انگارے
1
طاہر جاوید مغل
Pakistanipoint
Learning Point

ایک نوجوان کی داستان جسے معاشرے کے ناسور لوگوں نے آتش بنا دیا۔

انگارے

طاہر جاوید مغل

علی میاں پبلی کیشنز

۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ فون: 37247414

پیش لفظ:

''انگارے'' ڈنمارک میں رہنے والے شاہ زیب نامی نوجوان کی کہانی ہے۔ وہ ایک شریف النفس انسان تھا۔ پھر اس کی ایک دوست کے ساتھ ایسا واقعہ ہوا جس نے اسے مارشل آرٹ کی طرف آنے پر مجبور کر دیا۔ وہ ''مکس مارشل آرٹ'' کی جدید فیلڈ میں داخل ہوا۔ اس نے دیکھتے ہی دیکھتے یورپ میں اپنا لوہا منوا لیا مگر پھر ایک دن اس پر انکشاف ہوا کہ مارشل آرٹ کا بڑا کھلاڑی یا چیمپئن ہونا بھی کوئی معنی نہیں رکھتا۔ یہ دنگا فساد اور خونریزی کی دنیا ہے۔ ایک گولی، فقط ایک گولی بڑے سے بڑے ''رستم خاں'' کو قبر میں لٹا دیتی ہے۔

اس کے سینے پر کچھ ایسے چرکے لگے کہ وہ بتدریج کھیل سے دور اور کھلواڑ سے قریب ہو گیا۔

وہ یورپ کی گلیوں کا ایک دبنگ گینگسٹر بن گیا۔ اس نے جان ڈیرک جیسے خوفناک درندوں سے ٹکر لی اور ان کو تگنی کا ناچ نچایا۔ مگر اسی دوران میں ایک من موہنی پاکستانی لڑکی تاجور اس کی آنکھوں کے راستے اس کے دل کی گہرائیوں میں اتر چکی تھی۔ وہ اسے بھول کر بھی نہ بھول سکا۔ اس نے مار دھاڑ کی خوفناک دنیا سے چند دن کی رخصت لی اور ایک عام شخص کے حلیے میں پاکستان پہنچ گیا۔

یہاں وہ لڑکی تاجور اسے دوبارہ ملی اور اپنے ساتھ پنجاب کے کھیتوں کھلیانوں میں لے گئی۔ شاہ زیب نے ایک ایسی دنیا دیکھی جس کا اس نے کبھی تصور نہ کیا تھا۔ یہاں دیہی علاقوں کے سارے رنگ موجود تھے۔ محبت، دشمنی، سازشیں، جاہلیت، لڑائی اور دوستانے۔

شاہ زیب کو نہ چاہتے ہوئے بھی تاجور کی خاطر کچھ سنگین واقعات کا حصہ بننا پڑا۔ اس نے علاقے کے ایک بڑے ناسور ''پردے والی سرکار'' کو جہنم واصل کر دیا۔ مگر اس سے یہ ہوا کہ تاجور اس سے خوفزدہ ہو گئی۔ وہ سمجھ گئی کہ شاہ زیب کسی اور دنیا کا باسی ہے۔ اس کی گردن پر بہت سے خون ہیں۔ وہ قریب ہونے سے پہلے ہی اس سے دور ہوتی چلی گئی۔

دوسری طرف شاہ زیب ایک ایسے گورکھ دھندے میں پھنس گیا جس نے اسے برونائی سے آئے ہوئے ایک ارب پتی ریان فردوس کے عشرت کدے میں پہنچا دیا...... وہ جنوبی پنجاب کے شہر لیہ جا پہنچا۔ واقعات اور حادثات کے بگولے اس کے قدموں کو کہیں رکنے نہیں دے رہے تھے۔ ارب پتی ریان فردوس کو اپنی ایمپائر کی حفاظت کے لیے واپس جانا پڑا اور شاہ زیب بھی وہاں پہنچ گیا۔

وہاں ایسے لرزہ خیز اور محیر العقول واقعات پیش آئے جنہوں نے شاہ زیب اور اس کے دوست انیق کو چکرا کر رکھ دیا۔ وہاں جنگ کا سماں تھا۔ وہاں سائنس سے آگے کی چیزیں موجود تھیں۔ وہ پُراسرار حالات میں جکڑتے چلے گئے۔ کچھ بھی باقی نہ رہا۔ صرف تاجور کی محبت تھی جو شاہ زیب کو زندہ رہنے اور ہاتھ پاؤں مارنے کا حوصلہ دے رہی تھی۔ کچھ لوگ اس کے پرستار بن گئے تھے۔ وہ اسے اوتار کا درجہ دے رہے تھے، نجات دہندہ سمجھ رہے تھے اسے ایک ایسی جنگ لڑنا پڑی جو وہ لڑنا نہیں چاہتا تھا۔

یہ کہانی ہمیں اس حقیقت سے آگاہ کرتی ہے کہ کمزوری اور بے عملی کا دوسرا نام موت ہے۔ انسان وہی کچھ پاتا ہے جس کے لیے کوشش کرتا ہے۔ جو دیواروں میں دَر بنانے کا عزم کرتے ہیں، ان کو راستے ملتے ہیں۔ ایسے راستے جو انہیں آسمان کی بلندیوں تک لے جاتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ میرے دیگر سلسلوں کی طرح یہ سلسلہ بھی آپ کو پسند آئے گا۔ اور آپ اپنی رائے سے آگاہ کریں گے۔

آخر میں، مَیں اپنے بچپن کے پیارے دوستوں مولانا اکرم، ظفر اقبال، تحصیلدار محمد جاوید، ایس ڈی او خلیل اُپل، بینک منیجر خورشید اور ان سب کے لیے دعا گو ہوں...... جن سے ماضی کی بے شمار یادیں جڑی ہوئی ہیں...... وہ جہاں جہاں بھی ہیں اللہ ان کو اپنی حفظ وامان میں رکھے...... آمین

طاہر جاوید مغل

یہ نومبر کی ایک نہایت خوشگوار شام تھی۔ میرے وطن کی شام...... میرے بچھڑے دیس کی شام۔ اس شام میں میری جنم بھومی کے سارے کھیتوں کھلیانوں اور پھلواریوں کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ گلی کوچے، بستیاں، دریا، پہاڑ، میدان اور سبزہ زار سب کی مہک اسی شام میں شامل تھی۔

ائیرپورٹ سے باہر نکلتے ہی میں نے اپنے دونوں بازو فضا میں پھیلائے۔ ایک بھرپور انگڑائی لی اور اس انگڑائی کے بعد ڈھیر ساری تازہ ہوا اپنے سینے میں بھر لی۔ میں ابھی ابھی ڈنمارک سے لاہور آنے والی فلائٹ سے اترا تھا اور مختلف مراحل سے گزر کر ائیرپورٹ سے باہر آیا تھا۔ میں غالباً دس بارہ سال کا تھا جب آخری بار امی ابو کے ساتھ پاکستان آیا۔ اب میری عمر 23 سال تھی یعنی اپنے وطن کی زمین پر میرے قدم کم و بیش تیرہ سال بعد پڑے تھے۔

میں چچا کے گھر جا رہا تھا۔ یہ گھر دراصل ہمارا آبائی گھر بھی تھا۔ وہاں قدم قدم پر میرے بچپن کی یادیں بکھری ہوئی تھیں۔ یہ گھر لاہور سے پندرہ بیس میل دور ایک قصبے نما گاؤں میں واقع تھا۔ چچا کی بیٹی کی شادی تھی۔ پروگرام کے مطابق مجھے 14 نومبر کو لاہور پہنچنا تھا لیکن میں 12 نومبر کو ہی آ گیا تھا۔ میں، چچا اور ان کی فیملی کو سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ آج میری چچازاد فائزہ کی منگنی کی رسم تھی اور میں اس موقعے پر چچا کے گھر کی خوشیوں کو دوبالا کرنا چاہتا تھا۔

ائیرپورٹ سے نکل کر میں سامان والی ٹرالی دھکیلتا ہوا ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف بڑھا۔ اردگرد موجود کئی خواتین و حضرات نے مجھے توجہ سے دیکھا۔ اس توجہ میں یقیناً پسندیدگی کی جھلک بھی موجود تھی۔ مجھے اپنے بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں۔ تاہم حقیقت یہی ہے کہ میں چھ فٹ قد کا ایک جاذب نظر نوجوان تھا۔ اکثر لوگ بالخصوص نوجوان خواتین میری شخصیت سے

ہو رہی تھی۔ وہ یکسر بے ہوش تھا۔ میں نے ٹیکسی کی طرف دیکھا وہ سڑک پر تھی۔ ڈرائیور باہر کھڑا تھا۔ اس کی شکل دیکھ کر ہی لگتا تھا کہ وہ مجبوراً کھڑا ہے۔ اگر اس نے مجھ سے پندرہ سو روپے کرایہ وصول نہ کرنا ہوتا تو کب کا جا چکا ہوتا۔ مجھے اس کے رویے پر بے حد تعجب ہوا۔ میں نے یہ تو سن رکھا تھا کہ پاکستان میں قانون کی عمل داری کا معیار وہ نہیں جو یورپی ممالک میں ہے اور اس حوالے سے لوگوں کے رویے بھی قدرے مختلف ہیں لیکن جو کچھ میں یہاں جائے حادثے پر دیکھ رہا تھا وہ ششدر کر دینے والا تھا۔

میں نے ڈرائیور کو آواز دی تو وہ لڑکھڑاتا ہوا نیچے اتر آیا۔ ہم نے کوشش کر کے زخمی کو اٹھایا اور اوپر سڑک تک لے آئے۔ اس دوران میں دو تین راہگیر ارد گرد نظر آئے۔ انہوں نے زخمی کو ٹیکسی میں ڈالنے میں ہماری مدد کی۔ یہ دیہاتی ہی تھے۔ درمیانی عمر کے ایک تنومند شخص سے میں نے پوچھا کہ قریب ترین اسپتال کہاں ہے۔ اس نے ایک قریبی جگہ کا نام بتایا جو ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے کہا۔ ''بھائی صاحب! آپ ہمارے ساتھ ہی بیٹھ جائیں۔ بڑی مہربانی ہوگی۔''

وہ پہلے تو ہچکچایا پھر حوصلہ کر کے ہمارے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ میں نے پچھلی نشست پر بیٹھ کر زخمی کا سر اپنی گود میں لے رکھا تھا۔ اس کے زخم سے بہنے والا خون میری پینٹ کو تر بتر کر رہا تھا۔ وہ بہت گہرے سانس لے رہا تھا۔ عمر یہی تیئس چوبیس سال رہی ہوگی۔ وہ قبول صورت تھا۔ وہ کسی ماں کا بیٹا تھا، کسی بہن کا بھائی تھا اور ہو سکتا ہے کسی بیوی کا شوہر ہو۔ اس کے پیارے اس پر ٹوٹنے والی آفت سے بے خبر اپنے اپنے حال میں مگن تھے۔

''جلدی چلو یار۔'' میں نے ڈرائیور کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

اس نے رفتار کچھ اور تیز کر دی۔ اس کے تاثرات سے پتا چلتا تھا کہ وہ مجھ سے خفا ہے لیکن وہ اس خفگی کا اظہار نہیں کر سکتا تھا۔ موقع ہی ایسا تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا کہ مصداق وہ گاڑی بھگائے چلا جا رہا تھا۔ قریباً چار کلو میٹر کا فاصلہ طے کر کے ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ یہ نیم دیہی علاقے کا ایک چھوٹا سا اسپتال تھا۔ طبی سہولتیں بس گزارے لائق ہی تھیں۔ بہرحال عملے نے زخمی کو فوراً ایمر جنسی والے کمرے میں پہنچایا اور طبی امداد دینا شروع کر دی۔ میں اور ڈرائیور برآمدے میں کھڑے تھے۔ ہمارے ساتھ آنے والا مددگار دیہاتی بھی پاس ہی موجود تھا۔ ڈرائیور نے مجھ سے ہولے سے کہا۔

''باؤ جی! میرا خیال ہے کہ اب ہمیں نکل جانا چاہیے۔''

ابھی اس کا فقرہ مکمل ہوا ہی تھا کہ شلوار قمیص والا ایک لحیم شحیم ڈاکٹر ہمارے پاس آن

کھڑا ہوا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''اس بندے کو آپ لے کر آئے ہیں یہاں؟''

''جی ہاں۔'' میں نے جواب دیا۔

''آپ کی گاڑی سے زخمی ہوا ہے یہ؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں ڈاکٹر، ہم گزر رہے تھے۔ یہ پہلے سے سڑک پر پڑا تھا۔''

ڈاکٹر نے مجھے سر تا پا گھورا پھر ٹیکسی ڈرائیور سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''یہ تمہاری ٹیکسی ہے؟''

ٹیکسی ڈرائیور نے اثبات میں جواب دیا۔ ڈاکٹر تنومند دیہاتی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''آپ کون ہیں؟''

''میں بھی ان کے ساتھ آیا ہوں جی۔'' دیہاتی نے جواب دیا۔

ڈاکٹر بولا۔ ''آپ تینوں ابھی یہیں رہیں۔ زخمی کی حالت ٹھیک نہیں۔ ہم نے پولیس کو بلایا ہے۔ وہ آپ سے دو چار سوال کرے گی پھر آپ جا سکیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب! اگر ہمارا پولیس سے ملنا ضروری ہے تو پھر آپ انہیں ذرا جلدی بلا لیں۔ مجھے ایمرجنسی میں کہیں پہنچنا ہے۔''

اس کا معنی خیز فقرہ میرے کانوں میں گونجنے لگا۔ ''ایمرجنسیاں ہی کام خراب کرتی ہیں۔'' کہیں اس کا یہ فقرہ ڈرائیور اور میری طرف تو اشارہ نہیں کر رہا تھا۔

چند منٹ بعد پولیس پارٹی بھی پہنچ گئی۔ ان میں ایک فربہ اندام اے ایس آئی تھا۔ ساتھ میں ایک حوالدار ٹائپ شخص اور دو ہیڈ کانسٹیبل تھے۔ بظاہر وہ میرے اور ڈرائیور نثار کے ساتھ عزت سے پیش آئے لیکن اس عزت کے پیچھے شکوک کے سائے بھی موجود تھے۔ اے ایس آئی نے مجھ سے تیکھے لہجے میں سوالات کیے۔ میں کہاں سے آیا تھا؟ کہاں جا رہا تھا؟ ہم نے زخمی کو کہاں دیکھا؟ اس کی موٹر بائیک کہاں ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ اس نے ہمارے ساتھ آنے والے تنومند راہگیر سے بھی دو چار سوال پوچھے۔

جس دوران میں اے ایس آئی ہم سے یہ سوالات کر رہا تھا۔ حوالدار اور ایک کانسٹیبل احاطے میں کھڑی ٹیکسی کا آگے پیچھے سے معائنہ کر رہے تھے۔ انہوں نے ڈرائیور نثار سے کاغذات طلب کیے تو اس نے کانپتے ہاتھوں سے ان کے حوالے کر دیئے۔

اے ایس آئی اپنی ڈائری پر کچھ اندراجات وغیرہ کرنے لگا۔ میں نے گھڑی دیکھی اب آٹھ بجنے والے تھے۔ چچا کے گھر نو بجے کے قریب رسم منگنی تھی۔ میں نے اے ایس آئی سے کہا۔ ''محترم! مجھے کہیں جلدی پہنچنا ہے۔ اگر آپ نے مجھ سے مزید کچھ پوچھنا ہو تو میں فون

نمبر دے دیتا ہوں۔ آپ اس پر مجھ سے رابطہ کر لیجیے گا۔“
وہ ایک دم تلخ لہجے میں بولا۔ ”آپ ذرا بریک پر پاؤں رکھو۔ ابھی بڑے تھانیدار صاحب آ رہے ہیں۔ وہی فیصلہ کریں گے کہ تم دونوں کو جانا ہے یا رکنا ہے۔“
مجھے تاؤ آ گیا میں نے کہا۔ ”یہ آپ کس لہجے میں بات کر رہے ہیں۔ ہم مجرم نہیں ہیں۔ ہم نے ایک شہری کی مدد کی ہے اور ایسے وقت میں کی ہے جب کوئی دوسرا نہیں کر رہا تھا۔ ہم نے اسے اسپتال پہنچایا ہے۔ آپ نے جو کچھ ہم سے پوچھنا تھا، پوچھ لیا ہے۔ اب براہِ مہربانی ہمیں جانے دیں۔“
اے ایس آئی نے ڈائری بند کر کے میز پر رکھی اور مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ”نئے نئے آئے ہو نا۔“
میں نے کہا۔ ”ہاں نیا نیا آیا ہوں لیکن جانتا ہوں کہ قانون کیا ہے۔“
”اور ہم تو یہاں آلو چھولے بیچ رہے ہیں۔ کیا خیال ہے؟“ اس نے زہر خند لہجے میں کہا۔
”یہ آپ کس طرح بات کر رہے ہیں؟“ میں نے ذرا تنک کر کہا۔
”اچھا اب بات کرنا بھی مجھے آپ جناب سے سیکھنا پڑے گا؟“ وہ پھنکارا۔
ہمارے درمیان دو تین تلخ جملوں کا تبادلہ مزید ہوا۔ اسی دوران میں حوالدار اور کانسٹیبل ٹیکسی کا معائنہ کر کے اندر آ گئے۔ حوالدار نے چونکتے ہوئے کہا۔ ”سر! تیسرا بندہ کہاں ہے؟“
تیسرے بندے سے اس کی مراد ہمارے ساتھ آنے والا دیہاتی تھا۔ وہ واقعی نظر نہیں آ رہا تھا۔ پولیس والوں نے اسے احاطے میں اِدھر اُدھر دیکھا لیکن وہ کہیں دکھائی نہیں دیا۔ وہ موقع دیکھ کر نکل گیا تھا۔ اے ایس آئی کا پارا کچھ اور بھی چڑھا ہوا نظر آنے لگا۔ حوالدار سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”اوئے رمضان علی کہیں یہ دونوں بھی رفو چکر نہ ہو جائیں۔ ویسے بھی بڑی چھیتی ہے ان باؤ صاحب کو۔ ان کو ذرا اندر والے کمرے میں لے جاؤ اور آرام سے بٹھاؤ۔“
حوالدار توند مٹکاتا ہوا میری طرف بڑھا۔ اس کے پیچھے لمبے تڑنگے کانسٹیبل چلے آ رہے تھے۔ ڈرائیور کا رنگ بالکل زرد ہو گیا۔ حوالدار نے مجھے بازو سے تھاما اور بولا۔ ”باؤ جی! چھیتی کا کام شیطان کا ہوندا ہے۔ آپ ذرا اندر چل کر تشریف رکھیں۔“
”پر کیوں؟“
اے ایس آئی پھنکارا۔ ”زخمی کا کوئی پتا نہیں کہ کب اللہ بیلی ہو جائے۔ وڈے تھانیدار صاحب کو تم دونوں سے پوچھ گچھ کرنی ہے۔“

میں نے حوالدار کا ہاتھ اپنے بازو سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تم لوگوں کو بتایا ہے کہ مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ میں اپنا فون نمبر، ایڈریس، شناختی کارڈ سب کچھ آپ لوگوں کو دے دیتا ہوں لیکن میں یہاں رک نہیں سکتا۔''

حوالدار نے بدتمیزی کے انداز میں کہا۔ ''رکیں گے تو اب آپ ۔ ک. بڑے بھی۔ چلو اندر۔''

میں نے غصے سے اس کا ہاتھ اپنے بازو سے ہٹایا۔ ''ڈونٹ ٹچ می۔'' میرے منہ سے بے ساختہ جھلائی ہوئی آواز نکلی۔

وہ بولا۔ ''اس انگریزی کا ڈراوا کسی اور کو دینا باؤ۔ سیدھی طرح اندر چلو۔ نہیں تو بے عزتی ہو جائے گی۔''

''کیا کرو گے تم؟'' میں نے سرسراتے لہجے میں کہا۔

اے ایس آئی نے آگے بڑھ کر مجھے زور سے دھکا دیا۔ ''زبان مت چلاؤ، جو کہہ رہے ہیں وہ کرو۔''

اس نے دوسرا دھکا دیا تو میں دیوار سے جا لگا۔ دماغ میں چنگاریاں سی بکھر گئیں لیکن میں جانتا تھا یہ میری کیٹیگری کے لوگ نہیں ہیں۔ میں کسی کو ایک ہاتھ بھی مار دیتا تو اس کے لیے اٹھنا محال ہو جاتا۔ میں نے خود پر ضبط کیا اور انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ تم اچھا نہیں کر رہے ہو سب انسپکٹر، تمہیں اس کے لیے جواب دینا پڑے گا۔''

اے ایس آئی کی آنکھوں سے جیسے خون ٹپکنے لگا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا، ایک لڑکی تیزی سے اندر آئی۔ وہ شلوار قمیص میں تھی۔ ایک شال نے اس کے جسم کو ڈھانپ رکھا تھا مگر یہ شال اس کے جسم اور دلکشی کو چھپانے میں تقریباً ناکام تھی۔ لڑکی کے گھنے بالوں کی کچھ لٹیں شال سے نکل کر اس کے حسین چہرے پر جھول رہی تھیں۔ وہ بے حد پریشان دکھائی دیتی تھی۔ مجھے اور ڈرائیور کو دیکھ کر وہ سیدھا ہماری طرف آئی۔ جو کچھ اس نے کہا مجھے اس کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ اس نے جھپٹ کر میرا گریبان پکڑ لیا اور مجھے جھنجوڑ کر بولی۔ ''تم نے جان بوجھ کر کیا ہے۔ تم نے جان بوجھ کر مارا ہے اسے۔ تم کمینے...... تم اسی کے آدمی ہو...... وہ ہمیں برباد کر دینا چاہتا ہے۔ ہمیں مار دینا چاہتا ہے لیکن میں ایسا نہیں ہونے دوں گی...... اور ہوا تو جان دے دوں گی اپنی۔'' وہ ہیجانی انداز میں بولتی جا رہی تھی۔

اے ایس آئی نے اسے بمشکل پیچھے ہٹایا۔ لڑکی نے لال بھبوکے چہرے کے ساتھ میری اور ڈرائیور نظار کی جانب تھوک دیا۔

پتا نہیں کیسا الاؤ بھڑک رہا تھا اس کے اندر۔ وہ شکل صورت سے تو ایسی نہیں لگتی تھی۔ وہ مسلسل جنونی انداز میں بولتی چلی جا رہی تھی۔ دو نرسیں اسے سنبھال کر دوسرے کمرے میں لے گئیں۔ وہاں سے اس کی روتی کراہتی ہوئی آواز آئی۔ ''وہ کہاں ہے؟ میں اسے دیکھنا چاہتی ہوں، پلیز مجھے اس کی شکل دکھا دیں۔''

ایک نرس بولی۔ ''بی بی، اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب اسے لاہور بھجوا رہے ہیں۔ ابھی ایمبولینس آجاتی ہے پھر اسے دیکھ لینا۔''

ڈرائیور کے ہونٹ بالکل خشک ہو رہے تھے۔ وہ بار بار شکوہ کناں نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اب میرا دل بھی گواہی دینے لگا تھا کہ ہم راہ چلتے ایک سنگین چکر میں پھنس گئے ہیں۔ اگر واقعی مضروب کو کچھ ہو جاتا تو ہم شدید مشکل میں پڑ سکتے تھے۔ جہاں تک مجھے علم تھا ایکسیڈنٹ کی صورت میں تو فوراً ضمانت وغیرہ ہو جاتی ہے لیکن اگر یہ بات نکل آئے کہ جان بوجھ کر ٹکر ماری گئی ہے تو پھر یہ نہایت سنگین کیس بنتا ہے۔

میں نے اے ایس آئی کی طرف دیکھا۔ اس کا سانولا چہرہ جیسے اندرونی جوش سے تمتمانے لگا۔ حوالدار سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''یہ تو اور ہی چکر نکل آیا ہے بھئی۔''

حوالدار نے بھی مونچھوں کو تاؤ دے کر اثباتی انداز میں سر ہلایا۔ میں نے اے ایس آئی سے کہا۔ ''میں ایک ٹیلی فون کرنا چاہتا ہوں۔''

اس نے کہا۔ ''ٹیلی فون بھی کروا لیتے ہیں۔ ذرا چھری کے نیچے سانس تو لو لاٹ صاحب۔'' اس کے تیور اب ضرورت سے زیادہ خطرناک نظر آنے لگے تھے۔

''یا اللہ یہ کیا ہو رہا ہے۔'' میں دل ہی دل میں پکارا۔ ڈرائیور بھی ہکا بکا نظر آ رہا تھا۔ وہ زخمی کو جائے حادثہ سے اٹھانے سے ڈر تو رہا تھا لیکن یہ توقع یقیناً اسے بھی نہیں تھی کہ صورتِ حال ایسا سنگین رخ اختیار کر لے گی۔

اس سے پہلے کہ اے ایس آئی ہمیں دوبارہ اندرونی کمرے میں بھیجنے کا حکم جاری کرتا۔ اس کے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے فون کان سے لگایا۔ دوسری طرف اس کا کوئی افسر تھا۔ ''ہیلو سر! قادر بول رہا ہوں...... جی جی سر...... روڈ ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ جی شک ہو رہا ہے کہ یہی لوگ بندے کو ٹکر مار کر یہاں لائے ہیں۔ ٹیکسی کے بمپر پر ڈینٹ بھی نظر آ رہا ہے...... جی سر...... جی سر...... ایک لڑکی بھی یہاں آئی ہے جی...... وہ بھی کچھ واویلا کر رہی ہے۔ آپ یہاں آئیں تو پھر بات کھلے گی...... اوکے سر۔'' بات ختم کرنے کے بعد اے ایس آئی نے ایک بار پھر آتشیں نظروں سے مجھے گھورا اور بولا۔ ''معاملہ کافی لمبا لگ رہا ہے باؤ جی اور اس

کڑی کا کیا چکر ہے، اس کی بھی ابھی کچھ سمجھ نہیں آئی؟''
حوالدار نے مونچھوں کو تاؤ دے کر عام سے انداز میں کہا۔ ''دشمنی وغیرہ کا چکر ہے جی۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جو کچھ ہوا ہے اس میں باؤصیب اور ڈرائیور کی ساجھے داری ہو۔'' اس نے ساجھے داری پر زور دیا۔
''بالکل ٹھیک ہے۔'' میں نے اوپر نیچے سر ہلایا۔ ''میں ابھی ابھی ڈنمارک سے آیا ہوں۔ آتے ساتھ ہی میں نے ٹیکسی پکڑی اور ڈرائیور سے ساجھے داری کر کے اس بندے کو ٹکر ماردی ہے اور پھر خود ہی اسے اٹھا کر یہاں بھی لے آیا ہوں...... زبردست۔''
اے ایس آئی بولا۔ ''بندے کو یہاں لے آنا تمہیں بے گناہ ثابت نہیں کرتا ہے۔ موقعے پر اور لوگ بھی تو موجود تھے اور ان میں سے یہ دو تین بندے تمہارے ساتھ بھی آئے ہیں۔''
''کون سے دو تین بندے؟''
''جواب غائب ہوگئے ہیں۔'' اے ایس آئی نے اپنی ٹھوری کھجا کر کہا۔
''دو تین بندے نہیں تھے، وہ صرف ایک بندہ تھا اور اسے ہم خود اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ ہمیں اسپتال کے رستے کا پتا نہیں تھا۔'' میں نے ترخ کر کہا۔
''یہ تو تم کہہ رہے ہو نا، سچ کیا ہے یہ ہمیں پتا ہے اور جو نہیں پتا وہ بھی چل جائے گا۔''
پھر وہ حوالدار سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''چلو بھئی، ان دونوں کو بٹھاؤ گاڑی میں۔''
ڈرائیور نے گھگیا کر کہا۔ ''میں بالکل بے قصور ہوں سر جی۔ میرا اس بندے سے کوئی تعلق واسطہ نہیں۔ میں تو ڈرائیور ہوں۔''
''اوئے چل باہر، گاڑی میں بیٹھ۔ تھانے جا کر تیرا سارا اگا پچھا پتا کر لیتے ہیں۔''
حوالدار نے خطرناک لہجے میں کہا اور اس کے ساتھ ہی ڈرائیور کو دھکا دیا۔
اس بے چارے کی ٹانگوں میں جیسے جان ہی نہیں تھی۔ وہ لڑکھڑا کر دروازے کی دہلیز سے ٹکرایا اور اوندھے منہ گرا۔ اس کی ناک پر چوٹ لگی اور تیزی سے خون رِسنا شروع ہو گیا۔
حوالدار نے اسے اوپر تلے کئی تھپڑ مارے۔ وہ دہشت زدہ انداز میں چلانے لگا۔ مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر حوالدار کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس پر عملہ مشتعل ہو کر مجھ پر پل پڑا۔ مجھے ان سے ایسی لاقانونیت کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ شاید میں نے جس طرح اے ایس آئی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کی تھیں وہ اس کے لیے رنج کا باعث بنی تھیں۔ میری گردن پر دو زوردار جھانپڑ پڑے پھر اے ایس آئی نے میرے پیٹ پر لات رسید کی۔ یکا یک

مجھ پر مکوں اور ٹھوکروں کی بارش ہوگئی۔ غالباً وہ لوگ سمجھے ہوں گے کہ میں بھی ڈرائیور کی طرح فرش پر گر کر رونا چلانا شروع کردوں گا۔ ان بے چاروں کو خبر نہیں تھی کہ یہ سب کچھ میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ میں ایک پروفیشنل فائٹر تھا۔ میرا جسم اس سے کہیں زیادہ تکلیف جھیل سکتا تھا۔ دوسری طرف اگر میں ان پر جوابی وار کرتا تو شاید یہ لوگ چند سیکنڈ میں چوٹیں کھا کر تتر بتر ہوجاتے۔ بہرحال میں ایسا کچھ کرنا نہیں چاہتا تھا بلکہ شاید کر ہی نہیں سکتا تھا۔ میں اپنے ساتھ جو وعدے لے کر یہاں آیا تھا وہ مجھے پابند کرتے تھے کہ میں ان پر جوابی حملہ نہ کروں۔

میری جیکٹ پھٹ گئی۔ نچلے ہونٹ سے بھی خون رِسنے لگا۔ انہوں نے اپنے طور پر مجھے اچھی طرح ٹھیک کرلیا تو اے ایس آئی نے میرا پھٹا ہوا گریبان پکڑا اور باہر کی طرف دھکا دیتے ہوئے بولا۔ ''چل بیٹھ گاڑی میں۔ نہیں تو یہیں پر ننگا کردوں گا۔ کوئی معافی نہیں پولیس پر ہاتھ اٹھانے والے کے لیے۔''

میں نے اپنی اندرونی کیفیت پر ضبط کرتے ہوئے اے ایس آئی کی ہدایت پر عمل کیا۔ ڈرائیور مجھ سے پہلے ہی باہر نکل کر پولیس موبائل کی طرف جاچکا تھا وہ لوگ اسے مارتے ہوئے وہاں تک لے گئے تھے۔ مجھے بھی دھکے دیتے ہوئے پولیس موبائل کے اندر پہنچا دیا گیا۔ اردگرد کے مناظر میری آنکھوں کے سامنے چکرا رہے تھے۔ مجھے ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ صورتِ حال اتنی تیزی سے خراب ہوجائے گی۔ میں فی الحال اپنے اور اپنے چچا کی فیملی کے لیے کوئی مصیبت کھڑی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے اپنی خاموشی اور بے عملی کو برقرار رکھا۔

''اوئے، ایسے ڈیلے پھاڑ پھاڑ کر کیا دیکھتا ہے، نیچی کر آنکھیں، نیچی کر۔'' حوالدار نے میرے بال پکڑ کر میرے سر کو جھٹکا دیا۔

میں نے ہونٹ سے خون پونچھتے ہوئے کہا۔ ''یہ جو کچھ ہو رہا ہے اچھا نہیں ہو رہا۔ اس کے لیے تم لوگوں کو جواب دینا پڑے گا۔''

''اوئے دے لیں گے جواب بھی تجھ وڈے لاٹ صاب کو۔'' حوالدار نے زہرخند لہجے میں کہا اور مجھے ایک اور جھانپڑ رسید کرنے کے لیے ہاتھ اٹھایا لیکن ایک ہیڈ کانسٹیبل نے اس کا ہاتھ روک لیا۔

''جانے دو جی، کافی ہوگئی ہے۔'' اس نے اپنے حوالدار سے کہا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم پولیس اسٹیشن میں تھے۔ یہ جگہ اپنی مثال آپ تھی۔ یوں لگتا تھا کہ ہم ایک سرکاری دفتر میں نہیں کسی چودھری کے ڈیرے پر آگئے ہیں۔ احاطے میں بوہڑ کے ایک

بڑے درخت کے نیچے ایک بہت بڑی چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ ایک جانب تین چار گھوڑے بندھے نظر آرہے تھے۔ احاطے میں دستی نلکے کے قریب ایک بھوری بھینس بندھی ہوئی تھی اور ایک اہلکار غلط وقت پر بھونڈے طریقے سے اس کا دودھ دھونے کی کوشش کر رہا تھا۔ یقیناً یہ بھینس کسی مقدمے میں ملوث ہو کر یہاں آئی تھی اور اب تھانے کے اہلکار مالک کے خرچے پر اس کا دودھ وغیرہ نوش کر رہے تھے۔ کافی بڑا تھانہ تھا۔ چھ سات کمرے ہوں گے۔ ایک بڑے کمرے میں بجلی کا ہیٹر جل رہا تھا اور میز پر کاغذات وغیرہ بکھرے ہوئے تھے یقیناً یہی ایس ایچ او صاحب کا کمرا تھا لیکن وہ تھانے میں موجود نہیں تھے۔ مجھے اور ڈرائیور کو ایک غلیظ سے لاک اَپ میں بند کر دیا گیا۔ یہاں پہلے سے تین حوالاتی موجود تھے۔ ایک بے چارہ پرالی (چاول کی چھال) پر الٹا لیٹا تھا یقیناً اسے خوب مار لگائی گئی تھی اور وہ سیدھا لیٹنے کے قابل نہیں تھا۔

ڈرائیور کی حالت بری تھی۔ میں نے اس کا کندھا تھپک کر اسے تسلی دی۔ میں نے کہا۔ ”مجھے پتا ہے جو کچھ ہوا ہے میری وجہ سے ہوا ہے لیکن تم اب تسلی رکھو۔ میں تمہیں کچھ نہیں ہونے دوں گا۔“

وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”میں غریب بندہ ہوں جی۔ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔“

”رجسٹریشن ہے نا تمہارے پاس؟“

”ہاں جی پر میرا چالان ہو گیا تھا۔ چالان کی پرچی میں نے چھوٹے تھانیدار کو دے دی ہے۔“

”اور لائسنس؟“

”لائسنس بھی دے دیا ہے جی۔“

”پھر کوئی فکر نہیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

اسی دوران میں ہمیں حوالات کی سلاخوں کے اندر سے احاطے میں روشنی دکھائی دی۔ یہ ڈرائیور نثار کی ٹیکسی تھی جو اب اندر داخل ہو رہی تھی۔ اسے ایک ہیڈ کانسٹیبل چلا کر لایا تھا۔ ٹیکسی برآمدے کے قریب رک گئی۔ بلب کی روشنی میں، میں نے دیکھا اور دنگ رہ گیا۔ ٹیکسی کا اگلا بمپر ایک طرف سے ٹوٹا ہوا تھا اور سامنے والی جالی بھی مڑی ہوئی نظر آتی تھی۔ یہ سب کچھ پہلے تو نہیں تھا۔ غصے سے میرے جسم میں چنگاریاں سی بکھر گئیں۔ خبیث اے ایس آئی نے اپنا کہا سچ ثابت کرنے کے لیے اور ہمیں مزید پھنسانے کے لیے ٹیکسی کو خود نقصان پہنچایا

تھا۔ شکر ہے کہ ڈرائیور نے یہ سین نہیں دیکھا ورنہ وہ مزید دہشت زدہ ہو جاتا۔ اسے دیکھ کر تو پہلے ہی ایسا لگتا تھا کہ اسے دل کا دورہ پڑنے والا ہے۔ اب مجھے اپنے سامان کی فکر ہونے لگی۔ یہ کافی قیمتی سامان تھا اور ٹیکسی کی ڈکی میں پڑا تھا۔ میں نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ ہماری پولیس اپنے قبضے میں آنے والی اشیا کے ساتھ برا سلوک کرتی ہے۔ ان میں یقیناً جاندار اشیا بھی شامل تھیں۔ جیسے وہ بھینس، جس کے تھن سے بے ڈھنگے طریقے سے کھینچ کھینچ کر زبردستی اس کا دودھ نکالنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کیا جائے۔

ڈرائیور نے کانپتے لہجے میں کہا۔ ''آپ اپنے کسی رشتے دار یا واقف کار کو فون کریں جی۔ نہیں تو یہاں ہمارا حال بہت برا ہو جانا ہے۔''

''فون کیسے ہوگا، تمہارا فون تو لے لیا ہے انہوں نے اور میرے پاس ہے ہی نہیں۔'' میں نے کہا۔

''ہر کام روپے دے کر ہو جاتا ہے جی۔ آپ اس سنتری سے بات کرو۔ ابھی کوئی انتظام کر دے گا۔''

''بھئی مجھے تو یہاں کے طور طریقے پتا نہیں۔ نیا نیا آیا ہوں، تم ہی کوشش کر کے دیکھو۔''

ڈرائیور نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری اور پھر بڑی عاجزی سے سنتری کو آوازیں دیں۔ ''سنتری جی...... ذرا ایک منٹ بات سنو جی۔''

سنتری نے بالکل کان نہیں دھرے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ ایسی داد فریاد ایسی جگہوں پر ہر وقت کا معمول ہوتی ہے۔ اس لیے تھانے کا عملہ اس پر زیادہ توجہ نہیں دیتا۔

ڈرائیور قریباً دس منٹ تک وقفے وقفے سے سنتری کو بلاتا رہا لیکن اس نے گھورنے اور بڑبڑانے کے سوا اور کچھ نہیں کہا۔ اس دوران میں کسی کمرے سے گاہے بگاہے کسی ملزم کے رونے چلانے کی آوازیں بھی آتی رہیں۔ بالآخر سنتری نے ڈرائیور پر تھوڑا سا ترس کھایا اور بیزار سے انداز میں ہماری طرف آیا۔

''یہ کیا چاؤں چاؤں لگا رکھی ہے؟'' وہ اکھڑے لہجے میں بولا۔

ڈرائیور نے سلاخوں کے ساتھ منہ لگایا اور سنتری کے ساتھ تھوڑی دیر کھسر پھسر کی۔ ڈرائیور کا انداز بے حد التجا کا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد ڈرائیور اپنے ہاتھ کی مٹھی میں کچھ لے کر میرے پاس آیا۔ میں حیران رہ گیا۔ یہ ایک بوسیدہ سا موبائل فون تھا۔ وہ مجھے لے کر حوالات کے ایک نسبتاً تاریک گوشے میں چلا گیا۔ لرزتی آواز میں بولا۔ ''لو جی، جلدی سے کر لو فون جس کو کرنا ہے لیکن آواز ذرا نیچی ہی رکھنا۔''

میں یہاں بالکل نو وارد تھا۔ چچا کے سوا کس کو فون کر سکتا تھا مگر چچا کے گھر اس وقت منگنی کی رسم چل رہی تھی۔ مجھے بالکل مناسب نہیں لگا کہ میں اس وقت اس مصیبت کی اطلاع انہیں دوں پھر میری نظر برآمدے کے وال کلاک پر پڑی۔ اب رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔ دیہات اور قصبات میں یہ وقت سونے کا ہوتا ہے۔ عین ممکن تھا چچا کے گھر بھی تقریب ختم ہو چکی ہو۔ میں نے چچا کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف چار پانچ دفعہ بیل ہوئی پھر چچا کی بھاری آواز ابھری۔ ''کون؟''

''چچا! میں شاہ زیب بول رہا ہوں۔''

''ہاں شاہ زیب پتر، کیا حال ہے؟ کب پہنچ رہے ہو پاکستان؟''

میں نے کہا۔ ''چچا! میں پاکستان پہنچ گیا ہوں اور یہاں پہنچتے ہی ایک...... چھوٹی سی مشکل ہو گئی ہے میرے ساتھ۔''

''کک...... کیا کہہ رہے ہو...... میں سمجھا نہیں؟''

میں نے مختصر الفاظ میں چچا کو بتایا کہ میرے ساتھ یہاں کیا اور کس طرح ہوا ہے۔ چچا ہکا بکا سے سن رہے تھے جب اچانک سلسلہ منقطع ہو گیا۔ میں نے دوبارہ کال ملانے کی کوشش کی۔ نیٹ ورک میں خرابی آ رہی تھی۔ کال نہیں مل رہی تھی۔ نثار نے میرے ہاتھ سے فون سیٹ لیا اور خود نمبر ملانے کی کوشش کی۔ اس مرتبہ کوشش کامیاب رہی لیکن آواز اب بھی صاف نہیں آئی۔

نثار ہیلو ہیلو کر رہا تھا جب اچانک ایک گرج دار آواز نے ہمارے کانوں کے پردے پھاڑ دیئے۔ ''اوئے...... یہ کیا کر رہا ہے تُو؟''

نثار سرتا پا لرز گیا۔ اس نے سہم کر آہنی سلاخوں کی طرف دیکھا بلکہ ہم دونوں کی نظر ایک ساتھ ہی سلاخوں پر پڑی۔ وہاں ہمیں ایک ہٹا کٹا پولیس افسر نظر آیا۔ اس کے جبڑے غیر معمولی طور پر چوڑے تھے۔ سخت گیر چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ میں نے فوراً اندازہ لگا لیا کہ یہی اس تھانے کا ایس ایچ او ہے اور اسپتال میں اے ایس آئی قادر نے اسی سے بات کی تھی۔ یہ شخص نہ جانے کب خاموشی سے یہاں آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے نثار کو فون پر ہیلو ہیلو کرتے دیکھ لیا تھا اور اب سخت طیش میں نظر آتا تھا۔

بہرحال چند سیکنڈ بعد جب وہ دوبارہ بولا تو اس کے لہجے میں طیش کے بجائے تحمل نظر آیا۔ اس نے ڈرائیور کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''ادھر لاؤ یہ فون۔''

نثار آگے بڑھا اور لرزتے ہاتھ کے ساتھ فون سیٹ ایس ایچ او کی طرف بڑھا دیا۔ اب

حوالدار رمضان اور اسسٹنٹ سب انسپکٹر قادر بھی ایس ایچ او کے پیچھے آ کر مؤدب کھڑے ہو گئے تھے۔

ایس ایچ او نے سب انسپکٹر سے پوچھا۔ ''جناب کی تلاشی نہیں لی گئی تھی؟''

''لی تھی جناب، کہیں نیفے شیفے میں چھپا رکھا ہوگا۔''

ڈرائیور نے کانپ کر کہا۔ ''نہیں سر جی...... میں نے...... میں نے......''

''کیا میں، میں کر رہا ہے؟'' سب انسپکٹر گرجا۔

''وہ جی...... میں نے...... ذرا سنتری صاحب کی منت کی تھی۔ ضروری بات کرنی تھی۔'' نثار نے ایک طرف کھڑے سنتری کی طرف اشارہ کیا۔

دبلا پتلا سنتری فوراً مکر گیا کہ اس نے کوئی موبائل دیا ہے۔ الٹا وہ غصہ دکھانے لگا کہ اس پر الزام لگایا جا رہا ہے۔

اس دوران میں لمبا تڑنگا ایس ایچ او حوالات کا دروازہ کھلوا کر اندر آ گیا تھا۔ اس نے ڈرائیور سے نرم لہجے میں کہا۔ ''اگر آپ کو کوئی ضروری بات کرنی ہی تھی تو سب انسپکٹر سے کہتے، وہ آپ کو لینڈ لائن پر کال کروا دیتا۔ میرے تھانے میں اس طرح کا گھپلا ہو، میں کبھی برداشت نہیں کرتا۔ آئندہ آپ کو احتیاط کرنا ہوگی۔''

''جی سر...... جی سر۔'' نثار ہکلایا۔ وہ ایس ایچ او کے شائستہ لہجے پر قدرے متحیر بھی نظر آ رہا تھا۔

''اب آپ ذرا...... مرغا بن جایئے۔'' ایس ایچ او نے فقرہ مکمل کرتے ہوئے کہا۔

ڈرائیور نثار کا رنگ فق ہو گیا۔ میں بھی ہکا بکا رہ گیا۔

ایس ایچ او دوبارہ بولا۔ ''جناب نے سنا نہیں، میں نے عرض کیا ہے کہ مرغا بن جایئے۔''

ڈرائیور نثار ایک دم ایس ایچ او کے پاؤں پر گر پڑا۔ ''مجھے معاف کر دیجیے جی۔ مجھ سے غلطی ہو گئی۔ اپنے بچوں کے صدقے مجھے......'' اس کا فقرہ ادھورا رہ گیا۔ ایس ایچ او نے وہ کیا جس کی توقع ہمیں ہرگز نہیں تھی۔ کم از کم مجھے اور نثار کو تو بالکل بھی نہیں تھی۔ اس نے نثار کی شلوار کے نیفے پر ہاتھ ڈالا اور ایک جھٹکے سے اس کی شلوار نیچے گرا دی۔ اہلکار نثار پر ٹوٹ پڑے اور مارنے لگے۔ وہ گر گیا۔ لمبی قمیص کی وجہ سے وہ مکمل برہنہ ہونے سے بچ گیا تھا لیکن اس کی مکمل ستر پوشی بھی نہیں رہی تھی۔ وہ دوہائی دے رہا تھا۔

''خدا کے لیے معاف کر دو، خدا کے لیے۔''

میں اپنی جگہ پتھر کی طرح ساکت کھڑا رہا۔ اپنی نگاہوں پر بھروسا نہیں ہورہا تھا۔ انسانیت کی یہ تذلیل میری برداشت سے باہر تھی۔ مزید تکلیف کی بات یہ تھی کہ اس تذلیل کی کوئی بڑی وجہ بھی نظر نہیں آرہی تھی۔ میں نے یہ سب کچھ جھیلنا چاہا لیکن جھیل نہیں سکا۔ میں جھپٹ پڑا۔ میں نے نثار کو اہلکاروں کی بے رحم ضربوں سے بچانے کی کوشش کی۔ میں اس پر گر پڑا۔ میں نے اسے ڈھانپ لیا۔ اس کے جسم پر آنے والی تمام چوٹیں میں نے اپنے جسم پر لیں۔ چوٹیں ہر طرف سے لگ رہی تھیں۔

''پیچھے ہٹ جاؤ...... پیچھے ہٹ جاؤ۔'' میں دھاڑا لیکن کسی نے میری نہیں سنی۔

میں ان لوگوں پر ہاتھ اٹھانا نہیں چاہتا تھا کیونکہ مجھے پتا تھا کہ اگر میں نے ہاتھ اٹھایا تو ان کو کاری ضربیں آئیں گی اور ہوسکتا ہے کہ ان میں سے ایک آدھ کا کام ہی تمام ہوجائے۔ انہیں کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کس مصیبت کو دعوت دے رہے ہیں۔ وہ اپنے حریف کی طاقت سے ناواقف تھے۔

دھینگا مشتی کے دوران میں نثار اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کی شلوار پاؤں سے نکل چکی تھی۔ تاہم لمبی قمیص نے اسے گھٹنوں تک ڈھانپ رکھا تھا۔ میں اسے اپنے جسم کی آڑ فراہم کرتا ہوا حوالات کے دروازے کی طرف آگیا۔ مجھے تھانے دار کے ہاتھ میں اس کا سرکاری پستول نظر آرہا ہے۔ اس نے پستول کا دستہ پورے زور سے نثار کے سر پر مارا۔ دوسرا وار وہ غالباً مجھ پر کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے دھکا دیا۔ یہ کافی شدید دھکا تھا اور شاید تھانے دار کو اس کی توقع بھی نہیں تھی۔ وہ اڑتا ہوا سا دیوار سے ٹکرایا اور کھانے کے برتنوں پر جاگرا۔

صورتِ حال سنگین تر ہوگئی۔ اے ایس آئی نے بھی پستول نکال لیا لیکن اس سے پہلے کہ کوئی نہایت ناخوشگوار واقعہ پیش آجاتا ایک گرج دار آواز سنائی دی۔ ''یہ کیا ہورہا ہے، رک جاؤ''

اس آواز نے جادو کا سا کام کیا۔ نہ صرف اے ایس آئی ٹھٹک گیا بلکہ مجھے اندھا دھند مارنے والے بھی بدک گئے اور ہاتھ روک لیے۔ میں نے نثار کو بدستور اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے رکھا تھا۔ وہ بے چارہ سر پر لگنے والی چوٹ کی وجہ سے نیم بے ہوش ہوگیا تھا۔ اس کا پورا چہرہ خون سے رنگین نظر آنے لگا تھا۔

حوالات سے باہر چھریرے جسم والا یک دراز قد پولیس افسر کھڑا تھا۔ میں دیکھتے ہی جان گیا وہ ایس پی تھا۔ وہ درمیانی عمر کا نوجوان تھا اور اس نے پی کیپ پہن رکھی تھی۔

''یہ کیا تماشا ہے قیصر چودھری؟'' اس نے نثار کے پھٹے ہوئے سر کو دیکھ کر بارعب لہجے

میں پوچھا۔

''تماشا آپ کے سامنے ہی ہے جی۔'' تھانے دار نے اپنے کپڑے جھاڑتے ہوئے کہا۔ میرا دھکا کھا کر وہ کھانے کے برتنوں پر گرا تھا اور شاید اسٹیل کے جگ کا کنارہ اس کی ٹھوڑی پر لگا تھا۔ یہاں کٹ آنے کی وجہ سے خون رِسنے لگا تھا۔

اب عملے کے دو چار مزید افراد لاک اَپ کے اندر آ گئے تھے۔ انہوں نے مجھے بازوؤں سے جکڑ لیا اور گھسیٹ کر آہنی سلاخوں کے ساتھ لگا دیا۔ ایک ہٹے کٹے پولیس والے نے میرے ہاتھ میں ہتھکڑی لگائی اور ہتھکڑی کا دوسرا سرا آہنی سلاخوں سے منسلک کر دیا۔ میرا پہلے سے زخمی ہونٹ مزید زخمی ہو چکا تھا اور چہرے پر مزید چوٹیں بھی آئی تھیں۔

تھانے دار نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے ایس پی کو مخاطب کیا۔ ''سر! یہ خطرناک شخص ہے۔ اس نے حوالات سے بھاگنے کی کوشش کی ہے۔ مجھ پر حملہ کیا ہے۔ پستول چھیننا چاہ رہا تھا مجھ سے۔''

''یہ غلط ہے جناب! ایسا کچھ نہیں ہوا یہاں۔'' میں نے کہا۔ ''میں اور یہ ٹیکسی ڈرائیور بے قصور ہیں۔ ہمارا گناہ صرف اتنا ہے کہ ہم ایک بے ہوش زخمی کو اٹھا کر اسپتال لائے ہیں۔ اگر ہم ایسا نہ کرتے تو شاید وہ وہیں پڑا پڑا مر جاتا۔''

''یہ بکواس کر رہا ہے سر۔'' تھانے دار نے ہانپتے لہجے میں کہا۔ ''ابھی تھوڑی دیر پہلے حاجی نذیر صاحب کی بیٹی اسپتال پہنچی تھی۔ اس نے چلا چلا کر کہا ہے کہ ان لوگوں نے لڑکے کو جان بوجھ کر ٹکر ماری ہے۔ اسے جان سے مارنے کی کوشش کی ہے۔''

ایس پی نے کہا۔ ''چلو، اس بات کا فیصلہ تو عدالت میں ہو جائے گا لیکن یہاں لاک اَپ میں جو کچھ ہوا ہے، یہ ٹھیک نہیں ہے۔''

تھانے دار نے ایک کپڑے سے اپنی خون آلود ٹھوڑی پونچھتے ہوئے کہا۔ ''اس کے ذمے دار بھی یہی لوگ ہیں۔ اگر پسٹل میرے ہاتھ سے نکل جاتا تو یہاں باقاعدہ پولیس مقابلہ ہو جانا تھا۔'' اس کے ساتھ ہی وہ ایک بار پھر مجھ پر جھپٹ پڑا۔ اس نے مجھے دو زوردار تھپڑ مارے اور میرا گریبان پھاڑ دیا۔ اس موقعے پر ایس پی تیزی سے آگے آیا اور اس نے تھانے دار کو مزید کارروائی سے روک دیا۔

''اسٹاپ اِٹ، کنٹرول یور سیلف۔'' اس نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

تھانے دار ہانپتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔ ٹھوڑی سے بہنے والے خون نے اس کی وردی کو داغ دار کر دیا تھا۔ اسی خون جیسی سرخی اس کی آنکھوں میں بھی دکھائی دے رہی تھی۔ ایس پی اسے

لے کر حوالات سے باہر نکل گیا۔ میں سلاخوں کے ساتھ لگا کھڑا رہا۔ میرا ایک ہاتھ ہتھکڑی میں تھا۔ نثار نیم بے ہوشی کی حالت میں ٹھنڈے فرش پر لیٹا تھا۔ حوالدار کی ہدایت پر دو حوالاتی اسے ہوش میں لانے کے لیے اس کی ہتھیلیوں کی مالش کرنے لگے۔ دیگر عملہ خونخوار نگاہوں سے مجھے گھورتا رہا۔ ایک حوالاتی نے کوشش کر کے نثار کی شلوار اس کی برہنہ ٹانگوں پر چڑھا دی۔ یہاں جو کچھ ہو رہا تھا میرے لیے بے حد تحیر خیز تھا۔ مجھے صرف دو باتوں سے تھوڑی سی تسلی ہو رہی تھی۔ پہلی یہ کہ ایس پی پڑھا لکھا شخص تھا اور قدرے مختلف لگ رہا تھا۔ دوسری یہ کہ چچا حفیظ کو میری مصیبت کی خبر ہو چکی تھی اور یہ بھی اندازہ ہو چکا تھا کہ میں کس تھانے میں ہوں۔

قریباً ایک گھنٹے کے بعد تھانے کے احاطے میں کسی گاڑی کے رکنے کی آواز آئی۔ تھوڑی دیر اور گزری اور پھر مجھے حوالات کی سلاخوں کی دوسری جانب چچا حفیظ کی صورت دکھائی دی۔ ان کے ساتھ ایک اور لحیم شحیم شخص بھی تھا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا یہ دوسرا شخص ہمارا ایک دور کا رشتے دار اور ہائی کورٹ کا وکیل تھا۔ میری صورت حال دیکھ کر چچا کا رنگ کچھ اور بھی زرد ہو گیا۔ آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔

''یہ کیا ہو گیا شاہ زیب پتر؟'' انہوں نے لرزاں لہجے میں کہا اور سلاخوں کے اندر سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ وہ میرے خون آلود کپڑوں کو دیکھ رہے تھے۔ یہ اسی زخمی کا خون تھا جسے ہم نے اسپتال پہنچانے کا گناہ کیا تھا۔

وکیل کا نام عبداللہ تھا اس نے چچا کی موجودگی میں ہی مجھ سے سارا ماجرا سنا۔ اس کے چہرے پر پریشانی نظر آنے لگی۔ اس نے کہا۔ ''اگر معاملہ صرف ٹکر والا ہوتا تو میں کل ہر صورت تمہاری ضمانت کروا لیتا لیکن اب لڑکی کے بیان اور انسپکٹر کے زخمی ہونے کی وجہ سے معاملہ کچھ ٹیڑھا ہو گیا ہے پھر بھی میں اپنی پوری کوشش کروں گا۔''

میں نے کہا۔ ''یہ لڑکی کون ہے؟ میرے تو فرشتے بھی اسے نہیں جانتے اور یہ جو لڑکا ایکسیڈنٹ میں زخمی ہوا ہے، یہ کون ہے؟''

وکیل نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تھوڑا بہت اس بارے میں پتا ہے۔ جو لڑکی وہاں اسپتال میں آئی تھی اس کا نام عاشرہ نذیر ہے۔ وہ ایک مقامی زمیندار حاجی نذیر کی بیٹی ہے۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے ایکسیڈنٹ میں زخمی ہونے والا لڑکا عارف اس کا ماموں زاد ہے اور شاید منگیتر بھی۔''

''لڑکی نے اسپتال آتے ساتھ ہی یہ کیوں کہہ دیا کہ ہم نے لڑکے کو جان بوجھ کر ٹکر

ماری ہے؟'' میں نے پوچھا۔ وکیل کی طرح میں بھی بہت مدھم آواز میں بول رہا تھا۔
''اس کا ٹھیک جواب تو وہی دے سکتی ہے لیکن اس سے یہ خیال ذہن میں ضرور آتا ہے کہ ہوسکتا ہے یہ واقعی ایکسیڈنٹ کا کیس نہ ہو۔ کسی نے دشمنی نکالنے کے لیے جان بوجھ کر عارف کو ٹکر ماری ہو۔ سنا ہے کہ لڑکی جوان اور خوبصورت ہے۔ یہ کوئی رشتے کا تنازعہ بھی ہوسکتا ہے۔''
چچا حفیظ کی آنکھوں میں کروٹ لیتے ہوئے خوف میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ انہوں نے متوحش نظروں سے میرے چہرے کی چوٹوں کو دیکھا اور بولے۔ ''شاہ زیب پتر! تجھے کیا ضرورت پڑی تھی یہاں آتے ساتھ ہی پرائے پھڈے میں ٹانگ اڑانے کی؟''
میں نے کہا۔ ''چچا! وہ بندہ سڑک کے کنارے مر رہا تھا۔ گاڑیاں گزرتی جارہی تھیں کوئی اسے اٹھا نہیں رہا تھا۔ وہ چند منٹ اور وہاں پڑا رہتا تو پھر اسپتال بھی نہ پہنچ پاتا۔ میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا جس پر مجھے شرمندگی ہو۔''
''لیکن شاہ زیب پتر! یہ پولیس والوں کے ساتھ ہاتھا پائی تو غلط ہوئی ہے نا۔ یہ پاکستانی پولیس ہے رائی کا پہاڑ بناتی ہے اور یہاں تو انسپکٹر زخمی بھی ہوا ہے۔ یہ بڑا ڈنگا بندہ ہے یہ ہمیں سخت مصیبت میں ڈال دے گا۔''
میں نے فرش پر کراہتے ہوئے ڈرائیور کی طرف اشارہ کیا اور کہا۔ ''میں نے کسی پر ہاتھ تو نہیں اٹھایا چچا۔ بس اس بے گناہ کو بچانے کی کوشش کی ہے۔ یہ لوگ اسے وحشیوں کی طرح مار رہے تھے۔ میں اس کے اوپر گر گیا۔ یہ چوٹیں جو مجھے لگی ہیں آپ کے سامنے ہیں۔''
چچا پریشان لہجے میں بولے۔ ''یہ تو تم کہہ رہے ہو ناں، وہ تو کہہ رہے ہیں کہ تم نے اسلحہ چھیننے اور حوالات سے بھاگنے کی کوشش کی ہے۔ تھانے دار کی وردی پر خون بھی لگا ہوا ہے۔''
''یہ چوٹ میں نے اسے نہیں لگائی ہے چچا۔ میں نے اسے بس پیچھے دھکیلا تھا۔ وہ برتنوں پر گرا اور کسی برتن کا کنارہ اس کی ٹھوڑی پر لگا اور جو اسلحہ چھیننے والی بات ہے وہ بھی سفید جھوٹ ہے۔ میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔''
''ایسے معاملوں میں صرف قسموں سے کام نہیں چلتا۔ شہادتوں کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔'' ایڈووکیٹ عبداللہ نے ذرا بجھے لہجے میں کہا پھر تسلی دینے والے انداز میں بولا۔ ''بہرحال کل میں پوری کوشش کروں گا کہ ضمانت ہوجائے۔ کم از کم ڈرائیور کی ضمانت تو ہونی چاہیے۔''

میں نے چچا سے معذرت کی کہ میری وجہ سے انہیں ایک مصیبت سے دوچار ہونا پڑا ہے اور وہ بھی خوشی کے موقعے پر۔

چچا بہت فکر مند نظر آتے تھے۔ پتا نہیں انہوں نے میری معذرت سنی بھی یا نہیں۔ میں نے وکیل کو اپنے اس سامان کے بارے میں بتایا جو ٹیکسی کی ڈکی میں پڑا تھا۔ اس نے اس سامان کی تفصیل مجھ سے پوچھی اور ایک کاغذ پر لکھ لی پھر بولا۔ ''تھانے والوں نے بھی سامان کی لسٹ بنائی ہوگی۔ میں اسے اس لسٹ سے ملا لیتا ہوں۔ اللہ کرے زیادہ فرق نہ ہو۔''

مجھے کچھ ضروری ہدایات دے کر چچا اور وکیل تیزی سے باہر چلے گئے۔ کچھ ہی دیر بعد میں ان کی گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز سن رہا تھا۔ لگ رہا تھا وہ کسی سے ملنے گئے ہیں۔ اب رات کے بارہ کا عمل ہو چکا تھا۔ سردی بڑھتی جا رہی تھی اور اس سردی نے حوالات کی دیواروں اور برہنہ فرش کو کچھ اور ناقابلِ برداشت بنا دیا تھا۔ تینوں حوالاتی ٹھٹھرے سہمے لاک اَپ کی دیواروں سے لگے بیٹھے تھے۔ نثار کروٹ کے بل فرش پر پڑا تھا۔ اس کے زخمی سر پر ایک میلی سی پٹی باندھ دی گئی تھی۔ وہ آنکھیں بند کیے ہولے ہولے کراہ رہا تھا۔ میں نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے میں ڈرائیور کو اس چکر سے نکالنے کی پوری کوشش کروں گا۔ اگر کوئی جھوٹا الزام اپنے سر لینا پڑا تو وہ بھی لے لوں گا۔ میں پیچھے ہٹنے والا بندہ نہیں تھا۔ اگر کسی کے لیے کھڑا ہو جاتا تھا تو پھر آخری حد تک جاتا تھا۔

رات کے قریباً ڈھائی بجے کا عمل ہوگا جب ایک گاڑی تیزی سے تھانے کے احاطے میں داخل ہوئی۔ آواز سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ وہی گاڑی ہے جس پر چچا حفیظ اور ایڈووکیٹ پولیس اسٹیشن آئے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں ایک چودھری نما بارعب شخص کے ساتھ لاک اَپ کی طرف آئے۔ چودھری کے ساتھ دوسرے بندے کو دیکھ کر میں بری طرح چونک گیا۔ یہ وہی بندہ تھا جو ہمیں جائے حادثے پر ملا تھا اور جس کو ہم نے اسپتال کا راستہ جاننے کے لیے اپنے ساتھ ٹیکسی میں بٹھا لیا تھا۔ اسپتال میں پولیس کو دیکھنے کے بعد یہ شخص وہاں سے کھسک گیا تھا۔

چچا حفیظ کی پریشانی میں اب تھوڑی سی کمی دکھائی دے رہی تھی۔ انہوں نے اس شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ''شاہ زیب یہ وہی ہے ناں جس نے تمہیں اسپتال کا رستہ بتایا تھا؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ چچا حفیظ نے کہا۔ ''یہ گھبرا کر اسپتال سے نکل گیا تھا پر اب پھر آ گیا ہے۔ یہ عدالت میں گواہی دے سکتا ہے کہ وہاں موڑ پر اصل معاملہ کیا ہوا تھا۔''

اس شخص نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ میں نے چچا سے پوچھا۔ ”آپ اسے لے کر کہاں سے آئے ہیں؟“

چچا کے بجائے ایڈووکیٹ نے جواب دیا۔ ”ہم موقعے پر گئے ہوئے تھے جہاں یہ روڈ ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ وہاں پاس ہی دو تین دکانیں اور ایک چھوٹی بستی ہے۔ تم اسے چھوٹے سائز کا گاؤں بھی کہہ سکتے ہو۔ یہ اس گاؤں کے چودھری ہیں۔“ اس نے سرخ سفید رنگ والے بارعب شخص کی طرف اشارہ کیا پھر دیہاتی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ کرم داد ہے، اسی گاؤں کا رہنے والا ہے۔ اسے ڈھونڈنے میں چودھری صاحب نے ہماری مدد کی ہے۔“

چچا حفیظ نے کہا۔ ”ایک اچھی گل اور بھی ہے۔ پتا چلا ہے کہ لاہور کے اسپتال میں زخمی لڑکا ہوش میں آ گیا ہے۔ اللہ سوہنے سے امید ہے کہ وہ بچ جائے گا۔ عبداللہ کہہ رہا ہے کہ اگر تھانے دار قیصر سے معاملہ ہو جائے تو کل کچہری سے تمہاری ضمانت ہو سکتی ہے۔“

”تھانے دار سے معاملہ...... میں سمجھا نہیں؟“

”پتر، اس کے پاس وردی ہے، اختیار ہے، وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ اس معاملے کو سیدھا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اسے راضی کر لیا جائے۔“

”کس طرح راضی کر لیا جائے؟“ میں نے اکھڑے لہجے میں پوچھا۔

”تم...... اس کے سامنے معافی کے دو بول، بول دینا۔ باقی گل بات چودھری صاحب خود ہی کر لیں گے۔“ چچا نے جھجکتے ہوئے کہا۔

میں نے بگڑ کر کہا۔ ”میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا چچا۔ میں کس بات کی معافی مانگوں؟ معافی تو ان پولیس والوں کو مانگنی چاہیے۔ انہوں نے دو شریف شہریوں کو پریشان کیا ہے، بیدردی سے مارا پیٹا ہے اور یہ سب اس لیے کہ ہم نے ایک شدید زخمی شہری کی جان بچانے کی کوشش کی ہے۔ ٹھیک ہے ہمیں شاباش نہ دو، ہماری حوصلہ افزائی نہ کرو لیکن اس طرح معافیاں تو نہ منگواؤ ہم سے۔“

چچا حفیظ نے مجھے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”پتر! تم جہاں سے آئے ہو وہاں یہ رواج ہوں گے، یہاں نہیں ہیں، خدا کا شکر کرو کہ بندے کی حالت اسپتال میں چنگی ہو گئی ہے اور یہ چودھری بشارت بھی ہمارا ساتھ دے رہے ہیں۔ نہیں تو کام بہت بگڑ جانا تھا۔“

میں اندر سے بری طرح تپ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”لیکن میں انسپکٹر سے معافی نہیں مانگوں گا۔ جب میرا قصور ہی کوئی نہیں تو معافی کس بات کی؟ یہ تو اپنے آپ سے جھوٹ بولنا

ہے اور میں ایسا نہیں کرسکتا۔''

چچا حفیظ کے چہرے پر ناگواری کے آثار نظر آئے۔ انہوں نے کہا۔ ''شاہ زیب! تم نے پہلے بھی جلد بازی کر کے معاملہ بگاڑا ہے، اب اور من مانی نہ کرو۔ میں جیسا کہہ رہا ہوں ویسا تمہیں کرنا پڑے گا۔ تم صرف معافی مانگ لو باقی بات ہم کرلیں گے۔'' چچا روانی میں کہہ گئے۔

''باقی بات کیا؟'' میں نے پوچھا۔

چودھری نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ''تھانے دار اور چھوٹے تھانے دار کو کچھ دینا دلانا بھی پڑے گا۔ ان لوگوں کے ہاتھ میں قلم ہے۔ دو چار سخت لفظ بھی انہوں نے رپورٹ میں لکھ دیئے تو بات مہینوں اور سالوں تک چلی جائے گی۔''

میرے دماغ میں چنگاریاں سی بھر گئیں۔ ''تو آپ لوگ رشوت کی بات کر رہے ہیں؟''

چچا حفیظ نے اپنائیت بھرے غصے سے کہا۔ ''تم ان باتوں میں دخل نہ دو جن کا تمہیں پتا نہیں۔ جب یہاں کچھ دن رہ لو گے پھر اپنی مرضی کرلینا۔ ابھی جو کہتے ہیں وہ کرتے جاؤ۔ صبح سات بجے پیشی کے لیے روانگی ہے۔ اس سے پہلے پہلے معاملہ ٹھیک ہو جانا چاہیے۔''

''میں نے صاف کہہ دیا ہے، میں کسی سے معافی نہیں مانگوں گا اور میں نے کسی کو رشوت بھی نہیں دینی۔ آپ میری بات ایس پی صاحب سے کروائیں وہ سب کچھ جانتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ میری بات سنیں گے۔ وہ یہاں سے ہو کر گئے ہیں۔ انہوں نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔'' میں نے کہا۔

ایڈووکیٹ نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''تم ایس پی تبریز کی بات کر رہے ہو۔ تمہارا اندازہ ٹھیک ہے۔ وہ بہت اچھے افسر ہیں لیکن یہاں بات اچھے برے کی نہیں۔ یہ دیکھنا ہے کہ کس کا اختیار زیادہ ہے اور کوئی بڑا افسر ہوتے ہوئے بھی بے اختیار ہے۔''

''میں سمجھا نہیں؟''

''قیصر چودھری ویسے تو صرف انسپکٹر ہے لیکن اس کی اصل اتھارٹی شاید ایس پی سے بھی زیادہ ہے، اس کا پیچھا بڑا مضبوط ہے۔ وہ ایک بہت بااثر شخص کا خاص آدمی ہے۔''

''کون شخص؟'' میں نے پوچھا۔

ایڈووکیٹ بس لمبی سانس لے کر رہ گیا۔ میں نے صاف دیکھا کہ چچا حفیظ کے چہرے پر بھی رنگ سا آکر گزر گیا ہے اور صرف چچا حفیظ ہی نہیں ان کے ساتھ آنے والے چودھری کی کیفیت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔

''شاہ زیب! میرا مشورہ ہے کہ تم فی الحال سوال جواب میں زیادہ وقت ضائع نہ کرو۔ ابھی تمہارے لیے اتنا جان لینا ہی کافی ہے کہ انسپکٹر کی بیک بڑی تگڑی ہے۔ اگر ہم نے اس کی ناراضگی دور نہ کی تو بڑی سخت مصیبت میں پڑ جائیں گے۔ تمہارے چچا جو کہہ رہے ہیں وہ بات سو فی صد درست ہے۔ تمہیں قیصر صاحب سے معافی مانگ لینی چاہیے۔ باقی ہم سنبھال لیں گے۔'' پھر وکیل مزید دھیمی آواز میں بولا۔ ''وہ کہتے ہیں نا کہ وقت پڑنے پر لوگ گدھے کو بھی باپ بنا لیتے ہیں۔''

میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ میں سیدھا سیدھا چلنے والا شخص تھا۔ میری عمر کا زیادہ حصہ ڈنمارک جیسے ملک میں گزرا تھا۔ کئی ایک معاشرتی خامیوں اور اخلاقی برائیوں کے باوجود وہاں عدل وانصاف کا بول بالا تھا۔ شہریوں کو مثالی حقوق حاصل تھے۔ ان لوگوں نے اسلام کے ہی کچھ سنہری اصولوں کو اپنا کر اپنی زندگیوں کو آسان اور خوبصورت بنا رکھا ہے۔ عدل وانصاف کا رویہ بھی ان سنہری اصولوں میں سے ایک ہے۔ میں نے اب تک یہی کچھ دیکھا تھا لیکن اب جو کچھ میں دیکھ رہا تھا وہ میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ مجھے ایک ایسے شخص سے معافی مانگنے کا کہا جا رہا تھا جسے مجھ سے معافی مانگنی چاہیے تھی بلکہ جسے اپنی نوکری کا خطرہ لاحق ہو جانا چاہیے تھا۔

اگلا آدھ گھنٹا اسی بحث وتکرار میں گزر گیا۔ آخر چچا حفیظ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ انہوں نے میرے دونوں ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ''دیکھ پتر شاہ اگر تو مجھے اپنا چاچا سمجھتا ہے اور تیرے دل میں میرے لیے تھوڑی سی بھی عزت ہے تو میری بات مان لے۔ معافی مانگنے سے تو چھوٹا نہیں ہو جائے گا لیکن ہم سب ایک بڑی مصیبت سے بچ جائیں گے۔ یہ دیکھ...... میں تیرے سامنے ہاتھ جوڑ دیتا ہوں۔''

چچا کے بندھے ہوئے ہاتھ دیکھ کر میں تڑپ گیا۔ میں نے ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے پھر میری نظر ٹھنڈے فرش پر کراہتے ہوئے زخمی نثار پر پڑی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ اگر یہ معاملہ مزید بگڑ گیا تو اس بے چارے کو بھی سخت رگڑے لگیں گے۔ میں نے دل پر جبر کرتے ہوئے چچا کے سامنے نیم رضامندی ظاہر کر دی۔

چچا اور عبداللہ دوسرے کمرے میں تھانے دار کی طرف چلے گئے۔ چودھری بھی ان کے ساتھ گیا۔ چودھری کا پورا نام بشارت گوندل تھا۔

میری ٹانگیں مسلسل کھڑے رہنے سے اور سردی کے سبب اکڑ گئی تھیں کیونکہ ہتھکڑی کی وجہ سے میں بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو اب تک بے دم ہو چکا ہوتا لیکن میرے

لیے یہ سب جھیلنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ کسی قریبی کمرے سے تین چار افراد کے بولنے کی مدھم آوازیں آ رہی تھیں۔ کوئی کوئی فقرہ میری سمجھ میں آ بھی رہا تھا۔ ایسے میں ایک دو فقروں نے میرے سینے میں سلگتے انگاروں کو کچھ اور بھی تکلیف دہ بنا دیا تھا۔ چچا بڑے التجائیہ لہجے میں کہہ رہے تھے۔

''بچہ ہے جناب، نیا نیا آیا ہے۔ ناسمجھ ہے، ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ لیتا ہے آپ سے۔''

تھانے دار کی دھیمی مگر نہایت کاٹ دار آواز سنائی دی۔ ''میں نے اس کی معافی کا اچار ڈالنا ہے۔ معافی مانگنی ہے تو عدالت میں جا کر مانگے۔ میں تو قانون کا نوکر ہوں جو قانون کہتا ہے وہ میں نے لکھ دیا ہے۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔''

''ایسا نہ کہیں قیصر صاحب۔ سب کچھ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ بچوں سے غلطی ہو جاتی ہے۔ بڑے معاف کرتے ہیں۔'' چچا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

چودھری بشارت مدد کرتے ہوئے بولا۔ ''دیکھو جی قیصر صاحب! ہم تو جانتے ہیں ناں آپ کو۔ کبھی چوں چراں کی ہمت نہیں کرتے آپ کے سامنے۔ اب یہ منڈا انجانے میں غلطی کر بیٹھا ہے، آپ وڈا پن دکھائیں، معاف کر دیں۔''

گفتگو وضاحت سے ہم تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ تاہم یہ بات واضح تھی کہ چچا وغیرہ تھانے دار کی منت سماجت میں مصروف ہیں۔

کچھ دیر بعد چچا حفیظ اور وکیل میرے پاس آئے۔ چچا کی آنکھوں میں نمی تھی۔ میرے سامنے پھر ہاتھ جوڑتے ہوئے بولے۔ ''دیکھ تھانے دار کے سامنے کوئی غلط سلط بات منہ سے نہ نکالنا۔ میرے کہنے کی لاج رکھ لینا۔ اس سے معافی کے دو بول، بول لینا، باقی ہم سنبھال لیں گے۔''

چچا کی بے چارگی اور ڈرائیور کی بے بسی مجھ سے دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ میں رضا مندی کے انداز میں خاموش رہا۔ ایک ہیڈ کانسٹیبل نے میری ہتھکڑی کھول دی۔ میں چچا اور ایڈووکیٹ کے ساتھ لاک اَپ سے نکل کر اس کے دفتر نما کمرے کی طرف بڑھا جہاں اس تھانے کا حاکم انسپکٹر قیصر براجمان تھا۔ بجلی کے ہیٹر نے کمرے کو نیم گرم کر رکھا تھا۔ میز کے سامنے صرف دو کرسیاں تھیں، جن میں سے ایک پر چودھری اور دوسری پر سب انسپکٹر قادر بیٹھا تھا۔ انسپکٹر قیصر کی ٹھوڑی پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور وہ پرانی طرز کے ٹیلی فون پر کسی سے بات کرنے میں مصروف تھا۔ اس کے سرخ چہرے پر غصے کی تمتماہٹ تھی اور لہجہ نرم ہونے کے

باوجود اپنے اندر زہر چھپائے ہوئے تھا۔ وہ ریسیور کو کان سے لگائے ہوئے بولا۔

''چلو کوئی بات نہیں جناب عالی۔ آپ کے کوٹھے کی لڑکی ہے تو ہمارے سر آنکھوں پر۔ مجھے پتا ہوتا تو کل ہی چھوڑ دیتے اسے لیکن اب بھی کوئی بات نہیں صبح تک محترمہ آجائیں گی واپس آپ کے کنجر خانے پر...... نہیں نہیں...... آپ بے فکر رہیں۔ نہیں جی نہیں...... آپ اتنا پریشان کیوں ہوتے ہیں۔ چھوٹی موٹی شرارت سے کیا بگڑ جاتا ہے ایسی ہونہار کڑیوں کا اور آپ کی یہ بادشاہ زادی تو دیکھنے میں ہی بڑی ہیوی ڈیوٹی لگتی ہے......''

تھانے دار کی باتوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ کسی قریبی چوکی میں کسی طوائف زادی اور دو تماش بینوں کو پکڑ کر بند کیا گیا ہے اور یہ واقعہ پرسوں رات پیش آیا ہے۔ شاید طوائف زادی کے ساتھ کسی بہکے ہوئے اہلکار نے دست درازی کی ہے یا پھر اس سے بھی آگے گیا ہے۔ اب ایس ایچ او طوائف زادی کے وارث کوٹھے دار کو مطمئن کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور ساتھ ہی اسے یہ بھی باور کروا رہا تھا کہ لڑکی کی رہائی کے لیے اسے نقد کی صورت میں بھی کچھ نہ کچھ خراج دینا پڑے گا۔

بات لمبی ہوتی جا رہی تھی بلکہ یوں لگ رہا تھا کہ وہ جان بوجھ کر بات لمبی کر رہا ہے۔ شاید ہمیں اس طرح اپنے سامنے کھڑا کر کے اور انتظار کروا کے اسے مزہ آرہا تھا۔ یہ کوٹھے دار یا دلال اس کا پرانا واقف کار لگتا تھا۔ لڑکی والی بات چیت کے بعد اس نے کسی متنازعہ پلاٹ کے بارے میں گفتگو شروع کر دی۔ اسے ہماری موجودگی کی جیسے کوئی پروا ہی نہیں تھی۔ خدا خدا کر کے اس کی یہ فون کال ختم ہوئی اور اس نے سوالیہ نظروں سے ہماری طرف دیکھا۔ چچا حفیظ نے جو الفاظ پچھلے پندرہ بیس منٹ سے اپنے ذہن میں جوڑ رکھے تھے وہ تھانے دار کے سامنے ادا کر دیئے۔

چچا نے کہا۔ ''جناب! یہ اپنی غلطی کو مان رہا ہے۔ آپ سے معافی مانگنا چاہتا ہے۔''

تھانے دار نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''کیا بات کر رہے ہو بزرگو! میں ایک دو ٹکے کا تھانے دار اور یہ سر جی آئے ہیں ڈنمارک سے۔ پتا نہیں کتنا پڑھے ہوئے ہیں اور کن کن پڑھے لکھوں سے رابطے ہیں جناب کے۔ میری موت آئی ہے کہ میں ان سے معافی منگواؤں؟''

''چلو جی غصہ تھوک دو صاحب۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم بھی شرمندہ ہو رہے ہیں۔''

چودھری بشارت نے کہا پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''اب کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو معافی مانگ لو قیصر صاحب سے۔ یہ چاہیں تو ابھی پولیس مقابلے کا کیس بن سکتا ہے تم پر۔ دفع

333 وغیرہ لگ گئی تو دن میں تارے نظر آ جائیں گے ہم سب کو۔"

چچا حفیظ نے مجھے ٹھوکا دیا۔ میں کسی اور ٹائپ کا بندہ تھا۔ تھانے دار قیصر، چودھری جیسے لوگ میرا کچھ بگاڑ سکتے تھے اور نہ مجھے مرعوب کر سکتے تھے لیکن یہاں صورتِ حال کچھ اور ہو گئی تھی۔ میری وجہ سے کچھ اور لوگ سخت پریشانی میں گرفتار ہو رہے تھے جن میں چچا حفیظ اور ڈرائیور نثار سرفہرست تھے۔ میں نے دل پر جبر کیا اور خود کو حتی الامکان نارمل رکھتے ہوئے کہا۔ "جو کچھ ہوا غلط ہوا...... آئی ایم سوری انسپکٹر۔"

اس کا چہرہ کچھ اور تمتما گیا۔ اپنے مخصوص طنزیہ لہجے میں بولا۔ "واہ...... زبردست...... یہ کیسا لفظ ایجاد کیا ہے انگریزوں نے سوری...... کمال کا لفظ ہے۔ بندے کی اکڑ بھی نہ ٹوٹے اور معافی تلافی بھی ہو جائے۔ واہ...... سوری۔" اس نے ہاتھ نچا کر کہا۔

چچا نے ایک بار پھر مجھے ٹھوکا دیا اور غصے بھری سرگوشی میں بولے۔ "سیدھی طرح کہو نا...... معاف کر دیں۔"

میرے دماغ میں چنگاریاں سی بھر گئیں لیکن میں نے ضبط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ میں نے انسپکٹر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "جو کچھ ہوا میں اس کے لیے معافی مانگتا ہوں۔"

"کس سے؟" انسپکٹر قیصر نے ڈھٹائی سے پوچھا۔ وہ ذلیل کرنے پر تلا ہوا تھا۔

میرا جی چاہا کہ سارے اندیشے بالائے طاق رکھ کر اس پر پل پڑوں۔ اس پر گھونسے برساتا جاؤں اور کہتا جاؤں تم سے...... تم سے...... کمینے۔

لیکن میں جانتا تھا کہ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ میرے سامنے وعدوں کی ایک زنجیر تھی۔ میں نے حتی الامکان برداشت سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "آپ سے معافی مانگتا ہوں۔"

وہ ایک دم بھڑک کر میری طرف آیا۔ اس نے اپنے شائستہ لہجے کو خیرباد کہا اور میرا گریبان پکڑ کر پھنکارا۔ "اسی طرح بک بک کرنا جس طرح کر رہا تھا۔ بلانا اپنے کسی لاٹ صاحب کو جس کے سامنے مجھے اپنے کرتوتوں کا جواب دینا ہے...... بلانا اب۔" اس نے میرے پھٹے ہوئے گریبان کو جھنجوڑ کر مزید پھاڑ دیا۔

چودھری بشارت جلدی سے ہمارے درمیان آیا۔ اس نے ایک بار پھر انسپکٹر کی منت سماجت کی۔ وہ اپنے کپڑوں سے باہر ہو رہا تھا۔ پھر دھاڑا۔ "تو جانتا نہیں ہے مجھ کو۔ تیرے جیسے میرے پیشاب کی دھار میں بہہ جاتے ہیں......" فقرے کے آخر میں اس نے بلا دریغ مجھے ایک گالی سے نواز دیا۔

میرا پیمانہ صبر لبریز ہونے لگا۔ سر سے پاؤں تک جیسے ایک برق کوندگئی۔ میں نے کچھ کہنے کی غرض سے منہ کھولا تھا لیکن چچا شاید میرے منہ کھولنے سے پہلے ہی میرا ارادہ بھانپ گئے تھے۔ انہوں نے اپنے ہاتھ سے میرا منہ ڈھانپ لیا اور مجھے زور سے پیچھے دھکیلتے ہوئے بولے۔ ''چپ...... چپ ایک لفظ نہیں کہنا...... چل نکل اب یہاں سے......نکل۔'' انہوں نے مجھے اپنی اوٹ میں لے لیا۔ شکر کا مقام تھا کہ عین اس وقت تھانے دار کے فون کی گھنٹی بج اٹھی اور وہ ذرا ٹھٹک کر فون کی طرف متوجہ ہوگیا۔ اس کا چہرہ لال بھبوکا ہورہا تھا۔ چچا اور عبداللہ وغیرہ مجھے پھر لاک اَپ کی طرف لے آئے۔ میرا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا کہ شاید معافی مانگنے کے بعد میں گھر جاسکوں گا۔ مجھے پھر لاک اَپ میں بند کر دیا گیا۔ کچھ دیر بعد تھانے دار کے کمرے کی طرف سے ایک بار پھر گفت وشنید کی آوازیں آنے لگیں۔ اب غالباً لین دین والا معاملہ طے ہورہا تھا۔ میں اندر سے بے طرح ابل رہا تھا۔ پتا نہیں کہ ٹھوڑی پر لگنے والی ایک چوٹ کے عوض اس راشی تھانے دار نے چچا سے کتنی رقم وصولنا تھی۔

رات کے قریباً ساڑھے تین ہو چکے تھے۔ یہ سرد رات کچھ زیادہ ہی طویل محسوس ہورہی تھی۔ دس پندرہ منٹ بعد تھانے دار کو کسی واردات کی اطلاع ملی اور وہ جیپ پر بیٹھ کر کہیں چلا گیا۔ تاہم چچا، حفیظ اور عبداللہ بدستور تھانے میں ہی موجود رہے۔ شاید وہ نہیں چاہتے تھے کہ تھانے دار کے واپس آنے پر پھر میرا اور اس کا سامنا ہوجائے اور وہ میرے ساتھ کوئی بدسلوکی کرے۔

خدا خدا کر کے اجالے کی جھلک نظر آئی۔ چچا نے میرے اور نثار کے لیے حلوہ پوری اور چنے کا ناشتا لاک اَپ میں بھجوایا۔ یہ ناشتا جوں کا توں پڑا رہا بعد میں میرے اصرار پر تینوں حوالاتیوں نے یہ ناشتا کیا۔

پروگرام کے مطابق سات بجے کے قریب ہمیں ضلع کچہری لے جانے والی گاڑی تھانے پہنچ گئی۔ اس میں کسی دوسرے تھانے کے چار حوالاتی اور بھی تھے۔ ایک حوالاتی کی ناک سے مسلسل خون رِس رہا تھا۔ آدھ پون گھنٹے کے سفر کے بعد ہماری گاڑی لاہور میں داخل ہوئی اور پھر کچہری پہنچ گئی۔ اب ایڈووکیٹ کا کام تھا۔ اس نے اپنا کام بڑے اچھے طریقے سے کیا۔ مجھے خدشہ تھا کہ وہ لڑکی یا اس کے وارث کچہری میں موجود ہوں گے جس نے اسپتال میں ہم دونوں پر دانستہ ٹکر مارنے کا الزام لگایا تھا مگر یہ خدشہ غلط ثابت ہوا۔

ڈرائیور نثار کا لائسنس جج کو پیش کیا گیا اور مختصر کارروائی کے بعد ہم دونوں کی ضمانت ہوگئی۔

چچا کے علاوہ میرا چچا زاد بھائی ولید اور دو تین دیگر عزیز بھی کچہری میں موجود تھے۔

سب نے مجھے فرداً فرداً گلے لگایا اور پھر پرائیویٹ گاڑی میں بٹھا دیا۔ نثار کو ابھی تک ٹیکسی واپس نہیں ملی تھی۔ میرا سامان بھی تھانے میں ہی تھا۔ میں نے نثار کو ہر طرح تسلی دی اور وکیل سے کہا کہ وہ جلد از جلد سپرداری کروا کے نثار کی ٹیکسی اس کے حوالے کر دے۔ آئندہ پیشی پر بھی میں نے اسے اپنے پورے تعاون کا یقین دلایا۔ کرائے کے علاوہ میں نے مرہم پٹی اور ٹیکسی کی مرمت کے لیے چار ہزار روپے اسے نقد دیئے۔ وہ دعائیں دیتا رخصت ہوا۔ ہم لاہور سے واپس چچا کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

○......❖......○

چچا کے گھر میں رونق تھی۔ چچی آمنہ بھی تھانے کچہری کا سن کر بے حد پریشان تھیں۔ انہوں نے ہمیشہ مجھ سے شفقت کی تھی۔ وہ دیر تک مجھے گلے سے لگائے کھڑی رہیں۔ چچا کے صرف دو ہی بچے تھے۔ ایک فائزہ جس کی شادی ہو رہی تھی اور دوسرا ولید جو قریباً میرا ہی ہم عمر تھا۔

اپنوں میں آ کر میں جیسے کل رات والے دکھ بھول سا گیا لیکن سینے کے اندر سلگنے والی آگ مسلسل اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی تھی۔ جیسے بادلوں کے اندر گاہے بگاہے بجلی چمک جاتی ہے اسی طرح دو مناظر بار بار آنکھوں کے سامنے آتے تھے اور دل میں خنجر سا گھونپ دیتے تھے۔ ایک نثار کے نیم برہنہ ہونے کا منظر اور دوسرا وہ منظر جب میں نے بپھرے ہوئے تھانے دار سے معافی مانگی اور اس نے مجھے گالی دی۔

اگلے پانچ چھ دن رشتے داروں اور واقف کاروں سے ملنے ملانے میں گزر گئے۔ گھر میں بھی خوب گہما گہمی رہی۔ اس گھر سے میرے بچپن کی بے شمار یادیں وابستہ تھیں۔ ان دنوں میں بھی اپنے والدین کے ساتھ یہیں رہتا تھا۔ ہم بچے اس وسیع گھر میں آنکھ مچولی کھیلتے تھے۔ احاطے میں دوڑتے بھاگتے تھے، باغیچے کے درختوں پر چڑھتے تھے اور پرندوں کی طرح کچے پکے پھل کھاتے تھے۔ میری دونوں بہنیں بھی اس کھیل کود میں میرے ساتھ شریک ہوتی تھیں۔ اس گھر میں آ کر وہ ساری سنہری یادیں تازہ ہو گئیں۔ چچا نے اس گھر کو حال ہی میں رنگ و روغن کروایا تھا۔ باغیچے کی تراش خراش درست کی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ انہوں نے اس آبائی عمارت کو بڑی اچھی طرح سنبھال رکھا ہے۔

گھر کے پچھواڑے ایک کارخانہ نما جگہ تھی۔ ہمارے دادا کے زمانے میں یہاں سردیوں کے موسم میں بڑے بڑے کڑاہوں میں گڑ تیار ہوتا تھا اور تہواروں یا تقریبات پر میدے اور بوندی کے لڈو بنتے تھے لیکن اب یہاں باقاعدہ بیکری کا سامان تیار ہوتا تھا۔ یہ اعلیٰ

کوالٹی کا سامان نہ صرف لاہور شہر میں سپلائی کیا جاتا تھا بلکہ لاہور کے ایک اچھے علاقے میں بیکری کے سامان کی ایک شاندار دکان بھی تھی جس کی دیکھ بھال ولید کرتا تھا۔

چچا کے گھر گزرنے والے پانچ چھ دنوں میں، میں نے صاف محسوس کیا کہ چچا کچھ پریشان ہیں۔ پہلے تو میں یہ سمجھا کہ شاید مقامی تھانے دار سے جو اَن بن ہوئی تھی اس کا اثر ہے لیکن پھر محسوس ہوا کہ کوئی اور بات ہے۔ شاید کوئی کام کاج کا مسئلہ ہے۔ میں نے اس بارے میں ولید سے بھی ٹوہ لی۔ اس نے بھی یہ بات تسلیم تو کی کہ ابو دو تین مہینوں سے پریشان ہیں لیکن کیوں؟ اس بارے میں وہ بھی الجھن میں تھا۔ میں نے سوچا کہ عین ممکن ہے یہ بھی کوئی لڑائی جھگڑے کا معاملہ ہو۔ ولید طبیعت کا بہت تیز تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ چچا گڑبڑ والی باتیں اس سے چھپا لیتے ہیں۔

تھانے سے واپسی کے تیسرے دن مجھے میرا وہ سامان بھی واپس مل گیا جو ٹیکسی کی ڈکی میں رکھا گیا تھا۔ حسبِ اندیشہ اس میں سے دو تین قیمتی چیزیں غائب تھیں۔ غائب ہونے والی چیزوں میں ایک لیڈیز گھڑی بھی تھی جو میں نے اپنی فائزہ کو دیگر تحائف کے ساتھ دینی تھی۔ بہرحال وکیل کے بقول اس سلسلے میں صبر و شکر کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔

O.....❖.....O

ایک دن سردی معمول سے کچھ زیادہ تھی۔ شام سے پہلے ہی ہلکی سی دھند چھانا شروع ہوگئی تھی۔ میں اور ولید گھر کی وسیع و عریض بیٹھک میں بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے۔ ہمارے سامنے کوئلوں کی انگیٹھی دہک رہی تھی۔ اتنے میں گھر کا کام کرنے والی ماسی اندر آئی اس نے ولید سے مخاطب ہوکر کہا۔ ''ولید پتر! گاڑی میں کوئی ملنے آیا ہے تم سے۔''

ابھی چند سیکنڈ پہلے ہم نے گلی میں کسی گاڑی کے انجن کی مدھم سی آواز بھی سنی تھی۔ ولید اپنی گرم چادر درست کرتا ہوا باہر گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا اور انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ''حاجی نذیر صاحب کی گاڑی ہے۔ اس میں وہی لڑکی ہے جس نے اس دن اسپتال میں تمہیں برا بھلا کہا تھا۔''

''تمہارا مطلب ہے، حاجی صاحب کی بیٹی؟''

''ہاں، وہ ملنا چاہ رہی ہے تم سے۔''

میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پچھلے چھ سات دنوں میں، میں نے کئی بار اس لڑکی اور اس کے رویے کے بارے میں سوچا تھا۔ اگر وہ یہاں نہ آتی تو شاید ایک دو دن میں، میں خود اس سے ملنے کی کوشش کرتا۔ میں ولید کے ساتھ باہر آ گیا۔ ایک ٹویوٹا کار میں پچھلی نشست پر

وہی خوبرو لڑکی موجود تھی جو اس رات اسپتال میں مجھ پر بے طرح برسی تھی۔ سیاہ گرم چادر میں سے اس کے چہرے کی ایک سائیڈ دکھائی دے رہی تھی۔ ناک میں شاید چاندی کا چھوٹا سا کوکا جگمگا رہا تھا۔ گاڑی کا ڈرائیور ایک طرف مؤدب کھڑا تھا۔

میں قریب پہنچا تو لڑکی نے کھڑکی کا شیشہ نیچے اتار دیا۔ اس نے میری طرف دیکھا تو اس کی حسین آنکھوں میں حزن و ملال کی کیفیت نظر آئی، وہ بولی۔ ''میرا نام عاشرہ ہے۔ میں حاجی نذیر صاحب کی بیٹی ہوں۔ میں آپ سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو دو منٹ کے لیے گاڑی میں بیٹھ جائیں۔''

میں ذرا سا ہچکچایا پھر اگلا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔ دروازہ میں نے کھلا ہی رہنے دیا تھا۔ میرے پاؤں زمین پر تھے یوں میں اگلی نشست پر بیٹھے ہونے کے باوجود لڑکی کی طرف دیکھ بھی سکتا تھا۔

''جی فرمائیے۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

اس کی آنکھوں میں ایک دم نمی آ گئی۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''اس روز میری طرف سے آپ کے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی۔ میں آپ سے معافی مانگتی ہوں۔ مجھے سب پتا چل گیا ہے۔ ٹکر مارنے والے آپ نہیں تھے۔ آپ نے تو عارف کو بچانے میں مدد کی تھی۔ اگر آپ اسے اسپتال نہ پہنچاتے تو...... اللہ جانے کیا ہو جاتا۔'' میں نے دیکھا دو آنسو اس کے شفاف رخساروں پر لڑھک گئے۔

میں نے کہا۔ ''چلو، آپ کو غلطی کا احساس ہو گیا۔ جلد بازی میں جو ردِ عمل دکھایا جاتا ہے وہ اکثر غلط ہی ہوتا ہے۔''

''میں جانتی ہوں، آپ کو اس خدا ترسی کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی ہے۔ آپ کے ساتھ مار پیٹ ہوئی، آپ کو حوالات میں رات گزارنا پڑی۔ اب بھی ایک دو پیشیوں کے بعد آپ کی خلاصی ہو گی۔'' اس کے لہجے میں ہمدردی آمیز دکھ تھا۔

''ایک انسانی جان بچ گئی، اس کے عوض یہ سب، کچھ معنی نہیں رکھتا۔'' میں بولا۔

ہمارے درمیان چند جملوں کا تبادلہ مزید ہوا پھر میں نے کہا۔ ''عاشرہ صاحبہ! آپ سے ایک ذاتی سوال پوچھوں، اگر آپ برا نہ مانیں؟''

''پوچھیے۔'' وہ ذرا توقف سے بولی۔

''اس رات آپ کے شدید غصے کی وجہ یہ تھی کہ آپ کو کسی پر شک تھا۔ آپ کا خیال تھا کہ عارف کی بائیک کو کسی نے جان بوجھ کر ٹکر ماری ہے، آپ کا...... ایسا کون دشمن ہے جو اس

حد تک جا سکتا ہے؟''

عاشرہ کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ اس نے اپنا نچلا ہونٹ ہولے سے دانتوں میں دبایا پھر نفی میں سر ہلا کر بولی۔ ''سوری شاہ زیب صاحب! میں آپ کو اس بارے میں کچھ نہیں بتا سکتی۔'' اس کے چہرے پر کرب کے آثار صاف دکھائی دیتے تھے۔

میں نے کہا۔ ''اچھا...... یہی بتا دیجیے کیا اب آپ کا شک رفع ہو چکا ہے...... میرا مطلب ہے، جان بوجھ کر ٹکر مارنے کے حوالے سے؟''

''ج...... جی ہاں...... وہ بس ایک غلط فہمی تھی۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔ اس کا لہجہ صاف بتا رہا تھا کہ وہ بہت کچھ چھپا رہی ہے۔

عین اس وقت میری نگاہ اتفاقاً اس کی کلائی پر پڑی۔ دودھیا جلد پر ایک دو نیل تھے اور کٹ کا نشان تھا۔ یوں لگا کہ دو چار روز پہلے کانچ کی چوڑیوں نے ٹوٹ کر اس کی کلائی زخمی کی ہے۔ شاید اس سے کھینچا تانی ہوئی تھی۔ یہ منظر بس ایک سیکنڈ کے لیے دکھائی دیا پھر اس کی گرم شال نے کلائی کو ڈھانپ لیا۔

عاشرہ نامی لڑکی تو معافی تلافی کر کے چلی گئی لیکن میرے ذہن میں کئی سوال چھوڑ گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں اور ولید پھر بیٹھک میں گرم انگیٹھی کے پاس آ بیٹھے اور اس لڑکی کے بارے میں بات چیت کرنے لگے۔ ولید اس کے بارے میں بس اتنا ہی جانتا تھا کہ وہ اس علاقے کے ایک بڑے زمیندار حاجی نذیر کی بیٹی ہے۔ اپنے شوق کی وجہ سے لاہور میں کسی جاب کے لیے جاتی ہے اور اس کا ماموں زاد عارف غالباً اس کا منگیتر ہے۔

''یار ولید! میرا دل چاہ رہا ہے کہ اس لڑکے عارف سے ایک بار ملا جائے۔'' میں نے کہا۔

''کیوں؟''

''بس بڑی الجھن سی ہو رہی ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں...... تجسس پیدا ہو رہا ہے۔''

''وہ جنرل اسپتال میں ہے۔ کل میرے ساتھ شہر چلنا مل لیں گے اس سے۔'' ولید بولا۔

اسی دوران میں کسی قریبی کمرے سے چچا حفیظ کے کھانسنے کی مسلسل آواز آنے لگی۔ چچی آمنہ پکار کر بولیں۔ ''ولید! اپنے ابا جی کی دوائی دیکھنا کہاں ہے۔'' ہم دونوں چچا کو دیکھنے ان کے کمرے کی طرف چلے گئے۔

○......❖......○

اگلے روز میں ولید کے ساتھ جنرل اسپتال پہنچا۔ عارف سے ملاقات ہوئی۔ حادثے کی رات بھی اسے دیکھا تھا لیکن وہ افراتفری کا عالم تھا۔ آج دھیان سے دیکھا۔ وہ چوبیس پچیس سال کا ایک خوش رُو نوجوان تھا۔ شلوار قمیص پہنے بستر پر نیم دراز تھا۔ مضافاتی علاقے کا رہائشی ہونے کے باوجود پڑھا لکھا نظر آتا تھا۔ طبی امداد کے دوران میں اس کا سر مونڈ دیا گیا تھا اور کنپٹی کے قریب دس پندرہ ٹانکے نظر آ رہے تھے۔ ایک ہاتھ پر بھی آٹھ دس دن پرانا زخم تھا۔

جب اسے یہ معلوم ہوا کہ اسے جائے حادثہ سے اٹھا کر اسپتال پہنچانے والا میں ہوں تو اس کی آنکھوں میں نمی چمک گئی۔ ''بہت شکریہ۔'' اس نے بس اتنا ہی کہا۔

میں نے کہا۔ ''یار! آپ پڑھے لکھے نظر آتے ہو۔ آپ کو ہیلمٹ ضرور پہننی چاہیے۔ اگر ایسا ہوتا تو شاید یہ حادثہ اتنا سنگین ثابت نہ ہوتا۔''

''ہو ہی جاتا تو اچھا تھا۔'' اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''کیا مطلب؟''

''کک...... کچھ نہیں۔'' وہ ایک دم پژمردہ دکھائی دے رہا تھا۔ یوں لگا کہ اپنی جان بچ جانے کی اسے کوئی خوشی ہی نہیں۔ اس کے چہرے پر غم واندوہ کی کیفیت جیسے نقش ہو کر رہ گئی تھی۔ میں اور ولید اس کے لیے پھل وغیرہ لے کر گئے تھے۔ اس نے ہمارے لیے چائے منگوائی۔

باتیں کرتے کرتے وہ اچانک سسک پڑا۔ کراہ کر بولا۔ ''اس دنیا میں کمزور بندے کی کوئی زندگی نہیں۔ اسے مر ہی جانا چاہیے۔ میں بھی مر ہی جاتا تو اچھا تھا۔''

میں نے اسے کریدنا چاہا لیکن وہ کچھ بھی بتانے پر آمادہ نہیں ہوا۔ میں نے کہا۔ ''عارف! تمہاری باتیں سن کر پتا نہیں کیوں لگ رہا ہے کہ وہ شک درست ہی ہے۔''

''کون سا شک؟''

''یہی کہ اس رات تمہاری بائیک کو جان بوجھ کر ٹکر ماری گئی تھی۔''

وہ خاموش ہو گیا۔ اس کی خاموشی گواہی دینے لگی کہ وہ میری بات کی تائید کر رہا ہے۔ ولید تو کچھ دیر بیٹھ کر اپنی شاپ کو دیکھنے چلا گیا لیکن میں وہیں عارف کے پاس بیٹھا۔ اس سے باتیں کرتا رہا۔ اسے اعتماد میں لیتا رہا۔ میں نے اسے اس رات والا واقعہ بھی بتایا جب عاشرہ حادثے کے بعد اسپتال پہنچی تھی اور اس نے بڑے جذباتی انداز میں مجھے اور ڈرائیور کو آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ عاشرہ کا نام سننے کے بعد عارف کے چہرے پر کرب کے آثار بڑھ گئے۔ مجھے

اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ سارا معاملہ کسی ''رشتے'' کا ہے۔ کوئی اور بھی تھا جو عاشرہ کو حاصل کرنا چاہ رہا تھا۔ میں نے اس حوالے سے عارف کو مزید کریدا تو اس بار اس کے ضبط کا بند ٹوٹ گیا۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''وہ جیت گئے ہیں۔ میں ہار گیا ہوں۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا...... کچھ نہیں۔''

''کیا تم ان لوگوں کی بات کر رہے ہو جنہوں نے تمہیں مارنے کی کوشش کی؟''

اس نے نم آنکھوں کے ساتھ اپنا سر اثبات میں ہلایا۔ ''وہ بڑے زور والے ہیں۔ انہوں نے سب کچھ اپنے حق میں کر لیا ہے۔ اب...... اب وہ بھی مجھے دھتکار گئی ہے۔ اس نے بھی اپنا نفع نقصان دیکھ لیا ہے۔ اچھا تھا میں مر ہی جاتا...... مجھے نہ اٹھاتے آپ وہاں سے۔''

''کون ہے وہ، جو اس طرح تم سے دشمنی چکا رہا ہے؟'' میں نے اپنائیت سے اپنا ہاتھ اس کے زخمی ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔

عارف کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔ وہ بولا۔ ''وہ بہت زور والا ہے۔ بڑے لمبے ہاتھ ہیں اس کے۔ پتا نہیں کیوں اللہ نے اس کی رسی اتنی لمبی کی ہوئی ہے۔''

میری نگاہوں کے سامنے وہی منظر گھوم گیا جب میں نے ایسی ہی بات عبداللہ کے منہ سے سنی تھی۔ اس کے چہرے پر بھی ایسا ہی سایہ لہرایا تھا اور قریباً یہی الفاظ اس نے بھی کہے تھے۔

میرے تجسس کا بڑھ جانا ایک فطری عمل تھا۔ میں کافی حد تک عارف کو اپنے اعتماد میں لے چکا تھا۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ میرے اور اس کے درمیان جو بات چیت ہو رہی ہے وہ ہم دونوں کے درمیان ہی رہے گی۔ شاید وہ بھی ایک ایسی کیفیت میں تھا جب بندہ دیوار سے بھی بات کرنے کو تیار ہو جاتا ہے تاکہ اس کا غم ہلکا ہو سکے۔

میرے اصرار پر اس نے ایک بھاری بھرکم سیاسی شخصیت کے بیٹے کا نام لیا۔ اس سیاسی شخصیت کا نام میں نے ڈنمارک میں بھی اکثر الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا پر سنا تھا۔ عطاءاللہ داراب صاحب خود تو عملی سیاست میں نہیں تھے لیکن پس پشت رہ کر وہ سب کچھ کر رہے تھے۔ آسان لفظوں میں کہا جائے تو یوں ہوگا کہ عطا داراب نامی یہ بندہ ان لوگوں میں سے تھا، جو کنگ نہیں ہوتے...... کنگ میکر ہوتے ہیں۔

عطا داراب صاحب ایک بڑے صنعت کار تھے اور اب بڑے زمیندار بھی بنتے جا رہے تھے۔ عام طور پر لوگ پہلے زمیندار ہوتے ہیں پھر صنعت کار بنتے ہیں لیکن یہاں معاملہ دوسری طرح کا چل رہا تھا۔ بیٹے کا نام بھی میں نے کافی سنا ہوا تھا لیکن اس وقت اس کی صورت

ذہن میں نہیں آرہی تھی۔ یقیناً یہ بہت بڑے لوگ تھے۔ کچھ دیر کے لیے میں بھی گم صم رہ گیا۔ مجھے اس بات پر سخت حیرانی بھی ہو رہی تھی کہ وہ لوگ جو قوم کے رہنما کہلاتے ہیں اور عوام کو عدل وانصاف مہیا کرنے کے ذمے دار ہوتے ہیں، خود ایسی من مانیوں میں ملوث ہیں۔ اگر کہیں ڈنمارک میں اس طرح کی صورتِ حال ہوتی تو ایک طوفان برپا ہو گیا ہوتا۔

میرے کریدنے پر عارف نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ اسے جان سے مارنے کی کوشش کرنے والے داراب فیملی کے آدمی تھے۔ وہ عرصے سے دھمکی آمیز رویہ اختیار کیے ہوئے تھے۔ آخر انہوں نے ان دھمکیوں کو عملی جامہ پہنایا ہے۔ اس کارروائی کے بعد حاجی نذیر کے گھر والے اور خاص طور سے ان کی بیٹی عاشرہ اتنے ہراساں ہوئے ہیں کہ ان کی ہر بات ماننے کو تیار ہو گئے ہیں۔

میں نے پوچھا۔ ''ہر بات ماننے سے تمہاری کیا مراد ہے عارف؟''

وہ کچھ دیر ہچکچاتا رہا پھر اشکبار لہجے میں بولا۔ ''وہ خبیث شکیل داراب، عاشرہ پر بہت عرصے سے نگاہ رکھے ہوئے ہے۔ وہ عاشرہ کو حاصل کرنے کے لیے ہر ہتھکنڈا آزمانے کے لیے تیار ہے اور...... میرا خیال ہے کہ وہ کامیاب ہو چکا ہے۔ پہلے شکیل کا باپ اس شادی پر راضی نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ حاجی نذیر اس کا ہم پلہ نہیں۔ بے شک حاجی نذیر بھی ایک بڑا زمیندار ہے لیکن عطا داراب جیسے شخص کے لیے تو وہ ایک معمولی خاندان کا حقیر سا بندہ ہی ہے۔ وہ صرف اس لیے راضی ہوا ہے کہ بیٹا اس رشتے پر اڑا ہوا ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ عاشرہ اور شکیل داراب ایک ہونے والے ہیں؟''

''ہونے والے نہیں، سمجھو کہ ہو چکے ہیں۔ مجھے لگتا ہے ایک دو ہفتے کے اندر ہی ان کا نکاح ہو جائے گا۔ جہاں تک میری اطلاع ہے یہ شادی لاہور میں ہی بڑی سادگی سے ہوگی۔ گنے چنے افراد کو بلایا جائے گا۔'' عارف کی آواز دکھ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

''سادگی سے کیوں؟ دھوم دھام سے کیوں نہیں؟''

''ایسے لوگ دھوم دھام سے تو پہلی شادی ہی کرتے ہیں۔''

''کیا مطلب...... یہ اس کی پہلی شادی نہیں ہے؟''

''نہیں اس کی پہلی شادی دس بارہ سال پہلے ہوئی تھی۔''

''لیکن...... جہاں تک میرا اندازہ ہے شکیل داراب کی عمر اتنی زیادہ نہیں۔ چھبیس ستائیس کا ہوگا۔''

''اس کی پہلی شادی بڑی چھوٹی عمر میں ہو گئی تھی۔ سولہ سترہ سال کی عمر میں۔ پہلی بیوی

سے بچہ کوئی نہیں۔ یہ بہانہ بھی مل گیا ہے اس کو۔ ویسے کوئی بہانہ نہ بھی ہو تو بھی یہ لوگ اپنا کام تو کر ہی گزرتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ عرصے بعد یہ تیسری شادی کرے اور یہ شادی بغیر کسی بہانے کے ہی کر لے۔'' عارف کی آواز طیش اور دکھ کی شدت سے ٹوٹ رہی تھی۔

میں کچھ دیر اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا پھر میں نے کہا۔ ''عارف! تم اپنے حق کے لیے لڑتے کیوں نہیں ہو؟''

''کس کے لیے لڑوں؟ کس کے بھروسے پر لڑوں؟''

''عاشرہ کے لیے لڑو، اس کے بھروسے پر لڑو۔''

اس کے ہونٹوں پر ایک زخمی مسکراہٹ کھیل گئی۔ ''آپ باہر کے ملک سے آئے ہونا۔ آپ نہیں جانتے یہاں اپنے حق کے لیے لڑنا کتنا مشکل ہوتا ہے اور پھر عطا داراب...... شکیل داراب جیسے لوگوں سے لڑنا تو سمجھو ممکن ہی نہیں اور جو تم عاشرہ کی بات کر رہے ہو وہ بھی اب ممکن نہیں۔ وہ مجھ سے بہت دور چلی گئی ہے۔ میرے اور اپنے خاندان کی زندگی اور عزت کی خاطر اس نے مجھ سے ہر ناتا توڑ لیا ہے۔''

''کیا اس طرح ناتے توڑ لینے سے ٹوٹ جاتے ہیں؟ کیا وہ تمہیں بھول پائے گی؟ کیا تم اس کو بھول پاؤ گے؟ تم اسے کیوں ایک جھوٹی زندگی شروع کرنے دے رہے ہو؟ تم کسی پرانے دور کے جاہل قبیلے کے فرد نہیں ہو۔ جو کچھ بھی ہے، یہ ایک آزاد ملک ہے۔ یہاں عدالتیں ہیں، ادارے ہیں، آزاد پریس ہے، الیکٹرانک میڈیا ہے۔''

''سب کچھ ہے لیکن عام بندے کی شنوائی نہیں ہے۔'' عارف نے دکھی لہجے میں کہا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''تم نے ابھی خود بتایا ہے کہ حادثے والی رات تمہارے اور ڈرائیور کے ساتھ کیا ہوا؟ اور میرے خیال میں تم نے کم ہی بتایا ہے۔ اس سے زیادہ ہوا ہوگا۔ کیا تم اس کے لیے انصاف لے سکے ہو؟ اور یہ تو ایک چھوٹی سی مثال ہے جہاں شکیل داراب جیسے لوگوں سے سامنا ہو وہاں کسی کا کچھ نہیں ہوسکتا۔''

میں کچھ دیر گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر میں نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ ''اگر میں اس سلسلے میں تمہاری کچھ مدد کرنا چاہوں تو؟''

اس نے چونک کر مجھے دیکھا پھر میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ''نہیں بھائی، اب مجھے معافی دے دو۔ تم نے پہلے ہی میرے لیے اتنا دکھ اٹھایا ہے کہ میں اپنے سینے پر پہاڑ جیسا بوجھ محسوس کر رہا ہوں۔ میں تمہیں کسی اور مصیبت میں نہیں دیکھ سکتا۔ تم یہاں نئے نئے آئے ہو۔ پہلے کچھ دن یہاں رہ کر یہاں کی اونچ نیچ سمجھ لو۔ عطا داراب اور شکیل جیسے نورانی چہرے

والوں کی اندر کی کالک دیکھ لو پھر اس قسم کی باتیں کرنا۔''

میں نے دل میں سوچا۔''تب تک تو تمہارے لیے بہت دیر ہو چکی ہو گی عارف احمد۔ تمہاری عاشرہ ایک دو بچوں کی ماں بن چکی ہو گی۔'' پھر میرے ذہن میں عاشرہ کی زخمی کلائی آئی۔ کسی نے اس کی چوڑیاں توڑی تھیں اور شاید اس پر سختی بھی کی تھی۔ وہ کون ہو سکتا تھا، کہیں وہ عارف ہی تو نہیں تھا۔ ممکن ہے کہ کسی غصے بھری جذباتی ملاقات میں اس نے عاشرہ کے ساتھ ایسا کیا ہو؟ لیکن وہ تو زخمی حالت میں یہاں اسپتال پڑا تھا۔ وہ یہ کیسے کر سکتا تھا۔ تو کہیں اس کا ذمے دار وہی شکیل داراب تو نہیں تھا؟ بہت سے سوالات ذہن میں اٹھ رہے تھے۔

میں عارف کے پاس کچھ دیر مزید بیٹھا اور اس سے تسلی تشفی کی باتیں کرنے کے بعد اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے ذہن میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ میں نا انصافی برداشت کرنے والا شخص نہیں تھا۔ اپنے ساتھ ہونے والی نا انصافی سے زیادہ کسی دوسرے سے ہونے والی نا انصافی مجھے تکلیف دیتی تھی۔ میں مار دھاڑ کی جس فیلڈ میں گیا تھا اور آج جس مقام پر تھا اس کی بنیادی وجہ ایسی ہی ایک نا انصافی تھی جو کسی دوسرے کے ساتھ ہوئی تھی۔ اس نے مجھے بدلا تھا اور کہیں سے کہیں پہنچا دیا تھا۔ اسپتال سے میں سیدھا ولید کی شاپ پر پہنچ گیا۔ یہ کافی بڑی شاپ تھی اور پورے علاقے میں بیکری کے سامان کے لیے مقبول تھی۔ ہم شاپ کے پچھلے حصے میں واقع چھوٹے سے دفتر میں بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے۔ میں نے وہ سب کچھ ولید کے گوش گزار کیا جو مجھے عارف سے معلوم ہوا تھا۔

میں نے ولید سے کہا۔''یار! میں نے اس کی جان بچانے میں مدد کی ہے لیکن وہ اتنا دکھی ہے کہ زندگی اسے بوجھ لگ رہی ہے۔ میں اس کے لیے کچھ کرنا چاہ رہا ہوں یار۔''

''کیا کرنا چاہ رہے ہو؟''

''کیوں نا ہم حاجی نذیر صاحب سے ملیں اور ان کو بتائیں کہ عاشرہ اور عارف ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں۔ اگر عاشرہ کی شادی اس کی مرضی کے بغیر ہو گئی تو دونوں کی زندگیاں تباہ ہو جائیں گی۔''

ولید کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی، بولا۔''تم کیا سمجھتے ہو شاہ زیب بھائی، حاجی نذیر کو ان باتوں کا پتا نہیں ہو گا۔ اسے سب پتا ہو گا لیکن عاشرہ کی طرح وہ بھی مجبور ہو گیا ہو گا۔''

''یار! وہ کوئی غریب غربا تو نہیں جسے کوئی چودھری یا وڈیرا دھمکا کر اپنی مرضی پر چلا لے گا۔ وہ علاقے کا ایک بڑا زمیندار ہے۔''

”زمیندار تو ہے لیکن عطا داراب اور شکیل داراب وغیرہ کے سامنے کچھ بھی نہیں۔ شکیل داراب بہت بڑی مچھلی ہے اور حاجی نذیر اس کے مقابلے میں بہت چھوٹی مچھلی ہے۔“

”کچھ بھی ہے یار لیکن میں ایک بار حاجی نذیر صاحب سے ضرور ملنا چاہوں گا۔“

”خوامخواہ بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ نہ ڈالو۔ اس سے کچھ حاصل نہیں ہونا بلکہ ایس ایچ او قیصر جیسے پالتو ہمارے پیچھے پڑ جائیں گے اور ہمارا جینا حرام کر دیں گے۔“

”پالتو...... کیا مطلب؟“

”قیصر بھی ان کرائے کے لوگوں میں سے ہے جو داراب فیملی کے لوگوں کے اشاروں پر دُم ہلاتے ہیں۔“

انسپکٹر قیصر کی کرخت صورت میری نگاہوں میں گھوم گئی اور وہ سب کچھ بھی یاد آ گیا جو اس نے ایکسیڈنٹ والی رات ہم سے کیا تھا۔ سینے میں پھر چنگاریاں سی پھوٹ گئیں۔

میں نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ ”تو کیا قیصر جیسے لوگوں کی وجہ سے تم سب اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہو اور تمہارے اردگرد جو کچھ ہو رہا ہوتا ہے اسے ہونے دیتے ہو۔ ولید! میں نے تو سنا تھا کہ تم بڑے سچے کھرے بندے ہو۔ زیادتی نہیں سہتے اور فوراً زیادتی کرنے والے کا گریبان پکڑتے ہو۔“

”یہ تو میں کرتا ہوں۔“ ولید دھیرے سے مسکرایا۔ اس کی آنکھوں میں چیتے جیسی چمک ابھری، وہی چمک جو بلا جھجک خطرات کا سامنا کرنے والے لوگوں کی آنکھوں میں نظر آتی ہے۔ اس نے اپنی پی کیپ اٹھائی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ”چلو آؤ۔“ اس نے کہا۔

”کہاں؟“

”جہاں تم کہہ رہے ہو۔“

ہم کچھ دیر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے پھر دفتر سے باہر نکل آئے۔ باہر دسمبر کی سنہری دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ ہم سوزوکی کار میں آ بیٹھے۔ ولید بولا۔ ”ایک بات میں تمہیں ابھی بتا دوں۔ ہماری کوشش سے ہونا ہوانا کچھ نہیں۔“

”یہ تو کھیلنے سے پہلے ہی ہار ماننے والی بات ہے۔“

”اگر تم اسے کھیل سمجھ رہے ہو تو یہ ہے بڑا خطرناک...... لیکن میں تمہارے ساتھ ہوں، جو ہوگا دیکھا جائے گا۔“

”تم کیا سمجھتے ہو، حاجی نذیر صاحب کچھ نہیں سنیں گے؟“

”مجھے لگتا ہے شاہ زیب وہ سن ہی نہیں سکتے۔ ان میں داراب فیملی نے اتنی سکت ہی

نہیں چھوڑی ہو گی۔"

"تو پھر ہم ڈائریکٹ عاشرہ سے بات کریں گے۔ اگر وہ اس معاملے میں اسٹینڈ لینے کو تیار ہو گئی تو ہم آگے تک جائیں گے۔ قانون کی مدد لیں گے۔ پریس تک اور میڈیا تک بات پہنچائیں گے۔ وہ عاقل بالغ لڑکی ہے۔ اپنا اچھا برا سمجھ سکتی ہے۔ اس کے ساتھ زبردستی نہیں کی جاسکتی اور مجھے لگتا ہے کہ شاید اس کے ساتھ زبردستی ہو بھی رہی ہے۔ میں نے اس کے جسم پر تشدد کے نشان دیکھے ہیں۔"

"شاہ زیب تم جو کچھ کہہ رہے ہو اپنی جگہ درست ہے اور ہو سکتا ہے کہ زبردستی کے بارے میں جو اندازے تم لگا رہے ہو وہ بھی ٹھیک ہوں لیکن یہاں وہ کچھ نہیں ہوگا جو تم آج تک باہر کے ملک میں دیکھتے آئے ہو۔ یہ پاکستان ہے اور یہاں رسموں، رواجوں اور پابندیوں کا گورکھ دھندا کچھ زیادہ ہی ہے۔ اگر تم عاشرہ کے لیے کچھ کرنا چاہو گے تو مجھے یقین ہے کہ سب سے پہلے عاشرہ ہی تمہاری مخالفت کر دے گی۔"

"کیا مطلب؟"

"ظاہر ہے کہ وہ رشتوں، رواجوں اور مجبوریوں میں جکڑی ہوئی لڑکی ہے۔ اپنی اور اپنے خاندان کی بدنامی نہیں چاہے گی اور پھر جب واسطہ عطا داراب جیسی فیملی سے پڑا ہو تو کیا نہیں ہو سکتا۔ پریس، میڈیا، عدالتیں ہر جگہ ان لوگوں کا زور چلتا ہے۔ عطا داراب کا بیٹا شکیل ایسے معاملوں میں باپ سے دو ہاتھ آگے ہے۔"

"اچھا یار! تم ڈرانے والی باتیں ہی کرو گے یا کوئی اچھا رخ بھی دکھاؤ گے تصویر کا۔" میں نے کہا۔

"میں تو تمہارے پیچھے چل پڑا ہوں۔ جہاں کہتے ہو چلے جاتے ہیں۔ پہلے تم عاشرہ سے بات کر کے ہی دیکھ لو۔ پتا چل جائے گا کہ وہ اس معاملے میں کسی طرح کا اسٹینڈ لے بھی سکتی ہے یا نہیں۔"

"اس سے کہاں ملاقات ہو سکتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"پنجاب یونیورسٹی کے نیو کیمپس میں۔ میری معلومات کے مطابق اسی سال گرمیوں میں اسے وہاں لیکچرار کی جاب ملی ہے۔ اگر اس پر پہرے وغیرہ نہیں بٹھا دیئے گئے تو وہ یقیناً آج کل بھی یونیورسٹی جا رہی ہو گی۔"

"اس کا پتا کیسے چلے گا؟"

"ابھی چل جاتا ہے۔" ولید نے کہا اور اپنے سیل فون سے کسی کو کال کرنے لگا۔ یہ ولید

کی کوئی فرینڈ تھی اور پنجاب یونیورسٹی میں ایم ایس سی کر رہی تھی۔ ولید نے اس سے بات کی تو پتا چلا کہ عاشرہ آج بھی یونیورسٹی آئی ہوئی ہے لیکن دو چار دن میں وہ یہ جاب چھوڑ رہی ہے۔

بات ختم کر کے ولید بولا۔ ''چلو، یہ سنہری موقع ہے۔ ابھی اس سے مل سکتے ہیں۔''

ہم بیکری کی کشادہ پارکنگ سے نکلے اور ولید کی سوزوکی کار میں پندرہ بیس منٹ کے اندر نہر کنارے نیو کیمپس میں پہنچ گئے۔ کیمپس اور اس کے گرد و نواح سے میری بھی کچھ حسین یادیں وابستہ تھیں۔ جب میں پچھلی دفعہ آیا تھا تو صرف تین دن کے لیے پاکستان رکا تھا لیکن 72 گھنٹے یعنی تین دنوں میں ہی ایک ایسے حسین چہرے سے میری راہ و رسم بڑھی تھی جس کے خدوخال، دل و دماغ پر نقش ہو کر رہ گئے تھے۔ میں نے پچھلے ساڑھے تین برسوں میں جب بھی اس چہرے کو یاد کیا تھا، دل میں ایک عجیب سی کسک جاگی تھی، میٹھی میٹھی، نہ بہت دھیمی نہ بہت تیز...... درد کی ایک ایسی دلگداز لہر نے مجھے یقین دلایا تھا کہ یہ معاملہ ابھی مکمل طور پر ختم نہیں ہوا۔ ابھی کچھ باقی ہے...... ابھی کچھ نہ کچھ باقی ہے ورنہ دنیا کی بھیڑ میں گم ہو جانے کے بعد حسین چہروں اور مسکراہٹوں کے جھرمٹوں میں رہنے کے باوجود میں نے اس طرح اسے یاد نہ کیا ہوتا۔ میری سماعت اور میری نگاہیں اس کی تلاش میں بھٹکی نہ ہوتیں۔ پتا نہیں کیوں مجھے یقین سا تھا کہ وہ پھر ملے گی اور پتا نہیں کیوں یہ بھی یقین سا تھا کہ وہ بھی مجھے یاد کرتی ہوگی۔

نیو کیمپس اور نہر کے گرد و نواح کو دیکھ کر کئی بھولے بسرے مناظر آنکھوں کے سامنے آ گئے۔ یہاں ہم دونوں نے گاڑی روکی تھی۔ یہاں ہم گھاس پر بیٹھے تھے۔ یہاں سے ہم نے انرجی ڈرنک پیئے تھے اور پھر یہاں سے موڑ مڑ کر ہم دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ اس بے مثال چہرے سے میرے رابطے کا واحد ذریعہ بس ایک سیل فون نمبر تھا۔ تین ساڑھے تین برسوں میں، میں نے شاید سیکڑوں بار اس نمبر پر رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر ناکام ہوا تھا۔ پھر میں نے ڈنمارک سے پاکستان کال کر کے ایک پاکستانی دوست کی مدد حاصل کی تھی اس نے مجھے پتا کر کے بتایا تھا یہ نمبر سرگودھا کے کسی اللہ رکھا کے نام پر رجسٹرڈ ہے یعنی ٹائیں ٹائیں فش ہو گیا تھا۔

میں اپنے خیالوں سے اس وقت چونکا جب ولید نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ دیکھو، شاہ زیب! میرا خیال ہے کہ محترمہ کلاس روم سے نکل رہی ہیں۔''

میں نے چونک کر دیکھا۔ سرو کے دراز قد پودوں کی دوسری جانب ایک برآمدے میں عاشرہ کا اجلا اجلا چہرہ نظر آیا۔ تین چار اسٹوڈنٹس اس کے اردگرد تھے۔ وہ سینے سے ایک فائل

لگائے ان سے باتیں کرتی ہوئی ایڈمنسٹریشن بلاک کی طرف جارہی تھی۔ چہرے پر وہی حزن وملال کی کیفیت تھی جو پچھلی ملاقات میں نظر آئی تھی۔

میں اور ولید تیزی سے آگے بڑھے۔ میں اس کے قریب پہنچا تو وہ مجھے دیکھ کر بری طرح چونک گئی۔ایک سیکنڈ کے لیے یوں لگا جیسے وہ مجھے نظرانداز کر کے آگے بڑھ جانا چاہتی ہو لیکن میں نے یہ موقع نہیں دیا۔

''السلام علیکم......کیسی ہیں آپ؟''

''وعلیکم السلام......آپ یہاں؟'' وہ ذرا پریشان لہجے میں بولی۔

''بے وقت تکلیف کی معافی چاہتا ہوں۔ دراصل مجھے ایک بہت ضروری بات کرنا تھی آپ سے۔اگر آپ چند منٹ مجھے دے سکیں۔''

اس نے کسی وحشت زدہ ہرنی کی طرح اردگرد دیکھا جیسے اسے ڈر ہو کہ کچھ نادیدہ نگاہیں اسے دیکھ رہی ہیں پھر خشک لبوں پر زبان پھیر کر بولی۔''کہیے......کیا کہنا ہے آپ کو؟''

''میں چند منٹ اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے وضاحت کی۔ یہ بات کہتے ہوئے میری نظر اتفاقاً اس کی گردن کے نچلے حصے پر پڑی۔ وہاں بھی مجھے ایک ہلکے سے نیل کے آثار نظر آئے۔ میرے ذہن میں اس کی کلائی کے نیل تازہ ہو گئے۔

میری گزارش سن کر اس کی خوبصورت پیشانی پر ناگواری کی شکن ابھری۔''سوری، میرے لیے یہ ممکن نہیں۔'' اس نے کہا۔

''لیکن......''

''ویری سوری شاہ زیب صاحب۔'' اس نے بے رخی سے میری بات کاٹی۔''میں بات نہیں کر سکتی۔'' وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

مجھے ایسے رویے کی توقع نہیں تھی۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کیا کروں کہ اچانک کسی کا ہاتھ میرے کندھے پر آیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا میرے سامنے گھنی مونچھوں والا ایک تیس پینتیس سالہ شخص کھڑا تھا۔ اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔

''السلام علیکم سر!'' اس نے بھاری آواز میں کہا پھر اپنے سیاہی مائل ہاتھ سے مونچھیں سہلا کر کہنے لگا۔''آپ ذرا میرے ساتھ آئیں، کوئی آپ سے ملنا چاہتا ہے۔''

''کون ملنا چاہتا ہے؟'' ولید نے ذرا تنک کر پوچھا۔

''یار آپ آؤ تو سہی۔'' مونچھوں والے نے ترشی سے کہا۔

''پہلے بتاؤ کس نے ملنا ہے؟'' ولید کا پارا چڑھنے لگا۔

''چودھری صاحب نے...... وہ سامنے گاڑی میں بیٹھے ہیں۔'' مزید ترشی سے جواب دیا گیا۔ ولید اور میں نے یونیورسٹی کے گیٹ سے باہر کھڑی ایک سفید کار کی طرف دیکھا۔ کار کے قریب ہی ایک دراز قد شخص کھڑا نظر آیا۔ مجھے پہچاننے میں دشواری نہیں ہوئی۔ یہ وہی دیوہیکل تھانیدار قیصر چودھری تھا۔ رگوں میں خون سنسنا سا گیا۔ وہ گالی یاد آگئی جو اس کی گندی زبان سے نکلی تھی اور میرے کانوں تک پہنچی تھی۔

قیصر اس وقت سادہ لباس میں تھا۔ ایک اور پولیس والا بھی سادہ لباس میں اس کے پاس کھڑا تھا۔ ذہن میں پہلا خیال یہی ابھرا کہ کوئی گڑبڑ ہونے والی ہے۔ شاید یہ لوگ عاشرہ کی نگرانی کر رہے تھے اور شاید یہی وجہ تھی کہ وہ مجھ سے اتنی بے رخی کے ساتھ بولی تھی۔

میں اور ولید مونچھوں والے سادہ پوش اہلکار کے ساتھ گیٹ کی طرف بڑھے اور پھر قیصر کے پاس پہنچ گئے۔ وہ حسبِ سابق بڑی ملائمت سے بولا۔ ''السلام علیکم جناب! کیا حال چال ہیں؟''

''بالکل ٹھیک۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔

''آپ سے ایک دو باتیں کرنی ہیں۔ کیا آپ گاڑی میں تشریف رکھیں گے؟''

''کیا یہاں کھڑے ہو کر بات نہیں ہو سکتی؟'' میں نے پوچھا۔

''اگر ہو سکتی تو میں آپ سے یہ گزارش ہی کیوں کرتا۔'' اس نے کہا۔ اس کی ٹھوڑی کے کٹ پر ابھی تک میڈیکل ٹیپ لگی ہوئی تھی۔ میں نے اردگرد دیکھا۔ تھوڑے ہی فاصلے پر سڑک کے کنارے ایک پولیس موبائل کھڑی تھی۔ اس میں عملے کے باوردی افراد موجود تھے۔ دو تین مسلح بھی تھے۔ میں اب تک قیصر کی فطرت کو کافی حد تک جان گیا تھا۔ وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ میں نے ولید کی طرف دیکھا اور آنکھوں آنکھوں میں اس سے کہا کہ ہمیں گاڑی میں بیٹھ جانا چاہیے۔ اس کے ساتھ ہی میں سفید کار کی پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔

ولید نے قیصر سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''میری گاڑی ادھر سڑک پر کھڑی ہے۔''

''کوئی بات نہیں برادر۔ گاڑی کوئی بندہ لے آتا ہے۔ آپ مجھے چابی دے دیجیے۔'' قیصر نے شائستہ لہجے میں کہا۔ تاہم اس لہجے کے نیچے چھپی ہوئی زہریلی پھنکار کو بھلا کون محسوس نہیں کر سکتا تھا۔

مجھے ایک لمحے کے لیے لگا کہ ولید بھڑک اٹھے گا اور ساتھ چلنے سے صاف انکار کر دے گا لیکن پھر اس نے خود کو سنبھالا اور چابی قیصر کے ایک ماتحت کے حوالے کر کے گاڑی کی پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔ ایک سادہ پوش اہلکار جس نے اپنی قمیص کے نیچے یقیناً کوئی ہتھیار لگا رکھا

تھا ہمارے ساتھ ہی پچھلی نشست پر براجمان ہو گیا۔ قیصر نے ڈرائیور کے ساتھ والی نشست سنبھالی اور کار تیز رفتاری سے ایک جانب روانہ ہو گئی۔ پولیس موبائل ہمارے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ مجھے خطرے کا احساس ہونے لگا۔ میں نے قیصر سے پوچھا۔ ''یہ آپ لوگ کہاں لے جا رہے ہیں ہمیں؟''

''زیادہ دور نہیں حضور والا۔ بس ایک لوکیشن دکھانی ہے آپ کو۔''

''کون سی لوکیشن؟''

''جہاں فلم ہیر رانجھا کی شوٹنگ ہوئی تھی۔ فردوس اور اعجاز وغیرہ پر سین پکچرائز کیے گئے تھے۔''

''مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی، آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟''

''سمجھ تو اس خاکسار کو بھی کئی باتوں کی نہیں آ رہی۔ مثلاً یہ کہ آپ جناب کو جنرل اسپتال جا کر محترم عارف صاحب سے ملنے کی کیا ضرورت تھی؟ ان کے پاس بیٹھ کر گھنٹوں تک گٹ مٹ کرنے کی کیا لوڑ پڑ گئی تھی اور پھر یونیورسٹی جا کر آپ نے حاجی صاحب کی بیٹی سے ملنے کی زحمت کیوں فرمائی ہے؟ اگر وہ آپ کو ایسی ہی اچھی لگی تھی تو ہمیں حکم کیا ہوتا، ہم اس کو آپ کی خدمت میں پیش کر دیتے۔ ویسے مجھے لگ رہا ہے آپ اپنے لیے نہیں کسی اور کی خاطر اس سے ملنا چاہ رہے تھے؟''

''فضول کی باتیں نہ کرو انسپکٹر۔ یہ ہمارے ذاتی معاملات ہیں۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''واہ ذاتی معاملات ...... پرسنل لائف ...... پرائیویسی ...... کیسے کیسے لفظ گھڑے ہوئے ہیں ان پڑھے لکھے لوگوں نے۔ ذاتی معاملات کی چادر اوڑھ کر اندر جو بھی گند مارتے رہو کوئی آپ کو پوچھنے والا نہیں۔''

میں نے بمشکل اپنے غصے پر ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ''انسپکٹر! بہتر یہ ہے کہ کام کی بات کرو۔''

''گستاخی معاف جناب! آپ خود ہی بات کو دوسری طرف لے گئے۔ میں نے تو آپ کو کام کی بات ہی بتائی تھی کہ آپ کو ہیر رانجھا فلم کی ایک لوکیشن دکھانے لے جا رہا ہوں۔ جناب نے زیادہ عرصہ ملک سے باہر گزارا ہے لیکن ہیر رانجھا تو باہر کی دنیا میں بھی دیکھی گئی تھی۔ اس میں ایک کردار سہتی کا بھی تھا۔ میں اس وقت آپ کو ہیر رانجھا سے زیادہ سہتی کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں۔ آپ نے بھی یقیناً فلم میں دیکھا ہوگا کہ سہتی کے پیٹ میں

ہمدردی کا مروڑ اٹھا تھا۔ اس نے فی سبیل اللہ ہیر اور رانجھے کو ملانے کی کوشش کی تھی نتیجہ کیا نکلا، ہیر بھی ماری گئی اور رانجھے کا بھی بولو رام ہو گیا۔ سہتی بہر حال بچ گئی لیکن ہر دفعہ تو ایسا نہیں ہوسکتا۔ ہوسکتا ہے کہ آئندہ جب ہیر رانجھے پر فلم بنے تو اس میں وہ دونوں تو زندہ رہیں لیکن بے چاری سہتی ماری جائے۔''

میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یہ خطرناک تھانیدار بڑی معنی خیز باتیں کر رہا تھا۔ غالباً وہ عارف اور عاشرہ کو ہیر رانجھے سے تشبیہہ دے کر مجھے سہتی کی جگہ دے رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی جان سے مار دینے کی دھمکی بھی میرے کانوں تک پہنچا رہا تھا۔ یہ عجیب سا بندہ تھا۔ قد کاٹھ غیر معمولی تھا لیکن شکل وصورت سے بہت سخت گیر نہیں لگتا تھا۔ بات چیت کا انداز بھی شائستہ تھا اور اپنی گفتگو میں تعلیم یافتہ لوگوں جیسے الفاظ استعمال کرتا تھا لیکن ذرا سا غور کرنے پر پتا چل جاتا تھا کہ اس بظاہر بااخلاق تھانے دار کے لہجے کے نیچے نیلی آگ کا دریا بہہ رہا ہے۔ زمین کے نیچے دبی ہوئی ایک ایسی بارودی سرنگ جو کسی بھی وقت پھٹ سکتی ہے۔

کار اب تیز رفتاری سے چلتی ہوئی شہر سے باہر آچکی تھی۔ ہم ملتان روڈ پر سفر کرتے ہوئے کافی آگے نکل آئے تھے۔ یہ ایک بالکل سنسان ذیلی سڑک تھی۔ کہیں کہیں امرود اور کینو وغیرہ کے باغات نظر آرہے تھے۔ ایک کچے راستے پر دونوں گاڑیاں آگے پیچھے کھڑی ہو گئیں۔ قیصر نے کھڑکی کا شیشہ نیچے اتارتے ہوئے کہا۔ ''یہ دیکھیے جناب! یہ وہ تاریخی درخت ہیں جہاں ہیر رانجھا کی شوٹنگ ہوئی تھی۔'' اس نے شوٹنگ کے لفظ پر خاص طور سے زور دیا اور مجھے ایک بار پھر چونکنے پر مجبور کیا۔

چند سیکنڈ بعد پولیس موبائل میں سے تین اہلکار نکلے اور چوکس کھڑے ہو گئے۔ وہ موبائل میں سے کسی شخص کو نکلنے کا کہہ رہے تھے مگر وہ نکل نہیں رہا تھا۔ حوالدار رمضان ہماری طرف آیا اور انسپکٹر سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''وہ باہر نہیں نکل رہا ہے جناب۔''

انسپکٹر باہر نکلا اور ہم دونوں کو بھی اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ ہم پولیس موبائل تک پہنچے۔ وہاں ہم نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ ہمیں موبائل کے فرش پر ایک شخص ہتھکڑی میں جکڑا نظر آیا۔ یہ وہی حوالاتی تھا جسے چند روز پہلے میں نے تھانے کے لاک اَپ میں اوندھا لیٹے دیکھا تھا۔ اس بے چارے کو اتنی مار لگائی گئی تھی کہ وہ سیدھا لیٹ ہی نہیں سکتا تھا۔ اب بھی وہ گھٹنوں اور کہنیوں کے بل پولیس موبائل کے سخت فرش پر پڑا تھا۔ اس کا چہرہ دہشت سے ہلدی ہو رہا تھا اور آنکھوں میں دنیا جہاں کی منت سماجت سمٹی ہوئی تھی۔

وہ انسپکٹر کو دیکھ کر گھگھیایا اور اس نے اپنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ''آپ مائی باپ ہو

صاحب۔ میں ساری زندگی آپ کا غلام بن کر رہوں گا۔ مجھے معاف کر دیں...... مجھے معاف کر دیں۔" اس نے اپنا اگلا دھڑ گاڑی کے پچھلے حصے سے باہر نکالا اور اپنا سر انسپکٹر کے گھٹنوں سے رگڑنے کی ناکام کوشش کی۔

انسپکٹر نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولا۔ "کلمہ پڑھ لو میرے بچے، اس وقت میں تجھے اس سے بہتر مشورہ اور کوئی نہیں دے سکتا۔"

وہ بے چارہ پوری جان سے تڑپ گیا۔ "خدا کے لیے نہیں...... خدا اور رسولؐ کے لیے بس ایک دفعہ میری جان بخش دیں پھر آپ جو کہیں گے، میں کروں گا جو آپ کہیں گے۔" وہ باقاعدہ رونے لگا۔ وہ چوبیس پچیس سالہ نوجوان تھا لیکن اس وقت کسی بچے کی طرح اس کی ناک بہہ رہی تھی۔ وہ اپنی زندگی کے لیے کسی بچے ہی کی طرح بلک رہا تھا۔

انسپکٹر نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "اگر تُو اب بات نہیں مان رہا تو کل کیسے مانے گا۔ میں تجھ سے گزارش کر رہا ہوں کہ کلمہ پڑھ اور تُو اس سے انکار کر رہا ہے۔"

وہ ایک بار پھر دلدوز انداز میں منت سماجت کرنے لگا۔ حوالدار نے تضحیک آمیز انداز میں کہا۔ "سر مجھے تو لگتا ہے کہ یہ مسلمان ہی نہیں۔ اگر اس کو کلمہ آتا ہوتا تو ضرور سنا دیتا۔"

انسپکٹر نے ٹھوڑی کھجاتے ہوئے کہا۔ "ویسے اب تھوڑا تھوڑا شک مجھے بھی ہو رہا ہے۔ اس کا نام راجو ہے نا...... اور ایسے نام تو اکثر ہندوؤں کے ہوتے ہیں۔ راج کمار سے راجو یا پھر راجیش سے راجو وغیرہ ویسے اگر یہ ہندو ہے تو پھر تو اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ سوچنا پڑے گا۔"

"آپ کا کیا مطلب ہے جناب؟" حوالدار نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

"بھئی ہندو برادری کے لوگوں کے لیے میرے دل میں بڑی نرمی ہے۔ تین چار سال پہلے جب میں سندھ کے اندرونی علاقے میں تھا۔ دو مہاشوں نے بڑے سخت وقت میں میری یادگار مدد کی تھی۔"

حوالدار نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ انسپکٹر نے راجو کے بال مٹھی میں جکڑ کر اس کا سر اوپر اٹھایا اور بڑے پیار سے پوچھا۔ "جناب ذرا ٹھیک ٹھیک ارشاد فرمائیں کہ آپ ہندو ہیں یا مسلمان؟"

وہ زاروقطار روتے ہوئے بولا۔ "مم...... میں کچھ بھی نہیں ہوں مائی باپ۔ آپ جو کہیں میں وہی ہوں۔ بب...... بس میری جان بخش دیں۔ میں اور میرے بچے آپ کو زندگی بھر دعائیں دیتے رہیں گے۔" اس نے ایک بار پھر اپنا سر قیصر کے گھٹنوں سے رگڑنے کی

کوشش کی اور اس بار کسی حد تک کامیاب رہا۔
قیصر دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''یعنی اگر میں آپ جناب کو راجیش کہہ کر بلاؤں تو آپ کو کوئی اعتراض وغیرہ تو نہیں ہوگا؟''
''نہیں مائی باپ! آپ جو مرضی کہہ کر بلائیں۔ مجھے اپنا کتا کہہ لیں۔ آپ کا جو دل چاہے کہہ لیں۔ میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔ زندگی بھر آپ کا غلام رہوں گا۔'' اس کی ہچکی بندھ گئی تھی۔ خوف کی زیادتی سے کبھی اس کا چہرہ ہلدی ہو جاتا تھا۔ کبھی امید کے سبب آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتی تھیں۔ راجو نامی یہ شخص شکل وصورت سے کوئی شریف آدمی تو نہیں لگتا تھا لیکن کوئی بہت بڑا بدمعاش یا خطرناک شخص بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ پتا نہیں اپنے کس گناہ کی پاداش میں وہ اس وقت قیصر جیسے خطرناک پولیس افسر کے ہتھے چڑھا ہوا تھا۔
اگلے ایک دو منٹ میں ولید اور میں نے راجو کی منت سماجت و گریہ وزاری کے اندوہناک مناظر دیکھے۔ وہ زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔ آخر قیصر کا رویہ کچھ بدلا ہوا نظر آیا۔ اس نے گھٹنے کی ہلکی سی ٹھوکر سے راجو کا سر پیچھے ہٹایا اور بولا۔ ''ٹھیک ہے، آپ ایک موقعے کا کہہ رہے ہیں تو میں ایک موقع آپ کو دے دیتا ہوں لیکن آئندہ کی کیا گارنٹی ہے؟''
راجو کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ کئی سیکنڈ تک وہ کوشش کے باوجود بول نہیں سکا۔ تب اس نے ہتھکڑی لگے ہاتھوں کے ساتھ اپنا اگلا دھڑ گاڑی کے پچھلے حصے سے آگے کی طرف گرایا اور انسپکٹر قیصر کے پاؤں چومنے کی کوشش کی۔
''مائی باپ! آپ جو گارنٹی کہیں میں دے دیتا ہوں۔ میرے مکان کی رجسٹری رکھ لیں۔ مم...... میرے بیوی بچے ضمانت کے طور پر رکھ لیں۔ آپ جو کہیں......'' وہ بے ربط انداز میں بولتا چلا گیا۔
آخر قیصر نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''وعدہ کرتے ہو کہ آئندہ وہ نہیں کرو گے جو اب تک کرتے رہے ہو؟''
''سو جان سے وعدہ کرتا ہوں سرکار۔ بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔'' راجو کی ہچکی بندھ گئی۔
قیصر نے ایک ہیڈ کانسٹیبل کو اشارہ کیا۔ اس نے پتلون کی جیب سے ایک لمبی سی چابی نکالی اور راجو کی ہتھکڑی کھول دی۔ وہ موبائل سے نیچے اترا۔ اس نے پہلے حوالدار کے اور پھر قیصر کے پاؤں پکڑ لیے۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ شاید ان کے تلوے چاٹنا شروع

کردیتا۔

یکا یک مجھے قیصر کی آنکھوں میں درندگی کی جھلک نظر آئی۔ اس نے اچانک اپنا سرکاری پستول نکالا اور چند قدم پیچھے ہٹ کر دو گولیاں راجو کے سینے میں اتار دیں۔ دھماکوں سے میرے کان سائیں سائیں کرنے لگے۔ اپنی ہی نگاہوں پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ راجو پشت کے بل گرا۔ اس کی آنکھیں خوف اور حیرت کے سبب پھٹی ہوئی تھیں۔ خون تیزی سے اس کے دھاری دار سوئٹر کو رنگین کرتا چلا گیا۔

قیصر نے جیسے انسان کو نہیں کسی مکھی کو مارا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک بار پھر وہی سفاک مسکراہٹ سج گئی۔ دم توڑتے راجو سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''راجو، راجیش! حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے آئندہ کے لیے نیک چلنی کا وعدہ تم سے اس جنم کے لیے نہیں آئندہ جنم کے لیے لیا تھا۔ تمہارے مذہب میں تو دوسرے جنم کی گنجائش موجود ہے نا۔''

راجو سوال کرنے یا جواب دینے کے قابل کہاں تھا ورنہ وہ اس سے پوچھتا۔ ''راجو، راجیش کا نام تو تم نے خود میرے منہ میں ڈالا۔ ورنہ میں تو جیسا بھی تھا، مسلمان ہی تھا۔''

ایک بار پھر میرا جی چاہا کہ سارے اندیشے بالائے طاق رکھ کر اس خون آشام پولیس آفسر پر ٹوٹ پڑوں لیکن اس سوچ کو عملی جامہ پہنانا میرے لیے اتنا آسان نہیں تھا۔ کچھ مجبوریوں نے مجھے گھیر رکھا تھا۔ میں ولید ہی کی طرح ساکت و جامد کھڑا رہا۔ ہمارے اردگرد کم از کم تین باوردی اہلکاروں کے ہاتھوں میں آٹومیٹک رائفلیں تھیں۔ ان کا رخ ہماری طرف تو نہیں تھا لیکن کسی بھی وقت ہو سکتا تھا۔

حوالدار آگے بڑھا اور اس نے ایک پستول دم توڑتے راجو کی مٹھی میں تھما دیا۔ (پستول ایک رومال میں لپٹا ہوا تھا) پھر اس نے پستول کا رخ پولیس موبائل کی طرف کر کے دو بار ٹریگر دبایا، دھماکوں سے شعلے نکلے۔ ایک گولی گاڑی کی باڈی میں لگی دوسری نے ایک کھڑکی کا شیشہ چکنا چور کر دیا۔ حوالدار نے یہ سارا کام بالکل عام سے انداز میں کیا۔ جیسے یہ اس کے لیے کوئی خاص اہمیت نہ رکھتا ہو۔

قیصر نے عجب سفاک نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''چلو بھائی جان، اب آپ کی باری ہے۔''

میرے سر سے لے کر پاؤں تک چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ مجھے لگا کہ ایک سیکنڈ کے لیے میرے چہرے کا رنگ بدلا ہے۔ یہ شخص کیا کہہ رہا تھا۔ کیا یہ ہمارے بارے میں بھی کوئی خطرناک ارادہ رکھتا تھا؟ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ اتنا بڑا اقدام ہمارے خلاف کیسے کیا جا سکتا

تھا؟ لیکن یہ دیوانہ پن بھی تو ہوسکتا تھا اور دیوانے پن کے لیے کسی دلیل یا وجہ کی ضرورت کہاں ہوتی ہے۔

دو تین سیکنڈ میں درجنوں سوالات ذہن میں اٹھے اور اوجھل ہوئے۔ شاید میرے چہرے پر لہرانے والے رنگ کو قیصر کی عقابی نگاہوں نے بھی نوٹ کرلیا تھا۔ مسکرا کر بولا۔ ''گھبرائیں نہیں جناب! میں مارا ماری کی نہیں ''بات چیت'' کی بات کر رہا ہوں۔ ہم خاکساروں کی یہ ہمت کہاں کہ آپ کو انگلی بھی لگائیں۔ گولی شولی تو بہت دور کی بات ہے۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے اپنی نگاہوں پر بھروسا نہیں ہو رہا۔ تم لوگ قانون کے محافظ ہو اور تم نے ہماری آنکھوں کے سامنے ایک جیتے جاگتے بندے کو پولیس مقابلے کے ڈرامے میں مارا ہے۔''

''تو یہ ہماری غلطی ہے نا۔ اب آپ جناب اس قتل کے چشم دید گواہ بن گئے ہیں۔ کل کلاں آپ کی کھوپڑی میں کیڑا رینگ گیا اور آپ نے عدالت میں جا کر گواہی دے دی تو ہم بے چارے تو بے موت مارے گئے نا۔ کیوں بھئی رمضان علی؟''

''ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔ یہ ضرور کچھ نہ کچھ کریں گے، ہوسکتا ہے کہ میڈیا والوں کے پاس جا پہنچیں یا پھر کچہری سے ہمارے خلاف پرچے کا آرڈر شاڈر کروالیں۔ یہ کچھ بھی کرسکتے ہیں جی۔ میرا تو خیال ہے جی کہ ان دونوں کو بھی......'' حوالدار نے معنی خیز انداز میں فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''نہیں نہیں، اتنی جلدی ٹھیک نہیں۔ شکل وصورت سے شاہ زیب صاحب سیانے بندے لگتے ہیں۔ ابھی نئے نئے تشریف آور ہوئے ہیں۔ انہیں سوچنے سمجھنے کا کچھ موقع دینا چاہیے۔ امید ہے کہ کچھ لوگ ان کو سمجھانے بجھانے کی کوشش بھی کریں گے۔ ان میں ان کے چاچا محترم حفیظ صاحب بھی شامل ہوں گے۔'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''جناب عالی! اللہ آپ کی عمر لمبی کرے۔ ایسا کیجیے گا کہ یہاں جو کچھ ہوا ہے سب سے پہلے اپنے چچا حضور کے گوش گزار ہی فرمایئے گا۔ وہ آپ کے کان مبارک میں ضرور کچھ مفید باتیں ڈالیں گے۔''

راجو ٹھنڈا ہو چکا تھا اس پر ایک بوسیدہ چادر ڈال دی گئی۔

میرے اندر ایک لاوا سا دہک رہا تھا۔ اگر میرے ضبط کا بند ٹوٹ جاتا تو کچھ بہت خطرناک ہوسکتا تھا۔ کچھ ایسا جو یہ لوگ زندگی بھر یاد رکھتے اور جس کی یاد بھی انہیں تھر تھر کانپنے پر مجبور کردیتی۔

اسی دوران میں ہماری سوزوکی کار بھی موقع پر پہنچ چکی تھی۔ اسے ایک اہلکار ہی چلا کر

یہاں لایا تھا۔ قیصر نے بڑی خندہ پیشانی سے میری جانب دیکھا اور بولا۔ ''لیجیے سرکار! آپ کی سواری تشریف لے آئی ہے۔ اب بیٹھیے اور ہمیں موقع دیجیے کہ ہم آپ کو خدا حافظ کہہ سکیں۔''

میں نے بغور اس کی طرف دیکھا۔ یہ شخص ابھی تک پوری طرح میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ ہاں اتنا پتا چل گیا تھا کہ یہ خطرناک ہے لیکن کتنا؟ یہ طے ہونا ابھی باقی تھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور ولید کے ساتھ سوزوکی کار کی طرف بڑھا۔ قیصر نے کہا۔ ''ہیر رانجھا کی لوکیشن آپ نے ملاحظہ فرمالی ہے۔ ہیر رانجھا میں ان دونوں کی ہمدردیاں زندہ رہی تھی لیکن ضروری نہیں کہ وہ ہر بار زندہ ہی رہے۔''

میں اور ولید گاڑی میں آبیٹھے اور گاڑی تیزی سے روانہ ہوگئی۔ گاڑی سے دس گنا رفتار کے ساتھ میرا ذہن بھاگ رہا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جو کچھ ہم نے اپنی جیتی جاگتی آنکھوں سے دیکھا، وہ کسی سنسنی خیز ایکشن فلم کا حصہ ہی لگتا تھا۔ ایک زندہ سلامت بندہ ہمارے سامنے خون اور مٹی میں لت پت ہوکر زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔

میں نے کہا۔ ''ولید یار! یقین نہیں آرہا کہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ان لوگوں کے حوصلے تو بہت بڑھے ہوئے ہیں۔''

''میں نے تمہیں غلط تو نہیں کہا تھا نا کہ یہ بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے والی بات ہے۔ یہ لوگ حد سے گزرے ہوئے ہیں۔ ان کا مقابلہ تب تک نہیں ہوسکتا جب تک خود بھی حد سے نہ گزرا جائے۔ ایسا سین دیکھ کر جب میرے جیسے کسی بندے کا میٹر گھومتا ہے نا تو پھر سچ مچ کا پولیس مقابلہ ہوجاتا ہے۔'' اندرونی تپش سے ولید کا چہرہ تمتما رہا تھا اور گلے کی رگیں پھولی ہوئی تھیں۔

گاڑی چلاتے چلاتے اس نے ڈرائیونگ سیٹ کے نیچے ہاتھ ڈالا اور ایک پسٹل نکال لیا۔ پھنکارتے لہجے میں بولا۔ ''قیصر جیسے لوگوں کو کوئی قانون نہیں پکڑ سکتا۔ ان کا بس یہی ایک سیدھا سادہ علاج ہوتا ہے۔'' میں نے دیکھا ولید کی آنکھوں میں شعلے سے لپک گئے۔

''نہیں یار! اس کو نیچے رکھو۔'' میں نے پسٹل اس کے ہاتھ سے لے کر دوبارہ سیٹ کے نیچے گھسا دیا۔ ''ہم کوئی ڈاکو نہیں ہیں ولید جو پولیس مقابلہ کریں گے۔ ہم شریف شہری ہیں اور بات صرف یہ ہے کہ ہمارے سامنے ایک بندے کو غیر قانونی طور پر جان سے مارا گیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ مجرم ہی ہو لیکن جس طرح اسے مارا گیا ہے یہ کسی طور بھی ٹھیک نہیں تھا۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ یہ ٹھیک تھا؟''

"تو جو حادثے کی رات تمہارے ساتھ ہوا وہ ٹھیک تھا؟ اگر نہیں تھا تو ہم اس کے لیے کیا کر سکے ہیں؟ معافی ہی مانگنا پڑی تھی نا۔"

"وہ میری ذات کا معاملہ تھا۔ یہ کسی اور کا معاملہ ہے۔ میں اس بارے میں خاموش نہیں رہ سکتا۔ ایک شریف شہری کی حیثیت سے، قانون کے دائرے میں رہ کر مجھے اپنا فرض ادا کرنا چاہیے۔"

"تو کیا کرو گے بھائی؟"

"میں دیکھوں گا کہ قانون اس بارے میں کیا کہتا ہے۔"

اچانک ولید کو زور سے بریک لگانا پڑے۔ سامنے چوک کا اشارہ بند ہو گیا تھا۔ ہم تو رک گئے لیکن ہمارے پیچھے آنے والی دو تین گاڑیاں فراٹے بھرتی ہوئی سگنل کراس کر گئیں۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ ان میں ایک ایسی موٹر سائکل بھی تھی جس پر تین پولیس اہلکار بیٹھے تھے۔

ولید نے زہر خند لہجے میں کہا۔ "لو دیکھ لو، یہ ہے ہمارے ہاں کا قانون۔ اگر سگنل کی خلاف ورزی پر روکنے والا کوئی نہیں تو پھر سگنل توڑنے کی آزادی ہے۔"

میں خاموش رہا۔ میرے ذہن میں کچھ اور طرح کی ہلچل تھی۔ کانوں میں ابھی تک ان دو گولیوں کے دھماکے گونج رہے تھے جو حیرت زدہ راجو کے سینے پر چلائی گئی تھیں۔ چند لمحے پہلے اس بے چارے سے آئندہ نیک چلنی کا وعدہ لیا گیا تھا لیکن بقول قیصر یہ وعدہ اگلے جنم کے لیے تھا۔ قانون کے محافظوں کی طرف سے ایسی دیدہ دلیری میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔

○......❖......○

ٹھیک دو گھنٹے بعد میں لاہور ہائی کورٹ کے احاطے میں موجود تھا اور ایڈووکیٹ عبداللہ کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ ہمارے سامنے چائے کی پیالیاں پڑی تھیں اور ایش ٹرے میں سگریٹس کی راکھ تھی۔ عبداللہ نے لاہور کے نواح میں ہونے والے جعلی پولیس مقابلے کی رُوداد بڑی تسلی سے سنی تھی۔ دھچکا تو اسے ضرور پہنچا تھا مگر یوں لگتا تھا کہ اس قسم کی خبریں اب عام لوگوں کے علاوہ قانون دانوں کے لیے بھی کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتیں۔ مجھے حیرت ہوئی جب اپنی گفتگو میں عبداللہ نے بھی تقریباً وہی باتیں کہیں جو راستے میں ولید نے کہی تھیں۔ اس نے کہا۔ "کچھ نہیں ہو پائے گا شاہ زیب۔ یہ قیصر جیسے لوگ تو کٹھ پتلیوں کی طرح ہوتے ہیں۔ ان کی ڈوریاں اوپر سے ہلائی جاتی ہیں اور جو ڈوریاں ہلانے والے ہوتے ہیں

وہ اپنی کٹھ پتلیوں کی پوری پوری حفاظت بھی کرتے ہیں۔ تم تو صرف زبانی کلامی گواہ ہو، اگر تم نے اس سارے واقعے کی ویڈیو بھی بنالی ہوتی اور اس ویڈیو میں دو چار گواہیاں بھی شامل کر لی ہوتیں تو اس سے بھی قیصر اور اس کے ٹولے کو کچھ فرق نہیں پڑنا تھا۔"

"تمہارا مطلب ہے ہم اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتے؟"

"کر سکتے ہیں لیکن نتیجہ کچھ نہیں نکلنا۔ الٹا یہ ہوگا کہ تمہیں اور تمہارے گھر والوں کو کسی چکر میں پھنسا دیا جائے گا۔ تم راجو کو بھول جاؤ گے اور اپنی پڑ جائے گی۔ وہ کیا کہتے ہیں...... تجھے پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ اور ویسے ایک بات میں تمہیں اور بتاؤں کبھی کبھی راجو جیسے لوگوں کو ٹھکانے لگا دینا ٹھیک ہوتا ہے۔ ان کا جرم بالکل ثابت ہو رہا ہوتا ہے لیکن عدالتی کارروائیوں اور قانون کی خامیوں کا سہارا لے کر یہ لوگ بچ جاتے ہیں اور پھر سے اسی رنگ میں رنگے جاتے ہیں۔"

"لیکن سوال تو یہ ہے اس بات کا فیصلہ کون کرے گا کہ جس شخص کو گولی سے اڑایا جا رہا ہے یہ واقعی مجرم ہے اور پھر یہ قانون پڑھانے والے ادارے، یہ سارا عدالتی نظام کس کام کا؟ اور تم بھی کس کام کے؟"

عبداللہ کے چہرے پر غصے کا رنگ سا لہرا گیا۔ ایک لمحے کے لیے لگا کہ وہ میری بات کا جواب سخت انداز میں دے گا لیکن پھر اس نے خود کو سنبھالا اور لمبی سانس لے کر بولا۔ "میرا خیال ہے شاہ زیب! تمہیں پرائے پھڈوں میں ٹانگ اڑانے کے بجائے پہلے اپنے اردگرد بھی دیکھنا چاہیے۔ مم...... میرا مطلب ہے......" وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے لگا کہ وہ شاید بے دھیانی میں ضرورت سے کچھ زیادہ کہہ گیا ہے۔

میں نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اردگرد سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

وہ پہلے تو کچھ تذبذب میں رہا پھر پہلو بدل کر بولا۔ "شاہ زیب تم کئی دن سے یہاں ہو، کیا تم نے چاچا حفیظ کے سلسلے میں کوئی خاص بات نوٹ کی ہے؟ میرا مطلب ہے ان کی کوئی پریشانی وغیرہ؟"

میں نے چونک کر کہا۔ "ہاں، کچھ گم صم تو ان کو دیکھا ہے میں نے......"

"وجہ نہیں پوچھی؟"

"دو تین بار پوچھا بھی لیکن کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملا۔"

عبداللہ نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "ایک دو بار میرے دل میں یہ بات آئی تھی

کہ اس بارے میں ولید سے بات کروں لیکن ہم سب جانتے ہیں کہ وہ بہت تیز مزاج کا ہے۔اپنے غصے کی وجہ سے وہ کئی دفعہ اپنا اچھا بھلا کام بگاڑ بھی چکا ہے اور یہ بات ایسی ہے کہ میں کم از کم اس سے تو شیئر نہیں کر سکتا۔"

"کوئی لڑائی جھگڑے والا معاملہ ہے؟"

"لڑائی جھگڑے والا ہوتا تو میں اس کو خود ہی نبٹانے کی کوشش کرتا مگر بات کچھ اور ہے......تم پڑھے لکھے اور سمجھ دار ہو۔اگر تم وعدہ کرو کہ بات اپنے تک رکھو گے تو میں تمہیں اس بارے میں کچھ بتاتا ہوں۔"

میں نے عبداللہ کو پوری پوری تسلی دی کہ یہ بات ہم دونوں کے درمیان رہے گی اور اگر میں نے اس سلسلے میں چچا سے بات کی بھی تو اس طرح کروں گا جیسے مجھے از خود کوئی جانکاری حاصل ہوئی ہے۔اس کے علاوہ میں نے اس سے یہ وعدہ بھی کیا کہ اس کے مشورے کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گا۔

اسی دوران میں کونے میں رکھے ٹی وی پر اس پولیس مقابلے کی پٹی چلنا شروع ہو گئی تھی جو چینل کی معلومات کے مطابق کوئی دو گھنٹے پہلے لاہور کے مضافات میں ہوا تھا۔بتایا جا رہا تھا کہ پیشی پر جاتے ہوئے راجو نامی غنڈا پولیس کی حراست سے فرار ہوا۔بعد میں پولیس مقابلہ ہوا۔راجو کے مددگار تین افراد بھاگنے میں کامیاب ہوئے جبکہ راجو موقعے پر مارا گیا، وغیرہ وغیرہ۔

عبداللہ نے بیزاری سے ریموٹ اٹھایا اور ٹی وی بند کر دیا۔وہ اصل موضوع سے ہٹنا نہیں چاہتا تھا۔اس نے سگریٹ کے دو گہرے کش لے کر دھواں ایک جانب چھوڑا اور ٹھہرے انداز میں بولا۔"تمہارے گھر اور تمہاری آبائی زمین کا مسئلہ ہے، کچھ لوگ اسے خریدنا چاہتے ہیں بلکہ یوں کہہ لو کہ زبردستی خریدنا چاہتے ہیں۔"

"کون لوگ؟" میں چونک گیا۔

"سمجھو کہ یہ لوگ بھی داراب فیملی کے کارندے ہیں۔یہ چکر پچھلے چھ مہینے سے چل رہا ہے۔ابھی تو یہ لوگ پیار و محبت سے کام لے رہے ہیں لیکن زیادہ دیر تک ایسا نہیں ہوگا۔اگر گھی سیدھی انگلیوں سے نہ نکلا تو انگلیاں ٹیڑھی کر لی جائیں گی۔"

"تمہیں یہ سب کیسے پتا ہے؟"

"قریباً دو مہینے پہلے اس بارے میں چچا حفیظ نے مجھے خود سب کچھ بتایا ہے۔تمہیں پتا ہی ہے وہ ہمیشہ سے ایسے ہی ہیں۔ہر مصیبت، پریشانی سے اپنے گھر والوں کو دور رکھتے ہیں۔

اب بھی وہ یہ سب کچھ اپنے اوپر لیے ہوئے ہیں۔ ولید کے کانوں میں بھنک بھی نہیں پڑنے دی انہوں نے...... وہ جانتے ہیں، وہ مرنے مارنے پر اتر آئے گا اور معاملہ بہت خراب کر لے گا۔ مجھے بھی انہوں نے رازداری کی سخت شرط کے ساتھ بپتا سنائی تھی۔''

میری نگاہوں میں اپنے آبائی گھر کا منظر گھوم گیا۔ وہاں کے ایک ایک چپے پر ہماری یادیں نقش تھیں۔ یہ ساری قریباً دو ایکڑ جگہ تھی۔ اندازاً ڈیڑھ کنال میں ہمارا وہ پرانا حویلی نما مکان تھا جہاں ہم نے تایا اور چچاؤں کے ساتھ اپنا بچپن گزارا تھا۔ مکان کے عقب میں وہ جگہ تھی جہاں دادا کے زمانے میں سادہ اور باداموں والا گڑ تیار ہوتا تھا اور دیہاتی سوغاتیں بنتی تھیں۔ اب وہاں بیکری کا کام چل رہا تھا۔ آگے کی قریباً ڈیڑھ ایکڑ زمین پر ایک باغ اور دو تین کھیت تھے جو اب چچا نے ٹھیکے پر دے دیئے تھے۔ یہ ساری جگہ ہم سب کو اور خاص طور سے چچا حفیظ کو بہت عزیز تھی کیونکہ باقی بھائیوں کے بکھر جانے کے باوجود وہ یہیں پر مقیم رہے تھے۔

ایک دم میرا دل بھر آیا۔ میری سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ چچا نے پورے گھر کو رنگ و روغن کیوں کروایا ہے۔ کیوں وہ کھوئے کھوئے سے اس کے درو دیوار کو دیکھتے اور راہداریوں میں گھومتے رہتے ہیں اور آج کل ان کی روز بروز گرتی صحت کا اصل سبب کیا ہے؟

میں نے کہا۔ ''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ کیا یہ بالکل ہی اندھیر نگری اور چوپٹ راج ہے؟ کیا یہاں سرے سے کوئی قانون ہے ہی نہیں۔ وہ چچا کی جگہ ہے، اس جگہ کو ان کی مرضی کے بغیر کیسے خریدا جاسکتا ہے؟''

''جو لوگ خریدنے والے ہیں، ان میں اتنی طاقت ہے کہ وہ خرید سکیں۔ کیا تمہارے سامنے انہوں نے حاجی نذیر جیسے بندے کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور نہیں کیا۔ اسے تیار نہیں کر لیا کہ وہ اپنی اکلوتی بیٹی کا ہاتھ شکیل داراب کے ہاتھ میں دے دے۔ شاید تمہیں پتا چل ہی گیا ہوگا۔ اگلے مہینے کی دس بارہ تاریخ کو عاشرہ اور شکیل داراب کا نکاح ہو رہا ہے۔''

میں ششدر رہ گیا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ یہ معاملہ اتنی جلدی طے پا جائے گا۔ میں تو وہاں اسپتال میں عارف کو بہت حوصلہ اور تسلی دے کر آیا تھا۔ میں نے اسے باور کرایا تھا کہ اس کی آواز عاشرہ اور حاجی نذیر کی فیملی تک پہنچانے کی کوشش کروں گا اور اس زبردستی کی شادی کو رکوانے کے لیے جو بھی ہوسکا کروں گا۔

''تمہیں کیسے پتا ہے کہ اگلے مہینے یہ شادی ہو رہی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کنفرم اطلاع ہے۔ ویسے اب یہ شادی ہو ہی جائے تو بے چاری عاشرہ کے لیے اچھا

ہے اور اس کے گھر والوں کے لیے بھی۔'' عبداللہ کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں جیسے ایک بھید سا تھا۔

''تم پہیلیاں کیوں بجھوا رہے ہو، کھل کر بات کیوں نہیں کرتے؟ حاجی نذیر اور عاشرہ نے اتنی جلدی ہتھیار کیسے ڈال دیئے؟''

''یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ سوچو، انہوں نے اتنی جلدی ہتھیار کیسے ڈالے اور اگر وہ اتنی جلدی ہار مان سکتے ہیں تو پھر چچا حفیظ بے چارے کہاں تک مزاحمت کر سکتے ہیں۔''

اس دوران میں عبداللہ کے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے کال ریسیو کی اور آٹھ دس منٹ تک بات کی۔ دوسری طرف غالباً اس کا کوئی صحافی دوست تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ بات حاجی نذیر اور اس کی بیٹی کے بارے میں ہو رہی ہے۔ یہ پتا بھی چلا کہ حاجی نذیر صاحب چند دن پہلے لاہور کے پنجاب کارڈیالوجی میں ایڈمٹ ہوئے تھے اور ان کی انجوگرافی ہوئی ہے۔

بات ختم کر کے عبداللہ نے ٹھنڈی سانس لی اور میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''وہی ہوا نا جس کا اندیشہ تھا۔ داراب فیملی کے لوگ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہر حد تک جاتے ہیں۔ بس کاریگری یہی ہے کہ قانون ان کو پکڑ نہیں سکتا اور عدالتیں ثبوت اور گواہوں کے بغیر بے بس ہو جاتی ہیں۔ پتا ہے پچھلے دنوں کیا ہوا ہے؟''

میں سوالیہ نظروں سے عبداللہ کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ اپنے کالے کوٹ کا کالر درست کرتے ہوئے بولا۔ ''حاجی نذیر صاحب کو درمیانے درجے کا اٹیک ہوا ہے اور اس اٹیک کی وجہ پتا ہے کیا ہے؟ ایک فائل...... جو ایک سرکاری دفتر میں کہیں فائلوں کے نیچے دبی پڑی ہوگی دس پندرہ سال سے۔ داراب فیملی کے وکیلوں نے اس فائل کو باہر نکال لیا ہے اور جھاڑ پونچھ کر کسی میز پر سجا لیا ہے۔''

''کیسی فائل؟''

''ایک پرانے مقدمے کی۔ حاجی نذیر کی ایک شوگر مل بھی ہے۔ اس شوگر مل میں ایک بوائلر پھٹ گیا تھا۔ بوائلر پھٹنے سے تین افراد ہلاک ہو گئے تھے۔ ان میں شوگر مل کی مزدور یونین کا جنرل سیکرٹری بھی تھا بعد میں یہ شور اٹھ کھڑا ہوا تھا کہ یہ حادثہ نہیں بلکہ سازش ہے۔ جنرل سیکرٹری کے ساتھ ایک طرح سے حاجی نذیر اور اس کے بیٹے کی دشمنی چل رہی تھی۔ اس شخص کو اسی دشمنی میں قتل کیا گیا ہے۔ ڈیڑھ دو سال کے بعد ناکافی شہادتوں اور گواہوں کی عدم موجودگی کے سبب یہ کیس سرد خانے میں چلا گیا لیکن اب اس باسی کڑی کو بھرپور ابال دیا

گیا ہے اور کیس کو بنا سنوار کر اس میں نئی جان ڈال دی گئی ہے۔ اس کیس کے ری اوپن ہونے پر ہی حاجی نذیر صاحب نے اپنے دل پر ہاتھ رکھا اور خراماں خراماں دل کے اسپتال پہنچ گئے۔ ان کے اسپتال پہنچنے کا نتیجہ پتا ہے کیا نکلا؟''

''کیا نکلا؟'' میں نے پوچھا۔

''میرے صحافی دوست کی اطلاع کے مطابق دو تاریخ کو سہ پہر چار بجے حاجی صاحب کی بیٹی عاشرہ از خود شکیل سے ملنے اس کے شیخوپورہ والے ریسٹ ہاؤس میں پہنچی۔ وہ ایک عام سی نیلی مہران کار میں گئی جس کی کھڑکیوں پر بلائنڈر لگے ہوئے تھے۔ وہ قریباً دو گھنٹے یعنی شام سات بجے تک اس ریسٹ ہاؤس میں رہی ہے اور اس بارے میں اب بہت سی چہ میگوئیاں بھی گردش کر رہی ہیں۔''

''کیسی چہ مگوئیاں؟''

عبداللہ نے سگریٹ کا ایک طویل کش لینے کے بعد کہا۔ ''کسی کی بیٹی کا معاملہ ہے۔ اس پر بات کرتے ہوئے بہت احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ بہرحال جو معلومات گردش کر رہی ہیں ان کے مطابق عاشرہ نے شکیل سے مل کر اس سے خود معاملات طے کیے ہیں اور اس سے نکاح پر رضامندی ظاہر کی ہے۔ معاملہ طے ہونے سے پہلے ان دونوں کے درمیان جھگڑا وغیرہ بھی ہوا تھا۔ ایک موقعے پر عاشرہ بڑے غصے میں شکیل کے دفتر سے باہر نکلی تھی اور اپنی مہران گاڑی میں آ بیٹھی تھی لیکن کچھ دیر بعد وہ دوبارہ اندر چلی گئی۔ ایک گھنٹے بعد جب وہ واپس آئی تو شکیل بھی اس کے ساتھ تھا۔ وہ نہ صرف اسے گاڑی تک چھوڑنے آیا بلکہ اس نے اپنے گارڈز والی ایک گاڑی عاشرہ کے ساتھ بھی بھیجی تاکہ وہ اسے مراد پور تک پہنچائیں۔''

میں نے گہری نظروں سے عبداللہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم نے شروع میں یہ کیوں کہا کہ اب عاشرہ، شکیل سے شادی کر ہی لے تو اچھا ہے؟''

عبداللہ کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ کھیل گئی، بولا۔ ''تم بات تاڑ جاتے ہو...... میرا خیال ہے بات وہی ہے جو اب تمہارے دماغ میں بھی آ رہی ہے۔ وہاں عاشرہ کو بڑی بے چارگی کے عالم میں کچھ لو اور کچھ دو کی بنیاد پر معاملہ طے کرنا پڑا ہے۔ اللہ کرے ہمارا اندازہ غلط ہو لیکن لگتا یہی کہ وہ شادی سے پہلے ہی...... شادی شدہ ہو گئی ہے۔ شکیل جیسے گھاگ کاروباری لوگ نو نقد نہ تیرہ ادھار پر یقین رکھتے ہیں۔'' عبداللہ کے لہجے میں تاسف کی جھلک تھی۔

میری آنکھوں کے سامنے وہ نشانات گھوم گئے جو عاشرہ کے دودھیا جسم پر موجود تھے اور

جن پر اتفاقاً ہی میری نظر پڑی تھی۔ خاص طور سے گردن کا نشان گواہی دیتا تھا کہ وہ کسی کی آتشیں دست درازی کا شکار ہوئی ہے۔

"اوہ گاڈ" میں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ نہ جانے ان لمحوں میں کیوں مجھے لگا کہ میں دور حاضر کے کسی ملک میں نہیں قدیم زمانے کی کسی اندھی تہذیب میں رہنے والا شخص ہوں۔ جہاں عیار عقل نے سو بھیس بدل رکھے ہیں اور نت نئے طریقوں سے جبر اور مجبوری کی تاریخ رقم کر رہی ہے۔

عبداللہ کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔ وہ موضوع بدلتے ہوئے بولا۔ "شاہ زیب! میری بات کا برا نہ ماننا۔ میں اسی لیے تمہیں کہتا ہوں کہ پرائے پھڈوں میں ٹانگ اڑانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ میرے خیال میں تو حاجی نذیر کی بیٹی کے ساتھ جو کچھ ہونا ہے وہ ہو چکا ہے۔ اب بہتری اسی میں ہے کہ ان کی شادی ہو جائے اور جلد سے جلد ہو جائے۔" میں سناٹے میں تھا۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس ڈرامے کا ڈراپ سین ہوگا اور اتنی جلدی ہوگا۔

عبداللہ نے نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "اللہ نہ کرے...... اللہ نہ کرے...... میرے منہ میں خاک۔ ہم پر بھی اس طرح کی کوئی آفت آ جائے۔ میرا مشورہ تو چچا حفیظ کے لیے یہی تھا کہ ان لوگوں سے متھا لگانا اور ٹینشن پالنا ہمارے بس میں نہیں ہے۔ وہ لوگ مارکیٹ کے مطابق جگہ کی معقول رقم دے رہے ہیں بلکہ شاید وہ زیادہ بھی دینے کو تیار ہو جائیں گے۔ ایسے میں بہتر ہے کہ یہ کڑوا گھونٹ بھر لیا جائے اور جگہ بیچ کر فوراً ہی کہیں اور جگہ خرید لی جائے۔ ولید کی بیکری شاپ بھی ابھی کرائے کی جگہ پر ہے۔ ڈھائی تین کروڑ میں اسے شاپ کے لیے اچھی جگہ مل سکتی ہے۔ مکان بنا کر باقی رقم کسی بینک میں جمع کروا دیں لیکن......"

"لیکن کیا؟"

"چچا اس جگہ پر ایسے دھنسے ہوئے ہیں جیسے بوڑھے پیپل کی جڑیں زمین میں اندر تک چلی جاتی ہیں۔ جب وہ وہاں سے جانے کے بارے میں سوچتے ہیں تو ان کے دل کو کچھ ہونے لگتا ہے اور بات صرف چچا ہی کی نہیں چچی کو بھی اس گھر سے بہت زیادہ لگاؤ ہے۔"

"وہ دونوں وہیں پلے بڑھے، وہیں جوان ہوئے، وہیں پر انہیں محبت ہوئی اور ان کی شادی بھی ہوئی پھر باقی بھائی تو ایک ایک کر کے دوسری جگہوں پر آباد ہو گئے لیکن چچا حفیظ نے اپنے حصے کی جائیداد میں یہی جگہ رکھی۔ ان کی ساری عمر یہیں پر گزری ہے۔ میں جانتا ہوں یہاں کی ایک ایک اینٹ سے انہیں پیار ہے۔" میں نے دل گیر لہجے میں کہا۔

"لیکن میرا خیال ہے اب اس پیار کے خاتمے کا وقت آ گیا ہے۔ جو بڑے بڑے مگر مچھ اس جگہ کے پیچھے پڑ گئے ہیں، وہ اسے حاصل کیے بغیر نہیں رہیں گے۔ بہت مشکل ہے۔"

میں نے کہا۔ "ان مگرمچھوں کے کوئی نام بھی ہیں یا صرف مگرمچھ ہی کہتے ہیں انہیں؟"

وہ بولا۔ "مگرمچھ نمبر ایک تو وہی لالہ نظام چودھری ہے۔ یہ شکیل داراب کے خطرناک گماشتوں میں سے ایک ہے۔ بے حد چالباز اور زہریلا شخص ہے۔ زمیندار اور کاشت کار اس کی صورت دیکھ کر جل تُو جلال تُو پڑھنے لگتے ہیں۔ یہ ان لوگوں میں سے ہے جو داراب فیملی کے ذاتی منصوبوں کے لیے مختلف جگہیں اور رقبے حاصل کرتے ہیں۔ دھن، دھاندلی، دھونس سب کچھ چلاتے ہیں یہ لوگ۔ لالہ نظام نامی یہ بندہ خود بھی کروڑ پتی بن چکا ہے۔ لاہور میں دو تین پلازوں کا مالک ہے۔ مزے کی بات یا پھر کہہ لو کہ سر پیٹنے کی بات یہ ہے کہ لالہ نظام چودھری اپنے محترم و معظم ایس ایچ او قیصر چودھری کا سسر ہے۔"

"تم تو کہتے ہو کہ یہ بہت بڑے لوگ ہیں، پھر یہ اس دو ایکڑ جگہ کے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑے ہوئے ہیں؟"

عبداللہ نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ "نمک معمولی سی چیز ہے لیکن ہزاروں لاکھوں روپے سے پکا ہوا کھانا بھی دس بیس روپے کے نمک کی وجہ سے بے کار ہو جاتا ہے۔ کچھ ایسی ہی صورتِ حال تم لوگوں کی دو ایکڑ زمین کی ہے۔ داراب فیملی کے لوگ یہاں ایک بڑی رہائشی اسکیم بنا رہے ہیں۔ مین سے لے کر پیچھے تک وہ سیکڑوں ایکڑ رقبہ حاصل کر چکے ہیں۔ بس فرنٹ پر دو تین لوگ ہیں جن کی دو دو تین ایکڑ زمین ہے۔ یہ زمین اسکیم میں شامل نہ ہوئی تو یہ لوگ اسے اپنے پروجیکٹ میں ٹاٹ کا پیوند سمجھیں گے۔"

عبداللہ کی باتیں سن کر نہ جانے کیوں مجھے لگا کہ وہ شخص جس کو تھپک تھپک کر میں نے اپنے اندر سلا رکھا تھا کسمسا کر بیدار ہو رہا ہے۔ میرے اور اس کے درمیان کافی دیر تبادلہ خیال ہوا۔ ذہن میں سیکڑوں اندیشے اور وسوسے لے کر میں عبداللہ کے پاس سے اٹھ آیا۔ میں سب سے پہلے چچا سے بات کرنا چاہتا تھا۔ عبداللہ کی بات بار بار میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔

"پرائے پھڈوں میں ٹانگ اڑانے کے بجائے اپنے گھر کو دیکھو شاہ زیب۔"

شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ اگر چچا کی روز بروز گرتی صحت اور پریشانیوں کا سبب یہی زمین والا معاملہ تھا تو پھر اس مسئلے کو سمجھنے اور اس کے لیے کچھ کرنے کی ضرورت تھی۔

O.....❖.....O

رات بڑی سرد تھی۔ تاریکی نے ہر شے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ قریباً گیارہ بجے کا عمل تھا۔ دیہاتی علاقوں میں یہ وقت مکمل خاموشی اور ویرانی کا ہوتا ہے۔ اکثر لوگ اپنے بستروں میں دبک چکے ہوتے ہیں۔ مجھے بھی نیند آنے لگی تھی مگر میں جاگ رہا تھا۔ میں چچا حفیظ سے کھل کر بات کرنا چاہتا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ عشا کے بعد سے اپنے ایک ہم عمر دوست کے ساتھ بیٹھے تھے اور یہ شخص جانے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ اس شخص نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ سر پر پگڑی اور بال قدرے لمبے تھے۔ وہ دونوں بیٹھک میں بیٹھے حقہ گڑگڑا کر مسلسل باتیں کررہے تھے۔ مجھے الجھن ہونے لگی۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ یہ پروگرام کل تک ملتوی کردوں کہ اچانک مجھے لگا کہ چچا کا دوست اٹھ کر جانے والا ہے۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ چند سیکنڈ بعد میں نے چچا اور ان کے دراز گیسو دوست کو بیٹھک سے نکل کر احاطے کی طرف جاتے دیکھا۔ جلد ہی مجھے محسوس ہوا کہ دونوں ہی کہیں جارہے ہیں۔ رات کے اس پہر اتنی سردی میں وہ کہاں کا ارادہ رکھتے تھے؟ میں نے شلوار قمیص پر چادر کی بکل لپیٹی اور چپل پہن کر اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ دونوں احاطے کی نیم تاریکی میں داخل ہوئے تو میں بھی خاموشی سے ان کے عقب میں چل پڑا۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ وہ بیرونی پھاٹک کی طرف جانے کے بجائے باغ کی طرف جارہے ہیں پھر مجھے ایک اور چیز نظر آئی۔ باغ کے اندر شاید کہیں تھوڑی سی آگ بھی جل رہی تھی۔ آگ تو نظر نہیں آئی لیکن سرخ روشنی کی جھلک دکھائی دی۔ حویلی کے باقی حصے پر مکمل سناٹے کا رواج تھا۔ زنانہ حصے میں فقط ایک بلب کی مدھم روشنی موجود تھی۔ چچا اور ان کا دوست ٹھٹھرے ہوئے اوس زدہ باغ میں داخل ہوئے تو میں بھی احتیاط سے درختوں کے اندر چلا گیا۔ یہاں کینو اور امرود کے بہت سے کوتاہ قد درخت موجود تھے۔ میں نے ان درختوں کے اندر سے ایک عجیب منظر دیکھا۔ آگ کے دو الاؤ روشن تھے۔ ایک چھوٹا اور ایک قدرے بڑا، بڑے الاؤ کے پاس ایک لڑکی، لڑکا ڈرے سہمے سے بیٹھے تھے۔ نہ جانے کیوں ان کے لباس کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ ان کی نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ شاید ایک آدھ دن پہلے ہی۔ دونوں لباس اور صورت سے غریب طبقے سے لگتے تھے بلکہ کافی زیادہ غریب۔ لمبے بالوں والے شخص نے ان دونوں کے پاس جاکر کچھ کہا اور دونوں کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ چچا حفیظ کا ایک اعجاز نامی ملازم بھی یہاں موجود تھا۔ اعجاز حجام کا کام بھی کرتا تھا۔ اعجاز اور لمبے بالوں والے شخص نے الاؤ کے سامنے دو تین بڑی بڑی چادریں اس طرح تان دیں کہ لڑکی لڑکا نگاہوں سے اوجھل ہوگئے۔

چچا حفیظ اور لمبے بالوں والا شخص کچھ دور جا کر چھوٹے الاؤ کے پاس بیٹھ گئے۔ چچا حفیظ تو حقہ گڑگڑانے لگے جبکہ لمبے بالوں والا ایک مالا نکال کر کچھ پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ یکایک مجھ پر یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ چادروں کے پیچھے اوجھل لڑکی، لڑکا یونہی نہیں بیٹھے ہوئے بلکہ وہ لیٹے ہوئے ہیں اور شاید نئے نویلے دولہا دلہن کی حیثیت سے قربت کے لمحات گزار رہے ہیں۔ یہ سب کچھ بے حد انوکھا اور تحیر خیز تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ سب کچھ کسی جادو ٹونے یا سفلی عمل کا حصہ ہے۔ میں چچا حفیظ کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ پختہ عقیدہ رکھتے تھے اور توہمات سے دور تھے پھر یہ سب کچھ کیا ہو رہا تھا اور کیوں؟ لمبے بالوں والا شخص مسلسل اپنی مالا کو گردش دینے میں مصروف تھا۔

قریباً ایک گھنٹا اسی عالم میں گزرا۔ سرد تاریکی میں پنجوں کے بل بیٹھے بیٹھے میرا جسم اکڑنے لگا تھا۔ یہ ڈر بھی تھا کہ کہیں کوئی اس طرف آ نہ جائے۔ بالآخر یہ امتحان ختم ہوا۔ میں نے دیکھا کہ غریب صورت لڑکے نے سامنے والی چادر ہٹائی اور خجل خجل سا لمبے بالوں والے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ لڑکی ابھی تک الاؤ کے پاس بیٹھی تھی۔ اس نے اپنا چہرہ ایک لمبے گھونگٹ میں چھپا لیا تھا۔ تب الاؤ کی مدھم روشنی میں مجھے وہ فرشی بستر بھی دکھائی دیا جس پر لڑکا، لڑکی موجود رہے تھے۔ دراز بالوں والا آگے بڑھا، اس نے گھاس پر بچھا ہوا بستر تہ کیا اور ایک طرف رکھ دیا۔ اس نے دلہن نما لڑکی کی چوڑیاں اتروائیں، اس کے گہنے اتروائے جو غالباً پیتل وغیرہ کے تھے پھر اس نے لڑکی کی کلائیوں سے پھولوں کے گجرے بھی اتروائے۔ یہ سب چیزیں اس نے تہ شدہ بستر کے اندر رکھیں۔ میری نگاہ الاؤ کی دوسری جانب ایک چھوٹے سے گڑھے پر پڑی۔ یہ گڑھا شاید دو تین گھنٹے پہلے ہی کھودا گیا تھا۔ اطراف میں تازہ مٹی نظر آتی تھی۔

دراز گیسو شخص نے بستر کو دیگر اشیا سمیت بڑی احتیاط سے گڑھے میں رکھوا دیا۔ پھر اس نے اعجاز کو اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھا، اس نے گردن کے پیچھے سے لڑکے کے کچھ بال قینچی کی مدد سے کاٹ لیے۔ پھر یہی عمل اس نے لڑکی کے ساتھ دہرایا۔ تاہم لڑکی کے بال چاروں طرف سے کاٹے گئے اور اس بے چاری کو تقریباً مونڈ کر رکھ دیا گیا۔ وہ شرم و حیا سے سکڑی سمٹی بیٹھی رہی۔ یہ سارے بال اور لڑکے کے بال اکٹھے کیے گئے اور انہیں بستر کے ساتھ ہی گڑھے میں رکھ دیا گیا۔ پھر اعجاز نے بیلچے کی مدد سے گڑھے پر مٹی ڈالنا شروع کر دی۔

چچا نے لڑکی کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ چچا کی مدھم آواز ہوا کے دوش پر تیر کر میرے کانوں تک بھی پہنچی۔ وہ اس سے کہہ رہے تھے۔ "مجھے معاف کرنا بچی، یہ ہماری مجبوری تھی۔ تم نے

ہمارا بہت ساتھ دیا ہے اور تم نے بھی۔" انہوں نے لڑکے کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنے واسکٹ کی جیب سے کچھ نوٹ نکالے اور لڑکے کے حوالے کیے۔ اس کے بعد سب لوگ پھاٹک کی طرف چلے گئے۔ بڑا الاؤ پانی کے چھینٹے دے کر بجھا دیا گیا۔ بس چھوٹا الاؤ جلتا رہا اور لمبے بالوں والا شخص اس کے پاس بیٹھ کر کچھ پڑھتا رہا۔

یہ بات میری سمجھ میں اچھی طرح آ گئی تھی کہ یہ کوئی جھاڑ پھونک کا عمل ہوا ہے اور عین ممکن ہے کہ اس کا تعلق چچا کی اس پریشانی سے ہو جس نے انہیں گھیرا ہوا ہے۔ سچ کہتے ہیں کہ شدید پریشانیاں راسخ العقیدہ لوگوں کو بھی شدید واہموں کے سپرد کر دیتی ہیں۔

○......❖......○

اگلے روز چچا حفیظ سے میری ملاقات ہوئی۔ تاہم میں نے رات والے واقعے کا کوئی ذکر نہیں کیا بلکہ اشارہ تک نہیں دیا۔ میں نے بیکری کے کام کی اور پھر زمین کے ٹھیکے کی بات چھیڑ دی۔ باتوں باتوں میں، میں نے وہ کہہ دیا جس کے لیے میں موقع ڈھونڈ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "چچا! مجھے پتا چلا ہے کہ اس علاقے میں کوئی بڑی رہائشی اسکیم بن رہی ہے اور کچھ لوگ ارد گرد کے رقبے خرید رہے ہیں؟"

چچا کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ انہوں نے کہا۔ "ہاں کچھ ایسا سلسلہ چل تو رہا ہے لیکن جو بیچنا چاہے گا وہی بیچے گا۔ ہم تو نہیں بیچیں گے۔"

"آپ سے کسی نے رابطہ نہیں کیا؟"

"ہاں، کچھ دن پہلے ایک بندہ آیا تھا۔ میں نے کہہ دیا کہ یہ ہماری آبائی جگہ ہے۔ ہمارے چند بزرگوں کی قبریں بھی ہیں یہاں۔ ہم نے اسے فروخت نہیں کرنا۔" چچا نے گول مول سا جواب دیا۔

چچا اس موضوع سے جان چھڑانا چاہتے تھے لیکن میں مسلسل ان کے کان کھاتا رہا۔ وہ واضح طور پر اپنی پریشانیاں چھپا رہے تھے۔ مجھے ان پر بے حد ترس آیا۔ وہ سب کچھ اپنے اوپر لیے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اکلوتے بیٹے ولید کو بھی بے خبر رکھا ہوا تھا۔

اس نئے چکر کا علم ہونے کے بعد عاشرہ اور اس پر ہونے والے جبر کا واقعہ تو وقتی طور پر میرے ذہن سے نکل گیا۔ اگلے چھ سات روز میں، میں نے کچھ بھاگ دوڑ کی۔ میں نے عبداللہ کو اپنے ساتھ ملایا اور یہ جاننے کی کوشش کی کہ اگر ہم یہ جگہ نہ بیچنا چاہیں تو اس کے لیے

کیا طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ ایسی بات ہرگز نہیں تھی کہ اگر دو تین شہریوں کا یہ پانچ چھ ایکڑ رقبہ اسکیم میں شامل نہ ہوتا تو اسکیم کو کسی طرح کا نقصان پہنچتا۔ اتنے بڑے پراجیکٹ کے لیے اس ٹکڑے کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ بس اتنا تھا کہ اسکیم کی باؤنڈری وال میں ایک جگہ تھوڑا سا خم آجانا تھا اور بڑے لوگ ایسے خم برداشت نہیں کرتے۔ نہ باؤنڈری والز میں نہ اپنی گردنوں میں۔ وہ ضد بنا لیتے ہیں اور اسے پورا کرنے کے لیے ہر حد تک جاتے ہیں۔ ان چھ سات دنوں میں مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ فی زمانہ ہمارے جیسے ملکوں میں انصاف کا حصول کتنا مشکل ہے۔ آگے جانا تو دور کی بات ہے پہلا قدم اٹھانا ہی دشوار ہو رہا تھا۔ کہیں بدنیت پٹواری بیٹھا تھا، کہیں تنک مزاج تحصیل دار، کہیں کرپٹ ایم پی اے اور کہیں قیصر چودھری جیسا خودسرا افسر۔ آ جا کے صرف ایک شخص ایسا تھا جس نے کچھ توجہ سے ہماری بات سنی لیکن عملی طور پر وہ بھی بے بس نظر آیا اور یہ تھا جواں سال ایس پی تبریز۔

میں ایک سینئر وکیل سے مل کر رات کو گھر واپس آیا تو چچا حفیظ دوا کھا کر سو گئے تھے۔ چچی نے مجھ سے کھانے کا پوچھا اور شکوہ کیا کہ میں نہ جانے کہاں بھاگا بھاگا پھر رہا ہوں۔ چچازاد بہن فائزہ نے بھی اسی طرح کا گلہ شروع کر دیا۔ وہ سب اس بات سے بے خبر تھے کہ اس گھر پر کیا مصیبت آئی ہوئی ہے۔ جس طرح کی صورتِ حال تھی عین ممکن تھا کہ ایک ڈیڑھ ماہ کے اندر ان لوگوں کو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر یہاں سے نکلنا پڑتا اور فائزہ بے چاری جو بابل کے اس پیارے آنگن سے شہنائیوں کی گونج میں رخصت ہونے کا سوچ رہی تھی۔ اس رخصتی سے پہلے ہی زبردستی یہاں سے نکال دی جاتی۔

میں نے چچی سے پوچھا۔ ”ولید کہاں ہے؟“

وہ بولیں۔ ”کہہ رہا تھا سر میں درد ہے۔ اپنے کمرے میں لیٹا ہوا ہے۔“

میں برآمدے سے گزر کر ولید کے کمرے تک پہنچا۔ دو تین بار دروازے پر دستک دی آخر اس کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”کون ہے؟“

وہ جان چکا تھا کہ دروازے پر میں ہوں پھر بھی دروازہ کھولنے سے ہچکچا رہا تھا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ کافی تاخیر سے اس نے دروازہ کھولا۔ اندر داخل ہوتے ہی ایک ناگوار بو میرے نتھنوں سے ٹکرائی اور مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ ولید نے شراب پی رکھی ہے یا شاید ابھی تھوڑی دیر پہلے تک بھی پی رہا تھا بہرحال کمرے میں کسی طرح کا کوئی ثبوت دکھائی نہیں دیا۔

میں نے اسے سرتاپا دیکھا اور غصے سے کہا۔ ”ولید! تم نے نشہ کر رکھا ہے؟“

پہلے تو اس کے چہرے پر ایک رنگ سا لہرایا پھر وہ ایک دم بے پروا نظر آنے لگا۔ اس

کے چہرے پر ندامت کے بجائے غصے کی سرخی پھیلتی چلی گئی۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ تب میری نگاہ ایک اور چیز پر پڑی اور میری پریشانی میں اضافہ ہو گیا۔ ولید نے شلوار قمیص اور چمڑے کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اس کی جیکٹ کی ایک جیب مجھے غیر معمولی طور پر پھولی نظر آئی۔ میں نے اس کی جیب ٹٹولی، اس نے ایک دم میرا ہاتھ پیچھے ہٹا دیا۔ میرا اندیشہ درست نکلا تھا۔ اس کی جیب میں وہی پسٹل موجود تھا جو چند روز پہلے میں نے اس کی کار میں نشست کے نیچے دیکھا تھا۔

''یہ سب کیا ہے ولید؟'' میں نے تلملا کر پوچھا۔

اس کا چہرہ انگارے کی طرح دہک رہا تھا۔ پھنکار کر بولا ''شاہ زیب! یہ مارا جائے گا۔ میں تمہیں لکھ کر دیتا ہوں یہ مارا جائے گا...... میں ماردوں گا اسے۔''

''کس کی بات کر رہے ہو؟ کون مارا جائے گا؟''

''یہی کمینہ قیصر چودھری۔ اس کی موت میری گولی سے ہونی ہے۔ سیدھی ماتھے پر ماروں گا، سیدی اس جگہ۔'' اس نے انگلی سے اپنی پیشانی کو چھو کر بتایا۔

''ہوا کیا ہے یار؟ کچھ پتا تو چلے؟''

''وہ رذیل کھل کر سامنے آگیا ہے۔ اب میں اسے بتاؤں گا کہ جب شریف آدمی بدمعاشی پر اترتا ہے تو پھر اس جیسے تھانے دار کا کیا حشر ہوتا ہے۔''

ولید کا انداز خطرناک سے خطرناک ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے غیظ و غضب کو الکحل کی گرمی نے دو آتشہ کر دیا تھا۔ میرا دل گواہی دینے لگا کہ جو باتیں اب تک چچا حفیظ اور عبداللہ، تیز مزاج ولید سے چھپا رہے تھے وہ اس کے علم میں آگئی ہیں۔ اگر ساری نہیں تو کچھ نہ کچھ ضرور آگئی ہیں۔

میں نے اس کے دماغ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی اور کسی حد تک کامیاب رہا۔ میں نے اصرار کر کے پوچھا تو اس نے انکشاف انگیز لہجے میں مجھے وہی کچھ بتایا جو مجھے کئی دن پہلے معلوم ہو چکا تھا۔ اس نے کہا۔ ''لالہ نظام نامی بندہ زبردستی ہماری یہ آبائی جگہ خریدنا چاہ رہا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ یہ بدفطرت شخص رشتے میں ایس ایچ او قیصر چودھری کا سسر ہے اور دراصل قیصر ہی وہ شخص ہے جو بار بار اس کے والد (چچا حفیظ) سے رابطہ کر رہا ہے اور زمین بیچنے کا تقاضا کر رہا ہے۔'' یہ باتیں بتاتے ہوئے ولید کی آنکھوں میں دکھ آمیز طیش کی لالی تھی جسے شراب کی لالی نے دو چند کر دیا تھا۔ وہ پھر بولا۔ ''مجھے اب پتا چلا ہے شاہ زیب بھائی کہ اباجی کی صحت روز بروز خراب کیوں ہو رہی ہے۔ یہ خبیث تھانے دار جونک کی طرح ان کو چم

ہوا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ، ابا جی کس طرح کے بندے ہیں۔ کیا انہوں نے کبھی جادوٹونے اور جھاڑ پھونک والی باتوں پر یقین کیا ہے۔ کیا وہ ایسی باتیں کرنے والوں سے جھگڑ نہیں پڑا کرتے تھے؟''

''ہاں ایسا ہی تھا۔'' میں نے جواب دیا۔

''اب دیکھو، وہ اس قدر پریشان ہیں کہ ان جیسا بندہ بھی ایسی چیزوں کا سہارا لینے پر مجبور ہو گیا ہے۔ مجھے اتنا دکھ ہوا ہے کہ میں بتا نہیں سکتا۔ شاید تمہیں بھی سن کر حیرانی ہو۔ کچھ دن پہلے وہ ایک عامل سے ملے ہیں۔ وہ ہمارے گھر بھی آیا تھا۔ اس نے ابا جی سے کافی روپے بٹورے ہیں اور جھاڑ پھونک کا عمل بھی کیا ہے۔''

''کیسا عمل؟'' میں نے جانتے بوجھتے پوچھا۔

ولید کچھ دیر تو تذبذب میں رہا پھر اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا۔ اس نے کہا کہ عامل نے ابا جی کو بتایا کہ اگر کوئی شریف پاک دامن لڑکی شادی کے بعد اپنی پہلی رات اس گھر میں گزارے اور پھر اس کی سہاگ رات کی نشانیاں یہیں پر کسی گڑھے میں دفن کرنے کے بعد خاص وظیفہ پڑھا جائے تو یہ جگہ محفوظ ہو سکتی ہے۔ مرتا کیا نہ کرتا کہ مصداق ابا جی نے یہ سب کچھ کیا۔ انہوں نے بڑی رازداری کے ساتھ اعجاز کو یہ سب کچھ بتایا اور اس نے قریبی کچی بستی سے ایک ایسا جوڑا ڈھونڈ نکالا جس کی آٹھ دس روز میں شادی ہونے والی تھی۔ ان کو کسی نہ کسی طرح راضی کر لیا گیا کہ وہ نکاح کے بعد حویلی میں رات گزاریں۔

ولید نے مجھے وہ سب کچھ بتایا جو میں ایک رات خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا اور جس نے مجھے حیرت کے دریا میں غوطے دیئے تھے۔ میں نے ولید سے پوچھا کہ اسے یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوا۔ اس نے بتایا کہ اس نے باغ میں وہ گڑھا خود دیکھ لیا تھا۔ شک ہونے پر اس نے وہ گڑھا کھودا تو اس میں سے بستر اور دوسری چیزیں نکلیں۔ اس کے ساتھ ہی کٹے ہوئے بال اور ایک قینچی بھی ملی جو شاید غلطی سے گڑھے میں چلی گئی تھی۔ یہ قینچی دیکھنے کے بعد ولید کو اعجاز پر شک ہوا۔ اس نے سختی کے ساتھ اعجاز سے پوچھ گچھ کی تو اس نے سب کچھ بتا دیا۔ بعد میں طیش سے بھرے ہوئے ولید نے پہلے والدہ اور پھر والد سے بات کی، اسے سب کچھ معلوم ہو گیا۔ اس کے بعد آج شام بپھرا ہوا ولید تھانے پہنچا۔ وہاں تھانے دار قیصر سے تو اس کی ملاقات نہیں ہوئی تاہم قیصر کے حوالدار سے اس کا سامنا ہوا۔ دونوں میں سخت تلخ کلامی اور گالم گلوچ بھی ہوا۔ اب تلملایا ہوا ولید آبلہ پا پھر رہا تھا اور اپنے اندر کی آگ کو جام سے بجھانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

ابھی میری اور ولید کی گفتگو جاری تھی کہ کمرے کا دروازہ دھماکے سے کھلا اور مجھے چچا حفیظ کی صورت نظر آئی۔ ان کا چہرہ غصے سے لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ انہوں نے غضب ناک نظروں سے ولید کو دیکھا اور گرجے۔ ''اپنا اوچھا پن دکھا دیا نا تُو نے...... اپنی مرضی کر لی نا؟ تُو ہے ہی لعنتی۔ تجھ سے ایسی ہی امید تھی۔''

ولید بھی دہاڑا۔ ''ہاں...... میں ہوں لعنتی اور میں وہی کچھ کروں گا جو میرے دل میں آئے گا۔ میں جان لے لوں گا اس کمینے کی۔''

چچا حفیظ آگے بڑھے اور انہوں نے ایک زناٹے دار تھپڑ ولید کے گال پر رسید کیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ پھنکارے۔ ''تو ٹھیک ہے، مار دے اس کو اور اس سے پہلے ہم کو مار دے۔ ہماری ہڈیاں بوڑھی ہو گئی ہیں۔ اب پولیس کی مار سہنے اور جیلیں کاٹنے کے لائق نہیں ہیں ہم۔ پہلے ہمیں گولی مار۔''

اس کے ساتھ ہی چچا حفیظ نے دیکھ لیا کہ ولید کی جیکٹ کی سائیڈ والی جیب میں پستول ہے۔ انہوں نے جھپٹ کر پستول نکال لیا اور اسے ولید کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولے۔ ''چل مار گولی پہلے اپنے اس منحوس باپ کو۔ مار...... مار...... پھر جا کر اپنی ماں کو مارنا اور پھر بہن کو بھی ختم کرنا نہیں تو وہ دونوں ذلیل ہو جائیں گی تھانوں کے اندر۔''

چچا حفیظ کا پورا جسم خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرز رہا تھا اور غیظ و غضب کے سبب گلے کی رگیں پھولی ہوئی تھیں۔ مجھے ڈر محسوس ہوا کہ کہیں انہیں اٹیک ہی نہ ہو جائے۔ میں نے پستول ان کے ہاتھ سے لیا اور انہیں سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔ یہی وقت تھا جب گھر سے باہر پولیس موبائل کا تیز سائرن سنائی دیا۔

چچا حفیظ کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے زرد رنگ لہرایا گیا۔ وہ ایک سیکنڈ خاموش رہے پھر کراہتی ہوئی آواز میں ولید سے مخاطب ہو کر بولے۔ ''لے اب کر لے بدمعاشی۔ لڑ لے پولیس والوں کے ساتھ...... تیرے ایک تھپڑ کے بدلے انہوں نے تیری ساری ہڈیوں سے گوشت الگ نہ کر دیا نا تو نام بدل دینا میرا۔''

ولید سینہ تان کر آگے بڑھا۔ شاید وہ باہر نکلنا چاہ رہا تھا۔ میں نے اسے اپنی بانہوں کے گھیرے میں لے لیا اور دھکیل کر ساتھ والے کمرے میں لے گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتا میں نے اس کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ برآمدے کی طرف سے چچی آمنہ کے رونے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں یقیناً انہیں بھی اندر ہونے والے ہنگامے کا پتا چل گیا تھا۔ میں نے چچا حفیظ کو ساتھ لیا اور برآمدے میں آ گیا۔ چچی کے علاوہ فائزہ بھی ڈری سہمی کھڑی تھی۔

بیرونی پھاٹک دھڑا دھڑ بجایا جا رہا تھا۔ چچا حفیظ لڑکھڑاتے ہوئے میرے ساتھ چل دیئے۔ ہم نے پھاٹک کا چھوٹا سا دروازہ کھولا۔ لمبا تڑنگا قیصر چودھری اور اس کا عملہ تیزی سے اندر آ گیا۔ قیصر ہمیشہ کی طرح پُرسکون نظر آ رہا تھا مگر آنکھوں میں قہر کی بجلیاں سی کوندر ہی تھیں۔ ساتھ ہی حوالدار بھی تھا۔ اس کے گریبان کے بٹن ٹوٹے ہوئے تھے اور چہرہ ایک طرف سے سرخ تھا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ تھانے میں ولید اور حوالدار کے درمیان صرف تلخ کلامی ہی نہیں ہوئی تھی ہاتھا پائی بھی ہوئی ہے اور شاید ولید نے یہ فاش غلطی بھی کی ہے کہ حوالدار پر ہاتھ اٹھایا ہے۔ اس نے یقیناً اپنے لیے بڑی مشکل پیدا کر لی تھی۔ شاید گھاگ حوالدار نے اسے جان بوجھ کر مشتعل کیا تھا۔

''کدھر ہے وہ آپ کا بدمعاش پتر؟ اسے تھانے لے جانا ہے۔'' قیصر چودھری نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

چچا حفیظ نے لرز کر کہا۔ ''نہیں تھانے دار پتر، اس کی غلطی کی سزا ہم سب کو نہ دو...... میں...... میں خود اسے چھتر ماروں گا۔ وہ...... معافی مانگے گا تم سب سے، ہاتھ جوڑ کر معافی مانگے گا۔''

''معافی تو اس نے مانگنی ہی ہے بزرگو اور چھتر شتر مارنے کا بھی بڑا تسلی بخش انتظام ہے ہمارے پاس۔ آپ اسے بس ہمارے ساتھ رخصت کر دیجیے۔''

میں نے دیکھا ایک طرف سے چچی آمنہ تڑپ کر آگے بڑھیں اور انہوں نے تھانے دار قیصر کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ''نہ میرا پتر، وہ تو بچہ ہے، بے عقل ہے۔ اس کی طرف سے ہم تجھ سے معافی مانگتے ہیں۔ اس کی بہن کی برات آنے والی ہے کچھ دنوں میں...... اس کے ساتھ کوئی اونچ نیچ ہوگئی تو ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ اس کی غلطی کا جو ہرجانہ کہو ہم دے دیتے ہیں۔''

چچی اشک بار آنکھوں کے ساتھ قیصر کی منت سماجت کرنے لگی۔ میں نے چچی کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''چچی! آپ اندر جائیں۔ ہم بات کر رہے ہیں ناں۔''

تھانے دار طنزیہ انداز میں بولا۔ ''آ ہو جی، آپ اندر جاؤ۔ آپ کے یہ ببر شیر جوان پتر بات کر رہے ہیں نا ہم سے۔ ان کے ہوتے ہوئے آپ کو منت ترلے کرنے کی کیا ضرورت۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے اے ایس آئی کو اشارہ کیا۔ وہ دو تین سپاہیوں کے ساتھ آگے بڑھا۔ اس بار چچا حفیظ سامنے آ گئے۔ انہوں نے قیصر کی ٹھوڑی کو ہاتھ لگایا۔

''ہماری بڑی بے عزتی ہوگی پتر۔ تم...... تم بس ایک منٹ کے لیے ایک طرف ہو کر میری بات

سن لو۔"

چچا منت کر کے قیصر کو ایک طرف لے گئے اور بڑے التجا بھرے لہجے میں اس سے سرگوشیاں کرنے لگے۔ وہ لوہے کا تھم بنا کھڑا تھا۔ اس کا عملہ دزدیدہ نگاہوں سے چچی کے علاوہ ڈری سہمی فائزہ کی طرف بھی دیکھ رہا تھا۔ میں نے ان دونوں کو زبردستی زنان خانے کی طرف بھیج دیا۔ چچا حفیظ اور قیصر میں بات لمبی ہوتی جا رہی تھی۔ بات لمبی ہونے سے یہ امید پیدا ہونے لگی کہ شاید بچاؤ کی کوئی صورت نکل آئے پھر میں نے دیکھا چچا حفیظ تیزی سے زنان خانے کی طرف گئے۔ کچھ دیر بعد وہ پلٹے تو ان کے ہاتھوں میں ایک موبائل فون تھا۔ یہ شاید فائزہ کا فون تھا۔ چچا نے اس پر ایک نمبر پریس کیا۔ کسی سے تھوڑی سی بات کی پھر کانپتے ہاتھوں سے یہ فون قیصر کی طرف بڑھا دیا۔ قیصر فون پر بات کرنے لگا۔ آواز مجھ تک نہیں پہنچ رہی تھی لیکن قیصر کے انداز سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ دوسری طرف سے بولنے والے شخص کو اہمیت دینے پر مجبور ہے۔ اس نے ایک دوبار اثبات میں بھی سر ہلایا اور تھوڑی سی بات بھی کی پھر اس نے بڑی ناگواری سے بات ختم کرنے کے بعد فون سیٹ چچا حفیظ کی طرف بڑھا دیا۔

وہ بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ٹھیک ہے بزرگو! آپ کا کہا سر آنکھوں پر۔ ہم آپ کے خادم تو بس تھپڑ شپڑ کھانے کے لیے ہی پیدا ہوئے ہیں۔ اپنے پتر جی سے پوچھ لیں اگر کوئی کسر رہ گئی ہے تو میں اپنا منہ بھی حاضر کر دیتا ہوں اس کے تھپڑوں کے لیے۔"

اس کے زہریلے لہجے نے چچا کو ایک بار پھر لرزا دیا۔ انہوں نے قیصر کی ٹھوڑی کو ہاتھ لگایا۔ "کیسی بات کر رہا ہے پتر، آپ تو حاکم ہو۔"

"حاکم آپ ہو چاچا جی۔ کسی بھی وقت ہماری پیٹی اتروا سکتے ہو اور پینٹ بھی...... چلیں ٹھیک ہے پھر ملاقات ہوگی۔"

میں نے چونک کر قیصر کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک برق سی تھی اور ایسی ہی برق اس کے لہجے میں بھی کوند رہی تھی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ اس خطرناک تھانے دار نے یہ سب کچھ ہضم نہیں کیا اور ہو سکتا ہے کہ وہ اس کا کوئی بہت سنگین ردِعمل ظاہر کرے۔

قیصر چودھری اپنے عملے سمیت واپس چلا گیا۔ چچا حفیظ برآمدے سے گزر کر اندرونی حصے میں پہنچے۔ انہوں نے بند کمرے کا دروازہ کھولا اور ایک بار پھر ولید پر برس پڑے۔ انہوں نے اسے بے نقط سنائیں اور کہا کہ وہ اپنی بے وقوفی کی وجہ سے بنے بنائے کام کا بیڑا غرق کرنے والا تھا۔ انہوں نے کہا۔ "اللہ سائیں ہم پر کرم کر رہے ہیں۔ ہماری مصیبتیں دور

ہونے کی امید بن رہی ہے اور تم اپنی خر دماغی کی وجہ سے نئی مصیبتیں ہمارے گلے میں ڈال رہے ہو۔"

ولید باپ کے ادب کی وجہ سے خاموش تھا ورنہ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ اندر سے چیخ رہا ہے اور قیصر اور اس کے ماتحتوں کے خلاف غصے سے بھرا ہوا ہے۔ یہ ہنگامہ ذرا کم ہوا تو میں اور چچا حفیظ بیٹھک میں آ بیٹھے۔ چچا بدستور بول رہے تھے۔ "تم لوگ ابھی بچے ہو۔ ہم نے دنیا دیکھی ہے۔ تمہیں پتا نہیں قیصر چودھری کا کلہ کتنا مضبوط ہے۔ یہ بڑے زہریلے لوگ ہیں۔ ہمارا ان کا کوئی مقابلہ نہیں۔ سوچو جب حاجی نذیر جیسے لوگ ان کا ایک جھٹکا نہیں سہہ سکتے تو ہم کس باغ کی مولی ہیں۔"

اس دن چچا حفیظ نے کھل کر مجھے زمین والے معاملے کی ساری رُوداد سنائی اور بتایا کہ ان کی پریشانیوں کی بنیاد کیا ہے۔ یہ سب کچھ مجھے پہلے سے معلوم تھا تاہم میں نے ایسے ہی سنا جیسے پہلی بار سن رہا ہوں۔ چچا حفیظ نے اسلام آباد کے ایک بااثر شخص اخلاق پراچہ کا نام لیا اور بتایا کہ اللہ نے شاید اس شخص کو ان کے لیے رحمت کا فرشتہ بنایا ہے۔ وہ اس سلسلے میں دل و جان سے مدد کر رہا ہے اور امید پیدا ہو گئی ہے کہ ان کی زمین اسکیم میں آنے سے بچ جائے گی۔

اخلاق پراچہ کا نام چچا حفیظ نے ابھی تھوڑی دیر پہلے بھی لیا تھا جب انہوں نے بپھرے ہوئے قیصر چودھری کو فون کروایا تھا۔ اب اندازہ ہوا کہ وہ فون بھی اسی اخلاق پراچہ نامی شخص کا تھا۔ چچا نے مجھے اس کے بارے میں زیادہ تفصیل نہیں بتائی۔ تاہم مجھے اپنے طور پر ہی اندازہ ہوا کہ وہ کوئی نیک نام بیوروکریٹ ہے۔

چچا حفیظ نے کہا۔ "میں پرسوں اسلام آباد جا رہا ہوں۔ اللہ سوہنے سے بڑی امید ہے کہ یہ معاملہ ٹھیک ہو جائے گا۔"

چچا کی باتوں سے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اندرونی طور پر خود کو کافی مضبوط محسوس کر رہے ہیں۔

چچا کے کہنے پر میں نے ولید کے ساتھ ایک طویل نشست کی اور اسے سمجھا بجھا کر کچھ ٹھنڈا کیا۔ چچا نے پرسوں کا کہا تھا لیکن وہ اگلے روز ہی شام کو اسلام آباد چلے گئے۔ وہ اپنے ساتھ بہت سا دیسی گھی اور باداموں و کشمش والا گڑ بھی لے کر گئے تھے۔ قیصر چودھری کے ساتھ ولید نے جو جھگڑا کیا تھا اس کی وجہ سے چچی آمنہ کے ہونٹ ابھی تک سوکھے ہوئے تھے۔ فائزہ بھی پریشان نظر آتی تھی۔ اس کی شادی کے دن قریب آ رہے تھے لیکن گھر میں خوشی

کا ماحول کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

چچا کی واپسی کا انتظار کرنے کے ساتھ ساتھ میرے ذہن میں عاشرہ والا معاملہ بھی کبھی کبھی بجلی کی طرح کوند جاتا تھا۔ عبداللہ نے پورے یقین کے ساتھ کہا تھا کہ وہ بے چاری بن بیاہی بیوی بن چکی ہے اور اب کلی طور پر شکیل اور اس کی زور آور فیملی کے رحم و کرم پر ہے۔ میرے ذہن میں بار بار ویران آنکھوں اور غمزدہ چہرے والے عارف کا تصور بھی ابھرتا تھا۔ میں نے حادثے والی رات اس کی جان بچائی تھی لیکن وہ کہتا تھا کہ میں نے اسے مرنے دیا ہوتا تو اچھا تھا۔ میں اسپتال میں اس سے وعدہ کر کے آیا تھا کہ اس کے لیے جو کچھ ہو سکا ضرور کروں گا لیکن میرے کچھ سوچنے یا کرنے سے پہلے ہی حالات کیا سے کیا ہو گئے تھے۔ مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک بااثر گھرانے کی تعلیم یافتہ عاقل بالغ لڑکی کو اس طرح مجبور و بےبس کیا جا سکتا ہے۔ میں اس بارے میں عبداللہ سے بھی مزید معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔

چچا حفیظ کی واپسی دوسرے روز شام کو ہوئی۔ ان کا چہرہ دیکھ کر ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ مطمئن واپس آئے ہیں۔ ان کے سنجیدہ چہرے کے نیچے دبی دبی خوشی صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔ واپس آنے کے بعد وہ دیر تک زنان خانے میں رہے پھر بیٹھک میں آئے اور مجھے اور عبداللہ کو بتایا کہ ان کا سفر بڑا کامیاب رہا ہے۔ وہ کھل کر نہیں بتا رہے تھے لیکن ان کے لب و لہجے سے پتا چل رہا تھا کہ آج شاید کئی ماہ کے بعد وہ پہلی بار قدرے سکون محسوس کر رہے ہیں۔

O......❖......O

اگلے روز شام کو فائزہ کی مایوں کی رسم ہونا تھی۔ چچا نے اعلان کیا کہ یہ رسم حویلی کی چھت پر شامیانوں کے اندر ہوگی۔ دراصل وہ ایک پرانی تقریب کی یاد تازہ کرنا چاہتے تھے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ کچھ پرانی تقریبوں کی یاد تازہ کرنا چاہتے تھے۔ جب ہم بہت چھوٹے تھے تو حویلی میں ہونے والے کئی فنکشن گھر کی وسیع چھت پر ہوئے تھے۔ ہم لوگ اسے بہت انجوائے کرتے تھے۔ دوپہر سے ہی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ قمقمے لگائے گئے، شامیانے تانے گئے، بہت تھوڑی تعداد میں مہمان بلائے گئے تھے لیکن سب قریبی تھے۔ رات دس گیارہ بجے تک ہلا گلا رہا۔ فائزہ کے لیے مایوں کی چھوٹی موٹی رسمیں ادا کی گئیں۔ کھانا وغیرہ کھانے کے بعد سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ ہم دو تین کزن کچھ دیر دہکی ہوئی انگیٹھی کے قریب بیٹھے رہے اور اس گھر سے وابستہ بچپن کی یادوں کو تازہ کرتے رہے۔

بارہ بجے کے قریب سب سونے کے لیے چلے گئے اور قریباً ایک بجے کے قریب وہ واقعہ ہو گیا جس نے سب کچھ تہ و بالا کیا اور ہمارے اس حویلی نما مکان میں قیامت صغریٰ برپا کر دی۔

میں اوپر تلے ہونے والے دو یا تین دھماکوں کی وجہ سے بیدار ہوا تھا۔ ولید بھی میرے قریب ہی پلنگ پر سو رہا تھا۔ وہ بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ہم دونوں ننگے پاؤں ایک ساتھ کمرے سے باہر نکلے۔ کلیجا منہ کو آ گیا۔ زنان خانے کا بیشتر حصہ آگ کی لپیٹ میں تھا پھر ایک اور دھماکا ہوا۔ آگ کسی طوفانی ریلے کی سی تیزی سے مردانے حصے کو بھی اپنی لپیٹ میں لینے لگی۔

''میرا خیال ہے کہ گیس کے سلنڈر پھٹ رہے ہیں۔'' ولید چلا کر بولا۔

یقیناً یہ گیس سیلنڈر ہی تھے۔ بیکری کا کام زنان خانے کے بالکل عقب میں ہوتا تھا۔ وہاں پکائی کے کام کے لیے گیس کے سیلنڈر رکھے گئے تھے۔ اچانک میری نگاہوں نے ایک دلدوز منظر دیکھا۔ شاید میرے لفظوں میں وہ سکت نہ ہو کہ میں اس منظر کی ہولناکی کو بیان کر سکوں۔ میں نے فائزہ کو دیکھا۔ اس کے بالوں اور سارے کپڑوں کو آگ لگی ہوئی تھی۔ وہ دوسری منزل پر تھی۔ دیوانہ وار چلاتی ہوئی بالکونی کی طرف آئی۔ اس نے چھلانگ لگانے کی کوشش کی لیکن بالکونی کے جنگلے میں ہی کہیں اٹک گئی۔ اسی دوران میں بالکونی کا جلتا ہوا بہت بڑا چھجا ایک دھماکے سے بالکونی پر گرا اور سب کچھ آگ کے بے اماں الاؤ میں گم ہو گیا۔

ولید ''فائزہ...... فائزہ!'' پکارتا ہوا شعلوں کی طرف بڑھنا چاہ رہا تھا لیکن میں نے اسے کمر سے تھام کر اپنی بانہوں میں جکڑ لیا۔ مجھے ایک طرف چچا حفیظ نظر آئے۔ انہیں تین چار افراد نے تھام رکھا تھا۔ وہ خود کو چھڑا کر آگ کی طرف جانا چاہ رہے تھے۔ وہ دلدوز انداز میں چچی کا نام لے رہے تھے۔

''آمنہ اندر ہے...... مجھے چھوڑ دو...... آمنہ اندر ہے۔''

انہیں تھامنے والے شاید جانتے تھے کہ اب اندر جانا بے سود ہے اور یہ واقعی بے سود ہی لگتا تھا۔ دروازوں کے اندر آگ کے پھنکارتے ہوئے مہیب شعلوں کے سوا اب کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ حویلی کے دو تین ملازم اور ارد گرد کے چند رہائشی قریبی جوہڑ سے بالٹیاں بھر بھر کر آگ پر ڈال رہے تھے لیکن یہ آگ ایسے بجھنے والی کہاں تھی۔ چچا حفیظ زمین پر پچھاڑیں کھانے کے بعد نیم بے ہوش سے ہو گئے تھے۔ کئی افراد نے انہیں گھیر رکھا تھا۔ ولید کی بھی بری حالت تھی۔ میں کوشش کر کے ڈیوڑھی کی طرف سے ایک ادھیڑ عمر ماسی کو شعلوں سے نکال لایا تھا اور اب سکتے کی سی کیفیت میں کھڑا تھا پھر میری ٹانگوں میں سے جان جیسے ختم

ہوگئی۔ میں پنجوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا اور اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ میرے چاروں طرف جیسے کہرام مچا ہوا تھا۔ لوگ بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ ہر طرف رونے چلانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

''یہ سب کیا ہوا...... یہ سب کیسے ہوا ہے؟'' اور جب یہ سوال میرے ذہن میں ابھرا تب نہ جانے کیوں اس وقت ایک چہرہ بھی تصور کے پردے پر ابھر آیا۔ یہ چہرہ میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ یہ قیصر چودھری کا چہرہ تھا۔ وہ بہت زہریلی نظروں سے چچا حفیظ کی طرف دیکھ رہا تھا پھر میری سماعت سے اس کے فقرے کی بازگشت ٹکرائی۔ اس نے تیزابی لہجے میں کہا تھا۔ ''چلیں ٹھیک ہے پھر ملاقات ہوگی۔''

اچانک ولید میری طرف آیا اور مجھے دونوں کندھوں سے جھنجوڑ کر بولا۔ ''دیکھ لیا نا تم نے...... یہی ہونا تھا...... یہی ہونا تھا...... یہ کسی اور نے نہیں کیا۔ یہ اسی کتے کمینے کا کام ہے۔ اس نے برباد کر دیا ہے ہمیں۔ اس نے ہمیں جیتے جی مار دیا۔ میں نہیں چھوڑوں گا اسے۔ اس کا خون پی جاؤں گا۔ میں ان سب کے ٹکڑے کر دوں گا...... ابھی، اسی وقت......'' وہ جیسے غیظ وغضب سے دیوانہ ہو رہا تھا۔

ابھی ثبوت کوئی نہیں تھا لیکن پتا نہیں کیوں میرا دل بھی کہہ رہا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا، سچ ہے۔ اس حویلی کو آگ حادثاتی طور پر نہیں لگی تھی۔ اس کے پیچھے کسی کا ہاتھ تھا۔ اس کے پس منظر میں کسی کی درندگی پھنکار رہی تھی...... اور اس کے ڈانڈے کسی کی ہوس سے اور سازش سے جڑے ہوئے تھے۔

یکا یک ولید دیوانہ وار بیرونی پھاٹک کی طرف دوڑا۔ میں جانتا تھا کہ اس کی جیب میں بھرا ہوا پستول موجود ہے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ پھاٹک پار کر گیا۔ میں سب کچھ بھول بھال کر اس کے پیچھے لپکا۔

''رک جاؤ ولید...... رک جاؤ'' میں پکار رہا تھا۔

ہم دونوں آگے پیچھے دوڑتے حویلی سے نکلے۔ وہ قصبے کی گلیوں میں اندھا دھند بھاگتا ہوا اس چوراہے کی طرف جا رہا تھا جہاں قصبے کا تھانہ واقع تھا۔ میرے اور اس کے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ بہت تیز دوڑنے کے باوجود میں اس کے قریب پہنچ نہیں پا رہا تھا۔ لوگ گلیوں میں بھاگتے ہوئے جائے وقوعہ کی طرف جا رہے تھے۔ ہم مخالف سمت میں بھاگ رہے تھے۔ دور کہیں فائر بریگیڈ کی گاڑیوں کے سائرن بھی سنائی دے رہے تھے۔ وہ نہ جانے اب یہاں کیا کرنے آ رہی تھیں۔ ولید دیوانہ وار بھاگتا تھانے کے عین سامنے پہنچا تو ایک گاڑی

گیٹ سے نکلتی دکھائی دی۔ یہ کھلی چھت والی پولیس جیپ تھی۔ میں نے دور سے دیکھ لیا اس میں انسپکٹر قیصر چودھری موجود تھا پھر وہی ہوا جس کا بدترین اندیشہ میرے ذہن میں موجود تھا۔ پولیس پارٹی کو دیکھتے ہی ولید نے انہیں للکارا۔ اس کی آواز چنگھاڑ سے مشابہ تھی۔ اس چنگھاڑ میں اپنی ماں اور بہن کی اندوہناک موت کا غم کسی برق کی طرح کوند رہا تھا۔ اس نے جیپ کے رخ پر دو فائر کیے۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا صرف ایک ہیڈ کانسٹیبل کے کندھے پر گولی لگی تھی۔ لگتا تھا کہ دوسری طرف پولیس پارٹی بالکل تیار بیٹھی تھی۔ انہوں نے فوراً جوابی فائر کیے۔ دھماکوں سے شعلے نکلے۔ میں نے دیکھا، گولیاں ولید کے سینے میں لگیں۔ اس کا متحرک جسم ایک جھٹکے سے پیچھے کی طرف آیا پھر ایک دیوار سے ٹکرا کر وہ پہلو کے بل کیچڑ میں گر گیا۔ میری آنکھیں جیسے پتھرا کر رہ گئی تھیں۔ میں بھاگتا ہوا ولید تک پہنچا۔ اس کا سینہ خون سے رنگین ہو رہا تھا۔ وہ شاید آخری ہچکیاں لے رہا تھا۔

''ولید......ولید......'' میں دلدوز آواز میں پکار اٹھا۔ میں نے اسے جھنجوڑا۔

یہی وقت تھا جب قیصر چودھری کے ساتھی جیپ سے کود کر مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ کسی نے رائفل کے وزنی دستے سے میرے سر کے عقب میں ایک طوفانی ضرب لگائی تھی۔ یہ ایسی بھیانک ضرب تھی کہ اپنے اندر غیر معمولی برداشت رکھنے کے باوجود میری آنکھوں کے سامنے تارے سے ناچ گئے۔ دوسری ضرب میرے سر پر کنپٹی کی طرف لگی۔ میں اوندھے منہ گرا۔ کوئی نصف درجن اہلکار مجھ پر چمٹ گئے۔ مجھے لگا میرا سینہ اور چہرہ سرد کیچڑ میں لتھڑے گئے ہیں۔ وہ لوگ چلا رہے تھے اور میرے بازو پشت کی طرف موڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ شاید ہتھکڑی پہنانا چاہتے تھے۔ ضبط کی ایک حد ہوتی ہے اور میرے اندر یہ حد ختم ہو رہی تھی۔ میرے اندر سے کسی نے پکار کر کہا۔

''شاہ زیب! ایک بار تمہیں ہتھکڑی لگ گئی تو پھر شاید کبھی کھل نہ سکے گی۔ یہ لوگ تمہیں بھی کسی ہیر رانجھا یا سوہنی مہینوال والی لوکیشن پر لے جا کر پولیس مقابلے کا شکار بنا دیں گے۔''

دل کے اندر سے ہی دوسری آواز آئی۔ ''لیکن تمہارے وعدے شاہ زیب، تمہارے ارادے، تمہارا عہد نامہ کہ تم کبھی اپنے ماضی کی طرف نہیں پلٹو گے۔ کبھی اس خونریزی کی طرف نہیں جاؤ گے جس نے تمہارے شب و روز کو لہو رنگ کیا تھا۔''

پہلی آواز نے دوبارہ کہا۔ ''لیکن وہ سب کچھ تو زندگی سے مشروط تھا اور یہاں تو شاید زندگی ہی ختم ہونے والی ہے۔''

اور پھر یہی وقت تھا جب میری آنکھوں کے سامنے فائزہ کی تصویر ابھری۔ اس نے

مایوں کا زرد جوڑا پہنا تھا۔اس کے ہاتھوں پر شگنوں کی مہندی تھی۔ وہ اپنی معصوم آنکھوں میں حسین سپنے سجائے چچا کی حویلی میں کسی خوش رنگ تتلی کی طرح چکرا رہی تھی اور ابھی تھوڑی دیر پہلے اس تتلی کے پر ہی نہیں اس کا کومل جسم بھی جل کر راکھ ہو گیا تھا...... طیش کی ایک فلک بوس لہر میرے اندر سے اٹھی اور ضبط کے بندھن میں ان گنت دراڑیں پڑ گئیں۔ میں نے سرد کیچڑ میں اوندھے پڑے پڑے گرانڈیل قیصر چودھری کی طرف دیکھا۔ وہ خود پر ٹوٹنے والی آفت سے بے خبر تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا، آج کی رات، اس تاریک گلی میں اس کا سامنا کس شخص سے ہونے والا ہے۔ اسے بالکل معلوم نہیں تھا۔

○......❖......○

مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر ایک بڑی توند والا سب انسپکٹر کھڑا تھا۔ اس کی کمر کے ساتھ ہولسٹر لگا تھا اور ہولسٹر میں سے پستول کا دستہ صاف نظر آ رہا تھا۔ میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی۔ یہ نہایت برق رفتار حرکت تھی۔ میں نے ہتھیلیوں پر زور دے کر اپنا سینہ اور پیٹ زمین پر سے اٹھایا پھر پاؤں کے زور سے خود کو کھڑا کیا اور تیزی سے آگے بڑھا۔ پلک جھپکتے میں توند والے سب انسپکٹر کا پستول میرے ہاتھ میں تھا۔ اس حرکت اور ''مومینٹم'' کو جاری رکھتے ہوئے میں نے آگے کی طرف جست لگائی اور گرانڈیل قیصر چودھری پر جا پڑا۔ اس کے منہ پر لگنے والی میرے سر کی ٹکر اتنی شدید تھی کہ وہ اڑتا ہوا سا پیچھے کی طرف گیا۔ اس کی پشت پولیس جیپ کی آہنی سائیڈ سے ٹکرائی۔ پشت پر لگنے والی اس ضرب نے اسے آگے کی طرف دھکیلا۔ میں نے اس کی گردن اپنے بازو کی لپیٹ میں لے لی اور اس کے عقب میں آ گیا۔ یہ سارا عمل چند سیکنڈ میں مکمل ہو گیا تھا۔

جب تک پولیس اہلکاروں کا اسلحہ میری طرف سیدھا ہوتا، میں قیصر چودھری کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے چکا تھا۔ میں نے پستول کی نال اس کے سر سے لگائی اور دہاڑ کر کہا۔
''خبردار! اس کی جان چاہتے ہو تو اسلحہ نیچے کر لو...... میں کہتا ہوں نیچے کر لو۔''

یہ بڑے فیصلہ کن لمحات تھے۔ جو کچھ ہونا تھا انہی چند سیکنڈ کے اندر ہونا تھا۔ مجھے عقب سے اطمینان تھا کیونکہ عقب میں پولیس کی خالی جیپ تھی۔ میں نے لحیم شحیم قیصر چودھری کو ڈھال بنا لیا تھا۔ وہ قد میں مجھ سے تین چار انچ زیادہ ہی ہو گا یقیناً حرام کھا کھا کر اس کے جسم میں بہت طاقت بھی آ چکی تھی لیکن اس کی کنپٹی پر پستول کا بے پناہ دباؤ اسے بتا رہا کہ وہ غلط حرکت کرے گا تو کچھ بھی ہو جائے گا۔

سب انسپکٹر قادر نے بھیانک لہجے میں کہا۔ ''چھوڑ دو سر کو..... مارے جاؤ گے۔'' اس

کے ہاتھ میں بھی سرکاری پستول تھا اور رخ ہماری طرف ہی تھا۔ دو رائفلیں اور ایک پستول مزید تھے جو میری طرف اٹھے ہوئے تھے۔

قیصر چودھری نے زور مارا۔ مجھے لگا کہ کام بگڑنے لگا ہے۔ میں نے پستول اس کی کنپٹی سے ہٹا کر گردن پر رکھا اور فائر کر دیا۔ دھماکے سے شعلہ نکلا اور اس کے ساتھ ہی قیصر چودھری چلایا۔ اس کی گردن سے خون کی پچکاری نکل کر اس کے کندھے پر گری۔ میں نے پستول پھر اس کی کنپٹی پر رکھ دیا اور گرج کر کہا۔ ''دوسری گولی سے اس کا بھیجا اڑا دوں گا۔ کوئی حرکت نہ کرے۔''

فائر کی آواز نے جیسے سب کو مسمرائز کر دیا تھا۔ میں جانتا تھا، میری چلائی ہوئی گولی نے قیصر کو مارا نہیں صرف زخمی کیا ہے اور وہ بھی معمولی۔

قیصر چودھری کے لمبے چوڑے جسم میں پیدا ہونے والا تلاطم ایک دم ہی سکوت میں بدل گیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں صرف دھمکا نہیں رہا۔ مارنے کی ہمت بھی رکھتا ہوں۔

میں نے اس کے کان میں سفاک سرگوشی کی۔ ''ان سے کہو، اسلحہ نیچے کریں اور دس قدم پیچھے ہٹ جائیں...... کہو ان سے۔''

قیصر چودھری نے چند لمحے سوچا پھر ہاتھ کے اشارے سے اہلکاروں کو میری ہدایت پر عمل کرنے کو کہا۔

تھوڑے سے تذبذب کے ساتھ انہوں نے اسلحہ نیچے کیا اور چند قدم پیچھے ہٹ گئے۔ میں قیصر کو گھسیٹتا ہوا جیپ میں آ بیٹھا۔ قیصر ڈرائیونگ سیٹ پر تھا اور میں اس کے پہلو میں۔ میں نے پستول کی نال مسلسل اس کے سر سے لگا رکھی تھی اور انگلی کو لبلبی پر تیار رکھا ہوا تھا۔ جیپ کے اگنیشن میں چابی موجود تھی۔

''چلو چودھری گاڑی اسٹارٹ کرو۔'' میں نے کہا۔

''تم اچھا نہیں کر رہے ہو۔ اب بھی وقت ہے باز آ جاؤ۔'' وہ بولا۔

''میں بھی یہی کہہ رہا ہوں۔ اب بھی وقت ہے...... جان بچانی ہے تو گاڑی اسٹارٹ کرو اور یہاں سے نکلو۔'' میری آنکھوں کے سامنے ولید کا بے حرکت جسم کیچڑ میں اوندھا پڑا تھا اور اس منظر نے میرے اندر درندگی بھر دی تھی۔

قیصر نے گاڑی اسٹارٹ کی اور آگے بڑھا دی۔ اہلکار ہکا بکا کھڑے تھے۔ اردگرد کوئی ایسی گاڑی نہیں تھی جس پر وہ تعاقب کر سکتے پھر ان میں سے کسی اہلکار نے دو تین ہوائی فائر کیے۔ اسے ایک اضطراری حرکت کے سوا اور کیا کہا جا سکتا تھا۔

گاڑی ٹرن لے کر کشادہ سڑک پر پہنچی اور تاریکی کا سینہ چیرتی آگے بڑھنے لگی۔ قیصر چودھری یقیناً بہت سخت اعصاب کا مالک تھا مگر اس وقت اس کے ہاتھ لرز رہے تھے اور گاڑی جیسے لہرا رہی تھی۔ اسے سب سے زیادہ فکر یقیناً اپنی گردن کی رہی ہو گی جس میں سے مسلسل خون ٹپک ٹپک کر اس کے کالر پر گر رہا تھا۔

''شیر بنو چودھری، لوگوں پر دھڑلے سے گولیاں چلاتے ہو۔ اب اگر ایک خراش آ گئی ہے تو مر کیوں رہے ہو۔ صرف ایک رگ کٹی ہے تمہاری......اور کچھ نہیں ہوا۔'' میں نے کہا۔

قیصر چودھری نے اپنی زخمی گردن کو چھوا۔ اسے جیسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ وہ غصے اور بے بسی کی انتہا کو چھو رہا تھا۔ میرے سر اور کنپٹی پر بھی شدید چوٹیں آئی تھیں۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو لمبا لیٹا ہوتا لیکن میرا تو کام ہی چوٹوں کو برداشت کرنا تھا۔

''کہاں جانا چاہ رہے ہو؟'' قیصر نے پھٹی پھٹی آواز میں پوچھا۔

''میں کہیں جانا نہیں چاہ رہا لیکن ہو سکتا ہے کہ تمہیں وہیں پہنچانا پڑ جائے، جہاں تم نے ابھی ولید کو پہنچایا ہے اور کچھ دیر پہلے اس کی ماں اور بہن کو پہنچایا ہے۔'' میرے لہجے میں شعلے پھنکار رہے تھے۔

''پتا نہیں تم کیا بکواس کر رہے ہو۔ میں نے کسی کو کچھ نہیں کہا۔ اس لڑکے پر بھی اس لیے گولی چلائی گئی کہ اس نے پہل کی تھی۔''

''لیکن پہل سے بھی بہت پہلے ایک پہل ہوتی ہے اور وہ تم نے کی ہے۔ قیصر چودھری، تمہارے گماشتوں نے آگ لگائی ہے گھر کو اور بیکری کو اور اب تم کو بھی اس آگ میں جلنا ہو گا۔'' میرے لہجے نے اسے سرتاپا دہلا دیا۔ اس نے سر گھما کر میری طرف دیکھا۔ گاڑی خم دار سڑک سے گزرتے ہوئے کسی نہر کے پل کی طرف بڑھ رہی تھی۔

''سامنے دیکھو چودھری......لگتا ہے کہ مرنے کی جلدی ہے تمہیں۔'' میں نے کہا۔

قیصر چودھری نے جلدی سے گاڑی کو سنبھالا ورنہ وہ سڑک سے اتر جاتی۔ چند سیکنڈ بعد وہ پھر بولا۔ ''دیکھو......تم اپنے دماغ کو ٹھکانے پر لاؤ۔ ہم کہیں رک کر بات کر لیتے ہیں...... اور اگر......''

''سامنے دیکھو۔'' میں پھر چلایا۔ گاڑی ایک پل پر سے گزر رہی تھی اور قیصر چودھری نے اسے سڑک سے تقریباً اتار ہی دیا تھا۔

میرے چلانے پر وہ پھر چونکا۔ اس نے اسٹیئرنگ کو دائیں طرف گھمایا۔ گاڑی جنگلے سے ٹکرانے سے بچ گئی لیکن بدحواسی میں اس نے اسٹیئرنگ زیادہ گھما دیا تھا۔ گاڑی سڑک کے

تقریباً وسط میں آ گئی۔ سامنے ڈھلوان سے ایک تیز رفتار ٹرک نمودار ہوا۔ اس کی ہیڈ لائٹس سیدھی ہماری آنکھوں پر پڑیں۔ میرے دل نے گواہی دی کہ اب یہ تصادم ہو جائے گا۔ آخری کوشش کے طور میں نے خود اسٹیئرنگ گھمانے کی کوشش کی مگر اب دیر ہو چکی تھی۔ گاڑی اتنی زیادہ گھوم گئی تھی کہ وہ دوسری طرف کے جنگلے سے جا ٹکرائی۔ میں نے ونڈ اسکرین کے ٹوٹنے کی آواز سنی، اس کے ساتھ ہی ہوا میں چنگاریاں سی اڑیں۔ ان چنگاریوں کی وجہ گاڑی اور جنگلے کے لوہے کا تصادم تھا۔ مجھے لگا کہ میں ٹوٹی ہوئی اسکرین کے اندر سے اڑتا ہوا گزرا ہوں۔ قریباً دو ڈھائی من وزنی جیپ میرے سر کے اوپر سے ہوتی ہوئی گئی اور ایک زوردار چھپاکے سے نہر کے تاریک پانی میں گری۔

میں پل کے ٹوٹے ہوئے جنگلے کے ساتھ لٹکا رہ گیا تھا پھر مجھے اس ٹرک کی عقبی بتیاں نظر آئیں جس کے ساتھ ہمارا تصادم ہوتے ہوتے رہا تھا۔ ٹرک برق رفتاری کے ساتھ موقع سے فرار ہو رہا تھا۔ (اس حادثے کی ایک وجہ یقیناً اس کی برق رفتاری بھی تھی) مجھے لگا جیسے حادثے کے موقعے پر رکنے یا مدد کرنے کا رواج اپنے ملک عزیز میں موجود ہی نہیں۔ حواس بحال ہوتے ہی پہلا احساس مجھے یہی ہوا کہ میں دونوں ہاتھوں سے جنگلے سے جھول رہا ہوں۔ میرے گھٹنوں اور کہنیوں پر شدید چوٹیں آئی تھیں لیکن مجموعی طور پر میں ٹھیک تھا۔ پستول میرے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔

میں نے گہرائی میں دیکھا۔ قریباً تیس فٹ نیچے پانی میں جیپ پہلو کے بل گری تھی۔ اس کی ایک ہیڈ لائٹ ابھی تک روشن تھی۔ اس روشنی میں مجھے کوئی شخص پانی میں ہاتھ پاؤں مارتا نظر آیا یقیناً یہ انسپکٹر قیصر ہی تھا۔ میری طرح وہ بھی موت کو جل دینے میں کامیاب رہا تھا۔ میں زور لگا کر جنگلے پر چڑھا اور سڑک پر آ گیا۔ دیہاتی طرز کی ایک کھٹارا بس کچھ فاصلے پر جا کر رک گئی تھی۔ غالباً اب بس کی سواریوں کو جائے حادثے کی طرف آنا تھا۔ اس بات کا شدید خطرہ بھی موجود تھا کہ تھانے کے قریب رہ جانے والے اہلکاروں نے بھی کوئی سواری ڈھونڈ لی ہو اور اب تیزی سے ہماری طرف آ رہے ہوں۔ میں نے اطراف میں دیکھا۔ پل کے آخری سرے پر اونچے کھیت دکھائی دیئے۔ میں لنگڑاتا ہوا بھاگا اور ان کھیتوں میں گھس گیا۔ یہ مکئی کے کھیت تھے۔ پودوں کی اونچائی چھ سات فٹ سے کم نہیں رہی ہو گی۔ اس اونچائی نے مجھے ڈھانپ سا لیا۔

○……❖……○

میں گیلے اور نیم خشک کھیتوں میں تیزی سے بھاگتا ہوا کافی دور نکل آیا۔ میرے سارے

جسم پر چھوٹی بڑی خراشیں تھی۔ خاص طور سے سر اور کنپٹی پر لگنے والی چوٹیں تکلیف دے رہی تھیں۔ میں تیزی سے سوچ رہا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ اب رات کا تیسرا پہر تھا اور گھڑی کی سوئیاں دو کے ہندسے پر گلے مل رہی تھیں۔

ایک جگہ مجھے ٹیوب ویل دکھائی دیا۔ یہاں دور کچے پکے کمرے بھی بنے ہوئے تھے۔ ایک طرف ٹریکٹر کے بغیر ٹرالی کھڑی تھی۔ میں پاس ہی درختوں کے ایک جھنڈ میں پہنچا۔ میرا سیل فون آن تھا۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ اپنے کزن ایڈووکیٹ عبداللہ کا نمبر پریس کیا۔ چند سیکنڈ بعد عبداللہ کی اشک بار آواز ابھری۔

''ہیلو شاہ زیب! کہاں ہو تم؟''

''میں زیادہ دور نہیں ہوں اور تم کہاں ہو؟'' میں نے پوچھا۔

وہ سسک کر بولا۔ ''یہاں سب کچھ ختم ہو گیا شاہ زیب۔ چچی آمنہ، فائزہ...... دونوں ختم ہو گئیں۔ مکان جل کر کوئلہ ہو گیا...... یہ کیا ہو گیا ہے ہمارے ساتھ؟''

میں نے اس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ ''عبداللہ! تھانے کے قریب ولید شدید زخمی ہوا تھا اس کا کچھ پتا چلا؟''

''نہیں...... اس کا بھی کچھ پتا نہیں بس اتنا معلوم ہوا ہے کہ اسے اسپتال لے گئے ہیں۔ پتا نہیں لاش لے گئے ہیں یا ابھی زندہ تھا...... لیکن تم کہاں ہو شاہ زیب؟''

''مجھے ٹھیک سے خود بھی پتا نہیں۔ بڑی نہر کا پل ہے جس کے پاس سے ریلوے لائن بھی گزرتی ہے۔ یہاں انسپکٹر قیصر کی گاڑی کے ساتھ حادثہ ہوا ہے۔ گاڑی نہر میں گر گئی ہے...... میں تمہیں تفصیل بعد میں بتاؤں گا، فی الحال تم کسی طرح مجھ سے مل لو۔''

''کس طرح ملوں...... مجھے صحیح ٹھکانا تو پتا ہو۔''

میں نے تفصیل کے ساتھ عبداللہ کو بتایا کہ میں کہاں اور کس جگہ موجود ہوں۔ ایک دو نشانیوں کے ساتھ وہ میری لوکیشن کو سمجھ گیا۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اچھا شاہ زیب، میں پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔''

پس منظر میں رونے پیٹنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ بہت سے لوگ بلند آوازوں میں باتیں کر رہے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ عبداللہ آتش زدگی والی جگہ پر ہی موجود ہے۔

میری آنکھوں کے سامنے ایک بار پھر وہ دلدوز مناظر گھومنے لگے۔ فائزہ کا جلتی ہوئی بالکونی میں پہنچنا اور پھر شعلوں کی نذر ہونا۔ وہ خوف ناک لمحے جیسے دل و دماغ پر نقش ہو کر رہ گئے تھے۔ یقیناً چچی آمنہ کی من موہنی صورت بھی اسی طرح شعلوں کا رزق بنی تھی۔

فون بند کر کے میں بڑی احتیاط سے چلتا ہوا ٹیوب ویل کی طرف آیا۔ ٹیوب ویل بند تھا، ہلکے سے کہرے نے اردگرد کی ہر شے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ ٹیوب ویل کے ساتھ واقع دونوں کمروں میں تاریکی تھی اور دروازے بند تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ایک کمرے میں ایک دو افراد سو رہے ہیں لیکن دوسرا خالی ہے۔ اس کمرے کے باہر زنجیر والی کنڈی لگی ہوئی تھی۔ میں احتیاط سے اندر داخل ہوا۔ یہاں دو خالی چارپائیاں تھیں اور لکڑی کی ایک الماری میں کچھ دیگر سامان پڑا تھا۔ یہ کسی محنت کش کسان کے روزمرہ استعمال کی اشیا تھیں۔ مجھے میری مطلوبہ چیز فوراً ہی مل گئی۔ یہ سفید رنگ کی ایک شلوار قمیص تھی۔ اس کے علاوہ ایک بوسیدہ سا کوٹ بھی نظر آ گیا۔ میرے کپڑے کیچڑ میں بری طرح لتھڑ چکے تھے اور ان پر جگہ جگہ خون بھی لگا ہوا تھا۔ میں نے اس لباس سے فوری نجات حاصل کی۔ گھڑے میں سے پانی لے کر منہ ہاتھ دھویا اور دوبارہ درختوں کے اس جھنڈ میں پہنچ گیا جہاں عبداللہ سے ملاقات متوقع تھی۔

ابھی میں جھنڈ میں پہنچا ہی تھا کہ موٹر سائیکل کی مدھم آواز سنائی دی پھر اس کی ہیڈ لائٹ نظر آئی۔ عبداللہ کی ون ٹو فائیو سی سی موٹر سائیکل کی بھاری آواز میں پہچانتا تھا۔ میں نے سیل فون کی ٹارچ کے ذریعے اسے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔

جلد ہی ہم اس جھنڈ کے اندر آمنے سامنے موجود تھے۔ ہم دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ عبداللہ مجھ سے لپٹ گیا۔ کتنی ہی دیر ہم اسی طرح سوگوار انداز میں کھڑے رہے۔ میں نے عبداللہ سے پھر پوچھا کہ ولید کے بارے میں کچھ پتا چلا۔ عبداللہ نے انکار میں سر ہلایا۔

میں نے کہا۔ ”عبداللہ...... انسپکٹر قیصر نے ولید کو جان بوجھ کر شوٹ کروایا ہے۔ وہ لوگ اسے زخمی کر کے آسانی سے پکڑ سکتے تھے۔“

عبداللہ نے درد بھرے لہجے میں کہا۔ ”وہ جو کچھ کر رہے ہیں جان بوجھ کر ہی کر رہے ہیں۔ بیکری کے پرانے ملازم عبدالرشید نے کہا ہے کہ کل شام دو مشکوک بندے چار دیواری کے آس پاس منڈلاتے رہے ہیں۔ وہ سادہ لباس میں تھے لیکن لگتا ہے کہ کسی تھانے کے اہلکار تھے۔ اب چار دیواری سے باہر ایسے نشان بھی ملے ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ کوئی اوپر سے کود کر احاطے میں آیا ہے۔ یہ سراسر سازش کے ساتھ ہوا ہے، حادثہ نہیں ہے یہ......“

”اب کیا کرنا چاہیے ہمیں؟“ میں نے لرزتی آواز میں پوچھا۔

”میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔ مجھے ابھی میرے ایک دوست نے لاہور سے فون

کر کے بتایا ہے کہ ٹی وی پر بہت بری خبر چل رہی ہے۔“

”کیا مطلب؟“

عبداللہ ذرا دیر ہچکچاتا رہا جیسے سوچ رہا ہو کہ اس کے بتانے سے میری پریشانی میں اضافہ نہ ہو جائے۔ آخر حوصلہ کر کے بولا۔ ”مجھے تو لگتا ہے کہ پورے ضلع کی پولیس تمہیں ڈھونڈنے کے لیے حرکت میں آ گئی ہے۔“

”کیوں، میں نے کیا کیا ہے؟“

”ان کے مطابق تو بہت برا کیا ہے بلکہ بہت ہی زیادہ برا۔“ عبداللہ کی آواز دکھ کی شدت سے ٹوٹ رہی تھی۔

”کچھ پتا بھی تو چلے؟“

عبداللہ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور کہا۔ ”شاہ زیب! یہ لوگ ولید کی طرح تمہیں بھی شوٹ کر دیں گے۔ انہوں نے پورا پلان بنالیا ہے۔ تم جان بچانا چاہتے ہو تو کسی طرح چند دن کے لیے کہیں اور روپوش ہو جاؤ یا پھر...... نکل سکتے ہو تو ڈنمارک واپس چلے جاؤ۔“

”تمہیں پتا ہے عبداللہ میں کاغذات کے بغیر واپس نہیں جا سکتا اور کاغذ چچا کے پاس تھے جل گئے ہوں گے دوسری چیزوں کے ساتھ ہی اور یہاں روپوش کیسے ہو جاؤں؟ میں تو یہاں جانتا نہیں ہوں کسی کو۔ راستوں تک سے واقف نہیں ہوں...... لیکن تم ادھوری بات کیوں کر رہے ہو؟ مجھے بتاؤ کہ ٹی وی پر کیا بری خبریں چل رہی ہیں؟“

عبداللہ نے چند لمحے توقف کرنے کے بعد کہا۔ ”پرسوں لاہور کے نواح میں دہشت گردی کا واقعہ ہوا تھا۔ دو نقاب پوشوں نے رائفلوں سے اندھا دھند فائرنگ کی تھی اور تین چار ہینڈ گرینیڈ بھی پھینکے تھے...... پتا ہے نا تمہیں؟“

”ہاں...... سات افراد ہلاک ہو گئے تھے، کچھ زخمی ہوئے تھے......“

”وہ لوگ...... یہ دہشت گردی تمہارے کھاتے میں ڈال رہے ہیں۔“

میں سکتہ زدہ کھڑا رہ گیا۔ اپنی سماعت پر بھروسا نہیں ہوا۔ ”یہ کیا کہہ رہے ہو عبداللہ؟ میں نے دہشت گردی کی ہے؟“

وہ دکھ سے بولا۔ ”یہ لوگ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ تم تو پھر ایک بالغ شخص ہو اور تم نے تھوڑی بہت مزاحمت کی بھی ہے۔ یہ لوگ تو آٹھ دس سال کے بچوں پر ڈکیتی اور آبروریزی کے پرچے کاٹ دیتے ہیں۔ میرا دوست باذان بتا رہا تھا کہ ٹی وی چینلز پر بار بار ایک فوٹیج

دکھائی جا رہی ہے جس میں تمہارے ہی قد کاٹھ کا ایک شخص پمپ ایکشن گن سے فائرنگ کر رہا ہے۔ پمپ ایکشن گن کو سرخ دائرے میں دکھایا جا رہا ہے اور دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ یہی خاص پمپ ایکشن تمہارے پاس سے ملی ہے۔''

''مجھ سے ملی ہے؟'' میں ہکا بکا رہ گیا۔

''اپنے ناپسندیدہ لوگوں پر اسلحہ اور منشیات وغیرہ کے کیس ڈال دینا قیصر جیسے تھانے دار کا پرانا وتیرہ ہے۔ تم پر یہ پمپ ایکشن گن ڈالی گئی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی بتایا جا رہا ہے کہ جب تم قیصر کو زبردستی اپنے ساتھ لے کر جا رہے تھے تو تمہاری جیکٹ سے ایک ہینڈ گرینیڈ بھی گرا ہے اور یہ بالکل اسی ساخت کا ہے جو دہشت گردی میں استعمال ہوا ہے۔''

میں دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر رہ گیا۔ اسی دوران میں عبداللہ کے سیل فون کی بیل بج اٹھی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ دوسری طرف اس کا وہی صحافی دوست باذان ہے۔ دو تین منٹ عبداللہ اس کی بات سنتا رہا اور ہوں ہاں کرتا رہا پھر فون بند کر دیا۔ پھر سرد آہ بھر کر بولا۔ ''شاہ زیب! تم سخت خطرے میں ہو۔ وہ لوگ تمہیں ہر جگہ تلاش کر رہے ہیں۔''

میں صاف محسوس کر رہا تھا کہ ایک نڈر وکیل ہونے کے باوجود عبداللہ موجودہ صورتِ حال سے خوف زدہ ہو گیا ہے۔ وہ مجھے مشورے تو دے رہا تھا لیکن فی الوقت مجھے پناہ دینے یا پناہ کے سلسلے میں میری مدد کرنے کا رسک نہیں لے رہا تھا اور وہ اپنی جگہ پر شاید ٹھیک ہی تھا۔ اس کی بیوی تھی، دو چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ ایک بڑا وکیل ہونے کے باوجود وہ قیصر چودھری، شکیل داراب اور عطاءاللہ داراب جیسے لوگوں سے لڑنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔

میں نے کہا۔ ''اچھا عبداللہ! مجھے مشورہ دو کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

اس نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا۔ ''یہ ایس پی تبریز، محکمے کے اچھے پولیس افسروں میں سے ایک ہے۔ تم اس سے مل بھی چکے ہو۔ میرا دل کہتا ہے کہ تم کسی طرح اس سے مل لو تو وہ کچھ نہ کچھ ضرور کرے گا۔''

''اس سے کہاں ملاقات ہو سکتی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میری معلومات کے مطابق وہ دو ہفتے کی چھٹی پر ہے۔ لاہور میں بیدیاں روڈ پر اس کا چھوٹا سا فارم ہاؤس ہے۔ نوے فیصد امید ہے کہ وہ فارم ہاؤس پر ہی ہو گا اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ اگر وہ تمہاری مدد کرنے پر تل گیا تو پھر یہ لوگ اتنی آسانی سے تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔''

عبداللہ نے جلدی جلدی سے مجھے تفصیلات فراہم کیں کہ میں ایس پی تبریز سے کہاں اور کس طرح ملاقات کرسکتا ہوں۔ میں نے اپنی جیبیں ٹٹول کر عبداللہ کو بتایا کہ اس وقت تو میرے پاس خرچے کے لیے پیسے بھی نہیں ہیں۔ اتفاقاً عبداللہ کے پاس دوڈھائی ہزار روپے تھے۔ وہ اس نے مجھے تھما دیئے۔ تب پہلی بار اس نے غور سے میرے لباس کو دیکھا۔

''یہ تمہارے اپنے کپڑے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں۔'' میں نے جواب دیا اور اسے بتایا کہ کس طرح ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے سامنے والے ڈیرے پر گھس کر یہ لباس حاصل کیا ہے اور اپنے خون آلود کپڑے جھاڑیوں میں چھپائے ہیں۔

باتیں کرتے ہوئے ہماری آواز بار بار دکھ کی شدت سے ٹوٹ جاتی تھی۔ یہ اس خوف ناک واقعے کا دکھ تھا جس نے دوڈھائی گھنٹے پہلے ہمیں کچھ انمٹ زخم لگائے تھے۔ میں سوچتا تھا تو کلیجا منہ کو آنے لگتا تھا۔

عبداللہ نے سوگوار لہجے میں کہا۔ ''میں زیادہ دیر موقع سے غائب رہوں گا تو وہ لوگ مجھ پر شبہ کرنے لگیں گے۔ ویسے بھی میرا وہاں موجود ہونا ضروری ہے۔ رشتے دار اکٹھے ہو رہے ہیں۔ چچا حفیظ کی حالت بھی خراب ہے۔ مجھے تو لگتا ہے انہیں بھی اسپتال لے جانا پڑے گا۔ انہیں میں نے ابھی تک ولید کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔''

دو تین منٹ کی مزید گفتگو کے بعد عبداللہ مجھ سے رخصت ہوگیا۔ میں کھیتوں اور جھاڑیوں میں چھپتا چھپاتا پکی سڑک تک پہنچا۔ عبداللہ نے ابھی بتایا تھا کہ ایک دو بسیں صبح سویرے نکلتی ہیں اور دودھ فروش و سبزی فروش حضرات ان سے فائدہ اٹھا کر لاہور پہنچتے ہیں۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ پہلی بس اس سڑک سے گزرنے ہی والی ہوگی۔

عبداللہ کی اطلاع بالکل درست تھی۔ ابھی مجھے پکی سڑک پر پہنچے چار پانچ منٹ ہی ہوئے تھے کہ کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس نظر آئیں۔ میں نے دور ہی سے پہچان لیا۔ یہ ٹریکٹر ٹرالی تو نہیں ہوسکتی تھی۔ یہ ایک پرانی دیہاتی بس تھی۔ اس کی چھت پر بھی سواریاں بیٹھی تھیں۔ میرے اشارے پر بس رک گئی۔ میں نے چادر کو اچھی طرح اپنے جسم کے گرد لپیٹا اور سیڑھی چڑھ کر بس کی چھت پر پہنچ گیا۔ یہاں آٹھ دس افراد چادریں لپیٹے اور کمبل اوڑھے بیٹھے تھے۔ دودھ کے برتن، چارے کے گٹھے اور سبزی وغیرہ کی گانٹھیں بھی دکھائی دے رہی تھیں حتیٰ کہ ایک موٹر بائیک بھی کسی نہ کسی طرح اوپر چڑھا لی گئی تھی۔ ڈنمارک کی لگژری بسوں اور یہاں کی بسوں کے سفر میں بہت فرق تھا لیکن جو کچھ بھی تھا ایک سادہ بے تکلفی لیے ہوئے تھا۔ کسی

نے مجھ پر خصوصی توجہ نہیں دی۔ میں ایک گوشے میں سمٹ کر بیٹھ گیا۔ ہوا کی کاٹ سے بچنے کے لیے میں نے اپنا منہ اور سر اچھی طرح چادر میں لپیٹ لیا۔

O......❖......O

صبح سورج نکلنے سے پہلے ہی میں لاہور شہر کی حدود میں داخل ہو چکا تھا۔ شہر کے گلی کوچے جاگنا شروع ہو گئے تھے۔ سڑکوں پر خاصی ٹریفک نظر آ رہی تھی۔ مجھے صرف ایک دو جگہ کے علاوہ کہیں کوئی پولیس ناکا نظر نہ آیا۔ وہاں سے بھی ہم بخیریت ہی گزر گئے۔

میں مزنگ چونگی کے قریب ایک بس اسٹاپ پر اترا۔ اب مجھے بیدیاں روڈ جانا تھا۔ عبداللہ کی ہدایت کے مطابق میں فیروز پور روڈ کی طرف چل دیا۔ بیس تیس قدم آگے گیا تھا کہ ایک پولیس موبائل سڑک کے کنارے کھڑی نظر آئی۔ پولیس والے بڑی چوکس حالت میں موٹر سائیکل سواروں کی تلاشی لے رہے تھے۔ میں ان پولیس والوں سے کنی کترا کر ایک چائے خانے میں گھس گیا۔ آٹھ دس افراد یہاں موجود تھے۔ کچھ حلوہ پوری کا ناشتا کر رہے تھے، کچھ ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ میں نے ایک کپ چائے منگوائی، کھانے کی خواہش کہاں تھی۔ گلے میں جیسے غم کا ایک بڑا سا گولا اٹکا ہوا تھا فوراً ہی چائے آ گئی اس پر ملائی تیر رہی تھی۔ باہر کے ملکوں میں اس طرح کی چائے کا تصور نہیں ہوتا۔ میں چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے رہا تھا کہ ایک دم چونک گیا۔ ٹی وی پر ایک نیوز چل رہی تھی اور اس نیوز کا تعلق براہِ راست مجھ سے تھا۔ میں عالم حیرت میں ٹی وی اسکرین کو گھورنے لگا۔

نیوز کاسٹر کہہ رہی تھی۔ مطلوبہ شخص کی تلاش میں پولیس کی ٹیمیں مختلف جگہوں پر چھاپے مار رہی ہیں۔ خیال ظاہر کیا جا رہا ہے کہ شاہ زیب نامی یہ شخص بیرون ملک سے دہشت گردی کی خاص تربیت لے کر یہاں آیا ہے اور اگر یہ جلد ہی گرفتار نہ ہوا تو خدانخواستہ تخریب کاری کا کوئی اور بڑا واقعہ پیش آ سکتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی ایک بار پھر وہ فوٹیج دکھائی جانے لگی جس کا ذکر کچھ دیر پہلے گاؤں میں عبداللہ نے کیا تھا۔ یہ سی سی ٹی وی کیمرے کی فوٹیج تھی۔ ایک دراز قد شخص جس نے اپنا منہ نقاب میں چھپا رکھا تھا، پمپ ایکشن گن سے لگاتار فائر کر رہا تھا اور الٹے قدموں پیچھے ہٹ رہا تھا۔ اس کے قدموں میں ایک نوعمر لڑکے کی لاش پڑی صاف نظر آ رہی تھی۔ پمپ ایکشن کو سرخ دائرے میں دکھایا جا رہا تھا۔

مختصر فوٹیج کو دو تین بار چلایا گیا پھر مجھے اسکرین پر قیصر چودھری کی منحوس شکل نظر آئی، اس کے ماتھے اور گردن پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے میز پر ایک ویسی ہی پمپ

ایکشن پڑی تھی جو فوٹیج میں دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے علاوہ ایک ہینڈ گرینیڈ تھا۔ قیصر چودھری میڈیا رپورٹرز سے باتیں کر رہا تھا لیکن اس کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس کے بجائے نیوز کاسٹر کی آواز اوور لیپ ہو رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

''پولیس ذرائع کے مطابق مبینہ دہشت گرد نے پولیس انسپکٹر قیصر چودھری کو گن پوائنٹ پر اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کی لیکن انسپکٹر نے بڑی دلیری سے یہ کوشش ناکام بنا دی اور گن پوائنٹ پر ہونے کے باوجود گاڑی کو پل کے جنگلے سے ٹکرا دیا۔ گاڑی نہر میں گر گئی اور ملزم زخمی حالت میں فرار ہونے میں کامیاب ہوا۔ انسپکٹر قیصر معجزانہ طور پر محفوظ رہا۔''

اس کے بعد اس سارے واقعے کی مزید تفصیل بھی بتائی گئی۔ میرے ساتھ ساتھ ولید کو بھی خطرناک دہشت گرد قرار دیا جا رہا تھا۔ اتنی بے باکی سے اس قدر بے بنیاد جھوٹ بولے جا رہے تھے کہ عقل دنگ رہ گئی اور دماغ چیخ گیا۔ اس سارے واقعے میں فقط ایک خبر ایسی تھی جسے کسی حد تک مثبت قرار دیا جا سکتا تھا اور وہ یہ کہ اسپتال میں ولید تاحال زندہ تھا...... تاہم اس کی حالت شدید خطرے میں بتائی جا رہی تھی۔

کچھ دیر بعد میں نے دروازے سے باہر جھانک کر دیکھا۔ پولیس والے اپنی گاڑی سمیت موقعے سے ہٹ چکے تھے۔ میں باہر آیا اور ایک بار پھر فیروز پور روڈ پر پیدل چل پڑا۔ جلد ہی مجھے سواری مل گئی۔ یہ ایک ویگن تھی۔ میں بیدیاں روڈ کی طرف روانہ ہو گیا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ ایس پی تبریز سے میری ملاقات کس طرح ہو پائے گی۔ بس میں چلا جا رہا تھا۔

فارم ہاؤس کا ایڈریس مجھے عبداللہ نے اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ راستے میں مجھے ایک دو جگہ ٹریفک کا شدید ازدحام نظر آیا۔ میں نے اسکول کے بچوں کو بسوں سے لٹکے اور رکشاؤں پر لدے ہوئے دیکھا۔ یہ مناظر اور اس جیسے دوسرے مناظر میرے لیے آج کل بہت حیرت کا باعث بن رہے تھے۔ بہر حال یہ موقع ایسا تھا کہ میں زیادہ حیران بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ میرے ذہن میں ایک آندھی سی چل رہی تھی۔ ویگن سے اترنے کے بعد میں پیدل چل پڑا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ تبریز صاحب سے میری ملاقات اتنی آسانی سے ہو جائے گی۔ میں فارم ہاؤس سے ابھی سو ڈیڑھ سو میٹر دور ہی تھا کہ میں نے درختوں میں ایک شخص کو ٹریک سوٹ میں بھاگتے ہوئے دیکھا۔ ایک بڑے سائز کا کتا اس کے پیچھے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ سورج کی روپہلی کرنیں درختوں سے چھن چھن کر آ رہی تھیں۔ میں نے پہچان لیا۔ یہ جواں سال ایس پی تبریز تھا۔

''سنیے سر۔'' میں نے تیزی سے کہا اور اس کے نزدیک چلا گیا۔

ایس پی تبریز مجھے دیکھنے کے بعد ٹھٹک کر رک گیا۔ وہ تیس بتیس سال کا ایک خوبرو اور اسمارٹ شخص تھا۔ کشادہ پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ اس نے آنکھیں سکیڑ کر دیکھا اور مجھے پہچان لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ چھٹی پر ہونے کے باوجود اس تہلکہ خیز خبر سے آگاہ ہو چکا ہے جو صبح سویرے سے ٹی وی چینلز پر چل رہی ہے۔

وہ رک گیا تو کتا تیزی سے میری طرف آیا اور دھمکانے والے انداز میں میرے چاروں طرف گردش کرنے لگا۔

''ایڈی...... ایڈی۔'' ایس پی تبریز نے کتے کو پچکارا اور پھر اس کے گلے میں زنجیر ڈال کر اسے ایک درخت سے منسلک کر دیا۔

''تمہیں یہاں دیکھ کر مجھے سخت حیرانی ہوئی ہے۔'' تبریز نے سخت الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''یقیناً آپ کو حیرانی ہونی چاہیے۔ جو کچھ میرے بارے میں ٹی وی پر چل رہا ہے، اس کے بعد تو آپ کو حیرانی کے ساتھ ساتھ طیش میں آنا چاہیے۔ میں آپ کے ایک خوب صورت دن کو برباد کرنے کے لیے آپ کے پاس آن پہنچا ہوں۔''

''تم صرف کام کی بات کرو۔'' تبریز کے لہجے میں روکھا پن نہایت واضح تھا۔

ہم نے وہیں شبنم آلود گھاس پر کھڑے کھڑے قریباً پانچ منٹ گفتگو کی۔ میں نے ایس پی تبریز کو ہر بات پوری سچائی اور دیانت داری کے ساتھ بتا دی۔ انسپکٹر قیصر کے سسر کی طرف سے چچا کی زمین زبردستی خریدنے کے ارادے سے لے کر حویلی کی آتش زدگی اور ولید کے شدید زخمی ہونے تک میں نے سب کچھ ایس پی تبریز کے گوش گزار کر دیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ان میں سے اکثر باتیں وہ پہلے سے یا شاید بہت پہلے سے جانتا تھا۔ بہرحال میرے اندازِ بیان نے اسے متاثر کیا اور شاید وہ یہ سوچنے پر بھی مجبور ہوا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہی اصل حقیقت ہے لیکن اس کے چہرے پر بہت زیادہ الجھن بھی نظر آ رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ''تبریز صاحب! میں بڑی آس لے کر آپ کے پاس آیا ہوں۔ آپ مجھے بہت مختلف نظر آتے ہیں۔ میں نے اپنا دل آپ کے سامنے کھول کر رکھ دیا ہے۔ اب آپ مجھے بتائیں، مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں یہاں بالکل اجنبی ہوں۔ یہاں کے طور طریقوں سے میری واقفیت نہ ہونے کے برابر ہے۔''

ایس پی تبریز نے کہا۔ ''مجھے بہت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ تم بری طرح پھنس

گئے ہو۔اب کچھ بھی ہے تمہیں ایک بار گرفتاری تو دینا ہی پڑے گی۔''

''اور اس کے بعد میرا کیا حال ہوگا۔اس کے بارے میں آپ بھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔جیسے چند دن پہلے راجو پولیس مقابلے میں مارا گیا تھا اور سیکڑوں دوسرے مارے جاتے ہیں، میں بھی مارا جاؤں گا اور میں ایسے مرنا نہیں چاہتا۔''

تبریز کے ماتھے پر سوچ کی بے شمار لکیریں پھیلی ہوئی تھیں۔وہ گہری سانس لے کر بولا۔''شاید ایک شخص تمہاری مدد کرسکتا ہے۔ملک اختر عباس، وہ ملک کے نامور قانون دان ہیں۔حال ہی میں جج کے عہدے سے ریٹائرڈ ہوئے ہیں۔قانون دان حلقوں میں بہت اثرو رسوخ ہے ان کا۔پولیس گردی کے بھی ہمیشہ سے خلاف رہے ہیں......ٹھہرو، میں ان کے سیکرٹری سے رابطے کی کوشش کرتا ہوں۔''

تبریز نے اپنا سیل فون نکالا اور مجھ سے کچھ فاصلے پر جا کر نمبر ملانے میں مصروف ہوگیا۔اس کے چہرے پر مسلسل تذبذب کی دھوپ چھاؤں تھی۔اچانک میری چھٹی حس نے پکار کر مجھے کسی خطرے سے آگاہ کیا۔میں نے صاف دیکھا کہ ایس پی نے پہلے جو نمبر پریس کیا تھا اس کو ری جیکٹ کر دیا اور ایک دوسرا نمبر پریس کیا۔ایسا کرتے ہوئے اس نے اپنا رخ میری طرف سے پھیر لیا تھا۔شاید فرض کا احساس اس کی سوچ پر غالب آرہا تھا۔اپنی چھٹی حس پر مجھے ناز تھا۔اس نے مجھے زندگی میں بہت کم دھوکا دیا تھا۔میں نے پکار کر کہا۔''سر رکیے...... ایک سیکنڈ۔''

وہ ٹھٹک کر میری طرف دیکھنے لگا۔میں اس کی طرف بڑھا۔وہ میری توقع سے زیادہ چوکس نکلا۔اس نے اپنی شرٹ کے نیچے ہاتھ ڈالا اور اپنی کمر کی طرف اڑسا ہوا چھوٹے سائز کا پستول نکال لیا لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کا سامنا کس شخص سے ہے۔وہ اس سے دو تین گنا پھرتی کا مظاہرہ بھی کرتا تو شاید مجھ پر حاوی نہ ہوسکتا۔میں نے اس پر جست لگائی اور اسے اپنے ساتھ لیے ہوئے کچی زمین پر گرا۔میں نے بائیں ہاتھ سے تبریز کا پستول والا ہاتھ جکڑ لیا تھا لیکن جب میں نے اس سے پستول چھیننا چاہا تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اس کے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔اس نے بائیں ہاتھ کا بھرپور طمانچہ میرے گال پر رسید کیا۔میری بائیں آنکھ کے سامنے سرخ ستارے سے چمک گئے۔میں نے جوابی وار کیا اور اپنے سر کی ضرب اس کے جبڑے پر رسید کی۔یہ بڑی شدید ضرب تھی۔میرا خیال تھا کہ تبریز ہاتھ پاؤں پھینک دے گا لیکن ایسا نہیں ہوا اور اس کے ساتھ ہی مجھے احساس ہوا کہ میرا مدِ مقابل کوئی معمولی شخص نہیں ہے۔

ایس پی تبریز کے کتے نے بلند آواز میں شور مچانا شروع کر دیا تھا۔اس کے ساتھ ساتھ

وہ بے طرح اچھل کود بھی کر رہا تھا۔ اگر چند منٹ پہلے تبریز نے اس کی چین کو درخت سے باندھ نہ دیا ہوتا تو اس وقت یہ جانور میرے لیے سخت خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ اگلے ڈیڑھ دو منٹ میں میرے اور جواں سال ایس پی کے درمیان سخت جدوجہد ہوئی تاہم وہ مجھ پر غلبہ حاصل نہیں کر سکا۔ یہ اس کے بس کی بات ہی نہیں تھی۔ اگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جاتا تو میں نے اسے زیادہ سخت چوٹیں لگائی ہی نہیں تھیں ورنہ اس کی دو چار ہڈیاں تو ضرور ٹوٹ جاتیں مگر پھر مجھے اپنا رویہ بدلنا پڑا۔ میں اس وقت تبریز کے اوپر تھا اور اس کی گردن کو اپنی کہنی سے رگیدے ہوئے تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ کتے کے شور نے کام دکھایا ہے۔ قریباً سو میٹر دور فارم ہاؤس کا ایک گیٹ کھلا اور مجھے دو افراد نظر آئے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں رائفل دکھائی دے رہی تھی۔

جس وقت میں گیٹ کی صورتِ حال دیکھ رہا تھا، تبریز نے فائدہ اٹھایا۔ میری ایک لمحے کی غفلت نے اسے میرے نیچے سے نکال دیا۔ میں الٹ کر لمبی گھاس میں گرا، اس سے پہلے کہ میں اٹھتا تبریز نے کسی درخت کی ایک توانا شاخ اٹھالی۔ یہ شاخ ایک بھاری بھرکم لٹھ سے مشابہ تھی۔

”سن آف بچ۔“ وہ پھنکارا۔ اس نے شاخ پوری طاقت سے میرے سر پر ماری۔ بڑی غلط پوزیشن میں ہونے کے باوجود میں نے اس کا یہ وار بچانے کی کوشش کی اور جزوی طور پر کامیاب رہا۔ لٹھ نما شاخ میرے سر کو چھوتی ہوئی کندھے پر لگی۔ پورا بازو جیسے جھنجھنا اٹھا۔

میں نے شاخ کو تھاما اور راؤنڈ کک کے انداز میں تبریز کی کنپٹی پر ضرب لگائی۔ وہ گھٹنوں کے بل گرا۔ اس کے گرتے گرتے میں کھڑا ہو چکا تھا۔ اب سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے شاخ گھما کر تبریز کی گردن پر رسید کی۔ وہ اٹھتا اٹھتا پھر گر گیا۔

”سوری ایس پی صاحب۔“ میں نے زہر خند لہجے میں کہا۔

دوسری ضرب میں سر پر لگا سکتا تھا لیکن میں نے پھر اس کی گردن کو ہی نشانہ بنایا۔ میں اس جواں سال ایس پی کو شدید نقصان سے بچانا چاہتا تھا۔ میرے اندازے کے عین مطابق اس دوسری چوٹ نے تبریز کو اوندھے منہ گرا دیا اور نیم بے ہوش کر دیا۔

اچانک میری نظر گھاس کے اندر ایک سیاہ چیز پر پڑی۔ یہ وہ سیاہ پستول تھا جو کچھ دیر پہلے ایس پی کے ہاتھ سے نکلا تھا۔ میں نے جھپٹ کر پستول پکڑ لیا۔ گیٹ سے برآمد ہونے والے افراد اب بلا کی تیزی سے میری طرف بڑھ رہے تھے۔ دور سے ان کی آوازیں بھی ہوا کے دوش پر تیر کر مجھ تک پہنچ رہی تھیں۔ یہ آوازیں کچھ اس قسم کی تھیں۔

"اوئے کون ہے......اوئے خبردار......گولی چلادیں گے۔"

دوسری طرف کتا بھی اپنی زنجیر کو جھٹکے پر جھٹکے دے رہا تھا۔ وہ کسی بھی لمحے آزاد ہوسکتا تھا۔ میں نے جھاڑیوں کا رخ کیا اور دوڑ لگا دی۔

میرے عقب میں دو فائر ہوئے۔ اندازہ یہی تھا کہ یہ ہوائی فائر ہیں۔ میرے پیچھے آنے والے ابھی مجھ سے کافی دور تھے۔ میرے پاس نکل بھاگنے کا ایک اچھا موقع تھا۔ کچھ فاصلے پر گنے کے اونچے کھیت تھے۔ میں ان میں گھس کر کسی سمت نکل سکتا تھا، کہیں پناہ لے سکتا تھا مگر پھر اچانک مجھے احساس ہوا کہ یہ کام اتنا آسان نہیں۔ کوئی بڑی تیزی سے میرے پیچھے آرہا تھا اور یہ انسان نہیں جانور تھا۔

ایس پی تبریز کا وہی کتا جسے چند لمحے پہلے میں نے بندھا ہوا چھوڑا تھا۔ میرے دماغ میں انگارے سے بھر گئے۔ یہ بستی، یہ گلی کوچے اور یہ لوگ مجھے راستہ نہیں دے رہے تھے۔ میں نے بھاگتے بھاگتے پلٹ کر دیکھا۔ کتے کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہکی ہوئی تھیں۔ اس کے نوکیلے دانت چمک رہے تھے۔ وہ بلا کی رفتار سے مجھ پر جھپٹ رہا تھا۔ اب میرے پاس اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ اس پر فائر کردوں اور میں نے بھاگتے بھاگتے پلٹ کر فائر کیا۔ گولی عین اس کی پیشانی پر لگی۔ وہ مجھ پر جھپٹتے ہوئے کسی شرابی کی طرح جھوما اور پھر کھیت میں پلٹنیاں کھاتا ہوا ساکت ہوگیا۔

میں نے ایک بار پھر پوری رفتار پکڑی۔ اب میرے اردگرد اونچی سبز فصل کا کھیت تھا، نیچے زمین ناہموار تھی۔ کئی دفعہ میں گرتے گرتے بچا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا میرے پیچھے مشتعل افراد ہیں۔ مجھے ان سے اپنا آپ بچانا تھا۔ میرے پیچھے آنے والے یقیناً فارم ہاؤس کے لوگ ہی تھے۔ وہ پولیس کے سادہ پوش اہلکار ہوسکتے تھے اور فارم کے پرائیویٹ ملازم بھی۔ میں ان کے ہاتھوں میں اسلحہ دیکھ چکا تھا اور اب مجھے لگ رہا تھا کہ ان کی تعداد میں اضافہ ہوگیا ہے۔ شاید راہ میں آنے والے کچھ اور لوگ بھی ان کے ساتھ شامل ہوگئے تھے۔ ہلکا سا شور بھی مجھے سنائی دے رہا تھا۔

تب ایک بار پھر دو تین فائر ہوئے۔ اس بار مجھے اندازہ ہوا کہ یہ ہوائی فائرنگ نہیں ہے۔ شاید کھیتوں میں میری جھلک دیکھی گئی تھی اور نشانہ بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ اب ضروری تھا کہ میں بھی ایک دو فائر کروں۔ چاہے وہ ہوا میں ہی ہوں اور میں نے ایسا ہی کیا۔ بھاگتے بھاگتے میں نے دو ہوائی فائر کیے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس کا کیا فائدہ ہوا لیکن اتنا فائدہ تو ضرور ہوا ہوگا کہ پیچھے آنے والے نڈر نہیں رہے ہوں گے اور انہوں نے اپنی رفتار بھی

کچھ کم کردی ہوگی۔

اچانک ایک مقام پر مجھے چھپنے کی بڑی محفوظ جگہ نظر آئی۔ یہ ایک ٹریکٹر ٹرالی کا ڈھانچا تھا۔ یہ آدھا زمین میں دبا ہوا تھا۔ میں نے سیکنڈ کے دسویں حصے میں فیصلہ کیا اور تیزی سے رخ پھیر کر اس ڈھانچے کے نیچے گھس گیا۔ یہ بڑا رسک والا فیصلہ تھا مگر ایسے موقعوں پر ایسے فیصلے کرنے ہی پڑتے ہیں۔ اگر میں دیکھ لیا جاتا تو یہ جگہ میرے لیے چوہے دان بھی ثابت ہو سکتی تھی۔

پستول ضرور میرے ہاتھ میں تھا لیکن مجھے پتا چل چکا تھا کہ اب اس میں صرف ایک گولی باقی ہے اور اس ایک گولی سے میں اپنا دفاع کرنے کے قابل ہرگز نہیں تھا۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق میرے تعاقب میں آنے والوں کی تعداد دس اور پندرہ کے درمیان تھی اور میرا یہ اندازہ غلط نہیں نکلا۔ قریباً ایک منٹ بعد جو افراد شور مچاتے اور لاٹھیاں وغیرہ لہراتے کچھ فاصلے سے گزرے وہ دس پندرہ کے قریب ہی تھے۔ ان میں سے دو چار کے پاس یقیناً آتشیں اسلحہ بھی تھا۔ ان میں سے شاید کسی ایک نے بھی ٹرالی کے خستہ حال ڈھانچے کی طرف دھیان نہیں دیا۔

بس ہوا کے دوش پر اڑتا ہوا ایک فقرہ میرے کانوں میں پڑا۔ کسی نے بھاری بھرکم دیہاتی لہجے میں ایک موٹی سی گالی دی اور پکار کر بولا۔ ''کچھ لوگ دائیں طرف جاؤ کچھ چھپڑ (جوہڑ) کی دوسری طرف دیکھو......''

جونہی وہ لوگ کچھ آگے نکلے میں ٹرالی کے ڈھانچے کے نیچے سے نکلا اور بائیں طرف والے کھیتوں میں گھس گیا۔ اب میں تیز بھاگنے کے بجائے چل رہا تھا۔ کسی وقت آٹھ دس قدم بھاگ بھی لیتا تھا۔ تسلی کے لیے میں نے ایس پی تبریز کا پستول پھر چیک کیا۔ چھوٹے سائز کے میگزین میں صرف ایک گولی تھی۔ یکا یک میں چونک گیا۔ کھیت کے اندر مجھ سے دو تین میٹر کے فاصلے پر دو دیہاتی خواتین نظر آئیں۔ یہ درمیانی عمر کی عورتیں پاس پاس بیٹھی تھیں اور اس جگہ کو ٹوائلٹ کے طور پر استعمال کر رہی تھیں۔ انہوں نے ڈری ڈری آوازیں نکال کر مجھے اپنی طرف آنے سے خبردار کیا۔ میں نے فوراً اپنا رخ بدل لیا اور ان کی نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔ ایسا منظر میں پہلی بار دیکھ رہا تھا اور حیرت زدہ ہوگیا تھا۔ قریباً آدھ فرلانگ دور ایک اونچے کھیت میں مجھے پھر اس سے ملتا جلتا سین دکھائی دیا۔ اس مرتبہ ایک ادھیڑ عمر شخص کو اپنی دھوتی سنبھال کر کھڑا ہونا پڑا تھا۔ اس نے مجھے خشمگیں نظروں سے دیکھا۔

''سوری چاچا جی۔'' میں نے کہا اور اس کی طرف دیکھے بغیر آگے بڑھ گیا۔

اپنے کپڑے میں نے جھاڑ لیے تھے اور چادر کو اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ لیا تھا۔ ایک جگہ بیٹھ کر میں نے اپنی کیچڑ آلود شلوار بھی اچھی طرح صاف کر لی۔ سامنے ہی کسی آبادی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ میں نے اپنا رخ اس طرف پھیر لیا۔ یہ نیم پختہ بستی تھی۔ بہت سے پلاٹ خالی پڑے تھے۔ اکثر گھروں پر پلاستر نظر نہیں آ رہا تھا اور سرخ اینٹوں کا رنگ ہی گھروں کا رنگ تھا۔ میں ایک گلی میں تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔ یہ بستی پار کر کے ہی کسی سڑک وغیرہ کے آثار نظر آ سکتے تھے۔ اب دن کے قریباً نو بج چکے تھے۔ گلیوں میں چہل پہل تھی۔ چھٹی کا دن تھا۔ بچے کھیل رہے تھے۔ ناشتے کی ایک دکان پر رش نظر آیا۔ یورپی ممالک میں علی الصباح ناشتا کر لیا جاتا ہے۔ پاکستان میں، میں نے دن بارہ بجے تک ناشتے کی سرگرمیاں دیکھی تھیں۔

دفعتاً میں بری طرح ٹھٹکا۔ میں نے چند باوردی پولیس اہلکاروں کو دیکھا۔ وہ جیسے متلاشی نظروں سے دائیں بائیں دیکھتے ناشتے والی دکان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میں تیزی سے پلٹا اور ایک بغلی گلی میں گھس گیا۔ مجھے شک گزرا کہ پولیس والوں نے مجھے دیکھا ہے۔ یہ موہوم شک تھا لیکن اسے یکسر بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مجھے تیس چالیس قدم کی دوری پر ایک گھر کی عقبی دیوار نظر آئی۔ دیوار زیادہ اونچی نہیں تھی۔ گلی بھی تقریباً خالی ہی نظر آ رہی تھی۔ میں نے اپنے عقب میں دیکھا پھر تیزی سے حرکت کی اور چھ فٹ اونچی دیوار کے اوپر چڑھ کر دوسری طرف کود گیا۔ یہاں نرم زمین تھی اور چھوٹا سا باغیچہ دکھائی دے رہی تھی۔ میں کچھ دیر بے حرکت، پنجوں کے بل بیٹھا رہا اور ارد گرد کی سن گن لیتا رہا۔ مجھے یوں لگا جیسے پاس ہی کسی کمرے میں ہارمونیم بج رہا ہو یا پھر ٹی وی پر ہارمونیم اور طبلے وغیرہ کی آواز سنائی دے رہی ہو۔ اس گھر میں مکمل سکوت تھا بس چپس کے نیلے فرش پر ایک بلی دھوپ میں انگڑائیاں لے رہی تھی۔

میں اپنی جگہ چھوڑ کر پھول دار پودوں کے اندر سے نکلا اور گھر کے اندرونی حصے کی طرف بڑھا۔ ایک ستون کی اوٹ میں کھڑے ہو کر دیکھا۔ ایک ہال نما کمرے کا کھلا دروازہ نظر آیا۔ یہاں فرش پر چاندنی بچھی تھی۔ چند سازندے اپنے ساز وغیرہ درست کرنے میں مصروف تھے۔ اچانک مجھے عقب میں زنانہ قدموں کی مدھم آہٹ سنائی دی۔ کہیں پر چھپنے کا وقت نہیں تھا۔ میں جلدی سے سیدھا کھڑا ہو گیا۔ ایک گوری چٹی صحت مند عورت چمک دار لباس پہنے میرے سامنے کھڑی تھی۔ میرے اندیشے کے برخلاف وہ مجھے دیکھ کر گھبرائی نہیں، نہ ہی اس نے چلانے کی کوشش کی۔ اس کے برعکس وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی اور بولی۔ ''نواب

کے ڈیرے سے آئے ہو؟'

میں نے اثبات میں سر ہلانا مناسب سمجھا۔

''نواب تو کہتا تھا آدھی رات تک پہنچ جاؤ گے۔''

''بس دیر ہو گئی۔'' میں نے مبہم جواب دیا۔

اس نے دوپٹے سے بے نیاز سر پر لگے چمکیلے کلپ کو چھوا اور بازاری انداز میں بولی۔
''پر اس وقت تو ساری کڑیاں تھک ٹٹ کر سوئی ہوئی ہیں۔ تیرے ساتھ کوئی نہیں بیٹھے گی۔ دوپہر دو ڈھائی بجے تک انتظار کرنا پڑے گا۔''

''کوئی بات نہیں کر لوں گا۔'' میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

''پیسے کتنے خرچ گا؟'' وہ پھر بازاری انداز میں مسکرائی۔ اس کے ٹیڑے میڑے دانت نمایاں ہو گئے اور وہ پینتیس چالیس کے بجائے چالیس پینتالیس کی نظر آنے لگی۔

''پیسے کافی ہیں جی۔'' میں نے اس کا مطلب سمجھ کر کہا۔

اس نے مجھے بڑے دھیان سے اوپر سے نیچے تک دیکھا اور گردن ٹیڑھی کر کے بولی۔
''ویسے تو تم آدھے انگریز لگ رہے ہو۔ نواب کے ڈیرے پر کیسے پہنچ گئے؟ اور یہ پینڈو کپڑے۔''

''بس پہنچ گیا کسی طرح۔ نواب صاحب سے اسلام آباد میں ملاقات ہوئی تھی۔'' میں نے ایک بار پھر گول مول جواب دیا۔ ''اور یہ کپڑے بس شوقیہ ہی پہنے ہوئے ہیں۔''

''اچھا چلو آؤ، ادھر بیٹھو، چائے پانی تو پیو۔''

وہ میری رہنمائی کرتے ہوئے اندرونی حصے کی طرف بڑھی۔ اپنے حلیے اور چال ڈھال سے وہ واضح طور پر بازاری عورت ہی دکھائی دیتی تھی۔ اس کا چربی دار جسم اس کے لباس میں سے پھٹا پڑ رہا تھا۔ اب تک میں یہ اندازہ اچھی طرح لگا چکا تھا کہ پولیس والوں سے بچتے بچاتے میں ایک بالا خانے جیسی جگہ پر آ پہنچا ہوں۔

عورت نے مجھے ایک آرام دہ کمرے میں بٹھایا۔ یہاں الکحل کی بو رچی بسی ہوئی تھی۔ دیوار پر ایک بڑی ایل سی ڈی لگی تھی اور ویڈیو سسٹم بھی نظر آ رہا تھا۔ ایک چھوٹی الماری کا پٹ عورت نے کھولا تو اس میں وہسکی اور رم وغیرہ کی چمکیلی بوتلیں پڑی نظر آئیں۔ یہ مکمل طور پر ایک عشرت کدہ ہی دکھائی دے رہا تھا۔

مجھے خطرہ تھا کہ کہیں یہ نائیکا نما عورت مجھ سے نواب نامی شخص کے حوالے سے کوئی مزید سوال نہ کرے بہرحال خیریت گزری۔ اس نے ایل سی ڈی آن کر دی اور بولی۔

''تمہارے لیے ناشتا وغیرہ بھجواتی ہوں۔ تم ٹی وی دیکھو، اتنی دیر میں کوئی لڑکی تیار ہو جائے گی۔'' میں نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

باتھ روم میں جا کر ہاتھ منہ دھویا۔ کنپٹی پر آنے والی چوٹ کافی تکلیف دے رہی تھی۔ ہلکا سا زخم بھی تھا جو بالوں میں چھپ گیا تھا۔ ڈیٹول سے زخم صاف کیا اور باہر آ گیا۔ بستر بڑا نرم اور آرام دہ تھا۔ میں نے ریشمی لحاف کمر تک اوڑھا اور نیم دراز ہو گیا۔ ٹی وی آن کیا اور مختلف نیوز چینل کا جائزہ لینے لگا۔ فی الحال کہیں پر اپنے بارے میں کوئی نیوز دکھائی نہیں دی۔ فقط ایک چینل پر آتشزدگی اور اس کے نتیجے میں ہونے والی دو اموات کی خبر آ رہی تھی۔ یہ خبر پٹی کی صورت اسکرین کے نچلے حصے پر چل رہی تھی۔ میں چینل بدلنے ہی والا تھا کہ پٹی پر آنے والے دو فقرے دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ یہ فقرے کچھ اس طرح تھے۔

''معتبر ذرائع کے مطابق یہ بتایا جا رہا ہے کہ گھر میں دھماکا خیز مواد تیار کیا جا رہا تھا۔ دونوں تخریب کار شاہ زیب اور ولید اسی حویلی نما مکان میں قیام پذیر تھے۔''

''یا خدا...... یہ کیا ہو رہا ہے؟'' میں نے ایک بار پھر سر پکڑ لیا۔

جھوٹ کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ کوئی بری بھلی بنیاد ہوتی ہے لیکن یہاں تو بلا تردد رات کو دن اور سفید کو سیاہ کہا جا رہا تھا۔ اتنے میں دروازے کی طرف آہٹ سنائی دی۔ میں نے جلدی سے چینل تبدیل کر دیا۔ اندر آنے والی ایک جواں سال لڑکی تھی۔ شکل و صورت معمولی تھی، لباس اور چال ڈھال سے گھر کی نوکرانی ہی لگتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک جہازی سائز ٹرے تھی۔ ٹرے میں دکھائی دینے والا ناشتا بے حد دھانسو قسم کا تھا۔ انڈوں کا حلوہ، گاجر کا حلوہ جس پر پستے اور بادام کی پھلجھڑیاں تھیں۔ چھوٹے پائے کا سالن، دیسی گھی کا چوڑا چکلا پراٹھا، گرم دودھ کا نصف جگ اور اس کے علاوہ بھی کافی کچھ۔ اس نے ناشتا میز پر دور تک پھیلا دیا اور دانت نکال کر بولی۔ ''کوئی اور چیز چودھری صاحب؟''

میں نے کہا۔ ''اس ناشتے کے بعد پرسوں تک تو شاید کسی چیز کی ضرورت نہیں پڑے گی۔'' پتا نہیں کہ اس نے میری بات سمجھی یا نہیں لیکن زور سے سر ہلا کر چلی گئی۔ مجھے کھانا کھائے ہوئے اب قریباً 16 گھنٹے ہو چکے تھے لیکن ان 16 گھنٹوں میں، میں جس طرح کے حالات سے گزرا تھا انہوں نے میرے دماغ کو ہی ماؤف نہیں کیا تھا میری بھوک کا گلا بھی گھونٹ دیا تھا۔

میں نے خود پر جبر کرتے ہوئے تھوڑا بہت کھایا اور کچھ ڈسٹ بن میں پھینک دیا۔ ریموٹ کنٹرول پر اے وی آئی کا بٹن دبایا تو ڈی وی ڈی آن ہو گیا۔ ایک نہایت نازیبا ڈانس

کی ویڈیو چلنے لگی اور اس کے فوراً بعد عریاں فلم شروع ہوگئی۔ پرلے درجے کی فحش فلم تھی
یہاں پر اسی قسم کی خرافات کی توقع کی جاسکتی تھی۔ میں نے ایک انٹرٹینمنٹ چینل لگا دیا۔ پتا
نہیں کیوں نیوز چینل دیکھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اتنا جھوٹ تھا کہ دم گھٹتا محسوس ہوتا تھا۔

کچھ دیر گزری اور پھر ایک بنی سنوری لڑکی چھم سے کمرے میں داخل ہوگئی۔ "سلاماں
لیکم چودھری صاحب۔" اس نے بھی مجھے چودھری صاحب کہہ کر ہی مخاطب کیا شاید اس کی
وجہ میرا لباس تھا۔

وہ آتے ہی بے تکلفی سے میرے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنا نام نیلی بتایا۔ اس کی
نائیکا کا نام ترانہ بائی معلوم ہوا۔ میں نے کہا۔ "نیلی...... یہاں چھاپے شاپے والا چکر تو نہیں
ہوتا؟"

"یہ ترانہ بائی کا ڈیرا ہے چودھری جی، کوئی مخول نہیں ہے۔ کسی پلے کی اتنی ہمت نہیں کہ
اِدھر پَر مار سکے۔ آپ بے فکر ہو کر کھاؤ پیو۔"

میں نے کہا۔ "پینے کو تو ظاہر ہے لال پری ہوگی لیکن کھلاؤ گی کیا؟"

"مجھے کھالو نا جی اسی لیے تو حاضر ہوئی ہوں تمہارے سامنے۔" وہ طوائفوں کے خاص
انداز میں بولی۔

میں نے غور سے اسے دیکھا۔ میک اَپ کی تازہ تہ کے نیچے اس کے چہرے پر
تھکاوٹ نظر آتی تھی۔ اسے نائیکا نے شاید اوور ٹائم کے لیے زبردستی جگایا تھا اور تیار کر کے
یہاں بھیجا تھا۔ ویسے وہ زیادہ عمر کی نہیں تھی۔ شکل وصورت بھی اچھی تھی اس کے چہرے پر
جیسے درج تھا "بہ حالت مجبوری" اس کے چہرے کی اس کیفیت پر نہ جانے کیوں مجھے ایک
اور چہرہ یاد آگیا۔ ایک شریف زادی کا چہرہ۔ حاجی نذیر کی بیٹی کا چہرہ۔ وہ بھی تو حالت
مجبوری میں تھی۔ شکیل داراب جیسے مگرمچھ نے عاشرہ نام کی اس خوش رنگ مچھلی کو اپنے
جبڑوں میں دبوچ لیا تھا اور کسی صورت چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔ اس سلسلے میں میری ساری
بھاگ دوڑ بھی بے کار ہی گئی تھی۔ کچھ دیر اس بارے میں سوچنے کے بعد میں پھر موجود
صورتِ حال کی طرف پلٹ آیا۔

میرے ذہن میں مسلسل کھلبلی مچی تھی۔ یہاں ہر طرف میری تلاش ہو رہی تھی۔ کسی بھی
وقت مجھے ٹریس کیا جاسکتا تھا۔ کیا پتا کہ کسی چینل پر میری کوئی تصویر بھی دکھائی جارہی ہوتی، یا
زبانی ہی حلیے سے آگاہ کیا جارہا ہوتا، ایسی صورت میں اس عشرت کدے کے مکینوں میں سے
ہی کوئی مجھے پہچان سکتا تھا۔

میرے پاس اپنے دفاع کے لیے فقط ایک گولی تھی یا پھر ٹانگیں تھیں جن کے ذریعے میں یہاں سے راہِ فرار اختیار کر سکتا تھا۔ یہاں پر اپنا کردار نبھانے کے لیے میں نیلی کے کچھ قریب ہو گیا۔ اس کے بالوں سے اٹکھیلیاں کرتا رہا اور اپنے ہونٹوں کو اس کے چہرے سے ہم کلام بھی کیا۔ اچانک نیلی کو اندازہ ہو گیا کہ میرے لباس کے نیچے کوئی ہتھیار موجود ہے۔ اس نے پستول کی چبھن محسوس کی اور چونک کر میری طرف دیکھنے لگی۔ ''یہ کیا ہے؟'' اس نے پستول کی سختی کو کپڑے کے اوپر سے ہی چھوتے ہوئے کہا۔

میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''وہی جو تم سمجھ رہی ہو۔''

''کیوں؟''

''میں دشمن دار آدمی ہوں۔ اپنی حفاظت کے لیے رکھنا پڑتا ہے۔''

اس نے پستول کو کپڑے کے اوپر سے ہی آہستہ آہستہ سہلاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے جی دار لوگ اچھے لگتے ہیں۔ جی دار اور ذرا کڑک۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے اس کی آنکھیں کچھ نیم باز ہو گئیں۔

''کیا مطلب؟''

''مجھے لگتا ہے کہ تم شراب وغیرہ نہیں پیتے؟''

میں نے نفی میں جواب دیا۔

''یہاں عام طور پر شرابی ہی آتے ہیں۔ یہ جھوٹ موٹ کے کڑک ہوتے ہیں اندر سے بالکل چلے ہوئے کارتوسوں کی طرح۔ وہ بڑی بے تکلفی سے بول رہی تھی۔

میں اس کی باتوں کے جواب میں ہنکارا بھرتا رہا۔ میرا دماغ تو کہیں اور الجھا ہوا تھا اور اتنی الجھنیں تھیں کہ اعصاب شل ہو رہے تھے۔ ہم ساتھ ساتھ لیٹ گئے۔ وہ کسی وقت نفسیاتی مریضہ جیسا رویہ دکھانے لگتی تھی۔ میں نے لیٹتے وقت پستول اپنے جسم سے علیحدہ کرنا چاہا تو وہ مسکرا کر بولی۔ ''نہیں رہنے دو جی اسی طرح اچھا لگتا ہے۔'' وہ پستول کی چبھن کو انجوائے کر رہی تھی۔

میں ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔ وہ اسی طرح مجھ سے لپٹتی رہی...... میں نے سارا وقت یورپ میں گزارا تھا۔ عمر عزیز کے قریباً چوبیس سال انہی رنگین گلی کوچوں میں غرقاب ہوئے تھے اور سچی بات یہ ہے کہ میں کوئی ایسا پارسا بھی نہیں تھا لیکن موجودہ صورتِ حال میں، میں اس نیلی نامی لڑکی سے قربت کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے بس اسے تھوڑا بہت مصروف رکھا اور وقت گزارتا رہا۔ مجھے شام کا اور اندھیرے کا انتظار تھا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ

ٹھکانا میرے لیے کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے۔

وقت گزاری کے لیے میں نے ایک بے ہودہ سی نیم عریاں فلم میں دلچسپی ظاہر کی اور ہم ایل سی ڈی پر وہ فلم دیکھنے میں مصروف ہو گئے۔ مختصر دن کے ٹھٹھرے ہوئے سائے جلد ہی طویل ہونے لگے تھے۔ فلم اختتام پذیر ہوئے دس پندرہ منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ گھر کے کسی بیرونی دروازے پر کال بیل بجائی گئی اور ترانہ کے بلند لہجے میں بولنے کی آواز آئی۔ اب گھر میں چہل پہل کے آثار محسوس ہو رہے تھے۔ لڑکیاں جاگ گئی تھیں۔ ان کے گھومنے پھرنے اور ہنسنے بولنے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ کسی کمرے میں شاید رقص وغیرہ کی ریہرسل ہو رہی تھی۔

نیلی ایک بار پھر بستر پر میرے ساتھ نیم دراز تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ طوائفیں بظاہر پُرجوش نظر آتی ہیں لیکن اندر سے ہوتی نہیں ہیں۔ نیلی کا معاملہ مختلف لگ رہا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے مجھ سے میرا سیل نمبر بھی لیا تھا اور مس کال کر کے اپنا نمبر بھی مجھ تک پہنچا دیا تھا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ میں اس کا پکا گاہک بننے جا رہا ہوں۔

تھوڑی دیر بعد مجھے اندازہ ہوا کہ نیلی کے سیل فون پر میسج کی ٹون ہوئی ہے۔ سیل فون سرہانے کی طرف رکھا تھا۔ اس نے چور نظروں سے فون کی طرف دیکھا پھر میسج پڑھا۔ میسج پڑھنے کے بعد اس کی سرگرمی ایک دم ماند پڑ گئی۔ وہ جو مجھ سے چمٹی ہوئی تھی ذرا پیچھے ہٹ گئی۔

''میں ابھی آتی ہوں۔'' اس نے کہا اور بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

میں نے کان لگا کر سنا، باہر سے کسی کے بھاری آواز میں بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ لہجہ تحکمانہ تھا۔ ''کہیں پولیس تو یہاں آ نہیں دھمکی؟'' یہ سوال میرے ذہن میں کسی انگارے کی طرح دہک اٹھا۔

نیلی اب آئینے کے سامنے کھڑی اپنا لباس درست کر رہی تھی اور بال سمیٹ رہی تھی۔ اس کا سرخ اونی سوئٹر پاس ہی پڑا تھا۔ مجھے معلوم تھا باہر نکلنے سے پہلے وہ سوئٹر بھی پہنے گی۔ میں نے تھوڑی سی پھرتی دکھائی۔ نیلی کے سیل فون پر اپنا نمبر ری ڈائل کیا اور جلدی سے کال وصول بھی کر لی۔ نیلی کا فون میں نے اس کے سوئٹر کی جیب میں ڈال دیا۔

نیلی نے جلدی جلدی سے سوئٹر پہنا۔ اس کے بٹن لگائے اور دوپٹا گلے میں ڈالتے ہوئے باہر نکل گئی۔ اس کے فون کے ساتھ میری کال ملی ہوئی تھی۔

میں نے اپنا سیل فون کان سے لگا لیا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ میری یہ احتیاط اتنی کامیاب رہے گی۔ پہلے نیلی کی اونچی ایڑی کی ٹھک ٹھک سنائی دیتی رہی پھر کچھ ملی جلی آوازیں آئیں۔

تب ایک بھاری مردانہ آواز سنائی دی۔

''کہاں ہے وہ؟''

''کمرے میں ہی ہے۔'' نیلی نے ہکلا کر کہا۔ ''لیکن آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

مردانہ آواز کے بجائے نائیکا ترانہ بائی نے جواب دیا اس کی آواز قدرے مدھم تھی۔ وہ انکشاف کرنے والے لہجے میں بولی۔ ''یہ وہی ہے...... جس کی خبر صبح سے ٹی وی پر چل رہی ہے۔ بڑا خطرناک بندہ ہے۔'' ترانہ غالباً سرتاپا کانپ رہی تھی۔

مردانہ آواز نے پوچھا۔ ''ہتھیار ہے اس کے پاس؟''

''ج...... جی ہاں ایک پستول ہے...... قمیص کے نیچے لگایا ہوا ہے اس نے۔'' نیلی نے ہراساں لہجے میں جواب دیا۔

''کوئی چاقو وغیرہ؟''

''میرے خیال میں تو نہیں جی۔''

بات چیت جاری تھی لیکن میرے لیے اب مزید سنتے رہنا ٹھیک نہیں تھا۔ میں تیزی سے اٹھا، جوتے پہنے اور کھڑکی سے کود کر پچھلے صحن میں آ گیا۔ یہ وہی سائیڈ تھی جہاں سے میں گھر میں داخل ہوا تھا۔ باغیچے میں دو بلیاں آپس میں گتھم گتھا تھیں۔ میں ان کے قریب سے گزرتا ہوا چھ فٹ اونچی چار دیواری تک پہنچا اور پلک جھپکتے میں اسے پار کر گیا۔ ایک موٹر سائیکل سوار گزر رہا تھا۔ اس نے مجھے چھلانگ لگا کر دیوار سے اترتے دیکھا اور حیرت زدہ ہو کر ایک دم بریک لگائے۔ اس کے عقب میں ایک ٹریکٹر آ رہا تھا۔ ٹریکٹر والے کو بھی یکا یک بریک لگانا پڑے۔ موٹر سائیکل کو ہلکی سی ٹکر لگی اور موٹر سائیکل سوار لڑھکتا ہوا دور جا گرا۔ ٹریکٹر پر بیٹھے ہوئے دو افراد بھی لڑھک کر کچے پکے راستے پر آن گرے۔

میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور لپک کر سامنے والی گلی میں داخل ہو گیا۔ ایک خالی پلاٹ کے اندر سے گزرتے ہوئے میں ساتھ والی سڑک پر آ یا۔ یہاں مجھے ایک موٹر رکشا دکھائی دے گیا۔ میں نے اسے اشارہ دیا۔ دیہاتی لباس پہنے ہوئے رکشا ڈرائیور نے فوراً رکشا روک دیا۔ میں سوار ہو گیا۔ ''کہاں جانا ہے جی؟'' ڈرائیور نے پوچھا۔

''چونگی تک جانا ہے۔'' میں نے کہا۔

رکشا ڈرائیور نے ذرا تعجب سے میری طرف دیکھا۔ چونگی وہاں سے کافی دور تھی۔ بہر حال اس نے رکشا آگے بڑھا دیا۔ کچھ فاصلے پر جا کر میں نے دیکھا۔ ایک پولیس موبائل ناہموار سڑک پر ہچکولے کھاتی تیزی سے اس گھر کی طرف جا رہی تھی جہاں سے میں نے ابھی

راہِ فرار اختیار کی تھی۔

رکشا اپنے راستے پر اڑا جا رہا تھا۔ میرے موبائل فون کی بیل ہونے لگی۔ میں نے دیکھا یہ نیلی کا نمبر ہی تھا۔ میں نے فون بند کر دیا۔

ہم کھیتوں اور درختوں کے درمیان تنگ سڑک پر سفر کرتے قریباً چار پانچ کلومیٹر آگے آئے اور پھر بڑی سڑک پر پہنچ گئے۔ میرے ذہن میں منزل کا کوئی تعین نہیں تھا۔ فی الحال میں اس جگہ سے دور چلا جانا چاہتا تھا۔ کوئی گمنام ہوٹل یا پھر رات بھر کھلا رہنے والا ریسٹورنٹ ہی میری جائے پناہ ہو سکتا تھا۔ اب اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ سردیوں کی ٹھٹھری ہوئی طویل رات میرے سامنے تھی اور بے شمار نادیدہ نگاہیں مجھے ڈھونڈ رہی تھیں۔ میں لاہور میں داخل ہو کر انسانوں کے سمندر میں گم ہونے کے بارے میں سوچنے لگا مگر خطرات تو ہر جگہ موجود تھے۔ یہ روشنیوں کا شہر میرے لیے شہرِ ستم ثابت ہو سکتا تھا۔ عبداللہ کے الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے۔

''شاہ زیب! یہ لوگ ولید کی طرح تمہیں بھی شوٹ کر دیں گے۔ انہوں نے پورا پلان بنا لیا ہے۔ تم چند دن کے لیے کہیں روپوش ہو جاؤ۔''

میں خطرات سے ڈرنے والا ہرگز نہیں تھا۔ مجھے میرے وعدے ڈرا رہے تھے۔ وہ وعدے جو میں نے پاکستان آنے سے پہلے اپنے آپ سے کیے تھے۔ میں اپنے وطن عزیز میں کسی اور روپ سے رہنا چاہتا تھا، کسی اور ڈھنگ سے جینا چاہتا تھا۔ میں خون اور بارود کی بُو نہیں چاہتا تھا۔ میں روتی بلکتی آوازوں کو اپنی سماعت سے دور رکھنا چاہتا تھا، میں امن چاہتا تھا۔ پھولوں کی خوشبو مانگتا تھا۔ حسین شاموں اور صبحوں کے رنگ دیکھنے کا خواہاں تھا۔ لیکن یہاں جو کچھ ہو رہا تھا یہ بہت مایوس کن تھا۔ یہ تو میرے بدترین اندیشوں سے بھی بڑھ کر تھا۔ جرم بے گناہی کی پاداش میں مجھے دہشت گرد قرار دیا جا رہا تھا اور قیصر چودھری جیسے پولیس والے میرے لیے موت کے فرشتوں کا روپ دھار گئے تھے۔

اتنی جلدی اتنا کچھ ہو جائے گا، میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ ابھی کل ہی کی تو بات تھی، میں نے نئی امنگوں اور آرزوؤں کے ساتھ وطن عزیز کی سرزمین پر قدم رکھا تھا۔

میرا دل چاہا، میں لاہور کے کسی بارونق چوک میں پہنچ کر رکشا رکواؤں۔ کسی بلند جگہ پر کھڑا ہو جاؤں اور پکار کر کہوں۔ ''اے میرے شہر کے لوگو! میرے ہم وطنو! میں بڑی دور سے بڑی آسیں لے کر آیا ہوں۔ تمہارے ساتھ جینا چاہتا ہوں، انہی گلیوں میں زندگی کے دکھ سکھ دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس سرزمین پر اپنا خون پسینا گرا کر یہاں خوشیوں کے پھول کھلانے کی خواہش رکھتا ہوں...... لیکن دیکھو میرے پیارو، کچھ لوگوں نے آتے ساتھ ہی مجھے دہشت گرد

بنا دیا ہے۔ میری جان لینے کے درپے ہو گئے ہیں۔ مجھے کہیں پناہ نہیں مل رہی۔ مجھے تمہاری قسم میں بے گناہ ہوں۔ میرا کوئی قصور نہیں، میری مدد کرو۔ اس سے پہلے کہ میں تمہیں کھو دوں، اور تم مجھے کھو دو میری مدد کرو۔"

لیکن یہ سب کچھ خیال ہی تھا۔ میں جانتا تھا میں ایسا نہیں کر سکتا۔ میں کوئی سیاسی لیڈر نہیں تھا جس کو دیکھ کر لوگ رک جاتے اور اس کی آواز کے لیے ہمہ تن گوش ہو جاتے۔ ویسے اپنے طور پر تو میں بھی ایک معروف شخص تھا مگر یہاں مجھے کوئی نہیں جانتا تھا اور جانتا بھی تو پہچان نہیں سکتا تھا۔ رکشا کی رفتار سست ہونے لگی اور پھر وہ قریباً رک گیا۔ سامنے دور تک ٹریفک جام تھا۔ دور تک گاڑیوں کی ٹیل لائٹس نظر آ رہی تھیں۔ انہی گاڑیوں کی طویل قطاروں میں کہیں کوئی ایمبولینس بھی پھنسی ہوئی تھی اور بے بسی سے ہوٹر بجاتی چلی جا رہی تھی۔ باہر کے ممالک میں ایسے مناظر کا تصور بھی محال تھا۔ میں نے ڈرائیور سے پوچھا کہ کیا معاملہ ہے۔ وہ باہر نکل کر کھڑا ہو گیا اور دیگر ڈرائیوروں سے بات کرنے لگا۔ اس نے آ کر مجھے بتایا۔ "کوئی حکومتی بندہ گزر رہا ہے جی یہاں سے...... وہ کیا کہتے ہیں وی وی پی موومنٹ۔"

"وی وی پی نہیں...... وی آئی پی۔" میں نے تصحیح کی۔

"ہاں جی وہی۔ داراب فیملی کا کوئی پھنے خاں ہوگا۔" اس نے جلے ہوئے لہجے میں کہا پھر ذرا توقف سے بولا۔ "بہتر تو یہی ہے کہ آپ پیدل آگے نکل جائیں اور پرلے کنارے سے کوئی اور سواری ڈھونڈ کر بیٹھ جائیں۔ یہ معاملہ اتنی جلدی ٹھیک ہونے والا نہیں۔"

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ میں نے اسے کرایہ دیا اور پیدل ہی چل پڑا۔ لوگ ایمبولینس میں سے ایک بے ہوش بچے کو نکال کر ہاتھوں ہاتھ آگے لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کی حالت نازک لگتی تھی۔ میں ٹھنڈی سانس بھر کر سڑک سے اتر گیا اور درختوں کے درمیان پیدل ہی چلنے لگا۔ میرا رخ لاہور کی طرف ہی تھا۔ میرا لباس سوئٹر کے بغیر تھا۔ سرد ہوا جسم کو چیرتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ کنپٹی کی چوٹ بھی تکلیف دے رہی تھی۔ چلتے چلتے میں نے موبائل پھر آن کیا اور دھڑکتے دل کے ساتھ عبداللہ کا نمبر ملایا۔ دیر تک بیل جاتی رہی مگر فون اٹینڈ نہیں ہوا۔ مجھے لگا جیسے عبداللہ جیسا شخص بھی اس وقت مجھ سے کنی کترا رہا ہے۔

○......❖......○

میں سڑک کے ساتھ ساتھ چلنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اس لیے درختوں میں چل رہا تھا۔ کہیں کہیں مجھے کسی کھیت کے اندر سے بھی گزرنا پڑتا تھا۔ جونہی میں شیشم کے ایک جھنڈ میں سے آگے نکلا میری رگوں میں خون جم سا گیا۔ بالکل غیر متوقع طور پر بلکہ حادثاتی طور پر میں ایک پولیس ناکے کے رُوبرو پہنچ گیا تھا۔ یہ تین اہلکار تھے اور ایک نیم پختہ راستے کو روک کر کھڑے تھے۔ سرکاری گاڑی اس طرح کھڑی کی گئی تھی کہ قریباً آدھا راستہ بلاک ہوگیا تھا۔ دو باوردی افراد مسلح نظر آرہے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں طاقتور ٹارچ تھی۔ میں نے جلدی سے واپس پلٹ جانا چاہا لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔ انہوں نے مجھے دیکھ لیا تھا۔

''کون ہے؟'' ایک اہلکار نے گرج کر کہا۔

اب بھاگنا خطرناک تھا۔ میں دھیمے قدموں سے آگے بڑھا۔ وہ لوگ چوکس ہوگئے۔ میں ان کے پاس پہنچ گیا۔ ٹارچ کا روشن دائرہ عین میرے چہرے پر تھا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ میں پہچان لیا گیا ہوں۔

''ہاتھ کھڑے کرو، سیدھے اوپر کھڑے کرو۔'' گرجدار آواز نے ایک بار پھر تحکم سے کہا۔

میں نے ہاتھ کھڑے کر دیئے۔ دو رائفلیں میری طرف سیدھی ہو چکی تھیں۔ ایک شخص تلاشی لینے کے لیے میری طرف بڑھا۔ مجھے اس کی غفلت پر حیرانی ہوئی۔ شاید ایسے کاموں کے لیے اس کی پراپر ٹریننگ ہی نہیں ہوئی تھی۔ ایک طرح سے اس نے خود مجھے مزاحمت کا آسان موقع فراہم کیا۔ میرے جیسے شخص کے لیے یہ بہت آسان ثابت ہوا کہ میں تلاشی کے لیے آگے بڑھنے والے کو ڈھال بنالوں اور اس شخص پر دھکیل دوں جس نے رائفل میری طرف سیدھی کر رکھی تھی۔ یہ بڑا زوردار دھکا تھا۔ دونوں اڑتے ہوئے کچی زمین پر گرے۔ دوسری رائفل میری طرف پوری طرح سیدھی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے رائفل کا بیرل پکڑ کر

اوپر اٹھا دیا۔ دھماکے سے شعلہ نکلا اور گولی کہیں تاریک فضا میں گم ہوگئی۔ میری ٹانگ کی شدید ضرب مدِ مقابل کی گردن کے اس حصے پر لگی جو میری تربیت کے مطابق ریڑھ کی ہڈی کا مرکز کہلاتا ہے اور ایک توانا بندے کو بھی ایک تہائی سیکنڈ کے اندر اندر غفیل کر دیتا ہے اور ایسا ہی ہوا۔ یہ پولیس اہلکار کٹے ہوئے شہتیر کی طرح نیم پختہ راستے پر گرا اور ساکت ہو گیا۔

اوپر نیچے گرنے والے دونوں اہلکار اب کھڑے ہو گئے تھے۔ یہ دونوں عام پولیس والوں کے برعکس چست جسموں کے مالک تھے۔ رائفل بردار کے ہاتھ سے رائفل نکل گئی تھی۔ وہ رائفل کی طرف لپکا تو میں نے اپنی قمیص کے نیچے سے ایس پی تبریز کا پستول نکال کر اس کی ران میں گولی ماری۔ وہ وہیں تڑپ کر گر گیا اور لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ یہ پستول کی آخری گولی تھی جو میں نے استعمال کر لی تھی۔ دوسرا اہلکار جست لگا کر میری طرف آیا اور گالیاں بکتا ہوا مجھ سے لپٹ گیا۔ مجھے ان پولیس والوں سے اتنی پھرتی کی اور ایسی مزاحمت کی توقع نہیں تھی۔ میں نے سوچا شاید یہ اسپیشل برانچ کے کمانڈوز وغیرہ ہیں۔ میرے اور اس توانا اہلکار کے درمیان تقریباً ایک منٹ تک شدید لڑائی ہوئی۔ بے شک مدِ مقابل لڑائی بھڑائی کے فن میں غیر معمولی طور پر طاق تھا لیکن آج اس سرد تاریک رات میں شیشم کے ان درختوں تلے اس کا پالا ایک چمپئن سے پڑا تھا۔ میں نے اسے جچی تلی کارگر چوٹیں لگائیں۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھ سے ایک دو ہڈیاں تڑوا بیٹھتا ایک چوتھا شخص سامنے آیا۔ یہ شاید انسپکٹر تھا۔ اس نے اہلکار کی گری ہوئی رائفل اٹھا کر مجھ پر سیدھی کر لی اور دہاڑا۔ ''بس ختم کرو یہ تماشا، نہیں تو گولی آرہی ہے۔''

اس کی آواز میں کوئی ایسی بات تھی کہ میں نظر انداز نہ کر سکا۔ میں نے خالی پستول پھینک دیا اور غور سے اس انسپکٹر کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ لمبوترا اور ٹھوڑی کافی بڑی تھی۔ آنکھوں میں عقابی چمک نظر آتی تھی۔ شاید اس ساری دھینگا مشتی کے دوران میں وہ پولیس موبائل کے اندر ہی موجود رہا تھا۔ اس نے بڑی مہارت سے میرے سر کو نشانہ بنا رکھا تھا اور کوئی موقع دینے کو تیار نہیں تھا۔

وہ پاٹ دار آواز میں اپنے ماتحتوں سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''فاروق کو گاڑی میں ڈالو...... واحد کو بھی سہارا دے کر بٹھاؤ اسے ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔ گاڑی اسٹارٹ کرو۔''

ماتحت اہلکار نے انسپکٹر کی ہدایات پر عمل کیا۔ پہلے بے ہوش ساتھی کو پولیس موبائل کے اندر پہنچایا پھر زخمی ران والے کو سہارا دے کر موبائل کی پچھلی نشست پر لٹا دیا۔ تب اس نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کی دراز قد انسپکٹر نے مجھے مسلسل گن پوائنٹ پر رکھا اور

گاڑی کی درمیانی نشست پر بٹھا دیا۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی مجھ سے غافل نہیں ہو رہا تھا۔ درحقیقت اس پولیس پارٹی نے صرف ایک غلطی کے سوا کوئی غلطی نہیں کی تھی اور یہ وہی غلطی تھی جب فاروق نامی اہلکار میری تلاشی لینے کے لیے بے پروائی سے میرے قریب آ گیا تھا۔

انسپکٹر نے رائفل کی نال میرے سر سے لگا لی اور میرے ساتھ جڑ کر بیٹھ گیا۔ یہی وقت تھا جب کچھ فاصلے سے کچھ مزید گاڑیوں کا شور سنائی دیا۔ درختوں کے اندر سے ہیڈ لائٹس کی روشنی بھی چھن چھن کر آ رہی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ کم از کم دو گاڑیاں ہیں جو ہماری طرف بڑھ رہی ہیں۔ شاید یہ پولیس کی گاڑیاں نہیں تھیں کیونکہ ان کی آوازیں سنائی دیتے ہی پولیس پارٹی جلدی میں نظر آنے لگی تھی۔ گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھی۔ میں بھی اتنی جلدی ہار ماننے والا نہیں تھا۔ مجھے ڈر صرف اس وقت تک تھا جب ابھی ایکشن شروع نہیں ہوا تھا۔

اب چونکہ مجھے ہاتھ پاؤں چلانے پر مجبور کر دیا گیا تھا، میرے اندر کی ساری خفیہ صلاحیتیں بیدار ہونے لگی تھیں اور میری رگوں میں لہو کی گردش رفتار پکڑتی جا رہی تھی۔ جونہی پولیس کی گاڑی ایک موڑ پر مڑی اور میرے ساتھ جڑ کر بیٹھا ہوا انسپکٹر ذرا ان بیلنس ہو کر مجھ سے پیچھے ہٹا۔ میں نے اسے دھکا دیا اور اسے اپنے ساتھ لیے ہوئے گاڑی سے نیچے گرا۔ ہم دونوں نے کئی پلٹنیاں کھائیں تاہم انسپکٹر نے اپنے حواس بحال رکھے اور مسلسل مجھ سے چمٹا رہا۔ رائفل بھی بدستور اس کے ہاتھ میں رہی۔ جب ہم ساکت ہوئے تو رائفل کی نال مسلسل میری گردن سے چھو رہی تھی۔ میں آخری بار کہتا ہوں گولی چلا دوں گا۔" انسپکٹر نے خوف ناک لہجے میں کہا۔

میں سمجھ گیا کہ اس موقع پر انسپکٹر کی دھمکی کو نظر انداز کرنا حماقت ہوگی۔ ہم دونوں درختوں کے درمیان لمبی لمبی نوکیلی گھاس (داب) میں گرے تھے۔

پولیس جیپ ایک جھٹکے سے آہستہ ہوئی لیکن رکی نہیں۔ شاید اب ان کے لیے رکنے کا موقع نہیں تھا۔ وہ گاڑیاں بالکل قریب پہنچ چکی تھیں جن کو دیکھ کر پولیس پارٹی کو پسوڑی پڑی تھی۔

مجھے اور انسپکٹر کو ہمارے حال پر چھوڑ کر پولیس موبائل تیزی سے آگے نکل گئی۔ ہم دونوں وہاں پانی اور کیچڑ میں پڑے رہے۔ بالکل ساکت اور بے حرکت۔ یہ درحقیقت ایک جوہڑ تھا۔ ہم پھسلتے ہوئے قریباً کمر تک سرد کیچڑ میں ڈوب گئے۔ چند سیکنڈ بعد شور مچاتی ہوئی گاڑیاں موقع پر پہنچ گئیں۔ ان میں سے ایک گاڑی کوئی سو میٹر دور اس جگہ پر رکی جہاں میں نے واحد کی ران میں گولی ماری تھی اور اس کا خون نیم پختہ راستے پر گرا تھا۔ دوسری گاڑی

تیزی سے آگے نکلتی چلی گئی یقیناً وہ اس گاڑی کے پیچھے گئی تھی جس میں سے انسپکٹر اور میں گرے تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر از حد حیرت ہوئی کہ موقع پر پہنچنے والی یہ دونوں گاڑیاں بھی پولیس کی تھیں۔ ان میں مسلح نفری بھری ہوئی تھی۔ ان پولیس والوں کو دیکھنے کے باوجود انسپکٹر میرے ساتھ جوہڑ کے اندر چھپا رہا۔ اس کی چھوٹی نال کی رائفل بدستور میرے سر سے لگی ہوئی تھی۔

وہ میرے کان میں پھنکارا۔ ''خاموش رہنا، آواز نکالنے کی کوشش کی تو مارے جاؤ گے۔''

''یہ تو تمہارے پیٹی بھائی ہیں۔ ان سے کس چیز کا پردہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں کہہ رہا ہوں نا، چپ رہو۔'' اس نے پھر زہریلی سرگوشی کی۔

اچانک ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ جن پولیس والوں سے میرا ٹاکرا ہوا ہے وہ اصلی نہیں ہیں۔ اصلی پولیس والے یہ ہیں جو اب آئے ہیں۔ میں سناٹے میں رہ گیا۔ اب یہ بات بھی میری سمجھ میں آنے لگی کہ نقلی پولیس والوں کو فرار کیوں ہونا پڑا ہے۔ شاید اس کا سبب وہ دو فائر تھے جو کچھ دیر پہلے یہاں ہوئے تھے۔ ان فائروں کی آواز نے ہی غالباً پولیس والوں کو یہاں موقع کی طرف کھینچا تھا۔

دراز قد انسپکٹر نے میری گردن اپنے مضبوط بازو کے شکنجے میں جکڑی ہوئی تھی اور رائفل کا بیرل میری کنپٹی میں گھسا رکھا تھا۔ میں چاہتا تو اس صورتِ حال میں بھی مزاحمت کا کوئی طریقہ ڈھونڈ سکتا تھا لیکن اس سلسلے میں مجھے کوئی ایسی جلدی نہیں تھی۔

''کون ہو تم؟'' میں نے رائفل بردار سے پوچھا۔

''تھوڑی دیر صبر کرو۔ سب کچھ بتاتا ہوں۔''

اصلی پولیس والے اب اس جگہ کا جائزہ لے رہے تھے جہاں فائرنگ ہوئی اور خون گرا تھا۔ اس دوران میں پولیس کی ایک سفید موٹر سائیکل بھی موقع پر پہنچ گئی۔ اس پر دو مسلح اہلکار سوار تھے۔ یہ سب لوگ ٹارچوں کی مدد سے اِدھر اُدھر روشنی پھینکتے رہے۔ ایک مرتبہ ٹارچ کا ایک دائرہ ہمارے قریب سے بھی گزرا بہر حال ہم محفوظ رہے۔

وہ آپس میں باتیں بھی کر رہے تھے جو ہم تک پہنچ رہی تھیں۔ وہ فائرنگ اور خون کے سلسلے میں مختلف قیاسے لگا رہے تھے۔

''یہ گولی کا ایک خول ملا ہے سر جی۔'' کسی اہلکار نے اپنے افسر سے کہا۔

''اور یہ دیکھیں جی...... یہ دو خالی بٹوے پڑے ہیں یہاں۔'' ایک دوسرے اہلکار نے

اپنے افسر کو اطلاع دی۔

''لگتا ہے کچھ بدمعاشوں نے لوٹ مار کی ہے یہاں۔'' افسر نے اپنے فقرے میں ایک موٹی گالی دیتے ہوئے کہا۔

اب صورتِ حال کچھ تو میری سمجھ میں بھی آنے لگی تھی۔ ناروے میں قیام کے دوران میں، میں نے ایک پاکستانی اخبار میں پڑھا تھا کہ پولیس کی وردی پہن کر وارداتیں کرنے کا رواج بھی بڑھ رہا ہے۔ جرائم پیشہ گروہ اس طرح جعلی ناکے لگاتے ہیں اور راہگیروں کو قیمتی اشیا سے محروم کرتے ہیں۔ شاید کچھ دیر پہلے تک یہاں بھی یہی کچھ ہو رہا تھا۔ میں اتفاقاً یہاں پہنچ گیا تھا اور جعلی پولیس والوں سے میرا تصادم ہو گیا تھا۔ اب میرے لیے دونوں طرف ہی شدید خطرہ تھا۔ میں اصل پولیس والوں کے ہتھے چڑھتا تو عین ممکن تھا وہ مجھے پولیس مقابلے میں مار ڈالتے۔ دوسری طرف میں ان نقلی پولیس والوں کی دشمنی بھی مول لے چکا تھا۔ ان کا ایک بندہ میری گولی سے شدید زخمی ہوا تھا۔ دوسرا بے ہوشی کی حالت میں یہاں سے گیا تھا۔ بہرحال اصلی پولیس والوں کی طرف سے خطرہ نسبتاً زیادہ شدید تھا۔

دو چار منٹ اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ کرنے کے بعد پولیس کی گاڑی نفری سمیت آگے روانہ ہو گئی۔ موٹر سائیکل پر سوار پولیس والے بھی چار پانچ منٹ وہاں رکنے کے بعد آگے نکل گئے۔ ٹیکنیکل طور پر یہ بھی غلط تھا۔ کم از کم دو تین اہلکاروں کو یہاں ضرور موجود رہنا چاہیے تھا۔ جعلی انسپکٹر کے لیے یہاں نکلنے کے لیے یہ موقع بڑا مناسب تھا۔ وہ مجھے گن پوائنٹ پر رکھے رکھے جوہڑ سے باہر لے آیا۔ سخت سردی میں جیسے نچلا دھڑ سن ہو کر رہ گیا تھا۔ سارے کپڑے کیچڑ میں لتھڑ گئے تھے اور جسم میں ایک طرح کی کپکپی پیدا کر رہے تھے۔

اب ہماری آنکھیں اندھیرے میں اچھی طرح دیکھنے کے قابل ہو چکی تھیں۔ دراز قد شخص نے مجھے سرتاپا گھورا اور بولا ''تم نے گولی چلا کر بڑا غلط کیا ہے لیکن لگتے اپنے ہی قبیلے کے ہو۔''

میں نے کہا۔ ''کیا تمہارا قبیلہ...... پولیس کا نہیں ہے؟''

''نہیں ہے...... اور میرے خیال میں اب تک تم یہ بات اچھی طرح جان چکے ہو۔'' وہ اب نارمل لہجے میں بول رہا تھا۔

''اب کیا چاہتے ہو مجھ سے؟'' میں نے پوچھا۔

''فی الحال تو ہم دونوں کی ایک ہی چاہت ہونی چاہیے کہ کسی طرح نکلا جائے یہاں سے۔'' اس نے کہا۔ رائفل کا رخ بدستور میری طرف تھا لیکن اب مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ

میری طرف سے بہت زیادہ فکر مند یا چوکس نہیں ہے۔ پتا نہیں کیوں میں اس۔ کے لہجے کے نیچے کہیں دوستی کی لہر سی محسوس کر رہا تھا۔

وہ ایک بار پھر سرتاپا گھور کر بولا۔ ''مجھے پچانوے فی صد یقین ہو گیا ہے کہ تم پولیس سے بھاگے ہوئے ہو۔''

''یعنی تم پولیس سے بھاگے ہوئے ہو؟''

''چلو ایسا ہی سمجھ لو۔''

''کیا ہم کہیں بیٹھ کر بات نہیں کر سکتے؟'' میں نے پوچھا۔

''کر سکتے ہیں...... اور اگر کہو تو میں اپنی یہ رائفل بھی کندھے سے لٹکا سکتا ہوں لیکن اس کی کیا ضمانت ہے کہ تم پھر مارا ماری پر نہیں اتر آؤ گے؟'' اس کے لہجے میں طیش کی جگہ اب ایک طرح کی اپنائیت نے لے لی تھی۔

میں نے کہا۔ ''اگر ہم ایک ہی گاڑی کے سوار ہیں تو پھر ہمیں ایک دوسرے پر اعتبار بھی کرنا چاہیے۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ ایسا کچھ نہیں ہو گا۔''

یقیناً وہ ایک باہمت اور زیرک شخص تھا۔ چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد اس نے رائفل کی نال میری گردن سے ہٹا لی۔

ہم گھنے درختوں میں چلتے پہلو بہ پہلو آگے بڑھنے لگے۔ سرد ہوا ہمارے جسموں کو کاٹ رہی تھی۔ جوتوں میں بھی کیچڑ بھر گئی تھی اور چلنا مشکل ہو رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ دراز قد شخص کی حرکات و سکنات میں کسی شکاری جانور کی سی چوکسی اور تیزی ہے۔ اندھیرے میں اس کی نگاہیں چاروں طرف گردش کر رہی تھیں۔ اب میری یہ حیرت بھی یقیناً دور ہو گئی تھی کہ کچھ دیر پہلے میں جن پولیس والوں سے لڑا تھا وہ اتنے پھرتیلے اور جی دار کیوں تھے۔ وہ پولیس والے تھے ہی نہیں۔ وہ اس دراز قد بدمعاش کے ساتھی تھے۔

دراز قد شخص چلتے چلتے بار بار اپنے سیل فون سے بھی چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا مگر بھیگ جانے کی وجہ سے سیل فون کام کرنے سے انکاری ہو گیا تھا۔ جلد ہی ہمیں اینٹوں کے ایک بھٹے کے آثار دکھائی دیئے۔ یہاں بالکل ویرانی تھی، کہیں ہلکی سی روشنی بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ تاہم بھٹے سے دھواں نکل رہا تھا اور قرب و جوار کی فضا میں ایک خوشگوار حرارت کا احساس بھی ہوتا تھا۔

مجھے اندازہ ہوا کہ دراز قد شخص اس جگہ سے ناواقف نہیں ہے۔ ہم دونوں بڑی احتیاط سے چلتے بھٹے کی عقبی سمت میں آ گئے۔ یہاں ایک جگہ اینٹوں کے حصار میں تھوڑے سے ادھ

بجھے انگارے نظر آ رہے تھے۔ شاید شام کے وقت یہاں آگ جلائی گئی تھی اور دو چار مزدوروں نے بیٹھ کر گپ شپ کی تھی۔ سگریٹوں کے ٹکڑے اور چائے کی ایک ٹوٹی ہوئی پیالی بھی دکھائی دی۔ فی الحال یہ جگہ بالکل سنسان تھی۔

ہم انگاروں کے قریب بیٹھ گئے۔ قدرے راحت محسوس ہوئی۔ میں نے جوتے اتار کر ان میں سے کیچڑ نکالی۔ دراز قد شخص نے مجھے اپنا نام داؤد بتایا۔ میں نے اپنا نام اعجاز احمد بتایا۔ اب پتا نہیں کہ اعجاز کی طرح داؤد بھی اصلی تھا یا نہیں۔ داؤد نہایت مضبوط کاٹھی کا ایک تیس پینتیس سالہ شخص تھا۔ اس کا چہرہ کافی لمبا اور ٹھوڑی آگے کی طرف نکلی ہوئی اور چوڑی تھی۔ اس کے چہرے کی سب سے اہم چیز اس کی آنکھیں تھیں۔ نیم تاریکی میں بھی اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں عقابی چمک نمایاں نظر آتی تھی۔

''داؤد صاحب کس کو فون کرنا چاہ رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''کوئی ایسا جو ہمیں یہاں سے نکال سکے۔'' اس نے بھاری آواز میں کہا پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''تمہارے پاس ہے فون؟''

میں نے دو سیکنڈ تذبذب میں رہنے کے بعد اپنا سیل فون اس کی طرف بڑھا دیا۔ میرا سیل فون بھیگنے سے محفوظ رہا تھا اور ورکنگ پوزیشن میں تھا۔ داؤد نامی اس شخص نے ایک نمبر پریس کیا اور کچھ فاصلے پر جا کر مدھم لہجے میں کسی سے بات کرنے لگا۔ رائفل مسلسل اس کے ہاتھ میں تھی اور وہ میری طرف سے بالکل غافل بھی نہیں تھا۔ یہ بھی ویسی ہی پوزیشن تھی جو کل صبح ایس پی تبریز کے حوالے سے پیش آئی تھی۔ وہ بھی اسی طرح کچھ فاصلے پر جا کر فون کرنے میں مصروف ہو گیا تھا اور مجھے شک ہو گیا تھا کہ وہ مجھے گرفتار کروانا چاہ رہا تھا بعد ازاں یہ شک بالکل درست ثابت ہوا تھا۔

بہر حال رسک کے بغیر تو کچھ نہیں ہو سکتا اور مجھے داؤد نامی اس شخص کے حوالے سے رسک لینا ہی تھا۔ کچھ دیر بات کرنے کے بعد وہ واپس آ گیا اور فون میری طرف بڑھا دیا۔

''کیا بنا؟'' میں نے پوچھا۔

''پولیس چاروں طرف موجود ہے۔ کئی جگہ ناکے لگے ہیں اور گشت بھی ہو رہی ہے۔ وہ یہاں پہنچنے کی کوشش کرے گا۔''

''کہاں جائیں گے ہم؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے ذرا غصے سے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''فی الحال تو ہمیں یہاں سے نکلنا ہے پھر دیکھیں گے کیا کرنا ہے۔''

''اور اگر میں تمہارے ساتھ نہ جانا چاہوں تو؟''

''تو پھر بھاڑ میں جاؤ۔ یہ پولیس والے تمہیں مردہ کتے کی طرح گھسیٹ کر یہاں سے لے جائیں گے۔''

ابھی داؤد کا فقرہ ختم ہی ہوا تھا کہ دو تین فرلانگ کے فاصلے پر پختہ سڑک کی جانب پولیس کی گاڑیوں کے سائرن سنائی دیئے۔ وہ بڑی تیزی سے کسی سمت جا رہی تھیں۔ داؤد نے کہا۔ ''یہ سارا علاقہ پولیس کے گھیرے میں ہے شاید کوئی اور واردات بھی ہوئی ہے یہاں جس کی وجہ سے ہائی الرٹ ہے۔''

ہم ادھ بجھے انگاروں کے پاس دبکے بیٹھے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ داؤد کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ زبردست مردم شناس بندہ ہے۔ اس کے علاوہ میں نے جس طرح اس کے ساتھیوں کی درگت بنائی تھی اس نے بھی اسے کافی متاثر کیا تھا۔ اس سے قطع نظر کہ اس کے دو بندے زخمی ہوئے تھے۔ وہ مجھے قدر کی نظر سے دیکھ رہا تھا اور شاید دوستانہ تعلقات بھی چاہ رہا تھا۔ بہرحال ابھی اس سلسلے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ مجھے یہ بھی اندازہ ہو رہا تھا کہ لاہور میں داؤد کے پاس کوئی محفوظ ٹھکانا ہے جہاں وقتی طور پر مجھے تسلی بخش پناہ مل سکتی ہے۔

کچھ دیر بعد میرے سیل فون کی بیل پھر بج اٹھی۔ میں نے سوچا شاید پولیس والوں کی مدد کرنے کے لیے نیلی نے پھر فون کیا ہے مگر یہ کوئی اور نمبر تھا۔ داؤد نے گردن لمبی کر کے اسکرین پر نمبر دیکھا اور بولا۔ ''یہ میرا ہی فون ہے۔''

میں نے فون اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ ایک بار پھر رائفل سمیت مجھ سے کچھ فاصلے پر چلا گیا اور مدھم آواز میں باتیں کرنے لگا۔

چند منٹ بعد وہ واپس آیا تو کچھ ریلیکس دکھائی دیتا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر کچھ حیرت بھی ہوئی کہ رائفل اب اس کے ہاتھ میں نہیں تھی بلکہ کندھے سے جھول رہی تھی۔ وہ میرے قریب ہی ایک ڈبل اینٹ پر بیٹھ گیا اور بولا۔ ''تمہاری قسمت نے ساتھ دیا ہے۔ بچ بچا ہو گیا ہے۔ واحد کی مرہم پٹی ہو گئی ہے۔ گولی اس کے پٹ (ران) کو چھید کر نکل گئی تھی۔ فاروق بھی ہوش میں آ گیا ہے۔ ان دونوں میں سے کسی کو کچھ ہو جاتا تو بڑا مسئلہ ہو جانا تھا۔''

میں نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ظاہر ہے کہ میں نے جو کچھ کیا اپنے دفاع میں کیا تھا۔ اگر میں اس وقت واحد نامی اس بندے پر گولی نہ چلاتا تو وہ یقیناً رائفل اٹھا کر مجھ پر گولی چلا دیتا۔

چند لمحے بعد میں نے پوچھا۔ "ہماری مدد کو کوئی آ رہا ہے یا نہیں؟"

"آ رہا ہے...... بالکل آ رہا ہے۔ تمہیں اندازہ نہیں کہ یہ کتنا بڑا کام ہوگا اگر آج رات ہم یہاں سے بچ بچا کر نکل گئے۔ یہ سانپ کے منہ سے نوالہ چھیننے والی بات ہوگی۔"

ایک بار پھر کہیں کافی فاصلے پر پولیس کی گاڑی کا سائرن سنائی دیا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد اوپر تلے دو فائر ہوئے۔ شاید تلاشی آپریشن کے دوران میں کوئی چور اچکا پولیس کے ہتھے چڑھا تھا۔ داؤد نے میری طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ قریباً پندرہ بیس منٹ اسی طرح اور گزرے پھر مجھے انجن کی مدھم گھر گھر سنائی دی تاہم لائٹ کہیں نظر نہیں آئی۔

داؤد الرٹ ہوتے ہوئے بولا۔ "میرا خیال ہے جھارا آ گیا ہے۔"

اس نے رائفل پھر ہاتھ میں لے لی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم ٹوٹی پھوٹی اینٹوں کے ایک ڈھیر کے پیچھے کھڑے ہو گئے اور آواز کی سمت دیکھنے لگے۔ کچھ دیر بعد انجن کی آواز واضح ہو گئی اور پھر گاڑی کا مدھم سا ہیولا نظر آیا۔ وہ بڑی سُست روی سے ہماری طرف بڑھ رہی تھی۔ جیسا کہ بعدازاں معلوم ہوا یہ شہ زور لوڈر تھا اور اس پر دودھ کے برتن لدے ہوئے تھے۔ لوڈر ہم سے کچھ فاصلے پر رک گیا اور اس کا انجن بند ہو گیا۔ میں اور داؤد احتیاط سے آگے بڑھے۔

قریب پہنچنے کے بعد داؤد نے دھیمی آواز میں کہا۔ "کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا جھارا؟"

"نہیں بھا جی۔" جھارے کی آواز آئی اور پھر وہ چھلانگ لگا کر لوڈر سے اتر آیا۔

میں اسے دیکھ کر دنگ ہوا۔ ڈنمارک میں رہنے کے باوجود مجھے معلوم تھا کہ جھارا ایک طاقتور پاکستانی پہلوان کا نام تھا جس نے جاپانی پہلوان انوکی کو ناکوں چنے چبوائے تھے۔ میرے ذہن میں جھارے کا تصور ایک لحیم شحیم شخص کا تھا لیکن جو شخص پھدک کر لوڈر میں سے برآمد ہوا وہ خاصا دبلا پتلا بلکہ مخنی تھا۔ اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر ہمارے لیے لوڈر کا عقبی راستہ کھولا۔ یہاں مضبوط پلاسٹک کے بہت سے نیلے ڈرم نظر آ رہے تھے۔ ان ڈرموں کے درمیان بیٹھنے کے لیے تھوڑی سی خالی جگہ بنائی گئی تھی۔ ہم سمٹ سمٹا کر وہاں بیٹھ گئے۔ جھارے نے اوپر ایک میلی سی ترپال ڈال دی اور ترپال کے اوپر چارے کے تین چار گھٹنے رکھ دیئے۔ لوڈر ایک جھٹکے کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

داؤد نے شاید ٹھیک ہی کہا تھا کہ یہاں سے بچ کر نکلنا سانپ کے منہ سے نوالہ چھیننے والی بات ہوگی۔ اگلے آدھ گھنٹے میں ہمیں کم از کم تین جگہ روکا گیا۔ ایک جگہ تو دو پولیس اہلکار لوڈر کے اوپر بھی چڑھ آئے اور دودھ کے وزنی ڈرموں کو اِدھر اُدھر کیا۔ اس دوران میں ہم بالکل دم سادھے بیٹھے رہے۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ ہم لاہور شہر کی حدود میں داخل

ہوگئے ہیں۔ٹریفک کا شور کافی بڑھ گیا تھا اور اس میں موٹر سائیکلز اور رکشاؤں کا شور بھی شامل ہوگیا تھا۔ دودھ کے ڈرموں میں غالباً برف وغیرہ ڈالی گئی تھی۔ وہ یخ بستہ ہور ہے تھے اور ہمارے بھیگے ہوئے کپڑوں کو مزید ٹھنڈا کر رہے تھے۔

○......❖......○

قریباً پندرہ منٹ مزید گزرے اور پھر لوڈر ایک خاموش جگہ رک گیا۔ داؤد نے ترپال اٹھائی اور ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ ایک بڑا گیراج تھا۔ یہاں چار پانچ گاڑیاں آسانی سے کھڑی ہوسکتی تھیں۔ گیراج کے تین شٹر تھے اور وہ بند تھے۔ یہاں آوازیں گونجتی ہوئی سی محسوس ہو رہی تھیں۔ ہم نیچے اترے۔ داؤد نے کانگڑی پہلوان جھارے کے ساتھ کچھ دیر کھسر پھسر کی۔ تب ایک دروازے سے گزر کر ہم نے چند سیڑھیاں اتریں اور ایک طویل راہ داری میں داخل ہوگئے۔ راہ داری کا اختتام ایک بڑے سلائیڈنگ دروازے پر ہوا۔ جھارے نے دروازہ کھولا۔ سامنے ایک لمبوترا کمرا نظر آیا۔ یہاں پہنچ کر ہمیں مختلف آوازیں سنائی دینے لگیں۔ یوں محسوس ہوا کہ ہم کسی بارونق جگہ پر داخل ہونے والے ہیں۔ تب ہم ایک دروازے میں سے گزرے اور وہ بارونق جگہ ہمارے سامنے آگئی۔ میں دنگ رہ گیا۔ یہ ایک وسیع و عریض ہال تھا۔ اس میں ایک دو جگہوں کے سوا کوئی ستون دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ یہاں درجنوں مرد و زن موجود تھے۔ رات میں دن کا سماں نظر آتا تھا۔ ہال کے چاروں جانب دروازے نظر آرہے تھے۔ یہ رہائشی کمرے تھے۔ ایک طرف ریسٹورنٹ نما جگہ تھی۔ وہاں میزوں کے گرد نیم عریاں لڑکیاں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ بہرحال اکثریت مردوں کی تھی جو سگریٹ پی رہے تھے اور شراب نوشی کر رہے تھے۔ ان میں سے کوئی ایک بھی مجھے شریف صورت نظر نہیں آیا۔ کرخت چہرے، بے ڈھنگے لباس، جھگڑالو آوازیں، یہاں بلیرڈ کی دو تین میز اور جوئے کی چند مشینیں بھی نظر آئیں۔ دو گروہ کسی طرح کی نعرہ بازی میں مصروف تھے۔ داؤد کو دیکھ کر وہ خاموش ہوگئے۔ کئی افراد نے ہاتھ ماتھے پر لے جا کر داؤد کو سلام کیا اور اس کے کیچڑ آلود کپڑوں کو حیرت سے دیکھا۔ جھارے کے ساتھ چلتے ہم فوراً ہی ایک آرام دہ اپارٹمنٹ میں داخل ہوگئے۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ ساری جگہ ایک وسیع بیسمنٹ کی حیثیت رکھتی ہے۔ چھت پر بہت سے لوگوں کے چلنے پھرنے کی مدھم آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔

روشنی میں، میں نے داؤد کو ایک بار پھر سرتاپا گھورا۔ وہ واقعی ایک دبنگ شخص نظر آتا تھا۔ انسپکٹر کی وردی بالکل اس کے ناپ کی تھی اور کیچڑ آلود ہونے کے باوجود اس کے توانا جسم

پر نچ رہی تھی۔ وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''تم نہا دھو کر اور کپڑے بدل کر فریش ہو جاؤ پھر بات کریں گے شاہ زیب۔'' اس کے منہ سے اپنا نام سن کر میں دنگ رہ گیا۔

وہ مسکرا کر بولا۔ ''حیران یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، مجھے شک تو پہلے سے تھا لیکن لوڈر میں سوار ہونے سے پہلے پہلے مجھے پتا چل گیا تھا کہ تم ہی وہ جناب دہشت گرد صاحب ہو جس کے بارے میں میڈیا پر نیوز چل رہی ہے۔''

میں نے خود کو بہ مشکل سنبھالا اور داؤد سے پوچھا۔ ''کیا میرے چہرے پر کچھ لکھا ہوا ہے؟''

وہ اپنی چوڑی ٹھوڑی کھجا کر بولا۔ ''یہی سمجھ لو کہ لکھا ہوا ہے۔ جھارا بلا کا چہرہ شناس ہے، ٹی وی پر تمہاری کوئی تصویر بھی دکھائی گئی تھی۔ وہاں بھٹے پر لوڈر کے نیچے ہی جھارے نے تمہیں پہچان لیا تھا۔''

میں نے فی الحال اس بارے میں خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ داؤد نے ایک بند دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ تمہارا کمرا ہے۔'' پھر اس نے پکارنے والے انداز میں کہا۔ ''روبی...... اِدھر آؤ۔''

ایک بغلی دروازہ کھلا اور ایک خوش شکل لڑکی چھم سے اندر آ گئی وہ بالکل نوخیز تھی بمشکل سترہ اٹھارہ سال کی رہی ہوگی۔ وہ چست پتلون اور ہاف سلیو شرٹ پہنے ہوئے تھی۔ موسم کے لحاظ سے یہ ناکافی لباس تھا لیکن یہ ساری جگہ چونکہ سینٹرلی گرم تھی اس لیے لباس کا کوئی ایشو نہیں تھا اس لیے کہیں لباس تھا اور کہیں نہیں تھا۔

روبی نام کی اس نوعمر لڑکی نے بڑی ادا سے اپنی گردن جھکائی اور بولی۔ ''آئیں جناب! میں آپ کو واش روم دکھاؤں۔''

چند منٹ بعد میں ایک لگژری واش روم میں موجود تھا اور نیم گرم پانی سے غسل کر رہا تھا۔ آدھ پون گھنٹا پہلے تک میں نے ایسے عیش و آرام کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ وسیع و عریض ہال کے اندر سے نعرہ بازی کی مدھم آوازیں واش روم کے اندر تک پہنچ رہی تھیں۔ اس کے علاوہ چھت کی طرف سے بھی چلنے پھرنے اور گاہے بگاہے میزیں وغیرہ گھسیٹنے کی آوازیں آتی تھیں۔

مجھے نہایت صاف ستھرا لباس فراہم کر دیا گیا تھا۔ یہ پینٹ شرٹ اور سرخ جرسی پر مشتمل تھا۔ اب جسمانی طور پر مجھے کنپٹی کی چوٹ کے سوا کوئی تکلیف نہیں تھی۔ بہر حال ذہنی اذیت بے پناہ تھی اور اس اذیت کا تعلق ان اندوہناک واقعات سے تھا جو مراد پور میں پیش آئے

تھے۔

میں باہر نکلا تو روبی بڑی خوش دلی سے میرے استقبال کے لیے موجود تھی۔ وہ میرے پوچھنے سے پہلے ہی بول اٹھی۔ ''بھاؤ جی سے آپ کی ملاقات تو اب سویرے ہی ہو سکے گی۔ آپ کچھ کھانا پینا پسند کریں گے؟''

''نہیں فی الحال کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ اگر ہو سکے تو ایک کپ چائے لا دو۔''

''جو حکم جی۔'' اس نے حکم کے لفظ پر خاص طور سے زور دیا تھا۔ اس کا یہ انداز یہ سمجھانے کے لیے کافی تھا کہ وہ حکم کے مطابق ہر خدمت انجام دینے کے لیے تیار ہو سکتی ہے۔

کچھ دیر بعد چائے آ گئی۔ ساتھ میں لوازمات بھی تھے۔ بہر حال میں نے بستر پر نیم دراز ہو کر چائے کے گھونٹ بھرنے پر اکتفا کیا۔ ذہن میں ہلچل تھی۔ یہ داؤد یہاں کا کرتا دھرتا نظر آتا تھا اور یہ کافی پہنچا ہوا شخص تھا۔ یہ وہاں بھٹے پر ہی میرے بارے میں سب کچھ جان چکا تھا لیکن اس نے اپنا اطمینان برقرار رکھا تھا اور مجھ پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ اب یہاں اس وسیع و عریض بیسمینٹ میں، میں اس کا کچھ اور ہی رنگ ڈھنگ دیکھ رہا تھا۔ یہ کسی بہت بااثر شخص کا انڈر گراؤنڈ ڈیرا لگتا تھا۔ اپنے دو بندوں کے زخمی ہونے کے باوجود داؤد کا رویہ مجھ سے دوستانہ تھا۔ یہ رویہ آئندہ کیا شکل اختیار کرے گا اس کے بارے میں ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اب مجھے یہ اندازہ بھی ہو رہا تھا کہ وہاں پولیس والوں کے بھیس میں داؤد اور اس کے ساتھیوں نے جو جعلی ناکا لگا رکھا تھا اس کا مقصد صرف راہگیروں سے لوٹ مار ہی نہیں تھا وہاں یہ لوگ غالباً کسی خاص شکار کی تلاش میں تھے۔

باہر سے مدھم شور کی آوازیں مسلسل آ رہی تھیں۔ میں نے کمرے کی لائٹ آف کر دی اور دیوار گیر کھڑکی کا دبیز پردہ تھوڑا سا کھسکایا۔ کھڑکی کے شیشے کی دوسری طرف ایک اور شیشہ نظر آیا بلکہ یہ شیشے کی دیوار سی تھی۔ اس دیوار کی دوسری طرف اسی ہال کے مناظر تھے۔ دیوار پر لگی ہوئی ایک بڑی ایل سی ڈی دیکھ کر میں بری طرح چونک گیا۔ بیس پچیس افراد اسکرین کے سامنے جمع تھے اور دکھائے جانے والے مناظر میں گم تھے۔ میں دم بخود رہ گیا۔ اپنی نگاہوں پر بھروسا نہیں ہوا۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ میں اس کھڑکی سے پردہ ہٹاؤں گا تو کچھ دور ایل سی ڈی کی اسکرین پر خود کو دیکھوں گا۔ ہاں...... یہ میں ہی تھا۔ یہ دو افراد کی ایک زوردار فائٹ تھی جو کسی غیر ملکی چینل پر دکھائی جا رہی تھی۔ یہ کوئی ڈمی فائٹ نہیں تھی۔ یہ سچی لڑائی تھی۔ بڑی بے رحم اور خون رنگ۔ میں اور میرا اٹالین مدِمقابل ایک دوسرے پر گھونسوں اور لاتوں

سے کاری ضربیں لگا رہے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا یہ میری زندگی کی دوسری فائٹ تھی۔

بے شک یہ میں ہی تھا۔ بے شمار لوگ مجھے اس روپ میں جانتے پہچانتے تھے۔ میں ان کے دلوں کی دھڑکن تھا لیکن یہاں اس زمین دوز ٹھکانے پر مجھے کوئی نہیں پہچانتا تھا۔ نہ ہی لاہور میں اور مراد آباد میں گھومتے پھرتے مجھے کسی نے پہچانا تھا۔ یہی بات میں نے شروع میں بھی کہی تھی کہ ایک معروف کھلاڑی ہونے کے باوجود مجھے یہاں کوئی شناخت نہیں کر رہا تھا۔ اس کی وجہ بالکل سادہ تھی، سامنے اسکرین پر جو شاہ زیب اپنے خونخوار حریف کو ناکوں چنے چبوانے میں مصروف تھا، اس کی داڑھی تھی، گھنی مونچھیں تھیں جنھوں نے اس کے تقریباً سارے ہونٹوں کو ڈھانپ رکھا تھا۔ لمبے بال کندھوں کے قریب، قریب پہنچ رہے تھے۔ ان دنوں میں مقامی فیشن کے مطابق اپنے بالوں کو سرخی مائل رنگ دیا کرتا تھا۔ اب میرے چھوٹے چھوٹے بال اپنے اصل کالے رنگ میں تھے اور میں کلین شیوڈ تھا۔ چمپئن فائٹر کے روپ میں بہت قریب سے جاننے والے بھی مجھے اس پاکستانی روپ میں دیکھ کر مشکل سے ہی پہچان پاتے پھر یہ بات کس کے تصور میں آسکتی تھی کہ انٹرنیٹ کی خصوصی سائٹس پر خوف ناک لائیو فائٹس کرنے والا یورپی چمپئن لاہور اور مراد آباد کی گلیوں میں پھر رہا تھا۔ انتظامیہ کے اعلیٰ عہدیداروں کی جھڑکیاں کھا رہا ہے اور پولیس والوں کے تھپڑ جھیل رہا ہے۔

فائٹ اب فیصلہ کن مرحلے میں تھی۔ اٹلی کے فائٹر ڈیوس نے مجھے نیچے گرایا ہوا تھا اور گردن کا لاک لگانے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ اس کی ناک منہ سے خون جاری تھا۔ میرے دونوں گھٹنے بھی بری طرح چھلے ہوئے تھے اور ایک آنکھ سوج کر تقریباً بند ہی ہوگئی تھی۔ اس بند آنکھ پر ڈیوس نے جان بوجھ کر ضربیں لگائی تھیں اور اسے مزید زخمی کر دیا تھا۔ اگر وہ مجھے نیک لاک لگانے میں کامیاب ہو جاتا تو شاید یہ چمپئن شپ کا سیمی فائنل یہیں پر ختم ہو جاتا لیکن عین موقع پر میں نے بازی پلٹ دی۔ میں نے پوری طاقت سے خود کو پلٹا اور اسے اپنے نیچے کر لیا۔ میرے طوفانی گھونسے نے اس کا بالائی ہونٹ پھاڑ ڈالا اور اس کے ساتھ ہی اس کا بازو میرے شکنجے میں آگیا۔ جدید طرز کی لڑائی میں ایسے آرم لاک بڑے کامیاب ثابت ہوتے ہیں۔ میں نے ڈیوس کو پوری طرح اپنے نیچے دبا لیا اور اس کے بازو کو پورے زور سے مروڑنے لگا تاکہ وہ ہار تسلیم کر لے۔ رنگ کے گرد موجود سیکڑوں تماشائی فلک شگاف نعرے لگا رہے تھے۔ بھدے نقوش والے اس غنڈا صورت سیاہ فام کے مقابل میں میرے سپورٹر کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ میں نے آخر وقت تک کوشش کی کہ ضدی ڈیوس ہار مان لے اور فرش پر ہاتھ مار کر یا ویسے ہی بول کر اپنی شکست کا اعلان کر دے لیکن وہ مسلسل مزاحمت کر رہا تھا۔ میں

خود بھی زخمی تھا۔اس لیے زیادہ رسک نہیں لے سکتا تھا۔ میں نے زور لگایا اور ڈیوس کا بازو تین جگہ سے ٹوٹ گیا۔ ہڈی کڑکڑانے کی آواز اتنی واضح تھی کہ ڈیوس کے کئی سپورٹر چلا اٹھے۔ مقابلہ ختم ہوگیا۔ میں نے دونوں ہاتھ فاتحانہ انداز میں بلند کیے۔ میرے سپورٹرز دیوانہ وار رِنگ میں گھسے اور انہوں نے مجھے کندھوں پر اٹھالیا۔

میوزک بج رہا تھا۔ بیسیوں فلیش لائٹس چمک رہی تھیں۔ رِنگ کے گرد لوگوں کی ٹولیاں پُرجوش انداز میں رقص کررہی تھیں پھر میری فتح کا باقاعدہ اعلان ہوا۔ میں رِنگ سے نیچے اترا اور گاؤن پہن کر ڈریسنگ روم کی طرف روانہ ہوا۔ راستے کی دونوں جانب سیکڑوں تماشائی کھڑے تھے۔ وہ مجھے چھُونا چاہتے تھے، ہاتھ لگانا چاہتے تھے۔ سکیورٹی مجھے حصار میں لیے ہوئے تھے۔ ماضی قریب کے یہ لمحے میرے لیے بھی یادگار تھے۔ میرے خیالوں کا تسلسل روبی کی آمد نے توڑا۔ وہ لہراتی بل کھاتی اندر آئی۔ اس کے ہاتھ میں خوشنما ٹرے تھی اور اس میں ڈرائی فروٹس کے علاوہ اسٹابری کا جوس تھا۔ ٹرے میرے قریب رکھتے ہوئے وہ ذرا شوخی سے بولی۔ ''جناب لگتا ہے کہ آپ بھی فائٹس وغیرہ شوق سے دیکھتے ہیں۔''

''ہاں ......کبھی کبھی۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔

''اگر ایسا ہے تو آپ کو پرسوں یہاں ایک لائیو فائٹ بھی دیکھنے کو مل سکتی ہے۔ باکسنگ کا زبردست مقابلہ ہونے والا ہے دو بندوں کے بیچ۔''

''باکسنگ کا مقابلہ دو بندوں کے بیچ ہی ہوتا ہے۔'' میں نے روکھے پن سے کہا۔

وہ ذرا خجل ہوکر بولی۔ ''بڑے جوش سے تیاری ہورہی ہے جی۔ ابھی کچھ دیر پہلے آپ نے جو نعرے بازی سنی تھی وہ اسی مقابلے کے سلسلے میں تھی۔

میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کھڑکی سے باہر ٹی وی اسکرین کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ کیسی مارکٹائی ہورہی تھی؟''

وہ بے تکلفی سے بولی۔ ''یہ دونوں بڑے مشہور فائٹر ہیں جی۔ ایک شاید اٹلی کا ہے دوسرا ڈنمارک کا۔ یہ جو ڈنمارک والا ہے ناں اس کے ماں باپ ہمارے ہی علاقے سے ہیں۔ کچھ کہتے ہیں انڈین ہیں، کچھ کہتے ہیں پاکستانی ہیں۔ اس کا اصل نام تو کچھ اور ہوگا لیکن اس فیلڈ میں اسے ایسٹرن کنگ کہہ کر پکارا جاتا ہے اور واقعی پچھلے دو چار سالوں میں اس نے خود کو کنگ ثابت بھی کیا ہے۔''

''ایسٹرن ......کنگ۔'' میں نے منہ میں دہرایا۔ وہ مجھے میرے ہی بارے میں بتارہی تھی اور یقیناً اس کے دماغ کے کسی دور دراز گوشے میں بھی یہ بات موجود نہیں ہوگی کہ وہ جس

شخص کے بارے میں باتیں کر رہی ہے، وہ اسی کمرے میں اس سے دو تین فٹ کے فاصلے پر موجود ہے۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''دراصل یہی فائٹ تھی جی...... جس نے اس بندے کو اوپر تک پہنچایا۔ یہ فائٹ اس نے بڑے جذبے کے ساتھ لڑی تھی، اس کے پیچھے ایک اسٹوری ہے جی۔ اگر آپ سننا پسند کریں تو میں مختار جھارا کو بلاؤں، وہ آپ کو پوری تفصیل کے ساتھ سنا سکتا ہے۔''

''نہیں...... اس کی ضرورت نہیں پھر سہی۔'' میں نے کہا۔

اسکرین پر اب ایک عمر رسیدہ کوچ کا انٹرویو نشر ہونے لگا تھا اور اسکرین کے سامنے موجود افراد خوش گپیوں میں مصروف ہو گئے تھے۔

میں نیرنگی حالات کے بارے میں سوچ رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا۔ میں جاننا چاہ رہا تھا کہ اس بیسمینٹ سے باہر حالات کیا ہیں اور میرے بارے میں کچھ کہا سنا جا رہا ہے یا اب میڈیا والوں کے ہتھے کوئی اور تازہ خبر چڑھ گئی ہے؟ میں نے روبی سے کہا کہ وہ کمرے کا ٹی وی آن کرے۔ اس نے ٹی وی آن کر دیا۔ میں نے کئی چینل بدلے لیکن فی الحال کہیں کوئی نیوز دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے ٹی وی آف کیا اور لیٹ گیا۔

آنکھوں کے سامنے پھر وہی دردناک فلم چلنے لگی جس نے مجھے میری بنیادوں سے ہلا ڈالا تھا۔ میں نے سوچا، فائزہ مہندی لگے ہاتھوں کے ساتھ قبر میں جا لیٹی ہوگی، چچی آمنہ بھی جرم بے گناہی کی سزا میں منوں مٹی اوڑھ چکی ہوں گی۔ اسپتال میں ولید کی حالت معلوم نہیں کیا تھی، وہ زندہ بھی تھا یا نہیں اور چچا حفیظ وہ پتا نہیں کس قیامت کا سامنا کر رہے ہوں گے؟ اگر مجھے اور ولید کو دہشت گرد ٹھہرایا جا رہا تھا تو پھر یقیناً چچا بھی دہشت گردوں کے پشت پناہ تصور کیے جانے تھے۔ عین ممکن تھا کہ وہ اپنے گھر کے بجائے پولیس کی کسٹڈی میں ہوں۔ سوچ سوچ کر میرا سر درد سے پھٹنے لگا۔

پتا نہیں کس وقت غنودگی طاری ہوئی اور پھر میں سو گیا۔ اچانک مجھے لگا کہ کوئی چلا چلا کر میرے کان کے پردے پھاڑ رہا ہے اور میرے جسم پر ہتھوڑے برسائے جا رہے ہیں۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ کوئی میرے اوپر چڑھا ہوا تھا اور اس کے فولادی گھونسے میرے چہرے پر برس رہے تھے۔

''ماردوں گا...... جان سے ماردوں گا۔'' وہ شخص دہاڑ رہا تھا۔ اس نے شراب پی رکھی تھی۔ الکحل کی تیز بُو میرے نتھنوں میں گھسنے لگی۔ میں نے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی۔ اس

نے سر کی ٹکر میرے چہرے پر رسید کی۔ میں ٹیبل لیمپ پر گرا اور کمرے میں مکمل تاریکی چھا گئی۔ مجھے سنبھلنے میں چار پانچ سیکنڈ مزید لگے۔اس دوران میں اس توانا شخص نے میرے جسم پر کئی ضربیں مزید لگائیں۔ یہ ضربیں کسی نہایت سخت چیز سے لگائی گئی تھیں جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا کہ ایک ہاکی تھی۔ میرے کندھے پر لگنے والی ایک ضرب تو اتنی شدید تھی کہ ہنسلی کی ہڈی ٹوٹنے میں معمولی سی کسر رہ گئی تھی۔

سنبھلنے کے بعد میں نے تاریکی میں تاک کر اپنے مدِمقابل کے چہرے پر گھونسا رسید کیا۔ وہ لڑکھڑا کر دو قدم پیچھے گیا۔ اسی دوران میں کوئی بھاری آواز میں زور سے بولا اور ساتھ ہی ٹرچ کی آواز کے ساتھ کمرے میں روشنی ہوگئی۔ اندر آنے والا خود داؤد عرف بھاؤ جی تھا۔

وہ دھاڑا۔ ''یہ کیا ہورہا ہے؟''

مجھ پر حملہ آور ہونے والا نہایت گھٹے ہوئے جسم اور صفاچٹ سر والا ایک پہلوان نما شخص تھا۔ اس نے دھاری دار شرٹ اور جین پہن رکھی تھی۔ سانولا چہرہ نشے کے اثر سے مزید سانولا نظر آرہا تھا۔ داؤد کے روکنے کے باوجود وہ ایک بار پھر بپھرے ہوئے سانڈ کی طرح میری طرف آیا لیکن مجھ تک پہنچنے سے پہلے ہی چوڑے چکلے داؤد نے اسے روک لیا۔ داؤد نے اسے بازوؤں میں جکڑ کر پیچھے ہٹایا اور پھر ایک زور کا تھپڑ اس کے منہ پر رسید کیا۔

''ہوش کر لودھی...... یہ ہماری پناہ میں ہے۔'' داؤد گرجا۔

نشے نے جیسے اس شخص کی عقل خبط کر رکھی تھی۔ اس نے مچل کر خود کو چھڑانا چاہا۔ داؤد نے ایک اور تھپڑ اس کے چہرے پر جڑا اور چنگھاڑا۔ ''میری بات نہیں سن رہا تو۔ میں کیا کہہ رہا ہوں...... میں کیا کہہ رہا ہوں۔'' وہ اس لودھی نامی شخص کو دھکیلتا ہوا کمرے سے باہر لے گیا۔

روبی نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ دروازے کی دوسری طرف سے چند لمحے تک گرجنے برسنے کی آوازیں آتی رہیں پھر خاموشی چھا گئی۔

میرے دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے خون رِسنے لگا تھا۔ ٹانگ اور کندھے پر بھی چوٹیں آئی تھیں۔ یہ مرے کو ماریں شاہ مدار والی بات تھی۔ میں تو پہلے ہی جسمانی اور ذہنی طور پر شدید اذیت کا شکار تھا۔ روبی جلدی سے آگے آئی۔ اس نے میری خونچکاں انگلیوں کو ٹشو پیپر سے صاف کیا اور انہیں دبا کر کھڑی ہوگئی۔ وہ پریشان نظر آرہی تھی۔

''آپ کو تو کافی چوٹیں آئی ہیں۔'' وہ بولی۔

''نہیں......کوئی بات نہیں...... ویسے کون تھا یہ؟''

وہ خشک لبوں پر زبان پھیر کر بولی۔ ''راول...... راول لودھی...... کراچی سے آیا ہے۔ باکسنگ کرتا ہے۔''

''میرے ساتھ اسے کیا دشمنی ہے؟''

وہ ذرا توقف سے بولی۔ ''یہ واحد کا بھائی ہے...... چھوٹا بھائی۔''

''کون واحد؟''

''یہاں آنے سے پہلے بھٹے کے قریب آپ کی لڑائی ہوئی تھی ناں، جس بندے کی ٹانگ میں گولی لگی ہے۔ وہی واحد ہے۔'' اس نے مجھے یاد دلایا۔

''اچھا...... تو وہ اس کا غصہ اتار رہا ہے۔''

''داؤد جی نے اسے خوب لتاڑا ہے۔ آپ کے سامنے ہی تھپڑ بھی مارے ہیں اسے۔ خبیث ابھی نشے میں ہے۔ نشہ اترے گا تو داؤد صاحب دوبارہ اس کی کلاس لیں گے۔ آج کل مقابلے کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی اکڑ آ گئی ہے اس میں۔''

''مقابلہ؟''

''وہی باکسنگ کا مقابلہ۔ میں نے بتایا تھا نا آپ کو کہ یہاں آج کل مقابلے وغیرہ ہو رہے ہیں۔ یہ لودھی فائنل مقابلے تک پہنچا ہوا ہے اور پرسوں فائنل ہے۔''

اسی دوران میں داؤد تیز قدموں سے اندر آ گیا۔ وہ اب شلوار قمیص اور کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس نے میری چوٹیں دیکھیں اور افسوس کا اظہار کیا۔ اس نے سنگل پسلی جھارے کو اندر بلایا اور اس سے کہہ کر میری انگلیوں کی مرہم پٹی کروائی۔ کمرے میں جو ٹوٹ پھوٹ ہوئی تھی، روبی نے اپنے ہاتھوں سے اس کی صفائی کر دی۔ داؤد کے چہرے سے عیاں تھا کہ اسے لودھی کی اس حرکت پر شدید طیش ہے۔ میں نے اس کا طیش رفع کرنے کی کوشش کی اور کسی حد تک کامیاب رہا۔ وال کلاک کی سوئیاں بتا رہی تھیں کہ اب صبح ہونے والی ہے۔ داؤد نے بھی اب پھر سے سونے کے بجائے جاگتے رہنا مناسب سمجھا۔ اب تک مجھے اچھی طرح اندازہ ہو چکا تھا کہ نوخیز روبی کی حیثیت داؤد کی رکھیل کی سی ہے۔ (وہ عمر میں اس سے پندرہ سولہ سال چھوٹی ہوگی) لیکن وہ شاید ایسی رکھیل تھی جسے وہ اپنے تک پابند رکھنے کا خواہش مند نہیں تھا۔ بوقتِ ضرورت کسی بھی مہمان یا دوست کو پیش کر سکتا تھا۔

داؤد نے اسے شراب اور ڈرائی فروٹس وغیرہ لانے کا حکم دیا۔ میں نے اپنے لیے اوولٹین ملا دودھ منگوایا۔ یہ چیزیں آ گئیں تو داؤد کا طیش مزید کم ہو گیا اور وہ نارمل نظر آنے لگا۔ اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور ذرا سا مسکرا کر بولا۔ ''اب بتاؤ، اپنے بارے

میں...... کہاں کہاں بم پھوڑے ہیں اور کہاں کہاں دہشت گردیاں کی ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''بتانے کی ضرورت نہیں آپ سب سمجھ ہی گئے ہوں گے۔ یہ پولیس والے تو چوہے کو بھی ہاتھی ثابت کرتے ہیں اور چوہا خود اقرار کرتا ہے کہ وہ واقعی ہاتھی ہے۔''

داؤد بولا۔ ''مجھے پتا چلا ہے کہ وہاں مراد پور میں کہیں آگ لگنے کا واقعہ بھی ہوا ہے جس میں دو تین ہلاکتیں ہوئی ہیں۔ پولیس کہہ رہی ہے کہ وہاں دھماکا خیز مواد بنایا جا رہا تھا؟''

''جی ہاں...... وہاں گولے بارود کی فیکٹری میں اور میرا کزن ہی چلا رہے تھے اور ہماری اس مجرمانہ سرگرمی کی وجہ سے میری چچی اور چچی زاد بہن کی جانیں بھی گئی ہیں۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا اور میرا سینہ دکھ سے بھر گیا۔

''مجھے یہ سن کر بڑا افسوس ہوا...... اوپر والا تمہیں صبر دے۔'' داؤد نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ کچھ دیر بغور میری طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''مجھے بتاؤ...... کہیں یہ زمینوں پر قبضے وغیرہ کا چکر تو نہیں؟''

''آپ...... یہ کیوں کہہ رہے ہیں؟''

''جہاں تک مجھے پتا ہے، اس علاقے میں داراب فیملی ایک بڑی ہاؤسنگ اسکیم بنا رہی ہے۔ زمینداروں اور پروپرائٹرز سے ان کے جھگڑے چل رہے ہیں۔''

''آپ ٹھیک سمجھ رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''مجھے کچھ تفصیل بتاؤ۔'' داؤد بولا۔

میں نے اپنی زخمی انگلیوں کو سہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کو کافی کچھ بتا رہا ہوں لیکن آپ نے ابھی تک کچھ نہیں بتایا۔ میں کہاں ہوں...... اور یہاں میری حیثیت کیا ہے؟ اس کے علاوہ ابھی مجھے آپ کے بارے میں بھی کچھ پتا نہیں۔''

داؤد نے ایک قیمتی لائٹر سے امپورٹڈ سگریٹ سلگایا اور بولا۔ ''سمجھو کہ جس طرح کچھ لوگ سیلف میڈ ہوتے ہیں اسی طرح کچھ لوگ پولیس میڈ ہوتے ہیں۔ وہ جو کچھ ہوتے ہیں انہیں پولیس گردی نے یا پھر جیل کے ماحول نے بنایا ہوتا ہے۔ شاید میں بھی ان میں سے ایک ہوں۔ میرا اندازہ ہے کہ تم اس شہر میں بلکہ شاید اس ملک میں نئے نئے آئے ہو۔ اگر تم لاہوریے ہوتے تو میرے بارے میں تھوڑا بہت تو ضرور جانتے ہوتے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں کچھ ہی دن پہلے ڈنمارک سے یہاں آیا ہوں اور آنے کے چند گھنٹے بعد ہی مراد پور کی پولیس نے مجھے پرلے درجے کا قانون شکن ثابت کر دیا تھا اور میری قانون شکنی یہ تھی کہ میں نے ایک زخمی کو سڑک سے اٹھا کر اسپتال پہنچانے کی غلطی کی

تھی۔''

داؤد زہریلے انداز میں بولا۔''یہ تو خیر کافی بڑی غلطی تھی،اس سے چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر بھی یہاں لوگوں کی زندگیاں تباہ کردی جاتی ہیں۔''

میرے اور داؤد کے درمیان قریباً دو گھنٹے تک گفتگو ہوئی۔اس گفتگو کے دوران میں ہی ہم نے ناشتا بھی کیا۔داؤد کی باتوں سے پتا چلا کہ میں اس وقت لاہور شہر کے بیچوں بیچ ایک نہایت محفوظ ٹھکانے پر موجود ہوں۔یہاں میرے علاوہ بھی بہت سے ایسے لوگ موجود ہیں جو پولیس کو فوری مطلوب ہیں اور ان کی حیثیت اشتہاریوں یا مفروروں کی ہے۔یہ سارے لوگ اس یقین اور اطمینان کے ساتھ یہاں رہ رہے ہیں کہ پولیس یا پولیس کا کوئی مخبر یہاں پَر بھی نہیں مار سکتا۔اس وسیع تہ خانے کے اوپر ایک بڑا بلیئرڈ کلب تھا اور اسنوکر وغیرہ بھی ہوتی تھی۔اس تہ خانے میں اترنے کے لیے ایک راستہ بلیئرڈ کلب میں ہی موجود تھا لیکن اسے کسی ہنگامی صورتِ حال کے علاوہ استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔تہ خانے میں آنے جانے کے لیے ایک ملحقہ گیسٹ ہاؤس میں سے چور راستہ نکالا گیا تھا اور ہم رات کو اسی راستے سے تہ خانے میں پہنچے تھے۔

داؤد نے مجھے اپنے بارے میں بہت کم بتایا۔تاہم جو کچھ بھی بتایا اس سے اندازہ ہوا کہ داؤد کی حیثیت ایک دبنگ جرائم پیشہ شخص کی ہے لیکن وہ ہر کام بہت صفائی سے کرتا ہے۔انتظامیہ اس کے خلاف ثبوت ڈھونڈنے میں سرگرداں رہتی ہے لیکن بہت کم کامیاب ہو پاتی ہے اور اگر کامیاب ہوتی بھی ہے تو داؤد قانونی لڑائی لڑنے کا ماہر ہے۔وہ اپنے خلاف چلنے والے کئی کیسوں کو بڑی کامیابی سے ہینڈل کر رہا تھا بہت سے کیس سرد خانوں میں جا چکے تھے اور جو سرد خانوں میں نہیں تھے ان میں اس کی ضمانتیں ہوتی رہتی تھیں۔اس نے بڑے فخر سے مجھے بتایا کہ اس نے اب تک جو زیادہ سے زیادہ جیل کاٹی ہے وہ آٹھ ماہ پندرہ دن کی ہے۔

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی ایک اعلیٰ سرکاری عہدیدار کا فون اس کے لیے آیا جس میں اس کی خیر خیریت دریافت کی گئی اور اس سے ٹی وی کی کسی ماڈل گرل کو دھمکانے کے بارے میں کہا گیا۔

مجھے اندازہ ہوا کہ میں قانون کے محافظوں سے بھاگتے بھاگتے نادانستہ طور پر کچھ ایسے قانون شکنوں میں پہنچ گیا ہوں جن کے ہاتھ بہت لمبے اور حوصلے بہت اونچے ہیں۔یہ اڈا ان مجرموں کی پناہ گاہ تھی جو کچھ عرصے کے لیے زیر زمین رہنا چاہتے تھے یا پھر ویسے ہی پولیس ان کو ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔وہ یہاں سے باہر نہیں نکلتے تھے اور انہیں یہیں پر داؤد کی طرف سے

ساری سہولتیں اور عیاشیاں میسر تھیں۔
داؤد کی باتوں کے جواب میں، میں نے بھی اسے اپنے بارے میں تھوڑا بہت بتایا۔ بہر حال یہ بات دوسروں کی طرح داؤد کے لیے بھی ایک راز ہی رہی کہ میں ڈنمارک میں کیا تھا؟ اس کے باوجود داؤد جیسا گھاگ شخص اتنا تو جان ہی چکا تھا کہ میں لڑائی بھڑائی کی خصوصی صلاحیت رکھتا ہوں اور ہوسکتا ہے کہ میں نے اس کے لیے کوئی خاص تربیت بھی حاصل کی ہو۔
وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ''تم نے کچھ بتایا تو نہیں ہے لیکن مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ اگر تم نے یہ سارا عرصہ واقعی ڈنمارک میں گزارا ہے تو پھر چین وسکون سے نہیں گزارا ہوگا؟''
''کیا مطلب؟''
وہ مسکرایا۔ ''مطلب یہ کہ اپنے چین سکون کے علاوہ دوسروں کے چین سکون کی بھی واٹ لگائی ہوگی۔ میرا دل کہتا ہے کہ کافی مارا ماری والی لائف گزارتے رہے ہو۔''
''کیسے اندازہ لگایا آپ نے؟''
''واحد اور فاروق میرے بڑے تگڑے بندوں میں سے ہیں۔ دو چار کو آسانی کے ساتھ خالی ہاتھوں سے لمبا لٹا سکتے ہیں۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولا۔
''تعریف کا شکریہ...... لیکن مجھے افسوس ہے کہ مجھے فائر کرنا پڑا اور آپ کا بندہ زخمی ہوا۔''
وہ سگریٹ کا طویل کش لے کر بولا۔ ''اور جہاں تک میرا خیال ہے تم نے وہ ٹھیک ہی کیا۔ میں گاڑی کے اندر سے وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ لڑائی کے اصول کے مطابق تمہارا وہ فیصلہ بہت بروقت تھا۔ اگر تم گولی نہ چلاتے تو یقیناً واحد رائفل اٹھا کر تم پر فائر کر دیتا اور شاید وہ تمہاری ٹانگ پر نہ کرتا۔ ویسے وہ پستول وہی تھا نا جو تم نے ایس پی سے چھینا تھا...... ایس پی تبریز سے؟''
''ہاں، اس میں صرف ایک ہی گولی تھی۔ باقی گولیاں میں نے اس وقت ہوا میں چلائیں جب تبریز کے ملازم کھیتوں میں میرا پیچھا کر رہے تھے۔''
''اب کیا ارادے ہیں؟''
میں نے گہری سانس لی۔ ''میری سمجھ میں تو ابھی کچھ نہیں آ رہا۔''
''تو جب تک اچھی طرح سمجھ میں نہیں آ جاتا، بڑے اطمینان سے یہاں رہو۔ سمجھو کہ

تمہاری حیثیت یہاں میرے خصوصی مہمان کی ہے۔"
"بہت شکریہ۔" میں نے کہا۔
وہ میرا کندھا تھپک کر اٹھ کھڑا ہوا اور دروازے کی طرف بڑھا لیکن باہر نکلنے سے پہلے رک گیا۔ واپس میری طرف آیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "اور میں تو کہتا ہوں ابھی باہر جانے کا ارادہ ہی ترک کردو۔ باہر خطرہ ہے تمہارے لیے، ویسے بھی تم انصاف چاہتے ہو نا اور انصاف یہاں مانگنے سے نہیں ملے گا اسے چھیننا پڑے گا۔"
میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ مجھے بائے کہتا ہوا باہر نکل گیا۔ وہ اپنی شکل سے اور طرح کا لگتا تھا لیکن بول چال سے پڑھا لکھا بھی محسوس ہوتا تھا۔

○......❖......○

وہ سارا دن میں نے سخت اذیت میں گزارا۔ اس بیسمینٹ میں سیل فون کے سگنل کمزور تھے لیکن اتنے بھی نہیں تھے کہ کال نہ ہو سکتی۔ ایک گمنام نمبر سے میں نے کئی بار عبداللہ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر ہر بار ناکام رہا۔ اس کا فون بند جا رہا تھا۔ چچا کی صورتِ حال کے بارے میں بھی کچھ خبر نہیں مل رہی تھی۔ بہرحال داؤد نے مجھے اتنا معلوم کر کے بتا دیا تھا کہ ولید گنگا رام اسپتال کے انتہائی نگہداشت وارڈ میں ہے۔ اس بات کی امید دکھائی دے رہی تھی کہ اس کی جان بچ جائے گی۔
رات کے وقت میں نے یہاں کے وسیع و عریض ہال میں گھوم پھر کر بھی دیکھا۔ اس وقت داؤد اور مختار جھارا میرے ساتھ تھے۔ داؤد اس جگہ کا بے تاج بادشاہ تھا اور اس کی رعایا بھی معمولی نہیں تھی۔ میں شکلیں دیکھ کر ہی اندازہ لگا سکتا تھا کہ شہر کا ایک سے ایک بڑھ کر غنڈا، جرائم پیشہ اور سزا یافتہ یہاں موجود ہے۔ یہ معاشرے اور قانون سے بھاگے ہوئے لوگوں کی ایک چھوٹی سی بستی تھی جہاں وہ مکافاتِ عمل کے خوف سے وقتی طور پر آزاد ہو کر موج مستی کے دن گزار رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ صورتِ حال زیادہ دیر چلنے والی نہیں تھی۔ بہت جلد یہ جگہ انتظامیہ کی نظر میں آ جانا تھی مگر داؤد کی باتوں سے پتا چلا تھا کہ اسے اس کی زیادہ فکر نہیں۔ اس کے پاس لاہور میں ہی ایسے درجنوں ٹھکانے تھے جہاں وہ اپنے ان خصوصی مہمانوں کی پناہ کا انتظام کر سکتا تھا۔ ایک چور راستے سے نکل کر دوسرا ٹھکانا اور دوسرے چور راستے سے نکل کر تیسرا ٹھکانا۔
ایک جگہ مجھے باکسنگ کے رنگ جیسا ایک اسٹیج نظر آیا۔ یہاں کل کے مقابلے کی تیاری ہو رہی تھی۔ رنگ کے گرد رسے وغیرہ درست کیے جا رہے تھے اور لائٹس لگائی جا رہی تھیں۔

داؤد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''فائنل مقابلے کے علاوہ بھی چھوٹے بڑے مقابلے ہوں گے، کیا تم کسی میں حصہ لینا چاہو گے؟''

''نہیں داؤد بھائی...... یہ میری فیلڈ نہیں ہے۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔

O......❖......O

اگلے روز وسیع ہال میں کافی گہما گہمی نظر آئی۔ نعرے بازی بھی ہو رہی تھی۔ لوگ چار پانچ ٹولیوں میں بٹے ہوئے تھے اور شور مچا رہے تھے۔ یہ نعرہ بازی فائنل میں حصہ لینے والے دونوں باکسرز کے بارے میں تھی۔ پہلا باکسر تو وہی لودھی نامی سر منڈا تھا جس نے کل شب نشے میں دھت ہو کر مجھ پر ہلا بولا تھا۔ دوسرا کریم نام کا ایک لڑکا تھا یہ حیدر آباد کا تھا۔ شکل کچھ کچھ مکرانیوں جیسی تھی۔ بال گھنگھریالے اور رنگ سانولا، نقوش عام باکسروں کی نسبت کافی اچھے تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ دونوں باکسرز پر کافی شرطیں بھی لگی ہوئی ہیں۔ یہاں موجود سارے تماشائی کھاتے پیتے جرائم پیشہ تھے۔ یقیناً کسی کے پاس چھینا جھپٹی اور دیگر وارداتوں سے حاصل ہونے والا مال حرام بھی ہوگا۔ یہ بھی بعید از قیاس نہیں تھا کہ کوئی ڈکیت یا قاتل لاکھوں سمیٹ کر بیٹھا ہو۔ ماحول سے پتا چل رہا تھا کہ کریم کی مقبولیت زیادہ ہے مگر شرطیں زیادہ لودھی پر لگائی گئی تھیں۔

مقابلوں کا آغاز شام سات بجے کے بعد ہوا۔ زوردار میوزک پلے ہو رہا تھا اور اکثر تماشائیوں نے پی رکھی تھی۔ کئی ایک کی بغل میں قبول صورت لڑکیاں بھی تھیں جن سے وہ سر عام چھیڑ خانیاں کر رہے تھے۔ دو چار افراد میں چھوٹی موٹی جھڑپیں بھی ہوئیں مگر داؤد کے اسسٹنٹ مختار جھارا نے معاملہ بگڑنے نہیں دیا۔ مختار جھارا کی صلاحیتیں آہستہ آہستہ آشکار ہو رہی تھیں۔ کہنے کو تو وہ چوبیس پچیس سال کا ایک مخنی سا شخص تھا لیکن کم بخت میں زور بلا کا تھا۔ آواز بھی جسم کے برعکس کافی بھاری تھی۔ میں نے اس کانگڑی پہلوان کے دم خم کا مظاہرہ ریسٹورنٹ کے بار کے سامنے ہونے والی ایک چھوٹی سی جھڑپ میں کیا۔ ایک شرابی نے مستی کی۔ اس کی ایک آنکھ کسی پرانے حادثے کی وجہ سے ضائع ہو چکی تھی۔ وہ ٹھوکر لگنے کے بہانے ایک لڑکی کے اوپر جا گرا۔ اس گرنے کے دوران میں ہی اس نے لڑکی کو نوچا بھی تھا۔ لڑکی بے شک کوئی طوائف زادی ہی تھی مگر احتجاج کیے بغیر نہ رہ سکی۔ اس نے یک چشم شرابی کو تھپڑ دے مارا۔ اس نے اس کا بلاؤز پھاڑ دیا۔ لڑکی کا موٹا تازہ ساتھی یک چشم پر پل پڑا۔ ایسے میں کانگڑی پہلوان جھارا آگے بڑھا۔ اس نے قصوروار شرابی کو پیچھے سے اپنے بازوؤں میں جکڑا۔ پہلے اس روکنے کی کوشش کی پھر گھما کر ایک ستون کے ساتھ دے مارا اور اس پر

ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ کچھ اور لڑکے آ گئے اور وہ یک چشم کو گھسیٹ کر ہال سے باہر لے گئے۔

بالآخر رنگ کے اندر مقابلے شروع ہوئے۔ فائنل سے پہلے کل چار مقابلے تھے۔ دو جوڑ تو ٹھیک تھے اور لگتا تھا کہ کھلاڑیوں کو باکسنگ آتی ہے مگر دو جوڑ بالکل مارکٹائی کے تھے۔ یہ عام لڑاکو افراد تھے۔ بس انہیں دستانے پہنا دیئے گئے تھے۔ وہ ایک دوسرے پر الٹے سیدھے ہاتھ چلا رہے تھے اور گالیاں بک رہے تھے۔ ایسے میں ہی ایک شخص کی ناف پر بہت زور سے مکا لگا اور وہ گر کر کچھ دیر کے لیے نیم بے ہوش ہو گیا۔

آدھ پون گھنٹے بعد اصل مقابلہ شروع ہوا۔ دونوں حریف میدان میں آئے۔ انہوں نے باقاعدہ باکسرز والا کاسٹیوم پہن رکھا تھا اور طور اطوار سے بھی پتا چلتا تھا کہ وہ باکسنگ کی شدبد رکھتے ہیں۔ دونوں کے جسم کسرتی اور مضبوط تھے۔ یہ دس راؤنڈ کا مقابلہ تھا، ہر راؤنڈ تین منٹ کا تھا۔ ریفری ایک ریٹائرڈ کرسچین باکسر تھا جو حال ہی میں جیل کاٹ کر لوٹا تھا۔

یہ اہم مقابلہ شروع ہونے سے پہلے ہال کی لائٹس بجھا کر نیم تاریکی پیدا کر دی گئی۔ صرف اسٹیج یعنی رِنگ پر فل روشنی رہی۔ مقابلہ شروع ہوا دونوں حریفوں نے ایک دوسرے پر آگے بڑھ کر حملے کیے۔ وہ خود کو جو بھی سمجھ رہے ہوں لیکن میں جانتا تھا کہ وہ کس کیٹیگری کے فائٹر ہیں۔ مکے بازی جاری رہی۔ پہلا راؤنڈ شروع ہوئے بمشکل ایک منٹ ہی ہوا تھا کہ کھیل ختم ہو گیا۔

بالکل اچانک ہی لودھی کا ایک بھرپور پنچ کریم کی ٹھوڑی پر لگا اور وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح دھڑام سے اسٹیج پر گرا۔ لوگوں کو یقین نہیں آیا۔ ریفری نے گنتی شروع کی۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ریفری بول رہا تھا "سات......آٹھ......نو......دس۔"

اس نے مقابلہ ختم ہونے کا اعلان کر دیا۔ تماشائی ہکا بکا رہ گئے۔ باکسنگ کے کھیل میں کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔ خاص طور پر ہیوی ویٹ باکسرز کے شروع کے ایک دو راؤنڈ بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ اگر کسی کو ایک بھرپور اسٹاک پنچ لگ جائے تو وہ ناک آؤٹ ہونے میں دیر نہیں لگاتا۔ یہاں بھی یہی کچھ ہوا تھا۔

لودھی کی فتح کا اعلان ہو گیا۔ اس نے چھاتی کوٹ کوٹ کر اور بلند آواز میں چنگھاڑ چنگھاڑ کر اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ بہرحال اکثر تماشائیوں کو بالکل بھی مزہ نہیں آیا تھا۔ وہ تو ایک اچھی اور سنسنی خیز مقابلے کی توقع کر رہے تھے۔ چند افراد نے "نوری......نوری" کے نعرے بھی لگائے یعنی یہ ایک فکسڈ مقابلہ تھا لیکن یہ آوازیں زیادہ زور نہیں پکڑ سکیں کیونکہ جو کچھ ہوا

سب کے سامنے تھا۔ اتفاقیہ طور پر کریم کو اتفاقی ایک زبردست پنچ نے زمین بوس کر دیا تھا۔

تماشائیوں کی مایوسی دور کرنے کے لیے کچھ دیر بعد یہ اعلان کیا گیا کہ نیا کلب چمپئن لودھی یہاں موجود کسی بھی شخص سے ایک اور مقابلہ کرنے کو تیار ہے اور یہ مقابلہ وہ صرف ایک ہاتھ سے کرے گا یعنی وہ اپنا اسٹاک پنچ استعمال نہیں کرے گا اور اس بازو کو اپنے جسم کے ساتھ باندھے رکھے گا۔

دو تین منٹ تک یہ اعلان ہوتا رہا لیکن کوئی بھی بپھرے ہوئے چمپئن کے سامنے نہیں آیا۔ تب ایک اور اعلان ہوا۔

''لودھی بھائی دو بندوں سے ایک ساتھ مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہیں۔ ان کا ایک ہاتھ اسی طرح بندھا رہے گا۔''

اب حاضرین میں تھوڑی سی ہلچل نظر آئی مگر سامنے آنے کو پھر بھی کوئی تیار نہیں تھا۔

داؤد نے مجھے ٹہوکا دیتے ہوئے کہا۔ ''شاہ زیب! اس کا غرور ذرا ٹوٹنا چاہیے، میرا خیال ہے کہ ایک تو تم کھڑے ہو جاؤ۔''

''نہیں داؤد بھائی۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں ایسے چکر میں پڑنا نہیں چاہتا ویسے بھی......'' میں کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

''کیا......ویسے بھی؟'' داؤد نے پوچھا۔

میں کہنا چاہ رہا تھا کہ ویسے بھی یہ میری کیٹیگری کے لوگ نہیں ہیں لیکن میں نے فقرہ بدلتے ہوئے کہا۔ ''ویسے بھی میری انگلیوں پر چوٹ آئی ہوئی ہے۔''

اس نے غور سے میری طرف دیکھا پھر میری انگلیوں پر نگاہ ڈال کر بولا۔ ''میں جانتا ہوں، ایسی چوٹیں تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ تمہاری اس دلیل میں کوئی خاص وزن نہیں۔''

اسی دوران میں حاضرین میں سے ایک دراز قد شخص نے لودھی کا چیلنج قبول کر لیا۔ وہ جھجکتا ہوا رنگ پر چڑھ آیا۔ تماشائیوں نے نعرے لگائے۔ اب دوسرے شخص کا انتظار تھا مگر یہ انتظار طویل ہوتا گیا۔ لودھی کا چہرہ جوش سے تمتما رہا تھا۔ اس نے کئی افراد کا نام لے لے کر انہیں اوپر آنے کی دعوت دی مگر کسی کی طرف سے یہ دعوت قبول نہیں کی گئی پھر اس نے جلتی نظروں سے داؤد کو دیکھا اور براہِ راست اس سے مخاطب ہو کر پکارا۔

''بھاؤ جی......کیا سب نے بھنگ پی لی ہے؟ نکالو نا کسی سورما کو۔''

''ابھی کوئی نکل آتا ہے۔'' داؤد نے اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

لودھی کے معاندانہ لہجے سے عیاں تھا کہ وہ اندرونی طور پر داؤد اور اس کے قریبی

ساتھیوں سے خار رکھتا ہے۔شاید اس خار میں اضافہ ان تھپڑوں کی وجہ سے بھی ہوا ہو جو پرسوں لودھی کو میرے بیڈروم میں سہنے پڑے تھے۔

دفعتاً لودھی کی توجہ میری طرف ہو گئی۔اس نے وہی کہا جس کی توقع اس سے کی جاسکتی تھی۔میری طرف اشارہ کر کے اس نے داؤد سے کہا۔''بھاؤ جی! اپنے اس رانی خاں کے سالے کو نکالو نا۔سنا ہے بڑی گرمی ہے اس کے اندر بھی۔''

بات کرتے ہوئے لودھی کا سانولا چہرہ تمتما رہا تھا اور آنکھوں میں نفرت آمیز طیش لشکارے مار رہا تھا۔انداز بے حد تاؤ دلانے والا تھا۔

داؤد نے ایک بار پھر مجھے ٹھوکا دیا۔''شاہ زیب، میں تو کہتا ہوں دو چار ہاتھ دکھاؤ اس کو......میرے خیال میں تو تم اکیلے بھی اس سے نمٹ سکتے ہو۔چلو اٹھو......''

میں نے دیکھا کہ سنگل پسلی مختار جھارا اور داؤد کے دو چار قریبی ساتھی بھی حوصلہ افزا نظروں سے میری طرف دیکھ رہے ہیں۔

داؤد نے مجھے باقاعدہ بازو سے پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کی۔''پلیز داؤد بھائی، میرا ذرا بھی دل نہیں چاہ رہا۔آپ کہیں گے تو پھر کبھی سہی۔''

''شاید ڈر رہے ہو؟'' داؤد نے دھیمے لہجے میں کہا۔

میں نے ایک طویل سانس لی اور اٹھ کھڑا ہوا۔''رانی خاں کے سالے'' والے الفاظ بھی میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔

میں ہموار قدموں سے چلتا لوگوں کے درمیان سے گزرا اور تین زینے طے کر کے رنگ میں داخل ہو گیا۔صفاچٹ سر والے لودھی نے ایک بار پھر جلتی نظروں سے مجھے سر تا پا گھورا اور بولا۔''آ گئے ہو رانی خاں کے سالے۔''

''ہاں آ گیا ہوں۔'' میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

اس نے بدمعاشوں کے انداز میں گردن ٹیڑھی کی۔''میں اکیلا ہوں اور تم دو ہو۔میرا ہاتھ بھی ایک ہے، اگر تم بالکل ہی ہیجڑے نہیں ہو تو میں دوسرا ہاتھ استعمال کرلوں؟''

میں نے کہا۔''دوسرا ہاتھ استعمال کرلو اور اس دوسرے بندے کو بھی باہر بھیج دو، میں اکیلا ہی تمہاری حجامت کروں گا۔''

میرے انداز نے اسے تھوڑا سا چونکایا لیکن فوراً ہی وہ سنبھل گیا اور اس کے چہرے پر سیاہی آمیز سرخی کی لہر دوڑ گئی۔اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی میں نے رنگ میں موجود دراز قد شخص سے کہا۔''تم باہر جاؤ......میں ذرا اکیلا ہی اس کی مردانگی چیک کرتا ہوں۔''

دراز قد شخص تو جیسے پہلے ہی کسی ایسے موقعے کا منتظر تھا۔ اس نے فوراً میری آفر قبول کی اور رنگ سے باہر نکل گیا۔ تماشائیوں کا جوش و خروش بڑھ گیا۔ انہوں نے شور مچا کر اور تالیاں بجا کر میرے فیصلے کو سراہا۔ خاص طور سے کریم کے ہمنواؤں اور داؤد کے قریبی ساتھیوں نے خوشی کا اظہار کیا۔ کرسچین ریفری نے میرے لباس کی تلاشی لی پھر مجھے باکسنگ گلوز پہنا دیئے۔ اس نے مختصر الفاظ میں مجھے مقابلے کی شرائط بھی بتائیں اور زبانی کلامی میری رضامندی بھی دریافت کی۔

اس نے کہا۔ ''وڑی...... یہ پانچ راؤنڈ کا مقابلہ ہوئیں گا۔ ہر راؤنڈ تین منٹ کا...... اور دو راؤنڈز کے درمیان کھالی دو منٹ کا وقفہ ہوئیں گا۔ بیلٹ کے نیچے کوئی مکا نہیں لگایا جائے گا۔ راؤنڈ کے بیچ میں اگر جیادہ چوٹ لگ جائے تو تم کسی بھی وقت مقابلہ کھتم کرنے کا کہہ سکتا ہے......''

میں خاموشی سے سب کچھ سنتا رہا۔ پچھلے آدھ پون گھنٹے میں، میں نے اچھی طرح پرکھ لیا تھا۔ یہاں ایک بھی اس پائے کا فائٹر نہیں تھا کہ دو منٹ بھی میرا سامنا کر سکتا۔ تین تین منٹ کے پانچ راؤنڈ تو بہت زیادہ تھے۔ بہرحال میں یہ مقابلہ جلد ختم کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

کچھ دیر بعد گھنٹی بجی اور باکسنگ شروع ہوئی۔ پہلے ہی منٹ میں اس گھمنڈی چمپئن نے مجھے ایسا کھلا موقع دیا کہ میں اس کی ناک کی ہڈی برابر کر کے اسے رنگ میں لمبا لٹا سکتا تھا لیکن میں نے اسے ہلکے پنچ لگانے پر ہی اکتفا کیا۔ ان ہلکے پنچوں نے بھی اس کا بالائی ہونٹ پھاڑ دیا اور خون اس کی ٹھوڑی کو رنگین کرنے لگا۔ راؤنڈ کے ختم ہونے تک میں نے اسے کئی زوردار چوٹیں لگائیں مگر کوئی چوٹ بھی اتنی سنگین نہیں تھی کہ اسے ناک آؤٹ ہونے کا موقع ملتا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کی حوصلہ افزائی اور تماشائیوں کی دلچسپی کے لیے میں نے خود بھی اس سے چند چوٹیں کھائیں۔

بلی چوہے کا یہ کھیل اگلے راؤنڈ میں بھی جاری رہا۔ اس راؤنڈ میں اس کا نچلا ہونٹ بھی زخمی ہو گیا۔ وہ ایک بار تیورا کر گھٹنوں کے بل بھی گرا مگر میں نے اسے مزید کوئی کاری چوٹ نہ لگا کر سنبھلنے کا موقع دیا۔ اس میں جتنی صلاحیت تھی اسے وہ آٹھ دس گنا بڑھا بھی لیتا تو میرا سامنا نہیں کر سکتا تھا۔ بہرحال میں اسے تھوڑی سی سزا دینا چاہتا تھا۔ میں نے جان بوجھ کر باؤٹ پانچویں راؤنڈ تک کھینچا۔ اس دوران میں دو تین موقع ایسے بھی آئے جب مجھے لگا کہ لودھی صاحب کا بولو رام ہو گیا ہے اور جناب ازخود ناک آؤٹ ہو کر اپنی جان چھڑانے کا سو

رہے ہیں۔ بالآخر پانچویں راؤنڈ کے دوسرے منٹ میں، میں نے چمپئن صاحب کی یہ خواہش پوری کردی۔ کراٹے کی طرز کا ایک راؤنڈ پنچ لگا کر میں نے اسے زمین بوس کر دیا۔

کریم کے حمایتیوں نے شور سے آسمان سر پر اٹھالیا۔ کچھ رِنگ میں داخل ہو گئے اور مجھے کندھوں پر اٹھانے کی کوشش کی جسے کانگڑی پہلوان جھارا نے ناکام بنایا اور اپنی حفاظت میں مجھے لوگوں کے نرغے سے نکال لایا۔ یہاں ہونے والی لڑائی کی شرائط کے مطابق چمپئن شپ تو لودھی کے پاس ہی رہی تھی لیکن چمپئن بنتے ہی اس کی جو دھلائی ہوئی تھی اس نے اس کا سارا مزہ خاک میں بلکہ کہنا چاہیے گوبر میں ملا دیا تھا۔

داؤد نے پُر جوش انداز میں میری پیٹھ ٹھونکی۔ ''مجھے تم سے یہی امید تھی۔ یہ بڑے پَر پُرزے نکالنے لگا تھا۔ اب کچھ دن ٹھنڈا ہو کر بیٹھے گا۔''

مختار جھارا بولا۔ ''آپ سے سوتے میں اس نے جو مار پیٹ کی تھی اس کا بدلہ بھی چکا دیا آپ نے۔''

روبی بھی بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ ہال میں موجود کئی لوگ اُچک اُچک کر مجھے دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے کئی ایک یہ جانتے تھے کہ تین دن پہلے مضافاتی علاقے میں واجد، فاروق اور ان کے ایک ساتھی کی درگت میں نے ہی بنائی تھی۔ آج انہوں نے بچشم خود میرا زورِ بازو دیکھ لیا تھا (بہر حال اس بات سے ابھی تک داؤد اور جھارے کے علاوہ کوئی آگاہ نہیں تھا کہ اس تہ خانے سے باہر شہر بھر کی پولیس مجھے ایک دہشت گرد کی حیثیت سے تلاش کر رہی ہے)

O......❖......O

داؤد مجھے لے کر اپنے خاص کمرے میں آ گیا۔ وہ وہسکی کی بوتل کھولتے ہوئے بولا۔ ''تم نے آج لاہور کے مانے ہوئے پھڈے بازوں کے سامنے لودھی کو مار لگا کر اپنی دھاک بٹھا دی ہے۔ ویل ڈن...... ویری ویل ڈن۔''

اس نے ایک گلاس میں وہسکی انڈیلنے کے بعد دوسرے میں انڈیلنے کی کوشش کی تو میں نے اسے ہاتھ سے روک دیا۔ ''نہیں داؤد بھائی اس وقت بالکل موڈ نہیں۔''

''کیوں؟''

''میرا سینہ جل رہا ہے داؤد بھائی۔ میری آنکھوں کے سامنے لاشیں ہیں اور آگ ہے، میں وہ سب کچھ بھول نہیں پا رہا ہوں۔''

''اوئے جھلے! بھولنے کے لیے ہی تو یہ چیز پی جاتی ہے۔ تم تیئس سال یورپ میں

رہے ہو۔ کیا اتنا بھی پتا نہیں۔ ابھی ایک دو پیگ لو، غم کو تھوڑا سا غلط کرو پھر سوچتے ہیں تمہارے سینے کی جلن کے بارے میں بھی۔“

”نہیں داؤد بھائی، میں اس آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے کوئی بھی غیر قانونی طریقہ اختیار کرنا نہیں چاہتا۔ مجھے انصاف چاہیے۔ صرف انصاف...... خالص انصاف۔“

وہ سر پیچھے کی طرف ڈال کر زور سے ہنسا۔ ”بھائی میرے، خالص تو یہاں دودھ تک نہیں ملتا، تم انصاف کی بات کر رہے ہو۔ یہاں ہر اچھی چیز چھیننی پڑتی ہے اور انصاف تو پیار محبت سے مل ہی نہیں سکتا۔“

”کیوں نہیں مل سکتا بھائی؟ کیا ہم اندھے بہرے ہیں، کیا ہم پڑھے لکھے نہیں۔ بات کرنا نہیں جانتے، بات سمجھنا نہیں جانتے۔ اگر ایک بات سچ ہے تو پھر سچ کو ثابت کرنے میں دشواری کیوں پیش آتی ہے۔ وہ سارے جانے پہچانے محاورے کہاں ہیں؟ سانچ کو آنچ نہیں...... سچ کا بول بالا...... سچ کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے...... کاغذ کے پھولوں سے خوشبو نہیں آسکتی، وغیرہ وغیرہ۔“

”شاہ زیب، تم پڑھے لکھوں والی باتیں کر رہے ہو اور یہاں آج کل کچھ اور طرح کے محاورے چل رہے ہیں۔ مثلاً پڑھو گے لکھو گے ہو گے خراب، جو مارو گے کوٹو گے بنو گے نواب۔ یہ جن لوگوں سے زخم کھا کر تم آئے ہو، یہ مارو کوٹو والے لوگ ہی ہیں۔ یہ قبضہ ماف ہے، لوگوں کی پراپرٹیوں پر قبضہ بھی کرتے ہیں اور ان سے معافیاں بھی منگواتے ہیں یعنی قبض مافیا شکیل داراب کو تو جان ہی گئے ہونا تم؟ سنا ہے کہ اس نے علاقے کے ایک بڑے زمیندا حاجی نذیر سے معافیاں منگوائی ہیں اور اس کی بیٹی کا قبضہ بھی حاصل کیا ہے۔“

میرے ذہن میں ایک بار پھر وہی سارا واقعہ تازہ ہو گیا۔ سینے میں ایک اور ٹیس اٹھی عارف کا افسردہ چہرہ نگاہوں میں گھومنے لگا۔ میں نے سڑک والے حادثے میں اس کی جا بچائی تھی اور وہ آج کل اس بات کی تمنا کر رہا تھا کہ اسے موت ہی آجاتی تو اچھا تھا اور شا اپنی جگہ وہ ٹھیک ہی تھا۔ وہ بے بسی کے شکنجے میں تھا۔ اس کی محبت کسی اور کی دسترس میں تھی ا وہ ان طاقتور لوگوں کو بس دیکھ سکتا تھا، ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا تھا۔ عاشرہ کوئی ”شام لا زمین نہیں تھی لیکن اس سے شام لاٹ والا سلوک ہی ہوا تھا۔ اس کی کمزور چار دیواری پر اغ کا بلڈوزر دوڑایا گیا تھا اور پھر راتوں رات اس پر ہوس کے پلازے کی تعمیر شروع ہو گئی تھ میرے وکیل کزن عبداللہ نے مجھے پورے وثوق سے بتایا کہ عاشرہ شادی کی رسم ادا ہو سے پہلے ہی شکیل داراب کی بیوی بن چکی ہے۔

داؤد کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔ ”حاجی نذیر جیسے لوگ اور اس سے بھی بڑے لوگ جب بے بس ہو جاتے ہیں تو میں اور تم کیا چیز ہیں۔ اب ان پولیس والوں کے لمبے ہاتھ ملاحظہ کرو۔ پلک جھپکتے میں ان لوگوں نے تمہیں ایک یورپ پلٹ پاکستانی سے یورپ پلٹ دہشت گرد بنا دیا ہے۔ ان لوگوں کے بنائے ہوئے جال بڑے مضبوط ہوتے ہیں، اب تم لاکھ تڑپو پھڑکو گے لیکن نکل نہیں سکو گے۔ سمجھو کہ جو ہتھے چڑھ گیا وہ چڑھ گیا۔“

میں نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ ”کچھ بھی ہے داؤد بھائی، میں نے تہیہ کر لیا ہوا ہے کہ قانون کو ہاتھ میں نہیں لوں گا۔ میں گرفتاری دوں گا۔“

”اور وہ تمہیں مفرور بنا کر شوٹ کریں گے اور پولیس مقابلے کا کیس بنا کر یا پھر خودکشی وغیرہ کا ڈراما رچا کر مٹی کے نیچے پہنچا دیں گے۔ اگر کہو تو میں یہ بات تمہیں لکھ کر دے دیتا ہوں۔ اسٹام پیپر پر۔“

”اور اگر میں کسی بہت معتبر بندے کے ذریعے اور میڈیا کی موجودگی میں گرفتاری دوں تو پھر؟“

”پھر بھی کچھ نہیں ہوگا۔“ داؤد نے گھونٹ لیتے ہوئے پورے اعتماد سے کہا۔

”کیا مطلب؟“

”ایسا تگڑا بندہ کہاں سے ڈھونڈو گے جو قیصر چودھری جیسے پولیس والوں کو نکیل ڈال سکے۔ مچھلی پانی کب پیتی ہے کوئی جان سکا ہے؟ اسی طرح کوئی یہ بھی نہیں جان سکتا کہ اپنے اختیار کے پانی میں ڈبکیاں لگاتے ہوئے پولیس والے من مانی کب کر لیتے ہیں۔“

”لیکن میں جس بندے کے بارے میں سوچ رہا ہوں وہ دوسروں سے مختلف ہے۔ مجھے اس پر پورا بھروسا ہے۔ مسئلہ صرف اس سے رابطے کا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ایک بار اس سے رابطہ ہو گیا تو بہت سے مسئلے حل ہو جائیں گے۔“

”ہم بے خبروں کو بھی معلوم ہو نام، اس ذات شریف کا۔“ داؤد نے لمبا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

”شاید آپ نے بھی نام سنا ہو، جسٹس اختر ملک۔“

”ریٹائرڈ جسٹس اختر......ملک۔“ داؤد نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر ادا کیا۔

”اختر ملک صاحب کا نام میں نے ڈنمارک میں بھی ایک انگلش لائر سے سنا تھا، اس نے ان کی تعریف کی تھی اور اچھے لفظوں میں یاد کیا تھا۔ یہ نام اس وقت سے میرے ذہن میں محفوظ تھا۔ بدھ کو بالکل اتفاقیہ طور پر ایک بار پھر یہ نام میرے کانوں میں پڑا۔ میں نے آپ کو

بتایا ہے نا کہ بیدیاں روڈ کے فارم کے پاس ایس پی تبریز سے ملاقات ہوئی تھی۔اس ملاقات میں تبریز نے بھی اختر ملک کا نام لیا اور بتایا کہ وہ ایسے معاملوں میں ڈٹ جانے والے بندے ہیں۔کوئی حقیقی شکایت ہو اور ان کے پاس لے جائی جائے تو وہ پورا ساتھ دیتے ہیں۔''

داؤد نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔''بات تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔''

''تو پھر کیا رائے ہے؟''

''اختر ملک صاحب سے رابطہ کرنا چاہ رہے ہو؟''

''جس طرح کی پولیس گردی میرے اور ولید کے ساتھ ہوئی ہے، اس کے بعد تو رابطہ کرنا بنتا ہے۔اگر وہ وقت دینے پر آمادہ ہو جائیں تو میں اپنے کزن ایڈووکیٹ کو بھی ساتھ لے جا سکتا ہوں۔''میری آواز دکھ کی شدت سے ٹوٹ رہی تھی۔

داؤد نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔''تو تم چاہتے ہو کہ اختر ملک صاحب کے ذریعے اپنی گرفتاری پیش کرو؟''

''میرا خیال ہے کہ ان جیسے نیک نام شخص پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔اگر وہ مجھے پولیس کے سامنے پیش ہونے کا کہیں تو میں ہو جاؤں گا۔''

''لیکن ان سے وقت لینا تو کافی مشکل ہوا کرتا ہے۔''

''کیا آپ ان کے بارے میں تھوڑا بہت جانتے ہیں؟''

''ہاں...... جانتے ہی ہیں تھوڑا بہت۔'' داؤد نے عجیب انداز میں کہا۔ مجھے شک ہوا کہ وہ اختر ملک صاحب کے بارے میں تھوڑا بہت نہیں کافی کچھ جانتا ہے۔

اس نے ایک بار پھر چبھتی ہوئی نظروں سے میرا چہرہ دیکھا۔آخری گھونٹ بھر کر وہسکی کا بدبودار گلاس خالی کیا اور اپنے سیل فون پر ایک نمبر پریس کرنے لگا۔

''کس کو فون کر رہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ملک صاحب کے پرسنل سیکرٹری اسلم باجوہ کو۔وہ آل اِن آل ہے۔''

چند لمحے بعد رابطہ ہو گیا۔''کون؟'' دوسری طرف سے ابھرنے والی مدھم آواز میرے کانوں میں بھی پہنچی۔

''میں داؤد بھاؤ بول رہا ہوں باجوہ۔''

''ہاں بھاؤ کیا حال ہے؟'' دوسری طرف سے روکھی سی آواز سنائی دی۔

''آپ سناؤ، کیا حال چال ہیں؟ ملک صاحب کیسے ہیں؟''

''ملک صاحب کے بارے میں تمہیں خبر نہیں ملی؟'' باجوہ نے بجھے سے لہجے میں کہا۔

''کیوں...... کیا ہوا؟'' داؤد نے پوچھا۔
''ملک جی کے بڑے داماد فیروز خان فوت ہو گئے ہیں۔''
''اوہ مائی گاڈ...... فیروز خان فوت ہو گئے۔ کب...... کیسے؟''
''ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی ایکسپائر ہو گئے۔''
''یہ کب کا واقعہ ہے؟''
''آج چار دن ہو گئے۔''
''اوہ...... ویری ویری سوری۔ میں دو تین دن سے اخبار دیکھ سکا ہوں اور نہ ٹی وی پر نظر پڑی ہے۔ پچھلے ہفتے کسی نے بتایا تھا کہ کلفٹن فائرنگ والے کیس میں فیروز کی ضمانت کینسل ہوئی ہے۔ بہر حال بہت افسوس ہے باجوہ۔ میں کوشش کر کے خود بھی ملک صاحب کے پاس حاضری دوں گا۔''
''اچھا...... اب کس لیے فون کیا تھا؟'' دوسری طرف سے قدرے خشک لہجے میں کہا گیا۔
''باجوہ، ایک بہت ضروری کام ہے...... اور بہت ارجنٹ بھی ہے۔ ایک بالکل بے گناہ بندے کو پولیس مقابلے کا سخت خطرہ ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ملک صاحب کے ذریعے خود کو پیش کر دے۔''
''تو میں کیا کروں؟''
''یار...... دس پندرہ منٹ کا وقت لے دو ان سے۔ میں جانتا ہوں کہ اس وقت وہ صدمے میں ہوں گے لیکن یہ کام بھی بہت ایمرجنسی کا ہے۔ مجھے یقین ہے اس بندے کی پوری بات سننے کے بعد......''
''یار خدا کا خوف کرو...... خدا کا خوف کرو بھاؤ۔'' باجوہ سخت بیزاری سے بولا۔ ''اب ان پیشیوں سے اور سلنڈروں سے معاف کر دو ملک صاحب کو۔ وہ بہت نیکیاں کما چکے ہیں اور بہت نیکیاں بھگت بھی چکے ہیں۔ کیا اب ان کی جان لے کر چھوڑو گے آپ لوگ۔''
''لیکن باجوہ......'' داؤد کی بات ادھوری رہ گئی، دوسری طرف سے فون بند کر دیا گیا تھا۔
فون ایک طرف رکھ کر داؤد نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اس کی عقابی آنکھوں میں طنز کے نشتر چمک رہے تھے۔ نہ جانے کیوں مجھے احساس ہو رہا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے داؤد نے جس فیروز نامی بندے کی خبر سنی ہے اس خبر سے وہ پہلے ہی آگاہ تھا۔
''کچھ اندازہ ہو رہا ہے تمہیں کہ لوگ یہاں کس طرح بے بس ہو جاتے ہیں؟'' داؤد

میں نے اپنا سیل فون تو احتیاطاً بند کر چھوڑا تھا۔ داؤد بھاؤ کے اسسٹنٹ مختار جھارا نے مجھے ایک گمنام نمبر والا فون دے دیا تھا۔ اگلے روز میں نے اس سیل فون کے ذریعے ایک بار پھر عبداللہ کے نمبر پر ٹرائی شروع کر دی۔ ٹرائی کرتے کرتے اچانک عبداللہ سے کال مل گئی۔

''ہیلو!'' اس کی بھرائی ہوئی بوجھل آواز سنائی دی۔

میں نے تڑپ کر کہا۔ ''عبداللہ بھائی کہاں ہو تم؟ میں نے پرسوں سے کوئی سو دفعہ فون کیا ہے، کبھی بیل جاتی تھی کبھی ویسے ہی آف ہوتا تھا۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں کیا کروں؟''

عبداللہ نے ذرا توقف کیا پھر طویل سانس لے کر بولا۔ ''شاہ زیب! یہاں بھی معاملہ بہت بگڑا ہوا ہے۔ ہماری سمجھ میں بھی کچھ نہیں آ رہا کہ کیا کریں؟''

''امی اور ابا جان آ گئے تھے پاکستان؟'' میں نے اپنے والدین کے بارے میں پوچھا۔

''نہیں تمہاری امی تو گھٹنوں کے درد کی وجہ سے نہیں آ سکیں۔ تایا جی پہنچ گئے تھے اور انہوں نے دونوں جنازوں میں شرکت بھی کی۔''

''ابا جان کو کیا بتایا ہے تم نے؟''

''نہ بھی بتاتے تو یہ سب کچھ چھپنا تو نہیں تھا پھر بھی کئی باتیں ان سے چھپائی ہیں۔ وہ بہت پریشان تھے۔ رکنا چاہتے تھے لیکن میں نے انہیں زبردستی واپس کوپن ہیگن بھیج دیا ہے۔ ویسے بھی انہیں تائی جان کی تیمارداری کرنا تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے بھی ان کا فون آیا ہوا تھا۔ تمہارے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ انہوں نے تائی جان کو یہاں کی خبروں سے بالکل بے خبر رکھا ہوا ہے۔''

''اب کیا صورتِ حال ہے یہاں کی؟'' میں نے پوچھا۔

''ٹھیک نہیں ہے۔'' عبداللہ نے افسردہ آواز میں کہا۔ ''پرسوں پولیس اہلکار چچا حفیظ کے علاوہ مجھے بھی پکڑ کر لے گئے تھے پھر تمہاری بھابی کو بھی تھانے پہنچا دیا گیا۔ کل شام ہم میاں بیوی کی جان تو وقتی طور پر چھوٹ گئی لیکن چچا بدستور تھانے میں ہی رہے۔''

''اب کیا حال ہے ان کا؟ کہاں ہیں وہ؟''

''حال زیادہ اچھا نہیں ہے۔ ایک تو چچی اور فائزہ کی جدائی کا صدمہ، اوپر سے تفتیشی افسر نے ان کی ناک میں دم کیا ہوا ہے۔ ان سے پوچھ تاچھ کے لیے لاہور سے اسپیشل افسر آیا ہوا تھا۔ مجھے تو لگتا ہے شاہ زیب اگر تم جلدی پیش نہ ہوئے تو یہ لوگ چچا حفیظ پر بھی سنگین چارج لگا دیں گے۔ وہ پہلے ہی کہہ رہے ہیں کہ تم اور ولید وہاں بیکری کی آڑ میں جو کچھ

کررہے تھے اس کا چچا حفیظ کو پورا علم تھا......"

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی عبداللہ کی طرف کسی دوسرے سیل فون کا کال میوزک سنائی دینے لگا۔ عبداللہ نے کہا۔"ایک منٹ ہولڈ کرنا شاہ زیب، دوسرے فون پر کال آرہی ہے۔"

میں نے ہولڈ کیا۔ عبداللہ ایک دوسرے فون پر بات کرنے لگا۔ اس کی بالکل مدھم آواز ہی مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اپنے اسی صحافی دوست باذان سے بات کررہا ہے۔ یہ بات طول پکڑ گئی اور تین چار منٹ جاری رہی۔ مجھے تشویش ہونے لگی۔ بالآخر دوسرے فون پر ہونے والی بات چیت ختم ہوئی اور میرے والے فون پر عبداللہ کی بوجھل آواز سنائی دی۔

"ہیلو شاہ زیب۔"

"ہیلو عبداللہ......کون تھا؟"

عبداللہ نے میرے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔"دیکھ لیا ناشاہ زیب! وہی ہوا جس کا ڈر تھا......" اس کی آواز بیٹھ گئی۔ میرے ذہن میں سیکڑوں اندیشے چنگھاڑنے لگے۔

"کیا ہوا عبداللہ بھائی، مجھے بتاؤ؟"

دوسری طرف کچھ دیر خاموشی رہی پھر عبداللہ نے گلوگیر آواز میں کہا۔"شاہ زیب لگتا ہے کہ دنیا بھر کی بری خبروں کا رخ ہماری طرف ہی ہوگیا ہے۔ چچا حفیظ کو تفتیشی سینٹر سے اسپتال پہنچایا گیا ہے۔ وہ آج صبح تین بجے سے......" وہ کہتے کہتے خاموش ہوگیا۔

"کیا ہوا عبداللہ...... پوری بات بتاؤ؟"

"چچا......کومے میں ہیں۔ پتا نہیں کہ بچتے بھی ہیں یا نہیں۔" عبداللہ کی آواز دلدوز تھی۔ میں سکتہ زدہ سا بیٹھا رہ گیا۔ یہ کیا ہورہا تھا اس گھرانے کے ساتھ اور میرے ساتھ۔ ہم پر بالکل بے بنیاد الزامات کی بارش کردی گئی تھی اور اس سلسلے کو کہیں روکا نہیں جارہا تھا۔ کوئی اس مصیبت میں مدد نہیں کررہا تھا۔ ہاتھ نہیں پکڑ رہا تھا۔ جیسے یہ انسان کی بستی ہی نہیں تھی جنگل کا قانون تھا۔ درندہ ریوڑ میں سے ایک شکار کو دبوچ لے تو باقی سارے لاتعلق ہوجاتے ہیں۔

چچا حفیظ کی صورت نگاہوں میں گھومنے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان پر آفتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے اور ان کا قصور یہ تھا کہ وہ اپنی آبائی جگہ جہاں ان کی بے شمار یادیں تھیں بیچنا

نہیں چاہتے تھے۔ قبضہ مافیا کے لوگ جن کا سرغنہ یقیناً قیصر چودھری کا بدنام سسر لالہ نظام چودھری ہی تھا جوان کے درپے ہو گیا تھا اور اب چچا اور ہم سب عام شہری نہیں تھے خطرناک دہشت گرد تھے۔ میڈیا کو اور عام لوگوں کو یہ بتایا جا رہا تھا کہ آتشزدگی کی جگہ سے جو شواہد ملے ہیں ان میں گندھک، لوہے کے ٹکڑے اور نٹ بولٹ وغیرہ بھی شامل ہیں جو اس شک کو تقویت پہنچاتے ہیں کہ یہاں دھماکا خیز مواد تیار کیا جا رہا تھا۔

میں فون سننے کے بعد قریباً پانچ منٹ تک وہیں بیٹھا رہا، ان پانچ منٹ کے اندر میرے ذہن میں زبردست قسم کی ہلچل رہی۔ آخر میں ایک فیصلے پر پہنچ گیا، یہ ایک تہلکہ خیز فیصلہ تھا۔ اس فیصلے کے سوا اب میرے پاس کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد داؤد بھاؤ نے مجھے وہی خبر پہنچا دی جو مجھے فون پر عبداللہ کی زبانی معلوم ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔ ”شاہ زیب! حالات اسی رخ پر جا رہے ہیں جس کا مجھے ڈر تھا۔ تمہارے چچا تفتیشی سینٹر سے سیدھے اسپتال پہنچے ہیں اور وہ بے ہوشی میں ہیں۔“

”مجھے پتا چل گیا ہے۔“ میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

”اور یہ لوگ کہیں رکیں گے نہیں۔ یہ تمہیں مجبور کرنا چاہتے ہیں کہ تم پیش ہو جاؤ۔“

”تو پھر ہو جاتا ہوں پیش۔“ میں نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

داؤد نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ وہ بے حد جہاندیدہ اور زیرک شخص تھا۔ اس کی عقابی نگاہیں جیسے بندے کے اندر تک اتر جاتی تھیں۔ اس نے سگریٹ سلگا کر دو گہرے کش لیے اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”کیا تم نے کوئی فیصلہ کیا ہے؟“

”ہاں۔“

”داؤد بھاؤ اگر تم برا نہ مانو تو میں کچھ دیر اکیلے میں سوچنا چاہتا ہوں۔“

”زبردست...... بہت خوب...... مجھے سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے والے لوگ اچھے لگتے ہیں۔“

”شکریہ۔“

”دیکھو شاہ زیب! میں یاروں کا یار ہوں۔ تمہیں پناہ دی ہے تو تمہارا ساتھ دے کر بھی دکھا سکتا ہوں۔ تم نے اپنے اندر کوئی جھجک نہیں رکھنی۔ اگر مجھ سے کسی طرح کا تعاون چاہیے ہوگا تو میں پوری کوشش کروں گا کہ تمہیں وہ تعاون ملے۔“

”میں جانتا ہوں داؤد بھاؤ لیکن......“

”لیکن......کیا؟“

''اگر میں نے کچھ کرنے کا فیصلہ کیا تو آپ کو زیادہ زحمت نہیں دوں گا۔''
اس نے ایک اور گہرا کش لے کر کہا۔ ''میں تمہارے اس فقرے کا مطلب نہیں سمجھا؟''
''شاید...... میں آپ کو کل بتاؤں گا۔'' میں نے کہا۔ اس نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا بس گہری نظروں سے دیکھ کر رہ گیا۔

○......❖......○

اگلے روز صبح دس گیارہ بجے میں نے پھر داؤد بھاؤ سے ملاقات کی۔ وہ ابھی ابھی اپنے بیڈروم سے نہا دھو کر نکلا تھا۔ یقیناً روبی کی قربت میں اس نے ایک خوشگوار شب گزاری تھی۔ روبی بھی اپنے گیلے بالوں کی نمائش کرتی پھر رہی تھی۔ چائے کی چسکی لیتے ہوئے میں نے کہا۔ ''داؤد بھاؤ مجھے ایک ایسا بندہ چاہیے جو تمہارے بھروسے کا ہو لیکن پولیس کو مطلوب نہ ہو۔''
وہ مسکرایا۔ ''کافی مشکل ڈیمانڈ کی ہے تم نے لیکن چلو میں ڈھونڈ لیتا ہوں۔''
''اور ایک موٹر سائیکل اچھی حالت کی۔ ون ٹو فائیو سی سی یا اس سے اوپر کی ہو جائے۔ ساتھ میں گہرے شیشے والا ہیلمٹ بھی۔''
''او کے، یہ دونوں چیزیں بھی مل گئیں۔ موٹر سائیکل کی نمبر پلیٹ اصلی چاہیے یا نقلی؟''
''نقلی...... اور اگر ہو سکے تو ایک پستول اور قریباً دو درجن فالتو راؤنڈ۔'' میں نے سوالیہ نظروں سے داؤد بھاؤ کو دیکھا۔
وہ مسکرایا۔ ''توپ سے نیچے نیچے جو مانگو گے مل جائے گا لیکن کچھ اشارہ تو دو کہ ارادے کیا ہیں؟''
''داؤد بھاؤ ارادہ نہ ہی پوچھو۔ میں تمہیں اس معاملے میں انوالو کرنا نہیں چاہتا اور اس بات کی ضمانت بھی دیتا ہوں کہ میرے کسی اقدام کی وجہ سے تم پر زد نہیں پڑے گی۔ جو بندہ تم مجھے دے رہے ہو وہ بھی براہِ راست کسی کام میں ملوث نہیں ہوگا۔''
''مطلب ہے کہ اعتماد نہیں کر رہے ہو۔'' داؤد بھاؤ کا لہجہ ذرا افسردہ ہو گیا۔
میں نے اس کی طرف دیکھا پھر ذرا توقف کر کے کہا۔ ''مجھے تو یہی لگتا ہے کہ اگر فی الوقت میں پورے شہر میں کسی پر اعتماد کر سکتا ہوں تو وہ تم ہی ہو داؤد بھاؤ۔''
میری بات نے اس کی افسردگی ذرا کم کی۔ وہ سگریٹ کا ٹکڑا ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے بولا۔ ''لیکن کوئی تھوڑا بہت اشارہ تو ہو۔''
میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''اشارہ یہی ہے داؤد بھاؤ کہ آج کل لاہور کی سڑکوں

پر ایکسیڈنٹ بہت ہو رہے ہیں۔"

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا لیکن بولا کچھ نہیں۔ اس کی چمکیلی نظریں جیسے بہت دور تک دیکھ رہی تھیں۔

اگلے روز صبح آٹھ بجے کے لگ بھگ مجھے میری مطلوبہ چیزیں مل گئیں اور بندہ بھی مل گیا۔ یہ بالکل عام قد کاٹھ اور عام شکل وصورت والا ایک نوجوان تھا۔ بال تھوڑے گھنگھریالے تھے، حلیے سے یونیورسٹی کا اسٹوڈنٹ ہی لگتا تھا لیکن ظاہر تھا کہ اگر وہ داؤد بھاؤ جیسے شخص کے ساتھ رابطے میں تھا تو پھر بالکل عام شخص تو نہیں تھا۔ اس نے مجھے اپنا نام انیق بتایا۔ وہ نک سک سے بڑی درست اردو بول رہا تھا اور قدرے باتونی بھی لگتا تھا۔ وہ لاہور کے گلی کوچوں کو اپنے ہاتھ کی لکیروں کی طرح جانتا تھا۔

صبح گیارہ بجے کے لگ بھگ ہم اس بیسمینٹ کے خفیہ راستے سے نکلے اور گیسٹ ہاؤس کی عمارت میں پہنچ گئے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ بیسمینٹ سے گیسٹ ہاؤس کی قریبی چار دیواری تک پہنچنے کے لیے قریباً بیس میٹر لمبی سرنگ بنائی گئی ہے اور یہ کام زیادہ پرانا بھی نہیں ہے۔ شاید ڈیڑھ دو سال پہلے ہی یہ چور راستہ تعمیر ہوا ہے۔

گیسٹ ہاؤس میں چہل پہل تھی۔ زیادہ تر نوجوان لڑکے، لڑکیاں ہی نظر آ رہے تھے۔ سب اپنے روزمرہ کے کاموں میں مصروف تھے۔ کسی نے ہم پر خصوصی توجہ نہیں دی۔ گیراج میں کئی موٹر سائیکل موجود تھیں۔ انیق نے ایک 175 موٹر سائیکل کی چابی مجھے تھمائی۔ ہینڈل کے ساتھ ایک گہری شیلڈ والا ہیلمٹ بھی جھول رہا تھا۔ میں نے سب سے پہلے ہیلمٹ پہنا اور موٹر سائیکل کا سیلف اسٹارٹ بٹن دبایا۔ وہ بارعب آواز کے ساتھ اسٹارٹ ہو گئی۔ انیق کی رہنمائی میں، میں لاہور کی مختلف سڑکوں کو ناپنے لگا۔ اسکولوں اور دفاتر وغیرہ کو جانے والے اپنی اپنی منزلوں پر پہنچ چکے تھے۔ اس لیے ٹریفک نسبتاً کم تھا پھر بھی لاہور کی رونقیں جگہ جگہ اپنی جھلک دکھاتی تھیں۔ ایک خوشگوار دھوپ پھیلی ہوئی تھی جس نے سردی کی شدت میں خاطر خواہ کمی واقع کر دی تھی۔ میں نے انیق سے پوچھا۔ "یہ کون سی سڑک ہے؟"

"اسے لوئر مال روڈ کہتے ہیں۔ ایم اے او کالج سے آگے جا کر یہ راستہ ہمیں ملتان روڈ تک پہنچا دے گا۔ ملتان روڈ کو تو آپ جانتے ہی ہوں گے جس کے کنارے لاہور کے مشہور فلم اسٹوڈیوز واقع ہیں۔ شاہ نور اور ایورنیو وغیرہ۔ کمال کی فلمیں بنتی رہی ہیں ان نگار خانوں میں۔"

"صرف کمال کی؟ وحید مراد اور محمد علی وغیرہ کی نہیں؟"

وہ زور سے ہنسا۔ ''میرا مطلب ہے جی کہ بہت شاندار فلمیں بنتی رہی ہیں۔ ویسے آپ کی بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ پاکستانی فلموں کے بارے میں کافی کچھ جانتے ہیں۔''

''نہ ہی جانتا ہوتا تو اچھا تھا۔ کہتے ہیں کہ بوگس فلمیں بنانے میں پاکستان آج کل بہت نام پیدا کر رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

''نہیں جی...... گاہے بگاہے اچھی فلمیں بھی بن رہی ہیں۔ مولا جٹ، شیر خان اور چوڑیاں کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟'' میرے جواب دینے سے پہلے ہی اس نے اچھی فلموں کی ایک لمبی چوڑی لسٹ بیان کر دی۔

اس کی لسٹ پوری ہوتے ہوتے ہم اس مقام تک پہنچ چکے تھے جہاں یہ شاہکار فلمیں تیار ہوئی تھیں اور اب وہاں اُلو بول رہے تھے۔ میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''چلو یہ باتیں بعد میں کرلیں گے ابھی ہمیں اس جگہ پہنچنا ہے جہاں داراب فیملی کے لوگ ہاؤسنگ اسکیم کی داغ بیل ڈال رہے ہیں۔ کیا یہی راستہ آگے جائے گا؟''

''ہاں جی، ابھی آپ سیدھے چلتے رہیں، آگے جا کر میں آپ کو بتاتا ہوں۔''

ہیلمٹ کا اصل مقصد تو سر کو خطرناک چوٹ سے محفوظ رکھنا ہوتا ہے لیکن یہ ہیلمٹ مجھے آج جو فائدہ دے رہا تھا، یہ بیان سے باہر تھا۔ میں اس شہر کی سڑکوں سے بے دھڑک گزر رہا تھا۔ جہاں کئی جگہ مجھے تلاش کیا جا رہا تھا۔ ایک دو پولیس ناکوں سے بھی ہم بخیر و عافیت گزر گئے۔ کسی نے میرا ہیلمٹ اتروانے اور چہرہ دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ شیشے کی شیلڈ اوپر بھی اٹھا دی جائے تو ہیلمٹ میں کسی کی صورت پہچاننا ایک مشکل کام ہوتا ہے۔

ہم بہ آسانی اس مضافاتی علاقے میں پہنچ گئے جہاں اسکیم کا شروعاتی کام ہو رہا تھا۔ مجھے چند ایک بلڈوزر اور ٹرک نظر آئے۔ ایک جگہ بڑے سائز کے کچھ جدید ٹینٹس لگے ہوئے تھے۔ انیق نے کہا۔ ''شاہ زیب صاحب یہ اسٹیٹ ڈویلپرز بڑے چالاک لوگ ہوتے ہیں۔ سادہ لوح شہریوں سے ان کھیتوں کے معاوضے بھی وصول کر لیتے ہیں جن پر فصلیں کھڑی ہوتی ہیں اور جن پر ابھی صرف کسانوں کا حق ہوتا ہے۔ بس کچھ زمین خرید لی۔ اس پر بلڈوزر وغیرہ کھڑے کر دیئے اور لوگوں سے بکنگ کے پیسے وصولنا شروع کر دیئے۔''

مجھے اندازہ تھا کہ یہ موضوع چھڑ گیا تو وہ اس پر بھی ایک دو گھنٹے آسانی سے بات کر لے گا۔ میں نے کہا۔ ''ابھی تم نے بتایا تھا کہ تمہاری معلومات کے مطابق لالہ نظام اپنی اس سائٹ پر آتا جاتا رہتا ہے۔ کیا خیال ہے وہ آج بھی آیا ہوگا؟''

''اگر آیا ہوتا تو کوئی چالیس پچاس لاکھ والی گاڑی بھی یہاں نظر آ رہی ہوتی اور آپ دیکھ ہی رہے ہیں ابھی تو بس غریب غربا والی ہنڈا اسوک اور ٹویوٹا وغیرہ نظر آ رہی ہیں۔''

''یہ جو ٹینٹ وغیرہ لگے ہیں یہاں کیا ہوتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ اسکیم والوں کا عارضی دفتر ہوگا۔ بکنگ شروع کرنے کی جلدی ہوتی ہے ناں ان لوگوں کو اس لیے پکے دفاتر بننے سے پہلے عارضی دفتروں میں ہی رقمیں بٹورنا شروع کر دیتے ہیں۔''

ہم ذرا بلندی پر کھڑے تھے۔ ٹینٹ وغیرہ نشیب میں نظر آ رہے تھے۔ میں نے انیق سے کہا۔ ''ذرا گاہک بن کر جاؤ۔ ریٹ اور قسطوں وغیرہ کا حال معلوم کرو اور ساتھ ہی یہ جاننے کی کوشش بھی کرو کہ لالہ نظام کی آمد یہاں کب ہوتی ہے۔''

انیق کی آنکھوں میں دبا دبا جوش نظر آنے لگا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اس طرح کے کام وہ بڑے ذوق شوق سے کرتا ہے۔ وہ چلا گیا اور میں وہیں ایک درخت کے نیچے سنسان سی جگہ پر موٹر سائیکل کا پلگ کھول کر بیٹھ گیا۔ انیق کی آمد پندرہ بیس منٹ بعد ہوگئی۔ اس کے ہاتھ میں چند کاغذ تھے۔ یہ اس عظیم الشان ہاؤسنگ اسکیم کے بارے میں اشتہاری مواد تھا یعنی جلد سے جلد گاہک کو پھانسنے کا جال۔

انیق نے بتایا۔ ''اچھی خبر ہے، لالہ نظام کی آمد یہاں سوموار اور منگل کے سوا قریباً روزانہ ہی ہوتی ہے۔ وہ ڈھائی بجے کے قریب تشریف لاتے ہیں اور کم از کم ایک گھنٹا رکتے ہیں یعنی آج بھی قریباً ایک گھنٹے بعد وہ یہاں قدم رنجہ فرمائیں گے۔''

''کوئی گارڈ وغیرہ بھی ساتھ ہوتا ہوگا؟''

''اس بارے میں پوچھا تو نہیں لیکن یقینی طور پر ایک دو تو ضرور ہوتے ہوں گے۔ میں نے دس پندرہ دن پہلے لالہ نظام کی سفید مرسیڈیز جیل روڈ پر دیکھی تھی۔ اس میں گارڈ موجود تھا۔''

میری نظر دور کچے پکے ناہموار راستے پر پڑی۔ ایک سفید کار ہچکولے کھاتی ہوئی آ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''کہیں یہی تو نظام کی گاڑی نہیں ہے؟''

اس نے آنکھیں سکوڑ کر دیکھا۔ ''ہاں جی...... یہ لالہ نظام ہی ہے بلکہ میرا خیال ہے کہ...... وہ گاڑی میں بیٹھا بھی ہوا ہے۔''

میں نے اپنی رسٹ واچ دیکھتے ہوئے کہا۔ ''انیق! تمہاری پہلی اطلاع ہی غلط ثابت ہوئی ہے۔ تم نے کہا تھا نظام ڈھائی بجے یہاں بیٹھتا ہے۔ ڈھائی بجنے میں ابھی پینتالیس

منٹ باقی ہیں۔''

''آپ ڈنمارک سے آئے ہو جی۔ وہاں تو ٹرینیں بھی سیکنڈوں کے حساب سے اسٹیشن پر پہنچتی ہیں۔ یہاں اگر کوئی ٹرین وقت پر پہنچ جائے تو لوگ ٹرین ڈرائیور کی طبیعت کے بارے میں فکرمند ہو جاتے ہیں۔''

اس روز ہم نے لالہ نظام کی آمد و رفت کا پورا جائزہ لیا اور موقع سے کچھ مزید معلومات بھی اکٹھی کیں۔ مجھے پتا چلا کہ کچے پکے راستے کی تعمیر شروع ہو رہی ہے۔ اور ہیوی ڈیوٹی ٹرک مٹی اور اسفالٹ وغیرہ لے کر سائٹ پر آ جا رہے ہیں۔ شام تک میں اپنا ہوم ورک مکمل کر چکا تھا۔ جب نظام اپنی شاندار مرسیڈیز پر اپنے تنومند گارڈ اور دو ساتھیوں کے ہمراہ سائٹ سے واپس روانہ ہوا تو میں نے اس کا دیدار شریف بھی کر لیا۔ وہ بہت بڑے تھوبڑے اور بھاری جثّے والا ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ صورت سے ہی پرلے درجے کا پھڈے باز اور جاہ پرست لگتا تھا۔ اسے دیکھ کر میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ وہی انگارے میرے سینے میں دہکنے لگے جنھوں نے مجھے یورپ کے کئی بدنام ترین غنڈوں کے سامنے کھڑے ہونے کا اور ان سے ٹکر لینے کا حوصلہ بخشا تھا۔ وہی آگ جسے میں مٹی کے نیچے دفنا کر یہاں آیا تھا لیکن جو اب اپنے مدفن میں راستے بنا بنا کر باہر نکلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ یہ لوگ اس آگ کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ وہ بلا جھجک اپنے ظلم کو بڑھاوا دیتے چلے گئے۔ بالکل اندھا بڑھاوا۔ میری ہزار کوشش کے باوجود انہوں نے میرے سینے پر ایسے گھاؤ لگا دیئے تھے جنہیں یکسر فراموش کر دینا میرے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔ اب ان کو تھوڑا بہت سبق سکھانا تو ضروری ہو گیا تھا۔

اگلا روز بڑا اہم تھا۔ آج صبح سویرے سے ہی مطلع اَبر آلود تھا اور ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ کبھی کبھی بوندا باندی تھم بھی جاتی تھی۔ آج میں اور انیق علیحدہ علیحدہ موٹر سائیکل پر گیسٹ ہاؤس سے نکلے۔ میں نے ہیلمٹ پہن رکھا تھا مگر انیق نے مقامی رواج کے مطابق اسے ضروری نہیں سمجھا تھا۔ مضافات تک پہنچتے پہنچتے میں تین ناکوں سے بخیریت گزرا۔ یہاں موٹر سائیکل سواروں کی چیکنگ ہو رہی تھی مگر کسی نے مجھے روکنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اگر کوئی ایسی صورتِ حال ہوتی بھی تو میرے کاغذ پورے تھے اور ان میں میرا نام شاہد محمود تھا۔

ہم ہاؤسنگ اسکیم کی وسیع و عریض سائٹ پر پہنچے۔ یہ تین بجے کا وقت تھا۔ نوے فیصد امید تھی کہ اس وقت لالہ نظام اسکیم کے عارضی دفتر میں موجود ہوگا۔ پروگرام کے مطابق ہم نے اپنی موٹر سائیکلز ایک سنسان مرغی خانے کے قریب کھڑی کیں۔ یہاں سے وہ نیم پختہ

راستہ زیادہ دور نہیں تھا جہاں سے کل لالہ نظام گزرا تھا۔ میں نے انیق سے کہا۔ ''تم اسکیم کے دفتر پہنچو اور مجھے کال کر کے بتاؤ کہ لالہ نظام وہاں موجود ہے یا نہیں۔''

انیق اثبات میں سر ہلا کر روانہ ہو گیا۔ اسکیم کا عارضی بکنگ آفس وہاں سے قریباً دو کلومیٹر دور تھا۔ میں ہلکی بارش میں خالی مرغی خانے کے ایک مختصر برآمدے میں کھڑا رہا۔ پندرہ بیس منٹ بعد انیق کی کال آ گئی۔

''جی شاہ زیب بھائی، لالہ نظام یہاں ہے اور میرا اندازہ ہے کہ دس پندرہ منٹ تک وہ واپسی کے لیے چل پڑے گا۔ اس کا ڈرائیور گاڑی میں کچھ کاغذات وغیرہ رکھ رہا ہے۔ ابھی لالہ نظام اور اس کے دو دوست چائے پی رہے ہیں۔''

''تمہیں یقین ہے کہ وہ پندرہ بیس منٹ تک روانہ ہو جائیں گے؟''

''لگ تو یہی رہا ہے جی بلکہ ٹھہریں...... ایک منٹ ہولڈ کریں۔ میرا خیال ہے کہ اب وہ اٹھنے والے ہیں۔ ساتھ میں ایک بہت اونچا لمبا پولیس والا بھی ہے...... میرا خیال ہے پولیس انسپکٹر ہے۔ ایک بندے نے بتایا ہے کہ یہ نظام چودھری کا داماد ہے...... یہ بھی لالہ نظام کے ساتھ ہی اٹھ رہا ہے۔ اب یہ لوگ گاڑی کی طرف جانے والے ہیں۔'' میری رگوں میں خون کی گردش یک دم انتہا کو پہنچ گئی۔ قیصر چودھری کا چہرہ اپنی تمام تر خباثت کے ساتھ میری نگاہوں میں گھوم رہا تھا۔

میں جانتا تھا کہ اب یہ میرے حرکت میں آنے کا وقت ہے۔ سامنے کچے پکے ناہموار راستے سے لدے ہوئے ٹرک گاہے بگاہے گزر رہے تھے۔ میں اپنی جگہ سے نکلا اور راستے کے کنارے پہنچ گیا۔ ہیلمٹ ابھی تک میرے سر پر تھا۔ مٹی سے بھرا ہوا ایک ہیوی لوڈر نظر آیا۔ میں بلا تردد اس کے سامنے جا کھڑا ہوا اور ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کیا۔ کیچڑ آلود راستے پر ڈرائیور نے بریک لگائے اور رک گیا۔

''کیا بات ہے؟'' اس نے کھڑکی کا شیشہ نیچے اتار کر ذرا حیران لہجے میں پوچھا۔

میں نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنی طرف کھینچا تو وہ کھل گیا۔ اس سے پہلے کے ڈرائیور کچھ سمجھ پاتا میں برق رفتاری سے اندر داخل ہو چکا تھا۔ میرا ایک خطرناک گھونسا ڈرائیور کی ٹھوڑی پر پڑا۔ وہ تیورا کر نشست پر گر گیا۔ میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ دوسرا گھونسا پھر اس کی ٹھوڑی پر لگا اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔ میں نے اسے بائیں طرف دھکیلا اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ لوڈر کے کیبن میں سے مجھے چرس کی تیز بو آئی۔ یہ صورتِ حال میرے لیے سازگار تھی۔ میں نے وائپر چلا کر ہیوی لوڈر کی ونڈ

اسکرین صاف کی اور لوڈر کو سُست روی سے آگ بڑھا دیا۔ یہ ساری کارروائی بمشکل پندرہ بیس سیکنڈ میں مکمل ہوگئی تھی۔ اول تو امید نہیں تھی لیکن اگر کسی نے دور سے لوڈر کو دیکھا بھی ہوگا تو اسے بس یہی لگا ہوگا کہ چند سیکنڈ رکنے کے بعد لوڈر پھر حرکت میں آ گیا ہے۔

میرے آگے کافی فاصلے پر ایک زرد رنگ کا لوڈر نظر آ رہا تھا۔ عقب میں کوئی گاڑی نہیں تھی لہٰذا میں کافی سُست روی سے پہلے دوسرے گیئر میں آگے بڑھتا رہا۔ اسی دوران میں وہ کال آگئی جس کا انتظار تھا۔ انیق نے مجھے بتایا کہ لالہ نظام اپنی سفید گاڑی میں روانہ ہوگیا ہے۔ گاڑی میں اس کے انسپکٹر داماد کے علاوہ ایک مسلح گارڈ بھی تھا۔ یہ میرے لیے بڑی زبردست سچویشن تھی۔ چند منٹ پہلے تک مجھے ہرگز امید نہیں تھی کہ قسمت اس طرح ساتھ دے گی اور مجھے ایک تیر سے دو شکار کرنے کا موقع مل جائے گا۔ یہ تو سراسر ایک زبردست بونس تھا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ ''لو انسپکٹر قیصر چودھری! جو بویا ہے وہ کاٹنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ میں آ رہا ہوں تمہارا حساب چکانے۔''

دیوہیکل ہینو ٹرک بلندی میں بھی کافی زیادہ تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں زمین سے سات آٹھ فٹ کی اونچائی پر بیٹھ کر ڈرائیونگ کر رہا ہوں۔ ناہموار راستے پر اس سیکڑوں ٹن وزنی دیوہیکل کو ڈرائیو کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ میری نگاہیں سامنے راستے پر جمی ہوئی تھیں اور میرے سینے میں دہکتے ہوئے انگاروں اور پھنکارتے شعلوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

اور پھر وہ لمحہ آن پہنچا جس کا پوری وحشت کے ساتھ مجھے انتظار تھا۔ مجھے دور فاصلے پر لالہ نظام والی سفید گاڑی دکھائی دی۔ بونداباندی کے درمیان وہ ہچکولے کھاتی میری طرف آ رہی تھی۔ دونوں گاڑیوں کے درمیان فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ یہ زندگی اور موت کا فاصلہ تھا۔ میرے اندر ایک سفاک بے حسی پروان چڑھتی چلی جا رہی تھی۔ میں نے اسٹیئرنگ پر اپنے ہاتھوں کی گرفت مضبوط کر دی۔ گاڑیاں مزید نزدیک آئیں۔ مجھے لالہ نظام کی مدھم جھلک نظر آئی پھر قیصر چودھری کی وردی کی مختصر جھلک دکھائی دی۔ قیصر کا جسم شاید اس وردی کے لائق ہی نہیں تھا۔ مجھے وہ منظر یاد آیا جب اس نے بے وجہ مجھے تھپڑ مارا تھا اور پھر اس تھپڑ کی معافی بھی مجھ سے منگوائی تھی اور دو بار منگوائی تھی کیونکہ وہ معافی کے الفاظ پر مطمئن نہیں ہوا تھا (اور یہ سب کچھ اس بڑی درندگی سے پہلے ہوا تھا جو ان لوگوں نے فائزہ، چچی آمنہ اور چچا حفیظ کے سلسلے میں دکھائی تھی)

میرے جبڑے بے ساختہ بھنچ گئے۔ میں نے ٹرک کی رفتار بڑھائی۔ وہ اپنے بے پناہ وزن کے ساتھ اچھلتا اور چنگھاڑتا ہوا آگے بڑھا۔ جیسے کوئی دیوہیکل شکاری جانور اپنے

چھوٹے سے شکار پر جھپٹ رہا ہو اور پھر وہ جھپٹا۔ میں نے لوڈر کا اسٹیئرنگ گھمایا۔ وہ سفید کار کی طرف بڑھا۔ کار سواروں کو پہلے تو یقین ہی نہیں آیا ہوگا کہ ایسا ہو رہا ہے اور جب تک یقین آیا ہوگا بہت دیر ہو چکی ہو گی۔ ٹرک اور کار کا تصادم ہوا۔ لوہے سے لوہا ٹکرایا، تڑخا، پچکا، شیشے چکنا چُور ہوئے۔ دیو ہیکل ٹرک کار کو روندتا اور گھسیٹتا ہوا آگے تک لے گیا۔ نیچے پھسلن تھی۔ کار پھسلنے کے بعد راستے سے نیچے اتری اور قریباً چالیس پچاس فٹ دور موٹے تنے والے دو جڑواں درختوں سے ٹکرائی۔ دائیں جانب سے اسے لوڈر نے کچل کر رکھ دیا۔

میری آنکھوں کے سامنے جیسے ایک سرخ چادر تنی ہوئی تھی۔ اس چادر کی دوسری طرف مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایک کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے میں سے مجھے نظام کے ایک نیم گنجے ساتھی کی ٹوٹی ہوئی کھوپڑی نظر آئی۔ اس کے ساتھ ہی گاڑی کے آہنی فریم میں لالہ نظام کا ایک کٹا ہوا بازو دکھائی دیا پھر گاڑھے دھوئیں نے گاڑی کو بھر دیا۔ تصادم اتنا شدید تھا کہ کسی کے بچنے کی امید کم ہی تھی۔ نیم پختہ راستے سے اترنے کے بعد ہیوی ٹرک بھی خطرناک انداز میں ایک پہلو پر جھک گیا تھا۔ ٹرک کی جہازی سائز کی اسکرین چکنا چُور تو نہیں ہوئی تھی مگر اس کا بایاں حصہ تڑخ گیا تھا اور مکڑی کے جالے کی طرح بڑی بڑی لکیریں نظر آرہی تھیں۔ دائیں طرف والی کھڑکی بھی پچک گئی تھی۔

میں نے دروازے کا ہینڈل گھمایا۔ دروازہ پھنسا ہوا تھا لیکن ٹانگ کی زوردار ضرب لگا کر میں نے دروازہ کھولا اور باہر کود گیا۔ سیاہ دھواں تیزی سے پھیل رہا تھا۔ میں اس دھوئیں میں جھک کر بھاگتا ہوا جھاڑیوں میں داخل ہو گیا۔ اب میرا رخ اپنی موٹر بائیک کی طرف تھا۔ باہر نکلنے سے پہلے اسٹیئرنگ اور ہینڈل وغیرہ پر سے میں نے اپنے فنگر پرنٹس صاف کر دیئے تھے۔

○......❖......○

قریباً ایک گھنٹے بعد میں اور انیق واپس بیسمینٹ میں موجود تھے۔ داؤد بھاؤ کا چہرہ متغیر تھا۔ اس نے سنسنی آمیز حیرت کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ میں سمجھ گیا کہ ٹی وی پر حادثے کی خبر چلنا شروع ہو گئی ہے۔ ہم نے آپس میں کوئی بات نہیں کی۔ داؤد بھاؤ میرے ساتھ سیدھا اپنے پرائیویٹ کمرے میں داخل ہوا۔ یہاں ایل سی ڈی پر ایک معروف نیوز چینل ٹیون تھا اور نیوز کاسٹر بڑے جوش وخروش سے حادثے کی اطلاع دے رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"ہمارا نمائندہ موقع پر موجود ہے...... وہاں کی تازہ ترین صورتِ حال سے ہم آپ کو آگاہ رکھے ہوئے ہیں۔ عدنان بخاری سے ہمارا رابطہ ایک بار پھر ہو گیا ہے۔ جی عدنان......

بتایئے اب جائے حادثہ پر کیا صورتِ حال ہے؟"

نمائندے عدنان کی تصویر اسکرین پر نظر آئی۔ بیک گراؤنڈ سے اس کی آواز ابھر رہی تھی۔اس کے ساتھ ملی جلی آوازیں بھی آرہی تھیں۔وہ بولا "جی...... میں سڑک کے کنارے موقع پر موجود ہوں۔جیسا کہ میں نے پہلے بتایا ہے لالہ نظام چودھری نے موقع پر ہی دم توڑ دیا تھا۔ان کی اور ان کے ایک دوست کی باڈی کو فریم کاٹ کر کار کے ڈھانچے میں سے نکالا گیا ہے۔ان کے دوست نے بھی گاڑی کے اندر ہی دم توڑا ہے۔ان کا نام رانا امتیاز بتایا جارہا ہے۔لالہ نظام کے داماد پولیس انسپکٹر قیصر چودھری کو زخمی حالت میں اسپتال پہنچایا گیا ہے۔ایک اور شخص شدید زخمی ہے اور اسے جنرل اسپتال پہنچایا گیا ہے......"

نیوز کاسٹر نے کہا۔"اچھا عدنان! ہمیں یہ بتایئے کہ حادثے کی وجہ کیا بیان کی جارہی ہے؟"

عدنان نے کہا۔"ظاہری وجہ تو خراب راستے پر ٹرک کی تیز رفتاری ہی دکھائی دیتی ہے پھر یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ ڈرائیور نشے میں تھا، پھسلن کی وجہ سے وہ ٹرک پر قابو نہ رکھ سکا اور وہ لالہ نظام کی گاڑی سے جاٹکرایا۔ڈرائیور بشیر ابھی تک بے ہوش ہے۔اس کے سر پر سنگین چوٹ آئی ہے۔اس کے ہوش میں آنے کے بعد ہی صورتِ حال واضح ہو سکے گی۔"

نیوز کاسٹر نے پوچھا۔"عدنان! متعلقہ حکام کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا اس اندوہناک حادثے میں کسی سازش کا عمل دخل بھی ہوسکتا ہے؟"

"جی...... ابھی میری بات انتظامیہ کے ایک ذمے دار افسر سے ہوئی ہے۔ان کا کہنا ہے کہ اس بارے میں کچھ کہنا ابھی قبل از وقت ہے۔سب کو معلوم ہے کہ لالہ نظام چودھری ہاؤسنگ اسکیم کے لیے رقبے ایکوائر کر رہے تھے۔اس حوالے سے کئی لوگوں سے ان کے تنازعات بھی چل رہے تھے۔بہت سے کیس عدالتوں میں زیرِ سماعت ہیں۔اس امر کو ہرگز خارج از امکان قرار نہیں دیا جاسکتا کہ ان کے اَن گنت بدخواہوں اور کاروباری رقیبوں میں سے کسی نے انہیں راستے سے ہٹانے کی یہ سنگدلانہ کوشش کی ہو۔"

داؤد بھاؤ نے چینل بدلا۔ایک اور نیوز چینل پر ایک ادھیڑ عمر شخص کو دہاڑیں مارتے اور پچھاڑیں کھاتے ہوئے دکھایا گیا۔وہ پکار رہا تھا۔"او ظالموں نے میرا بھائی مار دیا۔وہ میرا بھائی نہیں تھا میرا باپ تھا۔میں لالے کے بغیر یتیم ہوگیا۔میں تباہ ہوگیا......"

معلوم ہوا کہ یہ لالہ نظام کا چھوٹا بھائی وریام چودھری ہے۔

میں نے سوچا، اپنی پیاری بیٹی فائزہ اور بیوی کی موت کے بعد چچا حفیظ نے بھی تو ایسے ہی پچھاڑیں کھائی ہوں گی۔ایسے ہی نوحہ گری کی ہوگی۔ظالم کا ظلم سہتے جانا بھی ظلم ہی ہوتا

ہے۔شاید اس طرح ہم بالواسطہ طور پر جبر اور ناانصافی کو رواج دیتے ہیں۔

تب اسکرین پر ایک اور منظر ابھرا۔ یہ لالہ نظام چودھری کی نہایت فربہ اندام زوجہ تھی۔ وہ پکار رہی تھی۔ ''میرے سر کا سائیں چلا گیا۔ میں برباد ہوگئی۔ مجھے انصاف چاہیے......'' وہ اپنی وسیع وعریض چھاتی کوٹنے لگی۔

وہ انصاف کی دوہائی دے رہی تھی اور جانتی نہیں تھی کہ یہ انصاف ہی ہوا ہے بلکہ شاید رعایت کے ساتھ انصاف ہوا ہے۔

داؤد نے بٹن دبا کر ایل سی ڈی کی اسکرین تاریک کردی۔ وہ یک ٹک میری طرف دیکھنے لگا پھر نیا سگریٹ سلگا کر معنی خیز انداز میں بولا۔ ''لاہور کی سڑکوں پر ایک اور جان لیوا ایکسیڈنٹ؟''

میں نے کہا۔ ''چلتی کا نام گاڑی اور جو چلتی ہے وہ لگ بھی سکتی ہے۔''

''لوڈر کا ڈرائیور ہوش میں آکر کیا بیان دے گا؟'' داؤد نے پوچھا۔

''مجھے اس کی پروا نہیں۔ ویسے بھی وہ مجھے دیکھ نہیں پایا۔ اسے پتا ہی نہیں چلا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔

میرا اطمینان وسکون داؤد بھاؤ کو ورطۂ حیرت میں ڈال رہا تھا۔ اس کی عقابی نظریں ایک بار پھر میرے چہرے پر مرکوز ہوگئیں۔ طویل کش کا دھواں اپنے نتھنوں سے خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''کون ہو تم......ڈنمارک میں کیا کرتے رہے ہو؟''

''داؤد بھائی تمہیں بتایا تو ہے سب کچھ......''

اس نے میری بات سنی اَن سنی کردی۔ کھوئی کھوئی نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا۔ چہرے پر عجیب کیفیت تھی پھر طویل سانس لے کر بولا۔ ''شاہ زیب! مجھے لگتا ہے کہ تم نے اپنے آپ کو جس خول میں بند کر رکھا تھا وہ ٹوٹ گیا ہے۔ تم باہر نکل آئے ہو اور تمہارے ساتھ ہی وہ آگ بھی نکل آئی ہے جس پر تم نے پہرے بٹھا رکھے تھے۔ اب سب کچھ بدل گیا ہے اور اس بدلاؤ کے عین مطابق......تمہارے لیے ایک اہم خبر ہے۔''

''میں سمجھا نہیں؟''

اس نے چند لمحے توقف کیا پھر مجھے جانچنے والی نظروں سے دیکھ کر بولا۔ ''حاجی نذیر کی بیٹی عاشرہ کی شادی ہونے لگی ہے، شکیل داراب کے ساتھ......کیا خیال ہے، کیسی رہے گی یہ زورازوری کی شادی؟''

میرے سینے میں جیسے بھک کے ساتھ کچھ جل اٹھا۔

○......❖......○

داؤد بھاؤ کے منہ سے عاشرہ کی شادی کی خبر سن کر مجھے وہ ساری باتیں یاد آ گئیں جو آتشزدگی والے خوف ناک واقعے کی وجہ سے کچھ دیر کے لیے پس منظر میں چلی گئی تھیں۔ حاجی نذیر کی خوبرو بیٹی عاشرہ ہوس کے شکنجے میں تھی۔ داراب فیملی کا جواں سال چشم و چراغ شکیل داراب اسے اپنے جال میں جکڑ چکا تھا۔ خبر یہی تھی کہ وہ اسے شادی سے پہلے ہی اپنی بیوی بنا چکا ہے اب وہ مستقل طور پر اسے اپنی چار دیواری میں بند کر رہا تھا۔

میری نگاہوں کے سامنے زخمی عارف کا غم زدہ چہرہ گھوم گیا۔ آخری بار میں نے اسے اسپتال میں ہی دیکھا تھا۔ اس کا سر منڈا ہوا تھا اور سر کے زخم پر بھی کافی ٹانکے نظر آ رہے تھے۔ یہ زخم اسی واقعے کی نشانی تھا جب کسی نے سر راہ اس کی بائیک کو ٹکر ماری تھی اور موت کے منہ میں پہنچا دیا تھا۔ یہ نا معلوم، کوئی اور نہیں تھا۔ یہ وہی لوگ تھے جو عارف کو شکیل داراب کی راہ کا روڑا سمجھتے تھے۔ وہ اسے ہٹا کر شکیل کے لیے عاشرہ تک کا راستہ صاف کرنا چاہتے تھے اور انہوں نے ایسا کر لیا تھا۔

سب کچھ ذہن میں تازہ ہو گیا۔ سارے انگارے دہک اٹھے۔ مجھے یاد آیا کہ اپنی آخری ملاقات میں، میں نے مایوس عارف کو اسپتال میں امید دلائی تھی اور اس سے کہا تھا کہ میں اس کے لیے جو بن پڑا کروں گا۔ اس وقت میری سوچ کچھ اور تھی۔ میں با اختیار لوگوں کی مدد لینا چاہتا تھا۔ قانون کا دروازہ کھٹکھٹانا چاہتا تھا اور ایسی ہی ساری دیگر کوششیں کرنا چاہتا تھا لیکن اب بہت کچھ بدل گیا تھا شاید ابھی تھوڑی دیر پہلے داؤد بھاؤ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ میرا وہ خول ٹوٹ گیا تھا جس کے اندر میں نے خود کو سمیٹ رکھا تھا۔ میں نے خود کو سنبھالے رکھنے کی بڑی کوشش کی تھی مگر بڑی تیزی سے اور بری طرح ناکام ہوا تھا۔ پاکستان لوٹتے وقت میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ میرے ساتھ ایسا کچھ ہوگا اور مجھے اتنی جلدی شکست تسلیم کرنا پڑے گی لیکن اب شکست تسلیم ہو چکی تھی اور میری یہ شکست کچھ لوگوں کو بدترین انجام سے دوچار کرنے والی تھی۔ یہ شکست دراصل ان کے مقدر کی شکست تھی...... ہاں خول ٹوٹ گیا تھا۔ تذبذب دور ہو گئے تھے، ہچکچاہٹیں دم توڑ گئی تھیں۔ اب معاملات چل نکلے تھے تو پھر رکنا کیا اور سوچنا کیا۔ میں نے داؤد بھاؤ سے کہا۔ ”کیا واقعی ہو رہی ہے شادی؟“

”ہاں کنفرم اطلاع ہے۔“

”میں یہ شادی نہیں ہونے دوں گا۔“

”مجھے اندازہ تھا، تم یہی کہو گے لیکن یہ بڑا مشکل کام ہوگا۔“

''کچھ لوگوں کی ڈکشنری میں مشکل اور ناممکن جیسے لفظ نہیں ہوتے داؤد بھاؤ۔''

''کیا اس وقت ایک اور محاذ کھولنا تمہارے لیے مناسب ہوگا؟''

''اب اگر یہ محاذ نہ کھولا تو بعد میں کھولنے سے کیا فائدہ؟'' میں نے ترنت جواب دیا۔

''تمہاری یہ بات تو صحیح ہے۔'' داؤد نے اپنا بڑا سا سر اوپر نیچے ہلایا۔ ''تو اب کیا کرنا چاہو گے؟'' بھاؤ کو جیسے اب میرے طور طریقے دیکھ کر مزہ آنے لگا تھا۔

''کسی طرح عارف کا پتا کرواؤ داؤد بھاؤ...... اور ہو سکے تو ایک دفعہ میری اس سے بات کروادو۔ سامنے نہیں تو فون پر ہی ہو جائے۔''

''ٹھیک ہے میں کوشش کرتا ہوں۔'' داؤد بھاؤ نے آمادگی ظاہر کی۔

داؤد بھاؤ بلا تردد میری مدد کر رہا تھا۔ نہ صرف اس نے مجھے پناہ دی تھی بلکہ ہر طرح کی سپورٹ بھی فراہم کر رہا تھا۔ ایسا کرنے میں اس کے لیے اور اس کے اس زیر زمین ٹھکانے کے لیے رسک ہی رسک تھا مگر وہ یہ رسک لے رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ داؤد مجھ سے ہمدردی رکھتا ہے اور میری صلاحیتوں سے خاطر خواہ متاثر بھی ہوا ہے لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ داؤد جیسے لوگ بے وجہ کسی کی مدد نہیں کرتے۔ یوں لگتا تھا کہ میرے حوالے سے داؤد بھاؤ کے ذہن میں مستقبل قریب کے لیے کوئی پلان موجود ہے۔

اگلے روز داؤد بھاؤ نے اپنے وسائل استعمال کیے اور عارف تک پہنچنے میں کامیاب رہا۔ داؤد بھاؤ کا اسسٹنٹ مختار جھارا میرے پاس ایک سیل فون لے کر آیا اور مجھے اطلاع دی کہ میں عارف سے بات کر سکتا ہوں۔ میں نے ہیلو کہا۔

دوسری طرف واقعی عارف کی آواز ابھری۔ ''کون؟'' اس نے پوچھا۔

''شاہ زیب...... بڑی کوشش سے رابطہ ہو سکا ہے تمہارے ساتھ۔''

''بھائی اب کیا کہنا ہے آپ کو؟'' عارف کے لہجے میں بیزاری کے علاوہ بیگانگی بھی تھی۔ اس کے علاوہ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہ شاید نشے میں ہے جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا اس نے سکون بخش دوا کھا رکھی تھی۔

میں نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ ''عارف مجھے لگ رہا ہے کہ تم نے ہار مان لی ہے۔ لڑنے سے پہلے ہی شکست کھا کر بیٹھ گئے ہو۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اگلے ہفتے عاشرہ کی شادی ہو رہی ہے؟''

دوسری طرف خاموشی رہی۔ مجھے خدشہ محسوس ہوا کہ کہیں وہ فون ہی بند نہ کر دے لیکن پھر چند سیکنڈ بعد اس کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''شاہ زیب بھائی! ان باتوں سے اب کوئی

فائدہ نہیں سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔ اب وہی ہونا ہے جو نظر آ رہا ہے۔''

''نظر وہی آتا ہے عارف جو ہم سوچتے ہیں، تم اپنی سوچ بدل لو، سب کچھ بدل جائے گا۔ اب بھی بہت دیر نہیں ہوئی ہے۔''

''دیر ہونا اور کس کو کہتے ہیں بھائی؟'' اس کی آواز بھرا گئی۔

میں نے بدلے ہوئے آہنگ میں کہا۔ ''مجھے صرف ایک بات...... صرف ایک بات بتاؤ عارف۔ کیا تم اب بھی عاشرہ کو چاہتے ہو۔ کیا اس کو حاصل کرنے کی خواہش اب بھی تمہارے دل میں ہے؟''

''وہ تو زندگی کی آخری سانس تک رہے گی۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

''تو پھر تیار ہو جاؤ عارف...... عاشرہ تمہیں ضرور ملے گی۔ ہم بازی پلٹ دیں گے۔''

دوسری طرف پھر چند لمحے کے لیے خاموشی طاری ہو گئی۔ ''ہیلو'' میں نے کہا۔

جواب میں عارف کی پژمردہ آواز ابھری۔ ''شاید تم اپنے حواس میں نہیں ہو شاہ زیب بھائی۔ تم جن لوگوں سے ٹکر لینے کی بات کر رہے ہو، وہ میرے اور تمہارے جیسوں کو کیڑے مکوڑوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے اور ہم ان کے لیے ہیں بھی کیڑے مکوڑے ہی۔ خدا کے لیے...... مجھے معاف کر دو۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو میری تقدیر میں تو جو عذاب لکھے ہیں وہ اب میں جھیل لوں گا لیکن میں نہیں چاہتا کہ وہ بھی زندگی موت کے درمیان لٹک جائے۔''

وہ سے اس کی مراد عاشرہ ہی تھی۔

''تم کوئی عذاب نہیں جھیلو گے اور نہ وہ جھیلے گی۔ عذاب وہی جھیلیں گے جنہوں نے جرم کیا ہے، جو گناہ گار ہیں۔''

عارف بولا۔ ''تم نے ان سے ٹکر لینے کا انجام دیکھ ہی لیا ہے شاہ زیب۔ مجھے سب معلوم ہو چکا ہے۔ جو کچھ ہوا ہے اس پر میرا دل خون کے آنسو روتا رہا ہے۔ تمہارے چچا کے گھر کو آگ لگ گئی۔ تمہاری بہن اور چچی زندہ جھلس گئے۔ تمہارا چچا زاد ولید اسپتال میں پڑا ہے اور پولیس کے پہرے میں ہے۔ تمہارے چچا بھی زندگی موت کی لڑائی لڑ رہے ہیں۔ پتا نہیں کہ بچتے بھی ہیں یا نہیں۔ یہ سب کس وجہ سے ہوا ہے؟ بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح میں بھی جانتا ہوں۔''

''تو پھر تم نے کچھ اور بھی تو جانا ہو گا عارف؟ خدا کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔ تم نے خبر سنی ہی ہو گی۔ قبضہ مافیا کا کرتا دھرتا لالہ نظام اور اس کا قریبی ساتھی امتیاز احمد ایک ٹریفک حادثے میں مارے گئے ہیں۔ اس کا خبیث داماد قیصر چودھری اسپتال میں ہے۔''

''حادثے میں تو ایک نظام مرا ہے بھائی یہاں تو پورا نظام ہی بگڑا ہوا ہے۔ ابھی دیکھنا چند روز تک ایک دو اور نظام پیدا ہو جائیں گے۔ تم نظام کے چھوٹے بھائی لالہ وریام کو کیا سمجھتے ہو؟ وہ اس سے دو ہاتھ آگے ہوگا اور پھر جب تک ان لوگوں کا پشت پناہ موجود ہے کوئی چھوٹا بڑا ایکسیڈنٹ ہم جیسوں کی بدنصیبیوں کو کم نہیں کر سکتا۔''

''میں تم سے لمبی بحث نہیں کرنا چاہتا عارف..... صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا تمہارے لیے عاشرہ اب بھی قابلِ قبول ہے؟''

''یہ تم کیسی بات کرتے ہو شاہ زیب؟'' عارف جیسے تڑپ کر بولا۔ ''وہ تو میری زندگی ہے۔ میری نس نس میں بسی ہوئی ہے۔ میں اب بھی اس کے ایک اشارے پر اپنی جان دینے کے لیے تیار ہوں۔ اس نے خود ہی حالات کا رخ دیکھ کر اپنے رستے بدل لیے ہیں۔ میں اس کو حاصل کرتا تو خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھتا لیکن یہ میرا نصیب ہی نہیں تھا۔''

''بس..... اپنے ان الفاظ کو یاد رکھنا عارف اور یہ بھی یاد رکھنا کہ تمہارے اور عاشرہ کے لیے میں جو کچھ کروں گا، اس کی وجہ سے تم پر یا تمہاری فیملی پر کوئی زد نہیں آئے گی..... ایک ہلکی سی آنچ بھی نہیں آئے گی۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو شاہ زیب۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا؟''

''خدا حافظ۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

کچھ دیر بعد میں اور داؤد بھاؤ پھر پرائیویٹ کمرے میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ میں نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ ''بھاؤ، میں داراب فیملی سے ٹکر لینا چاہتا ہوں۔ مجھے بتاؤ، میں کیا کروں؟''

''میں تو کہوں گا کہ یہ کیڑا دماغ سے نکال دو۔''

''یہ فیصلہ تو اب ہو چکا۔ آگے بات کرو۔''

''میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا کہوں۔ تمہارے ذہن میں کیا ہے؟''

میں نے قیمتی صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ ''ہر بڑے سے بڑے دبنگ شخص کے لیے کوئی نہ کوئی چیلنج ہوتا ہے۔ داراب فیملی کے لیے کون چیلنج ہے؟''

''جونا فیملی۔'' داؤد نے فوراً جواب دیا۔ ''یہ علاقے کی دوسری بڑی سیاسی فیملی ہے لیکن یہ بھی داراب فیملی کی طرح بے ایمان، گھمنڈی اور بے رحم لوگ ہیں۔ ان سے کسی خیر کی توقع کی ہی نہیں جاسکتی۔ میرے تمہارے جیسوں کو تو یہ وی آئی پیز لوگ اپنے دو کوس قریب سے

بھی نہیں گزرنے دیتے۔‘‘

’’مگر آپس میں اختلاف بھی تو ہوتے ہیں ان بڑے لوگوں کے اور اپنے اپنے مفاد بھی ہوتے ہیں۔‘‘

’’لیکن ایک حد تک۔ جہاں سے سچائی، انصاف اور انسانیت وغیرہ کی حدیں شروع ہوتی ہیں وہیں پر ان لوگوں کے آپس کے اختلاف ختم ہو جاتے ہیں اور ہم تو ویسے بھی حقیر کیڑے مکوڑے ہیں۔ ہم کیا اور ہماری اوقات کیا۔‘‘ داؤد بھاؤ کے لہجے میں زہر بھرا ہوا تھا۔ انڈر ورلڈ کا ایک نامی گرامی کردار ہونے کے باوجود وہ خود کو ان سیاسی مافیاز کے سامنے حقیر فقیر ہی سمجھ رہا تھا۔

’’آگے بڑھنے سے ہی راستے ملتے ہیں داؤد بھاؤ اور میں آگے بڑھنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’لیکن اگر غلط سمت میں آگے بڑھو گے تو یہ لوگ دو چار قدم پر ہی تمہیں پیس کر رکھ دیں گے۔‘‘

’’تم کوئی تجویز دے سکتے ہو تو دو ورنہ میں اپنے طور پر سوچتا ہوں۔‘‘ میں نے روکھے لہجے میں کہا۔

داؤد بھاؤ یک ٹک مجھے دیکھتا رہا۔ میرا رویہ اسے متاثر کر رہا تھا اور شاید مزہ بھی دے رہا تھا۔ چند سیکنڈ بعد وہ پہلو بدل کر بولا۔ ’’ایک بندہ ہے تنویر پاشا...... ہے تو بہت ڈنگا پر پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے کہ یہ تمہارے لیے فائدے مند ثابت ہو سکتا ہے۔‘‘

’’کیا بیچتا ہے یہ تنویر پاشا؟‘‘

’’بیچتا کچھ نہیں......خریدتا ہے......روپے کے زور پر اور اپنے تعلق کے زور پر۔‘‘

’’کیا خریدتا ہے؟‘‘

’’وہی سب کچھ جو ایک آوارہ کو موج مستی کی زندگی گزارنے کے لیے چاہیے ہوتا ہے۔ دنیا کی بہترین شراب، بہترین رہائش، عورتیں اور فارن کے ٹور وغیرہ......اور ہاں اس کے علاوہ انڈیا کے بہترین کبوتر بھی۔‘‘

’’کبوتر؟‘‘

’’ہاں اس عیاش پٹھے کے ساتھ تین بازیاں لگی ہوئی ہیں۔ نشے بازی، عورت بازی اور کبوتر بازی۔ لاہور کے بہترین علاقے میں چار کنال کی کوٹھی میں رہتا ہے۔ نوکر چاکر، گارڈز سب کچھ ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس کا کلا بڑا مضبوط ہے اور یہ کلا یعنی کھونٹا ٹھکا ہوا ہے شکیل داراب کے محلات میں۔‘‘

''مطلب یہ کہ شکیل داراب کا آدمی ہے؟''

''دوسو فیصد۔آج سے پانچ چھ سال پہلے تک یہ عام سا بندہ تھا۔کہیں جنوبی پنجاب سے آ کر لاہور میں رہ رہا تھا۔کسی انگلش اسکول میں کینٹین وغیرہ کا ٹھیکا تھا اس کے پاس۔ اب عیاشیوں کے تالاب میں مگرمچھ بن کر بیٹھا ہوا ہے۔اس مگرمچھ کی عیاشیوں کی ایک خاص بات اور ہے۔شاید تمہیں یہ بات عجیب لگے گی۔اس کے شکنجے میں زیادہ تر منگیتر اور شادی شدہ عورتیں ہی پھنستی ہیں۔اب پتا نہیں یہ ایک اتفاق ہے یا پھر وہ جان بوجھ کر ایسی عورتوں کو ٹارگٹ کرتا ہے۔میرا خیال ہے کہ وہ جان بوجھ کر ہی ایسا کرتا ہے۔بعض لوگوں کو ایسی چیز مزہ نہیں دیتی جو آسانی سے ہاتھ آ جائے۔اب دیکھو، کبوتر بھی اس نے بس وہ رکھے ہوئے ہیں جو انڈیا سے آتے ہیں۔سنا ہے اس کے کبوتروں میں سے کچھ کی قیمت دس پندرہ لاکھ روپے تک ہے۔ایسے کبوتروں کی خرید و فروخت باقاعدہ ڈی این اے ٹیسٹ کروانے کے بعد ہوتی ہے۔''

مجھے اس قصے میں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی میں نے داؤد سے پوچھا۔''یہ بندہ میرے لیے کس طرح فائدے مند ثابت ہو سکتا ہے؟''

داؤد نے وہسکی کا ایک تلخ گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔''پتا نہیں کیوں...... ہاں پتا نہیں کیوں مجھے یہ شک ہے کہ یہ شخص، شکیل داراب یا اس کے کسی قریبی عزیز کی دکھتی رگ سے واقف ہے۔شاید کوئی ایسا خاص بھید ہے اس کے پاس جس کے سبب شکیل اس پر ماہانہ لاکھوں خرچ کر ڈالتا ہے۔''

''یہ کرتا کیا ہے؟''

''یہی تو مزے کی بات ہے۔یہ دو ٹکے کا بندہ ہے۔اسے پچھلے پانچ چھ سال سے صرف اور صرف اپنی موج مستیوں سے غرض ہے۔پچھلے سے پچھلے سال یہ بیمار بھی ہوا تھا اور داراب فیملی کے خرچے پر ہی انگلینڈ سے علاج کروا کے آیا ہے۔تین چار لاکھ ڈالر کے چیک تو پہنچ گئے ہوں گے انگلینڈ کے کسی اسپتال میں۔''

''اس سے ملاقات کیسے ہو سکتی ہے؟''

''ایسے لوگوں سے ملاقات ہی تو مشکل ہوتی ہے۔'' داؤد نے کہا پھر ذرا سوچ کر بولا۔ ''اس کا ایک خاص باڈی گارڈ ہے۔ارشد کپتان۔اسے کپتاناں، کپتاناں بھی کہتے ہیں۔یہ ہر وقت اس کے ساتھ رہتا ہے۔کپتانے کی رہائش اچھرہ کے علاقے میں ہے۔ہر روز شام کو پندرہ بیس منٹ کے لیے اپنے گھر کا چکر ضرور لگاتا ہے۔''

''اس کے گھر کا اتا پتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

داؤد نے اثبات میں سر ہلایا۔

O......❖......O

کچھ ہی دیر بعد میں اور انیق ایک بار پھر بیسمینٹ سے باہر نکلنے کے لیے تیار تھے۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے انیق دیکھنے میں بالکل یونیورسٹی کا اسٹوڈنٹ ہی لگتا تھا۔ قطعی بے ضرر سا لیکن اگر یہ لڑکا داؤد بھاؤ کے ساتھ تھا تو یقیناً اس میں کچھ خاص گن تھے۔ ابھی تو اس کا ایک گن ہی سامنے آیا تھا اور وہ یہ کہ یہ لاہور کے چپے چپے سے واقف تھا اور پاکستانی فلموں کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔

جب میں اور انیق بیسمینٹ کے وسیع ہال کے قریب سے گزرے، ایک بار پھر میں نے ٹی وی پر اپنی ایک جھلک دیکھی۔ ایک غیر ملکی اسپورٹس چینل پر کونٹیکٹ فائٹ دکھائی جا رہی تھی۔ اس فائٹ کے دوران میں ایک فائٹ کا اشتہار چلایا گیا تھا اور اس میں، میں موجود تھا۔ کمنٹیٹر کی پُر جوش آواز سنائی دی۔ وہ انگلش میں کہہ رہا تھا۔

''ایک بار پھر ایسٹرن ینگ کنگ...... بمقابلہ ڈچ اسٹارم...... سانس روک دینے والا یادگار مقابلہ...... آپ کی پُر زور فرمائش پر پھر ری ٹیلی کاسٹ کیا جائے گا۔ آج شب، ساڑھے گیارہ بجے۔''

کمنٹیٹر کی آواز معدوم ہوتی چلی گئی۔ ہم بیسمینٹ سے نکل کر اس بیس میٹر لمبے چور راستے میں داخل ہو چکے تھے جو گیسٹ ہاؤس میں کھلتا تھا۔ اب قریباً نو بجے کا وقت تھا۔ گیسٹ ہاؤس میں مقیم افراد رات کا کھانا وغیرہ کھا رہے تھے۔ حسبِ سابق ہم نے ون سیون فائیو موٹر سائیکل نکالی۔ میں نے ہیلمٹ پہنا۔ انیق میرے پیچھے بیٹھا اور ہم باہر سڑک پر آ گئے۔

میں انیق کی رہنمائی میں آگے بڑھنے لگا۔ ہم نے اس حادثے کے بارے میں کوئی بات نہیں کی جو آج سرِ شام لاہور کے مضافات میں ہوا تھا اور جس نے میڈیا اور لوگوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ لالہ نظام چودھری مارا گیا تھا۔ کوئی اور جانتا ہو یا نہ لیکن انیق ضرور جانتا ہوگا کہ میں عین حادثے کے وقت کہاں موجود تھا اور میری موجودگی کتنی بھید بھری تھی۔ بہرحال وہ اس حوالے سے بالکل خاموش رہا غالباً داؤد بھاؤ کی طرف اسے زبان بندی کی ہدایت تھی۔

ہم اچھرہ کے گنجان علاقے میں پہنچے۔ مطلوبہ سڑک پر جا کر ایک جگہ انیق نے مجھے رکنے کا اشارہ کیا۔ ہم ایک چائے خانے کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ یہاں رش تھا۔ کرکٹ میچ دکھایا جا رہا تھا۔ پاکستان اور سری لنکا آمنے سامنے تھے۔ سڑک پر کھڑے لوگ دلچسپی سے دیکھ

رہے تھے۔ ہم بھی ناظرین میں شامل ہو گئے۔ میری طرح اور بھی دو راہگیر ہیلمٹ سمیت ہجوم میں موجود تھے اور میچ دیکھ رہے تھے۔ ہیلمٹ کا یہ شاندار استعمال مجھے بہت پسند آرہا تھا۔ اس ہیلمٹ نے میرے لیے ایک نقاب کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔ ان سڑکوں پر جہاں پولیس اہلکاروں کی اَن گنت نگاہیں مجھے ڈھونڈ رہی تھیں، میں آزادانہ پھر رہا تھا۔ میں نقاب پوش تھا اور میرا نقاب میرا سیاہ ہیلمٹ تھا۔

انیق کی نگاہیں بار بار گھڑی کی سوئیوں کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ ہماری معلومات کے مطابق ارشد کپتاناں یہاں آنے والا تھا یا یہاں سے جانے والا تھا۔ دونوں صورتوں میں اسے اس اندرونی سڑک سے گزر کر جانا تھا۔ اس کے پاس سبز رنگ کی سوزوکی مہران کار تھی اور کار کا نمبر بھی مجھے معلوم تھا۔ مجھے اور انیق کو بہت زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ قریباً بیس منٹ بعد ہمیں ایک سبز مہران گاڑی بازار کے موڑ سے نمودار ہوتی دکھائی دی۔

انیق نے مجھے ٹہوکا دیا۔ ''لیں بھائی جان، آپ کا دوست تشریف لے آیا ہے۔''

میں پہلے ہی تیار تھا۔ مہران کار چوک کی طرف سے نمودار ہوئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ ارشد کپتاناں اپنے گھر سے ہو کر واپس آرہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں میرا کام شروع ہو گیا تھا۔ اب مجھے اسے روکنا تھا۔ پروگرام کے عین مطابق میں ٹہلتا ہوا سڑک کے کنارے پہنچ گیا۔ مہران قریب آئی۔ میں ارشد کپتانے کی تصویر دیکھ چکا تھا اس لیے فوراً پہچان گیا۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر موجود تھا اور اکیلا تھا۔ اس کا چہرہ بالکل گول اور ناک کسی سیاہ فام ہی کی طرح چوڑی تھی۔ میں نے گاڑی کے تقریباً سامنے آکر ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا۔ اسے بریک لگانا پڑے۔ میری قسمت نے ساتھ دیا۔ دروازہ اندر سے لاک نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ ارشد کپتاناں کچھ سمجھتا، میں نے دروازہ کھولا اور اس کے برابر سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ہیلمٹ ابھی تک میرے سر پر تھا۔ اس نے بے حد حیرت سے میری طرف دیکھا۔ میں نے پستول اس کی بغل کے نیچے عین دل کے مقام پر رکھ دیا۔

''اس پر سائیلنسر لگا ہوا ہے۔ آواز بھی نہیں آئے گی اور تم قتل ہو جاؤ گے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے گمبھیر لہجے میں کہا۔

اس نے جیسے تڑپ کر میری طرف دیکھا۔ ایک لحظ کے لیے لگا کہ وہ زبردست مزاحمت کرے گا لیکن اگلے ہی لمحے اس نے ارادہ بدل دیا۔ میرے لہجے اور انداز نے اسے سمجھا دیا تھا کہ آنے والے دو تین سیکنڈ میں کچھ بھی ہو سکتا ہے اور اس نے ٹھیک فیصلہ کیا تھا۔ اگر وہ میرے لیے مسئلہ پیدا کرتا تو میں یقیناً اسے شوٹ کرنے میں دیر نہ لگاتا۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط

نہ ہوگا کہ آج شام لالہ نظام کی مرسیڈیز کو بھاری بھرکم ہینولوڈر کے نیچے روندنے کے بعد میرے سر پر خون سوار ہو چکا تھا اور اس خون کی بو اور حدت میرے لب و لہجے میں سرایت کر چکی تھی۔

''کون ہو تم؟'' ارشد کپتاناں نے مینڈک جیسی بیٹھی ہوئی آواز میں کہا۔ یقیناً اس کی آواز ایسی نہیں تھی، حیرت اور خوف کی زیادتی نے آواز کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔

میں نے جواب میں کہا۔ ''اگر تم نے چپ چاپ گاڑی آگے نہ بڑھائی تو سمجھو میں موت کا فرشتہ ہوں۔'' میں نے ایک بار پھر سرد لہجے میں اسے آگاہ کیا اور اس کے ساتھ ہی اس کی بالائی پسلیوں پر پستول کا دباؤ بڑھا دیا۔

''گجراتی کے بندے ہو؟'' نہ جانے کیوں اس کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔

''یہی سمجھ لو۔'' میں نے اس کی الجھن کو برقرار رکھنا مناسب جانا ورنہ میں کسی گجراتی شجراتی کو نہیں جانتا تھا۔

اس نے لمبا سانس لے کر دائیں بائیں دیکھا پھر چپ چاپ گاڑی آگے بڑھا دی۔ وہ مضبوط اعصاب کا مالک نظر آتا تھا اور اعصاب ہی نہیں اس کا جثہ بھی بے حد مضبوط اور گٹھا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اس نے سخت سردی کے باوجود ایک ہلکا سا سلیولیس سوئیٹر پہن رکھا تھا۔ توانا رانوں پر نیلی جین کسی ہوئی تھی۔ ناک حبشیوں جیسی تھی لیکن رنگ صاف تھا۔ عمر ستائیس اٹھائیس سال سے زیادہ نہیں ہوگی۔

کچھ آگے جا کر نسبتاً کم رونق والی جگہ پر اس نے گاڑی روک دی۔ شاید بات چیت کرنا چاہ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''نہیں برادر گاڑی روکنی نہیں۔ اگر گاڑی روکو گے تو پھر مجھے اپنی شہادت کی انگلی کو حرکت دینا پڑے گی اور تمہیں پتا ہی ہے اس وقت یہ انگلی کہاں رکھی ہوئی ہے۔''

''لیکن......''

''لیکن کچھ نہیں...... اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میں صرف خالی دھمکی دے رہا ہوں یا تمہارے دماغ میں یہ کیڑا کلبلا رہا ہے کہ تم اچانک مجھ پر جھپٹ پڑو گے تو پھر سمجھ لو کہ...... ابھی کچھ دیر پہلے تم اپنے گھر والوں کو آخری بار دیکھ چکے ہو......'' میرا پُرسکون انداز اسے جتنا خوفزدہ کر رہا تھا اتنا شاید میرا پستول بھی نہیں کر رہا تھا۔

''کیا چاہتے ہو؟'' وہ قدرے ڈھیلے لہجے میں بولا۔

''کوئی بھی اور سوال پوچھے بغیر مجھے سیدھا تنویر پاشا کے گھر کے اندر لے چلو۔ اس سے

کم کسی بھی قیمت پر تمہاری جان بچ نہیں سکتی ہے۔"

اس نے ایک بار پھر میری آنکھوں میں جھانکا...... اور پھر چپ چاپ گاڑی آگے بڑھادی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ میری بات اس کی سمجھ میں آ گئی ہے۔

ہم مختلف سڑکوں سے گزرتے ہوئے ڈیفنس کے علاقے میں آ گئے۔ میں نے اپنا پستول والا ہاتھ اپنی جیکٹ کے نیچے چھپالیا تھا۔ بہرحال سائیلنسر لگے ہوئے بیرل کا رخ کپتاناں کی طرف ہی تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ میں اسے باآسانی نشانہ بنا سکتا ہوں۔ سیاہ ہیلمٹ ابھی تک میرے سر پر ہی تھا۔ بہرحال ڈیفنس کی اندرونی سڑکوں پر داخل ہونے کے بعد میں نے ہیلمٹ اتار دیا۔ ایک دو جگہ مجھے بڑے بڑے ہورڈنگ نظر آئے۔ انہیں دیکھ کر اندازہ ہوا کہ علاقے میں شاید الیکشن وغیرہ کا ماحول بن رہا ہے۔ ان ہورڈنگز پر شکیل داراب اور عطا داراب وغیرہ کی بلند کرداری پر سلوگن لکھے ہوئے تھے۔

تنویر پاشا کی وسیع وعریض کوٹھی مجھے دور ہی سے نظر آ گئی۔ اس کی پہچان یہ تھی کہ کوٹھی کی بلند و بالا چھت پر کبوتروں کے بہت بڑے بڑے پنجرے دکھائی دے رہے تھے۔ کشادہ گیٹ پر مسلح گارڈ موجود تھا۔ اس نے گاڑی میں ارشد کو دیکھنے کے بعد بڑا گیٹ کھول دیا۔ طویل ڈرائیووے سے گزر کر ہم پورچ کی طرف آئے۔ وہ پورچ کی طرف جانا چاہ رہا تھا۔ تاہم اسی دوران میں مجھے بائیں جانب چار پانچ گیراج دکھائی دیئے۔ میں نے ارشد کپتاناں کو ہدایت کی کہ وہ گاڑی گیراج میں لے جائے۔

گاڑی کو نیم تاریک گیراج میں پارک کرنے کے بعد کپتاناں سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ "مجھے کسی ایسے کمرے میں لے چلو جہاں بیٹھ کر اطمینان سے بات کرسکیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ہم نے دس پندرہ منٹ سکون سے بات کرلی تو یہ ہم دونوں کے لیے بہت اچھا ہوگا اور خاص طور سے تمہارے لیے۔"

"چلو آؤ۔" اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

"ذرا ٹھہرو۔" میں نے اسے روکا۔ اب تک مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ کپتانے نے اپنے سوئٹر کے نیچے کمر کی طرف پستول یا ریوالور وغیرہ اڑسا ہوا ہے۔ میں نے احتیاط سے ہاتھ بڑھا کر یہ ہتھیار نکال لیا۔ یہ اعشاریہ پچیس کا ایک چھوٹا بریٹا پستول تھا۔ اس میں پوری گولیاں موجود تھیں اور یہ بالکل ورکنگ پوزیشن میں تھا۔ میں نے اسے اپنی پنڈلی میں جراب کے اندر اڑس لیا۔ کپتانے کے سڈول جسم پر تیزی سے ہاتھ گھما کر میں نے اس بات کی تسلی کی کہ اس

کے پاس کوئی اور ہتھیار تو موجود نہیں ہے۔ اس کے بعد میں نے اپنے پستول کا سائیلنسر اتار کر جیکٹ کے اندر رکھ لیا۔ اب میں اپنا دایاں ہاتھ باآسانی پستول سمیت جیکٹ کی سائیڈ پاکٹ میں گھسا سکتا تھا۔ کپتاناں یہ ساری کارروائی ایک تلخ خاموشی کے ساتھ دیکھ رہا تھا اور یہ بات اس کی سمجھ میں بڑی اچھی طرح آرہی تھی کہ میں اسے مہم جوئی کا کوئی موقع دینے کے لیے تیار نہیں۔

ہم پہلو بہ پہلو چلتے گیراج سے نکلے اور پورچ کی طرف جانے کے بجائے کوٹھی کے پہلو کی طرف آگئے۔ ایک طویل برآمدے میں چلتے ہم ایک چھوٹے دروازے کے ذریعے عمارت کے اندرونی حصے میں داخل ہوئے۔ ایک مسلح شخص نے ارشد کپتانے کو جھک کر سلام کیا اور ایک گھریلو ملازم بھی ارشد کو سلام کرتا ہوا شاید کچن کی طرف چلا گیا۔ کسی کمرے سے کسی شوخ لڑکی کے ہنسنے کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ یہ کوٹھی باہر کی طرح اندر سے بھی بے حد شاندار تھی۔ یوں لگتا تھا کہ تعمیر میں پانی کی طرح روپیہ بہایا گیا ہے۔ ایک قالین پوش راہ داری سے گزر کر ہم ایک مستطیل کمرے میں پہنچے۔ یہاں داخل ہوتے ہی باہر سے آنے والی آوازیں یکسر ختم ہو گئیں۔ مجھے فوراً اندازہ ہوا کہ یہ ایک ساؤنڈ پروف یا سیمی ساؤنڈ پروف کمرا ہے۔ اس کمرے تک پہنچتے پہنچتے مجھے پتا چل چکا تھا کہ ارشد کپتاناں کو اس کوٹھی میں کافی اختیارات حاصل ہیں۔ اس کے علاوہ اپنی چال ڈھال اور اپنے انداز سے وہ کافی پھرتیلا اور خطرناک شخص لگتا تھا۔ میں اس کی طرف سے زیادہ محتاط ہو گیا۔ اس ساؤنڈ پروف کمرے میں دو بڑے صوفے تھے۔ اس کے علاوہ ایک میز تھی جس کی دونوں جانب کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ دائیں جانب ایک بڑی الماری سی تھی جس کے دروازے سلائڈ کرتے تھے۔

بالکل اچانک کپتانے نے کام دکھا دیا۔ وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ گھوما اور اس نے اپنا بایاں ہاتھ میرے پستول والے ہاتھ پر مارا۔ یہ بڑی تگڑی ضرب تھی۔ میں بمشکل پستول کو اپنے ہاتھ میں رکھنے میں کامیاب ہوا۔ اس وار کی ناکامی نے کپتانے کو حواس باختہ نہیں کیا۔ ایک لحظہ ضائع کیے بغیر اس نے میرے سینے پر اپنے فولادی سر کی چوٹ رسید کرنا چاہی۔ میں اس کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ اس سے پہلے کہ اس کا فولادی کدو میری طرف بڑھتا، میں نے اس کے پیٹ میں گھٹنے کی جچی تلی ضرب لگائی۔ وہ لڑکھڑا کر تین چار قدم پیچھے گیا اور دیوار گیر الماری سے ٹکرایا۔ میں پستول سیدھا کر چکا تھا۔ انگلی کو ذرا سی حرکت دیتا تو تنویر پاشا کا یہ انتہائی پھرتیلا گارڈ مقتول قرار پاجاتا۔

لیکن میں نے اسے پستول سے صرف دھمکایا، فائر نہیں کیا۔ اس کی سرخ آنکھوں میں

خوف اور طیش یکجا ہو چکے تھے۔ اس نے مٹھیاں بھینچ رکھی تھیں اور اس کا انداز حملہ کرنے والا تھا۔ اس کے کھڑے ہونے کے انداز نے ہی مجھے سمجھا دیا تھا کہ وہ بائیں ہاتھ کا زیادہ استعمال کرتا ہے اور گتھم گتھا ہونے کے بجائے دور رہ کر لڑنا زیادہ پسند کرتا ہے۔ میں نے دیکھا کمرے کا دروازہ اندر سے لاک ہو چکا تھا۔ کوئی خفیہ کیمرا بھی مجھے یہاں نظر نہیں آیا۔ میں نے پستول جیکٹ کی اندرونی جیب میں ڈالا تو کپتانے کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"لگتا ہے بہت بھروسا ہے تمہیں اپنی تیز طراری پر۔" میں نے کہا۔ وہ خاموش کھڑا رہا۔ جیسے سمجھ نہ پا رہا ہو کہ اس موقع پر کیا کہے۔

میں نے کہا۔ "چلو آؤ، میں تمہیں تھوڑا سا موقع دیتا ہوں اپنی تیزی طراری آزمانے کا۔ میرا خیال ہے کہ یہ جگہ ساؤنڈ پروف ہے۔ اگر تمہیں رونا چلانا پڑا تو تمہاری آواز باہر نہیں جائے گی۔"

یقیناً اسے اپنے قوتِ بازو پر ضرورت سے زیادہ بھروسا تھا۔ اس نے مزید کوئی بات کہے بغیر مجھ پر حملہ کر دیا۔ بے شک وہ لڑائی کے گر جانتا تھا اور اس میں وہ آگ بھی تھی جو ایک فائٹر کو اضافی توانائی دیتی ہے لیکن اس کا سامنا ایک پروفیشنل شخص سے ہوا تھا۔ میں نے اس کا پہلا وار آسانی سے بچایا اور پھر اگلے پورے ایک منٹ تک اسے بار بار خود پر حملہ کرنے کا موقع دیا۔ وہ میری ٹھوڑی پر ایک اچٹتا ہوا سا ہاتھ لگانے کے سوا اور کچھ نہ کر سکا۔ وہ ہانپ رہا تھا اور اس کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی پھر اس نے ایک فاؤل کیا۔ اس نے جھپٹ کر الماری کی ایک زیریں دراز کھولی اور اس میں سے ایک ہتھیار نکالنے کی کوشش کی جیسا کہ بعد ازاں معلوم ہوا یہ ایک ریوالور تھا۔ میں نے تیزی سے اس کا بازو جکڑ لیا۔ اس نے ٹانگ چلائی اور یہ ٹانگ میں نے اپنی دونوں ٹانگوں کی گرفت میں لے لی۔ اس نے بوکھلاہٹ میں اندھا دھند زور لگایا اور ٹخنے کے اوپر سے اپنی پنڈلی تڑوا بیٹھا۔ ہڈی ٹوٹنے کی آواز بڑی واضح تھی۔

وہ درد کی شدت سے ڈکرایا اور اس کا رنگ لیموں کی طرح زرد ہو گیا۔

میں نے کہا۔ "جو کچھ کیا ہے، تم نے خود کیا ہے کپتانا ں...... لیکن اب اگر تم نے میری بات نہ مانی تو پھر جو کچھ ہوگا، وہ میں کروں گا اور وہ کچھ زیادہ اچھا نہیں ہوگا۔"

"کک...... کون ہو تم؟" وہ درد کی شدت سے بل کھاتے ہوئے بولا۔

"تمہیں بتایا تو ہے گجراتی کا بندہ۔"

"نہیں، تم جھوٹ بول رہے ہو۔ گجراتی کے پاس تمہاری طرح کا کوئی بندہ نہیں ہو سکتا۔ میں اس کے لڑکوں کی کیٹیگری جانتا ہوں۔ تم...... تم......"

''ہاں...... ہاں بولو تمہاری پنڈلی کی ہڈی ٹوٹی ہے۔ زبان کی ہڈی تو نہیں ٹوٹی۔''

وہ خشک زرد ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔ ''تم وہی ہو شاید جس کے بارے میں کچھ دن پہلے ٹی وی پر خبریں چلی تھیں۔ تم نے لاہور کے نواحی علاقے میں دہشت گردی کی کارروائی میں حصہ لیا اور پھر پولیس کی حراست سے بھاگ گئے۔''

''چلو اب اگر تم نے اس دہشت گرد کو پہچان ہی لیا ہے تو پھر خود پر تھوڑی سی دہشت بھی طاری کر لو کیونکہ میری بات نہ ماننے کی صورت میں یہاں تمہارے ساتھ جو کچھ ہونے والا ہے، تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔''

اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی مضروب پنڈلی دبا رکھی تھی اور اس کا ماتھا پسینے سے تر ہوتا جا رہا تھا۔

''کیا چاہتے ہو مجھ سے؟'' اس نے پوچھا۔

''بس چار پانچ سوالوں کے جواب لیکن بالکل ٹھیک ٹھیک۔''

''اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ اب یہاں سے بچ کر نکل سکو گے تو یہ تمہاری بھول ہے۔''

''اور اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تم یوں خالی ڈرم کی طرح بج کر مجھے میرے ارادوں سے باز رکھ سکو گے تو یہ تمہاری بھول ہے۔'' اس کے ساتھ ہی میں نے اس کی زخمی پنڈلی کو اپنے پاؤں سے ہلکی سی ٹھوکر لگائی۔ وہ بے ساختہ چلا اٹھا، آواز میں درد کا دریا بہہ گیا تھا۔

میں نے کہا۔ ''اس سے دس گنا زیادہ آواز سے بھی چلاؤ گے تو تمہاری پکار باہر نہیں جائے گی۔ میں نے اس کمرے کی ساؤنڈ پروف کوالٹی کو اب اچھی طرح دیکھ لیا ہے۔ اگر کوئی شک ہے تو تجربہ کر کے دیکھ لو۔'' اس مرتبہ میں نے قدرے شدت سے کپتانان کی ٹوٹی ہوئی ہڈی کو ٹھوکر ماری۔ وہ درد کی شدت سے بلند آواز میں ڈکرایا اور اس کی پوری ٹانگ تھر تھر کانپنے لگی۔

وہ سمجھ گیا تھا کہ صورتِ حال اس کے بس سے باہر ہو چکی ہے۔ جسمانی طور پر تو میں نے اسے شکست فاش دی ہی تھی، ذہنی طور پر بھی وہ بے طرح میرے نیچے لگ گیا تھا۔

وہ قالین پر گرا پڑا تھا۔ نیلی جین کے نیچے اس کی پنڈلی سوجتی جا رہی تھی اور بڑے بے ڈھنگے انداز سے مڑی ہوئی تھی۔ میں اس کے قریب چرمی صوفے پر بیٹھ گیا۔ ''ہاں جی کپتان صاحب! اس وقت یہاں اس عمارت میں آپ کی ٹیم کے کتنے بندے اور بندیاں ہیں؟ لیکن جواب ایک سو ایک فیصد ٹھیک ہونا چاہیے ورنہ آپ کے پاؤں کو تھوڑی سی کوشش کے ساتھ باقی ٹانگ سے علیحدہ بھی کیا جا سکتا ہے۔''

وہ کراہتے ہوئے بولا۔ ''تین بندے ہیں، ایک گارڈ، ایک چوکیدار اور ایک ملازم۔''

''بندیاں کتنی ہیں؟''

اس بار وہ ذرا ہچکچایا اور کراہتی آواز میں بولا۔ ''پانچ...... ان میں سے تین گھر کی ملازمائیں ہیں اور دو پاشا صاحب کی دوستیں۔''

''واہ کیا مزیدار لفظ ہے دوستیں...... یعنی فرینڈز۔ چلو ٹھیک ہے اور خود جناب پاشا صاحب اس وقت کہاں تشریف فرما ہیں؟ میرا مطلب ہے کہ کس کمرے میں؟''

اس نے اپنی ٹوٹی ہوئی رسٹ واچ دیکھی اور بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ وہ اپنے بیڈروم میں جا چکے ہوں گے۔''

''اس بیڈروم یعنی Bad room میں آپ جناب کے پاس کون سا ہتھیار ہوگا؟ اور ایک بار پھر بتا دوں مجھے جواب بالکل ٹھیک چاہیے۔''

''ان کے پاس بیڈروم میں ایک ٹرپل ٹو رائفل ہوتی ہے۔ ان کے سرہانے کی طرف بیڈ کے باکس میں رکھی رہتی ہے۔''

''جو تین بندے تم نے بتائے ہیں، ان کے پاس کیا اسلحہ ہے؟''

''گارڈ کے پاس سیون ایم ایم ہے۔ باقی دونوں ملازموں کے پاس کچھ نہیں۔ کم از کم میرے علم میں تو یہی ہے۔'' اس نے آخری فقرہ جیسے احتیاطاً ادا کیا۔ اس کی ٹانگ درد کی شدت سے لرزتی چلی جا رہی تھی۔

میں نے یونہی دیوار گیر الماری کے سلائیڈنگ دروازے کو حرکت دی اور بری طرح چونک گیا۔ اس الماری کو بس الماری کی طرح بنایا گیا تھا ورنہ یہ اندر سے کچھ اور تھی۔ ایک بڑی پینل پر آٹھ دس اسکرینز نظر آ رہی تھیں۔ یہ دراصل ایک پورا سرویلینس سسٹم تھا جس کے ذریعے کوٹھی کے مختلف حصوں میں لگے ہوئے سی سی ٹی وی کیمرے مختلف مناظر دکھا رہے تھے۔ ایک منظر اس مین گیٹ کا تھا جہاں سے ہم کچھ ہی دیر پہلے گزر کر اندر آئے تھے۔ ایک اسکرین پر کوٹھی کے بڑے سے کچن کا منظر دکھایا جا رہا تھا۔ یہاں دو درمیانی عمر کی ملازمائیں برتن دھونے میں مصروف تھیں۔ ان میں سے ایک کو ہم نے اس ساؤنڈ پروف کمرے میں آنے سے پہلے دیکھا تھا۔ ایک منظر شاندار ٹی وی لاؤنج کا تھا۔ چھتیس اڑتیس برس کا ایک نشئی سا شخص پھیل کر بیش قیمت صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ ایک خوبرو اسمارٹ لڑکی اس کے پہلو میں بیٹھی اپنے سیل فون سے چھیڑ چھاڑ میں مصروف تھی۔ شاید کوئی گیم وغیرہ کھیل رہی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے لاتعلق بیٹھے تھے۔ شاید ان میں کوئی لڑائی وغیرہ چل رہی تھی۔

درمیانی عمر کے شخص نے گلابی رنگ کا سلیپنگ گاؤن پہن رکھا تھا اور کوئی برانڈی قسم کی چیز ٹن پیک سے پی رہا تھا۔ اس کا سوجا ہوا تھوبڑا اور مخمور آنکھیں دیکھ کر میں جان گیا کہ یہی اس محل نما کوٹھی کا مالک بلکہ عیاش مالک اور مختار کل پاشا ہے۔

بقول داؤد بھاؤ اس شخص کو تین بازیاں لاحق تھیں۔ کبوتر بازی، نشے بازی اور عورت بازی اور اپنی ان تمام بازیوں سمیت یہ دو ٹکے کا بندہ شکیل داراب کی ناک کا بال بنا ہوا تھا۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے پاشا کے محافظ خاص ارشد کپتانے نے بتایا تھا کہ پاشا صاحب بیڈروم میں جا چکے ہیں لیکن وہ شاید ابھی گیا نہیں تھا۔ غالباً کسی وجہ سے اس کا موڈ اپ سیٹ تھا اور وہ اپنی بغل میں موجود حسین لڑکی میں بھی کوئی خاص رغبت محسوس نہیں کر رہا تھا۔

میں نے ارشد کپتانے سے کہا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ تم کوٹھی میں موجود تینوں مرد ملازموں کو یہاں اس کمرے میں بلاؤ۔ میرا خیال ہے کہ تم ایسا کر سکتے ہو؟''

اس کے تاثرات نے مجھے سمجھا دیا کہ وہ ایسا کر سکتا ہے لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور تذبذب کے عالم میں میری طرف دیکھتا رہا۔ میں نے پھر وہی کیا جو مضروب کپتانے کو گھائل جانور کی طرح چلانے پر مجبور کر دیتا تھا۔ میں نے بے رحمی سے اس کی ٹوٹی ہوئی ہڈی پر ضرب لگائی۔ وہ جیسے تڑپنے لگا بہرطور اس بے رحمی کا نتیجہ مثبت نکلا۔ قریباً دس منٹ بعد گارڈ سمیت کوٹھی کے تینوں ملازم اس ساؤنڈ پروف کمرے میں موجود تھے۔ پٹھان گارڈ اپنی سیون ایم ایک رائفل سے محروم ہو چکا تھا اور دونوں ہاتھ سر پر رکھے میرے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے خانساماں کو اپنی مدد پر مجبور کیا اور سب سے پہلے پٹھان گارڈ کے ہاتھ نائیلون کی رسی سے اس کی پشت پر بندھوائے بعدازاں باقی دونوں افراد کے ہاتھ بھی اسی طرح بندھ گئے۔

اب ملازماؤں کی باری تھی۔ دونوں ملازمائیں ابھی تک کچن میں نظر آ رہی تھیں۔ میرے حکم پر ارشد نے جس طرح تھوڑی دیر پہلے گارڈ غلام خان کو فون کیا تھا اور اس سے کہا تھا کہ وہ باقی دونوں ساتھیوں کو لے کر فوراً میٹنگ والے کمرے میں پہنچے فوری، کام ہے۔ اسی طرح اب اس نے کچن میں کام کرتی ہوئی دراز قد ملازمہ سے کچن کے انٹرکام پر رابطہ کیا۔

بیل ہونے پر بھرے بھرے جسم والی خوبرو ملازمہ نے نیپکن سے ہاتھ صاف کیے اور ریسیور اٹھایا۔ ''ہیلو۔'' ارشد کپتاناں نے بھاری آواز میں کہا۔

''جی کپتاناں صاحب۔'' ملازمہ جلدی سے بولی۔

''آسیہ تم نسرین اور بلی کو لے کر فوراً میٹنگ والے کمرے میں آؤ۔''

''خیریت تو ہے کپتاناں صاحب؟'' لڑکی آسیہ نے ذرا پریشان ہو کر کہا۔

"ہاں خیریت ہی ہے۔تم جلدی کرو ضروری کام ہے۔"

اس نے جی اچھا کہتے ہوئے ریسیور رکھ دیا اور سی ٹی وی کیمرے کے فریم سے آؤٹ ہوگئی۔

قریباً تین چار منٹ بعد اس ساؤنڈ پروف کمرے سے باہر ہلکا سا بزر بجا۔ پہلے کی طرح میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ میں دروازے کی اوٹ میں ہوگیا۔ سامنے کپتاناں اسی طرح قالین پر پڑا تھا اور زخمی ٹانگ دونوں ہاتھوں سے تھام رکھی تھی۔

"کیا ہوا کپتاناں صاحب؟" آسیہ نامی وہ لڑکی چلائی اور دیگر لڑکیوں کے ساتھ تیزی سے اندر آگئی۔ میں نے دروازہ فوراً لاک کر دیا۔ میرے ہاتھ میں اب گارڈ غلام خان والی سیون ایم ایم رائفل تھی۔

ملازمائیں تقریباً ایک ساتھ چلا اٹھیں۔ ان کی سمجھ میں آگیا تھا کہ یہاں کچھ بہت برا ہو چکا ہے۔ انہوں نے بندھے ہاتھوں والے مرد ملازمین کو بھی دیوار کے ساتھ کھڑے دیکھ لیا تھا۔ آسیہ کے پاس سیل فون موجود تھا۔ دیگر افراد کے سیل فونز کی طرح یہ فون بھی میں نے اپنے قبضے میں لے لیا۔ اس بات کی تسلی میں پہلے ہی بہت اچھی طرح کر چکا تھا کہ یہاں اور کوئی فون موجود نہیں ہے۔ کوئی لینڈ لائن بھی نہیں۔

اب اسکرین والے پینل پر ٹی وی لاؤنج والا صوفہ بالکل خالی نظر آ رہا تھا۔ ایل سی ڈی بھی آف تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ پاشا اپنے بیڈروم میں جا چکا ہے۔

قریباً پندرہ منٹ بعد میں اپنی ساری کارروائی مکمل کر چکا تھا۔ پاشا کی گرل فرینڈز میں سے ایک تو اس کے ساتھ بیڈروم میں تھی، دوسری باہر تھی۔ یہ بھی گداز جسم والی ایک دلکش لڑکی تھی۔ عمر چھبیس ستائیس سال رہی ہوگی۔ اس کا نام فرح معلوم ہوا تھا۔ میں نے اسے بھی گن پوائنٹ پر رکھ کر میٹنگ روم میں پہنچا دیا تھا۔ سب کے ہاتھ مضبوطی سے باندھے جا چکے تھے۔

مجھے صرف دو افراد کی طرف سے تھوڑا سا اندیشہ تھا۔ ایک گارڈ غلام خان اور دوسری ملازمہ آسیہ۔ یہ لڑکی آسیہ بھی دیگر افراد کی طرح مجھے کوئی چور ڈاکو ہی سمجھ رہی تھی اور مسلسل دھمکا رہی تھی۔ اس کی باتوں کا مفہوم یہ تھا کہ میں نے غلطی سے شیر کی کچھار میں قدم رکھ دیا ہے۔ اب یہاں میری ہڈیاں بھی نہیں ملیں گی۔ اگر مجھ میں تھوڑی بہت عقل بھی موجود ہے تو بدترین انجام سے بچنے کے لیے اب بھی یہاں سے دفعان ہو جاؤں۔

کچھ اسی قسم کی باتیں غلام خان بھی کر رہا تھا۔ اسے شاید یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ کوئی اکیلا شخص اس طرح دندناتا ہوا تنویر پاشا کے گھر میں گھس سکتا ہے اور کپتاناں جیسے شخص کو

مار پیٹ کر اور لنگڑا کر کے فرش پر ڈال سکتا ہے۔ وہ بار بار کہہ رہا تھا۔ ’’تم پاشا صاحب کو جانتا نہیں ہے......اور اگر جانتا ہے تو پھر تم سے بڑا بے وقوف اور کوئی نہیں۔ خوتم کو اندازہ نہیں ہے کہ یہاں تمہارا کیا حشر ہونا ہے......‘‘

میں نے مناسب سمجھا کہ غلام خان کو مزید احتیاط کے طور پر اٹیچ باتھ روم میں لاک کر دیا جائے اور میں نے ایسا ہی کیا۔ اس میٹنگ روم کا آہنی دروازہ بالکل محفوظ تھا اور میں نے پوری تسلی کر لی تھی کہ یہاں سے کوئی باہر نہیں نکل سکتا اور نہ ہی اپنی آواز باہر پہنچا سکتا ہے۔ موبائل فونز کے علاوہ کسی بھی قسم کا کوئی ہتھیار بھی میں نے میٹنگ روم میں نہیں رہنے دیا تھا۔ میٹنگ روم کو باہر سے لاک کرنے کے بعد میں نے گارڈ غلام خان والی سیون ایم ایم رائفل سنبھالی اور پاشا کے بیڈروم کا رخ کیا۔ دروازہ اندر سے لاک تھا۔ میں نے دو تین بار ہلکی ناک کی۔

’’کون ہے؟‘‘ اندر سے باریک نسوانی آواز سنائی دی۔

میں نے پھر ناک کی۔ دروازہ کھل گیا اور لڑکی کی جھلائی ہوئی شکل نظر آئی۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں دہشت کے آثار ابھرے۔ میں نے لپک کر اس کے ہونٹوں پر اپنا مضبوط ہاتھ رکھ دیا اور اسی بازو کے ساتھ اسے عقب سے جکڑ لیا۔ میرے دوسرے ہاتھ میں رائفل تھی اور یہ رائفل میں نے جہازی سائز کے لگژری بیڈ کی طرف کر دی تھی۔

بیڈ پر پاشا دبیز کمبل اوڑھے لیٹا تھا یقیناً سو رہا تھا۔ مجھے اس کے خراٹوں کی بہت مدھم آواز سنائی دی۔ سائیڈ ٹیبل پر برانڈی کی بڑی بوتل اور گلاس وغیرہ پڑے تھے۔ بیڈروم میں بھی برانڈی کی بُو رچی بسی تھی۔ خوبرو لڑکی میرے بازو کے شکنجے میں ایک مرتبہ چڑیا کی طرح پھڑ پھڑائی پھر اس نے جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔ میں نے تیز سرگوشی کی۔ ’’اگر شور نہیں کرو گی تو کچھ نہیں کہوں گا اور رائفل بھی تمہاری طرف نہیں کروں گا۔‘‘

لڑکی سرتاپا لرز رہی تھی۔ تاہم اس نے خود کو تیزی سے سنبھالا اور اپنا سر اثبات میں ہلایا۔ اس کی طرف سے اطمینان محسوس ہوا تو میں نے اس کے ہونٹوں سے ہاتھ ہٹا لیا اور بازو کی گرفت بھی ڈھیلی کر دی۔ وہ تڑپ کر مجھ سے جدا ہوئی اور پلٹ کر میری طرف دیکھنے لگی۔ وہ خوف زدہ ہونے کے باوجود دلکش نظر آ رہی تھی۔

’’کون ہو تم؟‘‘ وہ دھیمی لرزاں آواز میں بولی۔

’’تمہیں کہا ہے نا جو کوئی بھی ہوں تمہیں نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ میرا جھگڑا تمہارے اس منہ بولے خاوند پاشا سے ہے۔‘‘

مجھے لڑکی کی شکل کچھ جانی پہچانی محسوس ہوئی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں نے اسے ٹی وی

اور رسالوں میں دیکھا ہوا ہے۔ میں نے اسے دیوار کے ساتھ کھڑا رہنے کا حکم دیا اور خود دبے پاؤں آگے بڑھ کر پاشا کے سرہانے پہنچ گیا۔ کپتانے نے اس باکس کی نشاندہی کر دی تھی جس میں پاشا کی ٹرپل ٹو رائفل رکھی رہتی تھی لہٰذا مجھے رائفل تک پہنچنے اور اسے قبضے میں لینے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ اس دوران میں، میں نے لڑکی پر بھی نظر رکھی۔ پاشا کی رائفل میں سے میگزین نکال کر میں نے جیکٹ کی جیب میں ڈال لیا اور رائفل واپس رکھ دی۔

پاشا بدستور سو رہا تھا۔ میں نے لڑکی سے اس کا نام پوچھا۔ اس نے جاناں بتایا۔ میں نے کہا۔ ''تم ٹی وی پر کام کرتی ہو؟''

وہ منمنائی۔ ''بب...... بس ایک دو اشتہاروں میں کام کیا ہے۔''

''یہاں اس بیڈ روم میں پاشا کے ساتھ کون سا اشتہار بنوا رہی ہو؟''

وہ کٹ کر رہ گئی اور نیچے دیکھنے لگی۔ اس کی صورت بتا رہی تھی کہ وہ یہاں انجوائے نہیں کر رہی بلکہ بہ امر مجبوری موجود ہے۔ کسی پھنسی ہوئی لڑکی کی طرح۔

اچانک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ مجھے وہ دلدوز منظر یاد آ گیا جب میں زخمی عارف کو اسپتال پہنچانے کی پاداش میں حوالات کے اندر بند کر دیا گیا تھا اور پھر چچا حفیظ نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ کر مجھے انسپکٹر قیصر سے بے وجہ معافی مانگنے پر مجبور کیا تھا۔ جب میں معافی مانگنے انسپکٹر قیصر کے کمرے میں پہنچا تھا تو وہ فون پر بازار حسن کے کسی شخص سے بات کر رہا تھا۔ کسی لڑکی کا معاملہ تھا ایک ایسی آوارہ لڑکی جو اپنے گاہک سمیت پولیس کی گرفت میں آ گئی تھی۔ گفتگو میں اس لڑکی کا نام بھی آیا تھا۔ مجھے یاد آ گیا وہ نام جاناں ہی تھا۔ نوے فی صد امکان تھا کہ یہ وہی لڑکی ہے۔

''ابھی تک تمہاری جان ان لوگوں سے چھوٹی نہیں جاناں؟'' میں نے زہریلے لہجے میں پوچھا۔

''کک...... کیا...... مطلب؟''

''خیر چھوڑو، یہ بات بعد میں ہو جائے گی۔ ابھی وقت کم ہے میں ذرا انٹرویو لے لوں تمہارے ان پاشا صاحب کا۔''

''کیسا انٹرویو؟'' وہ ہکلائی۔

''پاشا صاحب کو نوکری دینی ہے نا۔''

''نن...... نوکری؟''

''ہاں دوزخ میں کھڑکیاں صاف کرنے کی نوکری۔'' میرا لہجہ زہرناک تھا۔

وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ میں نے احتیاطاً اسے کمرے کے اٹیچ باتھ روم میں لاک کردیا۔ وہ ہکا بکا تھی شاید یہاں کے دیگر مکینوں کی طرح اسے بھی یقین نہیں آرہا تھا کہ کوئی اکیلا شخص پاشا جیسے دبنگ کے گھر میں گھس کر اس طرح کی کارروائی کرسکتا ہے۔

اس لڑکی جاناں کی طرف سے مطمئن ہوکر میں پاشا کے شاندار لگژری بیڈ تک پہنچا اور ٹھوکر مار کر اسے جگایا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ پہلے میچی ہوئی آنکھوں سے میری جانب دیکھتا رہا پھر جیسے یکا یک اسے صورتِ حال کی سنگینی کا احساس ہوا۔

''کون ہو؟'' وہ گمبھیر آواز میں بولا۔

پھر میرے جواب دینے سے پہلے وہ تڑپ کر بیڈ کے اس چوبی باکس کی طرف بڑھا جو سرہانے کی طرف تھا۔ اس نے تیزی سے باکس کا ڈھکن اٹھایا اور اپنی ٹرپل ٹو رائفل نکال لی۔ اس نے رائفل کا رخ میری طرف کیا اور دہاڑا۔

''ہاتھ اوپر اٹھاؤ......کون ہوتم؟''

میں اس کی طرف بڑھا تو اس نے فائر کردیا۔ ٹریگر دبانے سے رائفل میں سے بس ٹرچ کی آواز نکل کر رہ گئی۔ میں نے کہا۔ ''پاشا! یہ بھی تمہاری طرح کھوکھلی ہوچکی ہے۔ بس نام کی رائفل ہے۔''

پاشا کا چہرہ حیرتوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ یقیناً اسے ایسا ہی لگ رہا تھا کہ وہ جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھ رہا ہے پھر وہ ایک دم پکارنے لگا۔ ''کپتانے...... کپتانے...... غلام خان......''

میں نے اس کے سلیپنگ گاؤن کو گریبان کے پاس سے پکڑا اور ایک زوردار جھٹکا دے کر اسے قالین پر گرادیا۔ اس نے گلابی گاؤن کے نیچے صرف ایک انڈرویئر پہن رکھا تھا۔ وہ پشت کے بل گرا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ رائفل اب بھی اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے ایک بار پھر بے دریغ میری طرف ٹریگر دبایا۔ نتیجہ وہی نکلا جو پہلے تھا۔ اب اسے پتا چل گیا کہ رائفل کے ساتھ میگزین نہیں ہے۔ ''کون ہوتم......کیا چاہتے ہو؟'' وہ پھر چنگھاڑا۔ اس کی ناک بری طرح سرخ ہورہی تھی اور آواز بھی نزلہ زدہ تھی۔ غالباً اسے شدید قسم کا زکام لگا ہوا تھا۔ شاید اسی لیے وہ برانڈی وغیرہ بھی پی رہا تھا۔ جاناں جیسی لڑکی کے موجود اور دستیاب ہونے کے باوجود اس کے سوجانے کی وجہ بھی شاید یہی نزلہ زکام تھا۔ باتھ روم کے اندر لڑکی مسلسل دروازہ کھٹکھٹا رہی تھی اور پاشا کو وہاں اپنی موجودگی کا پتا دے رہی تھی لیکن پاشا اس کی کیا مدد کرسکتا تھا وہ تو خود لوہے کے جال میں تھا اور برے حال میں تھا۔

میں اس کے قریب پہنچا تو اچانک اس نے پھرتی دکھانے کی ناکام کوشش کی۔ اس نے مجھے ٹانگوں سے پکڑ کر گرانا چاہا اور میرے اوپر سوار ہونا چاہا لیکن وہ سُست الوجود شرابی اس سے دس گنا تیزی کا مظاہرہ کرتا تو بھی شاید اپنے ارادے میں کامیاب نہ ہوتا۔ میں نے بہ آسانی اپنی ٹانگ بچائی اور پھر اس کے منہ پر ایک زوردار ٹھوکر لگانے کے بعد اسے بالوں سے گھسیٹتا ہوا بیڈروم سے ٹی وی لاؤنج میں لے آیا۔ اسی کھینچا تانی میں پاشا کا ریشمی گاؤن بھی اس کے جسم سے جدا ہو گیا اور وہ انڈرویئر میں مضحکہ خیز نظر آنے لگا۔ دراصل میں چاہتا تھا کہ پاشا کو اپنی اس بے عزتی کی پوری پوری کوریج ملے۔ بیڈروم میں سی سی ٹی وی کیمرا موجود نہیں تھا لیکن یہاں ٹی وی لاؤنج میں تھا۔ ساؤنڈ پروف میٹنگ روم میں یقیناً ٹی وی لاؤنج کا پورا منظر دکھائی دے رہا تھا۔

رائفل ابھی تک پاشا کے ہاتھ میں تھی۔ میں اس کے سامنے خالی ہاتھ کھڑا تھا۔ کپتانان کی طرح میں نے پاشا کو بھی اس کے دل کی حسرت نکالنے کا پورا موقع دیا۔ اگلے قریباً دو منٹ میں اس نے رائفل کو آہنی لاٹھی کی طرح استعمال کیا اور مجھ پر کئی اندھا دھند حملے کیے پھر اس نے رائفل چھوڑ کر ایک ٹوٹا ہوا بلوری گلدان پکڑ لیا اور اس کے نوکیلے کنارے کو خنجر کی طرح استعمال کر کے مجھے زخمی کرنے کی کوشش کی مگر مجھے چھُو بھی نہیں سکا۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ اس نے اپنے ہاتھوں کی انگلیاں زخمی کر لیں۔ اس کا چربی دار جسم تھل تھل کر رہا تھا اور وہ بالکل ہانپا ہوا نڈھال بھینسا دکھائی دینے لگا تھا۔ ایل سی ڈی کی اسکرین برباد ہو گئی تھی اور دو کھڑکیوں کے شیشے بھی چکنا چُور تھے۔ پاشا کی حالت اس دیوار کی سی تھی جسے ہوا کا ایک تیز جھونکا بھی مسمار کر دیتا ہے۔ یہ جھونکا میری ٹھوکر کی صورت میں اس کی دنبے جیسی پیٹھ پر لگا اور وہ گالیاں بکتا ہوا ایک صوفے پر جا گرا۔ پاشا کو جگانے سے پہلے میں نے گارڈ سے چھینی ہوئی سیون ایم ایم رائفل ایک میز کے نیچے رکھ دی تھی۔ اب میں نے رائفل پھر اٹھالی اور اس کا بیرل پاشا کے پیٹ پر رکھ دیا۔

''کیا خیال ہے؟'' میں نے کہا۔ ''تمہاری ناف کے ساتھ ہی ایک اور ناف نہ بنا دی جائے؟''

اس نے پھر ایک گالی دی اور خطرناک دھمکی کا اعادہ کیا۔ میں نے جواباً اس کے منہ پر ٹھوکر ماری اور اسے خون تھوکنے پر مجبور کر دیا۔ ''دیکھ میرے بیمار بھینسے، پیٹ میں گولی لگے تو بندے کو مرنے میں بڑی تکلیف ہوتی ہے اور میرا دل یہی چاہ رہا ہے کہ تجھے گولی ماروں تو پیٹ میں ماروں۔''

اس نے ایک بار پھر مجھ پر جھپٹنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں وہ صوفے سے قالین پر گر پڑا۔ میں نے اس کی گردن پر اپنا پاؤں رکھ دیا۔ وہ بری طرح کھانسنے لگا اور تکلیف کی شدت سے اس کی زبان باہر نکل آئی۔ اس کا انڈرویئر کچھ نیچے کھسک گیا تھا اور وہ نیم عریاں نظر آنے لگا تھا۔ مجھے یہ سوچ کر مزہ آرہا تھا کہ میٹنگ روم میں کنٹرول پینل کی اسکرین پر یہ سارا تماشا دیکھا جارہا ہوگا۔

اگلے دو تین منٹ میں وہ بالکل بے بس نظر آنے لگا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ آج رات اس کے اس عشرت کدے میں کچھ بہت انوکھا ہو چکا ہے اور اس کی آہ و بکا سن کر اس کا کوئی پالتو اس کی مدد کے لیے یہاں نہیں آئے گا۔

وہ کچھ دھیما پڑا تو میں نے اس سے کہا کہ مجھے اس سے اپنے چند سوالوں کے جواب چاہئیں۔ اگر وہ ٹھیک جواب دے گا تو میں اس کی جان بخشی کر کے یہاں سے جا بھی سکتا ہوں۔ دوسری صورت میں اللہ نے چاہا تو کل شام سے پہلے پہلے اس کی نماز جنازہ ادا ہو جائے گی۔

وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔ ''پہلے مجھے میرا گاؤن دو۔''

میں نے گاؤن کی طرف دیکھا۔ وہ بیڈروم اور ٹی وی لاؤنج کے درمیان پڑا تھا۔ میں نے گاؤن اسے تھما دیا۔ اس نے لرزاں ہاتھوں کے ساتھ گاؤن پہنا اور اس مرتبہ اس کی بیلٹ بھی باندھی۔ میں اسے رائفل سے دھکا کر ایک ساتھ والے کمرے میں لے آیا۔ میں نے دیکھ لیا تھا یہاں سی سی ٹی وی کیمرا موجود نہیں تھا۔ یہاں تسلی کے ساتھ پاشا صاحب سے پوچھ گچھ کی جاسکتی تھی۔ داؤد کے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ یہ بندہ شکیل داراب کی کسی دکھتی رگ سے واقف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی پانچوں گھی میں اور سر کڑاہی میں ہے۔

اس کمرے میں پہنچنے کے بعد پاشا نے مجھ سے پہلا سوال یہی کیا کہ اس کا عملہ اور ارشد کپتان وغیرہ کہاں ہیں۔

میں نے کہا۔ ''ان کے بارے میں تسلی رکھو۔ وہ تم سے بہت بہتر پوزیشن میں ہیں۔ میٹنگ روم میں حالات حاضرہ پر تبصرہ کر رہے ہوں گے۔ تم ان کی فکر چھوڑ دو اور اپنی کرو۔ مجھے تم سے شکیل داراب کے بارے میں کچھ پوچھنا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ تم اس سے اپنی وفاداری نبھانے کی کوشش کرو لیکن یاد رکھو، آج رات تم کسی ایک سے ہی وفا کر سکو گے۔ شکیل سے یا اپنی زندگی سے۔''

''مجھے سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا کہہ رہے ہو؟''

میں اس کے قریب ہی صوفے پر بیٹھ گیا۔ میں نے کہا۔ ''تم ایک عظیم کبوتر باز ہو اور کبوتر باز کی نظر بہت تیز ہوتی ہے۔ مجھے شاید پہچانا نہیں ہے تم نے؟''

اس نے ایک بار پھر آنکھیں کھول کر بڑے دھیان سے مجھے دیکھا اور اس کے تمتماتے ہوئے چہرے پر سنسنی سی پھیل گئی، بولا۔ ''کہیں تم...... میرا مطلب ہے...... کہیں وہی تو نہیں ہو جس نے قیصر چودھری کو گن پوائنٹ پر......''

''ہاں وہی ہوں۔'' میں نے اس کی بات کاٹی۔ ''اور اب تمہیں یہ بھی یاد آگیا ہوگا کہ میں نے مفرور ہونے سے پہلے اور کیا کیا کارنامے کرر کھے ہیں۔ بم پھوڑے ہیں، دہشت گردیاں کی ہیں، پولیس مقابلے فرمائے ہیں اور قیصر چودھری کی ساری باتیں مانی جائیں تو پھر میں نے قتل عام اور قتل خواص بھی کیے ہیں۔''

اچانک وہ ہوا جس کی توقع مجھے ہرگز نہیں تھی۔ کم از کم اس اسٹیج پر تو نہیں تھی۔ ابھی تو پاشا سے بات چیت ہی شروع ہوئی تھی۔ اس نے دفعتاً اپنے گاؤن کی کشادہ جیب میں ہاتھ ڈالا اور پھرتی سے کوئی چیز منہ میں ڈال کر چبالی۔

''یہ کیا ہے؟'' میں نے اس کا منہ دبوچ کر اسے اس کے ارادے سے باز رکھنا چاہا لیکن وہ منہ میں ڈالی ہوئی چیز نگل چکا تھا۔ یہ کوئی نہایت تیزی سے اثر کرنے والی دوا تھی۔ میں نے اسے سر کے بالوں سے پکڑ کر جھنجوڑا اور پوچھا کہ اس نے کیا کھایا ہے۔

اس نے کوئی معقول جواب نہیں دیا۔ بس مجھے خطرناک دھمکیوں سے نوازتا رہا۔ اسی دوران میں اس کی آنکھیں نیم باز نظر آنے لگیں۔ مشکل سے ایک منٹ گزرا ہوگا کہ اس کے چہرے کا رنگ بدلا اور اس نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیئے۔ اس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ نہایت سریع الاثر بے ہوشی کی دوا تھی۔ بالکل انستھیسیا کی طرح اثر کرنے والی۔ اس نے بزدلی آمیز چالاکی دکھائی تھی اور خود کو بے ہوشی کے حوالے کر کے میری باز پُرس سے جان چھڑالی تھی۔

میں نے اس کے چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دیئے۔ اسے جھنجوڑا، ہلایا جلایا لیکن اندازہ ہوا کہ اس کی بے ہوشی گہری اور طویل ہے۔ چند لمحوں کے لیے میں سٹپٹا کر رہ گیا۔ پاشا کے بیڈروم کی طرف سے گاہے بگاہے دروازہ پیٹنے کی آواز آرہی تھی۔ یہ وہی جانان نامی لڑکی تھی جسے میں نے باتھ روم میں بند کیا تھا۔ چند روز پہلے یہ لڑکی اپنے کسی گاہک کے ساتھ پولیس کے ہتھے چڑھی تھی اور ابھی تک اس چکر میں پھنسی ہوئی تھی یقیناً وہ ابھی تک اپنے

ٹھکانے پر واپس نہیں گئی تھی۔

میں نے اندازہ لگالیا تھا کہ یہ جاناں نئی نئی پھنسی ہوئی مچھلی ہے۔ یہ پاشا کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتی تھی لیکن وہ دوسری فرح نامی لڑکی اس تالاب کی پرانی مچھلی لگتی تھی۔ کوشش کر کے اس سے کوئی کام کی بات معلوم کی جاسکتی تھی اور نہ جانے کیوں میرا دل بھی یہ گواہی دے رہا تھا کہ وہ کچھ نہ کچھ بتائے گی۔

میں نے بے ہوش پاشا کو گھسیٹا اور اسے بھی کمرے کے باتھ روم میں لاک کر دیا۔ اس کے ریشمی گاؤن کی تلاشی لی تو جیب کی اندرونی جانب ٹیپ سے چپکایا ہوا ایک اور کیپسول برآمد ہوا۔ کچھ دیر پہلے اسی طرح کا کیپسول پاشا نے چبایا تھا جیسا کہ بعد میں فرح نامی لڑکی سے مجھے معلوم ہوا۔ اگر وہ یہ دونوں کیپسول ایک ساتھ چبالیتا تو اس کی موت واقع ہو جاتی۔ یہ کیپسولز کسی ہنگامی صورتِ حال کے لیے پاشا نے اپنے لباس میں رکھے ہوئے تھے۔ اس کی بے مہار عیاشیوں نے یقیناً اس کے کئی دشمن بھی پیدا کر رکھے تھے۔ شاید کسی ایسے ہی دشمن کے قہر سے بچنے کے لیے اس نے یہ انتظام کر رکھا ہوگا۔

پاشا کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں نے غلام خان والی رائفل اٹھائی اور میٹنگ روم کا رخ کیا۔ میں فرح کو پوچھ گچھ کے لیے میٹنگ روم سے نکالنا چاہتا تھا۔ اس کام میں تھوڑی سی دشواری تو ہوئی لیکن میں کامیاب رہا۔ فرح کو لے کر میں اس کمرے میں آ گیا جہاں پاشا سے سوال جواب کیے تھے۔

فرح بھی خوش شکل تھی۔ اس نے شب بسری کا ڈھیلا ڈھالا ہلکی لباس پہن رکھا تھا۔ بال جوڑے کی صورت میں کس کر باندھے ہوئے تھے۔ وہ سی سی ٹی وی کیمرے کے ذریعے اپنے باس کا حشر دیکھ چکی تھی۔ اس کا دم خم تو اسی وقت ختم ہو گیا تھا جب اس نے میٹنگ روم میں کپتاناں کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ ملاحظہ کی تھی اور دیگر ملازمین کو بندھے ہوئے دیکھا تھا۔ اب پاشا کی درگت دیکھنے کے بعد وہ بالکل ہی لرزاں و ترساں نظر آتی تھی۔ میرے اشارے پر چل رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ”تم سمجھ ہی گئی ہوگی، آج کی رات تم لوگوں پر بہت بھاری ہے۔ زندہ وہی بچے گا، جو مجھ سے تعاون کرے گا۔“

اس نے خشک لبوں پر زبان پھیر کر اثبات میں سر ہلایا۔

”اپنے بارے میں بتاؤ؟“ میں نے تحکم سے کہا۔

جواب میں اس نے جو کچھ کہا، اس سے پتا چلا کہ...... وہ لالہ نظام کے ایک پراپرٹی

ڈیلنگ آفس سبحان ڈویلپرز میں ملازمت کرتی تھی۔ بدقسمتی سے وہیں پر ایک دن پاشا آیا اور اس کی نظر کرم اس پر پڑ گئی۔ اس کی منگنی ہو چکی تھی لیکن اپنے منگیتر سے اس کے تعلقات اچھے نہیں تھے۔ وہ دبئی میں رہتا تھا۔ پاشا نے اپنا رعب داب استعمال کر کے دو چار مہینوں میں اس کے منگیتر کو فارایسٹ بھگا دیا اور اسے اپنے تصرف میں لے آیا۔ شروع میں وہ اس سے شادی کا وعدہ بھی کرتا تھا لیکن بعد میں اس وعدے سے بالکل انکاری ہو گیا وغیرہ وغیرہ۔

مجھے اندازہ ہوا کہ اندر سے یہ لڑکی پاشا کے خلاف غم وغصے سے بھری ہوئی ہے۔ ظاہر نہیں ہونے دے رہی ورنہ شاید پاشا کی شاندار درگت دیکھنے کے بعد وہ اندر سے بہت مسرور تھی۔

میں نے کہا۔ "دیکھو فرح! اس کمرے میں جو بات چیت ہو رہی ہے، وہ ہم دونوں تک ہی رہے گی۔ تمہیں یقین دلانے کے لیے میں بس یہی کہوں گا کہ یہ ایک مرد کی زبان ہے۔"

"لیکن میں سچ کہہ رہی ہوں...... مم...... میں پاشا صاحب کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتی۔ شاید اتنا ہی جانتی ہوں جتنا عام ملازم جانتے ہوں گے۔ دراصل وہ......" وہ رک گئی۔

"ہاں ہاں کہو۔" میں نے اسے اکسایا۔

"دراصل...... یہ بہت گہرا بندہ ہے۔ اپنے سائے پر بھی بھروسا نہیں کرتا۔" اس بار بولتے ہوئے فرح کے لہجے میں ایک زہر سا سرایت کر گیا۔

میں نے یہ بات بھانپ لی کہ وہ ویسے تو پاشا کے خلاف بھری ہوئی ہے اور پاشا کا حشر دیکھنے کے بعد اس کے اندر تھوڑی بہت جرأت بھی پیدا ہوئی ہے مگر وہ زیادہ کچھ نہیں جانتی ہے اور اس کی یہ بات درست ہے کہ پاشا بہت گہرا اور گھنا بندہ ہے۔

میں اسے مسلسل اعتماد میں لینے کی کوشش کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ یہ جرأت بھی دے رہا تھا کہ اگر وہ کوئی اہم بات جانتی ہے تو بتا دے۔

آخر اس نے ڈرے ڈرے انداز میں کہا۔ "بھائی جی! میرا اندازہ ہے کہ پاشا کی کوئی منکوحہ بیوی بھی ہے...... یا پھر تھی۔"

"اس اندازے کی وجہ؟"

"کبھی کبھی جب وہ بہت نشے میں ہوتا ہے تو کسی ناہید نامی عورت کا نام لیتا ہے۔ اسے بہت گالیاں دیتا ہے اور اول فول بکتا ہے۔"

"تمہارا کیا قیافہ ہے...... وہ واقعی اس کی بیوی ہے؟"

''میرا یہی خیال ہے اور یہ بھی اندازہ ہے کہ شاید وہ بے اولاد ہے۔''

''ایسا کیوں کہہ رہی ہو؟''

''پاشا نے ایک بار اسے بانجھ، بنجر اور کمینی وغیرہ کے خطاب دیئے تھے۔''

میں نے بہت کوشش کی کہ فرح نامی اس لڑکی سے اس بارے میں کچھ اور جان سکوں لیکن یہی محسوس ہوا کہ اس بارے میں وہ جو جانتی تھی، اس نے بتا دیا ہے۔ اس سے صرف ایک اضافی بات معلوم ہو سکی۔ اس نے بتایا۔ ''میٹنگ روم کے ساتھ ایک چھوٹا کمرا ہے جو ہر وقت لاک رہتا ہے۔ اس میں پاشا کی ذاتی چیزیں پڑی ہیں۔ کچھ کاغذات، نایاب شراب کی کچھ بوتلیں، کچھ حنوط شدہ کبوتر، اسمگل کیے ہوئے چند ہتھیار اور اسی طرح کا اور سامان ہو سکتا ہے کہ جس سے آپ کو کوئی کام کی بات معلوم ہو جائے۔''

''اس کی چابی کہاں ہو گی؟''

''پاشا کے بیڈ روم میں ہے، ڈھونڈنا پڑے گی۔'' فرح نے جواب دیا۔

''کیا تم اس سلسلے میں کوئی مدد کرو گی؟''

اس نے بڑی عاجزی سے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ''میں آپ کی منت کرتی ہوں مجھے اس میں انوالو نہ کریں۔ آپ نے وعدہ کیا ہے کہ یہاں جو بھی تھوڑی بہت بات ہوئی ہے، وہ بھی ہمارے درمیان ہی رہے گی۔''

اس کی سیاہ آنکھوں میں عجز و التجا کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ میں نے باتھ روم میں جا کر پاشا کا معائنہ کیا۔ وہ سلیپنگ گاؤن میں ٹائیلوں کے فرش پر بے سُدھ پڑا تھا۔ فرح بے شک تعاون کر رہی تھی لیکن اس کے حوالے سے بھی میں کوئی رسک لینے کو تیار نہیں تھا۔ میں نے اسے بھی باتھ روم میں مقفل کر دیا اور پاشا کے بیڈ روم میں چلا گیا۔ یہاں کے باتھ روم سے جاناں کے رونے کی مدھم آواز ابھر رہی تھی۔ غالباً رونے چلانے کے بعد وہ نڈھال سی ہو کر بیٹھ گئی تھی۔ پاشا کے بیڈ روم میں، میں نے قریباً دس منٹ لگائے اور ایک الماری کی اندرونی دراز سے میں مطلوبہ چابی ڈھونڈنے میں کامیاب ہوا۔

سات آٹھ سیڑھیاں اتر کر میں پاشا کے پرائیویٹ کمرے میں پہنچا۔ یہ قریباً پندرہ ضرب پندرہ فٹ کا کمرا تھا۔ باقی عمارت کی طرح اس کی آرائش میں بھی بے تحاشا امارات کی جھلک تھی۔ یہاں وہ سب کچھ موجود تھا جس کی اس فرح نامی لڑکی نے نشاندہی کی تھی۔ جدید طرز کے قیمتی پسٹل، پرانی شراب کی قیمتی بوتلیں، شیشے کے ایک منقش آبنوسی باکس میں حنوط شدہ کبوتروں کا ایک جوڑا، رجسٹریاں، اقرار نامے، چیک بکس اور پتا نہیں کیا کچھ۔

میں نے ایک دیوار گیر الماری کی تلاشی لینا شروع کی۔ اس میں موجود بیشتر اشیا تنویر پاشا کی عیاش طبیعت کی غماز تھیں۔ بیس تیس منٹ میں، میں نے اس مختصر کمرے کے ایک ایک انچ کی تلاشی لی اور سب کچھ تہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ یوں لگتا تھا کہ کمرے میں جنات نے تہلکہ مچادیا ہے۔ میں نے ایک تیز دھار چاقو کی مدد سے صوفہ ادھیڑ دیا اور کرسیوں کی نشستوں کو بھی چیر پھاڑ کر رکھ دیا۔ دیوار گیر الماری کی سب درازیں فرش پر پڑی تھیں اور میں لکڑی کے تختوں کو ٹھونک بجا کر دیکھ چکا تھا۔ مجھے کوئی ایسی چیز یا ایسا کاغذ وغیرہ نہیں ملا جو کسی طور اس بات کی تصدیق کر سکتا جو ابھی کچھ دیر پہلے فرح نے مجھے بتائی تھی۔ کوئی ایسا کلیو بھی نہیں ملا جو تنویر پاشا کے ماضی پر کوئی روشنی ڈال سکتا۔ صرف...... چند پیپرز سے اتنا معلوم ہو سکا کہ دو ڈھائی سال پہلے، پاشا کو کثرت شراب نوشی کی وجہ سے گردوں کی تکلیف لاحق ہوئی تھی اور وہ علاج کے لیے لندن کے ایک معروف اسپتال میں گیا تھا۔ یہ بات مجھے پہلے سے معلوم تھی۔

میں نے دس پندرہ منٹ مزید سر مارا اور پھر مایوس ہو گیا۔ اس کمرے میں داخل ہونے سے پہلے جو امید نمودار ہوئی تھی، وہ یکسر اوجھل ہو گئی۔ میں نے جھلاہٹ میں دیوار گیر الماری کو ٹھوکر ماری تو اچانک اس کی ایک اندرونی شیلف کا چند انچ چوڑا ٹکڑا کھل کر نیچے لٹک گیا۔ یہاں ایک چور خانہ تھا۔ چور خانے میں کچھ پراپرٹی کے پیپرز تھے، کچھ غیر ملکی کرنسی اور ضروری کاغذات تھے۔ یہیں پر مجھے ایک پرانے شناختی کارڈ کی فوٹو اسٹیٹ ملی یہ ایک خاتون کا شناختی کارڈ تھا۔ نام نے مجھے بری طرح چونکا دیا۔ ناہید فیضان۔ شناختی کارڈ کے ساتھ ہی دو تین مزید کاغذ تھے۔ ان کو دیکھ کر مجھ پر انکشاف ہوا کہ یہ ناہید فیضان کا کوئی پرانا اپائنٹمنٹ لیٹر ہے۔ اس لیٹر سے اس انگلش اسکول کا نام معلوم ہوا جہاں وہ بطور ٹیچر سروس کر رہی تھی۔ اس لیٹر پر ناہید کا نام ناہید پاشا درج تھا۔ یہ بے حد اہم پیش رفت تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے فرح نے جو کچھ بتایا تھا وہ بالکل درست ثابت ہوا تھا۔ ماضی قریب میں پاشا شادی شدہ تھا اور اس کی شریکِ حیات وہی ناہید نامی لڑکی تھی جسے وہ کبھی کبھار نشے میں دھت ہو کر گالیاں دیتا تھا۔ یہ لڑکی کسی اسکول میں ٹیچنگ کرتی رہی تھی۔

پھر میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ مجھے فرح کی یہ بات بھی یاد آئی کہ پاشا چند سال پہلے تک ایک معمولی شخص تھا۔ پوش علاقے کے کسی اسکول میں اس کے پاس کینٹین وغیرہ کا ٹھیکا تھا۔ غالباً وہ یہی اسکول تھا جہاں ناہید فیضان ملازمت کرتی تھی۔ فوری خیال ذہن میں یہی آیا کہ شاید وہیں پر ان دونوں کی ملاقات ہوئی جو بعد ازاں ازدواجی بندھن کی شکل اختیار کر گئی۔ (لیکن یہ خیال بعد میں غلط ثابت ہوا۔)

ایک اہم سرا ہاتھ آ گیا تھا اور اس سرے کے ذریعے میں کسی سراغ تک پہنچ سکتا تھا۔
داؤد کے الفاظ میرے ذہن میں گونج رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ کیا واقعی پاشا کے پاس شکیل داراب کا کوئی ایسا راز ہے جس کی وجہ سے وہ بغیر ایک تنکا دہرا کیے عیاشیوں کی زندگی گزار رہا تھا۔

اپنے سارے ملازموں کے سامنے تنویر پاشا کی یادگار درگت بنی تھی۔ آج رات کے لیے یہ سزا اس کے لیے کافی تھی۔ یہ جگہ چھوڑنے سے پہلے میں نے کپتاناں کی مدد سے تین سی سی ٹی وی کیمروں میں موجود آج رات کی تمام فوٹیج ضائع کر دی۔ کپتاناں بہت خودسر شخص تھا لیکن ٹانگ کی سنگین چوٹ نے اس کے لیے وہی کام کیا تھا' جو مشتعل اونٹ کے لیے نکیل کرتی ہے۔ میں ٹانگ کو ہلکی سی ٹھوکر لگاتا تو وہ جیسے بلبلا اٹھتا تھا۔ میں واپسی کے لیے کپتاناں کی سبز مہران کار استعمال کرنا چاہ رہا تھا لیکن مسئلہ وہی میرے پہچانے جانے کا تھا۔ میں ہیلمٹ کے بغیر باہر نکلنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے گھریلو ملازم کی موٹر سائیکل استعمال کی۔ سر پر ہیلمٹ رکھ کر میں ایک بار پھر با آسانی لاہور کی سڑکوں پر سے گزرا۔ میں اس موٹر سائیکل کو گیسٹ ہاؤس کے اندر ہی لے گیا۔ یہاں انیق بے چینی سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں اس کے ساتھ بیسمینٹ میں پہنچ گیا۔

O......❖......O

اگلا روز بڑا اہم تھا۔ داؤد بھاؤ کی ہدایت پر انیق نے بڑی ہوشیاری اور تیز رفتاری سے کام لیا۔ صبح دس بجے سے پہلے ہی وہ اس انگلش میڈیم اسکول میں پہنچ گیا جس کا سراغ میں نے پاشا کے خاص کمرے سے لگایا تھا۔ یہ پوش علاقے کا ایک کافی مہنگا اور مشہور اسکول تھا۔ یہاں بیوروکریٹس، انتظامی عہدیداروں اور دیگر معروف لوگوں کے بچے زیر تعلیم تھے۔
میڈیا پر یا اخبار میں کہیں بھی رات والے واقعے کی خبر موجود نہیں تھی۔ کہیں پر ہلکا سا اشارہ بھی نہیں تھا کہ پاشا جیسے دبنگ شخص کے گھر میں کل رات کیا تماشا ہوا ہے۔ ہاں ایک دن پہلے والے ایکسیڈنٹ کے بارے میں نمایاں خبریں اور تبصرے موجود تھے۔ لالہ نظام چودھری کی لاش کی تصویر بھی جاری ہوئی تھی۔ اس کے نتھنوں میں روئی تھی اور منہ کھلا ہوا تھا۔ جیسے آخری لمحوں میں اسے یقین ہی نہ آ رہا ہو کہ ایک دیوہیکل ٹرک اس کی زندگی کا چراغ گل کرنے کے لیے اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ایک اور نہایت اہم اور غیر متوقع خبر بھی نیوز میں موجود تھی اور میرے نکتہ نظر سے یہ بڑی خوش کن خبر تھی۔ ٹرک کا نشے باز ڈرائیور سر کی چوٹ کی وجہ سے جانبر نہیں ہو سکا تھا۔ جس وقت لوڈر ٹرک مرسیڈیز سے ٹکرایا ڈرائیور فرنٹ سیٹ پر بے

ہوش پڑا تھا۔ تصادم سے اس کا سر ونڈ اسکرین سے ٹکرایا تھا جس سے ونڈ اسکرین بھی ٹوٹ گئی تھی۔ اس چوٹ نے انٹرنل بلیڈنگ کی اور وہ زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ اب اس بات کا کھوج دینے والا کوئی نہیں تھا کہ ٹرک اور مرسیڈیز کا تصادم ڈرائیور کی غلطی کی وجہ سے نہیں ہوا تھا۔

اسکول سے انیق کی واپسی دوپہر دو بجے کے قریب ہوئی۔ اس نے مجھے معلومات فراہم کرتے ہوئے بتایا۔ ''شاہ زیب بھائی! ناہید پاشا اسکول کی ایک بہت اچھی اور پسندیدہ ٹیچر تھی لیکن وہ کوئی چھ سال پہلے اسکول کی ملازمت چھوڑ گئی تھی۔ یہ ملازمت اس نے اپنی مرضی سے چھوڑی تھی۔ وہ اب کہیں لاہور میں ہی رہائش رکھتی ہے۔ میں ایک دوسری ٹیچر کے ذریعے اس کا کھوج لگانے کی کوشش کررہا ہوں۔ یہ ٹیچر آج شام تک مجھے کچھ نہ کچھ بتائے گی۔''

''پاشا کے بارے میں کیا معلوم ہوا؟'' میں نے انیق سے پوچھا۔

''پاشا اور ناہید میاں بیوی تھے۔ یہ دونوں بارہ تیرہ برس پہلے ملتان کے علاقے سے لاہور آئے تھے۔ یہاں ناہید کو اسکول میں جاب مل گئی بعد میں پاشا کو بھی اسی اسکول میں کینٹین اور پارکنگ وغیرہ کا ٹھیکا مل گیا۔ بظاہر میاں بیوی میں سلوک تھا لیکن ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔''

''کوئی اور خاص بات؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ کافی مہنگا، ہائی فائی تعلیمی ادارہ ہے۔ پتا چلا ہے کہ داراب فیملی کے بچے بھی یہاں پڑھتے رہے ہیں اور تو اور کچھ عرصہ شکیل داراب بھی اس اسکول میں رہا ہے۔ بعد میں وہ انگلینڈ کے کسی تعلیمی ادارے میں چلا گیا تھا۔''

میرے جسم میں جیسے کرنٹ سا دوڑ گیا۔ کچھ لنکز سے بن رہے تھے۔ شکیل داراب بھی اسی اسکول میں پڑھتا رہا تھا۔ اس کے اس اسکول میں پڑھنے اور اب تنویر پاشا کے عیاشیوں میں ڈوبے ہونے میں کیا ناتا ہوسکتا تھا؟ داؤد بھاؤ کے الفاظ پھر میرے کانوں میں گونجے...... یوں لگتا ہے کہ پاشا کے پاس داراب فیملی کا کوئی خاص بھید ہے۔

اب مجھے بے چینی سے شام کا انتظار تھا کیونکہ انیق کو ناہید کے پتے ٹھکانے کے بارے میں کچھ بتانا تھا۔ میں اس ساری پیش رفت سے داؤد بھاؤ کو بھی آگاہ رکھے ہوئے تھا۔ میں نے تنویر پاشا کے گھر میں گھس کر کل رات جو دھانسو قسم کی کارروائی کی تھی، اس نے مجھ پر داؤد کا اعتماد کچھ اور بڑھا دیا تھا۔ (قیصر چودھری کے بارے میں اطلاعات تھیں کہ اس کا ایک بازو دو جگہ سے ٹوٹ گیا ہے اور سر پر بھی چوٹیں ہیں۔ وہ اسپتال میں تھا۔)

شام آٹھ بجے سے کچھ دیر پہلے انیق نے فون پر مجھ سے رابطہ کیا۔ اس کی یہ کال مایوس کن ثابت ہوئی۔ اس نے بتایا کہ ناہید یا ناہید پاشا کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ ایک ذریعے سے یہ بات بھی پتا چلی ہے کہ وہ لاہور میں نہیں بلکہ سیالکوٹ میں کہیں رہائش رکھتی ہے۔

یہ معاملہ کھٹائی میں پڑتا نظر آرہا تھا لیکن میں اسے کھٹائی میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ گھڑی کی سوئیاں چل رہی تھیں۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ سات روز بعد ہفتے کے دن عاشرہ کی شادی شکیل داراب کے ساتھ تھی۔ یہ میرے لیے ڈیڈ لائن تھی۔ مجھے ہفتے کے دن سے پہلے پہلے کچھ کرنا تھا۔ میں نے بھاؤ سے درخواست کی اور بھاؤ نے اسی وقت انیق کو بذریعہ فلائنگ کوچ سیالکوٹ روانہ کر دیا۔

میرے اندازے کے عین مطابق داؤد بھاؤ کو بھی انیق کی صلاحیتوں پر پورا اعتماد تھا۔ اسے معلوم تھا کہ بظاہر یہ عام سا لڑکا دیواروں میں در بنانے کا ہنر جانتا ہے اور ہر قسم کے حالات سے نبرد آزما ہو سکتا ہے۔ میں نے بے چینی سے انیق کے فون کا انتظار کیا۔ خدا خدا کر کے اگلے روز سہ پہر کے وقت انیق کا حوصلہ افزا فون آ گیا۔ اس نے بتایا کہ اس نے سیالکوٹ کے انڈسٹریل ایریا کے قریب ایک پوش علاقے میں ناہید نام کی ایک خاتون کا سراغ لگایا ہے۔ وہ دس مرلہ کی ایک کوٹھی میں ایک بوڑھی عورت کے ساتھ رہائش پذیر ہے۔ خیال ہے کہ یہی خاتون ماضی کی اسکول ٹیچر ناہید پاشا ہے۔

ایک گھنٹے بعد انیق کا فون دوبارہ آیا۔ اس مرتبہ اس کی آواز جوش سے لرز رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”شاہ زیب بھائی! میں بہت خوش ہوں۔ سمجھئے کہ فلم آئینہ میں گمشدہ شبنم کو دوبارہ دیکھنے کے بعد ندیم اتنا خوش نہیں ہوا ہوگا جتنا میں ہو رہا ہوں۔“

”ہاں بتاؤ، کیا اطلاع ہے؟“ میں نے بدستور سنجیدہ رہتے ہوئے کہا۔

وہ بولا۔ ”یہ ناہید صاحبہ وہی اسکول ٹیچر ہیں۔ ان کے ساتھ کوٹھی میں رہنے والی ان کی بوڑھی آیا بتولہ ہے۔ ناہید طلاق یافتہ ہیں۔ ان کی گزر بسر قریبی مارکیٹ میں موجود چند دکانوں کے کرایے سے ہوتی ہے۔ محلے میں ان کی نیک نامی ہے۔ ضرورت مندوں کی مدد کرتی رہتی ہیں۔“

”کیا تم اس عورت سے براہِ راست مل چکے ہو؟“

”نہیں جناب لیکن جس مارکیٹ میں ان کی دکانیں ہیں وہاں سے تسلی بخش معلومات حاصل ہو گئی ہیں۔“

میں نے تیزی سے سوچتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے انیق، تم سیالکوٹ میں ہی رکو، میں

چند گھنٹوں میں تم تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اپنا ایڈریس بتاؤ۔"

انیق نے ایک ہوٹل کا پتا بتایا اور میں جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

داؤد بھاؤ کی اطلاع کے مطابق لاہور اور گردونواح میں بڑی سرگرمی سے میری تلاش ہو رہی تھی۔ میں کسی عام گاڑی کے ذریعے سفر نہیں کر سکتا تھا۔ داؤد بھاؤ مجھے پوری پوری لاجسٹک سہولتیں فراہم کر رہا تھا۔ اس نے اس بار میرے سفر کا انتظام ایک ٹرک کے ذریعے کیا۔ یہ ٹرک دلی دروازے کی ایک گڈز ایجنسی سے معمول کے سفر پر سیالکوٹ جا رہا تھا۔ اس پر لاہور سے سیالکوٹ ٹرانسفر ہونے والے کسی سرکاری افسر کا گھریلو سامان لدا ہوا تھا۔ میرے لیے اس سامان کے اندر ہی بیٹھنے کے لیے جگہ بنا دی گئی۔ میں ایک ڈبل صوفے پر آرام سے نیم دراز ہو گیا۔ سامان کے اوپر ترپال ڈال دی گئی تھی۔ داؤد بھاؤ کا کہنا تھا جس طرح کی بے کار چیکنگ ٹرکوں کے سامان کی ہوتی ہے۔ ہاتھی کو بھی با آسانی چھپا کر ایک شہر سے دوسرے شہر لے جایا جا سکتا ہے۔"

اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ لاہور سے سیالکوٹ تک کے سفر میں تقریباً پانچ گھنٹے لگے۔ کئی جگہ ٹرک رکا بھی لیکن کسی ایک جگہ بھی کوئی معائنہ کار ٹیم ٹرک کے پچھلے حصے میں نہیں آئی۔ میں نے سیالکوٹ روانگی سے پہلے داؤد بھاؤ سے ایک دو ضروری چیزیں مانگی تھیں جن میں ایک کیمرا بھی شامل تھا۔ بھاؤ نے کہا تھا۔ "یہاں سے کچھ لے جانے کی ضرورت نہیں۔ سیالکوٹ میں اپنا بندہ موجود ہے۔ انیق سے کہنا جو چاہو گے مل جائے گا۔"

○......❖......○

رات ساڑھے نو بجے کے لگ بھگ میں سیالکوٹ کے ایک اچھے ہوٹل میں انیق کے ساتھ موجود تھا۔ انیق کے پاس پریس کا ایک کارڈ موجود تھا۔ یہ کارڈ ایک ایسے مشہور روزنامے کا تھا جس کے ایک سینئر رپورٹر کو سبق سکھانے کے لیے داؤد کے کارندوں نے چند دن پہلے سخت مار لگائی تھی اور اس سے ہاتھ وغیرہ جڑوا کر اس کی تصویریں کھینچی تھیں۔ پروگرام کے مطابق کل ہم نے اس ناہید نامی خاتون تک پہنچنے کے لیے یہی کارڈ استعمال کرنا تھا۔ رات کو ہی انیق نے مجھے وہ اشیا بھی مہیا کر دیں جن کی ضرورت ہمیں پڑ سکتی تھی۔ ان میں ایک تو وہ کیمرا تھا جو پریس کے فوٹوگرافرز استعمال کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور اسپائی کیمرا تھا۔ ناروے میں، میں نے ایسے اسپائی کیمرے کا ایک دو دفعہ بڑا کامیاب استعمال کیا تھا۔ یہ جدید اسپائی کیمرے یوں تو بہت چھوٹے بھی ہوتے ہیں لیکن جو مجھے چاہیے تھا، اسے پن ہول ڈی وی آر کہتے ہیں اور اسے پورٹ ایبل مانیٹر پر آسانی سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یہ

سائز میں تقریباً انسانی ناخن کے سائز کا ہوتا ہے اور اس کی اہم خصوصیت اس کا آڈیو اور اس کی بیٹری کا بیک اَپ ہے جو 48 گھنٹے سے زیادہ کا ہوتا ہے۔

میں نے ایک کیمرا منگوایا تھا لیکن انیق دو لے آیا۔ وہ ہر کام اور ہر طرح کی گفتگو میں کہیں نہ کہیں فلم کے حوالے ڈھونڈ لیتا تھا۔ جس طرح لوگ اپنے دلائل کی مضبوطی کے لیے کتابوں، دانشوروں اور ضرب المثل وغیرہ کے حوالے دیتے ہیں، وہ فلموں کے حوالے دیتا تھا۔ پتا نہیں کہ وہ جان بوجھ کر ایسا کرتا تھا یا اس کی طبع ہی ایسی تھی۔ اب بھی بڑی سنجیدگی سے بولا۔ ''میں احتیاطاً دو کیمرے لے آیا ہوں۔ آپ کو راجر مور کی وہ فلم تو یاد ہی ہوگی جس میں ایسا ہی ایک کینڈڈ کیمرا خراب ہوگیا تھا لیکن دوسرے نے کام کر دکھایا تھا۔''

میں نے دانستہ اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا ورنہ وہ مذکورہ ایکٹر اور اس کی ساری فلموں کا انسائیکلوپیڈیا کھول کر بیٹھ جاتا۔ میرا خیال تھا کہ صبح وہ میرے ساتھ بطور کیمرا مین ناہید کے گھر جائے گا لیکن بھاؤ نے اس کے بجائے ایک اور وقاص نامی لڑکے کی ڈیوٹی لگائی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ بھاؤ، انیق کو ایسے کاموں سے دور رکھتا ہے جن میں پولیس کی نگاہوں میں آنے کا خدشہ موجود ہو۔

اگلے روز ایک موٹر سائیکل پر سوار ہم انڈسٹریل ایریا کے اس پوش رہائشی علاقے میں پہنچے جہاں ناہید کی رہائش تھی۔ حسبِ معمول موٹر سائیکل میں چلا رہا تھا اور میرے سر پر ہیلمٹ تھا۔ سیالکوٹ میں مجھے شاندار سڑکیں اور عالیشان عمارتیں دیکھنے کو ملیں۔ ہم ایک رہائشی علاقے میں داخل ہوئے اور ایک خوب صورت گھر کے سامنے پہنچ کر رک گئے۔ کال بیل دینے پر ایک ادھیڑ عمر ملازمہ باہر نکلی۔ اس نے آنے کی وجہ پوچھی۔ میں نے پریس کارڈ اسے دکھایا اور کہا کہ ''ہم میڈم سے ملنا چاہتے ہیں۔ ایک چھوٹا سا انٹرویو کرنا ہے۔''

عورت اندر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد آ کر اس نے کہا۔ ''بیگم صاحبہ کسی سے ملتی نہیں ہیں نہ ہی انٹرویو وغیرہ دیتی ہیں۔ ویسے آپ کس سلسلے میں انٹرویو لینا چاہتے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''اگر آپ ان سے بات کروا دیں تو میں تفصیل بتا دیتا ہوں۔ اگر وہ راضی ہوں گی تو ٹھیک ہے ورنہ ہم اصرار نہیں کریں گے۔''

ملازمہ پھر اندر چلی گئی۔ اس بار دروازے کے پیچھے سے جو آواز ابھری، وہ یقیناً ناہید کی ہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''جی فرمائیں۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے دروازے کی جھری میں سے باہر نگاہ ڈالی۔ مجھے صرف بڑی بڑی متین آنکھیں دکھائی دیں۔ آنکھوں میں ایک کشش سی تھی۔

میں نے کہا۔ ”میڈم! تکلیف کے لیے بہت معذرت۔ دراصل ہم ان خاتون اساتذہ کے بارے میں معلومات جمع کررہے ہیں جو اب ریٹائرمنٹ لائف گزار رہی ہیں۔ ان کے معاشی احوال اور ان کے طرزِ زندگی کو عام لوگوں تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ آپ سے بس پندرہ منٹ درکار ہوں گے۔“

”آپ کو یہاں کا ایڈریس کیسے ملا؟“

”کچھ معلومات آپ کے اسکول سے حاصل ہوئیں۔ کچھ ہم نے تگ و دو کی۔ دراصل آپ جیسی کامیاب اور ہردلعزیز استاد تک رسائی حاصل کرنا ہمارے لیے اعزاز کی بات تھی۔ اب اگر آپ تھوڑا سا وقت بھی......“

”سوری جی۔“ خاتون نے تیزی سے میری بات کاٹی۔ ”میں ریٹائرمنٹ کی لائف گزار رہی ہوں اور بس چار دیواری میں رہنا پسند کرتی ہوں۔“

میں نے پینترا بدلا۔ ”ٹھیک ہے میڈم اگر آپ انٹرویو نہیں دینا چاہتیں تو نہ دیں ہم آپ کی تصویر وغیرہ بھی نہیں لیتے لیکن آپ کے خیالات سے تو مستفید ہو سکتے ہیں؟“

”نہیں...... میں نہیں چاہتی کہ کسی بھی حوالے سے میرا نام وغیرہ اخبار میں آئے۔“

”ٹھیک ہے میڈم، آپ کہتی ہیں تو ہم آپ کا کوئی تذکرہ نہیں کریں گے لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر ہم صرف آپ کے خیالات سے ہی مستفید ہو سکے تو ہمارے اس کام کی اہمیت بہت بڑھ جائے گی۔“

وہ متذبذب نظر آنے لگی تھی۔ میں اس کے ذہن کو پڑھنے میں کامیاب ہو رہا تھا۔ وہ یقیناً ایک نیک خو خاتون تھی اور اپنی ذات سے کسی کو فائدہ پہنچانے میں بخل سے کام نہیں لیتی تھی۔ میں نے تھوڑی سی کوشش مزید کی اور اسے رضامند کرنے میں کامیاب رہا۔

ہم اس کے گھر میں داخل ہوئے۔ ڈرائنگ روم میں لکڑی کا کام وغیرہ ہو رہا تھا۔ اس لیے خاتون نے ہمیں ایک اور کمرے میں بٹھایا۔ کمرے کی آرائش سے خاتون خانہ کے سلیقے اور رکھ رکھاؤ کا پتا چلتا تھا۔ وہ خود بھی دلکشی اور وقار کا مجسمہ نظر آتی تھی۔ عمر چھتیس اڑتیس سال کے لگ بھگ تھی۔ جسم کچھ فربہ ہونا شروع ہو گیا تھا لیکن اچھے قد کی وجہ سے یہ موٹاپا زیادہ محسوس نہیں ہوتا تھا۔ ایک شال نے اس کے جسم کو آڑ فراہم کر رکھی تھی۔ شال کے نیچے دوپٹا تھا جس نے نصف سر ڈھانپ رکھا تھا۔

اس نے ملازمہ کو چائے لانے کا کہا اور ہمارے ساتھ بات چیت شروع کی۔ اس نے اپنا نام نہ لکھے جانے کی شرط پر ہمیں یہ بتایا کہ پرائیویٹ اسکولز میں کس کس طرح خاتون

اساتذہ کا استحصال کیا جاتا ہے۔ انہیں بہت کم تنخواہیں دی جاتی ہیں اور پیپرز میں زیادہ ظاہر کی جاتی ہیں۔ ان سے جبری مشقت لی جاتی ہے اور کہیں کہیں تو انہیں جنسی طور پر بھی ہراساں کیا جاتا ہے۔

میں نے گفتگو کا رخ ناہید کی ذاتی زندگی اور ملازمت کے دورانیے کی طرف موڑ دیا۔ اس کے بعد میں نے داراب فیملی کا ذکر کر دیا۔ میں نے کہا۔ ''میڈم! جن دنوں آپ اسکول میں ٹیچنگ کر رہی تھیں۔ کئی اعلیٰ خاندانوں کے بچے وہاں پڑھ رہے تھے۔ میرے خیال میں داراب فیملی کے شکیل صاحب بھی نویں یا دسویں کلاس میں تھے؟''

میں نے دیکھا، میڈم ناہید کے چہرے پر عجیب سا رنگ آ کر گزر گیا۔ اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''ہاں......ایسا ہی تھا۔''

''ان بڑے لوگوں کے بچوں کو پڑھانا اور ان کو ہینڈل کرنا آپ کو کیسا لگتا تھا؟'' میں نے دریافت کیا۔

''بس......کچھ مشکل بچے تو ہوتے ہیں اور یہ ہر طبقے میں ہوتے ہیں۔ استاد اچھا ہو تو وہ مینج کر لیتا ہے۔'' ناہید نے گول مول جواب دیا۔

''شکیل داراب کیسا بچہ تھا؟ میرا مطلب ہے کبھی آپ کو اس سے کوئی مسئلہ تو پیش نہیں آیا؟ میرا مطلب ہے بڑے لوگوں کے بچے ہر جگہ پروٹوکول مانگتے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ ان کے ساتھ خصوصی رعایت برتی جائے؟''

''نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں تھی۔'' ناہید نے مختصر جواب دیا۔ صاف محسوس ہوا کہ وہ اس موضوع کو طول دینا نہیں چاہتی۔

وہ بڑے دھیمے اور شائستہ لہجے میں بات کرتی تھی۔ کسی وقت وہ یقیناً کافی دلکش رہی ہو گی لیکن اب عمر کے اثرات نے اس کے سراپا پر پنجے گاڑنے شروع کر دیئے تھے۔ میں نے سوچا کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ شکیل کی تعلیم کے سلسلے میں میڈم ناہید کی ملاقات اس کے والد عطا داراب وغیرہ سے ہوتی رہی ہو۔ عطا جیسے لوگوں سے کچھ بعید نہیں ہوتا کہ کس کے بارے میں کس طرح سوچنے لگیں۔

میں نے کہا۔ ''آئی ایم ویری سوری میڈم! میں نے آپ کے کافی کان کھا لیے ہیں۔ بس ایک آخری سوال آپ سے کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے اس وقت جاب چھوڑی جب اسکول کو آپ کی ضرورت تھی۔ آپ اسکول کی دو تین اہم ترین ٹیچرز میں تھیں۔ کیا آپ کے جاب چھوڑنے کے پیچھے کسی طرح کا کوئی تنازعہ تھا یا پھر آپ کی کوئی نجی مجبوری تھی؟''

ایک بار پھر ناہید کے چہرے پر رنگ لہرایا تاہم وہ بدستور نارمل لہجے میں بولی۔ ''یہ میری ذاتی، گھریلو مجبوری تھی۔ اس میں اسکول یا اسکول کے حالات کا کوئی دخل نہیں تھا۔''

قدرت نے ہماری مدد کی۔ ساتھ والے کمرے میں لینڈ لائن فون کی گھنٹی بجی۔ ناہید نے پہلے ملازمہ سکینہ کو آواز دی پھر خود ہی کال ریسیو کرنے کے لیے گئی۔ میں مائیکرو کیمرا چسپاں کرنے کے لیے جگہ پہلے ہی تاڑ چکا تھا۔ اس سے بہتر جگہ کوئی مل ہی نہیں سکتی تھی۔ یہ دیوار پر ایک آرائشی لیمپ تھا جس پر بہت سے رنگ برنگے آرٹی فیشل نگینے جڑے ہوئے تھے۔ ہمارا کیمرا بھی تقریباً ان نگینوں کے سائز کا تھا۔ میں نے ایک سبزی مائل نگینے کے اوپر اسے چسپاں کر دیا۔ چسپاں کرنے کے بعد میں نے دیکھا تو مجھے خود بھی فوراً پتا نہیں چلا کہ کیمرا کہاں ہے۔

ایک منٹ کے اندر ہی ناہید واپس آ گئی۔ چائے کی ٹرالی بھی آ گئی تھی۔ ہم نے چائے پی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ خوش اخلاق ہونے کے باوجود میڈم ناہید ہماری موجودگی سے خوش نہیں ہے اور ہمیں جلد سے جلد چلتا کرنا چاہتی ہے۔

''بہت شکریہ میڈم۔'' میں نے کہا۔ ''میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم اپنے آرٹیکل میں آپ کی دانشمندانہ باتوں کا تذکرہ تو ضرور کریں گے لیکن آپ کا نام کہیں نہیں آئے گا۔''

کچھ دیر بعد ہم رخصت ہو کر باہر نکل رہے تھے۔ جب گھر کا دروازہ بند ہو گیا اور میرے کیمرامین ساتھی نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کرنا شروع کی تو مجھے ایک اور سنہری موقع مل گیا۔ دوسرا اسپائی کیمرا میرے پاس موجود تھا اور اسے استعمال کرنے کے لیے ایک بڑی مناسب جگہ بھی نظر آ گئی تھی۔ گیٹ سے تھوڑے ہی فاصلے پر ٹین کی چادر کا ایک کیبن سا بنا ہوا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے تک شاید یہ کیبن اس اسٹریٹ کا چوکیدار استعمال کرتا ہو گا لیکن اب اس کا دروازہ ٹوٹ چکا تھا اور اندر جالے لگے ہوئے تھے۔ نیا کیبن کنکریٹ کا تھا اور کچھ فاصلے پر بنایا گیا تھا۔ میں یونہی ٹین کے کیبن میں جھانکنے کے لیے آگے بڑھا اور ایک کونے میں ٹین پر کیمرا چسپاں کر دیا۔ کیمرے کا رخ ناہید کی رہائش گاہ کے دروازے کی طرف تھا۔

ایسے کیمرے بڑی آسانی سے اپنی ٹرانسمیشن طویل فاصلے تک پہنچا سکتے ہیں۔ ہمارا ہوٹل تو یہاں سے بمشکل چار پانچ کلومیٹر کی دوری پر تھا۔ ہوٹل پہنچ کر میں نے انیق کو اپنی کارروائی کا احوال بتایا۔ ہم نے سب سے پہلے اپنا ریسیونگ ڈیوائس نکالا اور اسے دھڑکتے دل کے ساتھ آن کیا۔ فریکوئنسی سیٹ ہو گئی تو سگنل صاف ہو گئے اور پھر ایک ہی اسکرین پر دونوں کیمروں کے مناظر نمودار ہو گئے۔ رزلٹ میری توقعات سے بڑھ کر تھا۔ باہر والے

کیمرے کی تصویر زیادہ واضح اور روشن تھی اور وہ گھر کے گیٹ کو ٹھیک کور کر رہا تھا۔ اندر کمرے میں شاید ایک لائٹ آن تھی اس کے باوجود کمرے کے پورے خدوخال نظر آ رہے تھے اور آڈیو سگنل بھی موصول ہو رہے تھے۔ یہ حساس ڈیوائس دس پندرہ فٹ کی دوری سے با آسانی آواز پکڑ لیتا تھا۔ گھریلو ملازمہ کچن مین برتن کھڑ کھڑا رہی تھی اور مدھم آواز ہم تک بھی پہنچ رہی تھی۔

''زبردست۔'' انیق نے تعریف کی۔

''بیٹری کا بیک اَپ کتنا ہے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

اس نے ڈبے سے پڑھ کر بتایا۔ پین کر رہا ہو تو 36 گھنٹے اور اسٹل ہو تو قریباً 50 گھنٹے۔

نہ جانے کیوں میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ ہم جلد ہی کوئی اہم منظر دیکھ پائیں گے یا آواز سن سکیں گے۔

یہ دو کیمروں کے دو ریسیور تھے جو ہم نے ساتھ ساتھ ایک میز پر رکھ دیئے تھے۔ رات تک یہ دونوں ریسیور مسلسل ہماری نگاہ میں رہے۔ مختلف اوقات میں مختلف مناظر ہماری آنکھوں کے سامنے آئے۔ ہم نے اس کمرے میں ناہید کو دوبار نماز پڑھتے دیکھا پھر اپنی ستر اسی سالہ آیا سے باتیں کرتے دیکھا اور سنا۔ اس گفتگو میں ہمارا ذکر بھی آیا۔ عمر رسیدہ آیا کا خیال تھا کہ ایسے لوگوں کو گھر میں گھسنے ہی نہیں دینا چاہیے۔ (اور اس کا خیال بالکل ٹھیک تھا) ایک مرتبہ مجھے اندر والے کیمرے کا ریسیور آف کرنا پڑا کیونکہ ناہید اپنا کوئی نیا سلا ہوا کرتہ پہن کر دیکھ رہی تھی۔ باہر کا کیمرا بھی مختلف آوازیں سنا رہا تھا اور مناظر دکھا رہا تھا۔ بہرحال یہ مناظر زیادہ اہم نہیں تھے۔ بس ایک مرتبہ غالباً کیبل کی فیس مانگنے والا گیٹ پر دکھائی دیا۔ ایک مرتبہ ایک ہمسائی اپنے چار پانچ سالہ بچے کے ساتھ گھر میں گئی۔ رات کو بھی ہم دونوں دو ڈھائی بجے تک باری باری نگرانی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ آخر اندر باہر بالکل سکوت چھا گیا۔ ہم بھی سو گئے۔

صبح آٹھ ساڑے آٹھ بجے پھر نگرانی کا یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ اب ہم کچھ کچھ بور ہونے لگے تھے۔ اندر والے کیمرے کی تصویر صاف نہیں آ رہی تھی کیونکہ کمرے کی لائٹ آف تھی۔ باہر والے کیمرے کی تصویر تو بہت واضح تھی لیکن اس کے آڈیو سگنلز میں کوئی گڑبڑ ہو گئی تھی۔ بہرحال اس کے بغیر بھی نگرانی تو جاری تھی۔ دس گیارہ بجے کے قریب ڈرائنگ روم میں کام کرنے والے کارپینٹر کے جھگڑے کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ غالباً ان کا کوئی ساتھی بتائے

بغیر کام سے غائب ہو گیا تھا اور جاتے جاتے کچھ اوزار بھی اڑا لے گیا تھا۔

دوپہر کے وقت میں نے انیق سے کہا۔ ''بجائے اس کے کہ ہم الوؤں کی طرح دیدے پھاڑ پھاڑ کر بس ان دو اسکرینز کو ہی دیکھتے رہیں۔ کچھ ہاتھ پاؤں بھی ہلانے چاہئیں۔''

''شاید آپ چاہتے ہیں کہ میں سپر مارکیٹ جاؤں اور میڈم کی دکانوں کے کرایے داروں سے کچھ انفارمیشن لینے کی کوشش کروں۔''

میں نے کہا۔ ''میں یہ کام خود کرتا لیکن تم جانتے ہو میرا کھلے عام پھرنا رسک سے خالی نہیں ہے۔''

''آپ میرے منہ کی بات چھین لیتے ہیں۔'' اس نے کہا پھر خود ہی مسکرا کر بولا۔ ''ویسے کسی کا موبائل یا پرس چھیننے اور منہ کی بات چھیننے میں کتنا فرق ہے؟''

وہ اکثر مزاحیہ بات بھی کرتا تھا اور بڑی سادگی سے کرتا تھا لیکن فی الوقت میرا موڈ ایسا ہرگز نہیں تھا کہ اس کی باتوں سے لطف اندوز ہو سکتا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد وہ چلا گیا اور میں کمرے میں بستر پر لیٹ کر اسکرینز کو واچ کرتا رہا اور خیالوں کے تانے بانے بُنتا رہا۔ ناہید کا کردار کافی پُراسرار محسوس ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہونے والی گفتگو سے صاف پتا چلا تھا کہ اس نے اسکول کی ملازمت نارمل انداز میں نہیں چھوڑی تھی۔ کوئی تنازعہ ہوا تھا یا کوئی اور معاملہ اور اس میں کچھ نہ کچھ ہاتھ تو شکیل داراب کا بھی تھا جو اس وقت نویں دسویں کا طالب علم تھا۔

سارا دن ہم کوئی کام کی بات معلوم نہ کر سکے۔ انیق بھی اپنی تمام تر ہوشیاری کے باوجود ابھی سپر مارکیٹ سے کوئی انفارمیشن ڈھونڈنے میں ناکام تھا۔ رات قریباً بارہ بجے تک ہم واچ کرتے رہے۔ شاید تھوڑی دیر بعد ہم یہ نگرانی ختم کر کے سو جاتے لیکن پھر ایک اسکرین پر کچھ ہلچل نظر آئی۔ یہ اندر والا کیمرا تھا۔ کمرے کی لائٹس روشن تھیں اس لیے منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ہم نے ناہید کو دیکھا، وہ اندر آئی اور اس نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ وہ کچھ بے چین سی نظر آ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ دیوار گیر الماری کی طرف گئی۔ یہ غیر معمولی طور پر بڑی الماری تھی۔ اچانک ناہید نے آگے بڑھ کر الماری کا دروازہ کھولا۔ کوئی شخص الماری میں سے نکل کر اطمینان سے چلتا ہوا کمرے میں آ گیا۔ اس نے شلوار قمیص اور ویسٹ کوٹ پہن رکھا تھا۔ گھنے بال سلیقے سے سر پر جمے ہوئے تھے۔

''یہ کیا ہے بھئی؟'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

انیق نے بھی تعجب سے میری طرف دیکھا۔ ایک شخص کا کمرے میں آنا اور وہ بھی

الماری کے راستے سے۔ بالکل افسانوی سی بات لگتی تھی لیکن جو کچھ ہوا، ہماری آنکھوں کے سامنے تھا۔

''اوہ گاڈ......اوہ گاڈ۔'' انیق نے بے پناہ حیرت سے کہا۔

''کیا ہوا؟''

''اس کو پہچانیے جی......اس کو دیکھئے۔'' انیق کی آواز لرز رہی تھی۔ میں نے دھیان سے اس شخص کو دیکھا جو اب سکون سے صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ آرائشی لیمپ میں چھپا ہوا اسپائی کیمرا اسے بائیں رخ سے واضح طور پر دکھا رہا تھا۔ ایک دم مجھے لگا جیسے کسی نے میرے سر پر بم پھوڑ دیا ہے۔ میں ہکا بکا سا چھ انچ کی اس اسکرین کو دیکھتا رہ گیا۔ اپنی نگاہوں پر یقین ہی نہیں ہو رہا تھا۔ اگر میں غلطی نہیں کر رہا تھا تو کمرے میں ناہید کے ساتھ نظر آنے والا جواں سال شخص کوئی اور نہیں خود شکیل داراب تھا۔ میں نے کئی بار اخبار و رسائل اور الیکٹرانک میڈیا پر اس کی تصویر دیکھی تھی۔ شکیل داراب جیسا نامور شخص اور یہاں اس گمنام ٹیچر کے کمرے میں......اور اس سے بھی بڑھ کر حیرانی کی بات ایک اور بھی تھی یہ الہ دین کے چراغ کے جن کی طرح اچانک ہی کمرے کے اندر سے نمودار ہوا تھا۔

میں نے کہا۔''انیق، یہ شکیل ہی ہے نا؟''

''ایک سو فی صد جناب۔'' انیق کی آواز کی کپکپاہٹ برقرار تھی۔ اس نے ریسیور کی ایک ناب گھما کر تصویر کی کوالٹی کو مزید بہتر کیا اور سرسراتی آواز میں بولا۔ ''لیکن یہ آیا کہاں سے ہے جی۔ باہر والے کیمرے نے تو کسی کی آمد نہیں دکھائی......''

میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کو کہا۔ آڈیو سگنل آ رہے تھے۔ شکیل کچھ کہہ رہا تھا، ہم نے آڈیو کا والیم بڑھایا۔ پہلے شور شامل تھا مگر پھر آواز واضح سنائی دینے لگی۔ ناہید اور شکیل داراب لگژری صوفے پر قریب قریب بیٹھے تھے۔ ناہید نے شکیل کے الجھے ہوئے بالوں میں انگلیاں چلائیں اور اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ شکیل نے قدرے بیزاری سے کہا۔

''مجھے سگریٹ دینا۔''

ناہید اٹھ کر سائیڈ ٹیبل تک گئی اور سگریٹ کیس اور لائٹر لا کر شکیل کے قریب رکھ دیئے۔ وہ سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔ ''تم رویہ دکھا رہی ہو۔ جو کچھ ہو رہا ہے یہ سب تمہیں پہلے سے معلوم تھا۔ ابھی شادی والی بات چیت شروع بھی نہیں ہوئی تھی جب میں نے تمہیں الف سے ے تک سب بتا دیا تھا۔''

''تو میں کچھ کہہ رہی ہوں شکیل؟ میں تو دل سے خوش ہوں۔ بس یہی کہہ رہی ہوں نا کہ اگر ہو سکے تو اب ہم ملاقات نہ کیا کریں۔ ویسے بھی......'' وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

''کیا...... ویسے بھی؟'' شکیل نے خشک لہجے میں پوچھا۔

وہ گہری سانس لے کر بولی۔ ''ویسے بھی...... میں جانتی ہوں شکیل، اب تمہیں مجھ میں کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ تم بس کسی وقت مجبوری سے ہی میری طرف آتے ہو۔''

''ہاں نہیں ہے دلچسپی...... اور مجھے بھی پتا ہے کہ اب تمہیں بھی میری شکل دیکھنا کچھ زیادہ اچھا نہیں لگتا۔ تو پھر کیوں نا یہ سلسلہ اب ختم ہی کر دیں...... قانونی طور پر ختم کر دیں۔ Divorce لے لو مجھ سے......''

''پلیز شکیل...... پلیز یہ لفظ زبان سے مت نکالو۔ میں ایک دفعہ یہ زہر پی چکی ہوں پھر پینا نہیں چاہتی۔ میں تم سے کچھ مانگ نہیں رہی، کوئی چھوٹی سے چھوٹی توقع بھی نہیں رکھتی۔ میں جہاں ہوں خوش ہوں۔ بس مجھے اسی حالت میں یہاں پڑا رہنے دو۔ ویسے تو گھڑی پل کا پتا نہیں لیکن مجھے نہیں لگتا کہ دو چار سال سے زیادہ جی سکوں گی۔'' وہ آزردہ لہجے میں بولی۔

وہ سگریٹ کا کش لیتے ہوئے بند کھڑکی کی طرف چلا گیا اور کیمرے کے فریم سے نکل گیا۔ اس نے کچھ کہا لیکن آواز واضح طور پر سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

ناہید فریج کی طرف گئی۔ اس نے وہاں سے ایک ڈونگا نکالا۔ کوئی سوئٹ ڈش تھی، ساتھ میں باؤل اور چمچ تھا۔ اس نے یہ چیزیں میز پر رکھیں۔

''کیا کر رہی ہو؟'' شکیل نے پھر بیزاری سے کہا۔

''رس ملائی ہے...... گھر کی۔''

''بھئی نہیں کھانا مجھے کچھ۔ رکھو اسے فریج میں۔'' شکیل گمبھیر آواز میں بولا پھر سر پکڑ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

کچھ دیر بعد اس نے واسکٹ کی جیب سے سیل فون نکالا اور اس پر شاید میسج وغیرہ کرنے لگا۔ اس نے دھیمی آواز میں ایک دو فقرے بھی ادا کیے جو سمجھ میں نہیں آئے۔ ناہید کچھ دیر اس کے پاس بیٹھی رہی پھر دھیرے دھیرے اس کے کندھے دبانے لگی۔ وہ لاتعلق سا سیل فون سے مصروف رہا۔

انیق نے کہا۔ ''شاہ زیب صاحب یہ کیا چکر ہے جی...... مجھے تو یقین نہیں آ رہا۔ یہ...... یہ خبیث شکیل اس عورت سے نو دس سال چھوٹا تو ہو گا اور یہ اس کا اسٹوڈنٹ بھی رہا ہے۔''

''ہاں...... ہے تو یہ سب کچھ بہت انوکھا لیکن ناممکن نہیں ہے۔ ایسے واقعات دیکھنے

میں آتے ہیں جب اسٹوڈنٹس اپنے ٹیچرز میں اس طرح انوالو ہو جاتے ہیں۔''

''لیکن...... یہ سب کچھ تو ایک حد تک ہوتا ہے جی۔''

''کل تم نے خود ہی کہا تھا۔ ان امیروں کے لیے کوئی حد نہیں ہوتی......''

ہم دونوں خاموش ہو گئے اور اپنے اپنے طور پر حساب جوڑنے لگے۔ آج سے دس گیارہ سال پہلے شکیل داراب یقیناً میٹرک کا اسٹوڈنٹ تھا۔ اس وقت ناہید کی عمر پچیس چھبیس سال ہو گی۔ یقیناً یہ سلسلہ اسی دور میں شروع ہوا ہو گا۔

انیق لرزتے ہاتھوں سے باہر والے کیمرے کو آپریٹ کرنے لگا۔ اس نے اس کی ریکارڈنگ دیکھنے کے لیے اسے ری وائنڈ کیا۔ وہ قریباً ایک گھنٹا پیچھے چلا گیا پھر اس نے پلے کا بٹن دبا کر فارورڈ کا بٹن دبایا۔ فوٹیج اسپیڈ کے ساتھ چلنے لگی۔ تین چار منٹ میں ہم نے پچھلے ایک گھنٹے کی ریکارڈنگ دیکھ لی۔ گیٹ سے کوئی بندہ ناہید کے گھر میں داخل نہیں ہوا تھا۔ یہ بڑی حیران کن بات تھی۔ تو کیا شکیل داراب پہلے سے اس کمرے کی الماری کے اندر موجود تھا؟ یہ ناقابلِ یقین بات تھی اور اس کی کوئی لاجک بھی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

اسی دوران میں اندر والے کیمرے کی آڈیو پر کال کا میوزک سنائی دیا۔ یہ کال شکیل کے سیل فون پر آئی تھی۔ اس نے قیمتی موبائل کان سے لگا کر ہیلو کہا پھر دوسری طرف سے کی جانے والی بات سن کر بولا۔ ''او کے، روکو ان کو۔ میں آ رہا ہوں تھوڑی دیر میں۔''

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ناہید نے اسے اس کا سگریٹ کیس تھمایا۔ وہ سگریٹ کیس لیتا ہوا دیوار گیر الماری کی طرف گیا اور اندر داخل ہو گیا۔ بالکل جیسے کسی دروازے میں داخل ہوتے ہیں۔ ناہید نے الماری کا دروازہ باہر سے بند کر دیا۔

''او گاڈ...... یہ تو کوئی دروازہ ہے۔'' انیق نے کہا۔

''اور لگتا ہے کہ کسی دوسرے گھر میں کھل رہا ہے۔'' میں نے خیال ظاہر کیا۔

''امیزنگ...... بے حد حیران کن ہے یہ سب کچھ۔ یہ تو بہت تہلکہ مچانے والی نیوز ہے۔''

''لیکن ابھی یہ صرف اور صرف ہم تک رہنی چاہیے۔'' میں نے انیق کو یاد دلایا۔

اس نے تسلی بخش انداز میں سر ہلایا اور ایک بار پھر اندرونی کیمرے کے ریسیور کی طرف متوجہ ہو گیا۔ کمرے کا منظر اب دھندلا ہو چکا تھا کیونکہ صرف ایک چھوٹی لائٹ آن تھی۔ ناہید باہر جا چکی تھی اور جاتے جاتے دروازہ لاک کر گئی تھی۔

''یہ تو تھرتھلی مچا دینے والی صورتِ حال ہے۔'' انیق نے کمرے میں بے قراری سے

ٹہلتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو پتا ہی ہوگا ضمنی الیکشن میں شکیل داراب کے علاوہ اس کا نہایت قریبی ساتھی اور دوست لالہ وریام ایم این اے کا الیکشن لڑ رہا ہے۔ اس کے علاوہ بھی ان لوگوں نے مختلف علاقوں کی آٹھ دس سیٹوں پر امیدوار کھڑے کر رکھے ہیں۔ اگر اس موقع پر یہ دھواں دھار اسکینڈل سامنے آ گیا تو ان لوگوں کا تو کونڈا ہو جائے گا۔ کونڈا سمجھتے ہیں نا آپ یعنی بربادی۔“

میں نے اثبات میں سر ہلا کر اس کی تائید کی۔

وہ بولا۔ ”اب یہ بات تو کلیئر ہوگئی ہے کہ یہ پاشا لاہور کے ڈیفنس جیسے علاقے میں اتنے عیش آرام کے دن کیوں گزار رہا ہے۔ لگتا یہی ہے کہ اس نے شکیل داراب کے کہنے پر ناہید کو طلاق دی تھی اور اس کے بدلے موج مستی کی زندگی کا سودا کیا تھا۔ اب وہ شکیل کے ایک اہم راز کا امین ہے اس لیے بے خطر عیش کر رہا ہے۔“

”ظاہر ہے کہ کچھ پانے کے لیے تھوڑا بہت تو کھونا پڑتا ہے اور شاید وہ یہی سمجھتا ہے کہ اس نے تھوڑا کھویا ہے اور بہت پایا ہے...... اور میرا خیال ہے انیق کہ اگر وہ شادی شدہ عورتوں اور دوسروں کی گرل فرینڈز وغیرہ میں دلچسپی لیتا ہے تو اس کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اس کی اپنی عورت اس سے شکیل داراب نے چھینی ہے۔“

”بڑی سنسنی خیز قسم کی کہانی بنتی ہے۔ پندرہ سولہ سالہ لڑکے کی اپنی خوب صورت ٹیچر سے محبت اور صرف محبت ہی نہیں محبت کا عملی جامہ بھی...... شاہ زیب بھائی، آپ نے وہ فلم دیکھی تھی، نہیں ابھی نہیں۔ جس میں کم عمر لڑکا فیصل بڑی عمر کی شبنم کو پسند کرنے لگتا ہے......“

”نہیں...... میں نے نہیں دیکھی تھی۔“ میں نے شروع میں ہی بات ختم کر دی ورنہ وہ اس موضوع کو کھینچنا شروع کر دیتا۔

میرا ذہن اپنے تانے بانے میں الجھا ہوا تھا۔ اب رات کے دو بج چکے تھے۔ دل چاہتا تھا کہ ابھی ہوٹل سے نکلوں اور کچھ نہ کچھ کر گزروں لیکن ہر پہلو پر غور کرنا بھی ضروری تھا۔ رات ایک طرح کی بے چینی میں ہی گزری۔ صبح میں نے انیق کو سب کچھ سمجھایا اور وہ اپنے ساتھ وقاص کو لے کر نکل گیا۔

ان دونوں کی واپسی دوپہر کے کھانے پر ہوئی۔ حسبِ توقع انیق نے وہ ساری معلومات حاصل کی تھیں جن کی ضرورت تھی۔ سب سے اہم سوال رات کو ہمارے ذہن میں یہ ابھرا تھا کہ شکیل داراب کمرے میں کہاں سے آیا اور نکل کر کہاں گیا تھا۔ اس سوال کا جواب دلچسپ تھا۔ ناہید کے دس مرلہ کوٹھی کے عین پیچھے کنال کنال کے گھروں والی لین تھی۔ ایسی

ہی ایک دو کنال کی کوٹھی ناہید کی کوٹھی کے عین پیچھے واقع تھی۔ اس کوٹھی کا فرنٹ دوسری طرف تھا یعنی دونوں گھروں کی پشت جڑی ہوئی تھی۔ یہ دو کنال کی کوٹھی شکیل داراب کے ایک نہایت قریبی دوست پرویز خان کی تھی۔ پرویز خان انڈسٹریل تھا اور سیالکوٹ میں لیدر کی جیکٹس وغیرہ بنانے کا وسیع کام کرتا تھا۔ دوسری طرف شکیل داراب کا ایک بڑا کارخانہ بھی سیالکوٹ میں موجود تھا۔ وہ اپنے کام کے سلسلے میں کبھی کبھار سیالکوٹ آتا تھا تو پرویز خان کے گھر ہی ٹھہرتا تھا۔

اب یہ سارا چکر سمجھ میں آ رہا تھا۔ ان دونوں گھروں کے رخ دو مختلف سڑکوں پر تھے لیکن ان کی عقبی دیواروں میں ایک راستہ موجود تھا اور یہ راستہ ایک بڑے راز کا امین تھا۔ انیق نے مجھے مکمل تفصیل بتائی اور دونوں گھروں کے نمبرز وغیرہ سے بھی آگاہ کیا۔

میں نے پوچھا۔ ''شکیل داراب کے بارے میں کیا معلوم ہوا؟''

''شکیل، کل صبح سیالکوٹ آیا تھا۔ ابھی گیارہ بجے کے لگ بھگ وہ لاہور واپس روانہ ہو گیا ہے۔''

میں نے دونوں کیمروں کے مانیٹرز دیکھے۔ دونوں کیمرے کام کر رہے تھے۔ باہر والا کیمرا دس مرلہ گھروں والی لائن کا منظر آگے تک دکھا رہا تھا۔ تعطیل کی وجہ سے ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ کبھی کبھی کوئی کار یا موٹر بائیک گزر جاتی تھی۔ اندر والا کیمرا خالی کمرا دکھا رہا تھا۔ کہیں پاس سے بوڑھی آیا کے کھانسنے کی آواز آ جاتی تھی۔ کچھ دیر بعد ناہید کی آواز بھی آئی۔ اس نے ملازمہ کو پکارا تھا کنفرم ہو گیا کہ وہ گھر میں ہی موجود تھے۔ چند سیکنڈ بعد ملازمہ کی آواز ابھری۔ وہ کیمرے کے آس پاس ہی موجود تھی لیکن دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

''جی بی بی جی۔'' ملازمہ نے کہا۔

''پلمبر کو فون کیا؟'' ناہید کی مدھم آواز سنائی دی۔

''ہاں جی۔ عرفان صاحب کو کہا ہے وہ کہتے ہیں بندہ کام پر نکلا ہوا ہے آدھے گھنٹے تک آ جائے گا۔'' ملازمہ نے جواب دیا۔

میں نے انیق سے کہا۔ ''انیق، میں وہاں پہنچنا چاہتا ہوں۔ پندرہ بیس منٹ کے اندر۔''

''کوئی مسئلہ نہیں جی۔'' وہ چوکس ہو کر بولا۔

وقاص ہمارے ساتھ ہی موجود تھا۔ اس کی موٹر سائیکل بھی نیچے پارکنگ میں موجود تھی۔

''کوئی بیگ یا تھیلا مل جائے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''بیگ تو اس کی موٹر سائیکل کے ساتھ ہی موجود ہے۔'' انیق نے کہا۔

''اس کو تھوڑا سا وزنی کیا جا سکتا ہے؟ میرا مطلب ہے کہ پلمبر کا بیگ نظر آئے۔'' میں نے کہا۔

''یہ موم بتی کا اسٹینڈ ہے۔ یہ دو چھوٹے گلدان بھی اندر رکھے جا سکتے ہیں۔'' انیق نے رائے دی۔ یہ مناسب رائے تھی۔

ٹھیک بیس منٹ بعد میں موٹر سائیکل پر ناہید کے گھر کے سامنے پہنچ چکا تھا۔ یہ سارا راستہ مجھے حفظ ہو چکا تھا۔ کسی طرح کی دشواری پیش نہیں آئی۔ میں نے ہیلمٹ پہنا ہوا تھا اور ایک ٹی ٹی پسٹل میری جیکٹ میں موجود تھا۔ میں نے بے دھڑک ناہید کے گھر کی کال بیل دی۔ ملازمہ نادیہ باہر نکلی۔

''کون؟'' اس نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر پوچھا۔

''پلمبر۔'' میں نے جواب دیا۔

میں نے ہیلمٹ کی اسکرین اٹھا رکھی تھی، اس کے باوجود اسے ذرا سا شک بھی نہیں ہوا۔ موٹر سائیکل لاک کر کے اور بیگ کو کندھے سے لٹکا کر میں اندر چلا گیا۔ ملازمہ مجھے سیدھا بیڈروم کے واش روم میں لے گئی۔ یہاں واش بیسن کے پائپ سے پانی کی مسلسل دھار نکل رہی تھی۔ ناہید بھی مجھے اس مسئلے کے بارے میں بتانے کے لیے کمرے کے اندر آ گئی۔ میں نے ابھی تک اپنا ہیلمٹ سر سے اتارا نہیں تھا۔ یہ بات شاید ان دونوں کو عجیب لگ رہی تھی۔ میں نے ملازمہ سے کہا۔ ''باہر سے پانی کا گیٹ وال بند کر دیں۔''

ملازمہ گیٹ وال بند کرنے گئی۔ ناہید ذرا شک کی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ وہ مجھے اور میری آواز کو پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے لپک کر اسے دبوچ لیا۔ میں نے اپنی توجہ اس بات پر مرکوز رکھی تھی کہ وہ آواز نہ نکال سکے اور میں کامیاب رہا۔ وہ بری طرح مچلی لیکن میں نے اسے پوری طرح شکنجے میں کس لیا تھا۔ میں نے اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ''میڈم آپ نے صحیح پہچانا ہے۔ میں وہی ہوں جس نے پرسوں آپ سے بات کی تھی۔ دیکھیں میں یقین دلاتا ہوں آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ یوں سمجھیں کہ میں اس وقت شکیل صاحب کا ایک خاص پیغام لے کر آپ کے پاس آیا ہوں۔''

شکیل کا نام سن کر اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ وہ پلٹ کر میری طرف دیکھنے کی کوشش کرنے لگی لیکن اس کے چہرے پر میری گرفت مضبوط تھی اس لیے کامیاب نہیں ہوئی۔ میں نے کہا۔ ''میں اب آپ کے منہ سے ہاتھ اٹھاتا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ آپ کسی کو پکاریں گی نہیں۔

میں پھر دہراتا ہوں آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔"
تھوڑا سا توقف کر کے اس نے اثبات میں سر ہلایا۔
میں نے اس کے ہونٹوں سے اپنی ہتھیلی ہٹالی اور پھر اس پر سے گرفت بھی ختم کردی۔ وہ پلٹ کر میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ میں نے اسے جیکٹ کی پھولی ہوئی جیب دکھاتے ہوئے کہا۔"میرے پاس پستول موجود ہے لیکن مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ آپ جیسی خاتون پر اسے نکال سکوں۔ میں آپ سے بس چند باتیں کر کے یہاں سے جانا چاہتا ہوں اور ان باتوں میں آپ کا فائدہ ہے۔"
اس نے کچھ بولنا چاہا لیکن بس تھوک نگل کر رہ گئی۔
"ابھی آپ کی ملازمہ آئے گی، وہ مجھے پہچان نہیں سکی۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی بے خبری برقرار رہے۔ میں آپ سے فقط چند منٹ چاہوں گا۔"
عورت سمجھ دار تھی اس نے نہایت تیزی سے خود کو سنبھالا۔ ملازمہ نادیہ واپس آئی تو ناہید نے کہا۔"اچھا بھائی، میں تمہیں اوپر کا ایک پائپ بھی دکھادوں۔" پھر وہ ملازمہ سے مخاطب ہو کر بولی۔"تم جلدی سے دونوں بل جمع کروا آؤ۔ کہیں دیر نہ ہو جائے اور واپسی پر سبزی بھی پکڑ لینا۔"
ملازمہ جی اچھا کہتی ہوئی اور چوکسی کا مظاہرہ کرتی ہوئی باہر نکل گئی۔ ویسے وہ کچھ تھوڑا سا ٹھٹکی ہوئی تھی اور شاید اس کی وجہ ناہید کی پریشان صورت تھی۔
ملازمہ کے جانے کے بعد ناہید سیڑھیاں عبور کر کے اوپر آ گئی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ وہ بڑی ہمت کا مظاہرہ کر رہی تھی پھر بھی اس کا سارا وجود جیسے اندر سے کپکپا رہا تھا۔ شکیل کا ذکر کر کے میں نے ایک بہت بڑی بات کہہ دی تھی اور اس بات نے اس کے دل و دماغ کی ساری چولیں ہلادی تھیں۔ وہ گاہے بگاہے متوحش نظروں سے میری طرف دیکھنے لگتی تھی۔ بالائی منزل پر آ کر ہم کامن روم میں بیٹھ گئے۔ مجھے ماننا پڑا کہ وہ واقعی کمزور اعصاب کی عورت نہیں۔ اس نے بڑی تیزی سے خود کو صورتِ حال کے مطابق ڈھالا تھا اور ملازمہ کو گھر سے باہر بھیج دیا تھا۔ میں نے پوچھا۔"آپ کے گھر میں آپ کی آیا بتولہ بیگم کے علاوہ اور تو کوئی نہیں؟"
اس نے نفی میں سر ہلایا اور خشک لبوں پر زبان پھیر کر بولی۔"تم نے...... ابھی کسی شکیل کا نام لیا ہے۔ میں کچھ سمجھی نہیں؟"
"لیکن میرا خیال ہے کہ آپ سمجھ گئی ہیں۔ ورنہ آپ کی یہ حالت نہ ہو رہی ہوتی۔" اس

کا رنگ کچھ اور پھیکا پڑ گیا۔

اپنے ہاتھوں کی لرزش چھپانے کے لیے اس نے انہیں اپنی چادر کے نیچے کھسکا لیا بولی۔ ”دیکھو، تمہیں جو کہنا ہے صاف کہو۔ مم...... میرے پاس زیادہ وقت نہیں۔ آیا سوئی ہوئی ہیں لیکن وہ کسی بھی وقت اٹھ سکتی ہیں۔“

”اٹھ تو سکتی ہوں گی لیکن زینے چڑھ کر اوپر نہیں آسکیں گی۔ اتنا تو میں بھی جانتا ہوں۔ میرے اندازے کے مطابق اگر اگلے چند منٹ میں ہمیں کوئی ڈسٹرب کر سکتا ہے تو وہ عرفان صاحب کا وہ پلمبر ہو گا جو آپ کے دروازے پر دستک دے گا۔“

ابھی میری بات منہ میں ہی تھی کہ دروازے پر بیل ہو گئی۔ میں نے کھڑکی سے نیچے جھانکا گیٹ کا منظر نظر آ رہا تھا۔ پلمبر اپنے کھٹارا اسکوٹر پر موجود تھا۔ میں نے کہا۔ ”لیں وہ آ گیا ہے۔ اسے اندر بلا کر واش بیسن دکھا دیں لیکن یہ بھی کہہ دیں کہ ابھی کام نہیں کروانا وہ بعد میں آ جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کی ملازمہ کو بعد میں کسی طرح کا شبہ نہ ہو۔“

ناہید مسلسل عقل مندی کا ثبوت دے رہی تھی۔ اس نے اب بھی دیا۔ اس نے پلمبر کو اندر بلایا اور چند منٹ میں فارغ بھی کر دیا۔

اس کے بعد وہ پھر میرے پاس بالائی منزل کے کامن روم میں آن بیٹھی۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”دیکھیں، میں تمہید باندھوں گا تو ہم دونوں کا وقت ضائع ہو گا اور اگر آپ انجان بننے کی کوشش کریں گی تو بھی یہی ہو گا۔ شکیل داراب کا نام سننے کے بعد آپ کو کچھ نہ کچھ اندازہ تو ہو گیا ہو گا کہ میں کیا کہنے والا ہوں؟“

”کک...... کون شکیل داراب؟“ ناہید کی حالت ابتر ہوتی جا رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ”وہ شکیل داراب جو دس گیارہ سال پہلے آپ کا اسٹوڈنٹ تھا اور پھر جس نے آپ کی شادی ختم کروانے کے بعد خود آپ سے شادی کی اور آپ اب بھی جس کی منکوحہ ہیں اور چوری چھپے اس سے ملتی ہیں۔ چور دروازوں کے راستے۔“ میں نے سارے انکشافات ایک ساتھ ہی کر ڈالے۔ میں چاہتا تھا کہ اس کو جو بھی شاک لگنے ہیں، وہ ایک ہی بار لگ جائیں۔

چند سیکنڈ کے لیے تو مجھے لگا کہ اسے کچھ ہو جائے گا۔ اس کا سارا جسم لرزنے لگا تھا اور ہونٹ نیلے پڑ گئے تھے۔ میں نے قریب پڑے جگ میں سے تھوڑا سا پانی گلاس میں لے کر اسے تھمایا۔ اس سے گلاس تھامنا مشکل ہو رہا تھا لیکن اس نے دو تین گھونٹ پیئے۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”میں آپ سے پھر کہتا ہوں جو کچھ میں بتا رہا ہوں، وہ آپ کے

لیے سخت ضرور ہے لیکن ایک ایسے شخص کے سینے میں ہے جو آپ کو کسی طرح کا نقصان پہنچانا نہیں چاہتا اور اگر وہ یہاں آپ کے سامنے موجود ہے تو اس کی وجہ بھی یہی ہے۔"

"تم...... ہو کون؟ کیا تمہارا تعلق پولیس سے ہے؟" وہ ہکلائی۔

"میرے بارے میں جانکاری حاصل کرنے سے آپ کو کسی طرح کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ بس اتنا سمجھ لیں کہ میں شکیل داراب کے ستائے ہوئے لوگوں میں سے بلکہ بہت زیادہ ستاتے ہوئے لوگوں میں سے ایک ہوں اور اب وہ میرے داؤ کے نیچے آیا۔ اس کے ساتھ میرا ایک اہم سودا ہونا ہے۔ اگلے چند دن اس کے لیے بہت بھاری ثابت ہونے والے ہیں۔"

ناہید خشک لبوں پر زبان پھیرنے کے سوا اور کچھ نہیں کر پا رہی تھی۔

میں نے کہا۔ "میں نے ابھی آپ پر جو انکشافات کیے ہیں ان کے نہایت ٹھوس ثبوت میرے پاس موجود ہیں۔ آپ کچھ نہ بھی بتائیں گی تو شکیل داراب کو شکنجے میں لینے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوگی لیکن اگر آپ بتا دیں گی تو میرا خیال ہے کہ آپ کے لیے میری ہمدردی بڑھے گی کیونکہ میں جانتا ہوں آپ بھی شکیل داراب کے اثر و رسوخ اور جبر کا شکار ہونے والوں میں سے ایک ہیں۔"

ناہید جیسے گنگ سی ہوگئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہے اور کیا نہ۔ میں نے کوشش کر کے دھیرے دھیرے اس کے خوف کو کم کیا۔ وہ میرے سوالوں کے چھوٹے چھوٹے جواب دینے لگی۔ میرا ہمدردانہ رویہ غیر محسوس طور پر اس پر اثر کر رہا تھا۔ کچھ وقت تو لگا لیکن بالآخر وہ اپنے ماضی قریب کے بارے میں اہم باتیں بتانے پر آمادہ ہوگئی۔ یہ گفتگو تو کافی طویل تھی اور کہیں کہیں بے ربط ٹکڑوں میں بٹی ہوئی تھی۔ بہرحال اس کا خلاصہ میں یہاں بیان کر دیتا ہوں۔

"قریباً دس گیارہ سال پہلے شکیل داراب اس انگلش اسکول میں ناہید کا اسٹوڈنٹ تھا۔ ناہید ٹیوشن نہیں پڑھاتی تھی لیکن داراب فیملی کے سامنے انکار کی جرأت کون کر سکتا تھا۔ وہ اسے ٹیوشن بھی پڑھانے لگی۔ ان دونوں کے درمیان وابستگی پیدا ہوئی لیکن شکیل کی وابستگی کا رنگ کچھ اور تھا۔ اس کی صحبت بھی کچھ اچھی نہیں تھی۔ ایک دو مرتبہ اسے ناہید سے بری طرح ڈانٹ بھی کھانا پڑی۔ بہرحال ناہید کوشش کے باوجود ان سفلی خیالات کو شکیل کے دماغ سے کھرچنے میں کامیاب نہیں ہوئی جو اس کے کچے اور خود سر ذہن میں جگہ بنا چکے تھے۔ اسکول سے فارغ ہو جانے کے بعد بھی گاہے بگاہے شکیل اس سے ٹیلی فونک رابطہ کرتا رہا۔ ان کی

گفتگو کا رنگ بس ایک ہی ہوتا تھا۔ ناہید اسے سمجھانے بجھانے کی کوشش کرتی تھی اور کبھی کبھی شرم بھی دلاتی تھی کہ وہ اس طرح کے خیالات رکھتا ہے۔ دوسری طرف شکیل اپنے دل کی بات زبان پر لانے سے نہیں چوکتا تھا اور بات کو زبان پر لانے کے لیے کبھی کبھی کسی نشے کا سہارا بھی لے لیتا تھا۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا، وہ زیادہ خودمختار ہوتا جا رہا تھا اور سرکش بھی۔ اس کو اپنے بڑوں کی فکر نہیں تھی اور بڑے بھی ایسے کون سے دانا بینا تھے۔ ایسے لوگوں کو تو اپنے ہی اللوں تللوں سے فرصت نہیں ہوتی پھر ایک وقت ایسا آیا جب شکیل ملک سے باہر چلا گیا اور تین چار سال کے لیے یہ معاملہ پس منظر میں جاتا محسوس ہوا۔

ناہید کو بھی اب قدرے اطمینان تھا لیکن وہ جانتی نہیں تھی کہ پندرہ سولہ سالہ میٹرک کا لڑکا اب ایک اکھڑ اور خودسر جوان بن چکا ہے اور اس کے ارادے اس کے بارے میں نیک نہیں ہیں پھر وہ کچھ ہوا جس کی توقع نہیں تھی۔ جب شکیل پاکستان آیا تو ہاتھ دھو کر ناہید کے پیچھے پڑ گیا۔ اس کے پاس بے پناہ وسائل تھے۔ وہ جس چیز پر انگلی رکھتا، وہ اس کی ہوسکتی تھی۔ اس کی ریشہ دوانیوں سے خوف کھا کر ناہید نے اسکول کی ملازمت چھوڑ دی مگر تب تک وہ اس کے شوہر پاشا کو شیشے میں اتار چکا تھا۔ پاشا اور ناہید کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ ان کے ازدواجی تعلقات بھی بس گزارے لائق ہی تھے۔ جب شکیل نے پاشا کو زمینی جنت کی جھلکیاں دکھائیں اور اس کے اکاؤنٹ کو نوٹوں سے بھرا تو وہ ناہید کو طلاق دینے پر آمادہ ہوگیا۔ ناہید نے مزاحمت کی۔ اس مزاحمت کو ختم کرنے کے لیے شکیل نے ہر حربہ استعمال کیا۔ منت سماجت سے لے کر ڈرانے دھمکانے تک سب کچھ کیا۔ یہاں تک کہ خود کو آگ لگانے کی سنگین دھمکی بھی دی۔ بالآخر ناہید مجبور ہوگئی۔ اس نے حالات سے سمجھوتا کرلیا۔ شکیل کی ایک شادی پہلے بھی تھی۔ دوسرا نکاح اس نے بڑی رازداری سے کرلیا اور ناہید کو لاہور سے نکال کر سیالکوٹ کے ایک علاقے میں گھر لے دیا۔ دوسری طرف پاشا کو اس کی من مرضی کی زندگی مل گئی۔ اس نے خود کو عیاشیوں میں گم کرلیا۔ شکیل داراب اور ناہید کا نکاح ایک ٹاپ سیکرٹ کے طور پر ہوا اور اب تک ٹاپ سیکرٹ ہی تھا۔

اب اس گفتگو کا آخری مرحلہ شروع ہو رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''ناہید صاحبہ! آپ سے بڑھ کر کون جانتا ہوگا کہ یہ شکیل ایک بہت بڑا بلیک میلر بھی ہے۔ میں بھی اس کو بلیک میلر بن کر ہی ٹکرا رہا ہوں مگر افسوس کہ اس میں آپ کی انوالومنٹ ہے۔ بہرحال اگر آپ میرے مشورے پر عمل کریں گی تو کسی بھی مصیبت سے بچی رہیں گی۔''

''میں کچھ سمجھی نہیں؟'' وہ آنسو پونچھ کر بولی۔

''آپ نے غلطی کی دو دن پہلے مجھے اور میرے ساتھی کو اندر آنے دیا یقیناً آپ کو یہ جان کر شاک لگے گا کہ ہم نے آپ کے گھر میں دو جگہ چھوٹے کیمرے لگائے۔ ان میں آپ اور شکیل کی ملاقات اور گفتگو کی فوٹیج بھی موجود ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ کی اس غلطی کی وجہ سے شکیل کے غضب کا نزلہ آپ پر گرے۔ آپ مجھے بتائیں آپ نے شکیل کو کچھ بتایا تو نہیں ہماری آمد اور انٹرویو کے بارے میں؟''

''نہیں۔'' ناہید نے سخت پریشانی کے عالم میں سر کو نفی میں ہلایا۔

''آپ بتائیں گی بھی نہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ شکیل سے ڈیل کرتے ہوئے فوٹیج دیکھنے دکھانے تک نوبت ہی نہ پہنچے اور اگر پہنچ بھی گئی تو آپ اس کا پیشگی بندوبست کر لیں۔''

''وہ کس طرح؟''

''اس صورت میں آپ کو یہ ظاہر کرنا ہوگا کہ چند دن پہلے کوئی آپ کی بے خبری یا غیر موجودگی میں داخل ہوا تھا۔''

''وہ......وہ کس طرح؟''

''کسی بھی طرح۔'' میں نے جواب دیا پھر ذرا سوچتے ہوئے کہا۔'' آپ کے ڈرائنگ روم میں لکڑی کا کام ہو رہا تھا نا ایک دن پہلے تک؟''

''ہاں۔''

''اور ٹھیکے دار بتا رہا تھا کہ ایک کاریگر بتائے بغیر لاپتا ہو گیا ہے اور ایک دو اوزار بھی لے گیا ہے؟'' ناہید نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے کہا۔'' آپ اس اتفاق کو اپنے حق میں استعمال کر سکتی ہیں۔ ان کیمروں کے سلسلے میں اس شخص کو بھی مشکوک ٹھہرایا جا سکتا ہے یا پھر اس طرح کا کوئی اور بندوبست کر لیں۔ گھر کا کوئی تالا وغیرہ خراب کر دیں۔ ایک دو چٹخنیاں اکھاڑ دیں کچھ بھی کر لیں جس سے آپ براہِ راست الزام سے بچ سکیں۔''

ناہید کی آنکھوں سے ٹپاٹپ آنسو گرنے لگے۔ وہ ہاتھ جوڑ کر بولی۔'' کیا تم اپنی اور شکیل کی لڑائی میں مجھے معاف نہیں رکھ سکتے؟''

''مجھے بہت افسوس ہے۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔'' میں جو زیادہ سے زیادہ آپ کے لیے کر سکتا تھا، وہ کر رہا ہوں ......آئی ایم سوری اور میں زیادہ دیر یہاں رک بھی نہیں سکتا، کہیں آپ کی ملازمہ یا کوئی اور نہ آ جائے...... خدا حافظ۔''

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ باہر والا کیمرا میں نے گھر میں داخل ہونے سے پہلے ہی اتار لیا تھا اندر والا جاتے جاتے اتار لیا۔ اس کے علاوہ الماری میں موجود چور دروازہ بھی اپنی آنکھوں

سے ملاحظہ کرلیا۔ وہ سکتہ زدہ سی سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ میں نے ایک بار پھر ہیلمٹ سر پر رکھ
اورموٹر سائیکل اسٹارٹ کردی۔

O......❖......O

دوپہر کا وقت تھا۔ میں سیالکوٹ سے واپس لاہور پہنچ چکا تھا۔ انیق بھی میرے ساتھ ہی
تھا۔ ہم داؤد بھاؤ کے انڈر گراؤنڈ ڈیرے پر موجود تھے۔ داؤد بھاؤ کو سیالکوٹ میں میری
کارکردگی کا علم ہو چکا تھا اور وہ باقاعدہ عش عش کر رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر زور سے میری
پیٹھ تھپکی اور بولا۔ ''شاہ زیب! تم وہ نہیں ہو جو نظر آتے ہو۔ فی الحال میں اس تفصیل میں نہیں
جاؤں گا کہ تم کون ہو؟ ابھی ہم صرف اس کامیابی کو انجوائے کریں گے۔'' اس نے اپنی نوخیز
رکھیل روبی کو آواز دی اور اس نے پینے پلانے کے لوازمات ہمارے سامنے سجا دیئے۔ میں
نے داؤد کو یہی بتا رکھا تھا کہ میں آج کل الکحل سے پرہیز کر رہا ہوں اس لیے میرے لیے ٹیبل
پر جوسز موجود تھے۔

میں جب بھی خوبرو روبی کے شہد رنگ بال دیکھتا تھا، مجھے کوئی اور یاد آ جاتا تھا۔ ایسے ہی
یا شاید اس سے بھی بڑھ کر بے مثال بالوں والا۔ جس کے ساتھ میں نے لاہور کے طوفانی
دورے میں چند گھنٹے گزارے تھے۔ جس کی جلترنگ سی معصوم، سادہ ہنسی ابھی تک میرے
کانوں میں گونج رہی تھی اور جسے کوشش کے باوجود میں ابھی تک بھول نہیں پایا تھا۔ تین سال
گزرنے کے باوجود وہ پری جمال ہر جگہ میرے ساتھ رہی تھی۔ ڈنمارک کی سرسبز سیرگاہوں
میں، روم کی چمکیلی دوپہروں میں، پیرس کی حسین شاموں میں اور وینس کی دلفریب آبی گزر
گاہوں کے عکس میں وہ ہر جگہ مجھے دکھائی دی تھی۔ میرے پاس اس کا کوئی پتا ٹھکانا نہیں تھا
تاہم جب میں پاکستان پہنچا تھا تو میرے دل میں یہ دھیمی سی خواہش موجود تھی کہ میں اسے
ڈھونڈنے کی کوشش کروں گا لیکن یہاں آتے ہی حالات کی ایسی تند آندھی چلی تھی جس نے
میرے اندر موجود ہر لطیف جذبے کو کند چھری سے ذبح کر دیا تھا۔ داؤد بھاؤ کے اس بیسمینٹ
میں، میں جب بھی روبی کے یہ منفرد لانبے بال دیکھتا تھا تو مجھے وہ بال یاد آ جاتے تھے حالانکہ
ان بالوں کی پاکیزہ خوشبو اور روبی کے بالوں کی مصنوعی سجاوٹ میں کوئی میل نہیں تھا، ہو
نہیں سکتا تھا۔

داؤد کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔ ''شاہ زیب! جو کچھ تمہارے ہاتھ میں آگیا
ہے، اس کو صحیح استعمال کر کے تم شکیل داراب اور اس کی فیملی کو جڑوں سے ہلا سکتے ہو۔''

''صحیح استعمال سے تمہارا کیا مطلب ہے؟'' میں نے پوچھا۔

بھاؤ بولا۔ ''یہ کہ جو کچھ تمہارے پاس ہے، اس کے مطابق قیمت مانگو۔ یہ قیمت نہ اتنی کم ہو شکیل کہ تمہیں نادان سمجھے اور نہ اتنی زیادہ کہ وہ دینے سے انکار کر دے۔''

''بھاؤ، تمہارے خیال میں اس کی قیمت کیا ہونی چاہیے؟''

''شکیل کے پنجے سے عاشرہ کی رہائی۔ عاشرہ کے والد حاجی نذیر کا تحفظ اور اگر ہو سکے تو تمہارے اپنے کنبے کا تحفظ جس میں ولید کی گلوخلاصی بھی شامل ہو۔''

''بھاؤ، تم نے میرے منہ کی بات چھینی ہے۔ میری اپنی سوچ بھی اس بارے میں یہی ہے۔ مجھے کم از کم مطالبات تو اس سے منوانے ہی چاہئیں۔''

''یہ بڑا گھاگ کھلاڑی ہے شاہ زیب، اس کو سودے بازی کا پرنس بھی کہتے ہیں۔ اپنے نفع نقصان کی جانچ بڑی اچھی طرح کر لیتا ہے یہ خبیث۔''

''بس میری تم سے ایک ہی درخواست ہے بھاؤ...... وہی بات جو میں نے شروع میں کہی تھی۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ ایک بدمعاش سیاست داں کے ساتھ ایک سچی کھری ڈیل ہو۔ میں اپنے مطالبات کے بدلے جو گارنٹی اس کو دوں، وہ واقعی گارنٹی ہو۔''

''میں تمہاری بات بڑی اچھی طرح سمجھ رہا ہوں شاہ زیب۔ اگر تمہیں دوست کہا ہے تو میں دوستی کا مطلب بھی جانتا ہوں۔ یہ خیال بھی اپنے ذہن میں نہ لانا کہ میں تمہاری حاصل کی ہوئی معلومات کو کبھی استعمال کرنے کا سوچوں گا بھی۔ سمجھو کہ مجھے یا انیق کو اس بات کی خبر ہی نہیں کہ پچھلے دو تین دن میں تم کہاں تھے اور کیا کرتے رہے ہو۔'' پھر اس نے مسکراتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔ ''سمجھو میرے یار! کہ یہ تین دن، تین صفحوں کی طرح میری اور انیق کی زندگی کی کتاب سے پھٹ گئے ہیں۔''

''تھینک یو بھاؤ۔''

''دوستوں میں تھینک یو نہیں چلتا۔'' اس نے وہسکی کا طویل گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

کوئی آدھ گھنٹے بعد میں ایک علیحدہ کمرے میں بیٹھ کر سیل فون کے ذریعے شکیل داراب سے رابطے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس سیل فون میں ایک فیک نام پتے والی سم تھی۔ بھاؤ نے مجھے بتایا تھا کہ شکیل سے رابطہ آسان نہیں ہوگا۔ اس کے پرسنل سیکرٹری سے پہلے پرسنل سیکرٹری کے اسسٹنٹ سے بات کرنا پڑے گی اور بھرائی ہوئی آواز والا یہ رانا رفیق نامی شخص پرلے درجے کا بدزبان اور راشی ہے۔

پتا نہیں کیوں ایسے لوگوں سے بات کر کے مجھے آج کمال مزہ آ رہا تھا۔ فون اسی رانا رفیق نامی شخص نے اٹھایا۔ ظاہر ہے کہ میری آواز اس کے لیے اجنبی تھی۔ روکھے پھیکے لہجے میں

بولا۔ ''کون ہے؟''

میں نے اپنا نام عالمگیر بتایا اور کہا کہ میں شکیل صاحب سے بات کرنا چاہتا ہوں کیونکہ مجھے پتا چلا ہے کہ وہ ہفتے کے روز دوپہر دو بجے سے پانچ بجے تک عام لوگوں کے مسئلے فون پر سنتے ہیں۔''

''یہ سلسلہ اب ختم ہو چکا ہے۔'' وہ خشک لہجے میں بولا۔

''کیا مسئلے ختم ہو گئے ہیں؟'' میں نے روانی سے پوچھا۔

''تمہیں کہا ہے ناں، بات نہیں ہو سکتی۔ وہ میٹنگ میں ہیں۔'' اس نے لگا بندھا جواب دیا۔

''میٹنگ کب ختم ہو گی؟''

اس نے اپنے طیش پر بہت ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ''ڈھائی تین گھنٹے میں۔''

''یعنی پانچ بجے کے قریب، چلو ٹھیک ہے میں پانچ بجے فون کر لوں گا۔''

''اگر تمہارے پاس کوئی ریفرنس ہے تو ٹھیک ہے ورنہ کال کرنے کی ضرورت نہیں۔'' اس نے سخت غصیلے انداز میں کہا۔

''مطلب یہ کہ مسائل کی کالوں والا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ صرف ان لوگوں کے فون سنے جاتے ہیں جن کا کوئی ریفرنس ہوتا ہے۔''

اس نے بڑبڑانے کے انداز میں سخت نازیبا الفاظ استعمال کیے اور ریسیور پٹخ دیا۔

میں نے دوبارہ کال ملائی۔ تیسری چوتھی کوشش میں پھر اسی بد دماغ شخص نے ریسیور اٹھایا اور پھنکارا۔ ''کیا بات ہے؟''

''تم نے ریفرنس کا کہا تھا، ریفرنس ہے میرے پاس۔''

''کیا ہے؟''

''اپنے افسر سے کہو کہ وہ شکیل صاحب کو بتائے...... سیالکوٹ کے چور دروازے والا بندہ ملنا چاہ رہا ہے۔''

''سیالکوٹ کا چور دروازہ؟'' اس نے چبا چبا کر کہا۔ ''یہ کون سا ریفرنس ہے؟ تمہارے ہوش تو ٹھکانے ہیں؟''

''ہوش ٹھکانے ہیں رانا ٹنگا صاحب اور تمہارے بھی آ جائیں گے۔ اگر تم نے میری کال شکیل صاحب یا ان کے سیکرٹری سے نہ ملائی تو۔''

رانا ٹنگا کے خطاب نے جیسے اس شخص کی دم پر ہاتھی کا پاؤں رکھ دیا۔ وہ چنگھاڑا۔

''اوئے......اوئے، کون بدبخت ہے تُو؟ کیوں موت آواز دے رہی ہے تجھے؟''

میں نے کہا۔''میری موت تو شاید آواز نہیں دے رہی لیکن تیری بے روزگاری تجھے ضرور آواز دے رہی ہے۔ اگر تُو نے اگلے دو منٹ تک میری کال شکیل صاحب یا ان کے سیکرٹری جواد سے نہ ملائی تو میں تیری نوکری کھا جاؤں گا۔ کل دوپہر سے پہلے پہلے تیری تشریف پر لات پڑ جائے گی اور تُو اپنے دفتر سے باہر گرے گا۔''

دوسری طرف چند سیکنڈ خاموشی رہی۔ یوں لگا جیسے رانا رفیق پر اثر ہوا ہے اور وہ مزید بکواس کرنے سے پہلے کچھ سوچ رہا تھا مگر وہ میری توقع سے زیادہ کریک نکلا۔ اس نے ایک گالی دی اور ایک بار پھر ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔

مجھے یہ سب کچھ مزہ دے رہا تھا۔ میں نے چار پانچ منٹ انتظار کیا اور پھر ایک اور گمنام نمبر سے رانا رفیق کو کال کی۔ ذرا بدلے ہوئے لہجے میں میں نے کہا۔''رانا صاحب، شکیل صاحب کے پرسنل سیکرٹری جواد صاحب سے بات کروائیں۔ میں گوجر خاں سے نادر وڑائچ بول رہا ہوں۔ ایم این صاحب کا بھائی (یہ ریفرنس مجھے داؤد بھاؤ نے بتایا تھا)

اس ریفرنس نے فوراً کام کیا۔ رانا رفیق نے مجھ سے ایک دو سوال پوچھے اور پھر سیکرٹری جواد کا سیل نمبر دیتے ہوئے کہا۔''وہ سیٹ سے اٹھے ہوئے ہیں اس نمبر پر بات کرلیں۔ وہ شکیل صاحب سے رابطہ کروادیں گے۔''

میں نے کہا۔''وہ میٹنگ میں تو نہیں ہیں؟''

''نہیں ابھی تو نہیں۔''

میں نے کہا۔''ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک خبیث مجھ سے کہہ رہا تھا کہ وہ میٹنگ میں ہیں۔ بڑے بڑے جھوٹے، کمینے بیٹھے ہوئے ہیں ان سیٹوں پر۔''

''کیا مطلب؟'' وہ حیران ہو کر بولا۔

''میں وہی بے وسیلہ شہری ہوں پہلی کال والا۔''

''شہری......مم......میں سمجھا نہیں؟'' وہ گڑبڑا گیا۔

''کتے کے بچے...... رانا ٹُنگے تیری نوکری ختم ہو چکی ہے۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

کچھ دیر بعد میں پرسنل سیکرٹری جواد احمد سے بات کر رہا تھا۔ اس نے بھی مجھ سے ریفرنس مانگا۔ میں نے کہا۔''جواد صاحب! ریفرنس بڑا خطرناک ہے لیکن جو بھی ہے، مذاق نہیں ہے سو فی صد درست کہہ رہا ہوں۔ شکیل صاحب سے کہیے کہ سیالکوٹ کے دو دیواروں

میں جو راستہ ہے وہ اب سیکرٹ نہیں رہا۔ اس بارے میں وہ مزید جاننا چاہیں تو مجھ سے بات کر لیں۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔"

یہ بندہ نسبتاً سمجھ دار نکلا۔ اس نے سنبھلتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "آپ کی بات کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی۔ آپ کس چور راستے کی بات کر رہے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "اگر بات آپ کی سمجھ میں آ جائے تو پھر آپ سیکرٹری نہ ہوں، خود باس ہوں۔ کیا سمجھے؟"

"آپ کی بات سے تو لگ رہا ہے کہ آپ سر کو کسی طور دھمکانے کی کوشش کر رہے ہیں؟"

"میں کوشش نہیں کر رہا، میں باقاعدہ دھمکا رہا ہوں۔ بس میں جو بات کہہ رہا ہوں، وہ اسی طرح شکیل صاحب تک پہنچا دیجیے۔ آپ کی ذمے داری ختم ہو جائے گی۔ آپ کہتے ہیں تو میں ہولڈ کرتا ہوں۔"

"ٹھ.....ٹھیک ہے، آپ ہولڈ کریں۔"

اسپیکر پر میوزک ابھرنا شروع ہو گیا۔ میں نے قریباً دو منٹ ہولڈ کیا۔ بالآخر فون پر ایک نئی آواز ابھری۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہ شکیل داراب ہے۔ اس کی آواز جوان اور پاٹ دار تھی مگر اس وقت آواز میں ایک ہلکی سی لرزش محسوس ہو رہی تھی۔

اس نے کہا۔ "آپ کون بول رہے ہیں؟"

میں نے جواب دیا۔ "نام میں کیا رکھا ہے شکیل صاحب۔ آپ کام دیکھیں اور کام کا دام دیکھیں۔"

"تمہیں بات کرنے کی تمیز نہیں؟" سپاٹ لہجے میں کہا گیا۔

"اور آپ کو بات سننے کی تمیز نہیں۔ میں نے جو ریفرنس آپ کو دیا ہے اس پر شاید آپ نے غور نہیں فرمایا۔ سیالکوٹ کے دو گھروں میں ایک چور دروازہ ہے۔ کیا خیال ہے اس کے بارے میں؟"

دوسری طرف خاموشی طاری ہو گئی۔ چند سیکنڈ بعد شکیل کی آواز دوبارہ ابھری تو وہ زیادہ گمبھیر اور بھرائی ہوئی تھی۔ "تم کس چور دروازے کی بات کر رہے ہو؟"

"وہ جو پچھلے چھ سال سے ہے اور جو آپ کو آپ کی منکوحہ سے ملاتا ہے۔"

اب کہنے سننے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ میرے کہے ہوئے الفاظ کا بے پناہ وزن شکیل داراب جانتا تھا اور میں بھی جانتا تھا۔

ایک بار پھر چار پانچ سیکنڈ تک فون لائن پر سناٹا طاری رہا۔ تب شکیل کی آواز ابھری۔
''ہم کو شاید...... آمنے سامنے بات کرنے کی ضرورت ہے۔''
''جیسے آپ کی مرضی۔''
ایک توقف کے بعد پھر پوچھا گیا۔ ''کہاں اور کیسے ملنا چاہو گے؟''
''جہاں اور جیسے میں محفوظ رہوں اور آپ کی رازداری بھی برقرار رہے۔ میں جانتا ہوں آپ ایک طاقت ور شخص ہو اور طاقت اپنا آپ دکھانے کی کوشش ضرور کرتی ہے۔''
''میری طرف سے پوری تسلی رکھو۔'' وہ بولا۔ آواز کی ہلکی سی لرزش برقرار تھی۔
''کب ملاقات ہو سکتی ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''جس وقت تم چاہو، ابھی ڈھائی بجے ہیں اگلے ایک دو گھنٹوں میں جو ٹائم تمہیں سوٹ کرے۔''
میں دل ہی دل میں مسکرایا۔ شکیل کی بات سے اس کی اندرونی اضطراب اور عجلت کا اظہار ہوتا تھا۔ ایسے لوگ تو ہفتوں اور مہینوں کے حساب سے وقت دیتے ہیں، وہ ایک دو گھنٹوں کی بات کر رہا تھا۔
میں نے کہا۔ ''شکیل صاحب! کوئی بھی پروگرام بنانے سے پہلے میں ہاتھ جوڑ کر ایک درخواست آپ سے کرنا چاہتا ہوں۔ میرے ساتھ کسی طرح کا دھوکا نہ ہو ورنہ میں ایسا انتظام کر چکا ہوں کہ جو کچھ میرے پاس موجود ہے وہ ایک آدھ گھنٹے کے اندر خود ہی پبلک ہو جائے گا۔''
''دھمکانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس پر عمل کروں گا۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے ایک طرح کی کمزوری شکیل کے لہجے میں اتر آئی۔ شکیل جیسے فرعون زادے کے لہجے میں کمزوری کی اس لہر نے مجھے مزہ دیا۔
اگلے دس پندرہ منٹ میں سب کچھ طے ہو گیا۔ شکیل مجھ سے ملاقات کر رہا تھا۔ ایسی ملاقات کے لیے لوگوں کو ہفتوں انتظار کرنا پڑتا تھا۔ سفارشیں لڑانا پڑتی تھیں اور پتا نہیں کیا کیا پاپڑ بیلنا پڑتے تھے۔
رات ساڑھے نو بجے کا وقت تھا۔ یہ ایک سرد اور اندھیری شب تھی۔ میں ملاقات کی جگہ پر پہنچ چکا تھا۔ یہ شاہدرہ سے آگے شیخوپورہ روڈ پر ایک مزار کے قریب قدرے سنسان جگہ تھی۔ جو کچھ طے ہوا تھا اس کے مطابق میری اور شکیل داراب کی ون ٹو ون ملاقات ایک اسٹیشن ویگن میں ہونا تھی۔ شکیل داراب کے ساتھ اس کے حفاظتی دستے کے پانچ افراد ساتھ

ہوتے تھے۔ تاہم ان مسلح افراد کو اسٹیشن وین سے کم از کم سو میٹر دور رہنا تھا۔ اسی طرح میں بھی اپنے ساتھ پانچ افراد لاسکتا تھا مگر انہیں موقع سے سو میٹر دور رہنا تھا۔ شکیل داراب نے وعدہ کیا تھا کہ میری طرح اس کے پاس بھی کوئی ہتھیار نہیں ہوگا۔

○......❖......○

داؤد بھائی نے میرے ساتھ اپنے پانچ اچھے شوٹر روانہ کیے تھے۔ ہم ایک ہی ٹویوٹا گاڑی میں موقع پر پہنچے۔ پروگرام کے مطابق میں نے ان پانچوں افراد کو مزار کے پہلو میں روک دیا اور خود گاڑی سے اتر آیا۔ کچھ فاصلے پر مجھے سلور رنگ کی اسٹیشن وین کی پارکنگ لائٹس نظر آگئیں۔ اپنے ساتھ آنے والوں کو ضروری ہدایات میں پہلے ہی دے چکا تھا۔ ان لوگوں کا انچارج مختار جھارا تھا۔ مختار خود بھی ایک اے کے 47 گن سے مسلح تھا۔

میں مستحکم قدموں سے اسٹیشن وین کی طرف بڑھا۔ شکیل نے کہا تھا کہ وہ وین میں اکیلا ہوگا مگر وین کے قریب ایک فربہ اندام شخص کو دیکھ کر مجھے تشویش ہوئی۔ میں قریب پہنچا تو فربہ اندام شخص نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ''سوری جی، آپ پریشان نہ ہوں۔ میری ڈیوٹی صرف یہ ہے کہ میں تسلی کرلوں کہ آپ کے پاس کوئی ہتھیار نہیں۔''

''میں نے زبان پر اعتبار کیا تھا تو شکیل صاحب کو بھی کرنا چاہیے تھا۔ چلو خیر......تم اپنی ڈیوٹی پوری کرلو۔'' میں نے کہا۔

اس نے شائستگی کے ساتھ میری پتلون اور جیکٹ کی جیبیں ٹٹولیں پھر پنڈلیاں وغیرہ چیک کیں اور تھینک یو کہتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔ چند سیکنڈ بعد وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا مخالف سمت کے درختوں کی طرف چلا گیا۔ میں نے دروازہ کھولا اور اسٹیشن وین کے نیم گرم ماحول میں داخل ہوگیا۔ اس شاندار لگژری وین کی کھڑکیوں کے شیشے ٹنڈڈ تھے اور اندر کی مدھم روشنی میں درمیانی نشست پر وہ بے تاج شہزادہ بیٹھا نظر آرہا تھا جس کے ایک اشارے سے لوگوں کی قسمتیں بنتی اور بگڑتی تھیں......اور زندگی موت کے فیصلے ہوتے تھے۔ جوان عمری میں ہی اسے اقتدار اور اختیار کے ایسے تیز رفتار گھوڑوں کی سواری نصیب ہوگئی تھی کہ وہ اپنے قدموں کی زمین کو دھول بنا کر اڑا رہا تھا۔ فلموں، ڈراموں میں عموماً ولن بدصورت یا کم صورت ہوتے ہیں لیکن میرا یہ ولن (جو یقیناً ولن ہی تھا) اپنے چہرے مہرے سے دیکھنے والوں کو صریح دھوکا دیتا تھا۔ چمچماتا ہوا کلین شیوڈ چہرہ، تیکھے نقوش فقط اس کی آنکھیں ایسی تھیں جن کے اندر کہیں گہرائی میں عیاری اور کمینگی چھپی ہوئی تھی۔

اس نے مجھے سرتاپا دیکھا اور بولا۔ ''ویلکم مسٹر شاہ زیب، مجھے توقع تھی کہ جو بندہ مجھے

سے بات کرنے اس وین میں آئے گا، وہ تم ہی ہو گے۔"

میں نے کہا۔ "اگر آپ نے مجھے پہچان لیا ہے تو پھر یہ بھی جان گئے ہوں گے کہ میں ایک بہت بڑا دہشت گرد ہوں جس نے بیرون ملک سے دہشت گردی کی اعلیٰ ڈگریاں حاصل کی ہیں اور یہاں پاکستان پہنچ کر اور اپنے کزن ولید کے ساتھ مل کر ظلم وستم کی نئی داستانیں رقم کی ہیں۔"

"کم از کم پولیس کی رپورٹیں تو یہی کہہ رہی ہیں۔" شکیل داراب نے کہا۔

"اور پولیس سے سچا کھرا ادارہ ہمارے ملک عزیز میں بھلا اور کون سا ہے۔"

"بہت غصے میں لگتے ہو؟" وہ پاٹ دار آواز میں بولا۔

"شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں غلطی کر رہا ہوں۔ مجھے تو ہنسنا چاہیے، ہنس ہنس کر آپ کو بتانا چاہیے کہ قیصر چودھری نے اور اس کے ساتھیوں نے ہمارے ساتھ کیا کیا ہے اور اس پر تو مسرت سے میرے قہقہے ہی نہیں رکنے چاہئیں کہ میں نے اپنی کزن اور اپنی چچی کو آگ میں زندہ جلتے دیکھا ہے اور ولید کو گولیوں سے چھلنی ہو کر تڑپتے پایا ہے۔ یہ سارے بڑے دلچسپ منظر تھے۔ مجھے ان مناظر کو یاد کر کے انجوائے کرنا چاہیے اور آپ کو بھی انجوائے منٹ کا موقع دینا چاہیے۔" میری آنکھیں شدت دکھ سے جلنے لگیں۔

وہ بغور میری طرف دیکھتا رہا۔ اس نے ڈینم کی نہایت بیش قیمت پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے اوپر کسی مہنگے ملک کی مہنگی شاپ کا سویٹر تھا۔ پرفیوم نے وین کے اندر کے ماحول کو معطر کر رکھا تھا۔ ہماری نشستیں آمنے سامنے تھیں۔ درمیان میں ایک خوب صورت فولڈنگ میز تھی۔ اس پر چند کاغذات رکھے تھے اور سگریٹ کیس وغیرہ پڑا تھا۔

شکیل گہری سانس لے کر بولا۔ "اس بات سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ولید نامی اس لڑکے نے پولیس پارٹی پر حملہ کیا۔ ایک اہلکار کو فائر مارا۔ اس بات سے بھی انکار کرنا ناممکن ہے کہ تم نے قیصر چودھری کو زخمی کیا۔ تمہاری وجہ سے اس کی گاڑی نہر میں گری اور تم اس کی حراست سے فرار ہوئے......"

"بالکل...... بالکل اور اس بات سے انکار کرنا بھی ناممکن ہو گا کہ ہم لوگ بیکری کی آڑ میں وہاں بم اور بارودی سرنگیں بنا رہے تھے اور میرے چچا اس اسلحہ ساز فیکٹری کے ماسٹر مائنڈ تھے اور اس سے بھی انکار مشکل ہے کہ کچھ دن پہلے میں نے ہی پمپ ایکشن کے ذریعے لاہور کے نواحی مقام پر اندھا دھند فائرنگ کی اور سات بے گناہ افراد کو موت کے گھاٹ اتارا۔ ہاں اس بات سے ضرور انکار کیا جا سکتا ہے کہ ایک گروہ قیصر چودھری جیسے لوگوں کی مدد

سے علاقے کی زمینوں پر قبضے کر رہا ہے اور جو مزاحمت کرتے ہیں ان کو عبرت کا نشان بنا رہا ہے۔ ان کی پروپرٹیز کو آگ لگادی جاتی ہے اور کچھ ایسے بھی ہوں گے جنہیں پولیس مقابلوں میں پار کر دیا جاتا ہے۔ ہاں اس سے ضرور انکار کیا جا سکتا ہے۔''

وہ خاموشی سے سن رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ ایک اَن دیکھے شکنجے میں ہے ورنہ اس جیسے لوگ خاموشی سے کب سنتے ہیں۔

ایک لمبی سانس لے کر اس نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ ہمیں بات مختصر کرنی چاہیے۔ تم نے فون پر کس چور راستے کی بات کی ہے؟''

''شکیل صاحب! آپ بس رسماً پوچھ رہے ہیں۔ ورنہ آپ کو پتا تو سب چل گیا ہے۔ آپ کی ٹیچر ناہید پاشا کو اس کے شوہر نے قریباً چھ سال پہلے طلاق دے دی تھی۔ اس طلاق کے پیچھے آپ کا ہاتھ تھا۔ اس کا شوہر پاشا اب لاہور میں ایک عالی شان گھر میں موج مستی کی زندگی گزار رہا ہے۔ ناہید سے آپ نے خفیہ طور پر نکاح کیا ہے اور وہ اب سیالکوٹ کے ایک ایسے گھر میں رہ رہی ہے جس کی دیوار کے ساتھ آپ کے قریبی دوست پرویز خان کی کوٹھی کی دیوار ملی ہوئی ہے۔ اتنا کافی ہے یا کچھ اور بھی بتاؤں؟''

شکیل داراب یقیناً مضبوط اعصاب کا مالک تھا پھر بھی اس کا اندرونی اضطراب اس کے چہرے پر جھلک رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''شکیل صاحب! آپ نے اپنی ایک محترم ٹیچر کو مجبور و بے بس کر کے اس سے نکاح کا ڈھونگ رچایا اور اسے چھ سال تک ایک طرح کے حبس بے جا میں رکھا اور اب اس سے دل بھر جانے کے بعد آپ ایک اور بے گناہ لڑکی کی زندگی برباد کر رہے ہیں۔ طریقہ کار مختلف ہے لیکن حاجی نذیر کی بیٹی عاشرہ بھی اسی قسم کا شکار ہو رہی ہے جس کا شکار کبھی ناہید پاشا ہوئی تھی۔ مجھے یقین ہے آپ کا یہ بھید کھل گیا تو آپ کی فیملی کا بیڑا غرق ہونے میں کوئی کسر باقی نہیں رہے گی۔''

''شاید تمہیں غلط فہمی ہو رہی ہے۔'' وہ دلیری سے بولا۔

''اگر غلط فہمی ہو رہی ہے تو آپ انکار فرما دیجیے۔ میں دعویٰ کرتا ہوں کہ ایک گھنٹے کے اندر میڈیا اور سوشل میڈیا پر آپ کے سارے کپڑے اتار دوں گا۔ بڑے پکے ثبوت ہیں میرے پاس۔''

''تم تمیز سے بات کرو۔ ابھی مرنے کی عمر نہیں ہے تمہاری۔'' وہ خطرناک لہجے میں بولا۔

''آپ کی عمر بھی برباد ہونے کی نہیں ہے۔ الیکشن سر پر ہے۔ یہ الیکشن آپ کی فیملی کا

بینڈ اس طرح بجا سکتا ہے کہ آپ کی اگلی نسل بھی ہاتھ لگا لگا کر روتی رہے گی۔"

اس کا چہرہ سرخ انگارہ ہو گیا۔ اس نے جھپٹ کر میرا گریبان پکڑ لیا اور اتنی زور سے بھنچا کہ میرا کالر ادھڑ کر رہ گیا لیکن میں پورے اطمینان سے اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ "تم جانتے نہیں ہو مجھے؟" وہ پھنکارا۔

"جانتا ہوں، آپ بہت بڑی توپ ہیں لیکن آپ سے بڑی بڑی توپوں کا گولا میں نے ان کے اندر ہی پھٹتے دیکھا ہے پھر ان کے ٹکڑے بھی ڈھونڈنے سے نہیں ملتے اور سچی بات سننا چاہتے ہیں تو آپ کوئی اتنی بلند و بالا شے بھی نہیں ہیں۔ ایسے بے شمار خاندان اس برصغیر میں موجود ہوں گے جن کی دولت آپ جناب کی دولت سے سوگنا زیادہ تھی لیکن جب ان کے پاؤں کے نیچے سے زمین کھسکنا شروع ہوئی تو ان کو گندی نالیوں میں اوندھے پڑے دیکھا گیا۔"

اس نے ایک زوردار جھٹکا دیا اور میرا گریبان نیچے تک پھٹتا چلا گیا۔ اس نے اپنا دایاں گھونسا مجھے مارنے کے لیے تانا لیکن بس اسے تان کر ہی رہ گیا۔ میں اسی طرح سکون سے اپنی جگہ بیٹھا رہا۔

چار پانچ سیکنڈ تک اس نے خونخوار نظروں سے مجھے گھورا پھر ایک دھکا دے کر میرا گریبان چھوڑ دیا۔

اس نے ایک جھٹکے سے اسٹیشن وین کا سلائڈنگ دروازہ کھولا اور باہر نکل کر کھڑا ہو گیا۔ میں اندازہ لگا چکا تھا کہ وہ اپنے بے پناہ غیظ و غضب پر غلبہ پانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس نے سگریٹ سلگایا اور اس کا ایک گہرا کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑا پھر بے قراری سے ٹہلنے والے انداز میں چند قدم اٹھائے۔ میں اسی طرح اپنی نشست پر بیٹھا، یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

قریباً ایک منٹ بعد وہ دوبارہ اندر آ گیا اور دروازہ بند کر دیا۔ اندر کی مدھم روشنی میں، میں نے دیکھا کہ اس نے خود کو کافی حد تک سنبھال لیا ہے۔ مجھے بھاؤ کی بات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا کہ شکیل اپنے نفع نقصان کو بے حد اہمیت دینے والا شخص ہے اور اس لیے ایک بہترین سودے باز یا سوداگر بھی ہے۔

میں بھی جانتا تھا کہ شکیل داراب نے میرا گریبان پھاڑنے کے بعد جو ڈیڑھ دو منٹ وین سے باہر گزارے ہیں، ان میں اس نے کوئی بہت بڑا فیصلہ کر لیا ہے۔

آنے والے ایک دو منٹ میں یہ بات بالکل درست ثابت ہوئی۔ شکیل داراب کچھ لے اور کچھ دے کی بنیاد پر یہ معاملہ طے کرنے کو تیار تھا۔ حسبِ توقع سب سے پہلے تو اس

نے مجھ سے میرے دعوے کا ثبوت مانگا۔ میں نے کہا۔ ''شکیل صاحب، میں نے گزارش کی ہے ناکہ ثبوت پکے ہیں اور وہ پکے ہی ہیں۔ آپ کو تھوڑا سا اندازہ اس بات سے ہی ہو جائے گا کہ بارہ تاریخ کو رات بارہ بجے کے لگ بھگ آپ نے ناہید صاحبہ کے گھر میں آ کر ان سے جو بات چیت کی تھی، وہ میرے علم میں ہے اور جو سوئٹ ڈش کھانے سے آپ نے انکار کیا تھا وہ بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔''

وہ حیرت زدہ نگاہوں سے میری جانب دیکھتا رہا۔ اس کا ذہن تیزی سے بہت کچھ سوچ رہا تھا۔

''ایک درخواست آپ سے اور ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس سلسلے میں ناہید صاحبہ یا ان کے گھر کا کوئی ملازم ذمے دار نہیں ہے۔ اگر آپ اپنے غصے کا نزلہ ان میں سے کسی پر گرائیں گے تو یہ غلط ہوگا۔ آگے آپ کی مرضی۔''

''تم چاہتے کیا ہو؟'' شکیل نے فیصلہ کن انداز میں پوچھا۔

میں نے اپنی پھٹی ہوئی قمیص کی جیب سے ایک کاغذ نکالا اور شکیل کی طرف بڑھا دیا۔

''میں جو کچھ چاہتا ہوں میں نے اس پر لکھ دیا ہے۔''

وہ کاغذ لے کر اندرونی روشنی میں پڑھنے لگا۔ میں نے اپنے جو مطالبات لکھے، وہ کچھ یوں تھے۔

''یہ وہ کم از کم مطالبات ہیں جن پر ہماری ڈیل ہوسکتی ہے۔ نمبر ایک، میرے کزن ولید کو فی الفور رہا کیا جائے اور اس پر درج جھوٹے بلکہ سراسر جھوٹے مقدمے ختم کیے جائیں۔ نمبر دو مجھ پر درج مقدمات بھی ختم کیے جائیں۔ مجھے اور ولید کو چچا حفیظ کے علاج کے لیے ملک سے باہر جانے کی اجازت دی جائے۔ نمبر تین، آپ عاشرہ سے دستبردار ہو جائیں۔ اسے اس کی منشا کے مطابق رہنے کی اجازت دیں (اور میرے خیال میں آپ کے لیے اب یہ کام اتنا مشکل بھی نہیں۔ آپ اس کو حاصل کرنے کی ضد تو پوری کر ہی چکے ہیں۔) اس کے علاوہ عاشرہ کے والد حاجی نذیر صاحب کے خلاف قتل کے بوگس مقدمے کی پرانی فائل دوبارہ نہ کھولنے کی گارنٹی دی جائے۔ نمبر چار، چچا حفیظ کی زمین پر قبضہ نہ کیا جائے اور نہ زمین زبردستی خریدی جائے۔ نیز حویلی میں لگنے والی آگ کی بالکل غیر جانبدارانہ تحقیق ہونے دی جائے۔ نمبر پانچ، یہ آخری مطالبہ ذرا غیر اہم لگے گا اور شاید دلچسپ بھی محسوس ہو لیکن یہ میرے لیے دوسرے مطالبوں کی طرح ہی اہم ہے۔ آپ جناب کے عملے میں پرسنل سیکرٹری صاحب نے اپنے اسسٹنٹ کے طور پر ایک کالے رنگ کا کتا رکھا ہوا ہے اس بوہلی کتے کو رانا

رفیق کہا جاتا ہے۔ کل دوپہر سے پہلے پہلے اس کو نوکری سے فارغ کیا جائے اور کم از کم ایک سال تک کسی بھی صورت میں اس کی بحالی یا ایڈجسٹمنٹ نہ ہو۔"

شکیل داراب نے بڑے تحمل اور غور سے اس تحریر کو دو بار پڑھا۔ تب۔ اس نے کاغذ سامنے بیش قیمت تپائی پر رکھا اور میری آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔ "اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ اگر میں ان مطالبات میں کچھ یا سارے مان لوں تو تم اپنی زبان بند کر لو گے اور یہ ہمیشہ بند رہے گی؟"

"یہ ایک مرد کی زبان ہے۔"

"بلیک میلنگ کرنے والے عام طور پر مرد ہی ہوتے ہیں اور ان کے مطالبات کو اکثر بریک نہیں لگتے یا پھر بریک لگانے کے لیے ان کی زندگی کو بریک لگانے پڑتے ہیں۔"

"یہاں ایسا کچھ نہیں ہوگا شکیل صاحب۔ شاید آج تک آپ کا واسطہ کسی مرد سے پڑا ہی نہیں۔ بریک لگیں گے اور فل بریک لگیں گے۔ اگر ہماری یہ ڈیل ہو جاتی ہے تو آپ اپنی زندگی کی آخری سانس تک اس ڈیل کو یاد رکھیں گے اور اپنی آنے والی نسل کو بھی بتائیں گے کہ جب ایک مرد کا بچہ زبان دیتا ہے تو وہ کیا ہوتی ہے۔"

میرے دل نے گواہی دی کہ شکیل جو کچھ بھی ہے لیکن ایک مردم شناس شخص ہے۔ وہ میری آنکھوں میں جھانکتا رہا اور شاید آنکھوں کے راستے ہی دل میں اترنے کی کوشش کرتا رہا۔ یہ فیصلے کے لمحے تھے اور پھر شاید فیصلہ ہو گیا۔ شکیل کے تاثرات بدلے۔ اس نے نیا سگریٹ سلگانے کے لیے اپنے ہاتھ ٹیبل کی طرف بڑھائے لیکن پھر یہ سوچ کر روک لیے کہ اس مختصر جگہ میں تمباکو نوشی ٹھیک نہیں۔

ٹھہرے لہجے میں بولا۔ "میں تمہارے مطالبات پڑھ چکا ہوں اور غور کر چکا ہوں۔ پہلا مطالبہ بھی کچھ مشکل ہے کیونکہ ملزم ولید نے آن ڈیوٹی اہلکار پر گولی چلائی ہے لیکن میں اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ کر لوں گا...... بہرحال تیسر مطالبے کو ماننا میرے لیے ناممکن ہے۔"

وہ عاشرہ والے مطالبے کی بات کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "اور یہی مطالبہ میرے لیے سب سے اہم ہے۔ اگر یہ نہیں تو پھر ڈیل پر کوئی بات کرنے کا فائدہ ہی نہیں۔"

اگلے دس منٹ میں ہم دونوں کے درمیان ان پانچوں مطالبات پر اور خاص طور سے عاشرہ والے مطالبے پر زبردست نگوسی ایشن ہوئی۔ درحقیقت وہ تیسرے یعنی عاشرہ والے مطالبے کے سوا سارے مطالبے ماننے کو تیار تھا۔ میرے پاس ترپ کا پتا تھا اور یہ پتا شکیل کی ہر چال کو ناکام بنا رہا تھا۔ وہ بارگیننگ میں اپنا فن دکھا رہا تھا لیکن میں اس فن کاری کے لیے

پہلے سے تیار تھا۔ بالآخر اس نے کڑوا گھونٹ بھرا اور عقل مندی کا ثبوت دیتے ہوئے تقریباً یہ مطالبات تسلیم کر لیے جو سب سے سخت فیصلہ اسے کرنا پڑا وہ یقیناً عاشرہ والا ہی تھا۔ ولید کے سلسلے میں، میں نے اس کی یہ بات تسلیم کر لی کہ اس پر دہشت گردی کا کوئی بوگس کیس نہیں بنے گا۔ کوشش کی جائے گی کہ اسے جیل کے بجائے زیادہ سے زیادہ اسپتال میں ہی رکھا جائے اور سارے واقعے کی جوڈیشنل انکوائری بغیر کسی دباؤ کے ہو۔

عاشرہ کے حوالے سے طے ہوا کہ فی الحال یہ اعلان کیا جائے کہ یہ شادی ملتوی کر دی گئی ہے۔ بعدازاں اسے کینسل کر دیا جائے گا۔ اگر عاشرہ باہر جانا چاہے تو اپنے والد حاجی نذیر کے علاج کے سلسلے میں باہر جا سکے گی۔ یہ اصولی فیصلہ بھی ہو گیا کہ میں واپس ڈنمارک چلا جاؤں گا اور جب بھی ولید کو موقع ملے گا اسے بھی باہر بھجوا دیا جائے گا تا کہ وہ بے بنیاد مقدمات سے بچ سکے۔

اس کے علاوہ بھی کئی جزئیات طے ہوئیں۔ ہماری اس گفتگو نے غیر معمولی طور پر طول پکڑا اور یہ قریباً تین گھنٹے جاری رہی۔ آخر میں سب کچھ طے ہو گیا۔

○......❖......○

شام کا وقت تھا۔ آج سردی معمول سے زیادہ تھی۔ بادل بھی تھے، لاہور کے گلی کوچوں میں کبھی کبھی رم جھم ہونے لگتی تھی۔ میں جوہر ٹاؤن کی کشادہ سڑکوں پر موٹر بائیک چلاتا ہوا ایک کوٹھی کے سامنے رکا۔ ایک کینال کی اس کوٹھی کے بس ایک دو کمروں میں ہی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے بائیک روکی اور ہیلمٹ سر سے اتارا۔ کال بیل دی، تیسری چوتھی بیل کے بعد اندر کھٹ پٹ کی آواز سنائی دی اور پھر ایک دبلے پتلے اٹھارہ بیس سالہ لڑکے نے دروازہ کھولا۔ وہ صورت اور حلیے سے گھر کا فرد ہی لگتا تھا۔

''عارف صاحب گھر پر ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں جی، آپ کون؟''

جواب دینے سے پہلے ہی میں موٹر بائیک گیٹ کے اندر لے گیا اور بائیک کے ہینڈل سے اڑسا اخبار نکال لیا۔ لڑکا سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''ان کو بتاؤ، آپ کا دوست شاہ زیب آیا ہے۔''

لڑکے نے الجھے ہوئے انداز میں گیٹ بند کیا اور اندرونی حصے کی طرف چلا گیا۔ میں جانتا تھا کہ گھر میں عارف اور اس لڑکے کے سوا اور کوئی نہیں۔ عارف کے سر کی چوٹ کا علاج معالجہ ابھی تک جاری تھا۔ اسے روزانہ جنرل اسپتال جانا پڑ رہا تھا اس لیے وہ مراد پور واپس جانے کے بجائے یہیں لاہور میں ٹھہرا ہوا تھا۔ یہ گھر اس کے ایک قریبی دوست کا تھا جو اپنی فیملی سمیت چند ہفتوں کے لیے کراچی گیا ہوا تھا۔ لڑکے کا نام سلیم تھا اور وہ عارف کا چھوٹا بھائی تھا۔ یہ ساری معلومات میں نے کل ہی حاصل کر لی تھیں۔

سلیم نے ایک بند کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ''کیا بات ہے؟'' اندر سے قدرے جھلائی ہوئی آواز آئی۔

''بھائی کوئی ملنے آیا ہے آپ سے۔'' سلیم نے کہا۔

میں نے آگے بڑھ کر دروازے پر دباؤ ڈالا۔ وہ اندر سے بند نہیں تھا، کھل گیا۔ کمرے میں گہرا اندھیرا تھا۔ گیس ہیٹر کی ہلکی سی سرخ روشنی ماحول کو پُراسرار رنگ دے رہی تھی۔ گیس ہیٹر کے قریب ہی سگریٹوں کے ان گنت ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے بٹن دبا کر روشنی کی۔ سامنے ہی بستر پر الجھے بالوں اور ویران آنکھوں والا عارف نیم دراز دکھائی دیا۔ وہی عارف جسے ایک دن میں نے جانے حادثہ سے اٹھا کر اسپتال پہنچانے کی غلطی کی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے مرجھائے ہوئے چہرے پر حیرت اُمڈ آئی۔

''تم یہاں؟''

میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ابھی سات بجے ہیں۔ یہ کون سا وقت ہے بتیاں بجھا کر سونے کا؟''

''تمہیں یہاں کا پتا کیسے چلا؟''

''کل اسپتال سے ہی معلوم ہوا تھا اور سناؤ کیا حال ہے؟''

''حال تمہارے سامنے ہے شاہ زیب بھائی۔ سر کی چوٹ کی وجہ سے گردن میں شدید درد رہتا ہے۔ اس کی ٹریٹمنٹ ہو رہی ہے۔''

''اس حال کا پتا تو مجھے کل اسپتال سے ہی چل گیا تھا۔ میں دوسرے حال کی بات کر رہا ہوں۔''

عارف نے اپنے چھوٹے بھائی کی طرف دیکھا جو دروازے میں ہی کھڑا تھا۔ عارف نے اس سے کہا۔ ''چائے وغیرہ لے آؤ۔''

''اگر پکوڑے یا بسکٹ وغیرہ بھی ہو سکیں تو ٹھیک ہیں۔'' میں نے کہا۔

عارف کے چہرے پر عجب سی آدم بیزاری ہوتی تھی۔ اس کے باوجود وہ کسی نہ کسی طور پر مجھے برداشت کرتا تھا آج بھی کر رہا تھا۔

ہم نے کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کیں تب میں پھر اصل موضوع پر آ گیا۔ میں نے کہا۔

''عاشرہ کی کچھ خیر خبر ہے؟''

اس نے ایک لمبی سانس لی۔ ''یہ بات آپ کیوں چھیڑتے ہو شاہ زیب بھائی۔ اس سے رستے اب علیحدہ ہو چکے ہیں۔''

''ہو سکتا ہے کہ رستے علیحدہ نہ ہوئے ہوں۔ ابھی کچھ امید باقی ہو۔'' میں نے کہا۔

اس نے نہایت دکھ بھرے انداز میں انکشاف کیا۔ ''آج اس کے ابٹن کی رسم ہے۔''

''میں نے کہا نا امید باقی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آج اس کی ابٹن کی رسم نہ ہو۔''

''آج ہی ہے۔'' وہ مرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''اور اب ان باتوں سے فائدہ بھی کیا؟'' آخری الفاظ ادا کرتے کرتے وہ پھر جھلا سا گیا۔

میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا دوپہر کا اخبار کھولا اور فرنٹ پیج پر لگی ہوئی ایک دو کالمی خبر اس کے سامنے کر دی۔ خبر کی سرخی کچھ یوں تھی۔

''شکیل داراب کی شادی ملتوی۔''

ذیلی سرخی تھی۔ ''ان کے ہونے والے سسر حاجی نذیر علاج کے لیے بیرون ملک جائیں گے۔''

عارف حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر یہ خبر دیکھ رہا تھا۔ ''یہ کیا ہے؟ کب ہوا یہ؟'' اس نے لرزاں آواز میں کہا۔

''کل ہوا...... اور خبر آج دوپہر چھپی ہے۔ بالکل تصدیق شدہ خبر ہے۔ سارے پیپرز میں آئی ہے یقیناً الیکٹرانک میڈیا پر بھی ہوگی لیکن تمہیں کیا پتا تم تو ساری دنیا سے کٹ کر یہاں اس اندھیرے کمرے میں پڑے ہو۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے شاہ زیب، چند دن بعد تو......''

''یہ ہو چکا ہے۔'' میں نے اس کی بات کاٹی۔ ''اور صرف یہی نہیں ہوا کہ شادی ملتوی ہوئی ہے یہ شادی کینسل بھی ہونے والی ہے اور یہ سب کچھ شکیل کی مرضی اور رضامندی سے ہوگا۔ عاشرہ پر یا اس کے گھر والوں پر کسی طرح کا کوئی بوجھ آئے گا اور نہ ان کی سبکی کا پہلو نکلے گا......''

''تم یہ سب کیسے کہہ سکتے ہو، اتنے یقین کے ساتھ؟''

''میں نے اسپتال میں تم سے وعدہ کیا تھا نا عارف کہ میں اپنی پوری کوشش کروں گا اور ان حالات کو بدل کر دکھاؤں گا۔''

''مگر...... یہ سب...... کیسے؟'' عارف گڑبڑا گیا۔ اسے الفاظ نہیں سوجھ رہے تھے۔

میں نے کہا۔ ''یہ سب باتیں چھوڑو عارف...... مجھے صرف ایک بات کی پھر یقین دہانی کروا دو...... صرف ایک بات۔''

اس کی آنکھوں میں نمی تھی اور سوالیہ نگاہیں میری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ وہ کچھ بھی نہیں بول پا رہا تھا۔ میں نے اس مرتبہ بالکل صاف صاف بات کرنے کا فیصلہ کیا اور کہا۔

''تمہیں معلوم ہو چکا ہے عارف کہ عاشرہ کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے، اس میں وہ بالکل بے قصور ہے۔ ہمیں سو فی صد یقین نہیں لیکن کہا یہ جا رہا ہے کہ جب وہ مجبور ہو کر شکیل سے

ملنے شیخوپورہ والے ٹھکانے پر پہنچی تو وہاں شکیل نے اس کے ساتھ زبردستی کی۔ یہ باتیں تمہارے علم میں بھی ہیں۔ کیا ان باتوں کی موجودگی میں تم اسے قبول کرنے اور اپنانے کو تیار ہو؟"

وہ کراہ کر بولا۔ "شاہ زیب بھائی! تم نے جتنی بار مجھ سے یہ سوال کیا ہے، اتنی ہی بار میرے دل میں خنجر اتارا ہے۔ میں بڑی سے بڑی قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ تم جو بات کہہ رہے ہو میرے نزدیک اس کی ذرا سی بھی اہمیت نہیں۔ میں بس یہ جانتا ہوں کہ میں اسے اپنی جان سے بڑھ کر پیار کرتا ہوں اور وہ اس سارے معاملے میں بالکل مجبور اور بے قصور ہے۔"

میں نے اسے دونوں کندھوں سے تھاما اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "عارف! میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تم دونوں کو ملا کر رہوں گا۔ میں نے تم دونوں کے لیے گھڑی کی سوئیوں کو الٹا چلایا ہے اور یہ سوئیاں اب اسی مقام پر پہنچیں گی جہاں سے تم دونوں جدا ہوئے تھے۔"

وہ سرتاپا لرز رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے، بولا۔ "شاہ زیب! یہ بہت لمبے ہاتھوں والے لوگ ہیں۔ ان کی دشمنی بہت زہریلی ہے۔ تمہیں پتا ہے ناں کہ عاشرہ کے والد والی فائل کھلی تھی جس کی وجہ سے وہ بستر پر جا پڑے ہیں۔ یہ فائل پھر کھل جائے گی اور اس کے علاوہ......"

"اب کچھ نہیں کھلے گا عارف۔" میں نے پورے وثوق سے اس کی بات کاٹی۔ "اگر کچھ کھلے گا تو وہ راستہ کھلے گا جو تمہیں عاشرہ تک لے جائے گا۔"

میرا یقین اور اعتماد دیکھ کر عارف کی حیرتیں انتہا کو چھونے لگیں۔ اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور بولا۔ "کیا تم شکیل سے خود ملے ہو؟"

"ہاں ملا بھی ہوں اور اس کے اندر بھی اترا ہوں۔ اس کی رگ رگ میں گھس گیا ہوں۔ اس ملاقات کو وہ بڑی دیر تک بھول نہیں سکے گا۔"

عارف سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ کتنی ہی دیر خاموش رہا پھر مجھے اس کی مدھم سسکی سنائی دی۔ "کیا ہوا بھئی کیا اب بھی رونے کا موقع ہے؟"

وہ اچانک اٹھ کر میرے گلے لگ گیا۔ اشک بار آواز میں بولا۔ "شاہ زیب بھائی! مجھے تمہاری کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔ تم کیا ہو؟ یہ سب کس طرح کر رہے ہو؟ اور اس کا فائدہ......؟"

"تم اپنے دماغ پر زیادہ بوجھ نہ ڈالو عارف۔ بس اپنی صحت کی بحالی پر توجہ دو۔ مجھ پر بھروسا رکھو۔ اللہ نے چاہا تو میں تمہیں منزل پر پہنچا کر دم لوں گا۔"

''لیکن کیوں؟ آخر کیوں شاہ زیب بھائی؟''

''اس لیے کہ تم نے مجھے طعنہ دیا تھا۔ تم نے کہا تھا کہ میں نے حادثے کے بعد کیوں تمہاری جان بچائی۔ تمہیں کیوں نہ مرنے دیا۔''

''وہ تو...... میں اب بھی کہتا ہوں۔'' وہ کمزور آواز میں بولا۔

''میں بہت جلد یہ لفظ تم سے چھین لوں گا۔ ہمیشہ کے لیے۔''

اس نے میرے چہرے کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''شاہ زیب! میں تمہیں سمجھنے سے بالکل قاصر ہوں تم...... یہ سب کس طرح کر پا رہے ہو کس کی مدد سے؟ کس کے تعاون سے؟''

''پیار کی مدد سے، پیار کے تعاون سے۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ ''تمہاری طرح میں بھی کسی سے پیار کرتا ہوں۔ اس کی جدائی جھیل رہا ہوں۔ اس تڑپ اور درد کو اچھی طرح جانتا ہوں...... لیکن اب یہ نہ پوچھنے بیٹھ جانا کہ کون تھی...... کیا تھی...... کیا ہوا...... کیسے ہوا؟ ابھی یہ موضوع چھیڑنے کا وقت نہیں۔ وقت آیا تو بتاؤں گا۔''

''تمہیں پتا ہے شاہ زیب بھائی، لالہ نظام اور اس کا دوست امتیاز ٹریفک حادثے میں مارے گئے ہیں۔ انسپکٹر چودھری قیصر زخمی ہو کر اسپتال میں پڑا ہے۔''

''ہاں، میں یہ خبر سن چکا ہوں۔ خدا کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔''

عارف بولا۔ ''ان لوگوں نے اَت اٹھائی ہوئی تھی۔ انسان کو انسان نہیں سمجھتے تھے جو کچھ وہاں تمہاری حویلی میں ہوا، اس کے پیچھے بھی ضرور اسی لالہ نظام کا ہاتھ تھا۔''

''اس میں تو کوئی شک ہی نہیں ہے عارف۔ ولید نے حوالدار رمضان کو تھپڑ ضرور مارا تھا لیکن اس بات کو بس بہانہ بنایا گیا۔ لالہ نظام وغیرہ ہاتھ دھو کر اس زمین کے پیچھے پڑے ہوئے تھے......''

اچانک بات کرتے کرتے میں رک گیا۔ میری نگاہ سامنے غالیچے کے اوپر رکھی شیشے کی خوب صورت گول تپائی پر پڑی یہاں ایک دو سنڈے میگزین اور انگلش رسالے رکھے تھے۔ اسپورٹس کے ایک غیر ملکی رسالے کا بیک ٹائٹل دیکھ کر میں چونکا تھا۔ انرجی ڈرنک کے ایک اشتہار میں میری تصویر موجود تھی۔ میرا نام بھی موجود تھا ایسٹرن کنگ۔ ایسٹرن کنگ اپنے ایکشن میں نظر آ رہا تھا۔ لمبے بال شانوں تک جاتے ہوئے۔ داڑھی اور گھنی مونچھیں یہ حلیہ اس حلیے سے بہت مختلف تھا جس میں...... میں یہاں جوہر ٹاؤن کی اس کوٹھی میں بیٹھا ہوا تھا۔ یہ زندگی بھی کیا کیا تماشے دکھاتی ہے۔

عارف نے میری نگاہوں کا تعاقب کیا۔ ’’کیا دیکھ رہے ہو؟‘‘

میں نے اشتہار والا رسالہ اٹھایا۔ ’’لگتا ہے تمہیں اسپورٹس سے بھی دلچسپی ہے۔‘‘

’’نہیں شاہ زیب بھائی۔ یہ تو چھوٹا بھائی سلیم پڑھتا ہے۔‘‘

میں اپنی تصویر دیکھ رہا تھا جب کچھ آوازوں نے میرے ساتھ ساتھ عارف کو بھی بری طرح چونکایا۔ یہ آوازیں باہر سے آ رہی تھیں۔ بالکل یہی لگا جیسے کوئی عورت کسی سے جھگڑ رہی ہے اور دروازوں کو دھکے دیتی ہوئی اندر آ رہی ہے۔ یہ کوئی لڑکی ہی تھی۔ اس کی آواز کے ساتھ کسی وقت عارف کے چھوٹے بھائی سلیم کی آواز بھی آتی تھی۔ میں اور عارف دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ عارف نے شاید یہ آواز پہچان لی تھی۔ وہ ایک دم گھبرایا ہوا نظر آیا۔ اس نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ’’شاہ زیب تم ساتھ والے کمرے میں چلے جاؤ۔‘‘

میں نے سوال جواب مناسب نہیں سمجھا۔ اس کی ہدایت پر فوراً عمل کیا اور بغلی دروازے سے گزر کر ملحقہ کمرے میں چلا گیا۔ عارف نے دروازہ بند کر دیا۔ یہ ایک اسٹور روم ٹائپ جگہ تھی۔ یہاں اندھیرا تھا۔ میں ایک کھڑکی کی درز میں سے دوسرے کمرے میں جھانکنے میں کامیاب ہوا۔ میرے دیکھنے سے دو چار سیکنڈ پہلے عارف والے کمرے کا دروازہ دھماکے سے کھل چکا تھا۔ اس دروازے کے راستے جو لڑکی اندر آئی تھی، میں اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اپنی نگاہوں پر بھروسا نہیں ہوا۔ میرے سامنے عاشرہ کھڑی تھی۔ وہ ساڑھی میں تھی۔ بارش کی وجہ سے کپڑے بھیگ چکے تھے اور بال بھی۔ اس کا حسین چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے دروازے میں سلیم ڈرا سہما کھڑا تھا۔

وہ بڑے طیش کے عالم میں عارف سے مخاطب ہوئی۔ ’’یہ سب کیا ہو رہا ہے عارف؟ کیوں ہو رہا ہے؟ کیوں مجھے زندہ دفن کرنے پر تلے ہوئے ہو؟ کیوں ہم سب کو بے رحمی کی موت مارنا چاہتے ہو؟ میں نے کیا بگاڑا ہے تمہارا؟ کیوں اتنی بڑی سزا دے رہے ہو مجھے؟‘‘

وہ بھونچکا کھڑا تھا جیسے حیرت اور پریشانی کے سبب پتھرا گیا ہو۔ وہ آگے بڑھی اس نے عارف کے دونوں ہاتھ پکڑے اور اپنی بھیگی ہوئی شفاف گردن پر رکھ کر چلائی۔ ’’اس سے بہتر ہے کہ تم مجھے اپنے ہاتھوں سے مار دو۔ ابھی میری جان لے لو۔ میں تمہیں اپنا خون معاف کرتی ہوں۔‘‘

’’عاشرہ! خدا کے لیے مجھے بتاؤ، میں نے کیا کیا ہے؟‘‘ وہ کراہ کر بولا۔

’’جو کچھ کیا ہے تم نے ہی کیا ہے۔ تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ میری شادی رک گئی ہے۔ میں کسی طرف کی نہیں رہی۔ دونوں طرف سے خوار ہو گئی ہوں لیکن اگر تم سمجھتے ہو کہ میں واپس

تمہارے پاس پلٹ آؤں گی تو یہ تمہاری بھول ہے۔ میں مر جاؤں گی، زہر کھالوں گی اب اپنے ماں باپ کے لیے اور امتحان نہیں بنوں گی۔''

عارف نے عاجزی سے کہا۔''عاشرہ! مجھے تمہاری بات کی سمجھ نہیں آرہی۔ کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ تمہاری شادی کے رکنے کی وجہ میں ہوں؟ میں یہ کیسے کر سکتا ہوں عاشرہ؟ میری بھلا کیا حقیقت ہے شکیل کے سامنے اور داراب فیملی کے سامنے؟''

''لیکن میں جانتی ہوں جو کچھ ہوا ہے، تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ تمہارے اسی ہمدرد نے کیا ہے جو پورے شہر میں غنڈا گردی کرتا پھر رہا ہے۔ دہشت پھیلائی ہوئی ہے، بے گناہ لوگوں کو مار رہا ہے اور پولیس مقابلے کر رہا ہے۔ وہ تو یہ سب کچھ کر کے یہاں سے چلا جائے یا کتے کی موت مارا جائے گا اور ہم رہ جائیں گے اس کے کرتوتوں کی سزا بھگتنے کے لیے۔''

عارف نے بپھری ہوئی عاشرہ کو شانوں سے تھام کر بمشکل کرسی پر بٹھایا۔ عاشرہ کا دلکش سراپا ٹیوب لائٹ میں دمک رہا تھا۔ عارف بڑی لجاجت سے بولا۔''اگر تمہارے دل میں میرے لیے تھوڑی سی......تھوڑی سی بھی محبت باقی ہے تو میری بات پر یقین کر لینا۔ جو کچھ ہوا ہے اس میں میرا ذرا سا بھی عمل دخل نہیں ہے۔ جہاں تک تم شاہ زیب کی بات کر رہی ہو اس کے بارے میں تمہاری اطلاعات بالکل درست نہیں ہیں۔ وہ دہشت گرد نہیں ہے، نہ قاتل ہے۔ وہ تو تمہاری اور میری طرح ہی مظلوم ہے۔ اس کی بہن اس کی سگی چچی، شکیل اور قیصر چودھری کی درندگیوں کا شکار ہوئی ہیں۔ میں اپنی مری ماں کی قسم کھا کر تمہیں یقین دلاتا ہوں عاشرہ وہ میری اور تمہاری طرح ہی مظلوم ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ میری اور تمہاری طرح بے بس نہیں ہوا یا پھر شاید اس میں ہم دونوں سے زیادہ حوصلہ ہے۔ مجھے لگتا ہے، اس نے ہمت کر کے......شکیل کی کوئی دکھتی رگ پکڑ لی ہے بس یہی لگ رہا ہے مجھے۔''

اچانک عاشرہ نے اپنا ماتھا عارف کے شانے سے ٹیک دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔''خدا کے لیے عارف، مجھ میں اب اور ہمت نہیں۔ مجھے معاف کر دو۔ اب میرا خیال دل سے نکال دو۔ جو ہو رہا ہے اسے ہو جانے دو۔ میں اب تمہاری نہیں ہو سکتی......اور نہ اس قابل ہوں کہ تمہاری ہو سکوں......میں اب وہ نہیں رہی ہوں۔ بہتر یہی ہے کہ اب شکیل کی چادر ہی مجھ کو ڈھک لے......''

عارف نے بے ساختہ اس کے نم بالوں کو چوم لیا۔''ایسا نہ کہو عاشرہ......میں تمہاری ہر بات سن سکتا ہوں لیکن یہ نہیں۔''

دفعتاً عارف کے بھائی سلیم کے چلانے کی آواز سنائی دی پھر وہ زور سے بولا۔ کسی نے

گرج کر کچھ کہا اور دندناتا ہوا برآمدے تک آ گیا۔ ایک ساتھ کئی قدموں کی آواز آ رہی تھی۔ عاشرہ سہم کر دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ ہم دونوں بھی ٹھٹک گئے۔ دو ہٹے کٹے افراد بھیگے کپڑوں کے ساتھ دندناتے ہوئے اندر گھس آئے۔ ایک غیر معمولی بڑے چہرے والے شخص نے آتے ساتھ ہی عارف کو گریبان سے پکڑا اور دیوار سے دے مارا۔ عاشرہ چلائی اور دیوار کے ساتھ جا لگی۔ آنے والے شخص کے ہاتھ میں پستول صاف نظر آ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ عارف کو الٹے ہاتھ کا تھپڑ مارتا، میں دروازہ کھول کر اندر آ چکا تھا۔ میں نے اس کی کلائی تھام لی۔ اس کے ساتھی نے بھنا کر میرے چہرے پر مکا رسید کرنا چاہا لیکن یہ اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ میں نے جھک کر یہ وار بچایا اور پھر پستول والے کے ہاتھ پر ٹانگ کی جچی تلی ضرب لگائی۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر چھت سے ٹکرایا اور صوفوں کے عقب میں جا گرا۔

یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ دونوں افراد کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ اسی دوران میں میری کہنی کی کاری ضرب نے دوسرے شخص کے جبڑے کا کڑا نکال دیا اور وہ الٹ کر شیشے کی گول تپائی کو چکنا چور کر گیا۔ یہی وقت تھا جب ایک تیسرا شخص عقب سے نمودار ہوا اور اس نے میرے سر کے پچھلے حصے سے پستول کی نال لگا دی۔

''خبردار!'' وہ گرجا۔

مگر تب تک میں اپنا پستول نکال چکا تھا اور اسے اپنے سامنے والے کی کنپٹی پر رکھ چکا تھا اور میرے اندازے کے مطابق یہی بڑے چہرے والا شخص ان کا سرغنہ تھا۔

اب یہ برابر کی چوٹ تھی۔ اگر وہ شخص مجھ پر فائر کرتا تو میں اس کے باس پر فائر کر دیتا۔ جس طرح اس نے انگلی ٹریگر سر پر رکھی ہوئی تھی۔ میں نے بھی رکھی ہوئی تھی کمرے میں شدید تناؤ کی کیفیت تھی۔ عارف کے چھوٹے بھائی کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا اسے کوریڈور کی طرف ایک شخص نے گن پوائنٹ پر رکھا ہوا تھا۔ کمرے میں سچویشن کچھ ایسی تھی کہ ایک ذرا سی غلطی یہاں کی دیواروں کو خون سے رنگین کر سکتی تھی۔ میں ایسی سچویشنز سے پہلے بھی گزر چکا تھا۔ یہ شدید تناؤ میرے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ میں نے سرغنہ سے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ تم شکیل کے پالتو ہو اور اس کے حکم پر حاجی صاحب کی بیٹی کے پیچھے لگے ہوئے ہو؟''

وہ پھنکارا۔ ''زبان سنبھال کر بات کرو۔ یہاں لاشیں گر جائیں گی ابھی اور لوگ بھی پیچھے آ رہے ہیں۔''

عاشرہ کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ سنگین صورتِ حال کے ساتھ ساتھ اسے میری آمد نے

بھی بھونچکا کر دیا تھا۔
میں نے کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ میں جان گیا تھا اور لوگوں والی بات صرف دھمکی ہے شاید ایک یا دو بندے یہاں اور موجود تھے۔
میں نے سرغنہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''لگتا ہے ابھی تمہیں تازہ صورتِ حال کی خبر نہیں۔ اسی لیے بی بی کے پیچھے کتے کی طرح گھوم رہے ہو۔ فون لگاؤ اپنے بڑے صاحب کو اگر لگا سکتے ہو تو۔''
''میں کہتا ہوں اپنی زبان سنبھالو۔'' وہ پھر لال پیلا ہونے لگا۔
میں نے بائیں ہاتھ سے اپنی جیکٹ کی جیب سے سیل فون نکالا اور ایک ہی ہاتھ سے نمبر پریس کیا۔ یہ ڈائریکٹ اس شخص کا نمبر تھا جو علاقے کا غیر اعلانیہ کرتا دھرتا تھا چند سیکنڈ بعد اس کی آواز اسپیکر پر ابھری۔ ''ہیلو شکیل اسپیکنگ۔''
''گڈ ایوننگ، آپ کا خادم شاہ زیب عرض کر رہا ہوں۔''
ایک توقف کے بعد شکیل نے اپنی پاٹ دار آواز میں کہا۔ ''ہاں شاہ زیب کہو کیا بات ہے؟''
''آپ کے تین چار ملازم جو شاید پچھلے چوبیس گھنٹے سے بھنگ پی کر سوئے ہوئے تھے۔ مس عاشرہ کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں جوہر ٹاؤن پہنچے ہیں۔ دھمکیاں دے رہے ہیں۔''
ایک بار پھر فون لائن پر سناٹا چھا گیا۔ یوں لگا جیسے وہ فون بند کر دیا گیا ہو لیکن میں جانتا تھا، وہ فون بند نہیں کر سکتا۔ آخر اس کی آواز ابھری۔ ''شاید غلط فہمی ہوئی ہے۔ اگر وہ پاس ہی ہیں تو ان میں سے کسی کو فون دو۔''
میں نے سیل فون بڑے تھوبڑے والے سرغنہ کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے فون سنا اور یس سر...... یس سر کی گردان کرتا چلا گیا۔ شاید وہ میرے پستول سے اتنا خوف زدہ نہیں تھا جتنا اس فون سے ہوا تھا۔
چند سیکنڈ بعد اس نے فون بڑے ادب سے میری طرف بڑھا دیا اور ساتھ ہی اپنے ساتھی کو اشارہ کیا کہ وہ پستول نیچے کرے۔ میں نے فون سنا۔ شکیل نے کہا۔ ''تمہیں پریشانی ہوئی اس کا افسوس ہے۔ تم نے اچھا کیا، کال کر لی۔ اِٹ اِز آل او کے۔''
''تھینکس۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔
''معافی چاہتے ہیں جی۔ یہ سب غلط فہمی سے ہوا۔ ویری سوری۔'' سرغنہ نے مجھ سے

نظر ملائے بغیر سر جھکا کر کہا۔

عاشرہ اور عارف حیرت سے بت بنے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اس بڑے تھوبڑے والے شخص کو شکیل داراب کے کارندے کی حیثیت سے جانتے ہیں اور اس کے دبدبے اور جارحیت سے بھی آگاہ ہیں۔ اس نے جس طرح کال سننے کے بعد سلنڈر کیا تھا، وہ ان دونوں کے لیے تعجب خیز تھا۔

باہر والے شخص نے بھی عارف کے بھائی کو چھوڑ دیا تھا۔ اس کے ماتھے پر چوٹ لگی تھی۔ گومڑ بن گیا تھا اور خون رِس رہا تھا۔ اسے گن پوائنٹ پر رکھنے والا شخص بھی اب شرمسار نظر آ رہا تھا۔

سرغنہ نے ایک بار پھر گردن کو خم کر دیا۔ ''سوری سر جی، جو کچھ ہوا غلط فہمی سے ہوا۔ اب بڑے صاحب نے آپ کا تعارف کروا دیا ہے۔ اب آئندہ کوئی گستاخی نہیں ہوگی۔''

میں نے کہا۔ ''آئندہ کی بات تو آئندہ دیکھی جائے گی لیکن جو گستاخی اس بچے کے ماتھے پر لگی ہے اس کا حساب تو ابھی دینا پڑے گا۔'' میں نے نوعمر سلیم کے ماتھے کے زخم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''جی، میں سمجھا نہیں۔'' سرغنہ نے بڑی بھاری آواز میں کہا۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتا، میں نے پستول کا دستا گھما کر اس کی پیشانی پر مارا۔ وہ لڑکھڑا کر دو قدم پیچھے گیا۔ ایک لحظے کے لیے لگا کہ وہ آگ بگولہ ہو کر مجھ پر پل پڑے گا اس کے ساتھی بھی یکا یک تن سے گئے مگر پھر سرغنہ نے خود کو سنبھالا۔ اس کے گلے کی پھولی ہوئی رگیں ڈھیلی پڑ گئیں۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے ساتھیوں کو ٹھنڈا رہنے کی ہدایت کی۔

''حساب برابر کرنا ضرور ہوتا ہے برادر...... پھر ہی آگے چلا جا سکتا ہے۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔ ''ناؤ یو کین گو۔'' عارف، عاشرہ اور سلیم حیرت زدہ کھڑے تھے۔ میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ عاشرہ کی خوب صورت آنکھوں میں جما ہوا خوف پگھل رہا ہے۔

O......❖......O

وہ مجھے ایسے دیکھ رہی تھی جیسے کوئی عجوبہ دیکھا ہو۔ شاید اس کے لیے یہ بات قابلِ یقین نہیں تھی کہ شکیل داراب جیسے شخص کے کارندے کو کوئی اس طرح لتاڑ سکتا ہے اور زخمی کر سکتا ہے۔

زخمی ہونے کے بعد سرغنہ نے اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ یقیناً اس کے ماتھے پر ویسا

ہی نیلگوں گومڑ نمودار ہو چکا تھا جیسا عارف کے چھوٹے بھائی سلیم کے ماتھے پر دکھائی دے رہا تھا۔ سرغنہ نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے ساتھیوں کو پیچھے آنے کا کہا۔ دُم دبا کر نکل جانے والا محاورہ ان پر بالکل صادق آرہا تھا۔ جس شخص کے جبڑے پر میری کہنی کی ضرب لگی تھی وہ بھی اپنا منہ دبائے ہوئے تھا۔ چہرے پر اذیت کے آثار تھے۔ میں نے سلیم کے ماتھے کو اپنے رومال سے صاف کیا اور اسے کہا کہ وہ چوٹ کو صاف پانی سے دھو لے۔

عاشرہ نے اشک بار آواز میں مجھے مخاطب کیا اور بولی۔ ''تم...... میرا مطلب ہے آپ یہاں کیسے پہنچے؟''

''میں عارف کا دوست ہوں اور مصیبت کے موقعے پر دوست مدد کو پہنچ ہی جایا کرتے ہیں۔ اس کے ایکسیڈنٹ کے وقت بھی تو میں پہنچ ہی گیا تھا نا۔''

''مجھے ایسا لگتا ہے آپ کی وجہ سے ہم سب بری طرح پھنسنے والے ہیں۔'' عاشرہ نے کانپتی آواز میں کہا۔

''اور میرا خیال ہے کہ میری وجہ سے ان شاء اللہ آپ کے ساتھ بہت کچھ اچھا ہونے والا ہے۔'' اس کے ساتھ ہی میں نے عارف کو اشارہ کیا کہ وہ عاشرہ کے ساتھ بات چیت کرے۔ خود میں کمرے سے باہر آگیا اور سلیم سے گفتگو شروع کر دی۔

عارف اور عاشرہ کی بات چیت قریباً ایک گھنٹا جاری رہی۔ اس کے بعد عاشرہ تیزی سے نکلی اور اپنی کار میں بیٹھ کر چلی گئی۔ یہ قریباً دس بجے کا وقت تھا۔

بارش تھم چکی تھی۔ عاشرہ کے جانے کے بعد میں پھر عارف کے پاس آ بیٹھا۔ اب عارف کے چہرے پر زندگی کی ہلکی سی چمک نظر آتی تھی۔ بہر حال مجموعی طور پر وہ غم زدہ ہی تھا۔ اس نے سلیم کو چائے اور بسکٹ وغیرہ لانے کا کہا پھر بولا۔ ''شاہ زیب بھائی! یہ سب کچھ اتنا حیران کرنے والا ہے کہ ابھی تک مجھے پوری طرح یقین نہیں آیا، عاشرہ کو کیسے آئے گا۔ بہر حال یہ بات تو وہ سمجھ گئی ہے کہ اب اسے شکیل کی طرف سے کوئی فوری خطرہ نہیں اور شاید یہ امید بھی اسے پیدا ہو گئی ہے کہ وہ اپنے والد نذیر صاحب کو علاج کے لیے پاکستان سے باہر لے جا سکے گی۔''

''چلو یہی بڑی بات ہے۔'' میں نے کہا۔

''لیکن یہ سب کیسے ہوا ہے، یہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ میرا مطلب ہے کہ شکیل جیسے بندے کا ایک دم پیچھے ہٹ جانا۔''

میں نے کہا۔ ''میرے خیال میں پیڑ گننا اتنا ضروری نہیں ہوتا اصل چیز تو پھل ہوتی

ہے۔"

"وہ اب بھی بڑی مایوسی والی باتیں کر رہی ہے۔ اپنی زندگی کو اپنے اوپر ایک بہت بڑا بوجھ سمجھ رہی ہے اور اس کی وجہ وہی ہے جو تم جانتے ہو۔ اس کتے نے عاشرہ کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ کاش میرے بس میں ہو تو اس کی منحوس کھوپڑی میں پوری چھ گولیاں ڈال دوں۔"

"اور پھر خود بھی شکیل کے بندوں کے ہاتھوں مارا جاؤں۔" میں نے اس کا فقرہ مکمل کرتے ہوئے کہا۔ "اس کے بعد داراب فیملی تمہارے وارثوں کو تھانے کچہریوں میں گھسیٹتی پھرے اور انہیں زندہ درگور کر دے۔ خدا کے لیے عارف، خدا کے لیے...... سمجھ بوجھ سے کام لو۔ اللہ نے تمہیں نئی زندگی دی ہے۔ اب وہی تمہارے لیے خوشیوں کے راستے بھی کھول رہا ہے۔ تم نے خود کہا ہے کہ جو کچھ عاشرہ کے ساتھ ہو چکا ہے تم اسے ایک حادثہ سمجھ کر بھول جانا چاہتے ہو۔ وہ تمہارے لیے اب بھی پہلے والی عاشرہ ہے۔ پاک دامن اور صاف شفاف۔ تم یہی بات اس کو کیوں نہیں بتاتے؟ کیوں اسے نئی زندگی کے لیے قائل نہیں کر رہے؟"

"میں نے قائل کرنے کی پوری کوشش کی ہے شاہ زیب اور مزید بھی کروں گا مگر اس کی سوچ کسی اور طرف جا رہی ہے۔"

"کس طرف؟" میں نے پوچھا۔

"میں اب تمہیں کیا بتاؤں شاہ زیب، وہ اس سارے معاملے کو بالکل اور طرح لے رہی ہے۔ مجھے لگ رہا ہے کہ اس خبیث نے اس کے ساتھ جو سلوک کیا ہے وہ اس کو اندر سے بری طرح زخمی کر گیا ہے۔ کسی وقت نفسیاتی مریضوں جیسی باتیں کرنے لگتی ہے۔"

"مثلاً کیا کہہ رہی تھی؟"

عارف بولا۔ "میں نے اس سے کہا عاشرہ، یہ زندگی بڑی کڑوی ہے اور کبھی کبھی بہت بدصورت بھی ہو جاتی ہے۔ میں سب کچھ جانتا ہوں۔ شکیل نے تمہیں مجبور کر کے، تمہارے ساتھ جسمانی تعلق بنایا اور اس طرح کے معاملے ہو جاتے ہیں کیونکہ عورت کمزور ہے، طاقت کے نشے میں مرد اسے زیر کر لیتے ہیں اور مجبور کر دیتے ہیں لیکن ایسے میں عورت کا کوئی قصور نہیں ہوتا۔ بے شک اس کے جسم سے بدسلوکی ہو جاتی ہے لیکن اس کا اندر اس کا اپنا آپ تو اسی طرح پاک صاف رہتا ہے۔ اس میں کوئی شک کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ میری بات کے جواب میں وہ عجیب انداز سے بولی۔

''تم اور بات کر رہے ہو عارف تم جو کچھ کہہ رہے ہو اسے مجرمانہ حملہ کہا جاتا ہے ریپ کہا جاتا ہے لیکن میں تو...... اس کی کوٹھی سے باہر نکل آئی تھی پھر اپنے قدموں سے چل کر واپس گئی۔''

عارف چپ ہو گیا تو میں نے گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔''عاشرہ کی اس دلیل میں کوئی وزن نہیں ہے۔ بات تو عورت کی مجبوری اور بے بسی کی ہوتی ہے چاہے عملی طور پر اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے جائیں، چاہے ایسے حالات پیدا کر دیئے جائیں کہ وہ بے بس ہو جائے اور اس کمینے چھوٹے داراب نے ایسے حالات پیدا کر دیئے تھے۔''

''میں اسے یہی سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اللہ کرے وہ سمجھ جائے لیکن ایک بات کا پتا مجھے بڑی اچھی طرح چل رہا ہے شاہ زیب بھائی۔''

''وہ کیا؟''

''اب میں اس شہر میں نہیں رہ سکتا اگر رہوں گا تو شکیل کسی نہ کسی طریقے سے مجھے قبر میں اتار دے گا۔''

''تو تمہیں کون کہتا ہے یہاں رہنے کے لیے۔ حاجی نذیر علاج کے لیے باہر جائیں گے اور جہاں تک میرا اندازہ ہے عاشرہ اور اس کی والدہ بھی جائیں اسی طرح تم بھی باہر نکل سکتے ہو۔ میں اس سلسلے میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ وہیں پر عاشرہ سے تمہارا نکاح بھی ہو سکتا ہے۔''

میں اور عارف تادیر باتیں کرتے رہے۔ وہ عجیب کشمکش میں تھا۔ جیسے کسی برفیلے پانی میں ڈوب کر ابھر رہا ہو۔ بہر حال میں جانتا تھا میں نے اس کی راکھ میں وہ چنگاریاں جگا دی ہیں جو کل شعلے بن جائیں گی اور شاید ایسی ہی ایک دو چنگاریاں عاشرہ کی بجھی ہوئی راکھ میں بھی پیدا ہو چکی تھیں۔ آج یہاں جو کچھ اس کی نگاہوں کے سامنے شکیل کے خاص غنڈوں کے ساتھ ہوا تھا وہ اس کے لیے بے حد حیرت انگیز اور حوصلہ افزا تھا۔

عارف نے ایک بار پھر مجھے کریدنے کی کوشش کی۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ میرے ہاتھ وہ کون سا بٹن آیا ہے جس کی مدد سے میں شکیل جیسے دبنگ شخص کو کنٹرول کرنے میں کامیاب ہو رہا ہوں۔ میں نے کہا۔

''عارف! معاف کرنا یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ میں اس پر ڈسکس کرنا پسند نہیں کروں گا۔''

○......❖......○

اگلے ایک مہینے میں بڑی تیزی سے کئی طرح کی پیش رفت ہوئی۔ عاشرہ اور اس کی والدہ حاجی نذیر کو لے کر لندن چلی گئیں۔ وہاں ان کی بائی پاس سرجری ہونا تھی۔ میں نے عارف کو باہر بھیجنے کا انتظام بھی کر دیا۔ عارف کے والدین تو حیات تھے لیکن وہ اس کے دو بڑے بھائیوں کے پاس تھے اور یہ دونوں بھائی والدین کو عارف سے کم ہی ملنے دیتے تھے۔ عارف کے کاغذات بنوانے کے ساتھ ساتھ میں اپنے سفری کاغذات بھی تیار کروا رہا تھا۔ میرے پہلے کاغذات میرے پاسپورٹ سمیت حویلی کی آتشزدگی میں ضائع ہو گئے تھے۔

چچا حفیظ اسپتال میں تھے اور ان کی حالت اب قدرے بہتر تھی۔ وہ چاہتے تو میں انہیں بھی باہر بھیجنے کا انتظام کر سکتا تھا۔ شکیل داراب اس سلسلے میں بھی ضرور میری مدد کرتا۔ وہ تو چاہتا ہی یہی تھا کہ ہم یہاں سے نکل جائیں لیکن چچا کسی صورت بھی اپنی مٹی اور اپنے بڑوں کی قبریں چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کا جینا مرنا یہیں ہے۔ ویسے بھی ان کا اکلوتا بیٹا ولید جیل میں تھا۔ وہ اسے تنہا نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ میں نے ولید کے کیس کی پیروی کے لیے ایک بڑا وکیل کر لیا تھا۔ دوسری طرف شکیل داراب نے بھی پس پردہ مجھے یقین دلایا تھا کہ ولید کو انصاف کے حصول میں مدد کی جائے گی (دوسرے لفظوں میں انصاف کے حصول میں رکاوٹیں نہیں ڈالی جائیں گی) ان سارے کاموں کے ساتھ ساتھ میں ایک اور کام بھی کر رہا تھا اور وہ کام تھا اس چہرے کی تلاش کا جو میری نگاہوں میں بسا ہوا تھا اور میرے سینے میں ایک داغ کی طرح جلتا تھا۔ یہ اس کا چہرہ تھا جس کا نام بھی میں نہیں جانتا تھا۔ جس کی ذات مجھے معلوم نہیں تھی، جس کا پتا ٹھکانا میرے علم میں نہیں تھا۔ جس طرح خلا کی بیکراں وسعتوں میں دو ستارے ہزاروں نوری سال تک سفر کرنے کے بعد اچانک ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں اور پھر بچھڑ جاتے ہیں وہ بھی میرے قریب آیا تھا۔ اس نے کچھ وقت میرے ساتھ گزارا تھا اور پھر اپنے مدار پر چلتا ہوا کہیں کھو گیا تھا۔ اس نے الوداع نہیں کہا تھا کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔ یہاں تک کہ مڑ کر بھی نہیں دیکھا تھا پھر بھی ایک نادیدہ ڈور تھی جو اس کے ساتھ ساتھ چلتی چلی گئی تھی۔ شاید اس ڈور کا ایک سرا مجھ سے بندھا ہوا تھا۔ اب یہ ڈور مجھے کھینچتی تھی۔ یہ حرکت کرتی تھی اور ڈوریں تب ہی حرکت کرتی ہیں جب ان کے دوسری طرف کوئی موجود ہوتا ہے۔

کئی ہفتوں تک میں نے اس ڈور کا دوسرا سرا ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی۔ میں نے بھاؤ کی مدد لی۔ انیق کی مدد لی، عارف سے بھی بات کر کے دیکھی لیکن مسئلہ یہی تھا کہ میرے پاس اس کا کوئی سراغ نہیں تھا۔ بس ایک فون نمبر تھا جو غلط ثابت ہو چکا تھا۔

ایک دن جب میں اسنوکر کلب کے نیچے داؤد بھاؤ کے زیرِ زمین ٹھکانے پر موجود تھا۔ بھاؤ نے ایک سابق پولیس والے کو وہاں بلالیا۔ الیاس نامی یہ شخص اسپیشل پولیس میں کام کرتا رہا تھا اور اس شعبے میں تھا جہاں ملزموں کے خاکے وغیرہ بنائے جاتے ہیں۔ بھاؤ نے مجھ سے کہا۔ ''یار یہ بڑا کا نٹا فن کار ہے۔ تم اس لڑکی کا حلیہ بتاتے جاؤ یہ اس کی تصویر بنا کے دے دے گا۔ تصویر بن جائے تو بندے یا بندی کو ڈھونڈنا آسان ہو جائے گا۔''

میرا دل تو نہیں چاہ رہا تھا کہ میں اس چہرے کا خاکہ بنواؤں جس سے میں پرستش کی حد تک محبت کرنے لگا تھا مگر پھر اس امید پر کہ شاید اس سے کچھ مدد مل جائے میں تیار ہو گیا۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کیں اور اس کے تصور کو ذہن میں اجاگر کیا۔ وہ ایک دم ابھر کر میرے سامنے آ گئی۔ بالکل جیسے میرے سامنے کھڑی ہو۔ چہرے کا ہر نقش واضح ہو گیا۔ پیشانی دمکنے لگی۔ اس نے اپنے طریقہ کار کے مطابق سب سے پہلے کمپیوٹر پر آنکھیں اور ناک دکھانا شروع کیں۔ میں نے کہا۔ ''نہیں...... مجھے سب سے پہلے پیشانیاں دکھاؤ۔'' پتا نہیں کیوں میں جب بھی اس کا تصور ذہن میں لاتا تھا سب سے پہلے پیشانی ہی ابھر کر سامنے آتی تھی اور اس کے ساتھ ہی شہد رنگ بالوں کی دو لٹیں جو خم کھا کر اس کے رخسار یا ناک کو چھوتی رہتی تھیں۔ پتا نہیں کہ وہ انہیں جان کر نہیں ہٹاتی تھی یا پھر ہٹانا بھول جاتی تھی۔

میں اس کا تقریباً دو تہائی چہرہ بنوا چکا تھا جب میرا ذہن ایک دم صاف ہو گیا۔ اس کا چہرہ میرے تصور کے پردے سے یوں غائب ہوا جیسے کبھی تھا ہی نہیں۔ میں نے بہت کوشش کی لیکن دوبارہ اس کے تصور کو مجسم نہ کر سکا۔ الیاس پریشانی کے عالم میں میری طرف دیکھتا رہا۔ کافی دیر کوشش کرنے کے بعد میں نے کہا۔ ''نہیں بھئی! ابھی نہیں...... ابھی کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا۔''

وہ اپنے طور پر کوشش کرنے لگا۔ اس نے کمپیوٹر سافٹ ویئر کے ذریعے سیکڑوں ناک، ہونٹ اور ٹھوڑیاں لا کر ادھورے چہرے پر سجائیں لیکن کوئی بات نہیں بن سکی۔

تھک ہار کر وہ چلا گیا۔ میں حیران تھا کہ وہ چہرہ ایک دم اوجھل کیوں ہو گیا ہے۔ الیاس کے جانے کے بعد مجھے انیق کی زبانی یہ بھی پتا چلا کہ الیاس کمپیوٹر خاکے بنانے میں ماہر ضرور ہے لیکن یہ کوئی کوالیفائڈ بندہ نہیں۔ اس نے بس یونہی اِدھر اُدھر سے کام سیکھ کر پولیس میں نوکری کر لی تھی۔ بعد میں اس کی جعلی ڈگری کا بھید کھلا تو اسے فارغ کر دیا گیا۔

میں نے پاکستان آنے کے بعد محسوس کیا تھا کہ الیاس جیسے ناتجربہ کار اور جعلی ماسٹر تقریباً ہر شعبے میں موجود ہیں۔ لوگ بتاتے کچھ تھے اور اصل میں ہوتے کچھ اور تھے۔ چند ہفتے پہلے

میں نے رانا رفیق نامی جس بندے کی ملازمت ختم کروائی تھی وہ بھی فراڈیا ہی نکلا تھا۔ اس کے پاس ایف اے کی جعلی سند تھی اور وہ شکیل داراب جیسے نامی گرامی شخص کے پرسنل سیکرٹری کا اسسٹنٹ بن کر لوگوں پر رعب گانٹھ رہا تھا۔

درحقیقت پچھلے ڈیڑھ دو مہینے میں مجھے اپنے اردگرد کے ماحول اور حالات نے سخت مایوس کیا تھا۔ وطن لوٹ کر اپنی مٹی میں بسنے اور اپنی ہواؤں میں سانس لینے کی ساری آرزوئیں بری طرح مجروح ہوئی تھیں۔ وہ سارے سپنے بکھر گئے تھے جو میں نے مدتوں سے آنکھوں میں سجا رکھے تھے۔ یہ میرا محبوب شہر لاہور تھا لیکن اب یہاں میرا دم گھٹنے لگا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ یہاں کے گلی کوچوں میں انسان نہیں روبوٹ چل رہے ہیں۔ یہاں کی فضاؤں میں منافقت اور جھوٹ کی گرد اڑتی محسوس ہوتی تھی۔ یہاں کے سبزہ زاروں اور تفریح گاہوں میں بے چینی اور خوف کے سائے رینگتے تھے۔ محسوس ہوتا تھا کہ اچھے اور سچے لوگ کونے کھدروں میں دبک چکے ہیں اور کرپشن کے دیو برہنہ ہو کر ہر جگہ رقص کر رہے ہیں اور شاید یہ صرف ایک لاہور ہی کی بات نہیں تھی اس وطن عزیز کے سارے گلی کوچے اسی صورتِ حال کا شکار دکھائی دیتے تھے۔

یہ وہ دیس تو نہیں تھا جو میرے سہانے سپنوں میں آتا تھا جو میری رُوح میں جگمگاتا تھا۔ یہ تو ایک ایسی اندھیر نگری تھی جس میں قدم رکھتے ہی مجھ پر ایک دلخراش سانحہ گزر گیا تھا۔ میں نے اپنی چچی اور اپنی سگی بہن جیسی چچا زاد کی اذیت ناک موت دیکھی تھی۔ میں اس چچا زاد بہن کی شادی کی خوشیاں دیکھنے کے لیے بڑے ارمانوں سے یہاں پہنچا تھا مگر سارے ارمان آگ اور خون میں لتھڑ گئے تھے۔ دلہن قبرستان کی مکین ہو گئی تھی۔

بے شک میں نے چچی اور فائزہ کی موت کا بدلہ لیا تھا۔ میں نے کسی ہرکارے یا کارندے کو نہیں مارا تھا بلکہ اصل کرتا دھرتا اور اس کے رائٹ ہینڈ کو ٹارگٹ کیا تھا۔ لالہ نظام منوں مٹی کے نیچے پہنچ چکا تھا اور اس کا دست راست قیصر چوہدری ہڈیاں تڑوا کر اسپتال میں پڑا تھا۔ میں اس بدلے کو مزید آگے بھی چلا سکتا تھا مگر مجھے ان لوگوں کے بارے میں بھی سوچنا تھا جو اس انتقامی سلسلے سے متاثر ہو سکتے تھے۔

چند دن پہلے تو میرا دل چاہا تھا کہ جونہی عارف پاکستان سے روانہ ہو میں بھی یہاں سے نکل جاؤں لیکن بات پھر وہیں دل کے معاملے پر آ جاتی تھی۔ میں پاکستان آیا تھا کسی کو ڈھونڈنے کے لیے۔ کسی کے ساتھ زندگی کا نیا سفر شروع کرنے کا انوکھا سپنا لے کر۔ تو کیا اسے ڈھونڈے بغیر ہی واپس چلا جاؤں؟

اس سوال کا جواب میرے اندر سے یہی ابھرا تھا کہ نہیں...... ابھی مجھے تھوڑی کوشش اور کرنی چاہیے۔ لاہور کے گلی کوچوں کی کچھ اور خاک چھان لینی چاہیے، کچھ اور دروازوں پر دستک، کچھ اور دوپہروں کی آوارہ گردی، کچھ اور شاموں میں آبلہ پائی۔

اکثر انیق میرے ساتھ ہوتا تھا۔ میرے پاس ہیلمٹ کا نقاب موجود تھا۔ ہم دونوں موٹر سائیکل بھی بدلتے رہتے تھے اور ہیلمٹ بھی۔ میں اکثر ان جگہوں پر گھومتا تھا جہاں اس سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ میری نگاہیں ہر اس مقام پر بھٹکتی تھیں جہاں اس نے میرے قدموں سے قدم ملائے تھے لیکن وہ کہیں نہیں تھی۔ کہیں بھی نہیں۔ کسی وقت مجھے لگتا تھا کہ شاید وہ صرف ایک خیال ہی تھی یا جاگتی آنکھوں کا خواب لیکن یہ تو ایک شاعرانہ سی بات تھی۔ حقیقت یہی تھی کہ ہم ملے تھے، ہم نے باتیں کی تھیں، ہم نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکا تھا اور چند ساعتوں کے لیے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوئے تھے مگر اصل بات تو تلاش کی تھی اور کسی نام پتے اور ٹھکانے کے بغیر اسے تلاش کرنا ایسے ہی تھا جیسے بھوسے کے ڈھیر میں سے سوئی ڈھونڈنا۔

○......❖......○

ایک چاندنی رات میں، میں اکیلا ہی موٹر بائیک پر نکلا اور نہر کے کنارے ان درختوں کے درمیان جا بیٹھا جہاں ہم نے گھاس پر کپڑا بچھا کر اور درختوں سے ٹیک لگا کر کچھ دیر گپ شپ کی تھی۔ نہر کنارے سردی اور بھی زیادہ ہوتی ہے مگر میں وہاں بیٹھا رہا۔ پانی میں چاند کا جھلملاتا عکس دیکھتا رہا اور اسے یاد کرتا رہا۔ دل میں خیال آیا، کتنا اچھا ہو وہ بھی مجھے ڈھونڈتی ہوئی اس طرف آ نکلے۔ ہم ایک دوسرے کی طرف حیران نظروں سے دیکھیں پھر وہ شرمائے اور اس کی آنکھوں میں ہزار ہا ستارے جگمگا اٹھیں لیکن ایسے کرشمے حقیقت میں کم کم ہی ہوتے ہیں اور سیانے یہ بھی کہہ گئے ہیں کہ آسیں شاذ و نادر ہی پوری ہوتی ہیں۔

مجھے اس سے اپنی وہ دونوں ملاقاتیں یاد آئیں جو ایک دن کے وقفے سے ہوئی تھیں۔ یہی دو ملاقاتیں میری یادوں کا سرمایہ تھیں۔ آنکھوں کے سامنے ایک فلم سی چلنے لگی۔

جیسا کہ میں نے بتایا ہے، یہ قریباً ساڑھے تین برس پہلے کی بات تھی، میں ڈنمارک سے پاکستان آیا تھا۔ میری والدہ بھی ساتھ تھیں۔ یہاں ہم نے صرف تین دن ٹھہرنا تھا اور ایک شادی میں شرکت کرنا تھی۔ میں سیلانی روح تھا۔ دوپہر کے وقت اکیلا ہی اپنے کزن کی گاڑی لے کر نکل کھڑا ہوا۔ یونہی شہر میں گھومنے کو دل چاہ رہا تھا۔ وہ دسمبر کے یخ بستہ دن تھے۔ میں قلعہ لاہور کی طرف نکل گیا۔ ان دنوں میرے بال بہت لمبے تھے اور گھنی داڑھی بھی

تھی۔ کئی لوگ مڑ مڑ کر مجھے دیکھ رہے تھے۔ قلعہ لاہور میں داخل ہو کر میں ابھی تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ میری نظر ایک لڑکی پر پڑی۔ وہ چادر میں سمٹی سمٹائی سیدھی میری ہی طرف آرہی تھی۔ مجھے لگا کہ وہ کافی ڈری ہوئی ہے۔ اس کے ڈر کی وجہ بھی فوراً ہی میری سمجھ میں آگئی۔ تین چار اوباش لڑکے اس کے پیچھے تھے۔

وہ ایک ورکنگ ڈے تھا۔ قلعہ میں بہت کم لوگ دکھائی دیتے تھے۔ حسبِ اندیشہ لڑکی سیدھی میرے پاس آئی اور کانپتی آواز میں بولی۔ ''میری مدد کریں...... یہ لڑکے......''

وہ میرے پہلو میں کھڑی ہوگئی اور لڑکوں کی طرف دیکھنے لگی۔ میں نے لڑکوں کو گھورا۔ میرا تن وتوش اور اعتماد دیکھ کر لڑکے وہیں ٹھٹک گئے۔ انہوں نے آگے بڑھنے کی حماقت نہیں کی۔ نہ ہی کسی نے کوئی شرارت وغیرہ کی اور یہ ان کے حق میں اچھا ہی ہوا کیونکہ اگر وہ مزید پیش رفت کرتے اور بات بڑھ کر ہاتھا پائی تک پہنچ جاتی تو ان کے لیے بہت برا ہوتا (میں اس وقت تک مارشل آرٹ کی فیلڈ میں داخل ہو چکا تھا اور ڈنمارک کے دو چار چوٹی کے کھلاڑیوں میں تھا)

لڑکے دائیں بائیں ہوگئے۔ لڑکی منمنائی۔ ''آپ شریف آدمی لگتے ہیں۔ پلیز میری مدد کریں۔ میں یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔''

مجھے اندازہ ہوا کہ لڑکوں کے کچھ ساتھی اور بھی ہیں اور وہ آس پاس موجود ہیں۔ میں کسی طرح کی پھڈے بازی افورڈ نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے لڑکی کو ساتھ لیا اور باہر آگیا۔ ''کیا آپ میرے ساتھ گاڑی میں جانا پسند کریں گی؟''

اس نے ایک بار پھر دھیان سے میری طرف دیکھا پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ ایک دلکش لڑکی تھی۔ شدید نروس ہونے کے باوجود اگر وہ دلکش نظر آرہی تھی تو پھر یقیناً اس میں کوئی بات تھی۔ اس کے شہد رنگ بال بالکل سیدھے تھے اور بالوں کی کچھ لٹیں چہرے پر جھول رہی تھیں۔

وہ گاڑی میں میرے ساتھ اگلی نشست کے بجائے پچھلی نشست پر بیٹھی۔ میں جز بز تو ہوا لیکن پھر میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ ''آپ نے کہاں جانا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''مم...... مجھے نہیں پتا۔ فی الحال آپ یہاں سے نکلیں۔'' اس نے کہا۔

اس کا لہجہ بالکل سادہ تھا۔ زیادہ پڑھی لکھی بھی نہیں لگتی تھی مگر صورت کی طرح اس کی آواز اور بات کرنے کا انداز بھی دلنشین تھا۔ میں نے گاڑی آگے بڑھادی۔ یہ ٹویوٹا تھی۔

رائٹ ہینڈ ڈرائیو تھی جبکہ میں ڈنمارک میں لیفٹ ہینڈ چلاتا رہا تھا۔ یہاں کی ٹریفک بھی سمجھ سے بالاتر تھی۔ تیسری بات یہ کہ مجھے راستوں کا بھی کچھ زیادہ علم نہیں تھا۔ اپنے کزن سے پوچھ پاچھ کر میں نے صرف بادشاہی مسجد، شاہی قلعہ اور مینار پاکستان وغیرہ کی لوکیشن معلوم کی تھی اور یہ تینوں جگہیں پاس پاس ہی تھیں۔ اب یہ لڑکی پتا نہیں مجھے کہاں لے جانا چاہتی تھی۔ ذہن میں یہ خیال بھی آیا کہ کہیں یہ کوئی ڈراما ہی نہ ہو جو مجھے کسی مشکل میں ڈال دے۔

میں نے کہا۔ ''مس، میں اس شہر کا نہیں ہوں۔ مجھے بتائیں آپ نے کہاں اترنا ہے۔''

''ابھی آپ سیدھے ہی چلتے جائیں۔'' وہ کانپتی آواز میں بولی۔

پتا نہیں کیوں اس کا لب ولہجہ مجھے یہ یقین دلا رہا تھا کہ وہ انتہائی سادہ اور سچی لڑکی ہے۔ مجھ سے کوئی ناٹک نہیں کر سکتی۔

وہ جیسے خود بھی اس شہر کے بارے میں زیادہ اچھی طرح نہیں جانتی تھی۔ مسلسل دائیں بائیں دیکھ رہی تھی جیسے راستہ تلاش کر رہی ہو۔ اچانک اس نے کہا۔ ''یہاں سے بائیں مڑ جائیں۔''

میں اس کشادہ سڑک پر مڑ گیا۔ ایک جگہ لگے بورڈ سے مجھے پتا چلا کہ یہ تو شہر کی مشہور سڑک شاہراہ قائداعظم ہے۔ ہم سیدھا چلتے گئے اور نہر پر پہنچ گئے۔ ایک جگہ گھنے درخت نظر آئے۔ یہاں لکڑی کے بینچ پڑے تھے۔ وہ بولی۔ ''یہ جگہ بیٹھنے کے لیے ٹھیک ہے۔ ہم یہاں تھوڑی دیر بیٹھ جاتے ہیں۔''

مجھے اس کا رویہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ شاید وہ ابھی تک لڑکوں سے ڈری ہوئی تھی۔ راستے میں، میں نے عقب نما آئینے پر نظر رکھی ہوئی تھی۔ مجھے ہلکا سا شبہ بھی نہیں ہوا تھا کہ کسی نے ہمارا تعاقب کیا ہے پھر وہ کس سے خوف زدہ تھی؟ یہ بھی ایک اہم سوال تھا کہ وہ اس شہر میں اجنبی ہونے کے باوجود اکیلی کیوں نکل کھڑی ہوئی تھی۔

میں گاڑی درختوں کے درمیان لے گیا۔ ہم اتر کر مور پنکھ کے بڑے بڑے پودوں کے عقب میں بیٹھ گئے۔ اِکا دُکا اور افراد بھی یہاں لکڑی کے بینچوں پر موجود تھے۔ میں نے کہا۔

''آپ کے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟ کیا آپ یہاں کسی کے ہاں مہمان آئی ہوئی ہیں؟''

اس نے بس اثبات میں سر ہلایا۔ بالوں کی لٹیں شفاف چہرے پر جھولنے لگیں۔

''آپ کو اکیلے نہیں نکلنا چاہیے تھا بہرحال وہ لڑکے تو بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ ان سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو کہیں بھی چھوڑ سکتا ہوں لیکن یہاں کے راستے مجھے نہیں آتے۔''

''کیا آپ باہر کے ملک سے آئے ہیں؟'' بڑی سادگی سے پوچھا گیا۔

''ہاں......اور مجھے لگتا ہے کہ آپ بھی اس شہر کی نہیں ہیں؟''

اس نے پھر اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ لٹیں چہرے پر تھیں۔ وہ جیسے انہیں ہٹانا بھول ہی گئی تھی۔

مجھے الجھن ہونے لگی۔ میں جو بات کرتا تھا وہ اس کا بہت مختصر جواب دے کر خاموش ہو جاتی تھی۔ آخر میں نے کہا۔ ''اگر آپ نے کہیں جانا نہیں تو پھر مجھے اجازت دیں۔''

وہ اپنی انگلیاں مروڑنے لگی۔ صراحی دار گردن کے نیچے اس کا سارا جسم بے حد متناسب تھا۔ اس نے صاف ستھرے لیکن بڑے سادہ کپڑے پہن رکھے تھے۔ کلائیوں میں کانچ کی خوشنما چوڑیاں تھیں۔ آخر وہ ایک دم جیسے کسی فیصلے پر پہنچ کر بولی۔ ''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ کچھ دیر میرے ساتھ رہیں۔ مم......میرا مطلب ہے......دو تین گھنٹے......میں کوئی ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں......لیکن میری مجبوری ہے۔''

''کیا مجبوری؟''

''میں شام پانچ چھ بجے سے پہلے گھر جانا نہیں چاہتی۔''

''لیکن......کیوں؟''

''دیکھیں آپ کوئی سوال نہ کریں۔ اگر میری اتنی سی مدد کر سکتے ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ میں آپ کو مجبور نہیں کروں گی۔''

میں نے ایک بار پھر اسے غور سے دیکھا۔ وہ مجسم معصومیت اور سادگی تھی۔ اس کا چہرہ اتنا شفاف تھا کہ خون کے ذرا سے دباؤ سے سرخ ہو جاتا تھا، کسی بیر بہوٹی کی طرح۔

میں نے ایک لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے، میں شام تک تمہارے ساتھ رہتا ہوں لیکن کیا یہیں بیٹھے رہنا ہے؟''

''کچھ دیر یہاں بیٹھتے ہیں پھر......لارنس گارڈن کی طرف چلے جائیں گے۔''

میں نے اس کے کوائف پوچھنا چاہے مگر اس کے ہونٹوں پر ایک بار پھر چپ کی مہر لگ گئی۔ وہ کچھ بھی بتانا نہیں چاہتی تھی۔ میں نے اسے اپنے بارے میں بتانا شروع کر دیا۔ میں نے اسے بتایا کہ ڈنمارک سے آیا ہوں۔ وہیں پلا بڑھا ہوں۔ اردو اس لیے روانی سے بول سکتا ہوں کہ ہمارے گھر میں یہی زبان بولی جاتی ہے۔

میں نے اسے اپنے پروفیشن کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ اگر بتاتا تو شاید وہ سمجھ نہ پاتی اور اگر سمجھ جاتی تو شاید ڈر جاتی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''وہاں قلعے کے اس حصے میں

دو چار اور لوگ بھی تو موجود تھے لیکن تم میری ہی طرف کیوں آئیں...... مجھ پر ہی بھروسا کیوں کیا؟''

''آ...... آپ مجھے ٹھیک لگے۔''

میں ہنس دیا۔ ''ٹھیک کیا لگا...... میرے لمبے بال ہیں کندھوں تک پہنچتے ہوئے...... مونچھیں ہیں، میں ہپیوں جیسا نظر آتا ہوں۔''

''بس...... آپ ٹھیک لگے۔''

''پر کیوں؟''

''پتا نہیں۔'' اس نے ایک بار پھر دل موہ لینے والی سادگی کے ساتھ نفی میں سر ہلایا۔

کچھ دیر خاموشی رہی پھر میں نے پوچھا۔ ''اگر تمہیں بھوک لگی ہو تو کھانے کے لیے کچھ لے لیں؟''

''اگر آپ کو لگی ہے تو لے لیں۔''

''یعنی تمہیں نہیں لگی؟''

''تھوڑی تھوڑی۔''

''تو پھر تم بیٹھو، میں کچھ لے کر آتا ہوں۔''

وہ ذرا سوچ کر بولی۔ ''نہیں...... دونوں ہی چلتے ہیں۔''

ہم دونوں پھر کار میں آبیٹھے۔ اس مرتبہ وہ جھجکتی ہوئی اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ میں نے ایک راہگیر سے پوچھا۔ ''یہاں آس پاس کوئی ریسٹورنٹ ہے؟''

اس نے ایک قریبی جگہ کا پتا بتایا۔ ہم نے وہاں سے دو لنچ باکس لیے۔ دو انرجی ڈرنک بھی تھے۔ ہم لارنس گارڈن کے بجائے گاڑی پر نیو کیمپس کی طرف نکل گئے۔ یہاں ایک خوب صورت چلڈرن پارک میں بیٹھ کر ہم نے لنچ کیا۔ اب ساڑھے تین کا وقت ہو چکا تھا۔ سائے لمبے ہونے لگے تھے۔ دسمبر کی خوشگوار دھوپ میں پھول دمکتے تھے اور تتلیاں منڈلاتی تھیں۔ ذرا سی دھوپ نے اس کا رنگ انگارے کی طرح سرخ کر دیا تھا۔ یہ سرخی مجھے اتنی بھلی لگی کہ میں ڈنمارک، ناروے اور ہالینڈ کی اَن گنت حسیناؤں کے چہرے بھول گیا جو مجھ سے ملی تھیں۔ یہ کیا سادگی تھی؟ یہ کیا حسن تھا؟ وہ ایک معما تھی لیکن اتنا دلکش کہ جان نکلتی محسوس ہوتی تھی اور وہ اس چمکیلی دوپہر میں نہ جانے کہاں سے کٹی پتنگ کی طرح ڈولتی ہوئی مجھ سے آٹکرائی تھی۔

میں نے ایک بار پھر اس سے پوچھنا چاہا کہ وہ شام تک اپنے گھر سے باہر کیوں رہنا

چاہتی ہے لیکن وہ نہ بتا سکی اور اس کا انداز مجھے سمجھا رہا تھا کہ اگر میں زیادہ اصرار کروں گا تو وہ اٹھ کر چلی جائے گی اور میں اس کا یہ مختصر ساتھ کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے مجھ سے باہر کی دنیا کے بارے میں پوچھا۔ وہاں کے حالات کے بارے میں معصوم سے سوالات کیے۔ میں جوابات دیتا رہا۔ کبھی کبھی ہماری گفتگو کے دوران میں خاموشی کا طویل وقفہ آجاتا۔ ایسے میں ہم ان پرندوں کی چہکاریں سنتے جو شام کو اپنے گھونسلوں میں واپس آرہے تھے اور دور کہیں کسی گاڑی کے ڈیک پر پلے ہوتی ہوئی موسیقی ہمارے کانوں تک پہنچتی۔ یہ موسم یہ مست نظارے پیار کرو تو ان سے کرو۔

شام کے ساتھ ہی گہری دھند بھی فضا کو ڈھانپنا شروع ہوگئی تھی۔ آخر اس کے جانے کا وقت ہوگیا۔ میں نے کہا۔ "کیا اپنا کوئی نام ونشان چھوڑ کر نہیں جاؤ گی؟"

"جی؟"

"کوئی فون نمبر تاکہ کبھی تمہاری خیر خیریت کے بارے میں پوچھ سکوں۔"

"نہیں، میں ایسا نہیں کر سکتی۔" اس نے سر جھکا کر کہا۔

"چلو میرا نمبر ہی لے لو۔"

وہ رضامندی کے انداز میں خاموش رہی۔ میں نے اسے اپنا سیل نمبر دے دیا۔ یہ میرے اس کزن کا فون تھا جس کے پاس میں ٹھہرا ہوا تھا۔ یہ فون آج کل میرے پاس تھا اور پھر وہ چلی گئی۔ مجھے ہرگز امید نہیں تھی کہ پھر کبھی اس سے رابطہ ہو سکے گا۔

میں اس وقت ششدر رہ گیا جب تیسرے روز ہی صبح دس بجے کے قریب اس کا فون آگیا۔ یہ فون اس نے کسی پی سی او سے کیا تھا۔ میں نے اس کی گھبرائی ہوئی آواز صاف پہچانی تھی۔ "جی آپ شاہ زیب بول رہے ہیں؟"

"ہاں، خیریت تو ہے، تم نے کیسے یاد کر لیا؟"

"کیا...... میں آج آپ کو پھر تین چار گھنٹوں کی تکلیف دے سکتی ہوں؟" اس نے رک رک کر کہا۔

"یعنی پرسوں کی طرح تم کچھ دیر گھر سے باہر رہنا چاہتی ہو؟"

"ایسا ہی سمجھ لیں۔"

میں نے ذرا توقف کر کے کہا۔ "آج رات کی فلائٹ سے مجھے بھی واپس چلے جانا ہے بہرحال شام چار پانچ بجے تک تو میں فارغ ہی ہوں۔"

"تو پھر آپ کی مہربانی، آپ آجائیں۔"

’’کہاں؟‘‘

’’وہیں آجائیں جہاں پرسوں ہم نہر کے پاس بیٹھے تھے۔‘‘

’’کتنی دیر تک آؤں؟‘‘

’’ابھی نکل پڑیں، میں بھی نکل رہی ہوں۔‘‘

فون پر بات ختم کرنے کے بعد میں نے سوچا کہیں کوئی جھگڑے والی بات نہ ہو۔ کیا میرے پاس کوئی ہتھیار ہونا چاہیے یا پھر اپنے کزن کو ساتھ لے لوں کہ وہ آس پاس رہ کر صورتِ حال پر نظر رکھے لیکن پھر میں نے یہ سارے اندیشے ذہن سے نکال باہر کیے اور اکیلا ہی روانہ ہوگیا۔ ٹھیک آدھے گھنٹے بعد میں کار پر سوار بے ہنگم ٹریفک سے بچتا بچاتا اور جگہ جگہ نظر آنے والی بدنظمی کو حیرت سے دیکھتا پرسوں والی جگہ پر پہنچ گیا۔ وہ میرے آنے سے پہلے ہی وہاں پر موجود تھی۔ پرسوں کی طرح سر سے پاؤں تک ایک کریم کلر کی چادر میں لپٹی ہوئی۔ اس نے چادر کو سر پر اس طرح ڈھلکا رکھا تھا کہ گھونگھٹ کی سی شکل بن گئی تھی۔ ایک عام سا شولڈر بیگ اس کی گود میں رکھا تھا۔

اس کی قربت مجھے مسحور کردیتی تھی۔ مجھ میں یہ پوچھنے کی ہمت ہی نہیں رہتی تھی کہ وہ ایسا کیوں کررہی ہے۔ کسی کے خوف سے گھر سے باہر رہنا چاہ رہی ہے۔ یہاں تک کہ میں اس کا نام دریافت کرنے کی ہمت بھی اپنے اندر نہیں رکھتا تھا۔ میرے سوالوں سے بچنے کے لیے وہ خود مجھ سے سوالات شروع کردیتی تھی اور پھر ان سوالوں کے طویل جواب چاہتی تھی۔ بہت کوشش کرکے میں بس اتنا ہی معلوم کرسکا کہ وہ لاہور میں اپنے کسی قریبی عزیز کے گھر مہمان آئی ہوئی ہے اور پھر واپس چلی جائے گی۔ یہ بھی اس نے نہیں بتایا کہ کہاں؟

اگر کوئی کسی شخص سے پوچھے کہ فلاں عورت یا لڑکی اسے کتنی پیاری لگی تو وہ کہے گا بہت پیاری لگی یا بہت زیادہ پیاری لگی، لیکن اگر کوئی مجھ سے پوچھے تو میں کہوں گا کہ وہ مجھے بے انتہا پیاری لگی۔ اسے دیکھ کر مجھے اپنے بدن سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔

نہ جانے کیوں اس وقت میرا دل چاہ رہا تھا کہ یہ سرکتا ہوا سورج ایک جگہ رک جائے۔ یہ سہ پہر کبھی شام کی صورت اختیار نہ کرے۔ وہ اسی طرح میرے پہلو میں بیٹھی رہے اور میں اس کے جسم کی منفرد مہک اور سانسوں کی خوشبو اپنے قرب وجوار میں محسوس کرتا رہوں۔ عورت میرے لیے کوئی انوکھی چیز نہیں تھی۔ میں نے اس لڑکی سے شاید دس بیس گنا زیادہ خوب صورت اور دلکش لڑکیاں بھی دیکھیں ہوں گی۔ اس سے زیادہ خوش انداز م وخوش اطوار مگر اس میں کوئی ایسی بات تھی جو میری سمجھ سے بالاتر تھی۔

جب دسمبر کی ٹھٹھری ہوئی شام کے سائے طویل ہوئے اور ہلکی ہلکی دھند نے فضا میں ڈیرے ڈالنے شروع کیے تو اس کی رخصت کا وقت ہوگیا۔ وہ میری طرف دیکھے بغیر بڑی عاجزی سے بولی۔ ''شاہ زیب صاحب آپ نے میرا بڑا ساتھ دیا۔ میرا یہ بہت مشکل وقت آپ کی وجہ سے خیریت سے کٹ گیا۔ میں آپ کا شکریہ ادا کرنے کے سوا اور کیا کرسکتی ہوں۔''

میں نے مسکرا کر کہا تھا۔ ''کچھ نہ کچھ تو کر ہی سکتی ہو۔''

وہ اپنی بڑی بڑی پلکیں اٹھا کر سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھنے لگی۔ میں نے کہا۔ ''تم نے مجھ پر تھوڑا سا بھی بھروسا نہیں کیا۔ مجھے اس کا ہمیشہ افسوس رہے گا۔''

وہ میری بات سمجھ گئی اور اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر سرخی پھیل گئی۔ پتا نہیں یہ شرم کی سرخی تھی، ندامت کی یا پھر پریشانی کی لیکن جو بھی تھی لاجواب تھی۔ اتنا حسین رنگ میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

اس نے گہری سانس بھر کر مجھے ایک فون نمبر دے دیا تھا اور پھر وہ چلی گئی تھی۔ دھند آلود ٹھٹھری ہوئی شام میں بڑی خاموشی کے ساتھ، بغیر رکے بغیر مڑ کر دیکھے۔ وہ دھیرے دھیرے پاپولر کے دراز قد درختوں کے درمیان قدم اٹھاتی گئی اور پھر میری نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

اور آج قریباً ساڑھے تین سال بعد میں پھر اسی جگہ بیٹھا اسے یاد کررہا تھا اور سوچ رہا تھا کہیں وہ صرف ایک خیال ہی تو نہیں تھی؟ اگر نہیں تھی تو پھر پچھلے ساڑھے تین برسوں میں، میں اس کا کوئی کھوج کیوں نہیں پاسکا تھا۔ کیوں کبھی میرے سیل فون پر اس کے نام کی گھنٹی نہیں بجی تھی؟ کیوں کبھی اس کے دیئے ہوئے نمبر پر کال تھرو نہیں ہوئی تھی اور کسی نے اپنی دلنشین آواز میں ہیلو نہیں کہا تھا۔ میں نے پچھلے تین ساڑھے تین برسوں میں شاید ہزاروں ہی بار اپنے سیل فون کی اسکرین کو اس امید کے ساتھ دیکھا تھا کہ شاید اس پر ''بے نام'' کے نام کی کوئی کال ہو، کوئی میسج، کوئی رابطہ مگر ہر بار نگاہ منتظر کو مایوسی کے سوا اور کچھ نظر نہیں آیا تھا۔ (میں نے سیل فون پر اس کا نمبر بے نام کے نام سے محفوظ کررکھا تھا) بہت سے دیگر سوالوں کی طرح یہ سوال بھی سیکڑوں بار میرے ذہن میں ابھرا تھا کہ اس کے ساتھ کیا مسئلہ تھا کہ وہ ایک خاص وقت تک گھر سے باہر رہنا چاہتی تھی اور کیا ایسا صرف دو دنوں کے لیے ہی ہوا تھا یا یہ سلسلہ بعد میں بھی چلتا رہا تھا۔

○......❖......○

اچانک مجھے اپنے پیچھے قدموں کی مدھم آہٹ سنائی دی اور میں اپنی طویل سوچ سے چونک گیا۔ مڑ کر دیکھا کوئی بھاگ کر تیزی سے میری طرف آیا اور عقب سے مجھ سے لپٹ گیا۔ وہ ایک توانا شخص تھا۔ اس نے مجھے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ اس کے ساتھ دو تین مزید افراد مجھ پر جھپٹ پڑے۔ مجھے ایک پولیس اہلکار کی وردی کی جھلک بھی نظر آئی۔ میں ابھی تک بیٹھا ہوا تھا۔ ان لوگوں نے گالیاں بکیں اور مجھے وہیں گھاس پر لمبا لٹانے کی کوشش کی۔ یہ ان کے بس کی بات تو نہیں تھی۔ میں نے مزاحمت کی ایک باوردی اہلکار کو گریبان سے جھٹکا دے کر میں نے اپنی طرف کھینچا اور اس کی بھاری توند پر اپنے گھٹنے کی ضرب لگائی۔ وہ الٹ کر پیچھے گرا۔ دوسرے اہلکار کے ہولسٹر میں سے میں نے اس کا سرکاری پستول کھینچ لیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''خبردار!'' میں گرجا۔ ''گولی چلا دوں گا۔''

یہ کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ وہ لوگ ہکا بکا رہ گئے۔ یہ کل تین بندے تھے اور میرے اندازے کے مطابق تینوں پولیس والے تھے۔ ایک سفید کپڑوں میں تھا اور دو وردی میں۔ جس اہلکار کے گریبان کو میں نے جھٹکا دیا تھا اس کی سیاہ جرسی نیچے تک پھٹ گئی تھی۔ اس کے کندھے کے پھول بتا رہے تھے کہ وہ انسپکٹر ہے۔ اس کی رنگت اُڑ گئی تھی مگر وہ اپنے چہرے پر افسرانہ شان اور دبدبہ پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سنسناتے ہوئے سے لہجے میں بولا۔ ''تم ہوش میں تو ہو۔ یہ کیا کر رہے ہو؟ پستول نیچے کرو۔'' میں نے نہ صرف پستول نیچے کر لیا بلکہ اس کے مالک کو واپس بھی کر دیا۔

ان تینوں کی اڑی ہوئی رنگت قدرے بحال ہوگئی۔ شاید انہوں نے یہی سمجھا تھا کہ میں نے پولیس مقابلے کے نہایت سنگین الزام سے بچنے کے لیے پستول واپس کر دیا ہے۔ پستول کے مالک سب انسپکٹر نے پستول کو حرکت دیتے ہوئے کہا۔ ''چلو ادھر گاڑی میں بیٹھو...... چلو۔''

''کس خوشی میں؟'' میں نے پوچھا۔

''اب بہت سی خوشیاں اکٹھی ہوگئی ہیں۔'' انسپکٹر نے زہرخند لہجے میں کہا۔ ''اور ایک خوشی تو یہی ہے جو تمہیں بھی نظر آ رہی ہے۔ پولیس اہلکار کی وردی پھاڑی ہے تم نے۔'' اس نے اپنی پھٹی ہوئی جرسی اور قمیص کے ٹوٹے ہوئے بٹن مجھے دکھا کر کہا۔

میں نے کہا۔ ''ابھی تو صرف وردی پھٹی ہے کچھ اور بھی...... ہو سکتا تھا۔'' میرا اعتماد اور اطمینان دیکھ کر تینوں اہلکار کچھ ٹھٹک گئے۔

اسی دوران میں درختوں کے عقب سے ایک لمبا تڑنگا شخص برآمد ہوا اور کڑک کر بولا۔
''اوئے نامردود! کیا دیکھ رہے ہو، توڑ دو اس کی ایک دو ہڈیاں اور ڈالو گاڑی میں......''
فقرے کے آخر میں اس نے ایک غلیظ گالی بھی بکی۔
آواز میرے لیے اجنبی نہیں تھی۔ میں نے پہچان لیا یہ وہی لمبے دھڑ اور پلپلے جسم والا تنویر پاشا تھا جس کی چند ہفتے پہلے میں نے یادگار ٹھکائی کی تھی۔ یہی ناہید کا سابقہ شوہر تھا اور اپنی کوٹھی میں مجھ سے زبردست درگت بنوانے کے بعد اس نے تیزی سے اثر کرنے والا نشہ آور کیپسول نگل لیا تھا۔
وہ ذرا روشنی میں آیا تو میں نے اسے دیکھ لیا۔ وہ غصے سے لال پیلا ہو رہا تھا۔ شلوار قمیص اوور کوٹ میں وہ کچھ اور بھی پھیلا ہوا دکھائی دیتا تھا مگر میں جانتا تھا اس بدبخت کے جسم میں بس ہوا ہی ہوا ہے۔
اگلے ایک دو منٹ میں ان ویران درختوں میں جو گفتگو ہوئی اس سے مجھے صاف پتا چل گیا کہ پولیس اہلکاروں کو یہاں لانے والا یہی پلپلا شرابی تنویر پاشا ہے۔ اس نے یا اس کے کسی ساتھی نے مجھے دیکھا تھا اور اب یہ لوگ مجھے گھیرنے کے لیے یہاں پہنچ گئے تھے۔ اس سے پہلے کہ انسپکٹر یا سب انسپکٹر وائرلیس کر کے مزید ساتھیوں کو یہاں بلا لیتا اور ہنگامہ بڑھ جاتا، میں نے پاشا سے کہا۔ ''اچھے بچے کوئی بھی حرکت کرنے سے پہلے اپنے ابا جی سے ضرور پوچھ لیتے ہیں۔ تم نے بھی محترم جناب شکیل صاحب سے اجازت مانگ لینی تھی۔''
وہ گالی دے کر خطرناک لہجے میں بولا۔ ''اجازتیں بھی مانگ لیں گے فی الحال تم تھانے چلو۔''
میں نے کہا۔ ''جو لوگ اپنی بیویوں کے سلسلے میں بے غیرت ہوتے ہیں ان کی عقل ایسے ہی ماری جاتی ہے۔ اپنے ابا جی، سے پوچھے بغیر مجھے تھانے لے جاؤ گے تو اس بار تمہیں دونوں کیپسول اکٹھے ہی کھانے پڑ جائیں گے۔''
اس کے ساتھ ہی میں نے اپنی جیکٹ کی جیب سے سیل فون نکالا اور شکیل داراب کا ڈائریکٹ نمبر ڈائل کیا۔ یہ نمبر اس نے بس خاص خاص لوگوں کو ہی دے رکھا تھا اور اس کے ایک اہم ترین راز سے واقف ہونے کے بعد میں بھی اس کے خاص لوگوں میں شامل ہو گیا تھا۔ کم از کم عارضی طور پر تو ہو ہی گیا تھا۔
دو تین بار بیل ہوئی پھر اسپیکر پر شکیل داراب کی جوان لیکن بارعب آواز ابھری۔ ''ہیلو شکیل اسپیکنگ۔''

''میں شاہ زیب عرض کر رہا ہوں۔ معافی چاہتا ہوں آپ کے ایک بے وقوف دوست کی وجہ سے آج پھر آپ کو زحمت دینا پڑ رہی ہے۔ میرے سامنے پاشا کھڑا ہے۔ اپنی مدد کے لیے ساتھ میں تین پولیس والے بھی لایا ہے۔ مجھے آوارہ گردی کے جرم میں پکڑ کر تھانے لے جانا چاہ رہے ہیں۔''

''پاشا؟'' شکیل کے لہجے میں حیرت تھی۔

''جی ہاں...... آپ کو یاد ہی ہوگا چند ہفتے پہلے اس کی کوٹھی میں اس کے ساتھ میری علیک سلیک ہوئی تھی۔ ذرا سنگین قسم کی علیک سلیک تھی۔ شاید یہ اس کا غصہ نکالنا چاہ رہا ہے مجھ پر۔''

''بڑا اُلو کا پٹھا ہے۔'' شکیل نے دانت پیسے۔

''آپ نے میرے بارے میں تھوڑا بہت بتا دیا ہوتا اسے۔''

''بتایا تھا، بھول گیا ہوگا کنجر کی اولاد۔ ہر وقت تو ٹن رہتا ہے۔'' شکیل نے کہا۔ ''پھر اسی غصیلے لہجے میں مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''اور...... تم کب جا رہے ہو یہاں سے؟ تمہارے کاغذات تو میرے خیال میں تیار ہی ہیں؟''

''بس زیادہ دن آپ کو تکلیف نہیں دوں گا۔'' میں نے کہا۔

''جب تک تم یہاں ہو ایسے مسئلے کھڑے ہوتے ہی رہیں گے۔ کچھ پولیس افسر تمہارے خلاف ہیں۔ میں نے تمہیں کہا بھی تھا کہ جلد نکل جاؤ۔''

''میں ایسے لوگوں کو جوتے کی نوک پر رکھتا ہوں شکیل صاحب لیکن آپ کا کہا سر آنکھوں پر۔ میں اب زیادہ دن یہاں نہیں رکوں گا۔''

اس نے ذرا توقف سے کہا۔ ''اچھا فون دو اس...... کو۔'' فقرے میں پاشا کے لیے انگریزی کی ایک تگڑی گالی موجود تھی۔

میں نے فون پاشا کی طرف بڑھایا۔ وہ بات کرتا ہوا کچھ آگے نکل گیا۔ یقینی بات تھی کہ شکیل داراب اسے بری بھلی سنا رہا ہوگا۔ پاشا اس کے لیے ایک ایسے کتے جیسا تھا جسے ہر وقت گودے سے بھرپور ہڈیاں ملتی رہتی تھیں۔ اس کے باوجود اگر وہ اپنے مالک کے لیے پریشانی کا باعث بنتا تھا تو مالک کو غصہ تو آنا ہی تھا۔ بہرحال میں جانتا تھا کہ یہ غصہ ایک حد سے نہیں بڑھے گا کیونکہ جس طرح میں شکیل کے ایک نہایت اہم راز سے واقف تھا، یہ پاشا بھی تھا بلکہ اس راز کا تو تعلق ہی پاشا سے تھا۔ اس راز کا افشا ہونا (اور پھر الیکشن جیسے نازک موقعے پر افشا ہونا) شکیل کے لیے سیاسی موت کا باعث بن سکتا تھا۔

تین چار منٹ بعد پاشا نے سرخ چہرے کے ساتھ سیل فون میری طرف بڑھا دیا اور منہ میں پتا نہیں کیا کیا بڑبڑانے لگا۔ میں اسے مزید تاؤ دلانے کے موڈ میں تھا۔ میں اس کے قریب گیا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے ایک طرف لے گیا۔ میں نے کہا۔ "پاشا! مجھے پتا چلا ہے کہ تُو صرف شادی شدہ عورتوں اور منگیتروں وغیرہ پر ہاتھ صاف کرتا ہے۔ اس کی وجہ میں بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔"

وہ سوالیہ انداز میں منہ کھول کو میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے کہا۔ "اس کی وجہ یہ لگتی ہے کہ تیری اپنی بیوی کسی اور کے پاس ہے۔ تُو جن موج مستیوں میں پڑا ہوا ہے اس کی قیمت تُو نے اپنی بیوی کی صورت میں دی ہے۔ بڑی اعلیٰ نسل کے خاندانی دلال ہی ایسے کام کرتے ہیں۔"

اس نے تڑپ کر میرا گریبان پکڑ لیا۔ پولیس والے بھی پھر الرٹ ہو گئے۔ پاشا خونخوار لہجے میں بولا۔ "اب ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو میں جان لے لوں گا تیری۔" فرطِ غضب سے وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔

میں نے کہا۔ "اتنے بڑے پیٹ کے ساتھ اس عمر میں اتنا غصہ ٹھیک نہیں۔ اٹیک شٹیک ہو جایا کرتا ہے۔"

اس کی گرفت سے اپنا گریبان چھڑا کر میں نے بڑے اطمینان کے ساتھ گھاس پر سے اپنا ہیلمٹ اٹھایا اور اپنی موٹر بائیک کی طرف بڑھ گیا۔

O......❖......O

میں داؤد بھاؤ کے زیر زمین ٹھکانے پر موجود تھا۔ اس وسیع ہال کے ایک گوشے میں ایک مستقل اسٹیج بنا ہوا تھا۔ یہاں اکثر مار کٹائی کے مقابلے ہوتے رہتے تھے۔ جس دن میں نے اس اسٹیج پر لودھی کو یادگار مار لگائی تھی یہاں میری دھاک بیٹھ گئی تھی۔ درحقیقت لودھی یہاں کا بہترین فائٹر سمجھا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اسے دھول چٹانے کے بعد یہ اعزاز میرے حصے میں آ گیا تھا۔ ویسے رسمی طور پر وہی اس کلب کا چیمپئن تھا۔ میرا خیال تھا کہ شاید لودھی ایک بار پھر مجھے چیلنج کرے گا اور یوں اپنا کھویا ہوا وقار واپس حاصل کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے گا لیکن اس نے یہ حماقت نہیں کی۔ ہاں اس نے ایک اور کام کیا۔ وہ ایک اور شخص کو میرے مقابل لے آیا۔

یہ بات انیق نے ہی مجھے بتائی۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھا ٹی وی پر نیوز دیکھ رہا تھا۔ اسکرین پر شکیل داراب نظر آ رہا تھا۔ الیکشن میں بس چند ہی روز رہ گئے تھے۔ وہ میڈیا والوں

کے تندو تیز سوالات کے جوابات بظاہر بڑی خندہ پیشانی سے دے رہا تھا۔ اس نے ابھی اساتذہ کے ایک بہت بڑے کنونشن سے خطاب کیا تھا اور اب میڈیا والوں کو بتا رہا تھا کہ تعلیم اور تعلیم دینے والوں کی اس کے نزدیک کیا اہمیت ہے۔ وہ علاقے میں بہت جلد ایک یونیورسٹی کی بنیاد رکھنے کی بات بھی کر رہا تھا۔

اگر کوئی یہاں آ کر بتا دیتا کہ اساتذہ کی شان میں قصیدے پڑھنے والے اس حاکم زادے نے اپنی ہی ایک محترم استاد کی زندگی کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے تو شاید لوگ ابھی اس پر جوتے پھینکنے لگتے۔ وہ سیاستدانوں کے دہرے چہرے کی زندہ مثال تھا۔

اتنے میں انیق اندر داخل ہوا۔ اس نے کہا۔ ''شاہ زیب بھائی! آپ کا سائیڈ ہیرو ایک بندے کو لے کر آیا ہے۔ میری انفارمیشن کے مطابق یہ بندہ حیدر آباد کا ایک پہنچا ہوا فائٹر ہے۔ فوج میں بھی بھرتی ہوا تھا لیکن پھر مکمل طور پر مارشل آرٹ کی طرف آ گیا۔ ریس میں حصہ لینے والی کاریں بھی ڈرائیو کرتا رہا ہے لیکن اس کی اصل شہرت اس کی مارکٹائی کا زبردست فن ہے۔ مجھے لگ رہا ہے کہ لودھی اسے آپ کے مقابل لانا چاہتا ہے۔''

''تو کوئی بات نہیں۔ ہو جائیں گے مقابل۔'' میں نے ایل سی ڈی کی اسکرین پر نگاہیں جمائے جمائے کہا۔

''پر یہ کوئی معمولی شخص نہیں ہے بھائی۔ سنا ہے کہ جاپان اور ہالینڈ کی یاترا بھی کر چکا ہے۔ وہاں بھی غیر ملکی فائٹروں سے مقابلے وغیرہ کرتا رہا ہے۔''

اسی دوران میں میرے سیل فون پر بیل ہوئی۔ دوسری طرف داؤد بھاؤ تھا، وہ مجھے اپنے چیمبر یعنی کمرے میں بلا رہا تھا۔ میں نے انیق کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لو بلاوا آ گیا ہے بھاؤ کا۔''

میں ایل سی ڈی آف کر کے بھاؤ کے کمرے میں پہنچا۔ وہاں بھاؤ کے ساتھ وہ حیدر آبادی بندہ بھی موجود تھا۔ وہ مضبوط جسم کا ایک توانا شخص تھا۔ عمر اٹھائیس سے اوپر رہی ہوگی۔ اسے دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ ایک تجربہ کار فائٹر ہے۔ اس نے مجھے دیکھا اور جیسے چونک سا گیا۔ کتنی ہی دیر بڑے تعجب سے میری طرف دیکھتا رہا۔ بھاؤ نے اس سے میرا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ ''مستان، یہ ہے شاہ زیب...... اور شاہ زیب، یہ ہے مستان۔ تمہاری ہی طرح لڑنے بھڑنے کے فن میں طاق ہے۔ جاپان اور یورپ کی سیر بھی کر چکا ہے اور ٹرافیاں، کپ شپ اکٹھے کیے ہیں......''

بھاؤ تعارف کروانے میں مصروف تھا اور وہ شخص بس مجھے دیکھے چلا جا رہا تھا۔ بھاؤ نے

تاڑ کر کہا۔ ''کیا بات ہے مستان! تم پہلے سے جانتے ہو شاہ زیب کو؟''

''شاہ زیب کو......'' اس نے الجھے الجھے لہجے میں کہا پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ ایک دم میرے ذہن میں روشنی کا جھماکا سا ہوا۔ مجھے شک ہوا کہ یہ شخص مجھے مارشل آرٹ والے نام یعنی ایسٹرن کی حیثیت سے نہ صرف جانتا ہے بلکہ مجھے مل بھی چکا ہے۔ اب مجھے اس کی صورت بھی کچھ جانی پہچانی لگ رہی تھی۔

اس نے کچھ بولنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر ارادہ ترک کر دیا۔ غالباً وہ سمجھ داری کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ وہ بدلے ہوئے حلیے کے باوجود میرے بارے میں زبردست شک میں مبتلا ہو چکا ہے۔ درحقیقت جو لوگ آپ کو قریب سے جانتے ہوں، آپ سے مل چکے ہوں، بات چیت کر چکے ہوں، ان کو اپنے گیٹ اَپ سے دھوکا دینا بہت مشکل بلکہ ناممکن ہی ہوتا ہے۔ بے شک اب میرے سر کے بال کندھوں تک نہیں جا رہے تھے۔ میری مونچھیں اور داڑھی بھی غائب تھی، بالوں کا رنگ بھی ایسٹرن کنگ والا نہیں تھا لیکن چہرہ تو وہی تھا اور آواز بھی۔

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی کوئی سیاہ کار سرکاری افسر داؤد بھاؤ کو سلام کرنے کے لیے وہاں آ گیا اور داؤد بھاؤ کو کچھ دیر کے لیے اٹھ کر دوسرے کمرے میں جانا پڑا۔

اب وہاں میں اور مستان نامی وہ شخص اکیلے تھے۔ مستان نے تیز نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ جیسے یہ جاننے کی کوشش کر رہا ہو کہ یہاں کوئی خفیہ کیمرا یا ڈکٹا فون تو موجود نہیں پھر بڑی دھیمی آواز میں بولا۔ ''مجھے یقین ہے کہ میری نگاہیں دھوکا نہیں کھا رہیں لیکن آپ کا حلیہ اس قدر بدلا ہوا ہے کہ کوئی آپ کو پہچان نہیں سکتا...... آپ ایسٹرن ہی ہیں ناں؟''

میرا جسم سنسنا گیا بہرحال میں نے نارمل لہجے میں کہا۔ ''کون ایسٹرن؟''

مستان کے چہرے کی رنگت بدل گئی۔ رنگت کا یہ بدلاؤ مجھے سمجھا رہا تھا کہ وہ مجھے پہچان لینے کے باوجود ابھی تک تذبذب میں ہے۔ ''پلیز آپ مجھے کنفیوژ کر رہے ہیں۔ میں نے آپ کو پہچان لیا ہے۔ اگر...... اگر آپ کی کوئی مجبوری ہے تو میں کسی سے ذکر نہیں کروں گا لیکن آپ...... مان تو لیں۔''

''تم نے کہاں دیکھا تھا مجھے؟''

''لندن میں...... پھر ہم پانچ دوسرے فائٹرز کے ساتھ ایمسٹرڈیم گئے تھے۔ اکٹھے ہی بائی روڈ...... ایمسٹرڈیم میں میرا مقابلہ ڈچ فائٹر جونی ونڈ کے ساتھ ہوا تھا...... وہی لمبے بازوؤں والا......''

اب مجھے بھی کچھ کچھ یاد آنے لگا تھا۔ یہ شخص کوئی تین سال پہلے کی بات کر رہا تھا۔ ہم نے ہالینڈ کے کیپٹل ایمسٹرڈیم میں ایک دھواں دھار مقابلے میں حصہ لیا تھا۔ ہماری ٹیم میں چھ سات کھلاڑی شامل تھے اور ہم لندن کے ہوٹل میں ایک رات اکٹھے بھی رہے تھے۔

میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے، مجھے یاد آگیا ہے لیکن میں چاہوں گا کہ تم اس سلسلے میں اپنی زبان ابھی بالکل بند رکھو۔ ہم اس بارے میں بعد میں بات کریں گے۔ تم میرا سیل نمبر لکھ لو۔“

”جو آپ کا حکم سر۔“ مستان نامی اس شخص نے فوراً رضامندی ظاہر کی۔

اسی دوران میں داؤد بھاؤ واپس آ گیا۔ وہ بڑبڑا رہا تھا اور اس سرکاری افسر کو کلاسیکل گالیاں دے رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ملک کے سب سے بڑے بلیک میلر اور کرپٹ سرکاری افسر اور بیوروکریٹس یہی ہیں۔ کرپٹ سیاست دان تو پھر بھی دفعان ہو جاتے ہی لیکن ان کی کرسیاں پکی ہوتی ہیں۔ ان کی اکثریت ایسی ہے جن کی گھٹی میں عیاشی پڑی ہوئی ہے۔

کچھ دیر بعد ہماری گفتگو پھر لڑائی مار کٹائی اور فائٹنگ کے فن کی طرف آ گئی۔ داؤد بھاؤ نے اشاروں کنایوں میں مجھے بتایا کہ اگر ہم دونوں میں ایک بھرپور فائٹ ہو تو دیکھنے والوں کو مزہ آ جائے۔

”کیا آپ فکسڈ فائٹ کی بات کر رہے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں یار، دو نمبری میں دو نمبری نہیں چلتی۔ مقابلہ ہوگا تو پھر اصل ہوگا۔ ہاں اس میں کوئی رول وغیرہ بنائے جا سکتے ہیں کہ کسی کو شدید چوٹ نہ لگے۔ ایسا پہلے بھی ہوتا رہا ہے۔“

کچھ دیر تک اس بارے میں مزید گفتگو ہوئی۔ مستان تو زیادہ تر خاموش ہی رہا۔ میں نے کہا۔ ”داؤد بھاؤ، میں سوچ کر آپ کو کل بتاؤں گا۔“

شام کے فوراً بعد جب میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا اور روبی میرے لیے چائے سرو کر رہی تھی۔ میری نگاہ بار بار اس کے شہد رنگ بالوں کی طرف اٹھ جاتی تھی۔ بھاؤ کی اس نوخیز رکھیل میں میرے لیے بس ایک ہی چیز دلچسپی کی تھی۔ مجھے جب بھی اس کے بال دکھائی دیتے تھے مجھے کسی اور کے بالوں کی یاد دلا دیتے تھے۔ وہ جو ایک خیال کی طرح مجھے ملی اور اوجھل ہو گئی تھی۔ کہاں تھے وہ بال؟ کہاں تھیں ان کی وہ لٹیں جو شفاف شیشے جیسے چہرے پر جھکی رہتی تھیں۔ انیق میرے کہنے پر اب بھی ایک موہوم سے کلیو کے ساتھ اس کی تلاش میں نکلا ہوا تھا مگر میں جانتا تھا کہ وہ مایوس چہرہ لے کر ہی واپس آئے گا۔

اتنے میں میرے سیل پر کال کے سگنل آئے۔ میں نے دیکھا، یہ مستان کی کال تھی۔

میں نے روبی کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ اپنے مختصر لباس میں اپنے توبہ شکن سراپے کی جھلک دکھاتی باہر نکل گئی۔

''ہیلو، مستان کیسے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''شکر ہے آپ نے مجھے میرے نام سے تو بلایا۔'' وہ لرزاں آواز میں بولا۔ ''یقین کریں میں اسے اپنی بہت بڑی خوش نصیبی سمجھ رہا ہوں کہ آپ جیسے چمپئن کھلاڑی سے یہاں اپنے وطن میں اس طرح ملاقات ہوگئی ہے۔''

''تو پھر کیا خیال ہے؟ اس خوش نصیبی کو کچھ اور بڑھایا جائے، میرا مطلب ہے مقابلہ وغیرہ کرنے کا ارادہ ہے؟''

''کیا بات کر رہے ہیں جناب؟ میری یہ مجال...... میری حیثیت تو آپ کے شاگردوں کے شاگرد کی بھی نہیں ہے۔''

''خیر اتنا بھی بانس پر نہ چڑھاؤ مجھے۔ داؤد بھاؤ کا خیال ہے کہ اگر ایک اچھا مقابلہ ہو جائے تو اسے کافی آمدنی ہوگی اور ہم دونوں کو بھی معاوضہ ملے گا۔''

''میں بھوکا مر سکتا ہوں لیکن اتنی بڑی حماقت نہیں کر سکتا جناب کہ پیسے کمانے کے لیے آپ سے لڑوں۔''

''یہ بھوکا مرنے کا ذکر کہاں سے آ گیا، تم خیریت سے تو ہو۔ میرا مطلب ہے کوئی تنگی ترشی والا ٹائم تو نہیں چل رہا؟'' وہ ایک دم خاموش ہو گیا جیسے اسے احساس ہوا ہو کہ اس نے غلط جملہ بول دیا ہے۔

میں نے کل بھی محسوس کیا تھا کہ مستان اپنے بائیں کندھے کو ہلاتے ہوئے کچھ دقت محسوس کرتا ہے۔ وہ جس فیلڈ سے تعلق رکھتا تھا اس میں عموماً انجریز ہوتی رہتی ہیں۔ کبھی کوئی پٹھا چڑھ گیا، کبھی کہیں پین نکل آئی۔ اگر اس طرح کی انجریز عام ہوں تو کوئی بات نہیں ہوتی لیکن اگر انجری کی نوعیت سنگین ہو تو کئی مرتبہ کھلاڑی کا کیریئر داؤ پر لگ جاتا ہے۔

میں نے مستان سے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا اور جلد ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ پچھلے تقریباً ایک سال سے اَن فٹ ہے۔ کل کا نامور فائٹر کراچی کے فائٹنگ کلبس میں بس چھوٹے موٹے مقابلے کر کے روزی روٹی چلا رہا تھا۔ پچھلے دنوں پولیس کے ٹریننگ سینٹر میں لڑکوں کو مارشل آرٹ کی سمجھ بوجھ دینے کے لیے انسٹرکٹر کی ایک نوکری نکلی تھی۔ مستان ہر طرح اس نوکری کا اہل تھا لیکن اس پر ایک نااہل منظورِ نظر کو ترجیح دے دی گئی تھی۔ وہی کہانی جو درجنوں بار اس سے دہرائی جا چکی تھی۔ اب اس پر ایک اور مصیبت آ گئی تھی۔ اس کی اکلوتی

بہن جس سے وہ بہت پیار کرتا تھا سخت مصیبت میں تھی۔ اس کا شوہر جو کسی امیر کبیر شخص کا خاص گن مین تھا کسی لڑائی میں زخمی ہو گیا تھا اور ساتھ ہی اس کی نوکری بھی چلی گئی تھی۔ بہن کا بچہ بیمار تھا اور اس کے ساتھ ان کو روٹی کے لالے بھی پڑے ہوئے تھے۔

مفلسی کی یہ تصویر واقعی دلدوز تھی۔ خاص طور سے اس لیے کہ اس کا تعلق ماضی کے ایک نامور کھلاڑی سے تھا۔ میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ اس کے لیے کچھ کروں گا۔ میں پاکستان سے جانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ مجھے یہاں اَن گنت مستان، ولید اور عارف نظر آئے تھے جو روپیہ اور وسائل نہ ہونے کی وجہ سے حالات کی چکی میں پس رہے تھے۔ میں ان سب کے لیے کچھ کرنے کے قابل تو نہیں تھا مگر کم از کم اس ایک مستان کا دکھ تو ہلکا کر سکتا تھا۔

اگلے روز پھر مستان سے ٹیلی فون پر بات ہوئی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس کے بہنوئی کا کیا حال ہے؟ وہ بولا۔ ”اس کی ٹانگ کا ایک اور آپریشن ہونا تھا لیکن اس کے سابقہ مالک نے مزید مالی تعاون کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اب ہم مجبوراً اسے سرکاری اسپتال میں داخل کروا رہے ہیں۔“

میں نے اس سلسلے میں مستان سے مزید سوال جواب کیے۔ میں نے اس گفتگو کے دوران میں ہی فیصلہ کر لیا کہ میں مستان کے لیے کچھ نہ کچھ کروں گا اور اس سلسلے میں میرے ذہن میں ایک پلان بھی بن گیا۔

میں نے کہا۔ ”مستان! میں داؤد بھاؤ کی بات نہیں ٹال سکتا۔ وہ میرا میزبان ہے اور مہربان بھی۔ اس کی خواہش ہے کہ میں تم سے مقابلہ کروں۔ یہ مقابلہ ہونا چاہیے اور اس میں تمہیں جیتنا بھی چاہیے۔“

”مم...... میں سمجھا نہیں جناب؟“

”فکسڈ مقابلہ۔“ میں نے جواب دیا۔ ”لیکن کسی رقم یا فائدے کے لالچ میں نہیں صرف اس لیے کہ میری ہی فیلڈ کے ایک شخص کو اس کا حق اور مقام نہیں دیا جا رہا۔“

وہ کچھ بولنا چاہ رہا تھا لیکن میں نے اسے خاموش کر دیا اور کہا کہ باقی باتیں ہم آمنے سامنے بیٹھ کر کریں گے۔

”جیسے آپ کا حکم...... لیکن مجھے کہاں آنا ہوگا؟“ وہ کانپتی سی آواز میں بولا۔

”جہاں تم آسانی سے آسکو مگر رازداری کے ساتھ۔“ ہم نے ایک ریسٹورنٹ کا تعین کر لیا اور ملاقات کا وقت بھی طے ہو گیا۔

O......❖......O

میں پاکستان سے روانہ ہونے کی پوری تیاری کر چکا تھا۔ چچی آمنہ اور فائزہ کی قبروں پر فاتحہ خوانی کر آیا تھا۔ اسپتال میں جا کر ولید سے مل آیا تھا اور اسے پوری تسلی دے آیا تھا کہ وہ بہت جلد آزاد زندگی کی طرف لوٹ آئے گا۔ بہر طور میں جانتا تھا کہ وہ غصے کا بہت تیز ہے فی الحال تو اس کا جیل میں رہنا ہی زیادہ مناسب تھا۔ اپنی والدہ اور بہن کی موت اسے طیش سے دیوانہ کیے ہوئے تھے اور اس طیش سے ایک قیامت برپا ہو سکتی تھی۔ چچا حفیظ اپنی برباد شدہ حویلی کے بچے کھچے حصے میں واپس پہنچ چکے تھے۔ میں نے انہیں بھی پوری تسلی دی تھی کہ وہ اب لالہ فیملی کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ ہیں۔ اب کوئی قیصر چودھری انہیں دھمکانے کے لیے یہاں نہیں آئے گا۔ نہ ہی یہ زمین فروخت کرنے کے لیے ان پر ناجائز دباؤ ڈالا جائے گا۔ میں نے ان کو یہ اطمینان بھی دلایا تھا کہ میں ڈنمارک میں ہوتے ہوئے بھی ہمہ وقت ان سے رابطے میں رہوں گا۔ وہ بار بار مجھ سے کہتے رہے۔ ''شاہ زیب پتر! اگر تم یہاں رہنے کا ارادہ لے کر آئے تھے تو اب واپس کیوں جا رہے ہو؟ اب تو تمہیں یہاں رہنے کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے۔ تمہاری چچی اور فائزہ کے بعد میں بالکل اکیلا رہ گیا ہوں۔ ولید بھی جیل میں ہے۔ کسی دن میری سانس رک جائے گی اور تم لوگ میرا منہ بھی نہیں دیکھ سکو گے۔''

میں چچا کو کیسے سمجھاتا کہ میں آیا تو واقعی یہاں رہنے کے ارادے سے تھا لیکن اب یہاں میرا دم گھٹنا شروع ہو گیا ہے۔ جس طرح انہیں اپنی سانس رکنے کا خدشہ ہے۔ مجھے بھی لگتا ہے کہ اس شہر کی بے پناہ حبس میرے پھیپھڑوں میں بھر کر میرے دل کو تھام لے گی۔

عاشرہ اپنے والد حاجی نذیر صاحب کو علاج کے لیے کوپن ہیگن لے جا چکی تھی۔ اس کی والدہ بھی ساتھ گئی تھیں۔ پاکستان سے میری روانگی مہینے کی 25 تاریخ کو تھی۔ عارف بھی میرے ساتھ ہی جا رہا تھا مگر مجھے یہ تاریخ مستان کی اشک شوئی کے لیے چار دن آگے کرنا پڑی۔ چار دن بعد میرے اور مستان کے بیچ داؤد بھاؤ کے زیرزمین ٹھکانے پر مقابلہ ہونا طے پایا تھا۔ میں نے تو اب شاید ہی بھاؤ سے دوبارہ ملنا تھا یا اس زیرزمین ٹھکانے پر واپس آنا تھا تو پھر میں اپنی ساکھ کو ضائع کیوں ہونے دیتا۔ کیوں نہ اسے کسی ضرورت مند کے حوالے کر دیتا تاکہ یہ اس کے کام آ سکے اور میں نے یہ ساکھ مستان کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مستان کو میں نے اس کے لیے کیسے اور کیونکر رضامند کیا یہ ایک علیحدہ کہانی ہے۔ میرے لیے اس زیرزمین کلب میں ہار جیت کی کوئی اہمیت نہیں تھی لیکن میری ہار مستان جیسے مصیبت زدہ کے دن پھیر سکتی تھی۔ یہاں سے فائٹنگ کلبس اور مارشل آرٹ کے حلقوں میں اس کا وقار بحال کر سکتی تھی۔ اپنے کندھے کی انجری کو میرے ساتھ ہونے والے تاریخی مقابلے کا نتیجہ بھی

قرار دے سکتا تھا اور یوں اسے انجری سے ابھرنے کے لیے بہ آسانی ایک آدھ سال کی مہلت بھی مل جاتی۔

میرے اور مستان کے مقابلے کی خبر بہت جلد اسٹریٹ فائٹرز اور مارشل آرٹ کے مقامی حلقوں میں پھیل گئی۔ اسے باکسنگ کا مقابلہ کہا جا رہا تھا لیکن یہ دراصل کک باکسنگ کے طرز کی لڑائی تھی۔ داؤ د بھاؤ کے زیرِ زمین ٹھکانے پر ایک بار پھر جوش و خروش کے وہی مناظر دیکھنے میں آئے جو میرے اور لودھی کے مقابلے کے موقعے پر دیکھنے میں آئے تھے۔ کلب میں میرے بہت سے پرستار پیدا ہو چکے تھے اور وہ میری جیت کے سلسلے میں بہت پُر امید تھے۔ تاہم ان میں سے اکثر یہ بھی جانتے تھے کہ پہلے لودھی تھا اور اب حیدر آباد کا مستان ہے۔

مستان، لودھی سے کہیں بڑا فائٹر ہے۔ مستان کی حمایت کرنے والوں میں لودھی فاروق، واحد اور ان کا گروپ شامل تھا۔ یہ لوگ مجھے مستان سے شکست کھاتا دیکھنے کے زبردست خواہش مند تھے اور میں ان کی یہ خواہش پوری کرنے جا رہا تھا کیونکہ میرا اس میں کچھ جاتا نہیں تھا۔ کئی بڑے بڑے پھنّے خان بھی مقابلہ دیکھنے کے لیے تشریف لا رہے تھے۔ ان میں کچھ نیم سیاسی، نیم بدمعاش ہستیاں بھی شامل تھیں اور انڈر ورلڈ کے دو چار چہرے بھی جھلک دکھانے والے تھے۔ بھاری شرطیں لگائی گئی تھیں۔

27 تاریخ کو مقابلہ ہوا اور خوب ہوا۔ بڑے مقابلے سے پہلے کئی چھوٹے مقابلے ہوئے۔ یہاں کا کانگڑی پہلوان جھارا منتظمِ اعلیٰ کی حیثیت رکھتا تھا اور اس کی موجودگی میں کسی بدنظمی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ نہ ہی فکسنگ وغیرہ کا کوئی چکر تھا یہاں۔ واحد فکسڈ مقابلہ میرا اور مستان کا تھا اور اس کا علم بھی صرف اور صرف ہم دونوں کو تھا۔

حسبِ سابق پانچ راؤنڈ کا مقابلہ تھا۔ تاہم پچھلی مرتبہ صرف باکسنگ ہوئی تھی اس مرتبہ کک باکسنگ ہونا تھی۔ تماشائیوں کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ زبردست نعرہ بازی بھی ہو رہی تھی۔ پورے ہال میں نیم تاریکی تھی صرف رِنگ روشنیوں میں جگمگا رہا تھا۔

یہ مقابلہ پورے چار راؤنڈ چلا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے پر شدید حملے کیے۔ اَن فٹ ہونے کے باوجود مستان نے میری توقع سے بڑھ کر کارکردگی دکھائی۔ وہ یقیناً ایک جان مارنے والا فائٹر تھا۔ اس کا کندھا ٹھیک ہوتا اور یہ طے شدہ مقابلہ نہ ہوتا تو وہ یقیناً مجھے ٹف ٹائم دے سکتا تھا۔ اس کے فٹ ورک اور چکما دینے کے ہنر نے مجھے متاثر کیا۔ بہر حال ایک سنسنی خیز اور دھڑکنیں بڑھا دینے والے مقابلے کی ساری خصوصیات اس فائٹ میں موجود تھیں۔ ایک دوسرے کو زوردار ضربات لگائی گئیں۔ ناک منہ سے خون بھی چھوٹا۔ تماشائیوں

نے اپنے شور سے آسمان بھی سر پر اٹھایا۔ کرسچین ریفری نے بار بار ہم دونوں کو وارننگ دی۔
”وڑی، فاؤل نہیں کریں گا۔ اگر فاؤل کریں گا تو ہام پوائنٹ کاٹیں گا۔“
ایک موقع پر کرسچن ریفری مجھے دھکیلتا ہوا رسوں تک لے گیا اور مجھے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ اس ادھیڑ عمر کے جسم میں اتنی طاقت کہاں تھی کہ مجھے روک سکتا۔ بہرحال میں نے اس کا بھرم رکھا اور خود کو چھڑایا نہیں۔ بہرحال اس مقابلے کا آخری نتیجہ وہی نکلا جو ہم نے چار روز پہلے طے کیا تھا۔ مجھے ٹیکنیکل ناک آؤٹ قرار دیا گیا اور مستان کو اس کے پُر جوش حمایتیوں نے کندھوں پر اٹھالیا۔

اسی دوران میں ایک ناخوشگوار واقعہ بھی ہو گیا۔ مجھے شکست خوردہ دیکھ کر میرے سابقہ حریف لودھی کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا۔ اس کی کدورت عود کر آئی۔ اس نے مجھ پر آوازیں کسی اور نازیبا جملے بولے۔ درحقیقت وہ ایک منہ پھٹ شخص تھا۔ اس کی بدزبانی کی وجہ سے انیق بھڑک اٹھا اور لودھی پر جا پڑا۔ دونوں نے ایک دوسرے پر اندھا دھند مکے برسائے۔ اس موقع پر میری نگاہ مستان پر پڑی۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں مجھ سے اجازت طلب کر رہا تھا کہ اگر میں کہوں تو وہ لودھی کی بولتی بند کر دے۔ میں نے آنکھوں آنکھوں میں ہی اسے منع کر دیا۔ میں جانتا تھا کہ مختار جھارا اس طرح کی سچویشنز کو بڑے اچھے طریقے سے سنبھالتا ہے۔ وہ بالکل سنگل پسلی تھا لیکن یہاں اس چھت کے نیچے اس کا کافی رعب داب تھا اور میرا اندازہ درست ہی نکلا۔ مختار جھارا اور اس کے دو تین قریبی ساتھیوں نے جلد ہی اس ہنگامے پر قابو پالیا۔ بہرحال ان ڈیڑھ دو منٹوں میں انیق کو کافی چوٹیں آگئیں۔ وہ اپنی پھٹی ہوئی قمیص سے بار بار اپنا خون آلود منہ پونچھ رہا تھا۔ اس طرح کے ہنگامے یہاں روزمرہ کا معمول تھے۔

میں نے یہاں اپنے اور مستان کے مقابلے کی تفصیل بیان نہیں کی، نہ ہی میں مقابلے کے بعد کسی صورتِ حال کا نقشہ کھینچنا چاہتا ہوں۔ (بے شک کچھ لوگ بہت خوش اور کچھ بہت مایوس ہوئے تھے) میں دراصل قارئین کو اس انہونی کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں جو اس مقابلے کی وجہ سے ہوئی یا یوں کہہ لیں کہ اس انعام کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں جو میری اس قربانی کے سبب مجھے ملا۔ اس کو آپ صرف ایک اتفاق کہہ سکتے ہیں اور ٹائمنگ کی کرشمہ کاری بھی مگر اس حقیقت سے بھی کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ بعض اوقات ہمارے کچھ اچھے کام ہمارے لیے آسانیوں کے راستے کھولتے ہیں۔ میں نے 25 تاریخ کو لاہور سے امارات کی ائیر لائن پر کوپن ہیگن روانہ ہونا تھا۔ اس مقابلے کی وجہ سے میں نے اپنی روانگی چار دن لیٹ کی یعنی اپنا اور عارف کا ٹکٹ 29 تاریخ کا کرا لیا۔

اور 28 تاریخ کو پاکستان میں میرے عارضی سیل نمبر پر ایک ایسی کال آئی جس نے میرے لیے بہت کچھ بدل دیا۔ یہ کال اس فرح نامی جواں سال لڑکی کی طرف سے تھی جس سے میری ملاقات چند ہفتے پہلے تنویر پاشا کے عشرت کدے پر ہوئی تھی۔ یوں تو پلپلا تنویر پاشا اس عشرت کدے میں راجا اندر بن کر بیٹھا رہتا تھا تاہم جس رات میں نے اس کے ٹھکانے پر شب خون مارا تھا وہاں صرف دو ہی لڑکیاں موجود تھیں۔ ایک ٹی وی آرٹسٹ جاناں اور دوسری یہ فرح۔ فرح نے اس رات میرے ساتھ کافی تعاون کیا تھا اور اس کے رویے سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ وہ ایک رکھیل کی حیثیت سے پاشا کے خلاف بہت بھری ہوئی ہے۔ فون پر فرح کی آواز سن کر میں بری طرح چونکا۔ میں نے سب سے پہلا سوال اس سے یہی کیا۔

''تمہارے پاس یہ نمبر کیسے آیا؟''

اس نے پہلے معافی مانگی پھر بولی۔ ''جب آپ تنویر پاشا کو دیکھنے دوسرے کمرے میں گئے تھے تو آپ کا فون صوفے پر پڑا ہوا تھا، میں نے اس میں سے نمبر دیکھ لیا۔''

میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میں تو صرف دس پندرہ سیکنڈ کے لیے نکلا تھا۔''

''میرے لیے یہ دس پندرہ سیکنڈ ہی کافی ثابت ہوئے تھے...... اس کے لیے ایک بار پھر آپ سے معذرت چاہتی ہوں۔''

''کیا میں فون کرنے کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟''

''وجہ صرف یہ ہے کہ آپ مجھے بہت اچھے لگے ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''اس کو کوئی غلط معنی نہ پہنایئے گا۔ دراصل میں نے چہرہ شناسی کو بہت اسٹڈی کیا ہے۔ اس حوالے سے باقاعدہ ایک غیر ملکی ڈپلوما ہے میرے پاس۔ بڑا دعویٰ تو نہیں کرتی مگر اتنا ضرور کہہ سکتی ہوں کہ برے بھلے بندے کی خاص طور سے مرد کی پہچان مجھے ہو جاتی ہے۔''

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''اس کے باوجود تم پاشا جیسے کمینے کے چکر میں پھنس گئیں۔ اس کو اپنے اوپر اتنا حاوی کر لیا کہ اس نے نہ صرف تمہاری منگنی تڑوائی بلکہ شادی کے جھوٹے وعدے پر تمہارے ساتھ گناہ کی زندگی بھی گزار رہا ہے۔''

وہ ذرا توقف سے بولی۔ ''شاہ زیب صاحب! اپنے ساتھ ہونے والے اس حادثے کے بعد تو میرے اندر یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میں لوگوں کو جانوں، ان کو سمجھوں اور ان کے اندر جھانک کر دیکھوں۔ خاص طور سے مرد ذات کو۔''

میں نے کہا۔ ''میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے، کیا تم اپنی بات کو مختصر کر سکتی ہو؟''

وہ بولی۔ ''میرا دل کہتا ہے کہ آپ کو کمزور اور بے بس لوگوں کی مدد کرنا اچھا لگتا ہے اور یہ ہر کسی کے بس کی بات ہوتی بھی نہیں۔ اللہ نے آپ کو ہمت اور جرأت دی ہے اور اس ہمت اور جرأت کے بھروسے پر میں ہاتھ باندھ کر آپ سے ایک درخواست کرنا چاہتی ہوں۔''

''تم نے جو بھی کہنا ہے جلدی کہہ دو۔''

''میں آپ سے صرف اور صرف دس منٹ مانگتی ہوں اور وہ بھی اپنے لیے نہیں کسی اور کے لیے اور میں آپ کو یہ بھی یقین دلاتی ہوں کہ آپ کے یہ دس منٹ ضائع نہیں ہوں گے۔ اگر آپ کو لگے کہ آپ کا وہ وقت ضائع ہوا ہے تو آپ جو جرمانہ کریں جو سزا دیں مجھے قبول ہوگی۔''

فرح کے لہجے میں عجیب سی التجا تھی۔ کوئی ایسی بات تھی جس نے مجھے متاثر کیا۔ نہ جانے کیوں مجھے شک ہوا کہ وہ اپنے ہی جیسی کسی مظلوم عورت کے سلسلے میں مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔

''پلیز...... شاہ زیب...... پلیز...... میری یہ درخواست ٹھکرایئے گا مت۔ میں صرف دس منٹ مانگ رہی ہوں آپ سے۔ اس کے بعد سب کچھ آپ پر چھوڑ دوں گی۔ ایک لفظ بھی نہیں کہوں گی۔''

''تم اس وقت کہاں ہو؟'' میں نے گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔

''لاہور میں ہی ہوں۔ آپ جہاں بھی کہیں، میں زیادہ سے زیادہ بیس منٹ میں پہنچ جاؤں گی۔''

میں بدفطرت پاشا کو اب کافی اچھی طرح جان چکا تھا اور فرح اس کے جور و ستم کا تختہ مشق بننے والوں میں سے ایک تھی۔ نہ جانے اب وہ کیا بپتا سنانا چاہتی تھی۔ پاشا کا منحوس چہرہ میری نگاہوں میں گھوما۔ میں نے فیصلے پر پہنچتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے، میں دس پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں دے سکوں گا۔ تم عثمان ریسٹورنٹ، میکلوڈ روڈ پر پہنچ جاؤ لیکن ایک بات پھر ذہن نشین کر لو۔ میں ڈاج دینے والوں کے ساتھ کچھ زیادہ اچھا سلوک نہیں کرتا۔ تم انڈرویئر میں پاشا کی حجامت ہوتے ہوئے دیکھ ہی چکی ہو سی ٹی وی پر۔''

وہ عجیب جذباتی لہجے میں بولی۔ ''اگر آپ کو مجھ پر ذرا سا بھی شک ہو تو میری کنپٹی پر گولی مار دیجیے گا۔ میں اپنے پرس میں یہ تحریر لکھ کر رکھ لیتی ہوں کہ میں اپنے ہاتھوں سے اپنی جان لے رہی ہوں یا پھر جیسے بھی آپ کہیں، میں آپ کو یقین دلانے کو تیار ہوں۔''

○......❖......○

میرے ذہن میں بار بار یہ بات آ رہی تھی کہ شاید فرح سے بات کر کے میں پاشا اور اس کے پشت پناہ شکیل داراب کے بارے میں کچھ اور جان سکوں۔ ٹھیک ایک گھنٹے بعد میں عثمان ریسٹورنٹ میں موجود تھا اور چائے کی چسکیاں لیتا ہوا فرح کا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے تین چار منٹ سے زیادہ اس کی راہ نہیں دیکھنا پڑی۔ یہ شام پانچ بجے کا وقت تھا۔ ڈائننگ ہال کا مین دروازہ کھلا اور دو لڑکیاں اندر داخل ہوئیں۔ ان میں سے ایک کو تو میں نے دور ہی سے پہچان لیا، وہ فرح تھی۔ وہ ماڈرن لباس میں تھی اور کوٹ کے نیچے اس نے جینز پہن رکھی تھی۔ دوسری لڑکی مشرقی لباس شلوار قمیص میں تھی۔ اس نے اپنا نصف چہرہ سیاہ رنگ کی شال میں چھپا رکھا تھا۔ وہ کچھ ڈری سہمی بھی دکھائی دیتی تھی۔

ہال میں آ کر فرح نے دائیں بائیں دیکھا اور پھر سیدھا میری طرف آئی۔ دوسری لڑکی نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ میں نے اٹھ کر انہیں ویل کم کہا۔ رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد وہ میرے رُوبرو بیٹھ گئیں۔ فرح سے یہ میری دوسری ملاقات تھی۔ وہ ایک پڑھی لکھی ہوشیار لڑکی تھی مگر ہوس پرست پاشا کے جال میں اس طرح پھنسی ہوئی تھی کہ اس کی ساری صلاحیتیں زیرو ہو کر رہ گئی تھیں۔ اس نے اپنے حالات سے جیسے سمجھوتا کر لیا تھا بہرحال جو عورتیں ایسے سمجھوتے کر لیتی ہیں ان کے اندر بھی بغاوت کی چنگاریاں کبھی نہ کبھی تو چمکتی ہی ہیں۔ شاید فرح کے اندر بھی آج کوئی ایسی ہی چنگاری چمکی ہوئی تھی اور وہ اپنے جیسی کسی مظلوم لڑکی کے ساتھ میرے سامنے آن موجود ہوئی تھی۔

''آپ کیسے ہیں؟'' فرح نے مجھ سے پوچھا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

''مجھے آپ کے بارے میں بہت سی باتوں کا پتا چل گیا ہے اور مجھے لگ رہا ہے کہ اس رات میں نے آپ کو پاشا کے بارے میں جو ایک کلیو دیا تھا اس سے کچھ نہ کچھ آپ کو حاصل ہوا ہے۔''

''یہ بات تم کیونکر کہہ رہی ہو؟''

''آج کل پاشا کا خمار کچھ اترا ہوا ہے۔ میں نے یہ بھی سنا ہے کہ اپنے نوجوان باس شکیل داراب کی طرف سے اس پر کچھ لعنت ملامت بھی ہوئی ہے۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے کہ اس لعنت ملامت کے پیچھے بھی آپ کا ہاتھ ہے۔ شاید اس رات آپ نے پاشا کی جو درگت بنائی تھی اس کی وجہ سے اس کے ستارے گردش میں ہیں۔''

جب فرح بات کر رہی تھی اور میں اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا، میری اچٹتی سی نظر اپنے

سامنے بیٹھی لڑکی پر پڑی۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے چادر کے نقاب نے اس کا نصف سے زائد چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔ بس آدھی ناک، آدھے سے کم رخسار، آنکھیں اور پیشانی نظر آرہے تھے اور سب سے پہلے مجھے اس کی پیشانی ہی دکھائی دی تھی۔ یوں لگا جیسے بے دھیانی میں، میں نے اپنا ہاتھ ہزاروں وولٹ کے ننگے تار پر رکھ دیا ہو یا پھر کسی نے عقب سے آکر میرے سر پر ایک طاقتور بم پھوڑ دیا ہو۔ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں لیکن میں یقیناً بے ساختہ اپنی کرسی سے اچھل پڑا تھا۔ میرے سامنے وہی بیٹھی تھی جسے میں نے اس شہر کے گلی کوچوں میں دیوانہ وار ڈھونڈا تھا اور اب تقریباً مایوس ہو کر اس شہر اور ملک کو چھوڑ رہا تھا۔ پچھلے قریباً ساڑھے تین برس میں، میں نے سیکڑوں بار اس کے بارے میں سوچا تھا اور اس کی تلاش میں اپنے سیل فون کی اسکرین پر نگاہیں دوڑائی تھیں لیکن ان لمحوں میں...... کم از کم ان لمحوں میں، میں اس کے بارے میں نہیں سوچ رہا تھا...... اور نہ میری نگاہیں اس کی تلاش میں بھٹک رہی تھیں اور وہ میرے سامنے، مجھ سے صرف دو فٹ کی دوری پر بیٹھی ہوئی تھی۔

''کک...... کیا ہوا؟'' فرح نے گھبرا کر پوچھا۔

یہی وقت تھا جب اس نے اپنی گھنیری پلکیں اٹھائیں اور مجھ پر نظر ڈال کر قدرے حیران دکھائی دینے لگی مگر یہ حیرانی مجھے پہچاننے جانے کی نہیں تھی۔ یہ ویسی ہی حیرانی تھی جیسی فرح کو ہوئی تھی۔ فرح کی حیرانی یہ تھی کہ میں اس بری طرح کیوں چونکا ہوں۔

''کیا بات ہے شاہ زیب؟ کیا آپ...... میرا مطلب ہے آپ اس کو پہلے سے جانتے ہیں؟'' فرح نے پوچھا۔

''نہیں...... ایسی تو کوئی بات نہیں۔ ہاں...... ان کی شکل...... کسی سے بہت زیادہ ملتی ہے اور میں اُسے جانتا تھا۔ یہیں لاہور میں ملاقات ہوئی تھی۔'' میں نے بات بنائی۔

''یہ بے چاری تو کبھی لاہور آئی ہی نہیں۔ بڑے دور دراز گاؤں کی رہنے والی ہے۔ گوجرانوالہ سے آگے جائیں تو ڈسکہ کی طرف ان کا گاؤں آتا ہے، چاند گڑھی۔ صرف خاص مجھ سے ملنے کے لیے بے چاری اتنا لمبا سفر کر کے آئی ہے۔ یہاں لاہور میں اس کی ایک بہن بیاہی ہوئی ہے اس کے پاس ٹھہری ہے......''

فرح باتیں کر رہی تھی اور مجھے اس کی آواز جیسے کہیں بہت فاصلے سے آتی محسوس ہوتی تھی۔ اردگرد کے مناظر میری نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ یہ سو فیصد وہی تھی۔ کیا وہ بھی مجھے پہچان پائی تھی؟ ساڑھے تین سال پہلے جب میں اس سے ملا تھا تو میرا حلیہ بالکل اور تھا۔ لمبے بال، مونچھیں، داڑھی۔ اب میں ایک صاف ستھرا کلین شیو نوجوان تھا۔ میری ڈریسنگ بھی

بہت مختلف تھی۔

میری زبان پر بے ساختہ وہ سوال آ گیا جو برسوں سے مجھے پریشان کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''ان کا نام؟''

''تاجور...... تاجاں بھی کہتے ہیں۔'' فرح نے جواب دیا۔ ''دور دراز گاؤں میں رہنے کے باوجود اس نے میٹرک کیا ہوا ہے۔ آگے پڑھنے کا ارادہ بھی رکھتی تھی مگر اس کے حالات...... بہت بری طرح پھنسی ہوئی ہے یہ۔ اسے مدد کی ضرورت ہے۔ کسی دلیر شخص کی مدد کی ضرورت۔''

میں فرح کی باتیں ضرور سن رہا تھا لیکن میرے کانوں میں فقط تاجور کا لفظ ہی گونج رہا تھا۔ کتنا جانا پہچانا لگا تھا یہ نام...... جیسے میرے کانوں تک پہنچنے سے پہلے ہی یہ میری روح میں بسا ہوا تھا۔ شاید ٹھیک ہی کہتے ہیں محبوب کی ذات سے وابستہ ہر چیز پیاری ہو جاتی ہے۔ چاہے وہ کیسی بھی ہو، میں اس نام کا مطلب نہیں جانتا تھا۔ شاید ابھی درست طور پر اس کا تلفظ بھی ادا نہیں کر سکتا تھا لیکن یہ مجھے پیارا ہو گیا تھا۔

میں نے اپنی بے تاب سانس اندر کی طرف کھینچی۔ یہ وہی تھی، سو فی صد وہی تھی۔ اس کے جسم کی بھولی بسری مہک سانس کے راستے میرے اندر اتری اور اس مہک نے ساڑھے تین برس بعد اپنی غیر مرئی انگلیوں سے میرے دل کے تاروں کو چھیڑا۔

فرح کہہ رہی تھی۔ ''مجھے چہرہ شناسی کا کوئی بہت بڑا دعویٰ تو نہیں لیکن جتنا تھوڑا بہت علم میرے پاس ہے...... میرا دل کہتا ہے کہ مظلوم عورت ذات کے لیے آپ کے دل میں بہت ہمدردی ہے اور آپ ان لوگوں میں سے نہیں جو صرف ہمدردی رکھتے ہیں۔ آپ اپنی ہمدردی کو عملی شکل بھی دے سکتے ہیں۔ صرف چند منٹ میں آپ اس لڑکی کی مختصر کہانی سن لیجیے۔ اس کے بعد اگر آپ مناسب سمجھیں تو اس کے لیے کچھ کر دیں، میں آپ سے مزید اصرار نہیں کروں گی۔''

''مجھے لگتا ہے فرح بی بی، تم نے مجھ سے کچھ زیادہ ہی توقعات لگا لی ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم یہ سب کچھ کیوں کہہ رہی ہو؟ میری کچھ مصروفیات ہیں اور میں ان میں سے بمشکل وقت نکال کر یہاں آیا ہوں۔'' میں نے جان بوجھ کر بے پروائی ظاہر کی۔ میں فرح کا اور فرح سے زیادہ اس لڑکی کا ردِ عمل دیکھنا چاہتا تھا۔ ورنہ میرے دل کے اندر جو ہلچل مچی ہوئی تھی اس کا حال کچھ مجھے ہی معلوم تھا۔

فرح نے عاجزی سے کہا۔ ''آپ کچھ نہ کچھ کر سکتے ہیں شاہ زیب۔ اگر آپ کے پاس

وقت نہیں تو آپ اپنے کسی دوست یا ساتھی کی ذمے داری لگا دیں۔ وہ کم از کم ایک بار اس کے ساتھ اس کے گاؤں جائے اور دیکھے کہ وہاں کتنے عجیب حالات ہیں۔ میں تو دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہی ہوں۔ اس اکیسویں صدی میں بھی سیانے بیانے لوگوں کے سامنے اس طرح کے تماشے لگائے جاتے ہیں......"

پھر وہ تاجور سے مخاطب ہو کر بولی۔ "تاجاں! اب کیوں منہ کو تالا لگا کر بیٹھی ہوئی ہو۔ بولو نا...... بتاؤ نا شاہ زیب صاحب کو، کیا ہو رہا ہے تمہارے ساتھ۔"

وہ بس اپنی انگلیاں مروڑ کر رہ گئی۔ اس کی گلابی چادر نے اس کا نصف سے زیادہ چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔ ایک آنکھ، ایک رخسار اور ایک کان دکھائی دے رہا تھا۔ وہی شیشے جیسی شفاف جلد جس کے نیچے دوڑتا ہوا خون بھی جھلک دکھا جاتا تھا۔ ہاں بالوں کی وہ دو لٹیں نظر نہیں آ رہی تھیں جو اس چہرے کو ایک شاہکار تصویر کا روپ دیتی تھیں۔

فرح اسے اپنی کہانی سنانے کو کہہ رہی تھی اور یہی کہانی تھی جسے سننے کے لیے میں عرصے سے بے قرار تھا۔ یہ جاننے کے لیے میری سماعت ترس گئی تھی کہ وہ کون تھی؟ کس کی بیٹی تھی اس کے دیگر کوائف کیا تھے؟ وہ کن حالات سے گزر رہی تھی؟

مجھے اس کی ایک آنکھ ہی دکھائی دے رہی تھی اور ایک ہی پلک اور یہ پلک لرز رہی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ یہ پلک اٹھے، وہ میری طرف دیکھے اور میں جان سکوں کہ جس طرح میں نے اسے پہچانا ہے وہ بھی پہچان سکی ہے یا نہیں۔ آثار یہی بتا رہے تھے کہ اس نے نہیں پہچانا۔

جب فرح نے دیکھا کہ وہ کوشش کے باوجود کچھ بول نہیں پا رہی تو اس نے ایک لمبی سانس لی اور یہ ذمے داری خود پر لے لی۔ وہ ٹھہری ہوئی آواز میں بولی۔ "شاہ زیب صاحب آپ نے ظالم شوہروں کے بارے میں تو سنا ہوگا لیکن ظالم منگیتروں کے بارے میں شاید کم ہی سنا ہو۔ منگنی کا دور تو ایک ایسا دور ہوتا ہے جب دونوں فریق ایک دوسرے کو اپنے مزاج کا بہترین رخ دکھاتے ہیں مگر یہاں تاجاں کا واسطہ ایک ایسے کرخت بے رحم منگیتر سے پڑا ہوا ہے جس نے شادی سے پہلے ہی اس بے چاری کی زندگی حرام کر کے رکھ دی ہے۔ سچ پوچھیں شاہ زیب تو یہ جی سکتی ہے نہ مر سکتی ہے۔ بس اس کی ہمت ہے جو ایسے برے حالات میں بھی سانس لیتی جا رہی ہے۔" فرح کی آواز بھرا گئی۔

"اس کے گاؤں کا ہی بندہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"گاؤں کا ہی ہے بلکہ سگے ماموں کا بیٹا ہے۔ پورے خاندان پر دہشت بٹھائی ہوئی ہے اس نے۔ کوئی اس کے سامنے بولتا ہی نہیں۔ کافی سال پہلے اس کے باپ نے پسند کی

لڑکی سے شادی نہ ہونے پر اسے گولیاں مار کر شدید زخمی کر دیا تھا اور لڑکی چند ماہ بعد زخم خراب ہو جانے سے مر گئی تھی۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ خون خرابے کے جراثیم اس بندے کو وراثت میں ملے ہوئے ہیں اور شاید اسی وجہ سے خاندان والے اس سے ڈرتے بھی ہیں۔''

''تاجاں کے ماں باپ کیا کہتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ان بے چاروں نے کیا کہنا ہے۔ باپ دمے کا پرانا مریض ہے۔ تاجاں کے دو بھائی ہیں۔ دونوں اس سے چھوٹے ہیں۔ بڑے کی عمر مشکل سے اب چودہ پندرہ سال ہوئی ہوگی۔ تاجاں سے بڑی دو بہنیں ہیں۔ دونوں بیاہی ہوئی ہیں۔ ایک وہیں ڈسکے کے پاس دوسری یہاں لاہور میں۔''

''تاجاں تمہارے والد کیا کرتے ہیں؟'' میں نے اسے گفتگو میں شامل کرنے کی کوشش کی۔

اس نے پھر ہاتھوں کی انگلیاں مروڑیں اور بس اتنا ہی کہہ سکی۔ ''زمین ہے۔''

بھولی بسری آواز کانوں سے ٹکرائی اور دل کے تار پھر بج اٹھے۔

اس نے نامکمل جواب دیا تھا۔ فرح نے اسے گھور کر دیکھا پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''شاہ زیب! ان کی تین مربعے کی زمین ہے مگر والد دین محمد چونکہ خود بیمار رہتے ہیں اس لیے صحیح طرح کاشت وغیرہ نہیں ہوتی۔ زیادہ تر ملازم ہی کھا پی جاتے ہیں۔ بھائی بے چارے ابھی چھوٹے ہیں، پڑھ رہے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''فرح! تمہاری باتوں سے پتا چلتا ہے کہ تاجاں وہاں شادی کرنا نہیں چاہتی۔ اگر یہ شادی کرنا نہیں چاہتی تو پھر تو یہ سیدھا سادہ معاملہ ہے۔ رشتے دار اس کی مدد کر سکتے ہیں اور اگر وہ نہیں تو گاؤں کی پنچایت ہوتی ہے، پھر کتنا بھی دور دراز گاؤں ہے وہاں پولیس وغیرہ کا وجود بھی ہوگا...... اس کے ساتھ زبردستی کیسے کی جا سکتی ہے؟''

''سب کچھ ہے شاہ زیب لیکن انصاف نہیں ہے۔ آپ نے خود دیکھا ہے اگر شہروں میں یہ حال ہے تو دیہات اور گوٹھوں وغیرہ میں کیا ہوگا۔ میں پھر آپ سے درخواست کرتی ہوں، اللہ نے آپ کو ہمت دی ہے اور کمزوروں کی مدد کا جذبہ بھی دیا ہے۔ آپ صرف ایک بار تاجاں کے گاؤں میں جا کر وہاں کے حالات دیکھ لیں اور اگر خود نہیں جا سکتے تو اپنے کسی اعتبار کے آدمی کو بھیج دیں اور دیکھیں کہ وہاں کچھ لوگ کس طرح اس بے چاری کے گرد گھیرا تنگ کر رہے ہیں۔''

''گھیرا تنگ کر رہے ہیں...... میں سمجھا نہیں؟''

"آپ کو پتا ہی ہوگا ہمارے دیہاتوں میں جھاڑ پھونک اور تعویز گنڈا کس قدر عام ہے۔ اب تو اس کے بارے میں سن سن کر کان پک گئے ہیں۔ تاجاں کے گاؤں میں بھی اسی طرح کے حالات ہیں۔ پیر ولایت نامی ایک بندہ وہاں روحانیت کا ٹھیکیدار بن کر بیٹھا ہوا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ تاجاں کے منگیتر اسحاق نے اس پیر ولایت سے یاری گانٹھی ہوئی ہے۔ پیر ولایت اس کے کہنے پر تاجاں کے خاندان والوں کو ڈراتا دھمکاتا ہے اور مجبور کرتا ہے کہ وہ تاجاں اور اسحاق کے رشتے میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش نہ کریں۔ خاندان میں دو چار گھر ایسے تھے جو اس جھگڑے میں تاجاں اور اس کے والدین کی حمایت کر رہے تھے اور چاہتے تھے کہ تاجاں جیسی کڑی اسحاق عرف ساتے جیسے لوفر کے پلے نہ بندھے مگر ان سب لوگوں کو چپ ہونا پڑا کیونکہ ان کے ساتھ کچھ ایسے واقعات ہوئے جنہوں نے انہیں ڈرا دیا۔ ایک گھر میں تو شاید اتفاقاً ہی ایک بارہ تیرہ سالہ نابینا لڑکی کی موت ہوگئی۔ ایک گھر میں دو افراد بری طرح بیمار ہوئے، انہیں خون کی الٹیاں آئیں اور انہیں گوجرانوالہ کے اسپتال میں پہنچانا پڑا۔ ایک گھر میں آگ لگ گئی اور آگ لگنے سے کچھ دن پہلے دیواروں پر خون کے چھینٹے نظر آتے رہے۔"

"ہاں اس طرح کے شعبدوں کے بارے میں تو میں نے بھی سنا ہے۔" میں نے کہا۔

فرح بولی۔ "پورے گاؤں میں جو دو تین بندے اب بھی اس بات کے حامی تھے کہ تاجاں کی مرضی کے بغیر یہ شادی نہیں ہونی چاہیے، ان میں سے ایک مسجد کے امام صاحب تھے وہ بہت کھل کر یہ بات کرتے تھے کہ ایسی شادی ناجائز ہوتی ہے۔ دو تین مہینے پہلے ہونے والی پنچائیت میں بھی انہوں نے کھل کر یہ بات کہی تھی۔ پچھلے دنوں امام صاحب نے دوسری شادی کی ہے۔ سنا ہے کہ اس شادی کا سارا خرچہ اسحاق کے ایک زمیندار دوست عالمگیر نے کیا تھا۔ اب دو مہینے پہلے اس نے امام صاحب کو مدرسہ بنانے کے لیے اپنی کچھ زمین بھی مفت دی ہے۔ کوئی دس بارہ مرلے جگہ ہے۔ اس کے بعد سے امام صاحب کا رویہ بھی بالکل بدل گیا ہے اور وہ بھی یہ بات کہنے لگے ہیں کہ فساد سے بچنے کے لیے تاجاں کے والدین کو یہ آٹھ دس سال پرانا رشتہ توڑنا نہیں چاہیے۔"

میں نے ایک بار پھر تاجاں کو گفتگو میں شامل کرنے کی کوشش کی۔ میں نے کہا۔ "تاجاں! تمہارا کیا خیال ہے۔ مولوی صاحب کی رائے بدلنے کی وجہ وہی ہے جو فرح نے بتائی ہے یعنی روپیہ اور زمین وغیرہ؟"

وہ ایک بار پھر اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی اور اس مرتبہ سر ہلانے سے وہ دو تین لٹیں بھی

ڈھلک کر پیشانی پر آ گئیں جن کی جھلک دیکھنے کا میں شدت سے منتظر تھا۔

فرح نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''اس میں کوئی شک ہی نہیں ہے۔ اب دیکھیں یہ مولوی صاحب بھی وہی بات کہہ رہے ہیں جو اس سے پہلے پیر ولایت کہتا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ تاجاں کے گھر پر نحوست کے سائے ہیں۔ پچھلے جمعے انہوں نے تاجان کے والد کو بلایا اور اسے کچھ عجیب سی باتیں بتائیں۔ انہوں نے کہا...... دو عورتیں ہیں جو ہر وقت تمہاری بیٹی تاجاں کا پیچھا کرتی ہیں۔ بالکل سیاہ رنگ والی بدصورت عورتیں ہیں۔ عام آنکھ سے نظر نہیں آتیں لیکن وہ ہیں۔ وہ کسی بھی وقت تاجاں کے ساتھ کچھ کر سکتی ہیں۔ اس کی شادی جلدی ہونی چاہیے۔ اس دن کے بعد سے تاجاں کے والد دین محمد شدید بخار میں ہیں۔ غشی کی حالت میں پتا نہیں کیا کیا بولتے رہتے ہیں۔ یہ دو عورتیں والی بات کچھ عرصہ پہلے اس فراڈ پیر ولایت نے بھی کی تھی...... اب بتائیں اس میں کیا شک ہے کہ مولوی صاحب بھی اپنا پرانا مؤقف چھوڑ کر اس کوشش میں لگ گئے ہیں کہ تاجاں اور اس کے گھر والے ساتے کی مرضی کے سامنے سر جھکا دیں۔''

وہ بول رہی تھی اور میں سن رہا تھا۔ یہ سارا معاملہ کسی اور لڑکی کا ہوتا اور فرح مدد کے لیے میرے پاس آتی تو شاید میں کبھی مثبت جواب نہ دیتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کرتا کہ ان دونوں کا رابطہ اپنے خالہ زاد ایڈووکیٹ عبداللہ سے کروا دیتا کہ وہ ان کی دادرسی کی کوشش کرے مگر یہاں تو صورتِ حال ہی کچھ اور تھی۔ ابھی تو میں لاہور سے روانہ نہیں ہوا تھا۔ میں کوپن ہیگن کی فلائٹ پر سوار ہوتے وقت بھی تاجاں کو دیکھ لیتا تو ٹکٹ پھاڑ کر پھینک دیتا اور واپسی کینسل کروا دیتا۔

بہرحال میں نے اپنے جذبات اور احساسات چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیئے اور بڑے تحمل سے مختلف سوالات کرتا رہا۔ میرے ذہن میں جیسے ایک آندھی سی چل رہی تھی۔

ایک موقعے پر میں نے کہا۔ ''فرح! بالفرض میں تاجاں کے ساتھ اس کے گاؤں جانے کی حامی بھر بھی لیتا ہوں تو کیا ہوگا؟ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ میں دو چار گھنٹے یا ایک دو دن میں سارے حالات کو سمجھ لوں اور پھر اس کے لیے کچھ کر بھی سکوں۔ مجھے وہاں رکنا پڑے گا۔ کہیں رہنا پڑے گا اور اس کے لیے کوئی حوالہ چاہیے ہوگا۔''

تاجور یعنی تاجاں نے ایک دم اپنی جھکی ہوئی گردن اٹھائی۔ شال سر سے ڈھلک گئی۔ وہ بالکل کسی الھڑ دیہاتی مٹیار کی طرح بولی۔ ''میرے ذہن میں ایک ترکیب ہے جی...... بالکل ٹھیک رہے گی۔''

میں اور فرح حیران ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ اسے فوراً ہی احساس ہوا کہ وہ بلند آواز میں اور چمک کر بولی ہے۔ وہ یکا یک خاموش سی ہو گئی، اس نے شال اپنے سر پر درست کی اور گردن پھر اداس بکری کی طرح جھکا لی۔ میں زیر لب مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

فرح نے اسے ٹھوکا دیتے ہوئے کہا۔ ''ہاں بولو، کیا بتانا چاہ رہی تھی؟''

اس نے منمنا کر اور رک رک کر جو کچھ کہا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ اس کے والد دین محمد کو ایک ٹریکٹر چلانے والے کی سخت ضرورت ہے، ایسا بندہ جو ٹریکٹر چلا سکے بلکہ بوقت ضرورت اس کی مرمت وغیرہ بھی کر سکے۔ تاجاں نے اشارہ دیا کہ اگر میں ٹریکٹر چلا سکتا ہوں اور انجن کی تھوڑی بہت سمجھ بوجھ بھی رکھتا ہوں تو بات بن سکتی ہے۔ اگر ایسا بندہ پانچ چھ ہزار روپے تنخواہ پر مل جائے تو ابا جی اسے فوراً رکھ لیں گے۔''

''کوئی گارنٹی وغیرہ نہیں مانگیں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''گارنٹی میں دے دوں گی۔'' فرح نے فوراً کہا۔ ''اور وہ قبول بھی کر لیں گے۔''

میں نے سگریٹ سلگانے کی ضرورت محسوس کی لیکن میرے پاس سگریٹ نہیں تھا اور ہوتا بھی تو میں اس حسین چہرے کے سامنے اس طرح کا کثیف عمل نہ کرتا۔ میں نے کہا۔ ''لباس بدل کر اور اپنی چال ڈھال تبدیل کر کے ٹریکٹر ڈرائیور کا روپ تو دھارا جا سکتا ہے تاجاں لیکن میں پنجابی روانی سے نہیں بول سکتا بلکہ جب اردو بولتا ہوں تو اس میں بھی کہیں کہیں انگریزی کے لفظ بول جاتا ہوں۔''

''ہاں، یہ تو ہے۔'' فرح نے اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے کہا۔

میں نے اپنے محبوب کے چہرے پر مایوسی کا سایہ سا لہراتے دیکھا، دل پر جیسے ایک ضرب لگی۔ میں نے کہا۔ ''ایک طریقہ ہو سکتا ہے، میں کچھ بولوں ہی نہیں۔''

''کیا مطلب؟'' فرح نے پوچھا۔

''اوں آں......اوں آں۔'' میں نے کسی گونگے کی طرح ایکسپریشن دیئے اور مسکرانے لگا۔

''ہاں یہ بھی ہو سکتا ہے۔'' فرح نے فوراً تائید کی۔ وہ جیسے اپنے طور پر یہ طے کر چکی تھی کہ اگر میں نے اس کی سہیلی کی مدد کی ہامی بھر لی تو پھر اس کے مسائل اگر پہاڑوں جیسے بھی ہیں تو پرزے ہو کر ہوا میں تحلیل ہو جائیں گے۔ پتا نہیں اگر یہ اس کی چہرہ شناسی تھی یا پھر اس رات تنویر پاشا اینڈ کمپنی کی یادگار درگت دیکھنے کے بعد وہ میرے دم خم کی پرستار اور معتقد ہو گئی تھی۔

اس نے تاجاں کے گاؤں کا نام چاند گڑھی بتایا تھا۔ فرح کے بیان کے مطابق چاند گڑھی لاہور سے ڈیڑھ سو کلو میٹر دور تھا۔ اگر یہ گاؤں ڈیڑھ ہزار کلومیٹر دور بھی ہوتا تو میں سر کے بل وہاں جانے کو تیار تھا، یہ اور بات ہے کہ میں ظاہر کچھ نہیں کر رہا تھا۔ فرح نہیں جانتی تھی کہ میں ایک دن بعد ڈنمارک جا رہا ہوں۔ اگر وہ جانتی ہوتی تو شاید تاجاں کی مدد کے لیے اتنی شدت سے اصرار ہی نہ کرتی۔ بہر حال میرے لیے ڈنمارک کا سفر اسی وقت بے معنی ہو گیا تھا جب میں نے اپنے محبوب چہرے کی پہلی جھلک دیکھی تھی۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ تاجاں کو دیکھنے کے فوراً بعد میرے لیے ڈنمارک والا چیپٹر کلوز ہو گیا تھا۔ اب 28 گھنٹے بعد عارف کو لاہور سے اکیلے ہی فلائی کرنا تھا۔ میں کہیں نہیں جا رہا تھا۔ میں کہیں جا ہی نہیں سکتا تھا۔ مجھے ڈور کا دوسرا سرا مل گیا تھا اور یہ ڈور مجھے جس طرف کھینچ رہی تھی مجھے اسی طرف محو پرواز ہونا تھا۔

O……❖……O

میں اور انیق دونوں دیہاتی لباس میں تھے۔ شلوار قمیص اور لنڈے کے کوٹ۔ پاؤں میں گرگابیاں اور میرے گلے میں ایک رنگ دار مفلر بھی تھا۔ ہم ایک دیہاتی کھٹارا بس میں سے اترے۔ یہ ایک تنگ سڑک کا چھوٹا سا بازار تھا۔ چند خوانچہ فروش، چند دکاندار جنہوں نے کپڑوں کے سائبان تان رکھے تھے۔ مٹھائیوں پر منڈلاتی ہوئی گرد، کچے پکے برتنوں کی دکان، موٹر سائیکل مکینک کی خستہ حال دکان، ڈیزل کا ڈپو اور اس کے سامنے بہت سے رنگ برنگے ڈرم۔ ہمارے اردگرد بس اسی طرح کے مناظر تھے۔ نہر کے ساتھ ساتھ ایک کچا ناہموار راستہ دور کہیں کیکر اور شیشم کے درختوں میں گم ہو جاتا تھا۔ اس راستے پر دودھ کے برتنوں سے لدا ہوا ایک ریڑھا ہچکولے کھاتا ہوا گزر رہا تھا۔ چند تانگے بس اسٹاپ پر موجود تھے۔ ان کے پہیے کیچڑ میں لتھڑے ہوئے تھے۔ تانگا بان آوازیں دے رہے تھے۔ ڈارا پور…… چاند گڑھی…… چاند گڑھی۔''

میں اور انیق ایک تانگے کی پچھلی نشست پر جا بیٹھے۔ چاند گڑھی کا کرایہ بیس روپے فی سواری تھا۔ تانگا بان کے تیور بتا رہے تھے کہ اس میں رعایت کی کوئی گنجائش نہیں۔ تانگا بان نے ہم پر کوئی خاص توجہ نہیں دی، بلکہ اردگرد موجود کسی نے بھی ہمیں قابلِ توجہ نہیں سمجھا۔ ہمارے حلیے تقریباً مقامی لوگوں جیسے ہی تھے بلکہ مقامی کھیت مزدوروں جیسے۔ تانگے میں موجود ایک شخص نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''کہاں سے آئے ہو جوانان؟''

میں نے انگلی سے اپنے بند ہونٹوں کو چھوا اور انکار میں سر ہلایا۔ انیق نے وضاحت

کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ گونگا ہے چاچا جی۔“

”کہاں جارہے ہو؟“

”بس جی روزی روٹی کی تلاش ہے۔“ انیق نے کہا۔

”کہاں پر تلاش ہے؟“ اس نے ذرا زور دے کر پوچھا۔

”دین محمد صاحب کے ڈیرے پر جانا ہے جی، انہوں نے کام کے لیے بلایا ہے۔“ دین محمد کا نام سن کر ادھیڑ عمر شخص کے چہرے پر ناگواری کے آثار نمودار ہوئے اور وہ منہ پھیر کر بیٹھ گیا۔

تانگا بان نے بھی مڑ کر ہماری طرف دیکھا اور مجھے اس کے چہرے سے مسکراہٹ غائب نظر آئی۔ باقی کا سفر قریباً خاموشی سے ہی طے ہوا۔ تانگے میں موجود لوگ آپس میں بات کرتے رہے لیکن ہم دونوں کو کسی نے گفتگو کے قابل نہیں سمجھا۔ ان لوگوں کی زیادہ تر گفتگو فصل، کھاد، بارش اور مقامی لڑائی جھگڑوں کے بارے میں تھی۔ اس گفتگو میں مولوی فدا محمد کی شادی کا ذکر بھی آیا۔ پتا چلا کہ مولوی صاحب کی عمر چالیس کے قریب ہے، انہوں نے ایک چوبیس پچیس سال کی لڑکی سے شادی کی ہے۔ ایک شخص نے اس شادی پر ناک بھوں چڑھائی۔ دوسرے نہ کہا۔

”بھائی شادی ہی کی ہے نا، کوئی گناہ تو نہیں کیا۔ شرعی کام میں کیڑے نکالنے والے ہم کون ہوتے ہیں۔“

معلوم ہوا کہ اس سلسلے میں گاؤں کے اندر دو رائے ہیں۔

چاند گڑھی گاؤں میں قریباً پچاس فیصد مکان کچے تھے۔ ٹیوب ویل کے ساتھ ساتھ ہمیں دو تین کنوئیں بھی دکھائی دیئے۔ ایک کنواں دو گھوڑوں کے ذریعے چلایا جارہا تھا۔ بجلی کے تار تو نظر آرہے تھے لیکن پتا نہیں بجلی یہاں پہنچتی بھی تھی یا نہیں۔ بہرحال موبائل فون یہاں بھی کسی نہ کسی کے ہاتھ میں دکھائی دے جاتا تھا۔ یہ بڑی عجیب بات تھی۔

تانگے سے اتر کر ہم کچھ فاصلے تک پیدل چلے اور پھر دین محمد کے چھوٹے سے ڈیرے پر پہنچے۔ یہاں ٹیوب ویل اور ایک خستہ حال ٹریکٹر دور ہی سے نظر آرہے تھے۔ ڈیرے کے اردگرد زمین کی حالت زیادہ اچھی نہیں تھی۔ دو تین کھیت تو ویسے ہی خالی پڑے تھے اور ان میں جڑی بوٹیاں سر اٹھارہی تھیں۔ دین محمد صاحب ڈیرے پر ہی تھے، ان کی عمر پچپن سے اوپر رہی ہوگی۔ کمزور جسم پر سفید قمیص اور تہبند باندھ رکھا تھا، سر پر سفید پگڑی تھی۔ انہوں نے مجھے سرتاپا دیکھا پھر میرے سوٹ کیس اور بستر کو دیکھا۔ تب انیق سے مخاطب ہوکر بولے۔ ”یہ گونگا ہے؟“

”جی ہاں لیکن بندہ کاریگر ہے، گاڑی کے پرانے انجن میں بھی نئی جان ڈال دیتا

ہے۔"

"پر یہاں گاڑی تو نہیں ٹریکٹر ہے۔"

"ٹریکٹر ہو یا بلڈوزر یا کوئی اس سے بھی بڑی شے جی۔ ایک دم ماسٹر ہے ان کاموں میں۔ بس قسمت کا مارا ہے، آج کل کوئی کام شام نہیں ہے اس کے پاس۔"

دین محمد نے حقہ گڑگڑایا اور کہا۔ "میں نے ٹیلی فون پر فرح بی بی کو بتا دیا تھا، میں چار ہزار سے زیادہ نہیں دے سکوں گا اور وہ بھی اس کا کام دیکھنے کے بعد۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔"

"اور خیر سے تم کس مرض کی دوا ہو؟" دین محمد نے انیق سے پوچھا۔ اس نے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر رکھے اور عاجزی سے بولا۔ "نوکر کیا اور نخرا کیا، جناب، آپ جو حکم دیں گے کروں گا، چارا کاٹنے سے بھینسیں نہلانے تک ہر کام پر حاضر جناب ہوں جی۔"

"کوئی تجربہ بھی ہے؟"

"معافی چاہتا ہوں جی، بھینسیں نہلانے میں کیا تجربہ ہوتا ہے۔ بس اس کی گیلی پوشل سے ہی بچنا ہوتا ہے نا۔"

"گیلی پوشل سے بھی اور اس کے سینگوں سے بھی۔" دین محمد نے کہا اور اس کے پاس بیٹھے ہوئے دو افراد مسکرانے لگے۔ دین محمد نے بھی مسکرا کر انیق کو دیکھا پھر ایک دم سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ "اردگرد کسی کی بات پر دھیان نہیں دینا بس اپنے کام سے کام رکھنا ہے۔ تم دونوں یہاں صرف مزدوری کے لیے آئے ہو، اپنے اس ساتھی کو بھی سمجھا دو۔" دین محمد نے میری طرف اشارہ کیا۔

ہم دونوں کو دین محمد کے ملازم نے ایک کمرا دکھا دیا۔ یہ نیچی چھت والی ایک ڈھارا نما جگہ تھی۔ تین ننگی چارپائیاں پڑی تھیں۔ ہم نے اپنے بستر اور دیگر سامان یہاں رکھ دیا۔ ملازم کا نام سولنگی تھا، اس نے انیق کو بتایا کہ دو وقت کا کھانا ملے گا۔ اگر دوپہر کو کھانے کی عادت ہے تو پھر اپنے پلے سے کھانا پڑے گا۔ سولنگی کے بازو پر کوئی چوٹ لگی ہوئی تھی اور اس نے پٹی باندھ رکھی تھی۔

بجلی یہاں تحفے کے طور پر بس ایک دو گھنٹے کے لیے آتی تھی۔ رات کو جب ہم لالٹین کی روشنی میں لحاف اوڑھے بیٹھے اور گاؤں کی ایک خاموش شب کو دھیرے دھیرے سرکتے دیکھ رہے تھے سولنگی ہمارے لیے کھانا لے آیا۔ یہ دال کریلے اور خمیری روٹی پر مشتمل تھا۔ ساتھ میں سوجی کا حلوہ تھا۔ اس کھانے نے جو لطف دیا اس نے کوپن ہیگن، روم اور لندن کے

عالیشان ہوٹل میں کھائے ہوئے ڈنرز کو پیچھے چھوڑ دیا اور کھانے سے بھی بڑھ کر کھانے کا ماحول تھا۔ لالٹین کی مدھم روشنی، کھڑکیوں سے باہر ہلکی دھند، مٹی کی انگیٹھی میں اپلوں کی آگ، دور کھیتوں میں چلتے ہوئے کسی ٹریکٹر کی مدھم آواز، یہ سب کچھ میرے لیے نیا تھا اور نہایت حیران کن بھی۔ میں پاکستان کا یہ رخ شاید پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ شہر کی حبس زدہ مشینی زندگی اور یہاں کے خاموش پُرسکون رہن سہن میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ سونگی نے انیق سے باتیں کرتے ہوئے کہا۔ ''چاچا دین محمد کی بیٹی کو ہم سب نکی بھین (چھوٹی بہن) کہتے ہیں۔ اللہ اس کی عمر لمبی کرے بہت ہمدرد ہے۔ ہم ملازموں، مزدروں کا بڑا خیال رکھتی ہے۔ مہینے میں دو چار بارا پنے ہاتھ سے کھانا پکا کر یہاں ڈیرے پر بھجواتی ہے، آج بھی شاید اس نے ہی پکایا ہے۔''

ایک دم مجھے لگا کہ کھانے کا لطف کئی گنا بڑھ گیا ہو۔ میں نے روٹی کا نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے سوچا۔ ''کیا واقعی اسے تاجور کے ہاتھ لگے ہوں گے؟''

تاجاں یعنی تاجور کو یقیناً پتا چل گیا تھا کہ ہم یہاں آچکے ہیں لیکن ابھی تک اس کی جھلک نظر نہیں آئی تھی حالانکہ دین محمد کا گھر ڈیرے سے بہت زیادہ دور نہیں تھا۔ درمیان میں صرف تین چار کھیت ہی پڑے تھے۔ میرا ذہن ابھی تک یہ معما حل کرنے کی کوشش میں مصروف تھا کہ جس طرح میں نے تاجور کو پہچانا ہے وہ بھی مجھے پہچان چکی ہے یا نہیں یا پھر پہچان کر انجان بنی ہوئی ہے۔

کھانے کے کچھ دیر بعد دودھ پتی آگئی۔ خالص دیہاتی دودھ کی یہ دودھ پتی، ان چاکلیٹس ڈرنکس اور ہاٹ سیرپس سے بہت جدا چیز تھی جو اب تک میرے ہونٹوں تک پہنچتے رہے تھے۔ کیا یہ بھی اس نے بنائی ہوگی، اس کے ہاتھوں نے ان پیالیوں کو چھوا ہوگا یا شاید یہ کسی اور نے بنائی ہو لیکن یہ اس کے گھر سے تو آئی تھی۔

اس دوران میں ایک بڑے دلچسپ کردار سے ہماری ملاقات ہوئی۔ رات کے قریباً دس بجے تھے جب دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ سونگی نے دروازہ کھولا۔ سامنے ایک کیم شیم پہلوان نما شخص کھڑا تھا۔ گھنی مونچھیں، چھوٹا سر اور بڑا چہرہ۔ اس نے گرم چادر کی بکل مار رکھی تھی لیکن وہ پنجابی نہیں لگتا تھا۔ بعدازاں یہ اندازہ درست ثابت ہوا۔ وہ ذات کا میو تھا اور اس کا پورا نام حشمت میو راہی تھا۔ وہ روانی سے اردو بولتا تھا اور پہلوانی کے علاوہ ہڈیوں کا علاج بھی کر لیتا تھا۔ اس وقت بھی وہ ہمارے کمرے کے ساتھی سونگی کا ٹوٹا ہوا بازو دیکھنے آیا تھا۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ اس کا انداز اتنا رازداری کا کیوں ہے جیسا کہ بعد میں پتا چلا

کہ سولنگی دور سے حشمت راہی کا تعلق دار بھی تھا۔ وہ سولنگی کے ٹوٹے ہوئے بازو کی مرہم پٹی کرنا چاہتا تھا مگر سولنگی چونکہ دین محمد کا ملازم تھا اور دین محمد کا حقہ پانی گاؤں کے لوگوں نے تقریباً بند کر رکھا تھا لہٰذا حشمت رات کے وقت چوری چھپے اسے دیکھنے آیا تھا۔

حشمت نے ہم دونوں کو قدرے حیرت سے دیکھا۔ سولنگی نے ہمارا تعارف کرواتے ہوئے بتایا، اس کا نام شاہ زیب ہے، یہ ٹریکٹر چلاتا ہے اور مرمت بھی کرتا ہے اور یہ اس کا ساتھی انیق ہے، یہ کھیتوں میں کام کرے گا۔“

حشمت نے دھیان سے مجھے دیکھا اور بولا۔ ”ابے کام شام بھی جانتا ہے یا پھر ہینڈل گھمانا ہی آوت ہے؟“

سولنگی نے کہا۔ ”یہ بول نہیں سکتا پہلوان ویسے کام کا پکا ہے۔“

”چلو ہاتھ کنگن کو آرسی کیا جب کام شروع کرے گا تو پتا چل جاوے گا۔“

حشمت نے سولنگی کے بازو کی پٹی کھولی، تھوڑی سی مالش کی اور نئی پٹی باندھ دی۔ معلوم ہوا کہ سولنگی بانس کی سیڑھی سے گر پڑا تھا۔ پہلوان تقریباً آدھا گھنٹا وہاں رکا۔ اندازہ ہوا کہ وہ دلچسپ شخصیت کا مالک ہے، غصے کا ذرا تیز تھا لیکن فطری طور پر ہمدرد لگتا تھا۔ اپنی گفتگو میں اونگیاں بونگیاں بھی مارتا رہا۔ اس کا خیال تھا کہ پاکستان میں ہڈیوں کے جتنے ڈاکٹر اور سرجن ہیں ان کو کسی بحری جہاز میں بٹھا کر سمندر میں ڈبو دینا چاہیے۔ خاص طور سے سرکاری اسپتالوں کے ڈاکٹروں کو کیونکہ وہ اپنے گندے اوزاروں سے لوگوں کی زندگیاں تباہ کر رہے ہیں اور انہیں معذور کر رہے ہیں۔ اس کے خیال میں دیسی طریقے سے بہتر کوئی علاج نہیں تھا اور اس کا خاندان کئی نسلوں سے یہی کام کر رہا تھا۔ اس نے یہ انکشاف بھی کیا کہ ہیر رانجھا کا اہم کردار کیدو ایک حقیقی کردار تھا۔ اس کی ٹانگ ایک بیل گاڑی کے نیچے آ کر چکنا چُور ہو گئی تھی۔ اس زمانے میں کوئی بڑے سے بڑا مائی کا لال ڈاکٹر بھی ہوتا تو ٹانگ کو کٹنے سے بچا نہیں سکتا تھا لیکن اس کی ٹانگ بچی رہی اور یہ اس کے بزرگوں کا ہی کارنامہ تھا۔ ایک حیرت انگیز انکشاف یہ بھی ہوا کہ پہلوان ہڈیاں جوڑنے کے علاوہ شعر بھی جوڑتا ہے اور راہی کے تخلص سے بڑی گاڑھی اردو میں شاعری فرماتا ہے۔ پہلوانی اور شاعری تو بالکل متضاد میدان تھے۔ جاتے جاتے اس نے انیق کو اپنا ایک شعر بھی سنایا۔

یہ نہ سمجھنا کہ تم بھلا دو گے ہمیں کل پرسوں
ہم نہ ہوں گے تو روئے گا ہمیں زمانہ برسوں

اس کے جانے کے بعد انیق دیر تک سر دھنتا رہا اور سولنگی کو بتاتا رہا کہ اس پائے کا شعر

شاید ہی مرزا غالب کے بعد کسی نے کہا ہو۔ سولنگی، پہلوان کو اپنا ماموں کہتا تھا۔ انیق نے کہا۔
"سولنگی! تمہارے حشمت ماموں کو فوراً لاہور چلے جانا چاہیے وہاں کی فلم انڈسٹری کا اگر بیڑا غرق ہو رہا ہے تو اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ حشمت ماموں جیسے شاعر اور ادیب یہاں چاند گڑھی جیسے دیہات میں بیٹھے ہیں۔"
سولنگی بھی فلموں کا شوقین تھا۔ دونوں میں فلمی گفتگو شروع ہوئی اور بہت دور تک گئی۔ میں بھی سنتے سنتے سو گیا۔

O......❖......O

اگلی صبح بڑی خوب صورت تھی۔ مجھے مرغ کی مسلسل اذان نے ہی جگایا تھا۔ میں انگڑائی لے کر اٹھا اور دروازہ کھول کر دیکھا۔ کھیتوں پر دور تک کہرے کی ہلکی سی چادر تھی۔ درختوں کے شبنم آلود پتے دھلے دھلائے تھے اور کہیں کہیں قطرہ قطرہ پانی ٹپک رہا تھا۔ ہوا اتنی صاف اور تازہ تھی کہ پھیپھڑوں کے بجائے روح میں اترتی محسوس ہوئی۔ بھینسوں کی ایک قطار اپنے گلے کی گھنٹیاں بجاتی ایک کچے پکے راستے پر آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی اور اس قطار کے اوپر پرندوں کی ایک ٹولی مسلسل چکر کاٹ رہی تھی۔ ایک بکری ممیاتی اور دوڑتی ہوئی میرے پاس سے گزری اور چند اور بکریوں کے ساتھ شامل ہوگئی۔ سورج ابھی افق سے ابھرا نہیں تھا لیکن دور ہرے کھیتوں کے عقب میں اس کی لالی محسوس کی جا سکتی تھی۔ یہ کیا منظر تھا، میں مبہوت ہو کر رہ گیا۔ مجھے لگا کہ اصل پاکستان میں نے آج دیکھا ہے۔ اتنا خوب صورت، اتنا سادہ......

ایک ادھیڑ عمر ملازم حق نواز کی بیوی بھی ڈیرے پر ہی رہتی تھی۔ اس کا نام نذیراں تھا۔ نذیراں نے تازہ مکھن سے پراٹھے بنائے جو ہم نے لسی اور لسوڑے کے اچار کے ساتھ کھائے۔ اس کے بعد سردیوں کی سنہری دھوپ میں بیٹھ کر چائے پینے اور ڈیزل انجن کی کوکو نے جدا ہی مزہ دیا۔ میں خود کو کسی اور ہی دنیا میں محسوس کر رہا تھا۔ شاید اس انجوائے منٹ کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں اب عاشرہ اور عارف کی طرف سے بھی بالکل مطمئن تھا۔ حسبِ پروگرام عاف 29 تاریخ کو لاہور سے روانہ ہو کر کوپن ہیگن عاشرہ کے پاس پہنچ چکا تھا۔ مجھے پوری امید تھی کہ ان دونوں کے دن بہت جلد پھر جائیں گے۔
میرا کام صبح آٹھ بجے کے قریب شروع ہوا۔ ٹریکٹر چلانے کی ٹریننگ میں یہاں آنے سے پہلے ہی لے چکا تھا۔ مجھے اس میں بالکل کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ ہاں اگر ٹریکٹر کو ٹرالی کے آگے جوڑ دیا جاتا تو پھر ڈرائیونگ ذرا مشکل اور مختلف ہو جاتی تھی۔ یہ سارا کچھ میں

نے صرف دو دن میں بڑی اچھی طرح سیکھ لیا تھا اور اس دوران میں ٹریکٹر انجن کے اہم نقائص کو پہچاننا اور انہیں دور کرنا بھی شامل تھا۔

دین محمد نے حقہ گڑگڑاتے اور کھانستے ہوئے میرا کام دیکھا اور مطمئن ہوا۔ میں نے دوپہر تک جتنا کام کیا اس نے دین محمد کے علاوہ ڈیرے کے دیگر لوگوں کو بھی حیران کیا بلکہ میں خود بھی حیران ہوا کہ کیا میں واقعی اتنی تندہی اور تیزی سے زمین میں ہل چلا سکتا ہوں۔ شاید میری اس توانائی اور جوش وخروش کے پیچھے کسی اور کا ہاتھ تھا اور جس کا ہاتھ تھا اس کی جھلک بھی میں نے دیکھی اور سرشار رہا۔ یہ دوپہر کوئی دو بجے کا وقت تھا جب انیق نے میرے پاس سے گزرتے ہوئے بہت آہستہ سے کہا۔ ''جناب...... میرا خیال ہے کہ وہ چھت پر ہے۔''

میں نے ''کیا مطلب'' کہنے کے لیے منہ کھولنا چاہا لیکن پھر فوراً یاد آیا کہ اللہ نے مجھے قوتِ گویائی سے ''محروم'' کر رکھا ہے۔

میں نے ٹریکٹر پر بیٹھے بیٹھے ذرا مڑ کر دیکھا۔ تین چار کھیت چھوڑ کر دین محمد کا گھر تھا۔ یہ گاؤں کے ان چند گھروں میں سے تھا جو نیم پختہ تھے۔ گھر کی چھت پر سنہری دھوپ تھی اور کوئی الگنی پر کپڑے پھیلا رہا تھا۔ یہ تاجور ہی تھی۔ ہلکے زرد لباس میں اس کی رنگت کچھ اور بھی کھلی ہوئی تھی۔ ہلکی ہوا میں نہ صرف اس کے بال اڑ رہے تھے بلکہ ایک پہلو سے اس کا لباس بھی جسم کا حصہ بن گیا تھا۔ اس نے دو تین سیکنڈ کے لیے سر گھما کر کھیتوں کے رخ پر دیکھا۔ کیا وہ مجھے دیکھ رہی ہے؟ یہ سوال ایک نہایت مٹھاس بھرے تیر کی طرح میرے سینے میں لگا۔ وہ جانتی تھی میں اس کے لیے یہاں آیا ہوں اور اس کے لیے یہاں موجود ہوں۔ وہ چھت پر رکی نہیں، بہت جلدی نیچے چلی گئی۔

اس روز گاؤں کی جو دوسری اہم ترین صورت مجھے نظر آئی وہ پیر ولایت کی تھی۔ یہ منظر بھی انوکھا تھا۔ میں نے ٹریکٹر کے ریڈی ایٹر میں پانی ڈالتے ہوئے دیکھا ایک مشکی گھوڑے پر ایک دراز قد شخص سوار تھا۔ اس نے زرد رنگ کا کافی بڑا پگڑ باندھ رکھا تھا۔ بالائی جسم پر ایک لمبا چغا سا تھا، گلے میں کچھ مالائیں دکھائی دے رہی تھیں۔ ایک مرید نما شخص نے اس کے گھوڑے کی باگ پکڑ رکھی تھی اور بڑے احترام سے سر جھکائے پیدل جا رہا تھا۔ راستے میں ملنے والے لوگ پیر صاحب کو دیکھتے ہی تیزی سے آگے بڑھتے اور اس کے پاؤں کو چھوتے یا ان پر اپنا ماتھا رکھتے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو گھوڑے کی باگ کو بوسہ دیتے۔ ایک شخص بڑا سا چھاتا لیے پیر صاحب کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا۔ غالباً جہاں پیر صاحب کو گھوڑے سے اترنا تھا

وہاں یہ چھاتا ان کے سر پر تانا جاتا تھا۔
کھیتوں میں کام کرتے ہوئے اکثر مزدور پیر صاحب کی سواری باد بہاری دیکھ کر احتراماً کھڑے ہو گئے اور رخ ان کی طرف پھیر لیا۔
انیق میرے قریب ہی کھیت سے جڑی بوٹیاں کھینچ رہا تھا۔ میلی سی شلوار قمیص میں وہ ننگے سر اور ننگے پاؤں سو فیصد کھیت مزدور ہی دکھائی دے رہا تھا۔ انیق کی شکل وصورت کی خاص بات یہ تھی کہ وہ خاص نہیں تھی، اگر کہا جائے کہ وہ عام سے خدوخال کا مالک تھا تو بے جا نہ ہوگا۔ ایک عام شخص لیکن بہت خاص۔ وہ دھیرے سے بولا۔ ''سراسر فراڈ ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ کریکٹر اس نے کسی ہندی فلم سے چرایا ہے۔''
پلاننگ کے مطابق انیق مجھ سے اشاروں کنایوں میں ہی بات کرتا تھا لیکن کسی وقت موقع تاڑ کر ایک آدھ فقرہ بول بھی دیتا تھا۔ میں نے اس بات کی خاص طور سے پریکٹس کی تھی کہ کسی کے آواز دینے پر چونک کر اس کی طرف نہیں دیکھنا۔ میں گونگا شخص تھا اور یقیناً بہرا بھی تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے اندر اداکاری کی صلاحیتیں ہمیشہ موجود رہی ہیں۔ گونگے بہرے کا یہ روپ میرے لیے زیادہ مشکل ثابت نہیں ہو رہا تھا۔
رات کو ایک عجیب واقعہ ہوا۔ گیارہ بجے کا عمل ہوگا۔ دیہات میں یہ رات گئے کا وقت شمار ہوتا ہے۔ انیق نے میرا کندھا جھنجوڑ کر مجھے جگایا۔ ''کوئی گڑبڑ ہے جی، دین محمد کے گھر کی طرف سے شور سنائی دے رہا ہے۔''
میں نے دیکھا سولنگی اپنے بستر پر موجود نہیں تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا کہ اس نے ہم سے پہلے ہی شور سن لیا تھا اور جائزہ لینے کے لیے باہر چلا گیا تھا۔
ہم نے لالٹین کی لو اونچی کر کے اپنی چپلیں تلاش کیں اور دروازہ کھول کر باہر نکلے۔ سرد ہوا نے استقبال کیا، دین محمد کے گھر کے باہر کئی لالٹینیں گردش کر رہی تھیں، واقعی کچھ گڑبڑ تھی۔ ہم پگڈنڈی پر تیز تیز چلتے گھر کے پاس پہنچ گئے۔ یہ دیکھ کر میرا جسم سنسنا اٹھا کہ ایک چودھری نما شخص، بوڑھے کمزور دین محمد کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجوڑ رہا تھا اور چلا رہا تھا۔
''ماردو......سب کو ماردو، جو تم کو عقل کی بات بتاتے ہیں خون کردو ان سب کا۔''
دین محمد نے کہا۔ ''یہ الزام ہے، میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔''
''تو پھر تیری دھی رانی نے خود کیا ہوگا یا پھر تیری گھر والی نے کیا ہوگا اور کون تھا یہاں تیسرا۔ اگر نادرہ کو کچھ ہو گیا تو میں سیدھا تیرے اور تیری دھی کے خلاف پرچہ کراؤں گا۔''

اتنے میں ایک اور شخص پکار کر بولا۔ ''یہ اور کسی کا کام ہے ہی نہیں۔ یہ دین محمد کی دھی کا کام ہے۔ یہ کل رات بہت لڑی تھی نادرہ سے، ہمارے گھر تک آواز آ رہی تھی اس کی بکواس کی۔''

''ہاں...... یہ اسی نے کیا ہے۔'' ایک اور عورت دوہائی دینے والے انداز میں بولی۔

میں نے دیکھا ایک طرف سے لحیم شحیم پہلوان حشمت تیز تیز قدم اٹھاتا نمودار ہوا، اس کا ایک شاگرد بھی ہمراہ تھا۔ شاگرد کے ہاتھ میں چمڑے کا بڑا سا تھیلا تھا، اس تھیلے میں پہلوان علاج معالجے کا سامان رکھتا تھا۔ پہلوان عجلت کے ساتھ دین محمد کے گھر میں داخل ہو گیا۔

انیق نے سولنگی کو دیکھا تو اس سے پوچھا۔ ''کیا ہوا سولنگی بھائی؟''

سولنگی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر انیق کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا، پھر وہ ہم دونوں کو ساتھ لے کر لوگوں سے کچھ فاصلے پر چلا گیا اور دھیمی آواز میں بولا۔ ''ساتھ والے پنڈ کے نمبردار فیاض کی بیوی نادرہ، مالک (دین محمد) کے گھر میں مہمان آئی ہوئی تھی۔ کسی نے سوتے میں اس کو زخمی کر دیا ہے، بڑی سخت چوٹیں آئی ہیں اس کے منہ سر پر۔ کہتے ہیں کہ جبڑا ٹوٹ گیا ہے اور سامنے کے دو چار دانت بھی نکل گئے ہیں۔''

''یہ کس نے کیا ہے؟''

''اللہ جانے، ابھی تو الزام مالک اور اس کے گھر والوں پر ہی آ رہا ہے۔ یہ عورت دراصل تاجور بی بی اور اسحاق کے رشتے کے لیے آئی ہوئی تھی۔ تاجور اور اس کے گھر والوں کو سمجھانے بجھانے کے لیے۔ بڑے لوگوں کا سمجھانا بجھانا بھی اصل میں دھمکی ہی ہوتا ہے کہ سمجھ جاؤ نہیں تو پچھتاؤ گے۔ سنا ہے کل رات نمبردار کی بیوی اور تاجور میں کافی بحثا بحثی بھی ہوئی تھی، آج یہ معاملہ ہو گیا ہے...... اللہ خیر کرے۔''

میری نگاہوں میں تاجور کی شبیہہ ابھری۔ یہ میرے محبوب کی شبیہہ تھی اور محبوب میں کوئی خامی ہو تو خوبی ہی لگتی ہے۔ میں اپنی محبت کو ایک طرف رکھ دیتا تو بھی میرا دل بڑے یقین سے گواہی دے رہا تھا کہ تاجور ایسی نہیں ہو سکتی۔ کسی سے تلخ کلامی یا تُو تکرار تو اور بات ہے مگر اس طرح کسی پر ہاتھ اٹھانا اور زخمی کر دینا کم از کم تاجور جیسی لڑکی تو نہیں کر سکتی۔

اتنے میں گھر کا دروازہ کھلا اور کچھ لوگ افراتفری میں ایک چارپائی اٹھا کر باہر لے آئے۔ میں نے دیکھا اس پر ایک ادھیڑ عمر عورت نیم بے ہوشی کی حالت میں لیٹی تھی، وہ درمیانے جسم کی تھی۔ اس کا چہرہ اور سر کے بال خون میں لتھڑے ہوئے تھے۔ پہلوان حشمت

بھی اس کے پیچھے تھا۔ اس نے چودھری نما شخص کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''یہ میرے بس کی نہیں ہے بھیا۔ اسے اسپتال لے جانا ہوگا اور ذرا جلدی کریں، کہیں زیادہ خون بہہ جانے سے کام اور خراب نہ ہو جائے۔''

چھ سات آدمیوں نے عورت والی چارپائی اٹھائی اور تیزی سے ایک ٹریکٹر ٹرالی میں ڈال دی۔ ٹریکٹر ٹرالی پر چند اور افراد بھی سوار ہو گئے اور یہ ٹرالی زخمی عورت کو لے کر تیزی سے گاؤں کے کچے راستے پر ہچکولے کھانے لگی۔

ماحول میں ایک سراسیمگی سی تھی، بہت سے افراد بلند آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ ان میں کبھی کبھی کسی عورت کے واویلا کرنے کی آواز بھی شامل ہو جاتی تھی پھر پتا چلا کہ پولیس والے آئے ہیں۔ میں نے علاقے کے تھانیدار کو پہلی بار دیکھا اور یہ دیہاتی تھانے دار بالکل ویسا ہی تھا جیسا میرے تصور میں موجود تھا۔ موٹا تازہ، کھردرے لہجے والا اور چہرے سے بے پناہ سختی ٹپکتی ہوئی۔ یہ سب انسپکٹر تھا۔

سونگی نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ''پتا نہیں اب کس کس کی شامت آتی ہے۔'' اس نے سرگوشی کی۔

دوسرا ملازم حق نواز بولا۔ ''اب ہمیں تو یہاں سے کھسکنا چاہیے۔''

سونگی نے انیق کو اشارہ کیا اور مجھے بھی ٹہوکا دیتے ہوئے بولا۔ ''چل بھئی گونگے ڈیرے پر چلیں۔''

ہم چاروں ڈیرے پر واپس جانے کے لیے پگڈنڈی کی طرف بڑھے۔ ابھی کچھ ہی دور گئے تھے کہ پیچھے سے ایک بھاری آواز آئی۔ ''اوئے ٹھہرو، اِدھر آؤ۔''

سونگی بڑبڑایا۔ ''لو بھئی، ہو گیا کام۔''

تحکمانہ آواز دوبارہ ابھری۔ ہم پلٹ آئے۔ سامنے ایک بغیر وردی کے پولیس والا کھڑا تھا جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا وہ ہیڈ کانسٹیبل تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی درشت لہجے میں بولا۔ ''چلو بھئی تمہیں تھانیدار صاحب بلا رہے ہیں۔''

ہم گھر کی بیٹھک میں پہنچے۔ یہاں ہم سے پہلے آٹھ دس دیہاتی اور موجود تھے۔ یہ سب کے سب کچے فرش پر مسکینوں کی طرح پاؤں کے بل بیٹھے تھے۔ سامنے تین کرسیاں رکھی تھیں، ان میں سے دو پر پولیس والے تھے جبکہ ایک پر چودھری نما شخص براجمان تھا۔

دیہاتی تھانے دار کی آنکھوں سے قہر ٹپک رہا تھا۔ چودھری نما شخص بھی خاصا تپا ہوا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے اشارہ کیا۔ ہم بھی قیدیوں کی طرح پاؤں کے بل فرش پر بیٹھ گئے۔

تھانے دار نے پوچھ گچھ شروع کی۔ سب سے پہلے تو پڑوسیوں کے دو لڑکوں کی شامت آئی۔ یہ شاید واحد گھر تھا جس نے اب بھی دین محمد اور اس کے کنبے سے تعلقات باقی رکھے ہوئے تھے۔ تھانے دار نے دونوں لڑکوں سے ایک ساتھ پوچھا۔ ''ہاں بھئی یہ کس کا کارنامہ ہے؟''

''ہم تو سو رہے تھے جی۔'' بڑے لڑکے نے جواب دیا جس کی عمر چوبیس پچیس سال تھی۔

''پچھلے مہینے تیرا ویاہ ہوا ہے اور تو سو رہا تھا ہیجڑے۔'' تھانیدار نے بیٹھے بیٹھے ٹانگ چلائی جو لڑکے کے سینے پر لگی اور وہ لڑھک کر کچی دیوار سے جا ٹکرایا۔

''اور تُو کیا کر رہا تھا چھوٹے؟'' تھانے دار نے دوسرے بھائی سے پوچھا۔

''مم...... میں جاگ رہا تھا۔'' وہ جلدی سے گھبرا کر بولا۔

''اچھا جس کی نئی نئی شادی ہوئی ہے وہ سو رہا تھا اور جو ابھی چھڑا ہے وہ جاگ رہا تھا، تُو کس چکر میں جاگ رہا تھا بھئی؟'' تھانے دار نے اسے بھی ٹانگ رسید کی اور وہ بھی بھائی کی طرح الٹ کر دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس کی دھوتی تتر بتر ہوگئی اور وہ عریاں ہوتے ہوتے بچا۔

تھانیدار نے اپنے ہیڈ کانسٹیبل کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''ان دونوں بہن خوروں کے بیان کچے ہیں۔ دونوں کو تھانے لے جانا ہے۔''

وہ ہاتھ پاؤں جوڑنے لگے باقی بھی سہم کر سکڑ سمٹ گئے۔ تھانے دار نے ایک درمیانی عمر کے شخص کو آگے بلایا۔ ذرا اونچی ناک والا یہ شخص لرزتا کانپتا تھانیدار کے قدموں میں جا بیٹھا۔ تھانے دار بولا۔ ''تیرا دین محمد کی زنانی سے بڑا یارانہ ہے، تُو کہاں تھا اس واردات کے وقت؟''

وہ بولا۔ ''وہ میری ماں جیسی ہے جی لیکن جب سے پنڈ والوں نے دینے سے ملنا جلنا بند کیا ہے، میں بھی کم ہی آتا ہوں ان کے گھر میں۔''

''یہ تو بڑا احسان کیا ہے تُو نے پنڈ والوں پر...... اوئے کنجر کے پتر، میں جو پوچھ رہا ہوں وہ بتا۔ واردات کے ویلے کہاں تھا؟''

''اپنے گھر میں تھا جی۔'' اس شخص نے تھانے دار کی طرف دیکھ کر کہا۔ گالی کھا کر اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا تھا۔

کیونکہ اس نے تھانے دار کی طرف دیکھ کر بات کی تھی، تھانے دار مشتعل ہو گیا۔ پھنکار کر بولا۔ ''اوئے ماں کے...... ڈیلے نکالتا ہے تیری تو......'' اس نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے دیہاتی

پر تھپڑوں کی بارش کردی۔ ہیڈ کانسٹیبل نے بھی اپنے افسر کا ہاتھ بٹایا۔ دیہاتی کے گلے سے بے ساختہ گھٹی گھٹی آوازیں نکلیں۔

''معاف کردیں جی...... معاف کردیں جی۔'' وہ بس یہی کہتا جارہا تھا۔

دو اہلکار اسے گھسیٹ کر کمرے سے باہر لے گئے۔ تھانے دار چلایا۔'' بڑی اونچی ناک ہے اس کی۔ ذرا زمین پر رگڑے دلواؤ اس کو۔''

اہلکاروں نے دیہاتی کو مجبور کیا کہ وہ لوگوں کے سامنے زمین پر ناک سے لکیریں کھینچے۔ تفتیش کا یہ عالم دیکھ کر قطار میں بیٹھا ایک لڑکا ہچکیوں سے رونے لگا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے اس کی پیٹھ پر دو ہنٹر رسید کیے۔

تھانے دار کا رعب بے پناہ تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ اگر چاہتا تو کمرے میں موجود کسی بھی شخص سے بہ آسانی اعترافِ جرم کرواسکتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ایک بہت بڑا زہریلا ناگ کمرے میں پھن پھیلائے بیٹھا ہے اور اس کی دہشت سے کمرے میں موجود آٹھ دس چوہے سکتہ زدہ ہوگئے ہیں۔ نہ ہل سکتے ہیں نہ اپنی آنکھ جھپک سکتے ہیں۔ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے اپنی ہٹ لسٹ میں اس تھانے دار کا نام بھی شامل کرلیا۔ یہاں گاؤں میں آنے کے بعد اس تصوراتی ہٹ لسٹ میں دو نام اور بھی شامل ہوچکے تھے لیکن ان ناموں کو ابھی فائنل ہونا باقی تھا۔ تھانیدار نے اپنی گرج دار آواز کو کچھ اور گرج دار بناتے ہوئے کہا۔ ''تم سب کو پتا ہے کہ میں مارتا کم ہوں اور گھسیٹتا زیادہ ہوں اور جس کو گھسیٹتا ہوں وہ دو تین مہینے تک اپنی بے بے کی گود میں سیدھا نہیں لیٹ سکتا۔ اس لیے چنگا یہی ہے کہ اگر کسی نے کچھ بتانا ہے تو ٹھکائی شروع ہونے سے پہلے ہی بتادے اور باقیوں کے حال پر رحم کرے۔''

قریباً سب ہی تھوک نگل کر رہ گئے۔ تھانیدار کو طیش آیا۔ اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے اپنی پتلون کی بیلٹ کھولی۔ کافی موٹی اور وزنی بیلٹ تھی۔ وہ کمرے میں ہی مار پیٹ کا ارداہ رکھتا تھا جیسے تھانے میں ہونے والی اصل ٹھکائی کا تھوڑا سا نمونہ دکھانا چاہتا ہو۔ اس نے سب کو دو دو کرارے ہاتھ لگائے اور گالیاں دیں۔ میرے کندھے پر بھی دو جگہ بیلٹ کی سخت ضرب لگی اور چنگاریاں سی چھوٹیں مگر دوسروں کی طرح مجھے بھی خاموش ہی رہنا تھا۔ کسی نے کہا۔ ہائے میں مر گیا۔ کسی نے معافی کی دوہائی دی، کوئی چلا کر رہ گیا۔ یہ سب کچھ اس پولیس والے کو مزہ دے رہا تھا۔

شاید وہ مزید مار پیٹ کرتا لیکن لوگوں کو عاجزی اور بے بسی کی تصویر بنے دیکھ کر اسے اپنے اختیار اور تسلط کے حوالے سے تھوڑی سی تسلی ہوئی۔ ویسے بھی توند بڑی تھی اور بیلٹ نہ

ہونے کے سبب پتلون کے نیچے کھسکنے کا اندیشہ موجود تھا اس لیے اس نے ہاتھ روک لیا۔

○……❖……○

اگلا سارا روز عجیب بے چینی میں گزرا۔ پورے گاؤں پر جیسے ہراس کی فضا طاری تھی۔ تھانے دار سجاد نے دین محمد کے تین ملازموں سمیت چھ سات افراد کو پکڑ کر تھانے میں بند کر دیا تھا۔ سنا تھا کہ ان کی خوب اچھی طرح ٹھکائی ہو رہی ہے۔ ان مصیبت زدگان میں ہمارا کمرے کا ساتھی سونگی بھی شامل تھا۔

دن بھر میں سوچتا رہا کہ یہ حملہ کس نے کیا ہوگا۔ اس سلسلے میں انیق نے دوسرے ملازم حق نواز سے بھی سن گن لینے کی کوشش کی۔ دوسرے لوگوں کی طرح حق نواز بے چارہ بھی بہت سہما ہوا تھا۔ اسے جیسے ہر گھڑی دھڑکا لگا تھا کہ تھانے سے اس کے لیے بلاوا آ سکتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے انیق سے کھل کر کوئی بات نہیں کی صرف اتنا کہا۔ ''نکی بہن تاجور تو ایسا کر ہی نہیں سکتی۔ نہ ہی یہ اس کے گھر والوں میں سے کسی کا کام ہے۔ یہ تو لگتا ہے کہ کسی نے جان بوجھ کر مالک اور اس کے گھر والوں کو پھنسانے کی کوشش کی ہے۔''

حق نواز کی یہ بات درست بھی ہو سکتی تھی۔ اس واقعے کے بعد دین محمد اور تاجاں یعنی تاجور وغیرہ پر بے حد دباؤ آ گیا تھا۔ ان پر پرچہ کٹوانے کی بات ہو رہی تھی۔ سہ پہر کے وقت پتا چلا کہ زخمی نمبردارنی نادرہ تحصیل اسپتال سے واپس آ گئی ہے، تاہم اس کا سارا منہ سر پٹیوں میں لپٹا ہوا ہے اور اس کے سر پر بہت سے ٹانکے بھی لگے ہیں۔

سونگی تو تھانے میں اپنے ناکردہ جرم کی سزا بھگت رہا تھا۔ رات کو میں اور انیق کمرے میں اکیلے تھے۔ یہ ایک دھند آلود یخ بستہ رات تھی۔ بجلی حسبِ معمول غائب تھی، کمرے میں انگیٹھی کی مدھم سی سرخ روشنی تھی۔ میں تاجور کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ ساڑھے تین سال کے بعد ایک حسین اتفاق کے تحت یہ لڑکی مجھے دوبارہ مل گئی تھی لیکن ابھی تک ایک معما ہی تھی۔ اس کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے وہ سارے واقعات بھی یاد آ رہے تھے جو ساڑھے تین سال پہلے پیش آئے تھے۔ وہ اس وقت بھی کسی کے خوف میں مبتلا تھی۔ شام سے پہلے گھر جانا نہیں چاہتی تھی وہ کون تھا کیا اس کا منگیتر ہی تھا یا پھر کوئی اور؟ اچانک کمرے کے دروازے کو کسی نے ہولے سے ہلایا۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے چادر میں لپٹی لپٹائی ایک عورت کھڑی تھی۔ اسے دیکھنے سے پہلے ہی مجھے پتا چل گیا کہ وہ کون ہے۔ اس کے جسم کی جدا مہک میں ہزاروں خوشبوؤں میں سے پہچان سکتا تھا۔

وہ جلدی سے اندر آ گئی اور دروازے کو خود ہی اندر سے کنڈی بھی چڑھا دی۔ اس

دوران میں انیق نے لالٹین کی لَو اونچی کردی تھی۔ تاجور نے اپنے چہرے سے چادر سرکائی۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اس کا جسم سرتاپا کانپ رہا تھا اور بولنے کی کوشش میں ہونٹ بے ساختہ لرز رہے تھے۔

''تاجور بیٹھ جاؤ پلیز۔'' میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

وہ جھجکتی ہوئی چارپائی کے ایک سرے پر بیٹھ گئی پھر دل فگار آواز میں بولی۔ ''میں اپنی جان دے دوں گی لیکن ان لوگوں کے سامنے سر نہیں جھکاؤں گی۔''

میں نے کہا۔ ''تم نے بہت بڑی بات کی ہے اور مجھے تم جیسی لڑکی سے ایسی ہی امید تھی۔''

وہ بولی۔ ''یہ جو کچھ ہوا ہے، مجھے پھنسانے کے لیے ہے۔ ابھی دو گھنٹے پہلے ساقا ہمارے گھر آیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ کل کسی وقت مجھ پر اور اباجی پر پرچہ کٹ جائے گا پھر تھانے کچہری کے چکر پڑ جائیں گے۔ اس نے اشاروں میں بتایا ہے کہ اگر وہ چاہے تو تھانیدار سجاد کو پرچہ کاٹنے سے باز رکھ سکتا ہے۔ اس کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ......'' اس کی آواز بیٹھ گئی اور وہ فقرہ مکمل کیے بغیر سسکنے لگی۔

میں نے اس کے ساتھ تسلی تشفی کے بول بولے۔ وہ قدرے نارمل ہوگئی۔ بہرحال اس کے جسم میں ہلکی سی لرزش اب بھی موجود تھی۔ وہ رات کے وقت اکیلی گھر سے نکلی تھی اور اس وقت ہم دونوں کے ساتھ ایک بند کمرے میں بیٹھی تھی یقیناً یہ ہمت اور دلیری کی بات تھی۔ اس کے علاوہ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا تھا کہ وہ ہم دونوں کی ذات پر بھروسا رکھتی ہے۔ میں نے کہا۔ ''تاجور! ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچ کر بتاؤ یہ کس کا کام ہوسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ نمبرداری تمہارے گھر میں تھی۔ اگر باہر سے کوئی اندر نہیں آیا تو پھر کون ہوسکتا ہے۔ میرا مطلب ہے تمہارے اور تمہارے امی، ابا کے علاوہ اور تو گھر میں کوئی نہیں تھا۔''

''نہیں، کوئی نہیں تھا۔''

''کوئی آہٹ کوئی آواز وغیرہ بھی نہیں آئی تمہیں؟''

''بس تھوڑی سی آوز آئی تھی جیسے دو تین بار کسی بھینس کو لاٹھی ماری گئی ہو۔ میں سمجھی کہ یہ آواز پڑوسیوں کے احاطے سے آئی ہے۔ ان کے تین چار ڈنگر ہماری دیوار کے بالکل پاس بندھے ہوتے ہیں۔''

''تم اس وقت جاگ رہی تھیں؟''

''ہاں میں برانڈے کے ساتھ والے کمرے میں سوتی ہوں لیکن کل بیٹھک میں سوئی

تھی۔ جگہ بدل گئی تھی اس لیے مجھے جلدی نیند نہیں آ رہی تھی۔ اتنے میں دو تین بار ٹھک ٹھک کی اونچی آواز آئی۔ اس کے ایک منٹ بعد ہی نمبردارنی نے برانڈے میں آ کر واویلا کیا اور پھر گر گئی۔ پہلے میں ہی برانڈے میں پہنچی تھی پھر ابا اور امی بھی آ گئے اس وقت تک وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔''

''آس پاس کوئی چیز پڑی تھی...... میرا مطلب ہے جس سے چوٹ لگائی گئی ہو؟'' انیق نے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ تاجور جواب میں کچھ کہتی، میں نے اسے روک دیا۔ ''ٹھہرو تاجور، پہلے ایک بات بتاؤ۔''

وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ دو لٹیں رخسار پر ڈھلک آئیں۔ میں نے کہا۔ ''ابھی تم نے بتایا ہے کہ تم برانڈے کے ساتھ والے کمرے میں سوتی ہو لیکن اس دن بیٹھک میں سو رہی تھیں۔ کیا تم ہمیشہ برانڈے کے ساتھ والے کمرے میں سوتی ہو؟''

''ہاں جی، وہی میرا کمرا ہے۔ چھوٹے سے بڑا بھائی کاکا بھی میرے ساتھ ہی سوتا ہے لیکن وہ آج کل چاچو کے گھر گیا ہوا ہے اس لیے میں اکیلی ہی تھی۔''

''تمہارے بیٹھک میں سونے کی وجہ کیا تھی؟'' میں نے پوچھا۔

تاجور کا جواب میری توقع کے مطابق تھا۔ وجہ نمبردارنی نادرہ ہی تھی۔ تاجور نے اپنے سیدھے سادے لہجے میں بتایا۔ ''نمبردارنی کو سردی کچھ زیادہ لگتی ہے اس لیے ابا جی نے کہا کہ تم تاجور والے کمرے میں سو جاؤ، تاجور بیٹھک میں سو جائے گی۔''

''یعنی تمہارے کمرے کو گھر میں تاجور والا کمرا کہا جاتا ہے۔''

''ہاں جی، دادی کے بعد سے اسے تاجور والا کمرا کہا جانے لگا تھا۔ اب تو دادی کو اللہ بخشے مرے ہوئے بھی آٹھ دس سال ہو گئے ہیں۔''

میرے ذہن میں ایک پھلجھڑی سی چھوٹ گئی تھی۔ برانڈے کے ساتھ والے کمرے کو تاجور کا کمرا کہا جاتا تھا اور وہ وہیں سوتی تھی لیکن تاجور رات وہاں نہیں بلکہ بیٹھک میں سو رہی تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وار کرنے والے نے نمبردارنی نادرہ کو نہیں بلکہ تاجور کو نشانہ بنایا ہو۔

یہ ایک خطرناک پہلو تھا۔ بہرحال میں نے اپنے تاثرات سے تاجور پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ میں نے انیق کے سوال کی طرف واپس آتے ہوئے کہا۔ ''ابھی انیق نے پوچھا ہے کہ کیا تمہیں زخمی نادرہ کے پاس سے کوئی ایسی چیز ملی جسے چوٹ لگانے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہو؟''

تاجور کی شیشے جیسی شفاف پیشانی پر سوچ کی لکیریں ابھریں۔ وہ بولی۔ ''سب یہی کہہ رہے ہیں کہ نمبردارنی کو لکڑی کے اس ڈنڈے سے مارا گیا ہے جو مرچ مسالا پیسنے کے لیے کونڈی میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ ڈنڈا کمرے کی دہلیز پر پڑا ہوا ملا تھا۔ تھانے دار اسے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ کہتا تھا کہ اس پر انگلیوں کے نشان ہوں گے لیکن اس ڈنڈے کو تو بعد میں کئی ایک نے ہاتھ لگایا تھا۔ پتا نہیں کس کس کی انگلیاں اس پر لگی ہوں گی۔''

''کوئی ایسی چیز جو تم لوگوں نے موقع پر دیکھی ہو؟''

میرے اس سوال پر تاجور کے شفاف چہرے پر رنگ سا لہرا گیا۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ بے چاری اپنے اندر کی کوئی بات چھپا ہی نہیں سکتی۔ بالوں کی لٹیں بدستور جھک کر رخسار کو چوم رہی تھیں اور وہ حسبِ عادت انہیں ہٹانا بھول گئی تھی۔

ذرا توقف سے بولی۔ ''آپ یہاں میری مدد کرنے کے لیے آئے ہیں اور میرا دل کہتا ہے کہ آپ مدد کر سکتے ہیں اور مجھے اپنے رب سے بھی پوری امید ہے کہ وہ میرے لیے کوئی وسیلہ ضرور پیدا کرے گا...... ایک چیز میرے پاس ہے اور اس کے بارے میں، میں نے ابھی تک کسی کو نہیں بتایا...... ابا جی کو بھی نہیں۔''

اس نے لرزتے ہاتھوں سے اپنی چادر کے پلو کو پکڑا اور ایک چھوٹی سی گرہ کھول کر کوئی چیز میری طرف بڑھائی۔ یہ بالکل چھوٹے سائز کی ایک تسبیح تھی۔ ایسی تسبیح میں عموماً 33 دانے ہوتے ہیں۔''

''یہ کہاں سے ملی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس چارپائی کے نیچے سے جہاں نمبردارنی سو رہی تھی۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا یہ نمبردارنی کی تسبیح ہو، یہ ہمارے گھر میں سے بھی کسی کی نہیں۔ ابا جی کے پاس تسبیح ہوتی ہے لیکن وہ لکڑی کے دانوں والی بڑی تسبیح ہے۔''

میں نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا، اس کے پلاسٹک کے نارنجی دانے بالکل چھوٹے تھے۔ انگلی کے گرد تسبیح کے دو چکر دیئے جاتے تو اس کی لمبائی ختم ہو جاتی۔

میں نے کہا۔ ''تاجور اسے دیکھ کر تمہارا دھیان کس کی طرف جاتا ہے؟''

اس نے اپنے نچلے ہونٹ کو ہلکے سے اندر کی طرف دبایا۔ بڑی پیاری ادا تھی، ساڑھے تین سال پہلے کے کئی مناظر یاد آ گئے۔ مجھے سب کچھ یاد آ رہا تھا لیکن کیا اسے کچھ یاد نہیں تھا۔ اس نے دائیں ہاتھ سے لٹوں کو پیچھے ہٹایا اور بولی۔ ''میں کوئی غلط بات کہہ دوں گی تو اللہ کی طرف سے مجھ پر اس کا عذاب آئے گا۔ لیکن پتا نہیں کیوں میرا دھیان مولوی فدا محمد کی طرف

بھی جاتا ہے۔ مولوی فدا کو میں جتنا اچھا سمجھتی تھی ان کی جتنی عزت کرتی تھی وہ سب کچھ میرے دل سے ختم ہو گیا ہے۔ مجھے لگتا تھا کہ اس پنڈ میں اگر کوئی میرا ہمدرد اور سہارا ہے تو وہ مولوی فدا ہیں۔ وہ ہر جگہ یہ بات علی الاعلان کہتے تھے کہ شادی کے لیے لڑکی اور اس کے والی کا رضا مند ہونا ضروری ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایک دن وہ اس طرح اپنا فتوی اور اپنی نظریں بدلیں گے اور یہ سب کچھ انہوں نے اپنی دوسری شادی کی وجہ سے اور مدرسے کی زمین ملنے کی وجہ سے کیا ہے۔ کوئی اور اس طرح کا لالچ کرے تو اتنا دکھ نہیں ہوتا لیکن جب نیکی کا درس دینے والا اس طرح سچ کو جھوٹ کہنا شروع کر دے تو ہر ایک پر سے یقین اٹھنے لگتا ہے۔"

یہاں آ کر گاؤں میں، میں نے دو طرح کی رائے نوٹ کی تھیں۔ کچھ لوگوں کا تو خیال تھا کہ مولوی فدا کو اس عمر میں بال بچے دار ہوتے ہوئے ایک جوان لڑکی سے شادی نہیں کرنی چاہیے تھی اور کچھ کا خیال تھا کہ اس میں کون سی برائی ہے۔ اس طرح مدرسے والی زمین کے بارے میں بھی دو رائے تھیں۔ ابھی تک مجھے مولوی صاحب کا دیدار نہیں ہوا تھا۔ ہاں ایک دو بار لاؤڈ اسپیکر پر ان کی گرج دار آواز ضرور سنی تھی۔

یہ چھوٹی سی تسبیح دیکھ کر اور تاجور کی باتیں سن کر نہ جانے کیوں میرا دل چاہا کہ ایک بار مولوی فدا صاحب سے ملاقات کر لی جائے۔

میں نے اپنی گفتگو میں تاجور پر یہ تو ظاہر نہیں ہونے دیا کہ میں کیا سوچ رہا ہوں (میری سوچ اس طرف جا رہی تھی کہ کل رات والا حملہ نمبر دارنی پر نہیں خود تاجور پر ہوا تھا) بہر حال میں نے اسے سختی سے ہدایت کی کہ وہ بہت محتاط رہے۔ بہتر ہے کہ ابا، امی والے کمرے میں ان کے ساتھ سوئے۔ گھر کے دروازے بھی اچھی طرح بند کیے جائیں۔ تھانے دار کے حوالے سے بھی میں نے اسے تسلی تشفی دی اور کہا کہ ہمارے یہاں ہوتے ہوئے اللہ نے چاہا تو اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔

وہ واپس گئی تو میں اور انیق اس وقت تک اسے دیکھتے رہے جب تک وہ کھیت پار کر کے اپنے گھر میں داخل نہیں ہو گئی۔

اس کے جانے کے بعد ہم ایک بار پھر سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ اگر یہ بات درست تھی کہ حملہ نمبر دارنی پر نہیں بلکہ تاجور پر کیا گیا تھا تو پھر کس نے کیا تھا؟ یہ تاجور کے منگیتر اسحاق عرف ساقے کی کارروائی تو ہرگز نہیں ہو سکتی، نہ ہی کسی ایسے شخص کی جو تاجور اور ساقے کی شادی کا حمایتی تھا۔ تاجور کو زخمی کر کے یا مار کر وہ کیا فائدہ حاصل کر سکتا تھا۔

انیق کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔ وہ سولنگی کا خالی بستر دیکھ کر اداس ہوگیا تھا، کہنے لگا۔ "پتا نہیں تھانے میں اس پر کیا بیت رہی ہوگی۔ مجھے تو وہ پرانی فلم ڈاکو رانی یاد آگئی ہے جس میں تھانے دار نے رانی کو کس قدر خوف زدہ کیا تھا۔"

"لیکن کچھ بھی ہے سولنگی عورت تو نہیں ہے۔ ہاں بے چارے کا بازو ضرور ٹوٹا ہوا ہے۔ ہاں یاد آیا، اس نے جھوٹ بولا ہے کہ اس کا بازو سیڑھی سے گر کر ٹوٹا ہے بلکہ یہ مار پیٹ سے ٹوٹا ہے۔"

"مار پیٹ...... کس نے کی؟" انیق نے حیران ہوکر پوچھا۔

"گاؤں والوں نے اور کس نے۔ دین محمد اور اس کے سارے قریبی لوگوں کا حقہ پانی گاؤں والوں نے بند کر رکھا ہے۔ چند دن پہلے سولنگی بے چارہ گاؤں کے کمپاؤنڈر سے پیٹ درد کی دوا لینے چلا گیا۔ درد زیادہ تھا کمپاؤنڈر نے ترس کھا کر دوا دے دی۔ نتیجے میں کمپاؤنڈر کو گالیاں سننا پڑیں مگر سولنگی کی با قاعدہ ٹھکائی ہوگئی۔ ایک لاٹھی لگنے سے اس کا بازو ٹوٹ گیا، اب حشمت پہلوان چوری چھپے آ کر اس کی مرہم پٹی کر رہا ہے۔"

"لیکن آپ کو کیسے پتا چلا؟" انیق نے حیران ہوکر پوچھا۔

"گونگے بہروں کو بہت سی ایسی باتوں کا پتا چل جاتا ہے جو تم جیسے نارمل لوگوں کو نہیں چلتا۔" میں نے زیر لب مسکرا کر کہا پھر وضاحت کرتے ہوئے انیق کو بتایا کہ کل کس طرح حق نواز ایک دوسرے ملازم کے ساتھ میرے سامنے ہی بے دھڑک اس واقعے پر بات کر رہا تھا۔

ابھی ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ انیق کی نظر کھڑکی سے باہر گئی اور وہ ذرا چونک گیا۔ میں نے اس کی نظر کا تعاقب کیا۔ مجھے وہی کل والا شخص نظر آیا جس کو تھانے دار نے دین محمد کی بیوی کا یار کہہ دیا تھا اور اس نے بڑی عاجزی سے کہا تھا کہ وہ تو میری ماؤں جیسی ہے۔ بعد میں تھانے دار نے ذرا سی بات پر مشتعل ہوکر اس وارث نامی شخص کی خوب درگت بنائی تھی اور اسے ناک سے زمین پر لکیریں کھینچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ شخص اب ایک موٹی تازی بکری اور ایک گٹھڑی لیے کہیں جا رہا تھا۔

انیق نے آواز دے کر اسے روکا۔ وہ بے چارہ ٹھٹک کر رک گیا اور ہماری طرف دیکھنے لگا۔ ہم اس کے پاس پہنچے۔ اس کی اونچی ناک پر گہری سیاہ خراشیں نظر آ رہی تھیں۔ یقیناً یہ کل والی سزا کا نتیجہ تھیں۔ وہ بہت سہما ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

"کہاں جا رہے ہو وارث؟" انیق نے اس سے پوچھا۔

"مولوی جی کو ذرا نذرانہ دینا ہے۔"

نذرانہ؟''

''آہو جی یہ ایک بکری ہے، کچھ دیسی گھی اور بادام کی گریاں ہیں۔'' اس نے بادام کی گریوں والا لفافہ دکھایا۔ یہ ڈھائی تین کلو سے کم نہیں تھا۔ دیسی گھی بھی پانچ چھ کلو تو رہا ہوگا۔

''نذرانہ کس بات کا؟'' انیق نے پوچھا۔

وارث کے چہرے پر سایہ سالہرا گیا۔ ''بس جی...... کچھ مصیبت آ گئی ہے۔'' وہ اٹک اٹک کر بولا۔

''تھانے دار والی بات کر رہے ہو؟'' انیق نے پوچھا۔

''آہو جی وہ بھی ہے مگر کل رات...... کچھ اور بھی مسئلہ ہوا ہے ناں۔''

اور مسئلہ؟''

وارث نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور ڈرے ڈرے سے انداز میں جو کچھ بتایا اس سے پتا چلا کہ کل رات اس کے گھر پر بھی کچھ پُراسرار گڑبڑ ہوئی ہے۔ آدھی رات کے وقت عورتوں کے بین کرنے کی آوازیں سنائی دیں۔ باہر نکل کر دیکھا تو کچھ بھی نہیں تھا۔ پھر کچھ دیر بعد گھر پر پتھر پڑنے شروع ہو گئے۔ صحن میں اور باہر کی دیواروں پر خون کی چھینٹے بھی نظر آئے۔ وہ سب اتنے ڈر گئے کہ پڑوسیوں کے گھر چلے گئے اور باقی ساری رات جاگتے اور پڑھتے ہوئے گزاری۔

''تو پھر آج صبح تم مولوی جی کے پاس گئے ہو گے؟'' انیق نے پوچھا۔

''آہو جی۔ انہوں نے کہا ہے کہ ہم ساتے اور تاجور کی شادی کے حق میں نہیں ہیں اس لیے ہم پر یہ مشکل آئی ہے۔ ابھی تو یہ صرف نمونہ ہے، بات اس سے آگے بھی جا سکتی ہے۔ انہوں نے مصیبت ٹالنے کے لیے یہ نذرانہ بھی منگوایا ہے۔''

میں اندر ہی اندر ابل کر رہ گیا۔ یقیناً انیق کی بھی یہی کیفیت رہی ہوگی۔ کچھ چالباز افراد ان سادہ لوح لوگوں کو بڑے بھونڈے طریقے سے بے وقوف بنا رہے تھے اور یہ بن رہے تھے۔

کچھ دیر بعد وارث تو موٹی تازی بکری اور گٹھڑی لے کر مولوی صاحب کی طرف چلا گیا اور ہم پھر کمرے میں آ بیٹھے۔ میرے اندر ہلچل تھی آج کی رات دو بندوں کے لیے بڑی سخت ثابت ہونے والی تھی۔ ان میں سے ایک گاؤں کا مولوی فدا تھا۔

O......❖......O

میں جو سامان لاہور سے اپنے ساتھ لایا تھا اس میں ایک ٹرنک بھی تھا۔ اس ٹرنک میں

ایک گرے پتلون کے علاوہ ایک سیاہ قمیص اور سیاہ جرسی بھی موجود تھی۔ تسموں والے بوٹ اور ایک عدد کولٹ پستول بھی اس سامان کا حصہ تھے۔ وہ ایک سرد ترین رات تھی۔ فضا میں ہلکا سا کہرا موجود تھا۔ پروگرام کے مطابق میں نے دیہاتی لباس اتار کر پتلون اور جرسی وغیرہ پہنی، پتلون کی بیلٹ میں کولٹ پستول لگایا۔ اس کے بعد چہرے پر سیاہ رنگ کا ایک کپڑا اس طرح باندھ لیا کہ بس آنکھیں ہی نظر آتی تھیں۔ اس سارے گیٹ اَپ کو چھپانے کے لیے میں نے ایک کمبل نما بڑی سی چادر اوڑھ لی۔ یہ چادر میرے سر کو ڈھانپ کر میرے گھٹنوں سے نیچے تک پہنچ رہی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد میں چادر میں لپٹا لپٹایا مولوی فدا کے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ ابھی میں اس کے گھر سے تیس چالیس قدم دور ہی تھا کہ مجھے ٹھٹک کر درختوں کے پیچھے جانا پڑا۔ میں نے مولوی فدا کے گھر سے کسی کو نکلتے دیکھا۔ یہ رات کے قریباً ساڑھے گیارہ بجے کا عمل تھا۔ پورا علاقہ گہری یخ بستہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس وقت مولوی فدا کے گھر سے کون نکل رہا تھا۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ ایک نہیں دو افراد تھے۔ ایک کے ہاتھ میں ٹارچ تھی اور یہ ذرا فربہ اندام تھا۔ میں پہچان گیا یہی مولوی فدا تھا۔ اس کے عقب میں ایک نوجوان لڑکا تھا۔ چھریرے جسم کا تھا اور اس نے شلوار قمیص پر سویٹر پہن رکھا تھا۔ اس لڑکے کے ہاتھ میں وہی گٹھڑی تھی جو ہم نے مصیبت زدہ وارث کے ہاتھ میں دیکھی تھی، بکری بھی ساتھ ہی تھی لیکن اس کی رسی مولوی فدا کے ہاتھ میں تھی۔

یہ دونوں کچھ آگے بڑھ کر کھیتوں میں داخل ہوئے تو میں بھی ان کے پیچھے چل دیا۔ وہ ٹارچ کی روشنی میں جا رہے تھے لہٰذا ان کی رفتار تیز تھی۔ مجھے احتیاط سے قدم اٹھانا پڑ رہے تھے۔ قریباً بیس منٹ پیدل چلنے کے بعد وہ دونوں درختوں کے ایک جھنڈ میں داخل ہوئے۔ یہاں ایک خستہ حال مکان تھا۔ تین چار کچے کمرے تھے۔ ایک کمرے کی چوبی بالکونی دکھائی دیتی تھی۔ نوجوان باہر کھڑا رہا اور مولوی فدا بکری اور گٹھڑی کے ساتھ اندر چلا گیا۔

میرا تجسس پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔ رات کے اس پہر مولوی فدا چوری چھپے یہاں کیوں آیا تھا۔ میں نے زیادہ توقف کرنا مناسب نہیں سمجھا اور ایک چھوٹا سا چکر کاٹ کر مکان کی عقبی سمت آ گیا۔ پانچ چھ فٹ اونچی چار دیواری پھاند کر اندر داخل ہونے میں مجھے بالکل دشواری پیش نہیں آئی۔ میں ایک برآمدے میں سے گزر کر ایک ایسے کمرے کے سامنے پہنچا جہاں لالٹین کی روشنی ہو رہی تھی۔ اندر سے کسی شخص کے کھانسنے کی مسلسل آواز سنائی دے رہی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ بہت زیادہ بیمار اور کمزور ہے۔

میں کچھ دیر انتظار کرتا رہا پھر کمرے کے سامنے سے گزر کر گھر کے بغلی حصے کی طرف آ گیا۔ اس طرف بھی برآمدہ تھا۔ بکری برآمدے کے ایک ستون سے بندھی ہوئی تھی اور گھاس پر منہ مار رہی تھی۔ یہاں بھی ایک کمرے کے کواڑوں سے لالٹین کی روشنی چھن چھن کر آ رہی تھی۔ اندر سے بولنے کی مدھم آواز بھی آ رہی تھی۔ میں نے بے دھڑک دروازے کی جھری سے آنکھ لگائی۔ مجھے ایک جواں سال عورت نظر آئی۔ اس نے زرق برق کپڑے پہن رکھے تھے، کسی حد تک سنگھار بھی کیا ہوا تھا۔ مولوی فدا جو گٹھڑی لایا تھا وہ قریب ہی لکڑی کی میز پر پڑی تھی۔ مولوی فدا نظر نہیں آ رہا تھا مگر کمرے میں موجود تھا۔ عورت اس سے بات کر رہی تھی۔ میں نے ان کی گفتگو وضاحت سے سننے کے لیے اپنی آنکھ ہٹا کر اپنا کان دروازے کی جھری سے لگا دیا۔

عورت نے کہا۔ ''اب کیا کروں مولوی جی۔ خاوند ہے جو کہتا ہے کرنا پڑتا ہے لیکن اس کی حالت اچھی نہیں۔ آپ کو پتا ہی ہے کہ ڈاکٹر بھی کہہ رہا تھا اب دس پندرہ دن سے زیادہ نہیں نکالے گا۔''

''ڈاکٹروں کے کہنے سے کیا ہوتا ہے پیاری۔'' مولوی فدا کی مدھم آواز ابھری۔ ''ہوسکتا ہے کہ دس پندرہ دن بھی نہ نکلیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دس پندرہ ہفتے نکل جائیں۔''

اس کے بعد کچھ دیر خاموشی طاری رہی پھر عورت نے سرگوشی میں کچھ کہا جو میری سمجھ میں نہیں آیا۔ جواب میں مولوی فدا تسلی دینے والے انداز میں بولا۔ ''سب ٹھیک ہو جائے گا پیاری، تھوڑا سا حوصلہ رکھو۔''

میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا اور کچھ آ بھی رہا تھا۔ ایک عورت جس کا خاوند سخت بیمار تھا اور ساتھ والے کمرے میں پڑا ہوا تھا یہاں مولوی فدا کے ساتھ موجود تھی۔ اس نے نئے نویلے کپڑے پہن رکھے تھے اور سنگھار کر رکھا تھا۔ مولوی فدا اس کے لیے تحفے تحائف لے کر آیا تھا۔ وہ تحفے جو اس نے نذرانے کے طور پر ایک سادہ لوح دیہاتی سے وصول کیے تھے۔

اچانک مجھے اپنے عقب میں قدموں کی آہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا لیکن تھوڑی دیر ہو گئی تھی، کسی نے ایک لاٹھی گھما کر میرے سر پر ماری۔ یہ ضرب کسی اور کو لگی ہوتی تو لمبا لیٹ گیا ہوتا لیکن میرا تو کام ہی چوٹیں مارنا اور چوٹیں سہنا تھا۔ ایک بار آنکھوں میں تارے سے ضرور چمکے لیکن پھر میں سنبھل گیا۔

حملہ آور نے دوسرا وار کرنا چاہا مگر اب یہ اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ میں نے جھک کر وار بچایا اور ٹانگ اس کی چھاتی پر رسید کی۔ وہ لڑکھڑا کر دیوار سے ٹکرایا۔

دھما چوکڑی کی آوازوں نے اندر والوں کو الرٹ کر دیا تھا۔ پہلے عورت کے چلانے کی آواز سنائی دی پھر کسی نے دھماکے سے کمرے کا دروازہ کھولا۔ یقیناً یہ مولوی فدا ہی تھا۔

''ماردوں گا...... چیر ڈالوں گا۔'' میرا لاٹھی بردار مدِ مقابل چلایا اور ایک بار پھر مجھ پر جھپٹا۔

میں نے بروقت دیکھ لیا تھا کہ اس کے ہاتھ میں چاقو ہے ورنہ چاقو کا پھل دستے تک میری ٹانگ میں گھس گیا ہوتا۔ میں ایک قدم پیچھے ہٹا اور اس مرتبہ حملہ آور کی کنپٹی پر ٹانگ کی جچی تلی ضرب لگائی۔ یہ ضرب کوئی پیشہ ور فائٹر تو برداشت کر سکتا تھا عام شخص نہیں۔ مدِ مقابل دیوار سے ٹکرایا اور اوندھے منہ گر کر انٹا غفیل ہو گیا۔ کمرے کے اندر سے نکلنے والی روشنی میں اس کے چہرے کی جھلک نظر آئی۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ یہ مولوی فدا کا وہی ساتھی تھا جو گھر سے باہر کھڑا رہ گیا تھا۔

اس سے پہلے کہ مولوی فدا کچھ کرتا یا پھر چمکیلے گلابی کپڑوں والی عورت باہر بھاگنے کی کوشش کرتی، میں نے کمر کی طرف سے جرسی اٹھا کر اپنا کولٹ پسٹل نکال لیا۔

''خبردار...... اگر کوئی چالاکی دکھائی تو گولی چلا دوں گا۔'' میں نے پستول مولوی فدا اور عورت کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔

وہ دم بخود سے کھڑے رہے گئے۔ عورت دہشت زدہ نظروں سے اوندھے پڑے نوجوان کو دیکھ رہی تھی۔ اسے شاید ڈر تھا کہ وہ مر گیا ہے۔ نوجوان کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ وہ مولوی فدا کے شاگردوں میں سے لگتا تھا۔ چھدری داڑھی کے اوپر ہلکی مونچھیں تھیں۔ لاٹھی گر گئی تھی لیکن چاقو ابھی تک اس کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ میں نے نیچے جھک کر چاقو اس کی گرفت سے نکال لیا اور بند کر کے پتلون کی جیب میں رکھ لیا۔

''کون ہو تم...... کیا چاہتے ہو؟'' مولوی فدا نے خوفزدہ آواز میں پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''تم اچھی طرح جانتے ہو، انسان کے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔''

میں مولوی فدا کو پہلی بار قریب سے دیکھ رہا تھا۔ عمر چالیس سے کچھ اوپر ہی رہی ہوگی، جسم قدرے موٹا تھا۔ داڑھی سیاہ اور سر پر گول ٹوپی تھی۔ ٹوپی میں سے جو بال نکلے ہوئے تھے ان پر تیل کی چمک دکھائی دیتی تھی۔

عورت روہانسی آواز میں بولی۔ ''اگر تم ڈاکو ہو تو یہاں سے جو جی چاہے لے جاؤ مگر ہمیں کچھ نہ کہو، تمہیں تمہارے بال بچوں کا واسطہ۔'' عورت کی آنکھوں سے کاجل نکلنا شروع

ہو گیا تھا اور اس کی ڈری ڈری نگاہیں مسلسل بے ہوش پڑے نوجوان پر تھیں۔

میں نے کہا۔ ”گھبراؤ نہیں بی بی، یہ مرا نہیں صرف بے ہوش ہوا ہے مگر تم دونوں کے لیے بات بے ہوشی سے آگے بھی بڑھ سکتی ہے۔ پوری چھ گولیاں ہیں اس میں۔“

”کیا چاہتے ہو تم؟“ مولوی فدا نے تھوک نگلا۔

”فی الحال تو تم دونوں اندر چلو۔“ میں نے پستول کو حرکت دیتے ہوئے کہا۔

قریبی کمرے میں مریض شخص مسلسل کھانس رہا تھا اور شاید بیوی کو پکارنے کی ناکام کوشش بھی کر رہا تھا۔ یقینی بات تھی کہ اسے یہاں ہونے والی گڑبڑ کا احساس ہو گیا تھا اگر وہ چارپائی سے اٹھنے کے قابل ہوتا تو ضرور یہاں پہنچ گیا ہوتا۔

میں مولوی فدا اور عورت کو واپس کمرے میں لے آیا لیکن اس سے پہلے میں نے بے ہوش نوجوان کو بازو سے گھسیٹ کر ایک چھوٹے کمرے میں بند کر دیا تھا۔

یہ گھر اندر سے بھی خستہ حال ہی تھا۔ ایک جگہ مجھے طاق میں ایک مورتی بھی دکھائی دی۔ اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ میں نے مولوی فدا اور عورت کو دیسی کرسیوں یعنی موڑھوں پر بیٹھنے کا حکم دیا۔ وہ بے چوں و چرا بیٹھ گئے۔ دونوں کے رنگ لالٹین کی روشنی میں زیادہ ہی زرد نظر آنے لگے تھے۔ میں نے ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھول کر دیکھا۔ وہاں بھی لالٹین روشن تھی۔ مجھے بستر پر ہڈیوں کا ایک ڈھانچا پڑا نظر آیا۔ چہرہ مدقوق، آنکھیں اندر دھنسی ہوئی۔ اس کے قریب میز پر بہت سی انگریزی اور دیسی دوائیں رکھی تھیں۔ دیکھتے ہی اندازہ ہو گیا کہ ایک تپ دق زدہ شخص ہے۔ میں نے دروازہ دوبارہ بھیڑ دیا اور دوسرے کمرے میں مولوی فدا اور عورت کے سامنے آن بیٹھا۔

عورت کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں تھیں۔ مولوی فدا بھی سکتہ زدہ سا بیٹھا تھا۔ میں نے مولوی فدا کا بہت گھناؤنا روپ دیکھا تھا۔ اس نے ایک کم عمر لڑکی سے شادی رچائی تھی اور اب بھی شاید اس کی مہم جوئی کو بریک نہیں لگے تھے۔ یہ اس چار دیواری میں بھی کوئی شدید قسم کی گڑبڑ کر رہا تھا۔

میں نے مولوی فدا کی آنکھوں میں دیکھا اور مجھے چونکنا پڑا۔ اس کی آنکھیں مجھے اس کے چہرے اور کردار سے مختلف نظر آئیں۔ پتا نہیں کیوں مجھے ان آنکھوں میں وہ مولوی فدا دکھائی نہیں دیا جو پچھلے دو تین دنوں میں میرے علم میں آیا تھا۔ میں عجیب سے تذبذب کا شکار ہو گیا اور شاید یہ میری زندگی میں پہلی بار تھا کہ میں کسی شخص کو دیکھ کر اس طرح کنفیوژ ہوا تھا۔ مجھے لگا کہ مولوی فدا وہ نہیں ہے جو نظر آ رہا ہے اور جو نہیں ہے شاید وہ بھی نہیں ہے۔

میں نے مولوی فدا سے باز پُرس شروع کی اور اس دن زندگی میں مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ کبھی کبھی چہرے میں اور اس تصویر میں کتنا فرق ہوتا ہے جو ہماری آنکھوں کے سامنے آتی ہے۔ ضروری نہیں ہوتا کہ حقیقت وہی ہو جو ہماری نگاہ ہمیں دکھاتی ہے یا ہماری سماعت ہمیں سناتی ہے یا ہمارے حواس ہمیں محسوس کرواتے ہیں۔ اگلے ایک گھنٹے کے اندر میں نے مولوی فدا کی خیالی تصویر اور اس کے اصل چہرے میں اتنا فرق دیکھا کہ دنگ رہ گیا۔

مولوی فدا مجھ سے بار بار پوچھ رہا تھا کہ میں کون ہوں اور اس سے کیا چاہتا ہوں۔ اس کی نگاہیں میرے سیاہ ڈھاٹے کے پیچھے دیکھنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔

میں نے اس کے حواس بحال کرنے کے لیے پہلے اسے تھوڑا سا پانی پلایا پھر کہا۔ ''میں ان دو بدصورت عورتوں کو دیکھنا چاہتا ہوں جن کا تم ذکر کرتے رہتے ہو اور بتاتے ہو کہ وہ گاؤں کی کسی تاجور نامی لڑکی کا پیچھا کرتی ہیں؟''

مولوی فدا کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ وہ اپنی داڑھی کو سہلاتے ہوئے بولا۔ ''ایسی باتوں کو مذاق کے طریقے سے نہیں کرتے، کبھی کبھی بہت نقصان ہو جاتا ہے۔''

''لیکن ایسی باتیں کرنے سے تمہارا تو فائدہ ہی فائدہ ہوتا ہے۔ تمہارے گھر نذرانے آتے ہیں۔ حلوے کے تھال پہنچتے ہیں۔ روپیہ پیسا بھی آتا ہے جس سے تم دھوم دھام سے شادی کرتے ہو اور مزید شادیاں کرنے کے پروگرام بھی بناتے ہو۔'' میں نے ڈری سہمی خوش شکل عورت کی طرف دیکھ کر کہا۔

مولوی فدا بولا۔ ''مجھے لگتا ہے آپ بھی ان لوگوں میں سے ہو جن کو میری شادی سے بہت دکھ پہنچا ہے۔ کیا میں نے نکاح کر کے کوئی غلط کام کیا ہے؟''

''نکاح کرنا تو کوئی غلط کام نہیں لیکن نکاح کے بعد تم جس طرح پیر ولایت کے اسپیکر بن گئے ہو اور ہر جگہ اسی کے ترانے پڑھتے ہو یہ یقیناً بہت غلط کام ہے اور تمہارے منصب کے مطابق بھی نہیں۔''

''میں تمہارے اس سوال کا جواب بعد میں دے سکتا ہوں۔ تمہارا پہلا سوال شادی کے بارے میں تھا۔''

اچانک وہ ہوا جس کی توقع نہیں تھی۔ عورت نے مجھے غافل سمجھا اور ایک دم اٹھ کر باہر کو بھاگی۔ میں نے اسے بازو سے پکڑ لیا۔ وہ گھوم کر دروازے کی چوکھٹ سے ٹکرائی۔ اس کی پھولدار قمیص کندھے پر سے پھٹ گئی اور عریاں جسم نظر آنے لگا۔ اس کے ہونٹوں سے بھی خون رِسنے لگا تھا، وہ چلا رہی تھی۔ میں نے اسے اپنے بازو کی لپیٹ میں لے لیا۔ مولوی فدا

نے اس کی مدد کرنا چاہی مگر میرا دھکا کھا کر چارپائی پہ گرا اور چارپائی کا بازو ٹوٹ گیا۔ لفافہ پھٹنے سے باداموں کی گریاں بھی ہر طرف بکھری نظر آئیں۔

میں نے پستول مولوی فدا کی طرف سیدھا کیا۔ ''چپ چاپ بیٹھے رہو ورنہ مارے جاؤ گے۔''

میں نے عورت کو بالوں سے پکڑ کر بری طرح دھمکایا اور پھر اسے اسی کمرے میں لے گیا جہاں نوجوان نیم بے ہوش پڑا تھا۔ اس نے اب ہولے ہولے کراہنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے پستول خوفزدہ عورت کی پیشانی سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''اب کوئی حرکت ہوئی تو معاف نہیں کروں گا اور یہ بات اس لڑکے کو بھی سمجھا دینا۔''

اس کے ساتھ ہی میں نے دھکا دے کر عورت کو اس تنگ کمرے میں پھینک دیا۔ وہ اتنی دہشت زدہ ہو گئی تھی کہ چلا بھی نہیں سکی۔ میں نے دروازے کو باہر سے پھر بولٹ کر دیا۔

چارپائی پر گرتے ہوئے مولوی فدا کا سر کسی سخت چیز سے ٹکرایا تھا اور تیل زدہ بالوں میں سے خون رِسنے لگا تھا۔ یقیناً آدھ گھنٹا پہلے تک اس نے سوچا بھی نہ ہوگا کہ اس پر ایسی آفت ٹوٹنے والی ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے پھر وہ ماتھے پر ہاتھ رکھ کر رونے لگا۔ ''یااللہ موت دے دے، ایسی زندگی سے تُو موت دے دے۔ یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ؟'' روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی۔

میں خاموشی سے اس کی جانب دیکھتا رہا۔ آخر وہ گمبھیر آواز میں بولا۔ ''مجھے بتاؤ، میں نے کیا جرم کیا ہے شادی کر کے؟ سارا پنڈ جانتا ہے کہ میں اپنی بیوی سے کتنی محبت کرتا تھا، وہ دوسرے بچے کی پیدائش کے بعد بیمار ہوئی اور پورے چھ سال تک بستر پر پڑی رہی۔ پورے چھ سال تک میں نے دن رات اس کو سنبھالا، نہ صرف سنبھالا بلکہ بچوں کو بھی ماں بن کر پالا...... اور پھر وہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئی۔ وہ اپنی زندگی میں ہی مجھے شادی کی اجازت دیتی تھی لیکن میں نے نہیں کی۔ اس کے بعد بھی میں نے ایک سال اسی طرح اکیلے پن میں گزارا۔ کیا چھ سات سال بالکل اکیلے پن کی زندگی گزارنے کے بعد میرا حق نہیں بنتا تھا کہ میں اپنی زندگی کے لیے کوئی سہارا ڈھونڈ لوں۔ کیا میرا حق نہیں بنتا تھا؟''

میں خاموشی سے اس کی بات مکمل ہونے کا انتظار کرتا رہا۔

وہ پھر بولا۔ ''پھر میں نے اپنی ہم عمر عورت ڈھونڈنے کی کوشش کی جو مجھے نہیں ملی۔ اب جس لڑکی سے میں نے شادی کی ہے وہ غریب گھرانے کی ہے۔ اس کا نکاح ہو چکا ہے لیکن رخصتی سے پہلے ہی طلاق ہو گئی۔ اب اس کی شادی کی عمر گزرتی جا رہی تھی، سب سے بڑھ

کر یہ بات کہ یہ لڑکی مجھے اپنے دونوں بچوں کے حق میں بہت بہتر لگی۔ میں نے باقاعدہ شرع سنت کے مطابق بغیر کسی جہیز کے اس کے ساتھ نکاح کیا۔ بتاؤ میں نے کچھ غلط کیا۔ کیا مجھے اپنے اور اپنے بچوں کے لیے ایک نئی زندگی شروع کرنے کا کوئی حق نہیں تھا؟"

"میں نے سنا ہے کہ اس شادی کا زیادہ خرچہ ایک ایسے بندے نے دیا ہے جو اسحاق عرف ساقے کا دوست ہے؟"

"تم زمیندار عالمگیر کی بات کر رہے ہو، یہ بالکل غلط ہے۔ اس نے صرف ولیمے کی دعوت کے لیے دو بچھڑے دیئے تھے، وہ بھی میں نے اس شرط پر قبول کیے تھے کہ میں فصل کی کٹائی پر ان کی قیمت ادا کر دوں گا۔ اس کے علاوہ اگر کچھ ثابت ہو جائے تو جو چور کی سزا وہ میری۔"

"اور مدرسے کی زمین...... یہ بھی تو ساقے کے دوست عالمگیر نے ہی تمہیں دی ہے؟"

وہ جیسے تڑپ کر بولا۔ "یہ بالکل غلط ہے، یہ زمین عالمگیر نے نہیں کسی اور نے دی ہے مگر وہ اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتا۔ اس لیے میں بھی چپ ہوں۔"

میں نے ذرا زور دے کر پوچھا تو پریشانی کے عالم میں اس کے منہ سے بے ساختہ خورشید بی بی کا نام نکل گیا۔

"کون ہے یہ خورشید؟" میں نے فوراً اس کی بات پکڑ لی۔ وہ چند لمحوں کے لیے سٹپٹایا ہوا نظر آیا۔ پھر اس نے بتا دیا کہ وہ عالمگیر کی والدہ ہے۔ جو زمین مدرسے کو ملی ہے وہ اس کی والدہ کے حصے میں سے ملی ہے اور اس کا باقاعدہ کاغذ اس کے پاس موجود ہے۔ خورشید بی بی اور طرح کی عورت ہے، وہ نہیں چاہتی کہ اس کی نیکی کا ڈھنڈورا پیٹا جائے۔"

اپنی بات کے آخر میں مولوی فدا نے مجھ سے درخواست کی کہ اگر ہو سکے تو میں یہ بات اپنے تک ہی رکھوں۔

وہ میرے سوالوں کے ٹھوس جواب دے رہا تھا اور بار بار یہ بھی کہہ رہا تھا کہ میں چاہوں تو اس کی باتوں کی تصدیق بھی کر سکتا ہوں لیکن اس کی صفائی مجھے پوری طرح متاثر نہیں کر رہی تھی۔ میں نے پچھلے دو تین دن میں بہت کچھ ایسا نوٹ کیا تھا جو کسی طرح بھی قابلِ قبول نہیں تھا۔ جیسے ابھی پچھلے آدھ پون گھنٹے میں جو کچھ میرے سامنے آیا تھا۔ مولوی فدا اور اس کے شاگرد کا تنہا اس مکان میں داخل ہونا اور پھر مولوی فدا کا اس عورت سے باتیں کرنا۔

اچانک وہ دروازہ زور زور سے پیٹا جانے لگا جس میں، میں نے مولوی فدا کے نیم بے

ہوش شاگرد اور اس عورت کو بند کیا تھا۔ اندر سے دروازہ پیٹنے والی وہ عورت ہی تھی، وہ گھبراہٹ کے عالم میں واویلا کر رہی تھی اور باہر نکلنا چاہتی تھی۔ اس کی آواز میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ ''میں مرجاؤں گی...... میری سانس رک جائے گی۔ مجھے یہاں سے نکالو، تمہیں بھگوان کا واسطہ......'' وہ بلند آواز سے رونے لگی۔

اس نے بھگوان کا واسطہ دیا تھا، میں چونک گیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے ساتھ والے کمرے میں طاق کے اندر رکھی ہوئی مورتی بھی یاد آئی۔ میں نے سوالیہ نظروں سے مولوی فدا کی طرف دیکھا۔ اس نے شاید میرے چونکنے کی وجہ نوٹ نہیں کی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''کیا یہ میاں بیوی ہندو ہیں؟''

مولوی فدا نے اثبات میں سر ہلایا۔

میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ ''یہ عورت کس قسم کی بیوی ہے اس کا شوہر سخت بیماری کی حالت میں بستر پر پڑا ہے اور یہ یہاں بن ٹھن کر تمہارے ساتھ باتیں کر رہی تھی؟''

مولوی فدا محمد چند لمحے خاموش رہا جیسے سوچ رہا ہو کہ میرے اس سوال کا کیا جواب دے پھر دھیمی آواز میں بولا۔ ''شاید تمہیں میری بات کا یقین نہیں آئے گا اس لیے بہتر ہے اسی عورت سے پوچھ لو۔''

میں نے کہا۔ ''تم بتاؤ، میں یقین کرنے کی کوشش کروں گا۔''

''اس کے خاوند وکرم کو ٹی بی ہے کافی آگے کی اسٹیج پر ہے لیکن ایسا نہیں کہ علاج ہی نہ ہو سکے۔ پنڈ کے اندر ہی رہتا تھا۔ پر اڑوس پڑوس والوں نے کہا کہ اس کا یہاں رہنا ٹھیک نہیں اسے یہاں کھلی جگہ پر چودھری نشان کے اس مکان میں بھیج دیا گیا۔ میاں بیوی میں بہت محبت ہے۔ وکرم اب سمجھنے لگا ہے کہ وہ زیادہ دن جی نہیں سکے گا۔ وہ اپنے ان آخری دنوں میں بیوی کو بدحال دیکھنا نہیں چاہتا۔ اس نے اسے سختی سے ہدایت کر رکھی ہے کہ وہ خستہ حالت میں اس کے سامنے نہ آئے۔ وکرم کے مجبور کرنے پر وہ بے چاری خود کو بنا سنوار کر رکھتی ہے ورنہ سب جانتے ہیں جو اس پر بیت رہی ہے۔ ان کی اولاد نہیں ہے اور اولاد نہ ہونے سے اکثر میاں بیوی کی محبت کم ہونے کے بجائے اور بڑھ جاتی ہے۔''

''تمہارا اس عورت سے کیا تعلق ہے؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''کیا مطلب؟''

''کچھ چھپانے کی کوشش نہ کرو تو اچھا ہے، میں نے ابھی کچھ دیر پہلے تم دونوں کی باتیں سنی ہیں۔''

مولوی فدا نے کسی خاص ردِعمل کا مظاہرہ نہیں کیا اور ٹھہرے لہجے میں بولا۔ ''میں ان تنگ نظر مولویوں میں سے نہیں ہوں جو چھوٹی چھوٹی بات پر مسلمان کو کافر قرار دیتے ہیں بلکہ اگر ذرا ٹھنڈے دل سے سوچا جائے تو کافر بھی تو آدم حوا کی اولاد ہیں۔ انسان ہونے کے ناتے سے ہمارے کچھ لگتے ہیں۔ اگر ہم پہلے ہی طے کر لیں گے کہ بس ان سے نفرت ہی کرنی ہے تو پھر ان کو اپنی طرف مائل کیسے کر سکیں گے؟ میں تم سے جھوٹ نہیں بول رہا اپنے دل کی بات بتا رہا ہوں۔ میرے دل میں ان دونوں کے لیے بھی محبت ہے اور جہاں تک رام پیاری کی بات کر رہے ہو وہ میرے لیے بہن، بیٹی جیسی ہی ہے۔''

''کون رام پیاری؟''

''وکرم کی یہ پتنی۔ اس کا نام رام پیاری ہے، اس کو گھر والے پیارو یا پیاری بھی کہتے ہیں۔'' مولوی فدا نے وضاحت کی۔

میں نے ابھی کچھ دیر پہلے مولوی فدا اور اس عورت کی جو گفتگو سنی تھی اس میں اسے مولوی فدا نے پیاری کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ اس وقت مولوی فدا کا یہ اندازِ تخاطب مجھے کافی مشکوک لگا تھا۔

مولوی فدا بھرائی ہوئی آواز میں اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ تمہارے جیسے لوگوں کے لیے کسی کا مولوی ہونا ہی جرم ہے، اس کے ہر کام کو شک کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اس میں کیڑے نکالے جاتے ہیں۔ اچھے برے لوگ کہاں نہیں ہوتے۔ بے شک مولویوں کے روپ میں بھی کچھ......''

''اچھا مجھے ایک بات بتاؤ؟'' میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''کل صبح وہ سیدھا سادہ بندہ وارث تمہارے پاس آیا۔ اس نے تمہیں اپنی بپتا سنائی۔ وہ ڈرا ہوا تھا۔ گاؤں کے کئی دوسرے لوگوں کی طرح ہوائی چیزوں کی کارستانیوں سے پریشان تھا۔ کیا تم نے اس کی پریشانی سے فائدہ نہیں اٹھایا؟''

''کیا مطلب؟'' مولوی فدا کے چہرے پر اس دفعہ رنگ سا آ کر گزر گیا۔

''تم نے اسے کوئی سیدھا راستہ دکھانے کے بجائے نذرانہ لانے کے لیے کہا۔'' دودھ دینے والی ایک صحت مند بکری، بادام اور گھی وغیرہ۔''

مولوی فدا پر کچھ دیر خاموشی طاری رہی۔ سر جھکا ہوا تھا پھر اس نے سر اٹھایا اور بولا۔

''میرے پاس اس کی بھی وضاحت ہے پر پتا نہیں تم یہ مانو گے بھی یا نہیں۔''

''تم بتاؤ، میں پہلے کی طرح اب بھی کوشش کروں گا۔''

ساتھ والے کمرے میں رام پیاری نامی عورت کا واویلا اب بند ہو گیا تھا، شاید وہ تھک کر چپ ہو گئی تھی۔ دوسرے کمرے میں اس کا شوہر اب بھی کھانس رہا تھا۔ مولوی فدا نے کہا۔ ''میں مانتا ہوں کہ میں نے وارث سے نذرانہ لیا لیکن میں یہ بھی جانتا ہو کہ اگر میں نہ لیتا تو وہ کسی اور کے پاس چلا جاتا۔ نذرانہ یا خیر خیرات دیئے بغیر اس کی تسلی ہونی ہی نہیں تھی تو پھر بجائے اس کے وارث کی خیر خیرات کسی ڈھونگی مولوی یا عامل کے پیٹ میں چلی جاتی، کیوں نہ اس سے کسی کا فائدہ ہوتا۔ میں نے وارث سے نذرانہ لے لیا اور یہ ایسا نذرانہ تھا جس کی کسی کو بہت سخت ضرورت تھی۔ شاید تم میری بات سمجھ گئے ہو گے۔ شہر کے ڈاکٹروں نے وکرم سے کہہ رکھا ہے کہ وہ اب بھی علاج کے قابل ہے لیکن جتنی ضرورت اسے دواؤں کی ہے، اتنی ہی اچھی خوراک کی بھی ہے۔ وارث نے جو بکری اور دوسرا سامان دیا ہے وہ میرے لیے ایک امانت کی طرح تھا اور وہ میں سارا یہاں وکرم کے پاس لے آیا ہوں، اس میں کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی میرے لیے حرام ہے۔'' مولوی فدا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

مولوی فدا محمد کے بارے میں میرے شبہات ڈانواں ڈول ہونے لگے تھے، وہ جو کچھ بتا رہا تھا اس میں وزن تھا۔ اس کے علاوہ مجھے مولوی فدا کی آنکھوں میں ایک عجیب سی غم آمیز کیفیت بھی نظر آ رہی تھی۔ غم آمیز اور کسی حد تک سکون آمیز۔ ایسی کیفیت یا تو سچے آدمی کی آنکھوں میں ہوتی ہے یا پھر بہت گہرے آدمی کی آنکھوں میں۔ بہر حال جو کچھ بھی تھا لیکن ایک بات ایسی تھی جو مجھے مولوی فدا کے حوالے سے کسی طور بھی ہضم نہیں ہو رہی تھی اور وہ یہ کہ مولوی فدا نے پیر ولایت کی کچھ ایسی شعبدہ بازیوں کی تصدیق کی تھی جو کسی طور بھی قابلِ قبول نہیں تھی۔ دو بدصورت عورتوں کا گاؤں میں موجود ہونا اور ہر وقت تاجور کا پیچھا کرنا۔ گھروں میں اچانک آگ بھڑک اٹھنا اور خون کے چھینٹوں کا نظر آنا یا مرغیوں کے کٹے ہوئے سر ملنا۔ مولوی فدا کو گاؤں میں ایک سمجھدار اور عالم شخص جانا جاتا تھا۔ اکثر لوگ سمجھتے تھے کہ مولوی فدا کی باتیں من گھڑت اور بے بنیاد نہیں ہوتیں پھر اس شعبدہ بازی کی حمایت کیا معنی رکھتی تھی۔ کیا مولوی فدا کے پاس اس کا بھی کوئی معقول جواز تھا۔ میرے خیال میں اس کا کوئی معقول جواز ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

چوٹ لگنے سے مولوی فدا کے سر سے مسلسل خون رِس رہا تھا۔ میں نے ایک لوٹے میں پانی دیا تا کہ مولوی فدا اس خون کو صاف کر کے زخم پر روئی یا راکھ وغیرہ رکھ سکے۔ پستول بدستور میرے ہاتھ میں تھا اور میرا منہ سر سیاہ ڈھاٹے میں چھپا ہوا تھا۔ میری صرف آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ مولوی فدا کے ذہن میں آ ہی نہیں سکتا تھا کہ میں وہی ٹریکٹر ڈرائیور

ہوں جسے دین محمد نے تین چار دن پہلے ملازم رکھا ہے۔ وہ مجھے یقیناً گاؤں کے باہر کا کوئی بندہ سمجھ رہا تھا۔ اس کی نگاہ بار بار میری سیاہ جرسی کی طرف بھی اٹھتی تھی۔ شاید اس کے ذہن میں یہ بھی آیا ہو کہ میں کوئی حاضر سروس یا سابق پولیس والا ہوں۔

جس وقت مولوی فدا اپنے زخم صاف کر رہا تھا میں کھڑکی سے باہر چٹکی ہوئی چاندنی کو دیکھ رہا تھا۔ سردیوں کی یہ ٹھٹھری ہوئی چاندنی دور تک کھیتوں کھلیانوں اور باغیچوں کو روشن کر رہی تھی۔ پاس ہی کہیں کسی سوئے (چھوٹی نہر) کا چمکتا ہوا پانی بھی نظر آتا تھا۔ گاہے بگاہے کسی بے تاب چکور کی صدا ابھرتی تھی اور سناٹے میں دور تک پھیل جاتی تھی۔ ایسے مناظر میں نے کوپن ہیگن اور لندن میں کہاں دیکھے تھے، نہ ہی پاکستان کی یہ سادہ و حسین تصویر مجھے لاہور میں نظر آئی تھی۔

کہتے ہیں کسی خوب صورت چیز کو فدا ہو جانے والی نظروں سے دیر تک دیکھا جائے تو اسے نظر لگ جاتی ہے۔ اس منظر کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ اچانک گھر کا بیرونی دروازہ دھڑ دھڑ بجایا گیا، ساتھ ہی آواز آئی۔

''پیاری......رام پیاری دروازہ کھولو، جلدی کرو۔''

میں نے پہچان لیا، یہ اسی پہلوان حشمت راہی کی آواز تھی۔ میں نے سوالیہ نظروں سے مولوی فدا کی طرف دیکھا، وہ بھی حیران اور کسی حد تک پریشان تھا۔ میں نے تیز سرگوشی میں کہا۔ ''دروازہ کھولو، لیکن کچھ بتانا نہیں۔ میں یہاں اس دروازے کے پیچھے موجود ہوں اور یاد رکھنا، میں گولی چلانے میں زیادہ دیر نہیں کروں گا۔''

کچھ تذبذب کے بعد مولوی فدا محمد نے آگے بڑھ کر بیرونی دروازہ کھولا۔ میں ایک قریبی کمرے میں چلا گیا تھا اور دروازے کے تختوں کے درمیان سے دیکھ رہا تھا۔ اندر آنے والا پہلوان حشمت ہی تھا۔ وہ ہانپا ہوا تھا اور گھبرایا ہوا بھی۔ اس نے اندر کے ماحول کا نوٹس ہی نہیں لیا۔ یہاں تک کہ مولوی فدا کے سر کی چوٹ پر بھی دھیان نہیں دیا، وہ بولا۔ ''مولوی صاحب آپ یہاں؟''

''ہاں کام سے آیا تھا۔'' مولوی فدا نے متانت سے کہا۔

''بہت گڑبڑی ہوگئی ہے جی، میں دیکھ کر آیا ہوں۔ وہ لوگ ادھر ہی آرہے ہیں، اب کی بار بہت غصے میں ہیں۔ ان کا بچہ مر گیا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ وکرم اور پیاری کو نقصان پہنچا دیں گے۔ کم از کم مار پیٹ کر یہاں سے نکال تو ضرور دیں گے۔''

''یہ کیا بات ہوئی، یہ تو سراسر بے وقوفی ہے جہالت ہے۔ اگر ان کا بچہ قضائے الٰہی

سے چلا گیا ہے تو اس میں ان میاں بیوی کا کیا قصور ہے۔''

ابھی مولوی فدا کی بات جاری تھی کہ میری نگاہ ادھ کھلی کھڑکی سے باہر چلی گئی۔ میں نے ایک ٹریکٹر ٹرالی کو دیکھا، وہ تیزی سے اچھلتی کودتی اس گھر کی طرف آ رہی تھی۔ غور سے دیکھنے پر اندازہ ہوا کہ اس میں بیس پچیس افراد سوار تھے۔ عقب میں چار پانچ گھڑ سوار بھی تھے۔ کچھ کے ہاتھوں میں لالٹینیں اور لاٹھیاں وغیرہ صاف دکھائی دے رہی تھیں۔

ذرا سی دیر میں یہ لوگ اس مکان کے سامنے پہنچ گئے۔ انہوں نے پلک جھپکتے میں بیرونی دروازہ توڑ دیا اور صحن میں گھس آئے۔ یہ سب مقامی دیہاتی تھے، ان میں سے کم و بیش پانچ بندوں کے پاس آتشیں اسلحہ موجود تھا۔ باقی لاٹھیوں اور کلہاڑیوں سے مسلح تھے۔ اپنے سامنے مولوی فدا کو دیکھ کر وہ ذرا ٹھٹکے پھر ان میں سے ایک بڑے پگڑ والے لحیم شحیم نے آگے آ کر کہا۔ ''مولوی جی، کہاں ہے وہ حرام کی جنی رام پیاری اور اس کا منحوس پتی؟''

''پر پتا تو چلے ہوا کیا ہے؟'' مولوی فدا نے لوگوں کے سامنے آتے ہوئے پوچھا۔

''جو ہونا تھا جی وہ بس ہو گیا ہے، اب ہماری باری ہے۔ مار مار کر ان کی ہڈیاں توڑیں گے اور پھینک کر آئیں گے اپنے پنڈ کی زمینوں سے باہر۔'' پگڑ والے شخص نے پکار کر کہا۔ اس کے ہاتھوں میں سیون ایم ایم رائفل تھی۔

مولوی فدا نے اس کا راستہ روکا۔ ''دیکھو...... ہمیں ایسا کرنے کا کوئی حق نہیں۔ زندگی اور موت اوپر والے کے ہاتھ میں ہے اور پھر...... یہ غیر مسلم جو بھی ہیں لیکن انسان ہیں۔ یہ ہماری پناہ میں ہوتے ہیں اللہ نے ہمیں ان کے حق حقوق بتائے ہیں...... اور یہ بھی تو دیکھو کہ......''

''مولوی جی ہم آپ کی عزت کرتے ہیں۔ پر چنگا یہی ہے کہ آپ اس معاملے میں نہ بولیں۔ آپ پیچھے ہٹ جائیں۔'' اس نے مولوی فدا کو ذرا پیچھے ہٹانا چاہا۔ مولوی فدا نے قدم پیچھے نہیں ہٹائے۔ یہ مولوی فدا کا ایک نیا اور روشن روپ میرے سامنے آیا تھا۔

پہلوان حشمت غصے سے بولا۔ ''مولوی جی سے زبانی بات کرو، ہاتھ نہیں لگاؤ۔''

پگڑ والے کا ایک ساتھی دو قدم آگے آ کر پھنکارا۔ ''یہ تمہارے نہیں سب کے مولوی جی ہیں، پر یہ اس معاملے سے دور رہیں تو ٹھیک ہے۔''

ایک دم میرے دل نے گواہی دی کہ یہاں معاملہ زیادہ خراب ہونے والا ہے۔ میں نے کھڑکی میں سے دو تین دیہاتی تانگوں کو دیکھا، ان پر بھی مشتعل افراد سوار تھے اور یہ اس مکان کی طرف آ رہے تھے۔ میں نے تیزی سے فیصلہ کیا اور کمرے سے نکل آیا۔ بالکل ساتھ

ہی اس کمرے کا دروازہ تھا جہاں میں نے رام پیاری اور مولوی فدا کے بے ہوش شاگرد کو بند کیا تھا۔ میں نے دروازہ کھولا تو ڈری سہمی رام پیاری ایک گوشے میں سمٹ گئی۔ یقیناً وہ باہر سے بلند ہونے والا شوروغل اور مکالمے سن چکی تھی۔ اس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ میں نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اپنے ساتھ لے کر باہر نکل آیا۔ ہم اندر کی طرف گئے اور اس کمرے میں پہنچے جہاں ہڈیوں کا ڈھانچا وکرم بستر پر چت لیٹا تھا۔ کچھ لوگ ایسے مریض کے قریب جانا بھی پسند نہیں کرتے لیکن میں فیصلہ کر چکا تھا، میں نے اس ہلکے پھلکے شخص کو اٹھا کر اپنے کندھے پر لادا اور رام پیاری کے ساتھ گھر کے عقبی دروازے کی طرف بڑھا۔ تب تک مشتعل افراد گھر میں توڑ پھوڑ شروع کر چکے تھے اور کہیں آگ بھی لگا دی گئی تھی۔ رام پیاری مجھ سے چمٹ کر رہ گئی تھی۔

O......❖......O

چند ہی سیکنڈ بعد ہم تینوں گھر سے باہر تھے۔ چاندنی کچھ مدھم ہو گئی تھی تاہم وہ ٹریکٹر ٹرالی صاف دکھائی دے رہی تھی جس پر مسلح افراد سوار ہو کر یہاں وکرم اور رام پیاری کے گھر تک آئے تھے۔ ایک بندہ ٹریکٹر کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ دوسرا قریب ہی کھڑا تھا۔ مجھے اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹے دستے کی کلہاڑی صاف نظر آئی۔ ہماری آمد پر دراز قد شخص چونکا اور اس نے مڑ کر ہماری طرف دیکھا۔ تب تک میں رام پیاری کو اپنے ساتھ کھینچتا ہوا اس شخص کے قریب پہنچ چکا تھا۔

اس نے نیم تاریکی میں آنکھیں سکیڑ کر ہمیں پہچاننے کی کوشش کی، پھر گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''کون ہے اوئے؟'' اس کے ساتھ ہی اس کی کلہاڑی بھی حرکت میں آئی تھی۔ اس کے تذبذب نے مجھے کافی وقت دے دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھے روکنے یا مجھ پر وار کرنے کا فیصلہ کرتا میں نے ٹانگ کی زوردار ضرب عین اس کے سینے پر پسلیوں کے نیچے لگائی۔ یہ بڑا خطرناک مقام ہوتا ہے۔ ضرب شدید ہو تو مضروب کی موت بھی واقع ہو سکتی ہے لیکن میں اسے مارنا نہیں چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ صرف کراہا اور دہرا ہو کر گھٹنوں کے بل گر گیا۔

ہڈیوں کا ڈھانچا وکرم ابھی تک میرے کندھے پر تھا۔ میرے بائیں ہاتھ میں رام پیاری کا بایاں بازو تھا اور وہ میرے پہلو سے پیوست تھی۔ کلہاڑی بردار چوٹ کھا کر گھٹنوں کے بل گرا تو کلہاڑی اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ میں نے دو قدم بڑھ کر پستول کا وزنی دستہ اس کی کنپٹی پر رسید کیا اور اس کو مزاحمت کی کوشش سے آزاد کر دیا۔ رام پیاری خوف سے چلا اٹھی۔ دوسرا ردعمل یہ ہوا کہ ٹریکٹر کی سیٹ پر بیٹھا ہوا دبلا پتلا شخص ہراساں ہو کر نیچے کود گیا اور

مخالف سمت میں بھاگتے ہوئے پکارا۔

''بشیرے......کرموں۔''

یہ سارا واقعہ بمشکل تین چار سیکنڈ کے اندر ہوا تھا۔ ٹریکٹر کے اگنیشن میں، چابی لگی ہوئی تھی۔ میں نے پہلے ہلکے پھلکے وکرم کو ٹریکٹر ٹرالی میں ڈالا پھر رام پیاری کی دونوں بغلوں میں ہاتھ دیا اور اسے بھی اٹھا کر ٹرالی میں ڈال دیا۔ اس کے بعد پھرتی سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ٹریکٹر اسٹارٹ ہی تھا۔ میں نے صرف ہیڈ لائٹس روشن کیں اور اسے تیزی سے آگے بڑھا دیا۔ پستول میں نے گود میں رکھ لیا تھا۔

تب تک سات آٹھ افراد صورتِ حال کی نزاکت سے آگاہ ہو چکے تھے اور شور مچاتے ہوئے ٹریکٹر کی طرف لپک رہے تھے۔ رام پیاری ابھی تک ٹرالی میں کھڑی تھی۔ میں نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ''نیچے لیٹ جاؤ۔''

اس نے میری ہدایت پر عمل کیا اور ٹرالی کے فرش پر لیٹ گئی۔ ٹرالی کے پیچھے آنے والے بس پچاس ساٹھ میٹر دور ہی ہوں گے۔ ان کی طرف سے چلائی جانے والی کوئی گولی میرے لیے سخت نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھی۔ بہرحال یہ رسک تو مجھے لینا ہی تھا۔ کمال کی بات تھی، صرف چند دن پہلے میں نے لاہور کے مضافاتی علاقے میں ٹریکٹر ٹرالی چلانے کی پریکٹس کی تھی اور آج یہ پریکٹس ایک خطرناک صورتِ حال سے نکلنے میں میرے کام آ رہی تھی۔ میں آناً فاناً ٹرالی کو کھینچتا ہوا نیم پختہ راستے پر لے گیا۔ میں جانتا تھا کہ ان لوگوں کے پاس گھوڑے بھی ہیں وہ تیزی سے میرے پیچھے آ سکتے ہیں۔

میں نے مڑ کر دیکھا، میرا اندازہ فوراً ہی درست ثابت ہو گیا۔ مدھم چاندنی میں مجھے کچھ گھوڑے حرکت کرتے دکھائی دیئے۔ ان کے پس منظر میں وکرم اور رام پیاری کی خستہ حال رہائش گاہ نظر آ رہی تھی۔ اس کے ایک حصے میں سرخ روشنی دکھائی دے رہی تھی اور دھوئیں کے بادل اٹھ رہے تھے۔

''یہ لوگ ہم کو مار دیں گے۔ تم ہمیں پولیس چوکی پر لے جاؤ۔'' عقب سے رام پیاری کی روتی بلکتی آواز سنائی دی۔

میرے اپنے ذہن میں بھی یہی بات آ رہی تھی۔ میں نے بلند آواز میں رام پیاری سے پوچھا۔ پولیس ''چوکی کس طرف ہے؟''

''ابھی سیدھے چلتے جاؤ۔ پل کے پاس سے نیچے ہو جانا سامنے ہی نظر آ جائے گی۔'' وہ پکار کر بولی۔

میں نے اس کے کہنے پر عمل کیا۔ اس کے خاوند کے مسلسل کھانسنے کی آوازیں بھی میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ میں نے ایک بار پھر مڑ کر دیکھا۔ گھوڑے قریب آ رہے تھے اور پھر دھماکے کے ساتھ ایک شعلہ چمکا۔ ہم پر فائر کیا گیا تھا۔ شاید ٹرالی یا ٹریکٹر کے ٹائروں کو نشانہ بنایا گیا تھا۔ چند لمحے بعد جب دوسرا فائر ہوا تو میں نے بھی پستول سے دو ہوائی فائر کر دیئے، مقصد ان لوگوں کو خود سے فاصلے پر رکھنا تھا۔

چند سیکنڈ بعد مجھے چھوٹی نہر کے پل کی جھلک نظر آ گئی۔ رام پیاری کی ہدایت کے مطابق میں نے ٹریکٹر ٹرالی کو پل کے پاس سے نشیبی راستے پر اتار لیا۔ جو لوگ ٹریکٹر ٹرالی چلاتے ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ ٹریکٹر ٹرالی کو موڑنا، اوپر چڑھانا یا نیچے اتارنا کتنا دشوار ہوتا ہے۔ بہر حال میری دو روزہ سخت مشق نے میری مدد کی اور میں ڈانواں ڈول ٹرالی کو نیچے اتارنے اور پولیس چوکی کی طرف بھگا لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔ گھڑ سوار تیزی سے پیچھے آ رہے تھے اور ان کا فاصلہ کم ہو رہا تھا۔ مجھے کچھ فاصلے پر پولیس چوکی کی مدھم روشنی نظر آئی۔ خوش قسمتی سے بجلی آ رہی تھی اور پولیس چوکی کی نیم پختہ عمارت کی ایک دو کھڑکیاں روشن تھیں۔ میں ٹریکٹر ٹرالی کو اندھا دھند بھگاتا گیٹ پر لے گیا۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ میں ٹریکٹر روکتا اور پولیس والوں سے گیٹ کھولنے کی استدعا کرتا۔ میں نے لکڑی کے گیٹ کو ٹریکٹر سے ٹکر ماری۔ ٹریکٹر اور ٹرالی دونوں بری طرح اچھلے۔ گیٹ کے ساتھ ہی ایک طرف کی دیوار بھی دھماکے سے ڈھ گئی۔ اگلے ہی لمحے ٹریکٹر ٹرالی چوکی کے احاطے میں تھی۔

میں نے برآمدے میں موجود ایک پولیس اہلکار کو بری طرح چونکتے اور کرسی سے کھڑے ہوتے دیکھا۔ دیوار ڈھ جانے سے گرد کا ایک بادل سا اٹھ کر ٹریکٹر ٹرالی کو ڈھانپ چکا تھا۔ میں جست لگا کر نیچے اترا اور اس گرد و غبار سے فائدہ اٹھاتا ہوا چار دیواری سے نکلا اور دائیں جانب کے کھیتوں میں گھس گیا۔ مکئی کے یہ اونچے کھیت میرے لیے بہترین پناہ گاہ ثابت ہوئے۔ میں قریباً سو میٹر تک کھیت کے اندر ہی بھاگتا چلا گیا پھر ایک جگہ رک کر صورتِ حال کا جائزہ لینے لگا۔ میری توقع پوری ہوئی۔ تعاقب میں آنے والے گھڑ سوار چوکی سے دور ہی رک گئے۔ ان میں سے دو تین کے پاس ٹارچیں بھی تھیں، ٹارچوں کی روشنی ان کی لوکیشن کا پتا دے رہی تھی پھر ایک دیہاتی تانگا نظر آیا۔ وہ ہمارا کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک پہنچا تھا۔ وہ بھی گھڑ سواروں کے قریب ہی رک گیا۔ اب جو کچھ بھی تھا لیکن وکرم اور رام پیاری پولیس چوکی میں تھے۔ میں اب یہاں سے واپس جا سکتا تھا۔

○......❖......○

اگلے روز پورے گاؤں میں رات والے واقعے کا چرچا تھا۔ اس سارے واقعے کے بارے میں، میں نے انیق کو کل رات ہی بتا دیا تھا۔ وکرم کی رہائش والے گھر کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا تھا۔ ایک حصے کو جو آگ لگائی گئی تھی وہ حملہ آوروں میں سے ہی کچھ لوگوں نے بجھا دی تھی۔ کچھ توڑ پھوڑ ضرور ہوئی تھی۔ مجھے حق نواز کی زبانی پتا چلا کہ وکرم اور رام پیاری اس سے پہلے گاؤں کے اندر ہی مارواڑیوں کے محلے میں رہتے تھے۔ وکرم چونکہ بیمار تھا اس لیے چھوت کے ڈر سے اسے گاؤں سے باہر رہنے کے لیے زمیندار عالمگیر نے ایک پرانا مکان دے دیا تھا۔ یہ کوئی ڈیڑھ دو مہینے پہلے کی بات تھی۔ وکرم کو گاؤں سے باہر نکالنے میں کچھ ہاتھ اس کے پڑوسی ریاست علی کا بھی تھا۔ ریاست کے بچے اکثر وکرم کے گھر کھیلنے چلے جاتے تھے۔ ریاست کا بڑا لڑکا جس کی عمر چھ سات سال تھی، بیمار رہنے لگا تھا۔ اسے اسپتال میں دکھایا گیا تو پتا چلا کہ اسے ٹی بی ہو گئی ہے۔ ریاست علی کو پہلا خیال یہی آیا کہ بچے کو یہ بیماری وکرم کے گھر جانے سے لگی ہے۔ اس بات پر ریاست کی بیوی اور وکرم کی بیوی کے درمیان بہت جھگڑا بھی ہوا تھا۔ ریاست علی کی بیوی نے کہا کہ وکرم اور رام پیاری نے بیماری والی بات محلے داروں سے ایک عرصے تک چھپائے رکھی۔ وہ اپنے بچے کی بیماری کے لیے وکرم کو قصوروار ٹھہراتے تھے۔ اب ایک دن پہلے وہ بچہ گوجرانوالہ کے بڑے اسپتال میں دم توڑ گیا تھا۔ بچے کے وارث غم وغصے کے عالم میں وکرم اور رام پیاری کے گھر پر چڑھ دوڑے تھے۔ گاؤں کے اکثر لوگ اس چڑھائی کو غلط قرار دے رہے تھے۔ بہرحال کچھ حمایت بھی کر رہے تھے۔

میری اور حق نواز کی بات چیت کے دوران میں ہی میواتی پہلوان حشمت راہی بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس کے ایک ہاتھ پر چوٹ کا نشان دکھائی دے رہا تھا جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ چوٹ رات والے ہنگامے کا نتیجہ تھی۔ پہلوان پتا کرنے آیا تھا کہ سولنگی کو ابھی پولیس والوں سے رہائی ملی ہے یا نہیں۔ حق نواز نے اسے بتایا کہ امید ہے آج وہ حوالات سے چھوٹ جائے گا۔ میں نے رات کو حشمت پہلوان کو مولوی فدا کے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے دیکھا تھا مگر پہلوان کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ کیونکہ میرا چہرہ اس وقت چھپا ہوا تھا۔ حق نواز نے پہلوان سے رات والے واقعے کی تفصیل پوچھی۔ اس نے اپنے مخصوص لہجے میں بتایا۔

''یہ سراسر مارواڑیوں کا ہی قصور تھا۔ ان کا بچہ دنیا سے چلا گیا لیکن زندگی موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہووے ہے۔ اس میں وکرم اور اس کی پتنی کا کیا گناہ۔ اور لوگ بھی تو وکرم کے

گھر آتے جاتے تھے اس سے ملتے جلتے تھے، یہ بیماری اس بچے راشد کو ہی کیوں لگی۔ بس اس بے چارے کی آئی ہوئی تھی۔''

''لیکن پہلوان جی سنا ہے کہ جب مارواڑیوں نے وکرم کے گھر پر ہلا بولا تو اس ویلے مولوی فدا بھی وہاں تھے۔ وہ کیا کرنے گئے تھے؟'' حق نواز نے کہا۔

''مولوی فدا دل کا برا بندہ ناہیں ہے۔ سب جانت ہیں کہ وہ وہاں کیوں گیا تھا۔ بس اب باتیں بنا کر چسکا لیوت ہیں اور تم بھی ایسا ہی کرر ہے ہو۔'' پہلوان نے برا سا منہ بنایا۔

''پہلوان جی، سنا ہے کہ اگر وہ ڈھاٹا پوش بندہ وہاں نہ پہنچتا اور وکرم اور اس کی بیوی کو وہاں سے نکال کر نہ لے جاتا تو ان دونوں کے ساتھ کچھ بہت برا ہو جانا تھا۔'' انیق بولا۔

ہاں یہ بات تو سولہ پیسے ٹھیک ہے۔'' پہلوان نے اپنا تربوز جیسا سر اوپر نیچے ہلایا۔ وہ غالباً سولہ آنے کہنا چاہتا تھا۔''بھیا جی، اس نے بڑی دلیری دکھائی ورنہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔''

''پہلوان! تم تو وہاں موجود تھے۔ تمہیں بھی کچھ اندازہ نہیں ہوا کہ وہ کون تھا؟ اس کی آواز تم نے سنی ہوگی۔ اس کی چال ڈھال، اس کے قد کاٹھ سے کچھ پتا نہیں چلا؟'' حق نواز نے پوچھا۔

''نہیں کوئی خاص اندازہ نہیں ہوا لیکن وہ لگتا ہمارے گاؤں کا ہی ہے۔'' پہلوان حشمت نے کہا۔

''پہلوان جی! ہم نے ایک اور بات سنی ہے۔ مولوی جی کا شاگرد طارق بھی زخمی ہوا ہے۔ اسے کسی نے سر پر بڑی بری چوٹ لگائی اور پھر وکرم کے گھر کے کمرے میں بند کر دیا۔''

''ہاں، یہ ہوا تو ہے بلکہ میں نے تو مولوی فدا کے سر پر بھی چوٹ دیکھی ہے۔ اب پتا نہیں کہ یہ مارواڑیوں میں سے کسی کا کام ہے یا کوئی اور چکر۔ ابھی بات کھلی ناہیں مگر دودھ کا پانی اور پانی کا دودھ تو ہووے گا ہی۔'' پہلوان نے پھر ایک محاورے کا حلیہ بگاڑا۔

''یہ طارق اب کیسا ہے؟'' حق نواز نے پہلوان سے پوچھا۔

''اسے بھی اسپتال لے کر گئے تھے وہاں سے مرہم پٹی کروا کے آ گیا ہے۔ صبح اپنے گاؤں چلا گیا تھا۔''

پہلوان کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ طارق نامی وہ لڑکا قریبی گاؤں روہی والا کا رہنے والا ہے۔ میری ٹھوکر سے اس کی کنپٹی پر خاصی چوٹ آئی تھی۔ وہ کافی دیر بہکی بہکی باتیں کرتا رہا تھا بہر حال اب وہ ٹھیک ہے۔

میرا ذہن بار بار مولوی فدا اور اس کے طارق نامی شاگرد کی طرف جا رہا تھا۔ کل رات

جو کچھ ہوا اس سے مولوی فدا کی پوزیشن کچھ صاف ہوگئی تھی لیکن دو چار باتیں ابھی تک سمجھ سے باہر تھیں۔ اگر مولوی فدا اتنے ہی سچے کھرے بندے تھے اور ایسی ہی خدا خوفی رکھتے تھے تو پھر وہ تاجور کے سلسلے میں لوگوں کو گمراہ کیوں کر رہے تھے۔ کیوں اس سلسلے میں پیر ولایت کے ہمنوا بن گئے تھے۔ وہ بھی گاؤں میں دو بدصورت عورتوں کے گشت کی بات کرتے تھے اور لوگوں کو ہراساں کر رہے تھے۔ گھروں میں پتھر پڑنے، آگ لگنے اور مرغیوں کے کٹے ہوئے سر ملنے کو بھی وہ ہوائی چیزوں کی کارستانی قرار دے رہے تھے۔ کیا اس کے پیچھے کوئی حکمت تھی یا پھر واقعی وہ بھی لالچ یا دباؤ کے دھارے میں بہہ گئے تھے۔

رات والے واقعے میں پہلوان حشمت نے اپنے کردار کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا اور بتایا کہ بے شک پینٹ جیکٹ والے ڈھاٹا پوش بندے نے دلیری دکھائی اور میاں بیوی کو خطرے سے نکالا لیکن اس میں ان کا بھی بہت ہاتھ تھا۔ پہلوان نے کہا۔ ''ایک موقعے پر مولوی جی اور وہ ڈھاٹے والا دونوں پیچھے ہٹ گئے تھے لیکن میں نے کلہاڑی پکڑ لی اور صاف کہہ دیا کہ اگر کسی نے دہلیز سے آگے قدم رکھا تو خون خرابا ہووے گا۔ تمہیں پتا ہی ہے جب مجھے غصہ آتا ہے تو پھر میں بھاؤ تاؤ نہیں دیکھتا۔'' شاید پہلوان آؤ تاؤ کہنا چاہ رہا تھا۔ دہلیز پار کرنے والی جو بات وہ کہہ رہا تھا وہ کل رات کم از کم میرے سامنے تو نہیں ہوئی تھی۔

جاتے جاتے پہلوان نے ایک پرانا شعر بھی سنا دیا۔ جس کا مطلب سلیس اردو میں یہ تھا کہ اس دھرتی پر اب بہت کچھ انوکھا ہونے والا ہے۔ جو لوگ سمجھ بوجھ رکھتے ہیں، انہیں ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا ہوگا۔

پہلوان کے جانے کے بعد میرے اشارے پر انیق نے حق نواز سے پوچھا کہ اس کی ملاقات تاجور یا تاجور کے والد دین محمد سے ہوئی ہے؟

حق نواز نے اس کا جواب اثبات میں دیتے ہوئے کہا۔ ''آج سویرے میں نے چھوٹی مالکن (تاجور) کو مالک کے ساتھ تانگے میں بیٹھتے ہوئے دیکھا تھا۔ مجھے لگتا ہے باپ بیٹی دو تین دن کے لیے چاند گڑھی سے چلے گئے ہیں۔''

''وہ کیوں؟'' انیق نے پوچھا۔

''وہی تھانے دار سجاد کا ڈر۔ ایسے لوگوں سے ڈرنا ہی چنگا ہوتا ہے۔ شاید مالک کا خیال ہو کہ حالات ذرا ٹھیک ہو جائیں تو واپس آ جائیں گے۔''

''پر اس طرح تو تھانے دار سجاد اور بھی شک میں پڑ جائے گا۔''

''میرا خیال ہے کہ ایک دو دن کے لیے دائیں بائیں ہو جانے کا مشورہ مالک کو کسی

سیانے نے ہی دیا ہوگا۔ یہ بات تو پکی ہے کہ نمبردارنی کو مارنے اور زخمی کرنے والی چھوٹی مالکن (تاجور) نہیں تھی۔ پر ابھی یہ تو پتا نہیں چلا نا کہ اصل جرم وار کون ہے۔ جرم وار کا پتا چل گیا تو پھر چھوٹی مالکن یا مالک کی گرفتاری کا ڈر نہیں رہے گا۔“

حق نواز کی بات میں وزن تھا۔ اس وقت ضرورت اس امر کی تھی کہ پتا چلے کہ نمبردارنی کی حالت کا اصل ذمے دار کون ہے۔ نمبردارنی نادرہ کی حالت مسلسل خراب تھی۔ اسے پھر اسپتال پہنچا دیا گیا تھا۔ لکڑی کے وزنی ڈنڈے نے اس کے سر کو کافی نقصان پہنچایا تھا۔ اس کی ناک سے گاہے بگاہے خون بھی رِسنے لگتا تھا۔ کسی وقت میں یہ سوچ کر کانپ جاتا تھا کہ اگر یہ سب کچھ تاجور کے ساتھ ہو گیا ہوتا، تو کیا ہوتا؟ میرا دھیان ایک بار پھر مولوی فدا اور اس کے شاگرد طارق کی طرف جانے لگا۔ پتا نہیں کیوں میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ میں ان سے کوئی خاص بات معلوم کر سکتا ہوں۔ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے طارق سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔

طارق کا پورا نام محمد طارق وارثی تھا۔ وہ مدرسے کے پرانے طالب علموں میں سے تھا۔ آج حق نواز اور انیق کی باتوں سے مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ ساتھ والے گاؤں روہی والا کے پاس چلا گیا ہے۔ انیق آج سہ پہر روہی والا کی بڑی نہر دیکھنے کے بہانے وہاں گیا تھا اور طارق کا پورا اتا پتا لے آیا تھا۔

○......❖......○

پروگرام کے مطابق رات دس بجے کے لگ بھگ میں نے اپنا صندوق کھولا۔ یہ بڑا خاص طرح کا صندوق تھا۔ باہر سے دیکھنے پر عام سا ٹرنک نما بکس لگتا تھا لیکن اس کے پیندے کی دو تہیں تھیں۔ اسی طرح ڈھکنا بھی دو پرتوں کا تھا۔ درمیانی خلا میں مختلف اشیا چھپائی جا سکتی تھیں اور انہیں آسانی سے ڈھونڈنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے اپنی پتلون، اپنا نقاب نما ڈھاٹا اور پستول پیندے والی پرت میں چھپا رکھا تھا۔ اس کے علاوہ میں اپنے ساتھ ایک چھوٹا اسپائی کیمرا، ایک ننھا سا وائس ریکارڈر، ایک ڈکٹا فون اور اس طرح کی ایک دو مزید چیزیں اپنے ساتھ لایا تھا۔ یہ اشیا ڈھکن والی پرت میں چھپائی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ خاص طرح کے جوگر جیسے بوٹ تھے جنہیں تہ کر کے مختصر جگہ میں رکھا جا سکتا تھا۔

میں نے صندوق میں سے اپنی مطلوبہ چیزیں نکال لیں۔ پتلون، جوگر اور ڈھاٹا، بالائی جسم کے لیے جیکٹ تھی اور یہ وہی بوسیدہ سی جیکٹ تھی جو میں سارا دن پہنے رہتا تھا لیکن یہ دہری جیکٹ تھی یعنی اسے الٹا کر بھی پہنا جا سکتا تھا۔ الٹانے سے یہ بالکل مختلف رنگ اور

مختلف رنگ زین کی جیکٹ بن جاتی تھی۔ اس سارے لباس کو میں ایک لمبی گرم چادر سے ڈھانپ سکتا تھا۔

چادر اوڑھ کر میں باہر نکلا اور پیدل ہی طارق کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ سردیوں کی ایک اور دھند آلود رات تھی۔ کھیتوں، کھلیانوں پر خاموشی چھائی ہوئی تھی اور راستے بالکل سنسان دکھائی دیتے تھے۔ بس کبھی کبھی کھیت میں روشنی کی جھلک نظر آتی تھی یا پھر کوئی سکڑا سمٹا راہی دکھائی دے جاتا تھا۔ کھیتوں کے درمیان، ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیوں پر سفر کر کے میں قریباً آدھے گھنٹے میں روہی والا اور پھر طارق کے گھر پر پہنچ گیا۔ یہ رات کے قریباً گیارہ بجے کا عمل تھا۔ قریب ہی کسی گلی سے چوکیدار کی خمار آلود آواز ابھری۔

''جاگدے رہنا۔'' اس کے ساتھ ہی کسی دور کی گلی میں کتے شور مچانے لگے۔ طارق کا گھر شناخت کرنے میں مجھے قطعی کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ ان علاقوں میں کھجور کا درخت نہیں ہوتا لیکن طارق کے گھر کے صحن میں کھجور کے دو درخت موجود تھے۔ انیق کی حاصل کردہ معلومات کے مطابق، اس کا باپ شہر، مزدوری کے لیے گیا ہوا تھا۔ اس کی ادھیڑ عمر والدہ اور چھوٹا بھائی گھر میں ہوتے تھے۔ میں نے بیرونی دیوار پھاندی اور چند سیکنڈ کے اندر اس کمرے کے عین سامنے پہنچ گیا جہاں طارق لحاف اوڑھے سو رہا تھا۔ دروازے پر دباؤ ڈالا تو وہ غیر متوقع طور پر اندر سے بند نہیں تھا۔ اس کے پٹ تھوڑے سے کھل گئے۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں اندر کی صورتِ حال دکھائی دے رہی تھی۔ طارق کی کنپٹی پر سفید رنگ کی بینڈیج، میڈیکل ٹیپ سے چپکی ہوئی تھی۔ پاس ہی ایک چارپائی پر اس کا تیرہ چودہ سالہ بھائی سویا ہوا تھا۔

یکایک مجھے چونکنا پڑا۔ میں یہاں اس لیے آیا تھا کہ طارق سے مل کر اس سے مولوی فدا اور پیر ولایت وغیرہ کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کر سکوں مگر جب میں نے ادھ کھلے دروازے سے کمرے میں جھانکا تو میری نگاہ بے ساختہ ایک چیز پر ٹھہر گئی۔ میں نے دوبارہ آنکھیں سکیڑ کر دیکھا اور مجھے دل کی دھڑکنیں بڑھتی محسوس ہوئیں۔ طارق کے سرہانے کی طرف لکڑی کی ایک چھوٹی میز رکھی تھی۔ اس پر دواؤں کی دو تین بوتلیں تھیں اور شیشے کا گلاس رکھا تھا اور اس کے ساتھ ایک چھوٹی سی تسبیح بھی رکھی تھی۔ یہی تسبیح تھی جس کو دیکھ کر میرا دورانِ خون بڑھا تھا۔ ایسی ہی تسبیح کا ذکر تاجور نے کیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ واردات کی رات اسے مضروب نمبردارنی نادرہ کی چارپائی کے پاس ایک چھوٹی تسبیح پڑی ہوئی ملی تھی۔ میری نگاہیں بدستور تسبیح پر جمی ہوئی تھیں۔ یقینی بات تھی کہ یہ طارق کی تسبیح تھی۔ تو کیا...... وہ

تسبیح بھی اس جوشیلے نوجوان کی تھی؟ کیا تاجور کے گھر میں گھس کر نمبردارنی پر حملہ کرنے والا وہی تھا۔ ابھی اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن اگر واقعی ایسا ہوا تھا تو پھر کئی سوال ذہن میں ابھرتے تھے۔ طارق نے ایسا کیوں کیا؟ اسے نمبردارنی سے کیا دشمنی ہوسکتی تھی اور تاجور کے گھر والوں سے کیا ہمدردی ہوسکتی تھی یا پھر اس نے تاجور اور اس کے گھر والوں کو پھنسانے کے لیے یہ کارروائی کیوں کی تھی؟

اس تسبیح کو دیکھنے کے بعد کچھ اور ثابت ہوتا ہو یا نہیں لیکن میرے اندر مولوی فدا کے اس شاگرد کے حوالے سے بے پناہ تجسس ضرور جاگ اٹھا تھا۔ میں نے دروازہ کھولا اور بہت آہستہ سے اندر داخل ہوگیا۔ میں نے پہلے طارق کے منہ پر مضبوطی سے اپنا ہاتھ جمایا پھر ٹھوکا دے کر اسے جگا دیا۔ وہ آنکھیں پھاڑ کر میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کی نیند سے سرخ آنکھوں میں کوئی تاثر نہیں تھا۔ شاید وہ ابھی تک صورتِ حال کو سمجھا نہیں تھا اور پھر جب وہ سمجھا تو اس نے تڑپنے مچلنے کی کوشش کی۔ میں نے پستول کی نال اس کی پیشانی سے لگا دی اور سرسراتی آواز میں سرگوشی کی۔ ''تمہیں کل والا سبق بھولا نہیں ہوگا طارق وارثی! اگر تڑپو پھڑکو گے تو نقصان اٹھاؤ گے۔ اگر میری بات پر عمل کرو گے تو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ کانٹا چبھنے کی تکلیف بھی نہیں دوں گا۔''

اس نے ہوش و حواس میں آنے اور صورتِ حال کو سمجھنے میں قریباً نصف منٹ لے لیا۔ بہرحال جب ایک بار وہ سچویشن کو سمجھ گیا اور میری طاقت کو بھی جان گیا تو اس نے عقل مندی کا ثبوت دیا۔ اس نے اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔ میں نے کہا۔ ''اگر تم شور نہیں کرو گے تو میں تمہارے منہ سے ہاتھ ہٹا دیتا ہوں۔''

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے ہاتھ منہ سے ہٹا لیا۔ پستول کا رخ بدستور اس کے سر کی طرف تھا۔ کل رات اس کی کنپٹی پر جہاں میری ٹھوکر لگی تھی وہاں باقاعدہ زخم ہوگیا تھا۔ یہ خوف ناک ضرب اسے بھولی نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ میری ہدایت پر بے چوں و چرا عمل کر رہا تھا۔ اس کا سارا جوش و ولولہ دھیما پڑ گیا تھا۔ میں اسے لے کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ میں نے اس سے کہا کہ میں اس سے چند ضروری سوال پوچھ کر یہاں سے چلا جاؤں گا لہٰذا اس کی عافیت اسی میں ہے کہ وہ مجھے کسی ایسے کمرے میں لے چلے جہاں اطمینان سے آدھ پون گھنٹا بات ہو سکے۔

کچھ ہی دیر بعد ہم بیرونی دروازے کے پاس ایک چھوٹی سی بیٹھک میں بیٹھے تھے۔ یہاں آنے سے پہلے میں نے طارق کے کمرے کی میز پر سے وہ چھوٹی تسبیح اٹھا لی تھی۔ میری

ہدایت پر اس نے اپنے کمرے کی لالٹین بجھادی تھی۔ مقصد یہی تھا کہ اگر اس کا چھوٹا بھائی جاگ جاتا تو اسے بڑے بھائی کی غیر موجودگی کا پتا نہ چلتا۔

بیٹھک میں آ کر طارق نے ایک لیمپ جلایا۔ میں نے دراوزے کو اندر سے کنڈی چڑھادی۔ میں نے کہا۔ ''طارق! میرے پاس زیادہ وقت نہیں۔ اس لیے سیدھی سیدھی بات کرتے ہیں۔ یہ تسبیح تمہاری ہے نا؟''

اس نے ذرا تعجب سے میری طرف دیکھا پھر اثبات میں سر ہلایا۔

''تمہیں پتا ہی ہے چار دن پہلے دین محمد کے گھر آئی ہوئی نمبردارنی پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے اور اس کی حالت ابھی تک خطرے سے باہر نہیں۔'' میں نے کہا۔

طارق نے تھوک نگل کر ایک بار پھر سر کو ہاں میں حرکت دی۔

''نمبردارنی کی چارپائی کے پاس سے ایک بالکل ایسی ہی تسبیح ملی ہے اور مجھے لگتا ہے کہ وہ اس شخص کی ہے جس نے نمبردارنی کو زخمی کیا۔''

طارق کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرا گیا۔ اس نے ڈری ڈری نظروں سے مجھے دیکھ کر کہا۔ ''میں تمہاری بات نہیں سمجھا؟''

''مگر میں کچھ کچھ سمجھ رہا ہوں۔ مجھے شک ہو رہا ہے کہ نمبردارنی پر اس رات حملہ تم نے کیا تھا بلکہ نمبردارنی پر نہیں، تم نے شاید دین محمد کی بیٹی تاجور کو نشانہ بنایا تھا لیکن وہ اس وقت اپنے کمرے کے بجائے گھر کی بیٹھک میں سو رہی تھی۔ اس لیے غلطی سے نمبردارنی کا کباڑا ہو گیا......''

طارق کے تاثرات سخت گھبراہٹ والے تھے۔ پتلی پتلی مونچھوں اور چھدری داڑھی کے درمیان اس کے ہونٹ بالکل خشک ہونے لگے تھے۔ میرے دل نے گواہی دی کہ میرے اندھیرے میں چلائے ہوئے تیر ایک دم نشانے پر لگ رہے ہیں۔

وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''آپ......کون......ہو؟''

''خدائی فوج دار...... سمجھو کہ میں اس چاند گڑھی کے بگڑوں تگڑوں کو ٹھیک کرنے کے لیے اسپیشل ڈیوٹی پر تشریف لایا ہوں۔ تم فضول سوالوں میں وقت ضائع کرو گے تو تمہاری جان کسی بڑی مصیبت میں بھی پھنس سکتی ہے بہتر یہی ہے کہ بات کا دائرہ چھوٹا رکھو۔ تم نے دین محمد کی بیٹی تاجور کو مارنے کی کوشش کیوں کی؟''

''مم...... میں نے نہیں کی۔ مجھے کچھ نہیں پتا۔''

''تو پھر کیسے پتا ہے؟ آج شام نمبردارنی تھوڑی دیر کے لیے ہوش میں آئی تھی۔ اس

نے حملہ کرنے والے کا جو حلیہ بتایا ہے وہ ایک سو دس فی صد تم سے مل رہا ہے۔" میں نے طارق کے پاؤں اکھاڑنے کے لیے نمبردارنی کے بارے میں جھوٹ بولا۔

اس کا رنگ کچھ مزید پھیکا پڑ گیا، ایک اور تیر نشانے پر لگا تھا۔

"طارق! مجھے لگتا ہے کہ ابھی ایک آدھ گھنٹے میں پولیس نے یہاں پہنچ جانا ہے کیونکہ ساری شہادتیں تمہاری ہی طرف جا رہی ہیں اور تمہیں پتا ہی ہے کہ سجاد کس طرح کا تھانیدار ہے۔ اگر پولیس کی زبردست مار سے بچنا چاہتے ہو تو مجھے سب کچھ صاف صاف بتا دو۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے لیے جو کچھ کر سکا کروں گا اور اگر تم نے یہ سب کچھ کسی کے کہنے پر کیا ہے تو پھر ہو سکتا ہے کہ تمہیں اس معاملے سے صاف ہی بچا لوں۔"

اس نے ایک بار پھر مجھے سرتاپا دیکھا۔ گھٹی گھٹی آواز میں بولا۔ "لیکن آپ ہو کون؟ کیا آپ بھی پولیس والے ہو؟"

"تم ایک بار پھر فضول سوالوں میں وقت ضائع کر رہے ہو اور میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ تمہارے پاس وقت زیادہ نہیں ہے۔ تم صرف میری بات کا جواب دو۔"

تین چار منٹ کے اندر میں طارق کو اپنے ڈھب پر لے آیا اور وہ اپنی زبان کھولنے پر آمادہ ہو گیا۔

اگلے تقریباً پندرہ منٹ میں ہمارے درمیان بڑی انکشاف انگیز گفتگو ہوئی۔ اس گفتگو نے اس سارے معاملے کا رخ ہی بدل کر رکھ دیا۔ سب سے پہلے تو طارق نے تسلیم کیا کہ نمبردارنی پر حملہ اس نے کیا تھا۔ اس وقت وہ بہت جذباتی حالت میں تھا اور اسے بس یہی لگ رہا تھا کہ اگر آج اس نے کچھ نہ کیا تو پھر حالات حد سے زیادہ بگڑ جائیں گے۔

"مگر تم نمبردارنی کو مارنا چاہتے تھے تو کیوں؟" میں نے پوچھا۔

اس کا جواب حیرت انگیز تھا اور میرے ایک مضبوط شک کے مطابق بھی تھا۔ اس نے اشک بار آواز میں کہا۔ "میں نے نمبردارنی پر نہیں دین محمد کی بیٹی پر حملہ کیا تھا۔ میں...... چاہتا تھا کہ اسے مار ڈالوں یا پھر اس کی شکل اتنی بگاڑ دوں کہ وہ کسی کے کام کی نہ رہے۔"

میں نے اپنے طیش کو بمشکل دبایا اور حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ "کیوں؟ ایسا کیا جرم سرزد ہو گیا تھا اس لڑکی سے؟"

"جرم اس لڑکی سے نہیں اس کی وجہ سے سرزد ہوا ہے اور اتنا بڑا ہے کہ اس نے کسی کی زندگی عذاب بنا کر رکھ دی ہے۔"

"کس کی؟"

''مولوی جی کی...... میرے مولوی جی کی۔ میرے استاد جی کی۔ وہ میرے استاد نہیں میرے روحانی باپ ہیں۔ میں ان کے لیے سب کچھ قربان کرسکتا ہوں۔ میں انہیں اس طرح مجبور و بے بس نہیں دیکھ سکتا تھا۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔

''تمہارا مطلب ہے کہ مولوی صاحب، تاجور کی وجہ سے کسی مصیبت میں ہیں؟''

''تاجور کی وجہ سے نہیں، اس کے کمینے عاشق کی وجہ سے اور عاشق کے حمایتیوں کی وجہ سے۔ ان لوگوں نے میرے مولوی جی کی زندگی عذاب بنادی ہے۔ ان کا جینا، موت سے برا کردیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مولوی جی وہی کہیں جو ان کا حکم ہے۔ وہ مولوی جی جیسے سچے کھرے بندے کے منہ میں اپنی جھوٹی، منحوس زبان رکھنے کی کوشش کررہے ہیں۔ نہ یہ دین محمد کی بیٹی ہوتی نہ یہ سارا فساد ہوتا......''

میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ بات کچھ کچھ میری سمجھ میں آنے لگی تھی۔ شاید مولوی فدا کو کسی بات پر مجبور کیا جارہا تھا اوران کی مجبوری و بے بسی دیکھ کر ان کا جوشیلا شاگرد طارق شعلہ جوالا بن گیا تھا۔

''کیا ہوا ہے مولوی فدا کے ساتھ؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''یہ پوچھو کیا نہیں ہوا ہے۔ تم کہتے ہو میں خدائی فوجدار بن کر آیا ہوں یہاں چاند گڑھی میں۔ تم کیسے خدائی فوجدار ہو۔ تمہیں پتا ہی نہیں کہ گاؤں کے سب سے نیک اور بھلے مانس بندے کے ساتھ کیا ہورہا ہے۔ کیا قیامت ٹوٹ پڑی ہے اس پر۔''

کہنے کو تو وہ یہ بات کہہ گیا لیکن پھر اس کا رنگ ایک دم پھیکا پڑ گیا۔ جیسے اسے احساس ہوا کہ وہ ضرورت سے زیادہ بول گیا ہے۔

بہرحال میں جو کچھ نوٹ کرچکا تھا اسے اب نظر انداز کردینا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ میں نے اسی نکتے کو اپنی گفتگو کا محور بنالیا۔ طارق پہلے تو شدید تذبذب اور اندیشوں کا شکار رہا مگر جب اس نے دیکھ لیا کہ کچھ بتائے بغیر اب اس کی جان چھوٹے گی نہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ میں اس کی مدد کرنے کے وعدے سے بھی پھر جاؤں تو اس نے سخت رازداری کی شرط پر یہ انکشاف کیا کہ مولوی فدا کی نوعمر بیٹی ایک عجیب و غریب بیماری کا شکار ہوگئی ہے۔ مولوی صاحب نے اس کی بیماری کا چرچا تو نہیں کیا مگر وہ اتنے پریشان ہیں کہ لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔

میرے استفسار پر اس نے بتایا۔''اس کا نام زینب ہے۔ مولوی صاحب کی پہلی بیوی سے ہے۔ اس کی عمر مشکل سے بارہ تیرہ سال ہوگی۔ زمیندار عالمگیر کی والدہ بہت نیک اور

ہمدرد عورت ہے۔اس کی نظر بہت کمزور ہو چکی ہے۔اس لیے وہ زینب کو اپنے گھر بلاتی تھی تا کہ وہ اس کے پوتے پوتیوں اور نواسوں وغیرہ کو قاعدہ پڑھائے پھر زینب عالمگیر کی بوڑھی والدہ کے چھوٹے موٹے کام بھی کرنے لگی۔کبھی کبھی وہ ان کے گھر رات بھی رہ لیتی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ وہیں پر رہنے لگی مگر چار پانچ مہینے پہلے مولوی جی نے اس کا وہاں جانا ختم کروادیا۔وہ اب چھوٹی سی بچی تو نہیں رہی تھی۔زینب چند ہی دن بعد ضد کرنے لگی کہ وہ واپس جائے گی۔مولوی جی یہ بات نہیں مانے پھر ایک دن زینب کو سخت بخار ہوا اور وہ بہکی بہکی باتیں کرنے لگی۔گاؤں کے کمپاؤنڈر سے بھی اسے دوالا کر دی گئی۔پر یہ مرض بڑھتا چلا گیا۔بیٹھے بیٹھے ایک دم زینب کی حالت غیر ہو جاتی اور وہ گر کر تڑپنے لگتی۔اس کے ماتھے پر گاڑھے پسینے آتے۔پورا جسم لرزنا شروع ہو جاتا مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ جب اسے عالمگیر کے گھر اس کی والدہ کے پاس بھیجا جاتا تو وہ بالکل ٹھیک ہو جاتی۔لگتا تھا کہ اسے کوئی تکلیف ہے ہی نہیں۔

''کسی بڑے ڈاکٹر کو نہیں دکھایا گیا اسے؟'' میں نے طارق سے پوچھا اس کے ساتھ ہی میں نے جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر چھوٹا سا انتہائی حساس وائس ریکارڈر آن کر دیا۔

''پچھلے مہینے مولوی جی بڑی خاموشی سے اسے گوجرانوالہ لے کر گئے تھے وہاں اس کے ایک دو ٹیسٹ ہوئے لیکن کچھ پتا نہیں چلا۔ڈاکٹروں نے کہا کہ اسے لاہور لے جائیں شاید کچھ معلوم ہو سکے۔وہ لاہور چلے گئے مگر وہاں کسی نے نہیں سنی۔'' طارق نے بتایا۔

''اب کیا پوزیشن ہے؟'' میں نے پوچھا۔

طارق نے سرد آہ بھر کر کہا۔''ایک خیال یہ بھی ہے کہ شاید عالمگیر کے گھر والوں میں سے کسی نے بچی پر تعویز گنڈا کیا ہوا ہے جس کی وجہ سے وہ واپس وہیں جانا چاہتی ہے لیکن عالمگیر کی والدہ پر تو اس قسم کا شک کسی صورت نہیں کیا جا سکتا۔پورے علاقے میں ان جیسی نیک پرہیز گار عورتیں دو چار ہی ہوں گی۔بڑے چھوٹے سب انہیں بڑی عزت سے وڈی اماں کہتے ہیں۔پچھلے دنوں جب مولوی جی نے اس بات کا شک ظاہر کیا کہ شاید ان کی بچی پر کسی نے تعویز دھاگا کیا ہے تو عالمگیر سخت غصے میں آ گیا۔اس نے مولوی جی کی بیٹی کو فوراً اس کے گھر واپس بھیج دیا اور کہا کہ اب یہ ہمارے گھر نہ آئے لیکن تین چار دن بعد ہی اسے پھر عالمگیر کے گھر بھیجنا پڑا بلکہ مولوی جی بے چارے اسے خود چھوڑ کر آئے۔''

''وہ کیوں؟''

''وہی ہوا جو آپ کو بتایا ہے۔اس بے چاری کی حالت بہت بگڑ گئی۔چکر آنے لگے،

پورا جسم کانپنے لگا اور کپڑے پسینے سے بھیگنے لگے پھر بے ہوشی میں بہکی بہکی باتیں کرنے لگی......"

"تمہارا مطلب ہے کہ وہ عالمگیر کے گھر جانے کے بعد ٹھیک ہو جاتی ہے؟"

"بالکل، ایسے لگتا ہے کہ اسے کبھی کچھ ہوا ہی نہیں۔ بچوں کو پڑھاتی بھی ہے، وڈی اماں کے کام بھی کرتی ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے مچھلی واپس پانی میں آ گئی ہو۔ یہ بات ہماری سمجھ میں بالکل نہیں آ رہی۔"

"اس بات کا کس کس کو پتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی تک تو یہ بات صرف مولوی جی کے گھر میں ہے یا پھر عالمگیر اور اس کی بیوی کو پتا ہے یا ہو سکتا ہے کہ تھوڑا بہت وڈی اماں کو بھی پتا ہو۔"

یہ طارق بڑی عجیب بات بتا رہا تھا۔ اگر یہ سب کچھ ایسے ہی تھا تو پھر قابلِ غور تھا۔ ایک نوعمر لڑکی نہ صرف خود مصیبت میں تھی بلکہ اپنے گھر والوں کے لیے بھی مصیبت بنی ہوئی تھی۔

میں نے طارق سے پوچھا۔ "اس بارے میں تمہارا اپنا کیا خیال ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ بچی زینب، عالمگیر کے گھر میں کسی کے ساتھ بہت اٹیچ ہو گئی ہو جیسے کہ وڈی اماں یا پھر کوئی اور...... کہیں ایسا معاملہ تو نہیں کہ عالمگیر نے اسے کسی جال میں پھنسا لیا ہو۔ تم بچی کی عمر بارہ تیرہ سال بتا رہے ہو، یہ بالکل کچا ذہن ہوتا ہے اور......"

"نہیں...... بالکل نہیں۔" طارق نے میری بات کاٹ کر کہا۔ "عالمگیر درمیانی عمر کا سخت گیر بندہ ہے۔ اس کے ساتھ تو پتا نہیں اس کی بیوی کیسے گزارا کرتی ہو گی اور پھر زینب کا ذہن بھی ابھی ایسی باتیں سوچنے کے قابل نہیں ہے۔ بالکل اور طرح کی بچی ہے، دبلی پتلی سی۔"

طارق کو ڈھاٹے میں سے صرف میری آنکھیں ہی نظر آ رہی تھیں۔ وہ بات کرتے ہوئے مسلسل میری آنکھوں میں جھانک رہا تھا جیسے لاشعوری طور پر یہ جاننے کی کوشش کر رہا ہو کہ میں کون ہوں؟

میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "تم نے ابھی بتایا ہے کہ تاجور کا منگیتر اسحاق اور عالمگیر دونوں مولوی جی کو مجبور کر رہے ہیں کہ وہ اپنی بولی چھوڑ کر ان کی زبان میں بات کریں اور ان کی ہاں میں ہاں ملائیں۔ تمہاری باتوں سے پتا چلتا ہے کہ یہ زینب والا معاملہ ہی مولوی جی کی مجبوری ہے۔"

"بالکل ایسا ہی ہے۔" طارق نے کہا۔ "وہ خبیث عالمگیر اس صورتِ حال سے فائدہ

اٹھا رہا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ مولوی جی اپنی بچی کی وجہ سے بے بس ہیں اور اس سے اپنے تعلقات کسی صورت نہیں بگاڑ سکتے۔ وہ ان سے کہتا ہے کہ وہ تاجور اور ساتے کی شادی کی حمایت کریں۔ مولوی جی نے دو تین بار بچی کی نازک حالت دیکھی ہوئی ہے۔ وہ لاچار ہو گئے ہیں۔ ورنہ ان جیسا بندہ تو پیر ولایت کی باتوں پر سو بار لعنت بھیجے۔''

اچانک کسی قریبی کمرے میں آہٹ ہوئی پھر ایک آواز آئی، یہ طارق کی ادھیڑ عمر والدہ تھی جو شاید غنودگی میں بڑبڑائی تھی پھر وہ کھانسنے لگی۔

طارق بولا۔ ''شاید وہ پانی مانگ رہی ہیں، اگر میں نہ گیا تو وہ خود اٹھ کر باہر آجائیں گی۔''

''تو ٹھیک ہے جاؤ مگر کسی طرح کا فتور اپنے دماغ میں نہ لانا۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہیں یا تمہارے گھر کے کسی بندے کو مجھ سے کوئی نقصان پہنچے۔ میں اس وقت یہاں تمہارے خیر خواہ کی حیثیت سے بیٹھا ہوں اور مجھے اسی حیثیت میں رہنے دینا۔''

وہ میری بات سمجھ رہا تھا۔ اس نے تسلی دینے والے انداز میں اثبات میں سر ہلایا۔ پستول میری گود میں پڑا تھا۔ میں نے طارق کو اشارہ کیا، وہ والدہ کو دیکھنے کے لیے باہر چلا گیا۔ میں نے دروازہ تھوڑا سا کھلا رہنے دیا تاکہ گھر کے صحن اور برآمدے پر میری نظر رہے۔ ایک سرد تاریکی نے گھر کے در و دیوار کو ڈھانپ رکھا تھا۔ کمرے میں چھوٹے لیمپ کی مدھم روشنی تھی۔ اس روشنی میں میری نظر ایک ادھ کھلی دراز کے اندر ایک موبائل فون پر پڑی۔ میں نے وہ نکال لیا۔ اس دور دراز علاقے میں جہاں سڑک اور بجلی، پانی جیسی بنیادی سہولتیں بھی میسر نہیں تھیں، موبائل فون موجود تھے۔ یہ بات ذرا حیران کن تھی۔

میں نے موبائل چیک کرنا کیا فوراً پتا چل گیا کہ یہ طارق کا ہی تھا۔ کافی پرانا تھا، بمشکل ہزار پندرہ سو کا ہو گا لیکن کیمرا اور ایف ایم ریڈیو جیسی ایپلی کیشنز اس میں موجود تھیں۔ کونٹیکٹس میں دوستوں کے نام تھے۔ ان بکس میں دو درجن کے قریب میسج موجود تھے۔ ان میں بھی کوئی قابلِ اعتراض بات نظر نہیں آئی۔ بھیجے گئے پیغامات میں ایک پیغام طارق نے اپنے کسی وقاص نامی دوست کو بھیجا تھا، اس سے پتا چلتا تھا کہ طارق مولوی جی سے کتنی گہری عقیدت رکھتا ہے اور ان کو دکھی دیکھ کر کس طرح خود بھی دکھی ہو جاتا ہے۔ آٹھ دس دن پہلے طارق نے وقاص نامی دوست کو جو پیغام بھیجا تھا، وہ اس طرح تھا۔

''ہمارے مولوی جی کی مشکلوں کی ایک جڑ ہے...... کسی دن اس جڑ کو ہی اکھاڑ پھینکوں گا۔''

تو کیا اس نے تاجور کو ہی جڑ قرار دیا تھا اور پھر اس پر حملہ کیا تھا لیکن اس حملے میں تاجور کے بجائے نمبردارنی گھائل ہو گئی تھی۔

اچانک میری نظر ایک وڈیو کلپ پر پڑی اور میں حیران رہ گیا۔ یہ وڈیو کلپ یقیناً مولوی جی کی بچی زینب کا ہی تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا بچی کی حالت سرگودھا کے ایک معالج کو دکھانے کے لیے یہ کلپ مولوی جی نے ہی بنوایا تھا۔ زینب بارہ تیرہ سال کی دبلی پتلی لڑکی تھی، گوری چٹی تھی اور یقیناً نقوش بھی اچھے تھے مگر وہ کلپ کے اندر بری حالت میں دکھائی دے رہی تھی۔ وہ کچی زمین پر گری ہوئی تھی اور سمٹ کر گٹھڑی سی بن گئی تھی۔ اس کا پورا جسم تھرتھر کانپ رہا تھا۔ آنکھوں کی پتلیاں اوپر چڑھی ہوئی تھیں اور پسینا دھاروں کی صورت چہرے اور گردن سے بہہ رہا تھا۔ مولوی جی اس کا سر دوپٹے سے ڈھانپنے اور اسے پانی پلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کے چہرے پر ایسا کرب تھا جسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بچی ان کے پاؤں کو ہاتھ لگا رہی تھی اور کچھ کہہ بھی رہی تھی۔ غالباً یہی کہہ رہی تھی کہ اسے وڈی اماں کے گھر واپس بھیج دیا جائے۔ کلپ میں آڈیو بھی موجود تھی مگر آوازیں صاف نہیں تھیں۔ بس کسی وقت مولوی جی کی دکھ بھری آواز ابھرتی تھی۔

''زینب...... ہوش کر میرا پتر...... زینب۔''

برآمدے کی طرف سے قدموں کی چاپ ابھری۔ طارق اپنی والدہ کو پانی پلا کر واپس آ رہا تھا۔ میں نے موبائل فون جلدی سے واپس اس کی جگہ پر رکھ دیا اور طارق کی طرف سے چوکس ہو گیا۔

اب واقعات کی کئی کڑیاں مل گئی تھیں اور ایک چھوٹی سی کہانی مکمل ہو گئی تھی جو کچھ اس طرح سے تھی۔

''تاجور کے گرد گھیرا تنگ سے تنگ کیا جا رہا تھا۔ اسحاق ہر صورت اسے بیاہ کر اپنے گھر لے جانا چاہتا تھا۔ اس کا رابطہ پیر ولایت اور زمین دار عالمگیر جیسے کرپٹ لوگوں سے تھا۔ وہ سب مل کر تاجور اور اس کے گھر والوں کے گرد جال بُن رہے تھے۔ مولوی فدا ان چند لوگوں میں سے تھے جو اسحاق اور اس کے ساتھیوں کے خلاف آواز اٹھاتے تھے اور چاند گڑھی میں مولوی جی کی رائے کی بہت اہمیت تھی مگر اب وہ بھی اس گھیرے میں آ گئے تھے۔ ان کی بچی کے ساتھ کوئی ایسا مسئلہ ہو گیا تھا کہ وہ زمیندار عالمگیر کے گھر میں رہنا چاہتی تھی اور اگر وہاں نہیں ہوتی تھی تو اس کی حالت غیر ہو جاتی تھی۔ عالمگیر وغیرہ اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھا رہے تھے اور مولوی صاحب کو اپنی مرضی کی زبان بولنے پر مجبور کر رہے تھے۔ مولوی

صاحب کی بے بسی دیکھ کر ان کا جوشیلا شاگرد طارق کچھ اور انداز سے سوچنے لگا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس فساد کی جڑ تاجور ہے۔ چند دن پہلے اس نے جنون کے عالم میں تاجور پر حملہ کیا تھا مگر تاجور کے بجائے نمبردارنی نادرہ نشانہ بن گئی تھی۔

یہاں تک تو سب سمجھ میں آ گیا مگر ایک نیا سوال پیدا ہو گیا تھا۔ مولوی جی کی معصوم بچی کے ساتھ کیا معاملہ تھا۔ جادو ٹونے والی بات تو مجھ جیسے شخص کو کسی طور ہضم نہیں ہو سکتی تھی۔ تو کیا پھر یہ کوئی جسمانی عارضہ تھا یا نفسیاتی معاملہ؟

طارق مسلسل میری آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ مری مری آواز میں کہنے لگا۔ ''آپ مولوی جی کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟''

''جو بھی کر سکا۔'' میں نے کہا۔ ''بچی کی خاطر بلیک میل ہوتے رہنا مسئلے کا حل نہیں ہے۔ بچی کو علاج معالجے کے لیے شہر بھجوایا جا سکتا ہے۔''

''ٹھیک ہے، آپ جو بھی کریں لیکن میری ایک منت ہے، اس زینب والی بات کو آپ اپنے تک ہی رکھنا۔ یہ مولوی جی کے لیے بڑی بدنامی کی بات ہے اور ان کی بدنامی یا بے عزتی مجھ سے کسی طرح برداشت نہیں ہوتی۔''

''اگر مولوی جی کی عزت کا اتنا ہی خیال تھا تو پھر ایسی حرکت کیوں کی؟ دین محمد کی بیٹی تاجور کا کیا گناہ تھا کہ اسے مارنے کے لیے چڑھ دوڑے۔ وہ تو خود ظلم سہہ رہی ہے۔ اس کا پورا گھر سہہ رہا ہے۔ اس کے لیے تمہیں شرم آنی چاہیے تھی۔''

وہ روہانسی آواز میں بولا۔ ''میں کیا کرتا...... میں نے ایک رات پہلے مولوی جی کو حجرے میں ہچکیوں سے روتے دیکھا، اور غم کی وجہ سے کچھ بھی میرے بس میں نہ رہا پھر بھی میں کسی کو جان سے مارنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا......''

''بس شکل بگاڑ دینا چاہتے تھے۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

اس نے سر جھکا لیا۔ اس کے کان سرخ ہو رہے تھے۔ پتا نہیں یہ شرم کی سرخی تھی یا غصے کی۔

اتنے میں ایک بار پھر قریبی کمرے سے اس کی والدہ کے بڑبڑانے کی آواز آئی۔ اب وہ شاید کچھ اور مانگ رہی تھی۔ میری توجہ بس ایک سیکنڈ کے لیے اس آواز کی طرف گئی تھی کہ پھرتیلے طارق نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا، وہ لپک کر میری طرف آیا۔ وہ میری گود میں رکھا ہوا پستول پکڑنا چاہتا تھا۔ اس نے بہت تیزی دکھائی تھی پھر بھی یہ کم تھی۔

میں نے تڑپ کر اپنا گھٹنا اوپر اٹھایا۔ طارق کا آگے کو جھپٹتا ہوا جسم میرے گھٹنے سے

ٹکرایا، وہ پہلو کے بل گرا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پیچ کس آگیا۔ اس نے مجھے زخمی کرنے کے لیے بے دریغ وار کیا۔ پیچ کس میرے کندھے کو چھوتا ہوا نکل گیا۔ اپنی جھونک میں وہ خود ہی کرسی سے ٹکرا کر پشت کے بل گرا۔ میں نے پلٹ کر اسے چھاپ لیا۔ پیچ کس والا ہاتھ میری گرفت میں تھا۔ وہ سینے کی پوری قوت سے چلانے لگا اور اس کے ساتھ ساتھ میرے چہرے سے ڈھاٹا نوچنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ میری شکل دیکھنا چاہ رہا تھا لیکن اسی دوران میں اس کی ٹانگ لگنے سے لیمپ گر کر چکنا چور ہو گیا اور کمرے میں تاریکی چھا گئی۔ میرا ایک بھرپور مکا کھا کر وہ صحن میں گرا۔ تاہم دوبارہ میری طرف آنے کے بجائے وہ مٹی کی سیڑھیوں کی طرف لپک گیا۔ میں نے بھی اس کے پیچھے جانا ضروری نہیں سمجھا اور کمرے کا بیرونی دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ طارق کا واویلا سن کر گھر والے جاگ گئے تھے اور اب شاید اس کے چھوٹے بھائی کے پکارنے کی آواز آ رہی تھی۔

"بھائی جان! کہاں ہو؟"

بھائی جان شاید چھت پر پہنچ گیا تھا اور ہو سکتا ہے کہ گلی کی طرف کود گیا ہو۔ میں ایک قریبی گلی سے گزر کر کھیتوں میں داخل ہو گیا اور مکئی کے اونچے پودوں میں اندر ہی اندر چلتا ہوا گاؤں سے باہر جانے والے راستے کی طرف بڑھنے لگا۔ میں نے گرم چادر کو ایک بڑی بکل کی طرح لپیٹ رکھا تھا۔ اس بکل میں سے صرف میرے پاؤں ہی دکھائی دیتے تھے۔ دیکھنے والے کے لیے میں ایک چادر پوش دیہاتی ہی تھا۔

O......❖......O

رات کو میں نے اپنے جدید وائس ریکارڈر پر طارق وارثی کا اعترافی بیان ریکارڈ کرلیا تھا۔ واپس آ کر یہ بیان میں نے انیق کو بھی سنایا۔ آواز واضح تھی اور صاف پہچانی جاتی تھی۔ یہ طارق کے خلاف ایک زبردست ثبوت بن سکتی تھی مگر اس کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ صبح سویرے پہلوان حشمت کی زبانی ایک سنسنی خیز خبر مل گئی۔ حشمت پہلوان نے بتایا۔ "کل رات بہت بڑا دھما کا ہوا ہے، پولیس والے بھی اش اش کر اٹھے ہیں۔"

"دھماکے پر اش اش؟" انیق نے حیرانی سے پوچھا۔

"ارے نامعقول دھماکے سے مطلب یہ ہے کہ یہ دھما کا میں نے کیا ہے۔ سمجھو کہ ایک بھاگتے مجرم کو پکڑ کر پولیس کے حوالے کیا ہے۔ ویسے وہ بندہ تھا تو مولوی جی کا لیکن جب جرم کیا ہے تو پھر بھگتنا تو پڑے گا ہی نا۔"

انیق اور حق نواز کے پوچھنے پر پہلوان نے اپنے انداز میں جو تفصیل بتائی وہ کچھ یوں تھی۔ رات ساڑھے گیارہ بجے کے قریب پہلوان جی نے گنے کا کافی سارا رس پیا اور ساڑھے بارہ بجے کے قریب حاجت کے لیے کھیتوں کی طرف چل پڑے۔ ابھی وہ کھیتوں میں داخل نہیں ہوئے تھے کہ بھاگو پکڑو کی آوازیں آئیں۔ ٹارچوں کی روشنی بھی چمک رہی تھی، یہ پولیس والے تھے۔ کوئی ان کے آگے آگے بھاگ رہا تھا۔ پہلوان جی نے ہمت کی اور آگے بڑھ کر اس بندے کو بازوؤں میں جکڑ لیا۔ اس نے خود کو چھڑانے کی بڑی کوشش کی مگر پہلوان جی کے جن جپھے سے خود کو چھڑانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ وہ دونوں کانٹے دار جھاڑیوں میں گرے۔ اسی دوران میں پولیس والے بھی پہنچ گئے اور انہوں نے بھاگنے والے کو گرفت میں لے لیا۔ بعد میں پتا چلا کہ یہ تو مولوی فدا کا پرانا شاگرد طارق وارثی ہے۔ طارق بھاگتا ہوا جا رہا تھا کہ پولیس والوں نے اسے روکا۔ اس نے ایک پولیس والے کی ران میں پیچ کس مار کر اسے زخمی کر دیا اور دوڑ لگا دی۔ اس کے بعد اسے پہلوان حشمت نے

جکڑ لیا۔ پھر پولیس والے اسے تھانے لے گئے۔

کانٹے دار جھاڑیوں میں گرنے سے پہلوان حشمت کی پیٹھ پر دو تین کانٹے چبھے تھے اور گہری خراشیں آئی تھیں۔ اسے خراشوں کی تکلیف تو تھی ہی مگر اس سے زیادہ تکلیف یہ تھی کہ خراشیں نامناسب جگہ پر آئی تھیں۔ وہ کسی کو دکھا بھی نہیں سکتا تھا۔

اس نے ذرا مسکرا کر فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ''کبھی کبھی تو ہمارے کو لگت ہے کہ اردو کی اکثر کہاوتیں ایک دم غلط ہیں۔ کہتے ہیں کہ بہادر کو سینے پر زخم آوت ہے۔ اب دیکھو بھائی، ہم نے بہادری دکھائی اور زخم بھی پیٹھ پر آیا۔''

''آپ مزیدار باتیں کرتے ہیں۔'' انیق نے اس کی تعریف کی۔

''تمہاری اردو اتنی اچھی ناہیں ہے۔'' پہلوان حشمت نے کہا۔ ''مزے کا لفظ کھانے پینے کے لیے استعمال ہووت ہے۔ یہاں تو زخم کی بات ہے۔''

''آپ نے بھی زخم کھایا ہی ہے نا۔'' انیق نے ترنت جواب دیا۔

''زبان تمہاری بھی کافی چلت ہے بہرحال رات کو جو کچھ ہوا وہ کافی پریشان کرنے والا ہے۔ یہ بات بالکل سمجھ میں ناہیں آرہی کہ طارق کو بھاگنے اور پھر پولیس والے کو زخمی کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ تو وہی بات ہوگئی ناکہ آ بیل، مل کر کریں آہ وزاریاں۔''

محاورے کی بے حرمتی پر انیق سر کھجا کر رہ گیا۔

پہلوان مسلسل گفتگو جاری رکھے ہوئے تھے اور میرا ذہن صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ کوئی ایسی پیچیدہ گتھی نہیں تھی۔ رات کو میں نے طارق کو دھمکایا تھا کہ پولیس سارے معاملے سے باخبر ہو چکی ہے اور ہو سکتا ہے کہ ایک آدھ گھنٹے میں وہ لوگ اسے گرفتار کرنے یہاں پہنچ جائیں۔ اسی ڈر سے طارق میرے ہاتھوں سے نکل کر بھاگا تھا۔ شومئی قسمت اس نے راستے میں پولیس کو دیکھ لیا۔ پولیس نے اسے روکنا چاہا تو وہ مزید ڈر گیا اور ان سے بچ کر بھاگنے کی کوشش کی۔ اسی کوشش میں اس کے ہاتھوں ایک پولیس کانسٹیبل زخمی ہوگیا۔ پولیس نے اس کا پیچھا کیا اور پہلوان حشمت کے تعاون سے پکڑ لیا۔ اب عین ممکن ہے کہ پکڑے جانے کی گھبراہٹ میں طارق نے پولیس کو کچھ نہ کچھ بتا بھی دیا ہو۔

میرا یہ اندازہ تقریباً ایک گھنٹے بعد بالکل درست ثابت ہوگیا۔ طارق نے یہی سمجھا تھا کہ اس کا راز فاش ہو چکا ہے اور میرے بیان کے مطابق زخمی نمبردارنی نے پولیس کو اس کا حلیہ بتا دیا ہے۔ اس نے تھانے میں اس بات کا اعتراف کر لیا کہ دین محمد کے گھر میں گھس کر حملہ کرنے والا وہی تھا۔

یہ ساری صورتِ حال بے شک مولوی فدا اور طارق کے لیے پریشان کن تھی مگر اس میں تاجور اور اس کے گھر والوں کے لیے اطمینان کا پہلو موجود تھا۔ تاجور یا دین محمد کی گرفتاری کا خطرہ بھی ٹل گیا تھا بلکہ کہنا چاہیے کہ ختم ہی ہو گیا تھا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ سہ پہر کے وقت میں نے ایک دیہاتی تانگے کو چاند گڑھی کی طرف آتے دیکھا۔ یہ وہی تانگہ تھا جس پر دو دن پہلے تاجور اور دین محمد چاند گڑھی سے باہر گئے تھے۔ وہ اب واپس آ رہے تھے۔ میں اس وقت ایک کھیت میں ٹریکٹر چلا رہا تھا۔ میں نے دور سے تاجور کو دیکھا۔ بس ایک جھلک ہی دکھائی دی۔ سنہری دھوپ میں اس کا رنگ تازہ گلاب کی طرح دہک رہا تھا۔ ایک بار پھر میرے ذہن میں یہ سوال پوری شدت سے ابھرا کہ جس طرح میں نے اسے پہچانا ہے، وہ مجھے کیوں نہیں پہچان سکی۔ کیا تین چار سال پہلے کہ وہ سارے مناظر اس کے ذہن سے محو ہو چکے ہیں۔ کیا میرا نام، میری آواز، وہ سب بھول چکی ہے؟

شام تک سولنگی تھانے سے واپس آ گیا۔ دو تین دن میں ہی وہ برسوں کا بیمار نظر آنے لگا تھا۔ اس کے پاؤں کے تلوے پولیس کی مار سے سوجے ہوئے تھے اور وہ بمشکل چل پا رہا تھا۔ بہر حال اس کے لیے یہ بھی خوشی کی بات تھی کہ اس کی جان چھوٹ گئی تھی۔ تھانے دار سجاد تو ان لوگوں کے نزدیک زمینی خدا تھا۔ چاہے تو معمولی سی غلطی پر کسی کو پھانسی کے پھندے تک پہنچا سکتا تھا۔ اسی طرح پٹواری، تحصیل دار، چودھری وغیرہ ان لوگوں کے ساتھ جو چاہے سلوک کر سکتے تھے۔ مزید ستم یہ تھا کہ یہ لوگ احتجاج کرنا جانتے ہی نہیں تھے۔ سولنگی کی جیتی جاگتی مثال میرے سامنے تھی۔

O......❖......O

اگلے روز بارہ بجے کے لگ بھگ میں کام سے فارغ ہو کر کھیت کے کنارے بیٹھ گیا اور اردگرد کے مناظر دیکھنے لگا۔ ٹھنڈی ہوا نے سنہری دھوپ کے ساتھ مل کر عجیب سماں باندھ رکھا تھا۔ کھیتوں کے ہرے سمندر لہریں لے رہے تھے اور پرندوں کی ڈاریں گہرے نیلے آسمان پر دائرے بناتی تھیں۔ مٹی کی کھالوں میں پانی کی کل کل، رہٹ کی آواز، مویشیوں کے گلے کی گھنٹیاں اور کسی تندور سے اٹھنے والی گرم روٹی کی بھینی بھینی خوشبو، یہ سب کچھ جنتِ نشان تھا۔ میں ان مناظر میں جیسے ڈوب سا گیا۔ تو یہ تھا میرا اصل پاکستان۔ یہ تھا میرا وہ بچھڑا دیس جس کی باتیں والد صاحب اور دادا جی کیا کرتے تھے۔ ہاں...... یہی تھی وہ سنہری مٹی جس سے البیلی کہانیوں کا خمیر اٹھتا تھا۔ یہی تھی وہ دھرتی جس کے لیے شاعروں نے گیت لکھے تھے اور مصوروں نے شاہکار بنائے تھے۔

ایک تتلی میرے سر پر منڈلاتی ہوئی خودرَو پھولوں کی طرف چلی گئی اور پتا نہیں کیوں ایک دم تاجور مجھے بہت شدت سے یاد آئی۔ وہ میرے آس پاس ہونے کے باوجود مجھ سے بہت دور تھی۔ پتا نہیں کن دیواروں میں چھپی ہوئی تھی۔ میرا دل اس کے لیے جیسے بے کل ہوگیا۔ کبھی کبھی کسی کو شدت سے یاد کیا جائے تو وہ سامنے بھی آ جاتا ہے۔ کچھ ایسا ہی اس روز بھی ہوا۔ ایک خوشگوار اتفاق نے نہ صرف مجھے تاجور کے گھر پہنچایا بلکہ اس سے باتیں کرنے کا موقع بھی مل گیا حالانکہ بعد میں معلوم ہوگیا کہ وہ اتفاق نہیں تھا۔

میں کھیت کی منڈیر پر بیٹھا تھا جب ملازم حق نواز تیز قدم اٹھاتا میری طرف آیا۔ اس نے اشاروں کنایوں سے بتایا کہ مجھے دین محمد کے گھر میں بلایا جا رہا ہے اور غالباً تاجور بلا رہی ہے۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ میں فوراً شلوار قمیص جھاڑ کر اور رومال کندھے پر رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ مجھے سیدھا گھر میں لے گیا۔ ایک چھوٹے زمیندار کا یہ صاف ستھرا گھر تھا۔ بڑی اچھی لپا پوتی کی گئی تھی اور ہر چیز اپنی جگہ سلیقے سے رکھی نظر آتی تھی۔ دین محمد صاحب کہیں گئے ہوئے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ تاجور کے دونوں بھائی بھی اسکول میں ہیں۔ صرف اس کی والدہ کسی کمرے میں چارپائی پر لیٹی تھیں۔ حق نواز مجھے ایک چھوٹے سے واٹر پمپ کے پاس لے آیا۔ گاؤں میں کبھی کبھار، بجلی شکل ضرور دکھاتی تھی۔ ایسے مبارک موقعوں کے لیے دو چار گھروں نے بورنگ کروا کر یہ واٹر پمپس لگا رکھے تھے۔ حق نواز نے اشاروں میں مجھے بتایا کہ پمپ خراب ہے اور میں اسے ٹھیک کرنے کی کوشش کروں۔ میں نے زور و شور سے اثبات میں سر ہلایا۔ تاجور اندر سے ہتھوڑی، اسکریو رینچ اور اسکریو ڈرائیو وغیرہ لے آئی۔ میں موٹر کو چیک کرنے میں مصروف ہوگیا۔ مجھے فوراً ہی اندازہ ہوگیا کہ اس کا پاور والا تار اندر سے نکلا ہوا ہے۔ بہرحال میں یونہی ٹھوکا ٹھاکی کرتا رہا۔ حق نواز جا چکا تھا۔ تاجور میرے قریب ہی کھڑی تھی۔ گھر میں سکوت تھا۔ وہ ہولے سے بولی۔

''آپ ٹھیک ہیں ناں؟''

''ہاں، بہت اچھا وقت گزر رہا ہے۔''

تاجور نے ذرا سنجیدگی سے کہا۔ ''وقت تو گزرتا ہی جا رہا ہے لیکن ہمیں جلد کچھ کرنا پڑے گا۔''

''تم کیا کہنا چاہتی ہو؟''

''دو تین دن پہلے تو یہ ڈر پیدا ہوگیا تھا کہ کہیں مجھ پر اور ابا جی پر پرچہ ہی نہ ہو جائے۔ پر اب اللہ بھلا کرے چھوٹے تھانے دار کا۔ اس نے مولوی فدا کے لڑکے طارق کو پکڑ لیا ہے۔

اس نے قبول کرلیا ہے کہ ہمارے گھر میں گھسنے والا وہی تھا۔"

میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ وہ چھوٹے تھانے دار کو دعائیں دے رہی تھی حالانکہ جان جوکھم میں ڈال کر طارق کا کھرا دبانے والا میں ہی تھا۔

وہ دھیمی آواز میں بولی۔ "پہلے صرف شک تھا اب پکا یقین ہوگیا ہے کہ مولوی فدا نے بھی ساتے اور پیر ولایت ؒ سے یاری جوڑی ہوئی ہے۔"

"کئی دفعہ جو نظر آتا ہے وہ ہوتا نہیں تاجور۔ ہوسکتا ہے کہ مولوی فدا قصوروار نہ ہوں۔"

وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگی۔ "کیا...... آپ ملے ہیں مولوی فدا سے؟"

"یہی سمجھ لو...... مجھے کافی باتیں معلوم ہوئی ہیں اور مجھے لگتا ہے کہ میں بہت جلد تمہیں کوئی اچھی خبر دے سکوں گا لیکن مجھے تم سے ایک دو بہت ضروری باتیں پوچھنی ہیں۔ کیا کسی طرح تم مجھے گھر سے باہر کہیں مل سکتی ہو...... میرا مطلب ہے کہ پندرہ بیس منٹ ہم تسلی سے بات کرسکیں۔"

"آ...... آپ...... یہیں کرلیں۔" اس نے کہا۔

میں نے چور نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ دونوں ریشمی لٹیں حسبِ معمول چہرے پر ڈھلک آئی تھیں اور جیسے ایک خوب صورت تصویر مکمل ہوگئی تھی۔ دیوار کے ساتھ کھڑی وہ کسی فرانسیسی مصور کا شہ پارہ لگتی تھی۔ دل موہ لینے والے نقوش، پُرکشش وسادہ، موم کا مجسمہ جس میں سرخی کی جھلک تھی اور جھیل سی شفاف آنکھیں جن کے اندر فنا ہوجانے کو دل چاہتا ہی تھا۔ اور یہ تھا میرا پاکستان اور یہاں کے حسین لوگ۔ یہ قیمتی کاسمیٹکس اور ریشم وکمخواب کے بغیر بھی حسین تھے۔ مٹی سے لتھڑے ہوئے ہاتھوں اور بوسیدہ کپڑوں کے اندر سے بھی ان کی خوب صورتی لشکارے مارتی تھی۔ مقابلہ حسن منعقد کرکے عالمی حسیناؤں کا انتخاب کرنے والے مجھے ملتے تو میں انہیں کہتا کہ "آؤ دیکھو چاند گڑھی کے اس گھر میں کچی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑی اس لڑکی پر نظر ڈالے بغیر تمہارے انتخاب کی کوئی حیثیت نہیں۔ میں انہی خیالوں میں گم تھا کہ تاجور کی کھنک دار آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ اپنی بات دہراتے ہوئے بولی۔ "ہاں ہاں کرلیں۔"

"لیکن...... مجھے یہ جگہ مناسب نہیں لگ رہی۔" ابھی میری بات منہ میں ہی تھی کہ میرا کہا درست ثابت ہوگیا۔ باہر کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ وہ کسی ہرنی کی طرح بدکی، پھر سنبھل کر بولی۔ "میرا خیال ہے کہ کاکا اور چھوٹو آگئے ہیں۔"

اس نے جاکر دروازہ کھولا۔ "تاجور کے دونوں بھائی گلے میں بستے لٹکائے اندر آگئے۔

وہ تاجور ہی کی طرح سرخ و سپید اور خوش شکل تھے۔ ایک بار پہلے بھی مجھے مل چکے تھے۔ میرا ''گونگا'' ہونا ان کے لیے دلچسپی کا باعث تھا۔

''یہ کیا کرنے آیا ہے؟'' بڑے بھائی کاکے نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

تاجور نے اسے ٹوکا۔ ''تمیز سے بات کرتے ہیں۔ یہ بڑے ہیں۔ موٹر خراب تھی اسے ٹھیک کرنے آئے ہیں۔''

''لگتا ہے یہ بڑے کاریگر ہیں۔ ہر چیز ٹھیک کر لیتے ہیں۔'' کاکے نے کہا۔

''ہاں، سیانے لوگ کہتے ہیں نا کہ اللہ کسی بندے کو کوئی چیز کم دیتا ہے تو کچھ زیادہ بھی دیتا ہے۔ اب دیکھ لو یہ بول نہیں سکتے مگر کاریگر کتنے اچھے ہیں۔''

دونوں بچے مجھے موٹر ٹھیک کرتے دلچسپی سے دیکھتے رہے۔ چھوٹا بھائی بولا۔ ''ابا جی کہتے تھے گونگوں میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ کیا ان میں بھی بہت طاقت ہے؟''

تاجور ہولے سے مسکرائی۔ ''طاقت کا تو پتا نہیں لیکن ہمت ہے۔ دوسروں کی مدد کرتے ہیں۔ اللہ کرے یہ ہماری بھی مدد کر سکیں۔''

''یعنی ہمارے ٹریکٹر کو ٹھیک ٹھاک کر دیں۔'' چھوٹے نے خیال آرائی کی۔

''ہاں۔'' تاجور نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر کچھ سوچ کر بولی۔ ''ابھی یہ اشاروں میں مجھ سے کہہ رہے تھے کہ میں ڈیرے پر آ کر دیکھوں کہ انہوں نے ٹریکٹر کو کتنا فسٹ کلاس کر دیا ہے۔ میں آج تو نہیں آسکوں گی۔ عید کی تیاری کرنی ہے۔ ہاں کل شام کو چکر لگاؤں گی۔''

تاجور نے باتوں باتوں میں مجھے سمجھایا تھا کہ وہ کل مجھ سے ملنے کی کوشش کرے گی۔

کاکے نے نکتہ اٹھایا۔ ''باجی! یہ گونگے بھائی عید کرنے اپنے گھر نہیں جائیں گے؟''

''پتا نہیں...... تم خود پوچھ لو۔'' وہ بولی۔

کاکے نے اشاروں کنایوں میں اپنا مدعا بیان کرنے کی کوشش کی۔ اس نے عید کی نماز کا اشارہ دیا، پھر بکرا قربان کرنے کا اشارہ دیا اور اسی طرح دیگر اشاروں کے ذریعے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں اپنے گھر نہیں جاؤں گا؟

میں نے بھی اشاروں کی زبان استعمال کی اور نفی میں جواب دیا۔

موٹر کا مسئلہ معمولی سا تھا اور مجھے شک ہوا کہ یہ مسئلہ بھی تاجور نے خود پیدا کیا تھا تاکہ وہ مجھے یہاں بلا کر مجھ سے بات کر سکے۔ میں نے ایک ڈھکن کے پیچ کھولنے کے بعد پاور والا تار تھوڑا سا چھیل کر جوڑ دیا۔ اب بجلی آنے پر موٹر چلائی جا سکتی تھی۔

اسی دوران میں تاجور اندر گئی اور ایک پلیٹ میں کھیر لے آئی۔ اس نے کھیر میرے پاس ہی ایک تپائی پر رکھ دی، اور کہا کہ میں کھالوں۔ میں تکلف کے انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔ چھوٹو نے معصومیت سے کہا۔ ''گونگے بھائی، کھالیں باجی نے خود اپنے ہاتھوں سے بنائی ہے۔''

اس کے ہاتھ سے تو میں زہر بھی کھا سکتا تھا، یہ تو کھیر تھی۔ چاول، دودھ اور چینی کی بنی ہوئی اس سادہ سی سویٹ ڈش نے فائیو اسٹار ہوٹلوں کے ''ڈیزرٹس'' سے بڑھ کر مزہ دیا۔ اسی دوران میں صحن میں بندھے ہوئے ایک دنبے نے عقب سے میری قمیص چبانی شروع کر دی۔ تاجور نے لپک کر اس سے قمیص چھڑائی، اس دوران میں اس کا جسم مجھ سے ٹکرایا۔ میری رگوں میں چنگاریاں سی پھوٹ گئیں۔ دنبے نے قمیص چھوڑنے کے بعد تاجور کو ٹکر مارنے کی کوشش کی۔ وہ الھڑ انداز میں چلا کر تیزی سے ایک چارپائی پر چڑھ گئی۔ بچے ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہونے لگے۔

کچھ دیر بعد میں اشاروں کنایوں میں تاجور اور دونوں بچوں سے اجازت لے کر واپس لوٹ آیا۔ بچے مجھے دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ میں باہر نکل کر ڈیرے کی طرف روانہ ہو گیا۔ دل میں ایک میٹھی میٹھی سی لہر تھی۔ آج میں نے تاجور کو پھر قریب سے دیکھا تھا۔ اس کے بدن کی انوکھی مہک محسوس کی تھی، بلکہ اس کے بدن کو بھی محسوس کیا تھا۔ وہ بدن...... وہ سراپا جو اپنے اندر ایک ناقابلِ بیان کشش رکھتا تھا۔ میں اس کشش کو کوئی نام نہیں دے پا رہا تھا اور آج اس نے مجھ سے ملنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ بے شک یہ وعدہ سنجیدہ نوعیت کا تھا اور کام کے سلسلے میں تھا لیکن وعدہ تو تھا۔

○......❖......○

یہ بقر عید کے دن تھے۔ دیگر جگہوں کی طرح چاند گڑھی میں بھی عید کی گہما گہمی تھی۔ بچے قربانی کے جانوروں کی رسیاں پکڑے انہیں چہل قدمی کراتے نظر آتے تھے۔ سائیکل سوار پٹھان چھریاں چاقو تیز کر رہے تھے۔ لوگ قریبی قصبے کے بازار سے کپڑوں، جوتوں وغیرہ کی خریداری کر کے واپس آ رہے تھے۔ چودھری کی حویلی میں عید کے روز معزز لوگوں کی دعوت کا اہتمام تھا۔ عید پر اس طرح کی مصروفیت میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ ورنہ کوپن ہیگن میں تو عید کے آنے جانے کا پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ دفاتر میں چھٹی تک نہیں ہوتی تھی۔ قربانی کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ کبھی تو عید والے دن پتا چلتا تھا کہ آج عید ہے۔

عید گاہ میں بڑے اہتمام سے عید کی نماز ہوئی۔ تاجور کے گھر سے باداموں اور کشمش

وغیرہ سے سجا ہوا زردہ آیا۔ کچھ دیر بعد ایک رکابی میں بھنی ہوئی کلیجی آئی۔ پھر سہ پہر کے وقت ہم سب نے ڈیرے پر کھانا کھایا۔قربانی کے گوشت کا یہ پُر تکلف کھانا تھا اور حق نواز کی بیوی نے بڑے چاؤ سے بنایا تھا۔ درختوں کے نیچے ایک بڑی دری بچھائی گئی۔ بھنا ہوا گوشت، ساتھ میں تندوری روٹیاں اور نمکین لسی۔حق نواز کی بیوی نے چاندگڑھی کی دیگر عورتوں کی طرح زرق برق کپڑے پہن رکھے تھے اور چوڑیاں چھنکاتی پھر رہی تھی۔وہ پینتیس چالیس سال کی تھی لیکن کام کاج کے سلسلے میں اس کے اندر جوان لڑکیوں جیسی ہمت تھی۔ اخلاق کی بھی اچھی تھی۔ کھانے کے بعد ہم سب لوگ باغ کی طرف چلے گئے۔ یہاں ایک کھیت میں کبڈی کا بہت بڑا میچ تھا۔عورتیں، بچے، بڑے چھوٹے سب موجود تھے۔عورتیں اور بچے درختوں کے نیچے موجود تھے۔میری نگاہ بار بار اس طرف اٹھتی تھی۔

بے شک عید کی گہما گہمی مجھے اچھی لگ رہی تھی لیکن اس کے ساتھ ایک عجیب سی بے چینی نے بھی گھیرا ہوا تھا۔ آج شام کو تاجور نے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ پتا نہیں اس نے کب آنا تھا اور آنا بھی تھا یا نہیں؟ کبڈی کے میچ کے دوران میں بھی میری نگاہ مسلسل اسے ڈھونڈتی رہی لیکن وہ کہیں دکھائی نہیں دی۔ ہاں اس کے دونوں چھوٹے بھائی نظر آئے۔لیکن وہ دونوں بھی دوسرے بچوں سے الگ تھلگ بیٹھے ہوئے تھے۔میں یہاں پہلے دن سے ہی یہ دیکھ رہا تھا کہ گاؤں والوں نے دین محمد اور اس کے اہل خانہ کے ساتھ شدید سرد مہری اختیار کر رکھی ہے۔ اس کی وجہ یقیناً پیر ولایت اور مولوی فدا کے بیانات ہی تھے۔مولوی فدا کے بارے میں تو اب مجھے کافی معلومات حاصل ہو چکی تھیں لیکن پیر ولایت کو ابھی میں نے بس دور ہی سے دیکھا تھا۔اس کا کردار ابھی اندھیرے میں تھا۔

جوں جوں شام گہری ہوتی گئی، میری بے چینی بڑھتی گئی۔ڈیرے کے کمرے میں بس میں اور انیق تھے۔ پولیس کی مار کھانے کے بعد سونگی کو چند دن آرام کی ضرورت تھی۔اس لیے وہ قصبے میں اپنے کسی عزیز کے پاس چلا گیا تھا۔ میں اور انیق مسلسل سوچ رہے تھے کہ کیا اس دن کی طرح تاجور پھر یہاں آنے کی ہمت کرے گی؟

انیق کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔اچانک وہ بول اٹھا۔"لو جی......وہ آ گئی ہے۔"

میرا دل شدت سے دھڑک اٹھا۔ میں نے انیق کی نظر کا تعاقب کیا۔وہ آ رہی تھی لیکن اکیلی نہیں تھی۔ ایک اور لڑکی بھی اس کے ساتھ تھی۔ یہ غیر متوقع صورتِ حال تھی۔ بہرحال میں نے انیق سے کہا کہ وہ پروگرام کے مطابق باہر چلا جائے۔تھوڑی دیر بعد چوڑیوں کی چھن چھن سنائی دی۔ پھر تاجور کی آواز سنائی دی۔

"انیق...... تم اندر ہی ہو؟"

تاجور نے دروازے سے جھانکا اور پھر اپنی ساتھی سمیت اندر آ گئی۔ یہ دوسری لڑکی گھر کی ملازمہ نوری تھی۔ اس کے ہاتھ میں مسالا پیسنے والی بجلی کی مشین تھی۔ تاجور نے اشاروں میں مجھے بتایا کہ مشین خراب ہو گئی ہے۔ اس کی فوری ضرورت ہے کیونکہ کل گھر میں دعوت ہے۔

میں سمجھ گیا کہ کل دوپہر جس طرح تاجور نے واٹر پمپ کی موٹر کی خرابی کا بہانہ بنایا تھا۔ آج اس گرائنڈر مشین کو بہانہ بنایا ہے لیکن تھوڑا سا غصہ بھی آیا۔ وہ ملازمہ لڑکی کو ساتھ لے آئی تھی۔ اس کی موجودگی میں بھلا کیا بات ہو سکتی تھی لیکن جس وقت میں لالٹین کی روشنی میں گرائنڈر مشین کو دیکھ رہا تھا تاجور نے لڑکی کا حل بھی نکال لیا۔ اس نے ملازمہ سے کہا۔ "ہو ہائے نوری، مشین کا جگ تو ہم بھول ہی آئے۔ جا وہ بھی لے آ۔ اس کی نیچے والی پھرکی گھوم جاتی ہے۔"

"اچھا باجی۔" نوری نے کہا۔

"باورچی خانے میں یا ساتھ والے کمرے میں پڑا ہوگا۔ جہاں بھی ہے ڈھونڈ کے لے آ۔"

وہ "جی اچھا" کہتی ہوئی باہر نکل گئی۔ تاجور نے میری طرف دیکھ کر ہولے سے کہا۔ "اب پانچ دس منٹ تو لگ ہی جانے ہیں اس کو۔ ہم بات کر سکتے ہیں۔"

میں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی تک عید کے جھلملاتے لباس میں تھی۔ گورے ہاتھوں پر مہندی اور کلائیوں میں ست رنگی چوڑیاں تھیں۔ ایک گلابی شال نے اس کے بالائی جسم کو ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی بول اٹھی۔ "آپ کو کچھ پتا چلا ہے کہ مولوی فدا کے لڑکے طارق نے تھانے میں کیا بیان دیا ہے؟"

"تم نے بتایا تو تھا، اس نے مان لیا ہے کہ تمہارے گھر گھس کر نمبردارنی کو زخمی کرنے والا وہی تھا۔"

"لیکن یہ پوری بات نہیں ہے۔" تاجور نے سنسنی خیز انداز میں کہا۔ "طارق نے کہا ہے کہ اس نے نمبردارنی پر نہیں، مجھ پر حملہ کیا تھا پر غلطی سے نمبردارنی زخمی ہو گئی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ میں نے اس کا کیا بگاڑا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ گاؤں میں جو بھی فساد ہے میری وجہ سے ہے۔ میں چاند گڑھی کے لیے مصیبت بنی ہوئی ہوں۔ اب بتائیں آپ، یہ کوئی کرنے والی باتیں ہیں۔ میں تو خود سخت مصیبتوں میں ہوں۔ آپ دیکھ ہی رہے ہیں یہاں

کس طرح مجھے اور میرے گھر والوں کو بے بس کیا جا رہا ہے۔ ہمارا حقہ پانی بند ہو گیا ہے، ہمیں منحوس کہا جا رہا ہے اور اب ایسا کہنے والوں میں وہ مولوی فدا بھی شامل ہو گیا ہے۔''

''تاجور! میں نے تمہیں کہا تھا نا کہ بعض دفعہ حقیقت وہ نہیں ہوتی جو نظر آ رہی ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ جب تمہیں مولوی صاحب کے بارے میں ساری حقیقت معلوم ہو جائے گی تو تمہاری رائے ان کے بارے میں بدل جائے گی۔''

''کیا ہے حقیقت؟'' وہ ذرا تنک کر بولی۔

''میں کافی کچھ جان چکا ہوں، لیکن ابھی کچھ جاننا باقی بھی ہے۔ تمہیں بس تھوڑا سا انتظار اور کرنا پڑے گا۔''

اس کے چہرے پر شدید الجھن کے آثار نظر آئے۔ وہ سٹپٹائے لہجے میں بولی۔ ''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا کہ گاؤں میں کیا ہو رہا ہے، کیوں ہو رہا ہے۔ کوئی کالی پگڑی والا بھی ہے، جو پہلے وکرم اور رام پیاری کے گھر میں نظر آیا پھر طارق کے گھر میں بھی پہنچا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ کوئی پولیس والا ہی ہے جو بھیس بدل کر لوگوں کی ٹوہ لیتا ہے......کچھ کا خیال ہے کہ......''

ابھی تاجور کا فقرہ منہ میں ہی تھا کہ ہم دونوں کو بری طرح چونکنا پڑا، کھیتوں کے دوسری طرف سرپٹ دوڑتے گھوڑوں کی آواز آئی۔ کچھ للکارے سنائی دیئے، پھر لوگوں کے چلانے کی صدائیں ابھرنے لگیں۔ تاجور اور میں نے ایک ساتھ کھڑکی میں سے دیکھا۔ یہ دو چار نہیں درجنوں گھڑ سوار تھے اور غالباً مسلح بھی تھے۔ کچھ کے ہاتھوں میں ٹارچیں دکھائی دے رہی تھیں۔ ''ہائے میں مر گئی۔'' تاجور نے سینے پر ہاتھ رکھا۔ ''یہ تو سیالکوٹی کے لوگ لگتے ہیں۔'' تاجور کی آواز دہشت سے پھٹی ہوئی تھی۔

''سیالکوٹی! یہ کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''سجاول سیالکوٹی۔ بڑا خبیث بندہ ہے۔ لوٹ مار کرتا ہے۔ ہائے ربا۔ اب کیا ہوگا۔''

تاجور کی سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی تھی۔ ہاتھ بدستور سینے پر تھے۔

ہم دور سے دیکھ سکتے تھے۔ گاؤں میں افراتفری کا عالم تھا پھر دو تین فائر بھی ہوئے۔ اب معلوم نہیں کہ یہ گھڑ سواروں کی طرف سے کیے گئے تھے یا گاؤں والوں کی جانب سے۔ یہ بھی پتا نہیں تھا کہ کسی کو گولی ماری گئی ہے یا ہوا میں فائر ہوا ہے۔

پھر اچانک بائیں جانب سے چار پانچ تیز رفتار گھوڑے نمودار ہوئے اور سیدھا ڈیرے کی طرف آئے۔ تاجور تقریباً چلا اٹھی۔ ''ہمیں بھاگ جانا چاہیے۔''

مگران لوگوں نے بھاگنے کا موقع نہیں دیا۔ ہم بمشکل دروازے تک پہنچے تھے کہ انہوں نے ہمیں گھیر لیا۔ ایک شخص کے سوا سب نے اپنے چہرے پگڑیوں یا بڑے رومالوں میں چھپا رکھے تھے جو چہرہ نظر آرہا تھا وہ کسی چھٹے ہوئے بدمعاش کا ہی تھا۔

ایک شخص نے بیٹھے بیٹھے میرے سینے پر لات ماری اور گالی دے کر بولا۔ ''نکال، کیا ہے تیرے پاس۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ اس کی ٹارچ کی روشنی سیدھی میرے چہرے پر پڑ رہی تھی۔

اسی دوران میں ساتھ والے کمرے سے حق نواز کی بیوی نذیراں واویلا کرتی ہوئی باہر نکلی۔ دو افراد اس سے کھینچا تانی کر رہے تھے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے ایک شخص نے اس کے دونوں کانوں سے بالیاں نوچ لیں اور حق نواز کے ہاتھ سے گھڑی اتروالی۔ حق نواز کی ناک سے خون نکل رہا تھا۔ تاجور ایک گوشے میں سمٹ گئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں دو طلائی چوڑیاں تھیں جو شاید اس نے عید کی مناسبت سے پہن رکھی تھیں۔ اس نے خود ہی زور لگا کر چوڑیاں اتار دیں اور ایک حملہ آور کے حوالے کر دیں لیکن ایسا کرنے سے تاجور کی گلوخلاصی نہیں ہوئی۔ دوسرے شخص کی نگاہ تاجور کے کانوں پر پڑی۔

نذیراں کے کانوں میں چاندی کی بالیاں تھیں لیکن یہاں تو سونے کی تھیں۔ ان کو کیسے چھوڑ دیا جاتا۔

وہ شخص گھوڑے سے اتر کر بالیوں کی طرف جھپٹا اور یہی وہ غلطی تھی جو ان لوگوں کو مہنگی پڑ سکتی تھی۔ میں ابھی تک خاموش تھا مگر جب تاجور کے کان سے بالیاں نوچنے کی کوشش کی گئی اور وہ اپنا کان دبا کر درد سے چلائی تو میرے لیے تماشائی بنے رہنا ممکن نہ رہا۔ نتائج سے بے پروا ہو کر میں زبردستی کرنے والے پر جھپٹا۔ میں نے اس کی دونوں کلائیاں پکڑ کر اس بری طرح مروڑیں کہ اس نے پلک جھپکتے میں تاجور کو چھوڑ دیا۔ میرے سر کی بھرپور ٹکر نے اسے اچھال کر اپنے ساتھی پر پھینک دیا۔ اس کا ساتھی چارپائی کے نیچے سے سولنگی کا ٹیپ ریکارڈر نکال رہا تھا۔ دونوں اوپر نیچے گرے اور ٹیپ ریکارڈر کے ٹوٹنے کی آواز آئی۔

ایک شخص نے مجھے عقب سے دبوچا۔ اس کے فرشتوں کو بھی پتا نہیں ہوگا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ میں الٹے پاؤں پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ ہم دونوں کمرے کے دروازے سے باہر گرے۔ یہاں دیوار کے ساتھ ایک نوک دار کدال پڑی تھی۔ وہ کئی انچ تک اس شخص کے کندھے میں گھس گئی۔ میں اس شخص کے اوپر سے اٹھ گیا لیکن اٹھتے اٹھتے اس کے ہولسٹر سے پستول نکال لیا۔ باقی کسی شخص کے پاس آتشیں ہتھیار نہیں تھا۔ ہاں دو افراد کے پاس

چھوٹے دستے کی کلہاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ میں نے ان کے پاؤں کے بالکل پاس زمین پر گولیاں چلائیں اور پھر تاجور کو اپنے ساتھ لے کر بھاگا۔

ایک کھیت پار کرتے ہی ہم گنے کے اونچے کھیت میں گھس گئے۔ وہ افراد چلا رہے تھے اور اپنے ساتھیوں کو مدد کے لیے بلا رہے تھے۔ ان کی ہمت اور دلیری کا بھانڈا پھوٹ گیا تھا۔ پستول کی وجہ سے انہوں نے فوراً ہمارے پیچھے لپکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میرے لیے یہی تیس چالیس سیکنڈ کا وقت کافی تھا۔ میں تاجور کو اپنے ساتھ بھگاتا ہوا کافی آگے نکل گیا۔ وہ ہانپ رہی تھی اور دہشت زدہ آواز میں کہہ رہی تھی۔ ''یہ آپ نے اچھا نہیں کیا۔ یہ بہت برے لوگ ہیں۔ اب یہ ہمیں نہیں چھوڑیں گے۔''

''کچھ نہیں ہوگا'' میں نے بھاگتے بھاگتے اسے تسلی دی۔ ''یہ ایک بار اور پیدا ہو جائیں تو بھی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔''

''نہیں...... آپ کچھ نہیں جانتے...... آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ہائے، پتا نہیں میرے گھر میں کیا ہوا ہوگا۔'' وہ گرتے گرتے بچی۔ میں نے اس کا ہاتھ کھینچ کر اسے سنبھال لیا۔

گنے کا کھیت سات آٹھ فٹ سے کم اونچا نہیں ہوگا۔ درمیان میں ایک پگڈنڈی سی بنی ہوئی تھی۔ ''ہائے اللہ، وہ آ رہے ہیں۔'' تاجور نے کراہ کر کہا۔

میں جان گیا کہ اس نے ایسا کیوں کہا ہے۔ دائیں طرف ٹارچوں کی روشنیاں چمک رہی تھیں۔ گنے کے پودوں کے اندر سے یہ روشنی چھن چھن کر ہم تک پہنچ رہی تھی۔ میں نے اپنا رخ تھوڑا سا بدل لیا۔ پستول ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا۔ میرے اندازے کے مطابق کم از کم تین گولیاں اس میں موجود تھیں۔ اب مجھے اتنا تجربہ ہو چکا تھا کہ میں ہتھیار کے برانڈ اور اس کے وزن کو دیکھ کر اندازہ لگا لیتا تھا کہ اس میں کتنی گولیاں ہوں گی۔ اکثر یہ اندازہ ٹھیک ہی نکلتا تھا۔

اب ہمیں اپنے پیچھے للکارے سنائی دے رہے تھے اور گالیاں بھی۔ اپنے بندے کے زخمی ہونے کے بعد یقیناً وہ لوگ بہت طیش میں آ گئے تھے۔ ''وہ ہمیں نہیں چھوڑیں گے۔'' تاجور نے ایک بار پھر ہراساں آواز میں کہا۔ اس کے لہجے میں میرے لیے کسی حد تک ملامت بھی تھی۔

ایک بار پھر ٹھوکر لگنے سے ہم گرتے گرتے بچے۔ تاجور کے پاؤں سے جوتی نکل گئی۔ اتنی مہلت نہیں تھی کہ اسے ڈھونڈا جا سکتا۔ وہ ویسے ہی بھاگنے لگی۔

ایک للکارتی ہوئی آواز آئی۔ "اس طرف گئے ہیں۔ ادھر دیکھو۔"

ایک بار پھر ٹارچوں کی روشنیاں چمکیں۔ گھوڑوں کی ہنہناہٹ بھی سنائی دی۔ میں نے دوبارہ رخ بدلا اور باغ کی طرف بھاگتا چلا گیا۔

ہمارا اس طرح رخ بدلنا ہمارے لیے مفید ثابت ہوا۔ گھوڑں کی ہنہناہٹ اور گالیوں کی بوچھاڑیں ہم سے کچھ فاصلے پر چلی گئیں۔ باغ کے گنجان درختوں میں ہمیں ایک شہ زور لوڈر کھڑا نظر آیا۔ قریب پہنچ کر دیکھا، اس میں بکروں، دنبوں وغیرہ کی بہت سی کھالیں لدی ہوئی تھیں۔ یہ فیصلے کا وقت تھا۔ میں نے تیزی سے فیصلہ کیا اور تاجور کو کھینچ کر لوڈر کے اندر لے گیا۔ خون آلود کھالوں کو اِدھر اُدھر کر کے میں نے جگہ بنائی اور تاجور سمیت ان کے اندر گھس گیا۔ کھالیں تازہ تھیں۔ بو وغیرہ نہیں اٹھ رہی تھی، پھر بھی تاجور کراہ کر بولی۔ "مجھے الٹی آجائے گی۔"

"جو بھی ہے ابھی چپ لیٹی رہو۔" میں نے کہا۔

"مم...... میں منہ باہر نکال لوں۔"

"نکال لو۔" میں نے کہا۔

چار پانچ منٹ خیریت سے گزر گئے۔ لیکن یہ مکمل خیریت نہیں تھی۔ وہ ہمارے اردگرد موجود تھے۔ ہوا کے دوش پر تیر کر ان کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اسی دوران میں چاند گڑھی کی طرف سے آٹومیٹک رائفل کے کئی برسٹ چلنے کی آواز بھی آئی۔ "ہائے میں مرگئی۔" تاجور نے پھر گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

اچانک ہم ٹھٹک گئے۔ کسی نے تیزی سے لوڈر کی طرف قدم بڑھائے۔ اس کا اگلا دروازہ کھولا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ بمشکل دو سیکنڈ بعد لوڈر اسٹارٹ ہوا اور جھٹکے سے حرکت میں آ گیا۔

"یہ کیا؟" تاجور کے ہونٹوں سے پھر بے ساختہ ڈری ڈری صدا نکلی۔

میں نے اس کا منہ اپنی ہتھیلی سے ڈھانپ لیا۔ لوڈر نے آٹھ دس سیکنڈ کے اندر خاصی رفتار پکڑ لی اور ایک نیم پختہ راستے پر تیزی سے اچھلنے لگا۔ دو صورتیں ہو سکتی تھیں یا تو یہ گاڑی ڈاکو حضرات کے ہتھے چڑھ گئی تھی یا پھر اس کا مالک اسے ڈاکوؤں کی دسترس سے بچانے کے لیے باغ سے نکال لے آیا تھا۔ پہلی صورت تشویش ناک تھی لیکن دوسری اتنی تشویش ناک نہیں تھی۔ بہرحال دونوں صورتوں میں ایک اطمینان کا پہلو موجود تھا اور وہ یہ کہ تاجور میرے ساتھ تھی۔ بلکہ اس ہچکولے کھاتی گاڑی میں میرے ساتھ چمٹی ہوئی تھی۔ یقیناً ماحول کوئی ایسا

شاعرانہ اور قابلِ رشک نہیں تھا لیکن ماحول اور موسم تو بدلتے ہی رہتے ہیں۔ یہ ساری سچویشن خطرناک ہونے کے باوجود مجھے لطف دے رہی تھی۔ ایسے خطرات سے نمٹنا تو میرے مزاج کا حصہ بن چکا تھا۔ ہاں ایک فکر ضرور تھی۔ چاند گڑھی میں تاجور کے گھر والے اور انیق وغیرہ خیریت سے ہوں۔

''یہ کہاں لے جا رہے ہیں؟'' تاجور نے مرے مرے لہجے میں کہا۔

''کیا پتا مری یا ایوبیہ لے جائیں، سنا ہے وہاں کا موسم ان دنوں بہت اچھا ہوتا ہے۔'' میں نے ہلکے پھلکے لہجے میں سرگوشی کی۔

''آپ مذاق کر رہے ہیں۔ آپ کو پتا نہیں...... آپ نے سیالکوٹی کے بندوں پر ہاتھ اٹھا کر کتنی بڑی غلطی کر دی ہے۔''

لوڈر نے تیزی سے ایک موڑ کاٹا اور کسی سخت ناہموار راستے پر دو تین منٹ زوردار ہچکولے کھانے کے بعد اچانک رک گیا۔ نہ صرف رک گیا بلکہ اس کی ہیڈ لائٹس بند ہو گئیں اور انجن بھی خاموش ہو گیا۔ ڈرائیو کرنے والا شخص باہر نکلا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ اکیلا ہی ہے۔ اس نے اگلا دروازہ لاک کیا۔

اسی دوران میں ایک اور شخص تیز قدموں سے چلتا بلکہ دوڑتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔

''خیریت تو ہے بشارت؟'' ایک بھاری آواز نے پوچھا۔

''خیریت نہیں ہے بھولو...... سیالکوٹی کے بندوں نے پھر ہلا بولا ہے۔ چنگی بھلی لٹ مار کی ہے۔ خبیثوں کو پتا تھا کہ عید ہے، پولیس چوکی بھی خالی پڑی ہوئی ہے......''

''مجھے پہلے ہی ڈر سا لگ رہا تھا۔'' بھولو کی آواز سنائی دی۔ ''پچھلی دفعہ بھی انہوں نے دن دیہاڑے ہی قیامت مچائی تھی نا۔ ایک گڈی اور تین موٹر سائیکلیں بھی چھین کر لے گئے تھے۔''

''اسی لیے تو گاڑی لے کر نکل آیا ہوں۔''

''اوپر ترپال ڈال دیں؟'' بھولو نے پوچھا۔

''نہیں...... یہاں تو ترپال کی ضرورت نہیں ہے...... بس پھاٹک بند کر دو۔''

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے فاصلے پر چلے گئے پھر پھاٹک بند ہونے کا کھٹکا سنائی دیا۔ اس کے بعد مکمل خاموشی چھا گئی۔ یوں لگا جیسے ہمارے قرب و جوار میں میلوں تک کوئی بندہ بشر موجود نہیں۔ میرے اندازے کے مطابق ہم چاند گڑھی سے کم و بیش سات آٹھ میل آگے آ گئے تھے۔

قریباً دس منٹ کا وقفہ دے کر میں نے اپنے اوپر سے نمک لگی ہوئی آلودہ کھالیں ہٹائیں اور آواز پیدا کیے بغیر لوڈر سے اتر آیا۔ تاجور بھی اٹھ کر بیٹھ گئی لیکن اندر ہی رہی۔ میں نے سر گھما کر چاروں طرف دیکھا۔ یہ کوئی ورکشاپ ٹائپ جگہ لگتی تھی۔ ڈیزل انجن سے آرا مشین چلائی جاتی تھی اور لکڑی کاٹ کر پھلوں کی پیٹیاں وغیرہ تیار کی جاتی تھیں۔ چاروں طرف کاٹھ کباڑ بکھرا ہوا تھا۔ میں تھوڑا آگے گیا۔ کان لگا کر سنا تو پتا چلا کہ کسی کمرے میں چند افراد موجود ہیں۔ احاطے کی دوسری جانب رکھوالی کے کتے کی آواز بھی آرہی تھی۔ وہ مسلسل شور مچا رہا تھا۔ ممکن ہے کہ اس کے شور کی وجہ ہم دونوں ہوں۔ میں واپس آیا اور تاجور کو نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔ وہ اپنی چادر سنبھالتی ہوئی اتر آئی۔ اس وقت پتا چلا کہ وہ ننگے پاؤں ہے۔ اس نے اپنی دوسری چپل بھی کہیں اتار پھینکی تھی۔

ہم احتیاط سے چلتے پھاٹک تک پہنچے۔ وہ مقفل نہیں تھا۔ ہم کنڈی کھول کر باہر نکل آئے۔ کتے کا شور بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ یقیناً وہ زنجیر میں تھا ورنہ اب تک ہم سے ملاقات کر چکا ہوتا۔

''کہاں جانا ہے؟'' وہ روہانسی ہو کر بولی۔

''ابھی یہاں سے تو نکلیں۔'' میں نے کہا۔

وہ چلنے میں تکلیف محسوس کر رہی تھی۔ کچھ آگے جا کر میں نے اپنی ہلکی پھلکی پشاوری چپل اتاری اور تاجور سے کہا کہ وہ پہن لے۔ وہ پہلے انکار کرتی رہی پھر میرے اصرار پر مان گئی۔ ظاہر ہے چپل اسے بہت بڑی تھی مگر اتنا تو ہوا تھا کہ اس کے تلوے زخمی ہونے سے بچ گئے تھے۔ کچھ آگے گل عباسی کے پودے نظر آئے۔ ہم ان کے عقب میں جا بیٹھے اور صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگے۔ میرا اندازہ تھا کہ ہم چاند گڑھی سے سات آٹھ میل دور ہو گئے ہیں لیکن یہ خیال غلط بھی ہو سکتا تھا۔ ممکن ہے کہ ہم نے اتنا فاصلہ طے نہ کیا ہو (بعد ازاں یہ شک درست ثابت ہوا۔ ہم نے صرف چار میل فاصلہ طے کیا تھا) شال کی وجہ سے تاجور کے کپڑے تو داغ دار ہونے سے بچ گئے تھے تاہم میری جیکٹ اور قمیص پر خون آلود کھالوں کے دھبے تھے۔ تاجور کے ایک رخسار اور سر کے بالوں پر کھالوں کی آلودگی نمایاں نظر آرہی تھی۔ میں نے اس کی شال کے پلو سے اس کا رخسار صاف کیا۔

وہ بولی۔ ''سیالکوٹی کے بندے پنڈ والوں کو روپے پیسے کا نقصان تو دیتے ہیں پر کسی کو مارتے کوٹتے نہیں۔ ہاں جوان پر ہاتھ اٹھاتا ہے اس کو نہیں بخشتے اور آپ نے ان کے بندے کو زخمی کر دیا۔''

''تم کہتی ہو کہ مارتے کوٹتے نہیں۔ وہ تمہارے کان چیر کر بالیاں اتار رہا تھا، یہ مار پیٹ سے کم بات تھی۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔''

''مگر اب جو کچھ برداشت کرنا پڑے گا، وہ کون بھگتے گا۔ آپ ان کا پستول بھی چھین کر لے آئے ہو۔ وہ پستول اور بدلہ لیے بغیر چین سے نہیں بیٹھیں گے۔''

''کچھ نہیں ہوگا تاجور...... میں نے ان کے دم خم کا تھوڑا بہت اندازہ لگا لیا ہے۔ تم نے دیکھا تھا جب پستول میرے ہاتھ میں آ گیا اور ہم وہاں سے بھاگے تو وہ فوراً ہمارے پیچھے نہیں آئے۔ بلکہ اپنے ساتھیوں کو آوازیں دیں۔''

''ہائے ربا! آپ نے ان پر گولیاں بھی تو چلائی تھیں۔ کہیں کسی کو گولی ہی نہ لگ گئی ہو۔''

''نہیں، گولیاں زمین میں لگیں۔ میرا نشانہ اتنا خراب نہیں۔ میں نے انہیں بس ڈرایا تھا۔''

''پر یہ تو سیالکوٹی کے عام سے کارندے تھے۔ آپ کو نہیں پتا کہ سجاول سیالکوٹی خود کیا چیز ہے۔''

''چلو تم بتا دو کیا چیز ہے؟'' میں نے پستول کی گولیاں چیک کرتے ہوئے کہا۔ وہ تین ہی تھیں۔

''کئی قتل کر چکا ہے۔ جیل توڑ کر بھاگا ہوا ہے۔ اب اس نے جتھا بنا لیا ہے۔ لوٹ مار کر کے پھر پہاڑیوں کی طرف چلا جاتا ہے۔''

''سب ٹھیک ہو جائے گا، تم فکر نہ کرو۔ ہم نے جو کچھ کیا ہے اپنے آپ کو بچانے کے لیے کیا ہے۔''

''لیکن کچھ کرنے سے پہلے آپ کو یہ سوچنا تو چاہیے تھا کہ آپ یہاں نئے ہیں۔ آپ کو یہاں کے حالات کا کچھ پتا نہیں۔ اب پتا نہیں وہاں میرے گھر والوں پر کیا گزر رہی ہوگی۔ وہ تو ڈھونڈتے پھر رہے ہوں گے مجھے ہر طرف...... اللہ جانے کیا کیا سوچ رہے ہوں گے۔'' اس کا گلا رندھ گیا۔

''میرا خیال ہے کہ جب ہم وہاں سے بھاگے تو حق نواز اور اس کی بیوی میں سے کسی ایک نے یا پھر دونوں نے ہمیں ضرور دیکھا ہوگا۔ وہ بتا دیں گے کہ تم اکیلی نہیں ہو اور یہ بھی بتا دیں گے کہ تمہیں اور مجھے کیوں بھاگنا پڑا۔ تمہاری نوکرانی نوری کے بیان سے بھی سب کچھ واضح ہو جائے گا۔ وہ کہے گی کہ تم دونوں خراب گرائنڈر دکھانے کے لیے ڈیرے پر آئی

تھیں۔"

"پتا نہیں گھر میں کیا ہوا ہوگا؟" وہ سسکی۔

"دیکھو تاجور! اتنا بڑا گاؤں ہے۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ وہ لٹیرے گاؤں کے ہر گھر میں گھسے ہوں۔ پھر تم یہ کیوں سوچ رہی ہو کہ وہ تمہارے گھر میں بھی گئے ہوں گے۔ بس اللہ سے خیر مانگو۔"

O......❖......O

ہم کچھ دیر وہاں بیٹھے دھیمی آواز میں باتیں کرتے رہے۔ لیکن یہاں سرد ہوا کی کاٹ تھی۔ ویسے بھی یہ جگہ زیادہ محفوظ نہیں تھی۔ ہمیں لگا کہ ہمارے ہاتھ پاؤں ٹھنڈ سے جمنا شروع ہو گئے ہیں۔ کچھ فاصلے پر کیلے کے درختوں کا ایک جھنڈ سا نظر آ رہا تھا۔ ہم اُس طرف چل دیئے۔ وہاں پہنچے تو اندازہ ہوا کہ یہ جگہ رکنے اور چھپنے کے لیے کافی محفوظ ہے۔ کیلے کے درخت بالکل ساتھ ساتھ اُگے ہوئے تھے۔ ان کے اردگرد جھاڑ جھنکاڑ تھا۔ پانی کا ایک بڑا کھالا اس جھنڈ کے عین درمیان سے گزر رہا تھا۔ ہم دیکھ کر حیران ہوئے کہ یہ بالکل تازہ پانی تھا اور اس میں سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ ہاتھ لگایا تو نیم گرم محسوس ہوا۔ یقیناً یہ کسی کھیت کی طرف جا رہا تھا مگر اس کا ماخذ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ یہاں ہوا بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔ ایک جگہ تھوڑی سی چمک نظر آئی۔ "یہ کیا ہے؟" تاجور نے حیران ہو کر پوچھا۔

ہم نے آگے جا کر دیکھا۔ یہ ایک چھوٹا سا گڑھا تھا جس میں ادھ بجے انگارے اور راکھ تھی۔ خوشگوار حرارت کا احساس ہوا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ کچھ دیر پہلے تک یہاں کسی نے گوشت وغیرہ بھونا تھا۔ شاید قربانی کا گوشت۔ ایک دو ہڈیاں بھی نظر آئیں۔ بہرحال اب یہ جگہ بالکل خالی تھی۔ دور دور کوئی متنفس دکھائی نہیں دیتا تھا۔ گیارہویں رات کا چاند بدلیوں کی اوٹ سے نکل آیا تھا۔ اس کی مدھم روشنی میں قرب و جوار سحر زدہ نظر آنے لگے۔

"میں اپنی چادر دھولوں؟" تاجور نے کہا۔

"چادر دھولو اور سر بھی۔"

وہ پانی کی طرف چلی گئی۔ پہلے اس نے اپنی شال دھوئی۔ پھر نیچے جھک کر اپنے لمبے بالوں کو پانی میں ڈبویا اور انہیں صاف کیا۔ میں بیٹھا اسے محویت سے دیکھتا رہا۔ اس کی چوڑیوں کی مدھم چھن چھن، اس کے جسم کے دلکش زاویے، اس کی بے ساختہ ادائیں اور چاندنی کرن کرن گردوپیش پر اترتی ہوئی، یہ سب کچھ ایک حسین سپنے کی طرح تھا۔ میں نے بھی اپنی جیکٹ دھونے کے لیے اتاری مگر اس طرح کہ جیکٹ کے اندرونی حصے پر تاجور کی نظر

نہ پڑے۔ جب میں ڈھاٹا باندھ کر نکلتا تھا تو اسی جیکٹ کو الٹ کر پہنتا تھا۔ سر دھونے کے بعد تاجور نے اپنی گردن ٹیڑھی کی اور گیلے بالوں کو بل دے کر نچوڑا۔

اچھی طرح ہاتھ منہ دھو کر ہم ادھ بجھے انگاروں کے پاس آبیٹھے۔ اب رات کے قریباً گیارہ بج چکے تھے۔ تاجور کا دھیان بار بار اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ وہ پریشان لہجے میں بولی۔ ''شاہ زیب صاحب! ہم اور کتنی دیر یہاں رہیں گے؟''

''میرا خیال ہے کہ ہمیں دن نکلنے سے پہلے یہ جگہ چھوڑنی نہیں چاہیے......'' ابھی میں نے فقرہ مکمل نہیں کیا تھا کہ کہیں دور سے ہوا کے دوش پر تیر کر ایک آواز سنائی دی۔ یہ رائفل کے فائر کی آواز تھی۔

تاجور نے بھی یہ آواز سنی اور ڈری ڈری نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں جو بات کہنے والا تھا اس کی تصدیق پہلے ہی ہو گئی تھی۔

میں نے کہا۔ ''تاجور! مجھے لگتا ہے کہ آج کی رات خطرے سے خالی نہیں۔ وہ لوگ اس علاقے میں موجود ہیں اور یہ جگہ ہمارے لیے ہر لحاظ سے محفوظ ہے۔''

''ابھی دن چڑھنے میں کتنا وقت ہے؟''

''آدھی رات تو ہو گئی ہے۔ پانچ چھ گھنٹے اور گزارنے ہوں گے۔''

تاجور نے اپنی دھلی ہوئی چادر انگاروں کے پاس دو خشک ٹہنیوں پر پھیلا دی تھی۔ وہ ننگے سر تھی اور انگاروں کے پاس سکڑی سمٹی بیٹھی تھی۔ اس کے پاؤں میں ابھی تک میری چپل تھی۔

چاند دھیرے دھیرے مغرب کی طرف جھکنا شروع ہو گیا تھا۔ میں یک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ بے چین سی نظر آنے لگی۔

میں نے کہا۔ ''تاجور! آج مجھے ایک بات صاف صاف بتاؤ...... کیا تم نے واقعی مجھے نہیں پہچانا؟''

وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگی۔ ''کیا مطلب؟''

''اگر تم اداکاری کر رہی ہو تو بہت اچھی کر رہی ہو لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو پھر تمہاری یادداشت بہت کمزور ہے۔''

''آپ...... پہیلیاں بجھوا رہے ہیں۔''

میں نے گہری سانس لی۔ ''اچھا میری طرف غور سے دیکھو...... میری آواز پر غور کرو۔ کیا تمہیں کچھ یاد نہیں آ رہا؟ کیا تمہیں نہیں لگتا کہ ہم پہلے بھی ملے ہیں۔''

اس نے میری طرف غور سے دیکھا اور بولی۔ ''پتا نہیں کیوں...... کبھی کبھی لگتا ہے کہ آپ کی آواز...... پہلے سنی ہوئی ہے...... آپ کا لہجہ......''

میں نے اس کے تاثرات دیکھنے چاہے لیکن چاند پھر تیزی سے کسی بدلی کی اوٹ میں چلا گیا اور روشنی اتنی نہ رہی کہ کسی کو دیکھا جا سکے۔

اگلے چار پانچ منٹ میں ہم دونوں کے درمیان اسی موضوع پر بات ہوئی۔ آخر میں نے کہا۔ ''تاجور...... یہ میرا چہرہ دیکھو، اگر میری لمبی براؤنش داڑھی ہو۔ یہاں اوپر گھنی مونچھیں ہوں۔ سر کے بال بھی ہلکے براؤن ہوں اور یہاں میرے کندھوں تک جاتے ہوں......اور میں تمہیں لاہور کے شاہی قلعے کے دروازے سے کچھ آگے کھڑا نظر آؤں تو کیا تم پھر بھی مجھے نہیں پہچانو گی؟''

اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا...... پھر عجیب انداز سے بولی۔ ''ہاں، پھر آپ کو پہچان لوں گی۔''

مجھے زبردست شاک لگا۔ میں ششدر سا اس کی طرف دیکھتا چلا گیا۔ اس نے اپنی نیم خشک شال درخت کی شاخ پر سے اٹھائی اور سر ڈھانپ لیا۔ میں سناٹے میں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ مجھے شروع میں ہی پہچان گئی تھی پھر اس نے اتنے دن اظہار کیوں نہیں کیا؟ عورت کو ایک پہیلی کہا جاتا ہے۔ آج اس سرد رات میں کیلے کے اس جھنڈ کے اندر، گرم شال کا گھونگٹ نکالے...... وہ پہیلی میرے سامنے بیٹھی تھی۔

''اوہ گاڈ۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''شکر ہے تم نے تسلیم تو کیا۔''

شال کا پلو اس کے سر پر یوں ڈھلکا ہوا تھا کہ صرف ناک اور ہونٹ ہی دکھائی دے رہے تھے۔ وہ سرسراتی آواز میں بولی۔ ''جب میں فرح کے ساتھ اس ریسٹورنٹ میں آپ سے ملی تو دس پندرہ منٹ بعد ہی مجھے پتا چل گیا تھا کہ آپ کون ہیں۔''

''پھر تم نے بتایا کیوں نہیں؟''

''پتا نہیں۔'' اس کے جواب میں سادگی اور معصومیت کا ایسا انداز تھا کہ میں گنگ ہو کر رہ گیا۔

''ہر بات کی کوئی وجہ ہوتی ہے تاجور۔ اس کی بھی ضرور ہو گی۔''

وہ خاموش رہی۔ عورت کی وہی بھیدوں بھری خاموشی جو بڑے بڑے دانشوروں اور فلاسفروں کو بے بس کر دیتی ہے۔

میں نے کہا۔ ''تمہیں میرے انداز نے ضرور سمجھا دیا ہو گا کہ میں تمہیں پہچان گیا

ہوں۔''

''ہوں...... کسی حد تک۔''

''پھر تمہاری خاموشی کا کیا مطلب تھا؟ کیا تم یہ سمجھتی تھیں کہ اگر تم مجھے نہ پہچانو گی تو میں بھی اس بارے میں خاموش ہی رہوں گا؟''

''شش...... شاید۔''

''اگر تم مجھ سے گریز ہی کرنا چاہتی تھیں تو پھر...... تم وہاں لاہور میں ہی فرح کو بتا سکتی تھیں کہ تمہیں میری مدد کی ضرورت نہیں۔''

وہ ایک توقف کے بعد بولی۔ ''میں نے یہ سوچا تھا...... لیکن پھر پتا نہیں کیوں......'' وہ فقرہ مکمل نہ کر سکی اور اپنی کلائی کی چوڑیوں کو گھمانے لگی۔

''ہاں، عورت پہیلی ہے۔ کبھی کبھی اس کے دل کی گہرائی تک اترنا ناممکن ہو جاتا ہے یا شاید یہ گریز اور کشش کا وہی درمیانی رویہ ہے جو ہر جاندار میل اور فی میل میں پایا جاتا ہے۔''

''تم نے جب مجھے ریسٹورنٹ میں دیکھا اور پھر پہچان لیا تو تمہیں کیسا لگا؟''

''میں بہت حیران ہوئی تھی۔''

''حیران یا کچھ اور بھی۔ میرا مطلب ہے کہ کوئی خوشی نہیں ہوئی تمہیں کہ اتنے عرصے بعد ہم اچانک پھر مل گئے ہیں۔''

وہ کوئی جواب نہ دے پائی۔

میں نے کہا۔ ''میں سمجھ گیا...... تم نے مجھے جو فون نمبر دیا تھا، وہ غلط تھا۔ میں نے اس پر سیکڑوں بار کوشش کی لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ کچھ اور نہیں تو تمہیں اس بات کی شرمندگی تو ضرور ہوگی۔''

''میں اس کے لیے...... آپ سے معافی مانگنا چاہتی تھی۔''

''تو پھر مانگی کیوں نہیں؟''

''میں نے سوچا تھا کہ جب مجھے پکا یقین ہو جائے گا کہ آپ نے مجھے پہچان لیا ہے اور آپ اس بارے میں مجھ سے بات کریں گے تو پھر میں معافی بھی مانگ لوں گی۔''

میں نے کیلے کے ایک تنے سے ٹیک لگائی اور مسکراتے ہوئے کہا۔ ''چلو، اب تو پکا یقین ہو گیا۔''

چاند پھر نکل آیا تھا۔ اس کی روشنی اس کے حسین چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اس کے ہونٹ تھرائے اور وہ بولی۔ ''میں اس کے لیے معافی مانگتی ہوں۔ مجھے آپ کو دھوکے میں نہیں رکھنا

چاہیے تھا۔"

"اگر میں معاف نہ کروں تو......؟"

"مجھے پتا ہے، آپ ایسے نہیں ہیں۔"

اب سب کچھ کھل گیا تھا۔ ایک بار باتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو پھر دراز ہوتا چلا گیا۔ میں نے دل فگار لہجے میں کہا۔ "تاجور! پتا نہیں کیوں میں نے تمہیں بہت یاد کیا، بہت زیادہ۔ کیا تم نے بھی کبھی میرے بارے میں سوچا تھا؟"

"ہاں......لیکن اتنا زیادہ نہیں جتنا آپ کہہ رہے ہیں۔"

"کیوں نہیں سوچا؟"

وہ توقف کر کے بولی۔ "آپ نے دیکھ ہی لیا ہے، میں جس ماحول میں رہتی ہوں وہاں سوچنا کتنا مشکل ہے۔"

اس کا جواب بڑا معنی خیز تھا۔ میرے اندر جیسے ایک پھلجھڑی سی چھوٹ گئی۔ دوسرے لفظوں میں شاید اس نے یہ کہا تھا کہ وہ سوچنا چاہتی تھی مگر یہاں سوچ پر پہرے ہیں۔ پھول کھلنے سے پہلے مرجھا جاتے ہیں۔ بیلیں دیوار پر چڑھنے سے پہلے گر پڑتی ہیں۔ یقیناً وہ یہی کہہ رہی تھی تو اس کا کیا مطلب تھا۔ اس کے ذہن میں بھی میرا خیال آتا تھا۔ کبھی کبھی ہی سہی مگر آتا تھا۔

"تم میرے بارے میں کیا سوچتی تھیں تاجور؟"

اس نے سر پر شال درست کی۔ "یہی کہ آپ بہت اچھے ہیں۔ آپ دوسروں کی مدد کرنے والے ہیں۔ آپ نے میری مدد کی بلکہ تھوڑا سا خطرہ بھی مول لیا۔ ایک ہمدرد ساتھی کی طرح میرے ساتھ رہے......اور پھر خاموشی سے چلے گئے۔"

میں نے گہری سانس لی۔ "تاجور! وہ دو دن میں کبھی نہیں بھول سکا۔ تمہارے ساتھ گزرا ہوا ہر لمحہ میں سیکڑوں بار اپنی سوچوں میں دہرا چکا ہوں۔ جب میں تم سے جدا ہوا تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ دو دن مجھے اس طرح بے چین کریں گے۔ میں اپنا دھیان تمہاری طرف سے جتنا ہٹانا چاہتا تھا وہ اتنا ہی تمہاری طرف جاتا تھا۔ کوپن ہیگن کے ریستورانوں میں، لندن کی روشنیوں میں، پیرس کی تفریح گاہوں میں......میں کہیں بھی تمہیں بھولا نہیں اور جتنی بار اور جہاں بھی تمہارے بارے میں سوچتا تھا، ذہن میں سیکڑوں سوالات اٹھتے تھے۔"

وہ ہولے سے مسکرائی۔ "اور شاید یہ سوال بھی اٹھتا ہوگا کہ شاہی قلعے میں ملنے کے بعد

میں آپ کے ساتھ وقت کیوں گزارنا چاہتی تھی اور شام سے پہلے گھر واپس جانا کیوں نہیں چاہتی تھی؟"

"ہاں، یہ سب سے زیادہ پریشان کن سوال تھا۔"

"اب تو اس کا جواب کچھ کچھ آپ کی سمجھ میں آ گیا ہوگا۔"

میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ "کہیں اس بات کا تعلق بھی تو تمہارے منگیتر سے نہیں تھا۔ میرا مطلب ہے، کیا تم اس سے بچنے کے لیے گھر سے باہر رہتی تھیں؟"

"ہاں شاہ زیب صاحب...... میرا یہ روگ نیا نہیں ہے۔ پیچھے دیکھتی ہوں تو لگتا ہے کہ اب تک کی ساری زندگی اسی خوف کے سائے میں گزری ہے۔"

"کیا ان دنوں وہ بھی تمہارے ساتھ لاہور میں تھا؟"

"نہیں...... لیکن وہ وہاں پہنچ گیا تھا۔"

اس بارے میں تاجور نے جو کچھ بتایا، وہ یوں تھا۔ ساڑھے تین سال پہلے تاجور اپنی بڑی بہن کے گھر چھٹیاں گزارنے لاہور گئی تھی۔ انہی دنوں اس کے منگیتر اسحاق کا بھی لاہور آنا ہو گیا۔ دراصل وہ روزگار کے لیے دبئی جا رہا تھا۔ اس کا ویزا لگ گیا تھا اور ٹکٹ بھی مل گیا تھا۔ وہ جہاز پر سوار ہونے کے لیے گاؤں سے لاہور پہنچا۔ ایک چچازاد بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس کی فلائٹ کا وقت شام کے بعد تھا اور شام تک اس نے تاجور کی بہن کے گھر میں ٹھہرنا تھا۔ یہی وہ دن تھا جب شاہی قلعہ لاہور کے دروازے پر تاجور سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ وہ اسحاق کی آمد کی خبر سنتے ہی اپنی بہن کے گھر سے نکل آئی تھی۔ بلکہ بہن نے ہی اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ شام تک گھر سے باہر رہے۔ بہن کا شوہر بھی گھر میں موجود نہیں تھا۔ بہن کو ڈر تھا کہ اسحاق، تاجور کو بے جا تنگ کرے گا اور ممکن ہے کہ دست درازی پر ہی اتر آئے۔ اس سے کچھ بعید نہیں تھا۔ تاجور افراتفری میں گھر سے نکل آئی لیکن وہ جاتی کہاں؟ وہ وقت گزارنے کے لیے اِدھر اُدھر منڈلاتی رہی۔ شاہی قلعے پہنچی تو اوباش لڑکے اس کے پیچھے لگ گئے اور اسے میری پناہ میں آنا پڑا۔ بعدازاں شام کے وقت وہ مجھ کو الوداع کہہ کے گھر واپس چلی گئی۔ لیکن یہاں یہ مسئلہ ہوا کہ سردی اور دھند کی وجہ سے اسحاق کی فلائٹ کینسل ہو گئی اور وہ تاجور کی بہن کے گھر واپس آ گیا۔ اسی لیے اگلے روز مجھے پھر تاجور کا فون آ گیا اور اس نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں آج پھر اس کے ساتھ تھوڑا سا وقت گزاروں۔ یعنی اگلے روز وہ پھر گھر سے نکل گئی تھی اور شام تک باہر ہی رہی تھی۔ شام کو اس کا خطرناک منگیتر اسحاق دبئی کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔ (لیکن وہ دبئی بھی زیادہ عرصے نہیں ٹک سکا تھا۔ وہاں اپنے کفیل سے اس کا

جھگڑا ہوا اور وہ اس کے بیٹے کو تھپڑ مار کر پاکستان بھاگ آیا تھا)

تاجور سے یہ سارے واقعات سن کر میرے ذہن میں عرصے سے موجود ایک سوال کا جواب مل گیا۔ میں جان گیا کہ ماضی کے وہ دو حسین ترین دن کیسے میری جھولی میں آ گرے تھے۔

میں نے کہا۔ ''تاجور! تمہاری باتیں سن کر تو یہی لگتا ہے کہ تم مسلسل ایک عذاب جھیل رہی ہو۔ ساڑھے تین سال تو اس واقعے کو ہو گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اسحاق اس سے پہلے بھی تمہارا منگیتر تھا اور اس کا خوف تمہارے سر پر سوار تھا۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا پھر خاموشی کو توڑنے کے لیے بولی۔ ''ہاں...... وہ ضد کا بڑا پکا ہے اور غصے والا بھی بہت ہے۔ ابا امی، میرے چچا وغیرہ کوئی بھی نہیں چاہتا کہ ہمارا رشتہ ہو لیکن وہ کہتا ہے کہ کسی صورت اپنی منگ نہیں چھوڑوں گا۔ اس کی دھمکیوں کی وجہ سے سب چپ ہو جاتے ہیں۔''

''میں نے یہ بھی سنا ہے کہ اسحاق کے والد نے پسند کی شادی نہ ہونے پر ایک لڑکی پر فائرنگ کر دی تھی اور وہ بے چاری بعد میں زخم خراب ہونے کی وجہ سے مر گئی تھی؟''

میرے سوال کا جواب تاجور نے ہاں میں دیا اور بولی۔ ''وہ ایک دفعہ ابا جی کو بھی صاف صاف دھمکی دے چکا ہے۔ کہتا ہے کہ میں مر جاؤں گا اور مار دوں گا لیکن تاجور کو کسی کی ڈولی میں نہیں بیٹھنے دوں گا۔'' وہ بہت دکھی لہجے میں بول رہی تھی۔

میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''تاجور! ایک بات بتاؤ، بالکل سچ۔ کیا تم نے کبھی کسی سے پیار کیا ہے؟''

وہ چند لمحے کے لیے جیسے سناٹے میں رہی پھر سنبھل کر بولی۔ ''اپنے ابا امی سے کیا ہے اور اپنے چھوٹے بھائیوں سے۔''

''یعنی تم نے اپنی زندگی کا جیون ساتھی بنانے کے لیے کسی کو نہیں چاہا؟''

اس نے چادر کے نیچے نفی میں سر ہلایا۔

''لیکن، میں نے چاہا ہے۔''

''کون ہے؟''

''ایک لڑکی...... ایک دیہاتی لڑکی۔ جس کے لیے میں کوپن ہیگن سے یہاں پہنچا ہوں۔''

اس نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ ہم دونوں کے درمیان ایک بوجھل خاموشی طاری ہو

گئی۔ اس خاموشی میں کبھی کبھی کسی شب بیدار پرندے کی آواز ابھرتی تھی یا پھر کوئی جھینگر اپنی موجودگی کا احساس دلانے لگتا تھا۔ آخر اس خاموشی کو توڑتے ہوئے اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”آپ کی ساری زندگی باہر گزری ہے۔ آپ ہمارے دیہات اور ہماری لڑکیوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے اور نہ ان پابندیوں کے بارے میں جانتے ہیں جن میں یہاں کے لوگ جکڑے ہوئے ہیں۔ آپ کے لیے بہت اچھا ہے کہ دو چار دن یہاں گزارنے کے بعد واپس چلے جائیں۔“

”تو پھر اس مشن کا کیا ہوگا جس کے لیے میں یہاں آیا ہوں میں اس لڑکی کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ اسے اس کے مسئلوں کی دلدل سے نکالنا چاہتا ہوں اور بڑی حد تک میں اس کے مسئلوں کو سمجھ بھی چکا ہوں۔“

”آپ نے بہت کچھ کیا ہوگا لیکن آپ کی ایک بات نے آپ کی ساری کوششوں پر پانی پھیر دیا ہے۔ آپ جس کو مسئلوں کی دلدل سے نکالنے کی بات کر رہے ہیں، اسے اور بری طرح پھنسا دیں گے۔ آپ سوچ بھی نہیں سکتے کہ آپ کے ساتھ یہاں کیا ہو سکتا ہے۔“ اس کے لہجے میں ایک دم زبردست بیگانیت پیدا ہو گئی تھی۔ یوں لگا جیسے وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہونا چاہتی ہے۔

مگر پھر اچانک وہ زور سے چلائی اور میرے کندھے سے چمٹ گئی۔ میں نے اس کی نظر کا تعاقب کیا۔ چند فٹ کے فاصلے پر مجھے دو خوفناک چمکیلی آنکھیں نظر آئیں۔ جلد ہی پتا چل گیا کہ یہ ایک جنگلی بلا ہے جو شاید ہڈیوں کی خوشبو سونگھ کر اس طرف چلا آیا ہے۔ میں نے جھک کر پتھر اٹھایا تو وہ غائب ہو گیا۔ وہ بدستور میرے کندھے سے چمٹی ہوئی تھی۔ میں اس کے جسم کی نرمی اور حرارت کو محسوس کر رہا تھا۔ اس کی انگلیوں کے ناخن میرے بازو کے گوشت میں پیوست تھے۔

پھر یکایک اسے اس قربت کا احساس ہوا۔ وہ خجل انداز میں پیچھے ہٹ گئی۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”عورت کمزور ہوتی ہے لیکن اسے مناسب مرد کا سہارا مل جائے تو اس کے خوف دور بھی ہو جایا کرتے ہیں۔“ اس کی خاموشی سے اندازہ ہوا کہ وہ میری بات کا مطلب سمجھ رہی ہے۔

اس نے ملتجی انداز میں کہا۔ ”میری آپ سے ایک درخواست ہے۔ آپ اس بارے میں پھر بات نہ کریں۔ اگر آپ...... اس قسم کی بات کریں گے...... تو پھر میں اٹھ کر چلی جاؤں گی۔“

میں کٹ سا گیا۔ فوری طور پر سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہوں۔ واقعی اس جیسی لڑکی کا مجھے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ ایک طرف وہ میری بات سننا نہیں چاہ رہی تھی۔ دوسری طرف مجھے لاہور میں پہچان لینے کے باوجود یہاں اپنی مدد کے لیے لے آئی تھی۔ خاموشی طویل ہوئی تو وہ ایک دم موضوع بدلنے والے انداز میں بولی۔ ''آپ نے مولوی فدا کی بات کی تھی اور کہا تھا کہ وہ ایسا نہیں جیسا میں اسے سمجھ رہی ہوں، آپ کو اس میں کیا نظر آیا ہے؟''

''مجھے اس کی مجبوری نظر آئی ہے اور میں بہت جلد اس مجبوری کو اختیار میں بدلنے والا ہوں پھر مولوی جی وہی زبان بولیں گے جو وہ بولنا چاہتے ہیں۔''

''ایسی کیا مجبوری تھی کہ انہوں نے اپنے شاگرد کے ذریعے ہمارے گھر حملہ کروا دیا اور اب ثابت ہو گیا ہے کہ طارق، نمبردارنی کو نہیں مجھے مارنا چاہتا تھا۔''

''اس میں مولوی جی کا کوئی قصور نہیں۔ یہ طارق کا ذاتی فعل تھا۔ وہ مولوی جی کو مصیبت میں دیکھ کر برداشت نہ کر سکا اور جوش میں تمہارے گھر گھس گیا۔''

''میں نے اس کا کیا بگاڑا تھا؟''

''وہ سمجھتا تھا کہ تم بالواسطہ طور پر مولوی جی کی پریشانیوں کی ذمے دار ہو۔''

''مجھ سے کیا پریشانی تھی مولوی جی کو؟'' وہ سٹپٹا کر بولی۔

''سمجھو، یہ ایک بھید ہے۔ دو چار دن میں تم پر کھل جائے گا یا ہو سکتا ہے کہ......''

اچانک میرا فقرہ ادھورا رہ گیا۔ ہمیں کسی گاڑی کے انجن کی مدھم آواز سنائی دی تھی۔ ہم کان لگا کر یہ آواز سننے لگے۔ آواز دائیں جانب سے آ رہی تھی اور بتدریج واضح ہو رہی تھی۔ میں نے ادھ بجھے انگاروں پر مٹی ڈال دی۔ اب گھوڑوں کی ٹاپیں بھی سنائی دینے لگی تھیں۔ مدھم چاندنی میں تاجور کی آنکھوں میں ہراس کے سائے تھے۔ میں نے پستول جیکٹ کی جیب سے نکال لیا۔ بائیں ہاتھ میں تاجور کا دایاں ہاتھ تھاما اور کیلے کے جھنڈ میں کچھ اور اندر چلا گیا۔ انجن کا شور اور گھوڑوں کی ٹاپیں قریب آتی جا رہی تھیں۔ تاجور نے ایک بار پھر بے ساختہ میرا بازو تھام لیا۔ موقع سنگین تھا پھر بھی تاجور کی لرزاں گرفت مجھے مزہ دینے لگی۔ آثار یہی بتا رہے تھے کہ شاید ہمارے اندیشے درست ثابت ہو گئے ہیں۔ چاند گڑھی والے لٹیروں کی کوئی ٹولی یہاں پہنچ گئی ہے لیکن پھر دفعتاً تاجور نے میرا بازو چھوڑ دیا۔ بولی۔ ''مجھے تو کچھ اور لگ رہا ہے۔''

''کیا کہنا چاہتی ہو؟''

''مجھے تو یہ ملک عالمگیر کی گاڑی کی آواز لگ رہی ہے۔''

وہ کان سے شال ہٹا کر دھیان سے آواز سننے لگی پھر بولی۔ ''ہاں، یہ اسی کی گاڑی ہے......شاید اسحاق بھی اس کے ساتھ ہوگا۔''

''تمہارا مطلب ہے یہ لوگ تمہیں ڈھونڈتے ہوئے یہاں پہنچے ہیں؟''

''ایسے ہی لگتا ہے۔'' اب اس کی آواز میں خوف کا عنصر کافی حد تک کم ہو گیا تھا۔ چند سیکنڈ مزید گزرے، تب آوازیں جھنڈ کے سامنے پہنچ گئیں۔

''آپ ان کو آواز دیں۔ میں نے دیکھ لیا ہے۔ یہ عالمگیر کی ہی گاڑی ہے۔'' تاجور نے پورے یقین سے کہا۔

میں اور تاجور واپس انگاروں والی جگہ پر آگئے۔ یہاں سے راستہ دکھائی دے رہا تھا۔ یہ دس بارہ گھڑسوار تھے۔ ان کے آگے ایک بڑے سائز کی بے ہودہ سی جیپ تھی۔ ممکن تھا کہ وہ لوگ جھنڈ کی طرف آتے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ سیدھے نکل جاتے۔ میں اور تاجور جھنڈ سے باہر آئے۔ تاجور نے زور سے پکارا۔ میں نے بھی ہاتھ ہلائے۔ ہمیں دیکھ لیا گیا۔

میں نے تاجور کی طرف دیکھے بغیر سرگوشی میں کہا۔ ''تاجور! کسی بھی صورت ہمت نہ ہارنا۔ میں یہاں ہوں اور تمہیں اس مشکل سے نکال کر رہوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔''

جیپ رک گئی۔ پھر گھوڑے بھی ٹھہر گئے۔ جیپ کا رخ ہماری طرف ہوا۔ اس کی ہیڈ لائٹس سیدھی ہم دونوں پر پڑیں۔ کچھ افراد تیزی سے نیچے اترے۔ تاجور دوڑ کر آگے گئی اور ان میں سے ایک شخص کے ساتھ لپٹ گئی۔ میں نے دھیان سے دیکھا۔ یہ تاجور کے والد دین محمد تھے۔ ان کے پیچھے چوڑے جبڑوں والا اسحاق کھڑا تھا۔ اسحاق کے ساتھ ہی ایک غیر معمولی لمبے چہرے والا شخص نظر آیا۔ اس نے کلف دار سفید شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ کندھے سے پستول جھول رہا تھا۔ بعدازاں پتا چلا کہ یہی زمیندار عالمگیر ہے۔ اسے ملک عالمگیر بھی کہا جاتا تھا۔ درحقیقت یہی شخص چاند گڑھی کا کرتا دھرتا تھا۔ یہاں کا چودھری نیاز تو ایک چودہ پندرہ سالہ لڑکا تھا۔ بڑے چودھری کی موت کے بعد اسے چودھری بننا پڑا۔ ورنہ اس عمر میں وہ کیا فیصلے کر سکتا تھا۔ عالمگیر بڑے چودھری کے بہت قریب تھا۔ اس کا چھوٹا بھائی بنا ہوا تھا۔ اس لیے اس کی موت کے بعد اصل چودھراہٹ اس کے حصے میں آگئی تھی۔

تاجور نے اپنے گھر والوں کی خیر خیریت دریافت کر لی تھی اور اب اپنے باپ کے سینے سے لگی ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ دین محمد نے پوچھا۔ ''تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی دھی رانی؟ تُو ٹھیک ہے نا؟''

تاجور نے زور سے اثبات میں سر ہلایا اور مزید شدت کے ساتھ باپ سے چمٹ گئی۔

''شکر ہے مولا...... تیرا لکھ لکھ شکر ہے۔'' دین محمد نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

لمبے چہرے والا عالمگیر اور اسحاق سیدھا میری طرف آئے۔ دین محمد کا ملازم حق نواز ان کے پیچھے تھا۔ عالمگیر نے اشاروں میں مجھ سے پوچھا کہ وہ پستول کہاں ہے جو میں نے سیالکوٹی کے بندوں سے چھینا تھا۔

میں نے جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر پستول ان کے حوالے کر دیا۔ موقع تو یہ تھا کہ عالمگیر اور اسحاق وغیرہ میری کارکردگی پر مجھے شاباش دیتے، اس کے بجائے وہ مجھے قہر آلود نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ خاص طور پر اسحاق کی نظروں میں کینہ تھا۔ وہ چوڑے جبڑوں اور چھوٹی آنکھوں والا کرخت سا شخص تھا۔ ماتھے پر چوٹ کا پرانا نشان تھا۔ میں تاجور کے منگیتر کو آج پہلی بار قریب سے دیکھ رہا تھا۔

تاجور نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے والد سے کہا۔ ''اس نے بڑی ہمت دکھائی۔ نہیں تو وہاں ڈیرے پر کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ انہوں نے نشہ کیا ہوا تھا۔ گالیاں دے رہے تھے۔'' اس نے اپنا زخمی کان والد کو دکھایا۔ دین محمد میری طرف آئے۔ میرا کندھا سہلایا۔ اسحاق رخ پھیر کر دوسری طرف چلا گیا۔

تاجور، عالمگیر، اپنے والد اور دیگر لوگوں کو بتانے لگی کہ وہ کس طرح اتنی بڑی مشکل سے بچ پائی ہے۔

○......❖......○

تاجور اپنے والد اور اسحاق کے ساتھ عالمگیر کی جیپ میں بیٹھی۔ مجھے ایک گھوڑ سوار کے ساتھ بٹھایا گیا۔ مسلح گھڑ سوار ہمارے آگے پیچھے رہے۔ ہم سردی اور تاریکی میں قریباً چار پانچ میل کا فاصلہ طے کر کے واپس چاند گڑھی پہنچ گئے۔ اب رات کا آخری پہر شروع ہونے والا تھا۔ چاند گڑھی کے بیشتر گھروں میں لوگ جاگ رہے تھے۔ کچھ لوگ پہرے کے انداز میں گھومتے پھرتے نظر آئے۔ ان کے ہاتھوں میں لاٹھیاں اور کلہاڑیاں تھیں۔ دو تین رائفل برداروں پر بھی نظر پڑی۔

گاؤں میں داخل ہونے کے ایک منٹ بعد ہی میرے کانوں میں رونے پیٹنے کی آوازیں آئیں۔ یہ آوازیں چودھری کی حویلی کے ساتھ والی حویلی سے آرہی تھیں۔ عورتیں دلدوز انداز میں بین کر رہی تھیں۔ پتا چلا کہ سیالکوٹی کا گاؤں پر حملہ اس مرتبہ خون خرابے سے خالی نہیں رہا۔ عالمگیر کے سگے بھائی کی چھاتی پر گولی لگی ہے اور وہ گاؤں میں ہی دم توڑ گیا ہے۔ اس کا نام پرویز ہے اور وہ عالمگیر سے چھوٹا تھا۔ اس واقعے میں دو افراد زخمی بھی ہوئے تھے۔

یہ سنگین صورتِ حال تھی۔ چاند گڑھی میں کہرام سا مچا ہوا تھا۔ مجھے عالمگیر کی آنکھیں خون کی طرح سرخ دکھائی دیں۔ ایسے لگتا تھا کہ وہ چند گھنٹے پہلے تک دھاڑیں مار مار کر روتا رہا ہے۔ شاید یہ مکافاتِ عمل کی ہی کوئی شکل تھی۔ عالمگیر چاند گڑھی میں اصلی چودھراہٹ کے مزے لے رہا تھا اور من مرضی کے فیصلے کر رہا تھا۔ اس نے دین محمد جیسے شریف النفس بندے کا اور اس کی فیملی کا حقہ پانی بند کرار کھا تھا۔ بے چاروں پر عرصۂ حیات تنگ کیا ہوا تھا اور آج وہ خود زندگی کی شدید ترین کڑواہٹ چکھ رہا تھا۔

میں ڈیرے پر پہنچا تو انیق مجھ سے لپٹ گیا۔ وہ میرے لیے بے حد فکرمند تھا۔ جب شام کے بعد تاجور گرائنڈر مشین ٹھیک کرانے کے بہانے مجھ سے ملنے آئی تھی تو میں نے انیق کو کمرے سے باہر بھیج دیا تھا اور اسی دوران میں سیالکوٹی کے مسلح افراد آدھمکے تھے۔ مجھے اور انیق کو تنہائی ملی تو ہم سرگوشیوں میں بات کرنے لگے۔ میں نے انیق کو مختصراً اپنی رُوداد سنائی۔ انیق نے بھی یہاں کے حالات سے آگاہ کیا۔

اس نے بتایا۔ ''ایک سال میں یہ تیسرا ہلا ہے جو سیالکوٹی کے گروہ نے بولا ہے۔ پچھلا ہلا گرمیوں میں ہوا تھا۔ اس میں دو تین بندے زخمی ہوئے تھے مگر اس بار تو ایک بندے کی جان بھی چلی گئی ہے۔ گاؤں والے سخت غصے میں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کی جان و مال ہر وقت خطرے میں ہے۔ وہ پولیس والوں پر بھی لعن طعن کر رہے ہیں جو ان لٹیروں کے خلاف کچھ کر نہیں پاتے۔''

''پولیس آئی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں آئی تو ہے لیکن ویسے ہی جیسے آیا کرتی ہے جب مجرم اپنا کام کر کے اپنے ٹھکانوں پر پہنچ چکے ہوتے ہیں۔ سنا ہے کہ اب شہر سے بھی کچھ پولیس والے یہاں آ رہے ہیں۔ آخر عالمگیر کا بھائی مرا ہے، کوئی معمولی بات تو نہیں۔''

''یہ سجاول سیالکوٹی ہے کیا بلا؟''

''جو کچھ اب تک مجھے پتا چلا ہے جی اس کے مطابق تو وہ مفرور ڈکیت ہی ہے۔ یہاں سے پندرہ بیس میل آگے نکلیں تو پہاڑیاں اور ٹیلے شروع ہو جاتے ہیں۔ بڑا دشوار علاقہ ہے پوٹھوہار کی طرح۔ سیالکوٹی اور اس کے لوگ چاند گڑھی اور آس پاس کے دو تین دیہاتوں میں مار دھاڑ کر کے اس علاقے میں روپوش ہو جاتے ہیں۔ ایک دو دفعہ پولیس نے آپریشن بھی کیا ہے پر نتیجہ کچھ نہیں نکلا۔ بہرحال لگتا ہے، اب کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا۔''

''اس لیے کہ عالمگیر کا بھائی مرا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، یہ وجہ بھی ہے۔اس کے علاوہ پہلے تو یہ لوگ صرف قیمتی چیزوں پر ہی ہاتھ صاف کرتے تھے، کوئی جانی نقصان نہیں پہنچاتے تھے، نہ کسی عورت پر ہاتھ ڈالتے تھے مگر اس دفعہ تو دونوں کام ہوئے ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''انہوں نے ایک لڑکی کے کپڑے پھاڑے اور اسے نوچا کھسوٹا۔ عالمگیر کا بھائی پرویز اس بات پر مشتعل ہو کر سامنے آیا تو انہوں نے اس پر سیدھا فائر کر دیا۔اس کے علاوہ جو کچھ تاجور بی بی کے ساتھ ہوا ہے اس کا پتا تو آپ کو ہے ہی۔جس طرح وہ لوگ آپ دونوں کے پیچھے بھاگے تھے اگر خدانخواستہ آپ ان کے ہتھے چڑھ جاتے تو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔''

''تو اب کیا کہہ رہے ہیں لوگ؟''

''یہی کہ یا تو پولیس ان کی حفاظت کی ذمے داری لے یا پھر ان کو ہتھیار دے تاکہ وہ ان لٹیروں سے خود نمٹ سکیں۔''

O......❖......O

عید کا سارا ماحول برباد ہو کر رہ گیا تھا۔اگلے روز بھی چاند گڑھی میں سوگ کی کیفیت رہی۔ عالمگیر کے بھائی پرویز کی میت کو دفنانے سے پہلے اسے ٹریکٹر ٹرالی پر رکھ کر پکی سڑک تک لے جایا گیا اور وہاں کئی گھنٹے تک علاقے کے لوگوں نے مظاہرہ کیا۔ سیالکوٹ سے آئے ہوئے پولیس آفیسرز کی یقین دہانی پر پرویز کو چاند گڑھی میں سپرد خاک کیا گیا۔اس موقع پر ایک جم غفیر موجود تھا۔ میں نے جلالی طبیعت والے پیر ولایت کو جنازے کے وقت بڑے قریب سے دیکھا۔اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ وہ گمبھیر آواز میں بولتا تھا اور جب بولتا تھا تو لوگ بڑی توجہ سے سنتے تھے۔ وہ کافی لحیم شحیم شخص تھا۔ عمر چالیس سال سے زیادہ نہیں ہو گی۔اس کی آنکھیں سرمے سے لبالب بھری ہوئی تھیں اور کوئی تیز قسم کی خوشبو تھی جس نے اسے اپنے حصار میں لیا ہوا تھا۔ وہ اس موقعے پر بھی اپنے مطلب کی بات کرنے سے باز نہیں آیا۔ جنازے کے فوراً بعد اس نے لوگوں کے سامنے تقریر کرنے والے انداز میں کہا۔

''یہ جو کچھ ہمارے پنڈ میں ہو رہا ہے، نحوست کی وجہ سے ہے۔ ہم اپنی مرضیاں کر رہے ہیں اور جب بندہ اپنی مرضیاں کرتا ہے تو پھر اس کی سزا تو بھگتنی ہی پڑتی ہے۔ پورا گاؤں ایک طرف ہے اور صرف ایک گھر ایسا ہے جو اپنی بات پر اڑا ہوا ہے۔ میں پنڈ کے ہر بندے پر...... ہر چھوٹے بڑے پر مصیبت کے پرچھانوے دیکھ رہا ہوں۔''

اتنے میں پگڑی والا ایک بندہ اٹھا اور اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔''پر سائیں! اگر یہاں

یہی کچھ ہوتا رہا تو پھر بہت سے لوگ پنڈ چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ پچھلی بار جب سیالکوٹی نے لوٹ مار کی تھی تو آٹھ دس گھر پنڈ سے نکل گئے تھے۔ اس بار بھی کچھ لوگ کہیں اور جانے کا سوچ رہے ہیں۔ میرے چاچے نے تو آج اپنی زمین بیچنے کے لیے رکھ دی ہے۔ کہتا ہے میں نے یہاں نہیں رہنا۔"

اتنے میں ایک عورت کھڑی ہوئی، اس کے ساتھ اس کا دس بارہ سالہ بچہ بھی تھا۔ عورت نے اپنے بچے کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "پیر سائیں! میرے پتر جیدے نے وہی سب کچھ کہا ہے جو آپ کہتے ہیں۔ اس نے کل شام کے تھوڑی دیر بعد وہی دونوں بدشکل زنانیاں دیکھی ہیں۔ یہ قسم کھا کر کہتا ہے کہ اس نے اپنی آنکھوں سے ان دونوں کو قبرستان کے پاس والے ٹبے پر بیٹھے دیکھا ہے۔ انہوں نے لمبے چولے پہن رکھے تھے۔ دونوں سگریٹ پی رہی تھیں اور ساتھ ساتھ مٹی کھا رہی تھیں۔ یہ ان کو دیکھ کر ڈر گیا اور دوڑتا ہوا گھر آ گیا۔ اس کے بعد آدھے پونے گھنٹے کے اندر اندر سیالکوٹی کے لوگ گولیاں چلاتے ہوئے آ گئے۔"

بہت سے افراد ایک ساتھ بولنے لگے۔ پھر پنچایت کے لوگوں نے ان کو چپ کرایا۔

چاند گڑھی کے سیدھے سادے لوگ بہت جلد باتوں میں آ جاتے تھے۔ شام تک بہت سے لوگ اسی انداز میں بات کرنے لگے۔ یہ لوگ سیالکوٹی کے حملے کو بھی تاجور اور اسحاق کا بیاہ نہ ہونے والے معاملے سے جوڑ رہے تھے۔ اس صورتِ حال کو نحوست قرار دے رہے تھے کہ سب کے کہنے کے باوجود دین محمد کا گھرانا اپنی بات پر اڑا ہوا ہے۔ یہ بھی کہا جا رہا تھا کہ جب وہ بدصورت عورتیں کسی کو مٹی کھاتی ہوئی نظر آئیں تو گاؤں میں کسی کی موت ہو جاتی ہے۔ اگلے روز نوعمر چودھری کی حویلی میں پنچایت ہوئی۔ پنچایت میں بھی بہت بڑا ہنگامہ کھڑا ہوا۔ پہلوان حشمت بھی وہاں موجود تھا۔ ہمیں اس کی زبانی معلوم ہوا کہ پنچوں نے دین محمد اور اس کے بھائیوں پر سخت دباؤ ڈالا ہے اور کسی حد تک ان کو لاجواب بھی کر دیا ہے۔

انیق نے پہلوان سے پوچھا۔ "لاجواب کرنے سے آپ کا کیا مطلب ہے؟"

پہلوان نے مخصوص لہجے میں جواب دیا۔ "پچھلی سے پچھلی پنچایت سردیوں کی شروعات میں ہوئی تھی۔ اس پنچایت میں دین محمد کے منہ سے جوش میں ایک بات نکلی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ مولوی فدا صاحب کی بات کے علاوہ کسی کی بات ناہیں مانتا۔ اگر مولوی صاحب ایک بار کہہ دیویں کہ پنڈ کے گھروں میں خون کے جو چھینٹے نظر آوت ہیں اور جو پتھر پڑت ہیں ان کی وجہ میری بیٹی ہے تو میں ہر بات مان لوں گا۔"

"ہاں یہ بات تو کہی تھی اس وقت مالک نے۔" حق نواز نے تائید کی۔

''بس اب وہی بات دین محمد کے گلے پڑ رہی ہے۔'' پہلوان حشمت بولا۔ ''اس وقت مولوی صاحب کی رائے کچھ اور تھی مگر اب آہستہ آہستہ وہ کچھ اور کہنا شروع ہو گئے ہیں۔ پنچوں نے کل شام مولوی جی کو بھی پنچایت میں بلایا ہے۔ مجھے تو لگت ہے کہ دین محمد اب تاجور کی شادی والے معاملے کو اور زیادہ ناہیں ٹال سکے گا۔ وہ کیا کہوت ہیں...... بکرے کی ماں کب تک دودھوں نہائے گی۔''

سنجیدہ گفتگو ہو رہی تھی اس کے باوجود پہلوان حشمت کے محاورے پر انیق اپنی مسکراہٹ نہیں روک سکا۔ پہلوان نے کڑے تیوروں سے کہا۔ ''تم کیوں بتیسی نکال رہے ہو؟''

انیق نے کہا۔ ''معافی چاہتا ہوں۔ آپ نے پھر دو محاوروں کو ایک کر ڈالا ہے۔''

''کون سے دو محاورے؟''

''بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی...... اور دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو۔''

حشمت نے انیق کو گھورا اور خشک لہجے میں بولا۔ ''ویسے تم کوئی اتنے بابائے اردو ناہیں جتنا خود کو سمجھتے ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو یہاں اس گونگے کے ساتھ مل کر گھاس نہ کاٹ رہے ہوتے۔''

اس سے پہلے کہ انیق جواب میں کچھ کہتا دائیں جانب شور سنائی دیا۔ بہت سے افراد کسی کو گھسیٹتے اور مارتے ہوئے حویلی کی طرف لے جا رہے تھے۔ پتا چلا کہ اس شخص پر سیالکوٹی کا ساتھی ہونے کا شک ہے۔ عالمگیر کے کارندوں نے اسے قریبی گاؤں روہی والا سے پکڑا ہے۔ اب اسے پولیس چوکی لے کر جا رہے ہیں۔ یہی لگ رہا تھا کہ بھائی کی موت کے بعد عالمگیر جلے پاؤں کی بلی بنا ہوا ہے اور سیالکوٹی سے بدلہ لینے کی ہر ممکن کوشش کر رہا ہے۔

اس شخص کو دیکھنے کے لیے ہم بھی کمرے سے نکل کر موقع پر پہنچے۔ یہ ایک جواں سال شخص تھا۔ جھاڑ جھنکاڑ داڑھی تھی۔ کپڑے پھٹ گئے تھے اور جسم پر جگہ جگہ تازہ چوٹوں کے نشان تھے۔ پتا چلا کہ اس بندے سے پستول بھی برآمد ہوا ہے۔ میں نے اس کا پاؤں دیکھا۔ وہ سوج کر کپا ہو رہا تھا۔ ٹخنے سے ذرا اوپر کس کر رسی باندھی گئی تھی۔ ٹخنے پر زخم کا نشان بھی دکھائی دیا۔

''یہ کیا ہے؟'' انیق نے پہلوان سے پوچھا۔

''مجھ کو لگت ہے کہ اس کو سانپ نے بھی کاٹا ہے۔''

وہ شخص نیم بے ہوش ہو چکا تھا پھر بھی اس کی دھنائی جاری تھی۔ اس کا بالائی جسم گرد اور

خون میں لتھڑا گیا تھا۔ وہ لوگ اسے لے کر آگے چلے گئے تو ایک شخص نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگائے اور آسمان کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''واہ میرے مولا! تیری قدرت...... اور واہ پیر سائیں تیری کرامت۔''

میں نے انیق کو ٹھوکا دیا۔ اس نے دیہاتی سے پوچھا۔ ''کیا اسے پیر سائیں نے پکڑوایا ہے؟''

''انہوں نے نہیں پکڑوایا لیکن ان کی وجہ سے ہی پکڑا گیا ہے۔ تم نے دیکھا نہیں اس کو سانپ نے کاٹا ہے۔'' وہ بولا۔

انیق مزید وضاحت چاہ رہا تھا جب حق نواز نے اس کا بازو دبا کر اسے خاموش کر دیا۔ انیق خاموش ہو گیا۔ لمبا تڑنگا دیہاتی آگے چلا گیا۔ حق نواز نے کہا۔ ''مجھے ڈر تھا کہ کہیں تم پیر ولایت کے بارے میں کوئی الٹی سیدھی بات نہ کہہ دو۔ چاند گڑھی میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جو پیر کے خلاف چھوٹی سی بات سن کر بھی مرنے مارنے پر اتر آتے ہیں۔''

''یہ سانپ کے کاٹنے والی کیا بات کہہ رہا تھا؟'' انیق نے پوچھا۔

''پیر ولایت نے بہت سے سانپ بھی پال رکھے ہیں۔ کئی لوگ یہ کہتے ہیں کہ پیر جی رات کے وقت کچھ سانپوں کو کھلا چھوڑ دیتے ہیں اور یہ سانپ پنڈ کے ارد گرد گھوم کر پنڈ کا پہرا دیتے ہیں۔ جن لوگوں نے سیالکوٹی کے اس ساتھی کو پکڑا ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ بھاگنے لگا تھا مگر پھر اسے سانپ نے کاٹ لیا اور یہ گر کر تڑپنے لگا۔''

''سبحان اللہ!'' انیق نے جذباتی انداز میں اپنا سر ہلا کر پیر ولایت کے لیے ''عقیدت'' کا اظہار کیا۔

O......❖......O

اگلے روز جو پنچایت ہوئی وہ دین محمد اور تاجور وغیرہ کے لیے سخت تباہ کن تھی۔ اس پنچایت میں مولوی جی کو بھی بلایا گیا تھا۔ پنچایت کے بعد سرپنچ نے دین محمد کو دوٹوک فیصلہ سنا دیا۔ اسے فوراً تاجور کی شادی کی تیاری کرنا تھی اور دو ہفتوں کے اندر اندر اس کا ہاتھ اسحاق کے ہاتھ میں تھما دینا تھا۔ دوسری صورت میں یہ پنچایت کی اور گاؤں کے معززین کی ذمے داری تھی کہ وہ گاؤں پر سے سخت نحوست ٹالنے کے لیے خود کارروائی کریں اور تاجور کو اسحاق کے ساتھ رشتہ ازواج میں باندھیں۔

یہ بڑی نازک صورتِ حال تھی۔ گاؤں میں سیالکوٹی کے حملے اور پرویز کی موت کی وجہ سے پہلے ہی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ اب پنچایت کے اس حتمی فیصلے نے اور بھی سنسنی پھیلا دی۔

میری نگاہوں میں تاجور کی من موہنی صورت گھومنے لگی۔ سیالکوٹی والے واقعے کے بعد سے وہ مجھے دکھائی نہیں دی تھی مگر اس کا تصور تو پلک جھپکتے میں میرے سامنے آجاتا تھا۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں مجھ سے پوچھنے لگی۔ کیا آپ بھی کچھ نہیں کرسکیں گے شاہ زیب؟ کیا آپ بھی یہاں صرف میری بربادی کا تماشا دیکھنے ہی آئے ہیں؟ کیا میں پرانے زمانے کی کسی زرخرید لونڈی کی طرح آپ سب کی آنکھوں کے سامنے ایک بے رحم مرد کے حوالے کر دی جاؤں گی؟

اس رات میں نے پھر اپنا ٹرنک نما صندوق کھولا جو میرے لیے عمرو عیار کی زنبیل کی حیثیت رکھتا تھا اور جس میں میرے کام کی بہت سی چیزیں پوشیدہ تھیں۔ میں نے اپنا وہی سیاہ ڈھاٹے والا کاسٹیوم پہنا۔ جیکٹ کو الٹ کر زیب تن کیا اور اس کی جیب میں اعشاریہ 38 کا پستول رکھ کر نکل کھڑا ہوا۔ اس کے علاوہ میں نے پانچ ملی کی ایک سرنج بھی اپنی جیب میں رکھ لی۔ آج میں پھر مولوی فدا کے گھر جا رہا تھا۔ پچھلی مرتبہ تو مولوی صاحب کے گھر میں داخل ہونے سے پہلے ہی ان سے ملاقات ہوگئی تھی۔ (تب مولوی صاحب اور ان کا شاگرد طارق صدقے کی بکری اور گھی وغیرہ لے کر بیمار وکرم کے ہاں جا رہے تھے اور میں بھی ان کا تعاقب کرتا ہوا وکرم کے گھر جا پہنچا تھا) مگر اب یہی لگ رہا تھا کہ مجھے مولوی صاحب کو میزبان بنانے کا شرف حاصل ہو جائے گا۔ یہ بات مجھے آج شام ہی معلوم ہوگئی تھی کہ مولوی صاحب کی بچی زینب ایک دن کے لیے ان کے پاس آئی ہوئی ہے۔ میں اصل میں تو اس بچی سے ہی ملنا چاہتا تھا۔

میں ایک ایسی چادر میں لپٹا ہوا تھا جو میرے گھٹنوں سے نیچے تک جاتی تھی۔ میرا ڈھاٹا، جیکٹ اور پتلون سب کچھ اس چادر نے ڈھانپ رکھا تھا۔ یہ رات کے قریباً گیارہ بجے کا وقت تھا۔ گاؤں کے اکثر گھروں کی چار دیواریاں زیادہ اونچی نہیں تھیں۔ مولوی فدا کے گھر کی باؤنڈری بھی پانچ فٹ کے قریب تھی اور کچی مٹی کی بنی ہوئی تھی۔ میں بہ آسانی اسے پھلانگ کر اندر داخل ہوگیا۔ گھر کا سروے میں پہلے ہی کرچکا تھا۔ گاؤں کے اکثر گھروں کی طرح مولوی فدا کے گھر کی چھت میں بھی ایک بڑا سوراخ موجود تھا۔ ایسے سوراخ عام طور پر لکڑی یا ٹین وغیرہ کے ڈھکن سے ڈھانپ دیئے جاتے ہیں۔ ایسے سوراخوں کو ''مگ'' کہا جاتا ہے۔ یہ عام طور پر روشنی کے لیے رکھے جاتے ہیں یا پھر جب چھتوں پر اناج وغیرہ سکھایا جاتا ہے تو ان سوراخوں کے ذریعے کمرے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ یہ بڑی سادگی والی بات تھی کہ گھروں میں ناجائز طور پر گھسنے کے لیے خود ہی ایک راستہ فراہم کر دیا جاتا تھا۔ بہرحال آج رات یہ

راستہ میرے کام آ رہا تھا۔ میں کچھ سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر پہنچا۔ مگ پر لوہے کی چادر کا ڈھکن تھا اور اوپر تین چار اینٹیں وزن کے لیے رکھی ہوئی تھیں۔ میں نے آواز پیدا کیے بغیر ڈھکن ہٹایا اور مگ یعنی سوراخ کے کنارے سے لٹک کر ایک تاریک کمرے میں کود گیا۔ یہاں دائیں بائیں دو کمرے اور موجود تھے۔ ایک کمرے میں لالٹین کی بہت مدھم روشنی تھی۔ یہاں مولوی فدا کی نوجوان بیوی لحاف اوڑھے سو رہی تھی۔ بچی زینب بھی اس کے ساتھ ہی لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے دبلے پتلے چہرے سے میں نے اسے فوراً پہچان لیا۔ لحاف اس کے جسم سے سرکا ہوا تھا۔ وہ ان لڑکیوں میں سے تھی جن میں عمر سے کچھ پہلے ہی بلوغت کے آثار نمودار ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ ان دونوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر میں بائیں طرف والے کمرے میں پہنچا جہاں مولوی فدا ایک پلنگ پر محو استراحت تھے۔ میں نے درمیانی دروازہ بند کر دیا۔ دروازہ بند کرنے سے ہلکا سا کھٹکا ہوا۔ مولوی صاحب کسمسائے پھر انہوں نے گھبرا کر کہا۔

''کون ہے؟''

میں نے لپک کر ان کا منہ اپنے ہاتھ سے ڈھانپ لیا۔ ان کے توانا جسم میں کافی زور تھا مگر میری گرفت ایسی تھی کہ وہ جنبش بھی نہ کر پائے۔ انہوں نے مدھم روشنی میں میرا سراپا دیکھ لیا تھا اور یقیناً پہچان بھی لیا تھا کہ رام پیاری اور وکرم کے گھر میں، میں ان سے شرف ملاقات حاصل کر چکا ہوں۔ میں نے بڑی دھیمی لیکن ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔ ''مولوی جی! میں یہاں دشمن نہیں دوست بن کر آیا ہوں۔ آپ نے رام پیاری کے گھر میں مجھے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا تھا میں نے اس پر یقین کیا ہے اور اب...... اسی سلسلے میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔''

مولوی فدا کا خوف جتنی تیزی سے بڑھا تھا اتنی ہی سرعت سے کم بھی ہو گیا۔ میں نے ان کے منہ سے ہاتھ ہٹا لیا۔ وہ ہانپتے ہوئے میری طرف دیکھنے لگے۔

''تت...... تم یہاں بھی پہنچ گئے ہو۔ آخر کیا چاہتے ہو تم؟''

''وہی جو کچھ آپ چاہتے ہیں۔ موجودہ مصیبت سے آپ کا چھٹکارا۔ تاکہ آپ پھر اطمینان و سکون کی زندگی کی طرف آ سکیں اور آپ کو اپنے ضمیر کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑے۔''

''لیکن پہلے پتا تو چلے تم ہو کون۔ اگر تم راہِ راست پر ہو تو پھر اپنا آپ چھپا کیوں رہے ہو؟''

''میں نے پہلے بھی کہا تھا آپ کو آم کھانے سے مطلب ہونا چاہیے پیڑ گننے سے

نہیں۔''

''تم کہتے ہو کہ دوست اور ہمدرد کی حیثیت سے آئے ہو، لیکن تم نے وہاں طارق کے ساتھ کیا کیا۔ پہلے اسے زخمی کیا پھر اس کے گھر میں گھسے اور اسے ڈرا دھمکا کر اس سے اقبالی بیان دلوا دیا۔ اب وہ جیل میں ہے۔''

''اس کی بات چھوڑیں۔ اگر وہ جیل پہنچا ہے تو اپنی غلطی سے۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ سب کچھ سچ بتائے گا تو میں ہر طرح اس کی مدد کروں گا اور ہو سکتا ہے کہ اسے صاف ہی بچا لوں لیکن اس نے حماقت کی۔ بھاگ کھڑا ہوا اور پولیس کے ہتھے چڑھ گیا۔ چلو اچھا ہے۔ اس نے جو جرم کیا اس کی سزا اُسے مل جائے گی۔ ہو سکتا ہے کہ دو ڈھائی سال بعد جیل سے باہر آ جائے۔ آپ خود ہی تو اپنے خطبوں میں کہتے ہیں کہ آخرت کی سزا بہت سخت ہو گی۔ اس لیے دنیا میں ہی حساب صاف کرا لیا جائے تو بہتر ہے۔''

''اس نے جو کچھ کیا، وہ اپنے طور پر کیا۔ اس میں میرا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ میرے علم میں ہوتا تو...... اسے کبھی ایسا نہ کرنے دیتا۔''

''آپ اپنی صفائی پیش کر کے مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔ میں بڑی اچھی طرح جان گیا ہوں آپ زیادتی کر نہیں رہے بلکہ زیادتی سہہ رہے ہیں۔ آپ کی بچی کی جو صورتِ حال ہے وہ مجھے طارق سے معلوم ہو گئی ہے اور یہ سب کچھ واقعی تکلیف دہ ہے، بہت زیادہ تکلیف دہ۔''

مولوی فدا کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ پستول میرے ہاتھ میں تھا، وہ میں نے لاک کر کے جیکٹ کے اندر رکھ لیا اور مولوی جی کے دونوں ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔ اللہ نے چاہا تو آپ اس شکنجے سے نکلیں گے جس میں عالمگیر اور پیر ولایت جیسے لوگ آپ کو کس رہے ہیں۔''

''میں طارق کے بارے میں بڑا فکر مند ہوں۔ اگر نمبردارنی کو کچھ ہو گیا تو وہ تو پھانسی لگ جائے گا۔''

''آپ کے لیے ایک اچھی خبر ہے کہ نمبردارنی کو ہوش آ گیا ہے اور اب وہ خطرے سے باہر ہے۔''

''اللہ تیرا شکر ہے۔'' مولوی جی نے اوپر دیکھتے ہوئے کہا اور پھر آنکھوں کی نمی پونچھی۔ ان کی آنکھیں دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ سونے سے پہلے دیر تک روتے رہے ہیں۔ میں جوں جوں ان کو جان رہا تھا ان کے بارے میں میری رائے تبدیل ہو رہی تھی۔ مجھے اپنے ان سابقہ خیالات پر افسوس ہو رہا تھا جو میرے ذہن میں مولوی صاحب کے حوالے سے موجود

رہے تھے اور تاجور وغیرہ کے ذہن میں اب بھی موجود تھے۔

مولوی صاحب نے مجھ سے پوچھا۔ "طارق نے تمہیں میری بچی کے بارے میں کیا بتایا ہے؟"

"وہ سب کچھ جو میرے لیے جاننا ضروری ہے لیکن آپ اس بارے میں بالکل بے فکر رہیں۔ میں نے طارق سے وعدہ کیا تھا اور اب آپ سے بھی کرتا ہوں کہ آپ کی بچی کا معاملہ اس وقت تک راز میں رہے گا جب تک آپ نہ چاہیں گے۔"

اس کمرے میں لالٹین کی دھیمی روشنی میں میرے اور مولوی فدا کے درمیان قریباً آدھ گھنٹے تک سرگوشیوں میں بات ہوئی۔ ہمارے درمیان ایک بالکل دوستانہ ماحول بن گیا۔ مجھے لگا کہ میری شناخت کے بارے میں بے حد تجسس کا شکار ہونے کے باوجود وہ مجھ پر بھروسا کر رہے ہیں۔ گاؤں کے دیگر لوگوں کی طرح مولوی صاحب کا خیال بھی شاید یہی تھا کہ میں پولیس، رینجرز یا آرمی کا کوئی بندہ ہوں اور بھیس بدل کر گاہے بگاہے چاندگڑھی میں وارد ہو رہا ہوں۔

میری درخواست پر مولوی جی بچی زینب کو جگا کر میرے سامنے لانے پر رضامند ہو گئے۔ انہوں نے دوسرے کمرے میں جا کر پہلے اپنی بیوی کو اور پھر بچی کو جگایا۔ پانچ دس منٹ انہیں سمجھانے اور تسلی دینے میں لگائے۔ بہرحال اس دوران میں، میں کسی غیر متوقع صورتِ حال کے لیے بھی تیار رہا۔ کچھ دیر بعد مولوی جی بچی کو لے کر میرے پاس آ گئے۔ وہ ڈری سہمی تھی۔ اس نے دوپٹا بڑی مضبوطی سے اپنے چہرے کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ وہ خاص طور سے اس بات پر پریشان تھی کہ میں نے ڈھاٹا باندھ رکھا تھا اور میرا چہرہ اسے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مولوی فدا نے بچی کا خوف کم کرنے کے لیے کہا۔ "زینب! سمجھو یہ تمہارے چاچا ہیں۔ بہت اچھے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ تمہاری بیماری بالکل دور ہو جائے گی۔ ایک دم چنگی بھلی ہو جاؤ گی تم۔ شہر میں کوئی بہت بڑے ڈاکٹر ان کے جاننے والے ہیں......"

زینب کی سہمی سہمی نگاہیں بدستور میری آنکھوں میں جھانک رہی تھیں۔ مولوی صاحب نے بچی کی کیفیت بھانپتے ہوئے کہا۔ "زینب! اصل میں یہاں گاؤں میں ان کی دو چار لوگوں سے دشمنی ہے، ان سے بچنے کے لیے ہی انہوں نے اپنا چہرہ چھپایا ہوا ہے۔ ان سے ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔"

میں نے زینب سے اس کی طبیعت کے بارے میں پوچھا۔ وہ بولی۔ "اب میں بالکل ٹھیک ہوں چاچا جی۔"

''لیکن اگر تمہیں دو چار دن یہاں اپنے اباجی کے گھر میں رہنا پڑے گا تو تمہاری طبیعت پھر خراب ہو جائے گی۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟''

''مجھے نہیں پتا جی۔''

''تم کیا محسوس کرتی ہو۔ کیا اداس ہو جاتی ہو...... یا یہاں تمہیں کسی طرح کا ڈر لگنے لگتا ہے یا پھر کسی چیز کی کمی محسوس ہونے لگتی ہے؟''

''مجھے نہیں پتا۔ بس میری طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔ دم گھٹتا ہے۔'' اس نے ذرا خشک لہجے میں کہا۔

یوں لگتا تھا کہ بیماری کا ذکر اسے پریشان کر رہا ہے۔ میں نے نوٹ کیا کہ وہ ذرا کھینچ کر سانس لینے لگی ہے۔

میں نے موضوع بدل دیا اور پھر باتوں کے ذریعے اسے آمادہ کر لیا کہ وہ سرنج کے ذریعے مجھے اپنے خون کا نمونہ لینے دے، کچھ ہچکچاہٹ کے ساتھ اس نے بازو پر سے آستین اٹھائی اور میں نے نس میں سے اس کا بلڈ سیمپل لے لیا۔ میں نے بچی کے سر پر پیار دیا اور وہ رخصت ہو کر اپنی ماں کے پاس دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ مولوی جی کو کچھ ضروری ہدایات دے کر میں ان کے گھر سے واپس آ گیا۔ میرے اور مولوی جی کے درمیان یہ بھی طے ہوا کہ ہمارے رابطے کا علم کسی تیسرے فرد کو نہیں ہو گا۔ اس کے علاوہ مجھے جب بھی ضرورت پڑی میں اسی حلیے میں مولوی صاحب کے گھر آؤں گا اور وہ مجھ سے بات کریں گے۔

اگلے روز صبح سویرے میں نے انیق کو دین محمد صاحب سے چار دن کی چھٹی لے دی۔ یہ چھٹی قریبی عزیزہ کی فوتگی کے بہانے سے لی گئی تھی۔ انیق چاند گڑھی کے اس دور دراز دیہہ سے ڈسکہ اور ڈسکہ سے لاہور کی طرف روانہ ہو گیا۔ انیق کے پاس زینب کے خون کا نمونہ موجود تھا۔

O......❖......O

انیق کو واپس آنے میں پانچ دن لگے۔ ان پانچ دنوں میں چاند گڑھی کے حالات کافی دگرگوں رہے جس بندے کو سیالکوٹی کا ساتھی ہونے کے شک میں پکڑا گیا تھا، وہ جانبر نہ ہو سکا۔ تحصیل اسپتال میں اس کی موت واقع ہو گئی۔ یہ عالمگیر وغیرہ کے لیے بڑا نقصان تھا۔ وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ اس بندے کے ذریعے وہ سیالکوٹی کے موجودہ ٹھکانے تک رسائی حاصل کر سکیں گے۔

دوسری طرف تاجور کے حوالے سے بھی گاؤں میں ہلچل کی کیفیت تھی۔ آٹھ نو دن باقی

رہ گئے تھے اور اس دوران میں پنچایت کے فیصلے پر عمل درآمد ہونا ضروری تھا۔ اس وقت صورتِ حال مزید سنگین ہوگئی جب پتا چلا کہ دین محمد اور اس کے گھر والے خاموشی سے گاؤں چھوڑنے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ اب پتا نہیں کہ یہ افواہ تھی یا اس میں کچھ سچائی بھی تھی، بہرحال گاؤں کے سرپنچ غلام قادر نے فوراً حکم صادر کیا اور دین محمد کے گھر کے قریب پہرا بٹھا دیا گیا۔ اڑوس پڑوس والوں کو بھی تاکید کردی گئی کہ وہ گھر والوں کی نقل وحرکت پر نظر رکھیں۔ یہ صورتِ حال کسی طور پر قابلِ قبول نہیں تھی۔

میں کوئی بھی براہِ راست قدم اٹھا سکتا تھا اور میں خود کو اس قابل سمجھتا تھا کہ تاجور کو اس سنگین ترین صورتِ حال سے بچا سکوں۔ میرے اندر محبت کی طاقت تھی۔ اور یہ طاقت کسی پہاڑی دریا کی طرح ہر رکاوٹ کو بہا لے جانے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ میں ایسے بہت سے مرحلوں سے گزر چکا تھا۔ کوپن ہیگن لندن اور روم جیسے شہروں میں، میں نے بہت سی قیامتیں اپنے سینے پر جھیلی تھیں۔ یہ میری زندگی کا وہ تہلکہ خیز باب تھا، جس کے کم سے کم ورق پلٹنے کی میں خواہش رکھتا تھا۔

انیق نے چاندگڑھی واپس آنے کے بعد جو کچھ بتایا اس نے صورتِ حال کو ایک بالکل نیا رخ دے دیا۔ انیق لاہور کے بعد اسلام آباد پہنچا تھا۔ وہاں کے ایک ماہر فزیشن کے مشورے سے اس نے ایک بہترین لیبارٹری میں زینب کے خون کے ٹیسٹ کرائے تھے۔ یوں تو اس سے پہلے دین محمد نے بھی لاہور میں زینب کا خون وغیرہ ٹیسٹ کرایا تھا مگر وہ ابتدائی نوعیت کے ٹیسٹ تھے۔ انیق نے اسلام آباد میں خون کا جو تجزیہ کروایا اس نے ایک حیرت انگیز انکشاف کیا۔ زینب کے خون میں دو تین غیر معمولی تبدیلیاں پائی گئیں۔ ان میں سے ایک اہم تبدیلی خون میں ہیڈی ٹاکسن نامی کیمیکل کا پایا جانا بھی تھا۔ یہ ہیڈی ٹاکسن سانپ کے زہر میں بکثرت پایا جاتا ہے۔ یہ کوبرا سانپ کے زہر کا بھی ایک اہم جزو ہوتا ہے۔ خون کے خصوصی معائنے سے اس عنصر کی موجودگی سامنے آئی تھی۔

انیق کی فراہم کردہ رپورٹ پڑھنے کے بعد میرے ذہن میں شعلہ سا لپک گیا۔ مجھے چھ سات دن پہلے کا وہ واقعہ یاد آ گیا جب ملک عالمگیر کے کارندے ایک مشکوک بندے کو مارتے پیٹتے حویلی لے جا رہے تھے۔ اسے سانپ نے ڈسا ہوا تھا۔ بعدازاں ایک شخص کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ پیرولایت نے کچھ سانپ بھی پال رکھے ہیں اور ان میں سے کچھ خاص قسم کے سانپ گاؤں کا ''پہرا'' دیتے ہیں۔

تو کیا زینب کی اس رپورٹ اور پیرولایت کے پالتو سانپوں میں کچھ تعلق تھا؟

انیق بغور میرا چہرہ دیکھ رہا تھا، بولا۔ ''میں نے لاہور میں ایک کیمسٹ اور ایک سنیاسی سے بھی اس بارے میں تھوڑی سی بات کی ہے۔ ان لوگون کی گفتگو سے پتا چلتا ہے کہ بعض لوگ سانپوں کے زہر کو نشے کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔ کچھ لوگوں کے بارے میں تو یہ کہا جاتا ہے کہ وہ براہِ راست خود کو سانپوں سے ڈسواتے ہیں لیکن یہ بات تو طے شدہ ہے کہ سانپ کے زہر کو نشہ آور ادویات اور نسخوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔''

''تو کیا عالمگیر کے گھر میں اس بچی کے ساتھ بھی یہی کچھ ہو رہا ہے؟''

''یہ بالکل ممکن ہے جی۔ آپ نے فلم ناگ منی دیکھی تھی؟''

''یار! یہ سنجیدہ بات ہے۔ خوامخواہ پٹڑی نہ بدلا کرو۔'' میں نے خشک لہجے میں کہا۔

''سوری سر۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''دراصل میرا دھیان بار بار عالمگیر اور پیر ولایت کے گٹھ جوڑ کی طرف جا رہا ہے۔ عین ممکن ہے کہ پیر ولایت نے ہی عالمگیر کو کوئی ایسی چیز دی ہو جو زینب کو اندر ہی اندر تباہ کر رہی ہو۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر زینب کو کوئی ایسی چیز کھلائی جا رہی ہے تو وہ بتاتی کیوں نہیں؟ کیا وہ خود بھی اس کھیل میں شریک ہو چکی ہے؟''

''نہیں۔ میرا خیال کچھ اور ہے انیق...... بہت ممکن ہے کہ یہ سب کچھ اس کی لاعلمی میں ہو رہا ہو۔ اسے کھانے میں ملا کر چپکے سے کچھ دے دیا جاتا ہو...... یقیناً ایسا ہی ہے۔'' میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ کڑیاں آپس میں مل رہی تھیں۔ معما حل ہو رہا تھا۔

زینب بے خبری میں کسی خطرناک نشے کی عادی ہو رہی تھی۔ وہ عالمگیر کے گھر میں ہوتی تھی تو خوب چوکس اور ہشاش بشاش نظر آتی تھی لیکن جب عالمگیر کے گھر میں نہیں ہوتی تھی تو نشے کی ڈوز سے محروم ہو جاتی تھی۔ اسے کچھ پتا نہیں چلتا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ اس کے اعصاب جواب دینے لگتے تھے۔ لگتا تھا کہ وہ کسی آسیب کا شکار ہو گئی ہے۔ دو تین دن کے اندر اس کی حالت پتلی ہو جاتی تھی۔

انیق نے پریشان لہجے میں کہا۔ ''یہ عالمگیر کوئی اچھا بندہ تو نہیں۔ اس نے بچی کو جس طرح نشے کا غلام بنا رکھا ہے وہ اس کے ساتھ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اب نہیں تو ایک ڈیڑھ سال بعد وہ ایک نوخیز لڑکی کا روپ دھار لے گی۔''

''سب کچھ ہو سکتا ہے...... اور اب جو کچھ ہو رہا ہے وہ بھی کچھ کم سنگین نہیں ہے۔ اس بچی کے ذریعے مولوی صاحب کو بلیک میل کیا جا رہا ہے اور یہ بلیک میلنگ اتنی کارگر ہے کہ مولوی صاحب جیسا بے باک اور سچا آدمی بھی تاجور کے حوالے سے پیر ولایت کی زبان بولنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ اس گاؤں میں مولوی صاحب کی رائے کی بڑی اہمیت ہے اور اب

وہ بھی گاؤں پر نحوست کی بات کر رہے ہیں۔ دو بدصورت عورتوں کے گشت کی تصدیق کر رہے ہیں۔"

وقت بہت کم تھا۔ ہمیں جلد از جلد کچھ کرنا تھا۔ ورنہ چاند گڑھی والوں کی اکثریت تو اس بات پر تلی ہوئی تھی کہ روتی چلاتی تاجور کو بھی باندھ کر اسحاق کے حوالے کر دیا جاتا۔

اس شب میری اور مولوی فدا کی ملاقات پھر ہوئی۔ میری جیب میں اس وقت بیس ہزار کی رقم بھی تھی۔ میں حسبِ سابق اپنے ڈھاٹے والے لباس میں تھا۔ میری دستک پر مولوی فدا نے میری آواز پہچانی اور دروازہ کھول دیا۔ ہم اندرونی کمرے میں آن بیٹھے۔ میرا ڈھاٹے میں پوشیدہ چہرہ مولوی صاحب کو الجھن میں مبتلا کرتا تھا۔ اس کے باوجود وہ بڑی حد تک مجھ پر بھروسا کرنے لگے تھے۔

میں نے کہا۔ "مولوی جی! میرے پاس وقت کم ہے۔ مجھے ایک بات صاف صاف بتائیں۔ اگر زینب ٹھیک ہو جاتی ہے اور آپ کی یہ مجبوری ختم ہو جاتی ہے کہ آپ اسے ملک عالمگیر کے گھر رہنے کے لیے بھیجیں، تو پھر آپ کا رویہ کیا ہوگا؟"

"مم...... میں سمجھا نہیں۔"

"مولوی جی! چاند گڑھی میں آپ کی رائے کی بڑی قدر ہے۔ یہ آپ کی بدلی ہوئی رائے ہی ہے جس کے بعد گاؤں کی اکثریت دین محمد کے بجائے اسحاق اور عالمگیر وغیرہ کا ساتھ دینے لگی ہے اور آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ آپ کی یہ نئی رائے غلط ہے اور اس کی وجہ آپ کی مجبوری ہے۔"

"تم...... کیا کہنا چاہتے ہو بھائی؟"

"اگر زینب والی مجبوری بالکل ختم ہو جائے اور یہ بھی ثابت ہو جائے کہ آپ کو گھیرنے کے لیے زینب کی بیماری کو استعمال کیا جا رہا تھا تو آپ اپنی پہلے والی رائے پر واپس آ جائیں گے۔ یعنی...... لڑکی کی مرضی اور رضامندی کے بغیر اس کا نکاح نہیں ہو سکتا؟"

مولوی صاحب کے چہرے پر کرب بڑھ گیا۔ انہوں نے سر جھکایا اور اپنا ماتھا پکڑ لیا۔

میں نے کہا۔ "یہ بڑا نازک معاملہ ہے مولوی جی۔ آپ کی رائے کی وجہ سے بے قصور لڑکی کی زندگی تباہ ہو رہی ہے۔ یہ ایک بہت بڑا بوجھ ہوگا آپ پر۔"

وہ نمناک لہجے میں بولے۔ "میں سمجھتا ہوں...... سب سمجھتا ہوں۔ مجھے زینب کے لیے کوئی اور چارہ نظر نہیں آتا۔ تم نے اس کی حالت نہیں دیکھی ہے۔ تمہیں کیا پتا ہم پر کیا گزرتی ہے۔"

''میں نے اس کی حالت دیکھی ہے اور یہ بھی دیکھ رہا ہوں پورے یقین کے ساتھ کہ وہ اب ٹھیک ہونے جا رہی ہے۔ شہر سے خون کی رپورٹس آگئی ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ ان رپورٹس نے عالمگیر کا سارا بھانڈا پھوڑ دیا ہے...... شاید آپ کو یہ بات ''بے وقت'' لگے لیکن میں اعتماد کے ساتھ آپ کو آپ کی بچی کی صحت کی پیشگی مبارکباد دے سکتا ہوں۔''

مولوی جی نے اپنا سر اٹھایا اور نم آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگے۔

اگلے آدھ گھنٹے میں ہم دونوں کے درمیان جو گفتگو ہوئی وہ بے حد نتیجہ خیز تھی۔ مولوی جی ششدر تھے۔ اس گفتگو کے آخر میں، میں نے بے حد اصرار کے ساتھ بیس ہزار روپیہ مولوی جی کی جیب میں ڈال دیا تھا اور کہا کہ وہ کل ہی زینب کو لے کر اسلام آباد روانہ ہو جائیں۔ میں نے انہیں ایک نہایت قابل ڈاکٹر کا ایڈریس بھی دیا۔ یہ ایڈریس میں نے آج ہی بذریعہ فون اپنے بہی خواہ داؤد بھاؤ سے حاصل کیا تھا۔ (داؤد بھاؤ اس بات پر بہت خوش تھا کہ میں ابھی تک پاکستان میں ہوں۔ میرے نزدیک داؤد بھاؤ ایک بالکل صاف ہاتھوں والا بدمعاش تھا اور اس کے یہ ''صاف ہاتھ'' بہت لمبے بھی تھے۔ اس نے مولوی جی کے سلسلے میں مجھ سے ہر طرح کے تعاون کا وعدہ بھی کیا تھا۔ انیق کی صورت میں مجھے جو زبردست معاون ملا ہوا تھا وہ بھی بھاؤ کی دین تھا)

میں نے کہا۔ ''مولوی جی! یہ عالمگیر اور اسحاق کی سوچی سمجھی سازش ہے۔ شاید وہ پہلے سے جانتے تھے کہ اس طرح کے حالات پیدا ہونے والے ہیں۔ انہوں نے پچھلے سال ڈیڑھ سال میں زینب کو بتدریج نشے کی طرف راغب کیا اور اس کی بے خبری میں ایک نہایت خطرناک نشہ اس کے اندر اتارتے رہے ہیں۔ میں آپ کو مشورہ دیتا ہوں آپ بے خوف و خطر ان کی اس سازش کا بھانڈا پھوڑ دیں۔ چاند گڑھی والوں کو بتا دیں کہ بچی کی اصل بیماری اور بیماری کی جڑ کیا ہے۔''

مولوی جی نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور بولے۔ ''اگر تم ٹھیک بھی کہہ رہے ہو تو جھیل میں رہ کر مگر مچھ سے بیر کیسے کیا جا سکتا ہے؟''

میں نے بڑے اطمینان سے مولوی صاحب کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ اس بارے میں ایک فیصد شک بھی نہ کریں کہ زینب ٹھیک نہیں ہو گی۔ ان شاء اللہ آپ چند روز یا دو تین ہفتوں میں اسے پہلے کی طرح ہنستا مسکراتا دیکھیں گے۔ باقی رہی مگر مچھ والی بات، تو یہ سمجھیں کہ اس جھیل کا مگر مچھ اب کوئی اور نہیں میں ہوں۔ میں دیکھ لوں گا ان سب کو۔ کوئی آپ کا بال بھی بیکا کرے تو میں ذمے دار ہوں۔ آپ مجھ پر پورا بھروسا

کریں اور دل بڑا کر کے حق بات کہہ دیں۔“

لیکن یہ ساری تو بعد کی باتیں ہیں۔ پہلے یہ پتا تو چلے کہ زینب کے ساتھ کیا معاملہ ہے اور یہ کب ٹھیک ہوگی اور کس طرح؟“

مولوی فدا کے ذہن سے اب بھی یہ بات پوری طرح نکل نہیں رہی تھی کہ زینب پر آسیب وغیرہ ہے۔ اس معاملے میں ہمارے درمیان تفصیلی گفتگو ہوئی۔ میں نے مولوی فدا کو رپورٹس دکھائیں اور ان کا مطلب سمجھایا۔ اس نشے کے بارے میں بتایا جو سانپوں کے زہر سے کشید کیا گیا تھا۔ میری یہ بات مولوی صاحب کے دل کو لگی۔ ان کے تاثرات کچھ بدلے بدلے نظر آنے لگے۔ انہوں نے بتایا۔ ”پچھلے سال یہ بات مشہور ہوئی تھی کہ ملک عالمگیر نے اپنے کچھ سانپ پیر ولایت کو دیئے ہیں اور پیر ولایت ان کے زہر سے سانپ کے کاٹے کی دوا بنا رہا ہے۔ کوئی کشمیری جوگی بھی اس کام میں شامل تھا۔“

”ایسے لوگ دوا کہاں بناتے ہیں مولوی جی، ایسے لوگ تو بیماری ہی بناتے ہیں۔ یہ بندہ عالمگیر آپ کی بچی کی زندگی تباہ کرنے پر تلا ہوا تھا لیکن اب ایسا نہیں ہوگا ان شاء اللہ۔“

مولوی جی آہستہ آہستہ بات کی تہ تک پہنچ رہے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے اندر یہ احساس بھی شدت پکڑ رہا تھا کہ ان کی وجہ سے تاجور کی زندگی تباہ ہونے جا رہی ہے لیکن وہ فوری طور پر کوئی فیصلہ کرنے کے قابل بھی نہیں تھے۔ آخر انہوں نے اس کا ایک درمیانی راستہ نکالا۔ انہوں نے کہا۔ ”سرپنچ غلام قادر میری بہت عزت کرتا ہے۔ میں اس سے ملتا ہوں اور اسے اعتماد میں لیتا ہوں۔“

”کیا کہیں گے آپ؟“

انہوں نے سر پر ٹوپی درست کی اور بولے۔ ”میں اسے یہ ساری بات بتاتا ہوں لیکن پابند کرتا ہوں کہ وہ ابھی یہ سب کچھ اپنے تک ہی رکھے گا۔“

”اس سے دین محمد اور تاجور کو کیا فائدہ ہوگا؟“

”میں زینب کے علاج کے لیے شہر جاؤں گا تو غلام قادر کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ سرپنچ ہی نہ ہوگا تو پنچایت کے فیصلے پر عمل کرانا مشکل ہو جائے گا۔ اس لیے غلام قادر خود ہی اعلان کر دے گا کہ دین محمد کو ایک دو ہفتوں کی مہلت اور دے دیتے ہیں۔ دو ہفتوں کی مہلت دین محمد نے کل خود بھی مانگی ہے۔ اس کے قریبی عزیزوں میں کوئی فوت ہوا ہے۔“

”اس کے بعد کیا ہوگا؟“ میں نے پوچھا۔

مجھے مولوی فدا کی آنکھوں میں ایک عزم نظر آیا۔ انہوں نے گہری سانس لے کر کہا۔

''میں نے زندگی میں پہلی بار اپنی بچی کی خاطر جھوٹ بولا ہے، اگر میری بچی والی مجبوری ختم ہو جاتی ہے تو میں کفارہ ادا کروں گا۔ گاؤں والوں کے سامنے ہر بات کھول دوں گا۔ چاہے نتیجہ کچھ بھی نکلے۔'' ان کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔

مولوی فدا کی شخصیت مجھے متاثر کر رہی تھی۔ انہوں نے کئی سال تک اپنی بیمار بیوی کی دیکھ بھال اور دل جوئی کی جو تھوڑی بہت آمدنی تھی وہ اس پر لگاتے رہے آخر وہ اس دنیا میں نہ رہی۔ اب وہ زندگی کو ایک نئے رخ سے دیکھنے کے خواہش مند تھے۔ انہوں نے بیاہ کیا تھا۔ اپنے گھر کی حالت درست کی تھی اور اب مدرسے کی تعمیر کے لیے کوشش کر رہے تھے۔ بے شک اپنی بچی کی مجبوری نے انہیں ایک بہت بڑے امتحان سے دوچار کر دیا تھا لیکن اب جب انہیں امید کی کرن نظر آئی تھی، وہ کفارے کی بات کرنے لگے تھے اور مجھے یقین تھا کہ وہ ایسا کریں گے بھی۔ وہ ببانگ دہل اپنی غلطی کا اعتراف کریں گے اور سچ بات کہہ دیں گے۔

انہوں نے اپنی بات پھر دہرائی۔ ہاں میرے بھائی! اگر زینب کی زندگی کو خطرہ نہیں رہتا تو میں گاؤں والوں کے سامنے ہر بات کھول دوں گا۔ چاہے پھر مجھے یہ مسجد، یہ گاؤں ہی چھوڑنا پڑے۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔ اولاد کی محبت سے مجبور ہو کر میں نے کچھ ایسی باتیں کہیں جو مجھ جیسے شخص کو ہرگز نہیں کہنا چاہیے تھیں۔ زینب ٹھیک ہو جائے۔ میں ہاتھ جوڑ کر سب سے معافی مانگوں گا اور چھوڑ جاؤں گا یہ گاؤں...... یہ علاقہ۔''

میں نے پھر ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ ''آپ کو کچھ چھوڑنا نہیں پڑے گا۔ یہ میرا وعدہ ہے آپ سے۔''

ساتھ والے کمرے سے ان کی بیوی کے چلنے پھرنے کی مدھم آوازیں آ رہی تھیں۔ پھر اس نے پردے کے پیچھے سے پوچھا۔ ''مولوی صاحب! چائے بنالوں؟''

مولوی جی کے بجائے میں نے جواب دیا۔ ''نہیں میری بہن، میں چائے نہیں پیوں گا۔ بس اب اٹھ رہا ہوں، مجھے جلدی ہے۔''

مولوی جی کی سوالیہ نظریں ایک بار پھر میرے چہرے کی طرف اٹھنے لگیں۔ یہ نظریں بڑی شدت سے جاننا چاہ رہی تھیں کہ میں کون ہوں۔

○......❖......○

شام کا وقت تھا۔ پرندے گھونسلوں میں واپس آ رہے تھے۔ درختوں میں ہر طرف چہکار سی تھی۔ میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی کھولی۔ آہنی سلاخوں میں سے مغرب کی طرف دیکھا۔ سردیوں کا سورج گنے کے اونچے کھیتوں کے پیچھے اوجھل ہو رہا تھا۔ مویشی اپنے لگے بندھے

راستوں پر چلتے گاؤں کی طرف آرہے تھے۔ سامنے والے جوہڑ میں بطخیں تیر رہی تھیں اور کناروں پر مرغیاں بھاگ دوڑ کررہی تھیں۔ تین چار لڑکیاں سروں پر پانی کے مٹکے رکھے عین کھڑکی کے سامنے سے گزریں۔ ان کی الھڑ ہنسی نے جیسے اس سارے منظر میں رنگ بھر دیئے۔

اچانک انیق کی آواز نے مجھے چونکایا۔ ''شاہ زیب بھائی!''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی ابھی اندر آیا تھا۔ اس کا چہرہ کچھ کہہ رہا تھا۔ ''کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے دروازہ بند کیا اور قدرے پریشان لہجے میں بولا۔ ''ابھی کچھ دیر پہلے تاجور بی بی سے بات ہوئی ہے۔''

''کب؟ کہاں؟''

''سرسوں والے کھیت میں۔ انہوں نے مجھ سے کچھ ساگ توڑنے کے لیے کہا تھا۔ میں ساگ توڑتا رہا، وہ میرے پاس کھڑی باتیں کرتی رہیں۔''

''کیا باتیں؟''

انیق نے بوجھل انداز میں کہا۔ ''وہ آپ سے ناراض لگتی ہیں۔ اس کے علاوہ کافی مایوس بھی ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ سات آٹھ دن بعد ان کی شادی ہے۔ اس لیے...... اب وہ نہیں چاہتیں کہ ہم دونوں یہاں گاؤں میں رہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہم دونوں نے ان کی مدد کرنے کی کوشش کی، اس کا شکریہ۔ لیکن اب وہ سمجھتی ہیں کہ بات بہت آگے نکل گئی ہے۔''

''پھر تم نے کیا کہا؟''

''میں نے کیا کہنا تھا۔ وہ کچھ سننے کے موڈ میں ہی نہیں تھیں۔ دوٹوک لہجے میں کہنے لگیں کہ ہم زیادہ سے زیادہ کل دوپہر تک یہاں سے چلے جائیں۔''

میں نے بان کی چارپائی پر نیم دراز ہو کر تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ ''اسے کہتے ہیں ٹھنڈے دودھ کو پھونکیں۔ اب سب کچھ ٹھیک ہونے جارہا ہے اور وہ دل چھوڑ بیٹھی ہے۔''

''تو آپ ان سے مل کر انہیں سمجھائیں۔''

''سمجھانے کی ضرورت ہی نہیں۔ سب کچھ خود ہی اس کے سامنے آجانا ہے۔ اس کی شادی ملتوی ہورہی ہے۔ میرے خیال میں کل تک پنچایت والے خود اس کا اعلان کردیں گے۔''

''یعنی پنچایت والوں کو ملک عالمگیر اور اسحاق کی سازش کا بتادیا جائے گا؟''

''ساری پنچایت کو نہیں، صرف سرپنچ غلام قادر کو۔ بلکہ ہوسکتا ہے کہ وہ زینب کے علاج کے لیے مولوی جی کے ساتھ ہی شہر جائے۔ اب یہ معاملہ بالکل صاف ہونے جا رہا ہے۔''

''میرا دل تو چاہ رہا تھا کہ تاجور بی بی کو تھوڑا بہت بتا دوں لیکن آپ سے پوچھنا بھی ضروری تھا۔''

''اب پوچھ لیا ہے نا۔ اب وہ جہاں نظر آئے، اسے سب سے پہلے پیشگی مبارک باد دو اور بتاؤ کہ وہ سب کچھ ہونے جا رہا ہے جو وہ چاہتی ہے اور اس کے گھر والے چاہتے ہیں اور یہ بھی کہو کہ مان نہ مان، ہم اس کے مہمان ہیں۔ ہم نے اب کہیں آنا جانا نہیں ہے۔ یہیں رہنا ہے اور ان سب کی ایسی تیسی فرمانی ہے جو اس سے پہلے اس کی ایسی تیسی کر رہے تھے۔''

اچانک انیق کی نظر کھڑکی سے باہر گئی۔ وہ چونک کر بولا۔ ''ارے وہ دیکھیں، وہ پھر آ رہی ہیں۔''

میں نے انیق کی نظر کا تعاقب کیا۔ ڈوبتے سورج کی سنہری کرنیں تاجور کی روشن پیشانی کو منور کر رہی تھیں۔ چال میں ساحلی ہوا کی سی روانی تھی اور ایک ایسا سنجیدگی آمیز وقار تھا جو دیکھنے والے کو مرعوب کرتا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی ملازمہ نوری بھی تھی۔ وہ دونوں تیز قدموں سے سرسوں کے کھیت کی طرف ہی جا رہی تھیں۔

انیق بولا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ ساگ کم پڑ گیا ہے۔''

''تو جاؤ، مدد کرو اس کی...... اور اگر موقع ملے تو بات بھی کر لو۔ پوری تسلی دو اسے۔''

انیق باہر نکل گیا۔ وہ دونوں اپنے کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر سنبھل سنبھل کر چلتی درختوں کے پیچھے اوجھل ہو گئیں۔ میں نے گاؤں کے ایک ہٹے کٹے لاٹھی بردار کو دیکھا۔ یہ شخص عالمگیر کے کارندوں میں سے تھا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ تاجور کے لیے ''نگراں'' کا کردار ادا کر رہا ہے۔

دھوپ کی آخری کرنیں درختوں کے پتوں سے اٹکھیلیاں کر رہی تھیں۔ گھروں کے اندر سے چولہوں کا دھواں اٹھنا شروع ہو گیا تھا۔ جوہڑ میں تیرتی بطخوں نے ایک ساتھ شور مچایا اور جیسے اعلان کیا کہ چاند گڑھی کا ایک اور سنہرا دن اختتام پذیر ہو رہا ہے۔

انیق کا اندازہ درست تھا۔ تاجور اور نوری مزید ساگ لینے ہی کھیت کی طرف گئی تھیں۔ وہ واپس لوٹیں تو نوری کے ہاتھوں میں ساگ کا گٹھا تھا۔ ان کی واپسی کے پانچ منٹ بعد ہی انیق بھی آ گیا۔ اس نے بتایا۔ ''لمبی بات کرنے کا موقع تو نہیں ملا جی، دو منٹ کے لیے نوری ذرا آگے گئی تو میں نے آپ کی بات ان تک پہنچائی۔''

''کیا کہا؟''

''یہی کہ اب بہت جلد سب اچھا ہونے جا رہا ہے۔ یہ پریشان ہونے کا نہیں بلکہ خوش ہونے کا اور شکرادا کرنے کا موقع ہے۔''

''اس نے کیا کہا؟''

''کچھ نہیں۔ بس حیرت سے میری طرف دیکھنے لگیں۔ تھوڑا تھوڑا غصہ بھی تھا۔ اتنے میں نوری واپس آ گئی۔

○......❖......○

اگلی صبح بڑی تہلکہ خیز تھی۔ مولوی فدا کی موت کی خبر سن کر ہم سب سکتے میں آ گئے۔ کانوں پر یقین ہی نہیں آیا۔ ابھی اندھیرا پوری طرح اوجھل نہیں ہوا تھا۔ ہمارے کمرے کا دروازہ بڑے زور سے کھٹکھٹایا گیا۔ انیق اٹھ کر باہر نکلا تو حق نواز نے رندھی ہوئی آواز میں بتایا۔ ''مولوی جی کا پتا چلا کیا ہوا ہے؟''

''کیا ہوا؟'' انیق نے لرز کر پوچھا۔

''وہ مسجد کی سیڑھیوں سے گر گئے۔ وہیں پر ختم ہو گئے۔''

ہم بھاگم بھاگ مسجد پہنچے۔ وہاں ایک بڑا مجمع اکٹھا ہو چکا تھا۔ مسجد کے صحن میں اور دروازے پر لوگ ہی لوگ نظر آ رہے تھے۔ کچھ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ کچھ ایک دوسرے کو دلاسا دے رہے تھے۔ قریباً ہر آنکھ میں حیرت تھی اور آنسو تھے۔

مولوی جی کی میت مسجد کے دروازے کے سامنے ہی ایک چارپائی پر رکھ دی گئی تھی۔ اوپر ایک چادر تھی جو جگہ جگہ سے خون آلود ہو چکی تھی۔ مولوی جی کا چہرہ خون سے لتھڑا ہوا تھا مگر چہرے پر کوئی چوٹ نہیں تھی۔ وہ جیسے سو رہے تھے۔ چہرے پر سکون تھا اور ویسا ہی اجالا تھا جیسا چاند گڑھی کے گلی کوچوں میں پھیل رہا تھا۔ یقین نہیں آیا کہ پرسوں رات یہی جیتا جاگتا، باہمت شخص مجھ سے گفتگو کر رہا تھا۔ اپنی بچی کو شہر لے جانے کے لیے پروگرام ترتیب دے رہا تھا اور...... ایک ایسے کفارے کی باتیں کر رہا تھا جو بے گناہ تاجور کی زندگی کو برباد ہونے سے بچا سکتا تھا۔

مسجد کے صحن میں اینٹوں کا فرش تھا۔ ایک طرف سے کچی سیڑھیاں چھت تک جاتی تھیں۔ بجلی نہ ہونے کی صورت میں مولوی جی فجر کی اذان مسجد کی چھت پر ہی دیتے تھے۔ وہ اذان دے کر نیچے آ رہے تھے جب سیڑھیوں سے گرے۔ صحن میں ایک جگہ اینٹوں سے ایک دائرہ سا بنایا گیا تھا۔ یہ دائرہ اس جگہ کی نشاندہی کر رہا تھا جہاں مولوی صاحب گرے تھے۔

یہاں پر خون موجود تھا جس پر راکھ وغیرہ ڈال دی گئی تھی۔

ہجوم میں مجھے اشک بار پہلوان حشمت بھی نظر آیا۔ انیق نے اس سے اس المناک واقعے کے بارے میں پوچھا تو حشمت نے کہا۔ ''لگتا تو یہی ہے کہ سیڑھیوں سے نیچے آتے ہوئے مولوی جی کا پاؤں اپنے تہ بند میں الجھا اور وہ گر گئے۔ بعد میں ایک نمازی مسجد میں آیا تو اس نے مولوی جی کو فرش پر پڑے دیکھا۔ وہ بالکل آخری سانس لے رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہو گئے۔''

مجمع میں سے کسی نے پوچھا۔ ''چار پانچ دن پہلے اذان دینے کے لیے لڑکا بھی تو رکھا گیا تھا؟''

''مگر فجر کی اذان مولوی جی ہمیشہ خود ہی دیوت ہیں، سب جانت ہیں۔'' پہلوان حشمت نے کہا پھر ایک دم پہلوان نے چونک کر کہا۔ ''وہ لڑکا کہاں ہے؟ ابھی تلک نظر ناہیں آیا۔''

''ہاں، میں نے بھی نہیں دیکھا۔'' ایک ادھیڑ عمر نمازی بولا۔

''وہ لڑکا عبدالرحیم کہاں ہے؟'' پہلوان حشمت نے بلند آواز سے پوچھا۔

کئی افراد ایک ساتھ بولنے لگے۔ لڑکا کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

میرے ذہن میں شکوک تو اسی وقت پیدا ہو گئے تھے جب میں نے مولوی جی کی ناگہانی موت کی اطلاع سنی تھی۔ اب یہ شکوک پختہ ہو رہے تھے۔ میں نے مولوی جی کے سر کا زخم دیکھا تھا اور کچی سیڑھیاں بھی دیکھی تھیں۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ یہ زخم پختہ فرش پر گرنے سے نہیں آیا یا یوں کہا جائے کہ یہ صرف پختہ صحن پر ہی گرنے کا زخم نہیں تھا۔ انہیں کسی چیز سے مزید ضرب بھی لگائی گئی تھی۔

یہ شک درست تھا تو پھر......؟ صرف دس بارہ گھنٹے پہلے مولوی صاحب نے عالمگیر کا کچھا چٹھا کھولنے کا عزم کیا...... اور اب وہ خاموشی اوڑھ کر منوں مٹی کے نیچے جانے والے تھے۔ میرے ذہن میں فوراً سرپنچ غلام قادر کا نام آیا۔ مولوی جی نے کہا تھا کہ غلام قادر ان کی بہت عزت کرتا ہے اور بھروسا مند آدمی ہے۔ وہ پہلے اس سے بات کرنا چاہتے تھے تو کیا وہ اس سے بات کر پائے تھے؟

کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ غلام قادر اندر سے وہ نہ ہو جو مولوی جی اسے سمجھتے ہوں۔ اس نے مولوی جی کی بات عالمگیر تک پہنچا دی ہو اور عالمگیر نے مولوی جی کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا ہو؟ کئی سوال میرے ذہن میں ہلچل مچانے لگے۔ ہر سوال بہت سنگین تھا۔ اس پورے

گاؤں میں میرے سوا شاید کسی کو معلوم نہیں تھا کہ کل میرے اور مولوی جی کے درمیان کیا گفتگو ہوئی ہے اور اس گفتگو کے نتیجے میں عالمگیر اور اسحاق وغیرہ کے خلاف کیسا تہلکہ خیز انکشاف ہونے والا تھا۔

میں نے اشاروں کنایوں کی زبان میں حق نواز سے پوچھا کہ سرپنچ غلام قادر کون ہے؟ حق نواز نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی پھر چھوٹی داڑھی اور کھڑی ناک والے ایک دراز قد شخص کی طرف اشارہ کیا۔ اس کی عمر پچپن سال کے قریب ہوگی۔ رونے سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور وہ حسرت بھری نظروں سے مولوی جی کی میت کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ اس کا رنج وغم حقیقی ہے یا بناوٹی؟ مگر کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ وہی شعر ذہن میں آیا:

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

میرے سینے میں آگ سی سلگنے لگی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مولوی جی کی آنکھوں کے ساتھ ہی اس خوشگوار تبدیلی کی راہیں بھی بند ہوگئی ہیں جس کی مبارک باد میں کل تاجور کو دینا چاہ رہا تھا۔ ایک بار پھر ہم وہیں پر آن کھڑے ہوئے تھے جہاں چاندگڑھی میں آمد کے وقت تھے۔

اسی دوران میں ہجوم میں ہلچل محسوس ہوئی۔ پتا چلا کہ چودھری صاحب آ رہے ہیں۔ لوگوں نے اِدھر اُدھر ہٹ کر راستہ بنایا۔ چودھری صاحب نمودار ہوئے۔ یہ چودہ پندرہ سال کا دبلا پتلا لڑکا تھا اس نے کڑھائی دار کرتہ اور کھسا وغیرہ پہن رکھا تھا۔ گلے میں طلائی کینٹھا (ہار) تھا۔ وہ حیران حیران اور ڈرا ڈرا سا مولوی جی کی میت کو دیکھنے لگا۔ اصل چودھری تو عالمگیر تھا جو اس کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس کے پیچھے چوڑے جبڑوں والا اسحاق نظر آیا۔ دونوں کے چہروں پر حزن وملال کی کیفیت تھی۔ پتا نہیں کیوں میرے دل نے گواہی دی کہ یہ کیفیت جو بھی ہے مصنوعی ہے۔

عالمگیر نے بڑے سوگوار انداز میں مولوی جی کے سرہانے کھڑے ہو کر پندرہ بیس سیکنڈ کی خاموشی اختیار کی۔ پھر وہ جھکا اور مولوی جی کی پیشانی کو بوسا دے کر پیچھے ہٹ گیا۔ تاجور کے منگیتر اسحاق نے تسلی دینے والے انداز میں عالمگیر کا شانہ سہلایا۔ میں خاموشی سے یہ مناظر دیکھتا رہا اور میرے سینے میں ایک الاؤ سا بھڑکتا رہا۔ یہاں چاندگڑھی میں صورتِ حال نارمل نہیں تھی۔ یہاں جو کچھ ہو رہا تھا بہت برا تھا اور بڑے سفاک طریقے سے ہو رہا تھا۔

میں ڈیرے پر واپس آ گیا۔ دل پر بہت بھاری بوجھ تھا۔ لگتا تھا کہ مولوی فدا کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اس کا ذمے دار میں بھی ہوں۔ میں نے ہی انہیں عالمگیر وغیرہ کی سازش سے آگاہ کیا اور اس کے نتیجے میں وہ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ابھی کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ملا تھا مگر دل کی گواہی یہی تھی کہ مولوی جی کے ساتھ حادثہ نہیں ہوا، انہیں مارا گیا ہے۔ اُن کی جواں سال بیوی کا تصور بار بار نگاہوں کے سامنے آتا تھا۔ ابھی تو اس سہاگن کی مہندی کا رنگ بھی پھیکا نہیں پڑا تھا اور پھر مولوی جی کی بیمار بچی...... وہ اپنی ماں کو تو پہلے ہی کھو چکی تھی اب باپ سے بھی محروم ہو گئی تھی۔

میرا دھیان بار بار سرپنچ غلام قادر کی طرف ہی جا رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس مؤذن لڑکے کا خیال بھی آتا تھا جو صرف چار پانچ دن پہلے ملازم رکھا گیا تھا اور اب بغیر بتائے مسجد سے غائب تھا۔

عصر کے بعد مولوی جی کی چارپائی اسی میدان میں رکھی تھی جہاں اس نے پہلے وہ اَن گنت لوگوں کی نماز جنازہ پڑھا چکے تھے۔ آج وہ خود سفرِ آخرت پر رواں تھے۔ میں نے دوپہر کو ہی انیق کے ذمے یہ کام لگا دیا تھا کہ وہ سرپنچ غلام قادر اور مؤذن نوجوان عبدالرحیم کے بارے میں پتا کرے۔

مولوی جی کی تدفین کے فوراً بعد ہی انیق کی صورت نظر آ گئی۔ ڈیرے پر پہنچ کر انیق نے بتایا۔ ”لڑکے کا تو ابھی تک کوئی کھوج نہیں ملا۔ اس کا نام پتا بھی کسی کے پاس نہیں۔ اگر ہوگا تو مولوی جی کے پاس ہی ہوگا۔ قیاس یہی ہے کہ وہ کسی قریبی گاؤں کا ہے۔“

”غلام قادر کے بارے میں کیا خبر ہے؟“

”غلام قادر آج دوپہر ہی جہلم چلا گیا ہے۔ سنا ہے کہ وہاں اس کا کوئی عزیز سخت بیمار ہے۔ غالباً ایک دو دن تک تو وہ نہیں آئے گا۔“

میں جیسے تلملا کر رہ گیا۔ جی چاہا کہ سارے اندیشے بالائے طاق رکھ کر سیدھا عالمگیر کی حویلی میں گھس جاؤں اور تب تک اسے مارتا رہوں جب تک اس کی ساری ہڈیاں نہ ٹوٹ جائیں یا پھر وہ بتا نہ دے کہ مولوی جی کے ساتھ کیا ہوا ہے؟ مگر میں یہ بھی جانتا تھا کہ میں ایک انجان جگہ پر کچھ نہایت فسادی لوگوں کے درمیان ہوں اور مجھے جوش سے زیادہ ہوش کی ضرورت ہے۔

O......❖......O

رات ابر آلود تھی لیکن بارش کے آثار نہیں تھے۔ میرے سینے میں جیسے چنگاریاں سی

بھڑک رہی تھیں اس لیے سردی مجھ پر کچھ زیادہ اثر نہیں کر رہی تھی۔ میں صرف شلوار قمیص میں ملبوس درختوں کے نیچے ٹہل رہا تھا۔ چارپائی اور بستر کا تصور بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ رات کا زیادہ تر حصہ اسی طرح گھومتے ہوئے ہی گزار دوں۔ مولوی جی کا غمزدہ چہرہ اور ان کی یتیم بچی کی صورت بار بار نگاہوں کے سامنے گھومتی تھی اور اس کے ساتھ ہی تاجور کی مشکلات بھی نگاہوں کے سامنے آجاتی تھیں۔

اچانک میری نظر کچھ سایوں پر پڑی۔ یہ شیشم اور کیکر کے درختوں کے درمیان موجود تھے۔ ساتھ ہی کوئی گاڑی بھی تھی۔ میں تھوڑا سا آگے گیا تو مجھے دیکھ لیا گیا۔ ایک ٹارچ کی روشنی میرے چہرے پر پڑی پھر کسی نے کہا۔ ''اوئے یہ تو دین محمد کا گونگا نوکر ہے۔ یہ بھی انجن شنجن ٹھیک کر لیتا ہے۔''

دو افراد تیزی سے قریب آئے۔ میں نے پہچان لیا۔ یہ عالمگیر کے کارندے ہی تھے۔ لمبوترے چہرے والا عالمگیر بھی عقب میں موجود تھا۔ کارندوں نے مجھ سے اشاروں کی زبان میں بات کی اور بتایا کہ گاڑی رک گئی ہے۔ سیلف نہیں اٹھا رہی۔

میں نے نیازمندی سے اثبات میں سر ہلایا اور بونٹ کے پاس پہنچ گیا۔ اسی دوران میں گاڑی کے نیچے سے بھی ایک شخص نکل آیا۔ یہ تاجور کا منگیتر اسحاق تھا۔ گاڑی ٹھیک کرنے کی کوشش میں اس کے ہاتھ بھی کالے ہو رہے تھے۔ دو ٹارچوں کی روشنی انجن پر مرکوز کر دی گئی۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ فیول لائن میں رکاوٹ ہے۔ میں گاڑی کے پچھلے حصے میں موجود آئل فلٹر کھولنے میں مصروف ہو گیا۔ وہ لوگ میری موجودگی میں ہی بے دھڑک باتیں کر رہے تھے۔ میں ان کے نزدیک گونگا بہرا تھا۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ لوگ کسی ''مشن'' پر ہیں۔ عالمگیر کا ایک فقرہ میرے سر پر بم کا دھماکا ثابت ہوا۔ اس نے اسحاق سے پوچھا تھا۔

''تیرا کیا خیال ہے، سیالکوٹی کو شاہ پور سے ڈیرے تک آنے میں کتنا ٹائم لگے گا؟''

اسحاق اپنی بھدی آواز میں بولا۔ ''اگر گھوڑیوں پر ہوئے تو آدھے پونے گھنٹے میں پہنچ جائیں گے۔ اگر جیپ ہوئی تو پھر زیادہ وقت لگ سکتا ہے۔''

''کیا اندازہ ہے تمہارا...... ہمیں کتنا ٹائم لگے گا؟''

''اب یہ تو گونگا ہی بتا سکتا ہے۔ ہاں گڈی ٹھیک ہوگئی تو ایک گھنٹے میں ہم وہاں پہنچ سکتے ہیں۔''

عالمگیر کے کندھے سے سیاہ ہولسٹر جھول رہا تھا اور اس میں مشین پسٹل صاف نظر آرہا تھا۔ عالمگیر نے ہولسٹر کو کندھے پر درست کرتے ہوئے کہا۔ ''جو بھی ہے یہ سوچ لو کہ ہمیں

دن چڑھنے سے پہلے پہلے پنڈ واپس پہنچنا ہے۔''

اسحاق نے اثبات میں سر ہلایا پھر اشاروں کی زبان میں مجھے یہ سمجھانے بلکہ دھمکانے لگا کہ میں گاڑی جلدی ٹھیک کروں، اور یہ راستے میں خراب بھی نہیں ہونی چاہیے ورنہ...... میرے ساتھ اچھا نہیں ہوگا۔

آئل فلٹر میں رکاوٹ تھی، وہ میں نے صاف کر دی۔ گاڑی اسٹارٹ ہوگئی۔ عالمگیر نے بخشیش کے انداز میں سو کا نوٹ میرے ہاتھ پر رکھا اور اپنے مسلح کارندوں کے ساتھ آگے روانہ ہوگیا۔ میں نے جو کچھ کرنا تھا وہ میں پہلے ہی طے کر چکا تھا۔ میں رفتار سے دوڑتا ہوا واپس اپنے ٹھکانے پر آیا۔ یہاں حق نواز کے بھائی کی ایک کھٹارا موٹر سائیکل کھڑی تھی جسے میں نے آج دوپہر ہی ٹھیک کیا تھا۔ ٹنکی میں پیٹرول بھی موجود تھا۔ میں نے انیق کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ موٹر سائیکل کو اسٹارٹ کیا اور تیزی سے جیپ کے پیچھے روانہ ہوگیا۔

شروع میں مجھے کافی رفتار سے جانا پڑا۔ جو خطرناک تھا کیونکہ میں نے ہیڈ لائٹ آف کر رکھی تھی۔ جونہی مجھے جیپ کی عقبی سرخ بتی نظر آنا شروع ہوئی میں نے رفتار کم کر دی۔ ٹیڑھے میڑھے کچے راستوں پر یہ ایک نہایت مشکل تعاقب تھا۔ بس جیپ کی پچھلی سرخ بتی ہی میری رہنمائی کر رہی تھی۔ میں اپنا فاصلہ بھی کم نہیں کر سکتا تھا کہ کہیں رات کے سناٹے میں موٹر سائیکل کی آواز جیپ سواروں کے کانوں تک نہ پہنچ جائے۔

یہ طویل اور نہایت مشکل تعاقب تقریباً 50 منٹ جاری رہا۔ بالآخر ہم ایک بیلا نما مقام پر پہنچ گئے۔ یہاں چاروں طرف جھاڑیاں اور درخت ہی دکھائی دیتے تھے۔ بالکل سنسان جگہ تھی۔ جیپ رک چکی تھی۔ میں نے بھی کافی فاصلے پر موٹر سائیکل روک کر اس کا انجن بند کر دیا۔ دل کی دھڑکنیں تیز ہو چکی تھیں۔ آثار بتا رہے تھے کہ اب کچھ ہونے والا ہے اور جو ہے وہ سنسنی خیز ہے۔ شاید ان لوگوں کا سامنا خطرناک سجاول سیالکوٹی سے ہونے والا تھا۔

ہوا کے دوش پر تیر کر کچھ آوازیں میرے کانوں تک پہنچیں اور میں حیران رہ گیا۔ اس ویرانے میں ایسی آوازوں کی توقع ہرگز نہیں تھی۔ لگتا تھا کہ قریب ہی کسی جگہ کوئی طوائف ناچ رہی ہے اور تماش بین اس پر داد و تحسین کے ڈونگرے برسا رہے ہیں۔ گاہے بگاہے سرور و نشاط سے بھرپور قہقہے بھی سنائی دے جاتے تھے۔ وہ سازندوں کی سنگت میں گا رہی تھی۔

بجلی بھری ہے میرے اَنگ اَنگ میں
جو مجھ کو چھوئے گا وہ جل جائے گا

○......❖......○

میں درختوں میں دبکا بیٹھا رہا اور گانے کی آواز سنتا رہا۔ ہوا کی لہروں پر تیر کر یہ آواز کبھی تیز اور کبھی مدھم ہو جاتی تھی۔ ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ یہ سجاول سیالکوٹی کا ڈیرا ہے اور یہ ڈکیت یہاں رقص و سرود کی محفل جمائے بیٹھا ہے۔ اب عالمگیر اپنے ساتھیوں سمیت اس ڈیرے تک پہنچ چکا تھا۔ یقینی بات تھی کہ اپنے مقتول بھائی کا بدلہ لینے کے لیے عالمگیر، سجاول سیالکوٹی پر حملہ کرے گا۔ عنقریب مجھے فائرنگ کی آوازیں سنائی دے سکتی تھیں۔ یہ فائرنگ شدید خون خرابے کا آغاز بھی ہو سکتی تھی۔

قریباً دس پندرہ منٹ اسی طرح گزر گئے۔ مجھے فائرنگ سنائی نہیں دی۔ نہ ہی کسی اور طرح کی ہلچل محسوس ہوئی۔ شاید عالمگیر کے ساتھی بہتر موقعے کی تلاش میں گھات لگائے بیٹھے تھے یا پھر اس طرح کا کوئی اور معاملہ تھا۔ اب ایک اور گیت کے بول ابھر رہے تھے اور سرد رات کی خاموش تاریکی میں ارتعاش پیدا کر رہے تھے۔

رات بھر جام سے جام ٹکرائے گا
جب نشہ چھائے گا، تب مزہ آئے گا

مخمور مردوں کے پُرنشاط قہقہے بھی گاہے بگاہے فضا میں ابھرتے تھے۔

قریباً آدھ گھنٹا اسی طرح گزر گیا تو میرے ذہن میں شبہات پیدا ہوئے۔ میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور جھاڑیوں کے درمیان بڑی احتیاط سے چلتا ڈیرے کی طرف بڑھا۔ میری جیکٹ میں اعشاریہ 38 کا بھرا ہوا پستول تھا۔ پندرہ بیس فالتو راؤنڈ بھی جیکٹ کی اندرونی جیب میں موجود تھے۔ تھوڑا آگے جا کر مجھے عالمگیر کی جیپ نظر آئی۔ یہ وہی جیپ تھی جسے میں نے ڈیڑھ گھنٹا پہلے چلنے کے قابل بنایا تھا۔ یہ دیکھ کر میں مزید چونکا کہ جیپ کو درختوں میں چھپانے کی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ یہ جیپ ڈیرے سے تیس چالیس قدم کے فاصلے پر کھلی جگہ کھڑی تھی۔ ڈیرے کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ یہ چار پانچ کمروں پر مشتمل نیم پختہ سی جگہ تھی۔ برآمدہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ارد گرد اور صحن میں کثرت سے جھاڑ جھنکاڑ اُگا ہوا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ بے آباد جگہ ہے مگر...... کم از کم آج کی رات تو یہ بے آباد ہرگز نہیں تھی۔ اندر روشنی تھی۔ گھنگروؤں کی جھنکار تھی، بھنے ہوئے گوشت کی خوشبو تھی اور پُرکیف قہقہے تھے۔ مغنیہ کی آواز اب مزید واضح ہو چکی تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہاں سازندے وغیرہ موجود نہیں ہیں بلکہ ٹیپ ریکارڈر پر گانا پلے کر کے اس پر رقص کیا جا رہا ہے۔

یکایک مجھے اپنی بائیں جانب آہٹ کا احساس ہوا۔ میں نے مڑ کر دیکھا مگر دیر ہو چکی تھی۔ ایک شخص توپ کے گولے کی طرح مجھ سے آ ٹکرایا۔ ہم اوپر نیچے گرے۔ گہری تاریکی

میں، میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا۔ بس اتنا اندازہ ہوا کہ وہ طاقتور شخص ہے اور اس کے جسم سے شراب کی بو آ رہی ہے۔ اس شخص کو ہرگز توقع نہیں تھی کہ اس کے ساتھ ایسا ہوگا اور اتنی تیزی سے ہوگا۔ میں نے نیچے پڑے پڑے سر کی طوفانی ضرب اس کی پیشانی پر بائیں جانب لگائی۔ مارشل آرٹ کی زبان میں بعض لوگ ایسی چوٹ کو ''راؤنڈ امپیکٹ'' کا نام دیتے ہیں۔ یہ مضروب کے دماغ کی چولیں اس طرح ہلاتی ہے کہ اسے زمین و آسمان گھومتے محسوس ہوتے ہیں۔ میرے مدِ مقابل کی مزاحمت بھی آناً فاناً دم توڑ گئی۔ وہ اپنے منہ سے آواز تک نہیں نکال پایا تھا۔ میں نے مزید تسلی کے لیے نیچے لیٹے لیٹے اس کی کنپٹی پر ایک اور زوردار ہاتھ جمایا اور اسے مکمل انٹاغفیل کر دیا۔ اسے اپنے اوپر سے ہٹا کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ تاریکی میں آنکھیں پھاڑ کر دھیان سے دیکھنے پر احساس ہوا کہ وہ سجاول سیالکوٹی کا کوئی ساتھی تھا۔ اس کی کمر کے گرد گولیوں والی بیلٹ بندھی ہوئی تھی۔ ایک ٹرپل ٹو رائفل اس کے پاس ہی گری ہوئی تھی۔ غالباً وہ یہاں پہرے پر تھا اور میری آہٹ سن کر اپنی بدقسمتی کے طفیل اس طرف چلا آیا تھا۔

میں نے اس کو گھسیٹ کر گھنی جھاڑیوں کے اندر کر دیا اور اس کی رائفل بھی خالی کر کے ایک گڑھے میں پھینک دی۔ بڑی احتیاط سے چلتا ہوا میں ڈیرے کے پہلو میں پہنچا اور دیوار پھاند کر اندر داخل ہو گیا۔ میری تمام حسیات پوری طرح بیدار ہو چکی تھیں۔ کسی بھی خطرے سے نمٹنے کے لیے میں بالکل تیار تھا۔ مجھے ایک ادھ کھلا دروازہ ملا تو میں اس کے اندر چلا گیا۔ یہ شاید کسی وقت اس کھنڈر گھر کا باورچی خانہ رہا ہوگا مگر اب اس میں جالے لگے ہوئے تھے اور سیلن کی بُو تھی۔ میں بے آواز قدم اٹھاتا ہوا ایک ساتھ والے کمرے میں پہنچا۔ یہاں بس دو تین چارپائیاں پڑی تھیں اور ایک ٹرنک رکھا تھا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ ان لوگوں نے بس وہ دو تین کمرے ہی صاف کر رکھے ہیں جہاں یہ محفل برپا ہے، باقی گھر اسی طرح اُجاڑ پڑا ہے اور جالوں سے اٹا ہوا ہے۔ لکڑی کے ایک ٹوٹے ہوئے دروازے کے سوراخ سے میں نے آنکھ لگائی تو ٹھٹک کر رہ گیا۔ یہ وہی کمرا تھا جہاں محفل جمی ہوئی تھی۔ یہ شاید کوئی برآمدہ ہی تھا جسے بعد میں کمرے کی شکل دے دی گئی تھی۔ یہاں گیس لیمپس کی روشنی تھی۔ دو انگیٹھیوں میں کوئلے دہک رہے تھے۔ فرش پر ایک بڑی دری بچھی تھی جس پر کم و بیش پندرہ افراد موجود تھے۔ یہ سب کے سب دیواروں سے ٹیک لگائے آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ تین چار ''معتبر'' افراد نے گاؤ تکیے سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ ایک رقاصہ پاؤں میں گھنگھرو باندھے بڑی مشاقی سے ناچ رہی تھی۔ ٹیپ ریکارڈر پر گانا پلے ہو رہا تھا۔ تماش بین نشے میں جھوم رہے تھے اور گاہے بگاہے رقاصہ سے چھیڑ چھاڑ بھی کر رہے تھے۔

میں نے سجاول سیالکوٹی کو دیکھا نہیں تھا مگر اس کا حلیہ اچھی طرح معلوم تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اسے پہچاننے میں مجھے زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ خاکستری قمیص شلوار والا وہ تنومند شخص بڑے ٹھاٹ سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کی پیشانی پر پرانی چوٹ کا نشان نمایا تھا۔ پیشانی کے نیچے بڑی بڑی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ کرخت نقوش اور کانٹے دار داڑھی نے اسے ایک سکہ بند ڈکیت کا روپ دے رکھا تھا۔ مجھے جس چیز نے ششدر کیا وہ یہ تھی کہ لمبوترے چہرے والا عالمگیر بھی یہاں موجود تھا۔ وہ سجاول سیالکوٹی کے کندھے سے کندھا ملائے بیٹھا تھا......اور رقاصہ پر نوٹ نچھاور کر رہا تھا۔

یہ حیران کن ماجرا تھا۔ سیالکوٹی کے ساتھیوں نے عالمگیر کے چھوٹے بھائی کو قتل کیا تھا اور یہ خونی واقعہ ہوئے چند روز ہی گزرے تھے۔ مجھے وہ منظر یاد آیا جب عالمگیر آتشیں آنسو بہا رہا تھا اور اس کے قریبی عزیز بھی دہاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ پچھلے کئی دن سے عالمگیر کسی بگولے کی طرح چکرا رہا تھا اور لوگ یہی سمجھ رہے تھے کہ وہ اپنے بھائی کے قاتل سیالکوٹی کو ڈھونڈ رہا ہے لیکن یہاں کچھ اور ہی سین تھا۔ سجاول نے رقاصہ کو کھینچ کر آغوش میں لیا تو عالمگیر نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا بدبودار گلاس رقاصہ کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ رقاصہ نے ہونٹ بھینچ لیے اور انکار میں سر ہلانے لگی۔ سجاول نے ایک نازیبا حرکت کرنے کے بعد رقاصہ کو چھوڑ دیا اور وہ پھر محو رقص ہو گئی۔

رقص ختم ہوا تو وہ بدمست تماش بینوں سے بدن چرا کر دوسرے کمرے میں بھاگ گئی لیکن وہ تھی تو اسی چار دیواری میں۔ ان بہکے ہوئے مردوں کے لیے اس کی حیثیت گھڑے کی مچھلی جیسی تھی۔ وہ جب چاہے اس کو پکڑ سکتے تھے۔ ٹیپ ریکارڈر پر گانا پلے ہوا۔ جھانجریا پہنا دو...... بندیا بھی لگا دو...... ایک اور چمکتی دمکتی رقاصہ اندر آ گئی۔ اس نے نہایت مختصر لباس پہن رکھا تھا۔ پوری کمر اور کندھوں پر ریشمی ڈوریاں سی نظر آ رہی تھیں۔ کانوں میں بڑے بڑے آویزے تھے۔ اس نے اپنے بال کھلے چھوڑ رکھے تھے۔ اس نے گانے پر رقص شروع کیا۔ یہ حیرت کا دوسرا ریلا تھا جس نے مجھے جھنجوڑا۔ یہ رقاصہ میرے لیے اجنبی نہیں تھی۔ یہ وہی جاناں نامی لڑکی تھی جو ماڈلنگ وغیرہ بھی کرتی رہی تھی۔ اس سے میری ملاقات پاشا کی شاندار کوٹھی میں ہوئی تھی۔ پاشا نے اپنی ٹیچر بیوی ناہید کو شکیل داراب کے حوالے کر دیا تھا اور اس کے عوض خود موج مستی کی زندگی گزار رہا تھا۔ اس پاشا کو آڑے ہاتھوں لینے کے لیے جب میں لاہور میں اس کے گھر میں گھسا تھا تو وہاں میری ملاقات پاشا کی اس رکھیل جاناں سے ہوئی تھی۔ وہ ٹی وی کی ثانوی اداکارہ تھی اور رسالوں وغیرہ کے اشتہارات میں بھی دکھائی

دیتی تھی۔ ایک قانونی چکر میں پھنس کر وہ پاشا کے شکنجے میں آ گئی تھی۔ اب غیر متوقع طور پر وہ لاہور سے قریباً دو سو میل دور مجھے یہاں اس ویرانے میں دکھائی دی تھی۔

سیالکوٹی کی مخمور آواز میرے کانوں میں پڑی۔ اس نے اپنے کسی ساتھی سے کہا۔

''اوئے کبوتر! وہ دوجا گانا لگا۔ پتنگ وانگوں مینوں سجناں...... اڑائی جا اڑائی جا۔''

سیاہ چہرے والے کارندے نے ادب سے اثبات میں سر ہلایا اور ٹیپ ریکارڈر سے چھیڑ چھاڑ کی۔ فلمی گانے کے بول فضا میں بلند ہونے لگے۔ جاناں نے گانے کی موسیقی سے مطابقت پیدا کی اور پھر رقص کی کوشش کرنے لگی۔ صاف پتا چلتا تھا کہ وہ پہلی رقاصہ کی طرح اس کام میں ماہر نہیں ہے۔ وہ الٹے سیدھے ہاتھ پاؤں پھینک رہی تھی اور ڈری ڈری سی کوشش کر رہی تھی۔ بہرحال تماش بینوں کو اس کی یہ ناپختگی اور گھبراہٹ بھی لطف دے رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں میرا دل گواہی دینے لگا کہ اگر جاناں یہاں موجود ہے تو پھر کسی نہ کسی طرح ان لوگوں کا تعلق پاشا اور شکیل وغیرہ سے بھی ہوگا۔ وہی قبضہ گروپ جو مراد پور کے علاقے میں زمینداروں اور کاشتکاروں کو ان کے رقبوں سے محروم کر رہا تھا اور رہائشی کالونیاں بنانے کے لیے زندگیاں اجاڑ رہا تھا۔

وہ سارے دلدوز مناظر ذہن میں تازہ ہو گئے جو پہلے مراد پور اور پھر لاہور میں نظر آئے تھے۔ ہماری آبائی حویلی پر دولت کے پجاریوں کی حریص نظریں۔ چچا حفیظ کو ملنے والی خفیہ اور اعلانیہ دھمکیاں، پھر حویلی میں سازش کے تحت لگنے والی آگ، میری چچازاد بہن فائزہ اور چچی کی المناک موت۔ ولید کا زخمی ہو کر گرفتار ہونا، میرا غم و غصے سے دیوانہ ہونا اور پھر داؤد بھاؤ کے تعاون سے فائزہ اور چچی کے دہرے قتل کا انتقام لالہ نظام سے لینا، ان کی کار کو ہیوی لوڈر سے کچلنا...... اس کے بعد نوجوان سیاست دان شکیل کے سنگین کرتوت کا کھوج لگا کر اسے اپنی گرفت میں لانا اور عارف کی محبت عاشرہ کی جان شکیل سے چھڑانا...... سب مناظر ایک فلم کی طرح میرے تصور کے پردے پر چلنے لگے۔ میرا دل گواہی دینے لگا کہ شاید یہاں بھی وہ لوگ کسی نہ کسی طور پر موجود ہیں۔

عالمگیر کا ساتھی ساقا نشے کی ترنگ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے شراب کی بوتل اپنے سر پر رکھی اور جاناں کے اردگرد بھونڈے انداز میں ڈانس کرنے لگا۔ اس نے ایک ہاتھ سے اپنی شلوار کا پائنچا اونچا کیا ہوا تھا اور بے ہودہ انداز میں ٹھمکے لگا رہا تھا اور یہ وہ شخص تھا جو تاجور جیسی خوب صورت روشن کتاب کے سارے جملہ حقوق اپنے نام محفوظ کرنا چاہتا تھا۔ اس کے جسم و جان کا مالک بننا چاہتا تھا۔

میرے سینے میں چنگاریاں سی پھوٹ گئیں۔ ساقی کا ڈانس اور اشتعال انگیز حرکات دیکھ کر عالمگیر بھی جوش میں آ گیا۔ وہ ڈگمگاتا ہوا اٹھا اور بھنگڑے کے انداز میں ناچنے لگا۔ تماش بینوں نے بھڑکیں ماریں اور رقاصہ پر نوٹ نچھاور کیے۔ عالمگیر نے ہلکی پھلکی جاناں کو اپنے کندھے پر اٹھالیا اور اسی طرح رقص کرتا رہا۔ میری حیرت بڑھ رہی تھی۔ یہ شخص چاند گڑھی میں زہریلے سانپ کی طرح پھنکار رہا تھا اور اپنے بھائی کے قاتلوں کو عبرت کا نشان بنانے کی قسمیں کھا رہا تھا مگر یہاں وہ قاتلوں کے ساتھ بیٹھا دادِ عیش دے رہا تھا۔ مطلب یہ کہ صورتِ حال وہ نہیں تھی جو دکھائی دیتی تھی۔ عین ممکن تھا کہ عالمگیر کے بھائی کا قتل عالمگیر کی منشا پر ہی ہوا ہو...... وہی بات کہ......

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ

اچانک مجھے اپنے قریب آہٹ محسوس ہوئی۔ میں جلدی سے ایک کھڑی چارپائی کی اوٹ میں ہو گیا۔ اندر آنے والا ایک رائفل بردار تھا۔ اس نے ٹرنک میں سے انڈین شراب کی دو بوتلیں اور سگریٹوں کے چند پیکٹ نکالے اور جیسے جھومتا ہوا آیا تھا، ویسے ہی باہر نکل گیا۔ میں اپنی جگہ ساکت بیٹھا رہا۔ بہرحال اس کے بعد میں نے ایک بوسیدہ سا میز پوش احتیاطاً اپنے چہرے اور سر کے گرد لپیٹ کر مضبوط گرہ لگالی۔

میری جیکٹ کی اندرونی جیب میں ایک چھوٹا سا لیکن طاقتور اسپائی کیمرا موجود تھا۔ یہ اسٹل فوٹوگرافی کے علاوہ مووی بھی بناتا تھا۔ میں نے کیمرا نکال کر دروازے کے سوراخ میں لگایا اور بڑے اطمینان سے تصویریں کھینچ لیں۔ بے شک اندر روشنی بہت تیز نہیں تھی مگر کیمرے کی خوبی یہی تھی کہ وہ نیم تاریکی اور کم روشنی میں بھی واضح فوٹو لے سکتا تھا۔ تصویر کشی کے بعد میں نے ایک ایک منٹ کے دو تین کلپس بھی بنائے۔ یہ بات ثابت کرنے کے لیے کہ عالمگیر گاؤں والوں کو ڈکیت سجاول کے سلسلے میں دھوکا دے رہا ہے، یہ بڑے ٹھوس ثبوت تھے۔

دفعتاً آہٹ دوبارہ ہوئی۔ ایک بار پھر وہی شخص نمودار ہوا جو اس سے پہلے بوتلیں اور سگریٹ لے کر گیا تھا۔ شاید وہ مزید لوازمات لینے آیا تھا۔ وہ اپنی ترنگ میں ایک فحش سا گیت گنگناتا داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں بکرے کی چانپ کی ایک بڑی بوٹی تھی۔ گنگنانے کے ساتھ ساتھ وہ اسے نوچ بھی رہا تھا۔ اس مرتبہ بالکل غیر متوقع طور پر وہ آگے آ گیا۔ میں چارپائی کے پیچھے تھا۔ ہمارے درمیان بمشکل دو ڈھائی فٹ کا فاصلہ رہا ہوگا۔ میں نے سانس تک روک لی۔ اس نے ٹارچ جلائی اور ٹوٹے پھوٹے فرش پر کچھ تلاش کرنے لگا۔ پھر وہی ہوا

جس کا ڈر تھا۔ ٹارچ کا روشن دائرہ کھڑی چارپائی کی ادوائن سے گزر کر میرے پاؤں پر پڑا۔ وہ شخص بری طرح چونکا۔ اس کا ہاتھ بے ساختہ اپنی پنڈلی کی طرف گیا۔ میں تئے بھانپ لیا کہ وہ کوئی تیز دھار آلہ نکالنے جا رہا ہے۔ میں لپک کر چارپائی کے پیچھے سے نکلا۔ میری لات اس کے سینے پر پڑی اور وہ الٹ کر کاٹھ کباڑ پر گرا۔ میں نے اس پر جھپٹا مارا مگر اس دوران میں وہ بڑے ماہرانہ انداز میں اپنی پنڈلی سے ایک خم دار خنجر نکال چکا تھا۔ یقیناً وہ خنجر زنی میں ماہر بھی تھا۔ مجھے پیچھے ہٹنے میں ایک لمحے کی دیر بھی ہوتی تو وہ بے دریغ میرا پیٹ چاک کر دیتا۔ خنجر کی نوک میری جیکٹ کو چیرتی ہوئی گزر گئی۔ میں اسے دوسرا وار کرنے کا موقع دیتا تو یہ میری سنگین غلطی ہوتی۔ میں نے اس کی ٹھوڑی کے نیچے گردن پر اس جگہ وار کیا جہاں چوٹ لگنے سے سانس رک جاتی ہے اور ریڑھ کی ہڈی تک ضرب کا اثر ہوتا ہے۔ پہلی ضرب درست جگہ پر نہیں لگی۔ وہ سہہ گیا اور چلایا۔ ”رحمو......شوکے......رحمو۔“

دوسری ضرب نے اس کی بولتی بند کر دی اور وہ مردہ چھپکلی کی طرح ایک طرف ڈھے گیا۔

صورتِ حال نازک ہو چکی تھی۔ میں نے پستول نکالا اور مڑ کر دروازے کی طرف گیا۔ ناچ گانے والے کمرے میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ سجاول سیالکوٹی کی پاٹ دار آواز گونجی۔

”اوئے کون ہے؟ دیکھو ذرا جلدی سے۔“

بھاگتے قدموں کی آوازیں آئیں۔ میں چار دیواری کے قریب پہنچا تو ایک دراز قد شخص نے ٹارچ کی روشنی مجھ پر پھینکنے کی کوشش کی۔ میں نے بھاگ کر اس کے سینے پر ٹانگ جمائی۔ ”مومینٹم“ کی وجہ سے یہ ضرب اتنی زوردار تھی کہ مقابل کی پسلی ٹوٹنے کی واضح آواز آئی۔ وہ دیوار سے ٹکرا کر اوندھے منہ گرا۔ مزید لوگ پہنچ رہے تھے۔ میں نے پھرتی سے دیوار پھاندی اور جھاڑیوں میں اندھا دھند بھاگتا اس سمت بڑھا جہاں میری موٹر بائیک موجود تھی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ کئی افراد میرے پیچھے آ رہے ہیں۔ پھر جی تھری رائفل کی خوفناک فائرنگ سنائی دی۔ یہ ہوائی فائرنگ تھی لیکن مجھ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔

مجھے جھاڑیوں کے اندر ایک اور ایسی چیز دکھائی دی جس نے مجھے مزید چونکنے پر مجبور کیا۔ اس کا ذکر میں آگے چل کر کروں گا۔ میری پوری توجہ اس بات پر مرکوز تھی کہ میں اپنی بائیک تک پہنچ جاؤں۔ میری یادداشت نے درست کام کیا اور میں ایک جوہڑ کے سرکنڈوں کے اندر بھاگتا بائیک تک پہنچ گیا۔

ہوا کے دوش پر تیر کر ایک گرج دار آواز مجھ تک پہنچی۔ کسی نے ہانپتے لہجے میں گالی دی

اور پکار کر بولا۔ ’’زیادہ دور نہیں گیا...... دیکھو اس طرف۔‘‘

بائیک اسٹارٹ کرنے میں خطرہ تھا۔ میں کافی دور تک بائیک کو ویسے ہی کھینچ کر لے گیا۔ دس پندرہ فٹ اونچے سرکنڈے مجھے مکمل آڑ فراہم کر رہے تھے پھر دور سے آنے والی آوازوں سے پتا چلا کہ میں محفوظ فاصلے پر پہنچ گیا ہوں۔ میں نے بائیک اسٹارٹ کی اور تیزی سے چاند گڑھی کی طرف روانہ ہو گیا۔ مجھے راستوں کا علم نہیں تھا لیکن سمت کا اندازہ تھا۔ یہ بالکل بے آباد جگہ تھی۔ خودرَو جھاڑیوں، ٹیلوں کے درمیان اور کچے دشوار راستوں پر میں بائیک کو دوڑاتا چلا گیا۔

○......❖......○

میں جو کچھ دیکھ کر آ رہا تھا وہ بہت انکشاف انگیز تھا۔ انیق میرے انتظار میں جاگ رہا تھا۔ میں نے اسے ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ وہ میری کٹی ہوئی جیکٹ دیکھ کر حیران ہوا اور اسے پتا چلا کہ وہاں ہونے والی لڑائی مار کٹائی کتنی سنگین نوعیت کی تھی۔ ہم نے کیمرے کی ننھی سے اسکرین پر وہ تصویریں اور کلپس دیکھے جو میں نے دروازے کے سوراخ میں سے بنائے تھے۔ سب کچھ بہت واضح تھا۔ آوازیں بھی ریکارڈ ہوئی تھیں۔ انیق نے کہا۔ ’’لگ تو یہ رہا ہے کہ عالمگیر نے خود ہی بھائی کو مروایا ہے۔‘‘

’’ہاں، اندرخانے کی کوئی دشمنی لگتی ہے۔‘‘

’’ایک ایسا واقعہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوا ہے شاہ زیب بھائی۔ بڑے بھائی نے چھوٹے بھائی کو قتل کرایا اور پھر ایسا چکر چلایا کہ خود ہی اس کا خون بہا وصول کر کے قاتل پارٹی سے صلح بھی کی۔‘‘

’’ہمیں یہ صورتِ حال گاؤں والوں کے سامنے لانی ہے۔ تم کل ہی لاہور چلے جاؤ اور تصویروں کے پرنٹ تیار کرواؤ۔‘‘

انیق نے اثبات میں سر ہلایا پھر بولا۔ ’’آپ کے جانے کے بعد یہاں ایک اور واقعہ ہوا ہے۔

’’کیا؟‘‘

’’مولوی جی کی بیٹی زینب کو بے ہوشی کی حالت میں اسپتال لے کر گئے ہیں۔‘‘

’’کیا ہوا اسے؟‘‘

’’وہی جو ہوتا ہے۔ پہلے جی خراب ہونے کی شکایت کرتی رہی پھر زمین پر گر کر تڑپنے لگی۔ آخر منہ سے جھاگ نکلنے لگے اور بے ہوش ہو گئی۔ پہلوان حشمت، ماسٹر جی اور مولوی

صاحب کا ایک عزیز اسے گاڑی پر ڈال کر لے گئے ہیں۔ فی الحال تو وہ ڈسکہ جائیں گے۔ وہاں سے لاہور جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ مولوی صاحب کی بیوی بھی ساتھ ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''یہ لاہور جانے والی بات تو اچھی ہے۔ تم بھی لاہور جا رہے ہو، سامنے آئے بغیر تم ان لوگوں کو گائیڈ کر سکتے ہو۔''

''ممکن ہے کہ مولوی جی کی بیوی کے پاس وہ ایڈریس بھی ہو جو آپ نے مولوی جی کو دیا تھا۔ میرا مطلب ہے ڈاکٹر کا اتا پتا۔''

''بالکل ایسا ہو سکتا ہے اور اگر نہیں بھی تو تم دوبارہ یہ ایڈریس ان تک پہنچا سکتے ہو۔''

انیق اور میں دیر تک باتیں کرتے رہے۔ میں نے انیق کو بتایا۔ ''مجھے ایک اور شبہ بھی ہو رہا ہے، ہو سکتا ہے کہ ہمارے لاہور والے ''دوست'' بھی چاند گڑھی کے آس پاس موجود ہوں اور ان سے پھر ملاقات ہو جائے۔''

''میں سمجھا نہیں جی۔''

''شرابی پاشا اور شکیل داراب وغیرہ۔ میں نے تمہیں جن ڈانسرز کا بتایا ہے ان میں سے ایک وہی جاناں نام کی لڑکی تھی جس سے پاشا کی لاہور والی کوٹھی میں ملاقات ہوئی تھی۔''

انیق حیران رہ گیا۔ میں نے اسے تفصیل بتائی اور پھر اس خاص چیز کا ذکر بھی کیا جو مجھے وہاں بھاگتے ہوئے جھاڑیوں میں دکھائی دی تھی۔ میں نے سرگوشی میں کہا۔ ''تمہیں وہ گاڑی تو یاد ہو گی جسے میں نے ہیوی لوڈر کے ساتھ ٹکر ماری تھی۔ وہ بالکل تباہ ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ سفید رنگ کی مرسیڈیز تھی۔ مجھے بالکل ویسی ہی گاڑی وہاں جھاڑیوں میں بھی نظر آئی ہے۔''

''امیزنگ۔'' انیق نے حیران ہو کر کہا۔

''میں اس کا نمبر ٹھیک طرح نہیں دیکھ سکا۔ مجھے تو نمبر بھی ملتا جلتا ہی لگتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ لالہ نظام کے چھوٹے بھائی لالہ وریام کی گاڑی ہو۔ یعنی دونوں بھائیوں کے پاس ایک جیسی گاڑیاں ہوں۔''

''آپ کہنا چاہتے ہیں کہ لالہ نظام کی فیملی میں سے کوئی اور شخص بھی وہاں ناچ گانے کی محفل میں موجود تھا؟''

''بالکل ایسا ہو سکتا ہے۔ اگر وہ رقاصہ لڑکی جاناں یہاں موجود ہے اور لالہ نظام کی گاڑی جیسی گاڑی یہاں موجود ہے تو پھر ان لوگوں کی یہاں موجودگی بھی ناممکن نہیں۔''

''اس کا مطلب ہے، آپ کی بات درست ہے۔ لاہور والے دوستوں سے پھر ملاقات ہونے والی ہے۔'' انیق نے کہا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میرا ذہن جیسے گھڑ دوڑ کا میدان بنا ہوا تھا، بہت سے خیالات ذہن پر یلغار کر رہے تھے۔

میں نے روانگی کے وقت کھیتوں میں عالمگیر اور اس کے ساتھیوں کی جو گفتگو سنی تھی اس کے مطابق انہیں صبح منہ اندھیرے واپس چاند گڑھی پہنچ جانا تھا مگر ان کی واپسی دن گیارہ بجے کے لگ بھگ ہوئی۔ انیق نے مجھے جگا کر بتایا کہ عالمگیر کی کھٹارا جیپ گاؤں میں داخل ہو رہی ہے۔ میں نے دیکھا جیپ دھول اڑاتی آ رہی تھی۔ یقیناً یہ لوگ اب تک مجھے تلاش کرنے کے چکر میں ہی رہے تھے۔ عین ممکن تھا کہ وہ اردگرد کے ٹیلوں اور جنگل میں بھٹکتے رہے ہوں۔ میں نے دور ہی سے عالمگیر کا لمبوترا چہرہ دیکھا۔ وہ پریشانی کے سبب کچھ اور لمبا نظر آ رہا تھا۔ اسحاق بھی گم صم بیٹھا تھا۔ وہ لوگ میرے سامنے سے گزرے۔ مجھے یہ سوچ کر مزہ آیا کہ میں ان کے رُوبرو ہوتے ہوئے بھی ان کی نظروں سے اوجھل ہوں۔

○......❖......○

انیق نے لاہور میں اپنا کام بڑی تیزی سے کیا۔ نہ صرف اس نے منی کیمرے سے تصویروں کے شاندار پرنٹ نکلوا لیے بلکہ مولوی جی کی بیٹی زینب کے بارے میں بھی معلومات حاصل کر لیں۔ میرا یہ اندازہ درست تھا کہ زینب کی سوتیلی والدہ کے پاس وہ ایڈریس موجود تھا جو میں نے مولوی جی کو دیا تھا اور وہ 20 ہزار روپیہ بھی جو میں نے اصرار کر کے مولوی جی کو زینب کے علاج کے لیے مہیا کیا تھا۔ زینب کی یہ سوتیلی والدہ...... حقیقی والدہ ہی کی طرح اس کی ہمدرد اور غمگسار تھی۔ انیق نے پس پردہ رہتے ہوئے مطلوبہ کلینک اور ڈاکٹر تک پہنچنے میں ان لوگوں کی مدد کی۔ زینب کا فوری علاج شروع ہو گیا۔ یہ علاج اسلام آباد کے ایک اچھے پرائیویٹ کلینک میں ہو رہا تھا۔ علاج شروع ہو جانے کے بعد انیق فوراً چاند گڑھی واپس پہنچ گیا۔ انیق نے یہ بھی بتایا کہ شکیل داراب ابھی تک اپنے وعدے کی پاسداری کر رہا ہے۔ اس نے اپنا اثر رسوخ استعمال کیا ہے اور میرے چچا زاد ولید کو جیل بھجوانے کے بجائے ابھی تک اسپتال میں ہی رکھا گیا ہے۔ چچا حفیظ مراد پور میں جلی ہوئی حویلی کو اسی طرح دوبارہ بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ انہیں یہی معلوم تھا کہ میں پاکستان سے واپس جا چکا ہوں۔ انیق کا اہم کام یہی تھا کہ اس نے مطلوبہ تصویروں کے بہترین پرنٹ نکلوائے تھے۔

میں نے تصویریں دیکھیں۔ زبردست تھیں۔ پانچ چھ تصویریں تو اتنی واضح تھیں کہ شک شبہے کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہ جاتی تھی۔ عالمگیر اور سجاول سیالکوٹی نے ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالی ہوئی تھیں اور ان کے ہاتھوں میں وہسکی کے گلاس چمک رہے تھے۔ ایک

تصویر میں وہ ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار رہے تھے اور کھل کر ہنس رہے تھے۔ کئی تصویروں میں نیم عریاں جسم والی جاناں بھی صاف پہچانی جاتی تھی۔ اسحاق اس کے ساتھ ناچ رہا تھا، اور بیک گراؤنڈ میں سیالکوٹی اور عالمگیر دکھائی دیتے تھے۔

ہم تصویریں دیکھ رہے تھے جب دور سے پہلوان حشمت آتا دکھائی دیا۔ وہ بھی آج ہی اسلام آباد سے واپس آیا تھا۔ انیق کے ساتھ حشمت کی گاڑھی چھننے لگی تھی اور وہ سب بے تکلفی سے باتیں کرتے تھے۔ ہم نے تصویریں فوراً چھپا دیں۔ حشمت جھومتا ہوا سا اندر آ گیا۔ وہ چلنے میں ذرا دشواری محسوس کر رہا تھا۔ غالباً اس کی وجہ وہی گہری خراشیں تھیں جو کانٹے دار جھاڑیوں میں گرنے سے اس کی پشت پر آئی تھیں، اور جن کی ''لوکیشن'' بتا کر وہ خود ہی ہنسنے لگتا تھا۔ رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد وہ چارپائی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور ہمیں سفر کی رُوداد سنانے لگا۔ اس نے اپنے تئیں ہم پر انکشاف کیا کہ بچی زینب کی بیماری بالکل اور طرح کی چیز نکلی ہے، یہ آسیب یا جادو ٹونے والا چکر نہیں ہے، بلکہ اس کو کسی نے خاص طرح کی نشہ آور دوا کھلائی ہے اور کئی ماہ تک کھلائی ہے۔ اب جب وہ اس دوا سے محروم ہوتی ہے تو اس کی حالت غیر ہو جاتی ہے۔ اسلام آباد کے ڈاکٹروں نے پورا پورا کھوج لگا لیا ہے۔

انیق نے کہا۔ ''حشمت بھائی! اگر ایسا ہوا ہے تو کس نے کیا ہے؟''

''یہی سوچنے کی بات ہے۔ عالمگیر کے گھر کے علاوہ اس بے چاری کا کہیں آنا جانا ناہیں تھا۔ لگت تو یہی ہے کہ یہ بدعادت اس کو عالمگیر کے گھر سے ہی لاگی ہے۔ کیا پتا اس میں عالمگیر کا ہی ہاتھ ہو مگر عالمگیر پر اس طرح کا الزام لگانا کسی کے بس کا روگ ناہیں۔ چودھری نیاز تو ابھی بچہ بچونگڑا ہے۔ چاند گڑھی کا اصل چودھری اور کرتا دھرتا تو یہی عالمگیر ہے۔'' پہلوان حشمت کے لہجے میں زہر تھا۔

انیق نے کہا۔ ''اس کا مطلب تو یہی نکلا کہ عالمگیر اور اسحاق وغیرہ اس بچی کے ذریعے اللہ بخشے مولوی جی کو بلیک میل کر رہے تھے اور تاجور کے سلسلے میں اپنی زبان بولنے پر مجبور کر رہے تھے۔''

''دھیان تو یقیناً اسی طرف جاوت ہے بھیا، مگر یہ بات اپنی زبان پر کون لاوے؟ جو لاوے گا اس کا حشر نشر ہو جاوے گا۔ ویسے بھی اب مولوی صاحب تو اس دنیا میں ہیں ناہیں، اب ان کے بارے میں کچھ بھی کہا جا سکت ہے۔ اس کے علاوہ یہاں چاند گڑھی میں ہی بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو آنکھیں بند کر کے عالمگیر اور پیر ولایت جیسے لوگوں پر یقین کرتے ہیں۔''

مولوی جی کے ذکر پر حشمت ایک دم اداس ہو گیا اور یہ صرف اکیلے حشمت ہی کی بات نہیں تھی، گاؤں کی اکثریت نے مولوی جی کی ناگہانی موت کا گہرا دکھ محسوس کیا تھا۔

انیق نے نکتہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''حشمت بھائی! اگر عالمگیر وغیرہ مولوی جی کو بلیک میل کر رہے تھے تو پھر تو یہ بھی سوچا جا سکتا ہے کہ اپنا بھید کھلنے کے ڈر سے انہوں نے ہی مولوی جی کو مسجد کی سیڑھیوں سے دھکا دے کر مار دیا ہو۔''

پہلوان حشمت کے چہرے پر ایک رنگ سا لہرا گیا۔ اس نے ذرا پریشانی سے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ شام کے ٹھنڈے سائے قرب و جوار کو ڈھانپ رہے تھے۔ کہیں سے بانسری کی آواز آ رہی تھی۔ کھیت کے کنارے کنارے دو کھیت مزدور سروں پر سبز چارا اٹھائے گھروں کی طرف جا رہے تھے۔ پہلوان حشمت نے دبی آواز میں کہا۔ ''دھیان رکھو بھائی! ایسی بات اونچی آواز میں نہ کہو۔ دیواروں کے بھی کان ہووت ہیں اور چاند گڑھی میں تو یہ کان کچھ زیادہ ہی تیز ہیں۔ وہ کیا فرمایا ہے علامہ اقبال نے بات بندے سے کہتی ہے کہ تم مجھے منہ سے نکالو، میں تمہیں گاؤں سے نکالوں گی۔''

انیق نے حیرت سے دیدے گھمائے۔ ''حشمت بھائی! یہ علامہ اقبال نے کہا تھا؟''

''تو کیا تیرے کسی رشتے دار نے کہا تھا۔ ایسی بڑی باتیں بہت بڑے لوگ ہی کہہ سکتے ہیں۔''

اسی دوران میں میری نظر کھڑکی سے باہر ایک سجے سجائے خوب صورت تانگے پر پڑی۔ تانگے میں عالمگیر بڑے ٹھاٹ سے بیٹھا تھا۔ اس کی بغل میں گورا چٹا نوعمر چودھری تھا۔ چودہ پندرہ سالہ چودھری کی پگڑی کا شملہ کوئی دو فٹ اونچا تو ضرور رہا ہوگا۔ پچھلی سیٹ پر بھی تین افراد موجود تھے۔ میں نے انیق اور حشمت کی توجہ اس منظر پر مبذول کرائی۔ انیق نے حشمت سے پوچھا۔ ''یہ سواری کدھر جا رہی ہے؟''

حشمت نے گہری سانس لی اور بڑے تدبر سے بولا۔ ''سمجھو کہ شیر کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور ہووت ہیں۔''

''ہاتھی کے دانت۔'' انیق نے تصحیح کی۔

حشمت سنی اَن سنی کرتے ہوئے بولا۔ ''اوپر اوپر سے تو عالمگیر اپنے بھائی کی موت پر غم زدہ ہے مگر حقیقت میں اس کو کوئی ایسی سوگواری بھی ناہیں ہے۔ کل چودھری نیاز کی پیدائش کا دن ہے۔ پچھلے سالوں میں یہ دن گاؤں کے اندر ہی بڑی دھوم دھام سے منایا گیا تھا۔ ساری ساری رات کنجر خانہ لگا رہا تھا مگر اب چونکہ مولوی جی اور پرویز والا واقعہ ہو گیا ہے، اس لیے یہ

لوگ باہر جا رہے ہیں۔"

"کہاں...... کس لیے؟"

"میرا خیال ہے کہ ڈسکہ جاویں گے۔ وہاں عالمگیر کا ایک امیر کبیر یار ہے۔ اس کی کوٹھی پر جشن وغیرہ کر لیں گے۔ یعنی موج میلے سے باز نا ہیں آنا، چاہے مرنے والے کا کفن بھی میلا نہ ہوا ہو۔"

"ناچ گانا ہوگا؟" انیق نے پوچھا۔

"سب کچھ ہووے ہے گا۔" حشمت نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ کچھ دیر خاموش رہ کر وہ بولا۔ "سچی بات تو یہ ہے بھیا کہ عالمگیر نے چودھری نیاز کا اس چھوٹی سی عمر میں بیڑا غرق کر دیا ہے۔ شراب تو رہی ایک طرف، عورت تک لگا دی ہے اسے۔"

"عورت لگا دی ہے؟ کیا مطلب؟"

"یہ ناچنے والیاں...... اس چھوٹی سی عمر میں اسے ان کے ڈانس دکھاوت ہے اور پھر اسے ان کی عادت بھی ڈالت ہے۔ اس کا ارادہ یہی ہے کہ یہ لڑکا کسی کام کا نہ رہے اور اصلی چودھراہٹ کے مزے یہ خود ہی لیتا رہے۔"

یہ بڑی حیران کن اور سنگین صورتِ حال تھی۔ کچھ دیر اس موضوع پر بات ہوتی رہی۔ عالمگیر کے کئی کرتوت سامنے آئے۔

انیق نے حشمت سے پوچھا۔ "کیا عالمگیر اور اس کے مقتول بھائی میں جھگڑا وغیرہ بھی تھا؟"

"ایسے جھگڑے اکثر گھروں میں رہتے ہی ہیں۔ مقتول کی بیوی اور عالمگیر کی بیوی میں زیادہ چپقلش تھی۔ کوئی مکان کا معاملہ بھی تھا۔"

حشمت کی باتوں سے پتا چلا کہ مقتول پرویز کے سسرال والے تگڑے لوگ ہیں اور چاند گڑھی میں ہی رہتے ہیں۔ اس کے دو سالوں نے کچھ عرصہ پہلے جیل بھی کاٹی ہے۔ خاص طور سے اس کا بڑا سالا صولت ٹوانہ جو نائب تحصیل دار بھی ہے، بڑا دبنگ بندہ ہے۔ یہ گفتگو سننے کے بعد میں نے فوراً فیصلہ کر لیا کہ اس وقت جو تصویریں میرے تکیے کے نیچے رکھی ہیں وہ آج رات تک مقتول پرویز کی بیوی یا پھر اس کے بھائی صولت ٹوانہ تک پہنچ جائیں گی۔ عالمگیر ایک خبیث دشمن کے طور پر سامنے آیا تھا اور اپنے دشمن کو کسی بھی طرح کمزور کرنا لڑائی کا حصہ ہوتا ہے۔

○......❖......○

انیق شام کو ہی سروے کر آیا۔ اس کی صلاحیتیں اب کھل کر سامنے آ رہی تھیں۔ میں جو کام اسے سونپتا تھا نہایت خوش اسلوبی اور چالاکی سے انجام دیتا تھا۔ داؤد بھاؤ نے یقیناً اپنا ایک ہیرا ہی میرے حوالے کیا تھا۔ انیق نے نہ صرف نائب تحصیل دار صولت کا گھر دیکھ لیا تھا بلکہ یہ بھی جان لیا تھا کہ وہ گاؤں میں ہی ہے۔ اس کے علاوہ ایک خاص کام اس نے یہ کیا تھا کہ صولت کا موبائل فون نمبر بھی حاصل کر لیا تھا۔ یہ نمبر اسے پٹواری کے ملازم سے مل گیا تھا۔ کام اب اور آسان ہو گیا تھا۔ رات ساڑھے دس بجے میں نے انیق سے کہا کہ وہ تصویروں والا لفافہ صولت ٹوانہ کے گھر کی چھت پر پھینک آئے۔

انیق یہ کام کر کے سردی میں ٹھٹھرا ہوا واپس آ گیا۔ گیارہ بجے کے لگ بھگ میں نے نیق کے نمبر سے صولت کو کال کی۔ دوسری طرف سے ایک بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔ شاید س شخص نے پیگ وغیرہ لگایا ہوا تھا۔ ”کون؟“ اس نے پوچھا۔

”تمہارا ایک ہمدرد۔“ میں نے بڑے اطمینان سے کہا۔

”سیدھی سیدھی بات کرو۔ کون ہو تم؟“ نہایت خشک لہجے میں کہا گیا۔

”سیدھی بات تو یہ ہے کہ ایک بہت سیدھی بات تم لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئی ہے۔ اس کا تعلق تمہارے بہنوئی پرویز اور اس کی موت سے ہے۔“

”تمہاری بات میرے پلے نہیں پڑ رہی اور تم ہو کون؟“ ذرا چونکے لہجے میں پوچھا گیا۔

میں نے کہا۔ ”میرے بارے میں جاننے سے تمہیں کوئی خاص فائدہ نہیں ہو گا۔ مگر جو بات میں تمہیں بتانے جا رہا ہوں وہ تمہارے بہت فائدے کی ہے۔ تمہارا بہنوئی، ڈکیت سیالکوٹی کے بندوں نے نہیں مارا۔ اسے ان بندوں کے ذریعے مروایا گیا ہے اور مروانے والا کوئی اور نہیں...... تمہارے مقتول بہنوئی کا بڑا بھائی عالمگیر ہے۔“

دوسری طرف چند سیکنڈ خاموشی رہی، پھر لرزاں آواز میں پوچھا گیا۔ ”تم اپنے ہوش میں تو ہو۔ یہ کیا بات کر رہے ہو اور...... اور اس کا کیا ثبوت ہے تمہارے پاس؟“

”تمہارے آخری فقرے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید تمہارے دل کے کسی دور دراز گوشے میں بھی اس طرح کا شک موجود ہے اور میں تمہیں پورے یقین کے ساتھ بتا رہا ہوں کہ یہ شک سو فیصد درست ہے۔ عالمگیر نے سیالکوٹی سے ملی بھگت کر کے تمہارے بہنوئی کو مارا ہے اور تمہاری جوان بہن کو بیوہ کیا ہے۔“

ایک بار پھر اسی لرزاں آواز میں پوچھا گیا۔ ”کون ہو تم؟“

''خدائی فوجدار۔ چاند گڑھی کے کچھ لوگ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔ ان میں مولوی جی کا شاگرد طارق......رام پیاری اور وکرم وغیرہ شامل ہیں۔''

''تت......تم وہی پگڑی والے (ڈھاٹے والے) ہو؟''

''چلو جو بھی نام دے لو۔ لیکن میں وہی ہوں اور جو بات کہہ رہا ہوں پورے ثبوت سے کہہ رہا ہوں۔''

''کیا ہے ثبوت؟''

''تصویریں اور اگر چاہو تو موقع آنے پر باقاعدہ ویڈیو بھی دی جاسکتی ہے۔''

''تم کن تصویروں کی بات کر رہے ہو؟''

''وہ تمہارے گھر کی چھت پر گلی والی منڈیر کے پاس سفید لفافے میں پڑی ہیں۔ ابھی جا کر دیکھ لو۔ مزید تصدیق چاہتے ہو تو عالمگیر کے ساتھی ساتے سے بات کرلو۔ ذرا مرد بن کر پوچھو گے تو وہ چپہ بھی سب کچھ بتا دے گا۔'' میں نے فون بند کر دیا۔

○......❖......○

صبح بڑی سہانی تھی۔ میں کمرے سے باہر ایک کچی منڈیر پر بیٹھا تھا۔ دور تک سبز کھیتوں کے سلسلے تھے۔ ہریالی پر ہلکا ہلکا کہرا تھا اور گھاس پر اوس کے قطرے تھے۔ کوپن ہیگن اور لندن وغیرہ میں ایسی تازہ ہوا کا میں نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔ چند ننھی بچیاں اسکول جانے کے لیے میرے پاس سے گزریں تو میری طرف دیکھ کر مسکرائیں اور اشارے سے سلام کیا۔ کیا شگفتہ کلیوں جیسے چہرے، کیا معصومیت تھی۔ وہ گلے میں بستے لٹکائے ہاتھوں میں لکڑی کی تختیاں لہراتی، میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئیں تو چڑیوں کا ایک جھنڈ بھی فراٹے مار کر زمین سے اڑا اور فضا میں گم ہو گیا۔ یہ لڑکیاں بھی تو چڑیوں کا جھنڈ ہی ہوتی ہیں، اکٹھی دانہ دنکا چگتی ہیں، پھر اڑ جاتی ہیں اور بکھر جاتی ہیں۔

اڑنے اور بکھرنے سے میرا دھیان تاجور کی طرف چلا گیا۔ کیا وہ بھی اڑ کر کسی گھونسلے کی زینت بننے والی ہے اور ہمیشہ کے لیے میری نظروں سے اوجھل ہونے والی ہے۔ اس سے میری آخری ملاقات کافی مایوس کن رہی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں جلد از جلد یہاں سے چلا جاؤں اور دوبارہ اِدھر کا رخ نہ کروں۔ وہ اِس بات پر بھی سیخ پا ہوئی تھی کہ میں نے اس سے اظہارِ محبت کر دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میں بارود کے بہت بڑے ڈھیر کو چنگاری دکھانے کی بات کر رہا ہوں۔ اگر یہ چنگاری چمک گئی تو یہاں میری اور انیق کی لاشوں کا بھی پتا نہیں چلے گا۔ چاند گڑھی کی زمین ہمیں یوں نگل جائے گی جیسے کبھی ہمارا وجود ہی نہ تھا۔

ڈرانے والے ہمیشہ ڈراتے رہے ہیں اور عشق کی راہ میں آگے بڑھنے والے ہمیشہ آگے بڑھتے رہتے ہیں اور یہاں تو ڈر کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ اگر مجھے کوئی شدید خطرہ محسوس ہوتا تو میں انیق کو فوراً یہاں سے نکال دیتا اور خود چاند گڑھی کی زمین میں دفن ہونے کو تیار ہو جاتا۔ اس کی چوڑیوں کی ایک چھنک اور اس کی پیشانی کی ایک جھلک کے لیے میں اپنے جسم میں سیکڑوں کانٹے پرونے کو تیار تھا۔

ایک آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔ کوئی دیہاتی زور سے بولا۔ ''جلدی کرو...... خون نکل رہا ہے۔ ہڈی بھی باہر آرہی ہے۔''

ایک دوسرا بولا۔ ''پیلی (کھیت) کے اندر سے ہی نکل چلو۔''

میں نے مڑ کر دیکھا۔ سات آٹھ افراد تیز قدموں سے چلے آرہے تھے۔ انہوں نے لکڑی کی ایک کرسی اٹھا رکھی تھی۔ کرسی پر کوئی لہولہان حالت میں پڑا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا، یہ تاجور کا دعویدار اسحاق تھا۔ لگتا تھا کہ کچھ لوگوں نے اس کی خوب ٹھکائی کی ہے۔ اس کے چہرے پر نیلگوں ابھار تھے۔ سر پھٹا ہوا تھا اور ایک بازو شاید ٹوٹ گیا تھا۔ اندازہ ہوا کہ یہ لوگ اسے پہلوان حشمت کی طرف لے کر جا رہے ہیں۔

اتنے میں انیق بھی کمرے سے نکل کر میرے پاس آن کھڑا ہوا۔ ''سبحان اللہ!'' اس نے مطمئن انداز میں کہا۔ ''لگتا ہے کہ آپ کی اتاری ہوئی تصویروں نے کام دکھانا شروع کر دیا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ...... اب بات اور آگے بڑھے گی۔'' میں نے کہا۔

''ان شاءاللہ! مجھے تو جیمز بانڈ کی ایک پرانی فلم یاد آنا شروع ہو گئی ہے۔ اس میں شان کونری نے ایسے ہی اپنے دو مخالف گروہوں کو آپس میں لڑا دیا تھا اور خود اپنا مطلب حاصل کر لیا تھا۔''

''یعنی تم مجھے مطلب پرست قرار دے رہے ہو؟''

''توبہ توبہ...... میری یہ جرأت؟'' اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ''ہم جنگ لڑ رہے ہیں اور جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔ دشمن کی کمزوری اپنی طاقت بنتی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اسحاق کی یہ حالت مقتول پرویز کے سسرالیوں نے بنائی ہے اور اس سے اصل بات اگلوالی ہے۔''

اسی دوران میں حق نواز بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس کے آنے سے پہلے ہی ہم دونوں خاموش ہو گئے تھے۔ حق نواز کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ اس کو ابھی اسحاق کے زخمی ہونے کی خبر نہیں ملی۔ وہ ٹوانوں کی حویلی اور احاطے میں نظر آنے والی ہلچل کی بات کر رہا تھا۔ کہنے لگا۔

''مجھے کوئی گڑ بڑ والی گل لگ رہی ہے انیقے! شاید تحصیل دار کی حویلی میں کوئی جھگڑا ہوا ہے۔ وہاں تین چار تانگے آئے ہیں۔ ان میں سے بری بری شکلوں والے بندے اترے ہیں۔ ان میں بہت سوں کے پاس ہتھیار بھی ہیں۔ ہلچل کا پتا چل رہا ہے۔''

انیق نے پوچھا۔ ''کیا تحصیل دار کی کسی سے دشمنی وغیرہ بھی ہے؟''

''چھوٹی موٹی دشمنیاں تو ہوتی ہی ہیں۔ بڑی دشمنی تو اسی بندے سے ہوسکتی ہے جس نے تحصیل دار کی بہن کو بیوہ کیا ہے۔ میرا مطلب ہے پرویز کو قتل کرنے والا سجاول سیالکوٹی۔ ہوسکتا ہے کہ ان لوگوں کو سجاول سیالکوٹی کا کوئی کھوج کھرا لگ گیا ہو اور اب وہ اس پر ہلا بولنے جارہے ہوں۔''

وہ بے چارہ نہیں جانتا تھا کہ سیالکوٹی کا کھوج ملنا اتنا آسان نہیں، ہاں سیالکوٹی کے کچھ ساتھیوں کا پتا ٹوانوں کو چل گیا ہے اور وہ ساتھی اس گاؤں کے کرتا دھرتا عالمگیر وغیرہ ہی ہیں۔

انیق نے حق نواز سے کہا۔ ''حشمت پہلوان کی طرف جاؤ۔ وہاں کچھ لوگ زخمی ساتے کو لے کر گئے ہیں۔ پتا کرو کیا ہوا ہے اس کے ساتھ۔''

حق نواز کی واپسی پندرہ بیس منٹ کے بعد ہوئی۔ اس نے حیرت زدہ لہجے میں بتایا۔

''بڑی بری خبریں ہیں۔ تحصیل دار صاحب اور ان کے دو ساتھی فجر کے وقت ساتے کو اس کے گھر سے اٹھا کر لے گئے تھے۔ اپنے ڈیرے پر جا کر انہوں نے اس کی بڑی چنگی مرمت کی ہے۔ پتا نہیں کہ کس طرح کا شک تھا ان کو اس پر۔ عالمگیر کے دو ملازم ساتے کو چھڑانے کے لیے ڈیرے پر گئے تو ان کو بھی چپیڑیں ماری گئیں۔

اچانک گاؤں کے وسطی حصے کی طرف سے فائرنگ کی زوردار آواز آئی۔ یہ آٹومیٹک رائفل کا ایک کڑاکے دار برسٹ تھا۔ پرندے درختوں سے اڑ گئے۔ میرے عین سامنے سے دو بکریاں بدک کر کھیتوں میں گھس گئیں۔ رائفل کے پہلے برسٹ کے بعد چند سنگل فائر ہوئے اور پھر ایک دم جیسے کسی سیلاب کا بند ٹوٹ گیا۔ اندھا دھند فائرنگ ہونے لگی۔ چھوٹے بڑے ہتھیار آزادانہ استعمال ہورہے تھے۔

''یا اللہ خیر!'' ملازم حق نواز نے ڈرے ڈرے لہجے میں کہا۔

اس دوران میں حق نواز کی بیوی نذیراں بھی چلاتی ہوئی باہر نکل آئی۔ ''ہائے میں مر گئی، ہائے ربا، کیا وہ مرن جوگے پھر آگئے ہیں؟'' اس کا دھیان یقیناً ڈاکوؤں کے حملے کی طرف چلا گیا تھا۔

چار پانچ مسلح گھڑ سوار انتہائی تیزی سے گھوڑے بھگاتے عالمگیر کے ڈیرے کی طرف

سے آئے اور گاؤں میں داخل ہو گئے۔ ان کے عقب میں ایک تیز رفتار ٹریکٹر ٹرالی اچھلتی کودتی آ رہی تھی۔ اس میں بھی دس پندرہ افراد سوار تھے۔ کچھ کے ہاتھ میں رائفلیں اور کچھ کے ہاتھ میں کلہاڑیاں تھیں۔ یہ لوگ بھی گھڑ سواروں کے پیچھے لپکتے ہوئے گاؤں کے وسطی حصے کی طرف بڑھ گئے۔

میں نے معنی خیز نظروں سے انیق کی طرف دیکھا۔ وہی ہو رہا تھا جس کی توقع تھی۔ دفعتاً ایک خوفناک دھماکا ہوا اور زینب گرتے گرتے بچی۔ آواز اتنی شدید تھی کہ ایک گھوڑی رسا تڑا کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ یہ دھماکا ڈیرے سے صرف سو ڈیڑھ سو قدم کے فاصلے پر سنائی دیا تھا۔ یہ دستی بم کا دھماکا تھا۔ میں نے بہت سی دھول اور گرد و غبار فضا میں بلند ہوتے دیکھا۔ اس گرد و غبار میں کسی ٹوٹے ہوئے دروازے یا کھڑکی وغیرہ کے ٹکڑے بھی تھے۔ دھماکے کے فوراً بعد تابڑ توڑ فائرنگ ہونے لگی۔ میں نے رسا تڑانے والی گھوڑی کو گرتے اور تڑپتے ہوئے دیکھا۔ مطلب تھا کہ لڑائی کا دائرہ پھیل رہا ہے۔ ہم لپک کر کمرے کے اندر چلے گئے۔

پورے گاؤں میں تہلکہ سا مچا ہوا تھا۔ قریبی میدان میں کچھ بچے ربڑ کی گیند سے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ وہ بھی ڈر کر بھاگے۔ یقیناً ان میں سے بہت سوں نے یہی سمجھا تھا کہ شاید پھر سیالکوٹی کے گھڑ سواروں نے ہلا بول دیا ہے۔ بچوں کا ڈر کر چاروں طرف بھاگنا اور چلانا ایک دلدوز منظر تھا۔ ایک بچے کی ٹانگ میں گولی لگی مگر ایک بڑی عمر کا لڑکا اسے سہارا دے کر گھسیٹتا ہوا ایک گھر میں گھس گیا۔

فائرنگ مسلسل جاری تھی۔ حق نواز نے دہشت زدہ آواز میں کہا۔ ”سمجھ نہیں آ رہی کہ اس گاؤں میں کیا ہو رہا ہے۔“

انیق نے پُرخیال لہجے میں کہا۔ ”لگتا ہے دونوں طرف کے لوگ مورچہ بند ہو کر فائرنگ کر رہے ہیں۔ پولیس کہیں نظر نہیں آ رہی۔“

”ایسے موقعوں پر یہاں کی پولیس نظر آتی بھی نہیں۔ یہ پولیس تو ہم جیسے غریبوں کو چھتر مارنے کے لیے رہ گئی ہے۔“

فائرنگ کا دائرہ بڑھتا جا رہا تھا۔ لوگ گھروں میں دبک کر رہ گئے تھے۔ جو کھیتوں کھلیانوں میں تھے، انہوں نے وہیں پر دبکے رہنے میں عافیت سمجھی تھی۔ اسی دوران میں دستی بموں کے دو اور زوردار دھماکے ہوئے۔ ان دھماکوں کے فوراً بعد کہیں آگ لگ گئی، گاڑھا سیاہ دھواں فضا میں بلند ہونے لگا۔ ہم نے دیکھا گاؤں کی طرف سے دو زخمی افراد دوڑتے ہوئے کھیتوں کی طرف آئے لیکن ابھی وہ ہمارے ڈیرے سے کافی دور تھے کہ ان کے عقب

میں تین مسلح افراد نمودار ہوئے۔ انہوں نے ٹرپل ٹو اور سیون ایم ایم رائفلوں سے بے دریغ برسٹ چلائے۔ ایک زخمی تو جان بچا کر کھیتوں میں گھس گیا دوسرا وہیں مردہ گھوڑی کے پاس گر کر ڈھیر ہو گیا۔ مرنے والا عالمگیر کے ساتھیوں میں سے تھا۔ اب اس بات میں شک شبے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ مقتول پرویز کے سسرالی اور عالمگیر کا گروہ پوری شدت کے ساتھ ایک دوسرے سے ٹکرا گئے ہیں۔

اچانک مجھے کہیں پاس سے کسی بچے کے رونے چلانے کی آوازیں آئیں۔ انیق اور حق نواز نے بھی یہ آوازیں سن لیں۔

''لگتا ہے آواز سامنے والے کنویں سے آرہی ہے۔'' حق نواز نے کہا۔

''کون ہو سکتا ہے؟'' انیق نے پریشانی ظاہر کی۔

''شاید بھاگتے ہوئے کوئی بچہ کنویں میں گر گیا ہے۔''

بچہ مسلسل دلدوز انداز میں چلا رہا تھا۔ ''ہمیں اس کی مدد کرنی چاہیے۔'' انیق نے کہا۔

''لیکن کیسے؟'' سامنے فائرنگ ہو رہی ہے۔'' حق نواز بولا۔

کچھ دیر بعد بچہ خاموش ہو گیا۔ یوں لگا جیسے وہ بے ہوش ہو گیا ہے لیکن ایسا نہیں تھا، کچھ دیر بعد وہ پھر چلانے لگا۔ اچانک میرے پورے جسم میں ایک تیز سنسناہٹ دوڑ گئی۔ مجھے لگا یہ آواز میرے لیے نئی نہیں ہے۔ یہ تاجور کے چھوٹے بھائی کی آواز ہے۔ اگلے دو چار منٹ میں میرا یہ شک یقین میں بدل گیا۔ کنویں میں گرنے والے بچے کی مدد کرنے کے لیے میں پہلے ہی پر تول رہا تھا مگر اب مجھے فیصلے تک پہنچنے میں بالکل بھی دیر نہیں لگی۔ انیق بھی میرے تاثرات سے جان گیا کہ میں کچھ کہنا یا کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے حق نواز سے کہا۔ ''نواز بھائی! اپنی دونوں بکریوں کو اندر باندھ دو۔ کہیں گھوڑی کی طرح ان کے ساتھ بھی کوئی مسئلہ نہ ہو جائے۔''

حق نواز باہر نکلا تو میں نے سرگوشی میں کہا۔ ''انیق مجھے شک ہو رہا ہے کہ کنویں میں گرنے والا بچہ تاجور کا بھائی چھوٹو ہے۔''

''مگر کرکٹ کھیلنے والے بچوں میں مجھے وہ تو نظر نہیں آیا۔ ان دونوں بھائیوں کو تو گاؤں کے بچے اپنے ساتھ کھیلنے ہی نہیں دیتے۔''

''لیکن...... جو بھی ہے وہ بچہ تو ہے۔ ہمیں مدد کرنی چاہیے۔''

''اس میں تو کوئی دو رائے ہو ہی نہیں سکتیں۔'' انیق نے کہا۔

انیق نے حق نواز سے کہہ کر ایک لمبا رسا منگوا لیا۔ میں کمرے سے نکلا اور پیٹ کے بل رینگتا ہوا کنویں کے کنارے پہنچ گیا، بھینسوں کے لیے استعمال ہونے والے رسے کو گرہ

دے کر لمبا کیا گیا تھا۔ بہر حال اس طویل رسے کی زیادہ ضرورت نہیں پڑی۔ کنویں سے پانی نکالنے کے لیے لوہے کے چوکور ڈبوں کا ایک بیضوی دائرہ سا کنویں کے اندر جاتا تھا۔ پنجابی میں ان ڈبوں کو ٹنڈیں کہا جاتا ہے۔ کنواں چونکہ بند تھا اس لیے ٹنڈوں کا یہ سلسلہ بھی بے حرکت تھا۔ میں نے گہرائی میں جھانکا۔ قریباً پندرہ فٹ نیچے پانی چمک رہا تھا اور اس پانی میں لہولہان بچہ سینے تک ڈوبا ہوا مدد کے لیے پکار رہا تھا۔ یہ چھوٹو ہی تھا۔ اسفند عرف چھوٹو۔

مجھے دیکھ کر اس نے اپنے ننھے منے ہاتھ اوپر اٹھا دیئے اور پورے زور سے پکارا۔

''گونگے بھائی...... گونگے بھائی۔''

میں نے اوندھے لیٹے لیٹے ہاتھوں کے اشارے سے اسے تسلی دی اور آہنی ڈبوں کی لڑی کا سہارا لیتے ہوئے نیچے اترا، میرا حوصلہ اور اطمینان دیکھ کر اسفند کی دہشت میں بھی تھوڑی سی کمی واقع ہوئی۔ میں جونہی نیچے پہنچا وہ مجھ سے کسی چھپکلی کی طرح چمٹ گیا۔ زیادہ چوٹ اس کے ایک پاؤں اور سر پر آئی تھی۔ پانی یخ بستہ تھا۔ وہ خوف اور سردی کی وجہ سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس کی شلوار قمیص جسم سے چپک کر رہ گئی تھی۔ میں نے اسے پشت پر سوار کیا اور اشاروں میں سمجھایا کہ وہ اپنی ٹانگیں مضبوطی سے میری کمر کے گرد لپیٹ لے اور بازو گلے میں ڈال لے۔ مزید احتیاط کے طور پر میں نے رسے کا ایک ٹکڑا بھی اپنے اور اس کے گرد کس دیا۔ میں آہنی ڈبوں کے سہارے اوپر چڑھنے لگا تو مجھے پانی میں اسفند کا کرکٹ بیٹ تیرتا نظر آیا۔ میں نے وہ بھی اٹھا کر رسے کی بندش میں اڑس لیا۔

فائرنگ کی خوفناک آوازیں قرب و جوار کو مسلسل لرزہ رہی تھیں۔ میرے خیال میں کنویں سے نکلنا اتنا مشکل نہیں تھا جتنا نکل کر ڈیرے کے کمرے تک پہنچنا۔ بہر حال یہ دونوں کام خوش اسلوبی سے ہو گئے۔ کنویں سے نکل کر میں نے نرم و نازک اسفند کو اپنی اوٹ میں لیا اور جھک کر بھاگتا ہوا چار دیواری تک پہنچ گیا۔ انیق نے ہم دونوں کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔

اسفند عرف چھوٹو مسلسل رو رہا تھا۔ ہم نے اسے چار پائی پر لٹایا۔ اس کا پاؤں بری طرح چھل گیا تھا اور اس میں سخت قسم کی موچ بھی آ گئی تھی۔ کنویں کا آہنی ڈبا لگنے کی وجہ سے اس کے سر پر بھی گہری چوٹ آئی تھی اور خون رِس رہا تھا۔ انیق نے چولھے کی راکھ سے سر کے زخم کا خون بند کیا۔ میں نے پاؤں پر پٹی باندھی۔ وہ مسلسل باجی اور امی کو پکار رہا تھا۔ یقینی بات تھی کہ اس کے گھر والے بھی سخت پریشان ہوں گے۔

انیق نے حق نواز سے کہا۔ ''دین محمد صاحب کو اطلاع دینا بہت ضروری ہے۔ وہ بہت پریشان ہوں گے۔''

"لیکن باہر کیسے نکلا جائے۔ ہر طرف گولیاں چل رہی ہیں۔" حق نواز نے کہا۔

"میں شہر سے ایک موبائل فون لایا ہوں اور میرا خیال ہے کہ دین محمد صاحب کے پاس بھی ایک فون ہے۔ اس پر کوشش کر کے دیکھتے ہیں۔" انیق نے کہا۔

"ہاں مالک کے فون کا نمبر تو میں نے ادھر دیوار پر لکھا ہوا ہے۔" حق نواز نے بتایا۔

انیق اور حق نواز نے کوشش کی۔ قسمت اچھی تھی، وہ رابطہ کرنے میں کامیاب رہے۔ دوسری طرف سے تاجور نے ہی بات کی۔ وہ یقیناً رو رہی تھی۔ باقی گھر والوں کا بھی بہت برا حال تھا لیکن جب انیق نے انہیں بتایا کہ اسفند بالکل خیریت سے ہے اور ڈیرے پر ہمارے ساتھ ہے تو ان کی جان میں جان آئی۔

وہ بڑی پُرخطر شام تھی۔ چاندگڑھی میں جیسے غیر اعلانیہ کرفیو لگ گیا تھا۔ گاہے بگاہے فائرنگ کی آواز بھی آنے لگتی تھی۔ خبریں آ رہی تھیں کہ دونوں طرف کے لوگ مورچا بند ہیں اور کم از کم آٹھ افراد ہلاک ہو چکے ہیں۔ ان میں سے تین چار لاشیں ابھی تک کھلی جگہ پر پڑی تھیں اور کسی کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ آگے بڑھ کر انہیں اٹھائے۔ ان میں سے ایک لاش عالمگیر کے اسی ساتھی کی تھی جسے تحصیل دار ٹوانہ کے ساتھیوں نے ٹرپل ٹو رائفل کا برسٹ مارا تھا۔ یہ سب کچھ دہلا دینے والا تھا۔

اسفند متواتر درد سے کراہ رہا تھا اور باجی کے پاس جانے کی ضد کر رہا تھا۔ رات تک اسے تیز بخار بھی ہو گیا۔ میں مسلسل اس کی تیمارداری میں لگا ہوا تھا۔ میں نے اسے پین کلر کھلائی اور اس کے ماتھے پر ٹھنڈی پٹیاں رکھیں۔ تاجور کا فون دو دفعہ مزید آیا۔ وہ اسفند سے بات کرنا چاہتی تھی۔ انیق نے ایک دفعہ اسفند سے اس کی تھوڑی سی بات کرائی اور پھر میرے اشارے پر کال منقطع کر دی۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ اسفند تفصیل سے اپنی تکلیف کا ذکر کر کے گھر والوں کو مزید پریشان کرے۔ اس بے چارے کا پاؤں سوج کر کپا ہو گیا تھا۔ اور سر کا زخم بھی تکلیف دے رہا تھا۔ وہ نیم غنودگی میں گاہے بگاہے بڑبڑانے لگتا تھا۔ "ڈاکو آ گئے، گولی ماردیں گے...... گولی ماردیں گے......"

رات گئے پولیس کی بھاری نفری تین چار گاڑیوں پر چاندگڑھی پہنچ گئی۔ پولیس کی آمد سے ذرا پہلے شدید فائرنگ ہوئی لیکن پھر یہ سلسلہ رک گیا۔

○......❖......○

صبح حالات کچھ بہتر نظر آئے۔ وہ لاش بھی ہٹائی جا چکی تھی جو کل ہمیں کھڑکی سے نظر آ رہی تھی۔ اسفند کو پاؤں کی چوٹ سخت تکلیف دے رہی تھی۔ انیق گیا اور پہلوان حشمت کو بلا

لایا۔ پہلوان کے پاس گاؤں کے بارے میں تازہ ترین خبریں موجود تھیں۔ اس نے کہا۔
"عالمگیر اور صولت ٹوانہ دونوں گرفتار ہو گئے ہیں۔ دونوں طرف کے پندرہ بیس اور بندے بھی گرفتار ہوئے ہیں۔ پولیس نے دونوں طرف کے لوگوں کے ہتھیار بھی جمع کر لیے ہیں۔ یہ کوئی معمولی بات ناہیں ہے۔ دونوں پارٹیوں کے آٹھ بندے جان سے گئے ہیں۔ زخمی ہونے والے بھی بیس کے لگ بھگ ہیں۔ سچ کہوت ہیں بھیا! خدا کی "تلوار" بے آواز ہووت ہے۔"
"لیکن...... یہ ہوا کیسے حشمت بھائی؟" انیق نے انجان بن کر پوچھا۔
"جب لوگ طاقت کے نشے میں حد سے بڑھ جاوت ہیں تو پھر کچھ نہ کچھ تو ہووت ہی ہے۔ عالمگیر اور ٹوانہ دونوں اپنے اردگرد کے لوگوں کو کیڑوں مکوڑوں کی طرح سمجھتے ہیں۔ اب یہ آپس میں ہی بھڑ بیٹھے ہیں۔"
"مگر یہ سب ہوا کیسے حشمت بھائی، کوئی وجہ تو بنی ہوگی؟"
"یہ سب یاسر احمد کا کیا ہوا ہے۔" حشمت نے بڑے معاملہ فہم انداز میں کہا۔
"یاسر احمد؟ یہ کون ذات شریف ہیں؟" انیق نے پوچھا۔
"تم اس گاؤں کے ناہیں ہو، اس لیے اسے ناہیں جانت ہو۔ پورا گاؤں اس کو جانت ہے۔ کھاتے پیتے زمیندار گھر کا ہے۔ بڑا جی دار بندہ ہے۔ کچھ عرصہ فوج میں بھی رہا ہے۔"
"اس نے کیا کیا ہے حشمت بھائی؟"
"آج کل جو کچھ یہاں چاند گڑھی میں ہو رہا ہے، وہی کر رہا ہے۔ پہلے تو لوگوں کو صرف شک تھا پر اب یقین ہو گیا ہے۔ اس نے رام پیاری اور وکرم کی جان مارواڑیوں سے بچائی تھی۔ اپنے پلے سے رقم دے کر مولوی جی کی بچی کو شہر بھی اسی نے بھجوایا ہے۔ اب عالمگیر اور ٹوانہ کا بیڑا غرق بھی وہی کر رہا ہے۔"
"آ...... آپ اس کالی پگڑی والے کی بات کر رہے ہیں؟" انیق نے ذرا حیران ہو کر پوچھا۔
حشمت نے اپنا تربوز جیسا سر بڑے یقین کے ساتھ اثبات میں ہلایا۔ "یہ یاسر ہی ہے۔ سو فیصد یاسر ہی ہے۔ کوئی ایک سال ہو گیا ہے وہ گاؤں سے غائب ہو گیا تھا مگر سب جانت تھے کہ وہ گاؤں کے آس پاس ہی کہیں ہے اور گاؤں کے حالات کے بارے میں خبر رکھت ہے۔"
انیق نے کن انکھیوں سے میری طرف دیکھا۔ میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ میں نے جو کچھ کیا تھا، اس کا کریڈٹ یہاں کسی یاسر نام کے بندے کو دیا جا رہا تھا۔ بہر حال مجھے

اس سے کوئی فرق پڑنے والا نہیں تھا۔ میں جو کچھ کر رہا تھا بے لوث کر رہا تھا اور اس کے پیچھے صرف ایک ہی مقصد تھا اور وہ یہ کہ تاجور کی مشکلات ختم ہو جائیں۔

یاسر نامی اس بندے کے بارے میں انیق نے پہلوان حشمت سے تفصیل پوچھی تو اس نے اپنے مخصوص انداز میں جو کچھ بتایا وہ مختصراً یوں تھا۔ ایف اے میں فیل ہو جانے والے ایک لڑکے نے اپنے باپ کی جمع پونجی سے گاؤں میں ہی کریانے کی ایک دکان کھولی تھی۔ اس نے دن رات محنت کر کے یہ دکان چلالی۔ چاند گڑھی کے باہر سے بھی لوگ اس کے پاس سودا سلف لینے کے لیے آنے لگے۔ اسی دوران میں عالمگیر کے کچھ چمچوں نے بالے نامی اس لڑکے کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ وہ اس کی دکان سے مفت بوتلیں اور سگریٹ وغیرہ پینے لگے۔ بالا پہلے تو برداشت کرتا رہا لیکن جب کام حد سے بڑھا تو اس نے بڑی عاجزی کے ساتھ دبے لفظوں میں منع کر دیا۔ عالمگیر کے چمچے انکار سننے کے عادی ہی نہیں تھے۔ انہوں نے بالے کو بری طرح مارا پیٹا اور یہیں پر بس نہیں ہوا۔ اس بے چارے کو حکم دیا کہ اب وہ خود بوتلیں اور سگریٹ وغیرہ ڈیرے پر پہنچایا کرے۔ لوگوں نے بالے کو سمجھایا کہ وہ چوں و چرا نہ کرے۔ اسی میں اس کی خیریت ہے مگر ہونی ہو کر رہتی ہے۔ ایک دن بالے کو پھر کسی بات پر عالمگیر کے چمچے ساتے کا تھپڑ سہنا پڑا۔ وہ آنسو بہاتا ہوا یاسر کے پاس پہنچا۔ بالے کی ماں یاسر کے گھر میں برتن وغیرہ دھوتی تھی۔ یاسر بھی اس سارے معاملے سے باخبر تھا۔ وہ آگ بگولا ہو کر اٹھا اور بالے کے ساتھ عالمگیر کے ڈیرے پر پہنچا۔ اس روز وہاں زبردست لڑائی ہوئی۔ چاقو چلے اور فائرنگ بھی ہوئی۔ یاسر نے مفت خوری کرنے والے ایک چمچے کی دونوں ٹانگیں توڑ دیں۔ ایک چمچہ جان بچانے کے لیے بھاگا اور چھت سے کود گیا۔ بھینسوں کے لیے گاڑا گیا ایک کھونٹا اس کے سینے میں لگا اور وہ وہیں دم توڑ گیا۔ مرنے والا پورے گاؤں کے لیے ایک ولن کی طرح تھا۔ بہرحال یہ قتل کا کیس بن گیا تھا۔ یاسر، بالے سمیت موقع سے فرار ہو گیا اور وہ اب تک فرار ہی تھا۔

یہ رُوداد سنگین اور دلچسپ تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ چاند گڑھی والے دل ہی دل میں یاسر نامی اس بندے کے کردار کو سراہتے ہیں۔ اب ان میں سے اکثر یہ سوچنے لگے تھے کہ چاند گڑھی میں ڈھاٹے والا جو شخص نظر آ رہا ہے وہ ہو نہ ہو یاسر ہی ہے۔

پہلوان حشمت نے کہا۔ ''جہاں تک میری ''سی آئی ڈی'' کام کرت ہے، یاسر نے بڑی ہوشیاری سے سجاول سیالکوٹی اور عالمگیر کی کچھ تصویریں اتاری ہیں۔ ان تصویروں میں وہ دونوں اکٹھے موج میلہ کر رہے ہیں۔ اس موج میلے سے یہ بات ثابت ہووت ہے کہ دونوں

میں ملی بھگت ہے اور پرویز کا قتل بھی اسی ملی بھگت کی وجہ سے ہوا ہے۔ اب پرویز کے سسرالی پنجے جھاڑ کر عالمگیر پر چڑھ دوڑے ہیں۔''

ہماری گفتگو جاری ہی تھی کہ دین محمد صاحب وہاں پہنچ گئے۔ اسفند چارپائی پر سویا ہوا تھا۔ دین محمد نے اسے سینے سے لگایا، چوما۔ وہ اس کی چوٹیں دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ حشمت نے اسفند کے پاؤں کی بڑی اچھی طرح مرہم پٹی کر دی تھی۔ اس نے کہا۔ ''بھائی دین محمد! آپ گھبرائیں نہیں، ہڈی کو کچھ ناہیں ہوا۔ فقط ٹخنے میں موچ آئی ہے۔ ان شاء اللہ تین چار پٹیوں میں بالکل ٹھیک ہو جاوے گا، سر کا زخم بھی اب بہتر ہے۔''

''لیکن...... لیکن یہ چوٹیں اسے لگیں کس طرح؟'' دین محمد نے پوچھا۔

انیق نے میری طرف دیکھا پھر مؤدب انداز میں بولا۔ ''مالک! اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اسفند کو کچھ زیادہ نقصان نہیں پہنچا۔ یہ کنویں میں گر گیا تھا۔''

''کنویں میں؟'' دین محمد کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔

''جی مالک۔'' حق نواز نے کہا۔ ''جب گولیاں چلنا شروع ہوئیں تو میدان میں کھیڈنے والے منڈے ڈر کر بھاگے، اپنا اسفند بھی بھاگا اور کیچڑ میں پھسل کر اندر گر گیا۔''

دین محمد نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا پھر لرزاں آواز میں بولے۔ ''پھر نکلا کس طرح؟''

حق نواز نے میری طرف دیکھا اور ساری رُوداد کہہ سنائی۔ بتایا کہ کس طرح میں فائرنگ کے دوران میں کنویں تک گیا اور اسفند کو نکالا۔

دین محمد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ انہوں نے بے ساختہ آگے جھک کر مجھے اپنے ساتھ لگایا اور میرا سر چوما پھر انہوں نے دوبارہ اسفند کو اپنے ساتھ لپٹایا اور اس کی پیشانی اور گالوں پر بوسے دینے لگے۔

وہ اور حق نواز زخمی اسفند کو گود میں اٹھا کر گھر لے گئے۔

O......❖......O

میں اور حشمت وہیں ڈیرے پر رہے۔ انیق اور حشمت میں گاؤں کے بدلے ہوئے حالات کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی۔ حشمت کا خیال تھا کہ عالمگیر اور اس کے قریبی ساتھیوں کے گرفتار ہونے سے عام لوگوں کا خوف کم ہوا ہے اور اب ہو سکتا ہے کہ مولوی جی کے حادثے والے معاملے پر بھی بات ہونے لگے...... اور غائب ہو جانے والے مؤذن لڑکے کا کھوج بھی سرگرمی سے لگایا جائے۔

پہلوان حشمت کا یہ قیافہ چوتھے پانچویں دن بالکل درست ثابت ہو گیا۔ اس دن مولوی جی کی نوجوان بیوہ پروین شہر سے گاؤں آئی تھی۔ بچی زینب ابھی تک اسپتال میں داخل تھی اور اس کا علاج بڑی کامیابی سے جاری تھا۔ پروین اپنا اور بچی کا کچھ سامان وغیرہ لینے کے لیے ایک دن کے لیے آئی تھی۔ دوپہر کو میں ٹریکٹر کا ڈیزل لینے کے لیے ڈپو کی طرف گیا تو مسجد کے قریب شور سنائی دیا۔ نئے امام صاحب کے علاوہ دیگر کئی افراد بھی دروازے کے قریب جمع تھے۔ ایک چادر پوش عورت بلند آواز میں بول رہی تھی۔ میں ٹریکٹر سے اتر کر موقع پر پہنچا۔ عورت کی صرف پیشانی اور آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ لیکن میں نے پہچان لیا۔ وہ مولوی جی کی بیوہ ہی تھی۔ وہ ہیجانی انداز میں چلا رہی تھی۔ ''میں اللہ کے گھر کے سامنے کھڑے ہو کر کہہ رہی ہوں، زینب کا یہ حال کرنے والا وہ خبیث عالمگیر ہے۔ اسی ظالم نے مولوی جی کی جان لی ہے...... اسی نے لی ہے۔''

اس کی آواز بیٹھ گئی لیکن وہ اپنے جسم کی پوری قوت جمع کر کے چلاتی رہی۔ ''وہی ہے مجرم۔ مولوی جی نے ایک دن پہلے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ جانور ہے درندہ ہے۔ وہ زینب کو نشہ پلاتا رہا ہے۔ اس کے ساتھ بری حرکتیں کرتا رہا ہے۔ اس بدبخت کو اللہ نے موقع نہیں دیا، ورنہ پتا نہیں وہ کیا کر گزرتا، اپنا بھید کھلنے کے ڈر سے اس نے مولوی جی کی جان لی ہے۔ میں اس کے خلاف گواہی دوں گی، ہر جگہ گواہی دوں گی۔''

وہ پکار رہی تھی اور اس کی آواز جیسے پورے چاند گڑھی میں گونج رہی تھی۔ امام صاحب نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور اسے سنبھالنے کی کوشش کی۔ ''ہمیں تمہارے ساتھ پوری ہمدردی ہے بیٹی...... لیکن الزام کے ساتھ ثبوت بھی چاہیے ہوتے ہیں۔''

''ہیں میرے پاس ثبوت۔ ڈاکٹروں نے پوری رپورٹ دی ہے۔ زینب کو جو نشہ دیا جاتا رہا ہے، اس میں سانپوں کا زہر ہے اور یہ پیر ولایت کی کارستانیاں ہیں۔ میں اس کے خلاف بھی پرچہ کٹواؤں گی اور زینب سے بڑا ثبوت اور کیا ہو گا۔ وہ خود گواہی دے گی اس بدبخت عالمگیر کے خلاف۔''

لوگ چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ سرگوشیوں میں بات کر رہے تھے۔ ان کے چہرے بتا رہے تھے کہ ان میں سے زیادہ تر پروین کے ہمنوا ہیں۔ اس کی بات کو درست سمجھ رہے ہیں۔ چاند گڑھی کے لوگوں پر سے جمود ٹوٹنا شروع ہو گیا تھا۔ ان کے دل کی آوازیں، ان کے ہونٹوں تک پہنچنا شروع ہو گئی تھیں۔ جمود ایسے ہی ٹوٹا کرتے ہیں، خوف کے سناٹے ایسے ہی سمٹا کرتے ہیں۔ جب جبر و ستم کی سیاہ چٹان میں دراڑیں پڑتی ہیں تو عوامی غیظ و غضب کا

سیلابی پانی اسی طرح ان دراڑوں میں گھستا ہے اور چٹان کو ٹکڑوں میں بانٹ دیتا ہے۔

اس شام میں نے خود کو بے حد پُرسکون محسوس کیا، اسی گلابی شام میں، میں سبز کھیتوں کے کنارے کنارے دور تک چلتا گیا۔ پرندوں کی چہکاریں، مویشیوں کے گلے کی گھنٹیاں، رہٹ کی آوازیں، میرے کانوں میں کسی موسیقی کی طرح گونجتی رہیں۔ میں نے دل ہی دل میں کہا...... اے کوپن ہیگن والو...... مشینوں کے شور اور گاڑیوں کے دھوئیں میں زندہ رہنے والو! آؤ میرے دیس کی اس خوش رنگ شام کو دیکھو اور محسوس کرو۔ زندگی کا اصل حسن کہاں ہے۔ تمہارے نائٹ کلبوں کے تھرکتے جسموں میں یا اس پگڈنڈیوں پر قطار میں جاتی ہوئی دیہاتی دوشیزاؤں کے لہراتے آنچلوں میں؟

آج میں تاجور کی طرف سے بھی بہت مطمئن تھا۔ اس کا دعویدار اسحاق عرف ساقا، صولت ٹوانہ کے ہاتھوں شدید زخمی اور ذلیل ہو کر اسپتال میں پڑا تھا اور اس کی ''شادی خانہ بربادی'' کا دور دور پتا نہیں تھا۔ یہ بات بھی عین ممکن تھی کہ وہ عالمگیر کے ساتھ ہی مولوی جی کے قتل والے کیس میں پھنس جاتا۔ یہ لوگ وہی کچھ کاٹ رہے تھے جو انہوں نے بویا تھا۔

رات کا کھانا شام کے ایک گھنٹے بعد ہی کھا لیا جاتا تھا۔ ڈیرے کے کمرے میں لالٹین کی روشنی تھی۔ میں، انیق، سونگی اور حق نواز اکٹھے ہی کھانا کھا رہے تھے۔ آلو گوبھی کا چٹ پٹا سالن تھا۔ ساتھ میں دودھ کی نمکین لسی تھی۔ حق نواز کی بیوی نذیراں گرم گرم روٹیاں اتار کر لا رہی تھی۔ کھانے کے ساتھ ساتھ دوپہر والے واقعے پر بھی بات ہو رہی تھی اور مولوی جی کی بیوہ کی انکشاف انگیز باتوں پر تبصرہ ہو رہا تھا۔ سونگی نے بڑا سا لقمہ منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''ویسے اب تو سب کو یقین ہوتا جا رہا ہے کہ پنڈ میں یہ جو سکھ کی ہوا چلی ہے اس میں یاسر بھائی کا ہاتھ بھی ہے۔ بڑا جی دار بندہ ہے۔ لوگ پہلے ہی کہتے تھے کہ وہ کہیں گیا نہیں۔ پنڈ کے آلے دوالے ہی ہے اور یہاں کی اونچ نیچ پر پوری نظر رکھے ہوئے ہے۔

حق نواز نے کہا۔ ''ہاں، پڑھا لکھا منڈا ہے۔ مولوی جی وچارے تو یہی سمجھ رہے تھے کہ بچی پر سایہ وغیرہ ہے۔ یہ اسی نے مولوی جی کو شہر کا رستہ دکھایا تھا۔ اب تو یہ گل ثابت ہو گئی ہے نا۔''

سونگی نے کچی لسی کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ ''کیا پتا اب وہ کھل کر سامنے بھی آ جائے۔ عالمگیر تو اب اتنی جلدی باہر نہیں نکلے گا۔''

اسی دوران میں دین محمد صاحب کے کھنکھارنے کی آواز سنائی دی۔ ہم سب ذرا سنبھل کر بیٹھ گئے۔ دین محمد صاحب اندر داخل ہوئے اور میری طرف دیکھ کر اشارے سے بولے کہ ''چلو۔''

میں سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔انہوں نے اشاروں سے مجھے، بتایا کہ گھر جانا ہے۔ اشاروں کے ساتھ ساتھ وہ وضاحت کے لیے بول بھی رہے تھے۔ کہنے لگے۔
''چھوٹو کا بخار نہیں اتر رہا۔ بے ہوشی میں بار بار تمہارا نام لے رہا ہے۔ کہہ رہا ہے کہ گونگے بھائی جان کو بلاؤ۔تم دیکھ بھال کرتے رہے ہونا اس کی......''
میں دین محمد صاحب کی ساری باتیں سن رہا تھا لیکن ظاہر یہی کیا جیسے ان کے اشاروں سے بس تھوڑا بہت ہی سمجھ پا رہا ہوں۔ اسفند قریباً چوبیس گھنٹے میرے پاس رہا تھا۔ وہ پہلے بھی مجھ سے انسیت محسوس کرتا تھا، میری تیمارداری نے اسے مجھ سے مزید مانوس کر دیا تھا۔ یہ میرے لیے خوش آئند بات تھی۔
میں دین محمد صاحب کے ساتھ گھر روانہ ہو گیا۔ وہ مجھے سیدھا اسی اندرونی کمرے میں لے گئے جہاں اسفند چارپائی پر نیم بے ہوش لیٹا تھا۔ اس کا پاؤں کافی سوجا ہوا تھا۔ پہلوان حشمت ابھی ابھی اس کی پٹی بدل کر گیا تھا۔ لالٹین کی روشنی میں جو کمزور عورت اس کے سرہانے بیٹھی تھی، وہ اس کی والدہ تھی۔ میں آج انہیں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ عمر پینتالیس سے اوپر ہی رہی ہو گی۔ چہرے پر بیماری کی نقاہت تھی۔ تاہم بیٹے کو تکلیف میں دیکھ کر وہ اپنی تکلیف بھول چکی تھیں۔ مجھے حیرانی ہوئی جب انہوں نے اٹھ کر مجھے گلے سے لگایا اور میرا ماتھا چوما۔ پھر فوراً ہی مجھے وجہ بھی سمجھ میں آ گئی۔ میں نے ایک نہایت مشکل وقت میں ان کے بچے کی مدد کی تھی۔ وہ لرزتی آواز میں بولیں۔ ''ہم تمہارا احسان نہیں دے سکتے پتر، تم اسے کھوہ سے باہر نہ نکالتے تو پتا نہیں کیا بیت جاتی اس پر۔''
میں نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر عاجزی کا اظہار کیا اور جیسے خاموشی کی زبان میں بتایا کہ یہ تو میرا فرض تھا۔
انہوں نے پھر میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولیں۔ ''گولیاں چل رہی تھیں پتر، تُو نے اپنی جان کی پروا بھی نہیں کی، کسی بڑی چنگی ماں کا لال ہے تُو۔ اللہ تجھے حیاتی دے۔''
انہوں نے چادر سے اپنے آنسو پونچھے اور اپنے الفاظ کو اشاروں کی زبان سے واضح کرتے ہوئے بولیں۔ ''یہ دوپہر سے بار بار تیرا نام لے رہا ہے۔ اس کے پاس بیٹھ...... اس کو دوا وغیرہ کھلا۔ یہ تجھے دیکھے گا تو اسے بڑا آسرا ملے گا۔''
میں نے نیازمندی سے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ پھر مجھے دعائیں دینے لگیں۔ مجھے کبھی کبھی افسوس بھی ہوتا تھا کہ میں اتنے اچھے اور مہربان لوگوں کو دھوکے میں رکھ رہا ہوں اور خود کو ان کے سامنے بے زبان ظاہر کر رہا ہوں۔ لیکن اب یہ ایک مجبوری بن گئی تھی۔

دفعتاً آہٹ ہوئی۔ دروازے پر تاجور کی صورت میں چاند چمکا۔ اس کے پہلو میں کاکا کھڑا تھا جس طرح چھوٹو کا اصل نام اسفند تھا، اسی طرح کاکے کا اصل نام راحیل تھا۔ تاجور نے ممنونیت بھری آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ میرے ''اظہارِ محبت'' کے بعد یہ پہلی بار تھی کہ وہ مجھے دکھائی دی تھی اور اچھے انداز میں دکھائی دی تھی۔ اس کا یہ انداز دل کی گہرائی میں دور تک اتر گیا مگر ابھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اس نے میری گستاخی پر مجھے معاف کیا ہے یا نہیں۔ وہ اندر آ گئی اور موڑھے پر بیٹھ گئی۔ پورا کمرا جیسے اس کی خوشبو اور روشنی سے بھر گیا۔ یہ پیرس کے کسی مہنگے پرفیوم کی خوشبو نہیں تھی۔ نہ ہی یہ روشنی مصنوعی لائٹس کی تھی، یہ خوشبو اور روشنی اس کی ذات کی سادگی اور پاکیزگی سے ابھرتی تھی۔

ماں نے تاجور کے سامنے ایک بار پھر میرے کندھے پر ہاتھ پھیرا اور تاجور سے مخاطب ہو کر بولیں۔ ''ہمارے لیے تو یہ رحمت کا فرشتہ ہی ثابت ہوا ہے۔ پہلے سیالکوٹی والے واقعے میں اس نے تجھے بچایا اور ان خبیثوں سے لڑ جھگڑ کر تجھے نکال لے گیا۔ اب اس نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر اسفند کو بچایا۔''

تاجور نے اقرار میں سر ہلایا اور ایک بار نرم نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ میں لاتعلق سا بیٹھا تھا جیسے کچھ بھی سن نہیں پا رہا ہوں۔ انہوں نے غور سے میری طرف دیکھا اور بولیں۔ ''دیکھو کتنا سادہ اور معصوم سا ہے لیکن دلیر بھی ہے۔''

سادہ اور معصوم کے الفاظ میرے کانوں میں گونج کر رہ گئے۔ اس بے چاری کو کیا پتا تھا کہ یہ سادہ اور معصوم ڈنمارک اور انگلینڈ جیسے ملکوں میں کیا گل کھلاتا رہا ہے۔ کیسے کیسے ماحول کا حصہ رہا ہے اور اب بھی اگر وہ یہاں آیا ہے تو اس کی بیٹی کی خاطر۔ اس کے عشق میں ڈوب کر۔ اور اس کے ''ارادے'' بہت آگے کے ہیں۔ انہوں نے اشارے کنایوں میں مجھ سے پوچھا کہ میں کہاں کا رہنے والا ہوں اور میرے ماں باپ کہاں ہیں؟

میں نے مبہم سے اشارے دیئے اور بے بسی سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ ذرا تاسف سے بولیں۔ ''کتنا جوان ہے، سوہنا بھی ہے پر اللہ نے زبان نہیں دی۔''

تاجور نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''ہر کام میں اللہ نے کوئی بہتری رکھی ہوتی ہے امی۔ ہو سکتا ہے کہ زبان ہوتی تو اس کا استعمال کیسے کیسے ہوتا۔'' تاجور کی والدہ نے اپنی ناک کو انگلی سے چھو کر مجھ سے پوچھا کہ میری شادی ہوئی ہے یا نہیں؟

میں نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔ تاجور ذرا شوخی سے بولی۔ ''امی، میرا خیال ہے آپ لڑکی ڈھونڈنا شروع کر دیں۔ یہ بھی نیکی کا کام ہوگا۔''

کاکا چمک کر بولا۔ ''امی، بابے نتھے کی دونوں بیٹیاں گونگی ہیں۔ چھوٹی تو شکل کی بھی چنگی ہے۔''

والدہ نے ہاتھ ہلا کر کہا۔ ''چل وے، اتنا سوہنا...... گبرو ہے۔ اس کے لیے وہی رہ گئی ہے۔ یہ دل کا نیک ہے۔ اللہ اس کے لیے بھی چنگا کرے گا۔''

میں نے تاجور کی طرف دیکھا، اتفاقاً تب وہ بھی میری ہی طرف دیکھ رہی تھی، اس نے گڑبڑا کر نظریں جھکا لیں۔ میرے سینے میں میٹھا میٹھا درد ہلکورے لینے لگا۔ اسی دوران میں اسفند کسمسایا اور زور سے کراہ کر پکارنے لگا۔ ''ہائے، امی...... ہائے باجی...... ہائے باجی۔''

تاجور تڑپ کر اس کے سرہانے پہنچی اور اس کے منہ پر ہاتھ پھیر کر اسے پچکارنے لگی۔

''میں یہاں ہوں اسفند...... اور یہ دیکھ...... تیرے گونگے بھائی جان بھی آئے ہیں۔'' اسفند عرف چھوٹو نے پلکیں اٹھائیں۔ اس کی آنکھیں بخار کی حدت سے سرخ ہو رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر طمانیت ابھری۔ تاجور نے مجھے اشارے سے کہا کہ میں اس کے سرہانے بیٹھ جاؤں۔ میں نے بیٹھ کر اس کا سر گود میں رکھ لیا اور اس کا ماتھا دبانے لگا۔ اس نے آنکھیں موند لیں۔

اسی دوران میں دین محمد صاحب کھنکھارتے ہوئے اندر آ گئے۔ ''کہاں گئے تھے؟'' تاجور کی والدہ نے پوچھا۔

''ذرا باہر کی خبر لینے گیا تھا۔'' دین محمد نے کہا۔ ''پھر ذرا توقف سے بولے۔ ''پتا ہے کیا ہوا ہے؟''

تاجور اور اس کی والدہ سوالیہ نظروں سے دین محمد کی طرف دیکھنے لگیں۔ میں نے اپنا چہرہ سپاٹ رکھا اور جوں کا توں بیٹھا رہا۔ ظاہر ہے میں تو ''گونگا بہرا'' تھا۔ دین محمد نے کہا۔ ''پیر ولایت بڑا خچرا نکلا ہے۔ بالکل گرگٹ کی طرح رنگ بدلا ہے اس نے۔ کہتا ہے کہ عالمگیر سے میرا ملنا جلنا ضرور رہا ہے پر ان کی کسی کارستانی سے میرا کوئی تعلق واسطہ نہیں۔ پولیس والے ابھی شام سے پہلے اس کے پاس گئے تھے پوچھ گچھ کے لیے۔ اس نے ان کو بتایا ہے کہ وہ بھی سجاول سیالکوٹی کو اتنا ہی برا سمجھتا ہے جتنا پنڈ کے دوسرے لوگ۔ وہ دن رات سیالکوٹی کے لیے بددعا کرتا ہے اور اپنے پنڈ کی خیر مانگتا ہے۔ اس نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر عالمگیر اور ساقا وغیرہ قصوروار ہیں تو انہیں اس کی سخت سے سخت سزا ملنی چاہیے۔''

''اب تو اس نے ساقے کے ویاہ کی گل نہیں کی ہوگی؟'' تاجور کی والدہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''نہیں، اب کس منہ سے کرے گا۔'' دین محمد نے جواب دیا۔

''اور مولوی جی کی بیٹی کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اس کے بارے میں کیا کہتا ہے وہ؟'' تاجور نے پوچھا۔

''کہتا ہے کہ اس سے بھی میرا کوئی تعلق واسطہ نہیں۔ کہتا ہے کہ سانپوں کے زہر سے بنائی گئی زکام ریشے کی ایک دوائی اس کے پاس ضرور ہے، اگر عالمگیر نے یا کسی اور نے اس دوائی میں کچھ اور ملا کر کوئی نشہ وغیرہ بنالیا ہے تو اس میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔''

کچھ دیر تک دین محمد اپنے اہلِ خانہ کے پاس بیٹھ کر گفتگو کرتے رہے۔ ان کی باتوں سے یہ پتا بھی چلا کہ عالمگیر اور تحصیل دار ٹوانہ کے درمیان جو سنگین جھگڑا شروع ہوا ہے وہ عارضی طور پر تھم تو گیا ہے لیکن یہ دشمنی اتنی آسانی سے ختم نہیں ہوگی۔ پولیس کی بھاری نفری گاؤں میں موجود ہے اس لیے دونوں طرف کے لوگ کونے کھدروں میں دبکے ہوئے ہیں۔

اتنے میں کوئی دین محمد صاحب سے ملنے آ گیا، وہ باہر چلے گئے۔ تاجور کی والدہ نے میرے سامنے ہی تاجور سے بات کی کہ اب کیا کرنا ہے، وہ بولیں۔ ''کم از کم آج کی رات تو شاہ زیب کو یہیں رہنا پڑے گا لیکن جو کچھ بھی ہے یہ غیر بندہ ہے، تھوڑی سی احتیاط کرنا پڑے گی۔''

''چلیں دیکھ لیتے ہیں۔'' تاجور نے کہا۔ ''اگر رات گیارہ بارہ بجے تک اسفند کی طبیعت اچھی ہوگئی تو پھر یہ واپس بھی جا سکتا ہے۔''

''نہیں، آج کی رات تو یہ یہیں رہ لے۔ لیکن ایسا کرتے ہیں کہ اسفند کی چارپائی بیٹھک میں بچھا دیتے ہیں۔ وہاں تخت پوش بھی پڑا ہے، اگر شاہ زیب نے کمر سیدھی کرنی ہو گی تو اس پر لیٹ جائے گا۔''

دو چار منٹ ماں بیٹی میں مشورہ ہوا پھر ہم نے مل کر اسفند والی چارپائی اٹھائی اور گھر کی کشادہ بیٹھک میں لے آئے۔

تاجور کی والدہ کی طبیعت خراب تھی۔ تاجور نے بہت اصرار کر کے انہیں دوا کھلائی اور سونے کے لیے بھیج دیا۔ میں اور تاجور، اسفند کے پاس بیٹھے رہے، گاہے بگاہے دین محمد صاحب بھی چکر لگاتے رہے۔ کچھ دیر مجھ سے غنودگی بھری باتیں کرنے کے بعد اسفند اب سو گیا تھا۔ میں نے سرگوشی میں تاجور سے کہا کہ وہ بھی جا کر آرام کر لے لیکن وہ وہیں بیٹھی رہی۔ راحیل کونے میں بچھی چارپائی پر نیم دراز تھا اور لالٹین کی روشنی میں اپنے کورس کی کتاب پڑھ رہا تھا۔ اسی طرح پڑھتے پڑھتے وہ سو گیا۔ موقع غنیمت جان کر میں نے سرگوشی میں تاجور سے کہا۔ ''مبارک ہو، ساقا اب اپنے شیطانی ارادوں سمیت تم سے کافی دور جا چکا

ہے، اگر میں غلط نہیں ہوں تو شادی میرا مطلب ہے جبری شادی کا خطرہ مستقل طور پر تمہارے سر سے ٹل گیا ہے۔"

"اس میں یاسر بھائی نے بہت بڑا کردار ادا کیا ہے۔" وہ بھی مدھم آواز میں بولی۔ "اگر وہ اس طرح زینب کی بیماری کی اصلیت نہ بتاتے...... اور پھر عالمگیر کا کچا چٹھا، سیالکوٹی کے بارے میں نہ کھولتے تو کایا کبھی اس طرح نہ پلٹتی۔ انہوں نے تصویروں کے ذریعے عالمگیر اور سیالکوٹی کی دوستی کا بھانڈا پھوڑا اور نتیجے میں عالمگیر کی پکڑ ہوگئی۔"

جی چاہا اسے بتا دوں کہ وہ جس شخص کی تعریفیں کر رہی ہے اس بے چارے کو تو شاید اس سارے معاملے کا پتا بھی نہ ہو۔ اصل "ہیرو" تو تمہارے سامنے بیٹھا ہے اگر کوئی میٹھا بول بولنا ہے تو میرے بارے میں بولو۔ لیکن ابھی یہ ساری باتیں افشا کرنے کا وقت نہیں آیا تھا۔

وہ کھوئی کھوئی سی آواز میں بولی۔ "یاسر بھائی، اماں برکتے کے بیٹے ہیں۔ بڑے چنگے اخلاق کے ہیں۔ پنڈ والوں کو ہمیشہ ان کی طرف سے کوئی اچھی امید ہی ہوتی ہے۔"

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "بالکل...... بندہ اچھا ہو تو اس سے اچھی امید خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔"

"مجھے تو لگتا ہے کہ اب یاسر بھائی پنڈ بھی واپس آجائیں گے۔ دیکھا جائے تو انہوں نے دونوں پارٹیوں کی کمر توڑ دی ہے۔ میرا مطلب ہے عالمگیر اور تحصیل دار ٹوانہ...... دونوں پکڑے گئے ہیں اور دونوں پر پرچے شرچے بھی کٹے ہیں۔"

"اور تیسری پارٹی؟" میں نے پوچھا۔

"کیا مطلب؟"

"تمہارا دعویدار اسحاق صاحب، سنا ہے جناب کو ٹوانہ کے بندوں نے خوب مار لگائی ہے۔ کمر تو خیر اس کی نہیں ٹوٹی لیکن کلائی ٹوٹ گئی ہے۔"

تاجور کے چہرے پر نفرت اور کراہت کے آثار نمودار ہوئے، وہ بولی۔ "چھوڑیں اس بات کو۔"

"تو کس کی بات کریں؟ میرا مطلب ہے...... میں اپنی بات کرلوں؟"

اس کے شفاف چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ اس نے چونکی ہوئی نظروں سے دونوں چھوٹے بھائیوں کی طرف دیکھا۔ دونوں ہی سو رہے تھے۔ ساتھ والے کمرے سے دین محمد صاحب کی کھانسی بھی سنائی نہیں دیتی تھی۔ لگتا تھا کہ ان کی غنودگی بھی نیند میں بدل گئی ہے۔ دور کی کسی گلی سے آوارہ کتوں کا مدھم سا شور سنائی دے رہا تھا۔

"آپ نے کیا کرنی ہے اپنی بات؟" وہ نرم لہجے میں بولی۔

"میں تو ماضی کی بات ہی کروں گا۔ بس وہی دو دن...... جو میں کبھی بھولا نہیں اور نہ بھول سکوں گا۔ سچ تاجور! ایسا لگتا ہے، وہ دن میرے دل پر کسی نے کندہ کر دیئے ہیں۔ گہرائی تک کھود دیئے ہیں۔ اب شاید موت بھی انہیں مٹا نہ سکے۔"

"آپ گونگے زیادہ اچھے لگتے ہیں۔" وہ زیر لب مسکرائی۔

"چلو، کسی طور اچھا تو لگتا ہوں۔"

وہ ایک دم سنجیدہ ہو کر بولی۔ "شاہ زیب! آپ واقعی بہت اچھے ہیں، اس لیے میں چاہتی ہوں کہ آپ کسی بڑی مصیبت میں گرفتار نہ ہو جائیں۔ آپ نے جو کچھ میرے لیے اور میرے بھائی کے لیے کیا ہے، میں اسے زندگی بھر بھول نہیں سکوں گی لیکن پلیز...... آپ یہاں سے چلے جائیں۔"

میں نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "کیا اس وقت تک رہنے کی اجازت بھی نہیں جب تک یہاں کے حالات کچھ ٹھیک نہ ہو جائیں؟"

وہ سر جھکا کر بولی۔ "میں اجازت دینے یا نہ دینے والی کون ہوتی ہوں۔ میں تو صرف گزارش کر سکتی ہوں۔"

لالٹین کی روشنی مدھم ہو گئی تھی۔ اچانک کہیں سے ہوا کا ایک جھونکا آیا اور وہ بجھ گئی۔ کمرے میں گہری تاریکی چھا گئی۔ "مم...... میں موم بتی دیکھتی ہوں۔" تاجور نے جلدی سے کہا اور کھڑی ہو گئی۔

وہ لکڑی کی الماری کی طرف بڑھی تو اسے ٹھوکر لگی اور وہ میرے اوپر گرتے گرتے بچی۔ اس کا گداز جسم ایک لمحے کے لیے میرے شانے سے ٹکرایا۔ جب اس نے سنبھل کر سیدھا ہونا چاہا تو ہو نہیں سکی۔ اس کے چہرے پر ہر وقت جھولنے والی بالوں کی دو لٹوں میں سے کوئی ایک لٹ میری جیکٹ کے بٹن میں اٹک گئی تھی۔

"ہائے اللہ۔" اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ سسکاری نکلی۔

جیکٹ کی کالر پر لگے ہوئے ستارہ نما بٹن نے اسے رکوع کے بل جھکے رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں نے بٹن کو ٹٹولا اور اس کی لٹ کو آزاد کرنے کی کوشش کی۔ اس کی گرم خوشبودار سانسیں میرے چہرے سے ٹکرا رہی تھیں۔ پتا نہیں کیسے میں نے بے ساختہ اپنے سر کو حرکت دی اور اپنے گرم ہونٹوں سے اس کی تابندہ پیشانی چوم لی۔ لٹ آزاد ہو چکی تھی۔ وہ تڑپ کر سیدھی کھڑی ہو گئی۔ یہ سب کچھ چار پانچ سیکنڈ کے اندر وقوع پذیر ہوا۔ وہ باہر نکل گئی۔

میرا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ جو کچھ ہوا اتنا آناً فاناً تھا کہ خود میری سمجھ میں بھی نہیں آیا۔ میرے ہونٹوں پر ابھی تک اس کی پیشانی کا بے مثال لمس تھا۔

وہ لوٹی تو اس کے ہاتھ میں شمع تھی۔ میں نے اس کا چہرہ دیکھا اور سٹپٹا گیا۔ وہ سخت غصے میں نظر آتی تھی۔ اس نے شمع دروازے کے قریب طاق میں جمائی اور میری طرف دیکھے بغیر بولی۔ ''شاہ زیب صاحب! آپ میرے اور اپنے حال پر رحم کریں۔ آپ یہاں سے چلے جائیں......اگر کہتے ہیں تو میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑ دیتی ہوں۔''

''سوری تاجور، میں شرمندہ ہوں۔''

''میں آپ سے زیادہ شرمندہ ہوں۔ میں آپ کو...... یہاں دوبارہ دیکھنا نہیں چاہتی۔'' اس نے انتہائی روکھے پن سے کہا اور پلٹ کر باہر نکل گئی۔

مجھے لگا کہ اگر میں نے ایک لفظ بھی اور کہا تو شاید وہ ہر اندیشے کو نظر انداز کر کے چلا اٹھے......اور گھر والے بیدار ہو جائیں۔

اس کا ردِعمل میری توقع سے زیادہ شدید تھا۔ میں گم صم اپنی جگہ بیٹھا رہا اور گاہے بگاہے اسفند کی پیشانی کو سہلاتا رہا۔ ایک دوبار اس نے اپنی سرخ آنکھیں کھولیں اور میری طرف دیکھ کر دوبارہ بند کر لیں۔ اسے جیسے اطمینان تھا کہ میں اس کے پاس موجود ہوں۔ تھوڑی دیر بعد تاجور کی والدہ کے کھانسنے کی آواز آئی اور وہ تسبیح لے کر میرے پاس آن بیٹھیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ تہجد کا وقت ہونے والا ہے۔

وہ دعائیہ انداز میں بولیں۔ ''یا اللہ سب کی خیر، سب کا بھلا۔ پتا نہیں اس پنڈ کو کیا ہوتا جا رہا ہے۔ ہر روز کچھ نہ کچھ برا سننے کو مل رہا ہے۔''

پرسوں والے خونی واقعے نے جیسے ابھی تک انہیں ہراساں کر رکھا تھا اور یہ خوف و ہراس چاند گڑھی کے اکثر لوگوں کے چہروں پر نظر آتا تھا۔ پُراسرار واقعات اور گاؤں میں دو بدصورت عورتوں کی موجودگی والی باتیں پہلے ہی ان لوگوں کے لیے سوہانِ روح تھیں، اب لاشیں گرنا بھی شروع ہو گئی تھیں۔

تاجور کی والدہ نے مجھ سے اصرار کیا کہ میں چارپائی پر لیٹ کر آرام کر لوں۔ مگر میں نے اشاروں کنایوں میں بتایا کہ میں یہاں بالکل ٹھیک ہوں۔ وہ نہیں مانیں اور مزید اصرار کر کے مجھے لٹا دیا۔

میں زیادہ دیر نہیں سویا۔ اٹھا تو رات کا اندھیرا دن کے اجالے میں بدل رہا تھا۔ صحن کی طرف چڑیاں چہکار رہی تھیں۔ تاجور اور اس کی والدہ اسفند کو دوا پلا رہی تھیں۔ تاجور نے

میری طرف دیکھا تک نہیں اور اسفند کو دوا دینے کے بعد تیزی سے باہر چلی گئی۔ میں اسفند کے پاس آ بیٹھا اور اس سے باتیں کرنے لگا۔ اس کی طبیعت اب بہتر تھی۔ وہ میری ٹھوڑی پر انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا۔ ''آپ بہت اچھے ہیں گونگے بھائی۔''

تاجور کی والدہ نے سرزنش کے انداز میں کہا۔ ''گونگے بھائی نہیں کہتے ...... صرف بھائی کہا کرو ...... بھائی جان۔''

اسفند نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''پھر ذرا چونک کر بولا۔ ''بھائی جان! آپ بول بھی لیتے ہیں؟ میں نے رات کو آپ کی آواز سنی تھی۔''

میرا دل اچھل کر رہ گیا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے تاجور کی والدہ کی طرف دیکھا۔ انہوں نے مسکرا کر اسفند کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''نہیں پتر، یہ نہیں بول سکتے۔ تجھے بخار کی بے ہوشی تھی نا اس لیے الٹی سیدھی آوازیں سن رہا تھا۔ اپنے ابا جی کو ماسٹر جی کہہ کر بلا رہا تھا۔

''نہیں امی، یہ بول رہے تھے۔ باجی سے بات کر رہے تھے۔'' وہ زور دے کر بولا۔

''اچھا چلو ٹھیک ہے کر رہے تھے بات۔'' والدہ نے اسے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔ ''اب زیادہ باتیں کرے گا تو منہ پھر سوکھنے لگے گا۔ سو جا تھوڑی دیر۔'' ننھا اسفند الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا پھر اس کی پلکیں دوا کے اثر سے بوجھل ہونے لگیں۔

میں اپنے جسم میں ابھی تک سنسناہٹ محسوس کر رہا تھا۔

ناشتا میں نے دین محمد صاحب کے گھر پر ہی کیا۔ تاجور مجھے کہیں نظر نہیں آئی۔ اس کی آواز تک سنائی نہیں دی۔ جانے کس کونے کھدرے میں چھپ گئی تھی۔ مجھے بار بار اس کا نہایت روکھا لہجہ یاد آتا تھا اور سینے میں کچوکا سا لگتا تھا۔ دس بجے کے قریب میں اپنے کام پر واپس آ گیا۔ آج ایک کھیت میں ٹریکٹر کے ذریعے سہاگا پھیرنا تھا اور یہ کام آج ہی کرنا ضروری تھا۔ کیونکہ کل بوائی ہونا تھی۔

میں شام تک کام میں جتا رہا۔ اس کے ساتھ ساتھ ذہن میں ایک پروگرام بھی بنتا رہا۔ جب میں نے انیق کو بتایا کہ کل ہم چاند گڑھی سے واپس جا رہے ہیں تو وہ حیران رہ گیا۔

''کیوں، کیا ہوا؟'' اس نے بھاڑ جیسا منہ کھول کر پوچھا۔

''بس یہاں ہمارا دانہ پانی اتنا ہی تھا۔''

وہ غور سے میری طرف دیکھنے لگا۔ ''کیا بات ہے شاہ زیب بھائی! آج تو آپ فلم دل لگی کے ندیم نظر آ رہے ہیں ...... وہ کیا گانا تھا ...... کل کسی وقت شام سے پہلے، میں تیرا شہر چھوڑ جاؤں گا۔''

''نہیں بھئی، میں سنجیدہ ہوں۔'' میں نے کہا۔

اسی دوران میں اتفاقاً دین محمد صاحب بھی حقہ گڑگڑاتے ہوئے ہماری طرف آ گئے۔ انیق سے مخاطب ہو کر بولے۔ ''کیوں بھئی، کیا گل ہے۔ شاہ زیب نے حق نواز سے کہا ہے کہ کام چھوڑنا ہے۔''

انیق سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

دین محمد صاحب نے کہا۔ ''کیا کسی سے کوئی ناراضگی وغیرہ ہو گئی ہے یا پھر کوئی اور بات ہے؟''

میں نے اشاروں کنایوں میں وضاحت کی۔ انیق نے میری ترجمانی کرتے ہوئے کہا۔ ''مالک! یہ کہہ رہا ہے کہ اس کی کیا مجال کہ آپ سے ناراض ہو۔ دراصل یہ کسی کام کی بات کر رہا ہے۔ ابھی مجھے بھی پوری طرح بات سمجھ میں نہیں آئی۔ میں ابھی تھوڑی دیر میں اس سے پوچھ کر بتاتا ہوں۔''

''تو ابھی پوچھ لونا۔ میں تو پریشان ہو گیا ہوں۔ اگر کوئی تنخواہ کا یا پیسوں کا معاملہ ہے تو بھی مجھے بتاؤ بھئی۔''

انیق نے کہا۔ ''آپ دو منٹ یہاں بیٹھیں مالک۔ میں اس سے پوچھتا ہوں۔''

دین محمد حقہ لے کر ڈیرے کی چارپائی پر بیٹھ گئے۔ انیق مجھے لے کر اندر کمرے میں آ گیا۔ ''کیا چکر ہے شاہ زیب بھائی؟'' اس نے تیز سرگوشی میں پوچھا۔

''بس وہی بات جو تم سے کہی ہے۔ ہمیں یہاں سے جانا ہے۔ تم دین محمد صاحب سے کہو کہ قصبے سے فون آیا ہے۔ میرے والد اور چچا میں جھگڑا ہو گیا ہے۔ بات بڑھ گئی ہے، میں والد کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ مجھے جانا پڑے گا اگر دو چار ہفتے میں معاملہ ٹھیک ہو گیا تو ہو سکتا ہے کہ پھر آ جاؤں۔''

O......❖......O

اس دلچسپ داستان کے بقیہ واقعات
دوسرے حصے میں ملاحظہ فرمائیں

"شاہ زیب بھائی......تاجور باجی سے کوئی اَن بن ہوگئی ہے؟"

"یار تفصیل میں نہ جاؤ، جو کہہ رہا ہوں، وہی کرو۔" میں نے اٹل لہجے میں کہا۔ کچھ دیر بعد میں اور انیق باہر آئے۔ انیق نے سب کچھ دین محمد صاحب کے گوش گزار کر دیا۔ دونوں آپس میں کافی دیر باتیں کرتے رہے۔ آخر دین محمد صاحب نے افسردہ دلی کے ساتھ مجھے جانے کی اجازت دے دی لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ وہ میری کمی بے حد محسوس کریں گے اور میں نے جس طرح ان کی فیملی کی مدد کی ہے وہ اسے بھول نہیں سکتے۔ انہوں نے الفاظ اور اشاروں کنایوں کے ذریعے مجھ سے کہا کہ وہ کوئی نیا ملازم ابھی نہیں رکھیں گے اور امید کریں گے کہ میرے حالات ٹھیک ہو جائیں اور میں ایک دو ہفتے میں واپس آجاؤں۔

میں نے نیاز مندی سے اثبات میں سر ہلایا۔ انہوں نے مجھے اور انیق کو آدھے مہینے کے بجائے پورے مہینے کی تنخواہ دینے کا کہا اور یہ بھی کہا کہ میں نے جب بھی جانا ہو راحیل، اسفند اور باقی گھر والوں سے مل کر جاؤں۔

رات کو میں نے انیق سے سامان وغیرہ باندھنے کا کہا۔ وہ بھی خاصا کنفیوژ تھا۔ جیسے سمجھ نہ پا رہا ہو کہ میں نے ایکا ایکی بستر بوریا کیوں سمیٹنا شروع کر دیا ہے۔ حق نواز اور اس کی بیوی نذیراں بھی افسردہ سے تھے۔ انیق کچھ دیر گہری نظروں سے مجھے دیکھتا رہا پھر بولا۔ "آپ نے پرانی انڈین فلم "حقیقت" دیکھی ہوئی ہے؟"

میں نے کہا۔ "میرے اندر تیری طرح کوئی بڈھی روح نہیں گھسی ہوئی۔ اگر کبھی دیکھنی ہو تو نئی فلم دیکھتا ہوں۔"

وہ سنی اَن سنی کرتے ہوئے بولا۔ "اس میں ایک گانا ہے۔"

میں یہ سوچ کر اس کے دَر سے اٹھا تھا......

کہ وہ روک لے گی منا لے گی مجھ کو......

ہواؤں میں لہراتا آتا تھا دامن......
کہ دامن پکڑ کر بٹھا لے گی مجھ کو......
قدم ایسے انداز میں اٹھ رہے تھے......
کہ آواز دے کر بلا لے گی مجھ کو......
"لیکن پتا ہے جی کہ ہوا کیا تھا؟"

"کیا ہوا تھا؟" میں نے اپنی جیکٹ ٹرنک نما صندوق میں رکھتے ہوئے کہا۔

"نہ کسی نے لہراتا ہوا دامن پکڑا تھا، نہ آواز دی تھی، نہ روکا تھا۔ وہ چلتا ہی آیا تھا اور جناب عالی! جدا ہو گیا تھا کہیں ادھر بھی ایسا ہی نہ ہو۔"

اچانک کمرے کی عقبی کھڑکی پر بہت مدھم دستک ہوئی۔ میرا دل دھڑک اٹھا۔ انیق نے آگے بڑھ کر کھڑکی کھولی۔ سلاخوں کے دوسری طرف تاجور کا ہیولا نظر آیا۔ میرے سینے میں جیسے جلترنگ بج اٹھے۔ پاؤں سے سر تک ایک دلکش لہر سی دوڑ گئی۔ میں کھڑکی کے پاس پہنچا۔ انیق معاملہ فہمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فوراً باہر چلا گیا۔

تاجور نے شال مضبوطی سے اپنے گرد لپیٹ رکھی تھی۔ دونوں سرکش لٹیں حسبِ معمول رخسار کو چھو رہی تھیں۔ اس کے عقب میں کچھ فاصلے پر درختوں کے نیچے ایک اور ہیولا نظر آیا۔ میں نے دور ہی سے پہچان لیا۔ یہ ملازمہ نوری تھی۔ وہ اس طرح کھڑی تھی کہ اگر گاؤں کی طرف سے کوئی شخص ڈیرے کی طرف آتا تو وہ فوراً دیکھ لیتی اور تاجور کو آگاہ کر دیتی۔ اس کا مطلب تھا کہ تاجور اسی مقصد سے اسے اپنے ساتھ لائی ہے۔ تاجور اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی پھر بولی۔ "میں نے سنا ہے، آپ جانے کی بات کر رہے ہیں؟"

"جانے کی بات نہیں کر رہا، میں صبح جا رہا ہوں۔ اب میرا جانا ہی بنتا ہے۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"اور انیق؟" اس نے پوچھا۔

"وہ بھی جا رہا ہے۔"

"ابا جی کہہ رہے تھے، کئی کام اٹکے ہوئے ہیں۔ آپ دونوں چلے گئے تو انہیں مشکل ہو جائے گی۔"

"بے روزگاری بہت ہے۔ ملازم ڈھونڈنا کون سا مشکل ہے۔ ایک ڈھونڈو تو ہم جیسے دس ملتے ہیں۔"

تاریکی میں جھینگر کی آواز دور تک پھیل رہی تھی۔ چند سیکنڈ خاموشی رہی۔

''اگر آپ جانا چاہتے ہیں تو ٹھیک ہے......'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔
شاید اس کا خیال تھا کہ میں اسے فقرہ مکمل کرنے کو کہوں گا لیکن میں بھی خاموش رہا۔ اسے خود ہی بولنا پڑا۔ ''اسفند بھی ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں۔ سویرے بھی آپ کا پوچھ رہا تھا۔''
''کوئی بات نہیں، ایک دو دن میں بہل جائے گا۔ بچہ ہے، بس توجہ مانگتا ہے۔'' وہ جیسے لہو کا گھونٹ بھر کر رہ گئی۔
چند سیکنڈ ہم دونوں کے درمیان گمبھیر خاموشی رہی۔ وہ جیسے سب کچھ سمجھ رہی تھی۔ آخر ایک بار پھر طویل سانس لے کر بولی۔ ''شاید، میں کل رات کچھ زیادہ بول گئی......سوری۔'' اس کے بعد وہ تیزی سے واپس پلٹ گئی۔
''سوری۔'' اس کا یہ لفظ جیسے میری سماعت سے نکل کر میرے پورے جسم میں اور ارد گرد کی ساری فضا میں گونجنے لگا۔ اس ایک لفظ میں بہت کچھ تھا۔ میں نے اندھیرے میں اس کی پیشانی کے ساتھ جو ''جسارت'' کی تھی اس کی معافی بھی تھی۔ مجھ سے ابھی یہیں رہنے کی درخواست بھی تھی اور شاید کہیں بہت گہرائی میں، میری تھوڑی سی حوصلہ افزائی بھی تھی۔
میں ادھ کھلی کھڑکی سے اس کا دور جاتا ہیولا دیکھتا رہا۔ اس کے ہیولے کے ساتھ ساتھ جاتا دوسرا ہیولا نوری کا تھا۔ وہ جب تک اپنے گھر کے قریب نہیں پہنچ گئیں، میں نے ان پر نظریں جمائے رکھیں۔
چند منٹ بعد انیق بھی آن وارد ہوا۔ ''ہاں جی، سامان باندھنا ہے یا کھولنا ہے؟''
میں نے مسکرا کر کہا۔ ''فی الحال تو کھولنا ہی ہے......''
وہ بولا۔ ''لگتا ہے کہ آپ نے سامان زیادہ کس کر باندھا ہی نہیں۔ آپ کو پہلے ہی یقین تھا کہ اسے کھولنا پڑے گا۔''
''ساری بات ہی یقین کی ہوتی ہے میاں......''
انیق نے کہا۔ ''یعنی یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم۔''
پہلوان حشمت نے اندر داخل ہوتے ہوئے شعر مکمل کیا۔ ''جہاد زندگانی میں، یہ ہیں مردوں کی شمشیریں...... واہ کیا خوب صورت شعر کہا ہے اپنے استاد مرزا غالب صاحب نے۔''
انیق اور میں نے ایک ساتھ ٹھنڈی سانس لی۔ کوشش کے باوجود انیق اپنی زبان کی کھجلی کو نہیں روک سکا، بولا۔ ''حشمت بھائی، یہ حکیم الامت علامہ اقبال کا شعر ہے۔ مرزا غالب کا نہیں۔''

''اس بارے میں تمہاری معلومات ٹھیک ناہیں ہیں۔'' پہلوان حشمت پورے وثوق سے بولا۔ ''یہ شعر اصل میں غالب کا ہی ہے۔ انہوں نے علامہ اقبال کو درست کرنے کے لیے دیا تھا اور حضرت علامہ اقبال نے اسے اتنے اچھے طریقے سے درست کیا کہ مرزا غالب نے خوش ہو کر انہی کو دے دیا۔ بعد میں حضرت علامہ نے اس وزن پر ایک شاندار غزل لکھی۔ یہ سب کچھ میرے دادا حضور کی موجودگی میں ہوا تھا۔''

''حشمت بھائی! مرزا غالب تو 1867ء میں فوت ہو گئے۔ علامہ اقبال کوئی دس سال بعد پیدا ہوئے تھے۔ وہ مرزا غالب کے شعر کی اصلاح کس طرح کر سکتے ہیں۔ (اس بات پر پہلوان حشمت گڑبڑا گیا لیکن پھر جلد ہی سنبھل گیا)

''یہ عشق اور روحانیت کی باتیں ہیں۔ تمہاری سمجھ میں ناہیں آویں گی بچے! اور نہ ہی تمہیں ان سے کوئی فائدہ ہووے گا۔ وہ کیا کہتے ہیں۔ بندر کیا جانے......آنگن ٹیڑھا۔''

انیق بولا۔ ''حشمت بھائی، کم از کم اس شعر کے بارے میں تو آپ کو ضرور غلط فہمی ہو رہی ہے۔''

''لگت ہے کہ تمہاری عقل گھاس چرنے کو چلی گئی ہے جو چشم دید گواہ کے پوتے کو غلط فہم کہہ رہے ہو۔ میں تمہیں اپنے دادا جی کے ہاتھ کا لکھا ہوا روزنامچہ دکھا سکت ہوں اور مجھے لگت ہے کہ تم پیدائش کی تاریخوں میں بھی گڑبڑی کر رہے ہو۔''

یہ بیکار بحث طول کھینچ سکتی تھی لیکن اسی دوران میں سونگی سردی میں ٹھٹرتا ہوا اندر آ گیا۔ اس نے انگیٹھی پر ہاتھ سینکے اور بولا۔ ''پولیس کے بڑے افسر کے حکم پر عالمگیر، تحصیل دار ٹوانہ اور ان کے گرفتار ہونے والے ساتھیوں کو گوجرانوالہ پہنچا دیا گیا ہے۔ دراصل پولیس کو خطرہ تھا کہ سجاول سیالکوٹی کہیں کوئی گڑبڑ نہ کر دے۔''

''کیسی گڑبڑ؟'' انیق نے پوچھا۔

''وہ ہلا بول کر عالمگیر کو چھڑانے کی کوشش کر سکتا تھا۔ ایک دفعہ پہلے بھی یہ لوگ اسی طرح اپنے دو ساتھیوں کو چوکی سے چھڑا کر لے گئے تھے۔ یہ تھانیدار سجاد جو ہم جیسے غریبوں کے لیے فرعون بنا ہوا ہے، منہ دیکھتا رہ گیا تھا۔''

پہلوان حشمت نے بیزار لہجے میں کہا۔ ''چھوڑو یار، مجھے تو پورا پورا شک ہے یہ تھانیدار بھی اندر خانے سجاول سے یارانہ جوڑے ہوئے ہے۔ اب بڑے افسر آ گئے ہیں ہو سکت ہے کہ اس کا بھانڈا بھی پھوٹ جاوے۔''

سونگی بولا۔ ''بے شک عالمگیر کو یہاں سے لے گئے ہیں پھر بھی پنڈ میں لوگ ڈرے

ہوئے ہیں۔ان کو خطرہ ہے کہ باہر سے آنے والی پولیس واپس چلی گئی تو سجاول پنڈ والوں کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔"

اگلے روز انیق نے میری طرف سے دین محمد صاحب سے بات کی اور انہیں بتایا کہ قصبے میں میرا مسئلہ کسی حد تک حل ہو گیا ہے۔ کچھ لوگوں نے میرے والد اور چچا کے درمیان صلح کرائی ہے۔اب میرا واپس جانا ضروری نہیں ہے۔ ہاں ہفتے کے روز میں ایک دو دن کے لیے جاؤں گا۔

یہ اطلاع دین محمد صاحب کے لیے کسی خوش خبری سے کم نہیں تھی۔انہوں نے میری پیٹھ تھپکی اور بولے۔"تم لوگ ملازم نہیں، میرے بیٹوں کی طرح ہو۔کسی طرح کی ضرورت ہو تو مجھے بے جھجک بتایا کرو۔"

میں نے نیاز مندی سے سر ہلایا۔

رات کو پھر میرے لیے گھر سے بلاوا آ گیا۔حق نواز نے آکر بتایا۔"اسفند کو پھر ہلکا سا بخار ہے، ضد کر رہا ہے۔تمہیں بلا رہا ہے۔ مالک نے کہا ہے کہ تم آ جاؤ۔"

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ میں نے اسی وقت جیکٹ پہنی اور تاجور کے گھر پہنچ گیا۔ اسفند کی چارپائی آج بھی بیٹھک میں ہی رکھی تھی۔وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔دین محمد نے بیوی سے مخاطب ہو کر کہا۔"لو بھی حمیدہ! دیکھو تمہارے پتر کا آدھا بخار تو شاہ زیب کو دیکھ کر ہی اتر گیا ہے۔"

"آجا پتر بیٹھ جا، یہاں کرسی پر۔" تاجور کی والدہ حمیدہ بی بی نے کہا پھر میرے کندھے پر ہاتھ پھیر کر بولیں۔"اس کو اپنا ہی گھر سمجھ۔شرم وغیرہ نہ کیا کر۔"

دین محمد نے تاجور کو آواز دی۔"تاجاں پتر! گرم دودھ لے آ تھوڑا سا مٹھا ڈال کر۔"

دودھ شاید پہلے سے ہی گرم تھا۔وہ پلیٹ میں گلاس رکھ کر اندر لے آئی اور پلیٹ میز پر رکھ دی۔ دین محمد اطلاع دینے والے انداز میں بولے۔"تاجاں پتر! اب شاہ زیب واپس نہیں جا رہا۔اس کے والد اور چاچے میں صلح صفائی ہو گئی ہے۔"

"یہ تو بڑی چنگی گل ہے ابا جی، پر اتنی جلدی لڑائی اور اتنی جلدی صلح؟"

"پتر! دل صاف ہوں نا......تو پھر لڑائیاں اتنی لمبی نہیں ہوتیں۔"

"ہاں جی......دل تو واقعی صاف ہونے چاہئیں۔" تاجور نے ذرا معنی خیز انداز میں کہا اور باہر چلی گئی۔

اسفند اب اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔وہ دوا نہ کھانے کی ضد کر رہا تھا۔میرے ہاتھ سے اس نے

دوا بھی کھالی پھر ہم لوڈو کھیلنے لگے۔ کاکا یعنی راحیل بھی ہمارے ساتھ شریک ہو گیا۔ تاجور گاہے بگاہے کمرے میں آتی رہی لیکن وہ ٹک کر ہمارے پاس نہیں بیٹھی۔ اس نے اوڑھنی بھی مضبوطی سے سر پر لپیٹ رکھی تھی۔

تاہم رات گئے اسفند کا بخار تیز ہو گیا۔ میں نے اشاروں سے تاجور کو بتایا کہ وہ والدہ اور والد کو بتا کر خواہ مخواہ انہیں پریشان نہ کرے۔ والد سو گئے تھے اور والدہ لیٹی ہوئی تھیں۔ میں خود ہی اسفند کے ماتھے پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھتا رہا۔ میں نے اس کے سر کے زخم کی پٹی بھی خود ہی بدلی۔ زخم اب بہتر ہو رہا تھا۔ پٹی بدلنے میں تاجور نے بھی میری مدد کی۔

دو بجے کے قریب اسفند کا بخار اترنا شروع ہو گیا۔ تاجور نے اسے تھوڑا سا دلیا بھی کھلایا۔ وہ سو گیا۔ میں نے تاجور سے مخاطب ہو کر سرگوشی میں کہا۔ ''اب بخار جلدی اتر جاتا ہے، لگتا ہے ایک دو دن میں اسفند بالکل بھلا چنگا ہو جائے گا۔''

اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ دیا۔ یقیناً اسے دو دن پہلے والی بات یاد آ گئی تھی جب اسفند نے والدہ کے سامنے کہنا شروع کر دیا تھا کہ میں بول سکتا ہوں۔

خطرات کے پیشِ نظر چاند گڑھی میں ٹھیکری پہرا دیا جا رہا تھا۔ پانچ چھ بندوں کی ایک ٹولی گاؤں میں گشت کرتی تھی۔ تین گھنٹے بعد ڈیوٹی بدل جاتی تھی۔ گشت والی ٹولی بیٹھ کر نگرانی کرتی تھی اور دوسری ٹولی گشت کرنے لگتی تھی۔ پہرے داروں کی آوازیں گاہے بگاہے تاریک فضا میں ابھرتی تھیں۔ کسی پاس والے گھر میں شاید کوئی عاشق مزاج شخص جاگ رہا تھا اور ٹیپ ریکارڈر پر میوزک سن رہا تھا۔ خاموش فضا میں ایک حسبِ حال گیت ابھر رہا تھا۔ نہ تم ہمیں جانو، نہ ہم تمہیں جانیں مگر لگتا ہے، کچھ ایسا، میرا ہمدم مل گیا ہے......

میں گاہے بگاہے کن انکھیوں سے اسے دیکھ لیتا تھا۔ بالوں کی دونوں لٹیں دلکش انداز میں بل کھا کر اس کے رخسار کو چوم رہی تھیں۔ لالٹین کی روشنی میں رخسار قندھاری انار کی طرح دہکا نظر آتا تھا۔ قریب ہی راحیل کی ہوم ورک والی رف کاپی اور پین پڑا تھا۔ میں نے ایک خالی صفحے پر لکھا۔ ''پیار'' اور کاپی اس کی طرف کھسکا دی۔

اس نے دیکھا اور پیشانی پر ناگواری کی شکن ابھری۔ میرے لکھے ہوئے لفظ پر قلم پھیر کر اس نے کاپی میری طرف کھسکا دی۔

میں نے لکھا۔ ''میں اپنے پیار میں تم سے کبھی کچھ مانگوں گا نہیں، لیکن خاموش پیار کرتے رہنے کا حق تو مجھے ہے۔''

فقرہ پڑھ کر وہ کچھ دیر شدید تذبذب میں نظر آئی پھر اس نے لکھ دیا۔ ''نہیں۔''
میں نے پھر لکھا۔ ''چلو پیار نہ سہی۔ کوئی نرم گوشہ...... کوئی تھوڑی بہت گنجائش تو میرے لیے دل میں ہے نا؟''
اس نے فقرہ پڑھا۔ پھر کاغذ کاپی سے علیحدہ کر کے پھاڑا اور انگیٹھی میں پھینک دیا۔ میرا خیال تھا کہ اب وہ اٹھ کر چلی جائے گی لیکن وہ اٹھ کر بھی نہیں گئی...... ہاں عورت ایک پہیلی ہے۔ وہ یونہی بے وجہ اسفند کی دواؤں کا ڈاکٹری نسخہ پڑھنے لگی۔
میں بھی رومانی موڈ میں تھا۔ میں نے کاپی پر لکھا۔ ''پتا نہیں کیوں میرا دل گواہی دیتا ہے کہ تمہارے دل میں میرے لیے تھوڑی بہت گنجائش موجود ہے۔ ایک کام کرتے ہیں۔ اگر تم لکھ کر یا بول کر اقرار نہیں کرنا چاہتیں تو ایک اشارہ دو۔ تمہارے بالوں کی دو لٹیں تمہارے چہرے پر جھول رہی ہیں اگر تم انہیں ہاتھ سے ہٹا کر اپنے کان کے پیچھے اڑس لو گی تو میں سمجھوں گا کہ...... ہاں تھوڑی بہت گنجائش موجود ہے۔''
فقرہ پڑھ کر اس نے پھر کاغذ پھاڑ کر انگیٹھی میں جھونک دیا۔ میں امید بھری نظروں سے تاجور کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ اٹھ کر باہر چلی گئی۔
سینے میں دھواں سا اکٹھا ہونے لگا۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ وہ ایک مشکل لڑکی ہے۔ میں اس کے حوالے سے سخت مصیبت میں گرفتار ہونے والا ہوں۔ اس کی والدہ کی غنودگی بھری آواز ابھری۔ ''تاجاں! جاگ رہی ہے؟''
''ہاں امی۔'' کمرے سے اس کی آواز آئی۔
اسفند کا بخار اتر گیا ہے نا؟''
''ہاں امی، ٹھیک ہے اب، سویا ہوا ہے۔''
''میری کھانسی نہیں رک رہی، تھوڑی سی چائے بنا دے مجھے۔ شاہ زیب بھی پی لے گا۔''
''اچھا امی۔'' تاجور کی آواز ابھری۔ پھر کچن میں تھوڑی دیر برتن کھڑکھڑاتے رہے۔ آخر چائے کی خوشبو آئی۔ چائے کے ساتھ گھر میں بنے ہوئے خستہ نمک پارے بھی تھے۔ وہ دونوں چیزیں میز پر رکھ کر اور اسفند کی پیشانی ہاتھ سے چھو کر واپس چلی گئی۔ بالوں کی لٹیں بدستور اس کے چہرے پر جھول رہی تھیں۔ کام کاج کے دوران میں وہ جیسے انہیں بھول ہی جاتی تھی۔ مجھے بھی اس کشمکش میں لطف آرہا تھا۔ میں نے چائے اور نمک پاروں کی طرف دیکھا بھی نہیں۔

کچھ دیر بعد اس نے اندر جھانکا۔ دونوں اشیا جوں کی توں پڑی تھیں۔ میں واضح طور پر گم صم نظر آ رہا تھا۔ پہلے تو یوں لگا کہ وہ بھی ناراضگی دکھائے گی لیکن پھر اس نے تحمل کا ثبوت دیا۔ میری طرف دیکھ کر ہولے سے مسکرائی اور بالوں کی لٹوں کو چہرے سے ہٹا کر کان کے پیچھے اڑس لیا۔ شرم کی سرخی نے اس کے چہرے کو ڈھانپا اور وہ تیزی سے پلٹ گئی مگر دو چار قدم چل کر ہی رک گئی۔ اسے خیال آ گیا تھا کہ چائے تو ٹھنڈی ہو چکی ہے۔ وہ دوبارہ اندر آئی اور ٹھنڈی چائے والا کپ اٹھا لیا۔

''میں اور بناتی ہوں۔'' اس نے ہولے سے کہا۔

''تھینک یو۔'' میں نے بھی جذباتی سرگوشی کی۔ وہ نظریں ملائے بغیر باہر چلی گئی۔

دفعتاً گاؤں کے شمالی حصے سے فائرنگ کی زوردار آواز آئی۔ یہ آٹو میٹک رائفل کا برسٹ تھا۔ میرے اندازے کے مطابق ''اے کے 47'' تھی۔ یہ خطرے کی گھنٹی تھی۔ یہ تو طے ہوا تھا کہ ٹھیکری پہرے دار آدھی رات کے بعد دو تین دفعہ وقفے وقفے سے ہوائی فائر کریں گے لیکن یہ بھی طے تھا کہ یہ سنگل شاٹ ہوں گے۔ برسٹ کیوں چلایا گیا تھا؟ چند سیکنڈ بعد پھر برسٹ چلا، اس آواز نے تاجور کے گھر میں سب کو جگا دیا۔ تاجور کی والدہ حمیدہ بی بی بلند آواز میں آیت الکرسی پڑھنے لگیں، بچے بھی سہم گئے۔ تاجور کا رنگ اُڑا ہوا تھا۔ میں نے اشاروں کنایوں میں کہا کہ میں باہر جا کر دیکھتا ہوں۔

''نہیں کوئی لوڑ نہیں۔'' دین محمد نے مجھے سختی سے منع کر دیا اور دروازے کی کنڈیاں چیک کرنے لگے۔

لوہے کا یہ دروازہ انہوں نے شاید کل ہی لگوایا تھا، اس سے پہلے گھر کا داخلی دروازہ لکڑی کا تھا۔

دو برسٹ چلنے کے بعد فائرنگ تھم گئی۔ دین محمد کے اڑوس پڑوس والوں نے اب ان کا بائیکاٹ ختم کر دیا تھا اور بات چیت بحال ہو گئی تھی۔ ساتھ والے پڑوسی کی آواز آئی تو دین محمد نے بلند آواز میں پوچھا۔ ''کیا ہوا ہے بشیر محمد؟''

بشیر محمد نے بھی پکار کر کہا۔ ''اللہ نے خیر کی ہے بھائی جی۔ کوئی ایسی ڈر والی گل نہیں۔ کوئی مشکوک بندہ تھا۔ فائرنگ کے بعد بھاگ گیا ہے۔ تین چار لڑکے اس کے پیچھے گئے ہیں۔''

میں اور دین محمد بھی دروازے کی طرف بڑھے۔ میری نگاہیں ایک لمحے کے لیے تاجور کی نگاہوں سے ٹکرائیں۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں التجا کر رہی تھی کہ میں گھر سے باہر نہ

جاؤں، وہ میری موجودگی میں خود کو اور باقی گھر والوں کو بہت محفوظ خیال کر رہی ہے۔

میں جاتے جاتے رک گیا۔ دین محمد چلے گئے۔ لگتا تھا کہ گاؤں کے اکثر گھروں میں لوگ جاگ گئے ہیں اور صورتِ حال جاننے کے لیے باہر آگئے ہیں۔ درحقیقت گاؤں کے باسی اس شدید نفسیاتی خوف میں مبتلا ہو چکے تھے کہ سجاول سیالکوٹی چاند گڑھی پر ایک اور شدید حملہ کرے گا اور اس مرتبہ شاید لاشیں بھی گریں گی...... ٹوانے تو مریں گے ہی ممکن ہے کہ عام لوگ بھی اس رگڑے میں آجائیں۔

پندرہ بیس منٹ بعد دین محمد واپس آئے۔ انہوں نے بتایا کہ بندہ تو بھاگ گیا ہے، پر اس کی گھوڑی درختوں میں بندھی ہوئی مل گئی ہے۔

انہوں نے کہا۔ ''اس نسل کی گھوڑیاں سجاول کے ساتھیوں کے پاس ہیں۔ ظاہر تو یہی ہوتا ہے کہ یہ سجاول کا بندہ تھا۔ شاید پنڈ کی سن گن لینے کے لیے یہاں پہنچا تھا۔''

چاند گڑھی میں وہ رات کافی بے چینی سے گزری۔ شہر سے آنے والی پولیس واپس جا چکی تھی اور اب گاؤں کے لوگ خود کو عدم تحفظ کا شکار محسوس کر رہے تھے۔ کچھ گھر ایسے تھے جو زیادہ پریشانی کا شکار تھے اور ان میں دین محمد کا گھر بھی تھا۔ اسحاق عرف ساقا، عالمگیر کے خاص چمچوں میں سے تھا اور ساقے کو تاجور کا رشتہ نہ ملنے کی سخت رنجش تھی۔ سجاول کے غیظ و غضب کا رخ دین محمد کے گھر کی طرف بھی ہو سکتا تھا اور دین محمد کے گھر میں وہ ہستی بھی تھی جس کی حفاظت کے لیے میں جان لڑا سکتا تھا۔ یہاں کے لوگ مجھے جانتے نہیں تھے، نہ اچھے جانتے تھے، نہ برے جانتے تھے اور میری خواہش تھی کہ وہ مجھے نہ ہی جانیں، میرا دوسرا روپ اس روپ سے بہت مختلف تھا۔ میں جب اس روپ کے بارے میں سوچتا تھا تو میرے ذہن میں جھماکے سے ہوتے تھے۔ خون اچھلتا تھا، دھماکے ہوتے تھے، لاشیں گرتی تھیں۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے قتل کیا تھا۔ ایک دو افراد کو نہیں، آٹھ دس افراد کو بھی نہیں۔ ان کی تعداد درجنوں میں تھی۔ میں نے اس زندگی کو خیرآباد کہا تھا۔ ایک نئی زندگی شروع کی تھی اور میں چاہتا تھا کہ میری اس نئی زندگی میں پرانی زندگی کی جھلکیاں نظر نہ آئیں۔ اب تک میں بس ایک بار اپنے ارادے میں کچھ ناکام ہوا تھا جب میں نے فائزہ اور چچی کے قاتل کو ٹرک کے نیچے کچلا تھا۔ اس کے بعد اب تک خیریت ہی گزر رہی تھی۔

صبح ایک پُرتکلف ناشتے نے استقبال کیا۔ دیسی گھی کے پراٹھے، انڈوں کا آملیٹ، دہی کی گاڑھی میٹھی لسی اور بادام کا حلوہ۔ میں نے اسفند کو اپنے ہاتھ سے لقمے دیئے۔ وہ بہت خوش تھا۔ پانی کی موٹر پھر خراب تھی، وہ میں نے ٹھیک کر دی۔ ایک استری ٹھیک کی۔ لوہے

کے نئے دروازے کو بند کرنے میں مشکل پیش آتی تھی۔ اسے بھی فکس کیا۔ مجھے لگا کہ میں دین محمد صاحب اور ان کے گھر والوں کی ضرورت بنتا جا رہا ہوں۔ یہ میرے لیے بڑی خوش آئند بات تھی۔

سارا دن عجیب سی ترنگ میں گزرا۔ میں نے خود کو کسی کھلنڈرے لڑکے کی طرح محسوس کیا۔ جی چاہا میں چھلانگیں لگاؤں۔ اپنے دونوں بازو پھیلاؤں اور کھیتوں کھلیانوں کے درمیان بھاگتا چلا جاؤں۔ پھر کسی ویران جگہ پہنچ کر کھڑا ہو جاؤں۔ اپنا چہرہ شفاف نیلے آسمان کی طرف اٹھاؤں اور پکار کر کہوں۔ ''تیرا شکریہ یا رب، مجھے وہ مل گیا جو میں نے چاہا تھا۔ میں نے اسے پا لیا، جسے آن گنت زمانوں سے ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ مجھے مل گئی ہے اور اس کے دل میں میرے لیے گنجائش بھی موجود ہے۔ تیری کرم نوازی شامل حال رہی تو میں گنجائش کو محبت میں بدل دوں گا میرے مالک......''

زندگی میں پہلی بار مجھے اللہ کے وجود کا احساس اتنی شدت سے ہوا اور اس سے مانگنے کو بھی اتنی شدت سے دل چاہا۔ رات ہوئی تو میں نے ایک فیصلہ کیا۔ میں اپنی تاجور کو اور اس کے گاؤں کو ڈکیت سجاول کے خوف سے آزاد کر دوں گا جس طرح عالمگیر اور اسحاق وغیرہ کے جبر کے سائے اس کے سر پر سے سمٹے ہیں، سجاول کا سایہ بھی سمٹ جائے گا...... ناپید ہو جائے گا۔

میں وہ ٹھکانا اچھی طرح دیکھ چکا تھا جہاں چند دن پہلے سجاول اور عالمگیر نے رقص و سرودِ کی بے ہودہ محفل جمائی تھی۔ میں نے رات کا کھانا کھانے کے بعد انیق سے کہا۔ ''آج پھر ایک مہم پر نکل رہا ہوں۔''

''کس مہم پر؟'' انیق نے چونک کر پوچھا۔

''اس ٹھکانے کی طرف جہاں میں نے سجاول اور عالمگیر کو دیکھا تھا۔''

''آپ کا کیا خیال ہے، وہ اب بھی وہاں محفل جما کر بیٹھے ہوں گے اور آپ کا یا پولیس کا انتظار کر رہے ہوں گے؟''

''لیکن کوئی چانس تو بن سکتا ہے نا، ہو سکتا ہے کوئی کھوج کھرا مل جائے۔''

''میرا خیال ہے کہ میرا کچھ کہنا سننا فضول ہے، آپ پکا ارادہ کر چکے ہیں۔ لیکن ایک بات میری بھی مان لیں۔ اس خاکسار کو بھی ساتھ لے چلیں۔ کبھی کبھی کھوٹا سکہ بھی کام آ جاتا ہے۔''

''تم کھوٹے نہیں ہو، اس لیے تو سنبھال سنبھال کر رکھ رہا ہوں، کہیں ضائع نہ ہو جاؤ۔''

وہ اصرار کرنے لگا کہ ساتھ جائے گا۔ میں چونکہ اپنے پوشیدہ روپ میں نکلنا چاہتا تھا، اس لیے انیق کی بات نہیں مانی۔ میں نے پتلون نکالی، ڈھاٹا نکالا، جیکٹ الٹ کر پہنی اور دیگر تیاری کر کے جانے کے لیے تیار ہوگیا۔ یہ وہی روپ تھا جس میں مقامی لوگ مجھے یاسر سمجھنے لگے تھے۔ حق نواز کے بھائی کی کھٹارا موٹر سائیکل آج پھر میری ہمسفر بننے والی تھی۔ اسپائی کیمرا، ڈکٹافون، بے ہوشی کا اسپرے اور اس طرح کی دیگر اشیا میری جیکٹ کی اندرونی جیب میں یوں سما جاتی تھیں کہ آسانی سے ان کا کھوج نہیں لگایا جا سکتا تھا۔

گیارہ بجے کے لگ بھگ جب ٹھیکری پہرے والے گاؤں کی دوسری جانب تھے، میں موٹر سائیکل اسٹارٹ کر کے نکل کھڑا ہوا۔ سرد رات میں اونچے نیچے راستوں پر موٹر سائیکل کا سفر آسان کام نہیں ہوتا، پھر جب یہ خطرہ بھی ہو کہ کسی بھی وقت کسی نادیدہ دشمن سے ملاقات ہو سکتی ہے تو صورتِ حال اور گمبھیر ہو جاتی ہے۔ قریباً ایک گھنٹے کے سفر کے بعد میں ڈیرے کے قرب و جوار میں پہنچ گیا۔ اس مرتبہ میں نے موٹر سائیکل کافی فاصلے پر ہی روک دی اور اسے درختوں کے جھنڈ میں چھپا کر پیدل آگے بڑھا۔ میری جیکٹ کی جیب میں اعشاریہ 38 کا تسلی بخش بوجھ موجود تھا۔ ہر قسم کے حالات سے نمٹنے کے لیے میری حسیات پوری طرح بیدار تھیں۔

انیق کی بات کی بازگشت میرے کانوں میں گونجی۔ اس نے کہا تھا۔ ”یہ ہو سکتا ہے جی کہ سجاول اور اس کے ساتھی اس ڈیرے پر تو نہ ہوں لیکن ان کے ایک دو بندے چھپ کر ڈیرے کی نگرانی کر رہے ہوں۔ انہیں توقع ہو کہ ان کی تصویریں کھینچنے والا پھر وہاں پہنچے گا اور کیا پتا پولیس نے بھی سادہ کپڑوں میں اپنا کوئی مخبر وہاں چھوڑ رکھا ہو۔“

انیق کی کہی ہوئی بات میں وزن تھا۔ اسی لیے میں ضرورت سے زیادہ محتاط بھی تھا لیکن اگلے آدھے گھنٹے میں میرے یہ سارے اندازے غلط ثابت ہو گئے۔ یہ ٹھکانا بالکل خالی تھا، اردگرد بھی کسی کے آثار نہیں تھے۔ عین ممکن تھا کہ پولیس والوں نے دو چار روز اس جگہ کی نگرانی کی ہو لیکن اب اس ٹھٹھرے ہوئے ویرانے میں ان کا بھی کوئی وجود نہیں تھا۔ میرے پاس پنسل ٹارچ موجود تھی لیکن میں نے وہ بھی روشن نہیں کی۔ میں نے وہ جگہ دیکھی جہاں چند روز پہلے رقص و سرود کی محفل برپا تھی۔ وہاں اب بھی شراب کے ٹوٹے ہوئے گلاس، چچوڑی ہوئی ہڈیاں اور مرجھائے ہوئے گجرے پڑے تھے۔ آدم نہ آدم زاد۔ میرے کانوں میں اس شب کی بدمست آوازیں گونجنے لگیں۔ گھنگھروؤں کی جھنکار، شیشے کی کھنا کھن، سرشار قہقہے......

اور رات بھر جام سے جام ٹکرائے گا۔ جب نشہ چھائے گا، تب مزہ آئے گا۔ نشہ چھا گیا تھا اور

''مزہ'' بھی آ گیا تھا۔ مزہ لینے والے جسمانی ریمانڈ پر تھے اور یہاں بس تاریکی تھی اور جھینگروں کی آواز تھی۔ میں اس جگہ کے خستہ حال کمروں میں گھومنے لگا۔ عقبی سمت میں احاطہ تھا اور آگے کھلی جگہ تھی۔ یہاں گھنی جھاڑیاں تھیں اور مٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹیلے بھی تھے۔ اچانک ایک مدھم سی آواز سنائی دی۔ پہلے تو لگا کہ شاید میرے کان بجے ہیں مگر جب دوسری بار آواز ابھری تو میں چوکنا ہو گیا۔

یہ کسی عورت کے کھانسنے کی بہت دھیمی سی آواز تھی۔ میرے چہرے پر ڈھاٹا تھا۔ میں نے پستول نکال کر ہاتھ میں لے لیا اور محتاط قدموں سے آواز کی طرف بڑھا۔ آواز ایک جھاڑی کے عقب سے ابھری تھی۔ بلکہ یہ جھاڑی بھی نہیں تھی، بس جھاڑ جھنکاڑ ہی تھا۔ یہاں کوئی چھپ تو نہیں سکتا تھا مگر جب ذرا دھیان سے دیکھا تو پتا چلا کہ کچے ٹیلے کے اندر یہ ایک کھوہ سی ہے۔ ویران ٹیلوں میں ایسے قدرتی خلا اکثر موجود ہوتے ہیں۔ یہ آواز بھی اسی خلا کے اندر سے ابھری تھی۔ میں جھاڑ جھنکاڑ میں سے گزر کر اس چھوٹی سی کھوہ کے دہانے پر پہنچا۔

''کون ہے؟'' میں نے سرسراتی آواز میں پوچھا۔ آواز زیادہ بلند نہیں تھی۔

اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ ''تم جو کوئی بھی ہو، باہر آ جاؤ۔ میرے ہاتھ میں پستول ہے، کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو تمہارا نقصان ہو جائے گا۔''

جواب میں پھر خاموشی طاری رہی۔ بس جھینگروں کی آوازیں تھیں۔

میں نے خطرہ مول لیتے ہوئے پنسل ٹارچ روشن کی اور پستول کے ٹریگر پر انگلی رکھ کر اندر داخل ہو گیا۔ اندر داخل ہونے کے لیے مجھے گھٹنوں اور کہنیوں کے بل چلنا پڑا۔ یکایک پنسل ٹارچ کی روشنی کسی عورت کے ننگے پاؤں پر پڑی۔ میں نے ٹارچ کو حرکت دی اور ایک سکڑی سمٹی لڑکی نظر آئی۔

اس نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑے اور گھگیائی۔ ''مجھے کچھ نہ کہنا۔ خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو۔''

میں اس کی صورت دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ یہ وہی ماڈل گرل جاناں تھی جسے میں نے چند روز پہلے سامنے والے کھنڈر گھر میں رقص کرتے دیکھا تھا۔ اس سے پہلے جاناں سے میری ملاقات لاہور میں پلپلے جسم والے پاشا کی عالی شان کوٹھی میں ہوئی تھی۔ وہاں بھی یہ بے چاری بہ حالت مجبوری پاشا کا بیڈ روم آباد کر رہی تھی۔

میرا چہرہ ڈھاٹے میں چھپا ہوا تھا۔ کوئی سوال ہی نہیں تھا کہ وہ مجھے پہچان سکتی، میری

آواز کے ساتھ بھی اس کی جان پہچان معمولی سی تھی۔

میرے ہاتھ میں پستول دیکھ کر اس کی خوب صورت آنکھوں کی دہشت میں اضافہ ہوا۔ وہ یقیناً مجھے سجاول سیالکوٹی کا کوئی ساتھی ہی سمجھ رہی تھی۔ اس نے ہاتھ اب تک جوڑ رکھے تھے۔ ملتجی لہجے میں بولی۔ ''م...... میرا کوئی قصور نہیں۔ جو کچھ ہوا، اس کی وجہ سے ہوا...... وہ...... اپنے ہوش میں ہی نہیں تھا۔''

مجھ سے ڈر کر وہ پہلو کے بل گر گئی تھی اور گٹھڑی کی طرح بالکل ایک گوشے میں سمٹ گئی تھی

''سیدھی ہو کر بیٹھو۔'' میں نے ذرا تحکم سے کہا۔

وہ لرز کر سیدھی ہو گئی۔ ''تت...... تم جو کہو گے، میں مانوں گی...... اس کو پیچھے ہٹا لو۔'' اس کا اشارہ میرے پستول کی طرف تھا۔

میں نے پستول کی نال نیچے جھکانے سے پہلے احتیاط سے دیکھا، اس کے پاس کوئی ہتھیار یا آلہ نہیں تھا۔ کھوہ میں کسی دوسرے شخص کے آثار بھی نہیں تھے۔ میں نے ٹریگر پر سے انگلی ہٹالی اور بیرل نیچے جھکا لیا۔

''تم نے کیا سمجھا تھا، اس طرح بچی رہو گی۔'' میں نے اندھیرے میں تیر چلایا۔

''م...... میں کیا کرتی۔ وہ بالکل ہوش میں نہیں تھا۔ م...... مجھے لگ رہا تھا میرا دل رک جائے گا۔ وہ مجھے مار بھی رہا تھا۔ میں نے خود کو بچانے کے لیے اس کے سر پر بوتل ماری......''

جاناں کی باتوں سے میرے اندازے کی تصدیق ہوئی۔ یہ سب کچھ اسی رات ہوا تھا جب یہاں رقص و سرود اور شباب و کباب کی محفل جمی تھی۔ یہاں کل تین لڑکیاں تھیں اور یہ محفل کے اہم شرکاء کی رات کو رنگین کرنے کے لیے تھیں۔ ان شرکاء میں سے کوئی ایک شخص زیادہ ہی مدہوش تھا۔ پہلے سے تھکی ماندی جاناں کی برداشت جواب دے گئی اور اس نے اس مدہوش شخص کو وہسکی کی بڑی بوتل مار کر زخمی کر دیا۔ اس کے بعد وہ بھاگ نکلی اور یہاں چھپ گئی۔

میں نے ٹارچ کی روشنی میں جاناں کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ وہ بے بسی و بدحالی کی تصویر نظر آتی تھی۔ اس نے ٹراؤزر پہن رکھا تھا۔ بالائی جسم ایک شال سے چھپا ہوا تھا۔ اس کے چہرے اور ہاتھوں پر اس وحشت کے نشان تھے جو اس منحوس رات میں ان بدمعاشوں نے اس لڑکی کے ساتھ روا رکھی تھی۔

میں نے جاناں سے کہا۔ ''بڑی کرک لڑکی ہو تم، آٹھ دن ہو گئے ہیں، اور تم نے خود کو یہاں چھپا رکھا ہے، کھاتی پیتی کیا رہی ہو؟''

''میں وہاں کمروں میں گئی تھی۔ کچھ سوکھے ہوئے نان ملے تھے اور تھوڑا سا پانی۔ نانوں کے ٹکڑے پانی میں بھگو بھگو کر کھاتی رہی ہوں۔''

میں نے ٹارچ کے روشن دائرے کو حرکت دی۔ ایک گوشے میں اسٹیل کا ایک جگ پڑا تھا۔ پاس ہی ایک شاپر میں سوکھے ہوئے نان کے ٹکڑے تھے۔

''پولیس والے بھی تو پھرتے رہے ہیں یہاں، انہوں نے بھی تمہیں نہیں دیکھا؟''

وہ پہلو بدل کر بولی۔ ''شروع کے دو تین دنوں میں، میں نے گاڑیوں کی آوازیں سنی تھیں۔ ایک دو بار پولیس کی گاڑی والا سائرن بھی سنائی دیا تھا مگر اس طرف تو کوئی نہیں آیا۔''

''تم نے یہ نہیں سوچا کہ باہر نکل کر پولیس کی مدد مانگو؟''

''مجھے ٹھیک سے پتا نہیں تھا کہ یہ پولیس والے ہی ہیں یا کوئی اور ہے۔ پھر پولیس والوں میں بھی تو اچھے برے ہیں......'' وہ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔ ہو سکتا ہے کہ اسے لاہور کے واقعات یاد آ گئے ہوں۔ جب وہ اپنے ایک ''گاہک'' کے ساتھ تھی اور پکڑی گئی تھی پھر قیصر چودھری جیسے بے لگام انسپکٹر نے اسے ایسا پھنسایا تھا کہ وہ بلا معاوضہ پاشا جیسے بندے کی رکھیل بننے پر مجبور ہو گئی تھی اور اب یقیناً پاشا کے ذریعے ہی دربدر ہوتی پھر رہی تھی۔

''تو کیا، اب تمہارا ارادہ مستقل طور پر یہیں رہنے کا تھا؟'' میں نے ذرا چبھتے ہوئے لہجے میں اس سے پوچھا۔

''نن......نہیں...... میں اب یہاں سے نکلنا چاہتی تھی لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ میں بہت تھک گئی ہوں...... بہت تھک گئی ہوں۔ میں اب اپنے گھر جانا چاہتی ہوں۔ میری مدد کرو......پلیز میری مدد کرو۔'' وہ سسکیاں لینے لگی۔

مجھے اس پر بے تحاشا ترس آیا۔ وہ اپنی شال کو بار بار مضبوطی سے اپنے جسم کے گرد لپیٹتی تھی۔ جیسے میرے اور اپنے درمیان ایک دیوار کھڑی کرنا چاہ رہی ہو لیکن ایسی ''دیواریں'' بے بس عورتوں کا ساتھ کب دیتی ہیں۔ جلد ہی مجھے یہ اندازہ بھی ہو گیا کہ اس بے چاری کے بالائی جسم پر اس شال کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ کپڑے کا ایک تار بھی نہیں اور وہ سخت سرد راتوں میں اسی ایک شال کے ساتھ......اور پانی میں نان بھگو بھگو کر زندہ رہنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میرا دل چاہا، اس اجڑی پجڑی لڑکی کو پکڑوں اور لاہور جا کر اسے سیدھا کسی ٹی وی چینل پر لے جاؤں۔ اپنے ملک کی ہزارہا نوجوان لڑکیوں کو اس ''جاناں'' کی کہانی سناؤں

انہیں بتاؤں کہ ''شوبز'' میں نام کمانے کے شوق میں جو لڑکیاں گھروں سے نکلتی ہیں اور بے مہار ہوتی ہیں، وہ کبھی کبھی کس انجام کو پہنچتی ہیں۔

○......❖......○

جاناں مجھے کافی کچھ بتا رہی تھی لیکن کافی کچھ چھپا بھی رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ مجھے ابھی تک ڈکیت سجاول کا ساتھی ہی سمجھ رہی تھی۔ میں نے اس کا خوف دور کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے اپنا پستول لاک کر کے جیکٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ اس کے بعد میں نے اپنی جیکٹ اتاری اور قمیص بھی اتارنے لگا۔ جاناں کی آنکھوں میں خوف کچھ اور بڑھ گیا۔

میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''لگتا ہے کہ تم نے شال کے علاوہ اور کچھ نہیں پہنا ہوا۔ کم از کم یہ قمیص اور بنیان پہن لو۔ میں دو منٹ کے لیے باہر چلا جاتا ہوں۔''

وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگی۔ یقیناً یہاں لانے والے کسی بھی شخص نے اسے کچھ پہننے کے لیے نہیں کہا ہوگا۔ ہر ایک نے اس کے برعکس ہی بات کی ہوگی۔

قمیص اور بنیان اسے دے کر میں باہر نکل گیا۔ ٹارچ بھی میں نے اندر ہی چھوڑ دی تھی۔ دو تین منٹ بعد واپس آیا تو وہ میری ہدایت پر عمل کر چکی تھی۔

میں نے کہا۔ ''تمہارے لیے ایک اچھی خبر ہے جاناں! میرا تعلق سجاول وغیرہ سے نہیں، سمجھو کہ میں ایک قریبی آبادی سے آیا ہوں۔''

پہلے تو اسے بھروسا نہیں ہوا لیکن جب میں نے اپنی بات اصرار کے ساتھ کہی تو وہ کچھ سوچنے پر مجبور ہوگئی بولی۔ ''تم پڑھے لکھے لگتے ہو۔ تمہاری بول چال سے مجھے کچھ شک تو ہو رہا تھا لیکن......تمہارا حلیہ؟ اور یہ پگڑی جس میں تم نے منہ چھپایا ہوا ہے؟''

''سمجھو کہ سجاول اور اس کے ساتھیوں کی طرح میری بھی یہ مجبوری ہے......''

''کیا تم......میری مدد کر سکتے ہو؟'' وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔

''ہاں، لیکن اس صورت میں جب تم مجھے اپنے اور سجاول وغیرہ کے بارے میں سب کچھ بتاؤ۔''

''کیا بتاؤں؟'' وہ روہانسی آواز میں بولی۔

''تمہیں یہاں لانے والا کون تھا؟''

''اس کا نام پاشا ہے۔ وہ لاہور میں رہتا ہے۔ بڑا بااثر بندہ ہے۔ اس کی پہنچ اوپر تک ہے۔ میں ایک معاملے میں پھنس کر اس کے پاس چلی گئی تھی۔ اب اس کے پاس رہتی ہوں۔ وہ مجھے اپنے دوستوں اور جاننے والوں کے پاس بھی بھیجتا رہتا ہے...... اب اس نے دو

دوسری لڑکیوں کے ساتھ مجھے یہاں بھیجا تھا۔"
جاناں نے اپنی رام کہانی کے اکثر حصے مجھے صاف صاف سنا دیئے۔ بہرحال کئی باتیں وہ چھپا بھی گئی۔ مثلاً پاشا کے اصل پشت پناہ شکیل داراب کا نام وغیرہ۔
میں نے کہا۔ "جشن کی رات میں نے یہاں درختوں میں ایک مرسیڈیز گاڑی کھڑی دیکھی تھی سفید رنگ کی...... وہ کس کی تھی؟"
وہ ذرا جھجک کر بولی۔ "مجھے ٹھیک سے اس کا نام معلوم نہیں۔ وہ لاہور کا ایک مالدار زمیندار ہے۔ اسے "لالہ" بھی کہتے ہیں۔"
"لالہ وریام تو نہیں۔" میں نے پوچھا۔
"ہاں...... شاید یہی ہے۔"
"کیا اس جشن کی رات وہ بھی یہاں تھا؟"
"ہاں وہ آیا تھا لیکن پینے پلانے سے اس کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی تھی۔ اس لیے وہ سونے چلا گیا تھا۔"
میں نے کہا۔ "میں نے اخبار میں ایک خبر پڑھی تھی۔ یہ لالہ وریام وہی تو نہیں جس کا ایک بڑا بھائی لالہ نظام ٹریفک کے ایک حادثے میں مارا گیا تھا۔ ایک بھاری ٹرک نے اس کی مرسیڈیز کا کچومر نکال دیا تھا؟"
"ہاں...... ہاں...... یہ بات میں نے بھی سنی ہے۔"
اس رات یہاں درختوں یں دیکھی ہوئی مرسیڈیز گاڑی پھر میری نگاہوں میں گھومنے لگی۔ یہ ہو بہو وہی گاڑی تھی اور مجھے تو لگتا تھا کہ اس کا نمبر بھی وہی ہے، یہ ایک معما سا لگتا تھا۔ ایسی تباہ حال گاڑیوں کو تو اسکریپ والے ہی قبول کرتے ہیں پھر وہ گاڑی یہاں صحیح سالم حالت میں کیسے موجود تھی؟
مجھے خاموش دیکھ کر وہ بولی۔ "میں نے تمہیں اپنے بارے میں اتنا کچھ بتایا ہے لیکن تم نے ابھی نام تک نہیں بتایا۔"
میں نے کہا۔ "نام میں کچھ نہیں رکھا ہوتا۔ اصل چیز تو کام ہوتی ہے اور مجھے امید ہے کہ میرا کام تمہیں پسند آئے گا۔ میں تمہیں حفاظت کے ساتھ یہاں سے نکالوں گا اور محفوظ ٹھکانے تک پہنچاؤں گا۔"
"پھر بھی...... مجھے...... نام کا تو پتا ہونا چاہیے۔"
پتا نہیں کہ میرے دل میں کیا آئی۔ میں نے کہا۔ "تم مجھے یاسر کہہ سکتی ہو۔"

''یاسر؟'' اس نے چونکے لہجے میں کہا۔

''ہاں یاسر، لیکن تم حیران کیوں ہوئی ہو؟''

اس کے چہرے پر ہلچل کے آثار تھے۔ وہ مجھے سرتاپا دیکھ رہی تھی اور اس کے ہونٹ بے ساختہ لرز رہے تھے۔ وہ ہکلائی۔ ''تم وہی ہو جسے علاقے کے لوگ یاسر بھائی کہتے ہیں...... اور...... تم نے پچھلے ہفتے یہاں سجاول اور اس کے ساتھیوں کی تصویریں وغیرہ بھی اتاری تھیں؟''

''ہاں میں وہی ہوں۔ لیکن...... یہ تصویروں کی بات تم کیوں کر رہی ہو۔ کس نے بتایا ہے تمہیں؟''

''انہی لوگوں سے پتا چلا ہے۔ تم نے ان کی تصویریں کھینچیں، ویڈیو بنائی...... اور ان تصویروں اور ویڈیوز کی وجہ سے سجاول سیالکوٹی کے کسی دوست کو بہت نقصان پہنچا۔ وہ ایک جھگڑے میں ملوث ہو کر گرفتار ہو چکا ہے۔ کیا یہ سب صحیح ہے؟''

''پہلے تم مجھے یہ بتاؤ کہ تمہیں یہ سب پتا کیسے چلا؟''

''میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا کہ یہاں چھپنے کے بعد میں نے ڈکیت سجاول کے کسی ساتھی کو نہیں دیکھا۔ کل رات وہ اس کھوہ کے باہر گھوم رہے تھے۔ اتنے قریب تھے کہ میں ان کی رائفلوں کی کھڑکھڑ بھی سن سکتی تھی۔ قدرت نے مجھ پر خاص الخاص مہربانی کی ہے کہ میں کل رات ان کے ہتھے نہیں چڑھی۔ ورنہ پتا نہیں میرا کیا حشر ہوتا۔ وہ تین یا چار بندے تھے اور مجھے لگتا ہے کہ مجھے ڈھونڈنا بھی ان کے پروگرام میں شامل تھا۔ ویسے وہ اپنا کچھ اسلحہ لینے آئے تھے جو انہوں نے یہیں کہیں جھاڑیوں میں دبایا ہوا تھا پلاسٹک وغیرہ لپیٹ کر۔''

''انہوں نے اس کھوہ کے اندر نہیں جھانکا؟'' میں نے جاناں سے پوچھا۔

''اسی لیے تو کہتی ہوں کہ مجھ گناہ گار کی کوئی چھوٹی موٹی نیکی کام آئی ہے۔ وہ کھوہ کے اندر آئے۔ ان میں سے ایک بندے نے ٹارچ بھی گھمائی۔ پتا نہیں میں کس طرح روشنی میں آنے سے بچ گئی۔ کھوہ کے اندر آنے والا نشے میں جھومتا ہوا باہر چلا گیا۔ وہ لوگ یہاں پاس ہی درختوں کے نیچے آگ جلا کر بیٹھ گئے۔ وہ پیتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ ان کی باتوں سے ہی مجھے تمہارے نام کا پتا چلا اور یہ بھی پتا چلا کہ جشن والی رات تم ان کے دو بندے زخمی کر کے بھاگ گئے تھے......''

باتیں کرتے کرتے جاناں ایک دم رک گئی۔ لرز کر بولی۔ ''اگر تم ہی یاسر بھائی ہو تو پھر ذرا سی دیر بھی نہ کرو۔ فوراً اپنے گھر پہنچو...... فوراً پہنچو۔''

''یہ کیوں کہہ رہی ہو تم؟''

''کل میں نے جو کچھ سنا ہے، اس سے پتا چلتا ہے کہ آج کی رات تمہارے گھر والوں پر بہت بھاری ہے۔ کیا ٹائم ہوا ہے تمہارے پاس۔'' وہ ہیجانی انداز میں بولی۔

میں نے رسٹ واچ دیکھی۔ یہ ڈیڑھ بجے کا عمل تھا۔ میں نے اسے وقت بتایا۔ وہ لرزیدہ آواز میں بولی۔ ''تمہارا گھر یہاں سے کتنی دور ہے؟''

''زیادہ دور نہیں۔'' میں نے گول مول جواب دیا۔ مجھے اس گاؤں کا نام تو معلوم تھا جہاں یاسر کے گھر والے رہ رہے تھے لیکن یہ پتا نہیں تھا کہ وہ کتنے فاصلے پر ہے۔

وہ کراہی۔ ''تم مجھے بھلے آدمی لگتے ہو۔ وقت ضائع نہ کرو۔ اپنے گھر والوں کی خبر لو۔ اگر پولیس کی مدد حاصل کر سکتے ہو تو وہ کرو۔ رات آخری پہر تمہارے گھر میں کچھ بہت برا ہونے والا ہے۔''

اگر یاسر نامی اس شخص کے گھر والوں کے ساتھ کچھ برا ہونے والا تھا تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ علاقے کے لوگوں نے خود ہی میری کارروائیوں کو اس یاسر نامی بندے سے منسوب کر دیا تھا۔ اب یہ بات خود ہی ہر خاص و عام تک چلی گئی تھی اور نتیجے میں یاسر کے گھر والوں کے لیے کوئی سنگین مشکل پیدا ہو رہی تھی۔ بہرحال جو کچھ بھی تھا، یہ میرے لیے کسی طور قابلِ قبول نہیں تھا۔

اگلے ڈیڑھ دو منٹ میں فیصلہ ہو گیا۔ میں جاناں کو لے کر اس ویران جگہ سے نکل آیا۔ پستول میں نے ہاتھ میں لے لیا تھا اور ہر صورتِ حال کے لیے بالکل تیار تھا۔ چند منٹ بعد ہم موٹر سائیکل تک پہنچ گئے۔ میں نے موٹر سائیکل میں چابی لگائی اور اس وقت مجھے احساس ہوا کہ کوئی آس پاس موجود ہے۔

میں نے جاناں کو گردن سے پکڑا اور نہایت تیزی سے نیچے جھکا دیا، خود میں بھی جھک گیا تھا۔ ہمارا یوں جھکنا ہم دونوں کی زندگی کی ضمانت بن گیا۔ دھماکے کے ساتھ ایک شعلہ سا ہمارے سروں کے اوپر سے گزر گیا۔ جاناں کے چلانے کی آواز دور تک گونجی تھی۔ میں نے جوابی فائر کیا۔ گولی مدِمقابل کے سینے میں لگی اور وہ سرکنڈوں میں گر کر اوجھل ہو گیا۔

تب ایک شخص پہلو سے حملہ آور ہوا۔ میں نے بھانپ لیا کہ اس کے ہاتھ میں کوئی تیز دھار آلہ ہے۔ میں تڑپ کر پیچھے ہٹا اور چاقو کا وار مجھے چھوتا ہوا نکل گیا۔ بالکل اسی طرح جیسے پچھلی مرتبہ ہوا تھا اور میری جیکٹ پر کئی انچ لمبا کٹ آ گیا تھا۔ میں نے مدِمقابل کے سینے پر لات رسید کی۔ وہ دور تک لڑھک گیا۔ غیر متوقع طور پر دوبارہ میری طرف آنے کے بجائے

اس نے سرکنڈوں میں گھس کر دوڑ لگا دی۔

میں اپنا ڈھاٹا مضبوطی سے باندھتا تھا اور مزید احتیاط کے طور پر سیفٹی پنیں بھی لگاتا تھا۔ پھر بھی پتا نہیں کیسے ڈھاٹے کا ایک پلو لٹک گیا اور وہ کھلتے کھلتے بچا۔ میں نے اسے دوبارہ درست کیا اور زخمی تک پہنچا۔ وہ چت لیٹا تھا اور ختم ہو چکا تھا۔ اس کی عمر ستائیس اٹھائیس سال سے زیادہ نہیں رہی ہوگی۔ دیہاتی لباس کے بجائے پتلون اور سویٹر پہن رکھا تھا۔ اس کا حلیہ گواہی دے رہا تھا کہ وہ سجاول سیالکوٹی کے ساتھیوں میں سے ہے۔ میں نے اس کی جیبیں ٹٹولیں، جیبوں سے ملنے والی سب سے اہم شے کسی گاڑی کی چابی تھی۔ میں نے اردگرد نگاہ دوڑائی۔ جھاڑیوں کی اوٹ میں کھڑی ایک پک اَپ نظر آئی۔ یہ چابی اسی سیاہ پک اَپ کی تھی۔ یہاں دو فائر ہو چکے تھے، اب یہ جگہ رکنے کے لیے بالکل بھی مناسب نہیں تھی۔ میں نے پک اَپ کا عقبی دروازہ کھول کر موٹر سائیکل کو پک اَپ پر چڑھایا۔ ہلاک ہونے والے ڈکیت کا مشین پسٹل اٹھا کر ڈیش بورڈ میں رکھا۔ جاناں کو اپنے پہلو میں بٹھایا اور پک اَپ کو حتی الامکان رفتار سے چاند گڑھی کی طرف دوڑا دیا۔

یہ بات تو مجھے تاجور سے معلوم ہو گئی تھی کہ یاسر کے مفرور ہونے کے کچھ عرصے بعد یاسر کے گھر والے بھی چاند گڑھی سے نکل کر پاس والے گاؤں میں چلے گئے تھے۔ اس گاؤں کا نام اس نے ''پیپل والی'' بتایا تھا۔ جاناں جو کچھ بتا رہی تھی اگر وہ درست تھا تو پھر مجھے جلد از جلد اس ''پیپل والی'' گاؤں پہنچنا تھا۔

ہم نے ایک جگہ رک کر پیپل والی کا راستہ ایک کھیت مزدور سے پوچھا۔ اس نے بتایا کہ ہم بمشکل ڈھائی تین کلومیٹر دور ہیں۔ جاناں بہت ڈری ہوئی تھی۔ اس نے مری مری آواز میں کہا۔ ''یاسر! آپ مجھے یہیں کہیں اتار دیں، مجھ میں اب اور سہنے کی ہمت نہیں ہے۔ میں اب اس جگہ سے نکل جانا چاہتی ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''تم بالکل فکر نہ کرو۔ میں تمہیں پیپل والی اور وہاں کی صورتِ حال سے بہت دور رکھوں گا۔ مجھے اچھی طرح پتا ہے کہ میں نے تمہیں کہاں اتارنا ہے۔''

○......❖......○

قریباً دس منٹ بعد میں پک اَپ ڈرائیو کرتا ہوا، طوفانی رفتار سے ''پیپل والی'' گاؤں میں داخل ہوا۔ جاناں اب میرے ساتھ نہیں تھی۔ میرے پیچھے تاریک گلیوں میں گرد کا بادل اٹھ رہا تھا اور آوارہ کتوں کی ٹولیاں میرے پیچھے لپک رہی تھیں۔ پتا نہیں کیوں، گاؤں میں داخل ہوتے ہی مجھے احساس ہوا کہ یہاں کوئی سنگین گڑبڑ ہو چکی ہے۔ یہ رات کا پچھلا پہر تھا۔

اس کے باوجود لوگ ٹولیوں میں یہاں وہاں کھڑے تھے۔ تین چار گھڑ سوار افراتفری کے عالم میں گھوڑے بھگاتے میرے سامنے سے گزرے۔

میں نے پک اپ روک کر ایک ہراساں شخص سے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

وہ دوہائی دینے والے انداز میں بولا۔ ''سیالکوٹی کے لوگ اماں برکتے کی بیٹی کو اٹھا کر لے گئے۔ زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے، کوئی ان کو پکڑے۔''

میں نے پک اپ کی ہیڈ لائٹس میں دیکھا کچھ فاصلے پر ایک عورت بے حس و حرکت زمین پر پڑی تھی۔ اس کے سر کے بال اور کپڑے خون اور مٹی میں لتھڑے ہوئے تھے۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا وہ یاسر کی والدہ ہی تھی۔ اس نے آخر وقت تک بیٹی کو بچانے کی کوشش کی تھی اور اس کے ساتھ گھسٹتی ہوئی گاؤں کے چوراہے تک پہنچ گئی تھی۔ یہاں ڈاکوؤں نے اس کے سر پر بندوقوں کے بٹ مارے تھے اور اسے نیم جان کر کے چھوڑ گئے تھے۔

اتنے میں تین چار مزید افراد پک اپ کے پاس پہنچ گئے تھے۔ وہ تذبذب کے عالم میں میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے کہا۔ ''کوئی مجھے بتا سکتا ہے کہ وہ لوگ کس طرف گئے ہیں؟''

لمبی داڑھی اور روشن چہرے والا ایک درمیانی عمر کا شخص تیزی سے پک اپ میں داخل ہو گیا۔ ''مجھے پتا ہے وہ کس طرف گئے ہوں گے۔'' اس نے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ کہا۔

میں نے دیکھا، اس شخص نے کندھے سے ہولسٹر لٹکا رکھا تھا۔ ''تم کون ہو؟'' میں نے اس سے دریافت کیا۔

''امام مسجد کا بھائی ہوں......اور تم؟''

''ایک ہمدرد ہی سمجھو۔ عزت سب کی سانجھی ہوتی ہے۔'' میں نے بھاری آواز میں مختصر جواب دیا۔

''یہاں سے دائیں موڑو۔'' باریش شخص نے پورے اعتماد کے ساتھ کہا۔

میں نے پک اپ کو نشیب میں ایک سخت ناہموار راستے پر اتار دیا۔ مجھے ارد گرد کھیتوں میں اور درختوں میں جگنو سے چمکتے نظر آ رہے تھے۔ یہ گاؤں کے وہ مسلح لوگ تھے جو دو تین ٹولیوں کی صورت میں اغوا کنندگان کے پیچھے گئے تھے۔ وہ وقفے وقفے سے ہوائی فائر بھی کر رہے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ باریش شخص نے ایک نہایت مشکل راستہ اختیار کیا ہے مگر یہ شارٹ کٹ بھی ہے۔ ایک دو جگہ تو یوں لگا کہ کھلی چھت والی یہ پک اپ الٹ ہی جائے گی۔ بہرحال میں کسی نہ کسی طور اسے سنبھالنے میں کامیاب رہا۔ باریش شخص اغوا

کنندگان کے خلاف غصے سے بھرا ہوا تھا اور انہیں بے نقط سنا رہا تھا۔ وہ بار بار کہہ رہا تھا۔ ''اب یہ علاقہ تو شریف لوگوں کے رہنے کے قابل ہی نہیں رہا۔ چاند گڑھی میں خون خرابے کے بعد اب یہاں بھی یہی کچھ ہونے لگا ہے۔''

وہ بار بار اپنے موبائل فون پر پولیس چوکی کا نمبر ملانے کی کوشش بھی کر رہا تھا لیکن وہاں سے وہی جانا پہچانا جواب مل رہا تھا۔ مطلوبہ نمبر سے رابطہ ممکن نہیں۔

باریش شخص گلوگیر آواز میں بولا۔ ''یہ سب کچھ سمجھ سے باہر ہے۔ آج جو کچھ ہوا ہے، اس کے بعد تو لگتا ہے کہ بہت سے لوگ گاؤں چھوڑنا شروع ہو جائیں گے۔''

بات کرتے کرتے اس نے ایک بار پھر مجھے دھیان سے دیکھا۔ میرا منہ سر ڈھاٹے میں چھپا ہوا تھا۔ وہ پھولی ہوئی سانس کے ساتھ بولا۔ ''کہیں تم...... کہیں تم...... یاسر کے کوئی دوست تو نہیں ہو؟''

''کون یاسر؟'' میں نے انجان لہجے میں پوچھا۔

اس سے پہلے کہ وہ جواب میں کچھ کہتا۔ دور نشیب میں دو سرخ روشنیاں دیکھ کر ہم ٹھٹک گئے۔ میں نے پک اَپ کی لائٹس آف کر کے رفتار دھیمی کر دی۔ باریش شخص نے لرزاں آواز میں کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ یہ وہی ہیں۔ شاید ان کی جیپ کہیں رک گئی ہے یا پھنس گئی ہے۔''

ہم پک اَپ کی بجھی ہوئی لائٹس کے ساتھ ہی تقریباً پچاس میٹر آگے گئے اور پھر اس امر کی تصدیق ہوگئی کہ یہ وہی لوگ ہیں۔ اس وقت جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی جب دو تین بار کسی لڑکی کے چلانے کی بہت مدھم سی آواز بھی سنائی دی۔ میں نے پک اَپ کا انجن بھی بند کر دیا۔ ڈیش بورڈ سے مشین پسٹل نکال کر میں باہر نکل آیا۔ میرے اندر وہی آگ بھڑک چکی تھی جو مجھے ہر خطرے سے بے نیاز کرتی تھی۔ سینے میں دھڑکن کا نقارہ پوری شدت سے گونج رہا تھا۔ وہی میٹھا میٹھا درد جو ہر فائٹر کے جسم میں، میدان میں اترنے سے قبل جاگتا ہے۔ باریش شخص نے بھی پستول اپنے ہولسٹر میں سے نکال لیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ابھی تک اپنے موبائل فون کے ذریعے چوکی کا نمبر ملانے کی ناکام کوشش بھی کر رہا تھا۔

اب ہم جیپ کے اتنے قریب پہنچ گئے تھے کہ جیپ سواروں کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں اور انجن کا شور بھی۔ انجن کے شور اور شور کے اتار چڑھاؤ سے اس بات کی تصدیق ہوتی تھی کہ جیپ واقعی کہیں پھنسی ہوئی ہے۔

میں جانتا تھا، اب خطرناک ترین مرحلہ شروع ہونے والا ہے۔ میں نے باریش شخص سے کہا۔ ''آپ آگے جانا چاہتے ہو یا یہیں رکنا چاہتے ہو یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ پیچھے

جاؤ اور لوگوں کو بلاؤ......"

اس سے پہلے کہ باریش شخص کوئی جواب دیتا، اس کے سر پر قیامت ٹوٹ گئی۔ وہ لڑکھڑا کر اوندھے منہ گرا۔ اس کے ساتھ ہی کڑک دار آوازیں آئیں۔ "خبردار اسلحہ نیچے رکھو...... گولی ماردیں گے...... نیچے رکھو اسلحہ۔"

وہ لوگ نظر نہیں آرہے تھے اور یہی چیز سب سے زیادہ خطرناک تھی۔ مارشل آرٹ کی تربیت کی الف ب بھی یہی ہے کہ نادیدہ دشمن کے وار سے بچنا چاہیے......

میرے قیافے کے مطابق ان کی تعداد تین سے زیادہ نہیں تھی۔ ایک تو وہ تھا جو میرے ساتھی کو چوٹ لگا کر واپس درختوں کی اوٹ میں ہو گیا تھا اور اس کے دو ساتھی مزید ہو سکتے تھے۔ مشین پسٹل نیچے پھینکنے کے سوا میرے پاس چارہ نہیں تھا۔ میرے باریش ساتھی کا پستول خود بخود اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔

ان لوگوں نے ہمیں گن پوائنٹس پر لیا اور بڑی احتیاط سے چلاتے ہوئے موقع پر لے آئے۔ وہ تین نہیں دو تھے لیکن اپنے کام میں ایک دم ماسٹر تھے۔ ہم موقع پر پہنچے تو نقشہ ہماری توقع کے مطابق تھا۔ بڑے سائز کی لینڈ روور جیپ بائیں طرف جھکی ہوئی تھی۔ اس کا ایک پہیہ بری طرح کیچڑ آلود کھڈے میں دھنسا ہوا تھا۔ پہیہ گھومنے سے جو چھینٹے اڑے تھے انہوں نے جیپ سواروں کے کپڑے داغ دار کر رکھے تھے۔ یہ کل چھ افراد تھے۔ دو کے پاس کلہاڑیاں تھیں باقی آتشیں ہتھیاروں سے مسلح تھے۔ تین افراد نے ڈھاٹے باندھ رکھے تھے، باقی کھلے منہ تھے۔ وہ شکلوں سے ہی بدترین قاتل ڈکیت دکھائی دیتے تھے۔ ان میں سے گھنی مونچھوں والا ایک شخص زیادہ لمبا چوڑا تھا اور اس کے بال کندھوں تک پہنچ رہے تھے۔ اس کے ہاتھ میں آٹومیٹک رائفل تھی۔ میرے قیافے کے مطابق یہی اس ٹولی کا سرغنہ تھا۔

یہ قیافہ درست ثابت ہوا۔ وہ دہاڑ کر بولا۔ "اپنا ڈھاٹا کھولو اور شکل دکھاؤ۔" ساتھ ہی اس نے رائفل کو خطرناک انداز میں حرکت دی۔

میں ساکت کھڑا رہا۔ کہیں پاس سے لڑکی کے رونے کی گھٹی گھٹی آواز آرہی تھی۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا گیا تھا۔

"میں تمہارا باپ کیا بکواس کر رہا ہوں تم سے۔ اپنا تھوبڑا دکھاؤ مجھ کو۔"

"اور اگر نہ دکھاؤں تو؟" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"تیری تو......" اس نے گالی بکی اور رائفل کو بیرل کی طرف سے پکڑ کر مجھ پر جھپٹا۔ اس سے بڑی غلطی کیا ہو سکتی تھی اور میں کسی ایسی ہی غلطی کا منتظر تھا۔

میں نے جھک کر سرغنہ کا خطرناک وار بچایا اور اس سے بغلگیر ہو کر اسے اس طرح دھکیلا کہ وہ اپنے دو ساتھیوں سمیت نشیب میں لڑھکتا چلا گیا۔ میں بھی لڑھک کر ایک جھاڑی میں گرا۔

''فائر نہ کرنا...... فائر نہ کرنا۔'' سرغنہ چلایا۔

کلہاڑی بردار خطرناک انداز میں میری طرف بڑھے۔ میں الٹے قدموں پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ دو رائفل برداروں نے بھی اپنی رائفلیں نال کی طرف سے پکڑ لی تھیں۔ لگتا تھا کہ وہ اسی جگہ مار مار کر میری ہڈیوں کا سرمہ بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ میں نے یہ دیکھ کر اطمینان کی سانس لی کہ ''پیپل والی'' کا باریش شخص نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ جان بچانے میں کامیاب ہوا تھا۔

میرے عقب میں کانٹے دار جھاڑیاں تھیں۔ وہ لوگ تین طرف سے میرے قریب آ رہے تھے۔ اب یہ بات بھی سمجھ میں آ گئی تھی کہ وہ فائر کیوں نہیں کرنا چاہ رہے تھے۔ انہیں پتا تھا کہ انہیں تلاش کرنے والے آس پاس انہیں ڈھونڈ رہے ہیں اور وہ بڑی تعداد میں ہیں۔ اگر یہاں فائرنگ ہو جاتی تو وہ فوراً اس طرف متوجہ ہو جاتے۔

وہ اپنی طرف سے احتیاط برت رہے تھے لیکن یہ احتیاط انہیں بہت مہنگی پڑنے والی تھی۔ اپنی لاعلمی کے سبب انہوں نے دست بدست لڑائی لڑنے کے لیے ایک نہایت غلط شخص کو چن لیا تھا۔ یہ کون لوگ تھے؟ یہ جو بھی تھے لیکن ان کے ڈانڈے لالہ وریام اور لالہ نظام سے مل رہے تھے اور یہی لالے تھے جو میری چچازاد فائزہ اور چچی آمنہ کے سفاک قتل میں براہِ راست ملوث تھے۔ (نوجوان سیاست دان شکیل داراب براہِ راست اس دہرے قتل کا ذمے دار نہیں تھا)

فائزہ اور چچی آمنہ کی موت کے دلدوز مناظر یاد آئے تو میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ جھاڑ جھنکاڑ سے گھری ہوئی اس ویران جگہ پر اگلے تین چار منٹ میں ایک خوفناک لڑائی ہوئی۔ میرے مقابل پانچ افراد تھے اور یہ پانچوں بے رحم اور خونخوار قسم کے لڑاکے تھے۔ وہ مسلح ہونے کی وجہ سے مجھ پر غالب آ سکتے تھے لیکن ان کی بدقسمتی یہ تھی کہ وہ فائر کرنا نہیں چاہ رہے تھے۔ میں نے انہیں مارا ہی نہیں، حیرت زدہ بھی کر دیا۔ پہلے دو منٹ کے اندر ہی ان میں سے ایک شخص کی ٹانگ ٹوٹ گئی اور دو دیگر بری طرح زخمی ہو گئے۔ ایک شخص کی آنکھوں میں خون اس طرح بھر گیا تھا کہ وہ کچھ دیکھنے کے قابل ہی نہیں رہا تھا۔

جب میرے ہاتھ ایک کلہاڑی آ گئی تو وہ سمجھ گئے کہ اب فائر کیے بغیر چارہ نہیں، لیکن

اب ان کے لیے دیر ہو چکی تھی۔ سرغنہ نے مجھے گولی مارنے کے لیے اپنی سیون ایم ایم رائفل سیدھی کی تو کلہاڑی کے زوردار وار نے اس کا ہاتھ کلائی پر سے اس طرح کاٹا کہ وہ قریب قریب علیحدہ ہو گیا۔ دوسرے شخص کے فائر کرنے سے پہلے ہی میں جھک گیا تھا۔ پگھلا ہوا سیسہ موت کی سرگوشی سناتا میرے سر پر سے گزرا اور گڑھے میں پھنسی ہوئی لینڈ روور جیپ کے ٹائر میں لگا۔ ٹائر ایک بلند دھماکے سے برسٹ ہو گیا۔ میں نے فائر کرنے والے پر جوابی وار کیا۔ یہ گردن پر تھا مگر اس کی کنپٹی پر لگا۔ کلہاڑی کا تیز دھار پھل کئی انچ تک اس کے کھوپڑے میں گھس گیا۔ میں نے کلہاڑی باہر کھینچنے کی کوشش نہیں کی، وہ اسی طرح اس کے سر میں اٹکی رہی اور وہ مردہ چھپکلی کی طرح لمبی گھاس میں جا گرا۔ میں نے اس کی رائفل اٹھائی اور اس طرف لپکا جدھر سے لڑکی کی گھٹی گھٹی آوازیں آ رہی تھیں۔ مجھے بھاگتے قدموں کی آوازیں آئیں۔ یقیناً یہ وہی شخص تھا جو لڑکی کو سنبھالے بیٹھا تھا۔ اس کے پاس کوئی آتشیں ہتھیار نہیں تھا ورنہ وہ مجھ پر فائر کرنے کی کوشش ضرور کرتا۔ اس کے بھاگتے قدموں میں دہشت زدگی کی جو جھلک تھی اس نے مجھے مزہ دیا۔ یقینی بات تھی کہ اس نے جھاڑیوں کی اوٹ سے میرے اور اپنے پانچ چھ ساتھیوں کی لڑائی کے خونی مناظر دیکھے ہیں۔ وہ جان گیا تھا کہ میرے سامنے آنا اس کے بس کا روگ نہیں ہے۔

لڑکی کی گھٹی گھٹی آواز ابھری۔ ”بچاؤ...... بچاؤ۔“

میں وہاں پہنچا۔ وہ کانٹے دار جھاڑیوں میں اوندھی پڑی تھی۔ اس کے ہاتھ اسی کے دوپٹے سے پشت پر باندھ دیئے گئے تھے۔ پاؤں چپل سے محروم تھے۔ میں نے پنسل ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ وہ قبول صورت تھی مگر اس وقت بے چارگی کی تصویر نظر آتی تھی۔ اس کے منہ میں ٹھونسا گیا کپڑا جزوی طور پر نکل چکا تھا۔

”بچاؤ...... خدا کے لیے بچاؤ“ وہ مجھے دیکھ کر بھی زور زور سے پکارتی رہی۔

میرے سیاہ ڈھاٹے کی وجہ سے وہ مجھے بھی اغوا کنندگان کا ساتھی ہی سمجھ رہی تھی۔

”حوصلہ کرو، ابھی آتا ہوں۔“ میں نے کہا اور پلٹ کر سرغنہ کی طرف آیا۔

اس کا کٹا ہوا ہاتھ بھیانک انداز میں لٹک رہا تھا اور اس نے دوسرے ہاتھ سے خون اگلتی کلائی دبا رکھی تھی۔ میرے دل میں ان لوگوں کے لیے ذرہ بھر رحم نہیں تھا۔ میں نے صرف چھ انچ کے فاصلے سے اس کے سر میں گولی ماری اور اسے ٹھنڈا ٹھار کر دیا۔ جس شخص کی ٹانگ ٹوٹی تھی، وہ گھسٹتا ہوا ایک رائفل کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے اس کی پشت پر دو فائر مار کر اسے بھی پار کر دیا۔ ایک سورما بے ہوش پڑا تھا۔ اس کی رائفل اس کے چوڑے چکلے جسم کے

نیچے دبی ہوئی تھی۔ بس اس کے دستے کا ذرا سا حصہ ہی نظر آرہا تھا۔ میں نے یہ رائفل بھی کھینچ کر اس کے نیچے سے نکال لی۔ باقی دو افراد شدید چوٹیں کھانے کے بعد راہِ فرار اختیار کر چکے تھے۔

مجھے آوازوں اور روشنیوں سے اندازہ ہوا کہ متلاشی لوگ ہماری طرف آرہے ہیں۔ پھر مجھے موٹر سائیکل کی پھڑ پھڑاہٹ سنائی دی۔ یہ ایک نہیں دو موٹر سائیکلز تھیں۔ پچانوے فیصد امکان یہی تھا کہ یہ پیپل والی کے ہی لوگ ہوں گے۔ میں بندھی ہوئی لڑکی کے قریب رائفل بدست چوکس کھڑا تھا۔ وہ لوگ نزدیک آئے۔ ایک ایک موٹر سائیکل پر تین تین افراد سوار تھے۔ یہ پیپل والی کے لوگ ہی تھے۔ دو کے ہاتھ میں رائفلیں بھی نظر آرہی تھیں۔ ایک موٹر سائیکل پر وہی باریش شخص بھی نظر آیا جو دلیری کا مظاہرہ کر کے میرے ساتھ یہاں تک پہنچا تھا۔ اس نے اچھا ہی کیا تھا کہ ''میدان جنگ'' گرم ہونے سے پہلے مدد لینے کے لیے نکل گیا تھا۔

اس نے آس پاس پڑی ہوئی تین لاشوں کو دیکھا اور دنگ رہ گیا۔ وہ لاش سب سے خوفناک منظر پیش کر رہی تھی جس کے سر میں کلہاڑی اٹکی ہوئی تھی۔

''تت......تم ٹھیک ہونا بھائی صاحب؟'' باریش شخص ہکلائی ہوئی آواز میں بولا۔

''ہاں ٹھیک ہوں۔'' میں نے مخصوص بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''دو بھاگ گئے ہیں۔ میں اُن کو دیکھتا ہوں، یہاں کا معاملہ دیکھو۔''

اس سے پہلے کہ وہ جواب میں کچھ کہتا، میں پک اَپ پر سوار ہو چکا تھا۔ اس کا انجن ابھی تک اسٹارٹ تھا۔ میں نے دیکھا گاؤں کے لوگ ٹولیوں کی صورت میں موقع پر پہنچنا شروع ہو گئے تھے۔ ان میں سے کچھ گھوڑوں پر اور کچھ بائیکس وغیرہ پر سوار تھے۔ زیادہ تر لاٹھیوں اور کلہاڑیوں سے مسلح تھے۔

میں زیادہ لوگوں کا سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے گیئر لگایا اور سیاہ پک اَپ کو تیزی سے آگے بڑھا دیا۔

○......❖......○

میں نے جاناں کو اسی قریبی گاؤں میں چھوڑا تھا جہاں رام پیاری اپنے بیمار شوہر وکرم کے ساتھ نقل مکانی کر کے آئی تھی۔ رام پیاری اور وکرم میرے مداح ہو چکے تھے۔ مارواڑیوں کی بڑی حماقت تھی کہ انہوں نے اپنے بچے کی موت کا ذمے دار وکرم اور اس کی بیماری کو ٹھہرایا تھا اور بے قصور میاں بیوی پر چڑھ دوڑے تھے۔ ان دونوں کو بچانے کے لیے

مرحوم مولوی فدا نے بھی اہم کردار ادا کیا تھا۔
کئی دیگر لوگوں کی طرح رام پیاری اور وکرم نے بھی ابھی میری شکل نہیں دیکھی تھی مگر مجھے دیکھے بغیر ہی وہ مجھے اپنے گھر کے فرد کی طرح محسوس کرنے لگے تھے۔ مارواڑی ذات کے لوگوں سے ڈر کر رام پیاری یہاں اپنے ماموں سیوک رام کے پاس آ چکی تھی۔ سیوک رام اور اس کی ادھیڑ عمر پتنی کے سوا اس گھر میں اور کوئی نہیں تھا اور وہ دونوں بھی بھلے مانس لوگ تھے۔
پک اَپ میں نے راستے میں ہی درختوں کے ایک جھنڈ میں چھوڑ دی اور موٹر سائیکل اتار لی۔ میں موٹر سائیکل پر سیوک رام کے گھر پہنچا۔ دروازہ کھولنے والی رام پیاری ہی تھی۔
''ہائے رام، اتنی دیِر لگا دی آپ نے۔ میرے من میں تو پتا نہیں کیا کیا وسواس اٹھ رہے تھے۔''
''میں بالکل ٹھیک ہوں......لڑکی کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''میں نے اس کو اپنے کپڑے دے دیئے ہیں۔ نیا لحاف بھی نکال دیا ہے۔ دو تین بار بھوجن کا پوچھا ہے۔ کھاتی پیتی کچھ نہیں ہے۔ بہت ڈری ہوئی ہے۔ ابھی آپ نے دروازے پر دستک دی تو بے چاری کا رنگ ہلدی ہو گیا۔''
''یہ کئی دن سے بھوکی ہے۔ سیالکوٹی کے بندوں کے ڈر سے چھپی ہوئی تھی۔ تم کھانا لاؤ۔ میں کھلاتا ہوں اس کو۔''
''آپ خود بھی تو کھائیں گے نا بھائی جی؟''
''دو چار نوالے لے لوں گا۔'' میں نے کہا۔
ڈھاٹے کا نقاب بدستور میرے منہ پر تھا۔ میں رام پیاری کے ساتھ اس کمرے میں پہنچا جہاں جاناں سکڑی سمٹی لحاف کے اندر بیٹھی تھی۔ اس کے جسم پر اب ڈھنگ کا لباس نظر آ رہا تھا۔ رونے سے اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ وہ ذرا سی آہٹ پر جیسے بدک اٹھتی تھی۔ رقص و سرود کی رات یقیناً اس کے ساتھ ناروا سلوک ہوا تھا۔ وہ کوئی شریف زادی نہیں تھی، مگر گوشت پوست کی زندہ انسان تو تھی جو تکلیف بھی محسوس کرتی تھی اور توہین بھی۔
اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا اور سرگوشی میں بولی۔ ''سب ٹھیک تو ہے نا؟''
''سب ٹھیک نہیں تھا۔ مگر تم بروقت اطلاع نہ دیتیں تو کچھ بہت برا ہو جانا تھا۔ اس کے لیے تمہارا شکریہ۔''

''وہ......لوگ تمہارے گھر پر پہنچ گئے تھے؟''

''ہاں......پہنچ گئے تھے۔''

''مم...... مجھے تفصیل بتاؤ یاسر۔'' وہ لرزاں سرگوشی میں بولی۔ (وہ اس بات پر یقین کر چکی تھی کہ میں ہی وہ یاسر ہوں جس کا نام اس نے سیالکوٹی کے ساتھیوں کی زبانی سنا تھا)

میں نے اسے مختصر الفاظ میں بتایا کہ پیپل والی میں کیا ہوا ہے۔ میں نے یاسر کی سگی بہن کا ذکر بھی کیا جسے وہ لوگ اٹھا کر لے جانے میں تقریباً کامیاب ہو چکے تھے۔ وہ آبدیدہ ہو گئی۔ بولی۔ ''اوپر والے نے تم پر بڑی مہربانی کی ہے یاسر کہ تمہاری بہن ان درندوں کے ہتھے چڑھنے سے بچ گئی ہے۔'' پھر ذرا توقف سے کہنے لگی۔ ''میں تمہارے بارے میں نہیں جانتی یاسر، لیکن اتنا دیکھ لیا ہے کہ تم اچھے بندے ہو، تمہاری ہمت اور دلیری میں بھی کوئی شبہ نہیں لیکن ایک......دوست اور ہمدرد کی حیثیت سے تم کو میرا ایک مشورہ ہے۔''

''کیا؟''

''تم ان لوگوں سے متھا نہ لگاؤ۔ یہ بہت بڑا گینگ ہے۔ ان کے ٹانکے بہت آگے تک جڑے ہوئے ہیں۔ تم نے داراب فیملی کا نام سنا ہوا ہے؟''

''نہیں۔'' میں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، رام پیاری کھانا لے کر آ گئی۔ ہم دونوں خاموش ہو گئے۔ سبزی اور چاول تھے۔ مرغی کا سالن تھا۔ ساتھ میں دودھ تھا۔ رام پیاری ہماری تسلی کے لیے بولی۔ ''جھٹکے کا گوشت نہیں ہے۔ ہمسائی کے گھر سے آیا ہے۔ برتن بھی بالکل صاف ستھرے ہیں۔''

ٹرے سامنے پڑی تھی۔ جاناں اور رام پیاری دونوں ہی تجسس سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ درحقیقت میرا ڈھاٹا میرے اردگرد موجود ہر شخص کو زبردست الجھن میں مبتلا رکھتا تھا۔ شاید اب ان دونوں عورتوں کا خیال بھی یہی تھا کہ میں جب کھانا کھاؤں گا تو مجھے اپنا ڈھاٹا تھوڑا بہت نیچے کھسکانا پڑے گا اور وہ زیادہ نہیں تو تھوڑی بہت میری صورت دیکھنے میں کامیاب ہو جائیں گی لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ میں نے کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔ بس ایک گلاس نیم گرم دودھ پیا، اور وہ بھی اس طرح کہ ڈھاٹا کھسکانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ یہ سب کچھ ان دونوں کے لیے تعجب خیز تھا۔

رام پیاری اپنے کراہتے اور کھانستے ہوئے شوہر کے پاس واپس چلی گئی تھی۔ وہ گھر میں پھیلی ہوئی غربت اور بیماری کے باوجود زرق برق کپڑوں میں تھی۔ دن کے وقت وہ ہلکا سا

میک اَپ بھی کیے رہتی تھی۔ یہ سب کچھ وہ اپنے قریب المرگ شوہر کی شدید خواہش پر کرتی تھی۔ وہ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں بھی اپنی دھرم پتنی کو ہشاش بشاش اور خوب صورت دیکھنا چاہتا تھا۔

میں نے اصرار کر کے جاناں کو کھانا کھانے پر مجبور کیا۔ وہ واقعی فاقہ زدگی کی حالت میں تھی۔ میں نے کہا۔ ''تم داراب فیملی کی بات کر رہی تھیں؟''

''یہ ایک بہت بااثر سیاسی خاندان ہے۔ ان کا بڑا عطا اللہ داراب ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے ہے جو بادشاہ نہیں...... بادشاہ گر ہوتے ہیں۔ کوئی بے وقوف سے بے وقوف بندہ بھی ان سے ٹکر لینے کا نہیں سوچ سکتا۔ بلکہ یہ تو دور کی بات ہے جن لوگوں کا داراب فیملی سے تعلق ہوتا ہے، کوئی ان سے بھی اونچی نیچی بات نہیں کر سکتا۔''

''کیا تم نے بھی کوئی اونچی نیچی بات کی تھی جس کی وجہ سے تمہارا یہ حال ہو رہا ہے؟'' میں نے اچانک پوچھا۔

اس کے شفاف چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ آہ بھر کر بولی۔ ''ہمارے جیسے لوگ تو ان کے لیے کیڑے مکوڑوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ ہم نے ان سے کیا اونچ نیچ کرنی ہوتی ہے۔ بس میری بدقسمتی کہ ایک دوست کے ساتھ پولیس کے ہتھے چڑھ گئی اور پھنس پھنسا کر یہاں تک پہنچ گئی۔''

''لیکن میری سمجھ میں ایک بات نہیں آ رہی جاناں، جن لوگوں کے پاس تم پھنسی ہوئی ہو، یعنی پاشا اور لالہ وریام وغیرہ...... وہ لاہور سے اتنی دور یہاں چاند گڑھی کے آس پاس کیا کر رہے ہیں؟''

وہ بولی۔ ''اس رات میرے کانوں میں تھوڑی سی بات پڑی تھی۔ لالہ وریام نے بہت زیادہ پی ہوئی تھی اس لیے وہ سجاول وغیرہ کے ساتھ اونچی آواز میں بول رہا تھا۔ بڑی بھاری آواز میں باتیں کر رہا تھا۔ کسی سڑک کی بات تھی جو اس علاقے میں آنے والی ہے۔ بہت بڑی سڑک ہے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ یہ سڑک شروع ہو گئی تو یہاں بہت کچھ بدل جائے گا۔''

''اور کیا کہہ رہے تھے؟''

''وہ ایک دو دیہات کی بات بھی کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہاں کی مٹی سونا بننے والی ہے۔ لالہ وریام کی یہ بات سن کر سجاول سیالکوٹی نے کہا تھا...... آپ فکر ہی نہ کرو لالہ جی۔ سونے کا خزانہ آپ کا ہے اور خزانے پر جو سانپ بیٹھا ہوا ہے اسے ہٹانا ہمارا کام ہے پھر سب زور زور سے ہنسنے لگے تھے۔''

سانپ، خزانہ، سونا...... ان باتوں کا کیا مطلب تھا۔ یہ بات تو مجھے اچھی طرح معلوم تھی کہ جو لوگ حکومت میں ہوتے ہیں یا سیاسی طور پر بہت فعال ہوتے ہیں، انہیں ترقیاتی منصوبوں کا علم پہلے سے ہو جاتا ہے اور پاکستان جیسے ملکوں میں تو بہت ہی پہلے سے ہو جاتا ہے۔ اس طرح وہ ان منصوبوں کے اردگرد بڑے بڑے رقبے خرید لیتے ہیں اور بے بہا فائدہ اٹھاتے ہیں۔

کڑی سے کڑی مل رہی تھی۔ اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا اور میں حیران رہ گیا...... کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ خزانہ ''چاندگڑھی اور اردگرد کے دیہات'' کی زمین کو کہا جا رہا تھا اور اس پر بیٹھے ہوئے سانپ سے مراد وہ لوگ تھے جو اس زمین کو آباد کر کے یہاں بیٹھے ہوئے تھے۔

اچانک ایک اور خیال ذہن میں آیا اور میں سناٹے میں رہ گیا۔ چاندگڑھی اور اس کے آس پاس کے علاقے میں رہنے والے لوگوں کو گاہے بہ گاہے سجاول سیالکوٹی کی جارحیت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ یہ ڈکیت شمال کی جانب کے ویران علاقے سے نکلتے تھے اور تباہی مچا کر واپس چلے جاتے تھے۔ علاقے کے لوگ بددل اور خوف زدہ ہو رہے تھے۔ شروع میں تو سجاول گینگ کے لوگ صرف لوٹ کھسوٹ تک محدود تھے مگر اب وہ باقاعدہ زندگیاں بھی چھین رہے تھے اور اسی پر بس نہیں، اب وہ لوگوں کو عزت آبرو کے خوف میں بھی مبتلا کر رہے تھے۔ پچھلی واردات میں انہوں نے باقاعدہ ایک لڑکی کو اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ میں نے تاجور کو بھی بمشکل ان کی یورش سے بچا پایا تھا۔

''تم کس سوچ میں کھو گئے ہو؟'' جاناں نے کہا۔

''کچھ نہیں۔ یہی سوچ رہا ہوں کہ ان لوگوں کی ہوس کی کوئی حد بھی ہوتی ہے یا نہیں۔ یہ لوگ کتنی کتنی دور مار کرتے ہیں اور اس کے بعد مزید آگے کی سوچنے لگتے ہیں۔''

''میں ان سے بہت ڈر گئی ہوں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ کچھ دنوں کے لیے کہیں روپوش ہو جاؤں۔ پلیز مجھے کسی طرح اس علاقے سے کہیں نکال دو۔''

''تھوڑا سا صبر کرنا پڑے گا۔ اس وقت یہ لوگ بڑے بھڑکے ہوئے ہیں۔ میں نے تمہیں بتایا ہے نا، ابھی دو گھنٹے پہلے ان کے کچھ بندے قتل بھی ہوئے ہیں۔ ابھی تمہارا یہاں سے نکلنا کسی طور ٹھیک نہیں۔ بے شک یہ میاں بیوی ہندو ہیں لیکن مجھے ان پر پورا بھروسا ہے۔ تم یہاں بالکل محفوظ ہو۔''

''کتنے دن یہاں رہنا ہوگا؟'' وہ مری مری آواز میں بولی۔

''یہ حالات پر ہے۔ ہوسکتا ہے کہ تین چار دن میں، میں تمہیں یہاں سے نکال لوں۔''
کسی قریبی کمرے سے وکرم کے کھانسنے کی آواز آرہی تھی۔ برآمدے کی طرف سے بکری کے ممیانے کی آواز بھی آتی تھی۔ یقیناً یہ وہی بکری تھی جسے کچھ دن پہلے مولوی فدا مرحوم نے بڑی نیک نیتی کے ساتھ رام پیاری کے گھر پہنچایا تھا تاکہ اس کے بیمار پتی کو اچھی خوراک مل سکے۔
میں نے کمرے میں جا کر وکرم کی عیادت کی۔ وہ جوں کا توں تھا۔ اس کے بچنے کی امید کم تھی۔ بہرحال اس کی بیوی اس کے جیون کے آخری ایام کو آرام دہ بنانے کی پوری کوشش کررہی تھی۔
رام پیاری مسلسل میری طرف دیکھ رہی تھی۔ سر پر دوپٹا درست کرتے ہوئے بولی۔
''آپ نے ہم دونوں کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ بھگوان سے پرارتھنا ہے کہ آپ سکھی رہیں۔ آپ پر اور آپ کے پریوار پر کوئی آنچ نہ آئے۔''
رام پیاری کو معلوم نہیں تھا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے یہ آنچ آتے آتے رہ گئی ہے۔ یاسر کی نوجوان بہن بدترین حالات سے دوچار ہوتے ہوتے بچی ہے۔
''ایک بات پوچھوں اگر آپ برا نہ مانیں تو؟'' وہ لجاجت سے بولی۔
''پوچھو۔''
''آپ...... یاسر بھائی ہی ہیں نا......''
''تمہیں کیا لگتا ہے؟''
''میں نے آپ کو بس دور سے دیکھا ہوا ہے۔ ہاں میرا پتی وکرم آپ سے دوچار بار ملا ہے۔''
''وہ کیا کہتا ہے؟''
''وہ کہتا ہے...... آپ یاسر بھائی ہی ہیں۔ بس...... آپ کی آواز اسے کچھ بدلی ہوئی لگتی ہے۔ آپ کی گردن پر چوٹ بھی آئی تھی نا جب آپ عالمگیر کے بندوں سے لڑے تھے؟''
''تم خود سوال کررہی ہو اور خود ہی جواب بھی دے رہی ہو۔''
وہ گڑبڑا سی گئی۔ ہکلا کر بولی۔ ''وکرم کی بڑی اکھشا (خواہش) ہے کہ ایک بار آپ کی شکل دیکھے......''
''چلو دکھا دوں گا شکل بھی، لیکن اس وقت بہت جلدی میں ہوں۔ جو باتیں میں نے تمہیں بتائی ہیں ان کا پورا دھیان رکھنا ہے۔ جاناں کے بارے میں بھولے سے بھی کسی سے

ذکر نہیں کرنا۔"

رام پیاری کو کچھ ضروری ہدایات دینے کے بعد میں یہاں سے جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

میں موٹر سائیکل پر سوار تھا۔ ایک جگہ درختوں کے ایک سنسان تاریک جھنڈ میں گھس کر میں نے اپنا لباس تبدیل کیا۔ شلوار میں پتلون کے نیچے ہی پہنے رکھتا تھا اور کسی وقت پتلون کے اوپر شلوار پہن لیتا تھا۔ اب بھی میں نے ایسا ہی کیا۔ پتلون نیچے کر دی اور شلوار اوپر۔ جیکٹ کو الٹ کر پہن لیا اور ڈھاٹا اتار لیا۔ اب میں پھر سے گونگے شاہ زیب کے روپ میں تھا۔ دین محمد کا ٹریکٹر ڈرائیور۔ جو بس اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔

موٹر سائیکل پر سوار میں چاند گڑھی پہنچا تو ڈیرے پر انیق حسبِ معمول میرے انتظار میں جاگ رہا تھا۔ اس تک یہ خبر پہنچ چکی تھی کہ قریبی گاؤں پیپل والی میں سجاول سیالکوٹی کے لوگوں نے پھر واردات کی ہے اور یاسر کی بہن کو اٹھانے کی ناکام کوشش کے دوران میں کچھ افراد قتل ہو گئے ہیں۔

"آج تو بڑی دھواں دھار رات گزاری ہے آپ نے؟" اس نے میری طرف دیکھ کر معنی خیز لہجے میں کہا۔

"آگے آگے دیکھو ہوتا ہے کیا۔"

"آپ ٹھیک تو ہیں نا؟"

"پہلے سے زیادہ ٹھیک ہوں۔ یہاں گاؤں میں کیا پوزیشن ہے؟"

"لوگ پہلے سے زیادہ خوف زدہ ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ عالمگیر اور اس کے ساتھیوں کی گرفتاری کے بعد سجاول زخمی درندے کی طرح ہو گیا ہے۔ وہ ضرور مزید کارروائیاں کرے گا۔ اب بھی چودھری محمد نیاز کی بیٹھک میں گاؤں کے بڑے بیٹھے ہوئے ہیں اور بات چیت ہو رہی ہے۔"

اگلی صبح پورے چاند گڑھی میں رات والے واقعے کا چرچا تھا۔ عام لوگوں کے لیے یہ بڑی جوشیلی خبر تھی کہ سجاول کے لوگ یاسر کی بہن کو اٹھانے کے لیے آئے اور یاسر نے بڑے ڈرامائی انداز میں نمودار ہو کر ان کا راستہ روک لیا۔ موقع پر جو دست بدست لڑائی ہوئی تھی اس کا بھی خوب چرچا تھا۔ اس لڑائی کی گواہی یقیناً امام مسجد کے باریش بھائی نے بھی دی ہو گی۔

چاند گڑھی کے لوگوں کے لیے یہ سب کچھ حیران کر دینے والا تھا۔ اکیلے "یاسر" نے کم از کم چھ افراد کا مقابلہ کیا تھا اور ان میں سے تین کو موت کی نیند سلا دیا تھا۔ کچھ لوگ اس کو مزید

بڑھا چڑھا کر بیان کر رہے تھے۔ ہر طرف یاسر بھائی کے نام کی گونج تھی۔ درحقیقت یاسر نامی اس نوجوان کو لوگ پہلے ہی ایک ''ہیرو'' کا درجہ دیتے تھے۔ اب اوپر تلے پیش آنے والے واقعات نے ان کے خیالات کو مزید تقویت دی تھی۔ وہ اس کے دیوانے سے ہو گئے تھے۔ ان میں سے کچھ تو یہ کہتے ہوئے بھی سنے گئے کہ یاسر دو چار دن میں کھل کر سامنے آنے والا ہے۔ پولیس کے بڑے افسروں سے اس کا معاملہ طے ہو گیا ہے۔ کچھ پولیس افسر خود یہ چاہتے ہیں کہ یاسر آگے آئے اور سیالکوٹی کا سامنا کرے۔

کئی طرح کی باتیں کہی جا رہی تھیں۔ یاسر چونکہ کچھ عرصہ فوج میں بھی رہا تھا لہٰذا گاؤں کے سیانوں کا یہ بھی خیال تھا کہ انتظامیہ اس کے لیے نرم گوشہ رکھتی ہے۔ بہرحال تھوڑی دیر بعد یہ بات غلط ثابت ہو گئی......اور اس کا ثبوت مجھے انیق نے دیا۔

میں کمرے سے باہر نکلا تو سامنے ٹیوب ویل کے پاس درختوں کے نیچے ڈیرے کی جہازی سائز کی چارپائی پر پہلوان حشمت، انیق، حق نواز اور سولنگی وغیرہ بیٹھے تھے۔ کچھ دیر پہلے تک یقیناً رات والے واقعے پر ہی گرما گرم گفتگو ہوتی رہی تھی لیکن اب حسبِ معمول حشمت اور انیق میں علمی بحث چھڑی ہوئی تھی۔ انیق کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ''حشمت بھائی، آپ ماسٹر جی کو بلا لیں، دو چار اور پڑھے لکھوں کو بلا لیں۔ ''گھبرو'' کا لفظ طاقتور، صحت مند جوان کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

حشمت بگڑ کر بولا۔ ''پتا ناہیں کس اُلو کے پٹھے نے تم کو اردو پڑھائی ہے۔ جی چاہت ہے کہ تم کو کچھ ناہیں کہوں، تمہارے استاد کو ڈھونڈوں اور اس کا سر پھوڑوں۔ تم ذرا سی بھی عقل استعمال کر سکتے ہوتے تو بات تمہاری سمجھ دانی میں آ جاتی۔ تم اس لفظ پر ہی غور کر لو۔ گھبرو......یعنی گھب رو......یہ گھبرانے سے نکلا ہے۔ ڈرنے والا، خوف زدہ ہونے والا۔

''یعنی ہم اس طرح کہیں گے کہ محمد شاہ رنگیلا بہت بڑا گھبرو تھا۔ کیونکہ جب نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا تو وہ اس قدر گھبرایا کہ لڑے بغیر ہی ہتھیار ڈال دیئے۔''

''بالکل اگر اس نے واقعی ہتھیار ڈال دیئے تھے تو پھر اس کو گھبرو کہنا چاہیے۔''

''یعنی آپ کو پتا ہی نہیں کہ اس نے ہتھیار ڈال دیئے تھے، اور کل آپ یہ کہہ رہے تھے کہ آپ نے حضرت عیسیٰؑ تک کی تاریخ گھول کر پی رکھی ہے۔''

یہ بحث مزید طول کھینچ سکتی تھی مگر اسی دوران میں دین محمد صاحب ڈیرے کی طرف آتے دکھائی دیئے۔ سب چارپائی سے اٹھ گئے اور اپنے اپنے کام میں لگ گئے۔ میں اور انیق بھی ٹریکٹر کی طرف آ گئے۔ ریڈی ایٹر میں پانی ڈالتے ہوئے انیق نے کہا۔ ''ویسے شاہ

زیب بھائی، آپ سے کچھ زیادتی نہیں ہو رہی؟''
''کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔
''جگہ جگہ اپنی جان خطرے میں آپ ڈال رہے ہیں اور ڈنکا یاسر کے نام کا بج رہا ہے۔'' وہ دھیمی آواز میں بولا۔
''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' میں نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔
وہ ذرا چونک کر بولا۔ ''آپ کے لیے ایک تازہ خبر کا کھوج لگایا ہے میں نے۔''
''فرماؤ۔''
''کل رات سیالکوٹی کے لوگوں نے یاسر کے گھر پر جو حملہ کیا، اس میں یاسر کی والدہ اور پھوپی شدید زخمی ہوئی تھیں۔ آج صبح سویرے اس کی پھوپی نے دم توڑ دیا ہے۔ ابھی دوپہر سے پہلے اسے سپردخاک کر دیا جائے گا۔''
''بری خبر ہے۔'' میں نے کہا۔
''لیکن ایک اس سے بھی بری خبر ہے۔''
''وہ کیا؟''
''یاسر کو اپنی اس پھوپی سے بہت پیار تھا۔ پولیس والوں کا خیال ہے کہ یاسر اس کے جنازے میں شریک ہونے کی کوشش کرے گا یا کم از کم کسی وقت اس کی قبر پر ضرور پہنچے گا۔''
''تمہیں کیسے پتا چلا؟''
''داؤد بھائی جیسے گینگسٹر کے پاس رہ کر آنکھیں اور کان کھلے رکھنے تو آ ہی گئے ہیں جناب۔ چوکی کے پاس جو چائے خانہ ہے، وہاں جا کر چائے شائے پیتا ہوں۔ آپ کا کیا خیال ہے، وہاں کیوں جاتا ہوں۔''
''میرا تو خیال ہے کہ وہاں ڈی وی ڈی پر انڈین اور پاکستانی فلمیں لگتی ہیں اور فلموں کے بغیر تمہیں حاجت میں مشکل ہوتی ہے۔''
''آپ کی بدظنی سر آنکھوں پر...... لیکن وہاں اس لیے بھی جاتا ہوں کہ کئی پولیس والے بھی وہاں چائے پینے کے لیے آتے ہیں۔ ایسے ہی ایک حوالدار نیامت سے علیک سلیک بنا رکھی ہے میں نے...... نیامت سے ہی پتا چلا ہے کہ آج رات سے ہی پیپل والی کے قبرستان کی نگرانی شروع ہو جائے گی۔''
''مگر کیا وہ اتنا ہی سیدھا سادہ ہے کہ گھوڑا دوڑاتا ہوا قبرستان میں پہنچ جائے گا؟''
''ہو بھی سکتا ہے جی، آج رات نہ سہی چار پانچ دن بعد اس سے یہ غلطی ہو سکتی ہے۔

جذبات میں بندہ بہت کچھ کر جاتا ہے۔ لالہ وریام بھی تو ایسے ہی کچلا گیا تھا۔'' انیق نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

یہ اسی رات کا واقعہ ہے۔ میں اور انیق ساتھ ساتھ چارپائیوں پر لیٹے تھے۔ میں تاجور کے بارے میں سوچ رہا تھا اور اس کی پیشانی کے اس حسین بوسے کے بارے میں سوچ رہا تھا جو بدھ کی رات اچانک ہی میرے ہونٹوں پر جگمگایا تھا اور میری روح کو نہال کر گیا تھا۔ یورپ کے خونی کلبوں کا چمپئن فائٹر جسے بڑے بڑے تگڑم نیچا نہیں دکھا سکے تھے ایک دھان پان سی دیہاتی لڑکی کے ہاتھوں چاروں شانے چت ہو گیا تھا اور اس وقت لالٹین کی مدھم روشنی میں کھدر کا لحاف اوڑھے ایک کچے کمرے میں پڑا تھا۔

بڑی عجلت میں دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ انیق نے حق نواز کی آواز پہچان کر دروازہ کھولا۔ باہر بڑی سرد ہوا چل رہی تھی۔ حق نواز کے ساتھ چھوٹے قد کا ایک جواں سال شخص کھڑا تھا۔ حق نواز نے کہا۔ ''انیق یہ اقبال ہے، تمہیں پتا ہی ہوگا کریانے کی دکان کرتا ہے۔ یہ بڑی مشکل میں ہے۔ شادپور میں اس کی بڑی بہن ہے۔ اس کو بچہ ہونے والا ہے۔ بڑی تکلیف میں ہے۔ اس کا گھر والا کراچی گیا ہوا ہے۔ یہ اس کے پاس جانا چاہتا ہے، فوراً۔''

''ہم کیا کر سکتے ہیں؟'' انیق نے ہمدردی سے پوچھا۔

''میں تو موٹر سائیکل چلا نہیں سکتا۔ تم شاہ زیب سے کہو یہ اسے شادپور پہنچا دے۔ پانچ چھ میل سے زیادہ کا فاصلہ نہیں ہے۔ بڑی نیکی کا کام ہوگا۔''

ٹھیک پندرہ منٹ بعد میں اقبال نامی اس دکاندار نوجوان کو کھٹارا موٹر بائیک پر اپنے پیچھے بٹھائے کچے ناہموار راستے پر جا رہا تھا۔ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا ہوا تھا اور بار بار شکریہ ادا کرنے والے انداز میں میرا شانہ سہلا رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر زچگی کے سلسلے میں عورت کی مدد کرنے کے لیے مجھے آگے بھی جانا پڑا تو چلا جاؤں گا۔

اسی دوران میں میرے پیچھے بیٹھے ہوئے شخص کے بوسیدہ کوٹ کی جیب میں موبائل فون کی بیل ہونے لگی۔ اس نے موبائل نکالا اور بولا۔ ''ہیلو...... کون...... بشارت بھائی......؟ ہاں ہاں ٹھیک ہے...... میں جا رہا ہوں...... موٹر سائیکل پر...... ہاں دین محمد کا گونگا ملازم چلا رہا ہے...... بس دعا کرو کہ یاسر بھائی گھر پر ہی ہو......''

دوسری طرف سے کچھ کہا گیا جسے اقبال خاموشی سے سنتا رہا پھر بولا۔ ''نہیں...... نہیں...... سب کچھ بتاؤں گا اس کو۔ میں ابھی خود دیکھ کر آیا ہوں۔ قبرستان کے باہر دو پولیس والے موجود ہیں...... ہاں ٹھیک ہے...... اللہ حافظ۔''

اس نے فون بند کر دیا۔ میں اس کے لیے گونگا بہرا تھا۔ اس نے میرے سامنے بڑی آزادی سے ایک اہم گفتگو کی تھی۔ اس گفتگو نے مجھ پر انکشاف کیا کہ یہ اقبال مجھے کوئی دھوکا دے رہا ہے۔ یہ کسی زچگی کے سلسلے میں نہیں جا رہا۔ اس نے جس شخص کا نام لیا تھا اس نے میری رگوں میں خون کی گردش نہایت تیز کر دی تھی۔ اس نے یاسر کا نام لیا تھا۔

اچانک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ مجھے وہ کہانی یاد آئی جو تاجور نے سنائی تھی۔ ایک سال پہلے یاسر یعنی یاسر بھائی نے گاؤں کے غریب کریانہ فروش کے لیے عالمگیر سے ٹکر لی تھی اور نتیجے میں وہ ایک بندے کا قاتل بن گیا تھا۔ جو شخص میرے پیچھے بیٹھا ہوا تھا اور یاسر کو پولیس کی موجودگی سے باخبر کرنے جا رہا تھا وہ بھی ایک کریانہ فروش ہی تھا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہی وہ بندہ ہے جس کی خاطر یاسر نے سر اٹھایا اور مشکلات کا شکار ہوا۔

اب شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ اس ابر آلود یخ بستہ رات میں آدھ پون گھنٹے کے اندر اندر میری ملاقات اس شخص سے ہونے والی تھی جو یاسر بھائی کے نام سے پہچانا جاتا تھا اور آج کل ہر خاص و عام سے ''خراج تحسین'' وصول کر رہا تھا۔

میں نے موٹر سائیکل کی رفتار کچھ اور تیز کر دی۔

O.......❖.......O

جلد ہی مجھے شاد پور گاؤں کے آثار نظر آنے لگے۔ کہیں کہیں ہلکی روشنی بھی دکھائی دے رہی تھی۔ رات سرد تھی اور موٹر سائیکل پر سفر کرنے والے کے لیے تو مزید سرد تھی۔ میری توقع کے عین مطابق کریانہ فروش اقبال نے مجھے گاؤں کے اندر جانے کی زحمت نہیں دی۔ گاؤں کی پہلی گلی میں داخل ہونے سے پہلے ہی اس نے مجھے موٹر سائیکل روکنے کا اشارہ دیا۔ میں رک گیا تو وہ فوراً نیچے اتر آیا۔

بولا۔ ''تمہارا بہت بہت شکریہ۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی بات کا مفہوم سمجھانے کے لیے میرا کندھا بھی تھپکا۔

تب اس نے اپنے بوسیدہ کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور پیٹرول کے خرچے کے طور پر پچاس روپے میرے ہاتھ میں تھمانے کی کوشش کی۔ میں نے شدومد سے انکار میں سر ہلایا اور اشاروں کی زبان میں اسے بتایا کہ ہم ایک ہی گاؤں کے رہنے والے ہیں اور بھائی چارے میں ایسا لین دین نہیں ہوتا۔ اس نے ایک بار پھر میرا شکریہ ادا کیا اور چل پڑا۔ وہ بہت جلدی میں نظر آتا تھا۔ اس نے شلوار قمیص کے اوپر غالباً لنڈے کا کوٹ پہن رکھا تھا۔ دیکھنے میں وہ قبول صورت تھا اور اس کا قد بھی کوئی ایسا چھوٹا نہیں تھا۔ جسم کے لحاظ سے مناسب ہی تھا۔

اس کو دکھانے کے لیے میں نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور واپس چل دیا مگر کچھ ہی آگے جا کر میں نے انجن بند کر کے موٹر سائیکل کو درختوں میں کھڑا کیا اور اس سمت میں بھاگا جہاں اقبال گیا تھا۔ جلد ہی مجھے اس کا ہیولا نظر آ گیا، وہ گاؤں کے اندر جانے کے بجائے آبادی کے ساتھ ساتھ چلتا جا رہا تھا پھر وہ کھیتوں میں داخل ہو گیا۔ اس کے انداز میں عجلت تھی۔ میں فاصلہ رکھ کر محتاط انداز میں اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ پھر وہ گاؤں کے قبرستان میں داخل ہو گیا۔ قبرستان کو کیکر اور جنتر وغیرہ کے درختوں نے گھیر رکھا تھا۔

اب میں نے فاصلہ کم کر دیا۔ مجھے خدشہ تھا کہ وہ کہیں اوجھل ہی نہ ہو جائے۔ قبرستان کے اندر نیچی چھت والے دو کچے کمرے بنے ہوئے تھے۔ ایک کمرے میں لالٹین کی روشنی بھی موجود تھی۔ اقبال نے ایک دروازے پر دستک دی اور اس کے ساتھ ہی محتاط انداز میں مڑ کر پیچھے دیکھا۔ میں بیٹھا ہوا تھا۔ اگر مجھے ایک قبر کے پیچھے لیٹنے میں ذرا بھی تاخیر ہوتی تو اقبال کی نظر مجھ پر پڑ سکتی تھی۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور ''السلام علیکم چاچا'' کی مدھم آواز میرے کانوں تک پہنچی، یہ آواز یقیناً اقبال ہی کی تھی۔

اقبال اندر اوجھل ہو گیا تو میں سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ شہرِ خموشاں میں مکمل خاموشی اور تاریکی کا راج تھا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا۔ کمروں کے گرد گھوم پھر کر دیکھا۔ دو کھڑکیاں موجود تھیں مگر اچھی طرح بند تھیں۔ پھر میری نگاہ ایک گول روشن دان پر پڑی۔ یہ چھت سے بس ایک ڈیڑھ فٹ ہی نیچے ہو گا۔ میں کوئی بھی آہٹ پیدا کیے بغیر کھڑکی کی چوکھٹ پر پاؤں جمانے میں کامیاب ہوا اور پھر چھت پر پہنچ گیا۔ یہاں الٹا لیٹ کر میں نے گول روشن دان میں جھانکا۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں مجھے اقبال کی پشت نظر آئی۔ اس کے سامنے جو ادھیڑ عمر شخص کھڑا تھا، وہ اپنے حلیے سے کوئی گورکن ہی نظر آتا تھا۔ کمرے میں کھدائی کے آلات، کسیاں، کھرپے وغیرہ موجود تھے۔ ایک طرف لحد کے اوپر رکھے جانے والے لکڑی کے پھٹے ڈھیر کی صورت میں نظر آ رہے تھے۔ اقبال کی دھیمی آواز میرے کانوں تک پہنچی۔ ''میں اس کا دکھ سمجھتا ہوں شمس چاچا پر اس کا جانا بالکل ٹھیک نہیں۔ تم اسے بلاؤ۔ میں بتاتا ہوں سب کچھ۔''

''اچھا تم بیٹھو۔ سردی لگ رہی ہے تو یہ کمبل لے لو۔'' ادھیڑ عمر شخص نے کہا۔

''نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' اقبال بولا۔

پھر میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ ادھیڑ عمر چاچے شمس نے ایک پلنگ نما چارپائی کو گھسیٹ کر ایک کونے میں کیا۔ چارپائی کے نیچے ایک بڑے سائز کا جستی صندوق تھا۔ چاچے

نے اسے بھی اس کی جگہ سے کھسکایا۔ نیچے لکڑی کے پھٹے نظر آئے۔ دو پھٹے ہٹانے کے بعد چاچے شمس نے آواز دی۔ ''یاسر پتر! باہر آ۔ بالا ملنے آیا ہے تجھے۔''

کچھ دیر کھٹ پٹ کی آوازیں آتی رہیں۔ پھر خلا میں لکڑی کی سیڑھی نظر آئی، اور اس سیڑھی پر چڑھ کر وہ شخص باہر آ گیا جس کا ڈنکا آج کل (میری وجہ سے) پورے علاقے میں گونج رہا تھا۔ یہ یاسر تھا، لیکن میں اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ برسوں کا بیمار دکھائی دیتا تھا۔ اس کا چہرہ مرجھایا ہوا اور سیاہی مائل تھا۔ شلوار قمیص ایسے تھی جیسے کسی طویل لکڑی پر جھول رہی ہو۔ اس کی گردن پر ایک پٹی بھی بندھی ہوئی تھی، مجھے تاجور کی بات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا۔ ''جب عالمگیر کے بندوں سے یاسر بھائی کی لڑائی ہوئی تھی تو ان کی گردن پر چوٹ آئی تھی۔''

یاسر کو دیکھ کر مجھے گہری مایوسی ہوئی۔ اس کی آنکھیں بھی سوجی ہوئی تھیں۔ ممکن ہے کہ یہ سوزش اس دکھ کا نتیجہ ہو جو اسے اپنی پیاری پھوپھی کی ناگہانی موت سے ہوا تھا۔ تاہم اس کے ساتھ مجھے یہ بھی لگا کہ اس نے تھوڑی بہت پی رکھی ہے۔

اقبال اور یاسر نم آنکھوں کے ساتھ ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔ ''یاسر بھائی! تمہاری پھوپھی جی کا بہت افسوس ہے۔ یقین کرو ایسے لگتا ہے کہ اپنا کوئی خون کا رشتہ وچھڑ گیا ہے۔''

''اللہ کے کاموں میں کس کو دخل ہے۔'' چاچے شمس نے دلاسا دینے والے انداز میں کہا۔

وہ تینوں چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔ چاچا شمس تو مجھے نظر نہیں آ رہا تھا مگر یاسر اور اقبال دونوں دکھائی دیتے تھے۔ یاسر نے روکھے سے لہجے میں کہا۔ ''بالے! تم سے کہا بھی تھا کہ بہت ضرورت کے وقت ہی آیا کرو۔ زیادہ آؤ گے تو کوئی بھی تمہارا پیچھا کر کے یہاں تک پہنچ جائے گا۔''

''اس وقت سخت ضرورت ہی تھی تو آیا ہوں یاسر بھائی، مجھے ڈر تھا کہ تم کہیں، چاند گڑھی کا رخ نہ کرلو۔ میرا مطلب ہے پھوپھو سے تم کو بڑا پیار تھا۔ تم ان کا منہ بھی نہ دیکھ سکے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ تم ان کی قبر پر آنے کی کوشش کرو گے۔''

''اگر کرتا بھی تو اس میں کیا ہے؟'' یاسر نے چڑچڑے سے انداز میں کہا۔

''پولیس چاند گڑھی میں قبرستان کا پہرا دے رہی ہے۔ ابھی دو چار ہفتے تک بھول کر بھی ایسی سوچ دماغ میں نہ لانا۔''

یاسر نے اپنی بغلی جیب ٹٹول کر سگریٹ کا ایک مڑا تڑا پیکٹ نکالا اور لرزتے ہاتھوں سے

اسے جلایا۔ اس کا انداز اس امر کی تصدیق کر رہا تھا کہ وہ نشے میں ہے۔ سگریٹ مٹھی میں دبا کر اس نے دو لمبے کش لیے۔ دوسرے کش کے بعد اسے کھانسی ہونے لگی۔ کھانسی ہوتے ہی اس کے مدقوق چہرے پر کرب کے آثار نمودار ہوئے اور اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا گلا تھام لیا۔ یقیناً گلے کا پرانا زخم اسے تکلیف دے رہا تھا۔

گورکن چاچا شمس نے اٹھ کر اسے جلدی سے پانی پلایا۔ اس کی کھانسی تھمی تو نہیں لیکن کم ہوگئی۔ اقبال نے دکھی لہجے میں کہا۔ ''یاسر بھائی! تمہاری ساری مشکلوں کی اصل جڑ میں ہی ہوں۔ کبھی کبھی تو زندہ رہنے کو بھی دل نہیں چاہتا۔''

''ہر بار یہ رونا نہ رویا کر۔ بس جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔'' یاسر نے ایک بار پھر چڑچڑے انداز میں کہا اور منہ پر ہاتھ رکھ کر کھانسنے لگا۔

گورکن شمس نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''بالے! وہ کالی پگڑی والے کا کیا قصہ ہے۔ کچھ لوگ یہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ یاسر ہے بلکہ کئی تو اس پر پکا پکا یقین کر کے بیٹھے ہوئے ہیں۔''

''ہاں چاچا، چاندگڑھی میں بھی زیادہ تر لوگوں کا خیال یہی ہے کہ وہ یاسر بھائی ہے اور یہ جو یاسر بھائی کے گھر پر سیالکوٹی کے غنڈوں نے ہلا بولا ہے، اس کی وجہ بھی تو یہی ہے۔''

گورکن شمس نے کہا۔ ''ہاں، کوئی تصویروں والی گل بھی سنی ہے۔ ان تصویروں کی وجہ سے ہی عالمگیر اور تحصیل دار میں خون خرابا ہوا ہے۔''

''اور کہا یہ جا رہا ہے کہ یہ تصویریں یاسر بھائی نے اتاری ہیں۔'' اقبال نے شمس کی بات مکمل کی۔

''مجھے اس سارے بکھیڑے سے کچھ بھی لینا دینا نہیں ہے۔'' یاسر نے تقریباً چلا کر کہا اور سگریٹ کا خالی پیکٹ دور پھینک دیا۔ ''بالے! تم بس میرا ایک پیغام میرے تایا جی تک پہنچا دو۔''

''جو حکم یاسر بھائی۔'' اقبال نے سراپا اطاعت بن کر کہا۔

یاسر دھیمی آواز میں اسے اپنے پیغام کے بارے میں بتانے لگا۔ وہ اپنے تایا سے کہنا چاہ رہا تھا کہ وہ اس کی والدہ اور بہن وغیرہ کو پیپل والی گاؤں سے نکال کر سیالکوٹ یا پھر لاہور پہنچا دیں۔ وہ ان کے لیے مزید خطرات مول لینا نہیں چاہتا اور خود اس کے بیمار جسم میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ ان کی حفاظت کر سکتا۔ ان لمحوں میں وہ مجھے ایک بالکل بے بس اور کمزور شخص دکھائی دیا۔ جو بے شک دلیر تھا لیکن اب اپنی بیماری اور حالات کے ہاتھوں شکست کھا

چکا تھا۔ وہ اس وقت ایک خوف زدہ شخص کی طرح اس گورکن کے زمین دوز ٹھکانے میں چھپا ہوا تھا۔ یہ تصویر اس تصویر سے بہت مختلف تھی جو میں نے یاسر کے حوالے سے اپنے ذہن میں بنائی تھی۔ اس نے اقبال سے یہ بھی کہا کہ وہ اس کے تایا تک اس کا پیغام ڈاک کے گمنام خط کے ذریعے پہنچائے یا ایسا ہی کوئی اور طریقہ اختیار کرے۔ کچھ دیر بعد اس کی کھانسی پھر شدت پکڑ گئی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا سا اٹھ کھڑا ہوا۔ اقبال سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''تم دونوں بیٹھو، چائے شائے پیو، میں اب نیچے جاتا ہوں۔''

اقبال نے اسے سہارا دینا چاہا مگر اس نے اسے پیچھے ہٹا دیا۔ خود ہی سنبھل سنبھل کر لکڑی کے زینے تک پہنچا اور اترنے لگا۔ اترتے اترتے رک گیا اور اقبال سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''تمہاری اطلاع کا شکریہ۔ ٹھیک ہے اگر تم کہتے ہو تو میں ابھی باہر نہیں نکلوں گا۔''

اقبال نے اثبات میں سر ہلایا۔ یاسر کے اوجھل ہونے کے بعد گورکن شمس نے خلا پر تختے برابر کر دیئے اور ان پر ٹرنک اس طرح رکھ دیا کہ وہ چھپ گئے۔

سردی میں چھت پر اوندھے لیٹے لیٹے میرا جسم اکڑ گیا تھا مگر اندر کی صورتِ حال اتنی دلچسپ تھی کہ میں مزید یہاں رہنا چاہتا تھا۔ یاسر کے جانے کے بعد گورکن شمس نے تجسس آمیز لہجے میں اقبال سے پوچھا۔ ''بالے، سوچنے کی بات ہے اگر وہ پگڑی ڈھاٹے والا یاسر نہیں ہے تو پھر کون ہے؟ اس نے عالمگیر کو تو نتھ ڈال دی ہے اور یہ بھی سنا ہے کہ پیر ولایت اب اپنی صفائیاں پیش کرتا پھر رہا ہے۔''

''ولایت کی صفائیاں بس ایسے ہی ہوتی ہیں۔ پہلے بھی اس کی صفائیاں لوگوں نے کم ہی مانی تھیں۔ بس وہی مانتے ہیں جو اندھوں کی طرح اس پر بھروسا رکھتے ہیں۔ جیسا پیو ویسا پتر۔ پیو کہا کرتا تھا کہ سب کو بھسم کر دوں گا اور بھسم خود ہو گیا۔ یہ کہتا ہے کتے کی موت مرو گے، اور مرنا اس نے خود ہی ہے۔''

دونوں اپنی اپنی جگہ گم صم ہو گئے۔ جیسے ماضی قریب کے کسی واقعے کی یاد میں گم ہو گئے ہوں۔ گورکن شمس نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ ''اس کا کچھ اتا پتا چلا؟''

اقبال کے چہرے پر جیسے ایک رنگ سا گزر گیا، ہاتھ ہلا کر بولا۔ ''چاچا! نہ کر واب اس کی بات۔ دل دُکھتا ہے۔ اس کو اب کہاں آنا ہے۔ آنا ہوتا تو اب تک آ چکی ہوتی۔''

''وہ کہتے ہیں نا بالے کہ مرنے والوں کے لیے چین آ جاتا ہے لیکن جو گم ہو جاتے ہیں ہمیشہ رُلاتے رہتے ہیں۔ مجھے پتا ہے تُو اسے نہیں بھول سکا اور نہ چاند گڑھی والے بھول سکے ہیں۔''

"نہیں، میں بھول چکا ہوں چاچا۔نہیں آتی اب مجھے اس کی یاد۔ وہ میری تھی ہی نہیں، اگر ہوتی تو اس طرح میرے آنے سے پہلے پنڈ نہ چھوڑتی اور چھوڑنا ہی تھا تو کوئی پتا ٹھکانا تو بتاتی۔ کبھی کوئی خط پتر تو لکھتی کہ اس دنیا میں ہے یا نہیں۔ وہ کہتی تھی کہ میں ایک بار گئی تو پھر نہیں آؤں گی اور اس نے ایسا ہی کیا ہے چاچا، اگر وہ اتنی کٹھور دل کی ہے تو پھر میں بھی کیوں کروں اسے یاد...... کیوں کروں؟"

وہ ایک دم ہچکیوں سے رونے لگا۔ ایک بار اس کے ضبط کا بند ٹوٹا تو یوں لگا کہ سیلاب آ گیا ہے۔ اس نے اپنا سر اپنے گھٹنوں پر ٹکایا اور روتا چلا گیا۔ شمس اس کی کمر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ اسے اپنے ساتھ لگانے لگا۔ وہ بھی شمس کے گلے لگ گیا۔ جیسے ایک ہمدرد کو پانے کے بعد اپنے دل کی ساری بھڑاس نکال لینا چاہتا ہو۔

پتا نہیں یہ کیا رُوداد تھی مگر اقبال جس طرح ٹوٹ کر رو یا تھا، وہ بڑا متاثر کن تھا۔

میں زیادہ دیر اس سردی میں کھلے آسمان کے نیچے اوندھا لیٹ کر یہ مناظر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ یہاں تک آنے کا میرا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ میں نے آج اس بے بس "یاسر بھائی" کو دیکھ لیا تھا جو پورے چاند گڑھی کے لیے بلکہ اردگرد کے علاقے کے لیے بھی "ہیرو" کی حیثیت رکھتا تھا۔ مجھے اس کی شخصیت نے بالکل متاثر نہیں کیا تھا۔

میں ایک بجے کے لگ بھگ موٹر سائیکل پر سوار چاند گڑھی واپس پہنچ گیا۔ حسبِ معمول انیق میرے انتظار میں جاگ رہا تھا۔ فٹ بولا۔ "شاہ زیب بھائی! آپ نے تو مجھے بیوی بنا کر رکھ دیا ہے۔ آپ رات کو نکل جاتے ہیں اور میں تارے گنتا رہتا ہوں۔"

"لیکن آکر تمہیں ایک زبردست کہانی بھی تو سناتا ہوں ہر بار۔" میں نے کہا۔

"چلیں پھر سنائیں، اب کی بار کی کہانی۔"

میں نے اسے پچھلے دو ڈھائی گھنٹے کی ساری رُوداد کہہ سنائی۔ وہ بھی حیرت کے دریا میں گم ہو گیا۔ بہر حال میں نے اسے تاکید کی کہ وہ حق نواز وغیرہ کو اس بارے میں بھنک نہیں پڑنے دے گا۔

O......❖......O

فضاؤں میں آج کل نشہ سا بھرا ہوا تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا کہ میں زمین پر نہیں چلتا میرے پاؤں بے ساختہ ہوا پر حرکت کرتے ہیں اور میں اڑتا ہوں۔ ایک عجیب ترنگ تھی، ایک عجیب میٹھا میٹھا درد تھا اور یہ جو کچھ بھی تھا، سب تاجور کی وجہ سے تھا۔ اس کا تصور ہر وقت میرے دل و دماغ کو جگمگاتا رہتا تھا۔ گاؤں کی ایک سہانی صبح میرے سامنے تھی۔ ہریالی پر

اوس کے ننھے منے قطرے تھے اور کھیتوں پر ہلکا ہلکا کہرا دکھائی دے رہا تھا۔ جی چاہا کہ ایسے میں کہیں سے تاجور نمودار ہو جائے۔ مجھے دیکھ کر شرارت سے بھاگ اٹھے، میں اس کے پیچھے بھاگوں۔ ہم ایک ایسے گہرے کہرے میں چھپ جائیں جہاں کوئی ہمیں دیکھ نہ سکے۔ میں اپنے ہونٹوں کو اس کے حسین چہرے کے مقابل رکھ دوں اور سب کچھ بھول جاؤں۔

انیق کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔ ''کہاں کھو گئے شاہ زیب بھائی۔''

میں نے کہا۔ ''اس منظر میں کھو گیا ہوں جو اس منظر میں نہیں کھونا...... میرے خیال میں وہ بالکل ''کھوتا'' ہے۔''

''لیکن میں کھوتا نہیں ہوں۔''

''تو آؤ پھر ذرا چہل قدمی فرمائیں۔'' میں نے خوشگوار موڈ میں کہا۔

ہم دونوں نکل پڑے۔ ہوا کسی ایسی الھڑ دوشیزہ کی طرح تھی، جسے کسی کا ہاتھ لگانا تو دور کی بات ہے کسی نے میلی نظر سے دیکھا تک نہ ہو۔ کنوئیں سے آنے والی شفاف نالیوں میں پانی کی ''قل قل'' سنائی دیتی تھی۔ انیق نے ایک کیکر سے دو پتلی شاخیں توڑیں۔ ہم انہیں مسواک کی طرح استعمال کرتے ہوئے کچے راستے پر آگے بڑھنے لگے۔ گاؤں کی اس جانب ہم کبھی نہیں آئے تھے۔ دراصل میں پیر ولایت کا آستانہ دیکھنا چاہ رہا تھا۔ اس نیم پختہ آستانے پر دور ہی سے ایک بڑا جھنڈا لہراتا نظر آتا تھا۔ قریبی درختوں پر لوگوں نے منتوں مرادوں والی بے شمار رنگ برنگی دھجیاں باندھ رکھی تھیں اور گری ہوئی سیاہ دیواریں تھیں، لگتا تھا کہ کچھ عرصہ پہلے یہاں زبردست آتشزدگی ہوئی جس نے سب کچھ راکھ کر دیا۔

''یہ کیا ہے انیق؟'' میں نے پوچھا۔

''سنا ہے جی کہ یہ پیر ولایت کے والد پیر سائیں ساجی کا ڈیرا تھا۔ چھ سات سال پہلے یہاں زبردست آگ لگ گئی تھی۔''

''پھر کوئی جانی نقصان ہوا یا بچ بچاؤ ہو گیا؟''

''اس کا تو پتا نہیں جی......'' انیق بولتے بولتے رک گیا۔ اس کی نگاہ کچھ فاصلے پر کھڑے ایک شخص پر پڑی۔ صبح کی ان اولین گھڑیوں میں یہ سادہ لوح دیہاتی بڑی عقیدت کے ساتھ اس خاکستر جگہ کے سامنے دوزانو بیٹھا تھا اور ہاتھ جوڑ کر دعا وغیرہ مانگ رہا تھا۔ انداز ہوتا تھا کہ یہ جگہ بھی لوگوں نے اپنی منتوں مرادوں کے لیے وسیلہ بنائی ہوئی ہے۔

انیق بولا۔ ''میرا خیال ہے ان بابا جی سے کچھ پوچھنا چاہیے۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

کھچڑی داڑھی والا شخص اپنی ''مناجات'' سے فارغ ہوا تو ہم اس کے قریب پہنچ چکے تھے۔ اس نے جلی ہوئی جگہ کی کچھ سیاہی بڑی عقیدت سے اپنی پیشانی پر لگائی اور سوالیہ نظروں سے ہماری طرف دیکھنے لگا۔ (پہلے تو لوگ ہم سے بات ہی نہیں کرتے تھے کیونکہ ہم دین محمد صاحب کے ملازم تھے اور دین محمد کا گاؤں والوں نے بائیکاٹ کیا ہوا تھا مگر اب صورتِ حال مختلف تھی)

''کیا بات ہے پتر؟'' داڑھی والے نے انیق سے پوچھا۔

انیق بولا۔ ''بزرگوار! ہم نے سنا ہے کہ یہ پیر ولایت کے والد پیر سائیں جی کا ڈیرا تھا۔ یہ آگ میں جل گیا تھا۔ کیا پیر جی خود بچ گئے تھے؟''

''نہیں وہ شہید ہو گئے تھے اور...... یہ شہادت انہوں نے خود اپنے لیے چنی تھی۔''

''خود چنی تھی؟''

''ہاں...... انہوں نے اس جگہ بیٹھ کر ایک سو بیس دن کا چلہ کاٹا تھا۔ ہم گناہ گاروں کے سارے گناہ اور ہماری ساری برائیاں انہوں نے اپنے سر لے لی تھیں اور پھر اللہ پاک سے دعا کی تھی کہ وہ انہیں اٹھا لے۔ آسمان سے نور کی ایک لاٹ اتری تھی اور اس نے وڈے پیر جی کے خاکی پنڈے (جسم) کو ساڑ کر سواہ کر دیا تھا...... ہمارے گناہوں سمیت۔''

انیق حیرت سے اس جلے ہوئے کھنڈر کی طرف دیکھنے لگا۔ جہاں اب بھی لوگ پھول وغیرہ پھینکتے تھے۔ اسی دوران میں ایک اور ضعیف شخص بھی تسبیح پھیرتا ہوا وہاں آ گیا۔ اس نے ہمیں یہ واقعہ مزید تفصیل سے سنایا۔ 120 دن کے چلے کے بعد ایک اندھیری رات میں آسمان سے روشنی کا ایک ستون سا اترا تھا اور اس نے وڈے پیر سائیں جی کے آستانے کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔ پھر سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا۔ وڈے پیر جی کے ساتھ ان کے دو خاص مرید بھی ''شہید'' ہوئے۔ بزرگ کا کہنا تھا کہ اس جلے ہوئے آستانے سے سات سال بعد بھی ایک طرح کی خوشبو آتی ہے۔ اس نے ہمیں سونگھنے کو کہا...... خوشبو واقعی محسوس ہوتی تھی۔ ہماری گفتگو کے دوران میں ہی پہلوان حشمت بھی چہل قدمی کرتا ہوا وہاں پہنچ گیا اور خاموشی سے بیٹھ کر سفید براق لمبی داڑھی والے بابا جی کی باتیں سنتا رہا۔ اس نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔

لیکن کچھ دیر بعد جب ہم پہلوان حشمت کے ساتھ ڈیرے پر واپس پہنچے تو اس نے سرگوشیوں میں انیق کو کچھ اور ہی کہانی سنائی۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ ''اللہ سے ڈر لگت ہے بھیا کہ منہ سے کوئی غلط سلط بات نہ نکل جاوے...... مگر جو کچھ یہ بابا جی بتا رہے

تھے، بہت سے لوگوں کے نزدیک یہ صحیح ناہیں ہے۔"

"تو صحیح کیا ہے؟" انیق نے پوچھا۔

پہلوان حشمت نے اپنی آواز کچھ مزید دھیمی کرتے ہوئے کہا۔ "کوئی نور کی لاٹ شاٹ نہیں اتری تھی۔ سب منہ زبانی باتیں ہیں۔ وڈے پیر کے ڈیرے میں آگ لگی تھی اور بس جل گیا تھا وہ۔"

"آگ کیسے لگی؟" انیق نے پوچھا۔

"اگر میرے منہ سے کچھ غلط نکلے تو اللہ مجھے معاف کرے۔ بہت سے لوگوں کا خیال یہ ہے کہ وڈے پیر نے ایک لڑکی کا جن نکالنے کے بہانے اس سے زیادتی کی تھی۔ وہ لڑکی ڈسکے کی طرف کسی پٹھان گھرانے کی تھی، بڑے ڈھاڈے لوگ تھے وہ۔ وہ آدھی رات کے وقت آئے۔ انہوں نے ڈیرے کے چاروں طرف پیٹرول چھینکا اور آگ لگا کر غائب ہو گئے۔ وڈا پیر سانتا اور اس کے دو خاص چیلے اندر ہی جل کر خاک ہو گئے تھے۔ اس وقوعے کے دو دن بعد وہ پٹھان فیملی بھی غائب ہو گئی۔"

یہ حیرت ناک انکشاف تھا۔ انیق نے حشمت سے پوچھا۔ "یہ پیٹرول اور آگ لگانے والی بات کا پتا کیسے چلا۔ کیا کسی نے پٹھانوں کو دیکھا تھا؟"

"ہاں، کچھ نے دیکھا بھی تھا لیکن سامنے آ کر کسی نے بات نہیں کی۔ اندر خانے کی کہانی کا بہت سے لوگوں کو پتا ہے۔" حشمت نے کہا۔ پھر محتاط نظروں سے ارد گرد دیکھا، جیسے کسی کے موجود نہ ہونے کی تسلی کرنا چاہتا ہو۔ سرگوشی میں بولا۔ "بیس بائیس سال کی خوش شکل لڑکی تھی۔ اس کے وارثوں کا خیال تھا کہ اس پر سایہ ہے۔ وہ اسے وڈے پیر سانتا کے پاس چھوڑ گئے تھے علاج معالجے کے لیے۔ وہ جن نکالنے کا دعویٰ بھی کرتا تھا۔ مریض کو ڈنڈوں سے مارت تھا اور جب مریض چلاوت تھا تو سانتا کہوت تھا کہ اس کے اندر کی بدروح چلاوت ہے۔ میں نے چھ سات سال کی ایک بچی کو خود اپنی گناہ گار آنکھوں سے دیکھا ہے۔ پیر سانتا کے چیلوں نے ڈنڈے مار مار کر اس معصوم کی جان ہی لے لی تھی۔ آج بھی وہ منظر آنکھوں کے سامنے آوت ہے تو دل کانپ جاوت ہے۔"

پہلوان حشمت نے جھرجھری سی لی اور خاموش ہو گیا۔

میں نے انیق کو ٹہوکا دیا۔ وہ میرا مطلب سمجھ کر پہلوان حشمت سے نوجوان لڑکی سے زیادتی والے واقعے کی تفصیل پوچھنے میں مصروف ہو گیا۔ پہلوان کی باتوں سے پتا چلا کہ وہ نوجوان لڑکی وارثوں کی سادہ لوحی کی وجہ سے چھ سات روز سانتا کے ڈیرے پر ہی رہی تھی۔

پیر اسے زیادتی کا نشانہ بناتا رہا اور ساتھ ساتھ ڈراتا رہا کہ اگر اس نے اپنے گھر والوں سے اس "عمل" کا ذکر کیا تو وہ مزید مصیبت میں پڑ جائے گی۔ اس سے چمٹا ہوا جن اس کا حشر نشر کر ڈالے گا۔ (چمٹا ہوا جن تو اصل میں پیر سانتا خود ہی تھا)

لڑکی کے وارث لڑکی سے ملنے آئے تو اس نے سب کچھ اپنی ماں کے گوش گزار کر دیا۔ وہ لوگ خاموشی سے لڑکی کو لے گئے لیکن اس کا جو نتیجہ نکلا وہ پرسانتا کی سوچوں سے بہت آگے تھا۔ مشتعل وارثوں نے اسے اور اس کے دو مریدوں کو ڈیرے سمیت جلا کر راکھ کر ڈالا۔ بعدازاں پیر سانتا کے بیٹے پیر ولایت اور خاص مریدوں نے اس سارے واقعے کو ایک اور رنگ دے دیا۔ انہوں نے کہا کہ پیر صاحب نے 120 دن کا جو چلہ کاٹا تھا، اس میں انہوں نے اپنے چاہنے والوں کے سارے گناہ اپنے سر لے لیے ہیں اور ان گناہوں سمیت خالقِ حقیقی سے جا ملے ہیں)۔

انیق نے کہا۔ "اور حشمت بھائی! وہ جو خوشبو جلے ہوئے کھنڈر میں سے آتی ہے؟"

"وہ سب جھوٹ ہے۔" حشمت نے جھلائے ہوئے انداز میں کہا۔ "اللہ معاف کرے۔ خوشبو تو ان عظیم لوگوں کی قبروں سے آوت ہے جو اللہ کی راہ میں جان دیوت ہیں۔ ایسے پاکھنڈیوں کے مرقد میں خوشبو کا کیا کام؟ یہ تو پیر ولایت کے چیلے چانٹے ہی ہیں جو خاموشی سے وہاں عطر وغیرہ پھینک دیوت ہیں۔ کچھ خوشبو ان پھولوں کی ہووت ہے جو لوگ وہاں چڑھاوت ہیں۔"

یہ اسی روز شام کی بات ہے۔ میں تین گھنٹے مسلسل ٹریکٹر چلانے کے بعد ابھی ابھی نیچے اترا تھا۔ پانی کے ایک کھالے کے کنارے بیٹھ کر اپنے پاؤں دھونے لگا۔ اس دوران میں دین محمد کی ملازمہ نوری نظر آئی۔ وہ سرسوں کا ساگ توڑ رہی تھی۔ بغل میں دو تین کلو ساگ ہو گا۔ میرے قریب ہی بیٹھ کر وہ ساگ کو شفاف پانی سے دھونے لگی۔ اردگرد کماد کے کھیت تھے۔ کوئی متنفس نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی اور ہولے سے بولی۔ "کیا حال ہے بھائی شاہ زیب؟"

میں نے اشاروں سے بتایا کہ ٹھیک ہوں۔ اس کے ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹ کھیل گئی۔ اردگرد دیکھ کر بولی۔ "مجھ سے اشارو میں بات کرنے کی لوڑ نہیں۔ میں جانتی ہوں بھائی، آپ بول سکتے ہیں۔"

میں سناٹے میں رہ گیا۔ اس کا مطلب تھا، تاجور نے اسے سب کچھ بتا رکھا ہے۔ وہ پانی کے قریب گھاس پر دوزانو بیٹھ گئی اور بولی۔ "باجی کی کوئی بات مجھ سے چھپی ہوئی نہیں ہوتی۔"

میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''پھر تو تم بڑے کام کی چیز ہو نوری۔''

''وہ تو میں ہوں۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

''تو پھر کچھ کرو نا۔''

''کیا مطلب جی؟''

''تین چار دن ہو گئے ہیں اس کی شکل دیکھے ہوئے، برا حال ہے۔'' میں نے بھی معنی خیز لہجے میں کہا۔

وہ سنی اَن سنی کرتے ہوئے بولی۔ ''آپ کو بولتے سنا ہے بھائی، تو سچی، ایسے لگا ہے، جیسے کسی بے زبان جانور کو بولتے دیکھ لیا ہے۔'' اپنی بات پر وہ خود ہی ہنسنے لگی۔

میں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟''

''مجھے مار پڑوا دینی ہے آپ نے، مالک سے یا پھر باجی جی سے۔''

''باجی جی تو نہیں مارے گی۔ یہ تو میں گارنٹی دیتا ہوں تمہیں۔''

وہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر بولی۔ ''پرسوں کچھ گنجائش نکل سکتی ہے۔ مالک نے ایک رات کے لیے گوجرانولہ جانا ہے۔ کوئی تاریخ شاریخ ہے۔''

''شاباش یہ ہوئی نا بات۔ اب بتاؤ کیا کرنا ہو گا مجھے؟''

وہ ساگ کا پانی نچوڑتے ہوئے بولی۔ ''ابھی تو بس، ذرا آہستہ بولنا ہو گا۔ کسی نے سن لیا تو ابھی پورے پنڈ میں رولا پڑ جائے گا کہ گونگا بولنا شروع ہو گیا ہے۔'' وہ شرارت آمیز انداز میں ہنسی۔

''آہستہ ہی بول رہا ہوں بھئی، تم زور سے ہنس رہی ہو۔''

اگلے دو تین منٹ میں طے ہو گیا کہ میں پرسوں رات گیارہ بجے کے بعد آؤں گا۔ لوہے کے دروازے کو بہت آہستہ سے انگلی کے ساتھ دو تین بار بجاؤں گا۔ نوری دروازہ کھول دے گی۔ میں سیڑھیاں چڑھ کر سیدھا چھت پر چلا جاؤں گا۔

وہ رات میرے لیے بڑی سنسنی خیز تھی۔ میں ایسی تاریک راتوں میں دنیا کے خطرناک ترین کام کر چکا تھا۔ یورپ کے ایسے خونخوار گینگسٹرز کا سامنا کر چکا تھا جن کا نام سن کر ہی لوگوں کے جسموں میں کپکپی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسے ایسے ''رسکی ایڈونچرز'' میں حصہ لے چکا تھا جن میں ہر گھڑی جان ہتھیلی پر رہتی ہے لیکن اس وقت بھی میرا دل اتنی بے قراری سے نہیں دھڑکا تھا جیسے آج دھڑ دھڑا رہا تھا۔ یہ ایک معمولی سا کام تھا۔ خاموشی سے تاجور کے گھر میں داخل ہونا اور پھر گھر کی چھت پر اس سے ملاقات کرنا۔ لیکن یہ معمولی کام میرے لیے معمولی

نہیں رہا تھا۔ جب تاجور کی بات ہوتی تھی تو پھر ہر صورتِ حال اور ہر کیفیت اپنے معنی بدل لیتی تھی۔

حسبِ پروگرام میں نے لوہے کے بیرونی دروازے پر مدھم دستک دی۔ نوری نے دروازہ کھول دیا اور میں کچی سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر چلا گیا۔ یہاں چار فٹ اونچی کچی منڈیر تھی۔ میں ایک چارپائی پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ وہ اوپر آئے گی بھی یا نہیں؟ آخر قدموں کی مدھم چاپ ابھری اور وہ میرے پاس پہنچ گئی۔ لرزاں آواز میں بولی۔ ''آپ یہ سب کیوں کر رہے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ مجھے کسی بڑی مصیبت میں ڈال دیں گے۔''

''میرے ہوتے کوئی مصیبت تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتی۔'' میں نے بھی مدھم سرگوشی کی۔

''آپ کچھ ضرورت سے زیادہ ہی دلیر نہیں ہوتے جا رہے؟''

''جو کیا ہے، تم نے کیا ہے۔''

''الٹا چور کوتوال کو۔''

''اسی طرح کھڑی رہو گی تو کوئی دیکھ لے گا۔''

وہ جھجکتی ہوئی چارپائی کے ایک سرے پر بیٹھ گئی۔

''اتنا ہٹ کر بیٹھو گی تو گر جاؤ گی۔''

''ہٹ کر نہ بیٹھا جائے تو بھی تو بندہ گر جاتا ہے شاہ زیب۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

مجھے اچانک یاد آیا کہ اس نے نوری کو پورا پورا رازداں بنا رکھا ہے اور میرے ''بے زبان'' نہ ہونے کے بارے میں بھی بتا دیا ہے۔ میں نے کہا۔ ''سیانے کہتے ہیں کہ بات جب تک اپنے سینے میں رہے تب تک اپنی رہتی ہے۔ تم نے نوری کو بتا دیا ہے کہ میں گفتگو فرما سکتا ہوں۔''

''اگر نہ بتایا ہوتا تو آپ اس وقت یہاں بھی نہ ہوتے...... ویسے جناب، نوری بالکل اور طرح کی لڑکی ہے، بےفکر رہیں۔''

دفعتاً ایک مدھم آواز نے مجھے چونکا دیا...... کوئی عورت بہت باریک آواز میں رو رہی تھی۔ پہلا خیال ذہن میں یہی آیا کہ شاید یہ تاجور کی بیمار والدہ ہے لیکن پھر غور کرنے پر پتا چلا کہ آواز پڑوس کے گھر سے ابھر رہی ہے۔ بہت دھیمی آواز تھی مگر اتنی دلدوز کہ روح میں چھید کرتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ اس میں جدائی کا دکھ تھا اور فاصلوں سے پیدا ہونے والا کرب تھا۔

''کون ہے یہ؟'' میں نے تاجور سے پوچھا۔

''چاچی حلیمہ......ریشمی کی ماں۔''

''ریشمی؟ یہ کون ہے؟''

''تھی ایک بدنصیب۔'' تاجور کی آواز میں بھی بے پناہ دکھ عود کر آیا۔ ''میری سب سے قریبی اور گہری سہیلی۔''

''کیا ہوا اس کے ساتھ؟''

''وہی جو ہوا کرتا ہے، پیار کرنے والوں کے ساتھ۔'' آخری الفاظ اس نے بڑی مشکل سے ادا کیے۔

''کہیں اور شادی ہو گئی اس کی؟''

''شادی ہوتی یا......مر بھی جاتی تو شاید ماں باپ کو چین آ جاتا...... پر وہ تو ایسی لاپتا ہوئی کہ کبھی کھوج ہی نہیں ملا۔''

ایک دم میرے ذہن میں کوندا سا لپکا۔ مجھے وہ مختصر گفتگو یاد آئی جو میں نے قبرستان میں گورکن شمس اور کریانہ فروش اقبال کے درمیان سنی تھی۔ اس میں بھی کسی لڑکی کی گمشدگی کا ذکر تھا۔ میں نے اندھیرے میں تیر چلاتے ہوئے کہا۔ ''تاجور! یہ ریشمی وہی تو نہیں جس کا اقبال سے ملنا جلنا تھا۔''

''ملنا جلنا نہیں شاہ زیب، وہ ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ ایک دوسرے کے بغیر جینے کا سوچا بھی نہیں تھا انہوں نے......لیکن انہیں جینا پڑا......اسی لیے...... کہتے ہیں نا شاہ زیب! یہ کانٹوں بھرا راستہ ہے۔ اس پر جو بھی چلا ہے، لہولہان ہی ہوا ہے۔''

میں یہاں آیا تھا تاجور سے کچھ میٹھی میٹھی باتیں کرنے کے لیے۔ اسے پھر سے چھونے کی آرزو لے کر۔ لیکن یہاں تو ایک اور ہی سنگین موضوع چھڑ گیا تھا جس لڑکی کے گم ہونے کی بات میں نے پانچ دن پہلے اقبال کے منہ سے سنی تھی وہ تاجور کی بہت گہری سہیلی نکلی تھی اور دوسروں کی طرح تاجور بھی اس کی جدائی کو بے طرح محسوس کرتی تھی۔

اگلے پندرہ بیس منٹ انکشاف انگیز تھے۔ اس ٹھٹھری ہوئی شب میں تاریک چھت پر مجھ سے تین فٹ کے فاصلے پر بیٹھ کر تاجور نے اقبال اور ریشمی کے بارے میں جو کچھ بتایا، وہ اس طرح تھا۔

وہ دونوں اسی گاؤں کے تھے اور لڑکپن سے ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ ریشمی کی صورت کی طرح اس کی آواز بھی بہت اچھی تھی۔ وہ شادی بیاہ کے موقع پر گانا گاتی تھی تو

سننے والے دم بخود رہ جاتے تھے۔ ریشمی کے لیے کچھ بننے کی خاطر اقبال چند سال پہلے مسقط چلا گیا۔ مگر وہاں بھی اسے کوئی خاص کامیابی نہیں ملی۔ اسی دوران میں ریشمی کے والدین کا ارادہ بدلنا شروع ہو گیا۔ چاند گڑھی میں رہنے والا پرویز نامی ایک لڑکا لاہور میں ایک بڑے ٹھیکیدار کے پاس ملازمت کرتا تھا۔ ٹھیکیدار لاہور جیسے بڑے شہر میں کوٹھیاں وغیرہ بنانے کا کام کرتا تھا۔ پرویز کے حالات بھی بدل رہے تھے۔ وہ چاند گڑھی آتا تو لوگوں کو لاہور میں اپنے ٹھاٹ باٹ کے واقعات سناتا۔ ریشمی کے والدین اس کی باتوں میں آنے لگے۔ ایک دن ایسا آیا جب انہوں نے اپنی بچی کی خوش حالی کی خاطر اس کا رشتہ پرویز سے کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ ریشمی کا ہر احتجاج ناکام ہوا۔ وہ بیاہ کر لاہور چلی گئی۔ چاند گڑھی سے بہت دور ہو گئی۔ ایک سال کے دوران میں وہ بس دو تین دفعہ ہی چاند گڑھی آئی۔ ہر وقت ہنسنے کھیلنے اور گیت گانے والی ریشمی بالکل گم صم نظر آتی تھی۔ وہ کچھ بتاتی نہیں تھی مگر پورا گاؤں جانتا تھا کہ وہ خوش نہیں ہے پھر ایک دن گاؤں والوں پر یہ خوفناک انکشاف ہوا کہ پرویز اسے گانے پر مجبور کرتا ہے۔ وہ ہوٹلوں اور گھریلو محفلوں میں پیسے لے کر گانے گاتی ہے، اور اس کے علاوہ بھی اس کے ساتھ بہت برا ہو رہا ہے۔ پرویز اسے اپنے جاننے والوں کے ساتھ تعلق رکھنے پر مجبور کرتا ہے۔ پرویز غنڈا ٹائپ شخص تھا۔ سب اس سے ڈرتے تھے۔ ریشمی کے بوڑھے ماں باپ بھی اس سلسلے میں خاطر خواہ احتجاج نہیں کر سکے۔ کچھ لوگوں نے پولیس میں رپورٹ درج کرانے کے مشورے دیئے مگر اس پر بھی عمل نہ ہو سکا۔ پرویز کا اٹھنا بیٹھنا بھی عالمگیر گروپ کے ساتھ تھا۔

پھر ایک دن وہ ریشمی کو پھر یہاں چاند گڑھی میں لے آیا۔ اس کا بچہ ضائع ہوا تھا اور وہ برسوں کی بیمار نظر آتی تھی۔ اس کے جسم پر چوٹوں کے نشان بھی تھے۔ یہ چوٹیں یقیناً اس سے ہونے والی مار پیٹ کا نتیجہ رہی ہوں گی۔ پرویز اس کا حکیمی علاج کروا رہا تھا کیونکہ اس کا ٹائیفائیڈ اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہا تھا۔ وہ نماز روزے کی طرف بھی متوجہ ہو گئی تھی۔ کئی لوگوں نے اسے وظیفہ وغیرہ پڑھتے بھی دیکھا۔ نو جوانی میں ہی بڑی بوڑھیوں کی طرح سنجیدہ ہو گئی تھی۔ کبھی کہتی تھی میں ملنگنی بن جاؤں گی، کسی کو بتائے بغیر کسی طرف نکل جاؤں گی۔ یہ بھی پتا چلا کہ پرویز اس کے ٹھیک ہونے کا انتظار کر رہا ہے اور جب وہ ٹھیک ہو جائے گی وہ اسے پھر لاہور لے جا کر اپنی من مانی شروع کر دے گا۔ اقبال مسقط سے ناکام ہو کر واپس آچکا تھا۔ وہ اپنی یادوں کے سہارے زندہ تھا۔ ریشمی کی حالت دیکھ دیکھ کر کڑھتا تھا لیکن کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ ایک دفعہ اس کی پرویز سے منہ ماری ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پرویز نے اسے بری طرح

پیٹ دیا۔اس کے کچھ ہی دن بعد ریشمی اچانک گاؤں سے غائب ہوگئی۔ جاتے جاتے وہ اپنی عزیز ترین سہیلی تاجور کے نام ایک مختصر رقعہ چھوڑ گئی۔ اس نے لکھا کہ وہ اپنی مرضی سے جا رہی ہے۔کوئی اسے تلاش نہ کرے۔ اس دنیا سے اس کا پیٹ بھر گیا ہے،اب وہ کسی اور دنیا کی تلاش میں ہے،وغیرہ وغیرہ۔

اسے آنے والے وقت میں بہت تلاش کیا گیا۔ خاص طور سے اس کے والدین اور شوہر ''پرویز عرف پیجا'' نے بہت بھاگ دوڑ کی لیکن کوئی کھوج نہیں ملا۔ اب تک یہ صورتِ حال برقرار تھی۔

اپنی عزیز ترین سہیلی کی رُوداد بیان کرتے ہوئے تاجور کی آنکھیں کئی بار نم ہوئیں۔ آخر میں وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔ ''کبھی کبھی سوچتی ہوں،شاید یاسر بھائی اس سلسلے میں کوئی مدد کرسکیں۔ اپنے پنڈ کے ہر بندے کا انہیں بہت خیال رہتا ہے۔ جب وہ یہاں تھے ریشمی کی گمشدگی کے بارے میں اکثر بات کرتے تھے......''

میں نے دھیان سے تاجور کی طرف دیکھا۔ آسمان پر تاروں کی برات تھی۔ سرد ہوا شمالاً جنوباً چل رہی تھی۔ اس ہوا نے تاجور کے چہرے کی آوارہ لٹوں کو رقصاں کر دیا تھا۔ وہ انہیں بار بار سنبھالنے کی کوشش کرتی تھی،ایسے میں اس کی گوری کلائی کی چوڑیاں چھن چھن بج اٹھتی تھیں۔

وہیں تاجور کے سامنے بیٹھے بیٹھے،اس گھڑی پتا نہیں میرے دل میں کیا آئی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔''تاجور! جو کام تم یاسر بھائی سے کروانا چاہتی ہو،وہ میں کر دوں تو؟''

''کیا مطلب؟''

''پتا نہیں کیوں میرا دل گواہی دیتا ہے کہ اگر ایک بار تم اپنی زبان سے یہ کہہ دو کہ میں تمہاری سہیلی کا کھوج لگاؤں تو یہ کھوج لگ جائے گا۔ضرور لگ جائے گا۔''

''یعنی آپ ڈھونڈنے نکلیں گے اسے؟''

''ہاں،لیکن اگر تم کہو تو اور میں اس میں زیادہ دیر بھی نہیں لگاؤں گا۔ وہ جہاں اور جس حال میں بھی ہے،اس کا پتا تمہیں دوں گا۔''

''کس طرح شاہ زیب! جو کام اب تک نہیں ہوسکا اور......''

''بس اس بارے میں تم چپ رہو۔ بس ایک بار اپنے منہ سے ذرا پیار کے ساتھ اتنی بات کہہ دو......شاہ زیب! پلیز آپ میرے لیے ریشمی کا پتا چلائیں......بس یہ آٹھ نو الفاظ

کافی ہوں گے۔"

وہ حیرت سے آنکھیں پٹ پٹا کر میری طرف دیکھنے لگی۔ "کیا آپ کے پاس کوئی گیدڑ سنگی ہے یا جادو ٹونا؟"

"دونوں چیزیں ہیں۔ اور وہ دونوں چیزیں تمہارے روپ میں میرے سامنے موجود ہیں۔"

"آپ کیا چیز ہیں شاہ زیب؟"

"اس چکر میں نہ ہی پڑو تو اچھا ہے۔ بس جو آٹھ نو لفظ میں نے کہے ہیں، وہ پیار سے کہہ دو۔"

اس نے ایک گہری سانس لی اور لرزاں ہونٹوں سے مسکرا کر بولی۔ "ٹھیک ہے...... میں کہہ رہی ہوں۔"

"نہیں بھئی، منہ سے ادا کرو، اور پوری سنجیدگی کے ساتھ۔"

وہ جھینپے ہوئے انداز میں پھر مسکرائی اور بولی۔ "شاہ زیب! پلیز آپ میرے لیے ریشمی کا پتا چلائیں۔"

"اس کا انعام کیا ہوگا؟" میں نے بے باکی سے پوچھا۔

"شرافت کے دائرے میں رہ کر آپ جو مانگیں گے۔"

"وعدہ رہا، شرافت کے دائرے میں ہی رہوں گا، ڈیل فائنل۔"

"لیکن شاہ زیب......"

...اب کوئی سوال جواب نہیں۔ ڈیل فائنل...... ہاں اگر کچھ ایڈوانس میں دینا چاہو

...وانس تو ہوتا ہے نا۔"

...وہ تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے اس کا

...ائی پر بیٹھ گئی۔ تاہم اس مرتبہ وہ بالکل

...کی لٹوں کو چوما۔ "پلیز چھوڑیں،

...چھوا۔ وہ تڑپ کر اٹھ گئی اور کئی فٹ دور جا

ٹا...

نے...

تھی۔...

چلا کہ پرویز...

لاہور لے جا...

اپنی یادوں کے...

تھا۔ ایک دفعہ اس کی...

''اتنا تھوڑا ایڈوانس؟'' میں نے شرارت سے کہا۔

''آپ بھول رہے ہیں، آپ نے انعام کی بات کی تھی اور انعام میں ایڈوانس وغیرہ کوئی نہیں ہوتا اور اب پلیز آپ چلے جائیں۔ بہت دیر ہوگئی ہے۔''

''بہت ہوگئی ہے؟ یہ تو کچھ بھی نہیں ہوئی۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ ''بہرحال، میں چلا جاتا ہوں۔ بس ریشمی کے بارے میں دو تین مزید سوال پوچھنے ہیں۔''

وہ چند سیکنڈ تذبذب میں رہ کر بیٹھ گئی مگر اب اس دوسری چارپائی پر بیٹھی جو پانچ چھ فٹ دور تھی۔ میں بھی اب پھر سنجیدہ ہو چکا تھا۔ میں نے تاجور سے چند سوال مزید کیے اور پھر اسے بھرپور امید دلائی کہ میں بہت جلد اسے ریشمی کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور بتاؤں گا۔

اگلے روز میں نے انیق کے ذمے لگایا کہ وہ ریشمی کے گم ہو جانے والی رُوداد کی تفصیل معلوم کرے اور یہ جانے کہ آخری بار اسے کب اور کہاں دیکھا گیا تھا۔ حسبِ توقع انیق نے الہ دین کے جن کی طرح کام کیا اور صرف 24 گھنٹے میں مجھے ایک اہم اطلاع پہنچائی۔ اس اطلاع کے مطابق ریشمی کو آخری بار دیکھنے والے چاندگڑھی کے ہی ایک میاں بیوی تھے۔ رام پیاری اور اس کا بیمار شوہر وکرم۔ یہ کچھ عرصے پہلے کی بات تھی۔ ان دنوں وکرم کی طبیعت اتنی زیادہ خراب نہیں تھی۔ وہ سہارے کے ساتھ چل پھر سکتا تھا۔ وہ دونوں کہیں سے آرہے تھے۔ انہوں نے میرپور کے بس اڈے پر ایک ملنگ لڑکی کو دیکھا تھا...... وہ ریشمی تھی۔ اس واقعے کی مزید تفصیل رام پیاری سے مل کر معلوم کی جا سکتی تھی۔ اس روز رات کو میں ایک بار پھر ''یاسر بھائی'' والے کاسٹیوم میں فیض پور گاؤں پہنچا۔ میرا اصل مقصد رام پیاری سے ملنا تھا۔ تاہم میں ماڈل گرل ورقاصہ جاناں کو بھی دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ ابھی تک وہیں تھی اور اسے تسلی تشفی کی ضرورت تھی۔

رات بارہ بجے کے لگ بھگ میں نے فیض پور پہنچ کر رام پیاری کی قیام گاہ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے وکرم کے کھانسنے کی مدھم آواز ابھر رہی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ابھی شاید رام پیاری بھی جاگ رہی ہوگی۔ میں نے دیکھا تھا کئی بار وہ رات رات بھر شوہر کے سرہانے بیٹھی رہتی تھی۔ میرا خیال درست نکلا۔ جلد ہی دروازے کی دوسری جانب رام پیاری کی ڈری ڈری آواز ابھری۔ ''کون ہے؟''

''یاسر۔'' میں نے ٹھہرے لہجے میں جواب دیا۔

دروازے کی جھری میں سے دیکھنے کے بعد اس نے دروازہ کھول دیا۔ وہ ہمیشہ کی طرح زرق برق لباس میں تھی۔ کانوں میں جھمکے، ناک میں چھوٹی سی نتھلی، ہونٹوں پر لالی کے مدھم

کافی ہوں گے۔"

وہ حیرت سے آنکھیں پٹ پٹا کر میری طرف دیکھنے لگی۔"کیا آپ کے پاس کوئی گیدڑ سنگی ہے یا جادو ٹونا؟"

"دونوں چیزیں ہیں۔ اور وہ دونوں چیزیں تمہارے روپ میں میرے سامنے موجود ہیں۔"

"آپ کیا چیز ہیں شاہ زیب؟"

"اس چکر میں نہ ہی پڑو تو اچھا ہے۔ بس جو آٹھ نو لفظ میں نے کہے ہیں، وہ پیار سے کہہ دو۔"

اس نے ایک گہری سانس لی اور لرزاں ہونٹوں سے مسکرا کر بولی۔"ٹھیک ہے...... میں کہہ رہی ہوں۔"

"نہیں بھئی، منہ سے ادا کرو، اور پوری سنجیدگی کے ساتھ۔"

وہ جھینپے ہوئے انداز میں پھر مسکرائی اور بولی۔"شاہ زیب! پلیز آپ میرے لیے ریشمی کا پتا چلائیں۔"

"اس کا انعام کیا ہوگا؟" میں نے بے باکی سے پوچھا۔

"شرافت کے دائرے میں رہ کر آپ جو مانگیں گے۔"

"وعدہ رہا، شرافت کے دائرے میں ہی رہوں گا، ڈیل فائنل۔"

"لیکن شاہ زیب......"

"بس اب کوئی سوال جواب نہیں۔ ڈیل فائنل...... ہاں اگر کچھ ایڈوانس میں دینا چاہو تو......"

"ایڈوانس......؟"

"بھئی، ڈیل میں تھوڑا بہت ایڈوانس تو ہوتا ہے نا۔"

اس کے چہرے پر شرم کا رنگ لہرا گیا۔ وہ تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ اٹھتے اٹھتے، جھونک میں لہرا کر پھر چارپائی پر بیٹھ گئی۔ تاہم اس مرتبہ وہ بالکل میرے پہلو میں تھی۔ میں نے اسے اپنے ساتھ لگایا اور اس کی لٹوں کو چوما۔"پلیز چھوڑیں، کوئی آجائے گا۔" وہ ہراساں آواز میں بولی۔

میں نے اس کی گردن کو اپنے ہونٹوں سے چھوا۔ وہ تڑپ کر اٹھ گئی اور کئی فٹ دور جا کھڑی ہوئی۔

''اتنا تھوڑا ایڈوانس؟'' میں نے شرارت سے کہا۔

''آپ بھول رہے ہیں، آپ نے انعام کی بات کی تھی اور انعام میں ایڈوانس وغیرہ کوئی نہیں ہوتا اور اب پلیز آپ چلے جائیں۔ بہت دیر ہوگئی ہے۔''

''بہت ہوگئی ہے؟ یہ تو کچھ بھی نہیں ہوئی۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔''بہرحال، میں چلا جاتا ہوں۔بس ریشمی کے بارے میں دو تین مزید سوال پوچھنے ہیں۔''

وہ چند سیکنڈ تذبذب میں رہ کر بیٹھ گئی مگر اب اس دوسری چارپائی پر بیٹھی جو پانچ چھ فٹ دور تھی۔ میں بھی اب پھر سنجیدہ ہو چکا تھا۔ میں نے تاجور سے چند سوال مزید کیے اور پھر اسے بھرپور امید دلائی کہ میں بہت جلد اسے ریشمی کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور بتاؤں گا۔

اگلے روز میں نے انیق کے ذمے لگایا کہ وہ ریشمی کے گم ہو جانے والی رُوداد کی تفصیل معلوم کرے اور یہ جانے کہ آخری بار اسے کب اور کہاں دیکھا گیا تھا۔ حسبِ توقع انیق نے الہ دین کے جن کی طرح کام کیا اور صرف 24 گھنٹے میں مجھے ایک اہم اطلاع پہنچائی۔ اس اطلاع کے مطابق ریشمی کو آخری بار دیکھنے والے چاندگڑھی کے ہی ایک میاں بیوی تھے۔ رام پیاری اور اس کا بیمار شوہر وکرم۔ یہ کچھ عرصے پہلے کی بات تھی۔ ان دنوں وکرم کی طبیعت اتنی زیادہ خراب نہیں تھی۔ وہ سہارے کے ساتھ چل پھر سکتا تھا۔ وہ دونوں کہیں سے آ رہے تھے۔ انہوں نے میرپور کے بس اڈے پر ایک ملنگ لڑکی کو دیکھا تھا......وہ ریشمی تھی۔ اس واقعے کی مزید تفصیل رام پیاری سے مل کر معلوم کی جا سکتی تھی۔ اس روز رات کو میں ایک بار پھر ''یاسر بھائی'' والے کاسٹیوم میں فیض پور گاؤں پہنچا۔ میرا اصل مقصد رام پیاری سے ملنا تھا۔ تاہم میں ماڈل گرل ورقاصہ جاناں کو بھی دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ ابھی تک وہیں تھی اور اسے تسلی تشفی کی ضرورت تھی۔

رات بارہ بجے کے لگ بھگ میں نے فیض پور پہنچ کر رام پیاری کی قیام گاہ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے وکرم کے کھانسنے کی مدھم آواز ابھر رہی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ابھی شاید رام پیاری بھی جاگ رہی ہوگی۔ میں نے دیکھا تھا کئی بار وہ رات رات بھر شوہر کے سرہانے بیٹھی رہتی تھی۔ میرا خیال درست نکلا۔ جلد ہی دروازے کی دوسری جانب رام پیاری کی ڈری ڈری آواز ابھری۔''کون ہے؟''

''یاسر'' میں نے ٹھہرے لہجے میں جواب دیا۔

دروازے کی جھری میں سے دیکھنے کے بعد اس نے دروازہ کھول دیا۔ وہ ہمیشہ کی طرح زرق برق لباس میں تھی۔ کانوں میں جھمکے، ناک میں چھوٹی سی نتھلی، ہونٹوں پر لالی کے مدھم

آثار تھے۔ اس کے شوہر کی یہ عجیب منطق تھی۔ وہ آخری دم تک اپنی شریکِ حیات کو خوب صورت اور بنا سنورا دیکھنا چاہتا تھا۔ میرے اندر داخل ہوتے ہی رام پیاری نے دروازے کو کنڈی چڑھا دی۔ رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد میں نے اس سے جاناں کے بارے میں پوچھا۔

اس نے اپنے نم بال اوڑھنی کے نیچے سمیٹے اور بولی۔ ''بھگوان کا شکر ہے، اب وہ تھوڑا بہت بھوجن لینے لگی ہے۔ بات شات بھی کر لیتی ہے۔ اسے آپ کا بہت انتظار تھا۔''

''کہاں ہے؟''

''اپنے کمرے میں ہی ہوگی۔''

میں نے اس کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹانا چاہا لیکن وہ پہلے ہی تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ میں اندر داخل ہوگیا۔ وہ لحاف اوڑھے سو رہی تھی۔ سرہانے کی طرف لالٹین کی ہلکی روشنی تھی۔ اس کی گردن اور رخساروں پر ابھی تک تشدد کے نشان موجود تھے۔ میں نے بہت آہستہ سے اسے جگایا لیکن وہ پھر بھی ڈر گئی۔ خاص طور سے میرے ڈھاٹے نے اسے ڈرایا۔ وہ چلائی اور جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی، اس کی آنکھوں میں ہراس اور کرب کی یلغار تھی۔ ''نہیں نہیں...... مجھے کچھ نہ کہنا...... میں نے کچھ نہیں کیا۔'' اس نے کہا اور بستر سے چھلانگ لگا کر دروازے کی طرف بڑھنے کی کوشش کی۔

میں نے اسے بازو سے تھام لیا۔ تب تک میرا رخ لالٹین کی طرف ہو چکا تھا اور وہ مجھے زیادہ اچھی طرح دیکھ سکتی تھی۔ اس کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ مزاحمت بھی ختم ہوگئی۔ ''میں یاسر ہوں۔'' میں نے اسے جھنجوڑ کر کہا۔

اسے پتا نہیں کیا ہوا کہ اس نے اپنی پیشانی میرے شانے سے ٹکائی اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ اسی دوران میں رام پیاری بھی گھبرائی ہوئی اندر آگئی تھی۔ میں نے اشارے سے اسے باہر جانے کے لیے کہا۔

چار پانچ منٹ بعد جاناں آنسو وغیرہ بہا کر نارمل ہوگئی۔ اس کے ہونٹوں پر بس ایک ہی بات تھی۔ ''میں یہاں سے واپس کب جاؤں گی؟''

میں نے کہا۔ ''اگر دیر ہو رہی ہے جاناں...... تو اس میں تمہاری بہتری ہی ہے...... زیادہ نہیں، لیکن ایک ہفتہ انتظار تو تمہیں کر ہی لینا چاہیے۔''

میرے سمجھانے بجھانے سے اس کی بے قراری کم ہوگئی۔ وہ سب سے زیادہ پاشا اور تھانے دار قیصر چودھری سے خوف زدہ تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ میری معلومات کے مطابق

تو قیصر زخمی ہے اور بھی تک لاہور کے اسپتال میں ہے جبکہ پاشا یہاں سے واپس جا چکا ہے اور اگر ہوتا بھی تو میرے ہوتے تمہارے قریب نہ پھٹک سکتا۔

رام پیاری کاڑھنی کا گرم دودھ دے گئی۔ میں نے اصرار کر کے جاناں کو بھی پلایا۔ وہ رام پیاری اور وکرم کی باتیں کرنے لگی۔ وہ میاں بیوی کے پیار کو دیکھ کر ششدر تھی۔ اسے یقین نہیں ہوتا تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ اس نے ایک بات بتا کر مجھے بھی حیران کر دیا۔ بولی۔ ''آج ان کی شادی کی سالگرہ تھی۔ تم یہ سن کر حیران ہو جاؤ گے کہ انہوں نے شادی کی سالگرہ اسی طرح منائی ہے جس طرح عام لوگ مناتے ہیں۔ رام پیاری نے پتی کو بھی نئے کپڑے پہنائے، خوشبو لگائی۔ اچھا کھانا پکایا۔ حلوہ پوری کی خوشبو تو تمہیں بھی آ رہی ہو گی؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ زیرِ لب مسکرا کر بولی۔ ''شام کے بعد سے دونوں کمرے میں اکٹھے ہی تھے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی لالٹین روشن کی ہے انہوں نے۔''

مجھے رام پیاری کے گیلے بال یاد آئے...... وہ یقیناً کچھ ہی دیر پہلے نہا کر نکلی تھی۔

جاناں نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔ ''وکرم کو ٹی بی ہے۔ کیا اس طرح اس کے قریب جانے سے رام پیاری کو بیماری نہیں لگے گی؟''

میں نے کہا۔ ''ٹی بی اسپتالوں میں جو ملازم دن رات مریضوں میں گھرے رہتے ہیں، وہ بھی تو بچ ہی جاتے ہیں۔ صحت بیماری اوپر والے کے ہاتھ میں ہے اور شاید رام پیاری کو بھی اس پر یقین ہے۔''

واقعی بات سوچنے کی تھی۔ وہ بے خوف ہو کر دن رات تپ دق زدہ شوہر کی خدمت میں مصروف تھی۔ یہی مشرق ہے۔ اگر یہ ناروے یا انگلینڈ کی کوئی گوری ہوتی تو شوہر سے کم از کم بیس میٹر کا فاصلہ برقرار رکھتی اور زیادہ امکان یہی تھا کہ اب تک طلاق لے کر کسی اور کے بیڈ روم کو جگمگا رہی ہوتی۔ میرے دل میں اس جوڑے کے لیے اور خاص طور سے رام پیاری کے لیے مزید ہمدردی اور انسیت پیدا ہو رہی تھی۔

میں نے رام پیاری سے علیحدگی میں ملاقات کی اور اس سے ریشمی والے واقعے کے بارے میں تفصیل سے پوچھا۔

ریشمی کے ذکر نے رام پیاری کو بھی اداس کر دیا۔ وہ بولی۔ ''سچ یہ ہے یاسر بھائی کہ تاجور کی طرح وہ بھی بڑی اچھی لڑکی تھی۔ بڑی سندر، بہت ہمدرد، دونوں گہری سہیلیاں تھیں۔ ایسا پریم کم ہی دیکھنے میں آتا ہے لیکن دونوں بے چاریوں کے ساتھ انیائے ہوا۔ تاجور کے

پلے ایک ایسا منگیتر پڑ گیا جس نے اس کا جیون عذاب بنا دیا...... اور یہ ۔ بے چاری ریشمی بدمعاش پتی کے ہتھے چڑھ گئی۔ وہ اسے دلہن بنا کر شہر لے گیا اور وہاں اس کی کمائی کھانا شروع کر دی۔" رام پیاری کی آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔

جلد ہی اسے اصل موضوع پر لے آیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ میر پور کے لاری اڈے پر اس کی ملاقات ریشمی سے کب اور کیسے ہوئی۔

اس نے بتایا۔ "یاسر بھائی، کوئی سات ماہ ہونے کو آئے ہیں۔ پر وہ منظر مجھے ابھی تک پہلے روز کی طرح یاد ہے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ وکرم کی تکلیف بڑھ گئی تھی۔ کسی نے مجھے کوٹلی کا بتایا اور کہا کہ وہاں ایک کشمیری سنیاسی ہے جو ہر روگ کا علاج کر سکتا ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے کرائے اور خرچے کے پیسے جمع کیے اور وکرم کو وہاں لے گئی۔ جب ہم واپس آ رہے تھے تو میر پور کے اڈے پر لاری تھوڑی دیر کے لیے رکی۔ وہاں کھڑکی سے میں نے دیکھا کہ کچھ لوگ ایک عورت سے کھینچا تانی کر رہے تھے۔ میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گئی کہ یہ ریشمی تھی۔ اس نے فقیروں جیسا چولا پہنا ہوا تھا۔ سر اور پاؤں سے ننگی تھی۔ دو تین مشٹنڈے اسے اٹھا کر ایک ویگن میں ڈالنا چاہتے تھے۔ بھگوان کی کرپا سے تین چار دکاندار آ گئے اور انہوں نے غنڈوں سے مار پیٹ شروع کر دی۔ اسی دوران میں ریشمی موقع سے فائدہ اٹھا کر کہیں غائب ہو گئی۔"

"تم نے ٹھیک سے دیکھا تھا، وہ ریشمی ہی تھی؟"

"ہاں بھائی، مجھے اتنا ہی وشواش ہے۔ جتنا یہ کہ تم میرے سامنے بیٹھے ہو۔ وہ ریشمی تھی لیکن بالکل بدلی بدلی۔ میں نے اسے لاری کی کھڑکی میں سے دیکھا۔ ہمارے درمیان کیول دو تین گز کا فاصلہ رہا ہو گا۔"

میں نے رام پیاری سے کچھ مزید معلومات حاصل کیں اور اسے بتایا کہ میں ریشمی کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میری یہ بات اسے بہت پسند آئی اور اس کی آنکھیں پھر نم ہو گئیں۔ میں نے دوسرے کمرے میں جا کر وکرم کا حال احوال بھی دریافت کیا۔ وہ بستر پر نیم دراز انگیٹھی تاپ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے لیٹے رہنے پر مجبور کر دیا۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگتا تھا کہ وہ اب پہلے سے کچھ بہتر ہے۔ کسی وقت دل میں یہ خیال آتا تھا کہ شاید وہ زندگی کی طرف لوٹ ہی آئے۔ اس کی یہ سالگرہ آخری سالگرہ ثابت نہ ہو۔ رام پیاری بھی ہمارے قریب آن کھڑی ہوئی۔ صحن میں بندھی ہوئی بکری ممیائی تو ہم تینوں کو ایک ساتھ مولوی فدا محمد کی یاد آ گئی۔ مولوی صاحب اب اس دنیا میں نہیں تھے لیکن

چاندگڑھی میں انہوں نے اس غیر مسلم جوڑے کے لیے جو کچھ کیا تھا اور جس طرح ان کے سامنے ڈھال بنے تھے، وہ یادگار تھا۔

ہم نے دو چار منٹ مولوی فدا اور ان کی بیمار بچی کا ذکر کیا جس کا اسلام آباد میں علاج ہو رہا تھا۔ پھر میں میاں بیوی اور جاناں سے رخصت ہو کر بیرونی دروازے کی طرف آ گیا۔ رام پیاری مجھے باہر تک چھوڑنے آئی۔ وکرم کی طرح یقیناً اس کی بھی خواہش رہی ہو گی کہ میں کم از کم ایک بار تو انہیں اپنی صورت دکھاؤں لیکن پچھلی بار میں نے چونکہ رام پیاری کو سختی سے منع کر دیا تھا۔ لہٰذا اس مرتبہ یہ خواہش اس کی زبان پر نہیں آئی۔ پتا نہیں کہ میری نقاب پوشی کے حوالے سے وہ دل میں کیا کیا سوچتے ہوں گے۔ جاناں بھی اس سلسلے میں مسلسل الجھن میں تھی۔ میں موٹر سائیکل پر واپس چاندگڑھی روانہ ہوا۔ گمشدہ ریشمی کے حوالے سے میرے ذہن میں ایک پروگرام ترتیب پا رہا تھا۔

○......❖......○

اب انیق اور میں دونوں ریشمی کا کھوج لگانے کے مشن پر تھے۔ ہم نے پہلے پیدل اور پھر دیہاتی تانگے کے ذریعے قریباً بیس میل کا فاصلہ طے کیا تھا۔ تب پکی سڑک سے کھٹارا بس پر بیٹھے تھے اور اب میرپور سے ہوتے ہوئے کوٹلی کے آس پاس پہنچ چکے تھے۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ سردیوں کی خوشگوار دھوپ چمک دکھا رہی تھی۔ سڑک کی دونوں جانب حدِ نگاہ تک سرسبز ٹیلے تھے۔ کہیں کہیں مکئی اور گنے کے کھیت بھی دکھائی دیتے تھے۔ روانہ ہونے سے پہلے ہم نے چاندگڑھی کے قدیم باسیوں، سولنگی اور پہلوان حشمت کے ساتھ بیٹھ کر کوٹلی کے علاقے میں موجود مزاروں، آستانوں اور خانقاہوں کا ایک نقشہ تیار کیا تھا۔ اس نقشے کے مطابق کوٹلی سے آگے پہاڑی اور نیم پہاڑی علاقے میں کم و بیش دس اہم مزار اور آستانے موجود تھے۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ اگر ہم نے دلجمعی سے کوشش کی تو انہی جگہوں میں سے کسی جگہ سے ریشمی کا کھوج کھرا مل جائے گا۔

چند دن پہلے میں نے دین محمد صاحب سے ایک دو روز کی رخصت مانگی تھی۔ اب اس مشن کے پیشِ نظر، میں نے اس رخصت کی مدت میں اضافہ کر دیا تھا۔ میں نے دین محمد صاحب سے پانچ دن کی چھٹی کی درخواست کی تھی اور انہوں نے قبول کر لی تھی۔ انیق نے بتایا تھا کہ پاکستانی دستور کے مطابق ہم ان پانچ دنوں میں دو تین دن کا اضافہ اپنی طرف سے بھی (بہ امر مجبوری) کر سکتے ہیں۔

اب ہم چاندگڑھی سے، کافی سے زیادہ دور آ چکے تھے، اس لیے ضروری نہیں تھا کہ میں

اپنا گونگے والا روپ برقرار رکھوں۔ میں اور انیق آزادانہ باتیں کر رہے تھے اور کھا پی بھی رہے تھے۔ چاول کی پنیاں، باداموں والا گڑ، مرونڈا اور بھنے ہوئے مکئی کے بھٹے، سب کچھ اس کھٹارا لاری کے اندر ہی دستیاب تھا۔ راستے کے دلکش مناظر دل کو لبھا رہے تھے۔ اور کچھ بستیوں میں اٹکھیلیاں کرتی ہوئی زندگی کے میٹھے سُر کانوں میں رس گھول رہے تھے۔ پاکستان میں وارد ہوتے ہی مجھ پر جو عظیم سانحہ گزرا تھا، وہ ناقابلِ برداشت تھا۔ مجھے لگا تھا کہ پاکستان سے جانے کے بعد بھی میں مدتوں اس دکھ کے حصار سے نکل نہیں سکوں گا۔ لیکن عجب بات تھی۔ میں پاکستان میں ہی تھا اور میرے زخموں کا مداوا بھی ہو رہا تھا۔ شہری زندگی کے لگائے ہوئے گھاؤ...... دیہی زندگی بھر رہی تھی۔ تاجور کی من موہنی صورت میری نگاہوں میں چمکی۔ میری نظر دور ایک سرسبز پہاڑی ڈھلوان پر جم گئی۔ ایک چھوٹا سا تنہا گھر دکھائی دیا۔ میرا دل چاہا، میں ایسی ہی کسی دور دراز ڈھلوان پر کسی تنہا گھر کے اندر تاجور کے ساتھ اپنی ساری زندگی گزار دوں۔ لیکن سوال یہ تھا کہ کیا وہ مصیبتیں جو یورپ سے میرے ساتھ لگی ہوئی ہیں، میرا پیچھا چھوڑ دیں گی؟

پروگرام کے مطابق رات کو ہم نے اپنا پہلا پڑاؤ ایک نیم پہاڑی مقام پر کیا۔ یہاں کسی نوری سائیں کا مزار تھا اور اس نسبت سے اس جگہ کو نوری پور کہا جاتا تھا۔ یہاں ایک بڑے احاطے میں مریدوں کے رات گزارنے کا انتظام بھی تھا۔ یہاں ہم نے کئی ایک خرافات دیکھیں لیکن ایک بے ہودہ عمل نے دل و دماغ کو بہت مکدر کیا۔

ایک جوان لڑکی کو درخت سے باندھا گیا تھا۔ سخت سردی میں بھی بے چاری نے گرمیوں والے کپڑے پہن رکھے تھے۔ سر پاؤں سے ننگی تھی۔ ایک موٹی تازی عورت گاہے بگاہے اس کے جسم پر ٹھنڈے یخ پانی کی بالٹی انڈیل دیتی تھی۔ پانی گرنے پر لڑکی تکلیف سے چلاّتی تھی اور جان بخشی کی التجائیں کرتی تھی۔ بار بار بھیگنے سے اس کا لباس جسم کا حصہ ہی بن گیا تھا اور وہ دور سے دیکھے پر عریاں نظر آتی تھی۔ دیکھنے والے کن انکھیوں سے اسے دیکھتے تھے۔ ایک مرید نے بتایا کہ اس پر جن ہے۔ یہ صحرائی علاقے کا جن ہے اور ٹھنڈے پانی سے بہت ڈرتا ہے۔ پانی ڈال کر لڑکی کا علاج کیا جا رہا ہے۔ اس صورتِ حال پر مجھے ایک بار پھر چاند گڑھی کے پیر سانتا کے لرزہ خیز واقعات یاد آ گئے۔ پہلوان حشمت راہی نے پورے وثوق سے کہا تھا کہ پیر سانتا نے ایک لڑکی کی عزت تاراج کی اور اس کے پٹھان وارثوں نے غیرت میں آ کر سانتا کو دو مریدوں سمیت خاکستر کر دیا۔ جہاں توہمات ہوں وہاں اس طرح کے سانحے ہونا بڑی بات نہیں ہوتی۔

ہم اگلے روز دوپہر تک اس مزار پر رہے اور یہاں ریشمی کا کھوج لگایا۔ اندازہ یہی ہوا کہ ریشمی یہاں موجود نہیں، کم از کم اس وقت تو نہیں۔

ہماری اگلی منزل قریباً آٹھ کلومیٹر دور ایک اور آستانہ تھا۔ یہ بھی پہاڑی جگہ تھی۔ یہاں ایک گاؤں بھی آباد تھا۔ کئی گز لمبی ایک قبر تھی۔ قبر پر بڑا سا سائبان تھا اور سائبان پر اَن گنت جھنڈے لہرا رہے تھے۔ یہاں سازوں پر بڑے جوش خروش سے کچھ گایا جا رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اسے قوالی کہتے ہیں۔ سامعین میں سے کچھ لوگ اپنے سر کو گول گول حرکت دے رہے تھے۔ اور عجیب کیفیت میں نظر آتے تھے۔ میرے پوچھنے پر انیق نے کہا۔ ''اسے حال چڑھنا کہتے ہیں۔''

اس جگہ پر بھی ہمیں ریشمی کا کوئی اتا پتا نہیں ملا۔ ہم نے کئی افراد سے اس بارے میں سن گن بھی لی۔ مگر اگلی صبح جب ہم وہاں سے آگے روانہ ہونے والے تھے، ایک عجیب واقعہ ہوا۔ ہم نے لنگر خانے کی سیڑھیوں پر ایک شخص کو بے ہوش پڑے دیکھا۔ اس کی عمر پچیس کے لگ بھگ ہوگی۔ ہٹا کٹا تھا اور براؤن رنگ کی خستہ شلوار قمیص پہنے ہوئے تھا۔ اس کے چہرے پر آٹھ دس روز پرانی چوٹوں کے نشان تھے۔ دو تین افراد اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے، باقی تماشا دیکھ رہے تھے۔ ایک شخص نے اس کی بوسیدہ جرسی اوپر اٹھا کر اس کی جیب ٹٹولی۔ کچھ ریزگاری کے علاوہ مڑے تڑے سگریٹ نکلے۔ وہ سونگھ کر بولا ''چرس والے ہیں۔''

دوسرے نے کہا۔ ''لگتا ہے زیادہ پینے سے ہی اس کا یہ حال ہوا ہے مگر اسے پہلے یہاں نہیں دیکھا۔''

پہلا شخص بولا۔ ''رات کو ہی آیا ہے یہاں۔ کہتا تھا آگے جانا ہے مجھے، کسی گاؤں کا نام لے رہا تھا۔ پتا نہیں چاند پور کہ چاند گڑھی......''

چاند گڑھی کے الفاظ پر میں اور انیق بری طرح چونکے۔ ہم جو آگے بڑھنے کا ارادہ کر رہے تھے وہیں پر ٹک گئے۔ کچھ دیر بعد اس شخص کو ہوش آ گیا۔ وہ لال انگارہ آنکھوں سے اردگرد دیکھنے لگا۔ اسے آستانے کے خاص گھڑے میں سے پانی پلایا گیا اور کھانے کے لیے کاغذ پر حلوہ رکھ کر دیا گیا۔ وہ وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ کر کھانے لگا۔ تماشائی دائیں بائیں ہو گئے۔ میں اور انیق اس کے قریب بیٹھ گئے۔

''تم چاند گڑھی سے آئے ہو؟'' انیق نے پوچھا۔

وہ انیق کو سرتاپا گھور کر غصیلے لہجے میں بولا۔ ''تمہیں اس میں کوئی تکلیف ہے؟''

''نہیں، میرا مطلب تھا کہ ہم بھی وہیں سے آئے ہیں۔''
اس نے ایک بار پھر انیق کو سرتاپا گھور کر کہا۔ ''لیکن میں نے تو تمہیں کبھی وہاں نہیں دیکھا۔''
''ہمیں آئے زیادہ دن نہیں ہوئے۔ دین محمد صاحب کے پاس کام کرتے ہیں۔ یہ میرا ساتھی گونگا شاہ زیب ہے۔ ٹریکٹر چلاتا ہے اور انجن وغیرہ مرمت کرتا ہے۔''
''تو میں لڈو بانٹوں؟ کیا کروں؟'' اس نے پھر بھنے لہجے میں کہا۔
''میرا مطلب تھا کہ ''حاضری'' کے بعد ہم بھی واپس چاندگڑھی جا رہے ہیں اگر تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں تو...... تم ہمارے ساتھ جا سکتے ہو۔''
''ہوائی جہاز ہے تمہارے پاس؟''
''تم برا نہ مانو، کوئی زبردستی نہیں ہے...... ویسے میں نام پوچھ سکتا ہوں؟''
''پوچھو۔'' وہ تپے ہوئے لہجے میں بولا۔
''تو بتادیں۔'' انیق نے بھی ڈھیٹ بن کر کہا۔
''پرویز...... پیار سے پیجا پیجا کہتے ہیں...... بولو...... اب کوئی ہمشیرہ ہے تمہاری، جس کا رشتہ دینا ہے پیجا کو؟''
انیق کا رنگ لال ہو گیا۔ ایک لمحے کے لیے لگا کہ وہ اس بد دماغ شخص کے تھوبڑے پر گھونسا جڑ دے گا لیکن پھر ایک دم اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ شاید میری طرح اس نے بھی ''پرویز'' کے لفظ پر غور کر لیا تھا۔ ہماری معلومات کے مطابق پرویز توریشمی کے شوہر کا نام تھا اور وہ کئی ماہ سے اسے ڈھونڈتا پھر رہا تھا...... کیا یہ وہی پرویز تھا؟
انیق نے سنبھل کر کہا۔ ''تمہارے دماغ کو خوامخواہ گرمی چڑھ رہی ہے۔ اگر ہم بہت برے لگ رہے ہیں تو چلے جاتے ہیں۔ ہم تو سمجھے تھے کہ تم بھی اپنے ٹائپ کے بندے ہو۔''
''کون سا ٹائپ؟'' اس نے منہ ٹیڑھا کر کے پوچھا۔
''یہی مست سگریٹ والا۔'' انیق نے اس کی جیب سے برآمد ہونے والے دو مڑے تڑے سگریٹس کی طرف اشارہ کر کے کہا۔
پرویز عرف پیجا کا چہرہ متغیر ہوا۔ کچھ دیر للچائی ہوئی نظروں سے مجھے اور انیق کو گھورتا رہا پھر بڑھی ہوئی شیو کو کھجا کر بولا۔ ''کوئی مال پانی ہے تو بتاؤ؟'' مال پانی سے اس کی مراد چرس ہی تھی۔
انیق بولا۔ ''سب کچھ ہے بھائی میرے...... اور کھلا ڈلا ہے۔''

انیق نے مجھے اشارہ کیا۔ میں اس کا مطلب سمجھ رہا تھا۔ اٹھ کر آستانے کے پچھواڑے گیا۔ یہاں لمبے بالوں والا ایک ملنگ افیم اور چرس بیچ رہا تھا۔ میں نے چار سو روپے دے کر اس سے چرس لی اور واپس انیق کے پاس پہنچ گیا۔ تب تک انیق پیجا کو مزید شیشے میں اتار چکا تھا۔ دونوں تندوری روٹی پر حلوہ رکھ کر کھا رہے تھے۔ ہم ریشمی کی تلاش میں نکلے تھے۔ ہمیں ہرگز ہرگز توقع نہیں تھی کہ اس طرح سرِراہ ہماری ملاقات ریشمی کے مبینہ شوہر سے ہو جائے گی۔ نہ جانے کیوں میرا دل گواہی دینے لگا تھا کہ ہمیں اس بندے سے کوئی اہم کھوج ضرور ملے گا۔

آدھ گھنٹے بعد ہم ٹیلوں کے درمیان چیڑ کے درختوں کے جھنڈ میں بیٹھے تھے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی لیکن خوشگوار دھوپ نے موسم کو متوازن رکھا ہوا تھا۔ چرس بھرے سگریٹ کے زوردار سوٹے لگانے کے بعد پیجا نے بہکنا شروع کر دیا تھا۔ بہرحال میں نے انیق کو اشارے سے سمجھا دیا تھا کہ اسے زیادہ بہکنے نہیں دینا۔ کہیں پھر لمبا نہ لیٹ جائے۔ انیق اور میں بھی کش لے رہے تھے مگر ہوشیاری یہ دکھاتے تھے کہ دھواں اندر نہیں لے جاتے تھے۔

ترنگ میں آ کر پیجا نے اول فول بولنا شروع کر دیا اور پھر اسی کیفیت میں نامعلوم افراد کو گالیاں دینے لگا۔ ''میں دیکھوں گا تم کو...... دیکھ لوں گا تم سب کو...... عورت دیکھ کر شیر بنے ہوئے ہو۔ تم اسے زبردستی اپنے پاس نہیں رکھ سکتے۔ ہتھکڑیاں لگوا دوں گا۔''

''کون ہے وہ؟'' انیق نے اسے ٹٹولنے کی کوشش کی۔

وہ پھٹ پڑا۔ ''تمہاری ماں بہن نہیں ہے۔ تم اپنے کام سے کام رکھو۔''

میں نے انیق کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اس کا فائدہ ہوا۔ کچھ دیر بعد اس کا نشہ بڑھا تو وہ خود ہی انیق سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''دیکھو جس کی زنانی ہوتی ہے، اسی کی ہوتی ہے نا؟''

انیق نے اثبات میں جواب دیا۔

پیجا نے ہاتھ لہرا کر کہا۔ ''اور زنانی...... تو زنانی ہی ہوتی ہے...... زنانی کی عقل کہاں ہوتی ہے بھلا؟...... یہاں...... یہاں...... اس کی گت (چوٹی) میں۔'' اس نے اپنے ہاتھ سے گردن کے پچھلے حصے کو چھوا۔

''بالکل ایسے ہی ہے۔'' انیق نے تائید کی۔

''زنانی کو اوپر والے نے بے عقل پیدا کیا ہے۔ بڑی جلدی سے باتوں میں آ جاتی ہے۔ وہ بھی حرامزادی باتوں میں آئی ہوئی ہے۔ وہ سور کے پتر اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اُلو کی پٹھی سمجھتی ہے کہ میرے ساتھ رہے گی تو اس کی عجت خراب ہو گی، اسے پتا نہیں عجت

وہاں بھی خراب ہو گی اور بدلے میں ملے گا ٹھینگا بھی نہیں......'' اس نے انگوٹھا دکھا کر ہمیں سمجھانے کی کوشش کی۔

وہ کش لے رہا تھا اور بک رہا تھا۔ بات کچھ کچھ ہماری سمجھ میں آنا شروع ہو گئی تھی اور یہ بڑی سنسنی خیز بات تھی۔ لگ رہا تھا کہ پرویز عرف پیجا کسی طرح ریشمی کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ اب وہ جو صلواتیں سنا رہا تھا، ان لوگوں کے لیے تھیں جن کے پاس ریشمی تھی اور وہ جو نیلی پیلی چوٹیں اسے لگی ہوئی تھیں یہ بھی شاید ریشمی کے ہی سلسلے میں لگی تھیں۔

انیق نے پیجا کو یاد کرا دیا تھا کہ ہمارے پاس اعلیٰ کوالٹی کی چرس کا تسلی بخش اسٹاک موجود ہے......اور اس کے علاوہ جیب بھی پوری طرح گرم ہے۔

ہم اسے قریبی گاؤں میں لے آئے۔ یہاں ایک مسافر سرائے ٹائپ جگہ تھی جہاں ''لمبی قبر'' کے عقیدت مند شب بسری کر سکتے تھے۔ یہاں اچھا کھانا بھی میسر تھا۔ کرایہ معمولی تھا۔ انیق چونکہ پیجا کو شیشے میں اتار چکا تھا اس لیے وہ ہمارے ساتھ سرائے میں قیام کو تیار ہو گیا۔ یہاں کچے فرش پر چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں اور میلے کچیلے تکیے رکھے تھے۔ زنانہ حصہ دوسری طرف تھا۔ دوپہر کو مرغ پلاؤ کھا کر اور دودھ پتی پی کر پیجا کا موڈ کچھ اور بہتر ہو گیا۔ اس نے ہمارے سامنے بھڑ ماری کہ وہ یوں تو چاند گڑھی کا رہنے والا ہے لیکن لاہور میں ٹھیکیداری کرتا ہے۔ ریشمی کا ذکر کرتے ہوئے اس نے کہا کہ اس کی بیمار بیوی کو ایک کرنالی نامی ملنگ بہلا پھسلا کر اپنے ساتھ، پردے والی سرکار کے پاس لے گیا ہے۔

''پردے والی سرکار؟ یہ کون ہے؟'' انیق نے پوچھا۔

''پتا نہیں کون ہے۔ پر اسے ''پردے والی سرکار'' ہی کہتے ہیں۔ علاقے میں اس کو بڑا مانا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کے پاس بڑی کرامتیں ہیں۔ ہوں گی کرامتیں لیکن جو میری زنانی ہے، وہ میری ہے۔ اسے واپس دینا ہوگا۔''

''تو کون نہیں دے رہا؟ پردے والی سرکار؟''

''نہیں، وہ تو کسی کے سامنے ہی نہیں آتا۔ یہ سارا کیا دھرا، اس موٹے مشٹنڈے ملنگ کرنالی کا ہے۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا جب بھی موقع ملا اس کا پیٹ پھاڑ دوں گا۔ کبھی تو ملنگی ڈیرے سے باہر نکلے گا وہ۔''

''کہاں ہے یہ ملنگی ڈیرا؟'' انیق نے سب سے اہم سوال کیا۔

''بڑے نالے سے آگے والی پہاڑیوں میں۔''

انیق نے مزید تفصیل پوچھی تو پتا چلا کہ ''بڑے نالے'' سے آگے جو جنگل شروع ہوتا ہے اس میں ''کرماں والا'' نام کا ایک گاؤں ہے یہ جگہ جسے ملنگی ڈیرہ کہا جاتا ہے کرماں والا گاؤں کے ساتھ ہی ہے۔

پرویز عرف پیجا کو مزید ٹٹولنے پر یہ اندازہ بھی ہوا کہ وہ اندر خانے ملنگوں سے خوف زدہ ہے۔ انہوں نے اسے بری طرح مار پیٹ کر وہاں سے بھگایا ہے اور اب وہ چرس کے دھوئیں میں غرق ہو کر اپنا غم غلط کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس بات کی امید بھی نہیں تھی کہ وہ مستقبل قریب میں اس ''ملنگی ڈیرے'' کا رخ کرے گا۔ وہ یوں تو واپس چاند گڑھی جانے اور پولیس میں رپورٹ درج کرانے کی باتیں کر رہا تھا مگر پتا چلتا تھا کہ یہ خالی خولی دھمکیاں ہیں۔ پیجا کا اپنا کردار ہمارے علم میں آچکا تھا۔ تاجور نے بتایا تھا کہ پورا گاؤں اس کے خلاف ہے۔ وہ شہر میں ریشمی کو محفلوں میں گانے پر مجبور کرتا رہا ہے اور اس کی کمائی کھاتا رہا ہے۔ بعض یہ بھی کہتے تھے کہ وہ اسے غیر مردوں سے تعلق رکھنے پر بھی مجبور کرتا تھا۔ اب وہ کس منہ سے پولیس کے پاس جا سکتا تھا۔

سچ کہتے ہیں کہ ہر مچھلی کو اس سے بڑی مچھلی کھاتی ہے۔ ''پیجا'' اپنے طور پر چاند گڑھی کا غنڈا بنا ہوا تھا اور عالمگیر کو گرو کہتا تھا۔ ریشمی کے ماں باپ سمیت کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ بے بس چڑیا کی طرح پھڑ پھڑاتی ہوئی ریشمی کو اس کے چنگل سے نکال سکتا لیکن اب اس کو ملنگی ڈیرے کے ملنگ ٹکر گئے تھے، جو اس سے زیادہ طاقتور تھے۔ ریشمی ان کے پاس تھی اور انہوں نے بد دماغ پیجا کو مار بھگایا تھا۔

صبح ہم اٹھے تو پیجا غائب تھا۔ وہ رات پچھلے پہر اٹھ کر کہیں نکل گیا تھا۔ جاتے جاتے وہ انیق کی جیکٹ سے چرس کے دو ٹکڑے اور ہزار بارہ سو کی نقدی بھی لے گیا تھا۔ اس سے ایسی ہی امید تھی۔ ہمیں اس کے جانے سے کوئی خاص پریشانی نہیں ہوئی۔ جانے سے پہلے وہ ہمیں ہمارا راستہ دکھا گیا تھا۔ لمبی قبر والے اس آستانے سے ایک ناہموار کچا راستہ آگے کی منزل کا سراغ دیتا تھا۔ فوجی طرز کی دو بہت پرانی جیپیں یہاں نقل و حرکت کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔ ہم نے کرایہ بھرا اور اس دشوار گزار راستے پر قریباً پندرہ کلو میٹر کا فاصلہ طے کر کے کرماں والا پہنچ گئے۔

یہ بلند پہاڑوں سے گھرا ہوا گاؤں تھا۔ گاؤں کا کچھ حصہ ہموار جگہ پر اور کچھ ڈھلوان پر تھا۔ یہ ڈھلوان آگے جا کر پہاڑوں کی اونچائی میں کہیں گم ہو جاتی تھی۔ ایک پہاڑ کی اوٹ سے سفید رنگ کا ایک گنبد سا نظر آتا تھا...... اور جھنڈے لہرا رہے تھے۔ اس جگہ کو ملنگی ڈیرا

کہتے تھے اور یہیں پر ''پردے والی سرکار'' بھی رہتی تھی۔

گاؤں میں ایک کافی بڑا بازار بھی تھا۔ دو تین مسافر سرائے تھے جہاں پردے والی سرکار کے عقیدت مندرات بسر کر سکتے تھے۔ اس بازار میں باورچی حضرات بھی موجود تھے جو نذرانے کی دیگیں وغیرہ پکاتے تھے۔ مٹھائی اور چڑھاوے کی ریشمی چادریں وغیرہ بھی یہاں کثرت سے دستیاب تھیں۔ ایک دور دراز گاؤں ہونے کے باوجود یہاں خوب چہل پہل نظر آتی تھی...... مسافر سرائے میں ہماری ملاقات کوٹلی کے ایک نوجوان بابر سے ہوئی۔

میرے پوچھنے پر اس نے بتایا۔ ''چھ سات سال پہلے تک ملنگی ڈیرے کا مزار علاقے کے عام مزاروں کی طرح تھا...... مگر پھر یہاں پردے والی سرکار کا ظہور ہوا۔ پردے والی سرکار کی اونچی شان تھی اور ان کی کرامات تھیں کہ دیکھتے ہی دیکھتے ملنگی ڈیرا پورے علاقے میں مشہور ہو گیا۔ اب دور دور سے لوگ یہاں آتے ہیں اور مرادیں پاتے ہیں۔''

میں نے بابر سے پوچھا۔ ''تم کیا مراد لے کر آئے ہو؟''

وہ بولا۔ ''میں مراد لے کر نہیں آیا جی۔ مراد پوری ہونے پر سرکار کا شکریہ ادا کرنے حاضر ہوا ہوں۔ نذرانہ لے کر آیا ہوں۔''

''کیسا نذرانہ؟''

''دس ہزار روپیہ نقد اور اپنی بیوی کی دو چوڑیاں۔ میری چار سال کی بچی ایک سال سے بیمار تھی۔ اس کے سر کا درد کسی طرح جاتا ہی نہیں تھا۔ بہت سے ڈاکٹروں، حکیموں کو دکھایا۔ کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ پھر کسی نے پردے والی سرکار کا بتایا۔ انہوں نے چولہے کی راکھ پر دم کر کے دیا۔ اب دو مہینے ہو گئے ہیں۔ اللہ کے فضل سے بچی بالکل ٹھیک ہے۔ جیسے اسے کبھی کچھ ہوا ہی نہیں تھا اور یہ کوئی میری بچی کی بات ہی نہیں ہے۔ اللہ کی بڑی مخلوق کو پردے والی سرکار سے فائدہ نصیب ہو رہا ہے۔''

اپنی بات ختم کر کے بابر نے غور سے ہم دونوں کو دیکھا اور بولا۔ ''آپ کس لیے آئے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''ہم تو بس سلام کرنے حاضر ہوئے ہیں۔ بڑی شہرت سنی تھی ملنگی ڈیرے کی۔''

بابر عقیدت بھرے لہجے میں بولا۔ ''جو کچھ سنا ہے، اس سے بہت بڑھ کر پائیں گے۔ اوپر والے نے بڑا فیض رکھا ہے سرکار جی کی ذات میں، ایسے ایسے واقعات ہیں کہ سن کر حیرت ہوتی ہے۔ کسی نے کہا تھا حکیم لقمان کے پاس موت کے علاوہ ہر چیز کا علاج تھا۔ شاید

سرکار جی کے بارے میں بھی یہی کہا جا سکتا ہے۔"

مسافر سرائے کی کھڑکی کے سامنے سے کچھ دیہاتی ایک لاغر عورت کو چارپائی پر ڈالے گزرے۔ ان کا رخ بلندی کی طرف جانے والے اس راستے کی جانب تھا جو ملنگی ڈیرے پر پہنچتا تھا۔

بابر نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ جو اتنا بڑا بازار آپ دیکھ رہے ہیں، چھ سات سال پہلے تک کچھ بھی نہیں تھا۔ بس تین چار بے کار سی دکانیں تھیں۔ اس گاؤں کی آبادی بھی آج کی آبادی سے آدھی تھی اور ملنگی ڈیرے کا تو اس علاقے سے باہر کسی کو پتا ہی نہیں تھا۔ اب دیکھیں لوگ کس طرح ٹولیوں کی شکل میں آ رہے ہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "تمہارا کیا خیال ہے۔ یہ جو نذرانہ تم پردے والی سرکار کے لیے لائے ہو، یہ کہاں استعمال ہوگا؟"

"عام لوگوں کی "مدد امداد" کے لیے۔ ملنگی ڈیرے پر بہت سے ایسے لوگ رہتے ہیں جنہوں نے فقیری لے لی ہوئی ہے۔ ان میں مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی۔ یہ لوگ کبھی بھی ڈیرے سے باہر نہیں آتے۔ وہیں پر روکھی سوکھی کھاتے ہیں اور عبادت میں مصروف رہتے ہیں پھر بہت سے یتیم اور بے آسرا بچے بھی ہیں جو ملنگی ڈیرے کے پکے پکے مہمان ہیں...... ان کے لباس، خوراک اور تعلیم وغیرہ کا دھیان ملنگی ڈیرا ہی رکھتا ہے۔"

اتنے میں شور سنائی دیا۔ پتا چلا کہ دو خچروں پر دو دیگیں لاد کر لائی گئی ہیں۔ ان دیگوں میں چاول تھے جو عقیدت مندوں میں تقسیم ہونے تھے۔ لوگ بھاگ بھاگ کر ایک طویل قطار میں کھڑے ہونے لگے۔ بابر ایک کھاتا پیتا شخص لگتا تھا لیکن وہ بھی چاول لینے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم سے مخاطب ہو کر بولا۔ "یہاں کا لنگر کھانا بھی برکت کا ذریعہ بنتا ہے۔"

میں اور انیق سر ہلا کر رہ گئے۔ اللہ کی برگزیدہ ہستیوں کے مزاروں اور خانقاہوں کا تقدس اپنی جگہ ہے۔ ان جگہوں پر بہت نیک و متقی لوگ بھی پائے جاتے ہیں لیکن بہت سی جگہیں ایسی بھی ہیں جہاں عیار لوگ روحانیت کی آڑ میں سادہ لوح لوگوں کو بے وقوف بناتے ہیں۔ بے شک مشرقی ممالک میں یہ پریکٹس زیادہ ہے لیکن میں نے یورپ کے پادریوں اور ان کے کلیساؤں میں بھی یہ سب کچھ ہوتے دیکھا تھا۔

قریباً ایک گھنٹے بعد میں اور انیق ایک طویل ڈھلوان پر چڑھ کر "ملنگی ڈیرے" پہنچے۔ یہ پتھروں میں گھری ہوئی ایک وسیع و عریض جگہ تھی۔ سفید مزار کے ساتھ ہی ایک پرانی طرز کی لمبی چوڑی عمارت تھی۔ اس کی اونچی دیواریں پتھر کی تھیں۔ مزار کے سامنے ایک وسیع احاطہ

شاید حال ہی میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس پر ٹین کی مخروطی چھتیں تھیں جن پر نیلا رنگ کیا گیا تھا۔ یہاں ہم نے ہلکا نیلا لباس پہنے ہوئے بہت سے مردوں کو دیکھا۔ ان میں سے اکثر کے بال لمبے تھے اور گلے میں مالائیں تھیں۔ کسی کسی نے نیلے چغے کے اوپر کوئی صدری پہن رکھی تھی یا بوسیدہ کمبل اوڑھ رکھا تھا۔ ہمیں کہیں بھی کوئی عورت دکھائی نہیں دی۔ بس دو تین بوڑھی عورتوں پر نظر پڑی جو صفائی ستھرائی کے کام میں مصروف تھیں۔

ہم عام عقیدت مندوں کی حیثیت سے اِدھر اُدھر گھومتے رہے۔ مزار کی سیڑھیوں کے پاس ڈھول بج رہا تھا اور کئی ملنگ یہاں رقص میں مصروف تھے۔ انیق نے کہا۔ ''اسے دھمال ڈالنا کہتے ہیں۔ شروع شروع میں ہماری اکثر پنجابی فلمیں اس دھمال کے بغیر نامکمل سمجھی جاتی تھیں......''

شاید وہ فلموں کے حوالے سے مزید گوہر افشانی کرتا مگر اسی دوران میں بابر بھی چاول وغیرہ کھا کر یہاں پہنچ گیا۔ ہمیں دیکھ کر وہ سیدھا ہماری ہی طرف آیا۔ رقصاں ملنگوں کو دیکھ کر وہ بولا۔ ''آپ خوش قسمت ہیں۔ اچھے موقع پر حاضری کے لیے آئے ہیں۔ آج ضرور پردے والی سرکار لوگوں کے سامنے آئے گی۔ یہ ملنگوں کی دھمال اسی وقت ہوتی ہے جب سرکار نے سامنے آنا ہو۔''

''کیا مطلب؟'' انیق نے پوچھا۔ ''وہ لوگوں کو اپنی صورت دکھائیں گے؟''

''نہیں بھائی، اتنی ہماری گناہ گاروں کی قسمت کہاں۔ ان کا ہمارے درمیان آ جانا ہی بہت بڑی خوش نصیبی ہے۔ وہ اُس سامنے والے چبوترے پر بیٹھیں گے اور مریدوں اور عقیدت مندوں سے خطاب کریں گے۔''

میں نے دیکھا دور احاطے کے آخری سرے پر سفید پتھر کا گول چبوترا سا نظر آ رہا تھا اس چبوترے کے قریب سے اس وسیع و عریض احاطے کو لکڑی کی ایک عارضی دیوار کے ذریعے دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ بابر نے بتایا کہ عورتیں اس دیوار کی دوسری جانب بیٹھتی ہیں۔

نیلے چولے اور لمبے بالوں والا ایک ادھیڑ عمر ملنگ ہمارے قریب سے گزرا۔ اس نے اپنی بغلی جیب سے کچھ نکالا تو اس کی نیلی، جالی دار ٹوپی نیچے گر گئی۔ میں نے اسے آواز دی۔ ''بابا جی۔''

وہ رک گیا لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے ٹوپی اٹھا کر جھاڑتے ہوئے کہا۔ ''یہ آپ کی ہے؟''

اس نے پھر بھی جواباً کچھ نہیں کہا۔ بس اثبات میں سر ہلایا اور ٹوپی لے کر آگے بڑھ

گیا۔ بابر نے کہا۔ ''جن لوگوں نے فقیری لی ہوئی ہے۔ وہ عام لوگوں سے بات نہیں کرتے، ہاں کوئی بہت شدید ضرورت ہو تو اور بات ہے۔ یہ لوگ بالکل الگ تھلگ رہتے ہیں اور کچھ تو ایسے بھی ہیں جو سرکار جی کی طرح زندگی بھر کسی کو شکل نہ دکھانے کا عہد کر لیتے ہیں۔''

بابر نے اِدھر اُدھر دیکھا، پھر دور ایک شخص کی طرف اشارہ کیا۔ وہ ایک پتھریلی دیوار سے ٹیک لگائے چمٹا بجا رہا تھا اور چمٹے کی آواز کو ڈھول کی تھاپ سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے اپنے سر پر ایک نیلی چادر، گھونگھٹ کی طرح ڈال رکھی تھی۔ اس کا چہرہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بابر نے کہا۔ ''یہ دیکھو، اس طرح کے کئی اور بھی نظر آئیں گے۔''

میں نے لکڑی کی اس طویل دیوار کو دیکھا جو اس ہال نما احاطے کو دو حصوں میں تقسیم کرتی تھی۔ تو کیا تاجور کی عزیز ترین سہیلی ''ریشمی'' اس دیوار کی دوسری جانب آ کر بیٹھے گی؟ کیا وہ یہیں موجود ہوگی؟ اس قدیم عمارت کی اونچی دیواروں کے پیچھے؟ اس کو کیسے دیکھا جا سکے گا، اس سے کیسے بات کی جا سکے گی؟ یہاں کا انتظام بہت سخت دکھائی دے رہا تھا، پتا چل رہا تھا کہ انتظامیہ کی مرضی کے بغیر یہاں سے کسی کو لے جانا تو دور کی بات ہے، کسی سے ملنا بھی آسان نہیں۔

ایک گھڑیال سا بجا اور رقص کرنے والے فقیروں نے اپنے پاؤں روک لیے۔ سب لوگ وسیع و عریض چھت تلے جمع ہونے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے چبوترے کے سامنے والا حصہ مریدوں اور زائرین سے بھر گیا۔ اگلی قطاروں میں نیلے چولوں والے مریدین اور چیلے تھے۔ ان کے عقب میں عام زائرین اور عقیدت مند ترتیب سے بیٹھتے جا رہے تھے۔ لکڑی کے عارضی پارٹیشن کی دوسری جانب بھی ہلکا ہلکا شور سنائی دینے لگا تھا۔ یہ عورتوں کی بھنبھناہٹ تھی۔ بالآخر خاص مریدوں کے جلو میں پردے والی سرکار نمودار ہوئی۔ سر سے پاؤں تک ایک سیاہ لبادہ تھا۔ کندھوں پر بھی ایک سفید شال تھی۔ ایک ململ کی کامدار چادر سر پر تھی اور اس نے چہرے پر گھونگھٹ سا بنا رکھا تھا۔ سب لوگ باادب انداز میں کھڑے ہو گئے اور تعظیم کے انداز میں سر جھکایا۔ پردے والی سرکار چبوترے کی سب سے اونچی نشست پر بیٹھ گئی۔ دو صحت مند مرید جن کے بال ان کے کندھوں تک پہنچ رہے تھے، دائیں بائیں کھڑے ہو گئے۔ یہ نیلے چغوں میں تھے۔ گلے میں لکڑی اور پتھروں کی موٹی مالائیں تھیں۔ میں نے ریشمی کے شوہر پیجا کی زبانی ملنگ کرنالی کا حلیہ سنا تھا، مجھے فوراً خیال آیا کہ پردے والی سرکار کی دائیں جانب کھڑا ہونے والا فربہ شخص ملنگ کرنالی ہے۔ بعدازاں یہ خیال درست ثابت ہوا۔ پرویز عرف پیجا کے مطابق یہی شخص تھا جس کی باتوں سے متاثر ہو کر ریشمی نے فقیری لبادہ اوڑھا تھا اور

سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر یہاں چلی آئی تھی۔

بیٹری سے چلنے والا ایک لاؤڈ اسپیکر ''پردے والی سرکار'' کے سامنے رکھ دیا گیا۔ ایک ایسا ہی اسپیکر عورتوں والی جانب بھی پہنچا دیا گیا۔

''کیا عورتوں کی طرف سے بھی کوئی تقریر کرے گا؟'' انیق نے سرگوشی میں پوچھا۔

''تقریر اور زبان کے استعمال میں عورتیں مردوں سے کہیں آگے ہوتی ہیں۔'' میں نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔

مگر عورتوں کی طرف سے کوئی تقریر نہیں ہوئی بلکہ کورس کی شکل میں ایک گیت سنائی دیا۔ یہ کوئی ''کافی'' کی طرح کا پنجابی گیت تھا جس میں انسان کے لالچ کی بات کی گئی تھی اور اس لالچ سے پیدا ہونے والی پریشانیوں کا تذکرہ تھا۔ عام لوگوں کو تلقین کی گئی تھی کہ وہ سادہ زندگی گزاریں۔ لذتوں اور دنیاوی آلائشوں سے دور رہیں۔ گیت اچھا تھا اور اس کی لے بھی بہت خوب صورت تھی مگر سادہ زندگی کے جو اصول بتائے جا رہے تھے، ان پر کم از کم یہاں کے خاص مرید تو ہرگز عمل پیرا نہیں تھے۔ پردے والی سرکار کے دائیں بائیں کھڑے دو اہم مریدوں کو ہی دیکھ لیا جاتا تو ان کا وزن دو دو من کے قریب تھا۔ خود پردے والی سرکار بھی خوش خوراک ہی نظر آتی تھی۔

کورس میں ''لیڈ'' کرنے والی لڑکی کی آواز بہت سریلی تھی اور دل میں اترتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ اچانک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ تاجور نے بتایا تھا کہ ریشمی بڑی خاص آواز کی مالک ہے اور اس آواز نے ہی اس کی مشکلوں میں اضافہ بھی کیا ہوا ہے۔ کہیں یہ آواز ریشمی ہی کی تو نہیں تھی؟

میں نے یہ بات انیق کے کان میں کہی تو وہ بھی چونک گیا بولا۔ ''یہ ہو بھی سکتا ہے۔'' پھر اس نے قریب بیٹھے بابر سے پوچھا۔ ''بڑی پیاری آواز ہے۔''

بابر نے کہا۔ ''بالکل ایسا ہی ہے۔ اس آواز نے دھوم مچا دی ہے۔ کئی لوگ تو اس ''پاک بہن'' کی آواز کو سننے کے لیے ہی یہاں آجاتے ہیں۔''

''پاک بہن؟''

''ہاں، اس کو پاک بہن ہی کہا جاتا ہے۔ پردے والی سرکار کی خاص مریدنیوں میں سے ہے۔ کچھ عرصہ پہلے ہی یہاں آئی ہے لیکن سب ''پہلے پڑھنے والیوں'' کو پیچھے چھوڑ گئی ہے۔ بلھے شاہ، وارث شاہ اور ان جیسے کئی بزرگوں کے کلام پڑھے ہیں اس نے۔ خود بھی شعر بنا لیتی ہے۔ کل تو میں نے پاک بہن کی ایک کیسٹ بھی کرماں والا کے بازار میں دیکھی ہے۔

''پاک بہن کا کوئی نام بھی تو ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔
''نام کا تو پتا نہیں، لیکن سیالکوٹ سائیڈ کی رہنے والی ہے۔ شوہر کے ظلم اور زمانے کی سختیوں سے تنگ تھی، فقیری کی طرف آ گئی۔ سنا ہے کہ کچھ دن پہلے اس کا نشئی شوہر اس کا دعویدار بن کر یہاں آیا تھا۔ پردے والی سرکار نے اسے سمجھایا بجھایا اور ہدایت پر لانے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں مانا۔ بعد میں اس نے بڑے مرید کرنالی صاحب سے بدتمیزی کی تو عام لوگوں نے اسے مار پیٹ کر یہاں سے بھگا دیا۔''
اب بات واضح ہو رہی تھی۔ وہ جادو اثر آواز جو اس ملنگی ڈیرے کے در و دیوار میں گونج رہی تھی۔ یقیناً ریشمی ہی کی تھی۔ مجھے موسیقی اور نغمے وغیرہ سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا، مگر اس آواز میں یقیناً کوئی بات تھی۔ اس نے مجھے کشش کیا اور یہی دل گداز کشش تھی جو ہر کسی کو متاثر کر رہی تھی۔ مغربی دنیا میں تو موسیقی کے نام پر ایک طوفان بدتمیزی بپا ہوتا ہے، یہ آواز اس سے بہت اوپر کی چیز تھی۔
گیت ختم ہوا تو کافی دیر سناٹا چھایا رہا۔ اس کے بعد کچھ ملنگوں نے دھمال ڈالی اور اپنی بھونڈی آواز میں حق ہو کے نعرے بلند کیے۔ اس کے بعد لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے پردے والی سرکار نے مختصر خطاب کیا۔ اس کے لب و لہجے میں پنجابی جھلک نمایاں تھی تاہم وہ اردو بول رہا تھا۔ اس کی شکل بالکل اوجھل تھی۔ اس نے جو باتیں کہیں ان میں سے کئی ایک گیت میں بھی کہی جا چکی تھیں۔ اپنی آواز سے یہ کوئی درمیانی عمر کا سنجیدہ سا شخص لگتا تھا۔
تقریر کے بعد نیلے رنگ کی ایک طویل رسّی لائی گئی۔ اس میں سیکڑوں گرہیں بندھی ہوئی تھیں۔ یہ رسّی دو ٹکڑوں میں تھی۔ ہر ٹکڑے کی لمبائی سو فٹ کے قریب رہی ہوگی۔ ایک ٹکڑا عورتوں کی طرف پھیلا دیا گیا، دوسرا مردوں کی طرف۔ بے شمار بے تاب عقیدت مندوں نے رسی کے اس ٹکڑے کو پکڑ لیا۔ ٹکڑے کا دوسرا سرا ''پردے والی سرکار'' کے ہاتھ میں تھا۔ پردے والی سرکار نے کچھ پڑھا اور بار بار رسی کے ٹکڑے پر پھونکا۔
بابر نے بتایا۔ ''رسی کو تھامنے والے سب مریض ہیں، جو اپنا کوئی نہ کوئی روگ لے کر یہاں آئے ہیں۔ پردے والی سرکار کے ہاتھ میں جو شفا ہے، وہ اس نیلی رسی کے ذریعے روگیوں تک پہنچے گی اور ان کی مشکلیں آسان کرے گی۔''
انیق نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ''آپ بھی رسی تھام لیں، شاہ زیب بھائی۔''
''مجھے کیا روگ ہے؟''
''پریم روگ سے بڑا روگ کیا ہوگا۔'' اس نے بے باکی سے کہا لیکن جب میں نے مکا

تانا تو اس نے جلدی سے ہاتھ جوڑ دیئے۔
اگلے آدھ پون گھنٹے میں ہمیں یہاں ایسی کئی چیزیں دیکھنے کو ملیں جنہیں خرافات کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ میں نے کچھ ایسے ملنگ بھی دیکھے جو صورتوں سے ہی خطرناک نظر آتے تھے۔ انہوں نے جو کمبل یا پیوند لگی چادریں لپیٹ رکھی تھیں ان کے نیچے یقیناً آتشیں اسلحہ موجود تھا۔ ملنگی ڈیرے میں چبوترے کے پیچھے ممنوعہ علاقہ تھا جس کی طرف چغہ پوش مریدوں کو جانے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ میں اور انیق ایک گوشے میں بیٹھ کر تبرک کھانے کے ساتھ ساتھ باتیں کرنے لگے۔ میں نے کہا۔ ''انیق! میں نے تو ایک ہی نتیجہ نکالا ہے، اگر ہم ریشمی سے رابطہ کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے کسی عورت کی مدد درکار ہوگی۔''
''اور یہاں ایسی کون سی عورت ہے جو اپنی عاقبت خطرے میں ڈال کر آپ کی مدد کو تیار ہو جائے گی؟''
''لیکن مسئلہ ایک اور بھی ہے۔ بات صرف ریشمی سے ملنے ہی کی نہیں انیق، اُسے سمجھانے کی بھی ہے۔ وہ جس راہ پر چل نکلی ہے وہ آسانی سے اسے چھوڑے گی نہیں اور جب وہ خود ہی اپنے پنجرے سے نکلنے کو تیار نہیں ہوگی، ہم اسے کیسے نکال سکیں گے؟''
''اور ماں بے چاری رو رو کر مر جائے گی اس کی۔'' انیق نے کہا۔
''ایک بات سمجھ میں آتی ہے۔'' میں نے طویل سانس لے کر ٹھنڈی ٹھار پتھریلی دیوار سے ٹیک لگائی۔
''وہ کیا؟'' انیق ہمہ تن متوجہ ہو گیا۔
''تاجور اس کی قریب ترین سہیلی ہے اور یہ جتنی تاجور کی مانتی ہے اور کسی کی نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ تاجور اس کا ذہن بدلنے میں کامیاب ہو جائے۔''
انیق مسکرایا۔ ''آپ کی بات میں وزن ہے لیکن ایک اندیشہ بھی ہے۔ اگر الٹا ریشمی نے تاجور کا ذہن بدل دیا اور اس نے واپس جانے سے انکار کر دیا تو پھر آپ کیا کریں گے؟''
''پھر میں بھی اپنا ذہن بدل لوں گا۔ فقیری اختیار کر لوں گا اور چمٹا بجاؤں گا۔''
''اور میں ڈھولک پر تھاپ دوں گا۔ کیونکہ آپ کے ساتھ رہنے کے بعد اب میرا بھی داؤ دبھاؤ کے پاس واپس جانے کو جی نہیں چاہتا۔''
''مجھے تو لگتا ہے کہ مجھ سے زیادہ تمہارا دل حشمت پہلوان سے لگ گیا ہے۔''
''ویسے شاہ زیب بھائی...... یہ حشمت پہلوان ہے بڑے مزے کی چیز۔ ایسی باتیں کرتا ہے کہ ہنسنے کو دل چاہتا ہے اور ساتھ ساتھ رونے کو بھی۔ اردو کی ایسی ایسی ٹانگ توڑتا

ہے کہ محققین کی روحیں قبروں میں تڑپ اٹھتی ہوں گی۔ ہفتے کے روز مجھ سے کہنے لگا، میں تقریباً گوجرانوالہ جا رہا ہوں، منگل تلک واپسی ہووے گی۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''تقریباً کیا مطلب؟'' ارشاد فرمایا۔ کسی ''تقریب'' میں جانے کو ہم کہہ سکت ہیں کہ ہم تقریباً وہاں جا رہے ہیں۔ بعد میں یہ بحث شروع کر دی کہ ''نو سو چوہے کھا کے بلی حج کو چلی'' والا محاورہ انگریزوں نے بنایا تھا۔ اصل محاورہ یہ تھا...... نو سو چوہے کھا کے بلی خالق حقیقی کے پاس چلی...... اور اس قسم کے کئی ادبی شب خون انگریزوں نے مارے ہیں جن کا ہمیں آج تک پتا نہیں چلا۔ بنگال میں تو انہوں نے......''

میں نے کہا۔ ''انیق ڈیئر! مجھے لگتا ہے کہ ہم سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان کے دور میں چلے گئے ہیں۔ ہمیں پاس پاس ہی رہنا چاہیے۔ ہم تاجور کی بات کر رہے تھے۔ میرا دل کہہ رہا ہے کہ اگر ہم اسے کسی طرح یہاں لا سکیں اور اس سے کہیں کہ وہ ریشمی کو یہاں سے نکالنے کی کوشش کرے تو ہوسکتا ہے کہ ہم اسے واقعی نکال لیں۔''

انیق نے کہا۔ ''شاہ زیب بھائی، یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ وہ اس ملنگی ڈیرے کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر خود بھی بیزار ہو چکی ہو اور اسے سمجھانے بجھانے کی زیادہ ضرورت ہی پیش نہ آئے۔''

''خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ پہلوان حشمت کے پاس بیٹھ بیٹھ کر تمہاری عقل بھی گھاس چرنے جانے لگی ہے۔ ریشمی کے بیزار ہونے کا کوئی امکان یہاں نظر نہیں آیا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے اس کا بھجن نما گیت سنا ہے، کس قدر ڈوب کر گا رہی تھی۔ وہ یہاں کے ماحول میں پوری طرح کھپ چکی ہے۔ جوں جوں وقت گزرے گا، وہ اس راستے پر اور آگے نکلتی چلی جائے گی۔''

میری بات نے انیق کو خاموش کرا دیا۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ ''لیکن مسئلہ تو یہ ہے شاہ زیب بھائی کہ تاجور کو یہاں لایا کیسے جا سکتا ہے۔ دین محمد صاحب تو ہرگز ہرگز اس کی اجازت نہیں دیں گے۔''

''جب ''پیار'' اجازت لے کر نہیں کیا تو پھر کئی اور کام بھی اجازت کے بغیر کرنا پڑیں گے۔'' میں نے کہا۔

''واہ کیا قول زریں ہے۔ اس پر تو گانا بن سکتا ہے۔ پیار کیا ہے، اجازت کیوں لیں، پیار کیا ہے کوئی اندر تو نہیں آئے...... اجازت تو اندر آنے کے لیے لی جاتی ہے......''

O......❖......O

دو دن بعد میں اور انیق ایک بار پھر چاند گڑھی میں تھے۔ ایک بار پھر مجھے، تاجور کے ساتھ اس کے گھر کی چھت پر خفیہ ملاقات کرنا پڑی۔ اس مرتبہ یہ ملاقات مزید خطرناک تھی کیونکہ دین محمد صاحب بھی گھر میں ہی تھے۔ پچھلی دفعہ کی طرح میری مدھم دستک پر نوری نے باہر والا دروازہ کھول دیا اور میں سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر چلا آیا۔ تاجور قریباً آدھ گھنٹا تاخیر سے چھت پر پہنچی۔ وہ جلد از جلد جاننا چاہتی تھی کہ میں ریشمی کے بارے میں کیا خبر لایا ہوں۔ میں نے تفصیل سے اسے تمام رُوداد کہہ سنائی اور آخر میں کہا۔ ''ریشمی سے ملنے اور اسے واپسی پر آمادہ کرنے کا بس ایک ہی طریقہ سمجھ میں آتا ہے۔ تم ہمت کرو اور کرماں والا پہنچ کر اس سے ملو۔ یہ کام تمہارے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا۔ شاید ریشمی کی والدہ بھی ایسی کوشش میں ناکام رہے گی۔''

''مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے شاہ زیب! اباجی کبھی اجازت نہیں دیں گے۔ عید والے واقعے کے بعد تو اب وہ مجھے گھر سے بھی نہیں نکلنے دیتے......''

''لیکن اگر اسے زندہ درگور ہونے سے بچانا چاہتی ہو تو پھر کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا۔ ہم اسے وہاں سے نکالنے کی کوشش تب ہی کر سکتے ہیں جب وہ خود بھی آمادہ ہو گی۔''

اسی دوران میں پڑوس کے گھر سے کسی مرد کے گرجنے برسنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میرے اندازے کے مطابق یہ ریشمی کا باپ عبدالرزاق ہی تھا۔ وہ طیش کے عالم میں بیوی پر برس رہا تھا۔ اندھی ہو جائے گی۔ ٹھوکریں کھاتی پھرے گی۔ ہر وقت کا رونا دھونا نحس ہوتا ہے، سنبھال خود کو......''

میں نے تاجور سے پوچھا تو میرا اندازہ درست نکلا۔ یہ عبدالرزاق ہی تھا۔ میں نے کہا۔ ''تاجور! تم نے بتایا تھا کہ جوانی میں رزاق چاچا کوئی کھلاڑی وغیرہ رہا ہے؟''

''ہاں...... پچیس تیس سال پہلے یہ پسرور کے ہائی اسکول میں پڑھتے تھے تو وہاں ہاکی کھیلتے تھے پھر کھیل میں ان کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ غریبی کی وجہ سے صحیح علاج نہ ہو سکا۔ ٹانگ کاٹنا پڑی۔ پڑھائی وغیرہ بھی اسی وقت ختم ہو گئی تھی۔ یہاں تھوڑی سی زمین ہے، خود تو کاشت نہیں کر سکتے، کسی کو دی ہوئی ہے۔ دانے وغیرہ آ جاتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''تمہارے اباجی سے رزاق چاچا کی سلام دعا بھی ہو گی۔ کیا یہ کسی طرح تمہیں اجازت لے کر نہیں دے سکتے؟''

''سلام دعا تو بہت زیادہ ہے لیکن اجازت والا کام یہ نہیں کر سکیں گے۔'' تاجور کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ کچھ سوچ رہی تھی۔ میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ آوارہ لٹ کو

پیشانی سے ہٹا کر بولی۔ ''ایک کام کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے......''

''وہ کیا؟'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔

اس نے سرگوشیوں میں مجھے ایک پروگرام بتایا جس پر عمل کرنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ تاجور کی ایک پرانی سہیلی عافیہ صداقت ''کوٹلی'' میں رہتی تھی۔ وہ کافی عرصے سے تاجور سے کہہ رہی تھی کہ وہ اس کے پاس آئے۔ گرمیوں میں پروگرام بنا تھا کہ دین محمد اسے چھوڑ آئیں گے اور وہ چند دن وہاں رہے گی، لیکن پھر کسی وجہ سے یہ پروگرام رہ گیا۔ اب اگر تاجور کوشش کرتی تو دین محمد صاحب آمادہ ہو سکتے تھے۔ تاجور کی والدہ کی طبیعت آج کل بہتر تھی اور موسم بھی ٹھیک تھا۔ دوسرے یہ کہ دین محمد صاحب خود بھی چاہتے تھے کہ تاجور گاؤں کے بگڑے ہوئے حالات سے کچھ دن دور رہے۔

ٹھیک دو روز بعد تاجور اپنی سہیلی عافیہ کے پاس کوٹلی پہنچ گئی۔ ہم ایک روز پہلے ہی وہاں پہنچ چکے تھے اور ایک چھوٹے سے ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ حسبِ پروگرام رات کو سیل فون پر تاجور نے ہم سے رابطہ کیا۔ اس نے ایک اچھی اطلاع یہ دی کہ ملازمہ نوری بھی اس کے ساتھ ہی یہاں پہنچی ہے۔ اس نے کہا۔ ''لگتا ہے کہ قدرت بھی ہماری مدد کر رہی ہے۔ عافیہ کا شوہر صداقت بھائی دو دن پہلے کویت چلا گیا ہے۔ اب گھر میں عافیہ اور اس کی امی کے سوا اور کوئی نہیں۔''

''چاچا جی (دین محمد) واپس جا چکے ہیں؟''

''ہاں دوپہر کو ہی نکل گئے تھے۔ اب تو گاؤں پہنچنے والے ہوں گے۔''

میں نے کہا۔ ''اب کرماں والا جانے کا کیا پروگرام ہوگا؟''

''عافیہ کی امی یعنی ساس خدیجہ خاتون بڑی اچھی عورت ہیں۔ نماز روزے کی بڑی پابند ہیں۔ اپنی اپنی سوچ ہوتی ہے۔ خدیجہ خاتون ہر مہینے ایک دو دیگیں پکواتی ہیں اور ایک پاس کی خانقاہ میں بھیجتی ہیں۔ وہ خود بھی اللہ والوں کے مزاروں پر حاضری دیتی رہتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اگر میں اور عافیہ ان سے کرماں والا جانے کی اجازت مانگیں تو وہ ضرور دے دیں گی۔''

''ٹھیک ہے۔''

''اور اصل بات یہ ہے کہ وہ اس بارے میں ابا جی کو بتائیں گی بھی نہیں۔ میرا مطلب ہے کہ میں اور عافیہ ان سے کہہ دیں گے کہ جب ابا جی مجھے لینے آئیں تو وہ ہمارے کرماں والا جانے کا بالکل ذکر نہ کریں۔''

''لیکن ایک بات ذہن میں رکھو۔ ہمیں کرماں والا میں تین چار دن لگ سکتے ہیں۔''

"ٹھیک ہے، میں دیکھتی ہوں کہ کس طرح پروگرام بنانا ہے۔"

اگلے روز دوپہر کو ہم کوٹلی کے بس اڈے پر ملے۔ تاجور کالے برقع میں تھی۔ پروگرام میں تھوڑی سی تبدیلی یہ ہوئی تھی کہ عافیہ کے بجائے تاجور کے ساتھ نوری تھی۔ نوری بھی سرتاپا ایک چادر میں تھی اور بس اس کی آنکھیں ہی دکھائی دیتی تھیں۔ عافیہ اپنی "امی ساس" کے پاس گھر میں ہی رہی تھی۔

دیہاتی علاقے کی خستہ حال بسوں میں سفر کر کے مجھے بڑا مزہ آیا تھا۔ ایک اور ہی طرح کی زندگی دیکھنے کو مل رہی تھی اور اب تو سونے پر سہاگے والی بات تھی۔ تاجور بھی اس سفر میں میرے ساتھ شریک تھی۔ وہ اور نوری ہم سے اگلی نشست پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ اس بس میں کئی ایسے مرد و زن موجود تھے جو "پردے والی سرکار" کے آستانے پر حاضری کے لیے جارہے تھے۔ اپنے اپنے روگ اور اپنی اپنی مرادیں لے کر۔ ایک انیس بیس سالہ دیہاتی نوجوان کو جگر کا کینسر تھا۔ اس بے چارے کو اس وقت کسی اچھے اسپتال میں ہونا چاہیے تھا لیکن وہ جھاڑ پھونک کے لیے ملنگی ڈیرے کا رخ کر رہا تھا۔ اس نوجوان کے قریب ہی ایک ادھیڑ عمر شخص گرم چادر میں اپنا منہ سر لپیٹے بیٹھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ شاید اسے کوئی متعدی بیماری ہے لیکن دو گھنٹے بعد یہ خیال بالکل غلط ثابت ہوا اور اس شخص کے حوالے سے ہم پر ایک ایسا انکشاف ہوا جس نے ہمیں بہت پریشان کر دیا۔

سخت ناہموار سفر کے بعد ایک جگہ بس رک گئی۔ اب اس سے آگے ہمیں پیدل یا پھر کرائے کی جیپ پر سفر کرنا تھا۔ بس سے اترتے ہوئے تاجور کو مشکل پیش آرہی تھی۔ اس طرح کا برقع اس نے کبھی پہنا نہیں تھا۔ میں نے اسے سہارا دے کر نیچے اتارا...... اسے چھونا میرے لیے ہر بار ہی بڑا سنسنی خیز ثابت ہوتا تھا۔ میں، انیق اور نوری، تاجور سمیت ان درختوں کی جانب چل دیئے جہاں ایک بڑے سائز کی کھٹارا جیپ کھڑی تھی۔

اچانک تاجور ٹھٹک کر رک گئی۔ وہ مڑ کر پیچھے دیکھ رہی تھی۔ "کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ......کون ہے؟" اس نے ڈری سی آواز میں کہا اور انگلی سے ایک طرف اشارہ کیا۔

بس کی آخری دو تین سواریوں کے ساتھ ایک شخص نیچے اترا تھا اور اب لنگڑاتا ہوا سا ایک پتھر کے پیچھے اوجھل ہو رہا تھا۔ "کیا بات ہے، تم پریشان ہو گئی ہو؟" میں نے تاجور سے کہا۔

"مجھے شک ہو رہا ہے۔" وہ گھبرائی ہوئی سی آواز میں بولی۔ "مم...... مجھے لگ رہا ہے کہ شاید کچھ ٹھیک نہیں ہو رہا۔"

''کیا مطلب؟''

''کہیں...... یہ چاچا رزاق تو نہیں۔ میرا مطلب ہے ریشمی کے ابا جی؟''

اس مرتبہ نوری بھی کچھ چونکی ہوئی نظر آئی۔ بے ساختہ بولی۔ ''مجھے بھی کچھ شک لگ رہا ہے۔''

تاجور اور نوری کو وہیں چھوڑ کر میں اور انیق تیزی سے پتھر کی اوٹ میں پہنچے۔ وہ شخص اب درختوں کے ایک جھنڈ کے پاس کھڑا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ واضح طور پر ٹھٹکا اور درختوں میں گھس گیا۔ میں نے پہچان لیا یہ وہی بندہ تھا جو بس میں منہ سر لپیٹ کر بیٹھا ہوا تھا۔ میں اور انیق درختوں میں گھسے۔ وہ کسی لکڑی کے سہارے لنگڑاتا ہوا نشیب میں اتر رہا تھا۔ شاید تاجور نے ٹھیک ہی اندازہ لگایا تھا، یہ شخص کسی چکر میں تھا۔ ہم نے اس کے پاس پہنچ کر اس کا راستہ روک لیا۔ ''کیا بات ہے؟'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

چادر کا پلو ابھی تک اس کے چہرے پر تھا۔ وہ جس لکڑی کے سہارے چل رہا تھا وہ دراصل ایک ہاکی تھی۔ چاند گڑھی میں تاجور نے مجھے بتایا تھا کہ چاچا رزاق اپنے لڑکپن کے زمانے میں پسرور قصبے کے ہائی اسکول میں پڑھتے تھے اور ہاکی کھیلتے تھے۔ اسی کھیل میں زخمی ہونے کے بعد انہیں اپنی ایک ٹانگ سے محروم ہونا پڑا تھا۔

میں نے کہا۔ ''خود کو چھپانے سے کوئی فائدہ نہیں چاچا رزاق، ہم نے تمہیں پہچان لیا ہے۔''

وہ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئے۔ اسی دوران میں تاجور اور نوری بھی موقع پر پہنچ گئیں۔ اب تاجور نے بھی تصدیق کر لی تھی کہ یہ چاچا رزاق ہی ہیں۔ وہ ڈری ہوئی نظر آ رہی تھی۔ انیق نے کہا۔ ''چاچا! لگتا ہے کہ تم چاند گڑھی ہی سے پیچھا کرتے ہوئے یہاں پہنچے ہو۔ اس کا کیا مطلب ہے؟''

''مم...... میں نے کسی کا پیچھا نہیں کیا۔ میں تو...... مزار پر حاضر کے لیے...... جا رہا ہوں۔''

''اگر ایسی بات تھی تو ہم سے منہ چھپا کر کیوں بیٹھے تھے اور اب ہمیں دیکھ کر بھاگنے کی کیا ضرورت تھی؟'' انیق نے کہا۔

''بب...... بس، ویسے ہی۔ میں اکیلا رہنا چاہتا تھا۔ میں نے تمہیں بس میں دیکھا، اس لیے پچھلی سیٹوں پر جا کر بیٹھ گیا۔''

صاف ظاہر تھا کہ چاچا رزاق صاف گوئی سے کام نہیں لے رہے۔

میں نے کہا۔ ”چاچا جی! جو کچھ بھی ہے، اب تو پتا چل ہی گیا ہے اس لیے آپ ہمارے ساتھ چلیں۔“

چاچا رزاق کے چہرے پر شدید تذبذب دکھائی دیا۔ بہر حال جب تاجور نے بھی کہا تو وہ ہمارے ساتھ چلنے کو رضامند ہو گئے۔ مجھے شک گزر رہا تھا کہ پچھلے دو تین دن میں چاچا رزاق کی ملاقات اپنے چرسی داماد پرویز عرف پیجا سے ہو چکی ہے اور اسی سے چاچا کو ملنگی ڈیرے کے بارے میں معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ وہ چاند گڑھی سے ملنگی ڈیرے کے لیے روانہ ہوئے تھے اور اتفاقاً کوٹلی سے آگے اسی بس میں سوار ہو گئے جس میں ہم سفر کر رہے تھے۔

ہم نے آگے کا سفر پیدل کرنے کا پروگرام بنایا تھا لیکن اب چونکہ ہمارے ساتھ چاچا رزاق بھی تھے اور وہ اپنی لکڑی کی ٹانگ کے ساتھ آسانی سے سفر نہیں کر سکتے تھے اس لیے ہم نے ایک سالم جیپ کرا لی۔ ویسے بھی سردیوں کی شام تیزی سے ٹھٹھری ہوئی دھوپ پر جھپٹ رہی تھی اس لیے جیپ کا سفر مناسب تھا۔

سورج مغربی چوٹیوں میں اوجھل ہو چکا تھا جب ہم کرماں والا گاؤں پہنچ گئے۔ راستے میں چاچا رزاق سے کسی طرح کی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ جیپ ڈرائیور مقامی شخص تھا اور اس کی موجودگی میں کسی طرح کی بات مناسب بھی نہیں تھی۔ وہ ملنگی ڈیرے والوں کا مخبر ہو سکتا تھا۔ بس انیق نے ایک دفعہ میرے کان میں سرگوشی کی تھی۔ اس نے وہی کہا تھا جس کا اندیشہ ہم سب کے ذہن میں موجود تھا۔ وہ بولا۔ ”چاند گڑھی والوں کے لیے آپ گونگے ہیں لیکن آج کم از کم چاچا رزاق کو تو پتا چل ہی گیا ہے کہ آپ بول سکتے ہیں اور تاجور کے ساتھ تو فرفر بول سکتے ہیں۔“

”ہاں، یہ مسئلہ تو بالکل ہو گیا ہے۔“

”فلموں میں تو ایسے کردار کو قتل کر دیا جاتا ہے کہ راز کھلنے نہ پائے۔ اب چاچا جیسے نیک اور مصیبت زدہ بندے کو قتل کرنے کی ہمت کم از کم مجھ میں تو نہیں۔ ویسے بھی میں نے اپنا کوٹا مقرر کیا ہوا ہے۔ ایک مہینے میں پچیس افراد سے زیادہ موت کے گھاٹ نہیں اتارتا اور پچیس ہو چکے ہیں۔“

”میں بھی ایسا ہی کرتا ہوں لیکن میرے ابھی چوبیس ہوئے ہیں، تم بے کار کی بک بک بند کر دو تو اچھا ہے۔“

کرماں والا گاؤں میں دیئے روشن ہو گئے تھے۔ بازار میں بھی جگہ جگہ گیس لیمپس اور

لالٹینیں دکھائی دے رہی تھیں۔اوپر ملنگی ڈیرے تک جانے والے طویل راستے پر بھی کہیں کہیں متحرک روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ہم نے مسافر سرائے میں دو کمرے حاصل کرنا چاہے لیکن ایک ہی ملا۔اس میں دونوں خواتین یعنی تاجور اور نوری کو ٹھہرا دیا گیا۔میں، انیق اور چاچا رزاق ایک ہال کمرے میں دیگر زائرین کے ساتھ ٹھہر گئے۔گوشت آلو اور تندوری روٹی کے ساتھ رات کا کھانا نمٹانے کے بعد، ہم نے قہوے کی پیالیاں پکڑیں اور لحاف لپیٹ کر بیٹھ گئے۔سب سے پہلے تو چاچا رزاق نے مجھ سے وہی سوال کیا جس کی میں توقع کر رہا تھا۔ وہ بولے۔"بس میں، میں نے تم چاروں کو دیکھا تو حیران ہوا۔پر اس سے کہیں زیادہ حیرانی اس وقت ہوئی جب میں نے تم کو باتیں کرتے سنا...... یہ سب کیا ہے شاہ زیب! اگر تم بول سکتے ہو تو پھر گاؤں میں گونگا بن کر رہنے کی کیا ضرورت تھی۔تم نے...... دین محمد جیسے نیک بھلے مانس بندے کو بھی دھوکے میں رکھا ہے؟"

میں نے کہا۔"چاچا جی! میں اس سارے معاملے میں شرمندہ ہوں لیکن یہ کسی بری نیت سے نہیں تھا۔اس کے پیچھے ایک مجبوری تھی۔میں بہت جلد آپ کو اس بارے میں بتاؤں گا اور آپ مانیں گے۔"

کچھ دیر اس بارے میں بات ہوئی پھر موضوع بدل گیا۔میں نے کہا۔"چاچا جی! کیا آپ واقعی اتفاق سے یہاں کرماں والا گاؤں کی طرف نکل آئے ہیں۔"

"اور یہی بات، میں تم چاروں سے بھی پوچھ سکتا ہوں؟"

میں نے گہری سانس لی۔"چاچا جی! میرا خیال ہے کہ اب ہمیں ایک دوسرے سے کچھ چھپانا نہیں چاہیے۔اصل بات مان لینی چاہیے جس طرح آپ کی ملاقات پرویز سے ہوگئی ہے، اسی طرح ہماری بھی ہو چکی ہے۔"

چاچا رزاق کی آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔وہ میری طرف دیکھ کر بولے۔"اگر تم یہاں میری دھی رانی کی خاطر آئے ہو، تو یہ میرے لیے بڑی امید والی بات ہے۔میں تمہاری بڑی قدر کرتا ہوں تم نے پنڈ میں جس طرح دین محمد کے بچے کو کنوئیں میں سے نکالا، وہ بڑا ہمت اور دلیری والا کام تھا اور اس سے پہلے جس طرح تم نے سیالکوٹی کے حلے کے وقت تاجور کی جان بچائی، وہ بھی کوئی بھولنے والی بات نہیں۔اللہ کرے کہ تمہارے یہ ہمت اور دلیری میری کرماں ماری دھی کے کام بھی آسکے۔" چاچے رزاق کی آواز بھرا گئی اور وہ اپنی گرم چادر کے پلو سے آنکھیں پونچھنے لگے۔

"آپ سے پرویز کی ملاقات کب ہوئی؟" میں نے پوچھا۔

''تین دن پہلے، چاند گڑھی میں۔ وہ نشے میں تھا۔ چوٹیں بھی لگی ہوئی تھیں۔ پتا نہیں کیا کیا بک رہا تھا۔ یہاں کے ملنگوں کو گالیاں دے رہا تھا اور ساتھ ساتھ ہمیں بھی......اب تو یہ منڈا حد سے گزر گیا ہے۔ وہ کرماں ماری صرف اور صرف اس کے کرتوتوں کی وجہ سے دنیا سے منہ موڑ کر ان ملنگوں میں جا بیٹھی ہے۔''

''آپ حوصلہ کرو چاچا، اگر تمہاری بیٹی واقعی اس ملنگی ڈیرے پر ہے تو پھر ہم اسے ان شاء اللہ یہاں سے لے کے جائیں گے۔''

''تمہاری ملاقات پیجا سے کہاں ہوئی تھی؟'' چاچا رزاق نے آنسو پونچھ کر کہا۔

''یہاں سے کافی پیچھے۔ نوگزے کی قبر کے نام سے کوئی آستانہ ہے۔ وہاں چرس کے نشے میں بے ہوش پڑا تھا۔'' میں نے جواب دیا۔

''کیا کہتا تھا؟''

''وہی کچھ جو آپ سے کہہ رہا تھا۔ لگتا ہے کہ اس نے اپنے طور پر ریشمی کو واپس لے جانے کی کوشش کی، ملنگوں نے اسے ڈرا دھمکا کر اور مار پیٹ کر بھگا دیا۔''

''کیا یہ ملنگ ہمارے ساتھ بھی یہی کریں گے؟'' چاچا رزاق نے ڈرے ڈرے لہجے میں پوچھا۔

''وہ کیا کریں گے، یہ تو بعد کی بات ہے۔ پہلا کام تو یہ ہے کہ ریشمی سے کسی کا رابطہ ہو اور اس کی مرضی کا پتا چلے، ہم اسی لیے حیلے بہانے سے دین محمد صاحب کی بیٹی تاجور بی بی کو یہاں لے کر آئے ہیں۔''

چاچا رزاق کی آنکھوں میں دبا دبا جوش نظر آیا، بولے۔ ''تم لوگوں نے یہ بڑا سمجھ والا کام کیا ہے۔ میں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ اگر کوئی ریشمی کا ذہن بدل کر اسے یہاں سے نکال سکتا ہے تو وہ صرف تاجور ہے......لیکن ریشمی کا پتا کیسے چلے گا کہ وہ ڈیرے پر کس جگہ ہے اور ان دونوں کی ملاقات کیسے ہو گی؟''

''یہ سب کچھ ہم نے سوچ لیا ہے چاچا جی، آپ فکر مند نہ ہوں۔'' انیق نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''بس ہم کو آپ سے ایک ہی درخواست کرنی ہے۔''

''کہو پتر، مجھے حکم دو۔''

''نہیں جی، آپ ہمارے بڑے ہیں، آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں، آپ کی بیٹی کے لیے کر رہے ہیں جو ہمارے لیے بہن کی طرح ہے۔ اس کے بدلے ہماری بس ایک ہی درخواست ہے۔ یہاں آپ نے جو کچھ دیکھا ہے اسے صرف اور صرف

اپنے تک رکھیں۔''

چاچا رزاق نے بلاتوقف کہا۔''میں اس کے لیے بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔تم مجھ سے جس طرح کا وعدہ چاہو لے سکتے ہو۔بس میری بھی ایک ہی آرزو ہے بلکہ شاید یہ زندگی کی آخری آرزو ہے کہ میں اپنی ریشمی کو پھر سے ہنستا کھیلتا ہوا دیکھ سکوں۔''

''بالکل ایسا ہی ہوگا۔'' میں نے کہا۔میں کچھ مزید بھی کہنا چاہتا تھا مگر خاموش ہوگیا۔ سرائے کا ایک ملازم چھوٹی سی ٹرے لیے ہمارے آس پاس گھوم رہا تھا۔کوئی بڑی بات نہیں تھی کہ وہ نئے آنے والوں پر نگاہ رکھے ہوئے ہو۔

باہر بارش ہونے لگی تھی، سردی میں اضافہ ہوگیا تھا۔ چوٹیوں پر بجلی چمک رہی تھی۔ ڈھلوانوں پر پانی گرنے کا شور تھا۔ برسات کی اس رات میں ساتھ والے کمرے میں تاجور موجود تھی۔ جی چاہا کہ اس کا ہاتھ پکڑ کر نکلوں اور بارش میں بھیگتے ہوئے اس جنگل میں گم ہو جاؤں۔ایک پہاڑ کی چوٹی پر وہی تنہا خوب صورت مکان میری نگاہِ تصور میں اتر آیا جو میں نے کھٹارا بس میں سفر کرتے ہوئے دیکھا تھا۔وہ مکان ہو، یہ موسم ہو اور تاجور ہو، پھر آخری سانس تک زندگی سے کوئی شکوہ نہ رہے۔

میری نظر اس ہاکی پر پڑی جس کے سہارے چاچا رزاق چلتے تھے۔یہ ہاکی چاچا نے سرائے کی چوبی دیوار کے ساتھ کھڑی ہوئی تھی۔کافی پرانی لیکن مضبوط ہاکی تھی۔ میں نے چاچا سے پوچھا۔''آپ اسکول کے زمانے میں کھیلتے رہے ہیں؟''

''صرف کھیلتا ہی نہیں رہا، بہت اچھا کھیلتا رہا ہوں۔ میں گول کیپر تھا اور اپنی ٹیم کا کپتان بھی تھا۔ ماسٹر اشفاق کہا کرتے تھے......تُو بہت اوپر جائے گا رزاقے...... مجھے بھی ایسے ہی لگا کرتا تھا۔بے شک میرا تعلق ایک چھوٹے سے قصبے سے تھا مگر ارادے چھوٹے نہیں تھے۔میں گوجرانوالہ اور پھر لاہور تک جانا چاہتا تھا مگر پھر ایک دن سب کچھ چکنا چُور ہوگیا۔ ایک میچ میں میری ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔اُس زمانے میں آج جیسے علاج کی سہولتیں کہاں تھیں، مجھے علاج کے لیے کسی بڑے شہر میں بھیجا جانا چاہیے تھا لیکن جنہوں نے بھیجنا تھا، انہوں نے غفلت کی۔میں گاؤں میں ایک ہڈی جوڑنے والے اسے برا بھلا علاج کراتا رہا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک دن لاہور کے میو اسپتال میں میری ٹانگ کاٹ دی گئی۔''

چاچا رزاق جیسے ماضی کے ان تلخ روز و شب میں کھو سے گئے تھے،ان کے چہرے پر دکھ کی پرچھائیاں کچھ اور گہری ہوگئیں۔چھوٹی جگہ کا ایک بڑا کھلاڑی پرواز سے پہلے ہی اپنے پر کٹوا بیٹھا تھا اور اب ایک کمزور اپاہج شخص کی حیثیت سے اپنی زندگی کے دن پورے کررہا تھا۔

سخت سردی کی وجہ سے بوڑھے چاچا رزاق کی معذور ٹانگ میں رات بھر درد ہوتا رہا۔ صبح وہ تو اوپر ملنگی ڈیرے پر نہ جا سکے۔ تاہم میں انیق، تاجور اوپر چل گئے۔ نوری، چاچا رزاق کی دیکھ بھال کے لیے نیچے ہی رہی۔ ملنگی ڈیرے پر وہی چند دن پہلے والی گہما گہمی تھی۔ حلوے مانڈے کی خوشبو، گھنگھروؤں کی چھن چھن، چمٹے بجاتے اور رقص کرتے ہوئے مست حال ملنگ۔ تاجور خواتین والے حصے کی طرف چلی گئی۔ میں اور انیق اِدھر اُدھر گھومتے رہے اور جائزہ لیتے رہے۔ گہری لال آنکھوں والے دو ہٹے کٹے ملنگ مین دروازے کے قریب ٹہل رہے تھے۔ اب میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ ان کے پیوند لگے کمبلوں کے نیچے آتشیں اسلحہ موجود ہے۔

تاجور کی واپسی قریباً دو گھنٹے بعد ہوئی۔ وہ سیاہ برقع میں تھی۔ بس اس کی پیشانی اور آنکھیں ہی نظر آتی تھیں۔ بالکل جیسے سیاہ بادل میں سے چاند کا ایک تابندہ حصہ چمک رہا ہو۔ انیق لنگر حاصل کرنے کے لیے ایک قطار میں کھڑا تھا۔ وہ سیدھی میری طرف آئی۔ وہ اندر سے جو تبرک لے کر آئی تھی، وہ کھیر کی شکل میں تھا اور مٹی کی چھوٹی تھالی میں تھا جسے ٹھوٹھی کہا جاتا ہے۔ ایسی ہی ایک ٹھوٹھی میرے ہاتھ میں بھی تھی۔ ہم دونوں وہیں پتھر کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر کھانے لگے۔

تاجور کی آنکھوں میں دبا دبا جوش نظر آ رہا تھا۔ میں نے سرگوشی میں پوچھا۔ ”کچھ کامیابی ہوئی؟“

”بالکل ہوئی...... میں ریشمی سے مل کر آ رہی ہوں۔ ہم نے باتیں کی ہیں، وہ تو حیران ہو گئی مجھے دیکھ کر۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔“

”وہ ٹھیک تو ہے؟“

”ہاں، لیکن پہلے سے بڑی کمزور ہو گئی ہوئی ہے۔ رنگ بھی سانولا ہو گیا ہے۔ بالکل گم صم سی لگتی ہے۔ باتیں کسی اور سے کر رہی ہوتی ہے دھیان کہیں اور ہوتا ہے۔“

”تم نے کیا بتایا اسے کہ کیسے آئی ہو؟“

”میں نے صاف کہہ دیا ہے کہ میں اس سے ملنے اور اسے لینے کے لیے یہاں آئی ہوں۔ اس کے اباجی بھی ساتھ ہیں۔ یہ سن کر اس کا رنگ پیلا پڑ گیا، کہنے لگی...... اب یہ نہیں ہو سکتا تاجور، اب میرا جینا مرنا یہاں پر ہی ہے۔ میں سارے ورقے پھاڑ کر یہاں آئی ہوں...... میں نے اس بارے میں زیادہ بحث نہیں کی۔ ابھی اس کو بس بات چیت میں رواں کیا ہے...... اور ہاں...... آپ کا اندازہ درست تھا۔ مزار کے سامنے عورتیں مل کر جو شعر گاتی ہیں ان میں

اکیلی آواز ریشمی کی ہی ہوتی ہے، اس کی آواز کی یہاں بڑی قدر کی جارہی ہے۔"

سرخ آنکھوں والا ایک مجاور ہمیں گھورتا ہوا ہمارے پاس سے گزرا۔ تاجور تھوڑا اگڑ بڑا گئی۔ میں نے کہا۔"خود کو نارمل رکھو۔ جیسے ہم...... میاں بیوی ہوں...... سلام کے لیے آئے ہوں۔"

"سلام کے لیے تو ٹھیک ہے، لیکن یہ دوسری بات ٹھیک نہیں۔" وہ لمبی سانس لے کر بولی۔

"بھئی، فرض کررہے ہیں ہم...... فرض کررہے ہیں کہ میاں بیوی ہیں، فرض کررہے ہیں کہ ابھی تک ہماری کوئی اولاد نہیں ہوئی...... فرض کررہے ہیں کہ میری والدہ یعنی تمہاری ساس، پوتے پوتی کے لیے بہت بے چین ہیں......"

"تو پھر آپ یہ بھی فرض کرلیں کہ میں نے آپ کو دھکا دیا ہے اور آپ سیڑھیوں سے لڑھکتے ہوئے نیچے گرے ہیں۔" وہ ذرا مسکرا کر بولی۔

"نہیں، یہ فرض نہیں کیا جاسکتا۔ یہ مزار ہے۔ ایسی جگہوں پر ایسی نازیبا باتیں فرض نہیں کرتے، یہاں پر دعا وغیرہ مانگتے ہیں۔"

"دعا بھی مانگی ہے کہ ہم جس مقصد کے لیے آئے ہیں، وہ اللہ کی مدد سے پورا ہو۔"

"اور میں جس مقصد کے لیے آیا ہوں؟"

"کیا مطلب؟"

"بھئی، میں تو تمہارے لیے آیا ہوں نا، تمہاری خاطر...... ایک آدھ بول میرے لیے بھی کہہ دینا تھا۔"

"آپ کے لیے ہدایت کی دعا مانگی ہے......"

"ماشاءاللہ...... اور اپنے لیے؟"

"اپنے لیے آسانی کی۔"

"کس بات کی آسانی؟"

"جس الجھن اور مشکل میں آپ نے مجھے ڈال دیا ہے، اس میں سے نکلنے کی آسانی۔"

"تم محبت کو مشکل کہہ رہی ہو؟"

"سیانے کہتے ہیں کہ اس سے بڑی مشکل کوئی اور ہے ہی نہیں۔" اس نے ٹھنڈی سانس لی پھر ایک دم سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔"شاہ زیب! ریشمی سے مل کر خوشی بھی ہوئی ہے اور پریشانی بھی بڑھی ہے۔ وہ یہاں کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ سمجھ میں نہیں آرہا کہ وہ

ہماری بات مانے گی بھی یا نہیں...... میرے خیال میں اس کا سب سے بڑا خوف اس کا شوہر پیجا ہی ہے۔اس خبیث کی وجہ سے وہ یہاں ہے۔''

''تو اسے پکڑوا دیتے ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''وہ بیوی پر ظلم توڑتا رہا ہے۔اسے گانے اور پیشہ کرنے پر مجبور کرتا رہا ہے۔اس کے خلاف بڑا مضبوط کیس بن سکتا ہے۔تین چار سال کے لیے آرام سے جیل میں چلا جائے گا۔ لاہور میں میرا ایک خالہ زاد کافی بڑا ایڈووکیٹ ہے۔وہ یہ کام آسانی سے کر لے گا۔''

''لیکن اس کا خوف تو پھر بھی ریشمی کے سر پر سوار رہے گا نا۔''

اسی دوران میں انیق لنگر کے چاول لے کر ہماری طرف آ گیا اور ہم خاموش ہو گئے۔ انیق نے بتایا وہ لنگر خانے کے پچھواڑے ملنگوں نے ایک لڑکے کو بری طرح مارا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ وہ درخت پر چڑھ کر عورتوں والے حصے میں جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

رات کو مسافر خانے میں ایک سریلے گیت کی مدھم آواز سنائی دی۔یہ آواز تقریباً ایک فرلانگ اوپر ملنگی ڈیرے میں سے آ رہی تھی۔مجھے یہ جاننے میں دیر نہیں لگی کہ یہ ریشمی ہی کی آواز ہے۔سرائے میں لیٹے ہوئے کئی افراد اٹھ کر بیٹھ گئے اور بڑے دھیان اور احترام سے یہ آواز سننے لگے۔شعر سمجھ میں نہیں آ رہے تھے لیکن یہ کوئی مناجات قسم کی چیز تھی۔کچھ دیر بعد آواز تھم گئی اور پہاڑی سناٹے نے اس ٹھٹھری ہوئی شب کو پوری طرح ڈھانپ لیا۔

انیق تلی ہوئی مچھلی کھا کر سو گیا تھا۔میں اٹھا اور سرائے سے باہر آ گیا۔میں نے سیل فون پر لاہور میں داؤد بھاؤ سے رابطے کی کوشش کی اور کامیاب رہا۔سگنل کمزور تھے۔میں کچھ اور آگے نکل گیا اور ایک پہاڑی پر کھڑے ہو کر تفصیلی بات کی۔داؤد بھاؤ اپنے اسی زیرزمین ٹھکانے پر تھا جس کے اوپر ایک ہائی فائی اسنوکر کلب کی سرگرمیاں جاری رہتی تھیں۔مجھ سے بات کر کے داؤد بھاؤ خوش ہو گیا۔''کیسا چل رہا ہے؟'' اس نے اپنے مخصوص پاٹ دار لہجے میں پوچھا۔

میں نے کہا۔''سب ٹھیک ہے اور سب سے پہلے تو آپ کے پٹھے کے لیے آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں بھاؤ، انیق میری توقع سے بڑھ کر میری مدد کر رہا ہے۔بڑا اسچل پیس عنایت فرمایا ہے آپ نے۔''

''تم خود بھی تو سچل ہو۔تمہارے جانے کے بعد بھی یہاں کلب میں تمہارے چرچے ہیں......اور تو اور لودھی جیسا کھر دماغ باکسر بھی تمہاری تعریف کرنے پر مجبور ہے۔''

میں نے سنا پس منظر میں تماشائیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ شاید RING میں اب بھی کوئی باکسنگ مقابلہ جاری تھا۔ میں نے کہا۔ ''داؤد بھاؤ! اس وقت آپ کو ایک ضروری کام کے لیے فون کیا ہے۔''

''میرے خیال میں اس لڑکی کے سلسلے میں ہوگا جو ٹھاہ کر کے تمہارے دل کو لگی ہوئی ہے۔ اگر سیدھی طرح ہاتھ نہیں آ رہی تو بتاؤ...... ایک سو ایک دوسرے طریقے بھی ہیں۔''

''یہی کام تو کرنا نہیں ہے۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''تو پھر؟''

''بس ایک بندے کو پھڑکانا ہے...... جو اس بے چاری کی زندگی کا دشمن بنا ہوا ہے۔''

''نام بتاؤ اس کا...... اور بتاؤ رہتا کہاں ہے؟''

''نام ہے پرویز عرف پیجا اور ملے گا چاندنی کلب میں۔ وہاں اس کی بیوی گانا وغیرہ گاتی رہی ہے۔''

''نو پرابلم...... ہو جائے گا...... کہو تو آج رات ہی ہو جائے گا...... لیکن صرف پھڑکانا ہے یا تڑپانا بھی ہے۔''

''نہیں صرف پھڑکا دیں...... ڈیڈ باڈی بے شک کسی سڑک پر پھینک دیں۔ تصویر خود بخود ہی اخبار میں آ جائے گی۔''

''کوئی مزہ نہیں آیا۔'' داؤد بھاؤ بولا۔ ''تمہارا فون آیا تھا تو میں سمجھا تھا کہ کوئی بڑا کام ہوگا۔''

''بڑا کام بھی آنے والا ہے داؤد بھاؤ۔ پتا چلا ہے کہ لالہ وریام مجھے ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔ اپنے بھائی کی موت اسے ابھی تک ہضم نہیں ہوئی۔''

''موت بھی ہضم نہیں ہوئی اور اس کی موت سے کوئی سبق بھی نہیں سیکھا اس نے...... انیق نے بتایا تھا کہ آج کل وہ سیالکوٹ کے علاقے میں کہیں پایا جا رہا ہے اور وہاں بھی زمین پر کلے گاڑ کر کاشت کاروں کی بددعائیں لینے کا پروگرام بنا رہا ہے۔''

''بالکل ایسا ہی ہے داؤد بھاؤ، کچھ دیہات خالی کرانے کے لیے اس نے ایک ڈکیت سیالکوٹی کی مدد بھی لے رکھی ہے۔ سیالکوٹی اپنے گینگ کے ساتھ ان دیہات کے لوگوں کو مسلسل خوف زدہ کر رہا ہے۔ بہت سے لوگ نقل مکانی کر رہے ہیں...... یعنی مائیگریشن۔ اور ایک بات کا پتا مجھے اچھی طرح چل چکا ہے بھاؤ، یہ شکیل داراب بھی ان لوگوں میں سے نہیں جو آسانی سے ہار مان لیتے ہیں۔ یہ اندر خانے ضرور بہت برا سوچ رہا ہوگا۔ مجھے ولید اور چاچا

حفیظ کی طرف سے فکر رہتی ہے۔''
اچانک شور شرابا سنائی دینے لگا۔ شراب کی بوتلیں اور گلاس ٹوٹنے کی آوازیں آئیں۔ پھر کوئی لڑکی سریلے انداز میں چلائی۔ یقیناً یہ پکی عمر کے داؤد بھاؤ کی سترہ اٹھارہ سالہ رکھیل روبی ہی رہی ہوگی۔ ''کیا ہوا داؤد بھاؤ؟'' میں نے پوچھا۔
''کچھ نہیں یار، لودھی ایک لڑکے سے جھگڑ پڑا ہے۔ میں دیکھتا ہوں۔'' اس نے اطمینان سے کہا پھر بولا۔ ''باقی تمہارا کام ہو جائے گا...... آج ہی رات ہو جائے گا۔ تصویر بھی چھپ جائے گی...... اوکے؟''
''تھینک یو۔'' میں نے کہا۔
سلسلہ منقطع ہو گیا۔ کام ہو جانے کی بات داؤد بھاؤ نے یوں کی تھی جیسے میں نے اسے بندہ مارنے کے لیے نہ کہا ہو۔ پانی یا بجلی کا بل ٹھیک کرانے کے لیے کہا ہو۔ مجھے یقین تھا کہ ویسا ہی ہوگا جیسا اس نے کہا ہے۔
ریشمی کے شوہر پیجا کو میں نے بیس چوبیس گھنٹے میں ہی پہچان لیا تھا۔ وہ پرلے درجے کا کرخت مزاج اور بد کردار شخص تھا جس کے درست ہونے کے امکانات دور دور نہیں تھے۔ ریشمی اور اس کے بوڑھے والدین کی زندگیاں اسی صورت بدترین عذاب سے بچ سکتی تھیں اگر پیجا ہمیشہ کے لیے ان کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا۔ وہ ایک ظالم شوہر ایک بے رحم داماد اور ایک قابلِ نفرت انسان کی ساری خصوصیات پر پورا اترتا تھا۔
کرماں والا کے بازار میں اخبار اگلے روز پہنچتا تھا۔ منگل کا اخبار وہاں بدھ کو پہنچا اور مجھ سے پہلے انیق نے دیکھا۔ میں نے ابھی تک انیق کو نہیں بتایا تھا کہ داؤد بھاؤ سے فون پر میری کیا بات ہوئی ہے۔ ہم مسافر سرائے کے دالان میں بیٹھے پیالیوں میں چائے پی رہے تھے۔ تاجور ہمارے لیے مقامی طرز کے شکر پارے پلیٹ میں رکھ کر لائی تھی۔ ابھی میں نے پہلا شکر پارہ ہی اٹھایا تھا کہ انیق اخبار پکڑے اندر داخل ہوا اور بلند آواز میں بولا۔ ''شاہ زیب بھائی! یہ دیکھیے، یہ کیا خبر ہے؟''
اس نے اخبار میری طرف بڑھایا اور اندرونی صفحے کی دو کالمی خبر پر انگلی رکھی۔ خبر سے پہلے میری نظر تصویر پر پڑی...... اور یہ ریشمی کے بدماغ شوہر پرویز عرف پیجا کی تصویر تھی۔ خبر کی سرخی تھی۔ ''چوراہے میں گولیوں سے چھلنی لاش''
ذیلی سرخی تھی۔ ''مقتول پرویز ایک ٹھیکیدار کے پاس ملازم تھا۔ نامعلوم افراد نے قتل کر دیا۔''
خبر کی تفصیل اس طرح تھی۔ ''کل رات ایک بجے کے لگ بھگ مقتول پرویز نشے کی

حالت میں موٹر سائیکل پر جا رہا تھا۔ نامعلوم کار سواروں نے اسے ٹکر مار کر گرایا اور گولیاں مار کر فرار ہو گئے۔ پرویز نے موقع پر ہی دم توڑ دیا۔ یاد رہے کہ پیجا کا ملنا جلنا مشکوک کردار کی عورتوں سے تھا۔ کچھ عرصہ پہلے تک اس کی مبینہ بیوی گلوکاری کرتی تھی اور ایک مقامی ہوٹل میں ڈنر کے وقت لائیو پرفارمنس دیتی تھی۔"

انیق خبر پڑھ رہا تھا اور چاچا رزاق کے ساتھ ساتھ تاجور بھی حیرت سے آنکھیں پھاڑے سن رہی تھی۔ چاچا رزاق نے لرزتے ہاتھوں کے ساتھ اخبا تھاما اور غور سے پیجا کی تصویر دیکھنے لگے۔ پیجا کے چہرے کا ایک حصہ خون میں لتھڑا نظر آتا تھا۔ آنکھیں تارے لگی ہوئی تھیں۔ پھر چاچا نے اخبا ایک طرف رکھا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ روتے ہوئے بولے۔ "اس نے بڑا دکھ دیا ہے میری دھی کو۔ بہت رولا ہے اسے۔ اللہ کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔ مجھے پتا تھا ایک دن اس نے ایسے ہی مرنا ہے۔ ایسے ہی کسی گندی نالی میں گرے گا یہ......"

○......❖......○

اس سہ پہر جب میں، انیق اور تاجور اور پر ملنگی ڈیرے پر گئے تو وہ اخبار بھی ہمارے ساتھ تھا۔ تاجور نے اسے تہ کر کے اپنے برقع میں چھپایا ہوا تھا۔ پہلے کی طرح ہم مردانہ حصے میں رہے اور تاجور زنانہ حصے میں چلی گئی۔

انیق اڑتی چڑیا کے پر گنتا تھا۔ وہ گاہے بگاہے غور سے میری طرف دیکھنے لگتا تھا۔ آخر بول ہی اٹھا۔ "شاہ زیب بھائی! اس پیجا کی موت کی ٹائمنگ بڑی زبردست ہوئی ہے۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"ویسے ہی بات کر رہا تھا۔" اس نے کہا۔ پھر تھوڑی دیر بعد میری آنکھوں میں دیکھ کر گویا ہوا۔ "یہ کل آپ نے جوداؤ د بھاؤ کو فون کیا وہ کس سلسلے میں تھا؟"

کوشش کے باوجود میں اپنے ہونٹوں تک پہنچنے والی مسکراہٹ نہ روک سکا۔ انیق کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ میں نے کہا۔ "تمہاری سونگھنے کی حس بڑی تیز ہے۔ ایک نمبر کے بوگیر ہو تم۔"

"یعنی میرا اندازہ درست ہے۔" وہ چمک کر بولا۔ "پرویز عرف پیجا کو آپ کی نظر لگی ہے۔"

"وہ تھا ہی اس قابل۔" میں نے کہا۔

اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "یہ بات تو میں نے بھی محسوس کی تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جن کے بارے میں کتے کی ٹیڑھی دُم والی مثال دی جاتی ہے۔ اب اللہ

کرے اس دُم کے کاٹے جانے کی خبر ریشمی کی زندگی کے لیے مبارک ثابت ہو۔“
”ضرور ہوگی۔“ میں نے کہا۔

ہم ملنگی ڈیرے کے طول و عرض میں گھومتے پھرتے رہے۔ یہ جگہ تقریباً پہاڑ کی چوٹی پر تھی۔ دو طرف گہری کھائیاں تھیں جن میں اترنا آسان نہیں تھا۔ تیسری طرف داخلی راستہ تھا۔ یہاں کڑا پہرا رہتا تھا۔ بہر حال ہم نے کسی شخص کے ہاتھ میں رائفل وغیرہ نہیں دیکھی۔ یہ لوگ آتشیں اسلحہ اپنے پیوند لگے کمبلوں یا صدریوں میں چھپا کر رکھتے تھے۔ داخلی دروازے کے قریب ایک بلند جگہ پر ہمیں ایک پوسٹ نما جگہ بھی نظر آئی۔ میرا اور انیق کا مشترکہ خیال تھا کہ یہاں کم از کم دو پہریدار کسی دور مار رائفل کے ساتھ موجود ہوں گے۔ بہر حال عملی طور پر ہمیں وہاں بھی کوئی رائفل دکھائی نہیں دی۔ ڈیرے کی چوتھی طرف نشیب میں لکڑی کا ایک جھولتا ہوا پل تھا۔ اس پل کو پار کر کے ساتھ والے پہاڑ پر جایا جا سکتا تھا۔ یہاں بھی کڑی نگرانی موجود تھی۔

اس روز تاجور کو زنانے حصے سے واپس آنے میں کافی تاخیر ہوئی۔ وہ ڈھائی بجے کے لگ بھگ گئی تھی۔ اندھیرا پھیل گیا۔ گیس لیمپس اور لالٹینیں جل اٹھیں لیکن وہ لوٹی نہیں۔ ہمیں تشویش ہونے لگی۔ مگر اسی دوران میں اس کا برقع نظر آ گیا۔ وہ سیڑھیاں اترتی ہماری طرف آ رہی تھی۔ اس کی ہموار متوازن چال یہ بتانے کے لیے کافی تھی کہ وہ مطمئن لوٹ رہی ہے۔ تاجور کو دیکھتے ہی انیق اِدھر اُدھر ہو جایا کرتا تھا تاکہ ہمیں آسانی سے بات کرنے کا موقع ملے۔ اس مرتبہ بھی وہ کھسک گیا۔

”اتنی دیر؟“ میں نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

”دیر ہوئی لیکن درست ہوئی۔“ وہ پتھریلی سیڑھیوں پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”کیا کہنا چاہ رہی ہو؟“

”میں نے ریشمی کو اخبار دکھایا۔ پہلے گم صم ہوگئی، پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، لیکن یہ پرویز کے مرنے کا دکھ نہیں تھا۔ اسے وہ سارے زخم یاد آ گئے تھے جو اس بندے کی وجہ سے اسے لگے ہیں۔ مجھ سے کہنے لگی۔ ”مجھے پہلے ہی پتا تھا کہ ایک دن اس بندے کا یہی آخیر ہونا ہے۔ وہاں ریشمی کی ساتھی عورت ایک اور اخبار بھی ڈھونڈ لائی۔ اس میں بھی پرویز والی خبر موجود تھی۔ ہم دیر تک اس بارے میں بات کرتے رہیں......“

”کوئی کام کی بات بھی کی یا نہیں؟ میرا مطلب ہے اس کی واپسی کی بات؟“

تاجور نے ایک گہری سانس لی اور اس گہری سانس کے سبب برقع کے اندر اس کے جسم

نے بڑے دلکش انداز میں حرکت کی۔ وہ بولی۔ ''شاہ زیب! وہ اتنی جلدی کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکتی۔ اس سے بار بار ملنا بھی آسان نہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ اس کے لیے کافی سارا وقت چاہیے ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ دو تین مہینے۔ کوئی اسے سمجھانے والا ہو اور وہ پکا ارادہ کر کے لگا رہے تو شاید اس کا ذہن بدل جائے۔''

''لیکن یہ بھی تو ہوسکتا ہے تاجور کہ دو تین مہینے میں وہ یہاں کے رنگ میں کچھ اور رنگ جائے۔''

''ہاں، ہونے کو تو کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ ملنگوں اور مجاوروں نے یہاں مشہور کر رکھا ہے کہ مزار میں لیٹی ہوئی ہستی کی آواز ریشمی کی آواز میں بدل گئی ہے۔ اسی وجہ سے اس آواز میں درد ہے اور لوگ ملنگی ڈیرے کی طرف کھچے چلے آتے ہیں......''

''مزار میں لیٹی ہوئی؟ تمہارا مطلب ہے یہ مزار کسی عورت کا ہے؟''

''ہاں، یہی تو انکشاف ہوا ہے آج۔ اسے مستاں مائی کا مزار کہتے ہیں۔ وہ دو تین سو سال پہلے یہاں دفن ہوئی تھی۔ کہتے ہیں کہ اس کی آواز بہت اچھی تھی۔ اس میں جادو تھا۔ وہ خود ہی شعر جوڑتی تھی اور پڑھتی تھی۔ راہ گیر اس کی آواز سن کر رک جاتے تھے اور پرندے بھی آس پاس جمع ہو جاتے تھے۔ کچھ اسی طرح کی باتیں ہیں۔''

''ایسی کہانیاں تو ایسے مزاروں، مقبروں کے بارے میں گھڑ ہی لی جاتی ہیں۔'' میں نے کہا۔

''پر شاہ زیب! اب جو کہانی گھڑی گئی ہے، وہ ریشمی کے لیے بڑی خطرناک ہے۔ بڑے مجاور اور پردے والی سرکار کہہ رہی ہے کہ ریشمی کے گلے میں مستاں مائی کی آواز ہے۔ اس لیے ریشمی کا درجہ بہت اونچا ہے۔ اسے ملنگی ڈیرے کے زنانے حصے میں رہنے کے لیے بڑی خاص جگہ دی گئی ہے۔ میں آج دیکھ کر آرہی ہوں۔ وہاں ہر وقت انگیٹھیاں جلتی ہیں، نرم گدے ہیں، فانوس کی طرح کے بڑے بڑے لیمپ ہیں اور بجلی کی روشنی بھی ہے۔ انگیٹھیوں میں کوئی خوشبو بھی پھینکی جاتی ہے جس کی وجہ سے ہر طرف مہک سی رہتی ہے۔ دو تین نوکرانیاں رات دن ریشمی کے آس پاس رہتی ہیں۔ وہ تو......'' تاجور کہتے کہتے چپ ہو گئی۔

''بات تو پوری کرو۔'' میں نے کہا۔

''وہ تو مجھے بھی یہ مشورہ دے رہی ہے کہ میں یہاں آجاؤں، باہر کی دنیا میں کچھ نہیں رکھا، بس دکھ اور تکلیفیں ہیں۔''

"یعنی لینے کے دینے۔" میں نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔ "چلو بھئی چلو۔ مٹی ڈالو اس ریشمی پر۔ صبح نکل چلتے ہیں۔ پہلے ٹائم والی بس پکڑ لیں گے کوٹلی کے لیے۔"
سیاہ نقاب کے اوپر تاجور کی آنکھیں مسکرائیں۔ وہ بولی۔ "فرض کر لیں کہ میں ریشمی کی باتوں میں آ جاتی ہوں اور فرض کر لیں کہ میں زنانے حصے میں جاتی ہوں اور پھر واپس نہیں آتی......اور فرض کر لیں کہ آپ کو اکیلے واپس جانا پڑتا تو پھر......؟"
"تو پھر یہ بھی فرض کر لو کہ میں نے آٹھ دس ملنگ مار ڈالنے ہیں اور اپنی کنپٹی پر خود ہی پستول رکھ کر گولی چلا لینی ہے۔"
"اتنا غصہ؟"
"نہیں اتنا پیار...... جب تم اس طرح کی بات کرتی ہو تو جی چاہتا ہے کہ......" میں نے دانت پیس کر اس کی طرف دیکھا۔
"کیا جی چاہتا ہے؟"
میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ "اگر بتا دوں تو......تم اپنا رنگ لال گلابی کر لو گی اور ہو سکتا ہے کہ اگلے آٹھ دس روز تک مجھ سے بات ہی نہ کرو۔"
"اتنے برے ارادے ہیں۔" وہ مجھے گھور کر بولی۔
میں نے نفی میں سر ہلا کر پہلو بدلا اور سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ "مذاق کر رہا ہوں تاجور......تم سے جتنا پیار کرتا ہوں، اتنا ہی احترام بھی کرتا ہوں تمہارا۔ میرا تو دل چاہتا ہے کہ تمہیں دیکھنے سے پہلے بھی تم سے اجازت لوں، سچ بہت چاہتا ہوں تمہیں۔"
"کہتے ہیں زیادہ پیار اچھا نہیں ہوتا اور وہ بھی ایک ایسے شخص سے جسے آپ اچھی طرح جانتے بھی نہ ہوں۔"
"یعنی تم کہنا چاہ رہی ہو کہ......تم مجھے ٹھیک سے جانتی نہیں ہو؟"
"ہاں شاہ زیب......کبھی کبھی ایسا ہی لگتا ہے مجھے شاید......آپ نے اپنے بارے میں بہت کچھ مجھ سے چھپا رکھا ہے۔"
"یہ غلط فہمی ہے تمہاری۔"
شاید میں کچھ اور بھی کہتا مگر دو ملنگوں کو بھاگتے دیکھ کر چونک گیا۔ یوں لگا جیسے وہ کسی کے پیچھے لپک رہے ہوں۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک محرابی دروازے میں داخل ہو کر اوجھل ہو گئے۔ ارد گرد موجود کئی اور مرد و زن نے بھی ان بھاگتے ہوئے ملنگوں کو دیکھا تھا اور اب سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کی جانب دیکھ رہے تھے۔ ایک ملنگ تیز تیز قدموں سے چلتا

اسی محرابی دروازے کی طرف بڑھا۔ایک عورت نے آگے بڑھ کر پوچھا۔''کیا ہوا سائیں جی؟''

''کچھ نہیں، ایک جیب کترا تھا۔'' ملنگ نے مختصر جواب دیا اور محرابی دروازے میں اوجھل ہو گیا۔

اس کا جواب اور انداز تسلی بخش نہیں تھا۔ بہرحال اس کے بعد بھاگ دوڑ کا کوئی اور منظر نظر نہیں آیا۔ اردگرد موجود لوگ پھر اپنے اپنے حال میں مگن ہو گئے۔ کچھ دیر بعد میں یونہی ٹہلتا ہوا ایک منڈیر کے پاس پہنچا۔ میں انیق کو دیکھنا چاہ رہا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ انیق تو نظر نہیں آیا لیکن میری نگاہ دور نیچے گہرائی میں گئی۔ قریباً تین چار سو فٹ نیچے ملنگی ڈیرے کا ایک زیریں حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ ایک منظر مجھے چند سیکنڈ کے لیے دکھائی دیا اور بری طرح چونکا گیا۔ مجھے تین چار ملنگ دکھائی دیئے جو ایک نوجوان کو مارتے اور گھسیٹتے ہوئے ایک جانب لے جا رہے تھے۔ میں کافی بلندی سے دیکھ رہا تھا پھر بھی مجھے اندازہ ہوا کہ نوجوان بری طرح لہولہان ہے۔ وہ شاید ملنگوں سے جان بخشی چاہتا تھا مگر وہ کچھ نہیں سن رہے تھے۔ گہرائی اتنی زیادہ تھی کہ نوجوان کے چلانے کی آواز اور ملنگوں کے دھاڑنے کی صدائیں مجھ تک نہیں پہنچ رہی تھیں۔ وہ لوگ زخمی نوجوان کو گھسیٹتے ہوئے ایک دروازے میں اوجھل ہو گئے۔ یہ سارا منظر بمشکل تین چار سیکنڈ پر مشتمل تھا۔

''کیا ہوا شاہ زیب؟'' سیڑھیوں پر بیٹھی تاجور نے میرے تاثرات دیکھ کر کہا۔

''کچھ نہیں، یونہی جائزہ لے رہا تھا۔ بہت زیادہ گہرائی ہے اس طرف۔''

اس سے پہلے کہ تاجور کوئی مزید سوال پوچھتی، ایک طرف سے انیق آتا دکھائی دیا۔ وہ مناسب وقت پر آیا تھا۔ میں نے اوپر دیکھتے ہوئے کہا۔''بادل گہرے ہو رہے ہیں، کسی بھی وقت بارش ہونے لگے گی۔ تم انیق کے ساتھ نیچے سرائے میں جاؤ میں ابھی آتا ہوں۔''

''کیوں؟ کہاں جانا ہے؟'' وہ فکرمندی سے بولی۔

''ایک واقف بندہ نظر آیا ہے، اسے دیکھ کر آتا ہوں۔'' میں نے گول مول جواب دیا۔

تاجور نے تھوڑی سی بحث کی لیکن پھر وہ انیق کے ساتھ مغربی جانب کی سیڑھیاں اتر کر سرائے کی طرف روانہ ہو گئی۔ نوجوان کی بے چارگی کا منظر مسلسل میری نگاہوں میں گھوم رہا تھا صاف پتا چل رہا تھا کہ یہاں کوئی گڑبڑ چل رہی ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے جو دو ملنگ بھاگتے ہوئے ہمارے سامنے سے گزرے تھے، وہ بھی غالباً اسی نوجوان کے پیچھے تھے۔ کیا پتا یہ وہی نوجوان ہو جسے پرسوں مارا بھی گیا تھا۔

جونہی انیق اور تاجور میری نظروں سے اوجھل ہوئے، میں عام انداز سے چلتا ہوا مشرقی ڈھلوان کی طرف اترنے لگا۔ ایک جگہ پتھروں پر لکھا ہوا نظر آیا...... آگے جانا منع ہے۔ مگر میں اس وارننگ کو نظر انداز کرتا آگے بڑھتا رہا۔ تیس چالیس قدم آگے جا کر مجھے طویل سیڑھیاں نظر آئیں جو گہرائی کی طرف جا رہی تھیں۔ اچانک ایک تنومند ملنگ نے میرا راستہ روک لیا، اس کے ہاتھ میں مضبوط لاٹھی تھی۔ اپنے نیلے چولے کے اوپر اس نے پیوند لگا کمبل اوڑھ رکھا تھا۔

"ادھر کہاں آ گئے ہو؟" وہ مجھے دیکھ کر کرخت لہجے میں بولا۔ سردی کے سبب اس کے منہ سے بھاپ نکل رہی تھی۔

"میں پردے والی سرکار سے ملنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"وہ کیوں؟"

"ان کی چمی لینی ہے۔ میرا مطلب ہے ان کے پاؤں چومنے ہیں۔"

"کیا بکواس کرتے ہو؟ کون ہو تم۔ تم نے وہاں اوپر لکھا ہوا نہیں دیکھا، ادھر آنا منع ہے۔"

"عام لوگوں کا آنا منع ہے۔ میں تو عاشق ہوں سرکار جی کا۔"

ملنگ کو میرے بارے میں شک ہو گیا تھا۔ اس نے فوراً کمبل اٹھایا۔ میری توقع کے عین مطابق کمبل کے نیچے چینی ساخت کی چھوٹی رائفل موجود تھی۔ وہ پھنکارا۔ "شناختی کارڈ ہے تمہارے پاس؟"

"نہیں کارڈ تو نہیں، لیکن اگر آپ کو برا لگ رہا ہے تو واپس چلا جاتا ہوں۔"

"اب اتنی دور آ گئے ہو تو آسانی سے واپس کیسے جا سکو گے۔" وہ دھمکی آمیز لہجے میں بولا۔

مجھے لگا کہ وہ اپنے کسی ساتھی کو آواز دینا چاہ رہا ہے۔ میں حرکت میں آیا اور میرا حرکت میں آنا اس کے لیے بڑا تباہ کن ثابت ہوا۔ میں نے اس کی چربی دار گردن پر اسی جگہ ہاتھ رسید کیا تھا جس کی ضرب ریڑھ کی ہڈی تک پہنچتی تھی اور جسم و دماغ کا رابطہ معطل ہو جاتا تھا۔ تنومند ملنگ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح سیڑھیوں پر گرا۔ اس کی لاٹھی ہاتھ سے نکل گئی تھی۔

ملنگ اور لاٹھی کے گرنے کی آوازوں نے ایک اور شخص کو میری طرف کھینچ لیا۔ یہ بھی ایک ملنگ تھا مگر چھریرے جسم کا اور زیادہ پھرتیلا۔ اس نے ساتھی کی گری ہوئی لاٹھی اٹھائی اور پوری طاقت سے میرے سر کے دو ٹکڑے کرنے چاہے۔ میں نے اس کے دو وار بڑے

اطمینان سے بچائے اور تیسرے وار سے پہلے ہی اسے دبوچ کر پشت کے بل گرا دیا۔ گرتے ہوئے ملنگ کا سر بڑے زور سے پتھریلی سیڑھیوں سے ٹکرایا تھا۔ میں نے ایک بار مزید اس کے سر اور سیڑھی کا ملاپ کرایا۔ وہ بھی بے سدھ ہو گیا۔ میں دونوں کو گھسیٹ کر پاس ہی ایک پتھریلی کوٹھڑی میں لے آیا۔ جو ہونا تھا، وہ ہو چکا تھا۔ اب پیچھے ہٹنے کے بجائے آگے بڑھنا ہی مناسب تھا۔ میں نے دونوں ملنگوں کا جائزہ لیا۔ ایک ملنگ کا قد کاٹھ مجھ سے مطابقت رکھتا تھا۔

قریباً دس منٹ بعد میں لمبے نیلے چولے اور کمبل میں ملبوس سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ میرے پاؤں ننگے تھے اور ہاتھ میں بانس کی لمبی لاٹھی تھی۔ میں نے اپنے سر پر ملنگ کی نیلی چادر اس طرح ڈال لی تھی کہ لمبا گھونگھٹ بن گیا تھا۔ یہ دھاری دار چادر تھی اور گھونگھٹ کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ گھونگھٹ والے پردہ دار ملنگوں کی موجودگی یہاں ثابت ہو چکی تھی۔ مجھے توقع تھی کہ کوئی مجھ پر خصوصی توجہ نہیں دے گا۔ دونوں بے ہوش ملنگوں کے ہاتھ پاؤں باندھ کر میں نے ان کے منہ میں کپڑے ٹھونس دیئے تھے اور انہیں گھنے جھاڑ جھنکاڑ میں ڈال دیا تھا۔ امید نہیں تھی کہ وہ دو تین گھنٹے تک میرے لیے کوئی مشکل پیدا کر سکیں گے۔

سو کے قریب سیڑھیاں اترنے کے بعد میں ملنگی ڈیرے کے خاص حصے میں پہنچ گیا۔ یہاں ملنگوں کے علاوہ جواں سال ملنگنیاں بھی نظر آئیں۔ میں ایک وسیع ہال میں داخل ہوا۔ یہ پتھر کا ایک قدرتی چیمبر تھا۔ یہاں لذیذ کھانوں کی خوشبو رچی بسی تھی۔ میں نے وہ محرابی دروازہ پہچان لیا تھا جس میں زخمی نوجوان کو گھسیٹ کر لے جایا گیا تھا۔ میں درست سمت میں جا رہا تھا۔ جب ایک دروازے میں سے گزرنے لگا تو ایک پہریدار نے کہا۔ ”کہاں جا رہے ہو مبارک؟“

میں نے گھونگھٹ ہٹائے بغیر پہریدار کے کان میں سرگوشی کی۔ ”کرنالی صاحب نے بلایا ہے۔ ایک بری خبر ہے۔“

”کیا؟“

”واپسی پر بتاتا ہوں۔“ میں نے پھر سرگوشی کی۔ سرگوشی میں آواز کا پہچاننا مشکل ہوتا ہے۔ لہٰذا لگا کہ کام چل گیا ہے مگر جب میں آگے بڑھا تو مجھے محسوس ہوا کہ پہریدار کی نگاہیں میرے پاؤں پر جمی ہوئی ہیں۔ میرے پاؤں صاف ستھرے تھے جبکہ ملنگوں کے ساتھ ایسا نہیں تھا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ پہریدار چونک چکا ہے مگر اس سے پہلے کہ وہ کسی طرح کا ردِعمل ظاہر کرتا، میں راہداریوں کی بھول بھلیوں میں داخل ہو چکا تھا۔ یہاں جگہ جگہ گیس

لیمپس روشن تھے۔ ایک دروازے کے سامنے سے گزرتے ہوئے، مجھے عجیب سی آوازیں سنائی دیں۔ جیسے جانور یا ایک سے زیادہ جانور کسی چیز پر جھپٹ رہے ہوں اور چھینا جھپٹی بھی کررہے ہوں۔ ایک جگہ بڑی سی سلاخ دار کھڑکی کے سامنے کئی ملنگ جمع تھے اور ڈرے ڈرے انداز میں کچھ دیکھ رہے تھے۔ میں بھی ان کے درمیان جا کھڑا ہوا۔ اپنے گھونگھٹ کے اندر سے میں نے جو کچھ دیکھا وہ دل کی دھڑکنیں روکنے والا تھا۔ میں نے سیاہ دھبوں والے تین جسیم چیتے دیکھے۔ ان کی تھوتھنیاں خون سے سرخ تھیں اور وہ گوشت کے چند لوتھڑوں کو اِدھر اُدھر کھینچ رہے تھے...... وہ ایک انسانی جسم کے لوتھڑے تھے۔ جا بجا کپڑے کی دھجیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ یہ ایک سیاہ پتلون اور کریم کلر سویٹر کی دھجیاں تھیں۔ قمیص وغیرہ کی دھجیاں بھی ہوں گی لیکن انہیں علیحدہ سے شناخت کرنا مشکل تھا۔ مجھے پہچاننے میں ذرا بھی دشواری نہیں ہوئی، یہ وہی بدقسمت نوجوان تھا جسے کچھ دیر پہلے ہٹے کٹے ملنگ گھسیٹ کر یہاں لائے تھے۔

کھڑکی سے چند فٹ کے فاصلے پر موجود لیوپارڈ چیتے نے نوجوان کے جسم کا ایک نازک حصہ اپنے خونی جبڑوں میں دبا رکھا تھا۔ دوسرے چیتے نے اس کی خون آلود کلائی دبوچ رکھی تھی۔ اس کٹی ہوئی کلائی پر ابھی تک رسٹ واچ بندھی ہوئی تھی۔ میں چند سیکنڈ کے لیے اس دلدوز منظر میں کھو کر رہ گیا۔ تب ایک دم مجھے خطرے کا احساس ہوا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ طویل راہداری کے موڑ پر وہی پہریدار نظر آیا جس نے مجھے روکا تھا۔ وہ لپکتا ہوا میری جانب بڑھ رہا تھا۔ میں نے اپنی جگہ سے حرکت کرنی چاہی لیکن اس سے پہلے ہی ایک سفاک سرگوشی میرے کانوں میں گونجی۔ ”اپنی جگہ سے ایک انچ بھی حرکت کرو گے تو آٹھ گولیوں کا برسٹ پورے کا پورا تمہارے دل میں اتار دوں گا۔“

تب میں نے محسوس کیا کہ میری بائیں بغل کے نیچے رائفل کے بیرل کا بے رحم دباؤ موجود ہے۔ پچھلے پانچ چھ سالہ تجربے نے مجھے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ کہاں پھرتی دکھانا ٹھیک ہوتا ہے اور کہاں نہیں۔ یہ ہرگز پھرتی دکھانے کا موقع نہیں تھا۔

سرگوشی کرنے والے نے مجھے الٹے قدموں پیچھے آنے کے لیے کہا۔ میں چند قدم پیچھے ہٹا، اسی دوران میں پہریدار بھی ہانپتا کانپتا وہاں پہنچ گیا۔ اب اس کے ہاتھ میں رائفل بھی نظر آ رہی تھی۔ یہ دوسری رائفل بھی میرے سر سے آن لگی۔ دونوں رائفل برداروں کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اسلحے کے استعمال میں زبردست مہارت رکھتے ہیں۔ اس منظر نے ہمارے اردگرد ایک دم ہلچل مچا دی تھی۔ چیتوں کی خون آشامی کا لرزہ خیز منظر دیکھنے والے بھی اب کھڑکی سے نگاہیں ہٹا کر ہماری طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ ان کی آنکھوں میں خوف جما ہوا تھا۔ پھر

جب انہیں یہ احساس ہوا کہ یہاں کسی بھی وقت فائرنگ ہو سکتی ہے تو وہ کونے کھدروں میں سمٹنے لگے۔

دو مزید رائفل بردار وہاں پہنچ گئے۔ رائفلوں کا رخ میری طرف ہی تھا۔ ایک نے رائفل کی نال سے دھاری دار چادر میرے چہرے سے ہٹائی۔ دوسرے نے کڑک کر کہا۔

''ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔''

میں نے ہاتھ اٹھا دیئے۔ جو رائفل میری بائیں بغل کے نیچے لگی ہوئی تھی اس نے مجھے بے بس کر دیا تھا۔ اس رائفل کی موجودگی میں مزاحمت کرنا خودکشی کے برابر تھا۔ اس کے باوجود میں موقع کی تلاش میں تھا...... یہ موقع مجھے تب ہی مل سکتا تھا جب وہ جذباتی ہو کر مجھ سے مار پیٹ کی کوشش کرتے، لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ میرا پستول اور موبائل فون بڑی احتیاط سے میری قمیص کے نیچے سے نکال لیا گیا اور مجھے ایک راہداری سے گزار کر ایک لاک اَپ نما جگہ پر پہنچا دیا گیا۔ یہ جگہ سرمئی رنگ کے پتھروں کو تراش خراش کر بنائی گئی تھی یا پھر خود ہی وجود میں آ گئی تھی۔ اس لاک اَپ یا کوٹھڑی کی ایک جانب لوہے کی موٹی موٹی زنگ آلود سلاخیں تھیں۔ نیچے چاول کی چھال بچھی ہوئی تھی۔ کونے میں دو تین بوسیدہ کمبل اور میلے کچیلے تکیے رکھے تھے۔

مجھے لاک اَپ میں دھکیلنے کے بعد دروازے کو ایک بھاری قفل لگا دیا گیا۔ سرخ آنکھوں والا ایک لحیم شحیم ملنگ مجھے اپنی سرخ انگارہ آنکھوں سے گھورے جا رہا تھا، میں نے پہچان لیا یہ وہی ڈشکرا تھا جس نے پرسوں تاجور کو اور مجھے سیڑھیوں پر بیٹھے دیکھا تھا اور ہمیں مسلسل تاڑتا رہا تھا۔ مجھ سے مخاطب ہو کر کڑے لہجے میں بولا۔ ''تیرے ساتھ والی زنانی کہاں ہے؟''

''کون سی زنانی؟''

''جو تیرے ساتھ یہاں لور لور پھر رہی تھی۔ ماں بہن تو نہیں تھی تیری...... معشوق ہو گی یا گھر والی ہو گی۔ چلو کوئی بات نہیں۔ ابھی پتا چلا لیتے ہیں۔''

وہ تیز قدموں سے چلتا ایک طرف اوجھل ہو گیا۔ باقی افراد مجھے کڑی نظروں سے گھورتے رہے اور آپس میں سرگوشیاں کرتے رہے۔ یہ سب لمبے نیلے چغوں اور کندھوں تک جاتے ہوئے بالوں والے ملنگ اور مجاور تھے۔ ان میں سے اکثر کی صورتوں پر پھٹکار برس رہی تھی۔ کچھ دیر بعد ایک کے سوا سب افراد تتر بتر ہو گئے۔

میں یخ بستہ لاک اَپ کی پتھریلی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ تاجور اور دیگر

ساتھیوں کی طرف سے پریشانی لاحق ہورہی تھی۔ بہرحال اس بات کی امید تھی کہ اگر وہ لوگ پکڑے گئے تو ان کو بھی یہاں ہی لایا جائے گا۔ یہ جگہ یقیناً ایسے کاموں کے لیے ہی استعمال ہوتی تھی۔ شاید یہاں پکڑے جانے والوں پر تشدد وغیرہ بھی کیا جاتا ہو۔ چند زنجیریں ایک دیوار میں پیوست تھیں، اس کے علاوہ ایذا رسانی کی کچھ نشانیاں دکھائی دے رہی تھیں۔

میری نگاہوں کے سامنے وہ ہولناک منظر بھی گھوم رہا تھا جو تھوڑی دیر پہلے میں نے یہاں سے کچھ فاصلے پر دیکھا تھا۔ بھوکے چیتوں کی پھنکاریں اور ان کے درمیان انسانی گوشت کے لڑھکتے ہوئے ٹکڑے۔ کٹی ہوئی کلائی پر رسٹ واچ کا منظر جیسے ذہن میں پیوست ہوکر رہ گیا تھا۔ مجھے اندازہ ہورہا تھا کہ یہ وہی بدقسمت نوجوان تھا جسے دو دن پہلے بھی مارا پیٹا گیا تھا۔ انیق نے مزار کے سامنے یہ منظر دیکھا تھا اور بتایا تھا کہ ملنگوں نے ایک ایسے لڑکے کی درگت بنائی ہے جو زنانے حصے میں تاک جھانک کررہا تھا۔

ایک میٹھا میٹھا سا درد میرے جسم میں لہریں لینے لگا۔ یہ خطرات کی آمد کا درد تھا۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ یہاں کچھ سنسنی خیز واقعات پیش آنے والے ہیں اور سنسنی خیزی میرے لیے کبھی کبھی روح کی غذا کا کام دیا کرتی تھی۔

وہی ہوا جس کے اندیشے لاحق تھے۔ قریباً ایک گھنٹا سخت کشمکش میں گزارنے کے بعد مجھے نسوانی آوازیں سنائی دیں۔ یہ تاجور کی صدا تھی اور میں اسے ہزاروں صداؤں میں سے پہچان سکتا تھا۔ وہ ملنگوں پر برس رہی تھی۔ ''چھوڑو مجھے...... میں کہتی ہوں مجھے ہاتھ نہ لگاؤ، چھوڑ دو۔''

تین افراد اسے گھسیٹتے ہوئے لاک اَپ کے سامنے لائے۔ ان تین افراد میں ایک ملنگ اور دو ملنگنیاں تھیں۔ ایک ہٹی کٹی ملنگنی نے تاجور کو اپنے بازوؤں میں جکڑ رکھا تھا، دوسری نے دائیں ہاتھ سے اس کے بال جکڑ رکھے تھے۔ بائیں ہاتھ میں موبائل فون تھا۔ یہ تاجور کا ہی تھا مگر تاجور بھی کوئی عام شہری لڑکی نہیں تھی۔ خالص دودھ مکھن کی پلی ہوئی دیہاتی مٹیار تھی۔ وہ ملنگنیوں کے ہاتھوں سے نکل نکل جارہی تھی۔

بالآخر ملنگ نے لاک اَپ کا دروازہ کھولا اور دونوں ملنگنیوں نے تاجور کو زوردار دھکا دے کر اندر پھینک دیا۔ اندر نیم تاریکی تھی۔ وہ سیدھی مجھ پر گری۔ میں چت ہوگیا اور وہ مجھ پر سوار سی ہوگئی۔ تاہم ایسا صرف دو تین سیکنڈ کے لیے ہوا وہ تڑپ کر مجھ سے جدا ہوئی اور دروازے کی طرف جھپٹی۔ دونوں ہاتھوں سے سلاخوں کو جھنجوڑنے لگی اور ملنگوں پر چلانے لگی۔ میں ملنگوں والے لباس میں تھا اور نیم تاریکی کی وجہ سے وہ مجھے بالکل نہیں پہچان پائی

تھی۔اس صورتِ حال کو برقرار رکھنے کے لیے میں نے گھونگھٹ نما چادر اپنے سر پر لے لی۔
اب وہ پکار رہی تھی۔ "شاہ زیب......شاہ زیب...... کہاں ہیں آپ...... بچاؤ......کوئی میری مدد کرو۔"

یقیناً وہ اتنا تو جانتی تھی کہ میں بھی کسی مشکل میں پھنس کر یہاں پہنچ چکا ہوں مگر کہاں ہوں، یہ اسے معلوم نہیں تھا۔وہ کافی دیر پکارتی رہی لیکن کسی نے اس کی آواز پر کان نہیں دھرا۔ اس کا گلا رندھ گیا۔ میں نے اپنے دائیں ہاتھ سے اپنے گلے کے ونڈ پائپ یعنی سانس کی نالی کو دبایا۔ایسا کرنے سے آواز بالکل بیٹھ جاتی ہے اور بدل جاتی ہے۔ریڈیو، ٹی وی وغیرہ کے صداکار یہ طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ میں نے بدلی ہوئی آواز میں کہا۔"بچہ جی، اس طرح رونے چلانے سے کوئی فائدہ نہیں۔کسی نے کچھ نہیں سننا۔"
اس نے گھوم کر ڈری ڈری نظروں سے مجھے دیکھا۔"آ...... آپ کون ہیں؟" وہ ہکلائی۔

میں نے اس کا گال سہلایا۔"تمہاری ہی طرح کا ایک مجبور۔کل تک جس کی عزت تھی۔آج وہ بے وقار ہو گیا ہے۔بے گناہی کے جرم میں یہاں پھنسا دیا گیا ہے......"
وہ میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔"یہ لوگ مجھے کیوں پکڑ کر لائے ہیں یہاں؟"

میں نے کہا۔"بچہ جی، ہمیں تو خود اپنا پتا نہیں، تمہارا کیا بتائیں۔"

وہ مجھے سرتاپا گھور رہی تھی۔ جیسے سمجھ نہ پا رہی ہو کہ میں کیا چیز ہوں۔ یہ بات تو وہ بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ یہاں کچھ ایسے ملنگ بھی موجود ہیں جو خود کو سرتاپا کپڑوں میں چھپائے رکھتے ہیں۔ وہ لرزاں آواز میں بولی۔"کیا یہ لوگ میرے علاوہ بھی یہاں کسی کو لے کر آئے ہیں؟"

"ہاں......لمبا سا لڑکا تھا۔کھڑی ناک والا۔ خاکی رنگ کی شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی، اوپر کالی جیکٹ تھی۔"

وہ تڑپ کر بولی۔"ہاں ہاں......اب......کہاں ہے وہ؟"

"وہ تمہارے ساتھ تھا؟" میں نے بیٹھی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"جی ہاں، وہ میرے ساتھ یہاں آئے تھے، سلام کرنے کے لیے۔"

"کیا لگتا ہے تمہارا؟"

"مم......منگیتر۔" وہ ہکلائی۔

''بچہ جی۔ وہ تو بڑا بزدل نکلا۔ پہلے تو ذرا اکڑا۔ لیکن جب ان لوگوں نے ڈنڈوں سے مار لگائی تو رونے لگ پڑا۔ معافیاں مانگنے لگا۔ تمہارا پتا بھی ان لوگوں کو اسی نے بتایا ہے۔ تمہارے ساتھ دو اور بندے بھی ہیں نا، ایک جوان ہے دوسرا بڑی عمر کا، لنگڑا کر چلتا ہے؟''

تاجور کی آنکھوں میں آنسو جمع ہونے لگے۔ ''نہیں...... ایسا نہیں ہوسکتا۔ آ...... آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ وہ ایسے نہیں ہیں۔ اب...... اب کہاں ہیں وہ؟''

''تمہیں تایا ہے نا بچہ، اسے لے گئے ہیں یہاں سے...... اب اسے یہاں کی بڑی ملنگنی کے حوالے کر دیں گے۔ وہ اس کی...... عزت لوٹے گی...... اور ہوسکتا ہے کہ اس پکا پکا اپنا رکھیلا بنالے۔ رکھیلا سمجھتی ہو نا تم؟ جیسے مردوں کی رکھیل ہوتی ہے، عورتوں کا رکھیلا۔''

تاجور حیرت سے منہ کھولے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے الجھن آمیز شک بھی تھا۔ اس نے ایک بار پھر مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا اور بولی۔ ''آپ کون ہیں، مجھے آپ سے...... ڈر لگ رہا ہے...... بابا۔''

''بابا مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' میں نے اس کا فقرہ دہرایا۔ ''کتنا خوب صورت جملہ ہے بچہ۔ ہم ویسے تو فلم نہیں دیکھتے لیکن پچھلی جمعرات کو ہم نے ''سرکار جی'' کے کہنے پر رشی کپور کی ''بوبی'' دیکھی تھی۔ اس میں وہ بے ہودہ سا گانا ہے، ہم تم ایک کمرے میں بند ہوں۔ رشی کپور کہتا ہے، آگے ہو گھور اندھیرا، پیچھے کوئی ڈاکو لٹیرا۔ وہ کہتی ہے، بابا مجھے ڈر لگ رہا ہے......''

تاجور اب بری طرح چونک چکی تھی۔ اس نے ایک دم ہاتھ بڑھا کر میرے چہرے سے گھونگھٹ الٹ دیا۔ وہ کچھ دیر سکتہ زدہ سی کھڑی رہی پھر بیٹھ گئی اور چہرہ ہاتھوں میں چھپا کے رونے لگی۔

''اتنی بڑی مصیبت میں پھنس گئے ہیں ہم اور آپ کو مذاق سوجھ رہا ہے۔'' وہ کراہ کر بولی۔ وہ دو تین منٹ تک سسکیاں لیتی رہی، پھر کچھ نارمل نظر آنے لگی۔

میں اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا اور پورے اعتماد سے کہا۔ ''تاجور! میں جب ساتھ ہوں تو پھر کوئی خطرہ، خطرہ نہیں ہے۔ ہم ایسے خطروں کو چٹکیوں سے اڑا دیں گے۔''

وہ ایک بار پھر میرا حلیہ دیکھ کر بولی۔ ''آپ یہ کیا بنے ہوئے ہیں اور آپ کو یہاں بند کیوں کیا ہے انہوں نے؟''

''یہ تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ وہ دیکھو باہر بیٹھا پہریدار کیسے گھور رہا ہے ہمیں۔'' میں نے سرگوشی کی۔

"کچھ پتا بھی ہے آپ کو کہ کیا ہوا ہے وہاں سرائے میں؟ یہ لوگ مجھے ڈھونڈتے ہوئے وہاں آئے تھے، انیق کو ان پر شک ہو گیا۔ اس نے انہیں روکا، سرائے کے برآمدے میں انہوں نے انیق کے ساتھ لڑائی شروع کر دی۔ مجھے اور چاچا رزاق کو موقع مل گیا۔ ہم پچھلے دروازے سے بھاگ نکلے۔ آگے جا کر پتا ہی نہیں چلا۔ اندھیرے میں چاچا کسی اور طرف نکل گئے میں کسی اور طرف۔ ایک چھت پر سے ایک ملنگنی نے مجھے دیکھ لیا اور شور مچا دیا۔ یہ لوگ مجھے پکڑ کر یہاں لے آئے؟"

میں نے اس کا چہرہ اور ہاتھ پاؤں دیکھے۔ کوئی چوٹ وغیرہ نہیں تھی۔ میں نے پوچھا۔

"کوئی مار پیٹ تو نہیں کی تمہارے ساتھ؟"

"نہیں، بس ملنگیاں کھینچا تانی کر رہی تھیں۔ ایک دو دفعہ میرے سر کے بال بھی نوچے ہیں۔" اس نے اپنے ٹوٹے ہوئے بالوں کو سر سے جھاڑتے ہوئے کہا۔

"گھبراؤ نہیں تاجور، ان چند بالوں کے بدلے میں ان کو پورا پورا گنجا نہ کر دیا تو نام نہیں۔"

"کک...... کیا کریں گے آپ؟"

"وہی جو پہلے کرتا آیا ہوں۔ جادو ٹونا...... تم سے کہا ہے نا کہ تمہاری صورت میں میرے پاس ایک جادو ٹونا ہے، جو بڑی سے بڑی مصیبت کو دھواں بنا کر اڑا سکتا ہے۔" میں نے اطمینان سے کہا۔

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔" وہ روہانسی ہو گئی۔

"لیکن میری سمجھ میں کچھ کچھ آ رہا ہے۔ انیق اور چاچا رزاق ابھی تک یہاں نہیں پہنچے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ ابھی تک ان لوگوں کے ہاتھ نہیں آئے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی طرف سے ہی کوئی مدد آ جائے اور اگر نہ بھی آئی تو کچھ نہ کچھ ہم ضرور کر لیں گے۔ مجھے یقین ہے، اور اس یقین کی وجہ یہ ہے کہ تم میرے ساتھ ہو۔"

وہ عجیب نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی لیکن زبان سے کچھ نہیں کہا۔ ویسے جو میں کہہ رہا تھا، وہ حقیقت تھی۔ فی الوقت میں بالکل نہتا تھا۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ کوئی مشکل پڑی تو مجھے کس طرح اپنا اور تاجور کا دفاع کرنا ہے۔ لیکن ایک بات کا مجھے پکا یقین تھا اگر کوئی ایسی صورت ہوتی کہ یہ لوگ ہم پر اور خاص طور سے تاجور پر ہاتھ ڈالتے اور وہ خطرے میں ہوتی تو میں کچھ نہ کچھ ضرور کر گزرتا۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ میرے ہوتے ہوئے وہ کسی آفت سے دوچار ہوتی۔ اچانک مجھے نوری کا خیال آیا، میں نے پوچھا۔ "نوری کہاں ہے؟"

تاجور نے کہا۔ ''وہ شاید وقتی طور پر تو بچ گئی ہے۔ اسے اس کے علاقے کی کوئی عورت ملی تھی۔ اس کے ساتھ پاس کے کسی گاؤں تک گئی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ رات بھی وہیں رہے۔''

کوئی آدھ گھنٹے بعد سرخ آنکھوں والا گرانڈیل ملنگ اپنے لمبے بالوں کو جھولاتا ہوا آہنی سلاخوں کے سامنے نمودار ہوا۔ ایک رائفل بردار کمبل پوش اس کے عقب میں تھا۔ ملنگ نے خونخوار نظروں سے مجھے گھورا اور پھنکارا۔ ''تم جو کوئی بھی ہو لیکن اپنے لیے بڑی مشکل پیدا کر لی ہے تم نے۔ وہاں اوپر سیڑھیوں پر تم نے دو بندوں کو زخمی کر کے باندھا ہے۔ ان میں سے ایک ابھی تک ہوش میں نہیں آیا۔ اسے کچھ ہو گیا تو تمہارے ساتھ بھی وہی کچھ ہو گا جو اس لاہوری لونڈے کے ساتھ ہوا ہے۔''

میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اسی لڑکے کا حوالہ دے رہا ہے جس کے جسمانی اعضا میں نے ایک قریبی کمرے میں بکھرے دیکھے تھے۔

''میں نے جو کچھ کیا ہے اپنے دفاع میں کیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''اپنے دفاع میں ہی تم نے بشارت خان کو ننگا کیا، اور اپنے دفاع میں اس کے کپڑے پہن کر یہاں اندر کے حصے میں گھس آئے...... زبردست...... بہت اچھے...... اب ذرا اپنے ''دفاع'' میں یہ بھی بتا دو کہ تمہارے دونوں بھگوڑے ساتھی کہاں ہوں گے اور کیسے پکڑے جا سکتے ہیں؟''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں؟''

''تم کہہ سکتے ہو۔'' اس نے معنی خیز انداز میں کہا اور سلاخوں کے اندر سے میرا موبائل مجھے تھما دیا۔

''کیا کروں؟''

اس نے تاجور کی پروا کیے بغیر ایک ننگی گالی دی اور بولا۔ ''ان کو فون کرو اور یہاں بلاؤ ان کو۔ ورنہ جو کچھ تمہارے ساتھ ہو گا وہ نہ بتانے کے قابل ہے اور نہ سننے کے۔''

''فون ان کے پاس نہیں ہے۔ ہم دونوں کے پاس ہی تھا۔''

اس نے اچانک سلاخوں کے درمیانی خلا میں بازو ڈال کر مجھے گھونسا مارنا چاہا۔ یہ اس کے بس کی بات نہیں تھی مگر میں نے جان بوجھ کر گھونسا کھایا تاکہ اس کا غصہ کچھ ٹھنڈا ہو۔

وہ کچھ دیر تک مجھ سے فون کرنے کے بارے میں تکرار کرتا رہا، پھر جھپٹ کر موبائل فون میرے ہاتھ سے لیا اور پاؤں پٹختا ہوا باہر نکل گیا۔

پریشان کن حالات کے باوجود مجھے بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ شاید اس کا سبب یہ تھا کہ

میں ان حالات کو پریشان کن سمجھ ہی نہیں رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب کچھ دیر بعد ایک اخبار میں لپیٹ کر کھانا ہم تک پہنچایا گیا تو مجھے اس کی خوشبو اچھی لگی۔ یہ کھانا تندوری روٹی اور بڑے گوشت کے کبابوں پر مشتمل تھا۔ ساتھ میں چٹنی تھی۔ میرے بہت اصرار کے باوجود تاجور ایک لقمہ بھی نہیں لے سکی۔ میں نے تین چار کباب اس کے لیے رہنے دیئے کہ شاید رات کو وہ کسی وقت بھوک محسوس کرے۔

رات سرد اور گم صم تھی۔ بس دور کہیں ڈھول بجنے اور چمٹا کھڑکھڑانے کی مدھم آواز سنائی دیتی تھی یا پھر کسی وقت ملنگوں کے کسی گروہ کا نعرۂ مستانہ بلند ہوتا تھا کوٹھڑی یعنی لاک اَپ سے باہر دو مسلح پہریدار چوکس حالت میں موجود تھے۔ انہوں نے ہمیں ایک لالٹین دے دی تھی، مگر کچھ دیر بعد میں نے تاجور کے کہنے پر اسے بجھا دیا تھا۔ روشنی میں ہمیں ہر وقت یہی لگتا تھا کہ پہریدار ہمیں گھور رہے ہیں، تاریکی میں سکون کا احساس ہوا۔ ہم بوسیدہ کمبل لینا نہیں چاہتے تھے مگر سردی کے سبب لینا پڑے۔ ہم اپنے درمیان تن چار فٹ کا فاصلہ رکھ کر لیٹ گئے۔ تاجور مسلسل یہ سوال کر رہی تھی کہ ہم یہاں سے کیسے نکلیں گے اور اگر نہ نکل سکے تو ہمارے ساتھ کیا ہوگا؟

وہ سرگوشی میں بولی۔ ''شاہ زیب! آپ نے تو کہا تھا کہ ان لوگوں نے آپ کو اوپر لنگر خانے کے قریب سے پکڑا ہے، مگر وہ لال آنکھوں والا ملنگ کچھ اور کہہ رہا تھا۔''

''کیا کہہ رہا تھا؟''

''یہی کہ آپ خود نیچے اترے ہیں اور دو ملنگوں کو زخمی کر کے......''

''بکواس کر رہا تھا۔ اس طرح کے کئی جھوٹ یہ لوگ بولیں گے۔ کیا تم ان پر بھی یقین کر لو گی۔''

''لیکن یہ کپڑے آپ نے کیسے پہنے؟''

''میں نے نہیں پہنے، انہوں نے پہنائے ہیں اور تم اپنے ننھے منے ذہن کو زیادہ تکلیف نہ دو۔ سوچنے کے لیے اور کرنے کے لیے میں جو موجود ہوں یہاں۔ کیا تمہیں مجھ پر بھروسا نہیں؟''

وہ جذباتی لہجے میں بولی تو اس کی آواز بھرا گئی۔ ''بھروسا ہی ہے تو آپ کے کہنے پر اتنی دور چلی آئی ہوں۔''

''اور مجھے یقین ہے تاجور...... میں تمہارے بھروسے کو ٹوٹنے نہیں دوں گا کبھی نہیں۔''

''مم......میرا دل بہت زیادہ دھڑک رہا ہے۔''

''اس کو سمجھاؤ کہ ذرا آرام کرے......اور تم بھی سو جاؤ۔ میں ہوں نا جاگنے کے لیے۔''

رات دھیرے دھیرے آگے کو سرکتی رہی۔ میرے منع کرنے کے باوجود وہ دھیمی آواز میں باتیں کرتی رہی۔ شاید اپنا دھیان بٹانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی سوچ بار بار اس دائرے میں گھوم رہی تھی کہ انیق اور چاچا رزاق کہاں گئے ہوں گے......اور یہ کہ اگر وہ جلد ملنگی ڈیرے سے نکل کر واپس کوٹلی نہ جا سکی تو وہاں کیا صورتِ حال بنے گی؟

اچانک کہیں پاس ہی ایک سرسراہٹ سی سنائی دی۔ پھر ایک ''تیز باریک چنگھاڑ سی'' خاموشی کا سینہ چیرتی چلی گئی۔ میں ایک لحظ میں پہچان گیا۔ یہ چیتے کی آواز تھی۔ تاجور جلدی سے میری طرف کھسک آئی اور میرا بازو مضبوطی سے تھام لیا۔ تب چیتے کی تیز آواز دوسری مرتبہ ابھری۔ یہ شاید دوسرا چیتا تھا۔

تاجور لرزاں آواز میں بولی۔ ''یہ کیا ہے شاہ زیب؟''

وہ اتنی پاس تھی کہ میں نے اس کی کمر کو تسلی آمیز انداز میں تھپکا۔ ''کچھ نہیں......کوئی جانور ہے شاید۔''

''کون سا جانور ہے یہ......اور......یہاں کیا کر رہا ہے؟'' وہ پھر ہکلائی۔

''جو بھی ہے تاجور......لیکن میرا خیال ہے کہ ہمیں اس سے کوئی خطرہ نہیں۔''

چیتے اب مسلسل چلا رہے تھے۔ شاید دو نر آپس میں لڑ رہے تھے یا پھر یہ نر اور مادہ کی اٹکھیلیاں تھیں۔

تاجور نے سرگوشی کی۔ ''شاہ زیب! ایسی آواز تو......چیتوں کی ہوتی ہے......میں نے چڑیا گھر میں ایک دو بار سنی ہے۔''

''شاید چیتے ہی ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''جس طرح کچھ لوگ رکھوالی کے لیے کتے وغیرہ رکھتے ہیں......کچھ لوگ دوسرے جانور بھی رکھتے ہیں۔ یہاں پاس ہی ایک لکڑی کا پل ہے۔ میرا خیال ہے یہ جانور اس پل کی رکھوالی کے لیے رات کو چھوڑ دیئے جاتے ہوں گے۔ دن کے وقت تو ایسی کوئی آواز سنائی نہیں دی۔''

چیتوں کی آوازیں تو کچھ دیر بعد تھم گئیں، لیکن تاجور کا خوف برقرار رہا۔ اس نے میرا بازو مسلسل اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامے رکھا۔ اس کے ناخن میرے بازو کے بالائی حصے میں پیوست ہو رہے تھے۔ وہ اتنی قریب تھی کہ میں اس کی سانس کا لمس تک محسوس کر سکتا تھا۔

میں اس سے تسلی تشفی کے بول بولتا رہا۔ دھیرے دھیرے اس کا خوف کم ہو گیا۔ اس نے میرا بازو تو چھوڑ دیا لیکن میرا اور اپنا درمیانی فاصلہ بڑھانے کی ہمت نہیں کی۔ وہ ابھی تک اسی لباس میں تھی جس میں ہم تین دن پہلے کوٹلی سے روانہ ہوئے تھے۔ برقع کا زیریں حصہ ابھی تک اس کے جسم پر تھا لیکن بالائی حصہ ملنگنیوں کی کھینچا تانی میں کہیں گر گیا تھا۔ اس کی چوڑیوں کی کھنک مجھے اپنے بالکل قریب سنائی دے رہی تھی اور بدن کی مہک اپنی سب سے الگ پہچان رکھتی تھی۔ چند سال پہلے پیرس کے ایک نامور ترین عطار سے میرا واسطہ پڑا تھا۔ اس نے انڈر ورلڈ کے ایک بندے سے اپنی جان بچانے کے لیے میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا اور اسی سلسلے میں کچھ تحائف پیش کیے تھے۔ ان میں ایک نایاب پرفیوم بھی تھا۔ مجھ سمیت جس نے بھی اس پرفیو کا تجربہ کیا، اسے بے مثال قرار دیا تھا لیکن مجھے وہ پرفیوم بھی اس قدرتی...... کنواری مہک کے سامنے ہیچ محسوس ہوتا تھا جو چاند گڑھی کی اس الہڑ کے پیکر سے پھوٹتی تھی۔ اس میں کچی مٹی، گیلے پتوں، ادھ کھلے شگوفوں اور گندم کی بالیوں کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔

کوئی اور صورتِ حال ہوتی تو اس خاموش تاریکی میں تاجور کا یہ قرب میرے لہو میں چنگاریاں بھرنے لگتا لیکن اب معاملہ کچھ اور طرح کا تھا۔ پھر بھی یہ سچویشن مجھے بھلی لگی۔ کل کیا ہونا تھا، اس کا کچھ پتا نہیں تھا لیکن آج جو کچھ تھا، دلچسپ اور سنسنی خیز تھا۔

میں نے ذرا مزہ لینے کے لیے کہا۔ ”ویسے تو تاجور! اس بات کی اطلاع پرویز کے ذریعے چاند گڑھی تک بھی پہنچ چکی ہوگی کہ ریشمی ملنگی ڈیرے میں پھنسی ہوئی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ خبر یاسر بھائی تک بھی پہنچ جائے اور وہ مدد کے لیے کچھ کرے۔“

تاجور نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ہونے کو ہو بھی سکتا ہے۔ مدد کے لیے تو وہ ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہی ہے چند دنوں میں انہوں نے عالمگیر اور اسحاق وغیرہ کا زور کس طرح توڑا۔ عالمگیر اور تحصیل دار کو آپس میں ہی لڑایا اور جیل پہنچا دیا۔“

”ہاں، یہ بات تو ہے۔“ میں نے تائید کی۔

اچانک یوں لگا جیسے کوٹھڑی کی عقبی دیوار کے ساتھ کسی نے اپنا جسم زور سے رگڑا ہو۔ اس کے فوراً بعد چیتے کی لرزہ خیز پھنکار سنائی دی۔ اس مرتبہ آواز اتنی نزدیک تھی کہ تاجور بے ساختہ چلا کر مجھ سے لپٹ گئی۔ چند سیکنڈ کے لیے میں بھی پریشان ہوا لیکن اس بات کی تسلی تھی کہ جانور جتنا قریب بھی ہے لیکن کوٹھڑی کی پتھریلی دیوار کی دوسری جانب ہے۔

کچھ دیر بعد آواز فاصلے پر چلی گئی لیکن تاجور کا فاصلہ وہی رہا۔ اس نے اپنا چہرہ

میرے سینے میں چھپا رکھا تھا۔ اس کے جسم کا دلکش گداز میرے جسم میں منتقل ہو رہا تھا پھر وہ جیسے چونک کر مجھ سے جدا ہوئی اور کراہی۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے شاہ زیب! ہم کہاں پھنس گئے ہیں؟“

”حوصلہ رکھو۔ سب ٹھیک ہو گا۔“ میں نے کہا۔

میں ایک بار پھر اس کی ڈھارس بندھانے لگا۔ اس کا خوف کم کرنے کے لیے میں نے لالٹین پھر روشن کر دی اور بہت اصرار کر کے اسے دو کباب کھلائے۔ اسی دوران میں راہداری کی طرف کچھ آہٹیں ہوئیں پھر کوٹھڑی کا آہنی دروازہ کھلا۔ ملنگ پہریدار اونچی آواز میں بول رہے تھے۔ پھر انہوں نے کسی کو ننگی گالی دی اور زوردار دھکے سے کوٹھڑی میں پھینک دیا۔ اندر آنے والا اوندھے منہ گرا، یہ چاچا رزاق تھے۔ میں نے لپک کر انہیں اٹھایا اور بٹھایا۔ ان کے ہونٹوں سے خون رِس رہا تھا اور چہرے پر چوٹوں کے گہرے نشان تھے۔ چاچا کا پورا جسم خشک کیچڑ سے لتھڑا ہوا تھا۔ چاچا کی بیساکھی یعنی ہاکی ان کے ساتھ نہیں تھی۔ وہ کوٹھڑی سے باہر ایک ڈشکرے ملنگ کے ہاتھ میں تھی۔ شاید اس ہاکی کو بھی ہتھیار قرار دیا گیا تھا اور باہر ہی روک لیا گیا تھا۔

دروازہ مقفل کر کے پہریدار جس طرح آئے تھے اسی طرح دندناتے ہوئے واپس چلے گئے۔ تاجور سسکنے لگی۔ میں نے چاچا کو پانی پلایا۔ وہ لرز رہے تھے اور کراہ رہے تھے۔ چند منٹ بعد ان کی طبیعت ذرا بحال ہوئی تو میں نے اچھی طرح ان کا جائزہ لیا۔ کوئی بڑی چوٹ تو نہیں آئی تھی لیکن پورے جسم پر ضربات موجود تھیں۔ ان کا گریبان بھی ناف تک پھٹا ہوا تھا۔ ایک ضعیف شخص سے اس طرح کا سلوک ان لوگوں کی کم ظرفی کو ظاہر کرتا تھا۔

میں نے پوچھا۔ ”چاچا...... انیق کا کچھ پتا ہے؟“

”وہ بھی پکڑا گیا۔“ چاچا نے افسردگی سے کہا۔ ”بلکہ شاید مجھ سے پہلے ہی پکڑا گیا تھا۔“

”لیکن یہ لوگ اسے یہاں لے کر نہیں آئے۔“

”میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“ چاچا نے کراہ کر کہا۔

چاچا نے جو کچھ بتایا، اس سے پتا چلا کہ وہ چھپے نہیں تھے بلکہ بھاگنے کی کوشش میں ایک گڑھے کے اندر گر گئے تھے۔ اس گڑھے میں کیچڑ بھرا تھا۔ وہ وہیں دبک کر بیٹھے رہے، بس ان کا سر ہی کیچڑ سے باہر رہا۔ لمبی گھاس نے انہیں چھپائے رکھا، لیکن یہ پناہ گاہ تادیر انہیں بچا نہ سکی۔ جلد ہی ٹارچوں کی روشنی میں انہیں دیکھ لیا گیا اور کھینچ کر باہر نکال لیا گیا۔ یہی وقت تھا

جب ایک ملنگ کی باتوں سے یہ پتا چلا کہ انیق کو بھی ڈھونڈا جا چکا ہے۔
اب نیا سوال پیدا ہو رہا تھا کہ انیق کو یہاں کیوں نہیں پہنچایا گیا۔ کہیں وہ زیادہ زخمی تو نہیں تھا یا پھر اسے علیحدہ رکھ کر پوچھ گچھ کی جا رہی تھی۔
اگلے روز صبح سویرے ایک اور عجیب واقعہ ہوا۔ ہم نے سلاخوں میں سے دیکھا کہ تین چار پہریدار ایک شخص کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے ایک طرف لے جا رہے تھے اور یہ کوئی اور نہیں وہی لال انگارہ آنکھوں والا ملنگ رنگا نامی تھا۔ پتا نہیں کہ اس کا کیا قصور تھا۔ وہ تو ہمیں پکڑنے اور اس کوٹھڑی تک پہنچانے میں پیش پیش تھا۔ کچھ ہی دیر بعد ہماری حیرت میں اضافہ ہو گیا۔ جب ہمیں کسی قریبی کمرے سے کراہنے اور چلانے کی آوازیں آئیں۔ مجھے پہچاننے میں دشواری نہیں ہوئی۔ یہ اسی رنگا نامی ملنگ کی آوازیں تھیں۔ ''لگتا ہے کہ اسے چھڑی یا بید سے پیٹا جا رہا ہے۔'' چاچا رزاق نے کہا۔
''مگر کیوں؟'' تاجور نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔
اس ''کیوں'' کا جواب ہمیں تب تو نہیں ملا، مگر اگلے روز دوپہر کو مل گیا۔ اگلے روز دوپہر تک کا وقت ہم نے جس شدید کشمکش اور تفکر میں گزارا۔ وہ کچھ ہمیں ہی معلوم تھا۔ ہر گھڑی یہی لگ رہا تھا جیسے ہم ملنگی ڈیرے میں نہیں، کسی دور دراز جزیرے میں پھنس گئے ہیں اور وہاں ہر گھڑی انوکھے واقعات رُونما ہو رہے ہیں۔ میرے لیے کوئی اور پریشانی تو اتنی اہم نہیں تھی مگر انیق کے سلسلے میں، میں بھی فکر مند تھا۔ اسے پکڑے گئے دو دن سے زیادہ ہو چکے تھے مگر اس کے بارے میں کچھ خبر نہیں تھی جو پہریدار ہمیں اس یخ بستہ کوٹھڑی میں کھانا پہنچا رہے تھے، میں نے ان سے پوچھنے کی کوشش کی تھی لیکن وہاں سے جھڑکی کے سوا کچھ نہیں ملا تھا۔ اس دوران میں ایک موقع پر جب تاجور سوئی ہوئی تھی، لکڑی کے پل کی جانب سے ایک بار پھر پالتو چیتوں کی لرزہ خیز آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میں نے چاچا رزاق کو اس بارے میں بتایا۔ یہ موضوع چھڑا تو پھر اس خونی واقعے کا ذکر بھی ہوا جس میں ان جانوروں نے ایک جوان لڑکے کی جان لی تھی۔ چاچا ششدر رہ گئے......
خدا خدا کر کے یہ کفر ٹوٹا اور تیسرے روز دوپہر کے بعد ہمیں انیق کی شکل نظر آئی۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ بہتر لباس میں تھا۔ اس نے سفید شلوار قمیص پہن کر سیاہ رنگ کی گرم چادر اوڑھ رکھی تھی۔ اس کے ساتھ کوئی کھینچا تانی بھی نہیں ہوئی اور کوٹھڑی کا دروازہ کھول کر اسے ہمارے پاس اندر پہنچا دیا گیا۔ اس کے بائیں ہاتھ اور ایک رخسار پر چوٹ کا نشان تھا۔ ہاتھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ وہ میرے گلے لگ گیا۔ اس کے بعد چاچا رزاق

سے ملا۔

رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد ہم چاول کی چھال پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ انیق کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس کے پاس کچھ نہایت اہم قسم کی اطلاعات ہیں۔ اس نے تھوڑی سی تمہید باندھنے کے بعد کہا۔ ”شاہ زیب بھائی! ہم ایک بڑی مصیبت میں پھنس چکے ہیں۔ چوبیس گھنٹے پہلے تک ہم چاروں کی زندگیاں اتنے شدید خطرے میں تھیں کہ آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اب بھی...... خطرہ کم نہیں ہوا...... ہاں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ٹلا ہوا ہے۔ کتنی دیر تک ٹلا رہتا ہے؟ یہ ہمارے رویے پر ہے۔“

”کیسا رویہ؟“

”ہم مجاوروں کی بات مانتے ہیں یا نہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ ہمارے پاس ”نہیں“ کی گنجائش بہت کم ہے۔“ اس کی آواز گمبھیر تر ہوگئی۔

میں نے تاجور کی طرف دیکھا، اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ کوئی اور جگہ بھی نہیں تھی جہاں ہم بیٹھ کر بات کر سکتے۔ ہمارے لیے سب کچھ یہی کوٹھڑی تھی۔ سلاخوں کی دوسری جانب دونوں مسلح پہریدار حسبِ معمول موجود تھے اور عقابی نظروں سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ جیسے اس بات کا اندیشہ موجود ہو کہ ہم دھواں بن کر یہاں سے اڑ جائیں گے۔ میں نے تاجور کو اشارہ کیا۔ وہ اس لمبوتری کوٹھڑی کے آخری کونے میں جا کر بیٹھ گئی۔ ہم سرگوشیوں میں بات کرنے لگے۔ انیق نے کہا۔ ”پرسوں جب آپ ڈیرے کے اس خاص حصے میں آئے آپ نے کیا دیکھا؟“

میں نے بدقسمت لڑکے کے حصے بخرے ہونے والا واقعہ بیان کر دیا۔

وہ بولا۔ ”اس واقعے نے ڈیرے کے ملنگوں میں تھرتھلی مچا رکھی ہے۔ اس لڑکے کا نام اسامہ تھا۔ وہ لاہور کے ایک بڑے پولیس افسر کا بیٹا، یا شاید چھوٹا بھائی تھا۔ جس طرح ہم ریشمی کے لیے یہاں آئے ہیں، وہ بھی کسی لڑکی کے لیے یہاں آیا تھا۔ ان ملنگوں نے اسے مار ڈالا ہے اور ہمارے لیے بدترین بات یہ ہوئی ہے کہ ہم اس قتل کے گواہ بن گئے ہیں۔“

”یہ بات تو بے شک ہے۔“ میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

”اصل میں گواہ تو آپ ہی تھے اور وہ بھی اتفاقاً بنے۔ مگر اس کے بعد ان لوگوں سے حماقت ہوئی اور انہوں نے تاجور اور چاچا کو بھی گواہوں میں شامل کر دیا۔ میری بات سمجھ رہے ہیں نا آپ؟ جب آپ تینوں کو ایک ہی کوٹھڑی میں بند کیا گیا تو دوسرے لفظوں میں آپ

تینوں اس قتل سے باخبر ہو گئے۔"

"اور یہ حماقت کس نے کی؟"

"اسی...... لال آنکھوں والے ملنگ رنگا نے۔ اس بات پر اسے کافی ذلت بھی اٹھانی پڑی ہے۔" انیق نے کہا۔

میری نگاہوں میں وہی کل صبح والا منظر گھوم گیا۔ گرانڈیل رنگا کو گھسیٹ کر کہیں بند کیا گیا تھا اور بیدو وغیرہ بھی مارے گئے تھے۔

انیق بولا۔ "اب ایک طرح سے ہم چاروں ہی اس قتل کے گواہ ہیں، اور ہماری وجہ سے قتل کے ذمے دار پھانسی کے پھندے تک پہنچ سکتے ہیں۔"

صورتِ حال کی سنگینی کا احساس ہو رہا تھا...... اور جو بات انیق کہنا چاہ رہا تھا وہ بھی سمجھ میں آ رہی تھی۔ ایک اعلیٰ پولیس آفیسر کا بیٹا یا بھائی یہاں ہولناک طریقے سے قتل ہوا تھا اور باہر کے لوگوں میں سے ہمارے سوا کسی کو معلوم نہیں تھا کہ ایسا ہو چکا ہے۔

انیق نے کہا۔ "شاہ زیب بھائی! پرسوں رات تک تو یہی لگ رہا تھا کہ یہ لوگ ہم چاروں کو بھی مار کر یہیں کہیں گاڑ دیں گے اور قیامت تک کسی کو ہمارا کھوج نہیں ملے گا، لیکن پھر سچویشن بدلی۔ میں نے کوشش کی، اللہ نے بھی مدد کی اور حالات میں کچھ تبدیلی آئی، لیکن یہ تبدیلی کب تک رہے گی اس کا دارومدار اسی بات پر ہے کہ ہم کیا فیصلہ کرتے ہیں......"

"کوئی شرط رکھی ہے انہوں نے؟"

"شرط نہیں جی، شرائط ہیں، اور بہت کڑی، لیکن اگر ٹھنڈے دل سے سوچا جائے تو ہمیں جان کے فوری خطرے سے بچنے کے لیے یہ سب کچھ مان لینا چاہیے بلکہ اگر سچی بات پوچھیں تو میں تو دلی طور پر مان بھی چکا ہوں۔ اب آپ تینوں کا کیا فیصلہ ہوتا ہے یہ پتا نہیں۔"

"تم تجسس بڑھا رہے ہو، کھل کر بات کرو انیق۔"

انیق نے ایک نظر تاجور کی طرف دیکھا، پھر آواز مزید دھیمی کر کے کہا۔ "ہمیں پردے والی سرکار کا مرید بن کر یہاں رہنا ہوگا۔ ایک خاص چار دیواری میں، ہم وہاں سے نکل نہیں سکیں گے۔"

"کب تک؟" چاچا رزاق نے پوچھا۔

"اس سوال کا جواب ذرا سخت ہے۔ میں آپ کو بتانے کے بجائے کچھ دکھانا چاہوں گا۔"

"کیا مطلب تمہارا؟"

"میں نے بڑے مجاور کرنالی صاحب سے اجازت لے لی ہے۔ہم اس لاک اَپ سے باہر چلیں گے لیکن تھوڑی سی پابندی آپ کو سہنا پڑے گی۔میرا خیال ہے کہ یہ لوگ آپ کے ہاتھ پشت پر باندھیں گے۔واپس آکر کھول دیں گے۔"

"کون کون جائے گا؟"

"آپ چلے جائیں اور ساتھ چاچا رزاق کو لے لیں۔"

"لیکن میں تاجور کو یہاں اکیلا چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔"

"اس کے لیے بالکل فکرمند نہ ہوں۔ میں آپ کو پوری گارنٹی دیتا ہوں۔" اس نے بھرپور اعتماد کے ساتھ کہا۔

"نہیں، میں اس سلسلے میں کوئی رسک نہیں لے سکتا۔" میرا لہجہ حتمی تھا۔

انیق نے چند لمحے توقف کے بعد کہا۔"ٹھیک ہے، میں کوشش کرتا ہوں۔" اس نے باہر جا کر کچھ دیر پہریداروں کے لیڈر سے کھسر پھسر کی پھر واپس آ گیا۔اس نے بتایا کہ وہ راضی ہو گئے ہیں۔دوسری اچھی خبر یہ تھی کہ صرف میرے ہاتھ پشت پر جکڑے جانا تھے۔چاچا رزاق اور تاجور کو رعایت مل گئی تھی۔انیق وہ ہاکی بھی پہریداروں سے واپس لے آیا جس کے سہارے چاچا رزاق چلتے تھے۔

میرے ہاتھ پشت کی طرف موڑ کر ان میں خاص طرح کی ہتھکڑیاں پہنائی گئیں۔ یہ لوہے کے بجائے توت یا کسی اور مضبوط لکڑی کی بنی ہوئی تھیں۔ پہریداروں نے یہ کڑیاں کوٹھڑی میں پہنچائیں اور انیق نے معذرت کے ساتھ مجھے پہنا دیں۔اوپر گرم چادر کی بکل مار لی گئی تاکہ عام لوگ میرے بندھے ہاتھ نہ دیکھ سکیں، ہم انیق سمیت باہر نکل آئے۔ چار مسلح افراد کی معیت میں ہم کوٹھڑی سے نکلنے کے بعد ایک طویل راہداری میں سے گزرے۔ دو آہنی دروازوں میں سے گزرنے کے بعد چوکور شکل کے ایک وسیع چیمبر میں پہنچ گئے۔ چھت کوئی سات فٹ بلند تھی۔ٹیڑھی میڑھی پتھریلی دیواروں سے پتا چلتا تھا کہ یہ قدرتی جگہ ہے۔ بس دو چار جگہ آہنی گرلیں اور شیشے وغیرہ لگا کر اسے ہال کی شکل دے دی گئی تھی۔اس میں حجرہ نما کمرے بنے ہوئے تھے۔ ان حجروں میں آرام دہ گدوں اور فرنیچر سمیت تقریباً تمام ضروریاتِ زندگی نظر آ رہی تھیں۔ایک طرف نہانے کے لیے وسیع تالاب تھا جس میں کسی گرم چشمے کا بھاپ دیتا ہوا پانی داخل ہوتا تھا۔ یہاں ہمیں کچھ ایسے مرد و زن نظر آئے جنہوں نے اچھے قیمتی لباس پہن رکھے تھے لیکن ایک تعجب خیز بات تھی، وہ سب کے سب لنگڑا کر چل رہے

تھے۔ ہر ایک کی بائیں ٹانگ میں ہلکا سا لنگ موجود تھا۔ یہ لوگ یہاں کھا پی رہے تھے۔ کچھ عبادت میں مصروف تھے۔ ان میں زیادہ تر عورتیں ہی تھیں، تاجور ایک دم سہم سی گئی۔ چاچا رزاق بھی حیرت زدہ نظر آنے لگا۔ "میرا سر چکرا رہا ہے۔" تاجور کراہی۔

ہم نے اسے تالاب کے کنارے ایک آرام دہ گدے پر بٹھا دیا۔ انیق نے اسے پانی پلایا۔ وہ ستون سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گئی۔ اس کے زرد چہرے پر سوال ہی سوال تھے۔ میں انیق اور چاچا رزاق تھوڑے فاصلے پر جا کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے کہا۔ "یہ سب کیا ہے انیق؟"

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "شاہ زیب بھائی! کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا پڑتا ہے۔ ان خطرناک لوگوں سے اپنی زندگی بچانے کے لیے، ہمیں اپنی آزادی کھونا پڑے گی۔ ہمیں یہیں رہنا پڑے گا۔"

"اس جیل میں؟"

"ہاں، اب سب کچھ آپ کے سامنے ہی ہے۔ بے شک ہے تو یہ جیل ہی لیکن بہت آرام دہ۔ زندگی کی ہر سہولت ہمیں یہاں ملے گی۔"

"کب تک رہنا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے کہا تھا نا کہ اس سوال کا جواب ذرا سخت ہے۔ اب آپ خود ہی سمجھ لیں، مگر یہ بھی کہتے ہیں کہ امید پر دنیا قائم ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مستقبل قریب یا مستقبل بعید میں کوئی تبدیلی آ جائے۔"

"یہ...... یہ تم کیسی باتیں کر رہے انیق۔" چاچا رزاق جھلا کر بولے۔ "تم یہ کہہ رہے ہو کہ ہمیں یہاں بند کر دیا جائے گا......؟ چند مہینوں کے لیے یا پھر چند سالوں کے لیے؟" آخری الفاظ کہتے کہتے ان کی آواز بیٹھ گئی۔

"فی الحال تو زندگی بچانے کا اس کے سوا اور کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا۔" انیق نے گمبھیر لہجے میں جواب دیا۔

"ہمارا قصور کیا ہے؟ ہم نے کیا گناہ کیا ہے؟" چاچا کی آواز بلند ہو گئی۔

میں نے انہیں دھیمی آواز میں بولنے کو کہا کیونکہ چند قدم دور کھڑے پہریدار چونک کر ہمیں دیکھنے لگے تھے۔

میرے ذہن میں ایک سوال بری طرح کلبلا رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "یہاں سارے لوگ لنگڑا کر چل رہے ہیں۔ یہ کیوں؟"

وہ بجھے بجھے سے لہجے میں بولا۔ ''اس کا جواب وہی ہے جو آپ کے ذہن میں بھی آرہا ہے۔ ان کو ایسا کر دیا گیا ہے۔''

''یعنی...... ٹانگ کا نقص جان بوجھ کر پیدا کیا گیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔ انیق نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں سناٹے میں تھا۔ چاچا رزاق کا رنگ بھی مزید پھیکا پڑ گیا تھا۔

میں نے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے...... کہ اگر ہم یہاں رہتے ہیں تو...... ہمارے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوگا؟''

''میں ابھی اس بارے میں یقین سے تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ بڑے مجاور آپ کو رعایت دینے پر تیار ہو جائیں۔''

''آپ سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

''یعنی آپ تینوں کو۔''

''کیا مطلب ہے انیق۔ کیا تمہارا معاملہ الگ سے ہے؟''

وہ سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ''ابھی تو الگ سے ہی ہے۔ مگر ہو سکتا ہے کہ کچھ عرصے بعد آپ سے بھی کچھ رعایتیں ہو جائیں اور آپ کو وہاں اوپر ''سائے'' میں جگہ دے دی جائے۔''

''سایہ؟ یہ کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

انیق ہمیں چند قدم چلا کر اس چیمبر کی بڑی بڑی آہنی کھڑکیوں میں سے ایک کھڑکی کے پاس لے آیا۔ میں نے کھڑکی میں سے دیکھا۔ دوسری جانب ایک سرسبز ڈھلوان پر بڑی خوب صورت جگہ نظر آرہی تھی۔ یہاں کھلا آسمان تھا۔ پھول پودے تھے۔ چھوٹے چھوٹے دو تین آبشار دکھائی دے رہے تھے۔ پھل دار درختوں کے نیچے لکڑی اور پتھروں کے خوب صورت گھر بنے ہوئے تھے۔ ان گھروں میں برقی روشنی نظر آرہی تھی جو یقیناً جنریٹرز کی مدد سے حاصل کی گئی تھی۔ غالباً وہاں ٹی وی اور فریج جیسی سہولتیں بھی موجود تھیں۔ مرد و زن وہاں آزادانہ پھر رہے تھے۔ غور سے دیکھا تو ایک دو ایسی شکلیں بھی نظر آئیں جو اوپر مزار پر مست ملنگ تھیں۔ وہاں ان لوگوں نے پھٹے پرانے کمبل اوڑھ رکھے تھے مگر یہاں بڑے آرام دہ لباس زیب تن کیے ہوئے تھے۔ چند بچے بھی ہنستے کھیلتے دکھائی دیے۔

انیق بولا۔ ''اس جگہ کو یہاں سایہ کہتے ہیں۔ یعنی یہ جگہ پردے والی سرکار کے قریب ان کے سائے میں ہے۔''

''تو تم یہاں نہیں...... اوپر وہاں رہو گے؟'' چاچا رزاق نے چبھتے ہوئے آزردہ لہجے

میں کہا۔

''ہاں چاچا! عارضی طور پر تو یہی انتظام ہو رہا ہے۔ میں آپ کو بتا رہا ہوں نا کہ اگر زندگی بچ گئی تو ہم بعد میں کسی وقت ''اچھے'' کی امید بھی کر سکتے ہیں۔ باقی یہاں سے نکلنے والی بات ابھی دماغ سے نکال دیں۔ میں نے پچھلے دو تین دن میں یہاں بہت کچھ سمجھا ہے۔ آپ بھی بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ یہاں اس چیمبر میں بھی آپ کو کوئی دقت نہیں ہونے والی۔ آپ کی ہر ضرورت پوری ہو گی۔ گاہے بگاہے آپ ریشمی سے بھی مل سکیں گے۔''

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''آپ کے لیے بھی کسی طرح کا کوئی پرابلم نہیں ہو گا شاہ زیب بھائی۔ وہ بندہ بشارت بھی ہوش میں آ گیا ہے جو آپ کی چوٹ کی وجہ سے بے ہوش ہوا تھا۔ میں نے کرنالی صاحب سے اس سلسلے میں خاص طور سے بات کی ہے۔ آپ کو ان دو بندوں کی وجہ سے کسی طرح کی پوچھ گچھ کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ تاجور کے سلسلے میں بھی آپ کو کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔ وہ آپ کے ساتھ آپ کی آنکھوں کے سامنے یہاں رہے گی۔ چاہے تو وہ چاچا رزاق کے ساتھ رہ سکتی ہے اور اگر...... چاہے تو اسے آپ کے ساتھ رہنے کی اجازت بھی مل سکتی ہے۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے انیق کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔

چاچا رزاق نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مجھے تمہاری کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔ یہ سب کیسے ہو سکتا ہے؟ ہم سب کے پیچھے ہمارے گھر والے ہیں۔ اب تاجور بیٹی کو ہی لو۔ دین محمد اور اس کی گھر والی چند دن بھی اس کے بغیر نہیں نکال سکتے اور......''

''چاچا! بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔'' انیق نے ذرا سختی سے چاچا کا جملہ کاٹا۔ ''یہاں کچھ بھی ہماری مرضی سے نہیں ہو رہا۔ یہ ہمیں کرنا پڑ رہا ہے اور کرنا پڑے گا۔ خدا کا شکر کرو کہ جانیں بچانے کے لیے ایک راستہ نکل رہا ہے ہمارے لیے......''

''اس سے تو نہ بچیں جانیں۔ مار دیں یہ لوگ ہمیں۔ ہمارا قصور ہے تو کر دیں ہمیں ذبح۔'' چاچا رزاق کے لہجے میں شدید تپش تھی۔

میں نے ایک بار پھر چاچا کو آہستہ بولنے کے لیے کہا۔ مجھے لگتا تھا کہ ریشمی کے حوالے سے پے در پے صدموں کے بعد اب چاچا رزاق زندگی سے عاجز آتے جا رہے ہیں۔ جیسے طویل بیماری سے تنگ آ کر کوئی بھلا مانس شخص خودکشی کا سوچنے لگے۔

انیق نے کہا۔ ''چاچا! تمہیں ٹھنڈے دماغ سے سوچنا چاہیے۔ اگر دیکھا جائے تو یہاں ہمارے دو بڑے ''جرم'' ہیں۔ پہلا تو یہ کہ ہم لڑکے کے قتل کے گواہ بن چکے ہیں اور دوسرا یہ کہ

ہم یہاں ایک نہایت غلط ارادے سے آئے تھے۔ کم از کم ان ملنگوں کے نزدیک تو یہ نہایت غلط ہی ہے۔ ہم یہاں اس لیے پہنچے تھے کہ ریشمی کو یہاں سے نکال سکیں اور ریشمی اب ان لوگوں کے لیے بڑی اہمیت اختیار کر گئی ہے۔ ان دونوں جرائم کے باوجود اگر یہ لوگ ہماری جان بخشی کے لیے تیار ہو گئے ہیں تو ہمیں شکر کرنا چاہیے۔ میں ایک بار پھر کہوں گا، زندگی بچ گئی تو پھر آگے جا کر ہو سکتا ہے، کوئی بہتر راستہ بھی نکل آئے۔"

اچانک میں چونک گیا۔ آہنی کھڑکی کی دوسری جانب مجھے ایک عجیب منظر نظر آیا۔ ایک خوب صورت پالکی دکھائی دی۔ اس پر ریشمی پردے پڑے تھے۔ پالکی یا ڈولی کی دونوں جانب دو دو طویل بانس تھے۔ ان بانسوں کو کم و بیش ڈیڑھ درجن لڑکیوں نے کندھوں کا سہارا دے رکھا تھا یہ جواں سال لڑکیاں نیلے چولوں میں تھیں اور سروں پر چادریں تھیں۔ تقریباً سبھی لڑکیوں کے گلے میں لکڑی کے موٹے دانوں کی مالائیں نظر آ رہی تھیں۔ پالکی کے بوجھ سے لڑکیوں کے جسم شاخوں کی طرح لچک رہے تھے۔

انہوں نے جھک کر پالکی ایک آبشار کے قریب رکھی۔ پردے اٹھے اور ایک طویل قامت شخص باہر نکل آیا۔ وہ سرتاپا ایک کامدار سفید لبادے میں ملبوس تھا۔ اس کے چہرے پر بھی ایک چمکیلی سفید چادر کا طویل گھونگھٹ تھا۔ اس کے اردگرد موجود لڑکیاں بالکل مؤدب کھڑی تھیں۔ ہم نے پہچان لیا۔ یہ وہی پردے والی سرکار تھی۔ پھر پالکی میں سے ایک اور سواری برآمد ہوئی۔ یہ لڑکی تھی۔ وہ ٹخنوں تک جاتے ہوئے ایک نیلے سلکی لبادے میں تھی۔ پالکی سے اترتے ہوئے اس کا کامدار آنچل ایک لحظے کے لیے اس کے سر سے ڈھلکا۔ وہ خوش شکل تھی۔ چاچا رزاق میرے پہلو میں کھڑے تھے۔ وہ بے ساختہ کربناک انداز میں چلائے۔ "ریشمی ...... ریشمی ...... میری بچی۔"

یہ سب کچھ دو چار سیکنڈ کے اندر ہی ہو گیا تھا۔ قریب کھڑے ایک پہریدار نے لپک کر چاچا رزاق کو دبوچ لیا اور ان کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ دوسرے پہریدار نے پھرتی سے کھڑکی کے طویل پٹ بند کر دیئے۔ کھڑکی سے پالکی کا فاصلہ کافی زیادہ تھا۔ یقیناً چاچا رزاق کی پکار اس کی بیٹی تک یا دیگر لوگوں تک نہیں پہنچی تھی۔

چاچا نے تڑپ کر اپنے ہونٹوں کو پہریدار کی مضبوط گرفت سے آزاد کرایا اور ایک بار پھر سینے کی پوری قوت سے پکارے۔ "ریشمی ...... میری ریشمی ......" ان کی آواز میں وہی کرب تھا جو ایک ایسے بدنصیب باپ کی آواز میں ہو سکتا ہے جس نے ایک طویل عرصے بعد اپنی گمشدہ جوان بچی کو دیکھا ہو۔ پہریدار نے چاچا رزاق کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ وہ ڈگمگا کر

گرے۔ گرتے ہوئے ان کی ہاکی گھوم کر پہریدار کے منہ پر لگی۔ وہ جیسے بھنا اٹھا۔ اس کے منہ سے گندی گالیاں، بے ساختہ ایک بوچھاڑ کی طرح نکلیں اور وہ چاچا رزاق پر پل پڑا۔ یہ نظارہ تکلیف دہ تھا۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔ میرے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے لیکن ٹانگیں تو آزاد تھیں اور میں ان ٹانگوں سے ہی ان ڈشکرے پہریداروں میں سے دو چار کی ہڈیاں توڑ سکتا تھا۔ میری بھرپور ٹھوکر پہریدار کے جبڑے پر لگی اور وہ اچھل کر دیوار سے ٹکرایا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر میری جانب دیکھا جیسے مجھ سے ایسی جرأت کی توقع اس نے نہ کی ہو۔ پھر وہ چنگھاڑ کر میری طرف آیا۔ اس بار میں نے ایڑی سے اس کی ناف کو نشانہ بنایا اور وہ دہرا ہو کر چاچا رزاق کے پہلو میں گرا۔ تکلیف کی شدت سے اس کا رنگ ہلدی ہو گیا تھا۔ دوسرے پہریدار نے عقب سے میرے سر پر رائفل کے دستے کا وار کیا، وہ میری بے خبری میں مجھے چوٹ لگانا چاہتا تھا لیکن اسے پتا نہیں تھا کہ روشنی اس کے عقب میں تھی اور سامنے دیوار پر اس کا سایہ بڑی وضاحت سے پڑ رہا تھا۔ میں نے جھک کر یہ وار بہ آسانی بچایا اور اس کے سینے پر سر کے عقبی حصے سے ضرب لگائی۔ وہ کربناک آواز کے ساتھ پشت کے بل گرم پانی کے حوض میں گرا۔ اس سے پہلے کہ پہلا پہریدار پھر مجھ پر جھپٹتا کئی دیگر "ملنگ پہریدار" اندر آ گئے اور انہوں نے لڑنے والے دونوں پہریداروں کو سنبھال لیا۔ اس سلسلے میں انیق نے بھی کردار ادا کیا اور اس لڑائی کو بڑھنے سے روک لیا۔ اس نے گرے ہوئے چاچا رزاق کو سہارا دے کر اٹھایا اور ان کے ہونٹوں سے بہنے والے خون کو روکا جو ان کی سفید داڑھی کو بھی رنگین کر چکا تھا۔ تاجور پتھر کا بت بنی کھڑی تھی۔ طیش میں آنے والے دونوں پہریداروں کو ان کے ساتھی باہر لے گئے تھے۔ تاہم ان میں سے ایک دو ایسے بھی تھے جو خونی نظروں سے مجھے گھور رہے تھے۔

○......❖......○

قریباً آدھ گھنٹے بعد میں، چاچا رزاق اور تاجور ایک بار پھر لاک اپ میں موجود تھے۔ میرے ہاتھ لکڑی کی ہتھکڑی سے آزاد کیے جا چکے تھے۔ چاچا رزاق کے ہونٹوں سے گاہے بگاہے خون رِسنے لگتا تھا۔ پالکی والے مناظر دیکھ کر ان کی حالت عجیب ہو چکی تھی۔ اب اس بات میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ ہم نے شاندار پالکی سے اترنے والے جس طویل قامت شخص کو دیکھا وہ "پردے والی سرکار" کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ وہ پالکی میں خوب صورت آواز والی ریشمی کے ساتھ سوار تھا۔ اس کے کیا معنی تھے؟ وہ اپنی شکل کیوں نہیں دکھاتا تھا؟ اس ملنگی ڈیرے پر در پردہ کیا ہو رہا تھا؟ یہ اور ان جیسے بے شمار سوال ذہن میں اٹھ رہے تھے۔

چاچا رزاق نے میری آنکھوں میں دیکھا اور سرسراتی آواز میں بولے۔ ''میں تمہیں ایک بات بتا دوں شاہ زیب! تمہارا یہ ساتھی منڈا ان لوگوں کے ساتھ مل چکا ہے۔ یہ دھوکا دے رہا ہے، تمہیں اور ہم سب کو۔ مجھے تو لگ رہا ہے کہ ہم یہاں پھنسے ہی اس کی وجہ سے ہیں۔''

''آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہو چاچا؟''

''اس لیے کہ میں کاکا نہیں ہوں۔ دنیا دیکھی ہے میں نے۔ یہ کہہ رہا ہے کہ ہم یہاں رہیں اور اپنا پیچھا بھول جائیں۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ اور...... میں سچی بات کروں گا۔ یہ تم کو بھی چوڑ کرنے کی کوشش کررہا ہے۔ کیا کہہ رہا تھا کہ تم چاہو اور تاجور چاہے تو تم یہاں اکٹھے بھی رہ سکتے ہو۔ کیا مطلب تھا اس بات کا؟ کیا وہ بھول گیا ہے کہ تم دونوں دین محمد کے ملازم ہو۔ ہو یا نہیں؟''

تاجور چونک کر میری طرف دیکھنے لگی۔ چاچا رزاق لاعلمی کی وجہ سے ایسی باتیں کر رہے تھے۔ انیق کے حوالے سے بھی انہیں کچھ پتا نہیں تھا۔ وہ اس بات سے بھی بے خبر تھے کہ جب انیق نے اس لاک اَپ میں پہلی بار ہمیں اپنی شکل دکھائی تھی تو اس نے اپنی آنکھ کے ایک خفیف اشارے سے ہی مجھے سب کچھ سمجھا دیا تھا۔ وہ یہاں لمبے عرصے تک رہنے کی جو باتیں کررہا تھا وہ صرف دکھاوے کی تھیں۔ اس کے ذہن میں کوئی تیز رفتار پلان تھا اور اس پلان کے تحت ہم کسی بھی وقت یہاں سے نکل سکتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں عنقریب یہاں ایک زلزلہ برپا ہونے والا تھا......

O......❖......O

تاجور کی آنکھوں میں مجھے حیرت آمیز اضطراب نظر آیا۔ یقیناً اس نے چاچا رزاق کی یہ بات سن لی تھی کہ ملنگی ڈیرے والوں نے مجھے آفر کی ہے کہ میں تاجور کے ساتھ رہ سکتا ہوں۔ تاجور کے چہرے پر برہمی کی ہلکی ہلکی سرخی دکھائی دینے لگی تھی یقیناً یہ برہمی ڈیرے والوں کے لیے ہی تھی اور شاید تھوڑی بہت انیق کے لیے۔

وہ میرے پاس آ کر بولی۔ "شاہ زیب! آخر یہ سب کیا ہے؟ ہم کون سا ایسا جرم کر بیٹھے ہیں اور یہ انیق؟ اس کی بھی کچھ سمجھ نہیں آ رہی......"

میں نے تاجور کے تاثرات دیکھے۔ اسے اب سب کچھ بتانا ضروری ہو گیا تھا۔ میں نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ چاول کی چھال پر میرے پاس ہی بیٹھ گئی، میں نے کہا۔ "تاجور! یہاں ملنگی ڈیرے پر ایک بہت سنگین واقعہ ہو چکا ہے اور قسمت کا پھیر یہ ہے کہ ہم اس واقعے کے چشم دید گواہ بن گئے ہیں۔"

"کیسا واقعہ؟"

"لاہور سے یہاں پہنچنے والے ایک لڑکے کو ان ملنگوں نے بیدردی سے قتل کر دیا ہے۔ وہ شاید یہاں اپنی کسی عزیزہ کے لیے آیا تھا۔ جیسے ہم یہاں ریشمی کے لیے آئے ہیں۔"

"کب ہوا یہ؟" تاجور نے لرزتی آواز میں پوچھا۔

"اسی دن جب میں سیڑھیاں اتر کر یہاں نیچے آیا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اس لڑکے کی لاش دیکھی۔ اسی دوران میں پہریداروں نے مجھے دیکھ لیا۔ انہوں نے مجھے اس طرح گھیرا کہ میں بھاگنے کی کوشش کرتا تو یہ سراسر خودکشی کے کھاتے میں آتا۔"

وہ حیرت سے سن رہی تھی۔ میں نے چیتوں والی بات گول کر دی، تاکہ تاجور کے خوف وہراس میں اضافہ نہ ہو۔

"اب...... کیا ہوگا؟" وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی۔

''مقتول لڑکا لاہور کے کسی بڑے پولیس آفیسر کا بیٹا تھا۔ ملنگوں نے اسے مار تو دیا ہے، پر اب بہت ڈرے ہوئے بھی ہیں۔ عین ممکن تھا کہ اس قتل کا نشان مٹانے کے لیے وہ ہم تینوں کو بھی مار ڈالتے لیکن انیق نے اس معاملے کو بڑی ہوشیاری سے سنبھالا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کی نیت پر شک کرنے کے بجائے ہمیں اس کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ اس نے ہماری موت کی سزا کو قید کی سزا میں بدلوا لیا ہے۔ اس نے یہ سب کیسے کیا ہے؟ یہ ابھی مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں، لیکن یہ ہے ویسے ہی جیسے میں کہہ رہا ہوں۔''

چاچا رزاق نے ذرا تلخ لہجے میں کہا۔ ''لیکن تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا ہے۔ اس غنڈے نے میرے سامنے تو تم سے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔''

''چاچا آہستہ بولو۔'' میں نے تیز سرگوشی میں کہا۔ ''ان پہرے داروں کے کان بڑے تیز ہیں اور وہ سامنے ہی بیٹھے ہوئے ہیں۔''

چاچا رزاق نے اپنی نیم سفید داڑھی کھجائی اور بے چینی سے پہلو بدلا۔ میں نے چاچا کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''میں، انیق کو اتنا ہی جانتا ہوں جتنا اپنے آپ کو۔ آپ اس بارے میں بالکل فکر مند نہ ہوں۔ فی الحال ہمیں صرف اس بات کی فکر کرنی چاہیے کہ ہماری زندگیوں کو لاحق خطرہ ٹل جائے۔''

میں سرگوشیوں میں دیر تک تاجور اور چاچا رزاق کو صورتِ حال کی نزاکت سمجھاتا رہا۔ ان کی بے چینی میں تھوڑا بہت فرق پڑا تھا۔ ان دونوں کو سب سے زیادہ فکر یہ تھی کہ اگر وہ جلد ہی یہاں سے نکل نہ سکے تو چاند گڑھی میں کیا طوفان مچے گا۔ تاجور کی آنکھوں میں بار بار آنسو جمع ہو رہے تھے۔

اگلے روز دوپہر کو ہمیں اسی پتھریلے چیمبر میں منتقل کر دیا گیا جس کی چھت صرف سات فٹ اونچی تھی اور جس کی ایک دیوار میں بڑی بڑی آہنی کھڑکیاں لگی ہوئی تھیں۔ انہی وزنی، زنگ آلود کھڑکیوں کی دوسری جانب وہ خوب صورت جگہ تھی جسے یہاں ''سایہ'' کہا جاتا تھا۔ پتھریلے چیمبر میں داخل ہونے کا واحد راستہ ایک چھوٹا سا تنگ دروازہ تھا۔ ہم اس میں سے جھک کر بمشکل گزرے۔ لوہے کا وزنی دروازہ ہمارے پیچھے بند ہو گیا۔ دروازہ بے شک لوہے کا تھا لیکن اس پر باہر کی طرف چار پانچ چپٹے پتھر اس طرح جوڑ دیئے گئے تھے کہ دروازہ بند ہونے پر اس تنگ راستے کی نشاندہی مشکل ہو جاتی ہوگی۔ باہر سے یہ پتھریلی دیوار ہی دکھائی دیتی ہوگی۔ ہمیں یہ پتا بھی چلا کہ اس چیمبر کو ''جنگلارے'' کا نام دیا جاتا ہے۔ شاید یہ لفظ جنگلے

سے نکلا تھا۔

چیمبر کے اندر کا منظر وہی تھا جو ہم پہلے بھی دیکھ چکے تھے۔ یہاں کم و بیش تیس مرد و زن رہائش پذیر تھے۔ ان میں سے دس بارہ افراد جوڑوں کی شکل میں تھے۔ باقی انفرادی طور پر رہ رہے تھے۔ زیادہ تر افراد کا تعلق آزاد کشمیر یا سیالکوٹ وغیرہ کے علاقوں سے ہی لگتا تھا...... وہ یہاں قیدیوں کی حیثیت سے موجود تھے مگر لگتا تھا کہ اب یہاں کے روز و شب انہیں راس آ چکے ہیں۔ چند ایک کے سوا سب ہی مطمئن دکھائی دیتے تھے۔ جو بات چونکاتی اور پریشان کرتی تھی، وہ یہی تھی کہ وہ سب کے سب لنگڑا کر چلتے تھے اور انیق نے بتایا تھا کہ ان کی چال کا یہ نقص پیدا کیا گیا ہے۔ میں جانتا تھا کہ اس حوالے سے تاجور کی زبان پر بھی کوئی سوال آنے والا ہے۔ میں نے خود کو اس سوال کے لیے تیار کر رکھا تھا...... ہمیں رہنے کے لیے دو حجرے دیئے گئے تھے۔ دونوں بالکل ساتھ ساتھ تھے۔ ایک حجرہ تاریک تھا اور دوسرے کے اندر روشنی ہو رہی تھی۔ اس روشنی کی وجہ تھوڑی دیر بعد سمجھ میں آئی۔ یہاں خربوزے کی شکل کا ایک ایسا پتھر رکھا ہوا تھا، جو بے حد چمکیلا تھا اور اس چمک کی وجہ سے حجرے میں ہلکی سی روشنی محسوس ہوتی تھی۔ حجروں کا فرش قدرتی پتھر کا تھا۔ یہ ناہموار فرش مسلسل استعمال سے چکنے اور شفاف ہو چکے تھے۔ دونوں حجروں میں آرام دہ گدے بچھے ہوئے تھے، لکڑی کی ایک ایک الماری تھی اور ضروریات زندگی کی دیگر اشیا موجود تھیں، جن میں لباس، کھانے کے برتن اور پانی کے کولر وغیرہ شامل تھے۔

چاچا رزاق نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ”نوری یہاں بھی نظر نہیں آ رہی۔“

میں خود بھی نوری کے لیے پریشان تھا۔ غالب گمان یہی تھا کہ وہ پکڑی گئی ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ شاید وہ سیدھی چیمبر میں پہنچا دی گئی ہو، لیکن وہ یہاں بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے ایک پہریدار سے کہا۔ ”ہماری ایک اور ساتھی بھی تھی؟“

وہ پھنکارا۔ ”اپنی چونچ بند رکھو اور جو کہا گیا ہے، بس اس پر عمل کرو...... کھانا تمہیں پکا پکایا ملے گا، لیکن اپنے کمرے کی صفائی ستھرائی...... اور اپنے کپڑے برتن وغیرہ دھونے کی ذمے داری تمہاری اپنی ہوگی۔ نہانے اور پیشاب وغیرہ کے لیے وہ سامنے تالاب کے ساتھ ساتھ چوکیاں بنی ہوئی ہیں۔ بائیں طرف والی چوکیاں مردوں کے لیے اور دائیں طرف والی زنانیوں کے لیے ہیں۔“

جنہیں وہ چوکیاں کہہ رہا تھا، وہ چھوٹے چھوٹے غسل خانے تھے۔

ضروری ہدایات دینے کے بعد پہریدار مجھے کڑی نظروں سے گھورتا ہوا باہر چلا گیا۔

اس کے گھورنے کی وجہ یقیناً وہی کل والا واقعہ تھا۔ میں نے اپنے ہاتھ بندھے ہونے کے باوجود دو پہریداروں کی ٹھکائی کر دی تھی...... اوراس سے پہلے بھی میں اوپر سیڑھیوں پر ان کے دوساتھیوں کوزخمی کر چکا تھا۔

چاچا نے فکر مند لہجے میں کہا۔ ''کہیں اس وچاری کڑی کے ساتھ کچھ ہو نہ گیا ہو۔'' چاچا کا اشارہ نوری کی طرف تھا۔

''آپ پریشان نہ ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ جلد ہی انیق سے ملاقات ہوگی اور وہ ہمیں صحیح پوزیشن بتا دے گا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ کسی وجہ سے ڈیرے پر واپس ہی نہ آئی ہو...... اور ابھی تک بچی ہوئی ہو۔''

''لیکن اس کو آنا تو تھا نا۔'' تاجور نے روہانسی آواز میں کہا۔

''ہمیں اچھے کی امید رکھنی چاہیے...... دعا کرنی چاہیے، اپنے لیے بھی اور اس کے لیے بھی۔'' چاچا رزاق نے کہا اور ہاکی دیوار کے ساتھ ٹکا کے گدے پر بیٹھ گئے۔ حجرے کے ادھ کھلے دروازے میں سے اس قید خانے کے کئی مکین پُرتجسس نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ صاف پتا چلتا تھا کہ وہ جلد از جلد ہمارے بارے میں جاننے کے خواہش مند ہیں۔

اس سے پہلے کہ ان میں سے کوئی ہمارے پاس آ بیٹھتا اور ''انٹرویو'' شروع کر دیتا ہمیں اس ''قید خانے'' کا مختصر دروازہ کھلتا نظر آیا۔ انیق جو ایک ریشمی کوٹ پہنے ہوئے تھا، جھک کر اندر آ گیا۔ کوٹ کے نیچے اس نے وہی نیلا چغہ پہن رکھا تھا جو ملنگوں کے پاؤں تک چلا جاتا تھا۔ اس کے سر پر ایک نیلی گول ٹوپی بھی تھی۔ اس ہیئت کذائی میں وہ عجیب لگا۔ اس کے پیچھے پیچھے گول چہرے والا وہی کرخت پہریدار تھا جو ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے گھورتا ہوا یہاں سے گیا تھا۔ پہریدار کے ہاتھ میں ایک لمبے عصا کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ میں نے دیکھا تھا کہ پہریدار اس چیمبر میں آتے وقت اپنے ہاتھ میں کوئی آتشیں ہتھیار نہیں رکھتے تھے۔

انیق نے رسمی کلمات ادا کیے اور پھر ہمارے حجرے میں بیٹھ گیا۔ ایک خدمت گار نے ہمارے سامنے فوراً چائے کی پیالیاں اور کچھ خشک میوے رکھ دیئے۔ انیق کے چہرے سے ظاہر تھا کہ وہ کوئی اہم بات کہنا چاہ رہا ہے اور اس کے لیے مناسب الفاظ تلاش کر رہا ہے۔ اس نے اپنے گلے میں موجود لکڑی کی تسبیح کو اپنی انگلیوں میں گردش دی اور گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔ ''شاہ زیب بھائی! کوئی جادو سا ہے یہاں کے ماحول میں۔ یقین کریں میں تو حیران رہ گیا ہوں۔ اتنا سکون ہے، اتنا امن ہے، یوں لگتا ہے کہ دنیا میں جنت کا مزہ مل رہا

ہے۔کل میں نے اوپر مزار کے سامنے جا کر پردے والی سرکار کا خطاب بھی سنا ہے، ان کی باتیں دل میں اترتی چلی جاتی ہیں۔''

''کیا یہی سب کچھ بتانے کے لیے یہاں آئے ہو؟'' چاچا نے تلخ لہجے میں پوچھا۔

''ہاں چاچا! بتانے آیا ہوں اور آپ سے ایک درخواست کرنے بھی آیا ہوں۔'' اس نے اپنے چغے کے اندر ہاتھ ڈالا اور ایک کتابچہ سا مجھے تھما دیا۔ کتابچے کا عنوان تھا۔''سرکار جی کی باتیں۔''

''یہ کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''شاہ زیب بھائی! آپ اس کو ایک بار تسلی سے پڑھیں ضرور۔ مجھے یقین ہے یہ سب کچھ آپ کے دل پر بھی ویسا ہی اثر کرے گا جیسا میرے دل پر کیا۔ مختصر بات کی جائے تو دنیا کے سارے غموں کا علاج ان چند صفحوں میں بتا دیا گیا ہے۔''

''یعنی تم ہمیں بھی اپنی طرح یہ نیلا چولا پہنانا چاہتے ہو؟'' چاچا رزاق نے پھر خشک لہجے میں کہا۔

''میں کچھ نہیں چاہتا چاچا، اور نہ ہی یہاں زبردستی کوئی آپ پر کچھ تھوپے گا۔ آپ کو جو کرنا ہے، اپنی مرضی سے کرنا ہے......''

انیق کے ساتھ آنے والا پہریدار چند قدم دور کھڑا تھا۔ ہماری اکثر باتیں اس کے کانوں تک بھی پہنچ رہی تھیں۔

تاجور نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔''اگر ہم اس مصیبت سے نکلنے کے لیے جھوٹ موٹ سرکار کے مرید بن جائیں اور تمہاری طرح نیلا چولا پہن لیں تو پھر......؟''

انیق نے بڑے وجدانی انداز میں اپنا سر دائیں بائیں ہلایا اور بولا۔''نہیں تاجور بہن! یہی تو کمال ہے سرکار جی کا۔ دلوں کا حال ان سے چھپا نہیں رہتا۔ آپ نیلا چولا نہ پہنیں، لیکن اگر آپ کے دل نے نیلا چولا پہن لیا تو سرکار جی کو فوراً پتا چل جائے گا، اصل بات تو ہمارے اندر کی ہوتی ہے اور اندر کی بات اندر کی آنکھ والے دیکھتے ہیں۔''

انیق کے کپڑے ایک انوکھی خوشبو میں بسے ہوئے تھے اور اس کے چہرے پر سرخی جھلکتی تھی۔ اسی دوران میں اس کے ساتھ آنے والے پہریدار کو کسی نے آواز دی اور وہ ہمارے حجرے کے سامنے سے پلٹ کر تالاب کی طرف چلا گیا۔ انیق نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا اور پھر بدلے ہوئے لہجے میں بولا۔''شاہ زیب بھائی! یہاں معاملہ خراب ہوتا جا رہا ہے۔ یہ خبیث پردے والی سرکار، ٹوٹے ہوئے چھتر کی طرح پھیلتی جا رہی ہے۔''

''کیا ہوا ہے؟'' میں نے بھی سرگوشی میں پوچھا۔

''میرے پاس تفصیل بتانے کا وقت نہیں ہے، بس یہ سمجھ لیں کہ ریشمی کی تلاش میں ہمارا یہاں آنا ریشمی کے لیے مصیبت کا سبب بن رہا ہے۔ پردے والی سرکار سمجھ گئی ہے کہ ریشمی کی تلاش میں یہاں لوگ آنا شروع ہو گئے ہیں اور وہ کسی بھی وقت اڑن چھو ہو سکتی ہے۔ وہ اس سونے کے انڈوں والی مرغی کو ہاتھ سے جانے نہیں دے سکتے۔''

''تو پھر؟''

''مجھے پتا چلا ہے کہ پردے والی سرکار ریشمی کو ازدواجی بندھن میں باندھنا چاہ رہی ہے۔ یہ بات تو شاید پہلے بھی چل رہی تھی مگر اب اس میں ایک دم تیزی آ گئی ہے۔ دوٹوک بات ہو رہی ہے اور شاید دو چار دن میں کوئی فیصلہ ہو جائے گا۔''

چاچا رزاق کا رنگ زرد ہو گیا۔ یوں لگا جیسے انہیں کچھ ہو جائے گا۔ میں نے ان کا ناتواں کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔ ''چاچا! حوصلہ رکھیں۔ ہمارے ہوتے ریشمی پہ کوئی آنچ نہیں آئے گی۔''

تاجور نے لرزتے ہاتھوں سے چاچا کو پانی پلایا۔ پہریدار اب کسی بھی وقت واپس آ سکتا تھا۔ میں نے انیق سے پوچھا۔ ''نوری کا کچھ پتا چلا ہے؟''

''نہیں بھائی! یہ لوگ کہتے ہیں کہ وہ واپس ڈیرے پر نہیں آئی۔''

''جھوٹ بول رہے ہیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''میں ٹوہ لگا رہا ہوں، آپ فکر نہ کریں۔'' اسی دوران میں عقابی نگاہوں والا پہریدار واپس پہنچ گیا۔ انیق نے لب و لہجہ پھر بدل لیا۔ سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ''سرکار جی کہتے ہیں، خوشی کا تعلق دولت اور آرام آسائش سے نہیں...... خوشی تو اپنے آپ کو فنا کر دینے میں ہے۔ سب کچھ چھوڑ دینے میں......'' وہ بول رہا تھا اور ہم سن رہے تھے...... میرے دماغ میں ہلچل تھی۔ اگر واقعی ریشمی کے ساتھ کچھ ہونے والا تھا تو پھر اسے روکے جانے کی ضرورت تھی۔

اسی دوران میں پہریدار نے اشارے سے انیق کو باہر بلایا اور اس کے کان میں کچھ کھسر پھسر کی۔ انیق نے اثبات میں سر ہلایا اور واپس ہمارے پاس آن بیٹھا۔ اس نے کہا۔ ''بڑے مجاور کرنالی صاحب کا حکم ہے کہ آپ تینوں کو اس ناخوشگوار واقعے کے بارے میں بالکل خاموش رہنا ہے۔ یہاں اس چیمبر کے کسی شخص سے اس بارے میں بات نہیں کرنی...... آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے۔ میں لاہوری لڑکے والی بات کر رہا ہوں۔''

میں نے انیق کو یقین دلایا کہ ایسا ہی ہوگا۔ کچھ دیر ہمارے پاس بیٹھنے کے بعد انیق

واپس چلا گیا۔ وہ غضب کا اداکار تھا۔ اس نے بڑی خوبی سے خود کو یہاں کے حالات میں ڈھالا تھا۔ لمبے نیلے چغے کوٹ اور ٹوپی کے ساتھ وہ واقعی کوئی مست ملنگ نظر آنے لگا تھا۔ جیسا کہ میں نے پہلے بتایا ہے، انیق کی خوبی یہ تھی کہ وہ عام قد کاٹھ اور عام شکل وصورت کا تھا۔ لوگوں میں گھلنے ملنے میں اسے بڑی آسانی رہتی تھی۔ کسی وقت اپنی شکل اتنی معصوم بنا لیتا تھا کہ اس پر کسی طرح کی چالاکی یا دھوکا دہی کا شبہ کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ انیق کی ایک اہم خوبی کا پتا مجھے ابھی پچھلے دنوں ہی چلا تھا...... یہ کہ وہ پنجابی کے علاوہ کئی دوسری علاقائی زبانیں بھی روانی سے بول سکتا تھا اور اس سے زیادہ حیرانی کی بات یہ تھی کہ انگلش کے علاوہ بھی اسے کچھ غیر ملکی زبانوں کی شدبد تھی۔ اس کے باوجود وہ بڑی معصومیت کے ساتھ چاند گڑھی میں پہلوان حشمت راہی کے ساتھ نثر اور شاعری کی بونگیاں مارتا تھا۔ ایسی ہی ایک نشست میں پہلوان نے اپنا ایک تازہ شعر بڑی سنجیدگی کے ساتھ سنایا تھا۔ سگریٹ کے پیکٹ پر لکھا ہوا یہ شعر کچھ اس طرح تھا۔ جب بھی مجھے اس سے اپنا رومانی سفر یاد آتا ہے......

شالامار، شاہی قلعہ اور چڑیا گھر یاد آتا ہے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ سفر کو صفر لکھا گیا تھا اور شاہی قلعہ کو شاہی کلا۔ اس کے باوجود انیق نے پہلوان کو کھل کر داد دی تھی۔

انیق کے جانے کے بعد میں اپنے حجرے میں چلا گیا اور بے چینی سے مختصر جگہ پر ٹہلنے لگا۔ انیق کی بات سمجھ میں آ رہی تھی۔ ہمارا یہاں پہنچنا، ریشمی کے لیے نیک فال ثابت نہیں ہوا تھا اور اب یہ لوگ اسے کسی بندھن میں باندھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مجھے ایک دن پہلے دیکھا ہوا وہ منظر یاد آیا، جس میں ہم نے ریشمی کو پردے والی سرکار کے ہمراہ ڈولی سے اترتے دیکھا تھا۔ اسی سے اندازہ ہو گیا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔

ریشمی خوش شکل تھی مگر کوئی ایسی حسین و جمیل بھی نہیں تھی۔ ''جوان ملنگنیوں'' میں شاید کچھ اس سے زیادہ خوب صورت ہوں۔ اصل میں ریشمی کی آواز ہی اس کے لیے وجہ مصیبت بن رہی تھی۔ اس آواز کی وجہ سے لوگ ملنگی ڈیرے کی طرف کھنچ کر آ رہے تھے...... اور ڈیرے والوں کی آمدنی میں بھی یقیناً اضافہ ہو رہا تھا۔

ریشمی کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے ہوتا تھا کہ اب اس کی آواز کی کیسٹس بھی فروخت ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ مجاوروں کو مستقبل قریب میں یقیناً ریشمی سے مزید فائدے کی توقع تھی۔

رات کو بھی میں دیر تک جاگتا رہا۔ دوسرے حجرے میں چاچا رزاق اور تاجور سوئے ہوئے تھے۔ پتا نہیں کہ وہ بھی سو رہے تھے یا جاگ رہے تھے۔ ماحول میں سناٹا تھا۔ بس کبھی

کبھار کسی حجرے سے کسی بوڑھے شخص کے کھانسنے کی آواز ابھرتی تھی اور بند چیمبر میں گونج کر رہ جاتی تھی۔ یہاں جو کچھ بھی تھا لیکن ایک سکون تو تھا کہ خونخوار لیوپارڈ چیتوں کی آوازیں سنائی نہیں دیتی تھیں۔ نیند آنے لگی تو میں ایک صاف ستھرا ڈبل کمبل اوڑھ کر سو گیا۔

صبح گھڑیال کی ایک زوردار آواز نے ہمیں جگایا۔ سونے اور جاگنے کے وقت کا تعین، گھڑیال کی یہی زوردار آواز کرتی تھی۔ چائے اور باقر خانی کا ناشتا تازہ اور مناسب تھا۔ میرے اور تاجور کے اصرار کے باوجود چاچا رزاق نے بس چائے کے دو تین گھونٹ لینے پر اکتفا کیا۔ ریشمی کا دکھ جیسے انہیں اندر سے توڑ پھوڑ رہا تھا۔

وہ کراہ کر بولے۔ ''مجھے کسی طرح اس پردے والی سرکار کے پاس پہنچا دو۔ میں اس کے پاؤں پکڑ کر اپنی دھی کی جان اس سے چھڑوا لوں گا۔''

میں نے کہا۔ ''چاچا! سمجھنے کی کوشش کریں، یہاں منت سماجت سے کچھ نہیں ہونے والا۔''

''اگر...... وہ منت سماجت سے نہیں مانے گا تو پھر...... میں مر جاؤں گا یا مار دوں گا۔'' چاچا نے جذباتی لہجے میں کہا۔

''لیکن چاچا...... اس سے پہلے ایک اور خاص بات ہے جو ہمارے لیے جاننا بہت ضروری ہے۔ کیا ریشمی بھی یہاں سے نکلنا چاہتی ہے؟ آپ جانتے ہی ہیں، تاجور نے اس سے ملاقاتیں کی ہیں لیکن وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوئی، بلکہ اس نے تاجور کو بھی اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی۔ لگتا ہے کہ وہ یہاں کے رنگ میں بری طرح رنگ گئی ہے۔''

میں نے سوالیہ نظروں سے تاجور کی طرف دیکھا۔ لٹیں اس کے چہرے پر جھول رہی تھیں۔ زرد رنگ کی ایک موٹی اونی شال اس کے کندھوں پر تھی۔ یہاں جنگلارے میں محبوس تمام افراد کے کپڑوں پر ایک چوڑی زرد پٹی تھی۔ یقیناً ٹانگ کے نقص کی طرح یہ پٹی بھی ان کی شناخت تھی۔ تاجور جیسے کسی سوچ میں گم تھی۔ کھوئے کھوئے انداز میں بولی۔ ''آپ کی بات ٹھیک ہے شاہ زیب! لیکن...... اب جو نئی صورتِ حال بن رہی ہے، شاید اس نے ریشمی کی سوچ پر بھی اثر ڈالا ہو۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ پردے والی سرکار کی زوجیت میں آنے والی بات؟''

تاجور نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''میں نے محسوس کیا ہے کہ ریشمی اس پردے والی سرکار کو اپنے کسی بڑے یا بزرگ کی سی حیثیت دیتی ہے۔ شاید بڑے مجاور کرنالی نے یا کسی دوسرے مجاور نے پہلے بھی ریشمی سے اس طرح کی کوئی بات کی تھی اور اسے پردے والی سرکار کے

نکاح میں آنے کو کہا تھا مگر ریشمی نے کہا تھا کہ وہ ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔''

تاجور کی بات میں وزن تھا۔ ریشمی سے دوسری ملاقات کے بعد تاجور نے یہ بھی بتایا تھا کہ ریشمی دنیاداری کے سارے معاملات سے دور نظر آتی ہے، مثلاً شادی...... بال بچے وغیرہ۔

ہماری گفتگو جاری ہی تھی کہ اس قید خانے کے تین ساتھی ہمارے پاس آ گئے۔ ان میں دو مرد اور ایک عورت تھی۔ عورت درمیانی عمر کی گوری چٹی تھی۔ مردوں میں سے ایک عمر رسیدہ اور دوسرا جوان تھا۔ عمر رسیدہ نے اپنا نام خدا بخش بتایا۔ جوان کا نام بھولا تھا اور وہ پانچ سال پہلے مظفر آباد میں معمار کا کام کرتا تھا۔ عورت دوسرے حجرے میں جا کر تاجور سے باتوں میں مصروف ہوگئی۔ خدا بخش اور بھولا، ہم سے بات چیت کرنے لگے۔ جلد ہی خدا بخش نے وہ سوال ہم سے پوچھ لیا جس کی ہم توقع کر رہے تھے۔ اس نے پنجابی میں پوچھا کہ ہم یہاں کیسے اور کیونکر آ پھنسے ہیں؟

کل ابیق نے ہمیں خاص طور سے ہدایت کی تھی کہ ہمیں لڑکے والے واقعے کے بارے میں کوئی بات نہیں کرنی۔ ہم یہ بات بھی نہیں کر سکتے تھے کہ ہم یہاں اس لڑکی کی رہائی کے لیے آئے ہیں جسے ''پاک بہن'' کہا جاتا ہے۔ ہم نے اس سوال کا جواب پہلے ہی تیار کر رکھا تھا۔ میں نے بتایا کہ ایک قریبی گاؤں میں میلے کے موقع پر ہمارا جھگڑا ملنگی ڈیرے کے لوگوں سے ہو گیا۔ اس لڑائی میں ڈیرے کے کچھ ملنگ اور دو ملنگنیاں زخمی ہوگئیں۔ سنا ہے کہ ان میں سے ایک ملنگ بعد میں مر گیا۔ یہ لوگ ہمیں اغوا کر کے یہاں لے آئے۔

باتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو طویل ہوتا چلا گیا۔ معلوم ہوا کہ یہاں موجود زیادہ تر مرد و زن وہی ہیں جو کسی وجہ سے پردے والی سرکار کے عتاب کا شکار ہوئے ہیں۔ ان کو رہا نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ان کے رہا ہونے سے ''سرکار جی'' کے بھید کھلتے ہیں۔ مثلاً بھولا نامی یہ نوجوان پانچ سال پہلے ملنگ بن کر یہاں آیا تھا۔ دراصل اس کی بیوی شادی کے صرف دس ماہ بعد فوت ہوگئی تھی۔ اس کے غم میں وہ نیم دیوانہ ہو گیا اور پھر سب کچھ چھوڑ کر اس ڈیرے پر پہنچ گیا۔ یہاں اس نے ڈھائی تین سال پردے والی سرکار کی محبت میں ڈوب کر گزارے لیکن پھر ایک دن وہ بدقسمتی سے ڈیرے کے ممنوعہ علاقے کی طرف چلا گیا۔ وہاں اس نے ایک خاص مجاور کو ایسی حالت میں دیکھ لیا کہ جو اسے ہرگز نہیں دیکھنا چاہیے تھا۔ نتیجے میں بھولے کو پکڑ کر اس زنداں میں ڈال دیا گیا۔

جو درمیانی عمر کی عورت دوسرے حجرے میں تاجور سے باتیں کر رہی تھی، وہ گوجرانوالہ

کی رہنے والی تھی، اس کا نام فہمیدہ تھا۔ چار پانچ سال پہلے وہ جوان اور خوب صورت تھی۔ وہ اولاد حاصل کرنے کی غرض سے ملنگی ڈیرے پر آئی تھی۔ مجاور کرنالی نے دو تین ماہ میں اس سے کئی ہزار روپیہ اینٹھا اور پھر ایک دن اسے روحانی عمل سے گزارتے گزارتے ''جسمانی عمل'' کی طرف لے آیا۔ بہت سی عورتیں یہ سب کچھ بھی برداشت کر جاتی ہوں گی لیکن فہمیدہ نہ کر سکی۔ اس نے کرنالی کا سر پھوڑ دیا اور نیم برہنہ حالت میں زائرین کے سامنے آنے کی کوشش کی۔ نتیجہ یہ تھا کہ اب وہ چار پانچ سال سے یہاں سڑ رہی تھی اور حالات سے سمجھوتا کر چکی تھی۔ اسی طرح یہاں موجود ہر شخص کی ایک کہانی تھی۔

مجھے لگا کہ ہم واقعی ایک خوفناک جگہ پر آن پھنسے ہیں۔ اور اب ہمارا یہاں سے نکلنا کوئی آسان کام نہیں۔ چند روز پہلے جب ہم ریشمی کا کھوج لگانے کے لیے چاند گڑھی کے خوب صورت ماحول سے نکلے تھے تو بالکل اندازہ نہیں تھا کہ آگے جا کر یہ ''تلاش'' اتنی سنگین صورتِ حال کا سبب بن جائے گی۔

تاجور اب حجرے میں موجود نہیں تھی۔ اس لیے میں نے خدا بخش سے وہ سوال کیا جو کافی دیر سے کرنا چاہ رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''بزرگو! آپ لنگڑا کر چل رہے ہیں۔ یہاں تقریباً سارے لوگ ہی لنگڑاتے ہیں...... یہ کیا ہے؟''

خدا بخش نے گہری سانس لی۔ ''پٹھا کاٹ دیتے ہیں یہ لوگ۔''

''پٹھا؟ کیا مطلب؟''

''میں تمہیں ڈرانا نہیں چاہتا پتر! لیکن سچ یہی ہے کہ تمہارے ساتھ بھی یہ سب کچھ ہونا ہے۔''

میں سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے دائیں بائیں نگاہ دوڑا کر اپنا لمبا اونی چولا، بائیں پنڈلی سے اٹھایا۔ گھٹنے سے نیچے پنڈلی کے پُر گوشت حصے پر ''کٹ'' کا پرانا نشان نظر آ رہا تھا۔ خدا بخش نے کہا۔ ''یہ لوگ ہرے گنے کے چھلکے سے ایک خاص طرح کا چاقو بناتے ہیں۔ اس چاقو سے ٹانگ کا ایک پٹھا کاٹ دیا جاتا ہے۔ پھر وہ شخص کبھی ٹھیک سے چل نہیں سکتا اور نہ تیزی سے بھاگ سکتا ہے۔ یہ ایک طرح سے یہاں کے قیدی کی نشانی ہوتی ہے۔''

''یہاں آنے کے کتنی دیر بعد یہ کام ہوتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بس ہفتے دو ہفتے کے اندر، لیکن ہو سکتا ہے کہ تمہارے ساتھ جو کڑی (لڑکی) ہے وہ بچ جائے۔ کیونکہ کسی کسی عورت کو یہ چھوڑ بھی دیتے ہیں، خاص طور سے جوان کو۔'' پھر وہ چاچا

رزاق کی طرف متوجہ ہوکر بولا۔ ''آپ کی ٹانگ تو پہلے ہی نقص والی ہے، آپ کو بھی کچھ نہیں کہا جائے گا۔''

خدا بخش کی بات کا مطلب یہ تھا کہ یہ سنگین عمل بس میرے ساتھ ہی ہوگا۔

بات کرتے کرتے خدا بخش رک گیا۔ اس نے دور سے پہریدار کو آتے دیکھ لیا تھا۔ اس تنومند پہریدار کا نام ہمیں بعدازاں جہاناں معلوم ہوا اور یہ پتا بھی چلا کہ وہ اس چیمبر کا انچارج ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا تھا کہ اس قید خانے کا داروغہ...... اسے اس بات پر سخت غصہ تھا کہ میں نے اپنے بندھے ہاتھوں کے باوجود اس کے دو ساتھیوں پر حملہ کیا اور انہیں چوٹیں لگائیں۔ وہ جیسے بدلہ لینے کے لیے کسی موقع کی تلاش میں تھا۔

فی الوقت وہ چاچا رزاق سے بات کرنے آیا تھا۔ پتا چلا کہ چاچا کی ملاقات ان کی بیٹی ریشمی سے کرائی جا رہی ہے۔ چاچا بڑی جذباتی کیفیت میں نظر آنے لگے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ جہانے نے انہیں تیار ہونے کا حکم دیا۔ جہانے کی ہدایت کے مطابق، غسل کے بعد انہوں نے زرد پٹی والا لمبا چولا پہنا اور اس کے اوپر نیلے رنگ کی گرم شال لی۔ جہانے کے کہنے پر انہوں نے اپنے لباس پر عطر وغیرہ بھی لگایا۔ کچھ دیر بعد وہ اپنی لاٹھی یعنی ہاکی کے سہارے چلتے ہوئے چیمبر سے باہر نکل گئے۔ ان کا رخ یقیناً اس پُرفضا، دلکش جگہ کی طرف تھا جسے یہاں ''سایہ'' کہا جاتا تھا۔

چاچا کی واپسی میں دیر ہوئی تو ہمیں فکر لاحق ہونے لگی۔ یہاں ہم میں سے کسی کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ تاجور نے کہا۔ ''دو گھنٹے ہونے کو آئے ہیں لیکن اب بھی وہ واپس نہیں آئے۔''

''آ جائیں گے جو کچھ بھی ہے لیکن ریشمی کی یہاں بہت اہمیت ہے اور وہ ریشمی کے باپ ہیں۔ ان کے ساتھ کوئی نامناسب سلوک نہیں ہو سکتا۔''

''یہ بھی تو نامناسب ہی ہے کہ انہیں ہمارے ساتھ اس جگہ قید کیا گیا ہے۔''

''یہ تو اب کی صورتِ حال ہے۔ کل کیا ہونا ہے کسے پتا......''

تاجور ایک بار پھر روہانسی ہو گئی۔ ''شاہ زیب! میرے اندازے کے مطابق ابا جی مجھے لینے کے لیے کوٹلی پہنچ چکے ہوں گے۔ ان پر کیا بیتے گی جب انہیں پتا چلے گا کہ میں اور نوری گھر میں موجود نہیں ہیں۔ عافیہ انہیں کیا جواب دے گی؟''

''ہو سکتا ہے کہ وہ انہیں اس ملنگی ڈیرے کے بارے میں بتائے، اور وہ ہمیں ڈھونڈتے ہوئے یہاں پہنچ جائیں۔''

تاجور کا رنگ مزید زرد ہو گیا۔ ''یہ تو اور بھی بری بات ہے۔'' وہ کراہی۔ ''یہ ملنگ انہیں بھی کسی مشکل میں ڈال سکتے ہیں۔''

''لیکن میرا خیال ہے تاجور کہ وہ اس معاملے کو اور نہیں بڑھائیں گے۔ کوئی ہمارے بارے میں پوچھنے آئے گا تو وہ ہماری موجودگی سے صاف انکار کر دیں گے اور سرخرو ہو جائیں گے۔''

تاجور کی آنکھوں کے کٹوروں میں اندیشوں کا پانی چمکنے لگا۔ میں نے تاجور کا ہاتھ تھام لیا اور اسے تسلی دینے لگا۔ اسی دوران میں چاچا رزاق واپس آتے دکھائی دیئے۔ وہ ہاکی ٹیکتے ہوئے چلے آ رہے تھے۔ جہاناں اب ان کے ساتھ نہیں تھا۔ چاچا کا چہرہ بس نارمل ہی نظر آ رہا تھا۔ وہ نرم گدے پر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ ''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔'' انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''کسی وقت لگتا ہے کہ وہ یہاں بالکل ٹھیک ہے۔ کسی وقت لگتا ہے کہ ٹھیک نہیں ہے، بس ظاہر کر رہی ہے کہ ٹھیک ہے۔''

''ایسا کیوں کہہ رہے ہیں آپ؟'' میں نے پوچھا۔

وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولے۔ ''میں تقریباً دو گھنٹے اس کے پاس بیٹھا ہوں۔ کھانا بھی کھایا ہے اس کے ساتھ۔ دیکھنے میں تو وہ بہت آرام میں لگتی ہے۔ پردے والی سرکار کی اور بڑے مجاوروں کی تعریفیں بھی کی ہیں اس نے۔ مگر اندر سے وہ بالکل بجھی ہوئی ہے۔ میری بچی ہے، میرے جگر کا ٹوٹا ہے۔ میں اس کے سارے اتار چڑھاؤ جانتا ہوں۔''

''کیا آپ کو مکمل تنہائی میں بات کرنے کا موقع نہیں ملا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں پندرہ بیس منٹ تنہائی کے بھی ملے مگر وہ کچھ خاص نہیں بولی۔ لیکن اگر......'' وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئے۔

میں نے ان کے بولنے کا انتظار کیا پھر کیا۔ ''آپ کچھ بتانے لگے تھے چاچا۔''

وہ چند سیکنڈ تذبذب میں رہنے کے بعد بولے۔ ''مجھے یوں لگا جیسے ریشمی کے منہ پر چپیڑ (طمانچے) کا نشان ہے۔ میں پھر کہتا ہوں شاہ زیب! وہ مجھ سے بہت کچھ چھپا رہی تھی۔ میں نے جب اس سے پوچھا کہ ''پردے والی سرکار'' تم سے نکاح کرنا چاہتی ہے تو اس نے بس گول مول سی بات کہی۔ بولی۔ ''کچھ اس طرح کی بات ہوئی تو تھی لیکن ابھی میں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا اور آپ کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کروں گی۔''

''اپنے خاوند پرویز کی موت کے بارے میں بھی اس نے کچھ کہا؟''

''نہیں، وہ اس بارے میں کچھ بھی سننا یا جاننا نہیں چاہتی۔ ہاں اپنی ماں اور دوسرے

رشتے داروں کے بارے میں اس نے باتیں کیں اور ان کا حال احوال پوچھا۔“

”آپ نے اس سے نوری کے بارے میں دریافت کیا؟“

”ہاں...... لیکن وہ کچھ نہیں جانتی۔ اسے تو یہ بھی پتا نہیں کہ بدھ کے روز جس لڑکے کو ڈیرے کے چیتوں نے مارا ہے وہ کون تھا؟ کہاں سے آیا اور کس قصور میں مارا گیا۔ ہاں وہ یہ جانتی ہے کہ ہم اس قتل کے گواہ بن گئے ہیں اور اس وجہ سے پردے والی سرکار نے ہمیں گرفتار رکھنے کا حکم دیا ہے۔ وہ تاجور کی وجہ سے بھی بہت پریشان تھی۔“

”آپ نے اس سے پوچھا کہ ہماری رہائی کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟“

”وہ اس بارے میں کچھ نہیں جانتی شاہ زیب، ہاں اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر وہ کوشش کرے تو ہمیں اس قید خانے کے اندر ہی کچھ سہولتیں مل سکتی ہیں......“

بات کرتے کرتے چاچا رزاق اچانک چونک گئے۔ ان کا ہاتھ اپنے نیلے چولے کی طویل بغلی جیب میں تھا۔ انہوں نے ہاتھ جلدی سے باہر نکالا۔ ہاتھ میں ایک تہ شدہ کاغذ تھما ہوا تھا۔ چاچا کے تاثرات سے اندازہ ہوا کہ وہ خود بھی اس کاغذ کی موجودگی سے بے خبر تھے۔

میں نے چونک کر دیکھا۔ آس پاس کوئی پہریدار موجود نہیں تھا۔ میں نے تہ شدہ کاغذ چاچا کے ہاتھ سے لے لیا۔ ”کہاں سے آیا یہ؟“ میں نے تیز سرگوشی میں پوچھا۔

”پتا نہیں۔“ وہ بوکھلائے ہوئے انداز میں بولے۔

میں نے تاجور کو اشارہ کیا، اس نے اٹھ کر حجرے کا دروازہ اچھی طرح بند کر دیا۔ لیمپ کی روشنی میں، میں نے کاغذ کی تہیں کھولیں۔ یہ دیکھ کر جسم میں سنسناہٹ محسوس ہوئی کہ یہ ایک خط تھا۔ سفید لائن دار کاغذ پر فونٹین پین سے باریک لکھائی میں لکھا گیا تھا۔ پہلی سطر پڑھتے ہی پتا چل گیا کہ یہ ریشمی کا خط اپنے اباجی یعنی چاچا رزاق کے لیے ہے۔ یہ سنسنی خیز تحریر کچھ یوں تھی۔

”اباجی! دعا کرتی ہوں کہ یہ خط حفاظت کے ساتھ آپ کے پاس پہنچ جائے اور آپ اسے پڑھ بھی لیں۔ میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ پچھلے سات آٹھ روز میں میری آنکھیں بہت اچھی طرح کھل گئی ہیں۔ میں سمجھ گئی ہوں کہ میں غلط راستے پر تھی۔ میں کرنالی صاحب اور پردے والی سرکار کو جو کچھ سمجھ رہی تھی، یہ وہ لوگ نہیں ہیں۔ ان کا اندر اب بالکل کھل کر میرے سامنے آ گیا ہے۔ جس شخص کو پردے والی سرکار کہا جاتا ہے، وہ مجھ سے نکاح کرنا چاہتا ہے اور مجھے لگتا ہے کہ اس کے لیے وہ مجھ سے زبردستی بھی کر سکتا ہے۔ مجھے یہ بھی پتا چلا ہے کہ دو لڑکیاں پہلے بھی بیوی کی طرح اس کے ساتھ رہتی ہیں...... ان میں سے بھی ایک کو اس نے

زبردستی بیوی بنایا ہے۔ میں آپ سے اور اپنے آپ سے بہت شرمندہ ہوں اباجی۔ میں غلط راستے پر تھی۔ میری وجہ سے آپ کو بہت دکھ پہنچے ہیں......اور اب اس سے بڑا دکھ اور کیا ہوگا کہ مجھے ڈھونڈتے ڈھونڈتے تاجور اور آپ ان ڈھونگیوں کے پاس آ پھنسے ہیں۔

''تاجور نے چند دن پہلے مجھے بتایا ہے کہ آپ کے ساتھ شاہ زیب نام کے کوئی بھائی صاحب ہیں۔ وہ ان پر بہت بھروسا کرتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ وہ ہر قسم کے حالات میں ہماری مدد کر سکتے ہیں۔ اللہ کرے وہ میری اور آپ سب کی مدد کر سکیں۔ میں سمجھ گئی ہوں یہ بڑے خطرناک لوگ ہیں۔ اپنی بات نہ ماننے والوں کے ساتھ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ میں یہاں سکون کے لیے آئی تھی اور مجھے سکون ملا بھی لیکن اب اصل باتوں کا پتا چلا ہے تو یہاں میرا دم گھٹنے لگا ہے۔ کسی وقت مجھے لگتا ہے کہ میری سانس بند ہو جائے گی اور میں مر جاؤں گی۔ اگر...... مجھے کچھ ہو گیا تو اباجی......آپ میرے گناہ معاف کر دیں۔ میں نے امی کو بھی بہت دکھ دیئے ہیں۔ آپ ان سے بھی کہنا کہ مجھے معافی دے دیں۔ فقط آپ کی بدنصیب بیٹی۔''

میں نے ریشماں کی یہ تحریر پہلے خود پڑھی، پھر دھیمی آواز میں چاچا رزاق اور تاجور کو بھی سنا دی۔

چاچا رزاق کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ خاص طور سے ان آخری فقروں نے چاچا کو بہت متاثر کیا جن میں اس نے اپنی موت کی صورت میں ان سے معافی مانگی تھی۔ چاچا ہچکیوں سے رونے لگے۔ بولے۔ ''تم کیوں معافی مانگتی ہو میری بچی، معافی تو ہمیں تجھ سے مانگنی چاہیے۔ ہم نے اپنی من مرضی کی۔ تیرے نہ چاہتے ہوئے بھی تیری شادی اس ظالم پیجا سے کر دی تجھے اپنے ہاتھوں سے دوزخ میں ڈال دیا۔ کاش ہم سے ایسا نہ ہوا ہوتا......''

چاچا رزاق نے گھٹنوں میں منہ چھپا لیا اور ہچکیاں روکنے کی کوشش کرنے لگے۔ تاجور اور میں انہیں دلاسا دینے لگے۔

وہ روتے روتے بولے۔ ''میں تم سے کہتا تھا نا کہ وہ بہت کچھ چھپا رہی ہے۔ وہ ہمیشہ سے ایسی ہی تھی۔ اس خیال سے کہ ہمیں دکھ نہ پہنچے اپنی بڑی سے بڑی تکلیف پر پردہ ڈال لیتی تھی۔ بچپن میں اپنا بخار تک ہم سے چھپاتی تھی۔ بڑی ہو گئی اور شادی ہو گئی تو شوہر کی ماریں کھاتی رہی لیکن ہمیں کچھ نہ بتایا۔ اس خبیث نے ٹھڈے مار مار کر اس کا بچہ ضائع کر دیا لیکن ہم سے کہا کہ سیڑھیوں سے گر گئی ہوں۔ کیا کیا بتاؤں اس کی باتیں۔ ابھی......ابھی میں نے کہا تھا نا کہ اس کے منہ پر چپیڑ کا نشان ہے۔ میں نے کہا تھا نا تمہیں۔'' چاچا کی آواز بیٹھ گئی اور وہ پھر سسکنے لگے۔

میں پیشاب کے بہانے غسل خانوں کی طرف چلا گیا اور وہاں ریشمی کا خط ضائع کر کے پانی میں بہا دیا۔ واپس آیا تو چاچا گدے پر نیم دراز تھے اور تاجوران کا اکلوتا پاؤں دبا رہی تھی۔ چاچا کا جھریوں بھرا چہرہ دکھ کی تصویر بنا ہوا تھا۔

رات کو ایک دم لڑائی جھگڑے کی آوازیں آنے لگیں۔ دو افراد آپس میں مار پیٹ کر رہے تھے۔ پھر دو مزید افراد ان میں شامل ہو گئے۔ چیمبر یعنی جنگلارے کا دروازہ کھلا اور پانچ چھ مسلح پہریدار اندر داخل ہو گئے۔ انہوں نے رائفلوں کے کندے اور لاٹھیاں مار مار کر لڑنے والوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کیا اور حجروں میں بند کر کے باہر سے تالے لگا دیئے۔ لڑنے والوں میں ایک اٹھارہ انیس سال کا دبلا پتلا لڑکا بھی شامل تھا۔ اس کا گریبان پھٹ گیا تھا اور ہونٹوں سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔

اندازہ ہوتا تھا کہ اس طرح کے لڑائی جھگڑے یہاں ہوتے رہتے ہیں۔ اگر جھگڑا شدید نوعیت کا ہو تو لڑنے والوں کو سزا بھی دی جاتی ہے۔

اگلے روز دوپہر کے وقت انیق سے ہماری ملاقات پھر ہو گئی۔ وہ اپنے حلیے سے یہاں کا سکہ بند ملنگ لگ رہا تھا۔ سر پر چوگوشا ٹوپی، لمبا نیلا چولا جو فرش پر گھسٹ رہا تھا۔ گلے میں دو تین رنگوں کی مالائیں۔ آج کلائیوں میں کڑوں کا اضافہ بھی نظر آ رہا تھا۔ یہ لکڑی کے کڑے تھے۔ اس کی آنکھیں سوجی سوجی تھیں۔ شاید دیگر ملنگوں کی طرح اس نے بھی بھنگ پی تھی۔ وہ سیدھا ہمارے پاس آیا۔ آج پہریدار بھی ساتھ نہیں تھا۔ لہٰذا ہم نظر بچا کر سرگوشیوں میں بات کر سکتے تھے۔

انیق نے کہا۔ ”میں کوشش کر رہا ہوں کہ یہاں آپ کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ آپ کے لیے ایک اچھی خبر ہے اور ایک بری۔ اچھی یہ کہ ان لوگوں نے تاجور بہن کو آراسی سے چھوٹ دے دی ہے۔“

”آراسی؟ یہ کیا چیز ہے؟“

”یہی ٹانگ کا پٹھا کاٹنے والا عمل۔ اسے یہاں آراسی کہتے ہیں۔“

”اور بری خبر؟“

”وہ آپ کو چھوٹ نہیں دے رہے۔ مگر میں کوشش کر رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ کامیابی ہو جائے۔ میں نے ان کو یہ رائے بھی دی ہے کہ آپ کو یہاں جنگلارے کا اندرونی نگراں مقرر کر دیا جائے۔“

”اندرونی نگراں؟ کیا مطلب؟“

''جس طرح جیلوں میں مقدم وغیرہ ہوتے ہیں، یہ قیدیوں کے اندر سے ہی ایسے سینئر قیدی ہوتے ہیں جو ساتھیوں کو کنٹرول کرتے ہیں۔ آپ نے مار کٹائی میں اپنی صلاحیت تو ثابت کر ہی دی ہے۔ اگر آپ کو آراسی سے چھوٹ دے دی جائے تو آپ سے مقدم والا کام لیا جاسکتا ہے۔''

''تو کیا کہتے ہیں یہ لوگ؟''

''کرنالی صاحب میری بات دھیان سے سنتے ہیں۔ شاید وہ مان جائیں۔''

میں نے کہا۔ ''تم نے ایک دو بار پہلے بھی کرنالی کا ذکر کیا ہے۔ لگتا ہے تم نے اسے شیشے میں اتار لیا ہے۔''

''بس یہی سمجھ لیں۔ ایک پرانے واقعے کی وجہ سے کچھ آسانی ہوگئی ہے مجھے۔''

''پرانا واقعہ؟'' چاچا رزاق نے پوچھا۔

چاچا کی آواز ذرا بلند تھی اس لیے ہم چونک گئے۔ دائیں بائیں دیکھا۔ کچھ دور وہی نوعمر لڑکا بیٹھا تھا جس نے رات کو جھگڑا کیا تھا۔ وہ اپنی چوٹوں کو چشمے کے پانی سے دھو رہا تھا۔ اس کی توجہ ہماری طرف نہیں تھی۔ میں نے چاچا کو اشارے سے سمجھایا کہ وہ دھیمے لہجے میں بولیں۔

''تم کس واقعے کی بات کررہے ہو؟'' میں نے انیق سے پوچھا۔

''بس ایک زبردست اتفاق ہوا ہے جس کی وجہ سے مجھے یہاں جگہ بنانے میں مدد ملی ہے...... یہ کوئی دو سال پہلے کی بات ہے۔ لاہور میں یہ مجاور کرنالی ایک دورے پر آیا تھا۔ قریباً دو مہینے اس نے لاہور کے ایک مزار پر ڈیرے ڈالے تھے۔ بہت سے لوگوں نے اس سے جھاڑ پھونک اور علاج معالجہ کروایا تھا۔ داؤد بھاؤ کی ایک ادھیڑ عمر ملازمہ تھی۔ اس کے سر میں رسولی تھی۔ ہر وقت تکلیف سے تڑپتی رہتی تھی۔ ڈاکٹر بے بس تھے۔ انہوں نے ایک طرح سے جواب دے دیا تھا۔ مجھے کسی نے کرنالی کا بتایا۔ میں حمیدہ کو اس کے پاس لے گیا۔ ہاں...... حمیدہ نام تھا اس کا۔ کرنالی نے اس کے ماتھے پر ایک تعویذ باندھا اور کوئی پاؤڈر سا پانی میں گھول کر پینے کو دیا۔ حیرت انگیز طور پر حمیدہ کا درد ٹھیک ہوگیا۔ وہ ہنسنے بولنے لگی۔ وہ اتنا خوش ہوئی کہ کرنالی کی تقریباً مریدنی بن گئی۔ اس نے چار پانچ تولے زیور بھی کرنالی کو دیا تھا۔ جب تک کرنالی لاہور میں رہا وہ ہر تیسرے چوتھے روز اسے سلام کرنے جاتی رہی۔ میں ہی اسے لے کر جاتا تھا۔''

''اب کہاں ہے حمیدہ؟''

''جہاں اسے ہونا چاہیے تھا...... قبر میں۔''
''یعنی مر گئی؟''
''بالکل...... اسے عارضی افاقہ ہوا تھا۔ کرنالی کے لاہور سے جانے کے کوئی دو ہفتے بعد ہی اس کی رسولی پھٹ گئی اور وہ اللہ کو پیاری ہو گئی۔''
''تو اس کو آرام کیسے آیا تھا؟''
''ڈاکٹروں کا یہی خیال تھا کہ اسے کوئی نشہ آور چیز دی جاتی رہی ہے جس کی وجہ سے اس نے اپنے آخری ڈیڑھ دو مہینے سکون سے گزار لیے، مگر رسولی جو شاید کچھ مہینے اور نہ پھٹتی، جلدی پھٹ گئی۔''
''تو اس بات سے فائدہ کیسے اٹھایا تم نے؟'' چاچا رزاق نے سرگوشی میں وضاحت چاہی۔
''جب پانچ دن پہلے ان لوگوں نے مجھے پکڑا تو سیدھا کرنالی کے پاس ہی لے کر گئے۔ میں نے کرنالی کو قریب سے دیکھا تو پہچان لیا اور کسی حد تک اس نے بھی پہچان لیا۔ میں اس کے پاؤں میں گر گیا اور اس کے منحوس ہاتھوں کو بار بار چوما اور ماتھے سے لگایا۔ میں نے کہا۔ ''مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ یہاں میری ملاقات آپ سے ہونے والی ہے۔ اگر پتا ہوتا تو میں سر کے بل چل کر آپ کے پاس آتا۔ میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ حمیدہ چنگی بھلی ہے اور دن رات آپ کو دعائیں دیتی ہے۔''
انیق کی بات اب کافی حد تک میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ میں بھی حیران تھا کہ انیق نے یہاں آتے ہی اتنی جلدی اپنی جگہ کیسے بنالی اور کس طرح ان لوگوں کا اعتماد حاصل کیا۔ یہ سب کچھ اس دو سال پہلے کی شناسائی کا نتیجہ تھا۔ انیق نے اس شناسائی کو بروقت اور ہوشیاری سے استعمال کیا تھا۔
وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''اب میں کرنالی کا بے دام کا غلام ہوں اور اس کے ایک اشارے پر اپنی جان بھی قربان کر سکتا ہوں۔''
میں نے پوچھا۔ ''یہاں تمہاری حیثیت کیا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ پابند ہو یا ڈیرے سے باہر جانے کی آزادی ہے؟''
''ابھی ڈیرا چھوڑنے کی آزادی تو نہیں ہے لیکن ڈیرے کے اس حصے میں ہر جگہ گھوم سکتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ جلد ہی اوپر مزار پر جانے کی اجازت بھی مل جائے گی اور پھر ہو سکتا ہے کہ کرنالی کی تسلی ہو جائے تو میں ڈیرے سے باہر بھی جا سکوں۔''

میں نے سرگوشیوں میں بات کرتے ہوئے انیق کو اس خط کے بارے میں بتایا جو ریشمی نے اپنے والد کی جیب میں ڈالا تھا۔ خط کے مندرجات سن کر انیق بھی حیران ہوا۔ اس نے کہا۔ ”میرا اپنا بھی یہی خیال تھا کہ ریشمی کے رویے میں جلد ہی تبدیلی آنے والی ہے۔ جہاں تک مجھے پتا چلا ہے، پردے والی سرکار چاہتی ہے کہ ریشمی کو جلد از جلد ڈیرے پر رہنے کا پابند کر لیا جائے اور اس کا طریقہ یہی ہے کہ اسے ازدواجی بندھن میں باندھا جائے جبکہ ریشمی اس کے لیے بالکل تیار نہیں۔ اس نے تو شاید ایک مرتبہ یہ بھی کہا تھا کہ پردے والی سرکار اس کے باپ کی طرح ہیں۔“

اسی دوران میں ہماری طویل گفتگو اختتام پذیر ہو گئی کیونکہ پہریدار جہاناں ٹہلتا ہوا ہماری جانب آ رہا تھا۔ انیق نے تیز سرگوشی میں کہا۔ ”اب میں شاید تین چار دن یہاں نہ آسکوں لیکن آپ فکر نہ کرنا۔ میں آپ کی طرف سے پوری طرح باخبر رہوں گا۔“

جہاناں خشمگیں نظروں سے انیق کو دیکھ رہا تھا۔ انیق ہمیں خدا حافظ کہہ کر واپس چلا گیا۔

اس نے تین چار دن بعد آنے کا کہا تھا مگر اگلے ہی روز وہ پھر جنگلارے میں آ گیا۔ چاچا اس وقت کمبل اوڑھے سو رہے تھے اور تاجور سامنے تالاب پر منہ ہاتھ دھو رہی تھی۔ میں نے دور ہی سے دیکھ لیا، انیق کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے۔ اس نے آتے ہی اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی اور بغیر سلام دعا کے بولا۔ ”میری ایک چھوٹی مالا نہیں مل رہی۔ کہیں وہ کل ادھر تو نہیں گری؟“

میں نے کہا۔ ”اگر گری ہوتی تو یہیں پر ہوتی......“

اس نے ایک بار پھر دائیں بائیں دیکھ کر اچانک اپنا لہجہ بدلا اور گمبھیر آواز میں سرگوشی کی۔ ”سوری شاہ زیب بھائی! میں ان لوگوں کو رضامند نہیں کر سکا۔ وہ آراسی کرنا چاہتے ہیں۔“

”کیا مطلب؟“

”وہی ٹانگ کا پٹھا کاٹنے والا معاملہ۔ آج رات کسی وقت وہ آئیں گے اور آپ کو جنگلارے سے باہر لے جائیں گے۔ پٹھا کاٹنے اور مرہم پٹی وغیرہ کرنے کے بعد آپ کو یہاں واپس پہنچا دیا جائے گا۔ رات کا جو کھانا آپ کو دیا جائے گا اس میں نشہ آور دوا ہو گی۔ آپ نیم بے ہوشی کی حالت میں چلے جائیں گے۔ اسی حالت میں آپ کو یہاں سے لے جائیں گے۔“

میں سناٹے میں رہ گیا۔ انیق نے کچھ مزید تفصیل بتائی۔

میں نے پوچھا۔ "سارے کھانے میں نشہ آور چیز ہوگی۔"

"جی ہاں۔" انیق نے جلدی سے جواب دیا۔ "بہتر ہے کہ آپ یہ کھانا نہ کھائیں۔ چاچا اور تاجور کو کھانے دیں۔"

شاید وہ کچھ اور بھی کہتا لیکن اسی دوران میں جہاناں ہمارے سر پر آن کھڑا ہوا۔ "مالا ملی یا نہیں؟" اس نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

انیق نے نفی میں جواب دیا۔ وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ "اس کی تلاشی لو۔ اس کی آنکھ میں سور کا بال نظر آتا ہے مجھے۔"

"نہیں جہانے، ان کے پاس نہیں ہے۔" انیق نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ جہانے کے ساتھ چلتا جنگلارے سے باہر جا چکا تھا۔

میرے ذہن میں آندھی سی چلنا شروع ہوگئی تھی۔ انیق جو کچھ بتا گیا تھا، وہ کافی تشویش ناک تھا۔ وہ مالا کے بہانے یہاں آیا تھا اور بات کی تھی، ممکن تھا کہ وہ کچھ اور بھی کہتا مگر جہانے کے آنے کے سبب اسے جانا پڑا۔

تاجور منہ ہاتھ دھو کر واپس آ چکی تھی۔ اس نے کھوجی نظروں سے میری جانب دیکھا۔

"کیا بات ہے شاہ زیب...... یہ انیق کچھ گھبرایا ہوا نظر آ رہا تھا؟"

"کچھ نہیں، اس کے گلے کی ایک مالا کہیں گر گئی ہے۔ اسے ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔" میں نے بات بنائی۔

"آپ کچھ چھپا تو نہیں رہے؟"

میں نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم سے بس ایک ہی چیز چھپائی تھی اور اس کا بھی تمہیں پتا چل گیا ہے۔" میں نے شہادت کی دونوں انگلیوں اور انگوٹھوں کو جوڑ کر دل کا نشان بنایا اور اسے دکھایا۔

تاجور نے چونک کر چاچا رزاق کی طرف دیکھا، ان کی آنکھیں بند تھیں۔ "خدا کا خوف کریں۔" وہ تیز سرگوشی میں بولی۔

"خدا کا خوف ہی تو کر رہا ہوں۔ ورنہ تم سے اتنا قریب رہتے ہوئے اتنا دور رہنا کتنا مشکل ہے، یہ کچھ میں ہی جانتا ہوں۔"

"مجھے لگتا ہے کہ آپ بات ٹالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

چاچا رزاق ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ "کون، کس کو مارنے کی کوشش کر رہا ہے؟" چاچا کے

چہرے پر ہراس ہی ہراس تھا۔

میں نے چاچا کے پاس جا کر انہیں تسلی دی۔ ''نہیں چاچا! ہم کوئی اور بات کر رہے تھے۔آپ پریشان نہ ہوں۔''

''ریشمی......کا کچھ پتا چلا؟'' وہ روہانسی آواز میں بولے۔

''وہ بالکل خیریت سے ہے۔ابھی انیق آیا تھا۔اس نے بتایا ہے۔'' میں ان سے تسلی تشفی کی باتوں میں مصروف ہو گیا لیکن دل و دماغ میں جو کچھ چل رہا تھا، وہ کچھ مجھے ہی پتا تھا۔

رات کا کھانا، آلو گوشت اور تڑکے والے چاولوں پر مشتمل تھا۔ میں جان چکا تھا کہ اس میں کوئی ایسی ''ٹرینکولائزر'' ملا دی گئی ہے جس کی وجہ سے ہم کچھ دیر کے لیے انٹاغفیل ہو جائیں گے۔ پروگرام کے مطابق میں نے معدے میں درد کا بہانہ بنایا اور صرف ایک دو لقمے چاولوں کے لیے۔ چاچا اور تاجور نے حسبِ معمول کھانا کھا لیا۔ آدھ پون گھنٹے تک تو وہ ٹھیک رہے اور مجھے شبہ ہونے لگا کہ شاید انیق کی معلومات پوری طرح درست نہیں ہیں لیکن پھر معلومات درست ہونے کے آثار پیدا ہو گئے۔ تاجور دیوار سے ٹیک لگائے لگائے سو گئی۔ چاچا رزاق جو سہ پہر کو بھی کافی دیر سوئے تھے پھر زوردار جماہیاں لینے لگے۔ وہ جیسے کمر سیدھی کرنے کے لیے پہلو کے بل لیٹے اور چند سیکنڈ کے اندر ان کے خراٹے پورے حجرے میں گونجنے لگے۔ یہ سب کچھ معمول کے مطابق نہیں تھا۔

میں نے اٹھ کر تاجور کے کندھے تھامے اور اسے بڑی آہستگی کے ساتھ گدے پر لٹا کر اس پر کمبل ڈال دیا۔ اس دوران میں وہ ذرا سا کسمسائی لیکن آنکھیں نہیں کھولیں۔ کھانے میں موجود نشہ اپنا اثر دکھا چکا تھا۔ میں اپنے حجرے میں پہنچا اور گدے پر پڑ کر بے سدھ ہو گیا۔ یہ ''بے سدھ ہونا'' دکھاوے کا تھا۔ میں اپنے اردگرد سے پوری طرح باخبر تھا۔ رات کے قریباً دس بجے ہوں گے جب مجھے اپنے حجرے سے باہر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ یہ ایک سے زیادہ افراد تھے پھر کسی نے مجھے ہلا جلا کر دیکھا۔ جہانے کی بھاری آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ''ہاں ٹھیک ہے، اٹھا لو۔''

چند افراد نے اپنے مضبوط ہاتھوں سے مجھے اٹھایا اور کسی اسٹریچر نما چیز پر ڈال دیا۔ اسٹریچر کو اٹھا کر حجرے سے باہر نکالا گیا اور پھر جنگلارے کے چھوٹے دروازے سے گزر کر ہم ایک پتھریلی راہداری میں آ گئے۔ میں سیدھا لیٹا تھا اور آنکھوں کی باریک جھری میں سے راہداری کی چھت کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ مجھے اسٹریچر پر لے جانے والے افراد

کی تعداد چار ہے۔ جہاناں بھی ان میں شامل تھا۔ مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں تھا کہ مجھے ابھی مزاحمت کرنی چاہیے یا نہیں۔ بہرحال مزاحمت کا فیصلہ تو میں کر چکا تھا۔ اسی دوران میں ہم ایک اور دروازے سے گزرے اور پھر ایک پتلی سی راہداری سے گزر کر ایک ہال نما کمرے میں آ گئے۔ اس جگہ کی چھت نسبتاً اونچی تھی یعنی آٹھ نو فٹ کے قریب۔ یہاں آتے ہی میرے نتھنوں میں دواؤں کی بو گھسی۔ اور یہ دیسی دواؤں کی نہیں، ایلو پیتھک دواؤں کی بو تھی۔ اسپرٹ، آیوڈین اور وکس وغیرہ۔ جہاں جہاں سے گزر کر ہم آئے تھے، وہاں لالٹینیں یا گیس لیمپس تھے، مگر یہاں برقی روشنی موجود تھی۔

''کتنی دیر میں فارغ ہو جائے گا؟'' جہانے کی پاٹ دار آواز میرے کانوں میں پڑی۔

''دو گھنٹے تک لے جانا۔'' ایک نسوانی آواز نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے جی۔ لیکن ذرا احتیاط رکھنا۔ خطرناک بندہ ہے۔ ہاتھ پاؤں بہت چلاتا ہے۔''

اس کے بعد قدموں کی چاپ سے اندازہ ہوا کہ مجھے یہاں لے کر آنے والے چاروں افراد باہر جا چکے ہیں۔ اب میرے ارد گرد دو افراد متحرک تھے۔ ان میں سے ایک تو ورزشی جسم والا ایک نوجوان تھا۔ دوسری کوئی لڑکی تھی۔ مگر مجھے ابھی تک اس کی شکل نظر نہیں آئی تھی۔ ہاں مالاؤں کی کھڑکھڑاہٹ اور کڑوں کی کھن کھن سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کوئی ملنگنی ہی ہے، لیکن ایک ملنگنی کا ڈاکٹری دواؤں کے درمیان کیا کام تھا؟

کچھ دیر بعد نوجوان نے اپنا رخ میری طرف پھیرا تو میں آنکھوں کی درزوں میں سے اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ گھنے بالوں اور ستواں ناک والا ایک دلکش نوجوان تھا۔ رنگ سرخ و سپید، شانے چوڑے، وہ کسی یونانی مجسمے کی طرح جاذب نظر تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ گجرات جہلم کی سائیڈ کا رہنے والا تھا۔ میں نے دیکھا تھا اور انیق نے بھی مجھے بتایا تھا کہ اس علاقے کے لوگ ایسی شکل و صورت کے مالک ہوتے ہیں۔ (بہرحال بعد میں وہ کراچی کا رہنے والا نکلا)

اسی دوران میں ملنگنی کی جھلک بھی مجھے دکھائی دی۔ اس نے چولا پہن رکھا تھا، گلے میں مالائیں اور ہاتھوں میں سفید دستانے دکھائی دے رہے تھے۔

''رضوان! باندھو اس کو۔'' ملنگنی نے کہا اور اس کے لب و لہجے نے مجھے یقین دلایا کہ وہ پڑھی لکھی ہے۔

اس کی عمر تیس سال کے لگ بھگ تھی۔ ماتھا چوڑا، کندھے فربہ اور شکل و صورت درمیانی

تھی۔اس کے چہرے پر مجھے چڑچڑا پن دکھائی دیا۔اس کی ہدایت کے مطابق رضوان نامی وہ خوبرو نوجوان میرے پاؤں کی طرف گیا اور اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ اس اسٹریچر کے ساتھ ایسی چرمی پٹیاں بھی لگی ہوئی ہیں جن کے ذریعے اسٹریچر پر لیٹے ہوئے شخص کے ہاتھ پاؤں باندھے جا سکتے ہیں۔نوجوان نے پہلے میرے دائیں پاؤں کو اسٹریپ میں کسنا چاہا۔اگر میں اب بھی حرکت نہ کرتا تو یہ بڑی بے وقوفی ہوتی۔میں آنکھوں کی درز سے اس جگہ کا حدود اربع کسی حد تک دیکھ چکا تھا۔دائیں طرف دروازہ تھا جو بند تھا۔چوڑے ماتھے والی ملنگنی کھڑکی کے قریب کھڑی تھی۔کھڑکی بھی بند تھی۔اس ہال نما کمرے میں کوئی اور متنفس دکھائی نہیں دیتا تھا۔یہی وجہ تھی کہ جب میں نے اوندھے لیٹے لیٹے اپنا سر اٹھایا اور اپنی بائیں ایڑی گھما کر خوبرو رضوان کی کنپٹی پر رسید کی تو وہ اپنی جگہ سے حرکت بھی نہیں کر سکا۔ضرب اتنی کاری اور ٹو دی پوائنٹ تھی کہ وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح قریبی صوفے پر گرا اور وہاں سے لڑھک کر فرش پر آ گیا۔

ملنگنی...... یا جو کوئی بھی وہ تھی چند لمحے کے لیے سکتہ زدہ رہ گئی اور یہ چند لمحے میرے لیے کافی سے زیادہ تھے۔میں نے جھپٹ کر اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔اس سے پہلے کہ وہ پورا منہ کھول کر چلاتی میں اس کی گردن کے ایسے حصے پر دباؤ ڈال چکا تھا کہ وہ منہ پورا کھلا ہونے کے باوجود آواز نہیں نکال سکی اور بس ایک لمبی آہ لے کر رہ گئی۔"تمہارا منہ کھلا ہے۔ چلاؤ اگر چلا سکتی ہو تو۔" میں نے بڑے اطمینان سے کہا۔

وہ بس میری گرفت میں مچل کر رہ گئی۔میری نگاہیں فرش پر لڑھکے ہوئے نوجوان پر تھیں۔وہ بے سدھ ہو چکا تھا۔میرے تجربے نے مجھے بتایا کہ وہ پانچ سے دس منٹ کے درمیانی وقفے میں ہوش میں آ جائے گا۔

ملنگنی نے اپنا منہ بند کر لیا تھا۔میں نے بھی اس کے گلے کی رگ پر دباؤ ختم کر کے ہتھیلی سے اس کا منہ ڈھانپ لیا۔اس نے ایک بار پھر پورا زور مارا۔اس کی چلائی ہوئی ٹانگ سے دواؤں کی کچھ بوتلیں فرش پر گر کر ٹوٹ گئیں اور کیمیکلز کی بو مزید بڑھ گئی۔

میں نے اسے اٹھا کر اوندھے منہ صوفے پر پٹخ دیا اور اپنا وزن اس پر ڈال دیا۔وہ میرے نیچے مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی۔اس کے چربیلے جسم میں کافی زور تھا۔مجبوراً مجھے اس کی کنپٹی پر بھی ایک جچی تلی ضرب لگا کر اسے نڈھال کرنا پڑا۔اس نے نیم بے ہوشی کی سی کیفیت میں ہاتھ پاؤں پھینک دیئے اور کراہنے لگی۔وہ نوجوان کی طرح مکمل طور پر انٹاغفیل نہیں ہوئی تھی۔مجھے ہر گھڑی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کوئی یہاں پہنچ نہ جائے۔میں نے سب سے

پہلے کپڑے کی ڈیڑھ انچ چوڑی میڈیکل ٹیپ کے ذریعے لڑکی کے ہاتھ مضبوطی سے اس کی پشت پر باندھے، اوراس کے ساتھ ہی اس کے منہ میں ایک کپڑا ٹھونس کر اوپر سے ٹیپ کے دو تین چکر دے دیئے۔

ہاتھا پائی میں اس کا نیلا اونی چولا اوپر کمر تک چڑھ گیا تھا اور ٹانگیں عریاں نظر آرہی تھیں۔ میں نے بمشکل کھینچ تان کر چولا نیچے اس کے ٹخنوں تک کیا اور پھر اس کے پاؤں بھی عارضی طور پر میڈیکل ٹیپ سے ہی جکڑ دیئے۔

نیچے فرش پر پڑے خوبرو نوجوان نے بھی اب کسمسانا شروع کر دیا تھا۔ ''پپ...... پانی۔'' اس نے کراہ کر کہا۔

میں نے ایک گلاس میں اسے پانی پلایا۔ دیوار سے ٹیک لگا کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ سفید پتلون اور سرخ جرسی میں تھا۔ پتلون اتنی ٹائٹ تھی کہ اس کی ٹانگوں کا حصہ محسوس ہوتی تھی۔ باریک کپڑے کی ایسی ٹائٹ پتلونیں وہ لڑکے پہنتے ہیں جو راہ چلتی لڑکیوں کو رجھانے کی خواہش رکھتے ہیں اور عام طور پر زبردست قسم کے فلرٹ ہوتے ہیں۔

بہرحال یہ لڑکا مجھے اپنی ساتھی ملنگنی سے کہیں کم خطرناک دکھائی دیا۔ اب میرے ہاتھ میں ایک تیز دھار نشتر نظر آرہا تھا اور وہ اس نشتر سے خاصا ڈرا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی گہری سیاہ آنکھوں میں ایک طرح کی حیرت بھی منجمد تھی۔ یقیناً یہ حیرت ایک سوال کی وجہ سے تھی اور سوال یہی تھا کہ میں جنگلارے میں ڈنر تناول فرمانے کے بعد بے ہوش ہو چکا تھا، پھر آناً فاناً اتنی پھرتی سے اٹھ کر کیسے بیٹھ گیا؟

تب اس کی نظر کسمساتی اور منہ سے غوں غوں کی آواز نکالتی ہوئی ملنگنی پر پڑی اور وہ مزید خوف زدہ دکھائی دینے لگا۔ ''تم...... تم کون ہو؟'' وہ بولا تو اس کی آواز میں لرزش واضح تھی۔

''بڑا بے وقوفی والا سوال کیا ہے تم نے۔ میری ٹانگ کی رگیں کاٹ کر مجھے لنگڑا بنانے جارہے تھے اور یہ جانے بغیر ہی کہ میں کون ہوں...... کس باغ کی مولی ہوں؟''

''تم اپنے لیے اچھا نہیں کر رہے۔ بہت سخت سزا ملنے والی ہے تمہیں۔'' وہ بولا۔

''تمہیں تو دھمکی دینی بھی نہیں آتی۔ تمہارے جیسے لڑکے...... کالجوں میں لڑکیوں کے پیچھے بھاگتے اور فلموں، ڈراموں کی نقل کرتے ہی اچھے لگتے ہیں۔''

وہ ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔ اس کے ہونٹ بہت سرخ اور پیشانی چمکیلی تھی۔ کسی رومانی فلم کا ہیرو دکھائی دیتا تھا لیکن کوئی دم خم نہیں تھا اس میں، اس کی ایک جھلک دیکھ کر ہی میں جان گیا

تھا کہ یہ لڑائی بھڑائی والا بندہ نہیں ہے۔ میں نے تیز نشتر اس کی ٹھوڑی کے نیچے شہ رگ کے قریب رکھا اور خطرناک لہجے میں کہا۔ ''کوئی چالاکی دکھاؤ گے یا کسی کو پکارنے کی کوشش کرو گے تو سانس کی نالی کاٹ دوں گا۔ جب میں سانس کی نالی کاٹتا ہوں تو عام طور پر غلطی سے خوراک کی نالی بھی کٹ جاتی ہے۔ یعنی سانس ختم اور دانہ پانی بھی ختم۔ اگر یقین نہیں تو کسی کو آواز دینے کی کوشش کرو۔'' میں نے تیز نشتر کا دباؤ اس کی گردن پر بڑھاتے ہوئے کہا۔ اس کا رنگ برف کی طرح سفید ہو گیا۔

میں نے کہا۔ ''ایسے دیتے ہیں دھمکی۔''

ملنگنی کے حلیے والی اب اپنے حواس میں آ چکی تھی۔ میں نے دیکھا کہ رضوان کی گردن پر نشتر دیکھ کر وہ بے طرح مچلی ہے۔ اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر بس غوں غوں کی آواز نکال کر رہ گئی۔

میں اب تک اچھی طرح اندازہ لگا چکا تھا کہ ملنگنی کے روپ میں نظر آنے والی یہ جواں سال خاتون کوئی کوالیفائڈ ڈاکٹر ہے کچھ دیر بعد اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔ میرے ایک سوال کے جواب میں رضوان نے اعتراف کیا کہ یہ ایک ڈاکٹر ہیں اور گائنا کالوجسٹ بھی۔

میں نے کہا۔ ''اب لگے ہاتھ یہ بھی بتا دو کہ یہ اچھی بھلی گائنا کالوجسٹ یہاں اس ملنگی ڈیرے پر دھونی رچا کر کیوں بیٹھی ہوئی ہے؟ کہیں شہر میں کوئی جرم وغیرہ کر کے تو بھاگی ہوئی نہیں؟ میرا مطلب ہے بھگوڑن؟''

''ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ اپنی مرضی اور خوشی سے یہاں رہ رہی ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''کسی بندے کی ٹانگ تو یہاں کبھی کبھار ہی کٹتی ہو گی اس کے علاوہ کیا کاٹتی ہیں یہ؟''

''در...... دراصل...... بڑے مجاوروں نے انہیں اپنے...... علاج وغیرہ کے لیے رکھا ہوا ہے۔'' رضوان کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

''بہت خوب...... بلکہ بہت ہی خوب...... زبردست...... لوگوں کا علاج تو یہاں تعویذ گنڈے اور رنگ برنگی نیلی پیلی لال پڑیوں اور چولہے کی راکھ وغیرہ سے ہوتا ہے مگر ذاتی علاج کے لیے ان مست ملنگوں نے ڈاکٹر رکھی ہوئی ہے۔''

''کبھی کبھار ان سے......'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

مجھے پتا چل رہا تھا کہ وہ کافی کچھ چھپا رہا ہے۔ میں اس کو اپنی نگاہ میں رکھے ہوئے سامنے ایک طویل میز کی طرف چلا گیا۔ یہاں بہت سے کاغذات اور نسخے وغیرہ رکھے تھے۔

میں نے دیکھا سفید رنگ کی بے شمار چھوٹی پرچیاں ایک بڑے ڈسٹ بن میں پڑی ہیں میں نے چند پرچیوں کو اٹھا کر دیکھا، مجھے یاد آیا، اوپر مزار پر جب چار بڑے مجاور مریضوں سے ملتے تھے تو ان کے نام ایسی ہی پرچیوں پر لکھتے تھے۔ پھر بیماری اور تکلیف کے بارے میں چند الفاظ پرچی پر لکھ دیتے تھے۔ اب یہ ڈھیروں پرچیاں یہاں اس اسپیشلسٹ ڈاکٹر کے ڈسٹ بن میں نظر آرہی تھیں۔ ہر پرچی کے نیچے والے حصے میں بیماری کا ڈاکٹری علاج درج تھا۔ مثلاً ڈسپرین...... ڈیک لاران...... نوسپا...... میوکین...... کرافلم...... موسیگار...... اور پتا نہیں کیا کچھ۔

اس کا مطلب تھا کہ پڑیوں کے سفوف، راکھ اور مٹی وغیرہ کچھ نہیں۔ ان میں یہ ایلو پیتھک دوائیاں ملائی جاتی ہیں۔ کہیں کم اور کہیں زیادہ...... اور اس سے بھی خوفناک انکشاف مجھ پر یہ ہوا کہ یہاں ''سٹی رائیڈز'' بھی استعمال کی جا رہی تھیں۔ خاص طور سے جو پانی کی بوتلیں وغیرہ دم کر کے دی جاتی تھیں ان میں یہ ممنوعہ اور نہایت مضر دوا شامل ہوتی تھی اور یہ سب کچھ ان سیکڑوں پرچیوں سے ثابت ہو رہا تھا جن کے نچلے حصے میں اس بہروپن ملنگنی نے اپنے ہاتھوں سے لکھا ہوا تھا۔

وہ صوفے پر پڑی بری طرح کسمسا رہی تھی۔ بے بس ہونے کے باوجود اس کی آنکھوں میں جارحیت دکھائی دیتی تھی۔ اس کے منہ سے ٹیپ اتارنے اور کپڑا نکالنے کا مطلب مصیبت کو دعوت دینا تھا اگر میں نے اسے صوفے سے باندھا نہ ہوتا تو وہ اب تک ٹانگیں چلا چلا کر اس انڈر گراؤنڈ کلینک کا کباڑا کر چکی ہوتی۔ وہ کافی حد تک جنونی دکھائی دیتی تھی۔

اچانک میری نگاہ اس کے قریب پڑے سیل فون پر پڑی۔ اس جگہ چونکہ برقی توانائی موجود تھی۔ لہٰذا سیل فون چارجنگ پر لگا ہوا تھا۔ میں نے موبائل فون اٹھایا اور اسے چیک کرنے لگا۔ کیمرے میں جا کر دیکھا تو تصویریں نظر آئیں۔ زیادہ تر تصویریں اس لڑکے رضوان ہی کی تھیں۔ سیل فون میں اس کا نام ''رضوان ٹی'' کے الفاظ میں محفوظ تھا۔ کہیں اس نے شاندار شلوار قمیص پہن رکھی تھی، کہیں پینٹ شرٹ اور کہیں اس کا بالائی جسم عریاں نظر آتا تھا۔ یہ عریاں جسم والی تصویریں یقیناً ایک دو دن پہلے ہی اتاری گئی تھیں۔ رضوان کی چھاتی پر کھرونچوں کے نشان تھے۔ یا پھر شاید سفلی جذبات کی شدت میں اسے کاٹا گیا تھا۔ ایک سیلفی غالباً چند گھنٹے پہلے ہی بنائی گئی تھی اور ابھی تک ''ڈیلیٹ'' نہیں کی جا سکی تھی۔ اس میں ڈاکٹر موجودہ لباس میں ہی تھی اور رضوان سے چمٹی ہوئی تھی۔

ان تصویروں کو دیکھنے کے بعد کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں رہی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ عام

شکل وصورت والی ڈاکٹر اس رضوان ٹی نامی نوجوان پر بری طرح فریفتہ ہے۔ اس کی فوٹوگرافی سے اس کے شدید لگاؤ کا اندازہ ہوتا تھا جو وہ رضوان سے رکھتی تھی مگر یہ ویسا ہی لگاؤ تھا جو اپنے کسی پیارے پالتو جانور سے رکھا جاتا ہے۔

''بہت خوب، تو یہاں یہ سلسلے چل رہے ہیں۔'' میں نے رضوان کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

وہ اپنے سرخ ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ تیز دھار نشتر ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ میری رگوں میں لہو سنسنا اٹھا۔ رضوان نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ''پوچھو، کون ہے؟'' میں نے سرگوشی میں کہا۔

''کون ہے؟'' رضوان نے بلند آواز میں پوچھا۔

''بشارت، تھوڑی سی صاف روئی مل جائے گی؟'' بھاری آواز میں کہا گیا۔

''کہو اس وقت نہیں ہے۔'' میں نے رضوان کو ہدایت جاری کی۔

اس نے یہی جواب دیا۔ لیکن اس کی آواز میں لرزش سی تھی۔

چند لمحے توقف کے بعد پوچھا گیا۔ ''کیا کر رہے ہو؟''

''بولو، کام کر رہے ہیں۔'' میں نے لقمہ دیا۔

رضوان نے بلند آواز میں میرا کہا ہوا فقرہ دہرایا۔ دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ اس دوران میں ڈاکٹر بری طرح تڑپتی مچلتی رہی تھی اور گلے سے گھٹی گھٹی آوازیں نکالتی رہی تھی۔

دستک دینے والا اب واپس جا چکا تھا۔ اندازہ یہی ہو رہا تھا کہ اسے کوئی شک نہیں ہوا۔ میں ایک بار پھر سیل فون کی طرف متوجہ ہوا۔ میری توجہ دو سیکنڈ کے لیے رضوان کی طرف سے کم ہوئی۔ پتا نہیں اس کے دل میں کیا آئی۔ اس نے اٹھ کر دروازے کی طرف لپکنا چاہا۔ اگر وہ سمجھ رہا تھا کہ میں غافل ہوں تو یہ اس کی بھول تھی اور اگر اس کا خیال یہ تھا کہ وہ پھرتی دکھا کر دروازے تک پہنچ جائے گا اور چٹخنی گرا کر باہر نکل جائے گا تو وہ سراسر حماقت کر رہا تھا۔ میں نے تڑپ کر اس کی گردن اپنے بازو کی گرفت میں لی اور اسے گھما کر اوندھے منہ فرش پر گرا دیا۔ اس نے مزاحمت کرنا چاہی مگر ناکام ہوا۔ گردن اس طرح بازو کے شکنجے میں تھی کہ ڈاکٹر والا سین ''ری پیٹ'' ہو گیا تھا۔ رضوان کا منہ کھلا تھا مگر وہ آواز نہیں نکال سکتا تھا۔ اگر اسے میری خودستائشی نہ سمجھا جائے تو یہی کہوں گا کہ پروفیشنل فائٹرز سے لڑ لڑ کر اب عام حریف مجھے بے حد ''آسان'' نظر آتے تھے۔ میں نے رضوان کے بالوں سے پکڑ کر اس کی گردن پیچھے کی طرف موڑی تو اس کا چہرہ تکلیف کی وجہ سے بگڑ گیا۔ یہی وقت تھا جب میری نگاہ صوفے سے

بندھی ہوئی ڈاکٹر پر پڑی۔ اسے دیکھ کر لگا کہ ابھی اسے دل کا دورہ پڑ جائے گا اور وہ جہانِ فانی سے کوچ کر جائے گی۔ اس کی جارحیت کی جگہ اب دہشت نے ۔لے لی تھی اور جنون کی جگہ منت سماجت کی کیفیت دکھائی دیتی تھی اور یہ سب کچھ رضوان کی وجہ سے ہوا تھا۔

میں نے تیز دھار نشتر رضوان کی کمر پر بائیں جانب رکھا اور زہر۔یلے لہجے میں کہا۔ ''یہاں سے یہ تیرے اندر گھساؤں گا تو سیدھا دل میں اتر جائے گا۔ اب آواز نہ نکالنا ورنہ وہ آخری آواز بن جائے گی۔''

وہ میرے نیچے اوندھا پڑا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ میں نے اس کی گردن چھوڑی۔ اس کے دونوں بازو پیچھے کی طرف موڑے اور انہیں بھی کپڑے کی چوڑی ٹیپ کے ساتھ باندھ دیا۔

رضوان کے اس طرح مزاحمت کرنے اور تکلیف اٹھانے کا ایک فائدہ ضرور ہوا تھا اور وہ یہ کہ مجھے اس جنونی ڈاکٹر پر غلبہ پانے کا طریقہ سمجھ میں آ گیا تھا۔ میرے دل نے گواہی دی تھی کہ جس طرح جن کی جان طوطے میں ہوتی ہے اسی طرح اس ڈاکٹر کی جان خوبرو رضوان میں تھی۔ کم از کم اتنا تو ضرور تھا کہ وہ اسے کسی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی تھی یا شاید یہ کہنا چاہیے، کہ یہ نہیں دیکھ سکتی تھی کہ کوئی اور اسے تکلیف پہنچائے۔ اسے خود تو وہ یقیناً تکلیف پہنچاتی تھی اور اس کا ثبوت رضوان کے جسم پر ''اندھا دھند محبت'' کے نشان تھے۔

میڈیکل ٹیپ یہاں وافر مقدار میں موجود تھی۔ رضوان کرسی پر بیٹھا تھا۔ میں نے ٹیپ کے تین چار بل دے کر اسے کرسی سے ہی باندھ دیا۔ اس کے بعد ایک کاؤنٹر کے نچلے دراز سے میں نے ایک پلاس نکال لیا۔ پلاس عام طور پر کیل وغیرہ اکھاڑنے کے کام آتا ہے لیکن یہاں میں اس سے کوئی اور کام لینا چاہتا تھا۔ چست پتلون میں سے رضوان کی صحت مند رانیں نظر آتی تھیں۔ میں نے ایک ران کے گوشت کو پلاس میں جکڑا تو تکلیف کی شدت سے بے ساختہ اس کا منہ کھل گیا۔ میں پہلے سے تیار تھا۔ ایک کپڑا میں نے پھرتی سے رضوان کے منہ میں گھسیڑ دیا اور اوپر سے میڈیکل ٹیپ چڑھا دی۔ ڈاکٹر کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ میں نے پلاس کا دباؤ بڑھایا تو رضوان کی حالت غیر ہو گئی اور اس سے زیادہ ڈاکٹر کی غیر ہو گئی۔ وہ نہایت بے قراری سے نفی میں سر ہلانے لگی۔ آنکھوں میں کرب ہی کرب تھا۔ میرا طریقہ کار کام کر رہا تھا۔

پلاس کے دباؤ سے رضوان کی ٹانگ کا گوشت کچلا گیا تھا۔ اور اس کی سفید پتلون پر خون کی سرخی نمودار ہو رہی تھی۔ میں نے ڈاکٹر سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''ابھی تو صرف

ران ہے۔ تمہارے معشوق کا پورا جسم پڑا ہے، یہ پلاس دائیں بائیں کہیں بھی اپنے دانت جما سکتا ہے۔''

وہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن منہ میں کپڑا ٹھنسا ہونے کی وجہ سے بے بس تھی۔ تین چار منٹ کے اندر ہی صورتِ حال میری مرضی کے مطابق ہو گئی۔ میں نے رضوان کے منہ میں تو کپڑا رہنے دیا لیکن ڈاکٹر کے منہ سے نکال دیا۔ وہ میرے سوالوں کے جواب دینے پر آمادہ نظر آ رہی تھی۔

میں نے سب سے پہلے اس کا نام پوچھا۔

''ارم...... ڈاکٹر ارم۔'' اس نے پر وحشت آواز میں جواب دیا۔

میں نے کہا۔ ''ڈاکٹر تم تو خود کو نہ ہی کہو تو اچھا ہے، یہ جو کچھ تم یہاں کر رہی ہو کوئی قسائی تو کر سکتا ہے مسیحا نہیں۔''

''تم جو کچھ کر رہے ہو، بہت برا کر رہے ہو۔ اس کا انجام تمہارے خیالوں سے کہیں زیادہ برا ہونے والا ہے۔ تم ان لوگوں کو جانتے نہیں ہو۔''

''جاننے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ تمہیں دیکھ کر ہی پتا چل جاتا ہے کہ تم جن کے لیے کام کر رہی ہو، وہ کتنے اعلیٰ پائے کے بدمعاش ہوں گے۔ بہرحال تم میری فکر نہ کرو۔ اپنی کرو اور اپنے اس چکنے بوائے فرینڈ کی کرو۔ تمہاری ہٹ دھرمی کی وجہ سے جو کچھ اس کے ساتھ ہو گا...... اور اس کی مردانہ صفات پر جس طرح کے اثرات پڑیں گے وہ تمہارے تصور میں بھی نہیں آ سکتا۔''

''کیا چاہتے ہو مجھ سے؟''

''سب کچھ بتاؤ، جو جو کچھ تمہارے علم میں ہے اور مجھے پتا ہے تم بہت کچھ جانتی ہو۔''

اگلے قریباً بیس منٹ میں ڈاکٹر ارم نے واقعی میری معلومات میں گراں قدر اضافہ کیا۔ وہ جہاں اٹکی، وہیں میں نے رضوان کے گوشت پر پلاس کا دباؤ بڑھایا اور فوراً ہی اس کی زبان کو روانی مل گئی۔

ڈاکٹر ارم نے اعتراف کیا کہ وہ لاہور کی رہنے والی ہے اور لاہور میں اس پر ناجائز ابارشن کرنے کے قریباً ایک درجن کیس بنے ہوئے ہیں، اب وہ پچھلے قریباً پانچ سال سے اس ملنگی ڈیرے کے زیریں حصے میں موجود تھی اور ''پردے والی سرکار'' کے لیے کام کر رہی تھی۔ اسے یہاں ٹھیک ٹھاک معاوضہ مل رہا تھا اور دیگر بے شمار سہولتیں بھی تھیں۔ یہ لوگ مریضوں کو بتائے بغیر انہیں ایلوپیتھک دوائیں اور خاص طور سے مضر صحت STEORIDES

کھلاتے تھے اور اپنی پیری فقیری چمکاتے تھے۔ اب یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آرہی تھی کہ پچھلے چند سالوں میں یہ ملنگی ڈیرا کیونکر اتنی تیزی سے مقبول ہوا اور ''روحانی علاج'' کا مرکز بن گیا۔

میں نے ڈاکٹر ارم سے پوچھا۔ ''چھ سات سال سے تم لوگ یہ پریکٹس فرما رہے ہو، کیا کبھی کسی نے کھوج نہیں لگایا کہ دیسی دواؤں اور راکھ، مٹی کی پڑیوں کے بجائے یہاں ڈاکٹری دوائیں بھونڈے طریقے سے دی جا رہی ہیں۔''

''چند کیسوں میں ایسا ہوا ہے...... لیکن...... میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ ان لوگوں کے ہاتھ تمہاری سوچ سے زیادہ لمبے ہیں۔ کئی اعلیٰ افسر اور جج تک پردے والی سرکار کے قدموں میں آکر بیٹھتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے پتا چلا ہے کہ تم ٹانگ کے پٹھے کاٹ دیتی ہو اور اس کام کے لیے کچے گنے کے چھلکے سے بنا ہوا چاقو استعمال کرتی ہو۔ مجھے تو یہاں ایسا کوئی چاقو نظر نہیں آرہا۔''

''بس یہ افواہ ہے۔ یہ کام میں ڈاکٹری اوزاروں سے ہی کرتی ہوں۔''

''بہت خوب...... کتنے فخر سے اعلان کر رہی ہو، لوگوں کو معذور بنانے کا۔ شرم آنی چاہیے تمہیں۔''

ڈاکٹر ارم کا رنگ انگارے کی طرح دہک گیا۔ ایک سیکنڈ کے لیے لگا کہ وہ جنونی انداز میں مجھ پر چلانے لگے گی لیکن پھر اس کی نگاہ پلاس پر اور پلاس کے ہدف پر جم گئی۔ وہ لہو کا گھونٹ بھر کر رہ گئی۔

دفعتاً دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ اس مرتبہ کسی ملنگنی کی آواز آئی۔ ''با جی جان، نصرت کی بیٹی کو پھر بڑا درد ہو رہا ہے۔''

میں نے سرگوشی میں کہا۔ ''اسے کوئی مناسب جواب دو۔ اسے پھر یہاں نہیں آنا چاہیے۔''

چند لمحے تذبذب میں رہ کر ڈاکٹر ارم نے بلند آواز میں کہا۔ ''ابھی کام کر رہی ہوں۔ وہی پہلے والی دوا دو اسے۔''

عورت 'جی اچھا' کہہ کر چلی گئی مگر چند سیکنڈ بعد ہی دروازے پر پھر دستک ہو گئی۔

''کون؟'' ڈاکٹر ارم نے پوچھا۔

''بندہ فارغ ہو گیا ہے جی؟'' بھاری آواز میں پوچھا گیا۔ یہ آواز یقیناً انچارج جہانے ہی کی تھی۔

''اسے کہو، ابھی دیر لگے گی۔ ایک گھنٹا۔'' میں نے تیز سرگوشی میں ہدایت کی۔ ڈاکٹر ارم نے جھلا کر بلند آواز سے کہا۔ ''ابھی جاؤ...... کام کر رہی ہوں۔''

''لیکن آپ نے......''

''ابھی جاؤ۔'' ڈاکٹر ارم بھنا کر چلائی۔ ''اس کا خون بند نہیں ہو رہا۔ ابھی ایک آدھ گھنٹا لگے گا۔''

وہ لوگ واپس چلے گئے۔ ''اب کیا چاہتے ہو تم؟'' وہ میری آنکھوں میں دیکھ کے بولی۔

''وہی جس کے لیے ہم یہاں آئے ہیں۔ میں ریشمی سے ملنا چاہتا ہوں کسی بھی صورت...... تم یہاں کی سینئر موسٹ مجاورن ہو۔ مجھے بتاؤ، میں کیسے مل سکتا ہوں اس سے؟''

''کوئی فائدہ نہیں۔ جو کچھ تم چاہتے ہو وہ نہیں ہو سکتا۔ تین دن بعد اس کا نکاح ہے پردے والی سرکار سے۔ آج کل وہ سخت پہرے میں ہے۔ اگر کوئی حماقت کرو گے تو پھر تمہیں پتا ہی ہے، پل والے محافظوں کا...... وہ ہڈیاں تک نہیں چھوڑتے۔''

ڈاکٹر کی آنکھوں میں وارننگ تھی۔ میں اس کا اشارہ سمجھ گیا تھا۔ وہ پل والے خونخوار چیتوں کا ذکر کر رہی تھی۔

وہ کافی گہری اور مضبوط اعصاب کی مالک تھی۔ ابھی تک مزاحمت جاری رکھے ہوئے تھی۔ میں نے کہا۔ ''مجھے سن گن ملی ہے کہ یہاں کوئی ایسا پوشیدہ راستہ بھی ہے جو سیدھا پردے والی سرکار کے رہائشی حصے تک پہنچا دیتا ہے۔ یقیناً ریشمی بھی اسی حصے میں ہو گی۔'' میں نے اندھیرے میں تیر چھوڑا تھا لیکن پتا چلا کہ یہ نشانے پر نہیں لگا۔

وہ نفی میں سر ہلا کر بولی۔ ''مجھے ایسے کسی راستے کا پتا نہیں۔''

وہ راستے کی موجودگی کا انکار کر رہی تھی، پھر بھی میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ وہ مجھے ریشمی سے ملانے کا کوئی نہ کوئی راستہ نکال سکتی ہے۔ اس کی ہٹ دھرمی دیکھ کر میں نے کہا۔

''ڈاکٹر ارم! اب تک تم ہی یہاں لوگوں کے پٹھے کاٹتی رہی ہو لیکن لگتا ہے کہ آج مجھے بھی کچھ نہ کچھ کاٹنا پڑے گا۔''

میں نے پلاس کو حرکت دی اور اس کے ساتھ ہی رضوان کی گردن بازو میں جکڑ کر اس کی ستواں ناک کی چونچ پلاس کی گرفت میں لے لی۔ وہ تڑپ اٹھا۔ میں نے کہا۔ ''یہ جسم کے نازک حصوں میں سے ہے، چلو پہلے اسی پر کوشش کرتے ہیں۔''

رضوان کا رنگ خوف سے یکسر سفید پڑ گیا تھا۔ ذاتی طور پر وہ مجھے برا شخص نہیں لگا تھا۔ پتا نہیں کہ یہاں کیونکر پھنسا ہوا تھا۔ میں اسے کوئی ایسا نقصان نہیں پہنچانا چاہتا تھا جو ناقابلِ

تلافی ہو۔ میں جو کچھ کر رہا تھا وہ اس ڈھیٹ عورت کو راہِ راست پر لانے کے لیے تھا۔
اور پھر ڈاکٹر ارم نے ہارے ہوئے لرزاں لہجے میں ایک ایسا انکشاف کیا جس نے واقعی چونکا دیا۔ وہ بولی۔ ”تمہیں اس لڑکی کو ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ......تھوڑی دیر میں خود ہی یہاں پہنچنے والی ہے......“
ابھی ڈاکٹر ارم کی بات ختم ہی ہوئی تھی کہ اس کمرے کے دروازے پر پھر دستک ہوئی لیکن اس مرتبہ یہ دستک ایک چھوٹے سے اندرونی دروازے پر ہوئی تھی اور کافی مدھم تھی۔
”کون؟“ ڈاکٹر ارم نے پوچھا۔
”جی میں فضیلت ہوں، کرنالی صاحب پوچھ رہے ہیں کیا ”پاک بہن“ کو یہاں بھیج دیا جائے؟“
ڈاکٹر ارم نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا، پھر بولی۔ ”ہاں......دس منٹ تک بھیج دو۔“
”جی اچھا۔“ کی آواز کے بعد خاموشی چھا گئی۔
میں نے ارم سے پوچھا کہ ریشمی یہاں کس لیے آ رہی ہے؟
وہ بولی۔ ”اس کے کان چھیدے جانے ہیں۔ اس کے کانوں میں خاص طرح کی بالیاں پہنائی جائیں گی۔ پردے والی سرکار کی بیوی بننے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اس کے کانوں میں یہ بالیاں ہوں۔“
”ٹھیک ہے، تم اس کو آنے دو۔ میں تمہیں کھول دیتا ہوں۔ تم خود اسے ریسیو کرنا لیکن اس دوران میں کوئی ہوشیاری دکھائی تو تمہارے اس ڈارلنگ کا حشر خراب ہو جائے گا۔“
اس نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر اثبات میں سر ہلایا۔
تیز دھار نشتر بدستور میرے بائیں ہاتھ میں تھا اور وہ دونوں اچھی طرح جان چکے تھے کہ میں اس کا بے دریغ استعمال کر سکتا ہوں۔ میں نے اسی نشتر کی مدد سے ڈاکٹر ارم کی بندشیں کاٹ دیں۔ اس جگہ اور ایسی کوئی شے دکھائی نہیں دے رہی تھی جسے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جا سکتا۔ اس حوالے سے مجھے مکمل اطمینان تھا۔ ارم مجھے یہ بھی بتا چکی تھی کہ پاک بہن یعنی ریشمی اکیلی ہی اس آپریشن تھیٹر نما کمرے میں آئے گی۔
میں نے رضوان کو کرسی سمیت گھسیٹا اور ایک قدِ آدم الماری کے عقب میں ہو گیا۔ اس جگہ میں اندر آنے والے کی نظروں سے اوجھل رہ سکتا تھا اور دروازے پر نگاہ بھی رکھ سکتا تھا۔
تھوڑی دیر بعد ہی دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ میں نے نشتر رضوان کی گردن پر رکھا ہوا تھا۔

آنکھوں آنکھوں میں، میں نے پھر ڈاکٹر ارم کو دھمکی دی کہ اگر اس نے کوئی چالاکی دکھائی تو پھر اس طوطے کی گردن پر چھری چل جائے گی جس میں اس کی جان ہے۔

ڈاکٹر ارم نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور ایک لڑکی کو اندر لے آئی۔ میں پہلی بار ریشمی کو براہِ راست دیکھ رہا تھا۔ وہ درمیانے قد کی قبول صورت لڑکی تھی۔ رنگ زردی مائل سفید اور ٹھوڑی پر تل تھا۔ وہ گم صم واداس نظر آتی تھی۔ اس نے چمکدار گہرا نیلا چولا پہن رکھا تھا۔ سر پر نیلی شال تھی۔ گلے میں کئی مالائیں نظر آ رہی تھیں۔ اس کے اندر آنے کے بعد میری ہدایت کے مطابق ڈاکٹر ارم نے دروازے کو اندر سے بولٹ کر دیا۔

''زیادہ درد تو نہیں ہوگا؟'' ریشمی نے سہمی سہمی آواز میں پوچھا۔

''نہیں میں لوشن لگا کر سن کرلوں گی۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔

یہی وقت تھا جب میں ریشمی اور ڈاکٹر ارم کے سامنے آ گیا۔ مجھے دیکھ کر ریشمی حیران ہوئی اور سوالیہ نظروں سے ارم کی طرف دیکھنے لگی۔

میں نے کہا۔ ''ریشمی! اس کی طرف مت دیکھو، یہ تمہیں کچھ نہیں بتائے گی جو پوچھنا ہے مجھ سے پوچھو۔''

''آ......آپ کون؟'' وہ بولی۔ اس کی آواز واقعی خوب صورت تھی۔ جیسے گرمیوں کی دوپہر میں آموں کے باغ میں کوئل کوک رہی ہو۔

میں نے کہا۔ ''یہاں تمہاری ملاقات تاجور سے ہو چکی ہے۔ اس نے تمہیں میرے بارے میں کچھ نہ کچھ بتایا ہوگا۔''

اس نے پوری آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا، پھر اس کے چہرے پر حیرت کے سائے گہرے ہوتے چلے گئے۔ انگلی سے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''کہیں آپ بھائی شاہ زیب تو نہیں؟''

''تم نے ٹھیک اندازہ لگایا ہے۔'' میں نے خوش ہو کر کہا۔

''مم......مگر آپ یہاں کیسے؟''

''میرا ابھی یہاں آپریشن ہونا ہے۔ تمہیں پتا ہی ہوگا۔ اپنے مہمانوں کی ٹانگ کا پٹھا وغیرہ کاٹ کر یہ لوگ میزبانی کا حق ادا کرتے ہیں۔''

بات کرتے ہوئے میری نگاہ بدستور ڈاکٹر ارم پر تھی۔ میں اسے ہوشیاری دکھانے کا کوئی موقع فراہم کرنا نہیں چاہتا تھا۔ بہرحال خطرہ ہر گھڑی موجود تھا۔ میں نے پہلا کام یہ کیا کہ تیز دھار نشتر کے زور پر ڈاکٹر ارم کو ملحقہ واش روم میں بند کر دیا۔ اس بات کی تسلی میں پہلے

ہی کر چکا تھا کہ اس مختصر واش روم میں ایسی کوئی شے موجود نہیں جو ڈاکٹر ارم کو کسی طرح کا فائدہ پہنچا سکے۔

ڈاکٹر کو لاک کرنے کے بعد میں رضوان کو کرسی سمیت گھسیٹ کر ریشمی کے سامنے لے آیا۔ رضوان کو اس حالت میں دیکھ کر ریشمی کی حیرت کئی گنا بڑھ گئی۔ اس کی ڈری ڈری نظر رضوان کی دائیں ران پر مرکوز تھی جہاں سفید پتلون خون سے سرخ ہو رہی تھی۔

''یہ کیا ہے؟'' وہ خوف زدہ آواز میں بولی۔

''اسے اردو میں ''جیسے کو تیسا'' کہتے ہیں اور پنجابی میں کہتے ہیں ''جیسا منہ ویسی چپیڑ۔''

''میں کچھ سمجھ نہیں پا رہی؟''

میں نے کہا۔ ''ریشمی! مجھے تمہارے بارے میں سب معلوم ہو چکا ہے۔ وہ خط بھی میں پڑھ چکا ہوں جو تم نے اپنے والد کو لکھا۔ اب کچھ بھی چھپا ہوا نہیں ہے۔ میں تمہیں یہاں سے چھڑانے آیا ہوں اور میں چھڑا کر لے جاؤں گا۔''

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ بہت مشکل ہے بھائی، بہت زیادہ مشکل۔ آپ...... یہ کیسے کر سکیں گے؟''

''جیسے میں یہ کر سکا ہوں۔'' میں نے کرسی سے بندھے ہوئے رضوان کی طرف اشارہ کیا۔ ''تمہارے سامنے اس زہریلی ڈاکٹرنی کو میں نے واش روم میں بند کیا ہے۔ کیا ہے یا نہیں؟''

وہ لاجواب سی ہو کر میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔ ''مجھ پر بھروسا رکھو۔ میں یہ کر گزروں گا۔ کوئی مجھے روک نہیں سکے گا۔''

میرے انداز نے جیسے اس کی ڈھارس بندھائی۔ اس نے ایک سسکی سی لے کر ہونٹوں پر ہاتھ رکھ لیا۔

اسی دوران میں، میں نے محسوس کیا کہ رضوان اپنی جگہ پر مچل رہا ہے اور بے قراری کے عالم میں کچھ کہنا چاہ رہا ہے۔ میں نے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس رکھا تھا۔ اس کی کیفیت دیکھ کر میں نے کپڑا اس کے منہ سے نکال دیا، اس نے چند گہری سانسیں لیں اور میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''میں آپ سے ایک دو باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ کیا ہم چند منٹ کے لیے اس سامنے والے کمرے میں جا سکتے ہیں؟''

وہ جسے کمرا کہہ رہا تھا، وہ ایک اسٹور روم تھا۔ یہاں مرہم پٹی کا سامان، دوائیں،

بیساکھیاں، آرتھوپیڈک کی پلیٹس وغیرہ رکھی تھیں۔ میں ابھی ریشمی کی طرف سے بھی پوری طرح مطمئن نہیں تھا۔ میں نے دونوں طرف کے دروازے لاک کر دیئے اور رضوان والی کرسی گھسیٹ کر اسٹور روم میں لے آیا، اسٹور روم کا دروازہ میں نے ادھ کھلا رہنے دیا تا کہ باہر نظر رکھ سکوں۔

تھوڑی سی تمہید باندھنے کے بعد رضوان نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ’شاہ زیب صاحب! میں خود بھی یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں۔ یہاں سے نکلنے کے لیے میں ہر طرح آپ کا ساتھ دینے کو تیار ہوں۔‘‘

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، مجھے اس کی خوب صورت آنکھوں میں سچائی نظر آئی۔ اگلے چار پانچ منٹ میں میرے اور اس کے درمیان جو بات ہوئی اس سے عیاں ہو گیا کہ وہ اس زندگی سے بری طرح اکتایا ہوا ہے۔ ڈاکٹر ارم تو باہر بھی آ جا سکتی تھی۔ کیونکہ وہ اپنی مرضی سے یہاں رہ رہی تھی، مگر رضوان کی اپنی حیثیت ایک قیدی کی سی تھی۔ وہ ڈیرے کے ایک محدود حصے میں نقل و حرکت کر سکتا تھا۔ ڈاکٹر ارم اک بلا کی طرح اس سے چمٹی ہوئی تھی۔ وہ اس سے محبت کرتی تھی لیکن کبھی کبھی وہ اس محبت میں ’’نفسیاتی‘‘ نظر آنے لگتی تھی۔ وہ اس کی ہر آسائش کا خیال رکھتی تھی مگر اس کے عوض اسے ہر وقت اپنی نگاہ اور دسترس میں رکھنا چاہتی تھی۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ’’تم یہاں کتنے عرصے سے ہو؟‘‘

وہ بولا۔ ’’ڈھائی سال سے۔ میں کراچی سے ایک کام کے سلسلے میں یہاں آیا تھا اور اس جنونی کے چکر میں پھنس گیا اور پھر یہاں پہنچ گیا۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’تم ڈھائی سال سے یہاں ہو لیکن یہاں سے نکلنے کا خیال تمہارے دماغ میں آج ہی کیوں آیا ہے......؟‘‘

وہ بولا۔ ’’اگر سچ پوچھتے ہیں تو اس سے پہلے مجھے اس قبرستان میں کوئی ایسا نظر ہی نہیں آیا تھا جس میں زندگی کی جھلک پائی جاتی ہو۔ آپ کو دیکھا، آپ کو سنا اور مجھے لگا کہ یہاں اس ملنگی ڈیرے پر کچھ ہونے والا ہے۔ شاید کچھ دیواریں گرنے والی ہیں، کچھ زنجیریں ٹوٹنے والی ہیں۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’پڑھے لکھے لگتے ہو، ان چکروں میں کیسے پھنس گئے؟‘‘

’’یہ ذرا لمبی کہانی ہے شاہ زیب صاحب۔ اگر یہاں سے بہ خیریت نکل گئے تو آپ کو ضرور سناؤں گا۔ میں آپ کو اپنا سینا چیر کر نہیں دکھا سکتا لیکن وہی کہہ رہا ہوں جو میرے دل

میں ہے۔ میں یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں اور اس حوالے سے آپ کے ساتھ ہر طرح کا تعاون کروں گا اور سب سے پہلا تعاون تو یہ ہوگا کہ میں آپ کو اس دروازے کی چابی دوں گا جس میں آپ بند ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ جنگلارے کے اکلوتے دروازے کی چابی۔''

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''

''یہ ہو چکا ہے جی، ایک سال پہلے ہو چکا ہے۔ اتفاق سے اس جنگلارے کی ایک ڈپلی کیٹ چابی مجھے مل گئی تھی اور وہ اب تک میرے پاس ہے۔''

''اس چابی کا کیا استعمال ہوسکتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ جنگلارے سے نکل سکتے ہیں، اس کی مکمل پلاننگ میں آپ کو بتا سکتا ہوں۔''

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''لیکن یہ سب کچھ تو تب ہوگا نا جب تمہاری یہ ڈاکٹر رانی کچھ کرنے دے گی۔ اس کو تو یہی کہنا ہے کہ پہلے میری لاش سے گزرو، پھر جو مرضی کرنا۔''

رضوان نے گہری سانس لے کر واش روم کے بند دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں وہ عورت موجود تھی جو اس سے محبت کرتی تھی...... اور اس کی آقا بھی تھی۔ وہ بولا۔ ''مجھے پچانوے فیصد امید ہے کہ جب ڈاکٹر ارم کو معلوم ہوگا کہ میں نے یہاں سے نکلنے کا تہیہ کر لیا ہے تو وہ بھی جانے پر آمادہ ہو جائے گی۔''

''اور اگر نہ ہوئی تو؟''

وہ عجیب لہجے میں بولا۔ ''وہ مجھے مرتا ہوا نہیں دیکھ سکتی۔ اگر اس نے مجھے زبردستی روکنا چاہا تو میں اس کے سامنے ہی اپنے ساتھ کچھ کر گزروں گا...... بلکہ...... یہ فیصلہ ابھی ہو جائے گا۔ دس پندرہ منٹ کے اندر۔ میں ڈاکٹر ارم سے دوٹوک بات کرتا ہوں ابھی، اسی وقت......'' لگتا تھا کہ رضوان اپنے تحمل اور برداشت کی آخری حدوں کو چھو رہا ہے۔

پتا نہیں کہ میرے دل میں کیا آیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تو کرو اس سے بات۔''

وہ تیار ہو گیا۔ اس نے کہا کہ میں چند منٹ کے لیے اسے ڈاکٹر ارم کے ساتھ اس اسٹور روم میں اکیلا چھوڑ دوں۔ میں نے بڑی باریک بینی سے اسٹور روم کا جائزہ لیا۔ وہاں باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ کوئی کھڑکی تک نہیں تھی۔ ایک دو چیزیں ایسی ملیں جنہیں ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جا سکتا تھا، وہ میں نے وہاں سے اٹھا لیں۔ ریشمی بدستور سہمی ہوئی کرسی پر بیٹھی تھی اور یہ ساری کارروائی دیکھ رہی تھی۔ میں نے ڈاکٹر ارم کو واش روم سے نکالا اور رضوان

کے پاس اسٹور میں پہنچا دیا۔ رضوان کی درخواست پر میں نے دروازہ اس طرح بند کر دیا کہ اس میں بس تھوڑی سی درز باقی رہ گئی۔ وہ دونوں تقریباً آدھ گھنٹے تک وہاں رہے۔ کسی وقت وہ بہت دھیمے لہجے میں بات کرتے۔ کسی وقت آوازیں بلند ہو جاتیں اور ان میں تلخی آجاتی۔ رضوان کے اس طرح کے الفاظ بھی ہمارے کانوں میں پڑے...... میں ختم کرلوں گا اپنے آپ کو...... لعنت ہے ایسی زندگی پر...... اور اس طرح کی دیگر باتیں......

قریباً آدھ گھنٹے بعد دونوں باہر نکلے تو ان کے چہرے لال بھبھوکا ہو رہے تھے۔ تاہم ایسا لگتا تھا کہ رضوان کافی حد تک ڈاکٹر ارم کو قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر ارم نے ریشمی کے کانوں کا معائنہ کیا اور بولی۔ ''جو بالیاں تمہیں پہنائی جانی ہیں، وہ خاص قسم کی ہیں۔ اس کے لیے ذرا بڑے سوراخ کرنے پڑیں گے۔ فی الحال میرے پاس وہ اوزار نہیں جس سے سوراخ کرسکوں۔ تمہیں کل تک انتظار کرنا پڑے گا۔ میں کوئی دوسرا طریقہ ڈھونڈتی ہوں۔''

رضوان نے آنکھوں آنکھوں میں مجھے سمجھایا کہ وہ جان بوجھ کر ایسا کر رہی ہے...... ریشمی واپس جانے کے لیے تیار نظر آ رہی تھی۔ رضوان نے اسے ''پاک بہن'' کہہ کر مخاطب کیا اور بولا۔ ''آپ بالکل تیار رہیں۔ کل رات کسی وقت ہم یہاں سے نکل جائیں گے......''

ریشمی کراہ کر بولی۔ ''لیکن...... یہ لوگ ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ میرے ابا جی یہاں ہیں۔ تاجور بھی یہاں ہے۔ میں ان کی زندگی کے لیے کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتی۔''

''کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ ڈاکٹر ارم کل کسی وقت اندر جا کر آپ سے ملاقات کریں گی۔ وہ آپ کو سارے پروگرام سے آگاہ کر دیں گی۔ ہم کوشش کریں گے کہ آپ کے ابا جی اور آپ کی دوست کو آپ سے پہلے ہی یہاں سے نکال لیں۔''

رضوان نے تائید طلب نظروں سے ڈاکٹر ارم کی طرف دیکھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہاں، میں کل ملوں گی تم سے۔''

اتنی دیر میں اندرونی دروازے پر پھر دستک ہوگئی۔ رضوان نے کہا۔ ''پاک بہن! آپ کو لینے آ گئے ہیں۔ آپ جائیں اور وہی کہیں جو آپ کو بتایا ہے۔ آپ کو کل پھر یہاں آنا ہے۔''

ڈاکٹر ارم نے دروازہ کھولا...... میں نے تسلی بخش انداز میں ریشمی کی طرف دیکھا۔ وہ ڈبڈباتی آنکھوں کے ساتھ باہر چلی گئی۔

رضوان نے کہا۔ ''شاہ زیب بھائی! وقت کم ہے۔ آپ لیٹ جائیں۔ ارم آپ کی

ٹانگ پر یونہی پٹی وغیرہ باندھ دیتی ہیں۔ میں اس دوران میں آپ کو تفصیل بتاتا ہوں۔"
میں آپریشن ٹیبل پر لیٹ گیا۔ ڈاکٹر ارم نے میری پنڈلی پر دوا لگا کر اور روئی رکھ کر پٹی باندھنا شروع کر دی۔ رضوان نے ایک الماری کے کسی اندرونی خانے سے ایک لمبی چابی نکالی اور اسے میری گھیر دار شلوار کے نیفے میں داخل کر دیا، بولا۔ "یہ چابی آج سے کوئی ایک سال پہلے کسی اور شخص نے بنائی تھی یہاں سے کسی کو نکالنے کے لیے، وہ اس کا بھائی تھا۔ وہ اسے تو نہ نکال سکا مگر خود زندگی کی قید سے نکل گیا۔ مجاوروں نے جان لے لی اس کی۔ یہ چابی میرے پاس آئی۔ یہ بالکل درست چابی ہے۔ اندر اور باہر دونوں طرف سے دروازے کو لگتی ہے۔"
"اس سے میں کیا کروں گا؟"
"اس سے آپ دروازہ کھولیں گے اور اپنے دونوں ساتھیوں سمیت باہر نکل جائیں گے۔"
"اور پہرے دار مجھے یہ سب کرنے دیں گے؟"
"جب آپ یہ کریں گے، پہرے دار وہاں موجود نہیں ہوں گے۔" رضوان نے بڑے اعتماد سے کہا۔
میرے پوچھنے پر اس نے تفصیلاً سب کچھ بتایا۔ اس تفصیل کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا۔
ہر رات پورے نو بجے اوپر مزار پر ایک چھوٹا گھڑیال بجتا تھا جس کی آواز نیچے تک سنائی دیتی تھی۔ یہ لنگر کھلنے کا اعلان ہوتا تھا اور یہی وقت پہرے داروں کے تبدیل ہونے کا بھی تھا۔ گھڑیال بجنے کے فوراً بعد جنگلارے کا پہرا بھی تبدیل ہوتا تھا۔ پہلے پہرے داروں کے جانے اور نئے پہرے داروں کے آنے کے درمیان آٹھ دس منٹ کا مختصر وقفہ ہوتا تھا۔ پلاننگ کے مطابق ہمیں اسی مختصر وقفے سے فائدہ اٹھانا تھا۔ رضوان کا کہنا تھا کہ گھڑیال کی آواز سننے کے فوراً بعد میں اپنے دونوں ساتھیوں یعنی چاچا رزاق اور تاجور کے ساتھ دروازے پر پہنچ جاؤں اور دروازے کو اندر کی طرف سے چابی لگا کر اسے کھول لوں۔ اس کے بعد دائیں طرف والی راہداری میں داخل ہو جاؤں جو قریباً سو گز تک نشیب میں جائے گی اور ہمیں لکڑی والے پل تک پہنچا دے گی۔
میں نے کہا۔ "بالفرض دروازے کے باہر کوئی پہریدار موجود ہوا یا نیچے جاتی ہوئی راہداری میں کسی سے مڈبھیڑ ہوئی تو؟"
وہ فوراً بولا۔ "میں ابھی ڈیڑھ دو گھنٹے بعد آپ کے پاس حجرے میں آؤں گا۔ بہانہ یہی ہوگا کہ آپ کی پنڈلی دیکھنی ہے۔ خون بند ہوا ہے یا نہیں۔ میں ایک گن آپ کو دوں گا اور مجھے

یقین ہے کہ آپ گن کا استعمال بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔'' وہ معنی خیز انداز میں میری طرف دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔''لیکن......ریشمی اور تم، ہم تک کیسے پہنچو گے؟''

''پاک بہن کو ڈیرے کے اندرونی حصے سے نکالنا بہت مشکل ہے لیکن جب وہ کان چھدوانے کے لیے یہاں ہمارے پاس اس کمرے میں ہو گی تو یہاں سے اس کے لیے نکلنا آسان ہو گا۔ میرے ذہن میں ایک پلان ہے۔'' اس کی چمکدار کشادہ پیشانی پر سوچ کی لکیریں تھیں۔ وہ تیزی سے دماغ دوڑا رہا تھا۔

اپنی پلاننگ کے بارے میں بتاتے ہوئے اس نے جو کہا وہ مختصراً یوں تھا۔ کل ساڑھے آٹھ بجے کے لگ بھگ ڈاکٹر ارم نے ریشمی کو یہاں اپنے پاس بلانا تھا۔ یہاں اس نے ڈاکٹر ارم والا لباس پہننا تھا اور رضوان کے ہمراہ یہاں سے نکل کر چوبی پل کی طرف روانہ ہو جانا تھا۔ ڈاکٹر ارم کام کرتے وقت کبھی کبھی اپنا چہرہ سرجیکل ماسک میں بھی چھپاتی تھی اس لیے وہ ماسک ریشمی کی شناخت چھپا سکتا تھا۔ ریشمی اور رضوان کے نکلنے کے فوراً بعد ڈاکٹر ارم کو ایک دوسرے راستے سے پل تک پہنچ جانا تھا۔ اس دوسرے راستے پر محافظ ملنگوں سے مڈبھیڑ ہو سکتی تھی مگر ڈاکٹر ارم کے راستے میں ان کی کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ رضوان کا کہنا تھا کہ لکڑی کا وہ پل ہی واحد راستہ ہے جو انہیں اس ملنگی ڈیرے کی بے رحم سنگین دیواروں سے نکال سکتا ہے۔

اب میرے ذہن میں دو سوال تھے۔ ایک تو انیق کا۔ دوسرا گمشدہ نوری کا۔ میں نے رضوان اور ڈاکٹر ارم سے پوچھا۔ ان دونوں کو بھی نوری کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ ہاں انیق کے بارے میں رضوان اچھی طرح جانتا تھا اور اس سے ملاقات بھی کر چکا تھا۔ میں نے اسے انیق کے بارے میں کچھ ضروری ہدایات دیں۔ وہ بولا۔''میں کل دوپہر سے پہلے اس سے مل کر اسے ساری پلاننگ سے آگاہ کر دوں گا۔''

ہمارے درمیان کچھ مزید گفتگو ہوئی پھر دروازے پر دستک ہو گئی۔ جہانان مجھے لینے کے لیے آ گیا تھا۔

O......❖......O

رات کے بارہ بجے چکے تھے۔ تاجور سو چکی تھی۔ چاچا رزاق میرے والے حجرے میں ہی بیٹھے تھے۔ چاچا رزاق کی آنکھوں میں ابھی تک دوا سے پیدا ہونے والی غنودگی موجود تھی۔ ہم نے پتھریلی دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی اور گھٹنوں تک کمبل لیے ہوئے تھے۔ میں نے چاچا

رزاق کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کر دیا تھا۔ اگلے چوبیس گھنٹے ہمارے لیے بڑے ہیجان خیز ثابت ہونے والے تھے۔ ہم یہاں سے نکل بھی سکتے تھے اور کسی بہت بڑی مصیبت کا شکار بھی ہو سکتے تھے۔ بہر حال جو کچھ ہو رہا تھا، بر وقت ہو رہا تھا اگر اس میں تاخیر ہوتی تو پھر ریشمی "پردے والی سرکار" کے حرم میں داخل ہو جاتی، دوسرے لفظوں میں ہمیشہ کے لیے ملنگی ڈیرے کی کنیز بن جاتی۔

چاچا رزاق کسی گہری سوچ میں نظر آتے تھے۔ آج ان پر عجیب سا موڈ طاری ہو گیا تھا۔ کھوئی کھوئی آواز میں کہنے لگے۔ "میں بڑا کامیاب گول کیپر تھا۔ اگر یہ چوٹ نہ لگی ہوتی تو بہت آگے جانا تھا میں نے۔ میرے کوچ مجھے ہیرو ڈیفنڈر کہتے تھے، ڈیفنڈر کو اردو میں کیا کہیں گے؟ بچانے والا؟"

"ہاں...... بچانے والا۔ دفاع کرنے والا۔"

"بالکل، میں دفاع کرنے والا تھا اور گول کیپر دفاع کرنے والا ہی تو ہوتا ہے۔ وہ کبھی کسی پر حملہ نہیں کرتا۔ بس حملہ کرنے والوں کو روکتا ہی ہے۔ سامنے والی ٹیم کے فارورڈز ہر وقت طوفانی رفتار سے اس کی طرف آتے رہتے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں آگ ہوتی ہے۔ پنڈے میں جیسے بجلیاں بھری ہوتی ہیں۔ گول کیپر نے انہیں روکنا ہوتا ہے۔ دفاع کرنا ہوتا ہے۔"

انہوں نے چند لمحے توقف کیا اور گمبھیر آواز میں بولے۔ "میں کھیل کے میدان سے باہر بھی اپنی پوری زندگی میں بس دفاع ہی کرتا رہا ہوں۔ اپنی خراب ٹانگ کا دفاع۔ اپنی اللہ بخشنے ماں کا دفاع، جسے میرا سخت باپ مار کر گھر سے نکال دینا چاہتا تھا۔ اپنے تین مرلے کے گھر کا دفاع جسے پٹواری کا رشتے دار ہضم کرنا چاہتا تھا۔ اپنی بیٹی کا دفاع جسے وہ ظالم جابر پیجا ٹکر گیا تھا اور اپنے گاؤں کا دفاع۔ ہاں کچھ عرصہ ایک توڑے دار بندوق کے ساتھ اپنے گاؤں کی چوکیداری بھی کی تھی میں نے۔ گول کیپر تھا نا میں۔ گول کیپر بس دفاع ہی کرتا ہے...... کبھی کامیاب ہوتا ہے...... کبھی نہیں ہو سکتا......"

اپنی بات ادھوری چھوڑ کر وہ پھر کسی گہری سوچ میں کھو گئے۔ اندھیرے میں، میں دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن میں جانتا تھا، ان کی آنکھوں میں بیٹی کا دکھ ہے اور آنسوؤں کی نمی ہے وہ دھیرے دھیرے اپنے پہلو میں رکھی ہاکی کو سہلا رہے تھے۔ کچھ دیر بعد کھوئے کھوئے لہجے میں بولے۔ "شاہ زیب پتر! کبھی کبھی مجھے لگتا ہے جیسے مجھے اپنی زندگی کا آخری میچ کھیلنا ہے۔ ابھی ایک آخری بار مجھے پھر میدان میں آنا ہے۔ میں خیالوں میں دیکھتا ہوں...... مخالف ٹیم کے

فارورڈ آندھی کی رفتار سے میری طرف آرہے ہیں۔ ان کے چہرے لال بھبوکے ہورہے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں شعلے ہیں۔ میں انہیں روک رہا ہوں، گر رہا ہوں، اٹھ رہا ہوں، پھر گر رہا ہوں۔ ان کے سامنے آخری دیوار بنا ہوا ہوں...... ہاں، کبھی کبھی مجھے لگتا ہے......"

اچانک دروازے کی طرف قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ہم نے مڑ کر دیکھا۔ ٹارچ کی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ یہ دو افراد تھے۔ آگے رضوان تھا۔ اس کے عقب میں مسلح ملنگ پہرے دار چلا آرہا تھا۔ اس چیمبر یعنی جنگلارے کے اندر آنے والے پہرے داروں کے پاس آتشیں اسلحہ نہیں ہوتا تھا، وہ عموماً بڑے سائز کی لاٹھی سے مسلح ہوتے تھے۔ رضوان کے ہاتھ میں ایک بیگ تھا، جیسا کہ بعد میں پتا چلا اس میں مرہم پٹی کا سامان تھا۔ رضوان اندر آگیا۔ پہرے دار حجرے کے دروازے کے سامنے کچھ فاصلے پر کھڑا رہا۔ رضوان نے ٹارچ کی روشنی میری ٹانگ پر ڈالی اور پوچھا۔ "اب کیسا لگ رہا ہے تمہیں؟ خون رکا یا نہیں؟"

"خود ہی دیکھ لو۔" میں نے کراہتی ہوئی سی آواز میں کہا۔

"خون تو آرہا ہے۔" اس نے کہا اور پٹی کے بل کھولنے میں مصروف ہو گیا۔

پہرے دار ایک دوسرے شخص کی طرف متوجہ تھا۔ رضوان نے تیز سرگوشی میں کہا۔ "گڑبڑ ہوگئی ہے جی، سارا پلان الٹ پلٹ ہوگیا ہے۔ اب ہم کل تک انتظار نہیں کر سکتے۔ ہمیں جو کرنا ہے ابھی کرنا ہوگا۔" اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔

"کیوں کیا ہوا؟"

"وہ حرام زادی کسی صورت نہیں مان رہی تھی۔ مجاوروں کو بتانے کی دھمکیاں دے رہی تھی۔ میں نے اسے بے ہوش کر کے باتھ روم میں بند کر دیا ہے۔"

"بے ہوش کر دیا ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"جی ہاں، اس کے سوا چارہ نہیں تھا۔ میں نے اس کے سر پر لوہے کے راڈ سے دو تین چوٹیں لگائی ہیں۔ ہاتھ پیر بھی باندھ دیئے ہیں۔ صبح تک تو یہ بات چھپی رہے گی مگر پھر سب کو پتا چل جائے گا کہ ڈاکٹر کے ساتھ کیا ہو چکا ہے۔ ہمیں دن چڑھنے سے پہلے پہلے یہاں سے نکلنا ہوگا۔" اس کے ساتھ ہی رضوان نے اپنے لبادے کے اندر سے ایک چھوٹی نال والی آٹومیٹک رائفل نکالی اور تکیے کے پیچھے چھپا دی۔ دواؤں والے تھیلے میں ایک اضافی میگزین اور فالتو راؤنڈ بھی تھے۔ وہ بھی اس نے تکیے کے نیچے گھسیڑ دیئے۔ یہ دواؤں والا تھیلا ایک طرح سے "ایمونیشن" بیگ تھا۔

"اب کیا کرنا ہے؟" میں نے پوچھا۔

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ بہرحال میں یہاں سے نکلنے کے بعد باہر کھڑے پہرے داروں کا دھیان بٹانے کی کوشش کرتا ہوں۔ آپ چابی سے دروازہ کھول کر باہر نکلیں اور اپنے طور پر کلینک تک پہنچنے کی کوشش کریں۔''

''ٹھیک ہے۔ ہم کتنی دیر تک یہاں سے نکلیں؟''

''میرے نکلنے کے قریباً تین چار منٹ بعد۔ اگر کوئی مزاحمت ہو تو پھر آپ بھی گولی چلا دیں۔ اس کے سوا اب کوئی چارہ نہیں ہے۔ اس اُلو کی پٹھی نے سارے منصوبے کا بیڑا غرق کر دیا ہے۔ اب میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے، میں جاتا ہوں۔''

رضوان نے جلدی جلدی دوائیں سمیٹیں اور اٹھ کھڑا ہوا۔ چاچا رزاق کے چہرے پر بھی ہیجان نظر آنے لگا تھا۔ رضوان کے جانے کے بعد میں نے جلدی جلدی رائفل چیک کی۔ یہ روسی ساخت کی کلاشنکوف تھی۔ میں اسے پہلے بھی استعمال کر چکا تھا۔ فالتو راؤنڈ میں نے اپنے چولے کی طویل پاکٹ میں ڈالے اور دوسرے حجرے میں جا کر تاجور کو جگا دیا۔

وہ ہڑبڑا کر بولی۔ ''کیا ہوا؟''

میں نے کہا۔ ''ابھی تو کچھ نہیں ہوا مگر ہونے والا ہے۔ ہم یہاں سے نکل رہے ہیں۔''

''آ...... آپ تو کل یا پرسوں کا کہہ رہے تھے؟''

''نہیں، اب پروگرام چینج ہوا ہے ہمیں ابھی یہ جگہ چھوڑنا ہوگی۔''

''اور ریشمی؟''

''اس کو بھی دیکھ لیتے ہیں۔'' میں نے تیزی سے کہا۔

''شاہ زیب! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

میں اپنے چہرے پر مسکراہٹ لے آیا۔ پھونک مار کر میں نے اس کے چہرے پر جھولتی ہوئی دولٹوں کو اس کی آنکھوں پر سے ہٹایا اور کہا۔ ''یہ تو پھر وہی گانے والی بات ہوئی...... بابا مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ بھئی۔ جب میں تمہارے ساتھ ہوں تو پھر ڈر کیسا؟''

میرے انداز نے اس کا خوف قدرے کم کیا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم جانے کے لیے تیار تھے۔ جنگلارے میں بیشتر لوگ سوئے پڑے تھے۔ سردی کی وجہ سے حجروں کے دروازے بند تھے۔ ہم تینوں نکلے اور نکاسی والے دروازے کی طرف بڑھے۔ اب جو کچھ بھی کرنا تھا رسک لے کر ہی کرنا تھا۔ میرے کمبل کے نیچے رائفل بالکل تیار حالت میں موجود تھی۔ میں نے وزنی دروازے کی چابی نکالی اور اسے ہضمی قفل میں ڈال کر ہولے سے گھمایا۔ دوسری تیسری کوشش پر چابی گھوم گئی۔ میں نے دھکیلا تو دروازہ کھل گیا۔ لگتا تھا کہ رضوان کو اپنے مقصد

میں کامیابی ہوئی ہے۔ وہ مسلح پہرے داروں کو کسی بہانے دروازے کے سامنے سے ہٹانے میں کامیاب ہوا تھا۔

باہر نکلنے کے بعد میں نے دروازے کو دوبارہ بھیڑ دیا۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے دروازے پر باہر کی طرف اس طرح پتھروں کے ٹکڑے جوڑے گئے تھے کہ یہ مختصر دروازہ دیوار کا حصہ ہی محسوس ہوتا تھا۔ میں نے سوراخ میں چابی گھمائی کر اسے دوبارہ لاک بھی کر دیا۔

ہم آگے پیچھے چلتے اس راہداری کی طرف بڑھے جو ڈاکٹر ارم کے ٹھکانے کی طرف جاتی تھی۔ چند گھنٹے پہلے جب میں اسٹریچر پر یہاں سے گزرا تھا تو میں نے اپنی بند آنکھوں میں جھری رکھی تھی اور راستے کو دیکھتا رہا تھا۔ میں آگے تھا۔ میرے پیچھے چاچا رزاق اپنی ہاکی ٹیکتے آ رہے تھے، آخر میں تاجور تھی۔ میری انگلی رائفل کی لبلبی پر تھی اور میں کسی بھی وقت اسے حرکت دے کر سامنے آنے والے شخص پر آگ برسا سکتا تھا۔ ایمونیشن والا تھیلا بھی میں نے کندھے سے لٹکا کر چولے کے نیچے چھپا لیا تھا۔

اچانک ایک موڑ پر ایک پہرے دار سامنے آ گیا۔ وہ حیرت سے ہماری طرف دیکھنے لگا۔ چند سیکنڈ کے لیے اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ وہ کیا دیکھ رہا ہے اور اسے کیا کرنا چاہیے۔ یہ وقت میرے لیے ضرورت سے کافی زیادہ تھا۔ میں نے اس کی کنپٹی پر رائفل کے دستے کا بھرپور وار کیا۔ وہ بغیر کوئی آواز نکالے، کٹے ہوئے شہتیر کی طرح زمین بوس ہونے لگا مگر میں نے اسے زمین بوس نہیں ہونے دیا اور ہاتھوں پر سہار کر ایک طرف تاریک گوشے میں ڈال دیا۔ اس کی رائفل میں نے کندھے سے اتار لی۔ ایک طرف بوسیدہ سی چٹائی پڑی تھی۔ تاجور نے اسے چٹائی سے ڈھانپ دیا۔ اب فوری طور پر اسے دیکھے جانے کا خدشہ نہیں تھا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم کلینک والے دروازے کے سامنے تھے۔ مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ ہم اتنی آسانی سے ڈاکٹر روم تک پہنچ جائیں گے۔ غالباً اس آسانی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی اور یہاں سیکورٹی کی چوکسی کا لیول کم ہو چکا تھا۔ دروازہ کھلا تھا، ہم اندر چلے گئے مختلف دواؤں کی تیز بو ہمارے نتھنوں میں گھسی۔

''یہاں تو کوئی نہیں ہے۔'' تاجور نے سرگوشی کی۔

''ہے...... کم ازکم ایک تو ہے۔'' میں نے کہا اور آگے بڑھ کر احتیاط سے واش روم کا دروازہ کھولا۔

میری توقع کے عین مطابق ڈاکٹر ارم فرش پر بے سدھ پڑی تھی۔ اس کے سر سے بہنے

والا خون گیلے فرش پر پھیلا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں بندھے تھے اور وہ ابھی تک بے ہوش تھی۔ اسی دوران میں رضوان بھی ہانپتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔

"آپ خیریت سے تو ہیں؟"

"تمہارے سامنے کھڑے ہیں۔" میں نے کہا۔ "بس راستے میں ایک، چولے والا سائیڈ ہیرو ملا تھا۔ اسے انٹاغفیل کر کے ڈال آئے ہیں۔"

"کہاں؟"

"جہاں سے تم گزر کر آئے ہو۔ اگر تمہیں نظر نہیں آیا تو اس کا مطلب ہے کہ اوروں کو بھی جلدی دکھائی نہیں دے گا۔"

وہ بولا۔ "ڈیڑھ بج چکا ہے۔ روشنی ہونے میں بہت زیادہ وقت نہیں ہے۔ ہمیں جو کرنا ہے، اجالا ہونے سے پہلے کرنا ہے۔"

"اور کیا کرنا ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر سوچنے لگا۔ پیشانی پر پسینے کی نمی تھی۔ بے شک وہ یہاں سے نکلنے کے لیے ہمت اور جرأت کا ثبوت دے رہا تھا۔ مگر میں بھانپ چکا تھا کہ وہ مار دھاڑ والا شخص نہیں ہے۔ اسلحے سے بھی اس کو بس واجبی سی واقفیت تھی۔ وہ دوسری رائفل دیکھ کر حیر ن ہو رہا تھا، میں نے اسے بتایا کہ یہ اس پہرے دار کی ہے، جسے ہم نے راستے میں گرایا ہے۔

وہ بولا۔ "پاک بہن کے لیے ہماری پلاننگ تو یہ تھی کہ کل جب وہ کان چھدوانے کے لیے یہاں آئے تو ہم اسے یہاں سے لے نکلیں۔ مگر اب تو ایسا نہیں ہو سکتا۔ اب اسے "سایہ" کے اندرونی حصے سے نکالنا ایک بہت مشکل کام ہے۔"

میں نے کہا۔ "مشکل کام کرنے کے لیے ہی تو ہم یہاں آئے ہیں۔ تم مجھے صرف راستہ سمجھاؤ اور یہ بتاؤ کہ راستے میں کس کس سے مڈبھیڑ ہو سکتی ہے۔ باقی کام مجھ پر چھوڑ دو۔ میں پاک بہن کو وہاں سے نکال لوں گا۔"

"شاہ زیب بھائی! مجھے یہ کام کافی مشکل نظر آتا ہے۔ معاف کیجیے آپ کی جان جا سکتی ہے۔"

"جان تو ویسے بھی جا سکتی ہے۔ اب ہم قدم اٹھا چکے ہیں۔ تم ڈاکٹر ارم کے ساتھ فل ٹکر لے چکے ہو، اور ہم جنگلارے کی جیل توڑ کر نکل آئے ہیں۔ اب تو جو ہونا ہے، وہ ہونا ہے۔"

اس نے ایک بار پھر خشک لبوں پر زبان پھیری۔ "آپ کا کیا خیال ہے، جنگلارے

میں آپ کی غیر موجودگی کب تک راز رہے گی؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ ہاں باہر نکلنے کے بعد میں نے تالے میں چابی گھما کر اسے پھر لاک ضرور کر دیا تھا۔"

"یہ تو آپ نے واقعی بہت اچھا کیا۔ کوئی اور ہوتا تو شاید افراتفری میں یہ نہ کر سکتا۔ اب امید ہے کہ صبح سات بجے تک تو آپ کا فرار راز ہی رہے گا۔"

"شرط یہ ہے کہ جس پہرے دار کو چٹائی کے نیچے چھپایا ہے وہ نیچے ہی رہے۔" تاجور نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

رضوان نے کہا۔ "سب سے پہلے تو آپ تینوں کو جنگلارے والے لباس سے نجات حاصل کرنا ہوگی اور بھائی، اگر آپ "سائے" کے اندرونی حصے کی طرف جانا چاہتے ہیں تو بھی آپ کا لباس بدلنا بہت ضروری ہے۔ بلکہ میری تو رائے ہے کہ آپ میرے والے کپڑے پہن لیں۔ سائز میں تھوڑا بہت فرق ہوگا مگر کام چل جائے گا۔" رضوان اب پینٹ شرٹ کے بجائے گہرے نیلے چولے اور پاجامے میں تھا۔ گلے میں صافا ڈال رکھا تھا۔

ہم تینوں نے تیزی سے حرکت کی اور جنگلارے والے "خطرناک زرد پٹی لباس" سے نجات حاصل کر لی۔ تاجور پر ڈاکٹر ارم کے کپڑے بالکل صحیح آئے۔ میرے لیے رضوان والا چغہ اور ٹراؤزر تھوڑا چھوٹا تھا مگر کام چل گیا۔ میں نے گلے میں مالائیں ڈال لیں اور سر پر صافا نما چادر رکھ لی، چاچا رزاق نے بھی رضوان کا ایک جوڑا پہن لیا۔ پہلے والے کپڑے اسٹور روم میں چھپا دیے گئے۔

ڈاکٹر ارم ابھی تک بے ہوش تھی۔ میں نے رضوان سے کہا کہ وہ مجھے "سائے" کے اندرونی حصے کا نقشہ سمجھائے اور دیگر تفصیل بتائے۔ اس نے کاغذ قلم سنبھال لیا مگر چہرے پر شدید تذبذب نظر آ رہا تھا۔ اس نے ایک نظر چاچا رزاق کی طرف دیکھا، پھر مجھے لے کر تھوڑی دور چلا گیا۔ سرگوشی میں بولا۔ "بھائی، میں آپ کو اپنے دل کی بات بتا رہا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت اگر ہم نے پاک بہن کو یہاں سے نکالنے کی کوشش کی تو...... شاید...... ہم سب مارے جائیں گے۔ اگر ہم دل کے بجائے دماغ سے سوچیں تو پھر بہتر راستہ یہ ہے کہ ابھی...... وقتی طور پر...... پاک بہن کا خیال دل سے نکال دیں۔"

"تمہارا مطلب ہے اس کے بغیر یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں۔"

"بالکل...... اگر ہم بچ کر نکل گئے تو پھر اس کے لیے بھی بہت کچھ کر سکیں گے ورنہ......"

''نہیں رضوان۔'' میں نے اس کی بات کاٹی۔ ''اس کی جان اور عزت دونوں خطرے میں ہیں۔ اگر ہم اسے چھوڑ کر نکلیں گے تو پھر...... اسے جان بچا کر بھاگنا ہی کہیں گے۔ اب جو ہوگا، ہم سب کے ساتھ ہوگا۔''

''آپ...... مجھے...... ڈرپوک تو نہیں سمجھ رہے؟''

''یہ بالکل غیر ضروری سوال کیا ہے تم نے۔ اگر تم ڈرپوک ہوتے تو اس طرح کی کارروائی کی پلاننگ ہی نہ کرتے۔ پلاننگ خراب ہوگئی ہے، صرف اس لیے کہ تم دوسری طرح سوچنے پر مجبور ہو رہے ہو۔''

اس نے ایک گہری سانس لی اور جیسے ہر طرح کے اندیشے ذہن سے نکال کر کاغذ پر جھک گیا۔ وہ مجھے ملنگی ڈیرے کے اس اندرونی حصے کی تفصیل بتا رہا تھا، جہاں پاک بہن یعنی ریشمی موجود تھی۔ یہ راہداریوں اور چوکور کشادہ جگہوں کا ایک سلسلہ تھا۔ آگے جا کر آٹھ دس قالین پوش زینے آنے تھے۔ یہ زینے طے کر کے میں سایہ نامی جگہ کے اس خاص الخاص حصے میں داخل ہو جاتا جہاں پردے والی سرکار، اس کی بیویوں اور مجاوروں سے میری مڈبھیڑ ہو سکتی ہے۔

نقشے کو پوری طرح سمجھنے کے بعد میں نے تاجور اور چاچا رزاق کو تیار رہنے کی ہدایت کی اور خود آگے جانے کو تیار ہو گیا۔ تاجور کا رنگ اُڑا ہوا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اگلے آدھے گھنٹے میں میرے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ وہ منمنائی۔ ''شاہ زیب! اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو...... مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔''

''اب رسک تو لینے ہی پڑیں گے تاجور۔''

''اگر...... انہوں نے آپ کو گھیر لیا تو، آپ گرفتاری دے دینا، اگر جان بچی رہے گی...... تو ہم پھر...... کوئی کوشش کر سکیں گے۔''

میں اسے تسلی بخش نظروں سے دیکھ کر آگے بڑھ گیا۔ کلینک کے چھوٹے اندرونی دروازے سے گزر کر میں ایک خم دار راہداری میں داخل ہوا، یہاں بھی چھت زیادہ بلند نہیں تھی بمشکل سات ساڑھے سات فٹ اونچی رہی ہوگی۔ میرے پاؤں ننگے تھے۔ ہلکی پھلکی لیکن طاقتور رائفل میرے بائیں ہاتھ میں تھی اور ہاتھ نیلگوں شال کے نیچے تھے۔ راہداری میں داخل ہوتے ہی مجھے اس بھینی بھینی مدھر خوشبو کا احساس ہوا جس کا تذکرہ تاجور نے کیا تھا۔ یہ ساری جگہ جیسے اس معطر خوشبو میں بسی ہوئی تھی۔ جوں جوں میں آگے بڑھتا گیا، سردی کی شدت ایک خوشگوار حرارت میں بدلتی گئی۔ تاجور نے بتایا تھا کہ یہاں ہر وقت بڑی بڑی

انگیٹھیاں دہکتی رہتی ہیں۔ جلد ہی مجھے ایک ایسی انگیٹھی دکھائی بھی دے گئی۔ یہ لوہے کی تین چار فٹ اونچی انگیٹھی ایک موڑ پر رکھی تھی۔ قریب ہی ایک پہرے دار کھڑا ہاتھ تاپ رہا تھا۔ اس کا رخ مخالف سمت میں تھا۔ میں پنجوں کے بل بے آواز چلتا اس کے سر پر پہنچا۔ رائفل کے دستے سے بہترین ضرب لگانے کے لیے میرے پاس کافی ٹائم موجود تھا۔ میں نے پہرے دار کی گدی کے نازک مقام کو نشانہ بنایا۔ بڑی پرفیکٹ ضرب تھی۔ اس کے گرنے سے پہلے ہی میں نے اسے بازو پر سہار لیا اور فرش پر لٹا دیا۔ بہرحال بند جگہ پر چوٹ کی آواز گونجی تھی اور پہرے دار نے ہلکی سی کراہ بھی خارج کی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک اوٹ سے ایک اور پہرے دار برآمد ہوا۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر حیرت کی یلغار ہوئی۔ اس نے پھرتی سے اپنی رائفل کندھے سے اتارنا چاہی۔ تب تک میں اس کی کمر کے گرد اپنے بازوؤں کا حلقہ قائم کر چکا تھا۔ میں نے اسے تیزی سے اوپر اٹھایا، اسے پتا ہی نہیں چلا ہوگا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ اس کے سر اور پتھریلی چھت کا زوردار تصادم ہوا اور اس کی گردن ڈھلک گئی۔ میں نے احتیاط سے اسے بھی انگیٹھی کے قریب لٹا دیا۔ مجھے اس کی کمر کے ساتھ چمڑے کے غلاف میں ایک خنجر بندھا نظر آیا۔ میں نے یہ خم دار خنجر...... غلاف سمیت اس کی کمر سے کھول کر اپنی کمر سے باندھ لیا۔ دوسرے پہرے دار کی رائفل بالکل اسی رائفل کی طرح تھی جو میرے پاس تھی۔ میں نے اس رائفل کا میگزین اتار کر اپنے چولے کی طویل جیب میں ڈال لیا۔ دونوں رائفلوں کو انگیٹھی کے عقب میں اس طرح کھڑا کر دیا کہ وہ فوراً نظر نہ آئیں۔ دونوں پہرے دار انگیٹھی کے قریب یوں پہلو بہ پہلو لیٹے تھے جیسے خوشگوار حرارت کے سبب سو گئے ہوں۔ ہاں غور سے دیکھنے پر دوسرے پہرے دار کے سر سے رستا ہوا خون نظر آ سکتا تھا۔

اندازہ ہوا کہ یہاں آس پاس کوئی اور موجود نہیں۔ اگر ہوتا تو اب تک رُونمائی کرا چکا ہوتا۔ میں مزید آگے بڑھا۔ ان ساری راہداریوں میں برقی روشنی موجود تھی۔ رات کا آخری پہر تھا، اس لیے بہت سے بلب بجھا دیئے گئے تھے۔ میرے پاس وہ نقشے والا کاغذ موجود تھا۔ جہاں کنفیوژن ہوتی تھی، میں کاغذ دیکھ لیتا تھا۔ جلد ہی مجھے کشادہ قالین پوش زینے نظر آ گئے۔ پاس ہی کہیں باتوں کی بھنبھناہٹ سنائی دی۔ میں دیوار سے لگ گیا اور سننے لگا۔ دونوں پہرے دار بڑے رومانوی موڈ میں تھے اور محبت کی باتیں کر رہے تھے۔ یہ دراصل میل اور فی میل پہرے دار تھے۔ میل نے شاید کوئی چھیڑخانی کی۔ فی میل جو یقیناً جواں سال عورت تھی۔ جھنجلا کر بولی۔ ”دیکھو یہ تم ٹھیک نہیں کر رہے، میں کرنالی جی سے شکایت کروں گی۔“

”تمہیں پتا ہے، اس میں تمہارا ہی نقصان ہوگا۔ تمہیں کہیں اور بھیج دیا جائے گا۔ جہاں

سائے جیسی عیاشیاں نہیں ملیں گی تمہیں۔'' مرد پہرے دار نے بے پروائی سے کہا۔
لگتا تھا فی میل پہرے دار اس کی ماتحت ہے اور وہ اس کو ہراساں کر رہا ہے۔
''لیکن کوئی حد بھی ہوتی ہے جیدے! ہم اس وقت ڈیوٹی دے رہے ہیں۔'' عورت پھر جھنجلائے ہوئے لہجے میں بولی۔
''اچھا چلو معاف کرو، لیکن......کل تو ڈیوٹی نہیں ہے۔کل آ جانا۔رات کے کھانے کے بعد'' وہ ڈھیٹ پن سے بولا۔
انہوں نے تھوڑی دیر اسی طرح کی باتیں کیں۔ پھر ان کی آواز مدھم ہوگئی۔ وہ آگے نکل گئے تھے۔ میں نے اوٹ سے دیکھا۔ وہ سیڑھیوں کی طرف جا رہے تھے۔ جواں سال عورت بھرے بھرے جسم والی ملنگنی تھی۔ اس نے پہرے داروں والا گہرے نیلے رنگ کا چولا پہن رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لٹھ تھی جبکہ مرد پہرے دار رائفل سے مسلح تھا۔ میں نے تقریباً ایک منٹ انتظار کیا پھر خود بھی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گیا۔ یہاں بہت سے حجرے نظر آ رہے تھے۔ راہداریاں بھی تھیں جن میں نیلگوں بلب روشن تھے۔ یہاں پہنچ کر مجھے گانے کی مدھم آواز سنائی دی۔ کوئی لڑکی بڑے مدھر سُروں میں گا رہی تھی۔ رات کے اس سناٹے میں اس کی آواز ان سنگی دیواروں میں تواتر سے ڈوب ابھر رہی تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ یہ ریشمی کی آواز ہے، عجیب سوز تھا، عجیب درد تھا۔ الفاظ سمجھ میں نہیں آ رہے تھے مگر وہ جو کچھ بھی پڑھ رہی تھی۔ دل پر اثر کرنے والا تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ پنجابی زبان کی کوئی کافی تھی جس میں جدائی کا ذکر تھا۔ فاصلوں کا ذکر تھا اور روح کی تڑپ کا ماجرا تھا۔ دنیا کی ستم ظریفی سے روح اور جسم ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں اور انہونی کی تلاش میں انتظار کے اندھے غاروں میں بھٹکنے لگتے ہیں۔
اتنا درد کیوں تھا اس کی آواز میں، شاید اس لیے کہ اس نے بھی کبھی کسی سے پیار کیا تھا۔ اس کی کنواری آنکھوں میں سپنے اترے تھے مگر وہ کسی اور کی ڈولی میں بیٹھ گئی تھی۔ ایک ایسا سنگ دل شریکِ حیات جس نے اسے لاہور کی گلیوں میں رسوا کیا اور توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔
آواز ملنگی ڈیرے کی ان دیواروں میں گونج رہی تھی اور انوکھا سحر پیدا کر رہی تھی۔ رات کے آخری پہر ابھرنے والی یہ غمناک جادوئی آواز مجھے میری منزل کا پتا بھی دے رہی تھی۔ میں جوں جوں آگے بڑھتا گیا، آواز واضح ہوتی گئی۔ میں بڑی احتیاط سے چلتا اور دیواروں کی اوٹ لیتا جلدی ہی آواز کے ماخذ تک پہنچ گیا۔
میں ایک شفاف راہداری میں کھڑا تھا۔ بالکل جیسے کسی محل یا قلعے کی غلام گردش ہو یہاں

بڑی مسحور کن مہک تھی۔ یہ مہک خاص طرح کی اگربتیوں سے خارج ہوتی تھی اور درودیوار کو معطر کرتی تھی۔ ایک جانب لوہے کی ایک بڑی انگیٹھی میں ادھ بجھے انگارے موجود تھے۔ میں نے شیشم کے خوب صورت دروازے پر ایک انگلی سے مدھم دستک دی۔ گانے کی آواز معدوم ہوگئی۔ دوسری دستک پر کسی نے پوچھا۔ ''کون ہے؟''

بے شک یہ ریشمی ہی کی آواز تھی۔ وہ دروازے کے بالکل پاس سے بول رہی تھی۔ میں نے دروازے سے منہ لگایا اور مدھم سرسراتی آواز میں کہا۔ ''شاہ زیب۔''

''کون؟'' پھر پوچھا گیا۔

''شاہ زیب۔'' میں نے اسی طرح سرگوشی میں جواب دیا۔

دروازہ کھل گیا۔ سامنے ریشمی تصویرِ حیرت بنی کھڑی تھی۔ اس حیرت میں نمایاں طور پر خوف کی آمیزش بھی تھی۔

میں جلدی سے اندر چلا گیا۔ ریشمی نے دروازہ اندر سے بولٹ کیا اور گھبرائی ہوئی میری طرف پلٹی۔ ''آ...... آپ یہاں؟''

''ہاں ریشمی، سارا پروگرام الٹ پلٹ گیا ہے۔ اب ہمارے پاس صرف دو ڈھائی گھنٹے ہیں ہمیں اسی وقت یہاں سے نکلنا ہوگا۔''

اس نے میرے ہاتھ میں رائفل دیکھ لی تھی اور یہ بھی سمجھ گئی تھی کہ میں ہر خطرے کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو کر آیا ہوں۔

اس سے پہلے کہ وہ جواب میں کچھ کہتی، راہداری میں بھاگتے قدموں کی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی دروازے کھٹکھٹائے جانے لگے اور پہرے داروں کی بلند آوازیں سنائی دیں۔ چند لمحے بعد ریشمی کے حجرے والا دروازہ بھی کھٹکھٹایا گیا۔ ریشمی نے دائیں بائیں دیکھا۔ ایک قد آدم الماری کے پیچھے خلا موجود تھا۔ میں اس خلا میں چلا گیا۔ ریشمی نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ کسی پہرے دار نے بھاری آواز میں پوچھا۔ ''پاک بہن! آپ خیریت سے ہیں؟''

''ہاں میں ٹھیک ہوں، کیا ہوا؟'' ریشمی نے پوچھا۔ اس کی آواز کی لرزش میں صاف محسوس کر رہا تھا۔

''کوئی شخص یہاں گھس آیا ہے۔ اس کے پاس رائفل بھی ہے۔ خطرناک بندہ ہے۔ آپ دروازہ اندر سے بند کریں اور آواز پہچانے بغیر نہیں کھولیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' ریشمی نے اثبات میں جواب دیا اور دروازہ پھر اندر سے بولٹ کر دیا۔

اس کے گہرے نیلے کپڑے شکن شکن تھے۔ بال بھی بڑی حد تک منتشر نظر آتے تھے۔ آنکھیں ورم زدہ تھیں۔ وہ جیسے کسی نشہ آور چیز کے زیر اثر تھی۔ عجیب کھوئی کھوئی آواز میں بولی۔ ''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا، یہاں کیا ہو رہا ہے۔ مجھے بس ایک فکر ہے، میرے ابا جی اور میری سہیلی کی جان بچ جائے۔ بھائی، آپ یہاں کیوں آئے ہو، آپ کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔''

میں نے کہا۔ ''ریشمی! تم خود کو سنبھالو، تمہارے ابا جی اور تاجور یہاں سے نکلیں گے اور تم بھی نکلو گی۔ میں سب ٹھیک کر لوں گا۔''

''مجھے لگتا ہے کہ کچھ ٹھیک نہیں ہو گا۔ سب ختم ہو جائے گا۔ میرے دل میں عجیب وسوسے آ رہے ہیں۔ میں دو دن سے بہت زیادہ پریشان ہوں۔ ایک ہی چیز بار بار میرے دماغ میں آ رہی ہے۔ بار بار آ رہی ہے۔'' اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھاما اور گدے پر گر سی گئی۔ اس کی پشت دیوار سے ٹکی ہوئی تھی۔

مجھے لگا کہ وہ سوئی ہوئی سی کیفیت میں ہے۔ شاید یہی کیفیت تھی جس میں وہ رات کے اس پہر جاگ رہی تھی اور گا رہی تھی۔

''کیا چیز بار بار تمہارے دماغ میں آ رہی ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔

''آپ نہیں سمجھ پائیں گے۔ میرا مذاق اڑائیں گے...... کوئی نہیں سمجھے گا۔''

''تم بتاؤ تو سہی۔'' میں نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

وہ بولی۔ ''میں نے ایک آواز سنی ہے۔ وہی آواز جو چاند گڑھی میں آتی تھی۔ یہ چاند گڑھی والی آواز ہی ہے۔''

''کیسی آواز؟''

''میں آپ کو نہیں بتا سکتی لیکن مجھے لگتا ہے کہ...... میں پہچان گئی ہوں۔ اگر وہ......''

یکا یک دروازے پر پھر دستک ہوئی اور ریشمی کی بات ادھوری رہ گئی۔ وہ پھر خوف زدہ نظروں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ ''کون ہے؟'' اس نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

''دروازہ کھولو پاک بہن۔'' دوسری طرف سے اسی پہرے دار کی آواز آئی۔

میں نے رائفل اٹھائی اور جلدی سے واپس الماری کی اوٹ میں چلا گیا۔ ریشمی نے ایک بلب بجھا دیا تاکہ کمرے میں روشنی کم ہو جائے۔ اس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ آگے بڑھ کر اس نے دروازہ کھولا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ دروازے پر ایک سے زائد افراد موجود ہیں۔ پھر کوئی ایک اندر آ گیا اور باقی واپس چلے گئے۔

''سس...... سرکار...... آپ یہاں؟'' ریشمی کی آواز میرے کانوں میں گونجی اور میرے

جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔

اس ملنگی ڈیرے کا اہم ترین شخص یہاں اس کمرے میں ریشمی کے سامنے موجود تھا۔ غالباً اس نے کوئی قیمتی خوشبو لگا رکھی تھی۔ پھر اس کی بھاری رعب دار آواز میرے کانوں تک پہنچی۔ ''ہاں، میں نے سوچا حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ تمہیں ڈر آ رہا ہوگا مجھے تمہارے پاس جانا چاہیے۔''

وہ گدے پر نہیں بیٹھا بلکہ ایک آرام دہ نشست پر ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ میں اب الماری کے تاریک عقبی خلا سے اسے دیکھ سکتا تھا۔ اس کے گلے میں لکڑی اور قیمتی پتھروں کی کئی مالائیں تھیں۔ ہاتھوں میں بھی جگمگاتی انگوٹھیاں تھیں۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں مجھے کڑے نظر آئے۔ یہ سنہری کڑے سونے کے تھے اور ان پر سبز نگینے جڑے تھے۔ چمکیلے کڑھائی دار سفید لبادے میں وہ دونوں بازو پھیلائے بیٹھا تھا...... اور سب سے انوکھی بات وہی تھی جس کا نظارہ میں پہلے بھی دو مرتبہ کر چکا تھا۔ پردے والی سرکار کا چہرہ بدستور سفید گھونگھٹ میں چھپا ہوا تھا۔ یہ ایک چادر سی تھی جو اس طرح وہ اپنے سر پر ڈالے رکھتا تھا کہ سر، چہرہ اور گردن مکمل طور پر اس میں اوجھل ہو جاتے تھے۔ وہ جب دائیں بائیں دیکھتا تھا تو یہ چادر اس طرح جھولتی تھی جیسے سفید ہاتھی کی سونڈ۔

''کھڑکی کا یہ پردہ ٹھیک کر دو۔'' پردے والی سرکار نے ریشمی سے کہا۔

وہ اٹھی اور پردہ درست کر کے دوبارہ سفید پوش شخص کے سامنے گدے پر بیٹھ گئی۔ وہ گمبھیر آواز میں ٹھہر ٹھہر کر بولا۔ ''ریشمی، پرسوں تم نے جو بات کہی، وہ ابھی تک میرے دماغ میں چکرا رہی ہے۔ تم نے کہا تھا کہ میری آواز تمہارے گاؤں چاند گڑھی کے کسی شخص سے ملتی ہے۔ وہ وہاں کا کوئی پیر تھا۔ جھاڑ پھونک کرتا تھا۔''

''جج...... جی ہاں...... مجھے کئی دن سے یہ لگ رہا تھا۔ پپ پرسوں میں نے آپ سے اپنے دل کی بات کہہ دی۔''

''اچھا کیا، دل کی باتیں دل میں نہیں رکھنی چاہئیں۔ دیکھو ریشمی جس طرح شکلوں سے شکلیں ملتی ہیں، آوازوں سے آوازیں بھی ملتی ہیں۔ اب اپنی آواز کو ہی دیکھو، لوگ کہتے ہیں یہ وہی آواز ہے جو ڈھائی تین سو سال پہلے بھی اس ڈیرے پر گونجتی تھی...... یہ مستاں مائی کی آواز تھی۔ لوگ دیوانہ وار اس کی طرف کھنچے آتے تھے۔ آج وہی مست کر دینے والی آواز تمہارے گلے میں ہے۔ میں نے تمہاری اس آواز سے بہت سی امیدیں لگائی ہوئی تھیں، لیکن......'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

کمرے میں چند سیکنڈ خاموشی رہی۔ اس خاموشی میں بس راہداریوں میں بھاگ دوڑ کرنے والے پہرے داروں کی چاپیں ہی سنائی دیتی تھیں۔ یقیناً یہ لوگ اس ''گھس بیٹھیے'' کو ڈھونڈ رہے تھے، جس نے رات کے آخری پہر یہاں گھس کر دو پہرے داروں کو لہولہان کر دیا تھا اور ان کے لیے ایک سخت مصیبت کھڑی کر دی تھی۔

چند لمحے بعد پردے والی سرکار نے اپنا ادھورا فقرہ جوڑتے ہوئے کہا۔ ''اس آواز سے بہت سی امیدیں لگائی ہوئی تھیں لیکن اب مجھے لگتا ہے کہ یہ آواز شاید اب میری مدد نہ کر سکے۔''

''میں سمجھی نہیں سرکار جی۔'' ریشمی کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

''غلطی مجھ سے ہی ہوئی ہے۔ مجھے سمجھنا چاہیے تھا کہ کبھی کبھی شکل کے علاوہ آواز بھی مصیبت بن جاتی ہے۔''

''میں آپ کی بات اب بھی سمجھ نہیں پا رہی ہوں۔'' ریشمی نے کہا۔

پردے والی سرکار نے ایک گہری سانس لی۔ ''میرا خیال ہے ریشمی کہ تم بہت تھک گئی ہو۔ پچھلے دنوں کافی پریشان رہی ہو نا۔ اب تم کو آرام کرنا چاہیے۔'' وہ شخص اردو میں بات کر رہا تھا مگر لہجے میں پنجابی کی جھلک موجود تھی۔

ریشمی نے جھجک کر کہا۔ ''آپ آرام کی بات کر رہے ہیں...... مگر شادی......؟''

''میں نے ایک اور فیصلہ بھی کیا ہے ریشمی۔'' پردے والی سرکار نے گمبھیر لہجے میں بات کاٹ کر کہا۔ ''میں تمہاری مرضی کے بغیر تم سے شادی نہیں کروں گا۔ بلکہ اب تو دل چاہتا ہے کہ...... تم جس طرح دوسروں کے لیے پاک بہن ہو، میرے لیے بھی پاک بہن ہی رہو۔''

''جی...... جی؟'' ریشمی پر جیسے حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

''میں نے کہا ہے نا...... تم بہت تھک گئی ہو۔ تمہارے جسم اور دماغ کو اب آرام کی ضرورت ہے۔ لمبے آرام کی۔'' پردے والی سرکار نے کہا۔ اس کے انداز میں کچھ جدا سی بات تھی۔

میں نے چونک کر دیکھا۔ آرام دہ نشست پر...... چہرے کو گھونگھٹ میں چھپائے بیٹھا، وہ عجیب لگ رہا تھا۔ اس نے اپنا انگشتریوں والا ہاتھ بڑھایا اور ریشمی کے گلے میں ڈال کر اسے اپنے گھٹنوں کے ساتھ لگا لیا۔ وہ ذرا ٹھٹکنے کے بعد اس کے گھٹنوں سے لگ گئی۔

تب میں نے ایک اور منظر دیکھا اور دم بخود رہ گیا۔ مجھے پردے والی سرکار کے ہاتھوں میں موٹی رسی کا ایک ٹکڑا نظر آیا۔ یہ ٹکڑا اس نے دفعتاً ریشمی کے گلے میں لپیٹا اور اسے پورے

زور سے کس ڈالا۔ ریشمی کا منہ بے ساختہ کھل گیا۔ اس کا چہرہ خون کے دباؤ سے سرخ ہو گیا۔ وہ چلانے کی کوشش کر رہی تھی مگر ناکام ہو رہی تھی۔ وہ پھول دار گدے پر بری طرح تڑپی۔ اس کا پاؤں لگنے سے ایک چھوٹے سائز کی منقش تپائی دور لڑھک گئی۔ اب میرا بے حرکت رہنا خطرناک تھا۔ میں الماری کی اوٹ سے نکلا اور پردے والی سرکار پر جھپٹا۔ میں نے عقب سے اس کی گردن میں اپنا بازو ڈالا اور ایک خاص انداز میں اس کی شہ رگ کو اپنے شکنجے میں کس لیا۔ اس اچانک افتاد نے اس شخص کو بوکھلا ڈالا۔ ریشمی کی گردن پر سے اس کی گرفت کمزور ہو گئی۔ ریشمی نے تڑپ کر خود کو اس سے چھڑایا اور ایک طرف گر کر بری طرح کھانسنے لگی۔

پردے والی سرکار نے زور مارا۔ مجھے اس شخص سے اتنی شدید مزاحمت کی توقع نہیں تھی۔ کچھ دیر پہلے اس کی آواز سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ اس کی عمر چالیس پینتالیس سال کے لگ بھگ ہو گی مگر اب وہ جس طرح زور مار رہا تھا، مجھے اپنا اندازہ غلط محسوس ہوا تھا اور پھر اس شخص نے وہ کام کیا جس کا مجھے بالکل بھی اندیشہ نہیں تھا۔ اس کا دایاں ہاتھ کہیں اس چرمی غلاف سے چھو گیا تھا جس میں، میں نے خنجر اڑسا ہوا تھا، اس نے تیز دھار خنجر نکال لیا۔ دستے پر اس کی گرفت مضبوط تھی اور اس کا انگوٹھا دستے کی عقبی جانب تھا۔ وہ اس پوزیشن میں تھا کہ میرے دائیں پہلو کو خطرناک طریقے سے نشانہ بنا سکتا تھا۔ میں نے اسے اس عمل سے روکنے کے لیے اس کی گردن پر دباؤ بڑھایا اور یہیں پر اس شخص سے وہ دوسری غلطی ہوئی جو اس کے لیے بے حد مہلک تھی۔ اس نے خود کو پلٹنے کے لیے زور مارا...... اور اس کی گردن کا منکا ٹوٹ گیا۔ یہ آواز بڑی واضح تھی اور اس آواز کا ارتعاش مجھے اپنے بازو کے نیچے ہولناک لگا۔ ایک دم اس شخص کا زور مارتا ہوا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ اس کے دونوں بازو بے جان ہو کر اس کے دونوں پہلوؤں پر لٹک گئے۔ خنجر اس کے ہاتھ سے نکل کر گدے پر گرا۔

ریشمی ابھی تک ابکائیاں لے رہی تھی۔ اس کے بال اس کے چہرے پر منتشر تھے۔ اسے ابھی تک پتا نہیں چلا تھا کہ پچھلے تین چار سیکنڈ میں کتنا بڑا واقعہ ہو چکا ہے۔ اس ملنگی ڈیرے کا اہم ترین شخص اپنی تمام تر شان اور پُراسراریت کے ساتھ موت کی وادی میں اتر چکا ہے......

میں نے پردے والی سرکار کا بے حرکت جسم گدے پر ڈالا۔ وہ اوندھے منہ تھا۔ میں نے اسے سیدھا کیا۔ سفید گھونگھٹ ابھی تک اس کے لمبوترے چہرے پر تھا۔ اب وہ مرحلہ تھا جس کے لیے میرے اندر ایک شدید تجسس مسلسل لہریں لے رہا تھا اور یقیناً یہ تجسس روتی ہچکیاں

لیتی ریشمی کے اندر بھی موجود تھا...... میں نے ہاتھ بڑھا کر ''پردے والی سرکار'' کا پردہ الٹ دیا۔

چند لمحے کے لیے ہم دونوں سکتہ زدہ رہ گئے۔ ریشمی میں تو شاید اتنی ہمت بھی نہیں رہی تھی کہ وہ چلا سکے۔ ہم حیرت زدہ نظروں سے دیکھ رہے تھے، ہمارے سامنے جو شخص پڑا تھا۔ اس کا چہرہ (اگر اسے چہرہ کہا جائے تو) نہایت کریہہ منظر پیش کر رہا تھا...... وہ بری طرح جھلسا ہوا تھا۔ ایک سائیڈ تو مکمل طور پر جل چکی تھی۔ اس جانب کی آنکھ بھی بغیر پلک کے تھی اور خوفناک منظر پیش کرتی تھی۔ چہرے کی دوسری سائیڈ بھی ایک تہائی متاثر تھی...... چہرے کے باہری گھونگھٹ کے نیچے ایک اور چھوٹا نقاب بھی تھا۔ پردے والی سرکار کا پورا چہرہ دیکھنے کے لیے اس نقاب کو بھی سرکانا پڑا۔

ریشمی نے کانپتی ہوئی ہراساں آواز میں کہا۔ ''مم...... میرا...... اندازہ...... ٹھیک تھا۔ یہ وہی ہے، وہی شیطان پیر سائیں ہے۔ ہمارے گاؤں میں لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ آگ میں جل چکا ہے، اپنے دو مریدوں سمیت ڈیرے پر سواہ (راکھ) ہو گیا ہے...... مم...... مجھے ابھی تک اپنی نظروں پر یقین نہیں آ رہا...... یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں......''

وہ جیسے خوف کے سبب کھسکتی ہوئی ''پردے والی سرکار'' سے کچھ اور دور ہٹ گئی۔ اسے ابھی تک معلوم نہیں تھا کہ یہ کریہہ المنظر شخص مر چکا ہے...... ملنگی ڈیرے کے اس خاص الخاص حصے میں ایک ایسا حادثہ ہو چکا تھا جو یہاں تہلکہ مچا سکتا تھا۔

''اسے کیا ہوا ہے؟'' ریشمی نے دہل کر پوچھا۔

''لگتا ہے، بے ہوش ہو گیا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ (پہلے سے دہشت زدہ ریشم کو میں مزید دہشت زدہ کرنا نہیں چاہتا تھا)

''اب کیا ہوگا؟'' وہ ہکلائی۔

میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے تیزی سے ''پردے والی سرکار'' کی تلاشی لی۔ اس کے بیش قیمت لبادے کا کپڑا موٹے ''ویل وٹ'' کا تھا اس کی جیبوں سے مجھے چند دیگر اشیا کے ساتھ چابیوں کا ایک گچھا بھی ملا۔ اس میں تین چار لمبی چابیاں تھیں۔ یہ چابیاں دیکھ کر ریشمی چونک گئی۔ اس نے پیتل کی ایک چابی کو گھما پھرا کر دیکھا اور بولی۔ ''مجھے لگتا ہے بھائی، یہ دوسرے دروازے کی چابی ہے۔''

''کون سا دوسرا؟''۔

جواب دینے کے بجائے اس نے مجھے ساتھ لیا اور ایک در سے گزر کر کمرے کے

دوسرے حصے میں آ گئی۔ اس مستطیل حصے میں ایک اور دروازہ نظر آ رہا تھا۔ اس کی چوڑائی بمشکل دو ڈھائی فٹ رہی ہوگی۔ وہ بولی۔ ''مجھے لگتا ہے، یہ اس دروازے کی چابی ہے۔ ایک بار یہ پردے والی سرکار یہاں سے بھی آیا تھا۔''

ریشمی کی بات خوش آئند تھی۔ اگر یہ چابی واقعی اس دروازے کے قفل میں لگ جاتی تو ہم اس عقبی دروازے سے بھی نکل سکتے تھے۔ میں نے واپس جا کر پردے والی سرکار (یا پیر سانتا) کا نہایت بدنما چہرہ کپڑے سے ڈھک دیا۔ اب اس شخص کے حوالے سے سب کچھ سمجھ میں آ رہا تھا، کیونکہ ریشمی نے اسے پہچان لیا تھا۔ برسوں پہلے اس شیطان صفت شخص نے چاند گڑھی میں زبردست من مانیاں کی تھیں اور آخر ایک معصوم لڑکی کی عزت سے کھیلنے کی پاداش میں زندہ جلا دیا گیا تھا مگر وہ زندہ نہیں جلا تھا۔

دروازے سے باہر پہرے داروں کی زبردست نقل و حرکت موجود تھی۔ اگر ہم اس جانب سے نکلنے کی کوشش کرتے تو مڈ بھیڑ لازمی تھی۔ میں نے رائفل سنبھالی۔ خنجر فرش سے اٹھا کر دوبارہ چمڑے کے غلاف میں لگایا اور ریشمی کا ہاتھ پکڑ کر عقبی دروازے کی طرف بڑھا۔ اس جانب نسبتاً خاموشی تھی۔ میں نے پیتل کی چابی کو قفل میں ڈالا اور بہت آہستہ سے حرکت دی۔ دوسری کوشش میں یہ قفل کھل گیا۔ اب باہر نکلنے کا خطرناک ترین مرحلہ تھا۔ میں نے رائفل کو ایک بار پھر چیک کیا۔ ریشمی نے میرا بازو تھاما اور ہم باہر نکل آئے۔ ابھی ہم چند ہی قدم چلے تھے کہ ایک شخص ہمارے سامنے آ گیا۔ وہ ہمیں دیکھ کر ٹھٹکا اور ہم اسے دیکھ کر۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی حرکت کرتا یا میری رائفل اس پر آگ اگلتی۔ میں سناٹے میں رہ گیا۔ ملنگ کے روپ میں جو درمیانے قد کا نوجوان میرے سامنے کھڑا تھا، وہ انیق تھا۔

مجھے دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے تیزی سے دائیں بائیں دیکھا، پھر میرے قریب آ کر بولا۔ ''آگے پہرے دار ہیں۔ آپ...... کو دیکھتے ہی فائر کھول دیں گے......''

وہ مجھے اور ریشمی کو تقریباً دھکیلتا ہوا واپس اسی دروازے میں لے آیا جو ہم نے ابھی کھولا تھا۔ اندر آ کر اس نے دروازہ جلدی سے بند کر دیا اور پھر چابی گھما کر اسے لاک بھی کر دیا۔ وہ متوحش نظروں سے ہماری طرف دیکھ کر بولا۔ ''شاہ زیب بھائی! مجھے پہلے ہی شک ہو گیا تھا کہ آپ یہاں گھس آئے ہیں، لیکن...... رضوان نے تو کچھ اور بات بتائی تھی۔ اس نے کہا تھا، آپ نے کل کارروائی کرنی ہے۔''

''سمجھو کہ پلان الٹ پلٹ ہو گیا ہے۔ رضوان کا ڈاکٹر ارم سے جھگڑا ہوا ہے۔ وہ

کلینک کے واش روم میں بے ہوش پڑی ہے۔ صبح سویرے مجاور کرنالی کو اس سے ملنے آنا ہے۔ اس کے بعد سارا راز کھل جائے گا۔ ہمیں جو کرنا ہے اس سے پہلے ہی کرنا ہے۔''

''چاچا اور تاجور کہاں ہیں؟''

''دونوں رضوان کے پاس کلینک میں ہیں۔ اگر ہم کسی طرح کلینک تک پہنچ جائیں تو وہاں سے پل کی طرف جانا آسان رہے گا۔''

''مگر یہاں سے نکلنے کے لیے یہ بڑا برا وقت ہے شاہ زیب بھائی، پہرے دار چاروں طرف آپ کو ڈھونڈ رہے ہیں، پاک بہن بھی آپ کے ساتھ ہیں۔ وہ آپ کو دیکھتے ہی فائر کھول دیں گے۔ میں ان کے تیور دیکھ کر آیا ہوں۔''

''تمہارے لیے ایک اور اہم خبر ہے انیق۔'' وہ سوالیہ نظروں سے میرے طرف دیکھنے لگا، میں نے کہا۔ ''پردے والی سرکار اب ہم میں نہیں رہی۔ وہ اس دارِ فانی سے کوچ کر چکی ہے۔''

انیق کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ ''...... یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟''

میں نے دیکھا کہ ریشمی کا دہشت زدہ چہرہ بھی مزید دہشت کی زد میں آ گیا ہے۔ میں نے کمرے کے دوسرے حصے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''وہاں پڑی ہے اس کی لاش۔''
انیق لپک کر دوسرے کمرے میں پہنچا۔ میں اور ریشمی بھی ساتھ تھے۔ انیق کے ذہن میں بھی وہی بات آئی جو اس سے پہلے میرے اور ریشمی کے ذہن میں آئی تھی۔ اس کے تاثرات سے اندازہ ہوا کہ وہ گھونگھٹ الٹ کر اس کی صورت دیکھنا چاہتا ہے۔

میں نے کہا۔ ''رہنے دو انیق! نہ ہی دیکھو تو اچھا ہے، بری طرح جھلسا ہوا ہے اس کا تھوبڑا۔''

انیق نے پردے والی سرکار یعنی وڈے پیر سانتا کے بالکل بے حرکت جسم سے اندازہ لگا لیا کہ وہ واقعی مر چکا ہے۔ اس نے میری طرف دیکھ کر لرزاں آواز میں پوچھا۔ ''یہ کیسے ہوا...... شاہ زیب بھائی؟''

''یار! میں نے اپنے ہاتھوں سے مشکل آسان کی ہے اس کی۔''

''آپ...... اس کو ''ایزی'' لے رہے ہیں۔ یہ بہت بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے شاہ زیب بھائی، یہاں تو طوفان آ جائے گا۔''

''تو ہم نے کون سا توقع لگائی ہوئی تھی کہ یہاں بادِ بہاری چلے گی۔''

ایک دم میرے ذہن میں ایک نئی بات آئی۔ میں نے دھیان سے پیر سانتا کے بے

حرکت جسم کی طرف دیکھا۔ وہ لمبے قد کاٹھ کا تھا۔ میں نے انیق کی طرف دیکھا۔ وہ جیسے میری نگاہوں سے ہی میرا مافی الضمیر سمجھ گیا۔ اس کے تاثرات بھی بدل گئے۔ میں نے ریشمی سے مخاطب ہو کر کہا۔ "ریشمی، تم ذرا پانچ منٹ کے لیے دوسری طرف چلی جاؤ اور گھبرانا بالکل نہیں۔ اگر گھبراؤ گی تو تمہارے اباجی اور تاجور سمیت ہم سب خطرے میں پڑ جائیں گے۔"

اس نے تھوک نگل کر اثبات میں سر ہلایا اور کمرے کے اس مستطیل حصے کی طرف چلی گئی جہاں عقبی دروازہ تھا۔

ہم دونوں نے مل کر تیزی سے پیر سانتا کو بے لباس کیا۔ انیق نے اس کا چہرہ اور جسم دیکھ کر اپنی کراہیت بمشکل دبائی۔ چہرے کی طرح پیر سانتا کا بایاں پہلو بھی کئی جگہ سے جلا ہوا تھا۔ یہ زخم اسے قریباً سات سال پہلے لگے تھے مگر ابھی تک ان کے نشان دل میں دہشت پیدا کرتے تھے۔ پیر سانتا کو نیم برہنہ حالت میں ہم نے الماری کے اندر ٹھونس دیا اور الماری باہر سے لاک کر دی۔ اس کی انگوٹھیاں، کڑے، مالائیں، جوتی وغیرہ ہم نے سب کچھ اتار لیا تھا۔ میں نے تیزی سے پیر سانتا کا بیش قیمت لباس پہن لیا۔ کہیں سے مجھے فٹ بیٹھا اور کہیں سے نہیں لیکن گزارا ہو گیا۔ اس کی بیش قیمت انگوٹھیاں، طلائی کڑے اور مالائیں، میں نے سب کچھ پہن لیا۔ کھسے نما جوتی کا مسئلہ تھا۔ وہ مجھے کھلی تھی مگر کسی نہ کسی طرح میں نے اس کو بھی ایڈجسٹ کر لیا۔ کراہت ہو رہی تھی مگر مجبوری تھی۔ پہلے میں نے پیر سانتا کا نیچے والا نقاب اپنے چہرے پر چڑھایا پھر چمکیلی سفید چادر کا گھونگھٹ نکال لیا کندھوں پر سفید گرم شال لٹکا کر میں نے رائفل، بغل کے نیچے اس طرح چھپالی کہ فوراً سے پہلے اسے استعمال میں لایا جا سکے۔

ریشمی مجھے اس روپ میں دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی۔ میں نے اسے سمجھا دیا کہ ہمیں کیا کرنا ہے اور کیسے؟ کمرے میں سے مشکوک نشانیاں مٹا کر ہم باہر نکل کے لیے تیار ہو گئے۔ اس مرتبہ مجھے اور ریشمی کو سامنے والے دروازے سے نکلنا تھا اور انیق کو پچھلے چھوٹے دروازے سے۔ ایک راہداری میں چھوٹا سا چکر کاٹنے کے بعد ہمیں ایک دوسرے سے مل جانا تھا۔

میں نے دروازہ کھولا اور ریشمی کے ساتھ باہر آ گیا۔ پروگرام کے مطابق میں اس سے دھیمی آواز میں باتیں کر رہا تھا اور وہ مسلسل اثبات میں سر ہلا رہی تھی۔ ہم پہلو بہ پہلو چلتے پہرے داروں کے درمیان سے گزرے۔ وہ ہماری دونوں جانب مؤدب کھڑے ہو گئے۔ ایک موڑ کاٹ کر ہم بڑی راہداری میں آ گئے۔ یہاں انیق موجود تھا۔ اس نے رکوع کی سی حالت میں جھک کر مجھے سلام کیا اور پھر ہمارے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ میں جہاں جہاں سے گزر

رہا تھا، پہرے دار اور دیگر افراد مؤدب کھڑے ہو جاتے تھے اور اپنے دونوں ہاتھ ناف پر باندھ لیتے تھے۔ جوں جوں ہم آگے بڑھ رہے تھے، خوش گوار حرارت اور اگربتیوں کی مست خوشبو میں کمی واقع ہو رہی تھی۔ ہم اسی جگہ سے گزرے جہاں قریباً ایک گھنٹا پہلے میں نے دو توانا پہرے داروں کو زیر کیا تھا اور انگیٹھی کے قریب فرش پر لٹایا تھا۔ وہاں اب پہرے داروں کا جمگھٹا تھا۔ فرش پر خون ابھی تک موجود تھا۔ اس کے گرد پتھر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے رکھ دیئے گئے تھے۔ ہم گزرے تو پہرے داروں نے دیواروں کے ساتھ لگ کر ہاتھ ناف پر باندھ لیے اور رکوع کے بل جھک گے۔

مجھے امید نہیں تھی کہ "سایہ" نامی جگہ کے اس اندرونی حصے سے نکلنا اتنا آسان ثابت ہو گا۔ قریباً تین چار منٹ کے ندر ہم کلینک میں داخل ہو گئے۔ مجھے، یعنی پردے والی سرکار کو اپنے سامنے دیکھ کر رضوان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ تاجور اور چاچا رزاق بھی ہکا بکا ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ مجھے ڈر محسوس ہوا کہ گھبراہٹ کے عالم میں رضوان کوئی الٹی سیدھی حرکت نہ کر بیٹھے۔

میں نے گھونگھٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "گھبرانے کی ضرورت نہیں، یہ میں ہوں۔"

رضوان کے سینے سے ایک طویل سانس خارج ہوگئی۔ تاجور لپک کر ریشمی کے گلے سے لگ گئی۔ ریشمی سسکیاں بھرنے لگی۔

"یہ سب کیسے ہوا؟" رضوان نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"پردے والی سرکار خالق حقیقی کو لبیک کہہ چکی ہے۔" میں نے اطمینان سے کہا۔ "اب ہمیں بھی جلد از جلد یہاں سے نکلنا ہے۔"

رضوان کے ساتھ ساتھ چاچا رزاق کا منہ بھی کھلا رہ گیا۔ ریشم، تاجور سے الگ ہوئی تو اپنے بوڑھے والد سے لپٹ گئی۔ وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ چاچا رزاق مسلسل اس کے سر پر بوسے دیئے جا رہے تھے۔ "نہ رو میری دھی رانی! سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم تجھے لے جائیں گے یہاں سے، نہ رو میری بچڑی۔"

واش روم کے اندر سے کھٹ پٹ کی مدھم آوازیں آرہی تھیں۔ رضوان نے کہا۔ "ارم ہوش میں آچکی ہے۔ منہ میں کپڑا ہے، نہیں تو اس نے آسمان سر پر اٹھا لینا تھا۔ مسلسل خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہی ہے۔"

میں نے دیکھا، اپنی بیٹی کو دیکھ کر اور اس سے مل کر چاچا رزاق کے بوڑھے جسم میں نئی توانائی آگئی تھی۔ ان کا کمزور سینہ جیسے تن گیا تھا اور وہ اپنی کمزور جان کے ساتھ ہر طرح کی

صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کو تیار نظر آتے تھے۔

میں نے سب کو سمجھایا کہ اب ہمیں کیا کرنا ہے اور کس طرح ہمیں یہاں سے نکل کر لکڑی کے پل تک پہنچنا تھا۔ ہمارے سامنے پہلا مرحلہ یہی تھا۔ میری موجودگی میں یعنی پردے والی سرکار کی موجودگی میں ریشمی کو بھیس بدلنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ہاں تاجور کا مسئلہ تھا۔ اس نے ڈاکٹر ارم کا ایک جوڑا پہن لیا تھا اور اس کے اوپر ایک ملنگی چولا ڈال لیا تھا۔ ڈاکٹر ارم کسی وقت سرجیکل ماسک بھی استعمال کرتی تھی۔ یہ ماسک اور ٹوپی پہننے سے تاجور کی شناخت کافی حد تک چھپ گئی۔ انیق اور رضوان وغیرہ کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ چاچا رزاق کو ہم نے اپنے درمیان رکھا۔ وہ رائفل جو میں نے شروع میں کلینک کی طرف آتے ہوئے ایک پہرے دار سے چھینی تھی، اس وقت انیق کے ہاتھ میں تھی اور وہ اسے استعمال کرنے کے لیے بھی تیار نظر آتا تھا۔ بہرطور ہماری دلی خواہش تھی کہ ہم بغیر کسی خون خرابے کے لکڑی کے پل تک پہنچ جائیں۔

اللہ کا نام لے کر ہم کلینک کے مین دروازے سے نکلے۔ ابھی چند قدم ہی چلے تھے کہ مجھے ٹھٹک کر رکنا پڑا۔ میرے پہلو میں چلتا ہوا رضوان بھی رک گیا۔ اس نے کہا۔ ''کرنالی آرہا ہے۔''

گول چہرے اور توانا جسم والا بڑا مجاور کرنالی تین چار مسلح پہرے داروں کے ساتھ سیدھا میری طرف آرہا تھا۔ اس کے کرخت چہرے سے خشونت برس رہی تھی۔ مخمل کا گہرا نیلا، لمبا کڑھائی دار چغہ فرش پر گھسٹتا چلا آرہا تھا۔ میرے قریب آکر اس نے مؤدبانہ انداز اختیار کیا اور پاٹ دار آواز میں بولا۔ ''سرکار! میں تو سمجھ رہا تھا کہ آپ پاک بہن کے کمرے میں ہیں۔''

میں نے بس سر کو ہولے سے نفی میں ہلا دیا۔

وہ مجھے دھیان سے دیکھ رہا تھا، بولا۔ ''ابھی تک کچھ پتا نہیں چلا سرکار! ہر جگہ تلاش ہو رہی ہے۔ سارے راستوں پر ناکے لگا دیئے ہیں۔''

میں نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا۔ میرے لیے ممکن نہیں تھا کہ بول کر اسے جواب دیتا۔ وہ کچھ چونک سا گیا۔ اس نے مجھے سرتاپا دیکھا۔ ریشمی کو دیکھا۔ رضوان کو دیکھا۔ ایک بار پھر مجھ پر نگاہیں جمائیں۔ اس کے تاثرات میں غیر معمولی تبدیلی آئی۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے شک میں کچھ اور آگے بڑھتا یا پھر میں ہی ساتھیوں سمیت وہاں سے چل پڑتا، راہداری کے موڑ سے ایک پہرے دار بھاگتا ہوا نمودار ہوا۔ یہ وہی داروغہ تھا جو ہمیں گاہے

بگا ہے جنگلارے میں بھی نظر آتا تھا۔

وہ دور ہی سے چلایا۔ ''پردے والی سرکار کو مار دیا گیا ہے۔ یہ پردے والی سرکار نہیں ہے...... یہ نہیں ہے۔''

ایک دم جیسے بہت بڑے چھناکے سے ایک بلند و بالا آئینہ چکنا چور ہو گیا...... ایک سیکنڈ سکتے کی سی کیفیت میں رہنے کے بعد پہرے داروں نے اپنے ہاتھ رائفلوں کی طرف بڑھائے لیکن ہم پہلے سے تیار تھے۔ میں نے موٹی شال کے نیچے سے روسی ساخت والی کلاشنکوف نکالی اور فائرنگ کر دی۔ خوفناک تڑتڑاہٹ کے ساتھ دو پہرے دار الٹ کر فرش پر گرے۔ انیق نے بے دریغ کرنالی کو نشانہ بنایا مگر گولیاں اس کے پٹھان باڈی گارڈ کو لگیں اور کرنالی جھک کر ایک طرف کو بھاگا۔

یہی وقت تھا جب میری نگاہ پھر ''داروغہ'' کی طرف اٹھ گئی۔ وہ بھاگتے بھاگتے رائفل سیدھی کر چکا تھا اس سے پہلے کہ وہ پورا برسٹ میرے جسم میں اتار دیتا، میں نے اسے نشانہ بنایا۔ دو گولیاں سیدھی اس کے ماتھے پر لگیں، وہ ایک انگیٹھی سے ٹکرا کر نیچے گرا۔ ہر طرف انگیٹھی کے انگارے بکھر گئے۔ ان انگاروں میں ان رنگ برنگی مالاؤں کے دانے بھی تھے جو اس شخص کے گلے سے ٹوٹی تھیں۔

تاجور اور ریشمی چلاتی ہوئی ایک دیوار کے ساتھ لگ گئی تھیں۔ ایک پہرے دار نے ان کی طرف رائفل سیدھی کی تو بوڑھے چاچا رزاق نے ہاکی کا بھرپور وار اس کے ہاتھ پر کیا اور کلائی توڑ کر رکھ دی۔ اگلے ہی لمحے انیق کی گولی نے اسے فرش پر لڑھکا دیا۔ پہرے دار کے لمبے بالوں میں خون کا پھول کھل گیا تھا۔

ہر طرف کہرام سا مچ گیا تھا۔ اس سے پہلے کے مزید پہرے دار پہنچتے ہم مشرقی سمت بھاگے، چاچا رزاق کو بھاگنے میں دقت ہو رہی تھی مگر وہ ہماری توقع سے زیادہ ہمارا ساتھ دے رہے تھے۔ انہیں COVER دینے کے لیے انیق سب سے آخر میں موجود تھا اور ایک طرح سے الٹے پاؤں بھاگ رہا تھا۔ آج میں پہلی بار اس کی اسلحہ شناسی اور فائٹنگ اسپرٹ دیکھ رہا تھا۔ وہ دبنگ گینگسٹر داؤد بھاؤ کا تربیت یافتہ اور یقیناً ایسے بہت سے سنگین مرحلے دیکھ چکا تھا۔ میں نے ایک ہاتھ میں تاجور کی کلائی پکڑ رکھی تھی اور اسے قریباً کھینچتا ہوا اپنے ساتھ لا رہا تھا۔ رضوان نے ریشمی کا بازو پکڑ رکھا تھا۔

ہم نیچی چھت والے اس راستے پر پہنچے جو بتدریج نشیب میں اترتا جاتا تھا اور بالآخر لکڑی کے پل تک پہنچ جاتا تھا۔ چانک گرنے کی آواز آئی۔ یہ چاچا رزاق تھے۔ ہاکی ان کے

ہاتھ سے لڑھک کر دور جا گری۔ انیق نے انہیں اٹھانے کی کوشش کی مگر وہ تیزی سے نہیں اٹھ سکے۔ میں نے ان کے منع کرنے کے باوجود انہیں کندھے پر لاد لیا۔ ان کی بیساکھی یعنی ہاکی رضوان نے تھام لی۔

''وہ آرہے ہیں۔'' رضوان نے چلا کر کہا۔

ایک موڑ سے دو مسلح پہرے دار نمودار ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک کو میں نے گولی کا نشانہ بنایا۔ دوسرے کو انیق نے لمبا لٹا دیا۔ اب میں نے رائفل صرف ایک ہاتھ سے تھام رکھی تھی۔ دوسرے ہاتھ سے چاچا کو کندھے پر سہارا دے رکھا تھا۔ وہ دھیمی آواز میں مسلسل اختلاف کر رہے تھے۔ ''نہ کرو پتر! میرے لیے خود کو مصیبت میں نہ ڈالو۔ مجھے اتار دو...... میں چل لوں گا۔''

وہ بار بار یہی بات کہہ رہے تھے۔ عقب سے اب ''بھاگو پکڑو'' کی آوازیں آنا شروع ہو گئی تھیں اور یہ کوئی دو چار افراد نہیں تھے۔ درجنوں تھے۔ تاہم ابھی وہ ہم سے کافی فاصلے پر تھے۔ ایک گرل نما آہنی دروازے نے ہمارا راستہ روک لیا۔ اس جہازی سائز کے دروازے میں پیتل کے دو بڑے قفل جھل رہے تھے مگر پہرے دار کوئی نہیں تھا۔ مجھے پتا تھا یہاں پہرے دار کیوں نہیں ہے؟ میرے اشارے پر انیق نے ساتھ آٹھ فٹ کی دوری سے تالوں پر فائرنگ کی۔ دھماکوں سے ہر طرف گولیوں کے خول بکھرے اور ساتھ ہی تالے بھی بکھر گئے۔ فولڈنگ دروازے کو دائیں بائیں ہٹا کر ہم اندر داخل ہو گئے میں اب پوری طرح چوکس ہو چکا تھا۔ ہاں میں جانتا تھا کہ آہنی دروازے پر کوئی پہرے دار کیوں موجود نہیں تھا اور یہاں پل کے سامنے ہمارا سامنا کس سے ہو سکتا ہے اور پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ مجھے ایک نامانوس مدھم آواز سنائی دی، جو تیزی سے ہمارے قریب آرہی تھی۔ اس آواز کو سن کر تاجور کا رنگ ہلدی ہو گیا۔ میں نے چاچا رزاق کو نیچے اتار دیا اور کلاشنکوف سے نیا میگزین اٹیچ کر لیا۔ میں جانتا تھا، یہ چنگھاڑتی ہوئی سی لرزہ خیز آواز کس کی ہے۔ اس آواز نے آنا ہی تھا اور یہ آ گئی تھی......اور یہ ایک نہیں دو آوازیں تھیں۔ تاجور میرے کندھے سے چمٹ گئی۔ میں نے انگلی لبلبی پر رکھی ہوئی تھی اور پوری طرح تیار تھا......اور پھر پہلا لیوپارڈ چیتا برق کی رفتار سے لپکتا ہوا ہماری طرف آیا۔ قد تقریباً سات فٹ وزن تقریباً 110 کلوگرام۔ وہ پھرتی اور طاقت کا خوفناک امتزاج تھا۔ وہ کمان سے نکلے تیر کی طرح ہماری طرف بڑھا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا، میرے پاس غلطی کی گنجائش نہیں۔ نشانہ خطا جانے کا مطلب تھا، ہم میں سے کم از کم ایک شخص کی فوری موت۔ تاجور اتنی شدت کے ساتھ میرے بازو سے چمٹی تھی کہ بازو کا حصہ بن

کر ہی رہ گئی تھی۔ خون آشام جانور سے ہمارا فاصلہ قریباً تیس فٹ تھا جب میں نے ٹریگر دبایا۔ چھ گولی والا برسٹ فائر ہوا۔ کم از کم چار گولیاں اس کے سر اور جسم میں لگیں۔ وہ لڑکھڑایا، گرا اور فرش پر پھسلتا چلا گیا۔ وہ عین ہمارے قدموں میں پہنچا۔ اتنے قریب سے اس کی دید ہیبت ناک تھی۔ اس کی پھنکاریں ہمیں اپنے پاؤں پر محسوس ہوئیں۔ اس کے جسم سے خون کے فوارے چھوٹ رہے تھے......وہ پھڑک رہا تھا۔

اور یہی وقت تھا جب تڑتڑاہٹ کی سماعت شکن آواز سے ایک اور برسٹ چلا۔ یہ دوسرا چیتا تھا جسے انیق نے شکار بنایا تھا۔ وہ چکنے فرش پر کئی لڑھکنیاں کھا کر گرل دار دروازے سے ٹکرایا اور اسے ہلا کر رکھ دیا۔ چند ہی لمحے میں وہ اپنے ہی خون کے اندر لت پت تھا۔ میں جانتا تھا، یہاں ایک لیو پارڈ چیتا اور ہے لیکن وہ کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

یکایک اس کی چلاتی ہوئی سی پھنکار سنائی دی، وہ ایک پتھر کی اوٹ سے نکلا۔ چاچا رزاق سے اس کی دوری بیس بائیس فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ چاچا رزاق جب تھوڑی دیر پہلے گرے تو ان کی پیشانی سے خون بہنے لگا تھا۔ غالباً یہی خون اب چیتے کی حس شامہ کو کشش کر رہا تھا۔ وہ گولی کی طرح ان کی طرف آیا چاچا نے اس سے بچنے کی کوشش کی اور دیوانہ وار ہاکی کی ضرب اس کے چہرے پر لگائی۔ یہ ضرب اس درندے کا کیا بگاڑ سکتی تھی۔ تاہم اتنا ضرور ہوا کہ وہ اس کے پہلے حملے سے بچ گئے۔ خطرناک افریقن لیو پارڈ کو دوسرے حملے کا موقع دینے کا مطلب چاچا کی موت تھی۔ اگر میں یا انیق فائر کرتے تو چاچا رزاق بھی زد میں آتے تھے لیکن رسک تو لینا تھا۔ میں نے فرش پر اوندھے گر کر ایک برسٹ مارا۔ دو گولیاں چیتے کے جسم کے پچھلے حصے میں لگیں۔ اس نے ایک پلٹی کھائی پھر اٹھ کر بھاگا لیکن ہماری سمت نہیں، مخالف سمت میں، دو ہی سیکنڈ میں وہ اوجھل تھا۔

ہم ایک بار پھر پل کی طرف لپکے۔ چند سیڑھیاں اتر کر ہم ایسی جگہ پر آ گئے جہاں چھت کے بجائے کھلا آسمان تھا۔ آسمان پر تارے چمک رہے تھے۔ یخ بستہ ہوا تھی اور رات کا اندھیرا اب دن کے اجالے میں بدلنا شروع ہو گیا تھا، لکڑی کا یہ طویل جھولتا ہوا پل ایک گہری تاریک کھائی پر واقع تھا۔ یہاں ہمیں کوئی پہرے دار نظر نہیں آیا۔ ہم نے پل کی طرف قدم بڑھائے۔ عین کنارے پر پہنچ کر میں ٹھٹک کر رک گیا۔ پل آغاز میں ہی درست حالت میں موجود نہیں تھا۔ لکڑی کے کم از کم چودہ پندرہ تختے غائب تھے اور نیچے سیکڑوں فٹ گہری کھائی نظر آتی تھی۔

''یہ کیا ہے؟'' تاجور نے ڈری ڈری آواز میں کہا۔

''لگتا ہے ان لوگوں نے جان بوجھ کر ایسا کر رکھا ہے۔ احتیاط کے طور پر تختے اتار کر کہیں رکھ دیئے ہیں۔'' رضوان نے کہا۔

''اگر ایسا ہے تو تختے یہیں کہیں ہوں گے۔'' چاچا رزاق نے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے کہا۔

''میرے خیال میں وہ پڑے ہیں۔'' رضوان نے انگلی سے ایک طرف اشارہ کیا۔

یہاں پل کی حفاظت کے لیے ایک مورچا سا بنایا گیا تھا۔ اینٹوں کی چنائی تھی سامنے ریت کی بوریاں رکھی تھیں۔ مگر کوئی موجود نہیں تھا۔ پل سے اتارے جانے والے تختے اوپر تلے مورچے کی دیوار کے ساتھ رکھے تھے۔

انیق نے غور سے پل کے خلا کو دیکھتے ہوئے کہا۔''ان تختوں کو آسانی سے پھر جوڑا جا سکتا ہے۔''

اس کی بات درست تھی۔ تختوں کو دوبارہ رکھنا ضروری تھا۔ میں، انیق اور رضوان تو شاید بھاگ کر یہ خلا پھلانگ جاتے مگر تاجور، ریشمی اور چاچا کے لیے یہ ممکن نہیں تھا۔

ہم سب تختوں کی طرف لپکے...... مگر محسوس ہو رہا تھا کہ ہمارے پاس وقت ختم ہو چکا ہے۔ درجنوں افراد بھاگتے اور شور مچاتے اس جگہ تک پہنچ چکے تھے جہاں دو لیو یارڈ چیتوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ پھر اچانک زبردست فائرنگ شروع ہو گئی۔ ہم سب نے مورچے کے عقب میں پناہ لی۔ انیق اور میں مورچے کی دائیں اور بائیں جانب تھے۔ ہم نے پوزیشن لے کر جوابی فائرنگ شروع کر دی۔ دھماکوں سے وسیع و عریض خلا گونج اٹھا۔ شعلے چمکے، گولیوں کے خول بکھرے اور ہر طرف بارود کی بو پھیلنے لگی۔ ہمارے جوابی حملے نے ملنگی ڈیرے کے خونخوار پہرے داروں کی پیش قدمی روک دی۔ وہ جو مست سانڈوں کی طرح سیدھے لپکے چلے آ رہے تھے، مختلف جگہوں پر پوزیشنیں لے کر فائرنگ کرنے پر مجبور ہو گئے۔

رضوان تختوں کی طرف گیا۔ اور دو تختوں کو گھسیٹ کر پل کے خلا پر لے آیا۔ وہ گولیوں کی زد سے بچنے کے لیے ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل چل رہا تھا اسی دوران میں انیق کو گولی لگ گئی۔ میں نے اسے کندھا پکڑ کر دہرا ہوتے دیکھا، آٹومیٹک رائفل اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔

یکا یک ڈیرے کے محافظوں نے شدید حملہ کر دیا۔ گولیاں بارش کی طرح برسنے لگیں۔ چاچا رزاق نے ہمت کی۔ انہوں نے انیق والی رائفل اٹھائی اور میرا ساتھ دینے لگے۔ مجھے

معلوم تھا کہ وہ اسلحے کا استعمال جانتے ہیں لیکن یہ امید نہیں تھی کہ ایسی سنگین صورتِ حال میں وہ باقاعدہ خم ٹھونک کر لڑنے لگیں گے۔ یہ ساری توانائی انہیں ان کی بیٹی کے پیار نے دی تھی۔ انہوں نے اپنی بوڑھی جان کے ساتھ سینہ تان لیا تھا اور لڑائی کا حصہ بن گئے تھے۔

انیق کے کندھے میں گولی لگی تھی۔ اس کا گہرا نیلا چولا خون سے سرخ ہو رہا تھا اور بازو کانپتا جا رہا تھا۔ دوسری طرف جب تاجور اور ریشمی نے دیکھا کہ رضوان کامیابی سے دو تختے گھسیٹ کر پل تک لے آیا ہے تو وہ بھی اس کا ساتھ دینے لگیں۔ یہ سب خطرناک تھا مگر خطرے کا سامنا تو اب ہمیں کرنا ہی تھا۔

انیق نے کراہتے ہوئے کہا۔ ”وہ لوگ قریب آتے جا رہے ہیں۔ ہمیں جلد کچھ کرنا ہو گا۔“

پھر وہ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی پل کی طرف رینگ گیا۔ وہ تختے رکھنے میں رضوان کا ہاتھ بٹانا چاہ رہا تھا۔ ہم تھوڑا تھوڑا خلا دے کر آٹھ دس تختے بھی رکھ لیتے تو پل پار کیا جا سکتا تھا۔ مگر اندھا دھند فائرنگ یہ موقع ہی نہیں دے رہی تھی۔ ملنگی ڈیرے کے پہرے داران خون آشام بھیڑیوں کی طرح تھے جو اپنے شکار کو مختلف اطراف سے گھیر رہے ہوں۔ وہ ایک ایک انچ کھسکتے، قریب آتے جا رہے تھے۔ اب ہم ان کی للکارتی ہوئی وحشی آوازیں صاف سن سکتے تھے۔ اپنی ”پردے والی سرکار“ کی موت نے انہیں سرتاپا قہر بنا دیا تھا۔ وہ اپنے راستے میں آنے والی ہر شے کو بھسم کر دینا چاہتے تھے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اگر وہ ہم پر غالب آ جاتے تو ریشمی اور تاجور وغیرہ کے ساتھ کیا سلوک ہوتا۔

ایک پکارتی ہوئی گرج دار آواز میرے کانوں تک پہنچی۔ ”ان حرامیوں میں سے کسی ایک کو بھی بچنا نہیں چاہیے۔ آگے بڑھو، ٹکڑے کر دو ان کے۔“

میں نے پہچان لیا۔ یہ بڑے مجاور کرنالی ہی کی آواز تھی۔

جی چاہا کہ وہ سامنے ہو اور میں سیدھا اس کی کھوپڑی میں سوراخ کر دوں...... چند گولیاں سنسناتی ہوئی میرے سر پر سے گزر گئیں۔

ہمارے پاس بہت زیادہ گولیاں نہیں تھیں۔ ہم زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ ان کو روک سکتے تھے۔ ہمیں جو بھی کرنا تھا ان پانچ چھ منٹ کے اندر ہی کرنا تھا۔ جوں جوں وہ لوگ آگے بڑھ رہے تھے، ان کی فائرنگ زیادہ مؤثر ہوتی جا رہی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق ہم ان کی سات آٹھ لاشیں گرا چکے تھے۔ اور ایسا اسی وجہ سے تھا کہ وہ کھلی جگہ پر تھے اور ہمیں ایک محفوظ مورچا نما جگہ میسر تھی لیکن یہ سب کچھ زیادہ دیر چلنے والا نہیں تھا۔ وہ تعداد میں بہت

زیادہ تھے۔ ان کے پاس اسلحہ بھی وافر مقدار میں تھا۔ اس کے علاوہ ہلاکتوں نے بھی ان کے اندر ایک بارود سا بھر دیا تھا۔ ان میں سب سے اہم ہلاکت اس ''سیٹ اپ'' کے اہم ترین شخص پیر سانتا کی تھی۔

میں نے فائرنگ کرتے کرتے مڑ کر دیکھا۔ رضوان نے تاجور اور ریشمی کے ساتھ مل کر آٹھ دس تختے رکھ لیے تھے۔ اچانک مجھ پر خوفناک انکشاف ہوا کہ چاچا رزاق زخمی ہو چکے ہیں۔ دو گولیاں ان کے نچلے دھڑ میں لگی تھیں اور لباس خون سے سرخ ہوتا جارہا تھا مگر وہ اپنی جگہ جمے ہوئے تھے......اور مسلسل سنگل شاٹ فائر کر رہے تھے۔

میں نے کہا۔ ''چاچا! اب ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔''

''لیکن ان کو روکے گا کون؟'' وہ بے ساختہ بولے۔

''ہم روکیں گے اور پیچھے بھی ہٹیں گے۔''

کہنے کو تو میں نے کہہ دیا لیکن میں جانتا تھا کہ فائر کرنا اور ساتھ ساتھ پیچھے ہٹنا چاچا رزاق کے لیے ممکن نہیں۔ انہیں تو اب کندھے پر اٹھا کر ہی یہاں سے نکالا جا سکتا تھا۔ میں انہیں کچھ دیر پہلے کندھے پر اٹھا چکا تھا اور اب بھی اٹھا سکتا تھا، لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ وہ اپنی جگہ سے ہلنے کو بالکل تیار نہیں۔

انہوں نے مجھے جھڑک کر کہا۔ ''بے وقوفی والی باتیں مت کرو۔ ہم میں سے ایک کو یہاں رکنا پڑے گا اور میں رکوں گا۔ میری حالت ایسی نہیں کہ یہاں سے ہل بھی سکوں۔ تم لوگ نکلو یہاں سے۔''

''چاچا! ہم آپ کو چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔'' میں نے مصمم ارادے سے کہا۔

''مجھے لے جا کر بھی کیا کرو گے۔'' وہ کراہتے ہوئے بولے۔ انہوں نے اپنا لبادہ پیٹ پر سے ہٹایا، ایک گولی ان کا پہلو چیر کر کمر کی طرف سے نکل گئی تھی۔

عقبی جانب سے رضوان اور انیق پکارنے لگے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ہم فائر کرتے ہوئے پیچھے کی طرف آئیں۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ میں نے رضوان کو آواز دی۔ وہ گولیوں کی بارش میں جھک کر دوڑتا ہوا ہمارے پاس پہنچا۔ میں نے چاہا کہ چاچا رزاق سے رائفل لے کر رضوان کو تھما دوں۔ وہ لبلبی دبا کر گولی تو چلا ہی سکتا تھا۔ میں چاچا رزاق کو کسی طرح پل کی طرف لے جانے کی کوشش کر سکتا تھا مگر جب میری ہدایت پر رضوان نے چاچا سے رائفل لینے کی کوشش کی تو وہ بھڑک اٹھے۔ وہ چلانے لگے۔ ''جاؤ...... دفع ہو جاؤ۔ سارے مارے جاؤ گے......

چلے جاؤ۔ میں روکتا ہوں ان کو۔“

میں ان کا انداز دیکھ کر سمجھ گیا کہ وہ یہاں سے ہلیں گے نہیں۔ فیصلہ تو بہت صدمے والا تھا لیکن منطقی انداز سے سوچا جاتا تو اس صورتِ حال میں یہی فیصلہ کیا جا سکتا تھا۔ یہ پل اسی صورت میں پار کیا جا سکتا تھا، جب کم از کم ایک شخص اس نا کے پر موجود ہوتا اور محافظوں کو پل کی طرف آنے سے روکتا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں نے رضوان کو واپس جانے کا اشارہ کیا۔

وہ جھک کر بھاگتا ہوا واپس پل تک پہنچ گیا۔ یہ قریباً چالیس میٹر کا فاصلہ بڑا خطرناک تھا۔

میں نے دل پر پتھر رکھ کر دو بھرے ہوئے میگزین زخمی چاچا رزاق کے قریب رکھے اور خود بھی جھک کر بھاگتا ہوا پل پر پہنچ گیا۔

”میرے ابا جی؟“ ریشمی نے کراہ کر کہا۔

”وہ بھی آتے ہیں۔“ میں نے کہا اور ریشمی کو بازو سے پکڑ کر پل کے تختوں پر چلاتا ہوا، محفوظ تختوں تک لے آیا۔ وہ پلٹ پلٹ کر عقب میں دیکھ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے محترم والد ابھی تک دکھائی کیوں نہیں دیئے۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ قریباً ڈیڑھ سو فٹ آگے، راستے کے خم پر جو شخص مورچے میں ڈٹا ہوا ہے اور آگے بڑھنے والوں کو روک رہا ہے وہ اس کا والد ہی ہے۔

وہاں گولیاں بارش کی طرح برس رہی تھیں۔ ہر طرف دھماکوں کی گونج اور چنگاریوں کی بوچھاڑ تھی اور وہ ڈٹا ہوا تھا۔ اس کا کام ہی ڈٹ جانا اور روک دینا تھا۔ وہ ایک ”ڈیفنڈر“ تھا...... ماضی کا ایک نامور گول کیپر تھا اور اس نے شاید ٹھیک ہی کہا تھا کہ ابھی اپنی زندگی کا ایک آخری میچ اس کو کھیلنا ہے۔ شاید یہ اس کی چھٹی حس تھی جس نے اسے بتا دیا تھا کہ اسے ایک بار پھر ”سپر ڈیفنڈر“ کا کردار ادا کرنا ہے۔ ہم اندھا دھند بھاگتے......اور ریشمی کو اپنے ساتھ تقریباً کھینچتے ہوئے پل کے دوسرے سرے پر پہنچ گئے۔ ریشمی بھی شاید اب صورتِ حال سمجھ رہی تھی۔ وہ پلٹ پلٹ کر چلا رہی تھی۔ ”ابا جانی......ابا جانی......“

اور ابا جانی بہت دور تھے۔ اپنی زندگی کا آخری مقابلہ کر رہے تھے۔ میں نے تصور کی نگاہ سے دیکھا......ان کے ہاتھوں میں ہاکی کے بجائے رائفل تھی۔ دشمن کے فارورڈز ان پر حملہ آور ہو رہے تھے۔ ان کے چہرے تمتمائے ہوئے تھے، آنکھوں میں آگ تھی اور چاچا انہیں روک رہے تھے۔ ان کے پے در پے حملوں کو پسپا کر رہے تھے۔ آج ان کے عقب میں گول پوسٹ نہیں تھی، ان کی لاڈلی دھی رانی تھی، آج وہ کسی کو گول پوسٹ تک کیوں پہنچنے دیتے۔

پل سے اترنے سے پہلے ہی میں نے لوہے کے ان دو موٹے کیبلز کو دیکھ لیا تھا جن پر پل کا دارومدار تھا۔ میں نے ساتھیوں کو چند قدم پیچھے ہٹایا اور پھر نشانہ باندھ کر ان آہنی کیبلز پر خاص طرح سے فائرنگ کی۔ دونوں کیبلز یعنی ''آہنی رسے'' ٹوٹ گئے اور قریباً 200 فٹ لمبا چوبی پل ایک مہیب آواز کے ساتھ کھائی میں گر کر جھول گیا۔

یہی وقت تھا جب کھائی کے دوسرے کنارے پر ملنگی ڈیرے کی طرف ایک زوردار دھماکا ہوا۔ میں فوراً جان گیا، یہ دستی بم کا دھماکا تھا، شعلے کے ساتھ ہی بہت سی اینٹیں اور دیگر ملبا ہوا میں اڑتا نظر آیا۔ غالب گمان یہی تھا کہ وہ مورچا اڑا دیا گیا ہے جہاں ماضی کے نامور گول کیپر نے پوزیشن سنبھال رکھی تھی لیکن اب اس سے کیا فرق پڑتا تھا؟ پل کے ناکے پر ہونے والے ''میچ'' کا وقت ختم ہو چکا تھا اور وقت ختم ہونے کے بعد ''گول'' ہو بھی جائے تو بے معنی ہوتا ہے۔ ہاں:..... اپنا آخری میچ گول کیپر نے ہارا نہیں تھا۔

دھماکا ہونے کے فوراً بعد ہی اردگرد کی چٹانوں پر چنگاریاں سی بکھرنے لگیں۔ مطلب یہ تھا کہ اب وہ لوگ آگے آ گئے تھے اور ہمیں نشانہ بنانے کا سوچ رہے تھے۔ ہم اب ان کی زد سے دور تھے۔ ہم پتھروں کے عقب میں چلے گئے۔ ''اب کس طرف جانا چاہیے؟'' میں نے رضوان سے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ سیدھا نکل چلیں تو آگے کھلا راستہ مل جائے گا۔ باقی ان ملنگوں کی طرف سے اب کوئی فوری خطرہ نہیں ہے۔ یہ کھائی پار نہیں کر سکتے اور چکر کاٹ کر آئیں گے تو ایک ڈیڑھ گھنٹا تو لگ ہی جائے گا۔''

ریشمی مسلسل آہ و بکا کر رہی تھی۔ وہ جان چکی تھی کہ اس کے ''اباجی'' وہاں سے زندہ سلامت نہیں نکل سکے۔ تاجور مسلسل اسے سنبھالنے میں لگی ہوئی تھی۔ اسے بانہوں میں لے رکھا تھا۔ کبھی اس کا سر چومتی تھی، کبھی گال سہلاتی تھی۔ ہمارے اردگرد بھربھرے اور سخت دونوں طرح کے پتھر تھے۔ کہیں کہیں بلند پتھروں کے درمیان تنگ راستے تھے، انیق نے اپنا زخمی کندھا دوسرے ہاتھ سے دبا رکھا تھا۔ خون اس کی انگلیوں کے اندر سے ٹپک رہا تھا۔ وہ بڑی ہمت کا ثبوت دے رہا تھا۔ لیکن ہمیں ضرورت تھی کہ ایک دو منٹ کے لیے کہیں ٹھہر جائیں اور اس کا زخم دیکھیں۔ اس کے علاوہ ریشمی کو بھی سنبھالے جانے کی ضرورت تھی۔ ''پردے والی سرکار'' کا ریشمی چولا اس طرح کا تھا کہ مجھے چلنے اور پتھروں پر چڑھنے میں سخت دشواری ہو رہی تھی۔ میں نے یہ چولا اتار کر اور لپیٹ کر جھاڑیوں میں پھینک دیا۔ اب میں اپنی ٹانگوں کو آزادی سے حرکت دے سکتا تھا۔ میں نے قیمتی انگوٹھیاں، مالاؤں اور طلائی

کپڑوں کے وزن سے بھی نجات حاصل کر لی۔ یہ اشیا میں نے کلاشنکوف کے ایمونیشن بیگ میں ٹھونس دیں۔ نیچے میں نے وہی جنگلارے کا زرد پٹی والا چولا پہن رکھا تھا۔ اب ہم گولیوں کی پہنچ سے دور تھے۔ ایک تنگ جگہ پر رک گئے۔ اب دن کا اجالا پھیل چکا تھا۔ قرب وجوار روشن ہو چکے تھے۔ دور مشرقی افق پر جموں کشمیر کی جانب سے نئے دن کا سورج طلوع ہونے والا تھا۔ تاجور ابھی تک ڈاکٹر ارم والے لباس میں تھی۔ بہرحال سرجیکل ماسک اب اس نے اپنے چہرے سے ہٹالیا تھا۔ سرخ وسپید رخساروں پر بالوں کی لٹیں جھول رہی تھیں۔ اس کی دلکش آنکھوں میں وہی چمک تھی، جو انسان کو خطرات سے نمٹنے کے لیے درکار ہوتی ہے۔ پچھلے دو تین دنوں میں مجھے تاجور کے متعلق ایک خاص بات معلوم ہوئی تھی اور وہ یہ کہ خطرے کے وقت اس کا ذہن زیادہ تیزی سے کام کرتا تھا۔ گھبرانے کے بجائے وہ صورتِ حال سے نکلنے کا کوئی کارآمد حل سوچتی تھی۔ وہ پنجاب کی مٹیار تھی۔ کسان گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ غصے، شرم یا خطرے کی کیفیات میں اس کے چہرے پر خون کی یورش یوں ہوتی تھی جیسے کسی نے اچانک چہرے پر سرخ رنگ پھیر دیا ہو۔ اس وقت وہ ریشمی کو تسلی دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ رضوان بھی اس کا ساتھ دے رہا تھا۔

میں نے اپنے چرمی غلاف میں سے تیز دھار خنجر نکالا اور انیق کا لبادہ کندھے پر سے چاک کر دیا۔ تشویش ناک بات یہ تھی کہ گولی اندر ہی تھی۔ فی الحال سب سے اہم کام خون روکنا تھا۔ شاید کوئی بڑی نس، کٹ چکی تھی۔ فرسٹ ایڈ کے اصول کے مطابق میں نے زخم پر کس کر پٹی باندھ دی۔ اب ہم آگے جانے کے لیے تیار تھے۔ ہم ملنگی ڈیرے کے نہایت مہلک، گھیرے سے نکل آئے تھے...... لیکن یہ ہماری بھول تھی۔ ابھی ایک اور افتاد ہم پر ٹوٹنے والی تھی۔ اس افتاد کا آغاز ایک بلند آواز کی صورت میں ہوا۔ یہ رضوان کی آواز تھی۔ وہ کہیں قریب ہی تھا اور اس نے پکار کر مجھے بلایا تھا۔ میں انیق کو چھوڑ کر اس کی طرف دوڑا۔ وہ ایک کھوہ نما جگہ پر تھا۔ یہ کھوہ دہانے سے تنگ اور اندر سے کشادہ تھی۔ کھوہ میں ایک طرف ایک گڑھا سا کھودا گیا تھا۔ گڑھے میں سے نکلنے والے پتھر اور بھربھری مٹی ایک طرف ڈھیر کی صورت میں پڑی تھی۔ اس ڈھیر کے پاس ہی ایک لاش پڑی تھی...... اور یہ نوری کی لاش تھی۔ میں دم بخود دیکھتا چلا گیا۔ اس بدنصیب کے جسم پر ابھی تک وہی شلوار قمیص تھی جس میں چند دن پہلے وہ ہمارے ساتھ کوٹلی سے روانہ ہوئی تھی۔ اس کے بال بکھرے تھے اور جسم پر جگہ جگہ خراشوں کے نشان نظر آتے تھے۔ صاف پتا چلتا تھا کہ پچھلے کئی دن سے اس کے ساتھ بدسلوکی ہوتی رہی ہے۔ اس کی کنپٹی پر گولی کا زخم تھا اور وہاں سے بہنے والا خون ایک لوتھڑے کی طرح

بھر بھری مٹی پر نظر آ رہا تھا۔ میں سکتہ زدہ رہ گیا۔
"لگتا ہے کہ اسے دو تین گھنٹے پہلے ہی مارا گیا ہے۔" رضوان نے کپکپاتی آواز میں کہا پھر اس نے غور سے میرا چہرہ دیکھا اور میرے تاثرات دیکھ کر چونک گیا۔ "کیا...... آپ...... اسے جانتے ہیں؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور قریب پڑی ہوئی ایک چادر اس کی لاش پر ڈال دی۔ میرے پیچھے ہی پیچھے انیق اور تاجور بھی وہاں پہنچ گئے تھے۔ دفعتاً مجھے شدید خطرے کا احساس ہوا۔ میں نے کھوہ کے اندرونی نیم تاریک حصے کی طرف دیکھا...... رائفل کے دستے پر بے ساختہ میری گرفت مضبوط ہوگئی۔ "باہر نکلو" میں نے ایک ساتھ سب سے مخاطب ہو کر کہا۔

لیکن اس سے پہلے کہ ہم اپنی جگہ سے حرکت کرتے ایک کرخت آواز نے ہمارے قدم جکڑ لیے۔ "باہر نہیں نکلو...... بس یہیں پر کھڑے رہو۔"

آواز کھوہ کے تاریک حصے میں سے آئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی دو فائر ہوئے ایک گولی رضوان کے سر پر سے اور دوسری میرے سر پر سے گزر گئی۔ دوسری کڑک دار آواز سنائی دی۔ "بندوقڑیاں پھینکو، نہیں تو مارے جاؤ گے۔"

لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں، کر بھی سکتے ہیں۔ سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ وہ ہمیں دیکھ رہے تھے اور ہم انہیں دیکھ نہیں سکتے تھے۔ یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ان کی تعداد کیا ہے اور ان کے پاس کیا اسلحہ ہے۔ اس صورتِ حال میں رائفلیں پھینکنے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ پہلے میں نے کلاشنکوف زمین پر گرائی پھر رضوان نے بھی رائفل پھینک دی۔ تاجور کا چہرہ لیموں کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ ابھی اس نے نوری کی لاش نہیں دیکھی تھی، ورنہ شاید بے ہوش ہو کر گر جاتی۔ دراصل سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ مجھے کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔

جلد ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ ہم نے ہتھیار پھینک کر اچھا کیا ہے، کھوہ کی تاریکی سے نکل کر ہمارے سامنے آنے والے افراد کی تعداد چار تھی، اور چاروں ہی مسلح تھے۔ دو افراد نے آٹومیٹک رائفلیں ہماری طرف سیدھی کر رکھی تھیں جبکہ باقی دو افراد کے پاس بھی رائفلیں موجود تھیں۔ یہ چاروں ملنگی ڈیرے کے نیلے کپڑوں والے محافظ تھے اور ان کی سفاکیاں ہم پچھلے چند دنوں میں ملاحظہ کر ہی چکے تھے۔ ان چاروں کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں، جیسے رات بھر نشے میں دھت رہے ہوں۔ اب بھی وہ نشے میں ہی لگتے تھے۔ ان میں مجھے وہ رنگا نامی محافظ بھی نظر آیا جس نے شروع میں ہمیں پکڑا تھا (اس شخص سے یہ غلطی ہوئی تھی کہ اس نے مجھے، چاچا رزاق اور تاجور کو ایک ہی کوٹھڑی میں بند کیا تھا اور اس کے لیے اسے سزا بھی بھگتنا

پڑی تھی) دو رائفل برداروں کی انگلیاں لبلبی پر تھیں، اور وہ ایک لمحے میں ہم پر پگھلے ہوئے سیسے کی بوچھاڑ کر سکتے تھے۔

ایک شخص نے اپنے ٹوٹے ہوئے دانت کی نمائش کی اور زہرخند لہجے میں بولا۔ ''ڈیرے کی طرف سے فائرنگ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ہمیں پتا تھا کوئی گڑبڑ ہو چکی ہے۔ اب تم منحوسوں کی شکل میں یہ ''گڑبڑ'' ہمارے سامنے کھڑی ہے۔''

ریشمی ابھی تک ان لوگوں کی نظروں سے اوجھل تھی، لیکن وہ اکیلی عورت ذات تھی اور غم کے گھیرے میں تھی، وہ بھلا کیا کر سکتی تھی۔

رائفل برداروں نے حکم دیا کہ ہم اپنی پھینکی ہوئی رائفلوں سے دور ہٹ جائیں اور خود کو دیوار کے ساتھ لگا لیں۔

ان کی ہدایت پر عمل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ مکمل طور پر ہم پر حاوی تھے لیکن وہ اس آگ سے بے خبر تھے جو نوری کی ترس ناک لاش دیکھنے کے بعد میرے سینے میں بھڑک چکی تھی۔ اس کا نتیجہ ان لوگوں کے لیے بہت برا نکلنے والا تھا مگر یہ نتیجہ کیسے نکلے گا، خود مجھے بھی پتا نہیں تھا۔

ذرا دیر بعد باہر سے رونے چلانے کی نسوانی آوازیں آئیں۔ یقیناً یہ ریشمی ہی تھی۔ چند سیکنڈ بعد ایک ہٹا کٹا محافظ ریشمی کو بازو سے پکڑ کر کھینچتا ہوا کھوہ میں لے آیا۔ محافظ کے دوسرے ہاتھ میں پستول تھا۔ اس نے دھکا دے کر ریشمی کو نوری کی لاش کے پاس گرا دیا۔ وہ وہیں پڑی، سسکتی رہی۔

ٹوٹے ہوئے دانت والا شخص ان محافظوں کا انچارج لگتا تھا۔ اس نے غور سے ریشمی کو دیکھا اور طنزیہ انداز میں بولا۔ ''اوہو...... تو پاک بہن بھی یہاں موجود ہے۔ یہ تو بڑی برکت والی صبح ہے کہ پاک بہن کے قدم یہاں پڑے ہیں۔''

نئے آنے والے ہٹے کٹے شخص نے ہانپتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''دلام صاحب! ڈیرے پر بہت گڑبڑ لگ رہی ہے۔ پل ٹوٹ کر کھائی میں گرا ہوا ہے۔ میں دور سے ٹھیک طرح دیکھ نہیں سکا لیکن لگتا ہے کہ پل کی دوسری طرف کافی لڑائی ہوئی ہے اور دستی بم بھی پھینکا گیا ہے۔''

دلام نامی انچارج نے گمبھیر آواز میں کہا۔ ''جو کچھ ہوا ہے یہ ان حرام کے جنوں کی وجہ سے ہی ہوا ہے۔ یہ وہاں سے پاک بہن کو لے کر بھاگے ہیں۔ یہاں اس طرف آنے کے بعد انہوں نے پُل توڑ دیا ہے۔''

نئے آنے والے پہرے دار نے اپنے پستول کا دستہ پورے زور سے رضوان کی گدی پر مارا، وہ اوندھے منہ گرا اور کراہنے لگا۔ صورتِ حال کی سنگینی نے رضوان کے خوبرو چہرے پر ہلدی سی پھیر دی تھی۔

اسی دوران میں دلام کی نظر میری کمر سے بندھے چرمی غلاف پر پڑ گئی۔ اس میں تیز دھار خنجر تھا۔ اس نے غضب ناک آواز میں مجھے حکم دیا کہ میں خنجر غلاف سے نکال کر رائفلوں کے قریب پھینک دوں۔ میں نے خنجر پھینک دیا۔ ''اور کیا ہے تمہارے پاس؟'' وہ پھنکارا۔

''کچھ نہیں۔''

''اگر کچھ نکل آیا تو بہت برا حال کروں گا۔'' وہ بولا۔

اس کی آواز میں بے پناہ سفاکی تھی اور اس سفاکی کا ثبوت نوری کی لاش کی صورت میں میرے سامنے تھا۔ پتا نہیں کیوں میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ نوری کو کسی نے قتل نہیں کیا بلکہ خود پر ٹوٹنے والے ستم سے عاجز آ کر اس نے خود اپنی جان لی ہے۔ (بعدازاں یہ اندازہ درست ثابت ہوا)

صبح کے سورج کی سنہری کرنیں اب کھوہ کے اندر تک آنے لگی تھیں۔ ہوا کا ایک سرد جھونکا آیا اور اس نے نوری کے چہرے پر پڑا ہوا کپڑا الٹ دیا۔ تاجور اور ریشمی کی نگاہ پہلی بار نوری کے چہرے پر پڑی۔ ریشمی تو سکتہ زدہ کھڑی رہی مگر تاجور نے لرز کر ''نوری'' پکارا اور پھر چلتی ہوئی اس کی طرف لپکی۔ ''رک جاؤ۔'' دلام دہاڑا۔

لیکن وہ رکنے والی کہاں تھی۔ وہ اس کی لاش سے لپٹ گئی اور دہاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

دلام نے ہمارے قدموں کے قریب زمین پر دو فائر کیے اور دھمکی آمیز انداز میں گرجا۔

''خبردار، کوئی ہلا تو۔''

ابھی ہلنے کا موقع بھی نہیں تھا۔ تاجور بلک رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ ''نوری آنکھیں کھولو......نوری میری طرف دیکھو۔'' پھر وہ رائفل برداروں کی طرف چہرہ پھیر کر بولی۔ ''تم نے اسے مار دیا......اس کی جان لے لی، تم قاتل ہو، درندے ہو۔'' تب وہ ایک بار پھر لاش سے لپٹ کر آنسو بہانے لگی۔

کچھ دیر بعد دلام نے ہٹے کٹے پہرے دار کو اشارہ کیا۔ اس نے تاجور کو بازو سے پکڑا اور کھینچ کر ہمارے قریب کھڑا کر دیا۔ ریشمی سسک رہی تھی اور آنسو دھاروں کی طرح اس کے رخساروں پر حرکت کر رہے تھے۔ ٹوٹے دانت والے دلام کی کرخت آواز ایک بار پھر ہمارے

کانوں میں گونجی۔ ''تم سب اپنے منہ دیوار کی طرف کرلو...... چلو جلدی کرو۔''

ہمیں تذبذب میں دیکھنے کے بعد اس نے ایک بار پھر فائر کیے۔ اس مرتبہ یہ پورا برسٹ تھا اور ہمارے قدموں کے بالکل قریب چلایا گیا تھا۔ بہت سے سنگریزے اڑ کر ہمارے زیریں جسموں سے ٹکرائے اور کھوہ میں بارود کی تیز بو پھیل گئی۔ ان لوگوں کے سر پر خون سوار تھا اور یہ ہر حد تک جانے کے موڈ میں تھے۔

میں نے انیق اور رضوان کو اشارہ کیا۔ ہم نے اپنے منہ دیوار کی طرف پھیر لیے۔ تاجور ابھی تک ہچکیاں لے رہی تھی۔ میں نے گھما کر اس کا منہ بھی دیوار کی طرف کر دیا۔

''اسی طرح نیچے زمین پر بیٹھ جاؤ۔'' دلام نے نیا حکم جاری کیا۔

ہم بیٹھ گئے۔ میں نے کندھے کے پاس سے تاجور کا بازو تھام رکھا تھا کہ کہیں وہ اضطراب میں کوئی غلط حرکت نہ کر بیٹھے۔ میری دائیں جانب انیق تھا۔ اس کے زخم سے مسلسل خون رِس رہا تھا۔

یہ لوگ کافی ہوشیار تھے۔ ان کے شکنجے سے نکلنا آسان نہیں تھا۔ مگر میری پوری صلاحیتیں بیدار تھیں اور ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میں نے وہیں اسی پوز میں بیٹھے بیٹھے دلام سے پوچھا۔ ''اس بے گناہ کے خون سے ہاتھ کیوں رنگے تم نے؟ زندگی تک چھین لی اس کی؟''

وہ پھنکارا۔ ''خود مری ہے، یہ حرام زادی۔ پہلے گولی چلا کر میرے بندے کا ہاتھ پھٹل کیا پھر خود کو فائر مار لیا۔''

''تم نے اسے اس حال تک پہنچایا تو اس نے فائر مارا نا۔ اس عمر میں مرنے کو کس کا دل چاہتا ہے۔''

''بہت پیار سے رکھا ہوا تھا اسے...... لیکن بہت بڑی اُلو کی پٹھی نکلی یہ۔''

میں نے دل میں سوچا...... تم لوگوں کا پیار تو نظر آرہا ہے اس کے چہرے پر اور ہاتھ پاؤں پر۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''لیکن تم اُلو کے پٹھے اور اُلو کی پٹھیاں نہ نکلنا۔ جس طرح کہا ہے، اسی طرح بیٹھے رہو۔ ہم ذرا آپس میں مشورہ کر لیں کہ تم لوگوں کی کیا خدمت کی جاسکتی ہے۔''

رضوان نے کراہتی ہوئی سی آواز میں کہا۔ ''میں...... تم سے بات کرنا چاہتا ہوں دلام بھائی۔''

دلام پھنکارا۔ ''پردے والی سرکار سے غداری کر کے، تم نے بات کرنے کا حق کھو دیا

ہے سوہنے منڈے۔ اب تیرا بھی وہی انجام ہوگا جو ان کا ہوگا۔“

ایک دوسرے پہرے دار نے رضوان سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”بدبختا! اچھی بھلی رات کی نوکری ملی ہوئی تھی تجھے...... اور وہ بھی بستر پر۔ تُو نے اپنے مقدر کو خود لات ماری ہے۔ اب چونچ بند رکھ...... اور ذرا چھری تلے سانس لے۔“

انہوں نے آپس میں کھسر پھسر شروع کر دی۔ نوری کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس کے متعلق اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔ وہ پانچ چھ دن پہلے ملنگی ڈیرے واپس آنے پر پکڑی گئی تھی۔ مگر بدنیت دلام یا اس کے کسی ساتھی نے اس کے پکڑے جانے کو راز رکھا تھا۔ یہ لوگ اسے چھپا کر یہاں لے آئے تھے۔ ملنگوں کے لیے یہ جگہ ایک چیک پوسٹ کی طرح تھی۔ اس طرف بالکل سنسان پہاڑیاں تھیں مگر پھر بھی یہاں لکڑی کا پل موجود تھا۔ لہٰذا چند پہرے دار یہاں رہتے تھے۔ بدنصیب نوری دو تین دن سے یہیں موجود تھی، آج رات پچھلے پہر جب یہ لوگ سو رہے تھے، وہ کسی طرح ایک پستول تک پہنچی تھی، اس نے پہلے ایک پہرے دار پر فائر کیا مگر نشانہ خطا جانے کے بعد اس نے دوسرا فائر اپنے کنپٹی پر کر کے اپنی زندگی ختم کر لی تھی۔ اب کھوہ کے اندر جو گڑھا کھدا ہوا نظر آ رہا تھا، وہ یقیناً نوری کے جسدِ خاکی کے لیے ہی تھا۔ یہ بہت دکھ دینے والا واقعہ تھا۔

پہرے داروں کی کھسر پھسر جاری تھی۔ کبھی کبھی کسی کی آواز بلند بھی ہو جاتی تھی۔ ایک دو بار کسی سیل فون کا ذکر بھی ہوا۔ یہ سیل فون شاید رنگا کا تھا اور وہ کام نہیں کر رہا تھا۔ اس پر رنگا کو ”انچارج دلام“ سے ڈانٹ بھی پڑی۔ دلام نے رنگا کے لیے ”کنجر کے پتر“ کا لفظ استعمال کیا اور کہا کہ اگر فون کام کر رہا ہوتا تو ڈیرے کی صورتِ حال کا پتا تو چلتا۔

لگتا تھا کہ یہ سیل فون، ان کے پاس ڈیرے سے رابطے کا واحد ذریعہ تھا اور وہ چارجنگ نہ ہونے کے سبب یا کسی اور وجہ سے بند ہو گیا تھا۔

کچھ دیر بعد دلام اور اس کے ساتھیوں کی مشاورت ختم ہو گئی۔ دلام غالباً شراب بھی پی رہا تھا کیونکہ جب وہ بولا تو اس کی آواز میں لڑکھڑاہٹ نمایاں تھی۔ اس نے کہا۔ ”بتاؤ اب کیا کیا جائے تم پانچوں کے ساتھ......“

میں نے کہا۔ ”بہتر تو یہی ہے کہ چھوڑ دیا جائے، کیونکہ......“

اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔ ”میرے لال بجھکڑ، دل تو میرا بھی یہی چاہتا تھا کہ چھوڑ دیا جائے۔ کیونکہ تم میں دو سوہنی سوہنی کڑیاں بھی ہیں۔ جو اس اینگل سے بھی سوہنی ہی لگ رہی ہیں لیکن...... مسئلہ یہ ہے لال بجھکڑ کہ تم اور تمہارے ساتھی کافی بدبخت ثابت ہوئے ہو،

پہلے تم لاہوری منڈے کے قتل کے گواہ بن گئے اور جنگلا رے میں جا پہنچے۔ اب خیر سے تم اس نوری کے قتل کے ''چشم دید گواہ'' ہو گئے ہو، اب تمہیں چھوڑنا خود کو سخت مصیبت میں ڈالنا ہے۔''

رضوان نے منہ پھیر کر کچھ کہنا چاہا۔ دلام لڑکھڑاتی آواز میں دہاڑا۔ ''خبردار اپنا منہ دیوار کی طرف رکھ، ورنہ پہلی گولی، تیرے بھیجے میں گھسے گی۔''

اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ ٹن ہو رہا ہے اور کسی بھی وقت کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اب مزید انتظار خطرناک تھا۔ یہ لوگ یقیناً ہمیں مارنے کا فیصلہ کر چکے تھے اور اس کی بڑی وجہ نوری کی موت ہی تھی۔ نوری کے ساتھ ان لوگوں نے جو کچھ کیا تھا، وہ ڈیرے میں کسی کے علم میں نہیں تھا۔ اب یہ لوگ مجاوروں اور ''پردے والی سرکار'' کے غضب سے بچنے کے لیے ہمیں بھی مار دینا چاہتے تھے۔ یہ ہمیں بھی یہاں کہیں دفن کر سکتے تھے یا پھر کہہ سکتے تھے کہ ہم بھاگنے کے دوران میں ان کی گولیوں کا شکار ہوئے ہیں۔ یوں ان کے سینوں پر شاباشی کا تمغہ بھی سج سکتا تھا۔ ان کو جو کچھ بھی کرنا تھا، جلدی کرنا تھا، کیونکہ یہ جانتے تھے کہ پل ٹوٹنے کے بعد ملنگی ڈیرے سے بہت سے لوگ ہم پانچوں کے تعاقب میں نکل پڑے ہوں گے۔ وہ کھائی کا چکر کاٹ کر یہاں آئیں گے اور اس کام میں اب انہیں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔

میں نے دیوار کی طرف رخ رکھے رکھے کہا۔ ''میں تمہیں ایک خبر دینا چاہتا ہوں دلام! اور اس کے ساتھ ساتھ ایک آفر بھی کرنا چاہتا ہوں۔''

''فرماؤ۔'' اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''تمہاری پردے والی سرکار اللہ کو پیاری ہو چکی ہے۔ ڈیرے پر ہونے والی جھڑپ میں کئی اور بڑے مجاور بھی ختم ہو گئے ہیں۔''

''کیا بکواس کر رہے ہو؟'' دلام دہاڑا۔ اس کے سر پر جیسے کسی نے وزنی بم پھوڑ دیا تھا۔

میں نے کہا۔ ''اگر تم لوگوں کا موبائل فون ٹھیک ہوتا تو اب تک تمہیں یہ ساری خبریں پہنچ چکی ہوتیں۔ اب بھی تم ہمارا ایمونیشن بیگ کھول کر دیکھ سکتے ہو، اس میں تمہیں پردے والی سرکار کی باقیات مل جائیں گی۔ اس کی انگوٹھیاں اور مالائیں وغیرہ۔''

چند سیکنڈ تک کھٹ پٹ کی آوازیں آتی رہیں پھر دلام کی لرزاں آواز ابھری۔ ''پردے والی سرکار کو کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ چیزیں تم نے چرائی ہوں گی...... یا پھر......''

''ابھی تھوڑی دیر میں تمہارا باقی کا نشہ بھی ہرن ہو جانا ہے۔'' میں نے اس کی بات

کاٹی۔ ''تمہیں سب کچھ پتا چل جائے گا، لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی ہو گی۔ اب میں تمہیں اس آفر کے بارے میں بتاتا ہوں جو میں نے کی ہے۔'' میں نے بڑے اطمینان سے کہا۔

وہ جواب میں کچھ نہیں بولا۔ میں نے ہولے سے اپنا رخ پھیرا اور اس کے دھواں دھواں چہرے کی طرف دیکھا۔ ''میں تمہیں یقین دلاتا ہوں دلام! یہ ملنگی ڈیرا ختم ہو چکا ہے۔ ابھی ایک آدھ گھنٹے میں قانون نافذ کرنے والی ایجنسیوں نے اس جگہ کو چاروں طرف سے گھیر لینا ہے۔ پھر تم لوگوں کی زندگی کا چانس ختم ہو جائے گا کیونکہ اب بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ اگر تم ہمیں چھوڑ دیتے ہو تو میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ ہم اپنے دل پر پتھر رکھ لیں گے، اور اس نوری والے واقعے کو رپورٹ نہیں کریں گے۔ تمہیں سزا میں زیادہ سے زیادہ رعایت دلانے کا وعدہ بھی ہم کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ تم میں سے ایک دو کو سلطانی گواہ بنا لیا جائے۔''

دلام کے چہرے پر زلزلے کی سی کیفیت تھی۔ جیسے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ میگزین بیگ اس کے سامنے کھلا پڑا تھا اور اس میں سے پیر سائنتا کی بیش قیمت انگوٹھیاں، مالائیں اور کڑے جھانک رہے تھے پھر دیکھتے ہی دیکھتے دلام کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ بولا۔ ''اگر سب کچھ واقعی اسی طرح ہو چکا ہے جس طرح تم بتا رہے ہو، تو پھر کیوں نہ ہم تمہیں چھلنی کر دیں اور اپنی جان بچانے کی کوشش کریں۔''

''میں نے تم سے کہا ہے نا دلام، اس جگہ کو گھیرے میں لینے کا کام شروع ہو چکا ہے۔''

''بکواس کر رہے ہو تم۔'' دلام نے رائفل کے دستے پر اپنے ہاتھوں کو بے قراری سے حرکت دی۔

یہی وقت تھا جب ایک بالکل غیر متوقع کام ہوا۔ میں نے رنگا کو دیکھا۔ اس نے اچانک دلام پر جست لگائی اور اسے اپنے ساتھ لیتا ہوا، نوری کی لاش کے پاس گرا۔ دلام نے ٹریگر دبا دیا، تاہم گولیاں کھوہ کی چھت میں پیوست ہوئیں۔ اتنا موقع میرے لیے کافی تھا۔ میں نے قریبی محافظ پر چھلانگ لگائی۔ رائفل اس کے ہاتھ سے نکل کر کسی طرف لڑھک گئی اور اس کا سر پتھریلی دیوار سے ٹکرایا۔ میرے ایک طوفانی گھونسے نے اس کا جبڑا توڑ ڈالا۔ تاجور اور ریشمی کے چلانے کی آوازیں میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ میں نے مڑ کر دیکھا، پستول بردار محافظ میرا نشانہ لے رہا تھا۔ ایسے موقعوں پر پھرتی کے علاوہ قسمت بھی ساتھ دیا کرتی ہے۔ میں نے جھک کر خود کو مہلک گولی سے بچایا...... پھر بھاگ کر اس شخص کے چہرے پر ٹکر رسید کی...... وہ گردن کے بل اس گڑھے میں گرا جو نوری کے لیے کھودا گیا تھا۔ انیق نے

زخمی ہونے کے باوجود اسے گڑھے کے اندر ہی دبوچ لیا۔ رنگا ابھی تک انچارج دلام سے لپٹا ہوا تھا اور اس سے رائفل چھیننے کی کوشش کر رہا تھا۔ دلام نے زوردار ٹانگ ماری اور رنگا کو دور گرا دیا۔ رائفل ابھی تک دلام کے ہاتھ میں تھی۔ ایک بلند چنگھاڑ کے ساتھ اس نے رنگا کو نشانہ بنانا چاہا مگر اس سے پہلے ہی ایک گولی اس کی چھاتی میں لگی اور وہ پشت کے بل گرا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا، یہ رضوان تھا جس نے اس لڑائی میں پہلی گولی چلائی تھی۔ اس کا رائفل پکڑنے کا انداز ہی بتا رہا تھا کہ وہ اناڑی ہے۔ میں نے اس سے رائفل جھپٹ لی۔ زخمی ہونے کے باوجود دلام اٹھنا چاہ رہا تھا مگر اس بار رنگا اس پر خنجر سے حملہ آور ہوا اور اس کا پیٹ پھاڑ کر رکھ دیا۔ بڑی وحشت تھی رنگا کے وار میں۔ شاید اس وحشت کے پیچھے وہ ''توہین'' تھی جو رنگا کو ڈیرے پر اور کچھ دیر پہلے یہاں بھی جھیلنی پڑی تھی۔

اب رائفل میرے ہاتھ میں تھی اور نوری کی لاش نے بڑی دیر سے میری آنکھوں میں خون اتارا ہوا تھا۔ میں نے رائفل کو برسٹ پر سیٹ کیا اور پلک جھپکتے میں دو پہرے داروں کو بھون کر رکھ دیا۔ تیسرے پہرے دار نے میری آنکھوں میں پڑھ لیا کہ میں اسے زندہ پکڑنا چاہتا ہوں۔ وہ مجھ پر فائر کرنے کے بجائے پلٹا اور بھاگ نکلا۔ وہ جانتا نہیں تھا کہ تقدیر فیصلہ دے چکی ہے۔ ان گھڑیوں میں یہاں وہی کچھ ہوگا، جو میں چاہوں گا۔ شاید اس وقت پورا ملنگی ڈیرا بھی یہاں پہنچ جاتا تو اسے مجھ سے بچا نہ سکتا...... میں اس کے پیچھے لپکا۔ تاجور چلا رہی تھی۔ میں اس بندے کو ہرگز چھوڑنے والا نہیں تھا لیکن جو کچھ ہوا، اس کی اپنی غلطی کی وجہ سے ہوا۔ اس نے بدحواسی میں ایک کھائی کو چھلانگ لگا کر پار کرنا چاہا، کھائی کچھ زیادہ چوڑی بھی نہیں تھی، بمشکل سات آٹھ فٹ رہی ہوگی لیکن ایک تو وہ بدحواس تھا، دوسرے قدرے فربہ جسم کا تھا۔ اس کا ایک پاؤں زمین پر پڑا لیکن دوسرا خلا میں رہ گیا۔ وہ بھیانک انداز میں چلایا اور الٹ کر نیچے گرا۔ ایک درخت کی جڑیں اس کے ہاتھ میں آئیں۔ وہ لٹک گیا۔ نیچے کم و بیش ساٹھ فٹ تک کچھ نہیں تھا۔ وہ گرتا تو نکیلے پتھروں سے ٹکراتا۔ اس کی رائفل ہاتھ سے نکل کر انہی پتھروں میں پہنچ چکی تھی۔ ''بچاؤ۔'' وہ پکارا۔

میں نے اوندھے گر کر اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا مگر اس سے پہلے ہی شاخ ٹوٹ گئی۔ وہ زندگی کی آخری پکار بلند کرتا ہوا گہرائی میں پتھروں پر جا گرا......اور جھاڑ جھنکاڑ میں اوجھل ہو گیا۔ اس کے بچنے کا امکان پانچ فیصد بھی نہیں تھا۔

میں پلٹا۔ پہرے دار کے بھاگنے اور اس کے، کھائی میں گرنے کے سارے عمل میں بمشکل ایک منٹ لگا تھا۔ اس ایک منٹ کے دوران میں ہی کھوہ کے اندر ہونے والا معرکہ

اختتام کو پہنچ گیا۔ ہماری مدد کرنے والا پہرے دار رنگا، دہانے کے پاس گرا پڑا تھا اور آخری سانسیں لے رہا تھا۔ اس کے سینے اور پیٹ میں رائفل کا پورا ایک برسٹ لگا تھا مگر اس برسٹ سے پہلے اس نے انچارج دلام کا کام تمام کر دیا تھا۔

میں نے رنگا کے سر کے نیچے ہاتھ رکھ کر اس کا سر تھوڑا سا اونچا کیا۔ وہ ڈوبتی ہوئی آواز میں رک رک کر بولا۔ ''چلے جاؤ...... وہ بڑی جلدی...... یہاں پہنچ جائیں گے......'' اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں دھندلاہٹ اترنا شروع ہو گئی۔ اس نے بڑی نفرت سے دلام کی لاش کی طرف دیکھا۔

رنگا جیسے خاموشی کی زبان میں مجھ سے کہہ رہا تھا۔ ''میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں نے بس اپنا بدلہ چکایا ہے۔ تم مجھے چھوڑو اور جاؤ یہاں سے۔''

پھر ایک دم اس کے جسم میں تھرتھراہٹ نمودار ہوئی۔ وہ ایک بار زور سے اینٹھ کر ختم ہو گیا۔

میں نے اس کا سر دوبارہ زمین پر ٹکا دیا۔ ہمارے اردگرد لرزہ خیز منظر تھا۔ دلام اپنے تین ساتھیوں سمیت اس کھوہ میں زندگی کی بازی ہار گیا تھا۔ پانچواں شخص ابھی کھائی میں گر کر جہنم واصل ہوا تھا۔ کھوہ میں پڑی چار لاشوں سے بہنے والا خون، سورج کی روپہلی کرنوں میں کچھ اور بھی سرخ دکھائی دے رہا تھا۔ پانچویں لاش نوری کی تھی اور یہ لاش ہمارے دلوں کو خون کر رہی تھی مگر ہمارے پاس ماتم کا وقت نہیں تھا۔ تاجور ایک بار پھر روتی ہوئی نوری کی لاش سے چمٹ گئی تھی۔ ریشمی نے اس بدنصیب جواں مرگ کے پاؤں تھامے ہوئے تھے۔ ہم میں سے کسی کو یہ ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ ایک بار پھر اس کے چہرے پر سے کپڑا ہٹاتے۔ تاجور پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھی۔ میں نے اسے تقریباً جھڑک کر نوری سے علیحدہ کیا۔ بس ایک نظر اس کے ستم زدہ چہرے پر ڈالی۔ اس کی پیشانی کو بوسہ دیا اور چہرہ پھر سے ڈھک دیا۔ میں نے اکیلے ہی اس کی لاش کو اٹھا کر پہلے سے کھدے ہوئے گڑھے میں ڈالا۔ اس کی اپنی چادر ہی اس پر پھیلائی...... اور پھر امانتاً اسے اس گڑھے میں دفن کر دیا۔ یہ عارضی قبر بنانے میں رضوان اور انیق نے بھی میرا ساتھ دیا۔

اس کے فوراً بعد ہم وہاں سے چل پڑے۔ ہمیں جلد از جلد یہاں سے دور ہونا تھا۔ ملنگی ڈیرے سے ہمارا فاصلہ جتنا بڑھ جاتا، اتنا ہی ہمارے لیے بہتر تھا۔ ریشمی ابھی تک غم سے نڈھال تھی۔ وہ گاہے گاہے مڑ کر عقب میں دیکھنے لگتی تھی۔ جیسے اسے اب بھی آس ہو کہ اس کا بابا جانی، لنگڑاتا ہوا اور زمین پر ہاکی ٹیکتا ہوا اس تک پہنچ جائے گا۔

○......❖......○

اگلے تین گھنٹے میں ہم نے پہاڑوں سے گھرے ہوئے دشوار گزار راستے پر حتی الامکان تیزی سے سفر کیا۔ ہر لحظہ یہی دھڑکا لگا تھا کہ ابھی کسی طرف سے ملنگی ڈیرے کے مشتعل ملنگ نمودار ہو جائیں گے اور ہم پر گولیوں کی بارش کر دیں گے۔ سورج اب نصف نہار پر چمک رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کی ''کاٹ'' دھوپ کی تمازت نے کسی حد تک کم کر دی تھی۔ انیق کی ہمت کی داد دینا پڑتی تھی، زخمی ہونے کے باوجود وہ بڑی روانی اور تسلسل سے ہمارا ساتھ دے رہا تھا۔ ریشمی کے منہ سے گاہے بگاہے ''ہائے'' نکل جاتی تھی۔ تاجور بھی چند منٹ کے وقفے سے سسکنا شروع کر دیتی تھی۔ رات کے آخری پہروں میں ملنگی ڈیرے پر پیش آنے والے خونی واقعات جاگتی آنکھوں کا خواب لگتے تھے۔ رضوان کا ڈاکٹر ارم کو زخمی کر کے واش روم میں بند کرنا، ہمارا جنگلارے سے نکلنا اور پھر میرا تاجور تک پہنچ کر پردے والی سرکار کو ختم کرنا، بعدازاں کرنالی کے بندوں پر گولیوں کی بوچھاڑ اور خونخوار چیتوں کی ہلاکت......اور آخر میں ماضی کے نامور گول کیپر کا آخری ''یادگار کھیل''۔ میری نگاہوں میں ابھی تک وہ تصوراتی نقشہ جما ہوا تھا۔ خونخوار فارورڈز اور چٹان کی طرح جمے ہوئے گول کیپر کی یادگار ٹکر۔

دوسروں کی طرح دونوں لڑکیوں کا بھی تھکاوٹ اور پیاس کی شدت سے برا حال تھا۔ میں سب سے آگے تھے، مجھے عقب میں کراہ سنائی دی۔ مڑ کر دیکھا تو ریشمی پہلو کے بل گری پڑی تھی۔ اس کے لمبے بال بھورے پتھروں پر بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے اور تاجور نے اسے لپک کر اٹھایا۔ اس کو پکارا۔ اس کے ہاتھ پاؤں کو جنبش دی۔ وہ بے ہوش تھی۔ میں نے اسے کندھے پر اٹھالیا۔ یہاں رک کر ہم اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرتے تو اپنے لیے خطرات میں اضافہ کر لیتے۔

''وہ دیکھیں جی۔'' رضوان نے انگلی سے ایک جانب اشارہ کیا۔

ہم سب ہی چونک گئے۔ اونچے گھنے درختوں کے عقب میں لکڑی کا ایک تنہا گھر نظر آرہا تھا۔ یہ دو منزلہ گھر تھا، چھت مخروطی تھی۔ اس تنہا مکان کے اردگرد کٹے ہوئے درختوں کے چند ڈھیر دکھائی دے رہے تھے مگر انسان کہیں نظر نہیں آتا تھا۔

میں نے ریشمی کو بہ آہستگی کندھے سے اتارا اور رائفل کا سیفٹی کیچ ہٹا کر اسے تیار حالت میں کر لیا۔ رضوان نے بھی رائفل سونت لی لیکن میں جانتا تھا وہ اسے چلانے کی ہمت شاید ہی کر پائے گا۔ ہم دونوں احتیاط سے مکان کی طرف بڑھے۔ عقب میں ایک کھلی چھت والی جیپ کھڑی نظر آئی۔ اسے ترپال سے ڈھانپا گیا تھا۔ قریب ہی دو بکریاں بندھی ہوئی تھیں۔

بکریوں کی موجودگی ظاہر کرتی تھی کہ یہاں کوئی نہ کوئی تو موجود ہوگا۔

ہم تھوڑا سا مزید آگے گئے تو اندازہ ہوا کہ گھر کی نچلی منزل میں کہیں ریڈیو یا ٹیپ ریکارڈر بج رہا ہے تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ہمیں ریشمی کی آواز سنائی دی......وہ گا رہی تھی۔ اب یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں تھا کہ اندر ٹیپ ریکارڈر پر ریشمی کی آواز کی کیسٹ چل رہی ہے۔ وہی دلسوز، دلگداز آواز جو کانوں کے راستے سیدھی دل پر اثر کرتی تھی۔ وہی پنجابی کافی کے بول۔ یہ آواز گواہی دے رہی تھی کہ اندر جو کوئی بھی موجود ہے، وہ ملنگی ڈیرے کے مجاوروں کا عقیدت مند ہے، ہم احتیاط سے آگے پیچھے چلتے کٹی ہوئی گیلیوں کے درمیان سے گزرے اور چوبی گھر کے اندر پہنچ گئے۔ آواز ایک وسطی کمرے میں سے آ رہی تھی۔ یہاں لمبے بالوں والا ایک نوجوان لحاف اوڑھے اونگھ رہا تھا بلکہ سو رہا تھا۔ کمرے میں ملنگی ڈیرے میں موجود مستاں مائی کے مزار کی ایک پوسٹر نما تصویر بھی تھی دیگر نشانیاں بھی ظاہر کرتی تھیں کہ یہ شخص ملنگی ڈیرے کے عقیدت مندوں میں سے ہے۔ اس شخص کو بزور بازو مطیع کرنے سے بہتر تھا کہ ہم خود کو ملنگی ڈیرے کے مرید ظاہر کرتے اور یوں اس کی ہمدردی حاصل کرتے۔

میں اور رضوان جس طرح خاموشی سے آئے تھے اسی طرح واپس چلے گئے۔ انیق اور تاجور مل کر ریشمی کو ہوش میں لا چکے تھے، تاہم وہ ابھی تک خود سے کھڑے ہونے کے قابل نہیں تھی۔ میں نے انیق اور تاجور وغیرہ کو بھی سمجھا دیا کہ ہمیں کیا اور کیسے کرنا ہے۔ یہ عین ممکن تھا کہ کمرے میں سوئے ہوئے نوجوان کے دیگر ساتھی بھی اردگرد موجود ہوں اور جلد ہی یہاں پہنچ جائیں۔ بہرحال ایک بات واضح تھی۔ یہ لوگ ابھی تک اس قیامت سے بے خبر تھے جو اٹھارہ بیس کلومیٹر پیچھے ملنگی ڈیرے پر ٹوٹ چکی تھی۔

ہم نے پروگرام کے مطابق ریشمی کو ایک لمبی چادر اس طرح اوڑھا دی کہ اس کا چہرہ اور لباس اس میں چھپ گیا۔ انیق نے اپنا زخمی کندھا چھپانے کے لیے ایک کمبل اوڑھ لیا۔ اپنی دو رائفلیں ہم نے وہیں درختوں میں چھپا دیں۔ بس ایک رائفل انیق نے اپنے کمبل کے نیچے گھسائے رکھی۔ ہم نے جا کر لمبے بالوں والے شخص کو جگایا۔ وہ پہلے تو حیران ہوا پھر علیک سلیک کے بعد ہم کو بیٹھنے کے لیے کہا۔ ہم چارپائی پر بیٹھ گئے۔ تاجور نے ریشمی کو ایک خالی چارپائی پر لٹا دیا اور اسے چادر اوڑھا دی۔

لمبے بالوں والے نے ریشمی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بہن جی کو کیا مسئلہ ہے بھرا جی؟''

''بیمار ہے۔ بہت علاج کرائے۔ کوئی فرق نہیں پڑا۔ ملنگی ڈیرے لے کر جا رہے

ہیں۔شاید رب سوہنا کوئی کرم کر دے۔'' میں نے کہا۔
''کہاں سے آرہے ہیں آپ؟'' لمبے بالوں والے نے پوچھا۔
میں اور رضوان اس سوال کا جواب پہلے ہی تیار کر چکے تھے۔ میں نے پلندری کے ایک قریبی گاؤں کا نام لیا اور بتایا کہ ہم پاپیادہ ڈیرے کی طرف جانا چاہ رہے ہیں۔
''آپ کو تو کافی لمبا سفر کرنا پڑے گا۔'' اس شخص نے کہا۔
''سفر تو واقعی لمبا ہے۔ بس اوپر والا کرم کر دے اور ہماری مریضہ ٹھیک ہو جائے تو پھر کوئی تکلیف...... تکلیف نہیں ہے۔''
''کرم تو ضرور کرے گا اوپر والا۔ سرکار جی کے ہاتھ میں بڑی شفا دی ہے نیلی چھتری والے نے۔ مُردے زندہ ہونے لگتے ہیں۔'' لمبے بالوں والے نے بڑی عقیدت سے اوپر نیچے سر ہلایا...... پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''ویسے اس سلسلے میں، میں تم لوگوں کی مدد کر سکتا ہوں۔''
''وہ کس طرح؟'' میں نے خوش ہو کر کہا۔
''کل رات کو ''بڑا لنگر'' ہے ڈیرا شریف پر۔ میرا پروگرام بھی صبح سویرے جانے کا بن رہا ہے اگر تم لوگ چاہو تو......''
''مگر ہم تو جلدی جانا چاہ رہے ہیں۔'' رضوان نے کہا۔
''موسم خراب ہو رہا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک دو گھنٹے میں بارش شروع ہو جائے۔ تم لوگ پیدل نکلو گے تو بھی کل سے پہلے وہاں نہیں پہنچ سکو گے۔''
موسم واقعی تبدیل ہو رہا تھا۔ دھوپ غائب ہو گئی تھی اور ہوا میں ٹھنڈک بڑھ گئی تھی۔
ہماری گفتگو جاری رہی۔ لمبے بالوں والے کا نام یاسین معلوم ہوا۔ وہ اور اس کا باپ حاجی نیاز یہاں لکڑی کی کٹائی کا کام کرتے تھے۔ تھوڑے فاصلے پر انہوں نے ایک بڑی ٹرالی والی آرا مشین بھی لگا رکھی تھی۔ آج یہاں چھٹی تھی اس لیے ورکشاپ میں کوئی مزدور نظر نہیں آرہا تھا۔ حاجی نیاز صاحب بھی قریبی قصبے میں گئے ہوئے تھے۔ انہیں شام کو آنا تھا۔ یاسین کی باتوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ پردے والی سرکار کا بہت بڑا عقیدت مند ہے لیکن اس کے والد کی رائے مختلف ہے۔ یہ بات نہیں تھی کہ وہ روشن خیال تھے بلکہ وہ کسی اور گدی نشین کے پیروکار تھے، اپنے بیٹے اور بہو کا پردے والی سرکار سے عقیدت رکھنا انہیں پسند نہیں تھا۔
میں نے یاسین سے پوچھا۔ ''اگر ہم کل آپ کے ساتھ جاتے ہیں تو پھر ہمیں رات یہاں گزارنا پڑے گی۔ کیا آپ کے والد صاحب برا تو نہیں منائیں گے؟''

''اس کا انتظام میں کرلوں گا۔'' یاسین پُرسوچ انداز میں بولا۔ ''آپ اوپر والے بڑے کمرے میں سو جانا۔ میں باہر سے تالا لگا چھوڑوں گا۔ صبح سویرے جب اباجی نماز کے بعد سو رہے ہوں گے، ہم نکل جائیں گے۔''

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی بادل گھر کر آنے لگے اور دوپہر میں ہی شام کا سماں محسوس ہونے لگا۔ فی الوقت یہ ٹھکانا تو ہمارے لیے موزوں تھا لیکن اگر ملنگی ڈیرے کے مشتعل ملنگ ہمیں کھوجتے ہوئے یہاں پہنچ جاتے تو معاملہ سنگین ہوسکتا تھا۔ بہرحال اس طرح کے رسک تو اب ہمیں لینا ہی تھے۔

میں نے یاسین سے پوچھا۔ ''کوئی اور بھی ہوگا، آپ کے ساتھ؟''

''بس ایک دوست ہے اور دو جانور۔''

''جانور؟''

''ہاں، وہ سامنے جو دو بکرے بندھے ہیں۔ وہ ڈیرے پر قربان کرنے ہیں۔ لنگر میں حصہ ڈالنے کے لیے۔'' یاسین نے جواب دیا۔

''یہ بڑا لنگر کیوں ہو رہا ہے؟'' انیق نے پوچھا۔

یاسین کے چہرے پر خوشی کی جھلک نظر آئی۔ عقیدت بھرے انداز میں بولا۔ ''سرکار جی کے آستانے پر ایک ''خوشی'' ہے۔ وہ نکاح کر رہے ہیں۔ پاک بہن کا نام سنا ہوا ہے آپ لوگوں نے؟''

''وہ...... جن کی آواز بہت پسند کی جا رہی ہے؟'' میں نے کہا۔

''پسند ہی نہیں کی جا رہی بلکہ لوگ عشق کرتے ہیں اس آواز سے۔ وہ دراصل...... ڈھائی سو سال پہلے کی مستاں مائی کی آواز ہے۔'' یاسین بڑی سادہ لوحی سے اس آواز کے اور پاک بہن کے قصیدے پڑھنے لگا۔

وہ جانتا نہیں تھا کہ اس سے چند قدم کی دوری پر جو ''بیمار لڑکی'' شال اوڑھے چارپائی پر بے سدھ پڑی ہے، یہ وہی پاک بہن ہے اور وہ جس سرکار جی کے گن گا رہا ہے وہ اپنا منکا تڑوا کر راہی ملک عدم ہوچکا ہے اور وہاں اب بڑے لنگر کے بجائے بڑا سیاپا ہونے والا ہے۔

بارش شروع ہونے والی تھی۔ سردی میں اضافہ ہوگیا تھا۔ میں نے اس بات پر رضامندی ظاہر کردی کہ ہم رات یہاں گزاریں گے اور صبح یاسین کے ساتھ ملنگی ڈیرے جائیں گے۔ یاسین ایک ساتھ تین ''پیر بھائی'' پاکر بہت خوش ہو رہا تھا۔ وہ لکڑی کی سیڑھیاں چڑھا کر ہمیں اوپر لے آیا اور وہ کشادہ کمرا دکھایا جہاں چار عدد چارپائیاں موجود

تھیں اور لحاف وغیرہ پڑے تھے۔ یہ جگہ یقیناً مزدوروں کے سونے کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ ایسے ہی تین چار کمرے یہاں مزید موجود تھے۔ ہلکی بوندیں پڑنے لگی تھیں۔ مجھے اس اسلحے کی فکر ہو رہی تھی جو ہم باہر درختوں میں چھوڑ آئے تھے۔ جب تاجور اور رضوان سہارا دے کر ریشمی کو اوپر لا رہے تھے، میں بہانے سے باہر نکلا۔ جھاڑیوں میں جا کر میں نے دونوں رائفلوں اور ان کے ایمونیشن کو ایک پلاسٹک میں لپیٹا اور انہیں اچھی طرح خشک ٹہنیوں اور جھاڑ جھنکاڑ سے ڈھانپ دیا۔

سردیوں کی شام نے جلدی ہی پر پھیلا لیے۔ بارش جاری تھی۔ ہمارے لیے صورتِ حال کسی بھی وقت دھماکا خیز ہو سکتی تھی۔ لہٰذا انیق نے اپنے کمبل کے نیچے آٹومیٹک رائفل کو بالکل تیار حالت میں رکھا ہوا تھا۔ تاجور اور ریشمی دونوں منہ سر لپیٹ کر لیٹی ہوئی تھیں اور یقیناً دونوں ہی کی آنکھیں اشکبار تھیں۔ ''کوئی آ رہا ہے۔'' اچانک انیق نے چونک کر کہا۔

کسی گاڑی کے انجن کی مدھم گھر گھر سنائی دے رہی تھی۔ ہم چوکس ہو گئے۔ عین ممکن تھا کہ یہ ملنگی ڈیرے کے ملنگ ہی ہوں۔ یاسین نے ہمارے کمرے میں خورونوش کا سامان رکھ دیا تھا اور باہر سے تالا لگا دیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ ہم کمرے میں کسی طرح کی آواز پیدا نہ کریں۔ یہ احتیاط اس نے اپنے والد بزرگوار کی وجہ سے کی تھی۔

کمرے میں ایک چھوٹی سی کھڑکی موجود تھی۔ میں نے اس کی درز میں سے جھانکا......
ایک جیپ نما گاڑی تیزی سے اچھلتی کودتی چلی آ رہی تھی۔ قریب آ کر رکی تو اس میں سے فربہ جسم اور کھچڑی داڑھی والے ایک حاجی صاحب اترے۔ یقیناً یہی یاسین کے والد گرامی تھے۔ سر پر چھتری تانے ہوئے وہ تیزی سے مکان میں داخل ہو گئے۔ جیپ نما گاڑی انہیں چھوڑ کر واپس چلی گئی۔

''لو جی، مالک مکان تو آ گیا۔ اب آواز بالکل پیدا نہیں کرنی۔'' میں نے ساتھیوں سے کہا۔

کمرے میں لالٹین روشن تھی۔ یاسین کی ہدایت کے مطابق میں نے اس کی لو بہت نیچی کر دی۔ سیڑھیوں کے پاس سے باتوں کی آواز آنے لگی۔ حاجی صاحب کسی بات پر بیٹے سے بحث کر رہے تھے، غالباً اسے کہیں جانے کے لیے کہہ رہے تھے۔ کسی وقت ان کی آواز خاصی ترش ہو جاتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہم نے دیکھا کہ یاسین چھتری لیے ہوئے برآمد ہوا اور اپنے سوزوکی لوڈر کی طرف چلا گیا۔ دو منٹ بعد اس کا لوڈر ہچکولے کھاتا ایک جانب جا رہا تھا۔ ''پتا نہیں یہ کہاں گیا ہے؟'' انیق نے پرتشویش لہجے میں کہا۔

''چلو جہاں بھی گیا ہے لیکن صبح سے پہلے واپس آجائے۔'' میں نے دعائیہ انداز اختیار کیا۔

ابھی یاسین کو گئے دس پندرہ منٹ ہی ہوئے تھے کہ رضوان ایک بار پھر پکار اٹھا۔'' لگتا ہے جی، اب کوئی اور گاڑی آرہی ہے۔''

اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میں نے لحاف سے نکل کر کھڑکی میں سے جھانکا۔ یہ ایک نہیں دو گاڑیوں کی روشنیاں تھیں۔ وہ بڑی تیزی سے اس ورکشاپ کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ چند منٹ بعد ہمارے خدشات درست ثابت ہوگئے۔ ان گاڑیوں میں سے جو لوگ برآمد ہوئے، وہ ملنگی ڈیرے کے مسلح محافظ تھے۔ ایک فربہ شخص کو چھتری کے سائے میں باہر لایا گیا۔ 86 ماڈل ٹویوٹا کار کی روشنی اس شخص پر پڑی اور میں پہچان گیا۔ یہ ملنگی ڈیرے کا بڑا مجاور کرنالی تھا۔ لکڑی کے پل کے پاس ڈیرے کے محافظوں سے ہمارا جوزوردار ٹاکرا ہوا تھا، اس میں یہ کرنالی ہی محافظوں کی قیادت کررہا تھا۔ اس کی آگ اگلتی آواز ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ ''یہ سرکار جی کے قاتل ہیں، ان کو ماردو...... ٹکڑے کردوان کے۔''

اب بھی وہ یقیناً اسی موڈ میں تھا۔ وہ لمبے ڈگ بھرتا ہوا ہماری نظروں کے سامنے سے اوجھل ہوگیا۔ چند سیکنڈ بعد ہم نے اس کی مدھم آواز سنی۔ وہ اپنے ساتھیوں سمیت حاجی صاحب کے سامنے موجود تھا اور گرج رہا تھا۔ ''اور کتنے لوگ ہیں یہاں؟''

حاجی صاحب نے ہراساں لہجے میں جواب دیا۔ ''آج تو صرف میں اور میرا بیٹا ہیں۔ آج چھٹی تھی نا۔ مزدور وغیرہ گھروں کو گئے ہوئے ہیں۔''

''بیٹا کہاں ہے تمہارا؟'' کرنالی نے تحکم سے پوچھا۔

''وہ ذرا قصبے تک گیا ہے، ڈیزل کا انتظام کرنے۔ سویرے کام شروع ہونا ہے نا۔''

''تم کتنی دیر سے ہو یہاں؟''

''کوئی ڈیڑھ گھنٹا تو ہوگیا ہے جی۔''

''کسی اور کو دیکھا ہے تم نے یہاں؟''

''نہیں جی، بارش ہورہی ہے۔ مجھے تو کوئی راہ گیر بھی نظر نہیں آیا۔ یاسین نے کسی کو دیکھا ہو تو کچھ کہہ نہیں سکتا۔''

پھر آوازوں سے اندازہ ہوا کہ ڈیرے کے محافظ گھوم پھر کر گھر کا جائزہ لے رہے ہیں۔ دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آہٹیں سنائی دیں۔ لکڑی کے فرش پر دندناتے قدموں کی صدا کانوں میں پڑی۔ کوئی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر بھی آرہا تھا۔ ہم نے سانس تک روک لیے۔ کسی

نے لاک دروازے سے باہر جھولتے ہوئے قفل کو دیکھا اور رسمی انداز میں قفل کو ہلا کر آگے بڑھ گیا۔ اس موقع پر کسی کو کھانسی یا چھینک وغیرہ بھی آ جاتی تو کام بگڑ سکتا تھا۔ اوپر آنے والے سیڑھیاں اتر کر نیچے چلے گئے۔ اب کرنالی اور حاجی نیاز صاحب باتیں کر رہے تھے۔

کرنالی نے کہا۔ ''پانچ لوگ ہیں۔ تین مرد اور دو لڑکیاں۔ مردوں میں سے ایک زخمی بھی ہے۔ آج صبح سویرے ڈیرے سے فرار ہو کر اس طرف آئے ہیں۔''

حاجی نیاز نے کہا۔ ''ہم پوری خبر رکھیں گے جی۔ اگر کوئی مشکوک بندہ نظر آیا تو آپ کو فوراً اطلاع دیں گے۔''

''لکھو...... یہ ایک موبائل نمبر لکھو۔'' کرنالی نے حکمیہ انداز میں کہا۔

حاجی نیاز غالباً نمبر لکھنے میں مصروف ہو گیا تھا۔ ایک دوسرا مجاور بھاری آواز میں بولا۔ ''ان کو خود چھیڑنے کی ضرورت نہیں۔ بس اطلاع دینی ہے۔ ان کے پاس ہتھیار وغیرہ بھی ہو سکتے ہیں۔''

''جو حکم جناب۔'' حاجی نیاز نے نیاز مندی سے کہا۔ (مجاوروں نے ملنگی ڈیرے پر گزرنے والی قیامت کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا)

کچھ مزید ہدایات دینے کے بعد ملنگی ڈیرے کے مشتعل مجاور باہر نکل گئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ اپنی گاڑیوں پر سوار ہو کر وہاں سے جا رہے تھے۔ ہم نے اطمینان کی سانس لی۔

اگلے آدھے گھنٹے تک کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ بارش تیز ہو گئی تھی۔ رہ رہ کر تاریکی میں چوٹیوں پر برق لہراتی تھی اور پھر بادل دھاڑنے لگتے تھے۔ یاسین ابھی تک واپس نہیں آیا تھا جو اشیائے خورونوش وہ چھوڑ گیا تھا، ان میں بسکٹ، فروٹ، بن، ڈبا بند دودھ اور اس قسم کی دیگر چیزیں تھیں۔ ہم نے کچھ پیٹ پوجا کی۔ لڑکیوں نے کچھ نہیں کھایا۔ اسی دوران میں ایک بار پھر کسی گاڑی کے انجن کا شور سنائی دینے لگا۔ کیا محافظ اور مجاور دوبارہ آ گئے ہیں؟ پہلا خیال یہی ذہن میں ابھرا۔

''لگتا ہے کہ یہ یاسین ہے۔'' رضوان نے گویا دل کو تسلی دینے کے لیے کہا۔

بہرحال انجن کی آواز بتا رہی تھی کہ یہ سوزوکی پک اَپ نہیں ہے۔ کچھ ہی دیر بعد کسی ٹرک کی روشنیاں دکھائی دیں۔ ٹرک ہچکولے کھاتا ہوا آیا اور مکان کے قریب آ کر رک گیا۔ ٹرک کے آڈیو ٹیپ پر زور شور سے قوالی بج رہی تھی۔ آقا بھیک ملے...... مجھ کو بھیک ملے۔ لوٹ کر میں نہ جاؤں گا خالی۔

کچھ لوگ ٹرک سے اتر رہے تھے۔ ایک بار زور سے بجلی چمکی تو سارا منظر دکھائی دیا۔ یہ

شلواروں قمیصوں والے ڈیڑھ دو درجن لوگ تھے۔ ان میں سے کئی ایک کے پاس کلہاڑیاں بھی تھیں۔ یہ واضح طور پر اس ورکشاپ کے مزدور تھے۔ جنہوں نے صبح کام شروع کرنا تھا۔ ایک، رکھوالی کا جسیم کتا اور ایک رائفل بردار چوکیدار بھی دکھائی دیا۔ یہ سب لوگ باتیں کرتے اور شور مچاتے اندر آ گئے۔ ٹرک انہیں اتار کر واپس چلا گیا تھا۔ اس ویران گھر میں اچانک ہی گہما گہمی کی فضا بن گئی تھی۔ ہٹے کٹے مزدور گلا پھاڑ پھاڑ کر باتیں کر رہے تھے اور کھا پی رہے تھے۔ اسی اثنا میں ہمارا میزبان یاسین بھی اپنی پک اَپ پر سوار واپس آ گیا۔ اس کے آنے کے بعد نسبتاً خاموشی ہو گئی۔ صورتِ حال سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اب ہمارے مسائل بڑھنے والے ہیں۔ مجاوروں نے حاجی نیاز کو بتا دیا تھا کہ ملنگی ڈیرے سے فرار ہونے والے افراد پانچ ہیں اور دیگر تفصیل بھی بتائی تھی۔ اب یہ تفصیل حاجی نیاز کی زبانی یاسین کو بھی معلوم ہونے والی تھی۔ اس کے بعد یاسین کا دھیان یقیناً ہماری طرف جانا تھا۔ بہرحال اگلے چار پانچ منٹ میں جو کچھ ہوا، وہ بالکل غیر متوقع تھا اور اس نے ہمارے لیے صورتِ حال کو کافی بہتر کر دیا۔

سیڑھیوں کے نچلے سرے پر یاسین اور اس کے والد حاجی نیاز کے درمیان جو بات چیت ہوئی، وہ صاف صاف ہمارے کانوں میں پڑی۔ حاجی نیاز نے خشک لہجے میں بیٹے کو بتایا۔ ''تمہارے آنے سے پہلے ملنگی ڈیرے کے کچھ بہروپیے (ملنگ) آئے تھے یہاں، ایک وکھری ہی خبر سنا گئے ہیں۔''

''کیا ہوا؟'' یاسین نے پوچھا۔ یاسین کے لہجے میں عیاں تھا کہ اس نے مجاوروں کے لیے بہروپیوں کا لفظ مشکل سے ہضم کیا ہے۔

''وہ کہہ رہے ہیں کہ ڈیرے سے کچھ بندے فرار ہوئے ہیں صبح منہ اندھیرے...... اور وہ اسی علاقے میں آئے ہیں۔ دو مرد ہیں اور تین عورتیں، ایک مرد زخمی بھی ہے۔'' (حاجی نیاز نے غالباً کمزور یادداشت کے سبب تین مردوں اور دو عورتوں کو الٹ کر دو مرد اور تین عورتیں بنا دیا تھا)

''بھاگے کیوں ہیں؟'' یاسین نے پوچھا۔

''یہ تو ان کو پتا ہو گا، یا پھر ان مشٹنڈے مجاوروں کو۔'' حاجی نیاز نے بیزاری سے کہا۔

اس کے بعد باپ بیٹے کی گفتگو ختم ہو گئی۔ کیونکہ آہٹوں سے اندازہ ہوا تھا کہ یاسین پاؤں پٹختا ہوا سیڑھیاں چڑھنے لگا تھا۔ وہ بالائی منزل پر آیا لیکن ہمارے کمرے کی طرف نہیں آیا۔ شاید ایک قریبی کمرے میں چلا گیا۔ حالات بتا رہے تھے کہ بالائی منزل پر یاسین ہی کو

تصرف حاصل ہے۔
حاجی نیاز کو اعداد و شمار میں جو غلطی لگی وہ ہمارے حق میں بہتر تھی۔ مزید بہتری یہ ہوئی تھی کہ باپ بیٹے میں گفتگو زیادہ طول بھی نہیں پکڑ سکی تھی۔ کرنالی اور اس کے ساتھیں نے ہمارا تھوڑا بہت حلیہ بھی حاجی نیاز کو بتایا تھا، یہ حلیہ وغیرہ بھی فی الحال حاجی نیاز تک ہی محدود رہا تھا۔
انیق کا زخم تکلیف دے رہا تھا لیکن وہ بہت برداشت کر کے بیٹھا ہوا تھا۔ وقفے وقفے سے ریشمی کی سسکیاں سنائی دے جاتی تھیں۔ وہ لحاف میں منہ سر لپیٹے پڑی تھی۔ میں تاجور کی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اسے تسلی دی اور کہا کہ وہ خود کو سنبھالے بلکہ ریشمی کو بھی سنبھلنے میں مدد دے۔ ہمیں سخت حالات نے گھیرا ہوا ہے اور اس میں ہمیں ہمت حوصلے کی ضرورت ہے۔
لحافوں اور کمبلوں کے باوجود ہمیں سردی محسوس ہو رہی تھی۔ کمرے میں انگیٹھی کی ضرورت تھی مگر انگیٹھی مہیا ہونے کی کوئی صورت موجود نہیں تھی۔ رات آہستہ آہستہ آگے کو سرکتی رہی۔ باہر بارش برستی رہی اور بادل گرجتے رہے۔ نیچے مزدوروں کی ہاہاکار بتدریج کم ہو گئی۔ یقیناً وہ سونے کے لیے لیٹ چکے تھے، بہرحال رکھوالی کا کتا مسلسل شور مچا رہا تھا۔ شاید اسے احساس ہو چکا تھا کہ اس چار دیواری میں کچھ غیر مانوس لوگ بھی موجود ہیں۔
رات کوئی بارہ بجے کا وقت ہوگا جب کسی نے آہستہ سے دروازہ ہلایا۔ ”کون؟“ میں نے مدھم آواز میں پوچھا۔
”میں یاسین۔“ سرگوشی میں جواب ملا۔
وہ بغیر آواز پیدا کیے تالا کھول رہا تھا۔ میں نے اندر سے کنڈی گرا دی۔ وہ جلدی سے اندر آ گیا اور دروازہ بولٹ کر دیا۔ ریشمی اور تاجور رو رو کر سو چکی تھیں۔ رضوان بھی اونگھ رہا تھا۔ بہرحال میں اور انیق جاگ رہے تھے۔ انیق نے کمبل اوڑھے دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی اور گھٹنوں تک لحاف لیا ہوا تھا۔ اس کے لحاف کے نیچے سیون ایم ایم بالکل تیار حالت میں موجود تھی اور کسی بھی خطرے کی صورت میں آگ اگل سکتی تھی۔ یاسین نے لالٹین کی لو اونچی کر کے دھیان سے ہماری صورتیں دیکھیں۔ ہوسکتا ہے کہ اس کے ذہن کے کسی گوشے میں موہوم سا شک موجود رہا ہو۔ بہرحال دو چار سوال پوچھنے کے بعد وہ مطمئن نظر آنے لگا۔ اس نے بتایا۔ ”سنا ہے کہ ملنگی ڈیرے سے کچھ لوگ کوئی ناجائز کام کر کے ہمارے علاقے کی طرف آئے ہیں۔ ڈیرے کے محافظ ان کا پیچھا کر رہے ہیں، کوئی اسلحہ وغیرہ بھی ہے ان کے پاس۔“
میں نے ہونٹ دائرے کی شکل میں سکیڑے۔ انیق اور رضوان نے بھی تشویش کا اظہار

کیا۔ باہر رکھوالی والا کتا مسلسل شور مچا رہا تھا۔

''کہیں کسی کو مار کر تو نہیں بھاگے یہ لوگ؟'' میں نے خیال ظاہر کیا۔

''ہو بھی سکتا ہے۔'' یاسین بولا پھر ذرا توقف سے کہنے لگا۔ ''آپ لوگوں کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟''

میں نے کھدر کے لحاف کے نیچے کسمساتی ہوئی ریشمی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''بہت درد ہو رہا ہے، اس کے کندھوں میں، کوئی درد کی دوا...... پین کلر مل جائے گی؟''

''ہاں، ہاں، درد والی گولیاں ہیں میرے پاس بلکہ میں نے تو ٹیکا بھی رکھا ہوا ہے۔ مزدوروں کو چوٹیں وغیرہ لگتی رہتی ہیں اس لیے علاج معالجے کا سامان رکھنا پڑتا ہے۔''

''ٹیکا ہے تو لے آؤ۔ میں لگا لوں گا اور گولیاں بھی لے آؤ۔'' میں نے کہا۔

وہ باہر گیا اور یہ دونوں چیزیں لے آیا۔ اس نے تکلیف کی نوعیت کے بارے میں پوچھا اور یہ بھی پوچھا کہ مریضہ سے میرا کیا رشتہ ہے۔ میں نے بتایا کہ وہ میری بھابی ہے۔ رضوان کو اس کا شوہر بتایا۔ یاسین نے ہم سے ہمارے نام اور کوائف وغیرہ پوچھے۔ ہم نے بتا دیئے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب جھوٹ تھا۔ جاتے جاتے یاسین نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''تم لوگ تیار رہنا ہم نے صبح پانچ بجے یہاں سے نکل جانا ہے۔ ناشتے کا سامان میں پک اپ میں رکھ لوں گا۔ ہم کہیں بھی رک کر ناشتا کر لیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے یاسین بھائی! ہم تیار ہوں گے۔''

یاسین کے باہر جانے کے بعد میں نے اندر سے دروازے کو پھر بولٹ کیا اور لالٹین قریب رکھ کر انیق کا زخم دیکھا۔ گولی سو فیصد اندر ہی تھی۔ کندھا سوج گیا تھا اور خون رِس رِس کر پٹی میں جذب ہو رہا تھا۔ میں ایک مرتبہ کوپن ہیگن میں اس طرح کی صورتِ حال سے دوچار ہو چکا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ایسے زخم کی تکلیف کتنی شدید ہوتی ہے۔ انیق کی پیشانی بار بار پسینے سے تر ہو جاتی تھی۔ میں نے اس کی پٹی بدلی۔ پین کلر گولیاں کھلائیں اور پھر انجکشن بھی لگا دیا۔ یہ زخم لگے اب تقریباً 20 گھنٹے ہو چکے تھے۔ خطرہ تھا کہ زہر پھیلنا نہ شروع ہو جائے۔ بہرحال ابھی گولی نکالنے کے سلسلے میں ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

میں انیق کے پاس ہی نیم دراز ہو گیا اور اس کا دھیان بٹانے کے لیے اس سے باتیں کرنے لگا۔ ملنگی ڈیرے کے تہلکہ خیز مناظر ایک بار پھر ہماری نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے۔ پردے والی سرکاری کا ریشمی کو قتل کرنے کی کوشش کرنا ایک سنسنی خیز واقعہ تھا اور اس واقعے سے زیادہ سنسنی خیز اس کا خود ہلاک ہونا اور پھر بے پردہ ہونا تھا۔ اس کا جلا ہوا چہرہ،

عبرت کی مثال تھا۔ یہ شخص جو اصل میں پیر سانتا تھا کوئی سات برس قبل چاند گڑھی سے جان بچا کر بھاگا اور ان پہاڑیوں میں آبسا۔ یہاں اس نے بڑی تیزی سے اپنی ایک الگ شناخت بنائی اور رنگ برنگی شفائی پڑیوں کی آڑ میں سادہ لوح لوگوں کو ایلو پیتھک دوائیں دینا شروع کیں۔ دوسرے لفظوں میں مسیحا بن کر بیٹھ گیا۔ کل رات ہم نے اس ''مسیحا کی گندی کہانی کو'' دی اینڈ لگا دیا تھا مگر ابھی اس کا پورا اینڈ کہاں ہوا تھا۔ پیر سانتا تو بے شک مر گیا تھا لیکن اس کا لختِ جگر پیر ولایت چاند گڑھی کے علاقے میں موجود تھا اور اس نے بھی باپ کی طرح اپنا کاروبار خوب چمکایا ہوا تھا۔ مجھے یہ سوچ کر خوشی محسوس ہوئی کہ اب پردے والی سرکار کو پیر سانتا کی حیثیت سے پہچان لیا جائے گا اور اس کے کرتوت چاند گڑھی والوں کے سامنے بھی آئیں گے۔

اچانک لحاف کے نیچے ریشمی ہچکیاں لے لے کر بلند آواز سے رونے لگی۔ اس کا صبر کا پیمانہ ایک بار پھر لبریز ہو گیا تھا۔ ''چپ کرو ریشمی! آواز باہر جا رہی ہے۔'' میں نے تیز سرگوشی میں کہا۔

''بابا جانی...... میرے بابا جانی......'' وہ بلک کر بولی۔

تاجور خود بھی غم کے گھیرے میں تھی لیکن اس موقع پر اس نے ہوش مندی کا ثبوت دیا۔ اس نے لپک کر ریشمی کا منہ اپنے ہاتھ سے ڈھانپ لیا اور اسے اپنے گلے سے لگا کر بھینچ لیا۔ وہ اسے پیار سے ڈانٹ بھی رہی تھی۔ باہر موجود کتا مسلسل شور مچا رہا تھا۔ اس کی آواز ہمیں بڑی بری لگ رہی تھی۔

O......❖......O

صبح ساڑھے پانچ بجے کے لگ بھگ یاسین نے ہمارے کمرے کے دروازے کا تالا آواز پیدا کیے بغیر کھولا۔ ہم نے اندر سے چٹخنی اتار دی۔ ہم پہلے سے تیار تھے۔ یاسین نے ہمیں اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ ہم دبے پاؤں بڑی احتیاط سے سیڑھیاں اترے اور گراؤنڈ فلور پر پہنچ گئے۔ ایک بڑے ہال کمرے میں کئی مزدور، گدیل بچھائے اور لحاف اوڑھے سو رہے تھے۔ ان کے خراٹے پورے ہال میں گونج رہے تھے۔ ان کے قریب سے گزر کر ہم باہر نکلے۔ بارش رک چکی تھی مگر بادل موجود تھے اور بہت ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔

اندھیرے میں سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتے ہم سوزوکی پک اَپ تک پہنچ گئے۔ اس کا انجن گرم کرنے کے لیے یاسین کے دوست نے اسے اسٹارٹ کر رکھا تھا۔ وہ چھوٹی چھوٹی داڑھی والا ایک دبلا پتلا سا نوجوان تھا۔ اس نے کمبل اوڑھ رکھا تھا۔ پک اَپ کے کھلے حصے پر

ترپال کی چھت ڈالی گئی تھی۔ دو بکرے ہم سے پہلے ہی پک اَپ پر سوار ہو چکے تھے۔ یہ قربانی کے بکرے تھے۔ یاسین نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''تم دونوں بیبیوں کے ساتھ پیچھے بیٹھ جاؤ۔ ہم آگے بیٹھ جاتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''آپ چار لوگ آگے کیسے بیٹھو گے؟''

وہ بولا۔ ''نہیں، یہ میرا دوست نذیر ہمارے ساتھ نہیں جا رہا۔ ہم تین آگے آسانی سے آ جائیں گے۔''

ہمارے لیے یہ بہتر صورتِ حال تھی۔ رضوان اور انیق آگے کیبن میں یاسین کے پاس چلے گئے۔ میں نے ریشمی اور تاجور کو سہارا دے کر پیچھے بٹھا دیا۔ یہاں فوم کی عارضی نشستیں تھیں۔ جب پک اَپ روانہ ہونے والی تھی، میں پیشاب کے بہانے جھاڑیوں میں چلا گیا۔ دونوں رائفلیں میں نے بڑی احتیاط سے کمبل کے نیچے چھپائیں اور واپس پک اَپ میں آ بیٹھا۔ تاریکی کی وجہ سے یاسین اور اس کے ساتھی کو بالکل شک نہیں ہوا کہ میں جھاڑیوں میں سے کچھ نکال کر لایا ہوں۔ تھوڑی ہی دیر بعد پک اَپ ہچکولے کھاتی وہاں سے روانہ ہو رہی تھی۔ اس کا رخ واپس ملنگی ڈیرے کی طرف تھا لیکن میں جانتا تھا کہ پک اَپ نے زیادہ دیر اس رخ پر نہیں چلنا۔ انیق کے شال نما کمبل کے نیچے چھوٹی نال کی رائفل موجود تھی اور وہ یہ رائفل یاسین کو دکھا کر، کسی بھی وقت اسے پک اَپ کا رخ کوٹلی کی طرف موڑنے پر مجبور کر سکتا تھا۔

ہچکولوں کی وجہ سے قربانی کے دونوں جانور ڈگمگا رہے تھے۔ کبھی وہ مجھ پر گرتے کبھی تاجور اور ریشمی پر۔ جگہ تنگ تھی۔ ہمیں یا ان کو چوٹ لگنے کا خدشہ تھا۔ میں نے ان کی رسیاں تنگ کر دیں۔

ہم ورکشاپ سے قریباً تین کلومیٹر دور آ چکے تھے، جب میری توقع کے مطابق پک اَپ ایک جگہ رک گئی۔ کیبن کی طرف سے یاسین اور انیق کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یاسین کی ڈری ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے۔ آپ میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہے ہو؟''

انیق نے کہا۔ ''میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ تمہیں یا تمہاری گاڑی کو ذرا سا نقصان بھی نہیں پہنچائیں گے۔ بس چپ چاپ ہمیں وہاں پہنچا دو جہاں ہم چاہتے ہیں۔ تمہیں تمہارا کرایہ تک دے دیں گے ہم۔''

''مم...... مگر آپ تو......''

''دیکھو فضول میں وقت برباد مت کرو۔ ورنہ ہمیں سختی کرنا پڑے گی۔'' انیق نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔

''کہیں تم لوگ وہی تو نہیں، جن کو محافظ ڈھونڈ رہے ہیں؟'' یاسین نے ڈری ڈری آواز میں کہا۔

''تم جو بھی سمجھنا چاہتے ہو، سمجھ لو۔'' انیق پھنکارا۔ ''مگر اب اپنی اس ماں کا اسٹیئرنگ موڑو اور چلو جس طرف میں بکواس کر رہا ہوں۔'' انیق نے ایک گینگسٹر کی سی زبان بولی تو یاسین کا پتا پانی ہو گیا اور اس نے بے چوں و چراں پک اَپ کو موڑا اور انیق کی بتائی ہوئی سمت میں روانہ ہو گیا۔

ہم اونچی نیچی پہاڑیوں کے درمیان ایک ناہموار راستے پر جا رہے تھے۔ یہاں دور دور تک کوئی آبادی نہیں تھی۔ دن اب چڑھ آیا تھا مگر بادلوں کی وجہ سے سورج کی شکل دکھائی نہیں دیتی تھی۔ یاسین حتی الامکان تیزی سے گاڑی چلا رہا تھا، جیسے ہمیں جلد از جلد منزل مقصود تک پہنچا کر بھاگ نکلنا چاہتا ہو۔ وہ جانتا نہیں تھا کہ اس کی جان اتنی آسانی سے چھوٹنے والی نہیں۔ بے شک انیق نے اس کو تسلی دی تھی مگر ہم اسے تب تک آزاد نہیں کر سکتے تھے جب تک ہمیں اپنے تحفظ کا یقین نہ ہو جاتا۔

ایک جگہ پہنچ کر پک اَپ بری طرح ڈگمگانے لگی۔ پتا چلا کہ ٹائر پنکچر ہو گیا ہے۔ پک اَپ رک گئی۔ اضافی ٹائر موجود تھا۔ ڈرے سہمے یاسین نے ٹائر بدلنا شروع کر دیا۔ انیق اس کے سر پر کھڑا رہا۔ کمبل کے نیچے اس کی رائفل بالکل تیار حالت میں تھی اور یاسین بھی اس بات کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ اس کی کوئی بھی غلط حرکت اس کے لیے شدید نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔

رضوان نے میرے قریب آ کر مدھم آواز میں کہا۔ ''یہاں کرنالی کے بندے ہمیں جگہ جگہ تلاش کر رہے ہیں۔ ہم جتنی جلدی یہاں سے نکل جائیں، اتنا ہی اچھا ہے۔''

میں نے یاسین سے مخاطب ہو کر تحکم سے کہا۔ ''جلدی کرو، اگر تمہارے پیر بھائی یہاں پہنچ گئے تو پھر ان کے ساتھ تم بھی مصیبت میں پڑو گے۔''

یاسین نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا۔ ''پیٹرول کتنا ہے تمہارے پاس؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''ٹینکی فل کرائی تھی۔ ابھی تو تین چار لیٹر ہی خرچ ہوا ہو گا۔'' وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔

وہ توہم پرست لیکن سیدھا سادہ بندہ تھا۔ میری دلی خواہش تھی کہ وہ اس بکھیڑے میں سے کوئی دشواری اٹھائے بغیر نکل جائے۔ بہر حال اس کا دارومدار حالات پر تھا۔

انیق کا درد پھر شدت پکڑ رہا تھا۔ میں نے اسے دو پین کلر مزید دیں۔ کھانے پینے کی جو اشیا رات کو یاسین نے ہمیں مہیا کی تھیں ان میں سے کچھ میں ساتھ لے آیا تھا۔ راستے میں ان کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔

ٹائر بدلنے کے بعد ہم ایک بار پھر چل پڑے۔ لیکن اس مرتبہ یہ سفر زیادہ دیر جاری نہیں رہ سکا۔ رفتار ایک دم سُست ہوئی اور پھر پک اَپ رک گئی۔ میں نے سر باہر نکال کر دیکھا اور بدن میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔ آگے ایک ناکا لگا ہوا تھا۔ یہ پولیس والے نہیں تھے۔ دور ہی سے اندازہ ہو گیا کہ یہ عام لوگ ہیں اور زیادہ امکان یہ تھا کہ یہ ڈیرے کے محافظ ہیں۔

انیق آگے یاسین کے پہلو میں موجود تھا۔ یقیناً اسی کے کہنے پر یاسین نے پک اَپ کو تیزی سے دائیں رخ موڑ دیا۔ ہم نے راستہ بدل لیا تھا۔ یہ راستہ زیادہ ناہموار تھا اور دشوار موڑ بھی آ رہے تھے لیکن تشویش کی اصل بات یہ تھی کہ کہیں ہمارا راستہ بدلنے کی وجہ سے وہ لوگ چونک تو نہیں گئے جنہوں نے راستہ روک رکھا تھا۔ دو چار منٹ بعد ہی یہ اندیشہ درست ثابت ہو گیا۔ میں نے دیکھا کھلی چھت والی ایک جیپ تیزی سے ہمارے پیچھے آ رہی ہے۔ یہ سرخ جیپ ان دو گاڑیوں میں سے ایک تھی جو کل رات ورکشاپ پر پہنچی تھیں۔ ان گاڑیوں میں کرنالی اور اس کے مسلح ساتھی سوار ہو کر آئے تھے۔

اب شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ ہماری پک اَپ ان لوگوں کی نظر میں آ گئی تھی۔ اس بات کا خطرہ صبح سے ہی ہمارے ذہنوں میں موجود تھا کہ ڈیرے کے محافظ اس علاقے میں ہمیں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں اور کسی جگہ ان سے مڈبھیڑ ہو سکتی ہے اور یہی ہوا تھا۔

تاجور نے بھی سرخ جیپ دیکھ لی تھی۔ ''اب کیا ہو گا شاہ زیب؟'' وہ منمنائی۔

''کچھ نہیں ہو گا، تم بے فکر رہو۔'' میں نے کمبل کے نیچے رائفل کا سیفٹی کیچ ہٹاتے ہوئے کہا۔

وہ بغور عقب میں دیکھ رہی تھی۔ سورج بادلوں کی اوٹ سے نکل آیا تھا اور اردگرد کا ہر منظر واضح دکھائی دیتا تھا۔ ''ان کے پاس تو رائفلیں بھی ہیں۔'' وہ سہم کر بولی۔

''تو کیا ہوا؟ ہمارے پاس بھی ہیں۔''

''وہ دیکھیں......ایک اور گاڑی بھی ہے۔'' تاجور نے انگلی اٹھائی۔

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ سرخ جیپ کے عقب میں ایک اور متحرک گاڑی میں نے دیکھ لی

تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ کم و بیش دس افراد نہایت خطرناک ارادوں کے ساتھ ہمارے پیچھے لپک رہے ہیں۔ ہم ملنگی ڈیرے پر انہیں نا قابلِ تلافی نقصان پہنچا کر آئے تھے اور اب وہ سراپا قہر ہمارے پیچھے تھے۔ انیق نے پک اَپ کے کیبن کی کھڑکی سے منہ نکال کر مجھے پکارا۔

''شاہ زیب بھائی! وہ پیچھے آ رہے ہیں۔''

''ہاں میں نے دیکھ لیا ہے۔ اگر انہوں نے گولی چلائی تو ہم بھی چلائیں گے۔'' میں نے بھی پکار کر کہا۔

اس کے ساتھ ہی میں نے کمبل اتار پھینکا اور پوزیشن سنبھال لی۔ یکا یک اوپر تلے دو فائر ہوئے۔ یہ سرخ جیپ سے ہی کیے گئے تھے۔ یہ کسی ''اے کے 57'' ٹائپ کی رائفل کی فائرنگ تھی۔ ایک گولی پک اَپ کی باڈی میں کہیں لگی۔ تاجور اور ریشمی ایک ساتھ چلا اٹھیں۔

''نیچے لیٹ جاؤ۔'' میں نے ان دونوں سے کہا اور اس کے ساتھ ہی جواب میں دو گولیاں چلائیں۔

میری اس فائرنگ کے جواب میں پورا ایک برسٹ آیا۔ ریشمی اور تاجور فرش پر لیٹ چکی تھیں اس لیے گولیوں سے محفوظ رہیں۔ ایک گولی میرے کندھے کے اوپر سے گزر گئی اور ایک گولی قربانی کے لیے جانے والے بکرے کی گردن میں لگی۔ وہ بلند آواز میں ممیایا اور فرش پر گر کر تڑپنے لگا۔ اس کا گرم خون فوارے کی شکل میں میرے پاؤں پر گرنے لگا۔

کیبن کی طرف سے انیق نے بھی تابڑ توڑ فائرنگ شروع کر دی۔ اب یہ نہایت خطرناک صورتِ حال بن گئی تھی۔ سخت دشوار راستے پر تینوں گاڑیاں زبردست ہچکولے کھاتی جا رہی تھیں اور فائرنگ بھی ہو رہی تھی۔ ہماری بائیں جانب پہاڑ اور دائیں جانب گہری کھائیاں تھیں۔ جگہ جگہ پر خطر موڑ تھے اور ڈھلوان کی وجہ سے رفتار بھی تیز تھی۔ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ ہماری تابڑ توڑ فائرنگ کی وجہ سے متعاقب گاڑیوں کا فاصلہ ہم سے کچھ بڑھ گیا لیکن وہ مسلسل پیچھے آ رہی تھیں۔ ایک اور برسٹ آیا اور اس برسٹ کی چند گولیاں پک اَپ کی ایک کھڑکی اور ونڈ اسکرین کو چکنا چور کر گئیں۔ ہم دیکھ نہیں سکتے تھے مگر شیشے ٹوٹنے کی زوردار آوازیں ہمارے کانوں تک پہنچیں۔ میں نے دیکھا، دوسرا بکرا بھی قربان گاہ تک پہنچنے سے پہلے ہی قربان ہو چکا تھا اور یہی وقت تھا جب ایک اور نہایت غیر متوقع واقعہ ہو۔ ایک تیز موڑ کاٹتے ہوئے ہماری پک اَپ کا اگلا پہیا ایک کھڈے میں گیا، پک اَپ کو زوردار جھٹکا لگا۔ میں نے تاجور کو اچھل کر پک اَپ سے گرتے اور کنارے کی جھاڑیوں میں اوجھل ہوتے دیکھا۔ اب میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ خود بھی چلتی پک اَپ سے چھلانگ

لگا دیتا، میں نے جست لگائی اور چند پلٹیاں کھا کر جھاڑ جھنکاڑ میں گرا۔ سب سے پہلے میں نے تاجور کے تعاقب میں نظر دوڑائی۔ وہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دی۔ بہرحال اتنی تسلی ضرور ہو گئی کہ وہ کھڈ میں نہیں گری ہو گی۔ یہاں نشیب میں کچھ ہموار جگہ تھی اور اصل کھڈ اس کے بعد شروع ہوتے تھے۔ رائفل ابھی تک میرے ہاتھوں میں تھی۔ ہماری سفید پک اَپ اسی رفتار سے بھاگتی دو ڈھائی سو میٹر دور جا چکی تھی۔ سرخ جیپ تیزی سے ہچکولے کھاتی میرے سامنے سے گزری۔ میں نے لمبے بالوں والے ملنگی محافظوں کی ایک جھلک دیکھی۔ انہوں نے رائفلیں سونت رکھی تھیں۔ میں نے نتائج سے بے پروا ہو کر سرخ جیپ پر فائرنگ کی۔ میں نے جیپ کے ٹائروں کو نشانہ بنایا تھا۔ بالکل قریب سے کی جانے والی یہ فائرنگ کارگر ثابت ہوئی۔ جیپ کے دونوں دائیں ٹائر دھماکوں سے برسٹ ہوئے اور وہ پتھروں سے ٹکرانے کے بعد راستے کے عین درمیان میں الٹ گئی، عقب میں آنے والی 86 ماڈل ٹویوٹا کے بریک بڑی شدت سے لگے۔ ٹائر چرچرائے اور وہ الٹی ہوئی جیپ کے عین سامنے رک گئی۔ الٹی ہوئی جیپ میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔

میرے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہاں کھڑے ہو کر آگے کی صورتِ حال دیکھتا۔ میں اس طرف لپکا جہاں تاجور گری تھی۔ آٹھ دس قدم آگے جانے کے بعد مجھے اس کے کپڑوں کی جھلک نظر آئی۔ یہ دیکھ کر کچھ تسلی ہوئی کہ کپڑوں میں حرکت تھی۔ میں جھک کر دوڑتا ہوا اس تک پہنچا۔ وہ ابھی تک جنونی ڈاکٹر ارم والے لباس میں تھی۔ وہ گرد اور جھاڑ جھنکاڑ سے اٹی ہوئی تھی مگر اٹھ بیٹھی تھی۔ ''تم ٹھیک تو ہو؟'' میں نے پکار کر پوچھا۔

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ بہرحال اس نے اپنی ایک کہنی دوسرے ہاتھ سے دبائی ہوئی تھی۔ پشت پر سے بھی لباس پھٹا ہوا لگتا تھا۔

میں نے اس کا ہاتھ تھاما اور ایک لمحہ ضائع کیے بغیر نشیب کے درختوں میں گھس گیا۔ عین ممکن تھا کہ محافظوں کو بالکل پاس سے ہونے والی اس فائرنگ کا اندازہ ہو گیا ہو۔ اب وہ کسی بھی وقت ہمارے پیچھے لپک سکتے تھے۔ ہم دونوں گرتے پڑتے کم و بیش سو میٹر نیچے چلے گئے۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا، ہم کس طرف جا رہے ہیں۔ ذہن میں بس یہی خیال تھا کہ ہمیں ان غضب ناک ملنگوں کی زد سے دور نکلنا ہے۔

تاجور بری طرح ہانپ رہی تھی لیکن یہ دیکھ کر اچھا لگا کہ اس کے چہرے پر زردی نہیں بلکہ ایک توانا سرخی ہے۔ پنجاب کی اس خوبرو مٹیار کا چہرہ جیسے انگارے کی طرح دہک رہا تھا۔ ایسے موقعوں پر خون اس کے شفاف چہرے پر یوں یورش کرتا تھا جیسے کسی نے اچانک اس کے

چہرے پر برش سے سرخ رنگ پھیر دیا ہو۔
وہ پھولی سانسوں کے ساتھ بولی۔ ''شاہ زیب! باقی لوگ کہاں ہیں؟''
''وہ نکل گئے ہیں، ان کی فکر نہ کرو۔'' میں نے بھی ہانپے لہجے میں کہا۔
''ہم کہاں جا رہے ہیں؟''
اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا، اوپر بلندی سے دو فائر ہوئے۔ شاید ان لوگوں کو کہیں کسی جگہ کسی کی موجودگی کا شک ہوا تھا یا پھر انہوں نے ویسے ہی اندھے فائر کر دیئے تھے۔ بہر حال اس سے ایک بات ثابت ہوتی تھی اور وہ یہ کہ وہ لوگ یا ان میں سے کچھ لوگ یہاں رک گئے ہیں اور اب نیچے اترنے والے ہیں۔
''تمہاری کہنی ٹھیک ہے نا؟'' میں نے بھاگتے بھاگتے پوچھا۔
''ہاں شاہ زیب، بس کمر پر کچھ چوٹ آئی ہے۔''
''کہیں رک جائیں؟''
''نہیں میں چل سکتی ہوں۔'' وہ ہمت سے بولی۔
دو تین منٹ بعد اندازہ ہو گیا کہ وہ لوگ ہمارے پیچھے آ رہے ہیں۔ شاید انہوں نے بلندی سے ہمیں درختوں میں حرکت کرتے دیکھ لیا تھا۔ وہ سیدھا ہماری جانب ہی لپک رہے تھے۔ ان کی بلند آوازیں ہمارے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ میں نے بھاگتے بھاگتے، رائفل کے ساتھ نیا میگزین اٹیچ کر لیا اور صورتِ حال کے لیے تیار ہو گیا۔ دفعتاً ہم نے خود کو گھنے درختوں کے درمیان ایک بوڑھے شخص کے رُوبرو کھڑے پایا۔ وہ خاکی شلوار قمیص میں تھا اور اس نے ایک سیاہ شال کی بکل مار رکھی تھی۔ وہ تشویش ناک انداز میں ہماری جانب دیکھ رہا تھا۔ ''کیا ہوا؟'' اس نے پوچھا۔
میں نے تیزی سے کہا۔ ''کچھ لوگ ہمارے پیچھے ہیں۔ کیا آپ ہمیں کچھ دیر کے لیے پناہ دے سکتے ہیں؟''
بوڑھے نے مجھے دیکھا، پھر سرتاپا تاجور کو دیکھا۔ وہ جیسے بہ زبان خاموشی کہہ رہی تھی...... ہم مصیبت میں ہیں محترم بزرگ، ہماری مدد کریں۔ اس شخص کی عمر ساٹھ ستر سال کے درمیان رہی ہوگی۔ جسمانی حالت بھی بہت زیادہ اچھی نہیں تھی لیکن وہ بولا تو اس کی آواز میں حوصلہ اور ارادہ تھا۔ ''کوئی بات نہیں۔ تم لوگ پریشان نہ ہو کچھ نہیں ہوگا تمہیں۔''
''یہاں کوئی چھپنے کی جگہ ہوگی بزرگو؟'' میں نے کہا۔ ''میرا مطلب ہے ایک دو گھنٹے کے لیے؟''

''تمہیں چھپنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں دیکھ لیتا ہوں ان کو۔ تم درختوں کی اوٹ میں ہو جاؤ۔'' اس نے انگلی سے چیڑ کے کچھ تناور درختوں کی طرف اشارہ کیا۔

میں کچھ سمجھ تو نہیں پایا لیکن اس معمر شخص کی بات ماننے میں کوئی نقصان دکھائی نہیں دیا۔ تاجور اتنی تھک چکی تھی کہ اگر ہم اسی طرح بھاگتے رہتے تو شاید دو تین منٹ بعد وہ گر پڑتی۔ وہ اب بھی بے طرح ہانپ رہی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور درختوں کی اوٹ میں چلا گیا۔ یہ بہت اونچے اور بڑے قطر کے درخت تھے۔ یہاں سے ہمیں ڈھونڈ لینا اتنا آسان بھی نہیں تھا۔

اب دیکھنا یہ تھا کہ ہمارا یہ بوڑھا مددگار ہمارے لیے کیا کرتا ہے؟ بہر حال کلاشنکوف رائفل میرے ہاتھوں میں بالکل تیار حالت میں موجود تھی۔ بمشکل ایک منٹ گزرا ہوگا کہ آوازیں نزدیک آ گئیں۔ درختوں کے درمیان یہ چوڑا ڈھلوان راستہ ان لوگوں کو سیدھا ہماری طرف ہی لا رہا تھا۔

تب میں نے معمر شخص کو دیکھا، اس نے اپنی سیاہ شال کے نیچے سے ایک پستول نکال لیا۔ بظاہر تو یہی لگا کہ بوڑھے کمزور ہاتھوں میں یہ چھوٹا سا پستول ہمارے تعاقب میں آنے والوں کا کیا بگاڑ سکے گا لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ بوڑھے نے بلند آواز میں کسی کو پکارا۔ دیکھتے ہی دیکھتے درختوں کی سبز شاخوں میں چھپے ہوئے چار پانچ افراد چھلانگیں لگا کر نیچے اتر آئے اور مختلف جگہوں پر پوزیشن لے لی۔ ان میں سے زیادہ تر نے خاکی یا سیاہ شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ ان کے پاس جدید اسلحہ تھا۔ بوڑھے نے پکار کر اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ''یہ منڈا اور لڑکی ہماری پناہ میں ہیں۔ ان کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔''

چند سیکنڈ بعد ہمارا تعاقب کرنے والے موقع پر پہنچ گئے۔ میں نے درختوں کی اوٹ سے دیکھا۔ ہمارا اندازہ بالکل درست تھا۔ یہ ملنگی ڈیرے کے مجاور اور ملنگ ہی تھے۔ وہ اپنے لباس اور اپنے ''کندھے تک جاتے ہوئے بالوں'' سے صاف پہچانے جاتے تھے۔ وہ ہانپے ہوئے تھے اور ان کی آنکھوں میں شعلے تھے لیکن اپنے سامنے چوکس مسلح افراد کو دیکھ کر وہ ٹھٹک گئے۔ کرنالی ان میں نمایاں نظر آتا تھا۔ اس کا چربی دار جسم نیلے مخملی چولے کے اندر مچل رہا تھا۔ وہ تڑخ کر بوڑھے سے مخاطب ہوا۔ ''آپ کون لوگ ہو؟''

بوڑھے نے کہا۔ ''اور میں تم سے پوچھتا ہوں، تم کون ہو۔ یہ ہمارا علاقہ ہے۔''

''ہمارا علاقہ...... کیا مطلب......؟ ہم اپنے مجرموں کا پیچھا کر رہے ہیں۔ وہ قتل کر کے

بھاگے ہیں۔“
”مجھے تو وہ قاتل نہیں لگ رہے...... بلکہ تم لگ رہے ہو۔ کہاں سے آئے ہو تم لوگ؟“
”مستاں مائی کے مزار سے۔“ کرنالی نے تنک کر کہا۔
”کون سا مستاں مائی کا مزار؟“
”تم نہیں جانتے اسی لیے اس طرح اکڑ رہے ہو۔ تمہارا بہت نقصان ہو جائے گا۔“ کرنالی نے زہریلے لہجے میں کہا۔ اس کے اردگرد پانچ چھ مسلح محافظ موجود تھے۔
بوڑھا بولا۔ ”اگر تم نقصان کی دھمکی دیتے ہو تو پھر تو ہم ان دونوں کو ضرور پناہ دیں گے۔ تمہارے جیسے بدمعاش ملنگ، سادھو بہت دیکھے ہیں ہم نے۔“
کرنالی کا ایک ساتھی چلایا۔ ”زبان سنبھال کر بات کر بڈھے، نہیں تو لاشیں بچھ جائیں گی یہاں۔“
بوڑھے کے ایک ساتھی نے کہا۔ ”لاشیں تو ضرور بچھیں گی، لیکن وہ تمہاری ہوں گی۔ تم اس وقت بھی کم از کم چھ رائفلوں کی زد میں ہو۔ بہتر ہے کہ ابھی الٹے پاؤں واپس بھاگ جاؤ۔“ اس نے رائفل سیدھی کر کے کندھے سے لگا لی۔
مجھے تھوڑا سا تعجب ہوا۔ درختوں سے اترنے والے افراد کی تعداد چار تھی۔ ان میں سے بھی صرف دو نے اپنی رائفلیں ہاتھوں میں لے رکھی تھیں۔ وہ چھ رائفلیں کہاں تھی جن کا ذکر ابھی ہمارے مددگار نے کیا تھا۔
یکا یک تین فائر ہوئے اور موٹے تگڑے کرنالی کے پاؤں کے پاس چنگاریاں سی چھوٹ گئیں۔ اس کے ساتھ ہی میری سمجھ میں آ گیا کہ باقی رائفلیں کہاں ہیں۔ کچھ افراد اب بھی اردگرد کے گھنے درختوں کے اوپر موجود تھے۔ وہ نظر نہیں آ رہے تھے مگر انہوں نے نیچے موجود ملنگوں کو نشانے پر لے رکھا تھا۔ بوڑھے کے ایک اشارے پر وہ ملنگوں کو کرنالی سمیت بھون کر رکھ دیتے۔
کرنالی نے بدحواسی کے عالم میں اردگرد کے درختوں پر نگاہ دوڑائی۔ یقیناً اسے کوئی بندہ تو نظر نہیں آیا لیکن وہ موت ضرور نظر آ گئی جو ٹکراؤ کی صورت میں اس کا مقدر بن سکتی تھی۔ چند لمحے شدید تذبذب میں رہنے کے بعد اس نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ وہ الٹے قدموں پیچھے ہٹے لیکن کچھ پیچھے جا کر پھر رک گئے۔ ان کے چہرے لال بھبوکے ہو رہے تھے، تاہم اپنی بے بسی کو بھی وہ اچھی طرح محسوس کر رہے تھے۔ درختوں پر سے ایک بار پھر فائرنگ ہوئی۔ یہ فائرنگ بھی ملنگوں کے قدموں کے آس پاس کی گئی تھی۔ اس مرتبہ ان

لوگوں کو رخ پھیر کر درختوں کی طرف بھاگنا پڑا۔ فائرنگ کرنے والے درختوں کے اوپر کافی بلندی پر تھے۔ کوئی جگہ ان کی نظروں سے اوجھل نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب ملنگ محافظ اور کرنالی وغیرہ ڈر کر بھاگے تو پھر بھاگتے ہی چلے گئے۔ درختوں پر موجود افراد گاہے بگاہے ان کے آس پاس فائر کرتے رہے اور انہیں کہیں رکنے نہیں دیا۔ ان لوگوں کا بھاگنا یقیناً ایک مضحکہ خیز پہلو بھی رکھتا تھا۔

جب ملنگوں کی طرف سے پوری تسلی ہو گئی تو بوڑھا ہمارے پاس پہنچا اور ہمیں درختوں کی اوٹ سے نکل آنے کو کہا۔ بوڑھے کی سفید شیو بڑھی ہوئی تھی۔ اس کی کلائیوں پر گھنے بال تھے اور چہرے پر پرانے زخموں کے کچھ نشان اس کی جنگجوانہ طبع کے غماز تھے۔ اس کے ساتھی بھی مار دھاڑ والے لوگ ہی لگتے تھے۔ بوڑھے کے سوا وہ مجھے شکل وصورت سے کچھ اچھے لوگ نہیں لگے۔ ان کا اسلحہ اور لباس وغیرہ دیکھ کر مجھے ایک اور شبہ بھی ہو رہا تھا۔

بوڑھے نے مجھے اپنا نام فیض محمد بتایا اور یہ بتایا کہ وہ ایک قریبی بستی کے رہنے والے ہیں...... اور یہاں اپنی ایک دشمن پارٹی کے انتظار میں کھڑے تھے۔ اوپر راستے کے قریب ہونے والی فائرنگ کی آواز سن کر انہیں یہ لگا کہ شاید مخالف پارٹی پہنچ گئی ہے۔ انہوں نے پوزیشن لے لی۔ ان کی یہ بات کچھ دل کو نہیں لگتی تھی۔ کئی سوالات تھے جن میں ایک یہ بھی تھا کہ اگر وہ واقعی یہاں کسی مخالف پارٹی کا انتظار کر رہے تھے تو پھر آناً فاناً یہاں سے جانے کے لیے کیوں تیار ہو گئے تھے؟ اور پھر ان کے جدید ہتھیار اور بے باکانہ انداز؟ کیا واقعی وہ یہاں کسی بستی کے مکین تھے؟

تسلی بخش بات یہی تھی کہ انہوں نے ابھی تک مجھ سے میری رائفل طلب نہیں کی تھی اور ان کا انداز بھی دوستانہ ہی تھا۔ بوڑھے فیض محمد نے مجھ سے میرے اور تاجور کے بارے میں پوچھا۔ میں نے انہیں اپنا درست نام بتایا۔ یہ بھی بتایا کہ ہم اپنے تین ساتھیوں کے ہمراہ ملنگی ڈیرے کی شہرت سن کر وہاں پہنچے تھے۔ ہماری ایک عزیزہ بیمار تھی۔ لیکن وہاں اس عزیزہ کو جھاڑ پھونک کے نام پر برہنہ کیا گیا اور ایک مجاور نے نازیبا حرکات کیں۔ یہ سب کچھ ہمارے لیے ہرگز قابلِ قبول نہیں تھا۔ وہاں مجاوروں سے ہمارا سخت جھگڑا ہوا اور ہم وہاں سے بھاگ نکلے۔ میں نے بوڑھے فیض محمد کو بتایا۔ ”ہمارے تین ساتھی آگے نکلنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ ان میں دو مرد اور ایک لڑکی ہے۔ لڑکی ہماری وہی عزیزہ ہے جو علاج معالجے کے چکر میں وہاں پھنسی ہوئی تھی۔ باقی دونوں میرے کزن ہیں۔“

بوڑھے فیض اور اس کے ساتھیوں کے ردِعمل سے میں نے اندازہ لگایا کہ یہ لوگ ملنگی

ڈیرے کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ درحقیقت ہم پچھلے ایک دن کی بھاگ دوڑ کے دوران میں اس علاقے سے کافی آگے نکل آئے تھے۔

بوڑھا فیض محمد اور اس کے ساتھی ہمیں لے کر نشیب میں اترتے چلے جارہے تھے۔ بے شک انہوں نے ہماری مدد کی تھی مگر ان کے طور اطوار مجھے کچھ اچھے نہیں لگ رہے تھے۔ ان میں سے کچھ سگریٹ پھونک رہے تھے اور کانوں میں کھسر پھسر بھی کر رہے تھے۔ اچانک میری چھٹی حس مجھے کسی خطرے سے خبردار کرنے لگی۔ یہ لوگ تاجور کو دزدیدہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ تاجور میرے پہلو میں چل رہی تھی۔ ان میں سے ایک بندہ چلتے چلتے تاجور کے بالکل قریب آ گیا تھا۔ دفعتاً مجھے یوں لگا کہ وہ تاجور پر جھپٹنے والا ہے۔ میری چھٹی حس نے مجھے بالکل صحیح سگنل دیا تھا۔ وہ شخص یکایک تاجور کی طرف جھکا۔ میں چونکہ پہلے سے تیار تھا۔ میں نے رائفل کا دستہ گھما کر اس کے منہ پر رسید کیا۔ وہ الٹ کر خاردار جھاڑیوں میں گرا۔ دوسرا شخص آگے بڑھا تو اس کا سامنا بھی کلاشنکوف کے آہنی دستے سے ہوا۔ تاجور چلا کر میری پشت پر آ گئی تھی۔ میں نے کلاشنکوف سیدھی کی اور ایک شخص کی ٹانگوں کو نشانہ بنانا چاہا مگر تب مجھ پر ایک مایوس کن انکشاف ہوا۔ کلاشنکوف نے کام کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ کلاشنکوف جیسی مقبول عام رائفل سے ایسی بے وفائی کی توقع ہرگز نہیں تھی۔ میرے حریفوں نے بھی ایک لحظے میں بھانپ لیا کہ میری رائفل میرا ساتھ چھوڑ گئی ہے۔ ایک شخص پھرتی کے ساتھ تاجور سے لپٹ گیا اور اس کی گردن پر ایک لمبا تیز دھار چھرا رکھ دیا۔ رائفل برداروں نے رائفلیں میری طرف سیدھی کر دیں۔

”گولی ماردیں گے۔ کھڑے رہو اپنی جگہ۔“ چوڑی ناک والا ایک شخص دہاڑا۔

شاید اگر تیز دھار آلہ تاجور کی گردن پر نہ ہوتا تو میں اس موقع پر بھی کچھ نہ کچھ کر گزرتا مگر اب میں بالکل بے بس تھا۔ رائفل تاحال میرے ہاتھ میں تھی لیکن اب وہ ایک لاٹھی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھی۔

”پھینک دو اسے۔“ بوڑھے فیض محمد نے غصیلے لہجے میں کہا۔

میں نے رائفل پھینک دی، جسے فوراً اٹھا لیا گیا۔ ایک شخص آگے بڑھا۔ اس نے تاجور کے سر پر سے چادر کھینچ لی۔ تاجور کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ وہ اپنے آپ میں سمٹ کر رہ گئی۔ اس شخص نے وحشت کے عالم میں چادر کو درمیان سے دو ٹکڑے کیا۔ ایک ٹکڑے کو رسی کی طرح بل دیئے اور پھر میرے عقب میں پہنچ کر میرے ہاتھ اس چادر سے باندھ دیئے۔ اس دوران میں چمک دار چھرا ایک لحظے کے لیے بھی تاجور کی گردن سے ہٹا نہیں تھا اور تاجور وہ ہستی تھی

جس کے لیے میں چھوٹے سے چھوٹا رسک بھی نہیں لے سکتا تھا۔

صورتِ حال مخدوش ہوتی جا رہی تھی۔ یہ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا والی بات ہوئی تھی۔ بوڑھے فیض کے چہرے سے بھی ہمدردی اور نرمی رخصت ہو چکی تھی۔ بوڑھا ہونے کے باوجود اس کے جسم میں عجیب طرح کی اکڑ اور تن فن تھی۔ اس نے اپنی سفید مونچھوں کو بل دیتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ''شکر کرو تمہاری بندوقڑی نے کام نہیں کیا۔ اگر یہ چل جاتی اور کوئی نقصان ہو جاتا تو پھر تمہارا حال بہت خراب ہونا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''کون ہو تم لوگ؟ اور کیا چاہتے ہو مجھ سے؟''

چوڑی ناک والا بولا۔ ''اپنے منہ کا پھاٹک بند کر۔ اب جو سوال کرنا ہے، ہم نے کرنا ہے۔ تم کو صرف جواب دینا ہے اور باقی رہی یہ بات کہ کیا چاہتے ہیں تم سے؟ تو ہم بہت کچھ چاہ سکتے ہیں اور خاص طور سے اس کڑی سے تو ''بہت کچھ'' چاہ سکتے ہیں۔''

اس نے تیز نظروں سے تاجور کو سرتاپا گھورا۔ کمر کی طرف سے تاجور کے کپڑے پھٹ گئے تھے اور اندر سے اس کا دودھیا بدن جھانک رہا تھا۔ چوڑی ناک والے کی نظریں خاص اسی جگہ پر مرکوز تھیں۔ جیسے کسی قلعے کی فصیل کہیں سے ٹوٹی ہوئی ہو اور بپھرے ہوئے لشکری اس رخنے کو مشتعل نظروں سے دیکھ رہے ہوں۔ میں جب سے پاکستان آیا تھا، یہ پہلا موقع تھا کہ میں خود کو اس طرح بے بس محسوس کر رہا تھا جو کچھ ہوا اتنا آناً فاناً ہوا کہ میں کچھ بھی نہ کر سکا۔ میرے خیال میں اس کی اصل وجہ رائفل کا جواب دے جانا تھا۔

یہ لوگ ہمیں مسلسل چلاتے ہوئے کم و بیش چار کلو میٹر آگے لے آئے۔ ان کے کچھ ساتھی یقیناً ابھی تک اسی جگہ درختوں کے اوپر موجود تھے جہاں انہوں نے ملنگوں کو ڈرا کر وہاں سے بھگایا تھا۔ یہ کون لوگ تھے؟ سب سے اہم سوال میرے ذہن میں یہی ابھر رہا تھا۔ کیا وہ داؤد بھاؤ کی طرح کا کوئی گینگ تھا یا پھر اسمگلروں کا کوئی گروہ؟ ان کا جدید اسلحہ اور قیمتی سیل فونز دیکھ کر نہ جانے کیوں یہ گمان ہو رہا تھا کہ یہ اسمگلر ہو سکتے ہیں۔ یہ لوگ ہمیں تنگ گھاٹیوں سے گزارتے ہوئے بلند چوٹیوں کی طرف لے آئے۔ یہاں پہنچ کر بلند درختوں کے اوپر کچھ رائفل برداروں کی موجودگی کا احساس ہوا۔ ایک چھوٹے سے درے سے گزر کر ہم ایک کشادہ جگہ پر پہنچے اور پھر دنگ رہ گئے۔ ایک وسیع احاطہ نظر آ رہا تھا۔ اس کے اردگرد پتھروں سے بنے ہوئے چھوٹے بڑے گھروندے تھے۔ یہاں چند جہازی سائز کی چارپائیاں بچھی تھیں اور کچھ مسلح افراد بیٹھے آلو گوشت کے سالن کے ساتھ خمیری روٹیاں کھا رہے تھے۔ شلواروں قمیصوں میں ملبوس یہ لوگ شکلوں سے ہی چھٹے ہوئے بدمعاش لگتے تھے۔

بوڑھے فیض محمد کو دیکھ کر وہ سب اٹھ کھڑے ہوئے اور سلام کیا۔ ''بیٹھو، بیٹھو۔ کھانا کھاؤ۔'' فیض محمد نے کہا۔

لیکن وہ پھر بھی کھڑے رہے اور ہمارے اردگرد اکٹھے ہو گئے۔ وہ خاص طور سے تاجور کو بڑی کڑی نظروں سے گھور رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ عورت ان لوگوں کے لیے کوئی نادیدہ شے ہے اور وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے کھا جانے کے خواہش مند تھے۔ وہ سب فیض محمد سے پوچھنا چاہ رہے تھے کہ یہ نادر ہیرا اسے کہاں سے اور کیسے ملا ہے۔ وہ میرے لباس کو بھی بڑی دلچسپ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ فیض محمد نے چوڑی ناک والے کو اشارہ کیا۔ ''انہیں اندر لے جاؤ فخرو۔''

وہ ہمیں رائفلوں کے سائے میں ہانکتا ہوا ایک پتھریلی کوٹھڑی میں لے آیا۔ اسے دس ضرب بارہ فٹ کا ایک چھوٹا سا کمرا بھی کہا جا سکتا تھا۔ اندر دو شکستہ چارپائیاں تھیں اور بھاری لحاف پڑے تھے۔ کونے میں لالٹین رکھی تھی۔ کمرے میں صرف ایک کھڑکی تھی جس میں موٹی گرل لگی ہوئی تھی۔ ہمیں اندر دھکیل کر لکڑی کے مضبوط دروازے کو باہر سے بند کر دیا گیا۔

تاجور نے سب سے پہلے میرے بندھے ہوئے ہاتھ کھولے پھر اس پھٹی ہوئی چادر کو کھول کر اپنے سینے پر پھیلا لیا۔ وہ بے حد ہراساں نظر آتی تھی اور میں جانتا تھا کہ اس کی وجہ کیا ہے۔ یہاں اسے ہر طرف گندی نظریں دکھائی دے رہی تھیں۔ ابھی تک ہم یہ بھی نہیں جان پائے تھے کہ یہ لوگ ہمیں کس جگہ لائے ہیں۔

سردی میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا۔ سورج ڈھلنے کے ساتھ ہی دھند پھیلنے لگی تھی۔ ہمارے لباس ناکافی تھے، خاص طور سے تاجور کا لباس۔ میں نے اس کی کمر کی چوٹ دیکھی۔ پھٹے ہوئے کپڑوں کے اندر سے اس کے زیریں لباس کی ڈوریاں دکھائی دیتی تھیں۔ پنڈے پر گہری نیلی خراشیں تھیں۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد کھٹ پٹ سنائی دی۔ پھر کسی نے برآمدے کا دروازہ کھولا اور ہمارے والے کمرے کی اکلوتی کھڑکی کے سامنے ایک شخص کرسی پر آ بیٹھا۔ یہ بوڑھا فیض محمد ہی تھا۔ اس نے کہا۔ ''لگتا ہے کہ تمہارے ساتھی ان ملنگوں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے ہیں، ان کا کہیں کوئی کھوج نہیں ملا۔ میرا خیال ہے کہ تمہارے لیے یہ خوشی کی بات ہو گی۔''

میں نے کہا۔ ''خوشی کی بات تو ہے مگر صحیح خوشی تو تب ہوتی جب ہم بھی یہاں سے نکل سکتے۔''

وہ بولا۔ ''میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ تم سب اکٹھے گاڑی میں نکلے، پھر تم دونوں

پیچھے کیسے رہ گئے؟''

میں نے اسے صاف بتا دیا کہ کس طرح تیز رفتار پک اَپ میں سے تاجور اچھل کر نیچے گری اور مجھے اس کے پیچھے چھلانگ لگانا پڑی۔ فیض محمد نے حیرت سے یہ سب کچھ سنا۔ آخر ایک لمبی سانس لے کر بولا۔ ''یہ کیا لگتی ہے تمہاری جس کی خاطر اتنی قربانی دی تم نے؟''

''یہ میری...... منگیتر ہے۔'' میں نے کہا۔

فیض محمد نے اس حوالے سے کچھ مزید سوال پوچھے۔ یعنی ہم کہاں کے رہنے والے ہیں؟ کیا کرتے ہیں؟ ذات پات کیا ہے؟ ان سوالوں کے جواب ہم نے پہلے ہی سوچ رکھے تھے۔ صرف گاؤں کا نام اور تاجور کا نام میں نے بدلا اور خود کو کوٹلی کے ایک قریبی علاقے کا رہائشی ظاہر کیا۔ باقی سب کچھ فیض محمد کے گوش گزار کر دیا۔ تاجور کا نام میں نے شمسہ بتایا۔

وہ سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر بولا۔ ''تو یہ منگیتر ہے تمہاری؟''

''جی ہاں۔''

''لیکن یہ تمہاری منگیتر نہیں ہے۔ تمہاری بیوی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''اور اسے بچہ بھی ہونے والا ہے...... کچھ دن پہلے ہی اس کا پاؤں بھاری ہوا ہے۔'' فیض محمد سنی اَن سنی کرتے ہوئے بولا۔

اس کے ساتھ ہی اس نے ایک صافا نما رومال کی گرہ کھولی اور اس میں سے تین چار لیموں نکال کر گرل کے اندر سے مجھے تھما دیئے۔ میں حیرت سے کبھی فیض محمد کو اور کبھی لیموؤں کو دیکھ رہا تھا۔ ''یہ کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''شکل سے اتنے بدھو تو نہیں لگتے ہو۔ بے وقوف، یہ کھٹائی ہے۔ عورتیں جب پیٹ سے ہوتی ہیں تو ایسی چیزیں لیتی ہیں۔''

''لیکن یہ سب کیوں ضروری ہے؟''

مجھے بوڑھے کے چہرے پر اپنے لیے ہمدردی نظر آئی۔ اس نے ایک نگاہ تاجور کی طرف دیکھا اور ذرا دھیمے لہجے میں سرگوشی کی۔ ''تمہاری قسمت کا پھیر ہے کہ تم ایک بری جگہ پھنس گئے ہو۔ اگر تم چاہتے ہو کہ اگلے چند گھنٹوں تک تمہاری اس منگیتر کی عزت یہاں محفوظ رہے، اور آئندہ دنوں میں بھی وہ کسی بڑی مشکل میں نہ پھنسے تو یہ سب کچھ ضروری ہے۔ میں فی الحال تمہیں کچھ زیادہ نہیں بتا سکتا۔ بس جو کہہ رہا ہوں اس کے مطابق شروع ہو جاؤ...... اور اپنی اس بات سے بالکل پیچھے نہ ہٹنا کہ یہ تمہاری منکوحہ زنانی ہے اور نہ ہی کسی کو یہ بھنک

پڑنے دینی ہے کہ اس بارے میں تم سے میں نے کچھ کہا ہے۔"

"کس بارے میں؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"یہی کہ میں نے تمہیں کوئی پٹی پڑھائی ہے۔" وہ ذرا جھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"میں جو کہہ رہا ہوں صرف اور صرف تمہاری ہمدردی میں کہہ رہا ہوں۔" آخری الفاظ ادا کرتے کرتے فیض محمد کے جھلائے ہوئے لہجے میں پھر تھوڑی سے نرمی آ گئی۔

میں نے التجا کے انداز میں کہا۔"بزرگوار! آپ شروع ہی سے مجھے دوسروں سے مختلف نظر آئے ہیں۔ میں خدانخواستہ آپ کی بات پر کوئی شک نہیں کرر ہا لیکن اگر آپ مجھے تھوڑی سی تفصیل بتادیں گے تو مجھے صورتِ حال کو ہینڈل کرنے میں آسانی ہوگی۔"

فیض محمد نے کش لے کر دائیں بائیں دیکھا اور آہستہ سے بولا۔"سمجھو کہ ایک بندہ کچھ دیر میں یہاں آنے والا ہے۔ وہ یہاں کا کرتا دھرتا ہے۔ اسے اپنے بڑے بھائی کے لیے ایک عورت کی سخت ضرورت ہے۔ بلکہ ہر وقت ہی رہتی ہے۔ اس سے تم اپنی عورت کو ایک ہی طرح بچا سکتے ہو۔ اگر اسے یقین دلا دو کہ یہ تمہاری منکوحہ ہے اور امید سے بھی ہے...... اب زیادہ سوال نہ کرنا۔ میں جا رہا ہوں۔"

اس سے پہلے کہ وہ اٹھ کر باہر نکل جاتا، میں نے کہا۔"بزرگوار! ایک مدد تو ہماری کر دی۔ شمسہ کی کمر پر چوٹ لگی ہوئی ہے۔ یہاں لگانے کے لیے کچھ دے دیں۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور چلا گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد چوڑی ناک والا ڈشکرا آیا اور اس نے گرل کے اندر سے مرہم پٹی کا سامان مجھے تھما دیا۔ اس کی پیشانی پر ایک مندمل ہوتا ہوا زخم تھا۔ جیسے کسی نے وہاں شیشے وغیرہ سے چوٹ لگائی ہو۔ اس کی جلتی نظروں نے ایک بار بھرپور طریقے سے تاجور کے جسم کا طواف کیا اور پھر لوفر انداز میں کچھ گنگناتا ہوا واپس چلا گیا۔ مجھے ہرگز امید نہیں تھی کہ اس جنگل میں مرہم پٹی کا مناسب سامان میسر ہو گا مگر چوڑی ناک والے فخرو نے جو کچھ ہمیں پہنچایا تھا، وہ فرسٹ ایڈ کے لیے کافی تھا۔ مثلاً اسپرٹ، کاٹن، میڈیکل ٹیپ اور آئنٹ مینٹ وغیرہ۔

"رہنے دیں شاہ زیب، مجھے درد ہو گا۔" وہ کراہ کر بولی۔ اس کے انداز میں تکلیف سے زیادہ شرم جھلک رہی تھی۔

"زیادہ سیانی مت بنو۔ تمہاری بینڈیج ضروری ہے۔ خون بھی رِس رہا ہے۔" میں نے ذرا تحکم سے کہا اور اس کی پشت پر پہنچ گیا۔

وہ ابھی تک ڈاکٹر ارم والا نیلا چولا پہنے ہوئے تھی۔ نیچے کڑھائی دار کرتہ تھا۔ یہ دونوں

چیزیں کسی شاخ سے الجھ کر پھٹ چکی تھیں۔ میں نے انہیں کچھ اور پھاڑ دیا۔ کاٹن پر اسپرٹ لگا کر اس کی جلد کو صاف کیا تو وہ ''اُف...... آہ...... پلیز......'' کرنے لگی۔ میں نے مرہم لگائی اور کاٹن رکھ کر میڈیکل ٹیپ چپکا دی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو اس کے سنگ مرمر سے تراشے ہوئے جسم کی دید مجھے نہال کرتی مگر فی الحال سچویشن اور تھی۔ میں نے اپنی شال اسے اوڑھا دی اور پہلو کے بل لیٹ جانے کو کہا۔

ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ انیق، رضوان اور ریشمی، پتا نہیں کس حال میں تھے۔ انیق کو گولی لگی ہوئی تھی۔ وہ شدید تکلیف میں تھا۔ میرے بعد اسی پر زیادہ ذمے داری بھی آ گئی تھی۔ تسلی کی بات یہ تھی کہ انیق نے یاسین پر کنٹرول حاصل کر لیا تھا اور وہ اس کی ہدایات کے مطابق چل رہا تھا۔ امید تھی کہ یاسین کی مدد سے وہ کسی محفوظ مقام تک پہنچ جائیں گے۔ اس کے بعد وہ کسی بھی طریقے سے پولیس کو یا دیگر ذمے دار افراد کو ملنگی ڈیرے کے حالات سے آگاہ کر سکتے تھے۔ ملنگی ڈیرے پر نوری اور لاہوری پولیس افسر کے بیٹے سمیت کئی بہیمانہ قتل ہوئے تھے۔ اب ملنگی ڈیرے والوں کی کم بختی آنا لازمی تھی۔

میں دیوار سے ٹیک لگائے سوچتا رہا۔ کمرے میں صرف ایک ہی دروازہ تھا اور اس کے نیچے چار پانچ انچ کا خلا موجود تھا جس میں سے ٹھنڈی ہوا اندر آتی تھی۔ میں نے اس خلا کو ایک پرانے کمبل کے ذریعے بند کر دیا مگر فوراً ہی کمبل میں حرکت پیدا ہوئی۔ خلا میں ایک ٹرے نمودار ہوئی، جس میں کھانے کی پلیٹیں تھیں اور ایک ماچس رکھی تھی۔ ماچس کمرے میں موجود لالٹین روشن کرنے کے لیے تھی۔ کھانے میں وہی خمیری روٹی اور آلو گوشت کا سالن تھا جو ہم نے کچھ دیر پہلے دیکھا تھا۔ روٹی گرم تھی اور اس میں سے اشتہا آمیز خوشبو اٹھ رہی تھی۔ میں نے بہت اصرار کر کے تاجور کو چند لقمے کھلائے اور خود بھی پیٹ پوجا کی۔ کھانا کھاتے ہوئے تاجور ایک بار پھر سسکنے لگی۔ یقیناً اسے پچھلے 36 گھنٹے کے لرزہ خیز واقعات یاد آ رہے تھے اور ان میں سب سے اندوہناک واقعہ چاچا رزاق کی موت اور پھر نوری کی لاش کا دکھائی دینے والا منظر تھا۔

''یہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے شاہ زیب! ہم کہاں آ پھنسے ہیں؟'' وہ کراہی۔

''ہمت ہارنے سے کچھ نہیں ہوگا تاجور، ہم حوصلہ رکھیں گے تو راستے خود بخود نکل آئیں گے۔ تم نے وہ مقولہ تو سنا ہوگا، اللہ ان کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔''

اس نے سر اپنے گھٹنوں پر رکھ لیا اور منمنائی۔ ''یہ بوڑھا کیا۔ کہہ رہا تھا آپ کے کان میں؟''

''اس کا کہنا ہے کہ تم اور میں خود کو یہاں میاں بیوی ظاہر کریں گے تو ہمارے لیے آسانی رہے گی۔ یوں سمجھ لو کہ یہ وقت کی ضرورت ہے۔ تمہیں یہ بات بری تو نہیں لگ رہی؟''

''مجھے برا لگنے یا نہ لگنے سے کیا ہوگا۔ آپ جو ٹھیک سمجھتے ہیں وہ کریں۔''

اس نے رضامندی ظاہر کر دی لیکن اگلا مرحلہ زیادہ مشکل تھا۔ وہ تین چار لیموں جو فیض محمد مجھے دے گیا تھا، میری جیب میں تھے۔ میں نے ایک لیموں تاجور کے سامنے رکھا تو وہ اپنی بھیگی پلکیں پٹ پٹا کر بولی۔ ''یہ کیا ہے؟''

میں نے نرم اور مناسب لفظوں میں اسے سمجھایا کہ اس نے کیا ظاہر کرنا ہے، اور کس طرح؟ وہ رو دینے والے انداز میں سنتی رہی۔ وہ کوئی اداکارہ نہیں تھی۔ گاؤں کی سیدھی سادی کنواری لڑکی تھی۔ شرم و حیا میں لپٹی ہوئی ایک بند کلی جس کی خوشبو بس اس کے گھر کی چار دیواری تک محدود تھی۔ وہ تند ہواؤں کی زد میں آ گئی تھی اور اسے ایسے تیز رفتار حالات سے گزرنا پڑ رہا تھا جو اس بے چاری کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھے۔

میں نے جب اسے بتایا کہ اسے ''پُر امید'' عورتوں کے انداز میں ابکائیاں وغیرہ لینا ہوں گی اور خود کو بیمار ظاہر کرنا ہوگا تو وہ باقاعدہ اشک بار ہو گئی۔ بہرطور میں کسی نہ کسی طرح اسے نیم رضامند کرنے میں کامیاب رہا۔

O......❖......O

جس شخص کے بارے میں کہا جا رہا تھا کہ وہ آنے والا ہے، اس کی آمدرات کوئی نو بجے کے لگ بھگ ہوئی۔ کہیں پاس سے ہی گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیں۔ میرے قیافے کے مطابق یہ تین چار گھوڑے تھے۔ یہ اندازہ بھی ہو رہا تھا کہ گھڑ سوار، گھوڑوں کے ساتھ پیدل ہی چلتے ہوئے آ رہے ہیں۔ کچھ آگے جا کر ٹاپیں معدوم ہو گئیں۔ یہاں موجود لوگوں میں افراتفری نظر آنے لگی۔ میں نے کھڑکی میں سے دو مسلح افراد کو دیکھا۔ ان میں سے ایک چوڑی ناک والا فخرو تھا۔ وہ جلدی جلدی پگڑیاں درست کرتے ہوئے احاطے کی طرف جا رہے تھے۔ کسی کمرے میں لچر فلمی گانے پلے کرنے والا ٹیپ ریکارڈر بھی بند ہو گیا۔

تاجور پہلے سے زیادہ سہمی ہوئی نظر آنے لگی۔ میری دھڑکن بھی بڑھ گئی تھی۔ اگلے چند منٹوں میں کسی طرح کی صورتِ حال بھی سامنے آ سکتی تھی۔ میں نے تاجور کو اشارہ کیا کہ وہ لحاف اوڑھ کر لیٹ جائے۔ لیموں کے دو ٹکڑے اور نمک وغیرہ میں نے لالٹین کے پاس ہی اس طرح رکھ دیئے کہ پہلی نظر میں دکھائی دے جائیں (یہ سب باتیں مجھے فیض نے ہی سمجھا دی تھیں۔ وہ یہاں کا بھیدی تھا۔ اس کی ساری باتیں تو میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں لیکن اس کے کہنے کے مطابق عمل کرنا مجھے مناسب لگا)

قریباً پندرہ منٹ بعد بھاری قدموں کی آواز سنائی دی۔ کوئی آ رہا تھا پھر وہ نمودار ہوا۔ وہ بلند قد کاٹھ کا شخص تھا۔ اس کے پیچھے دو افراد بہت مؤدب چلے آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک تو بوڑھا فیض تھا، دوسرا ایک مسلح شخص جس نے گیس لیمپ اٹھا رکھا تھا۔ دراز قد شخص کھڑکی کے سامنے رکھی کرسی کے قریب کھڑا ہو گیا۔ مسلح شخص نے گیس لیمپ اس کے پاس رکھ دیا اور واپس چلا گیا۔ اس بڑے لیمپ کی روشنی کمرے کے اندر تک آ رہی تھی۔ کچھ روشنی نو وارد کے چہرے پر بھی پڑ رہی تھی۔ میں نے اس کی صورت دیکھی اور بھونچکا رہ گیا۔ مجھے ہرگز ہرگز امید نہیں تھی کہ میں اس شخص کو یہاں ویرانے میں دیکھوں گا...... یہ وہی خطرناک

ڈکیت سجاول سیالکوٹی تھا۔ چاند گڑھی اور گردونواح کے علاقوں میں اس کی دہشت تھی۔ وہاں کے لوگ اسے ایک خدائی آفت قرار دیتے تھے...... اور اب وہ چاند گڑھی سے قریباً سو میل دور یہاں ان ویران پہاڑوں میں اس کھڑکی کے سامنے گیس لیمپ کر روشنی میں کھڑا تھا اور عقابی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ وہ مجھے شکل سے نہیں پہچانتا تھا لیکن میں اسے ایک بار دیکھ چکا تھا۔ جب میں عالمگیر کا تعاقب کرتا ہوا ایک کھنڈر چار دیواری میں پہنچا تھا اور وہاں ناچ گانے کی محفل برپا تھی۔ شہر سے آئی ہوئی طوائفیں (بشمول جاناں وغیرہ) ناچ رہی تھیں اور ڈکیت دادِ عیش دے رہے تھے۔ وہ منظر ابھی تک میرے ذہن میں محفوظ تھا۔

پتا چل رہا تھا کہ یہاں پہنچنے سے پہلے ہی فیض اپنے اس سرغنہ کو ہمارے بارے میں سب کچھ بتا چکا ہے۔ وہ بڑی دلچسپ نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میری توقع کے برخلاف اس نے تاجور کے بارے میں کوئی بات نہیں کہی، نہ ہی یہ حکم دیا کہ میں اسے اٹھ کر بیٹھنے کے لیے کہوں۔ وہ اسی طرح لیٹی رہی اور خود کو سویا ظاہر کیا۔

سیالکوٹی نے کالے رنگ کی شلوار قمیص اور گرے جیکٹ پہن رکھی تھی۔ ہولسٹر میں سے نائن ایم ایم کا طاقتور پستول جھانک رہا تھا۔ اس نے اپنی تیکھی مونچھوں کو انگلی سے سہلایا اور بھاری آواز میں بولا۔ ''کیا کرتے ہو تم اپنے گاؤں ہری پورہ میں؟'' (میں نے اپنے گاؤں کا نام یہی بتایا تھا)

''تھوڑی سی زمین ہے بھائی جی۔ وہی کاشت کرتا ہوں۔ کچھ ٹھیکے پر دے رکھی ہے۔ جٹ فیملی سے ہوں۔ ہم لوگ کھیتی باڑی سے دور تو نہیں رہ سکتے۔''

وہ مجھے دھیان سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تمہاری بول چال سے ایسا لگتا ہے جیسے تم پاکستان کی جم پل نہیں ہو، تھوڑی تھوڑی انگریزی گھسی ہوئی ہے تمہاری زبان میں۔ کیوں فیض ایسا ہی ہے نا؟'' سجاول نے بابے فیض محمد سے تصدیق چاہی۔ اس نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔

''آپ کا اندازہ بالکل ٹھیک ہے جی۔ جٹ پتر ہوں لیکن ولایت پلٹ ہوں۔ میرے ماں باپ میرے بچپن میں ہی ڈنمارک چلے گئے تھے۔ وہیں پلا بڑھا ہوں مگر پھر اپنے وطن کی مٹی، مجھے پھر یہاں کھینچ لائی۔''

''گھر میں اور کون کون ہے؟'' سجاول نے پوچھا۔

''والد، والدہ ہیں اور یہ گھر والی ہے۔ کوئی بڑا ٹبر نہیں ہے۔''

''باہر کے ملک میں عیش کرتے رہے ہو، اب پنڈ میں کیسے گزارا کر رہے ہو؟''

''گزارا تو وہاں ہو رہا تھا۔ زندگی گزارنے کا مزا تو یہاں ہی آیا ہے۔''

وہ پاٹ دار آواز میں بولا۔ ''فیض نے بتایا ہے کہ جی دار بندے ہو۔ اسلحہ چلانا بھی جانتے ہو۔ یہ اور بات ہے کہ موقع پڑنے پر تمہاری رائفل نے تمہارا ساتھ نہ دیا۔''

''ہاں جی۔ کوئی خرابی ہو گئی تھی اس میں۔'' میں نے کہا۔

''اور اس خرابی نے تمہیں میرے بندوں کے ہاتھوں ذبح ہونے سے بچا لیا۔''

میں سر جھکا کر رہ گیا، وہ بولا۔ ''فیض بتا رہا تھا کہ یہ کلاشنکوف تم نے ان مجاوروں سے ہی چھینی تھی؟''

''ہاں جی، ایسا ہی ہوا ہے۔ شریف بندے کی عزت داؤ پر لگ جائے تو پھر وہ سب کچھ کر گزرتا ہے۔ ہم نے بھی اپنی عورتوں کو بچانے کے لیے مجاوروں سے ٹکر لے لی۔ ہمارا ایک ساتھی مارا بھی گیا ہے لیکن ہم کسی نہ کسی طرح وہاں سے نکل آئے۔''

سجاول سیالکوٹی نے ایک گہری سانس لی اور اس کا صندوق جیسا سینہ کچھ اور بھی نمایاں ہو گیا، وہ بولا۔ ''اچھے بھلے تگڑے بندے ہو۔ کوئی تگڑا کام کرو۔ یہ وڈے زمیندار، یہ وڈیرے، یہ گدی نشین اور مخدوم، یہ سب چھوٹے لوگوں کا گوشت کھاتے ہیں، ان کا خون چوستے ہیں، ان کی تو......'' اس نے ایک گالی دی اور ایک طرف تھوک دیا۔

میں کہنا چاہتا تھا کہ سارے وڈیرے اور گدی نشین تو ایسے نہیں ہوتے لیکن...... پھر اس موقع پر سجاول جیسے غضب ناک شخص کے سامنے نکتۂ اعتراض اٹھانا مجھے مناسب محسوس نہیں ہوا۔ میں خاموش رہا۔

اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''فیض نے بتایا ہے کہ تمہارا جو ساتھی مرا، وہ بڑی عمر کا تھا۔''

''ہاں جی، ہم اسے چاچا رزاق کہتے تھے۔ ہمارے ساتھ جو دوسری لڑکی تھی، وہ اس کا والد تھا۔ وہاں ڈیرے سے نکلنے کی کوشش میں وہ مجاوروں کی گولیوں کا نشانہ بن گیا۔''

سجاول مجھ سے کرید کرید کر ملنگی ڈیرے کے محل وقوع کے بارے میں پوچھنے لگا اور یہ جاننے کی کوشش کرنے لگا کہ کیا اب ہم اپنے مقتول ساتھی کی موت کا بدلہ لینے کا ارادہ رکھتے ہیں یا اس کے قتل کے خلاف کوئی قانونی کارروائی کریں گے۔

میں نے کہا۔ ''ابھی میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں جی۔ ہم گاؤں پہنچ کر اور اپنے بڑوں سے بات کر کے ہی کوئی فیصلہ کر سکتے ہیں۔''

وہ مجھے بڑے دھیان سے سن رہا تھا۔ میرا لہجہ اس کے لیے دلچسپی کی چیز تھا۔ (میں نے

اب اپنے لب و لہجے پر بہت حد تک کنٹرول حاصل کر لیا ہوا تھا لیکن پھر بھی پنجابی میں اردو اور کبھی کبھی انگلش کی آمیزش بھی ہو جاتی تھی)

وہ جب بھی ملنگی ڈیرے کے بارے میں مجھ سے کوئی سوال پوچھتا تھا، مجھے اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے ملنگی ڈیرے کا تھوڑا بہت نام پہلے بھی سنا ہوا ہے۔ ملنگی ڈیرے کے بارے میں اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے میرے جسم میں پھریری سی دوڑ جاتی تھی۔ اگر یہ شخص ملنگی ڈیرے کو کھوجنے نکل کھڑا ہوتا اور وہاں تک جا پہنچتا تو پھر ظاہر ہے کہ اسے وہاں کے سارے حالات بھی معلوم ہو جانا تھے۔ جب حالات معلوم ہوتے تو شاید وہ یہ بھی جان لیتا کہ ملنگوں کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا کر وہاں سے راہِ فرار اختیار کرنے والے ہری پورہ کے نہیں چاند گڑھی کے رہنے والے ہیں۔ اگر ہمارا تعلق چاند گڑھی سے ثابت ہو جاتا تو پھر اور بھی بہت کچھ ثابت ہو جانا تھا جس میں سے اہم اور تہلکہ خیز بات یہی ہوتی کہ میں وہی "ولایت پلٹ جٹ پتر" ہوں جو دین محمد کا گونگا ٹریکٹر ڈرائیور بنا ہوا ہے اور میرے ساتھ کوئی شمسہ نامی لڑکی نہیں بلکہ دین محمد کی اکلوتی بیٹی تاجور ہے اور یہ وہی تاجور ہے جو ایک مرتبہ پہلے ہی اس کے (سجاول کے) ہرکاروں کے ہتھے چڑھتے چڑھتے بچی ہے۔

سجاول سیالکوٹی میں خود اعتمادی حد سے زیادہ تھی اور کیوں نہ ہوتی۔ وہ ایک نامی گرامی ڈکیت تھا۔ اس کے دشمن تو دشمن اس کے دوست بھی اس کے غیظ و غضب سے خوف کھاتے تھے۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ چاند گڑھی اور اردگرد کے علاقوں میں وہ دہشت بن کر لوگوں کے اعصاب پر سوار تھا اور بہت سے لوگ ایسے تھے جو اس کے اچانک حملے کے اندیشے سے گھربار چھوڑ کر دوسرے علاقوں میں منتقل ہو رہے تھے۔

اگلے روز ایک ادھیڑ عمر عورت ہمارے پاس کمرے میں پہنچائی گئی۔ اس کا نام اختری بی بی معلوم ہوا۔ پتا چلا کہ یہ اس جگہ کے خادموں میں سے ہے۔ تندور پر روٹیاں پکانے میں اسے خاص مہارت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ ی دایہ گیری بھی کرتی ہے۔ اختری بی بی نے تاجور کا حال احوال پوچھا۔ اس کی طبیعت دریافت کی، اور چپکے سے اس کے پیٹ پر ہاتھ وغیرہ بھی پھیرا۔ مجھے الجھن ہو رہی تھی۔ ایسی کائیاں عورت سے کوئی بعید نہیں تھا کہ وہ ہمارا جھوٹ پکڑ لیتی لیکن خیریت گزری۔ تاجور نے اس سے سرگوشیوں میں بات کی اور اسے یہ بتا کر مطمئن کیا کہ ابھی اسے چار پانچ ہفتے ہی ہوئے ہیں۔ وہ تاجور کو چند ہدایات دے کر واپس چلی گئی۔ بہرحال الجھن کی ایک شکن سی ضرور میں نے اس کے ماتھے پر دیکھی۔

دوپہر کو ہمیں اچھا کھانا دیا گیا مگر فیض محمد یا سجاول کی شکل پھر نظر نہیں آئی۔ تاجور نے

مجھ سے پوچھا۔ ''پتا نہیں کیوں مجھے لگ رہا ہے کہ آپ مونچھوں والے سردار کے بارے میں کچھ جانتے ہیں۔ کیا آپ نے اسے پہلے بھی دیکھا ہوا ہے؟''

یہ ایک مشکل سوال تھا۔ میں اس سوال کا درست جواب دے کر تاجور کے خوف و ہراس میں بے پناہ اضافہ کرنا نہیں چاہتا تھا مگر اس کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے اختری بی بی یہاں آئی تھی اور امید تھی کہ وہ آئندہ بھی آتی رہے گی۔ اس نے کسی بھی وقت تاجور کو بتا دینا ہے کہ یہاں کا کرتا دھرتا اصل میں کون ہے۔ وہ نہ بتاتی تو کوئی اور بتا دیتا۔ یہ بات زیادہ دیر راز نہیں رہنا تھی۔ تو پھر کیوں نا میں ہی اچھے طریقے سے تاجور کو بتا دیتا۔ میں نے کہا۔ ''تاجور! کہتے ہیں کہ مصیبت اکیلے نہیں آتی۔ ہمارے ساتھ بھی یہی ہو رہا ہے، لیکن ایک بات یقینی ہے جب تک میں تمہارے ساتھ ہوں، کوئی تمہارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔''

یہ تمہید باندھنے کے بعد میں نے تاجور کے گوش گزار کر دیا کہ ہم اس وقت کسی اور کی نہیں سجاول سیالکوٹی کی میزبانی میں ہیں۔

تاجور کو شدید شاک لگا۔ وہ کئی سیکنڈ تک بول نہیں پائی۔ میں نے اس سے تسلی تشفی کی باتیں کیں اور کہا۔ ''تاجور! بری خبر تم نے سن لی۔ اب اچھی خبر یہ ہے کہ سجاول سمیت یہاں کوئی ایسا بندہ موجود نہیں جو تمہیں تاجور کی حیثیت سے اور مجھے گونگے ڈرائیور کی حیثیت سے پہچان سکے۔ ان کی یہ بے خبری ہمیں یہاں سے نکلنے میں مدد دے سکتی ہے۔''

وہ لرزتی آواز میں بولی۔ ''کیا یہ سجاول کا گھر ہے؟''

''ایسے لوگوں کے گھر نہیں، خفیہ ٹھکانے ہوتے ہیں۔ یہ بھی ایک ایسا ہی ٹھکانا ہے۔ تم نے دیکھا ہی ہے کہ ہم کتنے دشوار راستوں سے گزر کر یہاں تک پہنچے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ کبھی کبھار اس جگہ آتا ہو۔''

ابھی ہم بات ہی کر رہے تھے کہ قدموں کی آہٹ ابھری۔ یہ فیض محمد تھا۔ اس نے سفید کرتہ اور تہبند پہن رکھا تھا، سفید ہی پگڑی تھی۔ وہ ہمارے پاس آ کر لکڑی کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا، پھر تاجور کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ واحد شخص تھا جس کی نگاہوں میں تاجور کے لیے خباثت کے بجائے نرمی اور اپنائیت تھی۔ اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''تم ٹھیک جا رہی ہو۔ لیکن اس اختری بی بی سے ذرا ہوشیار رہنا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ ابھی تھوڑی دیر میں پھر تمہارے پاس آئے۔ اس کے سامنے تم کو پورا ڈراما کرنا پڑے گا...... سمجھ رہی ہو نا؟''

تاجور تو کوئی جواب نہیں دے پائی۔ میں نے کہا۔ ''آپ فکر نہ کریں۔ وہی ہوگا جو آپ

کہہ رہے ہیں۔"
"اور اسی میں اس کی بھلائی ہے۔" فیض محمد نے زور دے کر کہا پھر سگریٹ سلگا کر بولا۔"ہوسکتا ہے کہ آج سردار بھی تم سے رابطہ کریں۔ان کی ہاں میں ہاں ملانا اور اپنی طرف سے ان کا دل صاف کرنے کی کوشش کرنا۔وہ خود بھی ایسے ڈھونگی ملنگوں اور فقیروں کے بہت خلاف ہیں۔ان کو اچھا نہیں سمجھتے۔"
"ٹھیک ہے۔"
"اور ایک بات تمہیں اور بتا دوں۔کسی طرح کی چالاکی نہ دکھانا۔جیسے کہ کل رستے میں دکھا چکے ہو۔یہاں سے بھاگنے کی کوشش کرو گے تو خود کو اور اس کڑی کو بہت وڈی مصیبت میں ڈال دو گے۔سردار معاف کرنا نہیں جانتا۔ذرا سی بات پر سر، دھڑ سے وکھرا ہو جاتا ہے یہاں۔"
"آپ بے فکر رہیں۔" میں نے فیض محمد کی تائید کی۔
کہیں پاس کے کسی کمرے میں کوئی شخص نشے کی حالت میں غل غپاڑا کر رہا تھا۔ ملازمین شاید اسے سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے۔وہ انہیں بھی ڈانٹ رہا تھا۔یہ سجاول تو ہرگز نہیں تھا۔میں اس بارے میں فیض سے پوچھنا چاہ رہا تھا مگر اسی اثنا میں وہ اٹھ کر چل دیا۔
جیسا کہ فیض نے کہا تھا، شام سے کچھ پہلے وہ ایک پیغام لے کر آ گیا۔اس کے ہاتھ میں ایک تھیلا تھا، جس میں کپڑوں کے دو جوڑے اور سویٹر وغیرہ تھا۔چوڑی ناک والا فخرو خودکار رائفل ہاتھ میں لیے اس کے ساتھ تھا۔وہ کھڑکی سے کچھ دور کھڑا ہو گیا۔فیض محمد نے میرے پاس آ کر کہا۔"سردار سجاول نے تمہیں یاد کیا ہے لیکن اس سے پہلے اپنا حلیہ بدل لو۔ اتارو یہ منحوس چولا۔ساتھ والے غسل خانے میں جا کر ان میں سے کوئی ایک جوڑا پہن لو۔"
"لیکن......"
وہ میرا مطلب سمجھ کر دھیمی آواز میں بولا۔"گھبراؤ نہیں۔تمہاری منگیتر کو یہاں کسی طرح کا کوئی ڈر نہیں ہے یہ میری بیٹی کی طرح ہے میں اس کی طرف سے ضمانت دیتا ہوں۔ویسے بھی اختری بی بی آ رہی ہے۔وہ تمہارے آنے تک یہاں اس کے پاس رہے گی۔"
مجھے دور سے اختری آتی دکھائی دی۔پتا نہیں کیوں فیض محمد کی باتوں پر بھروسا کرنے کو دل چاہتا تھا۔میری چھٹی حس بھی کچھ ایسی ہی گواہی دے رہی تھی اور اس حس نے مجھے بہت کم دھوکا دیا تھا۔
فیض محمد نے کوٹھڑی کا چوبی دروازہ کھول دیا۔اختری بی بی اندر آ گئی۔وہ تاجور کے لیے

مالٹے لے کر آئی تھی۔ تاجور اور وہ باتیں کرنے لگیں تو میں باہر آ گیا۔ فیض محمد نے مجھے ایک قریبی دروازے تک پہنچایا اور کپڑے، تولیا، صابن وغیرہ مجھے دے دیا۔ فخرو رائفل سونتے میرے اردگرد موجود تھا۔ وہ راستے میں میری خطرناک مزاحمت دیکھ چکا تھا، لہٰذا اب مجھے کوئی موقع دینے کو تیار نہیں تھا۔ غسل خانے میں گرم بھاپ دیتے پانی کی بالٹی بھری ہوئی تھی۔ میں نے رضوان کا لایا ہوا نیلا چولا اور ٹراؤزر اتار دیا۔ (پیر سائیں والا قیمتی چغہ میں نے ملنگی ڈیرے سے نکلتے ہی اتار پھینکا تھا) میں نے ہاتھ منہ دھو کر کپڑے بدلے، سویٹر پہنا اور کنگھی وغیرہ کر کے تیار ہو گیا۔ فخرو مجھے اپنے ساتھ لے کر احاطے کی مشرقی سمت میں بڑھا۔ اب اس کے ساتھ ایک اور رائفل بردار بھی موجود تھا۔ احاطے میں ہر طرف مسلح افراد دکھائی دے رہے تھے۔ دو مین دروازوں پر خوفناک شکلوں اور بڑے بڑے پگڑوں والے چوکیدار کھڑے تھے۔ ان کے پاس جدید رائفلیں تھیں اور وہ ایک اشارے پر کٹ مرنے والے لوگ لگتے تھے۔ میں نے ان میں سے کئی ایک کی کمر میں بڑے بڑے تیز دھار چھرے بھی بندھے ہوئے دیکھے۔ کل راستے میں ان لوگوں نے ایک ایسا ہی چھرا تاجور کی گردن پر رکھ کر مجھے بے بس کر ڈالا تھا۔

ایک کمرے کے اندر سے مار دھاڑ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یوں لگا کہ سجاول کے کچھ بندے، لڑائی بھڑائی اور چھرے بازی کی مشق میں مصروف ہیں۔ یہ لوگ مجھے لیے ہوئے ایک کشادہ کمرے میں لے آئے۔ یہاں مٹی کی ایک بڑی انگیٹھی دہک رہی تھی۔ فرش پر قالین بچھا تھا اور دیواروں کے ساتھ سرخ گاؤ تکیے رکھے تھے۔ مجھے لانے والے مسلح افراد میں سے فخرو نے آگے بڑھ کر ایک بار پھر احتیاطاً میرے لباس کی تلاشی لی اور مجھے اندر بھیج دیا۔ لمبا تڑنگا بارعب سجاول سیالکوٹی پھیل کر ایک گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے ڈرائی فروٹ سے بھری ہوئی دو پلیٹیں تھیں اور قہوے کے برتن رکھے تھے۔ میں ''مؤدب'' کھڑا رہا۔ اس نے مجھے اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے آلتی پالتی کے بجائے دوزانو بیٹھنا مناسب سمجھا۔

اس نے میرا حال چال دریافت کیا۔ پھر بارعب لہجے میں بولا۔ ''ملنگوں کے ڈیرے کے بارے میں تم نے جو کچھ بتایا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ ''موٹی مرغی'' ہیں۔ ان کے پاس چڑھاوؤں اور نذر و نیاز کا کافی روپیہ ہوگا۔ مجھے پتا ہے ایسے مزاروں پر لوگ نقدی کے علاوہ زیور اور دوسری قیمتی چیزیں بھی چڑھاتے ہیں۔''

''بالکل جی، ایسا ہی ہے۔'' میں نے ہاں میں ہاں ملائی۔

سجاول کی آنکھوں میں شکاری چمک ابھر آئی تھی وہ بولا۔ ''ایسے لوگوں سے چھیننا پاپ نہیں پُن ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ ان ملنگوں کی ایسی تیسی کی جائے تو روپیہ نکلے گا ان کے پاس سے؟''

''نکلنا تو چاہیے جی۔ مگر ہیں یہ خچرے لوگ۔ کیا پتا جمع پونجی مزار کے بجائے کہیں اور رکھتے ہوں۔''

''مزار کے اندر کے حصے میں کتنے محافظ ہوتے ہوں گے؟''

''ہم زیادہ اندر تو نہیں گئے جی لیکن سکیورٹی وغیرہ تو بڑی رکھی ہوئی ہے انہوں نے۔''

اچانک سجاول سیالکوٹی کے قیمتی سیل فون کی بیل ہونے لگی۔ اس نے کال ریسیو کی اور باتیں کرنے لگا۔ اس کی گفتگو میں عالمگیر کا لفظ سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ یقیناً یہ وہی عالمگیر تھا جسے میں نے اپنے اتارے ہوئے فوٹوگرافز کی مدد سے اس کے رشتے دار ٹوانہ سے لڑایا تھا اور جیل پہنچایا تھا۔ سجاول اپنے کسی دوست سے بات کر رہا تھا۔ اس نے عالمگیر کے وکیل کو ماں کی گالی دیتے ہوئے اپنے دوست سے کہا۔ ''بس ایک پیشی اور دیکھ لو۔ پھر دفع کرو اس کو۔ ہم نے دو مہینے کے اندر اندر عالمگیرے کی ضمانت کرانی ہے اور ہر صورت کرانی ہے۔''

دوسری طرف سے کچھ کہا گیا جس کے جواب میں سجاول دہاڑا۔ ''اس پیدا گیر کو تو میں دیکھ لوں گا۔ اس کی بیٹی کو لاہور کی ہیرا منڈی میں نہ نچوایا تو سجاول نام نہیں۔ بہت دیکھے ہیں ایسے بہن خور افسر۔''

فون بند کر کے اس نے مونچھوں کو سہلایا اور نیا سگریٹ سلگانے لگا۔ وہ جانتا نہیں تھا کہ وہ جس عالمگیرے کو جیل سے باہر لانے کی باتیں کر رہا ہے، اسے جیل میں پہنچانے والا اس سے بس دو فٹ دوری پر بیٹھا ہے۔ مجھے ہر گھڑی یہ دھڑکا بھی لگا ہوا تھا کہ سجاول کے اس ٹھکانے پر اس کا کوئی ایسا بندہ موجود نہ ہو جو مجھے یا تاجور کو پہچانتا ہو۔ بہرحال اس حوالے سے ابھی تک تو خیریت ہی تھی۔

اس سے پہلے کہ میری اور سجاول کی گفتگو کا سلسلہ بحال ہوتا، اس کے سیل فون کی گھنٹی پھر بج اٹھی۔ اس نے دوبارہ کال ریسیو کی۔ اس مرتبہ کوئی زیادہ خاص بات تھی وہ بات کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ اتنے میں ایک ملازم آیا اور اس نے گرما گرم قہوہ لا کر رکھ دیا۔ قہوے کی خوشبو اشتہا آمیز تھی مگر مجھے سجاول کی واپسی کا انتظار کرنا تھا۔ ملازم قہوہ رکھ کر واپس چلا گیا تھا۔ میں تکیے سے ٹیک لگا کر اور ذرا ایزی ہو کر بیٹھ گیا۔ ذہن عالمگیر اور اسحاق وغیرہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسی دوران میں دروازے کی طرف سے ایک بھاری نسوانی آواز آئی۔

''سجاولے......اوسجاولے۔''

چند سیکنڈ بعد ایک لحیم شحیم عورت اندر داخل ہوئی۔ اس کی عمر 55 سال سے اوپر ہی ہو گی۔ چہرہ رعب دار تھا۔ اس نے ایک موٹی اونی شال اوڑھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹکی۔ پہلے اس کے چہرے پر حیرت اور پھر خوشی کے آثار نمودار ہوئے۔ وہ میری طرف انگلی اٹھا کر لرزتی آواز میں بولی۔ ''تم......سجاولے کے ساتھ ہی آئے ہونا؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''نیازیوں کے پتر ہونا......؟'' اس نے پوچھا اور پھر میرے جواب دینے سے پہلے ہی جیسے خوشی سے چلا اٹھی۔ ''مجھے پتا تھا، تم آؤ گے......ضرور آؤ گے۔ میں صدقے جاواں، واری جاواں......بالکل ویسے ہی ہو جیسا میں نے سوچا تھا۔ اونچے لمبے، سوہنے۔''

میں حیرت کے عالم میں اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے لپک کر مجھے گلے سے لگا لیا۔ میرا منہ، سر چومنے لگی۔ پھر وہ دروازے کی طرف منہ کر کے پکاری۔ ''اوئے دینو......اوئے فخرو۔ کہاں مر گئے ہو......ادھر آؤ......جلدی آؤ۔ شگن کرو۔ میرا پتر آیا ہے۔ میرے گھر کی رونق آئی ہے۔''

''ماں جی......میں نے تو......''

''بس بس......اب کچھ نہیں کہنا۔ میں وہی کروں گی جو میری مرضی ہے، اس نے مجھ پر بوسوں کی بارش کر دی۔ میری گردن کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''یہ دیکھ......یہ تل بھی ہے تیری گردن پر۔ یہ بھی اس بات کی نشانی ہے کہ تُو ہی میری مانی کا سہاگ بنے گا۔ تُو ہی بنے گا۔''

وہ مجھ پر قربان ہوئی جا رہی تھی۔ پتا چل رہا تھا کہ اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے۔

میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ لپکتی ہوئی باہر چلی گئی۔ دو منٹ بعد واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں سو سو کے سرخ نوٹوں کی دو گڈیاں تھیں۔ اس کے پیچھے پانچ چھ ملازم لپکتے ہوئے آ رہے تھے۔ عورت نے مجھ پر نوٹ نچھاور کرنے شروع کر دیئے۔ ملازم جھپٹ جھپٹ کر یہ نوٹ اکٹھے کرنے لگے۔ نوٹ ختم ہوئے تو اس نے چوڑی ناک والے فخرو سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''کھڑا منہ کیا دیکھ رہا ہے پھینے! (چپٹی ناک والے) جا جلدی سے دنبہ لے کر آ۔ جلدی کر۔''

فخرو چند سیکنڈ تذبذب میں رہا مگر جب عورت نے اسے ڈانٹ پلائی تو وہ جلدی سے باہر نکل گیا۔ لحیم شحیم عورت مجھے بازو سے پکڑ کر کھینچتی ہوئی ایک اندر کے کمرے میں لے آئی۔ یہ سجا سجایا کمرا تھا۔ اس میں رنگین پایوں والی مسہری اور بان کی رنگین کرسیاں وغیرہ رکھی تھیں۔

وہ دیوانے پن سے بولی۔ ''تُو یہاں بیٹھ پتر۔ تُو کوئی مہمان نہیں ہے۔ تُو تو گھر کا بندہ ہے۔ اس گھر کی رونق ہے...... پتا نہیں کب سے تجھے اڈیک رہی تھی میں۔''

میں نے کہا۔ ''ماں جی! آپ پہلے سجاول صاحب سے بات کر لیں پھر آپ کو سب کچھ پتا چل جائے گا۔''

''مجھے کچھ بتانے کی لوڑ نہیں۔ مجھے سب پتا چل گیا ہے۔ اس نے کل ہی مجھے بتا دیا تھا سب کچھ۔''

وہ لپک کر ایک الماری کی طرف گئی اور اس میں سے ایک امام ضامن جیسی چیز نکال لائی۔ اس نے میری کوئی بات سنے بغیر یہ شے میری کلائی پر باندھ دی اور ایک بار پھر میرے ماتھے کا طویل بوسہ لیا۔ اسی دوران میں کمرے کے دوسرے دروازے کی طرف دنبے کی آواز سنائی دی۔ یہ دروازہ ایک برآمدہ نما جگہ پر کھل رہا تھا۔ عورت مجھے اپنے ساتھ برآمدے میں لے آئی۔ سیاہی مائل رنگ کا ایک موٹا تازہ ترکی دنبہ برآمدے میں کھڑا تھا۔ اس کی رسّی چوڑی ناک والے فخرو کے ہاتھ میں تھی۔ تین چار مزید افراد بھی یہاں موجود تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں تیز دھار چھرا تھا۔

سجاول سیالکوٹی مجھے اس سچویشن میں پھنسا کر خود نہ جانے کہاں دفع ہو گیا تھا۔ دو افراد نے نہایت صحت مند دنبے کو میرے پاؤں میں لٹایا اور پھر اسے ذبح کر دیا۔ عورت خوشی سے نہال ہو گئی۔ اس نے ایک بار پھر میرا بازو پکڑا اور مجھے تقریباً گھسیٹتی ہوئی واپس کمرے میں لے آئی۔ کرسی پر مخمل کا کشن رکھتے ہوئے اس نے مجھے بیٹھنے کی ہدایت کی۔ میں ہچکچاتا ہوا بیٹھ گیا۔ وہ پکاری۔ ''اوے دینو! کہاں مر گیا ہے؟''

دینو بھاگا ہوا آیا۔

عورت نے کہا۔ ''وہ قہوے کے بھانڈے اور مونگ پھلیاں ریوڑیاں ادھر لے کر آ...... یہاں۔''

دینو ایک بڑی ٹرے میں سب کچھ رکھ کر اس کمرے میں لے آیا۔ وہ یہ اشیا میز پر سجانا چاہتا تھا مگر میز پر کچھ دوائیں وغیرہ رکھی تھیں۔ عورت نے بڑے جذباتی انداز میں یہ دوائیں اٹھائیں اور انہیں، دروازہ کھول کر باہر برآمدے میں پھینکنے لگی۔ ''مجھے نہیں لوڑ (ضرورت) اب ان دواؤں کی۔ اب میرا جوائی پتر آ گیا ہے۔ اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بالکل ٹھیک ہوں۔'' وہ لرزاں آواز میں بولی۔ ملازم دم بخود کھڑے تھے۔ اسی دوران میں میری نظر اونچے لمبے بارعب سجاول پر پڑی۔ وہ برآمدے کی طرف سے کمرے کی جانب آ رہا تھا۔ اس نے

عورت کو دوائیں پھینکتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور وہ ذبح شدہ دنبہ بھی دیکھ لیا تھا جس کی گردن سے ابھی تک خون ٹپک رہا تھا۔ ملازم دینو مؤدب انداز میں سجاول کے پہلو میں چل رہا تھا اور ساتھ ساتھ اس کو صورتِ حال کے بارے میں بتا رہا تھا۔ سجاول کے چہرے پر حیرت اور تشویش کی ملی جلی کیفیت تھی۔ وہ قریب پہنچا تو عورت نے اس کی بھی بلائیں لینا شروع کر دیں۔ وہ اس کا سر چومتے ہوئے بولی۔ ''تُو نے میرا کلیجا ٹھنڈا کر دیا۔ مجھے پتا تھا تُو اس بار وعدہ ضرور پورا کرے گا۔ یہ دیکھ...... یہ دیکھ۔ میں نے تجھ سے کہا تھا نا کہ اس کی ناک اونچی ہوگی، اس کی گردن پر تل ہوگا۔ یہ دیکھ...... یہ ہے تل۔ یہ ہے۔'' اس نے میری گردن پر انگلی رکھی۔ اس کے لہجے میں دیوانگی کی جھلک تھی۔

سجاول نے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر ارادہ بدل دیا۔ شاید وہ عورت کی حالت دیکھتے ہوئے اسے کوئی شاک پہنچانا نہیں چاہتا تھا۔ یہ کیا صورتِ حال تھی، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بہرطور جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ تحیم شحیم عورت جسے یہاں سب ماؤ جی کہتے ہیں دراصل سجاول کی والدہ ہے اور اس کی ذہنی صحت ٹھیک نہیں۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لپٹانے لگی اور میری بلائیں لینے لگی۔ تھوڑی ہی دیر میں میرے سامنے دیہاتی مٹھائی اور فروٹ وغیرہ کا ڈھیر لگ گیا۔ دو بڑے بڑے گلاسوں میں گرما گرم تازہ دودھ لایا گیا جس پر بہت سی ملائی تیر رہی تھی۔ عورت کے کہنے پر میں نے اور سجاول نے مٹھائی کھائی اور دودھ پیا۔

اسی دوران میں عورت جسے بڑے احترام سے ماؤ جی کہا جا رہا تھا، بہت جذباتی انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی۔ ''میں مانی کو خوش خبری سنا کر آتی ہوں۔ تم دونوں ادھر ہی بیٹھو، باتیں شاتیں کرو۔ میں ابھی آتی ہوں۔''

وہ اپنے بھاری بھرکم جسم کو جھلاتی اور اپنی قیمتی شال سنبھالتی ہوئی باہر نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد سجاول کے تاثرات بدل گئے اور اس کے چہرے پر مسکراہٹ کے بجائے خشونت برسنے لگی۔ بڑی سنجیدگی سے بولا۔ ''ماؤ جی کے ساتھ ایک بڑا مسئلہ ہے۔ اپنی ایک پوتی کو انہوں نے ماں بن کر پالا ہے۔ اس کی ماں ایک ایکسیڈنٹ میں فوت ہوگئی تھی اور باپ بالکل ناکارہ، بیمار ہے۔ اس لڑکی کا نام مہناز ہے، ہم اسے مانی کہتے ہیں۔ ماں جی اس کے ویاہ کے لیے بہت زیادہ فکرمند رہتی ہیں۔ بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اس کی فکر نے ان کو بستر پر ڈال دیا ہے۔ بہت سمجھ بوجھ والی ہیں پر کسی وقت دیوانوں کی سی بات کرنے لگتی ہیں۔ مانی کی عمر چھبیس ستائیس سال ہو چکی ہے پر ابھی تک اس کا کوئی مناسب بر نہیں ملا۔ کچھ دن پہلے میں نے انہیں ایک لڑکے کا بتایا تھا لیکن......''

ایک دم سجاول کو چپ ہونا پڑا۔ ماؤ جی جھومتی ہوئی واپس آ رہی تھیں۔ ان کے ساتھ ایک کارندہ تھا۔ اس کے ہاتھ میں جدید طرز کا کیمرا تھا۔ اس نے ماؤ جی کے سامنے ہی کھٹ کھٹ میری چار پانچ تصویریں مختلف زاویوں سے اتاریں اور ماؤ جی کے ساتھ واپس چلا گیا۔

سجاول نے پریشانی کے عالم میں اپنی چوڑی چکلی پیشانی مسلی اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''میں نے ماں جی کو ایک لڑکے کا بتایا تھا۔ مانی کے جوڑ کا ہی تھا۔ میں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ اس ہفتے کے اندر اسے یہاں لے کر آؤں گا۔ لیکن ایک مسئلہ ہو گیا۔ اس کے ٹھیکیدار باپ نے اسے کہیں آگے پیچھے کر دیا ہے۔ بہت اعلیٰ نسل کا کنجر ہے اس کا باپ۔ بہر حال کچھ بھی ہے، ہفتے دو ہفتے میں، میں اسے ڈھونڈ لوں گا۔ لیکن یہاں سچویشن کچھ فلموں، ڈراموں والی ہوگئی ہے۔ ماں جی تمہیں ہی وہ لڑکا سمجھ رہی ہیں۔ اب یہ کسی طور ٹھیک نہیں کہ انہیں کسی طرح کا دھچکا پہنچایا جائے۔ ان کی حالت پھر بگڑ سکتی ہے۔''

وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے نیازمندی سے کہا۔ ''آپ بتاؤ جی آپ کیا چاہتے ہیں مجھ سے؟''

''میں چاہتا ہوں کہ جب تک وہ مل نہیں جاتا تم خود کو ماں جی کے سامنے وہی ظاہر کرو اور جس طرح وہ کہہ رہی ہیں، ویسا ہی کرو۔ وہ مل جائے گا...... اور مجھے یقین ہے کہ ضرور مل جائے گا...... تو میں ماں جی کو خود ساری بات بتا کر اطمینان دلا دوں گا۔''

''مجھے کتنے دن یہاں رہنا ہوگا؟''

وہ بے رخی سے بولا۔ ''ہوسکتا ہے کہ دو چار دن، یا پھر دو چار ہفتے بھی لگ سکتے ہیں۔''

''اور اگر وہ لڑکا نہ ملا تو پھر؟''

''دماغ کو زیادہ لمبا نہ دوڑاؤ۔ بس جو کہہ رہا ہوں وہ کرو۔ اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔'' سجاول کا لہجہ خشک ہو گیا۔

''لیکن میری بیوی ہے...... یہ چکر اسے بہت پریشان کر دے گا۔''

''اسے بتا دو کہ کیا مجبوری ہے۔ عقل مند ہوئی تو سمجھ جائے گی لیکن جو کچھ بھی ہے ایک بات میں تمہیں صاف صاف بتا دوں۔ ماں جی کو تمہاری یا تمہاری بیوی کی وجہ سے کوئی دھچکا لگا تو پھر تمہارے لیے ٹھیک نہیں ہوگا۔ چاچے فیض نے تمہیں میرے بارے میں کچھ نہ کچھ تو بتا ہی دیا ہوگا۔ ہوسکتا ہے، تم نے خود بھی تھوڑا بہت سن رکھا ہو۔''

''ہاں جی، آپ کو کون نہیں جانتا۔ میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ زندگی میں اس

طرح آپ سے ملاقات ہو گی۔ آپ کے بندوں کی بڑی مہربانی ہے کہ انہوں نے ملنگوں سے ہماری جان چھڑائی۔ اس کے علاوہ آپ سے اس بات کی معافی بھی چاہتا ہوں کہ میں نے آپ کے بندوں سے جھگڑا کیا۔ دراصل میری بیوی......''

''وہ سارا واقعہ فیض نے مجھے سنا دیا ہے۔'' سجاول نے ہاتھ اٹھا کر میری بات کاٹی اور ڈرائی فروٹ کی ایک مٹھی اپنے بہت بڑے منہ میں جھونک کر بولا۔ ''حرکت تو وہ تمہاری غلط ہی تھی لیکن جو کچھ بھی ہے اس سے تمہاری جی داری کا ثبوت ملتا ہے اور جی دار مجھے پسند ہیں۔ تم پڑھے لکھے بھی لگتے ہو۔ بہادری اور پڑھائی لکھائی ایک ساتھ کم ہی ہوتی ہے۔ مجھے تمہارے جیسے ایک بندے کی لوڑ بھی ہے۔ چلو اس بارے میں پھر بات کریں گے۔''

اسی اثنا میں سجاول سیالکوٹی کے قیمتی موبائل فون کی گھنٹی ایک بار پھر بج اٹھی۔ اس نے کال ریسیو کی اور ایک بار پھر بات کرتے ہوئے باہر نکل گیا۔ وہ ایک دم بہت سنجیدہ دکھائی دینے لگا تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے دیکھا کہ سجاول کہیں جانے کے لیے تیار نظر آرہا ہے۔ اس نے سیاہ چادر کی بکل کے نیچے مشین پسٹل کندھے سے لٹکا لیا تھا۔ اس کے مسلح ساتھی اس کے اردگرد موجود تھے اور وہ بھی تیار دکھائی دیتے تھے۔ سجاول نے ایک اچٹتی سی نظر مجھ پر ڈالی، پھر بوڑھے فیض محمد کو ایک طرف لے جا کر کچھ ہدایات دینے لگا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ ہدایات میرے بارے میں ہی ہیں۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا اس نے فیض محمد سے کہا تھا کہ ماؤ جی کو میری حقیقت سے آگاہ نہیں ہونا چاہیے۔ انہیں یہی معلوم رہنا چاہیے کہ سجاول مجھے بر دکھاوے کے لیے یہاں لے کر آیا ہے۔

چند منٹ بعد سجاول اور اس کے ساتھی عجلت میں کہیں روانہ ہو رہے تھے۔ میں نے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں بھی سنیں، جو بتدریج دور ہوتی چلی گئیں۔ یقینی بات تھی کہ اس جگہ تک جیپ یا گاڑی وغیرہ کی رسائی نہیں تھی۔ لہٰذا یہ لوگ گھوڑے اور خچر استعمال کرتے تھے۔ میرے ذہن میں یہ اندیشہ بھی سر اٹھانے لگا کہ کہیں یہ ملنگوں والا ہی معاملہ نہ ہو۔ کل والے واقعے میں تو سجاول کے ساتھیوں نے ملنگوں کو بھگا دیا تھا، یہ عین ممکن تھا کہ وہ پھر آگئے ہوں لیکن ایسی بات ہوتی تو سجاول یا فیض مجھ پر احسان جتانے کے لیے اس کا ذکر ضرور کرتے۔ ویسے بھی جس طرح ملنگوں کی کمر ٹوٹی تھی امکان تھا کہ وہ اس طرح کا ایڈونچر نہیں کریں گے۔ میں واپس جانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ ماؤ جی پھر آدھمکی۔ اس مرتبہ اس کے پاس ایک کارڈ سائز تصویر تھی۔ یہ تصویر ایک خوبرو لڑکی کی تھی۔ بھرے بھرے جسم والی یہ لڑکی چست پتلون اور بغیر آستین کی شرٹ پہنے کرتن کر کھڑی تھی۔ اس کے بال بوائے کٹ تھے۔

ماؤ بولی۔ ''یہ ہے مانی۔ کیسی لگی؟''

''اچھی ہے۔'' میں نے کہا۔

''طبیعت کی تھوڑی تیز ہے لیکن دل کی بہت چنگی ہے۔ تم ایک دو بار ملو گے تو خود جان جاؤ گے۔'' پھر وہ ذرا توقف کر کے کہنے لگی۔ ''تم سمجھتے ہو گے کہ یہ میری بیٹی ہے لیکن یہ میری پوتری ہے۔ میں نے اسے بڑے لاڈوں سے پالا ہے۔''

اس کے بعد وہ اپنی اس مانی نامی پوتی کی تعریفوں میں مصروف ہو گئی۔ وہ بتا رہی تھی کہ مانی کی ماں ایک ایکسیڈنٹ میں ماری گئی تھی۔ اس وقت مانی صرف چھ سات سال کی تھی۔ مانی کا والد سجاول کا بڑا بھائی تھا۔ بیوی کی موت کے بعد وہ سگریٹ اور شراب کے نشے میں ڈوب گیا۔ کسی کام کا نہ رہا۔ اپنی پوتی مانی کی پرورش ماؤ نے ماں بن کر کی۔ اب وہ اس کے ہاتھ پیلے دیکھنا چاہتی تھی، مگر یہ مراد پوری ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ مانی کی پسند کا بر نہیں مل رہا تھا اور وہ اپنی پسند کے بغیر ہرگز شادی کرنا نہیں چاہتی تھی۔

ہماری گفتگو جاری تھی کہ میں نے اختری بی بی کو دیکھا۔ وہ سیدھی ہماری ہی طرف آ رہی تھی۔ مجھے لگا کہ وہ مجھ سے ہی کچھ کہنے کے لیے آ رہی ہے (بعدازاں یہ خیال درست ثابت ہوا۔ وہ بتانے آئی تھی کہ شمسہ (یعنی تاجور) کے سر میں شدید درد ہے۔ وہ روئے جا رہی ہے اور مجھے بلا رہی ہے لیکن اس سے پہلے کہ اختری کمرے کے اندر پہنچتی اور مجھ سے کچھ کہتی۔ ماؤ جی اپنے مخصوص جذباتی انداز میں بول اٹھی۔ ''نی اختری! تو کہاں مر گئی تھی۔ یہ دیکھ، یہ کتنی بڑی خوش خبری آئی ہے ہمارے لیے۔'' ماؤ نے یہ بات کہتے ہوئے میری طرف اشارہ کیا۔

اختری بی بی منہ کھولے میری طرف دیکھنے لگی۔

ماؤ نے بات جاری رکھی۔ ''اوپر والے نے ہماری سن لی۔ مانی کا بر مل گیا ہے۔ اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ بس دیکھنا...... دو چار دن کی بات ہے۔''

''مم...... میں سمجھی نہیں جی؟'' اختری نے کہا۔

ماؤ جوش سے بولی۔ ''سجاولے نے کہا تھا نا کہ ایک دو دن میں وہ وعدہ پورا کر دے گا۔ اس نے کر دیا ہے۔ آ گیا ہے یہ شاہ زیب۔''

اختری چند لمحے گم صم رہی۔ پھر اس نے ماؤ کو کوئی اشارہ کیا اور اسے لے کر ساتھ والے کمرے میں چلی گئی۔ میں سمجھ گیا کہ سجاول سیالکوٹی کی ہدایت کے برعکس کام ہونے والا ہے۔ وہ ملازمین کو ہدایت دے کر گیا تھا کہ ماؤ جی کو میری اصلیت کا پتا نہ چلے۔ یہ ہدایت غالباً ابھی تک اختری کو نہیں پہنچی تھی اور وہ ماؤ کے سامنے سارا خلاصہ کھولنے والی تھی۔

وہی ہوا جو میں سوچ رہا تھا۔ ساتھ والے کمرے میں دونوں عورتوں کے درمیان جو باتیں ہورہی تھیں، ان میں سے کچھ الفاظ میرے کانوں تک بھی پہنچ رہے تھے۔ میں نے اردگرد دیکھا، کوئی اور موجود نہیں تھا۔ میں نے دروازے سے کان لگائے۔

اختری کہہ رہی تھی۔ ''میں ابھی اس کے پاس سے ہی اٹھ کر آئی ہوں۔ وہ بیوی ہے اس کی۔ شمسہ نام ہے۔ مجھے تو یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس کا پاؤں بھاری ہے۔ پر مجھے شک پڑ رہا ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ اس کی طبیعت شاید ویسے ہی خراب ہے۔ یا مکر کررہی ہوگی، لیکن ایک بات میں آپ کو بالکل پکی بتارہی ہوں۔ وہ اس شاہ زیب کی بیوی ہے۔''

چند لمحے خاموشی رہی، پھر ماؤ کی آواز ابھری۔ ''تمہاری بات سن کر میرا یقین اور پکا ہو گیا ہے کہ یہ منڈا، مانی کا گھر والا ضرور بنے گا، بلکہ سمجھو کہ بن گیا ہے۔'' ماؤ کی آواز میں دبا دبا جوش تھا۔

''آپ ایسا کیوں کہہ رہی ہیں؟'' اختری نے حیرت سے پوچھا۔

''پیرو سائیں نے کہا تھا۔ انہوں نے گلاب کے عرق سے وضو کر کے پوری ''فال'' نکالی تھی۔ انہوں نے بتایا تھا کہ ہوسکتا ہے کہ مانی کا ہونے والا شوہر پہلے سے شادی شدہ ہو۔ اگر وہ شادی شدہ ہوا تو اس کی گھر والی اپنے پہلے بچے کی پیدائش سے پہلے ہی مر جائے گی۔ اس کے بعد وہ مانی سے شادی کرے گا۔ بہت چنگی زندگی دے گا اسے۔ ساری عمر پاؤں دھو دھو پیے گا۔''

''پر اس منڈے شاہ زیب اور کڑی کو تو یہ لوگ کہیں سے پکڑ کر لائے ہیں۔ وہ کڑی اب تک اتھرو ڈیگ رہی ہے۔'' (آنسو بہا رہی ہے)

ماؤ نے بے پروائی سے کہا۔ ''ہمیں ان باتوں سے کیا لینا۔ ہمیں تو اپنے کام سے کام ہونا چاہیے۔ بس یہ منڈا یہاں آ گیا ہے، یہی کافی ہے۔''

''پر ماؤ جی، یہ شادی شدہ ہے۔ کیا اس کو ہماری مانی بی بی قبول لے گی؟''

''مجھ سے زیادہ مانی کو کوئی نہیں جانتا۔ یہ اسی طرح کا ہے جس طرح کا وہ چاہتی ہے۔ تم دیکھنا سب ٹھیک ہو جائے گا......''

شاید میں کچھ اور باتیں بھی سننے میں کامیاب ہو جاتا مگر اسی اثنا میں ایک مسلح شخص برآمدے میں منڈلانے لگا اور مجھے یک لخت دروازے سے پیچھے ہٹنا پڑا۔ کچھ ہی دیر بعد اختری اور ماؤ جی باہر آ گئیں۔ میں اختری کے ساتھ تاجور کی طرف چل دیا۔ اس موقع پر ماؤ نے مجھ سے اور کوئی بات نہیں کی۔

تاجور منہ سر لپیٹے لیٹی ہوئی تھی۔ وہ رات کو بھی نوری اور چاچا رزاق کے لیے روتی رہی تھی اس کے سر میں درد شروع ہو گیا تھا۔ میں نے اسے دوا دی اور تسلی تشفی دینے لگا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے بکھرے بال جُوڑے کی صورت میں سمیٹے اور شال جسم کے گرد لپیٹ لی۔ لالٹین کی روشنی میں اس کے شفاف رخسار سونے کے رنگ کے دکھائی دے رہے تھے۔ غلافی آنکھوں میں نیند کی جھلک تھی۔ چند قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ تب میں نے دیکھا کہ دو افراد کے ہمراہ ایک لمبا تڑنگا شخص کھڑکی کے سامنے آیا۔ اس کی بڑھی ہوئی شیو کانٹوں کی طرح تھی۔ ہونٹ سیاہ اور آنکھوں میں سرخی تھی۔ عمر چالیس کے قریب رہی ہوگی۔ میں اسے دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ یہ سجاول کا وہی بگڑا تگڑا بھائی ہے جس نے مبینہ طور پر بیوی کی موت کے بعد خود کو شراب میں غرق کر رکھا ہے۔ اس نے اپنا بہت بڑا تھوبڑا کھڑکی کے ساتھ لگایا اور بھکی آواز میں بولا۔ "ہاں بھئی کہاں ہے وہ سوہنی چھوکری جسے فیض لے کر آیا ہے؟"

اس کو دیکھ کر تاجور نے جلدی سے نقاب کر لیا، بس اس کی پیشانی اور آنکھیں ہی دکھائی دیتی رہیں۔ سجاول کے بھائی نے تاجور کو سرتاپا دیکھا، جیسے آنکھوں سے ایکسرے لے رہا ہو۔ پھر اس کے چہرے کی خباثت بڑھ گئی۔ بڑی بے باکی سے بولا۔ "آہو فخرو، پیس تو اچھا ہے۔ چلو نکالو اس کو ڈربے سے باہر اور میرے کمرے میں پہنچاؤ۔ آج رات اس کو 'چیک' کرتا ہوں۔"

فخرو بولا۔ "چابی چاچے فیض کے پاس ہے۔"

"فیض سے چابی لے کر آؤ۔ نہیں تو توڑ دو تالا۔ میں پندرہ منٹ کے اندر اس "ٹوٹے" کو اپنے بستر پر دیکھنا چاہتا ہوں۔ پر پہلے اس کو گرم پانی سے ذرا تاری شاری لگوا لو (یعنی غسل کرا لو)۔"

وہ ایسے بول رہا تھا، جیسے کوئی راجا مہاراجا ہو، اور اپنے حرم میں نظر آنے والی کسی خوب صورت لونڈی کو دیکھ کر کپڑوں سے باہر ہونے لگا ہو۔

وہ جانتا نہیں تھا، کمرے کے اندر چند فٹ کی دوری پر نظر آنے والی یہ لڑکی اس سے اتنی ہی دور تھی جتنا مشرق سے مغرب۔ اگر وہ واقعی اس تک پہنچنے کی کوشش کرتا تو پھر اسے آگ کے ایک دریا سے گزرنا پڑتا۔

اس نے کوارٹر بوتل کی آدھی وسکی ایک ہی بڑے گھونٹ میں اپنے اندر انڈیلی اور ہاتھ لہرا کر لوفر انداز میں گانے لگا۔

آجا میری رانی لے جا ایک شے نشانی...... ایک شے نشانی......

رات بھر جام سے جام ٹکرائے گا......
جب نشہ چھائے گا تب مزہ آئے گا......
پھر میری رانی پوچھے گی۔
ویکھ وے دن چڑھیا کہ نئیں......
اور میں کہوں گا......میں کہوں گا۔
اے تے ہور گنڈاں ہون گیا پکیاں نی توں جہاں زور لائیں گی......

وہ کئی گانوں کو آپس میں مکس کر رہا تھا اور ٹن حالت میں لڑکھڑا رہا تھا۔ وہ واقعی ایک خطرناک شخص تھا۔ اب میری سمجھ میں فیض محمد کی یہ بات آ رہی تھی کہ اس نے آتے ساتھ ہی مجھے یہ ہدایت کیوں کی تھی کہ میں تاجور کو اپنی بیوی بتاؤں، ورنہ اس کی عزت بچانا مشکل ہو جائے گی۔

کچھ اور افراد بھی تماشا دیکھنے کے لیے کھڑے ہو گئے تھے۔ اتنے میں چاچا فیض، فخرو کے ہمراہ آتا دکھائی دیا۔ اس نے آتے ساتھ ہی کہا۔ ''وڈے سردار، چابی تو میرے پاس نہیں ہے۔ وہ سجاول سردار ساتھ لے گئے ہیں۔''

''کب آئے گا وہ؟''

''پتا نہیں جی۔ ایک دو گھنٹے تو لگ ہی جانے ہیں۔''

اس نے اپنے سینے پر ہاتھ پھیرا۔ ''اوئے، اتنی ملائم کڑی کے لیے اتنی دیر کون اڈیکے گا۔ توڑ دو تالا۔ اور اسے تاری لگوا کر پہنچاؤ میرے کمرے میں۔''

فیض محمد نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ ''وڈے سردار یہ شادی شدہ ہے اور...... پاؤں بھی بھاری ہے اس کا۔''

وڈے سردار نے چونک کر فیض کی طرف دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا جوش وخروش بھی کچھ ٹھنڈا پڑتا محسوس ہوا۔ غالباً اس وڈے سردار کے لیے سجاول سیالکوٹی نے یہ قاعدہ بنا رکھا تھا کہ وہ بیاہی اور بچے والی عورتوں کو معاف رکھے گا۔ لیکن فی الوقت اس آوارہ شرابی پر نشہ اتنا حاوی ہو چکا تھا کہ وہ یہاں کے قانون قاعدوں کو بھی زیادہ اہمیت نہیں دے رہا تھا۔ اس نے تالے کو زور سے جھنجوڑا اور بولا۔ ''شادی شدہ ہے تو اس کے خصم سے اجازت لے لیتے ہیں۔ نوٹ شوٹ دے دیتے ہیں اس کو۔''

اس نے جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور نیلے رنگ کے کئی نوٹ ہوا میں لہرائے۔ میں سکون سے بیٹھا رہا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ فیض محمد کیا کرتا ہے۔ فیض محمد بڑی مشکل سے منت

ترلا کر کے ڈگمگاتے ہوئے شرابی سردار کو ایک جانب لے گیا اور اسے کچھ سمجھایا۔ جھلاہٹ کے عالم میں سردار نے شراب کی بوتل نیچے پٹخ کر توڑ ڈالی اور فیض کی گردن پکڑ کر بولا۔ ''تُو بالکل کھڑوس ہو گیا ہے۔ لے کر بھی آیا تو بیمار گابھن بکری پکڑ لایا۔ کوئی اتھری ہرنی لے کر آنی تھی۔ سارے موڈ کا کباڑا کر دیا ہے تُو نے۔ اب رات تم میں سے کس کی ہمشیرہ کے ساتھ گزاروں گا؟''

وہ ڈگمگاتا اور جھومتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ پھر رخ پھیرے بغیر زور سے بولا۔ ''کوئی اور انتظام کرو۔ نہیں تو صبح ٹنڈیں کرا دوں گا تم سب کی۔''

یہاں کے وڈے سردار سے ہماری یہ پہلی ملاقات تھی۔ سجاول کا بڑا بھائی ہونے کی وجہ سے اس نشئی کو سردار کہا جاتا تھا ورنہ اصل حکم تو سجاول کا ہی چلتا تھا۔ اس کا نام اعظم جاہ معلوم ہوا۔ اب مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ کل غل غپاڑے کی جو آوازیں آ رہی تھیں، وہ بھی اسی نشئی کی تھیں۔

کچھ دیر بعد فیض محمد پھر ہمارے پاس کوٹھڑی کی کھڑکی کے سامنے آیا۔ تاجور لحاف اوڑھ کر بے حرکت لیٹی تھی۔ پتا نہیں سو رہی تھی یا جاگ رہی تھی۔ وہ سرگوشیوں میں مجھ سے باتیں کرنے لگا۔ ''فکر نہ کر شاہ زیب! کچھ نہیں ہو گا تیری منگیتر کو۔ سردار سجاول ایسے معاملوں میں بڑا سخت ہے۔ کوئی بہت زیادہ مجبوری کی بات نہ ہو ورنہ وہ شریف عورت پر ہاتھ نہیں ڈالتا۔ اپنے اس نشئی بھائی کی ضرورت پوری کرنے کے لیے یہ بازاری عورتوں کا انتظام کر لیتا ہے۔ اس وقت بھی تین چار کسبیاں ہیں یہاں۔ راولپنڈی سے لایا ہے سردار سجاول۔ پندرہ بیس دن تو گزر ہی جائیں گے اس کے۔''

''پندرہ بیس دن؟ کیا مطلب؟''

''ایک عورت سے ایک ہفتے میں دل بھر جاتا ہے اس کا۔ پھر اس سے لڑ جھگڑ کر بھگا دیتا ہے اسے۔''

میں نے پوچھا۔ ''یہ سردار سجاول کا سگا بھائی ہے؟''

''سگا ہی ہے تو اس کے سارے کرتوت برداشت ہو رہے ہیں نا یہاں۔ کوئی اور ہوتا تو کب کا جیل میں یا پھر قبر میں سڑ رہا ہوتا۔''

''سنا ہے اس کی بیوی کسی ایکسیڈنٹ میں مر گئی تھی۔ اس کے بعد سے اس کی حالت ایسی ہوئی؟''

فیض محمد کے ہونٹ بے ساختہ طنزیہ انداز میں کھنچ گئے۔ ہولے سے بولا۔ ''ایکسیڈنٹ

وغیرہ میں نہیں مری تھی۔ کوئی اور چکر تھا خانہ خراب کا...... چلو چھوڑو ان باتوں کو۔ میں تمہیں صرف یہ بتانے آیا ہوں کہ تم شمسہ (تاجور) کی طرف سے ذرا سا فکر بھی دل میں نہ لانا۔ اس کو یہاں کانٹا چبھنے کی تکلیف بھی نہیں ہوگی۔ سمجھو میں ہر وقت اس کی نگرانی کر رہا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "آپ کا خیال درست تھا۔ اختری بی بی ہوشیار عورت ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اس نے "پاؤں بھاری" ہونے کے بارے میں ہمارا جھوٹ پکڑ لیا ہے۔"

"ہاں، اس نے تھوڑی سی بات مجھ سے بھی کی ہے۔ اسے شک ہے لیکن کچھ بھی ہے، میں اسے سنبھال لوں گا۔ تم کوئی پریشانی نہ لو اور شمسہ سے کہو کہ خود کو بیمار ہی ظاہر کرے۔"

اگلے روز بھی سجاول سیالکوٹی مجھے اپنے اس ٹھکانے پر کہیں نظر نہیں آیا۔ میں نے فیض محمد سے اس بارے میں پوچھنے کی کوشش کی لیکن اس نے کچھ بتا کر نہیں دیا۔ شام کے وقت میرے لیے ایک بار پھر ماؤ جی کا بلاوا آ گیا۔ بلاوا لانے والا فیض محمد ہی تھا۔ اس نے کہا۔ "تمہاری واپسی تک میں یہاں شمسہ کے آس پاس موجود ہوں۔ تم بالکل بے فکر رہو۔"

میں فخرو کے ساتھ کل والے سجے سجائے کمرے میں پہنچا۔ لیکن یہاں ماؤ جی کے بجائے ایک فتنہ ساماں لڑکی موجود تھی۔ وہی کسے ہوئے بدن والی اور شوخ چشم نازنین جس کی تصویر کل مجھے ماؤ جی نے دکھائی تھی۔ آج موسم کی مناسبت سے اس نے کاٹرائے کی تنگ پتلون اور جرسی پہن رکھی تھی۔ بوائے کٹ بال گیس لیمپ کی روشنی میں دمک رہے تھے۔ "اچھا تو تم ہو شاہ زیب؟" وہ مجھے سرتاپا گھور کر بولی۔

"ماؤ جی کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"انہوں نے تمہیں میرے لیے ہی بلایا تھا تا کہ ہم کوئی بات شات کر لیں۔" وہ بڑے نخرے سے بولی۔ پھر مجھے تنقیدی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "چلو آؤ، تمہیں اپنا کمرا دکھاؤں۔"

ذرا تذبذب میں رہنے کے بعد میں اس کے ساتھ چل دیا۔ وہ مجھ سے دو قدم آگے چل رہی تھی اور کوشش کر رہی تھی کہ چلتے ہوئے اس کے جسم کی ساری دلکشی نمایاں ہو کر سامنے آئے۔ ہم جس کمرے میں پہنچے وہ بھی آراستہ تھا۔ ایک بڑا ٹیپ ریکارڈ اور آڈیو کیسٹس یہاں وہاں بکھری ہوئی تھیں۔ دھیمی آواز میں ایک شوخ انڈین گانے پلے ہو رہا تھا۔ کمرے کی سجاوٹی اشیا میں دو تین پوسٹر سائز تصویریں بھی نظر آئیں جن میں سری دیوی اور مادھوری رقص کے نام پر نابالغوں کو بالغ اور بوڑھوں کو جوان بنا رہی تھیں۔

یہ تھی مہناز عرف مائی۔ اس کی شادی کی عمر واقعی نکلی جا رہی تھی۔ کمرے میں انگیٹھی

روشن تھی۔ انگیٹھی کی حدت میں پہنچ کر مانی کے رخسار کچھ اور بھی دہکنے لگے۔

اس نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا اور خود بھی دوسری کرسی پر اس انداز میں بیٹھ گئی کہ اس کے بدن کے نشیب و فراز نمایاں تر ہو گئے بولی۔ ''میں صاف صاف بات کرنے کی عادی ہوں۔ چاہے بات اچھی لگے یا بری۔''

''یہ اچھی عادت ہے۔'' میں نے کہا۔

''تم سوچ رہے ہو گے کہ میں شکل صورت کی اتنی بری بھی نہیں، پھر ابھی تک میری شادی کیوں نہیں ہو سکی۔ اس کا سیدھا سیدھا جواب ہے کہ اس کی دو وجہ ہیں۔ پہلی وجہ یہ کہ میرا چاچو سجاول ایک نامی گرامی ڈکیت ہے۔ میرا ابا بھی کچھ کم شریف نہیں ہے۔ بلکہ کچھ شرافتیں ایسی ہیں جن میں وہ چاچو سے بھی دو ہاتھ آگے ہے۔ مثلاً پینا پلانا اور رنگ بازی کرنا۔ میری بات سمجھ میں آ رہی ہے نا؟'' اس نے بے تکلفی سے اپنے دونوں پاؤں کرسی پر رکھتے ہوئے کہا۔

''بالکل آ رہی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اور دوسری وجہ؟''

''دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر بندہ میری پسند کا نہ ہو گا تو میں اس سے شادی نہیں کروں گی۔ شادی تو دور کی بات ہے، ایسے بندے کو تو میں لاتیں مار مار کر بھگا دیتی ہوں۔ سب سے پہلے میرا جو رشتہ آیا، وہ دو سال پہلے آیا تھا۔ لڑکا شکل کا تو ٹھیک تھا مگر جسم پر بوٹی ہی نہ ہو تو ایسی شکل کا کیا کرنا۔ چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد تھا مگر لگتا ایسے تھا کہ بانس پر کپڑے لٹکا رکھے ہوں۔ اوپر سے تمباکو والا پان کھاتا تھا جس طرح لوگ سگریٹ سے سگریٹ لگاتے ہیں وہ پان سے پان لگاتا تھا۔ منگنی والے دن مجھ سے بات کرتے ہوئے کسی بات پر ہنسا تو پان کے چھینٹے سیدھے میرے منہ پر پڑے۔ مجھے رومال دینے کے لیے جیب سے رومال نکالنے لگا تو ساتھ ہی چرس کی دو ڈلیاں نکل کر میز پر آ گریں۔ جس طرح پان کے چھینٹے سیدھے میرے منہ پر آئے تھے، میں نے بھی لات سیدھی اس کی پسلیوں میں ماری۔'' اس منظر کو یاد کر کے وہ خود ہی ہنس ہنس کر دوہری ہونے لگی۔

چند سیکنڈ بعد بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''کوٹلی کا ایک بڑا سٹے باز تھا وہ۔ اس کے بعد سنا ہے کہ کوٹلی وغیرہ میں تو کبھی نظر نہیں آیا۔''

''مطلب یہ ہے کہ نشہ تمہیں اچھا نہیں لگا۔ اچھی بات ہے۔ ایسے برے ماحول میں رہ کر بھی تم بری چیز کو برا ہی سمجھتی ہو۔''

''نہیں ایسی بات بھی نہیں لیکن یہ چرس افیم بھی کوئی نشہ ہے۔ نشہ ہو تو پھر کڑا کے دار

ہو۔ وہسکی ہو، شیمپین ہو جن ہو یا پھر پہلی دھار کی دیسی ہو۔ مرد پی کر شیر بنے...... یا کم از کم مرد تو لگے، چوہا تو نہ لگے۔"

اس نے چند لمحے توقف کر کے آئینے کی طرف دیکھا اور اپنے بال سنوارے۔ پھر بولی۔ "دوسرا رشتہ چاچو کے کسی جاننے والے کا تھا۔ اچھا لڑکا تھا۔ جی دار تھا۔ شاید ایک تھانے دار کی ٹانگ بھی توڑی تھی اس نے۔ دو چار ڈکیتیوں میں بھی حصہ لیا ہوا تھا، لیکن میرے سامنے یوں بیٹھتا تھا جیسے بلی کے سامنے چوہا۔ بس، آہو جی...... ہاں جی...... ٹھیک ہے جی کے سوا کوئی بات ہی نہیں آتی تھی اسے۔ اسے بھی میں اپنا کمرہ دکھانے کے لیے لائی تھی۔ میرا خیال تھا کہ کھل کر کوئی بات کرے گا کچھ اپنی کہے گا، کچھ میری سنے گا۔ پر وہ تو ایسے بیٹھا رہا جیسے گل گھوٹو کی بیماری ہو۔ سر جھکایا ہوا تھا اور میرے پاؤں سے نظریں ہی نہیں اٹھا رہا تھا۔ لگتا تھا کہ میری ساری چیزوں میں سے اسے میری جوتی ہی زیادہ پسند آئی ہے۔ میں نے وہ جوتی ہی اتار لی۔ میرا پارہ چڑھا ہوا تھا۔ میں نے اس کے سر کی ساری گرد جھاڑ دی۔ ایسا بھاگا کہ مڑ کر نہیں دیکھا۔ اس کے بعد چاچو کے ہاتھ بھی نہیں آیا۔ اس کی ایک تصویر ہے میرے پاس۔ بلکہ دونوں کی تصویریں ہیں۔ دکھاؤں تمہیں؟"

میرے جواب دینے سے پہلے ہی وہ کرسی پر کھڑی ہوگئی۔ "ذرا کرسی کو ہاتھ رکھنا۔" اس نے کہا۔

میں نے کرسی کو پکڑا۔ اس نے کرسی کے دونوں ہتھوں پر دونوں پاؤں رکھے اور ایک الماری کے اوپری خلا تک ہاتھ پہنچا کر ایک البم نکال لیا۔ لیکن کرسی سے اترتے ہوئے وہ بری طرح ڈگمگائی اور میرے اوپر آن گری۔ اب پتا نہیں یہ اتفاقیہ ہوا تھا یا اس کے ارادے کو بھی اس میں دخل تھا۔ ہم اوپر نیچے اونی چٹائی پر گرے۔ وہ مجھ پر تقریباً سوار تھی۔ اس کے دہکتے ہوئے ہونٹ مجھ سے بس تین چار انچ کے فاصلے پر تھے۔ فوراً پیچھے ہٹنے کے بجائے وہ اپنی جگہ رکی رہی۔ یکایک اس کی آنکھوں کی کیفیت بدل گئی ہونٹوں کی طرح اس کے رخسار بھی دہک اٹھے۔ اس نے میرے بالوں میں انگلیاں چلائیں، اور پھر بالکل غیر متوقع طور پر میرے رخسار کا بوسہ لے لیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مزید پیش قدمی کرے گی لیکن اس نے نہیں کی اور جیسے وہیں پر ٹھہر کر میرے ردِعمل کا انتظار کرنے لگی۔

وہ کیا ردِعمل چاہتی تھی یہ میں جان رہا تھا۔ وقفہ طویل ہوا تو اس کی پیشانی پر ناگواری کی شکن ابھر آئی۔ عورت میرے لیے کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ میں نے مشکل ترین عورتوں کو دیکھا تھا اور ہینڈل کیا تھا۔ میں خود کو عورتوں کی نفسیات کا ماہر تو نہیں کہتا مگر اتنا ضرور ہے کہ میں ان کے

اندر دور تک جھانک سکتا ہوں اور میری اس دوررس نگاہ نے مجھے بتا دیا کہ اگلے چند سیکنڈ یا چند منٹ میں میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ عین ممکن تھا کہ وہی ہوتا جو اس سے پہلے ان دو افراد کے ساتھ ہو چکا تھا جن کی تصویر اس البم میں تھی۔

سجاول سیالکوٹی کے الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے۔ اس نے کہا تھا۔ ''شاہ زیب! اگر تمہاری وجہ سے میری ماں کو کوئی دھچکا پہنچا یا ان کا کوئی نقصان ہوا تو اس کا نتیجہ بہت برا نکلے گا۔ میں نے تیزی سے سوچا۔ اس سے پہلے کہ وہ بھنائی ہوئی سی مجھ پر سے اٹھ جاتی۔ میں نے وہی ردِعمل ظاہر کیا جو وہ چاہتی تھی۔ میں نے اسے اپنے بازوؤں میں جکڑا اور پلٹ گیا۔ اس کی کارروائی کا مناسب جواب دینے کے بعد میں پیچھے ہٹ گیا۔ اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا اور آنکھوں میں چمک تھی۔

میرا خیال تھا کہ میری اتنی جواب دہی کافی ہو گی اور اب وہ مجھے جانے دے گی مگر وہ میری توقع سے زیادہ ''ڈیمانڈنگ'' تھی۔

''پیو گے؟'' اس نے پھولی سانسوں کے ساتھ پوچھا۔

میں چپ رہا۔ اس نے میری خاموشی کو نیم رضامندی سمجھا اور الماری کھول کر اس میں سے دو بوتلیں نکال لیں۔ اس نے اپنے لیے گلاس میں بیئر انڈیلی اور میرے لیے ووڈکا۔ بولی۔ ''یہ روسی تحفہ ہے۔ تم جانتے ہی ہو گے، دنیا کی تیز ترین شرابوں میں سے ہے۔''

اسے کیا پتا تھا کہ میں نہ صرف اس آتشیں مشروب کو جانتا ہوں بلکہ اگر وہ میرا امتحان لینا چاہے گی تو میں بوتل منہ سے لگا کر خالی بھی کر سکتا ہوں۔

بہرحال بات زیادہ آگے نہیں بڑھی۔ چار پانچ گھونٹ تک ہی رہی۔ وہ مجھے البم دکھانے لگی۔ اس میں اس کی فیشن ایبل مرحومہ ماں کی تصویر تھی۔ اس کے باپ اعظم جاہ کی تصویر بھی میں فوراً پہچان گیا۔ جوانی میں وہ خاصا خوب صورت اور صحت مند تھا جو نحوست اور پژمردگی میں نے اس کے چہرے پر پرسوں رات دیکھی تھی، اس کا کہیں پتا نہیں تھا۔ ''تمہاری ماں کا ایکسیڈنٹ کیسے ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''بس ٹائم آیا ہوا تھا اس کا...... مر گئی۔'' اس نے عجیب سے انداز میں کہا اور بے پروائی سے البم کا لیف پلٹ دیا۔

ایک تصویر میں وہ پینٹ شرٹ پہنے پستول سے گولیاں چلا رہی تھی اور گھڑ سواری کر رہی تھی۔ یہ تصویر چند ماہ پہلے کی ہی لگتی تھی پھر اس نے بڑے فخر سے بتایا کہ یہ پہلا ''باندر'' تھا جسے اس نے عین منگنی کے موقع پر بھگایا تھا۔ وہ واقعی بہت دبلا پتلا تھا، آنکھیں افیمیوں جیسی تھیں۔

دوسرا لڑکا صحت مند تھا لیکن مانی کے بقول وہ مردکم اور کرائے کا ٹٹو زیادہ لگتا تھا جو مالک کے قدموں کی آہٹ سنتا ہے تو ٹانگیں ذرا چوڑی اور کمر تان کر بوجھ اٹھانے کو تیار ہو جاتا ہے۔

مجھے البم کی تصویریں دکھاتے دکھاتے وہ میرے بالکل پاس آ گئی تھی۔ کسی وقت اس کا کان میرے کان سے چھو جاتا تھا۔ اچانک گیس لیمپ پھڑ پھڑا کر بجھ گیا۔ پتا نہیں کہ اس کی گیس ختم ہو گئی تھی یا اس ''کافر ادا'' نے اس کے ساتھ بھی کوئی کارستانی کی تھی۔ کمرے میں گہری تاریکی چھا گئی۔ اور تاریکی ایسے موقعوں پر بڑی خطرناک ہوتی ہے۔ یہاں بھی یہ خطرناک ثابت ہوئی۔ وہ میرے ساتھ بستر پر گر گئی اور الجھنے لگی۔ میں اس کی چھوٹی چھوٹی کارروائیوں کا مؤثر اور مناسب جواب دیتا رہا۔ میں شاہ زیب سکنہ کوپن ہیگن، ڈنمارک...... اپنے بارے میں کچھ بھی چھپا نہیں رہا ہوں۔ نہ ہی میں خود کو کہانیوں کا کوئی روایتی ہیرو ثابت کرنا چاہتا ہوں...... میں نے زندگی کا ہر رنگ دیکھا ہوا تھا۔ قمار خانوں سے لے کر نائٹ کلبوں تک اور فائٹنگ رنگز سے لے کر قتل گاہوں تک کون سی جگہ میرے قدموں تلے نہیں آئی تھی۔ یہ میرا ایک روپ ہے، وہ میرا دوسرا روپ تھا...... تو میں کہہ رہا تھا کہ عورت میرے لیے کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ میں مانی کی خرمستیوں سے بدکنے والا نہیں تھا۔ میں نے اسے خاطر خواہ جوابات دیئے...... اور اسے ''بیک فٹ'' پر کر دیا۔ اس نے خود ہی لائٹر جلا کر روشنی کر دی اور اپنا لباس درست کرنے لگی۔ پچھلے ڈیڑھ دو منٹ نے اسے میرے بارے میں کافی کچھ بتا دیا تھا۔

بہر حال ایک بات میری اپنی سمجھ میں بھی آئی تھی۔ اور یہ بڑی جدا بات تھی۔ کسی عورت کے قریب ہو کر مجھے پہلی بار ایک ندامت کا احساس ہوا تھا۔ وہی پشیمانی جو کسی ناجائز عمل کی وجہ سے انسان کے اندر جنم لیتی ہے۔ پچھلے ڈیڑھ دو منٹ میں کئی بار تاجور کا چہرہ میری نگاہوں کے سامنے آیا تھا۔ لٹیں اس کے دلکش چہرے پر جھول رہی تھیں۔ وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ یہ کیا ہے شاہ زیب؟ یہ کیوں ہے؟ تم تو پیار کرتے ہو نا مجھ سے اور تم کہتے ہو میں تمہارا پہلا اور آخری پیار ہوں؟

مانی نے لائٹر کی مدد سے ایک کینڈل روشن کر دی۔ کمرے سے باہر کھٹ پٹ کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ غالباً ماؤ اپنی پوتی کی ''آتش مزاجی'' سے آگاہ تھی اور اسے ضرورت سے زیادہ وقت دینا نہیں چاہتی تھی۔ ہم باہر نکل آئے......

مانی خوش نظر آ رہی تھی۔ میں نے بھی مسکرانے کی کوشش کی۔ ماؤ جی کے ڈرے ڈرے چہرے پر رونق آ گئی۔ اس نے میری بلائیں لیں اور جھوم کر بولی۔ ''میرا دل کہتا ہے کہ تم دونوں کی خوب جمے گی اور خوب نبھے گی۔''

باہر گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دے رہی تھیں۔ پتا چل رہا تھا کہ سجاول اور اس کے ساتھی جو کسی مہم پر گئے تھے واپس آ گئے ہیں۔ میں مائی اور ماؤ سے اجازت لے کر باہر نکلا۔ باہر ہوا سرد تھی۔ احاطے میں ٹارچوں کی روشنی تھی اور چند لالٹینیں بھی نظر آ رہی تھیں۔ میں نے گرانڈیل سجاول کو دیکھا۔ وہ گھوڑے سے اتر رہا تھا۔ سجاول کے ایک ساتھی نے ایک عورت کو سہارا دے کر گھوڑے سے اتارا۔ اس کے سر پر شال تھی اور وہ کچھ ڈری ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ یہ لمبے ہاتھ پاؤں والی قدرے دراز قد لڑکی تھی۔ تب میری نگاہ ایک اور شخص پر پڑی اور میں بری طرح چونک گیا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں چاند گڑھی سے اتنی دور اس شخص کو یہاں دیکھوں گا۔ ایک ٹارچ کی روشنی سیدھی اس شخص کے چہرے پر پڑ رہی تھی اور شک شبہے کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ یہ میواتی پہلوان، حشمت راہی تھا۔ اس کے چہرے پر ایک دو چوٹوں کے نشان دور ہی سے نظر آ رہے تھے۔ اس نے شلوار قمیص پر براؤن کوٹ پہن رکھا تھا۔ ایک گرم چادر اس کے دائیں کندھے پر تھی۔

میں اندھیرے میں تھا اس لیے وہ مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ چپٹی ناک والے فخرو نے اسے رائفل سے ٹھوکا دیا اور دھکیلتا ہوا ایک طرف لے گیا۔ ایک شخص نے اس لڑکی کی کلائی پکڑی جسے گھوڑے سے اتارا گیا تھا۔ لڑکی نے معمولی مزاحمت کی مگر جب پکڑنے والے نے اس کا بازو زور سے کھینچا اور گرج کر کہا۔ ''چل...... نخرے نہ دکھا۔'' تو وہ چل پڑی۔

حیرت کا دوسرا شدید جھٹکا مجھے اس وقت لگا جب میں نے اس لڑکی کی شکل دیکھی۔ حشمت راہی کی طرح اس لڑکی کو بھی یہاں دیکھنے کی میں ہرگز توقع نہیں رکھتا تھا۔ یہ ماڈل گرل اور رقاصہ جاناں تھی۔ میں اسے رام پیاری اور وکرم کے پاس چھوڑ کر آیا تھا۔ وہ ایک طرح سے ان کی پناہ میں تھی پھر وہ یہاں کیسے پہنچ گئی؟ میری رگوں میں خون جیسے سلگ پڑا۔ دو ہی باتیں سمجھ میں آ رہی تھیں یا تو رام پیاری کے گھر میں سے کسی نے مخبری کر دی تھی یا پھر جاناں نے میری ہدایت اور تاکید کے باوجود غلطی کی تھی اور اس محفوظ پناہ گاہ سے نکل کر شہر پہنچنے کی کوشش کی تھی۔ وہ سجاول کے ڈیرے پر ایک بندے کو زخمی کر کے بھاگی ہوئی تھی۔ اس ڈکیت گروہ کے ارکان ہر طرف اسے ڈھونڈتے پھر رہے تھے اور اب وہی ہوا تھا جس کا ڈر تھا۔ وہ پھر ان کی دسترس میں آ گئی تھی۔ اب اس کے ساتھ جو بھی ہو جاتا کم تھا۔ میں اس صورتِ حال پر دانت پیس کر رہ گیا۔ کئی اور باتوں کی طرح یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ پہلوان حشمت اور جاناں اکٹھے کیسے سجاول سیالکوٹی کے شکنجے میں آ گئے ہیں۔ پہلوان حشمت چاند گڑھی کا رہائشی تھا اور جاناں کو میں وہاں سے پندرہ بیس کلومیٹر دور فیض پور میں

چھوڑ کر آیا تھا۔
میں، تاجور کے پاس یخ بستہ کوٹھڑی میں واپس پہنچا تو وہ بڑی شدت سے میرا انتظار کر رہی تھی۔ گلوگیر آواز میں بولی۔ ''آپ کہاں چلے گئے تھے۔ اس طرح چھوڑ کر کیوں جاتے ہیں؟''
میں نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ''مجبوری تھی یہاں ہمیں نہ چاہتے ہوئے بھی کئی کام کرنا پڑیں گے۔''
''ریشمی اور انیق وغیرہ کا کچھ پتا چلا؟''
''پتا تو نہیں چلا لیکن اتنی تسلی ضرور ہو گئی ہے کہ وہ ملنگوں کے ہاتھ نہیں آئے۔''
اچانک تاجور غور سے میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے پر ناگواری کی شکنیں ابھریں۔ وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولی۔ ''آپ کے منہ سے...... بو آ رہی ہے۔ کیا کیا ہے آپ نے؟''
میں نے مائی کے کمرے میں جو چند گھونٹ لیے تھے، اس کا پتا تاجور کو چل گیا تھا۔ میں نے سنبھل کر کہا۔ ''تاجور! میں نے کہا ہے نا کہ ہمیں یہاں کئی کام اپنی مرضی کے خلاف بھی کرنا پڑیں گے۔''
''لیکن...... اس کا مطلب ہے کہ آپ...... یہ گندی چیز پیتے ہیں؟''
''بالکل نہیں...... بس زندگی میں دو چار دفعہ ہی ایسا ہوا ہوگا، اور وہ بھی یار دوستوں کے بہت مجبور کرنے پر۔'' میں نے سفید جھوٹ بولا۔ اسے کیا پتا تھا میں یورپ جیسے مادر پدر آزاد معاشرے میں پلا بڑھا تھا۔ پچھلے پانچ چھ سال میں کئی مواقع ایسے بھی آئے تھے جب میں نے خود کو دن رات الکحل میں غرق رکھا تھا۔
تاجور کی پیشانی پر ناگواری کی شکن برقرار رہی، وہ بولی۔ ''کہاں تھے آپ؟''
اب اس سوال کا درست جواب دینا بھی بے حد مشکل تھا۔ میں اسے کیا بتاتا کہ یہاں سجاول سیالکوٹی کی خطرناک بھتیجی سے میرے رشتے کی بات چل نکلی ہے۔ میں نے کہا۔ ''سجاول کی والدہ کو ہمارے بارے میں تجسس ہے۔ وہ پوچھنا چاہ رہی تھی کہ ہم یہاں کیسے اور کیوں پہنچے ہیں۔ اگر وہ تم سے کوئی سوال جواب کرے تو تم نے بھی وہی جواب دینے ہیں۔ تمہارا نام شمسہ، تمہارے گاؤں کا نام ہری پورہ، ہماری شادی کو چھ ماہ ہوئے ہیں۔ میں باہر سے آیا ہوں اور آج کل اپنی زمین آباد کر رہا ہوں وغیرہ وغیرہ۔''
تاجور کو مطمئن کرنے کے بعد میں لیٹ گیا۔ وہ بھی لیٹ گئی۔ میں نے خود کو سویا ہوا

ظاہر کیا، لیکن میرا دماغ گھڑ دوڑ کا میدان بنا ہوا تھا۔ میں جلد از جلد جاناں کے بارے میں جاننا چاہتا تھا کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔

میں اٹھ بیٹھا۔ میں نے ایک مسلح شخص سے کہا کہ وہ فیض محمد کو بلائے، میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ کچھ دیر بعد فیض محمد سگریٹ پھونکتا ہوا وہاں آن پہنچا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''نیند نہیں آ رہی۔ سوچا تھوڑی دیر بات کر لوں۔''

وہ مجھ سے ماؤ جی اور مانی کے برتاؤ کا حال جاننا چاہتا تھا مگر میں نے اسے اشارے سے منع کر دیا کہ وہ تاجور کی موجودگی میں یہ ذکر نہ چھیڑے۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''ابھی تھوڑی دیر پہلے جس لڑکی کو یہاں لایا گیا ہے، وہ کون ہے؟''

وہ بولا۔ ''سیالکوٹ کی طرف کسی گاؤں کے لوگ ہیں یہ۔ لڑکی پیشہ ور ڈانسر ہے۔ کچھ دن پہلے یہ سردار کے بندوں سے فراڈ کر کے نکل گئی تھی۔ اب اسے پیسے پورے کرنے کے لیے یہاں لایا گیا ہے۔''

''پیسے پورے کرنے کے لیے؟''

''بھئی، وہی ناچ گانا...... اور فلاناں ڈھمکاناں...... پر ابھی تو اسے دو تین دن آرام کرایا جائے گا۔ تیز بخار چڑھا ہوا ہے اسے۔ ملیریا لگتا ہے۔ بری طرح کانپ رہی ہے۔ میں دوائی دے کر آیا ہوں۔''

''اور وہ موٹا سا بندہ، جو ساتھ ہے؟''

''وہ کھوتے کا پتر اپنی بے وقوفی کی وجہ سے پکڑا گیا ہے۔ اپنی طرف سے سلطان راہی بن کر لڑکی کو بچا رہا تھا۔ ساتھ میں دھر لیا گیا ہے۔ ویسے ہے کام کا بندہ۔ کہتے ہیں کہ ہڈی پٹھے کے علاج کا ماہر ہے۔ اپنے علاقے میں اس کی مشہوری ہے۔ ہڈی کیسی بھی ٹوٹی ہوئی ہو، جوڑ لیتا ہے۔''

اچانک میرے ذہن میں ایک خیال کوندا۔ میں نے کہا۔ ''پھر تو شاید میرا بھی کچھ فائدہ ہو جائے۔''

''کیا مطلب؟'' فیض نے پوچھا۔

''یہ جو ابھی تک نیند نہیں آئی تو اس کی وجہ کندھے کا درد بھی ہے جب میں نے شمسہ کے پیچھے پک اَپ سے چھلانگ لگائی تو اسی وقت کندھے پر داب آئی تھی، لگتا ہے شاید جوڑ ہل گیا ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔ کل دکھالیں گے اس کو۔'' فیض نے جھٹ کہا۔ ''ابھی میں تمہیں ایک

تیل لا دیتا ہوں۔ وہ لگا کر اوپر سے کپڑا باندھ لو۔ بہت فرق پڑے گا۔"

کچھ دیر بات کرنے کے بعد فیض محمد اٹھ گیا۔ اس نے مجھے تیل کی ایک شیشی پہنچا دی۔ ساتھ میں باندھنے کے لیے ایک مفلر بھی تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ کندھے میں ہلکی پھلکی تکلیف تو تھی، لیکن اتنی بھی نہیں تھی کہ مجھے کسی ٹریٹ منٹ کی ضرورت ہوتی۔ میں نے ویسے ہی مفلر باندھ لیا اور لیٹ گیا۔ فیض سے ملاقات کا بہت زیادہ فائدہ ہوا تھا۔ جاناں کی طرف سے مجھے وقتی طور پر تسلی ہو گئی تھی۔ دوسرے پہلوان حشمت سے ملاقات کا امکان پیدا ہو گیا تھا لیکن پہلوان سے ملاقات میں ایک اندیشہ بھی پوشیدہ تھا۔ میں پہلوان کے سامنے جاتا تو اس نے مجھے فوراً گونگے ٹریکٹر ڈرائیور کی حیثیت سے پہچان لینا تھا۔ میری یہ شناخت میرے اور تاجور کے لیے مصیبتوں کے دروازے کھول سکتی تھی۔

بہرحال اگلے دن میری یہ مصیبت خود ہی آسان ہو گئی۔ ابھی میں اور تاجور ناشتے کے چند لقمے لے کر فارغ ہوئے ہی تھے کہ ماؤ نے ایک بار پھر مجھے یاد کر لیا۔ اس مرتبہ یہ بلاوا لے کر فخرو آیا۔ چوڑی ناک اور پیشانی کے زخم کی وجہ سے وہ کافی بھدا نظر آتا تھا۔ خاص طور سے جب وہ تیوری چڑھا کر بات کرتا تھا۔

اس نے کوٹھڑی کا تالا کھولا اور میں اس کے ساتھ ماؤ کی طرف روانہ ہو گیا۔ اب مجھے یہاں کافی رعایت دی جا رہی تھی۔ میرے اردگرد کوئی مسلح شخص موجود نہیں تھا۔ ہاتھ وغیرہ باندھنے کا تکلف تو پہلے دن ہی ختم ہو گیا تھا لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ یہاں کوئی پہرا نہیں تھا۔ میرے خیال میں یہاں نگرانی کا سخت ترین اور ناقابلِ شکست نظام موجود تھا۔ اس احاطے کے گرد پتھریلے ٹیلوں نے ایک قدرتی چاردیواری کی شکل اختیار کر رکھی تھی۔ چاروں طرف چیڑ اور پڑتل کے بلند و بالا درخت بھی تھے۔ ان درختوں پر شاخوں وغیرہ سے چھوٹی چھوٹی مچانیں بنائی گئی تھیں جو بادی النظر میں دکھائی نہیں دیتی تھیں۔ ان مچانوں پر ہر وقت طاقتور رائفلوں والے مسلح افراد موجود رہتے تھے۔ رات کی نگرانی کے لیے ان کے پاس طاقتور ٹارچیں بھی موجود تھیں۔ کئی درختوں پر چڑھنے کے لیے رسّے کی سیڑھیاں بھی لٹکائی گئی تھیں۔ وقت گزاری کے لیے یہ پہرے دار ٹرانزسٹر ریڈیو سنتے تھے یا اپنے سیل فونز پر میوزک پلے کرتے تھے۔ کبھی کبھی یہ اپنے قریبی ساتھیوں سے گپ شپ کرتے بھی سنائی دیتے تھے۔

مجھے ڈر تھا کہ ماؤ جی کی جگہ آج پھر مانی سے ملاقات نہ ہو جائے...... تاہم خیریت گزری۔ مانی سے ملاقات تو ہوئی مگر ماؤ کی موجودگی میں۔ ماؤ جی حسبِ معمول خوشی سے سرشار نظر آتی تھی۔ اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ "ابھی ناشتا تو نہیں کیا نا؟"

''بس کر ہی رہا تھا۔'' میں نے کہا۔

''آج تم اسپیشل ناشتا کرو گے ہمارے ساتھ۔'' وہ بولی۔

میز پر حلوہ پوری، گاجر کا حلوہ، نہاری، مرغ چنے اور پتا نہیں کیا کیا الا بلا رکھا تھا۔ مانی کے رخسار سرخ تھے اور آنکھوں کی چمک، کل رات گزرے ہوئے نرم گرم لمحات کی یاد دلا رہی تھی۔ وہ آج بھی پُر جوش نظر آ رہی تھی مگر اس کے جوش کو راستہ نہیں ملا۔ سجاول یہاں آنے والا تھا، مجھے جلد ہی ''چھٹی'' مل گئی اور میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ماؤ نے حکمیہ انداز میں کہا۔ ''میں نے سجاولے سے کہہ دیا ہے۔ آج سے تم اس کوٹھڑی میں نہیں رہو گے۔ یہاں پاس ہی تم دونوں کو ایک کمرا دے دیا گیا ہے۔ بلکہ یہ دو کمرے ہیں۔ ہر چیز موجود ہے وہاں۔''

میں نے شکریے کے انداز میں سر جھکایا اور باہر نکل آیا۔ ماؤ کی بات سے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس نے پوتی کو میرے شادی شدہ ہونے کے بارے میں بھی بتا دیا ہے۔ اس بات کا پوتی صاحبہ پر کوئی اثر نظر نہیں آتا تھا۔ پتا نہیں کس طرح کے...... بلکہ کس قماش کے لوگ تھے یہ؟

فخرو باہر ہی موجود تھا۔ میں اس کے ساتھ واپس کوٹھڑی کی طرف روانہ ہوا۔ ہماری کوٹھڑی سے پہلے ہی ایک اور کوٹھڑی نظر آئی۔ اس کی کھڑکی اب کھلی ہوئی تھی۔ میں دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ کھڑکی کی دوسری طرف پہلوان حشمت کسی اداس اُلو کی طرح بیٹھا تھا پھر اس کی نگاہ بھی مجھ پر پڑ گئی۔ وہ بری طرح چونکا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی ایسی ویسی حرکت کر بیٹھتا، میں نے اسے انگلی کے اشارے سے منع کر دیا۔ خوش قسمتی سے فخرو مجھ سے ایک قدم آگے چل رہا تھا، لہٰذا وہ میرے مبہم اشارے کو نہیں دیکھ سکا۔ پہلوان کا کھلا ہوا منہ کھلا ہی رہ گیا۔ بہرطور اس نے عقلمندی کا ثبوت دیتے ہوئے مکمل خاموشی اختیار کی۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد میں دوبارہ پہلوان حشمت والی کوٹھڑی کے سامنے موجود تھا۔ کوٹھڑی کا تالا کھولنے سے پہلے فیض محمد نے مجھ سے کہا۔ ''کچھ بھی ہے۔ یہ اس وقت ایک قیدی ہے۔ اس کی طرف سے ہوشیار رہنا کوئی چالا کی نہ دکھا جائے۔''

''تم بے فکر رہو چاچا۔'' میں نے کہا۔

دروازہ کھول کر ہم اندر داخل ہوئے۔ پہلوان حشمت فراست کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس نے یہی ظاہر کیا جیسے مجھے پہلی بار دیکھ رہا ہے۔ فیض محمد نے پہلوان کو تحکمانہ لہجے میں مخاطب کیا اور کہا۔ ''یہ اپنا خاص مہمان ہے موٹے، اس کے کندھے میں تکلیف ہے اور یہ تیرا امتحان بھی ہے۔ دیکھنا ہے کہ کیا کاریگری دکھاتا ہے تُو۔''

میں نے سویٹر اتارا اور کندھے پر سے قمیص بھی کھسکا دی۔ ''یہاں درد ہے۔'' میں نے کندھے کے نیل پر انگلی رکھتے ہوئے کہا اور چہرے سے شدید تکلیف ظاہر کی۔

پہلوان حشمت مجسم حیرت میری طرف دیکھنے لگا۔ میں، جو چاندگڑھی میں پیدائشی گونگا تھا، اس کے سامنے بول رہا تھا۔

فیض محمد نے غصے سے کہا۔ ''یہ بٹر بٹر کیا دیکھ رہے ہو، یہ کوئی فارسی نہیں بول رہا۔''

پہلوان نے خود کو بمشکل سنبھالا، اور لرزتے ہاتھوں سے میرے کندھے کا معائنہ کیا۔ اس نے بازو کو اوپر نیچے ہلایا تو میں نے شدید تکلیف ظاہر کی۔

اب حشمت بھی صورتِ حال کو کافی حد تک بھانپ چکا تھا۔ اپنی بھاری آواز میں بولا۔ ''مجھے لگت ہے کہ جوڑ بری طرح ہل گیا ہے اور پٹھا بھی زخمی ہے...... پہلے پٹھے کو چالو کرنے کے لیے ٹکور کی ضرورت ہووے گی، پھر گرم گھی کی مالش کر کے پٹی باندھوں گا۔ مجھے ایک انگیٹھی چاہیے اور ایک پکی اینٹ گرم کرنے کے لیے...... اس کے علاوہ تھوڑی سی ہلدی بھی۔''

فیض محمد دروازے کو باہر سے بند کر کے انگیٹھی وغیرہ کا انتظام کرنے چلا گیا۔ حشمت نے پھٹی پھٹی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اس کا پورا جسم کانپ رہا تھا۔ ''یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ تم نے ہم سب کو دھوکا دیا۔ تم بول سکت ہو۔''

''ہاں، میں بول سکتا ہوں۔ لیکن یہ جو کچھ بھی تھا ایک مجبوری کی وجہ سے تھا۔ فی الحال وقت نہیں کہ میں اس بارے میں تفصیل بتاؤں، ہمیں کچھ ضروری باتیں کر لینی چاہئیں۔''

وہ بدستور میری طرف دیکھتا رہا۔ مجھے بولتا سن کر پہلوان حشمت کو حیرت تو ہوئی تھی مگر اتنی شدید نہیں، جتنی ہونی چاہیے تھی۔ مجھے شک گزرا کہ وہ اس بارے میں پہلے ہی کچھ جان چکا ہے۔ اگلے چند منٹ میں ہمارے درمیان جو گفتگو ہوئی اس سے اس بات کی تصدیق بھی ہوگئی۔ (میں نے پہلوان کو بتا دیا کہ تاجور میرے ساتھ ہے اور صحیح سلامت ہے)

انیق، ریشمی اور رضوان خیریت سے چاندگڑھی تک پہنچ چکے تھے۔ حشمت نے کانپتی ہوئی سی آواز میں کہا۔ ''تمہارے، گونگے نہ ہونے کی بات ہمیں ریشمی سے معلوم ہوئی ہے۔ وہ تمہارا دوست انیق خود بھی یہ کہوت ہے کہ اسے پتا ناہیں تھا تم بول سکت ہو۔ گاؤں میں جتنے منہ ہیں اتنی ہی باتیں ہو رہی ہیں۔ کسی کی سمجھ میں کچھ ناہیں آ رہا۔''

''تاجور کے گھر والے کیسے ہیں؟''

''سب سے برا حال انہی کا ہے۔ گاؤں میں تہلکہ تو اسی وقت مچ گیا تھا جب پچھلے سے

پچھلے ہفتے لوگوں کو سن گن ملی تھی کہ دین محمد صاحب چپکے چپکے تاجور کو ڈھونڈنے میں لگے ہوئے ہیں۔ وہ نوکرانی نوری کے ساتھ کوٹلی گئی تھی اور پھر کوٹلی سے آگے کسی مزار پر چلی گئی تھی۔ چاچا رزاق بھی گاؤں سے غائب تھے۔ کچھ لوگوں نے یہ قیافہ بھی لگایا کہ ریشمی کے گھر والے پرویز نے چاچے رزاق کو ریشمی کا کوئی کھوج کھرا بتایا ہے اور وہ اسے ڈھونڈنے نکلے ہیں...... تاجور اور نوری بھی چاچا رزاق کے ساتھ گئی ہیں پھر اسی دوران ایک اور خبر نے لوگوں کو ہلا دیا۔ پتا چلا کہ ریشمی کے شوہر پرویز کو لاہور میں کسی نے قتل کر دیا ہے۔ لوگ یہ باتیں کرنے لگے کہ پرویز کو مارنے والے وہی لوگ ہوں گے جنہوں نے ریشمی کو اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ وہ چاچے رزاق اور تاجور کو بھی نہیں چھوڑیں گے۔ انہیں ماردیں گے یا غائب کر دیں گے۔ اس وقت کسی کو اندازہ نا ہیں تھا کہ تم اور انیق بھی چاچے رزاق کے ساتھ ہو۔"

"چاچے رزاق کے بارے میں پتا چل گیا ہے نا تمہیں؟" میں نے افسردگی سے پوچھا۔

حشمت نے اثبات میں سر ہلایا۔ "میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ گاؤں میں تہلکہ مچا ہوا ہے۔ یہ پیر کی رات کی بات ہے جب اچانک گاؤں میں یہ خبر پھیل گئی کہ چاچے رزاق کی بیٹی زندہ سلامت گاؤں میں واپس پہنچ گئی ہے۔ اس کے بعد ایسی ایسی خبریں ملیں کہ عقل دنگ رہ گئی۔ پہلے پتا چلا کہ چاچا رزاق ختم ہو گئے ہیں پھر معلوم ہوا کہ نوری بھی نہیں رہی اور تاجور کے بچنے کا بھی کوئی امکان نہیں۔ تاجور کی والدہ پہلے ہی بیمار تھیں۔ انہیں دل کا دورہ پڑا اور وہ اسپتال جا پہنچیں۔ بعد میں تمہارے دوست انیق نے بتایا کہ تاجور چلتی گاڑی سے اچھل کر نیچے گر گئی تھی، اسے بچانے کے لیے تم بھی گاڑی سے کود گئے تھے۔ انیق نے تسلی دی کہ تم دونوں ملنگوں سے بچ کر نکل گئے ہو۔"

"ملنگوں کے بارے میں کیا معلوم ہوا تمہیں؟"

"وہ سب کچھ...... جس پر اب تک یقین نہیں آ رہا۔ عقل خبط ہو گئی ہے لوگوں کی۔ پیر سائنا کو لوگوں نے سات سال پہلے مردہ سمجھ لیا تھا اور اسے بڑی شان سے دفن بھی کر دیا تھا لیکن اب ایک دوسری ہی کہانی سامنے آئی ہے۔ پولیس نے بھی تصدیق کی ہے کہ یہ پیر سائنا ہی تھا جو چاندگڑھی سے بھاگ کر آزاد کشمیر کی طرف نکل گیا اور وہاں کسی ملنگی ڈیرے کا کرتا دھرتا بن گیا۔ ملنگی ڈیرے کے بارے میں بھی جو باتیں سامنے آئی ہیں، وہ حیرت زدہ کرنے والی ہیں۔ یقین نہیں آ رہا کہ پیر سائنا نے اس طرح علاقے کے لوگوں کو بے وقوف بنایا ہوا تھا۔ پرسوں شام پیر سائنا کی لاش بھی پوسٹ مارٹم کے بعد چاندگڑھی پہنچی تھی جن لوگوں نے

اس کا جلا ہوا منہ دیکھا ہے، کانوں کو ہاتھ لگاتے ہیں۔ پیر ولایت اور اس کے حمایتی، عام لوگوں سے منہ چھپاتے پھر رہے ہیں۔''

پہلوان حشمت نے چند لمحے توقف کر کے دھیان سے مجھے دیکھا اور بولا۔ ''کیا واقعی پیر سانتا کو تم نے مارا ہے؟''

''تمہیں کیسے پتا چلا؟''

''ریشمی...... نے تو یہی بتایا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ تم نے بہت دلیری دکھائی۔ اگر تم سانتا کو نہ مارتے تو وہ اسے مار دیتا۔''

''ہاں، اس وقت تو یہی سچویشن بنی ہوئی تھی۔''

''چاند گڑھی کے لوگ اس بات پر تو دکھی ہیں کہ چاچے رزاق اور نوری کی جان چلی گئی ہے مگر وہ اس بات پر خوش بھی ہیں کہ پیر سانتا کا بھید کھلا ہے اور وہ بالآخر اپنے انجام کو پہنچا ہے۔ اب تو پیر لایت کے بہت سے عقیدت مند بھی اس پر لعن طعن کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ ولایت خبیث کہوت تھا کہ میرے باپ نے علاقے کے لوگوں کے گناہ اپنے سر پر لیے اور ان گناہوں سمیت آگ میں جل کر سرخرو ہو گیا۔ اب پتا چل رہا ہے کہ وہ خبیث اپنا منحوس منہ چھپا کر پردے والی سرکار بنا ہوا تھا اور کہیں اور جا کر لوگوں کی زندگیوں سے کھیل رہا تھا۔ چاند گڑھی میں ریشمی اپنے منہ سے اس کی اور پیر کرنالی کی کارستانیاں لوگوں سے بیان کر رہی ہے۔ سنا ہے، کئی تھانوں کی پولیس نے مل کر ملنگی ڈیرے پر بہت بڑا چھاپا مارا ہے۔ وہاں سے درجنوں ملنگ اور مجاور گرفتار ہوئے ہیں۔ بہت سے ایسے مردوں، عورتوں کو ڈیرے سے رہائی ملی ہے جن کو وہاں زبردستی بند رکھا گیا تھا۔ خبروں سے پتا چلت ہے کہ ان میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جن کی ٹانگوں کی کوئی رگ کاٹ کر انہیں لنگڑا کر دیا گیا تھا۔ ایسی ایسی کہانیاں سامنے آ رہی ہیں کہ دماغ سن ہو جاوت ہے۔ وہ پولیس افسر کے بھائی والی بات جانت ہو تم؟''

''ہاں، اسے وہاں قتل کر دیا گیا تھا۔'' میں نے کہا۔

''تمہارے دوست انیق نے تو بتایا ہے کہ اس بے چارے کو زندہ، شکاری چیتوں کے سامنے ڈالا گیا اور انہوں نے اس کے ٹکڑے کر دیئے۔ اس بے چارے کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ اپنے ایک دوست کی منگیتر کو ڈیرے کے چنگل سے چھڑانا چاہت تھا۔''

''میں نے وہ سارا واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور وقت پڑنے پر اس کی گواہی بھی دوں گا۔'' میں نے کہا۔

میں پہلوان سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ اور جاناں، ان ڈکیتوں کے شکنجے میں کیسے پھنسے ہیں اور چاندگڑھی سے اتنی دور یہاں اس جنگل میں کیسے پہنچے ہیں لیکن وہ بے تکان بولتا جارہا تھا پھر ایک دم مجھے نوری کی لاش کا خیال آگیا۔ میں نے حشمت سے پوچھا۔ ''نوری اور چاچے رزاق کی لاشوں کا کیا بنا؟''

''چاچے رزاق کی لاش تو پہلے دن ہی مل گئی تھی۔ اگلے روز تمہارے ساتھی رضوان کی نشاندہی پر نوری کی میت بھی گڑھے سے نکال لی گئی۔ چاچے رزاق کے جسم پر گولیوں کے کوئی پچاس زخم تھے۔ دستی بم کے ٹکڑے بھی لگے ہوئے تھے۔ رضوان اور ریشمی نے بتایا ہے کہ چاچا اپنے بوڑھے جسم کے ساتھ آخر تک ملنگوں کی فائرنگ کے سامنے ڈٹا رہا۔ وہ کوئی ایسا ماہر نشانے باز تو ناہیں تھا مگر بندوق چلانا اس کو آوت تھی اور وہ آخر وقت تک چلاتا رہا۔ بڑا پیار تھا اسے اپنی بیٹی سے...... اور اس نے یہ ثابت بھی کر دیا۔''

میں نے ذرا توقف کر کے کہا۔ ''میرے بارے میں لوگوں کی رائے کیا ہے؟''

وہ ایک بار پھر الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کی چربی دار گردن پر خراشیں نظر آ رہی تھیں۔ ایک طویل سانس لے کر بولا۔ ''سچی بات تو یہ ہے کہ تمہارے بارے میں رائے اچھی ناہیں تھی اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے جو اب مجھے بھی نظر آ رہی ہے۔ یقین ہی ناہیں آوت کہ ایسا ہو سکت ہے۔ تم بول رہے ہو اور ہم چاند گڑھی میں تمہیں پیدائشی گونگا سمجھت تھے۔ لوگوں کے ذہنوں میں یہی ہے کہ تم نے دین محمد اور اس کے گھر والوں سے فراڈ کیا ہے۔ وہ انیق کو بھی اس فراڈ میں شامل سمجھت ہیں۔ تمہارے بارے میں خراب رائے ہونے کی دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ لوگ شک میں پڑ گئے ہیں۔''

''کیسا شک؟'' میں نے پوچھا۔

''برا نہ ماننا...... لوگوں کو شبہ ہے کہ شاید تم دین محمد کی بیٹی تاجور کے پیچھے ہو۔ وہ یہ بھی سوچت ہیں کہ ملنگی ڈیرے جانے کے بارے میں انیق نے جھوٹ بولا ہے۔''

''کیسا جھوٹ؟''

''اس نے یہی بیان دیا ہے کہ تم انیق اور تاجور اتفاق سے ملنگی ڈیرے میں اکٹھے ہوئے۔ مگر لوگ سمجھت ہیں کہ تم تینوں یہاں سے پروگرام بنا کر گئے تھے...... کہ ریشمی کو ملنگی ڈیرے سے واپس لایا جائے۔ بہرحال......'' پہلوان کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گیا پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''ایک بات ہے کہ ملنگی ڈیرے پر تم نے جو دلیری دکھائی ہے اور جس طرح پیر سانتا کو مارا اور ریشمی کو وہاں سے نکالا ہے، لوگوں کی رائے تمہارے بارے میں کچھ بہتر ہو

گئی ہے۔ خاص طور سے ان لوگوں کی جو پیر سائنتا اور اس کے پتر پیر ولایت کو مکار اور بدکار سمجھتے ہیں۔"

"چلو...... تھوڑی بہت معافی تو ملی۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"ویسے لوگ تمہارے اور تاجور کے بارے میں بہت فکرمند ہیں۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس وقت ملنگ تمہارے سخت دشمن بنے ہوئے ہیں۔ تم انہیں جہاں بھی ملو گے وہ تمہیں...... مار ڈالیں گے لیکن...... جہاں تک میری عقل کام کرتی ہے، تو اس وقت ملنگوں کے پاس تو نہیں ہو۔ یہ تو خیر سے سجاول سیالکوٹی کا گینگ ہے۔"

میں نے کہا۔ "پہلوان! تم میرے بارے میں تو کافی کچھ جان گئے ہو، لیکن اپنے بارے میں کچھ نہیں بتا رہے ہو۔ تم ان لوگوں کے ہتھے کیسے چڑھے...... اور یہ لڑکی جو تمہارے ساتھ آئی ہے، کیا تمہارے ساتھ ہی پکڑی گئی ہے؟"

پہلوان نے محتاط نظروں سے ارد گرد دیکھ کر کہا۔ "بس میں تو خدا ترسی میں ہی دھر لیا گیا ہوں۔ میرے ساتھ اکثر ایسا ہی ہووت ہے۔ (ایک لمبی ٹھنڈی سانس لی) وہ استاد دامن کا مشہور شعر ہے نا کہ، چوٹ لگے کسی کو تڑپتے ہیں ہم میر...... سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے۔ بس یہی حال میرا ہے۔"

مجھے زیادہ پتا تو نہیں تھا لیکن یہ ضرور معلوم ہو گیا کہ جس شعر کو استاد دامن کا کہا جا رہا ہے، وہ ہرگز ان کا نہیں ہو گا کیونکہ اس میں شاعر کا تخلص "میر" آ رہا تھا...... بہرحال یہ بحث کا موقع نہیں تھا۔ میں پہلوان حشمت کی بپتا سنتا رہا، وہ بولا۔ "نہر پار کے گاؤں میں ایک مریض کو دیکھنے جا رہا تھا۔ شام کا وقت تھا۔ کھیتوں سے گزر رہا تھا کہ یہی لڑکی بھاگتی ہوئی نظر آئی۔ نہ پاؤں میں جوتی، نہ سر پر دوپٹا، اس نے کہا کچھ غنڈے میرے پیچھے ہیں۔ میں نے تاؤ دیکھا نہ آؤ۔ اسے اپنے پیچھے موٹر سائیکل پر بٹھا لیا۔ میں ناہیں جانت تھا کہ وہ لوگ بھی گاڑی پر ہیں۔ دو منٹ میں ان کی جیپ میرے سر پر پہنچ گئی۔ گھبراہٹ میں میری موٹر سائیکل کا گیئر پھنس گیا۔ تم تو جانت ہی ہو، اگر گیئر نہ لگا ہو تو کتنی بھی ریس دیں موٹر سائیکل آگے نہیں جاتی۔ بس انہوں نے پکڑ لیا۔ خطرناک لوگ ہیں مجھے اور لڑکی دونوں کو رائفلوں کے بٹ مارے۔ شاید مجھے چھوڑ جاتے لیکن قیامت اعمال (شامت اعمال) ان میں سے ایک نے مجھے پہچان لیا۔ کہنے لگا یہ چاند گڑھی کا پہلوان حشمت ہے۔ ہڈی جوڑ کا کام کرت ہے۔ ہمارے کام آ سکت ہے۔ بدبختوں نے مجھے بھی جیپ پر چڑھا لیا۔ وہ کیا کہوت ہیں، گدھے کے ساتھ گھن بھی پس گیا۔" پہلوان غالباً کہنا چاہ رہا تھا کہ گدھے کے ساتھ رسی بھی گئی۔

ایک دم پہلوان کو چپ ہونا پڑا۔ فیض محمد واپس آرہا تھا۔ ایک بندے نے انگیٹھی اور اینٹ کا ٹکڑا اٹھایا ہوا تھا۔ ساتھ میں کوئلے بھی تھے۔

فیض محمد کے سامنے پہلوان خاموشی سے اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ میرے ذہن میں خدشات ابھر رہے تھے۔ پہلوان نے ابھی بتایا تھا کہ سجاول کے جو ساتھی اسے پکڑ کر یہاں لائے، ان میں ایک ایسا بندہ بھی ہے جو اسے ہڈی جوڑ پہلوان کی حیثیت سے جانتا تھا۔ اگر وہ بندہ یہاں ساتھ آیا تھا تو پھر وہ مجھے یا تاجور کو بھی شناخت کر سکتا تھا۔

مجھے رہ رہ کر جاناں پر بھی غصہ آرہا تھا۔ میں نے اسے بار بار تاکید کی تھی کہ وہ تھوڑا صبر سے کام لے اور شہر جانے کی کوشش نہ کرے۔ اسے سجاول کے لوگوں کی طرف سے سخت خطرہ تھا اور رام پیاری اور وکرم کے پاس وہ بالکل محفوظ تھی لیکن حالات بتا رہے تھے کہ اس نے میری ہدایت کو نظرانداز کیا اور اس چار دیواری سے نکل آئی۔ اب نتیجہ سامنے تھا۔ وہ پھر ان کے ہتھے چڑھ گئی تھی اور ساتھ میں پہلوان حشمت بھی پھنسا تھا۔

پہلوان سے کندھے پر ''غیر ضروری'' پٹی بندھوا کر میں کوٹھڑی واپس پہنچا تو وہاں تاجور نظر نہیں آئی۔ میرے جسم کا سارا خون جیسے میرے سر کو چڑھنے لگا۔ وہ کہاں گئی تھی؟ پھر میری نظر فیض محمد پر پڑی۔ اس نے مجھے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔ ''گھبراؤ نہیں، میں خود اسے چھوڑ کر آیا ہوں۔ تم دونوں کو اندر کی طرف اچھا کمرا دے دیا گیا ہے۔ تاجور وہیں پر ہے۔ اختری بی بی بھی اس کے پاس ہے۔''

میں فیض محمد کے ساتھ اندرونی حصے میں پہنچا۔ تاجور آرام دہ ڈبل بیڈ پر لیٹی تھی۔ اختری بی بی اس کے پاس بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔ یہ دراصل دو کمرے تھے۔ درمیان میں چھوٹا سا دروازہ بھی تھا۔ آسائش کی کافی چیزیں یہاں موجود تھیں۔ انگیٹھی بھی دہک رہی تھی۔ ایک چھوٹے دروازے سے پتا چلتا تھا کہ باتھ روم بھی موجود ہے۔

یہاں اختری بی بی کی موجودگی مجھے اچھی نہیں لگی۔ یہ بڑی کائیاں عورت تھی۔ دو تین دن پہلے میں نے ماؤ کے ساتھ اختری کی جو باتیں سنی تھیں، ان سے پتا چلتا تھا کہ وہ تاجور کے حمل کے حوالے سے شک میں پڑ چکی ہے۔ اب شاید وہ پھر اسی ٹوہ میں لگی ہوئی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ اٹھ کر گئی تو میں اور تاجور باتیں کرنے لگے۔ تاجور کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے بتایا کہ اسے دونوں چھوٹے بھائی راحیل اور اسفند بہت یاد آرہے ہیں...... میں نے اسے تسلی دی اور ایک بار پھر اپنی بات دہرائی کہ میرے ہوتے ہوئے کوئی اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔

وہ کہنے لگی۔ ”شاہ زیب! میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس طرح سجاول جیسے خطرناک بندے سے سامنا ہوگا۔ میں ہر طرح سے اس کے رحم وکرم پر ہو جاؤں گی۔ یہ بڑے سخت لوگ ہیں۔ ابھی اختری بی بی بتا کر گئی ہے کہ یہ لوگ کسی ایکٹر لڑکی کو یہاں پکڑ کر لائے ہیں۔ وہ ناچ گانا بھی کرتی ہے۔ کچھ دن پہلے وہ سجاول کے ایک بندے کے منہ پر بوتل مار کر اور اسے زخمی کر کے بھاگ گئی تھی۔ اب وہ یہاں بھگتے گی۔ ابھی اختری بی بی بتا رہی تھی کہ وہ اس لڑکی کو سمجھا کر آئی ہے۔ اسے کہا ہے کہ وہ اب بری طرح پھنس گئی ہے۔ اس لیے اپنی اکڑ شکڑ چھوڑ دے۔ جو کچھ یہ لوگ کہتے ہیں، وہ خوشی خوشی کرے۔ وہ سکھی رہے گی اور یہ لوگ بھی خوش رہیں گے۔ اختری بتا رہی تھی......“ تاجور جھجک کر رک گئی۔

”کیا بتا رہی تھی؟“

”وہ بتا رہی تھی کہ ابھی لڑکی کو بخار ہے۔ دو چار دن میں ٹھیک ہو جاتی ہے تو سجاول کا بڑا بھائی اعظم اسے چند دن اپنے پاس رکھے گا، پھر اسے فخرو کے پاس بھیج دیا جائے گا۔“

”فخرو کے پاس کیوں؟“

”فخرو ہی تو وہ بندہ ہے جس کے منہ پر بوتل مار کر یہ بھاگی تھی۔“ تاجور نے بجھی بجھی آواز میں کہا۔

چوڑی ناک والے فخرو کی صورت میری نگاہوں میں گھوم گئی۔ اس کی پیشانی پر چند ہفتے پرانے زخم کا نشان بھی تھا۔ اب تاجور کی بات میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ عورت کائنات کی خوب صورت ترین مخلوق۔ جس سے زندگی میں رنگ ہیں، نرمی اور محبت ہے لیکن جب اسے دشمنی کی چکی میں پیسا جاتا ہے اور انتقام کے شکنجے میں کسا جاتا ہے تو پوری کائنات جیسے بدصورت ہو کر سسکنے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ ”لطف وکرم“ بھی ایک پسینا زدہ، ہانپی ہوئی کراہت میں بدل جاتا ہے جو قدرت نے پیکرِ زن میں رکھا ہے۔

میں نے کہا۔ ”تاجور! میں یہاں ہوں نا، بے شک یہ ایک بری جگہ ہے لیکن ہم پوری کوشش کریں گے کہ کم از کم ہماری موجودگی میں یہاں کوئی گھناؤنا کام نہ ہو۔“

وہ ذرا وقفہ دے کر بولی۔ ”یہ آپ بار بار کہاں چلے جاتے ہیں۔ آپ ٹھیک سے ناشتا بھی کر کے نہیں گئے۔ کچھ کھانے کے لیے دوں آپ کو؟“

”نہیں، اب بھوک نہیں۔“

وہ کھوجنے والی نظروں سے دیکھ کر بولی۔ ”بھوک نہیں یا کہیں سے ناشتا کر لیا ہے؟“

”سمجھو، تھوڑا سا کر ہی لیا ہے۔ سجاول کی والدہ ماؤجی نے مجبور کیا کہ میں وہاں ان کے

پاس ناشتا کروں۔"

"وہ عورت آپ کو اتنی اہمیت کیوں دے رہی ہے۔کیا کوئی مقصد ہے اس کا؟"

"اللہ کرے کوئی مقصد ہو۔جس کی وجہ سے ہمیں یہاں سے کچھ رعایتیں مل جائیں اور پھر ہمیں یہاں سے نکلنے کا موقع بھی مل سکے۔لیکن ابھی تک تو کوئی بات سامنے نہیں آئی۔" مجھے تاجور کے سامنے جھوٹ بولنا پڑا۔

میں نے دیکھا کہ وہ دور ہی سے کچھ سونگھنے کی کوشش کر رہی ہے۔شاید اندازہ لگا رہی تھی کہ میں آج پھر تو ڈرنک وغیرہ نہیں کر آیا۔

اب اس کمرے میں مسئلہ یہ تھا کہ ایک ہی ڈبل بیڈ تھا اور ڈبل بیڈ کا ایک ہی لحاف تھا۔ تاجور اس صورتِ حال پر سخت خجل ہو رہی تھی۔ بہرحال، ہم دونوں بیڈ کے ایک ایک کنارے پر منہ پھیر کر لیٹے رہے اور سو گئے۔تاجور کے اتنا قریب ہونے کے باوجود رومانی جذبات کا کہیں اتا پتا نہیں تھا۔یقیناً یہ صورتِ حال عارضی تھی اور حالات کے جبر کا نتیجہ تھی۔ یہاں ہمیں اچھا کھانا مل رہا تھا اور دیگر سہولتیں بھی حاصل تھیں۔

اگلے روز ماؤ جی کی طرف سے پھر بلاوا آ گیا۔میں تیار ہو کر چوڑی ناک والے فخرو کے ساتھ ماؤ جی کی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہوا۔کمرے سے باہر نکلتے ہی کانوں میں کسی کے بھاری آواز میں بولنے کی صدا آئی۔ میں فوراً پہچان گیا۔یہ سجاول کا وہی عیاش بڑا بھائی تھا۔ ساتھ ہی چاچا فیض محمد بھی تھا۔کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔سامنے بان کی چارپائی پر جاناں بیٹھی نظر آ رہی تھی۔اس کا چہرہ مظلومیت کی تصویر تھا۔سجاول کا بڑا بھائی اعظم طنزیہ انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔ایک ہاتھ سے اس نے جاناں کی دبلی پتلی کلائی تھام رکھی تھی۔شرابی انداز میں ہنس کر بولا۔"ٹھنڈا بخار ہے، ایک دم ٹھنڈا بخار ہے۔تم زنانیوں کو ایسے بہانے خوب آتے ہیں۔مہینے میں تیس دن اور تیس دنوں میں پچیس بہانے......"

وہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا سیب جاناں کے منہ میں ٹھونستے ہوئے کہا۔"کھا اس کو، کچھ کھائے پیئے گی تو چھیتی ٹھیک ہو گی کھا اسے۔" وہ زبردستی سیب اِس کے منہ میں گھسیڑنے لگا۔"نخرے نہ کر۔کھول منہ......شاباش۔" اس نے آدھا سیب اس کے منہ میں ٹھونس دیا۔اس نے مجبوراً ایک "بائٹ" لی۔اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے تھے۔جاناں نے میری طرف نہیں دیکھا تھا اگر دیکھتی بھی تو کہاں پہچانتی میں اسے تین چار بار ملا تھا اور ہر مرتبہ میرے چہرے پر ڈھاٹا تھا۔وہ مجھے بس یاسر بھائی کے طور پر جانتی تھی۔اگلے ہی لمحے ہم دروازے کے سامنے سے گزر کر آگے نکل گئے۔نشئی اعظم کی آواز میرے کانوں

تک پہنچی۔ وہ اب شاید کمرے سے باہر جا رہا تھا۔ فیض محمد سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''اوئے فیضو...... بالکل بے فیض ہوتے جا رہے ہو تم۔ کسی کا پاؤں بھاری ہے، کسی کا سر بھاری ہے، کسی کو ٹھنڈا بخار چڑھا ہوا۔ دو چار دن میں اس چھوکری کو بھلا چنگا کرو۔''

کچھ ہی دیر بعد میں براہِ راست شعلہ صفت مانی کے آراستہ کمرے میں پہنچ چکا تھا۔ سخت سردی میں بھی اس نے ہلکی سی شرٹ اور ٹراؤزر پہن رکھا تھا۔ وہ کچھ ہانپی ہوئی بھی تھی۔ کمرے میں میوزک بھی آن تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ ایک انڈین پنجابی گانے پر ڈانس کر رہی تھی۔ اس نے دروازہ اندر سے بند کر دیا اور اپنے دہکتے جسم کے ساتھ مجھ سے لپٹ گئی۔

''تمہیں ڈانس کرنا آتا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''آتا تو ہے لیکن اس وقت کوئی موڈ نہیں۔''

''تو پھر کیا موڈ ہے میرے سونے مونے کا۔'' اس نے ہونٹوں سے ''چچ'' کی آواز نکالی اور میری ٹھوڑی کو چھوا۔

''کچھ بھی نہیں۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔'' وہ اٹھلا کر بولی۔ ''تم پڑھے لکھے ہو لیکن ہو تو جٹ پتر۔ اور جٹ پتر بڑے محنتی اور ڈھاڈے ہوتے ہیں۔''

اس نے میرے سویٹر کے بٹن کھول کر اسے اتار دیا۔ میرے سینے کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مجھے بستر پر دھکیل دیا۔ وہ آج پھر پرسوں والے چونچلے چاہ رہی تھی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور تکیے سے ٹیک لگا لی۔

وہ مجھے غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کیا بات ہے، آج کچھ ڈھیلے ڈھیلے نظر آ رہے ہو۔ کہیں تمہاری گھر والی نے تو لگامیں نہیں کھینچ لیں؟''

''نہیں، اس کی مجھے کوئی ایسی پروا نہیں۔ دل سے چڑھ گئی ہوئی ہے۔''

وہ مجھے بازوؤں میں لیتے ہوئے بولی۔ ''دل سے چڑھ گئی ہوئی ہے تو پھر زندگی سے اتار دو نا اسے۔ دادی بھی کہہ رہی تھیں کہ وہ جلد ہی تمہاری زندگی سے رفو چکر ہونے والی ہے۔ دادو (دادی) کے مرشد بڑی پہنچی ہوئی چیز ہیں۔ وہ وقت سے پہلے ہی انہیں بہت سی باتیں بتا دیتے ہیں۔''

میں خاموش رہا۔ اس نے اپنا درمیانی فاصلہ کم کیا اور پھر مجھے اپنی حرارت سے مشتعل کرنے کی کوشش کی مگر میں برف بنا بیٹھا رہا۔

''مجھے بتاؤ، بات کیا ہے؟'' وہ ذرا سٹپٹا کر بولی۔

میں نے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ ''مانی! تمہیں میرا ایک کام کرنا ہوگا...... چھوٹا سا کام ہے۔''

''کیا؟'' وہ میری آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔

''ایک لڑکی کی تھوڑی سی مدد کرنا ہوگی۔ اب یہ نہ پوچھنا کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آئی ہے؟ میرا اس سے کیا تعلق ہے؟ بس یوں سمجھ لو کہ وہ جیسی بھی ہے، میں اسے عزت دیتا ہوں اور اسے یہاں مشکل سے بچانا چاہتا ہوں۔''

''عزت ہی دیتے ہونا؟'' وہ ذرا شوخی سے بولی۔

''بالکل ایسا ہی ہے۔''

''کون ہے وہ؟''

''وہی ماڈل گرل جاناں، جسے تمہارے لوگ سیالکوٹ کی سائیڈ سے پکڑ کر لائے ہیں۔''

''وہ جس کے ساتھ ایک موٹا بھی ہے، ڈڈو جیسی آنکھوں والا؟''

''ہاں وہی؟''

میں نے مانی سے کہا کہ تمہارا شرابی باپ اسے چند دن اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے پھر شاید اسے فخرو کے حوالے کر دیا جائے، کیونکہ وہ اسے دھوکا دے کر بھاگی تھی۔ میں نے مانی سے درخواست کی کہ وہ جاناں سے دوستی گانٹھ لے، اسے اپنی سہیلی بنالے، یا پھر کوئی اور طریقہ، جس سے وہ خراب ہونے سے بچ جائے۔

میں نے پوری بات مانی کو سمجھا دی تھی۔ وہ خود بھی کافی تیز طرار تھی۔ اس کی سمجھ میں بھی یہی آیا کہ اگر وہ اگلے دو تین دن میں جاناں سے فرینڈ شپ بنالے تو اسے یہاں ہونے والی بدسلوکی سے بہ آسانی بچایا جاسکتا ہے۔

کچھ دیر بعد وہ ادا سے بولی۔ ''چلو اب تو تمہارے دماغ سے بوجھ اتر گیا۔ اب ذرا موڈ بحال کرو۔''

وہ میرے کہنے سے پہلے ہی الماری سے بیئر اور وہسکی نکال لائی۔ میں نے کہا۔ ''نہیں، آج نہیں۔ دل نہیں چاہ رہا۔''

''یہ کیا بات ہوئی۔ ایسی باتیں تو عورتوں کے منہ سے چنگی لگتی ہیں۔''

''بھئی، تمہارے ہوتے ہوئے اس مصنوعی نشے کی ایسی کیا ضرورت ہے؟'' میں نے بات بنائی۔

وہ تڑاخ سے بولی۔ ''سیانے کہتے ہیں، نشہ، نشے سے مل جائے تو اور تیز ہو جاتا ہے۔''
''یہ نشہ پہلے ہی بڑا تیز ہے۔'' میں نے اسے بانہوں میں لیتے ہوئے کہا۔
وہ بڑی بپھری ہوئی تھی۔ اس کا بدن جیسے خاموشی کی زبان میں پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ اس کی شادی کو اب مزید دیر نہیں ہونی چاہیے۔ خوش قسمتی سے ایک دو منٹ بعد ہی ماؤ جی یعنی مانی کی دادو کی آواز سنائی دی۔ وہ اسے پکارتی ہوئی آ رہی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ ''اتفاقاً'' نہیں آتی۔ میں اور مانی سنبھل کر بیٹھ گئے۔ ماؤ جی اندر آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک قیمتی راڈو گھڑی اور ایک سیل فون سیٹ تھا۔ فون سیٹ بھی کافی مہنگا رہا ہوگا۔ اس نے اپنے ہاتھ سے گھڑی میری کلائی پر باندھی اور بولی۔ ''یہ کل سجاول نے دی تھی، خاص تیرے لیے...... اور یہ میری طرف سے۔ لیکن یہ ابھی نہیں، شادی کے بعد ملے گا تجھے۔''
میں نے دل ہی دل میں ان دونوں چیزوں پر لعنت ارسال کی۔ ظاہر ہے یہ ڈکیت کے تحفے تھے اور کسی مقتول یا مضروب کی نشانی تھے۔ ماؤ کی آمد کو غنیمت جان کر میں جلد ہی وہاں سے نکل آیا۔

شام کو عجیب انکشاف ہوا۔ فیض محمد میرے کندھے کا حال پوچھنے میرے پاس آیا۔ اسی دوران میں تیز بارش ہونے لگی۔ تاجور لحاف اوڑھ کر لیٹی ہوئی تھی۔ ہم ساتھ والے کمرے میں آن بیٹھے۔ چائے پیتے ہوئے فیض نے رازداری کے انداز میں کہا۔ ''شکر ہے کہ تمہاری منگیتر اس رات وڈے سردار اعظم سے بچ گئی۔ ایک نمبر کا خبیث ہے وہ...... یہاں ہر ایک کو پتا ہے کہ اصل میں وہ کیا ہے، تمہیں بھی ایک دو دن میں پتا چل ہی جانا ہے۔''
''کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''شیطان مردود، اور کیا۔ ویسے تو ہم سب ہی یہاں جہنمیوں والے کام کر رہے ہیں مگر اس وڈے سردار کی تو بات ہی اور ہے۔ اس کی بیوی ایکسیڈنٹ وغیرہ سے نہیں مری تھی۔ گھر سے بھاگ گئی تھی وہ اپنے عاشق کے ساتھ۔ شریف زادی نہیں تھی، طوائف کی بیٹی تھی۔ ایک نہ ایک دن تو خون بولتا ہی ہے نا۔ اس وقت یہ مانی صرف چھ سات سال کی تھی۔''
''تمہارا مطلب ہے کہ بیوی کی بے وفائی کے بعد اعظم کا یہ حال ہوا۔''
''ہاں، شراب، اور تھوڑی بہت عورت بازی تو خیر یہ پہلے بھی کرتا تھا لیکن اس کے بھاگنے کے بعد بالکل ہی عیشی پٹھا بن گیا۔ اب شاید اس بھگوڑی کا بدلہ ہی لیتا ہے دوسری عورتوں سے۔ اور کسی عورت پر زیادہ دیر ٹکتا بھی نہیں، ہفتے دس دن بعد ہی کسی اور کو ڈھونڈنے لگ پڑتا ہے۔ ایسے ماں پیو ہوں گے تو پھر اولاد تو شیطان ہی ہو گی نا۔''

فیض شاید ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ مانی کے کرتوت میرے سامنے تھے۔ اب یہ بات بھی سمجھ میں آ رہی تھی کہ اسے میوزک اور رقص وغیرہ میں اتنی دلچسپی کیوں ہے۔

اچانک دوسرے کمرے کا دروازہ دھماکے سے کھلا۔ تاجور کے چلانے کی آواز آئی۔ ساتھ ہی سجاول سیالکوٹی اپنی پاٹ دار آواز میں گرجا۔ ''کہاں ہے وہ...... کہاں ہے؟''

میں اور فیض اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔ میں نے سجاول کو دیکھا۔ رائفل اس کے ہاتھ میں تھی۔ کپڑے بارش میں بھیگے ہوئے تھے لیکن وہ خود شعلے کی طرح بھڑکا ہوا تھا۔ اس کے عقب میں دو تین ہرکارے تھے۔ ان میں سے ایک ہرکارے کو دیکھ کر میرے بدترین خدشات حقیقت کا روپ دھار گئے۔ سجاول کے اس ساتھی کو میں نے شاید چاند گڑھی میں بھی دیکھا تھا۔ اسی شخص نے حشمت کو پہچانا تھا اور غالباً اسی نے اب مجھے بھی پہچان لیا تھا۔ ''حرام زادے...... دھوکے باز'' سجاول دہاڑا اور رائفل کا دستا گھما کر میرے سینے پر رسید کیا۔ میں دیوار سے ٹکرایا۔ تین چار ڈشکرے مجھ پر پل پڑے۔ لاتوں اور گھونسوں سے بے دریغ مارنے لگے۔ وہ اپنے زعم میں میری ٹھیک ٹھکائی کر رہے تھے لیکن جس نے یورپ کے خطرناک فائٹنگ کلبوں میں سفاک ترین MMA فائٹرز کی مار کھائی ہو، اس کے لیے یہ ''دھول دھپا'' کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ مجھے اگر کوئی چیز تکلیف دے رہی تھی تو وہ تاجور کے چلانے کی آواز تھی...... مجھ پر حملہ آور ہونے والے مجھے دیواروں سے پٹخ رہے تھے اور بے طرح پیٹ رہے تھے۔ سجاول کی پھنکار میرے کانوں تک پہنچی۔ اس نے کہا۔ ''دین محمد کا گونگا ڈرائیور، اس کی دھی کو بھگا کر لے گیا اور شادی کر لی اس سے۔ کس نے اجازت دی تجھے شادی کی؟ کس نے؟ یہ عالمگیر کے یار کی منگ تھی۔ تجھے پتا نہیں تھا...... پتا نہیں تھا؟''

اس نے خود بھی آگے بڑھ کر ایک زوردار لات میری پیٹھ پر جمائی۔ میں چاہتا تو اس موقع پر اس کے ہولسٹر پر جھپٹا مار سکتا تھا یا اس کی کمر سے بندھے ہوئے چھرے تک ہاتھ پہنچا سکتا تھا مگر ابھی میں کسی طرح کا ایڈونچر نہیں چاہتا تھا۔ اچانک سجاول کے ایک کارندے نے چلا کر کہا۔ ''ماؤ جی آ رہی ہیں۔''

''ٹھہرو۔'' سجاول گرجا۔

مجھے مارنے والوں نے ہاتھ روک لیے۔ سجاول سٹپٹائے ہوئے انداز میں آگے بڑھا اور مجھے گریبان سے پکڑ کر جلدی سے اٹھایا۔ اسی دوران میں ہٹی کٹی ماؤ جی گھبرائی ہوئی دروازے پر نمودار ہوئی۔ اس نے میرا حلیہ دیکھا۔ سینے پر ہاتھ رکھ کر ''ہائے اللہ'' کہا اور جیسے چکرا کر تاجور والے بیڈ پر بیٹھ گئی۔ ''کیا ہوا اسے؟'' وہ کراہی۔ اس کا رنگ ایک دم زرد ہو گیا تھا۔

سجاول اس کی طرف بڑھا لیکن سجاول کے تھامنے سے پہلے ہی وہ بستر پر گر گئی...... وہ بے ہوش یا نیم بے ہوش ہو گئی تھی۔

سجاول نے قہرناک نظروں سے میری طرف دیکھا، پھر اپنے ایک کارندے سے مخاطب ہو کر دہاڑا۔ ''پانی لاؤ...... جلدی کرو۔''

تاجور کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ ہکا بکا کھڑی، ماؤ جی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

○......❖......○

ماؤ جی کے بے ہوش ہونے سے افراتفری سی مچ گئی تھی۔ سب بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ ایک شخص توند مٹکاتا ہوا آیا۔ اس کے ہاتھ میں پانی کا گلاس تھا۔ پانی پینے سے پہلے ہی ماؤ جی نے کسمسانا شروع کر دیا۔ سجاول سیالکوٹی نے اس کی ہتھیلیوں کی مالش کی۔ ماؤ نے آنکھیں کھول دیں اور بڑبڑانے لگی۔ ''شاہ زیب کو کیا ہوا؟ میرے پتر کو کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں ہوا ماں جی۔ سیڑھیوں سے گر گیا ہے۔'' سجاول نے بہانہ بنایا۔

''ہائے اللہ، اس کا دھیان کیوں نہیں رکھا تم نے؟ کتنی چوٹیں آئی ہیں اسے۔ وہ دینو کہاں مر گیا تھا۔ میں نے اس سے کہا بھی تھا کہ ہر وقت ساتھ رہے میرے پتر کے...... کہاں ہے وہ ڈنگر۔ کہاں ہے؟''

ایک طرف سے دینو آگے بڑھا اور ماؤ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''ماؤ جی، مم...... میں ذرا گھوڑوں کو پٹھے ڈالنے چلا گیا تھا۔''

ماؤ بھڑک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''پٹھے ڈالنے چلا گیا تھا، اُلو کے پٹھے، اگر میرے پتر کو کچھ ہو جاتا تو پھر؟'' ماؤ نے دینو کا گریبان پکڑا اور اس کے سر پر جھانپڑ رسید کرنے لگی۔

سجاول نے بمشکل دینو کی جان چھڑائی۔ ماؤ جی اب میری طرف بڑھی۔ میرے ہونٹوں سے خون رِس رہا تھا اور گریبان بھی پھٹ گیا تھا۔ پیشانی کی چوٹ علیحدہ تھی۔

ماؤ نے کہا۔ ''ہائے میرا پتر کتنی بری طرح گرا ہے...... پر...... سیڑھیوں سے گرنے سے یہ قمیص کیسے پھٹ گئی؟''

''یہ...... یہ اس کو اٹھاتے ہوئے پھٹی ہے۔'' چپٹی ناک والے فخرو نے فوراً بات بنائی۔

''کیسے گر گیا تھا، میرے بچڑے؟'' ماؤ نے اپنی قیمتی شال سے میرا خون پونچھا اور میرا سر چوما۔ وہ بے حد تاسف کا اظہار کر رہی تھی مگر اس کے تاسف میں حقیقت کم اور بناوٹ زیادہ تھی۔

''کچھ نہیں ماؤ جی، میں بس تہ خانے کے اسٹور کی طرف گیا تھا، پاؤں پھسل گیا۔'' میں

نے سجاول وغیرہ کی تائید کرتے ہوئے کہا۔
''وہ مرن جوگی سیڑھیاں بہت بھیڑی ہیں۔ ایک واری میں بھی گرتے گرتے بچی تھی۔ پر تم تہ خانے کی طرف کرنے کیا جارہے تھے؟ تمہیں پتا نہیں وہاں وہ منحوس منڈا ہے۔ ہر وقت بددعائیں دیتا رہتا ہے کالی زبان والا۔ اس خبیث کی تو آواز ہی نہیں سننی چاہیے۔ کیا پتا کب کوئی بددعا اثر کر جائے۔''
پتا نہیں، یہ منحوس منڈا کون تھا۔ اس کو یاد کر کے ماؤ کو ایک بار پھر غصہ آ گیا۔ وہ دوبارہ دینو کی طرف بڑھی اور اڑنگا لگا کر اسے زمین پر گرا دیا۔ پھر اس کے سینے پر چڑھ بیٹھی اور ہاتھوں کی مضبوط گرفت سے اس کی سانس روکنے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن یہ کوشش کوئی اتنی ضروری بھی نہیں تھی۔ ماؤ کے وزن سے ہی دینو کی سانس بند ہو سکتی تھی۔ سجاول نے ایک بار پھر سمجھا بجھا کر ماؤ کو دینو کے سینے سے اتارا۔ وہ اس کی پسلیوں پر ایک زوردار ٹھوکر مار کر اور اس کی ماں بہن کو کوستی ہوئی میری طرف آ گئی۔
مجھے اپنے بازو کے کلاوے میں لے کر وہ برآمدے میں پہنچی اور پھر اپنے کمرے میں لے آئی اور رونی صورت بنا کر بولی۔ ''اگر تجھے کچھ ہو جاتا نا تو میں نے کوٹھے سے چھال مار کر جان دے دینی تھی اپنی۔''
اتنی دیر میں وہ آفت کی پرکالی، مہناز عرف مانی بھی پہنچ گئی۔ اس کے اندر پتا نہیں کیا بھڑکا رہتا تھا کہ سخت سردی میں بھی وہ عام سے کپڑوں میں نظر آتی تھی، اس وقت بھی اس کے بازو کندھوں تک عریاں تھے۔ خرانٹ دادی نے چالاک پوتی کو میرے زخمی ہونے کی رُوداد سنائی۔ خرانٹ اور چالاک ہونے کے باوجود وہ دونوں اس بات پر یقین کر رہی تھیں کہ میں اس تہ خانے میں جانے کی کوشش میں گرا ہوں جہاں کوئی منحوس منڈا بند ہے، ایسا منڈا جو ہر آنے جانے والے پر چلاتا ہے اور بددعائیں دیتا ہے۔ دادی پوتی نے مل کر میری چوٹوں پر مرہم لگائی، دادی کی نظر بچا کر میرے سینے اور پیٹ کو ٹٹولا اور بولی۔ ''کہیں اور تو چوٹ نہیں آئی جانو؟''
میں نے مزید تشخیص سے بچنے کے لیے فوراً نفی میں سر ہلایا۔
وہ زیرِ لب مسکرانے لگی۔ بہرحال مجھے اس کی آنکھوں میں شک کی ہلکی سی جھلک نظر آ رہی تھی۔ اس کی وجہ شاید میرا پھٹا ہوا گریبان تھا۔ تاہم اس شک نے کسی طرح کے سوال و جواب کی شکل اختیار نہیں کی۔
کوئی دو گھنٹے بعد میں ایک بار پھر سجاول کے حضور پیش تھا۔ ہم کمرے کے اندر تھے اور

دروازہ بند تھا۔ سجاول کی آنکھوں میں پھر خون اترا ہوا تھا۔ اس نے میری آنکھوں میں جھانکا اور خوفناک لہجے میں بولا۔ ''تم نے کیا سمجھا ہوا تھا ہمیں۔ نرے گدھے اور اُلو کے پٹھے ہیں ہم؟ کچھ پتا نہیں چلے گا کہ تم کس باغ کی مولی ہو؟''

''میں معافی چاہتا ہوں۔ مجھے اپنے اور تاجور کے بچاؤ کے لیے یہ جھوٹ بولنے پڑے۔ میری نیت بری نہیں تھی۔''

''ہاں، تمہاری نیت تو بری ہو ہی نہیں سکتی۔ اچھی نیت کے ساتھ ہی تم چاند گڑھی میں بہروپیے بن کر آئے۔ اچھی نیت سے ہی اس کڑی سے عشق پیچا لڑایا۔ اچھی نیت سے ہی اس کو بھگا کر اس سے شادی کھڑکائی؟ اور آٹھ دس دن پہلے اچھی نیت سے ہی میرے بندوں کو کلاشنکوف کے برسٹ مار کر ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔''

''اپنی اس آخری غلطی پر تو میں آپ سے پہلے بھی معافی مانگ چکا ہوں، سجاول صاحب۔ باقی غلطیاں آپ کے سامنے ہیں۔ اگر آپ معاف کر سکتے ہیں تو کر دیں۔ آپ کا مجھ پر بڑا احسان ہوگا۔''

وہ قہرناک نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں بلا کی تپش تھی۔ وہ واقعی ایک قاتل، ڈکیت کی آنکھیں تھیں۔ اس کی نگاہیں کسی بھی شخص پر مرکوز ہو کر اس کا پتا پانی کر سکتی تھیں۔ وہ جیسے تصور ہی تصور میں مجھے کچا چبا رہا تھا۔ آخر ایک گہری سانس لے کر اس نے اپنے صندوق جیسے سینے کو کچھ اور چوڑا کیا پھر اپنی تیکھی مونچھوں کو انگلی سے سہلا کر بولا۔

''اس فساد کی جڑ سے کہاں اور کب نکاح کیا تم نے؟''

فساد کی جڑ سے اس کی مراد یقیناً تاجور ہی تھی۔ لازماً سجاول سیالکوٹی جانتا تھا یا اسے بتا دیا گیا تھا کہ چاند گڑھی میں تاجور کی وجہ سے کیا ٹین شین پھیلی رہی ہے...... اور عالمگیر اپنے یار اسحاق کی اس منگ کو اسحاق کی گود میں ڈالنے کے لیے کیا کیا جتن کرتا رہا ہے۔

میں سجاول کے اس سوال کا جواب پہلے ہی سوچ چکا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ ملنگی ڈیرے میں پہنچنے سے پہلے چاچے عبدالرزاق نے خود اپنی موجودگی میں ہمارا نکاح کروایا تھا۔ وہ ہمیں ایک گاؤں کے امام صاحب کے پاس لے کر گئے تھے اور وہاں ساری کارروائی ہوئی تھی۔ چاچا رزاق چونکہ اب اس دنیا میں نہیں تھے لہٰذا اس بات کی تصدیق نہیں ہو سکتی تھی)

سجاول کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ اسے اس بات سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں کہ میں نے تاجور سے کب اور کیسے نکاح کیا ہے اور کیا بھی ہے یا نہیں؟ ہاں وہ اس بات پر ضرور یقین کیے ہوئے تھا کہ میں تاجور سے جسمانی تعلقات رکھتا ہوں۔ شاید اس کی سمجھ میں

یہ بات آ ہی نہیں سکتی تھی کہ تاجور جیسی لڑکی کے ساتھ ایک ہی کمرے میں راتیں گزارنے کے باوجود اس سے دور رہا جا سکتا ہے۔ بہرحال وہ اس سارے معاملے کو نظرانداز کر رہا تھا۔ اس کی ساری توجہ اس بات پر تھی کہ اس کی بیمار ماں کو کسی طرح کا کوئی ذہنی صدمہ نہ پہنچے۔ وہ اس سلسلے میں میری چھوٹی سے چھوٹی غلطی معاف کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اسے زیادہ طیش بھی اسی بات پر تھا کہ میرا جھوٹ سامنے آنے پر وہ اپنے غصے کو سنبھال نہ سکا اور مجھے پٹوانا شروع کر دیا۔ میری اس پٹائی کی وجہ سے اس کی ماں کو شدید دھچکا لگا اور وہ بے ہوش ہو گئی۔

ایک طویل مکالمے کے بعد وہ دوٹوک انداز میں بولا۔ ''ہمیں اندھا مت سمجھو۔ سب کچھ سمجھ لیا ہے ہم نے اور جان بھی لیا ہے۔ تم دین محمد کی اس کڑی کے ساتھ ملنگی ڈیرے گئے تھے، بڈھے رزاق کی کڑی ریشمی کو وہاں سے نکالنے کے لیے۔ رزاق بھی تمہارے ساتھ ہی تھا۔ یہ بات ماننا پڑتی ہے کہ تم نے ڈیرے پر دلیری دکھائی۔ تم نے ڈیرے کے کرتا دھرتا پردے والی سرکار کو مارا اور ملنگوں کا گھیرا توڑ کر وہاں سے بھاگ نکلے۔ لگتا ہے کہ مار دھاڑ کا کافی تجربہ ہے تمہیں۔ اور شاید تم وہ بھی نہیں ہو جو نظر آتے ہو......'' سجاول کی مردم شناس نگاہیں جیسے میرے اندر بہت دور تک دیکھ رہی تھیں۔

وہ پہلو بدل کر کہنے لگا۔ ''دیکھو، مجھے سچ سچ بتاؤ، تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو، اور اس کڑی تاجور کے پیچھے کیسے پڑے تم۔ اور دیکھو، مجھ سے جھوٹ مت بولنا۔ میں پہلے ہی بہت تپا ہوا ہوں۔ یہاں کوئی پنگا شدگا نہ ہو جائے۔''

میں اب تک اچھی طرح جان گیا تھا کہ سجاول سیالکوٹی کوئی معمولی بدمعاش نہیں ہے۔ ایک جہاندیدہ اور نہایت خطرناک ڈکیت ہے اگر میں نہ بتاؤں گا تو وہ خود بہت کچھ معلوم کر لے گا۔ اس لیے بہتر تھا کہ اسے کچھ نہ کچھ بتا دیا جائے۔ میں نے کچھ باتوں کو صیغہ راز میں رکھا اور کچھ باتیں اسے بتا دیں۔ جو باتیں میں نے اسے بتائیں ان میں سے کچھ تو وہ یقیناً اپنے اس بندے کی زبانی جان چکا تھا جس نے مجھے یہاں گونگے ڈرائیور کی حیثیت سے پہچانا تھا۔ وہ میرے لب و لہجے سے تو بہت پہلے ہی چونک چکا تھا، اب میں نے اسے واضح بتا دیا کہ میں ڈنمارک کا رہنے والا ہوں۔ کوئی ساڑھے تین چار سال پہلے اتفاقاً میرا پاکستان آنا ہوا۔ یہاں لاہور کے شاہی قلعے میں میری ملاقات تاجور سے ہوئی۔ کچھ اوباش لڑکے اس کے پیچھے تھے۔ میں نے اس کی مدد کی اور اس کے بعد ہم دونوں نے لاہور کی مختلف جگہوں پر دو ملاقاتیں کیں۔ یہ ملاقاتیں مجھے واپس ڈنمارک جا کر بھی بھول نہ پائیں۔ پھر ڈنمارک میں حالات کچھ ایسے ہوئے کہ مجھے وہاں سے شفٹ ہونا پڑا۔ میں نے سوچا کہ جب مجھے شفٹ

ہی ہونا ہے تو پھر کیوں نہ پاکستان جاؤں جو میری جنم بھومی ہے اور جہاں تاجور سے میری ملاقات ہو سکتی ہے۔''

سجاول بولا۔ ''یعنی تمہاری یہ بات بھی جھوٹ تھی کہ تم ولایت پلٹ جٹ پتر ہو، اپنی بے آباد زمین آباد کرنے کے لیے پاکستان آئے ہو۔''

''میں مانتا ہوں، یہ بے آباد زمین آباد کرنے والی بات تو واقعی غلط تھی۔'' میں نے اعتراف کیا۔ ''لیکن اب میں آپ کو جو کچھ بتا رہا ہوں، وہ حلفاً سچ ہے اور اگر یہ غلط ثابت ہوا تو میں سزا کا حق دار ہوں گا۔''

میں واقعی اسے سچ بتا رہا تھا، ہاں یہ بات ضرور تھی کہ میں کچھ باتیں حذف کر رہا تھا۔ مثلاً یہ کہ میں نے اپنے سگے چچا حفیظ اور ان کے گھر پر گزرنے والی قیامت کا ذکر نہیں کیا۔ نہ ہی اس قیامت کے ذمے داروں یعنی انسپکٹر قیصر چودھری، لالہ نظام اور شکیل داراب وغیرہ کے بارے میں کچھ بتایا۔ اگر میں ان لوگوں کے بارے میں بتاتا تو پھر میرا شمار سجاول سیالکوٹی کے دشمنوں میں ہونے لگتا (سجاول سیالکوٹی اور لالہ وریام وغیرہ کا باہمی تعلق ثابت ہو چکا تھا۔ میں نے ان لوگوں کو راگ رنگ کی محفل میں اکٹھے، جام لنڈھاتے دیکھا تھا) میں نے سجاول کو صاف بتا دیا کہ یہ تاجور کی محبت ہی تھی جس کی وجہ سے میں زمیندار دین محمد کا گونگا کاماں بنا اور اس کے بعد بھی میں نے جو جو کچھ کیا ہے، وہ اسی عشق محبت کی وجہ سے ہی تھا۔

سجاول نے جلتی نظروں سے مجھے دیکھا اور مونچھوں کو سہلا کر بولا۔ ''لگتا ہے تمہارا شجرہ پیچھے جا کر، مرزے یارا نجھے شا نجھے سے ملتا ہے۔ مجھے یہ سب کچھ سن کر تم پر تاؤ چڑھ رہا ہے۔ زنانیوں کے لیے ترسنا اور ان کے پیچھے پھرنا، جی دار مردوں کا کام نہیں ہوتا۔ جو ہاتھ آنے والی نہ ہو، اس پر سو بار لعنت۔ اور جو ہاتھ آجائے اس کو رکھا اپنے پاس ہفتہ دس دن اور پھر فارغ کر دیا۔''

وہ ایک ڈاکو تھا۔ اس کی اپنی سوچ تھی۔ میں اس کی سوچ پر ''سو بار'' نفرین بھیجنے کے سوا اور کیا کر سکتا تھا۔ اسے کیا پتا تھا کہ وہ جس لڑکی کا ذکر کر رہا ہے، وہ میرے لیے کیا حیثیت رکھتی ہے۔ کس طرح میری رگِ جاں میں بس چکی ہے۔ لیکن اس موقع پر میں نے اسے جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ میں اس کے ساتھ تعلقات زیادہ خراب کرنے کا متحمل نہیں تھا اور شکر کا مقام تھا کہ چاند گڑھی میں میری باقی کارروائیاں ''یاسر بھائی'' کے نام سے ہی جانی گئی تھیں۔ ان کارروائیوں کا سارا کریڈٹ اور اس کا سارا وبال بھی ''یاسر بھائی'' ہی کی طرف جاتا تھا۔ سجاول کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ چند ہفتے پہلے اس کی سجائی ہوئی محفل رقص میں

اس کی اور عالمگیر کی تصویریں اتار کر عالمگیر کو اپنے رشتے دار توانہ سے لڑانے والا میں ہوں۔ اسی طرح میری دیگر کارروائیاں بھی ہرگز اس کے علم میں نہیں تھیں۔ رقاصہ جاناں میری ہی وجہ سے سجاول کے ڈشکروں کی دسترس سے نکلی تھی۔ میری ہی وجہ سے بچی زینب کی پُراسرار بیماری کا راز کھلا تھا اور چاند گڑھی کے لوگوں نے پیر ولایت اور عالمگیر پر لعنت کے ڈونگرے برسائے تھے۔ یاسر کی بہن کے لیے سجاول کے مسلح ساتھیوں سے لڑنے والا بھی میں ہی تھا۔ اس طرح کے اور بھی واقعات تھے جن پر ''یاسر بھائی'' کی چھاپ لگ چکی تھی۔

سجاول نے سگریٹ کو مٹھی میں دبا کر ایک طویل کش لیا اور میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ''چلو ٹھیک ہے۔ اس کڑی کے ساتھ موج میلہ کرو...... لیکن یاد رکھو کہ یہ عالمگیر کے یار کی بھی منگ اور معشوق ہے۔ اگر عالمگیر نے اسے مانگا تو تمہیں اس کو واپس دینا پڑے گا، کیا سمجھے؟''

سجاول کی سوچ اس معاملے میں بہت گھٹیا تھی۔ وہ تاجور کا ذکر ایسے کر رہا تھا جیسے وہ کوئی زندہ انسان نہیں، موٹر سائیکل، ٹیلی ویژن یا موبائل قسم کی شے ہے، جسے استعمال کرنے کے بعد کسی دوسرے خواہش مند کے حوالے کیا جا سکتا ہے۔ بہرطور میں اس موقع پر بحث مباحثہ کرتا تو یہ میری بے وقوفی ہوتی۔

''میں جو کہہ رہا ہوں، تم سن رہے ہوناں؟'' اس نے ذرا بلند آواز میں پوچھا۔

''جی سن رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

اس نے میری خاموشی کو میری نیم رضامندی سمجھا اور موضوع بدلتے ہوئے بولا۔ ''وہاں ڈنمارک سے کیوں بھاگے ہو تم؟ کیا کوئی پھڈا شڈا تھا وہاں؟''

سجاول کے سوال نے مجھے جھنجوڑ سا دیا لیکن میں نے اپنے جذبات کو تاثرات کی صورت میں اپنے چہرے تک نہیں آنے دیا۔ خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''جی ہاں، ایک پاکستانی کی خاطر مجھے وہاں چند لوگوں سے لڑنا پڑا، جس کی وجہ سے دشمنی بڑھ گئی۔ بات بہت آگے تک چلی گئی۔ میرے ماں باپ کو خطرہ تھا کہ میں قتل ہو جاؤں گا یا کسی کو قتل کر کے بجلی والی کرسی پر بیٹھ جاؤں گا۔ انہوں نے ہاتھ پاؤں جوڑ کر مجھے پاکستان بھیج دیا۔''

وہ بولا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ تم بات کو بہت گھٹا کر بتا رہے ہو۔ تم نے وہاں باہر کے ملک میں، شاید بہت مارا ماری کی زندگی گزاری ہے۔''

وہ کہہ تو ٹھیک رہا تھا۔ میں نے جس واقعے کا ذکر کیا تھا، وہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ اس نے نہ صرف میری بلکہ بہت سے لوگوں کی زندگیاں بدل ڈالی تھیں۔

وہ مجھے سوچ میں دیکھ کر بولا۔ ''چلو، خیر چھوڑو...... یہ بتاؤ وہ پاکستانی کون تھا جس کے لیے تم نے دشمنی مول لی؟''

''میں اسے نہیں جانتا تھا۔ بس میں نے بازار سے گزرتے ہوئے، اسے کچھ انڈین غنڈوں کے ہاتھوں مار کھاتے دیکھا، ان میں دو گورے بھی شامل تھے۔ میں نے اس پاکستانی لڑکے کو چھڑانے کی بڑی کوشش کی مگر جب ان لوگوں نے حد کر دی تو میں ان سے لڑ پڑا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ تو ایک بڑے گینگ کے لوگ ہیں۔ ٹیکساس کا ایک خطرناک گورا اس گینگ کا کرتا دھرتا تھا۔ بس پھر بات چل نکلی......''

شاید سجاول اس سلسلے میں مجھ سے مزید باز پُرس کرتا اور مجھے کچھ نہ کچھ تفصیل اسے بتانا پڑتی، ماؤ کی شکل نظر آ گئی۔ وہ جھومتی ہوئی میری طرف آ رہی تھی۔ سجاول نے دبی آواز میں کہا۔ ''میں ایک بار پھر تمہیں بتا رہا ہوں، اچھی طرح کان کھول کر سن لو...... ماں جی جیسا کہیں، تمہیں ویسا ہی کرنا ہو گا۔ نہیں تو تمہارے ساتھ یہاں وہ کچھ ہو جائے گا جو تمہارے خیال میں بھی نہ ہو۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ماؤ نے آتے ساتھ ہی حسب معمول میری بلائیں لیں۔ ایک امام ضامن نما چیز اس نے چند دن پہلے میری کلائی پر باندھی تھی، آج وہ اس نے اتار لی اور اس کی جگہ ایک اور بندھن مجھے باندھ دیا۔ یہ بھی بظاہر امام ضامن ہی دکھائی دیتا تھا۔ وہ بولی۔ ''شاہ زیب! تم کمزور ہوتے جا رہے ہو۔ کھاؤ پیو اور جان بناؤ۔ مرد کو ہٹا کٹا ہونا چاہیے بلکہ میں آج ہی تمہارے لیے بھانڈا بنواتی ہوں۔ مونگی اور چنے کی پسی ہوئی دال، گھی میں بھون کر اور مٹھا ڈال کر اس میں بادام پستہ اور کھوپرا ڈالا جائے تو بڑا شاندار بھانڈا بنتا ہے۔ تم نے زیادہ وقت ولایت میں گزارا ہے، تمہیں ان دیسی چیزوں کا زیادہ پتا نہیں ہو گا۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ مجھے لے کر اپنے کمرے میں آ گئی اور دیر تک باتیں کرتی رہی۔ یہ مختلف خوراکوں اور کھابوں کی باتیں ہی تھیں۔ اس کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ تاجور کی موجودہ حالت کے بارے میں جان چکی ہے۔ دایہ اختری کے ذریعے اسے پتا چل گیا ہے کہ تاجور ابھی نارمل ہے (یعنی وہ امید سے نہیں) مجھے یہ بھی پتا چلا کہ ماؤ کو موجودہ صورتِ حال پسند نہیں۔ وہ چاہتی ہے کہ تاجور جلد سے جلد امید سے ہو جائے۔ وہ میرے لیے جو ''اچھی خوراک وغیرہ'' کا ذکر کر رہی تھی، وہ بھی غالباً اسی پس منظر میں تھا۔ وہ عجیب خبطی عورت تھی۔ گاہے بگاہے منہ میں کچھ بڑبڑاتی بھی تھی، شاید کچھ پڑھتی تھی۔ جھاڑ پھونک پر اس کا اعتقاد بہت زیادہ تھا۔ میرے کانوں میں اس کی وہ گفتگو گونجنے لگی جو میں نے تین

چار دن پہلے دروازے کی اوٹ سے سنی تھی۔ اس نے کسی پیرو سائیں کا ذکر کیا تھا اور اختری سے کہا تھا کہ شاہ زیب کی یہ بیوی حمل کے دوران میں بیمار ہو کر مرے گی اور اس کے بعد اس کی شادی ہماری مانی سے ہوگی۔

ایسے لوگوں کا ذہن جس طرف چل نکلتا ہے......بس چل نکلتا ہے۔ اب شاید وہ یہ سوچ رہی تھی کہ تاجور جلد از جلد امید سے ہو۔ اس کے بعد (ماؤ کے منہ میں خاک) وہ مرے اور پھر اس کی پوتی کی شادی مجھ سے ہو۔ وہ پوتی جو کسی بازاری عورت کی بیٹی تھی اور ماؤ کے شرابی بیٹے اعظم کی حماقت سے اس ڈکیت خاندان کی رکن بن گئی تھی۔

○......❖......○

اگلے چار دن میں پہلوان حشمت راہی سے میری دو ملاقاتیں مزید ہوئیں۔ یہ ملاقاتیں میں نے اپنے کندھے کی چوٹ کے بہانے سے کیں۔ پہلوان یہاں آرام سے تھا۔ اسے ضروری سہولتیں حاصل تھیں لیکن ظاہر ہے کہ میری اور تاجور کی طرح اس کی حیثیت بھی یہاں قیدی ہی کی تھی۔ پہلوان سے مجھے چاند گڑھی کے حالات کے بارے میں مزید آگہی حاصل ہوئی۔ اس نے بتایا کہ سجاول کے بندے اب بھی علاقے میں یاسر کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ انہیں اس بات پر بہت طیش ہے کہ یاسر نے خفیہ طور پر سجاول اور عالمگیر کی تصویریں اتاریں اور ان کے ذریعے عالمگیر کو اس کے رشتے داروں سے لڑا کر جیل پہنچایا۔

حشمت نے کہا۔ ''اللہ بخشے مولوی فدا کے قتل والا معاملہ بھی ابھی تک لوگوں کو بہت زیادہ پریشان کرت ہے۔ یہ بات تو اب کھل ہی گئی ہے کہ مولوی جی کی بچی زینب کو عالمگیر نے ہی کوئی خطرناک کشتا کھلا کھلا کر بیمار کر رکھا تھا اس لیے سب کو اس بات کا شک ہے کہ مولوی جی کو مارنے میں بھی عالمگیر اور اسحاق وغیرہ کا ہاتھ ہے، مگر ثبوت کوئی نہیں۔ وہ مؤذن جس نے مولوی جی کو مسجد کی سیڑھیوں سے دھکا دیا تھا، وہ بھی اب تک لاپتا ہے۔ کئی لوگ تو یہ بھی کہوت ہیں کہ لڑائی جھگڑے والے معاملے میں عالمگیر کی ضمانت جلد ہو جاوے گی اور وہ واپس چاند گڑھی آکر اپنے مخالفوں کا شکنجہ کسنا شروع کر دیوے گا۔ مجھے لگت ہے کہ ان حالات میں اگر کوئی چاند گڑھی والوں کی مدد کر سکت ہے تو وہ یاسر ہی ہے، لیکن وہ ابھی کھل کر سامنے ہی نہیں آرہا۔''

میں نے سوچا، وہ کھل کر سامنے کیا آئے گا، وہ تو نشے میں ڈوب کر زندہ لاش کی طرح ایک تہ خانے میں پڑا ہے۔ جاناں کی اطلاع پر پیپل والی گاؤں میں پہنچ کر اس کی بہن کو میں نے ہی اغوا ہونے سے بچایا تھا۔ بہرحال اس کا کریڈٹ بھی یاسر کو ہی ملا تھا۔ پرسوں، پہلوان

حشمت نے مجھے بتایا تھا کہ یاسر کے گھر والے اپنے گاؤں سے راتوں رات کہیں چلے گئے ہیں۔ ان کے گھر اور ڈیرے پر تالے پڑے ہیں۔

یاسر کی بہن کے اغوا کے موقع پر میرے اور سجاول کے بندوں میں جو خونی لڑائی ہوئی تھی، وہ ایک بار پھر میرے ذہن میں تازہ ہوگئی۔ سارے مناظر نگاہوں میں گھوم گئے۔ ایک حملہ آور کی کٹی ہوئی کلائی، ایک شخص کے سر میں دھنسی ہوئی کلہاڑی...... اس لڑائی میں سجاول کے کم و بیش پانچ ساتھی جان سے گئے تھے اگر کہیں پاس والے کمرے میں موجود سجاول سیالکوٹی کو علم ہو جاتا کہ لڑکی کے اغوا کی کوشش کو ناکام بنانے والا اور اس کے بندوں کو موت کے گھاٹ اتارنے والا میں ہی تھا تو شاید وہ اپنی ماں کے مفادات کو بھی نظر انداز کر دیتا اور مجھے سفاکی سے قتل کر ڈالتا۔ اس وقت ان لوگوں کی بے خبری میری اور تاجور کی زندگی کی ضمانت بنی ہوئی تھی۔

پہلوان حشمت پہلے چند روز تو کافی غمزدہ و گم صم رہا مگر اب کچھ بحال نظر آ رہا تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ جان گیا تھا...... وہ یہاں اکیلا ہی پھنسا ہوا نہیں ہے، میں اور تاجور بھی موجود ہیں۔ دوسرے اسے یہاں ہڈی جوڑنے کا ایک کیس بھی مل گیا تھا اور وڈے سردار اعظم نے کہا تھا کہ اگر اس نے اس کے خاص مریض کا صحیح علاج کر دیا تو وہ اس کو انعام دے گا اور ہو سکتا ہے کہ اسے کچھ عرصے بعد چھوڑ بھی دیا جائے۔ (میں شاید بتانا بھول گیا کہ جب چند روز پہلے پہلوان حشمت اور جاناں کو یہاں لایا گیا تھا تو دونوں کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی)

پہلوان حشمت نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ ”ہم نے سنا تھا کہ قید کے دنوں میں لوگوں نے بڑی بڑی کتابیں لکھی ہیں اور شاعری کی ہے۔ اب یہاں پھنسا ہوں تو یہ بات درست لگت ہے۔ یہ دیکھو کیسے زبردست شعر جوڑے ہیں ہم نے۔“

اس نے ایک کاغذ پر لکھے ہوئے شعر مجھے دکھائے۔ وزن تو پتا نہیں کہ تھا یا نہیں لیکن املاء کی غلطیاں شاندار تھیں۔

ہم لوگوں کے کام آتے ہیں اور پھنستے ہیں
اس درد ناق صورتِ حال پر لوگ ہنستے ہیں
گاؤں اور گاؤں والے بہت دور رہ گئے ہم سے
پھر یادوں کے ناغ کیوں ہم کو ڈستے ہیں
عشق آسان نہیں تم باض آجاؤ اے راہی
سیانے لوگ اکسر ہم کو یہ بات دستے ہیں

پہلوان کی شاعری پر اعتراض تو اور بھی دکھائی دے رہے تھے، میں نے بس اتنا کہا۔

''پہلوان جی یہ جو آخر میں آپ نے ''دستے ہیں'' لکھا ہے، یہ کیا ہے؟''

پہلوان نے ترّخ سے کہا۔'' دستے ہیں...... کا مطلب ہووت ہے...... بتاتے ہیں۔''

''لیکن یہ تو پنجابی کا لفظ ہے؟''

''پنجاب کون سا غیر ہے۔ یہ تو ہمارے سارے صوبوں کا بھائی ہے اور مشکل کے وقت بڑے بھائی سے ایک آدھ لفظ تو لیا ہی جاسکت ہے۔''

''یہ تو بڑے پتے کی بات کہی ہے آپ نے۔'' میں نے عقیدت سے کہا۔

''باتیں تو میں ہمیشہ ہی پتے کی کرت ہوں لیکن اس سے پہلے تم سنتے ہی نہیں تھے۔ گونگے بہرے تھے نا تم۔'' پہلوان نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''بات صرف اتنی تھی پہلوان جی کہ میری اردو ٹھیک نہیں ہے۔ اب آپ سن ہی رہے ہیں میں کس طرح بولتا ہوں۔ زبان کی ٹانگ توڑتے ہوئے مجھے بڑی تکلیف ہوتی ہے اس لیے میں نے گونگا بننا مناسب سمجھا تھا۔''

''صرف یہی معاملہ ہوتا تو کوئی بات ناہیں تھی لیکن معاملہ اس سے بہت آگے کا ہے۔ تم نے دین محمد اور ان کے گھر والوں کو دھوکا دیا۔ ہمارے گاؤں کی سیدھی سادی لڑکی پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی۔ یہ تو وہی بات ہوئی نا کہ جس تھالی میں کھاؤ اسی میں بینگن رکھو۔''

''پہلوان جی، خاموش محبت کرنا گناہ تو نہیں۔ میں نے بھی خاموش بلکہ گونگی محبت کی تھی لیکن حالات نے اس محبت کو زبان دے دی۔ اب اس میں میرا کیا قصور ہے؟''

''تمہاری اس خاموش محبت کا جو خمیازہ دین محمد وغیرہ کو بھگتنا پڑے گا، یہ کچھ ہم ہی جانتے ہیں۔ بہت بڑی مصیبت کھڑی کر دی ہے تم نے ان لوگوں کے لیے۔'' پہلوان نے اپنا مٹکا سا سر اختلافی انداز میں ہلایا۔

میں نے کہا۔'' پہلوان جی، آپ کو پتا ہی ہے، میری اردو کس طرح کی ہے۔ یہ خمیازہ کیا ہوتا ہے؟''

''یہ جنازے کا چھوٹا بھائی ہے۔'' پہلوان نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

پہلوان کی باتیں دلچسپ ہوتی تھیں۔ اس کے پاس مزید بیٹھنے...... اور حالات جاننے کو دل چاہ رہا تھا مگر تاجور کی بھی فکر تھی۔ میری غیر موجودگی میں وہ بے چین ہونے لگتی تھی۔ حالانکہ یہاں موجود عورتوں میں سے کوئی نہ کوئی اس کے پاس موجود رہتی تھی۔ میں پہلوان سے رخصت ہو کر اپنے کمرے کی طرف روانہ ہوا۔ اب اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ سرد کہرا گرد و پیش

کو ڈھانپ رہا تھا۔ اس کہرے میں لالٹینوں اور گیس لیمپس کی روشنی دھندلائی ہوئی تھی۔ احاطے کے اردگرد درختوں کی بلندی پر چوکس نشانہ باز اپنی چھوٹی چھوٹی مچانوں پر موجود تھے۔ یہ مچانیں کسی وقت بھی خالی نہیں ہوتی تھیں۔

میں ایک کمرے کے سامنے سے گزر رہا تھا جب اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور ماؤ کی شعلہ صفت پوتی مانی مجھے بازو سے پکڑ کر کمرے کی طرف کھینچنے لگی۔ ''یا اللہ خیر'' میں نے دل ہی دل میں کہا۔

مجھے کمرے میں لا کر اس نے دروازہ بھیڑ دیا۔ یہاں وہ اکیلی نہیں تھی۔ جاناں بھی موجود تھی۔ کمرے میں کوئلے دہک رہے تھے اور فضا گرم تھی۔ مانی نے حسبِ معمول بڑا ہلکا سا لباس پہن رکھا تھا۔ دوپٹے کو کس کر کمرے سے باندھا ہوا تھا۔ اس کے ڈیانا کٹ بالوں کے نیچے اس کے دہکے عارضوں پر نقرئی جھمکے جھول رہے تھے۔ مجھے اس کے پاؤں میں گھنگرو نظر آئے۔ جاناں کے پاؤں میں بھی گھنگرو تھے۔ جاناں سویٹر اور شلوار قمیص میں تھی۔ شال اس نے بھی اتار کر ایک طرف رکھی ہوئی تھی۔ پتا چلا کہ مانی یہاں کمرے میں جاناں سے رقص کے کچھ آؤ بھاؤ سیکھ رہی ہے (حالانکہ جاناں خود بھی کوئی ایسی ماہر رقاصہ نہیں تھی)

مانی نے مجھ سے کہا۔ ''یہ مجھے اچھی سہیلی دی ہے تم نے ڈیئر۔ سہیلی بھی اور ڈانس کی پارٹنر بھی۔ میں نے اس سے کافی کچھ سیکھ لیا ہے...... یہ دیکھو۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے تلوے زور زور سے فرش پر مار کر ''تھا تھیا تھا'' وغیرہ شروع کر دیا۔ گاہے بگاہے وہ گول گول گھومنے بھی لگی۔ اس کے بوائے کٹ بال اس کی پیشانی پر بکھر گئے۔

کچھ دیر بعد وہ رک گئی اور سوالیہ نظروں سے جاناں کی طرف دیکھا۔

جاناں بالکل گم صم تھی۔ اس نے بس اثبات میں سر ہلایا۔ مطلب یہ تھا کہ مانی نے درست اسٹیپ لیے ہیں۔ ''چلو، اب آگے بتاؤ۔'' مانی نے اٹھلا کر کہا۔

جاناں جھجک رہی تھی۔ ہولے سے بولی۔ ''نہیں۔ باقی کل......''

''نہیں، سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وقت کم ہے اور مقابلہ سخت۔ کسی کو کچھ کر کے دکھانا ہے۔'' اس نے میری طرف دیکھ کر معنی خیز لہجے میں کہا۔

اس کے مجبور کرنے پر جاناں بادل ناخواستہ ہولے ہولے پاؤں کو حرکت دینے لگی۔ جاناں قدرے دراز قد اور دبلے پتلے جسم کی تھی۔ بہرحال نسوانی کشش اس میں واضح طور پر موجود تھی۔ اس کے خوب صورت بال رقص کے زاویوں کے ساتھ لہرا رہے تھے۔ وہ بے

چاری پولیس کے ہتھے چڑھ کر پاشا جیسے عیاش تک پہنچی تھی اور پھر وہاں سے آگے سجاول جیسے خطرناک ڈکیت کی محفل میں پہنچا دی گئی تھی۔ اب وہ نہ ٹی وی آرٹسٹ رہی تھی، نہ ماڈل گرل بلکہ پیشہ ور لڑکیوں والی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔

اچانک دروازہ زور سے کھلا۔ جاناں سہم کر دیوار سے لگ گئی۔ میں اور مانی بھی ٹھٹک کر دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔ وہاں شرابی، اعظم کھڑا نظر آیا۔ کہنے کو تو وہ یہاں کا وڈا سردار تھا لیکن اس کے وڈے پن کو دل سے کوئی نہیں مانتا تھا۔ اس کی نگاہ سیدھی جاناں پر ہی پڑی۔ اس نگاہ میں حرص و ہوس کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔ ایک لمحے کے لیے یوں لگا جیسے، یہ عورت باز شخص ہمیں نظر انداز کر کے سیدھا جاناں پر جا پڑے گا مگر پھر اس نے کمرے میں میری اور مانی کی موجودگی کو محسوس کیا۔

''تم یہاں؟'' مانی نے باپ کو بے رخی سے مخاطب کر کے پوچھا۔

''اور یہی بات میں تم سے پوچھ رہا ہوں۔ تم یہاں اس کمینی کے ساتھ کیا کر رہی ہو؟'' اعظم نے لڑکھڑاتے لہجے میں دریافت کیا۔

''یہ کمینی ہے، ناچی ہے یا نیک پروین۔ جو بھی ہے، میری سہیلی ہے اور یہ بات میں تم کو پہلے بھی بتا چکی ہوں۔ اب جاؤ یہاں سے۔''

باپ کے ساتھ مانی کا یہ طرزِ تخاطب چونکا دینے والا تھا مگر باپ جس قماش کا تھا شاید یہ انداز ٹھیک ہی تھا۔

اعظم نے ذرا ڈھیلا پڑتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو، یہ سجن نہیں دشمن ہے۔ ہمارا ایک بندہ پھٹل کر کے بھاگی ہوئی ہے۔ بڑی مشکل سے ہاتھ آئی ہے۔''

''دشمن ہے تو پھر اس کو گولی مار دو نا...... میرے سامنے گولی مارو۔ یہ لو پستول۔''

وہ جلدی سے ایک طرف گئی اور ایک دراز میں سے کولٹ پسٹل نکال کر اعظم کی طرف بڑھایا۔ اعظم کا نشہ ہرن ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اس نے پستول نہیں پکڑا۔ مانی کو سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ''دیکھو، اس نے نقصان کیا ہے ہمارا۔ بے عزتی کی ہے۔ اگر ہم اس کو عزت دیں گے تو دو ٹکے کے لوگوں پر کیا اثر پڑے گا۔ اس کمینی کو تو یہاں ذلیل و خوار ہونا چاہیے......''

''ٹھیک ہے، تو کرو ذلیل و خوار۔ اسے یہاں جھاڑو دینے پر لگا دو۔ گوبر اٹھانے پر لگا دو۔ سب کے سامنے مار کوٹ لو اسے...... کیا ذلیل و خوار کرنے کا بس ایک ہی طریقہ تمہاری سمجھ میں آتا ہے؟''

اعظم کے سامنے مانی کی بے باکی دیدنی تھی۔ کچھ بھی تھا وہ اس کی بیٹی تھی بلکہ اس سے دو ہاتھ آگے تھی۔

اعظم نے وہاں سے دُم دبا کر نکلنے میں ہی عافیت سمجھی۔ طیش سے مانی کے عارض سرخ تھے اور سینہ پھول پچک رہا تھا۔ جاناں کو اعظم اور فخرو وغیرہ سے بچانے کے سلسلے میں میری چال کامیاب جا رہی تھی۔

مانی ابھی مجھے مزید اپنے پاس روکنا چاہتی تھی مگر مجھے تاجور کے پاس جانے کی جلدی تھی۔ میں ان دونوں سے روانہ ہو کر تاجور کے پاس کمرے میں پہنچا تو وہ حسبِ توقع گم صم نظر آئی مگر آج چہرے پر پریشانی کے بجائے غصہ دکھائی دیتا تھا۔ اس کا نہایت شفاف، شیشے جیسا چہرہ، غصے یا شرم کے وقت سرخ گلابی ہو جاتا تھا۔ میں نے اس سے اس کیفیت کی وجہ جاننا چاہی۔ وہ تڑخ کر بولی۔ ”یہ ماؤ جی کیا عورت ہے۔ مجھے اس کی کچھ سمجھ نہیں آتی۔ ایسی بے ہودہ باتیں کرتی ہے کہ دل چاہتا ہے، اپنا سر پھوڑ لوں یا اس کا۔“

”کیا کہہ رہی تھی؟“ میں نے پوچھا۔

تاجور پہلے تو ہچکچاتی رہی پھر بولی۔ ”وہ مجھے اور آپ کو شادی شدہ سمجھ رہی ہے۔ چلو یہاں تک تو برداشت کیا جا سکتا ہے، لیکن اب وہ پوری پوری آپ کی ماں بنی ہوئی ہے اور کہتی ہے کہ...... اسے جلد سے جلد پوتا پوتی چاہیے۔“ تاجور روہانسی آواز میں کہہ گزری۔

میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ تاجور غصے سے بولی۔ ”مجھے نصیحتیں کر رہی تھی کہ میں آپ کو زیادہ سے زیادہ خوش رکھوں۔ آپ کو اچھا کھلاؤں پلاؤں۔ آپ کی صحت بناؤں۔ بالکل...... فضول...... بے ہودہ باتیں کر رہی تھی۔ پوری پوری کھوجی بنی ہوئی تھی۔ کہہ رہی تھی......“

تاجور بات مکمل نہ کر سکی اور گڑبڑا کر چپ ہو گئی۔ میرے اصرار کرنے پر وہ بولی۔ ”وہ بے شرم ہمارے بستر کی سلوٹیں تک گننے لگی ہے۔ کہہ رہی تھی، میں نے دو تین بار صبح کے وقت تمہارا بستر دیکھا ہے۔ دیکھ کر ہی پتا چل جاتا ہے کہ تم دونوں رات کو اپنے اپنے کنارے پر پڑے رہتے ہو۔ ایسے رہو گے تو زندگی کی گڈی آگے کیسے چلے گی۔ آپ بتائیں یہ کوئی کرنے والی باتیں ہیں۔ ابھی کہہ کر گئی ہے کہ اس تمہارے والے بڑے بیڈ کی ضرورت مجھے دوسرے کمرے میں ہے۔ میں تمہارے لیے ایک چھوٹا بیڈ بھجواؤں گی۔“ تاجور کا چہرے غصے سے لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔

تاجور کا دھیان بٹانے کے لیے میں نے اس سے پہلوان حشمت کا ذکر کیا اور اسے بتایا کہ وہ یہاں آیا ہے اور میں نے اس سے ملاقات کی ہے۔ تاجور کے چہرے پر کئی رنگ آ کر

گزر گئے۔ ''وہ کیسے آ گیا ہے یہاں...... کیا...... اسے بھی پکڑ کر لائے ہیں؟'' وہ حیرت زدہ ہو کر بولی۔

''سمجھو، پکڑ کر ہی لائے ہیں۔ دراصل ان لوگوں کو یہاں اپنے زخمیوں کے لیے کسی مرہم پٹی کرنے والے کی ضرورت تھی۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ دنوں کے بعد اسے چھوڑ دیں۔''

تاجور نے بے تابی سے پوچھا۔ ''وہ گاؤں کے بارے میں کیا بتاتا ہے؟ امی اور ابا جی کیسے ہیں؟ اور راحیل اور اسفند۔ سب ٹھیک تو ہیں نا؟''

''سب خیریت سے ہیں۔ وہ تمہارے بارے میں پریشان تھے مگر ریشمی اور انیق وغیرہ کے گاؤں واپس پہنچنے کے بعد انہیں تسلی ہو گئی ہے۔ ریشمی اور انیق نے انہیں بتا دیا ہے کہ تم اور میں ملنگوں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے ہیں اور کسی محفوظ ٹھکانے پر پہنچ گئے ہیں۔ انہیں امید ہے کہ ہم جلد ہی واپس آ جائیں گے۔''

''ہائے ربا۔ ان کے دل پر کیا بیت رہی ہو گی۔ پتا نہیں کہاں کہاں ڈھونڈتے پھر رہے ہوں گے ہمیں۔ پپ...... پتا نہیں، گاؤں میں کیا کیا باتیں بن رہی ہوں گی؟''

''کوئی باتیں نہیں بن رہی ہیں۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ ''سب کو پتا ہے کہ تم اور چاچا رزاق، دونوں نوری کو ساتھ لے کر ریشمی کو ملنگی ڈیرے سے نکالنے کے لیے گئے تھے۔ وہاں اتفاق سے میں اور انیق بھی پہنچ گئے۔''

''مجھے پتا ہے آپ میری تسلی کے لیے یہ سب کچھ کہہ رہے ہیں۔''

''وہم کا کوئی علاج نہیں، اگر موقع ملا تو میں پہلوان سے بھی تمہاری ملاقات کرا دوں گا۔''

''میرے بھائی کیسے ہیں؟ اسفند تو ابھی پوری طرح ٹھیک بھی نہیں ہوا تھا۔'' تاجور نے روہانسی آواز میں کہا۔

میں نے اس حوالے سے بھی اسے تسلی دی۔ اسی دوران میں کھٹ پٹ کی آوازیں سنائی دیں۔ یہ ماؤ کے ہی دو تین خدمت گار کارندے تھے۔ وہ ماؤ کی ہدایت کے مطابق ایک چھوٹا بیڈ لے کر آئے تھے۔ انہوں نے ڈبل بیڈ کمرے سے نکال کر اس کی جگہ چھوٹا بیڈ وہاں رکھ دیا۔ انہوں نے بتایا کہ کچھ مہمان آئے ہیں، ان کے لیے بڑے بیڈ کی ضرورت ہے۔

رات کو میں نے وہی کیا جو اکثر پاکستانی اور ہندوستانی فلموں میں ہیرو لوگ کیا کرتے ہیں اور واقعی اس عمل کی بہت ضرورت تھی۔ میں نے بیڈ پر تاجور کو سونے دیا اور خود فرش پر بچھونا بچھا کر لیٹ گیا۔

اگلے روز صبح سویرے دروازے پر زوردار دستک ہوئی، پھر ماؤ کی بھاری آواز آئی۔

''بچڑا جی، دروازہ کھولو۔''

میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ فرش پر بچھا ہوا بچھونا اٹھایا اور لپیٹ کر بیڈ کے نیچے گھسا دیا۔ تاجور بھی اٹھی بیٹھی تھی اور سر پر دوپٹا درست کر رہی تھی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ ماؤ اپنے چوڑے چکلے جسم کے ساتھ جھومتی ہوئی اندر آ گئی...... ''ہاؤ ہائے اتنا دن چڑھ آیا ہے کھل کھلا کے۔ اٹھ جاؤ میرے بچڑے، کوئی ناشتا نوشتا کرلو۔''

بات کرنے کے ساتھ ساتھ وہ گہری نظروں سے کمرے کا جائزہ بھی لے رہی تھی۔ ''تیرا کیا حال ہے کڑیئے؟'' اس نے گہری نظروں سے تاجور کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں ٹھیک ہوں۔'' تاجور نے بال جُوڑے کی صورت میں باندھتے ہوئے مختصر جواب دیا۔

''آج کل کی کڑیاں نہ کھاتی کھل کھلا کے ہیں، نہ بات کھل کھلا کے کرتی ہیں۔'' وہ اس کے پاس ہی بیڈ پر بیٹھ گئی۔ بے تکلفی سے اس کا منہ ہاتھ میں لے کر بولی۔ ''دیکھ کس طرح چونچ نکلی ہوئی ہے، کوئی رونق شونق نہیں۔ خشکی چڑھی ہوئی ہے ماس پر۔ ٹھنڈے پانی سے منہ ہتھ نہ دھویا کر اور کوئی کریم شریم بھی لگایا کر۔''

پھر اس نے دروازے کی طرف منہ کر کے ایک ملازمہ ماکھی کو آواز دی۔ ''نی ماکھی، کہاں مر گئی ہے۔ ادھر آ۔''

فربہ جسم والی ماکھی بھاگی ہوئی اندر آئی۔ ماؤ نے گرج کر کہا۔ ''کل سے ان دونوں کے غسل خانے میں گرم پانی رکھا ہونا چاہیے روزانہ۔ نہیں تو میں نے ٹنگ توڑ دینی ہے تیری۔''

ماکھی نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا اور باہر جانے لگی۔ اسی دوران میں اس کی نگاہ بیڈ کے نیچے چھپائے گئے بچھونے اور تکیے پر پڑ گئی۔ اس نے نیچے اشارہ کرتے ہوئے ماؤ سے پوچھا۔ ''ماؤ جی، کپڑے دھو رہی ہوں۔ یہ نیچے والی چادریں بھی دھونے والی ہیں؟''

ماؤ نے جھک کر دیکھا اور اسے وہ ''فرشی بستر'' نظر آ گیا جو میں نے بیڈ کے نیچے چھپایا تھا۔ اس نے بستر باہر کھینچ لیا۔ ''یہ یہاں کیوں ہے؟'' اس نے الجھے ہوئے سے انداز میں کہا۔

''یہ...... ذرا میں نے مالش کرائی تھی پنڈے کی...... تاجور سے۔'' میں نے وضاحت کی۔

معلوم نہیں کہ اسے میری وضاحت پر یقین آیا یا نہیں۔ بہرحال اس نے کوئی اور سوال نہیں کیا۔

ملازمہ ماکھی بچھونا اور کمبل وغیرہ لے کر باہر چلی گئی۔ ماؤ کے انداز میں شک تھا۔ اس نے غصیلی نظروں سے تاجور کی طرف دیکھا۔ یوں لگا کہ وہ تاجور سے کچھ کہے گی مگر اس نے خود پر ضبط کیا اور مجھے اشارہ کرتی ہوئی باہر چلی گئی۔

میں اس کے پیچھے باہر آیا۔ وہ مجھے اپنے کمرے میں لے آئی اور دیر تک سمجھاتی رہی۔ اس ساری نصیحتوں کا لبِ لباب یہی تھا کہ ہم میاں بیوی آپس کے تعلقات ٹھیک کریں۔

وہ اپنے مخصوص انداز میں بولی۔ ''میں ذرا کھل کھلا کر بات کرتی ہوں۔ یہ تمہاری زنانی ذرا ٹھنڈے مزاج کی ہے۔ نئی نئی دوہٹیوں والی تیزی طراری نہیں ہے اس میں۔ اور میری ایک بات اپنے پلے سے باندھ لو۔ لاکھوں روپے کی بات بتا رہی ہوں تمہیں۔ میاں بیوی کا رشتہ تب ہی پکا ہوتا ہے جب ان کی جھولی میں کوئی بچہ ہوتا ہے کھل کھلا کے۔ جتنی چھیتی بچہ ہو جائے گا اتنی ہی چھیتی اس کے منہ میں لگامیں پڑ جائیں گی۔ (کھل کھلا کے ماؤ کا تکیۂ کلام تھا)

میں اثبات میں سر ہلاتا رہا۔ فی الحال یہی مناسب تھا۔ میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ یہ خبطی عورت میرے ''بچے'' کے لیے کیوں تڑپ رہی ہے۔ اسے یقین تھا کہ تاجور سے میرا پیچھا تب ہی چھوٹے گا جب وہ امید سے ہوگی۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا کہ میرے اس وطنِ عزیز میں توہمات کی کیا کیا شکلیں ہیں اور فرسودہ عقیدوں کی جڑیں کس طرح دھرتی کی گہرائی میں اتری ہوئی ہیں۔

رات کو پھر میں فرش پر ہی چادر بچھا کر سویا۔ تاجور تو کچھ دیر کروٹیں بدلنے کے بعد سو گئی لیکن مجھے دیر تک نیند نہیں آئی۔ ماؤ بھوت بن کر ذہن سے چمٹی ہوئی تھی۔ خطرہ محسوس ہو رہا تھا کہ ابھی کمرے کا دروازہ دھڑ دھڑ بجنے لگے گا اور وہ یہ دیکھنے کے لیے اندر آجائے گی کہ میں آج پھر کہیں فرش پر تو نہیں سو رہا۔

بہرحال ایسی کوئی بات نہیں ہوئی، لیکن ایک اور بات ضرور ہوگئی۔ ''دھپ دھپ'' کی کچھ نامانوس سی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ یوں محسوس ہوا جیسے کوئی دیواروں پر دوہتڑ مار رہا ہو۔ یہ آوازیں کسی نیچے والے حصے سے آرہی تھیں اور رات کے سناٹے کی وجہ سے واضح سنائی دے رہی تھیں۔ دفعتاً میرا ذہن ماؤ کی کہی ہوئی بات کی طرف گیا۔ اس نے...... کہا تھا کہ فخرو وغیرہ نے مجھے تہ خانے کی سیڑھیوں کی طرف کیوں جانے دیا، اس کا کہنا تھا کہ تہ خانے میں وہ منحوس بند ہے جو ہر ایک کو بددعائیں دیتا ہے۔ معلوم نہیں کہ یہ بات اس نے کس کے لیے کہی تھی؟ وہ کون تھا اور یہاں کیوں بند تھا؟

تاجور بھی کسمسا کر جاگ گئی اور یہ گونجتی ہوئی آوازیں سننے لگی۔ ہمیں یاد آیا کہ پرسوں

رات بھی آخری پہر ایسی ہی دھپ دھپ سنائی دی تھی۔

میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''تاجور! دیکھنا چاہیے کہ یہ کیا ہے؟''

''نہیں، کوئی ضرورت نہیں۔'' وہ دوٹوک لہجے میں بولی۔

''اچھا چلو، برآمدے تک تو جانے دو۔'' میں نے ٹارچ اٹھاتے ہوئے کہا۔

وہ جلدی سے بستر سے نکل آئی، میرے ہاتھ سے ٹارچ واپس لیتے ہوئے بولی۔ ''میں نے کہا ہے نا، آپ کہیں نہیں جائیں گے۔''

اس کے تاثرات دیکھتے ہوئے میں نے ٹارچ واپس رکھ دی اور لالٹین کی لو پھر نیچی کر دی۔ آوازیں تھم گئی تھیں مگر اب وہ دوبارہ بستر پر جانے اور سونے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس کے ذہن میں انجانے اندیشے اودھم مچا رہے تھے۔ وہ کہہ نہیں رہی تھی مگر میرا قوی خیال تھا کہ اس کا ذہن ملنگی ڈیرے کے خطرناک اور خونی روز و شب کی طرف چلا گیا ہے۔ ایسی ہی ایک تاریک و خاموش شب میں تاجور نے پُراسرار آوازیں سنی تھیں۔ یہ آوازیں بعد میں خون آشام چیتوں کی ثابت ہوئی تھیں۔

کچھ دیر بعد میں نے اصرار کر کے اسے بستر پر لٹایا اور خود اس کے پاس بیٹھ کر اس سے تسلی تشفی کی باتیں کرنے لگا۔ وہ کراہ کر بولی۔ ''ہمارا کیا ہوگا شاہ زیب! جب ان لوگوں کو پتا چلے گا کہ میں شمسہ نہیں تاجور ہوں اور ہم دونوں ہری پورہ سے نہیں چاند گڑھی سے یہاں آئے ہیں تو یہ ہمیں کبھی معاف نہیں کریں گے۔''

''تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ سردار سجاول کو سب کچھ معلوم ہو چکا ہے اور اس نے یہ سب کچھ برداشت بھی کر لیا ہے۔''

''یہ سب کچھ کیسے ہوا؟''

''بس ہو گیا ہے نا۔ سجاول کی ماں کی ذہنی حالت کا تمہیں پتا ہی ہے۔ وہ مجھے بہت زیادہ اہمیت دے رہی ہے۔ شاید اپنے سگے بیٹوں سے بھی زیادہ...... سجاول مجبور ہے کہ میرا اور تمہارا بہت خیال رکھے، وہ اپنی ماں کو کسی طرح کا ذہنی صدمہ پہنچانے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔'' میں نے تاجور کو گول مول بات بتائی۔

''مجھے اس گورکھ دھندے کی کچھ سمجھ نہیں آ رہی...... میں تو بس یہ جاننا چاہتی ہوں کہ ہم کب تک یہاں سے نکل سکیں گے؟'' وہ الجھی آواز میں بولی۔

میں نے اس کے نرم ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ بہت جلد کوئی نہ کوئی راستہ نکل آئے گا۔ بس تم کو حوصلہ نہیں چھوڑنا ہے...... اور ہاں...... سجاول کی ماں کے

سامنے خود کو شمسہ ہی ظاہر کرنا ہے، اور باقی بھی جو کچھ اسے بتا رکھا ہے، اسی طرح رکھنا ہے۔''

وہ ڈری ہوئی تھی۔ اس نے میرا بازو کہنی کے اوپر سے تھامے رکھا اور لیٹی رہی۔ میں اس سے باتیں کرتا رہا۔ دھیرے دھیرے وہ غنودگی میں چلی گئی اور پھر سوگئی۔ بہرحال میرے بازو پر اس کی گرفت اسی طرح برقرار رہی۔ بڑی معصومیت اور اپنائیت تھی اس گرفت میں...... یہ اجنبی لوگوں کے درمیان، مشکل حالات میں گھری ہوئی ایک ایسی لڑکی کی گرفت تھی جو اب تک بس اپنی چار دیواری میں ہی رہی تھی، اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ اس کے بابل کے آنگن سے باہر اور اس کے چاند گڑھی سے آگے زندگی کتنی کٹھن اور سفاک ہوسکتی ہے۔

اچانک ایک بار پھر دھپ دھپ کی مدھم آوازیں آنے لگیں۔ ایک دو منٹ بعد یہ آوازیں معدوم ہوگئیں...... مگر پھر...... ایک اور طرح کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ میں ڈکیتوں کے اس ڈیرے پر اس طرح کی آواز سنوں گا۔ یہ آواز بند دروازوں کے پیچھے سے ابھر رہی تھی اور میرے کانوں تک پہنچتے پہنچتے کافی مدھم ہوگئی تھی۔ یہ اذان کی آواز تھی۔ بہت دھیان دینے پر ہی الفاظ کو سمجھا جاسکتا تھا۔ میرا تجسس بڑھ گیا۔ میں نے بہ آہستگی اپنا بازو تاجور کی گرفت سے چھڑایا۔ اپنے فرشی بچھونے پر لحاف کو اس طرح رکھا کہ وہ خالی دکھائی نہ دے۔ پھر چپل پہنتا ہوا کمرے سے باہر نکل آیا۔

برآمدے سے گزر کر میں نیچے جاتی ہوئی تاریک سیڑھیوں پر پہنچا۔ میں جانتا تھا کہ یہ کافی شکستہ سیڑھیاں ہیں، بہرحال میں نے ٹارچ جلانے کی کوشش نہیں کی۔ سنبھل سنبھل کر پاؤں رکھتا میں قریباً پندرہ فٹ نیچے ایک مقفل دروازے کے سامنے پہنچا۔ میری جیب میں تاجور کی دو ہیئر پنیں موجود تھیں۔ میں نے انہیں ڈبل کر کے اور بل دے کر ایک مڑا تڑا تار تیار کرلیا۔ ایک دو منٹ کی کوشش سے میں دروازے کا ہضمی قفل کھولنے میں کامیاب ہوگیا۔ ایک ہال نما جگہ پر پہنچا تو اذان کی آواز مزید بلند اور واضح ہوگئی۔ یہ آواز ایک اور بند دروازے کے عقب سے آرہی تھی۔ دروازے کو باہر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔

غالباً میرے قدموں کی چاپ سننے کے بعد اذان دینے والے نے اذان روک دی۔ اندر لالٹین کی مدھم روشنی تھی، وہ ادھ کھلی کھڑکی کی طرف آیا۔ وہ ایک نوجوان لڑکا تھا۔ عمر اٹھارہ سال کے لگ بھگ ہوگی۔ چھوٹی چھوٹی داڑھی، شلوار قمیص اور ایک میلی سی جیکٹ پہنے ہوئے تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر پھنکارا۔ ''تم سب جہنمی ہو...... دوزخی ہو۔ تم سب ذلت کی موت مرو گے۔ تمہاری لاشیں کتے اور گدھ کھائیں گے۔ تمہاری آنے والی نسل بھی تم پر لعنت بھیجتی رہے گی۔ تم نے ایک نیک انسان کو قتل کیا۔ اس کا خون ضرور رنگ لائے گا۔ ضرور لائے گا۔''

اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ میں نے کہا۔ ''دیکھو میں دشمن نہیں دوست ہوں۔ ان لوگوں سے میرا کوئی تعلق نہیں، میں تو......''

''بکواس بند کرو'' وہ دانت پیس کر بولا۔ ''میں تم سب کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم سب اسی عالمگیر حرامی کے پالتو سور ہو۔ تمہاری باتوں میں آکر میری زندگی برباد ہوگئی۔ میں کہیں کا نہیں رہا۔ میری دنیا بھی گئی اور آخرت بھی۔ مولوی جی کی روح مجھے کبھی معاف نہیں کرے گی...... کبھی نہیں۔''

اس نے جیسے دیوانگی کے عالم میں دیوار پر دو ہتڑ رسید کرنے شروع کر دیئے۔ ''دھپ...... دھپ......'' کی آواز پھر بلند ہونے لگی۔

میں نے دیکھا نوجوان کی انگلیوں سے خون رِس رہا تھا۔ میرے ذہن میں جیسے روشنی سی بکھر گئی۔ ابھی اس لڑکے نے مولوی جی کا لفظ استعمال کیا تھا۔ چاند گڑھی کی مسجد میں مولوی فدا صاحب کو سیڑھیوں سے دھکا دے کر قتل کرنے والا بھی ایک مؤذن لڑکا تھا اور وہ غالباً ابھی تک لاپتا تھا...... کہیں، یہی تو وہ لڑکا نہیں تھا؟ یہ بات ذہن میں آتے ہی میرے خون کی گردش بڑھ گئی۔

میں نے دھیان سے اسے دیکھا۔ وہ قبول صورت رہا ہوگا۔ مگر یہاں قید و بند کی صعوبتیں جھیل کر اس کی ہڈیاں نکل آئی تھیں اور حلیہ بگڑا ہوا تھا۔ میں نے دھیمے لفظوں میں اسے سمجھایا کہ وہ شور شرابا نہ کرے۔ ایسا نہ ہو کہ اوپر سے کوئی یہاں آجائے اور میں اس سے بات نہ کرسکوں۔ میں نے اسے ایک بار پھر یہ یقین دلانے کی بھرپور کوشش کی کہ میرا ان لوگوں سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہاں میری حیثیت بھی وہی ہے جو اس کی ہے۔

میری ان باتوں نے اس پر کچھ اثر کیا اور اس کا ہیجان کچھ کم ہوگیا۔ میں نے ہمت کر کے دروازہ کھولا اور اس کے پاس اندر کمرے میں چلا گیا۔ یہاں ایک چٹائی اور رضائی فرش پر ہی پڑی تھی جسے میں لالٹین سمجھ رہا تھا وہ ایک بڑے سائز کا ''جستی دیا'' تھا۔ شاید لالٹین اس لیے یہاں نہیں رکھی گئی تھی کہ اس کی چمنی کے شیشے سے یہ لڑکا خود کو یا کسی دوسرے کو نقصان نہ پہنچادے۔ مجھے اس سے، زیادہ سے زیادہ خطرہ یہی ہوسکتا تھا کہ وہ مجھ پر حملہ کر دے گا لیکن اگر وہ ایسا کرتا تو میں اسے بہ آسانی سنبھال سکتا تھا۔

میرے اعتماد نے اس کا اعتماد بحال کیا اور وہ آہستہ آہستہ مجھ سے باتیں کرنا شروع ہو گیا۔ میں نے اسے اپنے بارے میں اتنا بتایا کہ ایک چکر میں پھنس کر میں ان ڈکیتوں کے ہتھے چڑھ گیا ہوں اور اب یہاں سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہوں۔ جواب میں اس

عبدالرحیم نامی لڑکے نے جو باتیں کیں، ان سے مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ یہی وہ لڑکا ہے جس کے ذریعے قریباً ڈیڑھ مہینا پہلے مولوی صاحب کو سیڑھیوں سے گرا کر قتل کیا گیا تھا۔ عبدالرحیم کھلے الفاظ میں اس قتل کا اعتراف کر رہا تھا اور ان لوگوں کو بددعائیں دے رہا تھا جن کی وجہ سے اس سے یہ گھناؤنا جرم سرزد ہوا۔

وہ ہیجان زدہ تھا۔ عجیب لہجے میں بولا۔ ''میں جب آنکھیں بند کرتا ہوں میرے سامنے مولوی جی کی شکل آ جاتی ہے۔ میرا کلیجا پھٹنے لگتا ہے۔ وہ اذان دے کر دعا مانگتے ہوئے نیچے آنے لگے تھے جب میں نے ان کو دھکا دیا، اس سے دو سیکنڈ پہلے انہوں نے مڑ کر میری طرف دیکھا، ان کی وہ صورت میری آنکھوں میں اور میرے دماغ میں جم کر رہ گئی ہے۔ میں اس کو نہیں بھول سکتا۔ کسی صورت نہیں بھول سکتا۔ پتا نہیں اس وقت کیا ہو گیا تھا مجھے؟ کیوں میں نے اتنا بڑا جرم کیا۔ کس طرح کر دیا۔'' ایک بار پھر بے حد تاسف کے عالم میں اس نے پتھریلی دیوار پر دو ہتڑ رسید کیا اور اس کی دو انگلیوں سے ٹپ ٹپ خون کے قطرے گرنے لگے۔

وہ دردناک انداز میں بولا۔ ''میں ان بدبختوں کے چنگل سے نکلنا چاہتا ہوں۔ میں چاند گڑھی کے چوک میں کھڑے ہو کر اپنے گناہ کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں اور ان دوزخیوں کے نام بھی بتانا چاہتا ہوں، جنہوں نے مجھ سے یہ ظلم کرایا۔''

''یہ عالمگیر کون ہے؟'' میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

''ہے ایک خنزیر چاند گڑھی گاؤں کا۔ اسی کی وجہ سے میری عقل پر پتھر پڑے۔ وہ بہت بڑا چالباز ہے۔ اگر تھانے کچہری والوں نے اس کے ساتھ کچھ نہ کیا تو میں اپنے ہاتھ سے اسے گولی ماروں گا اور پیش ہو جاؤں گا۔ ڈبل پھانسی تو نہیں ہو گی نا مجھے، ایک ہی دفعہ ہو گی۔''

میں نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اپنی باتوں سے تم سمجھ دار اور سیانے لگتے ہو۔ پھر تم ایک نیک شخص کی جان لینے پر رضامند کیسے ہو گئے؟''

وہ بولا۔ ''کہا ہے، عقل پر پتھر پڑ گئے تھے۔ یہ لوگ بڑی چالاکی سے ہم جیسوں کی مت مار دیتے ہیں۔ فرقے، عقیدے، مسلک کو درمیان میں لا کر آگ بھر دیتے ہیں ہمارے اندر۔ مجھے بھی مولوی جی کے خلاف بھڑکایا گیا۔ ان کے مسلک کو غلط بتا کر ان کو کافر کہا گیا۔ ان کی گردن مارنے کو بہت بڑا ثواب بتایا گیا...... اور میں چل پڑا انہیں مارنے کے لیے مگر انہیں مارنے کے بعد...... میری زندگی حرام ہو گئی۔ میرا سکون چین برباد ہو گیا۔ میں ایک ایسے شکنجے میں جکڑ گیا ہوں کہ جی سکتا ہوں نہ مر سکتا ہوں۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے اس کی آواز بھرا گئی۔

اس نے انتہائی جذباتی لہجے میں جو کچھ بتایا، اس سے پتا چلا کہ مولوی جی کے قتل کے بعد وہ شدید ذہنی خلفشار اور بے سکونی کا شکار ہو چکا ہے۔ اس نے مولوی صاحب کو نہ صرف سیڑھیوں سے دھکا دیا تھا بلکہ بعد میں انہیں مکمل طور پر ختم کرنے کے لیے، پکی اینٹ سے ان کے سر پر وار بھی کیے تھے۔ اس نے کہا کہ اب مولوی جی کی صورت ہر وقت اس کی نگاہوں کے سامنے گھومتی رہتی ہے۔ بیٹھے بیٹھے ایک دم اسے لگتا ہے کہ لہو میں ڈوبے ہوئے مولوی صاحب دیواروں کا سہارا لیتے اس کے سامنے آن کھڑے ہوئے ہیں۔ وہ جب بولتے ہیں تو وہ ان کی آواز بالکل صاف سنتا ہے۔ وہ کہتے ہیں...... مجھے کیوں مارا؟ میں تو اذان دینے کے لیے اور نماز پڑھانے کے لیے گھر سے نکلا تھا۔ میرا کیا قصور تھا؟ ایسے وقت میں وہ اٹھ کر بھاگ جانا چاہتا ہے مگر اٹھ نہیں سکتا۔ سکتہ زدہ ہو جاتا ہے۔ اس کا سارا جسم پسینے میں نہا جاتا ہے اور غشی طاری ہونے لگتی ہے۔ اس نے بتایا کہ دن اور رات میں کم از کم ایک بار ایسا ضرور ہوتا ہے ابھی کوئی ایک گھنٹا پہلے بھی یہی سب کچھ ہوا ہے اور وہ دیوانوں کی طرح دیواروں پر دوہتڑ مارنے پر مجبور ہو گیا ہے۔

اس کی پوری بات سننے کے بعد میں نے کہا۔ ”تمہاری باتیں سمجھ میں آ رہی ہیں مگر تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ تم ان ڈکیتوں کے ہتھے کیسے چڑھے؟“ وہ گہری سانس لے کر بولا۔

”کوئی دو ہفتے پہلے کی بات ہے جب میں نے پکا فیصلہ کر لیا تھا کہ میں تھانے میں جا کر سب کچھ صاف صاف بتا دوں گا۔ میں نے اپنے ایک استاد قاری حبیب سے مشورہ کیا اور اس نے بھی کہا کہ یہ مناسب ہے لیکن اس نے یہ بھی کہا کہ مجھے اکیلے ہی تھانے نہیں جانا چاہیے۔ اس کا کہنا تھا کہ مقامی ایم پی اے کا ایک بھائی اس کا جاننے والا ہے۔ میں اسے لے کر تھانے میں پیش ہوں تو اچھا ہے، اس روز ہم ایم پی اے کے اس بھائی کی طرف ہی جا رہے تھے۔ ایک بیٹھک میں پہنچے تو کچھ لوگ ایک دم اندر گھس آئے۔ انہوں نے دروازہ بند کر دیا اور مجھے بے تحاشا مارنا شروع کر دیا۔ قاری حبیب سکون سے ایک طرف کھڑا رہا۔ مجھے پتا چلا کہ قاری حبیب نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے، وہ اندر خانے عالمگیر اور اسحاق وغیرہ سے ملا ہوا ہے۔ عالمگیر بڑا بے رحم شخص ہے۔ اس نے مجھے، اپنے ڈیرے پر ایک کوٹھری میں بند کروا دیا۔ میری جیب سے وہ دس ہزار روپیہ بھی نکال لیا گیا جو مجھے مولوی جی کے قتل سے پہلے خرچے کے لیے دیئے گئے تھے اور جو میں تھانے میں جمع کرانا چاہتا تھا۔ سخت سردی میں میرے پنڈے پر بس ایک شلوار اور بنیان رہنے دی گئی۔ رات کو میں نے وہاں سے

بھاگنے کی کوشش کی۔ انہوں نے مجھے پکڑ لیا اور پھر بیدردی سے مارا۔ میں بے ہوش ہو کر گر گیا۔ کوئی چار پہر بے ہوش رہا۔ پھر ہوش آ گیا لیکن بے ہوش بن کر ہی پڑا رہا۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ مجھے دوبارہ مارنا شروع کر دیں گے۔ ساتھ والے کمرے میں عالمگیر اپنے کچھ ساتھیوں سے باتیں کر رہا تھا۔ ان باتوں میں اللہ بخشے مولوی جی کی بیٹی زینب کا نام بھی آ رہا تھا۔ مجھے ایک عجیب بات کا پتا چلا۔ عالمگیر وغیرہ کے لیے زینب ایک بڑی قیمتی چیز تھی۔ وہ اسے کسی بہت امیر بندے کے ہاتھ بیچنا چاہتے تھے۔ پتا ہے کتنی قیمت پر؟"

"کتنی قیمت پر؟" میں نے پوچھا۔

"تقریباً ایک کروڑ بیس لاکھ میں۔ انہیں یقین تھا کہ پانچ دس لاکھ کی کمی بیشی سے یہ سودا ہو جائے گا۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا اور اب تک نہیں آ رہا۔ مولوی صاحب کی بچی عام سی ہے پھر پتا نہیں کیوں اس کے لیے اتنے زیادہ روپے کی بات ہو رہی تھی۔ اس رات مجھ پر ایک اور راز بھی کھلا۔ اور یہ زینب والے راز سے بھی زیادہ عجیب ہے۔ عالمگیر وغیرہ کی باتوں سے مجھے اشارہ ملا کہ زینب کوئی اکیلی لڑکی نہیں ہے۔ کچھ اور لوگ بھی ہیں جنہیں اس امیر کبیر بندے کے ہاتھ بیچا جانا ہے۔ یہ کوئی لمبا چکر ہے اور اس میں بہت سا روپیہ بھی ہے۔ عالمگیر جیسے کچھ اور لوگ بھی اس چکر کا حصہ ہیں۔ شروع میں تو یہی لگ رہا تھا کہ میں چاند گڑھی سے زندہ بچ کر نہیں نکلوں گا اور شاید یہ ساری باتیں میرے ساتھ ہی عالمگیر کے ڈیرے میں کہیں دفن ہو جائیں گی۔ مگر پھر ایک رات ایک کرشمہ ہوا۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ رات میرے لیے بہت بری ثابت ہونے والی تھی۔ اس رات عالمگیر کے بندے مجھے کاٹ کر ڈیرے کے پچھواڑے کہیں دفنانے والے تھے مگر رات کو ایک موٹا تازہ موچھیل بندہ آیا۔ اس نے مجھے یوں تاڑا جیسے لوگ قربانی کے جانور کو تاڑتے ہیں۔ اس نے عالمگیر کے کانوں میں کچھ کھسر پھسر کی۔ پھر میری بنیان اتروائی۔ میرے پنڈے کو بڑے دھیان سے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ایک ایسا کام کیا جس کی مجھے بالکل امید نہیں تھی۔ اس نے اپنے لمبے چھرے سے اچانک ہی مجھ پر وار کیا اور میری کمر پر سے گوشت ادھیڑ کر رکھ دیا...... یہ دیکھو......"

لڑکے عبدالرحیم نے اپنی گہرے رنگ کی میلی جیکٹ اور قمیص اوپر اٹھا کر مجھے اپنی پشت دکھائی۔ میں چونک گیا۔ یہ قریباً ڈیڑھ فٹ لمبا گہرا کٹ تھا جو رحیم کے دائیں کندھے سے شروع ہو کر اس کی ریڑھ کے ساتھ ساتھ چلتا نیچے تک آ گیا تھا۔ اس میں کم و بیش بیس ٹانکے لگے ہوئے تھے۔ زخم اب مندمل ہونا شروع ہو گیا تھا۔

"یہ ٹانکے بھی انہوں نے خود ہی لگائے؟" میں نے رحیم سے پوچھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”میری اچھی طرح مرہم پٹی کی گئی۔ دوائی بھی کھلائی گئی۔ اس دوائی میں کوئی نشہ آور گولی بھی تھی یا شاید ایک سے زیادہ گولیاں تھیں۔ میں بے ہوش ہو گیا۔ بے ہوشی کے دوران میں مجھے اندازہ ہوا کہ میں کسی جیپ یا ڈیزل کار میں لمبا سفر کر رہا ہوں۔ پھر میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر گھوڑے پر سفر کرایا گیا۔ پوری طرح ہوش میں آیا تو خود کو یہاں ان ڈکیتوں کے درمیان پایا۔ سجاول ڈکیت کا نام میں نے پہلے بھی سنا ہوا تھا لیکن یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ ایک دن میں خود اس بدنام گروہ کے چنگل میں پھنس جاؤں گا۔ مجھے نہیں لگتا کہ یہ لوگ مجھے زیادہ دیر زندہ رہنے دیں گے۔ ابھی تک مارا کیوں نہیں، یہ بات میری سمجھ سے باہر ہے۔ اسی طرح یہ کمر والا زخم بھی سمجھ سے باہر ہے۔ پتا نہیں، یہ لوگ کیا چاہتے ہیں مجھ سے۔“

میں نے رحیم سے پوچھا۔ ”یہ جو تم لڑکی کی قیمت والی بات بتا رہے ہو، بہت حیران کرنے والی ہے۔ اس بات کا ذکر تم نے ان ڈکیتوں سے بھی کیا ہے؟“

”نہیں، ابھی تک تو نہیں کیا لیکن ہو سکتا ہے کہ یہ خود ہی جانتے ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ عالمگیر کے دوستوں میں سے ہیں۔“

”اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نہ جانتے ہوں۔ ابھی تم اس سلسلے میں چپ ہی رہو۔“

رحیم اب مجھ پر اعتماد کرنے لگا تھا۔ اسے اندازہ ہوا تھا کہ میں چاند گڑھی کے آس پاس ہی کہیں رہتا ہوں۔ غالباً میری گفتگو سے اسے یقین آنا شروع ہو گیا تھا کہ میں بھی اس کی طرح یہاں زبردستی رکھا گیا ہوں اور اسی کی طرح یہاں سے نکلنا بھی چاہتا ہوں۔ میں نے اسے سمجھایا کہ اس طرح دیواروں پر مکے چلانے اور واویلا کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ وہ ذرا صبر تحمل سے کام لے۔ ہو سکتا ہے کہ دو چار دن میں یہاں سے نکلنے کی کوئی سبیل بن جائے۔ میں نے اسے یہ بتا کر حیران کیا کہ میرا تعلق بھی چاند گڑھی سے ہے اور مولوی فدا اور اس کی بیمار بچی کے بارے میں، میں بھی کافی کچھ جانتا ہوں۔ میں نے اسے اپنا نام بتایا اور یہ بھی بتایا کہ چاند گڑھی کے زمیندار دین محمد کی بیٹی تاجور بھی میرے ساتھ ہے۔ میں نے اس پر انکشاف کیا کہ میں اس سے نکاح کر چکا ہوں۔

دین محمد اور تاجور کا نام سن کر رحیم کچھ چونک سا گیا بولا۔ ”جس رات میں نے عالمگیر اور اس کے ساتھیوں کی باتیں سنی تھیں، اس رات میں نے تاجور کا نام بھی سنا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا تھا کہ شاید یہ تاجور نام کی لڑکی بھی ان لوگوں میں شامل ہے، جن کو کسی امیر کبیر بندے کے ہاتھ مہنگی قیمت پر بیچا جانا ہے...... مگر یہ تاجور والا کام جلدی ہونے والا نہیں تھا، اس میں کچھ دیر لگنی تھی۔“

تاجور کے ذکر نے مجھے بھی بری طرح چونکا دیا۔ بہرحال میں نے اپنے تاثرات کو نمایاں نہیں ہونے دیا۔ رحیم نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ تاجور کو ''تیار کرنے'' کی کوئی بات کررہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ اس میں کم از کم دو سال تو لگ جائیں گے......''

''دو سال لگ جائیں گے؟ تمہاری بات کچھ سمجھ میں نہیں آرہی؟'' میں نے کہا۔

''سمجھ میں تو میری بھی نہیں آئی تھی۔''

''اور کیا کہا انہوں نے؟''

''بس اسی طرح کی باتیں ہو رہی تھیں۔ وہاں کوئی اسحاق نام کا بندہ بھی تھا۔ عالمگیر غصے میں آکر اسے بزدل، ہیجڑا اور پتا نہیں کیا کیا کہنے لگا۔ اس کا کہنا تھا کہ تاجور کا منگیتر ہونے کے باوجود بھی وہ اسے اپنے گھر میں نہیں ڈال سکا۔ جب وہ گھر میں ہی نہیں ہے تو پھر اس کی ''تیاری'' کہاں ہونی ہے۔''

یہ ساری باتیں ایک معمے جیسی تھیں اور یہ معما بتدریج پیچیدہ ہو رہا تھا۔ رحیم نے پہلے زینب کے حوالے سے ایک حیران کن انکشاف کیا تھا اور اب وہ اس سے ملتی جلتی بات تاجور کے بارے میں بھی بتا رہا تھا۔ زینب عام شکل وصورت کی معمولی لڑکی تھی...... پھر اس کے حوالے سے کروڑ سوا کروڑ کی بات کیوں کی جارہی تھی؟ کیا اس سے کوئی خاص مقصد حاصل کیا جانا تھا؟ اور کیا تاجور کے حوالے سے بھی کوئی اسی قسم کا معاملہ تھا؟ چند ہفتے پہلے زینب کی بیماری والا معاملہ عالمگیر اور پیر ولایت وغیرہ کی بدنیتی تک محدود نظر آتا تھا مگر اب اس کی سنگینی اور وسعت کافی بڑھی ہوئی دکھائی دینے لگی تھی۔ اس سے تاجور کا نام بھی نتھی ہو رہا تھا۔ میرے بدن میں بے چینی کی ایک تیز لہر سی دوڑ گئی۔

شاید میری اور رحیم کی گفتگو مزید کچھ دیر جاری رہتی مگر اوپر سے کھٹ پٹ کی آوازیں آنے لگیں۔ مجھے شک ہوا کہ تاجور بیدار ہوگئی ہے اور گھبراہٹ میں دروازے کھٹکھٹا رہی ہے۔ یہ نازک صورتِ حال تھی۔ میں نے رحیم سے کل رات پھر ملاقات کرنے کا کہا اور تسلی آمیز انداز میں اس کا شانہ تھپک کر وہاں سے نکل آیا۔

دروازے کو مڑے ہوئے تار سے تیزی سے مقفل کرنے کے بعد میں سیڑھیاں پھلانگتا ہوا واپس اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ تاجور مجھ سے چمٹ گئی اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ اسے شدید گلہ تھا کہ میں اسے بتائے بغیر کمرے سے نکل کر کہیں چلا گیا۔ اس کے آنسو تھمنے میں نہیں آرہے تھے۔ میں اسے چپ کرانے کی کوشش کرتا تو وہ زور سے دھکا دیتی اور مزید شدت سے آنسو بہانے لگتی۔ میں نے کہا۔ ''پچھلے چار پانچ دن میں تم نے جتنا پانی بہایا ہے

تمہیں ضرور ''ڈی ہائیڈریشن'' ہو جائے گا۔ جسم سے پانی ختم ہو جائے تو اندر کی نسیں جڑنا شروع ہو جاتی ہیں۔''

''تو ٹھیک ہے، مر جاؤں گی نا۔ اس سے اچھا اور کیا ہو گا میرے لیے۔ پتا نہیں وہ کون سی گھڑی تھی جب مجھ سے اتنی بڑی غلطی ہوئی۔ میں نے آپ کو اپنا مددگار سمجھا اور لاہور سے آپ کو اپنے پیچھے لگا کر گاؤں لے آئی۔ کاش یہ نہ ہوا ہوتا۔ یہ نہ ہوتا تو شاید گاؤں میں میری بدنامی کے جھنڈے نہ لگے ہوتے۔ شاید نوری بھی اب تک زندہ ہوتی۔''

میں نے کہا۔ ''وہ تو شاید زندہ ہوتی لیکن سوچو، تم خود کہاں ہوتیں اور تمہارے گھر والے کہاں ہوتے اور ریشمی کے ساتھ کیا کچھ ہو گیا ہوتا۔ اگر کچھ برا ہوا ہے تو بہت کچھ اچھا بھی ہوا ہے۔ تاجور...... اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں ہم نوری اور چاچا رزاق کی قربانیاں رائگاں نہیں جانے دیں گے۔''

''میں بس واپس جانا چاہتی ہوں۔ اپنے گھر والوں کے پاس، اپنے بھائیوں کے پاس۔ ابھی اسی وقت۔'' وہ بچوں کی طرح ضدی لہجے میں بول رہی تھی۔

میں نے بڑی مشکلوں سے اسے سنبھالا۔ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

''آپ اتنی رات کو مجھے سوتا چھوڑ کر کہاں گئے تھے، مجھے بالکل سچ سچ بتائیں۔''

میں نے زیرِلب مسکرا کر کہا۔ ''دیکھو نا اب لگی ہو اپنی اپنی سی۔ کتنی محبت چھپی ہے اس سوال میں...... بہرحال...... اس سوال کا جواب تمہارے لیے اتنا اچھا نہیں ہے۔ میں تم سے جھوٹ بولوں گا تو مجھے ٹھیک نہیں لگے گا اور سچ بتاؤں گا تو تم ناراض ہو جاؤ گی۔''

''نہیں، مجھ میں حوصلہ ہے سچ سننے کا، آپ بتائیں۔''

''میں ماؤ کی پوتی مانی سے ملنے گیا تھا۔ اس سے آج ''ڈیٹ'' تھی میری...... ڈیٹ سمجھتی ہو نا؟ میٹھی میٹھی سی ملاقات۔ ہم دونوں نے بھینسوں والے کمرے میں گھس کر آلو والا نان کھایا۔ دودھ پتی پی کر تھوڑی سی گپ شپ کی...... اور بس۔ ویسے ہے بڑی کڑک لڑکی۔ ایک دم گرم اور ہائی اسپیڈ۔''

تاجور اپنی جگہ سے اٹھی اور پاؤں پٹختی ہوئی، بیڈ پر جا کر اور لحاف اوڑھ کر لیٹ گئی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ میں مذاق کر رہا ہوں۔ اتنی ''خطرناک'' بات میں نے ہلکے پھلکے انداز میں کہہ دی تھی اور میرے اس انداز کی وجہ سے اس کے اندر کا شک ایک دم دھند بن کر اڑ گیا تھا۔ یقیناً اس کے دل نے گواہی دے دی تھی کہ اگر مانی کے بارے میں اس کا شک درست ہوتا تو یہ بات ایسے ''ایزی'' انداز میں نہ کرتا۔ اب وہ یونہی روٹھ کر دکھا رہی تھی۔ اس کے بارے میں

مؤذن عبدالرحیم کی بات سن کر میں بہت فکر مند ہو گیا تھا، مگر یہ فکرمندی میں ابھی تاجور پر ہرگز ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔

تاجور کو منانے میں مجھے یقیناً کچھ وقت لگتا لیکن پھر برآمدے کی طرف سے کچھ ایسی آوازیں بلند ہوئیں جنھوں نے میرا کام آسان کر دیا۔ یہاں کا وڈا سردار اعظم، غل غپاڑا کر رہا تھا۔ اس کے دماغ کو چڑھی ہوئی تھی اور وہ بلند آواز میں اول فول بک رہا تھا۔ ڈنمارک میں، میں نے سنا تھا کہ پاکستان اور ہندوستان کے دیہی علاقوں میں لوگ گڑ کی دیسی شراب پیتے ہیں اور پھر ہر آنے جانے والے پر اینٹیں برساتے ہیں۔ اس وقت تو یقین نہیں آیا تھا مگر یہاں سجاول کے اس شرابی بھائی کو دیکھ کر لگ رہا تھا کہ کچھ لوگوں کی حد تک یہ بات ٹھیک ہی ہے۔

اعظم کا للکارا سنائی دیا۔ ''میں اندھا بہرہ نہیں ہوں۔ سب پتا چلتا ہے مجھے۔ مجھ سے فراڈ ہو رہے ہیں یہاں۔ وہ حرام زادی جھوٹ بول رہی ہے کہ اسے بچہ ہونے والا ہے۔ خود کو بچانے کے لیے ڈھونگ رچایا ہے اس نے۔ میں اس کو نہیں چھوڑوں گا۔ ابھی لے کر جاؤں گا اسے......''

یہ ذکرِ خیر یقیناً تاجور کا ہی ہو رہا تھا۔ شاید دایہ اختری ہی کی زبانی اسے سچ کا علم ہو گیا تھا۔ میں نے دیکھا لالٹین کی زرد روشنی میں تاجور کا چہرہ زرد تر دکھائی دینے لگا۔ اس نے اپنی ناراضگی بھول کر میرا بازو اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ اعظم کی مدہوش للکار کے جواب میں ادھیڑ عمر فیض کی سنجیدہ آواز ابھری۔ ''وڈے سردار! وہ امید سے نہیں، پر شادی شدہ تو ہے نا......اور بیمار بھی ہے......وہ آپ کے لائق نہیں ہے۔''

''ہاں، وہ میرے لائق نہیں ہے۔ فلانی بھی میرے لائق نہیں ہے، ڈھمکانی بھی میرے لائق نہیں ہے۔ تم لوگوں نے مجھے جھلا سمجھ رکھا ہے؟ اُلو کا پٹھا ہوں میں؟ یہ شادی شدہ ہے اس لیے میں اسے ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ وہ ڈانسر جس کو بدھ کے روز پکڑ کر لائے ہو، وہ خیر سے سہیلی بن گئی ہے مائی کی۔ کل کوئی اور آئے گی تو تم اسے اپنی ماں بنا لینا۔ میں سب سمجھتا ہوں تم لوگوں کی چکر بازیاں۔ پیچھے ہٹ جاؤ۔ میں ابھی لے کر جاؤں گا اسے۔''

اتنے میں کہیں دور سے سجاول کی گرج دار آواز سنائی دی اور رات کا سناٹا چیرتی ہوئی دور تک پھیل گئی۔ ''اوئے چاچا فیض یہ کیسا شور ہے؟''

چھوٹے سردار سجاول سیالکوٹی کی گرج نے کام دکھایا اور وڈے سردار کی آواز کا دم خم ایک دم ماند پڑ گیا۔ وہ بڑبڑانے والے انداز میں بولا۔ ''لو، اب یہ بھی بول پڑا۔ ابھی یہاں

آ کر مولوی ثنا اللہ بن جائے گا اور تقریر جھاڑنے لگے گا۔ ذات کا ڈکیت اور باتیں سنو اس کی حاجیوں والی۔"

سجاول سیالکوٹی کی گرج پھر ابھری۔ "یہ کیا ہو رہا ہے وہاں؟"

چھوٹے سردار سجاول کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ سب کچھ جانتا ہے، اور قصداً پاس نہیں آ رہا تاکہ بڑے بھائی سے منہ ماری نہ کرنا پڑے۔ اس کی یہ تدبیر کارگر رہی۔ بڑے بھائی اعظم کی بولتی بند ہونے لگی۔ وہ سٹپٹائے ہوئے انداز میں فیض محمد سے مخاطب ہو کر بولا۔ "میری زندگی حرام کر رہے ہو تم لوگ۔ کسی دن پھٹ پڑوں گا، بہت کچھ برباد کر دوں گا یہاں کا۔ بہت کچھ ختم کر دوں گا......" وہ شاید ڈگمگاتا ہوا واپس جا رہا تھا۔

اس چار دیواری میں اس کی حیثیت ایک عورت خور درندے کی سی تھی۔ وہ جیسے ہر جگہ صنفِ نازک کی ٹوہ لیتا پھرتا تھا۔ سجاول سیالکوٹی نے اسے بڑے حساب سے لگام ڈال رکھی تھیں ورنہ وہ یہاں تہلکہ مچا دیتا۔ کل مجھے فیض محمد نے اس مریض کے بارے میں بتایا تھا جس کا علاج پہلوان حشمت نے کرنا تھا۔ وہ نگینہ نام کی ایک نوجوان مریضہ تھی۔ کسی بات پر مشتعل ہو کر سردار اعظم نے اس کا ہاتھ توڑ ڈالا تھا۔ وہ عجیب قماش کا بندہ تھا۔ لگتا تھا کہ اس کی زندگی والا سگریٹ دو طرف سے جل رہا ہے۔ ایک طرف سے شراب اور دوسری طرف سے عورت اسے ختم کر رہی ہے۔ اس کے چہرے سے ایسی نحوست برستی تھی کہ خواہ مخواہ اس پر تھوکنے کو دل چاہتا تھا۔ اسے جو لوگ وڈا سردار کہتے تھے وہ یقیناً اسے اندر سے وڈا کمینہ ہی کہہ رہے ہوتے تھے۔

سارا دن مجھے یہی دھڑکا لگا رہا کہ ابھی ماؤ کی پوتی کی طرف سے نادر شاہی بلاوا آ جائے گا اور مجھے اس کے دل بہلاوے کے لیے اس کی خلوت گاہ میں جانا پڑے گا مگر اس روز خیریت ہی گزری۔ شاید وہ آفت کی پرکالی کسی اور مہم میں مصروف تھی۔ آج کل جاناں ہر وقت اس کے ساتھ نظر آ رہی تھی۔ مانی اس سے رقص کے داؤ پیچ سیکھ کر غالباً خود کو مزید مسلح اور تباہ کن بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔

میں نے تاجور کو ساری بات سمجھا دی تھی، لہٰذا اگلی رات جب میں پھر مؤذن عبدالرحیم سے ملنے کے لیے کمرے سے نکلا تو بیدار ہونے کے باوجود تاجور نے کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی۔ اس کی "ہیئر پنیں" میرے پاس تھیں لہٰذا اس کے سر کے بال کھلے ہوئے تھے۔ ان سیاہ بادلوں کے گھیرے میں وہ بڑی دلکش لگ رہی تھی۔ بے اختیار اسے پیار کرنے کو دل چاہا لیکن ابھی اس کے اندر کا موسم پوری طرح بحال نہیں ہوا تھا۔ ابھی مجھے انتظار کرنا تھا اور...... میں

اس کے لیے زندگی کی آخری سانس تک انتظار کر سکتا تھا۔

اس نے لحاف میں منہ سر لپیٹ کر کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لیں اور مجھے یقین دلایا کہ میری آواز پہچانے بغیر وہ ہرگز دروازہ نہیں کھولے گی۔ میں کل کی طرح خاموشی سے شکستہ سیڑھیاں اترا اور دروازے کا قفل کھول کر اندر چلا گیا۔ حسبِ توقع رحیم جاگ رہا تھا اور میرا انتظار کر رہا تھا۔ آج وہ قدرے پُرسکون نظر آتا تھا۔ وہ ایک کونے میں ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور لحاف گھٹنوں تک اوڑھا ہوا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی داڑھی نے ابھی پوری طرح اس کی ٹھوڑی کو ڈھانپا نہیں تھا، تاہم اپنی بول چال اور طور اطوار سے وہ کافی سنجیدہ اور سمجھ دار دکھائی دیتا تھا۔ شاید زیادہ سنجیدہ اور سمجھ دار لوگ ہی مذہبی ٹھیکیداروں کے غلط خیالات اور خام عقیدوں کے چکر میں پھنستے ہیں۔ وہ اس بات پر حیران نظر آتا تھا کہ میں کتنی بے خوفی اور آسانی سے دروازے کا تالا کھول کر یہاں اس کے پاس پہنچ جاتا ہوں۔

آج اس نے گفتگو کا آغاز عجیب انداز سے کیا بولا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ مجھے تو یہ لوگ زندہ نہیں چھوڑیں گے لیکن اگر تم یہاں سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئے تو خدا کے لیے، قانون کے محافظوں تک میری آواز ضرور پہنچا دینا۔ اگر سامنے نہ آنا چاہو تو نہ آؤ، کسی خط کے ذریعے یا ٹیلی فون کے ذریعے یا کسی بھی طریقے سے چاند گڑھی کے کسی معتبر تک یہ بات ضرور پہنچاؤ کہ مولوی جی کے ساتھ حادثہ نہیں ہوا تھا، انہیں قتل کیا گیا تھا اور قتل کرنے والوں میں سب سے پہلے عالمگیر اور اسحاق کا نام آتا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''رحیم! تم فکر نہ کرو، وہی ہوگا جو تم کہہ رہے ہو لیکن یہ تم خود کرو گے۔ اللہ نے چاہا تو یہاں سے بحفاظت نکلیں گے اور ذمے داروں کو کیفر کردار تک پہنچائیں گے۔''

''مگر غیب کا علم تو اللہ کو ہی ہے نا۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو پھر یہ کام تمہیں کرنا ہے بلکہ اگر چاہو تو تاجور کو بھی یہ بات بتا دو اور وہ جو تمہارا ساتھی پہلوان یہاں ہے، اس کو بھی باخبر کر دو۔''

''میں تمہیں یقین دلاتا ہوں، اگر ہمارا حوصلہ بلند رہے گا تو یہ لوگ ہمارا کچھ بگاڑ نہیں سکیں گے اور مجھے یہ بھی بھروسا ہے کہ قدرت ہماری مدد کرے گی۔''

اس نے محتاط نظروں سے بیرونی دروازے کی طرف دیکھا، پھر اپنی قمیص کے نیچے ہاتھ ڈال کر بولا۔ ''ٹھہرو، میں تمہیں ایک چیز دکھاتا ہوں۔''

اس نے اپنا آزار بند کھولا اور شلوار کے نیفے میں انگلی گھسا کر کچھ ٹٹولنا شروع کر دیا۔ اب تک اس نے جو کچھ بتایا تھا، وہ حیران کن تھا۔ اب معلوم نہیں وہ کیا افشا کرنا چاہ رہا تھا۔

چند سیکنڈ بعد اس نے قمیص کے نیچے سے ہاتھ نکالا تو اس میں کاغذ کی ایک بتی سی نظر آئی۔ اس نے بتی کو احتیاط سے کھولا۔ یہ کاپی سائز کا ایک صفحہ تھا۔

''یہ کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ مجھے اسی کوٹھری سے ملا تھا جہاں عالمگیر نے مجھے سخت سردی میں تین چار دن بھوکا پیاسا بند رکھا تھا۔ دراصل جب میں نے وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی تھی، ان لوگوں نے مجھے بری طرح مارا تھا۔ مارنے والوں میں عالمگیر کا منشی محمد افضل بھی شامل تھا۔ یہ کاغذ دو تین کرنسی نوٹوں کے ساتھ اسی کی قمیص کی جیب سے گرا تھا۔ میں نے بعد میں اٹھالیا۔''

میں نے صفحے کو لالٹین کی طرف کر کے غور سے دیکھا اور تعجب ہوا۔ میری اردو بہت اچھی تو نہیں تھی لیکن میں اردو تحریر آسانی سے پڑھ لکھ سکتا تھا جو کاغذ میرے سامنے تھا اس پر نیلی سیاہی سے جو کچھ لکھا ہوا تھا وہ اردو میں ہی نظر آتا تھا مگر اس کا ایک لفظ بھی میرے پلے نہیں پڑ رہا تھا۔ مجھے لگا کہ رسم الخط اردو ہے لیکن زبان شاید کوئی اور ہے۔

''کیا ہے یہ؟'' میں نے رحیم سے پوچھا۔

''تم بتاؤ کیا ہے۔ مجھے تو اب تک سمجھ نہیں آئی لیکن یہ میں تمہیں بتا دوں کہ یہ کوئی مذاق نہیں ہے، کوئی بہت اہم بات لکھی ہوئی ہے اس میں۔''

میں نے دھیان سے پڑھا۔ اس تحریر یا خط کا پہلا فقرہ القاب کی طرح لکھا ہوا تھا اور کافی نمایاں تھا۔ یہ فقرہ حرف بہ حرف اس طرح تھا۔

''رٹسام بحاص پاحب ٹیل وہ۔ روب جم وہ رک طح انھل اڑپ''

یہ کیا الفاظ تھے۔ میں نے تین چار بار دہرایا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ باقی کا خط بھی اسی طرح تھا۔ کہیں کوئی ایک لفظ بھی پلے نہیں پڑ رہا تھا، پتا نہیں کون سی جناتی زبان تھی، یا پھر کسی نے مذاق میں ایسا کر دیا تھا۔

میں نے رحیم سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''تم کہہ رہے ہو کہ یہ مذاق نہیں ہے، کوئی بہت اہم بات لکھی ہوئی ہے اس میں، یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟''

رحیم نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''جب یہ کاغذ مجھے کوٹھڑی کے فرش پر پڑا ہوا ملا تو اس کے ساتھ دس دس روپے والے تین نوٹ بھی تھے۔ میں نے کاغذ اور نوٹ بے پروائی سے اپنے بچھونے کے نیچے رکھ دیئے مگر اگلے روز کوٹھری کے اردگرد سے جو آوازیں سنائی دیں، ان سے مجھے پتا چلا کہ منشی افضل اور دیگر لوگ بڑی پریشانی کے عالم میں اس لکھے ہوئے کاغذ کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ منشی افضل نے ایک صفائی کرنے والی عورت کو باقاعدہ تھپڑ بھی مارا کہ اگر

اسے کوئی کاغذ دکھائی دیا تھا تو اس نے اٹھایا کیوں نہیں۔ عمر رسیدہ عورت دہائی دے رہی تھی کہ اس نے ایسا کوئی کاغذ نہیں دیکھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ اسی کاغذ کا ذکر ہو رہا ہے جس پر عجیب و غریب الفاظ لکھے ہوئے ہیں۔ تلاش کرنے والے میری کوٹھڑی میں بھی آئے۔ مجھ سے لکھے ہوئے کاغذ کے بارے میں پوچھا۔ میں نے لاعلمی ظاہر کی۔ انہوں نے کوٹھری میں موجود سب چیزوں کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا لیکن اس وقت تک میں یہ کاغذ نوٹوں سمیت اپنے نیفے میں چھپا چکا تھا۔"

میں نے ایک بار پھر تحریر کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "تمہارا کیا خیال ہے، اس کاغذ پر یہ کیا لکھا ہے؟"

"میرا دل یہ گواہی دیتا ہے کہ یہ جو کچھ بھی ہے بہت خاص ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا تعلق ان باتوں سے ہو جو میں نے مولوی جی کی بیٹی کے بارے میں سنی تھیں۔ یہ لوگ کسی لمبے چکر میں لگتے ہیں۔ یوں تو آج کل ٹیلی فون کا دور ہے لیکن دور دراز علاقے جہاں سگنل نہیں پہنچتے وہاں اب بھی خط و کتابت سے کام چلایا جاتا ہے۔ کچھ پرانے لوگ اب بھی خط کو ہی پیغام رسانی کا بہتر ذریعہ سمجھتے ہیں۔ لیکن سمجھنے والی بات یہ ہے کہ اگر یہ واقعی خط ہی ہے تو پھر کس زبان میں لکھا گیا ہے۔ عربی، فارسی وغیرہ کو تو ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں۔ یہ ہندی شندی بھی نہیں ہے۔"

میں نے ایک بار پھر دھیان سے پہلے چند الفاظ پڑھے۔ "رٹسام بحاص، پاتہب ٹیل وہ۔"

یہ کیا تھا...... رٹسام بحاص...... شاید کسی کا نام تھا اور اس سے کہا گیا تھا کہ پاتہب ٹیل وہ۔ ٹیل انگریزی کا لفظ لگتا تھا "وہ" اردو کا لفظ تھا لیکن باقی الفاظ کا کوئی سر پیر نہیں تھا۔

والد صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ انگریزوں کے دور حکومت میں برصغیر کے مقامی لوگ خط و کتابت کے لیے خفیہ زبانیں بھی استعمال کیا کرتے تھے۔ کیا یہ بھی کوئی ایسی ہی خفیہ یا اشاراتی زبان تھی۔ شاید یہ خط عالمگیر کے منشی افضل نے ہی اپنے جاننے والے کسی دیہاتی یار دوست یا بھائی بند کو لکھا ہو یا پھر یہ خط اسے کہیں سے آیا ہو اور اس نے جیب میں رکھ لیا ہو، جہاں سے رحیم کی مار کٹائی کے دوران میں یہ گر گیا ہو۔

رحیم نے کہا۔ "یہ کاغذ تم اپنے پاس سنبھال لو۔ ہو سکتا ہے کہ اس سے ہمیں کوئی بہت کام کی بات معلوم ہو جائے۔"

میں نے کاغذ اپنی اندرونی جیب میں رکھ لیا، یہ سب کچھ بڑا عجیب لگ رہا تھا، جیسے کسی

تفتیشی کہانی کا حصہ ہو، اس معاملے میں سب سے اہم بات وہی تھی جس کا ذکر میں پہلے بھی کر چکا ہوں، زینب میں آخر ایسی کیا بات تھی جس کی وجہ سے کوئی طلب گار اسے ایک کروڑ سے زائد رقم دے کر خرید رہا تھا۔ وہ ایک عام سی لڑکی تھی اور بیمار بھی تھی۔ کہیں اس کی بیماری ہی تو اس کے خاص ہونے کی وجہ نہیں تھی؟ یہ بات اب تقریباً ثابت ہو چکی تھی کہ زینب کے جسم میں ایک ایسا زہر موجود ہے جو سانپوں سے حاصل کیا گیا ہے۔ یہ زہر بڑے طریقے سے اسے دیا گیا ہے۔ پہلے بے حد معمولی مقدار میں اس کے خون میں شامل کیا گیا پھر بتدریج اس کی مقدار بڑھائی گئی ہے، یہاں تک کہ وہ پوری طرح اس زہر خورانی کی عادی ہو گئی ہے۔ اب اس کا علاج کرنے کی کوششیں ہو رہی تھیں، زہر اس کے جسم کی ضرورت بن چکا تھا۔ وہ اس سے محروم ہو کر تڑپتی تھی اور اس کا دم، جیسے آنکھوں میں آ جاتا تھا۔ کیا زینب کو کسی خاص مقصد کے لیے زہر کا عادی بنایا گیا تھا۔ اب چونکہ وہ عادی ہو گئی تھی اور اس کے جسم میں زہر موجود تھا اس لیے اس کی ایک خاص قدر و قیمت ہو گئی تھی، میرے لیے سنگین بات یہ بھی تھی کہ تاجور کے نام کو بھی زینب کے ساتھ نتھی کیا جا رہا تھا۔ تاجور کو دو سال میں ''تیار کرنے والی بات'' بھی ایک معما تھی۔

کہیں تاجور بھی تو اسی ''زہریلے چکر'' میں پھنسنے والی نہیں تھی؟ اس صورتِ حال کو اس ناقابلِ فہم تحریر نے کچھ اور پیچیدہ بنا دیا تھا۔ شاید رحیم کی یہ بات درست ہی تھی کہ اس تحریر کا تعلق، زینب والے معاملے سے ہے۔

○......❖......○

اگلے روز میں نے اپنے کندھے کی چوٹ کے بہانے پھر پہلوان حشمت سے ملاقات کی۔ پہلوان حشمت بہت اردو داں بنتا تھا۔ شاعری تو فنِ حرب کی طرح اس کے ''گھر کی لونڈی'' تھی۔ پہلوان حشمت سے ملاقات ہمیشہ دلچسپ ہی ثابت ہوتی تھی۔ اس دفعہ بھی یہ دلچسپی برقرار رہی۔ میں پہلوان کی کوٹھری میں پہنچا تو وہاں اس کی مریضہ نگینہ پہلے سے موجود تھی۔ میرے اندازے کے عین مطابق نگینہ ایک طوائف تھی۔ دراصل سجاول نے اپنے بڑے بھائی کی عیاشی کے لیے کچھ اصول ضابطے بنا رکھے تھے۔ ان میں سب سے اہم اصول یہ تھا کہ وہ حتی الامکان کسی شریف زادی کو خراب کرنے سے باز رہے گا، خاص طور سے اگر وہ شریف زادی بیاہتا بھی ہو۔ اپنے بھائی کی بھوک کو پورا کرنے کے لیے سجاول پیشہ ور عورتوں کا انتظام کرتا رہتا تھا۔ یہ نگینہ بھی ایک ایسی ہی جواں سال عورت تھی۔ شرابی ''اعظم'' نے مشتعل ہو کر اس سے مار پیٹ کی تھی اور اس کا بازو کہنی کے قریب سے ٹوٹ گیا تھا۔ اب وہ پہلوان

حشمت کے پاس بیٹھی ہائے ہائے کر رہی تھی اور پٹی بندھوا رہی تھی۔ اس کے جانے کے بعد حشمت نے مجھے بتایا۔ ''اس کی ہڈی غلط جڑ گئی ہے، اس لیے باز و ٹھیک سے ہلتا ناہیں۔ اب میں نے ہڈی پکی کرنے کے لیے اس پر چھان بورے اور گڑ کا لیپ کر دیا ہے۔ دو تین دن تک ہڈی پکی ہو جاوے گی اور میں اس کو ٹھیک جگہ پر بٹھا دوں گا۔''

میں نے کہا۔ ''پہلوان جی! آپ کے ہاتھ میں اللہ نے شفا دی ہے۔ ایک دنیا آپ کو مانتی ہے۔ آپ ماشاء اللہ پہلوان بھی ہیں یعنی ہڈی جوڑنے کے ساتھ ساتھ توڑنے کا کام بھی کر سکتے ہیں۔ پھر آپ شاعری بھی کرتے ہیں۔ یہ اتنے سارے کام آپ ایک ساتھ کیسے کر لیتے ہیں؟ جبکہ یہ کام ایک دوسرے سے کافی مختلف بھی ہیں۔''

شعر جوڑنا بھی ہڈی جوڑنے جیسا کام ہی ہووت ہے بھیا۔ ہڈی جوڑنے میں بھی ردیف قافیے کا دھیان رکھنا پڑت ہے۔ جس طرح مصرعے میں بحر کو صحیح بٹھانا ہووت ہے، اسی طرح ہڈی کے ٹکڑوں کو بھی ہڈی کے مطابق ٹھیک بٹھانا ہووت ہے۔''

''زبردست۔'' میں نے کہا۔

''شاید تم میری تعریف کرنا چاہ رہے ہو لیکن میں سچی سچی کہوں تو مجھے تمہاری کوئی بات اچھی ناہیں لگ رہی۔ تم نے جس طرح گونگا بن کر چاند گڑھی میں ہم سب کو اُلو بنایا ہے، وہ مجھ کو کسی طرح ہضم ناہی ہووت ہے۔''

''میں اس کی وجہ آپ کو بتا چکا ہوں اور اس کے لیے آپ سے معافی بھی مانگ چکا ہوں۔ یہاں سے بچ بچا کر نکل گیا تو میں پورے چاند گڑھی سے بھی معافی مانگ لوں گا۔''

''لیکن تاجور اور اس کے گھر والوں کے لیے تو اب چاند گڑھی میں رہنا ناممکن ہو جاوے گا۔ میں دین محمد صاحب کو اچھی طرح جانت ہوں، وہ یہ سب کچھ برداشت ناہیں کر پائیں گے۔ اب یہاں بھی لوگ کئی طرح کی باتیں بنا رہے ہیں، کچھ کہہ رہے ہیں کہ تم تاجور سے نکاح کر چکے ہو، اور کچھ کو اس میں شک ہے......''

میں نے پہلوان کو بڑی عرق ریزی سے سمجھایا کہ کچھ باتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں، میں فی الحال اسے کچھ نہیں بتا سکتا لیکن وقت آنے پر کچھ بھی چھپاؤں گا نہیں۔ میں نے اس کے سر کی قسم کھائی جو اسے اچھی لگی۔

پہلوان ذرا نارمل ہوا تو میں نے ایک بار پھر اس کے ہنر کی تعریف کی اور اسے یقین دلایا کہ وہ اپنی مثال آپ ہے، میں نے کہا۔ ''پہلوان جی! یقین کریں میں اکثر سوچتا رہتا ہوں کہ آپ جیسا ہمہ صفت شخص چاند گڑھی جیسے دور دراز گاؤں کے بجائے لاہور یا کراچی

جیسے شہر میں ہوتا تو دن رات روپیہ کماتا۔ دن کو ہڈیاں جوڑ کر اور رات کو شعر و شاعری کر کے۔ آپ کی شاعری میں اتنی گہرائی ہے کہ...... کہ...... اگر تھوڑی سی گہرائی اور ہوتی تو آپ نے قدرتی گیس نکال لینی تھی۔''

''کیا مطلب؟'' پہلوان نے ذرا چونک کر کہا۔

''میں مثال دے رہا ہوں، شاید میں مناسب الفاظ استعمال نہیں کر سکا...... قدرتی گیس بھی تو ایک نہایت قیمتی اور انمول چیز ہے۔ یقین کریں، میں تہ دل سے کہہ رہا ہوں، آپ لاہور میں ہوتے نا تو آپ پر شہرت اور روپے کی بارش ہو جاتی۔''

پہلوان قدرے مطمئن ہوا، ورنہ وہ قدرتی گیس والی بات کو لے کر بیٹھ جاتا تو گھنٹوں بحث چل سکتی تھی۔ اس نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''بھیا! کوئی فن بھی محنت اور ریاضت کے بغیر حاصل ناہیں ہونت۔ وہ محاورہ تو تم نے سنا ہی ہووے گا جتنا گڑ ڈالو گے اتنا ہی رادھا ناچے گی۔''

''بالکل...... بالکل۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا اور محاورے کی ''آبروریزی'' کو بمشکل برداشت کیا۔ پہلوان نے فلسفیانہ انداز جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''فن کے اندر اترنا پڑت ہے، غور کرنا پڑت ہے۔ تب کہیں جا کر اونچ نیچ کا پتا چلت ہے۔ اب دیکھو یہی شعر دیکھو، میں نے کل سے اسے کوئی چالیس مرتبہ پڑھا ہے، تب اس کا اصل مفہوم واضح ہوا ہے۔''

پہلوان نے چٹائی کے نیچے سے ایک اخباری کاغذ نکالا۔ اس کاغذ پر غالباً روٹی وغیرہ رکھ کر یہاں لائی گئی تھی۔ کسی اخبار کا سنڈے ایڈیشن تھا۔ تھوڑی سی شاعری بھی اس پر موجود تھی۔ پہلوان نے ایک شعر پر انگلی رکھی۔ ''پڑھو اسے'' مجھے حکم ملا۔

میں نے پڑھا۔

ایک زمانہ گزرا ہے دید کی چاہت میں
جانم تم کو دیکھا تو دم میں دم آیا

پہلوان نے فوراً غلطی نکالی۔ فرمایا۔ ''تم نے وہی غلطی کی جس کی مجھے امید تھی۔ یہ دم میں دم آیا نہیں۔ یہ ہے دُم میں دم آیا۔ یعنی شاعر کہوت ہے کہ اپنے محبوب کو دیکھ کر میں مرنے والا ہو گیا۔ میرا دم بالکل دُم میں آ گیا۔ یہ حسن کی بے پناہ تجلی اور عاشق نگاہوں کی بے بسی کا ماجرا بیان کیا گیا ہے اور کتنی خوب صورتی سے کیا گیا ہے۔''

میں نے ہنسی کو بمشکل ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ''مگر پہلوان جی، یہ دُم میں دم آنے والی

بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔ انسان کی تو دُم نہیں ہوتی اور شاعر بھی غالباً انسان ہی ہے۔''

''بھیا! تم ان باتوں کو ناہیں سمجھو گے۔ اس کو ''شعری رعایت'' کہوت ہیں۔ بڑے بڑے شاعروں نے اس طرح کے شعر کہے ہیں۔ اپنے مرزا غالب کا شعر تو تم نے سنا ہی ہووے گا۔ ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دُم نکلے...... بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے۔ اب سوچو اگر غالب جیسے عظیم اور بے مثال شاعر کی دُم نکل سکتی ہے تو ایک عام شاعر کا دم اس کی دُم میں کیوں ناہیں آ سکتا؟''

میں ماضی قریب میں انیق کے ساتھ پہلوان حشمت کی لمبی لمبی بحثیں سن چکا تھا اس لیے تکرار فضول تھی۔ میں نے تجربے کے لیے، اپنی اندرونی جیب میں سے وہ تحریر نکالی جو کل رات عبدالرحیم کے ذریعے مجھ تک پہنچی تھی۔ مسلح پہریدار کافی دوری پر تھا۔ وہ دیکھ نہیں سکتا تھا کہ ہماری سرگرمی کیا ہے۔ میں نے کاغذ پہلوان حشمت راہی کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

''آپ علم و فضل کے اعلیٰ درجے پر ہیں، مجھ ناچیز کی سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا، کچھ آپ ہی بتائیں، یہ کیا تحریر ہے اور کس زبان میں ہے؟''

پہلوان نے کاغذ کو غور سے دیکھا۔ اپنا کدو جیسا سر تعجب میں ہلایا اور اٹک اٹک کر پہلا فقرہ پڑھا۔ ''رٹسام بحاص۔ پاتہب ٹیل وہ...... اس کا کیا مطلب ہے؟'' انہوں نے سر کھجا کر مجھ سے ہی دریافت کیا۔

''اگر مجھے پتا ہوتا تو آپ سے کیوں پوچھتا؟ اس پوری تحریر میں سے ایک لفظ بھی ٹھیک طرح میرے پلے نہیں پڑ سکا۔''

''یہ کہاں سے ملا ہے تمہیں؟''

''بس سمجھیں کہ عالمگیر کے ایک خاص بندے کی جیب سے گرا تھا اور ایک بندے کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ اس نے مجھ تک پہنچا دیا ہے۔''

''مجھے تو یہ مذاق لگت ہے۔''

''لیکن یہ مذاق ہے نہیں۔ عالمگیر اور اس کے چمچے اس کاغذ کی تلاش میں کافی پریشان رہے ہیں۔ چلیں میں آپ کو ساری بات بتا ہی دیتا ہوں لیکن اسے آپ نے اپنے تک ہی رکھنا ہے...... آپ کو وہ مؤذن یاد ہے نا جس پر مولوی فدا صاحب کو دھکا دے کر مارنے کا الزام تھا؟''

''ہاں، ہاں۔ اسے ہم لوگ کیسے بھول سکت ہیں۔'' پہلوان بری طرح چونک گیا۔ میں نے مختصر الفاظ میں اسے بتا دیا کہ وہ مؤذن لڑکا یہاں سجاول سیالکوٹی کے ٹھکانے پر موجود ہے

اور بری حالت میں ہے۔ وہ اپنے کیے پر از حد پریشان ہے اور اپنے کیے کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہے۔ مؤذن عبدالرحیم کی پوری رُوداد سننے کے بعد پہلوان بھی ششدر رہ گیا۔ اس تحریر میں اس کی دلچسپی مزید بڑھ گئی۔ وہ بڑے دھیان سے لفظوں کے جوڑ توڑ پر غور کرنے لگا۔ پہلے اس نے اس زبان کو سنسکرت قرار دیا، پھر سندھی کی کوئی بگڑی ہوئی شکل بتایا۔ آخر میں خود ہی اپنی ان دونوں آرا کو رد کر دیا اور اس تحریر کے ڈانڈے تامل ناڈو سے ملانے شروع کر دیئے۔ پہلوان کا یہ خیال بھی تھا کہ رتسام دراصل بہار کے ایک راجا کا نام تھا اور پہلوان کی طرح وہ بھی نہ صرف میواتی تھا، بلکہ گتکے یعنی لٹھ بازی اور کشتی میں بھی زبردست مہارت رکھتا تھا۔ اس کے بعد پہلوان نے اپنی گفتگو کا رخ اپنے فنِ حرب کی طرف موڑ دیا اور بتایا کہ ہڈیاں جوڑنے کے فن سے پہلے اس نے کس طرح ہڈیاں توڑنے کا فن سیکھا اور اس کے اس فن سے کون کون سے لوگ کس کس طرح متاثر ہوئے۔

پہلوان سے بمشکل اپنا پلا چھڑا کر میں واپس تاجور کے پاس پہنچا۔ تاجور نے بتایا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ماؤ کی پوتی مانی مجھے ڈھونڈتے ہوئے یہاں آئی تھی، خوب بنی ٹھنی ہوئی تھی، جیسے کسی شادی پر جانے کے لیے تیار ہو۔ تاجور کے لہجے میں جو کاٹ سی تھی، اس نے مجھے مزہ دیا۔ مانی کے ذکر پر وہ جز بز ہو جاتی تھی۔ اس کی یہ کیفیت بتاتی تھی کہ میں اس کے لیے اہمیت رکھتا ہوں اور وہ میرے بارے میں سوچتی ہے۔ خاص طور سے مانی جیسی لڑکی کا میرے اردگرد رہنا اسے پسند نہیں۔

”وہ کیا کرنے آئی تھی؟“ تاجور نے خفگی لہجے میں پوچھا۔

”کوئی خاص نہیں بھئی، دراصل اسے میرے کندھے کی چوٹ کی بڑی فکر ہے۔ کہہ رہی تھی کہ اس کی دادی نے کشمیری جڑی بوٹیوں سے ایک بڑا خاص تیل بنوایا ہوا ہے۔ وہ مجھے اس تیل کی مالش کرنا چاہتی ہے دھوپ میں بٹھا کر...... لیکن اس کا یہ آئیڈیا مجھے کچھ زیادہ پسند نہیں آیا۔“

”کیوں؟“

”بھئی، ایسی زبردست لڑکی سے مالش ہی کروانی ہے تو پھر دھوپ میں بیٹھ کر کیوں کروائی جائے۔ بند کمرے میں ہونی چاہیے ایسی مالش تو۔“ میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

”تو کروالیں نا بند کمرے میں، رکاوٹ کیا ہے؟“

”کتنی عجیب بات ہے۔“ رکاوٹ“ خود ہی پوچھ رہی ہے کہ رکاوٹ کیا ہے۔ میں یہ کیسے برداشت کر سکتا ہوں کہ تمہارے ہوتے ہوئے کوئی اور لڑکی میرے جسم کو چھوئے؟“

"کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ ایسی بات آپ پہلے بھی بہت سی لڑکیوں سے کہہ چکے ہوں گے۔" اس نے میری آنکھوں میں دیکھ کر عجیب سے لہجے میں کہا اور اپنا سر دوپٹے سے ڈھانپ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ مصلے پر کھڑی مغرب کی نماز پڑھ رہی تھی۔

پتا نہیں کیوں، اس کے آخری جملے نے دل پر عجیب سی چوٹ لگائی تھی، یوں تو اس نے یہ جملہ بہت سنجیدگی سے نہیں کہا تھا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ہلکے پھلکے انداز میں کہا تھا لیکن میرے دل و دماغ نے اسے ہلکے پھلکے انداز میں نہیں لیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کی وجہ تھی۔ مجھے اپنے ماضی کا پورا علم تھا۔ مجھ سے بڑھ کر اور کون جان سکتا تھا کہ میں نے اپنے پچھلے چھ سات سال کس طرح گزارے ہیں۔ بے شمار لڑکیاں میری گناہ گار زندگی میں آئی تھیں اور ان میں سے بہت سی ایسی بھی تھیں جن سے میرا جسمانی تعلق رہا تھا۔ میں نے دنیا کے خطرناک ترین جوا خانوں میں جوا کھیلا تھا، شراب پی تھی، بیدردی سے قتل کیے تھے، لوگوں کے ہاتھ پاؤں توڑے تھے، انہیں اغوا کیا تھا اور ان کے بدلے اپنے جرائم پیشہ دوست چھڑائے تھے۔ جرائم کی کتاب سے ایسا کون سا ورق تھا جو میری زندگی کی کتاب کا ورق نہیں تھا...... اور میرے سامنے دوپٹے کے ہالے میں اپنا چہرہ لپیٹے نماز پڑھتی ہوئی یہ سیدھی سادی دیہاتی دوشیزہ مذاق مذاق میں یہ کہہ رہی تھی کہ شاید کچھ دوسری لڑکیوں سے بھی میرا ہنسی مذاق رہا ہے۔

میں نے التحیات میں بیٹھی ہوئی دلکش تاجور کا معصوم چہرہ بڑے دھیان سے دیکھا اور میرے اندر سے آواز آئی...... شاہ زیب، یہ فرشتہ سیرت لڑکی کسی اور دنیا کی باسی ہے، تم کسی اور دنیا کے رہنے والے ہو۔ بہت سی قاتل نگاہیں تمہارا پیچھا کر رہی ہیں، ڈنمارک کی پولیس ہتھکڑیاں لیے تمہیں ڈھونڈ رہی ہے۔ تمہارا مقدر بجلی والی کرسی ہے، زہر کا انجکشن ہے یا پھر کسی اندھیری رات میں کسی سنسان گلی میں پگھلا ہوا سیسہ تمہارا نصیب بنے گا۔ تم کیوں اس معصوم لڑکی کی پاک صاف زندگی میں گھس کر اسے زہرناک بنا دینا چاہتے ہو، ٹھیک ہے تم نے ساڑھے تین برس تک اسے ڈھونڈا...... تمہارے دل میں اسے دیکھنے کی تڑپ تھی، تم نے اسے دیکھ لیا...... اس سے مل لیا۔ اس کے ساتھ کچھ وقت گزار لیا۔ اب اسے اس کے حال پر چھوڑ کر اس سے کہیں دور چلے جاؤ۔

فوراً ہی دل کے اندر سے ہی جواب آیا...... اب دور جانا اتنا آسان نہیں۔ کم از کم ابھی تو اتنا آسان نہیں ہے۔ وہ جن حالات میں پھنسی ہوئی ہے اور جن نئے حالات میں تم نے اسے خود پھنسایا ہے، ان میں سے نکالے بغیر تم اسے کیسے چھوڑ سکتے ہو؟

تاجور نے سلام پھیر کر میری طرف دیکھا، مجھے گم صم پا کر بولی۔ "کیا ہوا؟"

''کچھ نہیں۔''

وہ بولی۔''سوری، جس طرح آپ مذاق میں بات کرتے ہیں، میں نے بھی مذاق میں کہہ دی۔''

میں اپنے تاثرات چھپانے کے لیے اٹھ کر باہر آ گیا۔

رات کو میں نے ایک بار پھر رحیم سے ملاقات کی۔ میں اسی تحریر کے بارے میں اس سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ جس طرح پچھلے 24 گھنٹے میں اس کاغذ پر لکھے ہوئے بے معنی الفاظ میرے دل و دماغ میں ہلچل مچاتے رہے ہیں یقیناً رحیم کے دماغ میں بھی پیوست رہے ہوں گے بلکہ وہ تو پچھلے کئی دن سے اس پر مغز ماری کر رہا تھا۔

میں نے حسبِ سابق احتیاط سے تہ خانے کی شکستہ سیڑھیاں طے کیں اور تاجور کی مڑی تڑی ہیئر پنوں سے اندرونی دروازے کا لاک کھول کر رحیم والے کمرے کے سامنے چلا گیا۔ یہاں لوہے کے بولٹ نے دروازہ باہر سے بند کر رکھا تھا۔ میں نے بہ آسانی بولٹ ہٹایا اور اندر چلا گیا۔ آج رحیم نے نئے کپڑے پہن رکھے تھے یہ جین کی پتلون اور ہاتھ کی بنی ہوئی موٹی جرسی تھی۔

وہ پتلون میں بیزار نظر آ رہا تھا۔ کہنے لگا۔''میں نے کبھی پتلون نہیں پہنی مگر شلوار قمیص بھی بہت گندی ہو چکی تھی اس لیے انہوں نے جو دیا پہن لیا۔''

''ان کپڑوں میں بھی ٹھیک لگ رہے ہو۔'' میں نے کہا۔

وہ واقعی بہتر لگ رہا تھا۔ اس کا جسم بھی کسرتی تھا۔ سینہ کشادہ اور بازو مضبوط تھے۔ اس کی عمر اٹھارہ بیس سال کے اندر تھی مگر اپنے قدم کاٹھ کی وجہ سے بڑا دکھائی دیتا تھا۔ ہم بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ آج اس کا موڈ بھی قدرے بہتر تھا۔ کمرے سے بریانی کی خوشبو آ رہی تھی۔ وہ اٹھ کر کمرے کے ایک کونے میں گیا اور ایک رومال کے نیچے ڈھانپی ہوئی پلیٹ لے آیا۔ اس میں حلوہ تھا۔ گاجر کے حلوے پر ابلے ہوئے انڈے کے قتلے اور بادام تھے۔ ہم دونوں نے مل کر کھایا۔ گاجر کا حلوہ اوپر تاجور اور میں نے بھی کھایا تھا۔ کچھ بھی تھا اس ڈکیت گینگ کا کھانا تو مزیدار ہی ہوتا تھا۔

''آج خوب مدارت ہوئی ہے تمہاری؟''

''لیکن خاطر مدارت کا فائدہ تو تب ہوتا ہے جب دل میں بھی خوشی ہو۔ میں تو اندر سے جل رہا ہوں۔ لگتا ہے کہ ایک بھانبھڑ سا رہتا ہے یہاں سینے میں، پتا نہیں وہ کون سا دن ہوگا جب میں یہاں سے نکلوں گا اور چاند گڑھی کے چوک میں کھڑے ہو کر اعلان کروں گا کہ

مولوی صاحب کی موت کیسے ہوئی اور اس موت کا ذمے دار کون کون ہے؟‘‘

’’گھبراؤ مت رحیم، سب کچھ ہوگا اور بہت جلد ہوگا۔‘‘

میں نے ایک بار پھر وہ کاغذ اپنی اندرونی جیب سے نکال لیا اور ہم دیئے کی روشنی میں اس کے الفاظ پر غور کرنے لگے۔ ہم نے ورق کو الٹ کر پڑھا۔ دائیں سے بائیں کے بجائے بائیں سے دائیں پڑھا۔ اوپر سے نیچے پڑھا کوئی تسلسل نہیں تھا۔ میں نے کہا۔ ’’رحیم، میں نے سنا ہوا ہے کہ ایسی تحریروں کی ایک چابی ہوتی ہے مطلب یہ کہ اگر کوئی ایک لفظ بھی سمجھ میں آجائے تو پھر پوری تحریر سمجھ میں آجاتی ہے۔‘‘

’’لیکن یہ چابی ڈھونڈے گا کون؟‘‘ رحیم نے زچ ہو کر کہا۔

’’ایک لڑکا تو ہے مگر وہ یہاں نہیں ہے۔ کاش وہ یہاں ہوتا یا ہم اس تک پہنچ سکتے۔‘‘

’’کون ہے؟‘‘

میں نے اس سے انیق کا ذکر کیا اور بتایا کہ وہ پنجابی، سندھی، بلوچی سمیت بہت سی غیر ملکی زبانیں بھی جانتا ہے۔ باکمال لڑکا ہے۔ دیکھنے میں بالکل عام اور پرکھنے میں خاص الخاص۔ اور واقعی ان لمحوں میں انیق مجھے شدت سے یاد آیا۔ ملنگی ڈیرے پر اس نے جس طرح قدم قدم پر میرا ساتھ دیا۔ اور اپنی جان شدید خطرے میں ڈال کر ریشمی کی آزادی کا راستہ ہموار کیا، وہ ناقابلِ فراموش تھا۔

رحیم نے محتاط نظروں سے بیرونی دروازے کی طرف دیکھا اور دھیمی آواز میں بولا۔ ’’شاہ زیب صاحب، میں یہاں بند ہوں لیکن آپ تو باہر گھومتے پھرتے ہیں۔ آپ نے سارا جائزہ لے رکھا ہوگا۔ کیا ہم کسی طرح یہاں سے نکل نہیں سکتے؟‘‘

میں نے بلند درختوں پر واقع ان چھوٹی چھوٹی مچانوں کا ذکر کیا، جنہوں نے چاروں طرف سے اس جگہ کو گھیر رکھا تھا اور جہاں چوبیس گھنٹے طاقتور رائفلوں اور ٹیلی اسکوپس والے گارڈز موجود رہتے تھے۔ باتیں کرتے کرتے اچانک میری نگاہ ایک دیوار پر پڑی۔ یہاں کچی پنسل سے کچھ لکھا ہوا تھا۔ میرے پوچھنے پر رحیم نے ذرا شرماتے ہوئے کہا کہ یہ اسی نے لکھا ہے۔ اس نے چند الٹے سیدھے شعر جوڑ رکھے تھے جن میں کسی کے قدموں کی خوب صورت آہٹ کا انتظار تھا۔ اس کے حسین چہرے کی دید کی آرزو تھی جو شبنم سے دھلے ہوئے پھول جیسا تھا اور جس کی پنکھڑیوں سے جنت کی ہوا کی مہک آتی تھی۔

میں نے کہا۔ ’’کوئی منگیتر ہے تمہاری؟ یا کسی کو پسند کرتے ہو؟‘‘

’’نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔‘‘ وہ ایک دم سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ’’ایسے ہی بے

خیالی میں لکھ ڈالا۔"

اس نے چادر کے پلو سے دیوار کو رگڑ کر جلدی سے الفاظ مٹانے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں وہ جزوی طور پر کامیاب ہوا۔ میں نے اسے کریدنے کی کوشش کی مگر جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ پیار محبت یا رومانس والا کوئی معاملہ نہیں ہے۔ بس یہ وہی احساس تھا جو لڑکپن کی عمر کا حصہ ہوتا ہے۔ ایسے ہی کسی کا انتظار، جس کو کبھی دیکھا ہی نہیں، اس کو دیکھنے کی خواہش۔ تصور میں تخلیق کیے ہوئے کسی چہرے کو چھونے کی آرزو۔

ہم ایک بار پھر کاغذ پر لکھے ہوئے نا قابلِ فہم الفاظ کی گتھی کو سلجھانے میں مصروف تھے۔ پہلا فقرہ ہی عجب گنجلک اور مضحکہ خیز تھا۔ رتسام، پاتہب ٹیل وہ۔ 'روب جم' وہ رک طغ انکھل اڑپ۔

رحیم نے چبا چبا کر یہ فقرہ پڑھا اور بولا۔ "پتا نہیں کیوں میرا دل گواہی دیتا ہے کہ یہ خط مولوی جی کی بیٹی زینب والے معاملے سے ہی تعلق رکھتا ہے۔ مجھے تو شک پڑتا ہے کہ یہ لوگ اسے اسپتال سے یا گھر سے اغوا کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں گے۔ وہ جتنی بڑی قیمت کی بات کر رہے تھے، اس کے لیے عالمگیر جیسا کمینہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔"

رحیم نے اپنی اس خواہش کا اظہار بھی کیا کہ میں کسی طرح اسے ایک ہتھیار فراہم کر دوں۔ وہ از خود یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنا چاہتا تھا۔ مجھے پتا تھا کہ یہ اس کی خام خیالی ہے۔ پچھلے چند دنوں میں، میں نے یہاں چلتے پھرتے جو کچھ نوٹ کیا تھا وہ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی تھا کہ سجاول سیالکوٹی کو جُل دے کر یہاں سے نکلنا ممکن نہیں۔ کوئی کسی طرح اس گھیرے سے نکل بھی جاتا تو اردگرد کے جنگل میں سجاول کے مسلح افراد موجود تھے۔

گیارہ بجے کے لگ بھگ میں دروازہ مقفل کر کے اور سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ تاجور جاگ رہی تھی۔ حسبِ معمول وہ بستر پر اور میں نیچے چٹائی پر تھا۔ ہم کچھ دیر باتیں کرتے رہے، پھر سونے کے لیے لیٹ گئے۔ میں غنودگی کی حالت میں تھا جب اچانک مجھے کسی گاڑی کی مدھم آواز سنائی دی۔ میرا چونکنا لازمی تھا۔ ابھی تک ہم نے یہاں گھوڑوں اور خچروں کی ٹاپیں ہی سنی تھیں، کوئی گاڑی دکھائی نہیں دی تھی۔ میں نے لالٹین کی لو اونچی کی اور اٹھ کر کھڑکی کے پاس گیا۔ کھڑکی کے پٹ تھوڑے سے کھولے۔ سرد ہوا کا جھونکا اندر آیا۔ اس کے ساتھ ہی آہنی گرل کی دوسری جانب برآمدے اور وسیع صحن کا منظر دکھائی دیا۔ اس کو صحن کے بجائے احاطہ ہی کہنا چاہیے۔ چاروں طرف بلند نکیلی چٹانیں سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ ان چٹانوں سے آگے چیڑ اور پڑتل وغیرہ کے بلند درخت تھے۔ یہ چاندنی

رات تھی ابھی دھند بھی نہیں تھی۔ مجھے فاصلے پر ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس نظر آئیں اور ساتھ ہی چار پانچ انسانی ہیولے دکھائی دیئے۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا یہ ایک پرانی لینڈ روور جیپ تھی اور عرصۂ دراز سے یہاں اس ڈیرے پر موجود تھی۔

غور سے دیکھنے پر مجھے اندازہ ہوا کہ کسی شخص کو زمین پر لٹایا گیا ہے بلکہ شاید باندھا گیا ہے اور وہ خود کو چھڑانے کے لیے تڑپ اور پھڑک رہا ہے۔ ساتھ ہی اس کی مدھم دور افتادہ آواز بھی کانوں میں پڑ رہی تھی۔ وہ چلّانے والی آواز میں کچھ کہہ رہا تھا مگر فاصلہ زیادہ ہونے کے سبب الفاظ سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔

پتا نہیں کہ یہ کون لوگ تھے اور کس کے ساتھ یہ بدسلوکی کر رہے تھے۔ بھاری بھرکم جیپ کا انجن پھنکار رہا تھا۔ اس کے اردگرد ٹارچیں حرکت کرتی نظر آتی تھیں۔ دور کہیں کسی کمرے کے اندر سے شرابی اعظم کی بہکی ہوئی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ کسی گیت کا ایک ہی مصرعہ بار بار دہراتا چلا جا رہا تھا۔ میں نے دیکھا، احاطے میں جس شخص کو باندھ کر زمین پر لٹایا گیا تھا، اس نے ایک بار زور سے حرکت کی اور بلند آواز میں کچھ کہا۔ وہ بہت اذیت میں دکھائی دیتا تھا۔ پھر میں نے ایک ایسا منظر دیکھا جس نے مجھے سرتاپا ہلا دیا۔ جیپ حرکت میں آئی اور بندھے ہوئے شخص کی طرف بڑھی۔ میرے اندازے کے مطابق جیپ کے بائیں جانب والے دونوں پہیے بدنصیب شخص کے سر کے اوپر سے گزر گئے۔ چلاتی ہوئی بلند آواز یکا یک دم توڑ گئی۔ جیپ ریورس ہو کر واپس آئی اور تب ایک بار پھر آگے بڑھی...... جیپ کا وزن بڑھانے کے لیے اس پر کچھ لادا بھی گیا تھا...... اس مرتبہ بھی وہ زمین پر لیٹے شخص کے سر کے اوپر سے گزری۔ یقیناً ایسا مزید تسلی کے لیے کیا گیا تھا، ورنہ یہ بات واضح تھی کہ وہ شخص پہلی مرتبہ جیپ کے نیچے آنے کے بعد ہی جاں بحق ہو چکا تھا۔

''کیا دیکھ رہے ہیں؟'' اچانک عقب سے تاجور کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

''کچھ نہیں، یونہی......'' میں گڑبڑا کر رہ گیا۔

''یہ گاڑی کی آواز کیسی ہے؟'' اس نے غنودہ لہجے میں پوچھا۔

''ان لوگوں کی ہی کوئی پرانی جیپ ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

تاجور وہیں بستر پر بیٹھی رہی اور الجھن آمیز انداز سے میری طرف دیکھتی رہی۔ اس دوران میں بدقسمت شخص کے بے حرکت جسم کو جیپ میں رکھ کر برآمدے کی طرف لایا گیا۔ برآمدے میں اسے جیپ سے اتار لیا گیا۔ کھٹارا جیپ کی ہیڈ لائٹس لاش پر پڑی اور میں جیسے سکتہ زدہ رہ گیا۔ چند سیکنڈ کے لیے لگا کہ دل دھڑکنا بھول گیا ہے۔ یہ رحیم کی لاش تھی۔ وہی

رحیم جو قریباً ڈیڑھ گھنٹا پہلے میرے ساتھ گاجر کا حلوہ کھا رہا تھا. ورکسی طرح یہاں سے نکل جانے کی باتیں کر رہا تھا۔ میں نے اسے اس کے لباس سے پہچانا۔ جین کی وہی نیلی پتلون جسے پہن کر وہ خود کو بے آرام محسوس کر رہا تھا اور براؤن جیکٹ جس پر سامنے کی طرف سیاہ پٹیاں تھیں۔

میرے جسم کا خون جیسے میرے سر کو چڑھنے لگا۔ میں پلٹ کر دروازے کی طرف گیا۔

''کہاں جا رہے ہیں؟'' تاجور نے کہا اور بستر سے چھلانگ لگا کر مجھے روکنے کی کوشش کی۔

میں اس کی کمزور گرفت سے رکنے والا نہیں تھا۔ میں برآمدے میں پہنچا اور پھر صحن میں آ گیا۔ مجھے جیپ کے پاس ہی سجاول سیالکوٹی کھڑا نظر آ گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے جیسے دھند سی چھا رہی تھی۔ میں نے ایک بار پھر جواں سال رحیم کی لاش کی طرف دیکھا۔ خدا کی پناہ......اس کے سر اور چہرے کا بھرتا بن چکا تھا۔ براؤن جیکٹ کا کالر اور کندھے اس کے خون سے سرخ ہو رہے تھے۔ اس کے دونوں ہاتھ اور پاؤں بڑی مضبوطی سے مختلف کپڑوں سے جکڑ دیئے گئے تھے۔

''تم نے کیا کیا سجاول؟'' میں سینے کی پوری قوت سے چلایا اور اس کی طرف بڑھا۔ اس سے پہلے کہ میں اپنے ہاتھ اس کے گریبان تک پہنچاتا یا کوئی اور حرکت کرتا، ایک شخص برق رفتاری سے مجھ پر جھپٹا اور دھکا دے کر مجھے پیچھے ہٹا دیا۔ میں اسے پہلی بار یہاں دیکھ رہا تھا۔ وہ چھریرے لیکن نہایت مضبوط جسم کا مالک نظر آتا تھا۔ اس کے دھکے نے مجھے دو تین قدم پیچھے ہٹا دیا۔ اس نے آگے بڑھ کر مجھے دوسری دفعہ دھکیلنے کی کوشش کی تو میرے دماغ میں چنگاریاں بکھر گئیں۔ میں نے اسے گھما کر دیوار سے دے مارا۔ ایک سیکنڈ میں جیسے تہلکہ سا مچ گیا۔ وہ شخص بے حد پھرتی سے مجھ پر جھپٹ پڑا۔ اس کے دو طوفانی مکے میں نے اپنی کلائیوں پر روکے پھر ٹانگ کی ضرب سے اسے پیچھے ہٹایا۔ ایک لحظے کے اندر ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ مدِمقابل کوئی معمولی شخص نہیں ہے۔ اگر میں نے اسے شروع میں تھوڑی سی بھی ڈھیل دے دی ہوتی تو وہ کوئی بہت کاری وار کر جاتا۔ اگلے تقریباً نصف منٹ تک ہمارے درمیان سخت مارا ماری ہوئی۔ سجاول کے کارندوں کی بلند آوازیں میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ وہ شاید میرے مدِمقابل کو روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اچانک اس نے اپنی غیر معمولی مہارت کا ایک اور ثبوت دیا۔ میری گردن کو اپنے بازو میں دبوچ لیا۔ عرف عام میں اس کو ''نیک لاک'' کہا جاتا ہے۔ یہ خطرناک داؤ بندے کو بے بس کر دیتا ہے۔ میں اس قسم کے پینترے ہزاروں دفعہ بھگت چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ میری گردن پر اس کی گرفت مکمل اور مضبوط ہوتی،

میں نے اس کی ناف میں گھٹنے کی بھرپور ضرب لگائی۔ اس کی گرفت ذرا نرم پڑی اور میں نے پاؤں کی ضرب سے اسے جیپ کے بونٹ پر پھینک دیا۔ اس نے ایک چنگھاڑ بلند کی اور برق کی طرح میری طرف آیا مگر راستے میں ہی سجاول نے اسے روک لیا۔

''ٹھہرو باقر۔'' سجاول کی گرج دار آواز ابھری...... اور وہ جس کا نام باقر تھا، اپنی جگہ اسی وقت رک گیا۔

اس کا چٹانی چہرہ تمتمایا ہوا تھا اور آنکھوں سے جیسے شعلے نکل رہے تھے۔ میں اپنے تجربے کی بنیاد پر کہہ سکتا تھا کہ وہ ایک اچھا ''لڑاکا'' ہے۔ اس نے بپھری ہوئی سانسوں کے ساتھ کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن سجاول نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ سجاول کی ساری کی ساری توجہ میری طرف تھی۔ وہ عجیب نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے آتشیں لہجے میں کہا۔ ''سجاول! یہ تم نے کیا کیا ہے، اس کی جان لے لی۔ کیا قصور تھا اس کا، کیوں اتنی بڑی سزا دی تم نے اسے؟''

سجاول نے رحیم کی بے چہرہ لاش کی طرف بے پروائی سے دیکھا اور بولا۔ ''تم اس کی بات کر رہے ہو؟''

''تو اور کون سی لاش ہے یہاں؟''

''یہ مجرم ہے ہمارا، بھاگنے کی کوشش میں تھا۔ گاڑی کے نیچے آ گیا ہے۔'' سجاول نے ایک بار پھر بے پروائی کا انداز اختیار کیا۔

''جھوٹ مت بولو۔ تم نے مارا ہے اسے۔ اس کی جان لی ہے۔ میں نے خود دیکھا ہے۔''

سجاول نے چند لمحے توقف کیا اور پھر اطمینان سے بولا۔ ''تو کیا ہوا؟ کون سی قیامت ٹوٹ پڑی ہے؟''

''سجاول! تم نے یہ اچھا نہیں کیا۔ تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو اس کا جواب دینا پڑے گا۔''

سجاول نے مضحکہ آمیز انداز میں اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں بھی میرے لیے تمسخر دکھائی دے رہا تھا۔ تب سجاول نے سگریٹ سلگایا اور دھواں میرے چہرے پر چھوڑ کر بولا۔ ''جواب شواب بھی دے لیں گے شاہ زیب صاحب، لیکن پہلے مجھے آپ سے ایک دو سوال کرنے ہیں، اکیلے میں۔''

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، سجاول بڑے سکون سے چلتا ہوا ایک اندرونی کمرے کی

طرف چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد اس کے دو ساتھیوں نے آٹومیٹک رائفلیں میری جانب سیدھی کر لی تھیں۔ باقر ایک طرف خاموش کھڑا تھا اور ابھی تک مجھے خونی نظروں سے گھور رہا تھا۔

"چلو بھئی سردار صاحب بلا رہے ہیں۔" ایک رائفل مین نے رائفل کو حرکت دیتے ہوئے کہا۔

ان لوگوں نے چند دن پہلے جنگل میں میری زبردست مزاحمت دیکھی تھی اس لیے میرے حوالے سے بڑے چوکس رہتے تھے۔ میری سب سے بڑی مجبوری تاجور تھی۔ ورنہ اپنی طرف اٹھی ہوئی ان رائفلوں کو چکما دینا اور رائفل برداروں سے ٹکرانا میرے لیے بہت زیادہ مشکل نہیں تھا۔ میں رائفل برداروں کے ساتھ اس کمرے کی طرف بڑھا جہاں ایک منٹ پہلے سجاول داخل ہوا تھا۔ تاجور اندر اپنے کمرے میں کھڑکی سے لگی کھڑی تھی اور مجھے بلا رہی تھی۔ میں اس کے پاس رکا۔ اسے تسلی دی اور کہا کہ وہ پریشان نہ ہو، میں سجاول سے بات کر کے دس منٹ میں واپس آ جاتا ہوں۔

ہم اندر پہنچے۔ گیس لیمپ کی روشنی میں سجاول رنگین پایوں والی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کا قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا تھا۔ جسم مضبوط، کندھے بھاری اور کمر پتلی تھی۔ وہ عام طور پر سیاہ یا براؤن شلوار قمیص پہنتا تھا، کندھے پر بھاری گرم چادر جھولتی رہتی تھی۔ اس وقت بھی وہ سیاہ شلوار قمیص میں تھا۔ اس نے اپنی تیکھی مونچھوں کو سہلایا اور مجھے اپنے سامنے چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ دونوں رائفل بردار تذبذب کے عالم میں کھڑے تھے۔ سجاول نے دونوں کو باہر بھیج دیا۔ وہ اب بھی مجھے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میری آنکھوں میں جھانک کر بھاری آواز میں بولا۔ "آج مجھے سچ سچ بتاؤ شاہی......کون ہو تم؟"

"میں نے تمہیں سب کچھ بتا دیا ہے۔" میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"اور بہت کچھ چھپا بھی لیا ہے۔" وہ ترنت بولا۔ "تم وہ نہیں ہو جو خود کو بتاتے ہو اور اس کا ایک ثبوت آج پھر میرے سامنے آیا ہے۔ تم نے ابھی باقر کو آڑے ہاتھوں لیا ہے۔"

"شکر کرو بس آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ اس کا کھوپڑا نہیں توڑ دیا۔"

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔ یہ لڑکا میرے بہترین "لڑنے والوں" میں سے ہے بلکہ بہترین ہے۔ اس نے جس طرح تمہاری گردن اپنے بازو میں لی تھی، یہ تمہارے لیے فل اسٹاپ تھا، لیکن تم نے اپنی گردن چھڑا لی۔ میں سمجھتا ہوں، یہ غور کرنے والی بات ہے۔"

میں خاموش رہا۔

وہ سگریٹ کا طویل کش لے کر بولا۔ ”مجھے لگتا ہے شاہی! تم نے لڑائی مار کٹائی باقاعدہ سیکھ رکھی ہے اور شاید باہر کے ملکوں میں...... پیشہ ور فائٹروں سے لڑتے بھی رہے ہو۔ ویسی ہی خونی کشتیاں جیسی ہم ٹی وی پر دیکھتے ہیں۔“

”مجھ نہیں پتا تم ایسی باتیں کیوں کر رہے ہو۔ میں جو کچھ ہوں تمہارے سامنے ہوں اور مجھے اس بات پر شدید دکھ ہے کہ تمہارے کارندوں نے بیدردی سے اس بے گناہ لڑکے کی جان لی ہے۔“

”تم تو اس طرح بات کر رہے ہو جیسے تمہارا کوئی گہرا رشتہ تھا اس سے۔“

”ہر انسان کا دوسرے انسان سے رشتہ ہوتا ہے۔ یہ جو کچھ میری آنکھوں کے سامنے ہوا ہے، میرے کلیجے کو چیر رہا ہے۔ اس نے کون سا اتنا بڑا جرم کر رکھا تھا کہ اس چھوٹی سی عمر میں تم نے اسے موت کی سزا دے دی؟“

”جن باتوں کا تمہیں پتا نہیں شاہی، وہ نہ ہی کرو تو اچھا ہے۔ فی الحال میں تم سے صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم...... اصل میں ہو کون۔ اور یہ لڑائی کی ٹریننگ کہاں سے لی ہے تم نے، کہیں فوج یا اسپیشل پولیس وغیرہ سے تو تعلق نہیں تمہارا؟“

”میری کسی بات پر تم نے یقین کیا ہے جواب کرو گے؟ اگر کوئی شک ہے تو اپنے طور پر تصدیق کرالو۔ میں نے جو کچھ تمہیں بتایا تھا، وہی سچ ہے۔“

”خیر تصدیق تو میں کروں گا اور اس کا میرا اپنا طریقہ ہے۔“ اس نے کہا۔ کچھ دیر سگریٹ کے روشن سرے کو گھورتا رہا تب میری طرف دیکھے بغیر بولا۔ ”میں تمہیں باقرے سے لڑانا چاہتا ہوں۔ ایک کے ساتھ ایک...... وہ کیا کہتے ہیں، ون ٹو ون۔“

”کیا جاننا چاہتے ہو؟“

”تم کتنے پانی میں ہو۔“ وہ گہرا کش لے کر بولا۔

”پانی کا پتا چل گیا، تو پھر کیا ہوگا؟ مجھے اپنا پارٹنر بنا لو گے؟“

”کیا پتا؟“

”تو پھر مجھے اپنی جگہ ہی کیوں نہیں دے دیتے۔ خود لڑ لو مجھ سے۔ فلموں میں تو ہم نے یہی دیکھا ہے۔ جو جیت جاتا ہے وہ سردار بن جاتا ہے۔“

”فلموں کے سردار اور اس سردار میں بہت فرق ہے شاہی جی۔“ سجاول نے سخت طنزیہ لہجے میں کہا۔ یہ بات کہتے ہوئے اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں عجیب سا غرور اور پُراسراریت ابھر آئی۔

رحیم کی لاش کی دید نے میرے سر میں انگارے سے بھر دیئے تھے۔ میں کچھ ایسی ہی کیفیت محسوس کر رہا تھا جو ''مراد پور'' میں اپنی چچی اور چچی زاد کی موت کے وقت ہوئی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ سارے اندیشے بالائے طاق رکھ کر سجاول پر جا پڑوں۔ اسے ماردوں یا خود مر جاؤں، لیکن میرے پاؤں میں تاجور کی بیڑی تھی۔ میں اس کے لیے چھوٹے سے چھوٹا خطرہ مول لینے کے لیے بھی تیار نہیں تھا۔ بس صبر کے گھونٹ بھر کر رہ گیا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' سجاول کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

''سچ پوچھتے ہو تو اس وقت تمہاری کوئی بات میرے پلے نہیں پڑ رہی۔ میرے دماغ میں صرف اس لڑکے کی لاش ہے۔''

سجاول نے کرسی سے ٹیک لگاتے ہوئے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ باہر رات کا گہرا سناٹا تھا۔ دھند کی وجہ سے اب چاندنی دھندلانا شروع ہوگئی تھی۔ سجاول کے کارندے جواں مرگ کی لاش کے ساتھ کچھ کر رہے تھے۔ شاید اسے خچر وغیرہ پر لاد رہے تھے۔ سگریٹ کا گہرا کش لے کر سجاول نے کہا۔ ''سمجھو کہ اس منڈے کو ہم نے نہیں کسی اور نے موت کی سزا دی ہے۔ میرے بندوں نے صرف جلاد والا کام کیا ہے اور کچھ نہیں۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''یہ لڑکا چاند گڑھی کے ایک زمیندار کا مجرم تھا۔ بہت بڑا دھوکا کیا تھا اس نے زمیندار کے ساتھ...... زمیندار اسے مارنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ بالکل پکا فیصلہ کر چکا تھا۔ لیکن اتفاقاً میرے کارندے فخرو نے اسے دیکھ لیا۔ فخرو کو اندازہ ہوا کہ یہ لڑکا ہمارے بہت کام آسکتا ہے۔ اس نے زمیندار سے لڑکے کو مانگ لیا اور یہاں لے آیا۔ یہاں اس نے کچھ دن اور جی لیا، کھا پی بھی لیا۔ اب یہ ہمارے کام آگیا ہے۔''

''کام آنے سے تمہارا کیا مطلب ہے؟'' میں نے جلتے لہجے میں پوچھا۔

وہ کچھ دیر سوچ میں رہا، پھر بولا۔ ''چلو تمہیں بتا ہی دیتے ہیں...... میرے جس لڑکے سے ابھی تمہاری جھڑپ ہوئی ہے۔ اس کا نام باقر ہے۔ تم نے باقرے کا قد کاٹھ اور جسم دیکھا ہوگا۔ وہ اس مرنے والے لڑکے کے بالکل مطابق ہے اور اس باقرے کے پیچھے آزاد کشمیر کی پولیس بڑے زور و شور سے پڑی ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ میری بات کچھ کچھ تمہاری سمجھ میں آرہی ہوگی۔''

میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ اور مجھ پر یہ حقیقت کھلی کہ پولیس سے باقر کی جان چھڑانے کے لیے رحیم کو مارا گیا ہے اور اس کا چہرہ مسخ کیا گیا ہے۔

سجاول نے اطمینان سے کہا۔ ''اس لڑکے نے مرتو ویسے بھی جانا تھا اب یہ ہمارے کچھ نہ کچھ کام آ گیا ہے۔ ہم اس کی لاش کو کسی ایسی جگہ پھینکیں گے جہاں یہ آوارہ جانوروں سے محفوظ رہے اور کل تک پولیس کی نظر میں بھی آ جائے۔ اس کے لباس میں کچھ ایسی چیزیں رکھ دی جائیں گی، جن سے اس کی شناخت باقر کے طور پر ہو گی۔'' سجاول نے اپنی بات ختم کی اور سکون سے دوسرا سگریٹ سلگانے میں مصروف ہو گیا۔

اب بات بالکل واضح ہو گئی تھی۔ سجاول چاندگڑھی کے جس زمیندار کی بات کر رہا تھا، وہ اس خبیث عالمگیر کے سوا اور کون ہو سکتا تھا...... پھر مجھے وہ زخم والی بات بھی یاد آئی۔ یہ زخم کچھ عرصہ قبل چاندگڑھی میں بدقسمت رحیم کی کمر پر لگایا گیا تھا۔ یہ زخم بھی یقیناً پولیس اور قانون کو دھوکا دینے کے لیے ہی تھا۔ غالب امکان تھا کہ سجاول کے کارندے باقر کے جسم پر بھی ایسا ہی کوئی زخم موجود تھا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ زخم پولیس والوں سے بچتے اور بھاگتے ہوئے ہی اس کے جسم پر آیا ہو۔

شاید سجاول سے میری یہ سنگین گفتگو کچھ دیر مزید جاری رہتی مگر اسی دوران میں چند مہمان اس سے ملنے آ گئے۔ یہ بڑے بڑے پگڑوں والے کرخت چہرہ افراد تھے۔ کئی ایک کی کمر سے بڑے بڑے چھرے بندھے ہوئے تھے۔ ان کے حلیوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ سرد رات میں کہیں دور سے سفر کر کے آئے ہیں۔

میں کمرے میں تاجور کے پاس واپس پہنچا۔ وہ سخت مضطرب دکھائی دیتی تھی۔ یقیناً اس نے بھی کچلی مسلی لاش دیکھ لی تھی۔ وہ بستر پر بیٹھی تھی اور لحاف کو اپنے گرد یوں لپیٹ رکھا تھا، جیسے وہ کوئی حفاظتی دیوار ہو، جس میں وہ خود کو چھپا رہی ہو۔ اس کی آنکھوں میں غصہ، دکھ اور خوف اس طرح گھل مل گئے تھے کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا ممکن نہیں تھا۔ پریشان لٹیں چہرے پر جھول رہی تھیں۔

وہ کراہتے ہوئے بولی۔ ''یہ سب کیا ہو رہا ہے شاہ زیب! آپ سب کچھ جانتے ہیں لیکن مجھ سے چھپا رہے ہیں۔ کیوں اندھیرے میں رکھ رہے ہیں مجھے؟ اگر ہمیں بھی اس لڑکے کی طرح مرنا ہی ہے تو پھر مجھے ابھی اپنے ہاتھوں سے مار دیں۔''

رحیم کی لاش کے اندوہناک منظر نے پہلے ہی میرے کاسۂ سر میں کھلبلی مچا رکھی تھی۔ تاجور کے اضطراب نے مجھے مزید دل گرفتہ کر دیا۔ میں نے کہا۔ ''تاجور! تمہیں پہلے بھی بتایا ہے، اس طرح رونے دھونے سے کچھ نہیں ہو گا۔ تمہیں ان حالات سے نکلنے کے لیے حوصلہ کرنا پڑے گا۔'' میرا لہجہ درشت تھا۔

تاجور نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ کہتے ہیں کہ جس نے کبھی کچھ نہ کہا ہو، وہ پھول بھی مارے تو پتھر کی طرح لگتا ہے۔ تاجور کے زرد چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ میں منہ پھیر کر واش روم کی طرف چلا گیا۔ میرا چہرہ جیسے آگ میں دہک رہا تھا۔ میں نے سردی کے باوجود ٹھنڈے پانی سے ہاتھ منہ دھویا، پھر بھی بے قراری کم نہیں ہوئی تو سر بھی دھو ڈالا۔ دہکتے ہوئے انگارے کچھ ماند پڑے۔ تولیے سے سر رگڑتا ہوا باہر نکلا تو تاجور سہمی ہوئی سی گم صم لیٹی تھی۔ لحاف کی لرزش سے پتا چل رہا تھا کہ رو رہی ہے۔

مجھے اپنے لہجے پر افسوس ہوا۔ لالٹین کی لو نیچی کر کے میں کافی دیر چٹائی پر کمبل اوڑھے لیٹا رہا۔ تاجور کی دبی دبی سسکی کسی وقت کانوں میں شدید جلن پیدا کر دیتی تھی۔ آخر میں اٹھا اور بستر پر جا بیٹھا۔

میں نے اس کے بالوں میں انگلیاں چلائیں۔ اسے سمجھایا، پچکارا۔ اپنے درشت لہجے پر معذرت طلب کی۔ وہ ایک دم پلٹ کر میرے گلے سے لگ گئی اور رونے لگی۔ میں نے اسے اپنی بانہوں میں لے لیا، اس کی آنکھوں سے بہنے والا گرم پانی میرے گریبان کو نم کر رہا تھا۔ اس نے اپنا چہرہ میرے سینے میں یوں گھسا رکھا تھا جیسے اسے ہمیشہ وہیں پر رکھنا چاہتی ہو۔ ہم بستر پر نیم دراز تھے۔ کچھ بول نہیں رہے تھے لیکن خاموشی ہی زبان بن گئی تھی۔

میں نے اس کے آنسو صاف کیے۔ جرأت کر کے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ اس نے ایک بار پھر اپنا سر میرے سینے پر ڈال دیا۔ ”کون تھا یہ، جس کو مارا ہے انہوں نے؟“ وہ بھیگی آواز میں بولی۔

”ان کا کوئی کارندہ تھا۔ لڑکا سا تھا۔ شاید کسی کو زخمی کر کے بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔“ میں نے بات بنائی۔

میں یہ بتا کر تاجور کے خوف میں اضافہ کرنا نہیں چاہتا تھا کہ یہ وہی مؤذن لڑکا رحیم ہے جس سے ملنے میں تہ خانے میں جاتا تھا۔

”کیا یہ ہم کو بھی کسی دن اسی طرح مار ڈالیں گے؟“

”یہ ہمارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے۔ تم مجھ پر بھروسا رکھو۔ میں نے ایسے بہت سے لوگوں سے نمٹا ہوا ہے۔ اللہ نے چاہا تو اب بھی سب اچھا ہوگا۔“

میں اس سے تسلی تشفی کی باتیں کرتا رہا، وہ میرے ساتھ لگی لگی، جیسے غنودگی میں چلی گئی اور پھر سو گئی۔

میری آنکھوں کے سامنے بار بار رحیم کا چہرہ آ جاتا تھا۔ اس کی آواز، اس کا نوخیز سراپا۔

وہ آج بڑے اچھے موڈ میں تھا۔ اس نے نہا دھو کر لباس بدلا تھا اور بہت دنوں بعد اچھا کھانا کھایا تھا۔ اسے کیا پتا تھا کہ یہ اچھا کھانا اسی طرح ہے جس طرح قربانی کے جانور کو قربانی سے پہلے کھلایا جاتا ہے۔ وہ بریانی، وہ گاجر کا حلوہ، اس کے آخری لقمے تھے، پھر اسے بیدردی سے مار دیا گیا تھا۔ مجھے وہ چلاتی ہوئی آوازیں یاد آئیں جو جیپ کے حرکت میں آنے سے قبل میرے کانوں تک پہنچی تھیں۔ مجھے پتا نہیں تھا، یہ کس کی آوازیں ہیں، نہ ہی الفاظ سمجھ میں آئے تھے لیکن اب میں جانتا تھا کہ وہ جواں مرگ رحیم کی پکار تھی، یقیناً اس وقت اس نے موت اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ لی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اس نے منت سماجت تو نہیں کی ہو گی۔ وہ طیش کے عالم میں ان پر دہاڑا ہو گا۔ ان کو بددعائیں دی ہوں گی اور صلواتیں سنائی ہوں گی۔ وہ ان سب کو مولوی فدا کا قاتل سمجھتا تھا اور مولوی فدا کے قتل کا پچھتاوا ہر وقت اس کی روح کو چھیدتا رہتا تھا۔

اس کے آخری الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے۔ اسی تہ خانے میں، دو دن پہلے اس نے مجھ سے کہا تھا...... لگتا ہے کہ یہ لوگ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے، اگر مجھے کچھ ہو گیا تو میرا ادھورا کام ضرور پورا کرنا۔ اگر خود سامنے نہ آنا چاہو تو کسی طریقے سے یہ اطلاع تھانے کچہری تک ضرور پہنچانا کہ مولوی جی کا قتل عالمگیر اور اسحاق نے میرے ذریعے کروایا ہے......

اس وقت میں نے رحیم کو تسلی دی تھی اور اسے کہا تھا کہ وہ خوامخواہ ایسے اندیشے اپنے ذہن میں نہ لائے، وہ یہاں سے نکلے گا اور خود یہ اطلاع پولیس تک پہنچائے گا۔

اس وقت مجھے ہرگز معلوم نہیں تھا کہ رحیم کے اندیشے اتنے ٹھوس ہیں اور موت اس کے اس قدر نزدیک ہے۔

اس کی مرنے کی عمر کہاں تھی۔ یہ تو وہ موسم ہوتا ہے جس میں بھرپور زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ اڑانیں بھری جاتی ہیں، منزلوں کو تلاشا جاتا ہے، جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھے جاتے ہیں۔ مجھے تہ خانے کی دیوار پر کچی پنسل سے لکھے ہوئے وہ شعر یاد آئے، جن مین کسی ایسے حسین معصوم چہرے کا ذکر تھا جس کو کبھی دیکھا نہیں گیا تھا، کسی ایسے خط کا انتظار جو پتا نہیں کہاں سے آنا تھا، کسی ایسی دستک کا تذکرہ تھا جو خبر نہیں کس نے دینا تھی اور کب؟

اب وہ حسین چہرہ، وہ خط، وہ دستک، سب جواں مرگ رحیم کے ساتھ ہی قبر میں اترنے والے تھے، نہ جانے کچھ ظالم لوگ، کچے ذہنوں اور نومیدہ پھولوں کو کیوں زہر آلود کر کے فنا کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ جو شیلے رحیم کی کہانی بھی تو یہیں سے شروع ہوئی تھی۔ اسے عقیدے اور مسلک کی بنیاد پر مولوی فدا کے خلاف اتنا بھڑکایا گیا تھا کہ وہ ان کی جان لینے پر

آمادہ ہو گیا۔ اگلے روز میری ملاقات عمر رسیدہ فیض محمد سے اس کے کمرے میں ہوئی۔ وہ مجھ پر بہت برہم نظر آتا تھا۔ اس نے چھوٹتے ہی کہا۔ ''تم شکل سے سمجھ دار لگتے ہو پر پتا نہیں کیوں بے وقوفی کر کے اپنے لیے مشکل بھی پیدا کر لیتے ہو۔ پہلے تم نے یہاں آتے ہوئے، راستے میں ہم پر کلاشنکوف چلانے کی کوشش کی، تمہاری زندگی شاید باقی تھی اس لیے یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی۔ پھر تمہارا جھوٹ پکڑا گیا کہ تم ہری پورہ سے نہیں چاندگڑھی سے آئے ہو اور تمہارے ساتھ آنے والی لڑکی کا نام شمسہ نہیں تاجور ہے اور وہ زمیندار دین محمد کی بیٹی ہے۔ تمہارے اس جھوٹ پر سردار تمہاری گردن کاٹ کر تمہارے جسم سے وکھری کر سکتا تھا مگر خوش قسمت ہو کہ ماؤ جی کی وجہ سے بچے رہے۔ اب رات کو پھر تم نے غلط حرکت کی۔ تمہیں کیا ضرورت تھی سردار سجاول کے گلے پڑنے کی؟''

''ضرورت تھی۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔ ''مجھ سے اس طرح کا ظلم برداشت نہیں ہوتا۔''

''اور اب جو ظلم تم پر ہوگا، وہ کیسے برداشت کرو گے۔ سردار نے تمہاری شہ زوری، کا کچومر نکالنے کے لیے تمہیں بھوکے بگھیاڑ (بھیڑیے) کے سامنے ڈالنے کا اعلان کیا ہے۔''

''کون بھوکا بگیاڑ؟''

''یہی باقرا۔ تم اسے کیا سمجھتے ہو۔ یہ خالی ہاتھوں سے دو منٹ کے اندر بندے کو لولا لنگڑا کر کے پھینک دیتا ہے۔ چودہ پندرہ قتل کیے ہوئے ہیں۔ اسے ایسے ہی بگیاڑ نہیں کہا جاتا۔''

''ایسے بگیاڑوں کے منہ میں ہاتھ ڈال کر مجھے ان کا کلیجا نکالنا اچھی طرح آتا ہے۔ لیکن مجھے تمہارے سردار سجاول کی بات کا مزہ نہیں آیا۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ چمچے کو میرے سامنے کیوں لاتا ہے۔ یہ میرے پائے کا بندہ نہیں ہے۔ کوئی بڑا بگیاڑ لے کر آئے یا پھر خود آجائے۔''

فیض نے آنکھیں پھاڑ کر میری طرف دیکھا۔ ''تت...... تم نے یہ بات سردار سجاول سے کہی تھی؟''

''بالکل کہی تھی۔''

فیض کچھ دیر تک گم صم میری طرف دیکھتا رہا، پھر اس نے اپنا ماتھا پکڑ کر سر جھکا لیا۔ دس پندرہ سیکنڈ تک اسی طرح بیٹھا رہا تب میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''میں غلط نہیں کہہ رہا کہ تم بڑی بڑی بے وقوفیاں کر رہے ہو۔ سردار سجاول کے بارے میں کیا جانتے ہو تم، کہ تم نے ان کو اپنے ساتھ لڑنے کا کہہ دیا؟''

''میں بس اتنا جانتا ہوں کہ وہ تمہارا سردار ہے اور یقیناً تم لوگوں کے لیے رستم ہند اور رستم زماں وغیرہ وہی ہوگا۔''

''تم اس کے بارے میں خاک بھی نہیں جانتے۔'' فیض محمد نے لرزاں لہجے میں کہا۔

''اگر جانتے ہوتے تو ایسی بات ہرگز نہ کرتے۔'' اس نے چند لمحے توقف کر کے اپنی بڑی بڑی سفید مونچھوں کو سہلایا اور بولا۔ ''تم نے چاند گڑھی میں بھی سردار اور اس کے ساتھیوں کو دیکھا ہوگا، یہاں بھی دیکھ رہے ہو، کیا تم نے کبھی یہ بھی دیکھا ہے کہ سردار نے خود کسی پر ہاتھ اٹھایا ہو، یا لڑائی مار کٹائی میں حصہ لیا ہو؟''

''نہیں، ایسا تو نہیں دیکھا۔'' میں نے کہا۔

''اور شاید دیکھو گے بھی نہیں۔'' فیض نے عجیب لہجے میں کہا۔ ''سردار کا تعلق وادیٔ سون کے ایک پرانے جنگجو قبیلے سے ہے۔''

''تو اس سے کیا ہوتا ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔

''اس سے بہت کچھ ہوتا ہے۔ تمہیں بہت سی باتوں کا پتا نہیں۔ تمہارے حق میں بہتر ہے کہ انہیں جان لو۔'' فیض محمد نے کہا اور سگریٹ کا کش لے کر بولا۔ ''یہ بات سب مانتے ہیں کہ سردار کے قبیلے میں پرانے زمانے سے ایک رِیت چلی آ رہی ہے۔ قبیلے کی ہر نئی نسل میں بڑے بیٹے کا بڑا بیٹا کوئی خاص ہنر لے کر پیدا ہوتا ہے۔ یہ لڑائی کا ہنر ہی ہوتا ہے۔ میں تمہیں بتاتا ہوں...... مثال کے طور پر...... سردار سجاول کے پڑدادا تلوار چلانے کا خاص ہنر رکھتے تھے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے برابر مہارت کے ساتھ تلوار چلاتے تھے۔ انگریزوں سے آزادی والی لڑائی میں انہوں نے بہت سے انگریز سپاہیوں اور افسروں کو قتل کیا۔ انہیں پھانسی ہوئی تھی۔ اسی طرح اگلی نسل میں ہاشم خاں کشتی کے فن میں ماہر تھا۔ وہ چھریرے جسم والا ایک ایسا پہلوان تھا جس نے بڑے بڑوں کا پِتّا پانی کر دیا تھا۔ سردار سجاول کے والد کمال کا ''نشانہ'' لے کر پیدا ہوئے تھے۔ اس جیسا نشانہ باز سون کی وادی نے آج تک نہیں دیکھا۔ بے شمار لوگ اس بات کے گواہ ہیں کہ وہ اڑتے پرندے کے سر کو نشانہ بنا سکتے تھے۔ ان کا نام خداداد سچل تھا۔ ہمارا سردار خداداد صاحب کا بڑا بیٹا ہے اور اللہ نے اسے بھی ایک خاص فن دے کر بھیجا ہے۔ یہ لڑائی بھڑائی کا فن ہے۔ سردار جس سے لڑتا ہے، اسے اکثر موت کا منہ دیکھنا پڑ جاتا ہے۔''

''لگتا ہے کہ تم کوئی کہانی سنا رہے ہو۔''

''ہے تو کہانی لیکن سو فیصد سچی، دعا کرو، کبھی اس کہانی کی سچائی تمہیں اپنی آنکھوں سے

نہ دیکھنا پڑے۔ سردار اول تو کسی سے لڑتا نہیں لیکن جب لڑتا ہے تو پھر طیش کے ریلے میں بہہ جاتا ہے۔ خاص طور پر سردار کے دائیں ہاتھ میں بے حد طاقت ہے۔ شاید یہ وہی طاقت ہے جو مختلف شکلوں میں نسل درنسل اس خانوادے میں آئی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ تمہیں یہ بات عجیب لگے، سردار کے دائیں ہاتھ کی چوٹ سے کئی بار مدِمقابل کی گردن ٹوٹ جاتی ہے۔''

''ہاتھ کی چوٹ یعنی مکے سے گردن ٹوٹ جاتی ہے؟'' میں نے تعجب سے کہا۔

''تمہیں حیرانی ہورہی ہوگی، ایسی حیرانی بہت سے لوگوں کو ہوتی ہے لیکن جب کوئی اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ لیتا ہے تو پھر اس کو حیرانی نہیں ہوتی، خوف اور دہشت کا حملہ ہوتا ہے اس پر......اور یہ دہشت بیٹھ جاتی ہے اس کے دل میں۔''

فیض محمد نے مجھے سردار سجاول کے حوالے سے کئی ایسی باتیں بتائیں جن پر یقین کرنا مشکل تھا۔ ان میں سے کچھ باتیں ایسی بھی تھیں جو واضح طور پر اس عقیدت کا شاخسانہ تھیں جو بوڑھا فیض محمد اپنے جوان سردار سے رکھتا تھا۔

اسی دوران میں میری نگاہ پہلوان حشمت پر پڑ گئی۔ وہ یہاں اپنے کسی مریض کو دیکھ کر واپس اپنی کوٹھڑی کی طرف جارہا تھا۔ چلتے ہوئے اس کی توند ہچکولے کھارہی تھی اور شام کے جھٹپٹے میں اس کا گندمی رنگ مزید گندمی نظر آرہا تھا۔ ایک رائفل بردار رائفل کندھے سے لٹکائے اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ سامنے نظر آنے والی دو بلند مچانوں پر جگنو چمک رہے تھے۔ یہ جگنو دراصل وہ سلگتے ہوئے سگریٹ تھے جو اکثر مچان نشین پہرے داروں کے ہاتھوں میں نظر آتے تھے۔

میں فیض محمد کے پاس سے اٹھ کر پہلوان کے ساتھ اس کی کوٹھڑی کی طرف چل دیا۔

پہلوان میری طرف سے کچھ پریشان نظر آرہا تھا۔ کوٹھڑی میں پہنچ کر اس نے مجھ سے کہا۔ ''یہ کیا تماشا لگا دیا ہے تم نے۔ سنا ہے سردار نے کل اپنے ایک خاص بندے سے تمہاری لڑائی کروانے کا فیصلہ کیا ہے اور وہ بندہ ایسا ہے کہ ایک منٹ میں دوجے کے ہاتھ پاؤں توڑ ڈالتا ہے۔ تمہیں کیا ضرورت ہے ہر جگہ اپنی جوانی کا ڈھنڈورا پیٹنے کی؟''

میں نے پہلوان کو مؤذن رحیم کے دردناک انجام کے بارے میں بتایا اور تفصیل سے ذکر کیا کہ ان لوگوں نے کس طرح بے رحمی سے اسے موت کے گھاٹ اتارا ہے۔

پہلوان حیران تو ہوا لیکن اس نے خاص دکھ کا اظہار نہیں کیا۔ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ ''جو کچھ بھی ہے لیکن وہ ہمارے مولوی جی کا قاتل تھا۔ اسے اپنے کیے کی سزا ملی۔''

''مگر وہ تو خود اپنے جرم پر شرمندہ تھا۔ اصل قاتلوں کو بے نقاب کرنا چاہتا تھا۔ میں تو

سمجھتا ہوں کہ وہ ایک بہت بڑی ذمے داری ڈال گیا ہے ہم پر۔"
"لیکن اس ذمے داری میں یہ کاہے کو شامل ہو گیا کہ تم سجاول کے ایک خطرناک بندے سے لڑائی مار کٹائی کرو گے۔ اس سے ہو گا کیا؟ وہ زخمی ہو جاوے گا یا تمہاری ایک دو ہڈیاں ٹوٹ جاویں گی۔"
"یہ لڑائی والا پروگرام میرا بنایا ہوا نہیں ہے پہلوان جی۔ سردار سجاول کو ہی کچھ سوجھی ہے۔ اس سے فائدہ کیا ہو گا، یہ بھی وہی بتا سکتا ہے۔ شاید وہ چاہتا ہے کہ میری وجہ سے باقر کی جو تھوڑی سی بے عزتی ہوئی ہے، اس کا مداوا ہو جائے اور وہ سب کے سامنے مجھے کچھ چھینٹی لگا سکے۔" میں نے ذرا توقف کرنے کے بعد بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "جہاں تک ہڈی وغیرہ ٹوٹنے کا مسئلہ ہے، تمہارے ہوتے ہوئے، مجھے اس کی کیا فکر؟"
"مجھے تو ابھی تلک یہ سمجھ ناہیں آئی کہ یہ کس طرح کی لڑائی ہووے گی، کشتی ہووے گی، مکے بازی یا پھر چاقو واقو چلاؤ گے تم دونوں؟"
"فیض محمد تو یہی بتا رہا تھا کہ خالی ہاتھ لڑائی ہو گی ایسی لڑائیاں دروازے کی دائیں طرف والے بڑے کمرے میں ہوتی ہیں۔ سردار سجاول بھی موجود ہوتا ہے اور وہ موقع پر دیکھ کر فیصلہ کرتا ہے کہ کس کا پلڑا بھاری رہا ہے۔"
"شاہ زیب، تم نے وہی کام کیا ہے کہ...... آ بیل، مل کر کریں آہ و زاریاں۔" پہلوان نے حسبِ عادت محاورے کی ہڈی توڑی۔ "تمہیں بھلا کیا ضرورت پڑی تھی اس پھڈے میں ٹانگ اڑانے کی۔ ہمارا تو بس ایک ہی مقصد ہونا چاہیے کہ ہم کسی نہ کسی طرح یہاں سے نکل جاویں۔ مجھے تو لگت ہے کہ یہاں تاجور کی عزت بھی داؤ پر لگی ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ کسی بھی وقت کچھ ہو سکت ہے۔ تم نے دیکھا ہی ہووے گا۔ اس رات وہ سور کا تخم وڈا سردار کس طرح تمہارے کمرے کے سامنے بڑھکیں مار رہا تھا۔"
وڈے سردار کی عمر کافی لمبی تھی۔ اِدھر پہلوان نے اس کا ذکر کیا اُدھر وہ آن موجود ہوا۔ اس کا بھاری بھرکم تھوبڑا غصے سے تمتما رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں طوائف زادی نگینہ کا ہاتھ تھا اور وہ اسے جیسے کھینچتا ہوا اپنے ساتھ لا رہا تھا۔ پہلوان کے سامنے آ کر وہ دہاڑا۔ "یہ تم نے کیا کیا ہے، اپنی اس ماں کے ساتھ؟"
"کک کیا ہوا جی؟" پہلوان ہکلایا۔
"تمہیں کہا تھا کہ اس کے بازو کی مالش وغیرہ کرنی ہے کہ یہ اوپر نیچے ہل سکے۔ تم نے اس کی ہڈی کچی کر کے توڑ دی۔" وڈا سردار غصے سے پہلوان پر جھپٹا۔ اس کی ٹانگ کی ضرب

پہلوان کی توند پر لگی اور پہلوان سیدھا میری گود میں آیا۔

بوڑھا فیض محمد بھاگتا ہوا موقع پر پہنچا۔ اس نے غصیلے سردار اعظم کو بمشکل روکا اور پوچھا کہ ہوا کیا ہے۔ اعظم پھر دہاڑا۔ ''کس کھوتے کے پتر کو پکڑ کر تم یہاں لے آئے ہو۔ یہ اندھی ماں کا نابینا سرجن پتر...... کہتا ہے مجھے ہڈی پٹھے کا کام آتا ہے، اس نے اس کڑی کی اچھی بھلی جڑی ہوئی ہڈی توڑ دی ہے۔'' اس نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں تلے لے کر ایک بار پھر پہلوان پر جھپٹنا چاہا۔ فیض محمد نے اسے کوشش کر کے روکا۔

پہلوان کا رنگ فق ہو رہا تھا۔ وہ منمنایا۔ ''میں نے تو ایکسرے کے مطابق ہی سب کچھ کیا ہے......''

''کون سا ایکسرے کھینچا تھا تیرے پیو نے یہاں جنگل میں؟'' وڈا سردار اعظم دہاڑا۔

پہلوان نے جلدی سے جھک کر تکیے کے نیچے سے ایک ایکسرے نکال لیا اور اعظم کو دکھایا۔

اعظم نے ایک بار پھر کھڑے کھڑے پہلوان کی توند پر لات رسید کرنے کی کوشش کی۔ اس مرتبہ میں نے یہ لات اپنی پسلیوں پر کھا کر پہلوان کو بچایا۔ اعظم گرجا۔ ''یہ تین مہینے پہلے کا ایکسرے ہے...... اور ہڈی جڑنے سے پہلے کا ہے۔ انی کے پتر! تجھے یہ تاریخ لکھی نظر نہیں آ رہی تھی، اس کے اوپر......؟''

پہلوان پھر منمنایا۔ ''ایسی بات تھی بھیا جی...... تو مریضہ مجھے ایکسرے دکھاتی ہی ناہیں۔''

نگینہ چیخ کر بولی۔ ''موٹے، مردود...... موٹے! مریضہ ہو گی تیری ماں...... تُو خود ہی تو کہہ رہا تھا کہ کوئی پرانا ایکسرے ہے تو وہ بھی لے آنا......''

خوب ہنگامہ مچا۔ مجھے ڈر محسوس ہوا کہ کہیں پہلوان کی اپنی ہی کوئی ہڈی نہ ٹوٹ جائے۔ فیض محمد نے بڑی ہمت اور دانشمندی سے مسلسل پہلوان کا دفاع کیا۔ اس دوران میں ایک بار پہلوان کو لات رسید کرنے کی کوشش میں شرابی سردار خود گرتے گرتے بچا۔ دوسری مرتبہ اس کی اچٹتی ہوئی سی لات پہلوان کے کولہے پر پڑی۔ آخر سردار اعظم فیصلہ کن انداز میں بولا۔ ''اس کڑی کی ہڈی تو توڑ دی ہے تُو نے۔ اب اگر یہ ہڈی تُو نے جوڑی نہیں تو سمجھ لے تیری ہڈی بھی ٹوٹے گی۔ اسی جگہ سے اور اسی طرح۔ اور تیرے دونوں گٹے (ٹخنے) بھی توڑوں گا...... تا کہ تُو بھاگنے کا سوچے بھی نہ یہاں سے۔'' بمشکل یہ معاملہ وائنڈ اَپ ہوا۔

○......❖......○

اور یہ میری اور باقر عرف باقرے کی لڑائی کا منظر تھا۔ اس لڑائی کے لیے بڑے دروازے کے پاس والا وہی کمرا استعمال کیا گیا تھا جہاں سجاول کے چھرے باز اکثر مشق کرتے تھے اور ان کی آوازیں باہر احاطے تک آتی تھیں۔ میری اور باقر کی دست بدست لڑائی شروع ہونے سے پہلے، یہاں دیواروں سے آویزاں تمام کلہاڑیاں اور چھرے وغیرہ ہٹا لیے گئے تھے۔ نیچے فرش تھا، یہ ایک نیم گول سا ہال کمرا نظر آتا تھا۔ بیٹھنے کے لیے سات آٹھ کرسیاں تھیں۔ ان میں سے دو کرسیاں زیادہ بڑی اور آرام دہ تھیں۔ ان پر دونوں بھائی یعنی وڈا سردار اعظم اور چھوٹا سردار سجاول براجمان تھے۔ باقی کرسیوں پر بڑے بڑے پگڑوں والے وہی کرخت چہرہ مہمان تھے جنہیں میں نے جمعے کی رات دیکھا تھا۔ باقی سب لوگوں کو کھڑے ہو کر یہ تماشا دیکھنا تھا۔ یہاں موجود عورتوں کو اس تماشے سے دور بلکہ بے خبر رکھا گیا تھا۔

اندازہ ہوتا تھا کہ اس جگہ اس طرح کی لڑائیاں مارکٹائیاں ہوتی رہتی ہیں۔ غالباً لکڑی کے چُھروں یعنی خنجروں سے چھرا بازی کی مشق یہاں پر ہوتی تھی۔ ایک طرف دیوار پر ایک درمیانے معیار کی بڑی سی پینٹنگ بھی لگی ہوئی تھی۔ اس میں گھنی مونچھوں اور سیاہ داڑھی والا ایک تنومند شخص دونوں ہاتھوں میں بڑے بڑے چھرے پکڑے، لڑائی کے ایکشن میں نظر آتا تھا۔ غور سے دیکھنے پر پتا چلتا تھا کہ یہ چھرے نہیں بلکہ چھوٹے سائز کی تلواریں ہیں۔

فیض محمد نے مجھے بتایا تھا کہ لڑائی کا فن کسی روحانی فیض کی طرح سجاول کے خون میں شامل ہے۔ سجاول کا پڑدادا ایک بے مثال تلوار زن تھا۔ دونوں ہاتھوں سے تلوار چلا کر درجنوں افراد کا گھیرا توڑ دیتا تھا اور انہیں خون میں نہلا دیتا تھا۔ شاید یہ سجاول کے اسی بزرگ کی تصویر تھی۔ (بعدازاں یہ اندازہ درست ثابت ہوا)

باقر جین کی پتلون اور جیکٹ میں تھا۔ اس نے خونی نظروں سے مجھے دیکھا اور جیکٹ اتار کر ایک طرف پھینک دی۔ نیچے اس نے ہاف سلیو شرٹ پہن رکھی تھی جس میں سے اس کے بازوؤں کی مچھلیاں نمایاں دکھائی دیتی تھیں۔ میں سفید شلوار قمیص اور جرسی میں تھا، میں نے بھی جرسی اتار کر ایک طرف رکھ دی اور آستینیں اڑس لیں۔

سجاول سیالکوٹی نے اعلان کرنے والے انداز میں کہا۔ ''یہ کوئی دشمنی یا عداوت کی لڑائی نہیں ہے۔ نہ ہی میں یہ چاہتا ہوں کہ اس لڑائی میں کوئی شدید زخمی ہو۔ کسی کے زیادہ زخمی ہونے کی صورت میں، میں لڑائی فوراً رکوا دوں گا۔ اگر تم دونوں میں سے کسی کو اپنی ہڈی وغیرہ ٹوٹنے کا خطرہ ہو تو وہ بول کر یا اپنا ہاتھ اٹھا کر لڑائی رکوا سکتا ہے۔''

یہ قریباً ویسی ہی شرائط تھیں جو مشہور زمانہ MMA یعنی ''مکس مارشل آرٹ'' کی فائٹس میں ہوتی ہیں۔ مجھے اپنے سامنے نظر آنے والا مدِمقابل بھی ان فائٹس والا کوئی فائٹر ہی لگتا تھا یا کم از کم ان کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ یقیناً لڑائی کی فیلڈ میں وہ ایک خطرناک شخص تھا، لیکن اس کی بدقسمتی تھی کہ بے خبری میں، آج وہ ایک ایسے شخص کے سامنے آگیا تھا جو اس میدان میں اس سے کافی آگے تھا۔

''چلو شروع کرو۔'' سجاول نے بلند آواز میں کہا۔

باقر دونوں ہاتھ پھیلا کر میرے سامنے آیا۔ میں نے بھی نیم دائرے میں اس کے اردگرد گردش کی۔ یکایک اس نے جھکائی دی اور میری ٹانگوں کی طرف آیا۔ اس کی پھرتی بے مثال تھی لیکن ٹریننگ اور تجربے کی کمی تھی۔ میں نے بہ آسانی اپنی ٹانگیں بچائیں اور اس کو تھوڑا سا آگے آنے دیا، تب میرے گھٹنے کی زوردار ضرب اس کی ٹھوڑی پر لگی اور وہ ڈگمگا کر پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے ٹانگ کی ایک ضرب اس کی پسلیوں پر لگائی، دوسری سر پر۔ سر پر چوٹ لگنے سے وہ جیسے آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے مجھ پر مکوں کی بارش کر دی۔ ایک دو مکے میرے چہرے پر بھی لگے لیکن میں برداشت کر گیا۔ باقر کے ساتھیوں اور تماشائیوں نے اس کے حق میں بے پناہ شور مچایا۔ وہ ان کے لیے ہیرو کی طرح تھا، لیکن آج یہ ہیرو شومئی قسمت ایک برتر مدِمقابل کے سامنے آگیا تھا۔

مجھے ایک دو موقع ملے جب میں اسے اپنے ہاتھ کی کاری ضرب لگا سکتا تھا مگر میں اس لڑائی کو فوراً ختم کرنا نہیں چاہتا تھا۔ دوسری طرف مجھے یہ ڈر بھی تھا کہ یہ بے حد پھرتیلا شخص کہیں کوئی اوچھا وار یعنی فاؤل نہ کر جائے۔ اس نے مجھے فرش پر گرانا چاہا لیکن میں نے بہ آسانی پلٹ کر اسے اپنے آگے رکھ لیا۔ اس کھینچا تانی میں اس کی شرٹ پھٹ گئی اور میری قمیص کا بازو بھی ادھڑ گیا۔ اس کی پھٹی ہوئی شرٹ کے اندر سے مجھے اس کی کمر نظر آئی اور ایک زخم کا نشان بھی نظر آیا۔ یہ نشان اس کے کندھے سے شروع ہو کر ریڑھ کی ہڈی کے ساتھ ساتھ نیچے چلا گیا تھا۔ بے شک میرا قیافہ درست ثابت ہوا تھا، یہ وہی نشان تھا جو عبدالرحیم کی کمر پر بھی لگایا گیا تھا، تاکہ اس کی بے چہرہ لاش باقر کی لاش کے طور پر لی جائے۔

میری توجہ شاید آدھے سیکنڈ کے لیے اس پرانے زخم کی طرف گئی تھی...... باقر نے تڑپ کر میرے نیچے سے نکل کر اوپر آنا چاہا۔ شاید یہاں موجود کوئی شخص بھی میری جگہ ہوتا تو خود کو باقر کی زد سے نہ بچا سکتا۔ میں نے بھرپور کوشش کی اور کامیاب رہا۔ میرے کانوں میں سجاول کی واہ واہ کی صدا پڑی۔ تاہم میری اس کوشش کے دوران میں ایک غلطی ہو گئی تھی۔ اتفاقاً

میرے دائیں ہاتھ کا انگوٹھا باقر کی بائیں آنکھ میں لگ گیا تھا۔

وہ پہلے ہی بہت بھنایا ہوا تھا یا شاید اسے ہزیمت سے بچنے کے لیے کوئی بہانہ ہی چاہیے تھا۔ وہ اپنی آنکھ دبا کر تین چار قدم پیچھے ہٹا۔ پھر ایک چنگھاڑ کے ساتھ تماشائیوں کی طرف گیا۔ اس نے اپنے ایک ساتھی کی کمر سے قریباً دو فٹ لمبا چھرا کھینچا اور آندھی کی رفتار سے میری طرف آیا۔ اس نے بے دریغ میری ٹانگوں کو نشانہ بنایا۔ چھرے کی تیز نوک میری ران کو بوسا دیتی ہوئی گزر گئی۔ دوسرا وار کرنے کے لیے باقر نے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ سجاول کی کڑکتی ہوئی آواز ابھری۔ ”نہیں باقرے......رک جاؤ۔“

باقرے جہاں کا تہاں رک تو گیا مگر اس کے طیش میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ اس کی بائیں آنکھ سرخ انگارہ دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے چھرا فرش پر پٹخا اور چلاتا ہوا مجھ پر پل پڑا۔ یقیناً وہ اتنا برا فائٹر نہیں تھا جتنا طیش میں آنے کے بعد ہو گیا تھا۔ اس نے اندھا دھند ہاتھ چلائے اور فاش غلطیاں کیں۔ آخر اس کی گردن میرے بازو کے شکنجے میں آ گئی۔

میں نے دانت پیستے ہوئے سرگوشی کی۔ ”بچہ جی، اسے کہتے ہیں...... NECK LOCK۔ اب ذرا نکل کر دکھاؤ۔“

جہاندیدہ سردار سجاول سمجھ گیا تھا کہ اب اگر باقرے نے بے وقوفی کی اور اندھا دھند زور لگایا تو ناقابلِ تلافی نقصان اٹھالے گا۔ اس نے اٹھ کر لڑائی رکوا دی اور میرا ہاتھ کھڑا کر کے میرے فاتح ہونے کا اعلان کیا۔

باقر کے ساتھی اور تمام تماشائی مجھے ایسی نظروں سے دیکھ رہے تھے جیسے میرے سر پر سینگ نکل آئے ہوں اور میں ابھی ان سینگوں کے ذریعے ان کے پیٹوں میں سوراخ کرنا شروع کر دوں گا۔ انہیں جیسے باقر کی شکست کا یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ باقر مسلسل اپنی آنکھ کا رونا رو رہا تھا اور بتا رہا تھا کہ میں نے جان بوجھ کر اس کی آنکھ کو نشانہ بنایا اور یہ کہ وہ اب بھی مجھ سے لڑنے کے لیے تیار ہے۔

بہرحال جو کچھ بھی تھا، وہ اس دس منٹ کی لڑائی میں ایک آدھ منٹ کے سوا مجھ سے مار ہی کھاتا رہا تھا اور یہ صورتِ حال سب نے دیکھی تھی۔ وہ سب گم صم اور ششدر تھے۔ سردار سجاول نے معنی خیز نظروں سے اپنے مہمانوں کی طرف دیکھا۔ وہ بڑے بڑے پگڑ سروں پر سجائے خاموش بیٹھے تھے۔ میں نے انہیں کم ہی بولتے دیکھا تھا۔

سجاول نے میرے پاس آ کر میری پیٹھ تھپکی۔ اس کٹ کا معائنہ کیا جو باقر کے چھرے سے میری ران پر آیا تھا اور جس نے شلوار کا کچھ حصہ بھی چاک کر ڈالا تھا۔ زخم زیادہ گہرا نہیں

تھا۔

سردار سجاول نے کہا۔ ”تمہیں انعام دینے کو دل چاہ رہا ہے۔“

میری آنکھوں کے سامنے مؤذن رحیم کی لاش آگئی۔ اس کا خونچکاں جسم، اس کا مسخ چہرہ، کتنی بیدردی سے مارا گیا تھا اسے۔ سجاول کی سفاکی کے لیے میرے سینے میں طیش کی ایک بلند لہر اٹھی۔ بہرحال اپنے تاثرات نارمل رکھتے ہوئے میں نے کہا۔ ”تو دے دو انعام۔“

اس نے ذرا چونک کر میری طرف دیکھا پھر سگریٹ کو نہایت قیمتی لائٹر سے سلگاتے ہوئے بولا۔ ”کیا چاہتے ہو؟“

میں نے کہا۔ ”دے سکو گے سردار؟“

”دے سکا تو ضرور دوں گا۔“

”جس طرح آج باقر سے لڑائی کی ہے۔ اسی طرح میں تم سے بھی لڑنا چاہتا ہوں۔“ میں نے اپنی آواز اتنی دھیمی رکھی تھی کہ صرف سجاول کے کانوں تک ہی پہنچ سکے۔

سجاول کے چہرے پر عجیب سا رنگ لہرایا۔ اس نے جیسے کچھ کہنے کے لیے لبوں کو حرکت دی لیکن پھر ارادہ بدل دیا۔ یک ٹک میری طرف دیکھتا رہا، تب دوسروں کو دکھانے کے لیے مسکرایا اور دوبارہ جا کر اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ بڑے بڑے پگڑوں والے افراد اس سے کھسر پھسر کر رہے تھے۔

میری جیت کی خبر آناً فاناً سارے ڈیرے میں پھیل گئی تھی۔ اس جیت نے دیکھتے ہی دیکھتے مجھے ان لوگوں کی نظر میں بہت اہم بنا دیا تھا۔ باقر ان کے نزدیک ایک نہایت خطرناک ”لڑاکا“ تھا اور وہ اس بات کی بھرپور توقع کر رہے تھے کہ مجھے چارپائی وغیرہ پر یہاں سے نکالا جائے گا۔ کچھ دیر بعد سجاول نے میرا اور باقر کا معانقہ کرایا اور تاکید کی کہ اب دل میں کسی طرح کی رنجش نہیں رکھنی ہے۔

جیسا کہ میں نے بتایا ہے، اس سنگین مقابلے کی خبر خواتین اور خاص طور سے ماؤ جی سے چھپائی گئی تھی۔ ورنہ وہ مجھے، یعنی اپنے ہونے والے ”داماد پتر“ کو کسی بھی طور اس خطرناک صورتِ حال کا شکار نہ ہونے دیتیں۔ لیکن جب یہ مقابلہ ہو گیا تو خبر راز نہ رہ سکی۔ یہ شام کا وقت تھا، میں کمرے سے نکل کر احاطے کی طرف گیا تو دور سے ماؤ آتی دکھائی دی، جیسے کوئی ہتھنی جنگل میں آدم زاد کو دیکھ کر اس کی طرف جھپٹ رہی ہو۔ وہ آتے ساتھ ہی میرے ساتھ لپٹ گئی اور منہ سر چومنے لگی۔

''پتا نہیں کیا ہو گیا ہے سجاولے کو۔ میرے جوائی پتر کے پیچھے ہی پڑ گیا ہے۔ پہلے کندھے کی چوٹ، پھر سیڑھیوں سے گرایا اور اب اس کو لڑائی مار کٹائی کا تماشا لگانے کی سوجھی ہے۔ اگر کوئی چوٹ شوٹ لگ جاتی نا تجھے تو میں نے سجاولے کی ٹانگیں توڑ دینی تھیں۔ اچھا بھلا سیانا ہے پھر ایسے ناسمجھی والے کام کرتا ہے۔''

تب ماؤ کی نظر میری کٹی ہوئی شلوار اور ٹانگ کے چہرے پر پڑی، اس نے ایک دم دہائی مچا دی۔ ''ہائے میرا بچا۔ ٹانگ بچی بھی ہے کہ نہیں۔ کدھر ہے وہ مرن جوگا فیض اور وہ سجاولا۔ میں تو ذرا پوچھوں ان سے۔ ہائے میرا تو کلیجا نکلا جا رہا ہے۔ کوئی خون بند کرو اس کا۔ کوئی آ کے پٹی باندھو۔ کہاں دفع ہو گئے سب کھل کھلا کے۔''

اس کی نوے فیصد پریشانی مصنوعی تھی۔ ورنہ سجاول کون سا دور تھا۔ اگر وہ چاہتی تو اس سے باز پُرس کر سکتی تھی لیکن وہ جانتی تھی کچھ بھی ہے اصل سردار وہی ہے۔ وہ جو کچھ بھی کرتا ہے، اس کے لیے کسی کو جواب دہ نہیں ہے۔ بیٹا ہونا علیحدہ بات تھی، سردار ہونا علیحدہ بات۔

وہ میرے منع کرنے کے باوجود مجھے اس حصے میں لے گئی جہاں وہ اور اس کی پوتی مانی رہائش فرما تھیں۔ اس نے اندر آتے ہی شور مچا دیا۔ ''نی مانی! کہاں مر گئی ہے۔ ادھر آ دیکھ میرے بچڑے کا کتنا خون نکل آیا ہے۔ دیکھ کس طرح ٹانگ لال و لال ہو رہی ہے، کھل کھلا کے۔''

مانی تو شاید بالکل تیار ہی بیٹھی تھی، دوڑتی ہوئی وہاں پہنچ گئی۔ سخت سردی میں بھی وہ کھلے گریبان کی شرٹس پہنتی تھی اور چست پتلون میں جسم کے خطوط نمایاں کرتی تھی۔ اس نے آتے ساتھ ہی بڑی ادا سے سینے پر ہاتھ رکھ کر ''ہائے اللہ'' کہا اور بڑی بے باکی سے میری کٹی ہوئی شلوار کے اندر سے میری ٹانگ کا معائنہ کرنے لگی۔

''اوہو، تمہیں تو پٹی کی ضرورت ہے ڈیئر جانو، آ جاؤ کمرے میں۔ میں اچھی طرح زخم کو صاف بھی کر دیتی ہوں۔ پر یہ سب کچھ ہوا کیسے؟''

ماؤ نے پوتی کو مختصر الفاظ میں آگاہ کیا کہ اس کے چاچا سجاول نے اپنی عادت سے مجبور ہو کر آج پھر دنگل کرایا ہے اور اس دنگل میں شاہ زیب کو باقرے سے لڑایا ہے۔

''باقرے سے؟'' مانی تقریباً چلا اٹھی۔ ''وہ باقرا بگیاڑ، وہ تو بندے کا کچالو بنا دیتا ہے، تم...... تم کیسے بچ گئے ڈیئر جانو۔ کیا چاچے نے لڑائی روک دی تھی۔''

ماؤ فخر سے بولی۔ ''ہاں لڑائی روک دی تھی اس نے لیکن شاہ زیب کو بچانے کے لیے نہیں، باقرے بگیاڑ کو بچانے کے لیے۔ میرا شاہ زیب پتر جیت گیا ہے باقرے سے۔ فیضو بتا رہا تھا کہ آج باقرے کی ساری آکڑ شاکڑ دیسی صابن سے دھو دی ہے شاہ زیب نے۔ اگر

سجاول، باقرے کو چھڑا تا نہ تو اس کی گردن کا کڑا کا نکال دینا تھا، میرے شیر بچڑے نے۔''
مانی اپنی دادی کی پروا کیے بغیر چھلانگ لگا کر مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے اسے بمشکل خود سے جدا کیا۔

اتنے میں اختری مرہم پٹی کا سامان لے آئی۔ مانی نے مرہم پٹی والا بکس اختری کے ہاتھ سے جھپٹا اور میرے کندھے کا بوسہ لے کر بولی۔ ''ڈیئر! کمال کر دیا تم نے...... اگر واقعی وہی کچھ ہوا جو ماؤ جی بتا رہی ہیں تو پھر تو تم شہزادے ہو ہم سب کے۔ ویسے بھی مجھے پہلے ہی لگتا تھا کہ چاچے نے کوئی ایویں شیویں بندہ نہیں ڈھونڈا ہو گا میرے لیے۔''

وہ مجھے کھینچتی ہوئی کمرے میں لے گئی۔ دروازہ اندر سے بند کر دیا اور مجھے زبردستی بستر پر لٹا دیا۔ اس نے شلوار کو کچھ اور چاک کر کے میرے زخم کو اسپرٹ سے صاف کیا۔ وہ اس صفائی کی حدود کو مزید وسیع کرنے کے موڈ میں تھی لیکن پھر میرے سنجیدہ تاثرات دیکھتے ہوئے ارادہ بدل دیا۔ زخم کچھ ایسا خاص نہیں تھا۔ مرہم پٹی کا تو بس بہانہ ہی تھا، بس یہ آفت کی پرکالی مجھ سے تین چار دن کی غیر حاضری کا ہرجانہ وصول کرنا چاہ رہی تھی۔ اس نے اپنا سارا بوجھ مجھ پر لاد دیا اور اٹکھیلیاں کرنے لگی۔

اچانک جیسے اسے کچھ یاد آیا اور وہ لال بھبھوکے چہرے کے ساتھ مجھ سے علیحدہ ہو کر بیٹھ گئی۔ میں سمجھا شاید وہ یہ پوچھنا چاہ رہی ہے کہ باقرے جیسے خطرناک بندے کے ساتھ میری ہتھ جوڑی کی وجہ کیا تھی اور میں نے اس جنگلی بگیاڑ کو کیسے زیر کیا لیکن اس کی ذہنی رو کسی اور طرف چل نکلی تھی۔ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بڑے نخرے سے بولی۔ ''آج مجھے ایک بات صاف صاف بتاؤ ڈیئر! جاناں کو تم نے کیوں بچایا ہے؟''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ اس نے چاچے سجاول کے خاص بندے فخرو کو زخمی کیا تھا اور بھاگ گئی تھی۔ اسے پکڑ کر یہاں لایا گیا تا کہ اسے فخرو کے حوالے کر دیا جائے مگر درمیان میں تم کود پڑے، اور تم نے اس کی جان بچانے کے لیے اسے میری سہیلی بنا دیا۔''

''تو کیا وہ اچھی سہیلی نہیں ہے۔ ہر وقت تمہیں کمپنی دیتی ہے، تمہیں مفت میں ڈانس سکھا رہی ہے۔ تمہیں نکھار رہی ہے۔''

''وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن میں کچھ اور پوچھ رہی ہوں میرے شہزادے، تمہارے پیٹ میں اس کی ہمدردی کا مروڑ کیوں اٹھا۔ مجھے سچی بتاؤ کہیں جاناں سے تمہاری کوئی پرانی جان پہچان تو نہیں؟''

''کیسی بے وقوفی کی باتیں کررہی ہو، وہ مجھے جانتی تک نہیں۔ میرا نام تک اسے معلوم نہیں اور تم کوئی ٹانکا ڈھونڈ رہی ہو ہم دونوں کے درمیان؟''

''دراصل اس دنیا میں کوئی بلاوجہ تو کسی کے کام نہیں آتا ہے نا۔''

''تم ڈکیت لوگ ہو لیکن بہت سے لوگ انسان بھی ہوتے ہیں۔ وہ انسان ہونے کے ناتے کسی سے ہمدردی کرسکتے ہیں......''

وہ ٹٹولنے والی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی پھر جیسے اس نے مطمئن ہو کر سر ہلایا۔ اپنے بوائے کٹ بالوں کو پیچھے کی طرف جھٹک کر بولی۔ ''ویسے ہے بڑے کام کی لڑکی۔ ڈانس جانتی بھی ہے اور دوسرے کو اچھی طرح سمجھا بھی سکتی ہے۔ سری دیوی کے ایک گانے پر میں نے بہت دفعہ ناچنے کی کوشش کی مگر ہر بار پاؤں میں موچ آئی، یا کمر کا پٹھا چڑھ گیا لیکن جاناں نے سمجھایا تو سب کچھ حلوے کی طرح لگا۔ ایسے پکے اسٹیپ بتائے ہیں اس نے کہ ساری عمر نہیں بھولیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''ڈانس کرتے ہوئے اگر تمہارا کوئی پٹھا چڑھ جاتا ہے تو اب فکر کرنے کی بالکل ضرورت نہیں۔ یہ جو پہلوان حشمت یہاں آیا ہے بڑے بڑے پٹھوں کو سیدھا کر دیتا ہے۔''

''دفع دور۔'' وہ ناک چڑھا کر بولی۔ ''میں تو ہاتھ بھی نہ لگانے دوں اس موٹے کو۔ بڑے ٹھرکی ہوتے ہیں ایسے چھوٹی چھوٹی آنکھوں والے......اور کاریگری اس کی خاک ہے۔ اس لڑکی نگینہ کی اچھی بھلی جڑی ہوئی ہڈی اس مشٹنڈے نے توڑ کر رکھ دی ہے۔ نابینا تھی...... ایکسرے پرانا دیکھ لیا اور شامت تازی بتازی لے آیا...... اچھا دفع کرو...... میں تمہیں کچھ دکھاتی ہوں۔''

''بہت کچھ تو تم پہلے ہی دکھا رہی ہو۔'' میں نے اس کے واہیات گریبان پر اچٹتی سی نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب؟'' وہ ادا سے بولی۔

''کچھ نہیں تم دکھاؤ جو دکھانا چاہتی ہو۔''

اس نے ٹیپ ریکارڈر پر گانا لگایا۔ ''میرے ہاتھوں میں نو نو چوڑیاں ہیں...... ذرا ٹھہرو صنم مجبوریاں ہیں......''

اس کے ساتھ ہی اس نے آستینیں اڑسیں اور چھما چھم ناچنا شروع کر دیا۔ جیسا کہ مجھے معلوم ہوا تھا، عرصہ پہلے اس کی ماں اپنے کسی آشنا کے ساتھ بھاگ گئی تھی اور وہ ایک طوائف

تھی۔ یہی خون مانی کی رگوں میں بھی دوڑتا تھا اور میوزک وڈانس سے مانی کی خصوصی دلچسپی کا سبب بھی یہی تھا۔

گانے میں تو ''مجبوریوں'' کا ذکر تھا لیکن مانی اس گانے کی صریح خلاف ورزی کر رہی تھی۔ وہ کسی مجبوری کو مجبوری سمجھتی ہی نہیں تھی۔ ناچنے کے دوران میں وہ زبردستی میری بانہوں میں گھس بیٹھتی تھی۔ اسے پتا تھا کہ میں اسے ناراض کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ کیونکہ میں اسے ناراض کرتا تو ماؤ جی ناراض ہوتی۔ ٹین شین میں ماؤ کا بلڈ پریشر فوراً 160 کی حد کراس کر جاتا تھا اور اس کے ساتھ ہی یہ خطرہ ہوتا تھا کہ اس پر غشی طاری ہونے لگے گی۔ بے شک یہ ذہنی صحت کی خرابی کا کوئی معاملہ تھا۔ سجاول نے مجھے کھلے الفاظ میں وارننگ دے رکھی تھی کہ وہ سب کچھ برداشت کر سکتا ہے، لیکن اگر میری وجہ سے اس کی ماں کو کوئی نقصان پہنچا تو وہ کبھی برداشت نہیں کرے گا۔

ماؤ کو یقیناً پتا تھا کہ اس کی پوتی کس قماش کی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب مانی میرے ساتھ کمرے میں اکیلی ہوتی تھی تو ماؤ آس پاس موجود رہتی تھی اور اپنی موجودگی کا احساس بھی دلاتی رہتی تھی۔ اس وقت بھی جب مانی ڈانس کے بعد ہانپ کر پکے ہوئے پھل کی طرح میری جھولی میں گری ہوئی تھی اور مزید ''گرنے'' کا ارادہ رکھتی تھی، ماؤ نے دروازے پر دستک دے دی۔

مہناز عرف مانی نے بہت برا سا منہ بنا کر اپنا لباس درست کیا اور لال بھبھوکے چہرے کے ساتھ دروازہ کھول دیا۔ ماؤ نے تیز نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا پھر انجان بن کر پوچھا۔ ''دوائی لگ گئی میرے بچڑے کو؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا لیکن دل میں سوچا کہ...... یہ تیری پوتی دوا کیا لگائے گی، یہ تو خود ایک لا دوا بیماری ہے۔

ماؤ نے مجھے اپنے ساتھ لیا اور خاص بات کرنے کے بہانے دوسرے کمرے میں لے آئی۔ مجھے سمجھانے والے انداز میں بولی۔ ''میری پوتی سے تیرا جوڑ کسی اور نے نہیں اوپر والے نے خود بنایا ہے۔ اس سے تیری شادی تو ہو کر ہی رہنی ہے۔ تُو اس کی زیادہ فکر نہ کر۔ اس وقت تُو اپنی گھر والی کی طرف زیادہ دھیان دے۔ اس کا حق تجھ پر زیادہ ہے، اسے خوش رکھ۔ کھلا پلا......اور خود بھی ذرا کھل کھلا کر کھایا پیا کر۔ شادی کے بعد بچے میں دیر ہو تو دل میں عجیب عجیب وسوسے آنے لگتے ہیں۔ یہ دیکھ، یہ اخروٹ کا حلوہ بنوایا ہے میں نے تیرے لیے......''

اس نے پلیٹ سے ڈھکی ہوئی ایک پلیٹ اٹھائی اور کوئی آدھ کلو حلوہ میرے سامنے رکھ دیا۔اس پر پستے اور کھوپرے کے چُورے کا چھڑکاؤ کیا گیا تھا۔

میں جانتا تھا اور اچھی طرح جانتا تھا کہ میری یہ خاطرداریاں 'ماؤ' کس وجہ سے کرتی ہے۔اس نابنجار عورت کے ذہن میں یہ بات گھر کر چکی تھی کہ جب تاجور امید سے ہو جائے گی تو پھر میری اور مانی کی شادی کا راستہ ہموار ہونا شروع ہو جائے گا۔خاکم بدہن وہ دوران حمل تاجور کی موت کی آس لگائے بیٹھی تھی اور یہ سارا شوشا ماؤ کے کسی پیرفرتوت پیرو سائیں کا چھوڑا ہوا تھا۔

حلوہ کھاتے کھاتے اچانک مجھے کسی کمی کا احساس ہوا۔میں نے اپنی قمیص کی چیسٹ پاکٹ کو چھوا اور چونک گیا۔وہ تہ کیا ہوا کاغذ موجود نہیں تھا، جو مجھے مرحوم عبدالرحیم سے ملا تھا اور میں نے سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔وہی ناقابلِ فہم تحریر جس میں رحیم کے بقول کوئی بہت خاص بات موجود تھی۔دفعتاً مجھے اندازہ ہوا کہ تھوڑی دیر پہلی مانی کے ساتھ ''رومانی دھینگامشتی'' کے دوران میں وہ کاغذ جیب سے سلپ ہو گیا ہے۔یقیناً وہ مانی کے کمرے میں ہی گرا تھا۔

مجھے چونکتے دیکھ کر ماؤ نے پوچھا۔''کیا ہوا میرے بچڑے، کوئی چیز گم ہو گئی ہے؟''

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا مانی لہراتی بل کھاتی میری طرف آتی دکھائی دی، اس کے ہاتھ میں وہی لکھا ہوا کاغذ تھا۔''یہ تمہارا ہے ڈیئر؟'' اس نے کاغذ لہراتے ہوئے کہا۔

''ہاں میری جیب سے ہی گرا ہے۔''

''پر یہ ہے کیا؟ اوٹ پٹانگ لکھا ہوا ہے۔'' اس نے کہا اور پڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔''رٹسام بحاص، پاتھب...... ٹیل وہ...... روب جم، وہ رک طغ انکھل...... اڑپ......'' اس نے سوالیہ نظریں مجھ پر گاڑ دیں۔

میں نے کہا۔''بس، یہ مجھے کہیں پڑا ہوا ملا تھا۔میں نے جیب میں ڈال لیا۔''

''لیکن...... یہ ہے کیا؟''

''خود مجھے بھی پتا نہیں چل سکا۔''

اس نے ایک بار پھر پڑھنے کی کوشش کی اور بولی۔''یہ تو مجھے کوئی خفیہ لکھائی لگتی ہے۔جیسے دوسروں سے چھپانے کے لیے کوئی ''لو لیٹر'' لکھا گیا ہو۔'' وہ شک کی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

ماؤ نے بھی خط کو دیکھا۔ہمیں سمجھ نہیں آئی تھی تو اسے کیا آتی۔مانی ذرا شوخی سے بولی۔

''ماؤ جی! ذرا چنگی طرح چھان پھٹک کر لیں اس منڈے کی۔کہیں کنویں میں دھکا نہ دے دینا

مجھے......"

"جا دفع ہو۔" ماؤ نے پوتی کو ڈانٹا۔ "ہیرا پتر ہے میرا۔ دیکھ ماتھے سے کیسے نور کی لاٹ نکل رہی ہے۔"

وہ ادا سے ہنسی۔ "یہ نور کی لاٹ نہیں ہے دادی ماؤ...... یہاں لڑائی میں مکا شکا لگا ہے شاہ زیب کو۔ ساری جگہ سرخ ہو رہی ہے۔"

"چل ہٹ۔ ایویں ٹرٹر کر رہی ہے۔ مکے اسے نہیں لگے۔ اس باقرے کو لگے ہیں جو یہاں بگیاڑ بنا پھرتا تھا۔ میرے بچڑے نے میرا سر فخر سے اور اونچا کر دیا ہے...... میرا ڈھول سپاہی...... میرا شیر پتر۔" اس نے خوشامدی انداز میں ایک بار پھر میری بلائیں لیں اور اخروٹ کے حلوے کا چمچ بھر کر میرے منہ میں ڈال دیا۔

مانی کاغذ کو دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے تھام کر بولی۔ "تو پھاڑ دوں اس کو؟"

"نہیں...... نہیں۔ ہوسکتا ہے کوئی کام کی بات ہو اس میں۔" میں نے کہا۔ اس نے بے پروائی سے کاغذ میرے ہاتھوں میں دیا اور بولی۔ "مجھے تو کوئی لو لیٹر ہی لگتا ہے۔" پھر لہراتی، بل کھاتی ہوئی واپس چلی گئی۔

ماؤ نے میرے کندھے پر اپنا بھاری ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "اس کی باتوں کی پروا نہ کیا کر، جھلی ہے۔"

میں نے سوچا۔ 'جھلی تو تم دونوں دادی پوتی ہو بلکہ تم تو اس سے بھی دو ہاتھ آگے نکلی ہوئی ہو۔'

مانی سے میری جان، ماؤ نے چھڑائی تھی۔ ماؤ سے میری جان چھڑانے کے لیے فخرو وہاں پہنچ گیا۔ اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر ذرا ہانپے ہوئے لہجے میں کہا۔ "آپ کو چھوٹے سردار بلا رہے ہیں...... فوراً......"

مجھے اندازہ تھا کہ وہ مجھے کیوں بلا رہا ہے۔ کچھ دیر پہلے میں نے باقرے سے لڑائی کے بعد سردار سجاول سے جو بات کہی تھی، وہ یقیناً سیدھی اس کے کلیجے پر لگی تھی، وہ اندر سے بری طرح تلملایا ہوا نظر آیا تھا۔ اب اس نے فرصت ملتے ہی مجھے بلا بھیجا تھا۔

میں ماؤ سے رخصت ہو کر سجاول کے کمرے میں پہنچا تو وہ بڑے سائز کی کرسی پر پھیل کر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ڈرنک کم ہی کرتا تھا مگر فی الوقت کر رہا تھا۔ کڑوا کسیلا گھونٹ اپنے معدے میں اتار کر بولا۔ "یہ کیا حماقت کی ہے تم نے۔ میں سمجھتا تھا، تھوڑی بہت عقل ہو گی تم میں؟"

"کیا ہوا سردار؟"

”تم اچھی طرح جانتے ہو۔“ وہ پھنکارا۔ ”مقابلے کے بعد تم نے مجھ سے لڑنے کی جو بات کی تھی، وہ ہم دونوں تک نہیں رہی ہے۔ اس دنیا میں بس تم ہی سمجھ دار پیدا نہیں ہوئے، اور بہت سے لوگ بھی اڑتی چڑیا کے پر گن لیتے ہیں۔ بہت سے لوگوں نے تاڑ لیا ہے کہ تم نے مجھ کو اپنے ساتھ لڑنے کی دعوت دی ہے۔“

”لیکن، میں نے تو اتنی آہستہ آواز میں کہا تھا کہ تم نے بھی مشکل سے سنا تھا۔“

اس نے ایک اور گھونٹ بھر کر کہا۔ ”لیکن کچھ دن پہلے تم نے یہ بات سب کے سامنے کہی تھی۔ فیض وغیرہ بھی موجود تھے۔ موجود تھے یا نہیں؟“ سجاول کی آواز میں طیش کے شعلے تھے۔

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”تو سردار! اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ پریشان تو مجھے ہونا چاہیے کہ اپنی حماقت کی وجہ سے میری زندگی داؤ پر لگ جائے گی۔“

میرے طنزیہ لہجے نے اسے اور آگ بگولا کیا۔ میں چاہتا بھی یہی تھا۔ وہ سرسراتی آواز میں بولا۔ ”بڑا غرور ہے تمہارے اندر۔ یہ غرور تمہیں مار ڈالے گا۔ لاش پہچانی نہیں جائے گی تمہاری۔“

”یہ فیصلہ تو وقت کرے گا۔“ میں نے پھر اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔

اس کا چٹانی چہرہ سرخ انگارہ ہو گیا۔ ایک لحظے کے لیے مجھے لگا کہ میں جس لڑائی کی بات کر رہا ہوں، وہ ابھی شروع ہو جائے گی۔

تاہم پھر سجاول نے خود کو سنبھالا۔ شاید وہ سمجھ گیا تھا کہ میں اسے طیش دلانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ خود کو پُرسکون کرنے کے لیے اس نے مشروب مغرب کا آدھا گلاس یک بیک گلے میں انڈیل لیا اور سگریٹ کو مٹھی میں دبا کر اس کے دو گہرے کش لے کر بولا۔ ”دیکھو شاہی! میں سمجھتا ہوں کہ تم...... کام کے بندے ہو...... باقرے کو نیچا دکھانے کے بعد تمہاری قدر میری نظروں میں اور بڑھ گئی ہے لیکن تم نے یہ بے وقوفی والی بات کر کے اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ تمہیں اس بات سے پیچھے ہٹنا پڑے گا۔ سب کے سامنے بتانا پڑے گا کہ تم اس طرح کی کوئی لڑائی نہیں چاہتے۔“

”میں یہ کیوں کہوں؟“ میں نے اپنا باغی لہجہ برقرار رکھا۔ میری آنکھوں کے سامنے رحیم کی لاش تھی۔

”میں تمہیں ضائع کرنا نہیں چاہتا۔“ سجاول نے دانت پیس کر شعلہ بار لہجے میں کہا۔

”اور میرا خیال ہے کہ تم جان چھڑانا چاہتے ہو۔“

''بکواس بند کرو۔'' وہ اتنی زور سے دہاڑا کہ کمرے کی دیواریں لرزتی محسوس ہوئیں لیکن اگر وہ یہ سمجھتا تھا کہ اس طرح میرا پتا پانی ہو جائے گا، تو یہ اس کی بھول تھی۔

میں اپنی جگہ اطمینان سے بیٹھا رہا۔ وہ چند سیکنڈ بعد پھر پھنکارا۔ ''تم میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے ہو۔ اگر میں ان لوگوں کا سردار ہوں تو ایسے ہی نہیں ہوں۔ ایسے ہی نہیں ہوں۔''

''مجھے یہ جاننے کی زیادہ ضرورت بھی نہیں۔ تمہاری طرح میں بھی دو ہاتھ اور دو پاؤں رکھتا ہوں۔ دیکھنا چاہتا ہوں کہ میں کتنے پانی میں ہوں۔''

''باقرے کو پچھاڑ کر تم بانس پر چڑھ بیٹھے ہو۔ تمہارا پانی اتنا گہرا نہیں ہے۔''

''تمہارے سب سے بہتر بندے سے تو گہرا ہی ہے۔'' میں نے بلا جھجک جواب دیا۔

وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ''یہ اکیلا ہی نہیں، اس طرح کے اور بندے بھی ہیں میرے پاس...... کسی اور سے لڑ لو۔''

''دیگ کے ایک دانے سے سارے چاولوں کا پتا چل جاتا ہے۔'' میں نے زہر خند انداز میں کہا۔

اس کا پارا ایک بار پھر ساتویں آسمان کی طرف حرکت کرنے لگا۔ اس نے اٹھ کر بے قراری سے کمرے میں دو چکر لگائے، تب دوبارہ رنگین پایوں والی جہازی سائز کرسی پر بیٹھ گیا۔ لمبی سانس لے کر بولا۔ ''میرے بڑوں کا مجھے حکم ہے۔ میں تمہیں سوچنے کا موقع دیتا ہوں۔''

''میں ابھی انکار کرتا ہوں۔''

''نہیں...... کم از کم دو دن تک سوچو۔'' اس نے پچکارا۔ ''پھر مجھے جواب دینا۔ اس کے بعد میں تمہیں ایک موقع اور دوں گا...... اگر......''

سجاول کی بات ادھوری رہ گئی۔ کہیں دور سے فائرنگ کی آواز سنائی دی تھی، اس کے ساتھ ہی کسی نے عجلت میں سردار کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

''آجاؤ۔'' سردار سجاول نے کہا۔

فیض ذرا گھبرایا ہوا اندر داخل ہوا۔ ''سردار! اوپر سڑک کی طرف فائرنگ ہو رہی ہے۔ ابھی احمد کا فون آیا ہے۔ کہتا ہے، یہ وہی ملنگ لگتے ہیں۔ کافی سارے بندے لے کر آئے ہیں......''

سجاول نے دانت پیس کر کچھ کہا پھر اپنے قیمتی موبائل سیٹ پر کال ملاتا ہوا احاطے کی

طرف چلا گیا۔ فائرنگ کی آوازیں کم وبیش تین چار کلومیٹر کے فاصلے سے آرہی تھیں اور خاصی مدھم تھیں۔

فیض محمد نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو، تمہیں پناہ دینا کتنا مہنگا پڑ رہا ہے ہمیں۔ ملنگوں نے ابھی تک تمہارا پیچھا نہیں چھوڑا۔''

''میں نے کب پناہ مانگی ہے چاچا۔ ہمیں تو قیدی بنایا ہوا ہے تم لوگوں نے۔ چھوڑ دو ہمیں۔ ہم خود ہی نمٹ لیں گے ان سے...... اور...... یہ بھی کیا ضروری ہے کہ یہ ملنگ ہی ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی اور دشمن گروپ ہو تمہارا۔''

''نہیں یہ وہی ہیں۔ ہمارے بندوں نے دیکھا ہے انہیں، ان کمینوں نے یہی سمجھ رکھا ہوگا کہ وہاں درختوں پر درجن آدھی درجن بندے ہیں، اس ڈیرے کا انہیں کچھ پتا نہیں ہے اور نہ ہی یہ پتا ہے کہ یہاں سے انہیں کیسا ظالم جواب مل سکتا ہے۔ بڑا نقصان اٹھائیں گے۔''

فائرنگ کی آواز فاصلے سے آرہی تھی مگر پھر بھی پتا چل رہا تھا کہ شدت کی فائرنگ ہے۔ آٹومیٹک اور پمپ ایکشن رائفلیں استعمال ہورہی تھیں۔ کبھی کبھی چھوٹے ہتھیار کی آواز بھی سنائی دے جاتی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد میں نے اصطبل کی طرف سے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سنی۔ تاریکی میں ٹارچیں چمک رہی تھیں۔ قریباً بیس کے قریب گھڑ سوار تیزی سے گھوڑے بھگاتے ہوئے احاطے سے باہر نکل گئے۔ وہ سب کے سب مسلح تھے۔ یقیناً سجاول بھی ان میں شامل تھا لیکن میں اسے دیکھ نہیں سکا۔

فیض محمد کو وہیں چھوڑ کر میں تاجور کے پاس کمرے میں پہنچا۔ اسے ابھی تک باقرے سے ہونے والی میری مار کٹائی کی کوئی خبر نہیں تھی۔ تاہم فائرنگ کی آوازوں نے اسے پریشان کر رکھا تھا۔

''یہ آوازیں کیسی آرہی ہیں شاہ زیب؟''

''پتا نہیں، میں نے ابھی سنی ہیں۔ شاید یہ لوگ کوئی مشق وغیرہ کر رہے ہیں یا چاند ماری۔''

''مگر میں نے ابھی دیکھا ہے، کئی گھوڑ سوار افراتفری میں باہر نکلے ہیں۔''

''اچھا......؟'' میں نے حیرانی ظاہر کی۔

''جب چاند گڑھی میں یہ سجاول کے بندے حملہ کرتے تھے تو ایسی ہی آوازیں آتی تھیں۔ مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے۔''

میں نے اس کا خوف کم کرنے کے لیے ہلکا پھلکا انداز اختیار کیا۔ ''جب تم ایسے بات

کرتی ہو تو مجھے وہی گانا یاد آجاتا ہے۔ بابا، مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے۔"

میرے انداز نے واقعی اس کا خوف کچھ کم کر دیا۔ وہ بستر پر بیٹھ گئی اور کان لگا کر آوازیں سننے لگی۔ اچانک اس کی نگاہ میری ران کی خون آلود پٹی پر پڑ گئی۔ اس کی پریشانی میں خاطر خواہ اضافہ ہو گیا۔ میں نے اسے بمشکل یہ کہہ کر مطمئن کیا کہ سجاول کے ایک خر دماغ کارندے سے جھڑپ ہو گئی تھی۔ ایک ٹوٹا ہوا شیشہ یہاں لگا ہے۔ اسی دوران میں چھ سات گھڑ سواروں کی ایک اور ٹولی گھوڑے بھگاتی احاطے سے نکل گئی۔ تاجور کی ساری توجہ گھڑ سواروں کی طرف ہو گئی۔

وہ پُر امید لہجے میں بولی۔ "شاہ زیب! کیا پتا، یہ پولیس والے ہوں۔"

"ہاں ہو بھی سکتا ہے۔" میں نے ہاں میں ہاں ملائی۔

میں یہ اسے کیسے بتا سکتا تھا کہ یہ ملنگی ڈیرے کے خونخوار ملنگ ہیں...... اور صرف ہمارے لیے یہاں آئے ہیں۔ کیونکہ ان کی پردے والی سرکار کو مار کر ہم ان کی دنیا اندھیر کر چکے ہیں اور وہ ہمیں "دردناک عذاب" دینے کے لیے زمین کی ساتویں تہ سے بھی نکال لینا چاہتے ہیں۔

میری نگاہوں میں وہ سارے خونی مناظر پھر سے گھومنے لگے جو ملنگی ڈیرے کی پُراسرار دیواروں میں پیش آئے تھے۔ پردے والی سرکار کی کراہت آمیز دید...... اس کا ریشمی کی جان لینے کی کوشش کرنا اور میرا اس پر چڑھ دوڑنا...... پھر پالتو چیتوں کی خوفناک جھپٹ، ان کے پھڑکتی ہوئی لاشیں، لکڑی کے پل کے آس پاس ہمارے اور ملنگوں کے درمیان خون ریز لڑائی۔ میری، رضوان اور انیق کی زبردست مزاحمت اور اس سب سے بڑھ کر عمر رسیدہ گول کیپر کا آخری اسٹینڈ۔

"کیا سوچ رہے ہیں؟" تاجور نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔

"نہیں، کوئی خاص بات نہیں۔" میں نے کہا۔

اگلا قریباً آدھ گھنٹا شدید کشمکش میں گزرا۔ پھر فیض محمد کے تاثرات سے مجھے اندازہ ہوا کہ حسبِ توقع سجاول اور اس کے ساتھی ملنگوں پر غالب رہے ہیں۔ فائرنگ بھی اب تھم چکی تھی۔ ہمارے اردگرد حالات معمول پر نظر آ رہے تھے۔ کم و بیش ایک گھنٹے بعد سجاول اور اس کے ساتھی واپس آ گئے۔ احاطے میں جلتی ہوئی تین چار مشعلوں کی روشنی میں، میں نے دیکھا، سجاول کے ساتھیوں کی ایک ٹولی، دو افراد کو ہانکتی ہوئی اپنے ساتھ لا رہی تھی۔ ان میں سے ایک مرد تھا، دوسری عورت۔ دونوں کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ مرد زخمی نظر آتا تھا۔

عورت واویلا کر رہی تھی اور ڈکیتوں سے اپنی پشت پر چھڑیاں کھا رہی تھی۔ یقیناً وہ ملنگی ڈیرے کی کوئی ملنگنی ہی تھی۔ شاید وہ پردے والی سرکار کی عقیدت میں اندھی ہو کر اس خطرناک مہم، میں مردوں کے ساتھ چلی آئی تھی اور پکڑی گئی تھی، اس کی عمر چالیس کے آس پاس رہی ہوگی شکل کی بھی معمولی تھی لیکن اس کے ساتھ اب یہاں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ وہ پکار رہی تھی۔ ”مستاں مائی کی دیوانی ہوں...... پردے والی سرکار کی ملنگنی ہوں۔ بہت بری موت مرو گے۔ کیڑے پڑیں گے تمہارے پنڈے میں......“

خطرناک شکلوں والے ڈکیت ان دونوں کو دھکیلتے ہوئے اور گالیاں دیتے ہوئے اندرونی حصے میں لے گئے۔ خدا کا شکر تھا کہ تاجور کی نگاہ ان مناظر سے محفوظ رہی تھی۔ وہ اندر اپنے کمرے میں تھی۔ میں چاہتا تھا کہ میری ملاقات فیض سے ہو جائے تاکہ مجھے پتا چل سکے کہ ملنگوں پر کیا گزری۔ لیکن وہ کہیں دکھائی نہیں دیا۔ واپس کمرے میں جا کر تاجور کو سمجھانے بجھانے میں مجھے کافی وقت لگا۔ میں نے اسے بتایا کہ بظاہر تو یہ ان ڈکیتوں کا کوئی مخالف گروپ لگتا ہے، جسے ان لوگوں نے مار بھگایا ہے۔ رات گئے تک میں جاگتا رہا۔ ایک تو یہ پریشانی تھی کہ ملنگوں نے ابھی تک ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا، اور وہ چاندگڑھی میں ریشمی وغیرہ کو بھی نقصان پہنچانے کی چھوٹی بڑی کوشش کر سکتے ہیں۔ دوسری بات یہ تھی کہ رحیم کی تاجور کے بارے میں کہی ہوئی بات میرے ذہن سے نکل نہیں پا رہی تھی۔ ”تاجور کو تیار کرنے میں دو سال کا وقت لگے گا۔“ آخر اس کا کیا مطلب تھا؟ یہ بات کن معنوں میں کہی گئی تھی؟

○......❖......○

اگلے روز تاجور نے ایک ایسا کام کیا، جس کی مجھے ہرگز امید نہیں تھی۔ اس سیدھی سادی لڑکی نے اپنی خداداد ذہانت سے ایک معما حل کر ڈالا۔ میں بیدار ہوا تو وہ بیڈ پر بیٹھی بڑے غور سے کچھ پڑھ رہی تھی۔ دو ریشمی لٹیں دلکش چہرے پر جھول رہی تھیں۔ میں یہ دیکھ کر چونکا کہ اس کے ہاتھ میں وہی ناقابلِ فہم تحریر والا خط ہے۔ غالباً میرے کپڑے جھاڑتے ہوئے اسے یہ ملا تھا۔ مجھے بیدار ہوتے دیکھ کر وہ بولی۔ ”یہ کیا اوٹ پٹانگ لکھا ہے شاہ زیب؟“

”بس اوٹ پٹانگ ہی ہے۔ رحیم نے مجھے دیا تھا۔ اسے بھی پتا نہیں چل سکا تھا۔“

”لیکن میری سمجھ میں آ گیا ہے۔ یہ الٹ لکھا ہوا ہے۔“ وہ عام سے لہجے میں بولی۔

میں تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔ ”الٹ لکھا ہوا ہے؟ کیا مطلب؟“

وہ کسی استانی کی طرح مجھے سمجھانے لگی۔ ”...... یہ دیکھیں نا۔ یہ پہلا لفظ ہے رٹسام۔ یعنی رٹ س ام۔ اب ان حرفوں کو الٹ کر پڑھیں۔ تو یہ بن جائے گا ماسٹر۔ اب اگلا لفظ

دیکھیں۔ یہ ہے بحاص۔ یعنی ب ح اص۔ اب اس کو الٹا کر پڑھیں تو یہ بنے گا......ص اح ب...... صاحب۔ یہ بن گیا ماسٹر صاحب۔ آگے لکھا ہوا ہے...... پاتہب ٹیل وہ۔ پا یعنی آپ۔تہب یعنی بہت......ٹیل یعنی لیٹ...... وہ یعنی ہو......اب یہ سارا فقرہ اس طرح ہو گیا...... ماسٹر صاحب! آپ بہت لیٹ ہو۔“

وہ تعریف طلب نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں واقعی ششدر تھا۔وہ گتھی جس نے بہت دنوں تک عبدالرحیم کو پریشان رکھا تھا اور پھر کئی دنوں سے مجھے اور پہلوان حشمت کو بھی الجھایا ہوا تھا۔تاجور نے بڑی سادگی سے سلجھا دی تھی اور کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے،کوئی لا ینحل معما، یونہی بیٹھے بٹھائے اچانک کسی کی سمجھ میں آجاتا ہے اور معما حل کرنے والے کو خود بھی پتا نہیں ہوتا کہ اس نے کتنا بڑا کام کر دیا ہے۔تاجور اب جوڑ کر اگلا جملہ پڑھ رہی تھی۔”روب جم“ وہ رک طخ انکھل اپ: روب جم کو اس نے الٹ کر ”مجبور“ پڑھا۔ وہ کو ہو بنایا۔ طخ کو خط...... انکھل کو لکھنا اور اڑپ کو پڑا۔ سارا فقرہ یوں بن گیا۔ مجبور ہو کر خط لکھنا پڑا۔

میں نے خط تاجور کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔ وہ ”معصوم حیرانی“ کے ساتھ میری طرف دیکھنے لگی۔ اس ناقابلِ فہم تحریر کی ”چابی“ مل گئی تھی۔ اب یہ سارا خط لفظ بہ لفظ ”ڈی کوڈ“ ہو رہا تھا۔ رٹسام بحاص پاتہب ٹیل وہ۔ ”روب جم“ وہ رک طخ انکھل اڑپ۔ (ماسٹر صاحب آپ بہت لیٹ ہو۔ مجبور ہو کر خط لکھنا پڑا)

میں نے خط پڑھنا شروع کیا اور میری آنکھیں کھلتی چلی گئیں۔ دل کی دھڑکن بڑھتی جارہی تھی۔ یہ کوئی معمولی خط نہیں تھا۔ یہ ایک زبردست انکشاف کی حیثیت رکھتا تھا۔ نیچے کی سطروں میں ایک فقرہ کچھ اس طرح سے تھا...... ”باروجات ایک یبھ چھک انرک (کرنا) وہ اگ۔“

میری نگاہوں کے سامنے چاندگڑھی کے عالمگیر کا مکروہ چہرہ نمایاں تر ہوتا چلا جارہا تھا۔

○......❖......○

جس فقرے کا میں نے ذکر کیا ہے، اس کا مطلب کچھ اس طرح سے تھا۔ با کا مطلب ''اب'' اور روجات کا مطلب ''تاجور'' تھا۔ الٹا لکھا ہوا پورا فقرہ اس طرح سے تھا۔ باروجات اک ہبھ چھک انرک وہ اگ۔ حرفوں کو سیدھا کر کے پڑھا جاتا تو مطلب یہ تھا...... اب تاجور کا بھی کچھ کرنا ہوگا۔ اگلا فقرہ تھا، ہم نے پیسے پکڑے ہوئے ہیں۔ ہم ذمے دار ہیں۔

یہ سارا خط ہی عجیب وغریب تھا۔ تحریر اس طرح تھی۔

''ماسٹر صاحب! آپ بہت لیٹ ہو۔ مجبور ہو کر خط لکھنا پڑا۔ آپ کو پتا ہی ہے ادھر میری طرف حالات زیادہ ٹھیک نہیں...... مولوی کی بیٹی زینب اسلام آباد کے اسپتال میں ہے۔ اسے وہاں سے نکالنا آسان نہیں۔ وہ تو جب چاندگڑھی آئے تو کچھ ہو سکتا ہے۔ اب تاجور کا بھی کچھ کرنا ہوگا۔ ہم نے پیسے پکڑے ہوئے ہیں، ہم ذمے دار ہیں۔ اسحاق خبیث تو اب تاجور کے معاملے میں ڈھیلا پڑ گیا ہے۔ پرسوں بھی لورو سے فون آیا ہے۔ بڑے صاحب اب زیادہ انتظار نہیں کر سکتے۔ کم از کم ایک لڑکی تو ہمیں فوراً بھیجنی پڑے گی، باقیوں کے لیے ٹائم مل سکتا ہے۔ تم اپنے والی لڑکی کی خوراک تھوڑی بڑھا دو۔ میرا خیال ہے کہ وہ اب دو تین ہفتے میں تیار ہو سکتی ہے۔ ایسا نہ ہوا تو رقم تو ڈوبے گی ہی، یہ نہ ہو کہ بڑے لوگوں کی دشمنی بھی مول لینی پڑے۔ باقی سجاولے کی طرف سے بے فکر رہو۔ اس معاملے میں وہ بالکل بھی شامل نہیں ہے، یہ بس ہمارا اور تمہارا معاملہ ہے......'' (خط کی آخری دو تین سطریں غائب تھیں کیونکہ کاغذ پھٹ گیا تھا)

تاجور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ یقیناً وہ خط کے مندرجات جاننا چاہتی تھی۔ وہ خود بھی خط پڑھنے کی خواہش کر سکتی تھی...... اور خط میں اس کا نام موجود تھا۔ مجھے تھوڑی سی اداکاری کرنا پڑی۔ اس سے پہلے کہ وہ خط کے حوالے سے مجھ سے کوئی بات کرتی، میں نے چونک کر کھڑکی کی طرف دیکھا اور اس سے کہا۔ ''فیض بلا رہا ہے۔ میں ابھی آیا۔''

خط کو جیب میں ڈالتا ہوا، میں تیزی سے باہر نکل گیا۔

ذہن میں آندھی چل رہی تھی۔ یہ کیا گورکھ دھندا تھا۔ دو تین ہفتے میں لڑکی تیار ہو سکتی ہے۔ اس کا کیا مطلب تھا۔ کیا اسے بھی زینب کی طرح زہر دے کر کسی کام کے لیے تیار کیا جا رہا تھا اور تیار ہونے کے بعد اسے "لورو" نامی جگہ پر کس بڑے صاحب کے حوالے کیا جانا تھا۔ کیا وہ کوئی جرائم پیشہ تھا یا عیاش امیرزادہ تھا؟ یا کچھ اور؟ اس سارے خط میں ایک بات دلچسپ تھی اور اہم بھی۔ جس طرح کی جدوجہد ہم کر رہے تھے اس میں یہ ہمارے بہت کام آ سکتی تھی۔ کہتے ہیں کہ محبت اور لڑائی میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔ یہ صورتِ حال میرے لیے ایک کھلی لڑائی کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ لڑائی میں اپنے دشمن کے درمیان تفرقہ پیدا کرنا اور اسے کمزور کرنا بھی حکمتِ عملی کا حصہ ہوتا ہے۔ اس سے پہلے چاند گڑھی میں، میں یہ حکمتِ عملی بڑے اچھے طریقے سے استعمال کر چکا تھا۔ میں نے عالمگیر اور تحصیل دار ٹوانہ کو لڑا کر ان کا زور نمایاں حد تک کم کر دیا تھا۔ اب صورتِ حال کچھ ایسی بن رہی تھی کہ عالمگیر اور سجاول کے درمیان بھی دراڑ پیدا کی جا سکتی تھی اور اس کا موقع اس خط کے اندر ہی موجود تھا۔ یقیناً یہ خط عالمگیر کی طرف سے کسی ماسٹر صاحب کو بھیجا گیا تھا۔ اس خط میں عالمگیر نے تحریر کروایا تھا کہ یہ معاملہ دوسرے معاملوں سے الگ ہے اور اس کی سجاول کو کچھ خبر نہیں۔ سجاول کو بیگانگی کے انداز میں "سجاولا" لکھا گیا تھا۔

میں فیض سے ملنے کا بہانہ کر کے کمرے سے نکلا تھا۔ باہر نکلا تو فیض سے ہی ملاقات ہو گئی۔ وہ بے دھیانی میں اپنی برف جیسی سفید مونچھوں کو سہلاتا میری طرف ہی آ رہا تھا۔ چہرے پر پریشانی تھی، مجھے دیکھ کر یہ پریشانی اور بڑھ گئی، افسردہ انداز میں بولا۔ "میں تمہاری ٹانگ کا حال پوچھنے آ رہا تھا...... اب کیسی ہے چوٹ؟"

"زیادہ گہرا کٹ نہیں تھا، اب ٹھیک ہوں۔" میں نے کہا۔

وہ بولا۔ "شاہ زیب! تم اپنے لیے مشکلیں بڑھا رہے ہو۔ اس سے بڑھ کر بے وقوفی کیا ہو گی کہ تم چھوٹے سردار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر رہے ہو اور ایک ایسی بے تکی بات کر رہے ہو جو تمہاری زندگی ختم کر سکتی ہے۔"

یقیناً فیض وہی بات کہہ رہا تھا جو یہاں پر ہر ایک کی گفتگو کا موضوع بنی ہوئی تھی۔ یعنی میرا ابا قرے بگھیاڑ کو ہرانا اور پھر چھوٹے سردار کو لڑنے کا چیلنج......

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا، میری نگاہ دور ایک منظر پر پڑی۔ کچھ افراد ایک شخص کو کھینچتے ہوئے چٹانوں کی اوٹ میں لے جا رہے تھے۔ اس کے ہاتھ رسّی سے پشت

پر بندھے تھے اور پاؤں میں بھی رسّی کی بیڑی نما بندش تھی۔

میں نے فیض سے پوچھا۔ ''یہ وہی ملنگ ہے جسے کل پکڑا گیا تھا؟''

فیض نے اثبات میں جواب دیا اور بولا۔ ''آج یہ اپنے کیے کی سزا بھگتے گا۔''

''کیا مطلب؟ کیا کیا تھا اس نے؟''

''جو اسے نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' فیض محمد نے کہا پھر مجھے کل رات والے واقعے کی تفصیل بتانے لگا۔ اس کی باتوں سے پتا چلا کہ کل رات سجاول کے ساتھیوں اور مسلح ملنگوں میں ٹھیک ٹھاک رن پڑا ہے۔ جب ملنگوں نے اوپر سڑک کے قریب حملہ کیا، درختوں میں صرف چار بندے موجود تھے۔ ملنگوں نے ایک کو مار دیا، ایک کو پکڑ لیا اور دو کچھ دیر مقابلہ کرنے کے بعد بھاگ گئے۔ اتنی دیر میں یہاں نیچے ڈیرے پر بھی خبر ہوگئی اور فی الفور کمک وہاں پہنچ گئی۔ ملنگوں کو بالکل امید نہیں تھی کہ یہاں اور لوگ بھی موجود ہیں اور ایک دم اتنے زیادہ مسلح افراد سے ان کا سامنا ہو جائے گا۔ ایک بار پھر زبردست فائرنگ شروع ہوئی۔ ملنگوں نے ایک دو منٹ مزاحمت کی پھر ایک لاش چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ دو کو پکڑ لیا گیا۔ ان میں ایک وہی ملنگنی تھی جسے میں نے کل شب شرابی ڈکیتوں کے نرغے میں دیکھا تھا۔ دوسرا یہ شخص اصغر نامی تھا۔ اس سے ایک سنگین غلطی ہوئی تھی۔ شروع میں جب سجاول کے ساتھی پسپا ہو گئے تھے، اس نے پکڑے جانے والے ڈکیت پر تشدد کیا، پہلے گولیاں چلا کر اس کے گھٹنے توڑے، پھر اس کے منہ میں پستول رکھ کر گولی چلا دی۔ (وہ اس سے باقی ساتھیوں اور ہمارے بارے میں پوچھ رہا تھا) اب اس سنگین جرم کی پاداش میں اسے سزا دی جارہی تھی۔ درمیانی عمر کی ملنگنی اب ڈکیتوں کے حوالے تھی اور یقیناً اس کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں ہونا تھا۔

''اب کیا کریں گے اس ملنگ کے ساتھ؟'' میں نے فیض سے پوچھا۔

''پھانسی۔''

''کیا مطلب؟''

''آؤ چل کر دیکھ لو، اگر دیکھنا ہے تو؟''

میں فیض کے ساتھ ان چٹانوں کی طرف چل پڑا جن کی اوٹ میں سجاول کے مسلح ساتھی جمع ہو رہے تھے۔ وسیع وعریض احاطے کے ساتھ یہ ایک چھوٹا سا احاطہ خود بخود بن گیا تھا۔ دو طرف اونچی نکیلی چٹانیں تھیں، تیسری طرف وہ بلند درخت تھے جن پر مچانیں بنی ہوئی تھیں۔ یہاں کم و بیش تیس افراد جمع تھے۔ ایک اونچے درخت پر رسّے کا پھندا جھول رہا تھا۔ قریب ہی

ایک سیاہ گھوڑا بھی کھڑا تھا۔ ایک چبوترا نما ہموار چٹان پر سجاول آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا، اس کے اردگرد مسلح افراد موجود تھے۔ باقی دائرے کی شکل میں کھڑے تھے۔ سجاول کے قریب ہی مجھے اس کا دست راست باقر بگھیاڑ بھی کھڑا نظر آیا۔ یہاں زیادہ تر افراد شلوار قمیص میں دکھائی دیتے تھے مگر باقر اجین اور جیکٹ وغیرہ پہنتا تھا۔ اس نے حسبِ توقع کینہ توز نظروں سے مجھے دیکھا۔ باقرے کا رنگ، اس کے گھونگریالے بال، اس کا قد کاٹھ...... تقریباً سب کچھ عبدالرحیم سے ملتا تھا، اور یہی مشابہت تھی جو عبدالرحیم کی بدنصیبی بن گئی تھی۔ باقرے کو دیکھ کر میرے اندر طیش کی بلند لہر سی اٹھ جاتی تھی۔ یہی شخص تھا جسے قانون سے بچانے کے لیے جواں سال رحیم کی زندگی چھینی گئی تھی۔

جس ملنگ کو رسیوں سے باندھ کر یہاں لایا گیا تھا، وہ ابھی تک لمبے نیلے چولے میں تھا دیگر ملنگوں کی طرح اس کے بال بھی کندھوں تک پہنچ رہے تھے۔ اس کے گلے میں لکڑی کی رنگ برنگی مالائیں، سورج کی روپہلی کرنوں میں چمک رہی تھیں۔ اس کی یقیناً خاصی مار پیٹ بھی ہوئی تھی۔ اس کی پیشانی اور ناک سوجی ہوئی تھی۔ اس کا دم خم بالکل ختم ہو چکا تھا۔ وہ کبھی سجاول وغیرہ کی منت سماجت کرنے لگتا، کبھی اپنے پیرومرشد کا نام لیتا تھا۔ پھانسی کا پھندا اپنے سامنے دیکھ کر اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو چکا تھا۔ اس کی عمر اٹھائیس تیس سال رہی ہوگی۔ مجھے شک ہو رہا تھا کہ میں نے اس شخص کو اس قیامت خیز رات میں دیکھا تھا جب ''ملنگی ڈیرے'' کے اندرونی حصے میں میرا اور پردے والی سرکار کا آمنا سامنا ہوا تھا۔ جب میں ملنگی ڈیرے کی غلام گردشوں سے گزرتا خاص الخاص حصے کی طرف جا رہا تھا، میں نے ایک پہرے دار کو ایک جوان ماتحت عورت سے چھیڑ خانی کرتے دیکھا تھا۔ غالباً یہ وہی شخص تھا۔

دفعتاً مجھ پر ایک عجیب انکشاف ہوا۔ ملنگ اپنے پیرومرشد کا نام تو لے رہا تھا مگر کسی اور انداز سے۔ وہ اسے پکار نہیں رہا تھا بلکہ اس کے لیے توہین آمیز الفاظ استعمال کر رہا تھا۔ میں نے کان لگا کر سنا۔ وہ کراہنے والے انداز میں کہہ رہا تھا۔ ''پردے والی سرکار کمینی تھی، جھوٹی تھی، دغاباز تھی، وہ حرام کاری کرتی تھی ...... وہ اپنے پیو کی ناجائز اولاد تھی۔''

میں حیران رہ گیا۔ میں نے سرگوشی میں فیض سے کہا۔ ''یہ کیا کہہ رہا ہے۔ یہ تو پردے والی سرکار کا چیلا ہے۔''

فیض نے طنز سے کہا۔ ''تم نے سنا نہیں ہوا، ڈنڈا پیر، سب کا پیر۔ اب یہ ڈنڈے پیر کا چیلا ہے۔ موت کو سامنے دیکھ کر ساری مریدی شریدی بھول گیا ہے۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''ان لوگوں نے اس سے کہا ہے کہ جان بچانا چاہتے ہو تو اپنے فراڈیے پیر کو گالیاں دو۔ یہ دے رہا ہے لیکن جان پھر بھی نہیں بچے گی۔''

اور پھر چند منٹ بعد وہی کچھ ہوا۔ اصغر کی بیڑی کھولی گئی۔ سجاول کے ہرکارے اس کے رونے چلانے کی پروا کیے بغیر اسے گھسیٹتے ہوئے، سیاہ گھوڑے کے پاس لے گئے۔ اسے زبردستی گھوڑے پر بٹھایا گیا۔ تین چار افراد نے اسے تھامے رکھا۔ ایک نے درخت پر چڑھ کر رسّے کا پھندا اصغر کی گردن میں ڈال دیا۔ وہ آخری وقت تک سجاول کو پکارتا رہا۔ اس سے جان بخشی کی التجائیں کرتا رہا۔ مگر سجاول اور اس کے ساتھیوں کے چہروں پر رحم کی کوئی رمق نہیں تھی۔ پھندا اصغر کی گردن کے گرد اچھی طرح کسا گیا تو سب سجاول کی طرف دیکھنے لگے۔ سجاول کی مونچھوں تلے ایک زہریلی مسکراہٹ تھی۔ اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ایک شخص نے گھوڑے کو چھڑی رسید کی۔ وہ تیزی سے آگے نکلا اور اصغر ایک جھٹکے کے ساتھ رسے سے جھول گیا۔ اس کے جسم میں چند سیکنڈ کے لیے شدید تڑپ نمودار ہوئی پھر وہ بے جان سا ہو کر ہوا میں لہرانے لگا۔

تماشائیوں نے اس منظر میں تھوڑی بہت دلچسپی تو لی مگر ان کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ ایسے سنگین تماشوں کے عادی ہیں۔ چند ایک نے ہوائی فائر کر کے اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ سجاول ایک ادھیڑ عمر شخص کو تسلی دینے میں مصروف تھا۔ فیض کی زبانی مجھے پتا چلا کہ یہ شخص اس بندے کا ماموں ہے جو کل رات اصغر نامی اس ملنگ کے پستول سے ہلاک ہوا۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے اصغر نے پہلے اس کے گھٹنے توڑے تھے پھر اس کے منہ میں پستول رکھ کر فائر کیا، گولی اس کی کھوپڑی توڑ کر نکل گئی۔

اصغر کی لاش درخت پر سے اتار لی گئی اور بے پروائی سے زمین پر پھینک دی گئی۔ میں نے دائیں جانب دیکھا تو اسے دبائے جانے کے لیے گڑھا تیار کیا جا چکا تھا۔ نہ جانے اس طرح کے کتنے گڑھے اس پتھریلی زمین میں موجود تھے۔ کتنی بار پھانسی کا پھندا تیار ہوا تھا، کتنی بار گولیوں کی باڑ پر سجاول کے ''مجرموں'' کے جسم اچھلے تھے۔ ان لوگوں کے اپنے اصول، ضابطے تھے، اپنا قانون اور اپنی سزائیں۔

ایک شخص مردہ اصغر کے پشت پر بندھے ہوئے ہاتھ کھولنے میں مصروف ہو گیا۔ سجاول اب یہاں سے اٹھ کر جانے کے لیے تیار تھا۔ اچانک ایک آواز نے سب کو چونکا دیا۔ یہ آواز اصغر کی لاش پر جھکے ہوئے فیض محمد کی تھی۔ اس نے کچھ کہا تھا پھر وہ اصغر کو ہلانے جلانے میں

مصروف ہو گیا۔ اس نے اس کی گردن کو گھما پھرا کر دیکھا۔ تب اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اس کی دھڑکن محسوس کرنے کی کوشش کی۔ دوسرے شخص نے اصغر کے پپوٹے الٹے اور آنکھوں کا جائزہ لیا۔

فیض نے بلند آواز سے کہا۔ "چھوٹے سردار! مجھے لگتا ہے، یہ ابھی زندہ ہے۔"

سردار کے چہرے پر دلچسپی نمودار ہوئی۔ وہ چبوترے سے اتر کر بے حرکت جسم کے قریب پہنچ گیا۔ قریب سے اس کا جائزہ لیا۔ فیض نے دونوں ہاتھوں سے اصغر کے سینے کو زور زور سے دبانا شروع کر دیا۔ چند سیکنڈ بعد سب نے حیرت سے دیکھا کہ اصغر کے جسم میں حرکت نمودار ہو گئی۔ سب اس کے گرد جمع ہو گئے۔ سب حیران تھے۔ کسی نے اسے اٹھا کر نیم دراز کیا۔ کسی نے اسے پانی پلانے کی کوشش کی۔ کسی نے اس کو ٹھوڑی سے پکڑ کر جھنجوڑا۔

اگلے تین چار منٹ میں یہ ثابت ہو گیا کہ پھانسی پانے کے باوجود اصغر ابھی زندہ ہے۔ اس کی چربی دار گردن خاصی مضبوط تھی پھر شاید اس کے وزن کے حساب سے رسے کی لمبائی کم تھی، یا ایسی ہی کوئی اور وجہ تھی۔ اس کی سانس اور دھڑکن رک نہیں سکی تھی۔

ہجوم زبردست دلچسپی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ کچھ لوگ شاید اب اس بات کے خواہش مند نظر آ رہے تھے کہ اگر یہ شخص پھانسی لگنے کے باوجود بچ گیا ہے تو پھر اس کی سزا معاف کر دی جائے۔ مختلف چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ اصغر کو اب اس درخت سے ٹیک لگا کر بٹھا دیا گیا تھا جس کی شاخ سے اسے پھانسی دی گئی تھی۔ وہ نیم جان تھا، اٹک اٹک کر سانس لے رہا تھا، آنکھیں بند تھیں۔ کسی وقت لگتا تھا کہ دوبارہ بے ہوش ہو جائے گا۔

سجاول نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا، زیرلب مسکرایا پھر بلند آواز میں کہنے لگا۔ "تم لوگوں کا کیا خیال ہے۔ کیا ہونا چاہیے اس کے ساتھ؟"

سب خاموش تھے۔ جو آٹھ دس افراد اب ملنگ اصغر کی جان بخشی کے حامی نظر آتے تھے، ان میں فیض محمد بھی شامل تھا۔ اس نے ہمت کر کے کہا۔ "چھوٹے سردار! آپ جو فیصلہ کریں گے وہی اچھا ہوگا۔"

"پھر بھی تمہاری رائے کیا ہے؟"

فیض محمد نے ذرا توقف سے کہا۔ "پھاہے لگانے کی سزا (پھانسی) تو اسے بالکل برحق ہوئی ہے سردار...... لیکن اب یہ بچ گیا ہے، شاید اس کا کچھ دانہ پانی ابھی باقی ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھتے ہیں تو اس کی "موت کی سزا" معاف کر کے...... اسے کوئی اور سزا دے دی جائے۔"

سردار سجاول نے چند سیکنڈ تک اپنی تیکھی مونچھوں کو انگلی سے چھوا۔ طائرانہ نظر اردگرد کھڑے لوگوں پر ڈالی۔ محسوس ہوا کہ وہ کوئی نرمی کا فیصلہ کرنے والا ہے۔ میں نے اصغر کی طرف دیکھا۔ اس کی ٹیک بدستور درخت سے لگی ہوئی تھی۔ وہ نیم بے ہوش تھا مگر لگتا تھا کہ سب کچھ سن رہا ہے۔ اچانک دو دفعہ دھماکے سے گولی چلی۔ اصغر کا جسم دو بار اچھلا اور پھر پشت کے بل گر کر ساکت ہو گیا۔ سجاول کے ہاتھ میں اس کا نائن ایم ایم پستول نظر آ رہا تھا۔

مجمع پر کچھ دیر کے لیے سکتہ سا طاری رہا مگر پھر سب نارمل ہو گئے۔ سردار سجاول نے پستول دوبارہ ہولسٹر میں لگاتے ہوئے کہا۔ ''کل جو کچھ اس نے کیا ہے، اس کے بعد یہ معافی کے لائق نہیں تھا۔''

تب وہ اس ادھیڑ عمر شخص کی طرف مڑا۔ جو کل رات مرنے والے شخص کا ماموں بتایا جا رہا تھا۔ سجاول نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''کیوں، ٹھیک کہہ رہا ہوں میں؟''

''بالکل ٹھیک چھوٹے سردار۔'' ادھیڑ عمر شخص نے جوش سے کہا پھر آگے بڑھ کر مردہ اصغر کی لاش پر تھوک دیا۔

ایک دم چھاؤں سی ہو گئی۔ مجھے لگا جیسے سجاول کی سنگ دلی دیکھ کر سورج نے بھی بدلی میں منہ چھپا لیا ہے۔

○......❖......○

خفیہ خط، عبدالرحیم نے کئی روز تک اپنی شلوار کے نیفے میں اڑسے رکھا تھا، عبدالرحیم کے بعد اب میں نے یہ خط نیفے میں اڑس لیا تھا۔ تاجور نے مجھ سے کئی بار پوچھا کہ اس خط میں کیا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں بس اوپر کی تین چار سطریں ہی پڑھ سکا ہوں۔

''تو اب باقی بھی پڑھ لیں۔'' وہ اپنے لحاف میں گھستے ہوئے بولی۔

''خط ہوگا تو پڑھوں گا نا۔''

''کیا مطلب؟''

''خط فیض محمد نے لے لیا، بلکہ سمجھو چھین لیا۔ میں نے اسے بتایا کہ یہ مجھے اصطبل کے پاس پڑا ہوا ملا ہے۔ اسے شک ہو رہا ہے کہ یہ خط کل پکڑے جانے والے ''ملنگ جوڑے'' کے لباس میں سے گرا ہے۔ اب وہ اس پر مغز کھپانے میں مصروف ہے۔''

تاجور میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ اس کی خوب صورت سیاہ پتلیوں میں لالٹین کی لو کا عکس تھا۔ لٹیں خم کھا کر بائیں رخسار اور ٹھوڑی کو چھو رہی تھیں۔ یہ لٹیں جیسے اس کے بے مثال چہرے کے عشق میں مبتلا تھیں اور گاہے گاہے جھک کر اس کے رخساروں، ناک اور

ٹھوڑی کو بوسے دیتی رہتی تھیں۔ وہ بولی۔ ''مجھے ایسا کیوں لگتا ہے شاہ زیب کہ میرے اور آپ کے درمیان ایک پردہ ہے۔ اس پردے میں سے آپ تو مجھے دیکھ سکتے ہیں لیکن میں آپ کو بالکل نہیں دیکھ پاتی، کسی وقت، یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آپ اپنے ہیں لیکن کسی وقت یوں لگتا ہے کہ آپ بہت غیر ہیں...... بہت زیادہ غیر ہیں۔ آپ کے چہرے کے پیچھے کوئی اور چہرہ ہے، جسے دیکھنا بھی میرے لیے محال ہے۔''

''تمہارے واہموں کا علاج میں کس طرح کرسکتا ہوں۔ یہ خود میری سمجھ میں بھی نہیں آتا۔'' میں نے نیچے چٹائی پر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔

''آپ نے مجھے ابھی تک اپنے روزگار کے بارے میں بھی نہیں بتایا۔ آپ باہر کے ملک میں کیا کرتے رہے ہیں؟''

''میں نے تمہیں بتایا تو تھا۔ بچپن سے باکسنگ اور جوڈو کراٹے وغیرہ کا شوق تھا، بعد میں اسی شوق کو آگے بڑھایا اور پیشہ بنالیا۔ اس کو MMA یعنی مکس مارشل آرٹ کہتے ہیں۔ یورپ میں اس سے اچھے خاصے پیسے بن جاتے ہیں۔''

''لیکن بات صرف اتنی نہیں ہے۔ آپ نے ملنگی ڈیرے پر جس طرح بڑے پیر کو مارا۔ اس کے چیلوں پر فائرنگ کر کے ان کو مارا......اور اس سے بھی پہلے چاند گڑھی میں جس طرح سجاول کے لوگوں سے ٹکر لی......صرف ایک کھلاڑی تو اس طرح کے کام نہیں کرسکتا۔''

''بات تمہاری جان اور عزت کی حفاظت کی ہوگی تو میں اس سے بڑھ کر بھی کروں گا۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔

وہ بولی۔ ''شاید آپ سمجھتے ہوں کہ اس طرح میری نظر میں آپ کا قد کاٹھ بڑھ جائے گا لیکن ایسا نہیں ہے۔ یقین کریں جب میں ان باتوں کے بارے میں سوچتی ہوں تو مجھے آپ سے خوف آنے لگتا ہے......''

اچانک ہماری گفتگو کو بریک لگ گئے۔ کہیں پاس سے دھما دھم کی زوردار آوازیں سنائی دیں۔ میں نے کھڑکی سے دیکھا۔ کوئی عورت بھاگتی ہوئی آرہی تھی۔ یہ سبز چولے والی وہی ملنگنی تھی جسے کل پکڑا گیا تھا۔ وہ نیم عریاں تھی اور چلا رہی تھی۔ دو افراد اس کے پیچھے بھاگے اور اسے پکڑ لیا۔ ایک اور ٹارچ بردار بھی آگیا۔ تینوں نے مل کر اسے بمشکل اٹھایا۔ وہ انہیں ماں بہن کی گالیاں دے رہی تھی پھر اس نے ایک کے منہ پر تھوکا اور اول فول بولنے لگی۔ یہ شبہ بھی ہورہا تھا کہ شاید اسے زبردستی شراب پلائی گئی ہے۔ اس بے وقوف عورت کی حماقت پر افسوس ہی کیا جاسکتا تھا۔ یقیناً وہ اپنی اندھی عقیدت اور جوش کے ہاتھوں ان ڈکیتوں کے ہتھے

چڑھی تھی اور اس مصیبت کا شکار ہوئی تھی۔

تاجور نے بھی کھڑکی سے اس منظر کی تھوڑی سی جھلک دیکھی تھی۔ شکر ہے کہ احاطے میں ناکافی روشنی کے سبب وہ پھٹے لباس والی عورت کو بطور ملنگنی پہچاننے میں کامیاب نہیں ہوئی۔ اگر وہ پہچان لیتی تو سوال جواب کا ایک اور طویل سلسلہ شروع ہو جاتا۔

ہم سے غلطی ہوئی کہ ہم کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھنے میں مصروف ہو گئے اور عقب سے بے خبر رہے۔ دوسری غلطی یہ تھی کہ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ پتا نہیں کس وقت گوشت کی پہاڑی ماؤ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ جب تک ہم اسے پلٹ کر دیکھتے وہ فرش پر بچھی ہوئی چٹائی دیکھ چکی تھی۔ شکر تھا کہ اس وقت چٹائی پر سرہانہ اور کمبل وغیرہ نہیں پڑا تھا، ورنہ وہ جان جاتی کہ میں اور تاجور اب بھی اکیلے سو رہے ہیں۔

"یہ چٹائی کیوں بچھا رکھی ہے بچڑے؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔

"کھانا ادھر کھا لیتے ہیں نا۔" میں نے فوراً بات بنائی۔

"ہاں کھانا اکٹھے کھایا کرو اور ایک ہی تھالی وِچ کھایا کرو۔ اس سے محبت زیادہ ہوتی ہے۔" ماؤ نے کہا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ماؤ کے ہاتھ میں کچھ فریم شدہ تصویریں تھیں، بولی۔ "یہ دیکھو میں نے شہر سے منگوائی ہیں تمہارے لیے۔ تم دونوں کے لیے۔ یہ کمرے میں ہوں گی تو تمہارے لیے بہت چنگا ہوگا۔"

یہ چھوٹے بچوں کی تصویریں تھیں۔ بالکل ننھے منے پیارے پیارے بچے۔ ماؤ بولی۔ "ان کو دیواروں پر لگاؤ۔ سویرے تک یہ لگ جانی چاہئیں، کھل کھلا کے۔"

میں نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے فدا ہو جانے والی مصنوعی نظروں سے تاجور کی طرف دیکھا اور بولی۔ "میرا دل چاہتا ہے کہ یہاں جلد سے جلد تیری بیوی کی گود بھرائی کی رسم ہو۔ یقین کرو مجھے اتنی خوشی ہوگی کہ میں بتا نہیں سکتی کھل کھلا کے۔"

میں نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ تاجور کا شیشے سا شفاف چہرہ شرم سے سرخ ہو رہا تھا۔ (اور جب وہ سرخ ہوتا تھا تو کمال کر دیتا تھا) وہ خود کو بمشکل چپ رکھے ہوئے تھی۔ ماؤ نے اپنے ڈیڑھ کلو وزنی ہاتھ سے تاجور کے سر پر پیار دیا اور اسے تنقیدی نظروں سے تکتی ہوئی واپس چلی گئی۔

"بچے تو واقعی پیارے ہیں۔" میں نے فریم شدہ تصویروں کو دیکھ کر ٹھنڈی آہ بھری۔

"پلیز چپ رہیں۔" تاجور نے روہانسی آواز میں کہا اور لحاف اوڑھ کر لیٹ گئی۔ یقیناً

یہاں کا سنگین ماحول اس پر بری طرح اثر انداز ہو رہا تھا۔

○......❖......○

میں اور سجاول بند کمرے میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ سجاول نے حسبِ عادت سگریٹ کو مٹھی میں دبا کر ایک کش لیا اور بولا۔ ''دو دن پورے ہو گئے ہیں اب کیا فیصلہ کیا ہے تم نے؟''

''کون سا فیصلہ؟'' میں نے انجان بن کر کہا۔

''میں نے تمہیں کہا تھا، تمہیں سب کے سامنے اعلان کرنا ہو گا کہ تم نے جوش میں آ کر وہ بات کہہ دی تھی۔ تم مجھ سے لڑنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے اور اپنی کہی ہوئی بات پر شرمندہ ہو۔''

''اور میں نے بھی تم سے کہہ دیا تھا کہ میں یہ جھوٹ نہیں بولوں گا'' میں نے پرسوں کی طرح اپنا تاؤ دلانے والا انداز برقرار رکھا۔ ''ہاں، اس وقت میں تمہارے بس میں ہوں۔ تم جو سلوک چاہو مجھ سے کر سکتے ہو۔''

سجاول کے گلے کی رگیں پھول گئیں۔ یک ٹک میری طرف دیکھتا رہا پھر سنبھل کر بولا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ تم میرے بارے میں تھوڑا سا جان لو......''

''مجھے اس کی ضرورت نہیں...... اور میں کافی کچھ جان بھی چکا ہوں۔ بلکہ یہ سمجھو کہ وہ سب کچھ جاننے کے بعد ہی میرے اندر تم سے دو دو ہاتھ کرنے کی خواہش پیدا ہوئی ہے۔'' میں نے بے پروائی سے کہا۔

''کیا جانتے ہو، اور کیسے؟''

میں نے فیض کا نام لیے بغیر وہ سب کچھ بتا دیا جو چند روز پہلے مجھے معلوم ہوا تھا۔ وہی خداداد صلاحیت والی بات، جو ہر نسل کے پہلوٹی کے بیٹے میں آتی تھی...... اور اسی طرح کی دیگر باتیں جن میں سے زیادہ تر پر مجھے بالکل یقین نہیں تھا۔

اس نے نشست سے ٹیک لگا لی، کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ''اس کے باوجود میں تم سے لڑنا نہیں چاہتا۔ میں تمہیں سوچنے کا ایک اور موقع دینا چاہتا ہوں۔''

''مگر میں یہ موقع لینا نہیں چاہتا۔ میں چاہتا ہوں، جو سانپ نکلنا ہے جلد نکل آئے۔''

اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''نکلے گا سانپ...... اور تمہیں ڈسے گا بھی۔ مگر ذرا چھری کے نیچے سانس لے لو تو اچھا ہے، پرسوں تک اور سوچ لو۔''

''چلو...... ٹھیک ہے لیکن پرسوں میں بھی ایک چھوٹی سی شرط رکھوں گا۔''

''کیسی شرط؟''

''جس طرح تم میرا فائدہ سوچ رہے ہو۔ میں بھی تمہارا فائدہ سوچ رہا ہوں۔ کوئی ایسی شرط نہیں ہوگی جسے تم مان نہ سکو۔''

پتا نہیں کیوں سجاول کی آنکھوں میں میرے لیے نفرت کی چنگاریاں سی پھوٹنے لگی تھیں۔ میں نے اسے لڑائی کا چیلنج دیا تھا اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے اور میرے چیلنج کو اہمیت دینے پر مجبور تھا۔ میں نے اس کے بہترین بندے (باقرے) کو دھول چٹائی تھی۔

میں اس کے سامنے سینہ تان کر بیٹھا تھا۔ اسے جیسے ڈر تھا کہ میں کچھ دیر اور یہاں بیٹھا رہا تو وہ مجھ پر پل پڑے گا۔ وہ پھنکارا۔ ''ٹھیک ہے، اب جاؤ یہاں سے......''

میرے دل میں بھی اس کے لیے کوئی گلزار نہیں مہک رہا تھا۔ اس نے جس بیدردی سے رحیم کو گاڑی تلے کچلا تھا اور پھر جس سفاکی سے ملنگ اصغر کی جان لی تھی، وہ یہ بتانے کے لیے کافی تھا کہ اس کی مٹی میں دور دور تک انسانیت کا نشان نہیں۔

میں باہر نکلا تو دور احاطے کی دوسری جانب جھگڑے کے آثار نظر آئے۔ چھوٹے چشمے کے قریب پہلوان حشمت کی کوٹھڑی کے باہر جمگھٹا سا تھا۔ میں قریب پہنچا تو وڈے سردار اعظم کو بپھرا ہوا پایا۔ اس کے ہاتھ میں ایک مضبوط لاٹھی تھی اور وہ پہلوان حشمت کو کلاسیکل گالیاں دے رہا تھا۔ فیض محمد اور فخرو وغیرہ نے اعظم کو سنبھالا ہوا تھا۔ پہلوان کے چہرے پر جیسے ہلدی پھری ہوئی تھی مگر ایک گال پر سرخ مرچوں کا رنگ تھا۔ غالباً یہاں اعظم کا جھانپڑ وغیرہ پڑا تھا۔ پہلوان ایک کونے میں سمٹا ہوا تھا۔ اب لگتا تھا کہ طوفان گزر چکا ہے۔ گالیاں بکتا ہوا سردار اعظم واپس جا رہا تھا۔ اس کی بھاری آواز گونج رہی تھی۔ ''تیرے دونوں گٹے توڑ دوں گا......موٹے، حرامی ہاتھی دو چار دن میں کڑی نگینہ ٹھیک نہ ہوئی تو تیرا پیٹ پھاڑ دوں گا۔''

یقیناً یہ وہی ہڈی پچی پکی کرنے والا معاملہ تھا۔ فیض اور دیگر افراد نشے میں چُور اعظم کو سنبھالتے ہوئے اندرونی حصے کی طرف لے جا رہے تھے، جب اچانک اس کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی۔ اترا ہوا طوفان ایک بار پھر لہریں مارنے لگا۔ اس نے اپنے چوڑے چکلے جسم کو اشتعال آمیز حرکت دی اور پوری طرح میری طرف متوجہ ہو گیا۔ لاٹھی سے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''اوئے، اِدھر آ تُو ...... اِدھر آ میرے پاس۔''

میں تو وہیں کھڑا رہا لیکن وہ زمین کو پاؤں کے نیچے کوٹتا ہوا میری طرف آ گیا۔ لپک کر اس نے میرا گریبان پکڑ لیا۔ اس کے منہ سے ولایتی شراب کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ دانت پیس کر بولا۔ ''یہ کیا سن رہا ہوں میں...... کیا سن رہا ہوں؟''

''کیا ہوا سردار؟'' میں نے پوچھا۔

''اوئے بد بختا...... تُو نے سجاول کو لڑائی کا چیلنج دیا ہے؟ اوئے تیری اوقات کیا ہے۔ تُو ہتھ جوڑی کرے گا سجاول سے؟ تیرا تو میں ملیدہ بناؤں گا اپنے پاؤں کے نیچے...... مار مار کر تیری یہ ستھن (شلوار) گیلی نہ کردوں تو اعظم نام نہیں میرا۔''

اس نے میرے پیٹ پر لات رسید کرنا چاہی لیکن توازن کھو کر فخرو پر گرا۔ لاٹھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ فخرو نے اس کو بمشکل سنبھالا۔ ایک بڑھک مار کر وہ پھر میری طرف آیا۔ دو گھونسے میرے سینے پر رسید کیے۔ تیسرے گھونسا سے میں نے خود کو بچالیا۔ اس نے مجھے اڑنگا لگا کر گرانے کی کوشش کی اور گرا خود ہی۔

وہ گالیاں بکنے لگا۔ اسی دوران میں سجاول بھی لپکتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ اعظم جاہ نے اب ایک کارندے کے ہاتھ سے رائفل جھپٹ لی تھی اور اس کا سیفٹی کیچ ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔

سجاول نے آکر اسے سنبھال لیا۔ ''کیا ہوا بھائیا...... کیوں شور مچا رہے ہو؟''

''میں اس کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ یہ ہے کیا چیز، یہ تم سے لڑنے کی بات کرتا ہے، میں اسے ننگا کر کے ماروں گا...... ابھی ماروں گا۔''

سجاول نے بھائی کے منہ پر ہاتھ رکھا اور طیش سے بولا۔ ''کیا کرتے ہو بھائیا! آہستہ بولو۔ ماں سن لے گی تو نیا بکھیڑا کھڑا ہو جائے گا۔''

ماں یعنی ماؤ کے ذکر پر یم شحیم اعظم ذرا ٹھنڈا پڑا۔ اتنی سی کسرت سے ہی اس کا سینہ دھونکنی کی طرح چلنے لگا تھا۔ سجاول نے غصیلے لہجے میں اعظم کو کچھ سرزنش مزید کی، پھر اس کے ہاتھ سے رائفل لے کر کارندے کو واپس کر دی۔ فیض کو اشارہ کیا وہ اسے یہاں سے لے جائے۔

فیض اور دیگر افراد اعظم کو دوسری طرف لے گئے۔ وہ مسلسل بک بک کر رہا تھا۔ گاہے بگاہے گندی گالیاں بھی میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ مجھے اس خبیث شخص کی طرف سے دھڑکا ہی رہتا تھا۔ یہ جاناں کو بے حد غلیظ نظروں سے دیکھتا تھا اور یوں لگتا تھا کہ اسے چھاپنے کے لیے کسی مناسب موقعے کی تلاش میں ہے۔ میں جاناں کو دیکھنے اور اس کے بارے میں جاننے کے لیے اندرونی حصے کی طرف چلا گیا۔ یہاں پتھروں کے چوکور بلاکس کو جوڑ کر نو دس فٹ اونچے کمرے بنائے گئے تھے۔ چھتیں لکڑی کی تھیں۔ یہ کمرے باہر سے خستہ حال لیکن اندر سے سجے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے کہ سجاوٹ لوٹ مار کی اشیا سے ہی تھی۔ میں ماؤ سے مل کر جاناں کو دیکھنا چاہتا تھا، پتا چلا کہ جاناں کو پھر ہلکا پھلکا بخار ہے اور وہ سوئی ہوئی ہے۔ تاہم

آفت جاں مانی سے ملاقات ہوگئی۔ وہ ہمیشہ کی طرح چست پتلون والے تو بہ شکن ڈریس میں تھی۔ بوائے کٹ بال منتشر تھے۔ ایک گرم شال سے بس اس نے اپنے کندھے ڈھانپ رکھے تھے۔ وہ چیل کی طرح مجھ پر جھپٹی اور کھینچ کر کمرے میں لے گئی۔ میرے سر کے بال مٹھی میں جکڑ کر بولی۔ ''شاہ زیب! یہ کیا تماشا لگا رہے ہو تم؟ لگتا ہے کہ تم اپنے ہوش حواس میں نہیں ہو۔ تم نے چاچو سے ''ہتھ جوڑی'' مانگی ہے۔ تمہیں پتا ہے کہ تم کتنی بڑی بات کہہ رہے ہو اور اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟''

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس میں اتنا طوفان اٹھانے والی کیا بات ہے؟'' میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

''طوفان اٹھانے والی بات ہے۔'' وہ زور دے کر بولی۔ ''تمہیں کچھ پتا نہیں، تم نے اپنی بے وقوفی سے چاچو کو بھی مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ وہ تم سے لڑنا نہیں چاہتا لیکن تم نے اسے سب کے سامنے چیلنج کیا ہے۔''

''تو اس میں کیا ہے؟ وہ یہ چیلنج قبول کر لے۔''

''وہ لڑنے پر آیا تو مار ڈالے گا تمہیں۔ تم اس کی مار کھا کر زندہ نہیں رہو گے۔ ڈیئر جانو! میں تم کو کھونا نہیں چاہتی۔ بڑی مشکلوں سے کوئی ڈھنگ کا بندہ ملا ہے مجھے۔'' وہ بے حد سنجیدہ تھی۔

''تم سجاول کو کیا سمجھتی ہو۔ وہ ایک عام آدمی ہے۔ میرے لیے تو عام آدمی ہے۔''

''وہ عام آدمی ہوگا لیکن لڑائی کے معاملے میں نہیں ہے۔ اس پر ہاتھ ہے۔''

''ہاتھ ہے؟ کیا مطلب؟''

وہ سنسنی خیز انداز میں بولی۔ ''اس خاندان کے بزرگ، جو کئی سو سال پہلے مر گئے تھے، ان کی روحوں کا سایہ ہے اس پر۔ اس لیے وہ کسی سے مات نہیں کھا سکتا۔ تم ولایت پلٹ ہو۔ شاید ان باتوں پر یقین نہ کرو لیکن یہ ایسا ہی ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ سجاول سے لڑنا، روحوں سے لڑنے کے برابر ہے؟''

''نہیں، ایسی بات بھی نہیں لیکن یہ تو سب جانتے ہیں کہ چاچو کے مکے میں کوئی خاص طاقت ہے۔ اس سے گردن ٹوٹ جاتی ہے۔ چاچو نے آخری بار کوئی ڈیڑھ سال پہلے ملاکھڑا کھیلنے والے ایک سندھی پہلوان کو مارا تھا۔ وہ پہلا مکا تو سہہ گیا تھا مگر دوسرے میں اس کی گردن ٹوٹ گئی تھی اور میں نے اپنی آنکھوں سے یہ دیکھا تھا۔ اس بات کو مذاق نہ سمجھو۔''

''میں تم سے اس بارے میں بحث کرنا نہیں چاہتا...... لیکن جو کچھ بھی ہے یہ زور آزمائی

کا معاملہ ہوگا۔ اس میں کسی کا مرنا یا کسی کو مارنا ضروری تو نہیں۔"

"لڑائی کے دوران میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اگر چاچو طیش میں بہہ گیا تو پھر تمہاری جان نہیں بچے گی اور میں یہ کبھی نہیں ہونے دوں گی۔ ڈیئر جانو! تمہیں میری لاش سے گزر کر ایسا کرنا ہوگا۔" وہ تن کر میرے سامنے کھڑی ہوگئی۔ آنکھوں میں پختہ ارادے کی جھلک تھی۔

میں نے ذرا توقف کر کے کہا۔ "تمہارے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

وہ فوراً بولی۔ "تم سب کے سامنے اعلان کر دو کہ تم نے یہ بات غلطی سے کہہ دی۔ تم کو چھوٹے سردار کے بارے میں سب کچھ پتا چل گیا ہے اور تم ان سے لڑنے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔"

اس سے ملتی جلتی بات خود سجاول بھی کر چکا تھا۔ جوں جوں ایسی باتیں میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں، میرے تجسس اور شوق میں مزید اضافہ ہو رہا تھا۔ میرے جسم میں ایک ترنگ سی پیدا ہوگئی تھی۔ میں نے جب کبھی بھی اپنے لیے کوئی اچھا حریف دیکھا تھا، میری یہی کیفیت ہوئی تھی۔

بہرحال میں اس موقعے پر شعلہ صفت مانی سے کوئی لمبی چوڑی بحث کر کے بدمزگی پیدا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں کچھ دیر خاموشی سے اس کی جانب دیکھتا رہا، پھر دھیمے لہجے میں بولا۔ "اگر تم کہتی ہو تو میں اس بارے میں کچھ سوچتا ہوں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ میں تمہارے چاچو سے ڈر گیا ہوں۔ میں اس سے کہیں بھی اور کسی بھی وقت دو دو ہاتھ کرنے کو تیار ہوں۔"

"تم سوچنے کی بات کر رہے ہو۔ ابھی اور اسی وقت فیصلہ کرو...... ورنہ تمہاری میری زبردست لڑائی ہو جائے گی اور پھر یہ لڑائی میرے تمہارے تک نہیں رہے گی۔ بات بڑی دور تک جائے گی۔"

اس کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ میں نے اسے ٹھنڈا کرنے کے لیے نرم رویہ اختیار کیا۔

"اچھا بابا...... اچھا، جو تم چاہتی ہو، وہی ہوگا۔"

اگلے تین چار منٹ میں، میں نے اسے باور کرا دیا کہ اس کی کوشش سے میری سوچ میں تبدیلی آئی ہے اور میں صرف اس کی خاطر، اس مہم جوئی سے پیچھے ہٹنے کے لیے آمادہ ہو گیا ہوں۔ وہ خوش ہوگئی۔ اس نے اوندھے لیٹ کر میری گود میں سر رکھا اور ٹانگیں موڑ کر مجھے اپنے پاؤں کے تلوے دکھائے جو نیچے سے سرخ ہو رہے تھے۔ "یہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تمہارے لیے ڈانس سیکھ رہی ہوں۔ پاؤں فرش پر مار مار کر یہ حال ہو گیا ہے۔"

میں نے دل پر جبر کر کے اس کے تلووں پر ہاتھ پھیرا۔ وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ میرے بالوں کو مٹھی میں بھینچ کر اس نے اپنے ہونٹوں کو میرے چہرے سے ہم کلام کیا۔ ایسے موقعوں پر وہ ایک پہاڑی ندی کی طرح ہو جاتی تھی، جو اپنے سامنے آنے والی ہر شے کو بہا لے جانا چاہتی ہو (مجھے ملنگی ڈیرے والا لڑکا رضوان یاد آ گیا اور ڈاکٹر ارم بھی۔ ڈاکٹر ارم بھی تو اسی طرح رضوان کو اپنی ''اندھا دھند محبت'' کے گھیرے میں رکھتی تھی۔ بہر حال میرے اور رضوان کے معاملے میں فرق تھا۔ میں اپنی ضرورت کے لیے جان بوجھ کر مانی کو خود پر مسلط ہونے دے رہا تھا۔ میرے ذہن نے ڈاکٹر ارم کے بارے میں سوچا۔ پتا نہیں اب وہ جنونی کہاں اور کس حال میں تھی)

چند سیکنڈ بعد مانی پیچھے ہٹی اور شرارتی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ ''یہ تمہارا منہ ہے کہ ریگ مال ہے۔ شیو کیوں نہیں کرتے ہو؟''

''تمہارے چاچو کا قیدی ہوں۔ قیدیوں کو ایسے ناز نخروں کے لیے ٹائم کہاں ملتا ہے۔'' میں نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔

''لیکن تم میرے ہونے والے ''وہ'' بھی تو ہو۔ میں تمہیں ''چم چم'' دیکھنا چاہتی ہوں۔ ٹھہرو، میرے پاس ہے شیو کا سامان۔''

وہ اچھل کر کھڑی ہوئی اور الماری کے ایک خانے میں سے پوری ''شیونگ کِٹ'' نکال لائی۔ اس نے مجھے نیم دراز کیا۔ میرے ساتھ لگ کر بلکہ مجھ پر لد کر بیٹھ گئی اور میری ٹھوڑی پر کریم لگا کر برش سے جھاگ بنانے لگی۔ اس نے ریزر کے بجائے استرا نکالا تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''او، یہ کیا کر رہی ہو۔ گردن کٹ گئی تو میں کسی کام کا نہیں رہوں گا۔ پیچھے ہٹاؤ اسے۔''

''میں تو اسی سے کروں گی اور دیکھنا کیسی چم چماتی مکھڑی نکل آئے گی میرے ڈیئر جانو کی۔''

''بالکل نہیں۔''

''دیکھو، میں نے تمہیں پہلے ہی بتایا تھا کہ مجھے کسی کام سے روکو گے تو میں رکوں گی نہیں۔ میں لڑکی ہوں ذرا اور ٹائپ کی۔ میں شور کروں گی اور ماؤ کو پتا چل گیا ناکہ میرے اور تمہارے درمیان کوئی گڑبڑ ہوئی ہے تو انہیں بے ہوش ہوتے ذرا دیر نہیں لگے گی۔''

''انہیں ایسے بھی بے ہوش ہوتے دیر نہیں لگے گی۔''

''کیا مطلب؟''

''میری چھاتی پر چڑھ کر جب تم میری گردن پر استرا چلا رہی ہو گی، تو بھی وہ دیکھ کر بے ہوش ہی ہوں گی اور مجھے لگتا ہے کہ وہ بس آنے ہی والی ہیں۔''

تھوڑی سی تکرار کے بعد اس نے استرا ایک طرف رکھ دیا۔ اور ''ریزر'' سے شیو بنانے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ مجھے وارننگ بھی دے رہی تھی کہ اگر میں نے لڑائی کا چیلنج واپس لینے کے حوالے سے اپنا وعدہ توڑا تو پھر وہ واقعی استرا گردن پر رکھے گی اور یہ اس کی اپنی گردن بھی ہو سکتی ہے۔

میں نے اسے یقین دلایا کہ یہاں تک نوبت نہیں آئے گی۔

یہ بے معنی باتیں تھیں۔ اندر خانے میں سجاول سے لڑنے کا پکا پکا ارادہ کر چکا تھا۔ مجھے اس فیصلے سے ہرگز پیچھے نہیں ہٹنا تھا۔

O......❖......O

رات کا وقت تھا۔ اس پہاڑی ویرانے میں ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ کمرے میں گیس لیمپ کی روشنی تھی اور انگیٹھی کی حرارت بھی۔ میں اور سجاول ایک بار پھر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ سجاول کا چہرہ ہمیشہ سے زیادہ تمتمایا ہوا تھا۔ اس نے اپنے بائیں ہاتھ کی انگلی کی انگشتری کو گھمایا اور بولا۔ ''اب کیا فیصلہ ہے تمہارا؟''

''وہی جو پہلے دن تھا۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔

اس نے اٹھ کر کمرے کا ایک چکر لگایا۔ پھر دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ سگریٹ سلگانے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن سگریٹ سلگایا نہیں۔ میری آنکھوں میں جھانک کر بولا۔ ''کب لڑنا چاہو گے؟''

''جب تم چاہو۔ اگر آج چاہو تو میں آج بھی تیار ہوں۔''

''خالی ہاتھ یا ہتھیار کے ساتھ؟''

''میرے خیال میں خالی ہاتھ بہتر رہے گا۔''

''خالی ہاتھ بھی ہم میں سے کسی کی موت ہو سکتی ہے۔''

''ڈرا رہے ہو؟''

''نہیں، بتا رہا ہوں۔''

''ہاں مجھے پتا چلا تھا کہ لڑائی شروع ہونے کے بعد تمہیں روکنا مشکل ہو جاتا ہے۔ تم حریف کی جان بھی لے سکتے ہو۔''

وہ پھنکارا۔ ''لے سکتا ہوں اور دے بھی سکتا ہوں۔ تم بہت بڑی غلطی کر رہے ہو۔

بہرحال اب تمہیں سمجھانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ تم نے اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی امتحان میں ڈال دیا ہے۔ اب اس امتحان کا کوئی نتیجہ نکالنا پڑے گا۔ بتاؤ کب لڑنا چاہتے ہو؟ تین دن بعد ٹھیک رہے گا۔ اتوار کے روز؟''

''جیسے تم مناسب سمجھو، لیکن میں نے تمہیں بتایا تھا، میری بھی ایک چھوٹی سی شرط ہے۔''

''وہ کیا؟''

''میں چاہتا ہوں، یہ لڑائی بس ہم دونوں کے درمیان ہو۔ کوئی اور دیکھنے والا وہاں موجود نہ ہو۔''

''اس کا مطلب؟''

''جس کمرے میں میری اور باقر کی لڑائی ہوئی تھی، اسی کمرے میں ہم دونوں اکیلے لڑیں گے۔ جو جیتے گا وہ باہر آ کر اپنی جیت کا اعلان کر دے گا۔''

''یہ کیا بات ہوئی؟''

''بس، یہ میری خواہش ہے۔ میں تم سے بالکل اکیلے میں لڑنا چاہتا ہوں۔''

''یہ بات تمہارے حق میں نہیں جاتی۔'' سجاول زہریلے لہجے میں بولا۔ ''کوئی بچانے والا نہیں ہوگا تمہیں۔''

''تو میں کب کہتا ہوں کہ بچنا چاہتا ہوں۔ شاید تمہیں اپنے بچاؤ کا خیال ہے۔'' میں نے بھی زہرخند لہجہ اختیار کیا۔

اس کا سینہ پھول گیا۔ آنکھوں سے چنگاریاں سی نکلیں، بولا۔ ''اب جاؤ یہاں سے۔''

''میری شرط منظور ہے تمہیں؟''

''ہاں، ہر شرط منظور ہے۔ اب دفع ہو جاؤ۔'' آخری الفاظ اس نے تقریباً چنگھاڑ کر ادا کیے۔

میں اطمینان سے اپنی جگہ سے اٹھا اور اسے سلام کیے بغیر باہر نکل آیا۔

○......❖......○

اگلے روز پہلوان حشمت کچھ مطمئن اور خوش نظر آ رہا تھا۔ میں اس کے پاس پہنچا تو اس نے بتایا کہ وڈے سردار اعظم کی منظورِ نظر نگینہ کی ہڈی ٹھیک بیٹھ گئی ہے اور اس کا درد بھی اب نہ ہونے کے برابر ہے۔

میں نے اسے مبارک دی۔ پورا فقرہ تو اس طرح ہونا چاہیے تھا...... ''وڈے سردار کی

لاٹھی سے تمہارے دونوں ٹخنے بچ گئے ہیں، تمہیں مبارک ہو۔"

پہلوان نے بھی فوراً وہی موضوع چھیڑا جس کی مجھے توقع تھی۔ وہ بولا۔ "مجھے تمہاری کچھ سمجھ نہیں آوت۔ تم مصیبت کو دعوت دے رہے ہو۔ وہ کیا کہتے ہیں، آ بیل، مل کر کریں آہ وزاریاں۔ تم سردار کو لڑائی کا چیلنج دے رہے ہو اور جہاں تلک مجھے پتا چلا ہے وہ ایک خطرناک شخص ہے۔ باقر سے جیت کر تمہاری اچھی خاصی عزت بن گئی تھی۔ اب تم نے یہ پنگا لے لیا ہے۔ یہ تو ٹھنڈے دودھ سے پوتوں کو نہلانے والی بات ہے۔" پہلوان نے افسوس سے سر ہلایا۔

"پہلوان جی، آپ نے پھر دو محاورے جوڑ دیئے۔ ایک محاورہ ہے ٹھنڈے دودھ کو پھونکیں مارنا اور دوسرا ہے دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو۔ آپ جان کر ایسا کرتے ہیں یا یہ ہو جاتا ہے۔"

"یار بال کی کھال مت اتارا کرو، جو تمہاری اردو ہے وہ بھی میں اچھی طرح جانت ہوں۔ تم واقعی گونگے ہوتے تو بہتر تھا۔ اصل بات سے دھیان ہٹا دیوت ہو۔ میں لڑائی کی بات کر رہا تھا۔ اگر سردار سے مارا ماری میں تمہارے ہاتھ پاؤں ٹوٹ گئے یا ویسے ہی تمہیں کچھ ہو گیا تو ہمارا کیا بنے گا؟"

"پہلوان جی، زندگی تو ایسے ہی چلتی رہتی ہے، کسی ایک کے زخمی ہونے یا وفات پا جانے سے پہیا رک نہیں جاتا۔ باقی آپ مجھے اتنا بھی انڈر اسٹیمیٹ نہ کرو۔ سردار جب میدان میں آئے گا تو اسے ایک زبردست حریف ملے گا۔"

"اگر تم جیت گئے تو پھر کیا ہووے گا؟ سردار کے لیے تو یہ بڑی شرمندگی کا مقام ہووے گا۔ وہ اپنے ساتھیوں کو کیا منہ دکھاوے گا؟"

"یہ اس کا مسئلہ ہے، میرا نہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ویسے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ غیرت کھا کر مجھے ہی سردار بنا دے۔ پھر سارے مسئلے خود بخود حل ہو جائیں گے۔"

"اتنے بھی خوش فہم نہ بنو۔ ایک بار کسی تمہارے جیسے کے لیے ہی میں نے ایک قطعہ کہا تھا۔

بے وجہ کسی سے لڑا "ناہیں" کرتے
جوش میں آ کر مسئلہ کھڑا ناہیں کرتے
اک بار کمان سے جو تیر نکل جاتے ہیں
وہ پھر سے کمان میں وڑا ناہیں کرتے

وہ دادطلب نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے کہا۔ ''شعر تو اچھے ہیں، لیکن آخر میں آپ نے اس میں پھر پنجابی ٹھوک دی ہے۔ یہ ''وڑا'' کا کیا مطلب ہوتا ہے؟''

''وڑا کا مطلب ہووت ہے، داخل ہونا۔ یعنی جو تیر کمان سے نکل جاوت ہے وہ واپس اس میں داخل ناہیں ہوسکتا۔''

''سبحان اللہ...... سبحان اللہ! کیا نکتہ نکالا ہے آپ نے، لیکن میں نے سردار کو جو چیلنج دیا ہے، وہ جوش میں آکر نہیں دیا۔ سوچ سمجھ کر دیا ہے۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے کہ میں اس بندے کا مقابلہ کرسکتا ہوں۔''

''خود پر اعتماد اچھی بات ہے بھیا، لیکن جب اعتماد حد سے بڑھ جاوت ہے تو الٹے بانس بریلی کو ہو جاوت ہیں۔ باقر سے جیت کر تم کچھ زیادہ ہی بپھر گئے ہو۔ تم نے اب تک ولایت میں ہی لڑائی بھڑائی کی ہوگی۔ وہاں کی لڑائی اور یہاں کی مار کٹائی میں بہت فرق ہے۔ لیکن تمہارا وہی حال ہے کہ بندر کیا جانے آنگن ٹیڑھا۔ یہ سردار بھی مجھے پرانی طرز کی لڑائی کا ماہر لگت ہے۔ اس لڑائی کے اپنے داؤ پیچ ہووت ہیں۔ میں اس بارے میں کافی کچھ جانت ہوں۔''

''تو پھر کچھ بتاؤ نا پہلوان جی۔''

''کب پروگرام بنایا ہے تم نے اس بے وقوفی کا؟''

''اتوار کے دن۔''

''دو ڈھائی روز میں کیا ہوسکت ہے۔ پھر بھی اگر تم چاہتے ہو تو میں تمہیں کچھ موٹی موٹی باتیں بتا سکت ہوں۔ تمہیں جب بھی ٹائم ملے آجایا کرو۔''

''چلیں، اب تو آیا ہوا ہوں، کچھ بتا دیں۔''

اگلے دس پندرہ منٹ کافی دلچسپ رہے۔ پہلوان حشمت راہی جس طرح شاعری میں خود کو مرزا غالب سمجھتا تھا اسی طرح پہلوانی میں بھی رستم ہند سے کم نہیں تھا۔ اس نے کوٹھڑی کا دروازہ اندر سے بند کرلیا، اور مجھے کافی کرتب سکھائے۔ مقامی طرز کی زور آزمائی میں جو الفاظ استعمال ہوتے تھے، ان کی تفصیل بھی پہلوان نے مجھے سمجھائی اور ان داؤ پیچ کا عملی مظاہرہ بھی کیا...... جیسے لانگڑی، دھوبی پٹکا، قینچی، سیدھی اور پٹھی وغیرہ۔ میں پہلوان کی دل شکنی کیسے کر سکتا تھا، جو کچھ وہ بتاتا رہا، میں پوری سنجیدگی اور دلچسپی سے سیکھتا رہا۔ میں اسے کیسے بتاتا کہ یہ سب کچھ تو جوڈو کی الف ب میں بھی شامل ہے، اور میں ان چیزوں سے کافی آگے ہوں۔ درحقیقت وہ MMA کے ایک یورپی چمپئن کو بالکل ابتدائی گُر سکھا رہا تھا۔ مجھے اس کی سادگی

اور اپنائیت اچھی لگ رہی تھی اور یہی چیز زیادہ اہم تھی۔ ایک دو بار مجھے بتاتے بتاتے وہ خود گر پڑا اور اس نے خفت مٹانے کے لیے اپنے اس گرنے کو اپنے داؤ کا حصہ بتایا۔ میں نے شدومد سے سر ہلا کر اس کی بات تسلیم کی۔ وہ ہر لحاظ سے ایک مزیدار اور مخلص شخص تھا۔

○......❖......○

دوسرے دن دوپہر کے وقت تک اس لڑائی کا خوب چرچا رہا جو متوقع طور پر میرے اور سردار سجاول کے درمیان ہونے والی تھی۔ زیادہ تر لوگ مجھے ترس ناک نظروں سے ہی دیکھ رہے تھے۔ شاید ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جن کے نزدیک میں بس ایک چلتی پھرتی لاش تھا۔ بہرحال دوپہر کے بعد میں نے احاطے میں ایک شامیانہ لگتے ہوئے دیکھا، شامیانے میں ایک طرف اسٹیج بنایا گیا تھا اور گیس کے ہنڈولے بھی لٹکائے جا رہے تھے۔ میں نے فیض محمد سے پوچھا۔ ''یہ کیا تیاری ہے؟''

وہ بولا۔ ''چھوٹے سردار کے کچھ مہمان آ رہے ہیں۔ ایک دو روز یہاں رہیں گے۔''

''لیکن وہ...... میرا اور سجاول والا معاملہ......؟'' میں نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ تمہاری کوئی نیکی کام آئی ہے۔ تمہارا برا وقت کچھ دیر کے لیے ٹل گیا ہے۔''

''لیکن آ کون رہا ہے؟''

''یہ تو چھوٹا سردار ہی جانتا ہے۔'' فیض نے بات گول کی اور شامیانے کی طرف چلا گیا۔ یہاں دو تین دیگیں بھی جھلک دکھا رہی تھیں۔ احاطے کی صفائی وغیرہ بھی ہو رہی تھی۔ مجھے گوشت بھونے جانے کی خوشبو آئی اور میرے علم کے مطابق یہ ہرن کے گوشت کی خوشبو تھی۔

فیض سے آٹھ دس منٹ بعد ہی دوبارہ ملاقات ہو گئی۔ اس کے ساتھ پہلوان حشمت بھی دکھائی دے رہا تھا۔ پہلوان حشمت کو ہمارے ساتھ والے ایک اسٹور روم میں ٹھہرا دیا گیا۔

میں نے فیض سے پوچھا۔ ''اب اس کو کس سزا میں یہاں بند کر رہے ہو؟''

فیض بولا۔ ''سزا نہیں، احتیاط ہے اور یہ احتیاط تمہارے اور تاجور کے لیے بھی ہے۔ چھوٹے سردار کا حکم ہے کہ اگلے دو تین روز تک تم بھی پہلوان کی طرح اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلو گے۔''

''وہ کس خوشی میں؟''

''اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔'' فیض نے سرگوشی میں کہا۔ ''تمہارا وہ چاند گڑھی والا دشمن عالمگیر ضمانت پر رہا ہو گیا ہے اور موج میلے کے لیے یہاں آ رہا ہے۔ سردار سجاول نہیں چاہتا کہ تم اس کے سامنے آؤ۔''

میں سناٹے میں رہ گیا۔ فیض کی بات سمجھ میں آ رہی تھی۔ عالمگیر ضمانت پر رہا ہو کر یہاں آ رہا تھا۔ عین ممکن تھا کہ اس کے ساتھ اس کا دست راست اسحاقا بھی ہو اور اسحاقا خود کو تاجور کا دعویدار سمجھتا تھا۔ سجاول مجھے اور تاجور کو عالمگیر وغیرہ کی نظر سے بچانا چاہ رہا تھا۔ اگر عالمگیر مجھے اور تاجور کو اس سے مانگ لیتا تو سجاول کی ماں یہ کبھی برداشت نہ کرتی۔ وہ تو اپنے دیوانے پن میں مجھے تقریباً مانی کا خاوند ہی سمجھ چکی تھی۔ عالمگیر کی ضمانت پر رہائی اور یہاں آمد کا سن کر میرے خون کی گردش بڑھ گئی۔ وہ خبیث سو فیصد مولوی فدا کا قاتل تھا مگر قانون ٹھوس ثبوت مانگتا تھا اور ٹھوس ثبوت جو مؤذن عبدالرحیم کی شکل میں تھا، اب ناپید ہو چکا تھا۔

شام کے فوراً بعد ہی مجھے اپنے کمرے کی اکلوتی کھڑکی میں سے عالمگیر کے درشن ہو گئے۔ وہ بڑے ٹھاٹ سے سجاول کے پہلو میں چلتا شامیانے کی طرف جا رہا تھا۔ سجاول کے کسی کارندے نے اس کے گلے میں پھولوں کا ہار بھی ڈال دیا تھا۔ ایسا ہی ہار ایک اور شخص کے گلے میں بھی نظر آ رہا تھا اور یہ وہی بدفطرت اسحاق عرف ساقا تھا۔ جس نے چاند گڑھی میں تاجور اور اس کے گھر والوں پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ ڈھول پر چوٹ پڑ رہی تھی اور تین چار افراد بھنگڑا ڈال رہے تھے۔ یہ سب کے سب پیگ لگائے ہوئے تھے اور ترنگ میں تھے۔ شامیانے میں سریلے قہقہے گونج رہے تھے اور گھنگھروؤں کی چھنا چھن تھی۔ یقیناً یہ وہ طوائفیں تھیں، جنہیں آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر شہر سے یہاں لایا گیا تھا اور اب انہیں دو تین راتوں تک یہاں اپنے قدردانوں کا ''دل بہلاوا'' کرنا تھا۔

میں دل ہی دل میں ماؤ کے ''دیوانے پن'' کو داد دینے پر مجبور ہو گیا۔ اگر ماؤ والی مجبوری نہ ہوتی تو یقیناً سجاول نے مجھے اور تاجور کو اپنے زمیندار دوست کے حوالے کر دینا تھا۔ وہ غرض کا بندہ تھا۔ اگر اس کی غرض نہ ہوتی تو شاید وہ اپنی آنکھوں کے سامنے میرے ٹکڑے کروانے اور تاجور کو بے آبرو کرانے میں کوئی مضائقہ نہ سمجھتا۔

بھنے ہوئے گوشت کی خوشبو پورے احاطے میں پھیلی ہوئی تھی۔ پہلے کھانا کھایا گیا پھر شامیانے میں محفلِ نشاط شروع ہو گئی۔ رقاصائیں لوفر اردو اور پنجابی گانوں پر ناچ رہی تھیں۔ ہم انہیں دیکھ نہیں سکتے تھے مگر ان کی آوازیں تو ہمارے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے، شاہ زیب! میرا سر پھٹ جائے گا۔" تاجور نے کانوں میں انگلیاں ٹھونستے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ یہ جس طرح پی پلا رہے ہیں، ایک ڈیڑھ گھنٹے میں ان میں سے زیادہ تر نے لمبا لیٹ جانا ہے۔"

"مگر یہ ایسا کیوں کر رہے ہیں شاہ زیب! انہوں نے آج ہمارے کمرے کو باہر سے تالا لگا دیا ہے اور آپ کہہ رہے ہیں کہ پہلوان حشمت کو بھی ساتھ والے کمرے میں بند کر دیا ہے۔"

"شاید یہ لوگ چاہتے ہیں کہ ہم ان کے مہمانوں کے سامنے نہ آئیں۔"

"ایسا کیوں چاہتے ہیں یہ لوگ؟ کہیں مہمانوں کا تعلق ہمارے چاند گڑھی سے تو نہیں؟"

تاجور کی قیافہ شناسی حیران کن تھی۔ میں نے اسے اِدھر اُدھر کی باتوں میں لگایا۔ میں اسے کیسے بتاتا کہ اس کی جان کا سب سے بڑا دشمن اس کا منگیتر ساقا یہاں آن موجود ہوا ہے، اور اس کے ساتھ خطرناک عالمگیر بھی جیل کی چند روزہ ہوا کھانے کے بعد اپنی تمام تر خباثت کے ساتھ یہاں موجود ہے۔

راگ رنگ اور لوفر گانوں والی محفل اپنے عروج پر پہنچی تو پٹاخے چھوٹنے شروع ہو گئے اور کسی ٹن ڈکیت نے آتش بازی شروع کر دی۔ دفعتاً وہ کچھ ہوا جس کی کسی کو ہرگز توقع نہیں تھی۔ شامیانے کے پاس سے چلائی گئی ایک ہوائی ہمارے کمروں کے قریب رکھے بھوسے کے ڈھیر پر گری اور آناً فاناً شعلوں کی سرخی نمودار ہونے لگی۔ سچ کہتے ہیں کبھی کبھی انتہا کی بدمستی وخرمستی کا نتیجہ انتہا کی پریشانی کی صورت میں نکلتا ہے۔

ہم جن کمروں میں تھے، ان کی چھتیں لکڑی کی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے کھڑکیوں اور دروازوں نے آگ پکڑ لی۔ ہمارے والے کمرے میں بھی حدت بڑھ گئی اور دھواں بھرنا شروع ہو گیا۔ یہ بڑی خطرناک صورتِ حال تھی۔ دروازے کو باہر سے تالا لگا ہوا تھا۔ آگ لگنے کے فوراً بعد شامیانے میں دادِ عیش دیتے ہوئے لوگ محفل چھوڑ کر آگ کا تماشا دیکھنے نکل آئے۔ تاجور چلا رہی تھی۔ "شاہ زیب! مجھے باہر نکالو۔ میری سانس بند ہو رہی ہے۔" (دھوئیں سے بچنے کے لیے میں نے اپنا منہ سر بستر کی چادر میں لپیٹ رکھا تھا)

میں نے دھڑا دھڑ دروازہ کوٹنا شروع کر دیا۔ یہ اندرونی دروازہ ابھی تک آگ سے محفوظ تھا۔ مگر شعلے کھڑکی کے راستے کمرے میں داخل ہونا شروع ہو گئے تھے جس وقت میں

اپنے کندھے کی ضربوں سے دروازے کو توڑنے کی کوشش کر رہا تھا، مصیبت آسان ہوگئی، فیض محمد کے بری طرح کھانسنے کی آواز آئی۔ کھانسنے کے ساتھ ساتھ وہ دروازے کے قفل میں چابی گھما رہا تھا۔ دو سیکنڈ بعد ہم آتش زدہ کمرے سے باہر تھے۔ تاجور دھوئیں کے سبب اس بری طرح کھانس رہی تھی کہ لگتا تھا اس کے پھیپھڑے پھٹ جائیں گے یا وہ بے ہوش ہو جائے گی۔

ان نازک گھڑیوں میں بھی مجھے یہ بات یاد رہی کہ اردگرد موجود لوگوں کو تاجور کی صورت نظر نہیں آنی چاہیے۔ ان لوگوں میں عالمگیر اور ساقا بھی موجود ہو سکتے تھے۔ میں نے اپنا چہرہ تو دھوئیں سے بچنے کے لیے چادر میں لپیٹ رکھا تھا، مگر تاجور نے ایسا نہیں کیا تھا۔ میں نے اس کی اوڑھنی سے ہی اس کا چہرہ چھپا دیا۔ وہ افراتفری میں کچھ چھپ سکا، کچھ نہیں۔

سجاول کے تین چار کارندوں نے ہمیں اپنے حفاظتی حصار میں لے لیا تھا۔ ہم بری طرح کھانستے اور جھک کر بھاگتے ہوئے آتشزدگی والی جگہ سے آگے نکل آئے۔ کچھ دیگر افراد بھی ہماری ہی طرح بری طرح کھانس رہے تھے اور ابکائیاں لے رہے تھے۔ ایک پہرے دار فرش پر بے سدھ پڑا تھا، اس کے لباس کا دو تہائی حصہ جل چکا تھا اور اسے عریاں کر رہا تھا۔ دیکھتے ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ ختم ہو چکا ہے۔ آگ نے تیزی سے پھیل کر قریب کے تین چار کمروں اور دو سائبانوں کو اپنی زد میں لے لیا تھا۔

سجاول کی چلاتی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ”چشمے کی طرف سے پانی لاؤ“

ایک دوسری آواز ابھری۔ ”ڈرموں میں بھی پانی ہے، جلدی کرو۔“

سجاول کے کارندے پوری کوشش کر رہے تھے کہ آگ زیادہ نہ پھیلنے پائے۔ اچانک میرے پورے جسم میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ مجھے پہلوان کا خیال آیا۔ وہ بھی ہمارے ساتھ والے کمرے میں بند تھا۔

تاجور کو ایک ستون کے ساتھ بٹھا کر میں نے پھر آگ سے متاثرہ حصے کی طرف لپکنا چاہا مگر فیض محمد نے مجھے تھام لیا۔ ”نہیں شاہ زیب، وہ تمہارا یار پہلوان نکل آیا ہے۔ بے ہوش ہے لیکن بالکل بچ گیا ہے۔“

میں نے تاجور کو دیکھا۔ وہ بھی بالکل محفوظ رہی تھی مگر دھوئیں کی مار نے اسے نیم جان کر رکھا تھا۔ میں نے دوبز ماؤ کو دیکھا۔ وہ مست ہتھنی کی طرح بھاگتی ہوئی میری طرف آ رہی تھی۔ اس نے مجھے دیکھ کر فاصلے سے ہی دونوں ہاتھ پھیلا لیے۔ ”ہائے میرا بچڑا“ اس نے نعرہ بلند کیا اور آ کر مجھ سے چمٹ گئی۔ مجھے یقین تھا آج پھر تین چار کالے بکروں کی قربانی ہو کر

رہے گی۔

بدمستی کے سبب لگی ہوئی اس آگ میں تین کمرے اور دو سائبان جل کر خاکستر ہو گئے۔ دو بندے جان سے گئے۔ تین چار زخمی ہوئے۔ ایک خچر کے علاوہ دو بھینسیں بھی لقمۂ اجل بنیں۔ تاجور کو ماؤ اور مانی کے پاس چھوڑ کر میں پہلوان کی خبر گیری کے لیے گیا۔ وہ عارضی طور پر فیض محمد کے کمرے میں ہی لیٹا ہوا تھا۔ وہ ابھی تک نیم بے ہوش تھا۔ فیض محمد نے بتایا۔ "یہ تم دونوں سے پہلے ہی اپنے کمرے سے نکل گیا تھا۔ کمرے میں دھواں بھرا تو اس نے دروازے کو ٹکریں ماریں۔ دروازے کی کنڈی کمزور تھی اکھڑ گئی اور یہ باہر نکل آیا۔"

"مگر بے ہوش کیسے ہوا؟"

"لگتا ہے کہ اس میں خدا ترسی ضرورت سے کچھ زیادہ ہے۔ ایک بندہ ساتھ والے کمرے میں پھنسا ہوا تھا، اس کی آوازیں سن کر یہ پھر اندر کو لپک گیا۔ وہ بندہ تو صحیح سلامت باہر آ گیا لیکن یہ دم گھٹنے سے بے ہوش ہو گیا۔ قسمت اچھی تھی کہ آگ سے بچا رہا۔ بعد میں اسے بھی نکال لیا گیا۔"

میں نے کہا۔ "دل کا بڑا اچھا بندہ ہے، یہاں بھی تو اسی لیے پھنسا ہے کہ کسی کی مدد کر رہا تھا۔"

سارا جشن سوگواری کی کیفیت میں بدل گیا تھا۔ اگلے روز مرنے والے ایک شخص کی تدفین ہوئی، دوسرے کی لاش کسی نامعلوم مقام پر بھیج دی گئی۔ آگ میں گھرنے اور سینے میں دھواں بھرنے سے تاجور کی طبیعت خراب تھی۔ وہ الٹیاں کرتی رہی تھی۔ ماؤ کا دماغ بس ایک ہی طرف کام کرتا تھا۔ وہ ان الٹیوں کو بھی کسی اور نظر سے دیکھ رہی تھی۔ ہم ایک دوسرے کمرے میں مقیم ہو گئے تھے۔ یہاں بھی بیڈ موجود تھا۔

رات کوئی دس بجے کا وقت ہو گا جب سردار سجاول نے مجھے پھر اپنے پاس طلب کیا۔ وہ کمرے میں اکیلا تھا اور کافی سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے مجھ پر انکشاف کرتے ہوئے کہا۔ "کل رات گڑبڑ ہو گئی ہے، عالمگیر نے تاجور کو دیکھ لیا ہے۔ جب آگ لگنے کے بعد تم دونوں کمرے سے نکلے تو اس کی نظر تاجور پر پڑ گئی۔"

"میں نے تو کافی احتیاط کی تھی۔" میں نے کہا۔

سجاول نے حسبِ عادت سگریٹ کو مٹھی میں دبا کر ایک طویل کش لیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میں نے تو اپنی طرف سے کوشش کی تھی کہ تم دونوں عالمگیر کی نظر میں نہ آؤ...... لیکن اب وہ جان گیا ہے کہ تم دونوں یہاں ہو، اب کچھ کرنا پڑے گا۔"

''کیا مطلب؟''

اس نے ایک اور کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑا اور بولا۔''عالمگیر سے پرانا دوستانہ ہے۔ میں اس سے اپنے تعلقات نہیں بگاڑ سکتا اور میں نے تم سے یہ بات کہی بھی تھی۔''

''کون سی بات؟''

''میں نے کہا تھا کہ اگر عالمگیر اور اس کا یار جیل سے باہر آ گئے اور انہوں نے تاجور کو مانگا تو تمہیں اس کو دینا پڑے گا۔''

میں سناٹے میں رہ گیا۔ وہی کچھ ہو رہا تھا جس کا ڈر تھا۔ عالمگیر اور ساتھی نے تاجور کو یہاں دیکھ لیا تھا اور اب اسے سجاول سے مانگ رہے تھے۔

''کس سوچ میں پڑ گئے ہو؟'' سجاول نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

''تم جانتے ہو سجاول، وہ میری بیوی ہے...... اور میں اسے بہت چاہتا ہوں۔''

''کیا کالج کے منڈوں جیسی باتیں کر رہے ہو۔ یہ محبت، یہ عشق معشوقی، یہ سب بیکار لوگوں کے ڈھکوسلے ہیں۔ عورت مزہ لینے والی چیز ہے، اور بس۔ تم نے بھی اس کے ساتھ وقت گزارا ہے۔ مزہ کیا ہے۔ اب کوئی اور دیکھ لو۔ بلکہ میں خود انتظام کر دیتا ہوں تمہارے لیے۔ جہاں تک خاوند بیوی والی بات ہے، وہ بھی میں چنگی طرح جانتا ہوں۔ تم نے تاجور کو بھگایا ہے، پتا نہیں کس کالے چور کے سامنے نکاح کیا ہے تم نے، اور کیا بھی ہے یا نہیں۔''

''وہ میری بیوی ہے سجاول۔'' میں نے زور دے کر کہا۔

''تو کیا بیوی کو چھوڑا نہیں جا سکتا۔ طلاق نہیں دی جا سکتی؟'' وہ گرج کر بولا۔''میں نے تمہیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ تمہیں ایسا کرنا پڑے گا۔''

''ایسا نہیں ہو سکتا۔''

''یہی ہوگا۔ آرام سے مان جاؤ گے تو اچھا ہے، ورنہ ہمیں انگلیاں ٹیڑھی کرنا پڑیں گی۔''

''لیکن تمہاری والدہ کا کیا بنے گا؟ وہ تو ہر صورت مجھے داماد بنانے کا ارادہ رکھتی ہیں۔'' میں نے پینترا بدلا۔

''میں صرف تاجور کی بات کر رہا ہوں، تمہاری نہیں۔ تم ہمارے پاس ہی رہو گے اور یقیناً مانی کے شوہر بھی بنو گے۔ میں نے عالمگیر کو اپنی مجبوری بتا دی ہے۔'' وہ اطمینان سے بولا۔

''اور اس معاملے کا کیا ہوگا جو تمہاری والدہ کے دماغ میں سمایا ہوا ہے، یعنی تاجور امید

سے ہوگی اور حمل میں اس کے ساتھ کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے گی، جس کے بعد میں مانی کا شوہر بنوں گا۔ تمہارے پیرو سائیں نے یہی فرمایا ہوا ہے۔"

"تم پریشان کیوں ہوتے ہو، یہ ہمارے سوچنے کی باتیں ہیں۔"

"پھر بھی، اس کا کیا حل نکالو گے؟"

وہ زہریلے لہجے میں بولا۔ "جب وہ تمہاری منہ بولی بیوی یہاں سے دفع ہو جائے گی تو ہم ماں جی کو بتا سکتے ہیں کہ وہ امید سے تھی اور اس کے ساتھ کچھ ہو گیا ہے۔" سجاول کی آنکھوں میں عیار چمک تھی۔ اس کے لب و لہجے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ تاجور کو عالمگیر اور ساتے کے حوالے کرنے کا تہیہ کر چکا ہے۔ بالکل جیسے وہ کوئی نایاب رائفل یا خوب صورت جانور اپنے ایک ساتھی سے لے کر دوسرے ساتھی کو دے دیتا تھا۔

میں نے کہا۔ "سجّاول! میں تاجور کو اپنے پاس رکھنے کے لیے ہر قیمت چکانے کو تیار ہوں۔"

"زبان کی کوئی قیمت نہیں ہوتی شاہی! اور میں عالمگیر کو زبان دے چکا ہوں۔ تم ایک دو راتوں کے لیے اس کڑی کے ساتھ اور "دل پشوری" کر لو، پھر تمہیں اس کو میرے حوالے کرنا ہوگا۔" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

وہ میرے لیے بڑی تکلیف دہ رات تھی۔ سجاول نے جو باتیں کہی تھیں وہ انگاروں کی طرح میرے سینے میں دہک رہی تھیں۔ میں نے اس سلسلے میں اپنے رازداں فیض محمد سے بھی بات کی تھی، اس نے بھی یہی بتایا تھا کہ آتش زدگی کی وجہ سے معاملہ گڑبڑ ہوا ہے، ورنہ شاید میری اور تاجور کی یہاں موجودگی کا علم عالمگیر وغیرہ کو نہ ہوتا اور وہ دو دن یہاں موج میلہ کر کے واپس چلے جاتے۔ اب چونکہ راز کھل گیا تھا، اس لیے سجاول نے دوستی کا بھرم رکھنے کے لیے عالمگیر کے سامنے بہانہ بنایا تھا کہ کل رات جشن کے بعد وہ خود ہی مجھے اور تاجور کو اس کے (عالمگیر کے) سامنے لانے والا تھا، یعنی یہ ایک طرح سے عالمگیر اور ساتے کے لیے سرپرائز ہوتا۔

صورتِ حال سنگین تھی۔ سجاول جیسے بے رحم اور پتھریلے شخص سے کچھ بھی بعید نہیں تھا لیکن میرے ہاتھ میں ترپ کا ایک پتا موجود تھا اور میرا دل گواہی دیتا تھا کہ یہ کام کرے گا۔ میں نے اس پتے کو استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ سجاول، زمیندار عالمگیر کو اپنا دوست و ہمنوا قرار دیتا تھا۔ وہ دونوں مل کر چاند گڑھی اور اردگرد کے علاقے میں دہشت پھیلا رہے تھے۔ لوگوں کو ان کے گھروں سے بے گھر کرنا چاہ رہے تھے لیکن ایک دوسرا معاملہ ایسا بھی تھا جس

میں عالمگیر تنہا پرواز کررہا تھا اور اس معاملے کی سجاول کو کانوں کان خبر نہیں تھی۔ کم از کم اس ''خط'' سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا۔

میں نے اپنی شلوار کے نیفے میں سے وہی مڑا تڑا خط نکالا جو عبدالرحیم کے ذریعے مجھ تک پہنچا تھا اور جس کا عقدہ تاجور نے کھولا تھا۔ اس خط میں عالمگیر نے سجاول کو نفرت کے انداز میں سجاولا لکھوایا تھا اور اس خط کے الفاظ میں کسی گہری سازش کے تاروپود تھے۔ کسی ''بڑے صاحب'' کی بات تھی، اور ایک لڑکی کے لیے قریباً کروڑ روپے کی رقم کا ذکر تھا۔ اس طرح کی کئی اور ناقابلِ فہم باتیں تھیں۔ میں دیر تک اس خط کو دیکھتا رہا، پھر حتمی فیصلے پر پہنچ گیا۔

○......❖......○

سجاول کے چہرے کا رنگ بدلا ہوا تھا۔ خط اس کے سامنے پڑا تھا اور وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ آخر وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ''اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ یہ سب کچھ عالمگیر نے ہی لکھوایا ہے؟''

''یہ عالمگیر کے منشی کی لکھائی ہے سجاول، اور اگر یہ ثابت ہو جائے کہ یہ عالمگیر نے نہیں لکھوایا تو تم میری گردن اتروا دینا، میں اپنا خون تمہیں ابھی معاف کر دیتا ہوں۔''

اس نے اٹھ کر کمرے کا ایک چکر لگایا پھر دوبارہ اپنی رنگین پایوں والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ یہ صبح نو ساڑھے نو کا وقت تھا۔ عالمگیر، ساقا اور بڑے بڑے پگڑوں والے مہمان ابھی تک سو رہے تھے۔ شاید یہ رات کو پیتے پلاتے رہنے کا اثر تھا۔ سجاول نے کھڑکی سے باہر چٹانوں کے پیچھے سے ابھرتے ہوئے سورج کو دیکھا اور بولا۔ ''تمہارا اپنا اندازہ کیا ہے۔ یہ کیا چکر ہو سکتا ہے؟''

''ابھی تک تو یہی پتا چل رہا ہے کہ جس طرح مولوی فدا کی بیٹی کو کھانے میں تھوڑا تھوڑا زہر دیا جاتا رہا ہے، اسی طرح ایک دو اور لڑکیوں کو بھی دیا جارہا ہے۔ اس طرح ان کو کہیں فروخت کرنے کے لیے تیار کیا جارہا ہے۔''

''اور خریدنے والا وہ ''بڑا صاحب'' ہے؟''

''بالکل...... اور یہ بڑا صاحب کوئی چھوٹی موٹی قیمت ادا نہیں کررہا۔ یہ کروڑوں کا معاملہ ہے۔''

سجاول کی آنکھوں میں چمک نمودار ہوگئی۔ پیشانی پر سوچ کی سلوٹیں ابھر آئیں۔ اس نے خط پر نگاہیں جمائے ہوئے کہا۔ ''اس میں کسی لورونامی جگہ کا ذکر ہے اور اندازہ ہوتا ہے

کہ وہ ''بڑا صاحب'' وہیں پایا جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے یہ جگہ چاند گڑھی کے آس پاس ہی کہیں ہو۔''

''لیکن زیادہ آس پاس نہیں ہوگی۔ خط کے لفظوں سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے۔''

''خیر، اس کا پتا تو چل جائے گا۔'' سجاول نے جبڑے بھینچ کر کہا۔ میں نے اس کے تاثرات دیکھے۔ میرا قیافہ تھا کہ وہ عالمگیر کے منشی کے بارے میں سوچ رہا ہے، جس نے یہ خط لکھا ہے۔ اس منشی کو رازداری سے پکڑ کر یہاں لے آنا، سجاول جیسے بندے کے لیے چنداں مشکل نہیں تھا۔ بہرحال میں صبح سویرے کی اس بات چیت سے جو مقصد حاصل کرنا چاہتا تھا، وہ پورا ہو رہا تھا۔ سجاول اور عالمگیر کے تعلق میں ایک دراڑ نمودار ہوگئی تھی اور ہر گزرنے والے پل کے ساتھ یہ دراڑ پھیل رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ''سجاول! یہ ایک بڑا سنہری موقع ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اگر ہم کوشش کریں تو کوئی بہت موٹی اسامی ہمارے ہاتھ لگ سکتی ہے۔ میں ڈنمارک میں ایک ایسے ترک سے ملا تھا جو خود کو زہریلے سانپوں سے ڈسواتا تھا۔ اس کا جسم اس طرح کا ہوگیا تھا کہ اس پر عام زہر اثر ہی نہیں کرتے تھے۔ وہ ایسے معاملوں میں بڑا کچھ جانتا ہے۔ اگر ہم چاہیں تو اس ترک سے رابطہ کر کے اسے یہاں بھی بلا سکتے ہیں......''

میں بات کر رہا تھا اور سجاول کی پیشانی پر سوچ کی سلوٹیں بڑھتی جارہی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے نرمی کی جھلک تھی۔ بہرحال میں جانتا تھا کہ اس نرمی کے پیچھے ''مشترکہ مفاد'' چھپا ہوا ہے۔ ورنہ سجاول جیسے لوگ کسی کو رحم کی نظر سے کم ہی دیکھتے ہیں۔

وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''کیا چاہتے ہو تم؟''

میں نے ذرا توقف سے جواب دیا۔ ''سب سے پہلے تو یہ چاہتا ہوں کہ تم میری بیوی کو عالمگیر کے حوالے کرنے کا فیصلہ واپس لے لو۔''

''یہ ایک مشکل کام ہے لیکن اس بارے میں سوچتا ہوں۔'' اس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

''فی الحال تو کوئی اور شرط نہیں، اگر میں اور تاجور یہاں حفاظت سے رہ سکیں، تو پھر تم جو کہو گے، میں کروں گا۔''

''اور وہ جو تم نے مجھ سے ہتھ جوڑی مانگ رکھی ہے...... اس معاملے کا کیا ہوگا؟''

''وہ تو اپنی جگہ موجود ہے۔ ہاں، ہم اس کو کچھ آگے کر سکتے ہیں۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آگے چل کر اس کا کوئی حل بھی نکل آئے۔'' میں نے اپنے رویے میں لچک پیدا کر لی۔

(پھر بھی میں نے یہ نہیں کہا کہ اپنا چیلنج واپس لے کر معافی مانگوں گا)

اتنے میں کسی قریبی کمرے سے عالمگیر کے کھانسنے کی آواز آنا شروع ہوگئی۔ وہ جاگ گیا تھا۔ ہمیں اپنی گفتگو منقطع کرنا پڑی۔ وہ خط سجاول نے احتیاط سے اپنے پاس رکھ لیا۔ میں تاجور کے پاس واپس آ گیا۔ تاجور آتشزدگی کے بعد سے گم صم سی تھی۔ گاہے بگاہے اس کا دل بھی متلانے لگتا تھا۔

اگلی صبح بڑے عجیب طریقے سے طلوع ہوئی۔ کسی نے زور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں چٹائی پر سے اٹھ بیٹھا۔ پہلے تو میں نے یہی سمجھا کہ ماؤ صبح سویرے ہمارے کمرے کے معائنے کے لیے آدھمکی ہے۔ میں نے تاجور کو جگانا چاہا مگر وہ اپنے بستر پر موجود نہیں تھی۔ میں نے سمجھا، شاید وہ غسل خانے میں ہو۔ وہ وہاں بھی نہیں تھی۔ غسل خانے کے دو دروازے تھے، باہر والا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے پلٹ کر کمرے کا دروازہ کھولا۔ سامنے چپٹی ناک والا فخرو کھڑا تھا۔ بولا۔ ''گڑبڑ ہوگئی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''لگتا ہے کہ...... آپ کی بیوی...... کہیں چلی گئی ہے۔ یہاں کہیں بھی نظر نہیں آ رہی۔ وہ اختری بھی غائب ہے۔''

''کیا بک رہے ہو۔'' میں اسے دھکا دیتے ہوئے باہر نکل آیا۔ ابھی سورج طلوع نہیں ہوا تھا مگر اچھا خاصا اجالا پھیل چکا تھا۔ مجھے احاطے اور طویل برآمدے میں افراتفری نظر آئی۔ مسلح افراد حرکت کر رہے تھے۔ برآمدے کے آخری سرے پر سجاول پریشان سا کھڑا تھا۔ موبائل فون اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ کوئی نمبر ملا رہا تھا۔ اسی دوران میں لمبا تڑنگا عالمگیر بھی اس کے قریب آن کھڑا ہوا۔ مجھے اپنا سر بھاری اور چکراتا ہوا محسوس ہوا۔

میں نے بابے فیض سے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟ کہاں ہے تاجور؟''

اس سے پہلے کہ فیض کچھ کہتا، بیرونی گیٹ کی طرف سے ایک پہرے دار کی چلاتی ہوئی آواز آئی۔ وہ کچھ کہہ رہا تھا۔

ہم تیزی سے لکڑی کے پھاٹک نما گیٹ کی طرف گئے۔ دیگر افراد کی طرح سجاول اور عالمگیر بھی وہاں پہنچ گئے۔ گیٹ کے پاس پتھروں کے پیچھے دو پہرے دار بے ہوش پڑے تھے۔ ان کے قریب ہی حقہ اور قہوے کے پیالے وغیرہ پڑے تھے۔

''لگتا ہے کہ یہ قہوہ پینے سے بے ہوش ہوئے ہیں۔'' سجاول نے موقع دیکھنے کے بعد اپنا خیال ظاہر کیا۔

’’اور رات کو قہوہ تو اختری ہی بنا کر ان لوگوں کو دیتی ہے۔‘‘ فخرو نے کہا۔

’’اس کا کیا مطلب ہے۔ وہ حرام زادی...... اختری کے ساتھ یہاں سے بھاگی ہے؟‘‘ وڈا سردار اعظم بولا۔

’’دیکھنے میں تو یہی لگ رہا ہے جی۔‘‘ فیض نے کہا۔ اس کے چہرے سے شدید پریشانی عیاں تھی۔

میرے ذہن میں آندھی چل رہی تھی۔ ابھی کچھ بھی واضح نہیں تھا، لیکن اگر تاجور کے گم ہونے میں سجاول یا پھر عالمگیر وغیرہ کا ہاتھ تھا تو پھر یہاں ایک قیامت برپا ہوسکتی تھی۔ ابھی ان لوگوں نے میرا صرف ایک روپ دیکھا تھا۔

میری نظر اسحاق عرف ساتے پر پڑی۔ وہ عالمگیر کے پہلو میں کھڑا تھا اور میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ یہاں یہ ہمارا پہلا آمنا سامنا تھا۔ ساتے کی آنکھوں میں میرے لیے شدید رقابت اور جلن تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک طرح کا تمسخر بھی تھا۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں مجھ سے کہہ رہا تھا۔ بڑے گھنے نکلے ہو تم۔ دین محمد کا گونگا ملازم بن کر ہم سب کو اُلو بنایا...... اور نمک حرامی کرتے ہوئے اس کی دھی کو لے اڑے۔ ممکن تھا کہ وہ واقعی مجھ سے کوئی تلخ ترش بات بھی کر گزرتا، لیکن یہ موقع ایسا نہیں تھا۔

اتنے میں ماؤ بھی جھومتی ہوئی موقع پر پہنچ گئی۔ ’’ہائے ربا! یہ کیا ہوگیا۔ مجھے پہلے ہی اس کڑی کی آنکھ میں سور کا بال نظر آتا تھا۔ کس کے ساتھ بھاگی؟ کیا لے کر بھاگی ہے، میرا بچڑا تو ٹھیک ہے نا۔‘‘

وہ میری طرف لپکنا چاہ رہی تھی مگر سجاول نے اسے راستے میں روک لیا اور سمجھا بجھا کر ایک طرف لے گیا۔

میں نے تاجور کے دل کی گہرائیوں میں جھانکا تھا۔ مجھے پتا تھا وہ ایسی نہیں ہے۔ مجھے اس سارے معاملے میں کوئی چکر لگ رہا تھا۔ نہ جانے کیوں میرا دل کہہ رہا تھا کہ میں صبر کا مظاہرہ کروں اور تھوڑا انتظار کروں۔ ہوسکتا تھا کہ اس سلسلے میں کوئی اچھی خبر سامنے آتی...... اور میں نے واقعی انتظار کیا اور خود کو سنبھالتا ہوا اپنے کمرے میں آگیا۔ میرا سر بہ دستور بھاری تھا۔

کچھ دیر بعد مجھے سجاول کی شکل دوبارہ نظر آئی۔ اس نے کہا۔ ’’گھبرانے کی ضرورت نہیں شاہی، تاجور کا پتا چل گیا ہے۔‘‘

’’کہاں ہے وہ؟‘‘ میں بے تابی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''آؤ میرے ساتھ۔'' وہ بولا اور مجھے کمرے کے عقبی دروازے سے نکالتا ہوا ان شکستہ زینوں کی طرف لے آیا جو تہ خانے میں اترتے تھے۔ اسی تہ خانے کے ایک کمرے میں مؤذن عبدالرحیم بند رہا تھا۔ سجاول نے جیب سے چابی نکال کر بڑے دروازے کا تالا کھولا۔ سامنے کمرے کا دروازہ دکھائی دے رہا تھا، اسے باہر سے کنڈی لگائی گئی تھی۔ کھڑکی کی گرل میں سے، مجھے جو پہلی صورت دکھائی دی، وہ اختری ہی کی تھی پھر مجھے تاجور نظر آئی۔ وہ فرشی بستر پر دراز تھی اور نیم غنودگی میں دکھائی دیتی تھی۔ میرا سینہ خوشگوار دھڑکنوں سے بھر گیا۔

سجاول نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''یہ یہاں بالکل خیریت سے ہے، اختری اس کے پاس ہے۔ اس کی ضرورت کی دوسری چیزیں بھی میں تھوڑی دیر میں یہاں پہنچا دوں گا۔''

''اس ڈرامے کا مطلب؟'' میں نے غصیلے لہجے میں پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ تھوڑا بہت تو تم سمجھ ہی گئے ہو گے۔ میں عالمگیر سے بگاڑنا نہیں چاہتا۔ دوسری طرف تمہاری ''بات'' رکھنا بھی ضروری ہے، تم اس کڑی کو خود سے دور کرنا نہیں چاہتے۔ میری کچھ مجبوریاں ہیں...... اوران مجبوریوں کی وجہ سے یہ درمیانی رستہ نکالنا پڑا۔''

بات سمجھ میں آرہی تھی۔ عالمگیر کو مطمئن کرنے کے لیے سجاول نے بڑی رازداری سے تاجور کے فرار کا ڈراما رچایا تھا۔ مجھ سمیت سجاول کے دیگر ساتھی بھی اس ڈرامے سے بالکل بے خبر تھے، یہی وجہ تھی کہ سچویشن میں حقیقت کا رنگ بھر گیا تھا۔ اختری اور فخرو کے علاوہ صرف ایک اور کارندے کو اس صورتِ حال کی خبر تھی۔ اس واقعے سے سجاول کی بے پناہ عیاری کا پتا بھی چلتا تھا۔ سجاول کی بات سے معلوم ہوا کہ ہمارے رات کے کھانے میں نشہ آور دوا ملائی گئی تھی۔ یہی دوا بعدازاں دو پہرے داروں کے قہوے میں بھی ملائی گئی مگر یہ زیادہ مقدار میں ملائی گئی اور وہ اب تک بے ہوش تھے۔ ہمارے کمرے کے غسل خانے کا دوسرا دروازہ باہر سے چابی لگا کر کھولا گیا اور تاجور کو بڑی احتیاط سے نکال کر تہ خانے میں پہنچایا گیا۔ وہ تب نیم بے ہوشی کی حالت میں تھی۔

سجاول نے نہایت سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''تمہیں اب اس معاملے کو نبھانا ہوگا۔ یہی ظاہر کرنا ہوگا جیسے تاجور واقعی لاپتا ہوگئی ہے اور ہم اسے ڈھونڈ رہے ہیں۔ کم از کم جب تک عالمگیر یہاں ہے ہمیں یہ ایکٹنگ کرنی پڑے گی۔''

''اور یہ کب تک یہاں ہیں؟''

''شاید، ایک یا دو دن۔''

مجھے کچھ ضروری باتیں سمجھانے کے بعد سجاول واپس چلا گیا۔ میں وہیں اختری اور

تاجور کے پاس موجود رہا۔ اختری کی شخصیت کا ایک اور پہلو میرے سامنے آ رہا تھا اور مجھے قدرے حیران بھی کر رہا تھا۔ اس کی موٹی شال کے نیچے ہولسٹر موجود تھا اور اس میں باقاعدہ پستول لگا ہوا تھا۔ ایک زنانہ پہرے دار کی طرح وہ بالکل چوکس نظر آتی تھی۔ اس کے گلے میں ایک تسبیح بھی ہوتی تھی جو اس کے مذہبی رجحان کا پتا دیتی تھی۔ وہ غالباً سجاول کے وفادار ترین ملازموں میں سے تھی۔

تاجور نے اب کسمسانا شروع کر دیا تھا۔ وہ مچی مچی آنکھوں سے اپنے قرب و جوار کو دیکھ رہی تھی پھر جیسے وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔ غنیمت تھا کہ اس کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی ورنہ ممکن تھا کہ وہ چلانا شروع کر دیتی۔

''ہم کہاں ہیں؟'' وہ بلند آواز سے بولی۔

''کہیں نہیں...... بس کمرا بدلا ہے۔'' میں نے اسے تسلی دی اور اپنے ساتھ لگایا۔

''لیکن...... میں یہاں...... کیسے پہنچی؟''

میں نے اختری کی طرف دیکھا۔ وہ میرا مطمع نظر سمجھتی ہوئی باہر چلی گئی اور کسی پہرے دار کی طرح تہ خانے کے بیرونی دروازے پر کھڑی ہو گئی۔

میں نے تاجور کے کندھوں پر دباؤ ڈال کر اسے واپس بٹھایا۔ وہ اپنی پیشانی کو مسل رہی تھی۔ یقیناً میری طرح اس کا سر بھی ابھی تک ٹرنکولائزر کے اثر سے چکرا رہا تھا۔ میں نے پہلے اپنی باتوں سے اس کا خوف کم کیا پھر اسے بتایا کہ یہاں سب ٹھیک نہیں ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ اس کا قیافہ درست تھا۔ چاند گڑھی کے دو بندے یہاں موجود ہیں اور ہمیں ان سے چھپانے کے لیے ہی کمرے تک محدود کیا گیا تھا مگر بعد میں آگ لگنے کی وجہ سے ہماری موجودگی راز نہ رہ سکی اور ان بندوں نے بھی ہمیں دیکھ لیا۔

''کون بندے تھے وہ؟'' تاجور نے ڈرے ڈرے لہجے میں پوچھا۔

میں نے تاجور کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''عالمگیر اور تمہارا منگیتر اسحاق......''

تاجور کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ میں نے کہا۔ ''لیکن گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ سمجھو کہ اب یہ بلا ٹل گئی ہے۔ وہ دونوں خبیث ایک آدھ دن تک یہاں سے واپس جا رہے ہیں۔''

''مم...... مجھے آپ کی کسی بات پر یقین نہیں۔ پتا نہیں...... یہاں کیا کیا کچھ ہو رہا ہے۔ آپ سب کچھ چھپا رہے ہیں۔''

''اگر کسی وقت چھپاتا ہوں تو ہم دونوں کی بہترین کے لیے ہی چھپاتا ہوں مگر اس وقت میں جو کہہ رہا ہوں سو فیصد درست ہے۔''

میں نے محبت سے اس کا ہاتھ تھاما اور اسے بتایا کہ سجاول نے عالمگیر اور اسحاق کو یہاں سے خالی ہاتھ لوٹانے کے لیے کیا حکمتِ عملی اختیار کی ہے اور وہ کیونکر یہاں اس تہ خانے میں موجود ہے۔

ساری بات سننے اور میرے سمجھانے بجھانے کے بعد اس کی ڈھارس کچھ بندھ گئی، لیکن وہ اس بات پر پریشان تھی کہ اسے یہاں اختری کے ساتھ اکیلا رہنا پڑے گا۔

میں نے کہا۔ ''ایسا صرف ایک یا دو دن کے لیے ہوگا۔ پھر وہ دونوں یہاں سے دفان ہو جائیں گے، ہم اپنے والے کمرے میں واپس چلے جائیں گے۔''

''کچھ بھی ہے۔ میں رات کو یہاں اکیلی نہیں رہوں گی۔ کسی صورت نہیں۔'' وہ روہانسی ہوگئی۔

آتشزدگی اور اس سے پہلے کے پے در پے واقعات نے اسے کافی سہما دیا تھا۔

میں نے کہا۔ ''چلو ٹھیک ہے۔ ابھی تو دن چڑھا ہے۔ میں اس سلسلے میں سجاول سے بات کرتا ہوں۔''

مجبوری تھی ورنہ میں اسے عالمگیر اور اسحاق کی موجودگی کے بارے میں کچھ نہ بتاتا۔ ان کی موجودگی نے اسے خاصا خوف زدہ کر دیا تھا۔ میں نے اسے دودھ پلانا چاہا لیکن اس نے صاف انکار کر دیا، جیسے اسے ڈر ہوا کہ یہاں کھانے پینے کی ہر چیز میں کچھ نہ کچھ ملا دیا گیا ہو گا۔

شام تک اس تہ خانے میں ضرورت اور استعمال کی کافی اشیا پہنچا دی گئیں۔ جگہ کو اختری نے اچھی طرح صاف ستھرا کر دیا۔ اگلا سارا دن بھی سجاول کے کارندے اردگرد کے علاقے میں تاجور اور اختری کو ''تلاش'' کرتے رہے۔ دو تین مشکوک افراد کو پکڑ کر ڈیرے پر بھی لایا گیا۔ یہ سب کچھ عالمگیر کو دکھانے کے لیے تھا۔ اب معلوم نہیں کہ عالمگیر کو اس صورتِ حال پر کس حد تک یقین آیا تھا۔ بہر حال ایک دفعہ وہ اور اسحاق خود بھی گھوڑوں پر سوار ہو کر وڈے سردار اعظم کے ساتھ کہیں گئے اور ناکام واپس آئے۔

دوسرے روز رات کو سجاول کے یہ دونوں منحوس مہمان یہاں سے دفع ہو گئے اور میں نے سکھ کی سانس لی۔ لیکن اگر میرا خیال تھا کہ اب مجھے سارا دن تاجور سے دور نہیں رہنا پڑے گا اور ہم اپنے پہلے والے کمرے میں واپس آ جائیں گے تو یہ غلط ثابت ہوا۔ سجاول نے مجھ سے کہا کہ اب جو کچھ ہو گیا ہے اس کے مطابق ہی چلنا بہتر رہے گا۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ تاجور کے یہاں ہونے کا بھید کسی طرح کھل جائے۔ یعنی تاجور کو اب اختری کے ساتھ تہ خانے میں

ہی رہنا تھا اور میں رات دس بجے کے بعد رازداری سے سیڑھیاں اتر کر اس کے پاس پہنچ سکتا تھا۔

یہاں موجود لوگ مجھے عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ان میں باقرا گھیاڑ، سردار اعظم اور دیگر لوگ بھی شامل تھے۔ میں ان کے نزدیک ایک ایسا شوہر تھا جس کی بیوی اسے سوتا چھوڑ کر فرار ہوگئی تھی اور اب وہ اپنے نصیب کو رو رہا تھا۔ شاید دو چار کی آنکھوں میں ہمدردی بھی ہوگی لیکن زیادہ کی آنکھوں میں تمسخر تھا۔ ایک اور طرح کا تمسخر بھی ان آنکھوں میں موجود تھا اور شاید اس کا تعلق میری دوسری ''حماقت'' سے تھا۔ یعنی میں نے سردار سجاول جیسے ناقابلِ شکست بندے کو لڑائی کا چیلنج دے ڈالا تھا۔ حقیقت میں دیکھا جاتا تو یہ دونوں باتیں...... حماقتوں کے زمرے میں نہیں آتی تھیں۔ نہ تاجور کہیں فرار ہوئی تھی اور نہ سجاول کو ہتھ جوڑی کا چیلنج دے کر میں نے کوئی ناقص کام کیا تھا۔ ہاں، یہ لوگ اسے ناقص یا غلط سمجھتے تھے تو یہ ان کی اپنی رائے تھی۔

کل سے ماؤ مسلسل مجھ سے رابطے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں اب تک بچتا رہا تھا مگر پھر مجھے جانا پڑا۔ اس نے مجھے گلے سے لگایا اور آنسو بہانے لگی۔ ''نہ میرے بچڑے! تُو کوئی بات اپنے دل سے نہ لگا۔ میں بات کرتی ہوں کھل کھلا کے۔ وہ مرن جوگی تیرے لائق ہی نہیں تھی۔ پتا نہیں کس گندی موری کی اینٹ چوبارے چڑھنا چاہتی تھی۔ اب دیکھنا میں کتنے چا سے کھل کھلا کے تیرا ویاہ کرتی ہوں۔ ایسا جشن مناؤں گی کہ لوگ سو سال تک بھول نہیں سکیں گے۔''

میں نے بمشکل خود کو اس سے چھڑایا۔ ''آپ نے بلایا تھا مجھ کو؟''

''بس تجھے ذرا تسلی دینی تھی۔ تُو اس چنڈال کی بالکل بھی پروانہ کر۔ میں تو کہتی ہوں کہ اب وہ مل بھی جائے نا، تو اس کو دو لاتیں مار کر دفع کر دے یہاں سے۔''

میں سر جھکا کر خاموشی سے سنتا رہا۔ وہ ذرا توقف سے بولی۔ ''اور وہ مانی بھی ملنا چاہ رہی تھی تجھ سے ذرا باتیں شاتیں کر کے تیرا دل لگانا چاہ رہی تھی۔ اس نے کبھی کوئی شے پکائی نہیں، لیکن آج اس نے بریانی بنائی ہے تیرے لیے۔ ہوسکتا ہے کہ زیادہ چنگی نہ بنی ہو پر تُو اس کا دل رکھنے کے لیے تریف شریف کر دینا۔ مظفر آباد سے بوندی کے اصلی لڈو بھی منگوائے ہیں اس نے خاص تیرے لیے۔ سمجھو ہر ویلے تیرے ہی بارے میں سوچتی رہتی ہے۔''

میں اندر پہنچا تو مانی بنی ٹھنی نظر آئی۔ آج اس نے مشرقی لباس پہنا تھا مگر چونکہ وہ پر کٹی کبوتری تھی اس لیے کچھ زیادہ نہیں جچ رہی تھی۔ اس کا جسم جیسے اس شریفانہ لباس کے اندر سے بھی اپنے غیر شریفانہ عزائم ظاہر کر رہا تھا۔ اس نے حسبِ معمول مجھے بانہوں میں لے کر

گرما گرم استقبال کیا۔ کچھ ہی دیر بعد بریانی اور لڈو وغیرہ بھی میز پر نظر آنے لگے۔ وہ بڑے نخرے سے بولی۔ ''میں نے اپنے ہاتھوں سے بریانی بنائی ہے تمہارے لیے۔ خاص دیسی ککڑ کی ہے اور گھی بھی دیسی۔ ولایت کے کھانے کھا کھا کر تم بالکل ولایتی مرغ بن چکے ہو۔''

میں نے بریانی چکھی۔ وہ واقعی عبرت ناک تھی۔ کچے گوشت اور لہسن کی تیز بو آ رہی تھی۔ چاول بھی آدھے کچے آدھے پکے تھے۔ میں نے بمشکل چند لقمے گلے سے اتارے۔

''یہ دعوت کس سلسلے میں ہے؟'' میں نے ذرا چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

وہ میرا انداز بھانپ گئی۔ کہنے لگی۔ ''یہ مت سمجھو کہ میں تمہاری بیوی کے بھاگ جانے کی خوشی منا رہی ہوں۔''

''تو پھر کس چیز کی خوشی ہے یہ؟''

''اس چیز کی کہ تم نے میری بات مان لی میرے ڈیئر جانو۔ تم چاچو سے ہتھ جوڑی والے خطرناک ارادے سے باز آ گئے۔ سچ، وہ بہت بڑی بے وقوفی کر رہے تھے تم۔''

میں اسے کیسے بتاتا کہ وہ ارادہ تو وہیں کا وہیں ہے، بلکہ پہلے سے زیادہ مضبوط ہوا ہے۔

اس نے باداموں والے لڈو کی پلیٹ میرے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ ''لو کھاؤ تھوڑا سا۔ ذائقہ بدل جائے گا۔''

''نہیں، دل نہیں چاہ رہا۔'' میں نے پلیٹ ایک طرف ہٹاتے ہوئے کہا۔

اس نے ترچھی نظر سے میری طرف دیکھا اور ادا سے میرے بالوں میں انگلیاں چلا کر بولی۔ ''لگتا ہے، اسی دغاباز کی یاد ستا رہی ہے۔''

''ہوسکتا ہے وہ دغاباز نہ ہو۔ کوئی سازش ہوئی ہو اس کے ساتھ۔''

''بس تم اسی طرح سوچتے رہنا اور اپنے دل کو تسلی دیتے رہنا۔ میں تو کہتی ہوں ایک دو دن میں ختم کرو اس کا سوگ اور نارمل ہو جاؤ۔ وہ تمہارے قابل ہی نہیں تھی۔ ماؤ تو کہتی ہیں کہ مجھے پہلے دن ہی اس کی آنکھ میں سور کا بال نظر آ گیا تھا۔ ایسی عورت تو مل بھی جائے تو اس کے منہ پر تھوک دینا چاہیے۔ چھوڑو اس کو۔ زندگی بڑی پیاری ہے۔''

اس نے انگڑائی لے کر میرے سامنے پھیلتے ہوئے کہا۔ دل تو یہی چاہا کہ اس کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے بدکردار عورت کے منہ پر تھوک دوں، لیکن اگر میں ایسا کرتا تو تھوک یقیناً مانی کے منہ پر ہی آتا اور اس کے فوراً بعد یہاں بہت کچھ تہس نہس ہو جاتا کیونکہ ماؤ کا بلڈ پریشر جمپ لگا کر ساتویں آسمان کو چھو جاتا اور اس کے فوراً بعد ہی وہ دھڑ کر کے گرتی

اور بے ہوش ہو جاتی۔

حسبِ توقع و اندیشہ مانی ایک بار پھر خرمستیوں پر اتر آئی۔ وہ جیسے مجھے اپنا زر خرید سمجھے ہوئے تھی اور اس زعم میں تھی کہ اپنے چاچو اور اپنی دادی کے ڈراوے سے وہ مجھے اپنا مطیع رکھ سکتی ہے۔ میں بھی اس کی اس بھول کو رفع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس آفت جان سے میرے کچھ مفادات تھے۔ میں نے اسے بانہوں میں بھرتے ہوئے اس کا سر تکیے سے ٹکایا اور کہا۔ ''جاناں کا کیا حال ہے؟''

وہ تنک کر بولی۔ ''دیکھو، جب میرے ساتھ ہوتے ہو تو پھر میرے ساتھ ہی رہا کرو۔ جاناں ٹھیک ہے، اپنے کمرے میں سوئی ہوئی ہے۔''

''کئی دن سے اسے دیکھا نہیں، اس لیے پوچھ رہا ہوں۔''

''زیادہ اداس ہو گئے ہو تو رات کو اسے بھیج دوں تمہارے کمرے میں؟'' وہ تلخ لہجے میں بولی۔

''دیکھو، بات کو سمجھنے کی کوشش کیا کرو، میں نے اسے تمہاری حفاظت میں دے رکھا ہے، اس کی خیر خیریت پوچھنے کا تو حق ہے نا مجھے۔''

وہ اٹھ بیٹھی۔ اپنے کپڑے درست کرتے ہوئے بولی۔ ''تو کر لو اپنا حق استعمال...... وہ ساتھ والے کمرے میں ہے۔ میں جا رہی ہوں ماؤ کے پاس۔''

وہ تیور دکھا رہی تھی۔ میں نے اسے پھر بانہوں میں بھر کر اس کا سر تکیے پر رکھا۔ اس کے جسم میں جیسے کوئی پارا مچلتا رہتا تھا۔ اس نے اپنے ہونٹوں کو میرے چہرے سے اور ناخنوں کو میرے جسم سے برسرِ پیکار کر دیا۔ اگر اس کی خرانٹ دادی جلد از جلد اسے کسی مرد کے پلے باندھنا چاہ رہی تھی تو ٹھیک ہی سوچ رہی تھی۔ وہ ایک ایسے پکے ہوئے پھل کی طرح تھی جو کچھ دیر اور تنہائی کے درخت کے ساتھ لٹکا رہتا تو گلنا سڑنا شروع ہو جاتا۔

دفعتاً ایک مدھم آواز نے مجھے چونکایا۔ یہ نسوانی آواز کسی قریبی کمرے سے آئی تھی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہ کراہتی ہوئی سی آواز جاناں کی ہے۔ شاید اس نے کسی ملازمہ کو یا پھر مانی کو ہی پکارا تھا۔

میں مانی سے علیحدہ ہو کر بیٹھ گیا۔ ایک بار پھر مدھم آواز ابھری۔ ''اف...... ہائے اللہ۔'' میں نے کہا۔ ''تم تو کہہ رہی تھیں کہ جاناں سو رہی ہے۔ کیا ہوا ہے اسے مجھے تو لگ رہا ہے، وہ زخمی ہے۔''

''نن...... نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ تمہیں پتا ہی ہے اسے دوسرے تیسرے روز بخار

ہو جاتا ہے۔"

"بے وقوف نہ بناؤ۔ یہ بخار کی ہائے ہائے نہیں ہے۔ اسے کوئی چوٹ لگی ہے شاید۔"
میں نے اٹھ کر اس کمرے کی طرف جانا چاہا جدھر سے آواز آئی تھی۔ پہلے تو مانی کے چہرے پر غصے کے آثار نظر آئے، پھر اس نے خود کو سنبھالا اور دھیمے لہجے میں بولی۔ "اچھا زیادہ پھوں پھاں نہ کرو۔ بیٹھو، میں تمہیں بتاتی ہوں۔"
میں بیٹھ گیا۔ اس نے تیزی سے وہسکی کا ایک جام بنا کر میرے ہاتھ میں تھمایا اور بولی۔ "شام کے بعد تھوڑی گڑبڑ ہو گئی تھی لیکن پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ جاناں بالکل ٹھیک ہے ڈیئر۔ بس ماتھے پر تھوڑی سی چوٹ آئی ہے۔ پٹی شٹی کر دی ہے۔ ایک دو دن میں زخم بھی ٹھیک ہو جائے گا۔"
"کس نے لگایا ہے یہ زخم؟ تمہارے شرابی باپ نے نا؟"
وہ ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی۔ "یہ بھی اپنی مرضی کرتی ہے نا۔ میں نے پچاس دفعہ کہا ہے، چھوٹے موٹے کاموں کے لیے ملازم موجود ہیں۔ خود باہر نہ نکلا کر۔ اس کے دماغ میں یہ بات آتی نہیں۔ تھوڑے سے جوٹھے برتن لے کر چشمے کی طرف چلی گئی۔ وہاں کہیں ابا بھی تھا۔ تمہیں پتا ہی ہے وہ نشے میں کتنا کمین ہو جاتا ہے......" مانی کے چہرے پر اپنے باپ کے لیے نفرت کی یلغار ہو گئی۔
اس کی باتوں سے پتا چلا کہ اس کے باپ وڈے سردار اعظم نے جاناں کو اکیلے دیکھا، تو اس پر جھپٹ پڑا۔ ایسے موقعوں پر اس کا رویہ جھاڑیوں میں دبکے کسی شکاری جانور جیسا ہی ہوتا تھا۔ جسے صرف شکار اور اپنی بھوک کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ جاناں کا شور سن کر مانی چشمے کی طرف بھاگی۔ اس دوران میں بابا فیض اور اس کا ایک ساتھی بھی پہنچ گئے۔ ان سب نے بمشکل جاناں کو اعظم کے پنجۂ ستم سے چھڑایا۔ پھر بھی اس نے اس کی پیشانی پر پستول کا بٹ مار کر زخمی کر دیا۔ یہ زخم شاید اس زخم کے بدلے میں تھا جو کچھ عرصہ پہلے جاناں نے محفل نشاط سے فرار ہوتے وقت گروہ کے ایک رکن فخرو کے چہرے پر لگایا تھا۔ (یہ واقعہ چاند گڑھی سے کچھ فاصلے پر جنگل میں پیش آیا تھا)
مانی کی زبانی ساری بات سن کر میرے جسم میں چنگاریاں سی چھوٹنے لگیں۔ میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "میں جاناں کو دیکھنا چاہتا ہوں۔"
تھوڑی سی پس و پیش کے بعد وہ مجھے اس کمرے میں لے گئی جہاں جاناں سر پر خون آلود پٹی باندھے لیٹی تھی۔ اس کی دودھیا گردن پر بھی گہری خراشیں تھیں۔ صاف پتا چلتا تھا

کہ اسے بے لباس کرنے کی ناکام کوشش کی گئی تھی۔ کراہنے اور بولنے کے بعد وہ پھر سو گئی تھی۔ مانی نے بتایا کہ اسے سکون بخش دوا دی ہے۔ جاناں کی حالت بظاہر تسلی بخش ہی لگتی تھی۔ زخم بھی زیادہ سنگین نہیں تھا۔ میں نے اسے جگانا مناسب نہیں سمجھا اور مانی والے کمرے میں واپس آ گیا۔ اچانک مانی نے پوچھا۔ ''یہ یاسر کون ہے؟''

میں چونک گیا اور سوالیہ نظروں سے مانی کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بولی۔ ''تم جانتے ہی ہو، اسے کئی دن بخار رہا ہے۔ بخار کی حالت میں بڑبڑاتے ہوئے اس نے تین چار دفعہ کسی یاسر کا نام لیا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے بھی یہ نیند میں یاسر کو یاد کر رہی تھی۔ اس کا شکریہ ادا کر رہی تھی۔ مجھے لگتا ہے کہ یاسر نام کے بندے سے اس کا کوئی چکر رہا ہے۔''

میں نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ ''میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

''مگر تم کچھ نہ کچھ تو ضرور جانتے ہو گے اس کے بارے میں۔ ایسے ہی تو اس کے بارے میں اتنے فکرمند نہیں رہتے ہو۔'' اس نے چبھتے لہجے میں کہا۔

''میں نے کہا ہے نا بس انسانی ہمدردی...... لیکن تمہیں انسانی ہمدردی کا کیا پتا۔ تم ڈکیت لوگ ہو اور صرف لوٹ مار ہی جانتے ہو۔''

اس نے مصنوعی غصہ دکھایا اور مجھے گرا کر میری چھاتی پر چڑھ بیٹھی۔ ''چلو، ایسے ہے تو پھر ایسے ہی سہی۔'' اس نے مجھ پر حملہ کیا۔ کچھ دیر زبردست دھینگا مشتی ہوئی۔ آخر میں نے اسے جکڑ لیا، وہ بری طرح ہانپی ہوئی تھی اور چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ''اب بس کرو۔ ابھی تمہاری ماؤ آ جائے گی۔''

اس نے میری پسلیوں میں زور سے کہنی رسید کی اور الگ ہو کر بیٹھ گئی۔ سانسیں درست کرتے ہوئے بولی۔ ''ویسے میں نے اس سے ایک دو بار پوچھا بھی ہے مگر اس نے بتایا کچھ نہیں۔ بات گول کر گئی ہے مگر مجھے پتا ہے؛ وہ یاسر نام کا بندہ ہے ضرور۔ ہو سکتا ہے یہ وہی ہو جس نے اسے چاچو سجاول کے بندوں سے بچا کر کسی محفوظ ٹھکانے پر پہنچایا تھا......''

بظاہر میں مانی سے باتیں کر رہا تھا مگر میرا ذہن کہیں اور پہنچا ہوا تھا۔ یہ میں ہی تھا جس نے ''یاسر بھائی'' کے روپ میں جاناں کی مدد کی تھی، اور اس وقت کی تھی جب وہ ایک کھوہ میں چھپی ہوئی، سوکھے نان پانی میں بھگو بھگو کر کھا رہی تھی اور کسی بھی وقت موت یا بے آبروئی کا شکار ہونے والی تھی۔ میں نے اسے اس چنگل سے نکال کر حفاظت سے رام پیاری تک پہنچایا تھا اور وہاں بھی ہر طرح سے اسے تحفظ دیا تھا۔ یقیناً جاناں نے رام پیاری سے بھی یاسر بھائی کی دلیری اور خدا ترسی کی باتیں سنی تھیں، اب شاید اس نے اپنے ذہن میں یاسر بھائی کو ہیرو

بنا رکھا تھا اور یہ امید لگائے ہوئے تھی کہ وہ یہاں بھی اس کی مدد کو پہنچے گا۔ وہ جانتی نہیں تھی کہ وہ ”یاسر بھائی“ اب بھی اس کے آس پاس موجود ہے اور واقعی اس کی مدد بھی کر رہا ہے۔

اچانک کچھ آوازوں نے ہمیں بری طرح چونکایا۔ یہ احاطے کی طرف سے آ رہی تھیں۔ پہلے سجاول زور سے بولا، پھر اس کے بڑے بھائی اعظم کے گرجنے برسنے کی صدائیں آنے لگیں۔ یوں لگتا تھا، جھگڑا ہو گیا ہے، میں تیزی سے باہر نکلا۔ جب میں احاطے میں پہنچا تو کئی افراد جمع تھے جن میں اعظم بھی تھا۔ بہرحال سجاول وہاں سے جا چکا تھا۔ اعظم ہاتھ لہرا رہا تھا اور دہاڑ رہا تھا۔ ”میں دیکھ لوں گا تجھ کو تو کتنی بڑی توپ ہے۔ میں دیکھ لوں گا۔ تُو سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو۔ کل کے لونڈے تک تو تجھے آنکھیں دکھا رہے ہیں۔ ان سے تو نمٹ نہیں سکتا اور چڑھائی کرتا ہے ہم پر......“

اتنے میں ماؤ بھی بدحواس ہتھنی کی طرح جھومتی ہوئی موقعے پر پہنچ چکی تھی۔ اس نے اعظم کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ وہ مزید بپھر گیا۔ ”ماؤ! بتا دے اپنے اس لاڈلے کو۔ اگر وہ یہاں کا تھانے دار بنے گا تو میں تیرے سامنے اس کی ٹانگیں چیر دوں گا۔ اس نے میرا جینا حرام کیا ہوا ہے۔ ہر کڑی اس کی ہمشیرہ ہے چاچی تائی ہے۔ خود گل چھرے اڑاتا ہے اور دوجوں پر پابندیاں لگاتا ہے۔“

مجھے چند سیکنڈ میں ساری صورتِ حال سمجھ میں آ گئی تھی۔ یہ اسی واقعے کا شاخسانہ تھا جو تھوڑی دیر پہلے چشمے کی طرف جاناں کے ساتھ پیش آیا تھا۔ یقیناً سجاول نے اسی حوالے سے بڑے بھائی کی سرزنش کی تھی اور وہ بپھر گیا تھا۔ اب اس خیال سے کہ اعظم کے ساتھ کچھ زیادہ بدتمیزی نہ ہو جائے سجاول تو یہاں سے اندرونی حصے کی طرف چلا گیا تھا اور اعظم یہاں کھڑا بڑھکیں مار رہا تھا۔ سب جانتے تھے کہ وہ کتنے پانی میں ہے۔ اس کی باتوں کی کوئی اتنی اہمیت نہیں تھی، تاہم اسے بدتمیزی سے روکنے کے لیے ماؤ بار بار اس کے منہ پر ہاتھ رکھ رہی تھی اور اسے اندر کی طرف کھینچ رہی تھی۔

اعظم نے سب کے سامنے ہی قمیص کے نیچے سے وہسکی کا ادھا نکال کر منہ سے لگایا اور کئی گھونٹ لینے کے بعد بوتل کو پتھریلی زمین پر پٹخ کر توڑ دیا۔ تب اس نے اپنی کمر میں اڑسا ہوا کوئی ایک فٹ لمبا چھرا کھینچ لیا اور یہ ظاہر کرنے لگا کہ وہ اپنی جان لے لے گا۔

ماؤ نے دوہائی دی۔ ”روکو اس کو؟“

کئی افراد نے آگے بڑھ کر وڈے سردار کو تھام لیا۔ دو بندوں نے اس کا چھرے والا ہاتھ جکڑ لیا۔ لگتا تھا کہ یہاں اس طرح کے تماشے ہوتے رہتے ہیں۔ چھرا اعظم کے ہاتھ سے

لے لیا گیا۔ وہ سجاول کو مسلسل گالیاں دے رہا تھا۔ سجاول کے ساتھی اس شرابی سردار کو سنبھالتے ہوئے اندرونی حصے کی طرف لے گئے۔ یقیناً ماؤ کو اسے سنبھالنے کا ڈھنگ آتا تھا۔ فیض محمد نے بتایا تھا کہ ایسے موقعوں کے لیے کوئی ایک ایسی طوائف سنبھال کر رکھی جاتی ہے جو نسبتاً دلکش ہوتی ہے اور اس سے پہلے اعظم کے ہاتھ بھی نہیں لگی ہوتی۔ وہ اس میں الجھ جاتا ہے اور یوں اگلے روز صبح تک یہ بلا ٹل جاتی ہے۔ اگر پوری طرح نہ بھی ٹلے تو اس کی سنگینی اور خطرناکی کم ہو جاتی ہے۔

میں اپنے کمرے میں واپس پہنچ گیا۔ میرے ذہن میں ابھی تک وہ ''لونڈے والا'' فقرہ گونج رہا تھا۔ اعظم نے کہا۔ تھا۔ کل کے لونڈے تک تو تجھے آنکھیں دکھا رہے ہیں۔ یہ الفاظ یقیناً میرے بارے میں ہی کہے گئے تھے۔ یہاں اور کس کو جرأت تھی کہ سجاول کو آنکھیں دکھا سکتا یا اس کی شان میں کسی طرح کی کوئی گستاخی کر سکتا۔

جاناں کے زخمی ہونے کی وجہ سے پریشانی لاحق ہو گئی تھی۔ اسے اعظم کی طرف سے ہر وقت خطرہ تھا۔ وہ خود بھی کسی وقت ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کا مظاہرہ کر جاتی تھی۔ میں نے اس سے کہا تھا اور مائی نے بھی سمجھایا تھا کہ وہ اکیلی احاطے میں نہ نکلا کرے لیکن وہ نکلی اور اعظم کی زد میں آئی۔ اس نے اسی طرح گاؤں میں بھی کیا تھا۔ میں نے رام پیاری کے پاس اسے بڑی محفوظ پناہ دلائی تھی اور تاکید کی تھی کہ وہ شہر جانے کے لیے جلدی نہ کرے مگر وہ نکل کھڑی ہوئی اور نتیجہ یہ نکلا کہ سجاول کے ہرکاروں نے اسے دیکھ لیا۔ وہ خود مصیبت کا شکار ہوئی اور ساتھ میں پہلوان حشمت بھی پھنس کر یہاں پہنچ گیا۔

ابھی رات کے ساڑھے نو ہوئے تھے۔ تاجور کے پاس تہ خانے میں جانے کے لیے ابھی مجھے مزید آدھ گھنٹا انتظار کرنا تھا۔ انتظار کا یہ وقت میں کتنی مشکل سے کاٹتا تھا، کچھ مجھے ہی معلوم تھا۔ جو کچھ بھی کرتا تھا، دھیان اسی کی طرف لگا رہتا تھا۔ وہ بھی پل پل گن کر انتظار کرتی تھی۔ بے شک اختری سارا دن اس کی دلجوئی میں لگی رہتی تھی۔ اس کے کھانے پینے کا خیال رکھتی تھی مگر رات کو جب میں اس کے پاس پہنچتا تھا تو اس کا چہرہ بتا دیتا تھا کہ پچھلے بارہ چودہ گھنٹے اس نے کس طرح گزارے ہیں۔

سرد رات کا سناٹا گہرا ہوتا چلا جا رہا تھا۔ کہرے نے اردگرد کی ہر شے کو ڈھانپ لیا تھا۔ احاطے میں اور رہائشی کمروں کے اندر اب مکمل خاموشی تھی۔ میں نے انگیٹھی بجھا دی اور لالٹین کی لو بہت نیچی کر دی۔ گرم چادر اوڑھ کر میں تہ خانے میں جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا جب دروازے پر مدھم دستک سنائی دی۔ میں نے دروازہ کھولا، سامنے فیض محمد کھڑا تھا۔

”چھوٹے سردار تمہیں بلا رہے ہیں۔کوئی بات کرنی ہے۔“اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”اس وقت؟“

”ہاں ابھی۔“

میرا ذہن فوراً خط والے معاملے اور عالمگیر کے منشی کی طرف چلا گیا۔میرا قیافہ تھا کہ بہت جلد عالمگیر کے منشی یا کسی اور خاص آدمی کو چاند گڑھی سے اٹھا کر یہاں پہنچا دیا جائے گا اور پھر اس سے اس خط کے تانے بانے کا پتا چلایا جائے گا۔عین ممکن تھا کہ یہ وہی معاملہ ہو لیکن فی الوقت مجھے تاجور کو بھی دیکھنا تھا۔

میں نے فیض محمد سے کہا۔”ٹھیک ہے،تم جاؤ۔سردار سے کہو میں آدھے پونے گھنٹے میں پہنچتا ہوں۔“

فیض محمد کی تیوری چڑھ گئی۔درشت لہجے میں بولا۔”ابھی چلو تم،سردار پریشان ہے۔اور میں تمہیں یہ بھی بتا دوں،تم اپنی بے وقوفیوں کی وجہ سے بڑا نقصان اٹھاؤ گے۔“

”اب کیا ہوا ہے؟“میں نے پوچھا۔

”جو کچھ کر چکے ہو،وہ کچھ کم نہیں ہے۔“فیض نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا۔”چلو آؤ،سردار ابھی تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔“

”معاملہ کیا ہے؟“میں نے ٹوہ لینے کی کوشش کی۔

”مجھے نہیں پتا۔تم بس چلو اور مزید کوئی بے وقوفی نہ کرنا ورنہ پچھتاؤ گے۔“

کچھ ہی دیر بعد میں ایک بار پھر سردار سجاول کے کمرے میں بڑے سائز کی چارپائی پر بیٹھا تھا۔وہ میرے سامنے کرسی پر براجمان تھا۔چہرہ انگاروں کی روشنی میں تمتما رہا تھا۔میں سمجھ گیا کہ یہ وہی جھگڑے والا معاملہ ہے جو دو ڈھائی گھنٹے پہلے اعظم اور سجاول کے درمیان ہوا ہے۔

سجاول نے بغیر کسی تمہید کے کہا۔”میں نے تم سے کہا تھا نا کہ تم نے اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی امتحان میں ڈالا ہے۔یہ تمہاری ہی نحوست ہے جس کی وجہ سے یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔“

”میں تمہاری بات سمجھا نہیں۔“

”اب سمجھنے سمجھانے کا وقت گزر گیا ہے۔اب باقی ساری باتیں چھوڑ کر تمہیں پہلے مجھ سے دو دو ہاتھ کرنے پڑیں گے۔“وہ دانت پیس کر بولا۔

میں سمجھ گیا کہ سجاول کو وہ ”لونڈے“ والی بات لڑ گئی ہے جو کچھ دیر پہلے اعظم نے

چنگھاڑتے ہوئے کہی تھی اور یقینی بات تھی کہ یہ بات سجاول کے دیگر ساتھیوں اور کارندوں میں بھی گردش کر رہی ہو گی۔ باقر کو چت کرنے کے بعد میں نے سجاول کو لڑائی کا کھلم کھلا چیلنج دیا تھا اور اب اس بات کو کافی دن گزر چکے تھے۔

میں نے گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ''میں تو ہر وقت تیار ہوں۔تم نے ہی کہا تھا، پہلے یہ خط والا معاملہ دیکھتے ہیں۔''

اس نے خط کو اور خط والے معاملے کو ایک غلیظ گالی دی اور پھنکارا۔ ''پہلے اپنی گندی اوقات کا پتا کرلو...... پھر اگر بولنے کے قابل ہو گے تو تم سے پوچھ لوں گا کہ کس مرض کی دوا ہو۔''

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اطمینان سے کہا۔ ''میں نے تو سنا ہے کہ تم سے ہتھ جوڑی کرنے والا بچتا ہی کم ہے۔ اگر میرا ابھی قصہ تمام ہو گیا تو ہمارے مشترکہ پروگرام کا کیا بنے گا۔ ہم نے تو بڑے صاحب تک پہنچنا تھا اور کھوج لگانا تھا کہ وہاں یہ کروڑوں کی باتیں کیوں ہو رہی ہیں؟''

وہ نہایت زہریلے لہجے میں بولا۔ ''یہ سب کچھ ہو جائے گا اور تمہارے بغیر بھی ہو جائے گا۔کوئی ایسے آسمان سے نہیں اترے ہوئے ہو تم...... تمہارے جیسے بہت بھوتنی کے اپنی ٹانگ کے نیچے سے گزار دیئے ہیں میں نے۔''

وہ غصے سے پھٹا پڑ رہا تھا اور لگتا تھا کہ اب مجھے براہِ راست گندی گالیوں کی زد میں لے آئے گا۔ اندازہ ہوا کہ یہاں معاملہ کافی گڑبڑ ہو چکا ہے اور اس کی وجہ وہی میرا کھلم کھلا چیلنج ہے (بعدازاں میرا یہ خیال بالکل درست ثابت ہوا۔ پتا چلا کہ سجاول کے ساتھیوں میں سخت بے چینی ہے بلکہ ان میں پھوٹ پڑنے کا اندیشہ پیدا ہو گیا ہے۔ ایک گروپ اس بات پر سخت برہم ہے کہ میں نے سردار سے علی الاعلان ہتھ جوڑی مانگی ہے اور کئی دن گزرنے کے باوجود سینہ تان کر یہاں دندنا رہا ہوں)

میں نے بہتر سمجھا کہ سجاول کے سامنے سے اٹھ جاؤں۔ ورنہ ہماری گفتگو جس رخ پر جا رہی تھی یہاں ابھی کوئی مارا ماری شروع ہو سکتی تھی۔ میں اٹھا تو سجاول نے گرج کر کہا۔ ''بیٹھو ابھی۔''

میں دوبارہ بیٹھ گیا۔ اس نے لال بھبوکے چہرے کے ساتھ اپنا قیمتی سیل فون اٹھایا اور کسی سے رابطہ کر کے بولا۔ ''آ جاؤ۔''

ایک منٹ کے اندر اندر دو مسلح افراد اندر آ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں ہیوی آٹومیٹک

رائفلیں تھیں۔ ان کے ساتھ چپٹی ناک والا فخرو بھی تھا۔ اس کی قمیص کے نیچے بھی یقیناً ریوالور یا پستول موجود تھا۔ رائفلوں کا رخ میری طرف تھا اور دونوں رائفل بردار بالکل چوکس حالت میں تھے۔ میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ آخر بلی تھیلے سے باہر آ ہی گئی تھی۔

''تلاشی لو اس کی۔'' سجاول نے کرخت لہجے میں حکم دیا۔

دونوں رائفل برداروں نے ماہرانہ انداز میں مجھے زد میں لے لیا تھا۔ فخرو آگے بڑھا اور مشاقی سے میری تلاشی لی۔ جیکٹ اتروالی۔ شلوار قمیص کو اچھی طرح کھنگالا۔

''خط کا باقی حصہ کہاں ہے؟'' سجاول نے پوچھا۔

''باقی حصہ کوئی نہیں ہے۔ شاید کوئی چھوٹا موٹا ٹکڑا ہوگا لیکن وہ میرے پاس نہیں آیا۔''

''اس کی شلوار اتار کر شلوار کے نیفے میں دیکھو۔'' سجاول نے فخرو کو حکم دیا۔

میں سمجھ گیا کہ وہ وہی کرے گا جو کرنا چاہ رہا ہے۔ میں نے خود ہی شلوار جسم سے علیحدہ کر دی۔ اب میں کرتے اور انڈرویئر میں کھڑا تھا۔ فخرو نے اچھی طرح نیفے کی جانچ کی۔ سجاول کے اشارے پر شلوار مجھے واپس کر دی گئی۔ میں نے وہیں کھڑے کھڑے پہن لی۔

اس نے مسلح افراد کو فخرو سمیت باہر بھیج دیا۔ میں کھڑا تھا، وہ اسی طرح پھیل کر کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ تفتیشی لہجے میں بولا۔ ''اور کیا جانتے ہو اس چکر کے بارے میں؟''

''کون سا چکر؟''

''میں اس خط کی بات کر رہا ہوں اور تمہارے اس پیو ''بڑے صاحب'' کی بات کر رہا ہوں۔'' وہ پھنکارا۔

''مجھے جو کچھ پتا تھا، میں نے تمہیں بتا دیا ہے۔''

اس نے مجھے گالی دی تو میں نے کہا۔ ''گالی نہ دو۔ یہ ہیجڑوں والا کام کر رہے ہو۔ کل میدان میں مجھے گرالو، پھر جو جی چاہے سلوک کرنا۔''

وہ خونی نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ میرا اور اس کا درمیانی فاصلہ دس فٹ کے لگ بھگ ہوگا۔ اگر میں چاہتا تو اس کے پستول نکالنے سے پہلے اسے چھاپنے کی ایک کامیاب کوشش کر سکتا تھا مگر میں جب بھی کوئی اس قسم کی بات سوچتا تھا، میری آنکھوں کے سامنے تاجور کی بے مثال صورت آ جاتی تھی۔ وہ معصوم آنکھیں، وہ دلکش رخسار، وہ گلاب کی نرم پتیوں جیسے ہونٹ، جو ذرا سی پریشانی سے بے ساختہ کپکپا اٹھتے تھے۔ کوئی ایسی بات تھی اس کی نسوانیت میں جس کی کشش کو لفظوں میں بیان کرنا کم از کم میرے لیے تو ناممکن تھا۔ زندگی میں پہلی بار مجھے پتا چلا تھا کہ کبھی کبھی عورت، آدمی کو کمزور بھی کر دیتی ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا

کہ اگر خدانخواستہ میری وجہ سے تاجور کو کوئی نقصان پہنچ گیا تو مجھے اپنی زندگی کا خاتمہ بھی کرنا پڑ جائے گا۔ اور اگر خاتمہ نہ ہو سکا تو یہ زندگی موت سے بدتر ہو گی۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ بڑی بے قراری سے اس نے کمرے کے دو چکر لگائے، پھر میری طرف دیکھے بغیر کسی سانپ کی طرح پھنکارا۔ ''دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ میں ابھی تمہاری شکل دیکھنا نہیں چاہتا۔''

میں اٹھ کر باہر آ گیا۔ دونوں مسلح افراد مجھے شعلہ بار نظروں سے گھور رہے تھے۔ میں واپس کمرے میں آیا تو ہر چیز کو الٹ پلٹ پایا، کمرے میں موجود لحاف اور تکیے تک کو ادھیڑ کر رکھ دیا گیا تھا۔ یقیناً میری غیر موجودگی میں سجاول کے بندوں نے کمرے کی بھرپور تلاشی لی تھی۔ شاید وہ خط کا باقی حصہ ڈھونڈنا چاہتے تھے، اس کے علاوہ بھی انہیں کوئی کام کی شے ملنے کی امید ہو سکتی تھی۔ ظاہر ہے ان کی ایسی کوئی امید بر نہیں آئی ہو گی۔

یکا یک میرا دھیان تاجور کی طرف چلا گیا۔ ممکن تھا کہ اسے بھی پریشان کیا گیا ہو۔ اب رات کے ساڑھے گیارہ بجے کا عمل تھا۔ میں جانتا تھا وہ بے چینی سے میرا انتظار کر رہی ہو گی۔ گرم چادر اوڑھ کر میں کمرے سے نکلا اور ایک تنگ راہداری سے گزر کر سیڑھیوں تک پہنچ گیا۔ لیکن آج یہاں ایک پٹھان پہرے دار موجود تھا۔ یقیناً یہ سجاول کا کوئی خاص الخاص کارندہ ہی رہا ہو گا۔ میں نے غور سے دیکھا تو پتا چلا کہ یہ انہی مہمانوں میں سے ہے جو بڑے بڑے پگڑ باندھے رہتے تھے اور شاذ و نادر ہی بات کرتے تھے۔ ان میں سے قریباً ہر ایک کی ناک غیر معمولی طور پر اونچی تھی اور آنکھوں میں عقابی چمک دکھائی دیتی تھی۔

''خو تم آگے نہیں جا سکتا۔'' چوکیدار نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''تم مجھے کیسے روک سکتے ہو؟'' میں نے بھی فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

ہمارے درمیان تین چار تلخ جملوں کا تبادلہ ہوا، اس سے پہلے کہ بات زیادہ بڑھ جاتی، کہیں اندر سے اختری کے بولنے کی آواز آنے لگی۔ الفاظ صاف سنائی نہیں دے رہے تھے۔ شاید وہ بھی یہی کہہ رہی تھی کہ مجھے اندر آنے دیا جائے۔

پہرے دار نے اپنی واسکٹ میں سے سیل فون نکالا اور ایک گوشے میں جا کر کسی کو کال میں مصروف ہو گیا۔ جو الفاظ میری سماعت تک پہنچے ان سے یہی پتا چلا کہ وہ سجاول سے بات کر رہا ہے۔ کچھ دیر بعد اس نے ادب سے جھک کر فون بند کیا اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

''خو ام دروازہ کھول دیتا ہے لیکن تم صرف دس منٹ اندر رہ سکتا ہے۔''

''اچھا...... دروازہ کھولو۔'' میں نے تحکم سے کہا۔

اس نے مجھے قہر ناک نظروں سے دیکھتے ہوئے دروازے کا لاک کھول دیا۔ میں اندر چلا گیا۔ یہاں دوسرا دروازہ تھا۔ تاہم اس کی چابی اختری کے پاس موجود تھی۔ میں نے سلاخ دار کھڑکی میں سے تاجور کی صورت دیکھی اور فوراً سمجھ گیا کہ اس سے بھی پوچھ گچھ کی گئی ہے اور شاید تلاشی وغیرہ بھی لی گئی ہے۔

آج اختری کے تیور بھی کچھ بدلے بدلے نظر آتے تھے۔ وہ مسلسل مجھے سخت نظروں سے گھور رہی تھی۔ تاجور میرے بازو سے لگ کر سسکنے لگی۔ ''مجھ سے بڑی بدتمیزی کی ہے اس نے۔'' تاجور کا اشارہ اختری کی طرف تھا۔

میں نے دیکھا، اس کمرے میں بھی سامان وغیرہ الٹ پلٹ کیا گیا تھا۔ استعمال کی تمام اشیا اور کپڑے وغیرہ اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔ یقیناً یہ سب کچھ اختری نے ہی کیا تھا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ خشک لہجے میں بولی۔ ''میں حکم کی بندی ہوں۔ سردار کے حکم پر اپنی جان بھی لے سکتی ہوں۔ دوسرے تو پھر دوسرے ہیں۔''

وہ کسی سپاہن کی طرح سینہ تان کر کھڑی تھی۔ خاصے مضبوط اور گٹھے ہوئے بدن کی تھی۔ یقیناً اسلحہ چلانا بھی بخوبی جانتی تھی۔ اس کی کمر سے بندھا ہوا پستول اس امر کی نشاندہی کرتا تھا۔ ایک دو دن پہلے تک وہ مجھ سے اپنائیت بھرے لہجے میں بات کرتی تھی لیکن آج سب کچھ بدلا ہوا تھا۔

''کیا کہا ہے تم نے تاجور کو؟'' میں نے پُرطیش لہجے میں اختری سے پوچھا۔ میرے لہجے سے وہ ذرا ٹھٹک گئی مگر اس کی تن فن برقرار رہی، بولی۔

''صرف تلاشی لی ہے، کمرے کی...... اور اس کی۔ اپنی تلاشی نہیں دے رہی تھی مگر مجھے تو وہ کرنا تھا جو اوپر سے کہا گیا تھا۔''

''تم نے مارا ہے اسے؟'' میں نے بپھر کر پوچھا۔

''بالکل نہیں...... پوچھ لو اس سے۔ تت...... تمہارے سامنے کھڑی ہے۔ پوچھ لو۔'' وہ ہکلائی (باقر کی ٹھکائی کے بعد سے یہاں میرا دبدبہ سا ہو گیا تھا)

تاجور میرے اور اختری کے درمیان آ گئی۔ شاید اسے ڈر تھا کہ میں اختری کو مار نہ بیٹھوں۔ وہ جلدی سے بولی۔ ''چھوڑو شاہ زیب، دفع کرو۔''

اختری صورتِ حال دیکھ کر جلدی سے باہر نکل گئی۔ تاجور نے مجھے نیچے گدیلے پر بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ وہ میرا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی باتوں سے پتا چلا کہ اختری نے صرف زبانی کلامی بدتمیزی کی اور آخر میں پستول کا ڈراوا دیا۔ وہ اس سے اسی خط کے

ٹکڑے کے بارے میں پوچھتی رہی جو الٹے حرفوں سے لکھا گیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ یہ جاننا چاہتی تھی کہ تاجور، ''بڑے صاحب'' اور لورو نامی جگہ کے بارے میں کیا جانتی ہے۔ تاجور کو کچھ معلوم ہی نہیں تھا، وہ کیا بتاتی۔ (لورو کو خط میں الٹ کر ''ورول'' لکھا گیا تھا)

وہ بس آنسو بہا رہی تھی اور جیسے خود میں سمٹتی چلی جا رہی تھی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے میرا بازو بڑی مضبوطی سے تھام لیا اور دھیمی آواز میں بولی۔ ''شاہ زیب! آپ کچھ بھی کہیں لیکن مجھے ان لوگوں کے تیور بدلے ہوئے لگ رہے ہیں۔ مجھے پتا چل رہا ہے کہ ہمارے ساتھ کچھ اچھا نہیں ہونے والا۔''

''میں نے کہا ہے نا تاجور، میں تمہیں کانٹا چبھنے کی تکلیف بھی نہیں ہونے دوں گا۔''

وہ جیسے سنی ان سنی کرتے ہوئے بولی۔ ''شاہ زیب! اگر میرے ساتھ...... کچھ ہونے لگے تو مجھے اپنے ہاتھوں سے مار دینا۔''

میرا کلیجا کٹ کر رہ گیا۔ تاجور کو اس مایوسی اور بے بسی کی حالت میں دیکھنا میرے لیے بہت کٹھن تھا۔ میں زندگی میں بہت سخت مرحلوں سے گزرا تھا۔ جسمانی اور ذہنی درد کی انتہا کو چھو کر دیکھا تھا۔ میرا دل توڑا گیا تھا اور میں نے بھی دل توڑے تھے، میں ان گنت مرتبہ موت کی وادی سے گزرا تھا اور دوسروں کو بھی اس وادی سے گزارا تھا۔ میں نے لاشیں دیکھی تھیں اور لاشوں پر روتے لوگ دیکھے تھے اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوا تھا کہ حالات کی سفاکی دیکھ کر خود اپنے اوپر رحم آیا تھا اور آنکھوں میں نمی جاگی تھی لیکن اتنا کرب میں نے کبھی محسوس نہیں کیا، جتنا چاند گڑھی کی اس سادہ و روشن چہرہ لڑکی کو اشک بار دیکھ کر کیا۔

میں نے بے پناہ جذب کے ساتھ اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا اور سچے دل کے ساتھ بے حد و حساب محبت سے اس کے کانوں میں ایسی سرگوشیاں کیں، جنھوں نے اس کا خوف کسی حد تک کم کر دیا۔

میں زیادہ دیر وہاں نہیں رک سکا۔ مجھے اوپر اپنے کمرے میں واپس آنا پڑا۔ تاجور کے بغیر یہ کمرا بالکل ویران اور اجاڑ محسوس ہوتا تھا۔ ماؤ نے یہاں بچوں کی جو تصویریں لگوائی تھیں، وہ مجھے اچھی لگتی تھیں اور میں ان کے حوالے سے تاجور کو چھیڑتا تھا لیکن اب ان تصویروں پر بھی نگاہ ڈالنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ میں بہت دیر کمرے میں ٹہلتا رہا اور موجودہ صورتِ حال کے بارے میں سوچتا رہا۔ میں یہ بات تو کسی صورت ماننے کو تیار نہیں تھا کہ سجاول کو جدی پشتی کوئی خاص صلاحیت ملی ہے اور اس صلاحیت کے زور پر وہ اپنے مقابل آنے والے ہر شہ زور کو زیر کر لیتا ہے۔ جہاں تک میں نے اب تک دیکھا تھا وہ صرف ڈکیت ہی نہیں تھا ایک

نہایت لالچی اور سفاک شخص بھی تھا۔ اگر فرض محال اس میں کوئی انہونی صلاحیت ہوتی تو وہ یوں چپ نہ بیٹھا رہتا۔ اس کا بے دریغ استعمال کرتا۔ اب تک نہ جانے کتنے لوگ اس کے دستِ ستم کا شکار ہو چکے ہوتے اور کتنی گردنیں اس کے گھونسے سے ٹوٹ چکی ہوتیں۔ مانی نے مجھے باتوں میں بتایا تھا کہ آخری بار اس کا چاچو قریباً ڈیڑھ برس پہلے ایک سندھی پہلوان سے لڑا تھا اور مانی اس خونی لڑائی کی چشم دید گواہ تھی۔ شاید اس طرح کی دو چار لڑائیاں اس نے اور لڑی ہوں۔

اگر واقعی وہ لڑائی بھڑائی کے فن میں خاص مہارت اور صلاحیت رکھتا تھا تو پھر اس کا استعمال کیوں نہیں کرتا تھا۔ مجھے تو یہ سارا کوئی ڈراما ہی لگتا تھا۔

صبح سویرے میں نے ایک پالکی دیکھی۔ ایسی پالکیاں پرانے زمانے میں خواتین کو لانے، لے جانے کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔ اس وقت بھی پالکی میں یقیناً عورتیں ہی تھیں۔ میں نے قریب کھڑے فیض محمد سے پوچھا۔ ''یہ کون ہے؟''

''ماؤ اوران کی پوتی۔'' پوتی سے فیض کی مراد یقیناً مانی ہی تھی۔

''کہاں جارہے ہیں یہ؟''

''ٹھیک سے پتا نہیں، لیکن شاید کل شام تک آجائیں گے۔'' فیض محمد نے قدرے روکھے لہجے میں جواب دیا۔ پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''یہ سب تمہاری وجہ سے ہورہا ہے۔''

''میری وجہ سے؟''

''یہ اس ہتھ جوڑی کی تیاری ہے، جو کل دوپہر تمہارے اور سردار سجاول کے درمیان ہونی ہے۔ سردار سجاول نہیں چاہتا کہ دونوں عورتوں کو خاص طور سے ماؤ کو اس کا پتا چلے۔ اس لیے دونوں کو بہانے سے دو دن کے لیے باہر بھیجا جارہا ہے۔''

میرے سینے میں دھڑکن کی رفتار تیز ہوگئی۔ اس کا مطلب تھا کہ فیصلہ کن گھڑیاں قریب آرہی ہیں۔ میں پالکی کو دیکھتا رہا۔ وہ آٹھ کہاروں کے کندھوں پر آہستہ آہستہ ہچکولے کھاتی چٹانوں کے عقب میں اوجھل ہوگئی۔ چھوٹی چھوٹی مچانوں میں بیٹھے درجنوں پہرے دار مؤدب انداز میں کھڑے ہوگئے تھے یا انہوں نے اپنی گردنیں جھکا لی تھیں۔

میں نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''کہاں ہوگا یہ مقابلہ؟''

''یہیں، اس احاطے کے بیچوں بیچ۔ یہاں موجود سب لوگ دیکھ سکیں گے۔''

''لیکن میں نے تو سجاول کے سامنے شرط رکھی تھی۔ میں نے کہا تھا......''

''تم نے کہا تھا کہ ہتھ جوڑی کمرے کے اندر ہوگی۔'' فیض نے میری بات کاٹ کر تلخ

انداز میں کہا۔ ”سردار نے تمہاری یہ شرط نامنظور کی ہے۔ کل جو کچھ بھی ہوگا سب کے سامنے ہوگا۔“

میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا، لیکن فیض محمد نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے چپ کرا دیا اور بپھرے انداز میں بولا۔ ”خوامخواہ زبان چلا کر اپنی بدبختی اور نہ بڑھاؤ۔ جو کچھ کر چکے ہو، اسی کو بھگت لو تو بڑی بات ہے۔“

وہ جیسے غم وغصے میں پاؤں پٹختا ہوا اپنے رہائشی کمرے کی طرف چلا گیا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ سیدھا سردار سجاول کے پاس جاؤں اور اس سے پوچھوں کہ وہ بند کمرے میں لڑنے کا وعدہ کر کے کیوں مکر گیا ہے مگر پھر اس کے پاس جانے کا ارادہ بدل دیا۔ وہ کل سے اتنا بپھرا ہوا تھا کہ اس سے بات کرنا ہی فضول تھا۔ میرا ذہن ایک بار پھر فیض محمد کی طرف منتقل ہو گیا۔ فیض محمد کا رویہ میرے ساتھ شروع سے ہی ہمدردانہ تھا، لیکن اب وہ بتدریج مجھ سے ناراض ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اس ناراضی کی سب سے اہم وجہ یقیناً یہ ہتھ جوڑی والا معاملہ ہی تھا۔

میرا دل چاہا کہ فیض محمد کی ناراضی دور کرنے کی کوشش کروں۔ آج موسم ابر آلود تھا۔ بڑی سرد ہوا چل رہی تھی۔ احاطے میں چہل پہل دکھائی نہیں دیتی تھی۔ مچانوں والے بھی اپنی مچانوں میں بند ہو کر بیٹھے تھے۔ میں فیض محمد کے کمرے کی طرف گیا تو راستے میں پہلوان حشمت پر نظر پڑی۔ اسے یہاں دو تین مریض مل گئے تھے۔ اس وقت بھی وہ ایک جواں سال لڑکے کی کلائی کو الٹے سیدھے مروڑے دے رہا تھا اور مالش کر رہا تھا۔ لگتا تھا کہ یہ لڑکا بڑے کمرے میں ہونے والی کسی پریکٹس لڑائی میں زخمی ہوا ہے یا شاید یہ کسی واردات کا نتیجہ ہو۔

پہلوان کے ساتھ دور ہی سے علیک سلیک کرتا ہوا میں بابے فیض کے کمرے میں پہنچا۔ وہ اپنی چارپائی پر نیم دراز تھا۔ کھدر کا پھول دار لحاف اس نے اپنی کمر تک کھینچ رکھا تھا۔ آنکھیں بند تھیں، وہ جیسے کسی گہری سوچ میں تھا۔ میں اندر آ کر بڑی آہستگی سے اس کے قریب موڑھے پر بیٹھ گیا اور اس کو پتا ہی نہیں چلا۔ جب میں نے اپنا ہاتھ لحاف کے اندر گھسا کر اس کی پنڈلی پر رکھا تو وہ بری طرح چونک گیا۔ ”اوئے، تم یہاں؟“ اس نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

میں نے بڑی محبت سے اس کی پنڈلیاں دبانا شروع کر دیں۔ وہ الجھے ہوئے انداز میں میری طرف دیکھتا رہا۔ جیسے سمجھ نہ پا رہا ہو کہ مجھ سے کیا کہے اور کیا نہیں۔

میں نے کہا۔ ”میں جانتا ہوں آپ میرا بھلا چاہتے ہیں۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ آپ نے کئی بار مجھے اس ہتھ جوڑی والے معاملے سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن بزرگوار!

کہتے ہیں نہ کہ ہوتا وہی ہے جو خدا کو منظور ہوتا ہے اور شاید یہاں بھی خدا کو یہی منظور تھا۔ اب بات اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ اسے یہاں سے واپس لانا ممکن نہیں، آپ اس کے لیے مجھے معاف کر دیں اور دعا کریں کہ یہ سب کچھ اچھے طریقے سے شروع ہو کر اچھے طریقے سے ہی ختم ہو جائے۔"

"اچھے طریقے سے ہی ختم ہو گا۔" فیض نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "کل دو ڈھائی بجے تمہاری لاش پڑی ہو گی وہاں چارپائی پر...... یا پھر ہمیشہ کے لیے لولے لنگڑے ہو کر رہ جاؤ گے۔"

"آپ سب لوگ لڑائی سے پہلے ہی لڑائی کا فیصلہ کر کے کیوں بیٹھے ہوئے ہیں؟" میں نے کہا۔

"اس لیے کہ ہم جانتے ہیں چھوٹے سردار کو، تم نہیں جانتے ہو۔" بابے فیض نے اتنی بلند آواز سے کہا کہ کمرا گونج اٹھا۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس نے جھٹکا دے کر میرے ہاتھوں کو اپنی پنڈلیوں سے دور کر دیا۔ وہ طیش سے کانپ رہا تھا۔

"جاؤ یہاں سے۔" وہ کچھ دیر بعد دوبارہ گر جا اور سر پھر سے تکیے پر رکھ دیا۔

میں اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ چند سیکنڈ بعد میں نے اپنے ہاتھ پھر سے لحاف میں داخل کر دیئے اور فیض کی بوڑھی لیکن سڈول پنڈلیاں دبانے لگا۔

فیض کی آنکھوں کے گوشے نم ہو رہے تھے۔ دھیرے دھیرے وہ نارمل ہو گیا۔ میں نے ایک بار پھر اس سے معذرت کی اور اپنائیت کی گفتگو کرتا رہا۔ باہر تیز ہوائیں چل رہی تھیں اور یخ بستہ جھکڑ کھڑکیوں، دروازوں سے سر ٹکرا رہے تھے۔

فیض نے کہا۔ "میں جانتا ہوں تم دلیر ہو اور لڑنا بھڑنا بھی بہت چنگی طرح جانتے ہو۔ تم نے باقر جیسے لڑکے کو آسانی سے نیچا دکھایا ہے پر...... یہ سردار سجاول عام بندہ نہیں ہے۔ اس پر ہاتھ ہے......"

یہ ہاتھ والی بات اس سے پہلے مانی بھی کہہ چکی تھی۔ اس نے قبیلے کے مرے ہوئے بزرگوں کی توجہ کا ذکر کیا تھا۔

میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔ "ہاتھ سے تمہارا کیا مطلب ہے چاچا؟"

"قبیلے کے بڑوں کا سایہ۔ کہا جاتا ہے کہ وہ سردار کے آس پاس رہتے ہیں اور جب وہ کسی سے لڑتا ہے تو وہ اس کی مدد کرتے ہیں۔"

''اور تم ان باتوں پر یقین رکھتے ہو؟''

باہر سرد ہواؤں نے طوفانی شکل اختیار کر لی تھی۔ درخت دیوانہ وار جھوم رہے تھے، کھڑکیوں اور دروازوں میں پرہول تھرتھراہٹ تھی۔ فیض نے کھوئی کھوئی آواز میں کہا۔

''کچھ باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ خاص طور سے پڑھے لکھے لوگ ان پر یقین نہیں کر پاتے مگر ان کے یقین نہ کرنے سے وہ باتیں جھوٹ تو نہیں ہو جاتیں۔ بندے کی عقل اتنی نہیں ہے کہ وہ ہر بات کی تہ تک پہنچ سکے۔''

''تمہارا خیال ہے کہ سجاول جب لڑ رہا ہوتا ہے تو وہ اپنی طاقت کے بجائے کسی اور کی طاقت استعمال کر رہا ہوتا ہے؟''

''نہیں، میں یہ نہیں کہہ رہا۔ مگر جب وہ لڑتا ہے تو ایک بدلا ہوا شخص نظر آتا ہے۔ اس کے چہرے پر نظریں جمانا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسی آگ ہوتی ہے اس کی آنکھوں میں کہ اس کے سامنے آنے والا، آدھی لڑائی تو اسے دیکھ کر ہی ہار جاتا ہے۔ سردار وادیٔ سون کے ایک پرانے لڑاکو (جنگجو) قبیلے کا بندہ ہے۔ اس قبیلے کی ہر نسل میں ایک نہ ایک بندہ ایسا ضرور پیدا ہوتا ہے جس پر اس کے پُرکھوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔''

میں نے اپنے طنز کو حتی الامکان چھپاتے ہوئے کہا۔ ''یہ ''ہاتھ'' ہر وقت رہتا ہے یا کبھی کبھی آتا ہے؟''

بابے فیض نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ ''کوئی رسم ہے جسے یہ لوگ لڑنے سے پہلے ادا کرتے ہیں۔ میں اس بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتا۔ اس رسم کے بعد یہ لوگ مرنے اور مارنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔''

''کیسی رسم؟''

بابا فیض پہلے تو گول مول بات کرتا رہا لیکن جب میں نے کسی صورت جان نہیں چھوڑی تو اس نے حقے کا ایک طویل کش لے کر چلم پر اپنا ہاتھ سینکا اور کھڑکی سے باہر سر پٹختی ہواؤں کو دیکھ کر بولا۔ ''شاید تمہیں یہ باتیں عجیب لگیں گی، مگر جو کچھ مجھے معلوم ہے، اس قبیلے کے پرانے لوگ سون کی گھاٹیوں میں رہنے والے ''باگھ'' کو بہادری اور دہشت کا نشان سمجھتے تھے۔ یہی باگھ (تیندوا یا شیر) اب تک کسی نہ کسی شکل میں ان لوگوں کے دماغوں میں موجود ہے۔ اب وہ اس کی پوجا تو نہیں کرتے مگر اس سے کچھ خاص باتیں ضرور نتھی کرتے ہیں۔ شاید تمہیں یہ سن کر حیرانی ہو کہ میں جس رسم کی بات کر رہا ہوں، اس میں کچھ اور انوکھی باتوں کے علاوہ باگھ کے سوکھے ہوئے جگر کا نام بھی لیا جاتا ہے۔''

''سوکھا ہوا جگر؟''

''ہاں......اس جگر کو اس طرح سکھایا جاتا ہے کہ وہ محفوظ ہو جاتا ہے پھر اس کو گرم پانی میں ڈال کر تازہ کر لیا جاتا ہے۔اس کے علاوہ اصل نسل کے گھوڑے کا کچا بچہ......''

''کچا بچہ......یہ کیا چیز ہے؟''

''چار مہینے کا حمل......گھوڑی کا پیٹ چیر کر بچہ نکالا جاتا ہے۔ بچہ بھی کیا ہوتا ہے، گوشت کا لوتھڑا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی بہت پرانی شراب ہوتی ہے ان لوگوں کے پاس۔اسے تین بار آگ دکھائی گئی ہوتی ہے۔وہ دور سے آگ پکڑ سکتی ہے۔''

''چاچا فیض، مجھے تمہاری باتیں کچھ سمجھ میں نہیں آ رہیں۔''

''خود میری سمجھ میں بھی یہ باتیں پوری طرح نہیں آتیں۔بس ان کا تعلق اس رسم سے ہے جو میں نے تمہیں بتائی ہے۔''

''تمہیں یہ سب کس نے بتایا؟''

''آج سے بہت سال پہلے، جب سجاول کا باپ زندہ تھا۔میں نے اتفاق سے اس کی اور سجاول کی کچھ باتیں سنی تھیں۔اگر ساری باتیں سن سکتا تو شاید کچھ اور بھی پتا چل جاتا لیکن اتنا پتا تو ضرور چل گیا کہ سجاول جب خاص موقع پر کسی سے کوئی خاص لڑائی لڑتا ہے تو پھر لڑائی سے پہلے یہ رسم بھی ہوتی ہے۔''

''تو تمہارا کیا خیال ہے، آج بھی یہ رسم ہوگی؟'' میں نے پوچھا۔

''ہو سکتا ہے کہ ہو، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کل رات ہو چکی ہو، یا اس سے بھی پہلے......'' فیض نے الجھے ہوئے انداز میں کہا۔

ہم دونوں خاموش ہو گئے۔بس تیز ہوائیں سیٹیاں بجاتی رہیں، اور سردی ہڈیوں کے گودے میں گھستی رہی۔

فیض نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔''شاہ زیب! بات یہ نہیں کہ وہ رسم کیا ہے اور اس کا اثر سردار سجاول پر کیا ہوتا ہے، اصل بات یہ ہے کہ وہ لڑائی کے وقت بالکل دوسرے روپ میں آ جاتا ہے یا یوں کہہ لو کہ اپنے ہوش حواس میں نہیں رہتا۔میں تمہیں بالکل سچ بات بتا رہا ہوں۔اس سے لڑنے والے کے لیے اپنی جان بچانا مشکل ہو جاتی ہے۔ میں نے سردار سجاول کی کم از کم ایسی چار لڑائیاں اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں، ایسی ایک لڑائی کوئی ڈیڑھ سال پہلے یہیں پر ایک ملاکھڑا کھیلنے والے پہلوان سے ہوئی تھی۔'' اس کے بعد فیض نے وہی تفصیل بتائی جو میں اس سے پہلے مہناز عرف مانی سے بھی سن چکا تھا۔وہی سجاول کا مہلک

ترین وار جو ایک گھونسے کی صورت میں ہوتا تھا اور مدِ مقابل کی گردن توڑ دیتا تھا۔

ایک دم فیض نے چونک کر کہا۔ ''شاید اس لڑائی کی ایک فلم بھی ہے......''

''فلم؟''

''ہاں...... وہی جو آج کل منڈے موبائل پر مووی وغیرہ بناتے ہیں۔ ایک منڈا صادق محمد ہے۔ شاید اس کے پاس یہ مووی ہو گی۔ سال ڈیڑھ سال پہلے بنائی تھی اس نے۔ اگر تم چاہو تو میں پتا کرتا ہوں۔''

میرے اندر شدید تجسس جاگ چکا تھا۔ میں نے فیض سے کہا کہ وہ پتا کرے۔ فیض کمبل لپیٹ کر اور ٹوپی اوڑھ کر باہر نکل گیا۔ میں نے کھڑکی سے دیکھا، وہ تیز ہواؤں میں چلتا ان مچانوں کی طرف گیا تھا جنہوں نے چاروں طرف سے اس جگہ کو گھیر رکھا تھا۔ تقریباً دس منٹ بعد وہ واپس آیا تو اس کے چہرے پر کامیابی کی جھلک تھی اور ہاتھ میں ایک سیل فون۔

دروازہ اندر سے بند کرنے کے بعد وہ میرے قریب لحاف میں بیٹھ گیا اور بولا ''شاہ زیب! دیکھو، میرے اور تمہارے درمیان جو باتیں ہو رہی ہیں وہ صرف ہمارے درمیان ہی رہنی چاہئیں۔ میں تم پر بھروسہ کر رہا ہوں، میرے بھروسے کو خراب نہ کرنا۔''

میں نے وعدہ کیا کہ ایسا نہیں ہو گا۔ جان جا سکتی ہے لیکن میری وجہ سے اس پر کوئی حرف نہیں آ سکتا۔

فیض نے کہا۔ ''یہ اپنے علاقے کا بڑا مشہور پہلوان تھا۔ کوئی آٹھ نو سال پہلے کی بات ہے جب لاہور میں بسنت کی رات اس کے چاچے کا جھگڑا سردار سجاول سے ہوا، ایک طوائف کو اپنے ساتھ لے جانے کا معاملہ تھا۔ سجاول نے برسٹ مار کر پہلوان کے چاچے کو ہیرا منڈی کے چوک میں مار ڈالا تھا۔ بعد میں پہلوان نے بدلے کی بات کرنا شروع کر دی۔ آخر وہ یہاں ڈیرے تک آ گیا۔ وہ اپنے ساتھ خیر پور سے بہت سے آگو (سرکردہ) لوگ بھی لایا تھا۔ اس نے سجاول سے ہتھ جوڑی مانگی۔ یعنی دو بدو لڑنے کا کہا۔ لمبی کہانی ہے۔ بہرحال اس فلم میں تمہیں اس لڑائی کے کچھ سین نظر آئیں گے۔'' فیض نے کہا اور موبائل میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

میں نے آواز بہت دھیمی کر کے ویڈیو کو پلے کیا۔ میں فوراً پہچان گیا۔ یہ وہی چھوٹا احاطہ تھا جہاں چند دن پہلے ایک ملنگ کو پھانسی دی گئی تھی۔ یہاں کافی لوگ جمع تھے۔ میں نے پہلوان کو دیکھا۔ وہ غیر معمولی طور پر گرانڈیل تھا۔ یوں لگتا تھا کہ قد سات فٹ کے قریب ہے۔ شانے چوڑے اور ٹانگیں درخت کے تنوں جیسی تھیں۔ وہ بس ایک شلوار میں تھا۔ سجاول

دراز قد ہونے کے باوجود اس کے سامنے کوتاہ قامت نظر آتا تھا۔ سجاول نے اس ویڈیو میں جانگیا پہن رکھا تھا جو اس کے گھٹنوں تک جاتا تھا اور اس میں ایک بیلٹ سی لگی ہوئی تھی۔ دونوں میں خوفناک لڑائی ہو رہی تھی۔ پہلوان بھی اپنے فن میں طاق نظر آتا تھا۔ دوسری طرف سجاول کا غیظ وغضب بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ ویڈیو کی کوالٹی اتنی اچھی نہیں تھی۔ کیمرا بھی بری طرح ہل رہا تھا۔ اس کے باوجود نظر آتا تھا کہ سجاول کی آنکھوں میں پتلیوں کی جگہ سرخ انگارے فٹ ہو گئے ہیں۔ پہلوان کے کسی وار سے سجاول کا نچلا ہونٹ کٹ کر لٹک چکا تھا۔ دوسری طرف پہلوان کی ایک آنکھ بھی سوج کر تقریباً بند ہو چکی تھی۔ دونوں کے جسموں پر کئی گہری چوٹیں تھیں۔ یہ ویڈیو کلپ بمشکل چار پانچ منٹ کا تھا...... اور کہیں کہیں ویڈیو کا سلسلہ ٹوٹ بھی جاتا تھا۔ بہر حال اس کلپ میں دو ہیبت ناک گھونسے جن میں سے ایک کو تو گرانڈیل پہلوان سہہ گیا مگر دوسرے نے اس کی توانا گردن توڑ ڈالی اور وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح پتھریلی زمین پر گرا۔ تماشائی مسلسل سجاول کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ اس آخری مرحلے پر انہوں نے فلک شگاف نعرے لگائے اور ہوائی فائرنگ کی آوازیں آئیں پھر ویڈیو کلپ ایک دم ختم ہو گیا۔

میں نے اس کلپ کو چار پانچ دفعہ پلے کیا اور سجاول کے لڑنے کی تکنیک کو سمجھنے کی کوشش کی۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ اس میں کوئی خاص تکنیک تھی ہی نہیں۔ بس جو کچھ نظر آتا تھا وہ اس کا بے پناہ غیظ وغضب ہی تھا۔ وہ جیسے اپنے سامنے والی ہر شے کو کچل دینا اور روند ڈالنا چاہتا تھا۔ اس چار پانچ منٹ کی لڑائی میں اس نے اپنا خوفناک دایاں مکا کئی بار استعمال کرنے کی کوشش کی تھی اور آخر اوپر تلے دو گھونسے مارنے میں کامیاب رہا تھا۔ میں نے اس باریکی پر غور کیا کہ وہ اپنے اس گھونسے کا استعمال کب اور کیسے کرتا ہے۔ یہ ویڈیو کلپ دیکھنے کے بعد مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ کل لڑائی ہونے کی صورت میں میرا سامنا ایک خوفناک اور انوکھے حریف سے ہونے والا ہے جو لڑائی کے وقت واقعی کسی خاص اثر میں ہوتا ہے۔

○......❖......○

وہ ایک یخ بستہ اور پُرشور رات تھی۔ یہ شور صرف شوریدہ سر ہواؤں کا تھا جو جنگل سے سائیں سائیں کرتے گزرتی تھیں اور چٹانوں سے سر ٹکراتی تھیں۔ تاجور حسبِ معمول نیچے تہ خانے میں تھی اور میں اوپر کمرے میں تنہا تھا۔ سینے میں میٹھا میٹھا جوش بھی تھا اور ایک عجیب و غریب تجسس بھی۔ باگھ کا سوکھا ہوا جگر، عربی گھوڑی کے پیٹ سے نکلنے والا کچے گوشت کا لوتھڑا...... اور کوئی ایسی قدیم شراب جو دور ہی سے آگ پکڑ لیتی تھی...... کیا یہ سب سنی سنائی

باتیں تھیں یا ان میں کوئی اصلیت بھی تھی۔کوئی جادوٹونا،کوئی نفسیاتی عمل جو سجاول کے اندر کی قوتوں کو ابھار دیتا تھا اور اس کی خفتہ صلاحیتیں بیدار ہو جاتی تھیں؟

اچانک ہوا کے کسی تیز جھونکے نے بند کھڑکی کے پٹ زوردار آواز سے کھول دیئے اور کمرا جیسے چند لمحوں میں ٹھنڈ سے بھر گیا۔ میں نے اٹھ کر کھڑکی کے پٹ بند کیے تو ساتھ والے کمرے کا روشن دان دھماکے سے کھل گیا اور ہوائیں فراٹے بھرتی ہوئی اندر داخل ہونے لگیں۔ میں اس دوسرے کمرے میں پہنچا اور ایک اسٹول پر کھڑے ہو کر روشن دان بند کیا۔ روشن دان بند کرتے ہوئے میری نگاہ احاطے کی ایک چٹان پر پڑی، مجھے شک گزرا کہ وہاں کوئی بیٹھا ہوا ہے۔اس طوفانی سردی میں وہاں کون ہوسکتا تھا۔درمیانی فاصلہ تیس پینتیس میٹر تھا۔درست اندازہ لگانا مشکل تھا مگر یقینی بات تھی کہ وہاں کوئی ہے۔

تجسس تو میرے اندر پہلے ہی بیدار تھا۔ میں نے جوتی پہنی،جیکٹ پہنی اور احتیاط سے باہر نکل آیا۔ برآمدے میں ہوائیں برچھی کی طرح جسم پر لگیں۔ میں احتیاط سے ایک دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا احاطے کی اس نکیلی چٹان کی طرف بڑھا۔ایک ستون کی اوٹ سے دیکھا اور رگوں میں خون سنسنا گیا۔مجھ سے قریباً پندرہ میٹر کے فاصلے پر ایک شخص آلتی پالتی مارے خاموش بیٹھا تھا۔اس کا جسم عریاں تھا۔بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔یہ سجاول کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔کیا وہ کوئی وظیفہ کر رہا تھا یا پھر کل کی لڑائی کے لیے یہاں کوئی مشق وغیرہ کرنے والا تھا۔اس کا اسٹائل ایسا تھا جیسے یوگا کے لیے بیٹھا ہو۔

ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ وہ شخص اٹھ کھڑا ہوا۔اب اس میں شبہے کی ذرہ بھر گنجائش نہیں تھی کہ وہ سجاول ہی ہے۔اس کے جسم پر کپڑے کا ایک تار بھی نہیں تھا۔خون منجمد کر دینے والی ہوا میں وہ چند سیکنڈ خاموش کھڑا رہا۔پھر اس نے اپنے زیریں جسم پر ایک لنگی سی لپیٹی اور اس ہال کمرے کی طرف چل دیا جہاں چھرے بازی اور دست بدست لڑائی کی مشقیں ہوتی تھیں۔ وہاں دیواروں پر قدیم ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ سجاول کے پرانے بزرگوں کی پینٹنگز بھی آویزاں تھیں۔

سجاول نے ہال کمرے کا قفل کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔دروازہ پھر سے بند ہونے کی مدھم آواز آئی۔ میں کچھ دیر کھڑا سوچتا رہا۔ ذہن میں وہی رسم والی بات پوری شدت سے گونجی۔کیا یہ وہی کچھ ہو رہا ہے جس کا ذکر آج صبح فیض محمد نے کیا تھا۔کوئی رسم،کوئی عمل؟

میرے لیے اب ممکن نہیں تھا کہ واپس کمرے میں چلا جاتا اور لحاف اوڑھ کر لیٹ جاتا۔نیند تو فی الحال ویسے بھی نہیں آ رہی تھی۔ میں کچھ دیر سوچتا رہا پھر دبے قدموں سے ہال

کمرے کی جانب بڑھا۔ حسیات پوری طرح بیدار ہو چکی تھیں اور میں ہر خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھا۔ میں ایک تاریک دیوار کے ساتھ ساتھ چپک کر چلتا ہوا آگے گیا اور پھر دوڑ کر ہال کمرے کی دیوار سے لگ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ اردگرد مچانوں پر بیٹھے ہوئے پہرے دار مجھے دیکھ نہیں پائے ہوں گے۔ ویسے بھی تند و تیز طوفانی جھکڑوں نے مچان نشینوں کو دبک کر بیٹھنے پر مجبور کر رکھا تھا۔ میں ایک چھجے سے لٹک کر ایک روشن دان تک پہنچا اور پھر روشن دان کے چوکھٹے کے سہارے چھت پر چلا گیا۔ روشن دان میں شیشے کے بجائے لکڑی کا تختہ تھا اور یہ تختہ اندر سے بند تھا۔ چھت پر اوندھے لیٹ کر میں نے دیگر روشن دانوں کا جائزہ بھی لیا، لیکن سب اندر سے بند تھے اور ان میں شیشے کے بجائے لکڑی کے تختے تھے جو اندر سے ہی کھولے جا سکتے تھے۔ ہال کے اندر جانے یا جھانکنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ آخر میں میری نظر چھت کی چمنی پر پڑی، چمنی کے اوپر ٹین کی چادر کا مخروطی ڈھکن تھا۔ اس جھونپڑی نما ڈھکن کو پیچوں کے ذریعے کسا گیا تھا۔ مجھے قریب ہی لوہے کی ایک پتری پڑی ہوئی مل گئی۔ میں نے کوشش کی اور چار میں سے تین پیچ کھولنے میں کامیاب ہو گیا۔ چوتھا پیچ کھولے بغیر ہی میں نے ڈھکنا ایک طرف کھسکا دیا۔ تھوڑی بہت آواز پیدا ہوئی لیکن ہواؤں کے شور میں اس آواز کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ اب میرے سامنے چمنی کا خلا تھا، جو قریباً ڈھائی فٹ لمبا اور ڈیڑھ فٹ چوڑا رہا ہو گا۔ میرے سامنے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا کہ میں رسک لوں اور آواز پیدا کیے بغیر اس خلا کے ذریعے نیچے اترنے کی کوشش کروں۔ خلا نیم گرم تو ضرور تھا مگر اس میں تپش نہیں تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ نیچے آگ وغیرہ نہیں۔ شاید چند گھنٹے پہلے آگ جلائی گئی ہو۔ میں خلا میں داخل ہوا اور چمنی کا جھونپڑی نما ڈھکنا، جو ٹین کا بنا ہوا تھا پھر سے خلاف کے اوپر ٹکا دیا تاکہ تیز ہوا اندر داخل نہ ہو۔ نیچے اترنے کے لیے سخت مہارت اور احتیاط کی ضرورت تھی۔ میں نے اپنے بازو اور ٹانگیں پوری کھول لیں تاکہ نیچے گرنے سے محفوظ رہوں۔ پھر خود کو آہستہ آہستہ ڈھیل دیتا ہوا نیچے کو کھسکنے لگا۔ کہنیاں اور گھٹنے شدید رگڑ کا شکار ہو رہے تھے۔ میں جانتا تھا کہ چمنی کی اندرونی کالک نے میرے ہاتھ پاؤں اور کپڑے بری طرح کالے کر دیئے ہیں تاہم تاریکی کے سبب مجھے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ چھت کی بلندی کافی تھی۔ مجھے نیچے پہنچنے کے لیے کم و بیش 18 فٹ کا مشکل فاصلہ طے کرنا پڑا۔ یہ میرا بے پناہ تجسس ہی تھا جس نے مجھے اس دشوار کام پر آمادہ کیا۔

آخر مجھے آتشدان اور ہال کمرے کی مدھم روشنی دکھائی دی۔ یہ بڑے نازک لمحے تھے۔ کوئی غیر معمولی آہٹ نیچے موجود سجاول کو چوکنا کر سکتی تھی۔ ایک ایک انچ کھسک کر میں آتش

دان میں اتر گیا۔ یہاں بجھے ہوئے انگارے تھے اور راکھ تھی۔ دور ہال کمرے کے ایک گوشے میں روشنی نظر آئی۔ یہ دو بڑے سائز کی موم بتیاں تھیں۔ مادر زاد برہنہ سردار سجاول اس روشنی کے سامنے دوزانو بیٹھا تھا۔ اس کی سفید لنگی ایک طرف پڑی تھی۔ باقی سارا ہال تاریکی میں تھا اور آتش دان بھی اسی تاریکی کا حصہ تھا۔ اس آتش دان کے بالکل قریب آئے بغیر سجاول مجھے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ موم بتیوں کے قریب ایک دیگچی رکھی تھی۔ دیگچی سے اٹھنے والی بھاپ سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس میں گرم پانی یا کوئی اور سیال ہے۔ پاس ہی زرد رنگ کا ایک بڑا شاپر رکھا تھا جس کو اوپر سے گرہ لگائی گئی تھی۔ کمرے میں عجیب طرح کی بو بھی محسوس ہو رہی تھی، جیسے سڑا ہوا گوشت یا پنیر ہو۔

میں ہر صورتِ حال کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ خطرات سے کھیلنے کا اپنا ایک مزہ ہوتا ہے، اور دیر ہوئی یہ مزہ میرے منہ کو لگ چکا تھا۔ اگلے قریباً پندرہ منٹ میں، میں نے جو کچھ دیکھا وہ میری زندگی کا ایک یادگار تجربہ تھا۔ میں زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گا، کیونکہ اس میں کراہت ہے اور بیزاری بھی۔ ان پندرہ منٹ میں وہ سب کچھ حرف بہ حرف درست ثابت ہوا جو صبح فیض نے بتایا تھا اور جس پر فیض کے ساتھ ساتھ مجھے بھی پورا یقین نہیں تھا۔ میں نے گرم پانی والی دیگچی میں سے سجاول کو کوئی چیز نکالتے ہوئے دیکھا۔ یقیناً یہ کسی جانور کا جگر ہی تھا جسے گرم پانی میں ڈال کر نارمل حالت میں لانے کی کوشش کی گئی تھی۔ ہال کمرے میں جو بو تھی وہ اسی بوسیدہ گوشت سے اٹھ رہی تھی۔ سجاول نے دانتوں سے نوچ نوچ کر اس گوشت کو کھایا۔ تاہم اسے کھاتے ہوئے اسے بار بار ابکائی آئی اور چہرے پر اذیت کے آثار نمودار ہوئے۔ تب اس نے زرد رنگ کا شاپر کھولا۔ اس میں سے جو چیز نکلی وہ تازہ گوشت کا ایک خونچکاں لوتھڑا تھا اور یقیناً یہ وہی ''نامکمل زندگی'' تھی جسے کسی اصیل گھوڑی کے پیٹ سے برآمد کیا گیا تھا۔ اگلے چار پانچ منٹ میں سجاول نے جو کچھ اس لوتھڑے کے ساتھ کیا وہ قابلِ نفرت تھا۔ کپڑے کی پوٹلی میں ڈال کر اسے ایک ہاون دستے کے ساتھ کوٹا گیا اور نچوڑ کر اس کی رطوبت نکالی گئی۔ ایک بڑا گلاس اس رطوبت سے دو تہائی بھر گیا تو اس میں وہ سہ آتشہ شراب ملائی گئی جس کا تذکرہ فیض محمد نے کیا تھا۔ تب سجاول اپنے جدامجد کی پینٹنگ کے سامنے دوزانو بیٹھ گیا۔ گلاس کے مکروہ محلول کو پینے کے لیے بھی سجاول کو کئی جتن کرنے پڑے۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور وہ بمشکل اپنی قے روکے ہوئے تھا۔

آخر میں سجاول پر عجیب سی لرزش طاری ہو گئی۔ اس کا بدن جیسے اینٹھ رہا تھا۔ وہ لیٹ گیا اور نہایت بے قراری میں کروٹیں لینے لگا۔ پتا نہیں کیوں میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ وہ

تھوڑی دیر میں آتشدان کی طرف آئے گا اور آگ وغیرہ سلگانے کی کوشش کرے گا۔ اب میرے لیے بہتر یہی تھا کہ میں جس خاموشی سے آیا تھا، اسی خاموشی سے واپس چلا جاتا۔ میں بڑی احتیاط کے ساتھ دھیرے دھیرے اوپر کو سرکنے لگا۔

دماغ میں آندھی سی چل رہی تھی۔ جو کچھ میں ہال کمرے کے اندر دیکھ کر آیا تھا وہ ناقابلِ یقین تھا۔ اس کا نتیجہ کیا نکلنا تھا یہ آنے والا وقت ہی بتا سکتا تھا۔ بے شمار ایسی چیزیں ہوتی ہیں جن کے استعمال سے وقتی طور پر انسان کے اندر غیر معمولی جسمانی یا ذہنی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ منشیات، ٹرنکولائزرز اور دیگر مسکن اشیا ان میں شامل ہیں لیکن یہ اضافی توانائیاں محدود مدت کے لیے ہوتی ہیں۔ کسی کا اثر چند گھنٹے ہوتا ہے، کسی کا ایک یا دو دن، بہت کم ایسی ہوتی ہیں جو زیادہ دنوں تک اثر پذیر رہتی ہیں۔ مجھے یہ سب کچھ جسمانی کے علاوہ نفسیاتی بھی لگ رہا تھا۔ شاید سائیکالوجی یا پیرا سائیکالوجی کا کوئی معاملہ۔

اس رات میں آخری پہر تک جاگتا رہا۔ چمنی کی کالک والے کپڑے میں نے تبدیل کر لیے تھے اور منہ ہاتھ دھو لیا تھا۔ میں نے کل کے معرکے کے لیے خود کو ذہنی طور پر یکسو اور جسمانی طور پر تیار کیا۔ اس کے لیے میں نے کمرے کو اندر سے بند کیا۔ لالٹین کی لو بہت نیچی کر دی اور کچھ ورزشیں کیں۔ ان ورزشوں اور مشقوں نے جہاں میرے جسم کو تیار کیا وہاں مجھے ماضی قریب کے دن بھی یاد کرا دیئے، جب میں نے انگلینڈ میں MMA کے تین اہم ترین مقابلے کیے تھے۔ ایک طرح سے یہ میرے آخری مقابلے تھے۔ وہ تیاری اور ہوتی تھی، وہ ماحول جدا ہوتا تھا۔ دنیا کے نہایت مہنگے کوچز جو دنوں کے حساب سے نہیں گھنٹوں کے حساب سے نہایت بھاری معاوضے لیتے تھے۔ بہترین جمز، جدید ترین مشینیں اور سہولیات۔ جسمانی توانائی کے لیے نایاب سپلیمنٹس اور ڈائٹس۔

یہاں وہ سب کچھ نہیں تھا۔ بس ایک تاریک کمرا تھا جس میں بمشکل دس ضرب بارہ فٹ کی خالی جگہ موجود تھی۔ مہینے گزر چکے تھے۔ میں نے کسی بھرپور ٹریننگ اور لڑائی میں حصہ نہیں لیا تھا۔ ران کا زخم تو ٹھیک ہو چکا تھا مگر کندھے کی چوٹ ابھی بھی اپنی جگہ موجود تھی۔ بس ایک جذبہ تھا، بس ایک چہرہ تھا، فقط ایک معصوم دیہاتی مسکراہٹ تھی، جس نے مجھے ہر امتحان سے گزرنے کا حوصلہ دے رکھا تھا، میں جو کچھ کر رہا تھا، جو کچھ سوچ رہا تھا، اور جو کچھ سوچنا چاہتا تھا، اس کا مقصد تاجور کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ وہ کیا تھی؟ مجھے خود بھی معلوم نہیں تھا۔ کبھی کبھی میرے دل میں آتا کہ کاش میں کوئی شاعر ہوتا۔ میں اس کے نہایت سادہ اور نہایت دلکش حسن کو لفظوں میں بیان کر سکتا۔ یا کوئی مصور جو اس کی شایانِ شان تصویر بنا سکتا، یا پھر کوئی

سنگ تراش، جسے بے پناہ خوب صورتیوں کو مجسم کرنے کا فن آتا۔

میں موجودہ حالات کے بارے میں سوچتا رہا اور میرے اندر کی کیفیت کچھ اور سی ہو گئی۔ ہال کمرے میں، میں نے جو کچھ دیکھا تھا وہ پریشان کن تھا۔ میرے اندر سے جیسے آواز ابھری۔ ''شاہ زیب! یہاں کچھ انوکھا ہے اور یہ ایسا انوکھا پن ہے جس سے تمہارا واسطہ آج تک نہیں پڑا، سوچ لو۔''

فوراً ہی دوسری آواز ابھری۔ ''جو کچھ بھی ہے، وہ محبت اور ہمت کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ تم کوئی عام شخص نہیں ہو۔ تم نے مشکل ترین حریفوں کو زیر کیا ہے۔ مت بھولو کہ تم پروفیشنل ہو...... چمپئن ہو۔ اگر تم ایسے انوکھے حریف سے نہیں لڑو گے تو اور کون لڑے گا۔ تمہیں دیکھنا چاہیے کہ وہ کتنے پانی میں ہے۔''

پہلی آواز نے کہا۔ ''چمپئن ہونا اور بات ہے، جنونی ہونا اور بات...... اور یہ شخص جنونی ہے۔ اس کے خون میں نسل در نسل کسی ''قاتل جارحیت'' نے گھات لگا رکھی ہے۔''

دوسری آواز نے کہا۔ ''جو کچھ بھی ہے لیکن اس نے لڑنا تو اپنے انہی دو ہاتھوں اور دو پاؤں سے ہے۔ تمہاری غیر معمولی مہارت اور برداشت اس کے ہر حربے کو ناکام بنا سکتی ہے۔ اس کا جنون تمہارے SKILL کے سامنے ٹھہر نہیں سکے گا۔''

میں کھڑکی میں آ بیٹھا۔ رات آہستہ آہستہ آگے کو سرک رہی تھی۔ دل میں عجیب بے قراری سی تھی۔ کل خبر نہیں کیا ہونے والا تھا۔ اگر مجھے کچھ ہو جاتا تو تاجور کا کیا بنتا۔ اور یہی خیال تھا جو مجھے منفی انداز میں سوچنے ہی نہیں دے رہا تھا، کہا جاتا ہے کہ ستمبر 65ء کی جنگ میں لاہور کے محاذ پر گھمسان کے رن میں ایک افسر نے اپنے سپاہی سے کہا تھا، ہمیں کچھ پیچھے ہٹنا پڑے گا۔ سپاہی اشک بار اور پُر جوش لہجے میں بولا تھا۔ میں پیچھے کیسے ہٹوں سر! پیچھے تو لاہور ہے۔

وہ جذبے کی ایک اعلیٰ ترین مثال تھی۔ میری مثال چھوٹی تھی لیکن اس سے ملتی جلتی تھی۔ میں بھی پیچھے کیسے ہٹ سکتا تھا اور شکست کا کیسے سوچ سکتا تھا۔ میرے پیچھے تاجور تھی۔

یخ بستہ رات کے سناٹے میں ایک آواز ڈوب ڈوب کر ابھر رہی تھی۔ یہ اس ملنگنی کی آواز تھی جسے یہ لوگ چند روز پہلے پکڑ کر یہاں لائے تھے۔ وہ ہوش میں ہوتی تو گالیاں بکتی تھی لیکن رات کو یہ لوگ اسے زبردستی شراب پلا دیتے تھے۔ نشے میں آنے کے بعد یہ بلند آواز میں ہنستی تھی۔ الٹے سیدھے گیت بھی گاتی تھی اور خود سے چھیڑ چھاڑ کرنے والوں کو میٹھی میٹھی گالیاں بھی دیتی تھی، لیکن ظاہر ہے کہ بات صرف چھیڑ چھاڑ تک ہی نہیں رہتی تھی۔ درمیانی عمر

کی یہ ملنگنی ان لوگوں کے لیے ایک کھلونا تھی اور وہ اس سے کھیلتے تھے۔ یہاں چند طرح دار طوائفیں بھی موجود تھیں مگر وہ اعظم جاہ اور سجاول کے قریبی ساتھیوں کی دل بستگی کے لیے تھیں۔ چھوٹے درجے کے کارندوں کے حصے میں یقیناً اس ملنگنی جیسی عورتیں ہی آتی تھیں۔

ملنگنی کی آواز سن کر پتا نہیں کیوں میرا ذہن ایک بار پھر ماضی کے اوراق پلٹنے لگا۔ میں ڈنمارک میں تھا۔ ایک بھلا مانس اور کام سے کام رکھنے والا لڑکا۔ آنکھوں میں مستقبل کے سہانے سپنے تھے اور یہ ارمان تھا کہ اپنی ماں کی شبانہ روز دعاؤں کو اثر دوں گا۔ وہ ساری خوشیاں اور کامیابیاں ان کی جھولی میں ڈالوں گا جس کی وہ مجھ سے امید رکھتی ہیں۔ میں ان کی آس بھری نگاہوں کا اکلوتا مرکز تھا لیکن پھر وہ واقعہ ہوا تھا جس کا میں نے پہلے بھی ذکر کیا ہے۔ ایک کمزور پاکستانی کو گورے اور انڈین غنڈوں کے چنگل سے بچاتے بچاتے میں خود ایک طوفان کی لپیٹ میں آ گیا۔ مجھ پر یہ خوفناک انکشاف ہوا کہ جن لڑکوں کو میں عام مشٹنڈے سمجھا تھا اور ان سے ٹکر لی تھی، وہ تو ایک بہت بڑے گینگ کے لوگ ہیں اور ایک خلقت اس گینگ کے نام سے کانپتی ہے۔ لڑائی کے دوران میں ایک شخص کچھ زیادہ ہی زخمی ہو گیا تھا اور اسپتال جا پہنچا تھا۔ اس صورتِ حال کی خبر والد صاحب کے ایک ڈینش دوست کو ہوئی تو اس نے والد کو بتایا کہ ٹیکساری گینگ کے لوگ مجھے بہ آسانی معاف نہیں کریں گے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک دو گھنٹوں کے اندر ان کے سرغنہ جان ڈیرک کی طرف سے میرے لیے بلاوا آ جائے۔ بہتر یہ ہے کہ اس کے بلانے سے پہلے ہم خود ہی اس کے ٹھکانے پر چلے جائیں اور میں اس سے معافی مانگ لوں...... اور اگر کوئی ہرجانہ بھی دینا پڑے تو دے دوں۔

والد صاحب نے ایک اور مقامی معزز شخص کو اپنے ساتھ لیا اور ہم جان ڈیرک کے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔ میں اندر سے لرز رہا تھا۔ والد صاحب اور ان کے دوست ایلوس کی شکل بھی دیدنی تھی۔ جان ڈیرک کے اسسٹنٹ نے ہمیں قریباً دو گھنٹے دفتر سے باہر انتظار میں بٹھائے رکھا۔ پھر یہ کہہ دیا کہ ڈیرک صاحب کسی ضروری کام سے نکل گئے ہیں ہم کل آئیں۔

ہم اگلے دن پہنچے۔ اگلے دن بھی طویل انتظار کے بعد ہمیں شرف باریابی ملا۔ جن غنڈوں سے میری لڑائی ہوئی تھی وہ کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ جبکہ میں، میرے والد اور ان کے دوست کھڑے تھے۔ جان ڈیرک نے مجھے غصیلی نظروں سے گھورا اور پاٹ دار آواز میں بولا۔ ”یہاں میرے دفتر میں کیا لینے آئے ہو۔ تم نے سنا ہوگا کہ بہترین انصاف وہ ہوتا ہے جو اس جگہ پر ہو جہاں جرم ہوا تھا۔ اگر معافی مانگنا ہے یا سزا پانی ہے تو وہیں پر جاؤ جہاں پر بدمعاش بنے تھے۔“

والد نے منت سماجت کی مگر وہ لوگ ہمیں وہیں لے آئے جہاں میرا جھگڑا ہوا تھا۔ گاڑی سے اترتے ہی تین چار بندوں نے مجھے مارنا شروع کر دیا۔ میرے ناک منہ سے خون چھوٹ گیا۔ آخر اردگرد کے لوگوں نے میری جان چھڑائی۔

''اب اگر طبیعت چاہ رہی ہے تو معافی مانگ لو۔'' ایک انڈین غنڈے سری کانت نے کہا۔

میری جگہ والد نے معافی مانگی اور میری جان چھوٹی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی میرے لیے حکم صادر ہوا۔ ''تم دوبارہ اس ایونیو (سڑک) پر نظر نہیں آؤ گے۔ اگر آؤ گے تو خود ذمے دار ہو گے۔''

میں نے والد اور والدہ کے کہنے پر سب کچھ برداشت کیا تھا لیکن یہ مستقل توہین مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ اس بازار میں میرے کئی دوست تھے، ملنے جلنے والے تھے۔ آخر ایک دن میں نے والدؑ سے کہہ دیا۔ ''یہ مجھ سے نہیں ہو گا۔ میں ان کو مار دوں گا یا خود مر جاؤں گا۔ اگر آپ یہی چاہتے ہیں کہ میں اس سڑک سے نہ گزروں تو پھر یہ فلیٹ ہی چھوڑ دیں۔''

والد بھی دیکھ رہے تھے کہ میں مسلسل اذیت کا شکار ہوں۔ مجھے اپنی یونیورسٹی جانے کے لیے روزانہ کوئی آٹھ کلومیٹر کا اضافی سفر کرنا پڑ رہا تھا اور بات صرف سفر ہی کی نہیں تھی۔

آخر انہوں نے فلیٹ چھوڑ دیا اور ہم نے ایک دوسرے علاقے میں رہائش اختیار کر لی......لیکن وہ جو کہتے ہیں نا کہ ہونی ہو کر رہتی ہے۔

○......❖......○

اس دلچسپ داستان کے بقیہ واقعات
تیسرے حصے میں ملاحظہ فرمائیں

ڈیڑھ دو ماہ بعد کی بات ہے وہ بہار کی ایک سہانی صبح تھی۔ میں اپنی یونیورسٹی کی دوست ڈیزی کے ساتھ موٹر سائیکل پر جا رہا تھا۔ ہم ویک اینڈ پر لانگ رائیڈ کے لیے نکلے ہوئے تھے۔ سڑک سنسنان تھی اور اطراف میں درخت تھے۔ ایک بڑی جیپ نے ہمیں اوورٹیک کیا اور کچھ آگے جا کر رک گئی۔ اندر سے وہی ٹیکساری گینگ کے چار پانچ لڑکے نکلے۔ انہوں نے پہلے تو ہمیں چاکلیٹس پیش کیں پھر بدتمیزی پر اتر آئے۔

میں نے کہا۔ ”دیکھو بھائی، اب بات ختم ہو چکی ہے۔ اب مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ ہم معافی بھی مانگ چکے ہیں۔“

ان کا سرغنہ بولا۔ ”معافی کے وقت ہم چاروں تو موجود تھے لیکن یہ ہمارا پانچواں دوست موجود نہیں تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ ابھی اس سے بھی معافی مانگنا باقی ہے۔“

”آپ لوگ مجھے دیوار سے لگا رہے ہو۔“ میں نے کہا تھا۔

”دیوار سے نہیں لگا رہے، صرف یہ کہہ رہے ہیں کہ ہمارا یہ پانچواں دوست ابھی تک تمہاری معافی سے محروم ہے۔“

”تو پھر کیا کیا جائے؟“ میں نے خود پر بے پناہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔

سرغنہ سری کانت بولا۔ ”زبانی کلامی کے بجائے ہم عملی معافی پر وشواش رکھتے ہیں۔ اپنی اس گرل فرینڈ کو ہمارے پانچویں ساتھی کے حوالے کر دو۔ ہمارا حساب بے باق ہو جائے گا۔“

اس کے بعد جو کچھ ہوا تھا، اسے بیان کرنے سے زخموں کے منہ کھلیں گے اور سینہ چھلنی ہو گا۔ مختصر یہ کہ ان لوگوں نے گن پوائنٹ پر مجھے باندھ دیا اور جیپ کی عقبی نشست پر ڈال دیا۔ میری دوست ڈیزی قریباً دو گھنٹے ان کی دسترس میں رہی۔ میں اس کے لیے کچھ نہ کر سکا۔ کرنے کے قابل ہی نہیں تھا۔

اس روز کے بعد میں نے کبھی ڈیزی کی شکل نہیں دیکھی۔ یقیناً وہ خود بھی دکھانا نہیں چاہتی تھی۔ اس واقعے کے بعد میری زندگی میں ایک انقلاب آ گیا تھا۔ میں نے اس ٹولے کے سرغنہ سری کانت کو ایک نائٹ کلب میں گھیر کر اتنا مارا تھا کہ اس کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئی تھیں اور انتڑیاں کٹ گئی تھیں۔ اس واقعے کے بعد میں کوپن ہیگن میں ہی رہا تھا اور پولیس تفتیش کا سامنا کیا تھا، میں نے نائٹ کلب میں جو کچھ کیا تھا، وہ ڈیزی والے واقعے کا ردِعمل تھا۔ مجھے چھ ماہ جیل ہوئی تھی۔ چھ ماہ بعد جب میں جیل سے نکلا تو میرا کیریئر تقریباً تباہ ہو چکا تھا اور میں ایک بدلا ہوا شخص تھا۔ والد مجھ سے منہ موڑ چکے تھے۔ ماں دکھ کی چکی میں پس رہی تھی۔ میں نے پہلے گلیوں میں دنگا فساد کیا، کہیں مارا، کہیں مار کھائی۔ پھر ماں کے بے حد اصرار پر میں نے اپنا رخ کچھ بدلا۔ میرا رجحان MMA یعنی مکس مارشل آرٹ کی طرف ہو گیا۔ میں نے خود کو سرتاپا اس خطرناک کھیل میں کھپا دیا۔ میں نے خود کو ایک مکمل کھلاڑی بنانے کی کوشش کی مگر ابھی ایک اور واقعہ تھا جو مجھے مارا ماری کی اس دنیا میں کچھ اور آگے لے جانے والا تھا۔ مجھے ''رِنگ'' سے باہر بھی لڑنا تھا اور بڑے برے طریقے سے لڑنا تھا۔

اچانک کسی کمرے سے ایک بار پھر ملنگنی کے چلانے کی آواز آئی۔ وہ نشے میں تھی اور اپنے ساتھ بدسلوکی کرنے والے کو بددعائیں دے رہی تھی۔ نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ ملنگنی کو یہاں آئے ہوئے اب آٹھ دس دن ہو چلے تھے۔ ملنگوں کے دو بندے جان سے بھی گئے تھے، مگر انہوں نے دوبارہ اس علاقے کا رخ نہیں کیا تھا۔ یقیناً اس کی ایک وجہ تو یہی تھی کہ ملنگی ڈیرا تباہ ہو گیا تھا۔ عین ممکن تھا کہ پردے والی سرکار کا دست راست کرنالی بھی کہیں چھپتا پھرتا ہو۔

دوسری طرف پولیس نے بھی اس طرف آنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ اس سے پتا چلتا تھا کہ مقامی پولیس میں سجاول گینگ کے خاص دوست موجود ہیں، جن کی وجہ سے یہ جگہ سجاول اور اس کے ساتھیوں کے لیے بالکل محفوظ ہے۔

سرد ہوا کے تھپیڑے مسلسل کھڑکیوں، دروازوں پر دستک دے رہے تھے۔ کبھی کبھی ہوا کے کسی تند و تیز جھونکے کے ساتھ موسیقی کی آواز بھی کانوں میں پڑتی تھی۔ یہ آواز اعظم جاہ کے رہائشی حصے کی طرف سے آ رہی تھی۔ کسی شب بیدار جانور کی طرح یہ شخص دن کو سوتا تھا اور رات کا اکثر حصہ جاگ کر گزارتا تھا۔ گھنگروؤں کی چھن چھن بتا رہی تھی کہ اس وقت بھی اس نے محفل طرب سجائی ہوئی ہے اور ناچنے والیاں اس کی رات کو رنگین کر رہی ہیں۔ کل شام میں نے دو بنے سنورے ہیجڑے بھی دیکھے تھے۔ یقینی بات تھی کہ وہ بھی اس محفل کا حصہ رہے ہوں

گے۔رات کے اس پہر بھنے ہوئے گوشت کی خوشبو آ رہی تھی۔

پہاڑوں کی گود میں اس ویران جنگل کے درمیان یہ بڑی انوکھی رات تھی، میں کھڑکی سے لگا بیٹھا رہا اور برفیلی ہواؤں کے شور میں جھومتے اور لہراتے درختوں کو دیکھتا رہا۔

ذہن ایک بار پھر آہستہ آہستہ ماضی کی طرف پلٹ گیا۔یورپ میں گزرے روز و شب آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے۔میں مکس مارشل آرٹ کی راہ پر بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔میرے اندر ایک آگ تھی۔وہی آگ جو ایک کمزور اور شریف شخص کے اندر اس وقت بھڑکتی ہے جب وہ مسلسل ذلت سہتا ہے۔میں نے پہلے کاؤنٹی کی سطح پر مقابلوں میں حصہ لیا پھر مزید آگے بڑھا۔کوپن ہیگن میں میری پہچان بن گئی۔میں نے داڑھی رکھ لی تھی، بال اتنے بڑھا لیے تھے کہ کندھوں تک پہنچتے تھے۔اس فیلڈ میں میرا ایک ترک دوست مامون تھا۔وہ مجھ سے تھوڑا اسینئر تھا۔اس کے ساتھ میری گاڑھی چھننے لگی تھی۔ایک لیڈی باکسر انیتا سے مامون کی گہری دوستی تھی۔ایک طرح سے دونوں اکٹھے ہی رہتے تھے۔ان دونوں کا سپنا تھا کہ ان کا اپنا ایک شاندار جمنازیم اور فائٹنگ رِنگ ہو۔اس کے لیے دونوں نے سخت محنت کی تھی۔تھوڑا تھوڑا سرمایہ جمع کر کے جمنازیم کی بنیاد رکھ دی تھی اور اب اسے مکمل کرنے کے لیے دن رات محنت کر رہے تھے۔

رِنگ کے اندر میری اور مامون کی کامیابیوں کا سلسلہ جاری تھا۔ہم دونوں جیسے یک جان دو قالب ہو گئے تھے۔ہر دکھ سکھ کے ساتھی اور ایک دوسرے پر جان چھڑکنے والے۔ لیکن ظالم ماضی نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ٹیکساری گینگ کے لوگ مسلسل میرے درپے تھے۔ ایک دو بار ان سے میری جھڑپ بھی ہوئی جس کی میں نے پولیس میں باقاعدہ رپورٹ کی۔ میں ایک کھلاڑی تھا اور صرف کھلاڑی رہنا چاہتا تھا۔لیکن ایک دن مجھے معلوم ہوا کہ صرف مارشل آرٹ کا زبردست کھلاڑی ہونا ہی کافی نہیں ہے، دنیا کے اس جنگل میں ایسے درندے بھی ہیں جو آپ کے مارشل آرٹ وغیرہ کو جوتے کی نوک پر رکھتے ہیں اور بغیر نام پتا پوچھے آپ کو چیر پھاڑ سکتے ہیں۔

اس دن جمنازیم کے ورزشی پورشن کا افتتاح ہونا تھا، مامون اور انیتا خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔مامون نے میرے سینے پر گھونسا مارتے ہوئے کہا تھا۔"شاہ زیب، صبح دس بجے تمہیں پہنچ جانا ہے وہاں۔ورنہ تیری میری "فل کونٹیکٹ" فائٹ ہو جائے گی۔"

میں نے کہا۔"صبح دس بجے وہاں میں نے جھاڑو پھیرنا ہے؟ افتتاح تو شام چار بجے ہے۔"

''کرر ہے ہونا وہی پوستیوں والی بات۔ بھئی سو طرح کے کام ہیں۔ اور کیا آپ کو یہ سمجھانے کی ضرورت ہے کہ جناب مہمان نہیں میزبان ہیں۔''

انیتا نے اپنے خوب صورت سنہری بالوں کو پیشانی سے ہٹاتے ہوئے لقمہ دیا۔ ''آج میں بالکل مامون کی ہمنوا ہوں۔ کہو تو میں ساڑھے نو بجے خود گاڑی لے کر آجاؤں گی۔''

''نہیں بھئی نہیں۔ میں خود ہی آجاؤں گا۔ یہ بڑا کمینہ ہے، شک کرنا شروع کر دیتا ہے۔ جو سچے عاشق ہوتے ہیں وہ ایسے ہی ہوتے ہیں۔''

مامون مجھ پر جھپٹا اور ہم گتھم گتھا ہو گئے۔ پہلے اس نے مجھے نیچے گرایا، پھر میں نے پلٹ کر اسے نیچے کیا۔ ہمارے درمیان ایسی دوستانہ دھینگا مشتیاں چلتی ہی رہتی تھیں۔ انیتا ہنس ہنس کر سرخ ہو رہی تھی۔ اس نے بمشکل ہم دونوں کو علیحدہ کیا۔ میں دل کی گہرائیوں سے انیتا کی عزت کرتا تھا اور میری شدید آرزو تھی کہ وہ دونوں جلد از جلد شادی کے بندھن میں بندھ جائیں۔

میں یہ بات ازراہِ مذاق کہہ رہا تھا کہ اگلے روز دس بجے جمنازیم نہیں پہنچ سکوں گا، لیکن یہ مذاق درست ثابت ہو گیا۔ میں ایک اسپتال کے لیے فنڈ ریزنگ کر رہا تھا۔ ایک نمائشی مقابلے میں حصہ لینے کے لیے میں ''البورگ'' گیا۔ صبح آٹھ بجے میری واپسی فلائٹ کوپن ہیگن کے لیے تھی۔ مگر شدید طوفانی موسم کے سبب یہ کینسل ہو گئی۔ میں کچھ نہیں کر سکتا تھا، سوائے ڈپارچر لاؤنج میں بیٹھ کر طوفان کے تیور دیکھنے کے۔

لیکن ایک اور طوفان ایسا تھا جس کے تیور مجھے نظر نہیں آ رہے تھے اور یہ طوفان کوپن ہیگن کے اس جم میں برپا تھا جہاں مامون اور انیتا افتتاح کی ابتدائی تیاریوں کے لیے موجود تھے۔ ٹیکساری گینگ کے درندہ صفت لوگوں نے میرا کام تمام کرنے کے لیے صبح سویرے جم پر حملہ کیا۔ ان کی اطلاعات کے مطابق میں بھی وہاں موجود تھا۔ بعد میں اس اندوہناک واقعے کی جو تفصیلات معلوم ہوئیں ان سے پتا چلا کہ وہ پانچ افراد تھے جو جم کا دروازہ کھلتے ہی دندناتے ہوئے اندر گھس آئے۔ اس وقت جم بالکل خالی تھا۔ ایک چوکیدار کے علاوہ صرف ایک سوئپر وہاں موجود تھا۔ یا پھر مامون اور انیتا تھے۔ حملہ آوروں نے حملہ کیا۔ مامون نے ڈٹ کر ان کا مقابلہ کیا۔ وہ کوئی معمولی فائٹر نہیں چمپئن تھا۔ انیتا نے بھی حتی الامکان اس کا ساتھ دیا۔ وہ یقیناً اپنا دفاع کرنے میں کامیاب رہتے لیکن پھر حملہ آوروں میں سے ایک نے گولی چلا دی۔ ایک فائر خوبرو انیتا کی پشت پر لگا اور سینے کی طرف سے نکل گیا۔ دوسرے فائر نے مامون کی ٹانگ زخمی کر دی۔ وہ جان بچانے کے لیے بالائی منزل کی طرف بھاگا۔ حملہ

آوراس کے پیچھے لپکے اوراسے گولیوں سے چھلنی کر دیا۔

مارشل آرٹ ہار گیا۔ آتشیں اسلحہ اور بدمعاشی جیت گئی۔ وہ سب کچھ میرے لیے بے حد روح فرسا تھا۔ میں رنج وغم کے سمندر میں ڈوب ڈوب گیا۔ میں مر جانا اور مار دینا چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا میرے اصل دشمن کون ہیں۔ وہی خون ریزی اور دہشت گردی کے ساجھے دار جان ڈیرک اور سری کانت کا بگ باس راہول۔ لیکن سب جانتے تھے کہ وہ کتنے خطرناک ہیں۔ حقیقت کی نظر سے دیکھا جاتا تو میری حیثیت ان بگ گینگسٹرز کے سامنے وہی تھی جو ایک بے دست و پا زخمی شخص کی بھوکے شیروں کے غول کے سامنے ہوتی ہے۔ میری پیاری ماں نے ایک بار پھر میرے قدموں میں اپنی چادر بچھا دی تھی، اور کہا تھا۔ ''شاہ بیٹے! اگر ماں کا مرا ہوا منہ دیکھنا نہیں چاہتا تو اپنے ارادے ختم کر دے۔ ہم قانونی لڑائی لڑیں گے اور ماموں اور انیتا کے قاتلوں کو ان کے انجام تک پہنچائیں گے۔''

اپنی نئی فیلڈ میں، میں نے جہاں نام اور شہرت پائی تھی وہاں کافی بینک بیلنس بھی بنایا تھا۔ والد صاحب نے کہا۔ ''ہم بہترین وکیل کریں گے اور یہ مقدمہ لڑیں گے۔ یہ ڈنمارک ہے۔ قانون کی حکمرانی ہے یہاں۔''

اس خونی واقعے کے دو چشم دید گواہ تھے۔ ایک اٹالین چوکیدار رونالڈ دوسرا پارسی جمعدار جوزف۔ رونالڈ تو کھڑا نہ رہ سکا اور اس نے صاف انکار کر دیا کہ اس نے مالک اور مالکن کو قتل ہوتے دیکھا ہے لیکن جوزف کھڑا رہا۔ جوزف کا رنگ گہرا سانولا تھا۔ جسم پر برص کے داغ تھے۔ دیکھنے میں ایک معمولی شخص نظر آتا تھا مگر اس نے ہمت دکھائی اور عدالت میں گواہی دینے کے لیے تیار ہو گیا۔ کیس کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ جوزف کی گواہی کی بے پناہ اہمیت ہو گئی تھی۔ میں نے اسے اپنی حفاظت میں رکھا ہوا تھا۔ تاہم ایک روز جان ڈیرک اور راہول کے سفاک ہرکارے اس جگہ پر بھی پہنچ گئے جہاں جوزف موجود تھا۔ انہوں نے اس گھر پر اتنی فائرنگ کی کہ کھڑکیاں، دروازے چھلنی ہو کر رہ گئے اور ایک حصے میں آگ بھڑک اٹھی۔ خوش قسمتی سے پٹرولنگ پولیس پہنچ گئی اور ایک اسٹور میں دبکے ہوئے سویپر جوزف کی جان بچ گئی۔

اس واقعے کے بعد میں نے سمجھ لیا کہ ڈنمارک جیسے ملک میں ہونے کے باوجود مجھے یہ قانونی لڑائی جیتنے نہیں دی جائے گی۔ وہ پہلا موقع تھا جب میں نے سنگین ارادے کے ساتھ پہلی بار قانون کو اپنے ہاتھ میں لیا اور پہلی بار ہی تھی جب میں نے اپنی شناخت چھپا کر کوئی کارروائی کی۔ میں نے اپنا چہرہ ایک سکائی ماسک میں چھپایا تھا۔ میرے ساتھ میرا ایک قریبی

دوست بھی تھا۔ ایک طرح سے یہ میرا اور مرحوم مامون کا مشترکہ دوست تھا۔ ہم نے ایک سوئمنگ پول میں اندھادھند فائرنگ کر کے گینگسٹر راہول بھائی کے ہندو دست راست گوپال ورما کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ یہی شخص تھا جس نے چھ ماہ پہلے میرے جگری یار مامون اور اس کی دوست انیتا کو بے رحمی سے مارا تھا اور اس وقت مارا تھا جب وہ دونوں اپنے سپنوں کی تعبیر پانے کے بالکل قریب تھے۔

پھر یہ سلسلہ چل نکلا تھا۔ اگلے قریباً دو سال میں، میں ایک طرف تو ایسٹرن کنگ کی حیثیت سے MMA کی فائٹس میں تہلکہ مچاتا رہا اور دوسری طرف سکائی ماسک کی اوٹ میں ٹیکساری گینگ کے لوگوں سے بھی برسر پیکار رہا۔ بہت سے لوگوں کو شک تھا کہ ٹیکساری گینگ کو گاہے بگاہے سنگین مصائب سے دوچار کرنے والوں میں ہی ہوں لیکن ابھی تک ثبوت کوئی نہیں تھا۔ پھر میں کچھ عرصے کے لیے زیرزمین چلا گیا۔ اس روپوشی کے دوران میں بھی میں نے ایم ایم اے کی خونی فائٹس جاری رکھیں اور مارشل آرٹ کے قانونی و غیر قانونی حلقوں میں اپنی دھاک بٹھادی۔

والد اور والدہ مجھ سے ناراض ہو چکے تھے، مگر میں جس رخ پر چل نکلا تھا وہاں سے واپسی میرے لیے ممکن نہیں تھی اور یہی دن تھے جب مجھے جان ڈیرک سے انتقام لینے کا ایک زبردست موقع ملا۔ ڈیرک کی ایک خاص محبوبہ تھی جسے فیری یعنی پری کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اسے ڈیرک کے مزاج میں بے پناہ دخل تھا اور کہا جاتا تھا کہ وہ انڈرورلڈ کے اس بے تاج بادشاہ ڈیرک سے جو چاہے کرا سکتی ہے۔ وہ بہت خوش لباس بھی مشہور تھی اور لاس اینجلس میں خوش لباسی کا کوئی بہت بڑا مقابلہ بھی جیت چکی تھی۔ اس کی عمر تیس پینتیس سال تھی۔ شہزادیوں اور ملکاؤں سے بڑھ کر زندگی گزار رہی تھی۔

ایک روز میرے خاص ساتھی ناصر نے مجھے ایک خاص اطلاع دی۔ اس وقت ہم روم میں تھے اور انٹرنیٹ پر دکھائے جانے والے ایک خونریز مقابلے کی تیاری کر رہے تھے۔ ناصر نے کہا۔ ''شاہ زیب! میرے ایک انفارمر نے بڑی چوٹی کی اطلاع دی ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے نیڈ بیگ پر مکے برساتے ہوئے پوچھا تھا۔

''فیری یہاں مضافاتی علاقے کی ایک کوٹھی میں موجود ہے۔ شاید سیر و تفریح کے لیے آئی ہوئی ہے۔''

کوپن ہیگن سے قریباً دو ہزار کلومیٹر کے فاصلے پر فیری کا یہاں موجود ہونا اچنبھے کی بات تھی، اور بڑی اہم بھی تھی۔

ناصر نے کہا۔ ''انفارمر الیکٹریشن کی حیثیت سے کوٹھی کے اندر گیا ہے اور اس نے معلومات لی ہیں۔ جان ڈیرک یہاں موجود نہیں۔ شاید ایک دو دن تک آئے گا۔ اندر مسلح بندوں کی تعداد بھی آٹھ دس سے زیادہ نہیں۔'' ناصر کی آنکھوں میں معنی خیز چمک تھی۔

واقعی یہ قابلِ قدر موقع تھا۔ جان ڈیرک اور فیری وغیرہ کے اردگرد ہر وقت درجنوں خطرناک ترین شوٹر ہوا کرتے تھے۔ اور کوپن ہیگن میں تو ان کے اردگرد چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی تھی۔ اس رات ہم نے روم کے مضافاتی علاقے میں ''فنطاسی'' نامی اس عمارت پر حملہ کیا تھا۔ ہمیں توقع سے زیادہ مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ فیری کے محافظوں میں سے چار افراد قتل ہوئے، ایک ملازمہ بھی ماری گئی۔ میرے دو ساتھی بھی شدید زخمی ہوئے جن میں سے ایک جانبر نہ ہو سکا۔ ہم نے فیری کو اس پھولوں سے لدی ہوئی کوٹھی میں سے اٹھا لیا اور ایک اسٹیشن ویگن میں ڈال کر قریبی شہر میں لے گئے۔ یہاں ہمارا ایک خفیہ ٹھکانا موجود تھا۔ فیری واقعی بڑی طرح دار عورت تھی۔ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتی تھی۔ خوش لباسی میں خود کو ملکۂ ڈنمارک سمجھتی تھی۔ شکل و صورت کی بھی اچھی تھی۔ اس کے اغوا کے دوران میں ایک غیر متوقع واقعہ بھی پیش آیا تھا۔ گھمسان کی دست بدست لڑائی میں میرے چہرے کا ماسک پھٹ گیا تھا اور حریفوں میں سے دو تین افراد نے مجھے شاہ زیب کی حیثیت سے پہچان لیا تھا۔ اب میرے لیے بے حد ضروری تھا کہ میرے والد اور والدہ منظر عام پر نہ رہیں۔ میں نے فوراً کوپن ہیگن میں اپنے ساتھیوں کو ہدایت جاری کر دیں کہ اب یہ کھلم کھلا جنگ ہو گئی ہے۔ لہٰذا میرے والدین کو فوراً سے پہلے کسی محفوظ جگہ منتقل کر دیا جائے۔ اس پر فی الفور عمل ہو گیا۔

اغوا ہونے کے بعد جب فیری ہمارے خفیہ ٹھکانے پر پہنچی اور اس نے مجھے پہچانا تو بہت تن فن دکھائی۔ اس نے کسی مہارانی یا ملکہ کی طرح ہمیں جھاڑیں پلائیں اور مجھے نہایت خوفناک نتائج کی دھمکیاں دیں۔

اس نے کہا۔ ''تمہیں ٹھیک سے پتا نہیں کہ تم نے کس سے ٹکر لی ہے۔ ڈیرک تمہیں اس حال تک پہنچا دے گا کہ تم بلک بلک کر موت کی بھیک مانگو گے اور موت تمہیں ملے گی نہیں۔''

وہ جانتی نہیں تھی کہ پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا ہے۔ وہ جس کو للکار رہی ہے، وہ بھی اب وہ نہیں رہا جو دو ڈھائی سال پہلے تھا۔ وہ مار دھاڑ اور بے رحمی میں اگر ان سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں۔ اس کا رویہ دیکھ کر میرے طیش میں اضافہ ہوا۔ مجھے اپنا وہی پرانا زخم یاد آ گیا جس نے پہلے پہل مجھے خون کے آنسو رلائے تھے۔ خوش رنگ ڈیزی جسے ٹیکساری گینگ کے غنڈوں نے پامال کیا تھا، اس تلخ یاد کا ردِعمل تھا کہ میں نے نک چڑھی ''ملکۂ

ڈنمارک'' کو خاکروب جوزف کے حوالے کر دیا۔ جوزف کو شراب کے سوا کوئی لت نہیں تھی (وہ ایک کڑک مرد تھا اور اس کا ثبوت یہی تھا کہ وہ جمنازیم والے واقعے کی گواہی دینے کے لیے ڈٹا رہا تھا) میں نے جوزف کو اجازت دے دی کہ اگر وہ اس کی بات نہ مانے تو وہ اس کو بھوکا رکھ سکتا ہے۔ اس سے مار پیٹ کر سکتا ہے۔ صرف دو تین ہفتے میں ہی فیری عرف ملکۂ ڈنمارک کی ساری اکڑفوں ختم ہو گئی۔ وہ میری منت سماجت پر اتر آئی کہ میں اسے اس برص زدہ پارسی سے نجات دلاؤں۔ میرے کان پر جوں تک نہیں رینگی تھی۔ آخر وہ پھر آنکھیں دکھانے لگی اور دھمکی دی کہ وہ اپنی جان لے لے گی اور اس کا خون ٹیکساری گینگ مجھے کبھی معاف نہیں کرے گا۔

میں نے کہا کہ میں نے بہت پہلے معافیاں مانگ لی تھیں۔ اب مجھے کچھ معاف نہیں کرانا۔

تیسرے دن فیری نے تیز نشہ آور گولیاں شراب میں گھول کر چڑھالی تھیں۔ وہ جانبر نہیں ہوئی تھی اور مجھے اس کا افسوس بھی نہیں ہوا تھا۔ کہتے ہیں کہ محبت سے محبت پروان چڑھتی ہے۔ نفرت سے نفرت اور سفا کی سے سفا کی۔

دفعتاً مجھے اپنے خیالوں سے پھر چونکنا پڑا۔ میں ایک بار پھر ماضی کے دھندلکوں سے نکل آیا۔ کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ یہ تیز ہوا کی دستک نہیں تھی۔ میں اٹھ کر دروازے پر پہنچا۔ ''کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''فیض محمد۔'' باہر سے آواز آئی۔

حیرانی کی بات تھی کہ وہ رات کے اس پہر دروازے پر تھا۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔ وہ اندر آ گیا۔ اس کا بوڑھا چہرہ تشویش اور دکھ کی آماجگاہ تھا۔ لگتا تھا کہ وہ بھی ابھی تک میری طرح جاگ رہا ہے۔

وہ میرے سامنے رنگین پایوں والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے ادھ بجھی انگیٹھی کی راکھ کرید کر اسے تھوڑا سا گرم کیا۔ وہ کچھ دیر عجیب نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا، پھر نہایت بوجھل لہجے میں بولا۔ ''شاہ زیب! بہت دیر ہو چکی ہے لیکن...... مجھے لگتا ہے کہ اگر میں کوشش کروں تو تمہیں اب بھی ایک موقع مل سکتا ہے۔''

''کس بات کا موقع؟''

''اپنی جان لیوا بے وقوفی کو ٹھیک کرنے کا موقع۔ تمہیں پتا نہیں...... کل تم سردار سجاول کے سامنے جا کر خود کو کتنی بڑی مصیبت میں ڈالو گے۔''

''کیا اس نے مجھے ڈرانے کے لیے تمہیں یہاں بھیجا ہے؟''
''اس نے نہیں بھیجا۔ میں خود آیا ہوں۔'' فیض دانت پیس کر بولا۔
میں خاموش بیٹھا رہا۔ اس نے میرا چہرہ دیکھنے کے لیے لالٹین کی لو کچھ اونچی کی اور ایک بار پھر آزردہ لہجے میں کہا۔ ''ہتھ جوڑی کی منگ واپس لے لو شاہ زیب! میں اپنی پگڑی سردار کے پاؤں میں رکھ کر اسے منالوں گا۔''
میں نے فیض کی پگڑی پر ہاتھ پھیرا۔ ''چاچا! یہ تمہارے سر پر ہی اچھی لگتی ہے۔ اب تو بس چند گھنٹے رہ گئے ہیں۔ اب جو ہونا ہے میدان میں ہی ہونا ہے۔''
میرے مصمم ارادے نے جیسے فیض کو سرتاپا ہلا دیا۔ میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ دور اس ہال کمرے کا دروازہ نظر آ رہا تھا جس میں مادر زاد برہنہ سردار سجاول آدھی رات کے بعد سے بند تھا۔ کسی کھڑکی یا روشن دان سے روشنی کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دیتی تھی۔
ہوائیں فراٹے بھرتی ہوئی دیوہیکل درختوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ وہ جیسے انہیں جڑوں سے اکھاڑ دینا چاہتی تھیں۔ دیوہیکل درختوں اور چٹانوں کے ساتھ منہ زور ہواؤں اور شوریدہ سر پانیوں کا یہ تصادم ہمیشہ سے رہا ہے۔ ہاں جب تک ڈیرک رہیں گے، شاہ زیب بھی رہیں گے......اور یہ تصادم بھی رہے گا۔

O......❖......O

یہ میرے اور سجاول کے مقابلے کا منظر تھا۔ یہ دوپہر کے بعد کا وقت تھا مگر مطلع ابر آلود تھا اور تیز ہوائیں بدستور چل رہی تھیں۔ کبھی ان کی شدت کم ہو جاتی تھی مگر ان کا سلسلہ کل سے رکا نہیں تھا۔ سردی اپنے عروج پر تھی۔ احاطے کے بیچوں بیچ ایک بڑے دائرے کی شکل میں کم وبیش دو سو افراد موجود تھے۔ یہ سب کے سب سجاول کے ساتھی اور کارندے تھے۔ ان میں سے بیشتر کے پاس آتشیں اسلحہ تھا۔ باقی جو تھے وہ کلہاڑیوں یا لمبے چھُروں سے مسلح تھے۔ ان کے لباس اور گرم چادریں ہوا کے زور سے پھڑ پھڑاتی تھیں مگر وہ اپنی جگہوں پر جمے ہوئے کھڑے تھے۔ بالکل جیسے پتھر کے بت ہوں۔
ایک جانب پانچ کرسیاں رکھی تھیں۔ ان کرسیوں پر بڑے بڑے پگڑوں والے وہی مہمان بیٹھے تھے جو بہت کم بولتے تھے اور ان کی آنکھوں میں ایک خاص طرح کی عقابی چمک دکھائی دیتی تھی۔ ان پانچوں افراد کو اس لڑائی کے لیے منصف کا کردار ادا کرنا تھا۔ ان میں سے چار نے سفید کلف دار شلوار قمیص پہن رکھی تھی جبکہ ایک کی شلوار قمیص کا رنگ سیاہ تھا اور اس کی پگڑی بھی سیاہ تھی۔

میدان کی جگہ نیم پتھریلی تھی۔ یہاں کسی قسم کا کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ سیاہ شلوار قمیص والے مہمان کے سامنے ایک گول نقارہ پڑا تھا۔ ایسے ہی تین چار چھوٹے نقارے تماشائیوں کے درمیان بھی رکھے تھے۔ یہ نقارے مسلسل بجائے جا رہے تھے۔ بالکل جیسے کسی جنگ سے پہلے، لڑنے والوں کا جوش و خروش بڑھانے کے لیے رجز پڑھے جاتے ہیں یا ڈھول اور طبل وغیرہ سے آواز پیدا کی جاتی ہے۔

میں میدان میں آچکا تھا، میں سر اور پاؤں سے ننگا تھا۔ جسم پر جین کی ایک پتلون اور صرف ایک بنیان تھی۔ تھوڑی دیر بعد سجاول بھی میدان میں نمودار ہو گیا۔ اس کے داخل ہوتے ہی نقارے زیادہ زور سے پیٹے جانے لگے۔ تماشائیوں میں غیر معمولی جوش و خروش دکھائی دینے لگا۔ سجاول اسی لباس میں تھا جو قریباً ڈیڑھ برس پہلے کی ویڈیو میں نظر آیا تھا۔ اس نے ایک ایسا جانگیا پہن رکھا تھا جو اس کے گھٹنوں تک جاتا تھا۔ بالائی جسم عریاں تھا اور فولاد کی طرح دمک رہا تھا۔ جانگیے میں ایک چوڑی پٹی بھی دکھائی دیتی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ پٹی کسی جانور کی کھال کی ہے۔ شاید...... وہی جانور جو اس قبیلے کے لوگوں کے لیے زمانۂ قدیم سے ایک خاص حیثیت رکھتا تھا...... یعنی باگھ...... جس کا بدبودار جگر چباتے ہوئے میں نے کل رات سجاول کو دیکھا تھا۔ وہ سارے مناظر ابھی تک میرے حافظے میں تازہ تھے اور دل و دماغ میں ہلچل پیدا کرتے تھے۔ سجاول کا تیندوے کا جگر چبانا۔ پھر گھوڑی کے شکم سے برآمد ہونے والے کچے گوشت کے لوتھڑے سے رطوبت نکالنا اور اسے کہنہ شراب میں ملا کر پینا۔ وہ سب کچھ کسی سفلی عمل کا ہی حصہ لگتا تھا۔ اس عمل کا کچھ حصہ میں نے آتش دان میں دبک کر دیکھا تھا...... اور کچھ شاید...... میری نگاہوں سے اوجھل رہا تھا۔

سردار سجاول کا چہرہ دیکھ کر دل پر ہیبت سی طاری ہوئی لیکن ایسا صرف چند سیکنڈ کے لیے رہا پھر میں سنبھل گیا۔ سجاول کا چہرہ اس طرح تمتمایا ہوا تھا جیسے اس کی جلد کے اندر سے ابھی خون ٹپک پڑے گا۔ اس چہرے پر آنکھیں دودہکے انگاروں کی طرح تھیں اور ان پر نگاہیں جمانا مشکل ہو رہا تھا۔ یہ کسی انسان کی آنکھوں سے زیادہ کسی جانور کی آنکھیں لگ رہی تھیں۔ تماشائیوں میں سے کئی افراد سجاول کو دیکھنے کے بعد رکوع کی سی حالت میں جھک گئے، باقی لوگ پُرجوش نعرے بلند کرنے لگے۔ ان کے نعروں میں ایک طرح کی ہیبت بھی جھلک دکھاتی تھی۔

وہ میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔ ہمارے درمیان بس آٹھ دس فٹ کا فاصلہ رہا ہو گا۔ سیاہ لباس اور سیاہ پگڑی والا شخص اپنی رنگین پایوں والی کرسی سے اٹھا اور ہم دونوں کے قریب آن

کھڑا ہوا۔ وہ ٹھہرے ہوئے بھاری بھرکم لہجے میں بولا۔ ''اس لڑائی میں کوئی ہتھیار استعمال نہیں ہوگا۔ لڑائی اگر دس منٹ تک جاری رہی تو پھر اس میں پانچ منٹ کا ایک وقفہ ہوگا، لیکن اس پانچ منٹ میں کوئی بھی اس دائرے سے باہر نہیں جا سکے گا......'' وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے سر ہلا کر کہا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''لڑائی کے دوران میں اگر کسی کو اپنے شدید زخمی ہونے کا خطرہ ہو یا اس کو لگے کہ اس کا ہاتھ پاؤں ٹوٹ سکتا ہے تو وہ آواز دے کر یا زمین پر ہاتھ مار کر یہ لڑائی رکوا سکتا ہے۔ کسی ایک کے زخمی ہونے یا پھر جان چلے جانے کی ذمے داری تم دونوں میں سے کسی پر نہیں ہوگی۔'' اس مرتبہ کالے کپڑوں والے نے یہ بات سجاول کی طرف دیکھ کر کہی تھی۔ سجاول نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ اس کے توانا بازوؤں کی مچھلیاں جیسے پھڑک رہی تھیں اور پتلی کمر کے اوپر صندوق جیسا سینہ سنگلاخ چٹان کے مانند دکھائی دینے لگا تھا۔

کالے لباس والے نے کہا۔ ''یہ لڑائی آج یہاں اور اسی وقت ختم ہو جائے گی۔ کسی کے زخمی ہونے یا جان چلے جانے کی صورت میں کسی طرح کا کوئی بدلہ نہیں لیا جائے گا......اور نہ بدلہ لینے کا ارادہ رکھا جائے گا۔ اگر لڑائی دس منٹ سے زیادہ چلی اور پانچ منٹ کا وقفہ ہوا تو وقفے کے بعد یہ لڑائی دونوں میں سے کسی کی ہار جیت تک جاری رہے گی۔ مطلب یہ کہ اب اسے برابری پر نہیں چھڑایا جا سکتا۔''

سیاہ لباس والے نے اس لڑائی کے کچھ مزید قواعد وضوابط بتائے اور اس کے بعد نقارچیوں کی طرف دیکھا۔ انہوں نے اپنا ردھم بدلا اور نسبتاً بلند آواز میں نقارے بجانے لگے۔ جوش کی ایک لہر تھی جو چاروں طرف لہراتی اور گونجتی محسوس ہوئی۔ ایک عرصے بعد میں نے آج پھر خود کو MMA کے رِنگ میں کھڑا محسوس کیا۔ ہاں، آج پھر میں ایسٹرن کنگ تھا اور میرے سامنے ایک انوکھا وپُراسرار حریف تھا۔ اگر میرے پاس خونی لڑائیوں کا طویل تجربہ نہ ہوتا تو شاید میں اس جنونی شخص کو اپنے سامنے دیکھ کر ہی آدھی لڑائی ہار جاتا۔

سیاہ کپڑوں والا واپس اپنی رنگین کرسی پر جا بیٹھا۔ اس نے حاضرین کی طرف دیکھ کر بڑے نقارے پر ایک زوردار چوٹ لگائی اور اس کے ساتھ ہی ہماری لڑائی کا آغاز ہو گیا۔

سجاول نے دونوں بازو پھیلائے اور بڑے بڑے تلے قدموں سے میرے گرد ایک چکر لگایا پھر ایک چنگھاڑ کے ساتھ وہ مجھ پر حملہ آور ہوا۔ یہی وہی طوفانی گھونسا تھا جس کے بارے

میں، میں اب تک بہت کچھ سن اور دیکھ چکا تھا۔ اگر میں پہلے سے تیار نہ ہوتا تو شاید یہ مقابلہ جس کی تیاری ہفتوں سے جاری تھی، پہلے پانچ سیکنڈ میں ہی ختم ہو جاتا۔ میں نے حتی الامکان تیزی سے خود کو اس گھونسے سے بچایا۔ یہ گھونسا اچٹتا ہوا سا میرے کندھے پر لگا اور اس نے مجھے بتا دیا کہ جو کچھ کہا اور سنا جاتا ہے، وہ ہرگز غلط نہیں ہے۔ میرے شانے سمیت میرا پورا جسم جھنجنا اٹھا اور بعین یہی لگا کہ کسی شہ زور شخص نے ایک وزنی ہتھوڑا پوری قوت سے گھما کر میرے شانے پر رسید کیا ہے۔ اگر یہ کہا جاتا تھا کہ سجاول کا یہ گھونسا مدِ مقابل کی گردن توڑ ڈالتا ہے تو غلط نہیں تھا۔ میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ ابھی اس گھونسے کا پورا ''امپیکٹ'' میں نے نہیں جھیلا۔ یہ ایک اچٹتی ہوئی ضرب تھی۔ اس کے باوجود کچھ دیر کے لیے شانہ اور پورا بازو سن ہو کر رہ گئے۔

اس کا دوسرا گھونسا بائیں ہاتھ کا تھا۔ یہ وار بچانے میں مجھے زیادہ دقت پیش نہیں آئی۔ تیسرا وار میں نے کیا۔ یہ دائیں ٹانگ سے لگائی جانے والی ایک برق رفتار ضرب تھی جو سجاول کے صندوق جیسے سینے پر پڑی۔ یہ MMA کے چیمپئن کی ضرب تھی۔ سجاول تین چار قدم تک لڑکھڑایا۔ تماشائیوں کے شور وغل کو جیسے دو تین سیکنڈ کے لیے بریک لگ گئے۔

اس چوٹ کا ردِ عمل میری توقع سے زیادہ تھا۔ سجاول نے کسی خونی جانور کی طرح پھنکارتے ہوئے مجھ پر حملہ کیا۔ بالکل یہی لگا جیسے کوئی بھوکا درندہ اپنی ساری توانائیاں جمع کر کے شکار پر جھپٹ پڑے۔ اس نے اپنے چاروں ہاتھوں پاؤں کو اتنی تیزی اور اتنے تواتر کے ساتھ حرکت دی کہ مجھے لگا، میرے جسم پر پتھروں کی بارش سی ہو گئی ہے۔ کچھ وار میں نے خالی دیئے مگر کچھ سہنا پڑے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ سجاول کے طرز لڑائی میں کسی طرح کے خاص ہنر یا مشق وغیرہ کا دخل نہیں ہے۔ اگر کسی چیز کا دخل تھا تو وہ اس کا دیوانہ پن تھا اور وہ بے پناہ غضب تھا جو اس کے اندر سے نیلے شعلوں کی طرح لپکتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

میں نے اپنی ساری توجہ دفاع پر مبذول کر دی۔ کیونکہ میں جان گیا تھا کہ اس طوفانی حملے میں اگر اس وحشی کا ایک دایاں گھونسا بھی ٹھکانے پر لگ گیا تو میرا سارا ہنر و فن دھرے کا دھرا رہ جائے گا۔

تماشائی للکار رہے تھے۔ ''مارو سردار...... مارو سردار...... سردار زندہ باد۔''

تیز ہواؤں کے شور میں نعروں کی صدائیں ڈوب ڈوب کر ابھر رہی تھیں۔ سردار مجھ پر دیوارنہ وار حملے کر رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ حیرت زدہ بھی ہو رہا تھا۔ شاید حیرت اس بات پر تھی کہ میں ابھی تک اس کے سامنے کھڑا کیونکر ہوں۔ میں نے اس کے ایک نسبتاً ڈھیلے وار کو

خالی دیا تو اس کا جسم میرے نزدیک آ گیا۔ جب مدِمقابل کا جسم زیادہ نزدیک آ جائے تو گھونسا اور کک وغیرہ زیادہ کام نہیں کرتے۔ یہ موقع سر سے ضرب لگانے کا ہوتا ہے اور میں نے یہ ضرب اس کے سینے پر لگائی وہ ایک بار پھر لڑکھڑا کر چند قدم پیچھے گیا۔

"ماردوں گا۔" وہ چنگھاڑا اور دگنی رفتار سے میری طرف آیا۔

ہم اوپر نیچے سنگلاخ زمین پر گرے۔ اور یہ وقت تھا جب مجھے پہلی مرتبہ اپنی مشکلات کا احساس ہوا۔ جس کندھے پر سجاول کا طوفانی گھونسا لگا تھا وہ پہلے ہی سے کسی حد تک چوٹ زدہ تھا۔ اب اس میں سے ناقابلِ برداشت ٹیسیں اٹھنا شروع ہو گئی تھیں۔

میں نے سجاول کے بھاری بھرکم جسم کو اپنے اوپر سے ہٹانے کی کوشش کی مگر کندھے کی وجہ سے ناکام رہا۔ سجاول کی غضب ناک پھنکاریں میرے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ اس کے جسم میں سے کسی درندے کی سی بو اٹھ رہی تھی۔ جب حریفوں کے جسم بہت قریب ہوں تو گھونسوں میں وہ طاقت نہیں ہوتی۔ زوردار گھونسا یا گھٹنا وغیرہ رسید کرنے کے لیے کچھ پیچھے ہٹنا پڑتا ہے۔ اپنا مہلک گھونسا میرے چہرے پر رسید کرنے کے لیے سجاول کچھ پیچھے ہٹا تھا۔ مجھے موقع مل گیا اور میں نے بڑے اطمینان سے اسے اپنے اوپر سے اچھال پھینکا۔ وہ کالے لباس والے کے ساتھیوں کے قریب گرا۔

اب کی بار اس کا اٹھنا اور جھپٹنا مزید خطرناک تھا۔ اگلے قریباً دو منٹ میں میرے اور اس کے درمیان زوردار رن پڑا۔ زیادہ تر حملے وہی کر رہا تھا۔ میں نے بھی اسے کچھ ضربیں لگائیں۔ ان میں سے کچھ شدید تھیں۔ تاہم مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ سجاول کی جنونی کیفیت نے اس کی قوتِ برداشت میں بھی بے پناہ اضافہ کر رکھا ہے۔ میری تمام تر توجہ اس بات پر تھی کہ میں سجاول کے مہلک گھونسے سے خود کو بچائے رکھوں۔ اس دوران میں میرے کندھے کو مزید ضعف پہنچا۔ دوسری طرف میرے ایک مکے سے سجاول کی دائیں ابرو بھی پھٹ گئی اور اس کا پورا تھوبڑا اس زخم کے خون سے سرخ نظر آنے لگا۔ تیز ہواؤں کے شور میں بڑے نقارے پر ایک گونج دار چوٹ پڑی اور وقفے کا اعلان ہوا۔

سیاہ لبادے والا دراز قد شخص اپنی جگہ سے اٹھا اور ہم دونوں کے درمیان آ گیا۔ اس نے بھاری بھرکم آواز میں کہا۔ "اب پانچ منٹ کا وقفہ ہو گا۔"

وہ سجاول کو سنبھالتا ہوا اپنی منقش کرسی کی طرف لے گیا اور اسے وہاں بٹھا دیا۔ دوسرا شخص سجاول کے چہرے پر آنے والے زخم کو دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ میرے بیٹھنے کے لیے بھی لکڑی کا ایک اسٹول میدان میں رکھ دیا گیا۔ پہلوان حشمت ذرا جھجکتا ہوا آگے بڑھا اور

میرا حال احوال دریافت کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اس کے لہجے میں حیرت تھی۔ کہنے لگا۔
"تم نے کمال کر دیا ہے شاہ زیب! سردار جس طرح لڑ رہا ہے، کوئی اور ہوتا تو اس کے پرزے اُڑ جانے تھے، شاباش۔"
"میرے کندھے پر چوٹ آئی ہے۔" میں نے کندھے کو ہلاتے ہوئے کہا۔
"ہاں مجھے بھی یہ لگت ہے کہ تمہارا کندھا ٹھیک سے کام ناہیں کر رہا۔ لیکن اس وقت تو کچھ ناہیں ہو سکتا۔ بس تم کندھے کو ٹھنڈا ناہیں ہونے دینا۔ اس کو ذرا ہلاتے جلاتے رہو۔"
میں نے دیکھا۔ سجاول اپنے زخم پر دوا لگوانے سے انکار کر رہا تھا۔ اس نے دوا لگانے والے کو دھکا دے کر دور گرا دیا۔ تب میں نے ایک اور تعجب خیز منظر دیکھا۔ اس نے اپنے ابرو کے زخم پر دو تین مکے رسید کیے اور اسے مزید خونچکاں بنا دیا۔ چہرہ جو کپڑے سے صاف کر دیا گیا تھا، ایک بار پھر لہولہان دکھائی دینے لگا۔ وہ بے انتہا طیش میں دکھائی دے رہا تھا۔ اس اثنا میں بادل زور سے گرجے اور تیز ہوا میں بارش کی بوچھاڑیں بھی شامل ہونے لگیں۔ ہجوم میں تھوڑی سی ہلچل ضرور نظر آئی مگر کوئی بھی اپنی جگہ سے ہلا نہیں۔
اسی دوران میں سجاول کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔ ابھی پانچ منٹ کا وقفہ مکمل ہونے میں ایک ڈیڑھ منٹ باقی تھا کہ وہ دہاڑتا ہوا سا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے اپنی طرف لپکتا دیکھ کر میں نے بھی جگہ چھوڑ دی۔ وہ غلیظ گالیاں بکتا ہوا کسی خونی جانور ہی کی طرح مجھ پر جھپٹا۔ اس کی گالیوں کا جواب میں نے تابڑ توڑ ضربوں سے دیا۔ ہر ضرب پر اس خبیث کا غیظ وغضب مزید بھڑکتا تھا۔ ہم گتھم گتھا ہوئے اور لڑتے ہوئے، تماشائیوں پر جا گرے۔ سجاول جیسے ہوش وحواس سے بیگانہ ہو چکا تھا۔ وہ ایک ایسی قاتل مشین کی طرح تھا جس کا سوئچ آن کرتے وقت سوئچ ٹوٹ گیا ہو اور اب مشین کو روکنا ناممکن ہو۔ مجمع کائی کی طرح پھٹ گیا، تماشائیوں کا دائرہ ٹوٹ گیا۔ ہم اندھا دھند لڑتے لڑتے رہائشی حصے کی طرف چلے گئے۔ لوگ ہمارے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ بڑے بڑے پگڑوں والے منصف حضرات نے بھی اپنی کرسیاں چھوڑ دی تھیں۔ بارش نے ہر ایک کو لت پت کر دیا تھا۔ یہ لڑائی اس قدر خوفناک تھی کہ کسی کو موسم کا ہوش ہی نہیں رہا تھا۔
میں بس دفاع کر رہا تھا اور پیچھے ہٹ رہا تھا۔ میں نے اب تک جتنی بھی لڑائیاں لڑی تھیں، یہ ان سب میں سے انوکھی تھی۔ مدِمقابل لڑائی کے فن سے تو زیادہ آشنا نہیں تھا مگر اس کے دیوانے پن نے اس کے اندر ایک ایسی آگ بھر دی تھی جس کا سامنا کرنا بے حد دشوار تھا۔ "مار دے اس کو...... جان سے مار دے۔" وڈا سردار اعظم بار بار چنگھاڑ رہا تھا۔

ہم لڑتے لڑتے لکڑی کے ایک کیبن سے ٹکرائے اور اسے چکنا چُور کرتے ہوئے اندر جا گرے۔ یہاں برتن تھے اور شراب کی بہت سی بوتلیں رکھی تھیں۔ کئی بوتلیں چکنا چُور ہو گئیں اور ان کے ٹکڑے کیبن میں بکھر گئے۔ یہ ٹکڑے زخمی کرنے لگے لیکن لڑائی ایسے مرحلے میں تھی کہ ان زخموں کی پروا سجاول کو تھی اور نہ مجھے۔ سجاول نے مجھے اوندھے منہ گرا لیا اور میری کمر پر سوار ہو کر میری گردن اپنے بازو کے شکنجے میں لے لی۔ شاید وہ پلک جھپکتے میں میری گردن توڑ ڈالتا لیکن MMA کے بنیادی اصول کے مطابق میں اس کے بازو کے شکنجے میں اپنا ہاتھ ڈالنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اب اس شکنجے کا سارا زور میری گردن پر نہیں تھا بلکہ کچھ زور میرا ہاتھ بھی جھیل رہا تھا۔

ناکامی سجاول سے برداشت نہیں ہو پا رہی تھی۔ اس نے ایک ٹوٹی ہوئی چوکھٹ کی موٹی لکڑی اٹھا لی اور میرے سر پر ضربیں لگانا شروع کر دیں۔ یہ قاعدے کے خلاف تھا۔

بارش کی بوچھاڑوں میں سیاہ لباس والے نے چلا کر کہا۔ ”نہیں سردار، لکڑی چھوڑ دو......“

”پیچھے ہٹ جاؤ۔“ سجاول چنگھاڑا۔ اس کی آواز میں بے انتہا درندگی تھی۔

شاید فیض محمد، مانی اور دیگر لوگوں نے درست ہی بتایا تھا کہ ایک بار لڑائی شروع ہونے کے بعد سجاول کو روکنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس بات کا شدید اندیشہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے حریف کی جان لے لے۔

وہ فاؤل کر رہا تھا۔ اب مجھے بھی اختیار تھا کہ میں اپنے دفاع کے لیے کوئی حربہ اختیار کروں۔ میرے اردگرد لکڑیاں اور شیشے کے چھوٹے بڑے ٹکڑے موجود تھے مگر میں نے خود کو جذبات کی رو میں بہنے نہیں دیا اور اپنی توجہ دو باتوں پر مرکوز رکھی۔ ایک تو سجاول میرے سر پر لکڑی کی کوئی کاری ضرب نہ لگا سکے، دوسرے وہ غیر متوازن ہو اور میں اسے اپنے اوپر سے ہٹا سکوں۔ یہ دوسرا موقع مجھے جلد ہی مل گیا۔ میں نے اپنی گردن چھڑائی اور پھر اپنے سر کے پچھلے حصے کی ضرب اس کی ناک پر لگائی۔ وہ ڈگمگایا تو میں نے پلٹ کر اسے اپنے نیچے کر لیا۔

ایک بار پھر میرے اور اس کے درمیان فرشی لڑائی شروع ہو گئی، یہ عجیب منظر تھا۔ ٹوٹے ہوئے کیبن کا ملبا چاروں طرف بکھرا ہوا تھا۔ لکڑی کی چھت بھی گر چکی گئی۔ طوفانی ہوا اور تیز بارش نے سب کو غتر بود کر دیا تھا۔ میری ناک میں الکحل کی بو تھی اور ٹوٹی ہوئی بوتلوں کے ٹکڑے جسم کو مزید لہولہان کر رہے تھے۔ یہی خونچکاں کیفیت سجاول کی بھی تھی۔ وہ اب میرے نیچے تھا۔ اس کی انگارہ آنکھوں میں مجھے غضب کے علاوہ جو سب سے نمایاں چیز نظر

آرہی تھی، وہ حیرانی تھی۔ یقیناً وہ غیر شعوری طور پر اس بات پر حیران تھا کہ میں اب تک اس کے مقابل کیونکر کھڑا ہوں۔ شاید اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ آج اس کا سامنا مار دھاڑ کے ایک پروفیشنل سے ہے، اب اس لڑائی کی طوالت اس کے شعلوں پر تیل چھڑک رہی تھی۔

اچانک مجھ سے ایک غلطی ہوئی۔ اس کے مہلک گھونسے سے خود کو دور رکھنے کی کوشش میں، میں نے اپنے بالائی دھڑ کو اتنا پیچھے کر لیا کہ سجاول کو نیچے لیٹے لیٹے میری ٹانگ گرفت میں لینے کا موقع مل گیا۔ یہ خطرناک گرفت تھی میری پنڈلی ٹوٹ سکتی تھی۔ میں نے تپ کر خود کو پیچھے کی طرف گرایا اور جوابی کارروائی کے طور پر اس کی ٹانگ گرفت میں لے لی۔ اس موقع پر یہ زیادہ سے زیادہ فائدہ تھا جو میں حاصل کر سکتا تھا اور یہ میں نے کیا۔

اب صورتِ حال یہ تھی کہ ہم پہلو بہ پہلو لیٹے تھے۔ میرا چہرہ سجاول کے پاؤں کی طرف اور اس کا میرے پاؤں کی طرف تھا۔ میری پنڈلی ایسی پوزیشن میں آگئی تھی کہ وہ اپنی کہنی کے زوردار دباؤ سے اسے توڑ سکتا تھا۔ اور وہ کب کا توڑ بھی چکا ہوتا اگر میں نے اس کے بائیں گھٹنے پر اپنا تسلط نہ جما لیا ہوتا۔

کھیل ختم ہو چکا تھا اور بڑے عجیب اسٹیج پر ہوا تھا۔ وہ میری پنڈلی توڑ سکتا تھا اور میں بھی اس کے گھٹنے کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچانے کی پوزیشن میں تھا۔ مجھے اپنی پوزیشن کا پتا تھا لیکن اسے شاید اپنی پوزیشن کا اتنا زیادہ پتا نہیں تھا۔ اس نے میری پنڈلی پر دباؤ بڑھایا تو میں نے اس کے گھٹنے کو بیدردی سے TWIST کیا۔

"نہیں سجاول، تم ایسا نہیں کر سکتے۔" میں نے تیز سرگوشی کی۔

"ماردوں گا تجھے...... ماردوں گا۔" وہ زہریلے ناگ کی طرح پھنکارا۔

"تو ماردے، اگر مار سکتا ہے۔"

"حرام زادے!"

اس نے ایک بار پھر پنڈلی پر زور مارنا چاہا۔ میں نے گھٹنے پر دباؤ خطرناک حد تک بڑھا دیا۔ میری تیز سرگوشی پھر اس کے کانوں تک پہنچی۔ "تُو پنڈلی توڑ سکتا ہے تو میں بھی گھٹنا توڑ سکتا ہوں۔ اور تجھے پتا ہی ہوگا گھٹنا ٹوٹنا کیسا ہوتا ہے۔"

یہ بڑی کانٹے دار صورتِ حال تھی۔ فری ہینڈ کی حقیقی لڑائیوں میں ایسی سچویشن کم کم ہی آتی ہے۔ زمین کی گردش جیسے تھم گئی تھی۔ یہ بڑے فیصلہ کن لمحے تھے۔ میری بات بڑی اچھی طرح سجاول کی سمجھ میں آگئی تھی۔ بے شک وہ جنونی ہو رہا تھا مگر اس جنون میں بھی اتنا پتا تو

اسے چل ہی رہا تھا کہ پنڈلی ٹوٹ جانے سے گھٹنا ٹوٹ جانا کہیں زیادہ خطرناک اور پیچیدہ ہوتا ہے۔ میں نے اس کے کان میں کہا۔ ”میں نے تجھ سے اسی لیے گزارش کی تھی کہ یہ لڑائی بند کمرے میں ہوتو اچھا ہے......“

اس نے ایک بار پھر پنڈلی پر دباؤ بڑھایا، میں نے اس کے پاؤں کو TWIST کیا، گھٹنا کڑکڑا اٹھا۔ ہم دونوں اپنی اپنی جگہ رک گئے۔ میں نے تیز سرگوشی نما آواز میں کہا۔ ”سجاول! یہ اس لڑائی کا فل اسٹاپ ہے......لیکن میں اپنی ہار مان رہا ہوں۔“

اس کے ساتھ ہی میں نے اپنا دایاں ہاتھ تین دفعہ زور سے زمین پر مارا۔

سیاہ لباس والا لپک کر آگے بڑھا۔ اس نے لڑائی روکنے کا اشارہ کیا۔ بڑی بڑی پگڑیوں والے اس کے چاروں ساتھی بھی آگے آئے۔ انہوں نے میری پنڈلی سجاول کی گرفت سے آزاد کروائی۔ میں نے بھی اس کا گھٹنا آزاد کر دیا۔ تماشائیوں نے شور سے آسمان پر اٹھا لیا۔ نقارے پورے زور سے بجنے لگے۔ سجاول کے ساتھی اور کارندے خوشی سے ناچنا شروع ہو گئے۔ وہ بڑھکیں مار رہے تھے اور خوشی سے بھرپور آوازیں بلند کر رہے تھے۔

لیکن دوسری طرف سجاول کے تاثرات مختلف تھے۔ اس کی آنکھوں سے ابھی تک چنگاریاں چھوٹ رہی تھیں۔ وہ سرتاپا شعلہ جوالا نظر آتا تھا۔ وہ دھاڑا۔ ”میں تجھے نہیں چھوڑوں گا۔ میں تیرا خون پی جاؤں گا۔“

وہ پھر مجھ پر جھپٹا لیکن اب میرے اور اس کے درمیان درجنوں افراد تھے......اور ان میں وہ بڑی پگڑیوں والے بھی تھے جنہوں نے یہاں ”ریفریز“ کا کردار ادا کیا تھا۔ ان سب نے مل کر سردار سجاول کو سنبھال لیا۔ ان میں سے زیادہ تر یقیناً یہی سمجھ رہے تھے کہ سردار ابھی تک اپنے غیظ و غضب کو سنبھال نہیں پا رہا۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ یہ صرف غیظ و غضب ہی نہیں ہے، اس میں شدید جھلاہٹ بھی شامل ہے۔ سردار جانتا تھا کہ وہ یہ لڑائی جیت نہیں سکا۔

لوگ مجھے تمسخر اور حقارت سے دیکھ رہے تھے۔ فیض محمد اور اس کے دو چار قریبی ساتھیوں نے مجھے اپنے حصار میں لیا اور بارش کی بوچھاڑوں سے گزار کر احاطے کی طرف لے گئے۔ میں نے اپنے زخمی کندھے کو دباتے ہوئے کہا۔ ”مجھے حشمت پہلوان کی ضرورت ہے۔“

”کیوں؟“ فیض نے کھردرے لہجے میں پوچھا۔

”مجھے لگتا ہے میرے کندھے میں گڑبڑ ہے۔“

فیض نے بوجھل انداز میں کہا۔ ”شکر کرو تمہارے صرف کندھے میں گڑبڑ ہے۔ تمہاری

گردن ٹوٹنے سے بچ گئی ہے۔''

اس نے رخ تبدیل کیا اور مجھے پہلوان حشمت کی کوٹھری کی طرف لے چلا۔ وہ ہم سے پہلے ہی اپنی کوٹھری تک پہنچ چکا تھا۔ میری بنیان پھٹ چکی تھی۔ پورے جسم پر شیشے کی کرچیوں سے لگنے والے چرکے تھے۔ بالائی دھڑ ان چرکوں کے سبب خون میں لت پت ہو چکا تھا۔ تیز بارش کے بعد اب بادل کہیں کہیں سے چھٹ چکا تھا اور سہ پہر روشن دکھائی دینے لگی تھی۔ پہلوان حشمت نے یہاں کے معالج کی حیثیت سے جلدی جلدی میرے زخموں کو صاف کیا۔ جہاں کہیں شیشے کی کرچیاں موجود تھیں، وہ نکالیں۔ دو چار جگہ بینڈ یج کی ضرورت تھی۔ پہلوان کو یہاں فرسٹ ایڈ کا سامان مہیا تھا۔ اس نے بینڈ یج کی اور میڈیکل ٹیپ چپکا دی۔ پھر وہ میرے کندھے کا معائنہ کرنے لگا۔

فیض محمد کی آنکھوں میں، میں نے نمی دیکھی۔ وہ مجھ سے مخاطب ہو کر سرسراتے لہجے میں بولا۔ ''ہم میں سے شاید کسی کو توقع نہیں تھی کہ تم سردار کے سامنے اس طرح جم کر لڑ پاؤ گے......اور اپنی زندگی بھی بچا لو گے۔ میں تم کو نئی زندگی کی مبارک دیتا ہوں۔''

''شکریہ۔'' میں نے کندھے کے درد کو برداشت کرتے ہوئے کہا۔

درحقیقت اس پوری لڑائی میں سجاول کے خوفناک گھونسے کی فقط ایک ضرب ہی میرے جسم کو سہنا پڑی تھی اور یہ یہی کندھے والی ضرب تھی۔ اس نے جیسے میرا کندھا اکھاڑ کر رکھ دیا تھا۔ اگر اس کے گھونسے کو گردن توڑ کہا جاتا تھا تو شاید ٹھیک ہی کہا جاتا تھا۔ اگر غیر جانبداری سے بات کی جائے تو حقیقت یہی تھی کہ آج یہاں اس موسلا دھار بارش میں میرا مقابلہ ایک زبردست حریف سے ہوا تھا۔ وہ کوئی ماسٹر فائٹر نہیں تھا لیکن اس کی اندھا دھند لڑائی میں ایک ایسا ''قاتل جوش'' تھا جس کا مقابلہ کرنے میں مجھے مزا آیا تھا۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے میں نے سجاول سے نہیں وادی سون کے کسی قدیم قبیلے کی ''پُراسرار توانائی'' سے مقابلہ کیا ہے۔

بارش تھم گئی تھی۔ ہوا کا زور بھی ٹوٹا ہوا تھا۔ شام نکھر آئی تھی۔ احاطے میں جشن کا سا سماں تھا۔ سجاول کے قریبی ساتھی اور بہی خواہ ڈھول کی تھاپ پر ناچ رہے تھے۔ جگہ جگہ الاؤ روشن کر دیئے گئے تھے اور لوگ ٹولیوں کی صورت ان کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ یہ لوگ سجاول کو دل و جان سے اپنا سردار مانتے تھے۔ پچھلے چند دن ان لوگوں نے بہت کرب میں گزارے تھے کہ ان کے سردار کی عزت کو للکارا گیا تھا اور داؤ پر لگایا گیا تھا۔ آج ان کا سردار ''سرخرو'' ہوا تھا (کم ازکم ان کی نظروں میں تو سرخرو ہی ہوا تھا) وہ بہت شادماں تھے۔

پہلوان حشمت نے میرے کندھے پر اپنی کاریگری دکھانی شروع کی تو درد کچھ اور بڑھتا

ہوا محسوس ہوا۔ مجھے یاد آیا کہ پہلوان نے کس طرح سردار اعظم کی محبوبہ نگینہ کی اچھی بھلی جڑی ہوئی ہڈی توڑ ڈالی تھی۔

میں نے کہا۔ ”پہلوان! زیادہ ہلاؤ جلاؤ نہ...... بس تھوڑا سا گرم تیل لگا کر اور روئی رکھ کر پٹی باندھ دو۔ میرا خیال ہے کہ ایک دو دن میں آرام ملے گا تو خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔“

”خود بخود کچھ ناہیں ہووت ہے بھیا۔ ایسا کبھی ہوا ہے کہ ہنگ لگے نہ پھٹکری اور نو من تیل بھی ہو جائے۔ تھوڑا بہت ہلا جلا کر پٹھوں کو ان کی تھاں (جگہ) پر بٹھانا تو ہووے گا۔“ پہلوان نے اصرار کیا۔

اس نے تھوڑی بہت کاریگری دکھائی۔ بہر حال میں نے زیادہ نہیں چلنے دی۔ میری پٹی کرتے ہوئے پہلوان کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اس کپکپاہٹ کی وجہ ایک طرح کی مرعوبیت تھی۔ پہلوان نے بھی دوسرے لوگوں کی طرح مجھے سجاول سے لڑتے ہوئے دیکھا تھا اور یہ کوئی معمولی لڑائی نہیں تھی۔ یہاں موجود بدترین مخالف بھی یہ لڑائی دیکھ کر مجھ سے مرعوب ہوئے تھے۔

میں فیض محمد اور اس کے ساتھیوں کے ہمراہ اپنے کمرے میں واپس پہنچ گیا۔ راستے میں، میں نے باقر بگھیاڑ کو دیکھا۔ وہ حسبِ معمول جین جیکٹ پہنے ہوئے تھا۔ جیکٹ کے بٹن چاندی کے تھے اور ڈوبتے سورج کی کرنوں میں دمک رہے تھے۔ اس نے کانوں میں ٹونٹیاں ٹھونس رکھی تھیں۔ شاید موبائل فون پر میوزک سن رہا تھا۔ اس نے بھی مجھے بڑی توجہ اور دلچسپی سے دیکھا۔ مجھے اس کی صورت دیکھ کر کبھی بھی خوشی نہیں ہوئی تھی۔ مجھے فوراً مؤذن عبدالرحیم یاد آ جاتا تھا جسے صرف اس وجہ سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا کہ اس کی وضع قطع اور ڈیل ڈول باقرے سے ملتے تھے۔

باقرے کو میں نے کچھ روز پہلے چاروں شانے چت کر دیا تھا۔ میری اس کامیابی نے مجھے یہاں کے لوگوں میں ایک خاص اہمیت دلا دی تھی۔ آج اس اہمیت میں گوناگوں اضافہ ہو گیا تھا۔ بے شک لوگوں نے یہی جانا تھا کہ میں ان کے سردار سے ہار گیا ہوں، لیکن جو زبردست فائٹ انہوں نے دیکھی تھی وہ ان کے دل و دماغ پر یقیناً نقش ہو گئی تھی۔ میں جب تک اپنے کمرے میں پہنچ نہیں گیا، باقرا اپنی جگہ پر کھڑا مجھے دیکھتا رہا۔ جسم ٹھنڈا ہونے کے بعد کئی چوٹیں تکلیف دینے لگیں۔ ان میں زیادہ اہم چوٹ کندھے ہی کی تھی۔ یہاں نیل پڑ گیا تھا اور سوجن بڑھتی جا رہی تھی۔ شیشے کی کرچیوں سے جو کٹ وغیرہ آئے تھے ان کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔

کھانے کے بعد میں دیر تک جاگتا رہا اور سوچتا رہا۔ میری اور سجاول کی لڑائی ایک طرح سے برابری پر ختم ہوئی تھی لیکن میں نے ہار مان لی تھی۔ ایک طرح سے میں نے اس کو اپنی حیثیت بھی بتا دی تھی اور اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بھی بڑھا دیا تھا۔ اب گیند سجاول کے کورٹ میں تھی کہ وہ کیا رویہ اختیار کرتا ہے۔

پھر میرا دھیان تاجور کی طرف چلا گیا۔ پچھلے تقریباً 72 گھنٹے سے میں اس سے مل نہیں سکا تھا۔ میں جانتا تھا، وہ بے حد پریشان ہوگی۔ ایک ایک پل گن گن کر گزار رہی ہوگی مگر سردار سجاول نے میرے اور اس کے ملنے پر پابندی لگا دی تھی۔ آخری مرتبہ جب میں نیچے تہ خانے میں گیا تھا تو بمشکل مجھے چند منٹ ملاقات کی اجازت ملی تھی اور اس دوران میں اختری سے میری منہ ماری بھی ہوگئی تھی۔

میری وجہ سے تاجور شدید مشکلات کا شکار تھی، اس کے حوالے سے میرے ذہن پر ہر وقت ایک بوجھ سا تھا۔ حالات ایسے ہو گئے تھے کہ اس پھول صفت لڑکی کو میرے ساتھ کانٹوں پر گھسٹنا پڑ رہا تھا۔ دروازے پر ہونے والی زوردار دستک نے مجھے میرے خیالوں سے چونکایا۔ ''کون؟'' میں نے پوچھا۔

''دروازہ کھولو۔'' باہر سے باقر کی آواز آئی۔

میں نے دروازہ کھولا۔ باقر نے مجھے بتایا کہ چھوٹے سردار نے مجھے فوراً طلب کیا ہے۔

میری دھڑکن تیز ہوگئی۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس کا رویہ کیا ہوگا۔ میں باقر کے ساتھ سردار سجاول کے کمرے تک پہنچا۔ احاطے میں اب بھی چند ٹولیاں اپنے سردار کی فتح کی خوشی منانے میں مصروف تھیں۔ دوالاؤ دہک رہے تھے اور موج میلہ ہو رہا تھا۔ باقر وہیں رک گیا۔ میں سردار کے کمرے میں داخل ہوا اس کی ایک آنکھ بری طرح سوجی ہوئی تھی اور ابرو پر بینڈ تیج دکھائی دے رہی تھی۔ باقی چوٹیں اس کے لباس میں چھپ گئی تھیں۔ سردار کبھی کبھار ہی شراب پیتا تھا اور وہ بھی ناپ تول کر۔ لیکن اس وقت وہ براہِ راست بوتل سے پی رہا تھا اور ایک خالی بوتل فرش پر لڑھکی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں دہک رہی تھیں۔

وہ مجھے دیکھ کر پھنکارا۔ ''کیا سمجھتا ہے تُو اپنے آپ کو۔ کیا سمجھتا ہے؟''

''میں نے کیا کیا ہے؟'' میں نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

اس نے مجھے گالی دی۔ ''تُو مجھے نیچا دکھانا چاہتا ہے۔ احسان چڑھانا چاہتا ہے مجھ پر۔ سجاول نے کبھی تجھ جیسے کسی کمینے کا احسان نہیں لیا۔ میں تیری ٹانگیں چیر دوں گا۔ سب کے سامنے تیری ٹانگیں چیر دوں گا۔'' اس کے منہ سے الفاظ کے بجائے جیسے شعلے نکل رہے تھے۔

لگتا تھا کہ وہ ابھی تک اسی خاص کیفیت میں ہے جو کسی قدیم رسم کی ادائیگی کے بعد سے اس پر طاری ہوتی تھی اور جو آج سہ پہر ہونے والی لڑائی میں بھی اس پر طاری رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ''سردار! اب غصہ کس بات کا ہے۔ میں نے سب کے سامنے اپنی ہار مان لی ہے۔''

''کیوں مانی ہے تُو نے ہار؟'' اس نے گرج کر میری بات کاٹی۔ ''یہ لڑائی ابھی آگے چلنی تھی......اگر......میں تیری پنڈلی نہیں توڑ سکتا تھا تو......تُو بھی میرے گھٹنے کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ہم دونوں کو اپنا اپنا داؤ چھوڑنا تھا۔ ہاں یہ لڑائی ابھی آگے چلنی تھی......اور میں اسے چلاؤں گا۔ ابھی اسے چلاؤں گا۔'' اس نے میرا گلا دبوچ لیا اور کمرے کی پتھریلی دیوار سے دے مارا۔

اس کی جنونی کیفیت پھر پوری طرح عود کر آئی۔ وہ دہاڑا۔ ''تجھے میری جان لینی ہوگی یا اپنی جان دینی ہوگی۔''

''تو لے لو جان۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔

اس نے میری ناف میں گھٹنے کی ایک طوفانی ضرب لگائی۔ میں رکوع کے بل جھک گیا۔ اس نے وحشت کے عالم میں اپنا نائن ایم ایم پستول نکال کر میری گردن میں گھسیڑ دیا۔ یہ بڑے نازک لمحے تھے۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا لیکن میرے اندر کی توانائی نے مجھے لڑکھڑانے نہیں دیا۔ میں یک ٹک اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ اس نے انگلی لبلبی پر رکھ لی۔ ٹریگر پر دباؤ بڑھا دیا۔ وہ قیامت کا لمحہ تھا لیکن گزر گیا۔ اس نے میرے سر کے بال مٹھی میں جکڑے اور میرے سر کو بے پناہ طاقت سے کھینچتا ہوا زمین کی طرف لے گیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ میرا چہرہ کمرے کے ناہموار پتھریلے فرش سے رگڑ کر لہولہان کر دینا چاہتا ہے۔ اسے جیسے خود بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ میرے ساتھ کیا کرے۔

میرا چہرہ فرش سے لگانے کے بعد اس نے میری پسلیوں میں ایک ٹھوکر لگائی۔ میں پھر دیوار سے ٹکرایا۔ ایک لالٹین چکنا چُور ہو گئی۔ فرش پر بچھے ہوئے ایک نمدے نے آگ پکڑ لی۔

وہ دہاڑا۔ ''دفع ہو جا یہاں سے۔ چلا جا......نہیں تو مارا جائے گا۔'' اس کی آواز میں واقعی کسی خونی جانور کا سا آہنگ تھا۔

میں نے پاؤں سے مسل کر نمدے کی آگ کو بڑھنے سے روکا اور پھر دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ جب میں باہر نکلا تو کمرے کے اندر سے کڑاکے کی زوردار آواز آئی۔ (جیسا کہ

بعد میں پتا چلا سجاول نے سخت طیش کے عالم میں اپنا مہلک گھونسا رسید کر کے شیشم کی مضبوط میز کے پرخچے اڑا دیئے تھے)

باہر باقر بالکل الرٹ کھڑا تھا۔ پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔ شاید میں مزید چند سیکنڈ تک باہر نہ آتا تو وہ صورتِ حال جاننے کے لیے دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیتا۔

O......❖......O

یہ تیسرے دن کی بات ہے۔ میرا کندھا پہلے سے بہتر تھا۔ جسم پر آنے والے چھوٹے بڑے کٹ بھی مندمل ہونا شروع ہو گئے تھے۔ بہرحال تاجور سے میری ملاقات ابھی تک نہیں ہو پائی تھی۔

ماؤ اور اس کی آفتِ جاں پوتی، لڑائی کے اگلے روز ہی واپس آ گئی تھیں۔ پالکی سے اترتے ہوئے کہیں ماؤ کے پاؤں میں موچ آئی تھی اور وہ زیادہ وقت بستر پر گزار رہی تھی۔ میری اطلاع کے مطابق ماؤ اور مانی کو یہاں ہونے والی خون ریز لڑائی کا کچھ علم نہیں تھا۔ سردار سجاول نے ہیڈ نوکرانی ماکھی کو سختی سے پابند کر دیا تھا کہ نوکرانیوں میں سے کوئی ماؤ اور مانی کے سامنے اس سلسلے میں اپنی زبان نہیں کھولے گی۔ مقابلے کے وقت جاناں کے علاوہ ناچنے گانے والی تین چار عورتیں بھی اس ڈیرے پر موجود تھیں۔ مقابلے سے پہلے انہیں یہاں کے ایک تہ خانے میں پہنچا دیا گیا تھا اور وہ صورتِ حال سے بے خبر رہی تھیں۔

شام کے وقت مجھے ایک بار پھر سردار سجاول کی طرف سے بلاوا آ گیا۔ میں سردار کے کمرے میں پہنچا۔ اسے دیکھتے ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ اس خاص کیفیت سے نکل چکا ہے جس میں اس نے مجھ سے مقابلہ کیا تھا اور بعد میں کمرے میں بلا کر مجھ سے مارا ماری و بدکلامی کی تھی۔ آج وہ بالکل خاموش اور سنجیدہ نظر آتا تھا۔ اس نے مجھے چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ خود ہمیشہ کی طرح وہ رنگین پایوں والی جہازی سائز کی کرسی پر براجمان تھا۔ اس کے سامنے تپائی پر اس کا قیمتی سیل فون اور سگریٹ کیس رکھا تھا۔ ایک اور سیل فون بھی پڑا تھا۔ میں نے ایسا سیل فون باقر کے ہاتھ میں دیکھا تھا۔ سجاول کے ماتھے پر بائیں طرف وہ بینڈ ایج ابھی تک موجود تھی جس نے اس کی ابرو کے زخم کو ڈھانپا ہوا تھا۔

سجاول نے آج مقابلے والا موضوع بالکل نہیں چھیڑا۔ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں نے تم سے کئی بار ایک سوال پوچھا ہے اور تم نے اس کا جواب نہیں دیا۔''

''کون سا سوال؟''

''یہی کہ تم کون ہو؟''

''میں قریباً سب کچھ تو بتا چکا ہوں۔''

''سب کچھ نہیں۔ بہت تھوڑا سا۔'' اس نے کہا اور چند لمحے توقف کے بعد بولا۔ ''پرسوں باقر اکوٹلی گیا تھا۔ وہاں کے ایک نیٹ کیفے سے وہ کچھ لے کر آیا ہے۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

سجاول نے باقر والا سیل فون اٹھایا اور ایک تصویر میرے سامنے کر دی۔ میں بھونچکا رہ گیا۔ یہ تصویر کوپن ہیگن یا لندن کے کسی رِنگ میں اتاری گئی تھی۔ یہ میری تصویر تھی۔ لمبے بال، داڑھی اور گھنی مونچھیں، میں کسی مقابلے سے پہلے غالباً خود کو وارم اَپ کر رہا تھا۔ درجنوں کیمرے میری طرف اٹھے ہوئے تھے۔

سجاول نے گمبھیر آواز میں کہا۔ ''باقر کو شک ہے کہ یہ کوئی اور نہیں، تم ہو۔''

میں اتنی دیر میں خود کو سنبھال چکا تھا۔ میں نے تصویر پر نظریں جمائے جمائے کہا۔ ''شکلوں سے شکلیں مل جایا کرتی ہیں۔ لیکن یہاں تو شکل بھی زیادہ نہیں مل رہی۔ پتا نہیں تم ایسی بات کیوں کہہ رہے ہو؟''

سجاول نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں۔ اسی لہجے میں بولا۔ ''باقر کا خیال ہے کہ تم یورپ کے ملکوں میں کسی بڑے دبنگ نام سے پہچانے جاتے ہو...... اور لڑائی کے بڑے بڑے مقابلے کر چکے ہو۔ تمہارے مقابلوں کی فلمیں ٹی وی اور نیٹ وغیرہ پر چلتی ہیں۔ ایک دنیا تم کو جانتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اگر سچ مچ ایسا ہوتا تو میں خود کو بڑا خوش قسمت تصور کرتا۔''

وہ زہر خند انداز میں بولا۔ ''لیکن سب کچھ تو ''خوش قسمتی'' والا نہیں ہے نا۔ کہتے ہیں کچھ خون شون بھی کیے ہیں تم نے۔ کچھ بڑی پکی دشمنیاں ہیں تمہاری۔ ہوسکتا ہے وہ ''باہر کی پولیس'' بھی ڈھونڈ رہی ہو تمہیں...... کیا کہتے ہیں اس کو انٹرپول۔''

''پتا نہیں سجاول! تم کیا کہتے جا رہے ہو۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں ڈنمارک میں مارشل آرٹ سیکھتا رہا ہوں اور چھوٹے موٹے مقابلے بھی کرتا رہا ہوں، لیکن جو کچھ تم کہہ رہے ہو، اسے غلط فہمی ہی کہا جا سکتا ہے۔''

وہ گہری سانس بھر کر بولا۔ ''چھوٹے موٹے مقابلے کرنے والا بندہ...... میرے ساتھ اس طرح نہیں لڑ سکتا تھا جس طرح تم تین دن پہلے میرے ساتھ لڑے ہو۔ باقی رہی غلط فہمی والی بات تو اس کا پتا بھی دو چار دن میں چل جائے گا۔'' وہ موبائل والی تصویر بڑے دھیان سے دیکھتے ہوئے بولا۔

میرے دماغ میں آندھی سی چل رہی تھی۔ وہی کچھ ہو رہا تھا جس کے اندیشے تھے۔ میرا ماضی کھلنا شروع ہو گیا تھا۔ باقر کی شکل میری نگاہوں میں گھومی اور جھلاہٹ کی لہر سی سینے میں اٹھی۔ اب میری سمجھ میں یہ بات آ رہی تھی کہ وہ مقابلے کے بعد سے مجھے کڑی نظروں سے کیوں گھور رہا تھا۔ یقیناً اس نے کسی ٹی وی چینل پر مجھے MMA کی فائٹ لڑتے ہوئے دیکھا تھا، اور ممکن تھا کہ کئی بار دیکھا ہو۔ اس کی سوچوں کا رخ اسے دھیرے دھیرے ایک نتیجے تک لے گیا تھا۔

اسی دوران میں ہلکی سی دستک کے بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور غیر متوقع طور پر کھانے کی خوشبو کمرے میں داخل ہوئی۔ یہ کھانے کا وقت ہی تھا۔ بھرے بھرے جسم والی دو جوان ملازمائیں دو تھالوں میں کھانا لیے ہوئے اندر داخل ہوئیں۔ دیسی گھی کا مرغ قورمہ۔ تلی ہوئی مچھلی اور پلاؤ وغیرہ کھانے میں شامل تھے۔

ایک ملازمہ نے الماری میں سے امپورٹڈ وہسکی کی بوتل نکالی اور گلاسوں سمیت میز پر سجا دی۔ یہ سب کچھ اس غیر معمولی تبدیلی کا اشارہ دے رہا تھا جو سجاول کے رویے میں آئی تھی۔ نہ ہار کر بھی میں نے جو ہار مانی تھی، اس کے مثبت آثار نمودار ہو گئے تھے۔

سجاول کے اشارے پر ایک ملازمہ نے بڑے ادب سے جھک کر گلاسوں میں وہسکی انڈیلی۔ سجاول نے جام اٹھایا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ CHEER کرنا چاہتا ہے۔ اب میری بھی مجبوری تھی کہ میں جام اٹھاؤں۔ ہم نے گلاس ٹکرائے اور کھانے سے پہلے چند گھونٹ لیے۔

کھانا مکمل خاموشی سے کھایا گیا۔ حالانکہ سجاول نے ملازماؤں کو باہر بھیج دیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اب سجاول مقابلے والا موضوع چھیڑنا ہی نہیں چاہتا۔ یہ بھی ایک مثبت اشارہ تھا۔ کھانے کے بعد پھر جام بھرے گئے۔ ماحول بتدریج دوستانہ ہوتا جا رہا تھا...... مجھے اندیشہ تھا کہ شاید اب وہ پھر میرے ماضی کو کریدنا شروع کر دے گا مگر یہ اندیشہ بھی درست ثابت نہیں ہوا۔ اس نے موبائل فون میں موجود تصویر والا معاملہ وہیں کا وہیں رہنے دیا۔

سگریٹ کا ایک لمبا کش لے کر وہ اچانک بولا۔ ''عالمگیر کا منشی محمد افضل یہاں پہنچ چکا ہے۔ تمہارا کہنا بالکل ٹھیک تھا۔ وہ الٹی لکھائی والا خط اسی کا لکھا ہوا ہے، لیکن ہے بڑا ڈھیٹ بندہ۔ کافی مار کھا چکا ہے پھر بھی بہت سی باتیں گول کر رہا ہے۔''

میرے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ میرا یہ اندازہ درست ثابت ہوا تھا کہ عالمگیر کا کوئی خاص بندہ بہت جلد اغوا ہو کر یہاں پہنچنے والا ہے۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا بتاتا ہے وہ؟''

''اس نے مانا ہے کہ اس سے یہ خط عالمگیر نے لکھوایا تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ اس طرح کے تین چار خط وقتاً فوقتاً کسی ماسٹر ریاض نام کے بندے کو لکھوا چکا ہے۔ یہ ماسٹر ریاض سیالکوٹ کے ہی کسی گاؤں میں رہتا ہے، لیکن کہاں رہتا ہے اس کا منشی کچھ نہیں بتا رہا۔ وہ کہتا ہے کہ عالمگیر اس سے خط لکھواتا ضرور تھا مگر اس کو ڈاک میں خود ڈالتا تھا۔ ایڈریس بھی خود ہی لکھتا ہوگا۔''

''لڑکیوں کے چکر کے بارے میں منشی کیا کہہ رہا ہے؟''

''کہا ہے نا کہ گول مول باتیں کر رہا ہے۔ کہتا ہے کہ جس طرح مولوی فدا کی لڑکی زینب کو کھانے میں نشہ ملا کر دیا جاتا رہا ہے، اسی طرح ایک دو اور لڑکیوں کو بھی دیا جا رہا ہے اور وہ لڑکیاں ماسٹر ریاض کے پنڈ کی ہیں۔''

''نشے کے بارے میں کیا بتاتا ہے وہ؟''

''بس یہ کہ یہ نشہ سانپ کے زہر سے تیار ہوتا ہے اور اسے پیر سانتا کا بیٹا پیر ولایت تیار کرتا ہے۔ ماسٹر ریاض کو بھی یہ نشہ پیر ولایت اور عالمگیر نے ہی سپلائی کیا ہوا ہے۔ منشی کا کہنا ہے کہ جو مرد عورت اس نشے کو دیر تک استعمال کرتا رہتا ہے اس کے اندر ایک خاص طرح کی طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔''

''طاقت؟''

''ہاں، اس کو کوئی بھی زہریلا کیڑا مکوڑا بلکہ سانپ بھی کاٹ لے تو اس کو کچھ فرق نہیں پڑتا بلکہ اسے کوئی زہر بھی دے دیا جائے تو اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔'' سجاول نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''مطلب یہ ہوا کہ ان لڑکیوں کو کسی بھی طرح کے زہر کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کیا جا رہا ہے؟'' میں نے خیال ظاہر کیا۔

''ہاں، ابھی تو یہی لگ رہا ہے۔ منشی سے پوچھ گچھ جاری ہے۔ سخت ہڈی کا ہے، لیکن کب تک منہ نہ کھولے گا۔ میں نے اسے فخرو کے حوالے کیا ہوا ہے۔ ایک دو دن تک سب کچھ بک دے گا۔''

میں نے کہا۔ ''خط میں کسی لورو نامی جگہ کا ذکر ہے اور کسی بڑے صاحب کی بات ہے۔ اس کے بارے میں منشی کیا کہتا ہے؟''

''لورو والے معاملے میں منشی نے کافی مار کھائی ہے مگر کچھ بتا نہیں سکا۔''

''تم نے اپنے طور پر بھی پتا کرنے کی کوشش کی؟''

سجاول نے ٹھٹک کر میری طرف دیکھا پھر بولا۔ ''ہاں آس پاس کے علاقے میں میرے بندوں نے کوشش کی ہے۔ ابھی تک اس نام کا کوئی پنڈ یا بستی سامنے نہیں آئی۔''

اندازہ ہو رہا تھا کہ سجاول اس سلسلے میں کافی سرگرم ہے۔ یقیناً اس کے اندر کا لالچ اسے اکسا رہا تھا کہ وہ کھوج لگائے اور آگے بڑھے۔ جہاں ایک لڑکی کے لیے کروڑ سوا کروڑ کی بات ہو رہی تھی تو وہ کوئی معمولی چکر تو نہیں ہو سکتا تھا۔

میں نے کہا۔ ''اگر تم مناسب سمجھو تو مجھے بھی منشی سے بات کرنے کا موقع دو۔''

''ہاں کیوں نہیں، تم بھی کر لینا۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ پہلے ذرا اس کی آکڑ شاکڑ ختم ہو جائے۔ ابھی تھوڑی دیر میں اس کی چھترول ہونی ہے۔ اس سے کافی افاقہ ہوگا اسے۔''

اچانک سجاول کے سیل فون پر کال آئی۔ اس نے کال ریسیو کی اور کھڑکی کی طرف جا کر بات کرنے لگا۔ دوسری طرف سے بولنے والے کی مدھم آواز میرے کانوں تک بھی پہنچ رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں مجھے شک ہوا کہ دوسری طرف اختری بات کر رہی ہے۔

ایک منٹ بعد ہی میرا یہ قیافہ درست ثابت ہو گیا۔ بات ختم کرنے کے بعد سجاول نے فون اپنے سامنے لوہے کی تپائی پر رکھا اور ذرا ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''اختری کی کال تھی تہ خانے سے۔''

''کیا کہتی ہے؟'' میں نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

''تمہاری اس منہ بولی بیوی نے بہت تنگ کیا ہوا ہے۔ رو رو کر برا حال کر رہی ہے۔ چلو جا کر پہلے اس سے مل لو۔ سمجھاؤ اسے کہ سکون سے رہے۔ اگر ہمیں بے سکون کرے گی تو خود بھی تنگ ہوگی۔''

یہ تو مجھے منہ مانگی مراد مل گئی تھی۔ میں سجاول سے اس بارے میں بات کرنے ہی والا تھا۔ میں نے اسی وقت سجاول سے اجازت لی اور اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف روانہ ہو گیا۔ ابھی رات کے دس بجنے میں ایک گھنٹا باقی تھا چونکہ سجاول نے خود اجازت دے دی تھی اس لیے میں تہ خانے میں اتر سکتا تھا۔ کمرے میں جا کر میں نے اپنا حلیہ درست کیا۔ لباس بدلا، گردن کے قریب شیشے کے ٹکڑوں سے آنے والے دو کٹ موجود تھے۔ انہیں چھپانے کے لیے مفلر کا استعمال کیا۔ کندھے کی پٹی اتار دی تاکہ جیکٹ کے نیچے سے ابھار محسوس نہ ہو۔ جب میں تیز قدموں سے سیڑھیوں کی طرف جا رہا تھا اچانک ٹھٹک گیا۔ میں نے ڈرنک کیا ہوا تھا۔ یقیناً میرے منہ سے ابھی تک وہسکی کی بو آ رہی تھی لیکن کیا کیا جاتا۔ صورتِ حال ایسی تھی کہ مجھے فوراً تاجور کے پاس بھی پہنچنا تھا۔

میں کمرے میں واپس پہنچا۔ اچھی طرح کلیاں کیں۔ ایک الائچی منہ میں رکھی اور پھر تہ خانے کی طرف چل پڑا۔ سرد رات اپنے پر پھیلا چکی تھی۔ چارسُو سناٹا تھا۔ احاطے کی طرف سے مجھے چلاّنے اور گڑگڑانے کی مدھم آوازیں آئیں۔ یقیناً یہ عالمگیر کا منشی ہی تھا، جسے کسی کوٹھری میں تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ میں سیڑھیوں سے اتر کر پہلے دروازے تک پہنچا۔ حسب توقع پہلے دروازے کے سامنے واسکٹ والا پٹھان چوکیدار چوکس کھڑا تھا۔ مجھے رائفل اس کے ہاتھ میں نظر آئی۔ مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹکا ضرور مگر پچھلی بار کی طرح اس نے سخت رویہ نہیں دکھایا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے چابی نکالی اور دروازے کا تالا کھولنے میں مصروف ہو گیا۔

میری رگوں میں خون جمنے لگا تھا۔ دروازے کی دوسری جانب سے تاجور کے مسلسل رونے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ بڑے صبر والی تھی مگر اب شاید اس کا صبر جواب دے گیا تھا۔ پچھلی بار اس نے جو فقرہ کہا تھا وہ آج بھی تیر کی طرح میرے دل میں پیوست تھا۔ اس نے کہا تھا......شاہ زیب! اس سے تو بہتر ہے کہ آپ مجھے اپنے ہاتھوں سے مار دیں......

اَن گنت طوفان اور صدمے، بے جگری سے سینے پر سہہ جانے والے شاہ زیب کو اس ایک فقرے نے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ دروازہ کھلا تو میں اسے دھکیلتا ہوا اندر داخل ہوا۔ منظر چونکا دینے والا تھا۔ تنومند اختری، تاجور کے ساتھ کمرے میں موجود نہیں تھی بلکہ باہر کھڑی تھی۔ اس نے کمرے کو باہر سے کنڈی چڑھا رکھی تھی۔ اندر تاجور سنگلاخ دیوار سے ٹیک لگائے اس طرح بیٹھی تھی کہ اس کا سر اس کے اوپر اٹھے ہوئے گھٹنوں پر تھا اور چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا......اس کی قمیص کندھے پر سے پھٹی ہوئی تھی۔ ایک کلائی پر بھی گہری خراشیں دور ہی سے دکھائی دے رہی تھیں۔

تب میں نے اختری کی طرف دیکھا۔ اس کا گریبان بھی پھٹا ہوا تھا۔ چہرے کی ایک جانب سرخ ہو رہی تھی اور نچلے ہونٹ سے خون رِس رہا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ تھوڑی دیر پہلے تاجور اور اختری میں باقاعدہ ہاتھا پائی ہوئی ہے۔ اختری نے مجھے دیکھ کر جیسے سکھ کا سانس لیا تھا۔ وہ تاجور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''سنبھالو اپنی زنانی کو۔ میری جان کو آئی ہوئی ہے۔'' اس نے کمرے کی چابی میری طرف بڑھا دی۔

تالا نہیں لگا تھا۔ صرف کنڈی بند تھی۔ میں کنڈی کھول کر اندر داخل ہوا۔ تاجور جان گئی تھی کہ میں آ گیا ہوں۔ لیکن وہ اسی طرح سکڑی سمٹی بیٹھی رہی اور روتی رہی۔ اس کے رونے کی آواز میرا سینہ چھلنی کر رہی تھی۔

میں نے اختری کو اشارہ کیا کہ وہ باہر جائے۔

غیر متوقع طور پر اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور خاموشی سے باہر چلی گئی۔ جاتے جاتے وہ راہداری والا دروازہ بھی بھیڑ گئی۔ اب کمرے میں تاجور اور میں تنہا تھے۔ میں اس کے قریب دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اپنا ہاتھ نرمی سے اس کے ہاتھ پر رکھا۔ ''تاجور! چپ ہو جاؤ۔ میں آ گیا ہوں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

اس نے اشکوں سے بھیگا ہوا چہرہ اٹھایا۔ جیسے سفید گلاب پر شبنم کے قطرے لرز رہے ہوں۔

وہ کراہ کر بولی۔ ''شاہ زیب! میرا دم گھٹ جائے گا۔ میں اس جگہ مر جاؤں گی۔ میں آپ سے کچھ اور نہیں مانگتی۔ خدا کے لیے مجھے میرے گھر پہنچا دیں۔ یہ لوگ جتنا روپیہ بھی کہیں گے میرے ابا جی دے دیں گے۔ بس مجھے یہاں سے نکال دیں۔''

''یہ کیسی باتیں کرتی ہو تاجور۔ روپے کی بات نہیں ہے یہاں ...... بس ایک اچھے موقع کی تلاش ہے مجھے۔''

اچانک وہ ٹھٹک سی گئی۔ میں سٹپٹا گیا۔ وہی ہوا تھا جس کا ڈر تھا۔ اسے میرے منہ سے بو آ گئی تھی۔ یکا یک وہ کچھ اور سمٹ گئی۔ مجھے صاف محسوس ہوا کہ چند سیکنڈ کے اندر وہ جسمانی اور ذہنی طور پر مجھ سے کچھ اور دور چلی گئی ہے۔

اس نے چہرہ پھر گھٹنوں میں چھپا لیا اور سسکنے لگی۔ ''یا اللہ! میری مدد کر...... میری غلطیاں معاف کر میرے مالک۔ مجھے رہائی دے دے یا پھر موت دے دے۔'' وہ دعائیہ انداز میں بڑبڑا رہی تھی۔

اس کی کلائی کے علاوہ اس کی گردن اور کندھے پر بھی بالکل تازہ خراشیں تھیں۔ یقیناً یہ اسی زور آزمائی کی نشانیاں تھیں جو میرے آنے سے تھوڑی دیر پہلے یہاں تاجور اور اختری میں ہوئی تھی۔ (اختری کے تاثرات سے اندازہ ہوا تھا کہ اسے تاجور کی طرف سے قرار واقعی جواب ملا ہے۔ اگر اس نے تاجور کو دو تھپڑ مارے ہوں گے تو ایک دو اسے سہنے بھی پڑے ہوں گے)

میں کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے کیا کہوں۔ آخر میں نے خیالات جمع کرتے ہوئے کہا۔ ''تاجور! باہر حالات میں کچھ تبدیلی ہوئی ہے۔ چھوٹا سردار سجاول کچھ بدلا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ عالمگیر وغیرہ سے اس کی ناچاقی ہو گئی ہے۔ میرا دل کہہ رہا ہے کہ وہ اب ہمیں زیادہ دن یہاں نہیں رکھے گا۔ میں کل اس سے بات کروں گا۔ ہو سکتا ہے کہ اب وہ ہمیں اوپر پہلے والے کمرے میں رہنے کی اجازت دے دے...... تم ...... میری

بات سن رہی ہو نا؟''

تاجور اسی طرح چہرہ چھپائے بیٹھی رہی۔ اس کے کندھے سسکیوں کی وجہ سے لرزتے محسوس ہوتے تھے۔

میں نے نرمی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اس نے ایک دم میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ اپنے آپ میں بالکل سمٹ گئی۔ ''خدا کے لیے...... مجھ پر رحم کریں...... مم...... مجھے یہاں سے نکال دیں۔ میں زندگی بھر آپ کی احسان مند رہوں گی۔'' اس کے لہجے میں حد درجے کی بیگانگی تھی۔ میں جیسے کٹ کر رہ گیا۔

پھر ایک دم اسے نہ جانے کیا ہوا۔ اس نے اپنا بھیگا ہوا چہرہ اپنے گھٹنوں سے اٹھایا اور میری طرف دیکھ کر اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ ''میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ میرے حال پر رحم کریں۔ جس طرح بھی ہے مجھے میرے گھر والوں تک پہنچا دیں، میں آپ سے اور کچھ نہیں مانگتی...... کچھ نہیں چاہتی۔''

اس کے لہجے کی اجنبیت اور تلخی نے مجھے لرزایا۔ مجھے لگا جیسے اس کے لب و لہجے نے مجھے یکا یک عرش سے فرش پر لا پھینکا ہے...... بلکہ شاید فرش سے بھی نیچے...... کسی اندھے گڑھے میں۔

ہاں جو میری جان تھی، میری زندگی کی شاید پہلی اور آخری محبت تھی جس کا عشق میری زندگی کا حاصل تھا...... وہ مجھ سے ڈر رہی تھی۔ میری قربت اس کو خوف زدہ کر رہی تھی۔ ایک دم سے میرے اندر جیسے کچھ بجھ گیا۔ ایک بے پناہ روشنی تھی جو زور سے پھڑ پھڑائی اور تاریک ہوگئی۔ میرے لیے تاجور کی طرف دیکھنا بھی دوبھر ہوگیا۔ میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ تاجور کا شانہ عریاں ہو رہا تھا۔ میں نے ایک گرم چادر اس کے شانوں پر ڈالی۔

''ٹھیک ہے تاجور! ایک یا دو راتیں جیسے تیسے کاٹ لو۔ میں تمہیں اب یہاں نہیں رہنے دوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔''

میں اپنا بچھونا بالکل ایک کونے میں لے گیا اور کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔ وہ اسی طرح گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی رہی۔ اضطراب کے عالم میں وہ آہستہ آہستہ آگے پیچھے ہل رہی تھی۔ اختری اندر آئی۔ اس نے کمرے کی صورتِ حال کا جائزہ لیا۔

''شاہ زیب! کوئی چیز تو نہیں چاہیے؟'' اس نے بلند آواز میں پوچھا۔

میں نے نفی میں جواب دیا۔

وہ دروازے کو باہر سے کنڈی چڑھا کر واپس چلی گئی۔ پانچ دس منٹ بعد میں نے کمبل میں سے سر نکال کر دیکھا۔ تاجور اپنی جگہ موجود نہیں تھی۔ وہ کمرے کے دوسرے گوشے میں فرش پر ایک چادر بچھائے نماز پڑھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ دوپٹے کے ہالے میں تھا۔ آنسوؤں سے دھلا دھلایا چہرہ ایک غم آمیز پاکیزگی کی تصویر تھا۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں وہ کسی مقدس مومی مجسمے کی طرح تھی۔ ہاتھ سینے پر باندھ رکھے تھے۔ خوب صورت دودھیا پاؤں آپس میں جڑے ہوئے تھے، آنکھیں بند، لب بے ساختہ حرکت کرتے ہوئے۔ اس کے اردگرد جیسے نور کا ایک ہالہ سا تھا۔ وہ اس ہالے کے اندر تھی، میں اس ہالے کے باہر تھا۔ ان در و دیوار سے باہر۔ یخ بستہ رات کا کہرا آہستہ آہستہ ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ میں نے کروٹ بدل کر کمبل سر پر تان لیا۔

○......❖......○

دل و دماغ میں ایک ہلچل سی تھی۔ وہ سوچیں جو پچھلے کئی روز سے مجھے کچوکے لگا رہی تھیں، آج کچھ زیادہ اذیت ناک ہو گئی تھیں۔ پتا نہیں کیوں آج مجھے تاجور پر بے تحاشا ترس آ رہا تھا وہ مجھے لاہور سے اپنے ساتھ چاند گڑھی کیوں لے کر آئی تھی؟ وہ اس لیے لے کر آئی تھی کہ اسے چاند گڑھی میں کچھ مشکل حالات کا سامنا تھا۔ اسحاق اور عالمگیر وغیرہ اس کا رشتہ زبردستی حاصل کرنا چاہ رہے تھے اور پیر ولایت ان کی مدد کر رہا تھا۔ تاجور اس میں اپنی اور اپنے والدین کی توہین محسوس کر رہی تھی۔

میرے آنے سے اسے کیا فائدہ پہنچا تھا؟ صرف یہی کہ وہ فوری طور پر اسحاق کی ڈولی میں بیٹھنے سے بچ گئی تھی۔ اس کے علاوہ اور تو کچھ بھی ٹھیک نہیں ہو سکا تھا۔ وہ اپنے گھر والوں کو جس توہین اور بے عزتی سے بچانا چاہتی تھی وہ کئی گنا بڑھ کر ان کی طرف آئی تھی۔ ایسے چرچے زبان زد عام تھے کہ تاجور نے گھر سے بھاگ کر اپنے باپ کے کامے سے نکاح کر لیا ہے۔ عالمگیر اور اسحاق وغیرہ علیحدہ سے تاجور اور اہلِ خانہ کے دشمن بنے پھرتے تھے۔ بے شک چاند گڑھی میں ایک دوسرا دھڑا بھی موجود تھا جو میری حمایت میں بول رہا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ میری وجہ سے گاؤں کی ایک بیٹی ریشمی صحیح سلامت ملنگوں کے چنگل سے نکل کر واپس آ گئی تھی...... اور پیر ولایت کے باپ کے کرتوت بھی آشکار ہو گئے تھے مگر لگتا یہی تھا کہ آہستہ آہستہ دوسرے دھڑے کا پلڑا بھاری ہو جائے گا اور میری حمایت کرنے والوں کی آواز دب جائے گی۔

پچھلے چند دنوں کے اندر ایک اور سوچ بھی میرے ذہن میں آئی تھی۔ یہ بڑی انوکھی

سوچ تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ کیوں نہ میں تاجور سے واقعی نکاح کرلوں اور اسے ایک بیوی کی حیثیت سے گاؤں والوں کے سامنے لے جا کھڑا کروں۔ مگر یہ سب تو تب ہی ہوسکتا تھا جب تاجور بھی دل و جان سے ایسا چاہتی۔ اس نے شروع میں ہی کہہ دیا تھا کہ وہ اپنے والدین کی مرضی کے بغیر شادی کا سوچ بھی نہیں سکتی اور اب تو یہ بات بھی پرانی ہو چکی تھی۔
میں نے محسوس کیا تھا کہ یہاں اس ڈیرے پر آنے کے بعد وہ بتدریج مجھ سے دور ہوئی ہے۔ اگر کوئی کچا پکا جذبہ اس کے اندر پرورش پا بھی رہا تھا تو حالات نے اسے بھسم کر دیا تھا۔ اس نے ملنگی ڈیرے پر میرا دوسرا روپ بھی دیکھا تھا۔ میری مارا ماری اور خونریزی دیکھی تھی۔ پھر یہاں پر بھی کئی ایسے واقعات پیش آئے تھے جنھوں نے اسے میرے قریب لانے کے بجائے مجھ سے خوف زدہ کیا تھا۔ اسے میرے چہرے کے پیچھے ایک اور چہرہ دکھائی دیتا تھا اور یہ بات اس نے ایک سے زائد مرتبہ مجھ سے کہی تھی۔
اور وہ کچھ ایسا غلط بھی تو نہیں سوچ رہی تھی۔ اس کی چھٹی حس نے اسے جو سگنل دیئے تھے، وہ FAKE نہیں تھے۔ میں جانتا تھا میں کون ہوں اور میرا ماضی مجھ سے زیادہ دور بھی نہیں تھا۔ وہ میرے آس پاس ہی پھنکار رہا تھا۔ لمحہ بہ لمحہ میرے قریب آ رہا تھا۔ ابھی دو گھنٹے پہلے سردار سجاول کے کمرے میں جو باتیں ہوئی تھیں، وہ میرے لیے تہلکہ خیز تھیں۔ ایسٹرن کنگ کے نام کی گونج، ڈکیتوں کے اس ڈیرے تک پہنچ گئی تھی اور وہ کسی بھی وقت تاجور کے کانوں تک اور چاند گڑھی تک بھی پہنچ سکتی تھی۔ تاجور جان سکتی تھی کہ جسے وہ صرف ایک کھلاڑی سمجھتی ہے، وہ موت کا کھلاڑی ہے۔ جرم کی دلدل میں گردن تک دھنسا ہوا ایک ایسا شخص ہے جو کسی بھی وقت دردناک موت کا شکار ہوسکتا ہے۔
میں کیوں ایک مظلوم، معصوم لڑکی کی زندگی تباہ کرنے پر تلا ہوا تھا؟ میرے اندر کی آواز نے پھر پکار کر کہا۔ ''شاہ زیب! تم صحرا کی جلتی ہوئی دھوپ ہو۔ وہ چاند گڑھی کے خوب صورت باغیچے میں کھلا ہوا خوش رنگ پھول ہے۔ تم کیوں اسے جھلسا کر راکھ کر دینا چاہتے ہو؟ وہ تمہارے لیے نہیں ہے، تم اس کے لیے نہیں ہو۔ تم اس سے محبت کرتے ہو لیکن اس کی سزا اسے کیوں دینا چاہتے ہو۔ تم نے اسے پیار کیا...... پھر ساڑھے تین سال تک اسے ڈھونڈا...... اسے پایا...... اسے قریب سے دیکھا۔ اس کے ساتھ کچھ اچھے لمحات گزارے۔ اب...... اب اس کے سر پر بوسہ دو۔ اس کو کسی محفوظ ٹھکانے پر پہنچا کر الوداع کہہ دو۔ اس پر سے اپنی کڑی دھوپ ہٹالو۔ اسے ان پُر بہار صبحوں کے حوالے کر دو جو شبنم کی نمی کے ساتھ ان دیہات کے کھیتوں کھلیانوں پر اترتی ہیں، تاجور اور ریشمی جیسے پھولوں کو زندگی سے معمور کرتی

ہیں۔ اسے ان حسین شاموں کو سونپ دو جو دیہی علاقوں کے کچے پکے گھروندوں کے اندر زندگی کے سادہ اور حسین ترین روپ کو پروان چڑھاتی ہیں۔ تم صرف ایک خطرناک کھیل کے کھلاڑی بھی ہوتے، تب بھی کوئی بات نہیں تھی، تم تو ایک مجرم ہو...... گینگسٹر ہو...... تمہارے حصے کی پُراندیش صبحیں کہیں اور ہیں...... تمہارے مقدر کی خوں رنگ شامیں کہیں اور ہیں۔ کیوں بھول رہے ہو خود کو؟ کیوں فراموش کر رہے ہو اپنے انجام کو؟

میں کونے میں کمبل تانے لیٹا رہا۔ تاجور مجھ سے کافی فاصلے پر لیٹ گئی تھی۔ اس نے کمبل اوڑھ کر کروٹ بدل لی تھی۔ مجھے ملنگی ڈیرے کی وہ پُرخطر لیکن ترنگ آمیز رات یاد آ گئی۔ جب ہم اسی طرح ایک کوٹھری میں لیٹے تھے۔ بہت قریب قریب۔ ایک دوجے کی سانسوں کو محسوس کرتے تھے اور پھر تاریکی میں گونجنے والی لیوپرڈ چیتے کی آواز نے ہمیں ایک دوسرے کے قریب تر کر دیا تھا۔ ہم نے ایک دوسرے کے دل کی دھڑکن سنی تھی، سرگوشیاں کی تھیں مگر وہ سب کچھ اب نہیں تھا۔ اب ایک ہی بند کمرے میں ہونے کے باوجود فاصلہ تھا۔ سنگلاخ فرش کا ایک خالی ٹکڑا جس کی وسعت شاید ہزار ہا کلومیٹر سے زیادہ تھی۔

پتا نہیں کب مجھے اونگھ محسوس ہوئی۔ اسی غنودگی کی حالت میں مجھے لگا کہ میں ایک نکھری نکھری دیہاتی دوپہر میں گلِ عباسی کے پودوں کے پیچھے کھڑا۔ ایک کھیت میں تاجور کو دیکھ رہا ہوں۔ اس کے چہرے پر وہی خوش رنگ چمک ہے جو میں نے پہلے پہل دیکھی تھی۔ اس کے ساتھ ایک تنومند خوبرو نوجوان ہے، اس کے سر پر رنگین پگڑی ہے۔ اس نے تاجور کے کندھوں پر بازو رکھا ہوا ہے اور اسے دور تک لہلہاتی فصل دکھا رہا ہے۔ تاجور کی گود میں ایک ننھا سا گول مٹول بچہ ہے۔ چمکتی آنکھوں والا اتنا پیارا بچہ جسے دیکھ کر بے ساختہ، چومنے کو دل چاہے، اور خدا کی قدرت پر یقین ہونے لگے۔ وہ ہمک رہا ہے اور ماں کا رنگین آنچل کھینچ رہا ہے۔ میں مطمئن نظروں سے ان تینوں کو دیکھ رہا ہوں۔ اچانک مجھے اپنے پیچھے فائر کی آواز سنائی دیتی ہے۔ میں گل عباسی کے پودوں سے نکل کر بھاگتا ہوں۔ کھیتوں میں دوڑتا ہوا ایک نہر کا پل پار کرتا ہوں۔ دوسری طرف جاتا ہوں تو منظر بدل جاتا ہے۔ کھیت کھلیان پیچھے رہ جاتے ہیں۔ یہ کوپن ہیگن کی کسی گلی کا منظر ہے...... بلند عمارتیں، گاڑیوں کا شور، میرے پیچھے جان ڈیرک کے خونخوار کارندے لگے ہیں اور پولیس کاروں کا شور ہے۔ میں اندھا دھند بھاگ رہا ہوں۔ میرے پھیپھڑے جیسے پھٹ رہے ہیں۔ پھر گولیاں چلتی ہیں۔ میں اوندھے منہ تارکول کی سڑک پر گرتا ہوں......

اچانک میں اپنی غنودہ حالت سے باہر نکل آیا۔ میرا دل بڑی شدت سے دھڑک رہا

تھا۔ سانس تیزی سے چل رہی تھی۔ میں بھاری کمبل کے نیچے اسی طرح ساکت پڑا رہا۔ دھیرے دھیرے حواس بحال ہوئے۔ میں نے کمبل کا ایک کونا اٹھا کر کن انکھیوں سے تاجور کی طرف دیکھا۔ وہ بدستور دیوار کی طرف منہ کیے لیٹی تھی۔ لالٹین کی لو خودبخود مدھم ہوتی چلی جارہی تھی۔ شاید تیل ختم ہو گیا تھا...... جب تیل ختم ہوتا ہے تو اسی طرح روشنی آہستہ آہستہ تاریکی میں بدل جاتی ہے...... میں نے گہری سانس لے کر کروٹ بدلی اور آنکھیں پھر بند کر لیں۔

○......❖......○

اور یہ سجاول کے کمرے کا منظر تھا۔ شام کا وقت تھا۔ ہم دوستانہ ماحول میں بیٹھے تھے۔ اسٹیل کی گول تپائی پر وہسکی کی بوتل کھلی ہوئی تھی اور کمرے میں سگریٹ کا دھواں تھا۔

میں نے پوچھا۔ ''منشی کی کیا خبر ہے سجاول؟''

''اچھی خبر ہے۔ اس خبیث کی عقل ٹھکانے پر آ رہی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ آج شام تک وہ سب کچھ نکال دے گا جو اس کے پیٹ میں ہے۔''

''تم نے کہا تھا کہ مجھے بھی اس سے ملواؤ گے۔''

''چلو، ملوا بھی دیتے ہیں، لیکن اس سے پہلے میں تمہیں کچھ دینا چاہتا ہوں۔'' وہ میرے گلاس میں وہسکی انڈیلتے ہوئے بولا۔

میں سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا، لکڑی کی الماری کھولی اور ایک چھوٹی نال کی کلاشنکوف نکال کر میرے سامنے رکھ دی۔

''یہ تمہاری امانت ہے۔'' اس نے کہا۔

میں چونک گیا۔ یہ وہی کلاشنکوف تھی جس کے ساتھ میں ملنگی ڈیرے سے بھاگا تھا۔ بعدازاں جب یہاں ہمیں سجاول کے ساتھیوں نے گھیرا تو میں نے یہ کلاشنکوف استعمال کرنے کی کوشش کی۔ یہ چل نہیں سکی اور یوں میں اور تاجور پکڑے گئے۔ یہ کلاشنکوف بھی ہم سے چھین لی گئی تھی لیکن اب یہ پھر میرے سامنے پڑی تھی۔

سجاول اپنی تیکھی مونچھوں کو سہلا کر بھاری بھرکم آواز میں بولا۔ ''اب یہ بالکل ٹھیک ہے شاہی! چاہو تو ابھی چلا کر دیکھ سکتے ہو۔''

میں نے کلاشنکوف کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس کی اچھی طرح صفائی کی گئی تھی اور تیل وغیرہ دیا گیا تھا۔ میگزین بھی بالکل ٹھیک جگہ پر بیٹھا ہوا تھا۔

مجھے میری کلاشنکوف کا واپس مل جانا ایک بڑی اہم بات تھی۔ یہ اس امر کا واضح اور کھلا

اشارہ تھا کہ سردار سجاول مجھ پر اعتماد کر رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ میرے اور اپنے دوستانہ تعلق کو مزید آگے بڑھانا چاہ رہا ہے۔

کلاشنکوف کا وزن ہی بتا رہا تھا وہ لوڈڈ ہے اور میں جب چاہے اسے استعمال کر سکتا ہوں۔ میں نے شکریے کے انداز میں سجاول کی طرف دیکھا اور رائفل اپنے پاس چارپائی پر رکھ لی۔

ہم نے اپنے اپنے گلاس خالی کیے تو سجاول اٹھ کھڑا ہوا۔ ''چلو آؤ، اب تمہیں منشی صاحب سے ملواؤں۔''

ہم دونوں آگے پیچھے کمرے سے نکلے۔ سجاول حسبِ معمول سیاہ شلوار قمیص اور واسکٹ میں تھا۔ نائن ایم ایم کا پستول ہر وقت اس کی کمر سے بندھا رہتا تھا۔ اس کے ابرو کے زخم پر ابھی تک بینڈ تیج موجود تھی۔ شام اب گہری ہو چکی تھی۔ اس ''ڈکیت ڈیرے'' پر لالٹینیں اور گیس لیمپ وغیرہ روشن ہو گئے تھے۔ حفاظتی مچانوں پر بھی روشنی دکھائی دینے لگی تھی۔ میرے کندھے پر کلاشنکوف دیکھ کر سجاول کے ساتھیوں کو حیرت ہوئی۔ کئی ایک مڑ مڑ کر دیکھنے لگے۔

میری اور سجاول کی لڑائی میں لکڑی کا جو مستطیل کیبن تباہ ہو گیا تھا، اسے پھر سے کھڑا کیا جا رہا تھا۔ وہاں چاروں طرف لکڑی کا برادہ اور تختے وغیرہ بکھرے ہوئے تھے۔ ہم زیرِ تعمیر کیبن کے پاس سے گزرتے احاطے کے اس سرے پر پہنچ گئے جہاں چشمہ واقع تھا۔ ایک چٹان کے اندر واقع کھوہ کو کمرے کی شکل دے دی گئی تھی۔ یہاں لوہے کا دروازہ تھا جس پر کالا روغن کیا گیا تھا۔ دروازے پر کسی نے سفید روغن کے ساتھ ہی بے ڈھنگے طریقے سے ''لڈو پیڑے'' لکھوا دیا تھا۔ یہ دراصل یہاں کا عقوبت خانہ تھا اور طنزیہ انداز میں اسے لڈو پیڑے کا نام دیا گیا تھا۔ مسلح گارڈ نے دروازہ کھولا۔ ہم اندر داخل ہوئے۔ یہ ایک ہی بڑا کمرا تھا جسے دو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ پتھریلی چھت پر زنجیریں وغیرہ جھول رہی تھیں۔ ایک طرف لوہے کا زنگ آلود شکنجہ پڑا تھا۔ بید کی ایک موٹی چھڑی اور ایذا رسانی کی دیگر اشیا بھی نظر آ رہی تھیں۔ منشی افضل سامنے ہی ننگے فرش پر بیٹھا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے یاد آیا کہ چاند گڑھی میں شاید ایک دو بار میں نے اسے دیکھا تھا۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر چونکا۔ اس کے بالائی جسم پر تو سویٹر اور جیکٹ تھی مگر زیریں جسم بالکل عریاں تھا۔ اس کی فربہ ٹانگوں پر درجنوں جگہ ایک سفید سفید مرہم سا لگا ہوا تھا۔ جیسے پھنسیاں ہوں، لیکن یہ پھنسیاں نہیں تھیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے زخم تھے۔

میرا خیال تھا کہ منشی کوئی دبلا پتلا کھچڑی داڑھی والا بندہ ہوگا لیکن یہاں صورتِ حال

مختلف تھی۔ وہ ہٹا کٹا تھا۔ سر کے زیادہ تر بال اُڑے ہوئے تھے۔ عمر پینتیس چالیس ہو گی وہ شکل سے ہی سخت جان اور عیار نظر آتا تھا۔ اس کی ناک سوجی ہوئی تھی اور چہرے پر نیل تھے۔ ایک طرف فرش پر اس کی ٹوٹی ہوئی عینک بھی پڑی تھی۔

وہ کچھ دیر سجاول کو دیکھتا رہا۔ پھر اپنی جگہ سے اٹھا اور برہنگی کی پروا کیے بغیر اس کے قدموں میں گر پڑا۔ ''مجھے معاف کر دو سردار، مجھے اس بندے (فخرو) سے بچالو۔ میں نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ اب اس سے کہو، میری جان چھوڑ دے۔''

سردار نے بے پروائی سے پاؤں جھٹک کر اسے اپنے قدموں سے ہٹایا۔ اتنے میں چپٹی ناک والا فخرو بھی نمودار ہو گیا۔ اس نے دو کرسیاں لا کر کمرے میں رکھ دیں۔ ہم بیٹھ گے۔ منشی افضل اسی طرح فرش پر بیٹھا رحم طلب نظروں سے ہماری طرف دیکھتا رہا۔ فخرو کو دیکھ کر اس کا رنگ مزید پیلا پڑ گیا تھا۔

سجاول نے جوتے سے اس کی عریاں ران پر ضرب لگائی اور طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تمہاری آکڑ شاکڑ ختم ہوئی یا ابھی مزید خدمت کی لوڑ ہے؟''

''میری کوئی آکڑ نہیں سردار، میرے چھوٹے چھوٹے تین بچے ہیں۔ مجھے ان کے پاس واپس جانے دو۔ میں بیوی بچوں کو لے کر کسی طرف منہ کر جاؤں گا۔ کبھی کسی کو دوبارہ اپنی شکل نہیں دکھاؤں گا۔''

''کیوں شکل نہیں دکھاؤ گے؟''

''جو کچھ میں بتا چکا ہوں، اس کے بعد میرے لیے چاند گڑھی میں رہنا تو ناممکن ہو جائے گا۔ چودھری عالمگیر ٹریکٹر کے نیچے دے کر قیمہ کروا دے گا میرا۔''

''میں نے کہا ہے نا کہ تیرا نام کسی کام میں نہیں آئے گا۔'' سجاول بولا۔ ''اس لیے جو جو کچھ بتانا ہے، کھل کر بتا دے۔''

اس نے ایک بار پھر سجاول کے پاؤں پکڑ لیے۔ ''مجھے جو کچھ پتا ہے میں نے بتا دیا ہے سردار، اب تو یہی ہو سکتا ہے کہ میں فخرو صاحب سے جان بچانے کے لیے جھوٹ بولتا رہوں اور جو جو کچھ وہ کہتے رہیں، قبولتا رہوں۔''

منشی کو اپنی برہنگی کا بالکل احساس نہیں تھا۔ اس ''شرمندگی'' نے جیسے اس کے لیے اپنے معنی کھو دیئے تھے۔ اس کی شلوار پاس ہی ایک کھونٹی پر لٹکی ہوئی تھی۔ مجھے ''چیں چیں'' کی باریک آواز سنائی دی۔ مڑ کر دیکھا تو ایک کونے میں ایک پنجرے کے اندر آٹھ دس تگڑے چوہے بند تھے۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ منشی کا منہ کھلوانے کے لیے اس کی شلوار میں

چوہے چھوڑے گئے تھے۔ اس کی ٹانگوں پر جو چھوٹے چھوٹے زخم تھے وہ یقیناً چوہوں کے کاٹنے سے ہی آئے تھے۔ اب ان پر مرہم یا چونا وغیرہ لگا کر انہیں کھلا چھوڑ دیا گیا تھا۔

سجاول نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''اچھا، جو کچھ اب تک بتایا ہے اسے ایک دفعہ دہراؤ...... ذرا تفصیل کے ساتھ۔''

منشی افضل نے اپنی نم آنکھیں صاف کیں اور فخرو کی طرف دیکھا۔ اس کے بعد وہ کسی ٹیپ ریکارڈر ہی کی طرح فر فر بولنے لگا۔ یہ وہی باتیں تھیں جو اس سے پہلے مجھے سجاول بتا چکا تھا لیکن دو تین نئی باتیں بھی تھیں۔ منشی نے کہا کہ اسے ماسٹر ریاض کے پنڈ کے بارے میں کچھ پتا نہیں اور نہ ہی اس نے کبھی اس بندے کو چاند گڑھی میں دیکھا ہے۔ بس اس کا اندازہ ہے کہ وہ ضلع راجن پور کے کسی دور دراز پنڈ میں رہتا ہے۔ وہاں ٹیلی فون یا موبائل وغیرہ کی سہولت نہیں ہے۔ جس طرح عالمگیر زینب کو کسی کام کے لیے تیار کر رہا تھا۔ ماسٹر ریاض بھی دو لڑکیوں کو تیار کر رہا ہے۔ یہ لڑکیاں بھی کنواری ہیں اور مذہبی گھرانے سے ہیں۔ ان لڑکیوں کو بہت مہنگی قیمت پر کسی بڑے صاحب کے پاس بھیجا جانا ہے۔

فخرو نے کڑک کر کہا۔ ''تم نے لورو کے بارے میں جو کچھ کہا ہے، وہ بھی سردار کو بتاؤ۔''

منشی نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''لورو نام کی کوئی جگہ نہیں ہے۔''

''لیکن خط میں تو لکھا ہوا ہے اور ہم اسے ڈھونڈنے کے لیے خجل ہوتے رہے ہیں۔''

منشی نے کہا۔ ''وہ سارا خط الٹے حرفوں میں لکھا گیا تھا، مگر اس جگہ کا نام چودھری عالمگیر نے سیدھے حرفوں میں ہی لکھوایا تھا۔ خط میں اس جگہ کو ''ورول'' لکھا گیا تھا اور یہ ورول ہی ہے۔''

سجاول نے ایک جھانپڑ منشی کے گنجے سر پر لگایا۔ ''کم بختا! دو دن پہلے بتا دیتا تو ہمیں اس طرح لور لور نہ پھرنا پڑتا۔''

منشی سر جھکائے بیٹھا رہا۔ سجاول نے فخرو سے پوچھا۔ ''ہے کوئی ورول نامی جگہ تمہارے ذہن میں؟''

''نہیں سردار، پر...... نام کچھ سنا سنا سا بھی لگتا ہے۔''

''کہاں ہے یہ تمہاری ماں کا سسرال؟'' سجاول نے ایک اور جھانپڑ منشی کی چندیا پر لگا کر پوچھا۔

''میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں سردار! مجھے کچھ پتا نہیں۔ چودھری عالمگیر جیسے لکھواتا تھا، میں لکھ دیتا تھا......''

''تمہارا کیا خیال ہے۔ عالمگیر کے چچوں چانٹوں میں سے کس کو پتا ہو گا اس جگہ کا؟'' سجاول نے پوچھا۔

''یہ سارا معاملہ چودھری عالمگیر بہت بھید میں رکھتا ہے۔ شاید والی بات ہے کہ اسحاق اس بارے میں جانتا ہو۔''

''اور پیر ولایت؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، پیر ولایت کو تو ضرور پتا ہو گا۔'' منشی نے جیسے چونک کر کہا۔

سجاول نے سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر دھواں منشی کی طرف پھینکا پھر فخرو سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''پہلے اپنے طور پر کوشش کرتے ہیں۔ نہ ہوا تو پھر اس ساتے یا پیر ولایت کو بھی یہاں لا کر لڈو پیڑے کھلانے پڑیں گے۔''

فخرو بولا۔ ''اب صحیح نام کا پتا چل گیا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے جی کہ جگہ کا کھوج بھی لگ جائے گا۔''

سجاول نے منشی سے کچھ مزید سوال جواب کیے، پھر سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میرے یہاں آنے کا مقصد یہی تھا کہ میں چاند گڑھی کے حالات کے بارے میں منشی سے ایک دو سوال کروں۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''پنڈ کے حالات اب کیا ہیں...... ریشمی کس حال میں ہے؟''

''ریشمی بالکل خیریت سے ہے۔ بہت سے لوگ کھلم کھلا پیر ولایت اور عالمگیر کے مخالف ہو گئے ہیں۔ انہوں نے پکا ارادہ کیا ہے کہ وہ ریشمی اور ان دو لڑکوں پر کوئی حرف نہیں آنے دیں گے جو ملنگی ڈیرے سے بچ کر آئے ہیں۔''

دو لڑکوں سے منشی افضل کی مراد یقیناً انیق اور رضوان ٹی ہی تھے۔ یہ جان کر اطمینان ہوا کہ ریشمی خیریت سے ہے اور اپنوں کے پاس ہے۔ بوڑھے گول کیپر کی آخری لڑائی رائگاں نہیں گئی تھی۔

میں نے منشی سے پوچھا۔ ''تاجور کے گھر والوں کے کیا حالات ہیں؟''

وہ دو سیکنڈ کے لیے چپ رہا پھر بولا۔ ''وہ...... پنڈ چھوڑ گئے ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''میرے...... یہاں آنے سے ایک دن پہلے وہ راتوں رات کہیں نکل گئے ہیں۔ پتا چلا ہے کہ ایک رات پہلے ہی انہوں نے اپنا ضروری سامان اپنی ٹریکٹر ٹرالی پر کہیں بھیج دیا تھا۔ اب ان کے خالی گھر کو تالے لگے ہوئے ہیں۔''

یہ ایک اہم اطلاع تھی۔ مجھے پہلے ہی اندیشہ تھا کہ چودھری دین محمد اور ان کے گھر والے یہ صورتِ حال برداشت نہیں کرسکیں گے اور شاید ایک طرح سے انہوں نے اچھا ہی کیا تھا۔ عالمگیر جیل سے باہر آچکا تھا۔ مقامی پولیس کے ساتھ اس کا پکا گٹھ جوڑ تھا۔ وہ کسی بھی وقت تاجور کے اہلِ خانہ کو کوئی نقصان پہنچا سکتا تھا...... ان کا عرصۂ حیات مزید تنگ کرسکتا تھا۔

منشی نے یہ بھی بتایا کہ پیر ولایت اپنے باپ پیر سانتا کو گاؤں کے اندر مسجد کے عقب میں دفنانا چاہتا تھا مگر بہت سے لوگوں نے اس کی زبردست مخالفت کی اب اسے گاؤں سے باہر عام قبرستان میں دفن کیا گیا ہے۔

ہم نے قریباً ایک گھنٹا منشی افضل سے پوچھ گچھ کی۔ ہم واپس آنے لگے تو وہ ایک بار پھر منت سماجت پر اتر آیا۔ اس بار اس نے میرے پاؤں پکڑ لیے اور فریاد کرنے لگا۔ ''میری سفارش کردو شاہ صاحب! میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔''

سجاول نے زہرخند لہجے میں کہا۔ ''یہ بھی بتاؤ نا کہ اس میں ایک بچہ تمہارا ہے، دو بچے اس غریب مزدور کے ہیں جس سے تُو نے زبردستی اس کی زنانی چھینی تھی۔ چھینی تھی یا نہیں؟''

''وہ...... وہ بات اب پرانی ہوگئی ہے سردار، اب وہ اپنی مرضی سے میرے ساتھ رہتی ہے۔''

''ایسی ہی ''مرضی'' کے ساتھ تم بھی تو یہاں رہ رہے ہو۔'' سجاول نے طنزیہ لہجے میں کہا اور مجھے لے کر باہر نکل آیا۔

منشی کی آنکھوں میں کچھ ایسی فریاد تھی کہ مجھے اس پر تھوڑا سا ترس آگیا۔ میں نے سجاول سے پوچھا۔ ''اس کی جان تو بچ جائے گی؟''

''جان بچا کر کیا کرنا ہے اس نے؟ بہت کچھ کھا پی لیا ہے۔ دیکھا نہیں کتنی چربی چڑھی ہوئی ہے کمینے پر۔''

''چلو پھر بھی، کچھ تعاون تو کیا ہے اس نے۔ اسے یہیں کہیں بند کر کے چھوڑ دو...... سالوں سال بھی بند رہے گا تو کسی کو پتا نہیں چلے گا۔''

''ہاں...... کیا تو جاسکتا ہے ایسا...... چلو بعد میں دیکھیں گے۔''

سجاول سے رخصت ہو کر میں اپنے کمرے میں پہنچا۔ رات کے آٹھ بجے تھے۔ نیچے تاجور کے پاس تہ خانے میں جانے کے لیے دس بجے کا وقت مقرر تھا۔ سجاول نے مجھے تاکید کی تھی کہ میں ماؤ کی عیادت کرآؤں۔ پالکی سے اترتے ہوئے اس کے پاؤں میں موچ آئی تھی۔ میں نے کلاشنکوف سنبھال کر الماری میں رکھی اور ماؤ کی طرف چل دیا۔ دل میں تمنا

کررہا تھا کہ آفت کی پرکالی سے ملاقات نہ ہونے پائے۔ میرا دل تاجور کے معاملے میں بہت بجھا ہوا تھا۔ دل پر جبر کر کے بھی مانی کی خرمستیوں کو جھیلنا میرے لیے آسان نہیں تھا۔

میں اندرونی حصے میں پہنچا تو ماؤ فوراً ہی نظر آ گئی۔ وہ صحن نما جگہ پر پہلوان حشمت کے سہارے چہل قدمی کررہی تھی۔ پہلوان خود بھی اچھے قد کاٹھ کا تھا لیکن جثّے اور وزن کے معاملے میں ماؤ اس سے بھی آگے تھی۔ اس نے پہلوان کے کندھوں پر اپنے بھاری بھرکم بازو کا پورا بوجھ ڈالا ہوا تھا اور چلنے کی کوشش کررہی تھی۔ پہلوان کا چہرہ زور لگنے سے لال بھبھوکا ہورہا تھا۔ قریب ہی چست لباس والی مانی بھی موجود تھی۔

مجھے دیکھتے ہی ماؤ نے دونوں بازو پھیلائے اور گرتے گرتے بچی۔ اس نے حسبِ معمول مجھے اپنے جن جپھے میں لے لیا اور منہ سر چومنے لگی۔ ''تُو کہاں تھا میرے بچڑے، میرا پتا ہی نہیں لیا تُو نے۔ میں تو ماکھی کو بھیجنے والی تھی تیری طرف۔''

پہلوان حشمت نے کرسی گھسیٹ لی۔ وہ دھم سے کرسی پر بیٹھ گئی۔ پہلوان نے جیسے شکر کی سانس لی۔

میں نے مانی کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ غصے سے انگارے کی طرح دہک رہا تھا۔ میں ایک لحظے میں سمجھ گیا کہ چار پانچ دن پہلے یہاں میرے اور سجاول کے درمیان ہونے والے تہلکہ خیز مقابلے کا پتا مانی کو چل چکا ہے۔ وہ اب شدید ناراضگی دکھا رہی تھی۔ پاؤں پٹختی اور کولہے مٹکاتی ہوئی کمرے کی طرف چلی گئی۔

ماؤ نے اسے جاتے ہوئے دیکھا اور بولی۔ ''دیکھو، اب تم سے شرمانا شروع ہو گئی ہے۔''

میں نے ماؤ کا حال احوال پوچھا۔ اس کے دو چار دکھڑے سنے۔ ماؤ کا کہنا تھا کہ اس کی زندگی کا اب کوئی بھروسا نہیں۔ پوتی کی صورت میں اس کے پاس جو نادرِ روزگار نمونہ تھا، وہ جلد از جلد میری جھولی میں ڈال دینا چاہتی تھی۔ اس نے کہا۔ ''پرسوں پیرو سائیں سے میری ملاقات ہوئی ہے۔ انہوں نے کھل کھلا کر بات کی ہے۔ ان کو پورا یقین ہے کہ وہ کمینی اب زندہ نہیں ہے۔''

''کون؟''

''وہی تیری غنڈی بیوی، جس نے منہ کالا کیا تھا کسی کے ساتھ۔ سائیں نے کہا ہے کہ اب تیرے اور مانی کے ویاہ میں کوئی رکاوٹ شکاوٹ نہیں ہے۔ ستارے بھی بالکل ٹھیک ہیں۔ اب مانی اور شاہ زیب جب چاہیں اک دوجے کے جیون ساتھی بن سکتے ہیں اور میں نے فوراً

کہا...... پیر جی تہاڈے منہ میں گھی شکر......"

"اور ماؤ جی! تمہارے منہ میں بھینس کا گوبر۔" میں نے دل ہی دل میں کہا۔ (ظاہر ہے زبان سے کہتا تو ماؤ نے بم کی طرح پھٹ جانا تھا)

پہلوان ہانپتے ہوئے بیل کی طرح ایک طرف بیٹھا تھا۔ اب اس کی سانسیں کچھ بحال ہو چکی تھیں۔ میں نے موقع مناسب دیکھ کر کہا۔ "ماؤ جی! وہ کڑی جاناں کدھر ہے، سنا تھا بخار وغیرہ ہو رہا ہے اس کو۔"

"مجھے تو عشق کا بخار لگتا ہے۔ کوئی چکر شکر ہے اس کڑی کا۔ ناچنے گانے والی ہے۔ کسی امیر زادے سے اکھ مٹکا کر لیا ہوگا...... ویسے اب ٹھیک ہے۔ وہ سامنے کمرے میں ہوگی۔"

میں نے کہا۔ "ماؤ! آپ کو کیسے پتا ہے کہ وہ کسی کے چکر میں ہے؟"

"مانی نے بتایا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ بخار کی بے ہوشی میں بھی اس کا نام لیتی رہی ہے۔ پتا نہیں کیا نام بتا رہی تھی۔ وہ...... ہاں...... یاسر۔ اللہ جانے یہ کون ٹٹ پیناں ہے۔ ویلے ٹائم میں بیٹھ کر بس شعر پڑھتی رہتی ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "اس کی ماتھے کی چوٹ کا اب کیا حال ہے؟"

"زیادہ چوٹ نہیں تھی۔ بس مکر شکر کر رہی تھی۔ اب ٹھیک ہے۔"

"میں ایک منٹ اسے دیکھ لوں؟"

"دیکھ لو۔" ماؤ نے بادل ناخواستہ کہا۔

میں نے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ "کون؟" اندر سے جاناں نے پوچھا۔

میں نے دروازے پر دباؤ ڈالا وہ کھل گیا۔ اندر جاناں پلنگ پر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ سیاہ بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کا زخم اب مندمل ہو رہا تھا۔ زیادہ چوٹ سر پر ہی آئی تھی۔ قریباً ایک انچ کا نشان ماتھے پر بھی تھا۔

اس کے سرہانے رکھے ٹرانزسسٹر ریڈیو پر عابدہ پروین کی گائی ہوئی غزل گونج رہی تھی۔

جب سے تُو نے مجھے دیوانہ بنا رکھا ہے، سنگ ہر شخص نے ہاتھوں میں اٹھا رکھا ہے۔

اس نے ریڈیو بند کیا اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے کہا۔ "بس تمہارا حال پوچھنے چلا آیا تھا۔ تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ احاطے کی طرف نہ جاؤ اور زیادہ وقت مانی کے ساتھ گزارو۔ وڈا سردار تمہارے لیے کسی بھی وقت خطرہ بن سکتا ہے۔"

"بس غلطی ہوگئی مجھ سے۔ اب احتیاط کروں گی۔" وہ احسان مندی کے لہجے میں بولی۔

وہ جانتی تھی کہ میری ہی وجہ سے اس کی اور مائی کی دوستی ہوئی ہے اور یوں اس کے لیے سردار اعظم سے بچے رہنے کا موقع پیدا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ وہ اور کچھ نہیں جانتی تھی۔ اس نے اس بات پر بھی میرا شکریہ ادا کیا۔

اسی دوران میں ماؤ نے مجھے آوازیں دینا شروع کر دیں۔ یقیناً میرا جاناں سے باتیں کرنا اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ جاناں کو تسلی دے کر میں ماؤ کے پاس واپس پہنچا تو وہ پہلا دان حشمت سے اپنے پاؤں کی مالش کروا رہی تھی۔ معنی خیز لہجے میں مجھ سے کہنے لگی۔ ''جا اندر جا کر حال چال پوچھ لے اپنی ''ہونے والی'' کا بھی...... شرم حیا والی ہے۔ منہ سے نہیں کہندی پر تیرا انتظار کرتی رہتی ہے۔''

میں نے جلدی سے کہا۔ ''ماؤ جی! اس وقت تو مجھے سردار سجاول نے بلایا ہے۔ دیر ہو گئی تو ناراض ہوں گے۔ کل کسی وقت آؤں گا۔''

ماؤ سے بمشکل جان چھڑا کر میں اس زنانے حصے سے باہر نکل آیا۔ ''شرم حیا والی'' کے الفاظ کانوں میں کانٹے کی طرح چبھ رہے تھے۔

O......❖......O

وہ رات بھی گزشتہ رات کی طرح عجب بے قراری کے عالم میں گزری۔ میں تہ خانے میں تاجور کے پاس رہا لیکن پاس رہ کر بھی بہت دور۔ وہ ایک کونے میں کمبل اوڑھ کر سمٹی رہی۔ میں دوسرے کونے میں کروٹیں بدلتا رہا۔ میں اس کے آنسو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ یہ آنسو جیسے براہِ راست میرے دل پر گرتے تھے۔ میری سمجھ میں یہ بات آنا شروع ہو گئی تھی کہ تاجور میری وجہ سے کانٹوں پر گھسیٹی جا رہی ہے۔ اگر میں اس کے ساتھ رہا تو اس کا یہ لہولہو سفر جاری رہے گا۔

اگلے روز دوپہر کے وقت سجاول نے مجھے ساتھ لیا اور چہل قدمی کرتا ہوا احاطے سے باہر لے گیا۔ پچھلے چند ہفتوں میں یہ پہلا موقع تھا کہ میں اس احاطے اور مچانوں کے حصار سے باہر نکلا تھا۔ ایک طرح کی آزادی کا احساس ہوا۔ آسمان بالکل صاف تھا۔ خوشگوار دھوپ نکلی ہوئی تھی اور درختوں سے چھن چھن کر آ رہی تھی۔ پرندے چہچہا رہے تھے مگر میرے دل کا موسم کچھ اور تھا۔

پتھریلی ڈھلوانوں پر دور دور تک جنگل کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ہم دونوں ایک آبِ جو کے کنارے تھوڑی سی دھوپ میں بیٹھ گئے۔ میں نے کلاشنکوف کندھے سے اتار کر گود میں رکھ لی۔ سجاول نے سگریٹ سلگانے کے بعد مجھے بھی پیشکش کی۔ مجھے سگریٹ کی طلب نہیں

ہوتی تھی، مگر میں نے اس کی آفر رد نہیں کی۔

میں نے کہا۔ ''سجاول! اس علاقے میں عام لوگ نہیں آتے؟''

''دو چار سال پہلے اِکا دُکا آجاتے تھے، مگر اب نہیں آتے۔ وہ اسے خطرناک علاقہ سمجھتے ہیں۔ ایک دو لاشیں ملنے کے بعد مشہور ہو گیا کہ یہاں جن بھوت ہیں...... ہمیں بھی یہ بات اچھی لگی۔ ہم نے یہاں دو چار مزید ایسی کارروائیاں کیں جن سے لوگوں کا ڈر پکا ہو گیا۔ اب کوئی بھولا بھٹکا آجاتا ہو تو علیحدہ بات ہے، ورنہ ارادہ کر کے کوئی نہیں آتا۔'' سجاول کی تیکھی مونچھوں کے نیچے عیارانہ مسکراہٹ تھی۔

''پولیس بھی جن بھوتوں سے ڈرتی ہے؟'' میں نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

''نہیں...... وہ ہم سے ڈرتی ہے۔'' سجاول نے بھی معنی خیز لہجے میں جواب دیا۔

ہم دونوں کچھ دیر خاموش رہے، جنگل میں پرندوں کی آوازوں اور بہتے پانی کی ''قل قل'' کے سوا اور کوئی آواز نہیں تھی۔ آخر سجاول نے ایک گہرا کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑا اور بولا۔ ''تو پھر کیا سوچا ہے تم نے؟ اس ''بڑے صاحب'' والے معاملے میں تم میرے ساتھ چلنا چاہو گے؟''

''تمہیں پتا ہے میں عالمگیر سے نفرت کرتا ہوں۔ یہ نفرت نکالنے کا جو موقع بھی ملے گا، میں اس سے فائدہ اٹھانا چاہوں گا اور پھر اس کام میں کافی سارا روپیہ بھی نظر آرہا ہے...... لیکن ساتھ چلنے کے لیے دل بالکل صاف ہونے چاہئیں سجاول...... اس لیے میری ایک شرط ہے۔''

''بتاؤ۔''

''تم تاجور کو چھوڑ دو۔ میں اسے جہاں چاہوں بھیج دوں تم یا تمہارا کوئی بندہ اس کی زندگی میں کوئی دخل نہ دے۔''

''بس یا کچھ اور......؟'' وہ مسکرایا۔

''پہلوان حشمت اور اس کے ساتھ پکڑی جانے والی لڑکی کو بھی آزاد کر دو۔''

''تمہارا مطلب ہے وہ ڈانسر جاناں؟''

''ہاں۔''

''ٹھیک ہے...... یہ بھی ہو گیا۔'' اس نے نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''ایک چھوٹی سی ڈیمانڈ اور ہے۔ چاند گڑھی میں میرا ایک ساتھی انیق ہے۔ میں اسے یہاں اپنے پاس بلانا چاہتا ہوں، وہ بہت کام کا بندہ ہے۔''

سجاول اس مطالبے پر یک ٹک میری طرف دیکھتا رہا پھر گہری سانس لے کر بولا۔ ''اگر وہ بندہ تمہارے بھروسے کا ہے اور تم سمجھتے ہو کہ اس کے یہاں آنے سے فائدہ ہوگا، تو لے آؤ۔''

''بس......تو میں تمہارے ساتھ ہوں۔'' میں نے کلاشنکوف کو سہلایا۔

وہ توقف کر کے بولا۔ ''لیکن تاجور کو کہاں بھیجو گے تم؟ کل تم نے سن ہی لیا ہے جو منشی افضل کہہ رہا تھا۔ اس کے گھر والے چاندگڑھی چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ آس پاس کوئی رشتے دار بھی نہیں ہے اس کا اور اگر ہوتا بھی تو کیا وہ عالمگیر وغیرہ کے ہوتے وہاں بچ کر رہ سکتی ہے؟''

''یہ تمہارے سوچنے کی نہیں، میرے سوچنے کی باتیں ہیں۔'' میں نے پورے اعتماد سے کہا۔

وہ کچھ دیر میری جانب دیکھتا رہا پھر کش لے کر بولا۔ ''ٹھیک ہے شاہی، لیکن ایک بات دھیان میں رکھ لینا، یہ زنانیاں کبھی کبھی بڑی مشکل میں ڈال دیتی ہیں مرد ذات کو۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''یہ عشق معشوقی والے کام مجھے چنگے نہیں لگتے۔ میں تو کہتا ہوں اسے اپنے پاس رکھو۔ موج میلہ کرتے رہو۔ یہ اس تہ خانے میں ہر ایک کی نظر سے بچی رہے گی۔ اور......''

''دیکھو سجاول! یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔'' میں نے اس کی بات کاٹی۔ ''میں اس بارے میں تم سے کوئی بات سننا نہیں چاہتا۔''

میرے ماتھے پر بل دیکھ کر وہ مسکرایا۔ ''نہیں، میں تو بس ایک مشورہ دے رہا تھا۔ باقی تمہاری مرضی ہے۔'' چند سیکنڈ تک ہم دونوں کے درمیان خاموشی رہی تب وہ اس بوجھل خاموشی کو توڑتے ہوئے بولا۔ ''مجھے صرف اتنی پریشانی ہے کہ تاجور نے یہاں تک کا رستہ دیکھا ہوا ہے۔ یہ نہ ہو کہ وہ بعد میں کسی مشکل کا سبب بن جائے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہاں ہمارے اس ٹھکانے پر جو بھی باہر سے آتا ہے، اس کی آنکھوں پر پٹی باندھی جاتی ہے مگر تاجور نے یہ رستہ کافی حد تک دیکھ لیا ہے......''

''میں......اس کی...... پوری پوری ذمے داری لیتا ہوں۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

میرے تاثرات دیکھ کر سجاول جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ ''بس ٹھیک ہے شاہی، اب یہ سب کچھ طے ہو گیا ہے۔''

وہ ایک معاملہ فہم شخص تھا اور تاثرات دیکھ کر بندے کے ذہن کو فوراً پڑھ لیتا تھا۔

ہم ایک مچان کے نیچے سے گزرتے ہوئے واپس احاطے میں آ گئے۔ سجاول اس ہال کمرے کی طرف چلا گیا جہاں اس کے چھرے باز اور فائٹر ''مارا ماری'' کی مشق کرتے تھے۔ میں پہلوان حشمت کو دیکھنے کے لیے اس کی کوٹھڑی کی طرف آ گیا۔ پہلوان سے ملنا اور اس کی باتیں سننا ہمیشہ سے اچھا لگتا تھا۔ لیکن آج تو کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ دل کی کچھ عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔ جیسے کوئی سینے کو اندر سے نوچ رہا ہو۔

پہلوان کے پاس پہنچا تو وہ کوٹھڑی کے فرش پر اوندھا لیٹا تھا، اور اپنا ایک بازو موڑ کر اپنے ہی ہاتھ سے اپنی کمر کی مالش کر رہا تھا۔

''کیا ہوا پہلوان جی؟'' میں نے اندر داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ''بھیا، یہ پوچھو کیا ناہیں ہوا۔''

''چلو بتا دو۔ کیا ناہیں ہوا؟''

وہ میرے کندھے پر کلاشنکوف دیکھ کر حیران ہوا اور خوش بھی۔ اس نے پوچھا۔ ''یہ اصلی ہے؟'' میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ بولا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ سردار سجاول سے تمہارے حالات اچھے جا رہے ہیں۔''

''ہاں، کچھ کچھ۔'' میں اس کے قریب چٹائی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

پہلوان نے ہاتھ بڑھا کر مجھے تکیہ پیش کرنا چاہا تو منہ سے بے ساختہ ''ہائے اللہ'' نکل گیا۔ اس نے بایاں ہاتھ کمر پر رکھ لیا تھا۔

''کوئی چوٹ لگ گئی ہے پہلوان جی؟''

''چوٹ ہی سمجھ لو۔'' اس نے برا سا منہ بنا کر کہا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''اس موقع کے لیے دو شعر یاد آ رہے ہیں۔

ان کو سہارا دیتے تھے، بھاگے پھرتے تھے
یارو، تب بس ہم تھے اور ہماری دوڑ تھی
پر اس وقت وہ کہیں نظر نہ آئے ہم کو
جب مشکل وقت میں ہم کو ان کی بڑی لوڑ تھی

ظاہر ہے کہ یہ پہلوان کا اپنا ہی شعر تھا، کیونکہ اس میں حسبِ معمول ایک جگہ پنجابی ٹھوکی گئی تھی۔

''کسے سہارا دیا آپ نے؟'' میں نے انجان بن کر پوچھا۔

وہ سرگوشی میں بولا۔ ''اسی موئی ہتھنی کو، جسے یہاں سردار کی ماؤ کہا جاوت ہے۔ میری

ہی عقل پر پتھر پڑ گئے تھے۔ میں نے اس کو مشورہ دے دیا کہ وہ کسی کا سہارا لے کر چند قدم چل لیا کرے، اس سے موچ جلد ٹھیک ہو جاوے گی۔ اس ظالم نے میرا ہی سہارا لے کر چلنا شروع کر دیا۔ چار دن سے صبح شام اس ہتھنی کو چہل قدمی کروا رہا ہوں۔ کمر کا کباڑا ہو گیا ہے۔ مجھے تو لگت ہے کہ اس چہل قدمی...... سے میرے ''چہلم'' کی راہ ہموار ہو جاوے گی۔''

''اللہ نہ کرے۔ پہلوان جی ابھی تو آپ نے بہت کچھ دیکھنا ہے دنیا میں۔''

''مجھے تو لگت ہے بھیا، ہر چیز سے دل ہی اچاٹ ہو گیا ہے۔ بچے بہت زیادہ یاد آوت ہیں۔''

چند دن پہلے یہ راز کھلا تھا کہ پہلوان حشمت کے چار بچے ہیں۔ بیوی بیمار رہتی ہے اور بچوں کی دادی ہی زیادہ تر بچوں کی دیکھ بھال کرتی ہے۔

میں نے پہلوان سے کہا۔ ''آپ بچوں کو یاد کرتے ہیں تو وہ بھی آپ کو ضرور کرتے ہوں گے اور کہتے ہیں کہ بچوں کی دعاؤں میں بڑا اثر ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کے یہاں سے نکلنے کی کوئی سبیل بن جائے۔''

پہلوان نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ''کک...... کیا...... کوئی بات ہوئی ہے سردار سے؟''

''نہیں، ہوئی تو نہیں، لیکن ہو سکتا ہے کہ ہو جائے...... اور میں آپ کو کوئی اچھی خبر سنا سکوں۔''

پہلوان کے چہرے پر چمک نمودار ہو گئی۔ اس نے مجھے کریدنے کی کوشش کی مگر میں وقت سے پہلے اسے کچھ نہیں بتانا چاہتا تھا۔ پچھلے دنوں پہلوان کے کانوں تک بھی یہ خبریں پہنچی تھیں کہ تاجور یہاں سے بھاگ گئی ہے اور وہ از حد پریشان بھی رہا تھا جب میں نے اسے بتایا کہ ایسا کچھ نہیں ہوا اور وہ یہیں پر میرے ساتھ ہے اور خیریت سے ہے تو اسے تسلی ہوئی۔

وہ رات بڑی دل گرفتہ کر دینے والی تھی۔ تہ خانے کی کوٹھری میں میرے اور تاجور کے درمیان اہم گفتگو ہو رہی تھی۔ یخ بستہ کوٹھری میں، میں اور تاجور شانوں تک کمبل اوڑھے بیٹھے تھے۔ لالٹین کی زرد روشنی میں ہمارے سائے دیوار پر لرزتے تھے۔ دو دن سے تاجور کو یہاں انگیٹھی بھی فراہم کی جا رہی تھی مگر اس وقت انگیٹھی قریباً بجھ چکی تھی۔ اختری بھی اوپر جا چکی تھی ورنہ اسے انگیٹھی دہکانے کی زحمت دی جا سکتی تھی۔ جب سے میرے کندھے پر کلاشنکوف آئی تھی یہاں میری حیثیت واضح ہو گئی تھی۔ اختری سمیت دیگر ملازم بے چوں و چرا میری

ہدایت پر عمل کرنے لگے تھے۔

میں نے تاجور کو بتا دیا تھا کہ میں اسے یہاں سے نکلوا سکتا ہوں اور وہ واپس اپنے والدین کے پاس پہنچ سکتی ہے۔ تاہم اس کے ساتھ یہ بھی بتا دیا تھا کہ اس کے گھر والے اب چاند گڑھی میں نہیں ہیں۔ تازہ اطلاع یہ ہے کہ وہ خاموشی سے گاؤں چھوڑ کر کہیں جا چکے ہیں۔ اپنا سامان بھی ساتھ لے گئے ہیں۔

میرا خیال تھا کہ والدین کے چاند گڑھی سے جانے کا سن کر تاجور کی پریشانی میں اضافہ ہو جائے گا مگر یہ اندیشہ درست ثابت نہیں ہوا۔ اسے دھچکا تو لگا مگر شدید نہیں۔

میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ''تاجور! اس موقع سے فائدہ اٹھانے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ اب مجھے بتاؤ کہ تم کہاں اور کس کے پاس جانا چاہو گی؟''

وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولی۔ ''میرا خیال ہے کہ میں جانتی ہوں۔ ابا جی کہاں گئے ہوں گے۔''

''کہاں گئے ہوں گے؟''

وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ ''جب گاؤں میں ہمیں عالمگیر اور پیر ولایت نے زیادہ تنگ کر دیا تھا تو ابا جی اور امی جی اکثر پروگرام بناتے تھے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر خاموشی سے کہیں چلے جائیں۔ وہ جہاں کا پروگرام بنایا کرتے تھے، مجھے پتا ہے۔''

''کون سی جگہ تھی؟''

وہ توقف سے بولی۔ ''وہ میں تب بتاؤں گی...... جب آپ مجھے خود چھوڑنے جائیں گے۔'' اس کا لہجہ حتمی تھا۔

میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہی ہے۔ وہ ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ اس خاص جگہ کے بارے میں کسی دوسرے کو معلوم ہو۔

میں نے کہا۔ ''تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں تمہیں کسی اور کے ساتھ یہاں سے بھیج دوں گا؟''

''اس لیے کہ آپ نے ابھی تک یہاں سے اپنے جانے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔''

''سمجھو کہ میری کوئی مجبوری ہے۔ میں ابھی یہاں سے نہیں جا سکتا لیکن میں تمہیں چھوڑنے جاؤں گا اور تمہارا ہاتھ دین محمد صاحب کے ہاتھ میں پکڑا کر واپس آؤں گا۔''

''کیا مجبوری ہے؟'' اس نے اپنی اشک بار آنکھیں میری طرف اٹھا کر پوچھا۔

''بس کوئی ذاتی وجہ ہے۔'' میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

میرا خیال تھا کہ وہ مزید کچھ پوچھے گی مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اس نے اوڑھنی کو اس طرح سرکایا کہ ایک چھوٹا گھونگھٹ سا بن گیا۔ اب میری نگاہ براہِ راست اس کے چہرے پر نہیں پڑ سکتی تھی۔ ہاں...... یہ مشرقی عورت کا وہی گھونگھٹ ہے جس میں وہ ہزار ہا طوفان اور اَن گنت بھید چھپا لیتی ہے۔

میں نے دھیرے سے کہا۔ ''تم تیار رہو۔ ہم کسی بھی وقت یہاں سے روانہ ہو سکتے ہیں۔''

''کیا......کوئی برقع وغیرہ مل جائے گا؟'' اس نے ڈرے ڈرے لہجے میں پوچھا۔

''ہاں، میں کوشش کرتا ہوں۔ اگر نہ ہوا تو کچھ اور انتظام کر لیں گے۔''

اس نے کچھ اور نہیں پوچھا۔ میں نے بھی کچھ اور نہیں کہا۔ کچھ دیر بوجھل خاموشی طاری رہی پھر میں اٹھ کر اپنے کونے میں آ گیا، اور کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔

ہاں وہ رات بڑی دل گرفتہ کر دینے والی تھی۔ جو کچھ ہو رہا تھا اس کی زیادہ ذمے داری مجھ پر ہی تھی۔ مجھے اپنے دل پر اختیار نہیں رہا تھا۔ یہ جانتے بوجھتے بھی کہ میں کون ہوں، میں نے گاؤں کی اس شبنم جیسی پاک الہڑ دوشیزہ کو دل دیا تھا اور اسے پانے کی خواہش اپنے اندر پالی تھی۔ یہ سراسر غلط تھا اور یہ غلطی جلد یا بدیر پوری شدت سے سامنے آنی ہی تھی۔

جدائی سے پہلے کی راتیں بڑی بوجھل ہوتی ہیں۔ ایک پہاڑ جیسے بوجھ کے ساتھ دل و دماغ کو کچلتی چلی جاتی ہیں۔ لب سل جاتے ہیں اور الفاظ، دل و دماغ سے اپنا دامن چھڑا لیتے ہیں۔ یہ بھی ایک ایسی ہی رات تھی۔ پتا نہیں کیوں ایک بار تاجور کو چھونے کو دل چاہتا تھا۔ لیکن کس حوالے سے چھوتا۔ مجھے وہ منظر بھولا نہیں تھا جب میری سانسوں میں شراب کی بو محسوس کر کے اس نے میرا ہاتھ اپنے جسم سے ایک دم پیچھے ہٹایا تھا اور سمٹ گئی تھی۔

وقت جیسا بھی ہو، گزر جاتا ہے۔ یہ رات بھی گزر گئی۔ میرے اندر جیسے کچھ ٹوٹ رہا تھا۔ شراب میری کمزوری نہیں تھی مگر اس وقت کیفیت کچھ ایسی تھی کہ پینے کو دل چاہ رہا تھا۔ ہتھیار بند اختری تہ خانے میں آ گئی تو میں اوپر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ میں نے بوتل کا منہ کھولا اور پینے لگا مگر عجب بات تھی ہر گھونٹ گلے میں اٹکتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ لگتا تھا کہ میرے گلے میں کوئی مرمریں ہاتھ ہے اور اس ہاتھ کی وجہ سے الکحل کا گھونٹ آگے جانے سے رک جاتا ہے۔

میں زبردستی چڑھاتا رہا اور سگریٹ پھونکتا رہا۔ دھیرے دھیرے وہ مرمریں ہاتھ الکحل

میں تحلیل ہو گیا۔ کوئی رکاوٹ باقی نہ رہی۔ میں نے جیسے خود کو مخاطب کرتے ہوئے یقین دلایا۔ ''تم اس کے لیے نہیں ہو شاہ زیب! تم ظلمت کدے کے باسی ہو...... وہ نور نگر کی روشنی ہے۔ اپنا سایہ اس پر ڈالو گے تو یہ روشنی بے موت مر جائے گی۔ تھوڑے دن تکلیف ضرور ہو گی لیکن پھر دھیرے دھیرے قرار آ جائے گا۔ کوئی نہ کوئی اور تمہیں ضرور ایسا مل جائے گا، جو سنبھلنے میں اور نارمل ہونے میں تمہاری مدد کرے گا۔''

ایک سایہ سا آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ اس سائے نے کہا۔ ''اسے حاصل کر لو...... اسے اپنے پاس رکھ لو۔ اس میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے، کوئی بھی رکاوٹ نہیں ہے......''

لیکن اس سائے کی اور اس کی آواز کی عمر چند سیکنڈ سے زائد نہیں تھی پھر میرے اندر کی توانائی نے اس کو اوجھل کر دیا اور اس کی آواز کو بھی۔

○......❖......○

پہلوان کی آنکھوں میں حیرت کا دریا بہہ گیا۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ اسے یہاں سے رہائی مل رہی ہے۔ کچھ یہی حال جاناں کا بھی ہوا۔ اس کی سیاہ آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ دبلا جسم لرزنے لگا۔ میں نے اسے بتایا۔ ''ہم آج رات دو بجے یہاں سے روانہ ہو رہے ہیں۔''

میں نے اسے سیاہ برقع دیا اور ایک شولڈر بیگ بھی فراہم کیا۔ ایسا ہی ایک برقع تاجور کے لیے بھی مہیا ہو چکا تھا۔ سجاول نے مجھے ایک کولٹ پسٹل اور اس کے پچاس فالتو راؤنڈ بھی فراہم کر دیئے تھے۔ اس کے علاوہ ایک سیل فون بھی دیا تھا۔ مجھے سیل فون کا مل جانا ایک نہایت اہم واقعہ تھا۔ فون چالو حالت میں تھا۔ پروگرام کے مطابق ہمیں یہاں سے گھوڑوں پر روانہ ہونا تھا۔ تاجور اور جاناں کے لیے پالکی تھی۔ قریباً چھ کلومیٹر آگے پختہ سڑک کے قریب ایک اسٹیشن وین موجود تھی۔ ہمیں اس پر کوٹلی اور پھر سیالکوٹ کے لیے سفر کرنا تھا۔ میرے اصرار پر تاجور نے مجھے بتا دیا تھا کہ اس کی منزل لالہ موسیٰ سے جنوب مشرق کی طرف ایک سیکھرا نامی چھوٹا سا گاؤں ہے۔ اسے نوے فیصد یقین تھا کہ اس کے والدین اور دونوں چھوٹے بھائی وہیں ہوں گے۔ روانگی کا یہ سارا انتظام اور ضروری اشیا کی فراہمی سجاول نے ہی کی تھی۔

پروگرام کے مطابق رات کے دو بجے، جب اس ڈیرے کے بیشتر افراد سو رہے تھے، ہم حرکت میں آ گئے۔ فیض محمد، فخرو اور باقرے کے علاوہ بس دو چار بندوں کو ہی معلوم تھا کہ آج رات کیا ہونے والا ہے۔ برقع پوش خواتین کے بارے میں ان کو بھی پتا نہیں تھا کہ وہ

کون ہیں۔ مقررہ وقت پر میں برقع میں لپٹی ہوئی تاجور کو تہ خانے سے باہر لے کر آیا۔ پالکی بالکل پاس ہی موجود تھی۔ میں نے تاجور کو اس میں بٹھا دیا۔ کچھ دیر بعد جاناں بھی ایک ملازمہ کے ساتھ آ گئی۔ سجاول نے مجھے اشارہ کیا۔ میں نے جاناں اور تاجور کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔ پہلوان حشمت کو پہلے ہی ایک گھوڑے پر سوار کر کے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھی جا چکی تھی۔ وہ سخت مضطرب نظر آتا تھا کیونکہ میں اسے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ فی الحال اسے اپنی کمر کی تکلیف بالکل بھولی ہوئی تھی۔

میں نے اپنا حلیہ تھوڑا بہت تبدیل کر لیا تھا۔ مانگ بیچ میں سے نکال لی تھی۔ یہاں پر قیام کے دوران میں، میں نے شیو نہیں کی تھی۔ (سوائے ایک دفعہ کے جب مانی نے میری گردن پر استرا رکھ دیا تھا) اب میرے چہرے پر چھوٹی چھوٹی داڑھی اور مونچھیں نظر آ رہی تھیں۔ مجھے امید تھی کہ بادی النظر میں مجھے پہچانا نہیں جا سکتا۔

وقتِ رخصت سجاول نے گہری نظروں سے مجھے دیکھا اور بولا۔ ''اعتبار کر رہا ہوں...... اور تم سے بھی اعتبار مانگتا ہوں۔''

''جو دے رہے ہو، وہ ملے گا بھی'' میں نے کہا۔

دوسرے لفظوں میں اسے بتا رہا تھا کہ مجھے یہاں واپس آنا ہے اور ہر صورت آنا ہے اور یہ حقیقت بھی تھی۔ تاجور کے اصل دشمنوں عالمگیر، پیر ولایت اور ساتے کو کیفر کردار تک پہنچائے بغیر میں یہاں سے ٹلنے والا نہیں تھا اور پھر وہ ''بڑا صاحب'' جس کے پاس زینب اور تاجور وغیرہ کو پہنچائے جانے کا مذموم پروگرام تھا۔

میرے لیے بھی گھوڑا تیار کھڑا تھا۔ سجاول نے میری آنکھوں پر بھی سیاہ پٹی بندھوا دی۔ میں گھوڑے پر سوار ہوا۔ ایک شخص نے میرے اور پہلوان والے گھوڑے کی لگامیں تھام لیں۔ چار کہاروں نے پالکی اٹھائی اور ہم روانہ ہو گئے۔

رات کا پچھلا پہر تھا۔ سرد ہوا ہڈیوں میں اترتی محسوس ہوتی تھی۔ اب مجھے دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر یقینی بات تھی کہ نہایت دشوار راستے پر سجاول کے لوگ ٹارچوں کی روشنی میں سفر کر رہے ہیں۔ کبھی ڈھلوان آ جاتی اور گھوڑے کے پاؤں پھسلنے لگتے۔ کبھی چڑھائی ہوتی اور جانور بری طرح ہانپنے لگتا۔ ایک دو جگہ ہمیں رکنا بھی پڑا۔ میں راستہ ذہن نشین کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

قریباً ڈیڑھ گھنٹے کے مشکل سفر کے بعد ہمیں گھوڑوں سے اتارا گیا اور آنکھوں سے پٹیاں کھول دی گئیں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہ وہی ڈھلوان ہے جہاں چند ہفتے پہلے تاجور چلتی

گاڑی سے گری تھی اور میں نے اس کے پیچھے گاڑی سے چھلانگ لگائی تھی۔ کچھ اوپر تاریک سڑک کے آثار بھی نظر آ رہے تھے۔

چاروں طرف تاریکی تھی۔ ہوا درختوں سے سائیں سائیں کرتی گزرتی تھی۔ باقر کے کہنے پر برقع پوش جاناں اور تاجور پالکی میں سے نکل آئیں۔ میں نے ان کی آنکھوں سے پٹیاں کھول دیں۔ میری پٹی پہلے ہی کھولی جا چکی تھی۔ سجاول کے ساتھیوں کے ہاتھوں میں ٹارچیں موجود تھیں لیکن اب وہ ان کو روشن نہیں کر رہے تھے۔

''آگے تھوڑا سفر پیدل کرنا ہوگا جی۔'' فخرو نے مجھ سے کہا۔

''کتنی دور جانا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''زیادہ نہیں۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

ہم ایک تنگ پگڈنڈی پر آگے پیچھے چلتے کوئی دو فرلانگ آگے گئے مجھے بائیں طرف پختہ سڑک کے آثار صاف نظر آ رہے تھے مگر سڑک بالکل خالی تھی۔ ایک جگہ سیاہ رنگ کی اسٹیشن وین کھڑی نظر آئی۔ اس میں ہماری ضرورت کی تمام چیزیں موجود تھیں۔ پروگرام کے مطابق سجاول کے خاص کارندے فخرو کو کوٹلی شہر تک ہمارے ساتھ جانا تھا۔ اس کے بعد اسٹیشن وین مجھے خود ڈرائیو کرنا تھی اور تاجور، جاناں وغیرہ کو ان کی منزل تک پہنچانا تھا۔

ہم صبح چار بجے کے لگ بھگ اسٹیشن وین پر روانہ ہوئے۔ میں، فخرو کے ساتھ اگلی نشست پر تھا۔ جاناں درمیان والی سیٹ پر لیٹی ہوئی تھی۔ سجاول کی ہدایت کے مطابق راستے میں، میں نے تاجور اور جاناں سے بالکل کوئی بات نہیں کی۔ دراصل سجاول نے اپنے کارندوں کو بالکل نہیں بتایا تھا کہ برقع میں جاناں کے علاوہ دوسری لڑکی کون ہے؟

کہیں کچی اور کہیں نیم پکی سڑک پر سفر کرتے ہوئے ہم دھوپ نکلنے تک اس مقام سے قریباً چالیس میل آگے نکل آئے۔ ایک جگہ رک کر گاڑی کے اندر ہی ناشتا کیا گیا۔ اب تک کے سفر میں صرف ایک جگہ ہمیں معمول کے ناکے پر روکا گیا۔ پولیس کے اہلکاروں نے فخرو سے پوچھا تھا کہ ہم کہاں سے آئے اور کہاں جا رہے ہیں۔ فخرو نے آزاد کشمیر کے ہی ایک قصبے کا نام بتایا تھا اور پچھلی نشست پر لیٹی ہوئی جاناں کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا۔ ''میری اس ہمشیرہ کو گردے کی سخت تکلیف ہے۔ اسے کوٹلی کے اسپتال لے کر جا رہے ہیں۔''

ہمیں آگے جانے دیا گیا تھا۔

ناشتے کے بعد ہم پھر روانہ ہو گئے۔ جوں جوں ہم بارونق علاقے میں پہنچ رہے تھے، دل کی دھڑکن بڑھ رہی تھی۔ اب شام ہونے والی تھی۔ ایک مقررہ جگہ پر فخرو گاڑی سے اتر گیا

اور اس نے چابی میرے حوالے کر دی۔ پروگرام کے مطابق اب اسے یہیں پر رہ کر میرا انتظار کرنا تھا۔ میں نے کل کسی وقت یا آج رات کو اسے فون پر اطلاع دینا تھی کہ میں کتنے بجے واپس کوٹلی پہنچ رہا ہوں۔

کوٹلی سے ہمارا سفر سیالکوٹ کی طرف شروع ہوا۔ سردی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ پلان کے مطابق میں نے سب سے پہلے تاجور کو اس کے مطلوبہ مقام تک پہنچانا تھا۔ اس کے لیے سب سے پہلے یہ کنفرم کرنا ضروری تھا کہ تاجور کے والدین واقعی اس سیکھرا نامی گاؤں میں موجود ہیں جس کا ذکر اس نے کیا تھا؟ اب سیل فون کے واضح سگنل آنے شروع ہو گئے تھے۔ میں نے تاجور کے بتائے ہوئے نمبر پر دو تین بار کوشش کی تو رابطہ ہو گیا۔ دوسری طرف سے تاجور کے والد چودھری دین محمد کی ہی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''کون ہے؟''

میں نے کہا۔ ''آپ کے لیے ایک خوش خبری ہے چودھری صاحب...... آپ کی بیٹی آپ سے بات کرنا چاہتی ہے......''

اس کے ساتھ ہی میں نے فون تاجور کو تھما دیا اور جاناں اور پہلوان کو اشارہ کیا کہ وہ گاڑی سے باہر آ جائیں۔ میں بھی باہر نکل آیا۔ میں چاہتا تھا کہ تاجور پوری تسلی سے والد سے اور گھر والوں سے بات کر لے۔

قریباً پانچ منٹ بعد تاجور نے کھڑکی کا شیشہ کھول کر مجھے اشارے سے پاس بلایا اور کہا کہ میں اس کے ابا جی سے گاؤں کا پتا ٹھیک سے پوچھ لوں۔ اس کے آنکھ کٹورے بھرے ہوئے تھے۔

دین محمد صاحب نے مجھے راستے کی تفصیل سے آگاہ کیا۔ آخر میں پوچھا۔ ''تم کون ہو پتر؟''

میں نے کہا۔ ''وہاں پہنچ کر آپ کو بتاتا ہوں۔''

دین محمد صاحب نے اس سے پہلے میری آواز سنی ہی نہیں تھی، وہ کیسے پہچانتے؟ اندازہ ہو رہا تھا کہ ابھی تاجور نے بھی انہیں میرے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ دین محمد صاحب نے مجھے جو ایڈریس بتایا وہ لالہ موسیٰ کے نواح میں سیکھرا گاؤں کا ہی تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ تاجور کا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔ اس کے اہلِ خانہ اسی گاؤں میں تھے جس کے بارے میں اس نے بتایا تھا۔ اپنے اندازے کی درستگی پر وہ بھی مطمئن دکھائی دینے لگی۔

جوں جوں تاجور سے جدائی کا وقت قریب آ رہا تھا، دل کی حالت ابتر ہو رہی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جب میں نے تاجور کے گھر والوں سے رابطے کے لیے فون کیا تھا، پتا نہیں

کیوں دل کی گہرائی میں کہیں یہ دبی دبی خواہش بھی پیدا ہوئی تھی کہ یہ رابطہ نہ ہو۔ تاجور کے گھر والے لاپتا رہیں...... اور...... وہ پھر میرے ساتھ واپس چلی جائے۔ مگر یہ سوچ صرف چند سیکنڈ کے لیے رہی تھی۔

ہم میرپور کے قریب سے ہوتے ہوئے لالہ موسیٰ کے نواحی علاقے میں پہنچ گئے۔ اب رات کے دس بج چکے تھے۔ ہم ایک تنگ سڑک پر سفر کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ اپنے طے شدہ پروگرام کے مطابق ہم ایک ایسے دیہی پیٹرول پمپ کے قریب پہنچنے والے تھے جس کا پتا مجھے سجاول نے بتایا تھا۔ اس نے تسلیم تو نہیں کیا تھا لیکن مجھے شک تھا کہ یہ پیٹرول پمپ اس کی ملکیت ہے یا وہ اس میں حصے دار ہے۔ وہ ڈکیت تھا، اس کا کام پمپ وغیرہ لوٹنا تھا، مگر وہ ایک پمپ میں مالک کی حیثیت بھی رکھتا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ اس طرح کے کئی اور ''کام'' بھی اس نے کر رکھے ہوں۔ مجھے اندازہ ہوا تھا کہ اس میں روپے کی ہوس بے انتہا ہے اور روپے کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔

اسٹیشن ویگن شکستہ سڑک پر ہچکولے کھاتی جا رہی تھی۔ میں نے اسٹیئرنگ کو مضبوطی سے تھاما ہوا تھا۔ تاجور میرے ساتھ والی نشست پر بیٹھی تھی۔ ہماری دونوں جانب جھاڑیاں اور قدرے بے آباد زمین تھی۔ جاناں بھی بالکل گم صم بیٹھی تھی۔ اس کا رنگ زرد تھا اور آنکھوں میں اداسی سی کروٹیں لیتی محسوس ہوتی تھی۔ شاید یہ وہی رومانی کیفیت تھی جس کا ذکر مانی مجھ سے کر چکی تھی۔ اچانک مجھے ٹھٹکنا پڑا۔ جونہی ہم ایک موڑ سے گھومے۔ سامنے ہی ٹارچوں کی روشنی دکھائی دی۔ مخالف سمت سے آنے والی ایک ٹریکٹر ٹرالی بھی یہاں کھڑی تھی۔ ٹرالی پر پانچ چھ عورتیں اور مرد نظر آ رہے تھے۔ دو تین بچے بھی تھے۔ یہ لوگ شاید کسی شادی سے لوٹے تھے۔ جس نے مجھے چونکایا تھا، وہ ایک موٹا تگڑا بندہ تھا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل دور سے ہی صاف دکھائی دیتی تھی۔ اس شخص کے پیچھے تین چار اور لوگ بھی موجود تھے۔ ان میں سے بھی دو مسلح دکھائی دے رہے تھے۔ ان کا انداز ہی بتا رہا تھا کہ جب ہم قریب پہنچیں گے تو یہ مسلح افراد ٹرالی کی طرح ہمیں بھی روک لیں گے۔ میں نے گاڑی کو پہلے ہی بریک لگا دیئے۔

''یہ...... کیا ہو رہا ہے؟'' پہلوان حشمت نے ڈری ڈری آواز میں پوچھا۔

''گڑبڑ ہے۔'' میں نے تائید کی۔

صاف پتا چل رہا تھا کہ مسلح افراد ٹرالی والوں سے چھینا جھپٹی کر رہے ہیں۔ میں اس وقت کسی بکھیڑے میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ پیچھے تاریک موڑ تھا۔ ممکن نہیں تھا کہ میں وین کو ریورس گیئر میں بھگا کر پیچھے لے جاتا۔ اسے تنگ سڑک پر فوراً

موڑنا بھی ممکن نہیں تھا۔ جو چیز مجھے زیادہ پریشان کر رہی تھی، وہ موٹے تگڑے شخص کی دید تھی۔ میں اسے پہچاننے میں غلطی نہیں کر رہا تھا۔ میں نے اس بندے کو چاندگڑھی میں دو تین بار پیر ولایت کے گھوڑے کے آگے آگے لگام تھام کر چلتے دیکھا تھا۔ اب یہ شخص چاندگڑھی سے پچاس ساٹھ کلو میٹر کے فاصلے پر یہاں لالہ موسیٰ کے نواح میں موجود تھا، اور راہزنی فرما رہا تھا۔

اسی اثنا میں پہلوان حشمت نے بھی اسے پہچان لیا، وہ سرسراتی آواز میں بولا۔ ''یہ تو مجھے جیرا قصائی لگت ہے۔ پیر ولایت کا چمچہ ہے......''

مسلح افراد نے اب تاڑ لیا تھا کہ ہم بھاگنے کی فکر میں ہیں، وہ ہماری طرف بڑھے۔ میں ان کی نظر میں ہرگز نہیں آنا چاہتا تھا۔ میں نے پگڑی کے پلو میں اپنا چہرہ مکمل طور پر چھپا لیا اور پہلوان حشمت سے بھی کہا کہ وہ چہرہ چادر سے ڈھانپ لے۔

دو مسلح افراد بھاگتے ہوئے ہماری طرف آئے۔ انہوں نے رائفلیں دھمکانے والے انداز میں ہماری طرف اٹھا رکھی تھیں۔

''رک جاؤ، اوئے۔ گولی ماردیں گے۔'' ایک بندے نے دور ہی سے چلا کر کہا۔

میں انجن بند کر کے اور چابی جیب میں ڈال کر نیچے اتر آیا۔ میں نے چادر کی بکل مار رکھی تھی اور بکل کے نیچے کولٹ پسٹل بالکل تیار حالت میں موجود تھا۔ جو دو بندے بھاگتے ہوئے میرے پاس آئے وہ بھی شاید چاندگڑھی کے ہی تھے۔ ان میں سے ایک کے رائفل پکڑنے کا انداز ہی بتا رہا تھا کہ وہ اس کام میں ابھی کچا ہے۔

''یہ زنانیاں کون ہیں تمہارے ساتھ؟'' ان میں سے ایک نے کڑک کر پوچھا۔

''ان میں سے ایک تیری بہن ہے اور دوسری ماں۔'' میں نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ تاہم جواب دیتے ہوئے، میں نے اپنی آواز ذرا بھاری کر لی تھی تا کہ ان لوگوں پر اضافی رعب پڑے۔

اور واقعی ان پر رعب پڑا۔ انہوں نے اپنے نصف چہرے ڈھاٹوں میں چھپا رکھے تھے، اور ڈھاٹا میں نے بھی لگا رکھا تھا۔

''کون ہو تم؟'' ان میں سے ایک نے قدرے لڑکھڑاتی آواز میں پوچھا۔

''اپنے باپ کو بلاؤ۔'' میں نے ہٹے کٹے جیرے قصائی کی طرف اشارہ کیا۔

جیرا ایک عورت کو تھپڑ مارنے کے بعد اس کے ہاتھوں سے زبردستی چوڑیاں اتروا رہا تھا۔ یقیناً یہ سونے کی ہی رہی ہوں گی۔ رائفل بردار نے جیرے کو آواز دی۔ ''استاد جی ادھر

آؤ ذرا۔"

استاد یعنی جیرے نے چونک کر ہماری طرف دیکھا۔ وہ بدمعاشوں کے انداز میں سینہ چوڑا کر کے اور بازو لہرا کر چلتا ہوا میری طرف آیا۔ ہاتھ میں خودکار رائفل تھی۔ میرے منہ پر ڈھاٹا دیکھ کر اور میرا انداز پرکھ کر وہ ذرا سا ٹھٹکا۔ قریب آ کر بولا۔ "کون ہو بھئی تم...... کیا چکر ہے؟"

"چکر تو تم بتاؤ، کس بہن کا جہیز اکٹھا کر رہے ہو یہاں؟"

بندہ سمجھ دار تھا، جان گیا کہ اونٹ پہاڑ کے نیچے آ گیا ہے۔ اس نے اپنے دونوں ساتھیوں کو اشارہ کیا، وہ ٹرالی کی طرف چلے گئے۔

"اپنے ہی قبیلے کے ہو؟"

"تمہارے قبیلے کا والد صاحب ہوں، سمجھو خصم ہوں تمہاری ماؤں کا۔"

اس کا چہرہ تمتما گیا، پھنکارا۔ "بات تو تمیز سے کرو۔"

میں نے ایک سیکنڈ ضائع کیے بغیر پستول کی نال اس کی پسلیوں سے لگا دی۔ "اپنی منحوس زبان چلاؤ گے تو، یہیں مار کر پھینک دوں گا۔" میں نے بھاری بھرکم، بدلی ہوئی آواز میں کہا۔

وہ جیسے تھرا کر رہ گیا۔ ایک سیکنڈ کے لیے لگا کہ شاید وہ کوئی اندھا دھند ردِعمل ظاہر کرے گا مگر پھر وہ سنبھل گیا۔ گہری سانس لے کر بولا۔ "راشد خان کے گروپ سے تو نہیں ہو؟"

پتا نہیں وہ کس حرامی کا ذکر کر رہا تھا۔ میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "گروپ کوئی بھی ہو، اب تم اپنی گندی صورت لے کر دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ ابھی اسی وقت...... اور وہ جو چوڑیاں شوڑیاں تم نے اتروائی ہیں اپنی ہمشیرہ کے ہاتھوں سے ابھی واپس کرو...... میرے سامنے۔"

"استاد جی! یاروں کے یار ہیں ہم...... ایسی کون سی بات ہے۔ آ...... آپ نے کہہ دیا...... تو ہو گیا۔" اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے ایک ساتھی کو رعب سے آواز دی۔ "اوئے دو نمبر...... ادھر آ...... یہ...... چوڑیاں واپس کر بی بی کو...... اور جانے دے ان لوگوں کو۔"

چمکیلے لباس والی ایک ادھیڑ عمر عورت نے ٹرالی کے اوپر سے دہائی دی کہ اس کے کانٹے بھی اتروائے ہیں ان لوگوں نے۔ میرے کہنے پر جیرے نے یہ کانٹے بھی فوراً واپس کیے۔

ٹرالی برق رفتاری سے شہر کی طرف روانہ ہو گئی۔ میں نے پستول اب تک جیرے کی پسلیوں سے لگایا ہوا تھا۔ میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "اگر ان ٹرالی والوں کے ساتھ کوئی حرامی پن کیا تُو نے تو بخشوں گا نہیں۔"

میرے الفاظ اور مہیب لہجے نے جیرے کا پتا پانی کر دیا تھا۔ وہ تو اب بس جان چھڑانے کی فکر میں تھا۔ اس کی ہدایت پر اس کے کارندوں نے قریبی درختوں میں چھپی ہوئی اپنی موٹر سائیکلز نکالیں اور ایک بغلی کچے راستے پر دھول اڑاتے نو دو گیارہ ہو گئے۔

بظاہر یہ سفر کے دوران میں پیش آنے والا ایک واقعہ تھا لیکن اس واقعے کا نتیجہ بعد میں کیا نکلا، اور اس نتیجے نے مجھے کس طرح متاثر کیا، اس کا ذکر میں آگے چل کر کروں گا۔

اب ایک بار پھر ہم اسٹیشن وین پر سوار اپنی منزل کی طرف گامزن تھے۔ پہلوان حشمت بھی میری طرح حیران تھا کہ چاند گڑھی سے اتنی دور پیر ولایت کے اس ''نیک نام'' چیلے سے ہماری ملاقات کیسے ہو گئی۔ اگر یہ لوگ جان جاتے کہ ہم اس علاقے میں ہیں تو تاجور کے لیے مشکلات پیدا ہو سکتی تھیں۔

جلد ہی ہم مطلوبہ پیٹرول پمپ پر پہنچ گئے۔ سجاول نے یہاں پہلے ہی اطلاع پہنچا دی تھی۔ یہاں موجود یونس نامی شخص نے ہمارے ساتھ پورا تعاون کیا۔ ہم نے اسٹیشن وین ایک چار دیواری کے اندر کھڑی کر دی۔ پروگرام کے مطابق پہلوان حشمت کو یہاں جاناں کے پاس رہنا تھا۔ میں نے تاجور کو ایک موٹر سائیکل پر لے کر آگے جانا تھا اور قریباً بیس کلو میٹر کا فاصلہ طے کر کے اسے اس کے والدین کے پاس پہنچانا تھا۔ پہلوان حشمت اور جاناں سمیت کسی کو اس گاؤں کا نام معلوم نہیں تھا۔ یہ بھید صرف میرے اور تاجور کے درمیان تھا۔

ون ٹین موٹر سائیکل مجھے فراہم کر دی گئی۔ اس کی ٹینکی فل تھی۔ ٹائر کو پنکچر لگانے کا سامان بھی موجود تھا۔ ایک طویل عرصے بعد سیل فون میرے ہاتھ آیا تھا۔ جی چاہا تھا کہ انیق کو فون کروں، مگر انیق والا فون تو ہم سے ملنگی ڈیرے پر ہی چھین لیا گیا تھا پھر بھی میں نے اس نمبر پر ٹرائی کیا لیکن کوئی رابطہ نہیں ہوا۔ لاہور میں داؤد بھائی اور مراد پور میں چاچا حفیظ سے رابطہ کرنے کو بھی دل چاہ رہا تھا مگر پھر میں نے صبر کرنا مناسب سمجھا۔ ہم نے اسٹیشن وین میں ہی کھانا کھایا پھر چل پڑے۔ سردی میں موٹر سائیکل کا سفر آسان نہیں ہوتا (اور خاص طور پر رات کے وقت کھلے علاقے میں) ہم نے خود کو حتی الامکان گرم کپڑوں میں لپیٹ لیا تھا۔ برقع اب غیر ضروری ہو گیا تھا۔ لہٰذا تاجور نے اتار کر وین میں رکھ دیا تھا۔

سڑک کہیں نیم پختہ اور کہیں بالکل کچا راستہ تھا۔ مجھے پتا تھا کہ ہماری پاکستانی عورتیں اکثر اپنا پلو لٹکائے رکھتی ہیں اور پلو کو موٹر سائیکل کے پہیے میں پھنسا بیٹھتی ہیں۔

''چادر سنبھال لی ہے؟'' میں نے تاجور سے پوچھا۔

اس نے جواب دینے کے بجائے بس ''ہوں'' کہنے پر اکتفا کیا۔

وہ عجیب کیفیت میں محسوس ہوتی تھی۔ یہ کچھ ملی جلی کیفیت تھی۔ اسے اپنے گھر والوں کے پاس واپس پہنچنے کی خوشی بھی تھی، ایک طرح کا خوف بھی تھا اور شاید...... شاید کچھ اداسی بھی تھی۔ بہرحال یہ بات تو صاف محسوس ہوتی تھی کہ وہ ذہنی طور پر مجھ سے فاصلے پر چلی گئی ہے اور اس کا ایک ثبوت یہ بھی تھا کہ وہ اس ہچکولے دار سفر کے باوجود میرا کندھا تھامنے یا کمر میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش نہیں کر رہی تھی۔ میں احتیاط سے چلا رہا تھا پھر بھی کسی وقت موٹر سائیکل اچھلتی تھی اور ڈر لگتا تھا وہ کہیں گر نہ پڑے۔

''میرے کندھے پر ہاتھ رکھ لو۔'' میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

ذرا توقف کرنے کے بعد اس نے میرا کندھا تھام لیا۔ تاہم اس گرفت میں جو لرزش اور بیگانگی تھی، وہ بھی عیاں تھی۔

کھیتوں میں بس کہیں کہیں روشنی دکھائی دیتی تھی۔ اکا دکا راہگیر بھی ملے۔ راہگیروں میں دو اسکوٹر سوار بھی دکھائی دیئے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ ان دیہاتی راستوں پر موٹر سائیکل کے ساتھ ساتھ اسکوٹر بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اسکوٹر میں فالتو ٹائر بھی ہوتا ہے اور خراب راستوں پر پنکچر ہونے کی صورت میں کام آتا ہے۔

ایک دو جگہ رک کر میں نے راستے کی تصدیق کی اور مجھے پتا چلا کہ ہم سیکھرا جانے کے لیے درست سمت میں سفر کر رہے ہیں۔ کسی وقت مجھے لگتا تھا کہ تاجور کچھ کہنا چاہ رہی ہے لیکن کہہ نہیں پا رہی۔ شاید میں بھی اس بوجھل خاموشی کو توڑنا چاہتا تھا لیکن توڑ نہیں پا رہا تھا۔ یہ جدائی کی گھڑی تھی اور کہا جاتا ہے کہ جدائی کی گھڑیاں ایسی ہی گمبھیر ہوتی ہیں۔

سفر کم ہوتا جا رہا تھا اور خاموشی برقرار تھی۔ اچانک مجھے ایک ہچکی سی سنائی دی۔ یہ تاجور ہی تھی۔ میں نے جلدی سے موٹر سائیکل کچے راستے کے کنارے پر روک دی۔ لائٹ بند کر کے انجن آف کیا اور نیچے اتر آیا۔ وہ بھی اتر آئی۔ گرم شال اس نے مضبوطی سے اپنے گرد لپیٹ رکھی تھی۔ اسی شال کا ایک چھوٹا گھونگھٹ سا پیشانی کی طرف بن گیا تھا۔ وہ سر جھکائے کھڑی تھی۔

''کیا بات ہے تاجور۔ تم رو رہی ہو؟''

اس نے ہولے سے نفی میں سر ہلایا مگر وہ جانتی تھی کہ اس کا جواب درست نہیں ہے۔

میں نے اسے بازو سے پکڑ کر ایک درخت کے گرے ہوئے تنے پر بٹھا دیا اور خود بھی اس کے پاس بیٹھ گیا۔ رات یخ بستہ اور خاموش تھی۔ درمیانی راتوں کا ٹھٹھرا ہوا چاند آہستہ آہستہ بدلیوں میں سفر کر رہا تھا اور اپنی منزل یعنی مغربی افق کی طرف جھکتا جا رہا تھا۔ دور فاصلے پر کسی

کاشتکار نے کھیتوں میں چھوٹا سا الاؤ بھڑکا رکھا تھا۔ دور سے یہ الاؤ کسی ٹمٹماتے دیئے کی طرح
ی دکھائی دیتا تھا۔
وہ جیسے کراہ کر بولی۔ "آپ نے...... میرے لیے...... بہت کچھ کیا ہے شاہ زیب! میں
آپ کے لیے کچھ نہیں کر سکی، مجھے معاف کر دیں۔"
میں نے کہا۔ "میں نے جو کچھ کیا ہے اس کے لیے تمہیں نہیں مجھے معافی مانگنی چاہیے۔"
"آپ غلط کہہ رہے ہیں۔ آپ میری سہیلی فرح کے کہنے پر صرف میری خاطر چاند
گڑھی آئے تھے اور آپ نے وہ سب کچھ کیا جو کر سکتے تھے اور یہ سچ ہے کہ آپ کی وجہ سے
عالمگیر کا زور ٹوٹ گیا اور حالات بدل گئے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اس پر کسی کا زور نہیں تھا اور
وہ میری ہی وجہ سے ہوا۔ میں نے ہی آپ سے کہا کہ آپ میری سہیلی کو ڈھونڈیں۔ میری
طرح آپ کو بھی پتا نہیں تھا کہ اس تلاش کی وجہ سے کیا کچھ ہو جائے گا۔"
"تاجور! تم نے مجھے کسی کام پر مجبور نہیں کیا تھا۔ میں نے جو کچھ کیا اپنی مرضی سے کیا۔
ہم سے کچھ غلطیاں بھی ہوئیں جن کی وجہ سے تمہاری ملازمہ نوری کو جان سے ہاتھ دھونا
پڑے۔ چاچا رزاق کی جان بھی گئی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ گاؤں میں تمہارے والدین کو
مشکل حالات کا سامنا کرنا پڑا اور پھر اپنے گھر بار کو خیر باد کہنا پڑا۔"
"تقدیر میں یہی کچھ لکھا تھا۔ لیکن یہ تو ہوا کہ ہم نے ریشمی کو بچا لیا اور پیر ولایت کے
پاپ کا یہ بھی کھول دیا......"
میں خاموش رہا۔ وہ بھی خاموش رہی۔ سرد ہوا دھیرے دھیرے کھیتوں میں اور درختوں
میں سرسراتی رہی، چاند کی کرنیں بادلوں سے آنکھ مچولی کھیلتی رہیں۔ خاموشی طویل ہوتی
جا رہی تھی۔ آخر تاجور نے کراہتی ہوئی سی آواز میں کہا۔ "مجھے لگتا ہے کہ...... میں نے آپ کا
دل دکھایا ہے...... اس کے لیے میں خود کو کبھی معاف نہیں کر سکوں گی...... آپ سے......
ایک...... چھوٹی سی...... درخواست بھی کرنا چاہتی ہوں......" اس کی آواز اشک بار تھی۔
"کہو تاجور!"
"آپ بہت اچھے ہیں، لیکن پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے کہ آپ جن لوگوں میں رہتے
ہیں وہ اچھے نہیں ہیں۔ آپ خطرناک طرح کی زندگی گزار رہے ہیں...... پتا نہیں کہ یہ آپ کی
مجبوری ہے یا کچھ اور بات ہے...... میری عقل اتنی نہیں کہ آپ کو سمجھا سکوں، بس اتنا کہہ سکتی
ہوں کہ...... آپ ان لڑائی جھگڑے والے کاموں سے دور چلے جائیں، ہو سکتا ہے کہ پھر
آہستہ آہستہ آپ دوسرے کام بھی چھوڑ دیں......" دوسرے کاموں سے اس کا مطلب یقیناً

سگریٹ نوشی، شراب نوشی اور اس طرح کے دیگر مشاغل تھے۔

اس بے چاری کو پتا نہیں تھا کہ بات اس سے کہیں آگے نکلی ہوئی ہے۔ وہ ایک ایسے شخص سے ہمکلام ہے جو گردن تک جرم کی دلدل میں دھنس چکا ہے اور موت کے اَن گنت ہرکاروں کو اپنے پیچھے لگائے پھرتا ہے...... وہ بہت کم جانتی تھی اور بہت زیادہ پریشان تھی۔

شاید اس کا خیال تھا کہ میں اس بارے میں کچھ کہوں گا لیکن میرے پاس کہنے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں، میں نے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ چادر کے عقب میں انگلیاں مروڑ رہی تھی۔ ''اب کہاں جائیں گے آپ؟''

''شاید واپس لاہور...... یا پھر ہو سکتا ہے کہ پاکستان سے باہر ہی جانا پڑے۔''

''میں آپ کے لیے...... دعا کیا کروں گی۔ میرا کہا سنا معاف کر دیجیے گا۔'' اس نے کہا اور جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ یوں لگا کہ وہ خود کو رونے سے بمشکل روکے ہوئے ہے۔

ہم دونوں پھر موٹر سائیکل کے پاس آ گئے۔ ''مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں۔'' میں نے کہا اور موٹر سائیکل پر بیٹھ گیا۔

وہ میرے عقب میں بیٹھ گئی۔ چاند بدلیوں کی اوٹ میں چلا گیا۔ کھیت کھلیان گہری تاریکی میں ڈوب گئے۔ میں نے موٹر سائیکل کی ہیڈ لائٹ آن کی اور ہم پھر سے روانہ ہو گئے۔

ہم مختلف چھوٹے بڑے دیہات اور بستیوں کے قریب سے گزرتے ہوئے آئے تھے۔ اب بھی آس پاس دیہات کے آثار دکھائی دیتے تھے۔ یہ سارا علاقہ ہی شاداب، آباد اور سرسبز تھا۔ آخر مجھے سیکھرا گاؤں کا ہیولا دکھائی دینے لگا۔ دور چاند کی سنہری کرنوں میں گاؤں کی مسجد کے بلند مینار پر نگاہ پڑ رہی تھی۔ گھروں کے مدھم خدوخال بھی دکھائی دیتے تھے۔

میں نے ایک بار پھر سیل فون پر دین محمد صاحب سے رابطہ کرنا چاہا، مگر مجھ سے پہلے ہی ان کی کال آ گئی۔ وہ کافی بے تاب تھے۔ چھوٹتے ہی بولے۔ ''پانچ بجنے والے ہیں پتر، کتنی دیر میں پہنچو گے؟ ہم تو گاؤں سے باہر ہی کھڑے ہیں۔'' ان کی آواز سردی اور تناؤ کے سبب لرز رہی تھی۔

مجھے دور درختوں کا ایک جھنڈ دکھائی دے رہا تھا۔ اس جھنڈ میں تین کھجور کے درخت سب سے نمایاں اور بلند تھے۔

میں نے کہا۔ ''دین محمد صاحب، گاؤں سے باہر جو تین کھجوریں نظر آ رہی ہیں ہم وہیں

پر ہیں۔آپ آ جائیں۔"

"تم......گاؤں کے اندر کیوں نہیں آ جاتے؟" دین محمد صاحب کے لہجے میں شکوک کی جھلک دکھائی دی۔

"ایسی کوئی بات نہیں دین محمد صاحب! بس میں ذرا احتیاط کرنا چاہتا ہوں......لیں، یہ آپ تاجور سے بات کر لیں۔"

میں نے سیل فون تاجور کی طرف بڑھایا، اس نے الجھی ہوئی سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ پھر والد سے مخاطب ہو کر بولی۔ "یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں ابا جی......آپ ان درختوں کے پاس آ جائیں۔ ہم بھی پاس ہی ہیں۔"

دوسری طرف سے کچھ اور بھی پوچھا گیا۔ جواب میں تاجور نے نفی میں سر ہلایا......

"نہیں ابا جی......اور کوئی نہیں......ہم دونوں ہی ہیں۔"

پھر دوسری جانب سے کوئی مزید سوال کیا گیا، تاجور نے گڑبڑائے ہوئے انداز میں کہا۔ "مجھے نہیں پتا ابا جی، ابھی آپ خود ہی بات کر لینا۔"

میں بھانپ گیا کہ تاجور کے والد نے کیا پوچھا ہوگا۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ تاجور کے ساتھ آنے والا میں یعنی شاہ زیب ہی ہوں؟ تاجور نے اس کا گول مول جواب دیا تھا۔

آخر میں وہ بولی۔ "ٹھیک ہے ابا جی، آ جائیں جلدی۔"

بات ختم کر کے اس نے سیل فون مجھے تھما دیا۔ میں نے موٹر سائیکل دوبارہ اسٹارٹ کی۔ تاجور ذرا سا اچھل کر میرے عقب میں بیٹھ گئی۔ اس کا ہاتھ میرے کندھے پر تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے یہ الوداعی لمس ہے۔ چوڑیوں کی مدھم کھن کھن......اس کے جسم کی دیوانہ کر دینے والی مہک، اس کے لباس کی سرسراہٹ، میں سب کچھ محسوس کر رہا تھا......اور سفر ختم ہو رہا تھا۔

میں نے اب موٹر سائیکل کی ہیڈ لائٹ روشن نہیں کی تھی۔ ویسے بھی اب اندھیرے میں اجالے کی آمیزش ہونا شروع ہو گئی تھی۔ دور تک ہرے ہرے کھیت اور ان پر چھایا ہوا کہرا دکھائی دیتا تھا۔ درختوں کے جھنڈ میں پہنچ کر میں نے موٹر سائیکل بند کر دی۔ ہم دونوں آمنے سامنے کھڑے ہو گئے۔ میں نے کہا۔ "تاجور! میں اس سے آگے نہیں جاؤں گا۔"

"کیا مطلب؟"

"میں دین محمد صاحب سے نہیں ملوں گا۔ مجھ میں اتنی ہمت ہی نہیں کہ ان کا سامنا کر سکوں۔ بس، ان سے کہنا مجھے معاف کر دیں۔"

وہ بڑبڑائی۔ ''مجھے پہلے ہی شک تھا کہ آپ ایسا کریں گے۔''
''بس سمجھ لو کہ یہ بھی میری مجبوریوں میں سے ایک مجبوری ہے۔ ویری سوری۔''
''میں انہیں کیا بتاؤں کہ کس کے ساتھ یہاں پہنچی ہوں۔'' وہ آزردہ لہجے میں بولی۔
''بتا دینا میرے بارے میں...... اور یہ بھی کہہ دینا کہ تمہیں اتار کر فوراً واپس چلا گیا ہوں۔''
اتنے میں دور فاصلے پر ایک سرخ ٹریکٹر ہچکولے کھاتا دکھائی دیا۔ یہ سیکھرا گاؤں کی طرف سے ہی آ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''تاجور! لگتا ہے، تمہارے گھر والے آ گئے ہیں۔''
وہ سمجھی کہ میں جا رہا ہوں۔ ہکلا کے بولی۔ ''یہ...... کہیں...... کوئی اور نہ ہو؟''
''گھبراؤ نہیں۔ میں ابھی یہیں ہوں۔ تم جاؤ، میں یہاں سے دیکھتا رہوں گا۔ جب دین محمد صاحب تم کو دیکھ لیں گے، تم سے بات کر لیں گے، میں پھر ہی جاؤں گا۔''
اس نے میری طرف دیکھا اور اس کی آنکھیں ایک بار پھر ڈبڈبا گئیں۔ ٹریکٹر تیزی سے اچھلتا ہوا کچھ نزدیک آ چکا تھا۔ میں نے آنکھیں سکیڑ کر دیکھا اور دور سے ہی پہچان لیا۔ یہ وہ ٹریکٹر تھا جسے میں چاند گڑھی میں چلاتا رہا تھا۔ اس پر ڈرائیونگ سیٹ کے علاوہ دو مزید بندوں کے بیٹھنے کی جگہ بھی تھی۔ فاصلہ کچھ اور کم ہوا تو مجھے دین محمد صاحب اور ان کی پگڑی کا شملہ صاف دکھائی دینے لگا۔ اب تاجور کو بھی کافی حد تک پتا چل گیا تھا کہ یہ اس کے ابا جی ہیں۔ ڈرائیونگ کوئی اور شخص کر رہا تھا...... اور اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کے کندھے پر رائفل بھی موجود ہے۔ ہمارا اور ٹریکٹر کا درمیانی فاصلہ اب بھی 100 میٹر سے زیادہ تھا۔
تاجور نے میری طرف دیکھا۔ ''اللہ حافظ۔'' میں نے کہا۔
''اللہ حافظ۔'' اس نے بھی کانپتے ہونٹوں کے ساتھ جواب دیا۔
وہ کچھ دیر ساکت کھڑی میری طرف دیکھتی رہی، پھر پلٹ گئی۔ وہ دھیمے سُست قدموں کے ساتھ جا رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگا کہ وہ مڑ کر دیکھے گی۔ وہ چلتی گئی...... اس نے دیکھا نہیں۔ اور شاید اچھا ہی کیا کہ نہیں دیکھا۔ اگر وہ ایسا کرتی تو یقیناً میرے دل پر پڑا ہوا بوجھ کچھ اور بڑھتا۔ دم بہ دم پھیلتے اجالے میں وہ چلتی چلی گئی۔ اس کی گلابی اور سفید شال مجھے دور تک نظر آتی رہی۔ اسے دیکھ کر ٹریکٹر رک گیا تھا۔ اس پر سے دین محمد صاحب اور ان کا ساتھی اترے اور تیزی سے تاجور کی طرف بڑھے۔ باپ کو دیکھ کر تاجور کی رفتار تیز ہوئی۔ پھر چند سیکنڈ بعد وہ بھاگ اٹھی...... اور بازو کھول کر دین محمد صاحب سے لپٹ گئی۔ انہوں نے اسے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ جیسے کوئی پرندہ اپنے بچے کو پروں میں چھپاتا ہے۔

میں نے ایک گہری سانس لی۔ موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور رخ موڑ کر واپس اس طرف چل دیا، جدھر ایک سنسان پیٹرول پمپ پر پہلوان حشمت اور جاناں میرا انتظار کر رہے تھے۔ دل پر ایک بھاری...... بہت بھاری بوجھ تھا لیکن اس بوجھ کی تکلیف کے اندر ایک عجیب سی طمانیت بھی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں نے تاجور کو بہت بڑی بڑی مصیبتوں کی زد میں آنے سے بچالیا ہے۔

جب میں اس دیہی پیٹرول پمپ پر پہنچا تو دن کافی چڑھ آیا تھا۔ دھند غائب ہو چکی تھی اور ایک چمکیلی دھوپ دھیرے دھیرے نمایاں ہوتی جا رہی تھی۔ اسٹیشن ویگن پمپ پر ہی موجود تھی لیکن مجھے وہاں کچھ افراتفری سی نظر آئی۔ پہلوان حشمت ویگن سے باہر ہی ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ یونس بھی اس کے قریب موجود تھا۔ دو افراد جو غالباً پمپ کے ملازم تھے، قریب ہی کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک فون کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر حشمت تیزی سے میرے پاس آیا اور بولا۔ ”ایک گڑبڑ ہوگئی ہے شاہ زیب۔“

”کیا ہوا؟“ میں نے موٹر سائیکل سے اترتے ہوئے پوچھا۔

”وہ لڑکی جاناں مجھے بتائے بغیر چلی گئی ہے۔“

اس کے ساتھ ہی پہلوان نے ایک چھوٹا سا رقعہ میری طرف بڑھا دیا۔ میں جاناں کی تحریر پہچانتا تھا۔ یہ اسی نے لکھا تھا۔ ”پہلوان جی، میں اپنی مرضی سے جا رہی ہوں۔ آپ بالکل بھی پریشان نہ ہوں۔ مجھے یہاں ایک جاننے والا نظر آ گیا ہے۔ اس کے ساتھ حفاظت سے لاہور پہنچ جاؤں گی۔ میری طرف سے شاہ زیب کا بھی بہت بہت شکریہ ادا کر دیں۔ میں ان کا احسان نہیں دے سکتی۔“

”کہاں ملا یہ؟“ میں نے پہلوان سے پوچھا۔

”ویگن کے اسٹیئرنگ پر رکھا ہوا تھا۔“ پہلوان نے سٹپٹائے ہوئے انداز میں کہا۔

”کتنی دیر پہلے کی بات ہے؟“

”تمہارے جانے کے پندرہ بیس منٹ بعد ہی مجھ سے کہوت تھی کہ میرے سر میں سخت درد ہووے ہے۔ وہ سامنے ہی اسپتال کا میڈیکل اسٹور ہے۔ میں نے سوچا وہاں سے ڈسپرین وغیرہ لادیوت ہوں۔ مشکل سے تین چار منٹ لگے ہوویں گے۔ واپس آیا تو وہ ناہیں تھی۔ اِدھر اُدھر دیکھا کہیں ناہیں ملی۔ پھر میں نے یونس بھائی کو جگایا۔ کافی دیر ہم لوگ آس پاس کی سڑکوں پر دیکھتے رہے۔ تھک کر واپس آئے تو اسٹیئرنگ پر یہ رقعہ رکھا ہوا ملا۔“

میں تلملا کر رہ گیا۔ یہ تیسری مرتبہ تھی کہ جاناں نے ایسی حرکت کی تھی۔ اچھی بھلی سیانی

تھی پھر پتا نہیں اس طرح کی حماقت کیوں کر جاتی تھی۔ پہلے وہ گاؤں میں رام پیاری اور وکرم والی پناہ گاہ چھوڑ کر گئی اور لاہور جانے کی کوشش میں پکڑی گئی۔ پھر سجاول کے ڈیرے پر، میرے بہت منع کرنے کے باوجود وہ احاطے میں اکیلی نکلی اور سردار اعظم کے ہتھے چڑھی۔ اب اس نے پھر سے من مانی کر ڈالی تھی۔

یونس کے ایک ادھیڑ عمر ملازم نے کہا۔ ''میں وہاں کیبن میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ مجھے ایک برقع کی جھلک نظر آئی۔ ساتھ ایک دبلا پتلا بندہ بھی تھا۔ وہ دونوں سڑک کی طرف جا رہے تھے۔ میرے وہم گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ آپ کے ساتھ آنے والی کڑی ہو گی۔''

اس اطلاع نے سخت بدمزہ کیا تھا۔ پتا نہیں وہ کس ٹائپ کی تھی۔ یہ بات بھی سوچنے والی تھی کہ اس دور افتادہ جگہ پر اسے اپنا کوئی شناسا اچانک کیسے دکھائی دے گیا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ یونہی کسی کے ساتھ چل پڑی ہو۔ اکیلی خوب صورت لڑکی کے لیے کسی کا ساتھ ڈھونڈنا کون سا مشکل کام تھا۔

پہلوان قدرے شرمندہ بھی نظر آ رہا تھا۔ ایک طرح سے میں اسے جاناں کا نگہبان مقرر کر کے گیا تھا لیکن اس کا بھی کیا قصور تھا۔ میری طرح اس کے سان گمان میں بھی نہ ہو گا کہ وہ کوئی اس طرح کی حرکت کرے گی۔ پتا نہیں اس نے کیا سوچا تھا۔ شاید دماغ میں یہ بات چل رہی ہو کہ وہ برقع میں ہے اس لیے اکیلی سفر کر کے زیادہ محفوظ رہے گی۔

دل بوجھل تھا۔ یونس کا ملازم مزے دار سیالکوٹی ناشتا لایا۔ حلوہ پوری گرما گرم چنے، اچار اور دہی وغیرہ۔ میں بس دو چار لقمے ہی لے سکا۔

میں محسوس کر رہا تھا کہ اب ہمارا یہاں زیادہ دیر رکنا بھی ٹھیک نہیں۔ پروگرام کے مطابق پہلوان کو اب یہیں سے چاند گڑھی کے لیے روانہ ہو جانا تھا۔ میں نے پہلوان کو انیق کے لیے اپنا پیغام تحریری شکل میں دیا۔ اس کے علاوہ اسے اپنا موجودہ سیل نمبر بھی دیا اور کہا کہ وہ مجھ سے رابطہ کرے۔ رابطہ نہ ہونے کی صورت میں اسے ایک دو روز تک یہاں اسی پیٹرول پمپ پر آ جانا تھا۔ یونس نامی یہ بندہ اسے میرے اور سجاول کے پاس پہنچانے کا انتظام کر سکتا تھا۔

وقتِ رخصت پہلوان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ وہ بولا۔ ''میرے لیے دعا کرنا شاہ زیب! پتا ناہیں چاند گڑھی میں اب کیا پیش آوے۔''

دراصل وہ عالمگیر وغیرہ سے ڈر رہا تھا۔ ویسے اسے کوئی فوری خطرہ تو نہیں تھا۔ جب سجاول کے ڈیرے پر آگ لگی اور میں اور تاجور عالمگیر کی نظر میں آئے تو پہلوان اس صورتِ حال سے بچ گیا تھا۔ وہ عالمگیر وغیرہ کی نگاہ میں نہیں آیا تھا۔ لیکن پہلوان کو اندیشہ تھا کہ جلد یا

بدیر عالمگیر پر یہ راز کھل جائے گا۔ اسے معلوم ہو جائے گا کہ جب سجاول نے اپنے ڈیرے پر اس کی میزبانی کی تو پہلوان بھی ڈیرے پر موجود تھا (یعنی پہلوان ایک طرح سے سجاول اور عالمگیر کی خفیہ دوستی کا ایک اور گواہ بن سکتا تھا)

جاتے جاتے پہلوان پھر مڑ کر واپس آ گیا۔ اس نے مجھ سے دوبارہ معانقہ کیا اور بولا۔

''شاہ زیب! میری سمجھ میں تو ایک ہی بات آوت ہے، اگر اب مجھے اور میرے بچوں کو چاند گڑھی میں رہنا ہے تو مجھے عالمگیر اور پیر ولایت سے بہت بنا کر رکھنا ہووے گی۔ وہ کیا کہوت ہیں، وقت پڑنے پر گدھے کو بھی...... گدھے کو بھی کچھ کیا جا سکت ہے......''

میں نے پہلوان کو تسلی تشفی دی اور یہ بھی کہا کہ میں اس کے حالات سے باخبر رہوں گا۔

○......❖......○

میری واپسی کا سفر شروع ہو چکا تھا۔ میں دس بجے کے لگ بھگ پیٹرول پمپ سے اسٹیشن ویگن لے کر نکلا اور کوٹلی کی طرف روانہ ہو گیا۔ کوٹلی تک کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ بس ڈرائیونگ ہوتی رہی۔ میری نگاہیں سامنے سڑک پر تھیں اور ذہن اَن گنت خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ میں واپس تو آ گیا ہوں مگر اپنی آنکھیں وہیں درختوں کے اس جھنڈ میں چھوڑ آیا ہوں جہاں تاجور مجھ سے وداع ہوئی تھی۔ اس کا آہستہ آہستہ چلتے ہی جانا، مڑ کر نہ دیکھنا اور پھر دور ایک کچے راستے پر اپنے والد کی بانہوں میں چلے جانا۔ شاید اسے ٹھیک سے احساس نہیں تھا کہ میں نے اسے خود سے جدا کرنے کے لیے اپنے اوپر کیا کیا عذاب جھیلے ہیں اور جو کچھ کیا تھا اس کے لیے کیا تھا۔ اس کی بھلائی اور اس کی بہتر زندگی کے لیے۔ مجھے پتا تھا اگلے چند ہفتے یا مہینے مجھ پر بہت کٹھن گزریں گے مگر پوری امید تھی کہ میں خود کو سنبھالنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔

ڈرائیونگ کرتے ہوئے گاہے بگاہے جاناں کی جلد بازی کا خیال بھی ذہن میں آتا تھا مگر اب اس کے لیے نیک خواہشات کے سوا اور کیا کیا جا سکتا تھا۔

سہ پہر کے وقت میں کوٹلی شہر کے آس پاس پہنچ گیا۔ راستے میں ایک دفعہ چاچا حفیظ سے ٹیلی فونک رابطے کی کوشش کی لیکن ناکامی ہوئی۔ فخرو سے بھی رابطہ کیا۔ پہلی کوشش ناکام ہوئی لیکن دوسری کامیاب رہی۔ فخرو نے کہا کہ وہ مجھے مقررہ جگہ پر کھڑا ملے گا۔

وہ اپنے کہے کے مطابق طے شدہ جگہ پر موجود تھا۔ ہم ایک پاس کے ہوٹل میں چلے گئے۔ متوسط درجے کا ریسٹورنٹ تھا۔ میں منہ ہاتھ دھو کر فریش ہوا۔ ہم نے وہاں کھانا کھایا اور ایک بار پھر روانہ ہو گئے۔ ہم نے فیول ٹینکی فل کرا لی تھی۔ اس مرتبہ ڈرائیونگ سیٹ فخرو

نے سنبھالی۔ میں ساتھ والی نشست پر بیٹھا اور وین بل کھاتی شکستہ سڑک پر ہچکولے لیتی شمال کی جانب رواں ہوگئی...... شمال جہاں ایک دشوار گزار علاقے میں، گھنے جنگل کے اندر سجاول نے اپنی ایک چھوٹی سی الگ دنیا بنا رکھی تھی۔

رات نو بجے تک ہم اپنی منزل سے پندرہ بیس کلومیٹر دور رہ گئے۔ سڑک سنسان تھی۔ بس کبھی کبھار ہی کوئی گاڑی یا مال بردار ٹرک دکھائی دیتا تھا۔ فخرو اچھی ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کوئی سوال کیا تھا اور نہ میں نے اسے کچھ بتایا تھا۔ بس ہم اِدھر اُدھر کی باتیں ہی کرتے رہے تھے۔ اچانک مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا۔ شاید کوئی مدھم آواز تھی جو وین کی عقبی نشستوں کی طرف سے آئی تھی۔ جیسے وہاں کوئی زندہ چیز موجود ہو...... کیا وہاں کوئی چوہا وغیرہ تھا۔

قریباً چار پانچ منٹ بعد یہ مدھم آہٹ دوبارہ سنائی دی۔ فخرو نے تو نوٹ نہیں کیا، مگر میری چھٹی حس ایک ہلکا سا الارم بجانے لگی۔ میں نے کن انکھیوں سے فخرو کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہیں سامنے تارکول کی شکستہ سڑک پر جمی تھیں اور وہ اطمینان سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”فخرو! ذرا گاڑی روکو۔“

اس نے پہلے تو تعجب سے میری جانب دیکھا، پھر گاڑی سڑک سے اتار کر ایک طرف روک دی۔

میں نیچے اترا اور سلائیڈنگ دروازہ کھول کر عقبی نشستوں کی طرف گیا۔ یہاں بالکل آخر میں عقبی اسکرین کے نیچے ایک لمبوترا خانہ سا بنا ہوا تھا۔ چوڑائی کوئی ڈیڑھ فٹ اور لمبائی پانچ فٹ کے لگ بھگ ہوگی۔ شاید اس خانے سے وہی کام لیا جاتا تھا جو کار میں ڈکی کا ہوتا ہے۔ یعنی اوزار اور دیگر اشیا یہاں رکھی جاتی ہیں۔ مجھے شبہ ہوا کہ آواز اسی ڈکی نما خانے سے آئی تھی۔ میں نے احتیاطاً کولٹ پسٹل نکال لیا۔

”کیا بات ہے جناب؟“ فخرو نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”یہاں پیچھے کچھ ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

وہ کچھ سمجھ نہیں پایا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس خانے کا کھٹکا تلاش کیا اور ڈھکن اٹھا دیا۔ وین کی اندرونی روشنی میں مجھے جو کچھ نظر آیا، وہ سکتہ زدہ کر گیا۔ خلا میں جاناں لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی نگاہیں مجھ پر جمی تھیں اور چہرہ بے تاثر تھا۔ ڈھکن اٹھنے کے بعد وہ اٹھ بیٹھی۔ وہ اسی لباس میں تھی جس میں ہمارے ساتھ روانہ ہوئی تھی۔ زیریں جسم پر سیاہ برقع تھا۔ برقع کا اوپر والا حصہ اس کے کندھوں پر تھا اور لمبے سیاہ بال چہرے پر منتشر ہو رہے تھے۔ شولڈر بیگ اس

کی گود میں تھا۔

میں نے کولٹ پسٹل دوبارہ قمیص کے نیچے لگالیا اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ''یہ سب کیا ہے؟'' میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔

''مجھے واپس نہیں جانا۔'' وہ حتمی لہجے میں بولی۔

اس کے لہجے کی مضبوطی اور استحکام نے مجھے چونکا دیا۔

''یہ کیا تماشا لگایا ہے تم نے؟'' میرا پارا چڑھنے لگا۔ ''ہم بے وقوفوں کی طرح وہاں تمہاری تلاش میں بھاگے پھرے ہیں اور تم...... یہاں گھس کر بیٹھی ہوئی ہو، تمہارے ہوش تو ٹھکانے پر ہیں؟''

''میں نے آپ سے کہا ہے نا کہ میں اب واپس جانا نہیں چاہتی۔'' اس نے کہا اور خود کو سمیٹتی ہوئی خلا سے نکل آئی۔

مجھے حیرانی ہو رہی تھی، وہ پچھلے سولہ سترہ گھنٹوں سے بھوکی پیاسی اس تابوت نما جگہ میں بند تھی۔ اگر موسم سرد نہ ہوتا تو یقیناً یہ حبس کی وجہ سے بے ہوش ہو چکی ہوتی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ اس لڑکی نے ایسا کیوں کیا ہے۔ فخرو بھی ششدر کھڑا تھا۔

میں نے اسے بازو سے پکڑ کر جھنجوڑا۔ ''تمہیں پتا ہے تم کیا کہہ رہی ہو؟ دیوانی ہو گئی ہو کیا؟''

اس نے الجھی ہوئی نظروں سے فخرو کی طرف دیکھا۔ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہی ہو کہ وہ اس کی موجودگی میں بات کرنا نہیں چاہتی۔

میں نے سٹپٹائے ہوئے انداز میں فخرو سے کہا۔ ''فخرو! تم ذرا دو منٹ کے لیے ہٹ جاؤ یہاں سے۔''

وہ کچھ فاصلے پر ایک درخت کے نیچے جا کر کھڑا ہو گیا۔

میں نے کہا۔ ''بتاؤ اب...... یہ کیا بے ہودہ ناٹک رچایا ہے تم نے؟''

''یہ کوئی ناٹک نہیں۔ میں جو کہہ رہی ہوں، سوچ سمجھ کر کہہ رہی ہوں۔ لاہور میں میرے لیے بہت سے خطرے ہیں۔ میں اب آپ کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ جہاں آپ جائیں گے میں بھی وہاں جاؤں گی۔''

''ٹھیک ہے، لاہور میں تمہارے لیے بہت خطرے ہیں، اور وہاں سجاول کے ڈیرے پر تو تمہیں بڑی شاندار قسم کی چادر اور چار دیواری مل جائے گی۔ وہاں وہ خبیث وڈا سردار کسی بھیڑیے کی طرح چکراتا ہے۔ ایک دن کھینچ کر لے جائے گا تمہیں اپنے بستر پر، حشر خراب کر

ڈالے گا تمہارا۔''

''مجھے کسی کی کوئی پروانہیں۔ میں نے کہہ دیا ہے نا کہ مجھے اب آپ کے ساتھ ہی رہنا ہے۔'' اس نے عجیب لہجے میں کہا۔

''یہ کیا''اب اب'' لگا رکھی ہے۔ اب کیا ہو گیا ہے، جو کل تک نہیں تھا۔'' میں نے تڑخ کر کہا۔

''بس کچھ ہو گیا ہے۔'' وہ بدستور میری جانب دیکھ رہی تھی۔

''ایسے ٹکر ٹکر کیا دیکھ رہی ہو۔ ختم کرو یہ تماشا۔ مجھے ایسی ڈرامے بازیاں زہر لگتی ہیں۔''

وہ ذرا توقف سے بولی۔''برا نہ ماننا، ڈرامے تو آپ بھی کرتے رہے ہیں، کبھی کسی روپ میں...... کبھی کسی روپ میں۔''

''تم پہیلیاں نہ ہی بجھواؤ تو اچھا ہے۔ سیدھی بات کرو۔ میرا صبر جواب دے رہا ہے۔''

اس کی آنکھوں کے کنارے سرخ ہو گئے۔ ناک بھی سرخ دکھائی دینے لگی۔ جذباتی لہجے میں کہنے لگی۔''میں آپ کو جانتی تو پہلے سے تھی، اب پہچان بھی گئی ہوں، اور جب بندہ کسی کو اچھی طرح پہچان لیتا ہے تو پھر اس کے بارے میں رائے بھی بدل جاتی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ ہماری ملاقات پرانی ہے۔''

میں اندر سے ٹھٹک گیا لیکن چہرے سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔''تم کس ملاقات کی بات کر رہی ہو؟''

''آپ کو پتا ہے لیکن آپ چھپا رہے ہو۔ حالانکہ آپ نے بے دھیانی میں خود ہی مجھے بتا بھی دیا ہے۔''

''بتا بھی دیا ہے؟ کیا بتایا ہے اور کب؟'' میرا پارا واقعی بلندی کی طرف جا رہا تھا۔

وہ میری طرف دیکھے بغیر ڈرامائی لہجے میں بولی۔''کل رات جب لالہ موسیٰ کی طرف جاتے ہوئے ہمیں مسلح لوگوں نے روکا اور آپ نے ان کے بڑے سے بات کی تو مجھے سب کچھ پتا چل گیا۔''

پہلے تو اس کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی، پھر میرا دماغ جیسے بھک سے اُڑ گیا۔ چند سیکنڈ کے اندر آنکھوں کے سامنے ایک تیز رفتار فلم سی چل گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے کڑی سے کڑی ملی اور مجھے پتا چل گیا کہ جاناں یہاں کیوں ہے؟ جب جیرے قصائی اور اس کے لوگوں نے ہمیں روکا تو میں نے منہ پر ڈھاٹا لگا کر اور ذرا آواز بدل کر جیرے سے بات کی تھی اور میرا یہی انداز ہوتا تھا جب میں چاند گڑھی میں ایک دوسرا روپ دھار کر نکلتا تھا اور عالمگیر وغیرہ

کے خلاف کوئی کارروائی ڈالتا تھا۔ غلطی انسان سے ہی ہوتی ہے اور مجھ سے بھی یہ غلطی ہوگئی تھی کہ میں جیرے قصائی سے بات کرتے ہوئے وین میں جاناں کی موجودگی کو بھول گیا تھا۔ جاناں نے وہ سب کچھ دیکھا اور سنا تھا۔ اس دیکھنے اور سننے نے اس کا ذہن سیدھا ''یاسر بھائی'' کی طرف منتقل کر دیا تھا اور شاید اسے یقین ہو گیا تھا کہ یاسر اور شاہ زیب ایک ہی شخصیت کے دو روپ ہیں۔

میں اندر سے تو بے طرح سٹپٹایا لیکن چہرے سے میں نے زیادہ کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ میں نے کہا۔ ''جاناں، تمہاری بک بک میری سمجھ میں بالکل نہیں آئی...... تمہارے کھوتے دماغ میں یہ سیدھی سادی بات کیوں نہیں آرہی کہ میں نے کوشش کر کے تمہیں یہاں سے رہائی دلوائی ہے اور تم پھر یہاں اس چنگل میں پھنسنا چاہ رہی ہو۔ یہاں تمہیں شرابی مردوں اور بے عزتی کی موت کے سوا اور کچھ نہیں ملے گا۔''

''اگر آپ کا ساتھ ہے تو میں سب کچھ جھیل سکتی ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''تم اپنے ہوش میں نہیں ہو۔ چلو بیٹھو آگے سیٹ پر۔ ہم تمہیں واپس چھوڑ کر آئیں گے۔ ابھی...... اسی وقت۔'' میرا انداز فیصلہ کن تھا۔

اس کی ناک پھر سرخ ہوگئی۔ اشک بار لیکن مضبوط لہجے میں بولی۔ ''میں آپ سے درخواست کرتی ہوں، مجھ سے زبردستی نہ کریں...... نہیں تو......''

''نہیں تو کیا......؟''

''نہیں تو میں اپنے ساتھ جو کچھ کروں گی اس کی ذمے داری صرف اور صرف آپ پر ہو گی۔''

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور فوراً جان گیا۔ وہ خالی خولی دھمکی نہیں دے رہی تھی۔ وہ کوئی بھی احمقانہ حرکت کر سکتی تھی۔ خود کو زخمی کر سکتی تھی۔ کھائی میں کود کر اپنا ہاتھ پاؤں تڑوا سکتی تھی...... اور اس طرح کے دیگر اقدام۔

میں جانتا تھا وہ ''یاسر'' سے محبت کرنے لگی ہے۔ وہ یاسر جس نے اسے اپنی جان خطرے میں ڈال کر سجاول کے ساتھیوں کے چنگل سے بچایا تھا اور رام پیاری والی پناہ گاہ میں پہنچایا تھا۔ اسے وہاں ہر طرح کی سہولت فراہم کی تھی، اس کے وہ کٹھن ترین دن بے لوث ہمدردی اور توجہ سے آسان کیے تھے۔ وہاں اس نے رام پیاری سے یاسر کی دلیری اور انسان دوستی کے قصے سنے تھے اور اس کے غائبانہ عشق میں مبتلا ہوگئی تھی...... اور کل رات اس پر انکشاف ہوا تھا کہ وہ جس یاسر سے ملی تھی، وہ کوئی اور نہیں میں ہی ہوں...... اور یہ میں ہی

ہوں جو ڈکیت بھیڑیوں کے اس خطرناک غول میں اس کی بچی کھچی عزت اور زندگی کا ضامن بنا ہوں۔

عورت ایک پہیلی ہے اور یہ پہیلی اس تاریک رات میں اس اسٹیشن وین کے اندر اپنے تمام تر اسرار اور پیچیدگی کے ساتھ میرے سامنے تھی۔

وہ کہہ رہی تھی، واپس نہیں جائے گی اور اگر زبردستی بھیجی گئی تو وہ خود کو نقصان پہنچا لے گی۔

میں نے چند منٹ اس کے ساتھ مزید سر کھپایا پھر طیش سے میرا دماغ گھوم گیا۔ میں نے اسے دو تھپڑ رسید کیے۔

کوئی پریشان کن ردِعمل ظاہر کرنے کے بجائے وہ میرے قدموں میں گر گئی اور سسکنے لگی۔ اس کے بال میرے پاؤں پر اور وین کے فرش پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی دل فگار آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ''مجھے واپس بھیجنا ہے تو پھر ابھی پستول نکالیں اور مجھے گولی مار دیں۔ میں اپنا خون آپ کو معاف کرتی ہوں۔''

دور کھڑے فخرو کو بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ وین میں کچھ مارا ماری ہوئی ہے۔ (وین کی اندرونی بتی روشن تھی) وہ جلدی سے ہماری طرف آیا۔ اس کے آنے سے پہلے ہی میں نے جاناں کو اپنے پاؤں سے اٹھا دیا تھا۔

''کیا بات ہے جی؟'' فخرو نے پریشان لہجے میں کہا۔

میں کچھ دیر جاناں کی طرف دیکھتا رہا، پھر میں نے ایک گہری سانس لی اور فخرو سے کہا۔ ''تم ابھی تھوڑی دیر اور باہر رکو۔ یہ کمبل پڑا ہے لے جاؤ۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ وین سے باہر واقعی بڑی سردی تھی۔ کمبل لپیٹ کر اور اپنے سگریٹ لے کر وہ پھر وہیں درخت کے نیچے جا کھڑا ہوا۔

میں نے کہا۔ ''جاناں، جہاں تک میری سمجھ میں آیا ہے، تمہاری ذہنی صحت ٹھیک نہیں۔ تمہارے دماغ میں صرف وہ چاند گڑھی کا یاسر گھسا ہوا ہے جس نے تمہاری مدد کی تھی۔ تمہیں میرے اندر اس کی جھلکیاں نظر آ رہی ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہاری یہ غلط فہمی کس طرح تمہارے دماغ سے نکالوں۔''

''چلیں...... آپ اس کو 'غلط فہمی' ہی رہنے دیں۔ لیکن پلیز...... پلیز مجھے خود سے جدا نہ کریں۔ میرے لیے اگر یہاں خطرہ ہے تو لاہور میں بھی کم نہیں ہے۔ انسپکٹر قیصر، پاشا اور لالہ وریام جیسے لوگ وہاں بھی میری مٹی پلید کرنے کے لیے تیار ہیں۔''

وہ میری غلط فہمی والی بات کو کوئی اہمیت نہیں دے رہی تھی۔ لیکن اس کی اہمیت تھی۔ میں نے کہا۔ ''تمہیں پتا ہے اگر تم واپس سجاول کے ڈیرے پر جاتی ہو اور اپنے ساتھ یہ غلط فہمی بھی لے جاتی ہو تو میرے لیے کتنا خطرہ پیدا ہو سکتا ہے؟''

''میں...... سمجھی نہیں۔''

''تمہارے ذہن میں بیٹھ گیا ہے کہ میں وہ یاسر ہوں جس نے تمہیں کھنڈر سے نکالا اور رام پیاری تک پہنچایا۔ یہی یاسر ہے جسے سجاول وغیرہ دیوانوں کی طرح ڈھونڈتے پھر رہے ہیں، کیونکہ ان کے بندے قتل ہوئے ہیں۔ اگر کہیں بھولے سے بھی تم نے اپنی یہ غلط فہمی ان لوگوں کے سامنے بیان فرما دی تو یہ لوگ میری گردن دو فٹ لمبی کر دیں گے، پھانسی دے کر۔''

اس نے میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ اس کے کومل ہاتھ جذبات کی شدت سے لرز رہے تھے۔ گلوگیر آواز میں بولی۔ ''میں نے آپ سے کہا ہے نا کہ میں نے آپ کو اپنا خون دل و جان سے معاف کر دیا۔ اگر کبھی سردار کے ڈیرے پر میں اس طرح کی کوئی بات کہوں تو آپ اپنے ہاتھوں سے میری جان لے لینا۔''

وہ اپنے ارادے پر چٹان کی طرح مضبوط تھی۔ دو چار منٹ ہمارے درمیان مزید بات ہوئی۔ آخر میں ایک نتیجے پر پہنچ گیا۔ اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آ رہا تھا کہ فی الحال اسے اپنے ساتھ ڈیرے پر لے جاؤں۔ وہاں چند دن اسے سوچنے کا موقع دیا جائے اور سمجھایا بجھایا بھی جائے۔

ہم ایک بار پھر روانہ ہو گئے۔ فخرو بالکل خاموشی سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں یہ ماجرا بالکل نہیں آیا تھا۔ یہ لڑکی تو دوسروں کے ساتھ ہی یہاں سے روانہ ہوئی تھی مگر وین کے عقبی حصے میں چھپ کر پھر واپس پہنچ گئی تھی۔ یہ بات اب واضح تھی کہ پیٹرول پمپ پر یونس کے ملازم نے جس برقع پوش لڑکی اور دبلے پتلے نوجوان کو جاتے دیکھا تھا وہ کوئی اور تھے۔ ہماری واپسی کے سفر کے مرحلے بھی وہی تھے۔ جہاں اسٹیشن وین رکی وہاں پہلے سے سجاول کے دو کارندے موجود تھے۔ وہ بھی میرے ساتھ جاناں کو دیکھ کر حیران ہوئے۔ ہم نے پہلے کچھ سفر پیدل کیا۔ پھر میری اور جاناں کی آنکھوں پر پٹی باندھی گئی اور ہم گھوڑے پر بیٹھے۔ دو آدمی گھوڑوں کی باگیں پکڑے آگے آگے تھے۔ اونچے نیچے دشوار گزار سفر کے بعد ہم بالآخر ڈیرے پر پہنچ گئے۔ سب سے پہلے سجاول سے ملاقات ہوئی۔ اسے کچھ دیر پہلے موبائل فون پر اطلاع مل چکی تھی کہ جاناں میرے ساتھ ہی واپس آ گئی ہے۔ وہ بھی حیران تھا۔

میں نے سردار سے کہا۔ ''صبح میں تفصیل سے بتاؤں گا کہ کیا ماجرا ہوا ہے۔''

اس نے سفر کا باقی حال احوال پوچھا۔ میں نے مختصر الفاظ میں اسے آگاہ کیا اور بتایا کہ سب ٹھیک ٹھاک رہا ہے۔ میں نے فخرو کے ساتھ جاناں کو مانی اور ماؤ کی طرف بھیج دیا۔ مجھے پتا تھا کہ مانی جب جاناں کو واپس اپنے پاس دیکھے گی تو خوش ہوگی۔ دونوں میں گاڑھی چھننے لگی تھی۔ جاناں نہ صرف اس کی سہیلی تھی بلکہ ڈانس سیکھنے میں بھی اس کی مدد کر رہی تھی۔ دونوں گھنٹوں تک کمرے میں بند رہ کر ٹیپ ریکارڈر پر میوزک بجاتی تھیں اور توڑے شوڑے اور آؤ بھاؤ کی مشق فرماتی تھیں۔

میں اپنے کمرے کی طرف بڑھا تو ایک آواز نے میرے قدم روک لیے۔ یہ آواز اسی بند دروازے کی طرف سے آئی تھی جس پر ''لڈو پیٹرے'' کے الفاظ لکھے ہوئے تھے۔ یہ دراصل سجاول کا عقوبت خانہ تھا اور یہاں کے لڈو پیٹرے بڑے عبرت ناک قسم کے تھے۔ میں نے فوراً پہچان لیا۔ آواز دینے والا وہی منشی افضل تھا۔ وہ ایک تنگ سے سوراخ سے منہ لگا کر مجھے پکار رہا تھا۔ میں اس کے پاس پہنچا۔ اندر مکمل تاریکی تھی اس لیے مجھے اس کی صورت نظر نہیں آئی۔ ہاں احاطے میں روشنی تھی اور وہ مجھے دیکھ سکتا تھا۔ سوراخ پر لوہے کی باریک جالی لگی ہوئی تھی۔

منشی فریاد کناں لہجے میں بولا۔ ''شاہ زیب صاحب! میں نے سجاول صاحب کو سب کچھ بتا دیا ہے۔ اب میرے پاس بتانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ میں اپنی مری ماں کی قسم کھاتا ہوں۔ میں نے کچھ نہیں چھپایا۔ اب میری جان بخشی کرا دو۔ میں ساری زندگی آپ کا احسان نہیں بھولوں گا۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''مصیبت آتو فٹافٹ جاتی ہے لیکن ٹلتے ٹلتے کچھ وقت لگتا ہے۔ شکر کرو سجاول نے تمہاری زندگی بخشنے کی بات کی ہے لیکن ابھی اتنی جلدی رہائی تمہیں یہاں سے نہیں ملے گی۔''

وہ پکارا۔ ''میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔ میں اپنے بیوی بچوں کو لے کر کہیں دور چلا جاؤں گا۔ کبھی کسی کو اپنی شکل نہیں دکھاؤں گا۔''

اسی دوران میں باقر میرے پیچھے آ کھڑا ہوا۔ منشی واویلا کرتا رہا، میں احاطہ پار کر کے اپنے کمرے میں آ گیا۔ یہ وہی کمرا تھا جہاں میں نے تاجور کے ساتھ کئی دن گزارے تھے۔ کئی دن اور کئی راتیں۔ دیواروں پر ابھی تک بچوں کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ ان تصویروں کے حوالے سے میں اکثر اسے چھیڑا کرتا تھا اور وہ کبھی غصے اور کبھی شرم سے سرخ ہو جاتی تھی۔ اب وہ الماری خالی پڑی تھی جس میں اس کے کپڑے ہوتے تھے۔ ایک عجیب

طرح کی اداسی نے مجھے گھیر لیا۔ یہاں ہر طرف اس کی یادیں بکھری ہوئی تھیں۔
میں نے فیصلہ کیا کہ آج کی رات تو جیسے تیسے گزاروں گا۔ کل سجاول سے کہوں گا کہ وہ مجھے کوئی اور کمرا دے دے۔
صبح سویرے سجاول سے ملاقات ہوئی۔ میں نے اسے جاناں کے حوالے سے بتایا کہ وہ کیوں اور کیسے میرے ساتھ واپس چلی آئی ہے۔ بہرحال اس میں یاسر بھائی کا ذکر کہیں نہیں تھا بلکہ اشارہ تک نہیں تھا۔ میں نے سجاول کو بتایا، وہ کچے ذہن کی لڑکی ہے۔ کسی وقت کسی کے عشق میں بھی گرفتار ہو سکتی ہے۔ تمہیں پتا ہی ہے پہلے یاسر کا نام لیتی رہی ہے۔ اب خیر سے مجھ پر عنایت کرم فرما رہی ہے۔ کہتی ہے کہ میرے ساتھ رہنا چاہتی ہے۔ لاہور جانا نہیں چاہتی کیونکہ وہاں اس کے بے شمار دشمن ہوں گے۔ میں نے اسے تفصیل سے بتایا کہ وہ کس طرح گاڑی کی عقبی نشستوں کے پیچھے چھپ گئی اور یہاں تک آ گئی۔
سجاول نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ ”تمہیں پتا ہی ہے شاہی، بھائیا (اعظم) اس پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ اس کے ہتھے چڑھ گئی اور کوئی مسئلہ ہو گیا تو میں ذمے دار نہیں ہوں گا۔“
”نہیں سجاول! میں کوشش کروں گا کہ وہ یہاں نہ رہے۔ اسے سمجھا بجھا کر واپس بھیج دیا جائے۔“
”میں بڑی بے چینی سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ یہاں کچھ نیا ہوا ہے۔ پچھلے اڑتالیس گھنٹوں میں میرے بندوں نے کافی بھاگ دوڑ کی ہے۔ ورول نامی جگہ کا پتا لگ گیا ہے۔“ سجاول کے لہجے میں ہلکا ہلکا جوش تھا۔
”زبردست۔“ میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔
اس نے میرے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ ”تمہارا کیا اندازہ ہے۔ کہاں ہوگی یہ جگہ؟“
”مجھے تو آزاد کشمیر یا پھر پنجاب کا ہی کوئی علاقہ لگتا ہے۔“
”ہے تو پنجاب کا ہی مگر ذرا ہٹ کر ہے۔ لیہ اور مظفر گڑھ وغیرہ کا نام سنا ہوا ہے تم نے؟“
”مظفر گڑھ تو شاید سنا ہوا ہے۔“
”بس اس کے آس پاس ہی ہے۔ سننے میں آ رہا ہے کہ کچھ بڑے اونچے لوگوں نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں یہاں ......“ سجاول سیالکوٹی کا لہجہ معنی خیز تھا۔
”بڑے صاحب کے بارے میں بھی کچھ پتا چلا ہے؟“ میں نے پوچھا۔
”ہاں، کچھ کچھ چلا ہے اور یہ بھی اندازہ ہوا ہے کہ اس سے ملاقات کیسے کی جا سکتی

ہے۔اس کے لیے ایک خاص تحفہ لے کر جانا ہوگا ہمیں، اور اس کا انتظام بھی میں کر چکا ہوں تقریباً......"

"کیسا تحفہ؟"

"وقت آنے پر بتا دوں گا تمہیں۔" وہ دوستانہ انداز میں مسکرایا پھر جیسے چونک کر بولا۔

"اچھا، تم نے اپنے دوست کا ذکر کیا تھا، کیا نام تھا اس کا؟"

"انیق، میں نے پہلوان کے ہاتھ اس کے لیے پیغام بھجوا دیا ہے ہوسکتا ہے کہ آج ہی کسی وقت اس کا فون آ جائے۔"

"تم نے بتایا تھا کہ وہ بہت سی زبانیں جانتا ہے۔ مطلب یہ کہ اردو، انگریزی کے علاوہ بھی۔"

"ہاں جانتا تو وہ ہے۔"

"اچھا...... مجھے بتاؤ...... مالے بھی کوئی زبان ہے؟"

"مالے؟ مالے تو نہیں لیکن ملائی زبان ہے ایک۔"

"یہ کس علاقے میں بولی جاتی ہے؟"

"مجھے ٹھیک سے پتا تو نہیں۔ بس ایک اندازہ سا ہے کہ یہ یہاں کی زبان نہیں، باہر کے ملک کی ہے۔ ایک برونائی نام کے ملک میں بھی یہ زبان بولی جاتی ہے، اس کے علاوہ ملائیشیا اور ایک دو دوسرے ملک بھی ہوں گے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے، تمہارا وہ دوست یہ زبان جانتا ہوگا؟"

"ہوسکتا ہے۔ یہ تو اس سے پوچھنے کے بعد ہی پتا چلے گا۔"

سجاول جیسے کسی سوچ میں گم ہو گیا۔ مجھے صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ مجھ سے کچھ باتیں چھپا رہا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی پتا چل رہا تھا کہ وہ میرے لیے دوستانہ جذبات محسوس کر رہا ہے۔ مقابلے میں اپنی شکست تسلیم کر کے میں نے جو قربانی دی تھی، اس نے اس پر گہرا اثر کیا تھا۔ شاید وہ مجھے ساتھ لے کر چلنا چاہتا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ خواہش بھی رکھتا تھا کہ اختیار اس کے پاس ہی رہے۔

مجھے اختیار کی کوئی ایسی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میرا اصل مقصد تو یہی تھا کہ زینب اور دیگر لڑکیوں والے اسرار کا پتا چلے کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ عالمگیر اور ساتھے کے کرتوتوں کا پردہ چاک ہو اور وہ کیفر کردار تک پہنچیں۔ مجھے یہی محسوس ہو رہا تھا کہ منشی افضل کو مسلسل "لڈو پیڑے" کھلانے کے بعد اس سے کافی کچھ اگلوا لیا گیا ہے مگر

سجاول مجھے پوری بات بتا نہیں رہا تھا۔ کم از کم ابھی تک نہیں بتا رہا تھا۔
میں نے سجاول سے کہا کہ میں اپنا کمرا بدلنا چاہتا ہوں۔ وہ کچھ کچھ تاڑ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ میں تاجور سے بے حد لگاؤ رکھتا تھا، اب وہ دور جا چکی ہے اور میں خود کو اس کمرے میں بے آرام محسوس کر رہا ہوں۔ اس نے مجھے اندرونی حصے میں وہی کمرا دے دیا جس میں، میں اور تاجور آتشزدگی کے بعد دو چار دن رہے تھے۔ یہ پھر بھی میرے لیے بہتر تھا۔ (سجاول کا رعب داب تو پہلے کی طرح ہی تھا لیکن اس کے رویے میں وہ جنونی کیفیت دور دور تک موجود نہیں تھی جس کا مظاہرہ اس نے مقابلے میں اور مقابلے کے بعد کیا تھا)
اس رات اس نئے کمرے میں ایک عجیب واقعہ ہوا۔ رات کسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ پہلا خیال ذہن میں یہی آیا کہ ماؤ ہوگی۔ مگر پٹ کھولے تو سامنے جاناں کھڑی دکھائی دی۔ میں ششدر رہ گیا۔ وہ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی اندر آ گئی۔ مجھے مجبوراً دروازہ بھیڑنا پڑا۔ اس نے ایک عام سی شال لپیٹی ہوئی تھی۔ سر پر بھی یہی شال تھی۔
''خیر تو ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''نیند نہیں آ رہی تھی...... چلی آئی۔'' اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔
اس نے شال ہٹائی تو میں دیکھتا رہ گیا۔ وہ کسی ہندی فلم کی ہیروئن دکھائی دے رہی تھی۔ آنکھوں میں کاجل، ہونٹوں پر لالی، رخساروں پر چمک...... غرض سولہ سنگھار۔ اس نے بالوں میں پھول پرو رکھے تھے اور ہاتھوں میں گجرے تھے۔ اس کا لباس ساڑھی تھا لیکن یہ اس طرح سے پہنی گئی تھی کہ ہرگز وہ کام نہیں کر رہی تھی جو اس کے کرنے کا تھا۔ یعنی جسم چھپانے کا۔ اگر اس منظر کا نقشہ تین چار لفظوں میں کھینچا جائے تو وہ یوں تھا...... وہ سراپا دعوت تھی۔
پھر میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب وہ بغیر پوچھے میرے بستر پر بیٹھ گئی اور چند لمحے جھجکنے کے بعد تکیے پر سر رکھ کر نیم دراز ہو گئی۔ اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔
''یہ کیا حرکت ہے؟'' میں نے سٹپٹا کر کہا۔ ''کہیں تم نے نشہ وغیرہ تو نہیں کر رکھا؟'' میں نے اس کا منہ سونگھا۔
وہ لرزاں آواز میں بولی۔ ''ہاں جی! میں نشے میں ہوں...... اور یہ آپ کے پیار کا نشہ ہے۔ یہ نشہ ٹوٹا تو میں مر جاؤں گی۔ مجھے اپنا بنا لیں۔ مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔''
اپنا بنانے سے اس کی جو مراد تھی وہ میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ وہ آدھی رات کو جس حال میں یہاں آئی تھی، اس کے بعد کسی وضاحت کی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے ہرگز معلوم نہیں تھا کہ میں جیرے قصائی سے بات کرنے کے لیے جب اپنا چہرہ ڈھاٹے میں چھپاؤں گا اور

آواز بدل کر بات کروں گا تو میرا یہ روپ اس روپ کے بالکل قریب چلا جائے گا جو میں بطور ''یاسر بھائی'' اپناتا تھا۔ اور میری یہ غلطی جاناں کے دیوانے پن میں اضافے کا باعث بن جائے گی اور اس اضافے کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ اپنا آپ میرے حوالے کرنے کے لیے بے تاب ہو جائے گی۔

میں اپنے بارے میں کچھ بھی چھپا نہیں رہا ہوں۔ زندگی کے جس حصے میں، میں جس طرح تھا، ویسا ہی بیان کر رہا ہوں۔ جذباتی لحاظ سے وہ میری زندگی کا بڑا پُر آشوب دور تھا۔ میں نے تاجور کو تازہ تازہ کھویا تھا۔ اسے بھولنے کے لیے اور خود کو سنبھالنے کے لیے مجھے کسی سہارے کی ضرورت تھی۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ میں اس وقت سگریٹ پھونک رہا تھا، شراب بھی پی رہا تھا اور اب ایک اور ''سہارا'' عورت کی صورت میں میرے سامنے تھا۔ (یہ نہ سمجھا جائے کہ میں کوئی ''لیڈی کلر'' تھا یا لڑکیاں مجھ پر مکھیوں کی طرح گرتی تھیں۔ ہاں خواتین میری زندگی میں آتی رہی تھیں اور اب بھی آ رہی تھیں۔ ان میں سے اکثر ایسی تھیں جو میرے ''مار اماری'' کے فن سے متاثر ہوتی تھیں یا پھر مجھے ان کی مدد کرنے کا موقع ملتا تھا۔ جاناں کے ساتھ بھی تو کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ مجھ سے ملنے سے پہلے وہ خود کو سخت غیر محفوظ تصور کرتی تھی)

کچھ دیر پہلے چند سیکنڈ کے لیے میرے دل میں خیال آیا تھا کہ جاناں کو بازو سے پکڑوں اور کھینچ کر کمرے سے باہر نکال دوں، لیکن پھر اتنی زیادہ سختی مجھے مناسب محسوس نہیں ہوئی۔ میں اس کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔ اپنا دھیان بٹانے کے لیے اس سے باتیں کرنے لگا۔ میں جانتا تھا کہ یہ ملاقات صرف باتوں تک نہیں رہے گی...... اور وہ نہیں رہی۔ وہ کوئی چھوئی موئی شریف زادی نہیں تھی۔ اتفاقاً یا بدقسمتی سے کئی پاپڑ بیل چکی تھی۔ گھر سے نکلی تو ٹی وی آرٹسٹ یا ماڈل بننے کے لیے تھی مگر اس بے چاری کا اسکرین ٹیسٹ کسی پروڈیوسر یا ہدایت کار کے بجائے انسپکٹر قیصر، پاشا اور لالہ جیسے لوگوں نے لیا تھا۔ اب تک پتا نہیں وہ کتنے مرحلوں سے گزر چکی تھی۔

وہ اٹھی اور خود ہی الماری سے میرے لیے امپورٹڈ وہسکی نکال لائی۔ اس نے مجھے اپنے ہاتھ سے پلانی شروع کی اور قریب تر ہوتی گئی۔ ایسی بہت سی راتیں میں گزار چکا تھا، بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ سنگین اور رنگین۔ مگر پتا نہیں آج کیا بات تھی، میرے اندر ایک ملامت سی تھی، میرے دل پر ایک بوجھ سا تھا، کہاں سے آیا تھا یہ بوجھ؟ میرا کسی سے کوئی وعدہ نہیں تھا؟ وفا کی کوئی قسم نہیں تھی، کسی آس امید یا انتظار کے تانے بانے نہیں تھے پھر یہ کیا تھا۔ تلخ

گھونٹ گلے میں کیوں اٹکتے تھے؟ گرم بانہوں میں تازیانوں کی سی تاثیر کیوں تھی؟

شاید یہ حالات اور زیادہ آگے بڑھتے اور ''خطرناک مرحلوں'' میں داخل ہو جاتے کہ اچانک مجھے ٹھٹک کر جاناں سے علیحدہ ہونا پڑا۔ مجھے احاطے کی تاریکی میں کچھ فاصلے پر کسی ہلچل کی مدھم آوازیں سنائی دی تھیں۔ ''کیا ہوا جی؟'' جاناں نے گھبرا کر پوچھا۔

میں نے کھڑکی کے شیشے میں سے باہر جھانکنے کی کوشش کی لیکن ناکامی ہوئی۔ ''کچھ نظر آ رہا ہے؟'' جاناں نے پھر پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا۔ ''میرا خیال ہے اب تم جاؤ۔''

وہ ایک دم مایوس سی ہوگئی، لیکن منہ سے کچھ بولی نہیں۔ اس نے اپنے بال سمیٹے، شال اوڑھی۔ ایک بار زور سے میرے گلے لگ کر اور گال چوم کر باہر چلی گئی۔ فرش پر اور بستر پر پھولوں کی پتیاں بکھری تھیں۔ میں نے انہیں سمیٹ کر پلنگ کے نیچے کر دیا اور ایک بار پھر کھڑکی سے چہرہ لگا کر احاطے کی نیم تاریکی میں جھانکنے کی کوشش کی۔ کمرے کی لالٹین میں نے یکسر بجھا دی تھی۔ کچھ دیر بعد میری نگاہیں احاطے کی نیم تیرگی میں جھانکنے کے قابل ہو گئیں۔ مجھے لگا کہ چشمے کے قریب چار پانچ افراد موجود ہیں۔

وہ چلاّ چلاّ کر کچھ کہہ رہے تھے لیکن آواز مجھ تک نہیں پہنچ رہی تھی، پھر ان افراد میں سے ایک بندہ یک لخت علیحدہ ہوا اور بھاگا۔ یوں لگا جیسے وہ فرار ہونے کی کوشش میں ہے۔ اس کا رخ چٹانوں کی طرف تھا اگر وہ اس اندھیری شب میں چٹانوں تک پہنچ جاتا تو اس کے بچ نکلنے کے امکانات تھے لیکن اسے ان چٹانوں تک کس نے پہنچنے دینا تھا۔ شاید اسے ان مچانوں کا پتا نہیں تھا جنہوں نے اس جگہ کو چاروں طرف سے گھیرا ہوا تھا اور جہاں ماہر شوٹر چوکس بیٹھے رہتے تھے۔

''رک جاؤ۔'' ایک گرجتی ہوئی دور افتادہ آواز میرے کانوں تک پہنچی...... شاید یہ آواز کسی مچان سے آئی تھی۔

اس کے بعد وہی کچھ ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ ''ریٹ ٹیٹ'' کی دل ہلا دینے والی آواز سے رات کا گہرا سناٹا تھرا اٹھا۔ میں نے بھاگنے والے سائے کو دیکھا۔ وہ گولیاں کھا کر ڈھلوان سے لڑھکتا ہوا واپس احاطے میں آ گرا...... ساری مچانوں پر ایک دم ٹارچیں روشن ہو گئی تھیں۔ ان میں سے کئی ٹارچیں سرچ لائٹ کی طرح طاقتور تھیں۔ اس ہنگامے نے ڈیرے کے سوئے ہوئے بیشتر مکینوں کو جگا دیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے احاطے اور برآمدوں میں کئی لالٹینیں اور ٹارچیں گردش کرتی نظر آئیں۔ میں بھی ٹارچ لے کر اور کلاشنکوف کندھے پر لٹکا

کر باہر نکلا۔ ٹھنڈی ہوا کے تھپیڑے کھاتا، موقع پر پہنچا تو ایک ٹارچ کے روشن دائرے میں منشی افضل کی خونچکاں لاش اوندھی پڑی نظر آئی۔ آٹو میٹک رائفل کی کم و بیش چار گولیوں نے اس کے سینے کو نشانہ بنایا تھا اور عقبی پسلیاں توڑ کر نکل گئی تھیں۔ میں ششدر رہ گیا۔ یقین نہیں آیا کہ منشی کے ساتھ یہ سب کچھ ہو چکا ہے۔ ''کیا ہوا؟'' میں نے ایک گارڈ سے سخت لہجے میں پوچھا۔

گارڈ کے بجائے چپٹی ناک والا فخرو آگے آیا اور بولا۔ ''اس نے بھاگنے کی کوشش کی ہے جی، روکنے پر بھی نہیں رکا۔ اوپر مچان والے گارڈ نے گولی چلا دی۔''

میرا جی چاہا ایک زناٹے کا تھپڑ فخرو کے گال پر رسید کروں لیکن پھر میں نے خود کو سنبھالا۔ میں نے کھڑکی سے سب کچھ دیکھا تھا۔ منشی بھاگا نہیں تھا۔ اسے شاید بھگایا گیا تھا۔ بالکل جیسے پولیس والے کسی بدنصیب شخص کے ساتھ پولیس مقابلہ کرتے ہیں۔ اسے بھاگنے کے لیے کہتے ہیں اور پھر بھون ڈالتے ہیں۔ اسی دوران میں دور سے سجاول کی پاٹ دار آواز بھی سنائی دی۔ وہ اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑا تھا اس نے پکار کر پوچھا۔ ''کیا ہوا ہے؟''

فخرو اور دو دوسرے افراد سجاول کو جواب دینے کے لیے اس کی طرف لپک گئے۔ میں اپنی جگہ کھڑا پیچ و تاب کھاتا رہا۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ یہ سب کچھ سجاول کی لاعلمی میں ہوا ہو۔ وہ لاعلمی کا ناٹک کر رہا تھا۔ میں سجاول کی سفاکی پہلے بھی دیکھ چکا تھا اب ایک اور خونی مثال سامنے آ گئی تھی۔ یہ ایک اتفاق ہوا تھا کہ رات کے اس پہر جاناں نے میرے کمرے میں قدم رنجہ فرمایا تھا۔ اگر وہ نہ آتی اور میں سو رہا ہوتا تو میرے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوتی کہ منشی کے ساتھ اصل واقعہ کیا ہوا ہے۔ پھر شاید میں بھی یہی سمجھتا کہ اس نے بھاگنے کی بےوقوفی کی ہو۔ منشی والے واقعے کو دیکھ کر مجھے ایک بار پھر مؤذن عبدالرحیم کا لرزا خیز قتل یاد آ گیا۔ اسے سجاول نے ایک وزنی جیپ کے نیچے دیا تھا اور اس کی کھوپڑی چٹخا دی تھی۔

سجاول نے بظاہر، منشی کی ناگہانی موت پر افسوس کا اظہار کیا اور میرے سامنے اس چوکیدار کی سخت سرزنش کی جس کی غلطی کی وجہ سے ''لڈو پیٹرے'' والے کمرے کا دروازہ ٹھیک سے لاک نہ ہو سکا اور منشی کو باہر نکلنے کا موقع مل گیا۔ میں نے یہ ساری ڈراما بازی خاموشی سے دیکھی اور سنی۔ کوئی بات کرنے کا اب کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ منشی کی جان تو جا چکی تھی۔ یقیناً سجاول ان لوگوں میں سے تھا جو اپنے جرم کا نشان مٹانے کے لیے ہر حد تک جاتے ہیں۔ اگر سجاول میری درخواست مان کر منشی کو کہیں بند کر دیتا تو اس بات کا امکان موجود رہتا کہ کبھی نہ

کبھی اس کے اغوا کا راز فاش ہو جائے۔ اس راز کا فاش ہونا سجاول اور عالمگیر کے تعلق کی موت ثابت ہوتا۔ لہٰذا اس موت سے بچنے کے لیے اس نے منشی کو موت دے دی تھی اور یہ سجاول جیسے بندے کے لیے روزمرہ کے کاموں جیسا ہی ایک کام تھا۔

مجھے افسردہ کھڑے دیکھ کر سجاول لمبے ڈگ بھرتا ہوا میری طرف آیا اور میرے دونوں کندھوں پر اپنا بازو رکھتے ہوئے بولا۔ ''چلو چھوڑو شاہی، جو ہونا تھا وہ ہو گیا، شاید اس کے مقدر میں یہی تھا...... آؤ میں تمہیں ایک نئی چیز دکھاؤں۔''

میں سُست قدموں سے اس کے ساتھ چل دیا۔ رات کے اس پہر بھی وہ کافی چوکس نظر آ رہا تھا۔ کہنے لگا۔ ''میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ آگے بڑھنے کے لیے ایک تحفے کی ضرورت بھی پڑے گی۔ میں نے اس کا انتظام کر لیا ہے۔''

وہ مجھے رہائش گاہ کے ایک اندرونی کمرے میں لے گیا۔ میں دیکھ کر حیران ہوا یہاں گلاب کا ایک ادھ کھلا پھول پڑا تھا مگر اس ادھ کھلے پھول کی اونچائی چار فٹ کے لگ بھگ تھی۔ گھیر قریباً دو فٹ قطر کا ہو گا۔ بڑی نفاست سے بنایا گیا تھا۔ غور سے دیکھنے پر ہی پتا چلتا تھا کہ یہ پلاسٹک کا ہے۔ ایک ادھیڑ عمر نیم گنجا شخص جو شاید اس پھول کا موجد تھا اور اس کی نوک پلک سنوارنے میں مصروف تھا۔ سجاول نے مجھے دکھایا کہ کس طرح ہاتھ لگانے سے یہ پھول کھل اٹھتا ہے۔

اچھی چیز بنائی گئی تھی۔ ہاتھ لگانے سے غنچہ، پھول بن جاتا تھا مگر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کھلونے سے کس کو خوش کیا جائے گا۔ یہ کوئی ایسی انوکھی شے تو نہیں تھی۔ اس کے اندر یقیناً کوئی بیٹری اور چھوٹی موٹر کام کرتی تھی جو پتیوں کو کھولتی تھی۔

سجاول مسکرایا۔ ''شاید تم سوچ رہے ہو کہ یہ کوئی نایاب تحفہ نہیں ہے مگر یہ نایاب بن جائے گا۔ کوئی اسے نایاب بنا دے گا۔''

''کیا مطلب؟''

''آؤ دکھاؤں۔'' اس نے کہا اور مجھے لے کر ساتھ والے کمرے کی طرف بڑھا۔ ساتھ ساتھ وہ بول رہا تھا۔ ''دراصل ہمیں جو کرنا ہے، جلدی کرنا ہے۔ اگلے بیس چوبیس گھنٹوں میں......''

ہم ایک کمرے کی ادھ کھلی کھڑکی تک پہنچے۔ اندر دو گیس لیمپ روشن تھے اور منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میری حیرت بڑھ گئی۔ بیس بائیس سال کی ایک نہایت خوش شکل لڑکی ایک لکڑی کے اسٹول پر بیٹھی تھی۔ تین چار ملازمائیں جن میں اختری بھی شامل تھی اسے بنانے

سنوارنے میں مصروف تھیں۔ خوش اندام لڑکی کی پنڈلیوں اور عریاں بازوؤں پر کوئی ابٹن ملا جارہا تھا۔ اس کے ناخن تراشے جا رہے تھے۔ لمبے گھنے بالوں میں کسی خوشبودار تیل کی مالش ہورہی تھی۔ نوخیز لڑکی مسکرا رہی تھی۔ یہ سب کچھ بڑا داستانی سا لگ رہا تھا۔

میں نے سوالیہ نظروں سے سجاول کو دیکھا۔ وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ ''کنول کے پھول میں سے تو شہزادی وغیرہ نکلتی ہی ہے۔ اب گلاب کے پھول سے بھی نکلے گی۔''

اب بات سمجھ میں آرہی تھی۔ پتا نہیں وہ کون شخص تھا جس کو اس طرح کے تحفے سے راہِ راست پر لایا جانا تھا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ اگر سجاول مجھے کچھ باتیں بتا رہا ہے تو بہت سی چھپا بھی رہا ہے۔ مجھے یہ بھی لگ رہا تھا کہ ہم جلد ہی یہاں سے روانہ ہونے والے ہیں۔ سوال یہ تھا کہ کہاں؟

شاید اسی ورول نامی جگہ کی طرف جہاں کوئی وڈا صاحب موجود تھا۔ کیا مشینی گلاب کے اندر سے برآمد ہونے والی یہ لڑکی اسی کو پیش کی جانی تھی۔ کیا یہ ان لڑکیوں میں سے ہی ایک تھی جنہیں خاص طریقے سے Immune کیا گیا تھا اور وہ زہروں کے اثر سے محفوظ ہوگئی تھیں یا پھر یہ کوئی اور تھی...... اور اسے اپنے ساتھ لے جائے جانے کا مقصد کچھ اور تھا۔ میں اپنے اندر عجیب سی سنسنی محسوس کر رہا تھا۔

○......❖......○

دفعتاً میرے فون کی بیل ہوئی۔ میں نے کال ریسیو کی اور دوسری طرف سے بولنے والے کا انتظار کیا۔ ''ہیلو'' انیق کی جانی پہچانی آواز سنائی دی۔

میرے سینے میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ ''ہیلو انیق! کہاں ہو تم......؟''

''جی شاہ زیب بھائی! کیسے ہیں آپ؟ جناب کی آواز سننے کو تو ترس گیا تھا آپ کا خادم۔''

سگنل واضح نہیں آرہے تھے۔ میں سیل فون کے ساتھ باہر احاطے میں آ گیا اور ایک چٹان کے نزدیک کھڑا ہو کر دھیمے لہجے میں انیق سے بات کرنے لگا۔ انیق کو پہلوان کے ذریعے میرا پیغام مل گیا تھا۔ وہ میری خیر خیریت کی طرف سے بے حد فکرمند تھا اور جلد از جلد میرے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں ابھی دس پندرہ منٹ بعد اسے دوبارہ کال کرتا ہوں اور بتاتا ہوں کہ اسے کیسے اور کس طرح یہاں پہنچنا ہے۔

میں اندر پہنچا۔ ساتھ والے کمرے میں لڑکی کو مسلسل بنایا سنوارا جارہا تھا۔ سارے کمرے میں شیمپو اور صابن وغیرہ کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ سجاول کھڑکی کے قریب کھڑا تھا۔ میں نے اس کو بتایا کہ انیق کا فون آ گیا ہے اور وہ یہاں آنے کے لیے تیار ہے۔

سجاول نے کہا۔ ''بہتر ہے کہ اسے کوٹلی کا ایڈریس بتا دو۔ وہاں سے میرا کوئی بندہ اسے لے لے گا۔''

سجاول نے مجھے ایڈریس لکھوایا اور ایک فون نمبر بھی دیا۔ میں نے باہر جا کر دوبارہ انیق کو فون کیا اور اسے یہ دونوں چیزیں لکھوا دیں۔ وہ اس قدر بے تاب تھا کہ فوراً چاند گڑھی سے روانہ ہونا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔ ''بہتر ہے کہ کل آرام سے تیار ہو کر نکلو، لیکن جب بھی نکلو پوری احتیاط کرنا۔ ہوسکتا ہے، عالمگیر کے بندے تم پر نظر رکھے ہوئے ہوں۔''

وہ بولا۔ ''احتیاط تو پوری کروں گا جی لیکن اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں خاموشی سے نکل

آؤں تو پھر......تو ابھی نکل آنا چاہیے۔ رات کا وقت ہے سارا گاؤں سویا پڑا ہے۔''
بات تو اس کی ٹھیک تھی۔ میں نے کہا۔''جیسا مناسب سمجھو کرو، اور میری ''کِٹ'' ساتھ لیتے آنا۔''
''کِٹ'' سے میری مراد وہ جدید الیکٹرانکس اشیا تھیں جو میں چاند گڑھی روانہ ہوتے وقت لاہور سے ساتھ لے کر چلا تھا۔ ننھا سا پن ہول کیمرا، ڈکٹافون، بے ہوشی کا اسپرے اور اس قسم کی دیگر اشیا۔
انیق نے پُر جوش انداز میں ''یس سر'' کہا۔ میں نے اسے کچھ ضروری ہدایات دیں اور سلسلہ منقطع کر دیا۔
انیق قریباً چوبیس گھنٹے بعد میرے پاس سجاول کے خفیہ ڈیرے پر پہنچ گیا۔ اسے آنکھوں پر پٹی باندھ کر لایا گیا تھا۔ فخرو کے علاوہ ایک اور موچھیل بندہ بھی اس کے ساتھ تھا۔ انیق نے پتلون قمیص پر موٹی جرسی پہن رکھی تھی۔ ہاتھوں پر دستانے تھے اور سر پر گرم ٹوپی۔ اس کی آنکھوں سے پٹی ہٹائی گئی۔ اس نے غور سے اردگرد دیکھا پھر مجھے پہچان کر میری طرف آیا اور لپٹ گیا۔ کتنی ہی دیر تک ہم نے ایک دوسرے کو گلے لگائے رکھا۔ وہ منظر نگاہوں کے سامنے آگیا جب ہم جدا ہوئے تھے۔ تاجور تیز رفتار گاڑی میں سے اچھل کر ڈھلوان پر گر گئی تھی اور میں نے اس کے پیچھے چھلانگ لگا دی تھی۔ چھلانگ لگانے سے شاید دو تین منٹ پہلے میں نے انیق کی آخری جھلک دیکھی تھی۔ اور اب اَن گنت دنوں بعد وہ مجھے آج دکھائی دے رہا تھا۔
میں نے سجاول سے اس کا تعارف کرایا پھر فیض محمد اور باقر وغیرہ سے ملایا۔ سجاول پرکھنے والی نظروں سے انیق کو دیکھ رہا تھا۔ شاید انیق کے قد کاٹھ نے اسے مایوس کیا تھا لیکن سجاول کو معلوم نہیں تھا کہ عام قد کاٹھ کے اس دبلے پتلے لڑکے میں کتنی توانائی اور جراٴت ہے۔ اس کے علاوہ اس کی وہ خداداد صلاحیت جس کے بل بوتے پر وہ دیواروں میں در بنا لیتا تھا اور مشکل ترین لوگوں میں بھی گھل مل جاتا تھا۔
سجاول نے ہمیں چائے پلائی پھر ہم اپنے کمرے کی طرف چل پڑے۔ احاطے کے اطراف میں انیق نے درختوں کی بلندی پر جگنو سے چمکتے دیکھے تو حیران ہوا۔ میں نے اسے بتایا کہ یہ مچانیں ہیں جن پر مسلح گارڈز بیٹھے رہتے ہیں۔ یہ روشنیاں ان کی ٹارچوں وغیرہ کی ہیں۔ ہم کمرے میں پہنچے۔ ہمارے پاس کرنے کے لیے ڈھیروں باتیں تھیں اور سردیوں کی طویل رات تھی۔

انیق نے سب سے پہلے تاجور کے بارے میں پوچھا۔
میں نے اسے بتایا کہ وہ خیریت سے ہے اور ایک محفوظ جگہ پر پہنچ گئی ہے۔
''کس نے پہنچایا ہے؟''
''سمجھو میں نے ہی پہنچایا ہے۔ اس کی طرف سے مجھے پورا اطمینان ہے۔''
''تاجور کے گھر والے تو جا چکے ہیں چاند گڑھی سے۔''
''ہاں، مجھے پتا ہے۔ سمجھو کہ وہ بھی ان کے پاس ہی پہنچی ہے۔''
''یہ تو بڑی زبردست بات ہے۔'' انیق کے سینے سے جیسے اطمینان کی طویل سانس خارج ہوئی۔
میں نے اس سے گاؤں کے حالات پوچھے۔ انیق نے بتایا کہ گاؤں کے لوگ کافی حد تک پیر ولایت سے متنفر ہو گئے ہیں مگر پھر بھی ایک دھڑا ایسا ہے جو سب کچھ جاننے کے باوجود ان فراڈیوں کی حمایت کر رہا ہے۔ یہی لوگ تھے جو پیر سانتا کو مسجد کے پہلو میں دفنانا چاہتے تھے مگر بعد میں لوگوں کے احتجاج پر اسے عام قبرستان میں سپرد خاک کرنا پڑا۔
میں نے کہا۔ ''یار، یہ اندھی عقیدت بھی کیسی ہوتی ہے لوگ اپنی آنکھوں سے اپنے جھوٹے مرشدوں اور مخدوموں کے گندے کرتوت دیکھتے ہیں پھر بھی ان کا نام جپنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ لیتے ہیں۔''
''مگر ایک بات ہے جناب! پیر ولایت کا یہ پاکھنڈ اب زیادہ دیر چلنے والا نہیں۔ وہ گرتی دیوار کی طرح ہے۔ ایک زوردار دھکا اور لگا تو ڈھے جائے گا۔''
''ملنگوں کا کیا حال ہے؟''
''ان کے بارے میں تو یہی پتا چل رہا ہے کہ بہت سوں کو پولیس نے دھر لیا ہے، باقی تتر بتر ہو گئے ہیں۔ تتر بتر ہونے والوں میں ''پردے والی سرکار'' کا نمبر دو یعنی ملنگ کرنالی بھی ہے۔ کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ کرنالی کا خفیہ طور پر پیر ولایت سے رابطہ بھی ہے۔ باقی اللہ جانے۔'' پھر وہ چونک کر بولا۔ ''ہاں، یاد آیا وہ ملنگنی ضرور پہنچ گئی تھی چاند گڑھی تک۔''
''کون ملنگنی؟''
''وہی ڈاکٹر فرح۔ وہ شیطان کی چرخی، رضوان ٹی کے پیچھے گاؤں آئی تھی۔ اس کے سر پر کافی سارے ٹانکے لگے ہوئے تھے۔ لیکن وہ بھی ہوشیار نکلا۔ اس کے آنے سے دو تین دن پہلے ہی گاؤں سے کھسک گیا۔ مجھ سے بھی ملی تھی۔ اس کے لیے دیوانی ہوئی جا رہی تھی۔ جیسے ہیروئن نہ ملنے سے کسی کا نشہ ٹوٹا ہوا ہو۔ میری منتیں کر رہی تھی کہ میں اس کا پتا بتا دوں۔ پھر

دھمکیوں پر اتر آئی۔ میں نے کہا، یہ مت بھولو کہ کئی دوسرے ملنگوں کی طرح اس وقت تم بھی پولیس کو مطلوب ہو۔ پتا نہیں کتنے ناجائز ''ابارشن'' کیے ہوئے ہیں تم نے۔ یہاں سے نکل ہی جاؤ تو اچھا ہے تمہارے لیے۔''

''کہاں گئی پھر؟''

''اسے شک تھا کہ رضوان لاہور کی طرف گیا ہے۔ ادھر ہی نکل گئی ہوگی۔ دل کے سہارے کے لیے اس کی تصویر پرس میں رکھی ہوئی تھی اور بار بار پرس کھول کر تسلی کرتی تھی کہ تصویر موجود ہے......''

میں نے انیق سے لاہور کا احوال پوچھا اور داؤد بھاؤ کی خیر خیریت دریافت کی۔ انیق ایک چکر لاہور کا بھی لگا آیا تھا اور چاند گڑھی صرف اس لیے واپس آیا تھا کہ میرے اور تاجور کے بارے میں ٹوہ لے سکے اور اگر کوئی سراغ ملے تو ہمیں تلاش کر سکے۔ اس نے بتایا کہ داؤد بھاؤ خیریت سے ہے لیکن آج کل انڈر گراؤنڈ ہے۔ امید ہے کہ پاکستان میں ہی ہے اور دو چار ہفتوں تک پھر نمودار ہو جائے گا۔

رات کا پہلا حصہ میں نے اور انیق نے باتیں کرتے گزارا۔ انیق مجھ سے پوچھنا چاہتا تھا کہ واقعی میں نے تاجور سے نکاح کر لیا تھا۔ اگر نہیں کیا تھا تو پھر ہماری محبت کہاں تک پہنچ پائی ہے؟

میں نے کہا۔ ''انیق! جو کچھ تم سننا چاہ رہے ہو، وہ میرے پاس سنانے کے لیے نہیں ہے۔ اگر تم ضرور سننا چاہو گے تو پھر تمہارا دل برا ہوگا۔ اس لیے ابھی اس موضوع کو یہیں رہنے دو۔ ہم اس معاملے پر بات کرتے ہیں جس پر بات کرنا اس وقت بہت ضروری ہے۔ ہمیں آج رات ہی کسی وقت یہاں سے روانہ ہونا ہے۔''

''کہاں؟'' انیق نے تعجب سے پوچھا۔

''وہاں...... جہاں کا پتا ابھی ٹھیک سے مجھے بھی نہیں معلوم۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یعنی ہم سجاول کے ساتھ کہیں جا رہے ہیں؟'' انیق نے معاملہ فہمی کا ثبوت دیا۔

''ٹھیک جواب تک پہنچے ہو...... مجھے ایک بات بتاؤ۔ تم کافی زبانیں جانتے ہو۔ ملائی زبان کے بارے میں بھی کچھ پتا ہے؟''

''ہائیں...... یہ ملائی کا ذکر کہاں سے آگیا بیچ میں؟''

''یہ ذکر بیچ میں ہے نا۔ تم بتاؤ کچھ شد بد ہے اس بولی کی؟''

وہ کسی دانشور کی طرح بولا۔ ''ملائی کی بھی دو تین قسمیں ہیں لیکن جو ملائیشیا وغیرہ میں بولی جاتی ہے، میں اچھی طرح بول اور سمجھ لیتا ہوں۔ ویسے اس زبان کو مالے کہتے ہیں۔''

''برونائی میں بھی یہی بولی جاتی ہے؟''

''ہاں جی...... زیادہ تر۔'' اس نے کہا۔ پھر ذرا ٹھٹکتے ہوئے انداز میں بولا۔''یہ سجاول کہاں پھنسا رہا ہے آپ کو۔ مجھے تو یہ اچھا بندہ نہیں لگا۔''

''بڑی پھوکٹ بات کی ہے تم نے۔ ڈاکو، اچھا بندہ کیسے لگے گا لیکن برے سے برے بندے میں بھی کوشش کر کے اپنے مطلب کے لیے کوئی اچھائی ڈھونڈی جا سکتی ہے۔ اب تک داؤد بھاؤ کو ہی دیکھ لو۔ اس میں بھی دو چار اچھائیاں ڈھونڈی ہی ہوں گی تم نے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر اس بندے کی آنکھوں میں مجھے بے انتہا لالچ نظر آیا ہے۔ ایسا بندہ کسی بھی وقت دھوکا دے سکتا ہے۔''

''یہ دنیا تو ہے ہی دھوکے کا گھر۔ اب دیکھو ملنگی ڈیرے پر کیسے کیسے دھوکے ملاحظہ کیے ہم نے۔ اگر سب کچھ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا ہوتا تو کبھی یقین نہ آتا۔''

اچانک کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ آج پھر جاناں ہی نہ آدھمکی ہو، لیکن یہ فیض محمد تھا۔ اس نے کہا۔''سردار نے کہا ہے کہ صبح چار بجے یہاں سے نکل جائیں گے۔ تم نے تھوڑا بہت آرام کرنا ہو تو کر لو اور میڈم کو بھی تیار رہنے کا کہہ دو۔''

''میڈم۔'' اس نے ذرا طنزیہ انداز میں کہا تھا۔ میڈم سے اس کی مراد 'جاناں'' تھی۔

''ہاں، شام کو ہی کہہ دیا تھا۔'' میں نے جواب دیا۔ وہ واپس چلا گیا۔

جاناں کے بارے میں سردار سجاول سے کل ہی بات ہوئی تھی۔ سردار نے بتایا تھا کہ یہ لڑکی چونکہ پڑھی لکھی ہے، اس سے ایک کام لیا جا سکتا ہے۔ اس لیے اس کو ساتھ رکھنا ہے۔ مجھے یہ تجویز پسند تو نہیں آئی تھی لیکن مجبوراً ہاں کرنا پڑی تھی۔

ڈھائی بجے کے لگ بھگ ہم اپنے کمروں سے نکلے اور احاطے میں آ گئے۔ گرم چادر میں لپٹی ہوئی جاناں اور انیق میرے ساتھ تھے۔ احاطے میں چار پانچ گھوڑے بالکل تیار حالت میں موجود تھے۔ ایک پالکی بھی دکھائی دے رہی تھی۔ سردار سجاول ذرا بدلے ہوئے حلیے میں نظر آیا۔ سیاہ شلوار قمیص کے بجائے، وہ بڑے سائز کی سفید گھیر دار شلوار اور خاکی کرتے میں دکھائی دیتا تھا۔ سر پر اس نے ''بس ڈرائیوروں'' کی طرح ڈبی دار مفلر باندھ رکھا تھا۔ کندھوں پر گرم چادر تھی۔ وہ فیض محمد کو ضروری ہدایات دے رہا تھا۔ سجاول کی غیر موجودگی میں فیض محمد ہی یہاں کے حالات کی نگرانی کرتا تھا۔ وڈا سردار اعظم تو کسی مرض کی دوا ہی نہیں

تھا...... بلکہ وہ خودمرض تھا۔ میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ سجاول اپنے نائب فیض محمد کو جو ہدایات دے رہا ہے، ان میں سے زیادہ تر شرابی سردار اعظم کے لیے ہی ہوں گی۔

اتنے میں دو لڑکیاں ایک تیسری لڑکی کو بازوؤں سے پکڑے آہستہ آہستہ چلاتی پالکی کی طرف لائیں۔ لڑکی سرتاپا ایک سرخ چادر میں چھپی ہوئی تھی، جیسے نو بیاہتا دلہن ہو۔ اسے بڑی احتیاط سے پالکی میں بٹھا دیا گیا۔ یہ وہی حسین دوشیزہ تھی جسے میں نے کل تیار ہوتے دیکھا تھا۔

سجاول کے اشارے پر جاناں بھی پالکی میں سوار ہوگئی۔ میں، انیق اور سردار سجاول گھوڑوں پر سوار ہوئے۔ سردار سب سے آگے تھا۔ حسبِ معمول ہماری آنکھوں پر پٹیاں باندھ دی گئیں۔ اونچے نیچے دشوار راستے پر سفر کرتے تینوں گھوڑوں نے قریباً پانچ کلومیٹر فاصلہ طے کیا اور اس پختہ سڑک پر آگئے جو شمال میں گھنے جنگلوں کے اندر کہیں غائب ہو جاتی تھی اور جنوب میں کوٹلی وغیرہ کی سمت جاتی تھی۔

میری آنکھوں پر سے پٹی ہٹائی گئی تو سامنے ہی ایک مزدا لوڈر کھڑا نظر آیا۔ اس پر لکڑی کے سلیپر لدے ہوئے تھے۔ آزاد کشمیر کے علاقوں سے لکڑی عموماً میدانی علاقوں کی طرف روانہ کی جاتی ہے، یہ بھی کوئی ایسا ہی مال بردار ٹرک تھا۔

میری حیرت کی انتہا نہ رہی، جب پتا چلا کہ اس لوڈر نما ٹرک پر لدے ہوئے سلیپروں کے اندر ایک بڑا خلا موجود ہے۔ لوڈر کا ڈرائیور ہمارے ساتھ لوڈر پر چڑھ گیا۔ چند سلیپروں کو ان کی جگہ سے ہٹایا گیا تو ٹارچ کی روشنی میں قریباً پانچ فٹ ضرب چھ فٹ کا ایک چوکور خلا نظر آیا۔

''یہ کیا ہے؟'' میں نے سجاول کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''لیہ تک کے لیے تمہارے سفر کا انتظام۔ مزے سے بیٹھو اور کھاؤ پیو۔''

میں نے دیکھا کہ اس خلا کے اندر پھل فروٹ کے علاوہ دو بڑے ٹفن باکس بھی رکھے تھے، یقیناً ان میں کھانا تھا۔

پالکی میں سے پہلے جاناں اور پھر وہی دلہن کی طرح سجی ہوئی لڑکی برآمد ہوئی۔ دونوں کو سجاول اور میں نے سہارا دے کر لوڈر پر چڑھایا اور خلا میں اتارا۔ لڑکی واقعی کسی نوخیز پھول کی طرح تھی۔ سبک بدن اور نرم و نازک، جاناں خوش شکل تو تھی لیکن اس کا جسم ذرا لمبوترا اور چھریرا تھا۔ پالکی میں سے کچھ اور بھی نکالا گیا، یہ وہی مشینی پھول تھا جس کی سرخ پتیاں میکنزم کے تحت کھلتی اور بند ہوتی تھیں۔ اب یہ فولڈنگ پھول بند تھا۔ بہ آسانی لکڑی میں موجود خلا

کے اندر آ گیا۔ سجاول نے مجھے بھی خلا میں اترنے کی ہدایت کی۔ ٹارچ کی روشنی میں، میں نیچے اتر گیا۔ کلاشنکوف میرے کندھے پر تھی۔ پروگرام کے مطابق اس نامی گرامی ڈاکو سجاول سیالکوٹی کو ڈرائیور کے روپ میں یہ لوڈر ڈرائیو کرنا تھا اور انیق کو اس کے کنڈیکٹر یا ہیلپر کا کردار ادا کرنا تھا۔

ہم بیٹھ گئے تو خلا کو پھر لکڑی کے شہتیروں یا سلیپروں سے ڈھک دیا گیا۔

''مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' لڑکی منمنائی۔

میں نے ٹارچ روشن کر دی۔ اس نے سرخ شال کا گھونگھٹ سرکا دیا تھا۔ وہ واقعی ایک خوش رنگ دلہن لگ رہی تھی۔ پوری طرح سجی ہوئی اور خوشبوؤں میں بسی ہوئی۔ لوڈر ایک دھچکے کے ساتھ اپنے اجنبی سفر پر روانہ ہو چکا تھا۔ میں نے لڑکی سے اس کا نام پوچھا۔

''سنبل۔'' اس نے لرزتی آواز میں کہا۔

''کہاں کی رہنے والی ہو؟''

''مانسہرہ سائیڈ کی۔''

''تمہیں پتا ہے، ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

''ہاں جی پتا ہے، لیکن...... سردار جی نے کہا تھا کہ......زیادہ باتیں نہیں کرنی ہیں۔'' وہ قدرے معصومیت سے بولی۔

جاناں مجھے تیکھی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ شاید سمجھ رہی تھی کہ میں اس سنبل نامی دیہاتی لڑکی میں دلچسپی لے رہا ہوں۔ مجھے اس کی پروا نہیں تھی کہ وہ کیا سمجھ رہی ہے یا سوچ رہی ہے بلکہ مجھے ایک طرح سے پریشانی بھی تھی کہ وہ دم چھلا بن کر میرے ساتھ چل پڑی ہے۔ اس پر عشق کا بھوت سوار تھا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ ایسے بھوت جتنی جلدی چڑھتے ہیں اتنی جلدی اتر بھی جایا کرتے ہیں، لیکن فی الحال تو یہ بھوت بڑے کروفر سے اپنی جگہ براجمان تھا۔

ہمارا سفر اگلے تقریباً چھ گھنٹے تک بغیر رکے جاری رہا۔ شروع کے دو گھنٹوں میں یہی سفر زیادہ مشکل اور ہچکولے دار تھا مگر پھر قدرے ہموار ہو گیا۔ ہمارے چاروں طرف وزنی لکڑی کی چرچراہٹ اور بو تھی۔ مجھے اس سلسلے میں کچھ زیادہ تجربہ نہیں تھا لیکن اندازہ سا تھا کہ یہ دیار کی لکڑی ہے۔ ساگوان کے بعد غالباً اسی لکڑی کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ اس کی اپنی ایک مہک ہوتی ہے، چکھنے میں اس کا ذائقہ کڑوا ہوتا ہے۔ سجاول نے وقتِ رخصت مجھ پر انکشاف کیا تھا کہ ہم یہ لکڑی اسی وڈے صاحب کی عالیشان کوٹھی کے لیے لے جا رہے ہیں۔ یہ کوٹھی کسی مضافاتی علاقے میں کافی بڑے رقبے پر تعمیر ہو رہی تھی۔ سوال یہ تھا کہ سجاول کو کیسے پتا

چلا کہ وڈے صاحب تک پہنچنے کے لیے لکڑی سے بھرے ہوئے لوڈر کو ذریعہ بنایا جا سکتا ہے۔ اور یہ کیسے پتا چلا کہ یہ لکڑی کہاں سے کون سپلائی کر رہا ہے۔ یقیناً یہ ساری معلومات سجاول کو منشی افضل سے ہی حاصل ہوئی تھیں اور لڈو پیڑے والے کمرے سے ہی حاصل ہوئی تھیں۔ پتا نہیں کیوں سجاول کی سفاکی دیکھ کر کبھی کبھی مجھے جان ڈیرک اور اس کا ٹیکساری گینگ یاد آ جاتا تھا۔ وہ لوگ بھی سفاکی کے چمپئن تھے اور میرے ازلی دشمنوں میں سے۔ مجھے پتا تھا جلد یا بدیر میرا ان سے پھر سامنا ہونا ہے۔

قریباً چھ گھنٹے کے بعد لوڈر ایک جگہ رکا۔ یقیناً اب دن کافی چڑھ آیا تھا۔ سنبل کی کلائی پر ہفت رنگ چوڑیوں کے ساتھ ساتھ ایک خوب صورت گھڑی بھی موجود تھی۔ میں نے وقت دیکھا۔ نو بجنے والے تھے۔ ''کیا محل آ گیا؟'' سنبل نے پوچھا۔

''نہیں، ابھی نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ محل کے لفظ پر میں اور جاناں دونوں ہی چونکے تھے۔

پتا نہیں کہ سجاول نے اس لڑکی کو کیا بتا رکھا تھا اور کس طرح مطمئن کر رکھا تھا کہ وہ خوشی خوشی کسی عشرت کدے کی طرف جا رہی تھی۔ اسے تحفے کے طور پر پیش کیا جا رہا تھا اور دیکھا جاتا تو وہ واقعی لاکھوں میں ایک تھی، کم از کم شکل وصورت کے لحاظ سے تو تھی۔

اسی دوران میں میرے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ دوسری طرف سجاول تھا۔ وہ لوڈر کے کیبن سے بول رہا تھا۔ اب وہ مجھے کافی بے تکلفی سے مخاطب کر لیتا تھا۔ کہنے لگا۔ ''کیا حال ہے جگر! ناشتا واشتا کر لیا؟''

میں نے کہا۔ ''تم کہیں ٹکنے دیتے تو ناشتا کرتے۔ اب کہاں ہیں ہم؟''

''میانوالی اور بھکر کے درمیان ہیں۔ آگے پانچ چھ گھنٹے کا سفر باقی ہے۔'' پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''چھوری کیسی ہے؟'' چھوری سے مراد سنبل ہی تھی۔

میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ ابھی پوچھ رہی تھی کہ محل کتنی دور ہے؟''

سجاول نے ذرا آواز دبا کر کہا۔ ''اس سے زیادہ باتیں نہ کر۔ ایویں الجھ جائے گی۔ میں نے اس سے کہا ہے کہ وڈا صاحب محل میں رہتا ہے۔''

......سجاول نے لڑکی سنبل سے ایسے ہی کہہ دیا تھا کہ وڈا صاحب محل میں رہتا ہے لیکن جب کوئی سات آٹھ گھنٹے بعد ہم لکڑی کے ان شہتیروں کے نیچے سے نکلے اور اردگرد دیکھا تو دنگ رہ گئے۔ ہم ایک سنسان جگہ پر تھے جو کسی حد تک سرسبز بھی تھی۔ ہمارا لوڈر ایک پختہ سڑک پر درختوں کے نیچے کھڑا تھا۔ قریباً دو ڈھائی فرلانگ کے فاصلے پر ہمیں واقعی ایک خوب

صورت محل نما وسیع عمارت نظر آ رہی تھی۔ اس کی بلند دیواریں اور سفید برجیاں دور ہی سے چمکتی دکھائی دیتی تھیں، کافی فاصلے سے بھی مجھے رکھوالی کے کتوں کا مدھم شور سنائی دیا۔ ہم ابھی تک لوڈر کے اوپر ہی کھڑے تھے۔ جاناں نے دور دور تک ان ویران نشیب و فراز پر نگاہ دوڑائی اور بولی۔ ''ہم کہاں ہیں شاہ زیب؟''

''ابھی تو لوڈر پر ہیں۔ نیچے اترو گی تو پتا چلے گا۔'' میں نے کہا۔

ہمارے ساتھ ہی انیق اور سجاول بھی لوڈر کے اگلے حصے سے نکل آئے تھے۔ سجاول مہندی لگے بالوں والے ایک تنومند شخص سے باتیں کرنے لگا۔ انیق نے میرے ساتھ مل کر دونوں لڑکیوں کو سہارا دیا اور لوڈر سے نیچے اتارا۔ ایک ہی جگہ سمٹ کر بیٹھے رہنے سے سنبل کی ٹانگیں اکڑ گئی تھیں اور وہ ہائے ہائے کر رہی تھی۔ محل نما عمارت تو خاصے فاصلے پر تھی، ہمیں چالیس پچاس قدم کے فاصلے پر ایک اور شاندار بنگلا نظر آ رہا تھا۔ یہ ڈیڑھ دو کینال کے رقبے پر ہوگا۔ باقی اوپن ایریا تھا۔ دروازے پر پنجابی شکل و صورت اور حلیے والا ایک دراز قد شخص پہرا دے رہا تھا۔ اس کے کندھے سے سیون ایم ایم رائفل جھول رہی تھی۔

مہندی لگے بالوں والے شخص نے مجھے اور دونوں لڑکیوں کو ساتھ لیا اور اس بنگلا نما عمارت کی طرف بڑھ گیا۔ ہمارے عقب سے سجاول نے ہانک لگائی۔ ''شاہی، میں بھی تھوڑی دیر میں آ رہا ہوں، یہ مال اتار کر۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

محل نما وسیع و عریض بلڈنگ کے عقب میں کچھ تعمیر کیا جا رہا تھا۔ دور ہی سے حرکت کرتے مزدوروں کے ہیولے دکھائی دیتے تھے۔ سیمنٹ اور بجری وغیرہ مکس کرنے والی کسی ہیوی مشین کا شور بھی سنائی دیتا تھا۔ یقیناً یہ لکڑی جو ہم لے کر یہاں پہنچے تھے، اسی نئی تعمیر میں استعمال ہونا تھی۔ ہم مہندی لگے بالوں والے شخص کے عقب میں چلتے بنگلے کے دروازے پر پہنچے۔ پہریدار نے دلچسپی اور شرارتی نظروں سے دونوں لڑکیوں کو دیکھا لیکن کچھ کہا نہیں۔ اس نے میرے کندھے سے جھولتی ہوئی کلاشنکوف پر بھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔ ہم اندر آ گئے۔ (تاہم اگلے دن یہ رائفل مجھ سے لے لی گئی)

یہ بنگلا اندر سے زیادہ سجا ہوا تھا۔ محسوس ہی نہیں ہوتا تھا کہ باہر سے یہ عمارت ایک ویرانے میں کھڑی ہے۔ ماربل کے فرش، آرائشی چھتیں، قدرتی گیس اور بجلی کا انتظام۔ صاف ستھری راہداریاں، نوکر چاکر بھی دکھائی دے رہے تھے۔ مہندی لگے بالوں والے شخص نے اپنا نام سراج بتایا اور ہمیں ایک کشادہ کمرے میں پہنچا دیا۔ جہاں قیمتی صوفے اور آرام دہ کرسیاں

رکھی تھیں۔ دیوار گیر شیشے کی دوسری جانب پھلواری تھی اوراس کے درمیان فوارے کا پانی اچھل رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں ایک ملازمہ ہمارے لیے چائے اور دیگر لوازمات لے کر آ گئی۔ وقت تو یہ کھانے کا تھا، بہرحال چائے اور لوازمات بھی غنیمت تھے۔ ابھی ہمیں بیٹھے ہوئے دس پندرہ منٹ ہی ہوئے تھے کہ کسی پاس والے کمرے سے کسی شخص کے گرجنے برسنے کی آواز آئی۔ شاید کسی ملازم کو زبردست ڈانٹ پلائی جا رہی تھی۔ کبھی کبھی ملازم کی لرزتی کانپتی باریک سی آواز بھی سنائی دے جاتی تھی۔ گفتگو سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ گرجنے برسنے والا شخص وہ ہے جسے سجاول نے وڈے صاحب کا منیجر بتایا تھا۔ ڈانٹ ڈپٹ کے آخر میں اس نے ملازم کو تھپڑ جڑ دیا اور گالیاں دیں۔ گالیوں کی غلاظت ہمارے کانوں تک بھی پہنچ رہی تھی۔ سنبل اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی اور جاناں بھی ڈری ڈری نظر آئی۔

پانچ دس منٹ مزید گزرے تھے کہ مجھے کہیں پاس سے ہی سجاول کی بھاری بھرکم آواز بھی سنائی دے گئی۔ لکڑی اتنی جلدی تو ''اَن لوڈ'' نہیں کی جا سکتی تھی۔ یقیناً سجاول یہ کام مزدوروں کے سپرد کر کے واپس یہاں بنگلے میں آ گیا تھا۔

قدموں کی تیز آواز آئی اور پھر رنگے بالوں والا سراج لمبے ڈگ بھرتا اندر آ گیا۔ ملازمہ بھی ساتھ تھی۔ ملازمہ نے جلدی جلدی چائے کے برتن اٹھائے۔ سراج نے تنقیدی نظروں سے ہمارا جائزہ لیا اور اطلاع دینے والے انداز میں بولا۔ ''آقا جان آ رہے ہیں۔ تم لوگوں سے بات کریں گے۔'' پھر اس کی نظر میری کلاشنکوف پر پڑی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا ہے۔ میں نے کلاشنکوف کندھے سے اتار کر ایک طرف صوفے کی آڑ میں رکھ دی۔

دو چار منٹ ہی گزرے تھے کہ بھاری قدموں کی آوازیں آئیں۔ سنبل نے ڈری ڈری نظروں سے میری اور جاناں کی طرف دیکھا۔ وہ ایک ان پڑھ دیہاتی لڑکی تھی۔ اس کا کل سرمایہ اس کی خوب صورتی اور جسمانی موزونیت ہی تھی۔ دروازہ کھلا اور تین افراد اندر آ گئے۔ ان میں ایک تو سجاول تھا جو ڈرائیور کے روپ میں بالکل ٹھیک لگ رہا تھا، دوسرا سراج تھا جو اب بڑے مؤدب انداز میں ناف پر ہاتھ باندھے ہوئے تھا اور تیسرا وہی ''آقا جان'' تھا۔ اس کی عمر چالیس کے قریب ہو گی۔ آدھا سر گنجا تھا۔ جسم چھریرا اور چہرے پر سختی نے جھنڈے گاڑ رکھے تھے۔ اس کی ناک کے اوپر ماتھے کے قریب ایک موٹا بل تھا جو اس کی تندمزاجی کی واضح دلیل تھا۔ اس نے پینٹ قمیص کے ساتھ سیاہ واسکٹ پہن رکھی تھی، آستینیں اڑسی ہوئی تھیں۔ اس نے تیز نظروں سے ہم تینوں کا جائزہ لیا۔ ہم کھڑے ہو چکے تھے۔ چند سیکنڈ بعد وہ سجاول سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''ہاں بھئی، کیا چاہتے ہو تم؟''

سجاول نے ''عاجزی'' سے کہا۔ ''اس لال چادر والی کو دیکھ لیں جی۔''
''کچھ دکھائے گی تو دیکھوں گا نا۔'' آقا جان نے جلے کٹے لہجے میں کہا۔ اس کی ناک کا بل کچھ اور موٹا ہو گیا۔

سجاول نے جاناں کو اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھی اور اس نے سنبل کے سر سے چادر اتار کر ایک طرف صوفے پر رکھ دی۔ سنبل اپنے آپ میں سمٹ سی گئی۔ آقا جان نے اسے سر تا پا گھورا۔ اس کی آنکھوں میں چند لمحے کے لیے مجھے دلچسپی کے آثار نظر آئے لیکن پھر اوجھل ہو گئے۔ ''ذرا گھماؤ اس کو۔'' آقا جان نے جاناں سے مخاطب ہو کر کہا۔ جیسے سنبل کوئی جیتی جاگتی لڑکی نہ ہو۔ لکڑی کی شہتیری ہو یا کوئی ڈیکوریشن پیس۔ جاناں نے چند سیکنڈ جھجکنے کے بعد سنبھل کو آہستہ سے گھمایا اور پھر آقا جان کے رخ پر کھڑا کر دیا۔ آقا جان، بیزاری سے بولا۔
''کیا کرنا ہے اس کا؟ مجھے تو کچھ خاص نظر نہیں آ رہا۔ پڑھی لکھی بھی نہیں ہے شاید۔''
سنبل جیسے زمین میں گڑی جا رہی تھی۔ سجاول نے فرمائشی انداز میں کہا۔ ''نین نقش کی اچھی ہے جناب...... اور تابع دار بھی ہے۔''
''نین نقش کی کیا اچھی ہے۔ رنگ ذرا چٹا ہے۔ ایسی تو اب بھی دو تین یہاں وہاں پھر رہی ہوں گی۔'' آقا جان کی ناک کی سلوٹ مزید نمایاں ہو گئی۔ وہ خاصا غصیلا اور بد دماغ لگتا تھا۔

سجاول نے کہا۔ ''ذرا علیحدہ ہو کر میری بات سنیں جی۔''
وہ بیزار انداز میں سجاول کے ساتھ باہر چلا گیا۔ ہم اپنی اپنی جگہ کھڑے رہے پھر بیٹھ گئے۔ سنبل خود کو خاصی خجل محسوس کر رہی تھی۔ وہ خوب صورت تھی اور اس کی خوب صورتی واقعی متاثر کرنے والی تھی...... اور مجھے یقین تھا کہ وہ سڑیل آقا جان بھی اس سے متاثر ہوا ہے۔ لیکن اس نے ظاہر یہی کیا تھا، جیسے سجاول جس لڑکی کو نادر تحفہ سمجھ کر لایا ہے، وہ عام سی لڑکی ہے۔

سجاول تو آقا جان کے ساتھ چلا گیا۔ ہم وہیں پر رہے اور ارد گرد کا جائزہ لیتے رہے۔ ایک کھڑکی میں دیوار گیر شیشہ لگا ہوا تھا۔ اس شیشے میں سے بھی دور فاصلے پر وہ محل نما عمارت نظر آتی تھی جس کا نظارہ ہم نے لوڈر سے اترتے وقت کیا تھا۔ عمارت کی بیرونی دیواریں بہت اونچی تھیں۔ انہیں شاید حال ہی میں مزید اونچا کیا گیا تھا۔ اوپر خار دار تاروں کے بڑے بڑے چھلے تھے۔ کئی جگہ چھوٹی چھوٹی برجیاں بھی بنی ہوئی تھیں۔ یقیناً یہ چیک پوسٹ کی حیثیت رکھتی تھیں۔ سورج کی روشنی میں سرچ لائٹس کے شیشے بھی چمک رہے تھے۔

جاناں نے کہا۔ ’’لگتا ہے کہ یہاں رہنے والوں کو سکیورٹی کا بہت زیادہ مسئلہ ہے۔‘‘
’’ہاں لگ تو یہی رہا ہے۔‘‘
’’کن لوگوں سے خطرہ ہو سکتا ہے؟‘‘ جاناں نے پوچھا۔
’’بڑے لوگوں کے لیئے ہر طرف خطرہ ہی خطرہ ہوتا ہے۔ ویسے بھی یہ مضافاتی علاقہ ہے۔ یہاں زمیندار لوگ رہتے ہیں، ممکن ہے کہ یہ کوئی مقامی خطرہ ہی ہو۔‘‘
ابھی ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ سجاول واپس آ گیا۔ اس کی آنکھوں سے پتا چلتا تھا کہ خاصا تپا ہوا ہے۔ وہ اور میں کشادہ کمرے کے ایک گوشے میں کارنر صوفے پر جا بیٹھے۔ وہ بولا۔ ’’بہت بھیڑی شے ہے یہ آقا جان۔ ایک نمبر کا دغا باز اور لالچی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کڑی میں نقص کیوں نکال رہا ہے۔ تم نے دیکھا ہی ہے اس کو۔ لاکھوں میں نہیں تو ہزاروں میں ایک ہے۔ پہاڑی لوگ تھے، ٹھیک ٹھاک پیسے دے کر لایا ہوں اسے۔ اور یہ خانہ خراب آقا جان کہہ رہا ہے کہ مال نرم ہے۔‘‘
’’کوئی چکر ہوگا اس کے پیچھے یا پھر تم سے کچھ رقم اینٹھنا چاہتا ہوگا۔‘‘
’’میں نے اشاروں کنایوں میں کہا ہے کہ اگر کچھ مال پانی کا مسئلہ ہے تو وہ بھی حل ہو سکتا ہے۔ مگر ایک بار اس کڑی پر وڈے صاحب کی نظر ضرور پڑنی چاہیے۔‘‘
’’کیا کہتا ہے؟‘‘
’’یہی کہ لڑکی ابھی کچی لگتی ہے۔ اٹھنے بیٹھنے کی تمیز نہیں ہے۔ بات چیت اور لباس کا رنگ ڈھنگ بھی ایسا ہے کہ وڈے صاحب کو پسند نہیں آئے گا۔ کہہ رہا ہے کہ یا تو اسے واپس لے جاؤ یا چند دن یہاں بنگلے میں رہنے دو تا کہ اس پر تھوڑی محنت کر کے اسے وڈے صاحب کے قابل بنایا جا سکے؟‘‘
’’اور محنت کرے گا کون؟‘‘
’’کہتا ہے کہ یہاں دو تین عورتیں ایسی ہیں جو وڈے صاحب کے مزاج کو اچھی طرح سمجھتی ہیں۔‘‘
’’اور ہم واپس چلے جائیں گے؟‘‘
’’نہیں۔ تم اور جاناں تو شاید نہیں جاؤ گے۔ میں اور انیق لکڑی کا دوسرا پھیرا لے کر دو چار دن میں پھر آ جائیں گے۔‘‘
’’میں اور جاناں کس طرح یہاں رہیں گے؟‘‘ میں نے پوچھا۔
’’میں نے تمہیں بتایا تھا ناں کہ یہ لمڈھینگ (جاناں) یہاں کسی کام آ سکتی ہے۔ یہ آقا

جان کی بیوی کے گھٹنے پننے کے کام آئے گی۔"

"آقا جان کی بیوی؟"

"ہاں کسی انگریز سے بیاہ کیا ہوا ہے اس نے۔ اس عورت کے بس دو ہی شوق ہیں۔ انگریزی کے ناول پڑھنا اور اپنی ٹانگیں دبوانا۔ لیکن پڑھ وہ خود نہیں سکتی۔ اس کی آنکھوں اور سر میں سخت درد ہو جاتا ہے۔ اس لیے اسے کسی ایسی کڑی کی ضرورت ہے جو اسے کتاب پڑھ کر سناتی رہے، اور ساتھ ساتھ ہر گھنٹے بعد پانچ دس منٹ کے لیے اس کا جسم بھی دباتی رہے۔"

ہمیں جہاں رکھا گیا تھا، یہ دراصل اس بنگلے کی انیکسی تھی۔ رات کو ہمارے لیے ساتھ والا کمرا بھی کھول دیا گیا۔ میں سجاول اور انیق اس کمرے میں چلے گئے۔ جاناں اور سنبل دوسرے کمرے میں رہیں۔ شام کے بعد ہمیں آقا جان کی بیوی کی بس ایک چھوٹی سی جھلک نظر آئی۔ وہ ٹیرس میں کھڑی کسی کو آواز دے رہی تھی۔ خوب صورت تو تھی لیکن موٹی ہو چکی تھی۔ عمر پینتیس چالیس ہوگی۔ گال سیبوں کی طرح دہک رہے تھے۔

انیق رات کا کھانا کھانے کے بعد برآمدے میں ٹہلنے چلا گیا۔ میں اور سجاول اپنے اپنے بستر پر بیٹھے صورتِ حال پر غور کرتے رہے۔ باتیں کرنے سے پہلے میں نے اچھی طرح کمرے کا جائزہ لے لیا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ یہاں آڈیو وڈیو ریکارڈنگ کا کوئی خفیہ انتظام نہ ہو۔ لیکن یہ اندیشہ غلط نکلا۔ بہرحال ہم نے گفتگو میں بالکل دھیما لہجہ ہی اختیار کیا۔ میں نے سجاول سے کہا۔ "میں جانتا ہوں، تم نے کچھ باتیں مجھے بتائی ہیں اور کچھ چھپائی بھی ہیں اور جو چھپائی ہیں شاید وہ زیادہ اہم ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"اگر ہمیں ایک ساتھ چلنا ہے اور اس وڈے صاحب کا کچا چٹھا جاننا ہے تو پھر ایک دوسرے سے آدھا نہیں پورا سچ بولنا ہوگا۔ اسی صورت میں کامیابی مل سکتی ہے۔"

"میں نے تم سے کیا چھپایا ہے؟" وہ اپنی بھاری پاٹ دار آواز میں بولا۔

"پہلی بات تو یہ چھپائی ہے کہ منشی افضل بھاگنے کی کوشش میں مارا گیا۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارے کارندوں نے اسے "لڈو پیڑے" والے کمرے سے خود نکالا اور قتل کیا۔"

سجاول کے چہرے پر کوئی خاص تاثر نہیں ابھرا۔ اسی طرح پہلو کے بل لیٹا رہا۔ سر کو اونچا رکھنے کے لیے اس نے کہنی کو تکیے پر ٹکایا ہوا تھا۔ اس کے چوڑے چکلے جسم نے جیسے پورے بیڈ کو گھیرا ہوا تھا۔ "اب دوسری بات بھی بتا دو۔" وہ بولا۔

''دوسری بات یہ کہ تم نے منشی افضل سے بہت کچھ اگلوایا۔ اسی کی دی ہوئی معلومات کے مطابق تم نے وڈے صاحب تک پہنچنے کے لیے لوڈر ڈرائیور کا روپ دھارا۔ منشی افضل کو پوری طرح نچوڑنے کے بعد تم نے اسے شوٹ کروا دیا۔''

سجاول نے وہسکی کے دو گلاس بھر لیے تھے۔ اس نے ایک میری طرف بڑھایا اور دوسرے سے گھونٹ گھونٹ پینے لگا۔ اس کی بڑی بڑی چمکیلی آنکھوں میں گہری سوچ تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے دھیمے لہجے میں بولنا شروع کیا۔ ''یہ وڈا صاحب جو کوئی بھی ہے بیرونائی سے آیا ہے۔ بے تحاشا پیسے کا مالک ہے، لیکن ہے چٹا ان پڑھ۔ کہتے ہیں کہ زندگی میں اس نے جس مٹی میں بھی ہاتھ ڈالا ہے اسے سونا بنایا ہے۔ کافی شوقین مزاج بھی ہے۔ پھولوں اور خوشبوؤں سے بہت زیادہ پیار کرتا ہے۔ سیکڑوں طرح کے تو گلاب ہی ہیں جو اس نے اپنے محل میں لگا رکھے ہیں۔''

میں نے دیوار گیر کھڑکی سے باہر دیکھا درمیانی راتوں کا گول چاند محل نما عمارت کی بلند برجیوں کے اوپر دمک رہا تھا۔ قریباً سترہ اٹھارہ فٹ اونچی چار دیواری پر سرچ لائٹس حرکت کرتی تھیں۔

سجاول نے کہا۔ ''شاید اس چاند کو دیکھ رہے ہو تم۔ اس چاند کا بھی یہاں ہونے والے پروگرام سے گہرا ناتا ہے۔''

''چاند کا...... گہرا ناتا؟''

''ہاں...... ہر تیسرے چاند پر یہ وڈا صاحب اپنے لیے کچھ تفریح وغیرہ کا انتظام کرتا ہے۔ شاید تمہیں پتا نہ ہو یہاں اس مہمان خانے میں ہم اکیلے ہی نہیں ٹھہرے ہوئے...... پانچ چھ اور مہمان بھی ہیں۔ سمجھو کہ پانچ چھ لڑکیاں اور ان کو یہاں لانے والے...... کل چودھویں کی رات ہے اور سب کو کل ہی کا انتظار ہے۔''

''تمہاری کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی سجاول۔ کسی ترتیب سے بتاؤ تو شاید پتا چل جائے۔'' میں نے قدرے بیزاری سے کہا۔

اس نے حسبِ عادت اپنی تیکھی مونچھوں کو شہادت کی انگلی سے سہلایا اور بولا۔ ''یہاں پانچ چھ کڑیاں اور بھی ہیں۔ کل وہ سب وڈے صاحب کے سامنے لائی جائیں گی۔ وہ ان میں سے کسی ایک کو اپنے پاس رکھے گا۔ اس کو یہ لوگ ''ملازم رکھنا'' کہتے ہیں۔ باقی لڑکیوں اور ان کے وارثوں کو انعام اکرام دے کر رخصت کر دیا جائے گا۔ ملازم ہونے والی کڑی دو تین مہینے یہاں وڈے صاحب کے پاس رہے گی اور پھر کافی ساری رقم اور تحفے تحائف لے کر چلی

جائے گی۔ لیکن ایسی ملازماؤں میں سے کوئی ایک آدھ ایسی خوش قسمت بھی ہوتی ہے جو خواص بن جاتی ہے۔"

"خواص کا کیا مطلب؟"

"مطلب تو ٹھیک سے مجھے بھی پتا نہیں۔ بس یہ سمجھو کہ وڈا صاحب اسے رخصت نہیں کرتا بلکہ پکی ملازمت دے دیتا ہے۔ ایسی سات آٹھ زنانیاں اور بھی یہاں موجود ہیں۔ ان کو خواص کہا جاتا ہے۔ وہ اس محل جیسی بلڈنگ کے علیحدہ علیحدہ حصوں میں بڑے ٹھاٹ سے رہتی ہیں۔"

"علاقے کے لوگ پوچھ تاچھ نہیں کرتے کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟"

"پوچھ تاچھ کرنے والے کون لوگ ہوتے ہیں؟ یہی علاقے کے ایم پی اے، ایم این اے اور دوسرے آگو زمیندار وغیرہ۔ یہ سب لوگ تو خود ایسے حماموں میں ننگے نہا رہے ہیں۔ ویسے بھی یہ سارا کام بڑے طور طریقے سے کیا جاتا ہے۔ اخبار میں باقاعدہ اشتہار دیا جاتا ہے کہ پڑھی لکھی خوش اخلاق ملازمہ کی لوڑ ہے وغیرہ وغیرہ۔ پر جاننے والے جانتے ہیں کہ وڈے صاحب کے محل میں کس طرح کی ملازمہ چاہیے اور کیوں چاہیے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ملازمہ اور ملازمت کے لفظ یہاں کس مطلب میں بولے جاتے ہیں۔ اس لیے وہ آجاتے ہیں۔ اب بھی آئے ہوئے ہیں۔"

"کون لوگ ہیں یہ؟" میں نے پوچھا۔

"یار، وہی شہدے جو اس طرح کے کام کرتے ہیں۔ ان میں سے دو تو لاہور کے شاہی محلے سے یہاں پہنچے ہیں۔ ایک خیر سے میرے سیالکوٹ کا ہی ہے...... لاہور سے ہی فلموں کا ایک ایکسٹرا سپلائر بھی ایک سپلائی (یعنی ایک لڑکی) لے کر آیا ہوا ہے۔ ایک بظاہر شریف زنانی ہے، بیوٹی پارلر والی...... وہ اپنی سگی بھتیجی کو لے کر یہاں پہنچی ہوئی ہے۔ یہ سب وہ کڑیاں ہیں جن کو اس حرامی آقا جان نے چن رکھا ہے۔ لیکن مجھے ایک سمجھ نہیں آرہی۔" سجاول الجھے ہوئے سے انداز میں بولا۔

"وہ کیا؟"

"میں نے دوپہر کو ان میں سے تین چار کڑیوں کو دیکھا ہے۔ ان میں سے ایک بھی اس سنبل کے پائے کی نہیں ہے۔ پائے کی یا اس کے گوڈوں تک بھی نہیں آتی۔ پر یہ بہن خور آقا جان سنبل میں کیڑے نکال رہا ہے۔"

میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "یہ آقا جان اور یہ وڈا صاحب نازل کہاں سے

ہوئے ہیں پاکستان میں؟‘‘

جواب میں سجاول نے اپنی محدود معلومات کے مطابق جو کچھ بتایا، اس کا لبِ لباب یہ تھا۔’’وڈا صاحب اپنے دو بیٹوں کے ساتھ برونائی سے پاکستان شفٹ ہوا تھا۔ برونائی میں اس کی کسی کے ساتھ سخت دشمنی چل رہی تھی۔ اس دشمنی سے خود کو اور بیٹوں کو بچانے کے لیے وہ یہاں آ گیا تھا۔ وڈے صاحب کے اصل نام کا تو سجاول کو پتا نہیں تھا، ہاں یہ معلوم تھا کہ اس کا باپ مسلمان اور ماں کوئی کرسچن خانہ بدوش تھی۔ وڈا صاحب صرف آٹھ سال کا تھا کہ اس کی ماں فوت ہو گئی۔ باپ بھی زیادہ توجہ نہ دے سکا اور وڈا صاحب آوارہ ہو گیا۔ وہ اَن پڑھ تھا لیکن زبردست مقدر لے کر پیدا ہوا تھا۔ جوان ہو کر اس نے جس کام میں بھی ہاتھ ڈالا، اس کو سونے کی کان بنا دیا۔ برونائی میں تیل کی ایک بڑی کمپنی اس کی ملکیت تھی۔ اس کے علاوہ کئی فیکٹریاں، فرمیں اور فارم ہاؤسز بھی اس کی پراپرٹی میں شامل تھے۔ جہاں دولت زیادہ ہوتی ہے وہاں حاسد بھی ہوتے ہیں۔ اپنے خاندان میں ہی کسی حاسد سے وڈے صاحب کی دشمنی چل نکلی۔ مگر یہ بھی کہا جاتا تھا کہ اس دشمنی کی جڑیں ماضی میں کافی دور تک موجود تھیں۔ وڈا صاحب جب چالیس پینتالیس کا تھا اس کو ایک خطرناک بیماری نے آ لیا۔ اس کی جان تو بچ گئی مگر اس کی قوتِ سماعت بہت کمزور ہو گئی۔ اس کے علاوہ اس کی جلد پر داغ سے نمودار ہو گئے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ اس بیماری کے پیچھے بھی ’’دشمنی‘‘ ہی تھی۔‘‘

سجاول نے مزید جو کچھ بتایا، اس کا خلاصہ یوں تھا۔ مجموعی طور پر وڈا صاحب بہت نفیس سمجھا جاتا تھا۔ اچھے لباس، اچھی خوشبوئیں اور بہترین گاڑیاں اس کا شوق تھیں۔ اب اس کی عمر پچپن سال سے اوپر تھی مگر جسمانی طور پر صحت مند تھا۔ دیگر مشاغل کے علاوہ خواتین کے ساتھ وقت گزارنا بھی اسے پسند تھا۔ اس کے لیے وہ بڑے کھلے دل سے روپیہ بھی خرچ کرتا تھا۔ اس کے مذہب کے بارے میں بات واضح نہیں تھی۔ کچھ کہتے تھے کہ وہ مسلمان ہے، کچھ کا خیال تھا کہ اس نے اپنی ماں کا مذہب اپنایا ہوا ہے۔

سجاول کی ساری بات سننے کے بعد میں نے کہا۔’’اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہاں جو بہت ہائی سکیورٹی نظر آ رہی ہے، اس کی وجہ وڈے صاحب کی وہ برونائی والی دشمنی بھی ہو سکتی ہے۔‘‘

’’شاید ایسا ہی ہے۔‘‘ سجاول بولا۔

’’لیکن وہ دوسرا معما کیا ہے؟‘‘

’’کون سا؟‘‘

''ان لڑکیوں والا جن کو زہر دے کر کسی کام کے لیے تیار کیا جا رہا ہے؟''

''تمہارا دماغ کیا کہتا ہے؟'' سجاول نے کہا۔

''ابھی تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ لیکن لگتا ہے کہ یہ معاملہ عیاشی والا نہیں ہے۔ وہ لڑکیاں کوئی بہت زیادہ خوب صورت بھی نہیں۔ پھر ان کا تعلق ایسے گھرانوں سے ہے جو مذہبی ہیں۔ ان لڑکیوں سے شاید کوئی اور طرح کا کام لیا جانا ہے۔''

اچانک ساتھ والے کمرے میں آہٹ ہوئی اور پھر کس عورت کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ اس ساتھ والے کمرے میں جاناں اور سنبل ٹھہری ہوئی تھیں۔ میں دروازے سے کان لگا کر سننے لگا۔ ایک عورت ولایتی لہجے میں اردو بول رہی تھی اور جاناں سے باتیں کر رہی تھی۔

''ہام کو بہت خوشی ہوا کہ تم، ہام کے ساتھ رہ سکتا ہے۔ ہام کو توم جیسا گرل کا بہت ضرورت تھا۔''

''مجھے آپ کی خدمت کر کے خوشی ہوگی۔'' جاناں نے کہا۔

''کیا تم ابھی ہام کے ساتھ چلنا پسند کریں گا۔ ہام کا دل کتاب سننے کو چاہتا ہے۔''

میں نے کی ہول سے آنکھ لگا کر دیکھا۔ یہ وہی، آقا جان کی فربہ اندام انگلش بیوی تھی جس کی جھلک بالکونی میں نظر آئی تھی۔ وہ بڑے دھڑلے سے دونوں ہاتھ کمر پر رکھے جاناں سے باتیں کر رہی تھی۔ اس کا لہجہ ضرور نرم تھا مگر چہرے پر اپنے خاوند کی طرح ہی کرختگی تھی۔ اس بارے میں میرے اور سجاول کے درمیان پہلے ہی مشورہ ہو چکا تھا۔ اس مشورے کے مطابق جاناں اس انگریز عورت کے ساتھ چلی گئی۔ کمرے میں اب سنبل اکیلی تھی۔ سجاول نے اس کے پاس جا کر اسے تسلی تشفی دی اور کہا کہ وہ آرام سے لحاف اوڑھ کر اور دروازہ بند کر کے سو جائے۔ جاناں کے پاس کمرے کی چابی ہے۔ جب اس کو آنا ہوگا، خود ہی آ جائے گی۔

میں اور سجاول اپنے کمرے میں ایک بار پھر باتوں میں مصروف ہو گئے۔ اس مرتبہ گفتگو پھر منشی اور افضل کی موت سے شروع ہوئی۔ سجاول نے ڈھکے چھپے لفظوں میں اقرار کر لیا کہ اسے منشی کو قتل کرنا پڑا ہے...... ابھی ہمیں گفتگو کرتے ہوئے پانچ دس منٹ ہی ہوئے تھے کہ باہر سے ایک بار پھر آقا جان کی کڑک دار آواز آنا شروع ہو گئی۔ وہ کسی اور ملازم کو ڈانٹنے پھٹکارنے میں مصروف تھا۔ سجاول نے کہا۔ ''اوئے، شاہی، تیرا وہ نکو شہزادہ ابھی تک نہیں آیا۔ کسی نے اغوا ہی نہ کر لیا ہو۔'' انیق کو وہ نکو شہزادہ کہہ کر بلانے لگا تھا۔

میں نے کہا۔ ''گھبراؤ نہ۔ وہ اتنا نکو بھی نہیں۔ عام کیٹیگری کے دو تین بندوں کو تو وہ خود اغوا کر سکتا ہے۔''

''بھئی، بڑی لمبی عمر ہے اس کی۔ وہ دیکھو آرہا ہے۔'' سجاول نے چھوٹی کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

باہر ٹیوب لائٹ کی دودھیا روشنی میں انیق لمبے ڈگ بھرتا ہوا آرہا تھا۔ دومنٹ بعد وہ کمرے میں تھا۔ میں اب اس کے تاثرات کو کافی حد تک پہچاننے لگا تھا۔ اس کی چپ بتا رہی تھی کہ وہ کوئی خبر لے کر آیا ہے۔

دروازہ بند کر کے اس نے احتیاط سے اردگرد کا جائزہ لیا اور دھیمی آواز میں کہا۔ ''مجھے ساتھ لا کر آپ لوگوں نے اچھا کیا ہے۔ میں نے آتے ساتھ ہی آپ حضرات کے لیے ایک آسانی پیدا کر دی ہے۔''

''کیسی آسانی؟''

''میں نے ابھی آقا جان کو فون پر کسی سے باتیں کرتے سنا ہے۔ وہ لان میں ٹہل رہا تھا اور بڑی بے پروائی سے کسی سوہل نامی بندے سے گفتگو کر رہا تھا۔ کافی خفیہ قسم کی گفتگو۔''

''خفیہ گفتگو اور سرِعام؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں یہ مالے زبان میں تھی۔'' انیق معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''پتا چل گیا ہے جی کہ یہ آقا جان، سنبل میں کیڑے کیوں نکال رہا ہے۔ دراصل وہ اپنا ایک اُلو سیدھا کرنا چاہ رہا ہے۔ کل جو پانچ چھ لڑکیاں وڈے صاحب کے سامنے جائیں گی ان میں سے ایک ایسی ہے جو آقا جان کے کسی جاننے والے کی سفارش سے آئی ہے۔ اگر وہ لڑکی وڈے صاحب کو پسند آجاتی ہے اور ''ملازمت'' کے لیے سلیکٹ ہو جاتی ہے تو آقا جان بڑے فائدے میں رہے گا۔ شاید روحی نام ہے اس لڑکی کا۔''

سجاول نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ ''وہی نسواری آنکھوں والی جو چِٹی پتلون میں پنسل جیسی ٹانگیں لیے پھر رہی تھی......؟''

''میں نے اس کو دیکھا تو نہیں جی۔ بس نام سنا ہے۔'' انیق نے کہا۔

سجاول نے اس لڑکی کو اور آقا جان کو ایک غائبانہ گالی دی اور وہسکی کے کئی گھونٹ چڑھا گیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اتنے غصے میں کیوں ہے۔ سفید پتلون اور سرخ جرسی والی لڑکی پر میری نظر بھی پڑی تھی۔ وہ واقعی اس لڑکی کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھی جو سجاول یہاں ''چارے'' کے طور پر وڈے صاحب کے لیے لے کر آیا تھا۔ اگر یہ ''چارا'' شکار تک پہنچ جاتا تو کسی بڑی کامیابی کی امید کی جاسکتی تھی۔ مگر راستے میں یہ آقا جان آگیا تھا۔

سجاول نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ''کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ کسی طرح ہم براہِ راست

وڈے صاحب سے رابطہ کر سکیں۔ میرا مطلب ہے تمہارے اس نکو شہزادے کا فائدہ اٹھایا جائے۔ تمہارا یہ شہزادہ ان لوگوں کی بولی جانتا ہے اور یہ بہت بڑی بات ہے۔''

میں نے کہا۔'' بہت بڑی بات تو ہے لیکن اگر ہم جلد بازی کریں گے تو کام خراب بھی ہوسکتا ہے۔ لگتا ہے کہ اس خانہ خراب آقا جان نے وڈے صاحب کو پوری طرح اپنے ہاتھوں میں لے رکھا ہے۔ ہمیں پہلے یہاں کی اونچ نیچ دیکھنا پڑے گی۔''

'' مطلب یہ ہوا کہ اس بار تو ہم اس وڈے صاحب کے پاس بھی نہیں پھٹک سکیں گے۔ ہمیں اگلے تین مہینے تک انتظار کرنا پڑے گا۔'' سجاول نے کہا۔

'' لگتا تو یہی ہے۔ پر ہوسکتا ہے کوئی راستہ نکل آئے۔'' میں نے کہا۔'' آقا جان کی باتوں سے تو یہی لگتا ہے کہ وہ ابھی ہمیں یہاں رکھنا چاہتا ہے۔''

'' اس میں بھی بدبخت کی کوئی چال ہی ہوگی۔'' سجاول پرسوچ لہجے میں بولا۔

رات خیریت سے گزری۔ اگلے روز پُرتکلف ناشتا دیا گیا۔ جاناں رات کو آقا جان کی بیوی میڈم لورین کو سلانے کے بعد بارہ بجے کے لگ بھگ واپس آئی تھی۔ وہ گاہے بگاہے اپنے لمبے پتلے بازو خود ہی دبانے لگتی تھی۔ اس نے بتایا کہ میڈم لورین کی خمیرے آٹے جیسی ٹانگیں دبا دبا کر اس کا برا حال ہوا ہے۔

شام کو وہ کارروائی شروع ہوگئی جس کے لیے مختلف مہمان پچھلے تقریباً اڑتالیس گھنٹے سے اس بنگلے کی انیکسی میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ چھ عدد لڑکیاں جو آقا جان نے منتخب کر رکھی تھیں اپنے وارثوں کے ساتھ شاندار لینڈ کروزر گاڑیوں میں آ بیٹھیں۔ ان سب نے عجیب سوانگ بھر رکھے تھے۔ ایک نے بالکل ملائیشیائی طرز کا لباس پہن رکھا تھا اور اسی انداز سے بالوں کے جُوڑے میں پھول سجا رکھے تھے۔ ایک ہندوستانی دلہن کے روپ میں تھی۔ اس نے بنارسی ساڑی باندھ کر زیورات پہن رکھے تھے اور ماتھے پر باقاعدہ ٹیکا لگا رکھا تھا۔ شاید کسی انڈین فلمی اداکارہ کا روپ پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔ ایک شہد رنگ بالوں والی لڑکی ایسے لباس میں تھی جو ایک چست لبادے کی صورت اس کے کندھوں سے لے کر اس کے ٹخنوں تک چلا گیا تھا۔ اس لبادے نے لڑکی کے جسم کو ایک بوتل جیسی شکل دے دی تھی اور یوں لگتا تھا کہ اس کا چہرہ بوتل کا ڈھکن ہے۔ ایک امیدوار ایسی تھی جس کا لباس موتیے کی سیکڑوں لڑیوں کے ذریعے مکمل کیا گیا تھا۔ ایسے لگتا تھا کہ یہ لڑکیاں کسی خاص فینسی ڈریس شو میں حصہ لینے کے لیے جا رہی ہیں۔

کچھ دیر بعد چمکتی دمکتی لینڈ کروزر گاڑیاں محل نما عمارت کی طرف روانہ ہوگئیں۔ روانہ

ہونے والی ان لڑکیوں میں سفید پتلون اور سرخ جرسی والی روحی بھی تھی۔ ہر لڑکی کے ساتھ ایک یا دو افراد موجود تھے۔ یہ کل تین گاڑیاں تھیں۔ ہر گاڑی میں دو تین مسلح و باوردی محافظ بھی موجود تھے۔

یقیناً ان لوگوں کو سکیورٹی کے کئی مراحل سے گزرنے کے بعد ہی محل نما عمارت میں جانے کا موقع ملا ہوگا۔ اب ہماری معلومات میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا۔ اس محل نما عمارت کو یہاں پارا ہاؤس یا پارا کوٹھی کہا جاتا تھا۔ یہ نام ''پارا'' کیوں پڑا؟ اس کا کچھ پتا نہیں تھا۔ پارا ہاؤس قریباً پندرہ ایکڑ رقبے میں پھیلا ہوا تھا۔ یہاں تالاب، گولف کلب، وسیع پھلواریاں اور ہیلی کاپٹر وغیرہ موجود تھے۔ رہائشی عمارت دو منزلہ تھی۔ اور یہاں ساٹھ سے زائد کمرے تھے لیکن یہ ساٹھ ستر کمروں والی لق و دق عمارت بھی شاید وڈے صاحب کے لیے ناکافی تھی اور اب پارا ہاؤس کے عقب میں بالکل جدید طرز کی ایک اور عالی شان عمارت تعمیر کی جارہی تھی۔ بتایا جاتا تھا کہ یہ جدید عمارت دو پورشن کی صورت میں تعمیر ہو رہی ہے۔ یہ جگہ لیہ سے کافی فاصلے پر تھی...... جیسے ٹیلوں کے درمیان ایک نخلستان سا ہوتا ہے۔ اسے مقامی طور پر وردل کہا جاتا تھا۔ منشی افضل کے الٹے خط میں بھی اسے وردل ہی لکھا گیا تھا۔ باقی سارا خط چونکہ الٹے حرفوں میں تھا اس لیے ہم وردل کو بھی لورو پڑھتے رہے تھے۔

چودھویں کا چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا اور پارا ہاؤس میں کوئی ایسی محفل بپا تھی جس سے ہمیں دور کر دیا گیا تھا۔ ہم صرف تصور ہی کر سکتے تھے کہ وہاں کیا ہو رہا ہوگا۔ اگر گہرائی سے دیکھا جاتا تو یہ جسموں کی خرید و فروخت ہی تو تھی جسے ایک نئی اور مہذب شکل دینے کی کوشش کی جارہی تھی۔

مہمانوں کی واپسی رات بارہ بجے کے لگ بھگ ہوئی۔ وہی اطلاع ملی جس کی ہم توقع کر رہے تھے۔ انیق نے جو کچھ بتایا وہ بالکل درست تھا۔ وہی سفید پتلون اور سرخ گلابی جرسی والی چلبلی لڑکی روحی ''ملازمت'' کے لیے منتخب ہوگئی تھی۔ اب اسے اگلے تین ماہ کے لیے پارا ہاؤس کی زمینی جنت میں رہنا تھا۔ اور اگر اس کی قسمت زور مارتی تو ہوسکتا تھا کہ وہ خواص بن کر خواص پورے کی زینت بن جاتی۔

سجاول بہت تپا ہوا تھا۔ اس کے طیش میں ایک اطلاع نے مزید اضافہ کر دیا تھا اور وہ اطلاع یہ تھی کہ منتخب ہونے والی لڑکی کو اسی کھلنے اور بند ہونے والے پھول میں بٹھا کر وڈے صاحب کی نظر سے گزارا گیا تھا جو سجاول خود بنوا کر یہاں لایا تھا۔ وہ اس خوب صورت مشینی پھول میں سنبل کو بٹھانا چاہتا تھا۔

کسی وقت تو یوں لگتا تھا کہ سجاول ٹرک ڈرائیور کا بہروپ چھوڑ کر سیدھا سیدھا ڈکیت قاتل بن جائے گا اور جا کر آقا جان کی انتڑیوں میں اپنا ایک فٹ لمبا چھرا گھونپ دے گا مگر بندہ عقل مند تھا۔ جانتا تھا کہ کوئی بہت...... بہت بڑا فائدہ اس کا منتظر ہے اور اس فائدے کے لیے اسے کچھ صبر سے کام لینا پڑے گا۔ یہ بات تو اب ہماری سمجھ میں بھی اچھی طرح آ رہی تھی کہ آقا جان نے اپنی من پسند لڑکی کو ملازمہ رکھوانے کے لیے اس گروپ کی دیگر لڑکیوں کی سلیکشن اپنے حساب سے کی تھی۔

جو لوگ پارا ہاؤس سے نامراد ہو کر واپس آئے تھے وہ بھی مکمل نامراد نہیں رہے تھے۔ ان سب کو قیمتی تحائف ملے تھے۔ ان میں زیورات، بیش قیمت پارچا جات اور نقدی وغیرہ شامل تھی۔

اگلے دن یہ سب ''مہمان'' واپس روانہ ہو گئے۔ سجاول اور انیق بھی ڈرائیور اور کنڈیکٹر کے روپ میں لوڈر لے کر آزاد کشمیر کی طرف نکل گئے۔ انہیں لکڑی کا اگلا پھیرا لے کر چار دن بعد واپس آنا تھا۔ اب میں اور جاناں ہی بنگلے میں تھے۔ میرے بارے میں سجاول نے آقا جان کو بتایا تھا کہ میں ایک گن مین ہوں لیکن کوئی نوکری مجھے راس نہیں آتی اور کسی کو میں راس نہیں آتا۔ میں نے جاناں سے کورٹ میرج کی ہوئی ہے۔ آج کل جاناں مختلف کام کر کے کما رہی ہے اور میں آرام کر رہا ہوں لیکن بندہ میں کام کا ہوں اور اعتبار والا بھی۔ سنبل کو مزید تربیت دینے اور سنوارنے، نکھارنے کے لیے آقا جان نے ان عورتوں کے سپرد کر دیا تھا جن کا ذکر اس نے تین چار دن پہلے کیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ یہ عورتیں عام لڑکی کو خوب صورت...... خوب صورت کو حسین اور حسین کو حور پری بنا دیتی ہیں۔

میں جانتا تھا کہ یہاں سنبل کو کسی بھی طرح کی زبردستی کا سامنا نہیں ہو گا۔ سب سے اہم وجہ تو یہ تھی کہ وہ وڈے صاحب کے لیے بطور تحفہ یہاں آئی تھی۔ اس پر میلی نظر ڈالنا یقیناً بہت بڑا خطرہ مول لینا تھا۔ دوسرے میں نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ آقا جان کو عورت سے کوئی ایسی خاص دلچسپی نہیں۔ یا ممکن تھا کہ تھوڑی بہت ہو لیکن اپنی دبنگ بیوی کی وجہ سے وہ اس باب کو بند رکھتا ہو۔

○......❖......○

رات سرد اور خاموش تھی۔ میں بنگلے کے آرام دہ کمرے میں بستر پر لیٹا تھا۔ ٹی وی آن تھا مگر آواز بہت دھیمی تھی۔ کھڑکی میں سے دور قریباً ڈھائی فرلانگ کے فاصلے پر پارا ہاؤس کی برقی روشنیاں نظر آ رہی تھیں اور سرچ لائٹس کے دائرے گھومتے دکھائی دیتے تھے۔ پتا چلا تھا

کہ پارا ہاؤس کے لیے بجلی کی ہیوی لائن قریباً چار کلومیٹر دور سے لائی گئی تھی۔ اسی طرح پارا ہاؤس والوں نے ذاتی خرچ پر قریباً چودہ کلومیٹر سڑک کو از سر نو تعمیر کروایا تھا۔

کمرے میں الیکٹرک ہیٹر، فریج، ٹی وی، انٹرکام غرض ضرورت کی ہر شے موجود تھی۔ وال کلاک رات کے گیارہ بجے کا وقت بتا رہا تھا۔ ٹی وی اسکرین پر پاکستان کا معروف لوک گلوکار شوکت علی نغمہ سرا تھا...... بہار آئی تو صحرا کی طرف چل نکلا......

میری آنکھوں کے سامنے تاجور کی من موہنی صورت آ گئی۔ اس کا سادہ معصوم حسن اپنی بے پناہ کشش کے ساتھ میرے خیالات پر حملہ آور ہوا۔ وہ کیا تھی؟ کہاں سے میری زندگی میں آئی تھی اور کہاں چلی گئی تھی؟

دل درد سے بھر گیا۔ اسے خود سے جدا کرنا میرے لیے آسان نہیں تھا لیکن میں جانتا تھا کہ میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ پچھلے چند مہینوں میں مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ مجھ سے لگاؤ رکھتی ہے لیکن ذہنی طور پر مجھ سے بہت دور ہے۔ میں اس کی محبت میں سرتاپا ڈوبا ہوا تھا مگر اس کے جذبے میں شاید وہ طاقت نہیں تھی جو مجھے میرے ماضی اور حال سمیت قبول کر سکتی۔ مجھ سے سوال کیا جا سکتا تھا کہ میں نے خود کو بدلنے کی کوشش کیوں نہ کی؟ اس کا جواب بڑا مشکل تھا۔ میں حالات کے جس بندی خانے میں بند تھا۔ اس میں سے صرف ایک ہی راستہ نکلتا تھا اور وہ قبرستان میں لے جاتا تھا۔

میں نے سائیڈ ٹیبل سے بوتل اٹھائی اور اپنے لیے جام بنانا شروع کیا۔ پتا نہیں کیوں، میں اب جس وقت بھی ساغر و مینا کی طرف ہاتھ بڑھاتا تھا، ایک چہرہ میرے سامنے آ جاتا تھا۔ اس چہرے پر بالوں کی دو ریشمی لٹیں جھولتی تھیں اور آنکھوں میں دل چیر دینے والا دکھ ہوتا تھا۔

اسی اثنا میں دروازے پر مدھم دستک ہوئی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے جاناں کھڑی تھی۔ ''السلام علیکم'' اس نے بڑی ادا سے کہا اور اندر آ گئی۔

''تمہاری ڈیوٹی تو میڈم لورین کے ساتھ تھی۔''

''ڈیوٹی کسی وقت ختم بھی تو ہو سکتی ہے۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

''کیا مطلب؟''

''میڈی بڑی سمجھ دار عورت ہے۔ اسے پتا ہے کہ عورت روٹی اور پانی کے بغیر تو زندگی گزار سکتی ہے لیکن محبت اور توجہ کے بغیر نہیں۔ اور خاص طور سے اپنے شوہر کی محبت اور توجہ کے بغیر۔ اس لیے اس نے مجھے آپ کے پاس بھیج دیا ہے۔ ان کی نظروں میں تو ہم میاں بیوی ہی

ہیں۔"

میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ وہ بڑی قیامت نظر آ رہی تھی۔ لانبا لیکن نازک اور گداز بدن۔ کمر تک جاتے ہوئے گھنے بال اور خوب صورت آنکھوں میں محبت اور لگن کی جوت۔ وہ جیسے ان لمحوں کی قید میں تھی جب وہ ایک کھوہ میں زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہی تھی اور کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے موت کے جبڑوں سے نکالا تھا۔

"جاناں! تم دوسرے کمرے میں سو رہو تو بہتر ہے۔" میں نے کہا۔

"یہیں ایک کونے میں پڑا رہنے دیں گے تو بہت نوازش ہوگی۔" وہ اپنی دودھیا کلائی میں کنگن کو گھماتے ہوئے بولی۔

میں نے کمرے کو چاروں طرف دیکھا۔ "کس کونے میں پڑے رہنا پسند فرماؤ گی؟"

"میں کمرے کے کونے کی نہیں، بستر کے کونے کی بات کر رہی ہوں۔" وہ شوخی سے بولی۔

میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس نے جام میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

وہ رات ہم نے ساتھ گزاری۔ الکحل اور جاناں کی قربت میں، میں اپنے اندر کے بے پناہ دکھ کو کچھ دیر کے لیے بھول گیا۔ وہ چہرہ عارضی طور پر میری نگاہوں کے سامنے سے ہٹ گیا جس پر دو لٹیں جھولتی تھیں اور دو دہکتے خنجروں کی طرح میرے دل کو درمیان سے چیر ڈالتی تھیں۔ مگر پھر بھی صبح دم اٹھا تو سینے پر جیسے ایک بہت بھاری بوجھ رکھا تھا۔ ایسا بوجھ جس سے مجھے کراہت محسوس ہوتی تھی اور جو میری پسلیوں کو توڑے ڈالتا تھا۔

رات بھر کے خمار کی وجہ سے سر میں درد تھا۔ جاناں کو وہیں سوتا چھوڑ کر میں باہر نکل آیا۔ سرد ہوا لگی تو طبیعت کچھ بحال ہونے لگی۔ ابھی سورج طلوع نہیں ہوا تھا۔ ہلکی سی دھند پھیلی ہوئی تھی۔ موسم اب بدلنا شروع ہو گیا تھا۔ یخ بستہ ٹھنڈ والی کیفیت ختم ہو رہی تھی۔ لیکن جب ہوا چلتی تھی تو بہت سرد ہوتی تھی۔

اس وسیع بنگلے میں سامنے اور پیچھے دونوں طرف قریباً ایک ایک کینال کا گراسی لان تھا۔ سامنے والے لان کے درمیان مین گیٹ تھا، جہاں ایک یا دو باوردی گارڈز موجود رہتے تھے۔ میں سامنے والے لان کے بجائے پچھلے لان میں ٹہلنے لگا۔ دراصل میرے اور سجاول میں یہی مشورہ ہوا تھا کہ ہم بنگلے میں زیادہ وقت کمروں کے اندر ہی گزاریں۔ اس بات کا خطرہ موجود تھا کہ عالمگیر وغیرہ میں سے کوئی یہاں آ جاتا...... اور ہمیں دیکھ لیتا۔ یہ صورتِ حال سجاول اور عالمگیر کی "دوستی" کے لیے زہرِ قاتل ثابت ہوتی۔

ابھی مجھے ٹہلتے ہوئے پانچ دس منٹ ہی ہوئے تھے کہ ایک سرے میں سے سنبل چہکتی ہوئی نکلی۔ اس کی گود میں سفید رنگ کا چھوٹا سا میمنا تھا۔ وہ اس سے لاڈ کر رہی تھی اور چوم رہی تھی۔ ایک اور لڑکی بھی اس کے ساتھ تھی۔ انہوں نے مجھے نہیں دیکھا اور اپنے حال میں مگن رہیں۔ یہ سنبل واقعی ہوش ربا خوب صورتی کی مالک تھی۔ پھر عمر بھی چھوٹی تھی، جو اسے دیکھتا تھا، دیکھتا رہ جاتا تھا لیکن میں اسے صرف ناقدانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ تاجور کی سادہ خوب صورتی کو دیکھنے کے بعد کسی اور کو دیکھنے یا سراہنے کی حس ہی جیسے ختم ہو گئی تھی۔

دونوں لڑکیاں ہنستی کھیلتی اندر چلی گئیں۔ کچھ ہی دیر بعد مجھے ہیوی موٹر سائیکلوں کے ہوٹرز کی آواز سنائی دی۔ میں نے فوراً گردن اونچی کر کے بنگلے کی چار دیواری سے باہر جھانکا۔ گاڑیوں کا ایک قافلہ پارا ہاؤس کی طرف سے برآمد ہوا تھا اور اب برق رفتاری سے جنوب کی طرف جا رہا تھا۔ یہ کم و بیش بیس گاڑیاں ہوں گی اور ایک سے بڑھ کر ایک قیمتی۔ موٹر سائیکلز کے عقب میں مسلح گارڈز کے دو اوپن وہیکلز تھے۔ اس کے پیچھے ایک لینڈ کروزر جیپ تھی۔ اس کے پیچھے دو کھلی جیپیں تھیں پھر ایک شاندار پورشے گاڑی تھی۔ اس کے شیشے تاریک تھے۔ عقب میں پھر مسلح گارڈز کا جتھا تھا۔ پچھلے حصے میں کچھ کاریں تھیں اور آخر میں دو بڑے لوڈر تھے۔ یہ پُرشکوہ قافلہ برق رفتاری سے بنگلے کے قریب سے گزرا اور چند سیکنڈ بعد درختوں میں اوجھل ہو گیا۔ مجھے پتا چلا تھا کہ وڈا صاحب عام طور پر کالے شیشوں والی سفید PORSCHE میں سفر کرتا ہے۔ یقیناً یہ وہی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ یہ لوگ تلور وغیرہ کے شکار پر نکلے ہیں۔ میری معلومات کے مطابق یہ شکار سدھائے ہوئے عقابوں سے کیا جاتا تھا۔

میں وہیں سرسبز لان میں کھڑا سوچتا رہا۔ یہ عالی مرتبت وڈا صاحب کون ہے؟ یہ یہاں کیوں موجود ہے؟ اور اس کے حوالے سے یہاں سے سیکڑوں میل دور چاند گڑھی کی بھولی بھالی زینب پر جو ظلم ہو رہا ہے، اس کا مقصد کیا ہے؟

جاناں یہاں پہنچنے کے بعد ایک فعال روپ میں نظر آنے لگی تھی۔ اس کے رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈیوں پر گلابی چمک نظر آتی تھی اور چال ڈھال میں تیزی آ گئی تھی۔ وڈے سردار اعظم نے اس کے ماتھے پر جو زخم لگایا تھا وہ مندمل ہو چکا تھا بس معمولی نشان رہ گیا تھا۔ وہ بھی لمبے بالوں کے آگے کو جھکے ہوئے اسٹائل میں چھپ جاتا تھا۔ جاناں رات گئے تک میڈم لورین کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کے دو ہی کام تھے۔ میڈم کو انگلش ناول سنانا یا اس کی مٹھی چاپی کرنا۔ اپنی اس ذمے داری کے دوران میں اس نے کچھ اہم معلومات بھی حاصل کر لی تھیں۔

سجاول اور انیق کو آزاد کشمیر سے لکڑی کا اگلا پھیرا لانے میں پانچ دن لگ گئے۔ وہ لوگ چھٹے روز دوپہر کے وقت یہاں پہنچے۔ ان کے آنے کی خبر مجھے آقا جان سے ہی ملی۔ آقا جان سے دن میں کم از کم ایک بار ملاقات ہو ہی جاتی تھی۔ وہ سخت سڑیل اور غصیلا تھا مگر اب مجھے اس کا مزاج سمجھ میں آ گیا تھا۔ لہٰذا میں اسے کامیابی سے ہینڈل کر رہا تھا۔ وہ مجھے جاناں کے نکھٹو شوہر کی حیثیت سے برداشت کر رہا تھا اور میں اسے وڈے صاحب کے منہ چڑھے خرانٹ ملازم کی حیثیت سے جھیل رہا تھا۔

لوڈر سے مال اتروانے کے بعد سجاول سہ پہر کو ہی بنگلے میں واپس آ گیا تھا لیکن اس سے میری ملاقات نہیں ہوئی۔ انیق نے بتایا کہ اسے آقا جان نے اپنے پاس روک لیا ہے، شاید کوئی خاص بات کرنی ہے۔

انیق نے سفر کی صورتِ حال بتائی اور میرا حال احوال پوچھا۔ سجاول کے بارے میں انیق کی رائے بالکل تبدیل نہیں ہوئی تھی۔ اس کے مطابق وہ ایک بے حد سفاک اور عیار شخص تھا...... اور اپنے مطلب کی خاطر کسی بھی بندے کو چیونٹی کی طرح مسل سکتا تھا۔ اس نے بتایا کہ راستے میں کس طرح اس نے معمولی جھگڑے پر ایک ٹریفک کانسٹیبل کو شوٹ کر دیا ہے۔

اسی دوران میں سجاول بھی آ دھمکا۔ مجھ سے گلے ملا اور گرم جوشی کا اظہار کیا۔ تاہم میں اس کی آنکھوں میں غصے کی لالی بھی صاف دیکھ رہا تھا۔ یہ غصہ آقا جان کے لیے تھا اور اس کی تصدیق بھی جلد ہی ہو گئی۔ میں اور سجاول کمرے میں پہنچے۔ تنہائی ملتے ہی سجاول پھٹ پڑا۔ اس نے آقا جان کو زبردست صلواتیں سنائیں اور اس کی ماں بہن سے انواع و اقسام کے رشتے جوڑے۔ ”یہ خبیث ہمارے اور وڈے صاحب کے درمیان دیوار بنا ہوا ہے۔ جی تو چاہتا ہے کہ اس دیوار کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں، پتا نہیں کیسے برداشت کر رہا ہوں۔“

میرے پوچھنے پر اس نے کہا۔ ”یہ چاہتا ہے کہ سنبل کو ہم سے خرید لے...... اور بعد میں اپنے طور پر اور اپنے حساب سے وڈے صاحب کو پیش کرے۔“

”اس سے ایسی ہی امید تھی۔“ میں نے کہا۔

”اپنی طرف سے بڑا ہوشیار لومڑ بنتا ہے، کہہ رہا ہے کہ اب تو ہمیں سنبل سے کوئی فائدہ حاصل کرنے کے لیے تین مہینے انتظار کرنا پڑے گا۔ کیونکہ اس سے پہلے وڈا صاحب کوئی نئی ملازمہ نہیں رکھے گا۔“

”سنبل کے لیے کیا آفر کر رہا ہے تمہیں؟“

''تین لاکھ روپیہ، اور وہ بھی نقد نہیں۔ تین لاکھ کے زیور دے رہا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ بھی اس نے ان لوگوں سے اینٹھے ہوں گے جو وڈے صاحب سے بخششیں وغیرہ لے کر آتے ہیں۔ حرامی کو پتا نہیں کہ 50 لاکھ کے زیور بھی ہوں گے تو میں اس کے منہ پر پھینک دوں گا۔ مجھے یہ کوئی بڑا چکر نظر آ رہا ہے شاہی! ہمیں اس کی تہ تک پہنچنا ہوگا۔''

سجاول کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ مجھے وہ منظر یاد آ گیا جب میرے ساتھ دوبدو مقابلے میں اس کی وحشت عروج پر پہنچی ہوئی تھی۔ تب وہ ایک اور ہی مخلوق نظر آتا تھا لیکن اس نارمل حالت میں بھی وہ کچھ کم خوفناک نہیں تھا۔ غصے میں اس کا مارا ہوا ایک مکا کسی کو بھی عدم آباد کی سیر کرا سکتا تھا۔ کچھ جدا سی بات تھی اس کے اس دائیں ہاتھ میں اور بازو میں۔ میں نے ہتھ جوڑی میں اس کا مکا کندھے پر سہا تھا اور اس واقعے کو دو ہفتے گزر چکے تھے مگر اثرات ابھی باقی تھے۔

کسی وقت سجاول کی آنکھوں میں جھانک کر مجھے مؤذن عبدالرحیم کی موت بھی یاد آ جاتی تھی اور دل درد سے بھر جاتا تھا۔ ''کیا سوچ رہے ہو؟'' سجاول نے تیز لہجے میں پوچھا۔

''تم کیا سوچ رہے ہو؟'' میں نے بھی ترکی بہ ترکی پوچھا۔

''یہی کہ تم وہ بات کب مانو گے جو باقر نے بتائی تھی۔ تم بہت بڑے یوزپی پھڈے باز ہو۔''

''یہ پھڈے باز کا لفظ تو تم بالکل غلط استعمال کر رہے ہو، مارشل آرٹ کا کھلاڑی کہو تو پھر بھی بات ہے۔''

''چلو پھڈے باز کھلاڑی کہہ لیتے ہیں۔'' وہ عجیب انداز سے مسکرایا۔

''اور اس پھڈے باز کھلاڑی کو تمہاری والدہ محترمہ جوائی بنانے پر تلی ہوئی ہیں۔'' میں بات کو ہلکے پھلکے انداز میں لے گیا۔

اس نے گہری سانس لی اور مسکرانے لگا۔ ''ہاں، ماں وہاں بہت یاد کر رہی ہیں تم کو۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے سمجھایا ہے کہ تم ضروری کام سے نکلے ہو، چند دن میں آ جاؤ گے۔ انہوں نے تمہارے لیے دیسی گھی اور مربہ وغیرہ بھی بھیجا ہے۔ ساتھ ہی الٹی میٹم دیا ہے کہ تمہیں زیادہ سے زیادہ دو ہفتے کے اندر واپس آنا چاہیے۔''

ایک بار پھر کسی کمرے سے آقا جان کی چنگھاڑیں سنائی دیں۔ اس بار ساتھ ہی اس کی بیوی بھی بول رہی تھی۔ دونوں کسی ملازمہ کی ایسی تیسی کر رہے تھے۔ آقا جان کی آواز سنتے ہی سجاول کا موڈ بگڑ جاتا تھا۔ اس نے منہ ہی منہ میں کوئی گالی بکی اور بولا۔ ''پتا نہیں کس افلاطون

نے اس خبیث کی ماں کو امید سے کیا تھا؟"

میں نے کہا۔ "جہاں تک مجھے پتا چلا ہے یہ پاکستان سے برونائی گیا تھا۔ اور وہاں دس بارہ سال وڈے صاحب کی کسی فرم کا منیجر رہا ہے۔ کافی منہ چڑھا ہے۔ اب وڈے صاحب کو یہاں پاکستان آنا پڑا ہے تو یہ بھی ساتھ آیا ہے۔ یہاں آکر اس کا اثر و رسوخ بڑھ گیا ہے کیونکہ یہ دونوں زبانیں جانتا ہے۔"

"کرلیں گے اس کی پھرتیوں کا بھی علاج۔" سجاول نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"اب کیا ارادے ہیں؟" میں نے گیس ہیٹر آن کرتے ہوئے پوچھا۔

"تم نے پچھلے چھ سات دنوں میں کیا ٹوہ لگائی ہے؟" سجاول نے الٹا سوال کیا۔

"ٹوہ یہی ہے کہ وڈے صاحب کا اصل نام ریان فردوس ہے، لیکن اسے وڈے صاحب...... بڑے صاحب یا پھر عزت مآب کہہ کر بلایا جاتا ہے۔ اس نے پچھلے قریباً تین سال سے یہاں ڈیرا جمار کھا ہے۔ یہ جو پارا ہاؤس ہے، یہ ریان فردوس نے ایک بڑے مقامی زمیندار چودھری شہاب الدین سے خریدا تھا۔ اب اپنے دو بیٹوں کے لیے علیحدہ پورشن بنوا رہا ہے۔ یہ عمارت دو حصوں میں بنے گی۔ جاناں نے ان میں سے ایک بیٹے کا نام ابراہیم معلوم کیا ہے۔ دوسرے کا پتا نہیں۔"

"نام سے کیا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ وڈا صاحب مسلمان ہے یا کچھ اور؟"

"نام سے تو بات واضح نہیں ہوتی ہے۔ فردوس تو شاید مسلم نام ہی ہوگا، مگر ریان کرسچن بھی ہوسکتا ہے۔ اسی طرح بیٹے کا نام بھی ہے۔ ابراہیم یا ابراہم عیسائی بھی رکھتے ہیں......"

"اس کے علاوہ کیا پتا چلا؟" سجاول نے پُرسوچ لہجے میں پوچھا۔

"جاناں کے مطابق یہاں صرف ایک اور بندہ ایسا ہے جو آقا جان کی طرح وڈے صاحب کے لیے بے حد بھروسے کا ہے۔ وہ برونائی کا ہی باشندہ ہے۔ اس کا نام حلمی ہے۔ آقا جان کی طرح وہ بھی تھوڑی بہت اردو بول لیتا ہے۔ جاناں کا خیال ہے کہ آقا جان اور حلمی آپس میں ملے ہوئے ہیں۔ یہ دونوں بندے وڈے صاحب کے لیے مترجم کی ذمے داریاں بھی نبھاتے ہیں اور جس طرح نبھاتے ہوں گے، تم خود ہی اندازہ لگا سکتے ہو۔"

ہم رات گئے تک مشورہ کرتے رہے۔ تھوڑی دیر کے لیے انیق بھی اس مشورے میں شریک ہوا۔ انیق عام طور پر ہلکے پھلکے انداز میں مزاحیہ گفتگو کرتا تھا اور ساتھ ساتھ فلموں کے حوالے بھی دیتا جاتا تھا مگر سجاول کے سامنے وہ محتاط ہی رہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ سجاول میں انڈین اداکار امریش پوری کی روح گھسی ہوئی ہے اور وہ کسی بھی وقت کسی کی زندگی سے کھیل

سکتا ہے۔طویل بات چیت کے بعد ہم نے فیصلہ کیا کہ فی الحال اس آقا جان سے بنا کر ہی رکھنا پڑے گی۔ اگر جلد بازی میں اس سے ٹکر لیں گے تو نقصان ہو سکتا ہے۔ انیق کا خیال تھا کہ یہ آقا جان بہت سے مالی گھپلے بھی کر رہا ہے۔ کیونکہ اس نے لکڑی کی جو ''پے منٹ'' کی تھی، اس کا کوئی ریکارڈ وغیرہ نہیں رکھا تھا۔

سنبل کے متعلق یہ فیصلہ ہوا کہ اگر آقا جان بہت اصرار کرے تو پھر چار پانچ لاکھ کے عوض سجاول اس کی بات مان لے۔ (سنبل کو سجاول نے اپنی ایک واقف کار نائیکا سے خریدا تھا۔ وہ طوائف زادی تو نہیں تھی لیکن ان لڑکیوں میں سے تھی جن کو بکنے میں کوئی خاص تامل نہیں ہوتا)

اگلے روز ایک عجیب واقعہ ہوا۔ میں سویرے جلدی جاگ گیا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کا مزا لینے کے لیے میں بنگلے کے لان میں آ گیا۔ مین گیٹ کے ساتھ چھوٹا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے ایک چونکا دینے والا منظر دیکھا۔ سنبل مین گیٹ سے باہر تھی۔ وہ اس سفید میمنے کو پکڑنے کی کوشش کر رہی تھی جو آج کل اس کی گود میں نظر آتا تھا۔ وہ چھلانگیں لگاتا ہوا اِدھر سے اُدھر پھدک رہا تھا۔ ''گیٹ کیپر گارڈ'' بھی میمنے کو پکڑنے میں سنبل کی مدد کر رہا تھا۔ غالباً یہ میمنا سنبل کو چکما دے کر باہر نکل گیا تھا اور اب وہ اس کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ پھر گیٹ کیپر نے میمنے کو دبوچ لیا اور اسے لے کر سنبل کی طرف آیا۔ وہ خوشی سے گلنار نظر آنے لگی۔ یہی وقت تھا جب مجھے موٹر سائیکلوں کے ہوٹرز سنائی دیئے۔ ایک بار پھر وہی منظر نظر آیا جو میں نے چند دن پہلے دیکھا تھا۔ شاندار گاڑیوں کا تیز رفتار جلوس بڑے کروفر سے سڑک پہ رواں نظر آیا۔ مسلح گارڈز، قیمتی جیپیں، موٹر سائیکلز اور وہ شاندار سفید پورشے کار جس کی قیمت میرے اندازے کے مطابق 5 لاکھ پونڈ سے کم نہیں تھی۔ سنبل ٹھٹک کر رک گئی اور اس جلوس کو دیکھنے لگی۔ مسلح گیٹ کیپر بھی اٹین شین کھڑا ہو گیا۔ گاڑیاں یکے بعد دیگرے بنگلے کے سامنے سے گزرتی رہیں...... پھر ایک غیر متوقع واقعہ ہوا...... گاڑیوں کے اس قافلے کی رفتار سُست ہو گئی۔ میں نے دیکھا۔ سفید پورشے کے پیچھے والی گاڑیاں رک رہی ہیں۔ سفید پورشے سے آگے والی گاڑیاں اپنی رفتار سے کچھ آگے نکل گئیں مگر پھر وہ بھی آہستہ ہو گئیں۔

سفید پورشے رک گئی۔ دو تین مسلح گارڈز گاڑی کی عقبی کھڑکی کے قریب جھک گئے پھر دو مزید افراد اپنی شاندار کاروں میں سے اترے اور بڑے مؤدب انداز میں سفید گاڑی کی کھڑکی کے پاس چلے گئے۔ وہ مڑ مڑ کر سنبل اور گیٹ کیپر کی طرف بھی دیکھ رہے تھے۔ میرے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ واضح طور پر دکھائی دے رہا تھا کہ قافلے کے رکنے کی وجہ

سنبل ہی ہے۔ سنبل میمنے کو سینے سے لگائے گیٹ کیپر کے پاس ساکت کھڑی تھی۔ بڑا افسانوی سا ماحول نظر آرہا تھا۔ اسی دوران میں مجھے اپنے عقب میں آقا جان کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''کیا ہوا ہے؟ یہ گاڑیاں کیوں رک گئیں؟''

میں نے مڑکر دیکھا۔ نیم گنجا آقا جان سلیپنگ سوٹ میں نظر آرہا تھا۔ تب اس کی نگاہ چاردیواری سے باہر سنبل پر پڑی اور میں نے اس کے چہرے کا بدلتا ہوا رنگ دیکھا۔ ''یہ...... یہ کیسے باہر چلی گئی۔'' وہ لرزاں آواز میں بولا۔

''مجھے تو پتا نہیں جی، میں ابھی آیا ہوں۔''

آقا جان حواس باختہ انداز میں باہر کی طرف لپکا۔ چھوٹا گیٹ کھلا تھا۔ میں بھی اس کے پیچھے باہر آگیا۔ باہر اب باقاعدہ تماشا لگ گیا تھا۔ بہت سے لوگ گاڑیوں سے اتر آئے تھے۔ لیکن وہ سب دور دور کھڑے تھے۔ سنبل کو سفید گاڑی کے قریب لے جایا گیا تھا۔ وہ پریشان نظر آرہی تھی۔ آقا جان کو دیکھ کر اسے کچھ حوصلہ ہوا۔

میں بھی قریب چلا گیا۔ پیچھے مڑکر دیکھا تو انیق بھی آگیا تھا۔ وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ ہم نے دیکھا سفید پورشے گاڑی کی پچھلی کھڑکی کا شیشہ نیچے اترا ہوا ہے۔ کھڑکی میں ایک ایسا شخص بیٹھا تھا جس نے ملائیشین طرز کا نہایت قیمتی لبادہ پہن رکھا تھا۔ اس کی گندمی جلد پر ہلکے سرخ داغ سے تھے۔ گلے میں قیمتی موتی، مالا کی شکل میں جھول رہے تھے۔ ہاتھوں میں زبردست جڑاؤ انگوٹھیاں تھیں اور کھلی آستین والی کلائی پر کوئی نہایت مہنگی گھڑی لشکارے مار رہی تھی۔ اس شخص کے گرد جیسے شہرت و دولت اور شان و شوکت نے ایک غیر مرئی ہالہ سا بنا رکھا تھا۔ یقیناً یہی تھا برونائی کا ارب پتی ریان فردوس، جسے وڈا صاحب کہا جاتا تھا۔ عزت مآب کہا جاتا تھا اور پتا نہیں کیا کچھ کہا جاتا تھا۔

پچھلی نشست پر ایک اور بارعب شخص بھی موجود تھا۔ اس کی توند جیسے اس کے گھٹنوں پر رکھی تھی۔ اس نے تھری پیس سوٹ پہن رکھا تھا۔ رنگ قندھاری انار سا تھا۔ یہ ادھیڑ عمر شخص کوئی مقامی صنعت کار لگتا تھا اور یقیناً وڈے صاحب کا دوست تھا۔ وہ بھی دلچسپ نظروں سے سنبل کو دیکھ رہا تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا اسی تھری پیس سوٹ والے نے سنبل کو پہلے دیکھا تھا اور وڈے صاحب کی توجہ اس کی طرف مبذول کرائی تھی۔

سنبل جیسے ایک تماشا بن چکی تھی۔ وڈے صاحب نے نامعلوم زبان میں آقا جان سے کچھ پوچھا۔ آقا جان نے ادب سے جھک کر اس کا جواب دیا۔ وڈے صاحب نے کچھ اور پوچھا۔ اس کا جواب بھی آقا جان نے دیا۔ سوال و جواب کا یہ سلسلہ دو تین منٹ جاری رہا۔

اس دوران میں سنبل کبھی وڈے صاحب اور کبھی آقا جان کا منہ تکتی رہی۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ آقا جان نے کسی نہ کسی طرح وڈے صاحب کو سنبل کے حوالے سے مطمئن کر دیا ہے۔

وڈا صاحب جو کچھ بولا تھا، اس کا ایک لفظ بھی میری سمجھ میں نہیں آیا تھا لیکن اس کے طور اطوار سے پتا چلتا تھا کہ بے شک دولت کی شکل میں بے پناہ طاقت اس کے پاس ہے لیکن وہ دھیمے مزاج کا مالک ہے۔

چند سیکنڈ بعد وڈے صاحب نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ گاڑیوں کا قافلہ پھر حرکت میں آ گیا۔ جب تک گاڑیاں دور نہیں چلی گئیں، آقا جان اور بنگلے کے ملازمین ساکت اور مؤدب کھڑے رہے۔

تب آقا جان مڑا۔ اس نے کھا جانے والی، شعلہ بار نظروں سے گیٹ کیپر کو گھورا۔ ''یہ باہر کیسے نکلی؟'' اس نے دانت پیس کر پوچھا۔

''جی، مجھے بالکل پتا نہیں چلا۔ دراصل یہ میمنا......''

ایک زناٹے کا تھپڑ گیٹ کیپر کے گال پر پڑا اور وہ لڑکھڑا کر دو تین قدم پیچھے چلا گیا۔ پھر وہ بے چارگی سے دائیں بائیں جھانکنے لگا۔ جیسے جاننا چاہ رہا ہو کہ کس کس نے اسے تھپڑ کھاتے دیکھا ہے۔ آقا جان سنبل کو ساتھ لیتا ہوا اور پاؤں پٹختا ہوا اندر چلا گیا۔

کمرے میں جا کر میں نے انیق سے پوچھا۔ ''تمہاری سمجھ میں کچھ آیا؟ آقا جان اور وڈے صاحب میں کیا بات ہوئی؟''

''بس جی ویسی ہی بات ہوئی جیسی فلم قربانی کے گانے میں ہے...... ہم تمہیں چاہتے ہیں ایسے...... مرنے والا کوئی زندگی چاہتا ہو جیسے۔'' وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ پھر ذرا توقف کر کے ٹھہرے لہجے میں گویا ہوا۔ ''کل سنبل پارا ہاؤس میں جا رہی ہے جی۔''

''زبردست، یہ کس طرح ہوا؟''

''جس طرح ہونا چاہیے تھا جناب! یہ لڑکی سنبل واقعی کسی بھی بندے کی مت مار سکتی ہے۔ وڈے صاحب کے ساتھ جو موٹا سا بندہ بیٹھا تھا، اس نے سنبل کو میمنے کے پیچھے بھاگتے دوڑتے دیکھا اور وڈے صاحب کو بھی متوجہ کیا۔ وڈے صاحب نے بھی اسے پسند کیا۔ اب وڈا صاحب آقا جان سے پوچھ رہا تھا کہ یہ لڑکی کون ہے اور اس کی نظر سے اوجھل کیوں رہی؟ آقا جان نے بہانہ بنایا کہ جب دوسری لڑکیاں وڈے صاحب کے سامنے سے گزاری گئیں تو تب یہ لڑکی یہاں نہیں پہنچی تھی۔''

''وڈے صاحب نے یقین کر لیا؟''

"ہاں جی لگتا ہے کہ وہ اس مکار پر آنکھیں بند کر کے بھروسا کرتا ہے۔ اسی گانے والا حساب ہے، جوتم کو ہو پسند وہی بات کہیں گے...... تم دن کو اگر رات کہو، رات کہیں گے۔"

"یار، ہر جگہ شاعری نہ گھسیڑا کرو۔ اور کیا بات ہوئی؟"

"آقا جان نے کہا...... عزت مآب لڑکی بہت اچھی ہے، لیکن "ملازمت" سے پہلے اسے اٹھنے بیٹھنے کی تھوڑی سی ٹریننگ دینا ہوگی۔ وڈے صاحب نے کہا، کوئی بات نہیں۔ اسے پاراہاؤس میں پہنچاؤ۔ ہمیں یہ ٹھیک لگ رہی ہے۔ اس بات پر آقا جان خاموش ہو گیا۔"

"مزید کچھ کہا گیا؟"

"شاہ زیب بھائی، وڈا صاحب جیسا بھی ہے لیکن مہمان نواز اور رکھ رکھاؤ والا لگتا ہے۔ آقا جان سے کہہ رہا تھا کہ جو اسے لے کر آیا ہے، اسے بھی ساتھ بھیجو۔ ہم اس سے ملنا چاہیں گے......"

"مطلب یہ کہ سجاول بھی اس کے ساتھ پاراہاؤس جائے گا۔"

"ایسا ہی لگ رہا ہے۔"

"یہ تو اچھی بات ہے۔ لیکن اگر کسی طرح تم بھی ساتھ جا سکو تو اور اچھی بات ہے۔ اندر کی کہانی کا کچھ پتا چلے۔"

"پتا نہیں کہ آقا جان مانے گا یا نہیں۔ ابھی تو وہ اسی پر پیچ و تاب کھا رہا ہوگا کہ سنبل بنگلے سے باہر کیوں نکل گئی تھی۔"

اسی دوران میں سجاول بھی جاگ گیا۔ ہم نے اسے ساری صورتِ حال بتائی۔ اس کا چہرہ دمکنے لگا۔ ہمیں آگے بڑھنے کا راستہ مل رہا تھا۔ سنبل کا اِتفاقاً بنگلے سے باہر نکل جانا بڑا نیک شگون ثابت ہوا تھا۔ اس واقعے سے سنبل کے شعلہ صفت حسن کا بھی اندازہ ہوتا تھا۔ اس کی خوب صورتی کسی کی عقل کو بھی خاکستر کر سکتی تھی۔ وڈے صاحب کے حوالے سے دیکھا جاتا تو ہمیں یہی پتا چلا تھا کہ وہ ملازمہ منتخب کرنے کے بعد تین ماہ تک چپ سادھ لیتا تھا اور تیسرے چاند کی چودھویں شب کو پھر لڑکی کا انتخاب کرتا تھا مگر سنبل کو دیکھنے کے بعد شاید اس نے اپنے اس چاند ماری والے اصول میں کچھ تبدیلی کر لی تھی۔

انیق نے جس طرح ہمارے لیے ایک نا قابلِ فہم زبان کا ترجمہ کیا تھا، وہ معمولی بات نہیں تھی۔ سجاول اس کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا۔ میرا بھی خیال تھا کہ بہت ہوا تو انیق انگریزی کے علاوہ فرانسیسی یا عربی وغیرہ جانتا ہوگا مگر اب اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ تو اس حوالے سے جینئس سے کم نہیں، وہ بہت سی زبانوں کی شد بد رکھتا تھا اور کسی بھی زبان کو چند دن کی

کوشش سے سمجھنا شروع کر دیتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر اس سے میڈم نور جہاں کے گانوں کے ترجمے کرائے جائیں تو دور دراز افریقی ملکوں صومالیہ اور ایتھوپیا وغیرہ میں بھی لوگ گاتے پھریں گے۔ یہ گھر میرا گلشن ہے۔ گلشن کا خدا حافظ......

ہم ناشتا وغیرہ کر کے فارغ ہوئے ہی تھے کہ آقا جان وہاں آدھمکا۔ اس کی ناک کا بل بہت موٹا نظر آ رہا تھا اور چہرے سے جھنجلاہٹ ٹپکی پڑ رہی تھی۔ اس نے سجاول کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ''یہ اس لڑکی کے لیے اچھا نہیں ہوا۔ اگر اس خبیث کو اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے کی تھوڑی سی تمیز آ جاتی تو پارا ہاؤس میں اس کی جگہ بن سکتی تھی۔ اب بس جائے گی اور چند دن بعد آ جائے گی۔''

سجاول بولا۔ ''پتا نہیں یہ سب کیسے ہو گیا۔ یہ آپ کے پاس ہی تھی۔ میں نے تو کئی دن سے اسے دیکھا بھی نہیں تھا اور کچھ نہیں تو گیٹ کیپر کو ہی چاہیے تھا کہ اسے باہر نہ نکلنے دیتا۔''

''اچھا...... اب جو ہونا تھا، ہو گیا۔'' آقا جان نے سخت بیزاری سے کہا۔ ''اب بڑے صاحب نے کہا ہے کہ اسے پارا ہاؤس پہنچاؤ۔ ساتھ میں تم کو بھی بلایا ہے۔ کوئی ڈھنگ کے کپڑے ہیں تو پہن لینا۔ اگر نہیں تو بتاؤ۔ میں کچھ انتظام کرتا ہوں۔''

''ہاں جی، کپڑے تو ہیں۔ بس استری وغیرہ کرنے والے ہیں۔'' سجاول نے کہا۔

آقا جان کے کہنے پر اس نے اپنے بیگ میں سے گرم شلوار قمیص نکال کر دکھائی۔ آقا جان بولا۔ ''ٹھیک ہے لیکن یہ گرم چادر وغیرہ وہاں نہیں چلے گی۔ میں تمہیں کسی کا سویٹر وغیرہ لے دیتا ہوں۔ اور ایک بات اچھی طرح سن لو۔ وہاں زیادہ بات شات کرنے کی ضرورت نہیں۔ بڑے صاحب جو پوچھیں بس اس کا جواب دینا ہے اور مختصر دینا ہے۔ اگر وہ یہاں آنے کی تاریخ کا پوچھیں تو 26 بتانی ہے۔ یہ بات ذہن میں بٹھا لو۔''

''پر ان سے بات چیت کس بولی میں کی جائے گی؟'' سجاول نے پوچھا۔

''وہ اپنی ہی بولی میں بولیں گے لیکن وہاں ایک دو ترجمہ کرنے والے بھی ہیں۔''

پارا ہاؤس جانے کے حوالے سے آقا جان نے سردار سجاول کو جلدی جلدی کچھ ضروری ہدایات دیں اور جھنجلایا ہوا سا واپس چلا گیا۔

صورتِ حال میں یہ ایک اچھی تبدیلی آئی تھی۔ سجاول ایک جہاندیدہ اور زیرک شخص تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ پارا ہاؤس میں داخل ہو گا تو ضرور کوئی کام دکھائے گا۔ وہ ایک ٹرک ڈرائیور کے روپ میں تھا۔ اس نے اپنی چال ڈھال اور بول چال کو اسی کے مطابق بنا رکھا تھا مگر اصل میں وہ کیا تھا...... وہ ہم جانتے تھے۔

شام کے فوراً بعد ہی سجاول اور سنبل پاراہاؤس جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ وہاں سے ان کے لیے گاڑی آنا تھی۔ سنبل کو پوری طرح تیار کیا گیا تھا۔ اس نے بہترین لباس پہن رکھا تھا اور خوشبو میں بسی ہوئی تھی۔ بالوں میں پھول سجائے گئے تھے اور کلائیوں میں بھی پھولوں کے گجرے تھے۔ اس نے جو کپڑے پہن رکھے تھے وہ برونائی کے رواج کے مطابق تھے۔ ایک لمبا کڑھائی دار چغہ تھا جس میں سینے اور بازوؤں پر خوب صورت دھاریاں تھیں۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا کہ اس لباس کو ''باجوکرنگ'' کہا جاتا تھا، سنبل میک اَپ کے بغیر بھی حسین تھی مگر میک اَپ سے اسے مزید نکھارنے کی کامیاب کوشش کی تھی۔ سنبل کو یقیناً انہی عورتوں نے تیار کیا تھا جو یہاں بنگلے میں اس کی دیکھ بھال کر رہی تھیں۔

شام آٹھ بجے کا وقت تھا جب چمک دار لیموزین سجاول اور سنبل کو لے کر پاراہاؤس کی طرف روانہ ہوگئی۔

میں اور انیق کمرے میں آ کر ٹی وی دیکھنے لگے۔ ہماری نگاہیں اسکرین پر تھیں مگر دماغ پاراہاؤس میں الجھا ہوا تھا۔ تصور میں سجاول اور سنبل کے حالات تھے۔ معلوم نہیں تھا کہ وہاں کیا صورتِ حال پیش آئی ہے۔ لگتا تو یہی تھا کہ سجاول وہاں سے اکیلا واپس آئے گا اور سنبل کو پاراہاؤس میں رہنے کی ''عزت'' بخش دی جائے گی۔ عین ممکن تھا کہ سجاول کافی انعام واکرام لے کر لوٹتا...... مگر وہ انعام واکرام کے لیے تو یہاں نہیں آیا تھا۔ اس کی ''حرص'' بہت بڑی تھی۔ وہ بہت آگے دیکھ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس وڈے صاحب کی صورت میں ایک بہت بڑی آسامی اس کے ہاتھ آنے والی ہے۔

ٹی وی پر ایک نیوز دیکھ کر انیق چونکا۔ نیوز یوں تھی کہ ''بدھ کے روز سیالکوٹ روڈ پر کسی نامعلوم شخص کی فائرنگ سے شدید زخمی ہونے والا ٹریفک کانسٹیبل اسپتال میں دم توڑ گیا۔''

انیق نے کہا۔''لو جی ایک اور قتل سجاول سیالکوٹی کے کھاتے میں چلا گیا۔''

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔''اس طرح کے کاموں سے تو اس کا کھاتہ بھرا ہے۔ شاید اب اس کھاتے میں اتنی جگہ ہی نہیں ہے کہ یہ چھوٹے موٹے قتل اس میں درج کیے جائیں۔''

اچانک مین گیٹ کی طرف گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ یہ وہی لیموزین تھی جو تھوڑی دیر پہلے سجاول اور سنبل کو یہاں سے لے کر گئی تھی۔ لیموزین اتنی جلدی واپس آئے گی اس کی توقع نہیں تھی۔ انیق باہر گیا اور تصدیق کر کے آیا کہ یہ وہی لیموزین ہے۔ تھوڑی دیر بعد آقا جان بھنایا ہوا سا ہمارے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی تیوری تو ہر وقت چڑھی رہتی تھی، اب کچھ

زیادہ ہی چڑھی ہوئی تھی۔

''اٹھو بھائی! بلاوا آیا ہے تمہارا۔'' اس نے کہا۔

''کہاں سے جی؟'' میں نے پوچھا۔

''پارا ہاؤس سے۔ بڑے صاحب نے تم دونوں کو بھی بلایا ہے۔ تم دونوں بھی تو اس لڑکی کو لانے والوں میں شامل ہو۔'' لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔

بات سمجھ میں آ رہی تھی۔ یقیناً سجاول اور سنبل کے وہاں جانے کے بعد یہ بات کھلی تھی کہ ہم دونوں بھی ان مہمانوں میں شامل ہیں جو سنبل جیسا ''نادر تحفہ'' لے کر یہاں آئے ہیں (حالانکہ حقیقت میں یہ ساری کارروائی سجاول ہی کی تھی) اب وڈے صاحب نے ہمیں بھی شرفِ میزبانی بخش دیا تھا۔

آقا جان نے کہا۔ ''تمہارے پاس بیس منٹ ہیں۔ منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل لو، باہر گاڑی تمہارا انتظار کر رہی ہے۔''

یہ بڑی غیر متوقع اور خوشگوار صورتِ حال تھی۔ ہم نے آقا جان کی ہدایت کے مطابق جلدی جلدی کپڑے بدلے اور باہر نکل آئے۔

قریباً دس منٹ بعد ہم لیموزین پر سوار پارا ہاؤس کے سامنے پہنچ چکے تھے۔ مسلح گارڈز نے بڑی شائستگی کے ساتھ ہمیں گاڑی سے باہر نکلنے کے لیے کہا اور ہمارے لباس کی اچھی طرح تلاشی لی گئی۔ لیموزین حالانکہ تھوڑی، دیر پہلے ہی پارا ہاؤس سے گئی تھی پھر بھی اس کو چیک کیا گیا۔ پارا ہاؤس کے مین گیٹ پر ایک بار پھر گاڑی کی کھڑکیوں کے شیشے اتارے گئے اور عقابی آنکھوں والے سکیورٹی ایجنٹس نے ہمارا جائزہ لیا۔

ہم پارا ہاؤس کے مین گیٹ سے اندر داخل ہوئے۔ یہاں ہمیں سکیورٹی کا دوسرا دائرہ نظر آیا۔ باہر کی بلند چار دیواری کے اندر ایک چھوٹی لیکن مضبوط چار دیواری اور نظر آ رہی تھی۔ یہ دراصل چھوٹے چھوٹے مضبوط پلر تھے، جنہوں نے پارا ہاؤس کو چاروں طرف سے گھیرا ہوا تھا...... وہاں کی اصل کشادگی اور شان وشوکت سے آگاہ ہوئے۔ دور تک خوب صورت گراسی لان اور پھلواریاں نظر آ رہی تھیں۔ رنگ برنگ پھولوں اور پھولوں سے بنی ہوئی اشکال کو نمایاں کرنے کے لیے ان پر اس طرح سے روشنی ڈالی گئی تھی کہ ایک ایک پتی اُجاگر ہو گئی تھی۔ ان پھلواریوں میں رنگین پانی کے فوارے تھے اور کہیں کہیں مصنوعی آبشاریں تھیں جو حوضوں میں گرتی تھیں۔ ہر چیز رات کے وقت بھی روشن دکھائی دیتی تھی، مگر یہ روشنی ایسی تھی جو آنکھوں کو چبھتی نہیں تھی۔ جگہ جگہ باوردی گارڈز پتھر کے مجسموں کی طرح ساکت کھڑے تھے،

ایک جگہ کبوتروں کے بڑے بڑے کابک نظر آئے اور وسیع پنجروں میں خوش الحان پرندوں کے جھرمٹ دکھائی دیئے۔ کسی گوشے سے کسی شکاری عقاب کی تیز طویل آواز کانوں میں گونجی اور ہوا کی لہروں پر سرسراتی چلی گئی۔

اندرونی عمارت باہر سے بھی زیادہ پُرشکوہ تھی۔ بلند چھتیں، بلند و بالا محرابی دروازے، مرمریں فرش، فانوس، قالین، آبنوسی اور ساگوانی فرنیچر۔ ہر شے سے بے پناہ امارت ٹپکتی تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہاں سی سی ٹی وی کیمروں کا نظام بھی موجود ہے اور ہماری ہر ہر حرکت دیکھی جارہی ہے۔ ہم ایک نہایت کشادہ اور سجی سجائی نشست گاہ میں داخل ہوئے۔ یہاں سجاول پہلے سے موجود تھا۔ ہم بھی اس کے پاس آرام دہ صوفے پر جا بیٹھے۔ سجاول کے سامنے میز پر چائے کی خالی پیالی اور دیگر لوازمات رکھے تھے۔

نشست گاہ کی ایک دیوار پر بڑی ایل سی ڈی اسکرین نظر آئی اور کنٹرول پینل بھی دکھائی دیا۔ چند سیکنڈ بعد ایک دراز قد شخص اندر داخل ہوا۔ اس نے نفیس پینٹ کوٹ پہن رکھا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہی وہ حلمی نامی شخص ہے جو آقا جان کی طرح وڈے صاحب کے لیے ترجمان کے فرائض انجام دیتا ہے۔ ہم نے کھڑے ہو کر اس سے مصافحہ کیا۔ اس نے خوش آمدید کہنے کے لیے رسمی کلمات ادا کیے۔ اس کی اردو اچھی تھی مگر لہجے میں غیر ملکی جھلک واضح نظر آتی تھی۔ اسی دوران میں سامنے لگی ہوئی جہازی سائز کی ایل سی ڈی روشن ہو گئی۔ اسکرین پر بڑے صاحب ریان فردوس کی شکل نظر آئی۔ جلد پر سرخ دھبے نمایاں تھے۔ جس طرح ہم اسے دیکھ رہے تھے یقیناً وہ بھی دیکھ رہا تھا۔ اس نے ہمیں مالے زبان میں خوش آمدید کہا۔ حلمی، نے ترجمہ کرتے ہوئے بتایا۔ ”عزت مآب تمہیں ویلکم کہہ رہے ہیں اور تمہارے نام پوچھ رہے ہیں۔“

ہم نے اپنے اصل نام بتائے۔ اس کے بعد وڈے صاحب نے کچھ مزید کہا۔ حلمی نے ترجمہ کر کے بتایا۔ ”عزت مآب کا کہنا ہے کہ وہ تم سے مل کر خوش ہوئے ہیں۔ تم لوگ بھی سجاول کی طرح یہاں مہمان ہو اور رات کا کھانا یہیں کھا کر جاؤ گے۔“

ہم نے شکریہ ادا کیا۔ کچھ دیر بعد اسکرین تاریک ہو گئی۔ ایک سیکرٹری ٹائپ اسمارٹ لڑکی اندر داخل ہوئی۔ حلمی نے سجاول سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”مسٹر سجاول، تمہیں ایک دو کاغذات پر دستخط کرنے ہیں، تم ان کے ساتھ چلے جاؤ۔“

سجاول نے اثبات میں سر ہلایا اور چست اسکرٹ والی لڑکی کے ساتھ باہر چلا گیا۔ سجاول کے جانے کے بعد حلمی نے مجھ سے پوچھا۔ ”یہ لڑکی سنبل، جو مسٹر سجاول لے کر آئے

ہیں، کہاں سے آئی ہے اور کیا وہ اپنی خوشی سے یہ ”ملازمت“ کرنا چاہ رہی ہے؟“
میں سمجھ گیا کہ سجاول کو اسی لیے باہر بھیجا گیا ہے تا کہ ہم سے اس کے بیانات کی تصدیق ہو سکے۔ بہتر یہی تھا کہ سب کچھ سچ سچ بتایا جاتا۔ میں نے کہا۔ ”جناب! یہ طوائف زادی تو نہیں ہے لیکن ایک نائیکا کے پاس رقص وغیرہ سیکھ رہی تھی۔ ایک ماموں کے سوا اس کا اور کوئی نہیں ہے۔ اسے پتا تھا کہ ماموں بدقماش ہے اور اسے کہیں نہ کہیں اونے پونے بیچ ڈالے گا۔ اب یہ لڑکی اس بات پر بہت خوش ہے کہ یہ سجاول کے پاس آ گئی ہے اور سجاول کے ذریعے ایک امیر گھر میں جا رہی ہے اگر یہ یہاں مستقل طور پر نہ بھی رہ سکی تو عزت مآب کی غریب نوازی سے اتنا کچھ تو ضرور حاصل کر لے گی کہ آئندہ اسے ہر طرح کا آرام آسائش مل جائے گا۔“
”اس کے ماموں سے سجاول نے اسے کیسے حاصل کیا؟“ حلمی نے ملائیشین لہجے کی اردو میں پوچھا۔
”سجاول نے اسے باقاعدہ معاوضہ دیا ہے......اور کوئی اسٹامپ پیپر بھی لکھوا رکھا ہے۔ اس کے ماموں کی طرف سے اب کسی طرح کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔
کئی واقعات بالکل غیر متوقع ہوتے ہیں۔ ہم اس وقت پارا ہاؤس کی زبردست سکیورٹی کے حصار میں تھے۔ یہاں چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی تھی۔ لہٰذا جب اوپر تلے دو فائر ہوئے تو ہم بری طرح چونک گئے۔ چھوٹی آنکھوں اور چوڑی پیشانی والا حلمی بھی ہماری ہی طرح چونکا۔ اس نے جلدی سے انٹرکام اٹھایا اور کسی سے پوچھا۔ ”یہ فائر کیسے تھے؟“
دوسری طرف سے کسی مقامی گارڈ نے کہا۔ ”شاید کسی کا ٹریگر غلطی سے دب گیا ہے جناب۔“
”جلدی پتا کرو۔ کون تھا یہ؟“ حلمی دہاڑ کر بولا۔
”اوکے سر۔“ اسپیکر سے مؤدب آواز ابھری۔
حلمی نے اپنی ٹائی درست کی اور اپنے سیل فون پر کوئی نمبر ملانے میں مصروف ہو گیا۔ اس کا چہرہ اندرونی اضطراب کا عکاس تھا۔ گارڈ نے کہا تھا کہ شاید غلطی سے کسی کا ٹریگر دب گیا ہے لیکن ٹریگر غلطی سے نہیں دبا تھا اور اس کا ثبوت چند سیکنڈ بعد مل گیا۔ نشست گاہ سے باہر بھاگتے قدموں کی آوازیں آئیں پھر ایک زبردست دھماکے سے دروازہ چوپٹ کھل گیا۔ ہم نے قریباً چار افراد دیکھے۔ ان کے جسموں پر پارا ہاؤس کے گارڈز کی ہی وردیاں تھیں لیکن چہرے اسکائی ماسک میں چھپے ہوئے تھے۔ وہ سب کے سب مسلح تھے۔ اندر گھستے ہی انہوں

نے بے دریغ حلمی کو نشانہ بنایا۔ وہ اسے شاید مارنا نہیں چاہتے تھے، بلکہ زخمی کر کے یرغمال بنانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ گولی حلمی کے کندھے میں لگی۔ وہ تکلیف کی شدت سے دہرا ہو گیا۔ میں نے اور انیق نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ سیکنڈ کے دسویں حصے میں ہم نے فیصلہ کر لیا۔ ہم ایک ساتھ نقاب پوشوں پر ٹوٹ پڑے۔

جو نقاب پوش میری طرف اپنی سیون ایم ایم رائفل سیدھی کر رہا تھا، اس کے پیٹ میں میری زوردار ٹھوکر لگی۔ وہ دہرا ہوا تو اس کی رائفل میری پہنچ میں آ گئی۔ میں نے بیرل کا رخ چھت کی طرف موڑ دیا۔ ایک برسٹ چلا اور بھاری بھرکم فانوس چکنا چور ہو گیا۔ میں نے نقاب پوش کو دھکیلا وہ اپنے ساتھی پر گرا اور اس کی فائرنگ سے شدید زخمی ہو گیا۔ میں نے رائفل اس سے چھین لی۔ دوسری طرف انیق بھی ایک گرانڈیل نقاب پوش سے لپٹ گیا تھا، دونوں میں زبردست کشمکش جاری تھی۔ ملنگی ڈیرے سے فرار کے وقت میں نے انیق کی زبردست فائٹنگ اسپرٹ دیکھی تھی، میں جانتا تھا کہ وہ اس صورتِ حال سے نمٹ لے گا۔ اسی دوران میں زخمی حلمی نے ایک بڑے صوفے کی اوٹ لے کر اپنے کوٹ کے اندر سے بریٹا پسٹل نکال لیا۔ اس نے انیق سے لپٹے ہوئے نقاب پوش کو نشانہ بنایا۔ صورتِ حال بدلتے دیکھ کر چوتھا نقاب پوش باہر کی طرف پسپا ہوا۔ اب پورے پارا ہاؤس میں خطرے کے الارم بجنے لگے تھے۔

جس شخص کی فائرنگ سے اس کا اپنا ہی ساتھی زخمی ہوا تھا، وہ اب اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کی رائفل خالی ہو چکی تھی۔ اس نے رائفل کو لاٹھی کی طرح استعمال کرتے ہوئے میرے سر کو نشانہ بنانا چاہا۔ میں نے اطمینان سے جھک کر یہ وار خالی دیا۔ دوسرا وار بھی میرے سر کے بالوں کو چھوتا ہوا گزر گیا۔ میں نے ٹانگ مار کر اسے دور ہٹا دیا اور ساتھ ہی اس کے ساتھی سے چھینی ہوئی رائفل بھی سیدھی کر لی۔

''ہینڈز اپ۔'' میں گرجا۔

اس نے خود کو بے بس دیکھ کر ہاتھ کھڑے کر دیئے۔ اسی دوران میں انیق نے عقب سے اس کے سر پر پیتل کے ایک وزنی گلدان کا تباہ کن وار کیا۔ وہ گھٹنوں کے بل گرا اور گلدان کی دوسری ضرب نے اسے انٹا غفیل کر دیا۔ میں نے اس کے چہرے سے اسکائی ماسک یعنی نقاب نوچا...... وہ مقامی شخص ہی تھا۔ اس کی فائرنگ سے زخمی ہونے والے کی پشت پر کم از کم چھ سوراخ تھے۔ اس کا جسم ساکت ہو چکا تھا۔ تیسرے شخص کے سینے میں حلمی کی چلائی ہوئی گولی لگی تھی اور وہ بھی گرا پڑا تھا۔

مگر یہ معاملہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ پارا پاؤس کے کسی اور حصے سے زبردست فائرنگ کی آواز آ رہی تھی۔
''یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ کون لوگ ہیں؟'' حلمی انٹر کام پر چلایا۔
پھر اس نے اپنے زخمی کندھے کو دبائے دبائے کنٹرول پینل کی طرف چھلانگ لگائی۔ اس نے مانیٹرز آن کیے۔ دس بارہ اسکرینز پر پارا ہاؤس کے مختلف حصے دکھائی دینے لگے۔ ایک حصے میں زبردست ہلچل نظر آ رہی تھی۔ حلمی نے بٹن دبا کر اس سین کو پوری اسکرین پر پھیلا دیا۔ یہ کسی اندرونی کمرے کا منظر تھا۔ شاہانہ فرنیچر، فانوسوں اور غالیچوں سے سجا ہوا یہ کمرا میدان جنگ کا منظر پیش کر رہا تھا۔ ہم نے ایک عورت کو دیکھا جو پچاس کے پیٹے میں نظر آتی تھی۔ اس نے برونائی طرز کا اسلامی لباس پہن رکھا تھا۔ سر پر اسکارف تھا۔ تین نقاب پوش اس سے لپٹے ہوئے تھے۔ ایک نے اپنا پسٹل اس کی کنپٹی پر رکھا ہوا تھا اور دوا سے گھسیٹ کر باہر لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔
تب ایک اور منظر نے ہمیں ہلا دیا۔ ہم نے سردار سجاول کو دیکھا۔ وہ کسی بگولے کی طرح اندر داخل ہوا۔ اس نے آتے ساتھ ہی پستول بردار کو نشانہ بنایا۔ اس کے سر کی طوفانی ضرب چہرے پر کھا کر پستول بردار دور جا گرا۔ اس کا پسٹل ہاتھ سے چھوٹ کر اور کھڑکی کا شیشہ توڑ کر نہ جانے کہاں گیا۔ اس سے پہلے کہ دوسرا شخص سجاول پر فائر کرتا، سجاول کا وہی مشہور و معروف مکا دیکھنے میں آیا جس کی کہانیاں مشہور تھیں...... اور جس کی ایک ضرب میں خود بھی دوبدو مقابلے میں جھیل چکا تھا۔ اس بھیانک مکے نے یقیناً رائفل بردار کا جبڑا چکنا چور کر ڈالا تھا۔ وہ کٹے شہتیر کی طرح منہ کے بل زمین پر گرا۔ تیسرا شخص فائر کرنے میں کامیاب رہا۔ گولی سجاول کو مس کرتی ہوئی اس کے اپنے ہی ساتھی کو کہیں لگی اور وہ جو پہلے ہی نیم جان تھا بالکل ساکت ہو گیا۔ سجاول نے جھپٹ کر تیسرے بندے کو چھاپ لیا۔ وہ اس سے رائفل چھیننے کی کوشش کر رہا تھا۔ عورت بے حد دہشت زدہ حالت میں ایک کونے میں سمٹی ہوئی تھی اور مسلسل چلا رہی تھی۔ سجاول کے مدِمقابل نے بلند آواز میں اپنے ساتھیوں کو پکارنا شروع کیا۔ ابھی اس نے بمشکل ایک دو آوازیں ہی نکالی تھیں کہ سجاول نے اسے گھما کر دیوار سے دے مارا اور وہ نڈھال ہو کر فرش پر لڑھک گیا۔ اس کی رائفل اب سجاول کے ہاتھ میں تھی۔ سجاول کے تاثرات سے صاف پتا چلا کہ راہداری میں سے بھاگتے قدموں کی آوازیں قریب آ رہی ہیں۔ یہ یقیناً وہی حملہ آور تھے جنہیں ان کے ساتھی نے مدد کے لیے پکارا تھا۔
سجاول نے دہشت زدہ عورت کو کمرے کے واش روم میں گھسا کر دروازے کو باہر سے

بولٹ کر دیا اور قریب پہنچتے ہوئے حملہ آوروں کے سامنے دیوار بن گیا۔ اس نے ایک گوشے میں پوزیشن لے لی اور کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے میں سے گن باہر نکال کر حملہ آوروں پر جوابی فائر کرنے لگا۔

حلمی نے افراتفری کے عالم میں ایک اور مانیٹر کے منظر کو ''انلارج'' کیا۔ یہ اس راہداری کا منظر تھا جہاں سے کچھ لوگ سجاول پر حملہ آور ہوئے تھے۔ یہ کم و بیش آٹھ افراد تھے اور سب کے سب نقاب پوش۔ انہوں نے پوزیشنز لے رکھی تھیں اور سجاول کو ڈھیر کرنے کے لیے اندھا دھند فائرنگ کر رہے تھے۔ جسے وہ ڈھیر کرنا چاہتے تھے وہ کوئی عام شخص نہیں تھا۔ ایک خونی گروہ کا خونخوار سردار تھا۔ وہ ایسے نہ جانے کتنے سنگین مرحلوں سے گزرا ہوا تھا۔

یہی وقت تھا جب اس نشست گاہ کے بالکل سامنے ہماری دائیں طرف بھی اندھا دھند فائرنگ ہونے لگی۔ انیق بڑبڑایا۔ ''لگتا ہے، یہ لمبا ہی کھڑاگ ہوا ہے۔''

''جوابی فائرنگ بھی ہو رہی ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہاں، یہ ہمارے ہی لوگ ہیں۔'' حلمی نے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

ایک گولی شیشہ توڑتی ہوئی آئی اور حلمی بال بال بچا۔ اس نے ایک کھڑکی کے ساتھ پوزیشن لے لی۔ ہم بھی جھک کر اوٹ میں ہو گئے۔ ہم دونوں کے پاس بھی اب رائفلیں موجود تھیں مگر ہم اس وقت تک فائر نہیں کر سکتے تھے جب تک کوئی ہم پر گولی نہ چلاتا۔ ہمیں پتا ہی نہیں تھا کہ یہاں اپنا کون اور پرایا کون؟

حلمی نے اپنا زخمی کندھا دوسرے ہاتھ سے دبایا ہوا تھا۔ خون اس کے پورے بازو کو بھگو رہا تھا۔ وہ ملائیشین لہجے کی اردو میں بولا۔ ''ہم فائر نہیں کریں گے۔ ہماری گولی اپنے ہی گارڈز کو لگ سکتی ہے۔''

حلمی کی بات سے اس امر کی تصدیق ہوئی کہ پارا ہاؤس کے گارڈز نشست گاہ کے سامنے مورچا بند ہو گئے ہیں اور حملہ آوروں کو نشست گاہ کی طرف آنے سے روک رہے ہیں۔ الارم مسلسل شور مچا رہے تھے۔ بالائی منزل سے بھی بھاگ دوڑ کی آوازیں آ رہی تھیں، تاہم وہاں فائرنگ کے آثار نہیں تھے۔

حلمی رکوع کی حالت میں جھک کر چلتا ہوا دوبارہ مانیٹرز کے پاس پہنچا۔ اس نے ایک بٹن پش کیا۔ سجاول نے آہنی دیوار کی طرح حملہ آوروں کو روکا ہوا تھا۔ کمرے کے سارے شیشے، فانوس اور آرائشی برتن چکنا چور ہو چکے تھے۔ دیواروں پر گولیوں کے اَن گنت نشان تھے۔ فرش پر پڑے باقی دونوں افراد اپنے ہی ساتھیوں کی اندھا دھند فائرنگ سے ہلاک ہو

چکے تھے۔ دوسرا کیمرا حملہ آوروں کو دکھا رہا تھا۔ وہ تھوڑا سا آگے ضرور آئے تھے مگر اب بھی خاتون کے اس بیڈروم سے بیس تیس قدم کی دوری پر تھے۔

حلمی نے کنٹرول پینل پر مختلف بٹن دبائے۔ پھر مائیکروفون پر چلانے لگا۔ ''انچارج قادر! کہاں ہو تم؟''

جواب میں پھولی ہوئی سانسوں میں کہا گیا۔ ''میں یہاں ہوں سر! مین سیڑھیوں کے پاس۔''

''احمق...... گدھے...... تمہیں اندر سے فائرنگ سنائی نہیں دے رہی۔ اندر جاؤ، بڑی بیگم کے بیڈروم کی طرف۔ وہاں وہ لوگ بیگم کو گھیر رہے ہیں۔ جلدی کرو۔ جتنے بندے ہیں ساتھ لے لو۔ سیدھی گولی چلاؤ۔''

''یس سر۔'' انچارج گارڈ نے ہانپی آواز میں کہا۔

ہماری نگاہیں ایک بار پھر اس اسکرین پر مرکوز ہو گئیں جہاں سجاول تن تنہا بڑی بیگم کی حفاظت کر رہا تھا۔ وہ واقعی کسی قدیم جنگجو قبیلے کا فرد نظر آتا تھا۔ مرنا اور مارنا جس کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔

تیس چالیس سیکنڈ بعد ہمیں ایک دم اندازہ ہوا کہ سجاول پر دباؤ کم ہو گیا ہے...... لیکن اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ حلمی کے آرڈر پر پارا ہاؤس کے گارڈ وہاں پہنچ گئے تھے۔ اس کی وجہ ایل ایم جی سے فائر ہونے والے وہ دو تین طویل برسٹ تھے جن کی آواز بالائی منزل سے آئی تھی۔ اس خوفناک ''تڑتڑاہٹ'' کے فوراً بعد ہی حملہ آوروں نے اپنی پوزیشنز چھوڑ دی تھیں اور اندرونی سیڑھیوں کی طرف لپکے تھے۔ ایک کیمرے نے سیڑھیوں کے قریب ان کی جھلک دکھائی۔ یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی اطلاع پر بالائی منزل کی طرف بھاگے ہیں۔ شاید واکی ٹاکی پر رابطہ کر کے انہیں اوپر بلایا گیا تھا۔

''او مائی گاڈ...... او مائی گاڈ۔'' حلمی اپنا سر دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر کراہ اٹھا۔

پھر اس نے لرزاں ہاتھوں سے کنٹرول پینل پر ایک بٹن دبایا۔ اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو گیا۔ اسکرین پر ہمیں اکیس بائیس سال کا ایک دبلا پتلا لڑکا نظر آیا۔ وہ ایک لمبے قیمتی لبادے میں تھا۔ اس کے سر پر وہی کیپ تھی جو برونائی کے باشندے پہنتے ہیں۔ اس نے چھوٹی داڑھی رکھی ہوئی تھی۔ دو نقاب پوشوں نے اسے دیوار سے لگا کر اس پر رائفلیں تان رکھی تھیں۔ فرش پر دو گارڈز کی خونچکاں لاشیں دکھائی دے رہی تھیں۔ انہیں یقیناً چند سیکنڈ پہلے ہی گولیاں لگی تھیں۔ لہو چکنے فرش پر حرکت کر رہا تھا اور ارد گرد گولیوں کے خول بکھرے تھے۔

بمشکل دس پندرہ سیکنڈ ہی مزید گزرے ہوں گے کہ وہ پانچ چھ گارڈز بھی اس بڑے کمرے میں پہنچ گئے جہاں لڑکے کو یرغمال بنایا گیا تھا۔ یہ سب کے سب بے حد جوش میں دکھائی دیتے تھے۔ ان میں سے تین افراد نے اپنے چہروں پر سے اسکائی نقاب نوچ کر اتار دیئے۔ یہ تینوں اپنی صورتوں سے ملائیشیا یا برونائی کے لگتے تھے۔ ذرا چھوٹی آنکھیں، بھاری پپوٹے اور پست ناک۔ ان میں سے ایک لحیم شحیم شخص نے کیمرے کی طرف چہرہ کیا اور گرج دار لہجے میں چند فقرے بولے۔

میں نے انیق کی طرف دیکھا۔ وہ میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔ ''ان لوگوں نے بڑے صاحب کے چھوٹے بیٹے ابراہم کو یرغمال بنالیا ہے۔ اب یہ بڑے صاحب کو وارننگ دے رہے ہیں کہ انہیں اپنی جان کی پروانہیں۔ اگر لڑکے کو چھڑانے کی کوشش کی گئی تو وہ اسے اور خود کو دھماکے سے اڑا لیں گے۔''

حلمی ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ کر ایک بغلی دروازے سے کسی طرف نکل گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ بڑے صاحب کی معاونت کے لیے گیا ہے مگر یہ اندازہ غلط نکلا۔ ایک منٹ بعد حلمی ہمیں اسی کیمرے میں نظر آیا جو سجاول اور بڑی بیگم والے مناظر کو ''کور'' کر رہا تھا۔ آواز ہم تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ لیکن ویڈیو میں دکھائی دیا کہ وہ سجاول کی پیٹھ تھپک رہا ہے۔ پھر اس نے بڑی بیگم کو باہر نکالنے کے لیے واش روم کا دروازہ کھولا۔ بڑی بیگم باہر نکل آئیں۔ کمرے کا خونچکاں منظر دیکھ کر بیگم کی حالت غیر ہونے لگی۔ وہ چلا رہی تھیں۔ حلمی انہیں سہارا دیتا ہوا دروازے کی طرف لے گیا۔ اب پارا ہاؤس کے قریباً نصف درجن گارڈز بھی یہاں آ گئے تھے۔ انہوں نے حلمی اور بڑی بیگم کو اپنی حفاظت میں لے لیا۔

''یہ سب کیا ہو رہا ہے شاہ زیب بھائی؟ یہ تو سر منڈواتے ہی اولے پڑنے والی بات ہے۔'' انیق نے کہا۔

''ابھی اور بھی اولے پڑنے ہیں۔ لگتا ہے کہ لڑکے کے پکڑے جانے سے معاملہ گڑبڑ ہو گیا ہے۔'' نشست گاہ کے عین سامنے ہونے والی تابڑتوڑ فائرنگ اب مدھم پڑ گئی تھی۔ محسوس ہو رہا تھا کہ پارا ہاؤس کے گارڈز نے حملہ آوروں کو پیچھے ہٹا دیا ہے یا پھر وہ مارے گئے ہیں۔ اسی دوران میں اسپیکر پر اعلان ہونے لگا۔ ''میں انچارج قادر بول رہا ہوں۔ پارا ہاؤس کے گیٹ بند کر دیئے گئے ہیں۔ کوئی شخص یہاں سے باہر نہیں جائے گا، نہ ہی کسی کو باہر سے اندر آنے دیا جائے گا۔ پارا ہاؤس میں کوئی شخص اپنا فون استعمال نہیں کرے گا۔ میں پھر دہراتا ہوں، کوئی شخص فون استعمال نہیں کرے گا۔''

انچارج قادر کی آواز سارے پاراہاؤس میں گونج رہی تھی۔
اگلے دو تین منٹ میں صورتِ حال کچھ واضح ہوگئی۔ پاراہاؤس کے گراؤنڈ فلور پر اب کوئی حملہ آور موجود نہیں تھا۔ اب وہ اوپر والی منزل پر تھے۔ جہاں انہوں نے عزت مآب بڑے صاحب کے چھوٹے بیٹے ابراہم کو یرغمال بنالیا تھا...... اور خود کو دو تین کمروں کے اندر محصور کر کے بیٹھ گئے تھے۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہاں موجود حملہ آوروں کی تعداد آٹھ کے لگ بھگ ہے، جن میں سے کچھ برونائی کے باشندے ہیں۔
پاراہاؤس کے تین گارڈز دندناتے ہوئے نشست گاہ میں داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک لحیم شحیم شخص آگے بڑھا اور بھاری آواز میں مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''بہت شکریہ مسٹرز، آپ نے بہت ہمت دکھائی ہے، اور مدد کی ہے۔''
میں نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ اس شخص کے چہرے کی غیر معمولی چیز اس کے بھاری چوڑے جبڑے تھے۔ اس کی آواز سے میں نے اسے پہچان لیا کہ یہ وہی انچارج گارڈ قادر ہے جو تھوڑی دیر پہلے پاراہاؤس کے آڈیو سسٹم پر اناؤنسمنٹ کر رہا تھا۔
وہ دوبارہ بولا۔ ''اب یہاں نیچے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ آپ یہ رائفلیں ہمیں دے دیں۔''
میں نے نقاب پوش سے چھینی ہوئی سیون ایم ایم رائفل، انچارج کے حوالے کر دی۔ انیق نے بھی اپنی والی رائفل انچارج کو دے دی۔ نشست گاہ کے فرش پر اس وقت ایک لاش اور دو بے ہوش حملہ آور موجود تھے۔ گلدان کی چوٹوں سے بے ہوش ہونے والے کے چہرے پر ابھی تک اسکائی ماسک موجود تھا۔ انچارج نے یہ ماسک ہٹا کر دیکھا۔ یہ بھی دوسروں کی طرح مقامی ہی تھا۔ گارڈز دونوں بے ہوش افراد کو گھسیٹ کر باہر لے گئے۔
انچارج نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''آپ دونوں میرے ساتھ آئیں اور اس ساتھ والے کمرے میں بیٹھیں۔ حالات ذرا کنٹرول میں ہوتے ہیں تو حلمی صاحب آپ کو سچویشن بتانے کے لیے خود آتے ہیں۔''
انچارج قادر نے ہمیں ایک قریبی کمرے میں پہنچا دیا۔ یہ عام سائز کا آراستہ کمرا تھا۔ صوفے اور کرسیاں وغیرہ موجود تھیں۔ ریفریجریٹر میں پینے پلانے کے لوازمات بھی دکھائی دے رہے تھے۔ ٹی وی آن تھا اور ایک بیکار سے ٹاک شو میں تین چار ہٹے کٹے سیاست دان منہ سے جھاگ اڑا رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ چینل کے اسٹوڈیو میں زلزلہ آیا ہوا ہے۔ ایسا ہی زلزلہ فی الوقت پاراہاؤس کے طول و عرض میں بھی آیا ہوا تھا۔ فائرنگ تو تھم گئی تھی مگر آوازوں

سے پتا چلتا تھا کہ ہر طرف بھاگ دوڑ مچی ہوئی ہے۔ ایمبولینس گاڑیوں کے سائرن بھی سنائی دیئے۔

ہمیں وہاں بیٹھے دو چار منٹ ہی ہوئے تھے کہ سردار سجاول بھی وہاں پہنچ گیا۔ ایک زبردست معرکے کے باوجود وہ محفوظ رہا تھا۔ صرف ایک بازو کو گولی چھوتی ہوئی گزری تھی یہاں تازہ بینڈ تیج دکھائی دے رہی تھی۔

''کچھ پتا چلا ہے تم کو؟'' سجاول نے اپنی تیکھی مونچھوں کو سہلا کر پوچھا۔

''ہاں پتا چلا ہے اور سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا بھی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم نے تھوڑی دیر پہلے جو پانی پت کی جنگ لڑی ہے، وہ سی سی ٹی وی پر ہم نے لائیو دیکھی ہے، ویل ڈن۔ زبردست۔''

سردار سجاول نے کہا۔ ''اور تمہارے ساتھ کیا بیتی؟''

میں نے مختصر الفاظ میں اسے وہ سب کچھ بتایا جو تھوڑی دیر پہلے نشست گاہ میں پیش آیا تھا اور جس کے نتیجے میں ایک شخص ہلاک اور دو شدید زخمی ہوئے تھے۔

سجاول نے کہا۔ ''اوپر، بڑی بیگم کا برا حال ہے۔ اسے ابھی ابھی پتا چلا ہے کہ اس کا پتر مسلح بندوں کے ہتھے چڑھ گیا ہے۔ وہ رو رہی ہے اور اپنے سر پر دوہتڑ مار رہی ہے۔''

''یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں؟'' انیق نے پوچھا۔

''شاید یہ وہی بروناٸی والی دشمنی ہے جس کے بارے میں تھوڑی سی ٹوہ جاناں نے لگائی تھی۔'' میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

ہمیں اندیشہ تھا کہ اس کمرے میں بھی ریکارڈنگ کا نظام موجود ہو لہٰذا ہم بہت دھیمے انداز میں بات کر رہے تھے۔

سجاول نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ ''پتا چل رہا ہے کہ پارا ہاؤس کے اندر کے کچھ گارڈز بھی ان لوگوں سے ملے ہوئے ہیں۔ وہ کیا کہتے ہیں، گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے، ورنہ جتنی سخت سکیورٹی ہے، یہ سب کچھ کبھی نہ ہوتا۔''

میں نے کہا۔ ''بڑی بیگم کی جان تو تمہاری وجہ سے بچ گئی، مگر اب انہوں نے بیٹے کو دھر لیا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے، یہ بچے کھچے بندے بڑے صاحب کے بچے کو چھوڑ دیں گے؟''

''ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ مجھے شک ہو رہا ہے کہ انہوں نے لڑکے کی ٹانگ کے ساتھ کوئی بم وغیرہ باندھ دیا ہے اور سب کچھ اڑانے کی دھمکی دے رہے ہیں۔''

''ہاں، یہ دھمکی تو ہم نے بھی فوٹیج میں دیکھی اور سنی ہے لیکن تب تک بم وغیرہ نہیں

باندھا گیا تھا۔‘‘

سجاول بولا۔ ’’میرا خیال ہے کہ ان لوگوں کا ایک ہی مطالبہ ہوگا۔ وہ لڑکے سمیت یہاں سے نکلنا چاہیں گے۔‘‘

’’ان کی ٹھیک تعداد کیا ہے؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’سات، آٹھ ہیں۔ ان میں سے تین باہر کے ہیں۔‘‘

پارا ہاؤس میں عجیب سی سنسنی اور دہشت پائی جا رہی تھی۔ ہمارا دل چاہتا تھا کہ باہر نکل کر صورتِ حال کا جائزہ لیں مگر حلمی نے ہمیں سختی کے ساتھ باہر نکلنے سے منع کر دیا تھا۔ اس کمرے میں صرف ایک ہی کھڑکی تھی اور وہ ایک چھوٹے سے لان میں کھلتی تھی جہاں ہلکی روشنی میں پھولوں کے رنگ برنگ تختے تھے۔

یہ ساری جگہ ہی سینٹرلی ائرکنڈیشنڈ تھی۔ ہمیں سردی کا احساس بالکل نہیں ہو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد نشست گاہ کی طرف سے بات چیت کی آوازیں آنے لگیں۔ غور کرنے پر اندازہ ہوا کہ یہ بڑے صاحب کا دست راست حلمی ہی ہے جو کسی سے بڑے تیز لہجے میں باتیں کر رہا ہے۔ مگر الفاظ بالکل سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ انیق نے کی ہول سے جھانک کر دیکھا لیکن کچھ فائدہ نہیں ہوا۔

میں نے ایک بار پھر بڑے محتاط انداز میں اس کمرے کے کونے کھدروں کا جائزہ لیا۔ یہاں مجھے کوئی کیمرا یا ڈکٹا فون وغیرہ نظر نہیں آیا۔ ہم سرگوشیوں کے بجائے قدرے نارمل انداز میں باتیں کرنے لگے۔ سجاول نے مجھ سے پوچھا۔ ’’تمہارا کیا خیال ہے، یہ لوگ پولیس کو بلائیں گے؟‘‘

’’ابھی جو اعلان ہو رہا تھا، اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ اس معاملے سے خود ہی نمٹنا چاہتے ہیں۔ اعلان یہی تھا کہ کوئی اندر سے باہر نہیں جا سکتا اور باہر سے اندر نہیں آ سکتا۔‘‘

’’اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کے پاس اتنی نفری ہے کہ یہ اپنے طور پر کارروائی کر سکتے ہیں۔‘‘

’’ہاں، یہ تو ہم نے یہاں آتے ہوئے بھی دیکھا تھا، عمارت کے چپے چپے پر گارڈ موجود تھے اور یہ کوئی عام، خانہ پُری والے، گارڈز نہیں ہیں۔ کوئی ہائی فائی سکیورٹی ایجنسی ہے۔‘‘

’’پھر بھی سوچنے والی بات ہے کہ یہاں کئی لوگوں کی جانیں چلی گئی ہیں۔ پولیس کو

اطلاع دیئے بغیر تو گزارا نہیں ہوگا۔'' سجاول نے نکتہ اٹھایا۔
''ہوسکتا ہے کہ کوئی ایسی وجہ ہو۔ یہ لوگ فی الحال پولیس کو بلانا نہ چاہتے ہوں۔''
مختلف آہٹوں، آوازوں اور بھاگ دوڑ سے پتا چلتا تھا کہ سکیورٹی گارڈز اور شوٹرز نے پورے پارا ہاؤس کو حصار میں لے لیا ہے۔ پارا ہاؤس کے عقبی حصے کی ساری لائٹس روشن کر دی گئی تھیں اور سرچ لائٹس کے دائرے بھی مسلسل حرکت کر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد نشست گاہ کی طرف سے پھر آوازیں آنا شروع ہوگئیں۔ اس دفعہ یہ آوازیں نسبتاً نزدیک سے آرہی تھیں۔ میں نے کی ہول سے آنکھ لگا کر دیکھا...... اور اس مرتبہ مجھے ''سرویلینس اسکرین'' کا ایک حصہ نظر آیا۔ کنٹرول پینل کے سامنے حلمی بیٹھا تھا۔ ہماری طرف اس کی پشت تھی۔ مجھے بس اس کا وہ کندھا دکھائی دے رہا تھا جس پر تازہ تازہ بینڈ یج کی گئی تھی۔ وہ شاید حملہ آوروں کے سرغنہ سے بات کر رہا تھا۔
میں نے انیق کو اشارہ کیا۔ اس نے پہلے کی ہول سے آنکھ لگا کر نشست گاہ کا منظر دیکھنے کی کوشش کی پھر کی ہول سے کان لگا دیا۔ مالے زبان میں بات ہو رہی تھی اور آواز بہت مدھم تھی۔ وہ بڑے دھیان سے سننے کی کوشش کرنے لگا۔
''کچھ پتا چلا؟'' میں نے سرگوشی میں پوچھا۔
اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور آنکھیں میچ کر ساکت بیٹھا رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے پر دلچسپی کے آثار ہیں۔
تین چار منٹ بعد اس نے دوبارہ کی ہول سے آنکھ لگائی اور پھر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ''یہ معاملہ کچھ زیادہ ہی گڑ بڑ لگ رہا ہے جی۔'' وہ بولا۔
''کس طرح کی گڑ بڑ؟'' میں نے پوچھا۔
''یہاں بڑے صاحب کے بیٹے ابراہیم کے علاوہ کوئی اور اہم بندہ بھی ''ہوسٹیج'' بن گیا ہے۔ وہ یہاں پارا ہاؤس میں وی وی آئی پی مہمان کے طور پر موجود تھا۔ ابھی تک نام کا پتا نہیں چل سکا۔ پر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کوئی حکومتی یا سیاسی شخصیت ہے۔''
سنسنی خیز اطلاع تھی۔ میں اور سجاول ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔
سجاول نے کہا۔ ''اس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس خاص بندے کے یہاں ہونے کو چھپایا جا رہا ہے اور اسی لیے پولیس کو اس پھڈے سے دور رکھا جا رہا ہے۔''
''بالکل یہی بات ہے۔'' انیق نے تائید کی۔ ''حلمی نے ابھی تھوڑی دیر پہلے بنگلے میں آقا جان سے بھی بات کی ہے۔ اس سے کہا ہے کہ وہ پورا دھیان رکھے۔ کسی بھی مقامی اخبار

نویس یا میڈیا والے کو پارا ہاؤس کے قریب بھی نہیں پھٹکنا چاہیے۔ اگر کوئی فائرنگ وغیرہ کے بارے میں پوچھے تو ہوائی فائرنگ کا یا اس طرح کا کوئی اور بہانہ بنا دیا جائے۔''

''یہ مہمان کون ہوسکتا ہے؟'' سجاول نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔

انیق بولا۔'' ایسے لگتا ہے کہ سیر اور شکار کے لیے کوئی یہاں پارا ہاؤس میں موجود ہے۔ آج کل تلور کا شکار بھی ہو رہا ہے۔ ممکن ہے کہ پارا ہاؤس والوں نے اس شغل کے لیے کسی کو دعوت دے رکھی ہو۔ اب وہ بندہ بھی اس لپیٹے میں آ گیا ہو۔''

مجھے گاڑیوں کا وہ پُرشکوہ قافلہ یاد آیا جو کل بھی فراٹے بھرتا پارا ہاؤس سے نکل کر ٹیلوں کی طرف گیا تھا۔ یہ لوگ زبردست موج میلے میں مصروف تھے اور کبھی کبھی زبردست موج میلے سنگین ترین حادثات پر اختتام پذیر ہوتے ہیں۔

یہاں آتے وقت سجاول کے ارادے تو کچھ اور تھے مگر میں اور انیق اس نیت سے لیہ پہنچے تھے کہ ہمیں زینب کے معمے والا حل ملے۔ زینب کو اور دیگر دولڑکیوں کو کس مقصد کے لیے تیار کر کے یہاں بھیجا جا رہا تھا مگر یہاں آ کر یہ دوسرا چکر چل گیا تھا۔ بڑے صاحب کی پرانی دشمنی نے اپنا جلوہ دکھایا تھا۔ غالباً یہ وہی دشمنی تھی جس سے بچنے کے لیے بڑے صاحب نے برونائی سے اپنا بستر بوریا سمیٹا تھا اور جنوبی پنجاب کے اس دور افتادہ علاقے میں چلا آیا تھا۔

بالائی منزل سے کسی جوان شخص کے چلانے کی آوازیں سنائی دیں۔ عین ممکن تھا کہ وہ بھی یرغمالیوں میں شامل ہو۔ اس نے شاید بھاگنے کی کوشش کی تھی اور اسے دوبارہ پکڑ لیا گیا تھا۔ اب اس سے مار پیٹ کی جا رہی تھی۔

سنگین ترین حالات کے باوجود انیق اب اپنے موڈ میں آ چکا تھا۔ وہ داؤد بھاؤ کا سدھایا ہوا تھا۔ ایسے حالات اس پر اثر انداز نہیں ہو سکتے تھے بولا۔'' شاہ زیب بھائی! ہم نے تو ہر فلم ڈرامے میں یہی دیکھا ہے کہ اولاد آوارہ گرد ہوتی ہے اور والدین نیکوکار۔ مگر یہاں لگتا ہے کہ الٹا حساب ہے۔ قبلہ والد صاحب رنگین مزاج ہیں لیکن بیٹے کو دیکھ کے لگتا ہے کہ شریف پرہیزگار ہے۔''

''اس کی والدہ کو بھی تو دیکھا ہے تم نے۔ اسلامی لباس میں تھی اور اسکارف باندھا ہوا تھا۔ اولاد پر اکثر ماں کا اثر زیادہ ہوتا ہے۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ بڑے صاحب کی ماں لوز کریکٹر تھی؟''

''لوز کریکٹر کا تو پتا نہیں، لیکن وہ ایک کرسچن خانہ بدوش تھی، ہم نے تو یہی سنا ہے۔''

''ویسے ماں کے اثر والی بات آپ نے ٹھیک کہی ہے جی۔'' انیق نے چور نظروں سے

سردار سجاول کی طرف دیکھا۔ پھر جلدی سے بات بدل کر بولا۔ ''ایسا سین تو فلم عادل میں بھی ہے۔ محمد علی بچپن میں ماں کی تربیت کا بہت اثر لیتا ہے اور گانا گاتا ہے پیاری ماں، دعا کرو میں جلد بڑا ہو جاؤں......''

سجاول سخت خشک لہجے میں بولا۔ ''یہ مسخری کا موقع نہیں ہے۔ کھوپڑے کو استعمال کرو اور سوچو کہ اب کیا کرنا ہے۔''

انیق نے سہمنے کی اداکاری کی اور مغموم صورت بنا کر بیٹھ گیا۔

اسی دوران میں نشست گاہ کی طرف سے ایک بھاری بھرکم آواز سنائی دینے لگی۔ یہ پارا ہاؤس کے سب سے بااختیار شخص بڑے صاحب ریان فردوس کی آواز تھی۔ بڑا صاحب اپنے دست راست حلمی سے بات کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہمارے کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک ملازم نے آکر کہا کہ ہمیں بلایا گیا ہے۔

ہم تینوں نشست گاہ میں پہنچے۔ بڑا صاحب سخت پریشانی کے عالم میں ایک بیش قیمت صوفے پر بیٹھا تھا۔ وہ برونائی کے چولا نما روایتی لباس میں تھا۔ دو مسلح گارڈز عقب میں چوکس کھڑے تھے۔ حلمی بھی سامنے ایک صوفے پر موجود تھا اور بہت مؤدب نظر آرہا تھا۔

ہم بڑے صاحب کے رُوبرو کھڑے ہو گئے۔ بڑے صاحب نے کمال مہربانی کا ثبوت دیتے ہوئے، ہمیں اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ہم بیٹھ گئے۔ بڑے صاحب نے تعریفی نظروں سے سجاول کو دیکھا اور اس کے لیے ستائش کے کلمات کہے، جن کا مطلب حلمی نے ہمیں بتایا۔ بڑے صاحب نے دوبارہ کچھ کہا۔

حلمی نے ترجمہ کرتے ہوئے کہا۔ ''عزت مآب تم تینوں سے خوش ہیں۔ تم نے جواں مردی کا ثبوت دیا بلکہ پارا ہاؤس کے گارڈز سے بھی بڑھ کر جرأت دکھائی۔ بہر حال ابھی یہ بلا ٹلی نہیں ہے۔ ان لوگوں نے پارا ہاؤس کے ایک اہم شخص کے علاوہ ایک معزز مہمان کو بھی یرغمال بنا رکھا ہے۔ ہمیں ان کی رہائی کے بارے میں کچھ سوچنا ہے۔''

سجاول نے کہا۔ ''عزت مآب کے لیے جان بھی حاضر ہے۔ ہم کسی لائق تو نہیں ہیں لیکن عزت مآب ہمیں جو بھی حکم دیں گے ہم بجا لائیں گے۔''

حلمی نے سجاول کی بات بڑے صاحب تک پہنچائی۔

جواب میں بڑے صاحب نے کہا۔ ''نہیں، ہم خود اس معاملے کو حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور یہ جلد ہو جائے گا۔ اگر کسی طرح کی ہیلپ کی ضرورت ہوئی تو تم لوگوں کو ضرور بتایا جائے گا۔''

مختصر گفتگو کے بعد مجھے اور انیق کو تو واپس بھیج دیا گیا مگر سجاول کو وہیں روکا گیا۔ میں اور انیق نشست گاہ کے ساتھ والے کمرے میں واپس آ گئے۔ صاف ظاہر تھا کہ سجاول کو زیادہ اہمیت دی جا رہی ہے اور یہ درست بھی تھا۔ اس نے پاراہاؤس کی بڑی بیگم کو یرغمال بننے سے بچا کر ایک زبردست کام کیا تھا۔

سجاول کی واپسی قریباً ایک گھنٹا بعد ہوئی۔ اس کا چہرہ اندرونی جوش سے تمتما رہا تھا۔ اس کے پاس کوئی اہم خبر تھی۔ رازداری کے لہجے میں بولا۔ ''اس مہمان کا پتا چل گیا ہے جو بڑے صاحب کے بیٹے کے ساتھ یرغمال بنا ہے۔ بڑا اونچا بندہ ہے۔''

''کون ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔

''تم ڈنمارک سے نازل ہوئے ہو۔ یہاں کے حالات اور یہاں کے سیاسی لوگوں کا تمہیں کچھ زیادہ پتا نہیں ہوگا۔ داراب فیملی کا نام سنا ہوا ہے تم نے؟ یہاں کی ایک مشہور سیاسی فیملی ہے۔''

میرے جسم میں کرنٹ سا دوڑ گیا مگر اپنے تاثرات میں نے ظاہر نہیں ہونے دیئے۔

''نام کچھ سنا سنا لگ رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

''داراب فیملی کا ایک نوجوان سپوت ہے۔ سپوت بھی کیا شہزادہ ہے۔ شکیل نام ہے اس کا۔ بڑے اُونچے درجے کی شے ہے۔ وہ اس رگڑے میں آ گیا ہے...... اور بڑے صاحب کے پتر کے ساتھ ہی پکڑا گیا ہے۔''

میرے سینے میں دھڑکن کے گولے سے پھٹ رہے تھے۔ شکیل داراب کو میں کیسے بھول سکتا تھا۔ یہی تو وہ سیاست زادہ تھا جس سے طاقت کا نشہ سنبھالے نہیں سنبھل رہا تھا اور وہ اپنی من مانیوں کی کوئی حد مقرر نہیں کر پا رہا تھا۔ یہ لوگ فی الوقت براہِ راست تو حکومت میں نہیں تھے لیکن اصل میں حاکموں کے حاکم تھے۔

شکیل داراب نے جس طرح اپنی ایک ٹیچر کو اپنے نام نہاد عشق کا نشانہ بنایا تھا اور جس طرح اس کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی، وہ سب کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ سیالکوٹ شہر کا وہ گھر جس میں ٹیچر ناہید رہتی تھی اور جس کی ایک دیوار میں ایک ایسا راستہ تھا جو ساتھ والی محل نما عمارت میں کھلتا تھا۔ یہ اسی شکیل داراب کا راستہ تھا جہاں سے یہ سیاست زادہ اپنی منکوحہ ناہید سے ملنے پہنچتا تھا...... مگر اب اس کا دل اس سے بھر چکا تھا اور اس کا ثبوت یہی تھا کہ اس نے عاشرہ نامی لڑکی کو نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی۔ عاشرہ کو اس سے بچانے کے لیے میں نے شکیل داراب سے ایک بڑی دھانسو قسم کی ملاقات کی تھی۔ یہ ملاقات

ایک اسٹیشن ویگن کے اندر ہوئی تھی اور ہم میں کچھ باتیں طے ہو گئی تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ شکیل کو وہ ملاقات بھولی نہیں ہو گی۔

آج کئی ماہ بعد میں پھر شکیل داراب کا نام سن رہا تھا۔

سجاول کی آواز نے مجھے میرے تیز رفتار خیالوں سے چونکایا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”یہ شکیل داراب آج سہ پہر یہاں تشریف لایا تھا۔ وہی، تلور کے شکار کی تیاریاں تھیں۔ سیانے ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ کبھی کبھی شکار کرنے والا بھی شکار ہو جاتا ہے۔“

”یہ بھی ابراہم کے ساتھ ہی تھا۔“ انیق نے پوچھا۔

”نہیں، یہ بالکل ساتھ والے پورشن کے بیڈروم میں۔ سویا ہوا تھا۔ اسے تب پتا چلا جب ایک رائفل اس کے سر سے آن لگی۔ یہ ایک بڑی خبر ہے۔ اب اس کو چھپانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ میڈیا کو بھنک پڑ گئی تو یہاں کیمروں کی قطاریں لگ جائیں گی۔“

”اب یہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟“

”ابھی تو گل بات سے مسئلہ حل کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ یعنی کچھ لو اور کچھ دو۔ مگر بات بنتی نظر نہیں آتی۔ ان لوگوں کی زبان سمجھ میں نہیں آتی مگر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہر ایک کو گالیاں دے رہے ہیں اور خطرناک دھمکیاں بھی۔ ان کے لیڈر کا نام شاید ناقب ہے...... وہ مرنے مارنے پر تلا ہوا ہے۔ دو بندوں نے مسلسل بڑے صاحب کے پتر پر رائفلیں تان رکھی ہیں۔ دو بندوں نے ہی شکیل داراب کی کنپٹی پر بھی اسلحہ رکھا ہوا ہے۔ وہ بالکل چوکس ہیں۔“

”اور وہ بم والی بات؟“

”وہ تو ابھی تک ثابت نہیں ہوئی۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے پاس کوئی بم ہو لیکن ابھی کیمروں میں تو کچھ دکھائی نہیں دیتا۔“

”کیمرے کام کر رہے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”پہلے تو کر رہے تھے لیکن اب انہوں نے توڑ دیئے ہیں۔ صرف ایک کیمرا چل رہا ہے اور اس کا رخ انہوں نے اپنی مرضی سے رکھا ہوا ہے۔“

”وہ جو تم دوسرا نام لے رہے ہو شکیل داراب کا...... وہ بھی اب ابراہیم والے کمرے میں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں دونوں کو اکٹھے بٹھایا ہوا ہے ساتھ ساتھ...... دونوں کے ہاتھ بھی پیچھے بندھے ہیں۔ سب کچھ نظر آ رہا ہے اسکرین پر۔“

اچانک میں چونک گیا۔ کھڑکی سے باہر احاطے میں ایک منظر دکھائی دیا۔ دو تین افراد

نے قالین کا ایک بڑا ٹکڑا فرش پر بچھایا۔ پھر دو افراد ایک خونچکاں لاش اٹھا کر لائے اور قالین پر رکھ دی......اور یہ کوئی ایک لاش نہیں تھی...... یکے بعد دیگرے قریباً آٹھ لاشیں لا کر قالین پر رکھی گئیں۔ یہ سب کے سب نیلی وردیوں والے گارڈز ہی تھے۔ یہ سب وہ لوگ تھے جو کچھ دیر پہلے ہونے والے خونی ہنگامے میں ہلاک ہوئے تھے۔ عین ممکن تھا کہ ابھی کچھ اور لاشیں بھی ہوں جو کہیں اور رکھی گئیں ہوں۔ یہ آٹھ لاشیں بظاہر تو پاراہاؤس کے محافظوں کی تھیں مگر یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ان میں وہ لوگ بھی ہو سکتے تھے جنہوں نے محافظوں کے بجائے حملہ آوروں کا کردار ادا کیا تھا۔ پھر ہم نے حلمی اور چند دیگر افراد کو دیکھا۔ وہ لاشوں کا معائنہ کرنے کے لیے آئے تھے۔ ان میں چالیس پینتالیس سال کا ایک چاق و چوبند شخص بھی تھا۔ اس عمر میں بھی اس کا جسم کسرتی اور چال ڈھال میں زبردست قسم کا طمطراق تھا۔ اس نے پینٹ اور جرسی پہن رکھی تھی۔ وہ بڑے ماہرانہ انداز میں لاشوں کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔

سجاول سرگوشی میں بولا۔ ''مجھے لگتا ہے، یہی وہ کمانڈو خالد شاہ ہے۔''

''خالد شاہ؟''

''ہاں، ابھی حلمی اس کے بارے میں بتا رہا تھا۔ یہ کوئی ریٹائرڈ پولیس افسر ہے۔ اسپیشل برانچ میں تھا۔ اس طرح کے کاموں میں بڑی مہارت رکھتا ہے۔''

''یہ کیا کرے گا؟''

''میرا خیال ہے کہ اسے یہ لوگ کسی بھیس میں اوپر بھیجنے کا ارادہ رکھتے ہیں...... پر ابھی ٹھیک سے پتا نہیں۔''

اگلا قریباً ایک گھنٹا بھی سخت تناؤ میں گزرا۔ نشست گاہ میں اب خاموشی تھی۔ بس کبھی کبھی تیز قدموں کی آواز آتی تھی، دروازے کھلتے یا بند ہوتے تھے۔ بیرونی چار دیواری کی طرف رکھوالی کے کتوں کا شور تھا اور سرچ لائٹس حرکت کر رہی تھیں۔

ایکا ایکی نشست گاہ دوبارہ آباد ہو گئی۔ مختلف آوازیں سنائی دینے لگیں جن میں ریان فردوس یعنی بڑے صاحب کی آواز بھی شامل تھی۔ میں نے کی ہول سے آنکھ لگائی۔ اسکرین پھر روشن دکھائی دے رہی تھی۔ ساری اسکرین تو کی ہول سے نظر نہیں آتی تھی مگر جتنی بھی آتی تھی وہ بھی صورتِ حال کو سمجھنے کے لیے کافی تھی۔ میں نے اسکرین پر پہلی بار شکیل داراب کو دیکھا۔ (اور اسے اس حال میں دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی) وہ سلیپنگ سوٹ میں تھا۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ گورے چٹے چمک دار چہرے پر دو نیلگوں گومڑ نظر آرہے تھے۔ ایک نقاب پوش نے رائفل باقاعدہ اس کی کنپٹی سے لگا رکھی تھی اور انگلی ٹریگر پر تھی۔ شکیل

خوف زدہ تو تھا مگر اس خوف میں شدید غصہ بھی شامل تھا۔ اس کے پہلو میں وہی دبلا پتلا لڑکا بیٹھا تھا جس کا نام ہمیں ابراہم معلوم ہوا تھا۔ اس کی ایک آستین خون آلود تھی۔ اس زخم پر پہلے ہماری نگاہ نہیں پڑی تھی۔ اس کے سر سے دو رائفلیں لگی ہوئی تھیں۔

یہ عزت مآب ریان فردوس کا لختِ جگر تھا اور اس کی کنپٹی پر بندوق رکھ کر ان نقاب پوشوں نے اس پورے پارا ہاؤس کو مفلوج کر ڈالا تھا۔

اسکرین پر ابھرنے والا ایک منظر دیکھ کر میں چونکا۔ وہی ادھیڑ عمر شخص اندر داخل ہوا جسے ہم نے تھوڑی دیر قبل چھوٹے احاطے میں لاشوں کے پاس دیکھا تھا۔ سجاول کے بقول یہ کوئی سابق پولیس کمانڈو تھا اور اسپیشل برانچ سے تعلق رکھتا تھا مگر اس وقت وہ مجھے ایک ڈاکٹر کے روپ میں نظر آیا۔ اس نے باقاعدہ سفید کوٹ پہن رکھا تھا اور گلے سے اسٹیتھ اسکوپ لٹکایا ہوا تھا۔ اس کے داہنے ہاتھ میں میڈیکل باکس صاف دکھائی دے رہا تھا۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟" سجاول نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

"کمانڈو موقع پر پہنچ گیا ہے۔ ڈاکٹر کے روپ میں آیا ہے۔ شاید ابراہم کی مرہم پٹی کے لیے۔"

"زبردست...... مجھے بھی دیکھنے دو۔"

میں پیچھے ہٹ گیا۔ سجاول نے اپنی آنکھ کی ہول سے چپکا دی۔

یہ بڑے سنسنی خیز لمحے تھے۔ ظاہر تھا کہ اگر یہ کمانڈو موقع پر پہنچا ہے تو صرف مشاہدہ مطالعہ کرنے نہیں گیا۔ وہ موقع کی تاک میں گیا ہے اور چانس ملنے پر کوئی کارروائی ضرور کرے گا۔ عین ممکن ہے کہ اس کے میڈیکل باکس میں کوئی ہتھیار بھی موجود ہو۔

کچھ دیر بعد سجاول پیچھے ہٹا تو انیق نے کی ہول کے ذریعے نشست گاہ کا منظر دیکھا...... تب پھر میری باری آ گئی۔

جب میں نے دیکھا تو کمانڈو خالد شاہ نے مضروب لڑکے ابراہم کے لبادے کی آستین چاک کر دی تھی اور اس کے بازو کے زخم کو دیکھ رہا تھا۔ زخم اسکرین پر نظر نہیں آ رہا تھا تاہم صورتِ حال سے پتا چلتا تھا کہ خون کا مسلسل اخراج ہو رہا ہے اور زخم کو ٹانکوں کی ضرورت ہے۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے خالد شاہ نے زخم کی اسٹیچنگ شروع کر دی۔ ابراہم کے چہرے پر تکلیف کے آثار نمودار ہوئے۔ سرغنہ ناقب نے مسلسل ہائی الرٹ کی پوزیشن اختیار کر رکھی تھی۔ اس کی "اے کے 47" رائفل ابراہم کی عین کنپٹی پر تھی۔ باقی رائفل بردار بھی چوکس تھے۔

''کیا ہو رہا ہے؟'' سجاول نے سوال کیا۔
''ٹانکے لگ رہے ہیں۔''
''کسی ہلچل کا چانس بھی ہے کہ نہیں؟''
''ابھی تک تو نہیں۔ اگر زبردستی چانس پیدا کیا گیا تو نقصان ہو سکتا ہے۔''
کمانڈو خالد شاہ اب اپنے میڈیکل باکس میں سے شاید قینچی ڈھونڈ رہا تھا لیکن اس نے جو شے نکالی، وہ قینچی نہیں تھی میڈیکل باکس کے کسی خفیہ خانے سے اس نے پستول برآمد کیا تھا۔ بالکل جیسے بجلی سی چمک گئی۔ خالد شاہ کا نشانہ شاندار تھا۔ اس نے سرغنہ کی کلائی کو بڑی صفائی سے نشانہ بنایا۔ میں نے دیکھا ''اے کے 47'' رائفل ایک جھٹکا کھا کر سرغنہ کے ہاتھ سے نکل گئی۔
اس کے ساتھ ہی اسکرین تاریک ہو گئی۔ باہر سے کمرے کی لائٹ آف کر دی گئی تھی، یقیناً ایسا پروگرام کے تحت ہی کیا گیا تھا۔ بالائی منزل پر کئی فائر ہوئے اور زبردست ہلچل نظر آئی۔ صرف آٹھ دس سیکنڈ بعد اسکرین دوبارہ روشن ہو گئی۔ (کیمرا تو چل ہی رہا تھا صرف اندھیرا ہونے کی وجہ سے اسکرین تاریک ہوئی تھی) جو نیا منظر اسکرین پر نظر آیا۔ وہ بالکل غیر متوقع تھا۔
کمرے میں ایک شلوار قمیص والے نوجوان کی لاش پڑی تھی۔ یقیناً اس نے کمانڈو خالد شاہ کی مدد کے لیے کمرے میں گھسنے کی کوشش کی تھی۔ کمانڈو خالد شاہ کی دونوں ٹانگوں سے بھی خون بہہ رہا تھا۔ شاید یہاں گولیاں لگی تھیں۔ سرغنہ ناقب نے خالد شاہ کو دیوار سے لگایا ہوا تھا اور اے کے 47 کی نال اس کی گردن میں گھسیڑی ہوئی تھی۔ وہ غیر ملکی زبان میں پتا نہیں کیا کیا بک رہا تھا۔ ابراہم اوندھے منہ فرش پر پڑا تھا۔ اس کے ہاتھ بدستور پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ شکیل داراب بھی اوندھا گرا ہوا تھا۔ وہ دونوں رائفلوں کی زد میں تھے۔
سجاول نے مجھے دھکیل کر پیچھے ہٹایا اور کی ہول سے آنکھ لگا دی۔
''کیا ہوا شاہ زیب بھائی؟'' انیق نے پوچھا۔
''وہی جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ان لوگوں نے ہلہ ناکام کر دیا۔ خالد شاہ زخمی ہو گیا ہے۔''
انیق نے بھی کان دروازے سے لگا دیا اور سننے کی کوشش کرنے لگا۔ سرغنہ ناقب کے دھاڑنے کی آواز مسلسل آ رہی تھی۔
''کیا کہہ رہا ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''لگتا ہے کہ خالد شاہ کو جان سے مارنے کی دھمکی دے رہا ہے......''

ابھی انیق کا فقرہ ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ ''اے کے 47 کا گونج دار فائر سنائی دیا۔ اس کے دو سیکنڈ بعد کہیں پاس ہی کوئی وزنی شے پختہ فرش پر گری۔ ایک دم بھاگتے دوڑتے قدموں کی آوازیں آئیں۔

سجاول نے اپنی آنکھ کی ہول سے ہٹالی اور آلتی پالتی مار کر فرش پر بیٹھ گیا۔

''کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''ماتھے پر بندوق رکھ کر گولی ماردی۔ لاش اوپر سے نیچے پھینک دی۔'' سجاول نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''کس کو ماری؟ خالد شاہ کو؟'' میں نے پوچھا۔

سجاول نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

جدھر سے وزنی شے فرش پر گرنے کی آواز آئی تھی، اس طرف ہمارے واش روم کی کھڑکی تھی۔ میں نے واش روم میں جا کر کھڑکی سے جھانکا۔ ماربل کے فرش پر خالد شاہ کا بے جان جسم پڑا تھا۔ گولی اس کی فراخ پیشانی توڑ کر سر کے پچھلے حصے سے نکل گئی تھی۔ اس کی دونوں ٹانگوں پر بھی زخم تھے۔

اس چاق و چوبند شخص کو ہم نے صرف ایک گھنٹا پہلے چھوٹے احاطے میں دیکھا تھا۔ چوڑا سینہ، آنکھوں میں دلیری کی چمک، چہرے پر تجربے کی روشنی۔ اسے اگر پارا ہاؤس والوں نے یہاں بلایا تھا تو یقیناً اس کی غیر معمولی صلاحیتوں کے سبب ہی بلایا تھا اور وہ بڑے اعتماد سے چلا آیا تھا لیکن اسے پتا نہیں تھا کہ آج وہی دن ہے جو ہر جاندار کے ساتھ ساتھ چلتا ہے اور ایک دن اس کے ہاتھ میں موت کا سندیسہ تھما دیتا ہے۔ ہمارے لیے خالد شاہ کا کردار کتنا مختصر ثابت ہوا تھا، اس کے لیے کہا جا سکتا تھا۔ وہ آیا...... وہ جھپٹا...... اور وہ مر گیا۔

بڑے صاحب، حلمی اور انچارج قادر سمیت کئی افراد اس کی لاش کے گرد جمع تھے۔ ہم بھی کمرے سے باہر آگئے اور سوگوار انداز میں اس کی لاش کے پاس کھڑے ہو گئے۔ اسے بالائی منزل کی کھڑکی سے نیچے پھینکا گیا تھا اور لاش پھینک کر کھڑکی پھر بند کر دی گئی تھی۔

اب بالائی منزل پر ایک بار پھر وہی پُراندیش خاموشی تھی۔ میں نے دیکھا کہ بڑے صاحب کے چہرے پر رنگ آ جا رہے تھے۔ انہوں نے حلمی کو ساتھ لیا اور تیز قدموں سے واپس نشست گاہ کی طرف چلے گئے۔ ہم بھی اپنے کمرے میں واپس آگئے۔ سنبل کا کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے اور موجودہ صورتِ حال میں کیا محسوس کر رہی ہے۔ بے شک وہ جادوئی حسن کی مالک تھی لیکن سمجھ بُوجھ بہت زیادہ نہیں تھی۔ یہ افراتفری کے حالات اسے

خوف زدہ کر سکتے تھے۔

ہمیں کمرے میں پہنچے ہوئے پانچ دس منٹ ہی ہوئے تھے کہ حلمی وہاں پہنچ گیا۔اس مرتبہ اس کے ساتھ آقا جان بھی تھا۔اس نے آتے ساتھ ہی سجاول کو تھپکی دی اور ہم دونوں کو بھی شاباشی کی نظروں سے دیکھا۔حلمی نے کہا۔''حالات کچھ زیادہ اچھے نہیں ہیں۔ابھی تم تینوں نے بھی وہ لاش دیکھی ہوگی جو اوپر سے پھینکی گئی ہے۔''

سجاول نے اثبات میں جواب دیا اور انجان بنتے ہوئے کہا۔''بہت زیادہ افسوس ہوا ہے جی۔خالد شاہ صاحب سے تو بڑی امید تھی۔یہ سب کیسے ہو گیا؟''

حلمی نے مختصر الفاظ میں بتایا کہ کس طرح خالد شاہ اور اس کے ساتھی نے حملہ آوروں کو زیر کرنے کی کوشش کی اور کس طرح یہ کارروائی ناکام ہوئی۔

ہم یہ سب کچھ مانیٹرنگ اسکرین پر دیکھ چکے تھے۔

حلمی کے ہاتھ میں کینوس کا ایک بیگ نظر آرہا تھا۔اس نے بیگ فرش پر رکھ دیا اور بولا۔''اس میں دو رائفلیں اور ایک پسٹل ہے۔کافی فالتو راؤنڈ بھی ہیں۔یہ ہتھیار تم تینوں کے لیے ہیں۔تم نے تھوڑی دیر پہلے جس جی داری کا مظاہرہ کیا ہے اس کی فوٹیج بڑے صاحب نے بھی دیکھی ہے۔وہ تم سے متاثر ہوئے ہیں اور خاص طور سے مسٹر سجاول سے۔''

سجاول نے اسلحہ نکال کر دیکھا اور حلمی کا شکریہ ادا کیا۔

حلمی نے کہا۔''موجودہ حالات میں تم تینوں کا مسلح ہونا ہمارے لیے توانائی کا سبب ہو گا۔اللہ کرے پاراہاؤس کے گارڈز خود ہی حالات کنٹرول کرلیں لیکن پھر بھی تم لوگوں کے پاس کوئی نہ کوئی ہتھیار ہونا چاہیے۔''

حلمی کا لہجہ دوستانہ تھا۔میں نے آقا جان کے تاثرات سے اندازہ لگایا کہ اسے یہ سچویشن کچھ زیادہ پسند نہیں آرہی۔وہ تو ہمارے یہاں آنے کے حق میں ہی نہیں تھا۔ہم نہ صرف آئے تھے بلکہ اب بڑے صاحب کی نظروں میں بھی آگئے تھے۔

''اب صورتِ حال کیا ہے جی؟''میں نے حلمی سے پوچھا۔

''وہی جو خالد شاہ کے جانے سے پہلے تھی بلکہ اب تو ان خبیثوں نے وہ آخری کیمرا بھی توڑ ڈالا ہے۔وہ ہمیں دیکھ رہے ہیں لیکن ہم انہیں نہیں دیکھ پا رہے۔ان سے ہمارا صرف آڈیو رابطہ ہے۔''

''میرے ذہن میں ایک بات آرہی ہے جی۔''میں نے کہا۔

''کہو کہو۔''

''ایسا نہ ہو کہ پارا ہاؤس کے گارڈز میں ابھی کوئی ایک آدھ اور ''کالی بھیڑ'' بھی موجود ہو......اور وہ کوئی نقصان پہنچا جائے۔''

حلمی نے ملائیشین لہجے کی اردو میں کہا۔''یہ اندیشہ ہمارے ذہن میں بھی پیدا ہو رہا ہے۔ ہم نے دس پندرہ ایسے لوگوں سے ہتھیار رکھوا لیے ہیں، جن پر کسی طرح کا شک کیا جاسکتا تھا۔ اب میں سوچ رہا ہوں کہ کچھ مزید لوگوں کو بھی چیک کرنا چاہیے۔ مناسب نفری تو موجود ہے لیکن کالی بھیڑ والی بات خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔''

''حملہ آوروں میں سے کوئی زندہ بھی پکڑا گیا ہے؟''میں نے پوچھا۔

''صرف ایک۔ اور وہ بھی زخمی ہے۔ بیسمینٹ میں بے ہوش پڑا ہے۔ اسے ہوش میں لانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ شاید وہ کچھ بتا سکے۔''

اسی دوران میں حلمی کے سیل فون کا میوزک بجنے لگا۔ وہ کال ریسیو کرتا ہوا تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔ آقا جان بھی اس کے ساتھ ہی گیا تھا۔ وہ یہاں ہماری پذیرائی پر کافی حیران ہوا تھا۔ اس کے نزدیک تو سجاول فقط ایک ٹرک ڈرائیور اور انیق ہیلپر تھا۔ میری حیثیت اس کے لیے ایک سُست الوجود گارڈ کی تھی، لیکن یہاں ہماری کارکردگی کا سن کر وہ متعجب ہو رہا تھا۔

اگلا ایک گھنٹا بے حد تناؤ بھرا تھا۔ ہم کمرے میں تھے اور کوئی اہم اطلاع ہم تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ گاہے بگاہے بالائی منزل سے دہاڑنے چنگھاڑنے کی آوازیں آتی تھیں۔ یہ آوازیں یقیناً سرغنہ اور اس کے غیر ملکی ساتھیوں کی ہی تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ آڈیو سسٹم کے ذریعے ''ہائی جیکروں'' سے مذاکرات ہو رہے ہیں۔ غالباً کچھ لو اور کچھ دو کی بنیاد پر معاملات کو سلجھانے کی کوشش کی جارہی تھی۔

اب رات کے ایک بجے کا عمل تھا، یہ نہایت سنگین ہنگامہ شروع ہوئے اب چار گھنٹے ہونے کو آئے تھے۔ کچھ پتا نہیں تھا کہ یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔ ڈاکٹر کے روپ میں کمانڈو خالد شاہ کی انٹری نے حملہ آوروں کو بے حد مشتعل کر رکھا تھا اور دہاڑ چنگھاڑ کی آوازیں بھی اسی حوالے سے تھیں۔ ہمیں یہاں کھانے کے لیے بلایا گیا تھا لیکن اس عزت افزائی سے پہلے ہی یہاں آگ برسنا شروع ہوگئی تھی اور جہاں گولیاں کھلائی اور کھائی جارہی ہوں وہاں کھانے کا ہوش کس کو رہتا ہے۔ اوپر سے جو آوازیں نیچے پہنچ رہی تھیں، ان میں گاہے بگاہے کسی عورت کی آہ و بکا بھی شامل ہو جاتی تھی۔ یقیناً یہ اسی پریشان حال ماں کی آواز تھی جس کا لختِ جگر قاتلوں کے قبضے میں تھا، اگر یہ صرف روپے پیسے کا معاملہ ہوتا تو شاید اب تک حل بھی ہو گیا

ہوتا۔ کیونکہ مال وزر کی اس پاراہاؤس میں کوئی کمی نہیں تھی۔ یہاں مطالبہ کچھ اور طرح کا تھا جس کی وجہ سے مذاکرات طول پکڑتے جارہے تھے۔

رات قریباً دو بجے کا عمل ہوگا جب حلمی تیزی سے اندر داخل ہوا۔ آقا جان بھی اس کے ساتھ تھا۔ حلمی نے کہا۔ ''معاملات طے ہورہے ہیں۔ ان لوگوں کا ایک ہی مطالبہ ہے۔ وہ چھوٹے صاحب ابراہم کے ساتھ یہاں سے نکلنے کا راستہ مانگ رہے ہیں۔ اس سے پہلے وہ وی آئی پی مہمان کو چھوڑ دیں گے۔''

''یہ مطالبہ مان لیا گیا ہے؟'' سجاول نے قدرے حیرانی سے پوچھا۔

''بظاہر تو مان لیا گیا ہے۔'' حلمی نے رازداری کے لہجے میں کہا۔ ''لیکن حقیقت میں ایسا نہیں۔''

سجاول سوالیہ نظروں سے حلمی کو دیکھنے لگا۔ حلمی نے سجاول کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''آؤ میرے ساتھ...... بلکہ تم دونوں بھی آجاؤ۔'' اس نے میری طرف بھی اشارہ کیا۔

ہم حلمی کے ساتھ کمرے سے نکل آئے اور نشست گاہ میں سے گزر کر ایک کوریڈور میں آگئے۔ یہ کوریڈور بغل کے داخلی دروازے تک جاتا تھا۔ کوریڈور میں سرخ قالین بچھا ہوا تھا اور یہ نہایت بیش قیمت تھا۔ ایک جگہ پہنچ کر حلمی رک گیا۔ یہاں قالین کا ایک حصہ ختم ہوتا تھا اور دوسرا شروع ہوتا تھا۔ حلمی نے اس جگہ کو اپنے پاؤں سے ٹھوکا۔ نیچے خلا کا احساس ہوا۔

حلمی نے ایک گارڈ کو اشارہ کیا، اس نے قالین کو کنارے سے پکڑ کر ہٹایا۔ نیچے ماربل کے فرش کے بجائے مضبوط لکڑی کے تختے تھے۔ اس کے کہنے پر گارڈز نے کوریڈور کے سرے پر جاکر ایک پوشیدہ کھٹکا دبایا۔ یکا یک تختے اپنی جگہ سے ہٹ کر نیچے لٹک گئے اور ایک خلا نظر آیا۔ اس کی چوڑائی کوریڈور کی چوڑائی کے برابر تھی۔ یعنی مشکل سے چار فٹ۔ لمبائی چھ فٹ کے لگ بھگ ہوگی۔

میں اور سردار سجاول حیرت سے حلمی کی طرف دیکھنے لگے، وہ بولا۔ ''یہ ہم نے نہیں بنایا۔ بہت پہلے کا بنا ہوا ہے۔ پہلے مالک نے بنایا ہوگا۔ اس طرح کا ایک اور ''ٹریپ'' مہمان خانے کی طرف بھی موجود ہے۔''

حلمی کی بات سمجھ میں آرہی تھی اور یہ بڑی سنسنی خیز بات تھی...... حملہ آوروں کو یہاں سے نکلنے کا جو راستہ دیا جانے والا تھا، وہ اس کوریڈور کی طرف سے تھا۔ اور یہاں ان کے لیے ایک بنا بنایا ٹریپ موجود تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ کیا یہ ٹریپ کام کر جائے گا؟

حلمی ہمیں لے کر ایک تنگ زینے سے اترا اور تہ خانے میں پہنچ گیا۔ یہاں فوم کے دس بارہ گدے اوپر تلے پھیلا کر رکھ دیئے گئے تھے۔ تا کہ گرنے والوں کو زیادہ چوٹ نہ آئے۔ حلمی نے سجاول کو مختصر الفاظ میں جلدی جلدی پلاننگ سے آگاہ کیا۔ اس پلاننگ کا اہم مفروضہ یہی تھا کہ حملہ آور اس کوریڈور سے گزرنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ دونوں یرغمالی یعنی ابراہیم فردوس اور شکیل داراب کو آگے رکھا جانا تھا۔ دو یا تین افراد نے انہیں براہِ راست گن پوائنٹ پر رکھنا تھا، باقی چھ سات افراد کو اس کے عقب میں ہونا تھا۔ جیسے ہی شکیل داراب اور ابراہم فردوس تختوں پر پہنچتے تختوں کو ہٹا دیا جاتا۔ وہ دونوں نیچے گرتے، ان کے ساتھ دو یا تین حملہ آور بھی گرتے۔ یہاں تہ خانے میں کم از کم پانچ چوکس افراد کو موجود ہونا تھا۔ وہ نیچے گرنے والوں کو چھاپ لیتے یا فوراً شوٹ کر دیتے۔ اوپر والوں کو تختے کھلنے کے فوراً بعد ہی شوٹ کر دیا جاتا۔ انہیں شوٹ کرنے کے لیے رائفل بردار ابھی سے کوریڈور میں موجود کھڑکیوں کے پیچھے چھپا دیئے گئے تھے۔

حلمی نے سجاول کو آفر کی کہ اگر وہ چاہے تو ان پانچ افراد میں شامل ہو سکتا ہے جن کو تہ خانے میں موجود رہنا تھا۔

سجاول نے اپنے چوڑے، صندوق جیسے سینے پر ہاتھ رکھا اور اس پیشکش کو قبول کرنے میں ایک لمحے کی دیر بھی نہیں لگائی۔

انچارج قادر بھی ان پانچ افراد میں شامل تھا جنہوں نے حملہ آوروں کے نیچے گرتے ہی انہیں چھاپ لینا تھا۔ باقی تین افراد بھی گارڈز کی نفری میں سے چنے ہوئے لوگ تھے۔ وہ اپنے مالک اور اس کے لختِ جگر کے لیے سر دھڑ کی بازی لگانے کے لیے بالکل تیار نظر آتے تھے۔ ان کے لیے سب سے ضروری ہدایت یہی تھی کہ ابراہم اور وی آئی پی مہمان کو کوئی گزند نہ پہنچے۔

حلمی اور آقا جان نے سجاول کو جلدی جلدی کچھ ضروری ہدایات دیں اور پھر ہم تہ خانے سے نکل کر اوپر آ گئے۔ اب آقا جان کا رویہ بھی ہم سے کچھ بہتر نظر آنے لگا تھا۔ شاید وہ سمجھ گیا تھا کہ فی الحال ہماری قسمت چمکارے مار رہی ہے اور اس کا کڑھنا بیکار ہے۔ حلمی نے مجھے اور انیق کو فی الحال کمرے میں رہنے کی ہدایت کی اور کہا کہ ہم تیار رہیں۔ ہماری ضرورت بھی پڑ سکتی ہے۔

میں نے حلمی سے کہا۔ ”جناب ایک سوال پوچھ سکتا ہوں۔ ابھی آپ نے کہا تھا کہ یہ لوگ یہاں سے نکلتے ہی وی آئی پی مہمان کو رہا کر دیں گے۔ مگر اب آپ کہہ رہے ہیں کہ یہ

لوگ چھوٹے صاحب ابراہم کے علاوہ معزز مہمان کو بھی لے کر نکلیں گے؟''
''تمہارا سوال درست ہے۔'' حلمی نے کہا۔ ''ان لوگوں نے مہمان کو چھوڑنے والا مطالبہ مانا تو ہے مگر وہ مہمان کو تب چھوڑیں گے جب پورچ میں پہنچ کر گاڑی میں بیٹھ جائیں گے۔''

میرے سوال کا جواب دینے کے بعد حلمی بڑی سرعت سے باہر نکل گیا۔ آقا جان وغیرہ بھی اس کے ساتھ تھے۔ جاتے جاتے وہ سجاول کو بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

○......❖......○

قریباً پندرہ منٹ بعد وہ خطرناک مرحلہ شروع ہو گیا جس کا یہاں شدت سے انتظار کیا جا رہا تھا۔ میں اور انیق کمرے میں موجود تھے اور ادھ کھلے دروازے سے سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ پارا ہاؤس کے گارڈز ہر جگہ موجود تھے اور ہائی الرٹ تھے۔ کوریڈور میں موجود کھڑکیوں کے پیچھے ماہر شوٹرز پوزیشن لے چکے تھے۔ سجاول دیگر چار افراد کے ساتھ نیچے تہ خانے میں پہنچ چکا تھا جس بندے نے کھٹکا دبا کر کوریڈور کے تختے کو نیچے گرانا تھا، وہ بھی اپنی جگہ پر پہنچ چکا تھا اور یہ خود حلمی تھا۔ دوسرے لفظوں میں اسٹیج پوری طرح تیار تھا۔ سب کے دل شدت سے دھڑک رہے تھے۔

آخر وہ لمحے آن پہنچے۔ سیڑھیوں کی طرف سے قدموں کی چاپیں ابھریں۔ چند سیکنڈ بعد ہی ہمیں دونوں یرغمالی اور مسلح افراد نظر آئے۔ سرغنہ نے بڑی بے رحمی سے ابراہم کے بال مٹھی میں جکڑ رکھے تھے۔ اس بے چارے کی دبلی گردن ایک طرف کو مڑ کر رہ گئی تھی۔ رائفل کی نال اس کے سر سے لگی تھی۔ وہ نیک صورت نظر آتا تھا۔ دہشت کے علاوہ زخم کی بے پناہ تکلیف بھی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

شکیل داراب کے ہاتھ بھی پشت پر بندھے تھے اور ایک رائفل اس کی پشت سے لگی ہوئی تھی۔ رائفل بردار کی انگلی ٹریگر پر تھی۔ اس حال میں بھی شکیل کے خوبرو چہرے پر رعونت اور غصیلا پن دکھائی دیتا تھا۔

انیق نے سرگوشی کی۔ ''صحیح کہتے ہیں کہ رسّی جل گئی مگر بل نہ گیا۔''

شکیل اور ابراہم کے عقب میں کم و بیش آٹھ مسلح افراد تھے۔ سب کے سب مسلح اور انتہائی چوکس۔ وہ چاروں طرف عقابی نظروں سے دیکھتے اور پھونک پھونک کر قدم رکھتے آ رہے تھے۔ حلمی کوریڈور کے سرے پر موجود تھا۔ اس نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے اس ''قافلے'' کو کوریڈور کی طرف موڑنا چاہا۔

یہاں تھوڑا سا مکالمہ ہوا۔ غالباً سرغنہ ناقب، حلمی سے دریافت کر رہا تھا کہ وہ سامنے والے دروازے کی طرف سے کیوں نہیں نکل سکتے۔ جواب میں حلمی نے وضاحت کی۔ یہ گفتگو مالے میں تھی۔

''کیا کہہ رہا ہے یہ؟'' میں نے انیق سے پوچھا۔

''کہہ رہا ہے کہ گاڑیاں اس طرف کھڑی ہیں۔ ادھر سے گئے تو چکر پڑے گا۔''

چند سیکنڈ تذبذب میں گزرے۔ شاید سرغنہ کی چھٹی حس اسے کسی خطرے سے، خبردار کر رہی تھی مگر پھر وہ کوریڈور کی طرف مڑنے پر راضی ہو گیا لیکن یہاں جو تبدیلی آئی، وہ ہرگز ہرگز بڑے صاحب اور حلمی وغیرہ کے حق میں نہیں تھی۔ سرغنہ یرغمالی ابراہم کے ساتھ سب سے آگے چل پڑا۔ اس کے عقب میں چار پانچ مسلح افراد تھے۔ اس کے بعد دوسرے یرغمالی شکیل کو رکھا گیا۔ اس کے عقب میں بھی دو مسلح افراد تھے۔ بالالفاظ دیگر اب ابراہم اور شکیل میں کم و بیش دس بارہ فٹ کا فاصلہ تھا۔

''بیڑا غرق۔'' انیق کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''ہاں یہ تو گڑبڑ ہو گئی۔'' میں نے کہا۔

ہم سب کچھ براہِ راست دیکھ رہے تھے اور جو ہونے والا تھا، وہ بھی سمجھ میں آ گیا تھا۔ اگر تختے گرا کر ابراہم کو نیچے گرایا جاتا تو شکیل داراب باہر رہ جاتا اور اسے حملہ آور بھون ڈالتے۔ ساری پلاننگ کا سوا ستیاناس ہو رہا تھا۔ میں نے حلمی کے چہرے پر انتہا درجے کی پریشانی دیکھی۔

سرغنہ اور ابراہیم مقررہ مقام تک پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے قالین پر اس جگہ پاؤں رکھے جہاں نیچے خطرناک تختے موجود تھے۔ پھر وہ صحیح سالم گزر کر آگے بڑھ گئے۔ تین چار سیکنڈ بعد شکیل داراب کے قدم بھی تختوں والی جگہ پر پڑے اور وہ بھی باعافیت وہاں سے گزر گیا۔

''اب کیا ہوگا؟ یہ لوگ نکل جائیں گے؟''

انیق نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔

ابھی اس کا فقرہ مکمل ہی ہوا تھا کہ ہم نے کوریڈور کے اگلے دروازے کو بند ہوتے دیکھا۔ یہ اسٹیل کا بنا ہوا سلائڈنگ دروازہ تھا۔ اور آٹومیٹک طریقے سے حرکت میں آیا تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا اسے حلمی نے ہی حرکت دی تھی۔

اپنے سامنے بند دروازہ دیکھ کر حملہ آور بری طرح ٹھٹکے۔ سرغنہ کی چنگھاڑ ابھری۔ یقیناً

وہ حلمی سے پوچھ رہا تھا کہ ان کا راستہ کیوں مسدود کیا گیا ہے۔
حلمی نے بلند آواز میں کچھ کہا۔ انیق نے ترجمہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''حلمی کہہ رہا ہے میکانکی خرابی سے بند ہوا ہے......''
اگلے پانچ چھ سیکنڈ کے اندر ٹینشن عروج پر پہنچ گئی۔ اے کے 47 رائفل کی خوفناک آواز سے در و دیوار دہل گئے۔ سرغنہ ناقب نے یہ ہوائی فائرنگ کی تھی۔ راہداری کی چھت سے پلاسٹر کے پرخچے اڑ کر ہر طرف بکھر گئے۔
''دروازہ توڑو۔'' حملہ آوروں میں سے کسی مقامی شخص نے چلا کر کہا۔
اسٹیل کے دروازے پر دو برسٹ چلائے گئے۔ ہر طرف چنگاریاں بکھر گئیں اور دھماکوں نے پارا ہاؤس کو لرزا دیا، بالائی منزل سے خواتین کے چلانے کی دہشت زدہ آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اسٹیل کے مضبوط دروازے کا کچھ نہیں بگڑا تھا۔
سرغنہ ناقب سمجھ گیا تھا کہ اس کے ساتھ کوئی چال چلی گئی ہے۔ یا چلنے کی کوشش کی گئی ہے۔ وہ دہاڑ رہا تھا اور خوفناک نتائج کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ اس نے حلمی پر بھی دو فائر کیے لیکن خوش قسمتی سے گولی حلمی کو لگی نہیں۔ اسی دوران میں ناقب کے ایک ساتھی نے ایک قریبی کمرے کا دروازہ توڑ دیا۔ اور اس کے ساتھی، دونوں یرغمالیوں کو کھینچتے ہوئے اندر لے گئے۔ ان لوگوں نے ایک بار پھر خود کو کمرے میں محصور کر لیا تھا۔
یہ خطرناک صورتِ حال تھی۔ پارا ہاؤس والوں نے ایک چال چلی تھی اور یہ ناکام ہوئی بلکہ یہ دوسری چال تھی جس کا نتیجہ مثبت نہیں نکل سکا تھا۔ اب حملہ آوروں کا غیظ و غضب کئی گنا بڑھ گیا تھا۔ جن لوگوں کو تہ خانے میں بھیجا گیا تھا، وہ بھی اب اوپر آگئے تھے۔ ان میں سجاول بھی شامل تھا۔ وہ ہمارے پاس چلا آیا اور سوالیہ نظروں سے ہماری طرف دیکھنے لگا۔
میں نے اسے بتایا۔ ''پلاننگ فیل ہوگئی ہے۔ وہ لوگ ہوشیار نکلے ہیں۔ دو حصوں میں کوریڈور میں گئے تھے۔ ابراہم اور شکیل کے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ حلمی وغیرہ کچھ نہیں کر سکے۔
اب نشست گاہ کی جانب سے حلمی اور انچارج گارڈ قادر خان کے جھگڑنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ ایک دوسرے پر ناکامی کا الزام لگا رہے تھے۔ حلمی کڑک کر بولا۔ ''اب دفع ہو جاؤ باہر...... جب ضرورت پڑے گی تمہیں بلا لوں گا۔'' قادر خان بیزار لہجے میں بولا۔
''اگر آپ کہتے ہیں تو میں ویسے ہی دفع ہو جاتا ہوں۔ سب کچھ میری ہی وجہ سے ہو رہا ہے نا۔''
''تو ہو جاؤ دفع۔ دور کرو اپنی شکل۔ تم ذمے دار ہو اس ساری مصیبت کے۔'' حلمی گرجا۔
آقا جان نے بیچ بچاؤ کرانے کی کوشش کی اور قادر خان کو سمجھا بجھا کر باہر لے گیا۔

کوریڈور کے اندر سے کسی لڑکی کے چیخنے چلانے کی آوازیں آرہی تھیں بلکہ یہ ایک سے زیادہ لڑکیاں یا عورتیں تھیں، حملہ آور جس کمرے کا دروازہ توڑ کر اندر گھسے تھے یقیناً یہ خواتین وہیں پر موجود تھیں اور حملہ آوروں کے ہتھے چڑھ گئی تھیں۔

''کہیں سنبل وغیرہ کی شامت تو نہیں آگئی؟'' انیق نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''نہیں وہ اس حصے میں نہیں ہے۔'' سجاول نے خشک لہجے میں جواب دیا۔ ''یہ یہاں کی ملازمائیں ہوسکتی ہیں۔''

حلمی اپنے زخمی کندھے کو دبائے لپکتا ہوا بڑی اسکرین کے پاس آیا اور ایک کیمرے کا منظر انلارج کیا۔ یہ وہی کمرا تھا جہاں حملہ آور بھرا مار کر گھسے تھے۔ سجاول کا اندازہ درست تھا۔ یہ ملازمہ لڑکیوں کا ہی کمرا تھا جو اسکرین پر نظر آرہی تھیں۔ وہ چار لڑکیاں تھیں۔ یہ سب ملازماؤں والی یونیفارم میں تھیں...... اور قبول صورت تھیں، لیکن اس وقت بری حالت میں تھیں۔ ان میں سے دو نے شاید بھاگنے کی کوشش کی تھی یا حملہ آوروں کی مزاحمت کی تھی۔ انہوں نے ان دونوں کے کپڑے پھاڑ کر انہیں نیم عریاں کر ڈالا تھا۔ ان کے گال طمانچوں سے سرخ نظر آرہے تھے۔ باقی دو لڑکیاں بھی سہم کر فرش پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کے سر پر رائفل بردار کھڑے تھے۔ ابراہم اور شکیل بدستور گن پوائنٹ پر تھے۔

سرغنہ ناقب نے ایک نیم برہنہ لڑکی کے بال بیدردی سے مٹھی میں جکڑے ہوئے تھے اور اپنی ''اے کے 47'' اس کی گردن میں گھسیڑ رکھی تھی۔ اس نے کیمرے کی طرف رخ کر کے اور دہاڑ کر کچھ کہا۔ جواب میں حلمی نے بھی مائیک آن کیا اور سرغنہ کو کچھ سمجھانے کی کوشش کی۔ یہ سنگین گفتگو مالے میں ہو رہی تھی۔

انیق نے بتایا۔ ''یہ لوگ بہت بھڑک گئے ہیں۔ ناقب نے صرف پندرہ منٹ کا الٹی میٹم دیا ہے۔ حلمی سے کہہ رہا ہے کہ اگر انہیں باہر نکلنے کا راستہ نہ دیا گیا تو وہ پندرہ منٹ بعد اس لڑکی کو گولی مار دے گا۔''

''حلمی کیا کہہ رہا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''دروازے کی خرابی کا بہانہ کر رہا ہے۔ کہہ رہا ہے کہ میں گاڑیاں دوسری طرف سے منگواتا ہوں، لیکن یہ صرف کہنے کی بات ہے۔ اس نے ایسا کرنا ہرگز نہیں۔''

سجاول بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ یہ لوگ جانتے ہیں کہ اگر ایک بار ابراہم پارا ہاؤس سے نکل گیا تو پھر سب کچھ ان کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔''

گڑبڑ بڑھتی جارہی تھی۔ کسی بھی وقت کچھ ہوسکتا تھا۔ پورے پارا ہاؤس میں ایک

سراسیمگی کی کیفیت تھی۔
یکایک بالائی منزل سے رونے چلانے کی بلند آوازیں ابھریں۔ ایسا لگا کہ تہلکہ سا مچ گیا ہے۔ ہم نے ایک دوسرے کے چہرے دیکھنے شروع کر دیئے۔ جلد ہی پتا چلا کہ پارا ہاؤس کے مالکان میں سے کسی معزز خاتون کو غشی کا دورہ پڑا ہے۔ تھوڑی دیر بعد تصدیق ہوگئی کہ وہ ابراہم کی والدہ بڑی بیگم ہی ہیں۔ ہمیں معلوم ہوا تھا کہ پارا ہاؤس کے اندر بھی جدید طبی سہولتیں موجود ہیں۔ تاہم یہ سہولتیں صرف خاص لوگوں کے لیے تھیں۔ بڑی بیگم سے بڑھ کر خاص اور کون ہوسکتا تھا۔ یہ اطلاع ملی کہ انہیں پارا ہاؤس کے نجی اسپتال میں پہنچایا گیا ہے۔ چند لمحے کے لیے ہمیں ایک اسکرین پر ''بڑے صاحب عزت مآب ریان فردوس'' کی صورت بھی نظر آئی۔ وہ دو ڈاکٹروں کو ڈانٹ پلا رہا تھا اور انہیں ضروری ہدایات بھی دے رہا تھا۔ بڑے صاحب کے بال منتشر تھے اور انگلیوں میں سگار لرز رہا تھا۔
آج کی رات اگر نارمل رہتی تو ممکن تھا کہ بڑے صاحب کے لیے بڑی نشاط انگیز ثابت ہوتی۔ اس نے نوخیز سنبل کو پسند کیا تھا اور اپنے پاس بلایا تھا۔ کیا پتا کہ وہ آج کی رات اس کے ساتھ گزارنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ اگر ایسا ارادہ نہ بھی ہوتا تو بھی وہ اس کے ساتھ دل لگی کی باتیں کرسکتا تھا اور اپنی اس زمینی جنت میں اس کے ساتھ کچھ اچھا وقت گزار سکتا تھا، لیکن یہاں سب کچھ الٹ ہوا تھا۔ بڑے صاحب کو ایک بدترین مصیبت نے آن گھیرا تھا۔ پچھلے چند گھنٹوں کے اندر پارا ہاؤس میں کم و بیش پندرہ افراد جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے، جن میں ایک سابق پولیس آفیسر بھی تھا۔
وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ اب ناقب کی دی ہوئی مہلت ختم ہونے میں فقط پانچ منٹ رہ گئے تھے۔ حلمی، ناقب کو قائل کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ وہ کسی کی جان لینے میں جلد بازی نہ کرے۔ اس نے ناقب سے کہا۔ ''بڑی بیگم کو دل کا دورہ پڑا ہے۔ ان کی جان خطرے میں ہے۔ بڑے صاحب ان کے ساتھ نیچے اسپتال میں ہیں۔ میں جب تک ان سے مشورہ نہ کرلوں، کچھ نہیں کرسکتا۔''
جواب میں ناقب گرجا۔ ''میری طرف سے تمہاری بڑی بیگم مرتی ہے تو مر جائے...... اس کا پورا خاندان مر جائے، لیکن میں نے اب جو کہہ دیا ہے، وہی ہوگا۔ میں اس لڑکی کو اڑا ڈالوں گا۔ صرف تین منٹ باقی ہیں۔''
حلمی بولا۔ ''تم صرف پندرہ منٹ اور دو۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ......''
''پندرہ سیکنڈ بھی نہیں۔'' ناقب دہاڑا۔ اور اس نے لڑکی کے بالوں کو اپنے ہاتھ کے گرد

بل دے کر اس طرح مروڑا کہ اس کی گردن ٹوٹنے والی ہوگئی وہ اپنی نیم برہنگی فراموش کر چکی تھی اور صرف جان بچانے کے لیے دہائی دے رہی تھی۔ اس کا چہرہ دہشت کی تصویر تھا۔

پندرہ منٹ پورے ہوتے ہی ناقب نے بے گناہ لڑکی کے عین ماتھے پر فائر مارا اور اس کی کمر پر لات رسید کر کے اسے کمرے سے باہر پھینک دیا۔ یہ ایک دلدوز منظر تھا۔ میں نے دیکھا حلمی بڑی اسکرین کے سامنے سر پکڑ کر بیٹھا ہوا ہے۔

میں نے کہا۔ ''سجاول! پتا نہیں کیوں مجھے لگ رہا ہے کہ میں ان حرام زادوں کا غرور توڑ سکتا ہوں۔''

''کس طرح؟'' سجاول نے عجیب نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''وہ غدار گارڈ کہاں ہے جو زندہ پکڑا گیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''نیچے پاراہاؤس کے اسپتال میں۔''

''ابھی ہوش میں آیا ہے یا نہیں؟''

''ٹھیک سے پتا نہیں۔''

''تم ایسا کرو سجاول، حلمی سے کہو کہ تم اس زخمی گارڈ کو دیکھنا چاہتے ہو۔''

''لیکن کیوں؟''

''جیسا کہہ رہا ہوں، ویسا کرو نا۔''

''لیکن یہ بات تم خود بھی تو حلمی سے کہہ سکتے ہو۔''

''یار! یہاں تمہارا ڈنکا بج رہا ہے۔ تم جو کچھ کہو گے، اس کا اثر ہوگا۔''

سجاول نے باہر جا کر حلمی سے بات کی۔ حلمی نے دو گارڈز کو سجاول کے ساتھ کیا اور اسپتال کی طرف روانہ کیا۔ سجاول نے مجھے بھی ساتھ لے لیا۔ نشست گاہ کے ساتھ والے کمرے میں جدید لفٹ موجود تھی۔ ہم اس کے ذریعے چند سیکنڈ کے اندر پاراہاؤس کے اس پورشن میں پہنچ گئے جسے ایک چھوٹے سے جدید اسپتال کی شکل دی گئی تھی۔ اس وقت بڑی بیگم بھی اسی کلینک نما اسپتال کے کسی اندرونی حصے میں طبی امداد کے لیے موجود تھی۔

میں اور سجاول اس کمرے میں پہنچے جہاں زندہ پکڑے جانے والے حملہ آور گارڈ کو رکھا گیا تھا۔ ہمیں یہاں بھی کچھ اضافی سراسیمگی نظر آئی۔ دروازے کے شیشے ٹوٹے ہوئے تھے۔ کرچیاں فرش پر بکھری ہوئی تھیں۔ ایک دیوار پر خون کے تازہ چھینٹے بھی دکھائی دیئے۔ دو نرسیں اور ایک ڈاکٹر پریشان حال کھڑے تھے۔ بیڈ خالی تھا۔ ''مریض کہاں گیا؟'' ہمارے ساتھ آنے والے ایک گارڈ نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

''وہ اب نہیں رہا۔'' ڈاکٹر نے بے دلی سے جواب دیا۔

''کیا ہوا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ ایم ایس سے بات کریں۔'' ڈاکٹر نے خشک لہجے میں کہا اور اندر چلا گیا۔

ہم ایم ایس کے پاس پہنچے۔ یہاں ایک بغلی کمرے میں کسی مشتعل شخص کو بند کیا گیا تھا۔ وہ دروازے پر دوہتڑ چلا رہا تھا۔ اور واویلا کر رہا تھا۔ ماردو...... مجھے بھی ماردو۔ ختم کر دو مجھے بھی۔''

''یہ کون ہے؟'' سجاول نے ایم ایس سے پوچھا۔

چند گھنٹوں میں ہی سجاول یہاں کی جانی پہچانی شخصیت بن گیا تھا اور کیوں نہ بنتا اس نے تن تنہا بڑی بیگم کو یرغمال بننے سے بچایا تھا۔ ایم ایس نے ہمیں بیٹھنے کے لیے کہا اور بولا۔ ''اس بندے نے زخمی گارڈ پر حملہ کیا ہے، جس کی وجہ سے اس کی جان چلی گئی ہے۔ اس کی حالت پہلے ہی اچھی نہیں تھی۔ سینے میں چاقو لگنے سے وہ فوراً ختم ہو گیا۔''

یہ سب حیران کن تھا۔

ایم ایس نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ''یہ بندہ جو اندر بند ہے اس کا نام صغیر ہے۔ یہ یہاں لیموزین ڈرائیو کرتا ہے۔ اس کا بھائی بھی بطور ڈرائیور یہاں بھرتی ہے۔ ابھی چند گھنٹے پہلے جب یہاں حملہ ہوا تو جن تین چار لوگوں کو سب سے پہلے گولی لگی ان میں صغیر کا بھائی صادق بھی شامل تھا۔ وہ موقع پر ہی ہلاک ہو گیا۔ صغیر اس کے غم میں دیوانہ ہو گیا ہے۔ پہلے اس نے احاطے میں رکھی ہوئی حملہ آوروں کی لاشوں کو آگ لگانے کی کوشش کی پھر پتا نہیں کس طرح اس طرف نکل آیا۔ آتے ہی زخمی گارڈ آصف پر پل پڑا۔ بہت مشکلوں سے پکڑا گیا ہے۔ ایک نرس کو بھی زخمی کیا ہے اس نے۔''

اسی دوران میں مشتعل صغیر نے کمرے کی کھڑکی کا ایک شیشہ توڑ دیا اور ٹوٹے شیشے میں سے منہ نکال کر چلانے لگا۔ ''یہ غدار ہیں۔ ان سب کی لاشوں کو آگ لگا دو۔ ان کی وجہ سے میرا بھائی مرا۔ ان کی وجہ سے وڈے صاحب پر مصیبت آئی۔ ان کو چن چن کر مار دینا چاہیے۔''

وہ پوری آواز سے بول رہا تھا اور اس کا چہرہ دہک رہا تھا۔ میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ بہت سے قاتلوں کے بہت سے جنونیوں کے چہرے دیکھے تھے میں نے۔ مجھے اب کسی حد تک ایسے چہروں کو پڑھنا آ گیا تھا۔ ایک دم میرے دل نے گواہی دی کہ اس شخص کا واویلا حقیقی نہیں ہے، اور جو جنونی جذبات وہ شو کر رہا ہے، وہ بھی بڑی حد تک بناوٹی ہیں۔

یکا یک مجھے لگا کہ اس شخص نے زخمی آصف کو مقصد کے تحت مارا ہے۔ شاید اس لیے کہ حملہ آوروں کے خلاف یہ اکلوتی شہادت ناپید ہو جائے۔ کوئی اس سے سوال جواب کر کے معلوم ہی نہ کر سکے کہ حملہ آور کس طرح پارا ہاؤس کی زبردست سکیورٹی کو ناکام بنانے میں کامیاب ہوئے اور اس خطرناک سازش میں کون کون شریک تھا۔

میں سجاول کو ایک طرف لے گیا۔ میں نے کہا۔ ''سجاول! ایک کام کرو اور تم کر سکتے ہو۔ مجھے یہ بندہ چاہیے۔''

''اس کمرے والے کی بات کر رہے ہو؟''

''ہاں...... تم اپنی طرف سے یہ بات کرو۔ حلمی سے کہو یا وڈے صاحب سے یا جس سے بھی۔''

''وہ...... کیسے مانیں گے؟''

''سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہ لوگ تم کو بڑی اہمیت دے رہے ہیں تم...... تم ان کو گارنٹی دو کہ تم ان کو کوئی بریک تھرو دو گے...... کوئی کھوج لگا کر دو گے۔''

جیسا کہ میں نے بتایا ہے سجاول زبردست مردم شناس اور معاملہ فہم تھا۔ اس نے دھیان سے میرے تاثرات دیکھے، پھر بولا۔ ''اگر کوئی رزلٹ نہ نکل سکا تو پھر...... خوامخواہ کی نکاتی ہو گی۔''

''نہیں ہو گی نکاتی...... میں تمہیں یقین دلاتا ہوں۔ تم بس بات کرو حلمی سے میرا ذکر بے شک نہ کرو۔ اپنی طرف سے بات کرو۔''

سردار سجاول مجھے وہیں چھوڑ کر لفٹ کی طرف گیا اور حلمی کے پاس پہنچ گیا۔

قریباً دس منٹ بعد میں اور سجاول اس بپھرے ہوئے سانڈ صغیر کے ساتھ ایک بند کمرے میں موجود تھے۔ خوش قسمتی سے یہ کمرا ساؤنڈ پروف بھی تھا۔

وہ اب بھی منہ سے جھاگ اُڑا رہا تھا۔ وہ سجاول کو سر کہہ کر مخاطب کر رہا تھا اور بار بار کہہ رہا تھا۔ ''آپ نے دیکھ لیا ناں، ان نمک حراموں نے ہمارے ساتھ کیا کیا۔ برباد کر دیا ہمیں۔ میرا باپ جیسا بھائی مر گیا۔ ہمارے چھوٹے صاحب کو جان کے لالے پڑ گئے۔ ایک بہادر پولیس افسر کی جان گئی...... اور...... ابھی پتا نہیں کیا کچھ ہونا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے پتا ہے صغیر صاحب کہ کیا ہونا ہے۔ ابھی آپ کے گال شریف پر ایک زناٹے کا تھپڑ پڑنا ہے اور آپ کے چودہ طبق روشن ہو جانے ہیں۔''

وہ بے حد حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا اور پھر واقعی وہی ہوا جو میں نے کہا تھا۔ میرے تھپڑ نے اس کا گال اندر سے پھاڑ کر رکھ دیا اور وہ لڑکھڑا کر دیوار سے ٹکرایا۔ ایک لمحہ

سکتہ زدہ رہنے کے بعد اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہوا اور وہ تیر کی طرح میری طرف آیا۔ اس نے میری گردن پکڑنے کی کوشش کی تھی۔ ایسا کرنا اس کے لیے آسان نہیں تھا۔ میں تیزی سے ایک قدم پیچھے ہٹا اور اس کے پہلو میں لات رسید کی۔ وہ فٹ بال کی طرح دیوار سے ٹکرایا اور اوندھے منہ فرش پر گرا۔ میں نے اسے وہیں دبوچ لیا۔

وہ غلیظ گالیاں بکنے لگا۔ میں نے اس کا بازو مروڑا اور کہنی پر سے توڑ ڈالا۔ بازو توڑنے کی وجہ اس کی ''گالیاں'' نہیں تھیں، دراصل مجھے پتا تھا کہ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ اگر میں روایتی طریقوں سے اس سے کچھ اگلوانے کی کوشش کرتا تو شاید گھنٹے لگ جاتے۔

وہ ایسے بھیانک انداز میں چلایا کہ محسوس ہوا اپنی جان، جانِ آفریں کے سپرد کر دے گا۔ اس کا پورا جسم پھڑک رہا تھا۔ یقیناً اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا تھا کہ ایکا ایکی اس کے ساتھ کیا ہو گیا ہے۔ وہ تو خود کو نیم دیوانہ ظاہر کر رہا تھا کہ اس کا بھائی مر گیا تھا اور یہاں اس سے بڑھ کر دیوانے اسے ٹکر گئے تھے۔ اس کے ٹوٹے ہوئے بازو کی ہڈی گوشت چیر کر اپنی جھلک دکھانے لگی تھی۔

میں نے کہا۔ ''صغیر صاحب! سب کچھ سچ سچ بتا دو گے تو کچھ بھی نہیں ہو گا۔ یہاں پر جدید علاج موجود ہے۔ ابھی دو گھنٹے میں تمہاری بہترین سرجری ہو جائے گی۔ پلیٹیں وغیرہ لگ جائیں گی۔ دو ماہ بعد تمہیں پتا بھی نہیں چلے گا کہ کبھی تمہارا بازو ٹوٹا ہوا تھا لیکن اگر تم نے یہ ڈرامے بازی جاری رکھی تو میں ابھی دو چار منٹ کے اندر تمہارا دوسرا بازو توڑوں گا اور اس کے بعد تمہارے دوسرے ''حصوں'' کی باری آئے گی۔''

صغیر کے سر پر جیسے قیامت ہی ٹوٹ پڑی تھی۔ وہ میرے نیچے مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔ ''کون ہو تم؟ میرا بھائی مر گیا ہے...... مجھے بھی مار ڈالو، مجھے بھی مار ڈالو'' وہ پھر جنونی انداز میں چلایا۔

''بالکل ایسا ہی کریں گے۔ ممکن ہے تم دونوں برادران کی نماز جنازہ ایک ساتھ ادا ہو۔'' میں نے کہا اور اس کے دوسرے بازو پر اپنی گرفت مضبوط کی۔

وہ دہائی دینے لگا اور نفی میں سر ہلانے لگا۔

''آصف تمہارا ساتھی تھا نا...... ابھی اس کو چاقو کیوں مارے تم نے؟''

اس کے ساتھ ہی میں نے اس کا بازو مروڑا۔ تکلیف کی شدت سے اس نے قے کر دی۔ اس کی مزاحمت دم توڑ رہی تھی۔

ٹھیک آدھے گھنٹے بعد ہم صغیر کو جیپ پر لے کر برق رفتاری سے ایک قریبی دیہہ کی

طرف جا رہے تھے۔ صغیر کا بازو پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ طاقتور پین کلر انجکشن نے اسے قدرے سہارا دے رکھا تھا۔ پھر بھی جیپ پر لگنے والے ہچکولوں سے وہ کراہ اٹھتا تھا۔ میرے اور سجاول کے علاوہ انچارج قادر خان اور اس کے دو ماتحت بھی جیپ پر سوار تھے۔ یہ صورتِ حال اتنی اہم تھی کہ حلمی خود ہمارے ساتھ آنا چاہتا تھا مگر پارا ہاؤس کے نہایت سنگین حالات کے سبب اسے وہاں رکنا پڑا تھا۔ اس نے قادر خان کو ہمارے ساتھ روانہ کیا تھا۔

اب رات کے تین بج چکے تھے۔ اس دوران میں پارا ہاؤس کے اندر بپھرے ہوئے ناقب نے ایک اور خادمہ لڑکی کو بیدردی سے گولی مار کر باہر پھینک دیا تھا۔ وہ ابھی زندہ تھی مگر حالت شدید خطرے میں تھی۔ اچانک صغیر کے سیل فون کا میوزک بجنے لگا۔ اس کا ایک بازو تو میں نے توڑ ڈالا تھا مگر دوسرے کو بھی ایسا شدید مروڑا دیا تھا کہ چھوٹا موٹا فریکچر ہو چکا تھا۔ اس کے لیے کہنی کو حرکت دینا دشوار ہو رہا تھا۔ میں نے اس کی مدد کرتے ہوئے اس کی جیب میں سے اس کا فون نکالا اور اسپیکر آن کر کے اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ ساری بات میں نے اس کو پہلے ہی سمجھا دی تھی۔ دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”ہیلو صغیر بھائی، کہاں ہو تم؟“ (یہ صغیر کے غدار ساتھیوں میں سے کوئی تھا)

”میں بس پہنچ گیا ہوں۔ تم لوگ کب تک آ رہے ہو؟“

”لگتا ہے ابھی تو تھوڑا ٹائم لگے گا۔ وڈا صاحب بڑا ڈھیٹ بنا ہوا ہے۔ ظاہر ہے اس کے لاڈلے پتر کا معاملہ ہے۔ کنجر کو پتا ہے کہ ایک بار ہم لوگ اسے پارا ہاؤس سے لے کر نکل گئے تو پھر اس کے ہاتھ میں چھنکنا بھی نہیں آئے گا۔“

پس منظر میں لڑکیوں کے رونے چلانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اور گاہے بگاہے سرغنہ ناقب کی کڑک دار آواز بھی گونجتی تھی۔ صغیر کو یہ فون پارا ہاؤس سے ہی آیا تھا۔ اس کے کسی ساتھی بشیرے نے کیا تھا۔ یہ بشیرا ان لوگوں میں شامل تھا جنہوں نے ناقب وغیرہ کے ساتھ مل کر ابراہم اور شکیل داراب کو یرغمال بنایا ہوا تھا۔

آخر میں بشیر عرف بشیرا بولا۔ ”بس تم تیار رہو صغیر بھائی، ہم جب یہاں سے نکلنے لگیں گے میں تمہیں فون کروں گا۔“

”ٹھیک ہے، میرا فون آن ہے۔“

بشیرے نے ذرا ٹھٹک کر کہا۔ ”کیا بات ہے؟ تم ٹھیک تو ہو، کوئی چوٹ شوٹ لگی ہے تمہیں؟“

”نن...... نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں۔ بس ذرا طبیعت بوجھل ہے۔ کچھ بھی ہے آخر

تھا تو بھائی......"

صغیرا پنے مرنے والے بھائی کا ذکر کر کے اپنی چوٹوں کی "ہائے ہائے" چھپا رہا تھا۔ فون پر بات ختم ہوئی تو صغیر شدت سے کراہنے لگا۔ جیپ اب پکی سڑک سے اتر کر اینٹوں کے سولنگ والی سڑک پر آ گئی تھی۔ تارکول کی سڑک اور اینٹوں والے راستے میں بہت فرق ہوتا ہے۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ اب ساڑھے تین بج چکے تھے۔ رات سرد تھی۔ راستے کی دونوں جانب کیکر اور ٹاہلی کے درخت تھے۔ کھیتوں میں کہیں کہیں کوئی روشنی کا جگنو چمک رہا تھا۔ زیادہ تر ریتیلے ٹیلے تھے اور خودرو جھاڑیاں تھیں۔ صغیر کا سارا کچا چٹھا اب کھل چکا تھا۔ اسی خبیث نے پاراہاؤس کے پندرہ بیس گارڈز کو اس خطرناک نمک حرامی پر تیار کیا تھا۔ یہ سب کے سب اس کے گاؤں برادری کے لوگ ہی تھے۔ ان سب کو بھاری رقمیں ایڈوانس میں دی گئی تھیں اور "کام" ہو جانے کے بعد بیش بہا انعامات کا وعدہ کیا گیا تھا۔ صغیر کا مرحوم بھائی جو خود بھی پاراہاؤس کا ڈرائیور تھا اس سازش میں شریک نہیں تھا۔ وہ اس حملے کے شروع میں ہی سینے پر دو گولیاں لگنے سے جاں بحق ہو چکا تھا۔

پوچھ گچھ کے دوران میں صغیر، قبول کر چکا تھا کہ اس نے پاراہاؤس میں کارروائی کے لیے ناقب صاحب اور اس کے ساتھیوں کو ہر طرح کی سہولت فراہم کی ہے۔ پچھلے چھ دن سے ناقب اور اس کے ساتھی صغیر کے گھر میں ہی موجود تھے اور وہیں پر اس کارروائی کی ساری پلاننگ ہوتی رہی تھی۔ وہیں پر برادری کے گارڈز کو صغیر نے اپنے ساتھ ملایا تھا، وہیں پر ناقب اور اس کے دو ساتھیوں کے لیے سکیورٹی ایجنسی کی وردیوں کا انتظام ہوا اور دیگر تیاری ہوئی تھی۔ پاراہاؤس کے اس ساؤنڈ پروف کمرے میں ہٹے کٹے صغیر نے میرے اور سجاول کے سامنے ایک ایک بات اگل دی تھی۔ اس میں یہ اعتراف بھی شامل تھا کہ اس کی بیوی بھی اس سازش میں شامل تھی اور یہ سب کچھ اس کے لالچ کی وجہ سے ہوا ہے۔

پندرہ بیس منٹ بعد ہم اس روجھانامی دیہہ کے قریب پہنچ گئے...... صغیر کا گھر دیہہ سے ذرا ہٹ کر تھا۔ اس کی تھوڑی سی زمین بھی تھی اور وہیں پر اس نے گھر بنایا ہوا تھا۔ اس کے مرحوم ہو جانے والے بھائی کا گھر بھی یہیں پر تھا۔ ہم نے جیپ کی لائٹس بجھا دیں اور اسے کچھ فاصلے پر ہی روک دیا۔ پہلے میں خود جا کر ماحول کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ میں نے حلمی کی دی ہوئی رائفل اپنی گرم چادر میں چھپالی اور احتیاط سے آگے بڑھا۔ گو صغیر صرف ایک ڈرائیور تھا لیکن اس نے اچھا خاصا گھر بنا رکھا تھا۔ اس کے مقابلے میں مرحوم بھائی کا گھر چھوٹا اور خستہ حال تھا۔ دونوں

گھروں کو دیکھ کر ہی دونوں بھائیوں کے کردار اور مزاج پر روشنی پڑ جاتی تھی۔
چند قدم آگے جا کر مجھے رکنا پڑا۔ یہاں رکھوالی کے لیے کتا موجود تھا جو شور مچانے لگا تھا۔ یہ صورتِ حال پریشانی پیدا کر سکتی تھی۔ میں واپس جیپ میں آیا اور صغیر کو بھی اپنے ساتھ لے لیا۔ اس نے گرم چادر کی بکل مار لی تھی۔ یوں اس کا زخمی بازو بھی چھپ گیا۔ اس مرتبہ ہم بہ آسانی گھر کے دروازے تک پہنچ گئے۔ مجھے حیرانی ہوئی رات کے اس پہر بھی اندر سے میوزک کی آواز ابھر رہی تھی۔ کیسٹ پلیئر آن تھا...... عیسیٰ خیلوی نغمہ سرا تھا۔ دل لگایا تھا دل لگی کے لیے۔ صغیر کی طرف سے میں نے دروازے پر مدھم دستک دی۔ میوزک تھم گیا۔ پھر کسی نے دروازے پر آ کر سریلی آواز میں پوچھا۔ ''کون؟''
''میں ہوں۔'' صغیر مری مری آواز میں بولا۔
مجھے لگا کہ دروازہ کھولنے سے پہلے گھر والی نے کسی درز وغیرہ سے ہم دونوں کو دیکھا ہے۔ تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد دروازہ کھول دیا گیا۔ سامنے ایک جواں سال عورت کھڑی تھی۔ اس نے سر پر اوڑھنی لے رکھی تھی اور اوڑھنی کو مضبوطی سے ٹھوڑی کے نیچے تھاما ہوا تھا۔ یہ چادر نما اوڑھنی اس کے ٹخنوں تک پہنچ رہی تھی۔ عورت کی عمر تیس سال کے قریب رہی ہوگی۔ رنگ گورا چٹا اور آنکھوں میں چالاکی تھی۔ یہی صغیر کی بیوی تھی۔
''خیر تو ہے صغیرے؟'' اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔
''ہاں ہاں...... خیر ہے۔'' صغیر نے میرے ساتھ اندر کی طرف قدم بڑھائے۔
عورت ہمارے پیچھے پیچھے آئی۔ وہ سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھ رہی تھی۔ صغیر نے کہا۔ ''یہ...... اپنا دوست ہے۔ پارا ہاؤس سے آیا ہے۔''
''وہاں سب ٹھیک ہے نا؟'' عورت نے آنکھیں پٹ پٹا کر پوچھا۔
صغیر نے اثبات میں جواب دیا۔
مجھے معلوم تھا کہ یہاں پر سرغنہ ناقب کا کم از کم ایک ساتھی موجود تھا۔ وہ اس گھر کے عقبی پورشن میں تھا۔ اس سے فوری ملاقات ضروری تھی۔ لیکن اس سے پہلے اس عورت کا بندوبست ضروری تھا۔ میں نے صغیر کو اشارہ کیا۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور ایک کونے میں جا کر عورت کے کان میں کھسر پھسر کرنے لگا۔ اس نے وہ سب کچھ بتایا جو پچھلے ایک ڈیڑھ گھنٹے میں اس کے ساتھ پیش آ چکا تھا...... اور وہ سب کچھ بھی جو ''نافرمانی'' کی صورت میں آئندہ پیش آ سکتا تھا۔ عورت کا رنگ بالکل ہلدی ہو گیا۔ وہ دہشت زدہ نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

میں نے آگے بڑھ کر اس کی شال نما اوڑھنی کھینچی اور میرا یہ اندازہ درست نکلا کہ وہ کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ ایک نہایت ہی مختصر چولی والی سرخ ساڑی میں تھی۔
اس نے بہت سا طلائی زیور پہن رکھا تھا جس میں جھمکے، جڑاؤ ہار، گلوبند، ملائیشین طرز کے کنگن، انگوٹھیاں اور مزید بہت کچھ تھا۔
میں نے کہا۔ ”لگتا ہے کہ یہ ساری حلال کی کمائی تمہارے خاوند کو پچھلے چار پانچ دن میں ہی نصیب ہوئی ہے؟“
”جی......وہ......میں تو......“
”ہاں تم تو بس آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر ذرا دل کو خوش کر رہی تھیں۔ پھر یہ ساری چیزیں تم نے اتار کر کسی گندے نالے میں پھینک دینی تھیں۔ ایسا زیور تو اگلے جہان میں آگ میں تپا کر عورت کی چمڑی پر لگایا جائے گا نا......“
”ہاں جی......نہیں جی......“ وہ اپنے خشک گلابی ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئی۔ اس کی ٹانگیں لرز رہی تھیں۔
اس کا رنگ برنگا سیل فون سامنے بستر پر پڑا تھا۔ وہ میں نے اپنے قبضے میں لے لیا اور اسے اس کے لمبے بالوں سے پکڑ کر کمرے کے اسٹور روم میں بند کر دیا۔ وہ اتنا ڈر گئی تھی کہ گم صم ہو کر بیٹھ گئی۔ میں نے زخمی صغیر کو گردن سے دبوچتے ہوئے کہا۔ ”ہاں بھئی، کہاں ہے تمہارا وہ مہمان؟“ میں نے یہ جملہ سرگوشی کے لہجے میں بولا تھا۔
صغیر نے مکان کے پچھلے صحن کی طرف نشاندہی کی۔ میں نے چادر کے نیچے ہی نیچے رائفل کا رخ صغیر کی طرف کر لیا اور اس سے کہا کہ وہ آگے آگے چلے۔
یکا یک مجھے محسوس ہوا کہ ہمیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ ہم جس کی طرف جا رہے تھے، وہ شاید ہمارے آس پاس ہی کہیں موجود تھا اور ہمیں دیکھ رہا تھا۔ یہ بڑا پُر خطر احساس تھا۔

O......❖......O

میں نے انگلی ٹریگر پر رکھی اور اس کھڑکی کی طرف دیکھنے لگا جس کے عقب میں کسی کی موجودگی کا شبہ تھا۔ میری حسیات پوری طرح بیدار تھیں اور میں خطرے کی تصدیق ہوتے ہی فائر کر سکتا تھا۔ اچانک کھڑکی کے ساتھ والا دروازہ کھلا اور سجاول نظر آیا۔

''یہ میں ہوں...... کہیں گولی نہ چلا دینا۔'' وہ بولا۔

میں طویل سانس لے کر رہ گیا۔ ''تم کیوں آ گئے؟'' میں نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

''مجھے لگا کہ مجھے آ جانا چاہیے۔ یہاں سب ٹھیک تو ہے نا؟''

''ابھی تک تو ٹھیک ہے۔''

''اس کی بیوی کہاں ہے؟''

''میں نے بند کر دی ہے ساتھ والے کمرے میں۔''

''کوئی اور تو نہیں ہے گھر میں۔ میرا مطلب ہے ناقب کے ساتھی کے علاوہ؟''

''نہیں، بس وہی ہے۔ پچھلے صحن میں کہیں ہے۔ اس کے پاس سیون ایم ایم رائفل ہے اور مجھے لگتا ہے کہ وہ خبیث پوری طرح چوکس بھی ہے۔''

''اگر تم کہو تو میں اسے دیکھتا ہوں۔'' سردار سجاول بولا۔

''تم نے میرے دل کی بات کہی ہے۔''

''ٹھیک ہے تم اس کنجر کو نشانے پر رکھو۔'' سجاول نے کہا۔ اس کا اشارہ ٹوٹے بازو والے صغیر کی طرف ہی تھا۔

سجاول نے اپنا پستول دوبارہ کمر میں اڑس لیا اور اپنی قمیص کے نیچے سے لمبے پھل والا چھرا برآمد کر لیا۔ یہ چھرا ایک طرح سے اس ڈکیت گینگ کا ٹریڈ مارک تھا۔ سجاول بڑی احتیاط سے اس گھر کے پچھلے صحن کی طرف بڑھا۔

میں خود بھی یہی چاہتا تھا کہ سجاول اس کارروائی میں فعال نظر آئے۔ بڑے صاحب اور

حلمی وغیرہ کی نظر میں اس کی کافی عزت بن گئی تھی۔ اس عزت کو برقرار رہنا چاہیے تھا بلکہ اس میں اضافہ ہونا چاہیے تھا۔ سجاول پر ان لوگوں کا یہ اعتماد آگے چل کر ہم سب کے لیے فائدہ مند ثابت ہوسکتا تھا۔

درحقیقت وہ لمحے بڑے نازک تھے جب حملہ آوروں نے پارا ہاؤس کی بالائی منزل پر جناب عزت مآب بڑے صاحب کی بیگم کو یرغمال بنانے کی کوشش کی تھی۔ سجاول اس کوشش کے سامنے دیوار بن گیا تھا...... اور اسے فوری طور پر پارا ہاؤس والوں کی نگاہ میں ایک اہم مقام مل گیا تھا۔ اب اس مقام کا برقرار رہنا بہت ضروری تھا۔

میری رائفل بدستور گرم چادر کے نیچے تھی اور اس کا رخ صغیر کی طرف تھا۔ میں صغیر کو لے کر ایک برآمدے میں آ گیا اور ایک دیوار کی اوٹ میں کھڑا ہو کر پچھلے صحن کا منظر دیکھنے لگا۔ یہ کافی کشادہ جگہ تھی۔ ایک طرف ٹین کی چھت کا بڑا سا سائبان بنا ہوا تھا۔ اس کے نیچے ایک جیپ کھڑی تھی۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ یہ پولیس جیپ تھی۔ اس کی چھت پر ایمرجنسی لائٹ بھی نظر آ رہی تھی۔ جیپ میں پولیس والوں کی تین چار وردیاں ہینگروں سے جھول رہی تھیں۔ بلب کی زرد روشنی میں دکھائی دیا کہ جیپ کی پچھلی نمبر پلیٹ اتری ہوئی تھی۔ پاس ہی ایک اور نمبر پلیٹ دکھائی دے رہی تھی اور اس کے نٹ بولٹ پڑے تھے۔ بالکل یہی لگا کہ چند سیکنڈ پہلے یہاں کوئی شخص موجود تھا اور نمبر پلیٹ تبدیل کر رہا تھا۔ سجاول کی آمد کو محسوس کر کے وہ فوراً کہیں دائیں بائیں ہو گیا تھا۔ یہ پُر خطر صورت حال تھی۔

سجاول نے بھی اس خطرے کو محسوس کر لیا۔ اس نے لمبے پھل والا چھرا اس کے چرمی غلاف میں واپس رکھا اور پستول کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس سارے عمل کے دوران میں چند ساعتیں ایسی تھیں جب سجاول نے اپنا ہاتھ چھرے کے دستے سے ہٹا لیا تھا اور پستول کا دستہ ابھی اس کے ہاتھ میں نہیں آیا تھا۔ یہی وقت تھا جب ایک پرچھائیں سی بلندی سے سجاول پر جھپٹی۔ اس اچانک اور شدید حملے کے باعث سجاول اوندھے منہ اینٹوں کے فرش پر گرا۔ میری آنکھوں کے سامنے بجلی کا کوندا ہوا۔ کسی تیز دھار آلے سے سجاول پر وار کیا گیا تھا۔ سجاول نے یہ وار اپنے داہنے ہاتھ سے روکا اور حملہ آور کو اپنی پشت سے ہٹانے کی کوشش کرنے لگا۔ یقیناً یہ وہی شخص تھا جس کے لیے ہم عقبی صحن میں آئے تھے اور جو کچھ دیر پہلے پولیس جیپ کی نیم پلیٹ تبدیل کر رہا تھا۔ اس نے بے حد ہوشیاری سے کام لیا تھا۔ ہماری آمد سے پہلے ہی برآمدے کے شیڈ پر چلا گیا تھا اور اب وہاں سے اس نے سجاول پر چھلانگ لگائی تھی۔

میں نے غور سے دیکھا، اس کے ہاتھ میں ایک چمکیلا پیچ کس تھا۔ اس پیچ کس کو اس

نے سجاول کی پسلیوں میں گھونپنے کی کوشش کی تھی۔ اب اس کا یہ ہاتھ سجاول کی مضبوط گرفت میں آچکا تھا مگر "پیچ کس" ہنوز اس شخص کی گرفت میں تھا۔ اس نے اپنے دوسرے بازو سے سجاول کی گردن جکڑ رکھی تھی اور کسی کیکڑے کی طرح اس کی پشت سے چپک کر رہ گیا تھا۔

یکایک سجاول نے پینترا بدلا۔ حملہ آور کو اپنی پشت سے اتارنے کی کوشش ترک کر کے وہ برق رفتاری سے الٹے قدموں پیچھے ہٹا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ حملہ آور کا تصادم پختہ دیوار سے ہوا۔ یہ بڑا زوردار تصادم تھا اور بالکل اچانک ہوا تھا۔ میں نے پیچ کس حملہ آور کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گرتے دیکھا۔ سجاول نے بلا تامل دوسری مرتبہ اس شخص کو دیوار سے ٹکرایا۔ وہ شخص خوش قسمت ہوتا تو اس دوسری ٹکر سے پہلے ہی سجاول کی گردن چھوڑ دیتا...... لیکن ایسا نہیں ہوا۔ یہ ٹکر پہلی سے بھی زیادہ مؤثر ثابت ہوئی۔ مضروب کے ہونٹوں سے بے ساختہ بلند کراہ نکلی اور وہ اینٹوں کے فرش پر گرا۔ اس کے ناک منہ سے خون جاری ہو گیا تھا۔ لگتا تھا کہ اس کے اندرونی اعضا کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے۔ چند سیکنڈ بعد ایک دم اس کے منہ سے خون کا فوارہ چھوٹا اور وہ دوبارا اینٹھ کر ساکت ہو گیا۔ اس کی آنکھوں پر ایک نگاہ ڈال کر ہی پتا چل جاتا تھا کہ وہ آناً فاناً دنیا کے بکھیڑوں سے آزاد ہو چکا ہے۔

بلب کی روشنی میں اب اس کا حلیہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ یقیناً برونائی کا ہی باشندہ تھا۔ آنکھوں کے پپوٹے بھاری تھے، ناک تھوڑی پست اور رخسار ابھرے ہوئے تھے۔ بہرحال اس کا لباس مقامی تھا۔ اس نے پینٹ اور سویٹر پہن رکھا تھا۔ اس کی سیون ایم ایم رائفل کافی فاصلے پر برآمدے کی دیوار سے ٹنگی ہوئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ رائفل استعمال نہیں کر سکتا تھا اور اس نے فوری طور پر پیچ کس کو ہتھیار بنانے کی کوشش کی تھی۔

"کیا یہ مر گیا؟" صغیر نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

"مر گیا ہے اور اسی طرح تم بھی مرو گے۔ اگر کوئی ہیرا پھیری کرو گے اور سوالوں کے ٹھیک جواب نہیں دو گے تو کل کا سورج تمہارے لیے نہیں ہوگا۔"

وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔

"کیا نام ہے اس کا؟" سجاول نے پوچھا۔

"باقر......"

"یہ کیا کر رہا تھا یہاں...... اور یہ پولیس کی گاڑی...... اس کے ساتھ کیا ڈراما ہو رہا ہے یہاں؟"

"یہ...... یہ پولیس کی گاڑی نہیں ہے۔ اسے ان...... لوگوں نے پولیس کی گاڑی جیسا

بنایا ہے۔" صغیر نے اٹک اٹک کر کہا۔

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ روشنی تھوڑی تھی پھر بھی مجھے پتا چل رہا تھا کہ گاڑی کو حال ہی میں پمپ اسپرے کے ذریعے پینٹ کیا گیا ہے اور اس میں دیگر ضروری تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ اس پر آزاد کشمیر پولیس کی نمبر پلیٹ بھی لگائی جا رہی تھی۔

میں نے صغیر سے پوچھا۔ "یہ جو وردیاں اندر لٹک رہی ہیں، یہ بھی جعلی ہیں؟"

"جج...... جی ہاں۔ ان لوگوں کا پروگرام یہ تھا کہ پولیس کے بھیس میں یہاں سے نکل جائیں۔ میرا مطلب ہے، چھوٹے صاحب کو لے کر......"

چھوٹے صاحب سے اس کی مراد عزت مآب کا فرزندِ ارجمند تھا۔ لگتا تھا کہ ان لوگوں نے لمبی چوڑی پلاننگ کر رکھی تھی۔

"یہاں سے ان لوگوں کا پروگرام کہاں جانے کا تھا؟" میں نے اسے گدی سے دبوچ کر دریافت کیا۔

"مجھے اس بارے میں نہیں معلوم جی......"

"تمہیں معلوم ہے...... اور تم بتاؤ گے بھی۔" میں نے اس کی گردن کو جھنجوڑا۔

جھنجوڑنے سے اس کا ٹوٹا ہوا بازو ہل گیا اور وہ بری طرح کراہنے لگا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ پارا ہاؤس میں میرے مروڑنے سے اس کی کہنی چکنا چُور ہو چکی ہے۔ پتا نہیں وہ کیسے درد کو برداشت کیے ہوئے تھا۔

معاً ایک بار پھر اس کے سیل فون کا میوزک بج اٹھا۔ میں نے رائفل کی نال اس کے سر سے لگاتے ہوئے کہا۔ "کوئی چالاکی دکھائی تو اس مشٹنڈے باقر کے ساتھ ہی فرش پر لمبے لیٹے نظر آؤ گے۔"

"نن...... نہیں جی۔"

"اگر فون پارا ہاؤس سے ہے تو خود کو بالکل نارمل ظاہر کرو...... اور یہاں او کے کی رپورٹ دو۔ اگر وہ لوگ باقر کا پوچھیں تو بتاؤ کہ وہ واش روم میں ہے۔"

صغیر نے تھوک نگل کر اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے اسے اشارہ کیا کہ وہ کال ریسیو کرے۔ اسپیکر آن کرنے کا حکم بھی میں نے اسے اشارتاً ہی دے دیا تھا۔ چند سیکنڈ کے بعد فون کے اسپیکر پر وہی آواز ابھری جو ہم نے کچھ دیر پہلے راستے میں بھی سنی تھی۔ یہ صغیر کا ساتھی بشیرا تھا اور پارا ہاؤس سے ہی بول رہا تھا۔ اس مرتبہ اس کی آواز میں اعتماد اور جوش تھا۔ بولا۔

"ہاں، صغیر بھائی! گھر پہنچ گئے ہو؟"

''ہاں، پہنچ گیا۔'' صغیر نے اپنی آواز کو حتی الامکان نارمل رکھتے ہوئے کہا۔

''یہ باقر کہاں مر گیا ہے۔ ناقب صاحب اس سے بات کرنا چاہ رہے تھے۔ اُس کا فون ہی نہیں مل رہا۔''

''شاید اس کا پیٹ خراب ہے۔ واش روم میں ہے۔''

''چلو ٹھیک ہے...... ادھر ایک خوش خبری ہے۔ وڈے صاحب کی گردن میں جو سریا تھا وہ ٹوٹ گیا ہے۔ اس نے ہمیں جانے کے لیے رستہ دے دیا ہے۔ ہم اب بڑے صاحب کے لڑکے کے ساتھ گاڑیوں میں بیٹھ رہے ہیں، بلکہ سمجھو کہ نکل رہے ہیں۔ چالیس پینتالیس منٹ میں ہم وہاں ہوں گے۔''

میں ساری گفتگو غور سے سن رہا تھا۔ صغیر کا یہ بشیرا نامی ساتھی صرف بڑے صاحب کے لڑکے کی بات کر رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ انہوں نے وی آئی پی مہمان شکیل داراب کو وعدے کے مطابق پارا ہاؤس کے پورچ میں پہنچ کر آزاد کر دیا ہے۔

بشیرا اب صغیر سے اس کے بھائی کی موت پر افسوس کا اظہار کر رہا تھا۔ ''حوصلہ رکھ صغیر! ناقب صاحب کو بھی تیرے بھائی کی موت کا دکھ ہوا ہے۔ ناقب صاحب اس کے گھر والوں کی مدد کریں گے۔ بے شک وہ ہمارے ساتھ نہیں تھا لیکن تمہارا بھائی تو تھا۔ اس کی جان تو واپس نہیں آ سکتی مگر باقی وہ کسی طرح کی کسر نہیں چھوڑیں گے۔ تو بس اپنے ہوش حواس کو کنٹرول میں رکھ۔''

''کوشش تو کر رہا ہوں۔'' صغیر نے مری مری آواز میں کہا۔

بشیرے کی آواز آئی۔ ''جس کمرے میں لڑکے کو رکھنا ہے اس کی ایک بار پھر چنگی طرح تلاشی لے لے۔ اس میں کوئی ایسی شے نہیں ہونی چاہیے جو منڈے کے کام آ سکے۔ تالے وغیرہ بھی چیک کر لے۔''

''میں نے سب دیکھ لیا ہے۔'' صغیر نے اپنی کراہ دباتے ہوئے کہا۔

گاڑیاں اسٹارٹ ہونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ دروازے بند ہو رہے تھے۔ پارا ہاؤس میں رکھوالی کے کتے بے پناہ شور مچا رہے تھے۔ مگر اب یہ شور اور دیگر سارے حفاظتی انتظامات بیکار رہتے تھے۔ سرغنہ ناقب دیگر حملہ آوروں کے ساتھ پارا ہاؤس والوں کو زیر کرنے میں کامیاب رہا تھا اور اب بڑے صاحب کے چھوٹے بیٹے ابراہم کو گن پوائنٹ پر رکھ کر پارا ہاؤس سے نکل رہا تھا۔ وہ خود کو کامیاب سمجھ رہا تھا لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ کامیاب و کامران ہو کر جہاں پہنچ رہا ہے، وہاں پہلے ہی اس کے لیے گھات لگائی جا چکی ہے اور یہ

گھات اس وجہ سے لگی ہے کہ اس کا ایک کارندہ ہمارے ہاتھ لگ کر اور ساؤنڈ پروف کمرے میں زبردست مار کھا کر سب کچھ اگل چکا ہے۔

یہ بڑے سنسنی خیز لمحات تھے۔ ہمارے پاس وقت بہت کم تھا۔ وہ لوگ پارا ہاؤس سے روانہ ہو چکے تھے اور یہاں تک کا فاصلہ پینتالیس پچاس منٹ سے زیادہ کا نہیں تھا۔ ہم نے باقر کی لاش کو گھسیٹ کر پچھلے صحن کے گیٹ سے باہر نکالا اور کچھ فاصلے پر جھاڑیوں میں چھپا کر اس پر ایک ترپال ڈال دی۔ خون کے نشانات بھی اچھی طرح صاف کر دیئے۔

صغیر کی حالت بری تھی۔ وہ مزاحمت کے قابل تو نہیں تھا، پھر بھی احتیاط ضروری تھی۔ میں نے ایک کپڑے سے اس کے ہاتھ پشت پر باندھے اور اسے اینٹوں کے فرش پر دیوار کے ساتھ بٹھا دیا۔ جب میں ہاتھ پشت پر باندھ رہا تھا وہ کربناک انداز میں چلانے لگا۔ اس کی تکلیف کی وجہ اس کا چکنا چور بازو ہی تھا۔

میں نے جیپ کی نمبر پلیٹ لگائی۔ ظاہر ہے کہ جیپ کی طرح یہ پلیٹ بھی جعلی ہی تھی۔ ہم نے گاڑی کو اندر سے دیکھا۔ گاڑی کی چابی ہمیں متوفی باقر کی جامہ تلاشی کے دوران مل گئی تھی۔ میں نے گاڑی کو اسٹارٹ کر کے دیکھا۔ وہ فوراً اسٹارٹ ہوگئی۔ فیول کی ٹینکی تقریباً بھری ہوئی تھی۔ میں نے اگنیشن کے نیچے ہاتھ ڈال کر بیٹری کے چند تار کھینچ دیئے۔ اب یہ فوری طور پر اسٹارٹ نہیں ہوسکتی تھی۔

اسی دوران میں اندرونی کمرے سے صغیر کی بیوی کی آہ و بکا سنائی دینے لگی۔ وہ دہائی دے رہی تھی۔ ”مجھے نکالو...... خدا کے لیے نکالو...... میں نے کچھ نہیں کیا۔“

آواز خاصی مدھم تھی۔ ہمیں اس کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔

سجاول نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ پہلے وہ کمرا دیکھ لیں جہاں منڈے کو رکھا جانا ہے۔“

جیپ کی طرف سے مطمئن ہو کر ہم نے صغیر کو ساتھ لیا اور اس کی نشاندہی پر اس کمرے میں پہنچے جہاں شاید چند گھنٹوں یا ایک دو دن کے لیے اغوا شدہ ابراہیم کو رکھا جانا تھا۔ یہ عام سائز کا کمرا تھا۔ اس کے دو دروازے تھے۔ ایک کھڑکی تھی جس میں موٹی گرل اور جالی لگی ہوئی تھی۔ کمرے میں ایک چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ ایک جستی پیٹی پڑی تھی اور ایک الماری رکھی تھی۔ چٹائی پر ایک کونے میں ایک فرشی بستر بچھا تھا۔ بستر سے تھوڑے فاصلے پر ہی اٹیچ باتھ روم کا دروازہ تھا۔ میں نے باتھ روم کا دروازہ کھول کر دیکھا۔ اندر ضرورت کا سامان، بالٹی، ڈونگا، صابن تولیا، شیمپو وغیرہ موجود تھا۔

انتظامات دیکھ کر سجاول نے اپنی تیکھی مونچھوں کو انگلی سے سہلایا اور بولا۔ ''لگتا ہے کہ منڈے کو یہاں کچھ دن رکھنے کا پروگرام ہے۔''

''ہاں، ہوسکتا ہے کہ پہلے اسے یہاں رکھا جائے۔ جب اس کو ڈھونڈنے کا کام ذرا سست پڑ جائے تو پھر آگے لے جایا جائے۔''

''مگر جیپ کی تیاری شیاری دیکھ کر تو یہ بھی لگتا ہے کہ فوراً یہاں سے روانگی کا پلان ہے۔'' سجاول نے کہا۔

''کیا پتا انہوں نے دونوں طرح کی تیاری کی ہو۔ فوراً نکل بھی سکتے ہوں اور رک بھی سکتے ہوں۔''

کمرے کے پچھلے دروازے کو باہر سے تالا لگایا گیا تھا مگر اگلا دروازہ کھلا تھا۔ میں نے صغیر کے کندھے کو رائفل کی نال سے ٹھوکا دیتے ہوئے کہا۔ ''اس تالے کی چابی کدھر ہے؟''

''مم...... میری گھر والی کے پاس۔''

سجاول نے آگے بڑھ کر اس کمرے کا دروازہ کھولا جہاں صغیر کی بیوی (جو کسی ہندی فلم کی ہیروئن بنی ہوئی تھی) موجود تھی اور گاہے بگاہے واویلا کرنے لگتی تھی۔ جونہی دروازہ کھلا وہ کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح آئی اور سجاول کی بغل سے نکل کر بھاگنے کی کوشش کی۔ سجاول اسے کہاں جانے دیتا۔ اس نے اس کے لہراتے بال پکڑے۔ وہ اپنی ہی جھونک میں ڈگمگائی اور گھوم کر ایک بستر پر جا گری۔ سجاول کی لہولہو آنکھیں دیکھ کر اس کا پتا پانی ہو گیا۔ وہ ہاتھ جوڑنے لگی۔ ''رب کا واسطہ مجھے کچھ نہ کہنا۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ جو کچھ کیا ہے اس نے کیا ہے۔ بب...... بس یہ ان لوگوں کے دھوکے میں آ گیا......'' اس کا اشارہ اپنے شوہر نامدار صغیر کی طرف تھا۔

صغیر کڑوا گھونٹ بھر کر رہ گیا۔ دلچسپ صورتِ حال تھی۔ شوہر اپنی بیوی پر لالچی ہونے کا الزام لگا رہا تھا۔ بیوی اپنے شوہر کو نادان قرار دے رہی تھی۔ شاید دونوں ہی قصوروار تھے۔

بے شک وہ دونوں جھلاہٹ میں ایک دوسرے پر الزام لگا رہے تھے مگر ان کے تاثرات اور ان کی نگاہوں کے انداز سے پتا چلتا تھا کہ وہ ایک دوسرے کی خیریت کے بارے میں بہت فکرمند بھی ہیں۔ ان کا ابھی کوئی بچہ نہیں تھا اور اکثر بے اولاد جوڑوں کی طرح شاید ابھی وہ دونوں ہی ایک دوسرے کی توجہ کا محور تھے۔

صغیر نے اپنے فرض سے غداری کی تھی۔ وہ پاراہاؤس کا محافظ تھا۔ اس کے جسم پر محافظ کی وردی تھی۔ اس کا اسلحہ پاراہاؤس کی حفاظت کے لیے تھا مگر اس نے پاراہاؤس کے غیر ملکی

دشمنوں کا ساتھ دیا تھا۔ اس نے اپنی برادری کے مزید گارڈز کو ساتھ ملایا اور ناقب کا دست راست بن گیا۔ اب وہ مشکل میں تھا اور ساتھ ہی اس کی گھر والی بھی۔

صغیر کی گھر والی کا نام نادیہ معلوم ہوا تھا۔ سجاول نے نادیہ کو قہرناک لہجے میں مخاطب کیا۔ ''چابی کہاں ہے اس تالے کی؟''

''جی...... وہ تو......'' وہ ہکلائی اور سوالیہ نظروں سے صغیر کی طرف دیکھا۔

''چابی دے دو۔'' صغیر نے مری مری آواز میں کہا۔

وہ چند لمحے ہچکچائی پھر اس نے اپنی مختصر تنگ چولی میں ہاتھ ڈالا اور چابی نکال کر سجاول کے حوالے کر دی۔ اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔

''اس چھمک چھلو کا کیا کرنا ہے؟'' سجاول نے نادیہ کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے سوال کیا۔

''تمہارا کیا خیال ہے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

وہ بستر پر آڑی ترچھی پڑی تھی۔ گلابی ساڑی کا طویل پلو فرش پر بکھرا ہوا تھا۔ کمر کا زیادہ تر حصہ لباس سے عاری تھا۔ بال بکھرے ہوئے اور گہنے وغیرہ وہ اتار چکی تھی۔ اکثر مردوں کو اپنی بیویوں کی حد سے بڑھی ہوئی ضروریات یا ان کا لالچ ہی پھنساتا ہے۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی معاملہ دکھائی دیتا تھا۔ سجاول نے خشک لہجے میں کہا۔ ''میرا خیال تو اس اُلو کی پٹھی کے بارے میں بڑا خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن جو تم کہو گے وہی کریں گے۔''

میں نے کہا۔ ''اس صغیر کو لگام ڈالے رکھنے کے لیے اس کی اس معشوق زوجہ کو اپنے قبضے میں رکھنا پڑے گا۔''

صغیر اور نادیہ دونوں کا رنگ زرد ہو گیا۔ صغیر بولا۔ ''آ...... آپ بےفکر رہو جی۔ یہ کچھ نہیں کرے گی۔ اس کو بس اسی کمرے میں بند کر دو۔ آواز تک نہیں نکالے گی۔''

میں نے جواب دیا۔ ''آوازیں تو یہ ابھی تھوڑی دیر پہلے بھی نکال رہی تھی۔ جب تمہارے وہ والد صاحبان اپنے ہتھیاروں سمیت یہاں تشریف لے آئیں گے تو پھر یہ کیوں رولا نہ ڈالے گی؟''

سجاول نے نادیہ کو بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور پستول کی نال سے ٹھوکا دے کر عقبی صحن کی طرف چلنے کے لیے کہا۔

وہ ہاتھ پاؤں جوڑنے لگی۔ سجاول کی لال انگارہ آنکھوں کا نظارہ اسے سخت خوف زدہ کر رہا تھا۔ وہ پکاری۔ ''میں نے کوئی قصور نہیں کیا۔ جو تم کہو گے میں وہی کروں گی لیکن میں

یہاں سے نہیں جاؤں گی۔"

وہ دوبارہ بستر پر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں پر لگا ہوا کاجل اس کے رخساروں تک آ رہا تھا۔ یقیناً وہ کمرے میں بند ہونے کے بعد آنسو ہی بہاتی رہی تھی۔ اس نے اپنے ماتھے کی بندیا بھی مٹانے کی کوشش کی تھی۔ وہ مکمل طور پر مٹ نہیں سکی تھی اور یوں ماتھے پر رنگ پھیل کر رہ گیا تھا۔

سجاول نے اس بار اس کے پہلو میں لات رسید کی۔ وہ اڑتی ہوئی سی برآمدے کے وسط میں جا گری۔ سجاول نے دھمکانے کے لیے پستول اس کی طرف سیدھا کیا اور پھنکارا۔ "چلتی ہو یا اسی جگہ کھوپڑی میں موربنا دوں۔"

وہ تڑپ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور چپ چاپ سجاول کے آگے آگے چل پڑی۔ اس کا چہرہ بالکل فق تھا۔ صغیر کو میں نے گن پوائنٹ پر رکھا ہوا تھا۔ چادر کی بکل کے نیچے اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ درد کی شدت سے وہ بار بار کراہ اٹھتا تھا۔

عقبی صحن میں پہنچ کر میں نے انچارج گارڈ قادر خان کو فون کیا۔ وہ تھوڑے ہی فاصلے پر اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ جیپ میں موجود تھا۔ "ہیلو کون؟" قادر خان کی بھاری آواز ابھری۔

"میں شاہ زیب بول رہا ہوں۔ سجاول صاحب کہتے ہیں کہ تم جیپ لے کر فوراً گھر کی پچھلی جانب آ جاؤ۔"

"کوئی ڈر خطرے والی سچویشن تو نہیں؟"

"نہیں، سب اوکے ہے۔" میں نے کہا۔

صرف پانچ منٹ بعد قادر خان کی جیپ گھر کے عقبی صحن کے گیٹ کے باہر کھڑی تھی۔ احتیاط کے طور پر قادر خان نے ہیڈ لائٹس بجھا رکھی تھیں۔ ہم نادیہ اور صغیر کو لے کر باہر آ گئے۔ سجاول کے اشارے پر قادر خان نے جیپ کا عقبی دروازہ کھولا۔ سجاول نے نادیہ کو گھسیٹ کر دروازے کے پاس کیا اور پھر دھکا دے کر جیپ میں پھینک دیا۔ وہ گھٹی گھٹی آواز میں چلانے لگی۔ صغیر بھی بیوی پر ٹوٹنے والی آفت کے حوالے سے سخت پریشان نظر آتا تھا لیکن کر کچھ نہیں سکتا تھا۔

سجاول نے کرخت لہجے میں قادر خان سے مخاطب ہو کر کہا۔ "اس حرام زادی کے کھوپڑے سے رائفل لگا کر رکھنا اگر اس کا خصم ٹھیک ٹھیک چلتا رہا تو کچھ نہیں کہنا لیکن اگر یہ کوئی گڑبڑ کرے تو پھر بے دریغ کھوپڑی اڑا دینا اس ناگن کی۔"

''جیسے آپ کا حکم ہو جی۔'' قادر خان نے فرمانبرداری کا مظاہرہ کیا۔
''میں کچھ نہیں کروں گا، جیسے آپ لوگ کہو گے وہی ہو گا۔ پر اس کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔'' صغیر نے کہا۔ اس کا اشارہ اپنی جواں سال بیوی کی طرف ہی تھا۔
''کچھ نہیں ہوگا۔'' سجاول بولا۔ ''بال بھی ڈنگا نہیں کریں گے اس کا۔ پر اگر تم نے اپنے ساتھیوں کو دیکھ کر کوئی چالاکی دکھائی تو پھر......'' سجاول نے معنی خیز انداز میں فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

صغیر نے ایک بار پھر یقین دلایا کہ وہ ہمارے ہر حکم پر عمل کرے گا۔ اس نے اپنی روتی بلکتی بیوی کو بھی تسلی دی اور ہمارے ساتھ واپس گھر میں آ گیا۔ واپس آنے سے پہلے ہم نے قادر خان کو ضروری ہدایات دے دی تھیں۔ ان ہدایات کے مطابق قادر خان کو جیپ لے کر قریباً 50 میٹر دور انہی جھاڑیوں کے عقب میں کھڑے رہنا تھا جہاں ہم نے تھوڑی دیر پہلے باقر کی لاش چھپائی تھی۔ جونہی ہم ابراہم کو لے کر جھاڑیوں تک پہنچتے قادر خان کو ہیڈ لائٹس آن کیے بغیر جیپ اسٹارٹ کرنا تھی اور ہمیں لے کر وہاں سے نکل جانا تھا۔ (قادر خان کا خیال تھا کہ پارا ہاؤس میں فون کر کے وہاں سے مزید نفری منگوانے کی کوشش کی جائے لیکن میں نے اور سجاول نے اسے سختی سے منع کر دیا۔ پارا ہاؤس میں بہت کنفیوژن تھا۔ کچھ پتا نہیں تھا کہ محافظوں میں سے کون وفادار ہے اور کون غدار۔ اپنی موجودہ لوکیشن کو ہم جتنا راز میں رکھتے اتنا ہی بہتر تھا)

ہم ایک بار پھر اس کمرے تک پہنچ گئے جہاں صغیر کے بقول اغوا شدہ ابراہم کو رکھا جانا تھا۔ سجاول نے چابی گھما کر عقبی دروازے کا تالا کھولا اور دوبارہ سے بند کیا۔ ہمیں تسلی ہو گئی کہ بوقت ضرورت ہم یہ تالا کھول سکتے ہیں۔ اب ہمیں اس کمرے کی عقبی جانب ایک ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں سجاول آنے والوں کی نگاہوں سے محفوظ رہ سکے اور اردگرد کڑی نظر بھی رکھ سکے۔ جلد ہی ہمیں یہ جگہ نظر آ گئی۔ یہ اندرونی برآمدے کے اوپر ایک پختہ پرچھتی تھی جس کے اوپر گتے کے کچھ بڑے کارٹن رکھے تھے۔ یہ خالی کارٹن تھے۔ سجاول ان کے پیچھے بہ آسانی چھپ سکتا تھا۔ جگہ کے حوالے سے مطمئن ہونے کے بعد سجاول اس کمرے میں پہنچا جہاں کچھ دیر پہلے ہم نے نادیہ کو بند کیا تھا۔ میں تاڑ گیا تھا کہ وہ وہاں کیا کرنے گیا ہے۔ اسے پتا چل گیا تھا کہ نادیہ نے وہاں اپنے بیش قیمت گہنے اتارے ہیں۔ یہ گہنے ان اشیا میں سے تھے جو غداری کے صلے میں صغیر کو عنایت کی گئی تھیں۔ سجاول ان پر ہاتھ صاف کرنا چاہتا تھا اور اس نے ایسا ہی کیا۔ دو تین منٹ بعد جب وہ باہر نکلا تو وہ جڑاؤ زیورات کی ایک چھوٹی پوٹلی کی

صورت میں سجاول کے لباس کے نیچے پہنچ چکا تھا۔ وہ شاید ایک پیدائشی ڈکیت تھا اور پرائی چیز پر قبضہ جمانا اس کی فطرت کا حصہ تھا۔

اب ہمارے پاس وقت بہت کم تھا۔ سجاول کو پرچھتی کے اوپر گتے کے خالی ڈبوں کے عقب میں چھپنا تھا۔ وہ قد آور ہونے کے باوجود پھرتیلا اور چست تھا۔ وہ پرچھتی پر چڑھا اور ڈبوں کی اوٹ لے کر بیٹھ گیا۔ میں نے اپنی والی رائفل اسے دے دی تھی اور اس کا پستول خود لے لیا تھا۔

پروگرام کے مطابق مجھے اسی کمرے کے اندر رہنا تھا جہاں ابراہم کو لا کر رکھا جانا تھا۔ کمرے میں چھپنے کی بہترین جگہ وہی جستی پیٹی تھی۔ یہ کمرے کے ایک کونے میں رکھی تھی۔ اس پر دو صندوق بھی پڑے تھے۔ یہ پیٹی لحاف وغیرہ رکھنے کے لیے استعمال ہوتی ہو گی مگر جب ڈھکنا کھول کر دیکھا تو چند گدیلے اور کھیس وغیرہ ہی رکھے تھے۔ لحاف نکال کر استعمال کیے جا رہے ہوں گے۔ یقیناً کوئی اس سے بہتر جگہ میسر آ ہی نہیں سکتی تھی۔ صندوق وزنی نہیں تھے۔ بوقت ضرورت میں بہ آسانی پیٹی کا ڈھکن اٹھا کر باہر نکل سکتا تھا۔

سجاول نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''شاہی! ایسی پیٹیوں میں بند ہونے میں ایک بڑا خطرہ ہوتا ہے جس کا پتا شاید تم کو نہیں......''

''کیسا خطرہ؟''

''یہ دیکھو، اس پیٹی کے دونوں طرف یہ کنڈیاں ہیں۔ پیٹی کا ڈھکن نیچے آئے تو یہ خود بخود بند ہو جاتی ہیں۔ پھر تم اندر جتنا مرضی ناچتے رہو یہ ڈھکن کھلے گا نہیں۔''

وہ درست کہہ رہا تھا۔ پیٹی کے کھٹکے خود بخود نیچے گر کر مجھے اندر ہی بند کر سکتے تھے۔ اس کا حل ہم نے یہ نکالا کہ دونوں کھٹکوں کو تھوڑا تھوڑا ٹیڑھا کر دیا۔ یوں وہ پوری طرح بند نہیں ہوئے۔ اب ڈھکن اندر سے بھی کھولا جا سکتا تھا۔

میں نے ایک بار پھر صغیر کی گدی اپنے ہاتھ میں دبوچی اور صاف کھرے لہجے میں کہا۔ ''صغیر بیٹا! اگر تم نے کوئی بھی حماقت فرمائی تو تمہاری چھمک چھلو پر قیامت ٹوٹ پڑے گی...... اور اس قیامت سے پہلے شاید تمہارا ابھی بولو رام ہو جائے۔ سجاول اوپر پرچھتی پر موجود رہے گا۔ وہ کسی بھی وقت تمہیں نشانہ بنا سکتا ہے۔''

''ایسا کچھ نہیں ہو گا جی۔'' صغیر بولا۔

اب وہ پوری طرح ہمارے ٹرانس میں آ چکا تھا۔ اس کی چھٹی حس نے شاید گواہی دے دی تھی کہ یہاں بہت کچھ الٹ پلٹ ہونے والا ہے۔ اس نے ہمیں یقین دہانی کرائی کہ اپنی

اور بیوی کی جان بچانے کے لیے وہ ہمارے ساتھ پورا تعاون کرے گا۔
یکا یک اس کے سیل فون کا میوزک پھر بج اٹھا۔ میں نے اسکرین دیکھی۔ حسبِ توقع دوسری طرف اس کا دوست بشیرا ہی تھا۔ میں نے آنکھیں نکال کر صغیر کی طرف دیکھا اور خاموشی کی زبان میں سمجھایا کہ اسے سابقہ ہدایات پر عمل کرنا ہے۔
صغیر نے اپنے سلامت بازو کو حرکت دے کر کال ریسیو کی۔ بشیرے کی آواز آئی۔ ساتھ میں چلتی گاڑی کا شور بھی تھا۔ بشیرے نے کہا۔ ''صغیر! ہم دس منٹ میں پہنچ رہے ہیں۔تم ریڈی رہو۔''
''میں...... بالکل ریڈی ہوں۔''
''سامنے والا گیٹ کھول دو۔ ہم لڑکے والی گاڑی سیدھی اندر ہی لائیں گے۔''
''ٹھیک ہے۔''
''باقر کو بلاؤ۔ ناقب صاحب بات کریں گے۔''
''بب...... باقر...... وہ پھر باتھ روم میں ہے۔اس کا موبائل باہر ہی پڑا ہے۔''
''شاباش، اچھے موقع پر باتھ روم لگے ہیں اسے...... چلو وہ نکلے تو اسے کہو کہ ناقب صاحب سے بات کرے۔''
''ٹھیک ہے۔''
سلسلہ منقطع ہو گیا۔ بشیرے کو معلوم نہیں تھا کہ جس سے وہ بات کرنا چاہ رہا ہے وہ تھوڑی دور جھاڑیوں میں ابدی خاموشی اوڑھ کر لیٹا ہوا ہے۔ اب حشر سے پہلے اس میں بیداری کے آثار نمودار نہیں ہوں گے۔
ہم نے صغیر کو سب کچھ سمجھا دیا۔ میں جستی پیٹی میں چلا گیا اور سجاول نے باہر کی نگرانی شروع کر دی۔
جستی پیٹی کے اندر تاریکی تھی اور خوشگوار حرارت کا احساس تھا۔ فینائل کی گولیوں کی بہت ہلکی سی بو بھی محسوس ہو رہی تھی۔ میں روئی کے گدیلوں پر نیم دراز ہو گیا۔ پستول کو اپنے ہاتھ میں بالکل تیار کر لیا اور کان باہر سے ابھرنے والی آوازوں پر لگا دیئے۔ دھڑکن جیسے کنپٹیوں میں گونج رہی تھی اور تناؤ بڑھتا جا رہا تھا۔
بمشکل سات آٹھ منٹ گزرے ہوں گے کہ گاڑیوں کا مدھم شور سنائی دیا۔ یہ کم از کم دو گاڑیاں تھیں جو تیزی سے اس مکان کی طرف آ رہی تھیں۔ پھر وہ سامنے والے گیٹ سے اندر داخل ہوئیں۔ پورے گھر میں بھاری قدموں کی آوازیں گونجیں۔ کسی نے مالے زبان میں

گرج کر کچھ کہا۔ دروازے کھلے اور بند ہوئے۔ چند سیکنڈ مزید گزرے پھر کمرے کا دروازہ پُرشور آواز میں کھلا اور کسی کو دھکا دے کر کمرے کے اندر پھینک دیا گیا۔ یقیناً وہ نوجوان ابراہم ہی تھا۔ وہ جستی پیٹی کے بالکل پاس چٹائی پر گرا تھا۔ میں نے سرغنہ ناقب کی آواز سنی۔ اس نے بڑے کرخت لہجے میں ابراہم سے کچھ کہا۔

جواب میں ابراہم کی گھٹی گھٹی آواز سنائی دی۔ وہ بھی مالے میں ہی بولا تھا۔ اس کے لہجے سے اس کی شدید جسمانی تکلیف کا بھی اظہار ہوتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس کے بازو پر کافی بڑا زخم ہے (پاراہاؤس میں اس زخم کو ہمارے سامنے ہی ٹانکے لگائے گئے تھے)

لکڑی کا مضبوط دروازہ دھماکے سے بند ہو گیا اور اسے باہر سے بولٹ کر دیا گیا۔ میں نے انجنوں کی آواز سے اندازہ لگایا کہ گاڑیاں واپس جا رہی ہیں۔ بات سمجھ میں آ رہی تھی۔ یہ پاراہاؤس کی گاڑیاں تھیں۔ ان گاڑیوں کو یہ لوگ یہاں روکتے تو اپنے لیے خطرہ پیدا کرتے۔ اب ان کو کہیں اور چھوڑ کر آیا جانا تھا۔ ممکن تھا کہ کہیں جھاڑیوں یا سرکنڈوں وغیرہ میں چھپا دیا جاتا۔

میں جستی پیٹی میں تھا۔ باہر کی دنیا سے میرا رابطہ بس آوازوں کی شکل میں ہی تھا۔ یہ مختلف آوازیں تھیں۔ ہتھیاروں کی کھڑکھڑاہٹ، بھاری قدموں کی چاپیں، مالے زبان کی گفتگو۔ ایک دوبار ناقب کی آواز بھی واضح سنائی دی۔ اس آواز میں جوش اور فتح کا تاثر تھا۔

تب ایک بار پھر کمرے کا دروازہ کھلا۔ مجھے محسوس ہوا کہ دو افراد اندر آئے ہیں۔ ان میں سے ایک بشیرا تھا جس کی آواز ہم سیل فون پر سنتے رہے تھے۔ پھر صغیر کی آواز بھی سنائی دی جو شاید کمرے کے دروازے پر موجود تھا۔

بشیرے نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ بس تھوڑی سی روئی رکھ کر ٹیپ لگا دیں۔''

''لیکن پہلے خون تو بند ہونا چاہیے۔'' دوسرے شخص نے کہا۔

''خون بند ہی ہے۔ بس گاڑی میں لگنے والے دھکوں کی وجہ سے ایک دو ٹانکے ٹوٹے ہیں۔'' یہ آواز دروازے پر کھڑے صغیر کی تھی۔ یہ گفتگو یقیناً ابراہیم کے زخم کے بارے میں ہو رہی تھی۔

صغیر اور بشیرا ایک ساتھ اس کمرے میں موجود تھے۔ صغیر کا بازو ٹوٹا ہوا تھا۔ پتا نہیں کہ اس نے بشیرے کو اور دیگر ساتھیوں کو اس حوالے سے کس طرح مطمئن کیا تھا۔ چار پانچ منٹ بعد بشیرا اس کا ساتھی اور صغیر وغیرہ واپس چلے گئے۔ لکڑی کا دروازہ پھر باہر سے بولٹ ہو گیا۔

مجھے پتا تھا کہ کمرے کے عقبی دروازے کے قریب سجاول بالکل چوکس ہے۔ عقبی دروازے کی چابی بھی اس کے پاس موجود تھی۔ آوازوں اور آہٹوں سے پتا چلتا تھا کہ زیادہ تر پہرے داری سامنے کی طرف ہی ہے۔ عقبی جانب شاید دو تین بندے ہی تھے۔

اب میرے حرکت میں آنے کا وقت تھا۔ میں نے بہت آہستہ سے ڈھکن کو اوپر اٹھانا شروع کیا۔ کمرے میں نیم تاریکی تھی۔ میں نے درز سے آنکھیں لگا کر دیکھا۔ ابراہم دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور پیٹی کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر مجھے خوف آمیز حیرت نظر آئی۔

میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ کوئی اور موجود نہیں تھا۔ اب دن کا اجالا پھیل چکا تھا۔ کمرے کی گرل دار کھڑکی سے سامنے والے برآمدے کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ ایک گارڈ ستون سے ٹیک لگائے کھڑا تھا اور اپنے سیل فون سے چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔ میں نے ڈھکن پورا اوپر اٹھایا اور ابراہم کی طرف دیکھا۔ حیرت سے اس کا منہ وا تھا۔ میں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ جیسے ٹھٹک کر رہ گیا۔

پھر اس نے بڑی تیزی سے صورتِ حال کو سمجھا۔ وہ آگے آیا اور اس نے ڈھکن اٹھا کر پیٹی میں سے نکلنے میں میری مدد کی۔ کمرے میں نیم تاریکی تھی اس لیے باہر سے اندر کا منظر فوری طور پر دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ میں نے اس کے دبلے پتلے کندھے پر ہاتھ رکھا، پھر اپنے سینے پر ہاتھ رکھا اور اشاروں کی زبان میں اسے سمجھایا کہ میں دشمن نہیں دوست ہوں۔

وہ خشک لبوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ کبھی گرل دار کھڑکی کی طرف دیکھتا تھا، کبھی میری طرف۔ اس کی تشویش بجا تھی۔ کھڑکی کے عین سامنے جو گارڈ ستون سے ٹیک لگائے کھڑا تھا، وہ کسی بھی وقت آگے بڑھ کر کھڑکی میں سے جھانک سکتا تھا۔ میں نے اشاروں میں ابراہم سے کہا کہ وہ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ جائے۔

اس نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ میں الماری کی اوٹ میں ہو گیا۔ پستول میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے پروگرام کے مطابق عقبی دروازے کی طرف قدم بڑھائے اور دروازے کو ہولے سے حرکت دی۔ یہ سجاول کے لیے اشارہ تھا۔

اس اشارے کے چند سیکنڈ بعد سجاول نے بھی جواب دیا۔ اس نے بھی دروازے کو ہولے سے حرکت دی۔ وہ دروازے کی دوسری جانب موجود تھا اور تالے میں چابی لگانے کو تیار تھا۔ یہی وقت تھا جب میری نگاہ دروازے کے درمیانی حصے کی طرف گئی۔ رگوں میں خون سنسنا کر رہ گیا۔ اب دروازے پر اندر کی طرف بھی تالا نظر آ رہا تھا۔ یقینی بات تھی کہ یہ تالا ابھی

پانچ دس منٹ قبل ہی لگایا گیا ہے۔ جب ابراہیم کو کمرے میں لایا گیا تو اس وقت کسی ملازم نے مزید احتیاط کے طور پر دروازے کو اندر سے بھی لاک کر ڈالا تھا۔

اس کا مطلب تھا کہ اب سجاول باہر سے دروازہ کھول بھی دیتا تو ہم آسانی سے باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ چند لمحے کے لیے میں شپٹایا۔ باہر سے کھٹ پٹ کی بہت مدھم آواز آئی۔ سجاول نے اپنی جانب سے کام کر دیا تھا۔ یعنی تالا کھول کر بولٹ ہٹا دیا تھا۔

میں نے اشارے سے ابراہیم کو پاس بلایا...... اور اشارے سے ہی بتایا کہ وہ باہر نکلنے کے لیے تیار ہو جائے۔

وہ شکستہ انگلش میں بولا۔ ''تم کیا کرنا چاہتے ہو؟''

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ میں اس سے بات کر سکتا ہوں۔ میں نے اسی کے انداز میں مدھم سرگوشی کی۔ ''باہر ہمارے آدمی موجود ہیں۔ اس دروازے سے نکلتے ہی ہم محفوظ ہو جائیں گے۔ تمہیں بس تھوڑی سی ہمت کرنا ہوگی۔''

''لیکن...... آپ کون ہو؟''

''کہا ہے ناں دوست ہوں۔'' میں نے بھی انگلش میں جواب دیا۔ ''جس بندے نے تمہاری ماما کو پارا ہاؤس میں بدمعاشوں سے بچایا ہے وہ اس دروازے کی دوسری طرف کھڑا ہے۔''

ابراہم کی آنکھوں میں امید کی کرن نمودار ہوئی۔ سجاول کے ذکر نے جیسے اس کے اندر نئی توانائی بھر دی تھی۔

یہی وقت تھا جب میں نے دیکھا کہ سامنے والی کھڑکی سے باہر کھڑا مسلح گارڈ کمرے میں جھانکنے کے لیے کھڑکی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ میں نے فوراً ابراہم کے کندھے پر دباؤ ڈالا اور اسے نیچے بٹھا دیا۔ خود میں تیزی سے اس الماری کی اوٹ میں چلا گیا۔ گارڈ نے اندر جھانکا اور پھر اپنی رانیں کھجاتا ہوا واپس ستون کی طرف چلا گیا۔

میں نے اشارے سے ابراہیم کو دروازے کے پاس بلایا۔ اسے پستول دکھاتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔ ''میں فائر کر کے یہ تالا توڑنے لگا ہوں۔ اس کے بعد ہم باہر نکلیں گے اور ایک راہداری میں دوڑتے ہوئے پچھلے صحن کی طرف جائیں گے۔''

اس نے ڈرے ڈرے انداز میں اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے کہا۔ ''کہیں رکنا نہیں۔ مڑ کر دیکھنا نہیں۔ بس سیدھے بھاگتے جانا ہے۔''

وہ انگلش اچھی طرح سمجھ رہا تھا اور تھوڑی سی دشواری کے ساتھ بول بھی لیتا تھا۔ وہ

برونائی اسٹائل کے لباس میں ہی تھا لیکن اب ٹوپی اس کے سر پر دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ لبادہ بھی ایک طرف سے پھٹا ہوا تھا اور فرش پر گھسٹ رہا تھا۔ بھاگتے ہوئے یہ کپڑا اس کی ٹانگوں سے الجھ سکتا تھا۔ میں نے اس پھٹے ہوئے کپڑے کو گرہ دے کر باندھ دیا۔

نائن ایم ایم کے پستول کو تالے پر رکھ کر میں نے دو فائر کیے۔ تالا ٹوٹ گیا اور اس کے ساتھ ہی اردگرد کی خاموشی بھی ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہوگئی۔ پہرے داروں کی بلند آوازیں سنائی دیں۔ پھر دوڑتے قدموں کی بازگشت ابھری۔ یقیناً وہ لوگ سامنے کی طرف سے کمرے کی جانب لپک رہے تھے۔

ہم پچھلا دروازہ کھول کر باہر نکل آئے۔ سجاول کے ہاتھ میں گن تھی اور آنکھوں کی سرخی جیسے شعلوں میں بدل چکی تھی۔ ہم نے ابراہیم کو اپنے درمیان رکھا اور عقبی صحن کی طرف بھاگے۔ سب سے پہلے پچھلے برآمدے میں مزاحمت ہوئی۔ ایک دراز قد پہرے دار رائفل تان کر سامنے آیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ صورتِ حال کو پوری طرح سمجھتا، سجاول نے بے دریغ اسے نشانہ بنایا گولی اس کے چہرے پر لگی اور وہ رائفل سمیت الٹ گیا۔ اس کے جسم کو پھلانگتے ہوئے ہم صحن میں آئے جعلی پولیس جیپ کے پاس ہی ایک مسلح گارڈ موجود تھا۔ اس نے گولی چلائی جو خطا گئی۔ اسے دوسری گولی چلانے کا موقع ہم نے نہیں دیا۔ میرا سیدھا فائر اس کی پیشانی پر لگا۔ وہ جیپ کی باڈی سے ٹکرایا اور زمین بوس ہوگیا۔

ہم اندھا دھند بھاگتے ہوئے عقبی گیٹ سے نکلے اور ان جھاڑیوں کی طرف لپکے جن کے پیچھے قادر خان موجود تھا۔ اپنے زخم کی وجہ سے ابراہیم کو بھاگنے میں تکلیف ہورہی تھی مگر موت کے خوف نے اس تکلیف کو پس منظر میں دھکیل دیا تھا اور وہ پوری کوشش کر کے ٹانگوں کو حرکت دے رہا تھا۔ میں نے کندھے کے پاس سے اس کا بازو تھام رکھا تھا۔

قادر خان نے بھی ہمیں آتے دیکھ لیا تھا۔ وہ جیپ کو ریورس بھگاتا ہوا ہماری طرف لایا۔ دوسری طرف مکان کے اندر تہلکہ مچ گیا تھا۔ بھاگو پکڑو کی صدائیں سنائی دے رہی تھیں۔ عقب سے ہم پر چند فائر بھی کیے گئے مگر خوش قسمتی سے کسی گولی نے ہمیں نقصان نہیں پہنچایا۔ جیپ کا عقبی دروازہ کھول دیا گیا تھا۔ ہم پھرتی سے جیپ میں چلے گئے اور وہ ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ مجھے گھر کے عقبی گیٹ سے باہر مسلح افراد نظر آئے۔

''سر نیچے کرو۔'' میں نے چِلّا کر کہا اور اس کے ساتھ ہی ابراہیم کو گدی سے پکڑ کر نیچے جھکا دیا۔

گولیوں کی ایک باڑ آئی اور جیپ کی دائیں جانب والی دونوں کھڑکیاں چکنا چور ہو

گئیں۔ہم بروقت نیچے جھک گئے تھے اس لیے محفوظ رہے۔

قادر خان خود ڈرائیو کر رہا تھا۔اس نے پکار کر پوچھا کہ کس طرف جانا ہے؟

میں نے کہا۔"تمہیں زیادہ پتا ہوگا۔جس طرف رستہ ملے نکل چلو۔"

قادر خان نے اسٹیئرنگ موڑا اور بائیس ہارس پاور کی فور وہیل جیپ کچے راستے پر اچھلتی کودتی تیزی سے آگے بڑھی۔بے ہودہ ساڑھی والی نادیہ بھی سکڑی سمٹی، جیپ کے ایک کونے میں پڑی تھی۔میں نے اسے اشارہ کیا کہ وہ بھی بیٹھنے کے بجائے لیٹ جائے۔

"کوئی پیچھے تو نہیں آرہا؟" قادر خان نے پوچھا۔

"ابھی تو نہیں......"

ابھی میرا فقرہ مکمل بھی نہیں ہوا تھا کہ ایک نیلی گاڑی کی جھلک دکھائی دی......وہ لوگ آرہے تھے......اور یہ صرف ایک گاڑی نہیں تھی۔چند سیکنڈ بعد ایک دوسری گاڑی بھی دکھائی دی۔یہ وہی کرولا تھی جو ہم نے یہاں اپنی آمد کے وقت صغیر کے گھر سے باہر کھڑی دیکھی تھی۔

پولیس جیپ کے تار کھینچ کر ہم یہ سمجھے تھے کہ شاید تعاقب نہ ہو سکے، مگر یہ خیال غلط ثابت ہوا تھا۔اب دو گاڑیاں برق رفتاری سے پیچھے آرہی تھیں۔

"حرام زادے...... کتے کے تخم۔" سردار سجاول نے دانت پیس کر کہا اور یکے بعد دیگرے کئی فائر ان گاڑیوں کی طرف کیے۔

جواب میں بھی فوراً فائر آئے۔دو تین گولیاں جیپ کی باڈی میں لگیں اور پوری جیپ تھرا اٹھی۔صغیر کی بیوی خوف زدہ ہو کر چلائی۔"ہائے میں مرگئی۔"

اب قادر خان نے بھی عقب نما آئینے میں گاڑیوں کو دیکھ لیا تھا۔اس نے رفتار حتی الامکان تیز کر دی۔جیپ بری طرح ڈگمگانے لگی۔دفعتاً مجھ پر ایک مایوس کن انکشاف ہوا۔یہ صرف ناہموار راستے کے ہچکولے نہیں تھے۔

میں نے سجاول سے کہا۔"مجھے لگ رہا ہے کہ ہماری گاڑی کا اگلا دایاں ٹائر بے کار ہو گیا ہے۔"

سجاول نے چند لمحے غور کیا اور بولا۔"شاید......ایسا ہی ہے۔"

ایک گولی سنسناتی ہوئی آئی اور سیدھی قادر خان کے ساتھی کے بازو میں لگی۔وہ بازو پکڑ کر دہرا ہو گیا۔رائفل اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔

سجاول نے بھنا کر جوابی فائرنگ کی۔اس نے دو چھوٹے برسٹ چلائے۔ہم نتیجے کے بارے میں تو نہیں جان سکے، لیکن اتنا ضرور ہوا کہ متعاقب گاڑیوں سے ہمارا فاصلہ کچھ بڑھ

گیا۔ سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا۔ مگر اجالا پھیل چکا تھا۔ ہمارے چاروں طرف ٹیلے تھے اور جھاڑیاں تھیں۔ ہماری جیپ کی اڑائی ہوئی گرد میں پیچھے دیکھنا دشوار ہو رہا تھا۔

یکایک قادر خان کو زور سے بریک لگانا پڑے۔ آگے راستہ مسدود تھا۔ ایک برساتی نالا ہمیں ''فل اسٹاپ'' لگا رہا تھا۔

قادر خان نے چند سیکنڈ تذبذب میں رہنے کے بعد گاڑی کو بائیں جانب موڑا اور نالے کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ برسٹ ٹائر کی وجہ سے جیپ کی رفتار تیز نہیں ہو سکتی تھی۔ پیچھے آنے والے بتدریج قریب آ رہے تھے۔ ان میں ایک تو وہی کرولا تھی جو ہم نے صغیر کے گھر سے باہر دیکھی تھی۔ دوسری ایک شہ زور گاڑی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اس میں درجن کے لگ بھگ مسلح افراد موجود ہیں۔ یہ نازک صورتِ حال ہو گئی تھی۔ میں نے قادر خان سے کہا۔ ''فون پر ساتھیوں سے رابطہ کرو۔''

''کوئی فائدہ نہیں۔'' وہ پکارا۔ ''میں انہیں اپنی لوکیشن کے بارے میں نہیں بتا سکتا۔ ویسے بھی انہیں یہاں آتے آدھ گھنٹا لگ جانا ہے۔''

عقب سے مسلسل فائر آ رہے تھے۔ یہ آٹومیٹک اور سیمی آٹومیٹک اسلحے کی فائرنگ تھی۔ گاہے بگاہے ایل ایم جی بھی استعمال ہو رہی تھی۔ سجاول اور قادر خان کا ساتھی بھرپور جواب دے رہے تھے۔ بہرحال ہم جانتے تھے کہ ہماری فائرنگ پاور کم ہے۔ ہمارا ایمونیشن زیادہ دیر ہمارا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ ہم رک رک کر گولی چلا رہے تھے یکایک ایک برسٹ آیا جس نے جیپ کی عقبی اسکرین توڑ دی اور مجھے اپنے پاؤں پر کسی گرم سیال کے گرنے کا احساس ہوا۔

میں نے دیکھا قادر خان کا دوسرا ساتھی اوندھے منہ میرے پاؤں پر پڑا تھا۔ اس کی گردن سے خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ کھوپڑی کا ایک حصہ بھی ٹوٹ چکا تھا اور مغز نشست پر بکھرا ہوا تھا۔ ابراہیم سکتہ زدہ نگاہوں سے یہ دلدوز منظر دیکھتا جا رہا تھا۔ ایک اور برسٹ آ کر ابراہیم کی اپنی کھوپڑی بھی چکنا چور کر سکتا تھا۔ میں نے ایک بار پھر ابراہیم کی دبلی گردن کو عقب سے پکڑا اور اسے آگے کی طرف جھکایا۔ ''نیچے لیٹ جاؤ۔'' میں نے چلا کر کہا۔

وہ پہلے گھٹنوں اور ہاتھوں کے بل ہو گیا پھر دو نشستوں کے درمیانی خلا میں پہلو کے بل لیٹ گیا۔ جہاں وہ لیٹا تھا وہاں خون تھا۔ شیشے کی بے شمار کرچیاں تھیں۔ اور گولیوں کے گرم خول تھے مگر زندگی بچانے کی فطری خواہش کے تحت اس نے کسی چیز کی پروا نہیں کی۔ گارڈ کی لاش کا منظر صغیر کی بیوی کو دکھائی نہیں دیا تھا۔ وہ اسی طرح گٹھڑی بنی ایک نشست پر پڑی تھی۔

عقبی گاڑیاں اب تیزی سے قریب آ رہی تھیں۔ کسی بھی وقت ہماری گاڑی کا کوئی اور ٹائر برسٹ ہو سکتا تھا۔ ہم نالے کے ساتھ ساتھ جا رہے تھے۔ دائیں طرف ایک خستہ حال پل نظر آ رہا تھا۔ یہ نالے پر ہی بنا ہوا تھا۔ قادر خان نے جیپ پل پر چڑھا دی۔ ہم نے پل تو بخیریت پار کر لیا مگر جب دوسری طرف اترے تو جیپ کا اگلا پہیا کیچڑ میں دھنس گیا۔ بے شک یہ فور وہیل ڈرائیو تھی مگر پہیا تو پہلے ہی برسٹ ہو چکا تھا۔ گارڈ زور لگا رہی تھی مگر نکل نہیں پا رہی تھی۔ انجن دہاڑ رہا تھا۔ پہیے گھوم رہے تھے مگر جتنا گھوم رہے تھے گاڑی اتنا ہی بائیں طرف جھکتی چلی جا رہی تھی۔ عقبی گاڑیوں کو خود سے دور رکھنے کے لیے ہم نے بھرپور فائرنگ شروع کر دی۔ دھماکوں سے قرب و جوار لرزنے لگے۔ اب صورتِ حال یہ تھی کہ پل کے ایک سرے پر ہم تھے اور دوسرے پر تعاقب کرنے والوں نے مورچا جما لیا تھا۔ وہ کسی بھی وقت پل پار کر کے ہم پر آ سکتے تھے۔

میں نے کہا۔ ''سجاول لگتا نہیں کہ گاڑی نکل سکے گی۔ تم اور قادر، ابراہم کو لے کر نکل جاؤ۔ ہم دونوں ان لوگوں کا راستہ روکتے ہیں۔ موقع دیکھ کر ہم بھی پیچھے آ جائیں گے۔''

''تم زیادہ قربان علی خان مت بنو۔'' سجاول نے کہا۔ ''تم اور قادر نکلو۔ میں ان لوگوں کو روک لوں گا۔''

''نہیں سجاول، قربانی شربانی کی بات نہیں ہے۔ یہ ابراہیم مجھ سے زیادہ تم پر بھروسا کر رہا ہے۔ تم ساتھ ہو گے تو اسے حوصلہ رہے گا۔''

تھوڑی دیر اس معاملے پر بات ہوئی پھر میں نے سجاول کو قائل کر لیا، وہ بولا۔ ''لیکن قادر کو لے جانا ٹھیک نہیں۔ یہاں اس کی زیادہ ضرورت ہو گی۔ میں اسے ساتھ لے جاتا ہوں۔''

سجاول کا اشارہ قادر کے اس ساتھی کی طرف تھا جس کے بازو پر گولی لگی تھی۔

قادر خان سے بات کی تو وہ میرے ساتھ رکنے کو تیار ہو گیا۔ وقت بہت کم تھا۔ زخمی گارڈ نے اپنی رائفل میرے حوالے کر دی اور میں نے اپنا پستول اسے دے دیا۔ رائفل کے ساتھ ساٹھ کے قریب اضافی راؤنڈ بھی تھے۔ زبردست فائرنگ کے دوران میں ہی ابراہم اور سجاول گاڑی کے اگلے دروازے سے باہر نکلے۔ زخمی گارڈ یعقوب بھی ان کے ساتھ تھا۔ وہ گاڑی کی آڑ لیتے اور جھک کر دوڑتے ہوئے جھاڑیوں میں اوجھل ہو گئے۔ اسی دوران میں قادر نے اور میں نے مسلسل فائرنگ کی اور پیچھے آنے والوں کو سر اٹھانے نہیں دیا۔ ہم چاہتے تو صغیر کی بیوی کو ڈھال کے طور پر استعمال کرنے کی کوشش کر سکتے تھے لیکن مجھے یہ گوارا نہیں

ہوا۔ وہ مسلسل توبہ تلا کررہی تھی اور رو رہی تھی۔ میں نے بائیں طرف والا دروازہ کھول کر اسے دھکا دیا اور کہا کہ وہ بھاگ جائے۔ وہ بھاگ کر درختوں میں روپوش ہوگئی۔

قادر خان انچارج گارڈ تھا اور یقیناً وہ اس عہدے کا حق دار بھی تھا۔ وہ بڑی دلیری سے میرا ساتھ دینے لگا۔ ہم اب پھنسی ہوئی گاڑی میں سے نکل آئے تھے اور اس کی اوٹ میں پناہ لے لی تھی۔ مرنے والے گارڈ کی لاش بدستور گاڑی کے اندر ہی تھی۔ گاہے بگاہے اس کوئی فائر لگتا تھا اور وہ اچھل کر رہ جاتی تھی۔ اب قریباً نو بج چکے تھے۔ ہر طرف سنہری دھوپ پھیل گئی تھی۔ ٹیلوں پر چھایا ہوا سرد کہرا اب چھٹنا شروع ہوگیا تھا۔ یہ بالکل بے آباد جگہ تھی۔ پھر بھی مسلسل فائرنگ کے سبب اکا دکا لوگ متوجہ ہو چکے تھے۔ دور ایک ٹیلے پر تین چار افراد کھڑے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ اس کے علاوہ قریباً نصف فرلانگ کے فاصلے پر ایک بیل گاڑی بھی اپنے راستے پر چلتے چلتے رک گئی تھی۔ اس پر موجود افراد اب بیل گاڑی کی اوٹ میں کھڑے پُل کی طرف نگاہیں جمائے ہوئے تھے۔

میں نے اور قادر نے اگلے کم و بیش آدھ گھنٹے تک بڑی کامیابی سے تعاقب کرنے والوں کو روکے رکھا۔ اس دوران میں ہماری گاڑی کی باڈی چھلنی بن گئی اور تین ٹائر فلیٹ ہو گئے۔ تعاقب کرنے والوں میں سے بھی دو تین افراد کے زخمی ہونے کی نشاندہی ہوئی۔ ان کی کرولا گاڑی آگے تھی اور اس کا ایک ٹائر بھی زبردست دھماکے سے پھٹ چکا تھا۔

قادر خان نے میرے پہلو میں پوزیشن لے رکھی تھی۔ عام پٹھانوں کی طرح اس کا نشانہ بہت سچا تھا اور کرولا گاڑی کا ٹائر اسی نے برسٹ کیا تھا وہ تیز سرگوشی میں بولا۔ ''شاہ زیب، مجھے لگ رہا ہے کہ کرولا آگے آرہی ہے۔''

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ لوگ اب کرولا کو دھکیلتے ہوئے اور اس کی آڑ لیتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔

''کتنے راؤنڈ ہیں تمہارے پاس؟'' میں نے پوچھا۔

''راؤنڈ تو پچاس کے قریب ہیں مگر اللہ نے چاہا تو اگلے پندرہ بیس منٹ اور ہم ان کو روکے رکھیں گے...... اور تمہارے پاس کتنے ہیں؟''

میں نے اپنی بیلٹ والے راؤنڈ گننے کے بعد اسے بتایا کہ چالیس کے قریب میرے پاس ہیں۔

کرولا اب پُل کے اوپر چڑھ آئی تھی۔ اسی دوران میں کرولا کے پیچھے شہ زور گاڑی کے پاس کچھ دھول نظر آئی۔ یہ ایک اور مہران گاڑی تھی۔ قادر بولا۔ ''لو جی، ان کے اور مددگار

بھی آ گئے۔''

''چار پانچ بندے تو اس میں بھی ہیں۔'' میں نے آنکھیں سکیڑ کر دیکھتے ہوئے کہا۔
جواب میں قادر خان نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن اس سے پہلے ہی ایک تبدیلی نظر آئی۔
مہران کار اب ریورس ہو رہی تھی۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ برساتی نالے کے ساتھ ساتھ چلتی اور دھول اڑاتی ہوئی مغرب کی جانب نکل گئی۔

فائرنگ میں کچھ دیر کے لیے وقفہ آ گیا تھا۔ قادر خان نے کہا۔ ''یہ مہران کس طرف گئی ہے؟''

''شاید یہ لوگ آگے کسی پل کی تلاش میں نکلے ہیں۔''

''یہ تو پھر خطرناک ہو گا۔''

''مگر لگتا نہیں کہ پل کہیں آس پاس ہو گا۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ لوگ ایک گھنٹے سے یہاں سر نہ مار رہے ہوتے۔''

اسی دوران میں ایک بار پھر تابڑ توڑ فائرنگ شروع ہو گئی۔ اس مرتبہ فائرنگ کی شدت نمایاں طور پر زیادہ تھی۔ یہ لوگ اب ایک اسنیپر گن بھی استعمال کر رہے تھے۔ ممکن تھا کہ یہ لونگ رینج کی رائفل ان کے لیے اسی مہران کار میں آئی ہو جو اب دھول اڑاتی مغرب کی طرف اوجھل ہو چکی تھی۔

گولیاں اب خطرناک زاویوں سے ہم تک پہنچ رہی تھیں کسی بھی وقت پگھلا ہوا سیسا ہم دونوں میں سے کسی کا مزاج پوچھ سکتا تھا۔ کرولا کار رینگتی ہوئی مسلسل آگے بڑھ رہی تھی۔ اس کے عقب میں شوٹرز نے آڑ لے رکھی تھی۔ گاڑیوں کے پیچھے آڑ لینے والے لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ ان کے پاؤں اور پنڈلیوں کے نچلے حصے اکثر غیر محفوظ رہتے ہیں۔ دو سال پہلے لندن میں ٹیکساری گینگ کے تین بدمعاشوں کے ساتھ میرا زبردست شوٹ آؤٹ ہوا تھا اور یہ تجربہ مجھے اسی لڑائی میں حاصل ہوا تھا۔ میں ریتیلی زمین پر اوندھا لیٹ گیا۔ میری نگاہ اپنی تباہ حال جیپ کے نیچے سے گزر کر کرولا کے نیچے گئی۔ کرولا کے عقب میں مجھے چھ ٹانگیں نظر آئیں۔ پاؤں اور پنڈلیاں میرے نشان پر تھے۔

اب تک میں نے بہت کم برسٹ چلائے تھے لیکن اب یہ برسٹ چلانے کا موقع تھا۔ میں نے ایک بار پھر اپنی سیون ایم ایم رائفل کو برسٹ پر سیٹ کیا...... نشانہ لیا...... اور ٹریگر دبایا تڑتڑاہٹ کی لرزہ خیز آواز سے آٹھ گولیوں کا ایک برسٹ فائر ہوا۔ میں نے کرولا کی آڑ لینے والوں کو زخمی ہو کر گرتے دیکھا۔ یہ ایک کامیاب حملہ تھا، مگر اس حملے کا جو دوسرا نتیجہ نکلا وہ

میرے گمان میں نہیں تھا۔ بالکل غیر متوقع طور پر ایک زوردار دھماکا ہوا اور میں نے کرولا کار کو ہوا میں اچھلتے اور آگ کی لپیٹ میں آتے دیکھا۔

جیسا کہ بعد میں پتا چلا۔ میرے چلائے ہوئے برسٹ کی کوئی گولی فیول ٹینک یا فیول لائن میں لگی تھی اور اس نے کرولا کو اڑا دیا تھا۔ کرولا قریباً دو فٹ اچھلنے کے بعد اپنے پہلو کے بل گری۔ ہم نے ایک شخص کو شعلوں کی لپیٹ میں دیکھا۔ وہ کربناک آواز میں چلاتا ہوا بھاگا اور اس نے نیم خشک نالے کے پانی میں چھلانگ لگا دی۔ کار پوری طرح آگ کی لپیٹ میں تھی۔ یوں لگتا تھا کہ کسی نے آگ کا گولا پل پر رکھ دیا ہے۔ گاڑھا سیاہ دھواں تیزی سے پھیل رہا تھا۔

یہاں سے نکلنے کے لیے یہ موقع بہترین تھا۔ ''آ جاؤ قادر۔'' میں نے کہا۔

ہم دونوں جھک کر بھاگے اور جھاڑیوں کی طرف لپکتے چلے گئے۔ ہم پر کوئی فائر نہیں ہوا۔ جھاڑیوں اور درختوں کا یہ سلسلہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ ہمیں معلوم تھا کہ ہم جتنی جلدی دور نکل جائیں گے اتنا ہی ہمارے حق میں بہتر ہوگا۔ جلدی ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ ابھی مصیبت پوری طرح ٹلی نہیں ہے۔ ہوا کے دوش پر تیر کر آنے والی چند آوازوں سے پتا چلا کہ وہ لوگ پیچھے آ رہے ہیں۔

''کچھ اندازہ ہے کہ ہم کس طرف جا رہے ہیں؟'' میں نے بھاگتے بھاگتے قادر خان سے پوچھا۔

''پارا ہاؤس کو جانے والی پکی سڑک اسی طرف ہے، پر ٹھیک سے پتا نہیں کہ کتنی دور ہے۔''

ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ بھاگتے رہیں...... اور سانس درست کرنے کے لیے کسی وقت چلنا شروع کر دیں۔ تھوڑی دیر بعد مجھے کافی فاصلے سے موٹر سائیکل کی آواز سنائی دی۔ پھر پتا چلا کہ یہ ایک نہیں زیادہ موٹر سائیکلز ہیں۔ شاید چار پانچ۔ اس جھاڑیوں اور جھاڑ جھنکاڑ والی جگہ پر ہمیں تلاش کرنے کے لیے وہ موٹر سائیکلیں بھی لے آئے تھے۔ موٹر سائیکلوں کی آواز بتدریج قریب آ رہی تھی۔ قادر خان پہلی بار کچھ گھبرایا ہوا نظر آیا۔ ہانپی آواز میں بولا۔ ''اب تو بچنا مشکل ہے۔ ہتھیار پھینکنے ہوں گے...... یا پھر لڑنا ہوگا۔''

اچانک مجھے خشک جھاڑ جھنکاڑ کے اندر ایک سیاہ سوراخ سا نظر آیا۔ یہ سوراخ بمشکل تین فٹ افقی رخ پر اور دو فٹ عمودی رخ پر تھا۔ خودرو خشک پودوں نے اسے ڈھانپ رکھا تھا۔ یہ دراصل ایک چھوٹا سا نیم ریتیلا ٹیلا تھا جس کے دامن میں یہ ایک خلا سا تھا۔ ہم اس

میں چھپنے کی کامیاب کوشش کر سکتے تھے۔ اگر تعاقب کرنے والوں کی نگاہوں سے بچنے میں کامیاب نہ ہوتے تو پھر ہم اس جگہ کو ایک محفوظ مورچے کی شکل بھی دے سکتے تھے۔

سوچنے سمجھنے کا وقت بالکل نہیں تھا۔ موٹر سائیکلز کی آواز اب بالکل نزدیک پہنچ چکی تھی۔ سواروں کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ ہم گھٹنوں تک اونچی جنگلی گھاس کے اندر چلتے تاریک سوراخ تک پہنچے۔ پہلے میں اوندھا لیٹ کر اس سوراخ میں گھسا، پھر قادر خان بھی داخل ہو گیا۔ کانٹوں نے ہمارے جسم چھیل دیئے تھے۔ اس خلا کے اندر کیا تھا؟ اس حوالے سے بھی شکوک تھے۔ یہ جگہ کسی خار پشت، نیولے یا جنگلی بلے وغیرہ کا مسکن ہو سکتی تھی۔ اس کے علاوہ پتا چلا تھا کہ سور، سیاہ گوش اور مشک بلاؤ وغیرہ سے بھی ان علاقوں میں ملاقات ہو سکتی ہے۔

عام حالات میں شاید ہم اس خلا میں گھسنے سے پہلے کئی بار سوچتے، لیکن اس وقت چونکہ ”موت“ پیچھے تھی اس لیے خلا کے حوالے سے کوئی اندیشہ بھی سنگین محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ خلا اندر سے قدرے چوڑا تھا اور کچھ کشادہ بھی محسوس ہوتا تھا مگر گہری تاریکی میں کچھ بھی دکھائی نہیں دیا۔ صرف دہانے کے پاس ہی مدھم سی روشنی تھی۔

ہم اوندھے منہ رینگنے کے بجائے اٹھ کر بیٹھ گئے اور باہر سے آنے والی آوازوں پر غور کرنے لگے۔ وہ لوگ یہاں چاروں طرف پھیل گئے تھے اور بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ موٹر سائیکلز کی آوازیں بھی چاروں طرف چکرا رہی تھیں پھر ایک آواز سن کر ہم اچھل پڑے۔ یہ آواز دہانے کے بالکل پاس سے آئی تھی اور یہ اجنبی نہیں تھی۔ یہ صغیر کے ساتھی بشیرے کی آواز تھی۔ اس نے اپنے کسی ساتھی سے کہا۔ ”وہ آگے نہیں جا سکتے۔ آگے ملٹری ایریا ہے۔ وہ یہیں کہیں چھپے ہوں گے...... یا پھر کھبے پاسے (بائیں طرف) نکلے ہوں گے۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے ہمیں ایک موٹی سی غائبانہ گالی دی۔

قادر خان پیچ وتاب کھا کر رہ گیا۔ یہاں اس بشیرے کے علاوہ کم و بیش دس افراد اور موجود تھے۔ سب کے سب مسلح اور بپھرے ہوئے۔ یقیناً کرولا کو آگ لگنے کے بعد ان کا پارا مزید چڑھ چکا تھا۔ ہم فون پر پارا ہاؤس سے رابطہ کرنے کی کوشش کر سکتے تھے لیکن دونوں کے فون اس نازک موقع پر ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ قادر خان کا فون، پل پر ہونے والی لڑائی کے دوران میں اس کی جیب سے گر گیا تھا جبکہ میرے والے کی چارجنگ بالکل ختم ہو چکی تھی۔

وہ ہر جگہ ہمیں تلاش کرنے لگے اور ساتھ ساتھ للکارے بھی مارنے لگے۔ عین ممکن تھا کہ سرغنہ ناقب بھی ان میں موجود ہو مگر اس کی آواز ہمیں سنائی نہیں دی۔ چاروں طرف

چاپوں کی آواز تھی اور ہم دم سادھے بیٹھے تھے۔ بشیرا اور اس کا کوئی ساتھی قدم قدم آگے بڑھتے اس خلا کے بالکل نزدیک چلے آئے۔

''کوئی ادھر ہی نہ گھس گیا ہو؟'' بشیرے نے کہا۔

''جان بچانے کے لیے تو وہ کہیں بھی گھس جائیں گے۔'' ساتھی نے بازاری لب و لہجے میں کہا۔

ہم تیار ہو گئے ...... اور انگلیاں ٹریگرز پر رکھ لیں۔ پھر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ کوئی شخص اوندھا لیٹ کر سوراخ میں گھسا، تاہم اس سے بھی پہلے اس کی رائفل اندر گھسی اور ساتھ میں ٹارچ بھی۔ دفعتاً اندر گھسنے والے کو پتا نہیں کیا ہوا وہ تڑپ کر پیچھے ہٹ گیا۔ ''کیا ہوا؟'' بشیرے کی گھبرائی آواز ابھری۔

''یہاں تو سانپ ہیں۔'' وہ شخص بولا۔

اب ہمارے ڈرنے کی باری تھی لیکن جہاں بیٹھے تھے وہاں سے ہل نہیں سکتے تھے۔ ہمیں تاریکی کی وجہ سے کچھ نظر نہیں آیا تھا لیکن بشیرے کے ساتھی نے ٹارچ کی روشنی میں کچھ نہ کچھ ضرور دیکھا تھا۔ بشیرے کے کہنے پر وہ شخص دوبارہ آگے بڑھا لیکن اس مرتبہ اس نے سوراخ میں سر گھسانے کی کوشش نہیں کی، بلکہ باہر سے ٹارچ کا روشن دائرہ خلا میں اِدھر اُدھر گھمایا، ہم اس لپکتی ہوئی سی روشنی سے کافی دور تھے اس لیے محفوظ رہے۔ تاہم فرش پر پڑنے والی روشنی میں مجھے کوئی سانپ یا سانپ جیسی چیز ضرور دکھائی دی۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی سانپ نے کسی شاخ کے گرد بل کھا رکھا ہے۔ شاخ اور سانپ دونوں زمین پر ہی پڑے تھے۔

روشنی اوجھل ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی قدموں کی چاپیں بھی دور چلی گئیں۔ وہ لوگ کسی اور طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ ایک موٹر سائیکل سوار سوراخ کے بالکل سامنے سے دوڑتی اور دھواں چھوڑتی ہوئی نکل گئی۔ پھر دو تین فائر سنائی دیئے۔ شاید درختوں اور جھاڑیوں کے کسی مشکوک جھنڈ میں اندھی فائرنگ کی گئی تھی۔ درختوں سے پرندے پھڑ پھڑا کر اڑ گئے اور ایک گونج سی دور تک گئی۔

موٹر سائیکلوں کا شور اور دیگر آوازیں ہم سے دور ہونے لگیں۔ یہ کسی حد تک اطمینان کا پہلو تھا لیکن اگر ہم یہ سمجھتے تھے کہ یہ جنگل مکمل طور پر کلیئر ہو جائے گا تو ایسا نہیں ہوا۔ کچھ لوگ بدستور آس پاس کے درختوں میں موجود تھے۔ ان کی باتوں کی آوازیں ہم تک صاف پہنچ رہی تھیں۔ اب ہماری آنکھیں آہستہ آہستہ اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہو گئی تھیں۔ میں نے دھیان سے دیکھا تو دہانے کے بالکل پاس موجود سانپ نظر آنے لگا۔ یقیناً وہ درمیانے سائز

کا ایک کنگ کوبرا تھا۔ وہ جس شاخ سے لپٹا نظر آ رہا تھا، وہ دراصل اس کی مادہ تھی۔ وہ دونوں ملاپ کی حالت میں تھے۔ یعنی وہی ازلی کھیل جو ہر ذی نفس کی افزائش نسل کا باعث بنتا ہے۔ یہ ایک مدھر ملن کی سی کیفیت تھی۔ وہ دونوں ان حالات و واقعات اور خطرات سے قطعی بے خبر تھے جو ان کے بالکل قریب موجود تھے۔ آتشیں ہتھیاروں میں پگھلا ہوا سیسہ بے قرار تھا اور عقابی نگاہیں اپنے ہدف کو ڈھونڈ رہی تھیں۔

یکایک میرے گھٹنے پر سرسراہٹ سی ہوئی۔ جیسے کوئی نرم جسم والا جانور مجھے چھو کر گزر گیا ہو۔ اسی دوران میں قادر خان کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی واقعہ ہوا۔ وہ ڈری ڈری آواز میں بولا۔ ''میرے پاس پنسل ٹارچ ہے، جلا کر دیکھوں؟''

میں نے کہا۔ ''لاؤ، مجھے دو۔''

اس نے پتلی سی ٹارچ میرے ہاتھ میں تھما دی۔ ہم کھوہ کی گہرائی میں تھے۔ کھوہ سے باہر دن کی تیز روشنی تھی۔ اگر ٹارچ احتیاط سے جلائی جاتی تو اسے باہر سے دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ میں نے ٹارچ کو اپنے اٹھے ہوئے گھٹنے کی بالکل اوٹ میں رکھ کر اس کا چھوٹا سا روشن دائرہ کھوہ کی گہرائی میں پھینکا، لفظی نہیں حقیقی معنوں میں میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یقیناً یہی حال قادر خان کا بھی ہوا ہو گا۔ یہاں کم و بیش ڈیڑھ درجن چھوٹے بڑے سانپ موجود تھے۔ یا یوں کہا جائے کہ ڈیڑھ درجن ہمیں نظر آ رہے تھے۔ جو مزید کونے کھدروں یا چھوٹے سوراخوں میں ہوں گے، وہ ہمیں دکھائی نہیں دیتے تھے۔

پہلے شاید وہ ہم سے دور تھے لیکن اب ہمارے جسموں کی اجنبی حرارت محسوس کر کے ہمارے قریب پہنچ چکے تھے۔ ان میں سے ایک باقاعدہ میرے گھٹنے پر چڑھ آیا تھا اور دوسرا قادر کے پاؤں کے پاس رینگ رہا تھا۔ قادر بے تابی سے کونے میں سمٹا۔ میں نے تیز سرگوشی کی۔ ''قادر، حرکت نہ کرو۔ خطرہ بہت زیادہ ہو جائے گا۔''

وہ ایک دلیر شخص تھا لیکن اس قدرتی آفت نے اسے حواس باختہ کر دیا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا۔ ورنہ شاید وہ اندھا دھند فائر کرنے لگتا یا پھر اٹھ کر باہر بھاگ جاتا۔ آگے کنواں پیچھے کھائی والا محاورہ ہم پر بالکل صادق آ رہا تھا۔ سانپ اجتماعی طور پر ہماری طرف بڑھ رہے تھے۔ میں بائیں جانب بیٹھا تھا اس لیے ان کا پہلا ہدف میں ہی تھا۔ میں جانتا تھا کہ اگر اس موذی جاندار کے سامنے بے حرکت رہا جائے اور خود کو بالکل پُرسکون رکھا جائے تو وہ نقصان پہنچانے سے باز رہتا ہے لیکن ایسی صورتِ حال میں پُرسکون رہنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ اگلے دو تین منٹ بے حد اذیت ناک تھے۔ کئی سانپ رینگتے ہوئے میرے جسم پر

آ گئے تھے۔ میں ان کے رینگتے ہوئے گرم لمس کو محسوس کر رہا تھا۔ ان کی پھنکاریں میرے کانوں میں گونج رہی تھیں مگر میں پتھر کے بت کی طرح ساکت تھا۔ یہاں تک کہ سانس بھی اتنی آہستگی سے لے رہا تھا کہ سینے کا زیر و بم واضح نہ ہو۔

ایک ''سنپولیا'' میری جیکٹ کی آستین میں گھس چکا تھا۔ ایک بڑا کوبرا میرے کندھے کے اوپر سے سرسراتا ہوا گزر رہا تھا۔ ایک گردن کو چھوتا ہوا نیچے جا رہا تھا، اس کا رخ قادر خان کی جانب تھا باہر بشیرا اور اس کا کوئی ساتھی گفتگو کر رہے تھے، ان کی یہ گفتگو کسی دور افتادہ آواز کی طرح میری سماعت تک پہنچ رہی تھی۔ کوبرے کے جان لیوا زہر سے کون واقف نہیں اور میں جانتا تھا کہ کسی بھی وقت دو نکیلے دانتوں سے نکلنے والا زہرناک مواد میرے جسم میں سرائیت کر سکتا ہے۔

جیسے کوئی بھولی کہانی یاد آتی ہے...... جیسے تاریک بادلوں میں بجلی کوندتی ہے...... تاجور کی من موہنی صورت میری آنکھوں کے سامنے چمک کر اوجھل ہو گئی۔

شاید ٹھیک ہی کہا جاتا ہے جو لوگ رگ جاں میں بستے ہیں وہ بدترین اور بہترین موقعوں پر ضرور یاد آتے ہیں۔

اور پھر یہ جان لیوا...... بدترین موقع گزر گیا۔ میرے جسم پر سے سانپوں کی مکروہ سرسراہٹ معدوم ہو گئی۔ اب قادر خان کا امتحان تھا۔ وہ اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔

میں نے سرگوشی کی۔ ''قادر خان، ڈرنا نہیں، یہ کچھ نہیں کہیں گے۔''

قادر خاں مجسمے کی طرح ساکت بیٹھا رہا۔ سانپ اور سنپولیے اس پر رینگتے رہے۔ اس کے جسم کے نشیب و فراز کا جائزہ لیتے رہے...... پھر وہ آگے بڑھنے لگے۔ وہ اسے چھوڑ کر مخالف سمت میں جا رہے تھے۔ لیکن بالکل آخری مرحلے میں قادر خان نے دل چھوڑ دیا۔ جب ایک سانپ اس کی شلوار کے پائنچے میں داخل ہو کر ذرا اوپر کی طرف گیا۔ اس نے سانپ کا سر دبوچ لیا۔ سانپ نے وہی کیا جو اس کی جبلت کا حصہ تھا۔ اس نے پلک جھپکتے میں اپنے نکیلے دانت قادر خان کی پنڈلی میں گاڑھ کر زہر اس کے جسم میں انجیکٹ کر دیا۔ قادر خان کے ہونٹوں سے بے ساختہ دردناک کراہ نکلی۔ مجھے کوبرا کے جسم کا پچھلا حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے جسم پر چھوٹے چھوٹے گول نشان تھے، اس کی دم کا ارتعاش لرزہ خیز آواز پیدا کر رہا تھا۔ میں نے اسے کھینچ کر قادر خان کے جسم سے جدا کیا اور دور تاریکی میں پھینک دیا۔

قادر خان نے گھٹنے کے پاس سے اپنی پنڈلی کو تھام رکھا تھا اور بری طرح اینٹھ رہا تھا۔ اسے ایک جسیم سانپ نے کاٹا تھا اور یقیناً زہر کی ایک بڑی مقدار اس کے جسم میں داخل ہو

چکی تھی۔ اس نے اپنے ہونٹ مضبوطی سے بھینچ لیے تھے۔ اور پوری کوشش کر رہا تھا کہ کراہ کی آواز بلند نہ ہونے پائے۔ قادر کی قمیص کے نیچے شکاری چاقو موجود تھا۔ میں نے چاقو نکال کر اس کی شلوار کا پائنچہ اوپر تک کاٹ دیا۔ اسی کپڑے کی ایک لمبی پٹی علیحدہ کر کے میں نے زخم پر اوپر کی طرف کس کے باندھ دی۔ زخم کے اردگرد کی جگہ حیرت انگیز تیزی سے سوجتی چلی جا رہی تھی۔ قادر خان کو فوری طبی امداد کی ضرورت تھی۔ اور میرا اندازہ تھا کہ پارا ہاؤس کے نجی اسپتال میں سانپ کے کاٹے کے انجکشن وغیرہ موجود ہوں گے لیکن یہ سب تو تب سوچا جا سکتا تھا جب ہم اس خلا سے نکل سکتے۔ ہم سے صرف آٹھ دس میٹر کی دوری پر قاتل دشمن موجود تھا۔ وہ مسلح تھا اور بے حد مشتعل بھی میں پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔

میں نے رائفل کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور سرگوشی میں قادر سے کہا۔ ”میں باہر جا کر دیکھتا ہوں۔“

سخت تکلیف میں ہونے کے باوجود قادر نے مجھے ہاتھ سے روک لیا۔ ”نہیں شاہ زیب۔ ذرا انتظار کر لو۔“

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ فی الحال ہمارا انتظار کرنا ہی بنتا تھا۔ کم از کم اس وقت تک جب تک دہانے کے قریب موجود افراد یہاں سے ٹل نہ جاتے مگر اب انتظار کرنا مشکل تھا۔ قادر خان کو تیزی سے زہر چڑھ رہا تھا۔ اگر اس کی جان بچانا تھی تو پھر نکلنا ضروری تھا۔ ویسے بھی سانپوں سے بھری ہوئی اس کھوہ میں زیادہ دیر ٹھہرنا بدترین مصیبت کو دعوت دینا تھا۔

میں نے اندازہ لگایا کہ قادر خان کا گلا بالکل خشک ہو گیا ہے۔ اسے پانی کی شدید ضرورت تھی مگر پانی یہاں کہیں نہیں تھا۔ پتا نہیں کیوں مجھے بشیرے اور اس کے ساتھی پر شدید طیش آنے لگا جو دہانے سے ہٹنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ میں نے اپنے طور پر فیصلہ کیا اور قادر خان کے منع کرنے کے باوجود دہانے کی طرف رینگ گیا۔ ناگ ناگن بدستور ایک دوسرے سے لپٹے اپنے حال میں مست تھے۔ لگتا تھا کہ کوئی ان کے اوپر پاؤں رکھ کر بھی گزر جائے تو وہ شاید اسے اپنی مستی بھری مصروفیت کے سبب معاف کر دیں گے۔ میں ان کے پاس سے پیٹ کے بل رینگتا ہوا سوراخ تک پہنچ گیا۔ میں نے باہر جھانکا تو مجھے ایک ہیولا نظر آیا اور کھنکارنے کی آواز سنائی دی۔ یقیناً یہ بشیرا ہی تھا۔ اس کے چہرے کا صرف ایک رخ دکھائی دے رہا تھا۔ بھاری سیاہ مونچھیں اور ٹھوڑی پر کسی پرانے زخم کا گہرا نشان تھا۔ وہ آٹھ ایم ایم کی رائفل سونتے کھڑا تھا۔ اس کا رخ دوسری طرف تھا۔ اس کا کوئی ساتھی دکھائی تو نہیں دیا لیکن یقینی بات تھی کہ وہ یہاں اکیلا نہیں ہے۔

میں زیادہ سوچ بچار کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ جو ہو گا، دیکھا جائے گا کے مصداق میں نے باہر کی طرف کرالنگ کی جس وقت میں سوراخ میں سے گزر رہا تھا، شکاری چاقو میرے دانتوں میں دبا ہا تھا۔ یہ بڑے نازک لمحے تھے۔ اگر آہٹ پیدا ہوتی اور بشیرا میری طرف مڑ کر دیکھ لیتا تو میرے پاس فائر کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ فائر کی آواز اس پورے گینگ کو اس ٹیلے کی طرف متوجہ کر سکتی تھی۔

میں فائر کرنا نہیں چاہتا تھا اور میری یہ مراد پوری ہوئی۔ میں رینگ کر سوراخ میں سے نکل آیا۔ یہی وقت تھا جب بشیرے کو خطرے کا احساس ہوا لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ میں رائفل نیچے رکھ چکا تھا اور چاقو دانتوں سے نکال کر ہاتھ میں لے چکا تھا۔ میں بلندی پر تھا۔ بشیرا نیچے کھڑا تھا۔ میں نے اس پر پوری جست لگائی۔ میرے ہاتھ میں پکڑا ہوا دندانے دار چاقو دستے تک اس کے سینے میں گھس گیا۔ وہ اور میں اوپر نیچے گرے۔ میرے ہاتھ کی پشت پر گرم لہو کی پچکاری چلی۔ یہ بشیرے کا ہی خون تھا۔

بشیرے کی رائفل بھی اس کے ساتھ ہی ڈھلوان پر لڑھکی۔ میں نے اس کے سینے پر گھٹنا رکھ کر دھنسا ہوا چاقو باہر کھینچا۔ دس پندرہ فٹ کے فاصلے پر بشیرے کا وہی ساتھی موجود تھا جس سے اس کی گفتگو چل رہی تھی۔ وہ چند سیکنڈ کے لیے سکتہ زدہ رہ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا اور کوئی پکار بلند کرتا، میں نے دوسری بار جست لگائی اور اس پر جا پڑا۔ یہ ایک بیس بائیس سالہ نوجوان تھا۔ اس کی بدقسمتی یہ تھی کہ جب میں نے اس پر چھلانگ لگائی وہ ڈھلوان پر کھڑا شلوار کا ازار بند باندھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کچھ نہیں تھا۔ آٹھ ایم ایم رائفل زمین پر پڑی تھی۔ میں نے سب سے پہلے اس کا منہ ہی ڈھانپا۔ وہ ایک پلٹی کھا کر اوندھے منہ میرے نیچے گرا۔ میں نے پشت کی جانب سے اس کے دل کو نشانہ بنانے کے لیے اپنا چاقو والا ہاتھ اوپر اٹھایا، بھرپور وار کرنے کے لیے چاقو کے دستے پر میری گرفت مضبوط تھی۔ انگوٹھا دستے کے آخری سرے پر تھا۔ یہاں پر بالکل وہی سین ہوا جو کبھی کبھی کرکٹ کے کھیل میں نظر آتا ہے۔ بالر گیند پھینکنے کے لیے اپنا ہاتھ اوپر اٹھاتا ہے لیکن عین موقع پر گیند کا رخ یا اس کی لمبائی تبدیل کر دیتا ہے۔ بالکل آخری لمحات میں مجھے اپنے حریف کی صورت اور کم عمری پر ترس آیا۔ میں نے اس کے دل کے بجائے نیچے والی پسلیوں کو نشانہ بنایا۔ اس کی شدید مزاحمت یک لخت دم توڑ گئی۔ میں نے اسی کی رائفل کے دستے سے اس کے سر کے عقبی حصے پر فیصلہ کن ضرب لگائی۔ وہ ہوش وحواس سے بیگانہ ہو گیا۔

یہ ساری کارروائی بمشکل دس بارہ سیکنڈ میں مکمل ہو گئی تھی۔ بشیرے کا جسم دو تین بار اینٹھ

کر ساکت ہو چکا تھا۔ اس کے سینے سے ابلنے والا خون ڈھلوان پر رینگ رہا تھا۔ آنکھیں ساکت تھیں۔ اس کی آنکھوں میں وہی سرخ ڈورے تھے جو انسان کی عیش پرستی اور بوالہوسی کو ظاہر کرتے ہیں۔ اب وہ اپنی تمام آسودہ و نا آسودہ خواہشات سمیت عدم آباد کے سفر پر روانہ ہو چکا تھا۔

میں نے قرب و جوار میں نگاہ دوڑائی۔ اردگرد کوئی دکھائی نہیں دیا۔ ہاں کچھ فاصلے سے موٹر سائیکل کی پھڑ پھڑاہٹ ضرور سنائی دے رہی تھی۔

''قادر خان آ جاؤ۔'' میں نے آواز دی۔

وہ سوراخ میں سے رینگ کر باہر نکل آیا۔ اس کا چہرہ پسینے میں نہایا ہوا تھا اور جلد کی رنگت گہری ہوتی جا رہی تھی۔ وہ شدید کرب میں تھا۔ ''پانی ملے گا؟'' اس نے بمشکل کہا اور ڈھلوان پر لیٹ گیا۔

میں نے دوبارہ اردگرد نگاہ دوڑائی۔ واپس قادر خان کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں بند ہو چکی تھیں۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ میں نے اسے کندھے پر اٹھایا اور جھاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا ڈھلوان سے اترنے لگا۔ قادر کی رائفل میں نے اپنے کندھے پر لٹکالی تھی۔

موٹر سائیکلز کی دور افتادہ آواز بتا رہی تھی کہ وہ لوگ کافی فاصلے پر دائیں طرف ہیں۔ میں نے بایاں رخ اختیار کیا۔ کیونکہ سیدھا جاتا تو آگے ملٹری ایریا تھا۔ چوڑے چکلے قادر خان کو کندھے پر اٹھا کر چلنا آسان نہیں تھا مگر میں جیسے تیسے حتی الامکان رفتار کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ سردی کے باوجود جسم پسینے سے شرابور تھا۔ میرے اردگرد جھاڑیوں اور ٹیلوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اب دن کے گیارہ بج چکے تھے۔ کہرا ختم ہو چکا تھا اور دھوپ میں چمک تھی۔ میں نے ایک جھنڈ میں رک کر ذرا دم لیا۔ قادر خان کو پشت کے بل ریتیلی زمین پر لٹا دیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور رنگ سیاہی مائل ہونا شروع ہو گیا تھا۔ پنڈلی کا رنگ تو تقریباً سیاہ ہو چکا تھا۔ اس کی زندگی خطرے میں تھی۔

قریب ہی ایک چھوٹے سے شفاف گڑھے میں کسی پرانی بارش کا تھوڑا سا پانی موجود تھا۔ میں نے اپنے ہونٹ تر کیے اور کچھ پانی قادر کے بند ہونٹوں پر بھی ٹپکایا۔ قریباً دس منٹ بعد میں نے ایک بار پھر اسے کندھے پر لادا اور آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ اپنے اندازے کے مطابق میرا رخ پختہ سڑک کی طرف ہی تھا۔ (بعدازاں پتا چلا کہ یہ اندازہ غلط تھا) اردگرد سے کوئی مخدوش آواز بلند نہیں ہو رہی تھی۔ پھر بھی میں جانتا تھا کہ میں خطرے سے باہر نہیں ہوں۔

میں نے بائیں ہاتھ سے قادر خان کے بے ہوش جسم کو کندھے پر سہارا دے رکھا تھا اور دائیں ہاتھ میں رائفل اس طرح تھام رکھی تھی کہ وقت پڑنے پر اسے فوراً استعمال کر سکوں...... اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد مجھ پر انکشاف ہوا کہ ''وقت پڑ گیا ہے'' مجھے انجن کی مدھم آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی کسی شخص کی صدا ہوا کے دوش پر تیر کر کانوں سے ٹکرائی۔ بڑی کرخت اور مشتعل آواز تھی۔ میں چند خاردار جھاڑیوں کے عقب میں رک گیا اور پھر ایک گھٹنا ٹیک کر بیٹھ گیا۔ تاہم میں نے قادر خان کو کندھے سے اتارا نہیں تھا۔ اس کی سانسوں کی نہایت بوجھل آواز میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ اس کا سانس اب اٹکنا شروع ہو گیا تھا۔

یکا یک مجھے عقب سے بھی کسی موٹر بائیک کا مدھم شور سنائی دیا۔ سامنے والی گاڑی اب بالکل نزدیک آ گئی تھی۔ وہ جس طرح سیدھی میری طرف بڑھ رہی تھی۔ مجھے شک ہوا کہ انہوں نے میری جھلک دیکھ لی ہے۔ ایک بلند آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ''وہ دیکھو...... ان جھاڑیوں کے پیچھے کوئی ہے۔''

اب صورتِ حال واضح ہو گئی تھی۔ میرے سینے میں انگارے سے دہکنے لگے۔ یہ وہی انگارے تھے جو ڈنمارک میں ''ٹیکساری گینگ'' سے مڈبھیڑ کے موقع پر میرے سینے میں دہکا کرتے تھے۔ میں زندگی موت سے بے نیاز ہو جاتا تھا اور جان ہتھیلی پر رکھ کر ان لوگوں سے ٹکرا جاتا تھا جنہوں نے مجھے ''ہمیشہ خون اگلنے والے'' زخم لگائے تھے۔

آج پھر کسی ویسی ہی کیفیت مجھ پر طاری ہوئی۔ میں نے ہچکیاں لیتے ہوئے قادر خان کو بہ آہستگی زمین پر لٹا دیا اور رائفل سے نیا میگزین اٹیچ کر کے بالکل تیار ہو گیا۔ یہ ایک چھوٹی جیپ تھی۔ اس کھلی جیپ میں کم و بیش پانچ افراد سوار تھے۔ ان کے ہاتھوں میں آتشیں اسلحہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔

اچانک رائفل کے دستے پر میری گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ میں پہچان گیا، یہ دشمن نہیں، دوست تھے۔ یہ پاراہاؤس کے لوگ تھے۔ میں نے گنجے آقا جان کو صاف دیکھ لیا۔ اس کے پیچھے انیق بھی کھڑا نظر آ رہا تھا۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اب جیپ والوں نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ آقا جان کے چہرے پر دبا دبا جوش نظر آیا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے ساتھیوں کو رائفلیں نیچی کرنے کا حکم دیا۔ پھر وہ لوگ چھلانگیں لگا کر نیچے اترے۔ موٹر سائیکل بھی ایک چکر کاٹ کر جیپ کے نزدیک پہنچ گئی تھی۔ موٹر سائیکل سوار کا تعلق بھی پاراہاؤس ہی سے تھا۔

انیق دوڑتا ہوا میرے پاس پہنچا۔ ''آپ ٹھیک تو ہیں شاہ زیب بھائی؟'' اس نے جیسے

سرتاپا مجھے نگاہوں سے ٹٹولا۔
''ہاں، میں ٹھیک ہوں لیکن قادر خان ٹھیک نہیں۔''
آقا جان اور انیق وغیرہ قادر خان پر جھک گئے۔ اس کی پنڈلی سے مسلسل گاڑھا سیاہی مائل خون رِس رہا تھا۔ ''اسے کوبرا نے کاٹا ہے۔ اسے فوراً اسپتال پہنچانا ہوگا۔'' میں نے اطلاع دی۔
ان لوگوں نے پلک جھپکتے میں قادر خان کو اٹھا کر کھلی چھت والی جیپ میں ڈالا۔ میں بھی سوار ہو گیا۔ ایک جیپ سوار، موٹر سائیکل والے کے پیچھے بیٹھ گیا۔ ہم تیزی سے پختہ سڑک کی طرف روانہ ہوئے۔ میں نے آقا جان سے پوچھا۔ ''سجاول اور ابراہیم پہنچ گئے؟''
''ہاں، ان سے ہی ہمیں پتا چلا کہ تم اور قادر پیچھے رہ گئے ہو۔ ہم جیپ لے کر نکل کھڑے ہوئے۔'' آقا جان نے کہا۔
''سجاول اب کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''وہ بھی تمہیں ڈھونڈنے کے لیے نکلا ہوا ہے۔ وہ چار افراد دوسری گاڑی پر ہیں۔ ان کے ساتھ بھی ایک موٹر سائیکل ہے۔''
اسی دوران میں دوسری موٹر سائیکل کی آواز بھی آنے لگی۔ یہ آواز دائیں جانب قریباً ایک ڈیڑھ فرلانگ کی دوری سے آرہی تھی۔ آقا جان نے فوراً سیل فون پر رابطہ کیا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم اس دوسری جیپ کے پاس پہنچ گئے جس پر سجاول وغیرہ موجود تھے۔
سجاول مجھے دیکھ کر گاڑی سے اتر آیا اور گلے لگا لیا۔ بے ہوش قادر خان کو دیکھ کر اسے بھی سخت تشویش ہوئی۔ میں نے مختصر لفظوں میں سجاول کو بتایا کہ قادر خان کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ ہم مزید وقت ضائع کیے بغیر فوراً آگے روانہ ہو گئے۔ پختہ سڑک پر پہنچنے تک ہمیں 'ناقب اینڈ کمپنی' سے مڈبھیڑ کا خدشہ رہا لیکن سڑک پر پہنچنے کے بعد یہ خدشہ نہ ہونے کے برابر رہ گیا۔ ہم تیزی سے پاراہاؤس کی طرف بڑھنے لگے۔

○......❖......○

قادر خان کو تو اسپتال میں داخل ہونا ہی تھا، پاراہاؤس کے ڈاکٹروں نے مجھے بھی وہیں پر روک لیا۔ میرے جسم پر کندھے اور پیٹ کے بالائی حصے پر شدید جلن ہو رہی تھی۔ جب میرے کپڑے اتروا کر دیکھا گیا تو وہاں گہرے سرخ نشان دکھائی دیئے جو نمایاں طور پر ابھرے ہوئے تھے۔ درحقیقت کھوہ کی تاریکی میں میرے جسم پر آزادنہ سانپ رینگتے رہے تھے اور یہ بھی ممکن تھا کہ ان میں کچھ اور حشرات الارض بھی ہوں۔ بہرحال جسم پر نشان

ڈاکٹروں کے لیے تشویش کا باعث تھے۔ وہ دیکھنا چاہ رہے تھے کہ ان نشانات کے اثرات زیادہ گہرے تو نہیں ہو رہے۔ مجھے انجکشن لگایا گیا اور سرخ نشانات کو کسی مرہم کے ساتھ ٹریٹ بھی کیا گیا۔ ہلکا سا ٹمپریچر بھی محسوس ہو رہا تھا۔

میں سارا دن اسپتال میں رہا۔ رات آٹھ بجے کے لگ بھگ ڈاکٹروں کی تسلی ہوئی اور انہوں نے میری جان چھوڑی۔ انیق بدستور میرے آس پاس ہی رہا۔ میں نے اس سے قادر خان کی طبیعت کے بارے میں پوچھا۔ اس نے کہا۔ ''قادر خان کی حالت ٹھیک نہیں۔ وہ مسلسل بے ہوش ہے۔ کبھی کبھی اس کے دل کی دھڑکن بھی خراب ہو جاتی ہے۔''

میں قادر خان کو دیکھنا چاہتا تھا مگر انیق نے بتایا کہ وہ انتہائی نگہداشت میں ہے اور ڈاکٹر کسی کو اس سے ملنے نہیں دے رہے۔

''پاراہاؤس کے رہائشی حصے میں کیا پوزیشن ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''رات کو یہاں سے نکلتے وقت حملہ آوروں نے شکیل داراب کو رہا کر دیا تھا۔ اس رہائی کے فوراً بعد اس نے پولیس بلا لی تھی۔ پولیس بھی رات کو اپنے طور پر کارروائی کرتی رہی ہے۔ پولیس افسروں کا خیال تھا کہ ابراہم کو اغوا کے بعد شاید سرحدی علاقے کی طرف لے جایا گیا ہو گا۔ یہ کسی کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ پاراہاؤس سے بہت زیادہ دور نہیں گیا۔ جب سجاول اسے واپس لے کر پہنچا تو اصل صورتِ حال کا پتا چلا۔''

''لاشوں وغیرہ کا کیا ہوا؟''

''وہ سب پولیس نے اپنی تحویل میں لے لیں۔ انہیں پوسٹ مارٹم کے لیے شہر بھیج دیا گیا ہے۔ شکیل داراب ابھی تک یہاں پر ہی ہے اور آج دوپہر تک قانونی کارروائی مکمل کرانے میں مصروف تھا۔ اس کی موجودگی میں پولیس کی زبردست دوڑیں لگی رہی ہیں......''

میں اور انیق اسپتال سے باہر نکلنے کے لیے راہداری میں آ گئے تھے، جب اسپتال کے عملے میں کھلبلی سی نظر آئی۔ انیق نے ایک بندے سے پوچھا تو پتا چلا کہ شکیل داراب میری خبر گیری کے لیے آ رہا ہے۔ چند ہی سیکنڈ بعد وہ دکھائی دے دیا۔ اس کے ساتھ چار پانچ دیگر افراد بھی تھے۔ گارڈز کا ایک دستہ بھی عقب میں آ رہا تھا۔

وہ مجھے دیکھ کر حیران ہوا۔ حیرانی اس بات کی تھی کہ میں اب بستر کے بجائے اپنے قدموں پر تھا۔ شکیل داراب نے مجھ سے مصافحہ کیا اور بولا۔ ''تمہیں اپنے پاؤں پر دیکھ کر خوشی ہوئی۔''

''مجھے بھی آپ کو صحیح سلامت پا کر خوشی ہوئی۔''

''سی سی ٹی وی پر ہم نے وہ سارے منظر دیکھے ہیں جن میں تم نے ڈٹ کر ناقب اور اس کے ساتھیوں کا مقابلہ کیا۔ میں نے تمہیں اسکرین پر دیکھ کر پہچان تو لیا تھا لیکن یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ تم ہی ہو۔''

''یقین کیوں نہیں آرہا تھا؟'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تمہاری اور میری اکلوتی ملاقات اسٹیشن وین میں ہوئی تھی اور اس ملاقات میں ہمارے درمیان کچھ باتیں طے ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ تم پاکستان سے چلے جاؤ گے۔''

''ہر کام میں قدرت نے کوئی بہتری چھپا رکھی ہوتی ہے۔ اگر میں چلا گیا ہوتا تو شاید آج یہاں کی صورتِ حال بھی ویسی نہ ہوتی جیسی اب نظر آرہی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ آپ نے میرے ساتھ ساتھ سردار سجاول کو بھی پہچان لیا ہوگا؟''

''نہیں، میں نے بس سجاول کا نام سنا ہوا تھا۔ کبھی اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ یہ تو آج ہی پتا چلا ہے کہ یہ وہی سجاول ہے جس کا نام چاندگڑھی وغیرہ میں لیا جاتا ہے۔''

شکیل داراب کا رویہ دوستانہ نظر آرہا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ یہ شخص ان مفاد پرست سیاست دانوں میں سے ہے جو اپنے مطلب کے بغیر کسی کے سلام کا جواب دینا بھی پسند نہیں کرتے۔ میں اور انیق، شکیل داراب کے ساتھ پارا ہاؤس کے رہائشی حصے میں پہنچے۔ کل رات ہلاک ہو جانے والے افراد کا دکھ تو پارا ہاؤس کی فضا میں محسوس کیا جا سکتا تھا لیکن اس کے ساتھ ابراہم کی بحفاظت بازیابی کی خوشی بھی دکھائی دے رہی تھی۔

پارا ہاؤس کی وسیع و عریض نشست گاہ میں کافی لوگ موجود تھے۔ ان میں بڑے صاحب کے علاوہ آقا جان، ابراہم اور ابراہم کا بڑا بھائی کمال احمد بھی تھا۔ کمال احمد، ابراہم کی نسبت قدرے صحت مند تھا۔ شکل سے وہ بھی شریف النفس اور کسی حد تک دین دار نظر آتا تھا۔ یعنی دونوں بیٹے اپنے باپ ''بڑے صاحب'' کا الٹ دکھائی دیتے تھے۔ میں نے بڑے صاحب کو ادب سے سلام کیا۔ بڑے صاحب نے مالے زبان میں کچھ کہا جس کا ترجمہ کرتے ہوئے مترجم نے بتایا۔ ''عزت مآب کا کہنا ہے کہ تم نے چھوٹے صاحب کو حملہ آوروں کے چنگل سے نکالنے کے لیے جس طرح سجاول صاحب کی مدد کی، وہ تمہارے بہت شکر گزار ہیں اور تمہاری اس خدمت کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔''

میں نے پھر بڑی عاجزی سے شکریہ ادا کیا۔ بڑے صاحب نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے ایک نشست پر بیٹھنے کی ہدایت کی۔ میں عقبی نشست پر بیٹھ گیا۔ سجاول کو یہاں بڑی اہم

جگہ ملی ہوئی تھی۔ وہ ابراہم کے بالکل ساتھ ایک شاندار کرسی پر براجمان تھا۔ مجھے سجاول کے ہاتھ میں نیلم کے پتھر والی ایک انگوٹھی نظر آئی۔ نیلم اتنا شاندار تھا کہ دور ہی سے چمکارے مار رہا تھا۔ میں نے انیق کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ انگوٹھی پہلے تو سجاول کی انگلی میں نہیں تھی؟''

''یہ اب اس کی انگلی میں تشریف لائی ہے۔ پاراہاؤس کی بڑی بیگم نے خوش ہو کر اسے انعام میں دی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ انگوٹھی دیتے ہوئے بڑی بیگم نے کوئی اور بات بھی کہی ہو گی۔''

''کیسی بات؟''

''ویسی ہی جیسی کہانیوں میں ہوتی ہے یا پھر گل بکاؤلی یا ہزار داستان جیسی فلموں میں۔ بادشاہ یا ملکہ کسی وفادار کی خدمت سے سرشار ہو کر اسے انگوٹھی دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ زندگی میں جب کبھی بھی ضرورت پڑے، یہ انگوٹھی دکھا کر کچھ بھی مانگ لینا۔ مغلِ اعظم میں بھی تو پرتھوی راج نے مدھو بالا کی ماں کو ایسے ہی انگوٹھی دی تھی۔''

''یہ سردار سجاول تم سے بہت تپا ہوا رہتا ہے۔ کہیں یہ نہ ہو کہ وہ یہ انگوٹھی بڑی بیگم کو دکھا کر تمہیں ہی ان سے مانگ لے۔''

''میرا اچار ڈالے گا؟''

''اچار کا تو پتا نہیں لیکن اپنے ڈیڑھ فٹ کے چھرے سے تمہارا کوئی اہم عضو ضرور کاٹ ڈالے گا اور ہو سکتا ہے کہ یہ عضو تمہاری زبان ہی ہو۔ تم اسے بہت زیادہ چلاتے ہو۔''

''شاہ زیب بھائی، زبان تو اللہ نے دی ہی چلانے کے لیے ہے، آپ کی اس بات پر مجھے پہلوان جناب حشمت راہی کا ایک شعر یاد آ گیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔ سیانے کہتے ہیں کتنی وڈی ہے اللہ کی یہ شان دیکھو، مرد مرے تو اس کی نبض دیکھو، عورت مرے تو زبان دیکھو۔''

شاید انیق اپنی زبان کو مزید حرکت دیتا چلا جاتا لیکن اسی دوران میں دو لڑکیاں چست لباس پہنے نمودار ہوئیں۔ ان کے ریشمی لبادوں کے گریبان تا حدِ نگاہ پھیلے ہوئے تھے۔ سروں پر پھولوں کی آرائش تھی۔ یہاں بیشتر اشیا میں پھولوں خاص طور سے سرخ گلابوں کی آرائش نظر آتی تھی۔ ہمیں معلوم ہوا تھا کہ گلاب بڑے صاحب کی بہت بڑی کمزوری ہے۔

لڑکیوں کے ہاتھوں میں کپڑے تھے...... اور ایک ڈبا سا کپڑوں کے اوپر رکھا تھا۔ آقا جان نے ڈبا کھولا اور ایک نہایت قیمتی کولٹ پستول جس کی قیمت میرے اندازے کے مطابق

پانچ لاکھ پاکستانی روپے سے کم نہیں تھی، نکال کر بڑے صاحب کو پیش کیا...... سردار سجاول اپنی جگہ سے کھڑا ہو چکا تھا۔ بڑا صاحب بھی کھڑا ہوا اور اس نے یہ بیش قیمت ہتھیار سجاول کو بطور انعام عنایت کیا۔ سردار سجاول نے جھک کر اس نوازش کا شکریہ ادا کیا۔

تب ایک کامدار جوڑا سجاول کو دیا گیا۔ یہ ایک طرح کی خلعت تھی جس سے سجاول کو سرفراز کیا گیا تھا۔ ہم دور ہی سے دیکھ سکتے تھے اس سرخ خلعت پر سونے کے تاروں کا کام کیا گیا تھا۔ مجھے اور انیق کو بھی ایک ایک خلعت دی گئی لیکن یہ کم تر درجے کی تھی۔ ایسی ہی خلعتیں تین چار اور افراد کو بھی دی گئیں۔

اپنی پُرشکوہ نشست پر بیٹھے بیٹھے بڑے صاحب ریان فردوس نے مالے میں ایک چھوٹی سی تقریر کی۔ اس کا ترجمہ کچھ یوں تھا۔

”کل رات، شام نو بجے کے بعد جو خونی ڈراما پارا ہاؤس میں شروع ہوا تھا، وہ اب اختتام پذیر ہو چکا ہے۔ اس خطرناک صورتِ حال سے ہمیں جہاں کچھ سبق بھی حاصل ہوئے ہیں وہاں بہت سے نمک حلالوں اور نمک حراموں کی پہچان بھی ہوئی ہے۔ پارا ہاؤس کے تمام سکیورٹی گارڈز کی چھان بین کی جا رہی ہے اور اب صرف ان لوگوں کی ملازمت ہی بحال ہو گی جن کی طرف سے ہر طرح کا اطمینان ہو جائے گا۔ اس نہایت مشکل وقت میں جن لوگوں نے میری فیملی کے لیے اپنی جان ہتھیلی پر رکھی ان میں نمایاں ترین نام مسٹر سجاول کا ہے۔ سجاول نے نہ صرف یہ کہ پارا ہاؤس کے اندر حملے کی شروعات میں بے مثال دلیری کا مظاہرہ کیا بلکہ اس کے بعد جب ہمارے بیٹے ابراہم کو حملہ آوروں نے یرغمال بنایا اور اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب ہو گئے تو بھی اس نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ اپنے ساتھی شاہ زیب کے ساتھ اس مقام تک جا پہنچا جہاں ابراہم کو آگے لے جانے سے پہلے رکھا جانا تھا۔ ابراہم کی رہائی کے وقت بھی زبردست معرکہ ہوا جس میں سجاول کے علاوہ اس کے ساتھی شاہ زیب نے بھی بھرپور کردار ادا کیا۔ بدبخت ناقب کی اندھا دھند یلغار اور گولیوں کی بوچھاڑ میں سجاول، چھوٹے صاحب ابراہم کو بحفاظت نکالنے اور پارا ہاؤس پہنچانے میں کامیاب رہا۔ اس جان لیوا کارروائی کے دوران میں انچارج گارڈ قادر خان بھی ایک حادثے کے سبب شدید زخمی ہوا ہے اور اس وقت موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ ہم اس کی زندگی کے لیے دعاگو ہیں......

”بدبخت ناقب اور اس کا ساتھ دینے والے دیگر غداروں کے گرد گھیرا تنگ کیا جا رہا ہے۔ مقامی پولیس بھی اس سلسلے میں زبردست تعاون کر رہی ہے۔ امید ہے کہ یہ لوگ جلد

سلاخوں کے پیچھے ہوں گے......"
تقریر ختم ہوئی تو انیق نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔"اس کہانی میں تو آپ کا یہ امریش پوری سجاول ہی سجاول چھایا ہوا ہے۔آپ کا ذکر تو بس مہمان داری کے طور پر ہی ہوا ہے۔"
"چلو ہوا تو ہے۔"
"لیکن یہ تو سراسر ناانصافی ہے۔صغیر کا بازو توڑ کر اس کے ٹھکانے کا کھوج آپ نے لگایا۔وہاں ہونے والی لڑائی میں آپ نے اپنی جان خطرے میں ڈالی اور پل پر حملہ آوروں کو روکا تاکہ یہ امریش پوری (سجاول) ابراہیم کو حفاظت سے لے کر نکل سکے لیکن اس بات کا کہیں ذکر ہی نہیں۔"
"اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ویسے بھی ایک چھوٹی سی تقریر میں یہ ساری باتیں تو نہیں کہی جاسکتی تھیں ناں۔"
"یہ بات نہیں۔مجھے تو لگتا ہے سجاول نے یہ بات ویسے ہی گول کر دی ہے تاکہ اس کی مارکیٹ ویلیو میں فرق نہ آئے۔"
"تمہارا مطلب ہے کہ یہ پاراہاؤس والوں کی نگاہ میں اپنی اہمیت بڑھا رہا ہے۔"
"اس میں کیا شک ہوسکتا ہے۔اصل کام آپ نے دکھایا ہے اور خیر سے بڑے صاحب کے پہلو میں یہ بیٹھا ہوا ہے۔انگوٹھیاں اس کو پہنائی جارہی ہیں۔"
"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے نکو شہزادے۔"میں نے اسے اسی نام سے پکارا جس سے سجاول پکارتا تھا۔
"فرق پڑتا ہے......ایک تو میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ آپ جان بوجھ کر پیچھے کیوں رہتے ہیں۔چاند گڑھی میں آپ نے وہاں کے لوگوں اور تاجور وغیرہ کے لیے کافی کچھ کیا لیکن اس کا کریڈٹ اپنے بجائے کسی نشئی یاسر بھائی کو دے دیا۔وہ یاسر بھائی کسی قبرستان میں چرس کا سوٹا لگا کر پڑا ہوگا اور لوگ اس کی ہمت اور خداترسی کے گن گاتے پھرتے ہیں۔اب یہاں آپ اپنی ساری محنت اس موٹی ناک والے سجاولے کے کھاتے میں ڈال رہے ہیں۔"
"اس کا بھی تو اپنا ایک مزہ ہوتا ہے۔"میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"بس آپ مزے لیتے رہیں اور یہ سجاول کوئی "عظیم الشان" کام دکھا کر رفوچکر ہو جائے گا اور ہوسکتا ہے کہ جاتے جاتے ہمارے لیے عدم آباد کا ٹکٹ کاٹ جائے۔"
"ایسا کچھ نہیں ہوگا یار! اگر سجاول کی ویلیو یہاں بڑھ رہی ہے تو یہ ہم سب کے کام ہی

آئے گی۔''

''مجھے تو یہ وہی راج کپور کی پرانی فلم برسات والا سین لگ رہا ہے، جس میں......''

میں نے اس کی بات کاٹی۔ ''آج مجھے ایک بات بتاؤ، ابھی تمہارے دودھ کے دانت گرے بھی زیادہ دیر نہیں ہوئی اور تم باتیں کرتے ہو چندر گپت موریہ کے دور کی۔ یہ پرانی فلمیں، پرانے گانے اور ڈرامے...... یہ سب کیا ڈراما ہے؟''

''سچی بات بتاؤں؟''

''بتا ہی دو ورنہ آج میں سجاول کو بتا دوں گا کہ تم نے اسے موٹی ناک والا کہا ہے، اور اس کے بارے میں کچھ اور گھٹیا باتیں بھی کی ہیں۔''

انیق نے ڈرنے کی اداکاری کی...... اور خوف زدہ نظروں سے سجاول کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''یہ غضب نہ کیجیے گا شاہ زیب بھائی۔ میری بیوی شادی سے پہلے ہی بیوہ ہو جائے گی اور میرے بچے پیدا ہونے سے پہلے ہی مر جائیں گے۔ یہ بڑا ظالم شخص ہے۔ میں نے اسے بہت چنگی طرح دیکھ لیا ہے۔ میں آپ کو اصل بات بتا دیتا ہوں۔ دراصل میں دیکھنے میں چھوٹا نظر آتا ہوں لیکن میری عمر 65 سے اوپر ہے۔ ہماری فیملی میں یہ خاص بات ہے کہ ہم بوڑھے ہونے کے باوجود جوان ہی نظر آتے ہیں۔ یہ جو آپ جاوید شیخ، شان اور معمر رانا وغیرہ کو دیکھ رہے ہیں یہ ہماری ہی لڑی سے ہیں۔''

''یعنی تم درحقیقت بوڑھے ہو؟''

''بالکل۔''

میں نے اس کی نچلی پسلیوں میں کہنی کی خاص چوٹ لگائی وہ تکلیف سے دہرا ہو گیا اور اس کے منہ سے بے ساختہ ''اوہ شٹ'' نکل گیا۔

میں نے کہا۔ ''اب یہ اپنا ''اوہ شٹ'' ہی دیکھ لو۔ یہ کوئی بوڑھا شخص نہیں بول سکتا۔ یہ نئی نسل کا لفظ ہے۔''

''اس چھوٹی سے غلطی کا مطلب یہ نہیں کہ آپ مجھ سے میری بزرگی چھین لیں۔'' وہ کراہتے ہوئے بولا۔

اسی دوران میں شکیل داراب کو فون موصول ہوا۔ اس نے کال ریسیو کی۔ اس کے سرخ وسپید چہرے پر دبا دبا جوش دکھائی دیا۔ پھر اس نے جھک کر حلمی کے کان میں کچھ کہا۔ حلمی نے بڑے صاحب کے کان میں سرگوشی کی۔ یہی وقت تھا جب تین پولیس موبائلز بڑی تیزی سے پارا ہاؤس کے پورچ میں داخل ہوئیں۔ میں نے دور ہی سے دیکھ لیا ایک گاڑی کی نیلی باڈی

میں گولیوں کے کئی سوراخ نظر آرہے تھے۔

حلمی نے کھڑے ہوکر اعلانیہ انداز میں حاضرین سے کہا۔ "آپ لوگوں کے لیے ایک اچھی خبر ہے۔ جناب شکیل صاحب کی ذاتی توجہ اور کوشش سے ہمیں کامیابی ملی ہے۔ پارا ہاؤس پر حملہ آور ہونے والوں کا سرغنہ اور اس کے دو ساتھی گرفتار ہو گئے ہیں۔"

اس خوش کن اطلاع کے فوراً بعد شکیل داراب لمبے لمبے ڈگ بھرتا پولیس کی گاڑیوں کی طرف چلا گیا۔ حلمی، سجاول اور چند دیگر افراد بھی اس کے ساتھ تھے۔ شکیل اس صوبے کا ایک نہایت طاقتور سیاست داں تھا۔ اس کی ذاتی توجہ کیوں رنگ نہ لاتی اور اغوا کے مجرم کیوں گرفتار نہ ہوتے؟ یہ کسی غریب کا بچہ تو نہیں تھا کہ کئی دن تک جس کی ایف آئی آر ہی درج نہ ہوتی۔

ناقب اور اس کے ساتھیوں کو پولیس موبائل سے اتار کر ایک قریبی کمرے میں لے جایا گیا۔ میں بس ناقب کی ایک جھلک ہی دیکھ سکا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ پولیس نے اسے کافی بھاگ دوڑ اور مارا ماری کے بعد گرفتار کیا ہے۔ اس کے کپڑوں پر لہو کے داغ دور ہی سے دکھائی دے رہے تھے۔

سجاول اپنی نشست سے اٹھ کر میری طرف آیا، اس کی تیکھی مونچھوں کے نیچے ایک مطمئن مسکراہٹ تھی۔

"اب کیا ارادے ہیں؟" میں نے سجاول سے پوچھا۔

"ارادے کیا ہیں، فی الوقت تو ہم پارا ہاؤس کے ہی مہمان ہیں۔"

انیق بولا۔ "ہم تو شاید مہمان ہیں لیکن آپ تو یقیناً مہمانِ خصوصی ہیں۔"

انیق کے لہجے میں چھپے ہوئے طنز کو محسوس کر کے سجاول کے تیور بگڑنے لگے لیکن میں نے فوراً بات بدل دی۔ "اب کہاں جانا ہے ہمیں...... کچھ بھوک بھی لگ رہی ہے۔"

"آؤ میرے ساتھ۔" سجاول نے بھاری آواز میں کہا۔

ہم اس کے ساتھ چل دیئے۔ تین چار خادم بڑے مؤدب انداز میں ہمارے ساتھ تھے۔ دو گارڈز بھی عقب میں آرہے تھے۔ ہم ایک بار پھر اسی مہمان خانے میں آ گئے جہاں ہم کل کا ہنگامہ شروع ہونے سے پہلے تھے۔ تب ہم کھانے کا انتظار کر رہے تھے مگر کھانے کی جگہ حملہ آوروں نے ہمیں گولیاں کھلانے کی کوشش کی تھی۔ اب واقعی بے طرح بھوک لگی ہوئی تھی۔

ہم سیدھا مہمان خانے کے ڈائننگ ہال میں گئے۔ گارڈز ہمارے پاس ہی موجود

تھے۔اس لیے کوئی اہم بات نہیں کی جا سکتی تھی۔ چند منٹ کے اندر ایک نہایت پُر تکلف کھانا ہمارے سامنے چن دیا گیا۔ اہم ترین ڈش شکار کیے ہوئے تلور کا سالن تھا۔ ہاں یہی پرندہ تھا جس کو شکار کرنے کی چاہ میں شکیل داراب کل خود شکار ہوتے ہوتے بچا تھا۔ وہ سارے مناظر نگاہوں کے سامنے گھوم گئے۔ حملہ آوروں نے ابراہیم کے ساتھ ساتھ شکیل کو بھی مرغی کی طرح باندھ کر فرش پر ڈالا ہوا تھا اور خوفناک نتائج کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ ہم نے یہ سب کچھ سی سی ٹی وی پر دیکھا تھا۔ اب شکیل داراب آزاد ہو گیا تھا اور اپنے اثر و رسوخ سے علاقے کی ساری انتظامی مشینری کو حرکت میں لے آیا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا تھا کہ 24 گھنٹے پورے ہونے سے پہلے پہلے مجرم دھر لیے گئے تھے۔

کھانا ختم ہوا ہی تھا کہ زخمی قادر خان کا اسسٹنٹ رفاقت اندر آیا اور اس نے سجاول کے قریب جھک کر اس کے کان میں کچھ کہا۔

سجاول اٹھ کر اس کے ساتھ چل دیا مگر دروازے پر پہنچ کر رک گیا اور اس نے مجھے بھی ساتھ آنے کو کہا۔

ہم چند راہداریوں سے گزرے۔ کل والے خونی ہنگامے کے بعد پورے پارا ہاؤس میں ریڈ الرٹ کی سی کیفیت تھی۔ بیشتر دروازے مقفل تھے، صرف ضروری راستے کھلے رہنے دیئے گئے تھے۔ گارڈز پوری طرح چوکس تھے اور نگرانی والے کیمرے اپنا کام کر رہے تھے۔ ہم پارا ہاؤس کے رہائشی حصے میں داخل ہوئے۔ ایک کمرے میں سنبل ہماری منتظر تھی۔ وہ کل شام سج سنور کر اس عالیشان محل میں پہنچی تھی۔ بڑے صاحب نے اسے منظورِ نظر کی حیثیت دی تھی اور اسے اپنی ''خدمت'' کے لیے منتخب کیا تھا۔ لیکن یہ ''خدمت'' اور خدمت گزاری کے سارے پروگرام کل رات گولیوں کی بوچھاڑوں اور خون کی پچکاریوں میں غارت ہو گئے تھے۔

پتا چلا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے سجاول نے خود سنبل سے ملنے اور اس کی خیر خیریت دریافت کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ بڑے صاحب نے اس کی درخواست مانتے ہوئے اسے یہاں سنبل کے پاس بھیج دیا تھا۔

سنبل اب کل والے زرق برق لباس کے بجائے ذرا دھیمے رنگوں والے کپڑوں میں نظر آ رہی تھی۔ وہ یہاں ہونے والے خون خرابے سے بہت ڈری سہمی بھی تھی۔ سجاول نے اسے تسلی تشفی دی اور سمجھایا کہ کل رات والا واقعہ محض ایک اتفاق تھا۔ یہاں اس چار دیواری میں اسے کسی طرح کا کوئی خطرہ لاحق نہیں۔

وہ منمنا کر بولی۔ ”مجھے یہاں بہت ڈر لگ رہا ہے۔ آپ لوگ مجھے چھوڑ کر نہ جائیں۔“

”تم بے فکر رہو۔“ سجاول نے کہا۔ ”بڑے صاحب بہت چنگے بندے ہیں۔ تمہیں بڑے آرام سے رکھیں گے۔ ویسے ہم بھی ابھی ادھر ہی ہیں۔ تمہارے آس پاس ہی موجود رہیں گے۔“

وہ اپنی حنائی انگلیاں مروڑ کر رہ گئی۔ اپنی کم عمری کی وجہ سے وہ کافی معصوم نظر آتی تھی۔ تاہم مرد وزن کے تعلق...... اور ان کے باہمی شوق اور اشتیاق کے ساری رمزوں سے وہ آگاہ تھی۔ اگر نہ ہوتی تو اس طرح خوشی خوشی یہاں بکنے کے لیے اور خود کو پیش کرنے کے لیے کیوں آجاتی۔ اب یہ اور بات تھی کہ اس کے ساتھ وہی محاورے والی بات ہوئی تھی کہ سر منڈواتے ہی اولے پڑ گئے۔

سجاول سے بات کرتے کرتے وہ کسی وقت متوحش نگاہوں سے در و دیوار کو دیکھنے لگتی تھی۔ اس نے بتایا کہ کل شام کے بعد جب ہنگامہ شروع ہوا تھا تو بڑے صاحب نے اپنی ایک اور خواص کے ساتھ اسے بالائی منزل پر بھجوا دیا اور چار زنانہ پہرے دار اس کی حفاظت پر لگا دیں۔ اب تک وہ بالائی منزل پر ہی ٹھہری ہوئی تھی۔

اس نے کہا۔ ”جب اوپر والی منزل پر بھی گولیاں چلنے لگیں اور رونا پیٹا مچ گیا تو میں تھوڑی دیر کے لیے بے ہوش ہو گئی تھی۔ بڑے صاحب کی خواص نے میرے منہ پر چھینٹے دے دے کر مجھے ہوش کرائی۔ بعد میں اس نے بتایا کہ حملہ کرنے والوں نے بڑے صاحب کے چھوٹے بیٹے کو زخمی کر کے پکڑ لیا ہے۔ اس کے بعد پہرے دارنیاں ہمیں اس کمرے سے نکال کر اندر کی طرف ایک دوسرے کمرے میں لے گئیں۔ یہ بڑا شاندار اور سجا سجایا کمرا ہے اور یہاں کھڑکیوں پر لوہے کی گرلیں لگی ہوئی ہیں......“

سجاول اور سنبل بہت دھیمے لہجے میں بات کر رہے تھے۔ اندیشہ تھا کہ اس کمرے میں بھی کوئی ڈکٹا فون قسم کی شے موجود نہ ہو۔ بظاہر تو اس طرح کی کوئی شے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ سجاول نے سنبل سے پوچھا۔ ”اور کوئی خاص بات نوٹ کی تم نے؟“

اس نے تھوک نگل کر اثبات میں سر ہلایا۔ ”مجھے تو یہاں بہت کچھ عجیب لگ رہا ہے۔ بڑے صاحب کے چھوٹے بیٹے ابراہیم کی طرح بڑا بیٹا کمال بھی نمازی اور پرہیز گار ہے۔ سنا ہے کہ ایک دن چھوڑ کر ایک دن روزہ بھی رکھتا ہے لیکن حرکتیں اس کی بھی کچھ اور طرح کی ہیں۔ ابھی کوئی دو ڈھائی گھنٹے پہلے میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھا تو باہر دھواں سا اٹھ رہا تھا۔ پھر زور زور سے بولنے کی آوازیں آئیں۔ ایسے لگا کہ آگ لگ گئی ہے۔ میں نے

اور خواص نے آگے جا کر دیکھا تو ہم دونوں حیران رہ گئے۔ ایک دروازے سے باہر بڑے قیمتی کپڑوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ یہ سارے زنانہ کپڑے تھے۔ کئی ایک پر تو موتی اور سونے کے تار بھی لگے ہوئے تھے۔ ان میں زیور اور زنانہ جوتیاں بھی تھیں اور چادریں وغیرہ بھی۔ کمال نے ان پر پیٹرول چھڑک کر آگ لگا دی تھی۔ ملازم اور گارڈ بھاگے ہوئے آئے۔ کچھ خواصیں (بیگمات) بھی پہنچ گئیں۔ انہوں نے پھیلنے سے پہلے ہی آگ کو بجھا دیا۔ بڑی بیگم ''کمال'' کو سمجھا بجھا کر اندر لے گئیں۔

''کیا چکر تھا یہ؟'' سجاول نے پوچھا۔

''بڑی بیگم اور کمال وغیرہ دوسری زبان میں بات کر رہے تھے۔ کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ پر اتنا پتا چل رہا تھا کہ کمال زار و قطار رو رہا ہے اور ان چیزوں کی بات ہی کر رہا ہے جو اس نے جلانے کی کوشش کی ہے۔''

''تم نے اپنے ساتھ والی خواص سے کچھ پوچھا؟'' میں نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے سنبل سے دریافت کیا۔

وہ انگلیاں مروڑتے ہوئے بولی۔ ''ہاں...... پوچھا تو سہی، مگر اس نے بس گول مول بات کی۔ بس اتنا بتایا کہ چھوٹے صاحب کمال کچھ پریشان رہتے ہیں۔ ان کی شادی ہوئی لیکن بیوی تھوڑے دنوں بعد ہی مر گئی تھی۔''

''ہوسکتا ہے کہ جو کپڑے وغیرہ جلانے کی کوشش کمال نے کی وہ اس مرنے والی کے ہوں۔'' سجاول نے کہا۔

''میں نے بھی خواص سے یہ پوچھا تھا پر وہ بات کو گھما کر اور طرف لے گئی۔''

دروازے سے باہر کھڑے پہرے دار گاہے بگاہے کن اکھیوں سے ہماری طرف دیکھ لیتے تھے۔ یہ نئے پہرے دار غیر معمولی طور پر چوکس اور ہوشیار باش نظر آتے تھے۔ ان کی وردیاں بالکل سیاہ تھیں۔ سجاول نے دھیمے لہجے میں سنبل سے کہا۔ ''تم ذرا ہوشیار بن کر رہو۔ اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھو۔ میری بات سمجھ رہی ہو نا؟''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خوب صورت آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ ذرا توقف کر کے بولی...... ''ہم کب تک یہاں سے جائیں گے؟''

''بے وقوف مت بنو۔'' سجاول دانت پیس کر بولا۔ ''تمہیں کہا ہے ناں یہاں کچھ نہیں ہوگا تمہیں، اب آئی ہو تو حوصلے سے رہنا پڑے گا۔''

سجاول کی لال آنکھیں دیکھ کر اس نے ہونٹوں کو مضبوطی سے بھینچا اور سر جھکا لیا۔

دراصل وہ تو یہ سمجھ کر یہاں آئی تھی کہ چند ہفتے یہاں رہے گی۔ محل کے عیش و آرام دیکھے گی۔ کھائے پیئے گی۔ اپنے جسم کی ٹھیک ٹھاک قیمت تحائف کی شکل میں وصول کرے گی اور خراماں خراماں اس بڈھے سے چھٹکارا حاصل کر کے نکل جائے گی، لیکن یہاں تو آتے ساتھ ہی اس نے پانی پت کی لڑائی دیکھ لی تھی اور اسے جان کے لالے پڑ گئے تھے۔

سنبل سے مل کر ہم واپس مہمان خانے میں آ گئے۔ واپس آتے ہوئے سجاول نے ایک بار پھر سنبل کو تاکید کی تھی کہ وہ اپنی ساتھی بیگم سے کمال کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ سجاول درحقیقت سنبل کو یہاں لایا ہی اس غرض سے تھا کہ اس کے ذریعے اندر خانے کی معلومات حاصل ہو سکیں۔ سجاول کے اس کام سے مجھے ٹیکساری گینگ یاد آ گیا۔ ان لوگوں کا طریقۂ کار بھی یہی تھا۔ وہ خوب صورت عورتوں کی مدد سے اپنے مقاصد حاصل کرتے تھے۔ جان ڈیرک اور اس کے انڈین پارٹنر راہول کی منحوس شکلیں میرے ذہن میں گھومنے لگیں۔ میں ان لوگوں کو زندگی کی آخری سانس تک معاف نہیں کر سکتا تھا۔ لڑائی میں یہ جو وقفہ تھا، عارضی تھا۔ اس عارضی وقفے میں بھی جان ڈیرک کا تصور اکثر میرے دماغ کو کچوکے لگاتا رہتا تھا۔ انہوں نے میرے جان سے پیارے دوست مامون اور اس کی محبوبہ انیتا کو اس وقت گولیوں سے چھلنی کیا تھا جب وہ بڑے ارمانوں سے اپنے جمنازیم کا افتتاح کرنے والے تھے۔ اس روز مارشل آرٹ ہار گیا تھا اور بدمعاشی جیت گئی تھی اور اب ڈیرک کا مقابلہ بھی کسی مارشل آرٹسٹ سے نہیں تھا۔

رات کو ہمارا قیام بڑا ٹھاٹ باٹ والا تھا۔ ہمیں تین بہترین کمرے دیئے گئے تھے۔ سجاول کے لیے علیحدہ کمرا تھا، تاہم ہمارا کمرا بھی بالکل ساتھ ہی تھا۔ سجاول کے ساتھ ایک غیر معمولی برتاؤ کیا گیا تھا اور وہ یہ کہ اسے بڑے صاحب ریان فردوس کا ڈائریکٹ نمبر بھی دیا گیا تھا۔ وہ بوقتِ ضرورت بڑے صاحب سے براہِ راست رابطہ بھی کر سکتا تھا۔ حلمی کا ڈائریکٹ نمبر بھی سجاول کے پاس موجود تھا۔ سجاول نے حلمی کے ذریعے یہ بات بڑے صاحب تک پہنچائی تھی کہ پارا ہاؤس میں ہونے والے ہنگامے کی وجہ سے اس کی منظورِ نظر سنبل ذرا ٹینشن میں ہے اس لیے وہ چاہتا ہے کہ ایک دو بار اس سے مل کر اس کو نارمل کرے۔

اگلے روز سجاول کو ایک بار پھر دس پندرہ منٹ کے لیے سنبل سے ملنے کا موقع مل گیا۔ واپس آ کر سجاول کافی دیر سوچ میں گم رہا، مجھے لگا کہ شاید وہ مجھ سے کھل کر بات کرنا نہیں چاہتا لیکن پھر وہ بتانے کی طرف آ گیا۔ وہ انیق سے چڑ کھاتا تھا۔ اس نے انیق کو باہر بھیج دیا اور بولا۔ ”سنبل کی باتوں سے پتا چلتا ہے کہ برونائی میں کہیں کمال کی شادی ہوئی تھی۔ لڑکی بھی

برونائی ہی کی تھی مگر وہ شادی کے صرف چار دن بعد بیمار ہوئی اور تین دن بستر پر رہ کر ختم ہو گئی۔کمال نے اس واقعے کا بے حد صدمہ لیا۔کئی ماہ تک وہ دیوانہ سا پھرتا رہا۔آہستہ آہستہ ٹھیک تو ہو گیا مگر اپنی دلہن کا غم اب تک اس کے دل میں ہے۔''

''غم دل میں ہے تو پھر اس کے کپڑے وغیرہ کیوں جلا رہا ہے؟''

''اس کی بھی وجہ ہے۔اب اس کی دوسری شادی ہو رہی ہے۔شاید چند دنوں کے اندر ہی......''

''کس سے؟''

''یہ تو پتا نہیں۔لیکن ہو ضرور رہی ہے بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دونوں بھائیوں کی اکٹھی شادی کا پروگرام ہو۔''

میرے ذہن میں بجلی کا کوندا سا ہوا۔میں نے کہا۔''تم نے بتایا ہے کہ کمال کی پہلی بیوی شادی کے چار پانچ دن بعد ہی بیمار ہو گئی تھی۔اس کی بیماری کا کچھ پتا چلا؟''

''تفصیل تو سنبل نہیں بتا سکی۔وہ اتنی سمجھ بوجھ والی نہیں ہے۔اس نے جو کچھ بتا دیا ہے وہی بڑی بات ہے۔''

انیق کی زبان میں کھجلی ہو رہی تھی۔اس کی حسن ظرافت نے زور مارا اور وہ خود کو بولنے سے باز نہیں رکھ سکا۔''دراصل جی سنبل کو زبان کا مسئلہ ہے نا اگر اس کی جگہ میں ہوتا تو اب تک بڑے صاحب کی تین چار پشتوں کی ہسٹری مجھے معلوم ہو گئی ہوتی۔''

سجاول نے کہا۔''اگر تو سنبل کی جگہ ہوتا تو تیرے ساتھ اور بھی بہت کچھ ہونا تھا، جو شاید تجھ سے برداشت نہ ہوتا۔تجھے پتا ہی ہے نا کہ یہ کُڑی یہاں کس لیے آئی ہے......؟''

''سوری، آپ تو برا مان گئے ہیں سجاول صاحب۔''

''شکر کرو برا ہی مان رہا ہوں۔برا کر نہیں رہا ہوں۔ایک دو چنگے کام بھی ہوئے ہیں تجھ سے جس کی وجہ سے تجھے برداشت کر رہے ہیں۔جب تمہیں لگے کہ عزت راس نہیں آ رہی ہے تو اِدھر اُدھر ہو جایا کرو اور بہتر یہ ہے کہ اب اِدھر اُدھر ہی ہو جاؤ۔''

سجاول کے تمتمائے چہرے کو دیکھ کر انیق نے پانی پینے کے بہانے اٹھ جانا ہی مناسب سمجھا۔

سجاول دھیمی آواز میں بولا۔''شاید کوئی زنانہ قسم کی بیماری ہو لڑکی کو...... یا پھر پہلے سے کوئی تکلیف ہو گی جو لڑکی والوں نے چھپائی ہو گی......''

''نہیں سجاول، میرا ذہن کسی اور طرف جا رہا ہے۔ہمیں معلوم ہے کہ یہاں پارا ہاؤس

میں لانے کے لیے کچھ لڑکیوں کو تیار کیا جا رہا ہے، شاید دو یا تین لڑکیوں کو...... اور ان میں سے ایک وہ بھی ہے جس کا نام زینب ہے اور جو یہاں سے بہت فاصلے پر اپنے گاؤں چاند گڑھی میں ہنسی خوشی رہ رہی تھی۔ ان لڑکیوں کو کسی طرح کا زہر دے دے کر کسی خاص مقصد سے تیار کیا گیا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ مقصد یہی ہو۔''

''کون سا؟''

''کمال اور ابراہیم کی شادی والا۔ ان لڑکیوں کی شادیاں ان دونوں بھائیوں سے کی جانی ہوں۔''

''لیکن کیوں؟ ایسی لڑکیاں جن کو زہر دے دے کر زہریلا کیا ہوا ہے، ان کو بیاہ کر لانے سے ان لڑکوں کو اور وڈے صاحب کو کیا ملے گا؟''

''ان کو یہ ملے گا کہ ان کو جیتی جاگتی بیویاں مل جائیں گی...... اور وہ زندہ بھی رہیں گی۔''

''زندہ بھی رہیں گی؟ تمہاری بات ابھی تک میرے پلے نہیں پڑ رہی۔'' سجاول اپنی تمام تر دانش مندی کے باوجود ابھی تہ تک نہیں پہنچ رہا تھا۔

مجھے سگریٹ کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔''کمال کی پہلی بیوی اپنی شادی کے صرف چار دن بعد بستر سے جا لگی اور مر گئی لیکن اب یہ ہونے والی بیوی شاید بچ جائے...... اور اس لیے بچ جائے کہ یہ IMMUNE ہے اس کے اندر بھی زہر موجود ہو گا۔''

سجاول کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ چہرے کا رنگ بدل گیا۔ وہ سرسراتی آواز میں بولا۔''تم کیا کہنا چاہتے ہو شاہی...... تمہارا مطلب ہے کہ...... یہ دونوں لڑکے بھی...... زہریلے ہیں......؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور سگریٹ کا کش لے کر دھواں کھڑکی کی جانب چھوڑا۔ کھڑکی سے باہر رات اپنے لمبے پر پارا ہاؤس کے در و دیوار پر پھیلا چکی تھی۔ روشنیاں در و دیوار کو اجاگر کر رہی تھیں۔ بلند باؤنڈری وال پر سرچ لائٹس چکراتی تھیں اور پھولوں سے گھری ہوئی روشوں پر گارڈن کیمپس دودھیا اجالا بکھیر رہے تھے۔

سجاول نے اٹھ کر کمرے کے اندر ہی چند قدم چہل قدمی کی اور دوبارہ میرے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔''تمہارا مطلب ہے کہ یہ دونوں لڑکے عام نہیں ہیں۔ ان کے خون میں زہر ہے اور اس زہر کی وجہ سے ہی کمال کی بیوی مری تھی۔''

''لگ تو یہی رہا ہے۔ شادی کے بعد میاں بیوی ایک دوسرے کے بالکل قریب آجاتے ہیں۔ پہلے سے ایک دوسرے کو نہ بھی جانتے ہوں تو بھی چند دنوں میں برسوں کا فاصلہ طے ہو جاتا ہے۔ شادی کے چند دن بعد ہی کمال کو اپنی دلہن کی جدائی سہنا پڑی۔ وہ ابھی تک اسے پوری طرح بھول نہیں پایا۔ اس نے اب تک اس کے ذاتی استعمال کی چیزیں سنبھال کر رکھی ہوئی تھیں۔''

''اور اب انہیں جلانے کی کوشش کر رہا ہے۔'' سجاول نے کہا۔

''ظاہر ہے جو کچھ سنبل بتا رہی ہے۔ اس سے تو یہی پتا چلتا ہے کہ کمال اور ابراہیم دونوں کی شادی ہو رہی ہے۔ اپنی دوسری شادی سے پہلے کمال ڈپریشن میں ہے...... اور پہلی بیوی کی یادوں سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہے۔''

کمرے میں گمبھیر خاموشی طاری ہو گئی۔ ہم دونوں ہی اپنی اپنی جگہ سوچ رہے تھے اور سوچنے کے لیے سب سے اہم بات یہ تھی کہ اگر دونوں بھائیوں کے جسموں کے اندر واقعی کوئی خطرناک زہر موجود ہے تو کیوں ہے؟ کیا وہ پیدائشی طور پر ایسے ہیں یا ان کے ساتھ بعد میں کوئی مسئلہ ہوا ہے۔ یا پھر یہ اسی دشمنی کا نتیجہ ہے جس کا ذکر بار بار سننے میں آ رہا ہے۔ مجھے زینب کے بارے میں بھی پریشانی لاحق ہو رہی تھی۔ اپنے والد مولوی فدا کی موت کے بعد وہ لاوارثوں کی طرح ہو گئی تھی۔ اس کی سوتیلی ماں اس کا بہت خیال رکھ رہی تھی لیکن عالمگیر اور پیر ولایت جیسے فتنہ سازوں سے ٹکر لینا اس کے بس میں کہاں تھا؟ انیق نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اسلام آباد کے اسپتال میں ابھی تک زیرِ علاج ہے اور وہاں اس کی حفاظت کے لیے پولیس کا گارڈ بھی موجود ہے مگر میں تازہ ترین صورتِ حال جاننا چاہتا تھا۔ ہماری نئی معلومات کے مطابق چار پانچ دن تک پارا ہاؤس میں دو تین لڑکیاں پہنچنے والی تھیں اور ان میں سے ہی دو لڑکیوں کو بڑے صاحب کے دونوں بیٹوں کی دلہنیں بننا تھا۔ سوال یہ تھا کہ کہیں زینب بھی تو ان میں شامل نہیں؟

اس سلسلے میں تازہ ترین صورتِ حال مجھے پہلوان حشمت سے معلوم ہو سکتی تھی۔ وقتِ رخصت تاجور کی طرح میں نے پہلوان حشمت کو بھی اپنا سیل نمبر دیا تھا۔ جواباً تاجور نے تو مجھے اپنا نمبر نہیں دیا تھا مگر پہلوان حشمت نے ضرور دیا تھا۔ پہلوان کو چاند گڑھی واپس پہنچے اب دو ہفتے ہو چکے تھے۔ اس دوران میں دو تین بار اس کی کال آئی تھی۔ ایک بار میں نے کال ریسیو بھی کی تھی اور پہلوان سے تھوڑی سی بات بھی ہوئی تھی۔

میں نے وہیں کمرے میں سجاول کے پاس بیٹھے بیٹھے پہلوان حشمت سے رابطہ کرنے

کی کوشش کی۔ تیسری چوتھی کوشش میں کامیابی ہوگئی۔ پہلوان کی بھاری بھرکم آواز فون کے اسپیکر پر ابھری۔ ''ہیلو شاہ زیب، تمہارا کیا حال ہے؟ تمہاری آواز سن کر دل باغ باغ ہوگیا ہے۔ تم سے جب بھی بات ہووت ہے بالکل ایسا لگت ہے کہ کوئی گمشدہ چیز مل گئی ہو۔''

''پہلوان جی، مجھے بھی بالکل یہی لگتا ہے۔ ویسے کیا حال ہے آپ کا؟ آپ کی آواز کچھ بدلی بدلی سی ہے۔''

''بس کوئی نہ کوئی مصیبت مجھ پر پڑ ہی جاوت ہے۔ کل کرموں اور سولنگی کے بکروں میں لڑائی ہوگئی۔ کرموں کے بکرے کا سینگ ٹوٹ گیا۔ میں اس کا سینگ جوڑنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس نے میرے منہ پر ٹکر ماردی۔ سارا چباڑا (جبڑا) ہل گیا ہے۔''

''آپ انسانوں کا علاج کرتے ہیں۔ انسانوں کی ہڈیاں ہی جوڑا کریں تو زیادہ اچھا ہے۔''

''تم نے میرے وہ شعر پہلے بھی سنے ہوں گے۔

ہم لوگوں کے کام آتے ہیں اور پھنستے ہیں
ہماری اس حالت پر لوگ بہت ہنستے ہیں
خلقِ خدا کے کام آنا ہی تو راہ ہے نیکی کی
ورنہ تو بہت سارے پنگے ہیں بہت سارے رستے ہیں

اب یہ بکرا بھی تو ایک انسان کا ہی تھا۔ انسان کی خدمت کو بکرے کی خدمت سے جدا تو نہیں کیا جاسکت ہے نا۔ ویسے بڑے ٹھیک ہی کہوت ہیں جو کام بھی ہووت ہے اس میں قدرت کی طرف سے کوئی بہتری ہی ہووت ہے۔ بڑے دنوں سے میرا حلوہ کھانے کو جی چاہ رہا تھا۔ بیوی کے بہت ترلے کرتا تو ایک دفعہ پکا دیتی۔ اب بغیر ترلوں کے ہی روز حلوہ مل رہا ہے۔'' اس کے بعد پہلوان نے غالباً ہنسنے کی کوشش کی تھی جس کی وجہ سے اسے بلند آواز میں کراہنا پڑ گیا۔

میں نے کہا۔ ''پہلوان جی، باتیں تو کئی پوچھنی ہیں مگر فی الوقت اللہ بخشے مولوی فدا کی بیٹی زینب کی خیر خیریت کے بارے میں بتا دیں۔''

''یہ تو اچھا پوچھا تم نے۔ میں کل ہی امام مسجد سے ساری بات پوچھ کر آیا ہوں۔ امام صاحب دو اور بندوں کے ساتھ کسی کام سے اسلام آباد گئے تھے۔ زینب کو بھی دیکھ کر آئے ہیں۔ اس کا بڑا اچھا علاج ہو رہا ہے۔ پہلے سے صحت مند بھی ہوگئی ہے۔ اس کی ماں سوتیلی ہے لیکن پھر بھی دن رات اس کی دیکھ بھال کر رہی ہے۔ دو سپاہی بھی اس کی حفاظت کے لیے

وارڈ میں موجود رہت ہیں۔''

''چلو میری تسلی ہو گئی۔ مجھے اس کی طرف سے بڑی فکر رہتی ہے۔ یہ عالمگیر اور پیر ولایت کی نیت اس بچی کے بارے میں ٹھیک نہیں ہے۔''

''ہاں اس بات کا پتا تو پورے گاؤں کو چل چکا ہے۔لوگ جانت ہیں کہ اگر انہوں نے مولوی جی کی بچی کی طرف سے توجہ ہٹائی تو اس کے ساتھ کچھ نہ کچھ برا ہو جاوے گا۔ اللہ کا شکر ہے کہ تاجور تو اس گندے پھڈے سے بچ کر نکل گئی ہے۔ وہ جہاں رہے سکھی رہے۔ میں تو اس کے لیے یہی کہوں گا...... جان بچی تو دودھوں نہائے......اور ہاں مجھے ایک اور بات یاد آئی۔ عالمگیر کے منشی افضل کے گم ہونے کا گاؤں میں بڑا چرچا ہے۔اسے زور شور سے ڈھونڈا جارہا ہے لیکن لوگوں کو پتا ناہیں کہ اب وہ ڈھونڈنے سے ناہیں ملے گا۔اس کے بارے میں رنگ برنگی کہانیاں بنائی جارہی ہیں......''

''چلیں ٹھیک ہے۔ میں پھر کال کروں گا اور تفصیل سے بات کریں گے۔''

''تم سے ملنے کو بہت دل چاہت ہے۔ میں تو سمجھت ہوں کہ تم میں پہلوانی کا بہت سا ہنر چھپا ہوا ہے۔ وہاں سجاول کے ڈیرے پر تم نے جس طرح سجاول سے ہتھ جوڑی کی، وہ کوئی بھولنے والی بات ناہیں ہے۔ ابھی تو مجھے زیادہ وقت ناہیں ملا۔ بس دو چار داؤ ہی میں تمہیں بتا سکا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر دو چار ہفتے ہمیں اکٹھے مل جائیں تو تم اچھے اچھوں کو لمبا لٹا سکت ہو۔''

پہلوان سے بات ختم کرنے کے بعد میں پھر سوچ میں ڈوب گیا۔ ابھی میری تسلی نہیں ہوئی تھی۔ میں زینب کے حوالے سے مزید جاننا چاہتا تھا۔ اس سلسلے میں داؤد بھاؤ سے زیادہ کون میری مدد کر سکتا تھا۔ میں نے داؤد بھاؤ سے فون ملانے کا سوچا اس سے پہلے دو تین مرتبہ میں اس سوچ کو عملی جامہ پہناتے پہناتے رہ گیا تھا۔ ایک بار کال کی تھی تو پتا چلا تھا کہ آج کل وہ زیر زمین ہے۔ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے داؤد بھاؤ کا نمبر ملایا۔ اتفاق تھا کہ پہلی ہی بیل پر داؤد بھاؤ کی بارعب آواز کانوں سے ٹکرائی۔ ''ہالو، کون بول رہا ہے؟''

''آپ کا خادم، شاہ زیب عرض کرر ہا ہوں۔''

داؤد بھاؤ کی خوشی دیدنی تھی لیکن میں چونکہ اسے دیکھ نہیں سکتا تھا اس لیے اس خوشی کو شنیدنی کہنا چاہیے۔ اس نے میرا حال احوال پوچھا اور ایک ساتھ کئی سوال جڑ دیئے۔ میں کہاں ہوں......سردار سجاول نام کا جو بندہ میرے پیش پڑا ہوا ہے وہ کس کھیت کی مولی ہے اور یہ مولی کتنی کڑوی یا میٹھی ہے۔ چاند گڑھی کی لڑکیوں والے معاملے کا کیا ہوا......اور ان کو

زہر دیئے جانے کا کیا قصہ ہے وغیرہ وغیرہ......؟

میں نے کہا۔ "داؤد بھاؤ، اتنے سوالوں کے جواب دوں گا تو میرا بیلنس ختم ہو جائے گا اور آپ کا دماغ بھی پلپلا ہونا شروع ہو جائے گا۔ یہ ساری باتیں میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا اور پوری تفصیل سے بتاؤں گا۔ یہ تو آپ کو انیق سے پتا چل ہی گیا ہوگا کہ ہم اس وقت لیہ کے قریب ایک خاص جگہ پر موجود ہیں۔ میں کچھ باتیں جاننا چاہ رہا ہوں جو یہاں رہ کر نہیں جان سکتا۔ ان میں سے ایک بات اس لڑکی زینب کے حوالے سے ہے جس کا ذکر انیق نے بھی آپ سے کیا تھا۔ وہ اسلام آباد کے جس اسپتال میں ہے، اس کا بھی آپ کو پتا ہے، میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنے کسی خاص بندے کو جو اسلام آباد میں ہی رہتا ہو، اسپتال میں بھیجیں اور زینب کی خیر خیریت کا پتا کریں۔"

وہ بولا۔ "میں پتا بھی کراتا ہوں اور اگر سکیورٹی کا پرابلم ہے تو اپنے دو چار بندے بھی لگا دیتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "اتنا تو پتا چلا ہے کہ دو پولیس والے وہاں ڈیوٹی دے رہے ہیں۔"

اس نے پولیس والوں کے بارے میں نازیبا الفاظ استعمال کیے اور بولا۔ "یہ ڈیوٹی وغیرہ کہاں دیتے ہیں۔ یہ تو اپنی والدہ کی برات پر تشریف لاتے ہیں اور کھا پی کر آرام کرتے ہیں۔ کوئی حملہ وغیرہ ہو جائے تو ان کی رائفلیں جام ہو جاتی ہیں۔"

"لیکن سب تو ایسے نہیں ہوتے۔ کچھ اپنی روزی حلال بھی تو کرتے ہیں۔"

"پاکستان آتے ساتھ ہی تم نے ان لوگوں کو بھگتا تھا، پھر بھی ان کے وکیل بن رہے ہو۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ میں ابھی اسلام آباد میں اپنے بندے کو کال کرتا ہوں۔"

"بہت شکریہ، میں دوبارہ فون کروں گا۔"

لیکن میرے دوبارہ فون کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ ابھی دس منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ میرے سیل فون کا میوزک بج اٹھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ کال داؤد بھاؤ کی طرف سے ہی ہے۔ داؤد بھاؤ کی نوخیز محبوبہ روبی کی شیریں آواز میرے کانوں میں پڑی۔ "ہیلو، بھاؤ آپ سے بات کرنا چاہیں گے۔"

"ہاں، کراؤ بات۔" میں نے کہا۔

روبی نے میری آواز نہیں پہچانی تھی ورنہ کئی سوالات کرتی۔ وہ یقیناً داؤد بھاؤ کے اسی لاہور والے...... زیرزمین ٹھکانے سے بول رہی تھی جس کے اوپر ایک بہت بڑا اسنوکر کلب تھا۔ اسنوکر کلب کے نیچے باکسنگ اور مارشل آرٹ کے خونی مقابلے ہوتے تھے۔ ایسے ہی

ایک مقابلے میں، میں نے بھاؤ کے اہم باکسر لودھی کو ناکوں چنے چبوائے تھے۔ بھاؤ نے لائن پر آنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی، وہ بولا تو اس کے لہجے میں گہری تشویش جھلک دکھاتی تھی۔ کہنے لگا۔ ''شاہ زیب! تم نے لڑکی کی خیر خیریت کب دریافت کی تھی؟''

''ابھی کوئی آدھ گھنٹا پہلے میرا چاند گڑھی میں ایک بندے سے رابطہ ہوا ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ پرسوں کچھ لوگ اسپتال گئے تھے اور وہ زینب کو دیکھ کر آئے ہیں۔''

داؤد بھاؤ نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''شاہ زیب! یہ خبر اب پرانی ہوگئی ہے، تمہیں اطلاع دینے والے بندے کو شاید پتا نہیں کہ ابھی کوئی چار گھنٹے پہلے وہاں اسلام آباد کے اسپتال میں ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آ گیا ہے۔''

''زینب تو خیریت سے ہے؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہ خیریت سے نہیں ہے۔ وہ کڈنیپ ہو چکی ہے۔ یہ واقعہ آج شام پانچ اور ساڑھے پانچ بجے کے درمیان پیش آیا ہے۔ ہڑتال کی وجہ سے اسپتال میں سکیورٹی کی حالت پتلی تھی۔ دو گاڑیوں پر آٹھ دس بندے آئے۔ ان میں سے چار اسپتال کے اندر گئے اور زینب کو اٹھا کر لے گئے۔ اس کی سوتیلی والدہ کافی زخمی ہوئی ہے۔ اسٹاف کے دو بندے بھی زخمی ہیں لیکن پولیس والے زخمی نہیں ہوئے۔ تمہیں کہا تھا ناں یہ لوگ اکثر موقع پر موجود نہیں پائے جاتے۔''

میرے جسم کا سارا خون میرے دماغ کو چڑھنے لگا۔ آخر وہی ہوا تھا جس کا اندیشہ کئی گھنٹوں سے میرے سر میں پُرخطر دھماکے کر رہا تھا۔ میرے سامنے بیٹھا سجاول میرے چہرے سے بھانپ گیا کہ کوئی بری خبر ہے۔

''کیا ہوا شاہی؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''زینب کو اسپتال سے اٹھا کر لے گئے وہ لوگ۔''

اس کے بعد میں نے پھر داؤد بھاؤ سے بات جاری رکھی۔

داؤد بھاؤ نے مجھے اس واقعے کی تفصیل بتائی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ وہ اپنے سب سے خاص بندے جھارے کو فوراً اسلام آباد بھیج رہا ہے۔ وہ مقامی پولیس کے ایک دو افسروں سے گہرے لنک رکھتا ہے۔ لڑکی کی بازیابی کے سلسلے میں وہ پولیس کے ساتھ مل کر...... اور انفرادی طور پر بھی اپنا کردار ادا کر سکتا ہے (جھارا وہی دبلا پتلا شخص تھا جسے ازراہِ تفنن اس خطاب سے نوازا گیا تھا لیکن اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے یہ شخص واقعی کسی جھارے یا بھولو سے کم نہیں تھا)۔

سجاول نے ذراستائشی نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''تمہارے دماغ نے ٹھیک کام کیا ہے۔ تمہیں جو ڈر تھا، وہ سچ نکلا ہے۔''

''ہاں، یہ لوگ شاید زینب کو بھی یہاں لا رہے ہیں۔''

''حالانکہ تم کہہ رہے تھے کہ وہ ابھی تک پوری طرح اس کام کے لیے تیار نہیں ہوئی جو یہ لوگ اس سے لینا چاہتے ہیں۔''

''بالکل ایسا ہی ہے۔ عالمگیر اور پیر ولایت چاند گڑھی میں ابھی زینب پر ''کام'' کر رہے تھے کہ میں نے ان کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ اسے کھانے میں ملا کر جو کشتہ وغیرہ دیا جا رہا تھا، وہ بھی لیبارٹری میں ٹیسٹ ہو گیا اور وہ علاج کے لیے اسپتال پہنچ گئی۔''

میری آنکھوں کے سامنے اس خفیہ خط کے مندرجات گھومنے لگے جو چاند گڑھی سے منشی افضل نے الٹے حرفوں میں لکھا تھا۔ اس خط میں زینب کا ذکر تھا اور خط کی شروعات کچھ اس طرح سے تھی۔ رٹسام بحاص پاتہب ٹیل وہ۔

حرفوں کو سیدھا کر کے پڑھا جاتا تو مطلب تھا۔ ''ماسٹر صاحب آپ بہت لیٹ ہو'' آگے لکھا تھا۔ ''مجبور ہو کر خط لکھنا پڑا۔ آپ کو پتا ہی ہے میری طرف حالات زیادہ ٹھیک نہیں۔ مولوی کی بیٹی زینب اسلام آباد کے اسپتال میں ہے۔ اسے وہاں سے نکالنا آسان نہیں۔ وہ تو جب چاند گڑھی آئے تو کچھ ہو سکتا ہے۔''

کچھ مزید آگے جا کر الٹے حرفوں میں ہی لکھا تھا۔ ''پرسوں بھی ورول سے فون آیا ہے۔ بڑے صاحب اب زیادہ انتظار نہیں کر سکتے۔ کم از کم ایک لڑکی تو ہمیں فوراً بھیجنی پڑے گی (تاکہ تسلی ہو) باقیوں کے لیے ٹائم مل سکتا ہے۔ تم اپنے والی لڑکی کی خوراک تھوڑی سی بڑھا دو۔ میرا خیال ہے کہ اب وہ دو تین ہفتے میں تیار ہو سکتی ہے۔''

یہ خط عالمگیر نے منشی افضل سے لکھوا کر اپنے کسی ساتھی ''ماسٹر صاحب'' کو روانہ کیا تھا۔ اس خط کے مندرجات سے فوراً پتا چل جاتا تھا کہ ان لوگوں کو بہت جلدی ہے۔ چونکہ انہوں نے موٹی رقم پکڑی ہوئی ہے اس لیے وہ وعدے کے مطابق جلد از جلد مطلوبہ لڑکیاں یہاں اس علاقے میں پارا ہاؤس تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ لڑکیوں کی تعداد تین کے قریب معلوم ہوتی تھی۔ شاید احتیاط کے طور پر ایک لڑکی اضافی منگوائی جا رہی تھی۔ یہ لڑکیاں بہت زیادہ خوب صورت تو نہیں تھیں مگر عام شکل وصورت کی بھی نہیں تھیں۔ ان کا تعلق دینی گھرانوں سے تھا۔ یہ دینی گھرانوں والی بات اب تھوڑی بہت میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ یہاں پارا ہاؤس میں پہنچ کر ہمیں صاف پتا چلا تھا کہ اپنے رنگین مزاج باپ ''بڑے صاحب'' کے برعکس اس کے

دونوں بیٹے مذہبی رجحان رکھتے ہیں اور نماز، روزے کے پابند ہیں۔ان کی والدہ بڑی بیگم کا مزاج بھی ایسا ہی تھا اور وہ اسلامی شعائر کی پابند نظر آتی تھیں۔

''کس سوچ میں کھو گئے ہو؟'' سجاول کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔

''یہی کہ اگر سب کچھ ویسا ہی ہے جیسا ہم سوچ رہے ہیں تو پھر جلد ہی ہم زینب کو یہاں پارا ہاؤس میں دیکھ سکتے ہیں اور شاید......''

''کیا شاید؟''

''شاید یہ صورتِ حال اس بے چاری کے لیے بہت خطرناک ثابت ہو۔وہ ان حالات کے لیے تیار ہی نہیں ہے جو اسے یہاں پیش آسکتے ہیں۔اسے وہ لوگ جلد بازی میں یہاں پہنچا رہے ہیں۔غالباً ان دو لڑکیوں میں سے بھی صرف ایک ہی تیار ہو سکی ہے جس کو تیار کرنے کی ذمے داری کسی ''ماسٹر صاحب'' کے پاس تھی یا تو وہ پوری طرح IMMUNE نہیں ہو سکی ہو گی یا پھر زہریلی ڈوز دینے کے دوران میں اس کے ساتھ کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی ہو گی۔یہ لوگ بڑا خطرناک کھیل کھیل رہے ہیں۔''

''میرا دماغ تو وہیں اٹکا ہوا ہے۔'' سجاول نے کہا۔''اگر تمہارے کہنے کے مطابق وڈے صاب کے دونوں منڈے واقعی زہریلے ہیں تو کیوں ہیں؟ یہ کوئی پیدائشی مسئلہ ہے یا انہیں بعد میں کوئی بیماری لگی ہے......''

''جہاں اتنا کچھ پتا چل گیا ہے، یہ بھی چل جائے گا۔ایک بات تو بالکل صاف نظر آرہی ہے۔یہ دونوں لڑکے بھلے مانس اور نیک ہیں۔یقیناً وہ کسی عورت سے ناجائز تعلق قائم کرنے کو بھی برا سمجھتے ہوں گے۔وہ شادی کرنا چاہتے ہیں اور یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں مگر اس کے لیے جو طریقہ اختیار کیا جا رہا ہے، وہ بالکل غلط اور غیر قانونی ہے۔''

''ہو سکتا ہے کہ ان لڑکوں کو بھی پتا نہ ہو کہ ان کے لیے دلہنیں کس طرح ڈھونڈی جا رہی ہیں یا پھر انہیں جھوٹ سچ ملا کر بتایا گیا ہو۔''

اسی دوران میں میرے سیل فون پر پھر کال آگئی۔یہ پہلوان حشمت ہی تھا۔میں نے ذرا تذبذب میں رہنے کے بعد کال ریسیو کی۔پہلوان کا سانس پھولا ہوا تھا۔وہ بولا۔''شاہ زیب! غضب ہو گیا۔مولوی جی کی بیٹی کو اسلام آباد کے اسپتال سے اغوا کر لیا گیا ہے۔یہ خبر ابھی ابھی یہاں گاؤں میں پہنچی ہے۔لوگ بہت پریشان ہیں۔زینب کی دادی کو بار بار غش آرہا ہے۔پولیس کچھ بھی ناہیں کر رہی۔عالمگیر گاؤں سے غائب ہے۔زیادہ تر لوگ یہی کہوت ہیں کہ اس ظلم کے پیچھے بھی عالمگیر کا ہاتھ ہی ہے۔''

''ہاں مجھے بھی ابھی ابھی اطلاع ملی ہے۔'' میں نے کہا۔
''تم کو کوئی شک تھا؟ ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے اس کی خیر خیریت پوچھی اور اب یہ خبر آ گئی؟''
''بس شک ہی سمجھ لو۔''
''یہ تو بہت برا ہوا ہے۔ گاؤں میں پہلے ہی دو دھڑے بنے ہوئے ہیں۔ اگر یہ ثابت ہو گیا کہ مولوی جی کی بیٹی کے اغوا میں عالمگیر اور پیر ولایت وغیرہ کا ہاتھ ہے تو ہو سکتا ہے کہ فساد ہو جاوے۔''
''چلو، آپ ہیں چاند گڑھی کی خبر دیتے رہنا۔ ہم بھی زینب کے سلسلے میں کوشش کر رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔
''لیکن تم......''
میں نے لائن کاٹ دی۔ مجھے پتا تھا کہ پہلوان اب پوچھے گا کہ میں اور انیق وغیرہ کہاں ہیں اور زینب کے لیے کس طرح کی کوشش کا ارادہ رکھتے ہیں۔
میرا دماغ گھن چکر بنا ہوا تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ آنے والے دو تین روز میں یہاں اہم واقعات ہونے والے ہیں۔ کچھ اور نہ بھی ہوتا لیکن یہ تو یقینی تھا کہ وہ لڑکیاں یہاں پہنچ جائیں گی جن کے لیے پاراہاؤس والوں نے عالمگیر وغیرہ کو فی لڑکی ایک کروڑ سے زائد کی رقم دینا تھی۔ ان لڑکیوں کو یہاں اس لیے لایا جا رہا تھا کہ بڑے صاحب کے دونوں بیٹوں کو رشتہ ازدواج میں منسلک کیا جا سکے۔ اپنے بیٹوں کے لیے من پسند دلہنیں لانے کے لیے بڑے صاحب ریان فردوس جیسا بندہ ایک کروڑ تو کیا کئی کروڑ خرچ کر سکتا تھا۔ پتا نہیں کیوں میرا دھیان تاجور کی طرف چلا گیا۔ وہ بے چاری بھی تو اس چکر میں پھنسنے والی تھی۔ وہ پُر اسرار خط جو مؤذن عبدالرحیم کے ذریعے میرے ہاتھ لگا تھا اس میں تاجور کا ذکر خیر بھی تو موجود تھا۔ منحوس خط کا چوتھا پانچواں فقرہ تاجور کے حوالے سے ہی تھا۔ مجھے وہ الفاظ اب تک یاد تھے۔ بادوجات اک بیھو چھک ازکت وہ اگ......یعنی ''اب تاجور کا بھی کچھ کرنا ہوگا......''
یہ تو تاجور کی خوش قسمتی تھی کہ وہ بروقت ساتے کے چنگل سے نکل گئی اور پھر چاند گڑھی سے ہی اپنے گھرانے سمیت اوجھل ہو گئی۔ ورنہ یہ ممکن تھا کہ اب تک پیر ولایت اور عالمگیر کے تعاون سے اسحاق اسے اپنی بیوی بنا چکا ہوتا اور وہ بیوی بننے کے باوجود کنواری رہتی اور اسے زہر کی ڈوز دینے کا بے ہودہ اور خطرناک کام شروع ہو چکا ہوتا یا پھر ساتے نے ہی اسے پامال کر دیا ہوتا۔

جب سے میں تاجور کو اس کے والدین کے پاس چھوڑ کر آیا تھا، کئی مرتبہ اس کی سوچوں نے میرے دل و دماغ پر حملہ کیا تھا۔ میں نے سیکڑوں ہی بار اپنے سیل فون کی اسکرین پر اس امید سے نگاہ ڈالی تھی کہ شاید تاجور نے میرے لیے کوئی پیغام بھیجا ہو۔ مجھے کال کیا ہو لیکن اسکرین کی طرف اٹھنے کے بعد میری نگاہ کو ہمیشہ مایوسی ہی ملی تھی۔ میرے پاس تاجور کا نمبر نہیں تھا۔ اگر ہوتا بھی تو شاید میں خود بھی اسے کال نہ کرتا۔ میں نے تو خود راستہ بدلا تھا۔ خود اسے اپنی دسترس سے نکالا تھا اور اسے والدین کے حوالے کر کے آیا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میں کبھی کبھی خود کو ملامت بھی کرتا تھا کہ میری نگاہ کیوں بے ساختہ فون کی اسکرین کی طرف اٹھتی ہے؟ کیوں دل کی اتھاہ گہرائی میں کوئی انتظار سا چھپا ہوا ہے؟

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب کسی کی یاد آتی ہے تو پھر آتی چلی جاتی ہے۔ شاید وہ رات بھی ایسی ہی تھی۔ دو دن تک جو شدید ہنگامہ جاری رہا، وہ اب ختم ہو چکا تھا۔ پارا ہاؤس کی بلند و بالا دیواروں کے اندر قدرے سکون محسوس ہوتا تھا۔ پتا نہیں کیوں میرا دل چاہ رہا تھا کہ اپنے کمرے میں چلا جاؤں اور چپ چاپ لیٹ جاؤں۔ کمرے میں مجھے کافی سکون ملتا تھا۔ وہاں پرائیویسی تھی۔ میں نے اچھی طرح دیکھ لیا تھا وہاں کوئی کیمرا یا مائیکروفون وغیرہ نصب نہیں تھا۔ مہمان خانے اور صرف کامن استعمال کے کمروں میں یہ چیزیں موجود تھیں۔ میں سجاول کو وہیں بیٹھا چھوڑ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ اب رات کے نو بج چکے تھے۔ راستے میں مجھے حلمی ملا۔ ہنگامے میں وہ خود بھی زخمی ہوا تھا اور اس کا ایک بازو گلے میں جھول رہا تھا۔ میں نے اس سے قادر خان کا احوال پوچھا۔ حلمی نے بتایا کہ اس کی حالت ابھی پوری طرح خطرے سے باہر نہیں۔ سانپ کے زہر نے اس کا خون اس قدر گاڑھا کر دیا ہے کہ دھڑکن اور سانس کی آمد و رفت پر بہت بوجھ پڑ گیا ہے۔

میں نے حلمی سے گرفتار شدہ ناقب اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں پوچھا۔ حلمی سے معلوم ہوا کہ اب ان لوگوں کو تھانے بھیج دیا گیا ہے اور صبح قانون کے مطابق انہیں عدالت میں پیش کیا جائے گا۔

میں کمرے میں داخل ہوا تو انیق پہلے سے آ کر ڈبل بیڈ پر لیٹ چکا تھا۔ میں نے سمجھا کہ سجاول سے جھاڑ کھانے کے بعد وہ ذرا بدمزہ ہوا ہے۔ میں نے کمبل کے اوپر سے ہی اس کے کولہوں پر چپت لگائی۔ ایک دم مجھے لگا کہ یہ چپت کسی مرد کو نہیں عورت کو لگی ہے۔ ساتھ ہی مجھے نسوانی کراہ سنائی دی۔ کمبل ہٹا اور جاناں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے بال کھلے تھے اور وہ سلیپنگ گاؤن میں تھی۔ میں ششدر رہ گیا۔

"تم یہاں؟"

"اتنے حیران کیوں ہو رہے ہو۔ پارا ہاؤس والوں کو تو یہی پتا ہے کہ میں آپ کی بیوی ہوں۔"

"تم یہاں پہنچیں کیسے؟"

"یہ لوگ بہت مہمان نواز ہیں...... اور سمجھ دار بھی۔ وہ جانتے ہیں کہ اگر تمہیں یہاں پارا ہاؤس میں مہمان رکھیں گے تو مجھے بھی تمہارے ساتھ رہنا ہوگا۔" وہ آنکھیں مٹکا کر بولی۔

"اور وہ جو بنگلے میں تمہاری ڈیوٹی لگی ہوئی تھی آقا جان کی بیگم کو انگلش ناول سنانے کی اور ٹانگیں دبانے کی؟"

وہ ادا سے بولی۔ "مجھے یاد تو نہیں لیکن میں نے زندگی میں کوئی نہ کوئی نیکی ایسی ضرور کی ہوگی جو میرے کام آگئی ہے اور مجھے اس موٹو کی ٹانگیں...... دن رات دبانے کی سزا سے چھٹکارا مل گیا ہے۔"

وہ میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر بیٹھ گئی اور کندھے سے کندھا ملا دیا۔ یہاں آنے کے بعد وہ بنگلے میں ایک رات میرے ساتھ رہی تھی۔ اس رات کے بعد سے وہ کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہو چکی تھی اور وقت بے وقت بھرپور دخل اندازی کر رہی تھی۔ لیکن اس وقت میرا موڈ بھی بہت ابتر تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ زینب کے اغوا کی خبر ملی تھی اور اس خبر کے ساتھ ساتھ تاجور کی یاد بھی ابھر ابھر کر ذہن کے نہاں خانوں میں چکرانے لگی تھی۔

وہ میرے کندھے سے سر ٹکاتے ہوئے بولی۔ "پتا نہیں کہ آپ یقین کریں گے یا نہیں، پچھلے دو روز میں آپ کے لیے بے حد پریشان رہی ہوں۔ یہاں ہونے والی فائرنگ کی آوازیں بنگلے تک صاف پہنچ رہی تھیں۔ اتنی زیادہ فائرنگ تھی کہ لگتا تھا کہیں دو فوجوں میں لڑائی چھڑ گئی ہے۔ اگر آپ کو کچھ ہو جاتا تو پتا نہیں میرا کیا بنتا۔"

اس نے اپنی سانسوں سے میری گردن کو گدگدانا چاہا لیکن میرے سینے میں تو دھواں سا بھرا ہوا تھا۔ میں نے اسے دھکیل کر پیچھے ہٹا دیا۔ "میں سونا چاہتا ہوں۔" میں نے بیزاری سے کہا۔

وہ شکوہ کناں نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ بے بی پنک کلر کے سلکی گاؤن میں سے اس کا جسم پھوٹا پڑ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد مسکرا کر بولی۔ "آپ سونا چاہتے ہیں...... اور سونا چاندی دونوں آپ کے پاس ہیں۔" انداز معنی خیز تھا۔

میں نے کہا۔ "جاناں، بہتر ہے کہ تم دوسرے کمرے میں جا کر سو جاؤ اور اگر ادھر ہی

سونا ہے تو خاموشی سے پڑی رہو۔''

وہ بدستور شوخ اور رومانی موڈ میں رہی۔ ''دیکھ لیں آپ زیادتی کر رہے ہیں۔ حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ میں آپ کے ایک اہم راز کی امین ہوں۔ اگر زبان کھول دی تو آپ کو مصیبت پڑ جائے گی۔''

''کس راز کی بات کر رہی ہو؟''

وہ نشیلی نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی، پھر زیرِ لب مسکرا کر بولی۔ ''ناراض نہ ہو جانا لیکن یہ بات تو آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ پچھلے کچھ عرصے میں چاند گڑھی میں ''یاسر بھائی'' نے جو کارروائیاں کیں وہ دراصل آپ نے ہی کی تھیں۔ ان میں ایک کارروائی وہ بھی تھی جس میں آپ نے میری جان بچائی، اور ایک کارروائی وہ بھی تھی جس میں آپ نے اصلی یاسر کی بہن کو بچاتے ہوئے سردار سجاول کے پانچ چھ آدمیوں کو......'' اس نے معنی خیز انداز میں بات ادھوری چھوڑ دی۔

وہ اس واقعے کی طرف اشارہ کر رہی تھی جب باغ پور گاؤں میں سجاول کے لوگوں نے یاسر بھائی کی بہن کو اغوا کرنے کی کوشش کی تھی اور ایک زوردار جھڑپ میں، میں نے اس کے پانچ بندوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ ایک بعد میں مر گیا تھا۔ اس جھڑپ کے وقت بھی میں نے اپنا چہرہ مخصوص ڈھاٹے میں چھپا رکھا تھا۔

ایک دم میرا دماغ جیسے تڑخ گیا۔ جاناں ڈھکے چھپے الفاظ میں مجھے بلیک میل کر رہی تھی۔ اس کی بات کا مطلب یہی تھا کہ وہ سجاول کو یہ بتا سکتی ہے کہ باغ پور میں اس کے بندوں کو ہلاک کرنے والا میں ہی تھا۔ بے شک جاناں نے یہ بات پوری سنجیدگی سے نہیں کہی تھی مگر اس وقت میرا موڈ کچھ ایسا ہو رہا تھا کہ مجھے طیش آ گیا۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ یہ کیسے ہو گیا۔ میرا ایک زوردار تھپڑ جاناں کے گال پر پڑا اور وہ بستر سے گرتے گرتے بچی۔

میں نے اسے کندھے کے پاس سے، بازو سے پکڑا اور دروازے کی طرف کھینچا۔ ''جاؤ...... تم ابھی جاؤ...... ابھی جا کر سجاول کو بتاؤ یہ سب کچھ اور اس کے علاوہ بھی جو تمہارا دل چاہتا ہے، بک دو۔''

وہ بھونچکی رہ گئی تھی۔ اس نے دروازے کی چوکھٹ پکڑ لی تاکہ میں اسے کمرے سے باہر نہ نکال سکوں۔ میں نے اس کے ہاتھ چوکھٹ سے چھڑائے تو اس نے دوسری جانب کی چوکھٹ تھام لی۔ میں نے اسے ایک دھکا دے کر پیچھے ہٹا دیا۔ وہ کمرے کے اندر ہی صوفے پر جا گری۔ میں نے کرخت لہجے میں کہا۔ ''میں اسی لائق ہوں کہ تم مجھے بلیک میل کرو۔ شاید

وہ وقت تم بھول گئی ہو جب سجاول کے ڈشکرے تمہیں اور پہلوان کو پکڑ کر ڈیرے پر لے آئے تھے۔ وہ شرابی اعظم اور اس کا ساتھی نوچ کر کھا جانا چاہتے تھے تمہیں۔ یہ مجھے پتا ہے کہ میں نے کتنے حیلوں سے تمہاری جان چھڑائی۔ اور اب تم مجھے بلیک میل کرو گی۔ تو ٹھیک ہے کرو۔ کرا دو میری جنگ سجاول وغیرہ کے ساتھ۔" میں نے زور سے دروازہ بند کر دیا۔ وہ کمرے کے اندر صوفے پر گٹھڑی سی بن کر بیٹھ گئی۔ اپنا سر اپنے اوپر اٹھے ہوئے گھٹنوں پر رکھ دیا اور رونے لگی۔ میں بستر پر آ کر لیٹ گیا۔ دماغ میں سنسناہٹ تھی۔ وال کلاک کی ٹک ٹک جیسے دماغ پر ہتھوڑے برسا رہی تھی۔ نائٹ کلب بلب کی مدھم روشنی بھی زہر لگ رہی تھی۔ میں نے بلب بھی آف کر دیا اور کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد مجھے اپنے بالکل پاس سے جاناں کی ہلکی سی آواز آئی۔ "مجھے معاف کر دیں شاہ زیب۔ میرا مطلب یہ نہیں تھا...... میں نے تو یونہی ایک بات کہہ دی تھی۔ مجھے پتا نہیں تھا آپ کو ایسے غصہ آ جائے گا۔"

میں اسی طرح لیٹا رہا۔ اس نے ہولے سے میرا کندھا ہلایا...... میں نے کمبل چہرے سے ہٹا کر ٹیبل لیمپ روشن کیا۔ اس کے بال منتشر تھے۔ چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ اس نے ہنتجی لہجے میں ایک بار پھر سوری کہا۔ اس نے انگلیاں میرے کندھے میں گاڑ رکھی تھیں جیسے اس کندھے کو ہی اپنا واحد سہارا سمجھ رہی ہو۔

"چلو ٹھیک ہے۔" میں نے بھاری آواز میں کہا۔ "آئندہ مذاق میں بھی اس طرح کی بات نہیں کہنا، خاص طور سے یہاں پارا ہاؤس میں۔ تم جانتی ہی ہو۔ یہاں دیواروں کے بھی کان ہیں۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور تکیہ کمبل وغیرہ پکڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ قالین پر سونا چاہ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ "نہیں، ادھر ہی سو جاؤ۔"

چند لمحے ہچکچانے کے بعد اس نے تکیہ دوبارہ اس کی جگہ پر رکھ دیا۔ پتا نہیں رات کا کون سا پہر تھا۔ غنودگی میں جسم سے جسم ٹکرایا۔ میں نے اپنے ہاتھوں پر اس کے ہاتھوں کا لمس محسوس کیا۔ سانس سے سانس الجھی اور میرے اندر پھیلا ہوا بیکراں صحرا پانی کا طلب گار ہوا۔ پتا نہیں وہ پانی تھا یا سراب۔ حقیقت تھی یا دھوکا، لیکن جو کچھ بھی تھا عارضی طور پر مجھے اپنے بے پناہ درد سے بہت دور لے گیا۔

صبح ایک بار پھر مجھ پر وہی ندامت طاری تھی جس کا تجربہ مجھے چند بار پہلے بھی ہو چکا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ کوئی میرا راستہ روکے کھڑا ہے۔ مجھ سے پوچھ رہا ہے، تمہارا یہ چلن کیوں

ہے؟ تمہارے یہ اطوار کس لیے ہیں؟ اور وہ جو میرا راستہ روکے کھڑا تھا میں اس کے سامنے خود کو جواب دہ سمجھتا تھا۔ میرا دل کہتا تھا کہ اس کا حق ہے، مجھ سے یہ سب پوچھے۔ میں کیوں الکحل سے دل بہلاتا ہوں، میں کیوں زلفوں کی چھاؤں ڈھونڈتا ہوں؟ اور یہ کُرن تھا؟ یا یہ کون تھی؟ یہ وہی تھی جو ہمیشہ سے میرے دل میں موجود تھی۔ میں جب یورپ کی بے پناہ روشنیوں میں رہتا تھا، اس وقت بھی پنجاب کے کسی کھیت کی شبیہہ میرے ذہن میں ابھرتی تھی۔ سرما کی سنہری دھوپ میں سرسوں کے زرد پھولوں میں کھڑی وہ مجھے دیکھتی تھی، مسکراتی تھی۔ مجھ سے خاموشی کی زبان میں پوچھتی تھی تم کب آؤ گے؟ کب مجھ سے بات کرو گے؟ لیکن جب میں آیا تھا۔ میں اس سے ملا تھا۔ میں نے اس سے بات کی تھی تو وہ چپ ہوگئی تھی۔ اس نے منہ پھیر لیا تھا۔ کیا یہ صرف اس کی کوئی ادا تھی یا پھر میں ہی غلط تھا۔ مجھے ہی دھوکا ہوا تھا کہ وہ سنہری دھوپ میں، سرسوں کے زرد پھولوں میں کھڑی مجھے بلاتی ہے......شاید مجھے ہی دھوکا ہوا تھا۔

سینے میں دھواں سا پھیلنے لگا۔ آنکھوں کے کنارے جلنے لگے۔ میں نے الماری سے بیئر نکالی اور اس کے دو گلاس خالی کر دیئے۔ یوں لگا جیسے دماغ میں دہکتے ہوئے انگارے کچھ ماند پڑ رہے ہیں۔ میں نے کمرے کی کھڑکی کھولی۔ سورج کافی اوپر آ گیا تھا۔ دس بج رہے تھے۔ پاراہاؤس کی بلند باؤنڈری سے آگے نئی تعمیر ہونے والی عمارت کی چھت کے کنگرے دکھائی دے رہے تھے۔ اس نئے عالیشان محل کی تعمیر آخری مراحل میں تھی۔ جہاں بڑے صاحب کے دونوں بیٹوں کے لیے علیحدہ علیحدہ پورشن بنائے جا رہے تھے۔ درجنوں مزدور چھت پر کام کرتے دکھائی دیتے تھے۔ کنکریٹ مکس کرنے والی مشینوں کی مدھم گڑگڑاہٹ پاراہاؤس کے اندر تک پہنچتی تھی۔ ابھی اس بلڈنگ کی تزئین و آرائش مکمل ہونے میں شاید تین چار ماہ مزید لگنے تھے مگر دونوں بھائیوں کی شادی ابھی ہو رہی تھی۔ غالباً دو تین ہفتے کے اندر ہی۔ پتا نہیں ایسی کیا جلدی پڑ گئی تھی۔ یہ دو تین ہفتوں کی تاخیر بھی شاید اس لیے کی جا رہی تھی کہ تین دن پہلے پاراہاؤس میں ایک خونی ہنگامہ در و دیوار کو لرزا چکا تھا۔ نئی بلڈنگ میں تو کام ہو ہی رہا تھا، پاراہاؤس میں بھی کاریگر لگے ہوئے تھے۔ شدید ہنگامے میں دیواروں پر گولیوں کے بے شمار نشان آئے تھے انہیں ختم کیا جا رہا تھا۔ ٹوٹے ہوئے شیشوں کی جگہ نئے شیشے لگ رہے تھے۔ اسی دوران میں ایک پورشے گاڑی ڈرائیو وے سے گزری۔ عقبی نشست پر پاراہاؤس کا کرتا دھرتا ''بڑا صاحب'' بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے کے سرخ داغ نمایاں نظر آتے تھے اور ہونٹوں میں سگار دبا ہوا تھا۔ وہ عام طور پر بالکل ساکت و جامد بیٹھتا تھا، جیسے بہت سکون کی حالت

میں ہو۔ اس کے اس طرح بیٹھنے سے مجھے اپنا، سانپوں والی کھوہ میں بیٹھنا یاد آ گیا...... وہ جاگتی آنکھوں کا خواب لگتا تھا۔ کوئی نصف درجن سانپ میرے جسم پر چڑھائی کر چکے تھے۔ میں ساکت جامد اور پُرسکون نہ رہتا تو شاید اب تک قبر میں اتر چکا ہوتا۔ وہ نہ بھولنے والی گھڑیاں تھیں۔

اچانک میں ٹھٹک گیا۔ مجھے سجاول کے ساتھ بڑے صاحب کا دست راست حلمی نظر آیا۔ دونوں گفتگو کرتے ہوئے پھولوں کی ایک وسیع و عریض کیاری کے ساتھ ساتھ چلتے جا رہے تھے۔ گلاب کے پھولوں کی ایسی بے شمار کیاریاں اور تختے پارا ہاؤس میں موجود تھے اور ان سے بڑے صاحب کے ذوق اور خوشبو پسندی کا پتا چلتا تھا۔ سجاول اور حلمی کے درمیان پتا نہیں کیا راز و نیاز ہو رہا تھا۔

انیق، سجاول کی طرف سے مطمئن نہیں تھا۔ وہ اکثر یہ بات کہتا تھا کہ یہ چونا لگانے والا بندہ ہے۔ ہوسکتا ہے کہ پورا پورا انڈین ولن امریش پوری بن جائے۔ ہم یہاں لٹکے رہ جائیں اور یہ بڑے صاحب کو کوئی بہت بڑا ٹیکا لگا کر چمپت ہو جائے۔ میں، انیق کو ایسی باتوں پر جھاڑ دیتا تھا لیکن اندر سے مجھے بھی معلوم تھا کہ سجاول سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔

کچھ دیر بعد وہ کمرے میں واپس آیا تو مجھے بیدار دیکھ کر چونکا۔ ”ہاں بھئی شاہی...... تمہارا وہ نکو شہزادہ آج دوسرے کمرے میں سو رہا تھا۔ کیا جھگڑا ہو گیا؟“

میں نے کہا۔ ”اتنے بھولے مت بنو، تم سب جانتے ہو۔ یہ بلا تم نے ہی میرے پیچھے لگائی ہے۔“

”شاید تم جاناں کی بات کر رہے ہو لیکن وہ تو بنگلے میں آقا جان کی زنانی کی مٹھی چاپی کر رہی تھی اور اس کو کتابیں پڑھ کر سنا رہی تھی؟“

”لیکن اب وہ یہاں پارا ہاؤس میں ہے۔ یہ بڑا صاحب ہمارا پورا پورا میزبان بنا ہوا ہے۔“

”چلو تمہاری راتیں چنگی گزر جائیں گی۔“ وہ آنکھ دبا کر بولا۔ ”اور وہ جو تمہارے پیٹ میں عشق کے مروڑ اٹھتے تھے وہ بھی ذرا کم ہو جائیں گے...... بلکہ کم ہونا شروع ہو گئے ہوں گے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا ناں کہ یہ زنانیاں تو بس وقت گزاری کے لیے ہونی چاہئیں...... وہ کیا کہتے ہیں...... تُو نہیں ہور سہی...... ہور نہیں ہور سہی۔“

میرے سینے میں شعلے بھڑک گئے۔ یہ دوسری، تیسری بار تھی کہ سجاول نے ایسی بات کہی تھی۔ جو بھی تھا، میں تاجور کے خلاف کچھ سن نہیں سکتا تھا۔ میں نے سجاول کی آنکھوں میں

دیکھتے ہوئے کہا۔ ''سجاول...... یہ کیا بات کہہ رہے ہو تم؟''

میں نے بالکل عام سے الفاظ کہے تھے لیکن ان عام الفاظ، اور عام لب و لہجے کے پیچھے جو آگ تھی، اس کو سجاول نے فوراً محسوس کر لیا۔ وہ جو کچھ بھی تھا بلا کا معاملہ فہم اور رمز شناس تھا۔ اس نے ایک دم دفاعی لہجہ اختیار کیا اور بولا۔ ''اچھا، چلو بھول ہو گئی۔ اب یہ بات نہیں کروں گا لیکن تم بھی کبھی کسی سے یہ بات نہ کرنا...... کبھی بھی...... میرا مطلب ہے کہ تاجور کی بات......''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' میں نے گمبھیر آواز میں پوچھا۔

''تاجور کو تم خود اس کی مرضی کی جگہ پر چھوڑ کر آئے ہو لیکن اس کے منگیتر ساقے اور عالمگیر وغیرہ کو ہم نے یہی بتایا ہے کہ وہ ڈیرے سے خود ہی کہیں بھاگ گئی تھی۔ تمہاری خاطر اتنا بڑا جھوٹ بولنا پڑا مجھے۔ اب اگر کبھی یہ راز فاش ہوا تو عالمگیر مجھے قتل کر دے گا یا میں اسے......''

''میں اس کی بات کیوں کروں گا؟ مجھے اس کی زندگی چاہیے...... اس کی عزت چاہیے۔ ہاں...... کبھی تم بھی اپنے دماغ میں کوئی فتور نہ لانا...... ورنہ بہت کچھ ختم ہو جائے گا۔'' میرا لہجہ ایک بار پھر آتش بار ہو گیا تھا۔

وہ دوستانہ انداز میں بولا۔ ''وہ سوہنی زنانی ہے۔ یہ ساقا اور عالمگیر اتنی جلدی اس کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ جگہ جگہ اس کو ڈھونڈیں گے۔ میں تو کہتا ہوں کہ اگر تمہارے بس میں ہے تو جلدی اس کی شادی کرا دو...... ایک دو بچے پیدا کر لے گی تو معاملہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔''

سجاول کی گفتگو کا انداز مجھے چٹخا دیتا تھا۔ میں نے کہا۔ ''تمہیں ایسی فکروں میں دبلے ہونے کی ضرورت نہیں اور اس موضوع پر ہم بات نہ ہی کیا کریں تو ٹھیک ہے۔''

اس نے ایک دم موضوع بدلا۔ سگریٹ سلگا کر بولا۔ ''ابھی تھوڑی دیر پہلے حلمی صاحب سے میری بات چیت ہوئی ہے، ایک نئی گل کا پتا چلا ہے۔''

میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ساتھ ساتھ میں اپنا طیش دبا رہا تھا۔

سجاول نے کہا۔ ''یہ بڑا صاحب چاہتا تھا کہ پہلے یہ دوسری بلڈنگ مکمل ہو جائے...... بالکل ریڈی ہو جائے اس کے بعد دونوں بیٹوں کی شادیاں کر کے ان کو علیحدہ علیحدہ حصے میں بھیج دیا جائے۔ پر اس کام مین کم از کم چھ سات مہینے اور لگنے تھے اور ہو سکتا ہے کہ زیادہ لگ جاتے۔ لڑکوں کی ماں چاہتی ہے کہ یہ شادیاں جلد ہوں، خود لڑکوں کا خیال بھی یہی ہے۔ بڑا لڑکا تو آج سے تین سال پہلے ہی لٹھ لے کر باپ کے پیچھے تھا کہ میری شادی کرو۔ شادی ہوئی اور

بیوی بھی مرگئی۔اب اس کے سر پر پھر سہرا باندھا جارہا ہے۔"

"بات کچھ کچھ میری سمجھ میں آرہی ہے۔ یہ دونوں لڑکے مذہبی ذہن کے ہیں اور ماں بھی ایسی ہی ہے بلکہ لڑکوں سے بھی بڑھ کر ہے۔ وہ اپنے بچوں کو باپ کے اثر اور آس پاس کی بے شمار برائیوں سے بچانا چاہتی ہے۔اس کی خواہش ہے کہ اسلامی تعلیم کے مطابق جلداز جلد بچوں کے نکاح ہوں۔"

"مگر وہ یہ نہیں جانتی کہ دونوں کے نکاح کے لیے کیا کچھ ہورہا ہے؟"

"ہاں، یہ تو ہے۔ جن لوگوں کے ذمے یہ کام لگایا گیا ہے کہ وہ ان لڑکوں کے لیے دلہنیں ڈھونڈیں، وہ یہ کام اپنے طور طریقے سے کررہے ہیں۔"

"بات پھر وہیں پر آجاتی ہے۔" سجاول نے کہا۔"یہ لڑکے ایسے کیوں ہیں کہ ان کے لیے ایسی خاص دلہنیں ڈھونڈنی پڑ رہی ہیں۔ اگر واقعی کوئی ایسی بات ہے کہ یہ...... زہریلے ہیں تو پھر کیوں؟ اور کیسے؟"

کچھ دیر خاموش رہ کر وہ بولا۔"یہ آقا جان اور حلمی وغیرہ اس فیملی کے خاص الخاص نوکروں میں سے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اس بارے میں کچھ جانتے ہوں۔"

"پتا نہیں کیوں، مجھے ایسا نہیں لگتا۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ اس فیملی کا بالکل اندرونی معاملہ ہے اور اسے ان لوگوں نے بس اور بس اپنے تک ہی رکھا ہوا ہے۔"

"آزمانے میں کیا حرج ہے؟" سجاول نے مونچھوں کو ہلکا سا بل دے کر کہا۔(وہ آقا جان یا حلمی پر ہاتھ ڈالنے کی بات کررہا تھا)

"حرج تو ہے۔ ہمارا سارا کھیل خراب ہوسکتا ہے۔ ہاں ایک بات ذہن میں آتی ہے۔ یہ جو لوگ برونائی سے بڑے صاحب کے پیچھے آئے ہیں، یہ ضرور اصل کہانی جانتے ہوں گے۔ میرا مطلب ہے، ناقب اور اس کے ساتھی۔"

"مگر وہ تو اب پولیس کے حوالے ہیں۔"

"مجھے نہیں لگتا۔" میں نے کہا۔

سجاول نے میری آنکھوں میں دیکھا اور اس کی چوڑی پیشانی پر سوچ کی لکیریں نمودار ہوئیں۔ وہ بولا۔"تمہاری یہ بات میرے دماغ میں بھی آتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ناقب وغیرہ کو پولیس کے حوالے نہ کیا گیا ہو اور یہیں کہیں پاراہاؤس میں بند رکھا گیا ہو یا پھر ویسے ہی کہیں مار کر گاڑ دیا گیا ہو۔"

"کسی طرح ناقب وغیرہ کی ٹوہ لگائی جانی چاہیے۔" میں نے کہا۔

''اپنے نکو شہزادے سے کہو۔ ٹھیک ٹھاک مسخرہ ہے۔ لوگوں میں بہت جل گھل مل جاتا ہے۔''

''ہاں اسے بھی کہا جا سکتا ہے...... اور...... وہ جو تمہاری سوہنی کڑی ہے۔ وہ کوئی کام نہیں دے رہی؟'' میرا اشارہ سنبل کی طرف تھا (وہ بڑے صاحب کی منظورِ نظر بنی تھی اور بڑی چاہت سے یہاں لائی گئی تھی)

سجاول بولا۔ ''وہ اتنے جوگی نہیں ہے۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ اپنے اردگرد نظر رکھے لیکن کوئی بہت زیادہ کام کی بات ابھی تک وہ نہیں بتا سکی۔ حالانکہ وہ اس رہائشی حصے کے اندر ہے جہاں یہ ٹبر (خاندان) رہتا ہے۔ سب کچھ اس کھوتی کے سامنے ہے۔ آج کل بڑے صاحب کے ساتھ سو رہی ہے۔ کافی وقت گزار رہی ہے اس بڈھے ککڑ کے ساتھ۔''

''کافی مال پانی بھی بنا رہی ہوگی؟'' میں نے ٹوہ لینے کے لیے سجاول سے پوچھا۔

''ہاں وڈے صاحب نے ایک ہار دیا تھا اسے ''منہ دکھائی'' کے طور پر۔ اور کچھ دوسری چیزیں تھی۔'' سجاول نے گول مول بات کی۔

''اگر وہ اتنا مہربان ہے تو پھر سنبل کو کوشش کرنی چاہیے کہ اسے ٹٹولے۔''

''کہا ہے نا کھوتے کی بچی ہے...... اور وہ بڈھا ککڑ ہے ایک نمبر کا کھوچل۔ ایسے لوگ حسن کے لشکارے سے اندھے تو ضرور ہو جاتے ہیں، پر اپنے مطلب کی چیزیں انہیں نظر آتی رہتی ہیں۔''

وہ ہار جس کا ذکر ابھی سجاول نے کیا تھا، میں نے پرسوں نوخیز سنبل کے گلے میں دیکھا تھا۔ وہ دو ملازماؤں کے ساتھ باغیچے میں اٹھکیلیاں کر رہی تھی۔ وہ سفید مینا بھی اس کے لیے پارا ہاؤس میں پہنچا دیا گیا تھا جو وہ بنگلے میں لیے پھرتی تھی۔ میں نے اس کے گلے کا ہار ذرا فاصلے سے دیکھا تھا۔ اس پر گہرے سبز زمرد جڑے ہوئے تھے۔ ایک موٹے سے اندازے کے مطابق وہ ہار پندرہ بیس لاکھ کا تو ہوگا۔ سجاول یہ بات بھی غلط کہہ رہا تھا کہ سنبل اندر خانے کی باتیں نہیں بتا رہی۔ وہ تو اسے لایا ہی جاسوسی کے لیے تھا۔ وہ اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق سجاول کا کام کر رہی تھی۔

''وہ دیکھو تمہارا نکو کیا کر رہا ہے۔'' سجاول نے برآمدے سے آگے گراسی لان کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ انیق ایک سنگی بینچ پر بیٹھا تھا اور ایک چھوٹے سے صاف ستھرے بندر کو اپنے ہاتھ سے مکئی کے بھٹے کھلا رہا تھا۔ بندر کبھی چھلانگ لگا کر اس کے کندھے

پر چڑھ جاتا تھا، کبھی اس کے گھٹنے پر بیٹھ کر بھٹے کھانے لگتا تھا۔

سجاول نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''لگتا ہے کہ تمہارے نکو کو اپنی بچھڑی ہوئی ہمشیرہ مل گئی ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے یہ بندریا ہے؟''

''ہاں، اور میرا خیال ہے کہ یہاں پارا ہاؤس کے کسی ملازم نے ہی پالی ہوئی ہے۔ شاید ہیڈ خانساماں نے۔''

بندریا اب باقاعدہ انیق کی گود میں بیٹھ گئی تھی اور اس کی ٹھوڑی پر ہاتھ چلا رہی تھی۔ جیسے وہ حجام ہو اور اس کی شیو کرنا چاہ رہی ہو۔ انیق نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ پھر پینٹ کی پچھلی جیب سے کنگھی نکالی اور بڑی ملائمت سے بندریا کے بالوں میں پھیرنے لگا۔ غالباً اس نے دو چار جوئیں بھی نکالیں اور انہیں دونوں انگوٹھوں کے ناخنوں سے مسلا۔

سجاول نے کہا۔ ''یار! یہ تمہارا نکو ویسے ہی جھلا ہے یا جان بوجھ کر جھلا بنتا ہے۔''

''اس کا پتا تو مجھے بھی آج تک نہیں چلا...... مگر اس کے اکثر کاموں میں کوئی نہ کوئی حکمت بھی ہوتی ہے۔''

''کبھی کبھی تو بڑا تاؤ آتا ہے اس پر۔ تمہارا خیال آ جاتا ہے ورنہ ایسا جھانپڑ ماروں اس کو کہ گردن کڑک ہو جائے۔''

''ایسی غلطی نہ کرنا۔ یہ بڑے کام کا لڑکا ہے۔ تم نے ہنگامے والی رات کو دیکھ ہی لیا تھا۔ اس نے کتنی بے جگری سے ہمارا ساتھ دیا۔ دیکھنے میں عام سا لگتا ہے مگر عام ہے نہیں۔ موم نظر آتا ہے مگر وقت پڑنے پر پتھر اور فولاد کی طرح سخت بھی ہے۔''

''پتا نہیں اس کی صورت دیکھ کر کیوں مجھے تاؤ آتا ہے۔''

''اس کی صورت میں ہی تو کمال ہے، بڑی جلدی لوگوں میں گھل مل جاتا ہے۔ دوسرے بھی اس سے کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتے۔''

گراسی لان میں بندریا اطمینان سے کنگھی کرا رہی تھی اور بھٹے کھا رہی تھی۔ اسی دوران میں ایک موٹا تازہ شخص جھومتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ ''یہی بڑا خانساماں ہے یہاں کا۔'' سجاول نے بتایا۔

وہ یقیناً برونائی ہی کا باشندہ تھا لیکن رنگ قدرے سرخ و سپید تھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ اور پپوٹے سوجے سوجے تھے۔ اس نے ایک نفیس گاؤن پہن رکھا تھا اور ہاتھوں پر سفید دستانے تھے جو کہنیوں تک پہنچتے تھے۔

اسے دیکھ کر انیق بڑے تپاک سے کھڑا ہو گیا۔ پھر دونوں پتھریلے بینچ پر ہی بیٹھ گئے۔ وہ اشاروں کنایوں میں باتیں کر رہے تھے۔ انیق حالانکہ مالے زبان جانتا تھا لیکن وہ خانساماں پر اپنی صلاحیت ظاہر نہیں کر رہا تھا۔ اتنے میں خانساماں کے سیل فون پر کال آ گئی۔ وہ کال ریسیو کرتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ بندریا جس نے فراک بھی پہن رکھا تھا جست لگ کر خانساماں کے کندھے پر چلی گئی۔ خانساماں نے انیق کو مسکرا کر دیکھا اور غالباً خدا حافظ کہتا ہوا کمروں کی طرف چلا گیا۔

کچھ دیر بعد انیق بھی ہمارے پاس پہنچ گیا۔ سجاول کو دیکھ کر اس نے نہایت برا سا منہ بنایا لیکن یہ احتیاط رکھی کہ سجاول اس برے سے منہ کو دیکھ نہ سکے۔

''ہاں، اس باندری سے کیا رشتے داری گانٹھ رہے تھے؟'' سجاول نے پوچھا۔

''آپ سے مذاق کی بات کروں گا تو آپ ناراض ہو جائیں گے۔''

''چلو نہیں ہوتا، تم بکو۔''

انیق ''بکو'' کے لفظ کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ بے چاری اکیلی ہے۔ باپ فوت ہو چکا ہے۔ ماں ایک لنگور کے ساتھ بھاگ گئی تھی اب اس کی اپنی عمر شادی کی ہے۔ مجھ سے یہی کہہ رہی تھی کہ جوان باندری ہوں۔ اپنے منہ سے کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ میرے ویاہ کی عمر نکلی جا رہی ہے۔ تم میرے لیے کوئی بر ڈھونڈنے کی کوشش کرو۔''

سجاول نے تیز تیکھے لہجے میں کہا۔ ''میلوں ٹھیلوں میں اکثر لوگ وچھڑ جاتے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ بھی تمہاری کوئی وچھڑی ہوئی ہمشیرہ ہے۔ بڑا بھائی سمجھ کر تم سے مدد مانگ رہی ہے۔''

انیق نے جواباً کوئی کراری سی بات کرنے کے لیے منہ کھولا لیکن میں نے آنکھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ میں جانتا تھا کہ انیق کی بات پر سجاول کسی بھی وقت ہتھے سے اکھڑ سکتا ہے۔

میری ہدایت پر انیق چپ رہا۔ سجاول دھیمی مگر غصیلی آواز میں بولا۔ ''یار! یہاں ہم باندروں کی جوئیں نکالنے کے لیے نہیں آئے۔ کچھ کرنا ہے ہمیں، وقت گزر جائے گا تو پھر ہاتھ لگا کر روتے رہو گے۔ نہ آگے کے رہو گے نہ پیچھے کے۔''

انیق سر کھجا کر رہ گیا۔

سجاول کا موڈ آف ہو رہا تھا۔ وہ اٹھ کر لمبے ڈگ بھرتا ہوا اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ برآمدے میں کھڑے نیلی وردی والے مسلح گارڈ نے اسے باقاعدہ سلیوٹ کیا۔ میں اور

انیق مدھم آواز میں باتیں کرنے لگے۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''یہ کیا چکر چلاتے پھر رہے ہو؟''

''بیکار کا چکر نہیں ہے۔ خانساماں ازمیر طیب سے دوستی گانٹھی ہے میں نے۔ ایک دو بڑے کام کی باتیں معلوم ہوئی ہیں۔''

''مثلاً کیا؟''

''کل ازمیر مجھے اپنا رہائشی کوارٹر دکھانے کے لیے لے گیا۔ کہنے کو تو کوارٹر تھا لیکن دیکھنے میں چھوٹا سا وِلا نظر آتا تھا۔ بعد میں ہم چھت پر چلے گئے اور کافی دیر باتیں کرتے رہے۔''

''باتیں کس طرح؟ تم تو اس سے اشاروں میں گفتگو فرمار ہے تھے؟''

''تو اشاروں میں گفتگو ہوتی ہے ناجی۔ آپ نے انڈین فلم کوشش دیکھی تھی؟ سنجیو کمار اور جیا بہادری والی۔ دونوں گونگے تھے۔ ویسے اس لڑکی نے پتا نہیں کیا بہادری دکھائی ہوئی ہے کہ ہر کوئی اسے ''بہادری'' کہتا ہے۔ ٹھیک ہے ایک بہت لمبے بندے سے شادی کرنا بھی بہادری ہے لیکن......''

''تم بکواس چھوڑ کر کام کی بات کرو تو اچھا ہے۔''

اس نے اپنے سر پر ہلکا سا مکا رسید کیا۔ جیسے خود کو بکواس کرنے سے روک رہا ہو پھر مسکرا کر بولا۔ ''سوری...... میرا مطلب ہے کہ اشاروں میں بھی بندہ بہت سی باتیں کر سکتا ہے اور مجھ پر تو اشاروں میں باقاعدہ انکشاف ہوا ہے...... اور انکشاف یہ ہے کہ کچن میں بڑے صاحب کے دونوں بیٹوں کے لیے عموماً کھانا پکتا ہے...... دراصل یہ دونوں بیٹے شراب کباب وغیرہ سے بہت دور ہیں اور بالکل سادہ کھانا کھاتے ہیں۔ دال چاول، سبزی، دلیہ وغیرہ۔''

''تو اس میں ایسا کون سا ''وکی لیکس'' والا انکشاف ہے؟''

''آپ پوری بات تو سنیں، مجھے پتا چلا ہے کہ دونوں بھائیوں کے لیے جو کھانا پکتا ہے، وہ کھانے کے وقت سے کوئی ایک گھنٹا پہلے ہی بڑی بیگم کے پاس پہنچا دیا جاتا ہے۔ بعد میں وہ کھانا دسترخوان تک پہنچتا ہے۔''

''بھئی، یہ بھی کوئی ایسی انوکھی بات نہیں ہے۔ اکثر بڑے گھرانے جن کی عداوتیں وغیرہ چل رہی ہوتی ہیں کھانے پینے میں بہت زیادہ احتیاط کرتے ہیں۔ کھانے کو پہلے چیک کیا جاتا ہے۔''

''لیکن یہاں ایک پوائنٹ اور ہے ناجی، پورے گھرانے کا کھانا چیک نہیں ہوتا۔ صرف دونوں لڑکوں، کمال احمد اور ابراہیم کا کھانا چیک ہوتا ہے اور مجھے تو ایک اور شک ہو رہا ہے شاہ زیب بھائی۔''

''کیا؟''

وہ کچھ دیر سنسنی خیز انداز میں میری طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''مجھے لگتا ہے جی، کہ یہ کھانا اس لیے کچن سے نہیں نکالا جاتا تاکہ اسے چیک کیا جائے۔''

''تو پھر؟''

''یہ اس لیے نکالا جاتا ہے، تاکہ اس میں کچھ ملایا جائے۔''

میں حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگا۔ ''تمہارا مطلب ہے کہ لڑکوں کی ماں یا پھر ماں اور باپ لڑکوں کی خوراک میں کچھ ملاتے ہیں؟''

''فی الحال تو یہ ایک مفروضہ ہی ہے...... لیکن مجھے لگتا ہے کہ ایک آدھ دن تک میں کسی نتیجے پر پہنچ جاؤں گا۔''

''لیکن کرو گے کیا؟''

وہ مسکرایا۔ ''یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔''

''مگر کہیں گردن نہ پھنسا بیٹھنا۔ تم دیکھ ہی رہے ہو یہاں سکیورٹی کتنی سخت ہے۔''

''سکیورٹی سخت ہے تو آپ کا یہ خادم بھی نرم نہیں ہے۔ مجھ پر بھروسا رکھیں جو کروں گا احتیاط سے کروں گا۔ میری وجہ سے آپ کا کھیل بگڑے گا نہیں۔''

اسی دوران میں میرے سیل فون پر لاہور سے پھر داؤد بھاؤ کی کال آ گئی۔ داؤد بھاؤ کے پاس کئی خاص نمبر تھے جو کسی بھی طرح ٹریس نہیں ہو سکتے تھے۔ داؤد بھاؤ نے بتایا کہ اس کا دست راست جھارا اسلام آباد میں ہے، اور لڑکی کا کھوج لگانے کی بھرپور کوشش کر رہا ہے۔ داؤد بھاؤ نے بتایا کہ انیق کی طرح وہ بھی ایک کائیاں بندہ ہے اور ہر کام کے لیے راستے نکالنا جانتا ہے۔

میں نے کہا۔ ''داؤد بھاؤ، آپ نے جو ٹینشن لی ہے اس کے لیے آپ کا بہت شکریہ...... مگر مجھے لگتا ہے کہ میں لڑکی تک پہنچنے والا ہوں۔''

''کس طرح؟''

''شاید، میں غلط کہہ گیا۔ آپ یوں کہہ لیں کہ لڑکی مجھ تک پہنچنے والی ہے۔''

''تمہاری بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔''

''آپ یوں سمجھ لیں کہ لڑکی نے اغوا ہونے کے بعد جس جگہ پہنچنا ہے، وہاں میں اور انیق پہلے سے ہی موجود ہیں۔ مجھے پچانوے فیصد امید ہے کہ زینب کو یہیں پارا ہاؤس میں لایا جائے گا۔''

''یہ تو زبردست بات ہے لیکن اگر یہ اندازہ غلط ثابت ہوا تو؟''

''پھر میں دوبارہ آپ سے مدد کی درخواست کروں گا۔''

''میں ہر وقت تیار ہوں۔ کوئی جھجک محسوس نہیں کرنا۔ کہیں مارا ماری کرنی ہو تو بھی ہر طرح کی نفری موجود ہے۔'' وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

میں نے ایک بار پھر داؤد بھاؤ کا شکریہ ادا کیا۔

○......❖......○

انیق نے کہا تھا کہ ایک آدھ دن تک وہ کوئی اہم سراغ لگائے گا مگر پورے دو دن گزر گئے۔ وہ کوئی اہم بات نہیں بتا سکا۔ ہاں وہ ایک دو بار خانساماں ازمیر طیب کے ساتھ ضرور نظر آیا۔ میرے جسم پر کسی زہریلے کیڑے کے رینگنے سے جو سرخ نشان نمودار ہوئے تھے وہ اب کافی حد تک معدوم ہو گئے تھے اور میں اس حوالے سے سکون میں تھا۔ دوپہر کو میں نے دیکھا کہ انیق ازمیر کی لاڈلی بندریا کے ساتھ لان میں فٹ بال کھیل رہا ہے۔ بندریا نے باقاعدہ سویٹر اور گرم پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ پارا ہاؤس کی اندرونی بالکونی میں چند لڑکیاں کھڑی دلچسپی سے یہ تماشا دیکھ رہی تھیں۔ ان میں زرق برق لباس والی سنبل بھی تھی جو آج کل یہاں ''خاتونِ اول'' بنی ہوئی تھی۔ لڑکیوں کی چہکاریں مہمان خانے تک پہنچ رہی تھیں۔

سہ پہر کو میں نے انیق سے کہا کہ وہ بندر کا تماشا ہی دکھاتا رہے گا کہ کوئی رپورٹ بھی دے گا۔

وہ بولا۔ ''ابھی تک تو رپورٹ کوئی نہیں۔ دراصل میں چاہ رہا تھا کہ کسی طرح پارا ہاؤس کے کچن تک پہنچ سکوں لیکن کچھ دوسری جگہوں کی طرح کچن کی سکیورٹی بھی بڑی سخت ہے۔ چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی۔''

''اگر کچن تک تمہاری رسائی ہو جاتی تو پھر کیا کرتے؟''

''مجھے پتا ہے کہ آپ کے پاس ایک زبردست پن ہول کیمرا موجود ہے۔ دال کے دانے جتنا...... اسے کہیں رکھنے کی کوشش کی جا سکتی تھی۔''

''چلو، اب یہ تو نہیں ہوا۔ اب کیا کرو گے؟''

''میں اب ازمیر کو ٹٹولنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ وہ تھوڑی بہت انگریزی بول لیتا ہے۔

میں بھی ٹوٹے پھوٹے انگلش لفظ بولتا ہوں، ایک دوسرے کی بات سمجھ میں آجاتی ہے۔''

انیق کہہ تو رہا تھا لیکن اس کے لہجے سے اشارہ ملتا تھا کہ خانساماں کے ذریعے کچھ معلوم ہونے کی امید کم ہی ہے۔

میں نے انیق سے کہا۔''تم کھل کر بتاؤ کہ چاہتے کیا ہو؟''

''بس یہی جاننا چاہ رہا ہوں کہ کسی طرح پتا چلے کہ دونوں بھائیوں کے کھانے کو علیحدہ سے کیوں لے جایا جاتا ہے اور اس کے ساتھ کیا ہوتا ہے؟''

میں نے سگریٹ سلگا کر کہا۔''ان دو ڈھائی دنوں میں، میں نے بھی تھوڑی سی سوچ بچار کی ہے اور کچھ ہوم ورک بھی کیا ہے۔ میں تمہیں اس کا طریقہ بتاتا ہوں۔''

وہ ہمہ تن متوجہ ہو گیا۔ میں نے کہا۔''آج کسی طرح معلوم کرو کہ رات کے کھانے میں دونوں بھائیوں کے لیے کیا پکا ہوگا۔''

''یہ تو مجھے معلوم ہے۔ یہ لوگ زیادہ چاول ہی کھاتے ہیں، آج بھی دونوں بھائیوں کے لیے سبزیوں والے چاول ہیں اسے یہ لوگ سبزی پلاؤ کہتے ہیں۔''

''کنفرم؟''

''آج کے دن کے لیے تو کنفرم ہے۔''

''چلو، یہ تو ہو گیا۔ اب شام کا انتظار فرماؤ۔''

''شام کو کیا ہوگا؟''

''شام کو سجاول کو سنبل سے ملنا ہے۔ ہم سنبل سے تھوڑا سا کام لیں گے۔''

''کس طرح؟''

''تم پہیلیاں بجھوا سکتے ہو تو اب مجھے بھی موقع دو۔''

وہ چپ ہو گیا اور سوچنے لگا۔

میں نے سنبل کی آمد سے پہلے ہی سجاول سے تفصیلی بات کر لی تھی۔ وہ شام سے کچھ دیر پہلے آئی۔ پارا ہاؤس میں چونکہ آناً فاناً سجاول کو زبردست اہمیت حاصل ہو گئی تھی اس لیے جب وہ سرپرست کی حیثیت سے سنبل سے ملنے کی بات کرتا تھا تو یہ بات مانی جاتی تھی۔ اس نے بڑے صاحب کو بھی یہ باور کرا دیا تھا کہ سنبل کو رام رکھنے کے لیے کبھی کبھی اس کا سنبل سے ملنا بہتر ہے۔

سنبل کے ساتھ دو اسپیشل گارڈز تھے۔ وہ باہر ہی کھڑے رہے۔ سنبل اپنے زرق برق لباس کو جھلاتی ہوئی سجاول کے آرام دہ کمرے میں آ گئی۔ میں بھی اس وقت وہیں موجود تھا۔

سنبل گلاب کے عطر میں بسی ہوئی تھی۔ شاید وہ رات بھر بڑے صاحب کی ''رنگین مزاجی'' کا ساتھ دیتی رہی تھی، کچھ مضمحل سی دکھائی دیتی تھی مگر اس کی آنکھوں سے جھلکنے والی الہڑ شوخی اب بھی لشکارا مارتی تھی۔

''کیسی گزر رہی ہے؟'' سجاول نے بے باکی کے ساتھ اس سے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں۔'' وہ زیرِ لب مسکرائی۔ ''مگر اس دوسری کو بڑی آگ لگی ہوئی ہے۔''

''کون دوسری؟''

''وہی سفید پتلون اور لال جرسی والی، کیا نام ہے پرکٹی کبوتری کا...... روحی۔''

سنبل اسی لڑکی کی بات کر رہی تھی جسے آقا جان کی آشیر باد حاصل تھی اور اس آشیر باد کے سہارے وہ چاند کی چودھویں رات کو پارا ہاؤس کے لیے منتخب ہوئی تھی۔ شاید اب وہ سنبل سے رقیبانہ جلن محسوس کر رہی تھی۔

سنبل نے بتایا کہ وہ کس طرح آتے جاتے اسے گھورتی ہے اور دوسری خواصوں کے ساتھ چہ میگوئیاں کرتی ہے۔ خواصیں وہی عورتیں تھیں جنہیں پارا ہاؤس کی مستقل رہائش نصیب ہو گئی تھی۔ وہ بڑے ٹھاٹ کے ساتھ پارا ہاؤس کے ایک علیحدہ پورشن میں رہتی تھیں۔ انہیں کبھی کبھار بڑے صاحب کی قربت کا موقع بھی ملتا تھا۔

سجاول نے سنبل کو سرتا پا کڑی نظروں سے گھورا۔ ''کوئی کام کی بات بھی معلوم کی ہے تُو نے، یا بس اس کڑی سے گھوریوں کا مقابلہ ہی کر رہی ہو؟''

''بہت سخت لوگ ہیں یہ۔ زنانہ پہرے دارنیاں بھی ہیں۔ سب خواصوں کو اپنی نظر میں رکھتی ہیں۔ کل ایک خواص ایک گارڈ سے باتیں کر رہی تھی۔ اس گارڈ کو پہرے دارنیوں نے پکڑ کر بری طرح مارا اور پھر تہ خانے کی طرف لے گئیں۔''

اس طرح کی دو چار مزید باتیں بھی سنبل نے اپنے مخصوص لب و لہجے میں بتائیں۔ باتیں کرتے ہوئے اس کے یاقوتی ہونٹوں کے اندر دانت کلیوں کی طرح چمکتے تھے اور بات سننے والا بس انہیں دیکھتا رہ جاتا تھا۔ پروگرام کے مطابق سجاول کے پاس ایک چھوٹا سا پلاس موجود تھا۔ سنبل کے گلے میں زمرد کے قیمتی پتھروں والا وہی بیش قیمت ہار نظر آ رہا تھا جو بقول سجاول اسے بڑے صاحب نے ''منہ دکھائی'' کے طور پر دیا تھا۔ سجاول نے ہار کا بغور جائزہ لیا اور پھر چھوٹے سے پلاس کی مدد سے ہار کی ایک لڑی ہار سے علیحدہ کر لی۔ اس کی لمبائی بمشکل تین انچ ہو گی۔ اس میں چھوٹے سائز کے سچے یمنی موتی جڑے ہوئے تھے۔ بے شک یہ چھوٹی سی لڑی تھی مگر اس سے ہار کی موزونیت اور خوب صورتی ماند پڑ گئی۔

''یہ کیا ہے؟'' سنبل نے حیرت سے پوچھا۔
''تمہارے ہار کی یہ لڑی کہیں گر گئی ہے اور تم اسے ڈھونڈتی پھر رہی ہو۔'' سجاول نے کہا۔
''مم...... میں کچھ سمجھی نہیں۔''
''میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔'' میں نے مداخلت کی پھر آسان لفظوں میں تفصیل کے ساتھ اسے آگاہ کیا کہ اسے کیا کرنا ہے...... اور کب کرنا ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ فی الحال وہ کسی کو لڑی گم ہونے کے بارے میں نہیں بتائے گی اور اپنا دوپٹا اس طرح رکھے گی کہ کسی کی نظر ہار پر نہ پڑ سکے۔ ہم اس لڑی کو ڈھونڈنے کے بہانے ایک خاص جگہ پر جانا چاہتے ہیں۔''
''کہاں؟'' اس نے دیدے پٹپٹا کر پوچھا۔
''اس جگہ جہاں پارا ہاؤس کا کچرا پھینکا جاتا ہے۔''
''لیکن کیوں؟''
''اس کا جواب بعد میں دیں گے۔'' سجاول نے کہا۔ ''فی الحال تم یہ ذہن میں رکھو کہ اگر لڑی گم ہونے کا پتا چل جائے تو تم نے بڑے صاحب سے یہی کہنا ہے کہ تم ڈر گئی تھیں، تم نے صرف مجھے بتایا تھا کہ ہار سے لڑی گم ہو گئی ہے اور میں نے تم سے کہا تھا کہ میں اسے ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہوں۔'' سنبل کو پوری بات سمجھا کر ہم نے واپس بھیج دیا۔ اسی دوران میں سجاول کو ''بڑے صاحب'' کا بلاوا آ گیا اور وہ اس سے ملنے کے لیے چلا گیا۔ بڑا صاحب اور بڑی بیگم اسے یہاں مہمان خصوصی کا درجہ دے رہے تھے۔
سجاول کے جانے کے بعد انیق نے مجھ پر سوالوں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ میرا پروگرام کیا ہے اور میں نے پچھلے دو تین دن میں کیا ہوم ورک کیا ہے؟
میں نے کہا۔ ''شہزادے! میرا ہوم ورک کچرے کے سلسلے میں ہے۔''
''ہائیں، کیا آپ کچرے کو ری سائیکل کر کے کوئی پاور پلانٹ بنانا چاہتے ہیں۔ حال ہی میں ایک انگلش فلم آئی ہے۔ اس میں......''
''ایک بے وقوف لڑکا قتل ہو گیا تھا...... اور وہ خوامخواہ بکواس کرنے کی وجہ سے قتل ہوا تھا۔'' میں نے اس کی بات کاٹ کر اس کی گردن دبوچی اور جھنجوڑ دی۔
اس نے آنکھیں الٹ دیں اور غش کھانے کی اداکاری کرنے لگا۔ ''اگر مسخری کرو گے تو میں تمہارے اور سجاول کے درمیان سے ہٹ جاؤں گا، بلکہ ابھی ہٹ رہا ہوں۔''

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے فوراً ہاتھ پاؤں جوڑ کر مجھے بٹھایا اور سنجیدگی سے ہمہ تن متوجہ ہو گیا۔ میں نے اسے اپنے ہوم ورک کے حوالے سے بتاتے ہوئے کہا۔ ''پارا ہاؤس کے اندرونی رہائشی حصے کا کچرا نیلے رنگ کے دو یا تین بڑے شاپرز میں ہوتا ہے۔ باقی کچرے کے لیے ہلکے شاپرز استعمال ہوتے ہیں۔ ان کا رنگ پیلا ہوتا ہے۔ ہر روز صبح نو بجے کے لگ بھگ یہ کچرا ایک چھوٹے لوڈر پر بار کر کے پارا ہاؤس سے باہر لے جایا جاتا ہے اور کوئی دو فرلانگ دور جھاڑیوں کے ایک جھنڈ میں رکھ دیا جاتا ہے۔ بعد میں بارہ بجے کے لگ بھگ کارپوریشن کی گاڑی آتی ہے۔ وہ زیرِ تعمیر بلڈنگ کا کچرا بھی لیتی ہے، پارا ہاؤس اور بنگلے کا کچرا بھی لیتی ہے اور چلی جاتی ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ پارا ہاؤس کے رہائشی حصے کا کچرا جو نیلے رنگ کے دو یا تین بڑے شاپرز میں ہوتا ہے، صبح نو بجے سے بارہ بجے تک ان جھاڑیوں میں پڑا رہتا ہے۔''

''تو اس سے ہمیں کیا فائدہ ہوگا؟'' انیق نے پوچھا۔

''ہمیں یہ فائدہ ہوگا کہ ہم اس کچرے میں سے سنبل کے ہار کا یہ گمشدہ ٹکڑا ڈھونڈ سکیں گے۔''

پہلے تو انیق کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ پھر اس نے اپنے دیدے تیزی سے دائیں بائیں گھمائے اور اس کے چہرے پر دبا دبا جوش نظر آنے لگا۔ ''آپ کا مطلب ہے کہ ہم یہ لڑی ڈھونڈنے کے بہانے اس کچرے تک جائیں گے اور وہاں پر کسی نیلے شاپر میں بچا کھچا سبزی پلاؤ ڈھونڈیں گے؟''

''شاباش...... اسی طرح دماغ استعمال کرتے رہو گے تو ایک دن ضرور تمہارا اپنا ذاتی ٹھیلا ہوگا۔ پانچ چھ ہزار کی سبزی میں سے ہزار روپیہ منافع تو ضرور نکال لیا کرو گے۔''

''پلان تو آپ کا ٹھیک ہے لیکن کیا ہم مطلوبہ چاولوں تک پہنچ پائیں گے...... اور اگر پہنچ بھی گئے تو کیا اس وقت دو چار گارڈز ہمارے آس پاس نہیں ہوں گے۔ ان کی موجودگی میں ہم ''سیمپل'' کیسے اٹھا سکیں گے؟''

''ساری منفی باتیں ابھی سوچنی ہیں...... تو پھر یہ بھی سوچ لو کہ ہم آج رات سے پہلے پہلے ہی وفات پا جائیں گے اور ہمارا یہ کھوجی پلان دھرے کا دھرا رہ جائے گا۔ بھلے مانس، پازیٹو سوچا کرو۔ ابھی تمہاری شادی نہیں ہوئی، پریشان ہونے کے لیے تو ساری عمر پڑی ہے۔''

''آج بڑی فارم میں نظر آ رہے ہیں آپ...... لگتا ہے کچھ نہ کچھ مل جائے گا ہمیں۔ اگر واقعی مل گیا اور کسی طرح ہم نے ''اس چیز'' کو لاہور وغیرہ بھیج کر اس کا کیمیکل ایگزام...... کرا

لیا تو اہم ثبوت مل سکتا ہے۔"

سب کچھ پلان کے مطابق چل رہا تھا۔ سجاول نے رات ہی کو ہمیں "بڑی بیگم" سے اجازت لے دی تھی کہ ہم کل صبح پارا ہاؤس سے باہر تھوڑی سی چہل قدمی کر لیں اور زیر تعمیر عالیشان عمارت کو نزدیک سے دیکھ لیں۔ میں اور انیق ساڑھے نو بجے کے لگ بھگ پیدل ہی نکلے۔ سردیوں کی ٹھٹھری ہوئی دھوپ میں پارا ہاؤس سویا سویا نظر آتا تھا۔ باہر ٹیلوں پر ہلکی سی دھند تھی۔ انچارج گارڈ قادر خان تو ابھی تک اسپتال میں بے ہوش پڑا تھا...... سکینڈ انچارج رفاقت ہمارے ساتھ تھا۔ وہ ہمیں مختلف مراحل سے گزار کر مین گیٹ تک لایا۔ (ہار کی ٹوٹی ہوئی لڑی میں نے اپنی جیکٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لی تھی)

ہم چہل قدمی کے انداز میں آگے بڑھے تو تین مسلح گارڈز مناسب فاصلہ رکھ کر ہمارے پیچھے ہو لیے۔ انیق نے کہا۔ "لو جی، وہی ہوا ناں جس کا ڈر تھا۔"

"اچھا اب خاموشی سے چلتے رہو۔ دیکھتے ہیں آگے کیا ہوتا ہے۔"

ہم سیر کرنے والے انداز میں زیر تعمیر عمارت کی جانب چلے گئے۔ ویرانے میں واقعی یہ ایک جادو کا محل لگتا تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ جب یہ مکمل ہو جائے گا تو دیکھنے سے تعلق رکھے گا۔ کم و بیش دو سو ورکر یہاں ہمہ تن مصروف دکھائی دیتے تھے۔ کچھ دیر تک باہر ہی سے اس محل کا نظارہ کرنے کے بعد ہم مشرقی جانب آ گئے۔ اب ہمارا رخ اپنی منزل کی طرف تھا۔ ہم ان جھاڑیوں کی سمت جا رہے تھے جہاں روزانہ پارا ہاؤس کا کچرا پھینکا جاتا تھا اور اٹھایا جاتا تھا...... مسلح گارڈز اب بھی حفاظتی انداز میں ہمارے پیچھے آ رہے تھے۔ میں نے ایک جگہ رک کر انہیں پاس بلایا۔ وہ پہلے تو جھجکے پھر مؤدب انداز میں ہمارے پاس آ گئے۔ وہ مقامی تھے۔ میں نے ان سے کہا۔ "ہمارے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم ذرا اکیلے گھومنا چاہتے ہیں۔"

چند لمحے توقف کرنے کے بعد ایک درمیانی عمر کے گارڈ نے کہا۔ "جیسے آپ کا حکم سر! لیکن آپ زیادہ دور نہ جائیں۔"

"او کے، زیادہ دور نہیں جائیں گے۔"

وہ وہیں کھڑے رہے...... ہم آگے بڑھ گئے۔ کچھ آگے جا کر میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ پارا ہاؤس کی طرف واپس جا رہے تھے۔ ہم دونوں نے اطمینان کی سانس لی۔ لیکن ہم جانتے نہیں تھے کہ "سبزی پلاؤ" کی تلاش میں ہمارے ساتھ کیا "اَپ سیٹ" ہونے والا ہے...... اور ہم حقیقت میں کتنا خطرناک کام کرنے جا رہے ہیں......

○......❖......○

ہم سیر کرنے والے انداز میں آگے بڑھتے رہے اور جھنڈ میں پہنچ گئے، جھنڈ کے عقب میں آج کا کچرا پڑا تھا۔ چھوٹے بڑے کئی شاپرز تھے۔ ان میں سے نیلے رنگ کے تین بڑے شاپرز علیحدہ ہی دکھائی دے رہے تھے۔ یہ وہ کچرا تھا جو پارا ہاؤس کے اندرونی رہائشی حصے میں سے آتا تھا۔

ہم نے دیکھا، اردگرد کافی فاصلے تک کوئی نہیں تھا۔ یہ دن کا پہلا پہر تھا۔ دھوپ کا سنہری رنگ نمایاں ہوتا جا رہا تھا اور پارا ہاؤس کی بلند و بالا برجیاں اس چمکیلے دن کی خوشگوار حرارت سے لطف اٹھاتی محسوس ہوتی تھیں۔ انیق نیچے بیٹھ گیا اور اس نے دو نیلے شاپرز کی گرہیں کھول دیں۔ میرے ہاتھ میں ایک درخت کی چھڑی نما شاخ تھی۔ میں نے اس شاخ کے ذریعے کچرے کو کھنگالنا شروع کیا۔ انیق بھی اپنے پاؤں کی مدد سے میرا ساتھ دینے لگا۔ یہ صاف ستھرا کچرا تھا۔ دودھ اور جوس کے خالی ڈبے، سگریٹس اور سگار وغیرہ کے ٹکڑے، وائن کی خالی بوتلیں، خالی ٹن پیکس، پھلوں کے چھلکے اور کچی سبزی کی باقیات، پلیٹوں میں بچ جانے والا سالن اور چاول وغیرہ۔ اور پھر ہمیں ایک شاپر میں سبزی پلاؤ کی باقیات نظر آ گئیں۔ یقیناً یہ پلیٹوں میں بچ جانے والے چاول ہی تھے۔ انیق کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ پہلے سے انتظام کر کے آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا پاؤچ نما شاپر موجود تھا۔ اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد وہ عام سے انداز میں نیچے جھکا اور اس نے پلک جھپکتے میں تھوڑے سے چاول شاپر میں ڈال کر اپنی جراب میں گھسا لیے۔

اس کے بعد ہمارا وہاں ٹھہرنا بیکار تھا۔ ہم ایک بار پھر چہل قدمی کے انداز میں ٹیلوں کے درمیان چکرانے لگے۔

میں نے کہا۔ ''تمہیں یقین ہے کہ یہ وہی چاول ہیں جو دونوں بھائیوں نے استعمال کیے ہوں گے؟''

''اس میں شک کی گنجائش کم ہی ہے۔'' انیق نے جواب دیا۔ ''یہ سبزی پلاؤ ہے اور کل یہ پلاؤ صرف دونوں بھائیوں کے لیے ہی بنا تھا۔ جو ''سیمپل'' ہم نے لیا ہے وہ استعمال شدہ چاولوں کا ہی ہے۔ آپ نے دیکھا ہی ہے ان میں دہی وغیرہ مکس ہے۔''

ہم باتیں کرتے ہوئے واپس پارا ہاؤس کی سمت چل دیئے۔ ہمیں اکا دکا پہرے دار دکھائی دینے لگے پھر وہ پہرے دار بھی نظر آئے جو کچھ دیر پہلے ہمارے ساتھ ہی روانہ ہوئے تھے۔ جونہی ہم پارا ہاؤس کے مین گیٹ کے سامنے پہنچے، ہمیں آقا جان کی کرخت صورت نظر

آئی۔اس کے ساتھ تین چار گارڈز بھی تھے جن میں انچارج گارڈ رفاقت بھی تھا۔
آقا جان نے ہمیں کڑی نظروں سے گھورا اور پوچھا۔"کہاں گھوم رہے ہو تم دونوں؟"
"ذرا سیر کے لیے نکلے تھے۔ بڑی بیگم سے اجازت لی تھی۔"
"سیر کی اجازت لی تھی ناں، لیکن تم تو کچھ اور گڑبڑ بھی کر رہے ہو۔" آقا جان نے کہا اور اس کی ناک کا بالائی بل کچھ اور موٹا ہو گیا۔
میرے جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ کچرے کے پاس اور دور دور تک کوئی نہیں تھا پھر آقا جان کو کیسے خبر ہوئی تھی۔ یکایک بات سمجھ میں آ گئی۔ ہماری بھول تھی کہ کوئی ہمیں دیکھ نہیں رہا تھا۔ یقیناً آس پاس کوئی سی سی ٹی وی کیمرا موجود تھا۔
"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟" میں نے آقا جان سے پوچھا۔
"تم لوگ کچرے کے پاس کیا کرنے گئے تھے اور وہاں کیا ڈھونڈ رہے تھے؟"
"اتنی سی بات پر آپ اتنا پریشان ہو رہے ہیں؟"
"یہ تمہارے لیے اتنی سی بات ہو گی۔ یہ سکیورٹی کا سنگین مسئلہ ہے۔ وہاں سے کیا اٹھایا ہے تمہارے ساتھی نے؟"
"لگتا ہے کہ آپ کو کوئی غلط فہمی ہو رہی ہے۔"
"یہ غلط فہمی آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔" سیکنڈ انچارج گارڈ رفاقت نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔
آقا جان کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے مسلسل شعلے نکل رہے تھے۔ اس نے تحکمانہ انداز میں ہمیں ساتھ چلنے کو کہا۔ مین گیٹ کے پاس ہی ایک "سرویلینس روم" تھا۔ یہاں مانیٹرز وغیرہ موجود تھے۔ ہم اندر پہنچے تو رفاقت نے فوراً ایک مانیٹر آن کر دیا۔ اس نے ریکارڈنگ چلائی۔ اسکرین پر میرا اور انیق کا ہیولا نمودار ہوا۔ ہم کچرے والے شاپرز کے نزدیک کھڑے تھے۔ کیمرا یقیناً جھنڈ کے کسی درخت پر ہی نصب تھا۔ عین ممکن تھا کہ کیمرے کو کیموفلاج کر دیا گیا ہو۔ فاصلہ زیادہ تھا، تصویر واضح نہیں تھی مگر چہرے پہچانے جا رہے تھے۔ فوٹیج میں نظر آیا کہ انیق اکڑوں بیٹھ کر شاپرز کی گرہیں کھول رہا ہے اور پھر میں چھڑی کے ساتھ کوڑے کو اِدھر اُدھر کر رہا ہوں۔ کیمرا ہمارے ایک پہلو کو دکھا رہا تھا۔ اس فوٹیج میں یہ تو نظر آیا کہ انیق نے کچرے میں سے کچھ اٹھایا ہے لیکن یہ بالکل پتا نہیں چلا کہ یہ کیا تھا اور انیق نے اس کے ساتھ کیا کیا ہے۔ یہ صورتِ حال حوصلہ افزا تھی۔ ہم نے جو احتیاطی تدبیر کی تھی وہ کام دے سکتی تھی۔

جس دوران میں فوٹیج پلے ہو رہی تھی اسی دوران میں آقا جان نے فون کر کے حلمی کو بھی بلا لیا تھا۔ فوٹیج ختم ہوتے ہوتے حلمی وہاں آن پہنچا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے آقا جان کو دیکھا، آقا جان تنک کر بولا۔ ''حلمی! میں تم سے مسلسل کہہ رہا ہوں کہ ان لوگوں کی طرف سے ہوشیار رہو، مگر میری بات ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکالی جا رہی ہے۔''

''اب کیا ہوا ہے؟'' حلمی نے ملائیشین لہجے کی اردو میں پوچھا۔

''یہ لوگ کچھ گڑ بڑ کر رہے ہیں۔ میرا شک پختہ ہوتا جا رہا ہے۔'' آقا جان نے کہا اور اس کے ساتھ ہی فوٹیج ری پلے کر دی۔

فوٹیج ختم ہوئی تو حلمی کی سوالیہ نظریں بھی ہم پر مرکوز ہو گئیں۔ ''یہ سب کیا ہے مسٹر شاہ زیب؟''

''کیا آپ کو آقا جان صاحب کی بات پر یقین نہیں آیا۔ ہم یہاں مشکوک سرگرمیوں میں مصروف ہیں اور عنقریب کوئی بڑی گڑ بڑ کرنے والے ہیں۔ پہلے تو آپ ہمیں غیر مسلح کر کے کسی کمرے میں بند کریں۔ اس کے بعد سوال و جواب کریں تو شاید آقا جان صاحب کو تسلی ہو۔''

میرے طنزیہ لہجے نے آقا جان کے تن بدن میں آگ لگا دی۔ وہ پھنکارا۔ ''تم زیادہ ٹرٹر نہ کرو۔ سیدھی بات کا سیدھا جواب دو۔ وہاں کیا کر رہے تھے؟''

''اس بات کا جواب میرے پاس ہے لیکن میں صرف حلمی صاحب کو دوں گا۔''

''یعنی ہم سب ایرے غیرے ہیں۔'' آقا جان نے دانت پیسے۔

''میں ایسی گستاخی نہیں کر سکتا لیکن یہ ایک اہم بات ہے۔''

''تم بھی اس دلال کی وجہ سے سر پر چڑھتے جا رہے ہو، لیکن تم جیسے لوگوں کو فکس کرنا مجھے اچھی طرح آتا ہے۔'' وہ پھنکارا۔

دلال کا لفظ اس نے سجاول کے لیے اس تناظر میں استعمال کیا تھا کہ وہ پری چہرہ سنبل کو آقا جان کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے لایا تھا۔ میں نے کہا۔ ''آقا صاحب، آپ ذرا زبان سنبھال کر بات کریں۔ ورنہ پھر بات آگے تک جائے گی۔''

''اوئے تُو مجھے دھمکی دیتا ہے۔ اوئے دو ٹکے کے ملازم......'' آقا جان چنگھاڑا اور اچھل کر میری طرف آیا۔

حلمی نے اسے راستے میں ہی روک لیا اور دھکیل کر پیچھے لے گیا۔ آقا جان لال پیلا ہو رہا تھا۔ وہ بدکلامی کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ گارڈز کو حکم دے رہا تھا کہ ہمیں گن پوائنٹ پر

رکھیں اور ہماری تلاشی لیں۔ گارڈ اس کے ہر حکم کو بجا لانے پر تیار نظر آتے تھے۔

وہ واقعی غصے کا سوٴر تھا۔ حلمی نے اسے بمشکل سنبھالا اور ٹھنڈا کیا۔ آقا جان بکتا جھکتا دوسرے کمرے میں چلا گیا تو حلمی ہمیں لے کر پارا ہاؤس کے مہمان خانے میں آ گیا۔ کمرے کا دروازہ بند کر کے اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔

میں نے جیکٹ کی جیب سے سنبل کے ہار کی ٹوٹی ہوئی لڑی نکال کر اس کے سامنے رکھ دی۔ ''یہ کیا ہے؟'' حلمی نے پوچھا۔

''وہی، جس کی تلاش میں ہم وہاں کچرے کے ڈھیر پر گئے تھے۔ یہ سنبل صاحبہ کے ہار کا ٹکڑا ہے۔ یہ پرسوں سے گم تھا۔ ڈر کی وجہ سے انہوں نے کسی کو بتایا نہیں، صرف سجاول صاحب کو آگاہ کیا کہ ہار کی ایک قیمتی لڑی نہیں مل رہی۔''

حلمی کی فراخ پیشانی پر سوچ کی سلوٹیں ابھریں۔ وہ جیسے بات کی گہرائی تک پہنچ رہا تھا۔ آخر اس نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ تم ان موتیوں کی تلاش میں کچرے کی طرف گئے تھے...... اور یہ کام تمہارے ذمے مسٹر سجاول نے لگایا تھا۔''

''جی ہاں، سنبل صاحبہ کا خیال تھا کہ اگر یہ لڑی کسی نے چرائی نہیں تو پھر صفائی کے دوران میں کوڑے کے ساتھ ہی کہیں چلی گئی ہو گی۔ امید تو کم تھی لیکن ہم نے کوشش کی اور خدا کا شکر ہے کہ یہ ہمیں کل والے کچرے کے اندر سے مل گئی۔''

میں نے مکمل تفصیل بتائی تو حلمی ننانوے فیصد مطمئن نظر آنے لگا۔ اس نے کہا۔ ''فوٹیج کی وجہ سے زبردست قسم کی غلط فہمی پیدا ہو رہی ہے۔ دراصل تم جانتے ہی ہو چند دن پہلے یہاں جو کچھ ہوا ہے، کئی جانیں گئی ہیں۔ کتنے ہی زخمی ابھی اسپتال میں پڑے ہیں۔ عزت مآب کے حکم پر سکیورٹی ریڈ الرٹ ہے۔ چھوٹی چھوٹی چیز کو نظر میں رکھا جا رہا ہے۔ آپ لوگوں کو بھی بہت احتیاط کرنی چاہیے۔''

اس کے بعد اس نے آقا جان کا نمبر ملایا اور اس سے بات کرتا ہوا باہر نکل گیا۔

انیق نے میری طرف دیکھا۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا تھا...... جان بچی سو لاکھوں پائے۔ درحقیقت ہماری پلاننگ کام کر گئی تھی ورنہ آقا جان کی خباثت اس معاملے کو خطرناک رنگ دے سکتی تھی۔ اسی دوران میں سجاول بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس کے چہرے سے اندازہ ہوا کہ اسے صورتِ حال کا علم ہو گیا ہے اور یہ پتا بھی چل گیا کہ ہم نے معاملے کو سنبھال لیا ہے۔

میں نے موتیوں والی لڑی سجاول کے ہاتھ پر رکھ دی اور یہ بھی بتایا کہ ابھی تھوڑی دیر

پہلے کیا معاملہ پیش آیا ہے۔ میں نے آقا جان کی بدزبانی کا بھی تھوڑا سا ذکر کر دیا۔ کچھ دیر بعد ہم مہمان خان کے اس رہائشی پورشن میں آ گئے جو آج کل ہمارے استعمال میں تھا۔ ہم اچھی طرح جائزہ لے چکے تھے یہاں جاسوسی کے لیے کسی طرح کا آڈیو ویڈیو سسٹم موجود نہیں تھا۔ یہاں ہم ذرا احتیاط سے ہر طرح کی گفتگو کر سکتے تھے۔ سبزی پلاؤ والا پاؤچ انیق کی جراب میں موجود تھا، اور یہ ہماری ایک اہم کامیابی تھی۔

سجاول تو وڈے صاحب اور سنبل سے ملاقات کے لیے چلا گیا تاکہ سنبل کو اس کے "گمشدہ ہار" کی لڑی واپس کی جا سکے اور ہم سوچ بچار میں مصروف ہو گئے کہ کچرے میں سے اٹھائے گئے سبزی پلاؤ کے نمونے کا کیا کیا جائے۔ اس کا کیمیکل ایگزیمن کرانے کے لیے اسے فیصل آباد یا لاہور وغیرہ میں پہنچایا جانا ضروری تھا اور فی الحال اس کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا مگر اسی روز شام کے بعد جو کچھ ہوا اس نے ہماری مشکل کسی حد تک آسان کر دی۔ کم از کم ہمیں اتنا پتا تو ضرور چل گیا کہ یہ سبزی پلاؤ واقعی زہر آلود ہے۔

قریباً آٹھ بجے کا وقت تھا۔ میں اور انیق، ٹی وی پر نیوز دیکھ رہے تھے۔ اتنے میں ساتھ والے کمرے میں کھٹکا ہوا۔ یہ خانساماں از میر طیب کی پالتو بندریا تھی جو پارا ہاؤس کے بیرونی حصے میں ہر جگہ چکراتی پھرتی تھی۔ وہ ایک چھوٹی کھڑکی سے کود کر اندر آئی اور پھر انیق کو پہچان کر سیدھی اس کے کندھوں پر آن چڑھی۔ وہ اپنی نہایت شرارتی آنکھوں سے پورے کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس نے باقاعدہ اونی سویٹر اور ٹراؤزر پہنا ہوا تھا۔ میں نے کہا۔ "انیق! مجھے تو سردار سجاول کی وہ بات بالکل ٹھیک ہی لگتی ہے۔ یہ بندریا واقعی تمہاری کوئی بچھڑی ہوئی رشتے دار ہے۔"

"خدا کا خوف کریں شاہ زیب بھائی، یہ سردار سجاول تو ہے ہی کافر زادہ۔ آپ کیوں جہنم میں اس کے پڑوسی بننا چاہ رہے ہیں۔ خدا نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے اور سجاول ایک انسان کو بندر کا رشتے دار بتا رہا ہے۔"

"اچھا اشرف المخلوقات صاحب، اس خبیث کو باہر نکالو ورنہ کوئی نقصان کر دے گی۔"

بندریا نے بھی جیسے یہ بات سن لی تھی۔ اس نے انیق کے سر پر ایک چپت لگائی اور جست لگا کر ریفریجریٹر پر چڑھ بیٹھی۔ ریفریجریٹر کے اوپر بسکٹ کا ایک ڈبا پڑا تھا، وہ جھٹ پٹ بسکٹ کھانے لگی۔ پھر اس نے بسکٹ کا خالی ڈبا میرے سر پر مارا اور جمپ لگا کر ٹی وی پر چڑھ گئی۔ اچانک انیق کے ذہن میں کوئی بات آئی اور اس کا چہرہ چمک گیا۔ اس نے بڑے دلار سے بندریا کو اپنے پاس بلایا۔ وہ جست لگا کر اس کی گود میں آ گئی اور اس کی ٹھوڑی پر یوں

ہاتھ چلانے لگی جیسے اس کی شیو کررہی ہو۔ شاید اس نے کسی حجام کو ایسا کرتے ہوئے دیکھا تھا۔

انیق نے مجھے اشارہ کیا۔ میں اس کا اشارہ سمجھ گیا۔ سبزی پلاؤ کا وہ چھوٹا سا پاؤچ فریج کے اندر رکھا تھا۔ میں نے لاک میں چابی گھما کر فریج کا دروازہ کھولا اور وہ پاؤچ انیق کو تھمایا۔ کارروائی تھوڑی سی ظالمانہ لگ رہی تھی مگر ہمارے پاس اس کے سوا چارہ نہیں تھا۔ انیق نے پاؤچ میں سے مٹھی بھر چاول اپنے ہاتھ میں لیے۔ دائیں ہاتھ سے وہ بندریا کی گردن سہلاتا رہا اور بائیں ہاتھ سے چاول اس کی طرف بڑھائے۔ وہ بڑی رغبت سے کھا گئی۔ وہ مزید مانگ رہی تھی۔ انیق نے تھوڑے سے مزید دیئے اور باقی بچا لیے۔

''اگر واقعی چاولوں میں کچھ ہوا، اور یہ مرگئی تو؟'' انیق نے کہا۔

''تم خود ہی تو بتا رہے تھے کہ اس کی شادی کی عمر نکلی جا رہی ہے اور کوئی اچھا رشتہ نہیں مل رہا۔ ہوسکتا ہے کہ بندر برادری یہ سمجھے کہ اس نے مایوس ہو کر خودکشی کی کوشش کی ہے۔ یوں کوئی اچھا صالح بندر اس کا ہاتھ تھامنے کے لیے تیار ہو جائے۔''

''لیکن یہ تو تب ہوگا جب یہ بچے گی۔''

''تم جیسے بھائی جب صدقِ دل کے ساتھ اپنی بہنوں کے لیے دعا مانگتے ہیں تو وہ ضرور قبول ہوتی ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''دیکھیں آپ پھر اس امریش پوری سجاول کی زبان بول رہے ہیں۔ اگر یہی کچھ ہوتا رہا تو پھر ایک دن مجھے اس کے لیے امتیابھ بچن یا سنی دیول وغیرہ بننا پڑے گا۔''

امتیابھ بچن تو نہ ہی بننا تو اچھا ہے۔ سنا ہے، قلی فلم کی شوٹنگ کے دوران میں امریش پوری نے اس کا برا حال کر ڈالا تھا۔ امیتابھ تو پھر بچ گیا تھا لیکن تم بچو گے نہیں۔ بڑی ظالم مار ہے اس بندے کی۔''

ہم باتیں کرتے رہے۔ بندریا کو چاول کھائے قریباً دس منٹ ہو گئے لیکن وہ اسی طرح ہشاش بشاش تھی پھر اس نے ایکا ایکی جست لگائی اور کھڑکی سے نکل کر کہیں اوجھل ہوگئی۔

''اب کیسے پتا چلے گا؟'' میں نے کہا۔

''میں ابھی تھوڑی دیر میں ازمیر کی طرف چکر لگاتا ہوں۔'' انیق نے کہا۔

ازمیر کی طرف جانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ آٹھ دس منٹ مزید گزرے ہوں گے کہ لان کی طرف سے کچھ عجیب سی آوازیں آئیں، جیسے دو بلیاں آپس میں لڑ رہی ہوں۔ ''یہ اسی کی آواز ہے۔'' انیق چونک کر بولا۔

ہم نے اٹھ کر کھڑکی میں سے جھانکا۔ وسیع گراسی لان میں ہلکی دودھیا روشنی تھی۔ پھولوں کی ایک وسیع و عریض کیاری کے پاس بجلی کے پول کے نیچے کوئی جاندار چیز گھاس پر لوٹ پوٹ ہو رہی تھی پھر ہم نے فربہ اندام خانساماں ازمیر کو دیکھا۔ وہ اپنے بھاری جسم کو جھلاتا بڑی تیزی سے بجلی کے پول کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے نیچے جھک کر بندریا کو اٹھایا اور بدحواسی میں چلانے لگا۔ ''لوسی......لوسی۔''

بند کھڑکی کے باوجود اس کی آواز ہمارے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ ایک دو اور افراد بھی موقع پر نظر آئے۔ ہم بھی کمرے سے نکلے اور گراسی لان میں پہنچ گئے۔ بندریا ازمیر کے ہاتھوں میں بل کھا رہی تھی اور سر کو بے قراری سے دائیں بائیں حرکت دے رہی تھی پھر اس نے بالکل انسانوں کے سے انداز میں ایک بڑی قے کی اور ہاتھ پاؤں پھینکنے لگی۔

''کیا ہوا اسے؟'' دوسرے خانساماں نے انگریزی میں ازمیر طیب سے پوچھا۔

''مجھے لگتا ہے کہ اس نے کوئی زہریلی چیز کھالی ہے۔'' ازمیر نے جواب دیا۔

''اسے اسپتال لے چلیں۔'' ازمیر کے ساتھی خانساماں نے عجلت میں کہا۔

وہ لوگ اپنی لوسی نامی بندریا کو لے کر پاراہاؤس کے نجی اسپتال کی طرف بھاگے۔ قے کرنے کے بعد لوسی کے چلانے میں کچھ کمی واقع ہوگئی تھی۔

میں اور انیق واپس اپنے کمرے میں آگئے۔ انیق کی آنکھوں میں تیز چمک تھی۔ ''ہمارا شک سو فیصد درست نکلا ہے۔'' وہ سرسراتے لہجے میں بولا۔

''لیکن ایسا ہو کیوں رہا ہے؟ مطلب تو یہی ہوا ناں کہ اگر کمال اور ابراہیم کے خون میں زہر ہے تو یہ زہر ان کے ماں باپ نے ہی پیدا کیا ہے۔''

انیق نے پرسوچ لہجے میں کہا۔ ''اور اب اس زہر کی وجہ سے ان کے لیے...... زہریلی بیویاں ڈھونڈی جا رہی ہیں۔''

''زہریلی نہیں......ایسی بیویاں جن کو زہر دے دے کر زہریلا پن برداشت کرنے کے لیے تیار کیا گیا ہے۔'' میں نے تصحیح کی۔

بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ ماں باپ اپنی اولاد کے لیے ایسا کیونکر چاہ سکتے ہیں اور پھر ایک ایسی ماں جو اپنے بچوں پر جان چھڑکتی ہو، انہیں کھانے میں زہر کی ڈوز کیسے دے سکتی ہے؟ اور کیا بچے اس صورتِ حال سے آگاہ تھے؟ کیا انہیں معلوم تھا کہ ان کا کھانا روزانہ علیحدہ سے کیونکر بنتا ہے؟''

سجاول تو شام سے ہی سویا پڑا تھا۔ میں اور انیق اس سچویشن کے بارے میں اکیلے ہی

سر دھنتے رہے۔ تھوڑا سا ''زہریلا پلاؤ'' ابھی تک انیق کے پاس موجود تھا۔ اسے کیمیائی تجزیئے کے لیے استعمال کیا جا سکتا تھا۔ کوئی ایک گھنٹے بعد ازمیر کی پالتو لوسی کے بارے میں پتا چل گیا۔ وہ جانبر ہو گئی تھی۔ اس کا معدہ صاف ہو گیا تھا اور اب اسے ڈرپ کے ذریعے دوا وغیرہ دی جا رہی تھی۔ غالباً اسپتال میں موجود کسی انسانی ڈاکٹر نے ہی وٹرنری ڈاکٹر کا کردار ادا کیا تھا۔

لوسی کے بچ جانے سے یہ اندازہ بھی ہو رہا تھا کہ چاولوں میں موجود زہر کی مقدار ایک خاص حد کے اندر ہی تھی۔

اسی دوران میں سردار سجاول بھی بیدار ہو کر موقعے پر پہنچ گیا۔ وہ بندریا لوسی والے واقعے سے بے خبر تھا۔ ہم نے اسے بتایا کہ کس طرح اس جانور نے ہمارے لیے لیبارٹری کا کام کیا ہے اور چاولوں کے زہریلے ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ یہ سب کچھ سجاول کے لیے بھی بے حد حیران کن تھا۔ یقیناً ہماری طرح اس کے ذہن میں بھی پہلا سوال یہی ابھرا تھا کہ وڈا صاحب اور بڑی بیگم اپنے دونوں بچوں کے ساتھ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟

میں نے سجاول سے پوچھا کہ سنبل کے ہار والے معاملے کا کیا بنا؟

وہ بولا۔ ''سنبل نے وڈے صاحب کو یہی بتایا ہے کہ وہ لڑی گم ہونے کے بعد ڈر گئی تھی۔ اس لیے کسی کو بتایا نہیں۔ وڈا صاحب بس مسکراتا رہا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ کر تھرک جھاڑتا رہا۔ وہ بڈھا ککڑ پوری طرح اس کی خوب صورتی کے نشے میں غرق ہے لیکن وہ آقا جان ایک نمبر کا بدمعاش ہے۔''

''کیوں؟ کیا ہوا؟''

''لگتا ہے کہ یہاں پارا ہاؤس میں اس کی بہت سنی جاتی ہے۔ وڈا صاحب بھی اس پر اندھا بھروسا کرتا ہے۔ وہ سنبل کو یوں سمجھا رہا تھا جیسے سنبل وڈے صاحب کی نہیں اس کی رکھیل ہے۔ سنبل کو بتا رہا تھا کہ وہ اپنی قیمتی چیزوں کے بارے میں بہت دھیان سے رہے، نوکروں میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں پھر اس نے ان نوکرانیوں کی کلاس لی جو وہاں صفائی وغیرہ کا کام کرتی ہیں۔ انہیں بری طرح ڈانٹ ڈپٹ کی کہ انہیں صفائی کے وقت موتیوں کی لڑی نظر کیوں نہیں آئی۔ ایک ملازمہ کو اس نے وڈے صاحب کے سامنے ہی تھپڑ مارا اور گالی دی۔

انیق نے کہا۔ ''مجھے بھی لگتا ہے کہ یہ آقا جان یہاں شاہ سے زیادہ شاہ کا وفادار بنا ہوا ہے۔ ہر معاملے میں سر گھسیڑتا ہے اور اس کے سر گھسیڑنے کو خوش دلی سے برداشت بھی کیا

جاتا ہے۔"

"مگر دوسری طرف یہ بھی کہا جارہا ہے کہ یہ حساب کتاب میں اور دوسرے معاملوں میں بہت زیادہ گھپلے کررہا ہے۔" سجاول نے نکتہ اٹھایا۔

میں نے کہا۔ "یہ بھی کہتے ہیں ناں کہ جو بہت منہ چڑھے ہوتے ہیں...... مالک ان کے گھپلوں کونظرانداز بھی کرتے ہیں۔"

"ایک اور خبر ہے۔" سجاول بولا۔

ہم سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

"پرسوں رات وہ دونوں لڑکیاں یہاں پہنچ چکی ہیں جنہیں کمال اور ابراہیم کی دلہنیں بننا ہے۔"

میں نے سنسنی محسوس کی۔ "یعنی زینب بھی یہاں آچکی ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"اس کا تو ٹھیک سے پتا نہیں چلا مگر سنبل نے بتایا ہے کہ وہ دونوں لڑکیاں دو دن سے یہاں پارا ہاؤس میں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک ذرا دبلی پتلی اور تیکھے نقوش والی ہے۔ دوسری ذرا صحت منداور بھورے بالوں والی ہے۔ دونوں لڑکیوں کی خوب آؤ بھگت کی جارہی ہے۔ دونوں لڑکوں سے ان کی ملاقات بھی کرائی گئی ہے اور کوشش کی جارہی ہے کہ ان کی جھجک دور ہو۔"

میں نے سجاول سے کہا۔ "سنبل سے کہو کہ لڑکیوں کے نام معلوم کرے۔ میرا خیال ہے کہ وہ دبلی پتلی لڑکی زینب ہی ہوگی۔"

سجاول بولا۔ "سنبل سے کہنے کی ضرورت نہیں۔ میرا خیال ہے کہ کل رات تک تم خود بھی انہیں دیکھ سکو گے۔ یہاں کوئی منگنی کی طرح کی رسم ادا ہورہی ہے۔ لڑکیوں کو انگوٹھیاں پہنائی جائیں گی۔ میرا خیال ہے کہ اس رسم میں ہمیں بھی دعوت دی جائے گی۔"

"اور اگر ایسا نہ ہوا تو؟ میرا مطلب ہے کہ ہمیں عوت نہ دی گئی تو؟"

"پھر ہم جانکاری کے لیے سنبل کو استعمال کرلیں گے۔"

میں آج کل انیق والے کمرے میں ہی سورہا تھا۔ جاناں میرے کمرے میں سوتی تھی۔ وہ بلائے بے اماں کی طرح مجھ سے چمٹی ہوئی تھی۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اس پر عشق کا بھوت سوار تھا۔ وہ رومان پسند لڑکی تھی۔ موسیقی اور شاعری وغیرہ اس کے اندر تک اتری ہوئی تھی۔ اس نے "یاسر بھائی" کا ایک بت بنایا تھا اور اس کی پوجا کی تھی اور جب اسے معلوم ہوا تھا کہ اس بت کے اندر دراصل میں ہی موجود ہوں تو اس کے جذبات کے سارے تند و تیز

دھاروں کا رخ میری طرف ہو گیا تھا۔ بہرحال ایک بات ہوئی تھی، اس رات بری طرح میری ڈانٹ کھانے کے بعد وہ اپنی حدود سمجھ گئی تھی اور وقت بے وقت میرے سر پر سوار نہیں ہوتی تھی۔ (ماؤ کی پوتی مہناز عرف مانی بھی ان لڑکیوں میں سے تھی جو از خود صنفِ مخالف کی طرف پیش قدمی کرتی ہیں لیکن آفت کی پرکالہ مانی اور جاناں میں ایک نمایاں فرق تھا۔ جاناں روکنے سے رک جاتی تھی لیکن مانی ہر طرح کی ''من مانی'' کرتی تھی اور خودسر تھی۔ اسے پتا تھا کہ وہ ایک آنسو گرائے گی تو اس کی دادی کو غش آنا شروع ہو جائیں گے اور پورے ڈیرے کا نظام تہ و بالا ہو جائے گا۔ سجاول سے مجھے جو اطلاعات ملی تھیں ان سے پتا چلتا تھا کہ ماؤ جی میرے بارے میں از حد فکر مند ہے اور ایک جوائی کی حیثیت سے جلد از جلد ڈیرے پر میری واپسی چاہتی ہے، بہرحال مستقبل قریب میں اس کی یہ خواہش پوری ہوتی نظر نہیں آ رہی تھی)

اگلے روز جاناں کے سلسلے میں میرے لیے مزید آسانی پیدا ہو گئی۔ آقا جان پارا ہاؤس آیا تو اس نے جاناں کے لیے حکم جاری کیا کہ اسے واپس بنگلے میں جانا ہے کیونکہ اس کی بیگم میڈم لورین کو اس کی ضرورت ہے۔ آقا جان نے یہ بھی کہا کہ اس سلسلے میں اس نے وڈے صاحب سے اجازت لے لی ہے۔

یہ صورتِ حال جاناں کے لیے پریشان کن لیکن میرے لیے اطمینان بخش تھی۔ میں نے رات کے کھانے کے بعد تنہائی میں اسے سمجھایا، ایسا کرنا ہمارے لیے فائدہ مند ہے یہاں اس پارا ہاؤس میں تو ہم موجود ہیں، لیکن وہاں بنگلے میں کیا کچھ ہو رہا ہے ہمیں پتا نہیں۔ تم وہاں ہو گی تو بہت کچھ جان لو گی۔''

''لیکن شاہ زیب! وہ موٹی میرا تیل نکال دیتی ہے۔ چوبیس گھنٹوں میں سے دس گھنٹے تو میں اس کی ٹانگیں دباتی ہوں۔ باقی وقت اسے ناول سنانے میں گزر جاتا ہے۔ دماغ پلپلا اور بازو لکڑی ہو جاتے ہیں۔''

''تو پھر؟'' میں نے ٹھنڈی سانس لی۔

''آپ سردار سجاول سے کہیں، یہ لوگ اس کی بات بہت مانتے ہیں۔ سردار، وڈے صاحب سے بات کرے تو شاید مجھے وہاں نہ بھیجا جائے۔''

میں نے گہری نظروں سے اسے دیکھا اور کہا۔ ''اگر میں کہوں کہ تم وہاں جاؤ تو پھر؟''

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ کچھ دیر تک میری آنکھوں میں نگاہیں گاڑے رہی، پھر میرے ساتھ لگ گئی۔ گلوگیر آواز میں بولی۔ ''آپ کے لیے تو مرنا بھی قبول ہے۔''

میں نے اسے بانہوں میں لے لیا۔ اس نے اگلی صبح چلے جانا تھا لہٰذا وہ رات کو ضائع

نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ایک بار پھر وہی چکر تھا۔ پھر وہی بھنور تھا، الکحل کی سنسناہٹ، سانسوں کی سرسراہٹ، جسم کی حرارت۔

اور صبح دم اس بھنور سے نکلنے کے بعد پھر وہی ندامت، پھر وہی دکھی کر دینے والا احساس...... پھر وہی چہرہ...... وہی دو لٹیں۔ وہ گم صم سی ایک پگڈنڈی پر میرا راستہ روکے کھڑی تھی۔ خاموشی کی زبان میں مجھ سے پوچھ رہی تھی۔ آپ تو کہتے تھے...... تاجور! میں نے تم سے پیار کیا ہے، اتنا پیار جو تمہارے تصور میں بھی نہیں آسکتا۔ کیا پیار ایسا ہوتا ہے؟ کیا وہ اتنی جلدی ختم ہو جاتا ہے؟ ہمت ہار جاتا ہے؟ پیار تو ایک ہلکی سی امید کے سہارے، برسوں کاٹ دیتا ہے۔ زمانے بِتا دیتا ہے۔

ہاں، وہ میرا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی تھی اور میں خود کو اس کے سامنے جواب دِہ سمجھتا تھا، کیوں سمجھتا تھا؟ وہ تو منہ پھیر کر چلی گئی تھی۔ اس ٹھٹھری ہوئی صبح میں اس سرخ رنگ کے ٹریکٹر کی طرف بڑھتی چلی گئی تھی جس پر دین محمد صاحب بیٹھے تھے۔ اس نے تو مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ ایک بار بھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی کہ میں کھڑا ہوں یا جا چکا ہوں۔ وہ سارے دروازے بند کر گئی تھی۔ اس نے کوئی چھوٹے سے چھوٹا در بھی کھلا نہیں رکھا تھا۔ میں نے سیکڑوں بار کی طرح ایک بار پھر اپنے سیل فون کی اسکرین پر نگاہ دوڑائی۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔

دکھ کی ایک بلند لہر میرے اندر سے اٹھی۔ میں نے فون کو فرش پر پٹخ کر چکنا چور کر دیا۔

انیق آواز سن کر اٹھ بیٹھا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس نے فرش پر بکھرے ہوئے سیل فون کو دیکھا اور سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھنے لگا۔ ''اسے کیا ہوا؟'' اس نے پوچھا۔

''گر گیا تھا۔'' میں نے بیزاری سے جواب دیا۔

''مجھے تو لگتا ہے کہ...... آپ بھی ساتھ ہی گرے ہیں۔'' اس نے بظاہر عام سے لہجے میں کہا اور فون کو سمیٹنے لگا۔ اس نے اس میں سے ''سم'' نکالی اور احتیاط سے جیب میں رکھ لی۔

''اسے کیوں رکھ رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''دوسرے فون سیٹ میں ڈال کر آپ کو دوں گا۔ کل از میر طیب نے مجھے ایک ملائیشین فون سیٹ دیا ہے۔'' وہ بولا۔

''شاید مجھے ضرورت نہیں۔''

''شاید آپ کو ضرورت ہے۔ اس وقت آپ غصے میں ہیں لیکن کل نہیں ہوں گے۔''

اس نے کہا اور باہر چلا گیا۔

وہ میرا رمز شناس بنتا جا رہا تھا۔ اسے پتا تھا کہ میری نگاہ دن میں درجنوں بار سیل فون کی اسکرین کی طرف اٹھتی ہے اور یہ بھی پتا تھا کہ کیوں اٹھتی ہے اور شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ مجھے پھر اس فون کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ یا یوں کہہ لیں کہ اس سم کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ یہ وہی نمبر تھا جو میں نے وقتِ رخصت تاجور کو دیا تھا۔ آسیں اتنی آسانی سے تو نہیں ٹوٹتیں۔ وہ ٹوٹ ٹوٹ کر پھر جڑ جاتی ہیں۔ دل میں انہونیوں کی امید رہتی ہے۔ گہرے پانیوں کے اندر دیئے جلانے کی کوشش جاری رکھنا، محبت کرنے والوں کی مجبوری ہوتی ہے۔

میرا اندیشہ درست تھا۔ مجھے اور انیق کو پارا ہاؤس کی اس نجی تقریب میں نہیں بلایا گیا۔ ہاں سجاول کو تھوڑی سی تاخیر کے ساتھ دعوت دے دی گئی۔ بڑی بیگم نے اسے ''بھائی'' کا سا درجہ دے ڈالا تھا اور اسے خاص انگوٹھی عنایت کی گئی تھی۔ سجاول نے حیران کن تیزی سے پارا ہاؤس میں جگہ بنائی تھی۔

ہم تقریب میں تو نہیں گئے لیکن اس کا ازالہ اس طرح ہو گیا کہ ہم نے پارا ہاؤس کے شارٹ سرکٹ ٹی وی پر اس تقریب کی جھلکیاں دیکھیں۔ یہ تقریب پارا ہاؤس کے رہائشی حصے کے اندر ایک وسیع ہال کمرے میں منعقد ہوئی۔ اس میں خاندان کے افراد کے علاوہ وڈے صاحب کے چند قریبی دوست بھی شامل تھے۔ یہ سب پاکستانی تھے اور ان میں شکیل داراب سرِفہرست تھا۔ ایک نہایت شاندار اسٹیج تیار کیا گیا تھا جو تقریباً سارے کا سارا سرخ سفید اور کالے گلابوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ معزز مہمانوں کے علاوہ وڈے صاحب کے دونوں فرزند بھی اسٹیج پر موجود تھے۔ وہ اسلامی طرز کے لباس میں تھے۔ لمبے چغے، سروں پر ٹوپیاں۔ چھوٹی چھوٹی خوب صورت داڑھیاں اور چہرے پر شرافت کی روشنی۔ ان کی والدہ بڑی بیگم نے حجاب کیا ہوا تھا اور وہ بھی ایک کھلے لیکن نہایت قیمتی لبادے میں تھیں۔ خاندان کی کچھ دیگر خواتین بھی حجاب میں نظر آتی تھیں۔ کچھ لڑکیوں نے زرق برق لباس پہن رکھے تھے اور لمبے لمبے گھونگھٹ نکال رکھے تھے۔ وہ ہاتھوں میں ہاتھ پکڑے ایک دائرے کی شکل میں چکرا رہی تھیں۔ اس دائرے کے درمیان میں ایک چھوٹا سا حجلہ عروسی تھا جس میں سے کبھی سبز اور کبھی سرخ روشنی پھوٹتی تھی۔ بڑی عمر کی عورتیں باری باری حجلہ عروسی پر ہاتھ رکھتی تھیں اور مسکراتی تھیں۔ یہ کوئی غیر ملکی رسم تھی۔ اسٹیج پر موجود مہمانوں میں گورا چٹا شکیل داراب بھی بڑی شان سے براجمان تھا۔ اس کے عقب میں دو مسلح گارڈز تھے۔ یہ سارا ہال ہی سخت سکیورٹی کے نرغے میں تھا۔ باقی مرد و زن اسٹیج کے سامنے آرام دہ نشستوں پر بیٹھے تھے اور پارا ہاؤس کی

شاہانہ میز بانی کا لطف اٹھا رہے تھے۔ سجاول بھی انہی مہمانوں میں موجود تھا۔ اسے ایک عقبی نشست ملی تھی۔

اسی دوران میں کچھ ہلچل محسوس ہوئی۔ کیمرے حرکت میں آئے فلش لائٹس چمکیں اور دونوں لڑکیاں ہال کمرے میں داخل ہوئیں۔ ان کے نصف چہرے نقاب میں تھے۔ وہ بیش قیمت سنہری کپڑوں میں ملبوس تھیں۔ میں نے زینب کو پہچان لیا۔ لیکن یہ شناخت آسانی سے نہیں ہوئی۔ وہ کافی بدل گئی تھی۔ اس کا وزن بھی معقول حد تک بڑھ گیا تھا۔ رنگت اجلی اور نقوش میں جاذبیت دکھائی دے رہی تھی مگر اسے دیکھتے ہی یہ پتا چل جاتا تھا کہ وہ غم کے ایک اَن دیکھے گھیرے میں ہے۔ سر اور نظر جھکائے وہ درجنوں مہمانوں کے درمیان سے گزرتی بڑی آہستگی کے ساتھ اسٹیج پر پہنچی اور دوسری لڑکی کے ہمراہ نشست پر جا بیٹھی۔ دونوں لڑکیاں درمیان میں تھیں، لڑکے دائیں بائیں تھے۔ زینب کے ساتھ ابراہیم تھا اور دوسری لڑکی کے ساتھ کمال احمد۔

ابراہیم کے بازو کے زخم پر ابھی تک یقیناً پٹی موجود تھی مگر اس پٹی کو کھلی آستین والے لبادے میں چھپا لیا گیا تھا۔ وہ تھوڑا سا زینب کی طرف جھکا اور مسکرا کر اس سے کچھ کہا۔

وہ بھی زبردستی مسکرائی اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

انیق نے مجھ سے کہا۔ ”لگتا ہے دونوں میں کچھ انڈراسٹینڈنگ ہو چکی ہے۔“

”مجھے تو یہ وہی انڈراسٹینڈنگ لگتی ہے جو پالتو جانور کی سرکس کے رِنگ ماسٹر کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس انڈراسٹینڈنگ کے پیچھے زبردست سختی، دباؤ اور مجبوری ہوتی ہے۔“

”آپ کا مطلب ہے، زینب کو ڈرایا دھمکایا گیا ہوگا؟“

”اس میں کوئی شبہ نہیں ہے، تم دیکھو اس کے گود میں رکھے ہوئے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔“

وہ واقعی خود کو بمشکل سنبھالے ہوئے تھی۔ کسی ڈری سہمی چڑیا کی طرح بیٹھی تھی جس کے اردگرد بڑے بڑے پروں والے عقاب پھڑ پھڑا رہے ہوں اور یہ چاند گڑھی کے ایک سادہ سے گھر میں رہنے والی ایک سادہ سی لڑکی تھی جو کچھ عرصہ پہلے تک اپنے مرحوم والد مولوی فدا کے سینے پر سر رکھ کر سوتی تھی اور شاید گڈے گڑیوں سے بھی کھیلتی ہوگی، ابھی تو اس کے لاڈ دکھانے کے دن تھے، ماں باپ سے فرمائشیں کرنے اور ہم عمر سہیلیوں کے ساتھ قلانچیں بھرنے کا زمانہ تھا اور اس بے چاری کو اپنوں سے سیکڑوں میل دور اس اونچی دیواروں والے پارا ہاؤس میں بھاری بھرکم کپڑوں اور زیوروں سے لاد کر بٹھا دیا گیا تھا۔ یہاں کوئی اس کا اپنا

نہیں تھا، کوئی شناسا نہیں تھا۔ وہ تو ان لوگوں کی زبان تک نہیں سمجھتی تھی۔ شاید ان کے نام تک نہ جانتی ہو۔ ہاں وہ پھڑ پھڑاتے ہوئے دیو ہیکل عقابوں کے درمیان ایک تنہا چڑیا تھی۔

میں نے دل ہی دل میں کہا...... گھبراؤ نہ اے سہمی ہوئی چڑیا۔ خود کو تنہا نہ سمجھو، ہم تمہارے ساتھ ہیں، تم پر کوئی آنچ نہیں آنے دیں گے۔ تم دردِ دل رکھنے والے مولوی فدا کی یتیم بچی ہو...... اور تم اس چاند گڑھی کی رہنے والی بھی ہو جس میں میرا کوئی اپنا رہتا تھا...... میرا بہت زیادہ اپنا۔ اس ''دوسری نسبت'' سے بھی تمہاری مدد کرنا میرا فرض ہے۔ میں تمہیں اس طرح طاقت اور دولت کی سولی پر نہیں چڑھنے دوں گا۔

ہال کمرے میں وڈے صاحب کی خواصیں بھی موجود تھیں اور ان میں مجھے سنبل کی جھلک بھی نظر آئی۔ وہ بہت بنی ٹھنی تھی اور یوں لگتا تھا کہ وڈے صاحب کی رکھیل نہیں بلکہ نوبیاہتا بیوی ہے۔ عورتوں اور لڑکیوں کے اس جھرمٹ میں روحی نامی لڑکی بھی دکھائی دی جس سے آج کل سنبل کی زبردست رقابت چل رہی تھی۔ ویڈیو میں بھی دکھائی دیا کہ وہ کینہ توز نظروں سے خوبرو سنبل کو تاک رہی ہے۔ تقریب میں کئی طرح کی چھوٹی چھوٹی رسمیں تھیں جن میں ایک گڑیا گڈے کو دودھ میں نہلانا، ہاتھوں اور چہرے پر مہندی لگانا اور نہایت تیز مرچوں والے چاول کسی نوبیاہتا عورت کو کھلانا اور اسے پانی نہ پینے دینا، وغیرہ شامل تھیں۔

○......❖......○

سنبل اپنا کام خوش اسلوبی سے انجام دے رہی تھی۔ وہ وڈے صاحب کو اپنی اداؤں کے جال میں جکڑے ہوئے تھی۔ گاہے بگاہے وہ اسے زبردست نخرے دکھاتی تھی اور ٹسوے بہاتی تھی۔ غالباً اس کی محبت کا جواب محبت سے دینے سے بھی انکار کرتی یا بہانہ بناتی تھی۔ سجاول نے وڈے صاحب کو سمجھا رکھا تھا کہ لڑکی جب بھی سرکش گھوڑی والے تیور دکھائے تو وہ اس کی لگام کچھ دیر کے لیے اس کے ہاتھ میں تھما دے۔ وہ اسے بات چیت کے ذریعے بالکل رام کر لے گا۔ اگلے روز بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ سنبل، سجاول سے ملاقات کے لیے چلی آئی۔ سفید مینا اس نے گلے سے لگا رکھا تھا۔ وہ جب بھی آتی تھی بڑی شان سے آتی تھی۔ ایک دو ملازمائیں، ایک دو مشاطائیں، دو تین گارڈز اس کے جلو میں ہوتے تھے۔ جب وہ سجاول کے پاس پہنچتی تھی تو یہ سب لوگ باہر کھڑے رہ جاتے تھے۔ اب کی دفعہ بھی سنبل اور سجاول کے درمیان تقریباً ایک گھنٹا گفت و شنید ہوئی۔

اس گفت و شنید کا خلاصہ ہمیں بعد ازاں سجاول سے معلوم ہوا۔ اس نے بتایا۔ ''زینب اور دوسری لڑکی شائستہ کو بری طرح ڈرایا دھمکایا گیا ہے۔ خاص طور سے زینب کو۔ کیونکہ وہ

زیادہ مزاحمت کر رہی تھی۔ اس سے کہا گیا ہے کہ اگر وہ اڑیل پن دکھائے گی تو اس کے وارثوں کے ساتھ برا سلوک ہوگا۔ ان کو جان کے لالے پڑ سکتے ہیں۔"

"کس نے دھمکایا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"دھمکانے ڈرانے والے کام یہاں ایک ہی خبیث تو کرتا ہے..... آقا جان، سمجھو کہ وہ یہاں کا ایس ایچ او ہے، جج بھی اور جلاد بھی۔ وڈا صاحب کسی حد تک نرم طبیعت کا مالک ہے مگر اس کی کمی اس کے اس وفادار ہرکارے نے پوری کر رکھی ہے۔"

"ابراہیم اور زینب کا معاملہ کیسا چل رہا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ان چند دنوں میں ابراہیم بالکل لٹو ہو گیا ہے زینب پر۔ سنا ہے کہ اس نے ماں سے کہا ہے کہ وہ بالکل ایسی ہی لڑکی چاہتا تھا۔ یہ زینب جس طرح نماز روزے کی پابندی کرتی ہے وہ بھی ابراہیم کے دل کو بہت بھایا ہے۔ ویسے تو دونوں ہی لڑکیاں مذہبی گھروں سے ہیں، پردہ وغیرہ بھی کرتی ہیں۔ شادی کی تیاری کے طور پر دونوں لڑکوں نے اور خاص طور سے ابراہیم نے اردو کے کچھ لفظ سیکھ رکھے ہیں۔ لڑکیوں کو بھی اس قابل بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ وہ اپنے خاوندوں سے بات کر سکیں۔"

"تمہاری بات سے تو یہی مطلب نکلتا ہے کہ زینب اس شادی پر راضی نہیں ہے۔"

"یار! وہ تو بالڑی ہے۔ اس کے راضی ہونے یا نہ ہونے سے کیا فرق پڑے گا۔ یہاں تو وہی کچھ ہونا ہے جو ان لوگوں نے چاہنا ہے۔"

"اور ہم یہ سب کچھ ہونے دیں گے؟"

"ہم کیوں ٹانگ اڑائیں۔" سجاول بولا۔ "ہم ان لڑکیوں کو یہاں نہیں لائے۔ نہ ہم ان کو شادی پر مجبور کر رہے ہیں۔ ویسے بھی ان کے ساتھ کوئی ایسا برا تو نہیں ہو رہا۔ یہ عام سے گھروں کی دیہاتی کڑیاں ہیں، اتنے بڑے خاندان کی بہو بن جائیں گی۔ کروڑوں، اربوں میں کھیلیں گی۔"

"لیکن تب ہی کھیلیں گی ناں جب زندہ رہیں گی۔ شاید تم بھول رہے ہو کہ یہاں اندر خانے اور معاملہ چل رہا ہے۔"

سجاول نے ذرا توقف کیا، پھر سگریٹ کا طویل کش لے کر بولا۔ "تمہارا مطلب ہے کہ وڈے صاحب کے یہ دونوں لڑکے زہریلے ہیں...... لیکن یہ بھی تو دیکھو کہ لڑکیاں بھی زہریلی ہیں۔ وہ پنجابی کی کیا مثال ہے...... سپ نوں سپ لڑے تے وِس کینوں چڑھے۔"

"تم اس معاملے کو ایزی لے رہے ہو سجاول! لیکن میں نہیں لے سکتا۔ میں خاص طور

سے مولوی فدا کی بیٹی زینب کے لیے پریشان ہوں۔''

''وہ کیوں؟ وہ تمہاری ''اُس'' کے پنڈ کی ہے اس لیے؟'' سجاول نے طنز کیا۔ اس کا اشارہ تاجور کی طرف تھا۔

ایک لمحے کے لیے میرا دل چاہا کہ اس پر پل پڑوں۔ مگر پھر خود کو سنبھالا۔ بزدلی کی وجہ سے نہیں، اس حقیقت کی وجہ سے کہ وہ ایک منفرد فائٹر تھا۔ اگر اس سے مارا ماری شروع ہو جاتی تو سارا کھیل ہی بگڑ جاتا اور جو کچھ بھی تھا، مجھے یہ ماننے میں بھی باک نہیں تھا کہ سجاول کے پُراسرار گھونسے کا مقابلہ کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس کا دایاں ہاتھ دیکھنے میں تو ایک عام ہاتھ ہی نظر آتا تھا لیکن جاننے والے جانتے تھے کہ یہ عام نہیں ہے۔ سجاول طیش کے عالم میں اس ہاتھ کے ذریعے کسی کو بھی موت کے گھاٹ اتار سکتا تھا اور جب وہ اس خاص حالت میں ہوتا تھا جس میں اس نے باگھ کا خشک جگر چبایا تھا اور مجھ سے ہتھ جوڑی کی تھی تو اس کا دایاں مکا ناگہانی موت کا دوسرا نام تھا۔

میرے چہرے پر چمکنے والی سرخی دیکھ کر سجاول تاڑ گیا کہ اس کی بات مجھے پھر بری لگ گئی ہے۔ اس نے جلدی سے وہسکی سے بھرا گلاس میری طرف بڑھایا اور بولا۔ ''دیکھو، میں نے کسی کا نام نہیں لیا۔ بس یونہی ایک بات کہی ہے...... تم بڑی جلدی برا مان جاتے ہو۔''

میں نے گلاس چڑھا لیا اور سگریٹ کے چند کش لے کر خود کو پُرسکون کرنے کی کوشش کی۔ سجاول میرے لیے نیا گلاس بھرتے ہوئے بولا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آیا، تم زینب کے لیے فالتو طور پر پریشان کیوں ہو؟''

میں نے گلاس ایک طرف ہٹا دیا۔ ''دیکھو سجاول! یہ بات کوئی ڈھکی چھپی نہیں کہ تم ایک ڈکیت ہو۔ تمہارا مسئلہ صرف مال اکٹھا کرنا ہے۔ تم یہاں پاراہاؤس میں بھی بس اپنے اسی کام کے لیے ہو۔ تمہارا دماغ بھی بس اپنے اسی کام کے بارے میں سوچ رہا ہے لیکن میں دوسری باتیں بھی دیکھتا اور سوچتا ہوں۔ جہاں تک میں جان پایا ہوں، کمال احمد والی لڑکی کو تو جسمانی طور پر اس ازدواجی بندھن کے لیے تیار کر دیا گیا ہے، مگر زینب تیار نہیں ہے۔ یعنی وہ پوری طرح IMMUNE نہیں ہو سکی ہے۔ اس بات کا ثبوت خط سے بھی ملتا ہے اور وہ کمینہ عالمگیر بھی یہ سب اچھی طرح جانتا ہوگا۔ اس نے صرف اپنی کھال بچانے کے لیے اور اپنی بقایا رقم کھری کرنے کے لیے اس بے چاری کو یہاں ''ڈلیور'' کر دیا ہے۔''

''تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ پوری طرح تیار نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ......''

''میں سب کچھ جانتا ہوں۔'' میں نے سجاول کی بات کاٹی۔ ''میں نے خود اسے عالمگیر

اور پیر ولایت کے پنجے سے چھڑایا تھا۔ خود اسے اسلام آباد کے اسپتال میں پہنچایا تھا۔ اب اسے اس اسپتال سے اغوا کر کے یہاں پہنچا دیا گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بالکل تیار نہیں ہے۔ وہ بہت زیادہ نقصان اٹھا سکتی ہے۔''

سجاول کی پیشانی پر سوچ کی سلوٹیں ابھر آئیں۔

اگلے روز دوپہر کے وقت انیق اپنے خانساماں دوست ازمیر طیب کے ساتھ اس کے رہائشی پورشن کی چھت پر کھڑا دھوپ سینک رہا تھا۔ اس نے اشارے سے مجھے بھی اوپر بلا لیا۔ ازمیر سرخ وسپید گول چہرے والا ایک صحت مند و ہنس مکھ شخص تھا۔ اس کی بندریا لوسی کی صحت اب بہتر تھی اور وہ ازمیر کے کندھے پر بیٹھی اٹکھیلیاں کر رہی تھی۔ کسی لاڈلے بچے کی طرح وہ ہر وقت زرق برق لباس میں نظر آتی تھی۔ انگریزی کے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں، میں نے ازمیر کے ساتھ چند جملوں کا تبادلہ کیا اور لوسی کی صحت یابی پر اسے مبارک باد دی۔ ازمیر طیب کی بات سے پتا چلا کہ لوسی کے خون میں NEUROTOXI ٹائپ زہریلا مواد پایا گیا ہے۔ شاید اسے کسی زہریلے کیڑے نے کاٹا ہے مگر جسم پر کوئی خاص نشان نہیں ملا۔ انیق نے مجھے اشارہ سے دور بنگلے کا منظر دکھایا۔ درمیانی فاصلہ کم و بیش تین فرلانگ کا تھا۔ بنگلے کے سامنے لوگوں کی دو طویل قطاریں نظر آ رہی تھیں۔ ان میں بچے، بوڑھے، عورتیں سب شامل تھے۔ اتنے فاصلے سے بھی اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ علاقے کے مفلوک الحال لوگ اور کھیت مزدور وغیرہ ہیں۔

''لگتا ہے کہ وہاں کچھ تقسیم کیا جا رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہاں شاید آقا جان کچھ بانٹ رہا ہے۔''

''وہ خسیس تو کسی کو دمڑی دینے والا بھی نہیں ہے، ہو سکتا ہے کہ پارا ہاؤس والے ہی کچھ تقسیم کر رہے ہوں، تم ازمیر سے پوچھو شاید اسے کچھ پتا ہو۔''

''نہیں، ازمیر صاحب نے بھی یہ سین ابھی دیکھا ہے۔''

بے شمار لوگ موجود تھے اور چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں مزید بھی آ رہے تھے۔ کچھ پیدل تھے، کچھ سائیکلوں پر، کچھ گدھا گاڑیوں وغیرہ پر۔

اندر خانے کی باتیں ہمیں سنبل یا جاناں کے ذریعے ہی معلوم ہوتی تھیں، ورنہ عام ملازمین تو کسی کے بارے میں ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالتے تھے۔ جاناں اب بنگلے میں موجود تھی اور وہ بتا سکتی تھی کہ وہاں کیا ماجرا ہے۔ شام کو میں نے حلمی سے اجازت لی کہ میں ایک آدھ گھنٹے کے لیے بنگلے جانا چاہتا ہوں تاکہ اپنی بیوی سے ملاقات کر سکوں۔ حلمی نے

اجازت دے دی۔ ایک گاڑی جو پاراہاؤس میں سامان خورونوش اتار کر واپس جا رہی تھی مجھے بھی لے گئی۔ تین چوکس سکیورٹی گارڈز اس میں موجود تھے۔

جاناں یہ جان کر نہال ہوگئی کہ میں اس سے ملنے آیا ہوں۔ لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ میرا آنا بے مقصد نہیں ہوگا۔ تنہائی میں ملاقات ہوئی تو وہ میری بانہوں میں گھس گئی۔ اس کے ویلوٹ کے کڑھائی دار کرتے میں سے بڑی ولایتی قسم کی خوشبو آ رہی تھی۔ وہ ہر وقت میڈم لورین کے ساتھ رہتی تھی اور یہ خوشبو غالباً وہیں سے اس کے کپڑں میں منتقل ہوئی تھی۔

''آج دوپہر سے میرا دل کہہ رہا تھا کہ آپ جناب کا دیدار ہوگا۔'' وہ اٹھلا کر بولی۔

''کیوں، دوپہر میں کیا خاص بات ہوئی تھی؟''

''دوپہر میں یہ خاص بات ہوئی تھی کہ آپ کی یہ بندی نیند سے جاگی تھی۔ میڈم نے رات کوئی ڈھائی بجے تک مجھ سے ٹانگیں دبوائیں۔ یقین کریں دونوں بازو پھوڑا بن جاتے ہیں...... ویسے ایک بات ہے، اب میں نے خود کو کچھ کچھ سمجھا لیا ہے۔ اب یہ مشقت بہت زیادہ محسوس نہیں ہوتی۔''

''کیا مطلب؟''

''سچی سچی بتاؤں؟'' اس نے ذرا شوخ نظر آنے کی کوشش کی۔

''فرماؤ۔''

''جب میں میڈم کی ٹانگیں دباتی ہوں تو آنکھیں بند کر لیتی ہوں اور یہ سوچتی ہوں کہ میرے سامنے میڈم نہیں...... آپ لیٹے ہیں اور میں آپ کی ٹانگیں دبا رہی ہوں، پھر پتا ہی نہیں چلتا، وقت گزرتا چلا جاتا ہے۔'' اس نے کہا اور اس کا چہرہ گلابی گلابی سا نظر آنے لگا۔

''تم مجھے زیادہ بانس پر نہ چڑھایا کرو تو بہتر ہے۔ اس طرح تم میرے ساتھ ساتھ خود کو بھی دھوکا دیتی ہو۔''

''محبت میں تو دھوکا ہوتا ہی نہیں ہے اور یہ محبت ہے جناب۔ یقین نہ آئے تو کسی وقت آزما کر دیکھ لیجیے گا۔''

''اچھا، زیادہ مکالمے بازی نہ کرو۔ میں کچھ پوچھنے آیا ہوں تم سے۔ آج دوپہر یہاں کیا شور شرابا تھا۔ بہت سے لگ قطاروں میں لگے ہوئے تھے؟''

''میرا خیال تھا کہ آپ پاراہاؤس میں ہیں، آپ کو سب پتا ہوگا۔''

''نہیں، وہاں سب کی زبانوں پر تالے ہیں۔''

اس نے ایک ادھ کھلی کھڑکی کو بند کیا اور پھر میرے سامنے بیٹھتے ہوئے قدرے دھیمی

آواز میں بولی۔ ”وڈے صاحب کے چھوٹے بیٹے ابراہیم نے اپنی ہونے والی دلہن کے نام پر صدقہ خیرات کیا ہے۔ لگتا ہے کہ کافی موٹی رقم آقا جان کے حوالے کی گئی تھی تاکہ وہ علاقے کے مستحق لوگوں میں بانٹ دے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ ابراہیم اپنی ہونے والی دلہن زینب پر بری طرح فریفتہ ہو چکا ہے۔“

”بانٹا کیا گیا ہے؟“

”بہت سی چیزیں تو راشن کی شکل میں تھیں۔ آٹا، چاول، تیل وغیرہ۔ باقی نقد رقم بھی تھی لیکن یہ نقد رقم تو لوگوں تک ساری نہیں پہنچی ہو گی۔ ہاں راشن کے تین چار ٹرک ضرور تقسیم ہوئے ہیں۔“

”تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ نقد رقم ساری نہیں پہنچی ہو گی؟“

وہ رازداری کے لہجے میں بولی۔ ”میں نے کچھ دیر پہلے آقا جان اور میڈم کی تھوڑی سی چخ چخ سنی ہے۔ میڈم کہہ رہی تھی ...... کچھ خدا کا خوف کرو، غریبوں کا پیسا بھی پیٹ میں ڈال لیتے ہو۔ کوئی بہت بری بیماری لگ جانی ہے تمہیں۔“

وہ بولا۔ ”بری بیماری لگی تو ہوئی ہے تمہاری شکل میں۔“

اس کے بعد دونوں طرف سے کافی تابڑ توڑ انگریزی بولی گئی، لیکن دروازہ بند کر لیا گیا تھا اس لیے سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

میں نے کہا۔ ”جو صدقہ خیرات کیا گیا ہے، وہ صرف ابراہیم کی طرف سے تھا؟“

”ہاں، لگتا ہے کہ بڑے بھائی کمال کو شادی کا زیادہ شوق نہیں ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ اس کی دوسری شادی ہے۔ پہلی بیوی فوت ہو چکی ہے۔“

”اور کوئی خاص بات، جس کا پتا چلا ہو؟“

”ابھی تو بس محبت اور انتظار کا ہی پتا چل رہا ہے۔“ وہ میری آنکھوں میں جھانک کر ادا سے بولی لیکن جب میرے چہرے پر سنجیدگی دیکھی تو فوراً بات بدلی۔ ”لگتا ہے کہ چھوٹا شہزادہ ابراہیم ایک ایک دن گن گن کر گزار رہا ہے۔ اس نے اپنے رہائشی حصے میں سے سارے کیلنڈر اتروا دیے ہیں۔ یہ بات پارا ہاؤس سے آنے والی ایک ملازمہ نے مجھے بتائی ہے۔“

”کیلنڈر اتروانے کا کیا مقصد؟“

”شاید وہ تاریخیں گننا نہیں چاہتا۔ ملازمہ نے یہ بھی بتایا ہے کہ وہ بلا ناغہ صبح اور شام زینب کے لیے گلدستہ بھجواتا ہے اور اس کی خیر خیریت دریافت کرتا ہے۔ دو چار بار ملاقات بھی کی ہیں لیکن یہ ملاقات ان لوگوں کے رواج کے مطابق پردے کی اوٹ میں ہوتی ہے۔“

میں جاناں کے پاس قریباً ڈیڑھ گھنٹا رکا۔ اس دوران میں ایک بار میڈم لورین کی جھلک بھی نظر آئی۔ غالباً وہ جاناں کو جلد از جلد پھر اپنے پاس دیکھنا چاہتی تھی۔ میں شام چھ بجے کے قریب پارا ہاؤس واپس آ گیا مگر ذہن بدستور الجھا ہوا تھا۔ جو کچھ ہونے جا رہا تھا وہ بالکل غلط تھا۔ اسے روکے جانے کی ضرورت تھی۔ دوسری طرف پارا ہاؤس میں شادی کی تیاریاں نمایاں طور پر نظر آنے لگی تھیں۔ رات کے وقت رہائشی حصے کے اندر سے کہیں گیت اور دف وغیرہ کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ پارا ہاؤس کے جن حصوں کو خونی ہنگامے کے دوران میں نقصان پہنچا تھا ان کو ٹھیک کر لیا گیا تھا اور وہاں تیز روشنیوں میں رات کے وقت بھی رنگ و روغن کا کام کیا جا رہا تھا۔

میں نے انیق سے مشورہ کیا اور سجاول سے بھی۔ میرا خیال تھا کہ ابراہیم سے ملاقات کر کے اسے صورتِ حال سے آگاہ کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ سجاول اس خیال کا حامی نہیں تھا۔ انیق اس کے سامنے تو چپ رہا لیکن بعد میں بھنائے لہجے میں بولا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ سجاول کو امریش پوری کہہ کر ہم اس کی خباثت کا حق ادا نہیں کر رہے، اس میں تو برصغیر کے تمام بڑے بڑے سائیڈ ہیروز کی خصوصیات جمع ہیں۔ مظہر شاہ، مصطفیٰ قریشی، اسد بخاری اور انڈیا کے پران، رنجیت اور ڈینی وغیرہ کی ساری بدکاریوں کو جمع کر لیا جائے تو وہ اس اکیلے سجاول میں موجود ہیں۔''

''اپنی چونچ بند رکھا کرو۔ کسی دن اس نے سن لیا ناں تو تمہارے سارے تخمینوں کو درست ثابت کر کے دکھا دے گا۔ مجھے صرف یہ بتاؤ کہ ہمیں ابراہیم سے بات کرنی چاہیے یا نہیں؟''

انیق نے دائیں ہاتھ سے سر کھجایا۔ یہ اس بات کی نشانی تھی کہ وہ سنجیدگی سے سوچ رہا ہے۔ ذرا توقف سے بولا۔ ''جہاں تک مجھ ناچیز کی رائے ہے یہ کمال احمد اور ابراہیم بری خصلت کے نہیں ہیں۔ خدا خوفی بھی ان میں موجود ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ہم زینب کے سلسلے میں ابراہیم کو طریقے سے آگاہ کریں تو وہ ہماری بات پر غور کرے۔''

''لیکن بات کی کس طرح جائے؟''

''منہ سے، جس طرح سارے لوگ کرتے ہیں۔''

''میں جھانپڑ مار دوں گا۔ تم مسخری کر رہے ہو اور یہ بھی جانتے ہو کہ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔''

''حلمی صاحب سے مدد مانگ کر دیکھ لیں۔''

"مجھے نہیں لگتا کہ وہ سجاول کی منظوری کے بغیر مدد کرے گا۔"

"آپ ہی کو شوق چڑھا ہوا ہے سجاول کو آگے بڑھانے کا اور اس کی عزت میں اضافہ فرمانے کا۔ آپ کی ڈھیل ہی کی وجہ سے ابراہیم کو ناقب وغیرہ سے چھڑانے کا تقریباً سارا کریڈٹ سجاول نے اپنے کھاتے میں ڈال لیا ہے۔"

میں نے اس کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ "ایک طریقہ ہو سکتا ہے۔ پائیں باغ کی طرف جاگنگ ٹریک بنا ہوا ہے۔ شام کے وقت ابراہیم اور کبھی کبھی کمال احمد وہاں جاگنگ کرتے ہیں۔ اگر وہاں ابراہیم سے "اتفاقاً" ملاقات ہو جائے تو بات چیت کی راہ نکل سکتی ہے۔"

یہ بات انیق کے دل کو بھی لگی۔

اسی شام میں چہل قدمی کے انداز میں پاراہاؤس کے انتہائی خوب صورت اور وسیع باغ کی طرف چلا گیا۔ مجھے پتا تھا کہ یہاں قدم قدم پر سی سی ٹی وی کیمرے موجود ہیں۔ اس لیے میں بہت محتاط تھا۔ میں بالکل نارمل انداز میں اِدھر اُدھر گھومتا رہا اور پھر جاگنگ ٹریک کے قریب چلا گیا۔ یہ وہی وقت تھا جب ابراہیم جاگنگ کرتا ہوا گزرتا تھا۔ اچانک درختوں کی اوٹ سے دو مسلح گارڈز نکلے اور میرے سامنے آ گئے۔ یہ وہی اسپیشل گارڈز تھے جو ہنگامے کے بعد کسی ہائی فائی ایجنسی سے منگوائے گئے تھے۔

"آپ کدھر جا رہے ہیں؟" ایک موچھیل گارڈ نے تند لہجے میں پوچھا۔

"جا تو کہیں نہیں رہا، صرف گھوم پھر رہا ہوں۔"

"آپ کی حرکات شک میں ڈالنے والی ہیں۔ آپ ادھر ہمارے ساتھ تشریف لائیں۔" گارڈ نے بدستور کاٹ دار لہجے میں کہا۔

اسی دوران میں مجھے نیم گنجا آقا جان بھی نظر آ گیا۔ وہ تیزی سے قدم اٹھاتا آ رہا تھا۔ غالباً اسے بھی ان نگران گارڈز نے کال کر کے ہی بلایا تھا۔ اس کی ناک کی سلوٹ بہت نمایاں نظر آ رہی تھی۔ اس نے مجھے کڑی نظروں سے گھورنے کے بعد کہا۔ "تمہارے یہاں جاگنگ ٹریک کے پاس منڈلانے کا کیا مطلب ہے؟"

"میں آپ کو جواب دینا ضروری نہیں سمجھتا۔" اس کے لب و لہجے نے میرا پارا بھی چڑھا دیا۔

"جواب تو تمہیں دینا پڑے گا بچہ جی۔" وہ دانت پیس کر بولا۔ "اس سے پہلے تم نے کچرا کنڈی کی طرف چہل قدمی کی تھی۔ لگتا ہے چہل قدمی کا کچھ زیادہ ہی شوق ہے تمہیں۔"

''آپ......اپنا لہجہ ٹھیک کریں جان صاحب۔'' میں نے کہا۔
وہ تو جیسے بہانہ ڈھونڈ رہا تھا۔ جھپٹ کر میری طرف آیا اور میرا گریبان پکڑنا چاہا۔ میں نے دفاعی انداز میں اس کی کلائی تھامی۔ میرا ایسا کرنا جیسے بارود کے فلیتے کو آگ دکھا گیا۔ گارڈز مجھ پر پل پڑے۔ مجھ پر غالب آنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ میں نے ایک گارڈ کے چہرے پر اپنے سر کی ٹکر رسید کی اور دوسرے کو لات مار کر دور پھینک دیا۔ ایک دم چاروں طرف دھما چوکڑی مچ گئی۔ صورتِ حال کو نازک دیکھا تو ایک گارڈ نے رائفل سیدھی کر لی۔ میں نے جھپٹ کر رائفل کا بیرل اوپر اٹھا دیا اور گارڈ کی ٹانگوں کے درمیان گھٹنے کی ضرب لگائی۔ وہ تڑپ کر زمین پر گر گیا، اب رائفل میرے ہاتھ میں تھی۔ دونوں گارڈز نے بھی رائفلیں تان لیں، لیکن ٹریگر دبانے کی ہمت مجھ سمیت کسی کو نہیں ہوئی۔ بے حد تناؤ والا منظر تھا۔ آقا جان غصے میں چلا رہا تھا۔ ''رائفلیں نیچے کرو۔ میں کہتا ہوں نیچے کرو۔''
یہی وقت تھا جب میری نگاہ جاگنگ ٹریک کی طرف اٹھ گئی۔ میں نے ابراہیم کو دیکھا۔ وہ ٹریک سوٹ میں تھا۔ اس کے ساتھ ایک باڈی گارڈ بھی ٹریک سوٹ میں تھا۔ ابراہیم ٹریک سے اتر آیا تھا اور میری طرف آرہا تھا۔ وہ انگریزی میں پکار کر بولا۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے، کیا بے وقوفی ہے؟''
اسے دیکھ کر میں نے رائفل فوراً نیچے کر لی۔ ایک گارڈ نے جھپٹ کر مجھ سے رائفل لے لی۔ یہ وہی تھا جس کے چہرے پر میری ٹکر لگی تھی۔ اس کے نتھنے خون سے رنگین ہو رہے تھے اور منہ سے بھی خون رِس رہا تھا۔ اس کے ساتھی گارڈز نے بدستور رائفلیں تانے رکھیں۔ ابراہیم نے انہیں حکم دیا کہ وہ رائفلیں نیچے کر لیں اور پیچھے ہٹ جائیں۔
گارڈز مجھے کینہ توز نظروں سے دیکھتے ہوئے پیچھے ہٹ گئے۔ کئی اور لوگ بھی موقع پر جمع ہو گئے تھے۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے جی؟'' ابراہیم نے انگلش میں آقا جان سے دریافت کیا۔
آقا جان پھٹ پڑا۔ ''یہ ٹھیک بندہ نہیں ہے۔ یہ ڈرامے کر رہا ہے۔ یہ جاگنگ ٹریک کے پاس منڈلا رہا تھا۔ کل بھی یہ اسی وقت یہاں گھومتا رہا ہے۔''
جواب میں ابراہیم نے جو کچھ کہا، اس نے مجھے حیران کر دیا۔ وہ بولا۔ ''آقا جان! آپ اس پر کسی طرح کا شک نہ کریں۔ مجھے اس پر اور سجاول صاحب پر پورا بھروسا ہے۔''
آقا جان نے کہا۔ ''بیٹا! آپ کو پتا نہیں، آپ کے آس پاس کتنے خطرے ہیں۔ ہم آپ کو اس طرح غیر محفوظ نہیں چھوڑ سکتے۔ آپ اس سے پوچھیں کہ یہ یہاں کیوں موجود ہے؟''
ابراہیم نے سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھا۔ میں نے کہا۔ ''اگر مجھے معلوم ہوتا

کہ اس طرف آنا اتنی سختی کے ساتھ منع ہے تو میں نہ آتا۔ لیکن اصل بات تو یہ ہے کہ گارڈز نے بہت برا رویہ اختیار کیا ہے اور ایسا آقا جان صاحب کے یہاں پہنچنے کے بعد ہوا ہے۔''

آقا جان ایک بار پھر تلملا کر رہ گیا۔ وہ کچھ بہت سخت الفاظ بولنا چاہ رہا تھا لیکن ابراہیم نے اسے اشارے سے روک دیا۔ وہ سخت غصیلے انداز میں پاؤں پٹختا ہوا دوسری جانب چلا گیا۔ دو گارڈز بھی اس کے عقب میں گئے۔ ابراہیم نے زخمی گارڈ کی فوری مرہم پٹی کا حکم دیا پھر اردگرد جمع ہونے والے لوگوں کو بتایا گیا کہ یہ سب کچھ غلط فہمی کی وجہ سے ہوا ہے۔

ابراہیم نے مجھ سے کہا۔ ''مسٹر شاہ زیب! تمہیں کوئی چوٹ وغیرہ تو نہیں آئی؟''

''نہیں چھوٹے صاحب! میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

ابراہیم مجھے لے کر پاراہاؤس کے رہائشی حصے کی طرف چل دیا۔ اس کے ساتھ جاگنگ کرنے والا اس کا باڈی گارڈ بھی ساتھ ہی تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ ابراہیم مجھے عمارت کے اس حصے میں لے آیا ہے جو اہلِ خانہ کے استعمال میں رہتا تھا۔ یہاں کی سج دھج اور آرائش دیکھنے کے قابل تھی۔ یہاں خوش اندام ملازماؤں کے علاوہ چوکس فی میل گارڈز بھی موجود تھیں۔ بڑے بڑے محرابی دروازے، چھتوں پر بیش قیمت فانوس اور دیواروں پر غالیچے۔ کہیں کہیں مصوری کے شاہکار بھی آویزاں تھے لیکن جس حصے میں ابراہیم رہائش پذیر تھا، وہاں مجھے کوئی تصویر نظر نہیں آئی۔ ابراہیم جہاں جہاں سے گزرتا تھا، ملازمین مؤدب انداز میں رک جاتے تھے یا پھر سلام کرتے تھے۔

ایک وسیع آراستہ کمرے میں جہاں گیس ہیٹر کی خوشگوار حرارت موجود تھی۔ ابراہیم نے مجھے ایک اٹالین صوفے پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ کسرتی جسم والا باڈی گارڈ ہمیں چھوڑ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ اگلے قریباً آدھ گھنٹے میں میرے اور ابراہیم کے درمیان کافی بے تکلفی پیدا ہوئی۔ اس نے دوستانہ ماحول میں میرے ساتھ چائے پی اور خشک میوہ جات کھائے۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ وہ کسی نہایت امیر کبیر گھرانے کا فرد ہے، ان لوگوں کے پرائیویٹ جہاز ہیں اور یہ لوگ بے شمار سیال سونے یعنی تیل کے مالک ہیں۔ وہ ایک بالکل عام اور سادہ سا نوجوان لگتا تھا اور یہ یقیناً اس کی ماں کی تربیت کا اثر تھا۔

ابراہیم نے کہا۔ ''مسٹر شاہ زیب! میں شاید بہت عرصے تک ان لمحوں کو بھلا نہ سکوں جب پل کی ایک طرف ہم اور دوسری طرف ناقب کے لوگ تھے۔ گولیاں بارش کی طرح برس رہی تھیں۔ تم نے ان لوگوں کو روکا تھا اور مسٹر سجاول مجھے وہاں سے نکالنے میں کامیاب ہوئے تھے۔''

میں نے کہا۔ ''بس میں نے تو ایک کوشش کی۔ شکر ہے کہ اوپر والے نے کامیابی دی۔''
''لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کام کا جتنا کریڈٹ مسٹر سجاول کو جاتا ہے اتنا ہی تم کو بھی جاتا ہے۔ مسٹر سجاول کی طرح تمہارے لیے بھی میں احسان مندی کے جذبات محسوس کرتا ہوں۔'' وہ صاف گوئی سے بولا۔

میں نے شکریہ ادا کیا۔ ہمارے درمیان یہ گفتگو انگریزی میں ہو رہی تھی۔ ابراہیم ٹھیک انگلش بول لیتا تھا۔ اپنے بارے میں، میں نے اسے بتایا کہ چونکہ میں ایک عرصہ اسلام آباد میں ایک آئرش سفارت کار کا ملازم رہا ہوں اس لیے ''ٹوٹی پھوٹی'' انگلش بول لیتا ہوں۔

ابراہیم نے کہا۔ ''مسٹر شاہ زیب! ابھی جو واقعہ ہوا مجھے اس کا بہت افسوس ہے۔ میں ''چچا آقا جان'' کی طرف سے بھی تم سے معذرت کرتا ہوں۔ انہیں جلدی غصہ آ جاتا ہے لیکن وہ دل کے برے نہیں۔ حقیقت یہی ہے کہ یہاں پارا ہاؤس کا زیادہ تر انتظام چچا آقا جان اور حلمی صاحب نے ہی سنبھال رکھا ہے...... بلکہ بیشتر ذمے داریاں چچا پر ہی ہیں۔''

مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ ابراہیم آقا جان کو چچا کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔ روز بروز ہمارا یہ احساس بڑھتا جا رہا تھا کہ آقا جان کے پنجے یہاں بہت مضبوطی سے گڑے ہوئے ہیں اور وڈے صاحب کی وجہ سے پارا ہاؤس والے آقا جان کی بہت سی غلطیوں کو نظرانداز بھی کرتے ہیں۔ ابراہیم کی گفتگو میں بھی یہ تنبیہہ موجود تھی کہ ہم چچا آقا جان کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہ کریں۔ ابراہیم کو ابھی تھوڑی دیر پہلے ہونے والی جھڑپ کا بھی افسوس تھا۔

ابراہیم نے اپنی چھدری داڑھی کو انگلیوں سے سہلاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے مسٹر شاہ زیب کہ تمہاری طبیعت میں تجسس زیادہ ہے۔ تم گھومتے پھرتے رہتے ہو اور کبھی کبھی گارڈز کو شک میں مبتلا کر دیتے ہو۔''

میں نے کہا۔ ''آپ سے سچی بات کہوں، آپ برا نہ مانیے گا۔ اس مرتبہ گارڈز کا شک غلط نہیں تھا۔''

''کیا مطلب؟'' جواں سال ابراہیم نے حیرت سے آنکھیں پٹ پٹائیں۔
''میں واقعی پلاننگ کے ساتھ جاگنگ ٹریک کی طرف آیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ کسی طرح میری اور آپ کی ملاقات ہو جائے۔''

ابراہیم کی حیرت بڑھ گئی۔ وہ ابھی تک ٹریکنگ سوٹ میں تھا اور صوفے میں دھنس کر بیٹھا ہوا بالکل نوعمر لڑکا لگ رہا تھا۔ ایک باریش کالج بوائے۔ ''ایسی کیا فوری ضرورت پڑ گئی تھی، مجھ سے ملاقات کی؟'' اس نے دریافت کیا۔

''ضرورت فوری بھی ہے اور بہت اہم بھی۔'' میں نے کہا پھر قریب رکھے رائٹنگ پیڈ پر چند الفاظ لکھ کر ابراہیم کی طرف بڑھائے۔ میں نے لکھا تھا۔''ابراہیم اس کمرے میں نگرانی کے لیے کوئی آڈیو، ویڈیو سسٹم تو موجود نہیں؟''

ابراہیم نے مزید حیرت زدہ ہوتے ہوئے کہا۔''نہیں، یہاں ایسا کچھ نہیں ہے، تم تسلی سے بات کر سکتے ہو۔''

اس سے پہلے میں کچھ کہتا دروازے پر مدھم دستک ہوئی۔ ابراہیم کی اجازت ملنے پر ایک خوش پوش سروقد ملازمہ اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں تازہ پھولوں کا ایک نہایت خوب صورت گلدستہ تھا۔ اس نے ذرا شوخ نظروں سے ابراہیم کی طرف دیکھا اور ادب سے گلدستہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ ابراہیم نے گلدستہ میز پر رکھا اور ایک ننھے سے کارڈ پر کچھ لکھ کر گلدستے میں رکھ دیا۔ بعدازاں اس نے یہ گلدستہ درمیانی عمر کی خوش پوش ملازمہ کو واپس دے دیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ وہی گلدستہ ہے جس کے بارے میں مجھے جاناں نے بتایا تھا۔ یہ گلدستہ زینب کو بھیجا جا رہا تھا۔ ابراہیم نے مالے زبان میں ملازمہ سے کچھ کہا بھی۔ شاید زینب کی خیر خیریت دریافت کی تھی۔

ملازمہ لپکتی جھپکتی واپس چلی گئی۔ ابراہیم کے دبلے پتلے چہرے پر عجیب سی محبت بھری روشنی تھی۔ میں نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔''میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔ لیکن ڈرتا ہوں کہ آپ برا نہ مان جائیں۔''

وہ ذرا توقف کر کے بولا۔''برا نہیں مانوں گا...... پوچھو۔''

''یہ خوب صورت گلدستہ آپ نے کس کو بھیجا ہے؟''

''یہ ذاتی سوال ہے، مگر اب تم نے پوچھ ہی لیا ہے تو بتا دیتا ہوں...... یہ میری ہونے والی دلہن کے لیے تھا۔''

''لگتا ہے کہ آپ بہت پیار کرنے لگے ہیں اس سے؟''

''مسٹر شاہ زیب! تم کیا کہنا چاہتے ہو؟'' ابراہیم کی پیشانی پر ہلکا سا بل آ گیا۔

''ایک بار پھر گستاخی کی معافی چاہتا ہوں۔ آپ اپنی ہونے والی دلہن سے بہت پیار کرتے ہیں۔ آپ یہ ہرگز نہیں چاہیں گے کہ اسے آپ کی ذات کی وجہ سے کوئی شدید نقصان پہنچے، کیا آپ چاہیں گے؟''

''مسٹر شاہ زیب! یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟''

''میں وہی باتیں کر رہا ہوں، جو مجھے کرنی چاہئیں۔ اس لیے کہ میں وہ کچھ جانتا ہوں

جو ابھی آپ نہیں جانتے۔ آپ کی ہونے والی دلہن شاید ویسا ہی نقصان اٹھا سکتی ہے جیسا آپ کے بڑے بھائی کی دلہن نے تین سال پہلے اٹھایا تھا......"

"پلیز، شٹ اپ۔" ابراہیم کا چہرہ تمتما گیا۔

وال کلاک کی مدھر موسیقی نے شام کے سات بجے کا وقت بتایا۔ اس کمرے میں ہم اکیلے تھے۔ کمرے کا اکلوتا دروازہ بند تھا۔ میں نے کہا۔ "ابراہم! میں آپ سے جو کچھ کہوں گا ایک سچے ہمدرد کی حیثیت سے کہوں گا اور آپ سے بھی یہ توقع رکھوں گا کہ آپ میری یہ باتیں اپنے تک ہی محدود رکھیں۔ ابراہیم! چند ہفتے پہلے میرے ہاتھ ایک ایسا خط لگا، جو رازداری کے لیے الٹے حرفوں میں لکھا گیا تھا۔ اس خط کے ذریعے مجھے آپ دونوں بھائیوں کی دلہنوں کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہوئیں۔ مجھے پتا چلا کہ ان لڑکیوں کو روزانہ کی خوراک میں ایک خاص زہر کی ڈوز دی جا رہی ہے۔ یہ کام ایک عرصے سے جاری تھا اور اس ڈوز کا مقصد ان لڑکیوں میں زہر کی امیونٹی پیدا کرنا تھا۔ اس ڈوز میں استعمال ہونے والا زہریلا عنصر سانپوں سے حاصل کیا گیا تھا اور یہ سانپ ایک پیرولایت نامی شخص کی ملکیت تھے۔ مجھے مزید جستجو ہوئی...... شروع میں میرا خیال تھا کہ شاید ان لڑکیوں کے ذریعے کسی کو نقصان پہنچانا مقصود ہے لیکن پھر پتا چلا کہ لڑکیوں کے خون میں شامل کی جانے والا زہر کسی کو نقصان پہنچانے کے لیے نہیں بلکہ خود لڑکیوں کو نقصان سے بچانے کے لیے ہے۔"

میں خاموش ہو کر ابراہیم کا چہرہ دیکھنے لگا۔ وہاں کئی رنگ آ جا رہے تھے۔ کچھ دیر بعد اس نے پوچھا۔ "لڑکیوں کو کس سے نقصان پہنچ سکتا ہے؟"

"آپ دونوں بھائیوں سے۔ اور آپ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں۔ آپ کے جسموں میں زہر موجود ہے اور یہ کوئی قدرتی عارضہ نہیں ہے۔ یہ زہر ایک طویل عرصے سے آپ کے جسموں میں داخل کیا جا رہا ہے اور میں پھر کہوں گا، آپ اس صورتِ حال سے لاعلم نہیں ہیں۔"

ابراہیم کی پیشانی پر پسینے کی نمی نمودار ہو گئی۔ وہ تعجب سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے جیسے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ میں نے اتنے تھوڑے عرصے میں اتنی زیادہ معلومات حاصل کر لی ہیں۔ "تمہیں یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوا؟" اس نے پوچھا۔

"میں دوبارہ عرض کروں گا، آپ اس سارے معاملے کو صرف اس طرح دیکھیں کہ مجھے آپ سے ہمدردی ہے اور میں اپنی بساط کے مطابق آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے آپ کو بتایا ہے کہ میرے ہاتھ ایک خط لگا تھا۔ اس خط کی وجہ سے میرے اندر تجسس پیدا ہوا۔

یہ اسی تجسس کا نتیجہ تھا کہ میں یہاں تک پہنچا اور مجھے آپ دونوں بھائیوں کے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں۔''

''تم جو باتیں بیان کر رہے ہو، ان کا پتا تمہارے سوا اور کس کو ہے؟''

''آپ سمجھیں کہ ابھی یہ باتیں صرف مجھ تک ہیں۔''

اگلے دس پندرہ منٹ میں میرے اور ابراہیم کے درمیان کافی اہم بات چیت ہوئی۔ میرے ذہن میں اہم سوال یہی تھے کہ دونوں بھائیوں کو زہر کیوں اور کب سے دیا جا رہا ہے۔ اگر والدین کی مرضی سے یہ زہر دیا جا رہا ہے تو کس لیے؟ کیا اس فیملی کے کچھ اور لوگ بھی اس قسم کی زہر خورانی کا شکار ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔

ابراہیم نے ان میں سے کسی سوال کا جواب نہیں دیا۔ نہ ہی وہ یہ بات ماننے کو تیار تھا کہ اس کے کھانے میں کسی طرح کا زہر شامل ہوتا ہے۔ وہ میری معلومات کو ناقص قرار دے رہا تھا مگر اپنی بات کا کھوکھلا پن خود اسے بھی محسوس ہو رہا تھا۔ آخر وہ بولا۔ ''مسٹر شاہ زیب! اگر ہم کچھ دیر کے لیے فرض کر لیں کہ واقعی ہماری خوراک میں زہر شامل کیا جاتا ہے...... اور یہ بھی فرض کر لیں کہ ہمارے والدین نے ہمارے لیے جن دلہنوں کا انتظام کیا ہے ان میں بھی زہر کے خلاف قوت مدافعت پیدا کی گئی ہے، تو پھر تم یہ بات کیوں کہہ رہے ہو کہ میری ہونے والی دلہن میری ذات سے نقصان اٹھا سکتی ہے؟''

میں نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''چھوٹے صاحب! یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ مجھے پتا ہے کہ آپ لوگوں کے ساتھ دھوکا کیا جا رہا ہے۔ اس میں آپ لوگوں کا بالکل کوئی قصور نہیں۔ قصور ان لوگوں کا ہے جن کے ذمے یہ کام لگایا گیا تھا۔ انہوں نے فی دلہن آپ سے ایک کروڑ سے زیادہ معاوضہ حاصل کیا ہے مگر ان میں سے کم از کم ایک دلہن ایسی ہے جو وعدے کے مطابق IMMUNE نہیں ہے اور وہ دلہن آپ والی ہے۔''

''کیا تم دلہن کو جانتے ہو؟'' ابراہیم نے لرزاں لہجے میں پوچھا۔

''جی ہاں، آج سے چند ماہ پہلے میں اسی گاؤں میں تھا جہاں یہ رہائش پذیر تھی اور مجھے یقین ہے کہ جب میں آپ کو اس زینب نامی لڑکی کے دیگر حالات بتاؤں گا تو آپ کو مزید حیرانی ہوگی۔''

''تم حیران کرنے پر تلے ہوئے ہو تو کرتے جاؤ۔ میں تمہیں روکوں گا نہیں۔''

میں نے ابراہیم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''چھوٹے صاحب! میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ آپ دونوں بھائی نیک اور خدا ترس ہیں۔ آپ کسی کے ساتھ زبردستی اور

ناانصافی کا سوچ بھی نہیں سکتے۔آپ مجھے صرف اتنی بات بتا دیں کہ آپ دونوں بھائیوں تک یہ دلہنیں کس طرح پہنچی ہیں؟''

''اس میں کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ ہمارے والدین نے چچا آقا جان کے ذمے یہ کام لگایا تھا۔ہمیں نیک، دین دار گھرانوں سے تعلق رکھنے والی ایسی لڑکیاں چاہیے تھیں جو بے آسرا ہوں۔ وہ ایک بار ہمارے خاندان کا حصہ بن جائیں تو پھر یہی خاندان ان کا سب کچھ ہو جائے۔ ہمارے کچھ ایسے مسائل ہیں جن کی وجہ سے ہم رشتے داریاں اور میل ملاقات وغیرہ افورڈ نہیں کر سکتے۔''

''آپ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ کے لیے ایسی لڑکیاں ڈھونڈی گئی ہیں جن کا آگے پیچھے کوئی نہیں۔ اگر کوئی ہے تو اسے معقول رقم دے دی گئی ہے اور اب یہ لڑکیاں اپنے ماضی سے بالکل علیحدہ ہیں؟''

''ہاں علیحدہ ہیں مگر اپنی رضامندی سے۔''

میں نے ایک لمبی سانس لے کر نفی میں سر ہلایا۔''نہیں چھوٹے صاحب! مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آپ کی دونوں باتیں درست نہیں ہیں۔ کم از کم زینب کے بارے میں تو یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں۔ بے شک اس کے والدین حیات نہیں ہیں لیکن وہ اپنے ماضی سے بالکل علیحدہ نہیں ہے، اس کے اپنے ہیں جن سے وہ محبت کرتی ہے۔ جنہیں وہ دیکھنے اور ملنے کی خواہش مند ہے اور آپ کی ''رضامندی'' والی بات بھی غلط ہے۔ زینب اپنی رضامندی سے یہاں نہیں ہے۔ اس پر جو بیت رہی ہے، وہی جانتی ہو گی۔ شاید آپ کو پتا نہ ہو، اسے یہاں پہنچنے کے بعد بہت ڈرایا دھمکایا گیا ہے۔ اس نے اپنے ہونٹ سی لیے ہیں لیکن ظاہر ہے یہ ہونٹ ہمیشہ سلے تو نہیں رہیں گے۔ بہت جلد آپ کو سب معلوم ہو جائے گا لیکن تب تک دیر ہو چکی ہو گی۔''

''کس نے ڈرایا دھمکایا ہے اسے؟''

''میں نام لینا نہیں چاہتا لیکن مجھے اندازہ ہے کہ آپ بھی اس پارا ہاؤس کے کرتا دھرتا کو اچھی طرح جانتے ہیں۔''

نوعمر ابراہیم کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں کچھ اور گہری ہو گئیں۔ وہ مزید بے چین نظر آنے لگا۔ وہ بمشکل اٹھارہ انیس سال کا ہو گا۔ میری اور اس کی عمر میں کئی سال کا فرق تھا لیکن میں اسے احترام سے ہی مخاطب کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔''چھوٹے صاحب! گستاخی معاف کریں۔ یہاں صورتِ حال آپ کی سوچ سے زیادہ سنگین ہے۔ میں آپ سے اس

معاملے میں کھل کر بات کرنا چاہتا ہوں لیکن یہ بات تب ہی ہو سکتی ہے جب آپ بھی مجھ پر اعتماد کریں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں...... پُل والی لڑائی کی طرح آپ مجھے ہر مقام پر اپنا ہمدرد اور جاں نثار پائیں گے۔''

نوعمر ابراہیم شدید ترین کشمکش کا شکار نظر آ رہا تھا۔ ایک ہی وقت میں وہ مجھ سے گھبرا بھی رہا تھا اور مجھ پر بھروسا کرنا بھی چاہ رہا تھا۔ جب میں نے اسے یہاں تک بتا دیا کہ تین دن پہلے میں اس کھانے کا نمونہ بھی حاصل کر چکا ہوں جو ان دونوں بھائیوں نے کھایا تھا تو وہ ایک دم ہارا ہوا سا دکھائی دینے لگا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں معاملے کی خاصی گہرائی ناپ چکا ہوں...... اس کے ساتھ ساتھ اس کا یہ یقین بھی پختہ ہوتا چلا جا رہا تھا کہ میں سچے دل سے اس کی بھلائی چاہ رہا ہوں۔

اس نے مجھ سے کہا کہ ہم کل صبح اس بارے میں پھر بات کریں گے۔ تب تک میں اپنی زبان بالکل بند رکھوں اور یہاں ہونے والی گفتگو کی بھنک بھی کسی کو نہ پڑنے دوں۔ میں نے وعدہ کر لیا۔

اگلے روز صبح سویرے ابراہیم نے مجھے طلب کر لیا۔ لگتا تھا کہ میری طرح رات کو وہ بھی مکمل نیند نہیں لے سکا ہے۔ اس کی آنکھیں متورم اور چہرہ کھچا ہوا سا تھا۔ آج گفتگو کے آغاز ہی میں ابراہیم نے تسلیم کیا کہ زہر خورانی کی حد تک میری معلومات درست ہیں لیکن اس نے یہ ہرگز نہیں بتایا کہ اسے اور کمال کو یہ زہر کب سے اور کیوں دیا جا رہا ہے۔ نہ ہی اس امر پر روشنی ڈالی کہ والدین اپنے ہاتھوں سے انہیں زہر خورانی کا شکار کیوں بناتے ہیں۔

اس کی گفتگو سننے کے بعد میں نے کہا۔ ''چھوٹے صاحب! اب گویا یہ بات صاف ہو گئی ہے کہ آپ کے لیے ایسی دلہنیں یہاں لائی گئی ہیں جن کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ ان میں زہر کے لیے قوت مدافعت موجود ہے اور وہ آپ کے ساتھ نارمل ازدواجی زندگی گزار سکتی ہیں۔''

نوعمر ابراہیم نے اثبات میں سر ہلایا۔

''لیکن چھوٹے صاحب! میں اپنی بات پر قائم ہوں۔ ان میں کم از کم ایک لڑکی قوتِ مدافعت نہیں رکھتی۔ اور وہ وہی آپ کی ہونے والی دلہن ہے۔''

''میں تمہاری اس رائے کو نہیں مانتا۔ ہم پورا اطمینان کر چکے ہیں۔''

''کس طرح؟''

''میں تفصیل نہیں بتا سکتا لیکن یہ سمجھ لو کہ دونوں لڑکیوں کے ''بلڈ سیمپل'' ہمارے نجی

اسپتال میں باریک بینی سے ٹیسٹ ہوئے ہیں......اور ان کا نتیجہ تسلی بخش ہے۔''

''یہاں کچھ بھی تسلی بخش نہیں ہے چھوٹے صاحب، آپ لوگوں کو دھوکے میں رکھا جا رہا ہے اور میں یہ ثابت کر دوں گا۔''

''تم بار بار دھوکا......دھوکا کیوں کہہ رہے ہو؟'' تحمل مزاج ابراہیم چیخ گیا۔ ''کیا ثبوت ہے تمہارے پاس، کس بنیاد پر یہ الزام لگا رہے ہو؟''

''میں خود ثبوت ہوں چھوٹے صاحب!'' میں نے بھی تیکھے لہجے میں کہا۔ ''میں چشم دید گواہ ہوں۔ سب کچھ میرے سامنے ہوا ہے۔ اس لڑکی زینب کو حاصل کرنے کے لیے اس پر ظلم کی انتہا کی گئی ہے۔ اس کو عرصے تک اندھا دھند زہریلے کشتے کی ڈوز دی گئی ہے۔ یہ بستر سے جا لگی تھی۔ اس کے بارے میں مشہور کر دیا گیا تھا کہ اسے کوئی خطرناک بیماری ہے اور جب اس کے والد امام مسجد مولوی فدا کو حقیقت کا علم ہوا تو ان کے ساتھ وہ سلوک کیا گیا جس پر آپ یقین نہیں کریں گے۔ انہیں جان سے مار دیا گیا۔ میرے پاس ثبوت ہیں اس کے۔ یہ میں ہی تھا جس نے زینب کو ان درندوں کے چنگل سے چھڑایا اور اسلام آباد کے اسپتال تک پہنچایا۔ وہاں ماہر ڈاکٹروں کی نگرانی میں اس کا علاج ہو رہا تھا۔ پچھلی جمعرات کو اسے اس اسپتال سے اغوا کیا گیا ہے اور سیدھا آپ کے پاس پہنچا دیا گیا ہے۔ آپ انگلش اخبار تو پڑھ ہی سکتے ہوں گے۔ اس تاریخ کے اخبار منگوا لیں۔ آپ کو اس اغوا کا ثبوت مل جائے گا۔''

میں نے دیکھا ابراہیم کے ہاتھوں پر رعشہ سا نمودار ہو رہا تھا۔ وہ بہت الجھی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ ''یہ بہت ہمت والی لڑکی ہے چھوٹے صاحب، اور شاید یہ لڑکیاں ہوتی ہی ہمت والی ہیں۔ ان کے نازک جسموں میں شاید لوہے کا جگر ہوتا ہے۔ سب کچھ سہہ کر بھی چہرے پر مسکراہٹ رکھتی ہیں۔ ان کے خمیدہ سر، ان کے گرے ہوئے گھونگھٹ، ان کی جھکی ہوئی پلکیں، اپنے اندر بہت سی قیامتیں چھپا لیتی ہیں۔''

''تم جذباتی تقریر کر رہے ہو۔ میں تمہیں ٹھوس بات بتا رہا ہوں۔ دونوں لڑکیوں کا بلڈ ٹیسٹ ہوا ہے......اور نتیجہ ہماری مرضی کے مطابق نکلا ہے۔''

''لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ نتیجہ مرضی کے مطابق نکالا گیا ہو۔''

''کیا مطلب؟''

''اگر آپ برا نہ مانیں تو مجھے بتائیں کہ ٹیسٹ کس ڈاکٹر نے کیا ہے؟''

''ہمارے ذاتی اسپتال میں ڈاکٹر خان ہیں۔''

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر خان نے رزلٹ درست نہ دیا ہو۔ یہاں آوے کا آوا ہی

بگڑا ہوا ہے۔"

"مسٹر شاہ زیب! تم ہر کسی پر الزام دھر رہے ہو۔ کیا تمہیں یہاں صرف جھوٹے اور مکار ہی نظر آ رہے ہیں؟"

"میں یہ گستاخی نہیں کر سکتا لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ یہاں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو وفادار ہونے کے باوجود وفادار نہیں ہیں۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں، آپ اپنی ہونے والی شریک حیات کا بلڈ ٹیسٹ ایک دفعہ پھر کرا لیں۔"

"تم میری الجھنیں بڑھانے کے سوا اور کچھ نہیں کر رہے ہو مسٹر شاہ زیب......" شاید ابراہیم کچھ اور بھی کہتا لیکن اسی دوران میں اس کے سیل فون پر کال آ گئی۔ اس نے اسکرین کی طرف دیکھا اور ذرا مؤدب نظر آنے لگا۔ "جی چچا جان!" اس نے کہا اور اس کے ساتھ ہی مجھے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ میں اب جا سکتا ہوں۔

میں باہر نکل آیا، وہ فون سننے میں مصروف ہو گیا۔ یقیناً اس نے چچا جان کا لفظ اسی نیم گنجے کرخت صورت آقا جان کے لیے استعمال کیا تھا۔ آقا جان کے پاس پتا نہیں کیا گیدڑ سنگی تھی کہ اس کی کئی نمایاں خامیوں کے باوجود پارا ہاؤس والے اس پر اعتماد رکھتے تھے اور اس کے مشوروں کو اہم ترین حیثیت دیتے تھے۔

واپس کمرے میں آ کر میں نے انیق سے کہا کہ وہ پارا ہاؤس کے پرائیویٹ اسپتال میں کام کرنے والے کسی ڈاکٹر خان کے بارے میں معلومات حاصل کرے۔ ایسے کاموں کے لیے انیق ہمہ وقت تیار رہتا تھا۔ وہ فوراً اپنے بندریا والے دوست ازمیر طیب کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کی واپسی قریباً ایک گھنٹے بعد ہوئی۔ چھوٹتے ہی بولا۔ "اگر پہلوان حشمت یہاں ہوتا تو ضرور آپ کے لیے اپنا کوئی اچھا سا شعر منتخب کرتا جس میں آپ کی آنکھوں کو "کول ڈوڈے" قرار دیا جاتا اور آپ کی ذہنی صحت کے بارے میں شکوک و شبہات کا اظہار کیا جاتا۔"

"میں نے ایسا کیا کر دیا ہے؟"

"آج کل آپ کو اکثر مؤنث چیزیں مذکر اور مذکر، مؤنث نظر آ رہی ہیں۔ پہلے آپ نے ازمیر کی بندریا کو بندر سمجھا اور اب ڈاکٹر خان کو فی میل کے بجائے میل سمجھ رہے ہیں، کل کلاں آپ مجھے بھی انیقہ قرار دے دیں گے۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"ڈاکٹر خان عورت ہیں۔ ابھی پورا نام معلوم نہیں ہوا۔ یہ حال ہی میں پارا ہاؤس کے

اسپتال میں بطور پیتھالوجسٹ ملازم ہوئی ہیں۔ ویسے ان کے پاس گائنی کی ڈگری بھی ہے۔ یہ پاراہاؤس میں ہی رہتی ہیں۔ ان کا شوہر بھی ان کے ساتھ رہتا ہے۔ وہ منشیات کا عادی ہے اور سارا دن گھر میں پڑا رہتا ہے۔''

''اچھی ڈاکٹر ہے۔ اپنے شوہر کو منشیات سے نہیں بچا سکی۔ کچھ مزید معلوم ہوا اس کے بارے میں؟''

''کام، پائپ لائن کے اندر ہے۔ میرا مطلب ہے کوشش کر رہا ہوں۔ کل دوپہر تک آپ کو مزید کچھ بتاؤں گا۔ اس کے علاوہ آپ کے لیے اچھی اطلاع بھی ہے۔ اسپتال میں قادر خان کی حالت اب بہتر ہے۔ میں ابھی اس سے بھی مل کر آرہا ہوں۔ وہ آپ کا بے حد مشکور ہے اور جلد از جلد آپ سے ملنا چاہتا ہے۔''

سانپ کا ڈنک کھانے کے بعد قادر خان ایک بار تو قبر کے کنارے پر پہنچ گیا تھا مگر ڈاکٹروں کی بھرپور کوشش رنگ لائی تھی اور اب وہ سنبھل رہا تھا۔

انیق نے کہا تھا کہ وہ مجھے کل دوپہر تک مزید معلومات فراہم کرے گا لیکن وہ صبح دس بجے ہی تیز قدموں سے میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کا چہرہ گواہی دے رہا تھا کہ کوئی بہت اہم اطلاع ہے۔ اس وقت سردار سجاول میرے پاس بیٹھا تھا اور مجھ سے میری اور ابراہیم کی ملاقات کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ سردار سجاول کو دیکھ کر انیق ذرا ٹھٹک گیا۔ اس نے بس آنکھوں کے اشارے سے مجھے بتایا کہ ایک اہم اطلاع ہے۔

سجاول کی موجودگی میں وہ اکثر اشارے کنایے میں کوئی بات کر جاتا تھا، لیکن اس مرتبہ سجاول کی عقابی نگاہوں سے یہ صورتِ حال پوشیدہ نہیں رہی۔ وہ انیق سے مخاطب ہو کر زہر خند لہجے میں بولا۔ ''کھڑکی میں بیٹھی ہوئی کنجریوں کی طرح اشارے مت کیا کرو۔ اگر زیادہ شوق ہے تو زنانہ کپڑے پہن کر بیٹھ جاؤ کسی چوبارے چھجے پر۔ وہاں ہر طرح کے گاہک آتے ہیں۔''

انیق کا رنگ پھیکا پڑ گیا، بولا۔ ''میں نے تو...... کچھ...... نہیں...... کہا۔''

''یہی تو بول رہا ہوں کہ کچھ کہا کرو۔ اشارے بازی نہ چلایا کرو۔ لنڈی کوتل کے ایک سرکس میں، میں نے ایک ڈانسر لڑکے کو اس طرح اشارے کرتے دیکھا تھا۔''

شاید سجاول ابھی انیق کی مزید کلاس لیتا لیکن میں نے مداخلت کی اور بات کو گھما پھرا کر دوسری طرف لے گیا۔ سجاول تاڑ چکا تھا کہ انیق مجھے کوئی اہم اطلاع دینے ہی آیا ہے، اب اگر انیق اطلاع نہ دیتا تو سجاول کے دل میں گرہ بیٹھتی۔ صورتِ حال اب نارمل ہو چکی تھی،

میں نے انیق سے پوچھا۔ ”ہاں، کوئی نئی بات معلوم ہوئی ڈاکٹر خان کے بارے میں؟“
انیق انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ”ہمارے لیے ایک بڑی دھما کا خیز اطلاع ہے جی...... ڈاکٹر خان کا پورا نام ڈاکٹر ارم خان ہے اور ہم اس سے پہلے بھی شرفِ ملاقات رکھتے ہیں۔“
میرے ذہن میں زوردار دھماکا ہوا اور میں حیرت سے انیق کا منہ تکنے لگا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میری نگاہوں کے سامنے ملنگی ڈیرے کے مناظر آ گئے۔ چوڑے ماتھے اور ذرا بھاری کندھوں والی ڈاکٹر ارم جو اپنے معاون رضوان ٹی پر جان چھڑکتی تھی۔ ملنگی ڈیرے کے پُراسرار تہ خانوں میں اس نے نہایت خوبرو رضوان کو اپنا ”پابند“ کر رکھا تھا۔ وہ جنون کی حد تک اس سے وابستہ تھی۔ اپنی راتوں کو اس سے گرماتی تھی اور اس پر نوازشوں کی بارش رکھتی تھی مگر اس کو اپنے حکم کے خلاف چلتا نہیں دیکھ سکتی تھی اور جب وہ خلاف چلا تھا تو وہ آگ بگولا ہو گئی تھی۔ اس نے رضوان کے ساتھ ملنگی ڈیرا چھوڑنے سے انکار کیا اور مجبوراً رضوان نے اسے زخمی کر کے کلینک کے باتھ روم میں بند کر دیا۔ بعدازاں جب ہم ملنگی ڈیرے سے نکل گئے اور رضوان، انیق کے ساتھ چاندگڑھی پہنچ گیا تو یہ جنونی ڈاکٹر اسے تلاش کرتے ہوئے چاندگڑھی جا پہنچی تھی۔ خوش قسمتی سے رضوان پہلے ہی وہاں سے نکل چکا تھا اور اب وہی ڈاکٹر ارم یہاں پاراہاؤس کے نجی اسپتال میں پائی جا رہی تھی۔
میں نے انیق سے کہا۔ ”تمہیں یقین ہے کہ یہ وہی ہے؟“
”ایک سو ایک فیصد جی...... اور مجھے تو یہ شک بھی پڑ رہا ہے کہ جس کو ڈاکٹر ارم کا نشئی شوہر بتایا جا رہا ہے، وہ کہیں رضوان ہی نہ ہو۔“
”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ تو سنا ہے کہ واپس کراچی کی طرف نکل گیا تھا۔“
”تو پھر کوئی اور مرغا پھانسا ہوگا اس نے۔ وہ جس طرح کی عورت ہے، ہم نے دیکھ ہی لیا تھا......“
سجاول سوالیہ نظروں سے ہم دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں سجاول کو اس معاملے کی تفصیل سے آگاہ کرتا، انیق پھر بول پڑا۔ ”اداکار رنگیلا کی فلم عورت راج دیکھی تھی آپ نے؟ اس میں بھی عورت ظالم جابر تھی اور مرد بے چارہ مجبور......“
میں نے کہا۔ ”تم پھر پٹری سے اترنا چاہ رہے ہو، تم نے ایک نہایت خاص اطلاع لا کر دی ہے، میں نہیں چاہتا کہ اس موقع پر تمہیں کسی بدمزگی کا سامنا ہو۔“
اس نے ایک اچٹتی سی نگاہ سردار سجاول پر ڈالی اور مغموم صورت بنا کر بیٹھ گیا۔ اس کی

اداکاری بے داغ ہوتی تھی۔

میں نے سجاول کو بتایا کہ یہ ڈاکٹر ارم کون ہے اور ملنگی ڈیرے پر اس کے کیا کرتوت ہمارے سامنے آئے تھے۔ وہ ایک طرح ملنگوں کی میڈیکل دست راست تھی۔ بے شک وہ ایک قابل ڈاکٹر تھی اور اس کے پاس ڈگریاں تھیں لیکن وہ اپنی قابلیت کو منفی اور غیر قانونی کاموں میں استعمال کر رہی تھی۔ وہ پردے والی سرکار کے مریضوں کو ایلو پیتھک دوائیاں، راکھ، سفوف اور مٹی وغیرہ میں ملا کر دے دیتی تھی۔ یہ سب کچھ بغیر کسی ٹیسٹ وغیرہ کے ہوتا تھا اور اندھا دھند ''سٹی رائیڈز'' بھی استعمال کیے جاتے تھے۔

رات کو میں نے براہِ راست اقدام کا فیصلہ کیا۔ انیق نے مجھے مکمل معلومات فراہم کر دی تھیں۔ اسپتال کے ملازمین اور ڈاکٹرز کے لیے اسپتال کے عقب میں ہی ایک شاندار رہائشی بلاک موجود تھا۔ اس تین منزلہ عمارت کے سیکنڈ فلور پر اپارٹمنٹ نمبر دس میں ڈاکٹر ارم کی رہائش تھی۔ میں نے قادر خان کے ساتھی سیکنڈ انچارج رفاقت کو اعتماد میں لیا اور اسے بتایا کہ میں ڈاکٹر ارم کے اپارٹمنٹ میں داخل ہو کر کچھ چھان بین کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے قادر خان کی جان بچائی تھی اور اس حوالے سے رفاقت بھی میرا احسان مند تھا۔ پارا ہاؤس میں چپے چپے پر سخت سیکورٹی تھی۔ تاہم رفاقت نے میری درخواست پر رات ساڑھے نو بجے کے لگ بھگ اس رہائشی بلاک کی لائٹس آف کرا دیں جہاں ارم رہائش پذیر تھی۔ لائٹس کے ساتھ ہی سیکورٹی کیمرے پانچ منٹ کے لیے بند ہو گئے۔ یہ پانچ منٹ میرے لیے کافی تھے۔ میں باہر ہی سے سیکنڈ فلور کے چھوٹے سے چھجے پر پہنچا اور جما جما کر پاؤں رکھتا اپارٹمنٹ نمبر دس کی بیرونی کھڑکیوں تک پہنچ گیا۔ اس کا اندازہ میں نے نیچے سے ہی لگا لیا تھا کہ کم از کم ایک کھڑکی ایسی ہے جو اندر سے بند نہیں ہے۔

میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ میں نے ہاتھ کا ہلکا سا دباؤ ڈالا تو کھڑکی اندر کی طرف کھل گئی۔ میں بہ آہستگی پردہ ہٹا کر اندر داخل ہو گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرا تھا جہاں فقط دو کرسیاں اور ایک اسٹائلش تپائی رکھی تھی، ایک دروازہ اپارٹمنٹ کے مین پورشن کی طرف کھلتا تھا۔ اس وقت میری امیدوں پر اوس پڑ گئی جب مجھے معلوم ہوا کہ یہ دروازہ دوسری طرف سے مقفل ہے۔ یہاں ایک دوسرا چھوٹا دروازہ بھی تھا جو شاید کچن کی طرف کھلتا تھا، یہ بھی باہر سے بند تھا۔ اسی دوران میں لائٹ آ گئی۔

پہلے دروازے کے ''کی ہول'' میں سے روشنی جھانک رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ کوئی موجود ہے۔ میں نے نیچے جھک کر کی ہول سے آنکھ لگائی۔ مجھے ایک حیران کن منظر

دکھائی دیا۔ دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ بلاشبہ انیق کی اطلاع درست تھی۔ سامنے بیڈ پر جو عورت نیم دراز تھی وہ واقعی ڈاکٹر ارم تھی۔ اس نے ایک کھلا ریشمی لبادہ پہن رکھا تھا۔ بال کھینچ کر پیچھے کی طرف باندھے ہوئے تھے جس کی وجہ سے ماتھا مزید چوڑا نظر آ رہا تھا۔ وہ پہلے بھی کوئی ایسی خوش شکل نہیں تھی لیکن لگتا تھا کہ پچھلے دو تین ماہ میں اس کے چہرے پر مزید پھٹکار برسی ہے۔ کنپٹی کے پاس ایک زخم کا نشان بھی تھا۔ یہ نشان غالباً اسی واقعے کی نشاندہی کرتا تھا جب رضوان نے مشتعل ہو کر اس کے سر پر لوہے کے راڈ سے ضرب لگائی تھی اور اسے نیم بے ہوش کر کے واش روم میں بند کیا تھا۔

وہ بڑے اطمینان سے اپنے سیل فون کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کر رہی تھی۔ ساتھ ساتھ شاید میوزک بھی سن رہی تھی کیونکہ کانوں پر ہیڈ فونز تھے۔ ششدر کر دینے والا منظر یہ تھا کہ ایک نوجوان نے اس کے دونوں پاؤں تھام رکھے تھے اور چہرہ اس کے تلووں میں چھپایا ہوا تھا، وہ اپنے چہرے کو اوپر نیچے حرکت دے رہا تھا۔ شاید اپنی زبان کی نوک سے اس کے تلووں کو گدگدا رہا تھا۔

اس نے چہرہ اٹھایا تو میرے خدشات حقیقت کا روپ دھار گئے۔ میرے سامنے رضوان تھا۔ اس کے چہرے پر چوٹوں کے کئی نشان تھے، اس کے گلے میں ایک ریشمی رسی تھی جس کا دوسرا سرا ارم کے پیٹ پر رکھا تھا۔

ارم نے اس کی طرف دیکھے بغیر پُرتحکم انداز میں کچھ کہا اور رضوان جیسے لڑکھڑا کر کھڑا ہو گیا۔ وہی کسرتی جسم، وہی یونانی دیوتا جیسے خدوخال۔ اس کے جسم پر باریک کپڑے کی نہایت چست پتلون تھی جو جسم کو چھپانے کے بجائے مزید نمایاں کرتی تھی۔ اس کا بالائی دھڑ عریاں تھا اور اس پر بھی چوٹوں کے نشان اور نیلگوں ابھار تھے۔

میں ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔ شکار پھر شکاری کے جال میں تھا اور اس مرتبہ یہ جال کہیں زیادہ سخت تھا۔ پہلے تو شاید کچھ محبت اور لگاوٹ بھی تھی لیکن اب صرف قہر ہی قہر تھا۔ ملنگی ڈیرے میں اپنی زنجیروں کو توڑ کر رضوان نے جو دلیری دکھائی تھی، وہ اسے مہنگی پڑی تھی۔ جنونی ڈاکٹر ارم نے اسے پھر ڈھونڈ لیا تھا اور اب وہ ایک نشئی بیمار شوہر کی حیثیت سے پھر اس کے ساتھ تھا۔

وہ واقعی نشے میں دکھائی دے رہا تھا۔ سوئی سوئی آنکھیں، بکھرے بکھرے حواس۔ پتا نہیں کہ ارم اس کے ساتھ یہاں کیا کچھ کر رہی تھی اور پتا نہیں کہ وہ یہ سب کچھ کیسے سہہ رہا تھا۔ اس کے اندر بغاوت کی جو چنگاریاں پیدا ہوئی تھیں وہ کہاں دب گئی تھیں اور کیوں؟

ارم اپنی جگہ سے اٹھی تو رضوان کسی چوپائے کی طرح اپنے ہاتھوں اور گھٹنوں پر جھک گیا، ارم نے اس کے گلے کی رسی پکڑی اور کسی جانور ہی کی طرح اسے چلاتی ہوئی میری نگاہ کے دائرے سے نکل گئی۔ اب بستر خالی تھا۔ قریب رکھی شیشے کی اٹالین تپائی پر دو تین سرنجیں اور انجکشن وغیرہ رکھے تھے۔ غالباً یہ کوئی SEDATIVE قسم کے انجکشن تھے۔ ان کے اثر سے خوبرو رضوان کا دماغ ماؤف نظر آتا تھا۔ اب اردگرد خاموشی تھی۔ بس ٹی وی کی مدھم آواز سنائی دیتی تھی۔ میں ایک مختصر سی جگہ پر موجود تھا۔ میں نے اچھی طرح در و دیوار کا جائزہ لیا۔ یہاں کوئی خفیہ کیمرا یا آڈیو سسٹم موجود نہیں تھا۔

قریباً پانچ منٹ اسی طرح گزرے۔ مزید کوئی آہٹ، آواز سنائی نہیں دی، تب ساتھ والے چھوٹے دروازے کے "کی ہول" میں روشنی نظر آنے لگی اور کھٹ پٹ بھی سنائی دینے لگی۔ میں نے اس کی ہول سے آنکھ لگائی لیکن اس سے پہلے یہ بھی دیکھ لیا کہ اگر کوئی دروازے کو غیر مقفل کر کے اس چھوٹے کمرے میں آ گیا تو مجھے کہاں چھپنا ہوگا۔ کی ہول سے جھانکنے پر میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ یہ اس اپارٹمنٹ کا کچن ہی تھا۔ مجھے یہاں جو ہیولا دکھائی دیا وہ رضوان کا ہی تھا۔ رسی بدستور اس کے گلے میں تھی لیکن اب وہ اپنے پاؤں پر کھڑا تھا اور آٹے کے پیڑے کو روٹی کی شکل دے کر توے پر ڈالنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ ساتھ ساتھ ہانڈی گرم ہو رہی تھی اور وہ اس میں بھی چمچ چلا لیتا تھا۔ یہ سب کچھ حیران کن تھا اور ڈاکٹر ارم کی نفسیاتی کج روی کی طرف اشارہ کرتا تھا۔ مجھے کچن کے کچھ مناظر نظر نہیں آئے تھے۔ تاہم صورتِ حال ساری سمجھ میں آ رہی تھی۔ رضوان نے کھانا تیار کر کے ٹرے میں رکھا، سلاد، پانی کا جگ، جوس کا ڈبا اور گلاس وغیرہ۔ پھر وہ ٹرے لے کر اس دوسرے کمرے میں پہنچ گیا جہاں کچھ دیر پہلے ڈاکٹر ارم نیم دراز ہو کر موسیقی سن رہی تھی۔ اب وہ بیڈ پر ہی آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔ سامنے دستر خوان بچھا ہوا تھا۔ رضوان نے جھک کر احتیاط سے ارم کے سامنے کھانا رکھا اور مؤدب کھڑا ہو گیا۔ ارم نے پہلا لقمہ لیا...... جب تک ارم نے تسلی بخش انداز میں رضوان کی طرف دیکھ نہیں لیا، وہ اسی طرح ساکت جامد کھڑا رہا جیسے خوف زدہ ہو کہ کہیں کھانے میں سے کوئی نقص نہ نکل آئے۔

ارم کی آواز میرے کانوں تک پہنچی۔ وہ رضوان سے مخاطب ہو کر کہہ رہی تھی۔ "تمہیں یہ سب کچھ عجیب لگ رہا ہوگا کہ جو جو کچھ یہاں عورتوں کے ساتھ ہوتا ہے وہ یہاں تمہارے ساتھ ہو رہا ہے لیکن اس میں سارا قصور تمہارا اپنا ہے۔ ہے یا نہیں؟ بولو ہے یا نہیں؟"

رضوان نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ دانت پیس کر بولی۔ ''زبان سے جواب دو۔ ہے یا نہیں؟''

''ہے......'' رضوان کی مری ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔

مجھے تعجب ہو رہا تھا، بے شک وہ لڑائی بھڑائی والا بندہ نہیں تھا لیکن اتنا بھی گیا گزرا نہیں تھا، وہ اس صورتِ حال کی مزاحمت کیوں نہیں کر پا رہا تھا۔ کیا ٹیکوں نے اس کا ذہن ماؤف کر رکھا تھا یا پھر کسی اور نادیدہ مجبوری نے اسے جکڑ لیا تھا۔ کھانا شاید اچھا بنا تھا۔ ڈاکٹر ارم کا موڈ قدرے بہتر نظر آیا۔ اس نے تحکم سے کہا۔ ''چلو، بیٹھ جاؤ تم بھی۔''

وہ ذرا ہچکچایا پھر ارم کے سامنے پائنتی کی طرف بیٹھ گیا۔ وہ نروس نظر آ رہا تھا۔ بیٹھتے وقت اس کا گھٹنا سالن کے ڈونگے سے ٹکرا گیا۔ ڈونگا الٹا تو گرم گرم سالن کچھ ٹرے میں گرا اور کچھ ارم کی ٹانگ پر۔ وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔ اس کے چہرے پر تکلیف تھی۔ ''حرامزادے، اُلو کے پٹھے، ڈنگر۔'' وہ پھٹ پڑی۔ اس نے رضوان کو زور سے ٹانگ رسید کی۔ وہ دونوں کی ہول کے سامنے سے ہٹ کر میری نظروں سے اوجھل ہوئے لیکن دونوں تھے کمرے کے اندر ہی۔ آوازوں سے پتا چل رہا تھا کہ وہ رضوان کو کسی چیز سے پیٹ رہی ہے۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا یہ ایک بیلٹ تھی۔ زوردار آواز کے ساتھ ضرب رضوان کے جسم پر لگتی تھی اور وہ بلند آواز سے کراہ اٹھتا تھا۔ یقیناً وہ کسی سنگین مجبوری کے گھیرے میں تھا جو بالکل مزاحمت نہیں کر پا رہا تھا۔ وہ عورت ہونے کے باوجود اس کے مضبوط سراپے پر پوری طرح حاوی تھی۔

یہ ایک اپارٹمنٹ تھا اور یہاں پیدا ہونے والی آوازیں یقیناً اردگرد کے اپارٹمنٹس تک بھی پہنچ رہی تھیں۔ ''پلیز۔'' رضوان کی کراہتی ہوئی سی آواز سنائی دی۔

چند سیکنڈ بعد وہ اڑتا ہوا سا بستر پر آن گرا۔ جنونی ارم نے یقیناً اسے زوردار دھکا دیا تھا۔ اس کے خوب صورت ورزشی جسم کے مختلف حصوں پر چمڑے کی بیلٹ کے خونی نشان تھے۔ ایک دم کمرے کی لائٹ آف ہو گئی۔

میں الٹے قدموں پیچھے ہٹ آیا۔ بیرونی کھڑکی کے قریب پہنچ کر میں نے پلاننگ کے مطابق سیکنڈ انچارج رفاقت کو ایک ''مسڈ کال'' دی۔ چند سیکنڈ بعد اس سارے رہائشی پورشن کی لائٹس ایک بار پھر آف ہو گئیں۔ میں جس طرح کھڑکی کے راستے آیا تھا، اسی طرح واپس نیچے اتر آیا اور پھر اپنے کمرے کی طرف روانہ ہو گیا۔ ڈاکٹر ارم کا کردار پہلے بھی ڈھکا چھپا نہیں تھا۔ اب بالکل واضح ہو گیا تھا۔ وہ ہر لحاظ سے ایک بداخلاق عورت تھی اور کسی بھی طرح کا کرپٹ کام کر سکتی تھی۔ اسی نے زینب اور دوسری لڑکی شائستہ کے خون کا تجزیہ کیا تھا اور اسی تجزیے کی بنیاد پر ابراہیم کہہ رہا تھا کہ یہاں سب کچھ ٹھیک چل رہا ہے۔ سب سے اہم سوال

یہ تھا کہ کیا اس سارے معاملے میں آقا جان بھی ملوث ہے؟

میں واپس پہنچا تو انیق بے قراری سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ ڈاکٹر خان واقعی ڈاکٹر ارم خان ہے اور اس کا نشئی شوہر کون ہے؟ میں نے انیق کو بتایا۔ ''ہمارے سارے اندیشے درست نکلے ہیں۔ وہ ارم ہی ہے اور جس کو شوہر ظاہر کر رہی ہے وہ رضوان ہے۔''

انیق کی حیرت میں اضافہ ہوا۔ میں نے جو سنسنی خیز مناظر وہاں دیکھے تھے ان کا مختصر احوال انیق کو سنایا۔ ارم کے حوالے سے اس کی نفرت میں بھی یقیناً اضافہ ہی ہوا ہوگا۔ وہ ڈاکٹری جیسے مقدس پیشے پر ایک بدنما داغ تھی۔ ''اب کیا کرنا چاہیے؟'' انیق نے مجھ سے دریافت کیا۔

''ابراہیم کو بتانا چاہیے کہ وہ لوگ جس ڈاکٹر کی ٹیسٹ رپورٹ پر بھروسا کر رہے ہیں وہ تو خود مریضہ ہے، اس کا علاج بلکہ سدِباب کرنے کی ضرورت ہے۔''

''مگر ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہاں اس نیم گنجے آقا جان کی بہت چلتی ہے۔ وہ کوے کو بھی سفید کہہ دیتا ہے تو یہ لوگ ماننا شروع کر دیتے ہیں۔ پتا نہیں کیا گھول کر پلا رکھا ہے اس خرانٹ ابن خرانٹ نے۔''

''مگر یہ میڈیکل ایشو ہے یار! اور مجھے تو اس رضوان ٹی پر بھی ترس آ رہا ہے۔ وہ کچھ دن اور اس جنونی کے پاس رہا تو شاید جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔''

انیق نے سر کھجا کر کہا۔ ''آپ غلط محاورہ بول گئے ہیں۔ کم از کم پہلوان حشمت کے نزدیک تو یہ غلطہ ہی ہے۔ وہ فرماتے تھے کہ ''جان سے ہاتھ دھو بیٹھا'' نہیں کہتے...... کہتے ہیں، جان سے ہاتھ دھولیا۔ کیونکہ جو مر جاوت ہے وہ بیٹھ تو سکتا ہی نا ہیں۔''

''بس تم پہلوان کا سیاپا کرتے رہو، میں ذرا ابراہیم کو فون کر لوں۔'' میں نے بیزاری سے کہا اور اٹھ کر ساتھ والے کمرے میں آ گیا۔

میں نے ابراہیم سے رابطہ کرنے کی کئی کوششیں کیں مگر ناکامی ہوئی۔ پہلے تو اس کا فون انگیج جا رہا تھا۔ پھر ویسے ہی بند ہو گیا۔ میرے سینے میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ میں ابراہیم کو جلد از جلد بتانا چاہتا تھا کہ صورتِ حال کتنی غیر یقینی ہے...... اگلے روز بھی میں نے ابراہیم سے ملنے اور بات کرنے کی کوشش جاری رکھی مگر کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ لگتا تھا کہ وہ بہت مصروف ہے۔ جو فون نمبر اس نے مجھے دیا تھا وہ بند جا رہا تھا۔ میرے کہنے پر سجاول نے حلمی کے ذریعے بھی کوشش کی کہ ابراہیم سے رابطہ ہو سکے مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ پارا ہاؤس میں

شادیوں کی تیاری جاری تھی۔ شام کے وقت زنانہ حصے کی طرف سے گاہے بگاہے ڈھولک اور دف وغیرہ بجنے کی آواز بھی آتی رہی۔

رات کے قریباً دس بجے تھے جب میں نے ایک بار پھر ابراہیم کا نمبر ٹرائی کرنے کی کوشش کی لیکن میری ٹرائی سے پہلے ہی کال کا میوزک بج اٹھا۔ یہ ابراہیم کی کال تھی۔ میں نے فوراً ریسیو کی۔ ''ہیلو مسٹر شاہ زیب! کہاں ہو؟'' ابراہم نے گمبھیر آواز میں پوچھا۔

''اپنے کمرے میں ہی ہوں جی۔''

''ذرا میرے پاس آجاؤ۔ میں اپنے گارڈ کو بھیج رہا ہوں۔'' ابراہیم نے کہا۔ اس کی آواز میں موجود ہلکی سی لرزش نے مجھے بتا دیا کہ کوئی اہم معاملہ ہے۔

دو تین منٹ بعد ابراہیم کا ورزشی جسم والا باڈی گارڈ میرے پاس پہنچ گیا۔ وہ برونائی کا باشندہ تھا۔ اس کا نام فاران معلوم ہوا تھا۔ مجھے شروع میں ہی شک ہوا تھا۔ اب ثابت بھی ہو چکا تھا کہ وہ گونگا بہرا ہے۔ میں اس کے ساتھ چلتا پارا ہاؤس کی ایئر کنڈیشنڈ راہداریوں سے گزرا اور اس پورشن میں پہنچ گیا جہاں اس خاندان کا ''چھوٹا شہزادہ'' ابراہیم رہائش پذیر تھا۔ گارڈ فاران باہر کھڑا رہا۔ میں کمرے میں چلا گیا۔ ابراہیم بالکل گم صم سا ایک صوفے پر بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ اور چہرہ اترا ہوا تھا۔ شبہ ہوتا تھا کہ شاید وہ کچھ دیر پہلے تک روتا بھی رہا ہے۔

اس کے ہاتھ میں چند کاغذ تھے۔ اس نے مجھے بیٹھنے کے لیے کہا اور پھر نہایت گمبھیر آواز میں بولا۔ ''مسٹر شاہ زیب! تمہارا اندازہ درست تھا۔ پہلی ٹیسٹ رپورٹ شاید درست نہیں ہے۔'' اس نے رپورٹس میری طرف بڑھائیں۔

یہ خون کی دراصل چار رپورٹس تھیں۔ دو زینب کی اور دو دوسری دلہن شائستہ کی۔ زینب کی دوسری رپورٹ پہلی رپورٹ سے بالکل مختلف تھی۔ میں زیادہ ''میڈیکل ٹرمز'' تو نہیں جانتا تھا تاہم اندازہ ہو رہا تھا کہ زینب کی پہلی رپورٹ میں جن کئی عناصر کو نیگیٹو قرار دیا گیا تھا وہ دوسری رپورٹ میں پازیٹو تھے۔ اور یہ خون میں کچھ کیمیائی اجزاء کی غیر موجودگی کو ظاہر کرتے تھے۔ شائستہ کی دونوں رپورٹس تقریباً یکساں تھیں اور ان سے پتا چلتا تھا کہ کم از کم اس کے معاملے میں عالمگیر وغیرہ نے جھوٹ نہیں بولا۔

ابراہیم نے اپنی چھوٹی سی نوخیز داڑھی میں مایوسی کے عالم میں انگلیاں چلائیں اور بولا۔ ''ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ کیوں کیا جا رہا ہے؟ یہ عالمگیر کون بندہ ہے؟ اتنا سنگین دھوکا...... کیا چچا آقا جان کو بھی کچھ پتا نہیں چل سکا؟''

”ہوسکتا ہے کہ نہ چل سکا ہو؟“ میں نے غیر یقینی انداز میں کہا۔

”یقیناً نہیں چلا ہوگا۔ ورنہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ ایکشن نہ لیتے۔“

”میرا خیال ہے کہ سب سے پہلے اس ڈاکٹر خان سے پوچھ گچھ کی جائے۔ اس نے یہ غلط رپورٹ کس کے کہنے پر تیار کی ہے۔“

ابراہیم نے آنکھیں بند کر کے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی اور ایک طویل ٹھنڈی آہ بھری۔ اس کے دبلے پتلے چہرے پر جیسے دنیا جہان کا دکھ سمٹ آیا۔ وہ نیک دل اور باکردار لڑکا تھا مگر سینے میں دل بھی رکھتا تھا۔ اس نے اپنی ہونے والی دلہن کو دیکھا تھا اور اس پر مرمٹا تھا۔ وہ اپنی شادی کے لیے ایک ایک دن گن گن کر گزار رہا تھا اور اب اسے معلوم ہوا تھا کہ لبِ بام پہنچ کر کمند ٹوٹ گئی ہے۔ یہ شادی ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ اتھاہ غم کے گھیرے میں تھا۔

میں نے کہا۔ ”ابراہیم! آپ مزید تسلی کے لیے ایک اور جگہ سے بھی رپورٹ کرالیں مگر مجھے یقین ہے کہ نتیجہ دوسری رپورٹ والا ہی ہونا ہے۔“

وہ جیسے سنی اَن سنی کرتے ہوئے اپنے سیل فون کی طرف متوجہ ہوگیا۔ اس نے حلمی سے رابطہ کیا اور بولا۔ ”حلمی صاحب! ڈاکٹر خان کہاں ہے؟“

دوسری طرف سے کوئی جواب دیا گیا جو مجھ تک نہیں پہنچا۔ ابراہیم نے کہا۔ ”ڈاکٹر کو فوراً یہاں میرے پاس لایا جائے۔“

میں نے پہلی بار ابراہیم کو طیش میں بات کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کے ماتھے کی رگیں ابھری ہوئی تھیں۔

میں نے کہا۔ ”ابراہیم بہتر یہی ہے کہ ابھی آپ ڈاکٹر سے اکیلے میں بات کریں۔ میں ابھی اس کے سامنے آنا نہیں چاہتا۔“

ابراہیم چند لمحے سوچتا رہا پھر اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں اٹھنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ دروازے پر تیز دستک ہوئی۔ پھر ایک گارڈ گھبرایا ہوا اندر داخل ہوا، اس نے ابراہیم سے مخاطب ہوکر کہا۔ ”سر! ڈ...... ڈاکٹر خان کو کسی نے مار دیا ہے۔ وہ اپنے کمرے کے فرش پر پڑی ہیں۔“

ہم ہکا بکا رہ گئے۔ اتنے میں ابراہیم کا پرسنل گارڈ فاران بھی آ گیا۔ اس کے چہرے پر بھی تلاطم تھا۔ ہم تیزی سے باہر نکلے۔ قریباً تین منٹ بعد ہم پاراہاؤس کے اس رہائشی پورشن میں تھے جہاں اسپتال کے ڈاکٹرز اور دیگر ملازمین رہائش رکھتے تھے۔ ارم والے اپارٹمنٹ کے سامنے کئی افراد جمع ہو چکے تھے۔ ان میں سکیورٹی گارڈز بھی تھے۔ سب کے چہروں سے

سنسنی اور گھبراہٹ ظاہر ہوتی تھی۔ چھوٹے صاحب ابراہیم کو دیکھ کر مسلح گارڈز نے راستہ دیا اور ہم اپارٹمنٹ میں داخل ہو گئے۔ یہاں بھی باوردی گارڈز موجود تھے۔ سیکنڈ انچارج رفاقت خود بھی دکھائی دے رہا تھا۔ ہم لیونگ روم میں پہنچے۔ یہیں پر کل شب ارم نے رضوان سے مار پیٹ کی تھی اور اسے تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔ اب وہ تشدد کرنے والی بیڈ سے نیچے قالین پر بے سدھ پڑی تھی۔ اس کا نارنجی رنگ کا سلیپنگ سوٹ پھٹا ہوا تھا۔ ایک ٹانگ عریاں ہو رہی تھی۔ پیٹ پر کم از کم چار جگہ تیز دھار آلے کے زخم تھے۔ قالین پر بہنے والے خون میں ارم کے بال بھی لتھڑ چکے تھے۔

"یہ کب ہوا؟" ابراہیم نے سرسراتے لہجے میں رفاقت سے پوچھا۔

اس نے شکستہ انگلش میں جواب دیا۔ "اندازہ ہو رہا ہے چھوٹے صاحب کہ یہ کوئی ایک گھنٹا پہلے کا واقعہ ہے۔ ابھی جب آپ نے ڈاکٹر کو طلب کیا تو میں ایک گارڈ کے ساتھ یہاں پہنچا، یہ اسی جگہ پر الٹ پت پڑی تھیں۔"

"اس کا شوہر کدھر ہے؟" ابراہیم نے پوچھا۔

"وہ نہیں ہے۔ ہم اسے ڈھونڈ رہے ہیں۔ ابھی کچھ کہنا تو قبل از وقت ہو گا لیکن اڑوس پڑوس والے یہی کہہ رہے ہیں کہ کل رات بھی میاں بیوی میں سخت جھگڑا ہوا تھا اور مار پیٹ کی آوازیں آئی تھیں۔"

"کیا مطلب؟"

رفاقت مؤدب لہجے میں بولا۔ "پتا چلتا ہے جناب کہ ڈاکٹر ارم شوہر کو نشے سے منع کرتی تھی۔ وہ نشے کی ڈیمانڈ کرتا تھا تو یہ اسے مارتی پیٹتی بھی تھی۔"

ایک پڑوسی بولا۔ "میرا نام ڈاکٹر معاذ ہے جناب! میں ان کا پڑوسی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ارم اپنے شوہر کو صرف نشے کے مطالبے پر ہی نہیں مارتی تھی، وہ ویسے بھی کچھ تشدد پسند تھی۔ شوہر کے ساتھ اس کا سلوک اچھا نہیں تھا۔ کئی بار اسے رسیوں سے بھی باندھ دیتی تھی۔ بہرحال اس موقعے پر ہمیں یہ ساری باتیں زیب نہیں دیتیں، ہم سب ڈاکٹر ارم کی موت پر سکتے کی سی حالت میں ہیں۔ کسی کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس گھر میں صورتِ حال اتنی سنگین ہو چکی ہے۔"

ابراہیم کے چہرے پر برہمی تھی۔ اس نے اُرم کی لاش پر چادر ڈالنے کا حکم دیا پھر رفاقت سے مخاطب ہو کر بولا۔ "اگر یہ واقعی اس کے شوہر کا کام ہے اور وہ اسے مار کر بھاگا ہے تو پھر پارا ہاؤس سے باہر نہیں گیا ہو گا۔ یہیں کہیں چھپا ہو گا۔"

''آپ درست فرما رہے ہیں جناب! ہم نے اس کی تلاش شروع کر دی ہے۔ سکیورٹی پہلے ہی ہائی الرٹ ہے۔ وہ یہاں سے نکل نہیں سکتا۔''

میں نے کہا۔ ''لیکن آپ لوگوں کو دوسرے پہلو سے بھی دیکھنا چاہیے۔ کہیں یہ نہ ہو کہ کسی نے ان دونوں کو ہی ٹھکانے لگا دیا ہو۔''

''جی...... آپ...... درست کہہ رہے ہیں۔ ہم ہر زاویے سے دیکھ رہے ہیں۔ یہاں موقعے سے بھی شہادتیں اکٹھی کر رہے ہیں۔''

ڈاکٹر ارم کی موت کی خبر تیزی سے پارا ہاؤس میں پھیل گئی تھی۔ نیچے سڑک پر بھی کافی لوگ جمع ہو چکے تھے۔ اڑوس پڑوس والے جو بیان دے رہے تھے ان کے مطابق اپارٹمنٹ سے اکثر ڈاکٹر ارم کی بلند غصیلی آواز سنائی دیتی رہتی تھی۔ وہ اکثر اپنے نشئی شوہر کے ساتھ مار پیٹ بھی کرتی تھی مگر کچھ لوگوں کو شک تھا کہ اپنے مبینہ شوہر کو نشے کے انجکشن بھی وہ خود ہی لگاتی ہے۔ کل رات بھی ان کے اپارٹمنٹ سے مار پیٹ کی بلند آوازیں سنائی دی تھیں لیکن آج ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا تھا۔

دس پندرہ منٹ بعد میں اور ابراہیم واپس کمرے میں پہنچ گئے۔ تنہائی ملتے ہی میں نے ابراہیم سے کہا۔ ''ابراہیم! مجھے شبہ ہے کہ ارم کو اس کے شوہر نے نہیں مارا۔ یہ ان لوگوں کا کام ہے جنہوں نے ارم کو استعمال کیا ہے اور اس سے خون کی غلط رپورٹ لی ہے۔ وہ جان چکے ہیں کہ اب آپ نے دونوں دلہنوں کے خون کا ٹیسٹ دوبارہ کرایا ہے۔ اپنا پول کھلنے کے اندیشے سے انہوں نے اپنی آلۂ کار ارم کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔''

''اور اس کا شوہر؟''

''ہوسکتا ہے کہ وہ بھی مارا گیا ہو یا پھر جان بچا کر موقع سے بھاگ گیا ہو۔ اگر وہ بھاگا ہے تو پھر پارا ہاؤس کے اندر ہی ہوگا اور اس کی جان بھی سخت خطرے میں ہوگی۔ آپ اپنے ذاتی محافظوں کو بھی حرکت میں لائیں، اور ان سے کہیں کہ وہ رضوان کی تلاش میں شریک ہوں۔''

نوجوان ابراہیم اب میری رائے کو اہمیت دے رہا تھا۔ اس نے پریشانی کے عالم میں اپنا سیل فون اٹھایا اور اپنے ذاتی گارڈز کو مالے زبان میں ہدایات دینے لگا۔ اس کی پیشانی پر بار بار پسینے کے قطرے نمودار ہو رہے تھے۔

مجھے رضوان کے معاملے میں واقعی سخت تشویش تھی۔ میں یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ اسی نے ارم کو بیدردی سے قتل کیا ہے (حالانکہ اگر وہ کرتا تو حق بجانب تھا) یہ غالباً انہی لوگوں کا

کام تھا جنہوں نے ڈاکٹر ارم سے غلط کام کروایا تھا۔ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے سیل فون پر انیق اور سردار سجاول سے بھی بات کی اور انہیں بتایا کہ پارا ہاؤس میں ابھی کچھ دیر پہلے کیا واقعہ ہوا ہے۔ انیق بھی ارم کی ہلاکت کا سن کر ششدر رہ گیا۔ میں نے سردار سجاول سے کہا کہ رضوان کی زندگی خطرے میں ہو سکتی ہے۔ ہمیں اس سلسلے میں حلمی سے بھی رابطہ کرنا چاہیے اور اس سے کہنا چاہیے کہ اگر وہ زندہ ہے تو اسے کوئی نقصان نہ پہنچے۔

میں نے فون بند کرنے کے بعد ابراہیم سے بات کرتے ہوئے کہا۔ ''چھوٹے صاحب! مجھے ڈر ہے کہ ان لوگوں نے رضوان کو بھی قتل کر دیا ہے اور اگر نہیں کیا تو ڈھونڈ کر کر دیں گے۔ اس کا زندہ رہنا ہمارے لیے بہت فائدہ مند ہوگا۔ وہ اصل قاتل کے چہرے سے نقاب ہٹا سکتا ہے۔''

''مجھے کیا کرنا چاہیے؟'' ابراہیم نے کہا۔ ان لمحوں میں وہ ایک نوعمر لڑکا ہی دکھائی دیا۔

میں نے کہا۔ ''آپ آقا جان اور حلمی صاحب سے رابطہ کر کے انہیں حکم دیں کہ رضوان کو ہر صورت زندہ حالت میں گرفتار ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں کوئی کوتاہی سامنے آئی تو سخت کارروائی ہوگی۔''

ابراہیم نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ یہ بات یقیناً اس کی سمجھ میں بھی آ رہی تھی کہ رضوان اگر زندہ رہا تو فائدہ مند ثابت ہوگا۔

اس نے میرے سامنے ہی حلمی اور آقا جان کو مالے زبان میں ہدایات دیں اور پھر بے دم سا ہو کر صوفے کی پشت سے ٹک گیا۔ اس کے چہرے پر دکھ کے بادل گھرے ہوئے تھے۔ اسی دوران میں درمیانی عمر کی ملازمہ دستک دینے کے بعد کمرے کے دروازے پر نمودار ہوئی۔ یہ وہی گلدستے والی ملازمہ تھی۔ آج بھی اس کے ہاتھ میں ایک تر و تازہ گلدستہ تھا جس میں گلاب، رات کی رانی اور گیندے کے پھول نمایاں تھے۔

گلدستے والی کو دیکھ کر ابراہیم کے چہرے پر شدید کرب کے آثار نظر آئے۔ وہ کچھ دیر سکتہ زدہ سا گلدستے کو دیکھتا رہا۔ پھر ایک سرد آہ سی کھینچی اور ہاتھ کے اشارے سے گلدستے والی کو واپس جانے کا اشارہ کیا۔ وہ بھی حیران ہوئی۔ وہ ابھی تک ابراہیم کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جیسے تصدیق چاہ رہی تھی کہ اسے گلدستہ واپس لے جانا ہے یا آگے پہنچانا ہے۔

ابراہیم ازخود اپنی جگہ سے اٹھا اور ملازمہ کے ہاتھ سے گلدستہ لے کر اسے واپس بھیج دیا۔ تب اس نے حسرت بھری نظروں سے گلدستے کو دیکھنے کے بعد اسے ڈسٹ بن میں پھینک دیا۔ صوفے پر ڈھیر ہو کر اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھا اور اپنے آنسو روکنے کی کوشش

کرنے لگا۔ ''مسٹر شاہ زیب! ابھی آپ جاؤ۔ میں پھر بات کروں گا۔''

اس کے کہنے کے باوجود میں وہیں بیٹھا رہا۔ ایک آنسو اس کے ہاتھ کے نیچے سے نکل کر اس کے رخسار کی طرف سرک رہا تھا۔ اسے سہارے کی ضرورت تھی۔ وہ بری طرح ٹوٹا ہوا تھا۔

کچھ دیر بعد میں نے کہا۔ ''ابراہیم! آپ خود کو سنبھالیں۔ سب کچھ ختم نہیں ہوا ہے۔ آپ خود کو سنبھالیں۔ میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔''

''مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ پلیز...... آپ فی الحال چلے جائیں۔'' اس کی آواز جیسے کرب کے بوجھ سے ٹوٹ رہی تھی۔

''آپ کو مدد کی ضرورت ہے۔ اور یہ مدد ہو بھی سکتی ہے لیکن آپ کو سچائی پر سے پردہ اٹھانا پڑے گا۔ آپ کے والدین آپ کو زہر دینے پر کیوں مجبور ہیں؟''

''میں نے کہا ہے ناں، میں فی الحال اس بارے میں کچھ کہنا نہیں چاہتا۔'' وہ تیز، پُرطیش سرگوشی میں بولا۔

میں نے فی الوقت اس کے پاس سے اٹھنا ہی مناسب سمجھا۔

ڈاکٹر ارم کے قتل اور اس کے شوہر (رضوان) کی گمشدگی کی خبر سارے پارا ہاؤس میں گردش کر رہی تھی۔ جتنے منہ اتنی ہی باتیں تھیں۔ بیشتر لوگوں کا خیال یہی تھا کہ شوہر رضوان نے برداشت کھو کر اپنی جنونی بیوی کو قتل کر ڈالا ہے اور پارا ہاؤس کے اندر ہی کہیں روپوش ہے۔

اطلاعات کے مطابق اپارٹمنٹ کے کچن سے گوشت کاٹنے والی ایک چھری غائب تھی۔ تیز دھار آلے سے قدرے فربہ اندام ارم کے پیٹ پر چار وار کیے گئے تھے اور وہ موقع پر ہی دم توڑ گئی تھی۔ اس کے رخساروں پر مضبوط گرفت کے نشان موجود تھے جس سے پتا چلتا تھا کہ حملے کے وقت اس کا منہ سختی سے ڈھانپ لیا گیا تھا تاکہ وہ آواز پیدا نہ کر سکے۔

کچن میں کئی ٹوٹے ہوئے برتن بھی موجود تھے۔ ان چیزوں کو دیکھ کر شبہ ہوتا تھا کہ شاید وقوعہ سے پہلے میاں بیوی میں جھگڑا بھی ہوا ہے۔

مگر اڑوس پڑوس والوں کے بیانات یہی ظاہر کرتے تھے کہ انہیں قتل کی رات اپارٹمنٹ سے کسی طرح کا شور شرابا سنائی نہیں دیا۔ اس کا مطلب تھا کہ کچن سے چھری کا غائب ہونا اور ٹوٹے ہوئے کپ، پلیٹیں وغیرہ ملنا، ڈراما بھی ہو سکتا ہے۔ ایک ایسا ناٹک جس کے ذریعے یہ ظاہر کرنا مقصود ہو کہ یہ قتل شوہر نے کیا ہے۔

شام کے وقت انیق نے مجھے اطلاع دی کہ سنبل آج پھر سردار سجاول سے ملاقات کے لیے آئی ہوئی ہے۔ موقع غنیمت تھا۔ میں بھی وہاں جا پہنچا، اسپیشل فورس کے چوکس گارڈز کمرے سے باہر کھڑے سنبل کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔ زرق برق کپڑوں والی دو مشاطائیں بھی سنبل کے عملے میں شامل تھیں اور اس کی واپسی کی منتظر تھیں۔ میں دخل در معقولات کرتے ہوئے اندر جا پہنچا۔ وہ شہزادیوں کی طرح بنی ٹھنی ایک صوفے پر براجمان تھی۔ کشادہ ریشمی لبادے نے سارا صوفا ہی ڈھانپ رکھا تھا۔ سولہ سنگھار، قیمتی گہنے اور گلاب کی مہک میں بسی ہوئی وہ نوخیز حسینہ ایک رنگین مزاج سرمایہ دار کی عیش کوشی کا چلتا پھرتا نمونہ تھی۔ آج کل پارا ہاؤس اس کے قدموں تلے بچھا ہوا تھا اور وہ جیسے خاتونِ اول بنی پھرتی تھی، لیکن سب جانتے تھے اور شاید وہ بھی جانتی تھی کہ چار دن کی چاندنی پھر اندھیری رات ہے، بہت جلد وہ بھی وڈے صاحب کے دل سے اتر کر یہاں سے چلی جائے گی یا پھر خواص پور کی زینت بن جائے گی۔

سردار سجاول نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ ''لو سنو، ایک تازہ خبر ہے۔ ابراہیم کی دلہن بننے کے لیے اور ایک لڑکی یہاں پہنچائی جا رہی ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ وہ ہر لحاظ سے ابراہیم کے لیے فٹ ہے۔''

''فٹ سے کیا مطلب ہے۔'' میں نے سنبل سے پوچھا۔

''اس کا تو مجھے پتا نہیں۔ لیکن کہتے ہیں کہ پہلی لڑکی زینب شاید بیمار ہے۔ اس کا کوئی ٹیسٹ وغیرہ ہوا ہے۔'' سنبل نے جواب دیا۔

سنبل کو بات کی گہرائی معلوم نہیں تھی۔ وہ زہر خورانی والے معاملے کے متعلق کچھ نہیں جانتی تھی۔ اس لیے سمجھ رہی تھی کہ شاید لڑکی زینب کسی مرض کا شکار ہے جس وجہ سے اب وہ ابراہیم کی دلہن نہیں بن رہی اور ایک دوسری لڑکی یہاں لائی جا رہی ہے۔

''ابراہیم اس تبدیلی کے لیے راضی ہو گیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہی تو خاص بات ہے۔'' سنبل بولی۔ ''وہ راضی نہیں ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ وہ ابھی یہ شادی نہیں کرے گا۔ وہ سوچنے کے لیے کچھ وقت چاہتا ہے۔ دوسری طرف تمام تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں۔ کارڈ تک بھیجے جا چکے ہیں۔ وڈے صاحب بہت غصے میں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ شادی وقت پر ہی ہوگی۔ کافی پھڈا پڑا ہوا ہے۔''

اچانک میری نظر سنبل کی ریشمی اوڑھنی کے نیچے اس کی شفاف گردن کے نچلے حصے پر پڑی۔ وہاں ایک گہری خراش نظر آئی جس کے اردگرد نیل سا پڑ چکا تھا۔ ممکن ہے کہ یہ نیل نیچے

تک جاتا ہو مگر قمیص کی وجہ سے نظر نہ آرہا ہو۔ سنبل آج کل وڈے صاحب کی تحویل میں تھی۔ وہ اپنا زیادہ وقت اسی کے ساتھ گزار رہی تھی۔ لیکن اس جسمانی چوٹ کے لیے ڈے صاحب پر تو شبہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ہماری اب تک کی معلومات کے مطابق وہ جیسا بھی تھا لیکن عورتوں کے لیے کافی مہربان تھا۔ وہ جن خواتین کے ساتھ تعلق رکھتا تھا، وہ اس کی نرم مزاجی و شائستگی کی گواہی دیتی تھیں۔

میں نے کہا۔ ''سنبل! یہ تمہاری گردن پر نشان کیسا ہے؟''

اس نے جیسے ٹھٹک کر اپنی کامدار اوڑھنی اپنی گردن پر درست کر لی۔ بہرحال یہ تو میں جان گیا تھا کہ وہ اس چوٹ سے آگاہ ہے اور وہ بھی یہ جان گئی تھی کہ میں نے گردن کا نشان دیکھ لیا ہے۔ سجاول بھی ذرا چونک گیا تھا۔ اس نے خود اوڑھنی ہٹا کر سنبل کی گردن ملاحظہ کی۔ نشان بہت گہرا نہیں تھا لیکن اس کی دودھیا رنگت کی وجہ سے نمایاں نظر آرہا تھا۔

''وہ...... وہ...... میمے کا پاؤں...... لگ گیا تھا۔'' وہ سفید میمنے کو میما کہہ کر بلاتی تھی۔

سجاول نے بے تکلفی سے اس کی چمکیلی گردن پر انگلی چلا کر دیکھی۔ ''یہ میمنے کا پاؤں تو نہیں لگتا۔ کوئی سینگ وغیرہ تو نہیں لگ گیا اس کا؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں...... میری گود میں اچھل رہا تھا۔ پاؤں لگ گیا ہے۔''

جرح کی ضرورت نہیں تھی لیکن اتنا اندازہ تو میں اور سجاول دونوں لگا چکے تھے کہ سنبل کچھ چھپا رہی ہے۔ شاید وہ کہیں گری تھی یا پھر یہ بھی ہوسکتا تھا کہ روحی نامی لڑکی، جو یہاں اس کی رقیب بنی ہوئی تھی، کوئی جھگڑا وغیرہ کر بیٹھی ہو۔

سنبل کا وہ بیش قیمت ہار جس کی ایک سفید لڑی ہم نے جان بوجھ کر گم کی تھی، اب پھر اس کے گلے میں جھلملا رہا تھا۔ ہار نے سنبل کی خوب صورتی میں اضافہ کیا تھا اور سنبل نے شاید اس ہار کی خوب صورتی بڑھائی تھی۔ وہ صوفے پر بیٹھی اپنی ننھی سی ناک کی جڑاؤ نتھلی کو انگلی سے ہلاتی کوئی نوخیز اپسرا ہی لگ رہی تھی۔ کہتے ہیں کہ اکثر بہت زیادہ حسین لڑکیاں زیادہ ذہین نہیں ہوتیں۔ سنبل پر بھی یہ بات صادق آتی تھی۔ اس کی سوچیں زیادہ گہری نہیں تھیں۔ اس کا سب کچھ اس کا حسن اور مرمریں جسم ہی تھا جس کو استعمال کر کے وہ اپنے لیے آسائشیں اکٹھا کرنا چاہتی تھی۔ شاید اسے پالنے والوں نے اسے بچپن سے یہی سکھایا تھا۔

میں نے اس کے بیش قیمت ہار کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس کی لڑی ٹھیک سے اپنی

جگہ بیٹھی ہے یا نہیں...... کہیں سچ مچ ہی نہ گر جائے۔"
میں نے اسے ہار اتارنے کو کہا اور موتیوں والی سفید لڑی کے تار کے دونوں سروں کو اچھی طرح موڑ دیا کہ لڑی کے گرنے کا امکان ختم ہو جائے۔ میں نے ہار کی "چین" کی مضبوطی کا اندازہ بھی لگایا۔ سنبل جیسی غافل لڑکی کسی بھی وقت اپنی کسی قیمتی چیز سے محروم ہوسکتی تھی۔ سنبل نے ہار دوبارہ پہن لیا۔ سجاول نے بھی اسے ہدایت کی کہ وہ اپنی قیمتی اشیا کے بارے میں بہت محتاط رہے، کیونکہ یہاں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اسے وڈے صاحب کی نظروں سے گرانا چاہیں گے۔
"اب میں جاؤں؟" اس نے سجاول سے دریافت کیا۔
"لیکن آنکھیں اور کان کھلے رکھو۔ یہ جاننے کی کوشش کرو کہ باپ بیٹے میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔"
سنبل نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "لیڈی ڈاکٹر والے واقعے کا کچھ پتا چلا ہے تمہیں؟"
اس کے چہرے پر خوف کا سایہ سا لہرایا۔ "ہاں جی، کہتے ہیں کہ ڈاکٹر کو کسی نے مار دیا ہے۔ شاید اس کے شوہر نے......"
"ہاں کچھ اس طرح کی بات ہوئی ہے۔ اس بارے میں بھی سن گن لینے کی کوشش کرو لیکن جو کچھ بھی کرو بہت بچ بچا کر۔"
اس نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا۔ آج وہ اپنا سفید میمنا ساتھ نہیں لائی تھی۔ خالی ہاتھ ہلاتی ہوئی اپنے گارڈز اور مشاطاؤں کے ساتھ واپس چلی گئی۔
سجاول نے سگریٹ سلگا کر میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا۔ "لگتا ہے کہ یہ کچھ چھپا رہی ہے۔ گردن پر نشان تو تم نے بھی دیکھا ہوگا۔"
"یہ بڈھے ککڑ کی کارستانی تو نہیں لگتی۔ شاید واقعی میمنے کا پاؤں لگا ہو۔ ہر وقت تو اسے گود میں لیے پھرتی ہے...... یا پھر کہیں گر گئی ہو۔" سجاول نے کہا۔ پھر ذرا توقف سے بولا۔
"اور یہ تم نے کیا کارستانی کی ہے؟"
میں سمجھ گیا کہ سجاول اس "حرکت" کو جان گیا ہے جو میں نے سنبل کے ہار کے ساتھ کی ہے۔ یقیناً وہ عقابی نگاہ کا مالک تھا۔
میں نے کہا۔ "مجھے امید ہے کہ اس "کارستانی" کا فائدہ ہمیں پہنچے گا۔ اگر سنبل کچھ چھپا رہی تھی تو ہمیں جاننے کی کوشش کرنی چاہیے......"

میرے پاس ایک نہایت جدید پن ہول کیمرا تھا۔ چنے کی دال کے دانے کا سائز ہو گا۔ میں نے اسے سنبل کے جڑاؤ ہار کے اندر کی جانب چپکا دیا تھا۔ چونکہ وہ ہار کے اندر کی طرف تھا، اس لیے فوٹیج تو نہیں دے سکتا تھا، ہاں آڈیو بڑی صاف ریکارڈ کر سکتا تھا۔ اس کیمرے کو ایک بال جیسے باریک تار کے ذریعے میں اپنے موبائل سے کنیکٹ کر کے اس کی ریکارڈنگ دیکھ اور سن سکتا تھا۔ چند دن پہلے میں نے غصے میں موبائل فون پھینک دیا تھا جس سے اسے نقصان پہنچا تھا مگر انیق نے اسے خود ہی ٹھیک ٹھاک کر لیا تھا اور سم ڈال کر واپس میرے حوالے کر دیا تھا۔

مجھے اور انیق کو رضوان کے سلسلے میں سخت پریشانی تھی۔ خاص طور سے میں بہت فکر مند تھا۔ میں نے دو دن پہلے رات کے وقت اسے ارم کے اپارٹمنٹ میں جس بے بسی کے عالم میں دیکھا تھا، وہ مناظر میرے ذہن پر نقش ہو کر رہ گئے تھے۔ اس خوبرو کے گلے میں رسی تھی اور ارم اس سے جانوروں سے بدتر سلوک کر رہی تھی۔ پتا نہیں وہ کس مجبوری کے گھیرے میں تھا کہ کچھ کر نہیں پا رہا تھا۔

○......❖......○

رضوان کے ساتھ میرا اور انیق کا زیادہ ساتھ نہیں رہا تھا۔ ہم ملنگی ڈیرے پر بس دو تین روز کے لیے ملے تھے۔ ہم ملنگی ڈیرے سے اکٹھے فرار ہوئے تھے اور پھر دو دن سفر میں ساتھ رہے تھے۔ پھر بھی اس کے ساتھ ایک وابستگی سی پیدا ہو گئی تھی۔ میں اسے زندہ دیکھنا چاہتا تھا مگر حالات مخدوش تھے۔ یقیناً اس کے ساتھ کچھ ہو چکا تھا یا پھر ہونے والا تھا۔ ایک بار پھر دل چاہا کہ ہم راست اقدام کریں اور کسی طرح پارا ہاؤس کے گنجے کرتا دھرتا آقا جان کی گردن ناپ لیں مگر یہ زبردست رسک کی بات تھی۔ وہ افلاطون وڈے صاحب کی ناک کا بال تھا۔ اس کے ایک اشارے پر پارا ہاؤس کی فورس ہمارے خلاف حرکت میں آ سکتی تھی۔

شام کو انیق نے مجھے بتایا۔ ''ڈاکٹر ارم کے قتل کی ایف آئی آر درج ہو چکی ہے۔ لاش کا پوسٹ مارٹم بھی ہو گیا ہے اور اس کی لاش کسی نامعلوم مقام کی طرف روانہ کر دی گئی ہے۔''

''پولیس نے کس پر شک کیا ہے؟''

''پولیس تو اسی پر شک کرے گی جس پر پارا ہاؤس والے چاہیں گے۔ شکیل داراب کے ہوتے ہوئے پولیس اپنی مرضی تھوڑی چلا سکتی ہے۔''

''یعنی ارم کے مفرور شوہر پر شبہ کیا جا رہا ہے؟''

''بالکل۔ یہ لوگ تو اسے مفرور شوہر ہی کہہ رہے ہیں جبکہ ہمارے خیال میں وہ نہ مفرور ہے اور نہ شوہر ہے۔'' انیق ذرا افسردگی سے بولا۔

''اس کا امکان تو بہت کم ہے کہ وہ پارا ہاؤس سے نکل پایا ہو گا۔ لگتا یہی ہے کہ وہ زندہ یا مردہ جس حالت میں بھی ہے، پارا ہاؤس کے اندر ہی ہے۔''

اگلے قریباً چوبیس گھنٹے ہم نے پریشانی کے عالم میں ہی گزارے۔ اب رضوان کے علاوہ مجھے زینب کی فکر بھی لاحق ہو گئی تھی۔ ابراہیم اس سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں

تھا۔اس چیز نے پاراہاؤس والوں میں تناؤ پیدا کر دیا تھا۔ایک طرح سے باپ بیٹے میں ٹھن گئی تھی۔اس امر کا ڈر موجود تھا کہ کہیں زینب کو راستے سے ہٹانے کی کوشش نہ کی جائے۔آقا جان جیسے خبیث مشیر کے ہوتے ہوئے یہاں پاراہاؤس میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

اگلے روز شام کے بعد میں نے سجاول سے کہا کہ وہ سنبل کو دوبارہ ملاقات کے لیے بلائے۔سجاول بولا۔"یہ بار بار کی ملاقاتیں ان لوگوں کو شک میں نہ ڈال دیں۔تم ایک آدھ دن صبر کرلو۔"

"نہیں سجاول! میں نے تمہیں بتایا ہے ناں کہ رضوان کی جان کی میرے نزدیک بہت اہمیت ہے۔اس کا کھوج لگانے کے لیے ہمیں ہر ذریعہ استعمال کرنا ہوگا اور جلد سے جلد۔"

"تمہارا خیال ہے کہ تمہارے ٹڈی کیمرے میں رضوان کی فوٹو آ گئی ہوگی اور وہ سب کچھ اپنی زبان سے بتا دے گا۔" سجاول نے طنز سے کہا۔

"یار فوٹو نہ آئی ہوگی مگر ہو سکتا ہے کہ ریکارڈ ہونے والی آوازوں سے ہمیں کوئی کلیو مل جائے یا پھر ویسے ہی سنبل نے کوئی اہم انفارمیشن حاصل کی ہو۔"

میرے اصرار پر سجاول نے ایک بار پھر وڈے صاحب سے رابطہ کیا اور اس سے درخواست کی کہ وہ سنبل سے چند منٹ کے لیے بات کرنا چاہتا ہے کیونکہ وہ لیڈی ڈاکٹر والے واقعے کے بعد اندر سے ڈری ہوئی ہے۔

وڈے صاحب نے ذرا جزبز ہونے کے بعد اجازت دے دی۔قریباً ایک گھنٹے کے بعد سنبل اپنے ٹھاٹ باٹ کے ساتھ سجاول کے پاس آ گئی۔حسبِ معمول چوکس گارڈز اور ذاتی ملازمائیں کمرے سے باہر کھڑے رہے۔سنبل اپنے قیمتی لبادے کو ٹائلوں کے نفیس فرش پر رولتی ہوئی کمرے میں آ گئی۔میری نگاہ سب سے پہلے اس کے گلے پر ہی پڑی اور یہ دیکھ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ وہ ہار پہنے ہوئے ہے۔

یہ زیادہ طویل ملاقات نہیں تھی۔میرا اصل مقصد ہار کے نیچے اپنا پن ہول اسپائی کیمرا جدا کرنا تھا۔چوڑا چکلا ہار سنبل کے پورے سینے پر پھیلا ہوا تھا۔ہم سنبل پر بھی کیمرے کی موجودگی کو ظاہر کرنا نہیں چاہتے تھے۔اس مرتبہ سجاول نے سنبل کا ہار اتروایا اور اس کی زنجیریں اور لڑیاں وغیرہ چیک کیں۔اس کے کلپ کو کھینچ تان کر دیکھا،اسی دوران میں، میں نے صفائی سے کیمرا ہار کی ایک طلائی پتی کے نیچے سے جدا کر لیا۔

وہ بولی۔"مجھے تو لگتا ہے کہ آپ دونوں کو مجھ سے زیادہ اس ہار کی فکر ہے؟"

"تمہاری فکر بھی ہے۔" سجاول نے رعب دار آواز میں کہا۔

''اسی لیے تو پوچھ رہے تھے کہ گردن پر چوٹ کیسی ہے۔'' میں نے لقمہ دیا۔
وہ ہنس کر چپ ہوگئی۔ میں نے کہا۔''وڈے صاحب سمیت اگر کسی سے بھی کسی طرح کی شکایت ہے تو بتاؤ۔ اس کا سدِباب کریں گے۔''
اس نے تیوری چڑھا کر کہا۔''اور کسی سے تو نہیں لیکن اس پر کٹی کبوتری پر بہت غصہ آتا ہے۔ ایسے ایسے کپڑے پہن کر وڈے صاحب کے سامنے آتی ہے کہ شاید وڈے صاحب کو بھی شرم آجاتی ہوگی۔'' وہ روحی کا ذکر کررہی تھی۔
سجاول نے کہا۔''اسی لیے تو کہتے ہیں کہ ہر طرح سے ہوشیار رہو، یہاں کئی طرح کی سازشیں چل رہی ہیں۔''
سنبل کے جانے کے فوراً بعد میں اپنے کمرے میں آگیا اور دروازہ لاک کر کے کیمرے کا ''کنکشن'' اپنے سیل فون سے کرنے میں مصروف ہوگیا۔ کافی دشواری ہوئی مگر کام ہوگیا۔ مجھے توقع تھی کہ آواز ریکارڈ ہو جائے گی۔ یہ توقع پوری ہوئی بلکہ وہ توقع بھی پوری ہوئی جو میں نے ہرگز نہیں کی تھی۔ کیمرے نے چار پانچ منٹ کی ایک ویڈیو بھی بنا ڈالی تھی۔ دراصل رات کے وقت جب اپنے بیڈروم میں سنبل نے اپنے جھمکے اور ہار وغیرہ اتار کر سائیڈ ٹیبل پر رکھے تو اتفاقاً ہار کا رخ کچھ ایسا ہوگیا کہ پن ہول کیمرا کمرے کے ایک حصے کا منظر دکھانے لگا۔ لائٹس روشن تھیں۔ یہ پارا ہاؤس کے ارب پتی مالک کا بیڈروم تھا جو کسی بادشاہ کی آرام گاہ سے کم حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ بہترین آبنوسی فرنیچر، عجیب وغریب شکلوں کے جہازی سائز صوفے، فانوس، غالیچے اور انوکھی طرز کا اٹالین بیڈ۔ پورا کمرا تو نظر نہیں آرہا تھا لیکن جتنا بھی آرہا تھا، بے مثال تھا۔ یہ کافی صاف ویڈیو تھی۔
میں نے وڈے صاحب عزت مآب ریان فردوس صاحب کو صرف ایک لنگی نما لباس میں دیکھا۔ بالائی دھڑ عریاں تھا۔ جسم قدرے ڈھلکا ہوا اور چربی دار تھا۔ سارے جسم اور چہرے پر وہی سرخ داغ تھے جن کی وجہ کوئی پرانی بیماری بتائی جاتی تھی۔ وڈا صاحب ریان فردوس خوشگوار موڈ میں لیٹا ہوا تھا۔ نوخیز حسینہ سنبل ایک گلابی رنگ کے سلیپنگ گاؤن میں تھی اور ریان فردوس کے سرہانے بیٹھی اس کے سر کے چھدرے بالوں میں انگلیاں چلا رہی تھی۔ لیکن غور سے دیکھنے پر پتا چلتا تھا کہ وہ کچھ اور بھی کررہی ہے۔ وہ اس کے ماتھے پر بھی اپنے ہاتھ کو حرکت دے رہی تھی۔ دراصل اس کے ہاتھ میں ایک لپ اسٹک تھی اور وہ غیرمحسوس طریقے سے ریان فردوس کے ماتھے پر لکیریں بنارہی تھی، جیسے کسی ہندو نے سرخ قشقہ لگا رکھا ہو۔

ریان فردوس کو جیسے شک ہوا۔اس نے سنبل کی کلائی پکڑی اوراس کی انگلیوں میں لپ اسٹک دیکھ کر حیران ہوا۔ پھراس نے جلدی سے بیڈ پر لگے ہوئے ایک آئینے میں اپنی صورت دیکھی۔ سنبل کھلکھلا کر ہنسی۔ وہ اس کے پیچھے لپکا، وہ تیزی سے بستر کے گرد ایک چکر کاٹ گئی۔ ریان فردوس نے اسے دوسری جانب سے پکڑنے کی کوشش کی تو وہ شوخی سے چلاّتی ہوئی الٹا چکر کاٹ گئی۔ وہ دونوں بستر کے گرد چکرانے لگے۔ ان لمحوں میں عزت مآب وڈا صاحب نہ تو عزت والا نظر آرہا تھا اور نہ ہی وڈا...... وہ اپنی عمر سے قریباً پینتیس چھتیس سال چھوٹی لڑکی کے پیچھے للچائے ہوئے انداز میں دوڑ رہا تھا، اس کا سارا جسم تھل تھل کر رہا تھا اور کسی وقت تو سرخ مخمل کی لنگی بھی خطرے میں نظر آنے لگتی تھی۔

آخر وہ ہانپ کر رک گیا۔ شوخ سنبل بیڈ کے دوسرے سرے پر کھڑی تھی۔ وڈے صاحب ریان فردوس نے ایک گہری سانس لے کر ایک سائیڈ ٹیبل کی دراز کھولی اور اس میں سے ایک سبز ڈبیا نکال کر سنبل کو دکھائی۔ اس نے ڈھکن اٹھایا تو ڈبیا کے اندر سے ایک جڑاؤ کنگن نکلا۔ فوٹیج میں کنگن کی پوری خوب صورتی تو نمایاں نہیں ہوتی تھی تاہم پتا چلتا تھا کہ اس پر سبز زمرد جڑے ہوئے ہیں اور اس کی مالیت لاکھوں میں ہوگی۔ اس نے بستر پر بیٹھ کر انگلی کے اشارے سے سنبل کو اپنے قریب بلایا۔ اس مرتبہ وہ فوراً آ گئی۔ پہلے اس نے گیلے ٹشو پیپر سے ریان فردوس کا ماتھا صاف کیا پھر اپنی کلائی آگے بڑھا دی۔ ریان فردوس نے بڑے سلیقے سے اسے کنگن پہنایا، لیکن کنگن پہنانے کے بعد بھی کلائی چھوڑی نہیں۔ وہ بہت بڑا سرمایہ دار تھا اور سرمایہ دار جانتا ہے کہ کنگن اور کلائی کی کیا تھیوری ہوتی ہے۔ کنگن پہنا کر کلائی چھوڑی نہیں جاتی۔ کنگن تو شاید پہنایا ہی کلائی پکڑنے کے لیے جاتا ہے۔ خمیرے آٹے جیسے جسم والے ریان فردوس نے خوش اندام سنبل کو اپنی بانہوں میں لے لیا، دونوں بستر پر گر کر پن ہول کیمرے کی نظر سے اوجھل ہو گئے۔

یہ چار پانچ منٹ کی ویڈیو بہت اچھی بنی تھی لیکن یہ میرے کسی کام کی نہیں تھی۔ میرے کام کی چیز آگے چل کر تھی اور یہ ویڈیو نہیں آڈیو کی شکل میں تھی۔ ویڈیو اور آڈیو کے درمیان کم و بیش دس گھنٹے کا فرق تھا۔ ان دس گھنٹوں میں بہت سی چیزیں اس جدید کیمرے میں ریکارڈ ہوئی تھیں۔ جذباتی سرگوشیاں، سانسوں کی سرسراہٹ، کھانسی کی آواز، دروازے کھلنے یا بند ہونے کی صدا، صبح دم جب کمرے کی لائٹس آن ہوئی تھیں پھر آٹھ دس منٹ کی ویڈیو بنی تھی لیکن اس میں بھی کوئی خاص بات نہیں تھی۔ فقط وسیع بیڈ روم کے ایک گوشے میں وڈے صاحب نے اپنے سیل فون پر ایک کال سنی تھی۔ مختصر گفتگو سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ تب وہ ذرا بے

چینی کے عالم میں سگار سلگاتا ہوا فریم سے نکل گیا تھا۔ بعدازاں سنبل نے یہ ہار شاید کسی الماری میں رکھ دیا تھا۔ یہاں صرف آڈیو ریکارڈنگ ہوئی تھی اور وہ بھی نہایت مدھم۔ جو اہم ترین آوازیں ریکارڈ ہوئیں ان کا وقت دن دس بجے کے لگ بھگ تھا۔ یہ ایسی ریکارڈنگ تھی جس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ ہرگز توقع نہیں تھی کہ میں یہ سب کچھ جان سکوں گا۔

پہلے کچھ نامانوس آہٹیں سنائی دیں۔ پھر اندازہ ہوا کہ کسی دروازے کا لاک کھولا گیا ہے۔ اونچی ایڑی کی ٹھک ٹھک گونجی جو یقیناً سنبل کے سینڈل کی ہی تھی۔ تب دروازہ دوبارہ لاک ہو گیا۔ سنبل کی مدھم آواز ابھری۔ ''کیسے ہو؟''

جواب میں ایک مردانہ آواز نے کچھ کہا جو صاف سنائی نہیں دیا۔

''تمہارے لیے کھانا لائی ہوں، برگر اور جوس ہے۔''

''تم میرے لیے بڑی تکلیف اٹھا رہی ہو۔'' اس مرتبہ بولنے والے کی آواز صاف تھی۔ میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ یہ آواز میرے لیے اجنبی نہیں تھی۔ یہ رضوان ٹی کی آواز تھی۔

اتنے میں سنبل کی آواز دوبارہ سنائی دی۔ ''اپنوں کے لیے کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔''

''تم مجھے اپنا سمجھ رہی ہو۔ میرے لیے یہ بہت بڑی بات ہے۔ میں تمہارا احسان زندگی بھر نہ بھول سکوں گا۔'' اب شبہے کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔ یہ رضوان ہی کی آواز تھی۔ پہلی خوشی تو یہ تھی کہ وہ زندہ ہے اور دوسری یہ کہ وہ قاتلوں کے ہتھے نہیں چڑھا اور محفوظ ہے۔ جتنی خوشی تھی اتنی ہی حیرت بھی تھی۔ پتا نہیں کہ وہ سنبل تک کب اور کیسے پہنچا تھا۔ وہ پارا ہاؤس کے حساس ترین حصے میں موجود تھا۔ یہ وڈے صاحب عزت مآب ریان فردوس کی رہائش گاہ تھی۔ بلکہ اس کے بیڈروم کا کوئی قریبی کمرا تھا شاید۔

گفتگو جاری تھی۔ ''تم میرے لیے بہت بڑا خطرہ مول لے رہی ہو۔ مجھے یہاں سے نکل جانا چاہیے۔''

''لیکن اب نکلنا اتنا آسان نہیں۔ بہت سخت پہرا ہے۔''

''لیکن اگر یہاں کوئی آ گیا تو پھر؟'' رضوان کی سرگوشی ابھری۔

''وڈے صاحب کے سوا یہاں کوئی نہیں آتا، اور وہ بھی کبھی کبھار ہی قدم رکھتا ہے۔ میں......کوشش کروں گی......کہ وہ اس طرف آنے ہی نہ پائے۔''

''لیکن اگر وہ آ گیا تو؟ مجھے......اپنے سے زیادہ......تمہاری فکر ہے۔'' رضوان بولا۔

''تمہارے لیے کوئی مصیبت آ بھی گئی تو سہہ لوں گی۔'' سنبل نے ذرا جذباتی لہجے میں

کہا۔

''تم بہت اچھی ہو۔ مجھے دکھ ہے کہ شروع میں، میں نے تمہارے ساتھ بدتمیزی کی۔''

''اس وقت تم مجھے جانتے نہیں تھے اور، نہ میں جانتی تھی۔'' سنبل کے لہجے میں اپنائیت تھی۔

''تمہاری...... گردن...... اب کیسی ہے۔'' رضوان نے دریافت کیا۔ لگتا تھا کہ گفتگو کے ساتھ ساتھ وہ کچھ کھا بھی رہا ہے۔

''اب ٹھیک ہوں۔ جو لوگ مجھے یہاں لے کر آئے تھے، ان میں سے ایک سجاول صاحب ہیں۔ انہوں نے میری گردن کا نیل دیکھ لیا تھا۔ پوچھ رہے تھے کیا ہوا۔ میں نے بتایا کہ میمنے کو گود میں اٹھا رکھا تھا، اس کا پاؤں لگ گیا۔''

''میری خاطر کتنے جھوٹ بولنے پڑ رہے ہیں۔''

''کوئی بات نہیں رضوان۔ بے گناہ کو بچانا جرم نہیں اور تم بے گناہ ہو۔ کبھی تو میرا دل چاہتا ہے کہ...... وڈے صاحب کو سب کچھ بتا دوں، اور اگر......''

''نہ...... نہ...... یہ غضب نہ کرنا۔ مجھے لگتا ہے کہ تم ان بڑے لوگوں کے طور طریقوں سے واقف نہیں ہو۔ یہ کچے اخروٹ کی طرح اوپر سے نرم اور اندر سے پتھر ہوتے ہیں۔ ابھی اپنی زبان بالکل بند رکھو۔ صرف یہ کوشش کرو کہ میں کسی طرح حفاظت کے ساتھ یہاں سے نکل سکوں۔''

لگتا تھا کہ وہ دونوں بالکل پاس پاس بیٹھے ہیں۔ ہار میں موجود اسپائی کیمرے کے ذریعے آڈیو بالکل صاف ریکارڈ ہو رہی تھی۔

کچھ دیر بعد ایک بار پھر کھٹ پٹ سنائی دی۔ آوازیں پہلے مدھم ہوئیں، پھر معدوم ہو گئیں۔

یہ سنسنی خیز صورتِ حال تھی۔ یہ بات اب تقریباً ثابت ہو چکی تھی کہ ڈاکٹر ارم کا قتل رضوان نے نہیں کیا۔ ریکارڈنگ میں سنبل اسے بار بار بے گناہ کہہ رہی تھی۔ اندازہ یہی ہو رہا تھا کہ ارم کے قتل کے وقت رضوان کو بھی پکڑنے کی کوشش کی گئی یا پھر پکڑ لیا گیا اور مارنے کی کوشش کی گئی۔ وہ بھاگ نکلا اور پتا نہیں کس طرح بچ بچا کر پارا ہاؤس کے خاص الخاص حصے میں جا پہنچا۔ اگر ڈاکٹر ارم کے قتل کے ڈانڈے آقا جان سے مل رہے تھے تو پھر رضوان چشم دید گواہ ثابت ہو سکتا تھا۔ یقیناً اس نے ان لوگوں کو دیکھا تھا جنہوں نے ارم کی جان لی اور اس جرم کو رضوان کے سر تھوپنے کی کوشش کی۔ رضوان کی گواہی قاتلوں کے لیے بے حد سنگین

ثابت ہو سکتی تھی۔ چھوٹے صاحب ابراہیم نے بڑے وثوق سے کہا تھا کہ چچا آقا جان کو ہرگز معلوم نہیں ہوگا کہ زینب کی ٹیسٹ رپورٹ غلط ہے۔ اب اس غلط رپورٹ دینے والی کو قتل کر دیا گیا تھا اور پتا نہیں کیوں میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ اس قتل میں آقا جان ملوث ہے۔ اگر اس کا ثبوت مل جاتا تو آقا جان کی بنیادیں ہل جاتیں۔

میں نے اسی وقت سجاول کو بلایا اور اسے ریکارڈنگ دکھائی۔ سجاول کا پہلا تاثر شدید طیش ہی کا تھا۔ اس نے سنبل کو کئی غائبانہ صلواتیں سنائیں اور پھنکارا۔ ''اس اُلو کی پٹھی سے ایسی ہی بے وقوفی کی امید تھی۔ حرامزادی نے بیٹھے بٹھائے اتنا بڑا پنگا لے لیا ہے، اگر وڈے صاحب کو پتا چل گیا تو بیڑا غرق ہو جائے گا اس کا......''

''لیکن کچھ بھی ہے یار! اس میں ایک پہلو فائدے کا بھی تو ہے۔ سنبل کی وجہ سے اس منڈے کی جان بچ گئی ہے۔ یہ منڈا قاتلوں کو پہچان سکتا ہے اور اگر اس نے پہچان لیا تو مجھے لگتا ہے آقا جان کی منحوس گردن ضرور شکنجے میں آئے گی۔ یہاں پارا ہاؤس میں اس کے نام کا جوڑ نکا بج رہا ہے وہ ڈنکا پھٹ جائے گا۔''

''لیکن وہ منڈا وہاں سے نکلے گا کیسے؟ جب بھی نکلے گا یہ حرامزادی پھنسے گی اور مجھے تو لگ رہا ہے کہ یہ اس سے عشق معشوقی بھی جھاڑنے لگی ہے۔''

''چلو، یہ تو بعد کی باتیں ہیں۔ سب سے پہلے تو ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ لڑکے کو وہاں سے نکالا کس طرح جائے؟ اور اس سے بھی زیادہ سوچنے کی بات یہ ہے کہ کہیں وہ کھوتے کی بچی اسے خود وہاں سے نکالنے کی کوشش نہ کرے۔ ایسا کرے گی تو دونوں پکڑے جائیں گے۔'' سجاول نے کہا۔

''تو پھر بلاؤ اس کو دوبارہ۔'' میں نے کہا۔

''وہ بڈھا ککڑ ضرور شک میں پڑے گا۔ دیکھا جائے تو ابھی دو چار دن ہمیں اس اُلو کی پٹھی سے رابطہ نہیں کرنا چاہیے۔''

''لیکن دو چار روز میں وہ کوئی نہ کوئی حماقت ضرور کر جائے گی بلکہ مجھے تو دو چار گھنٹے بھی خطرناک لگ رہے ہیں۔''

ہم سنبل سے دوبارہ ملاقات کا سوچ رہے تھے لیکن اس دوران میں ایک ایسا واقعہ ہو گیا جس نے خود بخود سنبل سے ملاقات کا موقع پیدا کر دیا۔ صبح ناشتے کے وقت ہی انیق کا دوست ازمیر طیب وہاں ہمارے پاس آ دھمکا۔ اس کا چہرہ بجھا ہوا سا تھا۔ انیق نے شکستہ انگریزی میں اس سے پوچھا کہ کیا ہوا؟

وہ بولا۔ ''سارا معاملہ ہی چوپٹ ہو رہا ہے۔ شادی کی تیاریاں تھیں لیکن سارے رنگ پھیکے پڑ گئے ہیں۔ چھوٹے صاحب ابراہیم شادی کے لیے بالکل تیار نہیں ہیں۔ ان کے لیے ڈھولک بجائی جا رہی ہے نہ گیت گائے جا رہے ہیں۔ چھوٹے صاحب کمال کی شادی کی تھوڑی بہت تیاری ہو رہی ہے لیکن رات والے واقعے کے بعد اس کا مزہ بھی کرکرا ہو گیا ہے۔''

''کیا ہوا؟'' انیق نے چونک کر پوچھا۔

جواب میں ازمیر نے اپنی ٹوٹی پھوٹی انگلش میں، اور گاہے بگاہے مالے کے لفظ بھی استعمال کر کے جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ کچھ یوں تھا۔

رات کو چھوٹے صاحب کمال احمد کی شادی کی رسموں کے سلسلے میں شمعوں کی محفل تھی۔ ملائی رواج کے مطابق لڑکیاں مل کر شمعیں جلاتی تھیں اور بڑے بڑے گھیر دار کپڑے پہن کر گول گول گھومتی تھیں۔ گھومتے گھومتے جو گر جاتی تھی، اسے لڑکیوں کی اس محفل میں ناچنا اور گانا پڑتا تھا۔ اس محفل میں باہر کی لڑکیاں اور خواصیں بھی شامل تھیں۔ اچانک سنبل کے کپڑوں کو آگ لگ گئی۔ لڑکیوں نے مل کر بہت مشکل سے ریشمی لبادے کی آگ بجھائی۔ بظاہر تو یہی لگا کہ اتفاقاً سنبل کا لبادہ کسی شمع سے چھو گیا ہے لیکن ایک خواص عائزہ خانم نے دیکھ لیا تھا کہ لبادے کو جان بوجھ کر آگ دکھائی گئی ہے اور یہ آگ روحی نامی اسی لڑکی نے دکھائی تھی جو سنبل سے پہلے ''ملازمت'' کے لیے پارا ہاؤس میں داخل ہوئی تھی۔ (اور سنبل کی آمد کے بعد نظر انداز کر دی گئی تھی) آگ سے سنبل کا ایک بازو جل گیا تھا اور اس کے بالوں کو بھی نقصان پہنچا تھا۔

یہ ایک سنگین واقعہ تھا۔ سجاول مشتعل نظر آنے لگا۔ وہ پھنکارا۔ ''اتنا کچھ ہو گیا اور ہمیں خبر ہی نہیں ہوئی۔''

اسی دوران میں حلمی بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس نے اردو میں کہا۔ ''گھبرانے کی کوئی بات نہیں مسٹر سجاول! سنبل کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا۔ اس کے بازو پر دوا وغیرہ لگا دی گئی ہے۔ بے شک یہ ایک خطرناک واقعہ تھا لیکن خواص عائزہ صاحبہ اور ان کی دو خادماؤں نے خود کو خطرے میں ڈال کر سنبل کی آگ بجھائی۔ سنبل سے زیادہ تو وہ تینوں زخمی ہوئی ہیں۔ ایک تو اسپتال میں ''ایڈمٹ'' ہے۔''

سجاول غصیلے لہجے میں بولا۔ ''حلمی صاحب! اس لڑکی کے بارے میں سنبل مسلسل شکایت کر رہی تھی اگر اس کی شکایت پر توجہ دی جاتی تو شاید یہ سب کچھ نہ ہوتا۔''

''لیکن اب اسے کیے کی سزا ملی ہے۔'' حلمی نے کہا۔'' آقا جان ڈسپلن کے معاملے میں رُو رعایت نہیں کرتے۔ حالانکہ روحی نامی یہ لڑکی آقا جان کے کسی جاننے والے کے واسطے سے یہاں پہنچی تھی لیکن اس کے ساتھ وہی سلوک ہوا ہے جو کسی بھی لڑکی کے ساتھ ہوتا۔''

تفصیل بتاتے ہوئے حلمی نے کہا کہ روحی نے جو حرکت کی وہ ایک ویڈیو کیمرے میں بھی محفوظ ہوگئی تھی۔ اس ویڈیو سے تصدیق ہوگئی کہ سنبل کے لبادے کو آگ غلطی سے نہیں لگی بلکہ روحی نے خود ایک شمع کے ذریعے لگائی۔ اس کا لبادہ آگ کے لیے اتنا خطرناک تھا کہ کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ خواص عائزہ اور ملازماؤں نے جان کی بازی لگا کر یہ آگ بجھائی۔ جب روحی کو ویڈیو دکھائی گئی تو اس کے پاس اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ وہ اپنا جرم تسلیم کرلے۔ اس سے کہا گیا کہ وہ پولیس کے حوالے ہونا چاہتی ہے یا پاراہاؤس میں سزا بھگتنا چاہتی ہے۔ اس نے پاراہاؤس میں رہنے کو ترجیح دی۔ اس کے سر کے سارے بال مونڈ دیئے گئے ہیں۔ اسے اسی وقت سو بید لگائے گئے۔ اب وہ بستر پر اوندھی پڑی ہے۔ کل یا پرسوں تک جب وہ بہتر ہو جائے گی اسے بھنگنوں والا لباس پہنایا جائے گا اور وہ پورے ایک ماہ تک پاراہاؤس کے واش روم صاف کرے گی۔

میں نے پوچھا۔'' یہ سزا آقا جان نے دی ہے؟ میرا مطلب ہے کہ یہاں سزائیں آقا جان ہی دیتے ہیں؟''

حلمی بولا۔'' آقا جان تجویز کرتے ہیں۔ تصدیق کی مہر عزت مآب کی ہوتی ہے۔''

کہنے کو تو حلمی کہہ رہا تھا مگر ہم دیکھ رہے تھے کہ یہاں اکثر اہم اور مشکل فیصلے آقا جان یا حلمی ہی کررہے ہیں...... خاص طور سے آقا جان کی جڑیں تو یہاں بہت گہری نظر آتی تھیں۔

سردار سجاول نے کہا۔'' حلمی صاحب! سنبل اب کیسی ہے؟''

''میں نے کہا ہے ناں وہ بالکل ٹھیک ہے، ابھی تھوڑی دیر میں شاید وہ یہاں آپ لوگوں سے ملنے بھی آئے۔''

قریباً آدھ گھنٹے بعد واقعی سنبل اپنے ''عملے'' کے ساتھ آتی دکھائی دی۔ اس کا سفید میمنا آج ایک خادمہ کی گود میں نظر آرہا تھا۔ سنبل ٹھیک ہی لگ رہی تھی۔ صرف ایک بازو پر ایک سفید مرہم کا لیپ تھا جو کلائی سے کہنی تک کیا گیا تھا۔ ہاں، اس کے حلیے میں نمایاں تبدیلی اس کے بالوں میں آئی تھی۔ اس کے بالوں کو یقیناً نقصان پہنچا تھا اور اب انہیں نئے انداز سے تراشہ گیا تھا۔ یہ انداز بھی اس پر جچ رہا تھا۔

سردار سجاول نے سرپرست کی حیثیت سے اسے اپنے ساتھ لگایا اور اس کا حال احوال دریافت کیا۔ لگتا تھا کہ سنبل نے اس واقعے سے بہت زیادہ اثر نہیں لیا۔ ممکن ہے کہ شروع میں اثر لیا ہو لیکن جب سزا کے طور پر روحی کی ایسی تیسی ہو گئی تو اس کے کلیجے میں کچھ ٹھنڈ پڑ گئی ہو۔ ویسے بھی آتشزدگی کا زیادہ صدمہ تو سنبل کے بجائے خواص عائزہ اور اس کی ملازماؤں نے جھیلا تھا۔

رات والے واقعے کی رُوداد ختم ہوئی تو سجاول کی تیوری چڑھنا شروع ہو گئی۔ وہ سنبل کو گھور کر تیز سرگوشی میں بولا۔ ''آگ سے تو بچ گئی ہو لیکن جو آگ تم خود اپنے آپ کو لگا رہی ہو اس سے کیسے بچو گی؟''

وہ چونک کر سجاول کو دیکھنے لگی۔ ''مم...... میں سمجھی نہیں؟''

''تمہیں گندی نالی سے اٹھایا ہے میں نے اور سونے چاندی کے ڈھیر پر بٹھایا ہے...... انسان کی بچی بن۔ اور تُو یہ کیا حرکتیں کر رہی ہے۔''

سنبل کا خوب صورت مکھڑا گہری زردی سے ڈھک گیا۔ ''مم...... میں نے کیا کیا ہے سردار؟''

''تھپڑ ماروں گا ناں تو آدھے دانت گر جائیں گے اور آدھے ایسے ہو جائیں گے کہ ساگودانہ بھی نہ کھا سکے گی۔'' وہ پھنکارا۔ ''کیا سمجھ رکھا ہے مجھے؟ کوئی بھنگی چرسی ہوں میں؟ تم اپنی مرضی کے نئے نئے پنگے لو گی اور مجھے کچھ پتا نہیں چلے گا۔''

اس کے ساتھ ہی سجاول نے وہ آڈیو سنبل کے سامنے کر دی جس میں اس کی اور رضوان کی گفتگو محفوظ تھی۔ چار پانچ فقرے سننے کے بعد ہی سنبل نے کانپنا شروع کر دیا۔ سجاول کی سرخ آنکھیں دیکھ کر بڑوں بڑوں کا پتّا پانی ہوتا تھا۔ یہ نازک سی لڑکی تو کوئی چیز ہی نہیں تھی۔ یقیناً وہ اس بات پر بھی حیران تھی کہ یہ آوازیں کس طرح ریکارڈ ہوئی ہیں۔

''کیسے آیا یہ بندہ تیرے کمرے میں؟''

''میرا کوئی قصور نہیں سردار۔ وہ زبردستی آ گیا تھا۔ اس نے مجھے پکڑ لیا۔ میری گردن پر چھری رکھ دی۔''

''چھری تو اس نے رکھی ہو گی لیکن یہ پرانی بات ہے۔ اب تو تُو اس کے ساتھ اکھ مٹکا کر رہی ہے۔ کمینی! سب کچھ ریکارڈ ہے اس میں۔''

''نن...... نہیں سردار! میں تمہاری مرضی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتی۔ کچھ نہیں کروں گی۔''

''میری مرضی کے بغیر اسے اپنی گود میں تو گھسا کر بیٹھی ہوئی ہے...... جانتی ہے کتنی بڑی

حماقت کر رہی ہے تُو؟ دل چاہتا ہے ابھی ایک فٹ کا چھرا تیرے پیٹ میں اتار ڈالوں۔"
"مجھے معاف کر دو سردار...... مم...... میں نے سب کچھ تمہیں بتا دینا تھا......"
شاید سجاول مزید کچھ بولتا لیکن میں نے اس کا بازو دبا کر اسے دھیرج رکھنے کا اشارہ دیا۔ اس نے وہسکی کا ایک لمبا گھونٹ لے کر گلاس فرش پر لڑھکا دیا۔
میں نے کہا۔ "سنبل! جو کچھ ہوا اچھا نہیں ہوا لیکن ہمیں تفصیل سے بتاؤ۔"
جواب میں اس نے اٹک اٹک کر اور ہونٹوں پر زبان پھیر پھیر کر جو کچھ بتایا اس سے پتا چلا کہ قتل کے بارے میں رضوان سے اس کی بات چیت ہوئی ہے۔ رضوان نے کہا ہے کہ ڈاکٹر ارم کو قتل کرنے والے چار افراد تھے۔ انہوں نے چہرے سیاہ ڈھاٹوں میں چھپا رکھے تھے لیکن ارم سے ہاتھا پائی کے دوران میں ایک بندے کا ڈھاٹا اتر گیا تھا۔ دو بندوں نے ارم کو جکڑے رکھا۔ تیسرے نے اس پر چاقو سے وار کیے۔ پھر ان میں سے ایک نے ارم کو چھوڑ دیا اور دوسرے کے ساتھ مل کر رضوان کو پکڑنے کی کوشش کی۔ رضوان ان کی زد سے نکل کر بھاگا اور پارا ہاؤس کے بڑے اسٹور روم میں چھپ گیا۔ خوش قسمتی سے اس نے اسٹور ایریا میں ایک ایسا کمرا ڈھونڈ لیا جہاں اسپیشل فورس کے محافظوں کی دھلی ہوئی یونیفارمز پڑی تھیں۔ اس نے اپنے جسم کے مطابق ایک یونیفارم ڈھونڈ لی اور پہن کر ایک راہداری میں گھس گیا۔ وہ باؤنڈری وال کی طرف جانا چاہتا تھا لیکن یہ راہداری بل کھا کر اسے اندرونی حصے میں اور پھر خاص الخاص رہائشی پورشن میں لے گئی۔ دو فی میل گارڈز سے بچنے کے لیے وہ عین اس کمرے میں گھس آیا جہاں سنبل موجود تھی۔ اس نے چھری کی مدد سے سنبل کو بے بس کیا لیکن بعدازاں اس نے سنبل کو بتایا کہ وہ وہی ہے جس پر ڈاکٹر ارم کے قتل کا الزام لگایا جا رہا ہے لیکن وہ ایک سو ایک فیصد بے گناہ ہے۔
سنبل نے اس سے نرم رویہ اختیار کیا تو رضوان نے اس کی گردن سے چُھری ہٹا دی۔ (سنبل کی گردن پر ہمیں جو گہرا نیل نظر آیا تھا وہ اسی کھینچا تانی کا نتیجہ تھا) وہ سنبل کو واقعی بے گناہ اور مظلوم لگا۔ اس کے چہرے پر تشدد کے نشان تھے اور گردن کی جلد پر ایسے آثار تھے جن سے پتا چلتا تھا کہ اسے رسّی ڈال کر گھسیٹا جاتا رہا ہے۔ یہ باتیں سنبل کے کانوں تک بھی پہنچ چکی تھیں کہ مقتولہ ارم اپنے شوہر پر تشدد کرتی ہے۔ اس کے دل میں خوف زدہ رضوان کے لیے شدید ہمدردی پیدا ہوئی۔ اس نے رضوان کو فوری طور پر چھپانے کا فیصلہ کیا۔ اس وسیع و عریض بیڈ روم سے ملحق ایک اور کمرا تھا۔ اسے "ڈارک روم" کہا جاتا تھا۔ یہاں در و دیوار اور فرنیچر سمیت ہر چیز گہری سیاہ تھی۔ وڈا صاحب کبھی کبھار مکمل سکون اور غور و فکر کے لیے یہاں

استراحت فرماتا تھا لیکن ایسا کبھی کبھار ہی ہوتا تھا۔ اب پچھلے قریباً چار دن سے رضوان اس ڈارک روم میں بند تھا اور سنبل بڑی رازداری سے اسے وہیں پر کھانا پہنچا رہی تھی۔

یہ ساری رُوداد حیران کن تھی...... بہرحال یہ رُوداد سن کر ہمیں کم از کم اتنی تسلی تو ہوئی کہ ہم اس نازک صورتِ حال سے بے خبر نہیں ہیں۔

سجاول بدستور سنبل سے ڈانٹ ڈپٹ جاری رکھے ہوئے تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ جو بھی صورتِ حال تھی اسے فوراً وڈے صاحب کو بتانا چاہیے تھا۔ اب وہ لڑکا (رضوان) چار دن سے چھپا ہوا ہے اور اسے سنبل نے چھپا رکھا ہے۔ اگر یہ بات اب وڈے صاحب کو بتائی گئی تو اسے کسی صورت بھی ہضم نہیں ہوگی۔ وہ اسے پتا نہیں کیا مطلب دے گا۔

سجاول کی بات درست تھی۔ یہ بڑا نازک معاملہ بن گیا تھا۔ وڈا صاحب آج کل بے طرح سنبل پر لٹو تھا۔ اگر اسے پتا چل جاتا کہ سنبل نے ایک خوبرو نوجوان کو اس کے بیڈ روم کے پہلو میں چھپا رکھا ہے تو یقیناً وہ بہت اثر لیتا اور اس کا ایکشن بھی سخت ہوتا۔

ہم نے سنبل کو سمجھا بجھا کر واپس بھیجا کہ وہ فی الحال حالات کو جوں کا توں رکھے۔ ہم اس مسئلے کا حل سوچتے ہیں۔

مجھے خبر مل رہی تھی کہ انچارج گارڈ قادر خان اب رُوبصحت ہے، ہوسکتا ہے کہ اسے اسپتال سے ڈسچارج کر دیا جائے۔ میں انیق کے ساتھ اس کی خبر لینے پارا ہاؤس کے نجی اسپتال پہنچا تو اس کا بستر خالی تھا۔ پتا چلا کہ وہ کل شام ہی ڈسچارج ہو گیا ہے۔ ایک سینئر گارڈ نے بتایا کہ انچارج قادر صاحب پارا ہاؤس کے بڑے اسٹور روم کی طرف گئے ہیں۔

میں اور انیق اسٹور روم پہنچے تو وہاں بہت اتھل پتھل نظر آئی۔ یہ دوپہر کا وقت تھا۔ وسیع و عریض اسٹور ایریا کو چاروں طرف سے پہرے داروں نے گھیر رکھا تھا۔ مختلف کمروں میں زبردست قسم کی تلاشی لی جا رہی تھی۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں قاتلوں سے اپنی جان بچانے کے بعد رضوان ٹی عارضی طور پر چھپا تھا۔

قادر خان بھی یہیں موجود تھا۔ ان چند دنوں میں وہ کافی کمزور ہو گیا تھا مگر اس وقت نسبتاً چوکس نظر آ رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے باقاعدہ سلیوٹ کیا...... اور آنکھوں میں نمی بھر لایا۔ میں نے اسے اپنے ساتھ لگا کر اس کا شانہ تھپکا وہ بولا۔ ''خدا کے بعد میری زندگی آپ کی دین ہے۔ پرسوں بڑا ڈاکٹر بتا رہا تھا کہ زہر سے بھرا ہوا سانپ تھا...... کوئی آدھ چھٹانک زہر میرے اندر ڈال دیا تھا اس نے۔''

''چلو، جو بھی ہوا۔ اب تم اپنے پیروں پر کھڑے ہو۔ یہی بڑی بات ہے۔''

وہ ایک بار پھر تہ دل سے شکریے کے الفاظ ادا کرنے لگا۔ میں نے کہا۔ ''یہ اسٹور ایریا میں افراتفری کس چیز کی ہے؟''

''تلاشی ہو رہی ہے۔ یہ وہی لیڈی ڈاکٹر کے قتل والا چکر ہے۔ شک ہو رہا ہے کہ اس کا مفرور شوہر کہیں اسی جگہ موجود ہے۔''

''شک کیوں ہو رہا ہے؟''

''میں نے آپ کو اسپتال میں بتایا تھا ناں کہ ایک دو فوٹیج اس طرح کی ملی ہیں۔''

''کہاں ہیں فوٹیج؟''

''شاہی بھائی! آپ ایسا کریں، اپنے کمرے میں چلیں۔ میں وہیں آپ کے پاس حاضر ہوتا ہوں۔ تفصیل سے بات کریں گے۔'' قادر خان بولا۔

کوئی ایک گھنٹے بعد قادر خان اہم فوٹیج سمیت میرے پاس موجود تھا۔ سی سی ٹی وی کی یہ فوٹیج اس نے ''کمپیوٹر بوائے'' کی مدد سے اپنے سیل فون پر منتقل کر لی تھی۔ یہ دراصل دو تین کیمروں کی فوٹیج تھی۔ پہلے ایک فوٹیج ڈاکٹر ارم کے اپارٹمنٹ کے بیرونی حصے کی تھی۔ وہ اپنی موت سے قریباً بیس پچیس منٹ پہلے لفٹ سے اتر کر راہداری میں چلی آ رہی تھی۔ گلے میں اسٹیتھ اسکوپ جھول رہا تھا۔ ہاتھوں میں دو بڑے بڑے لفافے تھے جن میں یقیناً اشیائے خورد ونوش تھیں۔ وہ جانتی نہیں تھی کہ یہ اشیا وہ کبھی استعمال نہیں کر سکے گی۔ وہ سفید کوٹ، سبز شلوار اور جوگر پہنے، مگن انداز میں چلی آ رہی تھی۔ جیسے سوچ رہی ہو کہ آج اپنے معتوب محبوب کے لیے کس طرح کی اذیت ایجاد کرے گی لیکن آج رات تو اذیت اس کے لیے تھی اور اس اذیت کے ساتھ موت بھی اس کی منتظر تھی۔

فوٹیج ختم ہوئی تو قادر خان بولا۔ ''اس سے آگے کے دو کیمرے وقوعے سے آٹھ دس گھنٹے پہلے ہی بند ہو گئے تھے۔ اب معلوم نہیں کہ ان میں خرابی ہوئی یا انہیں جان بوجھ کر بند کیا گیا۔ جہاں ڈاکٹر قتل ہوئی وہاں کوئی کیمرا موجود نہیں تھا اس لیے کوئی ثبوت بھی نہیں ہے۔ کہیں سے کوئی واضح فنگر پرنٹ بھی نہیں مل سکا، نہ کوئی زمینی شہادت ملی ہے۔''

''دوسری فوٹیج کون سی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

قادر خان نے ایک بار پھر سیل فون آن کیا۔ ''یہ دونوں فوٹیج زیادہ واضح نہیں ہیں، مگر پتا چلتا ہے کہ ڈاکٹر کا شوہر اپارٹمنٹ سے نکلنے کے بعد اسٹور رومز کی طرف بھاگا تھا۔''

اس نے فوٹیج چلائیں۔ رات کا وقت تھا اور اس جگہ روشنی بھی کافی نہیں تھی۔ بس ایک ہیولا سا نظر آیا جس نے گھبراہٹ میں گارڈینا کی باڑ پھلانگی اور ایک طرف اوجھل ہوا۔ چند

لمحے بعد اس کے پیچھے مزید تین افراد نے باڑ پھلانگی۔ ان چاروں افراد میں سے کسی کا حلیہ واضح نہیں ہوا۔ ہاں اتنا ضرور اندازہ ہوتا تھا کہ پیچھے آنے والوں میں سے دو کے پاس کوئی رائفل یا دوسرا ہتھیار موجود ہے۔ دوسری فوٹیج میں بھی کافی فاصلے سے یہی منظر دکھائی دیا۔

قادر خان بولا۔ ''آپ نے دیکھ ہی لیا ہے۔ بھاگنے والے اکیلے بندے کا رخ سیدھا اسٹورز کی طرف ہے...... اور قریباً نوے فیصد یہی لگتا ہے کہ وہ ڈاکٹر کا شوہر ہے۔''

''اور اس کے پیچھے کون تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ بھی یقیناً میرے گارڈز تو نہیں تھے، اگر ایسا ہوتا تو وہ بتاتے۔ ابھی تک کسی نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اس نے مفرور کا پیچھا کیا ہے۔''

''اس سے کیا مطلب نکلتا ہے؟''

''یہی کہ ڈاکٹر کا شوہر قتل میں ملوث نہیں۔ وہ قاتلوں سے جان بچا کر بھاگا ہے لیکن دوسرے امکان کو بھی رد نہیں کیا جا سکتا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ چاروں ہی بھاگ رہے ہوں۔ ڈاکٹر کا شوہر ذرا آگے ہے اس لیے یہی لگ رہا ہے کہ شاید باقی ان کا پیچھا کر رہے ہیں۔''

میں قادر خان کو بتانا چاہتا تھا کہ وہ اپنے خیالوں کے گھوڑے غلط سمت میں دوڑا رہا ہے۔ وہ جسے اسٹور ایریا میں ڈھونڈ رہا ہے وہ وہاں کہیں نہیں مگر ابھی میں قادر پر اس حد تک اعتماد نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے کہا۔ ''قادر، لیڈی ڈاکٹر کے قتل کی وجہ تمہارے نزدیک کیا ہو سکتی ہے؟''

وہ دھیمے لہجے میں بولا۔ ''کسی وقت تو مجھے بھی کوئی گہرا چکر لگتا ہے جی۔ سنا ہے کہ اندر گھر والوں کے درمیان بھی کوئی مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے۔ چھوٹے صاحب ابراہیم شادی سے انکار کر رہے ہیں۔ وڈے صاحب کہہ رہے تھے کہ ہر صورت شادی ہو گی اور اپنے وقت پر ہو گی...... مگر اب لگتا ہے شاید کہ یہ دونوں شادیاں ہی کینسل ہو جائیں۔''

قادر خان کی باتوں سے تصدیق ہوئی کہ دیگر لوگوں کی طرح اسے بھی زہر خورانی والے معاملے کا کوئی علم نہیں اور نہ ہی اسے یہ پتا ہے کہ ابراہیم نے شادی سے دراصل انکار کیوں کیا ہے۔

قادر خان گیا ہی تھا کہ انیق اندر آ گیا۔ اس کی آنکھوں میں شوخی سی تھی، بولا۔ ''بہارو پھول برساؤ، آپ کا محبوب آیا ہے......''

میں سمجھ گیا کہ وہ جاناں کی بات کر رہا ہے۔ میں کمرے میں پہنچا تو وہ آفتِ جاں میرا ہی انتظار کر رہی تھی۔ اس نے بال بڑے سلیقے سے جُوڑے کی صورت میں باندھ رکھے تھے۔

ویلوٹ کا سرخ جوڑا اس کے لمبے جسم پر جچ رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ کافی دلکش نظر آتی تھی۔ میں نے کہا۔ ''اسپین میں بل فائٹنگ کے کھیل میں سرخ کپڑا بیل کو مشتعل کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، تم کس کو طیش دلانا چاہتی ہو؟''

وہ میری بات کی گہرائی سمجھ گئی لیکن سنجیدہ رہتے ہوئے بولی۔ ''اگر آپ کو سرخ رنگ اچھا نہیں لگتا تو میں نہیں پہنوں گی۔''

اس کا یہ فقرہ پتا نہیں کیوں مجھے ماضی کے اسی دل دہلا دینے والے واقعے کی طرف لے گیا جس نے میری زندگی کو مکمل طور پر تہ و بالا کر دیا تھا۔ میرا جان سے پیارا دوست مامون اور اس کی خوب صوت اور ذہین دوست انیتا، دونوں یک جان دو قالب کی طرح تھے۔ ہر وقت ہنستے مسکراتے رہتے تھے۔ ان کی آنکھوں میں دن رات بس ایک ہی سپنا جگمگایا کرتا تھا۔ اپنے ذاتی جمنازیم کا سپنا۔ انہوں نے اس کے لیے بہت خون پسینا بہایا تھا اور پھر وہ گھڑی آن پہنچی تھی جب انہیں اپنے خوابوں کی سنہری تعبیر ملنا تھی۔ ایک روز بعد ان کے جم کا افتتاح تھا۔ اس روز ان دونوں کے درمیان ایک ایسا ہی مکالمہ ہوا تھا۔ انیتا نے سرخ شرٹ پہن رکھی تھی اور بے حد دلکش لگ رہی تھی۔ مذاق کرتے ہوئے مامون نے کہا تھا۔ ''ڈارلنگ کہیں تم مجھے سانڈ تو نہیں سمجھتی ہو۔ سرخ کپڑا تو سانڈ کو طیش دلانے کے لیے لہرایا جاتا ہے۔''

وہ ہنس ہنس کر دہری ہو گئی تھی پھر بولی تھی۔ ''یہ سرخ کپڑا نہیں...... سرخ جھنڈی ہے تمہارے لیے...... آج کی رات بہت امن سکون سے گزارنی ہو گی...... کل بہت سا کام کرنا ہے۔''

اور وہ سارے کام دھرے کے دھرے رہ گئے تھے۔ صبح سویرے ان ہنستے مسکراتے چہروں کو، ان زندگی سے بھرپور جسموں کو ان کے جمنازیم کے اندر ہی خون میں نہلا دیا گیا تھا۔ انہیں اتنی اذیت سے مارا تھا ڈیرک کے درندہ صفت کارندوں نے کہ جائے واردات کے در و دیوار بھی لہو کے آنسو رو پڑے تھے۔ یہ صدمہ جیسے میرے دل و دماغ میں پیوست ہو کر رہ گیا تھا۔ بے شک پاکستان میں میری چچا زاد بہن فائزہ اور چچی کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا وہ بھی ناقابلِ فراموش تھا لیکن اس حوالے سے اتنی تسلی ضرور تھی کہ میں نے ان کے قاتلوں لالہ نظام وغیرہ کو کیفر کردار تک پہنچا دیا تھا۔ مامون اور انیتا کے قاتل ابھی زندہ تھے۔ وہ ابھی میری پہنچ سے دور تھے اور بہت زیادہ طاقتور بھی تھے۔ ان کا زندہ ہونا دن رات میرے سینے کو سلگاتا تھا۔

''کہاں کھو گئے؟'' جاناں کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔

''کچھ نہیں...... ویسے ہی...... ایک بات یاد آ گئی تھی۔''

اس نے بڑی ادا سے اپنے سرخ دوپٹے کو سینے پر درست کیا اور بولی۔ ''کیسے ہیں آپ؟''

''تم کیسی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

میرے نرم لہجے سے اسے تھوڑی سی شہ ملی۔ ''بس ہر وقت آپ کی ٹانگیں دباتی رہتی ہوں، اچھی گزر رہی ہے۔''

''یعنی ٹانگیں میڈم لورین کی دباتی ہو اور احسان مجھ پر چڑھا رہی ہو...... خیر چھوڑو...... کس سلسلے میں آئی ہو؟''

''سلسلہ تو ہے کیونکہ سلسلے کے بغیر آتی تو ضرور آپ سے جھاڑ کھاتی۔''

''کیا سلسلہ ہے؟'' میں ذرا چونک گیا۔

وہ دھیمی آواز میں بولی۔ ''کل رات نو بجے کے آس پاس یہاں کچھ نہ کچھ ہونا ہے۔ میں نے ایک کال سنی ہے۔ شاید پارا ہاؤس کے ہی دو بندے آپس میں بات کر رہے تھے۔''

''کیسے سن لی کال تم نے؟''

''میں نے لینڈ لائن پر میڈم لورین کو فون کیا تھا، لیکن کسی دوسرے فون کی لائن ملی ہوئی تھی، گفتگو کی مدھم باریک آواز آ رہی تھی۔ میں سنتی رہی۔ کنکریٹ والی مشین چلنے کی مدھم آواز بھی فون میں سنائی دے رہی تھی، جس سے ثابت ہوتا تھا کہ کال پارا ہاؤس کے آس پاس سے ہی کی جا رہی ہے۔ ایک بندے نے کہا...... پہلے والا پروگرام ہی ہے۔ پہلے انہیں خود ہی بھگایا جائے گا، پھر کام کر دیا جائے گا...... دوسرے نے کہا۔ اگر وہ سچ مچ بھاگ ہی گئے تو پھر......؟ پہلے نے کہا۔ خیر اتنے بھی ہوشیار نہیں ہیں وہ اور جو سکیورٹی ہے اس کا بھی تمہیں پتا ہے۔ آج کل تو چڑیا بھی پر نہیں مار رہی...... بس تم نے نو اور دس بجے کے درمیان بالکل ہوشیار رہنا ہے۔'' جاناں نے ذرا توقف کیا اور اپنے جُوڑے کو پھر سے باندھتے ہوئے بولی۔ ''انہوں نے کچھ اور باتیں بھی کیں جو پوری طرح میری سمجھ میں نہیں آئیں لیکن اتنا اندازہ ضرور ہو گیا کہ کل نو بجے کے بعد کچھ ہونے والا ہے۔''

''نو بجے سے کیا پتا چلتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ دن کے نو بجے ہوں؟''

''نہیں ایسی بات نہیں ہے، جو کچھ میں نے سنا ہے اس سے یہی پتا چلتا ہے کہ جو کچھ ہونا ہے کل رات ہونا ہے اور نو دس بجے کے درمیان ہونا ہے۔''

جب وہ بات کر رہی تھی، میں نے اس کے ترشے ہوئے سرخ ہونٹوں کی طرف دیکھا۔ نچلے ہونٹ پر دائیں طرف ایک نشان نظر آ رہا تھا۔ ننھا سا سرخ دھبا...... جیسے یہاں انجکشن لگا ہو۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ پوچھتا، اس نے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈالا اور ایک تہ کیا ہوا کاغذ میری طرف بڑھا دیا۔ ''یہ کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہی جو لڑکیاں، لڑکوں کو لکھا کرتی ہیں۔'' وہ مسکرائی۔

وہ ایک اہم اطلاع لے کر آئی تھی اور میں اسے بدمزہ کرنا نہیں چاہتا تھا ورنہ اس وقت میرا موڈ ہرگز رومانوی نہیں تھا۔ وہ سچ مچ جھاڑ کھا سکتی تھی۔

میں کاغذ کی تہ کھولنے لگا۔ اس نے فوراً میرا ہاتھ تھام لیا۔ ''پلیز شاہ زیب! آپ ناراض نہ ہونا۔ میں جانتی ہوں، میرے جیسی لڑکی آپ کے لائق نہیں ہو سکتی...... آپ جو تھوڑا بہت وقت مجھے دیتے ہیں وہ بھی آپ کی مہربانی ہے لیکن میں کیا کروں، اپنی سوچوں پر میرا اختیار نہیں۔''

''یہ اقوالِ زریں تو تم پہلے بھی کئی بار دہرا چکی ہو۔'' میں ہولے سے مسکرایا۔

''چلو...... ایک بار اور سہی۔'' اس نے عاجزی سے کہا۔

میں نے کاغذ کھولا۔ یہ خط نہیں تھا۔ بس شاعری تھی۔ ایک آزاد نظم تھی جو غالباً اس نے اپنے خون سے لکھی تھی۔ مطلب کچھ اس طرح سے تھا۔

میں اسے کیسے بھلا دوں
وہ تو میری رگ رگ میں بس چکا ہے
میں برف کے اندھیرے گھر میں تھی
اور پل پل ختم ہو رہی تھی میری زندگی
وہ سورج بن کر آیا
تیرگی چھٹ گئی
برف بھی پگھل گئی
میں پھر سے جی اٹھی
اب یہ زندگی اس کی امانت ہے
سوچتی ہوں وہ محبوب ہے یا دیوتا
سوچتی ہوں یہ محبت ہے یا عبادت ہے

نظم پڑھ کر میں نے ایک طویل ٹھنڈی سانس لی۔ ''دیکھو جاناں! مجھے اتنے اونچے بانس پر نہ چڑھاؤ کہ گروں تو ہڈی پسلی ایک ہو جائے۔ میں جتنے جوگا ہوں، مجھے اتنا ہی رہنے دو۔''

''آپ کو شاید خود بھی پتا نہیں کہ آپ کیا ہیں۔ میرے بس میں ہو تو آپ کے قدموں میں سر رکھ کر جان دینے کو اپنی خوش نصیبی سمجھوں۔''

''اچھا اب زیادہ قربانہ خانم بننے کی کوشش نہ کرو۔ جو کچھ تم نے بتایا ہے وہ اگر واقعی درست ہے تو کافی اہم ہے۔ مجھے سوچنے اور سجاول سے مشورہ کرنے کا موقع عنایت کرو۔''

وہ مجھے شکوہ کناں نظروں سے دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے اٹھنے اور کھڑے ہونے کا اپنا ایک انداز تھا۔ وہ ان عورتوں میں سے تھی جن کی جسمانی خوب صورتی بیٹھنے سے چھپ جاتی ہے اور کھڑے ہونے سے نمایاں ہوتی ہے۔ اس کے کھڑے ہونے کا انداز مجھے تاجور کی یاد دلا دیتا تھا۔ وہ بھی اس حوالے سے بے مثال تھی۔ بیٹھتی تھی تو اپنے اندر سمٹ سی جاتی تھی لیکن جب چلتی پھرتی تھی، اپنے پورے قد کے ساتھ کھڑی ہوتی تھی تو پنجاب کے سارے لہلہاتے اور جھومتے درختوں کی دلکشی نگاہوں کے سامنے آجاتی تھی۔ پتا نہیں کہ وہ اس وقت کہاں تھی؟ کیا کر رہی تھی؟ اس کے پاس میرا نمبر تھا۔ وہ چاہتی تو اپنی انگلی کی ایک مختصر حرکت کے ساتھ مجھ سے رابطہ کر سکتی تھی لیکن اس نے نہیں کیا تھا۔ جب کوئی فاصلہ ختم کرنا ہی نہ چاہے تو پھر ایک قدم کا فاصلہ بھی ہزاروں لاکھوں کوس میں بدل جاتا ہے۔ یہ وہی رویہ تھا جو تین چار سال پہلے بھی تاجور نے مجھ سے اختیار کیا تھا۔ لاہور میں ہونے والی دو ادھوری سی لیکن ناقابلِ فراموش ملاقاتوں کے بعد اس نے مجھے ایک موبائل فون نمبر دیا تھا اور پھر اس نمبر پر میں ہزارہا کوشش کے باوجود رابطہ نہیں کر پایا تھا۔ چلو اس وقت تو اور بات تھی، دو ادھوری سی ملاقاتیں تھیں لیکن اب تو ہم نے ایک دوسرے کو چھوا تھا، ایک دوسرے کے قریب آئے تھے، بہت سا وقت ساتھ گزارا تھا۔ کیا اس کے باوجود ایک بار پھر وہ مکمل طور پر اجنبی بن چکی تھی۔ جب میں اس طرح سوچتا تھا تو مجھے تاجور کے کورے پن اور سخت دلی پر حیرت ہونے لگتی تھی اور کبھی کبھی غصہ بھی آتا تھا۔

''آپ بات کرتے کرتے کہاں کھو جاتے ہیں؟'' جاناں نے مجھے ہلکے سے ٹہوکا دیا۔

''بس تمہارے انکشاف کے بارے میں ہی سوچ رہا ہوں۔ کیا کل واقعی کوئی نیا ہنگامہ ہونے والا ہے۔'' میں نے جھوٹ بولا۔

اس نے ادا سے کہا۔ ''میں سمجھی، آپ میری اس نظم کے بارے میں سوچ رہے ہیں...... دیکھیں اپنے پیاروں کو خون کے ساتھ تو سارے ہی تحریریں بھیجتے ہیں لیکن میں نے یہ تحریر خاص قسم کے خون سے لکھی ہے۔''

''خاص قسم کا خون؟''

اس نے چنچل انداز میں اپنی انگلی سے اپنے نچلے ہونٹ کی طرف اشارہ کیا، جہاں ایک ننھا سا سرخ نشان نظر آ رہا تھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی، اس نے اپنے ہونٹ میں سوئی وغیرہ چبھو کر خون نکالا تھا اور پھر یہ نظم لکھی تھی۔ وہ موسیقی اور شاعری سے لگاؤ رکھنے والی عجب رومان پسند لڑکی تھی۔ انسپکٹر قیصر، پاشا اور لالہ وریام جیسے نہ جانے کتنے بدمست مردوں نے اسے روندا تھا لیکن اس کے اندر کی شعریت اور رومانیت کو کچلنے میں ناکام رہے تھے۔

وہ چلی گئی تو انیق آ دھمکا۔ میں نے اسے اپنے اور جاناں کے درمیان ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا۔ انیق کا خیال بھی یہی تھا کہ ہمیں جاناں کی اس اطلاع کو ایزی نہیں لینا چاہیے۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں سر کھجا کر بولا۔ ”مجھے تو ایک اور خطرہ بھی محسوس ہو رہا ہے شاہی بھائی۔“

”وہ کیا؟“

”کہیں......خدانخواستہ......میرا مطلب ہے کہ کہیں...... یہ گفتگو ہمارے بارے میں ہی نہ ہو۔“

یہ شک چند لمحوں کے لیے میرے ذہن میں بھی آیا تھا لیکن میں نے رد کر دیا تھا۔ اب یہی بات انیق بھی کہہ رہا تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ بات تو اب طے ہے کہ یہ آقا جان لومڑ سے زیادہ عیار اور بھیڑیئے سے زیادہ خطرناک ہے۔ یہ ہم سے بہت خار بھی کھائے ہوئے ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ کوئی خطرناک ڈراما رچا کر ہمیں راستے سے ہٹانا چاہتا ہو بلکہ......“ انیق کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

”بریک کیوں لگا لیے ہیں جو منہ سے پھوٹنا چاہتے ہو پھوٹو۔“

”شاہی بھائی، مجھے تو آپ کے امریش پوری سے بھی خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔ یہ بڑی تیزی سے اپنے ہاتھ پاؤں پھیلا رہا ہے۔ آقا جان سے بھی اس کی بات چیت ہوتی رہتی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ ڈاکو ابن ڈاکو ہمارا پتّا کاٹنے کی فکر میں ہو۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے یقین ہوتا جا رہا ہے کہ تم نے ایک دن ضرور سجاول کے غصے کی زد میں آ کر ضائع ہونا ہے۔ تمہارا ہر شک گھوم پھر کر سجاول کی طرف چلا جاتا ہے......“

”ٹھیک جاتا ہے شاہی بھائی! آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ نے ”ہتھ جوڑی“ میں جان بوجھ کر اپنی ہار تسلیم کر لی اور یوں سجاول کو اپنا احسان مند بنا لیا، اب وہ آپ پر اپنا ہاتھ ہولا رکھے گا۔ یہ بات بھول جائیں۔ درندے پر جتنی مرضی محبت نچھاور کریں وہ درندہ ہی رہتا ہے۔“

''لیکن درندے کو ایک دائرے میں تو رکھا جا سکتا ہے ناں۔ سرکس میں شیر ہمارے بچوں کو خوش کرتا ہے یا نہیں۔''

''مگر جناب! یہ انسان سے درندہ بنا ہوا ہے۔ ایسے درندوں کی خطرناکی کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ ہمارے حشمت راہی صاحب نے کیا خوب ارشاد فرمایا ہے۔

چیتا تو چیتے کو کھاتا نہیں، نہ شیر ہی شیر کو کھاتے ہیں
لیکن بندے ہی درندے بن کر بندوں کے دروازے کھڑکاتے ہیں

میں نے اسے گھور کر دیکھا تو وہ مزید شعر سنانے سے باز رہا اور سنجیدہ صورت ہو کر بولا۔

''ویسے اگلے چوبیس گھنٹے میں ہمیں چوکس رہنا چاہیے۔ آقا جان اس بات پر بہت بھرا ہوا ہے کہ چھوٹے صاحب ابراہیم نے گارڈز سے جھڑپ ہونے کے بعد آپ کی حمایت کی اور آپ کو اپنے ساتھ رہائشی حصے میں لے گئے۔ اسے یہ بھی شک ہے کہ ہم دونوں اور خاص طور سے آپ، یہاں کے معاملات کی ٹوہ لگا رہے ہیں......''

ہم نے اس معاملے پر کافی دیر بات کی...... اگلا روز بھی تناؤ میں گزرا۔ میں نے سجاول کو بھی ساری صورتِ حال سے آگاہ کر دیا تھا۔ جوں جوں رات کے نو بجے کا وقت نزدیک آ رہا تھا ہمارے تجسس میں اضافہ ہو رہا تھا۔ پارا ہاؤس کی صورتِ حال کے پیشِ نظر حلمی نے ہمیں مسلح کر رکھا تھا اور ہمارے ہتھیار ہمارے پاس موجود تھے۔

بہرحال جب رات کے قریباً ساڑھے نو بجے تو ہمارے سارے اندیشے غلط ثابت ہو گئے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ پارا ہاؤس میں کچھ ہوا ہی نہیں۔ پارا ہاؤس میں جاناں کی اطلاع کے مطابق بہت کچھ ہوا، لیکن اس کا تعلق براہِ راست ہم سے نہیں تھا۔ میں، انیق اور سجاول اکٹھے ہی کمرے میں بیٹھے تھے۔ اچانک تہ خانوں کی طرف سے شور سنائی دیا۔ ''بھاگو پکڑو۔'' کی آوازیں آئیں۔

چار دیواری کی بلندی پر موجود سرچ لائٹس نے اپنا رخ تبدیل کیا اور احاطے کے مرکزی حصے کو روشن کرنے لگیں۔ میں نے ایک بپھرے ہوئے شخص کو دیکھا، اس کے ہاتھ میں جدید آٹومیٹک رائفل تھی اور وہ اپنے عقب میں فائرنگ کرتا ہوا بھاگ رہا تھا۔ ہم نے اسے ایک لحظے میں پہچان لیا۔ یہ ناقب تھا۔ انہی لوگوں کا سرغنہ جنہوں نے چند روز پہلے پارا ہاؤس کو خون میں نہلایا تھا اور ابراہیم کو یرغمال بنایا تھا۔ بعدازاں ناقب اور اس کے ایک ساتھی کو پکڑ لیا گیا تھا۔ ہمارا خیال یہی تھا کہ ان دونوں مجرموں کو پولیس کے حوالے نہیں کیا گیا اور آج یہ اندازہ درست ثابت ہو رہا تھا۔

''وہ دیکھو، اس کا دوسرا ساتھی بھی ہے۔'' سجاول نے چلا کر ایک طرف اشارہ کیا۔
بے شک وہ ناقب کا غیر ملکی ساتھی ہی تھا۔ وہ بھی مسلح تھا اور اندھا دھند فائر کرتا ہوا مرکزی حصے کی طرف بھاگ رہا تھا۔ اس اثنا میں ناقب نے ایک بڑے ستون کے پیچھے پوزیشن لے لی تھی اور تابڑتوڑ گولیاں چلا رہا تھا۔ میں نے ایک گارڈ کو گولی کھا کر کالے گلابوں کے ایک تختے میں گرتے ہوئے دیکھا۔ پھر یکایک پتا نہیں کیا ہوا احاطے کی شمالی جانب ایک زوردار دھماکا ہوا۔ اس کے ساتھ ہی کم شدت کے پانچ چھ دھماکے ہوئے اور ہر طرف شعلے بکھرتے نظر آئے۔ دراصل یہ کوئی آوارہ گولی تھی جو پورچ میں کھڑی ایک جیپ کے فیول ٹینک میں جا لگی تھی۔ ٹینک پھٹ گیا۔ ساتھ ہی قطار میں چار پانچ ہیوی موٹر بائیکس کھڑی تھیں۔ یہ وہی بائیکس تھیں جو عزت مآب وڈے صاحب کے شاندار کانوائے کے آگے پیچھے چلتی تھیں۔ دھماکے سے انہوں نے بھی آگ پکڑ لی۔ میں نے دو موٹر سائیکلز کو آگ کے گولے کی صورت ہوا میں بلند ہوتے اور رہائشی حصے کے بالائی لان میں گرتے دیکھا۔ یہ ایک ہولناک منظر تھا۔ بالکل ہالی ووڈ کی کسی ایکشن فلم جیسا۔ ان دھماکوں نے ہر طرف تھرتھلی سی مچا دی۔ رہائشی حصے کے ایک پورشن میں آگ بھڑک اٹھی تھی۔ سیاہ گاڑھا دھواں تیزی سے ہر طرف پھیل رہا تھا۔

پورے پاراہاؤس کے الارم ایک بار پھر بلند آواز سے چلانے لگے۔ اندھا دھند گولیاں بھی چل رہی تھیں۔ میں نے سجاول کے کان میں تیز سرگوشی کی۔ ''سجاول! اگر واقعی کوئی ڈراما ہوا ہے تو اس ڈرامے سے ہم بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''ہم اندر ڈارک روم میں پھنسے ہوئے رضوان کو وہاں سے نکالنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔''

بات سجاول کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے کہا۔ ''اگر تم مناسب سمجھو تو میں اور انیق جاتے ہیں۔ تم یہاں کی صورتِ حال دیکھو۔''

''لیکن کوئی کام خراب نہ کر بیٹھنا۔ آقا جان تمہارے خلاف پہلے ہی بھرا بیٹھا ہے۔''

''تم بے فکر رہو۔''

میں اور انیق اپنی رائفلیں سنبھالے ہوئے تیزی سے باہر نکلے۔ آگ پھیلتی جا رہی تھی۔ دھواں ہر شے کو چھپا رہا تھا۔ کوئی پچاس قدم آگے ہمیں برآمدے میں ناقب کے ساتھی کی لاش پڑی نظر آئی۔ پورا ایک برسٹ اس کی کمر کو چھلنی کر گیا تھا مگر اندازہ ہوتا تھا کہ ناقب ابھی زندہ

ہے اور زوردار جوابی فائرنگ کر رہا ہے۔ میں اور انیق اندھا دھند دوڑتے رہائشی حصے میں گھس گئے۔ پورا نظام درہم برہم تھا۔ دو چار گارڈز نے ہمیں دیکھا بھی لیکن کوئی تعرض نہیں کیا۔ وہ جانتے تھے ہمیں وڈے صاحب کا اعتماد حاصل ہے، اور ہم اس سے پہلے بھی ہنگامی صورتِ حال میں پاراہاؤس کا دفاع کر چکے ہیں۔ ہمیں ایک جگہ بندریا لوسی کی جھلک بھی نظر آئی۔ وہ گھبرائی ہوئی تھی اور جست لگا کر ایک کھڑکی سے باہر کود رہی تھی۔ چند گولیاں آئیں اور ایک اندرونی کھڑکی کا شیشہ چکنا چور کر گئیں۔ کوئی لڑکی کمرے کے ایک گوشے میں سمٹی بری طرح چلا رہی تھی۔ کوئی ملازمہ تھی جس کے بال بڑے بے ڈھنگے طریقے سے تراشے گئے تھے۔ میں نے پہچان لیا۔ یہ وہی لڑکی روحی تھی جس پر سنبل کے کپڑں کو آگ لگانے کا الزام ثابت ہوا تھا اور اسے بید مارنے کے علاوہ واش رومز صاف کرنے کی سزا بھی دی گئی تھی۔ اس وقت بھی اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا ''وائپر'' نظر آ رہا تھا۔

''نیچے لیٹ جاؤ۔'' میں اسے دیکھ کر چلایا۔

اس نے میری ہدایت پر عمل کیا اور اچھا ہی کیا۔ ایک اور برسٹ آیا اور کئی جگہ سے دیوار کا پلاستر اکھاڑ گیا۔ چند فی میل گارڈز دھوئیں کے سبب بری طرح کھانستی اور ابکائیاں لیتی ہوئی کوریڈور میں بھاگی چلی جا رہی تھیں۔ ''آپ کے پاس ٹارچ ہے؟'' انیق نے بلند آواز میں مجھ سے پوچھا۔

میں نے اثبات میں جواب دیا، وہ بولا۔ ''آن کرلیں۔''

میں نے ٹارچ آن کر لی۔ انیق نے اپنی چھوٹی نال کی چینی رائفل سے دو فائر کیے۔ یکا یک رہائشی پورشن کا بہت بڑا حصہ تاریکی میں ڈوب گیا۔ جیسا کہ بعدازاں معلوم ہوا انیق نے بجلی کی ایک ''ڈی پی'' کو نشانہ بنایا تھا۔ یہ تاریکی ہمارے کام کے لیے بہت معاون تھی۔ ہم ٹارچ کی روشنی میں رہائشی پورشن کے خاص الخاص حصے کی طرف بڑھے۔ چند سیکنڈ کے اندر ہم عزت مآب وڈے صاحب کی قیام گاہ کے سامنے تھے۔ ہر طرف آہ و بکا تھی اور چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میری ٹارچ کا روشن دائرہ ایک چونکا دینے والے منظر پر پڑا۔ چند ہٹی کٹی فی میل گارڈز نے بے ہوش سنبل کو ہاتھوں پر اٹھایا ہوا تھا اور اسے بیرونی کوریڈور کی طرف لے جا رہی تھیں۔ سنبل یقیناً بڑھتے ہوئے دھوئیں اور گھبراہٹ سے بے ہوش ہوئی تھی۔ فی میل گارڈز خود بھی بری طرح کھانس رہی تھیں۔ آگ اس حصے تک نہیں پہنچی تھی مگر دھواں اور تاریکی دہشت پھیلا رہے تھے۔ ہم دونوں نے اپنے چہرے کپڑوں میں لپیٹے اور سیدھے وڈے صاحب کی عظیم الشان آرام گاہ میں گھس گئے۔ یہاں بھی تاریکی تھی لیکن ٹارچ اپنا کام

کررہی تھی۔ سنبل نے ایک دن پہلے ہمیں ڈارک روم کا محل وقوع اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ دھواں بڑھ رہا تھا۔ یہاں رکنا خطرناک تھا لیکن رضوان کو بچانا ہر لحاظ سے ضروری تھا۔ اس نے ان قاتلوں کو دیکھا اور سنا تھا جنہوں نے لیڈی ڈاکٹر ارم کی جان لی۔ وہ آقا جان کے خلاف کوئی ایسا ثبوت فراہم کرسکتا تھا جس سے وڈے صاحب اور دیگر اہلِ خانہ کی آنکھیں کھل جاتیں اور وہ اس خطرناک شخص کا اصل کردار جاننے اور ماننے پر مجبور ہو جاتے اور اس سے بھی بڑی بات یہ تھی کہ یہ ایک دوست کی جان بچانے کا معاملہ تھا۔ وہ اس ڈارک روم میں پھنسا تو پہلے سے ہی تھا۔ اب یہ قاتل دھواں فوری طور پر اس کی زندگی کو فل اسٹاپ لگا سکتا تھا۔

ٹارچ کا روشن دائرہ اسٹیل کے ایک سلائیڈنگ دروازے پر پڑا۔ یہی ڈارک روم تھا۔ چابی ڈھونڈنے کا وقت کہاں تھا۔ میں نے ہضمی قفل پر دو فائر کیے۔ تیسرے فائر نے دروازے کو اَن لاک کردیا۔ میں نے ٹارچ گھمائی رضوان کہیں نظر نہیں آیا۔

''رضوان کہاں ہوتم؟ میں شاہ زیب ہوں۔ سامنے آؤ۔'' میں پکارا۔

وہ ڈرا سہا ہوا سا ایک سیاہ الماری کی اوٹ سے نکلا۔ یہاں در و دیوار سمیت ہر شے سیاہ تھی۔ یہاں وڈا صاب استراحت فرماتا تھا، اور آنکھیں بند کر کے یقیناً ارب پتی سے کھرب پتی ہونے کے پروگرام سوچتا ہوگا۔ آہ...... زندگی کتنی مختصر اور پروگرام کتنے طویل ہوتے ہیں۔

میں نے اپنے چہرے سے کپڑا ہٹایا اور ٹارچ کا روشن دائرہ اپنے چہرے پر پھینکا......

''شاہ زیب بھائی......آپ......؟...... یہاں؟'' رضوان ہکلایا۔

''چلو نکلو۔'' میں نے اس کا بازو تھاما۔

''یہ کیا ہنگامہ ہے جناب......اور یہ دھواں؟'' وہ ہکا بکا تھا۔

''یہ سب باتیں بعد میں، پہلے یہاں سے نکلنا ہے۔''

برآمدوں کی طرف شعلوں کی سرخی دیکھ کر وہ مزید خوف زدہ ہوگیا۔ ''وہ...... وہ لڑکی...... سنبل...... کہاں ہے؟''

''وہ نکل گئی ہے یار، تُو اپنی فکر کر۔'' میں نے اسے کھینچا۔ انیق نے ایک بھیگا ہوا تولیا اس کے چہرے کے گرد لپیٹ دیا۔ ہم لوریڈور کی طرف لپکے۔ زیرِتعمیر عمارت کی طرف سے بھی بیسیوں افراد آگ بجھانے کے لیے پہنچ رہے تھے۔ آگ کو بس چند کمروں تک محدود کردیا گیا تھا۔ مگر دھواں غضب کا تھا۔ یہ دھواں ہماری جان لے سکتا تھا۔ مجھے خود سے زیادہ رضوان کی فکر تھی۔ ہم دونوں نے رضوان کو اپنے بازوؤں کے حصار میں لیا ہوا تھا اور جھک کر بھاگ

رہے تھے۔ ہم نے اپنے سانس روکے ہوئے تھے لیکن وہ بری طرح کھانس رہا تھا۔ وہ ابھی تک اسپیشل فورس کی اسی یونیفارم میں تھا جس میں بھاگ کروڑے صاحب کے پُرشکوہ بیڈروم تک پہنچا تھا۔ کوئی دیکھتا تو شاید یہی سمجھتا کہ ہم اسپیشل فورس کے کسی گارڈ کی جان بچا رہے ہیں۔

احاطے میں پہنچے تو کچھ فاصلے پر آقا جان نظر آیا۔ وہ غصے میں دہکا ہوا تھا۔ اس کے منہ سے جیسے جھاگ چھوٹ رہے تھے۔ چہرہ فرط غضب سے بگڑا ہوا تھا۔ وہ ایک بے جان جسم کو ٹھوکریں مار رہا تھا۔ یہ حملہ آوروں کے سرغنہ ناقب کی لاش تھی۔ لاش کو ٹھوکریں مارتا ہوا وہ واقعی ایک خون آشام درندہ نظر آتا تھا اور یہی وہ شخص تھا جو پارا ہاؤس والوں کے دل و دماغ کو اپنے شیطانی حصار میں جکڑے ہوئے تھا۔ ان سے اپنی مرضی کے فیصلے کرا رہا تھا۔ اس کی جڑیں اس خاندان میں اتنی گہری کیوں تھیں؟ یہ بڑا اہم سوال تھا...... وہ یہاں جس کو چاہتا تھا بچا لیتا تھا، جس کو چاہتا تھا مار دیتا تھا۔ یقیناً سرغنہ ناقب اور اس کے ساتھی کو موت کی کڑی سزا بھی اسی نے دی تھی۔ میں نے گہرے دھوئیں کی اوٹ سے اسے دیکھا اور میرے دل نے گواہی دی کہ اس بندے کو زیر کرنا آسان نہیں ہوگا۔

O.......❖.......O

ہم نے افراتفری اور گہرے دھوئیں کا فائدہ اٹھایا۔ جھک کر بھاگتے ہوئے مہمان خانے تک پہنچے اور پھر اپنے کمروں کی طرف نکل گئے۔ رضوان کو میں نے اپنے کمرے تک پہنچایا اور اس میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ اب سب سے پہلا مسئلہ یہی تھا کہ رضوان کو حفاظت سے چھپایا کہاں جائے؟ فوری طور پر کمرے کی قد آدم الماری کے سوا کوئی اور جگہ نظر نہیں آئی۔ میں نے انیق کے ساتھ مل کر بہ عجلت الماری کا ایک پورشن سامان سے خالی کیا۔ اور رضوان کو کھڑی پوزیشن میں وہاں گھسا دیا۔ یہاں اسے آکسیجن کی کوئی کمی تو نہیں ہوسکتی تھی۔ میں نے دروازہ باہر سے لاک کر دیا اور الماری سے نکلنے والا سامان اور کپڑے وغیرہ چھوٹے سے اسٹور میں چھپا دیئے۔

پارا ہاؤس کے رہائشی حصے میں لگنے والی آگ پر مکمل قابو پا لیا گیا تھا۔ یہ آگ بس دو تین کمروں تک ہی محدود رہی تھی۔ ایک ساتھ پانچ موٹر بائیکس نے دھماکوں سے آگ پکڑی تھی۔ بڑی گاڑی اس کے علاوہ تھی۔ یہ ساری گاڑیاں کھلی جگہ پر کھڑی تھیں۔ اگر یہ عمارت کے نزدیک ہوتیں تو کہیں زیادہ نقصان ہوتا۔

سجاول بھی جلد ہی ہمارے پاس پہنچ گیا۔ میں نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور اسے

بتایا۔ ''ہم بندہ لے آئے ہیں۔ ابھی الماری میں بند کیا ہے۔ صورتِ حال ذرا بہتر ہوتی ہے تو پھر اس سے بات کرتے ہیں۔''

سجاول نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ احاطے میں اب بہت سارے گارڈز اور ملازمین جمع ہو چکے تھے۔ حلمی اور قادر خان وغیرہ بھی نظر آ رہے تھے۔ سجاول نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''ان لوگوں نے ناقب اور اس کے ساتھی کو مار ڈالا۔''

''ہاں، ہم بھی دونوں کی لاشیں دیکھ کر آئے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''لگتا ہے کہ یہ کام آقا جان ہی کا ہے، وہ یہاں جس طرح کے کھیل چاہے کھیل رہا ہے۔ پہلے ان لوگوں کو بھگایا گیا ہے، پھر مار دیا گیا ہے۔''

میں نے دل میں سوچا۔ ''سجاول! تم نے بھی تو اپنے ڈیرے پر ایسا ہی کام دکھایا تھا۔ پہلے 'لڈو پیڑے' والے کمرے میں (عقوبت خانے میں) منشی افضل کو نچوڑا تھا پھر اسے بھاگنے کے ناکردہ جرم میں موت کی سزا دے ڈالی تھی......''

''کیا سوچ رہے ہو تم؟'' سجاول نے کہا۔

''یہی کہ اگر یہ سارا ڈراما تھا تو اس ڈرامے سے ہم نے بھی تو کچھ فائدہ اٹھا ہی لیا ہے۔ رضوان اب ہمارے پاس ہے۔''

''فائدہ تو تب ہو گا جب یہ بندہ کوئی پکا ثبوت دے سکے گا آقا جان کے خلاف۔''

''لگتا ہے کہ میری طرح تمہیں بھی یقین ہے کہ یہ دونوں تازہ قتل بھی آقا جان نے ہی کروائے ہیں۔''

سجاول نے میری بات کا جواب دینے سے پہلے گہری سانس لی اور اس کا صندوق جیسا سینہ کشادہ تر ہو گیا۔ اپنی تیکھی مونچھیں سہلا کر بولا۔ ''دراصل میرے کانوں تک بھی کچھ اس طرح کی باتیں پہنچ رہی تھیں۔ میں نے ایک دن وڈے صاحب سے پوچھا تھا کہ باغی گروپ کا کیا بنا۔ اس نے بتایا کہ صغیر اور ناقب وغیرہ سمیت سب بند ہیں۔ ان کو ان کے کیے کی سزا ضرور ملے گی۔ مگر وڈے صاحب کی باتوں سے لگتا تھا کہ وہ انہیں بہت زیادہ سخت سزا دینا نہیں چاہتا۔ دوسری طرف آقا جان اس معاملے میں کسی طرح کی رعایت کرنا نہیں چاہتا تھا۔ کم از کم بردنائی سے آنے والے سرغنہ ناقب اور اس کے ساتھی حارث کو تو وہ جان سے مار دینا چاہتا تھا تاکہ دوسروں کو عبرت ہو۔''

''اور اس نے مار دیا۔'' میں نے کہا۔

''ہاں، آقا جان بڑا اکڑ ک ہے اور شاید کئی معاملوں میں وہ ٹھیک ہی ہے۔ وڈے

صاحب کی نرم دلی اسے کئی معاملوں میں نقصان بھی پہنچا جاتی ہوگی۔"

"لیکن کئی معاملوں میں وہ خود بھی تو وڈے صاحب کو نقصان پہنچا رہا ہے۔" انیق نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ "اگر یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ زینب کے خون کی غلط رپورٹ آقا جان کی مرضی سے ہوئی تو یہ کتنی بڑی بات ہے۔ سراسر دھوکا وڈے صاحب اور ابراہیم کے ساتھ۔"

سجاول نے ناگواری سے انیق کی طرف دیکھا۔ وہ انیق کی بات کم ہی برداشت کرتا تھا لیکن انیق کی اس بات میں چونکہ خاصا وزن تھا اس لیے وہ کوئی سخت فقرہ کہنے سے باز رہا۔

انیق نے اسے بھی اپنی بڑی کامیابی سمجھا اور مطمئن انداز میں میری طرف دیکھا۔ اس کا یوں میری طرف دیکھنا سجاول کو پھر مشتعل کر گیا۔ وہ لال چہرے کے ساتھ بولا۔ "تم اپنی چونچ بند ہی رکھا کرو تو بہتر ہے۔ ابھی ہمارے پاس کیا ثبوت ہے کہ وہ غلط رپورٹ آقا جان نے کروائی یا یہ کہ لیڈی ڈاکٹر کو اس نے مروایا۔ بغیر ثبوت کے تو کچھ بھی کہا جا سکتا ہے...... میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ تم...... نو کے بجائے سات مہینے میں ہی پیدا ہو گئے تھے یا یہ کہ تم نے جنس تبدیل کروائی ہے اور لڑکا بنے ہو......"

انیق کڑوا سا گھونٹ بھر کر رہ گیا۔

میں نے اس گفتگو کو برخاست کرنا مناسب سمجھا اور سجاول کے ساتھ اٹھ کر باہر آ گیا۔ رائفلیں ہمارے کندھوں سے جھول رہی تھیں۔ حلمی نے ہمیں صورتِ حال سے آگاہ کیا اور بتایا کہ کس طرح ناقب اور اس کے ساتھی نے تہ خانے سے بھاگنے کی کوشش کی۔ کس طرح دوطرفہ فائرنگ میں ایک گاڑی کو آگ لگی اور موٹر سائیکلوں نے بھی آگ پکڑ لی۔ اس نے ناقب اور حارث کی ہلاکت کا بھی بتایا۔ بلکہ اس نے یہ بھی کہا کہ شاید حارث نے گرفتاری سے بچنے کے لیے خود کو گولی ماری ہے۔ دونوں لاشیں اٹھائی جا چکی تھیں۔ گارڈز میں سے دو افراد زخمی ہوئے تھے، انہیں اسپتال پہنچا دیا گیا تھا۔ حلمی یا کسی گارڈ کی بات سے بالکل یہ اشارہ نہیں ملا کہ کسی نے ہمیں ہنگامے کے دوران میں رہائشی حصے میں گھستے اور رضوان کو وہاں سے نکالتے دیکھا ہے۔

میں نے حلمی سے پوچھا۔ "وڈے صاحب اور اہلِ خانہ تو خیریت سے ہیں نا؟"

اس نے ملائیشین لہجے کی اردو میں جواب دیا۔ "بالکل خیریت سے ہیں۔ صرف مس سنبل اور ایک دوسری خواص دھوئیں کی وجہ سے کچھ دیر کے لیے بے ہوش ہو گئی تھیں۔ اب وہ بالکل ٹھیک ہیں۔"

آقا جان نے ہم سے کوئی بات نہیں کی۔ اس کی تیوری مسلسل چڑھی ہوئی تھی اور وہ کرخت لہجے میں گارڈز کو مختلف ہدایات دینے میں مصروف تھا۔ کچھ گارڈز ان نہایت قیمتی موٹر بائیکس کا معائنہ کر رہے تھے جو کچھ دیر پہلے ایک قطار میں کھڑی تھیں مگر اب یہاں وہاں پڑی تھیں اور جل کر ڈھانچوں کی شکل اختیار کر گئی تھیں۔

یہ ہنگامہ سرد ہوتے ہوتے رات کے بارہ بج گئے۔ قریباً ساڑھے بارہ بجے کا وقت تھا جب میں نے بند کمرے میں الماری کا دروازہ کھولا اور رضوان ٹی کو باہر نکالا۔ کھڑے کھڑے اس کی ٹانگیں اکڑ چکی تھیں۔ انیق بھی میرے ساتھ تھا۔ فی الحال ہم نے رضوان کو سجاول کے سامنے کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

رضوان کی حالت پتلی تھی۔ چہرے پر چوٹوں کے نشان ابھی تک موجود تھے۔ اس کا وزن کافی کم ہو چکا تھا۔ آنکھوں میں جیسے ایک ہراس سا جم کر رہ گیا تھا۔ میں نے اسے تسلی دی۔ ''اب گھبرانے کی بات نہیں۔ تم بالکل محفوظ ہو۔ پہلے نہا کر کپڑے بدلو، پھر اطمینان سے بات کریں گے۔''

''مجھے یقین نہیں آ رہا کہ میں آپ کو اور انیق کو یہاں اس عمارت میں دیکھ رہا ہوں...... یہ سب کیسے ہوا ہے؟...... اور یہ آگ......؟''

''میں نے کہا ہے ناں یہ ساری باتیں ہوں گی، پہلے فریش ہو جاؤ۔''

قریباً ایک گھنٹے بعد رضوان کافی بہتر حالت میں ہم دونوں کے سامنے بیٹھا تھا۔

میں نے کہا۔ ''پہلے تم بتاؤ، تم پر کیا بیتی؟''

رضوان نے اگلے پندرہ بیس منٹ میں رک رک کر اور آنکھوں کی نمی صاف کر کر کے جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ کچھ یوں تھا۔

ملنگی ڈیرے کی تباہی کے بعد مجاور کرنالی کی طرح ڈاکٹر ارم بھی اپنی جان بچانے اور بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ رضوان کو کھو کر وہ بالکل جنونی ہو رہی تھی۔ وہ اس کی تلاش میں چاند گڑھی جا پہنچی لیکن رضوان اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں سے نکل کر لاہور پہنچ چکا تھا۔ وہ اس کی ٹوہ لگاتی ہوئی لاہور چلی گئی۔ اس کے پاس رضوان کا ایک موبائل نمبر موجود تھا، وہ اس نمبر پر رضوان سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ اس نے فون پر رو رو کر رضوان کو بتایا کہ وہ اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس نے کہا۔ ''رضوان تم نے میرے ساتھ بہت برا کیا۔ مجھے زخم دے کر ڈیرے سے نکل گئے۔ میں وہاں اس واش روم میں مر بھی سکتی تھی لیکن تمہاری محبت نے مجھے زندہ رکھا۔ میں وہ سب کچھ بھولنے کو اور تمہیں معاف کرنے کو تیار ہوں۔ بس تم

میرے پاس واپس آجاؤ......"

رضوان اس کی شکل دیکھنے کا روادار نہیں تھا۔ اس نے اس کی غلامی میں بڑی اذیت جھیلی تھی مگر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ آسانی سے اس کا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ اس نے کہا۔ "ڈاکٹر، مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت دو۔"

وہ بولی۔ "میرے پاس آجاؤ، پھر جتنا چاہے سوچ لینا۔ میں تمہیں دیکھے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میرا ایک ایک پل کانٹوں پر گزر رہا ہے۔"

رضوان اس سے خوف زدہ تھا۔ اس نے ٹال مٹول کر کے ایک دو ہفتے گزارے پھر ڈاکٹر ارم کا فون سننا بند کر دیا۔ ہر بندے کی کوئی نہ کوئی مجبوری ہوتی ہے۔ رضوان کی بھی مجبوری اس کی ایک بہن تھی۔ اس کا نام مہرین تھا۔ وہ اس سے دو سال چھوٹی تھی اور اسے بہت پیاری تھی۔ اس کی شادی مظفر آباد میں ہوئی تھی۔ اس کا ایک بیٹا تھا اور وہ اپنے پراپرٹی ڈیلر خاوند کے ساتھ خوش تھی۔ مگر ایک بدقسمتی مہرین کا راستہ دیکھ رہی تھی۔ مہرین کا خاوند ابرار، پردے والی سرکار اور کرنالی وغیرہ کا مرید تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو اندھی بہری عقیدت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر ارم نے مجاور کرنالی کے ذریعے مہرین کے خاوند کو قابو کیا اور میاں بیوی کے درمیان زبردست قسم کا اختلاف پیدا کر دیا۔ ابرار کو یقین ہو گیا کہ مہرین اس پر تعویذ گنڈے کرا رہی ہے اور اس کی نیت میں فتور ہے۔ چند دن میں ہی مہرین کی مار کٹائی کی نوبت آ گئی۔

رضوان اس صورتِ حال سے آگاہ تھا اور بے حد حیران و پریشان تھا پھر ایک روز اسے اپنے سیل فون پر ڈاکٹر ارم کا ایک طویل ایس ایم ایس موصول ہوا۔ اس پیغام کا لب ولہجہ سخت تھا۔ ڈاکٹر ارم نے اس سے کہا کہ وہ فوراً اس سے ملے ورنہ مہرین کے سلسلے میں اس کی پریشانیاں بڑھتی جائیں گی۔ اس نے ڈھکے چھپے لفظوں میں رضوان کو بتایا کہ ہاتھ پاؤں چلانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ وہ جتنا پھڑکے گا جال سخت ہوتا جائے گا۔ وہ پہلی فرصت میں اس سے ملے۔

رضوان اس عورت کی خصلت بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ وہ اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آئی ہے اور اب کچھ بھی کر سکتی ہے۔ اپنی معصوم بے گناہ بہن کی زندگی کو عذاب بننے سے بچانے کے لیے وہ ایک دن ارم کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ رضوان نے "کم" بتایا۔ لیکن اس کے کم بتانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ میں سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ اپنی بہن کے سکھ کے بدلے رضوان نے بدترین اذیتیں جھیلنا قبول کر لیں۔ ڈاکٹر ارم پہلے اسے خوشاب لے گئی پھر وہاں سے پارا ہاؤس میں لے آئی۔ اپنے ایک جاننے والے کے ذریعے اسے پارا ہاؤس کے اسپتال میں ملازمت مل گئی تھی۔ وہ ہفتے

میں ایک بار فون پر اس کی بات اس کی بہن مہرین سے کروا دیتی تھی اور ساتھ ہی یہ بھی باور کرا دیتی تھی کہ اپنی بہن کی مسکراتی ہوئی آواز اسے تب تک ہی سنائی دے گی جب وہ بے دام کا غلام بنا رہے گا اور کسی بھی حکم پر چوں و چرا نہیں کرے گا۔

رضوان کی باتیں سن کر میری نگاہوں کے سامنے وہ سارا منظر گھوم گیا جو میں نے ڈاکٹر ارم کے قتل سے ایک رات پہلے اس کے اپارٹمنٹ میں دیکھا تھا۔ خوبرو رضوان کے لیے ارم کی محبت سراسر تشدد اور انتقام میں بدل چکی تھی۔ وہ اسے مسلسل نشے کے انجکشن لگا رہی تھی اور جانوروں سے بدتر سلوک کر رہی تھی اور پھر اس کے لیے قدرت کی لاٹھی حرکت میں آئی تھی۔ ارم کو کس نے قتل کیا اور کیوں؟ اس کا علم رضوان کو نہیں تھا۔ بہر حال وہ اس کی نگاہوں کے سامنے اپنی جان کی بازی ہاری تھی۔ اس رات وہ کچن میں ارم کے لیے سوپ تیار کرنے کے بعد اس کے کپڑے استری کر رہا تھا، اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ ارم سستانے کے لیے لیٹی ہوئی تھی اور اونگھ رہی تھی۔ رضوان نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ دو افراد تیزی سے اندر آ گئے۔ ان کے پیچھے دو اور داخل ہو گئے، ان کے چہروں پر اسکائی ماسک اور ڈھاٹے تھے۔ دو نے رضوان کو دبوچ لیا، دو نے اونگھتی ہوئی ارم کو چھاپ لیا۔ رضوان کو فرش پر گرا کر اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا گیا۔ رسّی تو پہلے ہی اس کے گلے میں جھول رہی تھی۔ اسی رسّی کے ساتھ رضوان کے ہاتھ پشت پر باندھ کر اور بری طرح دھکا کر اسٹور میں بند کر دیا گیا۔

ارم سخت مزاحمت کر رہی تھی۔ اسی مزاحمت کے دوران میں ایک حملہ آور کے چہرے سے نقاب کھسک گیا اور رضوان نے دروازے کے کی ہول سے اس کا چہرہ دیکھ لیا۔ وہ اسپتال کے سینئر گارڈز میں سے ہی ایک شخص تھا۔ بہر طور ہٹے کٹے گارڈز نے ارم کی ایک نہیں چلنے دی۔ انہوں نے کچن سے ہی ایک چھری حاصل کی اور اس کے پے در پے وار کر کے ارم کو لہولہان کر دیا۔ ہر وار پر اس کا جسم حملہ آوروں کی گرفت میں اچھلتا تھا اور وہ خود کو چھڑانے کی ناکام کوشش کرتی تھی۔ وہ ٹھنڈی ہو گئی تو حملہ آوروں نے اسے جوں کا توں چھوڑ دیا۔ اس کے بعد انہوں نے موقع واردات سے انگلیوں وغیرہ کے سارے نشانات صاف کیے۔ ان کی حرکات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اس خونی واردات کو کوئی اور رنگ دینا چاہ رہے ہیں۔ انہوں نے کچن میں کچھ برتن توڑے۔ رضوان کی کلائی کی ٹوٹی ہوئی گھڑی کو ارم کی لاش کے پاس گرایا اور اس طرح کے کچھ مزید اقدام کیے۔ ان کی گفتگو سے رضوان کو اندازہ ہوا کہ وہ اسے بھی مار دینا چاہتے ہیں لیکن وہ اس کی لاش یہاں نہیں چھوڑیں گے بلکہ اس کے لیے وہ لانڈری کی ایک بڑی ٹرالی اپنے ساتھ لائے ہیں اور اس کے جسم کو اس میں چھپا کر یہاں سے

نکال لے جائیں گے۔ خوش قسمتی سے رضوان کو اسٹور روم میں ایک ایسا ٹوٹا ہوا شیشہ مل گیا جس سے اس نے اپنے ہاتھ کی بندش کاٹ لیں اور ایک روشن دان کا اندرونی فریم اکھاڑ کر بھاگ نکلا۔ حملہ آوروں کو خبر ہونے تک وہ عقبی سیڑھیوں تک پہنچ چکا تھا۔ اس کا تعاقب کیا گیا مگر وہ گارڈینیا کی دو باڑیں پھلانگ کر پاراہاوس کے بڑے اسٹور روم تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا (بعد ازاں اس نے رہائشی حصے میں جا کر جس چھری سے سنبل کو دھمکایا تھا وہ اسے اسٹور روم سے ہی ملی تھی)

رضوان کی ساری رُوداد ہمیں معلوم ہو چکی تھی۔ اب اس کی آنکھوں میں گہرا تجسس نظر آرہا تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ ہم دونوں یہاں کیونکر اور کیسے پہنچے۔ میں نے اسے مختصراً احوال سنایا۔ میں نے چلتی گاڑی سے تاجور کے پیچھے چھلانگ لگائی تھی اور پھر ہم دونوں سجاول کے ٹھکانے پر پہنچ گئے تھے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کا بیشتر حصہ میں نے رضوان کے گوش گزار کیا۔

آخر میں رضوان نے پوچھا۔ ''اب سجاول صاحب کہاں ہیں؟''

انیق نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''اس شخص کے نام کے ساتھ صاحب لگانا ایسے ہی ہے جیسے گینڈے کو جناب عالی یا پھر ''یا حضرت'' کہہ کر بلانا۔ تم اسے سیدھا سیدھا امریش پوری کہہ سکتے ہو۔''

''اور وہ اس بات پر خوش ہو کر تمہیں سیدھا سیدھا قبر میں پہنچا دے گا۔'' میں نے رضوان سے کہا۔ رضوان سوالیہ نظروں سے کبھی میری اور کبھی انیق کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے رضوان کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس عاقبت نا اندیش کی باتوں پر نہ جانا۔ اس نے تو عنقریب سجاول کے ہاتھوں انا للہ ہونا ہے یا کم از کم چار چھ ہڈیاں تڑوا لینی ہیں۔''

انیق چہکا۔ ''آپ جب میری ہڈیاں ٹوٹنے کی بات کرتے ہیں تو مجھے فوراً پہلوان حشمت یاد آجاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ برے سے برے کام میں بھی اچھائی کا پہلو ہوتا ہے۔ میری ٹوٹ پھوٹ ہو گی تو پہلوان حشمت سے ملنے کا موقع تو پیدا ہو گا۔ یقین کریں ان کی کمی بڑی شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔ لگتا ہے کہ زندگی کی کہانی میں کوئی رنگ ہی نہیں۔''

''لیکن ہمیں رنگ نظر آرہے ہیں۔ تم اپنی چونچ ذرا بند رکھو۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا تو اس نے اداس اُلو کی طرح گردن جھکا لی۔

میں نے رضوان سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''اگر تمہیں کچھ لوگوں کی شکلیں دکھائی جائیں تو تم ان میں سے حملہ آور کا چہرہ پہچان لو گے۔ میرا مطلب ہے جس کا نقاب اس کے چہرے سے

کھسکا تھا؟''

''ایک سو ایک فیصد جی۔'' وہ مغموم لہجے میں بولا۔''میں وہ منظر کبھی بھول نہیں سکتا ہوں۔ڈاکٹر ارم دیوانوں کی طرح ہاتھ چلا رہی تھی۔اس کا منہ اتنی سختی سے ڈھانپا گیا تھا کہ اس کی آواز نکل نہیں پا رہی تھی۔اس نے استری اسٹینڈ کو گرانا چاہا تاکہ اسے گرا کر شور پیدا کر سکے لیکن ان لوگوں نے اسے قربانی والے بکرے کی طرح اٹھا کر فرش پر پٹخ دیا......''

میں رضوان کا خوب صورت چہرہ دیکھ رہا تھا۔اس کی بلوری آنکھوں میں تاسف تھا۔

''کیا تمہیں ڈاکٹر کی موت کا افسوس ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''شاید ہے۔بے شک اس نے بہت برا سلوک رکھا میرے ساتھ......لیکن کبھی کبھی وہ مجھے ڈاکٹر کے بجائے مریضہ لگتی تھی۔شاید اسے علاج کی شدید ضرورت تھی مگر وہ کسی کی سنتی ہی کب تھی۔وہ جس طرح دنیا سے گئی ہے اس کا مجھے ہمیشہ دکھ رہے گا۔اس کے علاوہ بہت پریشانی بھی ہے۔پتا نہیں ڈاکٹر کے قتل کی خبر کس طرح اس کے وارثوں تک پہنچے گی۔اگر ان لوگوں نے بھی یہی سمجھا کہ ڈاکٹر کو میں نے مارا ہے تو پھر......'' وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔ اس کے گلے میں جیسے پھندا سا لگ گیا تھا۔

میں اور انیق سمجھ گئے کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا تھا۔اس کے ذہن میں اپنی پیاری بہن کی تصویر تھی اور اس کے مستقبل کے اندوہناک اندیشے تھے۔

میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔''اگر تم اپنی بہن یا دوسرے وارثوں کی طرف سے فکر مند ہو تو یہ فکرمندی ذہن سے نکال دو۔ہم سب سنبھال لیں گے۔تم بس اپنی توجہ اس بات پر رکھو کہ ڈاکٹر ارم کے اصل قاتل کو پکڑوانا ہے۔''

رضوان نے ڈری ڈری اور الجھی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا۔''مجھے لگتا ہے جی کہ آپ اس قتل کی وجہ کے بارے میں کچھ نہ کچھ جانتے ہیں۔شاید یہ کوئی بہت سنگین معاملہ ہے۔''

''ہاں کچھ لوگوں کے لیے بہت سنگین ہے۔دراصل...... یہ ایک غلط ٹیسٹ رپورٹ کا معاملہ ہے۔اس غلط فہمی یعنی بوگس رپورٹ کی وجہ سے پارا فیملی کا ایک بڑا نقصان ہونے والا تھا۔سمجھو کہ اہلِ خانہ میں سے کسی کی قیمتی جان جانے والی تھی۔لگتا یہی ہے کہ ڈاکٹر ارم سے یہ بوگس رپورٹ تیار کروانے والے نے ہی اس کی جان لی ہے۔وہ اپنا جرم چھپانا چاہ رہا ہے اور وہ اس پارا ہاؤس کا ایک اہم ترین شخص ہے۔''

کچھ دیر بعد ہم نے سجاول کو بھی وہاں بلا لیا اور رضوان سے اس کا مکمل تعارف کرایا۔ سجاول کی نہایت دبنگ شخصیت نے رضوان کو بھی بے حد متاثر کیا۔وہ اس کے سامنے دبا دبا

نظر آنے لگا۔

سجاول سے مشورہ کر کے میں نے فوراً قادر خان کو سجاول والے پورشن میں بلایا۔ قادر خان میرا احسان مند تھا اور میری بات مانتے ہوئے ہر خطرہ مول لینے کو تیار ہو جاتا تھا۔ حالانکہ اسے معلوم تھا آقا جان کی نگاہ یہاں ہر معاملے پر بے حد سخت ہے پھر بھی جب میں نے اس سے کہا کہ مجھے اسپتال کے اردگرد موجود گارڈز کا ڈیٹا چاہیے تو اس نے ایک گھنٹے کے اندر اندر مجھے معلومات فراہم کر دیں۔ وہ اپنے سیل فون پر تقریباً پچیس سکیورٹی گارڈز کا ڈیٹا لے کر آ گیا۔ ہر گارڈ کی تصویر اور کوائف وغیرہ اس ڈیٹا میں موجود تھے۔

میں نے تنہائی میں رضوان سے کہا کہ وہ پوری یکسوئی سے ان تصاویر کو دیکھے اور معلوم کرے کہ جس گارڈ کو اس نے موقع واردات پر دیکھا وہ ان لوگوں میں موجود ہے یا نہیں۔

رضوان نے تصاویر دیکھنا شروع کیں۔ نویں دسویں تصویر پر ہی وہ بری طرح ٹھٹک گیا اور اس نے ایک تصویر پر انگلی رکھ دی۔

''یہی ہے وہ بندہ۔'' اس نے پورے یقین سے کہا۔

یہ بھاری مونچھوں والا ایک تیس بتیس سالہ شخص تھا۔ ناک غیر معمولی طور پر موٹی تھی اور بال پیشانی سے اُڑے ہوئے تھے۔ اسے دیکھ کر رضوان کا سفید رنگ زردی مائل ہو گیا تھا۔ یقیناً اسے قتل کی رات کے مناظر یاد آ گئے تھے۔

میں نے اس بندے کے کوائف دیکھے اس کا نام وحید تھا۔ ذات ڈوگر، سکنہ سمبڑیال لکھا ہوا تھا۔ رضوان نے باقی تصویریں بھی دیکھیں اور ایک بار پھر تصدیق کی کہ یہی وہ بندہ ہے جو قتل کی رات دیگر تین بندوں کے ساتھ ڈاکٹر ارم کے اپارٹمنٹ میں گھسا اور واردات میں شریک ہوا۔

میں نے فوراً دوبارہ قادر خان کو بلایا اور اسے وحید ڈوگر کی تصویر دکھا کر اس کے بارے میں پوچھا۔ قادر خان کو ابھی کچھ پتا نہیں تھا کہ ہم یہ چھان پھٹک کس لیے کر رہے ہیں۔ وہ تصویر دیکھ کر بولا۔ ''یہ تو آقا جان کا خاص الخاص بندہ ہے۔ بنگلے میں آقا جان کے باڈی گارڈز کے ساتھ بھی رہ چکا ہے۔ کوئی ایک مہینا پہلے اسے آقا جان نے ہی پارا ہاؤس میں شفٹ کرایا تھا۔''

اہم ترین بندہ ہمارے سامنے آ چکا تھا۔ اس کو چار چوٹ کی مار لگائی جاتی تو یہ سب کچھ بک سکتا تھا۔ مجھے اپنے جسم میں سنسناہٹ محسوس ہوئی۔ سجاول کا چہرہ بھی تمتما گیا۔ ہمیں لگا کہ آقا جان کے گرد گھیرا تنگ ہو رہا ہے۔

میں نے قادر خان سے کہا۔ ''اس بندے کا پتا کرو۔ یہ اس وقت کہاں ہے؟ لیکن اس کو کچھ پتا نہیں چلنا چاہیے۔ خاموشی سے آکر مجھے بتاؤ۔''

وہ بولا۔ ''شاہ زیب بھائی! مجھے پتا کرنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے پتا ہے کہ وہ پارا ہاؤس میں نہیں ہے۔ وہ بھاگ چکا ہے۔ اسے ڈھونڈا جا رہا ہے۔''

''ڈھونڈا جا رہا ہے؟'' میں ششدر رہ گیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک طرح کی مایوسی رگ و پے میں اترتی محسوس ہوئی۔

''جی ہاں، کوئی چار دن پہلے اس نے اسپتال کا لاکر کھولا۔ اس میں ڈاکٹروں اور نرسوں وغیرہ کی تنخواہ کے لیے تقریباً سات لاکھ روپے پڑے تھے۔ وہ نکال کر لے گیا۔ سچ کہتے ہیں کہ جب چوکیدار ہی چور بن جائے تو پھر سب کچھ ہو سکتا ہے۔ پولیس میں رپورٹ درج ہو گئی ہے اور اب اسے ڈھونڈا جا رہا ہے۔''

میں سر پکڑ کر رہ گیا۔ یہاں سازش کے تانے بانے بڑے گنجلک تھے۔ جرم کرنے والا ہر نشان مٹا رہا تھا۔ لگ یہی رہا تھا کہ اس وحید نامی بندے کو بھی جان بوجھ کر منظر سے ہٹایا گیا ہے۔ سازشی جان چکا تھا کہ دباؤ کس مہرے پر آسکتا ہے۔ اس نے بساط پر سے اس مہرے کو اوجھل کر دیا تھا۔ اور سازشی کون تھا؟ نوے فیصد امکان یہی تھا کہ وہ آقا جان ہی ہے۔

انیق نے کہا۔ ''ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ ایک جھوٹ کو چھپانے کے لیے سو جھوٹ بولنے پڑ جاتے ہیں۔ عالمگیر کی بددیانتی پر پردہ ڈالنے کے لیے اس کے پارٹنروں کو کیا کچھ کرنا پڑ رہا ہے۔''

سب کچھ ٹائیں ٹائیں فش تھا۔ ایک بار پھر ہم اسی جگہ کھڑے تھے جہاں ڈاکٹر ارم کے قتل کے وقت تھے۔ اگر رضوان کو کسی گواہی کے لیے پیش کیا جاتا تو شاید اس کی یہ گواہی تو مان لی جاتی کہ اس نے ڈاکٹر کی جان نہیں لی۔ مگر یہ دلیل ہرگز نہ مانی جاتی کہ ڈاکٹر کے قتل میں آقا جان ملوث ہے۔ اس کے لیے مضبوط تر ثبوت کی ضرورت تھی اور یہ ثبوت اس وحید ڈوگر نامی گارڈ کے اعترافی بیان سے ہی مل سکتا تھا۔ وہ گارڈ اب اوجھل ہو چکا تھا۔

رات کو میری ملاقات ایک بار پھر نوعمر ابراہیم سے ہوئی۔ وہ کافی کمزور اور پریشان نظر آتا تھا۔ اب وہ اپنے دل کی بات کھل کر مجھ سے کرنے لگا تھا اور یہ میری ایک بڑی کامیابی تھی۔ اس نے مجھے واضح لفظوں میں بتایا کہ وہ شادی نہیں کرے گا اور اگر کرے گا تو زینب سے کرے گا۔ اس نے مجھے اس نئی لڑکی کے بارے میں بھی بتایا جو زینب کے متبادل کے طور پر یہاں پہنچائی گئی تھی، وڈے صاحب کی خواہش تھی کہ ابراہیم اس لڑکی کو اپنی دلہن کے طور پر

قبول کر لے۔

ابراہیم نے مجھے اس کی تصویر دکھائی۔ وہ بھی وسطی پنجاب کے کسی علاقے کی لگتی تھی۔ اس نے حجاب کیا ہوا تھا۔ وہ درمیانی شکل وصورت کی تھی مگر مٹاپا واضح تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ مٹاپا پچھلے آٹھ دس ماہ میں ہی اس پر چڑھا تھا۔ غالب خیال یہی تھا کہ اسے IMMUNE والے زہر کی جو ڈوز دی جاتی رہی ہے، یہ اسی کا ردِعمل ہے۔ لڑکی کو ایک نظر دیکھ کر ہی کہا جا سکتا تھا کہ وہ ابراہیم کی دلہن بننے کے لائق نہیں ہے۔ مٹاپے کی وجہ سے اس کی آنکھیں چھوٹی اور ناک موٹی دکھائی دینے لگی تھی۔ خیر یہ تو ظاہری خامیاں تھیں لیکن اگر یہ لڑکی حسین وجمیل بھی ہوتی تو یقیناً ابراہیم اسے دلہن کے طور پر قبول نہ کرتا۔ دلہن کے طور پر اس کے دل ودماغ میں زینب پوری طرح نقش ہو چکی تھی۔

ابراہیم نے کہا۔ ''اس لڑکی کے بھی ٹیسٹ ہوئے ہیں۔ طبی لحاظ سے تو یہ میرے لیے تقریباً فٹ ہے لیکن میں اس سے شادی کا سوچ بھی نہیں سکتا اور میں نے والد اور والدہ کو یہ بات صاف بتا دی ہے۔''

''کیا آپ چاہتے ہیں کہ اب زینب کو دوبارہ زہر کی ڈوز دی جائے اور تیار کیا جائے؟''

اس نے اپنا ماتھا مسلا۔ ''میں کچھ بھی نہیں چاہتا۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آتا۔''

''ابراہیم! مسئلے کا وہ حل سوچو جو تمہارے لیے اور تمہاری بیوی کے لیے مستقبل میں مسئلے پیدا نہ کرے۔''

''آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟''

''شاید آپ سے کچھ باتیں چھپائی بھی جا رہی ہیں یا ان کو غلط طریقے سے بیان کیا جا رہا ہے۔ آپ زیادہ دور نہ جائیں۔ نیٹ پر ہی جا کر دیکھ لیں۔ آپ کو پتا چل جائے گا کہ اس قسم کی IMMUNITY رکھنے والوں کی اولاد میں بھی زبردست میڈیکل پیچیدگیاں نمودار ہو سکتی ہیں۔ آپ ایک پوری نسل کو ایک طبی مسئلے سے دوچار کر سکتے ہیں۔''

''یہ سب کچھ میرے ذہن میں بھی آتا ہے، اسی لیے تو میں زینب کو ذہن سے نکالنے کی کوشش کر رہا ہوں......مگر......''

وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا مگر اس کے تاثرات وہ سب کچھ بتا رہے تھے جو وہ کہنا چاہتا تھا۔ وہ کہنا چاہتا تھا، وہ سادہ سی گم صم سی لڑکی میرے اندر بہت گہرائی تک اتر چکی ہے۔ وہ میرے قریب آتے آتے مجھ سے بہت دور چلی گئی ہے۔ اب میں اسے ذہن سے نکال نہیں

سکتا۔ جتنا اس کی سوچوں سے دور بھاگتا ہوں اتنا ہی وہ مجھ کو گھیر لیتی ہیں۔
میں نے قیمتی صوفے پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ''ابراہیم! آپ مجھے دل کے بہت اچھے لگے ہیں۔ میں بھی آپ کے بارے میں سوچتا ہوں۔ آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں لیکن میں تب ہی کچھ کرسکوں گا جب آپ مجھے اس مسئلے کی بنیاد کے بارے میں بتائیں گے۔ آپ کے والدین آپ سے اتنا پیار کرتے ہیں، اس کے باوجود وہ آپ کو کھانے میں زہر کیوں دیتے ہیں۔ یقیناً اس کے پیچھے کوئی خاص مجبوری ہی ہوگی۔ میں اس مجبوری کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔''
ابراہیم کے دبلے پتلے چہرے پر ایک بار پھر شدید تذبذب نظر آیا۔ اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری اور الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔
میں نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''ابراہیم! میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں، آپ جو کچھ بتائیں گے، ہمیشہ میرے سینے میں رہے گا۔ اگر میں اپنے وعدے سے پھروں تو آپ میری جان لے لیجیے گا۔''
میں نے کچھ ایسے اخلاص سے کہا تھا کہ وہ چونک کر میری جانب دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر نیم رضامندی کے آثار نظر آنے لگے۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر کچھ دیر تمہید باندھنے میں صرف کی اور مجھ سے دوبارہ رازداری کا عہد لیا۔ اس کے بعد بولا۔ ''آپ نے والد صاحب کو دیکھا ہے۔ ان میں آپ کو کیا علیحدہ چیز نظر آتی ہے؟''
میں نے ذرا توقف کر کے کہا۔ ''ان کے چہرے پر اور جلد پر سرخ داغ......؟''
''یہ داغ پیدائشی نہیں ہیں اور نہ کسی بیماری کی وجہ سے ہیں......''
اچانک ابراہیم کے سیل فون پر کال کے سگنل آئے۔ اس نے اسکرین دیکھنے کے بعد کال ریسیو کی اور بات کرنے لگا۔ وہ ملائی زبان میں بول رہا تھا۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ اپنی والدہ بڑی بیگم سے بات کر رہا ہے۔ کوئی اہم ایشو تھا۔ ابراہیم کے چہرے سے بھی پریشانی مترشح تھی۔
مجھے لگا کہ شاید اسی شادی اور زینب والے معاملے پر بات ہو رہی ہے لیکن جلد ہی یہ اندازہ غلط ثابت ہوگیا۔ کہیں کہیں انگلش کے الفاظ بھی استعمال ہو رہے تھے۔ ان الفاظ سے پتا چلا کہ یہ پرسوں پیش آنے والا وہی سنگین معاملہ ہے جس میں ناقب اور اس کے ساتھی حارث کو ہلاک کر دیا گیا تھا۔ ان دونوں افراد کے حوالے سے وڈے صاحب اور شاید بڑی بیگم بھی نرم رویہ اختیار کرنا چاہتے تھے مگر آقا جان نے انہیں مار ڈالا تھا۔ اس کا یہ اقدام اگر

درست بھی تھا تو بھی اس کے نتیجے درست نکلنے والے نہیں تھے۔ یوں لگتا تھا کہ ابراہیم اور اس کی والدہ دونوں ڈرے ہوئے ہیں اور شاید دیگر اہلِ خانہ کا بھی یہی حال ہے۔ ایسے محسوس ہوتا تھا کہ وہ کسی ایسے شخص سے ڈر رہے ہیں جو ان سے کہیں زیادہ طاقتور ہے اور انہیں اس اقدام کی سزا دے سکتا ہے۔

اس گفتگو کے بعد ابراہیم کا موڈ کافی خراب ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھوں میں ہلکی سی لرزش بھی ہے۔

اس نے بے چینی کے عالم میں اپنی نوخیز ڈاڑھی میں انگلیاں چلائیں۔ پھر میری طرف دیکھ کر بجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''آپ ابھی جائیں۔ پھر بات کریں گے۔''

میں نے اٹھ جانا مناسب سمجھا اور اس کے عالیشان کمرے سے نکل کر کوریڈور میں آ گیا۔

پارا ہاؤس کے اندر بہت کچھ اسرار میں پنہاں تھا۔ بھاری دبیز پردوں کے پیچھے کوئی انجانی کہانی چل رہی تھی۔ اب آہستہ آہستہ یہ بات کھل رہی تھی کہ آقا جان ہی یہاں کرتا دھرتا کا کردار ادا کر رہا تھا۔ اس میں بہت سی خامیاں بھی تھیں لیکن وہ ان خامیوں کو کمال ہوشیاری سے اوجھل رکھتا تھا اور جو خامیاں اہلِ خانہ کی نظر میں آ بھی جاتی تھیں، ان سے چشم پوشی کی جاتی تھی۔

کوریڈور کے آخری سرے پر آقا جان سے آمنا سامنا ہوا۔ اس نے مجھے کڑی نظروں سے گھورا لیکن بولا کچھ نہیں۔ ابراہیم سے میرا بڑھتا ہوا تعلق اسے بالکل پسند نہیں تھا۔ کوریڈور کے آخری سرے سے تھوڑا آگے، بڑے فوارے کے پاس حلمی اور کمال احمد کھڑے دکھائی دیئے، ان کے چہروں پر بھی گہری سنجیدگی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ پارا ہاؤس کے سارے اہم لوگ کسی پریشانی میں مبتلا ہیں اور یہ پریشانی پرسوں سرغنہ ناقب اور حارث کی ہلاکت کے بعد شروع ہوئی تھی۔

مجھے کچھ جھنجلاہٹ بھی ہو رہی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میرے اور ابراہیم کے درمیان کافی اچھا ماحول بنا ہوا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ ابراہیم زہرخورانی والے اسرار پر سے پردہ اٹھانے پر رضامند ہو گیا ہے مگر بڑی بیگم کی کال نے سارا معاملہ چوپٹ کر دیا تھا۔ ابراہیم نے بات شروع کرتے ہوئے ان سرخ داغوں کا ذکر کیا تھا جو وڈے صاحب کے جسم پر پائے جاتے تھے۔ میرے علم میں اب تک یہی تھا کہ چند برس پہلے وڈے صاحب کو کوئی عارضہ لاحق ہوا تھا جس کے بعد اس کے جسم پر یہ داغ نمودار ہوئے اور اس کی قوت سماعت پر بھی اثر پڑا۔ لیکن اب ابراہیم نے تھوڑی دیر پہلے کہا تھا کہ یہ داغ کسی بیماری کا نتیجہ نہیں ہیں، تو کیا ان کا

تعلق زہر خورانی سے تھا؟

ابھی میں کوریڈور سے چند قدم ہی آگے گیا تھا کہ ٹھٹک کر رک گیا۔ رہائشی حصے کی طرف سے ایک دم رونے کی آوازیں بلند ہوئیں۔ یوں لگا جیسے ایک ساتھ کئی عورتوں نے نوحہ بلند کیا ہو۔ آوازیں مدھم تھیں مگر مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ ان میں شاید بڑی بیگم کی آواز بھی ہے۔

میں نے دیکھا کوریڈور کے آخری سرے پر کھڑے آقا جان کا چہرہ دھواں سا ہو گیا ہے۔ وہ تیزی سے اندرونی حصے کی طرف چلا گیا پھر شاید دروازے وغیرہ بند کر دیئے گئے تھے، آوازیں معدوم ہو گئیں۔

میرے ذہن میں وہی چند منٹ پہلے والے مناظر آ گئے۔ ابراہیم بڑی پریشانی کے عالم میں والدہ سے باتیں کر رہا تھا اور میرے قیافے کے مطابق اس گفتگو کا تعلق سرغنہ ناقب اور اس کے ساتھی کی موت سے ہی تھا۔ تو کیا ابھی تھوڑی دیر پہلے جو آہ و فغاں بلند ہوئی تھی اس کا تعلق اسی واقعے سے جڑتا تھا۔

میں، انیق اور سجاول کے پاس واپس پہنچا۔ وہ جاننا چاہ رہے تھے کہ میرے اور ابراہیم کے درمیان کیا گفتگو ہوئی ہے لیکن میں نے انہیں جو کچھ بتایا اس نے انہیں حیران کیا۔

میں نے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ آقا جان نے دلیری دکھاتے ہوئے ناقب اور حارث کو مار تو ڈالا ہے لیکن اس کا نتیجہ پارا ہاؤس والوں کے لیے اچھا نہیں نکلا۔ وہاں اندر رونا پیٹنا مچا ہوا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے کوئی خاص واقعہ ہو گیا ہے۔''

''کہاں؟'' سجاول نے پوچھا۔

''ہو سکتا ہے کہ یہاں ہوا ہو...... یا پھر برونائی میں......لیکن ہوا ضرور ہے۔''

''شاید سنبل کچھ بتا سکے۔'' انیق نے کہا۔

سجاول تڑخ کر بولا۔ ''تم ایسا کرو کہ جا کر اپنی اس اماں کی گود میں ہی بیٹھ جاؤ۔ وہ جو جو جانتی جائے گی، تم کو بتاتی جائے گی۔ تمہارے دماغ میں شاید گوبر بھرا ہوا ہے، اگر ہم اس طرح ہر جگہ تمہاری اس والدہ (سنبل) کا استعمال کریں گے تو وہ پکڑی جائے گی اور سب جوتے کھا کر یہاں سے نکلیں گے۔''

سجاول کی بدزبانی سے انیق کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ اپنے غصے کو دباتے ہوئے بولا۔

''سردار! ماں بہن کو بیچ میں نہ لاؤ۔ یہ ٹھیک نہیں ہے......''

''اوئے خنزیر کے بچے، آگے سے زبان چلاتا ہے۔'' سجاول پھٹ پڑا۔

اس سے پہلے کہ وہ انیق کا گریبان پکڑ لیتا اور کوئی خطرناک کارروائی شروع ہو جاتی۔

میں دونوں کے درمیان آ گیا۔ میں نے گرانڈیل سجاول کو اپنی بانہوں میں لے لیا اور انیق کو اشارہ کیا کہ وہ باہر نکل جائے۔ وہ فوراً میری ہدایت پر عمل کرتا تھا مگر اس مرتبہ اس نے نہیں کیا۔ غصے بھرے لہجے میں بولا۔ ''شاہ زیب بھائی! گالی مجھ سے برداشت نہیں ہو گی۔ آپ سردار کو سمجھا لیں۔''

''اوئے چٹنی بنا دوں گا تیری...... دفع ہو جا یہاں سے۔''

''جا رہا ہوں۔'' وہ طیش سے بولا اور باہر نکل گیا۔ اسے بہت کم غصہ آتا تھا لیکن آخر انسان تھا۔ آج چیخ گیا تھا۔

اگلا آدھ گھنٹا میں نے علیحدہ علیحدہ سجاول اور انیق کو سمجھانے بجھانے میں صرف کیا۔ معاملہ کسی حد تک سنبھل گیا۔ سجاول نے زور دیا کہ جب وہ بات کر رہا ہو تو انیق بیچ میں نہ بولا کرے۔ میری اس مفاہمتی گفتگو کے دوران میں ہی چند گاڑیاں تیز رفتاری سے پارا ہاؤس میں داخل ہوئیں۔ سیاہ رنگ کی شاندار بیوک کو دیکھ کر میں پہچان گیا کہ نوجوان سیاست زادہ شکیل داراب ''تشریف'' لایا ہے۔ ہم نے کافی فاصلے سے اسے دیکھا۔ وہ کریم کلر کے پینٹ کوٹ میں تھا۔ اردگرد باوردی گارڈز تھے اور ہٹو بچو کا شور تھا۔ وہ بڑے تیز قدم اٹھاتا ہوا اندرونی حصے میں اوجھل ہو گیا۔ اس کی آمد یقیناً پارا ہاؤس کی موجودہ صورتِ حال اور ہر دم بڑھتی ہوئی بے چینی کے حوالے سے ہی تھی۔

بند دروازوں اور بھاری پردوں کے پیچھے کچھ ہو رہا تھا۔ کوئی ہلچل سی تھی۔ میں نے سوچا کہ جاناں کو فون کروں شاید وہ کچھ جان گئی ہو لیکن یہاں فون کرنا ہرگز خطرے سے خالی نہیں تھا۔ کال ٹریس اور ریکارڈ ہو سکتی تھی۔ بہرحال ہماری یہ مشکل ایک اور طرح سے آسان ہو گئی اور اس طرح آسان ہوئی کہ ہم خود بھی دنگ رہ گئے۔ شکیل داراب اور پارا ہاؤس کے بڑوں کے درمیان ہونے والی گفتگو رات قریباً دس بجے تک جاری رہی۔ اس دوران میں دو تین اور قیمتی گاڑیاں بھی پارا ہاؤس میں آئیں اور باہر گئیں۔ ایک گاڑی نے مسلسل کئی چکر لگائے۔

رات قریباً ساڑھے دس کا عمل تھا جب انچارج گارڈ قادر خان ہمارے پاس پہنچا اور اس نے ہمیں اطلاع دی کہ محترم شکیل داراب صاحب ہم سے ملنا چاہتے ہیں۔ یہ غیر متوقع صورتِ حال تھی۔ بہرحال اتنا یقین تو مجھے تھا کہ جلد یا بدیر شکیل سے تفصیلی ملاقات ہونی ہے۔ مہمان خانے میں شکیل داراب کی آمد کی خبر نے جیسے ہلچل سی مچا دی۔ فالتو دروازے بند کر دیئے گئے، سکیورٹی الرٹ ہو گئی۔ قریباً پانچ منٹ بعد گورا چٹا، وجیہہ شکیل داراب ہمارے درمیان موجود تھا۔ آج پہلی بار میں اسے کچھ منتشر اور تھکا ہوا دیکھ رہا تھا۔ اس کی سرمئی ٹائی کی

ناٹ ڈھیلی تھی اور بال کچھ بکھرے ہوئے تھے۔

''کیسے ہو شاہ زیب؟'' اس نے مجھ سے پوچھا۔

''جیسا بھی ہوں، آپ کے سامنے بیٹھا ہوں۔''

وہ بولا۔ ''تم سے پوچھنے کو تو بہت کچھ ہے۔ مثلاً یہ کہ وعدے کے مطابق تم ڈنمارک واپس کیوں نہیں گئے۔ چاند گڑھی میں تم کیا کرتے رہے ہو؟ اور سجاول کے ساتھ تمہارا تعلق کب اور کیسے بنا؟ لیکن میں یہ سب کچھ نہیں پوچھوں گا۔ سمجھو کہ حالات ہی کچھ ایسے ہو گئے ہیں کہ میں ان باریکیوں میں پڑنا نہیں چاہتا۔''

میں نے کہا۔ ''پہلے آپ مجھے یہ بتائیں کہ پارا ہاؤس میں خیریت تو ہے ناں۔ میں نے کچھ دیر پہلے اندر سے رونے دھونے کی آواز سنی تھی۔ دل میں وسوسے اٹھ رہے ہیں۔''

''پارا ہاؤس میں تو خیریت ہی ہے لیکن کہیں اور پر خیریت نہیں ہے۔ ایک بڑا فساد ہو گیا ہے۔ ایک اہم شخص کی موت بھی ہوئی ہے جس کی وجہ سے پارا ہاؤس کے اندر سوگ کی کیفیت ہے۔ میں اسی سلسلے میں تم سے اور سجاول سے ایک اہم بات کرنے آیا ہوں۔''

''آپ کہیں۔ ہم سن رہے ہیں۔'' سجاول بولا۔

شکیل نے ذرا چونک کر سجاول کی طرف دیکھا۔ جیسے پہلی دفعہ اس کی طرف متوجہ ہوا ہو۔ گہری سانس لے کر بولا۔ ''لالہ نظام اکثر تمہارا نام لیا کرتا تھا، اب اس کا بھائی وریام تمہارا نام لیا کرتا ہے۔ وہ دونوں بتاتے ہیں کہ تم کام کے بندے ہو۔ یہاں پارا ہاؤس پر جو حملہ ہوا تھا اس میں، میں نے خود بھی تمہاری اور شاہ زیب کی کارکردگی دیکھی ہے۔ میں بہت خوش ہوا ہوں۔''

سجاول نے کہا۔ ''میں بھی لالہ نظام اور وریام سے آپ کا نام سنتا رہا ہوں اور آپ تو ویسے بھی ایک مشہور سیاست دان ہو۔ آپ کی تصویریں اخبار اور ٹی وی پر بھی آتی رہتی ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ کسی نہ کسی دن آپ سے ملاقات ضرور ہوگی لیکن اس طرح ہوگی یہ پتا نہیں تھا۔ ناقب وغیرہ نے جب دوسری منزل پر آپ کو گن پوائنٹ پر رکھا ہوا تھا، میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ آپ کو اس حالت میں یہاں سے نکلنے نہیں دوں گا۔''

شکیل نے تعریفی نظروں سے اسے دیکھا۔ میں اندر ہی اندر حیران ہو رہا تھا۔ شکیل دارا ب عوامی نمائندہ ہونے کا دعویدار تھا۔ لوگوں کو دن رات اخلاق اور انسانیت کے بھاشن دیتا تھا، لیکن ایک ڈکیت سے اس کے ناتے تھے۔ براہِ راست نہ سہی، لالہ نظام اور وریام کے ذریعے سہی لیکن سجاول کہیں نہ کہیں شکیل کی گڈ بکس میں تو تھا اور یہ سجاول اَن گنت بے

گناہوں کا خون کر چکا تھا، لوگوں کا مال و جان اور عزت اس کی ٹھوکروں میں رہتی تھی۔ وہ سجاول کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے کوئی اپنے ہاتھوں میں آنے والے گوہر نایاب کو دیکھتا ہے اور سجاول اسے ایسے دیکھ رہا تھا جیسے کوئی پرستار کسی بہت بڑے فنکار کا دیدار کرتا ہے اور دیکھا جائے تو دونوں قریب قریب ایک ہی ''فیلڈ'' سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک اپنے بول بچن اور وعدوں کے ذریعے عوام الناس کو لوٹتا تھا اور دوسرا ہتھیاروں کے ذریعے۔

شکیل نے امپورٹڈ سگریٹ نکال کر اپنے سرخ و سپید ہونٹوں میں دبایا اور ایک نہایت قیمتی لائٹر نکالا جس میں ڈائمنڈ لگا ہوا تھا۔ اس نے سگریٹ سلگایا اور بڑی نفاست سے کش لے کر بولا۔ ''ریان فردوس صاحب ایک بڑی مشکل میں ہیں۔ برونائی میں ان کی پرانی خاندانی دشمنی ہے۔ اس دشمنی کی وجہ سے ہی وہ اپنا وطن چھوڑ کر یہاں پاکستان آئے اور اس دور دراز جگہ پر خود کو ایڈجسٹ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن ان لوگوں نے یہاں بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ تازہ ترین واقعہ وہی ہے جو چند دن پہلے تم لوگوں کے سامنے ہوا۔ ناقب اور اس کے تین ساتھی یہاں پاکستان پہنچے۔ پوری سازش تیار کی اور پارا ہاؤس پر ہلا بول دیا۔ ان کے ارادے نہایت خطرناک تھے۔ وہ بڑی بیگم کو اغوا کرنا چاہ رہے تھے۔ ناکامی کے بعد انہوں نے ابراہیم کو اغوا کیا اور کسی نامعلوم جگہ پر لے جانے کی کوشش کی۔ یہ ایک نہایت سنگین کارروائی تھی جو ناکام ہوئی اور اس کو ناکام بنانے میں تم لوگوں کی ہمت کا بھی بہت دخل ہے۔''

شکیل داراب نے ذرا توقف کر کے اپنے قیمتی سیل فون کو چیک کیا اور اسے سائیلنٹ پر کرتے ہوئے بولا۔ ''ناقب اور اس کا ساتھی حارث پکڑے گئے تھے۔ ریان فردوس صاب ان کو سزا دینا چاہتے تھے لیکن زیادہ سخت نہیں۔ درحقیقت وہ اپنے دشمنوں سے ہمیشہ بہت محتاط رہے ہیں۔ وہ ان کی فطرت کو بڑی اچھی طرح جانتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جیسے تیسے وقت گزرتا رہے۔ لیکن کبھی کبھی حالات اپنی مرضی کے رخ پر خود ہی چل نکلتے ہیں۔ یہاں پارا ہاؤس میں بھی یہی کچھ ہوا ہے۔ ناقب اور حارث نے موقع پا کر تہ خانے سے بھاگنے کی کوشش کی اور مارے گئے۔ ان کی موت کی وجہ سے وہاں برونائی میں شدید ردِعمل ہوا ہے......''

اس موقع پر میرا دل چاہا کہ شکیل داراب کو اپنی معلومات سے آگاہ کروں اور اسے بتاؤں کہ یہ واقعہ ہوا نہیں ہے بلکہ اسٹیج کیا گیا ہے اور اس کا ذمے دار یقیناً آقا جان ہے لیکن مجھے ٹھیک سے اندازہ نہیں تھا کہ میرے اس انکشاف کا ردِعمل کیا ہوگا، یا ہوگا بھی کہ نہیں، لہٰذا میں نے خاموش رہنا مناسب سمجھا۔ سجاول بھی میری طرف دیکھ کر خاموش رہا۔

شکیل داراب اپنی بات جاری رکھے ہوئے تھا، اس نے کہا۔ ”ریان فردوس صاحب کے اندیشے کے عین مطابق مخالفوں کا ردِعمل شدید ہوا ہے۔ انہوں نے ایک قریبی جزیرے میں بڑی کارروائی کی ہے اور ریان صاحب کے مفادات کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ تم یوں سمجھ لو کہ ریان صاحب کی ہزاروں ایکڑ اراضی مع عمارات اور تنصیبات، مخالف گروپ کے قبضے میں چلی گئی ہے۔ دوطرفہ لڑائی میں کافی جانی نقصان بھی ہوا ہے۔ مرنے والوں میں بڑی بیگم کا سگا بھائی آدم بھی شامل ہے جو ریان صاحب کے بعد برونائی میں سارا انتظام وانصرام چلا رہا تھا۔ آدم کی موت نے اہلِ خانہ کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ یہ لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ اگر اب بھی امن اور صلح کی تلاش میں رہے تو سب کچھ کھو دیں گے۔ اب ان کے پاس ٹکر لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا۔“

شکیل خاموش ہوا تو سجاول نے کہا۔ ”آپ جو کچھ بتا رہے ہیں اس سے تو واقعی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مخالف ہر صورت میں وڈے صاحب اور ان کے خاندان کا جینا حرام کرنا چاہتے ہیں۔ برونائی سے ہزاروں میل دور یہاں آ کر بھی ان پر کارروائیاں ڈال رہے ہیں۔“

شکیل داراب پُرسوچ لہجے میں بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ ریان فردوس صاحب اور ان کے بیٹوں کو کچھ ایسے باہمت اور وفادار ساتھیوں کی ضرورت ہے جو ان کے دائیں بائیں کھڑے ہو سکیں۔ بے شک تنخواہ دار ملازموں کی ایک پوری فوج ان کے پاس موجود ہے، لیکن تنخواہ دار ملازموں اور جاں نثار ساتھیوں میں فرق ہوتا ہے۔ میری ایک خواہش ہے، اگر تم لوگ مانو تو......“

”جی آپ فرمائیں۔“ سجاول نے کہا۔

”میں چاہتا ہوں کہ تم لوگ ریان فردوس صاحب کا ساتھ دو...... اور ان چند لوگوں میں شامل ہو جاؤ جو تنخواہ دار نہیں بلکہ واقعی ریان فردوس صاحب کے وفادار ساتھی ہیں اور دل و جان سے اس فیملی کی بھلائی چاہتے ہیں۔“

میں اور سجاول ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ انیق بھی خاموشی سے صورتِ حال کا جائزہ لے رہا تھا۔ شکیل نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ بات تو تم بھی جان گئے ہو گے کہ اس فیملی کے پاس روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں ہے۔ وہ اپنے دوستوں اور ساتھیوں کو ان کی توقعات سے کہیں بڑھ کر نوازتے ہیں۔“

پھر شکیل داراب نے نیا سگریٹ سلگایا اور سجاول کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ”ویسے بھی تمہارے ساتھ اس فیملی کا معاملہ کچھ اور طرح کا ہو گیا ہے۔ بڑی بیگم تمہیں بہت زیادہ اہمیت

دیتی ہیں، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ تمہیں اپنے عزیزوں کی طرح سمجھنے لگی ہیں۔ اگر اس مشکل وقت میں تم ان لوگوں کا ساتھ دو گے تو تمہاری عزت توقیر اور بڑھ جائے گی۔"

سجاول نے اپنی مونچھوں کو سہلایا اور اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ "معافی چاہتا ہوں جی، مجھے عزت و توقیر کی کوئی ایسی تمنا نہیں ہے اور میں اپنی اصل بھی بڑی چنگی طرح جانتا ہوں، جس دن آپ نے ان لوگوں کو بتا دیا کہ میں مسٹر سجاول نہیں ڈکیت سجاول ہوں، تو یہ میرے سائے سے بھی بدکیں گے۔"

"لیکن میں کیوں بتاؤں گا؟" شکیل نے کہا۔ "اگر بتانا ہوتا تو اسی دن بتا دیتا جب تمہیں پہلی بار پاراہاؤس میں دیکھا تھا۔ یہ سوچ ذہن سے نکال دو کہ یہ بات کبھی میری زبان پر آئے گی۔"

"لیکن جناب، یہ کوئی راز رہنے والی بات تو نہیں ہے۔ آج یا کل یا ایک دو ماہ بعد یہ بات کسی نہ کسی طرح ان لوگوں کے کانوں میں پڑ ہی جانی ہے کہ میری اصل کیا ہے۔"

شکیل داراب نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ "دیکھو سجاول! میرا تم کو ایک مشورہ ہے۔ ابھی تم اس بارے میں بالکل خاموش رہو، جس طرح چل رہا ہے، اس کو چلنے دو۔ مجھے یقین ہے کہ تم بہت زیادہ فائدے میں رہو گے...... بلکہ تم دونوں۔" اس نے میری طرف دیکھا۔

شکیل داراب کی آنکھوں میں بلا کی ذہانت چمک رہی تھی اور وہ سیاست دان تھا جو اُڑتی چڑیا کے پر گنتا تھا اور وقت سے پہلے حالات کے درست اندازے لگا لیتا تھا۔ سجاول بے حد دبنگ ہونے کے باوجود شکیل کی شخصیت سے مرعوب تھا۔ اس نے شکیل سے زیادہ بحث مباحثہ مناسب نہیں سمجھا اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ "شکیل صاحب، ہمیں ریان فردوس صاحب کے لیے کیا کرنا ہوگا؟"

"ان کے ساتھ برونائی جانا ہوگا۔ آقا جان اور حلمی بھی ساتھ ہوں گے۔ یہ لوگ پہلے بات چیت کے ذریعے معاملہ حل کرنے کی کوشش کریں گے...... دوسری صورت میں مخالف گروپ کو سبق سکھایا جائے گا...... اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس کے لیے جزیرے کے حالات بہت سازگار بھی ہیں۔ وہاں بے شمار لوگ ہیں جو مخالف گروپ کی کارستانیوں سے تنگ ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ریان فردوس صاحب واپس آئیں اور ایک دفعہ ان کے درمیان کھڑے ہو کر مخالفوں کو منہ توڑ جواب دیں۔"

شکیل نے اپنی گفتگو میں دو تین بار جزیرے کا لفظ استعمال کیا تھا۔ میں نے اس بارے میں پوچھا تو شکیل نے بتایا کہ برونائی کے ساحل سے کچھ فاصلے پر یہ ایک بڑا جزیرہ ہے جو دو

تین نسلوں سے ریان فردوس کے خاندان کی ملکیت ہے۔ اب اس کے ایک حصے پر کچھ اور لوگ ناجائز قبضہ کیے ہوئے ہیں اور اس قبضے کو بڑھا رہے ہیں۔“

میں نے ان ”کچھ اور لوگوں“ کی تفصیل پوچھی تو ہم پر پہلی بار یہ انکشاف ہوا کہ وڈے صاحب ریان فردوس نے دو شادیاں کی تھیں۔ یعنی ان کی باقاعدہ شادیوں کی تعداد دو تھی۔ بڑی بیگم درحقیقت وڈے صاحب کی دوسری بیوی تھی۔ پہلی بیوی سے ایک بیٹا تھا اور اب وہی بیٹا وڈے صاحب کا دشمن نمبر ایک بنا ہوا تھا۔ وہ بے حد غصیلا اور چالباز شخص تھا۔ ابراہیم اور کمال احمد وغیرہ میں ہرگز اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ اپنے اس سوتیلے بھائی کی ریشہ دوانیوں کا سامنا کرسکیں۔ وڈا صاحب خود بھی عمر کے اس حصے میں تھا کہ اس میں عافیت پسندی آچکی تھی۔

شکیل داراب سے ہماری گفتگو قریباً ایک گھنٹا جاری رہی۔ اسی دوران میں موبائل فون سائیلنٹ ہونے کے باوجود اسلام آباد سے اس کی ایک ضروری کال آگئی اور اسے جانا پڑا۔ بہرحال اس نے کہا کہ وہ کل دوپہر تک واپس آجائے گا اور اس بارے میں مزید بات ہوگی۔ اس نے جانے سے پہلے مجھ سے میرے سارے کوائف مانگے اور ان کو ایک کاغذ پر درج کیا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ میں سجاول اور انیق سے ان کے کوائف یا شناختی کارڈز کی کاپیاں لے لوں۔ ان کی ضرورت پڑسکتی ہے۔ (جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ کوائف سفری کاغذات کی تیاری کے لیے حاصل کیے گئے تھے)

شکیل داراب کے جانے کے بعد میں اور سجاول پھر سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ سجاول کا خیال تھا کہ خوامخواہ قربانی کا بکرا نہ بنا جائے۔ سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا جائے اور ان حالات کے بارے میں جاننے کی کوشش کی جائے جو ہمیں وہاں پیش آسکتے ہیں۔ ہماری اس گفتگو کے دوران میں ہی جاناں کی کال آگئی۔ وہ بنگلے میں میری بیوی کی حیثیت سے موجود تھی اور گاہے بگاہے مجھ سے ٹیلی فونک رابطہ کرتی رہتی تھی، اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ ”شاہ زیب! یہ عالمگیر کون ہے؟“

میں چونک گیا۔ ”کیوں، کیا بات ہے؟ تم نے یہ نام کہاں سنا؟“

”بس سمجھیں کہ کانوں میں پڑ گیا۔ میرے جسم کا ہر حصہ آپ کی خدمت میں ہی تو لگا رہتا ہے۔ کل آقا جان اور میڈم باتیں کررہے تھے۔ آقا جان کہہ رہے تھے کہ یہ سب کچھ اسی عالمگیر کی وجہ سے ہوا ہے۔ میں اس کو سبق ضرور سکھاؤں گا۔“

”یہ وہی چاند گڑھی والا بندہ ہے۔ چلو اس بارے میں پھر بات کریں گے۔ تم کیسی ہو؟“ میں نے جلدی سے بات کا رخ بدلا۔

اس نے رسمی انداز میں سب اچھا کا جواب دیا۔ میں نے اس کے مزید بولنے سے پہلے

ہی فون بند کر دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ جاناں فون پر کسی طرح کی اہم گفتگو کرے۔
"کیا کہہ رہی تھی تمہاری زوجہ؟" سجاول نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔
"عالمگیر کی بات کر رہی تھی۔ کہہ رہی تھی کہ آقا جان اسے کسی ذریعے سے سبق سکھانے والا ہے، یا شاید سکھا رہا ہے۔"
"یہ تو ہونا ہی ہے۔" سجاول نے کہا۔ "یہ معاف کرنے والا شخص نہیں اور عالمگیر نے اسے ٹھیک ٹھاک ٹیکا لگایا ہے۔ اس کے ایک فراڈ کی وجہ سے آقا جان کو یہاں کئی فراڈ کرنے پڑے ہیں۔"
سجاول کا اشارہ زینب والے واقعے کی طرف تھا۔ میرا اپنا خیال بھی ایسا ہی تھا۔ ابھی ہماری گفتگو جاری تھی کہ انیق ہانپتا ہوا سا اندر آیا۔ اس نے چھوٹتے ہی کہا۔ "آپ نے کچھ سنا ہے؟"
"تم نے کچھ سنایا ہے؟" سجاول نے برا سا منہ بنایا۔
سجاول کو جواب دینے کے بجائے انیق نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا اخبار ہمارے سامنے کھول دیا۔ یہ آج ہی کا تھا۔ اخبار کے اندرونی صفحے پر ایک دو کالمی خبر دیکھ کر میں بری طرح چونک گیا۔ اس خبر میں ایک ایسی تصویر تھی جسے میں دیکھتے ہی پہچان گیا۔ یہ چہرہ میرے لیے ہرگز اجنبی نہیں تھا۔ خبر کی سرخی کچھ اس طرح تھی۔ چاند گڑھی کے مقامی زمیندار عالمگیر کے گودام میں آگ، کروڑوں کی زرعی مشینری جل کر خاکستر ہوگئی۔ زمیندار کے ڈیرے پر بھی نامعلوم افراد کی اندھا دھند فائرنگ، ایک شخص ہلاک چار کے قریب زخمی۔ زمیندار عالمگیر نے بھاگ کر بمشکل جان بچائی۔ واردات کسی پرانی دشمنی کا شاخسانہ لگتی ہے۔
اس خبر میں ایک اطلاع نے مجھے بری طرح چونکایا اور کسی حد تک خوش بھی کیا۔ کہتے ہیں کہ دشمن کے مرنے پر خوشی نہیں کرنی چاہیے کیونکہ آخر سجن بھی مر جاتے ہیں لیکن کبھی کبھی کوئی دشمن ایسا ہوتا ہے جس کی موت واقعی راحت کا احساس دیتی ہے۔ اس واردات میں مرنے والے شخص کا نام اسحاق عرف ساقا تھا اور خبر میں اسی کی تصویر تھی...... ہاں، تاجور کا وہی منگیتر جو دن رات لٹھ لے کر اس کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ وہ اسے منکوحہ بنانا چاہتا تھا اور اس سلسلے میں اس نے چاند گڑھی کے بہت سارے لوگوں کو اپنا ہمنوا بنا رکھا تھا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ اپنے ایک اہم دشمن سے تاجور کی جان ہمیشہ کے لیے چھوٹ گئی ہے۔ ساقے کو ڈیرے پر ہونے والی فائرنگ میں دو گولیاں لگی تھیں اور وہ موقع پر ہی دم توڑ گیا تھا۔
سجاول بھی آگے جھک کر یہ خبر پڑھ رہا تھا۔ اس کی بڑی بڑی سرخ آنکھوں میں تجسس کروٹیں لے رہا تھا۔ بے شک عالمگیر اس کا دوست تھا مگر جب سے سجاول نے اُلٹے حروف

والا خط پڑھا تھا اور اس خط میں عالمگیر کی جانب سے اپنے لیے توہین آمیز فقرے لکھے دیکھے تھے اس کا دل کھٹا ہو گیا تھا۔

''لو جی کتنی جلدی تصدیق ہو گئی جاناں والی اطلاع کی۔'' میں نے کہا۔

''تمہارا مطلب ہے کہ جو کچھ عالمگیر کے ساتھ ہوا...... یہ آقا جان وغیرہ کی طرف سے ہے؟''

''پچانوے فیصد امکان اسی بات کا ہے۔'' میں نے کہا۔ پھر میری نظر خبر کی نچلی سطور پر پڑی۔ میں نے ذرا بلند آواز میں پڑھا۔ ''حملہ آور مقامی نہیں تھے۔ ان کا تعلق جنوبی پنجاب سے لگتا تھا۔ یہ جعلی نمبر پلیٹوں والی دو گاڑیوں پر آئے اور کارروائی کے بعد بڑی ہوشیاری سے فرار ہو گئے۔ ان کے پاس جدید اسلحہ تھا اور وہ اپنے کام میں ماہر لگتے تھے۔''

انیق نے کہا۔ ''پارا ہاؤس والوں کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں ہے جی۔ بڑی پاور ہے ان لوگوں کی اور سب سے بڑی پاور روپیہ۔''

اس خبر سے آقا جان کے لمبے ہاتھوں کا پتا چلتا تھا اور یہ بھی انداز ہوتا تھا کہ وہ معاف کرنے والا شخص نہیں ہے۔ عالمگیر نے زینب وغیرہ کے سلسلے میں اسے دھوکا دیا تھا اور مالی نقصان پہنچایا تھا۔ آقا جان نے یہ ہضم نہیں کیا تھا اور عالمگیر کو قرار واقعی سزا دینے کی کوشش کی تھی۔ یہ عالمگیر کی خوش قسمتی تھی کہ حملے کے وقت روپوش ہو کر اس نے جان بچالی۔

یہ سچویشن کم از کم میرے لیے تو تسلی بخش ہی تھی۔ ہم نے کوشش کر کے ایک اور اخبار منگوایا۔ اس میں بھی یہ خبر موجود تھی۔ ساتے کی لاش کی تصویر بھی تھی جو زیادہ واضح تھی۔ وہ ڈیرے پر ہلاک ہوا تھا۔ اس کی لاش ننگی چارپائی پر پڑی تھی۔ منہ کھلا ہوا تھا اور چہرے پر اذیت تھی۔

ہم دیر تک اس خبر اور اس کے نتائج پر تبصرہ کرتے رہے۔ ساتھ ساتھ نیا موضوع بھی زیرِ بحث تھا اور یہ موضوع وہی تھا جس کو کچھ دیر پہلے شکیل داراب نے بڑی رازداری سے چھیڑا تھا۔ ایک تیسری بات بھی میرے ذہن میں مسلسل کھٹک رہی تھی۔ کچھ دیر پہلے میرے ہاتھ ایک بہترین موقع آیا تھا کہ میں ابراہیم سے زہر خورانی کی حقیقت کے بارے میں کچھ جان سکوں مگر بدقسمتی سے عین موقع پر بڑی بیگم کی کال آ گئی اور وہ سارا ماحول ہی درہم برہم ہو گیا۔

○......❖......○

میں ابراہیم سے اگلی ملاقات کے لیے بے چین تھا۔
اس ملاقات کے لیے مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ صبح سویرے میں غیر متوقع طور پر جلدی جاگ گیا۔ کھڑکیوں کے پردے ہٹا کر دیکھا ابھی سورج طلوع نہیں ہوا تھا۔ گلاب کے رنگ برنگ پھول حدِ نگاہ تک باادب کھڑے تھے۔ ان پر ہلکا سا کہرا تھا اور اوس کے قطرے تھے۔ یہ صبح کی کنواری، شفاف ہوا تھی جس میں سانس لے کر زندگی بحال ہونے لگتی ہے۔ میں نے ایک پتھریلے بینچ پر پارا ہاؤس کے ''چھوٹے شہزادے'' ابراہیم کو اداس بیٹھے دیکھا۔ یقیناً اس کے اردگرد گارڈز موجود تھے لیکن ایک دو کے سوا نظر نہیں آ رہے تھے۔ ابراہیم کے ہاتھوں میں ایک گلدستہ تھا۔ شاید اس نے خود ہی تیار کیا تھا۔ وہ محویت سے گلدستے کو دیکھ رہا تھا۔ خانساماں کی پالتو بندریا لوسی اس کے اردگرد گھوم رہی تھی لیکن اس کے قریب نہیں جا رہی تھی۔ جیسے اس سے ڈرتی ہو۔ کسی وقت وہ عجیب سے انداز میں بولتی تھی اور الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگتی تھی۔ ابراہیم اپنے اردگرد سے لاتعلق گلاب کے ہفت رنگ پھولوں کو تکتا چلا جا رہا تھا۔ پھر اس نے گلدستے کو بے پروائی سے ایک پودے کی جڑ میں پھینکا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا رخ اپنی رہائش گاہ کی طرف تھا۔
موقع غنیمت جان کر میں نے ایک گرم شال کی بکل ماری اور کنگھی سے بال درست کرتا ہوا اس کے پیچھے لپکا۔ اس نے مجھے دیکھ لیا اور علیک سلیک کے بعد اپنے ساتھ لے لیا۔ میں مختلف راہداریوں سے ہو کر اس کے عالیشان کمرے میں پہنچا۔ یہاں بہت کچھ بدلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ابراہیم اپنا سامان سمیٹ رہا ہے اور بات صرف ابراہیم کی ہی نہیں تھی۔ پورے پارا ہاؤس میں ایک نامعلوم ہلچل تھی۔ سارے معمولات درہم برہم تھے۔ جیسے کہیں جانے کی تیاری تھی۔ میں نے اس سلسلے میں ابراہیم سے کوئی سوال پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ خود ہی بتاتا تو دیگر بات تھی۔ غالباً وہ خود بھی یہ محسوس کر رہا تھا کہ اس دن ہماری بات

ادھوری رہ گئی تھی۔ اس نے کچھ زیادہ تمہید نہیں باندھی۔ میرا حال احوال پوچھنے کے بعد بولا۔
''اس روز میں آپ کو اس اہم معاملے کے بارے میں بتانے لگا تھا جس کی وجہ سے میں اور بھائی کمال ایک خاص طرح کی خوراک لینے پر اور ایک خاص انداز سے جینے پر مجبور ہیں۔''
''میں سن رہا ہوں ابراہیم...... بلکہ یہ سب کچھ سننے کے لیے میں کل ہی بے چین ہوں۔''
''تم پیش گوئی کرنے والوں کو کیا سمجھتے ہو؟'' ابراہیم نے غیر متوقع سوال کیا۔
''پیش گوئی...... یعنی وقت سے پہلے کسی چیز کے بارے میں قیافہ لگا لینا۔ یہ ایک طرح سے غیب کا علم ہے...... اور کہتے ہیں کہ غیب صرف اللہ کی ذات ہی جانتی ہے۔''
''تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن ہمارے بزرگ اور خفیہ علوم کے بہت سے ماہرین بھی کہتے ہیں کہ رمل اور ستارہ شناسی وغیرہ کے اصولوں کے مطابق ہم کچھ پیش گوئیاں کر سکتے ہیں اور جب اس میں کمال حاصل ہو جائے تو بہت سی پیش گوئیاں درست بھی ثابت ہو جاتی ہیں۔ یہ دراصل اللہ ہی کی دی ہوئی ذہانت اور فراست ہے جس سے کچھ خاص لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں۔''

ذرا توقف کرنے کے بعد ابراہیم نے اپنی چھدری داڑھی میں انگلیاں چلائیں اور بولا۔ ''وہاں برونائی میں ایک ذوالقرنین فارسی نامی عمر رسیدہ بزرگ ہیں۔ وہ پیش گوئیاں کرنے میں ماہر ہیں۔ پچھلے پچاس ساٹھ سالوں میں ان کی بہت سی پیش گوئیاں بالکل درست ثابت ہوئی ہیں۔ انہوں نے ہی ایک مرتبہ پیش گوئی کی تھی کہ ہمارے والد ریان فردوس درمیانی عمر میں ایک خوفناک حادثے سے بال بال بچیں گے۔ یہ حادثہ ممکن ہے کہ زہر خورانی کی شکل میں ہو۔ اس وقت والد صاحب کی عمر مشکل سے آٹھ دس سال رہی ہوگی۔ تب تک ہمارا کوئی ایسا دشمن بھی سامنے نہیں آیا تھا جس پر کسی طرح کا شک شبہ کر سکتے لیکن اس پیش گوئی کے قریباً تیس سال بعد یہ سب کچھ حرف بحرف درست ثابت ہوا۔ ہمارے کچھ بدخواہوں کی طرف سے والد صاحب کو زہر دیا گیا اور وہ موت سے قریباً ہمکنار ہونے کے بعد واپس آئے۔ والد صاحب کے جسم پر جو داغ نظر آتے ہیں اور ان کی قوتِ سماعت میں جو خرابی ہے وہ اسی خوفناک واقعے کی یادگار ہے۔''

ابراہیم نے اپنے دشمنوں کے بارے میں نہیں بتایا لیکن میری چھٹی حس نے کہا کہ یہ وہی لوگ ہیں جن کا تذکرہ ایک دن پہلے شکیل داراب نے کیا ہے۔ یعنی ابراہیم کا سوتیلا بھائی اور اس کی والدہ وغیرہ۔

ابراہیم نے کہا۔ ''شاہ زیب! آپ کے ذہن میں یقیناً یہ سوال ابھر رہا ہوگا کہ والد صاحب کو پیش آنے والے حادثے کا ہم دونوں بھائیوں کو زہر دینے سے کیا تعلق ہے؟ تو یہ تعلق ہے......اور بہت گہرا ہے۔ کیا تم کچھ اندازہ لگا پا رہے ہو؟''

''نہیں ابراہیم، آپ کچھ بتائیں گے تو پتا چلے گا۔''

''میں نے ذوالقرنین فارسی کی پیش گوئی آپ کو پوری نہیں بتائی۔ اس پیش گوئی کا ایک دوسرا حصہ بھی تھا......اور وہ یہ کہ شادی کے بعد والد صاحب کی جو نرینہ اولاد ہوگی اس کی زندگی کا خاتمہ بھی کسی نہ کسی اسٹیج پر زہرخورانی کی وجہ سے ہوگا اور اس میں بچ نکلنے کے امکان بہت کم ہیں۔ شروع میں اس پیش گوئی کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دی گئی تھی لیکن جب کئی برسوں بعد اس پیش گوئی کا پہلا حصہ حرف بحرف درست ثابت ہوگیا، یعنی والد صاحب زہرخورانی کے بعد موت کے کنارے سے واپس آئے تو ہمارے والدین بدترین تشویش میں مبتلا ہو گئے۔ اس وقت میری عمر بارہ سال اور بھائی کمال کی تقریباً چودہ سال ہوگی۔ والدین ہمیں دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ آپ اس کرب کو سمجھ سکتے ہو جو پیش گوئی کا پہلا حصہ سچ ثابت ہونے کے بعد ہمارے ماں باپ نے محسوس کیا ہوگا۔''

میں نے کہا۔ ''جو کچھ آپ بتا رہے ہیں، اس کے بعد تو ان کا جینا یقیناً حرام ہو گیا ہوگا۔''

''شاید یہ لفظ بھی اس کیفیت کو پوری طرح بیان نہیں کر پائے۔ وہ جیتے جی مر گئے تھے۔ انہوں نے دوبارہ اس پیش گو بزرگ کو ڈھونڈا اور اس سے رائے طلب کی۔ اس نے کہا جو تقدیر میں لکھا ہے وہ ضرور ہوتا ہے، اسے کوئی ٹال نہیں سکتا۔ بس ہم اپنی سی کوشش کر سکتے ہیں۔ یہ کوشش جو آپ دیکھ رہے ہیں وہی ہے جو اس ''پیش گو'' نے تجویز کی تھی۔ اس نے کہا کہ ہم دونوں بھائیوں کو مستقبل کے اس حادثے کے لیے ابھی سے تیار کیا جانا چاہیے، کچھ ایسا کیا جائے کہ ہمارے جسموں کے اندر ہر طرح کے زہر کے لیے مدافعت پیدا ہو جائے۔ اس نے ہمیں ایک بڑے بدھ سنیاسی کے پاس بھیجا۔ آپ اسے بدھ کیمیا گر بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس شخص نے ہمارے لیے ایک ایسا زہریلا کشتہ تیار کیا جو بہت تھوڑی مقدار میں ہمیں روزانہ دیا جانا تھا۔ شروع شروع میں دونوں بھائی بہت سے مسائل کا شکار ہوئے۔ بیمار بھی پڑ گئے۔ ایک دو موقعے تو ایسے آئے جب ہم نے ہمت ہار دی مگر پیش گو ذوالقرنین نے ہمیں اور ہمارے والدین کو پیچھے نہیں ہٹنے دیا۔ آہستہ آہستہ یہ زہرخورانی ہمارے جسم کی ضرورت بن گئی۔ اب تو ایسا ہے کہ اگر ہمیں عام کھانا دیا جائے تو چند روز میں ہی ہمارا معدہ کام کرنا بند کر

دیتا ہے۔ قے اور مسلسل متلی ہونا شروع ہو جاتی ہے۔"

اب بات بڑی حد تک میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ یہ زہر خورانی کوئی آج کا روگ نہیں تھا۔ لڑکپن سے ہی یہ دونوں بھائی ایک مسلسل IMMUNITY کے لیے سرگرداں تھے۔

ابراہیم نے ایک عمیق سانس لیتے ہوئے کہا۔ "اب ہم عام لوگوں سے مختلف ہو چکے ہیں۔ آپ دیکھیں گے میرے جسم پر کبھی مچھر یا مکھی نہیں بیٹھتی۔ کوئی کیڑا مکوڑا ہمیں نہیں کاٹتا۔ اگر کوئی چھوٹا کیڑا مکوڑا کاٹے تو مر جاتا ہے۔ ہمیں کبھی کوئی جلدی بیماری نہیں ہوتی۔ ہمارے پیشاب کا رنگ عام لوگوں کے رنگ سے مختلف ہوتا ہے۔ ہمارا تھوک بالکل سفید اور کاسٹک سوڈے جیسی تاثیر رکھتا ہے۔ ہم یہ احتیاط بھی رکھتے ہیں کہ کوئی ہمارا جھوٹا کھانا نہ کھائے۔ اس طرح کی اور کئی چیزیں ہیں۔"

میں نے گہری سانس لی۔ "اور ان میں سے ایک اہم ترین بات یہ بھی ہے کہ آپ کسی عام لڑکی سے شادی نہیں کر سکتے...... اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اگر آپ شادی کریں اور یہ کامیاب ہو جائے تو آپ کی اولاد بھی آپ جیسی خصوصیات لے کر پیدا ہو گی۔"

اس نے سر جھکا لیا۔ اس کا چہرہ غم و اندوہ کی تصویر تھا۔ میں بھی ہکا بکا سا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک زہریلے سانپ جیسا تھا لیکن "معصوم اور مجبور سانپ" وہ ہرگز ویسا نہیں تھا جیسا وہ بن گیا تھا۔ وہ اور اس کا بھائی تو اس وقت نوعمر لڑکے تھے جب انہیں زہر کی ڈوز دینا شروع کر دی گئی۔ یہ سراسر ان کے ماں باپ کا فیصلہ تھا۔ ماں باپ نے اپنے بچوں کو ایک متوقع حادثے سے بچانے کے لیے ایک ایسا راستہ اختیار کیا جس نے ان کی زندگیوں کو ہی زہر آلود کر دیا۔ اس میں کسی حد تک توہم پرستی کا عمل دخل بھی دکھائی دیتا تھا۔ مجھے کچھ دیر پہلے دیکھا ہوا وہ منظر یاد آیا جب بندریا لوسی ابراہیم کے قریب جاتے ہوئے ڈر رہی تھی اور یہ کوئی پہلا موقع نہیں تھا۔ ایک دفعہ پہلے بھی میں نے اسی طرح اسے کمال احمد سے خوف زدہ ہوتے اور چلّا کر بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔ شاید اس کے حیوانی ذہن میں ابھی تک اس زہر کے اثرات موجود تھے جو ایک مرتبہ ہم نے تجربے کے طور پر دیا تھا اور وہ مرتے مرتے بچی تھی۔ اس کی غیر معمولی حسیات اسے بتاتی تھیں کہ ان دونوں بھائیوں کے نزدیک جانا خطرناک ہے۔ یہ حالات کی ستم ظریفی تھی۔ ابراہیم جانتا تھا کہ وہ زینب کو حاصل نہیں کر سکتا۔ وہ اس کی زندگی برباد کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ (ساڑھے تین سال پہلے اس کے بڑے بھائی کی بیوی کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا وہ یقیناً اس کے ذہن میں محفوظ تھا) مگر دوسری طرف زینب کو خود سے دور کرنا بھی اس کے بس میں نہیں تھا۔ وہ ابھی تک پارا ہاؤس میں ہی تھی۔

میں کچھ دیر ابراہیم کے بولنے کا انتظار کرتا رہا پھر اجازت لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ آج کا انکشاف بہت گمبھیر تھا۔ میں جب دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا، ایک لمحے کے لیے مجھے لگا کہ شاید ابراہیم، ناقب کے قتل اور اس سے پیدا ہونے والے ''خطرات'' کے بارے میں کچھ کہنے لگا ہے لیکن پھر یہ موضوع اس کے ہونٹوں تک نہیں پہنچا۔ میں نے بھی اس بارے میں کچھ پوچھنا مناسب نہیں سمجھا اور باہر آ گیا۔

اگلی صبح ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے مجھے اور انیق کو ہلا کر رکھ دیا۔ ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ہمیں یہ کچھ سننے کو ملے گا۔ جاناں چونکہ بنگلے میں چلی گئی تھی۔ لٰہذا میں اور انیق ایک ہی کمرے میں سوتے تھے۔ دروازہ دھڑ ادھڑ بجایا گیا تو ہم ہڑبڑا کر جاگ گئے۔ انیق بڑبڑایا۔ ''یا اللہ خیر...... لگتا ہے کہ سورج مغرب سے طلوع ہوا ہے اور قیامت کا اعلان ہو گیا ہے۔''

میں نے جا کر دروازہ کھولا۔ سامنے اسپیشل فورس کے تین گارڈز کھڑے تھے۔ ''سجاول صاحب کدھر ہے۔'' ایک پٹھان گارڈ نے بہت تیکھے لہجے میں پوچھا۔

''ہمیں کیا پتا۔ اپنے کمرے میں ہو گا۔''

''وہ کمرے میں نہیں ہے۔ کہیں بھی نہیں ہے۔ کچھ...... اور باتیں بھی سننے میں آ رہی ہیں۔''

''اور باتیں؟'' میں حیران ہوا۔

اسی دوران میں دو مزید گارڈز ہانپتے ہوئے پہنچ گئے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ ''دیکھ لیا ہے جی۔ کچھ پتا نہیں چل رہا۔''

میں اور انیق دروازے کی طرف بڑھے۔ ہم جاننا چاہ رہے تھے کہ سجاول کے ساتھ کیا ہوا ہے مگر گارڈز نے ہمیں برآمد تک نہیں پہنچنے دیا۔ ''نہیں جی، ابھی آپ ادھر ہی رہیں۔ حلمی صاحب اور آقا صاحب آ رہے ہیں۔ وہی آپ کو ساری بات بتائیں گے۔''

''ساری بات؟ لیکن ہوا کیا ہے؟ کیا چھپا رہے ہو تم لوگ؟'' میں نے چیخ کر کہا۔

''آپ سے گزارش کی ہے نا کہ آپ ابھی ذرا ٹکے رہیں۔'' گارڈ بولا۔ وہ بالکل طوطا چشم دکھائی دے رہا تھا۔

اسی اثنا میں، میں نے دیکھا کہ دو گارڈز ہمارے کمرے میں سے برآمد ہوئے۔ انہوں نے ہماری رائفلیں قبضے میں کر لی تھیں۔ ہمارے سیل فونز بھی ان کے پاس تھے۔ میری رگوں میں خون سنسنا گیا۔ صورتِ حال ہمارے اندازے سے زیادہ سنگین تھی۔ کہیں...... سجاول نے کوئی گڑبڑ تو نہیں کر ڈالی تھی؟

بمشکل ایک منٹ گزرا ہوگا کہ آقا جان اپنے سرخ انگارا چہرے کے ساتھ وہاں آدھمکا۔ مجھے دیکھتے ہی سانپ کی طرح پھنکارا۔ ''چونا لگا دیا ناں۔ مجھے اس حرامی کی آنکھ میں پہلے ہی سؤر کا بال نظر آتا تھا۔''

''ہوا کیا ہے آقا جان؟''

''یہ پوچھو کیا نہیں ہوا ہے۔ وہ تمہارا یار حرام زادہ لوٹ کر لے گیا ہے پارا ہاؤس کو۔ کئی کروڑ کے تو زیور ہی ہوں گے...... سیونگ سرٹیفکیٹس، ڈالرز، یورو، بہت کچھ شامل ہے۔ دو بڑے سیف ٹوٹے ہوئے ہیں۔''

ہم سناٹے میں رہ گئے۔ انیق نے ہراساں نظروں سے میری طرف دیکھا۔ وہ کئی بار مجھ سے اس قسم کے خطرے کا اظہار کر چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں آقا جان سے کچھ پوچھتا اس نے گارڈز کو کڑک کر حکم دیا۔ ''ابھی یہ لوگ حفاظتی تحویل میں ہیں۔ یہ ان ہی کمروں میں رہیں گے۔ اگلے حکم کا انتظار کرو۔''

ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے مہمان خانے کے تینوں دروازے باہر سے بند کر دیئے گئے۔ باہر برآمدوں میں بھاگ دوڑ مچی ہوئی تھی۔ انیق نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''دیکھ لیا ناں شاہ زیب بھائی۔ مجھے یہی ڈر تھا۔''

''لیکن ابھی تو کچھ پتا نہیں چل رہا یار...... کہ ہوا کیا ہے؟''

انیق بولا۔ ''میں نے پرسوں ہی دیکھ لیا تھا کہ سجاول کے تیور ٹھیک نہیں۔ اس کی باتیں کھوکھلی تھیں۔ اس کے ذہن میں کچھ اور چل رہا تھا۔ آپ کے سامنے ہی اس نے قربانی کے بکرے والی بات بھی کہی تھی۔''

''یار ابھی تفصیل تو سامنے آنے دو۔ تم پہلے ہی سارے جہاز ڈبو کر بیٹھ گئے ہو۔'' میں نے ذرا جھنجلا کر کہا۔

تھوڑی دیر بعد اس واقعے کی کچھ مزید تفصیلات معلوم ہوئیں۔ پتا چلا کہ بے ہوشی والے اسپرے کے ذریعے دو گارڈز کو بے ہوش بھی کیا گیا ہے۔ دونوں سیف توڑے نہیں گئے تھے، بلکہ ان کی چابیاں حاصل کی گئی تھیں اور انہیں کھولا گیا تھا۔ دو سیف محفوظ رہے تھے۔ سب سے پہلے وڈے صاحب کو ہی اس واقعے کا علم ہوا، اور انہوں نے اپنے بیڈ روم کے قریب ایک بٹن پش کر کے خطرے کا الارم بجایا۔ تب تک سجاول فرار ہو چکا تھا۔ غالب امکان یہ تھا کہ اس نے فرار کے لیے پارا ہاؤس کے اسپتال کی ایک ایمبولینس استعمال کی ہے۔ ایمبولینس کے ڈرائیور کو شاید گن پوائنٹ پر رکھا گیا تھا۔ یہ بھی پتا چلا کہ سکیورٹی انچارج

قادر خان اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ سجاول کے تعاقب میں گیا ہے۔ ہمیں یہ اطلاعات سیکنڈ انچارج رفاقت نے پہنچائیں۔ وہ آہنی گرل والی کھڑکی کی دوسری جانب کھڑا تھا اور ہم سے بات کر رہا تھا۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ''مس سنبل کے بارے میں کچھ پتا چلا؟ وہ کہاں ہے؟''

''وہ تو جی یہیں پر ہے۔ وہ بھی اس اطلاع پر سخت پریشان ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں اسے دیکھ کر آیا ہوں۔''

''قادر خان سے فون پر رابطہ نہیں ہوا؟''

''نہیں، حلمی صاحب مسلسل کوشش کر رہے ہیں مگر کال نہیں مل رہی۔ اب کچھ اور لوگ بھی ان کے پیچھے گئے ہیں۔''

قریباً آدھ گھنٹے بعد پتا چلا کہ پارا ہاؤس سے نکلنے والی ایمبولینس لیہ سے قریباً بیس کلو میٹر دور دریا کے کنارے گھنے سرکنڈوں میں کھڑی مل گئی ہے۔ وہ بالکل خالی تھی۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ شاید وہاں پہلے سے سجاول کے چند ساتھی موجود تھے۔ ان کے پاس ایک دوسری جیپ تھی۔ مسروقہ مال اس میں منتقل کیا گیا تھا اور کسی نامعلوم مقام کی طرف لے جایا گیا تھا۔

قادر خان سے بھی فی الحال کوئی رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ اس بات کا اندیشہ موجود تھا کہ شاید قادر اور اس کے دونوں ساتھی بھی سجاول وغیرہ کے ہتھے چڑھ گئے ہیں یا پھر انہیں مار ڈالا گیا ہے۔ قادر خان سانپ والے اذیت ناک حادثے سے گزرا تھا اور اس کے ساتھ ایک تعلق سا پیدا ہو چکا تھا۔

پارا ہاؤس میں پہلے ہی ایک زبردست بے چینی پائی جا رہی تھی۔ اب اس نئے واقعے نے مزید افراتفری پیدا کر دی تھی۔ ابھی تک ہمارا سامنا وڈے صاحب سے نہیں ہوا تھا۔ لگتا یہی تھا کہ وہ اس غیر یقینی صورتِ حال میں خود بھی ہمارے سامنے آنا نہیں چاہتا۔ ہمیں بس گاہے بگاہے آقا جان کا تپا ہوا چہرہ ہی نظر آ رہا تھا۔ وہ ہمارے اردگرد جیسے کسی سانپ کی طرح پھنکار رہا تھا۔ سامنے کی طرف سے اس کے سر کے قریباً نصف بال اُڑے ہوئے تھے۔ جب وہ غصے اور پریشانی کے عالم میں ہوتا تھا، اس کے چہرے کے ساتھ ساتھ اس کا نصف سر بھی پسینے سے چمکنے لگتا تھا۔ اس پسینے کو وہ بار بار سفید رومال سے صاف کرتا تھا۔

انیق نے کہا۔ ''اگر ایک آدھ گھنٹے میں امریش پوری (سجاول) پکڑا نہیں جاتا تو یقیناً ہماری کم بختی آ جانی ہے اور شاید سنبل کی بھی۔ یہ لوگ ہم سے اس خبیث کا پتا ٹھکانا پوچھیں گے۔''

''اور ہم بتا دیں گے......؟''

''بتانا ہی پڑے گا، ورنہ......''

''ورنہ کیا؟''

''وڈا صاحب تو شاید اتنی سختی نہ دکھائے لیکن یہ غصیلا لومڑ آقا جان تو ہمارے ساتھ کچھ بھی کر سکتا ہے۔''

میں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''نہیں انیق! تم میری اجازت کے بغیر کسی طرح کا کوئی قدم نہیں اٹھاؤ گے۔ ابھی ہمیں سجاول کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتانا۔''

میری سنجیدگی نے جیسے اسے چونکایا۔

یہی وقت تھا جب ہیوی موٹر بائیکس کے ہوٹر سنائی دیئے اور ہمیں پتا چلا کہ شکیل داراب یہاں آن وارد ہوا ہے۔ ہم اسے دیکھ نہیں پائے لیکن اندازہ یہی ہوا کہ وہ اپنی سیاہ گاڑی سے اتر کر سیدھا وڈے صاحب کے پاس ہی گیا ہے۔ اس بات کا امکان موجود تھا کہ وہ جلد ہی ہمارے پاس بھی آئے گا۔

وہ آیا ضرور...... مگر قریباً دو گھنٹے بعد۔ اس دوران میں ہمارے اردگرد صورتِ حال بدستور تشویشناک رہی۔ مہمان خانے کے تینوں دروازے باہر سے بند تھے، بلکہ اب دروازوں کے باہر مسلح گارڈز بھی چکرا رہے تھے۔ شکیل داراب کی آمد کے موقعے پر گارڈز ہٹ گئے اور ایک دروازہ کھول دیا گیا۔ شکیل داراب کے ساتھ حلمی بھی تھا مگر وہ ہم سے بات کیے بغیر واپس چلا گیا۔ شکیل داراب اندر آیا۔ اس کا گورا چٹا چہرہ پریشانی کی تصویر تھا۔ وہ بلاتمہید بولا۔ ''یہ کیا ہوا ہے شاہ زیب، ہم اس کے لیے کیا کچھ سوچ رہے تھے اور اس نے کیا کر دکھایا، بڑی بیگم تو سکتے کی کیفیت میں ہیں۔''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں شکیل صاحب! ہمیں جو کچھ معلوم ہوا ہے، آپ لوگوں سے ہوا ہے۔''

''مگر، کچھ بھی تھا، وہ تم لوگوں کے ساتھ تھا۔''

''تو پھر ہمیں الٹا لٹکا دیجیے۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔

''بات کا غلط مطلب مت لو لیکن اگر وہ نہیں ملتا تو تم لوگوں کو یہ تو بتانا ہی ہوگا کہ اسے کہاں تلاش کیا جائے؟''

''ہم تو اس سے سرِ راہ ملے تھے۔ ہم سے زیادہ تو اس کے ٹھکانوں کے بارے میں آپ جانتے ہوں گے، آپ کا اس سے پرانا تعلق ہے۔''

''میرا تعلق صرف لالہ نظام اور وریام کے واسطے سے تھا۔ لالہ نظام مر گیا اور وریام کو بھی اس کے ڈیرے کا کچھ پتا نہیں۔ وریام اور سجاول کی صرف ایک ملاقات ہوئی تھی اور وہ بھی چاند گڑھی کے عالمگیر نامی زمیندار کے ذریعے سے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ یہ عالمگیر...... سجاول کے ٹھکانوں کو جانتا ہو گا۔ مجھے پتا ہے، چاند گڑھی میں بھی یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ سجاول اور عالمگیر کا یارانہ ہے۔''

شکیل نے بے قراری سے پہلو بدلا۔ ''لالہ وریام نے میری ہدایت پر عالمگیر سے رابطہ کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن پتا چلا ہے کہ اتوار کے دن اس پر کوئی قاتلانہ حملہ ہوا ہے اور وہ تب سے رُوپوش ہے۔ اس کا ایک قریبی ساتھی مارا بھی گیا ہے۔''

ہم اخبار کے ذریعے اس بارے میں جان چکے تھے لیکن میں نے خاموش رہنا مناسب سمجھا۔ شکیل نے پیشانی مسلتے ہوئے کہا۔ ''سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس شخص نے اتنی بڑی بے وقوفی کیوں کی؟ وہ چھپ نہیں سکے گا۔ ہم اسے زمین کی ساتویں تہ سے بھی ڈھونڈ نکالیں گے۔ اس کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا اور جو کچھ ہاتھ آنے والا تھا اس سے بھی وہ بدبخت محروم ہو گیا ہے۔ اس کے لیے بہت سے راستے کھل سکتے تھے۔ وہ اتنا کچھ حاصل کر سکتا تھا کہ اس کے فرشتوں کو بھی توقع نہ ہوتی۔''

''کہیں ایسا تو نہیں شکیل صاحب کہ اسے کسی چکر میں پھنسا دیا گیا ہو۔'' میں نے کہا۔

''اب تم بھی احمقوں والی بات کر رہے ہو۔ سب کچھ آنکھوں کے سامنے ہے۔ شک شبہے کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔'' شکیل جیسے چیخ گیا۔

میں نے کہا۔ ''آپ مجھے میرا فون واپس دلائیں، میں خود اس سے رابطے کی کوشش کرتا ہوں۔''

''کوئی فائدہ نہیں۔ سیکڑوں بار کوشش ہو چکی ہے۔ اس کا فون آف جا رہا ہے۔ تمہیں کسی اور طریقے سے ہماری مدد کرنا ہو گی۔''

''اور کون سا طریقہ؟''

''جو بھی تم مناسب سمجھو۔ اس کا ایک ٹھکانا کہیں آزاد کشمیر میں بھی ہے، کوٹلی سے کچھ آگے۔ مجھے لگتا ہے کہ تم اس ٹھکانے کے بارے میں کچھ نہ کچھ تو بتا ہی سکتے ہو۔''

''نہیں، یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔ ہم دونوں یہ نام پہلی بار آپ سے سن رہے ہیں۔''

شکیل کے چہرے پر سرخی لہرا گئی۔ خود پر ضبط کرتے ہوئے بولا۔ ''دیکھو شاہ زیب! اپنے لیے مسائل پیدا نہ کرو اور نہ اس لڑکی کے لیے جو تمہارے ساتھ یہاں آئی ہے۔ ہم اب

بھی تمہارے لیے دل میں نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ آنے والے دنوں میں تم دونوں کے بارے میں سوچ سکتے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”پہلی بات تو یہ ہے جناب کہ وہ لڑکی (سنبل) ہمارے ساتھ نہیں سجاول کے ساتھ یہاں آئی تھی۔ ہم اس کے برے بھلے کے ذمے دار نہیں۔ دوسری، جو نرم گوشے والی بات آپ نے کی ہے، اس کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوگا کہ دس پندرہ منٹ کے اندر ہی ہم یہاں معزز مہمان سے قیدی بن گئے ہیں۔ ہمارے ہتھیار، موبائل وغیرہ لے کر ہمیں یہاں لاک کر دیا گیا ہے۔“

”دراصل فوری طور پر ان لوگوں کی سمجھ میں کچھ آیا ہی نہیں۔ بہرحال یہ کوئی ایسا نہ حل ہونے والا مسئلہ نہیں ہے۔ میں آقا جان سے بات کرتا ہوں۔ اصل میں یہاں کے سارے اہم فیصلے وہی کرتا ہے لیکن...... تمہارا تعاون بہت ضروری ہے۔“

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیا تعاون کر سکتا ہوں۔“

”دیکھو شاہ زیب! مجھے بے خبر نہ سمجھو۔ میں نے تمہارے بارے میں کافی کچھ جان لیا ہے۔ لاہور سے نکلنے کے بعد تم کوپن ہیگن نہیں گئے بلکہ چاند گڑھی جا پہنچے...... کسی تاجور نامی لڑکی سے تمہارا چکر چلتا رہا ہے۔ تاجور کی کسی سہیلی ریشمی کی مدد کرتے ہوئے تم ملنگی ڈیرے پہنچے...... وہاں پردے والی سرکار سے تمہارا ٹاکرا ہوا اور تم نے اسے قتل کیا۔ اس کے بعد تم سجاول اور اپنے ساتھی انیق کے ساتھ یہاں پارا ہاؤس میں پائے گئے ہو۔ ظاہر ہے کہ تمہارا یہاں آنا بھی بے مقصد تو نہیں رہا ہوگا۔“

”آپ جناب کا کیا خیال ہے۔ میرا کیا مقصد رہا ہوگا؟“ میں نے بے باکی سے شکیل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

اس نے پُرسوچ لہجے میں جواب دیا۔ ”ہو سکتا ہے کہ تمہارا وہی رومانس وغیرہ کا چکر ہو۔ وہ تاجور نامی لڑکی اب تمہارے ساتھ نہیں۔ اس کے ماں باپ اور بھائی بھی چاند گڑھی سے اوجھل ہو چکے ہیں۔ شاید تم اسی کو ڈھونڈنے کے چکر میں یہاں ہو؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا اور میرے چہرے پر کوئی تاثر نہ پا کر بولا۔ ”دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ تم اسی لوٹ مار کے لیے پارا ہاؤس میں گھسے تھے مگر تمہارا ساتھی سجاول تمہیں بھی ڈبل کراس کر گیا اور ایک بڑی نقب لگا کر چمپت ہو گیا۔“ اس نے ایک بار پھر سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اگر وہ میرے تاثرات سے کچھ جاننا چاہ رہا تھا تو اسے یقیناً مایوسی ہوئی ہو گی۔

میں نے کہا۔ ''ایک تیسری وجہ بھی تو ہو سکتی ہے اور وہ آپ کی نظروں سے اوجھل رہی ہے۔ شاید اس کا سبب یہ ہے کہ بہت سے لوگ یہ سوچ ہی نہیں سکتے کہ کسی مفاد کے بغیر بھی کوئی کام کیا جا سکتا ہے یا کسی کے کام آیا جا سکتا ہے۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' وہ میرے تیکھے لہجے کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

''آپ نے چاند گڑھی سے اور تو بہت کچھ معلوم کر لیا ہے لیکن یہ نہیں معلوم کیا کہ چاند گڑھی میں کچھ ماہ پہلے قتل ہونے والے امام مسجد مولوی فدا کی یتیم بچی کہاں اور کس حال میں ہے...... جی ہاں...... میں اس لڑکی زینب کی بات کر رہا ہوں جو اسلام آباد کے اسپتال سے اغوا کر کے دلہن بننے کے لیے یہاں پہنچائی گئی ہے اور اس سارے کارنامے کے پیچھے اس حرامی عالمگیر کا ہاتھ ہے۔ میں اسی عالمگیر کی جڑیں کاٹنے کے لیے یہاں آیا تھا۔ عالمگیر اور اس کے ساتھیوں نے اس یتیم بچی کے لیے ان پارا ہاؤس والوں سے قریباً سوا کروڑ...... جی ہاں سوا کروڑ روپیہ اینٹھا ہے اور ایسی کم از کم دو مزید لڑکیاں اس نے پارا ہاؤس میں فروخت کی ہیں۔''

میرے اس انکشاف نے شکیل داراب کو کچھ زیادہ ششدر نہیں کیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اس حوالے سے کافی کچھ جانتا ہے۔ بہرحال اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ موٹی رقمیں لے کر لڑکیوں کو یہاں پہنچانے والا چاند گڑھی کا عالمگیر ہی ہے۔

میری بات سننے کے بعد اس نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ ''جہاں تک مجھے معلوم ہے یہاں آنے والی لڑکیاں بڑی حد تک بے آسرا ہیں اور انہیں یہاں ایک اچھی زندگی ملنے والی ہے۔ بہرحال یہ تو پارا ہاؤس والوں کے معاملات ہیں، ان کی کچھ مجبوریاں ہیں اور وہ ان کی قیمت ادا کر رہے ہیں۔ میرا سوال اپنی جگہ پر ہے۔ اگر میں تمہاری یہ بات مان بھی لوں کہ تم اس زمیندار عالمگیر کو سبق سکھانے یا سزا دینے کے لیے یہاں پہنچے ہو تو...... تمہارا تعلق اس ڈکیت سجاول سے کیسے بنا؟''

''آپ جانتے ہو کہ عالمگیر اور سجاول کا دوستانہ ہے۔ سجاول کو کسی طرح پتا چل گیا تھا کہ عالمگیر اس سے بالا بالا کوئی کھیل کھیل رہا ہے۔ کسی بہت امیر کبیر فیملی کو ایک ایک لڑکی سوا کروڑ میں فروخت کر رہا ہے۔ وہ بھی اس بات کا کھوج لگانا چاہتا تھا۔''

''لیکن میرا سوال اب بھی اپنی جگہ ہے۔ تمہارا اور سجاول کا میل کہاں ہوا؟'' شکیل نے پھر نکتہ اٹھایا۔

وہ اس درمیانی کڑی کے بارے میں جاننا چاہ رہا تھا جو میں اسے بتانا نہیں چاہ رہا تھا۔

یعنی میرا اور تاجور کا اتفاقاً سجاول کے ڈیرے کی طرف چلے جانا اور پھر کئی ہفتوں تک وہاں رہنا۔ مجھے محسوس ہوا کہ شکیل جیسے گھاگ شخص کو مطمئن کرنے کے لیے تھوڑا بہت تو بتانا ہی پڑے گا۔ میں نے مختصر الفاظ میں اسے آگاہ کیا کہ کس طرح اتفاقاً ایک روز کوٹلی کے ایک ہوٹل میں میرا اور سجاول کا آمنا سامنا ہوا۔ مجھے معلوم تھا کہ سجاول اور عالمگیر میں دوستانہ ہے لیکن میرے پاس ایک خط تھا جو الٹے حرفوں میں لکھا گیا تھا۔ اس میں عالمگیر نے لڑکیوں کی فروخت کا ذکر کیا تھا اور ساتھ ہی سجاول کو برے لفظوں سے یاد کیا تھا۔ یہ خط پڑھنے کے بعد سجاول کا دل عالمگیر کی طرف سے کھٹا ہوا اور اس نے میرے ساتھ مل کر لڑکیوں والے معاملے کا کھوج لگانے کا فیصلہ کیا۔

شکیل اب بھی مطمئن نہیں تھا۔ اس نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔ ''کیا یہ سارے معاملے ہوٹل میں ہی بیٹھ کر طے ہو گئے۔ وہیں بیٹھے بیٹھے سجاول نے ٹرک ڈرائیور کا بھیس بدلا۔ تمہارے ساتھی لڑکے کو ہیلپر بنایا اور تمہیں ساتھ لے کر ''لکڑی اور لڑکی'' کو لے کر یہاں پہنچ گیا؟''

''ہم اس کے ایک ٹھکانے پر گئے تھے۔'' میں نے اقرار کیا۔ ''مگر کوٹلی سے یہ طویل فاصلہ ہم نے ایک بند گاڑی میں طے کیا تھا اور ہماری آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ وہاں سے نکلتے وقت بھی ہمیں پٹی باندھ کر نکالا گیا۔''

(اور یہ بات کافی حد تک حقیقت تھی۔ سجاول اس سلسلے میں ہمیشہ بہت محتاط رہتا تھا۔ باہر سے ڈیرے میں داخل ہونے والوں کی آنکھوں پر پٹی باندھی جاتی تھی اور کبھی کبھی انہیں خوامخواہ گھما پھرا کر ڈیرے پر پہنچایا جاتا تھا)

اس گفتگو کے بعد بھی شکیل پوری طرح مطمئن تو نہیں ہوا۔ تاہم میرے اندازے کے مطابق اسے میرے بیان کے ساتھ ستر فیصد حصے پر یقین آ گیا۔

میں جانتا تھا کہ سجاول نے جو کچھ بھی کیا ہے لیکن شکیل میرے ساتھ بگاڑنا نہیں چاہے گا۔ وہ جانتا تھا کہ میں اس کے ایک اہم ترین راز کا امین ہوں...... اس راز کا کھلنا شکیل بلکہ ساری داراب فیملی کی سیاسی زندگی کے لیے ایک بھونچال ثابت ہو سکتا تھا۔ سیالکوٹ شہر کے ایک شاندار گھر کا عقبی دروازہ دس مرلے کے ایک ایسے گھر کے اندر کھلتا تھا جہاں شکیل کے اسکول کے زمانے کی ایک حسین ٹیچر (جو اب اتنی حسین بھی نہیں تھی) رہتی تھی اور شکیل نے اس کے ساتھ خفیہ نکاح کر رکھا تھا۔ اپنی ٹیچر کے ساتھ ہو جانے والے عشق کو اس نے بڑے بھونڈے طریقے سے ایک مجرمانہ عمل میں بدل رکھا تھا۔

شکیل کو یقیناً معلوم ہو گا کہ حفاظتی اقدام کے طور پر میں نے یہ راز اور اس کے ثبوت یقیناً اپنے کسی دوسرے بااعتماد ساتھی یا ساتھیوں کو بھی فراہم کر رکھے ہوں گے اگر وہ یہاں بیٹھے بیٹھے مجھے شوٹ بھی کر دیتا تو اس کا کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ اسی اثنا میں شکیل کے لیے وڈے صاحب عزت مآب کی طرف سے بلاوا آ گیا اور وہ مجھ سے صبح ملنے کا وعدہ کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس سے پتا چلتا تھا کہ وہ آج رات پارا ہاؤس میں ہی گزارے گا۔

رات قریباً بارہ بجے کا وقت ہو گا۔ پارا ہاؤس میں خاموشی چھا چکی تھی، بس پہرے داروں کے بوٹوں کی ٹھکا ٹھک تھی یا کسی وقت رکھوالی کے کتوں کا شور سنائی دیتا تھا۔ سردی آج کچھ زیادہ تھی۔ ہم نے کمرے میں گیس ہیٹر آن کر رکھا تھا اور ٹی وی دیکھنے کے ساتھ ساتھ آئندہ صورتِ حال پر غور کر رہے تھے۔ سجاول کا ابھی تک کچھ پتا نہیں چلا تھا، نہ ہی قادر خان اور اس کے دو ساتھیوں سے رابطہ ہو پایا تھا۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا اس بات کا اندیشہ بڑھتا جا رہا تھا کہ شاید قادر خان اپنے دونوں بندوں سمیت سجاول کے ہتھے چڑھ چکا ہے۔ سجاول کی سفا کی اب ہمارے لیے کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں تھی۔ مجھے منشی افضل کی موت کا منظر ابھی تک یاد تھا...... اور پھر ایک دفعہ سجاول نے ''اصغر'' نامی ملنگ کے ساتھ جو سلوک کیا تھا وہ بھی بھولنے والا نہیں تھا۔ سجاول نے اسے ''پھانسی کی سزا'' دی تھی۔ وہ معجزانہ طور پر بچ گیا تھا مگر سجاول نے اسے پھر بھی شوٹ کر دیا تھا۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ درست تھیں لیکن پتا نہیں کیوں میرے دل میں اب بھی امید کی کرن سی تھی۔ شاید میں نے سجاول سے کچھ زیادہ ہی توقعات لگا رکھی تھیں اور یہ توقعات یہ ''سب کچھ'' دیکھنے کے بعد مکمل طور پر ختم نہیں ہوئی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ میں بندے کو بڑی حد تک پہچان لیتا ہوں لیکن غلطی تو باوا آدم سے بھی ہوئی تھی۔ تو کیا میں بھی غلطی کر چکا تھا......؟

اچانک بیرونی دروازے پر آہٹ ہوئی۔ میں اور انیق چونک گئے۔ امید نہیں تھی کہ اتنی رات گئے کوئی مہمان خانے میں آئے گا۔ دروازے کو اَن لاک کیا گیا اور کچھ گارڈز اندر آ گئے۔ سیکنڈ انچارج رفاقت علی ان کے ساتھ تھا۔

''کیا بات ہے رفاقت؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ دونوں کو عزت مآب نے یاد کیا ہے۔'' اس نے ذرا بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''دونوں کا آنا ضروری ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں۔''

کچھ دیر تذبذب میں رہنے کے بعد ہم اٹھ کر چل دیئے۔ برآمدے میں پہنچے تو سامنے

ایک گاڑی نظر آئی۔ یہی وقت تھا جب مجھے خطرے کا احساس ہوا۔ گارڈز کے تیور ذرا بدلے ہوئے تھے۔ اپنی رائفلوں پر ان کی گرفت ''جارحانہ'' تھی۔ دو رائفلیں باقاعدہ ہماری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ ''آپ گاڑی میں سوار ہو جائیں۔'' رفاقت نے ذرا تحکم سے کہا۔

''لیکن تم تو کہہ رہے تھے کہ وڈے صاحب سے ملنا ہے؟''

''وڈے صاحب اس وقت پارا ہاؤس سے باہر ہیں۔'' پٹھان گارڈ نے مختصر سا جواب دیا اور انیق کو گاڑی کی طرف دھکیلا۔

میں نے رفاقت کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ مجبور ہے۔ ہمیں وہی کرنا ہو گا جو کہا جا رہا ہے۔ ورنہ گارڈز کسی حد تک بھی جا سکتے ہیں۔ انیق نے پُرتپش سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ بات ماننی ہے یا انکار کرنا ہے۔ میں نے آنکھوں آنکھوں میں اس سے کہا کہ ابھی ان کے کہنے کے مطابق ہی چلتے ہیں...... اس کے ساتھ ہی میں قدم بڑھا کر گاڑی کے عقبی دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ یہ ایک بڑی لوڈر نما گاڑی تھی۔ تقریباً ویسی ہی جیسی پولیس کے محکمے میں قیدیوں کو لے جانے کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ کھڑکیوں کے شیشے بلائنڈ تھے اور باہر کی طرف آہنی جالی لگی ہوئی تھی۔ دونوں طرف لمبی نشستیں تھیں اور درمیان سے فرش خالی تھا۔

ہمارے اندر داخل ہوتے ہی دروازہ باہر سے لاک کر دیا گیا اور گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ آگے روانہ ہو گئی۔ میرا دھیان پتا نہیں کیوں آقا جان ہی کی طرف جا رہا تھا یقیناً انیق کی سوچ کا رخ بھی یہی تھا۔ آقا جان یہاں پارا ہاؤس میں ہارڈ لائنر کی حیثیت رکھتا تھا اور وڈے صاحب کا ''وفادار'' ہونے کے باوجود اپنی من مانیاں کرتا تھا۔ وہ جن کو قصوروار سمجھتا تھا ان کے ساتھ اس کا رویہ بے حد سخت ہوتا تھا۔

جلدی ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ ہم سیکورٹی کے مختلف مراحل سے گزر کر پارا ہاؤس کی اونچی دیواروں سے باہر نکل آئے ہیں۔ ''کہاں لے جا رہے ہیں یہ لوگ؟'' میں نے انیق سے رائے طلب کی۔

''ہو سکتا ہے آپ کی سسرال لے جا رہے ہوں۔ میرا مطلب ہے بنگلے کی طرف جہاں آپ کی وائف (جاناں) قیام پذیر ہیں۔''

''تمہاری کھوپڑی ٹھیک کام نہیں کر رہی۔ مین گیٹ سے نکلنے کے بعد ہم دائیں طرف مڑے ہیں، بنگلا بائیں جانب ہے۔'' میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

''تو پھر ہو سکتا ہے کہ یہ ہمیں ربڑی کھلانے لے جا رہے ہوں۔ کیونکہ بائیں طرف

جائیں تو لاہور آ جائے گا اور پھر لاہور سے ''ذرا آگے'' کراچی۔''

''تمہاری یہ ربڑی والی بات مجھے بھی درست لگ رہی ہے اور میرا خیال ہے کہ ہمارے لیے یہ ربڑی آقا جان نے ہی تیار کروائی ہے۔''

''اور ہوسکتا ہے کہ وہ اس گاڑی کے پیچھے پیچھے ہمارے ساتھ آ رہا ہو۔'' انیق نے گاڑی کے عقبی دروازے کی درز سے جھانکنے کی ناکام کوشش کی۔

بہر حال نظر نہ آنے کے باوجود ہمیں اندازہ ہو رہا تھا کہ کوئی گاڑی مسلسل ہمارے پیچھے آ رہی ہے۔ گاہے بگاہے اس پیچھے آنے والی گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی چمک کسی کھڑکی میں نظر آتی تھی۔

پانچ دس منٹ اسی طرح گزر گئے۔ جب اس بند گاڑی نے کسی جگہ رکنے کا نام نہیں لیا تو میں نے سوچا کہ گاڑی کے ڈرائیونگ کیبن کی طرف دستک دی جائے اور ان لوگوں سے دریافت کیا جائے کہ کیا وہ واقعی ''لاہور'' یا پھر ''کراچی'' جا کر رکنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ گاڑی میں تھرتھراہٹ نمودار ہوئی، پھر وہ بری طرح ڈگمگانے لگی۔ اس کی رفتار کم ہوئی اور وہ سڑک کے کنارے کسی جگہ رک گئی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ اس کا اگلا بایاں ٹائر فلیٹ ہو گیا ہے۔ غالباً ناہموار سڑک پر کوئی شیشہ یا میخ وغیرہ ٹائر میں لگ گئی تھی۔

کھڑکیوں سے باہر دیکھنا ناممکن تھا۔ ہم مکمل تاریکی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ پوری گاڑی یخ ہو رہی تھی۔ باہر سے مدھم آوازیں سنائی دینے لگی۔ گارڈز باتیں کر رہے تھے۔ ساتھ ساتھ پہیا بدلنے کے لیے سامان نکالا جا رہا تھا۔ دفعتاً میرے کانوں میں آقا جان کی کرخت آواز پڑی اور یہ اندیشہ درست ثابت ہو گیا کہ وہ بدبخت ہمارے ساتھ یہاں موجود ہے۔ یقیناً وہ پیچھے آنے والی گاڑی میں سوار تھا اور اب اس لوڈر کے ڈرائیور وغیرہ پر برس رہا تھا۔ اس نے ڈرائیور یا ہیلپر میں سے کسی کو گندی گالی دی اور جلدی ہاتھ چلانے کا حکم دیا۔ اسی دوران میں اس کے سیل فون کی مخصوص گھنٹی بجی اور وہ کال سننے میں مصروف ہو گیا۔ وہ مالے زبان میں بات کر رہا تھا۔ میں صرف اتنا اندازہ لگا سکا کہ اس کا مخاطب حلمی ہے۔ بہر حال انیق میرے ساتھ گاڑی کے اندر موجود تھا اور وہ آقا جان کا بولا ہوا ہر ہر لفظ سمجھ رہا تھا۔ تاریکی میں مجھے انیق کے تاثرات تو صاف نظر نہیں آ رہے تھے مگر اس کے پہلو بدلنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ گفتگو اہم ہے۔ بات کرتے کرتے آقا جان کچھ فاصلے پر چلا گیا لیکن اس گفتگو کا اہم ترین حصہ انیق سن چکا تھا۔

اس نے سرگوشی کے لہجے میں انکشاف کرتے ہوئے کہا۔ ''شاہ زیب بھائی! ہماری

ربڑی والی بات درست تھی۔ ہمیں بڑی اسپیشل ربڑی بڑے اہتمام کے ساتھ کھلانے کا ارادہ رکھتے ہیں یہ لوگ۔''

''سیدھی طرح بتاؤ۔'' میں نے جھنجلا کر کہا۔

وہ بولا۔ ''یہ کنجر زادہ ہمیں اپنے کسی نجی ٹارچر سیل میں لے کر جا رہا ہے۔ ہم سے سجاول کا اتا پتا اگلوانا چاہتا ہے۔''

میری رگوں میں خون نے اچھالا مارا۔ ہاتھ پاؤں میں سنسناہٹ جاگ گئی۔ آخر آقا جان نے اپنی اصل دکھا ہی دی تھی لیکن وہ جانتا نہیں تھا کہ اس نے کہاں ہاتھ ڈالا ہے۔ اس نے ہمیں ''انڈر اسٹیمیٹ'' کیا تھا۔ یہ اسے سبق سکھانے کا وقت تھا۔

''پھر کیا ارادہ ہے؟'' انیق نے سرگوشی کی۔

''ربڑی کھانے اور کھلانے کے لیے یہ موقع اچھا ہے، وہاں ربڑی والی دکان (ٹارچر سیل) پر پہنچ گئے تو پھر پتا نہیں وہاں کتنے بندے ہوں۔'' میں نے کہا۔

''میں تیار ہوں۔'' وہ جوش سے بولا۔

''تمہاری جیب میں ایک لائٹر تھا؟''

''ہاں...... ہے...... یہ لیں۔'' انیق نے لائٹر میری ہتھیلی پر رکھ دیا۔ میں نے لائٹر آن کیا اور فوم کی نشست کے ایک کونے کو آگ دکھا دی۔ ایک ننھا سا شعلہ پیدا ہوا اور بڑھنے لگا۔ میں نے دھڑ ادھڑ گاڑی کی کھڑکیاں بجانا شروع کیں۔ ''دروازہ کھولو'' میں چلایا۔

اب انیق بھی میرا ساتھ دے رہا تھا۔ شروع میں تو ہمارے شور کو معمول کی کارروائی سمجھا گیا۔ لیکن جب دھواں درزوں میں سے باہر نکلنا شروع ہوا اور ہمارا شور بھی بڑھ گیا تو گارڈز کو بدحواسی میں عقبی دروازہ کھولنا پڑا۔ یہ ایک چاندنی رات تھی۔ اردگرد سب کچھ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے تیزی سے موقع محل دیکھ لیا۔ یہاں ہماری والی بند گاڑی کے علاوہ ایک کار موجود تھی۔ گارڈز کی تعداد تقریباً چھ تھی۔ ان میں سے دو گاڑی کا ٹائر بدلنے میں مصروف تھے۔ باقی چار میں سے دو کی رائفلیں کندھوں پر جھول رہی تھیں۔ دو کی رائفلیں ہماری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ دھوئیں کے سبب ہم بری طرح کھانستے ہوئے باہر نکلے تھے۔ خاص طور سے انیق کی کھانسی تو نہایت شدید تھی، اور میں جانتا تھا کہ اس میں ایکٹنگ بھی شامل ہے۔ وہ کھانستے کھانستے گھٹنوں کے بل گر گیا۔ اس کا سانس جیسے رک گیا تھا۔

ایک گارڈز نے اس کے قریب جھک کر اسے سیدھا کرنا چاہا اور اس کی یہ غلطی نہ صرف اسے اس کی رائفل سے محروم کر گئی، بلکہ اسے اپنے سینے کے نچلے اور نازک حصے پر سر کی ایک

ایسی زوردار ٹکر سہنا پڑی کہ وہ اچھل کر کئی فٹ پیچھے گرا۔
انیق کے ایکشن میں آتے ساتھ ہی میں نے سامنے والے گارڈ پر چھلانگ لگا دی تھی۔
سب سے پہلے میں نے اس کی آٹو میٹک رائفل ہی اوپر اٹھائی۔ وہ بے دریغ ٹریگر دبا چکا تھا۔ تڑتڑ کی لرزہ خیز آواز کے ساتھ بہت سے شعلے چاندنی میں پرواز کر گئے۔ میں نے رائفل بردار کی ناف میں زوردار لات رسید کر کے رائفل اس سے چھین لی۔ میں نے آقا جان کو اپنی سفید گاڑی کے پاس کھڑے دیکھ لیا تھا۔ میں اس کو گن پوائنٹ پر لے کر باقیوں سے ہتھیار رکھوانا چاہتا تھا لیکن وہ حالات کی نزاکت بھانپ چکا تھا، اس سے پہلے کہ میں بوری طرح رائفل کو اپنی گرفت میں لے پاتا اور اسے للکارتا، وہ نشیب میں چھلانگ لگا کر جھاڑیوں میں اوجھل ہو گیا۔ ایک گارڈ اپنی سیون ایم ایم سونت کر میرے سامنے آیا، میں نے اس کی ٹانگوں کو نشانہ بنایا۔ پنڈلی پر ایک گولی کھا کر وہ اوندھے منہ میرے قدموں میں گرا۔ تاہم تب تک تین گارڈز ایک ساتھ مجھ پر ہلا بول چکے تھے۔ شاید وہ مجھے گولی مارے بغیر پکڑنا چاہتے تھے اور بند گاڑی کا دروازہ کھولنے کے بعد یہ ان کی دوسری بھول تھی۔ انہوں نے مجھ سے رائفل چھیننے کی کوشش کی اور میں نے اگلے تیس چالیس سیکنڈ میں انہیں روئی کی طرح دھنک ڈالا۔
دوسری طرف انیق بھی بڑی کامیابی سے اپنی رائفل کا دفاع کر رہا تھا۔ وہ اپنے دو مدِمقابل سے گتھم گتھا تھا اور انہیں مسلسل گھونسے اور ٹکریں رسید کر رہا تھا۔ میرے حریفوں میں سے دو اپنی ہڈیاں تڑوا چکے تھے اور اب کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں تھے۔ تیسرے کی رائفل بھی اس کی گرفت سے نکل چکی تھی۔ اور وہ خنجر برآمد کرنے کی لاحاصل کوشش میں تھا لیکن پھر اچانک پانسا پلٹا۔ یہ تین موٹر سائیکلیں تھیں جو برق رفتاری سے موقع پر پہنچیں۔ ہر بائیک پر دو دو افراد سوار تھے۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا یہ لوگ آقا جان کے قریبی ساتھیوں میں شمار ہوتے تھے اور کچھ تاخیر کے ساتھ پارا ہاؤس سے روانہ ہوئے تھے۔ انہوں نے میدان جنگ گرم دیکھا تو آتے ساتھ ہی کود پڑے۔ ان میں سے ایک نے تو موٹر بائیک براہِ راست میری ٹانگوں میں گرائی اور دونوں سوار اچھل کر مجھ سے لپٹ گئے۔ ان کا واسطہ کسی عام شخص سے نہیں ایم ایم اے کے یورپی چیمپئن سے تھا مگر مجھے انیق کی طرف بھی دیکھنا پڑ رہا تھا۔ وہ اب نیچے گر گیا تھا اور اس سے رائفل چھیننے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ میں نے اب تک فائر کرنے سے گریز کیا تھا مگر لگتا تھا کہ اب فائر کرنا پڑے گا۔ میں نے دوسری گولی اس شخص پر چلائی جس نے انیق کی گردن پر پاؤں رکھا ہوا تھا اور رائفل کو مروڑے دے رہا تھا تاکہ وہ اس کی گرفت سے نکل جائے۔ اس بار بھی میں نے ٹانگ پر ہی فائر کیا تھا۔ لمبا تڑنگا پٹھان گارڈ جس کے

وزن سے انیق کی گردن ٹوٹنے کے قریب تھی تڑپ کر گرا۔ تاہم گرتے گرتے بھی وہ انیق والی رائفل لے گیا۔ میں نے تیسرا فائر اس شخص پر کیا جو خطرناک انداز میں اپنی رائفل انیق پر تان رہا تھا۔ گولی اس کے پیٹ میں لگی اور وہ سفید کار سے ٹکرا کر گر گیا۔ جب ان لوگوں نے مجھے مرنے مارنے پر آمادہ دیکھا تو رائفلیں سونت لیں۔ میری ایک رائفل کے مقابلے میں کم و بیش چھ رائفلیں میری طرف اٹھ گئیں۔ ایسے ہی وہ مقام ہوتے ہیں جہاں مارشل آرٹ ناکام ہو جاتا ہے اور بدمعاشی و خونخواری غلبہ پا لیتی ہیں۔ میں نے مارشل آرٹ کے علاوہ جو کچھ سیکھا تھا وہ ایسی سچویشنز کا مقابلہ کرنے کے لیے سیکھا تھا جب ایک ٹریگر دبا کر کسی شہ زور کو اوندھے منہ لٹا دیا جاتا ہے، جب کسی گینگسٹر کے پالتو قاتل، جوڈو کراٹے کے کسی نہتے کھلاڑی پر پگھلے ہوئے سیسے کی بارش کر دیتے ہیں اور وہ اپنے سارے فن و ہنر سمیت پلک جھپکتے میں راہی عدم ہو جاتا ہے۔ انیق کو تو انہوں نے دبوچ لیا تھا لیکن میرے ہاتھ میں آٹومیٹک رائفل تھی۔ میں ان کے لیے خطرے کی علامت تھا۔ وہ کسی بھی وقت مجھ پر فائر کھول سکتے تھے۔ کم از کم شدید زخمی تو کر ہی سکتے تھے۔ میری نگاہ اس تاریک نشیب کی طرف تھی جہاں کچھ دیر پہلے مجھ سے بچنے کے لیے آقا جان نے جست لگائی تھی۔ آخری کوشش کے طور پر میں خود کو اس نشیب میں گرا سکتا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں اس نازک فیصلے پر عمل کرتا۔ ایک للکار سنائی دی۔ یہ آواز میرے لیے اجنبی نہیں تھی۔ یہ سجاول کی آواز تھی۔ وہ دہاڑا تھا۔ ”رک جاؤ......کوئی گولی نہ چلائے...... رک جاؤ۔“

میں نے مڑ کر دیکھا، کیچڑ میں لتھڑی ہوئی ایک بڑی جیپ کی جھلک نظر آئی۔ اس کی تیز ہیڈ لائٹس اردگرد کے سارے منظر کو روشن کر رہی تھیں۔ اس بڑی جیپ پر کم و بیش آٹھ افراد سوار تھے۔ ان میں سے کئی ایک نے اپنی رائفلیں آقا جان کے ساتھیوں کی طرف تان رکھی تھیں۔ سجاول کی سرخ آنکھیں نیم تاریکی میں کسی شکاری جانور کی طرح چمک رہی تھیں۔ اس کے سر پر ایک بڑا خاکی پگڑ تھا۔ وہ جست لگا کر جیپ سے اترا۔ اس کی رائفل بدستور آقا جان کے شوٹرز کی طرف تھی۔ اس نے بلند آواز سے کہا۔ ”کوئی بھی گولی نہ چلائے......نہیں تو سب چلا دیں گے۔“

یہ بڑا ڈرامائی قسم کا سین تھا۔ جیسے اس چاندنی رات میں......اس ویران جگہ پر اس جما دینے والی سردی کے تھپیڑوں میں کسی فلم کی عکس بندی ہو رہی ہو۔ دونوں طرف سے رائفلیں اٹھی ہوئی تھیں۔ مجھ سمیت سب نے انگلیاں ٹریگرز پر رکھی ہوئی تھیں۔ یہی وقت تھا جب آقا

جان چلاتا ہوا نشیب میں سے برآمد ہو گیا۔ اس کا پینٹ کوٹ جھاڑ جھنکاڑ اور مٹی میں لتھڑا ہوا تھا۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے۔'' ''اسٹاپ اٹ...... آئی سے اسٹاپ اٹ۔''

گولی کوئی نہیں چلا رہا تھا مگر رائفل رکھنے کو بھی کوئی تیار نہیں تھا۔ انیق کو بدستور تین افراد نے جکڑا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا اس کے منہ سے خون بہہ رہا تھا اور اس کا سویٹر تار تار ہو چکا تھا۔ آقا جان کے چہرے پر بھی کئی خراشیں نظر آ رہی تھیں۔ سجاول کی گرجدار آواز ابھری، وہ بولا۔ ''شاہ زیب! تم الٹے قدموں چل کر یہاں میرے پاس آ جاؤ۔''

میں نے ایسا ہی کیا اور سجاول کے پاس پہنچ گیا۔ یہی وقت تھا جب میری نگاہ کیچڑ میں لتھڑی ہوئی جیپ کے اندر گئی۔ میں ششدر رہ گیا۔ وہاں انچارج گارڈ قادر خان رسیوں سے بندھا پڑا تھا۔ قادر خان کے چہرے پر چوٹوں کے کئی نشان تھے۔ اس کا ایک ساتھی بھی اس کے پہلو میں تھا اور اس کی مشکیں بھی کسی ہوئی تھیں۔ یہ کیا ماجرا تھا؟ قادر خان کی جگہ سجاول اور سجاول کی جگہ قادر خان نظر آ رہا تھا۔

سجاول نے آقا جان سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''یہ اچھا صلہ مل رہا ہے ہم کو...... میں تو سمجھا تھا کہ تمہارے مجرم کو پکڑ کراؤں گا تو گلے میں ہار ڈالو گے تم لوگ۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو تم؟'' آقا جان نے بلند آواز میں کہا۔

''کہنا کچھ نہیں چاہتا، خود ہی دیکھ لو۔ تمہارا یہ سکیورٹی انچارج، تمہارا سب سے بڑا محافظ...... سب سے بڑا چور نکلا ہے۔ مال بھی تقریباً سارا برآمد ہو گیا ہے اور یہ خود بھی موجود ہے۔''

آقا جان بھی ہکا بکا نظر آنے لگا۔ میں نے کیچڑ سے لتھڑی ہوئی جیپ میں جھانکا، قادر خان جیپ کے فرش پر پہلو کے بل چپ پڑا تھا اور اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں قادر خان کو اس حالت میں دیکھ رہا ہوں۔

آقا جان چند قدم چل کر آگے آیا اور اس نے بھی جیپ میں جھانکا۔ قادر خان کو دیکھ کر اس کی ناک کا بل کچھ اور موٹا ہو گیا۔ کچھ دیر تک تذبذب میں رہنے کے بعد اس نے اپنے ساتھیوں کو ہاتھ سے اشارہ کیا کہ وہ اپنی رائفلیں نیچے کر لیں۔

ان لوگوں نے یکے بعد دیگرے رائفلیں جھکا لیں تو ''کیچڑ آلود جیپ'' کے آس پاس کھڑے سجاول کے ساتھیوں نے بھی ہتھیار نیچے کر لیے۔ میں نے بھی رائفل ایک جانب رکھ دی۔ انیق نے بھی خود کو چھڑایا اور لپک کر ہمارے پاس پہنچ گیا۔ جس بند گاڑی کی نشست کو میں نے آگ لگائی تھی اس کے اندر سے اب بھی دھواں اٹھ رہا تھا۔ بہرحال آگ صرف

نشست کے ایک حصے تک ہی محدود رہی تھی۔ اسے مٹی وغیرہ ڈال کر بجھا دیا گیا تھا۔ جس گارڈ کے پیٹ میں میری چلائی ہوئی گولی لگی تھی وہ سڑک پر لوٹ پوٹ رہا تھا۔ اس کے سوا باقی سب کی حالت تسلی بخش تھی۔ اسے سفید کار میں ڈالا گیا، ایک اور زخمی جس کے ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی، کار میں سوار ہو گیا۔ کار انہیں لے کر تیزی کے ساتھ روانہ ہو گئی۔

"یہ سب کیا ڈراما ہے؟" آقا جان جھنجلا کر بولا۔

جواب دینے کے بجائے سجاول جیپ کی طرف بڑھا اور ریگ زین کے دو بڑے بیگ کھینچ کر باہر نکال لیے۔ یہ دونوں بیگ خاصے وزنی تھے۔ سجاول نے انہیں بے پروائی سے زمین پر پھینکا۔ پھر ایک بیگ کی زپ کھولی۔ وہ ملکی اور غیر ملکی کرنسی سے بھرا ہوا تھا۔ چند نہایت قیمتی ڈیکوریشن پیس اور ان پر لگے ہوئے ڈائمنڈ بھی ہیڈ لائٹس میں چمک رہے تھے۔ یقیناً دوسرے بیگ کا سامان بھی اسی نوع کا تھا۔ اندازاً دونوں بیگز کا وزن پینتیس چالیس کلو تو تھا۔

سجاول نے رائفل کا بیرل قادر خان کے سر سے لگایا اور زوردار کچوکا دیتے ہوئے بولا۔

"اپنے منہ سے بک کیا ہے یہ سب کچھ؟"

قادر خان بولا کچھ نہیں، لیکن اس کے نہ بولنے سے کچھ فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس کے تاثرات چلا چلا کر یہ گواہی دے رہے تھے کہ سجاول غلط نہیں کہہ رہا۔ وہ اپنے نتھنے سے گاہے بگاہے رِسنے والا خون پونچھتا رہا اور نگاہیں جھکائے رکھیں۔ انسان کے اتنے روپ ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ شکلیں دھوکا دیتی ہیں۔ قادر خان کو ہم کیا سمجھتے تھے اور وہ کیا نکلا تھا کہ وہ اس قماش کا بندہ ہے، ایک طرح سے وہ پارا ہاؤس کا سب سے بڑا محافظ تھا اور اسی نے پارا ہاؤس میں اتنی بڑی نقب لگائی تھی......

دوسری طرف سجاول تھا۔ پارا ہاؤس والوں کا سارا شک شبہ اسی کی طرف جا رہا تھا۔ شکیل داراب اور انیق، سجاول کو ایک ڈکیت کی حیثیت سے بھی جانتے تھے اور انہیں سو فیصد یقین تھا کہ یہ بڑی واردات سجاول نے ہی کی ہے۔ وہ دو تجوریاں خالی کر کے بھاگا ہے اور سکیورٹی انچارج اپنے فرض کو لبیک کہتے ہوئے اس کے پیچھے گیا ہے مگر جو کچھ سامنے آیا وہ برعکس تھا۔

سجاول نے اپنی رائفل کا بیرل قادر خان کے زخمی ساتھی کے سر پر رسید کیا اور کڑک کر پوچھا۔ "بولو...... ہم نے کہاں سے پکڑا ہے تمہیں؟"

اس نے سجاول کی بڑی بڑی سرخ آنکھوں میں دیکھا اور ہکلا کر بولا۔ "دریا پار کالے کیکروں والے علاقے سے۔"

سجاول نے کروڑوں کے مال مسروقہ اور نقدی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔''یہ اپنی والدہ کا جہیز کہاں سے اٹھایا ہے تم نے؟''

''اندر......اندر والی......دو الماریوں (تجوریوں) سے۔''اس نے نظریں جھکا کر کہا۔

اگلے دس منٹ میں ساری صورتِ حال کھل کر سامنے آ گئی۔ سجاول نے جو رُوداد سنائی وہ کچھ اس طرح تھی۔ قادر خان غالباً ایک عرصے سے کسی اچھے موقعے کی تلاش میں تھا۔ سکیورٹی انچارج کی حیثیت سے وہ ہر جگہ آ جا سکتا تھا اور اہم تالوں کی چابیوں تک بھی اس کی رسائی تھی۔ پرسوں شب اس نے اپنے دیرینہ منصوبے کو عملی جامہ پہنایا۔ ایک ایمبولینس اور ''تشویشناک'' حالت والا ایک مریض وہ پہلے ہی تیار کر چکا تھا۔ ایمبولینس پارا ہاؤس میں ایک ایسی جگہ کھڑی تھی جہاں اسے اصولی طور پر نہیں ہونا چاہیے تھا۔ رات کے اندھیرے میں اس کے اردگرد سجاول کو کچھ مشکوک سرگرمی بھی نظر آئی۔ آخر وہ وقت آ گیا جب قادر خان دو تجوریاں خالی کر کے سامان ایمبولینس میں پہنچا چکا تھا اور جانے کی تیاری میں تھا۔ سجاول اب پوری طرح ٹھٹک چکا تھا۔ اس کا دل گواہی دینے لگا تھا کہ دال میں بہت کچھ کالا ہے۔ وہ باہر نکلا اور سکیورٹی کے کیمروں سے بچتا ہوا ایمبولینس کے قریب پہنچ گیا۔ ایمبولینس کو ایسی جگہ کھڑا کیا گیا تھا جہاں سی سی ٹی وی کیمرا خراب تھا......یا خراب کر دیا گیا تھا۔ چند منٹ بعد جب ایمبولینس حرکت میں آئی تو سجاول اس کے نیچے موجود تھا۔ اس نے رسک لیا تھا اور خود کو اس کے پیندے کے نیچے چپکا لیا تھا۔ اس کام کے لیے اس نے ایک چرمی بیلٹ کا سہارا بھی لیا تھا۔

پارا ہاؤس سے باہر نکلنے کے بعد ایمبولینس کسی نامعلوم مقام کی طرف روانہ ہو گئی۔ سجاول تادیر اس طرح ایمبولینس کے نیچے چپکا نہیں رہ سکتا تھا۔ سڑک سے اس کے جسم کی دوری بھی زیادہ نہیں تھی۔ کسی اسپیڈ بریکر یا کھڈے میں اچھلنے کی صورت میں سجاول زخمی ہو سکتا تھا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ عقب میں کچھ فاصلے پر کوئی اور گاڑی بھی آ رہی ہے۔ نہر کے ایک تنگ پل پر سے گزرتے ہوئے جب ایمبولینس کی رفتار بہت دھیمی ہوئی تو سجاول نے خود کو ایمبولینس سے علیحدہ کر لیا۔ اسے معمولی خراشیں آئیں۔ اب اس کی نگاہ پیچھے آنے والی گاڑی پر تھی۔ پیچھے آنے والی گاڑی ایک پرانے ماڈل کی ایف ایکس کار تھی۔ سجاول نے سڑک کے درمیان میں کھڑے ہو کر اسے روکا، اسے ایک جواں سال شخص چلا رہا تھا۔ سجاول نے اسے ڈرا دھمکا کر بھگا دیا اور خود ایف ایکس کار پر سوار ہو کر ایمبولینس کا پیچھا جاری رکھا۔ جلد ہی ایمبولینس والوں کو شک ہو گیا کہ ایف ایکس کار مسلسل پیچھے آ رہی ہے۔ اس امر کی تصدیق

کے لیے انہوں نے ایمبولینس کو سڑک سے کچے میں اتار دیا اور درختوں کے درمیان ناہموار راستے پر آگے بڑھنے لگے۔ سجاول نے بھی ایف ایکس کچے راستے پر ڈال دی۔ جب اسے اندازہ ہوا کہ تیز رفتار ایمبولینس اسے جل دے کر نکل سکتی ہے تو اس نے اپنے پستول سے اس کا ٹائر برسٹ کرنا چاہا۔ اس نے قریباً 50 میٹر کے فاصلے سے ایمبولینس پر تین فائر کیے۔ جواب میں ایمبولینس کی طرف سے بھی اس پر فائر آیا۔ تعاقب میں شدت آ گئی۔ ایمبولینس میں قادر خان وغیرہ کو علم نہیں تھا کہ صرف ایک اکیلا شخص ان کا تعاقب کر رہا ہے۔ اندھیرے میں انہیں کار کی صرف ہیڈ لائٹس دکھائی دے رہی تھیں اور وہ خوف زدہ ہو چکے تھے۔ آگے ایک نالا تھا، جس میں پانی چل رہا تھا۔ قادر خان وغیرہ نے ایمبولینس نالے میں ڈال دی۔ سجاول کو بھی کار نالے میں اتارنا پڑی۔ ایمبولینس تو جیسے تیسے نکل گئی مگر سجاول والی کار چھوٹی ہونے کی وجہ سے نالے کے بیچ میں بند ہو گئی۔ سجاول نے کار چھوڑ دی اور کمر کمر پانی سے گزر کر کنارے پر پہنچا، وہ ہر صورت ایمبولینس کا پیچھا جاری رکھنا چاہتا تھا۔ آگے راستہ بے حد دشوار گزار تھا، جگہ جگہ بلند سرکنڈے تھے اور دلدلی زمین تھی، سجاول کا اندازہ درست نکلا۔ قریباً ایک گھنٹے بعد اس نے ایمبولینس کو گھنے سرکنڈوں میں کھڑے دیکھ لیا۔ ایمبولینس بالکل خالی تھی۔ اردگرد موجود ٹائروں کے نشانات سے واضح ہوتا تھا کہ ایک فور وہیل جیپ موقعے پر پہنچی تھی اور قادر خان اپنے دونوں ساتھیوں اور مسروقہ سامان سمیت اس میں سوار ہو کر نکل گیا تھا۔

نالا پار کرتے ہوئے سجاول کا سیل فون بھیگ کر بیکار ہو گیا تھا، تاہم اس کے بیکار ہونے سے ذرا پہلے سجاول نے اس پر ایک چھوٹی سی کال کر لی تھی۔ یہ کال اس کے ایک مقامی دوست کالے خان کے لیے تھی۔ اس کال نے کام دکھایا اور قریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد کالے خان اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ ایک جیپ پر وہاں پہنچ گیا۔ ان لوگوں نے مل کر جنگل میں قادر خان کو ڈھونڈا اور آج رات دس بجے کے لگ بھگ کامیاب ہو گئے۔ دراصل قادر خان اور اس کے تین ساتھی معاملہ ٹھنڈا ہونے تک کے لیے جنگل میں ہی چھپ گئے تھے۔ ٹائروں کے نشانات نے ان کی نشاندہی کی۔ سجاول اور کالے خان وغیرہ نے اپنی جیپ چھوڑ دی اور پیدل ہی آگے بڑھے۔ ایک جگہ سجاول کو جھاڑیوں میں سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ وہ پیٹ کے بل رینگتا ہوا موقعے پر پہنچا۔ چاندنی رات میں اس نے قادر خان کو جھاڑیوں میں بیٹھے دیکھا۔ وہ پیشاب کی حاجت کے لیے وہاں موجود تھا۔ اس کی رائفل ایک جانب درخت سے ٹکی ہوئی تھی۔ جونہی وہ اٹھا، سجاول نے رائفل کی نال اس کے سر سے لگا دی۔ اس نے بدحواسی میں

سجاول پر حملہ کر دیا۔ چند سیکنڈ تک دونوں میں مارا ماری ہوئی۔ اسے سجاول کے مکے کی طاقت کا اندازہ نہیں تھا۔ جونہی سجاول کو موقع ملا اس نے قادر کو نیم بے ہوش کر کے زمین پر ڈال دیا۔

اس اثنا میں سجاول کے ساتھیوں کالے خان وغیرہ نے تیزی سے کارروائی کی اور قادر کے ساتھیوں کو ڈھونڈ لیا۔ انہوں نے شاخوں وغیرہ سے ایک عارضی سائبان بنا رکھا تھا اور چائے تیار کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک تو بھاگنے میں کامیاب ہو گیا لیکن ایک کو سارے مسروقہ سامان سمیت پکڑ لیا گیا۔ (تیسرا شاید لکڑیاں وغیرہ اکٹھی کرنے نکلا ہوا تھا، وہ ہاتھ نہیں آیا)

سجاول کی رُوداد سننے کے بعد ہر بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوگئی۔ آقا جان اور اس کے ساتھیوں کے چہرے اب اترے ہوئے نظر آتے تھے۔ آقا جان کی ناک کا بل جو آدھ پون گھنٹا پہلے کوئی آدھ انچ ابھر آیا تھا اب ''ڈاؤن'' دکھائی دے رہا تھا۔ اب اس نے خود پر مصنوعی غصہ طاری کر رکھا تھا۔ وہ کیچڑ آلود جیپ کی طرف بڑھا، اور پہلے سے زخمی قادر خان پر جھپٹ پڑا۔ اس نے قادر خان کو کئی تھپڑ رسید کیے اور اس کے بال کھینچتے ہوئے بولا۔ ''نمک حرام......غدار...... تجھے کیا سمجھتے تھے ہم اور تو کیا نکلا۔ تیری تو کھال میں بھس بھروا کر نہ رکھ دیا تو آقا جان نام نہیں میرا۔ تیرے جیسے آستین کے سانپ ہی ہوتے ہیں جن کے سر جوتے سے کچلنے پڑتے ہیں......''

سجاول نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''آپ ٹھیک کہتے ہو آقا صاحب۔ آستین کے سانپوں کے ساتھ اور دوسرے سانپوں کے ساتھ تو ایسا ہی ہونا چاہیے لیکن جو آپ کے وفادار خدمت گار ہیں، ان کے ساتھ بھی یہاں کچھ اچھا سلوک نہیں ہو رہا۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو تم؟'' آقا جان کی ناک کا بل پھر موٹا ہونے لگا۔

''میرا خیال ہے آپ سمجھ رہے ہیں۔ یہ سب کیا تھا جو یہاں میرے آنے سے پہلے ہو رہا تھا؟''

''میں اس کا جواب یہاں نہیں، پاراہاؤس میں جا کر دوں گا اور ان دونوں کو بھی جواب دینا پڑے گا۔'' آقا جان نے تلخ انداز میں ہماری طرف اشارہ کیا۔ پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔ ''ان کی وجہ سے تین بندے زخمی ہوئے ہیں اور جس کے پیٹ میں گولی لگی ہے وہ شدید زخمی ہے۔ پتا نہیں کہ بچتا بھی ہے یا نہیں۔''

''لیکن جو کچھ ہوا ہے دونوں طرف سے ہوا ہے۔ مجھے پتا چلنا چاہیے کہ وجہ کیا تھی؟''

سجاول بھی ڈٹ گیا۔

اس کے تاثرات دیکھ کر آقا جان ذرا دھیما پڑا۔ کہنے لگا۔ ''میں نے اپنی طرف سے ان دونوں کا بھلا کیا...... جب تمہیں ساری صورتِ حال کا پتا چلے گا تو تمہیں خود بھی ان کی حرکت پر افسوس ہوگا۔''

''لیکن آقا جان صاحب! میں ابھی جاننا چاہتا ہوں۔'' سجاول نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ اس کا سینہ تنا ہوا تھا اور رائفل پر اس کی گرفت بتا رہی تھی کہ وہ کسی بھی وقت اسے پھر سے تان سکتا ہے۔

آقا جان تاڑ گیا کہ یہ معاملہ ایسے نہیں ٹلے گا۔ اگلے تین چار منٹ میں اس نے جو کہانی گھڑی اور سنائی وہ کچھ یوں تھی، اس نے کہا کہ اس نے ہمیں ہمارے بھلے کے لیے پارا ہاؤس سے نکالا تھا اور ایک دو دن کے لیے کہیں اور رکھنا چاہ رہا تھا۔ اس ''بھلے'' کی وضاحت کرتے ہوئے اس نے سجاول کی طرف اشارہ کیا اور پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''تم کہہ رہے ہو کہ تم اس نمک حرام قادر خان کے پیچھے گئے تھے لیکن پارا ہاؤس میں یہی سمجھا گیا کہ جو کچھ ہوا ہے تم نے کیا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ تمہارے ساتھ ساتھ تمہارے ان دونوں ساتھیوں کے بارے میں بھی بہت باتیں بنائی گئی ہیں۔ پارا ہاؤس والوں میں سے کچھ لوگ ان دونوں کے بارے میں بہت زیادہ تپے ہوئے تھے۔ مجھے ڈر پیدا ہوا کہ کہیں ان کو کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کی جائے۔ کچھ اور نہ بھی ہوتا تو اس چوری کے بعد ان سے زبردست مار پیٹ تو ہو سکتی تھی۔ میں خاموشی کے ساتھ انہیں وہاں سے نکال لایا، لیکن راستے میں انہوں نے دوسرا ہی تماشا کر دیا۔ تم نے گاڑی کو لگی ہوئی آگ دیکھی ہی ہوگی۔ یہ انہوں نے خود لگائی اور ہمیں دروازہ کھولنے پر مجبور کیا۔ اس کے بعد یہاں جو کچھ ہوا ہے، وہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ دعا کرو کہ زخمی کی جان بچ جائے ورنہ بات دور تک جائے گی۔''

آقا جان سراسر جھوٹ بول رہا تھا۔ اس نے ٹائر پنکچر ہونے کے بعد حلمی کے ساتھ جو گفتگو کی تھی وہ ساری انیق کی سمجھ میں آئی تھی۔ لیکن انیق نے وہ گفتگو نہ بھی سنی ہوتی تو بھی یہ بات ہرگز ماننے جانے کے قابل نہیں تھی کہ آقا جان جیسے مکار لومڑ نے ہماری حفاظت کی خاطر ہمیں وہاں سے نکالا تھا۔ بند گاڑی میں ہمیں سوار کرتے ہوئے جس طرح ہم پر رائفلیں تانی گئی تھیں، وہ نقشہ ہی آئندہ کی صورتِ حال سمجھانے کے لیے کافی تھا۔ وڈے صاحب اور اہلِ خانہ میں سے بھی کوئی ایسا نہیں تھا جس کی طرف سے ہمیں خطرہ ہوتا۔

بہر حال میں نے اس موقع پر بات کو طول دینا مناسب نہیں سمجھا۔ ہم سرِ راہ ایک سڑک

کے کنارے کھڑے تھے۔ رات کے تین بجے کا عمل تھا۔ اگر گشتی پولیس کی کوئی پارٹی اس طرف آنکلتی تو مسئلہ پیدا ہو سکتا تھا۔ سڑک کے کنارے کچی زمین پر ابھی تک اس خون کے دھبے موجود تھے جو میری گولی لگنے والے گارڈ کے جسم سے نکلا تھا۔ میں نے سجاول کو اشارہ کیا کہ فی الحال یہاں سے نکلا جائے۔ باقی باتیں پارا ہاؤس چل کر کریں گے۔ مالِ مسروقہ سے بھرے ہوئے دونوں بیگ آقا جان نے اپنی تحویل میں لے لیے تھے۔ میں نے سرگوشی میں سجاول سے کہہ دیا کہ وہ اسی گاڑی میں سوار ہو جس میں دونوں بیگ رکھے جائیں۔ مقصد یہی تھا کہ بیگ جوں کے توں پارا ہاؤس تک پہنچ جائیں۔ آقا جان کے ساتھی گارڈز خونی نظروں سے مجھے اور انیق کو دیکھ رہے تھے۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ کم از کم مجھے تو ضرور چھلنی کر دیتے۔

دونوں بیگ اسی بند گاڑی میں رکھے گئے جس میں ہمیں ٹارچر سیل لے جایا جا رہا تھا۔ سجاول اور آقا جان بھی اس گاڑی میں بیٹھے۔ میں اور انیق کیچڑ آلود جیپ میں کالے خان وغیرہ کے ساتھ سوار ہوئے۔ دونوں گاڑیاں اور تینوں ہیوی موٹر بائیکس برق رفتاری سے پارا ہاؤس کی طرف محوِ سفر ہو گئیں۔

O.......❖.......O

ہم پارا ہاؤس پہنچ گئے۔ اگلے پانچ گھنٹے میں وہ سب کچھ حرف بہ حرف درست ثابت ہو گیا جو سجاول نے بتایا تھا۔ میں نے سجاول کو اس گفتگو سے آگاہ کر دیا جو ہم نے آقا جان اور حلیمی کے درمیان راستے میں سنی تھی۔ سجاول یہ جان کر ششدر رہا کہ بات یہاں تک پہنچ چکی تھی، اس کے غائب ہو جانے کی وجہ سے ہمیں ٹارچر سیل میں پہنچایا جا رہا تھا۔ سجاول کی آنکھوں میں خون اتر آیا، لیکن یہ بات بتانے سے پہلے ہی میں اس سے وعدہ لے چکا تھا کہ وہ کسی سخت ردِ عمل کا اظہار نہیں کرے گا...... اور یہ بات صرف اور صرف اپنے تک محدود رکھے گا۔ میں حالات میں بگاڑ پیدا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ آقا جان کے پاس اپنے دفاع کے ایک سو ایک طریقے تھے۔ آخر میں نقصان پھر ہمارا ہی ہونا تھا۔

اصل صورتِ حال سامنے آنے کے بعد سجاول کے مخالفین کے منہ کو تالا لگ گیا تھا۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ سجاول کی شان میں مزید اضافہ ہوا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ ہماری حیثیت بھی بڑھی تھی۔ وڈے صاحب اور بڑی بیگم نے سجاول کو رہائشی حصے میں طلب کیا تھا اور مترجم کے ذریعے اس سے پوری رُوداد سننے کے بعد اس کے مشکور ہوئے تھے۔ قادر خان کے دو مفرور ساتھیوں کی تلاش شروع کر دی گئی تھی اور قادر خان کو اس کے ساتھی سمیت تہ

خانے میں ڈال دیا گیا تھا۔ بے شک یہ ایک بڑی واردات تھی۔ مالِ مسروقہ کی قیمت کروڑوں میں تھی۔ سامان کا معائنہ کیا جارہا تھا اور دیکھا جارہا تھا کہ اس میں کیا کمی بیشی ہے۔

میرے فائر سے شدید زخمی ہونے والے گارڈ کی حالت اب خطرے سے باہر تھی اور یہ بھی ایک اچھا شگون تھا۔ اس جھڑپ کی ساری تفصیل سے سجاول نے میری موجودگی میں وڈے صاحب کو آگاہ کیا تھا۔ اس نے اپنے وعدے کے مطابق واضح طور پر تو نہیں بتایا کہ آقا جان ہم دونوں کو اپنے کسی ٹارچر سیل کی طرف لے جارہا تھا۔ بہرحال اشارتاً یہ سوال ضرور اٹھایا کہ رات گئے، مجھے اور رانیق کو کہیں لے جانے کی کیا ضرورت تھی جبکہ وڈے صاحب کو اس کارروائی کی اطلاع بھی نہیں دی گئی؟ میں نے وڈے صاحب کے تاثرات دیکھے اور دل نے گواہی دی کہ وڈا صاحبؒ اگر بات کی تہ تک نہیں پہنچا تو بالکل بے خبر بھی نہیں رہا۔ وہ سمجھ گیا ہے کہ آقا جان کے ارادے کچھ اور تھے۔ بہرحال کبھی کبھی یہ صاف نظر آتا تھا کہ وہ آقا جان کی من مانیوں کو نظرانداز کرنے پر مجبور ہے۔ یہ کوئی گہرا بھید تھا۔

وڈے صاحب سے میری اور سجاول کی اس ملاقات میں وہ دوسرا اہم ترین موضوع بھی ڈسکس ہوا جس کا تذکرہ شکیل داراب چوری والی واردات سے پہلے کر چکا تھا۔ وہاں برونائی کے پاس کسی ملکیتی جزیرے میں کوئی سنگین قسم کی کشمکش چل رہی تھی۔ ناقب اور حارث کی موت کے بعد اس جزیرے پر شدید ردِعمل ہوا تھا اور وڈے صاحب کے مخالفین نے کوئی بڑی کارروائی کر کے وڈے صاحب کے برادرِ نسبتی کو موت کے گھاٹ اتار ڈالا تھا۔ وڈے صاحب کا اب برونائی پہنچنا ضروری ہو گیا تھا۔ وڈے صاحب کی گفتگو سننے کے بعد سجاول نے کہا۔ ''اگر ہم اس سلسلے میں آپ کے کسی کام آسکیں تو یہ ہماری بڑی خوش قسمتی ہوگی۔ اس سلسلے میں شکیل صاحب سے ہماری کچھ بات ہوئی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ اس بارے میں مزید بات کریں گے، لیکن پھر یہ چوری والی واردات ہوگئی۔''

وڈے صاحب نے سگار کا گہرا کش لینے کے بعد مترجم کے ذریعے کہا۔ ''پچھلے چند مہینوں سے مجھے ہر طرف سے مایوس کن خبریں ہی ملی ہیں۔ اگر کچھ اچھا ہوا ہے تو وہ یہ کہ تم جیسے باہمت اور معاون بندوں سے ملاقات ہوگئی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے لیے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔''

اسی دوران میں حلمی نے آکر وڈے صاحب کو اطلاع دی کہ شکیل داراب صاحب تشریف لارہے ہیں۔

وڈے صاحب نے کہا۔ ''اللہ اس کی عمر دراز کرے۔ ہماری پریشانیوں کو اپنی پریشانیاں سمجھ رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آج ہم اکٹھے بیٹھ کر برونائی روانگی کے بارے میں کچھ فیصلہ کر لیتے ہیں۔''

اطلاع دے کر حلمی مؤدب انداز میں واپس مڑ گیا۔ دیکھنے میں وہ بہت شائستہ اور راست گو نظر آتا تھا لیکن وہی مثال ہیں کوا کب کچھ نظر آتے ہیں کچھ...... حلمی کے ساتھ آقا جان کی گفتگو سننے کے بعد ہم پر ثابت ہو گیا تھا کہ کسی خفیہ مقام پر لے جا کر ہماری چمڑی ادھیڑنے کے پروگرام میں حلمی بھی آقا جان کے ساتھ برابر کا شریک تھا۔ آقا جان نے پارا ہاؤس پر گرفت مضبوط رکھنے کے لیے حلمی کو ہر طرح اپنے ساتھ ملا رکھا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد شکیل داراب اپنے پورے کروفر کے ساتھ نمودار ہو گیا۔ اس نے آتے ساتھ ہی سجاول کو گرم جوشی سے گلے لگایا اور قادر خان وغیرہ کو پکڑنے کے سلسلے میں اسے ''دلی'' مبارک باد دی۔ ساتھ ہی معذرت کا اظہار بھی کیا کہ سجاول کے اچانک غائب ہو جانے سے کئی طرح کی افواہیں پھیلیں اور غلط فہمیاں پیدا ہوئیں۔

○......❖......○

اس اہم ملاقات میں واقعی روانگی کے سلسلے میں فیصلہ ہو گیا۔ مجھے، سجاول اور انیق کو وڈے صاحب کے ساتھ ہی تین روز بعد برونائی جانا تھا۔ حیرت انگیز طور پر پچھلے چند روز میں ہمارے سفری کاغذات مع ویزا وغیرہ تیار ہو چکے تھے۔ شکیل داراب یہاں انتخابی سیاست میں بری طرح الجھا ہوا تھا۔ بہرحال اس نے بھی ایک ہفتے کے اندر برونائی کا وزٹ کرنا تھا۔ آقا جان چند گھنٹے پہلے پارا ہاؤس کے قریباً بیس ماہر ترین شوٹرز کے ساتھ برونائی پرواز کر چکا تھا۔ کچھ مزید تربیت یافتہ افراد بھی اگلے پانچ چھ گھنٹے میں روانہ ہو رہے تھے۔ پتا چلا کہ کچھ لوگ ملائیشیا سے بھی برونائی پہنچ رہے ہیں۔

انیق اس سفر کے سلسلے میں بہت پُر جوش تھا۔ اسے یقین تھا کہ نت نئے ہنگامے دیکھنے کو ملیں گے۔ درحقیقت داؤد بھاؤ جیسے گینگسٹر کے ساتھ رہ کر اس کے اندر بھی ہنگامے اور ایکشن کی بھوک پیدا ہو چکی تھی۔ وہ ہر وقت کسی بھی چھوٹی بڑی مہم جوئی کے لیے بالکل تیار رہتا تھا۔ وہ انہی لوگوں میں سے تھا جو موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کو ایک کھیل سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔

میں دو دن پہلے تک سجاول کے معاملے کی وجہ سے بے حد پریشان تھا لیکن اب یہ معاملہ کچھ اس طرح سے حل ہوا تھا کہ پارا ہاؤس میں سجاول کی پوزیشن روزِ روشن کی طرح

صاف ہوگئی تھی اوراس کے قد کاٹھ میں بھی قابلِ قدر اضافہ ہوا تھا۔ اب یہ بات بھی یقینی تھی کہ وہ برونائی کے سفر میں ہمارے ساتھ ہوگا لیکن اس سب کے باوجود میرے دل ودماغ میں ایک گہری مایوسی سی اتری ہوئی تھی۔ یہ مایوسی اور اداسی کسی اور حوالے سے تھی۔ یہ دل فگار کیفیت کسی اور سے نسبت رکھتی تھی، وہی جو سرسوں کے کھیت میں کھڑی مجھے پکارا کرتی تھی اور جسے میں نے پاکر کھودیا تھا۔ میں پاکستان چھوڑ کر جارہا تھا، پتا نہیں کہ باہر کیا حالات پیش آنے والے تھے۔ زندگی تو پانی کا بلبلا ہے اور بلبلا اگر تیز ہواؤں میں ہوتو اور بھی ناپائیدار ہوتا ہے۔ زندگی کی شام کب اور کس گلی میں ہوجائے کوئی نہیں جانتا۔ پتانہیں کیوں پچھلے تین چار روز سے وہ بے طرح یاد آرہی تھی۔ میرے دل میں عجیب سی خواہش پیدا ہورہی تھی۔ میں پاکستان چھوڑنے سے پہلے ایک بار ایک نظر تاجور کو دیکھنا چاہتا تھا۔ دور ہی سے ایک بار اس کے چہرے کا طواف کرکے اپنی آنکھیں بند کرلینا چاہتا تھا اوراس کے تصور کو تادیر محفوظ کرنے کی خواہش رکھتا تھا۔ وہ کہاں ہوگی، کیا کررہی ہوگی؟ کیسی لگتی ہوگی؟ اَن گنت سوالات سینے میں کچوکے لگاتے رہتے تھے۔ ہر کچوکے پر میں اپنے سیل فون کی خالی اسکرین دیکھتا تھا اور سینے میں ایک اور خنجر اتر جاتا تھا۔

میرے پاس ابھی قریباً ڈیڑھ دن تھا۔ میں صبح سویرے یہاں سے نکل جاتا تو رات تک لالہ موسیٰ کے اس دورافتادہ گاؤں سے ہوکر واپس آسکتا تھا جہاں اس جانِ جاں کا بسیرا تھا، جہاں اس کے قدم پڑتے تھے، جہاں اس کی آواز جلترنگ بجاتی تھی۔

میں نے انیق اور سجاول کو ایک ذاتی کام کا بتایا۔ سجاول نے کام کی نوعیت پوچھنے کی بہت کوشش کی مگر میں نے اس سے کہا کہ اپنے نجی معاملے کو اپنی ذات تک محدود رکھنے کا میں حق رکھتا ہوں۔ سجاول اور انیق تاڑ تو گئے مگر انہوں نے مجھے زیادہ کریدا نہیں۔ سجاول نے وڈے صاحب سے مجھے جانے کی اجازت دلا دی بلکہ ایک سوزوکی مارگلہ کار بھی مجھے آنے جانے کے لیے مہیا کردی گئی۔ مجھے کار کی ایسی ضرورت تو نہیں تھی لیکن میرے پیشِ نظر ایک اور مقصد بھی تھا۔ رضوان اب تک میرے کمرے میں ہی پوشیدہ تھا۔ میں برونائی جانے سے پہلے اسے بحفاظت پارا پاؤس سے نکالنا چاہتا تھا...... رضوان کے مسئلے کے لیے میں لاہور میں داؤد بھاؤ کو پہلے ہی مطلع کرچکا تھا۔ رضوان کے مسئلے کو حل کرنا داؤد بھاؤ جیسے آدمی کے لیے ایسا ہی تھا جیسے فرش پر چلتی کسی چیونٹی کو مسل دینا۔ تاہم داؤد بھاؤ نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ رضوان کے برادرِنسبتی کے ساتھ کوئی سختی نہیں کرے گا، بلکہ حکمت اور دباؤ کے ذریعے اسے مجبور کردے گا کہ وہ اپنے گھر کے معاملات درست کرے اوراپنی بیوی سے اچھا سلوک

کرے۔ رضوان کو ایک خوف یہ بھی تھا کہ کہیں ڈاکٹر ارم کے قتل کا الزام کلی طور پر اس کے سر نہ تھوپ دیا جائے۔ اس حوالے سے میں نے رضوان کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ ابھی منظرِ عام پر نہیں آئے گا۔ داؤد بھاؤ نے اس کے لیے لاہور ہی کی ایک رہائشی سوسائٹی میں ایک محفوظ ٹھکانے کا انتظام کر دیا تھا۔

پروگرام کے مطابق رات پچھلے پہر میں نے انیق کے ساتھ مل کر رضوان کو سوزوکی مارگلہ کی مختصر ڈکی میں پیک کر دیا۔ اس کام کو آسان بنانے کے لیے سجاول نے پورچ کی طرف موجود دو گارڈز کو بہانے سے اپنے پاس طلب کر لیا تھا۔ اس مقام کا سی سی ٹی وی کیمرا تب سے خراب تھا جب قادر خان نقدی اور زیورات وغیرہ سے بھرے ہوئے تھیلے لے کر نکلا تھا اور انہیں ایمبولینس میں رکھا تھا۔

علی الصباح میں پارا ہاؤس کی سخت ترین سکیورٹی سے گزر کر اس دور افتادہ بستی کی طرف روانہ ہو گیا جہاں کچھ عرصہ پہلے تاجور کو چھوڑا تھا۔ ایک دن پہلے ہی چاند گڑھی میں پہلوان حشمت سے میرا ٹیلی فونک رابطہ ہو گیا تھا۔ میں نے پہلوان کو سمجھا دیا تھا کہ اس نے کہاں اور کب پہنچنا ہے، اور اپنے ساتھ کیا لے کر آنا ہے۔ سوزوکی کار پر میں نے خیریت کے ساتھ چناب کے پل تک کا سفر طے کیا پھر ایک سنسان جگہ پر گاڑی کھڑی کی اور مڑے تڑے ہوئے رضوان کو ڈکی میں سے نکال دیا۔ اس کے گال حدت اور خون کے دباؤ سے سرخ ہو رہے تھے۔ وہ مضبوط لیکن لچک دار جسم کا مالک تھا ورنہ اتنی مختصر ڈکی میں سفر کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ وقتِ رخصت اس کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔ بولا۔ ”شاہ زیب صاحب! اگر آپ کی مدد نہ ہوتی تو میں اس شکنجے سے کبھی نہ نکل سکتا۔ میں کس منہ سے آپ تینوں کا شکریہ ادا کروں۔“

میں نے کہا۔ ”شکریہ بالکل ادا نہ کرو، لیکن اتنی سی بات ضرور مانو کہ آنکھوں میں اس طرح پانی نہ لاؤ۔ مرد روتے نہیں...... اور میں دیکھ رہا ہوں کہ اب تم مرد بن رہے ہو۔ ڈاکٹر کے مرنے کے بعد تم نے جس طرح خود کو حملہ آوروں سے بچایا اور پھر بعد میں سنبل کی پناہ حاصل کی، وہ اس بات کی دلیل ہے کہ اب تم کو حالات کا مقابلہ کرنا آ رہا ہے۔ قدرت نے تمہیں ڈاکٹر ارم کے جال سے نکال دیا ہے۔ اب بہت جلد تم اونچی اڑان بھرو گے...... مجھے یقین ہے۔“

اسے ہر طرح سے تسلی اور ضروری ہدایات دے کر میں نے روانہ کر دیا۔ بس اڈا قریب ہی تھا، اسے وہاں سے سیدھا لاہور روانہ ہو جانا تھا۔ کسی بھی مشکل کے سلسلے میں وہ داؤد بھاؤ سے براہِ راست رابطہ کر سکتا تھا۔ داؤد بھاؤ سے میرا بھی ٹیلی فونک رابطہ ہوتا رہتا تھا۔ میں

چاچا حفیظ اور ولید کی خیر خیریت کے حوالے سے بھی داؤد بھاؤ سے مدد لے رہا تھا۔ (ولید ابھی تک جیل میں تھا۔ شکیل داراب کے وعدے کے مطابق وہ ابھی تک کسی سنگین کیس میں ملوث نہیں ہوا تھا)

اب میرا آگے کا سفر شروع ہوا۔ میں لیہ سے آگے شور کوٹ روڈ تک تو پہنچ ہی چکا تھا۔ اب میرا رخ فیصل آباد کی طرف ہوا۔ فیصل آباد کے بارونق شہر کے قریب سے گزرتا ہوا میں حافظ آباد پہنچا۔ تب تک صبح کے نو بج چکے تھے۔ میں نے ایک ہوٹل سے واجبی سا ناشتا کیا اور پھر اپنا رخ لالہ موسیٰ کی طرف کر لیا۔ ڈنگہ کے مقام پر میرا اور پہلوان حشمت کا میل ہونا تھا۔ میں مقررہ وقت سے آدھ گھنٹا پہلے ہی پہنچ گیا تھا، اس لیے خدشہ تھا کہ شاید پہلوان ابھی پہنچا نہ ہو...... مگر دودھ دہی کی ایک دکان کے پاس میں نے دور ہی سے نیلا اسکوٹر دیکھ لیا اور اس کے پاس ہی پہلوان حشمت کا بھاری تن و توش بھی دکھائی دے گیا۔ وہ حسبِ معمول شلوار قمیص اور ڈبی دار سویٹر میں تھا۔ اس نے بھی مجھے دور ہی سے دیکھ لیا تھا اور اپنی باچھیں پھیلا لی تھیں۔

میں نے گاڑی روکی۔ ہم بغلگیر ہوئے اور گاڑی کے اندر ہی بیٹھ گئے۔ باہر کافی سرد ہوا چل رہی تھی اور سورج بھی گاہے بگاہے بادلوں کے پیچھے منہ چھپا لیتا تھا۔ یہ کرائے کا اسکوٹر تھا۔ اس کے ساتھ ہیلمٹ بھی موجود تھا۔ پہلوان نے ان دونوں چیزوں کا انتظام کل رات ہی کر لیا تھا۔ اب وہ چاند گڑھی سے قریباً بیس کلومیٹر کا سفر اسکوٹر پر طے کر کے یہاں پہنچا تھا اور سردی سے کانپ رہا تھا۔ میں نے اسے حقیقت حال سے آگاہ نہیں کیا تھا، اس لیے اس کی آنکھوں میں سوال ہی سوال تھے۔ کہنے لگا۔ ''شاہ زیب! اگر کوئی ڈر خطرے والا معاملہ ہے تو میں ساتھ چلتا ہوں۔ وہ کیا کہوت ہیں کہ ایک ایک اور نو دو گیارہ۔'' اس نے چھوٹتے ہی ایک محاورے کی مٹی پلید کی۔

میں نے کہا۔ ''ایسی بات بالکل نہیں پہلوان جی۔ اور اگر ہوگی بھی تو اللہ نے چاہا تو میں اکیلا نمٹ سکتا ہوں۔''

پہلوان نے اپنا تربوز سا سر اثبات میں ہلایا۔ ''اس میں تو کوئی شبہ ناہیں۔ میں اپنی گناہ گار آنکھوں سے سجاول کے ڈیرے پر سجاول سے تمہاری ہتھ جوڑی دیکھ چکا ہوں۔ دو چار بندوں کی ہڈی پسلی تو تم ''ہات سے کھیڈے'' میں توڑ سکتے ہو۔ لیکن وہ کہوت ہیں نا کہ گھر کا بھیدی سری لنکا ڈھاوت ہے۔ سامنے والے دشمن سے چھپا ہوا دشمن کہیں زیادہ خطرناک ہووت ہے۔''

میں نے کہا۔ ''یہاں دشمنی والا کوئی چکر ہی نہیں ہے۔ آپ سمجھیں کہ کسی دوست سے

ضروری ملاقات کرنی ہے۔ راستہ ایسا ہے کہ گاڑی کے بجائے موٹر سائیکل، اسکوٹر کا سفر ٹھیک ہے۔"

اس نے بھی کھوجی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ شاید اس کے ذہن میں بھی شک پیدا ہوا تھا کہ میں کہیں تاجور سے ملنے یا اس کی ٹوہ لگانے تو نہیں جا رہا۔ بہرحال اپنی گفتگو کے ذریعے میں نے اس کا یہ شک بڑی حد تک ختم کر دیا۔ میں نے آخر میں اس سے کہا۔ "پہلوان جی، سردی کافی ہے، آپ گاڑی بند کر کے آرام سے بیٹھیں اور جو انڈے میرے لیے ابال کر لائے ہیں وہ خود نوش جان فرمائیں۔ میں ابھی حافظ آباد سے بڑا تگڑا ناشتا کر کے نکلا ہوں۔"

وہ بولا۔ "شاہ زیب! ایک بہت ہی خاص خبر ہے تمہارے لیے، میں تمہیں ٹیلی فون پر ہی بتانا چاہتا تھا لیکن پھر سوچا کہ آمنے سامنے سنانے میں جو مزہ آوے گا وہ ویسے ناہیں آوے گا۔" اس کا چہرہ جوش سے تمتما رہا تھا اور اصل سائز سے کافی بڑا نظر آنے لگا تھا۔

"کیسی خبر؟" میں نے کہا۔ ویسے میں کچھ کچھ سمجھ گیا تھا۔

اس نے جیسے میرے سر پر بم پھوڑا۔ "تاجور کا منگیتر ساقا مارا گیا۔"

یہ سب کچھ مجھے پہلے سے معلوم ہو چکا تھا تاہم پہلوان کا دل رکھنے کے لیے میں نے اپنے چہرے پر شدید حیرانی پیدا کی اور "ششدر" آنکھوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

پہلوان نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "منگل کے دن ہوا ہے یہ سب کچھ، وہ خبیث عالمگیر بھی بس بال بال بچا ہے۔ کوئی مخالف پارٹی تھی ان لوگوں کی...... پر یہ بھی ہو سکت ہے کہ یہ وہی اسلام آباد کے اسپتال سے زینب کے غائب ہونے والا معاملہ ہو......"

پہلوان نے خوب مرچ مسالا لگا کر یہ ساری رُوداد میرے گوش گزار کی اور میں پہلوان کی منشا کے مطابق کہیں زیادہ اور کہیں بہت زیادہ حیران ہوتا رہا۔ پہلوان نے محسوس کر لیا تھا کہ مجھے جانے کی جلدی ہے۔ آخر میں اس نے کہا۔ "باتیں تو تم سے بہت سی کرنی ہیں...... اور ایک خاص بات تم سے پوچھنا بھی چاہت ہوں لیکن پہلے تم اپنے کام سے ہو کر واپس آ جاؤ۔ بس آنے سے آدھ گھنٹا پہلے میرے فون کی بیل کھڑکا دینا۔ میں تمہارے لیے مرغی کا کھوئے والا قورما اور روغنی نان وغیرہ تیار رکھوں گا...... یہیں گاڑی میں بیٹھ کر کھائیں گے۔"

میں نے اسکوٹر کا تیل پانی چیک کیا۔ ہیلمٹ سر پر رکھا اور پہلوان سے رخصت ہو کر روانہ ہو گیا۔ ہیلمٹ سر کی حفاظت کے لیے ہے لیکن کبھی کبھی یہ اپنی شناخت چھپانے کا بھی زبردست کام دیتا ہے۔ میں اس سے پہلے بھی اسے اسی مقصد کے لیے استعمال کر چکا تھا۔ میرا رخ اب اسی سکھیرا نامی گاؤں کی طرف تھا جہاں میں نے تاجور کو اس کے والد بزرگوار دین

محمد صاحب کے حوالے کیا تھا۔ میرا گزر اسی پیٹرول پمپ کے قریب سے ہوا جہاں پچھلی دفعہ سجاول کے ایک یونس نامی ساتھی نے ہمیں پارکنگ کی سہولت فراہم کی تھی اور مجھے موٹر سائیکل وغیرہ مہیا کی تھی۔ یہ خالص دیہاتی علاقے کا سفر تھا۔ سرسبز کھیتوں کے درمیان تارکول کی پتلی سڑکیں...... ان کے درمیان کہیں کہیں کھیت مزدوروں کی جھلکیاں، ٹریکٹر، ٹیوب ویل اور ٹریکٹر ٹرالیاں وغیرہ۔ پنجاب کے دیہات کا یہ سنہری ماحول دور تک میرے ذہن میں کھب جاتا تھا۔ سورج اب کافی اوپر آ گیا تھا اور دھند چھٹ چکی تھی۔ پچھلی مرتبہ اس سفر میں تاجور میرے ساتھ تھی اور موٹر سائیکل پر میرے عقب میں موجود تھی، خاموش و دل گرفتہ...... جدائی کا وہ سفر ہمیشہ کے لیے میرے ذہن پر نقش ہو چکا تھا۔ یہ قریباً بیس کلومیٹر کا سفر تھا جو میں نے آدھ پون گھنٹے میں طے کر لیا۔ آخر مجھے سکھیرا کے شاداب گاؤں کی مسجد کے بلند مینار نظر آنے لگے اور کھجور کے وہ تین عدد درخت بھی جن کے پاس ہی میں نے تاجور کو وداع کیا تھا۔

آج میں اس مقام پر رکا نہیں بلکہ آگے بڑھتا چلا گیا اور سکھیرا گاؤں میں داخل ہو گیا۔

یہ کوئی گیارہ بجے کا عمل تھا۔ گلی کوچوں میں سنہری دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ گاؤں کے مویشی قطار اندر قطار چراگاہوں کی طرف جا رہے تھے۔ چھوٹے بچے سردی کی پروا کیے بغیر کھلی جگہوں پر گلی ڈنڈا، اسٹاپو اور کانچے وغیرہ کھیل رہے تھے جن جگہوں پر دھوپ موجود تھی وہاں گاؤں کے بڑے بوڑھے بیٹھے حقہ پی رہے تھے اور گپیں ہانک رہے تھے۔ ایک گدھے پر بہت سا سبز چارا لدا ہوا تھا اور وہ لڑکھڑاتا ہوا سا ایک تنگ گلی میں داخل ہو رہا تھا۔ اسی گلی میں سے نکل کر ایک دیہاتی عورت اَن دھلے کپڑوں کا انبار اٹھائے شاید ٹیوب ویل کی طرف جا رہی تھی۔ میں شلوار قمیص میں تھا، اسکوٹر بھی بالکل دیہاتی طرز کا تھا، مجھ پر کسی نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ دین محمد صاحب کے گھر کا پتا کس سے اور کیسے پوچھوں کہ مجھے اپنی مشکل آسان ہوتی نظر آئی۔ میں نے تاجور کے چھوٹے بھائی کم سن اسفند کو دیکھا۔ وہ پرچون کی ایک چھوٹی سی دکان سے کچھ لے رہا تھا۔ گورا چٹا معصوم چہرہ...... یہی اسفند تھا جسے میں نے چاند گڑھی میں سجاول کے حملے کے دوران میں بچایا تھا۔ وہ ایک کنوئیں میں گر گیا تھا اور میں نے اسے نکالا تھا۔ اپنی اس "کارکردگی" کی وجہ سے مجھے تاجور کے قریب آنے کا موقع ملا تھا۔ وہ سارے مناظر جیسے ہمیشہ کے لیے میرے ذہن میں نقش ہو چکے تھے۔

میں نے اسکوٹر کچھ آگے جا کر کھڑا کر دیا اور اسفند کا انتظار کرنے لگا۔ وہ ہاتھ میں ایک چھوٹی سی پڑیا لیے اٹکھیلیاں کرتا میرے قریب سے گزرا...... بالکل پاس سے۔ اس نے مجھ پر

بالکل توجہ نہیں دی۔ شاید اس کے گمان میں بھی نہ ہوگا کہ وہ ''گونگے بھائی جان'' جن سے لپٹ کر وہ سوتا تھا اور جن کو راتوں میں اٹھ اٹھ کر پکارتا تھا اس کے بالکل پاس موجود ہیں۔ وہ آگے بڑھ گیا تو میں آہستہ آہستہ اسکوٹر پر اس کے پیچھے جانے لگا۔ ہیلمٹ بدستور میرے سر پر موجود تھا۔ ہاں اس کی سفید شیلڈ میں نے اوپر اٹھالی تھی۔ دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ اسفند اپنے گھر کی طرف جا رہا ہے لیکن اس وقت یہ اندازہ بالکل غلط ثابت ہوگیا جب اسفند اچھلتا کودتا کھیتوں کی طرف نکل گیا۔ کچھ ہی فاصلے پر چھ سات فٹ اونچی ایک کچی چار دیواری نظر آرہی تھی۔ اس وسیع وعریض چار دیواری کے اندر پھل دار پودوں کے درخت دور ہی سے دکھائی دیتے تھے۔ کینوں اور مالٹوں کا موسم اختتام پر تھا تاہم اب بھی کسی کسی درخت پر کوئی کینو ٹنگا نظر آرہا تھا۔ اسفند ایک کھلے ہوئے پھاٹک سے اندر داخل ہوگیا۔ مجھے مایوسی ہوئی، مجھے لگا کہ اب مجھے تھوڑی دیر اور انتظار کرنا پڑے گا۔ گھر کا پتا چل جانے کے باوجود تاجور کی جھلک دیکھنا اتنا سہل نہیں تھا۔

گاؤں کے لوگ آجا رہے تھے۔ ایک دو کے سوا کسی نے مجھ پر خاص توجہ نہیں دی۔ میں ایک چکر کاٹ کر چار دیواری کی دوسری جانب چلا گیا۔ یہاں نسبتاً سناٹا تھا۔ دور تک کھیت ہی دکھائی دیتے تھے۔ ایک تنگ سا کچا راستہ تھا۔ میں نے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر چار دیواری کے اندر جھانکا...... لڑکیوں اور عورتوں کے رنگ برنگے کپڑے دکھائی دیئے۔ چھوٹی عمر کے بچے بچیاں بھی دکھائی دے رہے تھے۔ دفعتاً میری ساری حسیات سمٹ کر میری آنکھوں میں آگئیں۔ مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ میری قسمت اس طرح یاوری کرے گی۔ میں نے کچھ ہی فاصلے پر تاجور کو دیکھا۔ وہ ایک گرے ہوئے درخت کے تنے پر بیٹھی تھی۔ گلابی شال کندھوں پر تھی۔ گھنے بالوں نے نصف چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔ سنہری چپل میں پاؤں، گلاب کے دو سفید پھول تھے جو سبز گھاس پر دھرے تھے۔ پیشانی کی وہی ملکوتی چمک، وہی جمال وہی کشش وہی ایک مقناطیسی ہالہ جو اسے سر تا پا اپنے گھیرے میں رکھتا تھا۔ اسحاق عرف ساقا کہاں تھا اس کے قابل؟ شکر تھا کہ وہ مر گیا اور...... مجھ جیسا جرائم زدہ بھی کہاں تھا اس کے لائق، بہتر تھا کہ اس سے دور ہو گیا۔ سینے سے ایک ہوک سی اٹھی اور میں اسے دیکھتا رہ گیا پھر یکایک خیال آیا کہ اردگرد کا دھیان بھی رکھنا چاہیے۔ اسکوٹر ابھی تک اسٹارٹ تھا۔ میں نے بٹن دبا کر اسے بند کیا اور نیچے جھک کر اس کے انجن کا ''کور'' اتار دیا۔ دور سے کوئی دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ اسکوٹر خراب ہو گیا ہے۔ مزید احتیاط کے طور پر میں نے پلگ کا تار بھی اتار دیا۔

میرے دل میں خیال ابھرا...... یہ عشق بھی کیا چیز ہے۔ میں دنیا کی بہترین رنگینیاں اور

خوب صورتیاں حاصل کرنے کے قابل تھا لیکن آج...... کسی نیم دیہاتی علاقے کے کالجیٹ لڑکے کی طرح ایک کھٹارا اسکوٹر پر بیٹھ کر یہاں کسی کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے موجود تھا۔ یہ کیسی شوریدہ سر کیفیت ہے، یہ کیسا دیوانہ جذبہ ہے۔ یہ بندے کو کیا سے کیا بنا دیتا ہے۔ مجھے خود اپنے آپ پر بھی حیرانی ہوئی مگر یہ جو کچھ بھی تھا میرے لیے بے حد...... بے حد اہم تھا۔

لڑکیوں کے ہنسنے کھیلنے اور چلانے کی آوازیں آرہی تھیں، میں نے ایک بار پھر پنجوں پر کھڑے ہو کر چار دیواری میں جھانکا۔ کئی لڑکیاں رسی پھلانگنے میں مصروف تھیں۔ انہوں نے دوپٹے اپنی کمروں سے باندھ رکھے تھے اور اپنے حال میں مست تھیں۔ کچھ لڑکیاں ایک قریبی درخت پر چڑھ کر بچے کھچے کینو اتار رہی تھیں۔ نیچے کھڑے بچے یہ کینو ایک تھال میں جمع کر رہے تھے۔ وہ پڑیا بھی تھال میں رکھی تھی جو اسفند لایا تھا۔ غالباً اس میں نمک مسالا وغیرہ تھا۔

میں نے دیکھا تاجور کچھ خاموش سی ہے...... ایک ہم عمر لڑکی نے اسے دبوچا اور گدگدی کر کے ہنسانے کی کوشش کی۔ تاجور ذرا سا مسکرائی اور اس کے ہاتھ پکڑ کر اسے پیچھے کر دیا۔ ایک اور لڑکی بھنا کر اس کی طرف بڑھی اور بے تکلفی سے بولی۔ ”اگر ایسے ہی بت بن کر بیٹھنا ہے تو پھر گھر چلی جا۔ کوئی لوڑ شوڑ نہیں تیری پھر یہاں۔“

ایک جواں سال عورت بولی اور اس کی آواز بالکل صاف میرے کانوں تک پہنچی۔ ”نی ابھی تو تجھ کو مانگا ہی ہے ناں...... ڈولی میں تو نہیں بٹھا لیا۔ ابھی سے کیوں گلیڈو (آنسو) لے کر بیٹھ گئی ہے۔“

اس کے ساتھ ہی اس نے تاجور پر چڑھائی کر دی۔ پہلے اسے گدگدایا پھر کھینچ کر اٹھایا اور کھیل کود والی جگہ پر لے آئی۔

میں نے اپنا سر نیچے کر لیا۔ یہاں درختوں کی شاخیں تھیں پھر بھی دیکھے جانے کا خطرہ تو موجود تھا۔ جواں سال عورت نے جو الفاظ کہے تھے وہ بہت واضح نہیں تھے۔ لب ولہجہ بھی کچھ اجنبی تھا مگر اتنا اندازہ تو مجھے ہو گیا کہ شاید تاجور کی منگنی وغیرہ کی بات کی گئی ہے۔ اگر ایسا تھا بھی تو یہ کوئی انہونی نہیں تھی۔ میرے دل کی گواہی بھی یہی تھی کہ اب تاجور کے ”بڑے“ جلد از جلد اس کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر کریں گے لیکن خبر تو پھر خبر ہی ہوتی ہے۔ سینے میں دھواں سا بھرنے لگا۔

میں نے دوبارہ سر اٹھا کر دیکھا۔ لڑکیوں نے تاجور اور ایک فربہ اندام عورت کو رسی پھاندنے پر مجبور کر دیا تھا۔ دو لڑکیاں طویل رسی کو گول گول گھما رہی تھیں اور تاجور، فربہ اندام

عورت کے ساتھ پھلانگ رہی تھی پھر دو اور چنچل لڑکیاں بھی اس رسی کو پھاندنے لگیں۔ ان کے لچک دار جسم پھول دار شاخوں کی طرح متحرک تھے اور ان میں خوش نما ترین شاخ وہی تھی جس سے میرے دل کے ہزار ہا دھاگے بندھے ہوئے تھے۔ بالوں کی دو لٹیں چہرے پر جھول رہی تھیں۔ رنگ لال گلابی ہو رہا تھا۔ لڑکیاں رسی پھلانگتے پھلانگتے کبھی بیٹھ جاتی تھیں، کبھی جھک کر تالی بجاتی تھیں، کبھی گول گھومتی تھیں...... اور وہ بھی اس ساری اٹھک بیٹھک میں شریک تھی۔ پھر وہ ایک دم رسی کے ''لوپ'' میں سے نکل گئی اور دوبارہ جا کر تنے پر بیٹھ گئی۔ دو سہیلیوں نے اسے پھر اٹھانے کی کوشش کی مگر اس مرتبہ وہ نہیں اٹھی۔

میں نے دیکھے جانے کے خوف سے سر پھر نیچے کر لیا۔ دل و دماغ کی کچھ عجیب کیفیت تھی۔ کسی وقت دل چاہتا تھا کہ فوراً یہاں سے نکل جاؤں، کسی وقت خواہش جاگتی کہ جتنی دیر تک اسے دیکھ سکتا ہوں دیکھتا رہوں۔ اردگرد کا جائزہ لینے کے بعد میں نے ایک بار پھر اپنے آپ کو پنجوں پر اٹھایا۔ وہ تنے پر بیٹھی تھی اور دونوں ہاتھ اٹھا کر اپنے ڈھیلے بالوں کو باندھ رہی تھی۔ رسی پھلانگنے کی مشقت کے سبب سینہ پھول پچک رہا تھا۔ میری نگاہ اس کے بائیں ہاتھ پر پڑی۔ یوں لگا کہ ان فقروں کی تصدیق ہوگئی ہے جو میں نے چند منٹ پہلے سنے تھے۔ تاجور کے ہاتھ کی دوسری انگلی میں انگوٹھی چمک رہی تھی۔

میں نے ایک بار پھر جلدی سے سر نیچے کر لیا۔ کیونکہ مجھے بعین یہی لگا تھا جیسے تاجور گردن گھما کر چار دیواری کے اس حصے کی طرف دیکھ رہی ہے جہاں میں موجود تھا۔

تاجور نے تو مجھے نہیں دیکھا تھا لیکن کسی اور نے دیکھ لیا تھا۔ کھیت کی دوسری جانب دو نوجوان مجھے تاڑ رہے تھے۔ میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

معاملے کو سنبھالنے کے لیے میں بیٹھ گیا اور اسکوٹر کے پلگ کی طرف متوجہ ہو گیا لیکن اگر میرا یہ خیال تھا کہ بات ٹل جائے گی تو ایسا نہیں ہوا۔ دونوں نوجوان لمبے ڈگ بھرتے ہوئے میرے پاس آ گئے۔

''کون ہو بھئی؟'' ایک نے کھردرے لہجے میں کہا۔

''یہاں کا ہی ہوں...... یہ اسکوٹر ذرا خراب ہو گیا ہے۔'' میں نے نارمل رہنے کی کوشش کی۔

''ذرا یہ ہیلمٹ شریف تو اتارو۔'' دوسرے نے ہیلمٹ کو ٹھوکا دیا۔

میں نے ہیلمٹ اتار دیا۔ دونوں نے گردنیں ٹیڑھی کر کے مجھے بغور دیکھا۔ ''یہاں کے تو نہیں لگتے ہو۔ کہاں تشریف لے جا رہے ہو؟''

''وارث پور۔'' میں نے ایک قریبی گاؤں کا نام لیا۔

''وارث پور تو سسرال ہے میرا۔ وہاں کس کے گھر جانا ہے جناب نے؟''

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا دو مزید بندے پگڈنڈیاں پھلانگتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ ان میں سے ایک لاچے کرتے میں اور دوسرا شلوار قمیص میں تھا۔ شلوار قمیص والے نے گرج دار آواز میں پوچھا۔ ''کیا بات ہے بشارت؟''

بشارت وہی تھا جس نے مجھے ہیلمٹ اتارنے کو کہا تھا۔ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''یہ رانجھا صاحب یہاں بھونڈی کر رہے تھے۔ اسکوٹر کھڑا کر کے باغ میں جھاتیاں مار رہے تھے، ہم نے خود دیکھا ہے۔''

کلف لگی شلوار قمیص والا نوجوان خاصے کسرتی جسم کا مالک تھا، اس کا رنگ سرخ و سپید اور بال ذرا لمبے تھے۔ کڑی نظروں سے مجھے گھور کر بولا۔ ''اسکوٹر خراب ہے یا جان بوجھ کر خراب کیا ہوا ہے سرکار نے؟'' اس کے ساتھ ہی اس نے اطمینان سے ہاتھ بڑھا کر اسکوٹر کی چابی نکال لی۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے؟'' میرا پارا بھی چڑھ گیا۔

''کیا بدتمیزی ہے اور کیسی ہے؟ یہ بھی بتا دیتے ہیں جناب کو۔'' شلوار قمیص والا بولا۔

''ذرا تشریف لے کر آئیں ہمارے ساتھ۔'' اس نے خطرناک لہجے میں کہا۔

میں نے بھی یہ مناسب سمجھا کہ یہاں سے آگے بڑھا جائے۔ یہاں اگر کوئی گڑبڑ ہوتی تو لڑکیوں کو فوراً خبر ہوتی اور میں یہ کیسے چاہ سکتا تھا۔ میں نے اسکوٹر کا ٹاپا دوبارہ اس کی جگہ پر لگایا اور ان لوگوں کے ساتھ چل دیا۔ وہ اسے میرے خوف پر محمول کر رہے تھے۔ باغ سے قریباً نصف فرلانگ آگے آ کر انہوں نے مجھے ایک چار دیواری میں چلنے کو کہا۔ یہ چھ فٹ اونچی پختہ چار دیواری تھی۔ اندر بس تعمیر کا تھوڑا بہت سامان پڑا تھا۔ باقی جگہ خالی تھی۔ میں اندر چلا گیا۔ ایک بندے نے لکڑی کا پھاٹک بند کر دیا۔ شلوار قمیص والے نے مجھے سرتاپا گھورتے ہوئے کہا۔ ''شکل سے تو تم ایسے نہیں لگتے کہ جنہیں کڑیاں جوتے شوتے مارتی ہیں، پھر ایسے کام کیوں کر رہے ہو؟''

میں چاہ رہا تھا کہ بات نہ بڑھے۔ میں نے معافی تلافی کی کوشش کی لیکن وہ نہیں مانے پھر ایک دم ان میں سے ایک مجھ پر پل پڑا۔ اب میرے لیے دفاع ضروری ہو گیا تھا۔ میں نے پہلے اسے روکا۔ پھر دو چار ہاتھ لگائے۔ ایک ہاتھ ذرا سخت پڑ گیا۔ وہ لڑکھڑا کر اوندھے منہ گرا اور اس کی ناک سے خون جاری ہو گیا۔ یہ منظر دیکھ کر شلوار قمیص والا لمبا تڑنگا نوجوان

ہم دونوں کے بیچ میں آ گیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ زخمی میری طرف پلٹا لیکن شلوار قمیص والے نے اسے روک دیا۔ ''نہیں بشارت، اس کی مستی میں خود اتارتا ہوں۔''
وہ چند لمحے کے لیے اینٹوں کے انبار کے پیچھے گیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اس کی قمیص کے نیچے کوئی ہتھیار موجود تھا جسے وہ وہاں رکھ آیا ہے۔ پھر اس نے اپنی سفید قمیص اور گھڑی بھی اتار کر ایک طرف رکھ دی۔ اس کے ورزشی بازوؤں پر ''ٹیٹو'' بنے ہوئے تھے۔ وہ پھنکار کر بولا۔ ''تیرے جیسوں کو ہاتھ نہیں لگاتا۔ صرف پاؤں سے مارتا ہوں۔'' ایک دم وہ مجھ پر پل پڑا۔ وہ لڑائی بھڑائی جانتا تھا اور غیر معمولی طور پر پھرتیلا بھی تھا...... جیسا کہ مجھے بعد میں پتا چلا کہ وہ سکھیرا گاؤں کے ایک بڑے زمیندار کا بیٹا تھا اور کبڈی کے کھیل میں اس کی شہرت تھی۔ لیکن یہاں اس کا سامنا ایک عام شخص سے نہیں ہوا تھا۔ میں نے اسے روئی کی طرح دھنک ڈالا لیکن کوئی ایسی مہلک ضرب نہیں لگائی جس سے کوئی بڑی چوٹ لگتی یا ہڈی وغیرہ ٹوٹ جاتی۔

دوسرے لڑکوں نے اپنے لیڈر کو پٹتے دیکھا تو وہ بھی مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ اس پختہ چار دیواری میں ریت مٹی اور اینٹوں کے درمیان ٹھیک ٹھاک مارا ماری ہوئی۔ ان چاروں کو ہینڈل کرنا میرے لیے بہت زیادہ مشکل نہیں تھا۔ شروع میں شلوار قمیص والے نے کہا تھا کہ وہ مجھے ہاتھ نہیں لگائے گا بلکہ صرف ٹھڈوں (ٹھوکروں) سے مارے گا۔ لیکن اب وہ ہاتھ بھی لگا رہا تھا اور باقی ہر حربہ بھی استعمال کر رہا تھا۔ ان میں سے ایک نے عقب سے میرے سر پر اینٹ کا وار کرنے کی کوشش کی، میں نے اس کے پیٹ میں ٹانگ کی شدید ضرب لگائی اور وہ گر کر تڑپنے لگا۔ صورتِ حال کو ہاتھ سے نکلتے دیکھ کر ایک شخص نے قمیص کے نیچے سے پستول نکال لیا۔ یہی موقع تھا جب شلوار قمیص والا میرے اور پستول بردار کے درمیان آ گیا۔ ''نہیں اوئے اکی! گولی نہیں چلانی۔'' وہ چلا کر بولا اور پستول اکی کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔
دوسرے لڑکے کے ہاتھ میں ڈبل اینٹ نظر آ رہی تھی۔ شلوار قمیص والے نے اسے بھی پیچھے ہٹا دیا۔ ''پیچھے ہٹ جا سیفی۔'' اینٹ بردار ہانپتی ہوئی آواز میں گرجا۔
مگر شلوار قمیص والے نے اینٹ اس کے ہاتھ سے چھین لی۔ وہ اب لڑائی رکوانے کے موڈ میں تھا، اس لیے میں بھی پیچھے ہٹ گیا۔ میرا گریبان پھٹ گیا تھا لیکن جسم پر خراش تک نہیں آئی تھی۔ دوسری طرف بشارت اور اکی نامی لڑکوں کے ناک منہ سے خون جاری تھا۔ لیڈر کا نام سیف تھا اور اس کے چہرے پر بھی چوٹیں آئی تھیں۔ وہ ہانپا ہوا تھا اور اپنے بائیں ہاتھ کی کلائی کو بار بار مسل رہا تھا۔ وہ گاہے بگاہے عجیب نظروں سے مجھے دیکھ بھی لیتا تھا۔

پھر اسے پتا نہیں کیا ہوا اس نے اپنے تینوں ساتھیوں سے کچھ کھسر پھسر کی اور وہ باہر چلے گئے۔ سیف کی طرح وہ تینوں بھی خاصے حیران نظر آ رہے تھے۔ ان کے جانے کے بعد سیف نے ''فائبر'' کی دو کرسیاں دھوپ میں کھینچیں اور مجھے بیٹھنے کے لیے کہا۔ میں کسی طرح کے انٹرویو کے موڈ میں نہیں تھا۔ میں نے کہا۔ ''اگر اب تم لوگوں کی عقل نے کام کرنا شروع کر دیا ہے......تو تمہاری بہت مہربانی۔ مجھے جانے دو۔''

''لیکن......تم ہو کون؟ میں جاننا چاہتا ہوں۔'' وہ جیسے کھوئے کھوئے سے انداز میں بولا۔

''تمہارے جیسا ہی ایک بندہ ہوں......''

''نہیں، تم ہمارے جیسے نہیں ہو۔ تم خاص بندے ہو۔ مجھے لگتا ہے کہ تم نے یہ لڑائی بھڑائی کہیں بڑے اونچے لیول پر سیکھی ہوئی ہے۔ میرا ایک جاننے والا بڑے اونچے درجے کا باکسر ہے۔ کہیں تم بھی تو کوئی باکسر شاکسر نہیں ہو......جسم تو تمہارا بھی بالکل کھلاڑیوں جیسا ہی ہے بلکہ......کھلاڑیوں سے بھی آگے کی چیز ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ہاں، محمد علی باکسر میرا شاگرد رہا ہے۔ اب مجھے جانے کی اجازت دو۔'' میں نے اسکوٹر کی چابی کے لیے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

وہ ٹس سے مس نہیں ہوا اور یک ٹک میری طرف دیکھتا رہا۔ اس کی تیکھی مونچھوں کے نیچے میرے گھونسے نے ایک نیل بنا دیا تھا اور اس نیلے رخسار کے نیچے اس کی خوب صورت ٹھوڑی پر کسی پرانے زخم کا نشان دوپہر کی سنہری دھوپ میں نمایاں نظر آتا تھا۔ ''ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''تم نے پہلی نظر کے عشق کے بارے میں کچھ سنا ہوا ہے؟''

''کیا مطلب؟''

''اگر میں یہ کہوں کہ مجھے پہلی نظر میں تم سے عشق ہو گیا ہے تو پھر؟''

''تو پھر اللہ تمہارے حال پر رحم کرے۔''

''میرے ساتھی تو بہت سے ہیں، لیکن دوست صرف ایک دو ہی ہیں۔ میں صرف دلیر اور جی دار دوست بناتا ہوں اور مجھے لگتا ہے کہ میرے دوستوں میں ایک بہت اچھے دوست کا اضافہ ہو سکتا ہے۔''

''لیکن مجھے نہیں لگتا۔''

''تو پھر مجھے اپنی شاگردی میں لے لو۔ میں تمہارے اندر ایک بڑا فنکار دیکھ رہا ہوں اور

میرا دل چاہتا ہے کہ تم سے کچھ سیکھوں۔"

"میں کوئی ستار نہیں بجاتا یا سرکس نہیں کرتا کہ تم مجھ سے کچھ سیکھو گے۔"

"لیکن......لیکن پھر بھی میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ تم کوئی معمولی چیز نہیں ہو۔ منہ پر تعریف کرنا اچھا تو نہیں ہوتا لیکن مجھے کرنا پڑ رہی ہے......"

وہ بالکل سریش ہو کر چپک گیا تھا۔ اس سے جان چھڑانے میں مجھے دانتوں پسینا آ گیا۔ اس نے مجھ سے میرا موبائل نمبر لیا اور ایڈریس بھی (جو میں نے غلط بتایا) میرے بے حد منع کرنے کے باوجود اس نے مجھے ایک شاندار دیہاتی لنچ کرایا، جس میں مکئی کی روٹی، دیسی مرغ کا سالن اور ساگ شامل تھا۔ ساتھ میں گنے کے تازہ رس سے لبالب بھرے ہوئے بڑے گلاس۔ اس کے ساتھیوں نے اس کے کہنے پر مجھ سے دست بستہ معافی مانگی، میں نے بھی اپنا کہا سنا معاف کرایا۔ یقیناً ان لوگوں کے ذہن میں اب بھی یہ سوال موجود تھا کہ میں ان کے علاقے میں کیا کر رہا تھا اور میری تاکا جھانکی کا مقصد کیا تھا لیکن وہ سب اور خاص طور سے سیف مجھ سے اتنا متاثر ہو چکا تھا کہ کسی نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا۔

سہ پہر کے تین بجے تھے۔ سردیوں کی شام کے سائے لمبے ہونا شروع ہو گئے تھے جب میں ہیلمٹ پہن کر اور اسکوٹر پر سوار ہو کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ جوں جوں سکھیرا گاؤں اور اس کے باسی مجھ سے دور ہوتے چلے گئے۔ دل و دماغ کو ایک عجیب سی اداسی گھیرتی چلی گئی۔ دو لہراتی ہوئی لٹیں...... انگلی میں دمکتی ہوئی انگوٹھی، باغ میں جلترنگ بجاتی ہوئی ہنسی، رسّی پر اچھلتا ہوا ایک بے مثل پیکر، اور پھر درخت کے گرے ہوئے تنے پر رکی ہوئی ایک بے نام خاموشی۔ سب مناظر نگاہوں میں گڈمڈ ہونے لگے۔

○......❖......○

پہلوان حشمت حسبِ وعدہ و ارادہ "ڈنگہ" کی اس مین سڑک پر گاڑی کے اندر میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے پہنچنے سے ایک گھنٹا پہلے اسے فون کر دیا تھا۔ لہٰذا ایک پُرتکلف کھانا تیار تھا جو پہلوان کی خصوصی ہدایات پر ایک قریبی ہوٹل میں دیسی گھی سے تیار کیا گیا تھا۔ کھانے کے ساتھ ساتھ پہلوان مجھ سے باتیں بھی کرتا رہا۔ وہ تاڑ گیا تھا کہ میں اسے اپنے پچھلے چند گھنٹے کی مصروفیت کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا لہٰذا اس نے زیادہ استفسار بھی نہیں کیا، اس نے مجھ سے انیق اور سجاول وغیرہ کا حال احوال پوچھا۔ ساتھ ساتھ چاند گڑھی کے ابتر حالات پر بھی تبصرہ کرتا رہا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ چاند گڑھی اب رہنے والی جگہ نہیں رہی۔

ٹینڈے گوشت کا سالن باکمال تھا۔ میں نے تعریف کی تو وہ بولا۔ "یہ یہاں کے مشہور

باورچی نے تیار کیا ہے۔ گوجرانوالہ کے استاد اللہ داد کا شاگرد ہے یہ...... دراصل استاد کے بغیر کوئی ہنر بھی ٹھیک سے بندے کے ہاتھ ناہیں آوت ہے۔ اب تم خود کو ہی دیکھو۔ تمہارے اندر اوپر والے نے بڑا ٹیلنٹ (ٹیلنٹ) چھپایا ہے۔ اگر تمہاری تھوڑی سی تربیت کی جاوے تو تم بہت آگے جا سکت ہو۔ بلکہ لاہور میں جا کر مقابلوں میں حصہ لے سکت ہو۔" پھر اس نے اس حوالے سے اپنے دو لنگڑے لولے شعر سنائے۔

بے شک صلاحیت تو نوجوانوں میں ہے بلا کی
بس کمی تھوڑی سی ہے جور و جفا کی
سن لے او کاکا، سن لے او کاکی
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

میں نے شعر کی "خوف صورتی" پر زور شور سے سر ہلایا اور خیال کی تائید کی۔ پہلوان نے اگلے دس منٹ اس موضوع پر صرف کیے کہ فائٹ کے دوران میں مجھ سے کیا کیا غلطیاں ہوتی ہیں اور اگر میں انہیں ٹھیک کرلوں تو کتنا آگے جا سکتا ہوں۔ جناب نے کار کے اندر ہی کچھ داؤ پیچ کا عملی مظاہرہ کرنے کی کوشش کی لیکن جب خطرہ پیدا ہوا کہ ٹینڈے گوشت کے سالن اور فرنی وغیرہ کا آپس میں غیر فطری ملاپ ہو جائے گا تو اس کوشش کو ترک کر دیا۔ خلاصہ کلام کے طور پر انہوں نے کہا۔ "چاندگڑھی سے میرا دل اچاٹ ہو گیا ہے، بیوی کو بچوں سمیت میں نے اس کے میکے بھجوا دیا ہے۔ اگر کچھ عرصہ میں تمہارے ساتھ رہ سکوں اور تمہاری "ٹریننگ" کرسکوں تو یقین کرو تم بڑوں بڑوں کو آگے لگا لو گے۔"

میں جان گیا تھا کہ گفتگو کس رخ پر جا رہی ہے۔ غالباً پہلوان کی خواہش تھی کہ میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں۔ انیق کے ساتھ اس کی گہری دوستی تھی اور اب میرے ساتھ بھی بے تکلفی پیدا ہو چکی تھی۔ بے شک پہلوان ایک دلچسپ کردار تھا اور بوقتِ ضرورت کئی طرح سے کام بھی آ سکتا تھا لیکن آئندہ جس طرح کے حالات درپیش تھے ان میں پہلوان کو گھسیٹنے کا سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔

میں نے باتوں باتوں میں پہلوان کو سمجھا دیا کہ فی الحال میرے لیے ایسا ممکن نہیں ہے لیکن اس کی دل شکنی بھی نہیں ہونے دی اور اسے بتایا کہ میں اس سے کچھ سیکھ کر اور اس کی شاگردی میں آ کر فخر محسوس کروں گا۔ پہلوان کو ایک بڑا اعتراض یہ بھی تھا کہ میں اس کا فون اٹینڈ نہیں کرتا اور کبھی کبھی اس کی بات درمیان میں ہی ہوتی ہے کہ میں فون کاٹ دیتا ہوں۔

میں نے فی الواقع محسوس کیا کہ یہ میری زیادتی ہے...... اور خلوصِ دل سے پہلوان کو

یقین دلایا کہ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ پہلوان نے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر وعدہ کرو کہ ہفتے میں کم از کم ایک بار فون پر بات ضرور کیا کرو گے۔''

میرے ذہن میں فوراً برونائی کا خیال آیا۔ اگر ہم وہاں چلے جاتے تو پتا نہیں کہ آسانی سے رابطہ ہوسکتا یا نہیں۔ بہرحال میں نے وعدہ کیا کہ میں ہر ممکن کوشش کروں گا اور اس سے چاند گڑھی کے حالات دریافت کرتا رہوں گا۔

پہلوان کو اسکوٹر دے کر اور گاڑی لے کر میں واپس براستہ فیصل آباد، لیہ کی طرف روانہ ہوگیا۔ میں ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ نگاہیں سڑک پر مرکوز تھیں، لیکن ذہن وہیں سکھیرا گاؤں کے باغ میں الجھا ہوا تھا اور اس انگوٹھی میں الجھا ہوا تھا جو دوپہر کی سنہری دھوپ میں لشکارا مارتی تھی۔ کیا یہ انگوٹھی پہننے سے پہلے، اس نے مجھے یاد کیا ہوگا؟ چند سیکنڈ کے لیے میرے بارے میں سوچا ہوگا؟ شاید نہیں۔ وہ مجھے بھول چکی تھی۔ اگر کچھ یادیں تھیں بھی تو اس نے انہیں کھرچ ڈالا ہوگا۔ مجھے یقین تھا کہ دین محمد صاحب نے اور ان کی بیوی نے تاجور کے لیے کوئی اچھا بر ڈھونڈا ہوگا، ان ہی کی طرح کا کوئی کھاتا پیتا زمیندار یا پھر کوئی زراعت پیشہ۔

سوچوں نے بے طرح میرے ذہن کو جکڑا ہوا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ مجھ سے ایک غلطی ہوئی۔ ایسی غلطی مجھ جیسے شخص سے ہونی نہیں چاہیے تھی۔ میں نے اپنی زندگی کے کئی سال یورپ میں، ٹیکساری گینگ کے غنڈوں سے لڑتے ہوئے گزارے تھے۔ جب ایسی دشمنیاں پڑ جاتی ہیں تو پھر بندے کو ہر وقت چوکنا رہنا پڑتا ہے۔ اپنے سائے سے بھی ہوشیار رہنا ہوتا ہے۔ پھر میں اپنے پیچھے چلنے والے ایک سائے سے ہوشیار کیوں نہ رہ سکا؟ شاید اس کی وجہ یہی تھی کہ ڈنگہ سے فیصل آباد اور پھر فیصل آباد سے لیہ کے نواح تک کے طویل سفر میں میرا ذہن مسلسل تاجور میں الجھا رہا تھا۔ میں پارا ہاؤس کی سخت سکیورٹی سے گزر کر اندر پہنچ گیا۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے، سجاول سو چکا تھا لیکن انیق اپنے دوست خانساماں ازمیر طیب کے پاس بیٹھا گپیں ہانک رہا تھا اور میرا انتظار کر رہا تھا۔

ابھی میں نے انیق اور ازمیر سے سلام دعا ہی کی تھی کہ سیکنڈ انچارج رفاقت علی نے انٹرکام پر مجھ سے رابطہ کیا۔ ''شاہ زیب صاب! ہم نے ایک بندے کو پکڑا ہے۔ ہمیں شک ہے کہ وہ آپ کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں آیا ہے۔''

''میرا پیچھا کرتے ہوئے؟ کون ہے؟''

''یہ تو وہی بتا سکتا ہے جی...... یا پھر آپ بتا سکتے ہیں۔ ایک سفید مہران کار پر ہے۔ مقامی لگتا ہے۔ چہرے پر چوٹوں کے نشان ہیں۔ اس کے پاس سے اعشاریہ 25 کا پستول

اور بیس بائیس راؤنڈ بھی برآمد ہوئے ہیں۔''

میں حیران تھا۔ ''اسے لاؤ یہاں میرے پاس۔'' میں نے کہا۔

قریباً دس منٹ بعد میں نے اس شخص کو دیکھا اور میری حیرت میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ وہ سکھیرا گاؤں کا وہی سیف تھا۔ مجھے یقین نہیں آیا کہ وہ اتنی دور سے اتنی کامیابی کے ساتھ میرا تعاقب کر کے یہاں پہنچ گیا ہے۔

''یہ کیا تماشا کیا ہے تم نے؟'' میں نے حیرت آمیز طیش سے کہا۔

وہ اپنی تیکھی مونچھوں کے نیچے مسکرایا اور لمبے بالوں کو انگلیوں سے سنوار کر بولا۔ ''میں نے تم سے کہا تھا نا کہ مجھے اپنے ساتھ لے چلو، تم نہیں مانے تو مجھے یہ رسک لینا پڑا۔''

میرا جی چاہا اسے جھانپڑ رسید کر دوں۔ مگر پھر ضبط کیا۔ انیق بھی تعجب سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے ایک طرف جا کر رفاقت علی اور اس کے ساتھ آنے والے گارڈز کو بتایا کہ اس کے ساتھ کوئی نفسیاتی مسئلہ ہے، ویسے یہ بہت حد تک بے ضرر بندہ ہے۔ میں اس سے بات کرتا ہوں۔ تم لوگ سمجھو کہ یہ میری ذمے داری پر یہاں ہے۔

رفاقت سکیورٹی کے حوالے سے تذبذب میں نظر آتا تھا۔ اس نے کہا۔ ''میرے لیے ضروری ہے کہ مالکوں کو اس بارے میں بتاؤں۔ ان سے بات کر کے ہی میں کچھ کہہ سکوں گا۔''

اس کے جانے کے بعد میں سیف کو دوسرے کمرے میں لے گیا۔ دروازہ بند کرتے ہوئے میں پھنکارا۔ ''میں تمہیں اتنا احمق نہیں سمجھتا تھا۔ پتا ہے تم نے میرے پیچھے آ کر کتنا خطرناک کام کیا ہے؟''

وہ بے پروائی سے بولا۔ ''میرے بھائی، عشق و محبت میں خطرے تو مول لینے ہی پڑتے ہیں اور یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ میں تم جیسے پہنچے ہوئے فنکار کے ساتھ رہنے اور اس سے کچھ سیکھنے کے لیے، کچھ بھی کر سکتا ہوں۔''

''اگر کچھ بھی کر سکتے ہو تو سب سے پہلا کام تو یہ کرو کہ یہاں سے دفع ہو جاؤ اور دوبارہ ادھر کا رخ نہ کرنا ورنہ بہت بڑی مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔''

''میں ہر مصیبت کے لیے تیار ہوں۔'' وہ بڑی ڈھٹائی سے مسکرایا۔

اس کی آنکھوں میں بلا کی ذہانت تھی اور وہ جیسے خاموشی کی زبان میں مجھ سے کہہ رہا تھا...... میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ تم کوئی اعلیٰ پائے کی چیز ہو۔ خود کو چھپا رہے ہو مگر تاڑنے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔

دلچسپ بات تھی۔ ابھی چند گھنٹے پہلے پہلوان سے بات ہوئی تھی۔ وہ اس لیے میرے ساتھ رہنا چاہتا تھا کہ اپنی پہلوانی کے کچھ نایاب داؤ پیچ مجھے سکھا سکے اور یہ بندہ اس لیے میرے پیچھے پڑ گیا تھا تاکہ سیکھ سکے۔ میں نے اس کے تن و توش کو جانچنے والی نظروں سے دیکھا۔ وہ ایک پیدائشی مہم جو اور فائٹر دکھائی دیتا تھا۔ برونائی میں جہاں ہم جارہے تھے وہاں بھی اچھے فائٹر اور اسلحہ شناس لوگوں کی ضرورت تھی۔ اس حوالے سے سیف عرف سیفی کی بات پر غور کیا جا سکتا تھا لیکن اتنی جلدی فیصلہ ممکن نہیں تھا۔ وہ ایک خوش شکل گبرو نوجوان تھا۔ ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ کھیلنے کھانے کے دن تھے۔ میری وجہ سے وہ کسی خطرناک سچویشن میں پھنس جاتا تو یہ بہت غلط ہوتا۔ وہ پنجاب کے سوہنے کھیل کبڈی کا کھلاڑی تھا۔ قمیص کے نیچے پستول لگا کر پھرنا اور چھوٹی موٹی لڑائیاں لڑ لینا اور بات ہے، کسی خطرناک مہم کا حصہ بن کر خود کو آگ اور بارود میں گھسا دینا اور چیز۔

پارا ہاؤس میں سجاول کے نام کا ڈنکا بج رہا تھا۔ اور تو اور آقا جان کا رویہ بھی اس کے ساتھ کافی نرم ہو گیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میرا دل بھی اندر سے خوش تھا۔ میرے دل و دماغ نے بدترین حالات میں بھی یہی گواہی دی تھی کہ سجاول کم از کم مجھے دھوکا نہیں دے گا اور یہ گواہی درست ثابت ہوئی تھی۔ کم از کم اب تک تو یہ درست ہی تھی اور شاید اس کی بنیاد وہی ہتھ جوڑی والا معاملہ تھا جس میں، میں نے سجاول کے سیکڑوں ساتھیوں کے سامنے اس کا بھرم رکھا تھا۔

رو رو کر بڑی بیگم کی آنکھیں سوج چکی تھیں۔ بھائی کی ناگہانی موت کا انہوں نے گہرا اثر لیا تھا۔ وڈا صاحب بھی اپنی ساری عیش و عشرت بھولا ہوا تھا۔ کم از کم آٹھ حسینائیں یعنی خواصیں ہر وقت یہاں اس کے تصرف میں تھیں۔ لیکن آج کل وہ اپنے بیڈ روم میں تنہا ہوتا تھا اور تو اور چنچل و خوبرو سنبل کے لیے بھی وہ کسی طرح کی رغبت محسوس نہیں کر رہا تھا۔ پارا ہاؤس میں روانگی کی تیاریاں جاری تھیں۔ جنہوں نے ساتھ جانا تھا ان کے کاغذات تیز رفتاری سے تیار ہو رہے تھے۔ روپے میں طاقت ہوتی ہے اور یہ طاقت اپنا کام دکھا رہی تھی۔ ہفتوں کا کام گھنٹوں میں ہو رہا تھا۔

انیق نے کہا۔ ”میں آپ کو ایک خبر سناؤں، آپ کا دل باغ باغ ہو جائے گا۔“

”کیسی خبر؟“ میں نے پوچھا۔ ہم مہمان خانے کے عقب میں ایک باغیچے میں پتھریلے بینچ پر بیٹھے تھے۔

”جاناں بھی ہمارے ساتھ جا رہی ہے۔ میرے خیال میں وہ میڈم لورین کی ضرورت

بن چکی ہے۔ وہ اسے ہر صورت ساتھ لے جانا چاہ رہی ہے۔ فرمائیے، ہو گیا ناں دل باغ باغ۔"

"اتنی پیاری صبح میں کتنی منحوس خبر سنائی ہے تم نے۔" میں نے برا سا منہ بنایا۔

وہ بولا۔ "آپ کی بات سن کر پہلوان حشمت کی ایک بات یاد آ گئی ہے۔ وہ فرماتے ہیں یہ لفظ "باغ باغ" نہیں ہوتا بلکہ "بھاگ بھاگ" ہوتا ہے اور پریشانی کے موقع پر بولا جاوت ہے۔ جیسے اگر کسی کی بیوی سسرال سے جلدی واپس آ جائے تو ہم کہیں گے...... بیوی کے آنے کی خبر سن کر اس کا دل بھاگ بھاگ ہو گیا۔"

"اپنی ہر بکواس بھی پہلوان کے کھاتے میں ڈال دیا کرو۔"

"بالکل نہیں جی۔ اگر میں نے اس موقعے پر کچھ کہنا ہوتا تو یہ کہتا...... جانے سے جاناں کے آئے بہار...... آنے سے جاناں کے جائے بہار...... بڑی مرجانی ہے میری محبوبہ......"

میں نے ٹانگ چلائی جو اس کے منہ پر پڑی۔ وہ گیند کی طرح لڑھک کر باڑ کے پیچھے ایک چھوٹے سے گڑھے میں جا گرا۔ وہیں سے کراہتے ہوئے بولا۔ "ویسے آپ کی ٹانگ امیتابھ بچن سے لمبائی میں تھوڑی ہی کم ہے اور امیتابھ بچن کے حوالے سے تو یہ لطیفہ خاصا مشہور ہوا تھا اس کی پیدائش کے وقت دایہ نے کہا تھا...... دھنیوا دھو ہری وانش صاحب آپ کے گھر میں ٹانگیں پیدا ہوئی ہیں، مزے کی بات یہ ہے کہ ان پر ایک پتلا سا منہ بھی لگا ہوا ہے۔"

"اچھا...... تماشے مت لگاؤ، ادھر آؤ۔"

وہ بولا۔ "ادھر کیسے آؤں۔ میں تو کھڈے میں گرا ہوا ہوں۔ آپ مجھے نکالیں، بلکہ مدد کے لیے اس امریش پوری کو بھی بلا لیں۔"

اتنے میں سجاول بھی لمبے ڈگ بھرتا ہوا موقع پر پہنچ گیا۔ باڑ کی دوسری طرف اسے انیق نظر نہیں آیا مگر اس کی آواز وہ یقیناً سن چکا تھا، بولا۔ "یہ کون گر گیا ہے کھڈے میں؟"

"انیق۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"تو سوچتے کیا ہو، ڈالو مٹی...... کام ختم کرو۔" سجاول بولا۔

اتنے میں انیق بھی کپڑے جھاڑتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر کھسیانی سی ہنسی تھی۔ سجاول اپنی بھاری بھرکم آواز میں بولا۔ "اور یہ امریش پوری کون ہے؟"

انیق کا رنگ اُڑ گیا، پھر ذرا سنبھل کر بولا۔ "وہ...... وہ...... میرا ایک چاچا ہے انڈیا میں۔ دراصل......"

سجاول نے ایک بڑی سی ڈکار لی اور کہا۔ ''تمہارے والد کا بھائی ہوا ناں، مجھے پہلے ہی شک تھا کہ تم کسی بگڑے ہوئے ہندو کی اولاد ہو۔''

سجاول کے تیز تیکھے فقروں پر انیق کے چہرے کا رنگ بدل جایا کرتا تھا لیکن اس دفعہ کوئی خاص ردِعمل نہیں ہوا۔ وہ مسکرا کر بات کو دوسری طرف لے گیا اور وضاحت پیش کی کہ وہ ایک منہ بولے چاچا کی بات کر رہا ہے۔

جب سے سجاول پر چوری کی واردات والا شک غلط ثابت ہوا تھا اور اس نے اصل مجرم قادر خان کو پکڑا تھا، اس کے بہت سے مخالفین نے اپنی زبانوں کو لگام دے لی تھی اور ان میں سے ایک انیق بھی تھا۔ وہ اب اس کے بارے میں قدرے محتاط ہو کر بات کرتا تھا۔ موقع دیکھ کر انیق وہاں سے کھسک گیا تو سجاول نے بینچ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے لیے ایک بالکل تازہ بہ تازہ خبر ہے شاہی، زینب کے بارے میں ہے۔ اندازہ لگاؤ کیا ہو سکتی ہے؟''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔'' میں نے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''کل رات...... ابراہیم اور زینب کا نکاح ہو گیا ہے۔''

میں تھرا کر رہ گیا۔ سماعت پر یقین نہیں آیا۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہو؟ مذاق کر رہے ہو؟''

''تمہیں پتا ہے میں مذاق نہیں کرتا۔ بالکل پکی اطلاع ہے۔ کل رات ہی زینب دلہن بن کر ابراہیم والے پورشن میں شفٹ ہو گئی تھی۔''

''اوہ گاڈ۔'' میں نے سر تھام لیا۔ ''اسے سب کچھ پتا تھا...... وہ سب کچھ جانتا تھا۔ وہ تو کہتا تھا......'' بات ادھوری چھوڑ کر میں کھڑا ہو گیا۔

''کہاں جا رہے ہو؟'' سجاول نے بھی کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا۔

''ابراہیم سے بات کرنا چاہ رہا ہوں۔'' میں نے سخت مضطرب لہجے میں کہا۔

''لیکن کوئی گڑبڑ والی بات نہ کرنا۔'' اس نے مجھے کندھے سے تھام کر کہا۔ ''ہمیں یہاں جو مقام ملا ہے، اسے گنوانا نہیں ہے۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ کمرے میں آ کر کپڑے تبدیل کیے۔ فون پر ابراہیم سے آنے کی اجازت مانگی اور پاراہاؤس کے خاص رہائشی حصے کی طرف چل دیا۔

○......❖......○

اب رہائشی حصے کی آرائش و زیبائش میں نمایاں کمی نظر آ رہی تھی۔ کئی جگہ پر سامان باندھ کر رکھ دیا گیا تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ مکین کہیں روانہ ہونے کی تیاری میں ہیں۔ سخت حیرت تھی۔ اس طرح کے ہنگامی حالات میں ابراہیم نے اس طرح کا عمل کیوں کیا تھا؟ پھر میرے ذہن

میں پرانے شاہی خاندانوں کا خیال آیا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ کسی بڑی اور خطرناک مہم سے پہلے یہ لوگ ''ہنگامی جشن'' مناتے تھے۔ عیش و عشرت کرتے تھے اور اپنی ناتمام خواہشوں کو آسودہ کرتے تھے۔ کہیں یہ بھی تو کوئی اسی طرح کی صورتِ حال نہیں تھی؟

سکیورٹی کے مرحلے سے گزر کر میں ابراہیم کے رہائشی پورشن کے قریب پہنچا تو ایک جواں سال خوبرو ملازمہ نظر آئی۔ وہ ایک دیدہ زیب گلدستہ لیے ابراہیم کے کمرے سے نکل رہی تھی۔ یقیناً وہ یہ پھول زینب کے کمرے میں لے کر جا رہی تھی۔ میں ایک دو دفعہ پہلے بھی اسے ایسے ہی گلدستے کے ساتھ دیکھ چکا تھا۔

میں اجازت لے کر کمرے میں داخل ہوا تو ابراہیم خوشنما ریشمی لبادہ پہنے ایک آرام دہ دیوان پر نیم دراز تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ سر کے پیچھے باندھ کر آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ چہرے پر گوناگوں سکون کی کیفیت تھی۔ میرے کھنکھارنے پر وہ اٹھ بیٹھا۔ ''آئیں شاہ زیب!'' وہ ملائمت سے بولا۔

میں اس کے سامنے بیش قیمت اٹالین نشست پر بیٹھ گیا۔ وہ رسمی کلمات کے بعد بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ آپ تک خبر پہنچ گئی ہے؟''

''جی ہاں۔ اور بے حد حیرت ہوئی ہے۔ ابھی تک یقین نہیں آ رہا۔'' میں نے انگلش میں کہا۔

''اب یقین کر لیں۔'' اس نے اپنے مہندی لگے ہاتھوں سے اپنے ریشمی چغے کی سلوٹیں درست کرتے ہوئے کہا۔

چند سیکنڈ خاموشی رہی۔ تب میں نے گہری سانس لے کر گفتگو کا سلسلہ جوڑا۔ ''ابراہیم اگر باقی ساری باتوں کو فی الحال ایک طرف رکھ دیا جائے تو بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ایسے ہنگامی حالات میں...... اور اپنے ماموں کی موت کے چند دن بعد ہی آپ نے یہ نکاح کر لیا ہے۔''

''یہ ایک مجبوری تھی اور یہ جو کچھ ہوا ہے بالکل سادگی سے ہوا ہے۔ بس گھر کے چار پانچ قریبی افراد ہی اس نکاح میں شامل تھے۔''

''اور آپ سب کچھ جانتے بھی تھے۔ آپ خود کہتے تھے کہ میں اس کی زندگی برباد نہیں کر سکتا۔''

''لیکن...... کئی دفعہ حالات انسان کے بس میں نہیں رہتے۔'' اس نے عجیب لہجے میں کہا۔ ''میں اسے کھونا نہیں چاہتا تھا...... اور وہ بھی مجھے کھونا نہیں چاہتی تھی۔ میں نے جو کچھ بھی

کیا ہے اسے سب کچھ بتا کر کیا ہے۔ کچھ بھی اس سے چھپایا نہیں ہے اور سب کچھ اوپر والے پر چھوڑ دیا ہے۔''

''انسان کو عقل بھی اوپر والے نے ہی دی ہے ابراہیم ......اور بتایا ہے کہ آگ میں کودو گے تو جلو گے، پہاڑ سے چھلانگ لگاؤ گے تو مرو گے۔''

''آپ جس طرف اشارہ کر رہے ہیں، میں سمجھ رہا ہوں۔ لیکن یہ صرف نکاح ہے، ازدواجی رشتہ نہیں ہے۔ میں نے خود سے عہد کیا ہے شاہ زیب کہ اس وقت تک زینب کے قریب نہیں جاؤں گا جب تک اسے میری ذات سے ہلکے سے ہلکا خطرہ بھی لاحق ہو گا۔ شاید میں ابھی نکاح بھی نہ کرتا لیکن مجبوری یہ تھی کہ میں اسے یہاں چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا تھا۔ اسے اپنے ساتھ برونائی لے جانے کا واحد راستہ یہی تھا کہ ہم ایک ہو جائیں۔''

میں نے نوخیز ابراہیم کی طرف دیکھا۔ یہ خطرناک ترین جوانی کی عمر تھی اور وہ زینب کو ٹوٹ کر چاہ رہا تھا۔ اب وہ منکوحہ بیوی کی حیثیت سے اس کے ساتھ تھی اور وہ اپنے اور اس کے درمیان بند باندھنے کی بات کر رہا تھا۔ یہ آگ اور پیٹرول کا کھیل تھا۔

میں نے کہا۔ ''کل رات زینب آپ کے ساتھ آپ کے کمرے میں رہی ہے۔ آپ اس سے دور رہے ہوں گے مگر یہ دوری کب تک قائم رہ سکتی ہے؟''

''میں نے خود سے اور اپنے اللہ سے وعدہ کیا ہے شاہ زیب صاحب اور میں اس پر قائم رہوں گا۔ رات کو بھی وہ میرے کمرے میں نہیں ساتھ والے کمرے میں تھی......اور آئندہ بھی ایسا ہی ہو گا۔ یہاں تک کہ قدرت کو ہم پر رحم آ جائے اور ہمارے لیے کوئی راستہ نکل آئے۔''

میں نے ذرا توقف سے کہا۔ ''کیا وہ آپ کے ساتھ برونائی جانے کو تیار ہے؟''

''ایک سو ایک فیصد۔'' وہ پورے یقین سے بولا۔ ''وہ خود بھی یہ کہتی ہے کہ اب...... اپنے ماضی کی طرف پلٹنا نہیں چاہتی۔''

ہماری گفتگو کو ایک بار پھر بڑی بیگم کی وجہ سے بریک لگ گئے۔ ایک ملازمہ نے آ کر ابراہیم کو اطلاع دی کہ بڑی بیگم کی طبیعت ناساز ہے اور وہ آپ کو بلا رہی ہیں۔ ابراہیم اٹھ کر روانہ ہو گیا۔ میں بھی باہر نکل آیا۔ ابراہیم کا فقرہ کانوں میں گونج رہا تھا......وہ ایک سو ایک فیصد تیار ہے۔ وہ خود بھی اپنے ماضی کی طرف پلٹنا نہیں چاہتی۔ میں سوچنے لگا شاید ساری مشرقی لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ ان کے سینوں میں درد اور جدائی کے لیے بے پناہ جگہ ہوتی ہے۔ وہ خود کو بدلے ہوئے حالات میں ڈھالتی ہیں اور ایسا کرتے ہوئے ہزار ہا دکھ خاموشی سے جھیل جاتی ہیں۔ پھر وہ ان سے پیار کرنے لگتی ہیں جن سے انہیں منسوب کر دیا جاتا ہے۔

تاجور بھی تو ایسی ہی تھی۔ اس نے اپنی اور اپنے ماں باپ کی بھلائی کے لیے سب کچھ فراموش کر دیا تھا۔ اب ماں باپ کی پسند سے اس کی سگائی ہو گئی تھی...... اور کیا پتا کہ اب وہ خود بھی اسی کو پسند کرنے لگی ہو جس نے اس کے جسم و جاں کا مالک بننا تھا۔ یقیناً یہ مشرقی لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔

میں ایک راہداری سے گزرا تو چونک گیا۔ میں نے دیکھا کہ ملازمین ایک جگہ کچھ تھیلے جمع کر رہے تھے۔ یہ سفید کینوس کے تکیہ نما تھیلے تھے جن کے منہ بند کیے گئے تھے۔ ان کی تعداد جو مجھے دکھائی دی، دس کے قریب تھے، ہر تھیلے پر MT لکھا ہوا تھا۔ میں نے ایک مقامی ملازم سے پوچھا۔ ''یہ کیا ہے؟''

''پتا نہیں صاحب! یہ شاید برونائی جا رہے ہیں...... دوسرے سامان کے ساتھ۔''

میں ان تھیلوں کو چھو کر دیکھنا چاہتا تھا مگر وہاں کئی گارڈز بھی موجود تھے، میں نے مناسب نہیں سمجھا۔ لیکن پتا نہیں کیوں میرے دل نے گواہی دی کہ ان تھیلوں میں جو کچھ بھی ہے، ان حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے ہے جو وہاں جزیرے پر درپیش ہیں۔ MT سے مراد کوئی بھی قانونی چیز ہو سکتی تھی۔ (غیر قانونی ہوتی تو اس طرح عام ملازم اس کی نقل و حرکت نہ کر رہے ہوتے) پتا نہیں کہ وہاں کیا صورتِ حال تھی؟

پارا ہاؤس کے برآمدوں سے گزرتے ہوئے میں نے دل ہی دل میں خود سے یہ سوال پوچھا۔ ''شاہ زیب! تم وڈے صاب کے ساتھ برونائی کیوں جا رہے ہو؟'' اس کا اہم ترین جواب یہی سامنے آیا کہ وہاں کے حالات کے حوالے سے میرے اندر بہت تجسس پیدا ہو چکا ہے، اور اس سے زیادہ اہم یہ کہ میں مولوی فدا صاحب کی یتیم بچی کو غیر یقینی حالات میں بے آسرا چھوڑنا نہیں چاہتا...... باقی دیگر باتوں کی اہمیت تو تھی مگر بہت زیادہ نہیں۔

میں سجاول کے پاس واپس پہنچا تو اس کے سامنے ایک خاکی لفافہ رکھا تھا۔ ''یہ کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہم تینوں کے پاسپورٹ، ویزے اور ٹکٹ...... شکیل داراب کی پاور کا ثبوت۔''

وہ درست کہہ رہا تھا۔ ابھی میں کاغذات دیکھ ہی رہا تھا کہ سجاول کے فون کا میوزک بجنے لگا۔ اس نے کال ریسیو نہیں کی اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے تیزی سے بولا۔ ''یہ ڈیرے سے ماؤ جی کا فون ہے۔ تم سے بات کرنا چاہتی ہیں۔ شاید مانی بھی کرے گی۔ ان سے جو کہنا ہے، وہ میں نے تمہیں بتا دیا تھا۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے کال ریسیو کی اور ایک دو فقرے بولنے کے بعد سیل فون میری طرف بڑھا دیا۔ ''ہیلو شاہ زیب پتر!

کہاں ہو تم؟'' ماؤ کی پاٹ دار آواز ابھری۔

''ہیلو ماؤ جی، میں یہاں ہوں سجاول بھائی کے ساتھ۔ بالکل ٹھیک ٹھاک۔ آپ تو ٹھیک ہیں ناں؟''

ماؤ جی نے بھوں بھوں رونا شروع کر دیا۔ ''اپنی ماؤ کو مار کر پوچھ رہے ہو کہ ٹھیک تو ہو۔ میرے بچڑے! تیرے بغیر جینا کوئی جینا نہیں...... اور مجھ سے بھی برا حال تیری اس ہونے والی کا ہے۔ سچ کہتی ہوں سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہے۔ کئی کئی دن کچھ کھاندی پیندی نہیں ہے۔ اب تم لوگ واپسی کی تاریخ کچھ ہور آگے ڈال رہے ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا بنے گا......'' ماؤ نے شکوے شکایتوں کے انبار لگائے اور پھر فون مانی کو تھما دیا۔

وہ آفت کی پرکالہ اپنے مخصوص انداز میں بولی اور اس نے بھی شکووں کی بوچھاڑ کی پھر کہنے لگی۔ ''شاہ زیب! تمہاری وجہ سے دادی ماؤ کو کچھ ہوا ناں تو پھر...... یاد رکھنا میں بھی اپنے ساتھ کچھ کر جاؤں گی۔ واپسی پر تمہیں ایک نہیں دو لاشیں ملیں گی۔ پورا ایک چھٹانک نیلا تھوتھا منگوا کر رکھ لیا ہے میں نے بھی۔''

لگتا تھا کہ اب ماؤ اس کے قریب موجود نہیں اس لیے وہ کھل کر بول رہی ہے۔ اس کے پوچھنے پر میں نے اسے بتایا کہ سجاول بھائی کے ساتھ اندرون سندھ جا رہا ہوں۔ وہاں کسی وڈیرے کا کوئی ضروری مسئلہ حل کرنا ہے۔ دو تین ہفتے لگ جانے ہیں۔ میں نے وڈیرے کا نام بھی بتایا (سجاول نے مجھے یہی کچھ بتانے کو کہا تھا) مہناز عرف مانی یوں بول رہی تھی جیسے میں اس کا ''منکوحہ'' بن چکا ہوں۔ باتوں کے دوران میں اس نے دو تین چھوٹی چھوٹی ڈکاریں بھی لیں جس سے یہ جھوٹ کھل گیا کہ وہ کھا پی نہیں رہی۔ فی الوقت بھی اس نے گلے تک ٹھونسا ہوا تھا۔

آفت جاں مانی سے بات ختم ہوئی تو میں نے ایک طویل ٹھنڈی سانس لی۔ اچانک مجھے اس سیلانی روح کا خیال آیا جو کل سکھیرا گاؤں میں مجھ سے چمٹی تھی اور میرے پیچھے پیچھے یہاں پارا ہاؤس پہنچ گئی تھی۔ میرا مطلب سیف عرف سیفی سے تھا۔ میں اپنے بیڈ روم کے ساتھ والے کمرے میں پہنچا، وہ پھیل کر سویا پڑا تھا۔ کلف دار شلوار قمیص چرمر ہو چکی تھی۔ لمبا تڑنگا مضبوط جسم، کسانوں والے ہاتھ پاؤں، چہرے پر کل والی چوٹوں کے دو تین نیل۔ وہ یوں بے فکر پڑا تھا جیسے خالہ جی کے گھر میں ہو۔ پتا نہیں یہ کیا شے تھی؟ ہیڈ خانساماں از میر طیب کی بندریا لوسی بھی بند کھڑکی میں سے اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

اچانک میری نگاہ ایک بٹوے پر پڑی۔ یہ اس کے کرتے کی بغلی جیب سے پھسل کر بیڈ

پر آ گیا تھا۔ میں نے ہولے سے بٹوا اٹھا لیا۔ اس میں سے ایک تصویر جھانک رہی تھی۔ یہ ایک تنومند بندے کی تصویر تھی۔ اس کے چہرے پر بال پوائنٹ سے کراس کا نشان لگا دیا گیا تھا۔ میں اس تصویر کو دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ میں اسے بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ یقین نہیں آیا کہ میں یہ تصویر یہاں پارا ہاؤس میں دیکھ رہا ہوں۔

○......❖......○

یہ داؤد بھاؤ کے اس خاص بندے کی تصویر تھی جسے جھارا پہلوان کہا جاتا تھا لیکن یہ نام کوئی اس کے منہ پر تو نہیں لے سکتا تھا کیونکہ وہ ایک دبلا پتلا لیکن نہایت کرخت شخص تھا۔ اس کا اصل نام مختار تھا اور وہ لاہور میں داؤد بھاؤ جیسے گینگسٹر کے اہم ترین کارندوں میں سے تھا۔ اس کی تصویر یہاں سیفی کی جیب میں رکھے بٹوے سے نکلی تھی اور اس کے استخوانی چہرے پر کراس لگایا گیا تھا۔

میں نے خاموشی سے تصویر واپس بٹوے میں رکھ دی۔ سیفی کسمسانے لگا پھر وہ جاگ گیا۔ اس نے لیٹے لیٹے ایک طویل انگڑائی لی اور مجھے دیکھ کر اٹھ بیٹھا۔

سر جھکا کر بولا۔ ''صبح صبح تمہاری شکل دیکھی ہے، لگتا ہے کہ آج کا دن مبارک ہے اور اچھا گزرے گا۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے بالکل الٹ لگ رہا ہے۔''

اس نے مسکرانے پر اکتفا کیا۔ اس کے اوپر والے ایک دانت کا کونا تھوڑا سا ٹوٹا ہوا تھا۔ شاید کبڈی کھیلتے ہوئے یا ویسے ہی مارا ماری کرتے ہوئے کوئی چوٹ لگی تھی۔ بہرحال یہ ٹوٹا ہوا کونا برا نہیں لگتا تھا۔ ہاتھ منہ دھو کر وہ میرے اور انیق کے ساتھ ہی ناشتے پر بیٹھ گیا۔ اس کی خوراک ٹھیک ٹھاک تھی۔ وہ بلاتردد ایک بڑا پراٹھا اور تین انڈے کھا گیا۔ بعد میں حلوہ کھایا اور دودھ پتی کے تین کپ بھی چڑھائے۔

انیق سے نہ رہا گیا اور بولا۔ ''کیا آپ کوئی ''علم'' وغیرہ بھی جانتے ہیں؟''

''کیا مطلب؟''

''یعنی کالا علم، نوری علم یا اس طرح کی کوئی اور چیز۔ آپ ماشاءاللہ خوب ڈٹ کر کھاتے ہیں پھر بھی اسمارٹ ہیں۔''

''اس کی وجہ یہ ہے کہ جتنا کھاتا ہوں، اس سے زیادہ نکال دیتا ہوں......''

''کوئی پیٹ کا مسئلہ ہے؟'' انیق نے ''معصومیت'' سے پوچھا۔

''نہیں یار، ورزش...... کبڈی کا شوق بلکہ جنون ہے، دس میل روزانہ دوڑتا ہوں، صبح

سویرے۔''

میں نے کہا۔''تو پھر آج کی دوڑ ابھی شروع کر دو۔ یہاں سے نکل کر دس میل جنوب کی طرف جاؤ گے تو بڑی سڑک آ جائے گی۔ وہاں سے لالہ موسیٰ جانے والی گاڑی آسانی سے مل جائے گی۔''

''شاید آپ بھول رہے ہیں، یہ خادم اپنی مہران کار پر یہاں تک پہنچا ہے اور وہ کار اس وقت یہاں کے گارڈز نے گیراج میں بند کی ہوئی ہے۔ میں اگر جانا چاہوں تو اس پر بھی جا سکتا ہوں لیکن یہاں سے جانا کس کافر نے ہے؟ میں آپ جناب کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔''

''اور میں آپ جناب کو ساتھ رکھنے کا خواہش مند نہیں ہوں۔'' میرا لہجہ روکھا تھا۔

اس نے بے باکی سے میری آنکھوں میں دیکھا۔''ایک بات تم بھول رہے ہو شاہ زیب صاحب! میں کبڈی کا کھلاڑی ہوں...... جاپھی کا مطلب سمجھتے ہو نا تم؟ یعنی وہ کھلاڑی جو کبڈی ڈالنے والے کو پکڑتا ہے۔ ایسا شکنجہ لگاتا ہے کہ بھاگنے والا بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔ میں بھی جاپھی ہوں۔ پنجاب میں جہاں جہاں کبڈی کھیلی جاتی ہے وہاں وہاں تمہارے اس خادم کا نام بھی جانا جاتا ہے۔''

''کیا سمجھانا چاہتے ہو؟''

''بس اپنی پکڑ کی بات بتا رہا ہوں۔ تمہیں استاد پکڑا ہے تو بس پکڑ لیا ہے...... اور اگر...... تم کہتے ہو تو بڑے ادب کے ساتھ تمہیں اس پکڑ کا مظاہرہ کر کے بھی دکھا سکتا ہوں۔''

''کس کو پکڑو گے؟''

''اپنے استاد کو اور کس کو۔ اگر استاد جیت گیا تو چیلا ہار جائے گا اور چپ چاپ سلام کر کے اور اپنی مہران میں بیٹھ کر یہاں سے نکل جائے گا۔ اگر استاد ہار گیا تو اسے اپنے چیلے کی درخواست ماننی ہوگی۔''

میں نے اس کی کالی سیاہ آنکھوں میں دیکھا، وہاں بلا کا اعتماد تھا۔ مجھے سوچتے پا کر جلدی سے بولا۔''لیکن استاد جی ایک گزارش ہے۔ تم مارا ماری نہیں کرو گے۔ مارا ماری میں، میں تمہاری ہوا کو بھی نہیں چھو سکتا اسی لیے تو استاد مان رہا ہوں تم کو۔''

انیق کی آنکھوں میں اب ایک طرح کا تجسس نظر آ رہا تھا۔ اس نے مجھے دلچسپ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔''شاہ زیب بھائی! یہ کیا بندہ اپنے پیچھے لگا لائے ہیں آپ؟ بات تو بڑی کڑا کے دار کر رہا ہے۔ آزمانے میں کیا ہرج ہے۔''

''گدھے کے ساتھ تم بھی گدھے مت بنو۔اس کے بازوؤں کا زور میں نے کل دیکھ لیا ہے سکھیرا پنڈ میں......''

''نہیں استاد نہیں۔''اس نے میرے گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر کہا۔''وہ تو مار کٹائی تھی اور اس میں، میں نے تمہیں استاد مانا......میری آنے والی نسل نے بھی مانا۔ میں یہاں کبڈی والی پکڑ کی بات کرر ہا ہوں۔ اگر خود کو چھڑا لو گے تو چپ چاپ یہاں سے چلا جاؤں گا۔''

میرے بجائے انیق بولا۔''چلو منظور ہے لیکن اس کھینچا تانی میں اگر تمہارا کوئی ہاتھ پاؤں ٹوٹا تو تم خود ذمے دار ہو گے۔''

''استاد کی وجہ سے ہاتھ پاؤں ٹوٹ گیا تو یہ میری خوش قسمتی ہو گی سجناں، بس ایک معافی مجھے ان سے دلا دو۔ یہ مجھے کوئی چوٹ شوٹ نہیں ماریں گے۔''

میں نے کچھ کہنا چاہا مگر انیق نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ پتا نہیں کیوں میرا دل بھی چاہنے لگا کہ اس بندے کی حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی کو ذرا پرکھا جائے۔ میرے ذہن میں بار بار مختار جھارا کی تصویر بھی آ رہی تھی۔ جھارے جیسے خطرناک شخص کی تصویر کسی ایرے غیرے کے بٹوے میں نہیں ہو سکتی تھی۔

تھوڑی دیر بعد میں اور انیق بڑے ہلکے پھلکے موڈ میں مہمان خانے کے ہال نما کمرے میں کھڑے تھے۔ یہاں ایک ڈائننگ میز اور سات آٹھ کرسیوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ یہ اشیا انیق اور سیفی نے گھسیٹ کر ایک گوشے میں کر دیں۔ سیفی نے اپنی جیکٹ اور قمیص اتار دی۔ اب وہ صرف شلوار پہنے ہوئے تھا، بالائی دھڑ ننگا تھا۔ کسرتی جسم ٹیوب لائٹ کی روشنی میں دمک رہا تھا۔ اس نے چھاتی پر ان مٹ روشنائی سے پنجابی کا ایک شعر لکھوا رکھا تھا۔ اس مختصر شعر کا مطلب کچھ یوں تھا۔ کوئی مرد میدان ہو یا سوہنی موہنی کڑی۔ میں نے جس کو بھی پکڑ لیا، اس کو ہاتھ سے چھوڑا نہیں۔

وہ شکل وصورت سے ایسا ہی لگتا تھا۔ تیز طرار پنجابی گبرو، اوپر سے دلیر بھی تھا۔ بہت سی لڑکیاں اس پر مرتی ہوں گی۔ سجاول پر ہر وقت ایک گمبھیر سی خاموشی اور سنجیدگی طاری رہتی تھی لیکن یہ تماشا دیکھنے کے لیے وہ بھی ہال کمرے میں آ گیا۔ ہم نے دونوں دروازے اندر سے بند کر دیئے۔ کپڑے پھٹنے کا ڈر تھا اس لیے میں نے بھی بالائی لباس اتار دیا۔ اب میرے بدن پر نیلی جین کی پینٹ تھی۔ لمبائی کے رخ پر ہال کمرے کی دیواروں کا درمیانی فاصلہ 25 فٹ کے قریب تھا، سیف کا دعویٰ تھا کہ وہ مجھے دیوار کے قریب دبوچے گا اور دوسری دیوار کی طرف بڑھنے سے روک دے گا۔ میرے خیال میں اس دعوے پر پورا اترنا اس کے لیے ممکن

نہیں تھا۔ میں نے پنجاب کے بے مثال کبڈی کھیلنے والوں کا ذکر سن رکھا تھا آج اتفاق سے ان میں سے ایک کو پرکھنے کا موقع مل رہا تھا۔

اس بات کا خدشہ تو نہیں تھا کہ کوئی مہمان خانے کے اس حصے کی طرف آئے گا، پھر بھی انیق نے کھڑکیوں کے پردے اچھی طرح برابر کر دیئے، سیف نے ایک بار پھر مجھ سے ''درخواست'' کی کہ میں اسے کوئی چوٹ نہیں لگاؤں گا...... آخر تماشا شروع ہوا۔ اس نے کبڈی کے کھلاڑیوں کے انداز میں میری ایک کلائی اپنے دونوں ہاتھوں کی مضبوط گرفت میں لی پھر اچانک پھسل کر میری دونوں ٹانگوں کو اپنے پاؤں کی قینچی ڈال دی۔ یہ عمل اتنا اچانک تھا کہ میں اس کے ساتھ ہی پہلو کے بل ماربل کے فرش پر گرا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے سیف کی گرفت کی بے انتہا سختی کا اندازہ ہوا۔

وہ بولا۔ ''معافی استاد! اور اگلے ایک دومنٹ میں جو بھی ہوگا اس کے لیے بھی معافی۔''

میں نے اپنی ٹانگوں کو اس کی پنڈلیوں کی قینچی سے آزاد کرانے کے لیے زور لگایا۔ ایک سیکنڈ کے لیے یہ قینچی نرم پڑتی محسوس ہوئی مگر پھر اس نے ماہرانہ انداز میں اپنے جسم کو کروٹ کے انداز میں موڑا اور پنڈلیوں کی گرفت پہلے سے بھی بڑھ گئی۔ میں نے زور لگا کر دوسری دیوار کی طرف کھسکنا شروع کیا۔ فرش چکنا تھا اور مجھے کھسکنے میں مدد دے رہا تھا۔ تاہم جلد ہی پنجاب کے اس ماہر جاپھی نے پینترا بدلا اور میرے دوسرے ہاتھ کو بھی اپنے بازوؤں کی بندش میں جکڑ لیا۔ میری ٹھوڑی فرش سے ٹکرائی۔ دماغ میں چنگاریاں سی بکھر گئیں۔ میرا داہنا بازو بے ساختہ حرکت میں آیا۔ مجھے تھوڑی سی گنجائش ملی، اب میں اپنے سر کی طوفانی ضرب سیف کے چہرے پر رسید کر سکتا تھا مگر اچانک یاد آیا کہ ایسا نہیں کرنا۔

وہ کسی کیکڑے کی طرح میرے ساتھ چپک چکا تھا۔ جیسے کسی آہنی شکنجے کے اسکریو کو بیدردی سے گھما دیا گیا تھا۔ ''تیری تو......'' میں نے بھنا کر کہا اور خود کو طاقت سے پلٹ کر اسے اپنے نیچے کر لیا لیکن اسے کوئی فرق نہیں پڑا۔ وہ اسی طرح آکٹوپس کے مانند مجھ سے چمٹا رہا۔ ہانپی ہوئی آواز میں میرے کان میں پھنکارا۔ ''مرد اوپر ہو یا نیچے، مرد ہی ہوتا ہے استاد۔''

''دیکھتا ہوں تیری مردانگی کو۔'' میں نے اسے چوٹ لگائے بغیر فرش پر زوردار رگڑا دیتے ہوئے کہا۔

ننگا پنڈا تھا، یقیناً اس کی کھال چھل گئی ہوگی مگر اس کی گرفت میں معمولی سا فرق بھی نہیں پڑا۔ میں نے پھر دوسری دیوار کی طرف کھسکنے کے لیے زور لگایا مگر چند انچ سے زیادہ حرکت

نہیں کر پایا، اس کی پکڑ نے جیسے میری مشکیں کس ڈالی تھیں۔ انیق میری حوصلہ افزائی کے لیے پکار رہا تھا۔ ''شاباش شاہ زیب بھائی! آدھا راستہ طے ہو گیا، ہمت کریں، آگے بڑھیں۔''

سجاول نے بھی مجھے جوش دلانے کے لیے ایک دو لفظ بولے۔ اگر چوٹ نہ لگانے والی شرط نہ ہوتی تو اب تک سیف کا بھرکس نکل چکا ہوتا لیکن اس نے اپنی مرضی کا میدان منتخب کیا تھا۔ کھیل شروع کرنے سے پہلے ہم نے تین منٹ کا وقت مقرر کیا تھا۔ سیف نے کہا تھا کہ کبڈی میں اتنا زیادہ وقت نہیں ہوتا لیکن وہ مجھے پورے تین منٹ کا وقت دے رہا ہے کہ میں خود کو چھڑا کر دوسری دیوار کو ٹچ کر سکوں۔ میں نے بمشکل گردن گھما کر وال کلاک کی طرف دیکھا، مگر سیف کی گرفت میں ایسی سختی تھی کہ میں گردن پوری نہیں گھما پایا۔ کلاک میری نظر سے اوجھل ہی رہا۔

انیق نے میرا مقصد سمجھ لیا اور پکار کر کہا۔ ''55 سیکنڈ باقی ہیں شاہی بھائی! کوشش کریں۔''

میں نے ایک بار پھر سیف سمیت دیوار کی طرف کھسکنا شروع کیا۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ مجھے مکمل طور پر روک نہیں پا رہا تو اس نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا اور کچھ نعرے بھی بلند کیے لیکن اس کا واسطہ کسی عام بندے سے نہیں پڑا تھا۔ میں اسے اپنے ساتھ گھسیٹتا ہوا دیوار تک پہنچ گیا۔ تین منٹ پورے ہونے میں اب بھی بیس سیکنڈ باقی تھے۔ سیف نے اپنی آکٹوپس جیسی گرفت ڈھیلی کر دی اور میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ ہارے ہوئے انداز میں فرش پر ہی لیٹا رہا اور لمبے لمبے سانس لیتا رہا۔ انیق نے کسی ریفری کے انداز میں میرا ہاتھ پکڑ کر فضا میں بلند کیا اور بولا۔ ''......اور ونر ہیں شاہی بھائی، ون اینڈ اونلی......''

میرا زوردار رگڑا لگنے سے سیف کا ایک کندھا بری طرح چھل گیا تھا اور خون رس رہا تھا۔ انیق مرہم پٹی کا سامان لینے کے لیے باہر لپک گیا۔ سجاول معنی خیز انداز میں مسکرایا اور بولا۔ ''تم گاہے بگاہے اس تصویر والی بات کو درست ثابت کرتے رہتے ہو۔''

''کون سی تصویر؟''

''ایسٹرن کنگ والی۔'' اس نے سرگوشی میں جواب دیا۔

(میں سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ اسی واقعے کی طرف ہے جب ڈیرے پر سجاول کے باقر نامی کارندے کو مجھ پر شبہ ہو گیا تھا اور وہ کسی نیٹ کیفے سے میری ایسٹرن کنگ والی تصویر اپنے موبائل فون پر منتقل کرا کے لے آیا تھا۔ اس نے سجاول کو بڑے سنسنی خیز انداز میں اطلاع دی تھی کہ میری اصل پہچان کچھ اور ہے)

میں نے سجاول کی بات کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھا اور سیف کو فرش سے اٹھنے میں مدد دی۔ کچھ ہی دیر بعد میں اور سیف علیحدہ کمرے میں بیٹھے بات کررہے تھے۔ اس کے کندھے کی بینڈ تیج ہو چکی تھی۔ وہ ہار گیا تھا اور اب اپنے وعدے کے مطابق بلا چون چرا یہاں سے جانے کو تیار تھا لیکن میں اس سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔

میں نے اسے بتایا کہ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے اس کے بٹوے میں موجود وہ تصویر دیکھی ہے جس کے چہرے پر کراس کا نشان لگا ہوا ہے۔

وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ''استاد جی! ہر بندے کی زندگی میں کوئی نہ کوئی پھڈا تو ہوتا ہی ہے۔ ہماری زندگی میں اس بندے کا پھڈا ہے۔''

''یہ ہے کون؟'' میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

''لاہور میں کسی بہت بڑے بدمعاش کا چمچہ ہے مگر یہاں ہمارے علاقے میں تو یہ خود بہت بڑا بدمعاش ہے اور اس نے کئی چمچے کڑچھے رکھے ہوئے ہیں۔ یہ ہمارے ہی علاقے کا جم پل ہے۔ سکھیرا کے پاس والے گاؤں سلطان پور کا رہنے والا ہے۔ علاقے کے لوگوں کا ناک میں دم کر رکھا ہے اس نے۔ اس کا ایک ساتھی لودھی بھی ہے جو بہت بڑا باکسر بھی ہے۔ ہمارے علاقے میں ایک بہت بڑا میلہ ہوتا ہے۔ کوئی دو ڈھائی سال پہلے اس میلے میں لودھی باکسر نے ماچھیوں کی ایک لڑکی سے چھیڑ خانی کی اور پھر ایسا اس کے پیچھے پڑا کہ ایک دن اسے اٹھا کر ہی لے گیا۔ لڑکی کے گھر والے اتنے تگڑے نہیں تھے، وہ رو دھو کر چپ ہو گئے۔ بعد میں انہوں نے لودھی اور جھارے وغیرہ کے ساتھ صلح کر لی اور لڑکی کا نکاح لودھی کے ساتھ کر دیا۔ انہوں نے تو یہ بات ہضم کر لی مگر سکھیرا گاؤں کے بہت سے لوگوں کو یہ ہضم نہیں ہوئی اور ان میں سے ایک میں بھی ہوں۔''

سیف کی بات کچھ کچھ سمجھ میں آرہی تھی اور اس کے ساتھ ہی یہ انکشاف بھی ہو رہا تھا کہ اس نے اپنے گاؤں میں رہتے ہوئے ایک خطرناک بندے سے متھا لگا رکھا ہے۔ وہ آگ سے کھیل رہا تھا اور شاید ابھی اسے اس آگ کی تپش کا صحیح اندازہ نہیں تھا۔

میں نے کہا۔ ''تم نے اس تصویر پر کاٹے کا نشان کیوں لگا رکھا ہے؟''

وہ اطمینان سے بولا۔ ''یہ نشان اس تصویر پر نہیں میرے دل پر لگا ہوا ہے استاد جی۔ وہ لڑکی ثمینہ گاؤں کی عزت تھی اور وہ اس لودھی نے زبردستی اپنے گھر میں ڈالی ہوئی ہے۔ جھارا اس کی پوری پوری سپورٹ کر رہا ہے۔ میری طرح گاؤں کے اور بھی چار چھ لڑکے ہیں جنہوں نے اس بات پر جھارے سے ٹکر لی ہوئی ہے۔ تین چار بار ہم میں جھڑپ بھی ہوئی ہے۔ ایک

بار گولی بھی چلی تھی جس میں ہمارے پنڈ کے نمبردار کا پتر زخمی ہو گیا تھا۔ وہ ابھی تک بیساکھی کے سہارے چل رہا ہے۔''

''یہ تو بڑے خطرناک راستے پر چل رہے ہو تم لوگ۔''

''جو کچھ بھی ہے استاد جی، اس لڑکی ثمینہ والی بات تو اب آئی گئی ہو گئی ہے۔ وہ اپنے حال پر راضی ہے۔ ایک بچے کی ماں بھی بن گئی ہے۔ پر جھارے سے ہماری دشمنی پکی ہو چکی ہے۔ کہتے ہیں کہ ڈائن بھی سات گھر چھوڑ دیتی ہے اور اس نے اپنے پڑوسی گاؤں کی لڑکی کے ساتھ یہ سب کچھ کرایا۔ ہم چند لڑکوں نے قسم کھا رکھی ہے کہ جھارے سے بدلہ ضرور لینا ہے...... اور یہ بھی کہ آئندہ کوئی ایسا واقعہ ہونے نہیں دینا...... کل جب بشارت وغیرہ نے آپ کو اپنے اسکوٹر کے پاس مشکوک انداز میں کھڑے دیکھا تو وہ چوکنے ہو گئے۔ انہیں شبہ ہوا کہ شاید آپ باغ میں لڑکیوں کو دیکھ رہے ہیں۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کے لیے مجھے افسوس ہے اور شرمندگی بھی۔''

میرا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ کل رات میرے ذہن میں یہ بات آئی تھی کہ بندہ جی دار ہے اور اسلحہ شناس بھی۔ اگر ضد کر رہا ہے تو کیوں نا اسے واقعی ساتھ رکھ لیا جائے لیکن پھر ساتھ ہی یہ خیال بھی آ گیا کہ گبرو جوان ہے۔ کھیلنے کھانے کے دن ہیں۔ اس کے شب و روز کو خطرے میں کیوں ڈالا جائے۔ اب یہ جاننے کے بعد کہ یہ تو پہلے سے ہی شدید خطرے میں گھرا ہوا ہے اور جھارے جیسے بندے سے متھا لگا کر بیٹھا ہوا ہے، مجھے اپنی رائے بدلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ویسے بھی تھوڑی دیر پہلے ''پکڑا پکڑی'' کی جدوجہد کے دوران میں، میں نے اس کے اندر ''شدید مزاحمت'' کی جو صلاحیت دیکھی تھی، اس نے مجھے متاثر کیا تھا۔

اس کی رام کہانی سننے کے بعد میں نے اسے بتایا کہ اس نے جس بندے سے دشمنی پال رکھی ہے، اسے تھوڑا بہت میں بھی جانتا ہوں۔ وہ لاہور شہر کے ایک بڑے گینگسٹر داؤد بھاؤ کا کارندہ ہے۔

وہ بولا۔ ''جی ہاں...... داؤد بھاؤ...... یہی نام سنا ہوا ہے ہم نے۔ سنا ہے بہت بڑی بلا ہے لیکن جو کچھ بھی ہے...... اس جھارے سے ہم نے کہیں نہ کہیں حساب چکانا ضرور ہے۔ آج نہ سہی، کل سہی۔ کل نہ سہی پانچ سال بعد سہی......'' وہ دیر تک اس بارے میں بولتا رہا۔

یقیناً وہ ٹھیک سے نہیں جانتا تھا کہ جن لوگوں سے اس نے ٹکر لی ہوئی ہے، وہ اس سے بہت آگے کی چیز ہیں۔ بات کرتے ہوئے وہ گاہے بگاہے اپنا زخمی کندھا بھی دباتا تھا۔ اپنی ہار کی ندامت اس کے چہرے پر نمایاں تھی۔

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''اب کیا ارادہ ہے تمہارا؟''

''اب تو جو ارادہ ہونا ہے آپ کا ہی ہونا ہے۔'' اب وہ مجھے احترام سے مخاطب کر رہا تھا۔

''اپنا ارادہ تو میں نے تمہیں بتایا تھا۔''

وہ چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد اٹھ کھڑا ہوا۔ ''ٹھیک ہے جی۔ گستاخیوں کی معافی۔ اگر آپ یہی چاہتے ہیں تو چلا جاتا ہوں۔''

''لیکن اگر میں کہوں کہ میں ایسا نہیں چاہتا تو؟''

وہ ٹھٹک کر میری طرف دیکھنے لگا۔ میرے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک نمودار ہوئی...... خوشی سے اس کے ہونٹ بے ساختہ لرز رہے تھے۔

○......❖......○

اور اب ہم برونائی کی طرف محو پرواز تھے۔ یہ ایک گلف اسٹریم 450 چارٹرڈ طیارہ تھا۔ بڑے صاحب ریان فردوس اور ان کی فیملی کے علاوہ آقا جان اور اس کی بیوی میڈم لورین بھی طیارے میں موجود تھے۔ یہ سب لوگ علیحدہ اپارٹمنٹ میں تھے۔ میں انیق اور سجاول چند دیگر افراد کے ساتھ طیارے کے پچھلے حصے میں تھے۔ ان افراد میں چند خواتین بھی شامل تھیں۔ خواتین میں سنبل نمایاں تھی جو آج کل بڑے صاحب کی منظورِ نظر بنی ہوئی تھی مگر اس وقت وہ بھی اداس بیٹھی تھی۔ بڑے صاحب کو بہت ''مرغوب'' ہونے کے باوجود وہ آج کل اس کی نگاہِ التفات سے محروم تھی۔ آتشزدگی والے واقعے کے بعد اس کے خوب صورت بال قینچ کر دیئے گئے تھے اور انہیں ڈیانا کٹ والا اسٹائل دے دیا گیا تھا۔ یہ اسٹائل بھی اس پر جچتا تھا۔ وہ ایک دوشیزہ کی حیثیت سے تحفتاً بڑے صاحب کی خدمت میں پیش ہوئی تھی اور اس نے واقعی ادھیڑ عمر بڑے صاحب کو اپنا گرویدہ کر لیا تھا۔ بڑے صاحب کے لوٹ پوٹ ہونے کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوگا کہ اس نے اپنی دیرینہ روایت توڑی تھی اور ''تین چاند'' پورے ہونے سے پہلے ہی سنبل کو اپنی خدمت میں طلب کر لیا تھا...... اور روحی جو پہلے سے اس کی خدمت میں موجود تھی، رقابت کی زد میں آ گئی تھی۔ سنبل کے لبادے کو آگ لگانے کے جرم میں نہ صرف اس نے بید کھائے تھے بلکہ اب بھنگن کی حیثیت سے پاراہاؤس کے واش روم صاف کر رہی تھی۔

سنبل کی نشست مجھ سے تین چار فٹ کے فاصلے پر تھی۔ سنا تھا کہ اس نے اپنا سفید مینا بھی ساتھ لانے کی ضد کی تھی لیکن وہ اس پرواز میں نہیں آ سکا تھا، تاہم بڑے صاحب نے

اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ دو چار روز میں اس کے پاس پہنچ جائے گا۔ میں نے کہا۔ ''کیا بات ہے، اپنے میمنے کے لیے اداس ہو؟''

''ہونہہ۔'' اس نے ہولے سے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر ذرا توقف سے بولی۔ ''اس کا کیا بنا؟''

میں سمجھ گیا کہ وہ رضوان کی بات کر رہی ہے۔ ''وہ بالکل محفوظ ہے اور اپنے گھر پہنچ چکا ہے۔'' میں نے اسے تسلی دی۔

''سچ کہہ رہے ہیں؟'' اس نے سرگوشی میں تصدیق چاہی۔

''مجھے جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں۔''

میں نے نشست کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ میرا دھیان سکھیرا گاؤں میں گزاری ہوئی اس دوپہر کی طرف چلا گیا جس میں، میں نے اپنی محبوب ترین ہستی کی کچھ جھلکیاں دیکھی تھیں۔ اس ''خوش رنگ باغ'' کے سارے مناظر آنکھوں کے سامنے سے گزرتے چلے گئے اور وہ ساری دلکش آوازیں کانوں میں گونجیں جو میں نے وہاں سنی تھیں پھر میرا دھیان سیف کی طرف چلا گیا۔ وہ بھی عجیب کردار تھا۔ پنجاب کے کھیتوں میں اگنے والے اونچے لمبے درختوں کی طرح کڑیل...... لیکن تھوڑا سا سنکی۔ سیف کو بھی ہمارے ساتھ آنا تھا لیکن ابھی اس کے سفری کاغذات تیار نہیں ہوئے تھے۔ امید تھی کہ وہ اگلی کھیپ کے ساتھ پہنچے گا۔

ہم نے لاہور سے پرواز کی تھی اور اب انڈیا اور خلیج بنگال کے اوپر سے ہوتے ہوئے ملائیشیا کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یہ رات کا وقت تھا۔ نیچے بس کہیں کہیں روشنیوں کے جمگھٹے ہی نظر آتے تھے۔ جیسے تاریکی کے سمندر میں روشن نقطوں کے جزیرے ہوں۔ ہماری منزل بھی ایک جزیرہ ہی تھی۔ پہلے ہمارا خیال یہی تھا کہ یہ برونائی کا کوئی ساحلی جزیرہ ہے لیکن ہمیں برونائی کے ساحل سے کم و بیش ایک ہزار کلومیٹر آگے جانا پڑا۔ جب جہاز میں لینڈنگ کا اعلان ہوا، رات کے تین بجے تھے اوپر سے تو یہ جزیرہ خاصا مختصر نظر آیا لیکن جوں جوں ہم زمین کے قریب ہوتے گئے اس کی وسعت بڑھتی گئی۔ چوڑائی کم تھی لیکن لمبائی کے رخ پر یہ بیس پچیس میل سے کم نہیں تھا۔ یہ کافی آباد بھی نظر آتا تھا۔ پہاڑیوں کے آثار بھی تھے۔ ہم ایک چھوٹے ائیرپورٹ پر اترے اور پھر جہاز سے باہر آ گئے۔ پاکستان کی کڑاکے دار سردی کے بجائے یہاں موسم قدرے مرطوب تھا۔ رات پچھلے پہر، پانی سے بوجھل ہوا چل رہی تھی۔ ائیرپورٹ سے باہر آئے تو حیرت زدہ رہ گئے۔ قیمتی گاڑیوں کی طویل قطار ہمارے استقبال

کے لیے موجود تھی۔ باوردی مسلح گارڈز دو رویہ یوں کھڑے تھے جیسے کسی شاہی مہمان کا استقبال ہونے والا ہو۔ دور تک سرخ کارپٹ دکھائی دے رہا تھا۔ انیق سرگوشی میں بولا۔

''لگتا ہے کہ یہ لوگ ہم تینوں سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہو گئے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''ہمارا تو پتا نہیں لیکن تم سے ضرور متاثر ہوئے ہوں گے، تمہاری شخصیت میں رعب داب بھی تو بہت ہے۔''

''آپ مذاق کر لیں لیکن اگر بات صرف قد کاٹھ اور جثّے کی ہوتی تو پھر دلیپ کمار اور ندیم جیسے لوگ فلم انڈسٹری پر راج نہ کرتے...... اور جنگل میں شیر کے بجائے زرافے اور اونٹ وغیرہ کی بادشاہت ہوتی۔''

''اچھا شیر صاحب! سرگوشیاں نہ کیجیے۔ یہ نہ ہو کہ کوئی سکیورٹی والا آپ کی دُم میں نمدہ فٹ کر دے۔''

''کچھ شیر پونچھ کے بغیر ہوتے ہیں جن کی دُم ہی نہ ہو ان کو نمدہ کیسے فٹ کیا جا سکتا ہے؟''

عزت مآب ریان فردوس کو دو خوش رو لڑکیوں نے باقاعدہ گلدستے پیش کیے اور پھر انہیں اپنی بیگم، بیٹوں اور کچھ دیگر اہلِ خانہ کے ساتھ سیاہ رنگ کی شاندار لیموزین میں بٹھا دیا گیا۔ آگے پیچھے مسلح گارڈز کی گاڑیاں اور ہیوی بائیکس تھیں۔ پروٹوکول کے افسران لوگوں کو درجہ بدرجہ مختلف گاڑیوں میں سوار کراتے رہے۔ ہم بھی ایک مرسیڈیز میں سوار ہوئے۔ موٹر بائیکس کے ہوٹرز گونجے اور یہ قافلہ شہر کی تقریباً خالی سڑکوں پر فراٹے بھرتا ہوا، پندرہ بیس منٹ بعد ایک شاندار محل نما عمارت کے سامنے پہنچ گیا۔

اس عمارت کی شان و شوکت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ یہ قریباً ویسی ہی عمارت تھی جیسی یہ لوگ لیہ کے نزدیک پارا ہاؤس کے پاس تعمیر کر رہے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ عمارت ابھی زیرِ تعمیر تھی اور اسے تعمیر ہوئے غالباً چند سال گزر چکے تھے۔ یہاں ہمیں دراز قد باوردی دربان، گھوڑا گاڑیاں اور بگھیاں وغیرہ بھی دکھائی دیں۔ ہمیں کچھ دیگر افراد کے ساتھ اس عمارت کی وسیع انیکسی میں پہنچا دیا گیا۔ یہ انیکسی بھی کسی سیون اسٹار ہوٹل سے کم نہیں تھی۔ کم از کم جس پورشن میں ہمیں پہنچایا گیا، وہ تو بالکل وی آئی پی تھا۔ بلند دروازے، دیدہ زیب چھتیں، قیمتی قالین اور غالیچے، باتھ روم ایسے کشادہ و آرام دہ تھے کہ انیق نے دیکھتے ہی کہہ دیا کہ وہ تو سونا بھی یہیں پر پسند کرے گا۔

پارا ہاؤس کی طرح اس رہائش گاہ میں بھی زبردست سکیورٹی نظر آ رہی تھی جگہ جگہ سی سی

ٹی وی کیمروں کی موجودگی بھی ثابت ہوتی تھی۔ ریڈ الرٹ والے سارے انتظامات دکھائی دیتے تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ایک طرح کا ہراس بھی یہاں نظر آ رہا تھا تو بے جا نہ ہوگا۔ ابھی کچھ پتا نہیں تھا کہ یہاں کیا صورتِ حال درپیش ہے۔ میں نے لگژری باتھ روم میں نیم ٹھنڈے پانی سے غسل کیا اور سب کچھ صبح پر چھوڑ کر سو گیا۔

میری آنکھ ایک نامانوس شور سے کھلی تھی۔ کھڑکی کھول کر دیکھا تو کچھ دکھائی نہیں دیا۔ بہرحال نعروں اور للکاروں کی آوازیں بدستور سنائی دے رہی تھیں۔ یہ جو کچھ بھی تھا، شاید اس عظیم الشان ولا کی چار دیواری سے باہر تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ایک بڑا جلوس ہے جو فصیل نما چار دیواری سے باہر جمع ہے۔ اتنے میں انیق بھی میرے کمرے میں پہنچ گیا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بولا ''یہاں سے آپ کو کچھ نظر نہیں آئے گا۔ آپ کو چھت پر چلنا ہوگا۔ بہت سے لوگ باہر میدان میں جمع ہیں۔ عزت مآب ریان فردوس کے حق میں نعرے بازی کر رہے ہیں۔''

''لیکن یہ تو بہت غصے میں لگتے ہیں۔''

''یہ غصہ عزت مآب کے دشمنوں کے لیے ہے۔ وہ ان کے خلاف کارروائی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔''

''یعنی وہی ریان فردوس کا سوتیلا بیٹا اور اس کی والدہ؟''

''نہیں، ابھی ٹھیک سے پتا نہیں چل رہا۔ یہ بار بار امریکن اور امریکن ایجنسی کے لفظ بھی استعمال کر رہے ہیں۔ ابھی انہوں نے دو پتلے جلائے ہیں۔ وہ بھی امریکیوں کے ہی لگتے تھے یا پھر برٹش ہوں گے۔''

سجاول ابھی تک سویا پڑا تھا۔ میں جلدی سے کپڑے بدل کر انیق کے ساتھ باہر نکل آیا۔ ہم ایک سبک لفٹ کے ذریعے تیسری منزل کی چھت پر پہنچے، یہاں سے اس محل نما عمارت کا صدر دروازہ صاف نظر آ رہا تھا۔ دروازے کے بالکل قریب ہی بلندی پر ایک بہت بڑا جھروکا سا تھا۔ شاید یہاں کھڑے ہو کر ریان فردوس اپنے لوگوں کو اپنے درشن کراتا ہوگا۔ لوگ اس جھروکے کے سامنے جمع تھے۔ ان کی تعداد ایک ہزار سے کم نہیں ہوگی۔ وہ زیادہ تر ملائیشین اور برونائی طرز کے لباس میں تھے۔ اکثر کے پاس آتشیں ہتھیار یا لاٹھیاں وغیرہ نظر آ رہی تھیں۔ ان کے چہرے تمتمائے ہوئے تھے اور آنکھوں سے شعلے نکلتے محسوس ہوتے تھے۔

کچھ لوگوں کے پاس بڑے بڑے کتبے بھی تھے جن پر ملائی زبان میں نعرے وغیرہ لکھے تھے۔ چند کتبے انگلش میں بھی نظر آئے۔ ایک کتبے پر درج تھا۔ ''عزت مآب آپ حکم دیں۔ ہم کٹ مرنے کے لیے تیار ہیں۔'' ایک کتبے کی تحریر تھی۔ ''ظلم حد سے بڑھ چکا، اب خاموشی کا مطلب موت ہے۔''

انیق نے کہا۔ ''لگتا ہے کہ یہ لوگ ریان فردوس کو بالکونی میں دیکھنا چاہتے ہیں اور ان کو اپنے مطالبات پیش کرنا چاہتے ہیں۔''

بالکونی میں کچھ باوردی آفیسرز موجود تھے اور وہ میگا فون کے ذریعے گاہے بگاہے لوگوں کو نظم وضبط اور صبر کی تلقین کرر ہے تھے، ان کی وردیاں سبز رنگ کی تھیں۔

چند منٹ مزید گزر گئے۔ لوگوں کا جوش وخروش بڑھتا چلا گیا۔ انیق نے کہا۔ ''زیادہ تر نعرے بازی کسی امریکن ایجنسی کے خلاف ہی ہو رہی ہے۔ لگتا ہے کہ بہت سے امریکی بھی اس جزیرے کے باشندوں میں شامل ہیں۔''

ریان فردوس تو جھروکے میں نہیں آیا لیکن ایک لڑکی آ گئی۔ ہم اسے کافی فاصلے سے دیکھ رہے تھے مگر اس کے خدوخال واضح تھے۔ وہ قبول صورت تھی۔ بڑی دبنگ چال چلتی ہوئی وہ جھروکے میں پہنچی۔ اس نے کوئی یونیفارم ٹائپ لباس پہن رکھا تھا۔ آستینیں اڑسی ہوئیں، کمر سیدھی، سینہ تنا ہوا۔ اس کے بال بوائے کٹ تھے اور اگر اس کے جسم پر دھیان نہ دیا جاتا تو وہ ایک خوش شکل لڑکا ہی دکھائی دیتی تھی۔ وہ جھروکے میں پہنچی تو پروٹوکول کا عملہ اٹین شین ہو گیا۔ ایک آفیسر نے جھک کر بڑے ادب سے مائیک کا کلپ لڑکی کے کالر سے لگا دیا۔ اسے دیکھ کر ہجوم نے ملے جلے نعرے لگائے۔ ان میں سے کچھ شاید اب بھی ریان فردوس کو ہی دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ بولی تو اس کی آواز بھی چال ڈھال کی طرح رعب دار تھی۔ وہ لوگوں سے مخاطب ہوئی تو شور کم ہو گیا اور لوگ توجہ سے سننے لگے۔ وہ ملائی بول رہی تھی۔ انیق میرے لیے ترجمہ کرنے لگا۔ لڑکی کی تقریر مختصراً یہ تھی۔

''میرے بھائیو! بہنو اور بزرگو! آپ کے جذبات کا عزت مآب کو بہت اچھی طرح علم ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ وہ اس سلسلے میں آپ سے زیادہ فکر مند ہیں۔ وہ سفر سے تھکے ہوئے ہیں اور کچھ علیل بھی ہیں اس لیے آ نہیں سکتے۔ ان کی طرف سے میں آپ کو بتاتی ہوں کہ اب ہم ان شاء اللہ پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ پچھلے ایک ڈیڑھ ماہ میں جو کچھ سامنے آیا ہے، اس کے بعد اصل دشمن کی پہچان بہت اچھے طریقے سے ہو گئی ہے۔ یہ دشمن ہمارے اندر ہی موجود ہے۔ ہمیں اس کو کچلنا ہوگا۔''

لوگوں نے فلک شگاف نعرے لگائے۔ لڑکی نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے اور مٹھیاں بھینچ کر نعروں کا جواب دیا۔ جھروکے میں اس کے ساتھ کھڑے باوردی افسران نے بھی ایک ایک ہاتھ اوپر اٹھا کر مکا لہرایا۔

لڑکی دوبارہ بلند آواز میں بولی۔ ''بس تھوڑا انتظار کیجیے...... بہت تھوڑا...... اپنی صفوں میں ڈسپلن برقرار رکھیے۔ عزت مآب اگلے چوبیس گھنٹوں میں بہت اہم فیصلے کرنے والے ہیں۔ ہم خون خرابے سے بچنے کے لیے آخری حد تک گئے ہیں اور اب بھی آخری کوششیں کر رہے ہیں مگر جو کچھ ہونے والا ہے، وہ سامنے دیوار پر لکھا نظر آ رہا ہے۔''

ایک بار پھر پُر جوش نعرے بلند کیے گئے اور ہجوم کے کسی گوشے میں سے ہوائی فائرنگ کی آواز بھی سنائی دی۔ صبر وتحمل کی تلقین کرنے کے بعد لڑکی نے لوگوں کو الوداع کہا اور گارڈز کے ساتھ بڑی مردانہ چال چلتی پُر شکوہ جھروکے میں اوجھل ہوگئی۔

''یہ کون ہے؟'' میں نے انیق سے پوچھا۔

''شک تو مجھے بھی ہو رہا ہے...... لیکن...... ہے یہ لڑکی ہی۔''

''ایک چپیڑ ماروں گا۔ کچھ اندازہ ہوا کہ اس نے کس حیثیت سے تقریر کی ہے۔''

''اس کے لہجے میں بڑی آگ تھی اور دکھ بھی لہریں لے رہا تھا۔ میرا اندازہ ہے کہ یہ بڑی بیگم کے مقتول بھائی کی کچھ لگتی ہوگی...... بیوی، بہن یا پھر بیٹی بھی ہو سکتی ہے۔''

چھت پر سے عمارت کے اردگرد کا علاقہ دور تک نظر آ رہا تھا۔ یہ بڑی شاداب جگہ تھی۔ حد نگاہ تک جدید طرز کے مکان تھے۔ ٹی وی کے بے شمار انٹینا ز بھی دکھائی دے رہے تھے۔ کشادہ چمکیلی سڑکوں پر نئی نکیلی گاڑیاں پھسل رہی تھیں۔ پام کے بلند درخت تازہ ساحلی ہوا میں ہلکورے لیتے تھے اور فضا میں گلاب اور ٹیولپ کے ان بے شمار پھولوں کی مہک تھی جو اس محل میں اور رہائشی علاقے کی بالکونیوں سے جھانک رہے تھے۔ دور سمندر کا نیلا پانی اور اس میں تیرتی ہوئی خوش رنگ کشتیاں بھی جھلک رہی تھیں۔ بہرطور ان ساری خوب صورتیوں کو ایک خاص قسم کی کشیدگی اور تناؤ نے ڈھانپ رکھا تھا۔ جیسے کوئی تنا ہوا رسا ہو جو کسی بھی پل بے پناہ دباؤ کی وجہ سے ٹوٹ سکتا ہو۔

دوپہر کا کھانا ایسے ہی تھا جیسے ہم بکنگھم پیلس میں کھا رہے ہوں۔ دستانے پہنے ہوئے خوش پوش ویٹرز، انتہائی قیمتی کراکری اور بے حد نایاب ڈشز۔ انیق نے سرد آہ بھر کر کہا۔

''کاش ہم پہلوان حشمت کو ساتھ لا سکتے۔''

سہ پہر تین بجے کے قریب محل کے اندرونی حصے میں کوئی ہنگامی میٹنگ شروع ہوئی جو

شام پانچ بجے تک جاری رہی۔ میٹنگ برخاست ہونے کے بعد عزت مآب کی طرف سے مجھے اور سجاول کو اندر طلب کیا گیا۔ عمارت کا اندرونی حصہ آرائش و زیبائش کی قابلِ دید مثال تھا۔ یوں لگتا تھا کہ تیل کی دولت کا بڑا حصہ اس عمارت اور گردونواح کی عمارتوں کی شان و شوکت میں کھپا دیا گیا ہے۔ ہمیں نشست گاہ میں لے جانے کے بجائے براہِ راست ڈائننگ ہال میں لے جایا گیا۔ بڑا صاحب ریان فردوس اور اس کے دونوں فرزند ابراہیم اور کمال بھی یہاں موجود تھے۔ آقا جان اور حلمی کے علاوہ کچھ اور باوردی افسران بھی یہاں دکھائی دے رہے تھے۔ ایک بڑی میز پر شام کی چائے کے لوازمات چنے گئے تھے۔ یہ ''ہائی ٹی'' طرز کی چائے تھی۔ باوردی ملازمین دیدہ زیب طشتریوں کے ساتھ چکرا رہے تھے۔ کہنے کو تو یہ روزمرہ کی چائے تھی لیکن کسی بڑی دعوت کی سج دھج لیے ہوئے تھی۔ زعفرانی کوفتے، چکن کے سیخ کباب، تلی ہوئی مچھلی کے کٹلے، کاغذی سموسے جن میں ایرانی آلو اور مٹن کا آمیزہ بھرا گیا تھا۔ شاہی ٹکڑے، حلوہ، اسنیکس، ملائیشین طرز کی مٹھائیاں اور نہ جانے کیا کچھ چائے کے ساتھ موجود تھا۔ بڑے صاحب کی آن بان ہم نے لیہ کے پارا ہاؤس میں بھی دیکھی تھی مگر یہاں آ کر اس میں کئی گنا اضافہ نظر آیا تھا۔ سجاول چونکہ بڑی بیگم کے ''بھائی'' کی حیثیت اختیار کر گیا تھا اس لیے بڑے صاحب نے اسے اپنے قریب جگہ دی۔ بڑے صاحب کو عورت، شراب، سگار اور گلاب کے علاوہ کباب، یعنی کھانے، سے بھی خاصی رغبت تھی اور اس کا ثبوت یہ بے انتہا سجی ہوئی میز بھی تھی۔ میں نے نوٹ کیا کہ دونوں بھائی ابراہیم اور کمال ایک ساتھ بیٹھے ہیں اور ان کے لیے لوازمات کی اسپیشل دو تین طشتریاں ہیں۔

ہم چائے پی رہے تھے جب تیز قدموں کی چاپ ابھری۔ دروازے پر کھڑے باوردی گارڈز نے کھٹا کھٹ سلیوٹ کیے اور وہی سجیلی بانکی لڑکی دبنگ چال چلتی اندر آ گئی جسے ہم نے صبح وسیع و عریض جھروکے میں دیکھا تھا۔ وہ اب بھی ایک یونیفارم نما لباس میں تھی۔ کمر سے ہولسٹر جھول رہا تھا۔ بڑے صاحب نے اس کے لیے ملائی زبان میں جو الفاظ کہے وہ کچھ اس طرح کے تھے۔ ''آؤ...... آؤ...... خوشی آمدید...... بیٹھو میری بیٹی۔''

(ملائی زبان اب کچھ کچھ میری سمجھ میں آنا شروع ہو گئی تھی۔ میں لیہ میں قیام کے دوران میں بھی اس کی مشق کرتا رہا تھا)

لڑکی نے انواع و اقسام کے کھانوں سے سجی ہوئی میز کو قدرے ناگواری سے دیکھا۔ ایک باوردی دربان نے اس کے لیے کرسی پیچھے ہٹائی اور وہ بیٹھ گئی۔ بڑے صاحب کی طرف سے اسے کچھ لینے کے لیے کہا گیا لیکن اس نے نفی میں سر ہلایا اور چائے کی چند چسکیاں لینے

پر اکتفا کیا۔ اسی دوران میں بڑے صاحب کے حکم پر حلمی نے لڑکی سے ہمارا تعارف بھی کرایا۔

وہ سجاول سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''یہ جنابہ قسطینا ہیں۔ ہم سب کے لیے قابلِ صد احترام......اورعزت مآب کی بھتیجی...... یہ جناب آدم شہاب کی دختر ہیں جو پچھلے دنوں شہادت پا گئے ہیں۔''

اس کے بعد حلمی نے ہماری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یور ہائی نس! اور یہ مسٹر سجاول ہیں...... یہ ان کے ساتھی مسٹر شاہ زیب ہیں۔ ان کا تھوڑا سا ذکر آپ سے پہلے بھی ہو چکا ہے۔ انہوں نے پارا ہاؤس پر ناقب وغیرہ کے شب خون کے وقت بڑی بے جگری سے پارا ہاؤس کے دفاع میں حصہ لیا۔ مسٹر سجاول قریباً آدھ گھنٹے تک ہز ہائی نس بڑی بیگم کے سامنے ڈھال بنے رہے۔ یہ تاریخی لمحات سی سی ٹی وی کیمروں میں محفوظ ہیں۔ بعدازاں چھوٹے صاحب کو ناقب کے گینگ سے آزاد کرانے میں بھی مسٹر سجاول اور مسٹر شاہ زیب کا اہم کردار رہا۔''

ہم دونوں نے سر جھکا کر اس قسطینا نامی لڑکی کو سلام کیا۔ اس نے بھی سر کو خفیف انداز میں حرکت دی۔ وہ بڑے تناؤ میں لگ رہی تھی۔ چائے ختم ہوئی تو سب سامنے والی دیوار کی طرف متوجہ ہو گئے۔ یہاں ایک بڑی ایل سی ڈی آویزاں تھی۔ قسطینا کے حکم پر ایک دربان نے یو ایس بی ڈال کر ایل سی ڈی کو آن کیا۔ ایک چونکا دینے والا منظر دکھائی دینے لگا۔ یہ اس جزیرے کا ہی کوئی حصہ تھا۔ پام کے درخت، سرسبز ٹیلے اور شفاف سڑکیں دکھائی دے رہی تھیں۔ یہ ایک بارونق سڑک تھی۔ ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ شام کا وقت تھا۔ ایک سیاہ کار جس کی کھڑکیوں کے شیشے ٹنڈڈ تھے، ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے سامنے آکر رکی۔ اس میں سے دو افراد برآمد ہوئے۔ ان میں سے ایک دراز قامت سفید فام تھا۔ اس کا چہرہ کافی لمبا تھا۔ اس نے ایک رین کوٹ پہن رکھا تھا جس کی ٹوپی اس کے سر پر تھی۔ سیاہ شیشوں والی عینک کی وجہ سے اس کی شکل ٹھیک دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اس کے ساتھ ایک پادری ٹائپ شخص تھا۔ ہوٹل کے دروازے پر دو افراد استقبال کے لیے موجود تھے۔ ان میں سے ایک بارعب مقامی شخص تھا۔ بہت تنومند اور گول مٹول۔ اس نے فرنچ کٹ ڈاڑھی رکھی ہوئی تھی اور برونائی کا ہی لگتا تھا۔ دونوں کے ہاتھ میں چھتریاں تھیں۔ وہ آنے والوں کو چھتریوں کے نیچے، ہوٹل کے اندر لے گئے۔ یہ ویڈیو کلپ یہاں ختم ہو گیا۔ قسطینا نے ٹھہری ہوئی آواز میں حاضرین کو مخاطب کیا۔ ''یہاں اس خبیث نے رین کوٹ پہنا ہوا ہے۔ شکل صاف نظر نہیں آ رہی لیکن اگلے

کلپ میں ایسا نہیں ہے۔"

اس نے دوبارہ ویڈیو پلے کی، اس مرتبہ وہی گرے کار، ایک نائٹ کلب کے سامنے کھڑی تھی۔ ایک شخص کلب کے اندر سے برآمد ہوا۔ اس نے پی کیپ اور چشمہ پہن رکھا تھا۔ یہ وہی پہلے کلپ والا دراز قد شخص تھا۔ تب اس کے ساتھ پادری تھا، اب پادری کے بالکل برعکس "چیز" تھی۔ ایک خوبرو لڑکی جس کے جسم پر لباس کے نام پر آدھا میٹر کپڑا ہی ہوگا۔ لمبے چہرے والا وہ دراز قد شخص تیزی سے کار میں داخل ہو گیا۔ اس عمل کے دوران میں ایک دو سیکنڈ ایسے بھی آئے جب اس کا چہرہ کافی صاف دکھائی دیا۔ قسطینا نے ریموٹ کنٹرول کے ذریعے ویڈیو کو یہاں "پاز" کر دیا۔ لمبے چہرے والا کوئی امریکن ہی لگتا تھا۔ اس کی ناک کی سائیڈ پر ایک چھوٹا سا مسّا بھی تھا۔ قسطینا نے تصویر کو انلارج کر کے اس مسّے کو نمایاں کیا اور ٹھہری ہوئی آواز میں بولی۔ "مجھے لگتا ہے کہ اب شک شبے کی کوئی گنجائش نہیں۔"

یہ الفاظ اس نے انگلش میں کہے تھے۔ وہ مقامی ہونے کے باوجود اپنی گفتگو میں کئی فقرے انگلش میں ادا کرتی تھی۔

ڈائننگ ہال میں موجود سبھی افراد کے چہروں پر سراسیمگی اور سنسنی نظر آ رہی تھی۔ حلمی اور آقا جان کے چہرے بھی تمتمائے ہوئے تھے۔ قسطینا نے شعلہ فشاں نگاہوں سے اسکرین کی طرف دیکھا۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں دکھ آمیز طیش کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہمیں بتایا گیا تھا کہ قسطینا کے والد محترم آدم کو مخالفین نے ایک بڑے حملے کے دوران میں شہید کیا ہے۔ قسطینا کی آنکھوں میں جو کچھ بھی نظر آ رہا تھا، وہ یقیناً اسی قتل اور خونریزی سے نسبت رکھتا تھا۔ اپنے باپ کی موت پر وہ سراپا انتقام تھی۔ اس کے سامنے بیٹھے ابراہیم نے دھیمی آواز میں اس سے کچھ کہا۔ وہ آگے کو جھک کر اور اس کے دونوں ہاتھ تھام کر جذباتی لہجے میں بولی۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو میرے پیارے بھائی، لیکن اب ان لوگوں نے ہمارے سامنے کوئی دوسرا راستہ چھوڑا ہی نہیں ہے۔ ان بدبختوں نے ہمارے اندر رہتے ہوئے ہماری جڑیں کاٹی ہیں اور دن رات کاٹ رہے ہیں۔ اصل دشمن اب بے نقاب ہو چکے ہیں۔" اس کی آواز میں پھنکار تھی۔

یہ "اصل دشمن" والا لفظ میں دوسری تیسری بار سن رہا تھا۔ لگ رہا تھا کہ امریکی باشندے جو ہر بین الاقوامی مسئلے میں اپنی "ٹانگ شریف" اڑانا، پیدائشی حق سمجھتے ہیں یہاں بھی کسی نہ کسی صورت میں موجود ہیں اور "اصل دشمن" کا خطاب انہی کو دیا جا رہا ہے۔ ابھی ویڈیو کلپ میں جو بندہ نظر آیا تھا، وہ بھی امریکی ہی لگتا تھا۔ کم از کم میرا تجربہ تو یہی کہتا تھا۔

اگلے پندرہ بیس منٹ میں وہاں پر جو گفتگو ہوئی، وہ کافی جذباتی تھی۔ زیادہ تر گفتگو ملائی میں تھی لیکن کئی جگہوں پر انگلش جملے بھی بولے گئے جو کچھ میرے پلے پڑا اس سے یہی پتا چلا کہ یہاں بھی وہی تقسیم کرو، لڑاؤ...... اور فائدہ اٹھاؤ والا کلیہ استعمال کیا جا رہا ہے۔ ابراہیم اور کمال کے سوتیلے بھائی نے تو بے شک دشمنی کا جھنڈا گاڑ رکھا تھا لیکن اس جھنڈے کو زور شور سے لہرانے اور پھڑ پھڑانے کے لیے ہوا کچھ اور ذریعوں سے مہیا ہو رہی تھی۔ ذہین و فطین غیر ملکی گروہ یہاں کچھ گہری چالیں چل رہا تھا اور ساتھ ساتھ اس خوب صورت آئی لینڈ پر اپنا تسلط مضبوط کر رہا تھا۔

قسطینا کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ بوائے کٹ بال ماتھے پر لہرا رہے تھے۔ وہ بات کرتے کرتے گاہے بگاہے بے دھیانی میں میز پر مکا رسید کرتی تھی اور برتن جھنجھنا اٹھتے تھے۔ وہ زیادہ تر بڑے صاحب، آقا جان اور حلمی وغیرہ کو ہی مخاطب کر رہی تھی۔ دیگر افراد کی طرف اس کی توجہ نہ ہونے کے برابر تھی۔ بڑے صاحب کا رویہ اب بھی دھیما اور شش و پنج والا تھا۔ بڑے صاحب کے الفاظ تو پوری طرح میری سمجھ میں نہیں آ رہے تھے تاہم پتا یہی چل رہا تھا کہ وہ اب بھی کوئی افہام و تفہیم کا راستہ نکالنا چاہتا ہے اور دشمن کی طاقت سے بری طرح خوف زدہ ہے۔ ابراہیم اور کمال کے بارے میں بھی یہی بات کچھ کم شدت کے ساتھ کہی جا سکتی تھی۔ وہ دونوں گم صم تھے۔ ان کی کزن (قسطینا) گاہے بگاہے انہیں بھی مخاطب کرتی تھی اور نسبتاً نرم لہجے میں کچھ پوچھتی تھی۔ اس کے جواب میں وہ دونوں آپس میں سرگوشیاں کرنے لگتے تھے۔ کسی وقت ابراہیم کا چہرہ بھی غصے سے سرخ ہو جاتا تھا۔

اچانک ایک شور در و دیوار میں گونجنے لگا۔ شہر کے کسی حصے سے فائرنگ کی مدھم آوازیں بھی ابھریں۔ قسطینا نے گارڈز کی طرف دیکھا۔ اسی دوران میں دو باوردی آفیسرز لپکتے ہوئے اندر آئے۔ انہوں نے بڑے احترام سے جھک کر بڑے صاحب کے کان میں کچھ کہا۔ بڑے صاحب کا چہرہ زرد نظر آنے لگا۔ اس نے حاضرین اور خاص طور سے قسطینا کو مخاطب کر کے ملائی زبان میں نامعلوم اطلاع دی۔

محفل برخاست ہو گئی۔ سب افراتفری میں اس جھروکے کی طرف بڑھے جو لمبائی کے رخ پر قریباً پچاس فٹ اور گہرائی کے رخ پر قریباً تیس فٹ پھیلا ہوا تھا۔ اس کے سامنے کی طرف جو نیم گول جنگلا تھا اس پر سونے کا پترا چڑھا ہوا تھا اور چاندی کی دلکش جھالریں لٹک رہی تھیں۔ میں اور سجاول بھی موقع غنیمت جان کر سب کے پیچھے ہو لیے۔ جھروکے سے باہر بیرونی چار دیواری کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ اس فصیل نما چار دیواری کی دوسری جانب ایک وسیع

میدان تھا اور یہاں بے شمار لوگ جمع تھے۔ اب ان کی تعداد بھی زیادہ تھی اور جوش وخروش بھی بے پناہ تھا۔ وہ دیوانہ وار نعرے لگا رہے تھے اور اچھل رہے تھے۔ شہر کی طرف سے گاہے بگاہے فائرنگ کی آوازیں بھی آنے لگتی تھیں۔ اس مرتبہ عزت مآب ریان فردوس کو جھروکے میں جانا پڑا۔

جھروکے میں سراسیمگی کی کیفیت تھی۔ سجاول نے حلمی سے پوچھا۔ ''کیا ہوا ہے؟''

حلمی بولا۔ ''شہر میں ہنگامے پھوٹ پڑے ہیں۔ لوگوں نے ایجنسی والوں پر حملے شروع کر دیئے ہیں۔ ان کے ایک کیمپ کو آگ لگا دی ہے اور دو پولیس اسٹیشن گھیرے میں لے لیے ہیں۔ پندرہ بیس بندے ہلاک ہو گئے ہیں۔ زخمی ہونے والے پتا نہیں کتنے ہوں گے۔''

''یہ ایجنسی والے کون ہیں؟'' سجاول نے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ حلمی جواب دیتا، آقا جان نے اسے اپنے پاس بلا لیا۔ تاہم اپنے سوال کا جواب ہمیں ایک اور ذریعے سے مل گیا۔ میری نظر کچھ کتبوں پر پڑی ان پر انگلش میں سرخ رنگ سے درج تھا۔ ''ایجنسی قاتل ہے''...... ''ایجنسی نامنظور''...... ایجنٹوں کو مارو، گلیوں میں گھسیٹو......''

اس دوران میں بہت سے مسلح افراد محل کے اندر گھس آئے...... وہ محل کے محافظوں کی روک ٹوک کی پروا کیے بغیر سنگِ مرمر کی سیڑھیوں تک پہنچے اور پھر دندناتے ہوئے وسیع و عریض جھروکے میں آ گئے۔ ان سب کے چہرے جوش سے دہکے ہوئے تھے۔ موٹی گھنی مونچھوں اور رعب دار چہرے والا ایک شخص آگے بڑھا اور سب کی ترجمانی کرتے ہوئے بڑے صاحب سے مخاطب ہوا۔ اس نے کہا۔ ''عزت مآب! اللہ تعالیٰ کی ذات کے بعد ہمارے لیے سب سے زیادہ اختیار کے مالک آپ ہیں۔ آپ ہمارے مالک اور اَن داتا ہیں۔ اوپر والے کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نازک موقع پر آپ دوبارہ ہمارے درمیان موجود ہیں۔ آپ نے ہمارا سینہ ولولے سے بھر دیا ہے۔ ہم آپ کو دوبارہ اقتدار کی کرسی پر بٹھائیں گے۔ ان بد بخت ایجنٹوں کو ''جاماجی'' سے نکال کر رہیں گے۔''

جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا جاماجی یا پولاؤ جاماجی اسی جزیرے کا نام تھا اور کہا جا رہا تھا کہ یہ تین چار نسلوں سے بڑے صاحب کے خاندان کی ملکیت ہے۔ پہلے اس کی آبادی چند ہزار نفوس پر مشتمل تھی لیکن پھر بڑھتے بڑھتے کئی لاکھ تک پہنچ گئی۔

گھنی مونچھوں والے شخص کے ساتھ لمبے تڑنگے پچاس کے قریب افراد تھے۔ یہ سب کے سب شکلوں سے ہی جنگجو لگتے تھے۔ ان کے پاس جدید آتشیں ہتھیار تھے۔ کئی

ایک نے اپنی بیلٹس کے ساتھ دستی بم بھی لٹکا رکھے تھے۔ انہوں نے آگے بڑھ بڑھ کر ریان فردوس کے ہاتھ چومے۔ کئی نے ایک گھٹنا زمین پر ٹیک کر ریان فروس اور اس کے بیٹوں کو تعظیم پیش کی۔

ریان فردوس شدید تذبذب میں نظر آ رہا تھا۔ وہ جیسے ان لوگوں کے جوش و خروش سے خوف زدہ تھا۔ شاید وہ اس سنگین معاملے کو مزید سنگین بنانا نہیں چاہتا تھا مگر جھروکے سے نیچے لوگوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی اور نعرے فلک شگاف ہوتے جا رہے تھے۔ لگتا تھا کہ یہ معاملہ ریان فردوس کے ہاتھوں سے نکلتا جا رہا ہے۔

دوسری طرف قسطینا اور آقا جان وغیرہ خوش دکھائی دیتے تھے۔ قسطینا کی آنکھوں کی چمک کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ شاید وہ ریان فردوس کی وجہ سے چپ تھی ورنہ وہ آگے بڑھ کر ان جنگجو افراد کو شاباش دیتی اور پیٹھ ٹھونکتی۔

کچھ مزید مشتعل افراد محل میں داخل ہو چکے تھے۔ جیسا کہ اب معلوم ہوا تھا کہ اس جگہ کو ڈی پیلس کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ وہ لوگ اب جگہ جگہ ٹولیوں کی شکل میں کھڑے تھے اور نعرہ زنی کر رہے تھے۔ ریان فردوس نے طویل گھنی مونچھوں والے شخص کو افغانی کہہ کر مخاطب کیا اور اس سے کہا کہ وہ صبر و تحمل سے کام لے، سب اچھا ہوگا۔

پُر جوش لوگوں سے جان چھڑا کر ریان فردوس رہائشی حصے میں واپس آ گیا۔ ہم بھی اس کے ساتھ تھے۔ رہائشی حصے میں واپس پہنچتے ہی ریان فردوس اور قسطینا میں جھڑپ ہو گئی۔ ریان فردوس یعنی عزت مآب کو میں نے پہلی دفعہ غصے میں دیکھا۔ اس کے چہرے کے سرخ داغ مزید سرخ ہو گئے۔ جسم لرزنے لگا۔ وہ بڑے تلخ لہجے میں بول رہا تھا۔ قسطینا کا چہرہ بھی لال بھبھوکا ہو گیا۔ وہ بھی تیز لہجے میں جوابات دے رہی تھی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ قسطینا کو باور کرا رہا ہے کہ یہاں کا مختار وہ خود ہے اور جو فیصلے کرنے ہیں وہ خود کرے گا۔

قسطینا بھناتی ہوئی سی چلی گئی۔ آقا جان اور چند باوردی افراد بھی اس کے ساتھ ہی گئے۔ یہاں کچھ عجیب سی کھچڑی پکی ہوئی تھی۔ صورتِ حال واضح طور پر ہماری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ صرف یہ پتا چل رہا تھا کہ کوئی امریکن ایجنسی یہاں موجود ہے۔ مقامی لوگ اس سے بے حد خفا ہیں اور اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ اس ایجنسی کا ابراہیم کے سوتیلے بھائی اور اس کی ریشہ دوانیوں سے کیا تعلق ہے، یہ ابھی ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

○......❖......○

اگلے دن دوپہر کے وقت ایک اور اہم واقعہ ہوا۔ شہر کے وسط میں چند زوردار دھماکے ہوئے۔ سجاول کو یقین تھا کہ یہ دستی بموں کے دھماکے ہیں۔ میرا اپنا خیال بھی یہی تھا۔ ابھی ان دھماکوں کی بازگشت باقی تھی کہ ڈھائی تین سو مشتعل افراد کچھ سفید فام لوگوں کو لے کر ''ڈی پیلس'' میں داخل ہوئے۔ مجھے دیکھتے ہی اندازہ ہو گیا کہ ان میں سے زیادہ تر امریکی ہیں۔ ان میں بچے اور عورتیں بھی شامل تھیں۔ مردوں میں سے اکثر کے لباس پھٹے ہوئے تھے اور ان کے جسموں پر چوٹیں دکھائی دیتی تھیں۔ انہیں کہیں سے پکڑ کر ڈی پیلس لایا گیا تھا۔

انہیں براہِ راست عزت مآب ریان فردوس کے سامنے پیش کیا گیا۔ گھنی طویل مونچھوں والا وہ گرانڈیل شخص بھی مشتعل افراد کے ساتھ تھا جسے ریان فردوس نے افغانی کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ وہاں ہونے والی تند و تیز گفتگو سے اندازہ ہوا کہ مشتعل افراد غیر ملکی قیدیوں کو فوراً قتل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ ایجنسی والے اپنے جدید اسلحے سے شہر میں وحشیانہ کشت و خون کر رہے ہیں۔ اس کا انتقام لیا جانا چاہیے تاکہ ان کو عبرت ہو۔

بڑے صاحب ریان فردوس نے افغانی اور اس کے مشتعل ساتھیوں کو اس کارروائی سے منع کر دیا۔ اس نے سگار کا طویل کش لیتے ہوئے اپنے اضطراب کو کم کیا اور بولا۔ ''جن لوگوں نے زیادتی کی ہے، ان کو سزا ضرور ملے گی۔ لیکن اس طرح عورتوں بچوں سمیت سب کو انتقام کا نشانہ بنانا ٹھیک نہیں۔ ان لوگوں کو ہمارے حوالے کر دیا جائے۔ ہم انصاف کے تقاضے پورے کریں گے۔''

افغانی ذرا بھڑک کر بولا۔ ''عزت مآب! آپ یہاں ڈی پیلس میں ہیں۔ اپنی بلٹ پروف گاڑی پر ذرا شہر کا ایک راؤنڈ لگائیں، آپ کو اندازہ ہوگا کہ یہ لوگ کیسی درندگی کر رہے ہیں۔''

''جو کچھ بھی ہے افغانی، ہمیں ان کو مارنے سے پہلے مجرم اور بے قصور کی پہچان کرنی ہو گی۔ ان چھوٹے بچوں کا بھلا کیا قصور ہو سکتا ہے...... اور یہ عورتیں؟''

افغانی کچھ کہنا چاہتا تھا مگر قریب کھڑے آقا جان نے اس کے کندھے پر دباؤ ڈال کر اسے منع کر دیا۔ آقا جان جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا تھا...... بحث کا فائدہ نہیں جو کچھ بھی ہے عزت مآب کی بات ماننا پڑے گی۔

ریان فردوس اور افغانی میں ساری گفتگو ملائی میں ہوئی تھی۔ انیق سرگوشیوں میں مجھے اس کا مفہوم بتاتا جا رہا تھا۔ غیر ملکی عورتیں انگلش میں فریاد کناں تھیں۔ بچے رو رہے تھے۔ ان لوگوں کی تعداد ساٹھ کے لگ بھگ تھی...... زیادہ تر عورتوں نے جینز اور شرٹس پہن رکھی تھیں۔

بچے فراکس اور نیکرز وغیرہ میں تھے۔ کچھ فیشن ایبل مرد بھی نیکرز پہنے اپنی تنومند رانوں کی نمائش کر رہے تھے۔ ان سب کے چہرے ہراس اور اندیشوں کی آماجگاہ تھے۔

ریان فردوس کے حکم پر ڈی پیلس کے محافظوں نے قیدیوں کو اپنے حصار میں لے لیا اور انہیں ہانکتے ہوئے باہر لے گئے۔ مشتعل افراد مطمئن نہیں تھے۔ ان میں سے کئی کے چہروں پر ریان فردوس کے لیے بھی دبی دبی برہمی نظر آتی تھی۔ بہرحال قسطینا اور آقا جان وغیرہ کے کہنے پر افغانی سب لوگوں کو واپس لے گیا۔

صاف پتا چل رہا تھا کہ یہاں کے معاملات بگڑتے چلے جا رہے ہیں۔ شہر کے کئی حصوں سے گاہے بگاہے فائرنگ کی آوازیں آنے لگتی تھیں۔ ان میں لائٹ مشین گن اور کلاشنکوف وغیرہ کی آوازیں بھی شامل تھیں۔ شہر کی سڑکوں پر وقفے وقفے سے ایمبولینسز اور سکیورٹی کی گاڑیوں کے سائرن سنائی دیتے تھے۔ وہ رات تجسس اور سنسنی کے گھیرے میں گزری۔ میں، انیق اور سجاول مختلف اندازے لگاتے رہے۔ ہمیں کوئی بھی اصل صورتِ حال بتانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ حلمی سے توقع کی جا سکتی تھی مگر اسے ابھی شاید سر کھجانے کی فرصت بھی نہیں تھی۔ سیل فون مسلسل اس کے کانوں سے لگا ہوا تھا اور وہ ڈی پیلس کی طویل راہداریوں اور بلند و بالا چھتوں کے نیچے بگولے کی طرح چکراتا پھر رہا تھا۔

O......ختم شد......O

اس دلچسپ داستان کے بقیہ واقعات
چوتھے حصے میں ملاحظہ فرمائیں

اگلی صبح سجاول نے سنبل سے ملاقات کی۔ اس کا سفید مینا اس کے پاس پہنچ چکا تھا اور وہ اسے گلے سے چمٹائے ہوئے تھی۔ پارا ہاؤس میں اور اب یہاں ڈی پیلس میں نہ جانے کتنے مرد ملازمین ایسے ہوں گے جو سنبل کو دیکھ کر اس مینے کی قسمت پر رشک کرتے ہوں گے مگر سنبل کے گلے سے لگنے کا موقع ملتا تھا تو ایک ادھیڑ عمر بیمار شخص کو...... جو یہاں کا عزت مآب تھا۔ سنبل نہائی دھوئی اور نکھری نکھرائی نظر آتی تھی۔ آنکھوں میں ایک طرح کی طمانیت بھی تھی۔ جلد ہی اس کا راز کھل گیا۔ کل شب اسے بڑے صاحب کی ''رفاقت'' نصیب رہی تھی۔ بات تھوڑی سی حیرانی کی تھی۔ ان پریشان کن دنوں میں بھی بڑے صاحب نے عیش و عشرت سے مکمل طور پر ہاتھ نہیں کھینچا تھا یا شاید اپنا غم غلط کرنے کے لیے ہی اس نے کل شب نوخیز سنبل کو اپنی خلوت میں بلایا ہو۔ سجاول نے اس سے پوچھا۔ ''بس موج میلے میں ہی لگی ہوئی ہو یا کچھ سن گن بھی لے رہی ہو؟ یہ کیا ہو رہا ہے یہاں؟''

وہ بولی۔ ''جو تھوڑی بہت بات بڑے صاحب نے بتائی ہے اس سے تو بس یہ پتا چلتا ہے کہ دوسری بیوی سے بڑے صاحب کا بیٹا اپنے باپ کے خلاف لڑ رہا ہے۔ اس لڑائی میں مدد کے لیے بڑے صاحب اور ان کی فیملی نے باہر کے ملک سے کچھ ہتھیار اور ہتھیار چلانے والے منگوائے تھے۔ یہ ہتھیار چلانے والے آہستہ آہستہ اتنے بڑھ گئے ہیں کہ ایک چھوٹی موٹی فوج کی طرح ہو گئے ہیں۔ اب یہ لوگ بڑے صاحب کو ہی مصیبت میں ڈال رہے ہیں۔ بس کچھ اس طرح کا معاملہ ہے۔''

''یہ ایجنسی والے کس کو کہا جاتا ہے؟'' سجاول نے پوچھا۔

''یہ تو...... مجھے پتا نہیں......'' سنبل بولی۔

سجاول نے برا سا منہ بنایا۔ انیق بولا۔ ''لگتا تو یہی ہے کہ ان ہتھیار والوں کو ہی ایجنسی والے کہا جاتا ہے۔''

''واہ۔ بڑی اونچی بات کی ہے۔'' سجاول نے طنزیہ لہجے میں کہا۔''ہم سو سال بھی ٹکریں مارتے رہتے تو اس نتیجے تک نہ پہنچ سکتے۔'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''تمہارے اس نکو شہزادے کو تو ''یو این او'' میں ہونا چاہیے تھا۔ بڑے بڑے مسئلے چٹکی بجاتے حل کر سکتا تھا۔''

''سوری۔'' انیق نے کہا اور مغموم بکرے کی طرح گردن جھکا لی۔ سجاول کی شعلہ بیانی سے بچنے کا میں نے اسے یہی حل بتایا ہوا تھا۔

ڈی پیلس کے ارد گرد اب لوگ مستقل طور پر جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ انہوں نے پیلس کے وسیع سبزہ زاروں میں جگہ جگہ کیمپ گاڑ لیے تھے اور محافظوں کے کہنے کے باوجود رک نہیں رہے تھے...... یہ سب کے سب مسلح تھے اور اندازہ ہوتا تھا کہ شہر کے باہر سے بھی آ رہے ہیں۔ یہ سب، ایجنسی کے لوگوں کو پولاؤ جاماجی سے نکال باہر کرنا چاہتے تھے۔

سجاول، انیق سے چڑتا تھا لیکن انیق وقتاً فوقتاً اپنی اہمیت ثابت کرتا رہتا تھا۔ شام کے وقت بھی یہی ہوا۔ انیق کی زبان دانی ہمارے کام آئی۔ اس نے آ کر مجھے بتایا۔'' کچھ امریکی عورتوں کے ساتھ برا سلوک ہونے والا ہے۔ میں ابھی آقا جان کے قریبی بندے آرب کی گفتگو سن کر آ رہا ہوں۔''

میرا دھیان ان پکڑے جانے والے امریکیوں کی طرف گیا جن کی جان بخشی ریان فردوس نے بمشکل کرائی تھی لیکن انیق نے میرے اس خیال کو رد کیا اور بولا۔''میں نے جو کچھ سنا ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ یہ عورتیں ڈی پیلس سے باہر ہیں...... کسی واشنگٹن ہوٹل نامی جگہ پر۔''

میرے اور سجاول کے پوچھنے پر انیق نے جو تفصیل بتائی۔ اس سے پتا چلا کہ ابھی باغیچے میں آقا جان کا قریبی ساتھی آرب ایک دوست شخص کے ساتھ ناریل کا پانی پی رہا تھا اور ملائی میں معنی خیز گفتگو کر رہا تھا۔ دونوں نشے میں بھی تھے۔ آرب کہہ رہا تھا۔''کبھی...... ولایتی مرغابی کھائی؟''

دوسرا بولا۔''نہیں یار، آج تک تو حسرت ہی رہی۔ کون ویزا لگوائے اور ولایتی مرغابی کھانے امریکا یا یورپ جائے۔''

''لیکن اب تو ویزے کے بغیر ولایتی مرغابی ملے گی اور مل بھی رہی ہے۔ آج رات کو ہی پک رہی ہے ہوٹل واشنگٹن میں۔ چلنا ہے تو چلو۔''

''یار! کہیں مروا نہ دینا۔ ابھی کچھ پتا نہیں کہ حالات کس طرف جاتے ہیں۔ اگر ولایتی

مرغابیاں اور مرغابے پھر حاوی ہو گئے تو حشر خراب ہو جائے گا۔''
''اب کچھ ہونے والا نہیں۔'' آرب نے شرابیوں کی طرح ہاتھ لہرا کر جواب دیا۔
''اولڈ مین کا زور اب ٹوٹ گیا ہے۔ اب جو کچھ کرنا ہے ہز ہائی نس قسطینا اور آقا جان جیسے
لوگوں نے ہی کرنا ہے۔ تخت یا تختہ اور امید یہی ہے کہ تخت۔''
اس کے بعد وہ دونوں دوست ایک جیپ میں سوار ہو کر ڈی پیلس سے باہر چلے گئے
ولایتی مرغابیاں کھانے کے لیے۔
انیق کی اطلاع قابلِ غور تھی۔ میرے ساتھ ساتھ سجاول کے اندر بھی تجسس ابھر آیا۔
ویسے بھی ہم شہر میں نکلنا چاہ رہے تھے تاکہ صورتِ حال کو کچھ سمجھ سکیں۔ سجاول نے اپنی مرضی
کرنے کا اچھا راستہ ڈھونڈ لیا تھا۔ اس کو کہیں جانا ہوتا تو براہِ راست بڑی بیگم سے اجازت
طلب کر لیتا تھا اور وہ اس پر بہت اعتماد کرتی تھیں۔ اجازت مل جاتی تھی، اس مرتبہ بھی اس
نے ایسا ہی کیا۔ بڑی بیگم نے کچھ تحفظات اور ہدایات کے ساتھ ہمیں جانے کا اجازت نامہ
دے دیا لیکن ہمیں دو گارڈز کے ساتھ جانا تھا۔ ان میں سے ایک ''ڈرائیور کم گارڈ'' تھا۔ ہم
یہاں آنے کے بعد پہلی بار ڈی پیلس سے نکلے۔ اندھیرا پھیلتے ہی شہر میں اَن گنت روشنیاں
تو جاگ اٹھی تھیں مگر چہل پہل نظر نہیں آتی تھی۔ عام لوگ جیسے گھروں میں دبکے ہوئے تھے اور
ایک طرح کے خوف و ہراس نے در و دیوار پر اپنے سائے پھیلا رکھے تھے۔ سڑکوں پر صرف
مسلح افراد کے جتھے تھے جو مسلسل عزت مآب کے حق میں نعرہ بازی کر رہے تھے۔ ایک دو جگہ
ہماری گاڑی کو بھی روکا گیا اور کھڑکیوں میں سر گھسا کر ایجنسی مردہ باد...... عزت مآب زندہ باد
کے نعرے لگائے گئے۔ ایک دو جگہ ہمیں مساجد کے بلند مینار بھی نظر آئے جس سے اس بات
کی تصدیق ہوتی کہ یہاں کی زیادہ تر آبادی مسلمان ہے۔ غالباً بڑی بیگم کے اثر و رسوخ اور
کوششوں کی وجہ سے اکثر لوگ اسلامی شعائر کی پابندی بھی کرتے تھے۔
مختلف کشادہ سڑکوں سے گزرنے کے بعد ہم جلد ہی اس بڑی عمارت کے قریب پہنچ
گئے۔ اس کی پیشانی پر ہوٹل واشنگٹن کے حروف جگمگا رہے تھے۔ یہ عمارت بھی ہنگاموں سے
متاثر ہوئی تھی۔ کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹے ہوئے تھے اور کئی جگہ آتشزدگی اور ٹوٹ پھوٹ کے
آثار تھے۔ پارکنگ میں دو جلی ہوئی کاروں کے ڈھانچے پڑے تھے، ان میں سے ایک ابھی
تک سلگ رہا تھا۔
ہم کچھ آگے جا کر جیپ سے اتر گئے اور چہل قدمی کے انداز میں کچھ آگے نکل گئے۔
ہمارے ساتھ آنے والے مقامی گارڈز کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ وہ ہمیں یوں گھومنے

پھرنے سے روکنا چاہتے ہیں، لیکن ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ ایسی روک ٹوک کر سکتے۔ ہم اردگرد کا جائزہ لینے کے لیے ہوٹل کی عقبی سمت میں چلے گئے۔ یہاں بھی دو تین عمارتیں ایسی نظر آئیں جن میں ایک روز پہلے توڑ پھوڑ کی گئی تھی۔ ایک بلند درخت پر ایک موٹی سی چیز لٹکی دکھائی دی۔ یہ پھل تو ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔ غور کرنے پر عقدہ کھلا کہ یہ ایک کٹا ہوا انسانی سر ہے۔ سر ہولے ہولے گھوم رہا تھا۔ اس کا رخ روشنی کی جانب ہوا تو پتا چلا کہ وہ کوئی امریکی سفید فام ہے۔ اس ایک منظر سے یہاں کے حالات کی سنگینی کا اندازہ بخوبی ہو جاتا تھا۔ کچھ آگے بڑھے تو ایک چوراہے پر بہت سے ادھ جلے ٹائر پڑے دکھائی دیئے۔ رات کے اس پہر یہاں مکمل خاموشی تھی۔ بس کسی وقت مسلح افراد کی کوئی گاڑی فراٹے کے ساتھ گزر جاتی تھی۔ اچانک ہم بے طرح ٹھٹک گئے۔ کچھ نسوانی آوازیں سنائی دیں۔ ان چلاتی ہوئی آوازوں میں کرب تھا اور فریاد تھی۔ یہ مدھم آوازیں ہوٹل واشنگٹن کی نیم تاریک عمارت کے اندر سے آرہی تھیں۔ کسی وقت کوئی عورت اونچی آواز میں کچھ کہتی تھی اور پھر خاموشی چھا جاتی تھی۔

میں نے اور سجاول نے ایک دوسرے کی صورت دیکھی۔ یقیناً وہ فقرہ سجاول کے کانوں میں بھی گونجنے لگا تھا جو انیق نے ہمارے گوش گزار کیا تھا۔ ''آج رات ہوٹل واشنگٹن میں کچھ غیر ملکی عورتوں سے بدسلوکی کی جائے گی۔''

دفعتاً ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس نظر آئیں۔ یہ کافی دھیمی رفتار سے گشت کرنے والے انداز میں ہماری طرف آرہی تھی۔ میں اور سجاول تیزی سے ایک ٹرک کی اوٹ میں ہو گئے جو ہوٹل کی عقبی دیوار کے ساتھ پارک کیا گیا تھا۔ ہمیں شبہ ہوا کہ شاید یہ وہی جیپ ہے جس پر ہم یہاں پہنچے ہیں لیکن جب گاڑی قریب آئی تو وہ مختلف تھی۔ کھلی چھت والی اس کارگو ٹائپ گاڑی میں پانچ چھ مسلح گارڈز سوار تھے۔ یہ سب مقامی تھے۔ ان میں سے کچھ نے سیفٹی ہیلمٹ اور بلٹ پروف جیکٹس بھی پہن رکھی تھیں۔ چند سیکنڈ کے لیے وہ ٹرک کے قریب رکے۔ یقیناً انہیں بھی ہوٹل کے اندر سے ابھرنے والی مدھم آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

ان میں سے ایک گارڈ نے ملائی زبان میں اور طنزیہ لہجے میں کچھ کہا۔ باقی ہنسنے لگے..... گاڑی پھر رینگتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ ہوٹل کے کسی اندرونی کمرے سے کسی شخص کی کڑکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ تب کوئی عورت بلند آواز میں رونے لگی۔ ایسے موقعوں پر میرے اندر ایک عجیب سی وحشت بھڑک اٹھتی تھی۔ پتا نہیں کیوں..... ہر بار مجھے وہی منظر یاد آ جاتا تھا جب ایک عرصے پہلے ڈنمارک میں میری ایک دوست کو بند گاڑی میں درندگی کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ تب میں بے بس تھا اور شاید کمزور بھی لیکن آج اتنے برس گزر جانے کے بعد میں وہ شاہ

زیب نہیں رہا تھا۔ اب میں کچھ اور ہو چکا تھا۔

''کیا خیال ہے سجاول، دیکھا جائے کہ کیا ہو رہا ہے؟'' میں نے سرگوشی میں کہا۔

سجاول نے جواب دینے کے بجائے اپنا دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ سے پکڑ کر میری طرف بڑھا دیا۔ اس کا مطلب سمجھتے ہوئے میں نے اس کے ہاتھ پر پاؤں رکھا اور اوپر اٹھ کر باؤنڈری وال کا بالائی کنارہ تھام لیا۔

چند ہی سیکنڈ بعد میں اور سجاول دونوں ہوٹل کے عقبی احاطے کے اندر تھے۔ شور نما آوازیں اب بلند ہو گئی تھیں۔ یقیناً عمارت کے کسی اندرونی حصے میں شیطانی کھیل کھیلا جا رہا تھا۔ پتا نہیں کہ یہ امریکی عورتیں تھیں یا کوئی اور...... لیکن جو بھی تھا عورتیں تھیں اور انسانیت کے ناتے ان کی مدد کرنا فرض بنتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ فسادات اور جنگوں میں سب سے زیادہ استحصال عورتوں کا ہی ہوتا ہے۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی نقشہ نظر آ رہا تھا۔ درد میں ڈوبی، ایک چلاتی ہوئی آواز ابھری۔ کسی لڑکی نے انگلش میں کہا۔ ''مدد...... کوئی ہے...... کوئی ہے؟''

سجاول کے پاس کولٹ پستول موجود تھا جو اسے بڑی بیگم نے ہی فراہم کیا تھا۔ میں خالی ہاتھ تھا مگر بوقت ضرورت ہتھیار حاصل کرنا میرے لیے کوئی ایسا مشکل نہیں تھا۔ ہم ایک کوریڈور سے گزر کر، ہوٹل کی اُجڑی لابی میں پہنچے اور وہاں سے ڈائننگ ہال کے سامنے آئے۔ ایک دیوار گیر کھڑکی کے شیشے پر کوئی پتھر لگا تھا اور وہاں ایک بڑا سوراخ تھا۔ میں نے اس سوراخ سے اندر جھانکا اور لرز گیا۔ اس اسٹیج پر مدھم نیلگوں روشنی میں شیطان ننگا ہو کر ناچ رہا تھا۔ یہ کوئی آٹھ غیر ملکی عورتیں تھیں جو ''نشے میں دھت مردوں'' کے رحم و کرم پر تھیں۔ ان میں سے دو درمیانی عمر کی باقی نوجوان یا جواں سال تھیں۔ انہیں ایک دوسرے کے سامنے ہی بے آبرو کیا جا رہا تھا۔ فرش پر شراب کی بوتلیں لڑھکی ہوئی تھیں اور لباس بکھرے ہوئے تھے۔ اس گھناؤنے کھیل کا ایک حصہ یہ بھی تھا کہ ایک نسبتاً ''کوآپریٹو'' لڑکی کو رقص پر مجبور کیا گیا تھا اور وہ میڈونا کے کسی گانے پر الٹے سیدھے ہاتھ پاؤں چلا رہی تھی۔

میری نگاہ اس سے پہلے آقا جان کے دست راست آرب پر پڑی۔ وہ سنہری بالوں والی ایک لڑکی کے منہ میں زبردستی شراب انڈیل رہا تھا، اس عمل میں اس کا ایک ساتھی اس کی مدد کر رہا تھا۔

ہمارے سامنے دو راستے تھے۔ ایک تو ہم فوری طور پر براہِ راست کارروائی کرتے، دوسرے یہ کہ ریان فردوس یا بڑی بیگم تک سیل فون کے ذریعے اس دلدوز واقعے کی اطلاع پہنچاتے۔ براہِ راست کارروائی کے لیے ہمارے پاس پوری معلومات نہیں تھیں اور نہ ہی یہ پتا

تھا کہ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ ابھی ہم اس شہر کے حالات سے تقریباً ناواقف تھے۔ ریان فردوس یا کسی اور ذمے دار تک اطلاع پہنچانے کی صورت میں تاخیر کا امکان تھا۔

یکا یک میری چھٹی حس نے خطرے سے خبردار کیا۔ اس سے پہلے کہ میں مڑ کر دیکھتا، ایک کڑک دار آواز میرے کانوں میں پڑی۔ کسی نے ملائی میں کچھ کہا تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو ایک درمیانے جسم کا شخص سرخ آنکھوں سے ہمیں گھور رہا تھا پھر اس نے اپنے ہولسٹر میں سے پستول برآمد کرنا چاہا۔ میری ٹانگ کی بروقت ضرب نے پستول اس کے ہاتھ سے چھڑا دیا۔ سجاول نے لپک کر اسے اپنی گرفت میں لے لیا اور اس کا منہ اپنی چوڑی ہتھیلی سے بند کر دیا۔ مقصد یہی تھا کہ وہ آواز نہ نکال سکے۔ لیکن اسی دوران میں ایک شخص نے پہلو سے مجھ پر حملہ کر دیا۔ اس نے رائفل کو لاٹھی کی طرح استعمال کرتے ہوئے میرے سر پر تباہ کن چوٹ لگانا چاہی تھی مگر رائفل میرے کندھے سے ٹکرائی۔ میں نے پلٹ کر اس کی کنپٹی پر جچا تلا مکا رسید کیا۔ مارشل آرٹ کی زبان میں اسے راؤنڈ پنچ کہا جاتا ہے۔ اس انداز کی زوردار ضرب چہرے پر کہیں بھی لگے، بندے کو ناشغفیل کر سکتی ہے۔ میرے مدِ مقابل کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا اور وہ تاب نہ لا کر فرش پر گر گیا۔

اب اتنا شور پیدا ہو چکا تھا کہ اندر ہال میں شیطانی کھیل کھیلنے والے بے خبر نہیں رہ سکتے تھے۔ افراتفری کی آوازیں سنائی دیں۔ کسی کونے سے نکل کر تین اور گارڈز ہم پر پل پڑے لیکن وہ زیادہ بھی ہوتے تو میرے اور سجاول کے سامنے نہ ٹھہر سکتے۔ ہم نے انہیں مکوں اور ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ ایک گرانڈیل شخص کو سجاول کے تباہ کن گھونسے نے لمبا لٹایا۔ ایک لنگڑے گارڈ کو سینے پر میری زوردار ٹھوکر سہنا پڑی۔ اسی اثنا میں آرب اور اس کے تین چار ننگ دھڑنگ ساتھی بھی موقع پر پہنچ گئے۔ ان میں سے ایک کے جسم پر تو انڈرویئر بھی نہیں تھا۔ میری چھٹی حس نے گواہی دی کہ فائرنگ اور خون خرابے سے بچنے کے لیے لمبے تڑنگے آرب پر قابو پانا ضروری ہے۔ میں نے خود سے لپٹے ہوئے گارڈ کو اٹھا کر ایک دوسرے گارڈ پر مارا اور جست لگا کر آرب کو چھاپ لیا۔ اس کی گردن میرے بازو کے شکنجے میں آئی اور اس کا منہ بے ساختہ کھل گیا۔ سجاول نے اپنا پستول میری طرف پھینکا۔ میں نے کرکٹ بال کی طرح اسے ایک ہاتھ سے دبوچا اور آرب کی کنپٹی پر رکھ دیا۔ وہ مچھلی کی طرح تڑپا لیکن میری گرفت سے نہیں نکل سکا۔ اس کی گھن گرج اس کے گلے میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔

"خبردار...... گولی مار دوں گا۔" میں نے کہا اور آرب کو گھسیٹتا ہوا پیچھے لے گیا۔ اب میری پشت دیوار کے ساتھ تھی۔ میں نے جو اندازہ لگایا، وہ بالکل درست ثابت ہوا۔ اپنے

سرغنہ آرب کو میری گرفت میں دیکھ کر گارڈز جہاں کے تہاں کھڑے رہ گئے۔ اندر ہال میں اور کوریڈورز میں کہرام سا مچا ہوا تھا۔ لڑکیاں ہال کمرے سے نکل کر راہداریوں میں بھاگ رہی تھیں اور کونے کھدروں میں چھپ رہی تھیں۔ یقیناً باہر نکلنے کا راستہ مسدود تھا ورنہ وہ اپنی حالت کی پروا کیے بغیر نکل چکی ہوتیں۔

میں آرب کو اپنے ساتھ گھسیٹتا ہوا لابی میں پہنچا اور پھر مین گیٹ تک آ گیا۔ سجاول کے ہاتھ میں ایک کلاشنکوف نظر آ رہی تھی۔ یقیناً یہ اس نے کسی گارڈ سے ہی چھینی تھی۔ وہ پوری طرح میرا ساتھ دے رہا تھا۔ مین گیٹ اندر سے مقفل تھا۔ ''گیٹ کھولو، ورنہ اڑا ڈالوں گا اس کو۔ ذمے دار تم ہو گے۔'' میں نے کولٹ پسٹل آرب کی چربی دار گردن میں گھساتے ہوئے انگلش میں کہا۔

آرب کی حالت پتلی تھی۔ وہ خاصا زور آور تھا مگر میں نے اسے ایسا جکڑ رکھا تھا کہ وہ دو دفعہ مزید پیدا ہو جاتا تو بھی اس شکنجے سے نکل نہ سکتا۔ اس کی گردن پھنسی ہوئی تھی اور باقی کا جسم توری کی طرح لٹک رہا تھا۔ اس کے بدن پر فقط سفید انڈر ویئر تھا جسے اس نے ایک ہاتھ سے تھام رکھا تھا۔

جب گیٹ کھولا نہیں گیا تو سجاول نے اس پر کلاشنکوف کا ایک میڈیم برسٹ مارا، لرزہ خیز آواز کے ساتھ شعلوں نے رقص کیا اور گیٹ کا تالے والا حصہ ٹوٹ کر باہر جا گرا۔ میں آرب کو گھسیٹتا ہوا باہر لے آیا۔ جس جیپ پر ہم یہاں پہنچے تھے وہ پاس ہی کھڑی تھی۔ دونوں گارڈز یہ تماشا دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ انہیں جیسے اپنی نگاہوں پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے ''ڈرائیور کم گارڈ'' سے انگلش میں کہا۔ ''بڑے صاحب، بڑی بیگم، یا کسی دوسرے ذمے دار سے بات کراؤ۔''

چند ہی سیکنڈ بعد میں سجاول کی طرف سے بڑی بیگم سے فون پر بات کر رہا تھا اور انہیں یہاں کی نہایت کشیدہ صورتِ حال کے بارے میں بتا رہا تھا۔ بڑی بیگم نے کہا کہ وہ مدد بھیج رہی ہیں۔

کم از کم پانچ افراد نے ہماری طرف رائفلیں سیدھی کر رکھی تھیں مگر آرب کی وجہ سے کوئی کارروائی نہیں کر پا رہے تھے۔ میرے کندھے سے درد کی شدید ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ ابھی بمشکل دو تین منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ ''ہوٹرز'' سنائی دیئے۔ سکیورٹی فورس کی تین گشتی گاڑیاں فراٹے سے وہاں پہنچیں اور ان میں سے مسلح افراد چھلانگیں لگا کر اترے۔ یہ لوگ یقیناً کہیں آس پاس ہی موجود تھے اور بڑی بیگم کے ڈائریکٹ آرڈر پر یہاں پہنچے تھے۔

تھا کہ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ ابھی ہم اس شہر کے حالات سے تقریباً ناواقف تھے۔ ریان فردوس یا کسی اور ذمے دار تک اطلاع پہنچانے کی صورت میں تاخیر کا امکان تھا۔

یکایک میری چھٹی حس نے خطرے سے خبردار کیا۔ اس سے پہلے کہ میں مڑ کر دیکھتا، ایک کڑک دار آواز میرے کانوں میں پڑی۔ کسی نے ملائی میں کچھ کہا تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو ایک درمیانے جسم کا شخص سرخ آنکھوں سے ہمیں گھور رہا تھا پھر اس نے اپنے ہولسٹر میں سے پستول برآمد کرنا چاہا۔ میری ٹانگ کی بروقت ضرب نے پستول اس کے ہاتھ سے چھڑا دیا۔ سجاول نے لپک کر اسے اپنی گرفت میں لے لیا اور اس کا منہ اپنی چوڑی ہتھیلی سے بند کر دیا۔ مقصد یہی تھا کہ وہ آواز نہ نکال سکے۔ لیکن اسی دوران میں ایک شخص نے پہلو سے مجھ پر حملہ کر دیا۔ اس نے رائفل کو لاٹھی کی طرح استعمال کرتے ہوئے میرے سر پر تباہ کن چوٹ لگانا چاہی تھی مگر رائفل میرے کندھے سے ٹکرائی۔ میں نے پلٹ کر اس کی کنپٹی پر جچا تلا مکا رسید کیا۔ مارشل آرٹ کی زبان میں اسے راؤنڈ پنچ کہا جاتا ہے۔ اس انداز کی زوردار ضرب چہرے پر کہیں بھی لگے، بندے کو اننا غفیل کر سکتی ہے۔ میرے مدِ مقابل کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا اور وہ تاب نہ لا کر فرش پر گر گیا۔

اب اتنا شور پیدا ہو چکا تھا کہ اندر ہال میں شیطانی کھیل کھیلنے والے بے خبر نہیں رہ سکتے تھے۔ افراتفری کی آوازیں سنائی دیں۔ کسی کونے سے نکل کر تین اور گارڈز ہم پر پل پڑے لیکن وہ زیادہ بھی ہوتے تو میرے اور سجاول کے سامنے نہ ٹھہر سکتے۔ ہم نے انہیں مکوں اور ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ ایک گرانڈیل شخص کو سجاول کے تباہ کن گھونسے نے لمبا لٹایا۔ ایک لنگڑے گارڈ کو سینے پر میری زوردار ٹھوکر سہنا پڑی۔ اسی اثنا میں آرب اور اس کے تین چار ننگ دھڑنگ ساتھی بھی موقع پر پہنچ گئے۔ ان میں سے ایک کے جسم پر تو انڈرویئر بھی نہیں تھا۔ میری چھٹی حس نے گواہی دی کہ فائرنگ اور خون خرابے سے بچنے کے لیے لمبے تڑنگے آرب پر قابو پانا ضروری ہے۔ میں نے خود سے لپٹے ہوئے گارڈ کو اٹھا کر ایک دوسرے گارڈ پر مارا اور جست لگا کر آرب کو چھاپ لیا۔ اس کی گردن میرے بازو کے شکنجے میں آئی اور اس کا منہ بے ساختہ کھل گیا۔ سجاول نے اپنا پستول میری طرف پھینکا۔ میں نے کرکٹ بال کی طرح اسے ایک ہاتھ سے دبوچا اور آرب کی کنپٹی پر رکھ دیا۔ وہ مچھلی کی طرح تڑپا لیکن میری گرفت سے نہیں نکل سکا۔ اس کی گھن گرج اس کے گلے میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔

''خبردار...... گولی مار دوں گا'' میں نے کہا اور آرب کو گھسیٹتا ہوا پیچھے لے گیا۔ اب میری پشت دیوار کے ساتھ تھی۔ میں نے جو اندازہ لگایا، وہ بالکل درست ثابت ہوا۔ اپنے

سرغنہ آرب کو میری گرفت میں دیکھ کر گارڈز جہاں کے تہاں کھڑے رہ گئے۔ اندر ہال میں اور کوریڈورز میں کہرام سا مچا ہوا تھا۔ لڑکیاں ہال کمرے سے نکل کر راہداریوں میں بھاگ رہی تھیں اور کونے کھدروں میں چھپ رہی تھیں۔ یقیناً باہر نکلنے کا راستہ مسدود تھا ورنہ وہ اپنی حالت کی پروا کیے بغیر نکل چکی ہوتیں۔

میں آربؔ کو اپنے ساتھ گھسیٹتا ہوا لابی میں پہنچا اور پھر مین گیٹ تک آ گیا۔ سجاول کے ہاتھ میں ایک کلاشنکوف نظر آ رہی تھی۔ یقیناً یہ اس نے کسی گارڈ سے ہی چھینی تھی۔ وہ پوری طرح میرا ساتھ دے رہا تھا۔ مین گیٹ اندر سے مقفل تھا۔ ''گیٹ کھولو، ورنہ اڑا ڈالوں گا اس کو۔ ذمے دار تم ہو گے۔'' میں نے کولٹ پسٹل آرب کی چربی دار گردن میں گھساتے ہوئے انگلش میں کہا۔

آرب کی حالت پتلی تھی۔ وہ خاصا زور آور تھا مگر میں نے اسے ایسا جکڑ رکھا تھا کہ وہ دو دفعہ مزید پیدا ہو جاتا تو بھی اس شکنجے سے نکل نہ سکتا۔ اس کی گردن پھنسی ہوئی تھی اور باقی کا جسم توری کی طرح لٹک رہا تھا۔ اس کے بدن پر فقط سفید انڈر ویئر تھا جسے اس نے ایک ہاتھ سے تھام رکھا تھا۔

جب گیٹ کھولا نہیں گیا تو سجاول نے اس پر کلاشنکوف کا ایک میڈیم برسٹ مارا، لرزہ خیز آواز کے ساتھ شعلوں نے رقص کیا اور گیٹ کا تالے والا حصہ ٹوٹ کر باہر جا گرا۔ میں آرب کو گھسیٹتا ہوا باہر لے آیا۔ جس جیپ پر ہم یہاں پہنچے تھے وہ پاس ہی کھڑی تھی۔ دونوں گارڈز یہ تماشا دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ انہیں جیسے اپنی نگاہوں پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے ''ڈرائیور کم گارڈ'' سے انگلش میں کہا۔ ''بڑے صاحب، بڑی بیگم، یا کسی دوسرے ذمے دار سے بات کراؤ۔''

چند ہی سیکنڈ بعد میں سجاول کی طرف سے بڑی بیگم سے فون پر بات کر رہا تھا اور انہیں یہاں کی نہایت کشیدہ صورتِ حال کے بارے میں بتا رہا تھا۔ بڑی بیگم نے کہا کہ وہ مدد بھیج رہی ہیں۔

کم از کم پانچ افراد نے ہماری طرف رائفلیں سیدھی کر رکھی تھیں مگر آرب کی وجہ سے کوئی کارروائی نہیں کر پا رہے تھے۔ میرے کندھے سے درد کی شدید ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ ابھی بمشکل دو تین منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ ''ہوٹرز'' سنائی دیئے۔ سکیورٹی فورس کی تین گشتی گاڑیاں فراٹے سے وہاں پہنچیں اور ان میں سے مسلح افراد چھلانگیں لگا کر اترے۔ یہ لوگ یقیناً کہیں آس پاس ہی موجود تھے اور بڑی بیگم کے ڈائریکٹ آرڈر پر یہاں پہنچے تھے۔

ان کے آتے ہی صورتِ حال نارمل ہوگئی اور ہمیں خونی نظروں سے دیکھنے والے گارڈز اپنے اسلحے سمیت پیچھے ہٹ گئے۔

کچھ ہی دیر بعد ہم گشتی فورس کی گاڑیوں میں بیٹھ چکے تھے۔ نشے میں دھت آرب اور اس کے کئی ساتھیوں کو اہلکاروں نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ سجاول کے کہنے پر اہلکار ہوٹل کے اندر بھی چلے گئے تاکہ غیر ملکی عورتوں کو ڈھونڈا اور حفاظت میں لیا جا سکے۔

○......❖......○

ڈی پیلس پہنچنے کے بعد ہمیں بڑی بیگم نے طلب کیا۔ ہم ان کی خدمت میں پیش ہوئے۔ بڑی بیگم کے چہرے پر اپنے بھائی آدم کی موت کے بعد سے مستقل سوگواری نظر آتی تھی۔ حجاب کے گھیرے میں ان کا چہرہ متورم اور آنسوؤں سے نم رہتا تھا۔ وہ آرب اور اس کے ساتھیوں کی حرکت پر بہت زیادہ مشتعل تھیں۔ بڑی بیگم اپنے دونوں بیٹوں کی طرح کافی حد تک انگلش میں بات کرسکتی تھیں۔ انہوں نے کہا۔ ”یہ لوگ ہمارے لیے مصیبتیں بڑھا رہے ہیں۔ میں ان کو کڑی سے کڑی سزا دینا چاہوں گی۔“

پھر وہ سجاول سے مخاطب ہو کر بولیں۔ ”سجاول، ان عورتوں کی خوش قسمتی کہ تم وہاں جا پہنچے مگر یہ ہوا کیسے؟“

اس سوال کا جواب تو یہی تھا کہ انیق نے آرب اور اس کے ساتھی کی وہ رمزیہ گفتگو سنی (جس میں مرغابیوں وغیرہ کا ذکر تھا) مگر ہم بڑی بیگم کو بلکہ کسی کو بھی یہ نہیں بتا سکتے تھے کہ انیق ملائی زبان جانتا ہے۔ لہٰذا سجاول نے پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق بڑی بیگم کو بتایا کہ ہم ہوٹل واشنگٹن کی خستہ حالی دیکھنے کے لیے وہاں رکے تھے کہ ہم نے عورتوں کی آوازیں سنیں اور ہم پر یہ سب کچھ آشکار ہوا۔ میں نے کہا ہم آپ کو یہ اطلاع دینا چاہ رہے تھے مگر اسی دوران میں آرب کے ایک ساتھی نے ہم پر حملہ کر دیا اور ہمیں اپنا دفاع کرنا پڑا۔

”میں تم دونوں سے بہت خوش ہوں جس طرح ایک انسان کی جان بچانا ساری انسانیت کی جان بچانا ہوتا ہے اسی طرح ایک عورت کی آبرو بچانا بھی پوری عورت ذات کی آبرو کی حفاظت کرنے کے برابر ہے۔“

سجاول نے اردو میں کہا۔ ”بڑی بہن، آپ آقا جان سے کہیں کہ وہ اپنے آدمیوں کو اپنے کنٹرول میں رکھیں۔ وہ اکثر اپنی حد پار کر جاتے ہیں۔ آپ جانتی ہیں انہوں نے وہاں پاکستان میں بھی دو مرتبہ ایسا کیا ہے اور ہم پر حملہ آور ہوئے ہیں۔“

میں نے اس کا ترجمہ انگلش میں بڑی بیگم تک پہنچایا۔ بہرحال بڑی بیگم نے مجھے اور

سجاول کو محتاط رہنے کا مشورہ دیا اور یہ بھی کہا کہ ہم بلا ضرورت ڈی پیلس سے باہر نہ نکلیں انہوں نے مختصر الفاظ میں ہمیں صرف اتنا بتایا کہ چند برس پہلے یو ایس اے کی ایک بڑی سکیورٹی ایجنسی سے چند سو افراد سکیورٹی کے مقاصد کے لیے یہاں لائے گئے تھے مگر پھر ان کی ضرورت بڑھتی چلی گئی اور ان کی تعداد اور اہمیت میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا اب صورتِ حال یہ ہے کہ یہ لوگ پورے جزیرے پر حاوی ہونے کی کوشش کر رہے ہیں اور مقامی لوگوں کی باہمی لڑائی سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

○......❖......○

بڑی بیگم سے ملاقات کے بعد ہم انیکسی میں واپس آ گئے۔ میرے کندھے میں شدید درد ہو رہا تھا۔ جھڑپ کے شروع میں یہاں وزنی رائفل کی زوردار ضرب لگی تھی۔ دراصل یہ وہی کندھا تھا جہاں کچھ عرصہ پہلے ''ہتھ جوڑی'' کے دوران میں سجاول کا تباہ کن گھونسا لگا تھا اور مجھے اپنی ہڈیاں کڑکتی محسوس ہوئی تھیں۔ اب یہ ناقابلِ فراموش چوٹ پھر سے جاگ گئی تھی۔

میری تکلیف کو محسوس کرتے ہوئے سجاول نے ایک بار پھر بڑی بیگم کو فون کیا۔ قریباً پندرہ منٹ بعد ایک ملائیشین لیڈی ڈاکٹر موقع پر پہنچ گئی۔ اس نے میرے کندھے کو ہلا جلا کر دیکھا۔ اس کے خیال میں ایکسرے وغیرہ کی ضرورت تھی مگر اس وقت شہر کے حالات ٹھیک نہیں تھے اور ڈی پیلس سے باہر نکلنا نامناسب تھا۔ اس نے درد روکنے کے لیے ایک انجکشن لگایا، کھانے کے لیے دوا دی۔ ایک آرام دہ پٹی سے اس نے میرے کندھے کو پوری طرح جکڑ دیا اور آرام کی ہدایت کی۔

تنہائی ملتے ہی انیق نے مجھ سے کہا۔ ''جو کچھ بھی ہے شاہ زیب بھائی، سجاول انڈین ولن امریش پوری سے کم نہیں ہے۔ میں نے کہا تھا نا کہ آپ اینا بھ بچن بننے کی کوشش کریں گے تو یہ ضرور آپ کو کوئی گہری چوٹ لگا جائے گا۔''

''اگر اس نے سن لیا نا تو تم سے وہی سلوک کرے گا جو امریش پوری اپنی فلم کی ہیروئن وغیرہ سے کرتا ہے۔''

''آپ مجھے اس سلسلے میں انڈر اسٹیمیٹ کرتے ہیں۔ میں بس آپ کی وجہ سے چپ رہتا ہوں ورنہ اس ڈیش ڈیش کو ٹھیک ٹھاک ٹف ٹائم دے سکتا ہوں۔''

''ڈیش ڈیش؟ یہ کیا ہے؟''

''یعنی یہ خالی جگہ ہے، یہاں آپ اپنی مرضی سے ''لفظ'' بھر سکتے ہیں۔ کوئی بھی پلید جانور وغیرہ......''

رات کے اس پہر بھی ڈی پیلس کے باہر بہت سے افراد جمع تھے اور شور شرابا کر رہے تھے۔ پس منظر میں فائرنگ کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ کسی وقت بارودی مواد کا دھماکا ہو جاتا تھا اور آواز دور تک گونجتی محسوس ہوتی تھی۔ یہ ساری آوازیں شہر کے مختلف حصوں سے آ رہی تھیں۔ میں نے انیق سے کہا۔ ''جاؤ دیکھو یہ نعرے بازی کیوں ہو رہی ہے؟''

انیق دیکھنے چلا گیا۔ کچھ دیر بعد آ کر اس نے بتایا کہ یہ وہی کل والا پھڈا ہے۔ ریان فردوس نے جن غیر ملکیوں کو قتل ہونے سے بچایا تھا وہ اب ڈی پیلس میں ہی ہیں۔ لوگ عزت مآب ریان فردوس سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ ان لوگوں میں سے مردوں کو ان کے حوالے کر دیا جائے تاکہ وہ انہیں مار کر اپنے ساتھیوں کا بدلہ لے سکیں۔

''مطلب یہ ہے کہ فساد کی آگ ٹھنڈی نہیں ہو پا رہی۔''

''جی ہاں......اور آپ کے لیے ایک اور خبر بھی ہے۔ ہوٹل واشنگٹن میں آپ کی جن لوگوں سے مارا ماری ہوئی ہے، ان میں سے ایک بندہ بری طرح زخمی ہے۔ وہ پہلے ہی ایک ٹانگ سے معذور تھا۔''

میرے ذہن میں فوراً اس شخص کا خیال آیا جو لنگڑاتا ہوا مجھ پر جھپٹا تھا اور میرے جسم میں سنگین اتارنے کی کوشش کی تھی۔

''کیا ہوا ہے اسے؟''

''یہ تو آپ اپنی ٹانگ شریف سے پوچھیں کہ اس نے کیا کیا ہے۔ آپ کی ٹھوکر سے بے چارے کی دو پسلیاں ٹوٹ کر پھیپھڑے میں جا گھسی ہیں۔ اسپتال میں بے ہوش پڑا ہے۔''

''لیکن وہاں جو کچھ ہو رہا تھا وہ تم نے نہیں ہم نے دیکھا ہے۔ بے بس عورتوں کو کھلونا بنایا جا رہا تھا اور یہ بندہ ان میں سے تھا جو اس کھیل کی نگرانی کر رہے تھے۔''

''بہرحال اس کی حالت نازک ہے۔ مجھے ایک سکھ گارڈ کرخت سنگھ نے بتایا ہے۔''

''کرخت سنگھ؟ یہ کیا نام ہے؟''

''ان لوگوں کے نام ایسے ہی ہوتے ہیں جی۔ لگتا ہے کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو افراتفری میں جو چیز سامنے نظر آئے اسی پر نام رکھ دیتے ہیں۔ کرخت سنگھ، درخت سنگھ، دیوار سنگھ، دروازہ سنگھ، پرنالہ سنگھ، ڈلیش سنگھ......''

''پھر ڈلیش دے رہے ہو۔''

''کوئی بھی گندہ سا نام رکھ لیں۔ سب کچھ ممکن ہے لیکن کرخت سنگھ ہے اچھا آدمی۔ پرار تھنا کر رہا تھا کہ وہ لنگڑا گارڈ بچ جائے تا کہ آپ کسی مشکل میں نہ پڑیں۔''

اگلا دن بھی اسی کشمکش اور گومگو میں گزرا۔ ڈی پیلس میں اور ڈی پیلس سے باہر صورتِ حال کشیدہ تھی۔ یہ بھی پتا چلا کہ ریان فردوس اپنی دوسری بیوی کے بیٹے رائے زل سے اپنے برادرِ نسبتی آدم کی ہلاکت کے لیے خون کا بدلہ خون مانگ رہا ہے۔ اس روز اس کے سوا کوئی اہم واقعہ نہیں ہوا کہ مجھے ایک بکتر بند گاڑی کے ذریعے قریبی کلینک میں لے جایا گیا اور میرے کندھے کے دو تین ایکسرے ہوئے۔ پتا چلا کہ کندھے کی ہڈی INFRAGLENOLD میں ایک ہیئر لائن فریکچر موجود ہے۔ آرتھو پیڈک ڈاکٹر نے کچھ ضروری ادویات لکھ دیں اور ہدایت کی کہ اگلے دو ہفتے تک کندھے کو مکمل ریسٹ دوں۔ لچک دار پٹی بھی کر دی گئی۔

○......❖......○

یہ اسی رات کوئی گیارہ بجے کا عمل تھا۔ سجاول ڈرنک کر کے سو چکا تھا۔ انیق ''ڈی وی ڈی'' پر ایک پرانی انڈین فلم دیکھ رہا تھا۔ میں کندھے کی تکلیف کے سبب کچھ بے چین سا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ اگر گولی سے افاقہ نہیں ہوا تو انیق سے درد کش انجکشن لگوا لوں گا۔ اتنے میں انٹر کام کا بزر گونجا۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے آنے والی آواز نے چونکا دیا۔ میں اس نسوانی لیکن قدرے بھاری آواز کو بخوبی پہچانتا تھا۔ یہ بڑی بیگم نسا نورل کی بھتیجی قسطینا کی آواز تھی۔

''تم شاہ زیب بول رہے ہو؟'' اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''جی ہاں۔'' میں نے بھی انگلش میں جواب دیا۔

''میں تم سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ کیا تم انیکسی کے میٹنگ روم میں آسکتے ہو؟''

میں نے ذرا توقف کر کے کہا۔ ''اگر آپ کا حکم ہے تو حاضر ہو جاتا ہوں۔''

''کسی کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی ساتھ لانے کی ضرورت ہے۔'' سپاٹ لہجے میں کہا گیا۔

''ٹھیک ہے، جیسا آپ کہتی ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''او کے، ویٹ کر رہی ہوں۔'' انٹر کام خاموش ہو گیا۔

انیق بھی یہ گفتگو سن رہا تھا۔ ''میٹنگ روم میں طلب کیا ہے۔'' میں نے بتایا۔

''کوئی چکر شکر نہ ہو۔ سجاول سے مشورہ کر لیں۔'' انیق نے کہا۔

''نہیں، اسے کیوں بے آرام کریں۔'' میں نے کہا اور جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

انیق نے پھر اعتراض کیا لیکن میں نے رَد کر دیا۔

قریباً دس منٹ بعد میں انیکسی کے میٹنگ روم میں موجود تھا۔ یہ کمرا گول شکل میں تھا اور بہت زیادہ بڑا نہیں تھا۔ دیدہ زیب فرش کے درمیان ایک بڑی گول میز تھی، جس کے ارد گرد کم و بیش بیس آرام دہ کرسیاں موجود تھیں۔ ان میں ایک صدارتی کرسی بھی تھی۔ دیواروں پر ایل سی ڈیز لگی ہوئی تھیں اور اس جزیرے کا ایک تفصیلی نقشہ بھی ایک دیوار پر آویزاں تھا۔

صدارتی کرسی پر قسطینا بیٹھی تھی۔ میں اسے پہلی بار یونیفارم کے بغیر دیکھ رہا تھا۔ اس نے نیلے رنگ کا ایک ٹریک سوٹ پہنا ہوا تھا اور بال پونی ٹیل کی صورت بندھے تھے۔ پاؤں میں جوگرز نظر آ رہے تھے۔ تاہم اس لباس میں بھی اس کی اسمارٹ کمر سے ایک ہولسٹر منسلک تھا جس میں سے چھوٹے سے طاقتور بریٹا پسٹل کا دستہ جھلک دکھا رہا تھا۔ ایک نہایت تنومند ملائیشین گارڈ قسطینا کے عقب میں چوکس کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر پتھر توڑنے والے کسی طاقتور انجن کی شبیہہ ذہن میں ابھرتی تھی۔ اس شخص کی سوجی سوجی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔

جونہی میں اندر داخل ہوا قسطینا نے مسلح گارڈ کو باہر جانے کا حکم دیا۔ وہ فوجی انداز میں سلیوٹ کر کے باہر نکل گیا اور اس کے عقب میں میٹنگ روم کا آٹومیٹک دروازہ بند ہو گیا۔ باہر سے آنے والی آوازیں مکمل طور پر ختم ہو گئیں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہ میٹنگ روم ساؤنڈ پروف ہے۔

میں نے قسطینا کو سلام کیا۔ اس نے مجھے اپنے سامنے کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ اس کا سرخ و سپید چہرہ ہمیشہ کی طرح تمتمایا ہوا تھا۔ وہ تلخ لہجے اور شستہ انگلش میں بولی۔ ”مسٹر شاہ زائب! تم یقیناً کام کے بندے ہو، ورنہ عزت مآب تمہیں یہاں جاماجی میں کیوں لے کر آتے، لیکن تم نے آتے ساتھ ہی اپنی حد سے تجاوز کیا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”شاید یور ہائی نس کا اشارہ کل ہوٹل میں پیش آنے والے واقعے کی طرف ہے۔“

وہ سنی اَن سنی کرتے ہوئے بولی۔ ”بالفرض محال وہاں کوئی غیر قانونی یا غیر اخلاقی کام ہو بھی رہا تھا تو تمہیں اس میں براہِ راست مداخلت کرنے کی اجازت کس نے دی۔ تم ذمے دار افراد کو اطلاع دے سکتے تھے۔ انکل آقا جان اور حلمی تھے۔ عزت مآب اور بڑی بیگم تھیں......“

”ہم بالکل ایسا ہی چاہتے تھے یور ہائی نس! لیکن ہمیں اس کا موقع ہی نہیں ملا۔ اچانک ہم پر حملہ کر دیا گیا اور ہمیں دفاع کرنا پڑا۔“

''تم نے دخل اندازی کی...... اپنی حد سے اور اوقات سے آگے بڑھے، اسی لیے یہ سب کچھ ہوا...... تمہیں پتا ہے، تمہاری وجہ سے جو گارڈ شدید زخمی ہوا ہے، وہ کون تھا؟''

''مجھے نہیں پتا جی...... لیکن وہ انہی لوگوں میں سے تھا جو وہاں سخت غیر اخلاقی کارروائی کی نگرانی کر رہے تھے۔''

''وہ وہاں نہیں تھا۔'' قسطینا اچانک گرج کر بولی۔ ''وہ دنگا فساد کی آوازیں سن کر باہر سے آیا تھا...... اور تمہیں کیا پتا وہ کون تھا؟ اس نے کتنا دکھ سہا ہے ان گوری چمڑی والوں کی من مانیوں سے...... اور ان کے کرتوتوں سے۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے قسطینا کے لہجے میں جیسے نفرت کی بجلی کوند گئی۔

''ایک عورت کی آبرو لوٹنے سے بڑا کرتوت اور کیا ہو سکتا ہے یور ہائی نس! اور یہ لوگ ڈنکے کی چوٹ پر قانون کو اپنے ہاتھ میں لے رہے تھے۔''

''تم ہمیں قانون بتاؤ گے؟'' وہ زور سے گرجی اور حسبِ عادت اپنا ہاتھ میز پر مارا۔ ایک کپ میں کچھ بچی کھچی کافی پڑی تھی۔ ہاتھ لگنے سے پلیٹ اور کپ بری طرح اچھلے۔ کچھ کافی میرے چہرے اور گردن پر گری۔ میں نے بھنا کر اس کی طرف دیکھا۔ میرا یوں دیکھنا ہی اس نازک مزاج کو اور بھڑکا گیا۔ ''او یو سن آف......'' اس نے الٹے ہاتھ کا تھپڑ میرے منہ پر جڑا۔

ایک سیکنڈ کے لیے میں سناٹے میں رہ گیا۔ جب اس نے دوسری بار تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا تو میں نے اس کی خوب صورت کلائی تھام لی۔ یہ ایک طرح سے مزاحمت کا اعلان تھا۔ وہ سرتاپا شعلہ بن گئی۔ اس نے چلاتے ہوئے مجھ پر باقاعدہ حملہ کیا۔ میں نے اس کے دونوں بازو تھام لیے۔ اسی دوران میں اس نے پاؤں سے گول میز کی ٹانگ پر لگا ہوا کوئی کھٹکا دبا دیا۔ ساؤنڈ پروف کمرے کا آٹومیٹک دروازہ کھلا اور وہی قوی جثہ گارڈ اندر لپکا جسے تھوڑی دیر پہلے قسطینا نے باہر بھیجا تھا۔ وہ آتے ساتھ ہی مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ وہ لڑائی بھڑائی میں ماہر لگتا تھا۔ خاص طور سے اس کے ہاتھ پتھر کوٹنے والے ہتھوڑوں جیسے ہی تھے۔ اس کی ایک سخت ضرب میرے پہلے سے زخمی کندھے پر لگی اور پورا بازو جھنجھنا اٹھا۔ قسطینا کی کلائی پر سے میری گرفت ختم ہو گئی۔ اس نے بازو گھما کر ایک ضرب میرے سینے کے نچلے حصے میں لگائی۔ مارشل آرٹ میں یہ بڑی کارگر ضرب سمجھی جاتی ہے۔ حریف کی سانس بند ہو سکتی ہے اور پھیپھڑا زخمی ہونے کے سبب وہ جان سے بھی جا سکتا ہے۔ چند سیکنڈ کے لیے میری آنکھوں تلے بھی اندھیرا چھا گیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ احساس بھی ہوا کہ جو لڑکی مجھ پر جھپٹی ہے کوئی

معمولی چیز نہیں ہے۔ ان دونوں نے مجھے رگید کر رکھ دیا۔ ایک ماہر فائٹر کی طرح گرانڈیل گارڈ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ میرا کندھا زخمی ہو گیا ہے یا پہلے سے زخمی ہے۔ اس نے ساری توجہ میرے کندھے پر مرکوز کر دی اور بیدردی سے اس پر اپنے مکوں کے ہتھوڑے برسائے۔ جس کندھے کو آرام اور نگہداشت کی ضرورت تھی وہ طوفان کی زد میں تھا۔ میں نے بھنا کر ٹانگ کی ایک سخت ضرب گارڈ کے سینے پر ماری۔ وہ اس بری طرح دیوار سے ٹکرایا کہ اوندھے منہ پٹ سے ٹوٹی ہوئی صدارتی کرسی پر گرا۔ لوہا گرم دیکھ کر میں نے ایک اور چوٹ اس کی کنپٹی پر لگائی اور وہ اگلے ڈیڑھ دو گھنٹے کے لیے مکمل ریسٹ پر چلا گیا۔ تاہم اس کارروائی کے دوران میں قسطینا نے مجھ پر ایک زوردار حملہ کر دیا۔ وہ کسی جنگلی بلی کی طرح مجھ پر چڑھ دوڑی۔ وہ اپنے ہاتھ پاؤں کو مشینی انداز میں حرکت دے رہی تھی۔ ابھی تک اس نے اپنے ہولسٹر سے پستول نہیں نکالا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اسے اپنے آپ پر پورا اعتماد ہے اور یہ اعتماد کچھ ایسا غلط بھی نہیں تھا۔ مجھے ایک بار تو اسے سنبھالتے ہوئے دانتوں پسینے آ گئے۔ میرا مضروب کندھا بھی جیسے سن ہو کر رہ گیا تھا۔ اب تک میں قسطینا کو کوئی خطرناک ضرب لگانے سے باز رہا تھا مگر جب ایک موقعے پر مجھے لگا کہ وہ سچ مچ کوئی مہلک وار کر جائے گی تو میں نے بھی اسے دو چار سخت چوٹیں لگائیں۔ وہ مارشل آرٹ کی سوجھ بوجھ کے علاوہ بے حد طرار بھی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ چوٹ سہنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ پورا میٹنگ روم اب کباڑ کا منظر پیش کر رہا تھا۔ اندرونی شیشے ٹوٹ گئے تھے، لاکھوں روپے آرائش کی چیزیں، بیکار ٹکڑوں کی طرح فرش پر بکھری ہوئی تھیں۔ کمرا ساؤنڈ پروف ہونے کے سبب باہر کسی کو کچھ پتا نہیں تھا کہ اندر کیا چل رہا ہے۔

میں پیچھے ہٹتے ہوئے کسی چیز سے ٹکرا کر پشت کے بل گرا تو وہ میرے اوپر چڑھ بیٹھی۔ میں نے پلٹ کر اسے نیچے کر دیا۔ اگلے ہی لمحے وہ میرے ایک فرشی داؤ کی زد میں تھی۔ اب اگر وہ چاہتی بھی تو اپنا ہاتھ پستول تک نہیں پہنچا سکتی تھی۔ میرا ایک گھٹنا اس کے پیٹ پر تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ کلائیوں کے پاس سے میری مضبوط گرفت میں تھے۔ اس کے ٹریک سوٹ کا ''اپر'' پھٹ گیا تھا اور آنکھوں کو چندھیا دینے والا جسم جھانک رہا تھا مگر ان سنگین لمحوں میں نہ ہی اسے اپنی عریانی کی پروا تھی اور نہ میرا دھیان اس ''ہوش ربائی'' کی طرف تھا۔ میں نے الٹے ہاتھ کا تھپڑ رسید کرنے کے لیے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا۔ لیکن پھر اسے بے بس دیکھ کر ارادہ ملتوی کر دیا۔ اس کا چہرہ سرخ انگارہ تھا اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ وہ اپنے جسم کے نوے فیصد حصے کو حرکت دینے کے قابل نہیں تھی۔

میں نے اپنے بائیں ہاتھ سے اس کے پھٹے ہوئے گریبان کو درست کیا اور سرسراتی آواز میں پوچھا۔ ''بس...... یا ابھی کچھ اور؟''

میرے فقرے سے وہ پھر بھڑک اٹھی۔ اس نے یک لخت مچھلی کی طرح تڑپ کر خود کو میرے شکنجے سے نکالنا چاہا۔ میں نے اس کی دونوں پنڈلیوں کو اپنی بائیں ٹانگ کی لپیٹ میں لے لیا اور گھٹنے کا دباؤ بڑھا دیا۔ وہ ناکام ہوئی اور ایک بار پھر بے بسی سے میری طرف دیکھنے لگی۔ ہر سانس کے ساتھ اس کی گردن میں سامنے کی طرف ایک گڑھا پڑتا تھا جو اس بات کا غماز تھا کہ وہ بے طرح ہانپ رہی ہے۔ اس کے تاثرات اب بھی یہی گواہی دے رہے تھے کہ وہ ہار ماننے کو تیار نہیں۔ اگر میں نے اسے چھوڑا تو پھر مجھ پر پل پڑے گی۔

''دور ہو جاؤ مجھ سے۔'' وہ زور لگاتے ہوئے پھنکاری۔

''میرے دور ہونے کا دارومدار اس بات پر ہے کہ یور ہائی نس کا آئندہ رویہ کیا ہوتا ہے۔ کیا تم یہ وعدہ کرتی ہو کہ اب یہ دنگا نہیں مچاؤ گی؟''

''منہ بند کرو...... منہ بند کرو۔'' وہ انگلش میں دہاڑی اور پھر مچلنے لگی۔

غالباً وہ ان لوگوں میں سے تھی جو کسی صورت ہار ماننے کو تیار نہیں ہوتے۔ یعنی رسّی جل بھی جائے تو بل برقرار رہتا ہے۔ میں نے کندھے کے شدید درد کے باوجود اسے اسی طرح جکڑے رکھا۔ قدرے نرم لہجے میں کہا۔ ''میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں، ہم نے وہاں کوئی زیادتی نہیں کی۔ تم ہی جیسی کچھ بے بس لڑکیوں کو شرابی غنڈوں سے بچانا چاہا۔ ہم خود کوئی کارروائی کرنا نہیں چاہتے تھے مگر اس سے پہلے کہ ہم کسی سے رابطہ کرتے ہم پر اندھا دھند حملہ کر دیا گیا۔''

''لیکن تم نے اس سارے معاملے میں اپنی گندی ناک گھسائی ہی کیوں؟ چچا (آقا جان) بھی یہ بتاتے ہیں کہ تم وہاں پاکستان میں احمقانہ دخل اندازی کرتے رہے ہو۔ چلو وہ تو پاکستان تھا...... تمہیں یہاں ''تشریف'' لائے ہوئے وقت ہی کتنا ہوا ہے؟ اور تم یہاں کے ڈی آئی جی بن بیٹھے ہو۔ تمہیں کیا پتا یہاں کیا چل رہا ہے؟ اور کس کے ساتھ کیا بیت رہی ہے؟''

''اگر مجھے نہیں پتا تو تم بتا دو۔''

وہ گرجی۔ ''یہ جس کریم نامی بندے کو تم نے زخمی کیا ہے، تمہیں پتا ہے اس کا قصور کیا تھا؟ تمہیں پتا ہے کہ یہ ایک ٹانگ سے اپاہج کیسے ہوا......'' پھر وہ ذرا توقف سے بولی۔ ''اس کا قصور یہ تھا کہ اس نے ایک امریکن لڑکی کو ہاتھ لگایا تھا، ٹچ کر کے اس کے جسم کو پلید کر دیا

تھا۔ یہ ہمارے بیچ کرنے سے پلید ہو جاتے ہیں۔ ہم ان کے لیے جانوروں بلکہ کیڑے مکوڑوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ناپاک، مکروہ کیڑے مکوڑے، عقل سمجھ سے خالی، گندی نالیوں اور گٹروں میں رینگنے والے، اور یہ آسمان سے اتری ہوئی مخلوق ہیں۔ قدرت نے ان کو اعلیٰ ارفع دماغ عطا کیے ہوئے ہیں۔ یہ اپنی ماں کے پیٹ سے نہیں بلکہ سائنس کے پیٹ سے پیدا ہوتے ہیں اور پیدا ہوتے ہی اونچی ہواؤں میں اُڑنے لگتے ہیں...... زمین پر رینگتے ہوئے کیڑے مکوڑوں کو دیکھنے کے لیے اور ان کو مارنے کے لیے......'' وہ ذرا رکی۔ شاید اسے احساس ہوا تھا کہ وہ موضوع سے ہٹ گئی ہے۔

ذرا توقف کے بعد بولی۔ ''کریم کی موٹر سائیکل کو ایک امریکن ایتھلیٹ مارگریٹ نے اپنی اسپورٹ کار سے ٹکر ماری۔ موٹر سائیکل پر بیٹھا ہوا کریم کا بچہ گر کر زخمی ہوا۔ کریم کو بھی چوٹ آئی۔ معذرت کے بجائے مارگریٹ نے نکلنے کی کوشش کی۔ اتنی بڑی سوپر پاور کی شہری...... وہ کریم جیسے مکوڑے سے معذرت کیوں کرتی۔ کریم نے اسے گاڑی چلانے سے روکنا چاہا اور اس کو بازو سے پکڑا۔ یہی اس کے لیے قیامت بن گیا۔ ایجنسی کے اہلکاروں نے اسے تھانے میں بند کر کے اتنا تشدد کیا کہ اس کا پیشاب بند ہو گیا اور اسے اسپتال میں داخل کرنا پڑا۔ اسپتال میں بھی اسے ہتھکڑیاں لگی ہوئی تھیں جیسے وہ کوئی بڑا دہشت گرد ہو اور نائن الیون بھی اسی نے ترتیب دیا ہو۔ کریم کا بھائی عظیم اس سے اسپتال میں ملنے گیا تو اسے وہاں سے بھگانے کی کوشش کی گئی۔ وہ ایجنسی کے دو اہلکاروں سے لڑ پڑا اور ایک اہلکار کی ناک کی ہڈی توڑ کر بھاگ نکلا۔ وہ دہشت گرد قرار پایا۔ اس کی پوری فیملی ''خطرناک ترین'' لوگوں کی لسٹ میں شامل ہو گئی۔ ان کا چھوٹا سا گھر جہاں شاید سبزی کاٹنے والی چھری بھی نہیں تھی، خطرناک ہتھیاروں اور کیمیکل بموں کا مرکز قرار پایا۔ ایسے ہی کرتے ہیں، ایسے ہی کرتے ہیں یہ لوگ۔''

وہ سانس لینے کے لیے رکی اور ایک بار پھر خود کو چھڑانے کی ادھوری سی کوشش کی۔ تب جنونی انداز میں بولی۔ ''وہاں کابل میں بھی تو یہی ہوا تھا...... بغداد میں بھی تو یہی ہوا تھا۔ وہاں بہت زہریلے قسم کے جراثیمی اور کیمیائی ہتھیار تھے جو اس ساری دنیا کو کئی بار برباد کر سکتے تھے لیکن...... لیکن وہاں سے نکلا کیا...... چند میزائل...... جس سے دس گنا تباہ کن مواد اس سوپر پاور کے ایک جنگی بحری جہاز پر موجود ہوتا ہے...... ہاں یہ لوگ ایسے ہی کرتے ہیں۔''

اس کی آواز درد میں ڈوبی ہوئی تھی۔ طیش کی بلند لہریں اب آنکھوں میں نمی کی صورت اختیار کر رہی تھیں۔

میں نے گرفت ڈھیلی کر دی۔ وہ اٹھ بیٹھی لیکن اب اس نے کسی طرح کی ''ایگریشن'' کا مظاہرہ نہیں کیا۔ میں نے پستول اس کے ہولسٹر میں ہی رہنے دیا تھا اور یہ ایک طرح کا رسک بھی تھا، مگر اس نے اپنے اس ہتھیار کی طرف توجہ نہیں دی۔ وہ تمتمائے ہوئے چہرے کے ساتھ کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ وہ بدستور دکھ آمیز کیفیت میں تھی۔ اس کی نگاہیں جیسے ماضی قریب کے واقعات میں پیوست تھیں۔ وہ بولی۔ ''ایک نئی گن لے کر آئے ہوئے ہیں یہ ایجنسی والے...... جو چار انچ موٹے کنکریٹ کی دوسری جانب بھی مار کر لیتی ہے۔ ایسی گنز اور ایسے میزائلوں کا عملی تجربہ کرنے کے لیے اور ان کی شاندار ویڈیوز وغیرہ بنانے کے لیے ان امریکیوں کو ہم جیسے لوگ ہی چاہیے ہوتے ہیں۔ سو اس کیس میں عظیم اور اس کی فیملی ٹارگٹ بنی...... رئیل ٹارگٹ...... ان خبیثوں کا رئیل ٹارگٹ......'' وہ بڑی نفرت سے بولی۔ اس کا گارڈ ابھی تک فرش پر بے سدھ پڑا تھا...... گہری سانسیں لے رہا تھا۔

میں نے اٹھ کر اس کی نبض دیکھی۔ اس کے سر کے ڈبل گومڑ کا معائنہ کیا اور اطمینان بخش انداز میں سر ہلایا۔ ''یہ ایک گھنٹے کے اندر ہوش میں آجائے گا۔ فکر کی کوئی بات نہیں لیکن اگر تم چاہتی ہو تو ڈاکٹر کو دکھا لو۔''

اس نے وہی بٹن دبایا جو گول میز کے زیریں حصے میں تھا اور پاؤں سے آپریٹ کرتا تھا۔ سلائیڈنگ دروازہ حرکت میں آیا اور دو مسلح گارڈز اندر داخل ہوئے۔ میٹنگ روم کا ''شاندار نقشہ'' دیکھ کر ان کے اپنے چہروں کا نقشہ بگڑ گیا۔ انھوں نے وہ چند خراشیں بھی دیکھیں جو لڑائی بھڑائی میں قسطینا کے چہرے اور گردن پر آئی تھیں پھر انھوں نے فرش پر بے سدھ پڑے اپنے ساتھی کو ملاحظہ کیا۔ ان کے تیور بگڑے، مگر قسطینا کی طرف دیکھ کر وہ کسی بھی ردِعمل سے باز رہے۔ قسطینا ان کے قریب چلی گئی اور کچھ کھسر پھسر کی۔ قسطینا سے ضروری ہدایات لینے کے بعد دونوں گارڈز نے بے ہوش گارڈ کو اٹھایا اور باہر لے گئے۔

قسطینا نے اپنی بات تھوڑے سے توقف کے بعد جاری رکھی۔ اس کی گفتگو سے پتا چلا کہ ایجنسی والوں نے اپنی نئی گن کا جو ''تجربہ'' کیا، اس میں بے گناہ عظیم، اس کی بیوی، تین سالہ بچہ اور برادرِ نسبتی موقع پر ہی ہلاک ہو گئے تھے۔ کریم بمشکل جان بچا کر بھاگا تھا، اس کی ٹانگ شدید زخمی ہو گئی تھی۔ اس کی ٹانگ میں گولی نہیں لگی تھی بلکہ اپنے ہی بھائی کی کھوپڑی کا ایک پرخچا لگا تھا۔ وہ گولیاں ایسے ہی ہڈیوں کے پرخچے اڑانے والی تھیں۔ اپنے ہی بھائی کی ہڈی کے ٹکڑے نے کریم کی ٹانگ کے کئی پٹھے کاٹ ڈالے تھے اور وہ مستقل طور پر لنگڑاہٹ کا شکار ہو گیا تھا۔ ہاں اس میں امریکی ایجنسی کا بھلا کیا قصور تھا۔ مقتول کی ہڈی اُڑ کر کسی بھی

سمت میں جا سکتی تھی اور اس ''عظیم دہشت گرد'' کی ہڈی اُڑ کر اس کے اپنے ہی بھائی کو جا لگی تھی۔

میں قسطینا کی باتیں سنتا رہا اور مجھے لگنے لگا کہ وہ اتنی غلط بھی نہیں ہے جتنا میں اسے سمجھ رہا ہوں۔ اس کا پیارا باپ اس غیر ملکی ایجنسی نے مار ڈالا تھا اور وہ اس کی یاد کو سینے سے لگائے، اس کے انتقام کی حتی الامکان کوشش کر رہی تھی۔ میرے ساتھ قسطینا کا رویہ کچھ بہتر ہو گیا تھا پھر بھی اسے دوستانہ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ یہ ایجنسی آخر ہے کیا اور یہ یہاں اتنے اختیار کی مالک کیسے بنی ہے؟ لیکن پتا نہیں لگا کہ میرے اس سوال سے اس کے موڈ پر کیا اثر پڑے گا۔ میرے سوال کرنے سے پہلے ہی وہ جیسے میری سوچ کو بھانپ گئی۔ ذرا ٹھہرے لہجے میں بولی۔ ''مجھے لگتا ہے کہ عزت مآب یا بڑی بیگم نے ابھی تم لوگوں کو ایجنسی والوں کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں بتایا ہے۔''

''نہیں، ابھی تو کچھ بھی نہیں بتایا گیا۔''

وہ بولی۔ ''اس بات کا تو تم لوگوں کو یقیناً پتا ہوگا کہ پہلی بیوی سے عزت مآب کا ایک ہی بیٹا ہے۔ اس کا نام رائے زل ہے۔ رائے زل اور اس کی والدہ نے عزت مآب کے لیے عرصۂ حیات تنگ کر رکھا ہے۔ وہ انہی لوگوں کی وجہ سے پاکستان شفٹ ہوئے تھے، مگر رائے زل کی دشمنی کہیں بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑ رہی۔ اس دشمنی نے ہمیں بہت دکھ دیئے ہیں اور ان میں سے ہی ایک دکھ یہ ایجنسی بھی ہے۔ چھ سات سال پہلے عزت مآب سے غلطی ہوئی اور انہوں نے رائے زل کی بڑھتی ہوئی ریشہ دوانیوں سے بچنے کے لیے اس غیر ملکی سکیورٹی ایجنسی سے چند سو تربیت یافتہ گارڈز یہاں منگوائے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گارڈز کی نفری اور جدید ہتھیاروں کی ضرورت بڑھتی چلی گئی۔ سکیورٹی ایجنسی کی موجودگی میں عزت مآب مطمئن ہوتے چلے گئے لیکن ایجنسی والے اندر ہی اندر اپنے ہاتھ پاؤں پھیلاتے رہے۔ وہی کھیل جو یہ لوگ ہمیشہ سے تیسری دنیا کے لوگوں کے ساتھ کھیلتے رہے ہیں اور اب بھی کئی اسلامی ممالک میں کھیل رہے ہیں۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ پچھلے چھ سات سالوں میں یہ لوگ ہماری باہمی لڑائی کی وجہ سے بتدریج مضبوط ہوتے گئے ہیں اور اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ ان لوگوں نے ہمیں بالکل کارنر کر دیا ہے۔ اب پچھلے تقریباً ایک برس میں یہ بات بالکل ثابت ہوگئی ہے کہ یہ گوری چمڑی والے دہرا کھیل کھیل رہے ہیں۔ یہ ہماری باہمی دشمنی کی آگ کو مسلسل بھڑکا رہے ہیں اور نتیجے میں یہاں اپنے پنجے گہرے گاڑتے جا رہے ہیں...... تم نے بھی وہ ویڈیو دیکھی ہوگی جو میں نے پرسوں ڈائننگ ہال میں دکھائی تھی؟''

''جی ہاں۔'' میں نے اثبات میں جواب دیا۔

''اس میں جو امریکن دکھائی دیا تھا رین کوٹ والا...... وہ اس سکیورٹی ایجنسی کا چیف گیرٹ ہے جو اپنے سبز قدموں کے ساتھ یہاں موجود ہے۔ ہم لوگوں کی سادہ دلی ہے کہ ہم ایک عرصے تک یہی سمجھتے رہے کہ یہ لوگ رائے زل کے ساتھ لڑنے میں ہماری مدد کر رہے ہیں مگر آہستہ آہستہ پتا چلا کہ یہ اندر سے ہماری جڑیں بھی کاٹ رہے ہیں۔ یہ ہماری اور رائے زل کی دشمنی کو مسلسل ہوا دے رہے ہیں تاکہ جزیرے میں ان کی اور ان کے ہتھیاروں کی ضرورت روز بروز بڑھتی جائے اور یہ بتدریج یہاں کے مالک و مختار بن جائیں۔ اب اس ویڈیو کے بعد تو کسی قسم کا کوئی شک وشبہ باقی ہی نہیں رہا۔ وہ ویڈیو جزیرے کے اس حصے کی ہے جس پر رائے زل قابض ہے۔ چیف گیرٹ گول چہرے اور بھاری بھارکم جسم والے جس شخص کو اس گمنام ہوٹل کے دروازے پر مل رہا ہے، پتا ہے وہ کون ہے؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

وہ بولی۔ ''یہی ہے عزت مآب کی پہلی بیوی سے ان کا ناخلف بیٹا رائے زل۔ جاما جی کے عام لوگ ایک عرصے تک یہی سمجھتے رہے ہیں کہ چیف گیرٹ ہمارا نجات دہندہ ہے اور چیف اور رائے زل ایک دوسرے کے جانی دشمن ہیں مگر اس ویڈیو نے اس تصور کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی ہے۔ ثابت ہو گیا ہے کہ یہ لوگ اندر سے ملے ہوئے ہیں اور اس پورے جزیرے کو ہڑپ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت معاملات کو بگاڑتے چلے جا رہے ہیں۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہم پوری قوت کے ساتھ ان گوری چمڑی والوں کا مقابلہ کریں، مر جائیں یا مار دیں۔''

اس کے رخسار انگاروں کی طرح دہلک رہے تھے۔ اسی دوران میں ایک فون کال نے قسطینا کو کرسی سے اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ چند سیکنڈ میں اس کے چہرے نے کئی رنگ بدلے۔ وہ تیزی سے باہر جانے کے لیے اٹھی۔ میں نے اس کا بازو تھام لیا۔ وہ پلٹ کر میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے اس کے پھٹے ہوئے گریبان کی طرف اشارہ کیا۔ ''کہیں بھی جانے سے پہلے تم یہ کپڑے بدل لو۔''

وہ جیسے چونک کر اپنے لباس کی طرف دیکھنے لگی پھر اس نے میری جانب دیکھا اور بولی۔ ''شکریہ۔''

میں پوچھنا چاہتا تھا کہ اسے کیا خبر ملی ہے؟ مگر وہ اتنی تیزی میں تھی کہ مجھے اپنا سوال بے محل محسوس ہوا۔

میں اپنا زخمی کندھا دبائے واپس اپنے بیڈ روم میں آ گیا۔ وہاں انیق بیٹھا بے چینی سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ سمجھ گیا کہ قسطینا سے ملاقات کے بعد کوئی ''معرکہ'' پیش آیا ہے۔ اس نے تابڑتوڑ سوال کیے۔ میں نے مختصر جواب دیئے اسی دوران میں ہم نے دیکھا کہ ڈی پیلس میں زبردست ہلچل ہے۔ گاڑیاں اسٹارٹ ہو رہی ہیں۔ گارڈز بھاگ دوڑ کر رہے ہیں۔ ملازمین بلند آوازوں میں ایک دوسرے کو ہدایات دے رہے ہیں۔ اسی دوران میں ڈی پیلس کے عقبی حصے سے ایک ہیلی کاپٹر کی پھڑ پھڑاہٹ سنائی دینے لگی۔

میں نے سجاول کو جگایا اور اس سے کہا کہ وہ بڑے صاحب یا بڑی بیگم وغیرہ کو فون کرے اور پتا چلائے کہ کیا معاملہ پیش آیا ہے۔ سجاول نے کوشش کی مگر دونوں میں سے کسی کے ساتھ رابطہ نہیں ہو سکا۔ بہت سی گاڑیاں اور کئی سو مسلح افراد بڑی تیزی کے ساتھ کسی جانب روانہ ہو گئے۔

کافی کوشش کے بعد سجاول، سنبل سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہوا۔ اس سے صرف اتنا پتا چلا کہ سمندر کے کنارے ایجنسی کے لوگ ایئر پورٹ پر قبضہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کو روکنے کے لیے یہ لوگ جا رہے ہیں۔

سنبل معلومات تو دیتی تھی مگر پوری نہیں۔ ایک جاسوسہ کے طور پر سجاول نے سنبل کا انتخاب درست نہیں کیا تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد ساحلی علاقے کی طرف سے زبردست فائرنگ کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ ہلکے بھاری اور درمیانے ہر طرح کے ہتھیار استعمال ہو رہے تھے۔ گاہے بگاہے کوئی چھ سات انچ دہانے والی گن بھی استعمال ہوتی تھی، گونج دار دھماکے سے روشنی پھیلتی تھی جو پانچ چھ میل دور سے بھی صاف نظر آتی تھی پھر مزید ایسی گنز بھی ہمارے آس پاس استعمال ہونے لگیں اور جنگ کا سا منظر دکھائی دینے لگا۔ یہ شدید ہنگامہ جیسے ایک دم شروع ہوا تھا۔ ایسے ہی قریباً ایک گھنٹے بعد اچانک ختم ہو گیا۔ دو ہیلی کاپٹرز سے مخالفین پر اندھا دھند فائرنگ کی گئی تھی جس کے بعد ایک فریق شاید ہار مان گیا تھا۔ اسی دوران میں میرا رابطہ ابراہیم سے ہو گیا۔

اس نے کہا۔ ''ایجنسی والوں نے ایئر پورٹ پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تھی جسے ہم نے ناکام بنا دیا ہے۔ بہت سے غیر ملکی گارڈز مارے گئے ہیں اور گرفتار ہوئے ہیں۔'' ابراہیم کی آواز جوش سے لرز رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ''اگر آپ ہمیں بتاتے تو ہم بھی اس کارروائی میں کچھ حصہ ڈال سکتے

تھے۔"

"بس جو کچھ بھی ہوا ہے بالکل اچانک ہوا ہے۔ ہمیں بھی تب پتا چلا جب قسطینا فورس کو لے کر یہاں سے نکل چکی تھی۔ بہر حال آپ لوگوں نے بھی تو ایک کارروائی کر ہی ڈالی ہے۔ مجھے ابھی کچھ دیر پہلے ہی پتا چلا ہے کہ آپ لوگوں نے ہوٹل واشنگٹن میں پہنچ کر کچھ بے گناہ غیر ملکی عورتوں کو بلوائیوں کے چنگل سے نکالا تھا، یہ قابلِ تحسین کام ہے۔ والدہ اور والد بھی خوش ہوئے ہیں۔"

"آپ کی بیگم کا کیا حال ہے؟" میں نے زینب کے بارے میں پوچھا۔

"وہ بالکل ٹھیک ہے۔ میں نے اس سے آپ کا ذکر کیا تھا، وہ آپ سے ملنا چاہتی ہے۔"

"آپ جب کہیں میں حاضر ہوں۔"

اسی دوران میں ڈی پیلس کے باہر آتش بازی چھوٹنے لگی۔ آسمان روشنیوں سے بھر گیا۔ لوگ شاید سڑکوں پر نکل آئے تھے اور ائیر پورٹ والی لڑائی کے حوالے سے خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ ٹیلی فون پر ابراہیم نے بھی اس بات کی تصدیق کی۔ میں نے ابراہیم سے کہا۔

"لوگ جذبات میں حدیں پار کرنے لگتے ہیں۔ آپ کے ہاتھوں میں اختیار ہے۔ آپ کوشش کریں کہ کسی کے ساتھ زیادتی نہ ہو۔ کوئی امریکی ہو، روسی ہو، یا پھر اسرائیلی بھی ہو اگر وہ ذاتی طور پر گناہ گار اور مجرم نہیں تو پھر وہ رعایت کا مستحق ہے۔"

ابراہیم نے کہا۔ "عزت مآب اور والدہ صاحبہ کے خیالات بھی سو فیصد یہی ہیں اور اللہ کا حکم بھی یہی ہے۔"

اس رات شہر میں مختلف حصوں سے فائرنگ کی آوازیں آتی رہیں۔ یہ بھی پتا چلا کہ مشتعل لوگوں نے ایجنسی سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے گھروں میں گھس کر لوٹ مار کی ہے۔ چند امریکیوں کے قتل کی خبر بھی گردش کرتی رہی۔ میں یہ سب کچھ سن رہا تھا اور شدید قسم کے تفکر کا شکار تھا۔ مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ یہ "ایجنسی" والے جدید ترین ہتھیاروں سے مسلح ہیں اور ان میں مہارت کی بھی کمی نہیں ہے، ان کی تعداد بھی کچھ کم نہیں تھی اور یہ اتنی آسانی سے ہار ماننے والے نہیں تھے۔ وہ یقیناً اپنے آپ کو تیار اور یکجا کر رہے تھے۔ ممکن تھا کہ اپنے حواریوں کے ساتھ بھی گٹھ جوڑ میں مصروف ہوں۔ وہ کسی بھی وقت زبردست مزاحمت پیش کر سکتے تھے۔ ریان فردوس نے اگر محتاط رویہ اختیار کر رکھا تھا تو اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ان غیر ملکیوں سے خوف زدہ تھا۔

یہی وقت تھا جب میرے بیڈ روم کے دروازے پر مدھم دستک ہوئی۔ ''کون؟'' میں نے پوچھا۔
''میں جاناں ہوں۔'' باہر سے مترنم آواز ابھری اور میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ میرے سیل فون پر اس کی کوئی 200 کالز پچھلے دو تین دن میں آ چکی تھیں، جو میں نے ریسیو نہیں کی تھیں۔ اب وہ خود یہاں آ موجود ہوئی تھی۔ چار و ناچار میں نے دروازہ کھولا۔ وہ جیسے ایک چھناکے سے اندر آ گئی۔ اس نے ساڑی باندھ رکھی تھی۔ کانوں میں بڑے بڑے آویزے تھے اور ریشمی بال آبشار کی طرح کندھے سے کولہوں کی طرف جا رہے تھے۔ حسبِ توقع اس کے چہرے پر ناراضگی اور اداسی تھی۔ ''کیسے ہیں آپ؟'' اس نے دھیمی آواز میں پوچھا۔
''میں ٹھیک ہوں۔''
''میں تو پریشان ہو گئی تھی پھر پتا چلا کہ آپ کے کندھے پر کوئی چوٹ شوٹ آئی ہے۔''
''نہیں کچھ زیادہ نہیں۔ اب بہتر ہوں۔'' میں نے جھوٹ بولا۔
وہ کچھ دیر ناراض نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ اس کے سرخ ملائم ہونٹ پر ابھی تک وہ ننھا سا نشان موجود تھا جو سوئی چبھونے کے نتیجے میں بنا تھا۔ وہاں سے خون کی بوندیں نکال کر اس نے میرے لیے رومانی نظم لکھی تھی۔

میں اسے کیسے بھلا دوں
وہ تو میری رگ رگ میں بس چکا ہے
میں برف کے اندھیرے گھر میں تھی
اور پل پل ختم ہو رہی تھی میری زندگی......وغیرہ......وغیرہ۔

مجھے خاموش پا کر اس نے اپنا رخ کھڑکی کی طرف موڑا۔ آسمان کا ایک حصہ آتش بازی کی وجہ سے سرخ ہو رہا تھا۔ وہ کھوئی کھوئی آواز میں بولی۔ ''شاید یہ ہماری آخری ملاقات ہو شاہ زیب۔''
''ہائیں، یہ کیا کہہ رہی ہو؟''
وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ ''مجھے لگتا ہے شاہ زیب کہ میں نے اپنی اوقات سے بہت آگے سوچنا شروع کر دیا تھا۔ کہاں آپ؟ کہاں میں ایک بازاری اور کچلی مسلی ہوئی عورت۔ میرے خیال میں یہ آپ کی مہربانی اور رحم دلی ہی ہے جو مجھے آپ کی تھوڑی بہت قربت نصیب ہوئی۔ حقیقت میں تو میں آپ کے التفات کے قابل ہی نہیں تھی۔'' اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور نم آنکھوں کے ساتھ بولی۔ ''شاہ زیب! کیا آپ میری جسارتوں پر

مجھے معاف کر سکتے ہیں؟''

''اگر تم آئندہ جسارتیں نہ کرنے کا وعدہ کرو تو۔'' میں نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

وہ بدستور سنجیدہ رہی۔ کھوئے کھوئے انداز میں بولی۔ ''ہم لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں شاہ زیب! خیالی گھوڑوں پر سوار رہتی ہیں۔ نرم دل شہزادے...... بچوں کے قہقہوں سے گونجتے ہوئے آنگن...... محبت کی بارش میں بھیگتے ہوئے موسم۔ ہم سب کے آئیڈیل ایک جیسے ہی ہوتے ہیں اور ہمارے حصے میں محرومیاں بھی ایک جیسی ہی آتی ہیں۔ میں گھر سے نکلی تھی تو ذہن میں یہی تھا کہ اپنی پارسائی پر اور اپنے ماں باپ کی عزت پر کوئی حرف نہیں آنے دوں گی اور ایک نامور ماڈل اور آرٹسٹ بن کر دکھاؤں گی...... لیکن جو کچھ ہوا وہ آپ کے سامنے ہے اور ابھی نہ جانے مزید کیا کچھ ہونا ہے۔''

''اور کچھ نہیں ہوگا۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ ''اگر تم سنبھل جاؤ تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ پاکستان میں بھی اب تمہارے لیے وہ خطرات نہیں ہیں جو پہلے تھے۔''

''ہم لڑکیاں بس ایسی ہی تسلیوں اور ایسے ہی وعدوں پر جیتی ہیں۔'' وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولی۔ ''اب اس زینب کو ہی دیکھیں۔ کہاں سے چل کر کہاں آ گئی۔ اپنوں کو چھوڑا، اپنے گھر بار کو چھوڑا، ایک انجان بندے کے پلے سے بندھ کر ہزاروں میل دور یہاں چلی آئی۔ اسی کو سب کچھ سمجھنے لگی جو اس کا کچھ نہیں تھا، اپنی ساری آس امیدیں اسی کے ساتھ جوڑ کر بیٹھ گئی۔''

زینب کے ذکر نے مجھے چونکایا اور جاناں کی گفتگو میں دلچسپی لینے پر مجبور کر دیا۔ پتا چلا کہ پچھلے چند دنوں میں نوبیاہتا زینب اور جاناں کے درمیان دوستی پروان چڑھی ہے اور وہ کھل کر ایک دوسرے سے دل کی بات کر رہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس اجنبی ماحول اور اجنبی زبان والے انجان لوگوں کے درمیان جاناں کی موجودگی نے زینب کی گھٹن کو کچھ کم کیا ہوگا۔ میں نے جاناں کے لیے کرسی سیدھی کی تاکہ وہ اطمینان کے ساتھ بیٹھ سکے اور بات کر سکے (اس سے پہلے میں جاناں کی باتوں کو بس آدھے دل کے ساتھ ہی سن رہا تھا اور اس کے کچھ فقرے تو مجھے ایسے ہی لگے تھے جیسے کسی ڈرامے کی ہیروئن کوئی غم ناک سین کر رہی ہے)

جاناں کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ میں مرحوم مولوی فدا کی اس یتیم بچی کو بہت قریب سے جانتا ہوں اور اس کی طرف سے ہر وقت باخبر رہنا چاہتا ہوں۔ میں نے اسے زینب کے بارے میں کریدا تو وہ بولی۔ ''چھوٹے صاحب ابراہیم اور زینب کی شادی کی کہانی عجیب ہے شاہ زیب۔ یہ کہانی کم از کم میری سمجھ سے تو بالاتر ہے۔ زینب نوخیز اور خوب صورت ہے لیکن

ایسی بھی خوب صورت نہیں کہ اسے اتنے بڑے پرنس کی دلہن بنانے کے لیے ایسے ایسے پاپڑ بیلے جاتے۔ اسے اسلام آباد کے کسی اسپتال سے باقاعدہ اغوا کیا گیا اور پارا ہاؤس میں پہنچایا گیا۔ اب ابراہیم سے اس کی شادی ہو چکی ہے یا یوں کہہ لیں کہ نکاح ہو چکا ہے لیکن اب بھی یہاں بہت کچھ پُراسرار ہے جس کی کوئی توضیح پیش نہیں کی جا سکتی۔ شاید آپ کو یہ سن کر حیرانی ہو کہ ابراہیم اور زینب میاں بیوی بننے کے باوجود ابھی تک میاں بیوی نہیں بنے؟''

''کوئی رکاوٹ ہے؟'' میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

''یہ رکاوٹ بھی اتنی ہی عجیب ہے جتنی یہ شادی عجیب ہے۔ ابراہیم دن رات اپنی بیوی کے قریب آنے کو تڑپ رہا ہے بلکہ ترس رہا ہے، دوسری طرف زینب بھی اپنے شوہر کی بے قراری دیکھ کر اپنا آپ اس کے حوالے کرنا چاہتی ہے لیکن بے چاری کر نہیں سکتی۔ لگتا ہے کہ نوبیاہتا جوڑا کسی نتیجے سے بہت زیادہ ڈرا ہوا ہے۔''

''کیسا نتیجہ؟ کوئی مرض وغیرہ؟''

''شاید مرض ہی...... لیکن مجھے تو یہ جسمانی مرض کے بجائے کوئی روحانی مرض ہی لگتا ہے یا یوں کہہ لیں کہ پُراسرار مرض۔ شاید چھوٹے صاحب ابراہیم کو ڈر ہے کہ اگر اس نے زینب سے ازدواجی رشتہ بنایا تو وہ نقصان اٹھائے گی۔ شاید آپ کو پتا ہی ہو گا۔ ایک ایسا واقعہ اس سے پہلے بھی ہو چکا ہے جب ابراہیم کے بڑے بھائی کی نوبیاہتا بیوی سخت بیمار ہو گئی تھی، اور بچ نہیں سکی تھی۔''

''زینب ہماری ہم وطن ہے جاناں...... اور اس وقت بالکل اجنبی لوگوں کے درمیان ہے، تم اس کے ساتھ پوری طرح ''اٹیچ'' رہو اور اس کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کرو۔''

جاناں رازداری کے لہجے میں بولی۔ ''زینب مجھ سے ہر بات شیئر کر رہی ہے پھر بھی وہ کسی وقت اٹک سی جاتی ہے۔ جیسے ذہن پر بہت زیادہ دباؤ ہو...... کل اس نے مجھے ایک عجیب بات بتائی۔''

میں سوالیہ نظروں سے جاناں کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے محتاط نظروں سے بند دروازے اور کھڑکیوں کی طرف دیکھا پھر دھیمے لہجے میں بولی۔ ''زینب نے مجھے اپنے جسم کے کچھ حصے دکھائے تھے۔ وہاں سرخ نشان تھے اور ہلکی سی سوجن تھی۔ محسوس ہوتا ہے کہ اس کا شوہر اسے جہاں جہاں چھوتا ہے یا اس کا پسینا اسے لگتا ہے، وہاں زینب کا جسم کئی پہروں تک کے لیے سرخ رہتا ہے...... اور وہ جلن محسوس کرتی ہے۔''

میں سناٹے میں رہ گیا۔ ایسے خدشات میرے ذہن میں پہلے سے موجود تھے۔ یہ ایک

طرح سے آگ اور پیٹرول کا کھیل تھا۔ ایک بالکل نوخیز جوڑا، اس قدر قریب رہتے ہوئے، مکمل طور پر دور کیسے رہ سکتا تھا۔ بے شک ان لوگوں کے درمیان میاں بیوی والا رشتہ نہیں بنا تھا مگر وہ ''محبت'' کے لمحات یقیناً گزارتے تھے اور یہ محبت کے لمحات کسی بھی وقت ازدواجی رشتے میں بدل سکتے تھے۔ انسان خطا کا پتلا ہے اور ''مرد و زن'' کی محبت میں خطا کے امکانات بہت زیادہ ہوتے ہیں۔

میں نے کہا۔ ''اگر ابراہیم بیمار ہے اور یہ بیماری زینب کو متاثر کر رہی ہے تو پھر وہ اس سے دور کیوں نہیں رہتی؟''

وہ عجیب انداز سے مسکرائی اور اس کے ہونٹ کا نشان کچھ اور نمایاں ہو گیا بولی۔ ''میں نے بتایا ہے نا کہ ہم لڑکیاں بہت عجیب ہوتی ہیں، اپنے محبوب کو خوش رکھنے کے لیے اس کے قدموں میں اپنے جسم کی کھال بچھانے سے بھی دریغ نہیں کرتیں۔ وہ سب کچھ جانتی ہے پھر بھی اسے خود سے دور نہیں رکھ سکتی۔''

''گویا..... تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ وہ اس کا ''محبوب'' ہے؟''

''یہ تو مجھے پتا نہیں لیکن وہ اس کا شوہر تو ہے نا اور شوہر سر کا تاج ہوتا ہے، چاہے بیوی کو پاؤں کی جوتی سمجھتا ہو۔'' آخری الفاظ کہتے ہوئے وہ ہولے سے مسکرا دی اس کے دبلے پتلے چہرے پر، باہر ہونے والی آتش بازی کے رنگ، منعکس ہو رہے تھے۔ اس کا جسم نازک اور لمبا تھا۔ نیلگوں ساڑی اس پر بچ رہی تھی۔ وہ کھوئی کھوئی اور اداس نظر آتی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے تک مجھے اس میں کچھ زیادہ دلچسپی نہیں تھی اور میرا دل چاہتا تھا کہ وہ جلد ہی کمرے سے نکل جائے مگر اب صورتِ حال کچھ مختلف ہو گئی تھی۔ ایک تو اس کی اداسی نے میرے دل پر ہلکی سی چوٹ لگائی تھی۔ دوسرے مجھے یوں لگ رہا تھا کہ وہ زینب کے سلسلے میں میری بہت مدد کر سکتی ہے۔ میں ہر وقت زینب کے بارے میں باخبر رہنا چاہتا تھا اور وہ اس کی راز داں سہیلی بنی ہوئی تھی۔

میں نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تو وہ لرز کر میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کی ستارہ آنکھوں میں نمی چمک گئی...... پھر وہ ایک دم میرے گلے سے لگ گئی اور سسکنے لگی۔ ''میں آپ کی بے دام کی غلام ہوں...... مجھے خود سے جدا نہ کریں...... میں نے...... آپ کو اتنے فون کیے...... آپ نے ایک کا جواب نہیں دیا...... میرا دل چاہ رہا تھا، خود کو ختم کر لوں۔''

کتنی ہی دیر تک وہ ایسے ہی منمناتی رہی۔ میں نے اس کے بالوں کو بوسہ دے کر خود سے جدا کیا اور اٹھ کر کھڑکی کا پردہ برابر کر دیا۔ اس کی نیلگوں ساڑی کا پلو اس کے شانے سے

ڈھلک رہا تھا۔ میں اپنے کندھے کی تکلیف کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

ایک بار پھر وہی دائرہ تھا...... پھر وہی چکر تھا، گھنی زلفوں کا سایہ، گرم سانسوں کا لمس، ایک خود فراموشی، ایک فرار...... اور پھر اس کے بعد وہی ندامت، اپنے آپ پر وہی غصہ، سرسوں کے زرد کھیت میں کھڑی ہوئی وہی لڑکی۔ بہت اداس نظروں سے میری طرف دیکھتی ہوئی۔ اس کے ہونٹ بے حرکت تھے لیکن وہ بولتی تھی اور اس کی آواز میرے کانوں تک پہنچتی تھی...... آپ تو کہتے تھے، میں تم سے محبت کرتا ہوں، کیا محبت اتنی جلدی ہار جاتی ہے۔ وہ تو بغیر کسی امید کے، بغیر کسی آسرے کے، مدتوں انتظار کرتی ہے۔ جب کچھ بھی سنائی نہیں دیتا وہ پھر بھی سنتی ہے، جب کچھ بھی نظر نہیں آتا وہ پھر بھی دیکھتی ہے، وہ کانچ سے پتھر کو توڑنے اور پانی میں دیئے جلانے کی کوشش جاری رکھتی ہے۔ زخموں سے چُور ہو کر بھی وہ وفا کا پرچم بلند رکھتی ہے اور انہونیوں کی راہ تکتی ہے۔

میں اب تک ''سرسوں کے کھیت میں کھڑی لڑکی'' کی آواز سنتا ہی رہا تھا، جواب میں کچھ نہیں بولا تھا لیکن آج میں بولا۔ میں نے خود کو تصورات میں گم کر دیا اور خاموشی کی زبان میں کہا...... میں ہوائی قلعے تعمیر کرنے والا کوئی رومانی ہیرو نہیں۔ میں عملی آدمی ہوں۔ میں جانتا ہوں ایسی محبتوں کا انجام کیا ہوتا ہے۔ زندگی بھر آہیں بھرو اور بچھڑنے والے کو یاد کرو، جس کہانی کو انجام دینا ممکن ہی نہ ہو، اس کی تکمیل کے لیے خود کو ہلکان کرنے سے کیا فائدہ۔ مجھے پتا ہے وہ میرے لیے نہیں ہے اور نہ میں اس کے لیے ہوں اور وہ کوئی ایسی حسین و جمیل بھی نہیں جس کا بدل ملنا ممکن نہ ہو...... زندگی بہت خوب صورت ہے اور صرف ایک بار ملتی ہے۔ میں ان دیوانوں میں شامل نہیں ہوں گا جو زندگی جیسی خوب صورت شے کو روگ لگاتے ہیں اور آہیں بھرتے ہوئے قبر تک جا پہنچتے ہیں۔ میں سراب کے پیچھے نہیں بھاگوں گا۔ زندگی کو زندگی کی طرح جیوں گا۔ کہتے ہیں کہ قدرت نے ہر دکھ کا مداوا رکھا ہوا ہے۔ میں بھی مداوا ڈھونڈوں گا۔ میں احمقوں کی ویران دنیا کا باسی نہیں بنوں گا۔ میں اسے بھلا کر دکھا دوں گا......

اب رات کا تیسرا پہر چل رہا تھا۔ آتش بازی تو ختم ہو گئی تھی مگر شہر میں مسلح جتھے گھوم رہے تھے اور نعرہ بازی بھی ہو رہی تھی۔ جاناں کی نیلگوں ساڑی پھر سے اس کے لمبے جسم پر بہار دکھا رہی تھی۔ اس نے ہیئر کلپ کو دانتوں میں دبا رکھا تھا اور بالوں کو باندھ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ''اب کب ملاقات ہو گی؟''

''جب تم چاہو۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

وہ گلنار ہوگئی اور بھاگ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ وہ چلی گئی تو میں نے دروازہ پھر اندر سے بند کیا اور اپنے آپ کو ''خود فراموشی'' کے حوالے کرنے کے لیے گلاس اپنے سامنے دھر لیا۔ کندھا درد سے پھٹا جارہا تھا۔

O......❖......O

اگلے روز میں دیر تک سویا۔ سونے سے پہلے میں نے وائن میں پین کلر گولیاں بھی شامل کر لی تھیں۔ گیارہ بج چکے تھے۔ چمکیلی دھوپ میں نباتات کی خوشبو تھی۔ موسم نیم گرم اور مرطوب تھا۔ میرا سر بہت بھاری ہورہا تھا۔ پتا نہیں کیوں، اٹھتے ساتھ ہی میرا دھیان کبڈی کے مشہور کھلاڑی اور عجیب کردار سیف کی طرف چلا گیا۔ وہ ابھی تک پاکستان سے یہاں نہیں پہنچا تھا لیکن اس کو جلد ہی آجانا تھا۔ وہ اپنے ساتھ پنجاب کے سارے رنگ لیے پھرتا تھا۔ اتنے میں انیق آنکھیں ملتا ہوا آگیا۔ انیق نے میرے کندھے کا حال احوال پوچھا اور پہلوان حشمت کے بتائے ہوئے چند ٹوٹکے میرے گوش گزار کیے مگر لگتا تھا کہ بات اب ٹوٹکوں سے آگے چلی گئی ہے۔ قسطینا کے قوی ہیکل گارڈ کے فولادی مکوں نے کندھے کو قابلِ ذکر نقصان پہنچا دیا تھا۔ میں ناشتا کر رہا تھا جب انٹر کام پر ہز ہائی نس قسطینا کی کال آگئی۔ پہلے آپریٹر نے کہا۔ ''ہز ہائی نس، آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔'' پھر چند سیکنڈ بعد قسطینا کی قدرے رعب دار آواز سنائی دی۔ ''تم کیسے ہو مسٹر شاہ زائب؟'' وہ زیب کو زائب کہتی تھی۔ بڑی بیگم کا تلفظ بھی یہی تھا۔

''میں ٹھیک ہوں یور ہائی نس۔'' میں نے اسے پھر ادب سے مخاطب کیا۔

''مجھے آج ایک بات کا پتا چلا ہے، جس کا مجھے بہت افسوس ہوا ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

''کیسی بات یور ہائی نس؟''

''مجھے بتایا گیا ہے کہ بدھ کے دن ہوٹل واشنگٹن میں ہونے والی لڑائی میں تمہارا بایاں کندھا شدید زخمی ہوگیا تھا اور ایکسریز میں کوئی فریکچر بھی ''ڈائیگونوز'' ہوا تھا۔ تمہیں مکمل آرام کا مشورہ دیا گیا تھا، اگر ایسی بات تھی تو تم نے بتایا کیوں نہیں؟''

''آپ کا حکم تھا، میں نے حاضر ہونا مناسب سمجھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ • ہاں ایسی صورتِ حال پیش آجائے گی۔''

''اسی بات کا تو افسوس ہے۔ نہ تم نے کچھ بتایا نہ ہمیں پتا چلا۔ میں جانتی ہوں براڈے نے تمہارے کندھے کے ساتھ برا سلوک کیا ہے۔'' (براڈے یقیناً اسی گرانڈیل محافظ کا نام تھا

جو ہر وقت سائے کی طرح قسطینا کے ساتھ رہتا تھا)

"لڑائی اور محبت میں سب کچھ جائز ہو جاتا ہے یور ہائی نس، مجھے کوئی گلہ نہیں ہے۔"

"لیکن مجھے رنج ہے۔ تم اپنے کندھے کا دوبارہ ایکسریز کراؤ، بلکہ یہاں سی ٹی اسکین وغیرہ کی سہولتیں بھی موجود ہیں......"

"آپ کی توجہ کا شکریہ، لیکن ابھی تو میں کوئی ایسی ضرورت محسوس نہیں کر رہا۔"

لائن پر چند سیکنڈ خاموشی رہی، پھر اس کی کھنکتی ہوئی لیکن بھاری آواز ابھری۔ "پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے کہ تمہیں کہیں دیکھا ہوا ہے۔ کیا تم اس سے پہلے بھی برونائی یا جاما جی آئے ہو؟"

"نہیں یور ہائی نس، ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

وہ ایک دم جیسے چونک کر بولی۔ "ہمارے لیے ایک اچھی خبر بھی ہے، بلکہ دو اچھی خبریں ہیں۔ ایک تو اسپتال میں کریم کا آپریشن کامیاب ہوا ہے۔ اس کی ٹوٹی ہوئی پسلیوں کو ان کی جگہ پر بٹھا دیا گیا ہے اور اب وہ ہوش میں ہے۔ مجھے اس کی بہت فکر تھی۔ دوسرے کل رات ہم نے ائیرپورٹ پر ایجنسی کا زوردار حملہ کامیابی سے روکا ہے۔ ان کے تیس کے قریب افراد گرفتار ہوئے ہیں۔ اور مرنے والوں کی تعداد بھی پندرہ بیس کے قریب ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ہمارا ایک سپاہی بھی اس لڑائی میں مارا نہیں گیا۔"

"جی ہاں، رات کو جب آتش بازی شروع ہوئی تو ہمیں اس کامیابی کا اندازہ ہو گیا تھا۔"

"دراصل اب گمراہ کزن رائے زل اور ایجنسی کا گٹھ جوڑ کھل کر سامنے آ گیا ہے۔ یہ لوگ کھلم کھلا ایک دوسرے کی مدد کر رہے ہیں مگر جاما جی کے لوگ سروں پر کفن باندھ کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ اب ایجنسی اور ایجنسی کے پٹھوؤں کو جاما جی سے نکال کر ہی دم لیں گے۔"

میں نے کہا۔ "یور ہائی نس! میری یہ حیثیت تو نہیں کہ آپ کو مشورہ دے سکوں لیکن میں نے کافی عرصہ مغربی ملکوں میں گزارا ہے۔ میں ان لوگوں کی خصلت کو کافی حد تک جانتا ہوں۔ یہ لوگ اپنا ردِعمل بڑے آرام سے اور سوچ سمجھ کر ظاہر کرتے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ یہ اندرون خانہ خاص قسم کی تیاریوں میں مصروف ہوں۔ ہمیں چاہیے کہ جشن وغیرہ تو ضرور منائیں لیکن خود کو ریلیکسڈ نہ کریں۔ ان کے متوقع ردِعمل کے لیے تیار رہیں۔"

"یہ باتیں بالکل ہمارے ذہن میں موجود ہیں۔ میں ابھی تھوڑی دیر میں عزت مآب کی

طرف سے سرکردہ کمانڈروں کی ایک میٹنگ بلا رہی ہوں۔ دیگر اہم لوگ بھی شریک ہوں گے۔ تمہیں تو آرام کی ضرورت ہے تاہم میں مسٹر سجاول کو بھی مدعو کر رہی ہوں۔ امید ہے کہ اس میٹنگ میں اہم فیصلے ہوں گے۔"

ذرا توقف کے بعد اس نے کہا۔"او کے، میں ایک بار پھر دلی افسوس کا اظہار کرتی ہوں کہ تمہارے کندھے کو نقصان پہنچا ہے اگر درد میں افاقہ نہیں ہو رہا تو تم ذرا یہاں کے بڑے آرتھوپیڈک پروفیسر سے رجوع کر لو۔"

میں نے کہا کہ میں دیکھتا ہوں۔

○......❖......○

ڈی پیلس کے اندرونی حصے میں ہونے والی ہنگامی میٹنگ قریباً تین گھنٹے جاری رہی۔ سجاول نے واپس آ کر وہاں کی کچھ صورتِ حال بتائی۔ اس نے آگاہ کیا کہ کانفرنس روم کے اندر جتنے لوگ تھے، اس سے دس گنا لوگ باہر موجود تھے اور تمام وقت پُر جوش نعرہ زنی کرتے رہے ہیں۔ یہ لوگ ایجنسی والوں اور ان کے حواریوں کو نیست و نابود کر دینا چاہتے ہیں۔ یہاں ایجنسی والوں نے اپنا ایک گورنر بنا رکھا تھا۔ اس جوناتھن نامی گورنر نے آہستہ آہستہ خود کو عزت مآب کہلوانا شروع کر دیا تھا۔ اس شخص کو پکڑ کر نظر بند کر دیا گیا ہے اور کمانڈروں نے ریان فردوس کو باقاعدہ چیف ایگزیکٹو کی کرسی پر بٹھا دیا ہے اور انہیں پورے پورے اختیارات دلانے کا تہیہ کیا ہے۔

میں نے پوچھا۔"ریان فردوس کے خیالات کیا ہیں؟"

سجاول اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔"وہ بڈھا ککڑ تو اندر سے ڈرا ہوا ہے لیکن شاید اسے یہ سب کچھ تھوڑا تھوڑا اچھا بھی لگ رہا ہے۔ اختیار اور حکمرانی کس کو چنگی نہیں لگتی...... اور یہ سب کچھ پانے کے لیے اسے زیادہ ہاتھ پیر بھی ہلانے نہیں پڑ رہے۔ سب کچھ تو اس کے جوشیلے پرستار ہی کر رہے ہیں۔"

"قسطینا اور آقا جان وغیرہ کے ری ایکشن کیا تھے؟"

"قسطینا بہت خوش تھی۔ اس نے اعلان کیا کہ آئندہ عزت مآب کا لقب جزیرے میں صرف اور صرف انکل ریان فردوس کے لیے استعمال ہوگا۔ اس پر سب نے زوردار نعرے لگائے۔"

میں سجاول سے باتیں تو کر رہا تھا مگر دھیان اپنے کندھے کی طرف ہی تھا۔ درد بڑھتا جا رہا تھا۔ محسوس ہوتا تھا کہ اگر رات، عذاب میں نہیں گزارنی تو پھر اسپتال سے رجوع کر لینا

چاہیے۔ گولیاں تو رہیں ایک طرف اب انجکشن بھی اثر نہیں کر رہے تھے۔ سجاول نے بھی میرے چہرے سے میرے اندرونی اضطراب کو بھانپ لیا تھا۔ وہ بولا۔ ''چل اٹھ جا شاہ زیب، مجھے لگتا ہے کہ تیرا درد بڑھتا جا رہا ہے۔''

انیق نے انگلش میں ہولے سے کہا۔ ''جس نے درد دیا ہو، اس سے بڑھ کر اور کون جانتا ہے کہ درد کی صورتِ حال کیا ہے۔''

''کیا کہا تم نے؟'' سجاول نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

''کہہ رہا ہوں کہ ڈاکٹر ہی بتا سکتا ہے کہ اصل صورتِ حال کیا ہے۔''

''انگریزی کم بولا کر...... منہ ڈنگا ہو جائے گا تیرا۔ پہلے بھی کچھ اتنا سوہنا نہیں ہے۔'' سجاول نے ترُخ کر کہا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم ایک بکتر بند گاڑی پر سوار اسپتال کی طرف جا رہے تھے۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ کندھے کا فریکچر سنگین ہو چکا ہے۔ اچھا ہی ہوتا اگر اس رات میں انیق کی بات مان لیتا اور اکیلا میٹنگ روم میں قسطینا سے ملنے نہ جاتا۔ گاڑی شہر کی مختلف سڑکوں سے گزری۔ ہمیں ایک اور جگہ ایک ناپسندیدہ منظر دیکھنا پڑا۔ ایک امریکن کی لاش درختوں میں اوندھی پڑی تھی اور ایمبولینس کا عملہ اسے وہاں سے اٹھانے کی تیاری کر رہا تھا۔ جس اسپتال میں ہم پہنچے وہ پانچ چھ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ بلند سڑک سے ہمیں نشیب میں دور تک دکھائی دے رہا تھا۔ ایک وسیع سرسبز علاقہ تھا۔ جس میں کہیں کہیں پاک کے درخت دکھائی دیتے تھے اور پانی کی گزرگاہیں نظر آتی تھیں۔ اس وسیع میدان میں جاما جی کے باشندوں کے مخروطی چھتوں والے خوش نما گھر تھے اور جا بجا خوب صورتی سے تراشے ہوئے لان تھے۔ ان گھروں سے باہر چمکیلی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اور چھوٹی چھوٹی مارکیٹوں کی جھلک بھی دکھائی دیتی تھی۔ بہر حال انسان کہیں نظر نہیں آتا تھا اور اگر کہیں آتا بھی تھا تو بس ایک ''جھلک'' کی طرح۔ یقیناً اس کی وجہ بھی یہاں کے دگرگوں حالات ہی تھے۔ ڈرائیور کم گارڈ محسن ہانی آج بھی ہمارے ساتھ تھا اور ہمیں علاقے میں موجود اہم نئی اور پرانی عمارتوں کی تفصیلات بتا رہا تھا۔ مجھے دور کھلے علاقے میں سبزے کی سبز چادر کے اوپر کسی خاردار باڑ کی طویل لکیر نظر آئی۔ میں نے محسن سے اس بارے میں پوچھا تو وہ شستہ انگلش میں بولا۔ ''اسی باڑ کی وجہ سے تو سارا خون خرابا ہو رہا ہے۔ یہ باڑ آج سے چند ہفتے پہلے یہاں سے بہت پیچھے تھی مگر نیوسٹی والوں نے بارڈر لائن کی خلاف ورزی کی اور راتوں رات بکتر بند گاڑیوں اور بے شمار سپاہیوں کے ساتھ اندر گھس آئے۔ اب یہ سارا علاقہ ان کے قبضے میں ہے۔ ہمیں اس لڑائی میں دہرا زخم

لگا۔ ایک تو سیکڑوں ایکڑ کا یہ علاقہ ہمارے ہاتھ سے گیا، دوسرے ہمارے ہردلعزیز لیڈر اور ہز ہائی نس قسطینا کے والد محترم عالی جاہ آدم شہید ہوئے۔''

میں نے سبزے کی خوب صورت چادر کے درمیان خاردار باڑ کی وہ بدنما لکیر دیکھی۔ اس لکیر کی دوسری جانب تازہ بنے ہوئے بنکر دکھائی دیتے تھے اور مورچوں کی موجودگی بھی ظاہر ہوتی تھی۔ بہت سی فوجی طرز کی گاڑیاں بھی حرکت کرتی دکھائی دیتی تھیں۔ ان میں سے کئی گاڑیوں پر راکٹ لانچر اور بڑی گنیں لگی ہوئی تھیں۔ بارڈر کی اس جانب بھی کچھ ایسے ہی انتظامات موجود تھے۔

سجاول نے پوچھا کہ یہ نیوسٹی کا کیا مطلب ہے؟ میں نے یہی سوال انگریزی میں ''کن ورٹ'' کر کے ڈرائیور محسن تک پہنچایا تو اس نے بتایا کہ جو علاقے ہز ہائی نس ابراہیم اور کمال کے سوتیلے بھائی رائے زل نے اپنے قبضے میں کیے ہوئے ہیں انہیں ان لوگوں نے نیوسٹی کا نام دے رکھا ہے۔ مقبوضہ علاقے جزیرے کا قریباً ایک تہائی حصہ ہے۔ مگر یہ لوگ کہیں پر رک نہیں رہے اور چھتی جوتی کی طرح پھیلتے جا رہے ہیں۔

ایک موڑ کاٹ کر ہم ڈھلوان سڑک پر آ گئے اور پھر نیچے اترتے اسپتال کی شاندار عمارت تک جا پہنچے۔ آثار سے نظر آتا تھا کہ چند ہفتے پہلے ہونے والی لڑائی میں تھوڑا بہت نقصان اس اسپتال کو بھی پہنچ چکا ہے۔ مجھے فوراً پروفیسر ڈاکٹر نے دیکھا، جدید مشین پر ایکسرے کیے گئے۔ اندیشے درست نکلے تھے۔ کندھے کی ہڈی...... جس میں پہلے باریک سا فریکچر تھا، اب باقاعدہ ٹوٹ چکی تھی اور اپنی جگہ سے ہٹ بھی چکی تھی۔ کام لمبا ہو گیا تھا۔ اب اس کو پلیٹس لگنا تھیں۔ اور باقاعدہ آپریشن کے بعد پلاستر وغیرہ چڑھائے جانے کا بھی امکان تھا۔

میں ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا، یہ تو ایسا ہی تھا جیسے کسی کھلاڑی کو اہم میچز کھیلنے کے لیے بڑی شان سے بیرون ملک لے جایا جائے اور وہ وارم اَپ میچ میں ہی اَن فٹ ہو کر ٹورنامنٹ سے باہر ہو جائے۔ جس وقت آرتھوپیڈک پروفیسر میری سنگین چوٹ کا باریک بینی سے معائنہ کر رہے تھے۔ ہلچل سی نظر آئی باوردی گارڈز اور فورس کے سپاہی اٹین شین ہو گئے۔ پتا چلا کہ ہز ہائی نس قسطینا اسپتال میں کسی خاص شخص کی عیادت کے لیے آئی ہوئی تھیں اور اب میرے بارے میں سن کر یہاں میری طرف آ رہی ہیں۔ (یہ خاص شخص وہی ایک ٹانگ سے معذور کریم احمد تھا)

میں اسٹریچر پر لیٹا تھا، اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پروفیسر صاحب بھی مؤدب کھڑے ہو گئے۔ ہر

طرف ایڑیاں کھٹا کھٹ بجنے لگیں۔ چند سیکنڈ بعد قسطینا فوجی وردی میں بارعب چال چلتی اندر داخل ہوئی۔ عقب میں چار پانچ اعلیٰ افسر بھی تھے۔ قسطینا نے میرا حال احوال پوچھا۔

پھر پروفیسر کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ''ان کو وہ ہر بہترین سہولت دی جائے جو یہاں موجود ہے۔ اگر ہمیں باہر سے بھی کوئی ماہر بلوانا پڑا تو ہم دیر نہیں کریں گے۔''

اس نے خود بھی میرے ایکسرے دیکھے اور اس کی آنکھوں میں تشویش آمیز ندامت دکھائی دی۔ وہ جانتی تھی میرے کندھے کا یہ حال اسی کی وجہ سے ہوا ہے۔ اس نے میرے منہ پر طمانچا رسید کیا تھا جس کے بعد میٹنگ روم کی صورتِ حال یکا یک آؤٹ آف کنٹرول ہو گئی تھی۔

آرتھوپیڈک پروفیسر نے اسے بڑی توجہ سے میری تکلیف کے بارے میں بتایا اور تسلی دی۔ اب یہ فیصلہ ہونا تھا کہ مجھے ابھی اسپتال میں داخل کر لیا جائے یا ضروری ٹیسٹ لینے کے بعد بھیج دیا جائے اور کل شام کو پھر بلا لیا جائے مگر کسی کو پتا نہیں تھا کہ یہاں کیا صورتِ حال پیش آنے والی ہے، جو ماہر ڈاکٹر ہے وہ مریض بننے والا ہے اور جو مریض ہے اسے ڈاکٹر کی جان بچانے کی کوشش کرنی ہے اور خود اپنے لیے بھی اندھا دھند بھاگ دوڑ کرنی ہے۔ انسان کے اپنے منصوبے اور ارادے ہوتے ہیں، قدرت کی اپنی منشا ہوتی ہے اور ہوتا وہی ہے جو قدرت نے طے کیا ہوتا ہے۔

اچانک ایک سماعت شکن دھماکا ہوا۔ یوں لگا کہ اسپتال کے بالکل پاس ہی کوئی عمارت دھماکے سے زمین بوس ہو گئی ہے۔ در و دیوار لرزے اور ہر طرف مریضوں کی آہ و بکا گونجی۔ ابھی ہم سنبھل بھی نہ پائے تھے کہ دوسرا دھماکا ہوا اور یہ اسپتال کے مین گیٹ کی طرف تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے دو مسلح محافظوں کو ہوا میں اچھلتے اور دھوئیں میں گم ہوتے دیکھا۔ ایک کٹا ہوا بازو میری نگاہوں کے رُوبرو کھڑکی کو چکنا چور کر کے ایک ایکسرے مشین پر گرا۔ لوگ دیوانہ وار چلاتے ہوئے چاروں طرف دوڑے۔ قسطینا نے اپنے ہولسٹر سے بریٹا پسٹل کھینچا اور اپنے گارڈز کو ہدایات دیتی ہوئی کشادہ زینوں کی طرف بھاگی۔

''اسے دیکھو شاہ زیب۔'' سجاول پکارا۔

میں نے چونک کر اپنے قدموں کی طرف دیکھا۔ وہ ماہر پروفیسر سرجن جو چند سیکنڈ پہلے بڑی شان سے مجھے مختلف ہدایات اور تسلیاں دے رہا تھا اب خود اوندھے منہ فرش پر پڑا تھا اور اس کے پیٹ سے بہنے والا خون فرش کو رنگین کر رہا تھا۔ یقیناً اسے بم کا کوئی پرچا یا شیشے کا ٹکڑا لگا تھا۔ تب ایک اور پُرہول دھماکا ہوا اور اسپتال کی کینٹین نے آگ پکڑ لی۔ اس کے ساتھ ہی

مشین گن اور ایم جی 16 ٹائپ رائفلوں کی لرزہ خیز آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ''لگتا ہے، نیو سٹی کی فورس نے حملہ کردیا ہے۔ بارڈر لائن یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

سجاول نے جھک کر زخمی سرجن کو کندھے پر اٹھایا اور ہم بھی سیڑھیوں کی طرف دوڑے۔ سجاول کے ہاتھ میں اب وہی پستول نظر آرہا تھا۔ جو بڑی بیگم نے اسے دیا تھا۔ اب دوطرفہ فائرنگ شروع ہوچکی تھی۔ یہ شام کا وقت تھا۔ سیڑھیوں کی کھڑکیوں میں سے مجھے کھلے میدان میں ریان فردوس کے سپاہیوں کی بھاگ دوڑ دکھائی دی۔ ان کی نشانی ان کی گہری سبز وردی تھی۔ رائے زل کے سپاہیوں کی وردی گہری گرے تھی اور وہ بھی دور سے پہچانے جاتے تھے۔ ان کی طرف سے مارٹر گنوں اور بزوکا کا فائر آرہا تھا۔ بزوکا عام طور پر ٹینکوں کا حملہ روکنے کے لیے استعمال کی جاتی ہیں لیکن یہاں رائے زل کی فورس ان سے عمارتیں توڑنے کا کام لے رہی تھی۔ ریان فردوس کی سبز فورس بھی پوزیشنیں سنبھال چکی تھی۔ میں نے چند سپاہیوں کو دیکھا انہوں نے کندھوں پر راکٹ لانچر رکھے ہوئے تھے اور فائر کے لیے کوئی مناسب جگہ ڈھونڈ رہے تھے۔ اسی دوران میں ان کے بالکل قریب مارٹر شیل پھٹا اور وہ دھوئیں میں گم ہوگئے۔

ہم پہلی منزل پر پہنچے تو یہاں کم از کم چار گارڈز خون میں لت پت پڑے دکھائی دیئے۔ ان کی سبز جیکٹس گولیوں سے چھلنی تھیں۔ اور خون ایک ریلے کی طرح فرش پر بہہ رہا تھا۔ سجاول نے اپنا پستول بیلٹ میں اڑسا اور ایک سیون ایم ایم رائفل اٹھالی۔ ایک ایل ایم جی میری گرفت میں آگئی۔ یہ ان گارڈز کا ہی اسلحہ تھا جو چند سیکنڈ قبل ایم سولہ گن کے طویل برسٹ سے ہلاک ہوئے تھے۔ دفعتاً سجاول کو کچھ نظر آیا۔ اس نے کندھے سے زخمی سرجن کو اتارا اور ایک راہداری کی طرف دوڑا۔ میں اسے پکارتا ہی رہ گیا۔ اس راہداری سے کسی عورت کے چلانے کی دلدوز آواز آرہی تھی۔ بلکہ یہ ایک سے زیادہ عورتیں تھیں۔

○......❖......○

میں نے قدموں میں پڑے آرتھوپیڈک سرجن کی طرف دیکھا، خون اس کے پورے سفید کوٹ کو بھگو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ جس جگہ پڑا تھا وہاں کسی بھی وقت کسی آوارہ گولی کا شکار ہوسکتا تھا۔ اپنے زخمی کندھے کی وجہ سے میرے لیے ممکن نہیں تھا کہ اسے اٹھا سکتا لیکن میں نے خود پر جبر کیا اور کسی نہ کسی طرح اسے دائیں کندھے پر لادنے میں کامیاب رہا۔ اس کا وزن پینسٹھ ستر کے جی سے زیادہ نہیں تھا۔ ایک برسٹ آیا اور میری ایک جانب والی کھڑکی کا طویل شیشہ چکنا چور ہوگیا۔ شیشے کی بہت سی کرچیاں میری چاروں جانب

گریں، ٹوٹے ہوئے شیشے میں سے میں نے قسطینا کو دیکھا، وہ سرتاپا ایک ''جنگجولڑکی'' دکھائی دیتی تھی۔ اس نے ٹیرس کی چار فٹ اونچی دیوار کے پیچھے پوزیشن لے رکھی تھی۔ اس کے اردگرد اس کے جاں نثار گارڈز تھے۔ وہ سب بڑی بے جگری سے کاؤنٹر فائر میں مصروف تھے۔ قسطینا خود بھی ایک چھوٹی نال والی آٹومیٹک رائفل سے فائر کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اردگرد موجود اپنے درجنوں ساتھیوں کو مختلف ہدایات بھی دے رہی تھی۔ اس کا اعتماد دیدنی تھا۔

یکایک مخالف سمت سے آنے والے فائر میں بہت تیزی آگئی۔ یوں لگا کہ ہر طرف سے آگ برسنے لگی ہے۔ مارٹر کا ایک گولا ٹیرس کے بیچوں بیچ گرا اور میں نے قسطینا کے تین چار ساتھیوں کو شدید زخمی ہو کر گرتے دیکھا۔ قسطینا بھی دھوئیں میں گم ہوگئی۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ محفوظ رہ سکی ہے یا نہیں۔

گہری گرے وردیوں والے سپاہی بڑی تیزی سے آگے بڑھ آئے تھے۔ درجنوں بکتر بند گاڑیاں ان کے ساتھ تھیں۔ عزت مآب ریان فردوس کے سبز پوش پسپا ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔

''پکڑو...... کوئی جانے نہ پائے۔'' اسپتال کے گراؤنڈ فلور سے ایک للکارتی ہوئی آواز ابھری۔ اس کے ساتھ ہی بہت سے مریضوں کے رونے چلانے کی آوازیں بھی بلند ہو رہی تھیں۔ گراؤنڈ فلور پر اندھا دھند فائرنگ ہو رہی تھی۔ مطلب یہی تھا کہ رائے زل کے سپاہی اندر داخل ہو چکے تھے۔

بے ہوش سرجن بدستور میرے کندھے پر تھا۔ مجھے لگا کہ میں چند سیکنڈ مزید یہاں کھڑا رہا تو ناقابلِ تلافی نقصان اٹھالوں گا۔ سجاول کا خیال ترک کر کے میں بالائی زینوں کی طرف دوڑا۔ حملہ آوروں کے للکارے اب زیریں زینوں میں گونج رہے تھے۔ وہ اس بات کی پروا کیے بغیر کہ یہ اسپتال ہے، ہر طرف آگ برسا رہے تھے۔ چند گولیاں سنسناتی ہوئی آئیں۔ میرے جسم کو شدید دھچکا لگا۔ یہی محسوس ہوا کہ مجھے گولی لگ گئی ہے لیکن کہاں؟ ابھی کسی بھی جگہ درد محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے پلٹ کر دو فائر کیے۔ مجھے اپنے عقب میں دھوئیں کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اگر آ بھی رہا ہوتا تو شاید میں وزنی رائفل کو ایک ہاتھ سے سنبھال کر کسی نشانے پر گولی نہ چلا سکتا۔

میں اسپتال کے تیسرے فلور پر پہنچا اور پھر باقی کے زینے طے کر کے چھت پر چلا آیا۔ چھت کو دیکھ کر پتا چلتا تھا کہ اسپتال کی یہ عمارت زیادہ بڑے رقبے پر نہیں ہے۔ یہ میرے

اندازے کے مطابق کوئی چار کنال رقبہ ہوگا۔ یہاں کچھ ڈش انٹیناز اور بہت سے بیکار ائرکنڈیشنرز پڑے ہوئے تھے۔ایک کونے میں ٹین کی چادروں کا ڈھیر سا لگا تھا۔فوری طور پر مجھے چھپنے کے لیے یہی جگہ موزوں نظر آئی۔اب شام گہری ہوگئی تھی۔چھت کی بلندی سے میں نے اسپتال کے اردگرد ہونے والی لڑائی کی ایک جھلک دیکھی۔جگہ جگہ سے دھوئیں کے بادل اٹھ رہے تھے اور ان بادلوں میں تواتر سے موت کے شعلے لپک رہے تھے۔صاف پتا چلتا تھا کہ نیوسٹی کے سپاہی عزت مآب کے سبز پوش سپاہیوں کو دھکیلتے ہوئے کافی آگے تک لے گئے ہیں۔

میں نے پہلے ملائیشین سرجن کو احتیاط سے فرش پر لٹایا پھر اسے ذرا دھکیل کر آہنی چادروں کے زیریں خلا میں پہنچانے کی کوشش کی۔ایک سیکنڈ کے مختصر حصے میں مجھے احساس ہوگیا کہ سرجن صاحب اب سرجری اور ہر قسم کی دیگر مصروفیات سے فارغ ہو چکے ہیں۔گولی گردن کے پچھلے حصے میں کندھوں کے درمیان لگی تھی اور شاید دل جگر وغیرہ میں جا گھسی تھی۔درحقیقت مرحوم سرجن نے میرے لیے ڈھال کا کام کیا تھا۔میں نے بھاگتے وقت اسے کندھے پر لاد رکھا تھا۔اس کا بالائی دھڑ میری پشت پر جھول رہا تھا۔جو گولی عقب سے آکر میرے جسم میں سوراخ کرتی اسے سرجن ڈاکٹر کے جسم نے روکا تھا۔اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ سرجن ڈاکٹر نے میری جان بچائی تھی اور اپنے کیریئر کا یہ آخری کارنامہ اس نے کسی سرجری کے بغیر انجام دیا تھا۔

میں نے ڈاکٹر کے بے جان جسم کو تھوڑا کھینچ کر آہنی چادروں سے دور ہٹا دیا اور خود پیٹ کے بل رینگ کر چادروں کے نیچے چلا گیا۔اسپتال میں اور اردگرد لڑائی جاری تھی۔میں نے بھی اپنی گن پوزیشن میں کرلی۔میرا رخ چھت کے اس دروازے کی طرف تھا جہاں سے میں چھت پر آیا تھا۔آثار بتا رہے تھے کہ اب کسی بھی وقت نیوسٹی یعنی رائے زل کے حملہ آور سپاہی چھت پر آجائیں گے۔فائرنگ تھرڈ فلور کے مغربی حصے میں ہورہی تھی۔دھواں تیزی سے پھیل رہا تھا۔اس دھوئیں میں بارود کی بو تھی اور جلے ہوئے گوشت کی سڑاند بھی۔

یکایک دروازے پر ہلچل نظر آئی۔میں نے انگلی ایل ایم جی کے ٹریگر پر رکھ لی۔دو افراد تیزی سے اندر داخل ہوئے لیکن یہ حملہ آور نہیں تھے۔میری طرح شاید وہ بھی چھت پر کہیں پوزیشن لینے یا چھپنے آئے تھے۔انہوں نے تیزی سے چاروں طرف دیکھا اور پھر ان کی نظر بھی ان آہنی چادروں کی طرف ہی پڑی جو اوپر تلے ایک ڈھیر کی صورت چھت کے اس گوشے میں پڑی تھیں۔ان دونوں کے ہاتھ میں آتشیں اسلحہ تھا۔ایک کے ہاتھ میں شاید

پستول اور دوسرے کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ چادروں کے قریب پہنچ کر وہ دونوں اوندھے منہ لیٹے اور تب میں نے قسطینا کو پہچان لیا، دوسرا اس کا کوئی جاں نثار ساتھی تھا۔ وہ دونوں پیٹ کے بل رینگ کر اندر چلے آئے اور تب انہیں میری موجودگی کا احساس ہوا۔

''یہ میں ہوں یور ہائی نس۔'' میں نے تیزی سے کہا۔ مبادا وہ دونوں کوئی غلط حرکت کر بیٹھیں۔

''اوہ گاڈ۔'' ہانپی ہوئی قسطینا کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔ یہی وقت تھا جب چھت پر کھلنے والے دروازے پر کئی سائے ایک ساتھ نظر آئے۔

یہ نیوسٹی کی فورس کے لوگ تھے۔ ان کی گہری گرے وردیاں نیم تاریکی میں بھی پہچانی جا رہی تھیں۔ ان کے سروں پر سیفٹی ہیلمٹ اور جسموں پر بلٹ پروف جیکٹس تھیں۔ انہوں نے پھرتی سے چھت پر چاروں طرف دیکھا۔ ٹین کی چادروں کو بھی ٹھوکریں ماریں اور ان میں جھانکنے کی کوشش کی۔ ہم دم سادھے پڑے تھے۔ ہماری خوش قسمتی کہ کسی کی نظر ہم پر نہیں پڑی۔ وہ لوگ جس تیزی سے آئے تھے، اسی تیزی سے واپس نیچے چلے گئے۔ فقط ایک شخص چھت پر موجود رہا، تاہم اس کا رخ بھی چھت کے بجائے سیڑھیوں کی طرف تھا اور وہ نیچے کی صورتِ حال جاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

نیچے اب فائرنگ کی شدت بہت کم ہو گئی تھی۔ بس اکا دکا گولیاں چلتی تھیں یا پھر مار دھاڑ کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ نیوسٹی کی فورس نے اس علاقے کا مکمل کنٹرول حاصل کر لیا ہے۔ ریان فردوس کے لوگ پسپا ہو گئے ہیں، کچھ مارے گئے ہیں یا پکڑے گئے ہیں۔

قسطینا مجھ سے صرف چند انچ کے فاصلے پر میری ہی طرح اوندھی لیٹی تھی۔ میں اس کی ہانپی ہوئی سانسوں کی آہٹ سن رہا تھا۔ اس کا ساتھی شاید تھوڑا سا زخمی تھا، کسی وقت وہ بے ساختہ کراہ اٹھتا تھا۔ ''نیچے کیا ہوا ہے؟'' میں نے قسطینا سے پوچھا۔ لہجہ سرگوشی کا ہی تھا۔

وہ بولی۔ ''بزدل لوگ ہیں، اچانک حملہ کیا ہے اور دیکھو اسپتال کو بھی نہیں بخشا۔''

میں نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ ''کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ انہیں اسپتال میں آپ کی موجودگی کا پتا چل گیا ہو اور انہوں نے موقع سے فائدہ اٹھانا چاہا ہو؟''

''ہو...... بھی...... سکتا ہے۔'' قسطینا نے سرگوشی کی۔

''کیا آپ کے لوگ مکمل طور پر پسپا ہو گئے ہیں؟''

''لگ تو یہی رہا ہے۔'' قسطینا کے لہجے میں ہلکا سا تاسف تھا لیکن اس کے ساتھ تپش

بھی تھی۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ اب ہم اپنے نہیں ''دشمن'' کے علاقے میں تھے۔ اس اسپتال سمیت اردگرد کی ساری عمارتوں اور سڑکوں پر رائے زل کی فورس کو کنٹرول حاصل ہو گیا تھا اب کسی قریبی سڑک سے پُر جوش نعروں کی آوازیں بھی ہم تک پہنچ رہی تھیں۔ مجھے یاد آیا کہ 24 گھنٹے پہلے تک جاماجی کے لوگ کتنے پُر جوش تھے اور قسطینا نے بھی مجھے بڑے فخر سے بتایا تھا کہ ائیر پورٹ پر ہونے والی لڑائی میں ان کا ایک سنگل آدمی بھی کام نہیں آیا لیکن اب صورتِ حال مختلف تھی۔

میں نے سرگوشی میں کہا۔ ''یور ہائی نس، میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ یہ لوگ تھوڑی سی تاخیر کے ساتھ سخت ری ایکشن شو کریں گے۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو لائن آف کنٹرول کے اتنا نزدیک نہیں آنا چاہیے تھا۔''

''شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو مگر ہمارے پاس جدید سہولتوں والا یہی ایک بڑا اسپتال موجود ہے۔''

میں نے دل میں سوچا...... موجود ہے نہیں، موجود تھا۔ اس سے پہلے کہ قسطینا مزید کچھ کہتی، ایک بار پھر زینوں پر بھاری بوٹوں کی دھما دھم سنائی دی۔ ہمارے دل شدت سے دھڑک اٹھے۔ ہم مزاحمت تو کر سکتے تھے مگر یہ مزاحمت آدھ گھنٹے سے زیادہ نہیں چل سکتی تھی، اور اس بات کا دور دور تک امکان نہیں تھا کہ ایک آدھ گھنٹے میں یہاں کی مجموعی صورتِ حال تبدیل ہو سکتی ہے۔

سات آٹھ مسلح سپاہی چھت پر پہنچ گئے اور اس مرتبہ ان میں ایجنسی کے دو تین افراد بھی دکھائی دیئے۔ ایجنسی کے غیر ملکی سپاہیوں کی وردیاں بھی سبز تھیں مگر ان کی ٹوپیاں سبز اور سرخ دھاریوں والی تھیں۔

''دھوکے باز...... حرام زادے...... غدار۔'' قسطینا نے ایجنسی والوں کو دیکھا تو دانت پیس کر انہیں صلواتیں سنائیں۔ رائفل پر اس کی گرفت مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔

لڑائی کے دوران میں غالباً بجلی کے نظام کو نقصان پہنچا تھا۔ اسپتال کے بالائی فلور کو تاریکی نے ڈھانپ رکھا تھا۔ چھت بھی اس میں شامل تھی۔ ان حملہ آوروں کے ہاتھوں میں طاقتور ٹارچیں دکھائی دے رہی تھیں۔ یہ لوگ سرجن ڈاکٹر کی لاش تک پہنچے...... ایک ایجنسی اہلکار نے انگلش میں کہا۔ ''یہ یہاں کیسے پہنچا؟''

اس کا ماتحت ملائیشین لہجے کی انگلش میں بولا۔ ''لگتا ہے سر، زخمی ہو کر اوپر بھاگا اور

یہاں گر گیا۔''

''جہاں اسے گولی لگی ہے، یہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر نہیں آسکتا تھا، کوئی اسے اٹھا کر لایا ہوگا۔ دیکھو، کوئی اور تو موجود نہیں یہاں۔''

آفیسر ہدایات دیتا ہوا نیچے چلا گیا۔ ایجنسی کا ایک اہلکار اور تین چار دیگر افراد اوپر ہی رہے۔ وہ ایک بار پھر چھت کے کونے کھدروں کا جائزہ لینے لگے۔ انہوں نے ٹین کی چادروں کو الٹ پلٹ کرنا شروع کیا۔ ہم جس گھیرے میں تھے وہ تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ قسطینا کا ساتھی منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہا تھا۔ میں اور قسطینا بھی دم سادھے لیٹے تھے اور کسی بھی صورتِ حال کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کر رہے تھے۔

''اشرفی تم ادھر سے دیکھو۔'' امریکن افسر نے مقامی اہلکار کو حکم دیا۔

وہ گھوم کر عین اسی طرف آگیا، جہاں سے ہم خلا میں گھسے تھے۔ اب بچاؤ کی امید رکھنا حماقت تھی۔ قسطینا نے انگلی ٹریگر پر رکھ دی اور اپنے بریٹا پسٹل کا رخ خلا کی طرف موڑ دیا۔ میں نے بھی رائفل کو اسی جانب پوزیشن کر لیا۔ وہ شخص لڑکھڑاتا ہوا سا کچھ اور آگے آیا پھر اس نے گھٹنوں اور ایک ہاتھ کے بل جھک کر ٹارچ کا روشن دائرہ چادروں کے نیچے پھینکا، ہم تینوں بالکل ایک گوشے میں سمٹ گئے تھے۔ روشن دائرہ ہمارے بالکل پاس سے گزرا، پھر اس نے قسطینا کے ساتھی کی پنڈلیوں اور پاؤں کو روشن کیا۔ ایسا بس ایک سیکنڈ کے لیے ہوا۔ میری ایل ایم جی کسی بھی وقت شعلہ اگلنے کے لیے تیار تھی مگر روشن دائرہ آگے بڑھ گیا اور دائیں بائیں چکرا کر باہر چلا گیا۔ اشرفی نے شاید فتح کے نشے میں ایک دو پیگ لگا رکھے تھے، اس کی نظر نے درست کام نہیں کیا تھا یا پھر ہماری قسمت اچھی تھی کہ اس کی بینائی، اندھے پن میں بدل گئی تھی۔

ایک اور امکان کو بھی رد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ اشرفی نام کے اس نامعلوم شخص نے ہمیں ''رعایت'' دی ہو۔ بہرحال یہ بس ایک قیاس ہی تھا۔ ہم بے حس و حرکت وہاں پڑے رہے اور اپنی دھڑکنیں گنتے رہے۔ ڈاکٹر کی لاش وہاں سے اٹھوالی گئی۔ مسلح محافظ اِدھر اُدھر چکرانے کے بعد چھت کے دروازے کی طرف چلے گئے۔ یہاں کوئی چھوٹا سا باورچی خانہ تھا جس میں سے چائے کی ہلکی سی مہک اٹھ رہی تھی۔

''اب کیا کرنا ہے یور ہائی نس؟'' میں نے کہا۔

یور ہائی نس کو پہلی بار احساس ہوا کہ ٹارچ کی زد سے بچنے کے لیے وہ بالکل میرے ساتھ پیوست تھی۔ دائیں جانب سے اس کا جاں نثار ساتھی اس کے پہلو کو چھو رہا تھا۔ ہم تینوں

ٹن کی چادروں تلے اوندھے پڑھے تھے۔قسطینا تھوڑا سا پیچھے ہٹ گئی۔ دائیں جانب سے اس کے ساتھی نے بھی اپنے اور مالکن کے درمیان فاصلہ پیدا کر لیا۔ وہ شرمندہ سی آواز میں بولا۔''ویری سوری، یور ہائی نس۔''

''کوئی بات نہیں حیات۔'' وہ عام لہجے میں بولی۔ مجھے پتا چلا کہ اس کے مقامی ساتھی کا نام حیات ہے۔اس کی ہتھیلی پر کسی شاٹ گن کا فائر لگا تھا اور ایک چھرا گوشت میں گھسا ہوا تھا۔

''ہمیں ابھی وقت کا انتظار کرنا ہوگا۔ہوسکتا ہے کہ......'' وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

''کیا ہوسکتا ہے یور ہائی نس؟'' میں نے پوچھا۔

''شاید عزت مآب کے حکم پر افغانی جوابی حملہ کرے۔'' قسطینا نے کہا، تاہم اس کے لہجے میں یقین اور جوش کی کمی تھی۔

''مجھے اپنے ساتھی کی بھی فکر ہے۔'' میں نے مدھم آواز میں کہا۔

''کون؟...... ہاں تمہارا ساتھی مسٹر سجاول؟ کہاں ہے وہ؟''

''وہ فرسٹ فلور تک میرے ساتھ تھا پھر کسی کو بچانے کے لیے آپریشن تھیٹرز کی جانب چلا گیا، اس کے بعد پتا نہیں چلا۔''

''ادھر تو کافی نقصان ہوا ہے۔ مارٹر کے چار پانچ گولے بھی گرے ہیں...... چلو اگر زندگی ہے تو پھر کوئی آنچ نہیں......''

لیٹے لیٹے اب جسم اکڑنا شروع ہو گیا تھا۔ میں تھوڑا سا پیچھے کھسکا۔اس میں بڑی احتیاط کی ضرورت تھی۔ چادروں میں آواز پیدا ہوتی تو چھت پر موجود مسلح سپاہی چونک جاتے۔ پانچ چھ فٹ پیچھے کھسکنے کے بعد اندازہ ہوا کہ یہاں نسبتاً جگہ تھوڑی سی کشادہ ہے۔ہم کو دو فٹ سے زائد اونچائی مل سکتی تھی۔اس اونچائی میں اگر ہم سیدھے ہو کر نہیں تو ذرا جھک کر ضرور بیٹھ سکتے تھے۔

میں نے قسطینا کا پاؤں دبا کر اسے پیچھے آنے کے لیے کہا۔ وہ بھی احتیاط سے رینگتی ہوئی اس نسبتاً کشادہ جگہ پر آ گئی۔اب حیات کی باری تھی۔ وہ جب پیچھے ہٹا تو معمولی سی کھڑکھڑاہٹ پیدا ہوئی۔ہم جہاں کے تہاں منجمد ہو گئے۔ہم سے فقط پندرہ بیس میٹر کی دوری پر ''نیوسٹی'' کے خطرناک ہرکارے سرونٹ کچن میں موجود تھے اور چائے وغیرہ پی رہے تھے۔

ایک بار پھر قسمت نے یاوری کی اور وہ لوگ ہماری طرف متوجہ نہیں ہوئے۔ حیات بھی

پیچھے کو کھسک کر ہمارے پاس آ گیا۔ ہم آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے۔ تاہم ہمیں اپنی گردنیں جھکا کر رکھنا تھیں تاکہ سر چادروں سے نچ نہ ہو۔ کہیں دور ہیلی کاپٹر کی پھڑ پھڑاہٹ سنائی دی۔ غالباً یہ دو ہیلی کاپٹر تھے...... بلیک ہاک ٹائپ کے۔

قسطینا کے چہرے پر تھوڑی سی چمک آئی۔ ''یہ ہمارے چاپر ہیں......''

''آپ کا کیا خیال ہے جوابی حملہ......؟''

''شاید......''

ہم کچھ دیر خاموشی سے کان لگا کر آواز سنتے رہے۔ آواز پہلے کچھ قریب آئی لیکن پھر بتدریج دور ہوتی گئی اور معدوم ہو گئی۔ قسطینا ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئی۔ پستول بدستور اس کے ہاتھ میں تھا اور ہاتھ گود میں رکھا تھا۔ نیم تاریکی میں وہ بالکل کوئی خوبرو لڑکا ہی دکھائی دیتی تھی۔ لیکن اس ''خوبرو لڑکے'' کو میں تھوڑی دیر پہلے بے جگری سے لڑتے اور اپنے ساتھیوں کو کمانڈ کرتے دیکھ چکا تھا۔ وہ جیسے اپنے آپ میں ابل رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ ان چادروں کے ڈھیر میں سے کسی میزائل کی طرح نکلتی اور دشمنوں پر قیامت بن کر ٹوٹ پڑتی۔

کچن کے ساتھ ہی ایک سرونٹ کوارٹر ٹائپ جگہ تھی۔ چند مسلح سپاہی وہاں موجود تھے اور بلند آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ کسی وقت کوئی اڑتا ہوا سا فقرہ ہم تک بھی پہنچ جاتا تھا، وہ ریان فردوس اور اس کی فیملی کے لیے نازیبا الفاظ استعمال کر رہے تھے۔ ایک امریکن ایجنٹ یعنی ایجنسی اہلکار نے بلند آواز میں کہا۔ ''کاش وہ لیڈی کمانڈر یہاں ہوتی تو ہم اس سے لڑائی کے کچھ گُر ہی سیکھ سکتے......''

دوسرے نے کہا۔ ''لڑائی کے تو نہیں...... دفاع کے گُر وہ تمہیں ضرور سکھا سکتی تھی کیونکہ ہم جیسوں کے گھیرے میں تو اسے اپنے ''دفاع'' سے فرصت ہی نہیں ملنی تھی۔''

تین چار افراد لوفر انداز میں ہنسے پھر وہ شاید تاش کھیلنے میں مصروف ہو گئے جو افراد کچن کی طرف موجود تھے وہ اسپتال کے کسی کمرے سے کسی نرس کو پکڑ لائے تھے اور اب اس سے کوئی خاص ڈش بنوا رہے تھے۔ بڑی بھینی بھینی خوشبو اڑ کر ہم تک پہنچ رہی تھی۔ اس میں تلے ہوئے آلوؤں، مش رومز اور چکن کی موجودگی کا پتا چلتا تھا۔ نرس کو ''پکانے'' کے ساتھ ساتھ شاید سپاہیوں کی خرمستیاں بھی سنہا پڑ رہی تھیں۔ کوئی اس سے فحش مذاق کرتا تھا، کوئی چٹکی کاٹ لیتا تھا۔ گاہے بگاہے اس کی احتجاجی آواز بلند ہوتی تھی لیکن اسے ڈانٹ کر دوبارہ کام پر مجبور کر دیا جاتا تھا۔

یہ ساری آوازیں ہمارے لیے ناقابلِ برداشت تھیں۔ کسی وقت تو دل چاہتا تھا کہ ایل ایم جی لے کر نکل پڑوں اور کم از کم ان تین چار مہ نوشوں کو تو ضرور جہنم واصل کردوں پھر ان میں سے کوئی ایک اپنی لڑکھڑاتی ہوئی بھدی آواز میں ایک انگلش گیت گانے لگا۔ اس سنگیت کا مطلب کچھ اس طرح تھا۔

ہم چل پڑے ہیں تو منزل پر پہنچ کر دم لیں گے
کوئی رکاوٹ ہماری راہ میں نہیں آسکتی
ہم بزدل دشمن کو اس کی بل میں سے نکال کر ماریں گے
اور ہماری بہادری دیکھ کر
دشمن کی سرزمین ہمارے قدم چومے گی
پھل دار درختوں کی ساری ٹہنیاں خود ہمارے لیے جھک جائیں گی
اور وہاں کی خوبرو عورتیں
بڑی خوشی سے ہمارے گلے میں محبت کے ہار ڈالیں گی

''محبت کے ہار' والے الفاظ گانے میں بار بار آتے تھے اور جب یہ الفاظ آتے تھے سب مل کر گانے لگتے تھے ''محبت کے ہار''

ایک کڑاکے دار آواز نے ان میراثیوں کو خاموش ہونے پر مجبور کر دیا۔ یہ ان کا کوئی مقامی افسر تھا۔ اس نے انہیں ماں بہن کی گالیاں دیں اور اس بات پر بری طرح لتاڑا کہ وہ میڈیکل کے پیشے سے تعلق رکھنے والی ایک مجبور لڑکی پر مشقِ ستم کر رہے ہیں۔ وہ فی میل نرس کو ان سے چھڑا کر نیچے اسپتال میں لے گیا۔

ہم ایک بار پر ٹین کے اس ڈھیر تلے خاموش بیٹھے تھے۔ ہمارا بیٹھنا کافی مضحکہ خیز تھا۔ ہم نے آلتی پالتی مار کر سر حتی الامکان حد تک جھکا رکھے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی سزا دی گئی ہو۔ تادیر اس طرح بیٹھے رہنا ممکن نہیں تھا۔ جوں جوں رات آگے کو سرک رہی تھی ہوا میں خنکی بڑھتی جا رہی تھی اور ٹین کی یہ چادریں ٹھنڈی ہو رہی تھیں۔ ایک موقع پر حیات کو کھانسی آگئی اور اس نے جان توڑ کوشش کر کے اس کھانسی کو روکا۔ اس کوشش میں اس کے گلے سے گیں گیں کی دبی ہوئی آوازیں نکلیں......

قسطینا نے اس سے کہا۔ ''حیات! تم لیٹ جاؤ۔ دوبارہ کھانسی نہ ہونے لگے۔''

''نہیں، یور ہائی نس! میں یہ بے ادبی نہیں کر سکتا۔'' اس نے لرز کر کہا۔

''لیکن میں حکم دے رہی ہوں۔'' وہ ملائمت سے بولی۔

کچھ دیر ہچکچانے کے بعد حیات نے اپنے بالائی دھڑ کو قوس کی شکل میں حرکت دی اور پھر ہولے سے کروٹ کے بل لیٹ گیا۔ میں اور قسطینا اسی طرح بیٹھے رہے، باہر سے آنے والی آوازوں کو سنتے رہے۔ ''محبت کے ہار'' الاپنے والی ٹولی تو اب خجل ہو کر خاموش ہو چکی تھی مگر سرونٹ کوارٹر کی طرف گاہے بگاہے شور بلند ہوتا تھا۔ وہاں تاش کی بازی چل رہی تھی اور کھایا پیا جا رہا تھا۔

میرا پیٹ پچھلے بیس گھنٹے سے خالی تھا۔ اب بھوک لگنا شروع ہو گئی تھی۔ تلے ہوئے آلوؤں اور چکن کی بھینی خوشبو مسلسل نتھنوں میں گھس کر معدے میں ہلچل مچا رہی تھی۔ سڑکوں پر سے مسلح افراد کی گاڑیاں گزرتی تھیں اور کئی دفعہ نعرے بھی سنائی دیتے تھے۔ یہ نعرے رائے زل کے حق میں ہی ہوتے تھے۔ ساتھ میں کسی مدر مادام کا نعرہ بھی لگایا جاتا تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ رائے زل کی والدہ کا نعرہ تھا۔ ریان فردوس کی پہلی بیوی جو ایک عرصے سے خم ٹھونک کر میدان میں آئی ہوئی تھی، باہر سے آنے والی آوازوں میں گاہے بگاہے کسی ایمبولینس کا شور یا فائر کا دھماکا بھی سنائی دے جاتا تھا جس سے ماحول کی سنگینی بڑھ جاتی تھی۔

''آپ کے لیے تو ڈی پیلس میں بہت زیادہ فکرمندی ہو گی؟'' میں نے قسطینا سے مخاطب ہو کر سرگوشی میں کہا۔

''جنگ میں تو پھر ایسا ہی ہوتا ہے اور اب یہ ایجنسی اور اس کے پٹھوؤں کے ساتھ کھلی جنگ ہے۔''

''ہو سکتا ہے کہ آپ کی بازیابی کے لیے جوابی حملہ کیا جائے۔''

''ہو سکتا ہے اور نہیں بھی۔ عزت مآب فیصلہ کرتے ہوئے کچھ دیر لگاتے ہیں لیکن یہ بات تو اب طے ہے کہ جوابی حملہ ہو گا اور بڑا زوردار ہو گا۔'' وہ ایک دم چونک سی گئی۔ ''او مائی گاڈ۔'' اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

اس نے جلدی سے اپنی پینٹ کی پاکٹ تک ہاتھ پہنچایا اور اپنا سیل فون نکال لیا۔ سیل فون دیکھ کر اس نے اطمینان کی طویل سانس لی۔ سیل فون سائلنٹ پر تھا۔ یہ اچھا تھا کہ وہ سائلنٹ پر تھا ورنہ اس فون کی گھنٹی بج جاتی تو یقیناً ہماری بھی بج جاتی۔

میرا فون تو ادھر ڈی پیلس کی انیکسی میں ہی رہ گیا تھا۔ لہٰذا مجھے فکر نہیں تھی۔ قسطینا کے ساتھی حیات کے پاس بھی فون تھا۔ اس نے بھی قسطینا کی پیروی کرتے ہوئے جلدی سے فون نکالا اور اسے آف کر دیا۔ یقیناً یہ بھی ہماری خوش قسمتی ہی رہی تھی کہ اب تک حیات کے فون پر کوئی کال نہیں آئی تھی۔

قسطینا فون کو گھورتی چلی جا رہی تھی۔ وہ اسے آن کر کے اسکرین چیک کرنا چاہتی تھی۔ یہ بات تو یقینی تھی کہ اسے کالز کی گئی ہوں گی۔ ہو سکتا ہے کہ ایس ایم ایس بھی آئے ہوں۔ مگر اسکرین روشن کرنے کا مطلب خطرہ مول لینا تھا۔ ٹین کی چادروں کے نیچے چمکنے والا روشنی کا ننھا سا نقطہ بھی سرونٹ کوارٹر اور کچن میں موجود مسلح سپاہیوں کو ہماری طرف متوجہ کر سکتا تھا۔

ہنگامی صورتِ حال کے دوران میں میرے کندھے کا درد وقتی طور پر دب گیا تھا مگر اب وہ پھر مجھے بے چین کر رہا تھا۔ میں قسطینا پر اپنی تکلیف ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا مگر وہ کافی زیرک تھی، بھانپ گئی کہ میں تکلیف میں ہوں۔ اس کی سبز یونیفارم آٹھ پاکٹ والے ڈیزائن میں تھی۔ اس نے ایک پاکٹ میں ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹا سا باکس نکالا۔ یہ سگریٹ کی ڈبیا کے سائز کا تھا اور اسٹیل کا بنا ہوا تھا۔ اس میں فرسٹ ایڈ کا مختصر اور نہایت ضروری سامان موجود تھا۔ میڈیکل ٹیپ، پین کلر انجکشن اور چند گولیاں۔ اس نے نیم تاریکی میں باکس کھولا۔ کوشش کر کے ایک گولی ڈھونڈی اور سرگوشی میں بولی۔ ''پین زیادہ ہے تو اسے نگل لو لیکن پانی کے بغیر نگلنا ہوگی۔''

حقیقت یہ تھی کہ پیاس کی وجہ سے میرا گلا بالکل خشک ہو رہا تھا۔ اگر میں یہ ٹیبلٹ نگلنے کی کوشش کرتا تو لینے کے دینے پڑ سکتے تھے۔ کھانسی آ جاتی تو شاید ہمیں ٹین کی چادروں کے نیچے ہی بھون کر رکھ دیا جاتا مگر درد کا حل بھی کچھ اور نہیں تھا۔ درمیانی راستہ میں نے یہ نکالا کہ اس لمبوتری گولی کو منہ میں رکھ کر چبا لیا اور پیس کر نگل لیا۔ سارے منہ اور گلے میں بے تحاشا کڑواہٹ گھل گئی۔

○......❖......○

جب میں اپنے زخمی کندھے کے علاج کے لیے اس اسپتال کے مین گیٹ میں داخل ہوا تھا، میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں اسپتال میں داخل ہونے کے بجائے ایک چوہے دان میں پھنسنے جا رہا ہوں۔

ٹین کی بہت سی پرانی چادروں کے نیچے یہ ایک چوہے دان ہی تو تھا مجھے، قسطینا اور حیات کو یہاں ''ٹریپ'' ہوئے قریباً اڑتالیس گھنٹے ہو چکے تھے۔ ایک طرح سے یہ تیسری رات تھی جو اپنی تمام تر اذیت کے ساتھ ہمارے سر پر کھڑی تھی۔ قسطینا کے فرسٹ ایڈ باکس میں جتنی پین کلرز موجود تھیں وہ سب میں چبا چکا تھا اور بات صرف میری پین کی ہی نہیں تھی ان اڑتالیس گھنٹوں میں ہماری بھوک اور پیاس عروج پر پہنچ چکی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ پیٹ ہی نہیں پورا جسم خالی اور کھوکھلا ہے اس پیاس اور بھوک کو وہ بھینی بھینی خوشبو اور تکلیف دہ بنا دیتی

تھی جو شام کو کچن کی طرف سے اٹھتی تھی اور سارے میں پھیل جاتی تھی۔

"لگتا ہے کہ ہمارے ہیلی کاپٹر آ رہے ہیں۔" حیات نے مری مری آواز میں کہا۔

"ہیلی کاپٹر تو کل بھی دو بار آئے تھے مگر کوئی کارروائی کریں تب ہے نا۔" میں نے بے دلی سے کہا۔

"کارروائی تو ضرور ہوگی۔" قسطینا کی فاقہ زدہ آواز میں یقین کی لہر تھی۔

"ہماری وفات کے بعد ہوئی تو کیا فائدہ۔" میں نے یہ فقرہ زبان سے ادا نہیں کیا، لیکن دل میں یہی الفاظ تھے۔

کل دوپہر کے بعد قسطینا کے سیل فون کی بیٹری ختم ہوگئی تھی۔ حیات کا فون اس سے پہلے ہی ڈیڈ ہو گیا تھا۔ قسطینا کو آقا جان، حلمی اور ریان فردوس کی طرف سے کئی ایس ایم ایس موصول ہوئے تھے اور اسے اپنی شدید فکرمندی سے آگاہ کیا گیا تھا۔ ساتھ ہی یقین دلایا گیا تھا کہ اسے وہاں سے نکالنے کے لیے پروگرام ترتیب دیا جا رہا ہے۔ قسطینا نے ریان فردوس کو اپنی ٹھیک ٹھیک پوزیشن سے آگاہ کر دیا تھا۔ حلمی نے خیال ظاہر کیا تھا کہ شاید اسپتال کی چھت پر سے انہیں ہیلی کاپٹر کی مدد سے اٹھانے کی کوشش کی جائے۔

یہ سب کچھ بہت خطرناک تھا اور شاید اسی وجہ سے ابھی تک عملی طور پر کچھ بھی نہیں ہوسکا تھا۔ دوسرا راستہ یہ تھا کہ جاماجی کی فورس کی طرف سے ایک بڑے حملے کا انتظار کیا جائے...... جاماجی کی فورس یہ علاقہ کلیئر کرا لے اور یوں وہ تینوں بھی ٹین کی چادروں کی اس قبر میں سے نکل سکیں۔

ہیلی کاپٹرز کی آواز قریب آتی جا رہی تھی۔ یہ وہی دو بلیک ہاک یو ایچ 60 تھے جو ہم نے جزیرے پر آمد کے وقت ائیرپورٹ پر کھڑے دیکھے تھے۔ "لگتا ہے، اب کچھ نہ کچھ ہوگا۔" قسطینا کی آواز میں دبا دبا جوش تھا۔

ہیلی کاپٹرز کی آواز پہلی مرتبہ اتنی نزدیک آئی تھی۔ میں نے چادروں میں موجود ایک تنگ سوراخ کے ذریعے باہر جھانکنے کی کوشش کی لیکن ناکامی ہوئی۔ اچانک فائرنگ کی لرزہ خیز آواز سے در و دیوار گونج اٹھے۔ گن شپ ہیلی کاپٹرز اسپتال کے اردگرد اندھا دھند گولیاں برسا رہے تھے۔ جواب میں نیچے سے بھی فوراً فائرنگ شروع ہوگئی۔ دور مار رائفلوں اور راکٹ لانچرز کے دھماکے بھی سنائی دیئے۔ ایک ہیلی کاپٹر برق رفتاری سے اسپتال کی چھت کی طرف آیا اور ایک برسٹ مارتا ہوا گزر گیا۔ پائلٹ کو یقیناً سمجھایا گیا تھا کہ چھت پر پڑی چادروں کو HIT نہیں ہونا چاہیے۔ گولیوں سے ان چادروں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا...... اور اس کے

ساتھ ساتھ چھت پر موجود نیوسٹی کے سپاہیوں کو بھی کوئی نقصان نہیں پہنچا۔
یہ ایک ناکام حملہ تھا۔ نیچے سے اتنا شدید فائر کیا جارہا تھا کہ ہیلی کاپٹرز کسی بھی وقت ناقابل تلافی نقصان اٹھا سکتے تھے۔ (اور جیسا کہ بعد میں پتا چلا ایک بلیک ہاک کو نقصان پہنچا بھی تھا)

جلد ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ ہیلی کاپٹرز واپس جا رہے ہیں۔ دونوں ہیلی کاپٹرز نے کل آٹھ دس برسٹ ہی مارے ہوں گے۔ شاید ان کے جلدی واپس جانے کی ایک وجہ یہ بھی رہی ہو کہ ہم ایک اسپتال میں موجود تھے اور ''پاکیٹس'' اسپتال پر اندھا دھند گولیاں نہیں برسا سکتے تھے۔

دو چار منٹ تک اسپتال کی اردگرد کی سڑکوں پر ایمبولینسز کے سائرن سنائی دیتے رہے اس سے اندازہ ہوا کہ ہیلی کاپٹرز کی فائرنگ سے کچھ لوگ زخمی یا ہلاک ہوئے ہیں۔ اس کے بعد وہی پہلے والی روٹین کی آوازیں باقی رہ گئیں۔
قسطینا نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ ''لگتا ہے ابھی ہمیں کچھ دیر اور یہاں گزارا کرنا ہو گا۔''

قسطینا بڑے دبنگ لہجے میں بولتی تھی لیکن اب مسلسل بھوک پیاس کی وجہ سے اس کی آواز ٹوٹ رہی تھی۔ حیات نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''یور ہائی نس! میں آپ کی تکلیف برداشت نہیں کرسکتا۔ مجھے بتائیں میں کیا کروں؟''
''تکلیف تو ہم تینوں جھیل رہے ہیں اور تم دونوں تو زخمی بھی ہو۔''
''میرا زخم ایسا نہیں ہے مالکن کہ میں کچھ کر نہ سکوں۔'' حیات نے فدویانہ لہجے میں کہا۔
اس کی اپنی آواز بھی نقاہت سے ٹوٹ رہی تھی۔
ہیلی کاپٹرز کے مختصر حملے کے بعد چھت پر اب حالات پھر معمول کے مطابق تھے۔ کچن میں شاید بیسن والی مچھلی تلی گئی تھی اور بیف روسٹ کیا گیا تھا۔ باقی دو کھا کر جا چکے تھے لیکن ایک امریکن اور ایک مقامی اب بھی کچن میں موجود تھے۔ میں ایک درز میں سے ان دونوں کے ہیولے دیکھ سکتا تھا۔ چھت کی بجلی کل شام ہی بحال ہو گئی تھی۔ اب سرونٹ کوارٹرز اور کچن صاف دکھائی دیتے تھے۔
کچھ دیر بعد کچن میں موجود دونوں افراد کسی کے پکارنے پر نیچے جانے والی سیڑھیوں کی طرف چلے گئے۔ اب کچن خالی تھا، ہاں سرونٹ کوارٹر میں لوگ موجود تھے اور گفتگو ہو رہی تھی۔ یہ گفتگو ابھی تھوڑی دیر پہلے ہونے والی ''ہیلی کاپٹرز کی فائرنگ'' کے بارے میں تھی۔

ایک آواز آئی۔ ''مجھے تو لگتا ہے پائلٹوں کی جگہ گیدڑ بیٹھے ہوئے تھے۔''
دوسرے نے کہا۔ ''گیدڑ تو وہاں ڈی پیلس میں بیٹھا ہوا ہے۔ یہ تو اس کے بچونگڑے تھے۔''
پہلے نے کہا۔ ''یارو، یہ پوری فیملی ہی ہیجڑوں کی ہے۔'' یہ قصیدہ یقیناً ریان فردوس کی شان میں پڑھا جارہا تھا۔
بس اسی قسم کی گفتگو ہوتی رہی۔ ہم اپنی اپنی جگہ ساکت لیٹے رہے۔ ہمارے نیچے، ٹائلوں کا فرش تھا۔ یہ فرش دن کے وقت تپنے لگتا تھا اور رات کو یخ ہو جاتا تھا۔ کچھ یہی حال ٹین کی چادروں کا تھا۔ یہ چادریں شاید تعمیر کے دوران میں بچ گئی تھیں اور انہیں فالتو سامان کے ساتھ اس کونے میں ڈال دیا تھا۔ جزیرے کے دن اور رات کے ٹمپریچر میں خاصا فرق تھا۔ دن کے وقت پیاس بے حال کر دیتی تھی اور رات کو سردی کے سبب ''بھوک'' اپنے تیز پنجوں کے ساتھ معدے کو کریدنے لگتی تھی۔ یہ تیسری رات تھی اور مجھے محسوس ہورہا تھا کہ کل کا سورج جب طلوع ہوگا اور یہ چادریں گرم ہونا شروع ہوں گی تو ہم شدید ڈی ہائیڈریشن کا شکار ہو جائیں گے۔
مسئلہ یہ تھا کہ دو چار مسلح گارڈز ہر وقت چھت پر موجود رہتے تھے۔ کبھی یہ تعداد دس بارہ تک بھی پہنچ جاتی تھی۔ اگر کچن کی طرف کوئی نہیں ہوتا تھا تو سرونٹ کوارٹر کی طرف کوئی نہ کوئی ضرور موجود ہوتا تھا۔ اب بھی کچن کی طرف خاموشی تھی مگر کوارٹر کی طرف سے گارڈز کی منحوس آوازیں بلند ہورہی تھیں۔
''ہائیں، یہ کہاں گیا؟'' اچانک قسطینا کی سرگوشی نے مجھے چونکایا۔
میں نے بھی سر گھما کر دیکھا۔ حیات اپنی جگہ موجود نہیں تھا۔
''ابھی......تو......یہیں تھا۔'' قسطینا نے جیسے کراہ کر کہا۔
میں نے خود کو اوندھا کیا اور چادروں کے درمیان موجود ایک باریک جھری سے آنکھ لگائی۔ مجھے حیات نظر آیا۔ وہ نیم تاریکی میں پیٹ کے بل رینگتا ہوا کوئی بیس پچیس فٹ دور پہنچ چکا تھا اس کا رخ کچن کی طرف تھا جہاں سے اب بھی روسٹ گوشت اور تلے ہوئے پیاز کی مہک اٹھ رہی تھی۔ یقیناً اس نے بھوکوں مرنے کے بجائے، کوشش کرنے کو ترجیح دی تھی۔ وہ کچن سے کچھ لے کر آنا چاہتا تھا۔
''وہ کچن کی طرف جارہا ہے۔'' میں نے سرسراتی آواز میں قسطینا کو مطلع کیا۔
''یہ خطرناک کام کیا ہے اس نے۔'' وہ تاسف سے بولی۔

''مجھے لگتا ہے کہ وہ اپنے سے زیادہ ہمارے لیے فکر مند ہے، خاص طور سے آپ کے لیے......''

''مگر یہ رسک ہے، وہ کتنی دور گیا ہے؟''

''آدھے راستے میں ہے۔''

قسطینا ابھی تک پشت کے بل لیٹی تھی پھر وہ بھی اوندھی ہو گئی اور کسی جھری سے باہر جھانکنے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔

میں حیات کو دیکھ سکتا تھا۔ وہ ایک ایک انچ سرکتا ہوا کچن کی طرف جا رہا تھا۔ کچن میں موجود جو دو افراد نیچے گئے تھے، وہ ابھی تک نیچے ہی تھے۔ تاہم وہ کسی بھی وقت اوپر آ سکتے تھے۔ سرونٹ کوارٹر میں موجود افراد میں سے بھی کوئی باہر نکل سکتا تھا۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ حیات کو دیکھتا رہا۔ ایل ایم جی پر میری گرفت مضبوط تھی، تاہم ابھی تک میں یہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ کسی تصادم کی صورت میں مجھے کیا کرنا ہوگا۔

حیات بڑی دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کچن میں داخل ہو گیا۔ قریباً ایک منٹ بعد دوبارہ اس کا ہیولا نظر آیا لیکن اب وہ پیٹ کے بل نہیں رینگ رہا تھا رکوع کے انداز میں جھک کر چل رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کھانے کے لیے کچھ موجود تھا، پانی کی بڑی بوتل بھی تھی۔ وہ کچن اور سیڑھیوں سے دس بارہ قدم ہی آگے آیا تھا کہ دائیں جانب سرونٹ کوارٹر کا دروازہ پُرشور انداز میں کھلا اور ایک مسلح گارڈ ہاتھ میں خالی ٹرے لیے ہوئے برآمد ہوا۔ اس اچانک افتاد سے گھبرا کر حیات واپس مڑا اور تیزی سے سیڑھیوں میں اوجھل ہو گیا۔ خود کو گارڈ کی نظروں سے بچانے کے لیے وہ یقیناً سیڑھیوں میں کہیں کھڑا ہو گیا تھا۔ گرے یونیفارم والا تنومند گارڈ اپنے آپ میں مگن، کچن کے اندر داخل ہوا اور برتنوں کے کھڑکھڑانے کی آواز آنے لگی۔ وہ کھانے کے لیے کچھ نکال رہا تھا۔ اس کی واپسی کے بعد ہی حیات سیڑھیوں سے برآمد ہو کر ہمارے پاس پہنچ سکتا تھا۔

یکایک سیڑھیوں کی طرف شور سنائی دیا، اور ہم سکتہ زدہ رہ گئے۔ ''کون ہے یہ؟ پکڑو۔'' کسی غیر ملکی نے کڑک دار آواز میں کہا۔

اس کے ساتھ ہی گولی چلنے کی آواز آئی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہ وہی پستول ہے جو حیات کے پاس تھا۔

''پکڑو...... جانے نہ پائے۔'' کوئی پھر بھاری آواز میں چلایا۔ دھما چوکڑی مچی۔

میں نے چادروں میں موجود جھری میں سے دیکھا۔ سیڑھیوں کے دروازے پر حیات کا

ہیولا نظر آیا۔ اس کے پیچھے گارڈز تھے۔ پھر وہ اوندھے منہ کچن کے سامنے گرا۔ اس کے ہاتھ سے پانی کی بوتل گر کر دور تک لڑھک گئی۔ کئی افراد اس سے چمٹ گئے۔ اس سے پہلے کہ ہم کچھ سوچتے یا کر سکتے ایک بار پھر فائر کی آواز گونجی۔ یہ فائر بھی یقیناً حیات کے پستول سے ہی ہوا تھا۔ ایک دم ہنگامہ سرد پڑ گیا۔ حیات سے چمٹنے والے افراد پیچھے ہٹ گئے۔ مجھے حیات کا بے سدھ جسم دکھائی دیا۔ ایک فربہ اندام امریکی نے نیچے جھک کر حیات کے ہاتھ میں سے پستول نکال لیا۔ قسطینا کو یہ مناظر دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

''اس نے خود کو گولی مار لی۔'' میں نے سرگوشی میں قسطینا کو دردناک اطلاع پہنچائی۔

ہم اپنی اپنی جگہ ساکت اور خاموش لیٹے رہے۔ میں اوندھا لیٹا تھا اور چند انچ کے فاصلے پر قسطینا پشت کے بل پڑی تھی۔ ہمیں غم کی گہری تاریکی نے ڈھانپ لیا تھا کچن کے قریب سے آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ کسی نے انگلش میں کہا۔ ''یہ نیچے سے آیا ہے۔ سیڑھیوں کے موڑ پر دیوار سے لگا کھڑا تھا۔''

ایک اور شخص بولا۔ ''لیکن ڈبل روٹی اور روسٹ چکن تھا اس کے پاس...... اس کا مطلب ہے کہ یہ کچن تک پہنچا ہے اور پھر واپس آیا ہے۔''

مختلف آرا پیش کی جا رہی تھیں اور وہ کروٹ کے بل چھت پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اپنی تمام بھوک اور پیاس سمیت وہ راہی عدم ہو چکا تھا۔ وہ جاں نثار تھا اور اس نے بتا دیا تھا کہ جاں نثاری کیسے کی جاتی ہے، اسے اپنی بھوک پیاس سے نہیں زیادہ اپنی مالکن کی بھوک پیاس اور زندگی کی فکر تھی۔ اس نے مالکن کو کسی آزمائش میں بھی نہیں ڈالا تھا اور اس سے پوچھے بغیر کچن کی طرف رینگ گیا تھا اور وہ تقریباً کامیاب ہو چکا تھا...... لیکن......

گرتے وقت جو بوتل اس کے ہاتھ سے نکلی تھی، وہ لڑھک کر ہم سے چار پانچ میٹر کی دوری تک پہنچ چکی تھی اور وہ اپنے ہی خون میں ڈوب کر سرخرو ہو چکا تھا۔ اس کا نام حیات تھا...... اور اب وہ ''حیات'' نہیں تھا۔

اس کی لاش کو ایک اسٹریچر نما تختے پر ڈال کر نیچے لے جایا گیا۔ مختلف آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ زیریں فلور پر زور شور سے کونے کھدروں کی تلاشی لی جا رہی ہے پھر تلاشی لینے والے چھت پر بھی آ گئے۔ ہماری دھڑکنیں بڑھ گئیں۔ وہ چاروں طرف گھوم پھر کر دیکھنے لگے۔

انہوں نے ٹین کی چادروں کے ساتھ بھی اٹھا پٹخ کی۔ ایک بار پھر قسمت نے ہماری یاوری کی اور وہ چادروں کے ڈھیر کے نیچے وہاں جھانکنے میں ناکام رہے جہاں ہم بے حرکت

لیٹے تھے۔

رات پل پل آگے کو سرکتی رہی۔ ہم دو بے جان جسموں کے مانند چھت کی سرد ٹائلوں پر لیٹے تھے۔

اب نقاہت اتنی بڑھ چکی تھی کہ بولنا بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ قسطینا کی قوتِ برداشت میں کوئی شک نہیں تھا لیکن کچھ بھی تھا وہ بھی گوشت پوشت کی انسان تھی، اسے چپ سی لگتی جا رہی تھی۔

پچھلے قریباً دس گھنٹے سے کسی ہیلی کاپٹر کی آواز بھی سنائی نہیں دی تھی نہ ہی اردگرد کوئی اور جنگی سرگرمی نظر آتی تھی۔ ہم بہت تھک جاتے تھے تو اٹھ کر بیٹھ جاتے تھے ورنہ لیٹے رہتے تھے۔

یہ رات تو جیسے تیسے گزر سکتی تھی لیکن یہ بات واضح تھی کہ جب کل کا سورج طلوع ہوگا اور ٹین کی چادروں کا یہ ڈھیر گرم ہونا شروع ہوگا تو ہماری ڈی ہائیڈریشن عروج پر پہنچ جائے گی اور شاید ہم اپنے ہوش و حواس کے ساتھ کل کی شام نہ دیکھ سکیں۔

میری نگاہ ایک بار پھر پانی کی اس سفید بوتل پر جم گئی جو ہم سے چار پانچ میٹر کے فاصلے پر موجود تھی۔ ہم اس PET بوتل کو حاصل کر لیتے تو بھی شاید ایک آدھ دن مزید گزارا جا سکتا۔ لیکن بوتل تک پہنچنا شدید خطرے سے خالی نہیں تھا۔

بالآخر میں نے فیصلہ کیا کہ میں بوتل تک پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ قسطینا سے بات کی تو بحث ہوگئی۔ اس نے کہا۔ ”اگر یہ رسک لینا ہی ہے تو پھر میں لوں گی، کیونکہ میں دائیں طرف ہوں اور نکل سکتی ہوں۔“

”آپ اٹھ کر بیٹھ جائیں تو مجھے بھی باہر نکلنے کا راستہ مل سکتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”میں جانتی ہوں، تمہارا کندھا بری طرح سوج چکا ہے۔ تم اس قابل نہیں ہو کہ آسانی سے کرالنگ کر سکو۔“

ابھی ہماری بحث جاری ہی تھی کہ مسئلہ حل ہو گیا۔ ایک سوپر آیا۔ اس نے کچن کے پاس سے کھانے پینے کی وہ اشیا سمیٹیں جو آخری لمحوں میں حیات کے ہاتھ سے گری تھیں، پھر وہ چادروں کی جانب آیا، اس نے پانی والی بوتل اٹھائی اور چلتا بنا۔ ہم دونوں مایوسی اور تاسف کے اندھیرے میں ڈوب کر رہ گئے۔ میں نے اپنے گلے کو تھوک سے تر کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے یور ہائی نس...... پہلے آپ پہلے آپ والا محاورہ ہم پر صادق آتا ہے۔“

اس نے کچھ نہیں کہا بس آنکھیں بند کیے لیٹی رہی، تکلیف اور بھوک پیاس انسان سے ہر طرح کے جمالیاتی اور رومانی احساسات چھین لیتی ہے۔ ہم دونوں کی کیفیت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ دور دور تک اس چیز کا احساس نہیں تھا کہ ہم مرد اور عورت ہیں۔

میں ایک بار پھر سجاول اور ڈی پیلس وغیرہ کے بارے میں سوچنے لگا۔ پتا نہیں کہ سجاول پر کیا بیتی تھی۔ وہ زندہ بھی تھا یا نہیں۔ عین ممکن تھا کہ وہ گرفتار ہو چکا ہو اور اب آس پاس ہی کہیں دوسرے گرفتار شدگان کے ساتھ بند ہو۔ ڈی پیلس میں انیق پتا نہیں کیا سوچ رہا ہوگا؟ اس کی طرف سے یہ اندیشہ بھی موجود تھا کہ کہیں مایوسی اور پریشانی کے عالم میں کوئی ''رسکی'' قدم نہ اٹھا لے۔ اور جاناں...... وہ یقیناً مسلسل انیق کے کان کھا رہی ہوگی اور اسے مجبور کر رہی ہوگی کہ وہ میری WHERE ABOUTS کے بارے میں معلوم کرے۔

اور پھر سرسوں کا کھیت...... سرما کی چمکیلی دھوپ، ہوا میں اڑتی ہوئی دولٹیں...... میں سوچتا رہا......

یہ رات کا تیسرا پہر تھا۔ سمندر کی طرف سے مدھم ہوا چلنا شروع ہوگئی تھی۔ ٹین کی اس قبر سے باہر آسمان پر آخری راتوں کا چاند تھا۔ نیلا آسمان تھا کیلے، ناریل اور اناس کے درخت ہوا میں جھومتے تھے اور ساحل کے پیچ وخم سے سمندر کی جوشیلی لہریں بغل گیر ہوتی تھیں۔ مگر یہ سب کچھ ہماری نگاہوں سے دور تھا۔ میں نے اپنے ورم زدہ کندھے کو دائیں ہاتھ سے دبا رکھا تھا اور ٹیسوں کو برداشت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کندھے کا ورم اب کہنی تک پہنچ گیا تھا۔ بخار بھی محسوس ہو رہا تھا۔

''ویری ساری شاہ زائب۔'' قسطینا نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔

''کس بات پر؟''

''تمہارے کندھے کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے۔ اس کی ذمے دار میں ہوں۔ میں نے تمہیں براڈے (گارڈ) کے ہاتھوں بری طرح پٹوایا۔ کاش وہ سب کچھ نہ ہوتا۔''

''آپ نے دوبارہ یہ بات کی ہے...... یقین کریں میں اپنی جگہ شرمندگی محسوس کر رہا ہوں۔''

وہ چپ رہی، کوئی آوارہ بلی چادروں کے اوپر سے کھڑکھڑاتی ہوئی گزر گئی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ چند سیکنڈ بعد وہ عجیب لہجے میں بولی۔ ''تم ایسٹرن ہونا، ایم ایم اے کے مشہور کھلاڑی......؟''

میرے سر پر جیسے کسی نے بم پھوڑ دیا تھا۔ میں کتنی ہی دیر خاموش رہا۔ آخر میں نے کہا۔

"یہ...... آپ...... کیا کہہ رہی ہیں؟"

وہ ویسے ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "تم جان ہی چکے ہو گے، مارشل آرٹ میرا بھی جنون ہے۔ جب میں نے تمہیں دیکھا تو پتا نہیں کیوں لگا کہ تمہیں پہلے بھی دیکھا ہوا ہے پرسوں میٹنگ کے بعد تمہارے دوست مسٹر سجاول سے بات ہوئی، اس نے مجھے بتا یا۔"

"کیا بتا دیا؟"

"یہی کہ تم ڈنمارک سے آئے ہو اور وہاں فائٹنگ وغیرہ کے بہت مشہور کھلاڑی ہو۔ وہ بس اتنا ہی جانتا ہے۔ اسے تمہاری حیثیت کا ٹھیک اندازہ نہیں ہے۔ لیکن میں تو جانتی ہوں کہ ڈنمارک اور ایسٹرن کا کیا مطلب ہے......"

میں سکتہ زدہ سا لیٹا رہا۔ مجھے سجاول سے ایسی توقع نہیں تھی۔ پتا نہیں کہ اس نے یہ سب کچھ کیوں اگل دیا تھا۔ قسطینا نے ہولے سے میرا ہاتھ دبایا۔ "میں فخر محسوس کر رہی ہوں کہ اس وقت ایک ایسا شخص میرے ساتھ ہے جو بے شمار لوگوں کے لیے ایک لونگ لیجنڈ کی طرح ہے۔"

میں کافی دیر تک اپنے اندرونی اضطراب کو سنبھالنے کی کوشش کرتا رہا اور یہ کوشش کرتا رہا کہ میں اپنے خشک گلے کے ساتھ کچھ بول سکوں۔ آخر میں نے کہا۔ "یور ہائی نس، اس سلسلے میں ہم بعد میں بات کر سکتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ وقت تیزی سے گزر رہا ہے اگر ہمیں کل کا دن بھی اس جہنم میں گزارنا پڑ گیا تو ہم زندہ نہیں رہ سکیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ اگر ہم کچھ کر سکتے ہیں تو آج رات کر گزریں۔"

وہ کافی دیر خاموش رہی، پھر بولی۔ "میں ایک شرط پر تیار ہوں مسٹر ایسٹرن! تم مجھے یور ہائی نس نہیں کہو گے...... اور یہاں سے نکلتے ہوئے ہم ایک جیسا خطرہ مول لیں گے۔ نہ کم نہ زیادہ......" اس کے لہجے میں انوکھی سی اپنائیت محسوس ہوئی۔

چھت پر بھاری بوٹوں کی دھما دھم تھی اور قابض سپاہیوں کی کرخت آوازیں تھیں۔

○......❖......○

اب رات کے قریباً بارہ بج چکے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق کچن میں دو مسلح گارڈز موجود تھے۔ عام طور پر کچن میں موجود لوگوں کی تعداد چار پانچ تک ہوتی تھی۔ اس لحاظ سے دیکھا جاتا تو کارروائی کے لیے یہ وقت مناسب تھا۔ مناسب نہ بھی ہوتا تو آج رات کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ ہم ان ٹین کی چادروں کے نیچے کل کے تپتے سورج کا مقابلہ نہیں کر سکتے

اب میں بھی انہیں دیکھ چکا تھا۔ وہ کچن کے فرش پر ہی ایک چٹائی پر لیٹے تھے اور ان کے قریب ہی وہسکی کی بوتل پڑی تھی۔ وہ ہیڈ فون لگائے شاید موسیقی سن رہے تھے۔ میں نے دروازے کے قریب پہنچ کر رائفل کو دیوار کے ساتھ رگڑا۔ خاصی آواز پیدا ہوئی نتیجہ وہی نکلا جو میں چاہتا تھا۔ ایک گارڈ نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ وہ امریکی تھا۔ میں نے اچھل کر اس کی گردن دبوچ لی۔ ایسا کرتے ہوئے میرے بائیں کندھے میں ناقابلِ برداشت ٹیس اٹھی مگر دایاں بازو تو پوری طرح صحت مند تھا۔ گارڈ کوئی آواز نہیں نکال سکا اور اب اس نے کبھی کوئی آواز نکالنا بھی نہیں تھی۔ اس کی گردن ٹوٹ چکی تھی۔ میں اسے مارنا نہیں چاہتا تھا مگر کوئی رسک بھی نہیں لے سکتا تھا۔ اس لیے گردن پر طاقت کچھ زیادہ صرف ہو گئی تھی۔ وہ میرے ہاتھوں میں توری کی طرح جھول گیا، میں نے اسے آہستہ سے نیچے لٹا دیا۔

ابھی میں اسے لٹا کر سیدھا بھی نہیں ہوا تھا کہ دوسرا گارڈ پہنچ گیا۔ شاید اس نے کچھ کھٹ پٹ سن لی تھی۔ قسطینا اس کے لیے پہلے سے تیار تھی۔ اس نے وزنی رائفل کے دستے کا نہایت جچا تلا وار نو وارد کی کنپٹی پر کیا، وہ گھٹنوں کے بل گرا۔ رہی سہی کسر میرے گھونسے نے پوری کر دی اور وہ چت ہو گیا۔ یہ شکل وصورت سے ملائیشین لگتا تھا۔ ہم نے دونوں کو پھرتی سے کچن میں گھسیٹا اور دروازہ اندر سے بولٹ کر لیا۔ یہاں ایک ہی کھڑکی تھی، اس کا پردہ پہلے سے برابر تھا۔

”کیا یہ مر گیا؟“ قسطینا نے امریکی کا چہرہ دیکھ کر کہا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ امریکی جواں سال تھا۔ اٹھائیس تیس کا رہا ہو گا۔ وہ ایجنسی والوں کی سبز وردی میں تھا۔ ریان فردوس کے سپاہیوں اور ایجنسی والوں کی وردی میں فقط اتنا فرق تھا کہ ایجنسی والوں کو ٹوپیاں سبز اور سرخ دھاریوں والی تھیں۔ میں نے دل میں سوچا، ایک امریکی کا مرنا کتنا اہم ہوتا ہے اور جب یہی امریکی ہیروشیما میں، ویت نام میں، افغانستان اور عراق میں لاکھوں بے گناہوں کو مار ڈالتے ہیں تو یہ بس حالات کی کارستانی ہوتی ہے۔

امریکی اور ملائیشین گارڈز کی ٹوپیاں ہیلمٹس اور رائفلیں وغیرہ دیوار کی کھونٹیوں پر جھول رہی تھیں۔ ملائیشین کے بارے میں بھی یہی اندازہ تھا کہ وہ ڈیڑھ دو گھنٹے سے پہلے پوری طرح ہوش میں نہیں آئے گا۔ ایک دم میرے ذہن میں خیال آیا۔ میں نے قسطینا سے کہا۔ ”ہم کیوں نہ ان کی یونیفارمز استعمال کریں۔“

اس نے چونک کر دونوں افراد کی طرف دیکھا۔ درمیانے قد کے ملائیشین کی وردی

قسطینا کے جسم پر آسکتی تھی۔ ان دونوں کی بلٹ پروف جیکٹس بھی یہاں موجود تھیں اور ہیلمٹس بھی۔ یہ سب چیزیں ہمارے کام آسکتی تھیں۔ کچن کے اردگرد مکمل خاموشی تھی۔ میں نے ریفریجریٹر کھولا۔ منرل واٹر کی ٹھنڈی بوتلیں موجود تھیں۔ پانی پی کر یوں لگا جیسے جسم میں زندگی اتر رہی ہے۔ جان میں جان آئی۔ کچھ سینڈوچ بھی ریفریجریٹر میں سے نکل آئے۔ آگے بڑھنے کے لیے جسمانی توانائی کی ضرورت تھی۔ ہم نے جلدی جلدی تین چار سینڈوچ نگلے۔

''لائٹ آف کر دو۔'' قسطینا نے کہا۔

میں نے لائٹ آف کر دی۔ اب بس کھڑکی اور روشن دان سے آنے والی مدھم روشنی ہی کچن میں موجود تھی۔

ہم نے جلدی جلدی اپنا لباس تبدیل کیا۔ ایسا کرتے ہوئے میں نے اپنا رخ قسطینا کی طرف سے پھیر لیا تھا۔ امریکن کی یونیفارم میرے جسم پر بالکل درست آئی۔ جیسے یہ میرے ناپ پر بنائی گئی ہو۔ بہرحال ملائیشین گارڈ والی یونیفارم قسطینا کے جسم پر پوری نہیں اتری۔ لمبائی میں تو یہ تقریباً ٹھیک ہی تھی، کیونکہ قسطینا کا قد لمبا تھا مگر چوڑائی کے رخ پر یہ یونیفارم سے کچھ ڈھیلی رہی۔ اس ڈھیلے پن کی کمی بلٹ پروف جیکٹ نے پوری کر دی۔ ایک بلٹ پروف جیکٹ میرے حصے میں بھی آگئی۔ ہم نے سیفٹی ہیلمٹس بھی سروں پر رکھ لیے۔ بوٹوں کا مسئلہ تھوڑا سا ٹیڑھا ہوا۔ ملائیشین گارڈ والے بوٹ قسطینا کے لیے بہت کھلے تھے۔ وہ یہ بوٹ نہیں پہن سکی اور اس نے اپنے ہی بوٹ دوبارہ پہن لیے۔ دونوں گارڈز کے جسموں پر اب فقط ان کے زیر جامہ ہی تھے۔ ہم نے انہیں گھسیٹ کر ایک کونے میں ڈال دیا اور اوپر چٹائی اس طرح رکھ دی کہ وہ فوری طور پر نظر نہ آسکیں۔ اپنے اتارے ہوئے لباس بھی ہم نے اسی طرح ایک کچن کیبنٹ میں چھپا دیے۔ اپنی رائفلوں کو ''ان لوڈ'' کر کے ہم نے ''اوون'' کے پیچھے ایک خلا میں گھسا دیا، اب ہمارے ہاتھوں میں گارڈز والا اسلحہ ہی تھا۔ اس میں ایک سیون ایم ایم اور ایک ٹرپل ٹو تھی۔ میں نے تنقیدی نظروں سے قسطینا کی طرف اور اس نے میری طرف دیکھا۔ ہم دونوں اپنی اپنی جگہ مطمئن ہوئے۔

ہر دم بڑھتی ہوئی سنسنی کے سبب رگوں میں لہو کی گردش تیز ہو چکی تھی۔ ان لمحات میں اتنا تھرل تھا کہ مجھے اپنے کندھے کا درد بھی بھولا ہوا محسوس ہوا۔ ہم ایک ساتھ کچن میں سے باہر نکلے اور سیڑھیوں پر آگئے۔ ہیلمٹ کی ''فیس شیلڈز'' ہم نے اٹھالی تھیں۔ ان کو گرا کر رکھنا شبہے کا باعث بن سکتا تھا۔ سیڑھیوں پر پہنچتے ہی نچلے فلور کی آوازیں واضح ہوگئیں۔ قدموں کی چاپ، دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آہٹیں، مختلف آوازیں جن میں میل اور فی میل

نرسوں، ڈاکٹرز کی گفتگو بھی شامل تھی۔ ہم سیڑھیوں کے نچلے سرے پر پہنچے تو ایک اسٹریچر دکھائی دیا۔ دو گارڈز اسٹریچر اٹھائے ہمارے سامنے سے گزرے۔ لگتا تھا کہ اسٹریچر پر کوئی ایسا شخص ہے جس کی ایک ٹانگ اڑ چکی ہے۔ غالباً وہ کچھ دیر پہلے ہونے والی شیلنگ میں زخمی ہوا تھا۔ دونوں گارڈز نے ہماری ہی طرح بلٹ پروف جیکٹس اور ہیلمٹ پہن رکھے تھے۔ اسپتال کے اندرونی حصے سے زخمیوں کی آہ و بکا بھی سنائی دے رہی تھی۔ ہم ایک کمرے کے سامنے سے گزرے اور یہ جان کر تسلی ہوئی کہ وہاں موجود مسلح سکیورٹی اہلکاروں نے ہم پر کوئی خصوصی توجہ نہیں دی۔

ہم نیچے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔ تب ہمیں ایک آفیسر دکھائی دیا۔ وہ اپنے کسی ماتحت کو ہدایات دیتا ہوا جا رہا تھا۔ میں نے اس کی آواز سے ہی اسے پہچان لیا۔ یہ وہی بندہ تھا جس کی جھلک میں نے دو روز پہلے چھت پر دیکھی تھی۔ جب کچن میں موجود مسلح افراد نرس سے چھیڑ خانی کر رہے تھے تو ''نیوسٹی'' کے اس آفیسر نے آ کر اپنے ماتحتوں کو ڈانٹا پھٹکارا تھا اور اس کی جان چھڑائی تھی۔ میں بھونچکا رہ گیا۔ اب وہی لمبی ناک والا آفیسر نشے میں نظر آ رہا تھا اور وہی خوب صورت نرس اس کی بغل میں دبی ہوئی تھی۔ وہ اسے لے کر ایک کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ دکھاتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے؟

ہم سیڑھیاں اترے اور گراؤنڈ فلور پر پہنچ گئے۔ یہاں مختلف وارڈز تھے اور مریضوں کی بہت بڑی تعداد تھی۔ پتا نہیں کیوں میرا دل چاہ رہا تھا کہ ہم سجاول کے بارے میں کچھ جاننے کی کوشش کریں لیکن ایسا کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ ہم دو مسلح گارڈز کے درمیان سے گزرتے ہوئے ایک کوریڈور میں آ گئے۔ ہم اس کوریڈور میں پندرہ بیس قدم آگے ہی گئے تھے کہ یوں لگا جیسے کسی نے عقب سے پکارا ہے۔ میں سنی ان سنی کر کے آگے بڑھتا رہا۔ یقیناً قسطینا نے بھی یہ آوازیں سن لی تھیں مگر اس نے بھی اپنے قدم روکے نہیں۔ چند سیکنڈ بعد آواز دوبارہ آئی۔ اس مرتبہ وہ کافی واضح تھی۔ ملائی میں کہا گیا۔ ''ٹھہرو، رک جاؤ۔''

اب ہمارے پاس صرف بھاگنے کا آپشن تھا لیکن اس سے پہلے کہ ہم یہ آپشن استعمال کرتے، یہ خود بخود ہی ختم ہو گیا۔ چند قدم آگے جا کر ہمیں پتا چلا کہ یہ کوریڈور آگے سے بند ہے۔ ہمارے پیچھے آتے ہوئے پہریدار بڑی تیزی سے ہمارے سروں پر پہنچ گئے۔ ان میں سے ایک غیر ملکی اور دوسرا مقامی تھا۔ مقامی پہریدار کی نگاہ سیدھی قسطینا کے جوتوں پر جا رہی تھی۔

''کون ہو تم؟'' پہریدار نے سخت لہجے میں کہا۔

جواب میں قسطینا نے بے دریغ فائر کیا جو سیدھا اس کی پیشانی پر لگا۔ دوسرے پہریدار کو میں نے ٹانگ سے ضرب لگائی۔ یہ ضرب بھی گولی ہی کی طرح مہلک تھی۔ پیٹ کے بالائی حصے پر لگنے والی ایسی ضرب عام طور پر مدِمقابل کے اندرونی اعضا کا کچومر نکال دیتی ہے...... خاص طور سے اگر مدِمقابل ضرب کے لیے تیار نہ ہو۔ میرا مدِمقابل بھی پشت کے بل دیوار سے ٹکرایا اور پھر اوندھے منہ اپنے امریکن ساتھی پر گرا۔ اس کی ناک سے جیسے خون کا فوارہ سا نکل پڑا تھا۔

فائر کی آواز نے ہر طرف ہلچل مچا دی تھی۔ یہ کوریڈور سیدھا ہونے کے بجائے خم دار تھا۔ ہمیں تیس چالیس فٹ پیچھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا مگر ہم بھاگتے قدموں کی آوازیں صاف سن سکتے تھے۔ یہ تعداد میں کافی افراد تھے اور یقیناً مسلح ہوں گے ایک طرح سے یہ ''قدموں'' کی چاپ نہیں تھی، موت کی چاپ تھی اور یہ بڑی تیزی سے ہمارے قریب آ رہی تھی۔ ہمارے عقب میں سپاٹ دیوار کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ایک طرح سے ہم ایک چوہے دان سے نکل کر دوسرے چوہے دان میں پھنس گئے تھے۔ یہ مشکل ترین لمحے تھے۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ تب میں نے ایک ساعت کے لیے قسطینا کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہاں مرنے اور مار دینے والی کیفیت تھی لیکن اس طرح اندھا دھند جان دے دینا میرے نزدیک بے وقوفی ہی تھی۔ بہتر یہ تھا کہ اگر ہم خود کو بے بس پائیں تو سرنڈر کر دیں۔

''کیا خیال ہے؟ لڑنا ہے؟'' میں نے سرسراتے لہجے میں قسطینا سے پوچھا۔

''تمہارا کیا خیال ہے؟'' وہ بھی میرے ہی انداز میں بولی۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، ہمارے پہلو میں ایک بند دروازہ اچانک کھلا۔ ''اندر آ جاؤ...... بچ جاؤ گے۔'' ایک شخص نے تیز لہجے میں کہا اور اس کے ساتھ ہی قسطینا کا بازو پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچا۔

سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ میں اور قسطینا جلدی سے اندر چلے گئے۔ اس شخص نے دروازہ اندر سے بولٹ کر دیا۔ وہ گرے یونیفارم میں تھا اور انگلش بول رہا تھا۔ اس کی کمر سے چھوٹی نال کی رائفل جھول رہی تھی۔ میں اس کی صورت دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ یہ یقیناً وہی گارڈ تھا جس نے چھت پر پہلی شب کوٹین کی چادروں کے نیچے اپنی ٹارچ کا روشن دائرہ گھمایا تھا اور مجھے شک گزرا تھا کہ اس نے ہمیں دیکھ لیا ہے...... ہاں میری نظر دھوکا نہیں کھا رہی تھی...... یہ وہی تھا۔

کوریڈور میں اب تہلکہ سا مچ گیا تھا۔ اس کوریڈور میں دونوں طرف درجنوں

دروازے تھے۔ یہ دروازے دھڑا دھڑ بجائے جا رہے تھے۔ کمرے کے اندر سے بھی مختلف آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ شخص ہمیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے ایک کچن نما جگہ پر لے آیا۔ اس نے ایک دروازہ کھول کر ہمیں باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔ کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع نہیں تھا، نہ ہی شکریہ ادا کرنے کا موقع تھا۔ اس وقت فقط یہ احساس ہو رہا تھا کہ کسی نے مشکل ترین وقت میں ہماری مدد کی ہے۔

ہم دروازے سے باہر نکل آئے۔ یہ پارکنگ ایریا تھا۔ بڑی بڑی لائٹس اس ایریا کے مختلف حصوں کو روشن کر رہی تھیں۔ یہاں ابھی تک سکون تھا۔ سامنے ہی دو بکتر بند گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ایک گاڑی کی طرف لپکے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک ہٹا کٹا امریکن موجود تھا۔ وہ اپنی دھاری دار کیپ کی وجہ سے دور ہی سے پہچانا جا رہا تھا۔ وہ کچھ ہراساں نظر آیا۔ یقیناً اس نے اندر ہونے والے فائر اور ہڑبونگ کی آوازیں سن لی تھیں۔ ہمیں اپنی طرف آتا دیکھ کر وہ گاڑی سے باہر نکل آیا۔

''کیا ہوا ہے وہاں؟'' اس نے انگلش میں مجھ سے پوچھا۔

میں نے اسے زبانی جواب دینے کے بجائے عملی جواب سے نوازا۔ ایک بھرپور مکا اس کی گردن پر سامنے کی طرف لگا اور وہ بے جان چھپکلی کی طرح اوندھے منہ قسطینا کے قدموں میں گرا۔ سپر پاورز کے بندے قدموں میں کب گرتے ہیں مگر جنگ اور محبت میں بہت کچھ معمول سے ہٹ کر ہوتا ہے۔

چابی اگنیشن میں ہی تھی۔ قسطینا اچک کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ میں نے اس کے ساتھ والی نشست سنبھالی۔ بکتر بند گاڑی سے صرف تیس چالیس فٹ کے فاصلے پر ایجنسی کا ایک اور گارڈ موجود تھا۔ اپنی دھاری دار کیپ کی وجہ سے وہ بھی دور ہی سے پہچانا جا رہا تھا۔ حیرت انگیز طور پر وہ اپنے بالکل قریب ہونے والی اس کارروائی سے یکسر بے خبر رہا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی تمام تر توجہ اسپتال کے اندرونی حصے سے ابھرنے والی آوازوں کی طرف تھی۔ یہاں اب جگہ جگہ دھاری دار ٹوپیوں والے ایجنسی کے افراد نظر آ رہے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ایجنسی والے اب کھل کر سامنے آ گئے ہیں...... اور اپنے حقیقی حلیف رائے زل کے کندھے سے کندھا ملا رہے ہیں۔ ان کی منافقت کا پردہ چاک ہو گیا تھا۔

قسطینا کی خوب صورت آنکھوں میں شعلے سے لپک رہے تھے۔ اس نے انجن اسٹارٹ کیا اور گاڑی کو باؤنڈری لائن کی طرف بڑھایا۔ وہ ٹھیک سے گیئر نہیں لگا پا رہی تھی اور انجن دھاڑ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ہمیں ڈھونڈنے والے اب پارکنگ لاٹ میں بھی پہنچ گئے

ہیں۔ وہ ہر طرف بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ احاطے میں طاقتور لائٹس آن تھیں۔ ہر منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ کچھ افراد ہمارے والی بکتر بند کی طرف لپکے۔

''جلدی کریں قسطینا! وہ آرہے ہیں۔''

''گیئر میں کوئی نقص ہے۔'' قسطینا نے جھنجلا کر کہا۔

مگر پھر اچانک گاڑی ایک زوردار جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ پہلے کے بجائے اسے دوسرا گیئر لگا تھا۔ وہ ہچکولے کھاتی کچھ دور تک گئی پھر اس نے ایک دم رفتار پکڑ لی۔ گولیوں کی ایک باڑ آئی۔ ایک گولی نے بکتر بند کی چھوٹی سی ونڈ اسکرین توڑی اور قسطینا کی پسلیوں کو چھوتی ہوئی گزر گئی لیکن اگر وہ اسے لگ بھی جاتی تو بلٹ پروف جیکٹ موجود تھی۔ مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ ایسی مار دھاڑ میں بلٹ پروف جیکٹ اور ہیلمٹ وغیرہ سے تحفظ کا احساس کتنا بڑھ جاتا ہے۔ ہم بلاخوف بارڈر لائن کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ بارڈر لائن کم وبیش 700 میٹر دور ہو گی۔ ہم نے دور ہی سے دیکھ لیا۔ وہاں تیز فلڈ لائٹس میں کام ہو رہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے پول کھڑے کر کے خاردار تار لگایا جا رہا تھا۔ یعنی اس سارے رقبے پر اپنا قبضہ مضبوط کیا جا رہا تھا۔

فائرنگ کی آوازوں اور انسانی شور نے باڑ کے قریب موجود گارڈز اور ورکرز کو چوکنا کر دیا۔ انہیں کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ معاملہ کیا ہے؟ خطرہ کہاں ہے، اور فائرنگ کس پر کی جا رہی ہے؟ ان لوگوں کا یہی تذبذب اور یہی بے خبری ہمارے لیے آسانی فراہم کر رہی تھی۔ ہم ان گارڈز کے درمیان سے گزرتے باؤنڈری لائن کے قریب تر ہوتے جا رہے تھے۔

پھر شاید کچھ لوگوں کو اندازہ ہو گیا کہ باؤنڈری لائن کی طرف بڑھنے والی بکتر بند بے شک اپنی ہے مگر اس میں اپنے لوگ نہیں ہیں۔ انہوں نے ہم پر فائر کھولا۔ اب ہم پر دوطرفہ گولی چل رہی تھی۔ عقب سے اور بائیں جانب سے پگھلا ہوا سیسہ آرمڈ گاڑی کی آہنی پلیٹوں سے ٹکراتا تھا اور شدید تھرتھراہٹ پیدا ہوتی تھی۔ قسطینا کی گرفت گاڑی کے اسٹیئرنگ پر بہت مضبوط تھی۔ وہ ایکسلریٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھاتی چلی جا رہی تھی، اس نے باؤنڈری لائن پر ایک ایسا حصہ ڈھونڈ لیا تھا جہاں ابھی پول نہیں گاڑے گئے تھے۔ وہ سیدھی اسی حصے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ یہ دیکھ کر میرا جسم سنسنا اٹھا کہ ایک کھلی چھت کی جیپ جس پر بوفرز گن فٹ ہے، ہمارے راستے میں آگئی ہے اور اس گن کا رخ ہماری طرف ہے۔ ہم پر کسی بھی وقت بڑا فائر ہو سکتا تھا اور ہمیں ہرگز پتا نہیں تھا کہ یہ فائر ہماری آرمڈ گاڑی برداشت کر سکے گی یا نہیں۔ کم از کم مجھے تو بالکل پتا نہیں تھا۔ میں نے اپنے اکلوتے سلامت بازو کو حرکت دی اور

اپنی ٹرپل ٹو کا رخ جیپ کی طرف کر دیا۔ میرا چلایا ہوا طویل برسٹ کارگر رہا اور میں نے گن مین کو پلٹ کر جیپ سے نیچے گرتے دیکھا۔

''سر نیچے کر لو ایسٹرن۔'' قسطینا نے پکار کر کہا اور خود بھی سر جھکا لیا۔

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ ہماری گاڑی اب باؤنڈری لائن کراس کر رہی تھی۔ دو اطراف سے ہم پر تابڑ تاڑ فائر آ رہا تھا۔ آج سے ایک ہفتہ پہلے جب ہم لیہ میں تھے، میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ہم اس طرح کھلے پانیوں کے اس دور دراز جزیرے پر پہنچیں گے اور ہمیں وہاں اس قسم کے دھما کا خیز حالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہ سب کسی جنگی فلم کے مناظر تھے...... پردہ اسکرین پر ایسے مناظر دیکھنا اور بات ہے، حقیقت میں ان میں سے گزرنا اور بات۔ پردہ اسکرین پر بارود اور جلے ہوئے گوشت کی بو نہیں ہوتی، دھوئیں کی گھٹن نہیں ہوتی، گولی لگنے کی اذیت نہیں ہوتی...... کچھ بھی تو نہیں ہوتا......

ہم نے باؤنڈری لائن پار کر لی مگر اب ایک اور شدید ترین خطرہ سر پر تھا۔ یقینی بات تھی کہ اب ہمارے اپنے ہی ہم پر فائر کریں گے۔ ان کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ گرے فورس کی اس آرمڈ گاڑی کے اندر ان کی اپنی کمانڈر قسطینا ہے۔

مارٹر، بزوکا یا بوفرز جیسی کسی بڑی گن کا فائر اس آرمڈ گاڑی کو مہلک نقصان پہنچا سکتا تھا۔ ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ بھی نہیں تھا کہ ہم فوری طور پر اپنے لوگوں کو بتائیں کہ ہم کون ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ لڑائیوں میں ایسے موقعوں پر سفید جھنڈا استعمال کیا جاتا ہے۔ کوئی سفید جھنڈا یا کپڑا ڈھونڈنے کے لیے ہم واپس مقبوضہ علاقے میں تو نہیں جا سکتے تھے۔ اس وقت ہمیں شدید اور خوشگوار حیرت ہوئی جب کافی اندر آنے کے باوجود ہم پر کوئی فائر نہیں کیا گیا۔

''پتا نہیں کون سی نیکی کام آئی ہے؟'' قسطینا حیرانی سے بڑبڑائی۔

اس نے قریباً پچاس کلومیٹر کی رفتار سے بھاگتی ہوئی گاڑی کو ایک ٹرن دیا اور ایک تباہ حال سرکاری دفتر کے عقب میں جا کھڑا کیا۔

جونہی گاڑی کھڑی ہوئی ریان فردوس کی سبز پوش فورس کے کئی مسلح ارکان ہماری طرف دوڑے۔ ان کے ہاتھوں میں چند ٹارچیں بھی لشکارے مار رہی تھیں۔ ٹارچوں کی روشنی ہمارے چہروں پر ڈالی گئی۔ ہم گاڑی سے باہر نکل آئے۔ سبز وردیوں والے گارڈز نے ہمارے گرد حفاظتی حصار سا بنا دیا۔ ان کے رویے سے پتا چلتا تھا کہ وہ ہماری آمد سے آگاہ ہو چکے تھے۔ پتا نہیں ایسا کیونکر ہوا تھا۔ جونہی قسطینا نے سیفٹی ہیلمٹ اپنے سر سے اتارا، گارڈز اور آفیسرز نے اسے سلیوٹ کیا۔

''چلیے یور ہائی نس۔ یہ جگہ خطرے میں ہے۔'' ایک آفیسر نے انگلش میں کہا۔
ہم قریباً بھاگنے والے انداز میں ایک کار تک پہنچے اور اندر بیٹھ گئے۔ دو آفیسرز اور دو گن بردار بھی ہمارے ساتھ تھے جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، یہ اسپیشل بم پروف کار تھی۔ ہمارے بیٹھتے بیٹھتے ہی بھاری ہتھیاروں سے دو طرفہ فائرنگ شروع ہو گئی۔ روشنی کے جھماکوں اور زوردار دھماکوں کے ساتھ مارٹر وغیرہ کے شیل آس پاس گرنے لگے۔ میں زندگی میں پہلی بار اس طرح کا جنگی ماحول دیکھ رہا تھا اور اس کا حصہ بنا ہوا تھا۔ ہر طرف بارود اُڑ رہا تھا۔ بھاری گنوں کے گولے سیٹی کی سی آواز نکالتے ہوئے اپنے ہدف کی طرف بڑھتے تھے اور دھماکے سے گرتے تھے۔ لیکن یہ گولے کوئی بہت زیادہ نقصان نہیں پہنچا رہے تھے۔ بم پروف کار فراٹے بھرتی ہوئی ڈی پیلس کی طرف بڑھتی چلی گئی۔
''آپ اور آپ کا ساتھی زخمی تو نہیں ہیں یور ہائی نس؟'' ایک آفیسر نے مؤدب لہجے میں پوچھا۔
''میرا جواب تو نہیں میں ہے......اور تمہارا جواب؟'' قسطینا نے مجھ سے پوچھا۔
میں نے اپنے آپ کو ٹٹول کر دیکھا اور ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔ ''لگ تو ٹھیک ہی رہا ہوں، یور ہائی نس۔''
اس نے غیر محسوس طور پر اپنا ہاتھ میرے ہاتھ کی طرف بڑھایا اور اسے گرمجوشی سے دبایا۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہی تھی......ہم نے کوشش کی اور ہم نے کر دکھایا۔
میں نے قسطینا سے کہا۔ ''کیا یہاں لوگوں کو پہلے سے معلوم تھا کہ بکتر بند میں ہم ہیں؟''
قسطینا نے جواب دینے کے بجائے آفیسر سے ملائی میں بات کی۔ اس دو منٹ کی گفتگو کے بعد اس نے میری طرف دیکھ کر مطمئن انداز میں سر ہلایا اور ہولے سے بولی۔ ''میں بعد میں بتاؤں گی۔''

یہ بم پروف کار ڈی پیلس کے اندر جا کر رکی۔ درجنوں مسلح سپاہی قسطینا کے استقبال کے لیے دو رویہ اٹین شین کھڑے تھے۔ جونہی قسطینا گاڑی سے اتری اسے کھٹا کھٹ سلیوٹ کیے گئے۔ ہر چہرہ خوشی سے تمتمایا ہوا تھا۔ فورس کی ہردلعزیز لیڈر تین دن تک لاپتا رہنے کے بعد صحیح سلامت واپس ڈی پیلس پہنچ گئی تھی۔ اس کے حوالے سے یقیناً بہت سی پُراندیش یاس آرائیاں کی گئی ہوں گی۔ شاید کچھ لوگوں نے یہاں تک سوچا ہو کہ وہ زندہ نہیں بچ سکی۔ اب وہ لوگ اسے اپنے درمیان دیکھ کر جیسے پھر سے جی اٹھے تھے۔ ان میں فورس کے سپاہی بھی تھے اور وہ بے شمار رضا کار بھی جو جگہ جگہ سے یہاں ڈی پیلس میں آن موجود ہوئے تھے

اوراب پُر یقین تھے کہ ریان فردوس کو اس جزیرے ''پولا وُ جاما جی'' کا بااختیار حاکم بنا کر رہیں گے۔امریکنوں کی سازش ان کے سامنے کُھل گئی تھی۔ وہ جان گئے تھے کہ ایجنسی والے یہاں ان کی حفاظت کے لیے نہیں ہیں بلکہ رائے زل کے ساتھ مل کر اس پورے آئی لینڈ کو ہڑپ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بھی کہا جار ہا تھا کہ جزیرے میں موجود معدنیات پر ایجنسی والوں کی رال ٹپک رہی ہے۔

آقا جان اور حلمی وغیرہ بھی وہاں موجود تھے۔ ہر ایک بے تاب تھا کہ ہر ہائی نس قسطینا سے اس کی رُوداد سنے۔

میں نے ہولے سے اس کے کان میں کہا۔''میں الجھن میں رہوں گا۔ مجھے یہ تو بتا دیجیے کہ ہماری اپنی فورس کی طرف سے ہم پر فائر کیوں نہیں ہوا؟''

اس نے اپنے بوائے کٹ بال پیشانی سے ہٹائے اور بولی۔''ہمیں یہ سہولت بھی اس شخص کی وجہ سے ملی جس نے اسپتال کے بند کوریڈور میں ہمیں گرے گارڈز سے بچایا۔ جب ہم بکتر بند میں گھس کر بارڈر کی طرف آنے کا ارادہ کر رہے تھے اس نے وائرلیس پر حلمی صاحب کو براہِ راست اطلاع دی کہ بکتر بند پر فائر نہ کیا جائے، اس میں ہم دونوں ہیں۔''

''کون ہے یہ بندہ؟''

اس سے پہلے کہ قسطینا جواب میں کچھ کہتی، آقا جان کے ماتھے پر نا گواری کی شکن نمودار ہوئی۔ وہ تیزی سے بولا۔''قسطینا بیٹی! عزت مآب بے حد شدت سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں، آئیے......''

قسطینا، آقا جان، حلمی اور فوجی افسران کے ساتھ عزت مآب کی طرف چل دی۔ چند قدم چل کر وہ پھر میرے پاس آئی۔''میں بہت جلد فارغ ہو کر آتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے تمہارے کندھے کا کام بری طرح بگڑا ہوا ہے۔ اسے فوری اور بہترین علاج کی ضرورت ہے۔''

میں نے کہا۔''مجھے کندھے سے بھی زیادہ فکر اس بندے کی ہے جو میرے کندھے سے کندھا ملا کر رکھتا تھا۔ میں جلد از جلد اپنے ساتھی سجاول کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔''

''بے فکر رہو، امید ہے ہم چند گھنٹوں میں اس کے بارے میں جان لیں گے۔''

وہ تیز قدم اٹھاتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ اس نے ہیلمٹ اتار دیا تھا اور بلٹ پروف جیکٹ بھی۔ گرے فورس کے گارڈ کی ڈھیلی ڈھالی وردی میں وہ کچھ بے ڈھنگی سی لگ رہی تھی۔ قریباً پانچ کلومیٹر کنٹرول لائن پر وقفے وقفے سے ہلکے اور بھاری ہتھیاروں کی فائرنگ

ہو رہی تھی۔ شکر کا مقام تھا کہ ابھی تک دونوں طرف سے شہری علاقے کو نشانہ نہیں بنایا گیا تھا مگر جس طرح لڑائی کی آگ پھیل رہی تھی، کسی وقت یہ نوبت بھی آ سکتی تھی۔

کنٹرول لائن سے آنے والی دھماکوں کی آواز تھوڑی دیر بعد تھم گئی۔

میں انیق کے کمرے میں پہنچا۔ وہ وہاں موجود نہیں تھا۔ میں نے اس کے مقامی خدمت گار سے پوچھا۔ ''انیق صاحب کہاں ہیں؟''

اس نے شکستہ انگلش میں جواب دیا۔ ''صاحب! بہت موڈی بندے ہیں بلکہ کبھی کبھی تو عجیب لگتے ہیں۔''

''کیا عجیب کیا ہے اس نے؟''

''دوپہر سے کمرے کے فرش پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کہہ رہے تھے میں کوئی چلہ کاٹ رہا ہوں۔ میرے پوچھنے پر بتایا کہ وہ آپ کی بخیریت واپسی کے لیے چلہ کاٹ رہے ہیں۔ رات دس بجے کے بعد انہوں نے یہ چلہ ختم کر دیا مگر......''

''مگر کیا؟''

خدمت گار اپنی مسکراہٹ کو، جیسے بمشکل دبا کر بولا۔ ''انہوں نے کچھ اس طرح ٹانگوں کو پھنسا کر آلتی پالتی ماری ہوئی تھی کہ جب اٹھنا چاہا تو آلتی پالتی کھل نہیں پائی۔ انہوں نے آواز دے کر ملازموں کو اکٹھا کر لیا۔ بڑی مشکل سے ان کی ٹانگیں کھولی گئیں۔ وہ کافی دیر لنگڑا لنگڑا کر چلتے رہے۔ اب کہہ رہے تھے کہ میں ذرا ٹانگوں کو وارم اَپ کر آؤں۔ کافی دیر سے نکلے ہوئے ہیں، واپس نہیں آئے۔''

میں خدمت گار کے ساتھ انیق کی تلاش میں نکلا۔ ابھی کچھ ہی دور گئے تھے کہ وہ سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ اس نے آنکھیں سکیڑ کر مجھے دیکھا، پھر بھاگتا ہوا آیا اور لپٹ گیا۔ ''آپ کے لیے بہت زیادہ فکرمندی تھی شاہ زیب بھائی۔ شکر ہے کہ آپ کو ٹھیک ٹھاک اور صحیح سلامت دیکھ رہا ہوں۔''

میں نے اسے مختصراً بتایا کہ ہم تھوڑی ہی دیر پہلے حلمی کے ساتھ ڈی پیلس پہنچے ہیں۔

وہ بولا۔ ''ہم سے آپ کی کیا مراد ہے۔ کوئی اور بھی آپ کے ساتھ تھا؟''

''ہاں، ہر ہائی نس قسطینا۔''

''زبردست۔'' وہ خوش ہو کر بولا۔ ''میں سمجھا، کہیں امریش پوری تو نہیں تھا۔''

میں نے اسے گھورا۔ ''تمہارا مطلب ہے کہ اگر سجاول میرے ساتھ ہوتا تو تمہیں دکھ ہوتا؟''

''نن......نہیں جناب......میرا مطلب یہ تھا کہ ہر ہائی نس قسطینا کی واپسی تو سجاول کی واپسی سے بہت زیادہ ضروری تھی۔ لوگ بہت پریشان تھے ان کے لیے۔ باقی کوئی بات نہیں اللہ نے چاہا تو اس کے بارے میں بھی کوئی اچھی خبر ملے گی۔ وہ اتنی آسانی سے مرنے والا نہیں ہے...... اور نہ میری قسمت اتنی چمک دار ہے۔'' آخری الفاظ اس نے ہولے سے کہے۔

''اچھا بکواس بند کرو...... اب کہاں سے آرہے ہو؟''

وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ ''دراصل آپ کی بخیریت واپسی کے لیے میں نے ایک مشکل سی آلتی پالتی مار کر ایک خاص وظیفہ کیا تھا۔ شام کے بعد جب میں نے آلتی پالتی کھولنے کی کوشش کی......''

''پھر وہی بکواس، مسخرہ بننے کی کوشش نہ کرو، اگر کوئی کام کی بات ہے تو مجھے بتاؤ...... ویسے...... مجھے لگ رہا ہے کہ کوئی کام کی بات ہے۔'' میں نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس سے بڑی کام کی بات اور کیا ہوگی شاہ زیب بھائی کہ وہ آلتی پالتی......''

میں نے اسے گریبان سے پکڑ کر مکا دکھایا تو اس نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ''بالکل جی ایک کام کی بات...... بالکل ہے...... میں بتاتا ہوں۔''

میں نے اس کا گریبان چھوڑ دیا۔ وہ فوراً میرے پاؤں چھو کر بولا۔ ''چلہ تو میں نے کاٹا تھا لیکن لگتا ہے کہ ولایت آپ کو مل گئی ہے۔ غیب کی باتیں بتا رہے ہیں۔''

ہم دونوں واپس انیکسی میں آگئے۔ سجاول کے کمرے کا دروازہ لاک اور کھڑکیاں تاریک تھیں۔ یہ تاریک کھڑکیاں دیکھ کر دل میں گھونسا سا لگا۔ پتا نہیں، اب اس نے اس کمرے میں واپس آنا بھی تھا یا نہیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے قسطینا نے کہا تھا کہ وہ بہت جلد سجاول کے بارے میں کچھ نہ کچھ جان جائے گی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ رائے زل کے زیرِ قبضہ علاقے میں (جسے نیوسٹی کہا جاتا تھا) عزت مآب فیملی کے کچھ جاسوس موجود ہیں جو وہاں کی خبریں ڈی پیلس میں پہنچاتے ہیں۔ عین ممکن تھا کہ ان کے ذریعے ہی سجاول کا کچھ پتا لگ جاتا۔

اپنے کمرے میں آکر انیق نے دروازہ اندر سے بولٹ کر دیا۔ وہ میرے ورم زدہ کندھے کے بارے میں بہت فکرمند تھا...... میری رُوداد سننے کے لیے اس کی بے چینی بھی عروج پر تھی۔ میں نے اسے مختصر الفاظ میں اسپتال میں اور اسپتال کی چھت پر پیش آنے والے واقعات بتائے...... اور یہ بتایا کہ ہم نے کس طرح دو دن اور تین راتیں ٹین کی چادروں تلے گزاری ہیں۔

میری رُوداد کے بعد انیق کی باری آئی۔ اس نے کہا۔ ''یہاں کچھ اچھی خبریں نہیں ہیں۔''

''کس حوالے سے؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''مولوی جی کی بیٹی زینب کے حوالے سے۔''

میرا جسم سنسنا گیا۔ ''کیوں کیا ہوا اسے؟''

''وہ ڈی پیلس میں موجود نہیں...... کل صبح سے اسے مسلسل ڈھونڈا جا رہا ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے کسی نے......''

''نہیں، وہ اپنے شوہر ابراہیم کے لیے کوئی خط بھی چھوڑ گئی ہے۔''

''کہاں جا سکتی ہے وہ؟'' میرے سر میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔

انیق نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔ لگتا تھا کہ وہ کوئی انکشاف کرنے لگا ہے...... مگر اسی دوران میں دروازے پر بلند دستک ہوئی۔ انیق نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے ابراہیم کا ذاتی محافظ کھڑا تھا۔ دو مسلح گارڈ اس کے عقب میں تھے۔ اس نے بڑے احترام سے مجھے مخاطب کیا۔ میری خیریت دریافت کی اور بولا۔ ''اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو چھوٹے صاحب ابراہیم آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ ابھی...... اسی وقت۔''

میں نے انیق کی طرف دیکھا، پھر محافظ کی طرف دیکھا۔ فوری طور پر یہی سمجھ میں آیا کہ ذاتی محافظ کے ساتھ چل دوں۔

میں اٹھا تو ذاتی محافظ نے میرا شکریہ ادا کیا۔ ہم وسیع انیکسی سے نکلے اور احاطے کی پھول دار کیاریوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے ڈی پیلس کی مرکزی عمارت میں داخل ہوئے۔ احاطے میں اب بھی مشتعل گروہوں کی نعرہ بازی سنائی دے رہی تھی۔ باؤنڈری لائن پر ہونے والی گولا باری اب مکمل طور پر تھم گئی تھی مگر مشرق سے چلنے والی ہوا اپنے ساتھ بارود کی بو لا رہی تھی۔ ڈی پیلس کے اندر بھی ہر طرف جنگی ماحول تھا۔ احاطے میں ایک طرف خندقیں کھدی ہوئی نظر آئی تھیں۔ مرکزی عمارت کے اردگرد مورچے بنائے گئے تھے۔

ڈی پیلس کے عظیم الشان کوریڈور سے ہوتے ہوئے ہم اس خاص حصے میں پہنچ گئے جہاں ابراہیم رہائش پذیر تھا۔ یہاں مجھے ہر چہرہ اترا ہوا نظر آیا۔ بڑی بیگم ابراہیم کے کمرے سے نکلیں اور اپنی خادماؤں کے ساتھ زنانے حصے کی طرف مڑ گئیں۔ ان کی نظر مجھ پر نہیں پڑ سکی تھی۔ ہم اندر داخل ہوئے تو ابراہیم کو جائے نماز پر پایا۔ بڑی بیگم کے باہر نکلتے ہی شاید اس نے نوافل کی نیت باندھ لی تھی۔ میں ایک طرف نشست پر بیٹھ گیا۔ ابراہیم کا چہرہ اندوہ کی

تصویر تھا، آنکھیں ورم زدہ تھیں۔ ذاتی محافظ مجھے کمرے میں چھوڑ کر واپس جا چکا تھا۔ ابراہیم سلام پھیرنے کے بعد میری طرف متوجہ ہوا۔ اس نے اٹھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا اور خیر خیریت دریافت کی۔ اسے میرے کندھے کی شدید چوٹ کا پتا چل چکا تھا اور وہ فکر مند تھا۔ اس نے کہا۔ ”بڑی بہن قسطینا نے مجھے وہ سب کچھ بتایا ہے جو وہاں اسپتال میں پیش آیا۔ بہت شکر کا مقام ہے کہ آپ دونوں وہاں سے صحیح سلامت نکل آئے۔ ان شاء اللہ مسٹر سجاول کے بارے میں بھی جلد معلومات حاصل ہو جائیں گی۔“

”یہ میں کیا خبر سن رہا ہوں ابراہیم؟“ میرا سارا اضطراب میرے لہجے میں شامل ہو گیا۔

وہ بولا۔ ”خود میری سمجھ میں بھی کچھ نہیں آ رہا۔ پتا نہیں کہ یہ سب کیوں ہوا۔ وہ ایسی تو نہیں تھی۔ وہ نہیں تھی ایسی۔“

”ہو سکتا ہے کہ کوئی سازش ہوئی ہو ابراہیم، میرا اپنا دل بھی یہی کہتا ہے کہ وہ آپ کو چھوڑ کر نہیں جا سکتی تھی...... کسی صورت نہیں۔“

ابراہیم نے اپنے مخملی چغے کے اندر ہاتھ ڈالا اور وہ خط مجھے دکھایا جس کا ذکر ابھی تھوڑی دیر پہلے انیق نے کیا تھا۔ ”یہ اسی کی تحریر ہے شاہ زیب...... میں تو اردو نہیں پڑھ سکتا لیکن مترجم نے جو کچھ بتایا ہے، آپ بھی پڑھ لیں۔“

میں نے کاغذ کی تہ کھول کر دیکھا۔ فاؤنٹین پین سے خوبصورت اردو لکھائی میں یہ قریباً آٹھ نو سطور تھیں۔ اگر یہ واقعی زینب نے لکھا تھا، تو خط کچھ اس طرح تھا۔

”ابراہیم! میں ہاتھ جوڑ کر آپ سے معافی چاہتی ہوں۔ مجھے پتا ہے میرے اس طرح اچانک بتائے بغیر پاکستان واپس چلے جانے سے آپ کو بہت زیادہ دکھ ہو گا مگر میرے پاس اس کے سوا چارہ نہیں۔ میں اب بہت اچھی طرح سمجھ گئی ہوں کہ ہم دونوں ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔ آپ کے ساتھ کچھ ایسے مسائل ہیں جن کی وجہ سے آپ خود بھی مجبور ہیں۔ میں ان مجبوریوں کو لمبا اور تکلیف دہ کرنا نہیں چاہتی۔ ہم دونوں کی محبت اپنی جگہ لیکن حالات کی سختی اپنی جگہ ہے۔ جب تک آپ کو یہ خط ملے گا میں یہاں موجود اپنے ایک ”بزرگ ہمدرد“ کے ساتھ جزیرے سے بہت دور جا چکی ہوں گی۔ پلیز میرے پیچھے مت آئیے گا اور نہ مجھے پاکستان میں ڈھونڈنے کی کوشش کیجیے گا۔ اپنی زندگی کے لیے نئے راستے تلاش کر لیجیے۔ میں بھی کرنے کی کوشش کروں گی۔ زندگی سے بڑھ کر قیمتی کچھ نہیں ہوتا اور میں ابھی زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ اللہ حافظ۔“

میں اور ابراہیم کتنی ہی دیر اپنی جگہ گم صم بیٹھے رہے۔ خط میرے ہاتھ میں تھا اور پنکھے کی ہوا سے آہستہ آہستہ لہرا رہا تھا۔

''کیا نتیجہ نکالا آپ نے؟'' ابراہیم نے پوچھا۔

''تحریر تو بے شک زینب ہی کی ہے لیکن یہ سب کچھ اس نے اپنی مرضی سے لکھا ہے، اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کیا اس واقعے سے پہلے اس نے آپ کو کسی طرح کا اشارہ دیا تھا؟''

''نہیں...... مجھے تو بالکل یاد نہیں آتا۔ ہاں رات کے کھانے پر وہ کچھ خاموش سی تھی۔ میں نے ایک دو بار پوچھا مگر اس نے سر درد کا بہانہ بنایا۔ ہم کچھ دیر ایک ساتھ رہے پھر اپنے اپنے کمرے میں سونے کے لیے چلے گئے۔ صبح وہی آکر مجھے جگاتی تھی اور تازہ پھولوں کا گلدستہ میرے سرہانے رکھتی تھی۔ وہ نہیں آئی...... سات بجے کے لگ بھگ میں خود ہی جاگا۔ یہی وقت تھا جب زینب کی خاص خادمہ بھی اس کے کمرے کا دروازہ ''ناک'' کر رہی تھی۔ دروازہ دھکیلا تو وہ کھلا تھا۔ ہم اندر گئے۔ وہ وہاں نہیں تھی۔ ایک ڈیکوریشن پیس کے نیچے یہ خط رکھا تھا......'' بات کرتے کرتے ابراہیم کی آواز غم سے ٹوٹ رہی تھی۔ وہ جیسے اندر سے ریزہ ریزہ ہو گیا تھا۔

اس نے مجھے بتایا کہ کس طرح زینب کی تلاش شروع ہوئی۔ کیسے سمندر میں لانچیں اور اسپیڈ بوٹس دوڑائی گئیں اور کیسے پچھلے بیس گھنٹے سے جزیرے کے اندر بھی اسے جگہ جگہ ڈھونڈا جا رہا ہے اور مشتبہ افراد کو پکڑا جا رہا ہے۔

میں نے خط کے نیچے والی سطور پڑھتے ہوئے کہا۔ ''یہاں مسز زینب نے کسی ہمدرد بزرگ کا ذکر کیا ہے۔ یہ بندہ کون ہو سکتا ہے؟''

''میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ میری عقل نے کام کرنا ہی چھوڑ دیا ہے۔'' اس نے دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے اپنی پیشانی کو مسلا۔ اس کی عمر اٹھارہ اور بیس سال کے درمیان تھی لیکن کسی وقت وہ ایک بالکل بے بس نوعمر لڑکا دکھائی دینے لگتا تھا۔

اس کے بستر کے سرہانے باسی گلدستہ اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ گلدستہ رکھنے والا یہاں موجود نہیں ہے۔ وہ کہاں ہے؟ ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ابراہیم نے دل فگار آواز میں کہا۔ ''قمری کیلنڈر کا یہ مہینا اکثر ہمارے خاندان کے لیے بری خبریں ہی لاتا ہے۔ پتا نہیں کیوں...... مجھے ایسے لگتا ہے کہ...... زینب اب......''

وہ فقرہ مکمل نہ کر سکا اور سر جھکا کر سسک اٹھا۔ میں نے اسے اپنے ساتھ لگایا اور تسلی

دی۔ ”آپ بے فکر رہیں ابراہیم۔ میں پھر کہتا ہوں، مجھے یقین ہے وہ اس طرح آپ کو چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔“

دروازے پر دستک ہوئی۔ ابراہیم نے جلدی سے آنسو پونچھے اور ٹھہری ہوئی آواز میں بولا۔ ”آ جاؤ۔“

درمیانی عمر کی وہی خادمہ اندر داخل ہوئی جو نکاح سے پہلے ابراہیم اور زینب کے درمیان ”رابطے“ کا کام کرتی تھی۔ خادمہ نے اطلاع دی کہ عزت مآب چند منٹ بعد ابراہیم سے ملنے کے لیے آ رہے ہیں۔

میں ابراہیم سے اجازت لے کر واپس انیکسی میں آ گیا۔ انیق اپنے کمرے میں تھا۔ وہ مجھ سے کافی بے تکلف ہو چکا تھا اور اب میرے سامنے بھی اپنی اوٹ پٹانگ حرکات سے باز نہیں آتا تھا۔ اس وقت بھی اس نے آلتی پالتی مار رکھی تھی اور آنکھیں بند کر کے بستر پر اکڑوں بیٹھا تھا۔ میری آہٹ سن کر اس نے لال لال آنکھیں کھول دیں اور بولا۔ ”میرا وظیفہ بس آخری مرحلے میں ہے۔ اگر آپ دو منٹ باہر تشریف رکھیں تو میں آپ کو معرفت کی بہت سی باتیں بتا سکوں گا۔“

میں نے کہا۔ ”تمہاری معرفت کی ایسی تیسی۔ سیدھے ہو کر بیٹھو۔“

”آپ مذاق نہ سمجھیں شاہ زیب بھائی! مجھے مستقبل کی چیزیں نظر آنا شروع ہو گئی ہیں، یقین کریں۔“

”لیکن تمہیں وہ جوتا نظر نہیں آ رہا جو میں ابھی اتار کر تمہارے سر پر برسانے والا ہوں۔“

میں نے جوتے کی طرف ہاتھ بڑھایا تو وہ ایک دم سیدھا ہو گیا۔ ”ٹھیک ہے جی، آپ خود ہی اپنا نقصان کر رہے ہیں۔“

اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن ناکام ہوا۔ وہ کوئی ایسی عجیب قسم کی آلتی پالتی مارتا تھا کہ آسانی سے کھلتی نہیں تھی۔ میں نے اس کی پیٹھ پر لات رسید کی۔ وہ گیند کی طرح لڑھک کر وارڈ روب سے ٹکرایا اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔

میں نے کہا۔ ”جب بھی تم وظیفہ کرو تو بعد میں مجھے بلا لیا کرو۔ میں تمہاری آلتی پالتی کھول دیا کروں گا۔“

”آپ میری ہر بات کو مذاق میں لیتے ہیں جناب۔ لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ مجھ پر کشف ہونے شروع ہو گئے ہیں اور جو پہلا کشف ہوا ہے وہی بڑا دھانسو قسم کا ہے۔ اللہ خیر

کرے۔ مجھے تو فکر پڑ گئی ہے کہ کہیں لوگ مجھے پیر و مرشد وغیرہ نہ بنالیں۔''
''لوگوں کی عقلوں پر ابھی اتنے پتھر نہیں پڑے۔ بہر حال کیا کشف ہوا ہے تمہیں؟''
''کشف یہ ہے جناب کہ زینب کو کچھ نہیں ہوا۔ وہ حیات ہے...... خیریت سے ہے اور ہمارے آس پاس ہی کہیں ہے۔''
میں نے غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ مجھے لگا کہ وہ ضرور کچھ جانتا ہے۔ وہ اتنا بے کار ہرگز نہیں تھا جتنا نظر آتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ اس نے میرے بعد ڈی پیلس میں کچھ کھوج کھرا لگایا ہو۔ میں نے کہا۔''اوٹ پٹانگ کے لیے وقت نہیں ہے ہمارے پاس۔ یہ بڑا نازک معاملہ ہے اگر زینب کو کچھ ہو گیا تو......''
''اسے کچھ نہیں ہو گا۔ وہ ایک بہت ذہین، ہمدرد اور جی دار شخص کے پاس ہے۔''
''کون ہے وہ؟''
''آپ کے سامنے تو کھڑا ہے بقلم خود۔'' وہ چہکا۔
میں بھونچکا رہ گیا۔''کیا کہہ رہے ہو۔ کہاں ہے وہ؟''
''انڈین فلم کا گانا ہے...... آپ کے کمرے میں کوئی رہتا ہے...... ہم اس بے ہودہ گانے میں تھوڑی سی تبدیلی کریں گے...... امریش پوری کے کمرے میں کوئی رہتا ہے۔''
میں نے تیزی سے سوچا۔''تم سجاول کے کمرے کی بات کر رہے ہو؟''
اس نے اثبات میں سر ہلایا اور قدرے سنجیدہ ہو کر بولا۔''جسے چپے چپے پر ڈھونڈا جا رہا ہے۔ وہ یہیں پر ہے جناب۔ پچھلے قریباً بیس گھنٹے سے ہے۔ وہ بہت ڈری ہوئی ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے سنبھالا ہوا ہے۔''
''تم...... مذاق تو نہیں کر رہے انیق؟'' میں نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔
''یہ مذاق کا موقع نہیں ہے جی، آپ نے ابھی خود ہی تو کہا ہے۔''
''کہاں ملی وہ تمہیں؟''
''ایک خواجہ سرا کے مکان سے۔ بہت مصیبت میں تھی۔ میں نہ پہنچتا تو پتا نہیں کہاں پہنچ چکی ہوتی۔''
''مجھے تفصیل سے بتاؤ انیق...... لیکن نہیں...... پہلے مجھے اسے دیکھنے دو۔''
''ابھی چند منٹ انتظار کرنا ہو گا آپ کو۔ وہ سجاول کے کمرے میں ہے۔ باہر گارڈ ٹہل رہا ہے۔ وہ دائیں بائیں ہوتا ہے تو ہم کمرے میں جائیں گے۔'' میری دھڑکن بڑھ گئی۔
''وہ خیریت سے تو ہے نا؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں، معمولی خراشیں ہیں دو چار دن میں ٹھیک ہو جائے گی۔''
''تم کیسے پہنچے خواجہ سرا کے گھر تک۔ اور یہ ذات شریف ہے کون؟''
''عزت مآب کے خاندان کا پرانا نمک خوار ہے۔ ڈی پیلس میں کم و بیش بیس اور خواجہ سرا بھی ہیں جو مختلف خدمات انجام دیتے ہیں۔ یہ ان کا انچارج ہے۔ یہ کل شام کی بات ہے۔ میں آپ اور امریش پوری (سجاول) کی گمشدگی کی وجہ سے پریشان تھا۔ حلمی صاحب سے اجازت لی اور ڈی پیلس سے نکل کر ٹہلتا ہوا سمندر کی طرف چلا گیا۔ ایک گارڈ بھی میرے ساتھ بھیجا گیا تھا لیکن میں نے اسے بہلا پھسلا کر واپس بھیج دیا۔ وہاں بالکل ساحل پر کافی گھر بنے ہوئے ہیں۔ ان کی بالکونیاں اور برآمدے سمندر کی طرف ہیں۔ سمندر کا پانی ان کی دیواروں سے ٹکراتا ہے۔ اب تو جنگ کا ماحول ہے لیکن امن کی حالت میں یہاں کا نظارہ بہت خوب صورت ہوتا ہوگا۔ میں پام کے پیڑوں تلے بیٹھ گیا اور چاند کے ابھرنے کا منظر دیکھتا رہا۔ ساتھ ساتھ سوچتا رہا کہ آپ دونوں کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔ خبریں یہی آ رہی تھیں کہ آپ محفوظ ہیں اور اسپتال کے آس پاس ہی کہیں موجود ہیں۔ حلمی صاحب نے یہ بھی بتایا تھا کہ ہر ہائی نس قسطینا سے ٹیلی فونک رابطہ بھی ہوا ہے۔

میں انہی سوچوں میں گم بیٹھا تھا، جب مجھے کسی کے چلانے کی آواز آئی۔ کوئی عورت ''بچاؤ بچاؤ'' کی پکار کر رہی تھی۔ مگر یہ پکار صرف دو سیکنڈ کے لیے ہوئی، پھر اس پکارنے والی کو گھر کی بالکونی سے اندر کھینچ لیا گیا۔ اس وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ زینب ہو گی لیکن جو کوئی بھی تھی، وہ میری ہم زبان تھی۔ مجھے لگا کہ مجھے اس کی مدد کرنی چاہیے۔ یہ رات کوئی گیارہ بجے کا وقت تھا اور ساحل سنسان نظر آتا تھا۔ آگے سمندر میں کوسٹ گارڈز کی دو کشتیاں گشت کر رہی تھیں۔ پہلے میں نے سوچا کہ کسی طرح ان گارڈز کی مدد لوں۔ مگر پھر میں اکیلا ہی آگے بڑھا۔ میرے پاس آپ والا پستول تھا۔ دیوار پھاندنے میں مجھے زیادہ دقت پیش نہیں آئی۔ رکھوالی کا کتا موجود تھا، تاہم بندھا ہوا تھا۔ اس نے تھوڑا سا شور مچایا، پھر اس کے دل میں پتا نہیں کیا آئی کہ خاموش ہو کر لیٹ گیا۔ میں برآمدے میں پہنچا۔ پوری کوٹھی سنسان پڑی تھی...... یوں لگتا تھا کہ مالک مکان نے لڑکی پر دست درازی کرنے کے لیے باقی اہلِ خانہ اور ملازمین کو کہیں بھیج دیا ہے۔ آپ جانتے ہیں داؤد بھاؤ نے مجھے تالے وغیرہ کھولنے میں ''ٹرینڈ'' کیا ہوا ہے۔ میں نے ایک تار کی مدد سے مین دروازے کا تالا کھولا اور اندر چلا گیا۔ بالائی منزل کے ایک کمرے سے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں دروازہ توڑ کر اندر گھس گیا۔ میرا خیال تھا کہ کسی ہٹے کٹے غنڈا صفت سے پالا پڑے گا۔ جس شخص سے

پالا پڑا وہ ہٹا کٹا تو ضرور تھا مگر ایک ہیجڑا تھا پھر میری نظر زینب پر پڑی جو ایک کونے میں سمٹی ہوئی تھی۔ میں بھونچکا رہ گیا۔ میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ اسے وہاں دیکھوں گا۔ ہیجڑا درمیانی عمر کا تھا۔ آدھا سر گنجا تھا۔ اس کے بھدے ہونٹ لپ اسٹک سے لتھڑے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں کاجل اور لباس ست رنگا تھا۔ مجھے دیکھنے کے بعد وہ ایک الماری کی طرف لپکا اور پستول نکالنے کی کوشش کی۔ میں نے اسے دبوچ کر دیوار سے دے مارا۔ دیوار سے ٹکرانے کے بعد وہ لڑکھڑایا اور باہر کو بھاگا۔ شاید کوئی اور ہتھیار تھامنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ میرا دھکا لگنے سے وہ سیڑھیوں پر گرا اور کوئی دس فٹ نیچے پختہ فرش سے ٹکرا کر بالکل بے سدھ ہو گیا۔

میں زینب کی طرف بڑھا تو اس نے کہیں سے ایک چھری پکڑ لی۔ وہ ابھی تک مجھ پر بھروسا نہیں کر پا رہی تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ میں دشمن نہیں دوست ہوں۔ شاہ زیب بھائی کے ساتھ یہاں آیا ہوں۔ اب اس کی پکار سن کر یہاں اس گھر میں پہنچا ہوں۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ وہ مقامی لباس میں تھی۔ اس کے جسم پر چھڑیوں کے نشان تھے اور خراشیں تھیں۔ اس کے پاؤں رسّی سے باندھنے کی کوشش کی گئی تھی جو پوری طرح کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ زینب نے اپنے پاؤں کھول دیئے۔ اس نے بتایا کہ اس بدمعاش نے اسے بری طرح مارا ہے اور نوچا کھسوٹا ہے۔ اس نے بتایا کہ اس نے کوئی خاص قسم کا پان بھی کھا رکھا تھا جس کی وجہ سے اس کا دماغ گھوما ہوا تھا۔

ہیجڑے نے اب کراہنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے اس کی کنپٹی پر پستول کے دستے سے ایک زوردار چوٹ لگائی اور اسے پھر سے بے ہوش کر دیا۔ اس کے لباس کی تلاشی لی۔ کچھ مقامی کرنسی، تاش کے پتے اور پان کی ڈبیا نکلی۔ یہ چیزیں اب بھی میرے پاس ہیں۔'' انیق نے کہا۔

''پھر وہاں سے نکلے کیسے؟'' میں نے پوچھا۔

''میرے دوست خانساماں از میر طیب نے اس سلسلے میں میری مدد کی۔ میں نے اسے فون کیا۔ پوری طرح اعتماد میں لیا۔ وہ فارم ہاؤس سے تازہ سبزیاں لینے کے لیے رات کو پچھلے پہر گاڑی پر نکلتا ہے۔ اس وقت بھی نکلا ہوا تھا۔ وہ فارم ہاؤس سے سیدھا اس ساحلی کوٹھی پر پہنچ گیا۔ وہ ایک لوڈر گاڑی تھی۔ اس میں گوبھی، گاجر، پالک، ٹماٹر اور پتا نہیں کیا کیا بھرا ہوا تھا۔ کچھ سبزیاں ایسی تھیں جو زندگی بھر نہیں دیکھیں۔ ہم نے زینب کو سبزیوں کی گانٹھوں کے عقب میں چھپایا..... اور نکل آئے۔ ڈی پیلس کے قریب پہنچ کر میں پیدل ہو گیا

اور ڈی پیلس میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد از میر بھی زینب کو لے کر انیکسی میں آ گیا۔ ہم نے بڑی احتیاط سے اسے گاڑی سے نکالا اور کمرے میں پہنچا دیا۔"

یہ رُوداد واقعی تحیر خیز تھی۔ میں نے انیق سے پوچھا۔"وہ کیا بتا رہی ہے...... ڈی پیلس سے اس ہیجڑے کے پاس کیسے پہنچی؟"

"کچھ نہیں بتا رہی۔" انیق نے نفی میں سر ہلایا۔"کل سے بس روتی ہی جا رہی ہے کہتی ہے کہ وہ واپس جانا چاہتی ہے یا پھر مر جانا چاہتی ہے۔ اگر کسی نے اس کی مدد نہ کی تو وہ اپنی جان لے لے گی۔"

"ابراہیم کے بارے میں کچھ کہتی ہے؟"

"نہیں...... بس ایک دو بار یہ کہا ہے کہ بڑی بیگم سے بات کرنا چاہتی ہے، لیکن اس طرح کہ کسی دوسرے کو پتا نہ چلے...... اللہ جانے کیا چکر ہے۔"

کچھ ہی دیر بعد میں اور انیق، زینب کے پاس جانے کو تیار تھے۔ انیق نے کہا۔"آپ اس سے ہیجڑے کی مار پیٹ والی بات نہ کیجیے گا وہ زیادہ دکھی ہو جائے گی۔ میرے خیال میں اگر ہم اسے تسلی دیں کہ اسے یہاں سے نکال کر پاکستان پہنچانے کی کوشش کریں گے تو وہ کچھ نہ کچھ بتانے پر آمادہ ہو جائے گی۔"

اسی دوران میں میرے سیل فون پر قسطینا کی کال آ گئی، وہ بولی۔"میں آ رہی ہوں۔ تمہیں اسپتال لے کر جانا ہے۔"

میں نے کہا۔"یور ہائی نس! اب صبح کا انتظار کر لیتے ہیں۔ میں نے پین کلر انجکشن لگوایا ہے اور اب کچھ دیر سو جانا چاہتا ہوں۔"

قسطینا نے ایک لمبے توقف کے بعد کہا۔"تم ایک بہت بڑے اسٹار ہو۔ تمہیں پتا نہیں تمہیں کہاں کہاں چاہا جاتا ہے۔ میں یہاں تمہاری موجودگی پر بے حد حیران ہوں اور جتنی حیران ہوں اس سے کہیں زیادہ فکر مند ہوں۔ تمہارے کندھے کے ساتھ بہت برا ہو چکا ہے ایسٹرن، اور یہ میری وجہ سے ہوا ہے۔ اگر تم...... ٹھیک نہ ہوئے...... تو میں خود کو کبھی...... معاف نہیں کر سکوں گی۔" وہ رک رک کر بے حد جذباتی لہجے میں بولی۔

میں نے کہا۔"آپ کی یہ اسٹار والی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔ بہرحال آپ فکر نہ کریں، مجھے کچھ نہیں ہوگا۔"

وہ مجھے ابھی اسپتال لے جانا چاہتی تھی۔ تھوڑی سی بحث تمحیص کے بعد اس نے صبح تک کی چھٹی دے دی۔ پین کلر انجکشن میں واقعی انیق سے لگوا چکا تھا اور افاقہ محسوس کر رہا تھا۔ ہم

نے اپنے کمرے مقفل کر کے دروازے پر ''ڈسٹرب نہ کریں'' کی پلیٹ لگا دی اور سجاول والے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔ پُر آسائش کمرے میں صرف ٹیبل لیمپ روشن تھا۔ وہ بستر پر ڈری سہمی بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ چونکی۔ اس سے پہلے میرے ساتھ اس کا زیادہ تعارف نہیں تھا۔ ہم نے ایک دو بار دور ہی سے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ اسے کیا پتا تھا کہ اگر میں یہاں اس آئی لینڈ میں موجود ہوں تو اس کی ایک اہم وجہ وہ خود ہے۔ انیق نے اس کی اجازت سے ٹیوب لائٹ آن کی۔ کمرا روشن ہو گیا۔ اس نے بالوں کو ڈھیلے ڈھالے انداز میں چوٹی کی صورت باندھ رکھا تھا۔ اب وہ اس زینب سے بہت مختلف تھی جسے میں نے چند ماہ پہلے ایک موبائل فون کے ویڈیو کلپ میں دیکھا تھا۔ اس وقت وہ بیماری کے گھیرے میں تھی۔ چودھری عالمگیر کی زہریلی ڈوز نے اسے نیم جان کر رکھا تھا مگر اب وہ ایک موزوں جسم کی قبول صورت لڑکی تھی۔ اس کے چہرے کی ملاحت اور معصومیت غیر معمولی کشش رکھتی تھی اور اس کشش کو ایک طرح کی پارسائی اور نیک خوئی نے ڈھانپ رکھا تھا اگر ابراہیم اس پر ہزار جان سے فدا ہوا تھا تو کچھ ایسا انوکھا نہیں تھا۔ رو رو کر اس کی نازک پلکیں متورم ہو چکی تھیں۔

ہم دونوں اس کے قریب بید کی کرسیوں پر بیٹھ گئے اور دل جوئی کی باتیں کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد وہ بھی جھجک سے نکل آئی اور تھوڑا بہت بولنے لگی۔ اس نے کہا۔ ''انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ آپ بھی پاکستان سے یہاں پہنچ گئے ہیں۔ وہ آپ کے بارے میں اکثر بات کرتے رہتے تھے۔''

''انہوں'' سے زینب کی مراد اس کا شوہر ابراہیم ہی تھا۔

میں نے کہا۔ ''زینب! میں بھی آپ کی طرف سے باخبر رہنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ آپ میری ہم وطن ہیں اور ایسے حالات میں ہیں کہ آپ کو کسی بھی وقت تعاون اور مدد کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔''

وہ بولی۔ ''آپ نے جس طرح پارا ہاؤس میں گھسنے والوں کا مقابلہ کیا تھا اور ماں جی (بڑی بیگم) کو بچایا تھا، اس کا سب کے ذہنوں پر بڑا اچھا اثر ہے، وہ آپ اور سجاول صاحب پر بہت بھروسا کرتے ہیں۔''

بات شروع ہوئی تو میں بہت جلد زینب کو ڈھب پر لے آیا۔ اگر وہ ڈھب پر آئی تو اس کی ایک وجہ میرے اندر کی نیک نیتی اور بے لوث ہمدردی بھی تھی۔ کہتے ہیں کہ جو بات دل سے نکلتی ہے وہ اثر رکھتی ہے۔ اس نے یہاں بھی اثر کیا۔ میں نے محبت سے اس کا ہاتھ سہلایا

تو اس کی آنکھوں میں نمی آ گئی...... ہاں یہ وہی ڈری سہمی چڑیا تھی جو ریان فردوس اور آقا جان جیسے بڑے بڑے عقابوں کی زد میں تھی۔

رات کا آخری پہر شروع ہونے والا تھا۔ انیق بہانے سے باہر جا چکا تھا۔ زینب مجھ سے باتیں کر رہی تھی۔ میں نے یہ سوال تیسری مرتبہ دہرایا تھا کہ آخر وہ ابراہیم کے ساتھ رہنا کیوں نہیں چاہتی؟

بالآخر وہ سسک کر بولی۔ ''میرا خیال ہے کہ آپ بھی بہت کچھ جانتے ہیں۔ وہ عام نہیں ہیں، ان کے ساتھ بہت بڑا مسئلہ ہے۔ انہوں نے...... نکاح کرتے وقت کہا تھا...... یہ میں صرف اس لیے کر رہا ہوں کہ...... تمہیں اپنے ساتھ برونائی لے جا سکوں...... ابھی ہم میاں بیوی کی طرح نہیں رہیں گے...... لل...... لیکن......'' وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ شرم اور گھبراہٹ کے سبب اس کی آواز گھٹ کر رہ گئی۔

میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہی ہے۔ اگر وہ درست کہہ رہی تھی تو پھر یہ افسوسناک تھا۔ مجھے جاناں کی بات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا کہ زینب کبھی کبھی اس سے رازداری کی باتیں بھی کر لیتی ہے۔ اس نے زینب کے جسم پر کچھ نشان دیکھے تھے۔ یہ ابراہیم کے چھونے کا نتیجہ تھے۔ تو کیا ابراہیم اپنی تمام تر نیک خوئی اور متانت کے باوجود خود کو سنبھالنے میں ناکام رہا تھا...... اور نتیجے میں زینب اس سے خوف زدہ ہو گئی تھی مگر بہت سے سوالات اب بھی اپنی جگہ موجود تھے۔ زینب ڈی پیلس کے نہایت محفوظ شاہانہ ماحول سے نکل کر اس خبیث خواجہ سرا تک کیسے پہنچی؟

ایک بات اور بھی توجہ طلب تھی...... اور وہ یہ کہ وہ ڈی پیلس سے نکلنے کے باوجود بڑی بیگم سے ملنے کی خواہش کیوں کر رہی تھی۔ کیا اسے توقع تھی کہ وہ بڑی بیگم نسا نورل کو اپنا ہمنوا بنا سکتی ہے۔

انیق نے مجھے بتایا تھا کہ زینب نے پچھلے اٹھارہ بیس گھنٹوں سے کچھ بھی نہیں کھایا ہے۔ اس کا چہرہ زرد اور ہونٹ سوکھے ہوئے تھے۔ میں نے کوشش کر کے اسے تھوڑا سا جوس پلایا اور پیزے کے دو ٹکڑے کھلائے۔ وہ کروٹ بدل کر لیٹ گئی تو میں سمجھ گیا کہ وہ کچھ اور بولنا نہیں چاہ رہی ہے۔ میں نے دروازہ لاک کیا اور اپنے کمرے میں جا کر تھوڑی دیر کے لیے آنکھ لگ گئی۔ انجکشن کا اثر ختم ہو رہا تھا اور درد کی لہریں پھر پورے جسم میں پھیل رہی تھیں۔ میں اٹھ بیٹھا۔ دن چڑھ آیا تھا۔ کمرے کی کھڑکی سے ڈی پیلس کے وسیع و عریض احاطے کا کچھ حصہ دکھائی دیتا تھا۔ اچانک میں چونک گیا۔ مجھے ڈی پیلس کی مرکزی عمارت سے رونے پیٹنے کی

آوازیں آئیں۔ پھر میں نے خادماؤں کی ایک جماعت کو دیکھا جو باقاعدہ سینہ کوبی کر رہی تھیں۔ پورے جسم میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔

میں انیق کے کمرے کی طرف لپکا۔ وہ خالی تھا۔ میں نے سجاول والے کمرے کو بغیر آواز پیدا کیے ''ان لاک'' کیا۔ زینب کمرے میں موجود تھی اور جیسے تھک ہار کر سو گئی تھی۔ دروازہ دوبارہ لاک کر کے میں مرکزی عمارت کی طرف بڑھا۔ زخمی کندھے والے بازو کو میں نے ایک بیلٹ کے ساتھ کندھے سے لٹکا رکھا تھا۔ ہر چہرے پر غم و غصے کی کیفیت تھی۔ لوگ ڈی پیلس کے فواروں اور رنگ برنگی کیاریوں کے پاس ٹولیوں کی شکل میں کھڑے چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ اندر سے خواتین کے رونے کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔

مجھے پریشان حال کمال احمد نظر آیا۔ اس کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ میں نے ادب کے ساتھ پوچھا۔ ''کیا ہوا کمال صاحب؟''

وہ میری طرف دیکھے بغیر بولا۔ ''زینب مل گئی ہے...... لیکن زندہ نہیں۔''

''کیا مطلب یور ہائی نس؟''

''اس کی باڈی ملی ہے۔ ابھی صبح باؤنڈری لائن کے پاس اسے ایک کاٹیج کے ملبے سے نکالا گیا ہے۔'' کمال احمد نے جواب دیا۔

میں سناٹے میں تھا جس لڑکی کو میں ابھی دو منٹ پہلے سجاول کے کمرے میں صحیح سلامت دیکھ کر آیا تھا۔ اس کی لاش یہاں پہنچ چکی تھی۔ پورچ میں کچھ دیر گاڑیوں کے ساتھ ایک جدید ایمبولینس بھی کھڑی تھی۔ اچانک یہ ایمبولینس حرکت میں آئی اور عمارت کے اندرونی دروازے کے بالکل پاس رک گئی۔ ابراہیم کا بھائی کمال احمد بھی دوڑتا ہوا ایمبولینس کی طرف گیا۔ میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ کچھ گارڈز نے نوعمر ابراہیم کو ہاتھوں پر اٹھا رکھا تھا اور ایمبولینس میں منتقل کر رہے تھے۔ وہ بے ہوش تھا۔ بظاہر یہی نظر آ رہا تھا کہ یہ بے ہوشی شدید صدمے کا نتیجہ ہے۔ اپنے سیل فون سے میں نے اس منظر کا وڈیو کلپ بنایا۔ میں نے بڑی بیگم نسا نورل کو بھی دیکھا۔ انہوں نے اپنے گرد ایک شال لپیٹ رکھی تھی اور روتی ہوئی، ایمبولینس میں داخل ہو رہی تھیں۔

یہ سب کسی گہری سازش کے پیچ و خم تھے۔ میں انیق کو ڈھونڈ رہا تھا۔ آخر وہ مجھے ایک بڑے ستون کے پاس نظر آ گیا۔ وہ فربہ اندام ازمیر طیب سے باتیں کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ سیدھا میری طرف آیا۔ دھیمے لہجے میں بولا۔ ''کہا جا رہا ہے کہ کل رات دس بجے کے قریب باؤنڈری لائن کی طرف جو شدید گولا باری ہوئی ہے اس میں زینب بھی ماری گئی ہے۔ اس کی

لاش ابھی تھوڑی دیر پہلے یہاں پہنچی ہے۔ یہ صدمہ ابراہیم سے برداشت نہیں ہوا۔ آپ نے دیکھا ہی ہوگا اسے بے ہوشی کی حالت میں اسپتال لے جایا گیا ہے۔''

''لاش کے بارے میں کیا کہا جارہا ہے؟''

''کہہ رہے ہیں کہ وہ شاہی بہو رانی زینب کی ہی ہے۔ بری طرح بگڑی ہوئی ہے۔ کچھ تو کہہ رہے ہیں کہ اس کا اوپری دھڑ ہی نہیں ہے۔ مارٹر وغیرہ کا شیل لگا ہے اسے......''

عجب تماشا تھا، جس لڑکی کی اندوہناک موت پر بَین کیے جارہے تھے اور قیامت بپا تھی، وہ یہاں سے چالیس پچاس قدم کے فاصلے پر انیکسی کے ائرکنڈیشنڈ کمرے میں سو رہی تھی۔

میں نے خانساماں ازمیر طیب کی طرف دیکھا۔ حالانکہ وہ بھی ہم دونوں کی طرح اصل صورتِ حال سے آگاہ تھا لیکن ماحول کا حصہ بنے رہنے کے لیے اس نے بھی چہرہ لٹکا رکھا تھا اور گم صم دکھائی دیتا تھا۔ میں نے انیق سے پوچھا۔''ازمیر تو کہیں زبان نہیں کھول دے گا؟''

''بالکل نہیں۔'' انیق پورے یقین سے بولا۔''وہ خود بھی سب کچھ اچھی طرح سمجھ رہا ہے۔''

میں اور انیق انیکسی میں واپس آگئے۔ ہم زینب کے آس پاس رہنا چاہتے تھے۔

میں نے سجاول کے کمرے والا دروازہ اَن لاک کیا اور ہم دونوں اندر چلے گئے۔ وہ بستر پر ہی تھی اور سوئی ہوئی تھی۔ چہرہ پاکیزگی اور معصومیت کی تصویر نظر آتا تھا۔ اس حالت میں بھی اس نے دوپٹا اوڑھ رکھا تھا اور اسے دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے کسی مصور نے دھیمے رنگوں کے ساتھ ایک سادہ لیکن پُرکار تصویر بنائی ہو۔ وہ یہاں بے خبر پڑی تھی اور وہاں ڈی پیلس میں اس کی ''موت'' پر آہ و بکا ہو رہی تھی۔ میں نے اس کی کلائی کو آہستہ سے ہلا کر اسے جگایا۔ وہ کسمسائی اور پھر ایک دم اٹھ بیٹھی۔ چند سیکنڈ تک سخت ہراس میں رہنے کے بعد وہ نارمل ہوگئی اور اس نے ایک چادر سے خود کو ڈھانپ لیا۔ باہر سے آنے والی کوئی آواز اس کمرے تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔''زینب! ہم نے اپنا کام شروع کر دیا ہے۔ ہم تمہیں پاکستان پہنچانے کی کامیاب کوشش کر سکتے ہیں لیکن اس کے لیے بہت ضروری ہے کہ تم کوئی بات بھی چھپاؤ نہ۔''

''میں کچھ نہیں چھپا رہی۔'' وہ روہانسی ہو کر بولی۔

میں نے ذرا توقف سے کہا۔''تم بتا رہی ہو کہ تم نے ڈی پیلس کو صرف ابراہیم اور اس کے رویے کی وجہ سے چھوڑا تھا۔ کیا یہ واقعی ایسا ہے؟''

''ہاں......لیکن میں سمجھتی ہوں کہ اس میں ان کا کوئی زیادہ قصور نہیں۔ وہ خود سے مجبور تھے۔ان کی......بیماری نے ان کو......جکڑ رکھا ہے......''

''کیا ڈی پیلس سے نکلتے وقت تم نے ابراہیم کو اطلاع دی؟ یا کوئی پیغام وغیرہ لکھا؟''

وہ تذبذب میں رہنے کے بعد بولی۔''ہاں، میں نے ان کے نام ایک خط چھوڑا تھا جس میں سب کچھ لکھ دیا تھا۔''

میں نے کہا۔''میں نے وہ خط دیکھا ہے زینب! تم نے بڑی بے رحمی سے ابراہیم سے اپنا دامن چھڑایا ہے...... خط میں تم نے اپنے کسی ہمدرد بزرگ کے بارے میں بھی لکھا ہے، جس کی مدد سے تم یہاں سے نکل کر پاکستان جانا چاہ رہی تھیں۔ کیا وہ ''بزرگ'' یہی بدبخت خواجہ سرا تھا جس کا نام خیام معلوم ہوا ہے؟''

زینب نے بے قراری سے نفی میں سر ہلایا۔''نہیں......وہ کوئی اور تھے......''

''تو پھر یہ خیام اس معاملے میں کیسے آیا؟''

''خدا کے لیے، مجھ سے اس طرح سوال جواب نہ کریں۔ اگر آپ کوئی مدد کر سکتے ہیں تو آپ کا شکریہ، ورنہ مجھے یہاں سے جانے دیں۔ میں کسی بھی طرف نکل جاؤں گی......'' وہ سسک اٹھی۔

''کسی بھی طرف نکل جاؤ گی اور پھر خیام جیسے کسی خبیث کے ہتھے چڑھ جاؤ گی۔'' میں نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔

''کچھ اور نہیں کر سکتی، جان تو دے سکتی ہوں نا؟'' وہ جیسے بلک پڑی اور گھٹنوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگی۔

میں نے تھوڑی دیر اسے رونے دیا۔ اس کے اندر کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا تو میں نے نرم لفظوں میں اسے تسلی دی۔ میں اس کے لباس کے بارے میں جاننا چاہ رہا تھا کہ اس نے کہاں بدلا۔ وہ ''شاہی بہورانی'' کی حیثیت سے ایک قیمتی لباس میں ڈی پیلس سے نکلی تھی اور اب اس کے جسم پر ایک عام سا لبادہ تھا۔ جب دو دن پہلے انیق نے اسے خواجہ سرا خیام کے چنگل سے چھڑایا تو وہ کاٹن کے اسی براؤن چغے میں تھی جو ٹخنوں تک جاتا تھا۔

میرے استفسار پر اس نے بتایا کہ یہ لباس اس نے خواجہ سرا کے گھر پر ہی بدلا تھا۔ میں نے پوچھا۔''تم نے خود بدلا تھا یا اس نے زبردستی بدلوایا تھا؟''

جواب میں وہ پھر سسکنے لگی۔ جواب واضح تھا۔ وہ شاہی لباس زبردستی بدلوایا گیا تھا۔ انیق نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ہم دونوں سوچ کے گھوڑے دوڑا رہے

تھے۔ عین ممکن تھا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ''بارود سے مسخ'' جو لاش ڈی پیلس میں لائی گئی ہے، اس پر وہی لباس ہو جو زینب پہن کر یہاں سے نکلی تھی۔

صاف پتا چل رہا تھا کہ زینب بتا کم رہی ہے اور چھپا زیادہ۔ مجھے کچھ اور وقت مل جاتا تو شاید کچھ مزید معلوم ہو جاتا...... مگر مسلسل سوالوں سے گھبرا کر وہ ایک دم گم صم سی ہو گئی۔

○......❖......○

علی الصبح ہر ہائی نس قسطینا مجھے لینے کے لیے خود انیکسی میں پہنچ گئی۔ وہ میرے کندھے کے حوالے سے مزید تاخیر برداشت کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھی۔ میں نے انیق کو زینب اور اس کی حفاظت کے سلسلے میں کچھ ضروری ہدایات دیں اور قسطینا کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ وسیع و عریض پورچ میں قسطینا کی شاندار ٹویوٹا لینڈ کروزر بلٹ پروف کھڑی تھی۔ دو تین گاڑیاں پروٹوکول کی بھی تھیں۔ قسطینا نے مجھے رات کو ہی تنبیہ کر دی تھی کہ مجھے کچھ کھانا پینا نہیں ہے۔ وہ جلد از جلد میرا آپریشن چاہتی تھی اور حقیقت بھی یہی تھی۔ آپریشن کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اب تو مجھے، کندھے کو حرکت دینا بھی دشوار ہو چکا تھا۔

گاڑی میں قسطینا میرے ساتھ پچھلی نشست پر بیٹھی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''مسٹر سجاول کے حوالے سے کوئی اطلاع ملی؟''

وہ ذرا چونک کر بولی۔ ''ہاں...... ایک اطلاع تو ہے اور اسے اچھی اطلاع میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ اس روز اسپتال پر ہونے والے فائر اور کاؤنٹر فائر کے نتیجے میں دونوں طرف کے کم و بیش پچیس افراد جان سے گئے، زخمی ہونے والوں کی تعداد ایک سو چالیس کے قریب ہے مرنے والوں میں سے قریباً بیس افراد تو اسپتال کے بالکل آس پاس موجود تھے۔ ہمارے انفارمر نے اطلاع دی ہے کہ زخمی یا مرنے والوں میں مسٹر سجاول شامل نہیں ہیں۔''

''اور جو گرفتار ہوئے؟''

''ہمارے گرفتار ہونے والے افراد کی تعداد بھی تیس کے لگ بھگ ہے۔ یہ سب کے سب سپاہی تھے۔ ابھی ان لوگوں کی تفصیلات معلوم نہیں ہو سکیں۔ ممکن ہے کہ مسٹر سجاول گرفتار ہونے والوں میں ہوں۔''

بلٹ پروف کار کی پچھلی اور اگلی نشستوں کے درمیان ایک سلائیڈنگ شیشہ تھا۔ میں اور قسطینا جو گفتگو کر رہے تھے وہ ڈرائیور تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ ہمارے آگے پیچھے پروٹوکول کی گاڑیاں اور ہیوی موٹر بائیکس تھیں۔ ہوٹرز گونج رہے تھے۔ ابھی سورج کی رُوپہلی کرنیں بلند عمارتوں کے بالائی کناروں اور پام درختوں کی چوٹیوں پر ہی دکھائی دیتی تھیں۔ ایک موڑ

کاٹتے ہوئے میرا کندھا سائیڈ سے ٹچ ہوا تو بے ساختہ چہرے پر تکلیف کے آثار نمودار ہوئے۔ قسطینا نے بڑے دکھی انداز میں میری طرف دیکھا اور مجھے ایسٹرن کے نام سے مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ ''میں خود کو کبھی معاف نہیں کر سکتی، اگر تم دوبارہ RING میں اترنے کے قابل نہ ہوئے تو میں سمجھوں گی کہ میں نے ایک اسٹار کو اپنے ہاتھوں سے بجھا دیا ہے۔ کاش میں اس رات سے پہلے جان گئی ہوتی کہ تم کون ہو؟''

''میں وہی ہوں جو آپ کے سامنے ہوں۔ شاید میری شکل ''ایم ایم اے'' کے کسی مشہور فائٹر سے ملتی ہے۔ یہی بات اس سے پہلے سجاول اور اس کے ایک نوجوان ساتھی نے کہی تھی۔ اگر آپ یہ سمجھ رہی ہیں کہ......''

''تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔'' اس نے تیزی سے میری بات کاٹی۔ ''میں نے کل رات انٹرنیٹ پر آدھا گھنٹا گزارا ہے۔''

''لیکن آپ جو کچھ......''

''پلیز، میرے ساتھ ساتھ خود کو بھی دھوکا دینے کی کوشش نہ کرو۔ مجھے نہیں پتا کہ تم یہ سب کچھ کیوں چھپا رہے ہو، اور کب تک چھپانے کا ارادہ رکھتے ہو۔ لیکن میرے سامنے مت بنو۔ پلیز، مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارے کندھے کو یہ چوٹ کب لگی تھی؟''

میں نے ٹھنڈی سانس لی اور اس چوٹ کے اصل خالق سجاول کا نام چھپاتے ہوئے کہا۔ ''جس دن میں اور سجاول کچھ امریکن عورتوں کو بچانے کے لیے ہوٹل واشنگٹن میں گھسے تھے، ایک رائفل کا وزنی کندا بے حد شدت سے مجھے مارا گیا۔ چوٹ لگتے وقت ہی مجھے پتا چل گیا تھا کہ کچھ غیر معمولی ہو گیا ہے۔''

وہ بولی۔ ''کاش تم مجھے بتا سکو کہ تمہیں ضرب لگانے والا کون تھا اور میں اسے بتاؤں کہ اس سے مارشل آرٹ کے شعبے کا کتنا عظیم الشان نقصان ہوا ہے۔''

''جو کچھ بھی ہے یور ہائی نس، اس سے آپ کا احساس جرم تو کم ہو جانا چاہیے۔ میرے کندھے کی یہ حالت آپ اور آپ کے باڈی گارڈ براڈے کی وجہ سے نہیں ہوئی۔''

''اس چوٹ کو بدتر کرنے میں تو میرا ہی ہاتھ ہے۔'' وہ جیسے کراہ کر بولی۔ اس کے اندر کا دکھ اس کی آنکھوں اور چہرے پر نمایاں تھا۔

ذرا توقف سے کہنے لگی۔ ''تمہارے ملک پاکستان کے ڈاکٹر اور سرجن پوری دنیا میں مشہور ہیں۔ میں نے ہنگامی طور پر ایک بہترین آرتھوپیڈک سرجن کو کراچی سے بلا لیا ہے۔ بڑی امید ہے کہ سرجن صاحب شام تک یہاں پہنچ جائیں گے۔ ان کے آنے تک آپریشن کی

باقی تیاری ہو گی۔ ایک آسٹروی سرجن برونائی سے بھی یہاں آ چکا ہے۔ میں تمہیں بہترین سے بہترین طبی سہولتیں فراہم کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ باقی جو اوپر والے کو منظور۔''

''آپ ایسے بدترین جنگی حالات میں مجھ پر اتنی توجہ دے رہی ہیں تو اوپر والا بھی بہتر ہی کرے گا۔ ویسے آپ کی دعا سے میں کافی سخت جان واقع ہوا ہوں۔ بہت جلد ٹھیک ہو جاؤں گا۔''

اس نے بڑے دکھ سے میری طرف دیکھا۔''تم اپنے اندرونی جذبات کو چھپا رہے ہو ایسٹرن، اور مجھے پھر بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہے ہو۔ مسئلہ تمہارے کندھے کے صرف ٹھیک ہو جانے کا نہیں ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ تم پھر سے اسی توانائی اور اعتماد سے RING میں اترسکو جس کے لیے تم مشہور ہو جس کی وجہ سے تم ہزاروں، لاکھوں دلوں کی دھڑکن ہو اور میرے جیسے مارشل آرٹ کے شیدائی تم پر جان چھڑکتے ہیں...... ہاں مسئلہ یہ ہے۔'' وہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں اور لہجے میں عجیب سی کیفیت تھی۔

وہ مجھے ایسٹرن ثابت کرنے پر تلی ہوئی تھی اور میں اس موقع پر کسی بحث میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ میرا کندھا درد سے پھٹا جا رہا تھا اور سوجن ہاتھ تک پہنچ چکی تھی۔ مجھے پہلی بار یہ احساس ہو رہا تھا کہ مجھے جلد از جلد اسپتال تک پہنچ جانا چاہیے۔

اسپتال میں ہمیں زبردست پروٹوکول ملا۔ ہر طرف بھاری بوٹوں کی ایڑیاں ٹھکا ٹھک بجنے لگیں۔ یہ اسپتال جاماجی کے مغربی سرے پر واقع تھا اور جنگ کے بادلوں سے قدرے دور تھا۔ اسپتال کے اردگرد مجھے دو تین اینٹی ایئرکرافٹ گنیں بھی نظر آئیں۔ ڈاکٹروں کی ایک ٹیم نے مجھے فوراً اپنی تحویل میں لے لیا۔ بلڈ ٹیسٹ، ایکسرے، ای سی جی اور جو جو کچھ 'پری آپریشن' ضروریات تھیں، وہ پوری کی گئیں۔ ایک ایکسرے میں نے بھی دیکھا۔ ٹوٹی ہوئی ہڈی اب کافی حد تک اپنی جگہ سے ہل چکی تھی اور اس کا ایک ٹوٹا ہوا کونہ گوشت میں گھس رہا تھا۔

ایک اعلیٰ افسر مسلسل میرے ساتھ تھا۔ اپنی بے پناہ مصروفیات کی وجہ سے قسطینا سہ پہر کے وقت چلی گئی۔ تاہم رات کو آپریشن کے وقت وہ پھر اسپتال پہنچ گئی۔ اگلے تین چار گھنٹے آپریشن اور بے ہوشی کی دھند میں لپٹے ہوئے تھے۔ انستھیسیا کا اثر دو تین گھنٹے تک تو تنگ کرتا ہی ہے۔ رات ایک دو بجے کے لگ بھگ میں نے تیزی سے سنبھلنا شروع کر دیا۔ میرا بایاں کندھا یوسلیب پلاستر میں جکڑا ہوا تھا۔ یہ پلاستر کندھے کے اوپر سے شروع ہو کر کہنی کے نیچے تک چلا گیا تھا۔ کہنی کو قریباً ساٹھ کے زاویے سے موڑ دیا گیا تھا۔ مجھے سب سے پہلا فون

انیق کا ہی موصول ہوا۔ اس نے میرا حال احوال پوچھا۔ اصولی طور پر تو انیق کو اسپتال میں ہونا چاہیے تھا لیکن وہ ''معدے کے شدید درد'' کی وجہ سے ڈی پیلس میں ہی تھا۔ 'معدے کا یہ درد' مصنوعی تھا۔ دراصل زینب کی دیکھ بھال کے لیے اس کا اپنے کمرے میں رہنا ضروری تھا...... میرے ہوش میں آنے کے تھوڑی دیر بعد ہی قسطینا واپس ڈی پیلس چلی گئی۔ اسے زینب کی ''تجہیز و تکفین'' میں شریک ہونا تھا۔ اس ''واقعے'' نے جزیرے میں رنج و الم کی کیفیت پیدا کر رکھی تھی۔ میرے اردگرد جو گفتگو ہو رہی تھی اس سے اتنا معلوم ہوا کہ ہز ہائی نس ابراہیم ریان کی نوبیاہتا دلہن کی لاش اس علاقے سے ملی ہے جہاں پرسوں رات نیوسٹی کی گرے فورس اور جاما جی کی گرین فورس میں زبردست گولا باری ہوئی ہے۔ کوئی بڑا شیل یا راکٹ جسم کے بالائی حصے پر لگا اور لاش کو بری طرح مسخ کر گیا۔ زینب وہاں کیسے پہنچی، اس بارے میں ابھی کچھ پتا نہیں تھا۔

کوئی اور جانتا ہو یا نہ لیکن ہم جانتے تھے کہ آج رات جس کی تجہیز و تکفین کی جا رہی ہے، وہ زندہ ہے اور ڈی پیلس کی انیکسی میں ہے۔ اس سازش کا ایک اہم کردار وہ خواجہ سرا خیام تھا جو ایک ساحلی مکان میں رہتا تھا اور جہاں سے انیق نے زینب کو خستہ حالت میں نکالا تھا۔ وہ شاہی لباس یقیناً خیام کے پاس ہی رہا تھا جس میں کل صبح ''زینب کی لاش'' ملی تھی۔ مطلب یہ کہ خیام، زینب کو زندہ رکھنا چاہتا تھا مگر اس طرح سے کہ زینب کے ورثا اور عام لوگ اسے مردہ سمجھیں۔ کیا یہ اتنی بڑی سازش صرف خواجہ سرا خیام نے کی تھی یا اس کے پیچھے بھی کچھ لوگ تھے؟ وہ ہمدرد بزرگ کون تھا جس کا ذکر زینب نے ایک سے زائد بار کیا تھا؟ زینب یہاں پر یہ سب کچھ جھیلنے کے باوجود بڑی بیگم سے ملنا کیوں چاہ رہی تھی؟ بہت سے سوالات تھے۔

اگلے روز میں اسپتال سے واپس انیکسی میں پہنچ گیا تو انیق کے معدے کا ''شدید درد'' بھی ٹھیک ہو گیا۔ اس نے کہا۔ ''شاہ زیب بھائی! آج صبح ایک مسئلہ ہو گیا۔ صفائی والا آیا۔ اس نے کہا کہ وہ باقی کمروں کے علاوہ سجاول والا کمرا بھی صاف کرنا چاہتا ہے۔ انچارج کا حکم ہے۔ میں نے بمشکل اسے باز رکھا۔ چابی نہ ملنے کا بہانہ بنایا لیکن ایسا کب تک چلے گا۔ کل یا پرسوں یہ لوگ پھر کمرے کی صفائی کرنا چاہیں گے۔ یا ایسا ہی کوئی اور مسئلہ کھڑا ہو سکتا ہے۔ کل رات زینب دو چار مرتبہ زور سے کھانسی تو ہلکی سی آواز باہر تک آئی۔''

''کمرے سے روشنی تو باہر نہیں آتی؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔ وہ صرف ایک ٹیبل لیمپ جلاتی ہے اور اس کا رخ بھی میں نے ایسا رکھا ہوا

ہے کہ روشنی باہر نہیں آتی۔ اس کے علاوہ ایک اچھی بات بھی ہوئی ہے میں نے آپ کے اور امریش پوری (سجاول) کے کمرے کا درمیانی دروازہ ''ان لاک'' کرلیا ہے۔ اب امریش پوری والے کمرے میں آپ کے کمرے کے اندر سے ہی آمدورفت جاری رکھی جاسکتی ہے۔''

''زینب کے کھانے کا کیا کررہے ہو؟''

''کھانا تو وافر ہوتا ہے۔ اس کی کوئی پریشانی نہیں ہے لیکن وہ خود بہت ''اپ سیٹ'' ہے۔ اسے یہ بھی ڈر ہے کہ کہیں وہ خبیث خواجہ سرا اسے ڈھونڈتا ہوا یہاں نہ پہنچ جائے۔ میں نے اسے سمجھایا ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔ وہ تو خود اپنا جرم چھپانا چاہ رہا ہوگا۔''

''خواجہ سرا کے بارے میں کچھ پتا چلا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نے از میر طیب کو سن گن لینے کے لیے کہا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ خواجہ سرا کا پورا نام خیام مانش ہے۔ وہ ڈی پیلس میں موجود قریباً دو درجن خواجہ سراؤں کا ہیڈ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن پچھلے قریباً ایک ماہ سے وہ چھٹی پر ہے اور سمندر کے کنارے اپنے اس ساحلی گھر میں آرام کررہا ہے۔ وہاں وہ اپنے کسی عزیز اور دو ملازموں کے ساتھ رہتا ہے لیکن جس رات زینب والا واقعہ ہوا، وہ اس ساحلی گھر میں اکیلا ہی تھا۔ آثار یہ کہتے ہیں کہ وہ ابھی تک اس گھر میں ہی ہے۔''

''اس معاملے کی گتھی وہ سلجھا سکتا ہے یا پھر زینب ازخود زبان کھولے تو کچھ پتا چل سکتا ہے۔''

''آپ کے لیے ایک اور اطلاع بھی ہے۔'' انیق نے حسبِ عادت سر کھجاتے ہوئے کہا۔ ''آپ کا وہ پنجابی دوست کبڈی شاہ بھی یہاں پہنچ گیا ہے۔ کل سے اس نے آپ سے ملنے کی رٹ لگائی ہوئی تھی۔''

میں سمجھ گیا۔ انیق، سیف کی بات کررہا تھا۔ اپنے سفری کاغذات کی وجہ سے وہ ہمارے ساتھ نہیں آسکا تھا۔ اب اس نے قدم رنجہ فرمالیا تھا۔ اس کی عمر لمبی تھی۔ ابھی ہم بات ہی کررہے تھے کہ وہ آدھمکا۔ دروازہ کھلا اور اس کی ٹھیٹ پنجابی صورت دکھائی دی۔ وہ رنگ دار شلوار قمیص اور گرگابی میں تھا۔ گلے میں وہ صافہ نما تکینی کلر کپڑا تھا جسے ''پرنا'' کہا جاتا ہے۔ اس نے آتے ساتھ ہی مجھ سے بغلگیر ہونا چاہا لیکن پھر میرا زخمی بازو دیکھ کر سنبھل گیا اور پُرجوش مصافحے پر اکتفا کیا۔

''آپ کے بازو کے زخمی ہونے کا سن کر بہت زیادہ افسوس ہوا ہے شاہ زیب صاحب۔''

''یہ شاید تمہاری نظر ہی لگی ہے۔ تم بہت اونچے بانس پر چڑھا رہے تھے مجھ کو۔''

''آپ پہلے ہی بہت اونچی جگہ پر ہیں، آپ کو کون چڑھا سکتا ہے۔ اللہ کرے آپ کی تکلیف مجھ کو مل جائے اور آپ بھلے چنگے ہو جائیں۔'' وہ تہ دل سے بولا۔

''بڑی بونگی دعا مانگ رہے ہو۔ میری تکلیف اپنے لیے کیوں مانگ رہے ہو۔ یہ کہو کہ میں ٹھیک ہو جاؤں۔ دینے والے کے پاس کون سی کمی ہے۔''

اس نے میری بات سے اتفاق کیا اور دیگر حال احوال پوچھنے میں لگ گیا۔ وہ اس بات پر بہت خوش تھا کہ کہیں قریب سے (کنٹرول لائن کی طرف سے) گاہے بگاہے دھماکوں کی آوازیں آتی تھیں۔ وہ لڑائی مار کٹائی کا شوقین تھا اور یہ خیال ہی اس کے لیے بے حد فرحت آفریں تھا کہ وہ کسی طرح کی دھواں دھار لڑائی میں حصہ لے گا۔ وہ بہت من موجی قسم کا آدمی تھا۔ اسے یہاں آ کر صرف دو بڑے مسئلے پیش آئے تھے ایک تو یہ کہ ناشتے میں اسے خالص دہی کی لسی نہیں ملی تھی اور دوسرے یہ کہ یہاں باتھ رومز میں کموڈ لگے ہوئے تھے۔ جن پر بیٹھنا اسے کافی دشوار محسوس ہوتا تھا۔

اس نے بڑے اشتیاق سے کہا۔ ''استاد جی! میرا اصل کام کب شروع ہوگا؟''

اصل کام سے اس کی مراد لڑائی مار کٹائی ہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''ذرا چھری تلے سانس لو۔ سب کچھ ہوگا اور تمہاری امیدوں سے زیادہ ہوگا۔ ایک دو دن ذرا کھا پی کر جان بنا لو۔''

''کھانا پینا کیا ہے استاد محترم۔ یہاں تو ہر طرف برگر، سینڈوچ اور وہ کیا کہتے ہیں چائنیز فوڈ ہی نظر آتے ہیں۔ کوئی دیسی گھی کے پراٹھے ہوں، بکرے کا گوشت ہو، چانپ یا پٹھ کی بوٹیاں ہوں، ساتھ میں تلی ہوئی رہو مچھلی ہو، پر کوئی گل نہیں جی۔ یہاں اگر آپ کا ساتھ ہے اور لڑائی وغیرہ کا تڑکا ہے تو پھر سب کچھ قبول ہے۔''

''اس طرح کی لڑائی میں تم کیا کرو گے؟ تمہاری کوئی فوجی ٹریننگ تو ہے نہیں؟''

''استاد جی، آپ سب جانتے ہو۔ لڑائی ٹریننگ سے زیادہ یہاں سے لڑی جاتی ہے۔'' اس نے اپنے چوڑے سینے پر زور سے ہاتھ مارا۔ ''اور اگر آپ ٹریننگ کی بات ہی کرتے ہیں تو پھر کبڈی بھی تو ایک ٹریننگ ہی ہے۔ پلٹنا جھپٹنا اور جھپٹنے کے بعد پھر پلٹنا اور پھر جس کو چھا مار لینا اس کو زمین میں گاڑ کے رکھ دینا۔''

کنٹرول لائن کی طرف پھر کوئی زوردار دھماکا ہوا اور اس کی گونج سنائی دی۔ شاید کوئی بارودی سرنگ بچھاتے بچھاتے بلاسٹ ہوگئی تھی۔ کنٹرول لائن کی دونوں جانب ایک زوردار

لڑائی کی تیاری ہو رہی تھی۔ ریان فردوس کی گرین فورس ہر صورت میں اپنا وہ کھویا ہوا علاقہ واپس لینا چاہتی تھی جو پانچ روز پیشتر ایک اچانک حملے میں چھین لیا گیا تھا۔

رات کوئی نو بجے کے لگ بھگ انیکسی میں ہلچل نظر آئی۔ ہمیں اطلاع دی گئی کہ ہر ہائی نس قسطینا تشریف لا رہی ہیں۔ پروٹوکول کی گاڑیوں کے ہوٹر سنائی دیئے۔ سکیورٹی والے انیکسی میں اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ تاہم قسطینا کی آمد کی اطلاع غلط ثابت ہوئی۔ اس کی گاڑی تو وہاں آئی تھی مگر وہ خود موجود نہیں تھی۔

مجھے اطمینان ہوا۔ دراصل میں اپنی پہلی فرصت میں ساتھ والے کمرے میں جا کر زینب سے ملنا چاہتا تھا۔ چند سیکنڈ بعد صورتِ حال پھر تبدیل ہو گئی۔ ایک پروٹوکول آفیسر نے آ کر بتایا کہ ہر ہائی نس نے اپنی ذاتی گاڑی بھیجی ہے اور مجھے ڈی پیلس کی اصل عمارت میں بلایا ہے۔

حکم حاکم مرگِ مفاجات کے تحت پندرہ منٹ بعد میں ڈی پیلس کی ایک خوب صورت نشست گاہ میں وجود تھا۔ یہ نشست گاہ ریان فردوس کی عظیم الشان نشست گاہ کی طرح پُرشکوہ تو نہیں تھی پھر بھی دیکھنے کے لائق تھی۔ بیش قیمت طویل صوفے تھے جن کے درمیان فرانس کی بنی ہوئی ایک ایسی میز تھی جو آٹومیٹک طریقے سے گھومتی تھی اور اپنی جگہ بھی تبدیل کرتی تھی۔ دیواروں پر جدید ایل سی ڈیز لگی تھیں۔ اور الیکٹرانک نقشہ جات آویزاں تھے۔ میز پر بھی نقشے وغیرہ پھیلے ہوئے تھے۔ قسطینا سبز یونیفارم میں ملبوس تھی۔ اس کے اردگرد بیٹھے فوجی افسران بھی یونیفارم میں تھے۔ ان کے تھکے ہوئے چہروں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ پچھلے کچھ گھنٹوں سے مسلسل میٹنگ میں ہیں۔ اب یہ میٹنگ اختتام پذیر تھی۔ نقشے وغیرہ لپیٹے جا رہے تھے۔ قسطینا کی ہدایت پر میں ایک صوفے پر بیٹھ چکا تھا۔

قسطینا نے انگلش میں، میٹنگ برخاست کرنے کا اعلان کرتے ہوئے کہا۔ ''او کے جنٹلمین! میرے خیال میں اب کوئی سوال باقی نہیں ہے۔ ہم تین بجے کے بعد اگلی ملاقات کریں گے.....''

قسطینا کھڑی ہو گئی۔ دیگر افراد بھی کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے قسطینا کو پے در پے سلیوٹ کیے۔ سب کے چہروں پر دبا دبا جوش نظر آ رہا تھا۔ سینئر کمانڈر افغانی بھی ان میں شامل تھا۔ یہ اونچا لمبا پٹھان تھا۔ چہرے سے جنگجوانہ طبع کا مالک لگتا تھا۔ یہ ملائی بھی بول لیتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ طویل عرصے سے ریان فردوس فیملی کے ساتھ ہے۔ اس نے اور دو تین دیگر افسروں نے ذرا تیکھی نظروں سے میری طرف دیکھا، مگر زبان سے کچھ نہیں کہا۔

سب لوگوں کے جانے کے بعد قسطینا نے ایک بغلی دروازہ کھولا اور ایک سجے سجائے کمرے میں آگئی۔ یہاں بیڈ اور آرام دہ کرسیاں وغیرہ موجود تھیں۔ ایک طرح سے یہ ریٹائرنگ روم تھا۔ یہاں آ کر قسطینا نے کچھ ایزی محسوس کیا۔

''لگتا ہے کہ آپ آج سارا دن بھاگ دوڑ میں مصروف رہی ہیں؟''

اس نے اپنی سبز کیپ اتار کر میز پر رکھی اور ذرا دھیمی آواز میں بولی۔ ''ایسٹرن، ہم رائے زل پر ایک زوردار حملہ کرنے والے ہیں۔ زیادہ امکان یہی ہے کہ یہ حملہ آج رات پچھلے پہر ہو جائے گا۔ ہمیں اس کارروائی سے بہت امیدیں وابستہ ہیں۔ دعا کرو کہ ہم کامیاب ہو جائیں۔''

''میری اور میرے ساتھیوں کی ساری ہمدردیاں اور نیک تمنائیں یور ہائی نس کے ساتھ ہیں۔''

اس نے کہا۔ ''پھر وہی یور ہائی نس...... میں نے تم سے کہا بھی تھا۔ کم از کم ''تم'' مجھے اس لقب سے نہ پکارا کرو۔ میں تمہارے لیے بالکل مختلف طرح کے احساسات رکھتی ہوں۔ تم تو ایک لیجنڈ ہو ایسٹرن۔''

میں نے اپنی پتلیاں اوپر چڑھائیں۔ ''یور ہائی نس! پھر وہی ایسٹرن۔''

''اور پھر وہی یور ہائی نس۔'' وہ ہولے سے مسکرائی۔ پھر میری کلائی پکڑ کر میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ''انکار اور بحث سے کچھ حاصل نہیں۔ تم پکڑے جا چکے ہو۔ پورے ثبوتوں کے ساتھ۔ اپنا اور میرا وقت ضائع نہ کرو پلیز۔''

وہ اٹھی اور سپاہیانہ چال چلتی ایک چھوٹا دروازہ کھول کر ملحقہ کمرے میں گھس گئی۔ چند سیکنڈ بعد وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھوں میں کئی کلرڈ فوٹو گرافز اور رول کیے ہوئے پوسٹرز تھے۔ اس کے علاوہ سی ڈیز کا ایک پیکٹ بھی تھا۔ اس نے فوٹو گرافز میرے سامنے بکھیر دیئے اور پوسٹرز ''ان رول'' کر دیئے۔ ایک بڑے پوسٹر میں مجھے RING کے اندر غیظ و غضب کا روایتی مظاہرہ کرتے دکھایا گیا تھا۔ میں اپنے آئرش حریف پر چلا رہا تھا۔ اپنے دونوں بازو میں نے اوپر اٹھا رکھے تھے۔ میرے جسم پر فقط ایک نیکر تھی۔ کندھے تک جاتے ہوئے بالوں اور گھنی داڑھی مونچھ نے میرے دو تہائی چہرے کو ڈھانپ رکھا تھا۔

قسطینا نے میری قمیص کے بٹن کھولے اور میرا سینہ ننگا کر دیا۔ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''ثبوت تو بہت سے ہیں اور ایک سے بڑھ کر ایک ہے لیکن باقیوں کو چھوڑ بھی دو تو یہی ایک کافی ہے۔''

اس نے میری دائیں بغل سے ذرا نیچے ایک تل پر انگلی رکھی۔ یہ دراصل دو تل تھے جو ساتھ ساتھ واقع تھے۔ ایک قدرے بڑا اور دوسرا چھوٹا تھا۔ یہ دونوں تل سامنے پڑے قدِ آدم پوسٹر پر بھی واضح نظر آ رہے تھے۔ اس نے میری آنکھوں میں دیکھا، پھر زیرِ لب مسکراتے ہوئے میری قمیص کے بٹن بند کر دیئے اور پوسٹر کو سمیٹ لیا۔

میں خاموش تھا۔ وہ بولی۔ ''اگر مزید ثبوت درکار ہوں تو میں یہ سی ڈیز بھی پلے کر سکتی ہوں۔ ان میں بھی درجنوں ثبوت ہیں اور تو اور تمہاری آواز بھی پکار پکار کر گواہی دے گی کہ میں اسی ایسٹرن کی آواز ہوں جو شاہ زیب بن کر یہاں جاماجی میں موجود ہے۔''

میں نے ایک طویل توقف کے بعد کہا۔ ''آپ کیا چاہتی ہیں؟''

''کچھ بھی نہیں...... کچھ بھی نہیں۔'' وہ زور دے کر بولی اور مسکرائی۔ ''بس مجھے اپنے اعتراف کے ساتھ، یہ احساس ہو لینے دو کہ تم ہمارے درمیان موجود ہو، اور میں تمہیں اپنے سامنے دیکھ رہی ہوں...... تم اب تک جان ہی چکے ہو گے کہ میں مارشل آرٹ کی شیدائی ہوں اور خاص طور سے مارشل آرٹ کے اس سنسنی خیز ورژن یعنی ''ایم ایم اے'' کی۔ ایم ایم اے کے جن دو تین بے مثال کھلاڑیوں کو میں بے حد پسند کرتی ہوں ان میں ایک تم ہو ایسٹرن! میں نے کبھی...... سوچا بھی نہیں تھا کہ ایک دن تم کو اس طرح اپنے سامنے دیکھوں گی۔ تم اس چھوٹے سے گمنام جزیرے میں آؤ گے اور میرے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہو جاؤ گے۔''

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ اپنے فوجی بوٹ اتارتے ہوئے بولی۔ ''میں کوئی ''رومانی ہیروئن'' نہیں ہوں۔ ایک پریکٹیکل لڑکی ہوں۔ مجھ پر بے شمار ذمے داریاں ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے پیارے والد کی موت کا بدلہ لینا، میں اپنا اولین فرض سمجھتی ہوں۔ میری زندگی میں شاید کچھ اور سوچنے کی گنجائش ہی نہیں ہے...... بلکہ اب تو شاید...... زندگی کی گنجائش بھی کم ہوتی جا رہی ہے۔ ہم حالتِ جنگ میں ہیں، کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا ہے۔''

گفتگو کچھ بوجھل ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ دوبارہ ایک الماری کی طرف گئی اور اس میں سے ایک بک نکال لائی۔ بک کا خالی صفحہ میرے سامنے کرتے ہوئے بولی۔

''آٹوگراف پلیز۔''

میں کبھی آٹوگراف بک کو اور کبھی قسطینا کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنا قلم میری طرف بڑھا رہی تھی اور ساکت کھڑی تھی۔ میں نے گھبراہٹ میں جلدی جلدی سائن کر دیئے۔ وہ بولی۔

''کچھ لکھنا بھی تو چاہیے۔''

میں نے لکھا۔''ایک انوکھے فوجی کمانڈر کے لیے نیک تمناؤں کے ساتھ۔''

اس نے دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ آٹوگراف بک میرے ہاتھوں سے لے لی اور بولی۔''کالج کے زمانے میں آٹوگرافز کا شوق تھا۔اب ایک عرصے سے یہ بک بند پڑی تھی، تمہارے لیے کھولی ہے اٹ سواِیور......شکریہ ایسٹرن۔''

میں نے کہا۔''میری بھی ایک درخواست ہے......آپ سے...... مجھے ایسٹرن نہ کہیں۔''

''تو تمہیں بھی ایک بات ماننا ہوگی۔ مجھے یور ہائی نس نہ کہا کرو۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے۔لوگ کیا کہیں گے؟''

''چلو......لوگوں کے سامنے تو مجبوری ہے مگر جب یہ مجبوری نہ ہو تم مجھے میرے نام سے پکارو گے۔''

''اوکے......قس......طینا......صاحبہ......''

اس نے جرابیں اتاریں۔اس کے خوب صورت پیروں پر سخت بوٹوں کے سرخ نشان تھے۔ وہ پاؤں کی طرف توجہ دیئے بغیر بولی۔''تم بیٹھو، میں ذرا چینج کر آؤں لیکن نہیں...... پہلے کھانے کے لیے کچھ کہہ دوں۔ یقیناً تم نے بھی ابھی نہیں کھایا ہوگا۔'' اس نے ایک بٹن پش کیا وہی خوفناک باڈی گارڈ دی براڈے چراغ کے جن کی طرح حاضر ہوگیا جس نے انیکسی کے ساؤنڈ پروف میٹنگ روم میں قسطینا کے ساتھ مل کر میرے کندھے کا بھرتہ بنایا تھا۔ وہ نگاہیں نیچی کر کے اٹین شین کھڑا ہوگیا۔قسطینا نے ملائی زبان میں اس سے کچھ کہا۔

وہ ایک دم اپنے گھٹنوں پر ہوگیا اور میرے سامنے بدھ مت والوں کے انداز میں ہاتھ جوڑ دیئے۔شکستہ انگلش میں بولا۔''مجھ سے بہت بڑی بھول ہوئی۔ میں اس بھول کے لیے آپ سے معافی چاہتا ہوں۔''

میں نے اس کی معافی قبول کرنے میں دیر نہیں کی۔ایسے دھانسو قسم کے شخص سے اچھے تعلقات ہی بہتر تھے۔قسطینا نے ملائی زبان میں اس سے کچھ مزید کہا۔ وہ مؤدب انداز میں چل کر آگے آیا۔ میرے گھٹنوں کو ہاتھ لگائے اور الٹے قدموں واپس چلا گیا۔ قسطینا لباس بدلنے کے لیے چھوٹے دروازے کی دوسری جانب چلی گئی۔ میرا ذہن مسلسل سجاول کی غلطی پر افسردہ تھا۔ یہ سجاول ہی تھا جس نے قسطینا پر یہ ایسٹرن والا راز فاش کیا تھا۔اس رازکے کھلنے میں میرے لیے فائدہ کوئی نہیں تھا، نقصان ہی نقصان تھا۔ میں اپنے بدترین دشمنوں جان

ڈیرک اور راہول وغیرہ سے ابھی دور رہنا چاہتا تھا لیکن حالات یہ اشارہ دے رہے تھے کہ میں زیادہ دیر دور نہیں رہ سکوں گا۔
کچھ دیر بعد قسطینا لباس بدل آئی۔ اب وہ پنڈلیوں تک جاتے ہوئے ایک پھول دار اسکرٹ میں تھی۔ پاؤں میں خوش رنگ سرخ چپل تھی۔ اس کی نسوانیت اور جسمانی موزونیت پوری طرح نمایاں ہو رہی تھی۔ پہلی بار احساس ہوا کہ وہ بھرے ہوئے جسم والی ایک پُرکشش لڑکی ہے۔ میری نظروں کا زاویہ اور اس کی تپش محسوس کر کے اس کے ابھرے ہوئے رخساروں پر مدھم سرخی کی ایک غیر محسوس لہر دوڑ گئی۔ تاہم فوراً ہی وہ اپنی قدرتی رعب دار آواز میں بولی۔ ”آج کی رات ہمارے لیے بڑی اہم ہے...... میں خود کمانڈ کروں گی اور اگلی صفوں میں رہوں گی۔ سپاہیوں اور رضا کاروں کا مورال بہت ہائی ہے۔ تم سن ہی رہے ہو گے۔ ان کے نعروں کی آواز یہاں تک آ رہی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ یہ بہت اہم حملہ ہے۔ ہمارے پاس غلطی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔“
”اگر...... میں بھی اس لڑائی میں شریک ہونا چاہوں تو......؟“
”تو میں پورے ڈی پیلس کو بتا دوں گی کہ تم مارشل آرٹ کے انٹرنیشنل اسٹار ہو اور تمہاری حفاظت کی سخت ترین ضرورت ہے۔ اس لیے تمہیں تہ خانے میں بند کر دیا جائے۔“
میں نے کہا۔ ”آپ اور جو غضب چاہے کر لیجیے گا مگر کسی کو بتانے والا قہر نہ توڑیئے گا۔ یہ میرے لیے ازحد نقصان دہ ثابت ہو گا۔ میں اس بارے میں آپ کو پھر تفصیل سے بتاؤں گا۔“
”نہیں شاہ زائب! مذاق کر رہی ہوں۔ تم سمجھو کہ یہ بات میرے سینے میں اس وقت تک دفن ہے جب تک تم خود نہ چاہو۔“ (وہ مجھے شاہ زیب کے بجائے شاہ زائب کہتی تھی)
”بہت شکریہ۔“ میں نے کہا۔
”تمہارے کندھے کو دیکھتی ہوں تو مجھے ہول آنے لگتا ہے ایسٹرن...... مم میرا مطلب ہے شاہ زائب! کاش اس رات سے پہلے مجھے معلوم ہو جاتا کہ تم کون ہو اس رات جو کچھ ہوا کیا تم اس کے لیے مجھے معاف کر سکتے ہو؟“ اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا تھا۔
میں نے کہا۔ ”اتنی دلکش لڑکی کو تو کوئی بھی ”معمولی سی شرائط“ کے ساتھ معاف کرنے

کے لیے تیار ہو سکتا ہے اور آپ تو یہاں کی سپریم کمانڈر ہیں۔ ویسے بھی میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اس رات جو کچھ ہوا، وہ سراسر بے خبری میں تھا۔ آپ یقین کریں اس حوالے سے میرے دل میں کوئی گلہ نہیں۔"

اس سے پہلے کہ وہ جواب میں کچھ کہتی...... ڈنر آ گیا۔ ایک ملازم اور دو ملازمائیں، طشتریوں میں پُر تکلف سا کھانا لے کر آئیں۔ اس میں کانٹی نینٹل کے علاوہ دو چار چائنیز ڈشز بھی تھیں۔ تین چار طرح کے شیریں اور تلخ مشروبات بھی شامل تھے۔ طرزِ تناول بھی شاہی تھا۔ یعنی چھری کانٹے اور اس طرح کے دیگر لوازمات۔ کھانا سرو ہو گیا تو قسطینا نے ملازمین کو باہر بھیج دیا۔ ہم نے کھانا شروع کیا۔ ایک ہاتھ سے چھری کانٹا استعمال کرنا میرے لیے دشوار ثابت ہو رہا تھا۔ وہ اپنائیت سے بولی۔ "چھوڑو، میں تمہاری مدد کر دیتی ہوں۔"

میرے بہت منع کرنے کے باوجود وہ میرے لیے خود چھری کانٹا استعمال کرنے لگی اور نوالہ میرے منہ تک لے جانے لگی۔ مجھے یہ سب کچھ ٹھیک تو نہیں لگ رہا تھا مگر مجبوری تھی..

وہ بولی۔ "میں نے یہاں ایک چھوٹا سا جمنازیم بھی بنا رکھا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ تمہیں وہاں دیکھوں۔"

"کس لیے؟"

"یہ جاننے کے لیے کہ تم جسم کو کس طرح استعمال کرتے ہو اور تم سے کچھ گُر بھی سیکھوں۔ بالکل لائیو...... تمہارے رُوبرو کھڑے ہو کر۔ مگر اس میں دو بڑی رکاوٹیں ہیں۔"

"وہ کیا؟" میں نے پوچھا۔

"ایک تو آج کی رات ہی بڑی رکاوٹ ہے۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ "پتا نہیں، وہاں کیا حالات پیش آنے ہیں۔ واپسی بھی ہونی ہے یا نہیں...... اور اگر واپسی ہو بھی گئی اور سب کچھ ٹھیک بھی رہا تو بھی تمہارا یہ کندھا۔ پتا نہیں کہ یہ کب تک ہلنے جلنے کے قابل ہو گا۔"

"میں اسی کندھے کے ساتھ آپ کی ہر خواہش پوری کر سکتا ہوں...... آپ کی ہر حربی خواہش!" آخری الفاظ میں نے فقرے کی صحت درست رکھنے کے لیے کہے تھے۔

کھانے کے دوران میں اس نے آڈیو سسٹم آن کر دیا تھا۔ ہلکا سا ملائیشین میوزک کمرے میں گونج رہا تھا۔ وہ بالکل بے باک اور بے تکلف تھی۔ اسے ہرگز پروا نہیں تھی کہ وہ سپریم کمانڈر ہے اور ایک اجنبی کے ساتھ بند کمرے میں بیٹھ کر ڈنر کر رہی ہے۔ اس کے آفیسرز اس سے کہیں زیادہ سینئر تھے لیکن ان میں سے بھی کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ قسطینا

کے کسی قول یا فعل پر کسی طرح کا اعتراض کر سکتا۔

''تم نے ابھی تک شادی نہیں کی...... تم شادی سے اتنے الرجک کیوں ہو؟'' اس نے اچانک پوچھا۔

''آپ کو کیسے پتا ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔

''شاید تم بھول گئے ہو، یہ بات تم نے کچھ ہی عرصہ پہلے اپنے ایک انٹرویو میں کہی تھی۔ آئرش فائٹر کے ساتھ مقابلے سے پہلے۔''

''لگتا ہے کہ آپ میرے بارے میں بہت کچھ جانتی ہیں۔''

''نہیں...... یہ تو غلط ہے۔ میرے ذہن میں بہت سے سوالات ہیں...... اور سب سے اہم سوال تو یہی ہے کہ عزت مآب سے تمہاری ملاقات پاکستان میں کیسے ہو پائی...... اور تم یہاں کیونکر موجود ہو۔ تم ایم ایم اے کے میدان سے بھی غائب ہو اور اس بارے میں بہت کچھ کہا جا رہا ہے۔''

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا باؤنڈری لائن کی طرف دو تین بڑے دھماکے ہوئے میز پر رکھے ہوئے برتن لرزنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی ایک اپاچی ہیلی کاپٹر بہت نیچی پرواز کرتا ہوا ڈی پیلس کے اوپر سے گزرا۔ ڈی پیلس کے احاطے سے پُر جوش نعروں کی گونج سنائی دی۔

قسطینا کے چہرے پر اضطراب نظر آنے لگا تھا۔ اس نے سیل فون پر کسی سے ملائی زبان میں بات چیت کی۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا، یہ سینئر کمانڈر افغانی ہی تھا۔

افغانی سے بات کرنے کے بعد قسطینا ایک بار پھر سپاہیانہ موڈ میں آ گئی۔ اس نے میوزک بند کیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''ہماری فورس بہت پُر جوش ہے۔ رضا کار دستے بھی بالکل تیار ہیں۔ یہ دستے فورس کے عقب میں رہیں گے اور ان کو بوقتِ ضرورت استعمال کیا جائے گا۔ بہت امید ہے کہ آج رات ہم رائے زل کے دانت کھٹے کر دیں گے۔''

''میں آپ کے لیے نیک خواہشات رکھتا ہوں۔''

''شکریہ۔'' اس نے کہا پھر پُر تپش لہجے میں بولی۔ ''گرے فورس ہم پر جو قرض چڑھا رہی ہے وہ بڑھتا جا رہا ہے۔ تمہیں ابراہیم کی دلہن کے بارے میں بھی پتا چل گیا ہوگا۔ اس کی موت کا سبب بھی گرے فورس کی جارحیت ہی بنی ہے۔ وہ تمہاری ہم وطن تھی اور اس سے پہلا تمہارا ہم وطن مسٹر سجاول بھی اسی جارحیت کا شکار ہوا ہے۔ اللہ کرے وہ زندہ ہو۔ آج ہم اس طرح کے سارے مظالم کا حساب بے باق کریں گے۔'' اس کے انداز میں برق کوندرہی تھی

اس کی نگاہیں جیسے اپنے والد کی خونچکاں لاش کو دیکھ رہی تھیں۔

اس کے سیل فون کی گھنٹی پھر بجنا شروع ہو گئی تھی۔ میں نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ اب آپ بہت مصروف ہونے والی ہیں۔ کیا مجھے جانے کی اجازت ہے؟''

وہ کھڑی ہو گئی۔ میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ ''اپنے بازو کا بہت دھیان رکھو اور چند روز مکمل آرام کرو۔ میں نے ڈاکٹرز کو بھی تمہارے لیے خصوصی ہدایات کر دی ہیں۔''

''بہت شکریہ یور......'' میں کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

وہ مسکرائی اور میرے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھام کر گرمجوشی سے دبایا، لیکن اس طرح سے کہ میرے کندھے پر دباؤ نہ آئے۔ اس کے ہاتھوں کی نرمی و گرمی میں ایک خاص طرح کی اپنائیت تھی۔ میں واپس جا رہا تھا...... تاہم یہاں میں اپنی ایک ''خاص چیز'' چھوڑ کر جا رہا تھا۔

باہر قسطینا کی ذاتی گاڑی مجھے انیکسی تک لے جانے کے لیے موجود تھی۔

O......❖......O

میں واپس پہنچا تو انیق پریشان نظر آ رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ اندر سجاول کے کمرے میں زینب مسلسل رو رہی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ وہ یہاں سے واپس پاکستان جانا چاہتی ہے اور اگر ہم نے جلد ہی اس کے لیے کچھ نہ کیا تو وہ اپنی جان لے لے گی۔ وہ کچھ کھا پی بھی نہیں رہی ہے۔ میں نے انیق کو کل ہی سمجھایا تھا کہ وہ زینب سے 'لاش' وغیرہ کے بارے میں کوئی بات نہیں کرے گا۔ یہ ذکر چھیڑ کر ہم زینب کی پریشانی میں اضافے کے سوا کچھ حاصل نہیں کر سکتے تھے۔

میں اپنے کمرے سے اندرونی دروازے سے اس کے پاس پہنچا۔ کمرے میں صرف ٹیبل لیمپ کی روشنی تھی۔ وہ رنج والم کی ایک تصویر نظر آتی تھی۔ معصوم اور کسی چڑیا ہی کی طرح سہمی ہوئی۔

میں نے اس سے کہا۔ ''تمہیں ابراہیم کے بارے میں کچھ پتا چلا ہے؟''

''کیا ہوا؟'' اس کی آنکھوں میں اَن گنت اندیشے سمٹ آئے۔

''وہ تمہارے بعد بے حد پریشان ہے۔ اسے نیم بے ہوشی کی حالت میں اسپتال لے جایا گیا تھا۔ اب تک وہیں ہے۔''

''اب......ان کی حالت......کیسی ہے؟'' اس نے اپنی تشویش چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

میں بغور اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ ایک طرف وہ کہہ رہی تھی کہ وہ یہاں سے چلے جانا چاہتی ہے اور اس کی وجہ خود ابراہیم ہے۔ وہ اپنے آپ کو سنبھال نہیں پا رہا اور ایک شوہر کی حیثیت سے اس کے لیے خطرہ بنا ہوا ہے لیکن اب جس طرح کے تاثرات اس کے چہرے پر نظر آئے تھے۔ وہ اس کے بیان سے میل نہیں کھاتے تھے۔ وہ جیسے چند سیکنڈ کے لیے تڑپ سی گئی تھی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ وہ بہت کچھ چھپا رہی ہے۔ مجھے ابراہیم جیسے نیک خو اور

سلجھے ہوئے لڑکے سے ایسی بے صبری اور چھچھورے پن کی توقع نہیں تھی۔ بے شک وہ نوجوانی کی خطرناک ترین عمر میں تھا۔ زینب پر ہزار جان سے فدا ہو چکا تھا اور وہ اسے ہر طرح سے میسر بھی تھی مگر میرا دل کہتا تھا کہ وہ زینب کو کسی خطرے میں نہیں دھکیل سکتا۔

تو کیا پھر کوئی اور چکر تھا۔ زینب نے یہاں آ کر چند بار بڑی بیگم نورل کا نام بھی لیا تھا۔ وہ ان سے کیوں ملنا چاہتی تھی؟ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ زینب کے ڈی پیلس سے نکلنے میں کسی طور بیگم کا ہاتھ ہو۔ وہ روہانسی آواز میں بولی۔ ''آپ مجھے بتاتے کیوں نہیں وہ ٹھیک تو ہیں؟'' اس کا اشارہ ابراہیم کی طرف تھا۔

میں نے کہا۔ ''اگر اسپتال کے بستر پر بے ہوش پڑے ہونے کو اور اکھڑے ہوئے سانس لینے کو تم ٹھیک ہونا کہتی ہو تو پھر وہ ٹھیک ہی ہے۔''

وہ سسک اٹھی۔ کچھ دیر چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتی رہی، پھر بولی۔ ''انہیں کچھ نہیں ہوگا۔ وہ...... بڑی جلدی...... اس صدمے سے سنبھل جائیں گے۔ میرا دل یہ گواہی دیتا ہے ان کو کچھ نہیں ہوگا لیکن میرے یہاں رہنے سے بہت کچھ ہو سکتا ہے میں اچھی طرح جانتی ہوں۔''

میں نے اندھیرے میں تیر چھوڑتے ہوئے کہا۔ ''زینب! بڑی بیگم نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ اب تمہارے چھپانے سے کچھ فائدہ نہیں ہے۔''

اس کے معصوم چہرے پر رنگ سا گزر گیا، بھیگی آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ اس سادہ لوح لڑکی کو آہستہ آہستہ بولنے پر مجبور کر دینا میرے لیے بہت زیادہ دشوار ثابت نہیں ہوا۔ وہ میری باتوں میں الجھ کر رہ گئی اور اس کے منہ سے بے ساختہ کچھ ایسے فقرے نکلے جنہوں نے مجھے اس پر مزید حاوی کر دیا۔ جب میں نے اپنے سیل فون پر بنایا ہوا وہ ویڈیو کلپ زینب کو دکھایا جس میں نیم بے ہوش ابراہیم کو افراتفری میں ایمبولینس میں داخل کیا جا رہا تھا...... تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

میں نے کہا۔ ''زینب! اپنی اور ابراہیم کی زندگی کو بچانا چاہتی ہو تو کچھ بھی چھپاؤ نہیں۔ ورنہ بہت نقصان ہو جائے گا اور ہم تم سے پوری ہمدردی رکھنے کے باوجود کچھ نہ کر سکیں گے۔''

''لیکن وہ کہتی ہیں۔ اندر خانے بات بہت بگڑ چکی ہے۔ عزت مآب اپنی جان لے لیں گے یا ان کی......'' آواز اس کے ہونٹوں میں ٹوٹ رہی تھی۔

میں سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ بڑی بیگم کی طرف ہے۔ یہ بات تو مجھے پہلے ہی معلوم ہو چکی تھی کہ زینب سے شادی کر کے ابراہیم نے اپنے والد ریان فردوس کو اپنے بہت خلاف کر لیا

ہے۔ اب شاید بیگم نسا نورل نے اس معاملے میں رازداری سے مداخلت کی تھی اور زینب کو اس سلسلے میں بری طرح ڈرایا دھمکایا تھا۔ بیگم نورل یوں تو ایک اصول پسند خاتون تھیں مگر لگتا تھا کہ اپنے گھر کے کسی طوفان کا رخ بدلنے کے لیے انہوں نے تھوڑی سی بے اصولی کی گنجائش نکالی ہے۔

میں نے بے آسرا اور حواس باختہ زینب کو پوری رازداری اور تعاون کا یقین دلایا اور اس نے اگلے آدھ پونے گھنٹے میں مجھے کافی کچھ بتا دیا۔ بدھ کی رات ڈی پیلس میں درونِ خانہ ایک شدید جھگڑا ہوا تھا۔ ریان فردوس کی انا اور ضد نے باپ بیٹے کو ایک دوسرے کے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔ بے شک ابراہیم کی تربیت اس کی ماں نے بہت اچھی کی تھی اور باپ جیسا بھی تھا وہ اس کے سامنے آنکھ نہیں اٹھاتا تھا مگر چونکہ ابراہیم نے ریان فردوس کی منشا کے بغیر زینب سے نکاح کیا تھا، باپ بیٹے کے درمیان ایک بڑی خلیج حائل ہو گئی تھی۔ بدھ کی رات ایک زلزلے کے ساتھ یہ خلیج وسیع و عریض ہو گئی۔ بیٹے نے پہلی بار اپنے ضدی باپ کے سامنے آنکھ اٹھائی اور زبان بھی کھولی۔ یہ حرکت اس کے لیے قیامت بن گئی۔ شراب کے نشے میں دھت ریان فردوس نے ابراہیم سے کہا کہ وہ زینب کو طلاق دے یا پھر اپنے ہاتھوں سے اپنے باپ کو گولی مار دے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو پھر وہ خود اپنے بزدل اور نافرمان بیٹے کو گولی مارے گا۔

یہ واقعہ بیگم نورل نے پوری تفصیل اور شرح کے ساتھ اسی رات زینب سے بیان کیا اور روتے ہوئے اپنی چادر زینب کے قدموں میں ڈالی کہ وہ ابراہیم کی جان بچا لے کیونکہ اپنا اور ابراہیم کی جان پر عزت مآب نے بہت بڑی قسم کھائی ہے اور اب وہ اس قسم سے پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ زینب کو زیادہ کچھ سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا گیا جو کچھ بھی ہوا، سب اسی ایک رات میں ہی ہوا۔ رات پچھلے پہر زینب نے اپنے محبوب شوہر کے نام وہ خط لکھا جو میں خود بھی پڑھ چکا تھا۔ اس تحریر کے بعد بیگم نورل نے بڑی رازداری کے ساتھ زینب کو ایک نہایت بااعتماد شخص کے سپرد کر دیا۔ اس شخص کا نام زینب کو معلوم نہیں تھا لیکن وہ جو حلیہ اور شکل وصورت بتا رہی تھی، اس کی نسبت سے پتا نہیں کیوں میرا دھیان سینئر کمانڈر افغانی کی طرف جا رہا تھا۔ درمیانی عمر کا یہ کمانڈر اس جزیرے کی لڑائی میں بے حد فعال اور موثر کردار ادا کر رہا تھا۔ رضا کاروں کے جو جتھے ڈی پیلس میں پہنچ رہے تھے، انہیں وہی کنٹرول کرتا تھا اور ان کے جوش و جذبے میں نہ صرف اضافہ کرتا تھا بلکہ اس کو درست سمت بھی دیتا تھا۔ اس کی ا[illegible] بہادری اور جنگی صلاحیت بھی بے مثل تھی۔ لیکن کیا اسی بے مثل کمانڈر نے زینب کو بیگم نورل

سے موصول کر کے خیام جیسے مکروہ شخص کے پاس پہنچا دیا تھا۔ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی مگر زینب یہی کہہ رہی تھی کہ اسی شخص نے اسے خواجہ سرا خیام تک پہنچایا۔

زینب نے روتے ہوئے بتایا۔ ''وہ ہمدرد شخص پہلے مجھے اپنے بہت بڑے گھر میں لے گیا۔ اس کی باتوں سے یہی پتا چلتا تھا کہ وہ مجھے بڑی خاموشی کے ساتھ کسی لانچ میں بٹھا کر یہاں سے نکال دینا چاہتا ہے مگر اگلے روز دوپہر کے وقت مجھے ایک بند گاڑی میں بٹھا کر سمندر کے کنارے اس گھر میں پہنچا دیا گیا۔ اس شخص نے مجھ سے کہا کہ کوئی مسئلہ ہو گیا ہے۔ یہ مسئلہ لڑائی پھیلنے کی وجہ سے ہوا ہے۔ اب ہم کچھ دن سمندر میں سفر نہیں کر سکتے۔ مجھے اسی گھر میں اس خواجہ سرا کے ساتھ رہنا ہو گا۔''

میں نے کہا۔ ''تم نے پوچھا نہیں کہ کتنے دن رہنا ہو گا؟''

زینب آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ ''میں نے پوچھا تھا مگر اس نے جھڑک کر کہا کہ شکر کرو تمہاری جان بچ رہی ہے، جب وقت آئے گا تم کو نکال بھی دیا جائے گا۔''

''وہ شخص تم سے کس زبان میں بات کرتا تھا؟''

''وہ اردو بولتا تھا۔ جیسے پہاڑی علاقے کے لوگ بولتے ہیں۔ اس کی کچھ باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔''

میرا دھیان ایک بار پھر افغانی کی طرف ہی گیا۔ میں نے پوچھا۔ ''تمہارے سامنے خواجہ سرا نے اس بندے سے بات کی؟ یا اسے کسی نام سے بلایا؟''

زینب نے نفی میں سر ہلایا اور رخساروں سے آنسو صاف کیے۔

''تم سے لباس بدلنے کے لیے اسی خواجہ سرا نے کہا تھا؟'' میں نے دریافت کیا۔ اس نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔

دونوں کمروں کے درمیانی دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ یہ انیق ہی تھا۔ میں نے تصدیق کے بعد دروازہ کھولا۔ دوسرے کمرے میں اندھیرا تھا۔ انیق نے سرگوشی میں کہا۔ ''بلیک آؤٹ کا آرڈر ہوا ہے جی۔ آپ بھی ٹیبل لیمپ بند کر دیں۔ تھوڑی روشنی دروازے کی درزوں میں محسوس ہو رہی ہے۔''

ایک ہیلی کاپٹر نیچے پرواز کرتا ہوا فراٹے سے گزر گیا۔ لگتا تھا کہ حملے کی تیاری ہو رہی ہے۔ ''وہ سیف کا کچھ پتا چلا ہے آپ کو؟'' انیق نے سرگوشی میں کہا۔

''کیوں کیا ہوا؟''

''کچھ زیادہ ہی تیز ہے۔ رضا کاروں کے ایک دستے کے ساتھ بارڈر کی طرف چلا گیا

ہے۔ کہہ رہا تھا کہ مالِ غنیمت لے کر آؤں گا اور اگر مالِ غنیمت میں کوئی اچھی سی لڑکی مل گئی تو تمہاری اس سے شادی کرادوں گا، عجب بے سرا بندہ ہے۔"

"احمق ہے۔" میں نے کہا۔ "تمہاری طرح۔"

دھماکوں کی گھن گرج بڑھ گئی تھی۔ رضا کاروں کے دستے ابھی تک نعرہ زنی کرتے ہوئے بارڈر کی طرف روانہ ہو رہے تھے۔ ان میں بہت سے نوآموز لوگ بھی تھے۔ مگر ان کا جذبہ اور جوش وخروش دیدنی تھا۔ جیسا کہ قسطینا نے بتایا تھا، لڑائی میں ان لوگوں کو گرین فورس کے عقب میں رہنا تھا اور ضرورت پڑنے پر ہی ان سے کام لیا جانا تھا۔

انیق نے دروازہ بند کر دیا۔ میں نے ٹیبل لیمپ بجھایا تو کمرے میں گہری تاریکی چھا گئی۔ مسلسل دھماکوں سے ڈری ہوئی زینب کچھ اور بھی ڈر گئی۔

"آپ نے ...... اندھیرا ...... کیوں کر دیا؟" وہ منمنائی۔

"یہ ضروری ہے۔ باہر لڑائی ہو رہی ہے۔"

بارڈر کی طرف گولا باری شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ در و دیوار مسلسل لرز رہے تھے۔ مارٹر اور بزوکا وغیرہ کے علاوہ اب قدرے بھاری توپیں بھی چلائی جا رہی تھیں۔ جو کچھ بھی تھا زینب ایک سیدھی سادی لڑکی تھی۔ وہ دوطرفہ خوف کی زد میں تھی۔ ایک تو جنگ کا خوف۔ دوسرا ایک بند اندھیرے کمرے میں ایک غیر محرم کے ساتھ موجود ہونے کا خوف۔ "پلیز، آپ لیمپ جلا دیں۔" وہ پھر منمنائی۔

میں نے لیمپ تو نہیں جلایا مگر اس کا خوف کم کرنے کے لیے انیق کو بھی اسی کمرے میں بلا لیا۔ انیق نے اسے خیام کے چنگل سے نکالا تھا اور قدرتی بات تھی کہ وہ اس پر اعتماد کرتی تھی ...... ہیلی کاپٹرز مسلسل پروازیں کر رہے تھے۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ یہ دشمن کے ہیں یا اپنے۔ پھر ایک سماعت شکن دھماکا ہوا۔ یہ دھماکا ڈی پیلس کے اندر یا آس پاس ہی کہیں ہوا تھا۔ یوں محسوس ہوا کہ چھت ہم پر آن گری ہے۔ زینب تاریکی میں چلائی اور اس نے جھپٹ کر میرا بازو تھام لیا۔ تاریکی میں اس کو کچھ نظر نہیں آیا تھا۔ اس نے وہی بازو تھام تھا جو پلاستر میں جکڑا ہوا تھا۔ درد کی لہر کو میں نے بمشکل ضبط کیا۔ پھر ایک اور دھماکا ہوا۔ اس کی شدت بھی جگر پاش تھی۔ یقیناً یہ ہوائی حملہ تھا۔ ڈی پیلس کے اندر اور اردگرد لگی ہوئی اینٹی ائیر کرافٹ گنوں نے اپنے دہانے کھول دیئے۔ ایک شورِ محشر برپا ہو گیا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ لڑائی وقتِ مقررہ سے کچھ پہلے ہی شروع ہو گئی ہے۔ بارڈر کی طرف ہونے والی دوطرفہ فائرنگ میں بھی بہت تیزی آ گئی تھی۔

یکے بعد دیگرے دو تین مزید سماعت شکن دھماکے ہوئے۔ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ یہ بم ہیلی کاپٹرز سے گرائے جا رہے ہیں یا کسی ائر کرافٹ سے۔ طیارہ شکن گنوں کی مخصوص جھٹکے دار آواز صاف پہچانی جا رہی تھی۔

ایک دو منٹ بعد زوردار دھماکوں کا سلسلہ تو بند ہو گیا مگر بارڈر پر ہونے والی لڑائی میں مزید تیزی آ گئی۔ یوں لگتا تھا کہ چپے چپے پر بارود پھٹ رہا ہے اور دونوں طرف کی فورس اپنا تمام ایمونیشن ایک دوسرے پر نچھاور کر دینا چاہتی ہے۔ ڈی پیلس کے اندر جو دھماکے ہوئے تھے، ان کے اثرات بھی ہماری سماعت تک پہنچ رہے تھے۔ بھاگ دوڑ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ فائر بریگیڈ کی گاڑی کا سائرن بھی سنائی دیا۔ شاید کسی حصے میں تھوڑی بہت آگ بھی لگی تھی۔

''باہر نکل کر دیکھوں؟'' انیق نے کہا۔

''نہیں۔ رہنے دو۔'' میں نے کہا۔

ہم محاذ سے کم و بیش چھ میل دور بیٹھے تھے لیکن جو کچھ وہاں ہو رہا تھا، اس کی ''شدت'' آوازوں کی صورت میں ہم تک پہنچ رہی تھی۔ حملہ تو یقیناً قسطینا اور گرین فورس نے ہی کیا تھا مگر دوسری طرف سے بھی بھرپور مزاحمت مل رہی تھی۔ میں تصور کی آنکھ سے دیکھ سکتا تھا کہ فرنٹ پر کیا صورتِ حال ہو گی۔ مسلسل دھماکوں کی مہلک آواز اور قاتل چمک، دھواں، آگ، زخمیوں کی پکار، مرنے والوں کے چیتھڑے، گرین فورس کے جانباز غم و غصے سے بھرے ہوئے۔ اپنی سابقہ ہزیمت کا بدلہ چکانے کے لیے سر ہتھیلیوں پر رکھے ہوئے...... قسطینا آگے بڑھ بڑھ کر اپنے جاں نثاروں کا حوصلہ بڑھاتی ہوئی اور خود بھی آگ اور بارود سے نبرد آزما...... میں نے سب کچھ تصور میں دیکھا۔

انیق نے سیل فون کے ذریعے اپنے دوست ازمیر طیب سے رابطہ کیا۔ اس نے پوچھا۔

''ازمیر! آگے کیا صورتِ حال ہے؟''

''بڑا گھمسان کا رن پڑا ہوا ہے انیق، زخمی آ رہے ہیں۔ کچھ شہادتیں بھی ہوئی ہیں۔''

ازمیر کی آواز ہنگامی صورتِ حال کے سبب کانپ رہی تھی۔

''کچھ کامیابی ہوئی؟''

''ابھی ٹھیک سے پتا نہیں چل رہا۔ بہر حال ہماری فورس حملہ کر کے کچھ اندر تو گئی ہے۔''

ازمیر نے اپنی شکستہ انگلش میں جواب دیا۔ اس کی آواز فون کے اسپیکر کے ذریعے ہم تک بھی پہنچ رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ 'ڈی پیلس' پر ہیلی کاپٹرز کے ذریعے چند من بمباری کی گئی ہے

جس سے کچھ ہلاکتیں بھی ہوئی ہیں اور اسٹور روم کی طرف آگ لگی ہے۔ تاہم اینٹی ایئر کرافٹ گنوں کی فائرنگ نے حملہ آور ہیلی کاپٹرز کو مار بھگایا۔

بات کرتے کرتے ازمیر طیب نے ذرا توقف کیا اور بولا۔ ''ایجنسی والے اب کھلم کھلا رائے زل کی مدد کر رہے ہیں۔ انہوں نے ہماری فورس پر دو طرف سے حملہ کیا ہے۔ کچھ اور زخمی ڈی پیلس میں لائے گئے ہیں۔ دو لاشیں بھی ہیں۔ ان میں کمانڈر افغانی صاحب کے ایک قریبی ساتھی اکبر بھائی کی لاش بھی ہے۔ بڑا بہادر بندہ تھا۔ پورا جسم چھلنی ہے اس کا......''

ازمیر نے مرتعش لہجے میں کہا۔ اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہو گیا۔

میں نے ڈنمارک میں اور کچھ دیگر یورپی ملکوں میں اب تک کافی دھواں دھار زندگی گزاری تھی مگر اس طرح کی جنگی صورتِ حال سے کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ مجھے یہ پتا بھی پہلی بار چل رہا تھا کہ ہیلی کاپٹرز کے ذریعے بھی بمباری کی جاتی ہے اور ایسے ہیلی کاپٹرز کو عسکری زبان میں اٹیک ہیلی کاپٹرز کہا جاتا ہے۔ بے شک ہم محاذ سے بہت پیچھے تھے پھر بھی بے پناہ سنسنی محسوس کر رہے تھے۔ میرا دھیان بار بار سجاول کی طرف بھی جا رہا تھا۔ کیا اس لڑائی کے آخر میں ہمیں اس کی طرف سے کوئی اچھی خبر مل سکتی تھی؟

ہم اس تاریک کمرے میں موجود رہے۔ انیق گاہے بگاہے سیل فون کے ذریعے خانساماں ازمیر طیب سے باہر کے حالات پوچھتا رہا۔ پتا چل رہا تھا کہ ریان فردوس کی گرین فورس کی زبردست مزاحمت ہو رہی ہے بلکہ اپنے بے پناہ جوش و خروش کے باوجود انہیں ایک دو جگہوں پر کچھ پیچھے بھی ہٹنا پڑا ہے۔ پھر ایسی خبریں آئیں کہ گرین فورس کے علاوہ رضا کار دستوں سے بھی اکادکا زخمی اور جاں بحق ہونے والے قریبی اسپتالوں میں پہنچ رہے ہیں مجھے کبڈی شاہ سیف کی طرف سے بھی فکر تھی۔ وہ یونہی منہ اٹھا کر رضا کاروں کے ساتھ چل پڑا تھا۔

انیق نے کہا۔ ''شاہ زیب بھائی! آپ کو کچھ محسوس ہو رہا ہے؟......لگتا ہے کہ لڑائی اب نیوسٹی کے قبضے والے علاقے میں نہیں ہو رہی۔''

''ہاں......لگتا تو کچھ ایسے ہی ہے۔ فائرنگ کی آوازیں اب نسبتاً قریب سے آ رہی ہیں۔''

''اس کا کیا مطلب ہوا؟ رائے زل کی گرے فورس آگے آ گئی ہے؟'' اس کے لہجے میں تشویش کی لہر تھی۔

''ابھی یقین سے کیا کہا جا سکتا ہے لیکن یہ بات تو ہے کہ امریکن ایجنسی کے لوگ رائے

زل کی بھرپور مدد کر رہے ہیں۔"

ایک بار پھر اینٹی ائر کرافٹ گنز کی خوفناک آوازیں سنائی دیں۔ ڈی پیلس کے اردگرد چند زوردار دھماکے ہوئے۔ زینب اس تاریک کمرے میں ایک سہمی ہوئی روح تھی جو گاہے لگاہے میرے بازو کو اپنی لرزاں گرفت میں لے لیتی تھی۔ کسی وقت وہ منہ میں کچھ پڑھنے بھی لگتی تھی۔ پتا نہیں کس جذبے کے تحت میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور نرم سرگوشی میں کہا۔ "گھبراؤ نہیں زینب، جب تک ہم ہیں تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔"

سیل فون کے ذریعے جو اطلاعات ہم تک پہنچ رہی تھیں، وہ کچھ حوصلہ افزا نہیں تھیں پھر ان اطلاعات نے تشویشناک رنگ اختیار کر لیا۔ پتا چلا کہ گرین فورس پسپا ہو رہی ہے اور ایک دو جگہ اس کا بھاری جانی نقصان ہوا ہے۔ پھر خبر آئی کہ دو مقام پر رائے زل کی فورس اور ایجنسی کے الائنس کو کامیابی ملی ہے اور وہ آگے بڑھ آئے ہیں۔ ایک خبر کافی لرزہ خیز تھی۔ ازمیر طیب نے رندھی ہوئی آواز میں فون پر انیق کو اطلاع دی۔ "کہا جا رہا ہے کہ کمانڈر افغانی صاحب شہید ہو گئے ہیں...... ہماری فورس کچھ پیچھے ہٹ کر اپنی دوسری دفاعی لائن پر آ گئی ہے۔"

"مطلب یہ کہ...... پسپائی ہو رہی ہے؟" انیق نے پوچھا۔

ازمیر طیب نے دانت پیس کر کہا۔ "یہ حرامی ایجنسی والے غدار ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو بہادروں کی پیٹھ میں چھرا گھونپتے ہیں...... ہمیشہ گھونپتے ہیں۔"

اب اس امر میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ پوری تیاری اور جذبے سے جوابی حملہ کرنے کے باوجود گرین فورس کو شکست ہوئی تھی اور اب گھمسان کی جنگ میں وہ پیچھے ہٹ رہی تھی۔ پتا نہیں کہ اس کا نتیجہ کیا نکلنا تھا۔ مجھے شروع سے یہ اندیشہ تھا کہ عزت مآب کے لیے امریکنوں سے جیتنا آسان نہیں ہو گا۔

اسی دوران میں میرے والے کمرے کے دروازے پر دستک ہونے لگی۔ میں دونوں کمروں کے درمیانی دروازے سے گزر کر اپنے والے کمرے میں آیا اور دروازہ کھولا۔ سامنے دھواں دھار چہرے کے ساتھ حلمی کا ایک اسسٹنٹ کھڑا تھا۔ اس نے کہا۔ "جناب آپ کے لیے حلمی صاحب کی طرف سے ایک انسٹرکشن ہے۔"

"کیا؟"

"وہ کہہ رہے ہیں کہ لڑائی کی صورتِ حال غیر یقینی ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو انیکسی چھوڑ دیں اور ڈی پیلس کے اندرونی حصے میں آ جائیں۔ وہ خود بھی اب ڈی پیلس میں

آ گئے ہیں۔ڈی پیلس کا اندرونی حصہ ہرطرح سے محفوظ ہے۔''

یہ گڑبڑ والا معاملہ تھا۔ ہمارے ساتھ یہاں زینب موجود تھی (اور اس کی ''تجہیز و تکفین'' دو دن پہلے ہو چکی تھی) ہم اسے یہاں چھوڑ کر تو نہیں جا سکتے تھے۔ میں نے پیغام رساں سے کہا۔ ''اطلاع کا شکریہ۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ابھی ہمیں یہیں رہنا چاہیے۔ اگر کوئی سنگینی محسوس ہوئی تو ہم ہدایت پر عمل کریں گے۔''

وہ جز بز سا واپس چلا گیا۔ میں نے دروازہ بند کر دیا۔ کھڑکی کا پردہ سرکا کر مشرقی جانب دیکھا۔ ڈی پیلس کے ایک حصے میں ابھی تک شعلے تھے اور دھواں اٹھ رہا تھا۔ افراتفری سی دکھائی دے رہی تھی۔ گھپ اندھیرے کے پس منظر میں افق پر دھماکوں کے ساتھ روشنی کے زبردست جھماکے ہو رہے تھے۔

میں زینب والے کمرے میں واپس آیا۔ سنگین صورتِ حال کے باوجود انیق کی حسِ مزاح برقرار تھی۔ مغموم لہجے میں بولا۔ ''کیا اچھا ہوتا، اگر افغانی جیسے بہادر کے بجائے آقا جان کے مرحوم ہونے کی خبر آ جاتی...... یا پھر کم از کم......'' وہ رک گیا۔

''کیا کم از کم؟'' میں نے پوچھا۔

''یا پھر کم از کم سجاول صاحب کے بارے میں ہی ''تصدیق'' ہو جاتی۔''

تصدیق کا لفظ اس نے ''وفات'' کے معنوں میں استعمال کیا تھا۔ میں اس کا لب ولہجہ اب اچھی طرح سمجھنے لگا تھا۔

''کچھ شرم کرو۔'' میں نے غصیلی سرگوشی کی۔ ''یہاں بارود برس رہا ہے اور تمہیں مذاق سوجھ رہے ہیں۔''

''مم...... مذاق نہیں بھائی۔'' وہ مجھ سے ذرا دور کھسک کر بولا۔ ''وہ کہتے ہیں نا جی کہ جو مر جاتے ہیں ان کے لیے چین آ جاتا ہے لیکن جو بچھڑ جاتے ہیں، ان کا دکھ بڑا گہرا ہوتا ہے۔ رات دن سجاول صاحب کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔ وہ بہادر تھے، مجھے یقین ہے کہ وہ آٹھ دس بندوں کو مار کر ہی مرے ہوں گے۔ اللہ ان کے درجے بلند کرے۔'' اس نے ایک طویل ٹھنڈی سانس لی۔

میں نے کہا۔ ''وہ واپس آ گیا اور اسے تمہارے خیالات کا پتا چل گیا تو تمہارے ''درجوں'' میں بھی کافی ردوبدل کرے گا۔''

اب دن کا ہلکا ہلکا اجالا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ زینب بدستور میرا بازو پکڑے بیٹھی تھی۔ بالکل ایک سہمی ہوئی چڑیا تھی وہ...... در و دیوار مسلسل بارودی دھماکوں سے گونج رہے تھے۔

باہر ایمبولینسز کے سائرن چنگھاڑ رہے تھے اور گاہے بگاہے ہیلی کاپٹرز یا چاپرز کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹیں سنائی دیتی تھیں۔ مجھے یہ دھڑ کا لگا ہوا تھا کہ اگر حلمی نے دوبارہ سختی سے آرڈر کیا یا خود ہی یہاں آ گیا تو کیا ہوگا۔ ہمیں اُس کے ساتھ جانا پڑے گا اور زینب یہاں اکیلی رہ جائے گی۔

اچانک یوں محسوس ہوا کہ توپوں کی گھن گرج کم ہو گئی ہے۔ اگلے پانچ دس منٹ میں دھماکوں میں نمایاں کمی واقع ہوئی۔ چھوٹے ہتھیاروں کی فائرنگ میں بھی اب وہ پہلے جیسی شدت نہیں تھی یا تو یہ مختصر وقفہ تھا یا لڑائی عارضی طور پر رک گئی تھی۔ کمرے میں بھی ہلکا سا اجالا ہو گیا تھا۔ اجالا ہونے کے بعد زینب نے میرا بازو چھوڑ دیا تھا۔ اس کے بال پریشان تھے جنہیں وہ بار بار اپنی اوڑھنی میں سمیٹنے کی کوشش کرتی تھی۔ چھوٹی سی ناک مسلسل رونے سے سرخ ہو رہی تھی۔ اس کے کومل ہاتھوں پر ابھی تک سہاگ کی مہندی کا پھیکا سا رنگ موجود تھا۔ اس رنگ نے دل پر ٹھیس لگائی۔

میں نے کہا۔ ''انیق! میں باہر کا چکر لگا کر آتا ہوں۔''

وہ خود جانا چاہتا تھا لیکن چونکہ میں نے پہلے کہہ دیا تھا، اس لیے اسے خاموش رہنا پڑا۔ میں نے اپنے کمرے میں جا کر پہلے پین کلر اور اینٹی بائیوٹک کھائی، اس کے بعد اپنے ''آپریشن شدہ'' بازو کو دائیں ہاتھ سے سہارا دیتا ہوا باہر نکل آیا۔ دروازہ میں نے مقفل کر دیا تھا۔ احاطے میں پہنچا تو نقشہ بدلا ہوا نظر آیا۔ ہر چہرہ ستا ہوا تھا۔ کچھ رضا کار دستے واپس آ رہے تھے اور ان کے چہروں پر ''شکست'' لکھی ہوئی تھی۔ بہت سے ایسے تھے جن کے جسموں پر چھوٹے موٹے زخم بھی دکھائی دے رہے تھے۔ وہ بکھرے بکھرے سے تھے۔ چند گھنٹوں پہلے والے جوش و خروش کا کہیں نشان نہیں تھا۔ کچھ ایسے بھی تھے جو امریکنوں کی شان میں گالیاں بک رہے تھے۔ کچھ کی آنکھوں میں بے بسی کے آنسو تھے۔

ایک شخص ایک اونچی جگہ پر کھڑا ہو گیا اور ملائی میں غصے بھری تقریر کرنے لگا۔ اس کی تقریر میں بار بار عزت مآب کا نام بھی آ رہا تھا۔ وہ غالباً عزت مآب اور ان کی فیملی پر غفلت اور سُست روی کے الزامات دھر رہا تھا۔ ایک طرف سے ایک باقاعدہ فوجی نمودار ہوا اور اس نے تقریر کرنے والے کی پٹائی شروع کر دی۔ کچھ دیگر سپاہی بھی اس فوجی افسر کی مدد کو پہنچ گئے اور تقریر کرنے والے کو اٹھا کر وہاں سے دور لے گئے۔ میں سیف کو ڈھونڈ رہا تھا، اچانک میری نظر حلمی اور آقا جان کے مشترکہ اسسٹنٹ کیپٹن حارذ پر پڑ گئی۔ وہ انگلش روانی سے بولتا تھا۔

میں نے اس کو جا پکڑا۔ ''کیا ہوا کیپٹن حارز؟''
اس نے جبڑے بھینچے اور ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ''کامیابی نہیں ہوئی...... کافی جانی نقصان بھی ہوا ہے۔ ہمارے اسپتال اور کلینک زخمیوں سے بھر گئے ہیں، جاں بحق ہونے والوں کی تعداد بھی کافی ہے۔''
''اب لڑائی رک گئی ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''ہاں جی۔'' وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''رائے زل اور ایجنسی کے لوگ مزید آگے آ گئے ہیں۔ ٹیلوں تک پہنچ گئے ہیں۔ یہاں ہماری فورس اونچائی پر ہے اور انہوں نے ان کی پیش قدمی روک دی ہے۔ کم از کم وقتی طور پر تو روک دی ہے۔''
''تمہارے کہنے کا مطلب ہے کیپٹن کہ مزید علاقہ گرے فورس کے قبضے میں چلا گیا ہے؟''
''ہاں...... کافی زیادہ۔ ایجنسی نے جدید ترین ہتھیار استعمال کیے ہیں۔ ہماری کوئی پیش نہیں چلنے دی لیکن...... ان ساری بری خبروں کے درمیان ایک چھوٹی سی اچھی خبر بھی ہے۔ پہلے یہ اطلاع آئی تھی کہ کمانڈر افغانی لڑائی میں مارے گئے ہیں لیکن اب پتا چلا ہے کہ وہ صرف زخمی ہوئے تھے۔ اسپتال میں مرہم پٹی کے بعد وہ پھر بارڈر پر موجود ہیں۔ وہ جس جاں فشانی کے ساتھ اس لڑائی میں حصہ لے رہے ہیں، وہ بے مثال ہے۔''
اسی دوران میں میری نظر سیف پر پڑ گئی۔ ہجوم میں مجھے اس کی جھلک نظر آئی تھی۔ میں اس کی طرف لپکا۔ ''میں آپ ہی کو ڈھونڈ رہا تھا۔'' وہ مجھے دیکھ کر بولا۔
''اونٹ کی طرح منہ اٹھا کر کدھر چلے گئے تھے تم؟ کیا کارہائے نمایاں انجام دے کر آئے ہو؟'' میں نے خشک لہجے میں پوچھا۔
وہ بولا۔ ''اس کی تو نوبت ہی نہیں آئی جی۔ ہم تو ابھی پچھلے مورچوں میں تھے۔ اگلے مورچوں والوں نے پیچھے ہٹنا شروع کر دیا۔ پھر ایک دم ایک ریکا فوجی ہمارے پاس آیا۔ وہ زخمی بھی تھا۔ اس نے بتایا کہ ہمیں دائیں اور بائیں طرف سے گھیرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ہم فوراً اس گھیرے سے نکلیں اور ٹیلوں تک پیچھے ہٹ جائیں۔ ہم افراتفری میں وہاں سے نکلے...... بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ بھاگے۔ اس دوران میں جانی نقصان بھی ہوا۔''
سیف بھی اکثر رضا کاروں کی طرح عام لباس میں تھا۔ ہاں اسے ایک گرین کیپ دے دی گئی تھی۔ اس کے پاس ایک سیون ایم ایم رائفل اور اس کے فالتو راؤنڈ بھی موجود تھے۔ ان میں سے کچھ راؤنڈ وہ راستے میں بھاگتے ہوئے گرا آیا تھا۔ اس نے بھی لڑائی کے

حوالے سے تقریباً وہی باتیں بتائیں جو تھوڑی دیر پہلے کیپٹن حارذ بتا چکا تھا۔ آخر میں وہ بولا۔ "یہ پہلا تجربہ کچھ اچھا نہیں ہوا لیکن ہو سکتا ہے کہ اگلے تجربے اچھے ہوں۔ دراصل میں بھاگنے والا نہیں پکڑنے والا بندہ ہوں اور یہاں سین ہی بھاگنے والا تھا۔" وہ کبڈی کے حوالے سے بات کر رہا تھا۔

میں قسطینا کی خیر خیریت کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ آخر وہ بھی نظر آ گئی لیکن احاطے میں نہیں، اوپر بالکونی نما جھروکے میں۔ یہ وہی جھروکا تھا جہاں سے چند دن پہلے بھی اس نے سپاہیوں اور رضا کاروں سے خطاب کیا تھا۔ وہ اپنے افسران اور کمان داروں کے ساتھ اچانک ہی جھروکے میں نمودار ہوئی تھی۔ سورج کی روپہلی کرنیں سیدھی جھروکے میں پڑ رہی تھیں اور ہر منظر واضح تھا۔ قسطینا یونیفارم میں تھی۔ بلٹ پروف جیکٹ بھی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے چہرے پر جنگ کا دھواں اور گرد تھی لیکن حوصلہ اب بھی پست نہیں تھا۔ اسے جھروکے میں دیکھتے ہی بکھرے ہوئے لوگ یوں جھروکے کے نیچے جمع ہوئے جیسے ایک طاقتور مقناطیس نے لوہ چون کو اپنی طرف کھینچ لیا ہو۔ لوگوں نے اسے دیکھ کر بلند نعرے لگائے۔ وہ وقتی طور پر اپنے زخموں اور شکست خوردگی کو بھول گئے اور شاید قسطینا چاہتی بھی یہی تھی۔ لوگ جوق در جوق جھروکے کی طرف لپکے چلے آ رہے تھے۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے جو اسی پیلس کے اندرونی حصوں سے برآمد ہوئے تھے۔ انیق بھی انیکسی سے نکلا تھا اور میرے پاس میں آن کھڑا ہوا تھا۔

قسطینا نے ایک پُر جوش تقریر کی۔ آقا جان اور حلمی صاف ستھرے کپڑوں میں قسطینا کے پیچھے کھڑے تھے۔ یقیناً آقا جان ان لوگوں میں سے تھا جو خود نہیں لڑتے بلکہ دوسروں کو لڑاتے ہیں۔ حسبِ توقع قسطینا نے ایک پُر جوش تقریر کی۔ یہ تقریر ملائی میں تھی اور اس کے کچھ الفاظ ہی میری سمجھ میں آ رہے تھے۔ بہر حال پتا چلتا تھا کہ وہ اس وقتی شکست کو خاطر میں نہیں لا رہی تھی...... ساتھیوں سے کہہ رہی تھی کہ وہ اپنی صفوں میں اتحاد برقرار رکھیں۔ ہم اپنے علاقے کے ایک ایک انچ کا دفاع کریں گے۔

سپاہیوں اور رضا کاروں میں ایک بار پھر جوش کی لہریں دکھائی دینے لگیں، تاہم ان کے دلوں میں وہ پہلے جیسی اٹھان نہیں تھی۔ یہ بھی سننے میں آ رہا تھا کہ گھمسان کی لڑائی میں کم و بیش چار سو افراد جان سے گئے ہیں جن میں گرین فورس کے کئی اہم کمانڈر بھی ہیں۔ میں انیق کے ہمراہ واپس انیکسی میں پہنچا۔ انیق تو راز داری کے ساتھ فوراً زینب کے پاس چلا گیا۔ میں اور ہف باتیں کرتے رہے۔ وہ مجھے استاد جی کہہ کر بلا رہا تھا اور بار بار ٹوکنے پر بھی باز نہیں

آتا تھا کہنے لگا۔ ''استاد جی، لگتا ہے کہ کل کا دن ہی چنگا نہیں تھا اور اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں نے دن کی شروعات لسی سے نہیں کی تھی۔ لسی نہ پیوں تو لگتا ہے کہ کوئی بہت بڑا گناہ ہوا ہے جس کا وبال رات تک سر سے نہیں اترے گا۔''

میں نے کہا۔ ''یہ گناہ تو تمہیں آج پھر کرنا ہوگا کیونکہ میں نے یہاں کہیں لسی دیکھی نہیں ہے۔''

''پر میں نے دیکھ لی ہے جی بلکہ پیڑوں والی۔ کل ایک سردار جی سے ملاقات ہوگئی تھی۔ ان کے مسئلے مسائل بھی وہی ہیں جو میرے ہیں۔ لسی، مکھن، دیسی گھی کا پراٹھا، دیسی ککڑ اور دودھ جلیبی وغیرہ۔ سب کچھ ملے گا یہاں۔'' اس کے چہرے پر چمک تھی۔

وہ سارا دن الجھن اور پریشانی میں ہی گزرا۔ محاذ پر مکمل خاموشی تھی۔ ڈی پیلس میں اور ڈی پیلس سے باہر مختلف جگہوں پر، مرنے والے افسروں اور جوانوں کی آخری رسومات ادا ہورہی تھیں۔ زخمیوں کے لیے خون کے عطیات کی اپیل کی جارہی تھی۔ یہ اپیل جاما جی کے اپنے دو ٹی وی چینلز پر بھی ہورہی تھی۔ ایک سوگ کی سی کیفیت تھی۔ سجاول کے بارے میں تاحال کوئی خبر نہیں تھی اور یہ میرے لیے بڑی پریشانی کی بات تھی۔ پرسوں قسطینا نے مجھے تسلی دی تھی کہ اگلے چند گھنٹوں میں جاما جی کے انفارمر (مخبر) سجاول کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلوم کرلیں گے مگر ابھی تک کوئی پیش رفت نہیں تھی۔ دوسری طرف چھوٹے صاحب ابراہیم کے بارے میں بھی کوئی اچھی اطلاعات نہیں تھیں۔ وہ اسپتال سے ڈی پیلس واپس تو آگیا تھا مگر اس کی حالت دگرگوں تھی۔ اس نے زینب کی ''موت'' کا بہت گہرا صدمہ لیا تھا۔ وہ دواؤں کے زیر اثر اب بھی نیم بے ہوشی کی کیفیت میں تھا۔

جیسا کہ میں نے بتایا ہے قسطینا سے اپنی آخری ملاقات میں، میں اس کے کمرے میں اپنی ایک اہم چیز چھوڑ آیا تھا۔ اب اس چیز سے رزلٹ لینے کا وقت تھا۔ یہ وہی جدید ترین اسپائی کیمرا تھا جس کا سائز چنے کی دال کے دانے سے زیادہ نہیں تھا۔ یہ پن ہول کیمرا قسطینا کے اسی ''ریٹائرنگ روم'' میں تھا جہاں اس نے کل رات دس بجے کے لگ بھگ میرے ساتھ ڈنر کیا تھا۔ میں نے کیمرا بڑی صفائی سے ایک ''ڈیکوریشن پیس'' کے ساتھ چپکا دیا تھا......اور وہ ہم رنگ ہونے کی وجہ سے بالکل ''کیموفلاج'' ہوگیا تھا۔ اس کیمرے کا وائرلیس لنک میرے سیل فون کے ویڈیو سسٹم کے ساتھ تھا۔

رات کو میں نے کمرے میں بند ہوکر اس لنک کو آن کیا تو سگنلز میری توقع کے عین مطابق صاف اور واضح تھے۔ جو منظر نظر آیا، اس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ کیمرا قسطینا کو سائیڈ

سے دکھا رہا تھا اور وہ جو صبح کے وقت جھروکے میں باحوصلہ اور پُرعزم نظر آتی تھی، اس وقت تنہائی میں پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ لگتا تھا کہ اندر سے بالکل ٹوٹی ہوئی ہے پھر ایک اور مقامی لڑکی فریم میں دکھائی دی۔ متوازن، مضبوط جسم اور ذہانت بھری آنکھوں والی یہ لڑکی ایک دو دفعہ پہلے بھی قسطینا کے ساتھ دکھائی دی تھی۔ اس کی حیثیت قسطینا کی سہیلی جیسی تھی۔ اس کی آنکھیں بھی نم دکھائی دیں۔ اس نے کہا۔ ''قسطینا پلیز! ایک بار پھر سوچ لو، مجھے تو اس میں...... ضرورت سے زیادہ...... رسک لگ رہا ہے۔''

''نہیں ماریہ، جتنا سوچنا تھا، سوچ لیا ہے۔ مجھے اس کے سوا اور کوئی راستہ نظر نہیں آتا.. میں اس طرح بچ بھی گئی تو یہ زندگی میرے لیے بیکار ہو گی۔ میں نہیں جی سکوں گی اس طرح......''

اس نے ایک طرف سے ایک فریم شدہ تصویر اٹھائی۔ تصویر ٹھیک سے دکھائی نہیں دی لیکن میں نے یہ پہلے بھی دیکھی ہوئی تھی۔ میں جان گیا کہ یہ قسطینا کے والد مرحوم ''آدم'' کی تصویر ہے۔ اس نے بڑے جذباتی انداز میں تصویر کو چوما اور رخسار سے لگاتے ہوئے بولی۔

''تمہیں معلوم نہیں ماریہ! پاپا کی صورت ہر وقت میری نگاہوں میں گھومتی ہے، وہ شام جب وہ لڑائی پر روانہ ہو رہے تھے...... وہ انداز جس میں انہوں نے مجھے الوداع کہا۔ انہوں نے کہا...... میرے بچے! یہ لڑائی ہم پر مسلط کی گئی ہے۔ ہم دفاع نہ کریں گے تو ہماری نسلیں ہم کو معاف نہیں کریں گی۔ میں واپس نہ آیا تو میرے بعد تم لوگ یہ لڑائی جاری رکھنا۔ رائے زل اور ایگسی کے گٹھ جوڑ کے سامنے ہتھیار نہ ڈالنا۔ وہ اب بھی مجھ سے پوچھتے ہیں، میرا خون رائیگاں تو نہیں گیا قسطینا؟''

ماریہ بولی۔ ''ان کا خوں رائیگاں نہیں جائے گا۔ ہمارے کسی شہید کا نہیں جائے گا، یہ وقتی پسپائی ہے قسطینا، ہم ضرور سرخرو ہوں گے۔'' ماریہ شستہ انگلش میں بولی۔

''سرخرو تب ہی ہوں گے جب کچھ کریں گے اور میں ضرور کروں گی ڈاکٹر ماریہ، میں فیصلہ کر چکی ہوں۔ میں اپنے پاپا کے قاتل کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔''

''یہ بہت خطرناک ہے قسطینا! دشمن کے علاقے میں گھسنا آسان نہیں ہے۔ ہر جگہ سیکیورٹی ہائی الرٹ ہے، جب تم پہلی بار گئی تھیں، اس وقت بات اور تھی اب یہ سراسر خودکشی ہے اور تم سوچو...... اگر تم کامیاب ہو بھی گئیں...... تم نے چیف گیرٹ کو مار بھی دیا تو اس سے کیا ہو گا؟ وہ لوگ ہار تو نہیں مان جائیں گے، کوئی اور اس خبیث کی جگہ سنبھال لے گا۔ ہو سکتا ہے کہ پھر وہ زیادہ شدت اور جوش سے حملہ کریں۔''

''نہیں ماریہ، میں جانتی ہوں وہ چیف گیرٹ پر بہت انحصار کرتے ہیں، ان کی کمر ٹوٹ جائے گی اور پھر سب سے بڑی کامیابی، میرے لیے یہ احساس ہوگا کہ میرے پاپا کا قاتل زمین پر دندناتا نہیں رہا۔''

''جو کچھ بھی ہے قسطینا، میں آپ کو......''

''پلیز شٹ اپ...... پلیز۔'' قسطینا نے نہایت درشتی سے اپنی دوست کی بات کاٹی۔

''میں نے کہا ہے نا، میں فیصلہ کر چکی ہوں...... جو کچھ میں نے کہا تھا، وہ لے آئی ہو؟''

ماریہ نے ایک بار پھر کچھ کہنا چاہا مگر قسطینا نے زیادہ سختی سے اسے جھڑک دیا...... ماریہ دکھی انداز میں باہر گئی اور کچھ چیزیں لا کر ایک گوشے میں رکھ دیں۔ میرا اسپائی کیمرا اس گوشے کا احاطہ نہیں کر رہا تھا۔ مجھے یہی لگا جیسے کچھ کپڑے ہیں اور گتے کا ڈبا سا ہے۔

کیمرے کی کارکردگی میری توقع سے بڑھ کر تھی۔ کمرے میں لائٹ بھی بڑی مناسب تھی۔ دو تہائی کمرا، فریم کا حصہ تھا۔ آڈیو بھی مناسب تھی۔ میں سیل فون کی 5 ضرب 3 اسکرین پر سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ قسطینا نے کمرے کو اندر سے مقفل کرنے کے بعد ایک دو منٹ تک خود کو کمپوز کیا...... پھر ایک گہری سانس لے کر ان اشیا کی طرف متوجہ ہوگئی جو ماریہ لائی تھی۔

جو پہلا منظر میں نے دیکھا، وہی چونکا دینے والا تھا۔ قسطینا ے جو چیز اٹھائی وہ سیاہ گھونگریالے بالوں والی ایک نفیس سی وگ تھی۔ اس نے وگ کو اپنے بوائے کٹ بالوں کے اوپر رکھ کر دیکھا۔ گھونگریالے بال اس کے شانوں تک پہنچ گئے۔ پورا حلیہ ہی تبدیل دکھائی دیا۔ اس نے وگ ایک طرف رکھ دی۔

اگلا منظر مزید سنسنی خیز تھا۔ اس نے خود کو مکمل بے لباس کر دیا۔ دودھیا ٹیوب لائٹ میں ایک برق سی کوندرہی تھی۔ اس نے لچک دار اسٹریپ کے ذریعے اپنی ٹانگ کے ساتھ ایک سائیلنسر لگا کولٹ پسٹل باندھا۔ پھر اپنی کمر کے ساتھ ایک اور لچک دار بیلٹ کلپ کی۔ اس بیلٹ میں موجود چیز کو دیکھ کر میں لرز گیا۔ یقیناً یہ ایک دھماکا خیز ڈیوائس تھا اور ایک چھوٹی سی ڈوری کھینچنے کے ذریعے پھٹ سکتا تھا۔ اس کے بعد قسطینا نے اتاری ہوئی گرین یونیفارم کے بجائے ایک اور لباس پہننا شروع کر دیا۔ ایسا کرتے ہوئے وہ کیمرے کے فریم سے نکل گئی تھی۔ اسے دوبارہ دیکھنے کے لیے مجھے دو چار منٹ انتظار کرنا پڑا۔ وہ واپس کیمرے کے سامنے آئی تو ایک دم ناقابلِ شناخت لگ رہی تھی۔ وہ جزیرے کے مقامی لباس میں تھی۔ ایک اسکرٹ نما لمبا چغہ، سر پر اسکارف نما رومال، جس کو بوقتِ ضرورت نقاب کے طور پر بھی استعمال کیا جا سکتا تھا۔ مجھے ٹھیک سے نظر تو نہیں آ رہا تھا مگر شک ہو رہا تھا کہ اس نے آئی لینز ز

بھی لگائے ہیں جنہوں نے اس کی بادامی آنکھوں کو گہرا سیاہ شیڈ دے دیا ہے۔

اسی دوران میں اس نے وہ ڈبا اٹھایا جس میں اس کی ساتھی ماریہ کچھ لے کر آئی تھی۔ مجھے کیمرے کی آنکھ نے جو کچھ دکھایا، وہ ناکافی تھا۔ بہرحال یوں لگا کہ ڈبے میں چھوٹے چھوٹے پھول بھرے ہوئے ہیں۔

قسطینا نے ڈبا دوبارہ اس کی جگہ پر رکھ دیا اور آئینے میں اپنا سراپا دیکھنے لگی۔ اس نے پھول دار رومال کو نقاب کی شکل دی تو اس کا نصف سے زائد چہرہ ڈھک گیا۔ اسی دوران میں اس کے سیل فون پر سگنل آئے۔ اس نے کال ریسیو کی۔ دو تین رسمی فقروں کے بعد ہی اندازہ ہو گیا کہ دوسری طرف آقا جان ہے۔

وہ یقیناً اس سے پوچھ رہا تھا کہ اس نے کیا فیصلہ کیا ہے۔ قسطینا نے نمناک آنکھوں کے ساتھ بتایا کہ اس کا فیصلہ حتمی ہے۔

آقا جان کی آواز تو مجھ تک نہیں پہنچ رہی تھی مگر گفتگو کے انداز سے پتا چلتا تھا کہ آقا جان اسے اس خطرناک کارروائی سے باز رکھنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن اس کوشش میں کوئی جان نہیں تھی اور لگتا تھا کہ وہ صرف رسمی کارروائی کر رہا ہے۔ آخر اس نے قسطینا سے پروگرام کے بارے میں پوچھا جس کے جواب میں قسطینا نے کہا۔ ''انکل! میں اسی طرح جاؤں گی جیسے پہلے گئی تھی اور رائے زل کے ساتھ گیرٹ کی ویڈیو بنائی تھی۔ میرے پاس ڈینی فلاور ہیں اور آپ کو پتا ہی ہے کہ ایجنسی کے افسروں میں ان کی کتنی مانگ ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ مجھے گیرٹ کے قریب پہنچنے میں کوئی دشواری ہوگی۔''

دوسری طرف سے کچھ کہا گیا۔ جواب میں قسطینا بولی۔ ''آپ بالکل فکر نہ کریں انکل..... اور میں جو کچھ کر رہی ہوں اپنی مرضی سے کر رہی ہوں۔ مجھے پوری امید ہے کہ میں آپ سب کو بہت اچھی اور بہت بڑی خبر دوں گی۔ آپ بس اتنا کریں کہ ''مقبوضہ علاقے'' میں اپنے تینوں انفارمرز کو پوری طرح الرٹ کر دیں۔ خاص طور سے اسے جس کا نام آپ نے بن مشہد بتایا تھا۔ اس نے شفا اسپتال سے نکلنے میں بھی ہمارا بہت ساتھ دیا تھا۔''

آقا جان نے کوئی اور بات کہی جس کے جواب میں قسطینا بولی۔ ''وہی را کی گھاٹ والی جگہ سے انکل۔ قدرتی دراڑ ہے جو آگے جا کر سرنگ کی شکل اختیار کر لیتی ہے یہ سب میرے لیے بہت آسان ہے، میں پہلے بھی اس کا تجربہ کر چکی ہوں، اب مزید ہوم ورک بھی کر لیا ہے۔ آپ اس بارے میں بےفکر رہیں۔''

اس گفتگو کے دوران میں قسطینا میرے اسپائی کیمرے میں نظر نہیں آ رہی تھی اور آڈیو

بھی زیادہ کلیئر نہیں تھی مگر ماجرا تقریباً سارا سمجھ میں آ رہا تھا۔ قسطینا کی اس کیفیت کو شاید جوش و خروش تو نہیں کہا جا سکتا تھا۔ وہ شدید ڈپریشن میں تھی اور اسی ڈپریشن میں کوئی ایسا کام کرنے جا رہی تھی جو بہت خطرناک تھا۔

یہ بھی پتا چل رہا تھا کہ چند دن پہلے اس نے عزت مآب اور دیگر اعلیٰ فوجی اور سول افسران کے سامنے جو ویڈیو دکھائی تھی اور جس نے ایجنسی کے چہرے سے نقاب نوچا تھا وہ خود قسطینا نے ہی بنائی تھی۔ وہ بھیس بدل کر رائے زل کے علاقے میں گھسی تھی اور یہ اہم ترین ثبوت حاصل کیے تھے۔ اب وہ اسی انداز میں پھر گھسنا چاہ رہی تھی مگر تب کے گھسنے اور اب کے گھسے میں بہت فرق تھا۔ اب باقاعدہ لڑائی ہو رہی تھی اور دونوں طرف ریڈ الرٹ تھا۔

وہ آقا جان سے کہہ رہی تھی۔ ''انکل! آپ نے ہر صورت رازداری برقرار رکھنی ہے۔ اگر...... اگر...... مجھے کچھ ہو بھی جائے...... تو بھی کوشش یہی ہونی چاہیے کہ خبر سامنے نہ آئے۔ آپ جانتے ہی ہیں...... ہم اس وقت حالتِ جنگ میں ہیں......''

دوسری طرف سے غالباً آقا جان نے ایک بار پھر حجت پوری کرنے کے لیے قسطینا کو نتائج و عواقب سے آگاہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ یہ رسمی کارروائی ہے۔ پنجابی میں ایسے موقعوں کے لیے پہلوان حشمت نے ایک محاورہ استعمال کیا تھا۔ اس نے کہا تھا ایسی خانہ پُری کی باتوں کو ''گونگلوؤں سے مٹی جھاڑنا'' کہا جاتا ہے۔ سو یہاں بھی گونگلو جھاڑے جا رہے تھے۔

کچھ دیر بعد کمرا تاریک ہو گیا۔ قسطینا شاید کسی دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔ میرے سینے میں آگ سی لگ گئی تھی۔ قسطینا کی حیثیت سپریم کمانڈر کی سی تھی...... وہ ناموافق حالات کو دیکھ کر شاید جذباتیت کا شکار ہو گئی تھی۔ ایک ایسا کام کرنا چاہ رہی تھی جو اسے نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اگر اسے کچھ ہو جاتا تو گرین فورس کا مورال کنویں میں جا گرتا۔ قسطینا کے بعد کمانڈر افغانی کا نمبر آتا تھا اور مجھے پتا چلا تھا کہ وہ بھی زخمی ہے۔

میں نے موبائل بند کرنے کے بعد فوراً انیق کو اپنے کمرے میں بلایا۔ میں نے کہا۔

''انیق! ایک بری خبر ہے۔''

''اناللہ......'' اس نے فوراً کہا اور مسمسی صورت بنا کر بولا۔ ''کہاں سے ملی ہے مرحوم کی ڈیڈ باڈی......؟''

''انیق! میں واقعی تھپڑ مار دوں گا۔ یہ ایک بہت سیریس معاملہ ہے۔'' میں نے بھڑک کر کہا۔

میرے تیور دیکھ کر وہ سنبھل گیا اور سجاول کے بارے میں مزید کچھ کہنے سے رک گیا۔
میں نے نہایت مختصر الفاظ میں اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ وہ بھی متحیر ہو گیا۔ میں نے کہا۔ ''فوراً اپنے موٹے دوست سے رابطہ کرو اور اس سے دو باتوں کے بارے میں پوچھو۔ ایک تو یہ کہ را کی گھاٹ کس جگہ کا نام ہے اور وہ کہاں ہے۔ دوسرے یہ ڈینی فلاور کیا ہیں اور ان کی کیا اہمیت ہے؟''

موٹے دوست سے میری مراد خانساماں ازمیر طیب ہی تھا۔ انیق نے کہا۔ ''را کی گھاٹ کے بارے میں ازمیر سے پوچھ لیتے ہیں، لیکن ڈینی فلاورز کے بارے میں تو میں آپ کو خود بتا سکتا ہوں۔''

''بتاؤ۔''

''یہ اس جزیرے کا ایک خودرو پھول ہے۔ اُسے جنگلی پھول بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ اونچے ساحلی ٹیلوں پر بڑی تعداد میں کھلتا ہے اور اس میں خوشبو بھی ہوتی ہے، لیکن ان ڈینی پھولوں میں کچھ پھول ایسے ہوتے ہیں جن کے پولن کا رنگ اندر سے زرد کے بجائے سرخ ہوتا ہے۔ یہ ہزاروں ڈینی پھولوں میں بس دو چار ہی ہوتے ہیں۔ دراصل ان کو ہی اصل ڈینی پھول کہا جاتا ہے۔ ان کی خوشبو کستوری کی طرح نایاب ہوتی ہے..... اور یہ پانی میں رکھے جائیں تو کئی ہفتوں تک بالکل تازہ رہتے ہیں، مقامی لوگ ان کو شہر میں لے جا کر بیچتے ہیں۔''

''چلو ٹھیک ہے، اب را کی گھاٹ کا پتا کرو لیکن احتیاط سے۔ ازمیر کو شک نہیں ہونا چاہیے۔''

انیق نے ازمیر طیب سے فون پر رابطہ کیا۔ پہلے اس کی لاڈلی بندریا لوسی کا حال احوال پوچھا۔ پھر باتوں باتوں میں را کی گھاٹ کے بارے میں دریافت کیا۔

ازمیر طیب نے بتایا کہ یہ جزیرے کے جنوب میں لائٹ ہاؤس سے ذرا آگے ایک چھوٹی کھاڑی سی ہے۔ اس کو را کی گھاٹ کہا جاتا ہے۔

میں قسطینا کو اس کارروائی سے روکنا چاہتا تھا لیکن مجھے پتا تھا کہ اس وقت کوئی مجھے اس تک پہنچنے نہیں دے گا۔ ڈی پیلس کے اندر وہ سکیورٹی کے سخت پہروں میں رہتی تھی اور جب تک وہ خود نہ چاہتی، کوئی اس کے پاس بھی نہیں پھٹک سکتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ آج اور اس وقت وہ مجھ سے ہرگز ملنا نہ چاہے گی۔ ایک ہی طریقہ سمجھ میں آتا تھا کہ میں اسے ''را کی گھاٹ'' پر روکنے کی کوشش کرتا۔

میں نے گھڑی دیکھی، گیارہ بج کر چالیس منٹ ہوئے تھے۔ آقا جان کے ساتھ اپنی

گفتگو میں قسطینا نے کہا تھا کہ وہ رات ایک بجے تک روانہ ہو جائے گی۔ مطلب یہ تھا کہ قریباً ڈیڑھ گھنٹے تک وہ راکی گھاٹ کے پاس ہوگی۔ وہ وہاں کیسے اور کیونکر جائے گی، اس کا مجھے کچھ علم نہیں تھا۔ میں نے کسی حد تک اس کے مزاج کو پرکھ لیا تھا۔ وہ ارادے کی بہت پکی تھی اور جب کوئی فیصلہ کر لیتی تھی تو اس پر جم جاتی تھی۔

میں نے ضروری تیاری کی اور انیق کو سب کچھ سمجھا دیا۔ اسے زینب کی پوری نگہداشت رکھنا تھی اور کسی بھی صورت میں اس کی یہاں موجودگی کو ظاہر نہیں ہونے دینا تھا۔ وہ جیسا بھی اوٹ پٹانگ تھا لیکن مجھے اس کی صلاحیتوں پر پورا بھروسا تھا۔

میں نے کہا۔ ''بالفرض اگر مجھے واپسی میں کچھ تاخیر بھی ہو جائے تو پریشان نہیں ہونا۔ میں کوشش کروں گا کہ فون پر بھی تم سے رابطہ رکھوں لیکن تم نے خود مجھے کال نہیں کرنی۔''

وہ بولا۔ ''میں بھی آپ سے وہی درخواست کروں گا جو قسطینا صاحبہ کی ڈاکٹر دوست نے ان سے کی ہے۔ آپ بھی کسی طرح کا رسک نہ لیں۔ آپ کے بازو کی حالت مہم جوئی والی ہرگز نہیں۔''

''میں اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

○.....❖.....○

میں اس جگہ موجود تھا جسے راکی گھاٹ کہا جاتا تھا۔ رات تاریک اور ابر آلود تھی۔ کسی وقت ہلکی پھوار بھی پڑنے لگتی تھی۔ سمندر کی طرف سے نم ہوا چلتی تھی اور پام کے بلند و بالا درخت ہولے ہولے جھومتے تھے۔ میں پتلون قمیص میں تھا۔ یہ مقامی طرز کا لباس تھا۔ شرٹ کو پینٹ سے باہر رکھا جاتا تھا۔ شرٹ بھی کچھ عجیب سی تھی، اس کے کف وغیرہ نہیں ہوتے تھے۔ اپنی پنڈلی کے ساتھ میں نے الاسٹک بینڈ کے ذریعے پسٹل باندھ رکھا تھا۔ میں ایک بڑے پتھر سے ٹیک لگائے ایک تاریک گوشے میں بیٹھا تھا اور اس راستے کی طرف دیکھ رہا تھا جو پختہ سڑک سے نکل کر ساحل کی طرف آتا تھا۔ یہ جگہ رات کے اس پہر قریباً سنسان تھی۔ بس سمندر میں کوسٹ گارڈز کی اسپیڈ بوٹس تیر رہی تھیں۔ جن کی نشاندہی ان کی روشنیوں سے ہوتی تھی......لہروں کے شور میں کسی وقت کسی فائر کی آواز بھی سنائی دے جاتی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق یہ ہوائی فائر تھے جو کوسٹ گارڈز، دشمن کو یہ بتانے کے لیے کر رہے تھے کہ ہم ہوشیار ہیں۔ محاذ پر یوں تو مکمل خاموشی تھی مگر گاہے بگاہے اپاچی ہیلی کاپٹرز کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ ضرور ابھرتی تھی۔

میری نگاہیں مسلسل راستے پر جمی ہوئی تھیں۔ ایک بج کر پندرہ منٹ ہوئے تھے جب

اس نیم پختہ راستے پر ایک کار ہچکولے کھاتی نظر آئی۔ میری دھڑکن تیز ہوگئی۔ کار مجھ سے قریباً پچاس فٹ کی دوری پر رک گئی۔ یہ ایک سلور ہنڈا تھی۔ اس کی ہیڈ لائٹس رکنے سے پہلے ہی بجھا دی گئی تھیں۔ کار میں سے دو لڑکیاں اتریں۔ میں نے ان کے ہیولوں سے ہی انہیں پہچان لیا۔ ایک قسطینا اور دوسری ڈاکٹر ماریہ تھی۔

ہوا میں اڑتی ہوئی سی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ قسطینا نے کہا۔ ''ٹھیک ہے ماریہ اب تم جاؤ۔''

جواب میں ماریہ نے کچھ کہا جو میری سماعت تک نہیں پہنچا۔

قسطینا بولی۔ ''خدا سے خیر مانگو۔ سب ٹھیک ہوگا...... گڈ بائے۔''

ڈاکٹر ماریہ بوجھل قدموں سے دوبارہ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اس کا جیسے وہاں سے جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا مگر یہ قسطینا کا حکم تھا۔ اس نے ہیڈ لائٹس آن نہیں کیں، اور کار کو یوٹرن دے کر واپس پختہ سڑک کی طرف چلی گئی۔ قسطینا کا ہیولا اپنی جگہ موجود رہا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ ان ویران ٹیلوں میں جولڑکی اسکرٹ نما چغہ پہنے اور ایک باکس نما شے اٹھائے تنہا کھڑی ہے وہ یہاں کی گرین فورس کی سپریم کمانڈر ہے۔ سیکڑوں لوگ اس کی ایک جھلک دیکھنے کو بے تاب رہتے ہیں اور اس کے ایک اشارے پر کٹ مرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔

کار جب پختہ سڑک پر پہنچ گئی اور اس کی ہیڈ لائٹس آن ہو گئیں تو قسطینا نے رخ پھیرا اور ٹیلوں کی ڈھلوان پر چڑھنے لگی۔ اچانک میں نے اس کے ہیولے کو بھاگتے ہوئے دیکھا۔ وہ جیسے کسی پناہ کی تلاش میں تھی۔ پھر وہ ایک پتھر کے پیچھے اوجھل ہوگئی۔ چند سیکنڈ بعد مجھے وہ ''وجہ'' بھی سمجھ میں آ گئی جس نے اسے بھاگنے اور چھپنے پر مجبور کیا تھا۔ کوسٹ گارڈ کی ایک بوٹ بالکل کنارے پر رکی تھی اور اس میں سے سرچ لائٹ کا ایک بڑا روشن دائرہ نمودار ہو کر ٹیلوں پر رینگنے لگا تھا۔ میں نے بھی خود کو چٹان کے پیچھے کچھ مزید سمیٹ لیا۔ روشن دائرہ قریباً ایک منٹ تک ''رسمی کارروائی'' کے انداز میں نشیب و فراز پر حرکت کرتا رہا۔ پھر اوجھل ہو گیا۔ بوٹ بھی سمندر میں آگے نکل گئی۔

قسطینا کا ہیولا پتھر کے پیچھے سے نمودار ہوا اور وہ پھر آگے بڑھنے لگی۔ میں محفوظ فاصلہ رکھ کر اس کا تعاقب کرنے لگا۔ یہ ٹیلے سرسبز تھے۔ تاہم کہیں کہیں ننگی چٹانیں بھی دکھائی دیتی تھیں۔ اس تاریک ویرانے میں قسطینا کی پیش رفت دلیری اور بے خوفی کی غماز تھی۔ قریباً نصف کلومیٹر آگے جانے کے بعد ایک فوجی پوسٹ نظر آئی۔ راستے کی ایک سائیڈ پر بنکر سا بنا ہوا تھا اور چھت پر سرچ لائٹ بھی نظر آتی تھی۔ فی الحال یہ سرچ لائٹ آف تھی اور پوسٹ کے

اندر بھی کوئی ذی نفس دکھائی نہیں دیتا تھا۔ قسطینا اس پوسٹ کے سامنے سے بلا رکاوٹ گزر گئی۔ اس کے پیچھے میں بھی گزر گیا (جیسا کہ بعد میں پتا چلا، آقا جان کے حکم پر یہ پوسٹ عارضی طور پر خالی کرائی گئی تھی تا کہ قسطینا کو آگے جانے میں کوئی دشواری نہ ہو)

رم جھم میں میرا لباس بھیگ چکا تھا۔ خنکی کے سبب زخمی کندھے میں بھی ہلکی اینٹھن ہو رہی تھی۔ بہرحال میں آگے بڑھتا رہا۔ اب ہم ایک تنگ دراڑ میں سے گزر رہے تھے۔ قسطینا نے ایک پنسل ٹارچ روشن کر لی تھی لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا تھا اس لیے مجھے زیادہ دشواری کا سامنا تھا۔ کسی بھی وقت اس تعاقب کا بھانڈا پھوٹ سکتا تھا۔ ایک جگہ دراڑ کا راستہ مسدود نظر آیا۔ سامنے جھاڑ جھنکاڑ تھا۔

مجھے ازحد حیرت ہوئی جب قسطینا چند سیکنڈ تک اس جھاڑ جھنکاڑ کے پاس رکنے کے بعد اوجھل ہو گئی۔ دراڑ بند نظر آتی تھی مگر راستہ موجود تھا۔ جھاڑ جھنکاڑ کے پاس پہنچنے کے بعد میں نے تھوڑی دیر انتظار کیا، پھر نتائج کے خیال کو ایک طرف رکھ کر اندر داخل ہو گیا۔ دراڑ کی نسبت تھوڑی سی کشادگی کا احساس ہوا۔ یہ وہی قدرتی سرنگ تھی جس کا ذکر میں نے سنا تھا، یہ ذکر قسطینا نے ہی آقا جان سے کیا تھا۔

میں قسطینا کا ہیولا ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا جب اچانک میری پشت پر ایک زوردار ضرب لگی اور میں لڑکھڑا کر سرنگ کی دیوار سے ٹکرایا۔ زخمی بازو جھنجھنا اٹھا۔

''ہینڈز اَپ۔'' کڑک دار آواز سنائی دی۔ بے شک یہ قسطینا ہی تھی۔

اس نے پنسل ٹارچ کا روشن دائرہ میرے چہرے پر پھینکا۔ میں تب تک اپنا اکلوتا سلامت ہاتھ اوپر اٹھا چکا تھا، مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں وہ تناؤ میں فائر ہی نہ کر دے۔

''او گاڈ...... یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں؟'' قسطینا کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''اور میں بھی حیران ہوں کہ کیا دیکھ رہا ہوں؟''

وہ کتنی ہی دیر جیسے سناٹے میں رہنے کے بعد بولی۔ ''شاہ زائب! یہ سب کیا ہے، کیا تم...... میرا مطلب ہے تم...... میری جاسوسی کرتے پھر رہے ہو؟''

''ایسا کچھ نہیں ہے قسطینا! یہ سب ایک اتفاق ہے۔ بالکل اتفاق۔'' میں نے ہاتھ نیچے گرا دیا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' وہ تنک کر بولی۔

ایک لمبے توقف کے بعد میں نے کہا۔ ''پتا نہیں کہ آپ یقین کریں یا نہیں، لیکن حقیقت یہی ہے کہ میں کچھ بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ اپنے دیرینہ ساتھی (سجاول) کا خیال

بری طرح ستا رہا تھا۔ میں حلمی صاحب سے اجازت لے کر ہوا خوری کے لیے ڈی پیلس سے باہر نکل آیا۔ یہاں ساحل پر گھوم رہا تھا کہ گاڑی کی ہیڈ لائٹس دیکھ کر حیران ہوا۔ کچھ عجیب سا لگا کہ رات کے اس پہر کوئی سمندر کی طرف آ رہا ہے...... پھر سوچا فوج کی کوئی گشتی جیپ ہی نہ ہو۔ خوامخواہ باز پُرس شروع ہو جائے گی ایک پتھر کی اوٹ میں ہو گیا۔ ابھی کچھ دیر پہلے آپ کی ہنڈا کار میرے قریب آ کر ہی رکی تھی۔‘‘

’’کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں تمہاری اس کہانی پر یقین کر لوں؟‘‘ قسطینا نے متذبذب لہجے میں کہا۔ پستول ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا لیکن قدرے جھک گیا تھا۔

’’یہ کہانی نہیں ہے قسطینا! لیکن جو کچھ اب میں یہاں دیکھ رہا ہوں، یہ ضرور کسی خاص کہانی کا حصہ لگتا ہے۔ آپ کا حلیہ تو ایسا ہے کہ میں آپ کو پہچان ہی نہیں سکا تھا۔ میں نے آپ کو آپ کی آواز سے پہچانا اور جب آپ کی ساتھی نے آپ کو قسطینا کہہ کر مخاطب کیا تو مجھے یقین ہو گیا۔ میں اس وقت آپ سے صرف آٹھ دس قدم کی دوری پر موجود تھا۔‘‘

قسطینا نے پنسل ٹارچ کا رخ زمین کی طرف کر رکھا تھا۔ مدھم روشنی میں ہم ایک دوسرے کے تاثرات وضاحت سے نہیں دیکھ پا رہے تھے۔ پھر بھی میں محسوس کر رہا تھا کہ قسطینا بے حد متحیر اور سٹپٹائی ہوئی ہے۔ یہ سارا منظر ہی ڈرامائی تھا۔

وہ بولی۔ ’’میرا خیال ہے کہ بات اس سے بڑھ کر ہے جو تم بتا رہے ہو لیکن اگر ایسا ہے بھی تو تم نے جاسوسی کی کوشش کی ہے تم میرے پیچھے کیوں آئے؟‘‘

’’اسے آپ میری غلطی کہہ سکتی ہیں لیکن اس غلطی میں بھی آپ کی ہمدردی اور خیر خواہی پوشیدہ ہے۔ آپ اور آپ کی ساتھی کے درمیان جو مختصر گفتگو ہوئی ہے، اس سے مجھے اندازہ ہوا ہے کہ آپ اس وقت بھیس بدل کر کوئی بہت خطرناک کام کرنے جا رہی ہیں۔ ایسا کام جو آپ کی ساتھی کے نزدیک بھی قابلِ قبول نہیں...... پلیز قسطینا! پلیز مجھے بتائیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ آپ اس طرح تن تنہا اپنی جان خطرے میں کیوں ڈال رہی ہیں؟ آپ اور افغانی گرین فورس کی کمان کر رہے ہیں بلکہ آپ کی ذمے داری افغانی صاحب سے بھی زیادہ ہے۔ آپ کو اس طرح اپنی جان کسی نامعلوم خطرے میں ڈالنے کا حق کس نے دیا ہے؟‘‘

’’اور...... تمہیں اس طرح مجھ سے پوچھ گچھ کرنے کا حق کس نے دیا ہے؟ یہ حق میں نے اپنے فادر کے سوا کبھی کسی کو نہیں دیا اور نہ کبھی دوں گی۔ تم بالکل ایک غیر متعلق معاملے میں ٹانگ اڑا رہے ہو۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’تھوڑا بہت حق بھی نہیں......؟ ایسٹرن کو بھی نہیں؟‘‘

اس نے جیسے چونک کر میری طرف دیکھا اور چپ سی ہو گئی۔ کچھ دیر بعد ذرا بدلے ہوئے اور نرم لہجے میں بولی۔ ''تم نہیں جانتے کہ ایسٹرن کنگ کی حیثیت سے تم میرے لیے کتنی اہمیت رکھتے ہو۔لیکن یہ اور طرح کے معاملے ہیں......فوجی نوعیت کے......شاید تم ان کو اس طرح نہ سمجھ سکو جس طرح میں سمجھ رہی ہوں۔ اس میں کچھ زبردست پیچیدگیاں ہیں اور ٹائمنگ کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ میں نے جو سوچا ہے وہ مجھے کرنا ہی ہے۔تم مجھے اس سے روکنے کی کوشش نہ کرو۔ بعد میں تمہیں خود اندازہ ہو جائے گا کہ جو میں نے کیا، وہ کتنا ضروری تھا۔تم اسے میرا حکم سمجھ لو یا درخواست۔تم فوراً ڈی پیلس واپس جاؤ۔''

وہ اب دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی تھی۔ میں بھی بیٹھ گیا۔ سرنگ کا داخلی دہانہ جھاڑ جھنکاڑ میں چھپا ہوا تھا اور ہم سے بس دس پندرہ فٹ ہی دور تھا۔ بارش کی بوندوں کی آواز صاف سنائی دیتی تھی۔ کسی وقت بجلی کی چمک بھی اندر تک پہنچتی تھی اور پھر طویل گڑگڑاہٹ جو سرنگ کی دیواروں کو لرزا دیتی تھی۔ وہ ڈبا جسے میں گتے کا سمجھ رہا تھا، دراصل لکڑی کا شاندار سا باکس تھا۔اس کے ساتھ ایک چوڑا ''اسٹریپ'' تھا۔اس اسٹریپ کی مدد سے باکس کو گلے میں لٹکایا جا سکتا تھا باکس کے اوپر شیشہ لگا ہوا تھا اور شیشے کے نیچے وہ نایاب پھول تھے جنہیں ڈینی فلاور کہا جاتا تھا۔ پھولوں کو ہوا کی فراہمی کے لیے لکڑی کے باکس کی سائیڈوں پر باریک سوراخ کیے گئے تھے۔ پھولوں کی جادوئی مہک ان سوراخوں سے نکل کر فضا میں پھیل رہی تھی اور ذہن کو جیسے ہواؤں میں اڑا رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ''گستاخی معاف قسطینا! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ ان پھولوں کا کیا مصرف ہے۔آپ کا لباس اور یہ باکس دیکھ کر تو یوں لگتا ہے جیسے آپ یہ پھول کہیں فروخت کرنے جا رہی ہیں۔''

''پلیز شاہ زائب! اس سوال جواب سے تمہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا ہاں میں تمہاری یہ غلط فہمی دور کر دینا چاہتی ہوں کہ میں کوئی خطرناک یا جان لیوا کام کرنے جا رہی ہوں۔ یہ سب کچھ بہت ''بھانپا'' ہوا اور نپا تلا ہے۔ میں کل رات سے پہلے دوبارہ ڈی پیلس میں تم لوگوں کے بیچ ہوں گی۔''

''یعنی اب......کچھ دیر بعد آپ ہم لوگوں کے بیچ نہیں ہوں گی؟''

''کیا مطلب؟''

''قسطینا! یہ پتا تو مجھے بھی چل رہا ہے کہ یہ جس سرنگ نما راستے میں آپ آگے جانا چاہتی ہیں یہ کہیں نیوسٹی کے علاقے میں جا نکلے گا۔آپ عین جنگ کے زمانے میں دشمن کے

علاقے کے اندر گھس کر کوئی خطرناک کارروائی کرنا چاہ رہی ہیں۔ گستاخی معاف، اتنا میں بھی جانتا ہوں کہ لڑائیوں میں اس طرح کی کارروائیاں کی جاتی ہیں لیکن اس کے لیے کمانڈوز اور گوریلاز وغیرہ ہوتے ہیں۔ ملک کا سربراہ یا فوج کا کمانڈر خود بھیس بدل کر اس طرح کی آگ میں نہیں کود پڑتا۔''

''پلیز شاہ زائب!'' وہ جزبز ہو کر بولی۔ ''تم وہ بات نہ کرو جس کے بارے میں تم جانتے نہیں ہو۔ تم بیکار میں اپنا اور میرا وقت ضائع کرو گے۔ میں جو کچھ کر رہی ہوں، وہ میں اچھی طرح جانتی ہوں اور وہ مجھے ''کرنا'' ہے۔'' اس نے زور دے کر کہا۔

میری نگاہوں کے سامنے وہ مناظر کوند گئے جو میرے اسپائی کیمرے نے مجھے دکھائے تھے۔ ڈاکٹر ماریہ کا رونا بلکنا اور قسطینا کو اس کے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کرنا...... پھر آقا جان سے قسطینا کی گفتگو اور اس گفتگو کا رنگ ڈھنگ۔ آقا جان بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ قسطینا کتنا بڑا اور خطرناک قدم اٹھانے جا رہی ہے۔ یقیناً قسطینا شدید ترین ڈپریشن میں تھی...... رائے زل اور ایجنسی کے الائنس پر بھرپور حملے کے باوجود گرین فورس کو کامیابی نہیں ہوئی تھی بلکہ الٹا بہت سا اہم علاقہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ اسپتالوں میں لاشوں اور زخمیوں کے ڈھیر لگ گئے تھے اور کچھ معلوم نہیں تھا کہ کب گرے فورس دوبارہ پیش قدمی شروع کر دے۔ اس صورتِ حال نے قسطینا کو فرسٹریشن کے گرداب میں پھنسایا تھا اور وہ ایک خلافِ عقل کام کے ارادے سے نکل کھڑی ہوئی تھی۔ آقا جان کی کمینگی تھی کہ اس نے سب کچھ جانتے بوجھتے اسے روانہ ہونے دیا تھا، کم از کم میری سمجھ میں تو یہی آ رہا تھا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''قسطینا، آپ ارادے کی پکی ہیں تو میں بھی کچا نہیں ہوں، میں آپ کو اس مہلک مشن پر جانے نہیں دوں گا۔ میں وہی کروں گا جو ایسے موقعوں پر سچے دوست کرتے ہیں۔'' میں نے سیل فون نکال لیا۔

''کیا کرنا چاہتے ہو؟''

''عزت مآب اور بیگم نورل وغیرہ کو آپ کے ارادے سے آگاہ کر رہا ہوں...... وہ آپ کو روک سکتے ہیں۔''

کچھ دیر ہمارے درمیان بحث ہوئی...... پھر ایک دم مجھے چونکنا پڑا۔ قسطینا کے ہاتھ میں وہی سائلنسر لگا پستول دوبارہ نظر آ رہا تھا۔ جو اسپائی کیمرے کی آنکھ نے مجھے دکھایا تھا۔

''پلیز...... شاہ زائب! یہ سیل فون مجھے دے دو اور پلیز...... یہاں سے چلے جاؤ۔''

''اگر میں انکار کروں تو......''

وہ درد بھرے لہجے میں بولی۔ ''آئی ایم ویری سوری، میں کسی بھی حد تک جاسکتی ہوں۔''

''یعنی آپ مجھے شوٹ کر دیں گی؟''

خاموشی کا بوجھل وقفہ آیا، پھر وہ بولی۔ ''شوٹ نہ بھی کیا تو زخمی کر دوں گی۔ سیل فون مجھے دے دو اور یہاں سے واپس چلے جاؤ۔''

''میں انکار کرتا ہوں۔ میں آپ کو واپس لیے بغیر نہیں جاؤں گا۔ آپ نے گولی چلانی ہے تو چلا دیں۔''

اسے مجھ سے بھی زیادہ خطرہ شاید سیل فون سے تھا۔ میں اس کے ذریعے کسی بھی وقت کال ملا کر قسطینا کے سفر کو فل اسٹاپ لگوا سکتا تھا۔ کوئی بھی گشتی گاڑی دو چار منٹ میں راکی گھاٹ تک پہنچ سکتی تھی۔ ''شاہ زائب! اپنے آپ سے میری عقیدت اور چاہت کو امتحان میں نہ ڈالو۔ سیل فون میری طرف پھینک دو۔''

''میں نے کہا ہے نا، میں انکار کر رہا ہوں۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔

یہی وقت تھا جب ایک مدھم سی آہٹ نے قسطینا کی توجہ بانٹی۔ شاید کوئی چوہا یا لیزارڈ وغیرہ تھا جس نے اپنی جگہ سے حرکت کی تھی۔ میں نے ٹانگ کو برق رفتاری سے حرکت دی۔ چوٹ قسطینا کے پستول والے ہاتھ پر لگی۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکلا پتھروں پر گرا اور پھر ایک چار پانچ فٹ لمبی فرشی دراڑ میں گم ہو گیا۔ پنسل ٹارچ کی روشنی میں پستول کے لڑھکنے اور اوجھل ہونے کا منظر صاف نظر آیا۔

قسطینا جیسے سٹپٹا کر اور بپھر کر مجھ پر جھپٹ پڑی۔ پہلے اس نے میرا منہ نوچنے کی کوشش کی، تب ایک دم ہاتھ پاؤں چلانے لگی۔ یقیناً وہ ان لوگوں میں سے تھی جو طیش میں آجائیں تو خود کو سنبھال نہیں سکتے۔ وہ چلا رہی تھی۔ یقیناً اس کو زیادہ صدمہ اس بات کا تھا کہ جس سائیلنسر لگے پستول کو وہ بڑے اہتمام سے اپنے ساتھ لائی تھی، وہ کہیں گہرائی میں گر گیا تھا۔

اس نے مجھ پر مکے برسائے اور ٹھوکریں رسید کیں۔ میں نے اپنا صرف دفاع کیا اور یہ کوشش کی کہ وہ کوئی کارگر چوٹ نہ لگا سکے، خاص طور سے ایسی چوٹ جو میرے پہلے سے زخمی بازو کو نقصان پہنچا جائے۔ وہ بپھری ہوئی شیرنی تھی۔ ہم دونوں سنگلاخ فرش پر گرے۔ وہ جیسے اپنے حواس میں نہیں رہی تھی۔ میں نے اپنے اور اس کے مزید نقصان سے بچنے کے لیے اسے وہی فرشی داؤ لگا دیا جس سے میں نے اسے ساؤنڈ پروف میٹنگ روم میں بے بس کیا تھا۔ اپنے زخمی بازو کے ساتھ اس لاک کو مکمل کرنا کسی عام بندے کے بس کا روگ نہیں تھا۔

میں نے ایک ٹانگ سے اس کی دونوں زیریں پنڈلیوں کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں پر میری گرفت زیادہ مضبوط نہیں تھی، مگر یہ دونوں ہاتھ اس کی اپنی ہی کمر کے نیچے تھے لہٰذا وہ انہیں چھڑا نہیں سکتی تھی۔ اپنا زخمی بازو میں نے اس کی گردن پر رکھا ہوا تھا لیکن یہ دباؤ ظالمانہ نہیں دوستانہ تھا۔ ہاں اگر وہ زیادہ مزاحمت کرتی تو پھر میں اس دباؤ کو بقدر ضرورت بڑھا سکتا تھا۔

اس کا جنون ابھی برقرار تھا۔ ''چھوڑ دو مجھے۔'' وہ پھنکاری اور مچھلی کی طرح تڑپ کر گرفت سے نکلنا چاہا مگر پھر فوراً ہی سمجھ بھی گئی کہ یہ وہی گرفت ہے جو پہلے بھی ایک دفعہ اس کو بے بس کر چکی ہے۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں اور ایک دم جیسے بدن کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اس کا سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ میں نے دیکھا، اس کی بند آنکھوں کے گوشے میں ہلکی سی نمی تھی۔ یہ نمی سنگلاخ فرش پر پڑی پنسل ٹارچ کی روشنی میں چمک رہی تھی۔ سیاہ گھونگریالے بالوں کے نیچے اس کی روشن پیشانی پر رگڑ کا تازہ نشان تھا۔

اس کا رویہ دیکھ کر میں نے بھی اپنی گرفت ڈھیلی کر دی لیکن وہ اسی طرح پڑی رہی۔ بے حس وحرکت آنکھیں بند کیے۔ ''مجھے معاف کر دیں قسطینا! میں یہ سب نہیں چاہتا تھا۔''

وہ خاموش رہی۔ آنکھوں کے گوشوں میں دو ننھے موتی نظر آئے۔ لیکن اپنی جگہ ٹھہرے رہے، اس کے رخساروں پر یا کنپٹیوں کی طرف نہیں گئے۔ ''میں نے صرف اپنا دفاع کیا ہے قسطینا، آپ کو زیادہ چوٹ تو نہیں لگی؟''

اس نے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلایا۔ بڑی نرم سی کیفیت تھی اس کی آنکھوں میں۔ میں اسے اپنائیت کے سوا کوئی نام نہیں دے سکا۔ اس کے ماتھے پر اب ہلکا سا ابھار نمودار ہو گیا تھا۔ پتا نہیں کس جذبے کے تحت میں نے اس کی پیشانی چوم لی۔ ''سوری قسطینا! میں نے آپ کو چوٹ پہنچائی۔''

وہ اٹھ بیٹھی۔ ''تمہیں بھی تو چوٹ لگی ہوگی۔ تمہارے بازو کو۔'' اس نے کہا۔

''نہیں، میں ٹھیک ہوں۔'' میں نے زخمی بازو کو آہستہ سے حرکت دی۔

میرا بوسہ جیسے ابھی تک اس کی پیشانی پر چمک رہا تھا۔ وہ عجیب نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ پھر اس نے پنسل ٹارچ اٹھائی اور گھٹنے ٹیک کر اس خلا میں جھانکنے لگی جہاں سائیلنسر لگا طاقتور کولٹ پسٹل گرا تھا۔ اسے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ میری طرف دیکھے بغیر بولی۔ ''میں تمہیں ایک بات بتا دوں شاہ زائب! مجھے آج، اپنی کارروائی کے لیے جانا ہے اور ہر صورت جانا ہے۔'' اس کا لہجہ چٹان سا تھا۔

اس کے ارادے کی غیر معمولی سختی دیکھ کر میں نے کہا۔ ''تو پھر آپ کو بھی میری ایک بات ہر صورت ماننا ہوگی۔ میں آپ کے ساتھ جاؤں گا۔''

میرے لہجے کے حتمی اور فیصلہ کن انداز نے شاید اسے بھی چونکایا تھا۔ وہ کچھ دیر خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہی۔ ''کیسی بے وقوفی کی باتیں کر رہے ہو، تمہارا کندھا......''

''میرا کندھا ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ نے دیکھ ہی لیا ہے۔'' میں نے اس کی بات کاٹی۔ ''اگر میں نے آپ جیسی ''فیلڈ مارشل'' کو جھیل لیا ہے، تو ایروں غیروں کو بھی جھیل لوں گا۔ میں اس کندھے کو کسی طرح کا ضعف پہنچائے بغیر اب بھی دو چار بندوں سے بہ آسانی نمٹ سکتا ہوں۔''

ہمارے درمیان اس بارے میں تھوڑی سی بحث ہوئی۔ آخر وہ بولی۔ ''میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ تمہارا لباس......تمہاری زبان......تم ملائی کے دو چار لفظ بھی نہیں بول سکتے......''

''لباس کا مسئلہ کوئی نہیں۔ میں نے یہاں سکھوں کو بھی دیکھا ہے اور پاکستانی لباس والے بھی نظر آئے ہیں۔ باقی رہا زبان کا مسئلہ تو میں آپ کا گونگا مددگار بن جاؤں گا۔ آخر آپ ایک ''جوان دیہاتن'' کے روپ میں پھول بیچنے شہری آبادی میں جارہی ہیں، آپ کے ساتھ کوئی نگہبان، کوئی نگران تو ہونا چاہیے۔''

''مگر تمہارا بازو......''

''بازو بھی تو ایک معقول بہانہ ہے جیسا کہ سب جانتے ہیں یہ سرخ پولن والے ڈینی فلاور دشوار گھاٹیوں اور ٹیلوں پر ملتے ہیں۔ میں آپ کا گونگا مددگار یہی پھول ڈھونڈتے ڈھونڈتے اونچائی سے گر کر زخمی ہوا ہوں......کیا سمجھیں؟''

یہ بحث دس پندرہ منٹ مزید چلی۔ آخر قسطینا کی سمجھ میں آگیا کہ اس کا واسطہ اپنے ہی جیسے ایک ''ہٹ دھرم'' سے پڑ گیا ہے۔ وہ کچھ شرائط کے ساتھ آمادہ نظر آنے لگی۔ اس کو سب سے زیادہ فکر اپنے پسٹل کی تھی۔ اس نے پنسل ٹارچ کی روشنی پھر دراڑ میں ڈالی۔ انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''وہ دیکھو، نیچے کچھ چمکتا ہے۔ کہیں یہ پسٹل کا دستہ تو نہیں؟''

میں نے بھی گھٹنے ٹیک کر اور آگے کو جھک کر نظر دوڑائی۔ چار پانچ فٹ نیچے کچھ چمک تو رہا تھا۔ میں نے اپنی پینٹ کی بیلٹ اتاری۔ قسطینا نے اپنے دیہاتی روپ میں رنگ بھرنے کے لیے کانوں میں چاندی کے بڑے بڑے آویزے پہن رکھے تھے۔ یہ ایک طرح سے چاندی کے گول رنگ تھے۔ میں نے اس سے ایک آویزہ اتروایا اور اسے توڑ کر ایک ہک کی

شکل دے دی۔ اس ہک کو اپنی بیلٹ کے ساتھ منسلک کر کے میں نے تین چار انچ چوڑی دراڑ میں لٹکا دیا اور اس کی چمکیلی چیز کو ہک میں پھنسانے کی کوشش کرنے لگا۔ قسطینا نے ٹارچ کا روشن دائرہ مطلوبہ جگہ پر مرکوز کر رکھا تھا۔ جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ سائیلنسر لگا پسٹل ہی ہے۔ کوشش کچھ طویل رہی لیکن ناکام نہیں ہوئی۔ میں پسٹل نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ قسطینا نے اسے چیک کیا اور اپنا اسکرٹ نما چغہ اٹھا کر اسے دوبارہ ٹانگ کے بالائی حصے سے منسلک کر لیا۔ میری نگاہوں میں وہ منظر چمک گیا جب میں نے اسے اسپائی کیمرے کے ذریعے فطری لباس میں دیکھا تھا۔

پستول واپس حاصل کر لینے کے بعد قسطینا نے قدرے اطمینان محسوس کیا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اس کا آویزہ ضائع ہو گیا تھا اس لیے میں نے دوسرا بھی اتار کر دراڑ میں پھینک دیا۔ اس نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔ ”تم نے بھی وہ ویڈیو دیکھی تھی جس میں رائے زل اور لمبے چہرے والا چیف گیرٹ ایک ہوٹل میں خفیہ ملاقات کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ ویڈیو میں نے ہی زیرِ قبضہ علاقے میں گھس کر بنائی تھی۔ میں اسی بھیس میں وہاں گئی تھی جس میں اب نظر آ رہی ہوں۔ اس ویڈیو نے رائے زل اور ایجنسی والوں کے گٹھ جوڑ کو اس طرح بے نقاب کیا ہے کہ لوگوں کی آنکھیں کھل گئی ہیں لیکن......“ وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

میں اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ خود ہی گویا ہوئی۔ ”میں دیکھ رہی ہوں شاہ زائب! کہ یہ گٹھ جوڑ بڑا طاقتور ہو چکا ہے۔ یہ کہیں پر بھی ہمارے پاؤں جمنے نہیں دے رہا۔ لگتا ہے کہ ہم نے بہت دیر کر دی ہے......اور اس دیر کی اصل وجہ عزت مآب کی امن پسندی اور چشم پوشی ہی ہے۔ وہ خون خرابے سے بچنا چاہتے تھے اور شاید اب بھی چاہتے ہیں مگر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی دوسرا راستہ باقی ہی نہیں بچتا۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں......تو پھر اس راستے پر چل کر کہاں جانا چاہتی ہیں آپ؟“

وہ کچھ دیر تک عجیب انداز میں میری آنکھوں میں جھانکتی رہی پھر سخت چٹانی لہجے میں بولی۔ ”میں کل کی رات کو چیف گیرٹ کے لیے آخری رات بنا دینا چاہتی ہوں......“

میں چیف گیرٹ کے حوالے سے قسطینا کے خیالات پہلے بھی سن چکا تھا۔ اسے یقین تھا کہ گیرٹ مارا گیا تو رائے زل اور گرے فورس کی کمر ٹوٹ جائے گی۔ لیکن......صورتِ حال برعکس بھی تو ہو سکتی تھی اگر اس نہایت خطرناک کوشش میں قسطینا خود ماری جاتی تو گرین فورس کی کمر بھی ٹوٹ سکتی تھی۔

اس نازک معاملے پر میرے اور قسطینا کے درمیان چند منٹ مزید بات ہوئی۔ قسطینا

کے ذہن میں ایک مکمل پلان تھا جو اس کے خیال میں پوری طرح قابلِ عمل بھی تھا۔ اس پلان کے مطابق مقبوضہ علاقے یعنی نیوسٹی میں پہلے سے موجود دو انفارمرز (جاسوسوں) کو قسطینا کی مدد کرنا تھی۔ کل انگریزی کیلنڈر کے مطابق ویک اینڈ کی رات تھی اور قسطینا اچھی طرح جانتی تھی کہ اس رات چیف گیرٹ محاذ پر نہیں ہوگا بلکہ کسی ''اور جگہ'' ہوگا۔

قسطینا مجھے ہر بات جلدی جلدی بتا رہی تھی۔ اس کے پاس وقت زیادہ نہیں تھا، ورنہ شاید وہ ایک بار پھر مجھے میرے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کرتی۔ (حالانکہ وہ اچھی طرح سمجھ چکی تھی کہ جس طرح وہ باز نہیں آئی، میں بھی نہیں آؤں گا)

ہمارے درمیان ایک طرح کا معاہدہ ہو گیا اور ہم اس تنگ سرنگ میں بڑی احتیاط سے آگے بڑھنے لگے۔ یہاں خاصی گھٹن اور سیلن تھی۔ کہیں کہیں فرش پر پانی بھی موجود تھا۔ کسی جگہ راستہ اتنا تنگ ہو جاتا تھا کہ لگتا تھا مسدود ہو گیا ہے۔ ہمیں وہاں سے ترچھا ہو کر گزرنا پڑتا تھا۔ پنسل ٹارچ قسطینا کے ہاتھ میں تھی اور وہ دو قدم آگے چل رہی تھی۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ قسطینا نے اپنے جسم کے ساتھ ایک چھوٹا سا بم بھی باندھ رکھا تھا۔ یہ EXPLOSIVE مادہ یقیناً بدترین حالات کے لیے تھا۔ کہیں وہ گھیرے میں آ جاتی اور بچنا محال ہوتا تو وہ خود کو ختم کر سکتی تھی۔ بہرحال میں نے اس حوالے سے قسطینا کے ساتھ کوئی بات نہیں کی تھی کر بھی کیسے سکتا تھا؟ جو کچھ میں اسپائی کیمرے کی آنکھ سے دیکھ چکا تھا، وہ قسطینا پر آشکار کرنا ممکن نہیں تھا۔

سرنگ کی چھت آٹھ دس فٹ کے قریب اونچی تھی۔ کئی جگہ جالے لگے ہوئے تھے جیسے مدتوں سے یہاں کوئی گزرا نہ ہو۔ ٹارچ کی روشنی میں ہمیں کہیں کہیں چوہے، چھپکلیاں اور دیگر حشرات الارض دکھائی دیئے تھے۔ ایک جگہ کئی چمگادڑیں اچانک اڑیں اور ہمیں بری طرح ٹھٹکا گئیں۔

قریباً ایک کلومیٹر سے زائد فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم ایسی جگہ پہنچے جہاں یہ سرنگ مزید تنگ ہو گئی۔ یوں لگا جیسے کوئی فربہ اندام بندہ یہاں سے گزر ہی نہیں سکتا۔ یہاں ہمیں ہوا کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ مطلب یہ تھا کہ دوسرا دہانہ قریب ہے۔ بالآخر ہم دہانے پر پہنچ گئے۔ دہانہ کیا بس جھاڑ جھنکاڑ سے اٹی ہوئی ایک درز سی تھی۔ یہ احساس سنسنی خیز تھا کہ اب ہم اپنے نہیں دشمن کے علاقے میں ہیں۔ بارش اب رکی ہوئی تھی۔

پہلے قسطینا نے قدم باہر نکالے، پھر میں نکل آیا۔ یہ ''نیوسٹی'' کا ایریا تھا۔ اونچے نیچے تاریک ٹیلوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ اچانک قسطینا نے نشیب میں کچھ روشنیاں دیکھیں

اور ٹھٹک گئی۔ ''یہاں لوگ ہیں۔'' اس نے کہا۔

اس کے ساتھ ہی وہ مجھے لے کر واپس سرنگ میں آ گئی۔ ''گرے فورس کے گارڈز؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ہم جھاڑ جھنکاڑ کے اندر سے دیکھ رہے تھے کوئی ڈیڑھ سو میٹر نیچے نشیب میں ان کی موجودگی یہاں سے بھی نوٹ ہو رہی تھی۔

''اب کیا کرنا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ان کے اِدھر اُدھر ہٹنے کا انتظار کرنا ہوگا۔'' اس نے اپنی آستین کے نیچے چھپی ہوئی رسٹ واچ دیکھ کر کہا۔

ہم سرنگ میں چند فٹ پیچھے آ گئے۔ یہاں کم از کم بیٹھنے کے لیے جگہ موجود تھی۔ ہم نے سنگلاخ، ناہموار دیوار سے ٹیک لگا لی۔ نایاب ڈینی فلاوٗرز والا باکس قسطینا نے بڑی احتیاط سے اپنے گھٹنوں پر رکھ لیا۔ وہ اسے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھے ہوئے تھی۔ اب رات کے تین بج چکے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق اجالا ہونے سے پہلے پہلے ہمیں یہاں سے نکلنا تھا۔ گرے فورس کا ایک ہیلی کاپٹر نیچی پرواز کرتا ہوا اور ساحل پر اپنا روشن دائرہ پھینکتا ہوا مشرق کی سمت نکل گیا۔ مجھے پتا تھا کہ انیق بڑی شدت سے میرا انتظار کر رہا ہوگا اور پریشان ہوگا۔ میں نے قسطینا سے اجازت لے کر اسے فون کیا اور بتایا کہ مجھے واپسی میں دیر ہو جائے گی۔ ایک ضروری کام پڑ گیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کل رات کو واپسی ہو۔

میں اردو میں بات کر رہا تھا اور یقینی بات تھی کہ قسطینا کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ انیق نے کہا۔

''زیبی بھائی! زینب مسلسل رو رہی ہے۔ اس نے ابھی مجھے ایک نئی بات بھی بتائی ہے۔''

''کیا؟''

''ایک ہینڈ بل پر کمانڈر افغانی صاحب کی فوٹو چھپی ہوئی تھی، اس نے فوٹو دیکھی تو بری طرح چونک گئی۔ میرے پوچھنے پر اس نے کہا کہ یہ وہی ہیں جو اسے ڈی پیلس سے نکال کر لے گئے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ میں تمہیں واپس پاکستان پہنچاؤں گا۔ وہ اسے اپنے گھر میں لے گئے تھے لیکن پھر پتا نہیں کیوں انہوں نے ایک دم ارادہ بدلا اور اسے خواجہ سراخیام کے سپرد کر دیا......''

مجھے پہلے ہی سے شک تھا کہ وہ اپنے جس ہمدرد کا ذکر کر رہی ہے، وہ کمانڈر افغانی ہو

سکتا ہے۔ میں نے انیق کو ضروری ہدایات دے کر فون بند کر دیا۔ قسطینا پنسل ٹارچ کی روشنی میں ایک چھوٹا سا نقشہ دیکھنے میں مصروف تھی۔ چاند بادلوں میں چھپ گیا تھا اور سرنگ سے باہر گہری تاریکی چھا گئی تھی۔ میرا ذہن انیق کی گفتگو میں الجھ گیا۔ حالات سے ظاہر ہوتا تھا کہ عزت مآب کے بے پناہ خوف سے بیگم نورل نے زینب کو خط لکھنے پر مجبور کیا اور پھر اسے کمانڈر افغانی کے حوالے کر دیا۔ کمانڈر افغانی، بیگم سے کیے ہوئے وعدے کے مطابق زینب کو جزیرے سے نکال کر پاکستان پہنچا دینا چاہتا تھا لیکن پھر کسی وجہ سے اس نے ارادہ بدلا یا اسے بدلنا پڑا اور اس نے زینب کو فی الحال جزیرے میں ہی رکھنے کا فیصلہ کیا۔ وہ اسے خیام کے حوالے کر کے خود لڑائی کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔

اچانک زور سے بادل گرجا اور میں اپنے خیال سے چونک گیا۔ سرنگ سے باہر گھپ اندھیرا تھا۔ تاہم جھاڑ جھنکاڑ کے اندر سے نشیب میں وہ روشن نقطے نظر آ رہے تھے جن کو دیکھ کر ہم رکنے پر مجبور ہوئے تھے۔

دفعتاً ہی زوردار آواز سے بادل گرجے اور ایک بار پھر بارش ہونے لگی۔ تاریک آسمان پر برق لہرائی اور ایک لحظے کے لیے قسطینا کا چہرہ بھی روشن ہو گیا۔ وہ دیوار سے ٹکی ہوئی کوئی داستانی کردار ہی لگ رہی تھی۔ خوب صورت چہرے پر جلالی کیفیت اور آنکھوں میں مر مٹنے کا عزم۔ وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

''تم اپنے کندھے پر بہت ظلم کر رہے ہو شاہ زائب۔ اور اس سے بڑا ظلم یہ ہے کہ تم نے مجھے یہ ظلم دیکھنے پر مجبور کر دیا ہے۔''

''میں بھی بہت کچھ دیکھنے پر مجبور ہوں اس لیے فی الحال اس ٹاپک کو کلوز ہی رکھتے ہیں......''

وہ غصے اور ہمدردی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ رخ پھیر کر باہر دیکھنے لگی۔ میں سوچنے لگا کہ اگر ہم اس موجودہ صورتِ حال سے زندہ بچ نکلے اور ہمیں کچھ عرصہ ساتھ چلنے کا موقع ملا تو کیا ہمارے درمیان کوئی ''تعلق'' پروان چڑھ سکتا ہے؟ جواب ہاں میں تھا۔ وہ اشاروں کنایوں میں اپنی پسندیدگی کا اظہار کر چکی تھی...... اور میں تو تھا ہی ایک ضرورت مند کی طرح، جسے کچھ نہایت گہرے گھاؤ اور درد بھلانے کے لیے زلفوں کے طویل سایوں کی ضرورت تھی۔ ایک ایسا فرار جس کے سوا میرے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔

اس کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔ ''میرا خیال ہے شاہ زائب کہ یہ بارش ہماری مدد کرے گی۔ وہ دیکھو نیچے روشنیاں اوجھل ہو گئی ہیں۔''

وہ درست کہہ رہی تھی۔ تیز بارش نے گارڈز کو غالباً کھلی جگہ سے ہٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔ صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد ہم نکل کھڑے ہوئے۔

میں نے اپنا موبائل اور پستول ایک پولیتھین میں لپیٹ کر محفوظ کر لیا تھا۔قسطینا نے بھی اسی طرح کا اقدام کر لیا۔اسے زیادہ فکر ڈینی فلاورز کی تھی۔ وہ شیشے میں محفوظ تھے۔مزید احتیاط کے طور پر اس نے پولیتھین کا ایک ٹکرا باکس پر بھی ڈال دیا۔

باہر نکلتے ہی بارش کی بوچھاڑوں نے ہمارا استقبال کیا۔ ہوا تیز تھی ناریل، کیلے اور تاڑ کے طویل درخت دہرے ہو ہو کر جھوم رہے تھے۔ ہم آگے بڑھتے رہے اور ٹیلوں کی بلندی پر چلنے سے گریز کرتے رہے۔

جلد ہی بارش کا زور ٹوٹ گیا، ہم اس وقت تک سرنگ سے کم و بیش دو کلو میٹر آگے نکل آئے تھے۔ایک سڑک اور اس پر چلتی ہوئی گاڑیوں کی روشنیاں دکھائی دینے لگیں۔

جنگی حالات یہاں بھی دکھائی دے رہے تھے۔ کہیں کہیں خندقیں کھدی ہوئی تھیں، کھڑکیوں کے شیشوں پر سیاہ کاغذ چپکائے گئے تھے۔اکا دکا گھروں کے کھنڈر بھی دکھائی دیتے تھے۔

اب اجالا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ ہم چلتے رہے اور شہری علاقے سے قریب ہوتے گئے۔فوجی گاڑیوں کا ایک کانوائے ہمارے پاس سے گزرا۔ یہ گرے فورس کی گاڑیاں تھیں اور بارڈر کی طرف جا رہی تھیں۔

قسطینا نے فوجیوں کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ دو چار فوجیوں کی طرف سے جوابی ہاتھ ہلایا گیا۔میری طرح یقیناً قسطینا کا دورانِ خون بھی تیز ہو چکا تھا۔ایک چھوٹی سی چوکی پر چند سپاہی موجود تھے، وہ ہمیں گھورنے لگے۔قسطینا کا اعتماد دیدنی تھا۔ وہ ان سے کترانے کے بجائے ان کے قریب سے گزری۔

ایک فوجی افسر نے مقامی زبان میں اس سے کچھ کہا۔اس نے مقامی زبان میں ہی جواب دیا۔آفیسر نے غالباً میرے بارے میں بھی کچھ کہا۔قسطینا نے اس سوال کا جواب بھی اعتماد سے، مسکراتے ہوئے دیا۔ پھر وہ الھڑ انداز میں چند قدم آگے گئی اور باکس میں سے ایک ایمی فلاورز نکال کر مقامی آفیسر کو پیش کیا۔ وہ مطمئن نظر آنے لگا۔ ہم آگے بڑھ گئے۔ چلتے ہوئے وہ مجھ سے اشاروں کنایوں میں بات کر رہی تھی جس کا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ میں بول نہیں سکتا۔

یہاں ٹیلوں پر جگہ جگہ فورس کے جوان موجود تھے، کہیں کہیں دھاری دار ٹوپیوں والے

امریکن بھی دکھائی دیتے تھے۔ان کے پاس جدید ترین اسلحہ تھا۔ہمیں کوئی ایک امریکی بھی بلٹ پروف جیکٹ اور سیفٹی ہیلمٹ کے بغیر دکھائی نہیں دیا۔ان کی عقابی نظریں جسم میں چبھتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔

ہم اب مضافات سے گزر رہے تھے۔ یہاں عزت مآب کے باغی بیٹے رائے زل کا حکم چلتا تھا۔ جگہ جگہ ایک خاکستری جھنڈا بھی لہراتا دکھائی دیتا تھا، یہ نیوسٹی کا جھنڈا تھا۔ سڑکوں پر آمدورفت شروع ہو چکی تھی۔فوجی گاڑیاں بھی دکھائی دیتی تھیں۔ اکثر فوجی فتح اور وہسکی کے نشے میں چُور نظر آتے تھے۔

مقامی لوگ ان کی طرف دیکھ کر وکٹری کا نشان بناتے اور کچھ جوشیلے نعرہ زنی بھی کرتے تھے، ایک دو جگہ ہم نے بھی وکٹری کا نشان بنایا۔

ایک مقام پر سڑک پر کافی بڑا گڑھا نظر آ رہا تھا۔ یقیناً یہ کل رات والی بمباری کا نتیجہ تھا۔

ہم ٹریفک سگنل کے قریب سے سڑک پار کرنے کا سوچ رہے تھے، جب ایک آواز نے ہمیں تھرا دیا۔ ''ٹھہرو، بات سنو۔'' انگلش میں کہا گیا۔ پھر ایک شخص تیز قدموں سے ہماری طرف بڑھا۔ میری رگوں میں خون سنسنا اٹھا۔ وہ وردی میں تھا۔ اس کے تیور اچھے نہیں تھے۔

O......❖......O

میں اور قسطینا اپنی جگہ ساکت کھڑے ہو گئے۔ گرے وردی والا لمبے ڈگ بھرتا ہوا ہمارے قریب آیا۔اس کی تیز نگاہیں ہمارا جائزہ لے رہی تھیں۔

''گڈ مارننگ۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

میں اور قسطینا بری طرح چونک گئے۔ یہ وہی شخص تھا جس نے ٹین کی چادروں کے نیچے ہم کو پہچاننے کے باوجود نہیں پہچانا تھا......اور پھر اسپتال کے بند کوریڈور میں بھی ہماری مدد کی تھی۔

اس کا نام ہمیں بن مشہد معلوم ہوا تھا۔اس نے اپنے تاثرات بے حد سنجیدہ رکھے اور کسی قسم کی شناسائی ظاہر کیے بغیر فوجی انداز میں بولا۔''میرا خیال ہے کہ آپ نے مجھے پہچان لیا ہو گا؟''

''ہاں، تمہارا نام بن مشہد ہے؟''

''بالکل ٹھیک فرمایا آپ نے۔ میں کافی دیر سے یہاں آپ کا انتظار کر رہا تھا۔کل رات

سے یہاں یہ افواہ ہے کہ گرین فورس کے کچھ چھاتا بردار یہاں اترے ہوئے ہیں۔ سیکیورٹی ہائی الرٹ ہے۔ جگہ جگہ ناکے لگے ہوئے ہیں۔ آپ آگے نہیں جاسکیں گے۔ کہیں نہ کہیں آپ کو روک لیا جائے گا۔"

"پھر تمہارا کیا مشورہ ہے؟" قسطینا نے پوچھا۔

"آپ کو یہیں کہیں کسی جگہ رکنا پڑے گا۔ شہر کے اندر جانے کا پروگرام بعد میں بنایا جا سکتا ہے۔"

یہ بات چیت کچھ اس انداز سے ہو رہی تھی جیسے بن مشہد ہم سے پوچھ گچھ کر رہا ہو...... اور قسطینا اس کے سوالوں کا جواب دے رہی ہو۔

"کہاں رکنا ہوگا ہمیں؟" قسطینا نے دریافت کیا۔

"میں آپ کے اس ڈبے کی تلاشی لینے کے بعد یہاں سے چل پڑوں گا۔" اس نے اپنی پھولوں والے چوبی باکس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "آپ دونوں کچھ فاصلہ دے کر میرے پیچھے پیچھے آتے جائیں۔ ہم اس سامنے والی آبادی میں داخل ہوں گے۔ ایک جگہ رک کر میں اپنے بوٹ کا تسمہ باندھنے لگوں گا۔ وہاں بائیں جانب آپ کو ایک نیلے رنگ کا گیٹ نظر آئے گا۔ آپ نے گھنٹی دے کر اس گیٹ میں داخل ہو جانا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" قسطینا نے اثبات میں سر ہلایا۔ دور کھڑے فوجی دیکھتے تو یہی سمجھتے کہ وہ کسی بات پر بن مشہد کا شکریہ ادا کر رہی ہے۔

بن مشہد بار بار الجھن سے میری طرف دیکھنے لگتا تھا، بولا۔ "یور ہائی نس! آپ کو تو اکیلے آنا تھا؟"

اب قسطینا اسے کیا بتاتی کہ سرنگ میں کیا واقعہ پیش آیا ہے اور میں کس طرح پیر تسمہ پا کی طرح اس سے چپک گیا ہوں، وہ بولی۔ "یہ پروگرام بعد میں بنا۔ مجھے ایک ساتھی کی ضرورت تھی۔ اب یہ ایک گونگے کے طور پر میرے ساتھ ہیں۔"

بن مشہد نے اس باکس کی ہلکی پھلکی تلاشی لی جس میں نایاب ڈینی فلاور مہک رہے تھے۔ اس رسمی کارروائی کے بعد وہ آگے بڑھ گیا۔ ہم تھوڑی دیر وہیں پر کھڑے اِدھر اُدھر دیکھتے رہے۔ بادل چھٹ گئے تھے اور سورج کی کرنیں صبح کو روشن تر کرنے لگی تھیں۔ کچھ فاصلے پر سپاہیوں کی ایک ٹکڑی موجود تھی اور کسی وقت یہ لوگ ہماری طرف دیکھ لیتے تھے۔

جب ہمارے اور مشہد کے درمیان کافی فاصلہ ہو گیا تو ہم بھی اپنی جگہ سے چل پڑے۔ قسطینا اپنے لمبے گھونگریالے بالوں کی وگ اور کاسٹیوم کے ساتھ سو فیصد اس جزیرے کی رہائشی

ہی دکھائی دیتی تھی۔ میرا لباس بھی مقامی تھا۔ زخمی کندھے والا بازو میں نے گلے میں جھلا رکھا تھا۔ کیلے، کھجور اور تاڑ کے بھیگے ہوئے درختوں کے درمیان سے گزرتے ہم شفاف سڑک پر آگے بڑھتے رہے۔ سمندر کا نیلگوں پانی ہماری دائیں جاب جھلک دکھا رہا تھا۔ گرے فورس کا ایک ہیلی کاپٹر مسلسل فضا میں چکر لگا رہا تھا۔ بن مشہد کے پیچھے پیچھے چلتے ہم قدرے بارونق علاقے میں داخل ہو گئے۔ ناشتے کی دکانوں پر لوگ دکھائی دے رہے تھے۔ کہیں کہیں نیوسٹی کا خاکستری جھنڈا نظر آتا تھا۔ کچھ گاڑیوں کے عقب میں فربہ اندام رائے زل کی تصویر والے پوسٹر بھی دکھائی دیتے تھے۔ یہ نیم رہائشی علاقہ تھا۔ دائیں بائیں گھروں کے دروازے تھے۔

اچانک ہم سے چالیس پچاس قدم آگے جاتا ہوا بن مشہد رک گیا اور جھک کر اپنے بوٹوں کے تسمے درست کرنے لگا۔ ہم اس کے نزدیک ہوتے چلے گئے۔ ہمیں اس کے قریب ہی ایک نیلے رنگ کا چھوٹا سا گیٹ نظر آیا۔ شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ قسطینا نے کال بیل پر انگلی رکھی۔ چند سیکنڈ بعد ہی ہم اس گھر کے اندر تھے۔ یہاں ایک اجلے چہرے والی ادھیڑ عمر خاتون اور چھ سات سال کی بچی کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ گھر کی آرائش مقامی انداز کی تھی۔ بید کا فرنیچر، جالی دار کھڑکیاں، ان ڈور پھولوں کی بیلیں، جوتے باہر اتارے جاتے تھے اور اہلِ خانہ صاف ستھرے فرش پر ننگے پاؤں پھرتے تھے۔ ہم نے بھی جوتے دہلیز پر اتار دیئے۔ یہاں فرش کی چٹائیوں پر بیٹھنے کا رواج تھا۔ میں اور قسطینا بھی بیٹھ گئے۔ ادھیڑ عمر عورت قسطینا پر صدقے واری ہو رہی تھی۔ اس نے کئی بار قسطینا کے ہاتھ چومے۔ وہ قسطینا کے ساتھ ملائی زبان میں جو گفتگو کر رہی تھی اس کے چیدہ چیدہ الفاظ میری سمجھ میں آ رہے تھے۔ وہ قسطینا کو بطور قسطینا اور فوجی کمانڈر جانتی تھی اور اسے اپنا نجات دہندہ تصور کرتی تھی۔

پتا چلا کہ یہ بن مشہد کی والدہ ہے۔ بن مشہد کی بیوی اور تین بچے دو سال پہلے ایک المناک حادثے میں ہلاک ہو چکے تھے۔ صرف یہ ایک بیٹی بچی تھی، جو خوش قسمتی سے حادثے کے وقت کار میں موجود نہیں تھی۔ یہ کار نیوسٹی کے مضافاتی ٹیلوں میں ایک بارودی سرنگ سے ٹکرا کر اُڑ گئی تھی۔ اس حادثے کا لیفٹیننٹ بن مشہد پر بہت گہرا اثر ہوا تھا اور اس کے دل میں ہمیشہ کے لیے رائے زل کے لیے نفرت بیٹھ گئی تھی۔ اس حادثے کا اس کی بڑی بچی ناز و نے بھی گہرا اثر لیا تھا۔ اس کی زبان بند ہو گئی تھی اور وہ دو سال سے خاموش تھی۔ ڈاکٹروں کے مطابق قوتِ گویائی سے محروم ہو چکی تھی۔ اس وقت بھی وہ اپنی دادی سے اشاروں کنائیوں میں گفتگو کرتی نظر آتی تھی۔ جب اسے قسطینا سے معلوم ہوا کہ میں بھی قوتِ گویائی سے محروم ہوں تو وہ دلچسپی سے میری طرف دیکھنے لگی اور اشاروں میں باتیں کرنے لگی۔

بن مشہد کی والدہ ان لوگوں میں سے تھی جو نیوسٹی میں رہنے کے باوجود عزت مآب کے وفادار تھے اور خواہش مند تھے کہ موجودہ لڑائی میں عزت مآب کے خاندان کو فتح نصیب ہو۔

کچھ ہی دیر بعد بن مشہد بھی گھر آ گیا۔ اب وہ یونیفارم کے بغیر تھا اور پینٹ شرٹ میں ایک عام مقامی شخص نظر آتا تھا۔ وہ ایک پُرتکلف ناشتے کے لوازمات لے کر آیا تھا۔ وہ کچھ فکرمند بھی نظر آ رہا تھا۔

ناشتے کے بعد علیحدہ کمرے میں اس نے قسطینا کو بتایا کہ جگہ جگہ ناکے لگے ہوئے ہیں اس لیے تلاشی کے بغیر ہمارا ''برج کلب'' تک پہنچنا ممکن نہیں ہے۔

برج کلب کا لفظ میں یہاں ہونے والی گفتگو میں پہلے بھی دو تین بار سن چکا تھا۔ جب کچھ دیر بعد بن مشہد اپنی والدہ کے پکارنے پر باہر چلا گیا تو میں نے قسطینا سے برج کلب کے بارے میں پوچھا۔

وہ بولی۔ ''یہ وہ جگہ ہے جہاں رائے زل کی فوج کے افسر ویک اینڈ پر اپنی ''تھکن'' اتارنے کے لیے آتے ہیں۔ وہی ناچ گانا، وہسکی ایکسٹرا ایکسٹرا......'' قسطینا کے لہجے میں نفرت آمیز طنز تھا۔

''اور آپ کا خیال ہے کہ آج رات چیف گیرٹ بھی وہاں موجود ہوگا۔''

''ہماری اطلاعات تو یہی ہیں۔ ایجنسی والے اب کھل کر سامنے آ گئے ہیں۔ رائے زل کے فوجی اور ایجنسی اہلکار کندھے سے کندھا ملا کر لڑ رہے ہیں اور کندھے سے کندھا ملا کر عیش بھی کر رہے ہیں۔''

''آپ کا خیال ہے کہ آپ وہاں گھس سکتی ہیں؟''

''اس کلب کا کافی بڑا حصہ اوپن ایئر ہے۔ میں ایک دفعہ پہلے بھی ڈینی فلاور لے کر وہاں جا چکی ہوں۔''

''فرض محال، آپ وہاں گھس گئیں۔ آپ کو سخت سیکیورٹی کے باوجود چیف گیرٹ کے قریب جانے کا موقع بھی مل گیا اور آپ نے اسے شوٹ بھی کر دیا، تو کیا آپ وہاں سے بچ کر نکل پائیں گی؟''

''اس کا دارومدار درست ٹائمنگ پر ہے۔ اگر برقی رو درست ٹائم پر منقطع کی گئی تو بچ نکلنا شاید مشکل نہیں ہوگا۔''

''یعنی یہاں آپ کا کوئی ایسا ساتھی موجود ہے جو عین وقت پر برج کلب کی بجلی بند کر دے گا؟''

''صرف برج کلب کی نہیں۔ اس پورے ایریا کی بجلی بند ہو گی۔ بجلی کے ''سب ڈویژنل آفس'' میں ایک اہلکار مقررہ وقت پر یہ کام کرے گا۔''

''تو کیا برج کلب میں متبادل انتظام نہیں ہے۔ مطلب کہ جنریٹر یا یو پی ایس وغیرہ؟''

''شاہ زائب! یہاں بجلی شاذونادر ہی کبھی فیل ہوتی ہے۔ جنریٹرز تو برج کلب میں بھی ہیں لیکن ذمے دار لوگوں کو ان تک پہنچنے اور انہیں آن کرنے میں کم از کم پانچ منٹ تو لگ ہی جائیں گے۔ اس دوران میں، میں اپنا کام کر سکتی ہوں۔''

''یہ سب کچھ بہت خطرناک لگ رہا ہے قسطینا۔ اگر آپ نے...... اس قسم کا اٹیک کرنا ہی ہے تو کیا آپ اسے راستے میں پلان نہیں کر سکتیں؟ میرا مطلب ہے کہ چیف گیرٹ کو کہیں آتے جاتے...... راستے میں نشانہ بنانے کا پلان؟''

''نہیں شاہ زائب! اس سلسلے میں کافی سوچا گیا ہے بلکہ دو تین ماہ پہلے دور مار رائفل سے اس طرح کی ایک کوشش ہو بھی چکی ہے۔ سب سے بڑی رکاوٹ تو بلٹ پروف کار ہے۔ ویسے بھی سفر کے دوران میں وہ ہر وقت سخت سیکیورٹی کے حصار میں رہتا ہے۔''

بن مشہد واپس آ گیا تھا، ہمیں اپنی گفتگو کا سلسلہ روکنا پڑا۔ بن مشہد کی عمر اٹھائیس تیس سال کے لگ بھگ تھی۔ اس کی زندگی پر جو حادثہ گزرا تھا اس نے اس کے چہرے پر سنجیدگی اور درد کے گہرے نقوش چھوڑے تھے۔ وہ اندر آیا تو اس کی آنکھوں میں ایک امید کی کیفیت نظر آئی۔

وہ قسطینا سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ ''یور ہائی نس! شام کے وقت برج کلب تک پہنچنے کے لیے ایک راستہ تو نکل رہا ہے، اگر ہم فائدہ اٹھا سکیں تو......''

''بتاؤ، کیسا راستہ ہے؟''

''ابھی والدہ سے معلوم ہوا ہے کہ یہاں سے تین گھر چھوڑ کر ایک فوتیدگی ہوئی ہے۔ یہ ہمارے پڑوس میں رہنے والے انکل اسٹیفن ہیں۔ یہ قریبی مارکیٹ میں تمباکو کا کام کرتے تھے۔ فرائی ڈے کے روز دونوں طرف سے جو گولہ باری ہوئی، اس میں مارٹر کا ایک شیل ان کی دکان کی چھت پر گرا تھا۔ یہ زخمی ہوئے تھے۔ اس وقت تو ان کی حالت زیادہ بری نہیں لگتی تھی لیکن آج صبح یہ اسپتال میں انتقال کر گئے ہیں۔ ان کو شام چھ بجے کے قریب قبرستان لے جایا جانا ہے۔ یہ کرسچن قبرستان، برج کلب سے زیادہ دور نہیں ہے۔ میرا خیال ہے آپ نے دیکھا ہی ہو گا؟'

قسطینا نے اثبات میں سر ہلایا۔ بن مشہد نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''عام طور پر

جنازے کے جلوس میں پھول اور عطر بیچنے والے بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ آپ اس روپ میں بہ آسانی قبرستان تک جا سکتی ہیں۔ سیکیورٹی کتنی بھی سخت ہو لیکن یقینی بات ہے کہ فونرل (جنازے) کو روک کر تلاشی وغیرہ نہیں لی جا سکتی۔"

بات قسطینا کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ اس نے اس حوالے سے بن مشہد سے کچھ سوال جواب کیے اور ایک پروگرام ترتیب پا گیا۔

بچی نازو بڑی پیاری تھی۔ اشاروں کنائیوں میں بڑی پیاری اور دلچسپ باتیں کرتی تھی۔ بات کرتے ہوئے اپنے بالوں کو سپید ہاتھوں کے ساتھ بار بار پیشانی سے ہٹاتی تھی۔ اس کی معذوری دیکھ کر دکھ ہوا۔ جنگ لوگوں سے کیا چھینتی ہے اور خصوصاً بچوں اور عورتوں سے۔ میں یہ سوچ کر کانپ گیا کہ اگر رائےزل کے سپاہی اس گھرانے کی اصل حقیقت جان جائیں تو پتا نہیں کہ ان لوگوں پر کیا بیتے؟

شام سے تھوڑی دیر پہلے ہی ہم فوتیدگی والے گھر جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ بن مشہد کی والدہ نے قسطینا کے لیے ایک سیاہ شال فراہم کر دی تھی تا کہ وہ سوگوار کے روپ میں نظر آئے۔ بن مشہد گھر کی ایک ادھ کھلی کھڑکی میں سے مسلسل باہر گلی کا منظر دیکھ رہا تھا۔ جونہی ایک گاڑی پر رکھا ہوا تابوت اور اس کے عقب میں چلتے فونرل کے لوگ نظر آئے، ہم بھی لوگوں میں شامل ہو گئے۔ فونرل میں شامل لوگ سر جھکائے آہستہ آہستہ چل رہے تھے، ان میں عورتیں بھی تھیں۔ اکثر نے سیاہ کپڑے پہن رکھے تھے...... کچھ لوگوں نے سیاہ عینکیں لگا رکھی تھیں۔ بن مشہد بھی ان میں شامل تھا۔ جلوس کے پیچھے کچھ لوگ پھول اور موم بتیاں اٹھائے چل رہے تھے۔ ایک دو صلیب بردار بھی دکھائی دیئے۔

ہم شہر کی مختلف سڑکوں اور چوراہوں سے گزرتے ہوئے گنجان علاقے کی طرف بڑھتے رہے۔ یہاں سڑکیں نسبتاً کشادہ اور عمارتیں عالیشان تھیں۔ جگہ جگہ فوجی گاڑیاں اور ناکے بھی دکھائی دیئے۔ سیکیورٹی واقعی ہائی الرٹ تھی اور بن مشہد کی یہ بات درست معلوم ہوتی تھی کہ ہم پوچھ گچھ اور تلاشی کے بغیر اس علاقے میں سے ہرگز نہیں گزر سکتے تھے۔

قسطینا نے میری طرف دیکھے بغیر سرگوشی میں کہا۔ "دائیں طرف جو نیلے شیشے والی بلڈنگ ہے، اس کے ساتھ ہی برج کلب ہے۔"

میں نے کن انکھیوں سے کثیر المنزلہ عمارت کی طرف دیکھا۔ اس کی چھت پر خاکستری جھنڈے لہرا رہے تھے۔ پس منظر میں سورج کی الوداعی کرنیں تھیں۔ "یہاں سے زیادہ فاصلہ تو نہیں ہے۔" قسطینا نے بن مشہد سے مخاطب ہو کر کہا۔

''بالکل نہیں یور ہائی نس۔ اور میں آپ کو ایسا راستہ دکھاؤں گا کہ آپ دو منٹ میں برج کلب کے مین گیٹ پر ہوں گی۔''

ہم سڑک سے اتر کر ایک پتھریلے فٹ پاتھ پر چلتے قبرستان میں داخل ہو گئے۔ یہ گوروں کا قبرستان تھا۔ سنگِ مرمر کی مورتیاں، سنگی قبریں، پھول اور پری زادوں کے مجسمے جن کے ہاتھوں میں صلیبیں دکھائی دیتی تھیں۔ ہم بی بی مریم کے ایک مجسمے کے قریب کھڑے ہو گئے۔ تجہیز و تکفین کے مراحل شروع ہو گئے۔ باوردی سپاہیوں کی ایک ٹولی قبرستان میں داخل ہوئی۔ ان کے تیور خطرناک تھے۔ ان کے افسر نے معذرت کرنے کے بعد کہا۔ ''سوری لیڈیز اینڈ جنٹلمین! ہمیں اطلاع ملی ہے کہ یہاں ایک مطلوب فرد موجود ہے۔ آپ ہمیں جائزہ لینے کی اجازت دیں۔''

ایک پادری آگے بڑھا اور اس نے افسر سے کہا کہ وہ آگے آ کر اپنا فرض ادا کر سکتا ہے۔ فوجی افسر نے اپنے ہولسٹر میں سے پستول نکال لیا تھا۔ سپاہیوں کی ٹکڑی بھی الرٹ تھی۔ رائفلوں پر ان کی گرفت مضبوط ہو گئی تھی۔ میری رگوں میں خون سنسنا اٹھا۔ یقیناً قسطینا کی بھی یہی کیفیت تھی۔ افسر لمبے ڈگ بھرتا ہوا سوگوار لوگوں کی طرف بڑھا۔ وہ ایک ایک کا چہرہ غور سے تک رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ قسطینا نے اپنے ہاتھ کو چادر کے اندر ہی حرکت دے کر پستول اپنی ٹانگ کے بالائی حصے سے جدا کر لیا ہے۔ میں بھی ریڈ الرٹ تھا۔ فوجی افسر ہمارے عین سامنے رکا۔ میرا خیال تھا کہ قسطینا اب مزید انتظار نہیں کرے گی لیکن اس نے انتظار کیا اور یہ اس کی غلطی نہیں تھی۔ اگر وہ انتظار نہ کرتی تو غلطی ہوتی۔ یہ مضبوط اعصاب کی نشانی تھی۔ افسر ہمارے سامنے سے گزر گیا۔ قطار میں ہم سے آٹھ دس فٹ آگے کھڑا ہوا ایک نوجوان لڑکا اچانک بھاگا۔

''ہالٹ...... ہالٹ۔'' کی آوازیں بلند ہوئیں۔ لڑکے کی پھرتی قابلِ دید تھی۔ وہ کسی چھلاوے کی طرح قبروں کو پھاندتا اور اپنے جسم کو دائیں بائیں لہراتا ہوا بھاگا۔ فوجیوں نے ایک بار پھر وارننگ دی اور ساتھ ہی فائر کھول دیا۔ بھاگتے لڑکے کے اردگرد چنگاریاں سی چھوٹیں۔ وہ بیرونی دروازے کی طرف جا رہا تھا...... ابھی دروازے سے چند قدم دور تھا کہ گولیوں کی ایک اور بوچھاڑ آئی۔ وہ پلٹیاں کھاتا ہوا دو قبروں کے درمیان گرا اور ساکت ہو گیا۔

سوگواروں کے ہجوم میں بھگدڑ سی مچ گئی۔ لوگ تابوت کو گاڑی سے اتار رہے تھے۔ وہ لڑھک کر زمین بوس ہو گیا۔ اس افراتفری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بن مشہد نے قسطینا کو اپنے

پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ ہم دونوں اس کے پیچھے چل پڑے۔ تاریکی اب گہری ہو رہی تھی۔ لیکن قبرستان میں مدھم دودھیا روشنی موجود تھی۔ بغلی پھاٹک سے گزر کر ہم ایک تنگ سڑک پر آ گئے۔ نیلے شیشوں والی بلند عمارت کی جھلک یہاں سے بھی نظر آ رہی تھی۔ بن مشہد نے کہا۔ ''سیدھے چلتے جائیں، پہلے موڑ پر بائیں ہاتھ مڑ جائیں، چند منٹ میں آپ کلب کے سامنے ہوں گے۔''

میں اور قسطینا چل دیئے۔ کچھ آگے جا کر قسطینا نے اپنی سیاہ شال اتار کر جھاڑ جھنکاڑ میں چھپا دی اور سائلنسر والا پستول جو اس کے ہاتھ میں تھا، چغہ اٹھا کر دوبارہ ٹانگ سے منسلک کر لیا۔ اس نے کہا کہ میں اپنا پستول بھی اسے دے دوں۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ یہ ضروری ہے۔ اب ہم روشن اور بارونق علاقے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ قسطینا نے مجھے بتایا تھا کہ برج کلب گرے فورس کے فوجی افسروں کی پسندیدہ تفریح گاہ ہے۔ ابھی ہم کلب سے سو میٹر دور ہی تھے کہ میوزک اور ہاؤ ہو کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ کلب کے اوپن ایریا سے باہر گاڑیوں کی طویل قطاریں نظر آ رہی تھیں۔ یہ سب شاندار اور قیمتی گاڑیاں تھیں۔ کہیں کہیں کوئی فوجی جیپ بھی دکھائی دے جاتی تھی۔ مین گیٹ کے پاس ڈینی فلاور فروخت کرنے والے تین چار اور لڑکے بھی نظر آ رہے تھے۔ لیکن وہ باہر کھڑے آتے جاتے افسران اور ان کی بیگمات وغیرہ کو متوجہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ تاہم قسطینا بڑے اعتماد سے اندر جانے کے لیے بڑھی۔ ڈیوٹی پر موجود سیکیورٹی گارڈز نے اسے روکا۔ اس نے بڑے بے تکلف اور بھولے بھالے انداز میں ان سے دو چار باتیں کیں۔ یہ گفتگو ملائی زبان میں تھی۔ بہر حال مجھے اندازہ ہوا کہ اسے اندر جانے کی اجازت مل گئی ہے۔ لیکن وہ مجھے ساتھ لے جانے پر اصرار کر رہی تھی۔ گارڈز پہلے تو انکار کرتے رہے پھر ایک گارڈ نے مجھے سرتاپا دیکھا اور میری جامہ تلاشی لینے کے بعد مجھے جانے کی اجازت دے دی۔ یقیناً وہ لوگ یہی سمجھتے ہوں گے کہ ہم سیکیورٹی کے کئی حصاروں سے گزر کر آئے ہیں اس لیے بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت نہیں۔

ہم اندر داخل ہو گئے۔ ایک پھول بیچنے والی اور بھی یہاں موجود تھی۔ خوب صورت وسیع ہال میں گول میزوں کے اردگرد خوش باش خواتین و حضرات بیٹھے تھے۔ ان میں ایجنسی والے سفید فاموں کی بھی بڑی تعداد دکھائی دیتی تھی۔ وہ فتح کے نشے میں چور تھے۔ قریباً تمام سفید فام افسران کے پہلو میں خوش اندام و خوش پوش مقامی حسینائیں نظر آ رہی تھیں۔ ان میں سے ہو سکتا ہے کہ کچھ گرل فرینڈز ہوں لیکن بیشتر کا پیشہ حسن فروشی نظر آتا تھا۔ قسطینا نپے تلے انداز

میں میزوں کے درمیان گھومتی رہی۔ میں زخمی بازو گلے میں لٹکائے اس کے عقب میں تھا۔

پھولوں کے شوقین دو دو چار چار یا اس سے زائد پھول خریدتے تھے۔ نرگس کے پھولوں کی مانند ان کی ڈنڈیاں لمبی تھیں۔ قسطینا پھولوں کو بڑی چابکدستی سے ایک چمکیلے "ریپر" میں اس طرح لپیٹتی تھی کہ ڈنڈیاں یکجا ہو جاتی تھیں اور پھول چھوٹے سے گلدستے کی شکل اختیار کر لیتے تھے۔ پھول خریدنے والے اپنی مرضی سے کچھ رقم قسطینا کے ہاتھ پر رکھ دیتے تھے۔ یہ نایاب پھول تھے اور ان کی قیمت مقامی کرنسی میں فی پھول پانچ "برونائی ڈالر" کے لگ بھگ تھی مگر خریدنے والے اپنی خوشی سے زیادہ ہی دے رہے تھے۔

یہاں مستیوں اور رنگ رلیوں کا عجیب سا ماحول تھا۔ مرد و زن ایک دوسرے کے قرب میں سرشار تھے۔ جام گردش کر رہے تھے اور فضا کھانوں کی خوشبو سے مہکی ہوئی تھی۔ ایک دو بہکے ہوئے افراد نے قسطینا سے بھی ہلکی پھلکی زبانی شرارت کی۔

مرد حضرات اپنی جگہ سے اٹھتے تھے اور کسی ایسی خاتون یا لڑکی کو اپنے ساتھ رقص کی دعوت دیتے تھے جو اکیلی ہوتی تھی۔ عام طور پر یہ دعوت قبول کی جا رہی تھی۔ جوڑا ڈانسنگ فلور کی طرف بڑھ جاتا تھا اور وہ لوگ محو رقص ہو جاتے تھے۔ یہ رقص کی رسم بھی مغربی اقوام نے خوب نکالی ہے۔ عورت اور مرد کے درمیان مہینوں اور سالوں کا فاصلہ منٹوں میں طے ہو جاتا ہے۔ جب ہاتھ میں ہاتھ لے لیا جائے۔ مرد اپنا بازو عورت کی کمر میں حمائل کر دے اور عورت کا جسم اس کو چھونے لگ جائے تو پھر باقی کیا رہ جاتا ہے۔ یہاں بھی جسم تھرک رہے تھے، نگاہیں بجلیاں گرا رہی تھیں اور شراب کا نشہ اس باہمی ملاپ کو دوآتشہ کر رہا تھا۔ کئی مناظر تو ایسے تھے جن سے قسطینا کو یقیناً آنکھ چرانا پڑ رہی ہو گی۔ اگر آؤٹ ڈور میں یہ حال تھا تو اندر کیا کچھ ہو گا۔

قسطینا کے باکس کے قریباً آدھے پھول ختم ہو چکے تھے۔ ہم میزوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے ایک جانب آ گئے۔ کلب کے اندرونی حصے میں جائے بغیر ہمارا مقصد پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ جیسا کہ قسطینا نے بتایا تھا، بڑے فوجی افسران اور چیف گریٹ کا ٹھکانا اندرونی حصہ ہی تھا۔ لیکن اندر جانے والے دروازے پر واک تھرو گیٹ تھا اور تلاشی ہو رہی تھی۔ یہاں مردانہ کے علاوہ زنانہ تلاشی کا بھی انتظام تھا۔ سیکیورٹی کی دو لیڈیز اہلکار بھی دکھائی دے رہی تھیں۔

"اب تو بجلی جانے کا انتظار ہی کرنا پڑے گا۔" قسطینا نے سرگوشی میں کہا۔

"کیا ٹائم ہوا ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے اپنے اسکرٹ نما چغے کی آستین سرکا کر وقت دیکھا۔ ''نو بجنے میں بائیس منٹ ہیں۔ بجلی پورے پونے نو بجے بند ہوگی۔ یعنی ابھی سات آٹھ منٹ ہیں ہمارے پاس۔ جونہی لائٹ بند ہوگی، میں اندر گھسنے کی کوشش کروں گی۔ تم کو اسی جگہ موجود رہنا ہے۔ اگر میں بچ گئی تو باہر نکلنے کی کوشش کروں گی اور سیدھی تمہاری ہی طرف آؤں گی۔ تم کو اپنے پستول سے مجھے کور دینا ہے، یہ دیکھو...... یہاں سے باؤنڈری وال کم اونچی ہے۔ ہم یہاں سے پھلانگ کر نکلنے کی کوشش کریں گے۔''

میں نے کہا۔ ''لیکن پستول میرے پاس ہے کہاں؟''

قسطینا نے احتیاط سے اپنے اسکرٹ کے نیچے ہاتھ ڈالا اور میرا پستول مجھے واپس کر دیا جسے میں نے شرٹ کے نیچے اپنی کمر کی طرف اڑس لیا۔ ''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا قسطینا، آپ اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر کلب کے ہال میں گھس بھی گئیں تو سیدھی چیف گیرٹ تک کیسے پہنچ جائیں گی؟''

اس نے باکس کے خانے میں رکھی پنسل ٹارچ کی طرف اشارہ کیا۔ ''میں اس کی مدد لوں گی اور اسی کی مدد سے تم میری واپسی پر مجھے پہچانو گے۔ تم اس کی لائٹ دیکھ ہی رہے ہو۔ بالکل سیدھی اور باریک ہے۔''

''اتنے بڑے ہال میں آپ چیف تک کیسے پہنچیں گی؟''

''مجھے معلوم ہے شاہ زائب کہ وہ اس ہال میں کس میز پر بیٹھتا ہے۔ تم ان باتوں کی فکر نہ کرو۔ بس ایکشن کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

''میں ایک بار پھر کہوں گا قسطینا! آپ اس ایکشن کا خطرناک ترین حصہ خود پرفارم کرنا چاہ رہی ہیں...... یہ ٹھیک نہیں۔''

''یہ ٹھیک ہے...... کیونکہ بلٹ پروف جیکٹ تمہارے جسم پر نہیں میرے جسم پر ہے۔''

اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے پیٹ سے ٹچ کیا۔

اور تب مجھے احساس ہوا کہ اس نے اسکرٹ نما چغے کے نیچے بلٹ پروف جیکٹ بھی پہن رکھی ہے لیکن جب میں نے اسے اسپائی کیمرے کی آنکھ سے لباس اتارتے اور پہنتے ہوئے دیکھا تھا، اس وقت تو اس نے یہ جیکٹ نہیں پہنی تھی۔ مجھے اس ہوش ربا منظر کا ایک ایک لمحہ یاد تھا (بعد ازاں معلوم ہوا کہ یہ جیکٹ پہننے کا خیال اسے بعد میں آیا تھا)

ایک افسر ڈینی فلاورز والے باکس کو دلچسپی سے دیکھتا ہوا ہماری طرف بڑھا۔ اس کے ساتھ ایک لڑکی اس ادھورے لباس میں تھی جسے عرف عام میں ٹاپ لیس کہا جاتا ہے۔

کندھوں سے ''کافی'' نیچے تک سب کچھ روزِ روشن کی طرح عیاں ہوتا ہے۔ افسر سادہ لباس میں تھا تاہم اس کے طور اطوار اور گرما گرم انداز ظاہر کرتا تھا کہ وہ گرے آرمی سے تعلق رکھتا ہے۔ لڑکی کے بالوں کو تین ڈینی فلاورز کا تحفہ دے کر اور اسے بغل میں داب کر وہ آگے بڑھ گیا۔

گھڑی کی سوئیاں تیزی سے حرکت کر رہی تھیں۔ کلب کے ہنگامے بتدریج جوان ہو رہے تھے۔ موسیقی، مستی، لذتِ دہن، سب کچھ یکجا ہو گیا تھا۔ شاید واقعی یہ پرسوں رات والی فتح کا جشن تھا لیکن جشن منانے والوں کو خبر نہیں تھی کہ جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی۔ جنگ نہ صرف جاری ہے بلکہ ان کے درمیان دو ایسے نفوس بھی پہنچ چکے ہیں جو ان کی اس مستی بھری رات کو تہ و بالا کر سکتے ہیں۔

تفصیلات طے ہو چکی تھیں۔ اب مجھے اور قسطینا کو لائٹ آف ہونے کا انتظار تھا۔ ذہن میں کئی شکوک بھی جنم لے رہے تھے جن میں سب سے اہم یہ تھا کہ کیا الیکٹرسٹی کے کسی ڈویژنل آفس میں بیٹھا ہوا بندہ وقت مقررہ پر بجلی کی رَو منقطع کر سکے گا یا نہیں؟ جوں جوں گھڑی کی سوئیاں مقررہ وقت کی طرف بڑھ رہی تھیں، ہماری دھڑکن بڑھ رہی تھی۔ میں نے دودھیا گارڈن لائٹ میں دیکھا قسطینا کے چہرے پر مصمم ارادے کی جھلک تھی۔ اس کی نم آنکھوں میں جیسے اپنے پیارے والد کی موت کا غم دہک رہا تھا۔ اس کی نگاہیں کلب کے ہال کے دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ جنگی ماحول کی وجہ سے ہال کی دیوار گیر کھڑکیوں پر سیاہ کاغذ چپکا دیئے گئے تھے تاکہ روشنی باہر نہ آسکے، تاہم جب ہال کا دروازہ کھلتا تھا، اندر سے ڈسکو لائٹ کے رنگ اپنی جھلک دکھاتے تھے۔ موسیقی کی دھما دھم اور پُرمسرت قہقہوں کی بوچھاڑ چند سیکنڈ کے لیے سماعت کو جھنجوڑ کر غائب ہو جاتی تھی۔

اب نو بجنے میں پندرہ منٹ تھے۔ یہی مقررہ ٹائم تھا۔ اچانک روشنیاں گل ہو گئیں۔ برج کلب ہی نہیں اردگرد کی کئی عمارتیں بھی تاریکی میں ڈوب گئیں۔

''اوکے...... شاہ زائب...... میں جاتی ہوں۔'' اس نے میرا ہاتھ ہولے سے دبایا اور ایک عزم سے اندرونی حصے کی طرف بڑھی۔ ابھی وہ آٹھ دس قدم ہی گئی ہو گی کہ یکایک سارا برج کلب ایک بار پھر پوری آب و تاب سے روشن ہو گیا۔ قسطینا ٹھٹک کر رک گئی۔ اس کے ہاتھ میں پنسل ٹارچ نظر آرہی تھی مگر اپنا سائلنسر لگا پستول ابھی اس نے ہاتھ میں نہیں لیا تھا۔

وہ جلدی سے میرے پاس واپس آگئی۔ پھولوں والا چوبی باکس بدستور اس کے گلے میں تھا۔ اس کا رنگ اڑا ہوا سا تھا۔ ''مائی فٹ۔'' وہ دانت پیس کر بولی۔ ''لگتا ہے کہ جنریٹرز کا

سسٹم ''اپ ڈیٹ'' کر دیا گیا ہے۔''

یہ بہت بڑا اسیٹ بیک تھا۔ اردگرد کی بلند عمارتیں ابھی تک تاریک تھیں۔ ان میں بس جزوی طور پر ہی کہیں کہیں ہلکی روشنی دکھائی دے رہی تھی...... مگر برج کلب کے جنریٹرز پوری انرجی سے چل رہے تھے۔ ''اب کیا ہوگا؟ یہ تو پورا پلان ہی ڈسٹرب ہو گیا۔'' میں نے سرگوشی کی۔

قسطینا کی حالت زخمی شیرنی کی تھی۔ تاہم وہ اپنے تاثرات کو حتی الامکان کنٹرول میں رکھے ہوئے تھی۔ کسی وقت دھیمی سی میٹھی آواز میں ''ڈینی فلاور'' کی آواز بھی لگا دیتی تھی۔ بظاہر تو یہی لگ رہا تھا کہ ہم اندرونی حصے میں نہیں جاسکیں گے۔ یہاں دروازے پر واک تھرو گیٹ سے آگے دو ہٹی کٹی لیڈی اہلکار کھڑی تھیں...... اور جس خاتون پر شک ہوتا تھا، اسے چند سیکنڈ کے لیے سرچ روم میں لے جاتی تھیں۔

قسطینا کے چوبی باکس میں پھول مسلسل کم ہوتے جا رہے تھے اور اس نے کرنسی ڈالنے کے لیے اپنے کندھے سے جو بٹوا نما بیگ ڈالا ہوا تھا، وہ بھاری ہو رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''سارے پھول ختم ہو گئے تو ہمارے یہاں کھڑے ہونے کا کوئی جواز نہیں رہے گا۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور زیادہ فکرمند نظر آنے لگی۔ اسی دوران میں بجلی کی رو دوبارہ آ گئی اور جنریٹرز آٹومیٹک طریقے سے بند ہو گئے۔ قسطینا نے ٹھنڈی سانس لی۔ موسیقی کی دھما دھم پھر پورے زور وشور سے گونجنے لگی۔ سامنے اوپن ائر رقص گاہ پر جسم پھر تھرکنا شروع ہو گئے۔ لہراتے آنچل، جھومتی زلفیں، بہکی ادائیں اور بھونرا صفت مرد، پھولوں کا رس چوسنے کو بے قرار۔

ایک ٹن مقامی فوجی ہمارے قریب سے گزرا رک کر چند سیکنڈ قسطینا کو گھورتا رہا۔ اپنے سیاہ گھنگریالے بالوں اور کاسٹیوم کے ساتھ وہ جزیرہ جاماجی کی ایک الھڑ لڑکی ہی نظر آتی تھی۔ رخساروں پر گلاب کھلے ہوئے، لابنی شفاف گردن، رسیلے ہونٹ اور دل میں اترتی ہوئی نگاہیں۔ فوجی اپنے رینک اور اطوار سے کوئی درمیانے درجے کا آفیسر ہی لگتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شراب کی سرخی تھی، اس نے مسکرا کر ملائی زبان میں قسطینا سے کچھ کہا۔

قسطینا پہلے تو جھجکی پھر اس نے مختصر جواب دیا۔ پتا نہیں کیا جواب تھا لیکن مجھے لگا کہ اس جواب سے گرے فورس کے اس آفیسر کی حوصلہ افزائی ہوئی ہے۔ وہ قریب آ گیا اور بہکے بہکے انداز میں باکس کے اندر ڈینی کے پھول گننے لگا۔ ''ون ٹو تھری فور......''

اس نے قریباً پچیس پھول گنے، پھر پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور تین چار بڑے

نوٹ نکال کر قسطینا کے ہاتھ میں تھما دیئے۔ باکس میں سے سارے پھول نکال کر اس نے دو اپنے کانوں میں اڑسے اور تین چار قسطینا کے بالوں میں ٹانک دیئے۔ اس نے اپنے کسی ملازم کو آواز دی۔ وہ دور سے دوڑا ہوا آیا۔ آفیسر نے باقی پھول اسے تھما دیئے اور قسطینا کے گلے سے خالی باکس اتار کر میری طرف بڑھا دیا۔ اس کی للچائی ہوئی نگاہیں مسلسل قسطینا کے سراپا پر گردش کر رہی تھیں۔ اس نے ملائی میں قسطینا سے کہا کہ وہ بہت خوب صورت ہے۔ وہ اس کے ساتھ رقص کرنا چاہتا ہے۔

قسطینا تذبذب دکھا رہی تھی مگر میرا دل کہہ رہا تھا کہ وہ اندر سے اس کام کے لیے تیار ہو چکی ہے۔ ''پلیز...... پلیز سویٹ ہارٹ۔'' مدہوش فوجی نے ایک بار پھر قسطینا کو کندھوں سے تھام کر کہا۔

چند ہی سیکنڈ بعد قسطینا اور وہ آفیسر لان کے ڈانسنگ فلور پر تھے۔ وہ قسطینا کو اپنی بانہوں کے گھیرے میں لے کر ناچنے لگا۔ سب اپنے اپنے حال میں مست تھے۔ ایک دو کے سوا شاید ہی کسی نے نوٹ کیا ہو کہ گرے فورس کا آفیسر جس لڑکی کو ڈانسنگ پارٹنر بنائے ہوئے ہے وہ کوئی ''ماڈرن محترمہ'' نہیں بلکہ ڈیزی فلاور بیچنے والی لڑکی ہے اور اگر کوئی نوٹ کر بھی لیتا تو اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ یہاں ہر کوئی بس اپنی خواہش کی آبیاری کر رہا تھا، اپنی ہی مستی کے ہاتھوں میں کھیل رہا تھا۔

ملائیشین خدوخال والا آفیسر قسطینا کو اپنے قریب تر کرتا جا رہا تھا۔ پھر میں نے وہ دیکھا جو مجھے واقعی اچھا نہیں لگا۔ آفیسر کے ہونٹ قسطینا کے ہونٹوں سے پیوست تھے۔ وہ اسے بار بار چوم رہا تھا۔ اگر وہ یہ سب کچھ برداشت کر رہی تھی تو پھر یقیناً اس کے پیچھے کوئی وجہ تھی۔ کوئی پلان تھا اس کے ذہن میں۔ مجھے خدشہ یہ تھا کہ اس کا ڈانسنگ پارٹنر کہیں اس پستول کی موجودگی سے آگاہ نہ ہو جائے جو اس کی ٹانگ سے منسلک تھا یا پھر وہ دھماکا خیز ڈیوائس جو قسطینا نے اپنے پہلو سے اٹیچ کر رکھا تھا...... یا پھر قسطینا کی بلٹ پروف جیکٹ جو اس کے لبادے کے نیچے تھی، لیکن یوں لگتا تھا کہ آفیسر قسطینا کی خوب صورتی اور اس کے چہرے میں اس قدر منہمک ہے کہ اسے باقی چیزوں کا احساس ہی نہیں۔ طرہ یہ کہ شراب نے اس کے حواس مختل کر رکھے تھے۔ رقص کرنے والے جوڑے ناچتے ناچتے ایک بار گھومتے اور دوبارہ اپنے پاؤں کو آگے پیچھے حرکت دینے لگتے۔

ایک دو منٹ مزید گزرے پھر میں نے دیکھا کہ تمتمائے چہرے والا آفیسر قسطینا کو اپنی بغل میں دبا کر فلور سے اتر آیا اور ان سیڑھیوں کی طرف بڑھا جو کلب کی بالائی منزل کی طرف

جاتی تھیں۔ سیڑھیوں کے نچلے سرے پر بھی سیکیورٹی گارڈز موجود تھے۔ لیکن انہوں نے اپنے آفیسر کو دیکھ کر سلیوٹ کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کیا۔ آفیسر قسطینا کو لے کر بڑی شتابی کے ساتھ سیڑھیوں میں اوجھل ہو گیا۔ اس کے ذہن میں تو یقیناً یہی تھا کہ وہ ایک من پسند لڑکی کو اپنے بیڈروم میں لے جا رہا ہے۔ جو اس کی شب کو رنگین تر بنائے گی لیکن وہ جانتا نہیں تھا کہ وہ اپنے لیے کتنی بڑی مصیبت کو دعوت دے رہا ہے۔ قسطینا نے کمال ہمت سے اپنے ہونٹوں اور اپنے چہرے پر اس کا لمس برداشت کیا تھا اور اب یقیناً وہ اس کی قیمت وصول کرنے والی تھی۔ اس کے سینے میں اپنے والد کے انتقام کی جو آگ بھڑکتی تھی، میں اس کی تپش کو اچھی طرح جانتا تھا۔

میں وہیں ایک کونے میں گھاس پر بیٹھ گیا اور کلب کے اندر اور باہر کی رونقیں دیکھنے لگا۔ کہا جاتا ہے کہ جنگ کے زمانے میں اخلاقی قدریں بہت پیچھے چلی جاتی ہیں۔ یہی کچھ میں یہاں دیکھ رہا تھا۔ کچھ مقامی رقاصائیں تقریباً بے لباس ہو گئی تھیں اور ڈانسنگ فلور پر اپنے حسن کے جلوے بکھیر رہی تھیں۔ ایک ایسی ہی مدہوش لڑکی میز پر چڑھ کر ناچ رہی تھی اور تین چار حضرات نے میز کو تھام رکھا تھا تاکہ وہ گر نہ جائے۔ گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ قسطینا کے بارے میں میری تشویش بڑھتی جا رہی تھی۔ پتا نہیں کہ اندر اس کو کیا حالات پیش آتے۔ اس کے لباس کے نیچے چھپی ہوئی چیزیں کسی بھی وقت آرمی آفیسر پر آشکار ہو سکتی تھیں۔ اس کی وگ اترنے کا اندیشہ بھی موجود تھا اور یہ اندیشہ بھی کچھ ایسا غلط نہیں تھا کہ کوئی اسے شکل سے ہی پہچان لیتا۔

اچانک میں ٹھٹکا۔ ایک اردلی ٹائپ شخص سیدھا میری ہی طرف آ رہا تھا، اس نے آ کر اشارے سے مجھ سے کہا کہ اوپر مجھے بلایا جا رہا ہے۔ وہ مجھے گونگا ہی سمجھ رہا تھا اور اشاروں سے مجھے سمجھا رہا تھا کہ میری ساتھی لڑکی (قسطینا) اور باس مجھے بلا رہے ہیں۔ مجھے اوپر جانا مناسب لگا۔ پھولوں والا خالی باکس میرے پاس تھا۔ میں نے اس چوکور باکس کو اٹھا لیا اور ملازم کے ساتھ چل پڑا۔ سیڑھیوں پر موجود گارڈز نے مجھے اوپر جانے دیا۔ دس پندرہ زینے طے کر کے ہم بالائی منزل کے ایک کوریڈور میں آ گئے۔ یہاں اسنوکر، بلیئرڈ اور بیڈمنٹن وغیرہ کے لیے ہال بنے ہوئے تھے۔ کچھ آگے جا کر رہائشی کمرے شروع ہو جاتے تھے۔ ہر کمرے کا ایک نمبر تھا۔ نیچے ہال میں گونجنے والی موسیقی اور مخمور قہقہوں کا شور یہاں بہت مدھم آواز میں پہنچ رہا تھا۔ ایک دروازے کو کھول کر اردلی نما شخص اندر داخل ہو گیا۔ یہ دو تین کمرے پر مشتمل ایک لگژری اپارٹمنٹ تھا۔ مجھے بیرونی کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ دو تین منٹ کے اندر میرے

سامنے کھانے پینے والی اشیا کا انبار لگا ہوا تھا۔ روسٹ مچھلی، چکن کباب، ایگ فرائیڈ رائس اور کئی مقامی ڈشیں۔ ملازم نے مسکراتی نظروں سے میری طرف دیکھا جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا ہو...... تمہاری ساتھی، اندر میرے صاب کو ''سروس'' مہیا کرنے میں مصروف ہے تم یہاں بیٹھ کر کھاؤ پیو۔

ملازم کو دکھانے کے لیے میں چھوٹے چھوٹے لقمے لینے لگا۔ ملازم جہازی سائز کے ریفریجریٹر کی طرف متوجہ ہو گیا، اس نے وہاں سے وڈکا کی بڑی بوتل نکالی۔ ساتھ میں برف کی ٹکڑیوں کا ''باؤل'' برآمد کیا۔ دونوں اشیا کو بڑے سلیقے سے ایک خوب صورت منقش ٹرے میں سجایا اور اندرونی کمرے کی طرف لے گیا۔ یقیناً وہاں جاماجی کی سپریم کمانڈر قسطینا ایک گل فروش لڑکی کی حیثیت سے موجود تھی۔ کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا اور پھر وہ ہو گیا۔

مجھے سائلنسر لگے پستول کا فائر سنائی دیا۔ یہ آواز جیسے اس اپارٹمنٹ کے اندر ہی گونج کر رہ گئی تھی۔ پھر یکے بعد دیگرے دو فائر مزید ہوئے۔ میں نے اپنا پستول نکال لیا اور اپارٹمنٹ کا داخلی دروازہ اندر سے بولٹ کر دیا۔ چند سیکنڈ بعد اپارٹمنٹ کے اندرونی کمرے کا دروازہ کھلا اور میں نے قسطینا کو دیکھا سائلنسر لگا پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔

''آپ خیریت سے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

اسی دوران میں میری نگاہ قسطینا کے عقب میں گئی۔ وہاں اردلی کی لاش پڑی تھی۔ گولی اس کے سینے میں عین دل کے مقام پر لگی تھی اور خون کا ریلا قالین کو بھگو رہا تھا۔ ''آفیسر کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ بھی اپنے ٹھکانے پر پہنچ گیا ہے۔'' قسطینا نے سفاک لہجے میں کہا۔

اردلی کی لاش پھاند کر میں اندرونی کمرے میں پہنچا۔ گرے فورس کا افسر بیڈ پر اس طرح پڑا تھا کہ اس کی پتلون اس کے گھٹنوں پر تھی اور اس کی پیشانی خون سے رنگین ہو رہی تھی۔ اس کا اگلا دھڑ بیڈ سے نیچے لٹکا ہوا تھا۔ جیسے اس نے آخری وقت میں بھی قسطینا کو دبوچنے کی کوشش کی ہو۔ ایک گولی اس کے پیٹ میں لگی تھی جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا پیٹ میں لگنے والی بلٹ پہلے فائر ہوئی تھی۔

یکا یک بیرونی دروازے پر دستک ہونے لگی۔ ''کہیں فائر کی آواز باہر تو نہیں سنی گئی؟'' میں نے پُر اندیش لہجے میں کہا۔

''ہو سکتا ہے...... اور نہیں بھی۔'' قسطینا نے کہا۔ وہ بھی میری طرح دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ہم دونوں کے ہاتھوں میں پستول تھے۔

دس پندرہ سیکنڈ بعد دستک دوبارہ ہوئی ......مگر اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ دستک کی وجہ کچھ بھی ہوسکتی تھی مگر ہمارے لیے اطمینان کی بات یہ تھی کہ اب دروازے سے باہر کوئی موجود نہیں تھا۔

ہم نے دونوں لاشوں کو گھسیٹ کر لگژری باتھ روم میں پھینکا۔ آفیسر کی تلاشی سے چند اشیا ملیں جن میں اس کا سیل فون بھی تھا۔ اس کا سروس پسٹل اور آئی ڈی کارڈ وغیرہ بھی ہم نے اپنے قبضے میں لے لیا۔ اس کی گرے پتلون اب مزید کھسک کر اس کے ٹخنوں تک پہنچ چکی تھی۔ اسے باتھ روم میں چھوڑ کر ہم واپس کمرے میں پہنچے۔ قالین اور بستر پر کئی جگہ خون کے بڑے بڑے دھبے موجود تھے۔ انہیں صاف کرنا تو ممکن نہیں تھا۔ ہم نے انہیں ''فٹ میٹ'' اور چادروں وغیرہ سے چھپانے کی کوشش کی اور جزوی طور پر کامیاب رہے۔

''اب کیا کرنا ہے؟'' میں نے قسطینا سے پوچھا۔

وہ خونچکاں لاشوں کی طرف دیکھ کر بولی۔ ''ہم کارروائی شروع کر چکے ہیں۔ اب پیچھے ہٹنا ممکن نہیں۔ آگے ہی بڑھنا ہوگا۔''

''کیسے بڑھیں گی آگے؟''

''میری معلومات کے مطابق اس فلور پر کم ازکم دو راستے ایسے ہیں جو سیدھے مرکزی ہال میں اترتے ہیں۔''

''آپ کا مطلب ہے، سیڑھیاں ہیں؟''

''ہاں...... میں ان کا جائزہ لینے کی کوشش کرتی ہوں۔''

''مجھے لگتا ہے کہ آپ خودکشی کا ارادہ رکھتی ہیں۔''

''گھبراؤ مت شاہ زائب، میں اتنی آسانی سے نہیں مروں گی اور اگر مروں گی تو اس کی کم سے کم قیمت چیف گیرٹ کی موت ہوگی۔''

''لیکن میں آپ کو اس طرح اکیلے نہیں جانے دوں گا۔''

اس نے جلتی نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولی۔ ''شاہ زائب، تم پہلے سے زخمی ہو ہمارے درمیان طے ہوا تھا کہ تم میری ہدایات پر عمل کرو گے، میں بطور کمانڈر تمہیں حکم دے رہی ہوں کہ تم ابھی یہیں رکو گے، ویسے بھی میں ابھی صرف جائزہ لینے جارہی ہوں۔ کارروائی کرنا ہوگی تو تمہیں بتاؤں گی۔''

''اور اگر کارروائی خود بخود شروع ہوگئی تو؟''

''ایسا نہیں ہوگا۔ تم بے فکر رہو۔ اگر بالفرض محال ایسا ہو ہی گیا تو پھر تم اپنی سمجھ اور

حالات کے مطابق جو چاہو کر سکتے ہو۔''

وہ سنی اَن سنی کرتی ہوئی باہر نکل گئی۔ میں نے اس کی ہدایت کے مطابق داخلی دروازہ اندر سے بولٹ کرلیا۔ جاتے وقت قسطینا نے خود کو ایک شال میں چھپا لیا تھا...... شال کے نیچے سائلنسر والا پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔ میں اپارٹمنٹ میں الماریوں وغیرہ کی تلاشی لینے میں مصروف ہو گیا۔ اس تلاشی سے پتا چلتا تھا کہ کلب کے یہ کمرے اور اپارٹمنٹ صرف عیاشیوں کے لیے ہی استعمال ہوتے ہیں۔ اچانک میری نظر اس آفیسر کے ذاتی سیل فون پر پڑی جو اس وقت باتھ روم کے ٹب میں مردہ پڑا تھا۔ سیل فون پر میسج کا سگنل تھا۔ میں نے میسج پڑھا۔ اس کے کسی ماتحت لیفٹیننٹ نے لکھا تھا۔ ''سر لوکاس! کلب کی چھت والی اینٹی ائیر کرافٹ بالکل درست ہے اور کام کر رہی ہے۔''

میں IN BOX میں مزید پیچھے گیا۔ آج ہی کی تاریخ میں اس میں کئی پیغامات موجود تھے۔ کچھ کی نوعیت نجی تھی اور کچھ کی آفیشل۔ ایک میسج میں بارڈر کی صورتِ حال کا تذکرہ بھی تھا۔ قریباً چالیس منٹ پہلے آفیسر کو ایک اہم پیغام موصول ہوا تھا۔ یہ پیغام اسی لیفٹیننٹ کی طرف سے تھا۔ اس نے لکھا تھا۔ ''سر میں نے دونوں گنیں خود جا کر چیک کی ہیں۔ دونوں ہی کے کوائل سسٹم میں فالٹ ہے۔ وہ کام نہیں کر رہیں۔ آپ سمجھ سکتے ہیں یہ خطرناک ہے۔ کلب اور اردگرد کا سارا ایریا غیر محفوظ ہے۔'' جواب میں آفیسر لوکاس نے جو ٹیکسٹ میسج کیا تھا وہ بھی SENT MSG میں موجود تھا۔ اس نے لکھا تھا۔ فوراً چھت والی گن کو چیک کرو اور مجھے بتاؤ۔'' ساتھ ہی ذمے دار شخص کے لیے انگلش کی ایک عام فہم گالی بھی درج تھی۔ اس میسج کے جواب میں ماتحت لیفٹیننٹ نے وہ میسج ارسال کیا تھا جو میں نے سب سے پہلے دیکھا تھا یعنی ''......سر لوکاس! کلب کی چھت والی اینٹی ائیر کرافٹ بالکل درست ہے اور کام کر رہی ہے۔''

یہ آخری ٹیکسٹ پیغام آفیسر لوکاس کو قریباً بیس منٹ پہلے موصول ہوا تھا۔ یعنی یہ وہ آخری پیغام تھا جو اس نے اپنی زندگی میں موصول کیا تھا۔ صورتِ حال کچھ کچھ سمجھ میں آ رہی تھی۔ اس علاقے کا ائیر ڈیفنس کافی گڑبڑ تھا۔ غالباً رازداری کے خیال سے دونوں افسران نے وائس کال کرنے کے بجائے ٹیکسٹ پیغامات کا ذریعہ استعمال کیا تھا۔ ابھی میں یہ سب کچھ دیکھ ہی رہا تھا کہ دروازے پر مدھم سی مخصوص دستک ہوئی۔ یہ قسطینا تھی۔ میں نے پستول ہاتھ میں لے کر پشت کی طرف چھپا لیا اور دروازہ کھولا۔ قسطینا جلدی سے اندر آ گئی۔ اس کے چہرے پر پریشانی اور جھلاہٹ کے آثار تھے۔ اس نے شال کا گھونگھٹ سا نکال رکھا تھا۔

پستول اس کے ہاتھ میں تھا اور شال کے نیچے پوشیدہ تھا۔
اندر آتے ہی اس نے دروازہ اندر سے بولٹ کر دیا اور بے دم سی ہو کر صوفے پر بیٹھ گئی۔

''کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''حرامزادے...... سور کے بچے۔'' وہ دانت پیس کر بولی۔ ''اپنے اس باپ کے گرد انسانی ڈھال بنائی ہوئی ہے انہوں نے۔'' یقیناً وہ چیف گیرٹ اور اس کے محافظوں کا ذکر کر رہی تھی۔ تب میری نگاہ اس کی کلائی پر پڑی۔ کشادہ آستین میں سے اس کی گوری چٹی کلائی پر تازہ زخم نظر آ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ایک دو چوڑیاں ٹوٹ کر گوشت پر چرکا لگا گئی ہیں۔ میں نے ایک کپڑے سے اس کے خون کو مزید رسنے سے روکا اور پھر وہی کپڑا زخم پر باندھ دیا۔ وہ بولی۔ ''دونوں سیڑھیوں پر سخت پہرا ہے۔ سیڑھیوں کے اوپر بھی گارڈز کھڑے ہیں۔ نیچے جانا ناممکن ہے۔''

''یہ آپ کی کلائی......؟''

''ایک حرامی گارڈ نے مجھے نیچے جھانکتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ میری طرف آیا، میں ایک دروازے میں گھس گئی۔ یہ ٹیبل ٹینس کا خالی ہال تھا۔ وہ اندر آیا تو میں نے پستول کا دستہ مار کر اسے ڈھیر کر دیا۔''

''بے ہوش ہوا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں...... میں نے گھسیٹ کر ایک کونے میں ڈال دیا ہے۔ دروازے کو باہر سے لاک کر ڈالا ہے۔'' اس نے لاک کی چابی مجھے دکھاتے ہوئے کہا۔

وہ بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگی۔ اس کی بے قراری عروج پر تھی۔ وہ اپنے والد کے قاتل کے آس پاس پہنچ چکی تھی مگر اس کی گردن دبوچنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ وہ تلملا رہی تھی۔ آنکھوں سے آتشیں نمی جھلک رہی تھی۔ نیچے ہال کمرے میں محفل نشاط و طرب جاری تھی۔ کسی وقت بہت سے لوگ کورس کی شکل میں ہنستے تھے اور اس آواز کی گونج بالائی کمروں تک محسوس ہوتی تھی۔ بے شک ہم دونوں کلب کے اندرونی حصے میں پہنچ چکے تھے مگر اس مقام تک رسائی اب بھی ناممکن تھی جہاں چیف گیرٹ اور دیگر اعلیٰ افسران موجود تھے۔

قسطینا کی بے بسی دیکھتے ہوئے میں نے کہا۔ ''مجھے ایک بات کا پتا چلا ہے......''

''کیا؟'' وہ ٹہلتے ٹہلتے رک گئی۔

''یہ دیکھیں۔'' میں نے آفیسر لوکاس کی یونیفارم سے برآمد ہونے والا سیل فون قسطینا

کی طرف بڑھا دیا۔

میں نے پیغامات پڑھنے میں اس کی مدد کی۔ قسطینا کے چہرے پر توجہ اور دلچسپی کے تاثرات نمودار ہونے لگے۔ وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ پُرسوچ لہجے میں بولی۔ ''اس کا مطلب ہے کہ اس علاقے میں صرف ایک اینٹی ایئر کرافٹ ہے جو اس عمارت کی چھت پر ہے اور اگر اسے بھی بیکار کر دیا جائے تو اگلے ایک آدھے گھنٹے میں کلب پر بھرپور فضائی حملہ کیا جا سکتا ہے۔''

''بالکل یہ ممکن ہے۔''

وہ سنسنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ کچھ دیر تک ہم دونوں خاموش رہے، یقینی بات تھی کہ ہم دونوں ایک ہی انداز سے سوچ رہے تھے۔ وہ بولی۔ ''شاہ زائب! یہ چار منزلہ عمارت ہے۔ مطلب یہ کہ قریباً پینتالیس زینے چڑھ کر ہم اوپر چھت پر پہنچ سکتے ہیں اگر گن کے قریب زیادہ افراد نہیں ہیں تو پھر ہمارے لیے کچھ کر گزرنا مشکل نہیں ہوگا۔''

''اگر سیڑھیوں کے بجائے لفٹ سے چڑھا جائے تو؟''

''نہیں، میں دیکھ کر آئی ہوں لفٹ کی طرف کافی گارڈز ہیں۔ مگر سیڑھیوں کی طرف بھی کنفرم نہیں کہ گارڈز ہیں یا نہیں۔''

''اگر ہم گن کا کنٹرول حاصل کر لیتے ہیں تو پھر؟''

''مجھے پتا ہے شاہ زائب کہ اینٹی ایئر کرافٹ کو ناکارہ کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ ہم اس کو ایسا کر دیں گے کہ وہ کم از کم اگلے دس بارہ گھنٹے تک کسی کام کی نہیں رہے گی۔ اس کام کے فوراً بعد ہم کلب کی عمارت سے نکلنے کی کوشش کریں گے۔''

''اور نکلنے کے بعد؟''

''میری کوشش ہوگی کہ پہلی فرصت میں برج کلب پر فضائی حملے کا حکم دوں۔''

''کیسے دیں گی یہ حکم؟''

''یہی سیل فون استعمال کیا جا سکتا ہے۔'' قسطینا نے ہلاک ہونے والے آفیسر لوکاس کے فون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ یہاں ہماری موجودگی زیادہ دیر چھپی نہیں رہے گی۔ ہمیں جو کرنا ہے جلدی کرنا ہوگا۔''

اس نے ایک بار پھر میرے زخمی بازو کی طرف دیکھا۔ ''شاہ زائب، تمہارا بازو بہت زخمی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ اسے مزید نقصان پہنچے۔ تمہارے پاس بلٹ پروف بھی نہیں۔

تمہارے لیے یہاں رکنا زیادہ مناسب رہے گا۔ میں اوپر جاتی ہوں۔"
میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ کو پتا ہی ہے کہ کبھی کبھی کمانڈروں کو اپنے ماتحتوں کی طرف سے بغاوت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آپ سمجھیں کہ آپ کو بھی یہی صورتِ حال درپیش ہے۔ میں ہر صورت آپ کے ساتھ جاؤں گا۔ آپ کی اجازت سے اور آپ کی اجازت کے بغیر بھی......"
اس نے میری آنکھوں میں جھانکا اور چپ ہوگئی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اب میں باز نہیں آؤں گا۔ بے شک اس کا سامنا اپنے ہی جیسے ایک ڈھیٹ سے تھا۔ میں نے آخری جملہ مسکراتے ہوئے ادا کیا تھا۔ کبھی کبھی تناؤ اور خطرے کے بھرپور ماحول میں ایک ہلکی سی مسکراہٹ حیرت انگیز طمانیت اور حوصلے کا باعث بنتی ہے۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ میں نے قسطینا کے جوش میں نمایاں اضافہ محسوس کیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو کر تمتما رہا تھا۔ اس کی اپنی آنکھیں ہلکی براؤن تھیں لیکن فی الوقت اس نے گہرے سیاہ آئی لینز لگا رکھے تھے۔ وہ اپنی ان سیاہ پتلیوں کو خلا میں مرکوز کر کے جیسے آنے والی گھڑیوں کا منظر دیکھ رہی تھی۔ اس وقت یہاں کلب کے جشنِ طرب میں صرف چیف گیرٹ ہی نہیں، گرے فورس کے بہت سے اور سینئر کمانڈرز موجود تھے۔ ممکن تھا کہ حکومت کے کئی اعلیٰ عہدیدار بھی ہوں۔ اگر اس وقت کلب پر فضائی حملہ ہوسکتا تو رائے زل کا ناقابلِ تلافی نقصان ہوسکتا تھا۔
دو چار منٹ بعد ہم دونوں اس لگژری اپارٹمنٹ سے نکلنے کے لیے تیار تھے۔ دروازہ قسطینا نے ہی کھولا۔ ہم کوریڈور میں آئے۔ اوپر جانے والے زینے دس بارہ قدم دور تھے۔ قالین پوش زینوں کو طے کرتے ہوئے جب ہم گھومے تو ایک مدہوش منظر دکھائی دیا۔ یوں لگتا تھا کہ جزوی فتح کو رائے زل کے فوجیوں اور افسروں نے مکمل فتح سمجھ لیا ہے اور کھل کھلا کر اس کا جشن منا رہے ہیں۔ ایک جوڑا قالین پوش زینوں پر ہی مصروفِ عمل تھا۔ ایک قدرے فربہ شخص نے روم سروس کی ایک ملازمہ کو بانہوں میں لیا ہوا تھا اور عشق و محبت کی مختلف منازل طے کر رہا تھا۔ شاید دونوں ہی نشے میں تھے۔ انہوں نے ہمیں دیکھ کر بھی نہیں دیکھا۔ ہم ان کے قریب سے گزرتے ہوئے بالائی زینوں پر آئے۔ ان زینوں کے آغاز پر ہی ایک مسلح گارڈ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ گن کے بجائے اس کے ہاتھ میں شیمپئن کی بوتل تھی اور گن دیوار کے ساتھ کھڑی کر دی گئی تھی۔ گارڈ کے ائیرفونز میں سے یقیناً موسیقی برآمد ہو رہی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں اور غنودگی میں تھا۔
میں نے آواز پیدا کیے بغیر اس کی رائفل اٹھالی۔ دبے پاؤں چلتے ہم چوتھی منزل پر

پہنچے۔ اور یہاں ہمیں پہلی بار مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ دو گارڈز تھے۔ ایک کی کنپٹی پر میں نے رائفل کے وزنی دستے کا تباہ کن وار کیا۔ یہ وار میں نے اپنے اکلوتے ہاتھ سے کیا تھا، مگر ایسا ''ٹو دی پوائنٹ'' تھا کہ گارڈ نے ''مزید'' کی ڈیمانڈ نہیں کی۔ دوسرے گارڈ کے سینے پر قسطینا نے سائلنسر لگے پستول سے فائر کیا...... اور پھر اسے اپنے بازوؤں پر سہارا تاکہ وہ گرتے وقت آواز پیدا نہ کرے۔ اس کی رائفل کی سنگین قسطینا نے اتار لی۔

فائر بے شک سائلنسر لگے پستول سے کیا گیا تھا۔ نچلی سیڑھیوں پر موجود گارڈ جاگ گیا۔ پہلے تو یقیناً اس نے اپنی گمشدہ رائفل کو دیکھا ہوگا پھر وہ دھاڑا۔ ''کون ہے؟''

ہم اسے جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ بھاگتے ہوئے چھت پر پہنچے۔ کافی کھلی چھت تھی۔ نیوسٹی میں آج مکمل بلیک آوٹ نہیں تھا۔ کچھ عمارتیں تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھیں لیکن کچھ میں ہلکی روشنیاں موجود تھیں۔ ایک قریبی چوراہے کے ٹریفک سگنلز جلتے بجھتے نظر آرہے تھے۔ چوراہے کے قریب ہی ایک ٹاور نما عمارت تھی۔ اس کی مختصر چھت پر ریڈار کے آثار دکھائی دیتے تھے جس قبرستان سے ہمارا گزر ہوا تھا، اس کے گرجے کی بلند صلیب بھی یہاں سے دکھائی دیتی تھی۔ چھت کے عین درمیان ریت کی بہت سی بوریاں چنی گئی تھیں۔ ان بوریوں کے درمیان سے اینٹی ایئر کرافٹ کی لمبی نال نظر آرہی تھی۔ گن کے اوپر ایک جال تان دیا گیا تھا۔ چھت پر پہنچتے ہی ہم دونوں دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑے ہوگئے۔ میں نے اپنی رائفل نیچے رکھ دی تھی۔ پھر وہی ہوا جس کی توقع تھی جس گارڈ کی رائفل پر میں نے قبضہ جمایا تھا، وہ بوکھلایا ہوا سا چھت پر آیا۔ میں نے عقب سے اسے اس طرح دبوچا کہ وہ آواز نہیں نکال سکا۔ میں نے اپنی ہتھیلی سے اس کے ہونٹوں کو مضبوطی کے ساتھ ڈھانپ لیا تھا اور یہ کارروائی میں نے اپنے اکلوتے ہاتھ سے ہی کی تھی۔ قسطینا نے بڑی صفائی سے کوئی ایک فٹ لمبی سنگین گارڈ کے سینے میں گھونپ دی۔ میں مضروب کو گھسیٹ کر اوٹ میں لے گیا۔ وہ چند سیکنڈ تک تڑپنے کے بعد ساکت ہوگیا۔ میں نے اسے چھت کے فرش پر ڈال دیا۔

تب تک قسطینا جھپٹتی ہوئی بوریوں سے بنے ہوئے مورچے تک پہنچ چکی تھی، میں نے اوپر تلے تین فائرز کی آواز سنی۔ یہ تینوں فائر قسطینا نے اپنے سائلنسر لگے پستول سے کیے تھے۔ میں بوریوں تک پہنچا۔ اندر جھانکا دو سپاہی ساکت پڑے تھے ایک کے ہاتھ میں ابھی تک ادھ کھایا ہوا چکن پیس تھا۔ اس کی ٹانگیں جان کنی کے عالم میں ہولے ہولے لرز رہی تھیں۔

''ٹائم زیادہ نہیں ہے ہمارے پاس۔ آپ کو جو کچھ کرنا ہے جلدی کریں۔'' میں نے

قسطینا سے کہا۔

وہ چھلانگ لگا کر مورچے کے اندر اتر گئی۔ مورچے کی دیواریں ریت کی تھیلا نما بوریوں کی مدد سے بنائی گئی تھیں اور تقریباً چار فٹ اونچی تھیں۔ میں ایک دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ رائفل دوبارہ میرے ہاتھ میں تھی۔ میں اس طرح کھڑا تھا کہ مورچے کے اندر قسطینا کو دیکھ سکتا تھا اور چھت پر کھلنے والے دروازے پر بھی نظر رکھ سکتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اینٹی ائیر کرافٹ گن کو ناکارہ کرنے کے لیے قسطینا اس کے کسی پرزے سے چھیڑ چھاڑ کرے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ پوری اسلحہ شناس تھی اور اس گن کو بھی اچھی طرح جانتی تھی۔ اس نے نوک دار سنگین کی ضرب سے ریت کی ایک بوری کو پھاڑا اور ریت سے مٹھی بھر لی۔

''کیا کر رہی ہیں؟''

''بس دیکھتے جاؤ۔'' اس نے کہا۔

گن کے چیمبر کے پاس سے اس نے ایک چوکور ڈھکن کا کلپ ہٹایا اور ڈھکن اٹھا کر مٹھی بھر ریت اس میں ڈال دی۔ ڈھکن دوبارہ بند کر کے اس نے ہاتھ جھاڑے اور بڑے اعتماد سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ دونوں ''گن مین'' اب ٹھنڈے ہو چکے تھے۔ ان کے جسموں سے بہنے والا خون، ان کی وردیوں کو بھگونے کے بعد اب مورچے کی چٹائی کو بھگو رہا تھا۔

یکا یک عمارت کے کسی نچلے فلور پر الارم بجنے لگا۔ یقیناً سیڑھیوں پر پڑے گارڈز کو دیکھ لیا گیا تھا یا پھر باتھ روم میں آفیسر لوکاس کی نیم برہنہ لاش کی رُونمائی ہو گئی تھی۔ ''لو جی گڑبڑ شروع ہو گئی۔'' قسطینا نے زقند بھر کر مورچے سے باہر آتے ہوئے کہا۔

''میں نے اس طرف بھی ایک دروازہ دیکھا ہے۔ شاید سیڑھیاں ہیں۔'' میں نے چھت کے مغربی گوشے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ہم اس جانب دوڑے۔ دروازہ کھولا۔ وہاں واقعی سیڑھیاں تھیں جو نیچے جا رہی تھیں۔ ساتھ ہی لفٹ کا دروازہ بھی دکھائی دے رہا تھا۔ لفٹ موجود تھی۔ میں نے بٹن دبایا۔ دروازہ کھل گیا۔ لفٹ میں لفٹ بوائے کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ وہ ایک اسٹول پر اکڑوں بیٹھا تھا۔ سیڑھیوں کے بجائے لفٹ استعمال کرنا کہیں زیادہ مناسب تھا۔ ہم لفٹ میں گھس گئے۔ میری آستین پر خون دیکھ کر اور الارم کی آواز سن کر لفٹ بوائے کو خطرے کا احساس ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ یہ دبلا پتلا لڑکا کوئی حرکت کرتا، قسطینا نے وہی کیا جو وہ پہلے کرتی آئی تھی۔ (اور یقیناً اس وقت ہم جس طرح کی سچویشن میں تھے، کسی طرح کی صلہ رحمی کی گنجائش نہیں تھی) اس نے لڑکے کی پیشانی پر دو فٹ کے فاصلے سے گولی ماری اور وہ جو چلانے کا ارادہ کر رہا تھا، مٹی کا

ڈھیر بن کر فرش پر گر گیا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور وہ جیسے تعجب کے عالم میں ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ پیشانی پر خون کی بس ایک چھوٹی سی لکیر تھی۔ میں نے گراؤنڈ فلور کے لیے لفٹ کا بٹن دبا دیا۔ لفٹ نیچے جانے لگی۔ اب معلوم نہیں تھا کہ باہر نکلنے پر کیا حالات پیش آنے ہیں۔ میں نے اپنی خون آلود آستین کو چھپانے کے لیے اوپر تک اڑس لیا۔ میرا ارادہ تھا کہ رائفل کو لفٹ کے اندر ہی رہنے دوں گا۔ میرا پستول شرٹ کے نیچے موجود تھا مگر اس کے بعد جو کچھ ہوا غیر متوقع تھا۔ لفٹ گراؤنڈ فلور پر رکنے کے بجائے مزید نیچے جانا شروع ہو گئی۔ ہم نے کنٹرول پینل پر ہاتھ مار کر اسے بار بار روکنے کی کوشش کی مگر اس میں کوئی خرابی تھی۔ وہ دو فلورز کے درمیانی حصے میں کہیں رکی اور پھر سے اوپر چڑھنے لگی۔ لفٹ بوائے ہی اسے راہِ راست پر لا سکتا تھا لیکن وہ داعیٔ اجل کو لبیک کہہ چکا تھا۔ ایک دو فلور اوپر چڑھنے کے بعد ہم اسے روکنے اور دوبارہ نیچے لے جانے میں کامیاب ہو گئے۔ تاہم اس مرتبہ بھی وہ گراؤنڈ فلور پر رکنے کے بجائے دو منزلیں نیچے جا کر رکی۔ یعنی ہم بیسمنٹ کے زیریں حصے میں تھے۔ بٹن دبا کر دروازہ کھولا۔ خوش قسمتی سے سامنے کوریڈور خالی تھا۔ نیچے آنے والی سیڑھیوں پر بھاگ دوڑ کی آوازیں آ رہی تھیں۔

ایجنسی کے کسی اہلکار نے چلا کر انگلش میں کہا۔ ''لفٹ نیچے گئی ہے...... تین نمبر لفٹ ہے۔ اس میں دیکھو۔''

سیڑھیوں پر گونجنے والی بھاری قدموں کی دھما دھم مزید تیز ہو گئی۔ ہم کوریڈور میں دس پندرہ قدم آگے گئے۔ مسلح گارڈز بیسمنٹ میں پہنچنے والے تھے۔ ہمیں دائیں جانب ایک بھاری بھرکم دروازہ نظر آیا۔ ہم نے اس کے ہینڈل کے ساتھ کوشش کی اور دروازہ کھل گیا۔ ہم اندر گھسے، یہ عجیب وضع کا مستطیل کمرا تھا۔ دروازہ بند کیا اسے بولٹ کرنے کے لیے ایک چھوٹی سی چرخی لگی ہوئی تھی۔ ہم نے چرخی گھما کر دروازے کو لاک کر دیا۔

مختلف دروازے کھلنے اور بند ہونے کی مدھم آوازیں آ رہی تھیں۔ ہم نے کمرے کا جائزہ لیا۔ اس میں کوئی اور دروازہ تو دور کی بات کھڑکی یا روشن دان تک نہیں تھا...... ہاں دو تین دیوار گیر الماریاں موجود تھیں۔ ہم نے الماریاں کھول کر دیکھا وہ مختلف اشیا سے بھری ہوئی تھیں، ان میں اشیائے خورونوش بھی تھیں۔ کسی الماری میں اتنی جگہ نہیں تھی کہ اس میں چھپا جا سکے۔ مستطیل کمرے کے اندر ہی دو چھوٹے چھوٹے کیبن بنے ہوئے تھے معلوم ہوا کہ یہ واش رومز ہیں۔ اسی دوران میں باہر سے کمرے کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی گئی پھر اسے دھڑ ادھڑ بجایا جانے لگا۔ یہ دروازہ کافی مضبوط تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہ خاصی موٹی آہنی

چادر سے بنایا گیا ہے...... اور اسے کھولنا آسان نہیں لیکن عین ممکن تھا کہ اس پر آٹومیٹک گن سے فائر کیے جاتے تو اس کا لاک ٹوٹ جاتا مگر ایسی کوئی نوبت نہیں آئی۔ پندرہ بیس سیکنڈ تک دروازہ بجایا گیا، پھر خاموشی چھا گئی۔ لگتا تھا کہ تلاش کرنے والے عمارت کے دوسرے حصوں کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں...... یا پھر انہوں نے عارضی طور پر اس کمرے کو نظر انداز کر دیا ہے۔

فرش پر ایک باریک سا قالین بچھا ہوا تھا۔ لگتا تھا کہ یہ کمرا بہت کم استعمال ہوتا ہے۔ قالین پر ہلکی سی گرد موجود تھی۔ قسطینا دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اس کو دیکھ کر میں بھی بیٹھ گیا۔ ''تمہارا بازو تو ٹھیک ہے؟'' اس نے پُرتشویش لہجے میں پوچھا۔

''ابھی تو ٹھیک ہے۔''

''آئندہ بھی ٹھیک ہی رہے گا۔'' وہ بولی۔

ہم دونوں نے اپنے کان باہر سے آنے والی آوازوں پر لگا دیئے۔ بھاگ دوڑ کی آہٹیں ہم تک پہنچ رہی تھیں۔ گارڈز کے پکارنے کی مدھم آوازیں بھی ہم تک پہنچتی تھیں۔ اس کے علاوہ الارم کی آواز تھی جو غالباً گراؤنڈ فلور سے ابھر رہی تھی۔ میرے ہاتھ میں وہی سیون ایم ایم رائفل تھی جو میں نے سوئے ہوئے بے خبر گارڈ کے پہلو سے اٹھائی تھی۔ قسطینا کے ہاتھ میں سائلنسر لگا طاقتور پستول تھا جس کے ساتھ اب اس نے نیا میگزین اٹیچ کر لیا تھا۔

''کیا خیال ہے تمہارا شاہ زائب! ہوائی حملے کا کہہ دیا جائے؟''

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''پہلی بار پتا چلا کہ آپ مذاق بھی کر لیتی ہیں۔''

''یعنی تمہارا مطلب ہے کہ اس برج کلب پر حملہ ہوا تو ہم بھی دوسروں کے ساتھ ہی بھسم ہو جائیں گے؟''

''کیا آپ کو اس میں کوئی شک ہے؟'' میں نے الٹا سوال کیا۔

''بالکل شک ہے بلکہ یقین ہے...... کہ ہمیں کچھ نہیں ہوگا۔ حملہ کتنا بھی زوردار ہوا ہم بخیریت رہیں گے۔''

''وہ کس طرح؟''

وہ غیر محسوس انداز میں مسکرائی۔ اس کی آنکھوں میں چمک فزوں تر ہو گئی۔ وہ بولی۔ ''شاہ زائب! تمہیں معلوم ہے، ہم اس وقت کہاں ہیں؟'' پھر خود ہی جواب دیتے ہوئے بولی۔ ''ہم اس وقت اس عمارت کے مضبوط ترین زیرزمین بنکر میں ہیں۔ ایسے بنکر بنائے ہی

اس لیے جاتے ہیں کہ فضائی حملوں سے محفوظ رہا جا سکے۔ برج کلب میں زیادہ تر اعلیٰ فوجی افسران اور انتظامیہ کے عہدیدار ہی آتے ہیں۔ ایسی جگہوں پر حفاظت کے خاص انتظام کیے جاتے ہیں۔ مجھے یاد آرہا ہے کہ ڈیڑھ دو سال پہلے بھی اس علاقے پر ڈیڈ نے ایک زوردار فضائی حملہ کیا تھا اور یہ کلب تقریباً تباہ ہو گیا تھا۔ شاید تب ہی یہ بنکر بنایا گیا ہو گا۔" اس نے تنقیدی نظروں سے اس مستطیل ہال کمرے کے درودیوار کا جائزہ لیا۔

اس نے پستول کے دستے سے ایک دیوار کو ٹھونکا۔ عجیب سی آواز آئی۔ کچھ ایسی ہی آواز بھاری بھرکم دروازے سے بھی آئی تھی۔ وہ کہنے لگی۔ "میرے اندازے کے مطابق یہ دیواریں ڈیڑھ فٹ موٹے کنکریٹ سے بنائی گئی ہیں۔ مزید حفاظت کے لیے ان میں اندر کی طرف کئی انچ موٹی آہنی پلیٹیں لگی ہوئی ہیں۔ چھت کی بناوٹ بھی یہی ہے اور دروازہ تو تم دیکھ ہی چکے ہو۔"

میں نے بھی رائفل کے دستے سے دیواروں کو ٹھونکا تو لوہے سے لوہا ٹکرانے کی صدا ابھری۔ میں نے کہیں پڑھا یا سنا تھا کہ دوسری جنگِ عظیم میں جنگ زدہ علاقوں میں ایسے مضبوط ترین بنکر بنائے جاتے تھے جو سیکڑوں ٹن بارود کی بارش برداشت کر لیتے تھے اور ان میں پناہ لینے والے اس "بارش" کے بعد زندہ سلامت باہر نکل آتے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ ہم اتفاقاً ہی اس زیرزمین پناہ گاہ یعنی ایئر ایڈ شیلٹر میں گھس آئے ہیں۔ اسے ہماری خوش قسمتی بھی کہا جا سکتا تھا۔ اس کمرے نے کم از کم وقتی طور پر تو ہمیں مرحوم یا گرفتار ہونے سے بچا لیا تھا۔

قسطینا نے ایک بار پھر آہنی چرخی کو حرکت دی اور دروازے کے لاک سسٹم کو چیک کیا۔ وہ پوری طرح مطمئن نظر آرہی تھی اور اس کی آنکھوں میں شعلوں کا عکس تھا۔ اس کی حرکات و سکنات سے ظاہر تھا کہ وہ اب وقت ضائع کرنا نہیں چاہتی۔

اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "شاہ زائب! میں برج کلب پر فضائی حملے کا حکم دے رہی ہوں......"

میں نے کہا۔ "اگر آپ حکم دے رہی ہیں تو یقیناً آپ نے سب کچھ سوچ سمجھ لیا ہو گا۔ میں ہر طرح آپ کے ساتھ ہوں۔"

"شاہ زائب! کسی بات کی سو فیصد گارنٹی تو کوئی بھی نہیں دے سکتا لیکن میرا دل کہہ رہا ہے کہ ہم یہاں محفوظ رہیں گے۔" اس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا اور پھر آفیسر لوکاس کے سیل فون کے ذریعے ڈی پیلس سے رابطہ کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ سگنل یہاں کمزور آرہے تھے لیکن وہ کسی نہ کسی طرح آقا جان سے بات کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ اس نے آقا جان کو

چچا کہہ کر مخاطب کیا اور اسے ساری صورتِ حال کے بارے میں بتا کر فوراً ہیلی کاپٹرز کو بھیجنے کا حکم دیا۔ آخر میں وہ بولی۔ ''چچا جان! یہ بہترین موقع ہے۔ دیر بالکل نہ کی جائے۔ بھرپور حملہ ہو۔ کم از کم چار ہیلی کاپٹر ضرور ہونے چاہئیں۔ دو تین منٹ کے اندر آپریشن ختم کر دیں۔ جہاں تک میں دیکھ رہی ہوں، یہاں کوئی بچہ موجود نہیں۔ زیادہ تعداد فوجی افسروں اور ان کی گرل فرینڈز یا بیگمات کی ہے۔ سب سے بڑی بات یہی ہے کہ چیف گیرٹ خود یہاں موجود ہے۔''

دوسری طرف سے کچھ کہا گیا۔ قسطینا بولی۔ ''نہیں۔ چچا! آپ میری فکر نہ کریں۔ میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ یہ بڑی سیف جگہ ہے۔ آپ بس پائلٹوں کو پرواز کا حکم دیں۔''

چند مزید فقروں کے تبادلے کے بعد قسطینا نے گفتگو ختم کر دی۔ حالات بھی کس طرح رنگ بدلتے ہیں۔ قسطینا کسی اور پلاننگ کے ساتھ نیوسٹی کے علاقے میں داخل ہوئی تھی۔ وہ کسی بھی طرح چیف گیرٹ کے قریب پہنچنا چاہتی تھی۔ اطلاعات کے مطابق چیف گیرٹ ڈینی فلاورز اور ان فلاورز سے کشید کیے گئے عطر کا شیدائی تھا۔ غالباً اسی حوالے سے قسطینا نے پھول بیچنے والی دیہاتن کا روپ دھارا تھا اور یہاں پہنچی تھی۔ یہاں پہنچ کر صورتِ حال یکسر تبدیل ہوئی تھی۔ اور اب وہ برج کلب پر فضائی حملہ کرانے جا رہی تھی۔

گھڑی کی سوئیاں آگے کو سرک رہی تھیں۔ وال کلاک کی ٹک ٹک کسی آنے والے طوفان کی منادی کر رہی تھی اس ''شیلٹر'' سے باہر اب نسبتاً خاموشی تھی۔ لگتا تھا کہ ہماری تلاش کی سرگرمی ماند پڑ گئی ہے یا پھر کسی وجہ سے اس سرگرمی کا رخ بالائی منزلوں کی طرف ہو گیا ہے۔ میں نے ایک الماری کھولی۔ یہ اشیائے خورونوش سے بھری ہوئی تھی۔ یہ سب کا سب خشک راشن تھا۔ بسکٹس، چاکلیٹس، انرجی بارز، ہنٹر بیف اور مشروبات کی سربمہر بوتلیں وغیرہ۔ فرسٹ ایڈ کا سامان، مختلف ادویات اور آکسیجن کے سلنڈر وغیرہ بھی یہاں موجود تھے۔ یقیناً یہ سب کچھ ان لوگوں کے لیے تھا جنہیں ہنگامی طور پر اس بنکر میں پناہ لینا پڑتی۔

قسطینا نے کہا۔ ''یہاں کم و بیش پچاس افراد کی ''پناہ'' کی گنجائش موجود ہے۔ اگر ہمیں یہاں کچھ دیر رکنا بھی پڑ گیا تو کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ کیونکہ کافی خوراک ہے۔''

میں نے کہا۔ ''یہاں پچاس افراد کی گنجائش ہے اور ہم دو ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ ہم کم از کم اڑتالیس افراد کی حق تلفی کریں گے۔''

''اور ان کی سفاک جارحیت جس طرح عام لوگوں کی ''جان تلفی'' کر رہی ہے، وہ کس کھاتے میں جائے گی۔ میں مستقبل قریب کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں شاہ زائب!

اگر رائے زل، ڈی پیلس تک پہنچ گیا تو وہاں خون کا دریا بہا دے گا۔"

ہماری یہ ہلکی پھلکی گفتگو جاری ہی تھی کہ ایک بار پھر الارم بجنے لگا۔ تاہم اس بار اس الارم کے ساتھ ساتھ فضائی حملے کی اطلاع دینے والے سائرن بھی گونج رہے تھے۔ اس بیسمنٹ تک ان کی بہت مدھم آواز ہی پہنچ پا رہی تھی۔ چند سیکنڈ مزید گزرے ہوں گے جب یکایک اس بنکر کے آہنی دروازے کی دوسری جانب بھونچال سا آ گیا۔ آہنی دروازہ کھولنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ پہلے دروازے کو دھڑ ادھڑ بجایا گیا پھر اس پر جیسے ہتھوڑے برسنے لگے۔ باہر موجود افراد چلا رہے تھے اور دروازہ کھولنے کے لیے کہا جا رہا تھا۔

یہی وقت تھا جب ہمیں پہلا زوردار دھما کا سنائی دیا۔ شدید آواز تو اندر تک نہیں پہنچی مگر گونج سے پتا چل رہا تھا کہ دھما کا برج کلب کی حدود میں ہوا ہے اور خاصا زوردار ہے۔ چند سیکنڈ بعد اوپر تلے چار پانچ دھماکے مزید ہوئے۔ یوں لگا کہ ایک شدید زلزلے نے زمین کو دہلا دیا ہے۔ ہمیں شیلٹر کا فرش اپنے قدموں کے نیچے لرزتا محسوس ہوا۔

میں نے آہنی دروازے سے کان لگا کر سنا۔ لوگ چلا رہے تھے۔ دروازے پر دوہتڑ برسا رہے تھے۔ چلانے والوں میں خواتین کی آوازیں بھی تھیں۔ یقیناً یہ وہی مرد و زن تھے جو برج کلب کے ہال کمرے میں اور سبزہ زار پر کچھ دیر پہلے، دادِ عیش دے رہے تھے، رقص کر رہے تھے اور شیمپئن کے فوارے ہوا میں اچھال رہے تھے۔ اب وہ دردناک موت سے بچنے کے لیے اس پناہ گاہ میں گھسنا چاہتے تھے لیکن اب یہ پناہ گاہ ان کے لیے نہیں تھی۔

ایجنسی کا کوئی سفید فام آفیسر غصے میں دھاڑا۔ اس نے کسی ذمے دار کو گالی دے کر کہا۔ "اوپر آگ لگ گئی ہے۔ اوپر نہیں جا سکتے ہو، اس حرامزادے سے کہو دروازہ توڑ دے۔" میں نے یہ مدھم آواز دروازے سے کان لگا کر سنی۔

کسی نے دہشت زدہ آواز میں پکار کر کہا۔ "یہ نہیں ٹوٹے گا۔ یہ اب اندر سے ہی کھلے گا۔"

یکایک در و دیوار ایک بار پھر ہولناک دھماکوں سے لرز اٹھے۔ ہیلی کاپٹرز چکر کاٹ کر دوبارہ حملہ آور ہوئے تھے۔ وہ جنگی طیاروں کے مانند نیچی پرواز کر کے برج کلب پر بم پھینک رہے تھے۔ یہ دوسرا حملہ پہلے سے بھی شدید تھا۔ برج کلب کی چار منزلہ عمارت کا کوئی بڑا حصہ مسمار ہو گیا تھا۔ گڑگڑاہٹ ہیبت ناک تھی۔ آہنی دروازے کی دوسری جانب موجود فوجی افسران اور ان کی خواتین اب کربناک انداز میں آہ و بکا بلند کر رہے تھے۔ کوئی شخص گھٹی گھٹی آواز میں پکارا۔ "پیچھے ہٹو...... سب پیچھے ہٹو۔ ہم فائر کر رہے ہیں۔"

چند سیکنڈ بعد یوں لگا کہ شیلٹر کا آہنی دروازہ چکنا چُور ہو کر اندر آ گرے گا۔ اس پر آٹومیٹک رائفل سے اندھا دھند برسٹ مارے جا رہے تھے۔ ہم نے دونوں واش رومز کے اندر پوزیشن لے لی اور ادھ کھلے دروازوں میں چوکس ہو کر کھڑے ہو گئے۔ آئندہ چند لمحوں میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ دروازہ ٹوٹ جاتا تو یقیناً ہم پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی جاتی مگر دروازہ ٹوٹنے یا نہ ٹوٹنے کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ میں نے قسطینا کے تاثرات سے اندازہ لگایا کہ وہ بھی اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ چند لرزہ خیز دھماکے مزید ہوئے اور اس کے ساتھ ہی اندازہ ہوا کہ آگ نیچے تک پہنچ گئی ہے اور شیلٹر کے سامنے جمع ہو جانے والے لوگ کربناک انداز میں چلا رہے ہیں۔ آہنی دروازے پر ہونے والی اندھا دھند فائرنگ بھی یکسر تھم گئی تھی۔

''لگتا ہے یہاں کا ٹمپریچر بڑھ رہا ہے۔'' میں نے قسطینا سے مخاطب ہو کر کہا۔

''ہاں..... آگ نیچے تک پہنچ گئی ہے۔'' وہ بولی اور واش روم والی پوزیشن چھوڑ کر باہر آ گئی۔

میں بھی باہر نکل آیا۔ اس پناہ گاہ سے باہر جیسے کہرام سا مچا ہوا تھا۔ لگتا تھا کہ دیواریں ابھی تک گر رہی ہیں مگر اب بارودی دھماکوں کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ شاید ''اٹیک ہیلی کاپٹرز'' تیز رفتار کارروائی کے بعد واپس لوٹ گئے تھے۔ بنکر کی دیواریں گرم سے گرم تر ہوتی جا رہی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ آس پاس ہر طرف شعلے پھنکار رہے ہیں۔ شاید اس شیلٹر کے سوا پوری عمارت شعلوں کی لپیٹ میں تھی۔ درجہ حرارت بڑھتا جا رہا تھا۔ ہمارے جسم پسینے سے تر ہو گئے۔ سانس لینے میں دشواری محسوس ہونے لگی۔ مجھے ان گیس سلنڈرز کا خیال آیا جو تھوڑی دیر پہلے الماری میں دیکھے تھے۔ وہ شاید کسی ایسی ہی صورتِ حال کے لیے رکھے گئے تھے۔ میں نے دو سلینڈر نکالے یہ قریباً دو فٹ لمبے اور پانچ چھ انچ قطر کے تھے۔ نوزل کھول کر دیکھا ان میں گیس موجود تھی۔ میں نے ان کے ساتھ پائپ اور ماسک اٹیچ کر لیے اگر گھٹن زیادہ ہو جاتی تو ہم یہ سلنڈر استعمال کر سکتے تھے۔ بہر طور ابھی گزارا ہو رہا تھا۔

آہنی دروازہ بری طرح تپنے لگا تھا۔ اب اس پر ہاتھ دھرنا بھی مشکل تھا فرش اور دیواریں کنکریٹ کی تھیں لہٰذا وہ قدرے کم گرم تھیں۔ شدید گرمی سے بچنے کے لیے قسطینا ہال کمرے کے ایک نیم تاریک گوشے میں گئی۔ اس نے چغہ اتار کر اپنی بلٹ پروف جیکٹ جسم سے علیحدہ کی اور چغہ دوبارہ پہن لیا۔ گرمی میں کوئی کمی واقع نہیں ہو رہی تھی۔

قسطینا نے کہا۔ ''ایسی دیواروں کے اندر تھرماپول کی شیٹس رکھی جاتی ہیں ورنہ شاید اب

تک ہم جھلسنا شروع ہو جاتے۔''

''پاؤں تو اب بھی جھلس رہے ہیں۔'' میں نے ایک پاؤں فرش سے اٹھاتے ہوئے کہا۔

''شاید ہمیں پانی کی ضرورت ہے۔'' وہ بولی اور اس مرتبہ واش روم میں چلی گئی۔ اس نے خود کو شاور کے نیچے کھڑا کیا اور شاور کھول دیا۔ اس پر پانی گرنے لگا۔ تاہم اس سے پہلے اس نے لوکاس والا سیل فون اور پستول اپنے جسم سے علیحدہ کر دیا تھا۔ یہ طریقہ مناسب تھا۔ میں نے دوسرے واش روم میں جا کر یہی طریقہ اختیار کرنا چاہا تو وہاں پانی نہیں تھا۔ وہ پکار کر بولی۔ ''پانی نہیں ہے تو ادھر ہی آ جاؤ شاہ زائب۔''

میں دوسرے واش روم میں گیا اور اس کے ساتھ ہی شاور کے نیچے کھڑا ہو گیا پانی ٹھنڈا تو نہیں تھا مگر پھر بھی سکون دے رہا تھا۔ قسطینا کے سیاہ گھونگریالے بالوں کی وگ بھیگ کر اس کے چہرے اور گردن سے چپک گئی تھی۔ اس کے طویل پھول دار چغے کا بھی یہی حال تھا۔ اس کی جسمانی موزونیت نمایاں ہو رہی تھی۔ جیسے کوئی جل پری پانی سے نکل کر ساحل پر آن کھڑی ہوئی ہو۔ میرا اپنا لباس بھی تر بتر ہونے لگا تھا۔ اچانک قسطینا نے مجھے کھینچ کر شاور کے نیچے سے ہٹا دیا۔ ''کیا کر رہے ہو شاہ زائب! تمہارے بازو پر پلاستر ہے۔ اس کا ستیاناس ہو جائے گا۔ ایک منٹ ٹھہرو۔ میں نے یہاں ایک پولیتھین دیکھا تھا۔''

وہ الماری کی طرف گئی اور وہاں سے ایک بڑی پولیتھین کی شیٹ نکال لائی۔ اس نے اس میں سے ایک ٹکڑا چاک کیا اور میرے مضروب بازو اور کندھے کو اس میں لپیٹ کر اچھی طرح ایک ڈوری سے کس دیا۔ میں محویت سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ پانی کے قطرے اس کے بالوں اور ٹھوڑی سے ٹپک کر اس کے گلے میں رینگ رہے تھے اور لباس میں گم ہو رہے تھے۔

ہم دونوں ایک بار پھر شاور کے نیچے آن کھڑے ہوئے۔ وہ بولی ایسی ''ایئر ریڈ شیلٹرز'' کے اندر ائر کنڈیشنگ کا سسٹم بھی موجود ہوتا ہے لیکن یہاں شاید اس ضرورت کا خیال نہیں رکھا گیا۔''

گرمی میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا۔ اب شاور کا پانی بھی نیم گرم ہونا شروع ہو گیا تھا مگر پھر بھی اس پانی کی موجودگی غنیمت تھی۔ ہم آمنے سامنے بالکل ساتھ ساتھ شاور کے نیچے کھڑے تھے۔ بالائی لباس بھیگ جانے کے بعد قسطینا کے زیر جامہ کے رنگ بھی نمایاں ہونا شروع ہو گئے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ دھماکا خیز ڈیوائس بھی عیاں ہونے لگی جو اس نے اپنی دبلی پتلی کمر سے باندھ رکھی تھی۔ اس کا سائز سگریٹ کے پیکٹ سے تھوڑا ہی بڑا تھا۔

اس کے دو سرخ بٹن بھیگے چغے کے اندر سے صاف دکھائی دے رہے تھے اور وہ براؤن بیلٹ بھی جس نے ڈیوائس کو اس کی کمر سے منسلک کر رکھا تھا۔

''یہ کیا ہے قسطینا؟'' اب میں نے پوچھنا ضروری سمجھا۔

''اپنا تحفظ۔'' وہ بولی۔ ''اگر کوئی ایسی صورتِ حال بن جائے کہ میں یہاں سے نکل نہ سکوں تو پھر...... ان لوگوں کے ہاتھ آنے کے بجائے، میں مرنا بہتر سمجھوں گی۔''

میں نے ڈیوائس کو چھوتے ہوئے کہا۔ ''کیا یہ واٹر پروف ہے؟'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے کہا۔ ''آپ نے اپنا تحفظ کر لیا...... لیکن میرا......؟''

''تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔'' وہ تیزی سے بولی۔ ''یہ میرے دل کی گواہی ہے۔''

''لیکن آپ نے خود ہی کہا ہے کہ سو فیصد گارنٹی کسی چیز کی نہیں دی جا سکتی۔ غیب کا علم تو بس اللہ کو ہے۔''

''دل کی گواہی بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔'' وہ عجیب نظروں سے میری طرف دیکھ کر بولی۔

''شاید اسی کو چھٹی حس کہا جاتا ہے لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی چھٹی حس تو بہت تیز ہوتی ہے مگر باقی پانچوں حسیں بس ایویں ہوتی ہیں۔'' میں نے کچھ ایسے انداز سے کہا تھا کہ اس کے چہرے پر بے ساختہ ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''تم مجھے کیا سمجھانا چاہ رہے ہو؟'' وہ میری آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔

''مجھے لگتا ہے کہ آپ کچھ کچھ سمجھ رہی ہیں۔''

اس نے پُر درد انداز میں میرے زخمی کندھے کو ہولے سے سہلایا اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کر بولی۔ ''شاہ زائب! تمہارے کندھے کے زخمی ہونے کا دکھ میرے دل میں ایک گہری چوٹ کی طرح ہے۔ یہ دکھ ہی کچھ کم نہیں ہے، لیکن اگر اس خطرناک ایڈونچر میں میرے ساتھ تمہیں بھی کچھ ہو گیا تو میں خود کو کبھی معاف نہیں کر سکوں گی۔''

''یہ خوب کہی آپ نے...... جب ہم دونوں ہی وفات پا جائیں گے تو پھر خود کو معاف کرنے یا نہ کرنے کی بات کا کیا مطلب؟''

''روحوں کو بھی تو اذیت ہوتی ہے۔ وہ بھی تو بھٹکتی رہتی ہیں۔'' اس کے ہونٹوں پر ایک غم ناک مسکراہٹ ابھری۔ وہ دوبارہ بولی۔ ''تم ایک لیجنڈ ہو شاہ زائب! تمہیں زندہ رہنا چاہیے۔''

ایک اور خوفناک گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ عمارت کا کوئی اور حصہ زمین بوس ہو گیا تھا۔

یوں لگا تھا کہ پورا آسمان ٹوٹ کر اس شیلٹر کی چھت پر آن گرا ہے۔ کچھ دیر تک ہم دونوں سکتہ زدہ رہے۔ قسطینا نے کہا۔ ''ایسے شیلٹرز کی چھتیں خاص طور سے محفوظ بنائی جاتی ہیں۔ ان میں اسٹیل کے موٹے جال ہوتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''لیکن محترمہ! بات تو پھر وہیں پر آجاتی ہے۔ کسی بھی صورتِ حال کے لیے سو فیصد گارنٹی تو نہیں دی جا سکتی۔ سنا ہے کہ نائن ٹیز میں ایران عراق جنگ میں ایک ایسے ہی مضبوط ترین شیلٹر میں تین چار سو ''سویلین'' لقمہ اجل بن گئے تھے۔''

''ہاں، یہ ہوا تھا۔ لیکن یہ بھی تو دیکھو نا کہ وہ حملہ کس نے کیا تھا۔ انہی امریکیوں نے۔ انہوں نے لیزر گائیڈڈ میزائل اور اسمارٹ بم استعمال کیے تھے۔ وہی سب کچھ جو یہ لوگ یہاں کر رہے ہیں۔ نئے ہتھیاروں کے نئے اور کامیاب تجربے۔'' قسطینا کے چہرے پر پھر نفرت اور طیش کی یلغار ہوگئی۔ شاید ان لمحوں میں اسے پھر اپنے پیارے والد کی موت یاد آگئی تھی۔

اس نے کھوئی کھوئی نظروں سے شیلٹر کے آہنی دروازے کی طرف دیکھا اور بولی۔

''کتنا اچھا ہو کہ اس اٹیک میں چیف گیرٹ کا بوجھ بھی زمین سے اتر گیا ہو۔''

''ابھی تو شاید ہر طرف شعلے بھڑک رہے ہیں۔ صورتِ حال کنٹرول میں آئے گی تو پھر ہی کچھ پتا چل سکے گا۔ آپ سیل فون بھی استعمال کر سکتی ہیں۔ میں نے دیکھا ہے اس میں کافی بیلنس موجود ہے اور چارجنگ بھی ہے۔''

اب گھٹن بڑھتی جا رہی تھی۔ یہ ''ائر ایڈ شیلٹر'' پوری طرح ائر ٹائٹ تھا، پھر بھی کہیں نہ کہیں سے دھوئیں کی بو ہم تک پہنچ رہی تھی۔ غور سے دیکھنے پر ہال کمرے کے اندر بہت ہلکا سا دھواں محسوس بھی کیا جا سکتا تھا۔ قسطینا کھینچ کر سانس لے رہی تھی اور ہر سانس پر اس کی گردن میں سامنے کی طرف چھوٹا سا گڑھا نمودار ہو جاتا تھا۔ مجھے بھی سانس لینے میں دشواری ہونے لگی تھی۔

''میرا خیال ہے اب ہمیں سلنڈرز کی ضرورت ہے۔'' قسطینا نے کہا۔

میں نے تیار سلنڈر کو قسطینا کی کمر سے اٹیچ کیا اور ماسک اس کے منہ پر چڑھا کر نوزل کھول دی۔ مجھے سی ڈائیونگ کا تجربہ تھا اور آکسیجن سلنڈر کو استعمال کرنا اسی تجربے کا نتیجہ تھا۔ غوطہ خوری میں مہارت کی وجہ سے مجھے سانس لینے کی دشواری بھی نسبتاً کم محسوس ہو رہی تھی۔ بہرحال سلنڈر کا استعمال میں نے بھی شروع کر دیا۔

اچانک سیل فون پر کال کے سگنل آئے۔ قسطینا نے فون اٹھایا اور منہ سے ماسک ہٹا کر

کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے آقا جان کی آواز ابھری۔ ''تم خیریت سے ہو بیٹی؟''

''ہاں چچا! میں ٹھیک ہوں، حملے کا کیا بنا؟''

''زبردست...... بہت کامیاب، برج کلب کی اینٹ سے اینٹ بج گئی ہے۔ بہت بڑا حصہ گر گیا ہے۔ آگ اور دھوئیں کے سوا کچھ نظر نہیں آرہا۔ ہمارا ایک انفارمر اَپ ڈیٹس دے رہا ہے۔ ارد گرد کی کچھ عمارتوں میں بھی آگ نظر آئی ہے۔ مرنے والوں اور زخمیوں کو کلب کے ملبے سے نکالا جارہا ہے۔ ہر طرف ایمبولینسیں بھاگ رہی ہیں۔ تم بتاؤ کہاں ہو اس وقت؟'' آقا جان کی آواز فون کے اسپیکر میں سے ابھر رہی تھی۔

''میں نے کہا ہے نا چچا، میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ بتائیں ہمارا کوئی نقصان تو نہیں ہوا؟'' قسطینا نے پوچھا۔

''بالکل نہیں۔ اطلاع سو فیصد درست تھی۔ اینٹی ائر کرافٹ گنیں خاموش رہیں...... واپسی پر ہمارے صرف ایک ہیلی کاپٹر کو جزوی نقصان پہنچا لیکن وہ بھی ایئر پورٹ پر خیریت سے لینڈ کر گیا۔ مجھے تمہاری طرف سے فکر مندی ہے...... تم شاید گھٹن محسوس کررہی ہو۔ ٹھیک سے سانس نہیں لے رہی ہو۔'' آقا جان کی آواز رک رک کر آرہی تھی۔ کبھی بالکل مدھم ہو جاتی تھی، یہ کمزور سگنلز کی وجہ سے تھا۔ قسطینا نے آقا جان کو بتایا کہ کلب کے زیر زمین شیلٹر میں ہونے کی وجہ سے آواز صاف سنائی نہیں دے رہی۔ عیار آقا جان اب تک اندازہ لگا چکا تھا کہ قسطینا کے ساتھ کوئی اور بھی شیلٹر میں موجود ہے۔ آقا جان نے اس بارے میں استفسار کیا تو قسطینا نے صاف بتا دیا کہ میں اس کے ساتھ ہوں۔ اس نے بتایا کہ مجھے ساتھ لانے کا فیصلہ اس نے آخری لمحوں میں کیا تھا اور اسے میری مدد کی ضرورت تھی۔ آقا جان نے اس بارے میں زیادہ چھان بین نہیں کی۔

قسطینا نے ایک بار پھر اپنے حوالے سے آقا جان کو تسلی دی اور کہا کہ وہ جلد از جلد چیف گیرٹ کے بارے میں جاننا چاہتی ہے۔

اس نے دوبارہ ماسک چڑھا لیا۔ دو چار منٹ بعد ٹمپریچر میں کچھ کمی محسوس ہونے لگی۔ ہم نے دیواروں اور فرش وغیرہ کو ہاتھ لگا کر دیکھا وہ اسی طرح گرم تھے مگر صورتِ حال میں تھوڑی بہت بہتری محسوس ہورہی تھی۔ پہلے میں نے اپنا ماسک اتارا پھر قسطینا نے بھی اتار دیا۔ اب سانس لینے میں نسبتاً آسانی محسوس ہوئی۔ اچانک میری نگاہ چھت کی طرف گئی اور اٹھی رہ گئی۔ چھت پر ایک دیوار سے دوسری دیوار تک ایک سیاہ لائن سی دکھائی دے رہی تھی۔ غور سے دیکھنے پر اندازہ ہوا کہ یہ کریک قسم کی چیز ہے قسطینا کی نگاہیں بھی اس نشان پر جم کر رہ

گئیں۔ اس کی آنکھوں میں، میں نے پہلی بار ہراس کی کیفیت دیکھی۔ وہ ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی۔ ''ایسا ہوتو نہیں سکتا...... یہ ڈیڑھ فٹ کے قریب موٹی کنکریٹ اور لوہے کی چھت ہے۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس پر بہت بڑے ملبے کا بوجھ ہے۔ شاید ہزاروں ٹن۔''

جو سوچیں ذہن پر حملہ آور ہوئیں وہ بہت ہولناک تھیں۔ اگر یہ چھت بیٹھ جاتی تو شاید ہماری ہڈیاں بھی سرمہ ہو جاتیں۔ اس دراڑ سے دھیان ہٹانے کے لیے ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ قسطینا کی بس ایک ہی خواہش تھی۔ اس فضائی آپریشن کے نتیجے میں چیف گیرٹ اپنے انجام کو پہنچ گیا ہو اور یہ کوئی ایسا بعید بھی نہیں تھا۔ رقص وسرور اور مستی کی اس محفل میں جتنے لوگ بھی موجود تھے وہ گراؤنڈ فلور پر تھے اور آقا جان کی باتوں سے اندازہ ہوا تھا کہ گراؤنڈ فلور ناپید ہو کر رہ گیا ہے۔

بالائی منزلوں سے ایک بار پھر اکھاڑ پچھاڑ اور گڑگڑاہٹ کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ملبا ہٹانے کا کام زور وشور سے ہو رہا ہے۔ شاید وہ لوگ زخمیوں کو ریسکیو کرنا چاہ رہے تھے اور کرینوں، بلڈوزروں وغیرہ کا استعمال کر رہے تھے۔ مطلب یہ تھا کہ اب آگ بجھائی جا چکی ہے۔

قسطینا نے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ دوڑائی۔ اب رات کے قریباً دو بج رہے تھے۔ اس رات کی صبح تک پتا نہیں کیا ہو جانا تھا۔ میری نظر ایک بار پھر چھت کی دراڑ پر پڑی۔ یہ تشویش ناک انکشاف ہوا کہ وہ پہلے سے کچھ چوڑی اور نمایاں ہو چکی ہے۔ شاید چھت غیر محسوس طور پر بیٹھ رہی تھی۔ بہت غور سے دیکھنے پر اس میں ہلکا سا خم بھی محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے قسطینا سے پوچھا۔ ''کیا اتنے مضبوط بنکر بھی اس طرح مسمار ہو سکتے ہیں؟''

''ایسا ہوتا تو نہیں لیکن جب ملٹی اسٹوری بلڈنگز گرتی ہیں تو بہت کچھ توقع کے خلاف ہو جاتا ہے۔''

وہ ایک بار پھر دھیان سے میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سا کرب تھا، بولی۔ ''مجھے اپنی کوئی پروا نہیں شاہ زائب! لیکن یہاں اس وقت تمہارا میرے ساتھ ہونا میرے لیے بہت تکلیف دہ ہے۔''

''اگر ایسی بات ہے تو میں باہر نکل جاتا ہوں۔'' میں نے زیرلب مسکرا کر کہا۔

''کیسے؟''

''دروازہ کھول کر۔''

''اور تمہارا مطلب ہے کہ دروازہ کھول کر تم آرام سے چہل قدمی کرتے گراؤنڈ فلور پر پہنچ جاؤ گے...... اور وہاں سے کوئی ہیلی کاپٹر تمہیں اچک کر ڈی پیلس کی چھت پر اتار دے گا...... شاید تمہیں اندازہ نہیں، اس دروازے کے باہر بھی بہت کچھ مسمار ہو چکا ہوگا اور مجھے تو لگتا ہے کہ اب یہ دروازہ آسانی سے کھلے گا بھی نہیں۔ یہ باہر کو کھلتا ہے۔''

''ہم کوشش کر کے تو دیکھ سکتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ابھی یہ آگ کی طرح گرم ہے۔ اسے کچھ ٹھنڈا ہونے دو۔'' قسطینا نے کہا۔

ہم فرش پر ایک موٹا نمدہ بچھا کر بیٹھ گئے۔ سیل فون کے سگنل اب بالکل غائب ہو گئے تھے۔ کبھی کبھار سگنل کا ایک نقطہ سا ابھر کر اوجھل ہو جاتا تھا۔ میرا ذہن باہر کے حالات میں الجھنے لگا۔ پتا نہیں تھا کہ وہاں ڈی پیلس میں کیا صورتِ حال ہے۔ ابھی تو یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ انیکسی میں میری غیر موجودگی محسوس کی گئی ہے یا نہیں۔ میں نے آخری کال میں انیق سے یہی کہا تھا کہ میں کل رات تک واپس لوٹ آؤں گا۔ وہاں انیق زبردست آزمائش سے دوچار تھا۔ اس کو زینب کو سنبھالنا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ اس کی موجودگی کو راز بھی رکھنا تھا۔ وہ سجاول والے کمرے میں تھی اور اس کمرے میں وہ ہرگز محفوظ نہیں تھی۔ کسی بھی وقت یہ پول کھل سکتا تھا۔ زینب کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا، اس حوالے سے بھی میرا دھیان بار بار آقا جان کی طرف ہی جاتا تھا۔ انیق نے آخری فون کال میں جو خاص بات بتائی تھی وہ بھی ذہن میں گردش کر رہی تھی۔ اس کے کہنے کے مطابق زینب نے ایک پوسٹر پر کمانڈر افغانی کی تصویر دیکھی تھی اور پہچان لیا تھا کہ یہی بندہ ہے جو اسے خواجہ سراخیام کی خطرناک تحویل میں چھوڑ کر گیا تھا۔ کمانڈر افغانی نے ایسا کیوں کیا؟ ایک اہم سوال ابراہیم کے بارے میں بھی بار بار ذہن میں ابھر رہا تھا۔ پتا نہیں کہ زینب کی موت (جھوٹی موت) کے بعد اس پر کیا بیت رہی تھی۔ وہ دیوانگی کی حد تک اسے چاہنے لگا تھا اور اب اپنے تئیں وہ اسے کھو چکا تھا۔

اچانک ایک تڑاقا سا سنائی دیا جیسے کسی بہت سخت لوہے کو توڑا یا موڑا گیا ہو۔ ایک دھول سی ہمارے سروں پر گری۔ ہم نے ایک ساتھ اوپر دیکھا۔ خدا کی پناہ۔ وہ منظر بہت دہشت ناک تھا۔ چھت کی دراڑ مزید چوڑی ہو گئی تھی۔ وہ اب تک طویل سیاہ ناگ کی طرح بل کھاتی ایک کونے سے دوسرے کونے تک چلی گئی تھی۔ بہرحال چھت کا خم اب بھی زیادہ نمایاں نہیں تھا۔

''میرا خیال ہے ہمیں اس دروازے پر کوشش کرنی چاہیے۔'' میں نے کہا اور اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے کی آہنی چرخی ابھی تک تپ رہی تھی۔ اسے کسی کپڑے کی

مدد سے ہی چھوا جا سکتا تھا۔ قسطینا ایک الماری سے بڑا سا تولیا نکال لائی۔ اس کی مدد سے ہم دونوں نے ملا کر چرخی کو بمشکل گھمایا۔ میں صرف ایک بازو ہی استعمال کر پا رہا تھا۔ دروازے کے اندر سے ابھرنے والی آواز نے بتا دیا کہ وہ "ان لاک" ہو چکا ہے۔ ہم نے بڑی احتیاط سے اسے آہستہ آہستہ باہر کی طرف دھکیلا۔ جلے ہوئے گوشت اور بارود کی بو تیزی سے اندر آئی۔ کہیں اوپر ملبے میں حرکت کرتی ہوئی بھاری مشینوں کی گڑگڑاہٹ کچھ واضح ہو گئی۔ بہر حال نظر کچھ نہیں آ رہا تھا۔ ہم نے کافی قوت صرف کی مگر دروازہ دو تین انچ سے زیادہ نہیں کھل سکا۔ قسطینا کی یہ بات درست معلوم ہوتی تھی کہ ملبے نے دروازے کو کھلنے سے روک دیا ہوگا۔

کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ باہر کا منظر کیا ہے۔ قسطینا الماری میں سے ایک چھوٹی ٹارچ ڈھونڈ لائی۔ میں نے اس ٹارچ کی روشنی دو تین انچ کی درز سے باہر پھینکی جو منظر مجھے دکھائی دیا وہ دل و دماغ پر ہمیشہ کے لیے نقش ہو گیا۔ یہ بس اس منظر کی ایک جھلک ہی تھی۔ میں نے اس شیلٹر کے آہنی دروازے کے سامنے درجنوں جلی اور ادھ جلی لاشیں دیکھیں۔ وہ جیسے ایک ڈھیر کی صورت دروازے کے سامنے پڑی تھیں۔ ان میں نیوسٹی کے باوردی اور بے وردی فوجی افسران تھے۔ ان کی ساتھی خواتین تھیں۔ اس کے علاوہ ایجنسی کے افسران تھے اور ان کی گرل فرینڈز تھیں (مقامی فوجی تو ظاہر ہے زیادہ تر اپنی بیگمات کے ساتھ تفریح کرتے تھے لیکن بدیسی افسران کو یہاں مقامی لڑکیاں اور کال گرلز "ساتھ" فراہم کرتی تھیں) آگ، ان میں سے کئی افراد کے جسموں کو بے لباس کر چکی تھی۔ چہروں پر موت کی اذیت نقش ہو کر رہ گئی تھی اور آنکھوں میں نزع کا کرب جامد تھا۔ وہ سب کے سب اس شیلٹر میں پناہ لینے کے لیے اس طرف اُمڈ آئے تھے اور بند دروازے کے سامنے اپنے انجام کو پہنچے تھے۔

میں نے ٹارچ بند کر دی۔ "کیا ہوا شاہ زائب؟" قسطینا نے پوچھا۔

"کچھ نہیں، بس کچھ تکلیف دہ سین ہے۔"

"لاشیں ہوں گی۔ بمباری کے بعد وہ لوگ یقیناً اندر گھسنے کے لیے بھاگے ہوں گے؟"

"ہاں، ایسا ہی ہے۔"

"کاش ان میں گیرٹ بھی ہو۔" قسطینا نے نفرت انگیز لہجے میں کہا اور ٹارچ میرے ہاتھ سے لے لی۔

"کوئی فائدہ نہیں قسطینا، کوئی چہرہ بھی پہچانا نہیں جا رہا۔"

"لیکن میں دیکھوں گی۔" وہ مصمم انداز میں بولی۔

اس نے دروازے کی درز میں سے ٹارچ کی روشنی باہر پھینکی۔ کچھ دیر جبڑے بھینچ کر باہر جھانکتی رہی۔ میں نے بھی ایک نظر باہر ڈالی۔ وہ منظر یقیناً نگاہوں کو عذاب میں مبتلا کرنے والا تھا۔ مجھے اس فوجی افسر کی لاش بھی دکھائی دی جسے میں نے اوپر، اوپن ائیر حصے میں دیکھا تھا۔ وہ دو دوسرے حضرات کے ساتھ مل کر ایک میز کو مضبوطی سے تھامے ہوئے تھا اور میز پر چڑھ کر ایک نیم عریاں لڑکی رقص کر رہی تھی۔

دس پندرہ سیکنڈ بعد قسطینا نے ٹارچ بند کر دی اور اس نے اچھا ہی کیا۔ ٹارچ کی روشنی ہمارے لیے کوئی مسئلہ بھی پیدا کر سکتی تھی۔ ٹارچ بند کرنے کے بعد ہم ایک بار پھر دروازے سے زور آزمائی کرنے لگے۔ وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ ہم اس میں زیادہ سے زیادہ تین چار انچ کی درز ہی پیدا کر سکے۔ پھر یہ درز اس سے بھی کم ہو گئی۔ شاید باہر موجود انسانی ڈھانچوں کے انبار اور ملبے نے دروازے پر مزید دباؤ ڈال دیا تھا۔ ہم نے دروازے کو پھر سے لاک کر دیا۔

اس مشقت نے ہم دونوں کو ہانپنے پر مجبور کر دیا۔ اس کی ایک وجہ شاید آکسیجن کی کمی بھی تھی۔ اب اس زیر زمین بنکر میں دھوئیں اور جلے ہوئے گوشت کی بو بھی داخل ہو گئی تھی۔ یہ سب کچھ دروازہ کھولنے کی وجہ سے ہوا تھا۔

دیواریں اب نسبتاً ٹھنڈی ہو گئی تھیں۔ قسطینا نے نیچے بیٹھ کر دیوار سے ٹیک لگائی اور بولی۔ ”سیڑھیوں کا پورا اسٹرکچر تباہ ہو گیا ہے۔ اب زینوں کی جگہ ہزاروں ٹن ملبہ پڑا ہے اور اس میں سے بہت سا ابھی تک سلگ رہا ہے۔“

”لاشوں میں گیرٹ کا کھوج ملا؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں، کوئی واضح ثبوت تو نظر نہیں آیا مگر یہاں موجود لاشیں زیادہ تر بڑے افسروں کی ہیں۔“

میں سیل فون کے سگنل وصول کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ سگنل اب قریباً زیرو تھے۔ چھت کی ہولناک دراڑ ہمیں مسلسل ڈرا رہی تھی۔ تاہم تھوڑی سی خوش آئن بات یہ تھی کہ اب اس میں مزید کشادگی پیدا نہیں ہوئی تھی۔

”آپ کا کیا خیال ہے، کیا یہ یہاں رک جائے گی؟“

”امید تو بہت ہے لیکن اوپر جس طرح بھاری بھر کم مشینری کام کر رہی ہے اور ملبا بھی اپنی جگہ چھوڑ رہا ہے...... کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“

اس نے سیل فون میرے ہاتھ سے لے لیا اور رخ پھیر پھیر کر سگنل وصول کرنے کی

کوشش کرنے لگی۔ سگنل نہ ہونے کے برابر تھے اور مسئلہ یہ تھا کہ چارجنگ تیزی سے کم ہوتی جارہی تھی۔ ہمارے پاس کوئی چارجر بھی موجود نہیں تھا۔ وہ تھک ہار کر بیٹھ گئی اور مایوسی سے فون کی اسکرین دیکھنے لگی۔ اس کی چمکیلی پیشانی پر ابھی تک وہ چھوٹا سا ابھار موجود تھا جو سرنگ میں میرے ساتھ دھینگا مشتی کا نتیجہ تھا۔ اس ابھار کو میں نے بے ساختہ چوما تھا اور وہ جز بز ہوئی تھی، میں نے کہا۔ ''آپ کی پیشانی کی چوٹ پر کچھ لگا دوں؟''

اس نے اپنی پیشانی کو انگلیوں سے ٹٹولا اور مجھ پر ایک تیکھی نظر ڈال کر پھر فون کی طرف متوجہ ہوگئی۔ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہی ہو۔ جو کچھ لگایا تھا وہی کافی ہے......

میں نے کہا۔ ''آپ نے جواب نہیں دیا؟''

وہ بولی۔ ''معمولی سا ابھار ہے۔ اس سے کہیں زیادہ چوٹ تو کمر پر آئی ہے لیکن ابھی علاج معالجے میں پڑنے کا وقت نہیں۔''

''کیسے آئی چوٹ؟'' میں نے پوچھا۔

''جب اوپر بیڈروم میں اس خبیث آفیسر سے گتھم گتھا ہونا پڑا تھا۔ شاید کسی میز کا کونا لگا ہے۔'' وہ بولی۔

''میری آنکھوں کے سامنے آفیسر لوکاس کا شرابی چہرہ گھوم گیا۔ وہ بڑے بپھرے ہوئے انداز میں ''گل فروش قسطینا'' کو اوپر کمرے میں لے کر گیا تھا اور پھر چند منٹ بعد لاش میں بدل گیا تھا۔

میں نے قسطینا کی پشت کو پہلی بار دھیان سے دیکھا۔ کندھوں سے ذرا نیچے پھولدار اسکرٹ پر خون کے چھوٹے دھبے تھے جو نہانے کے دوران میں بھیگ کر پھیل گئے تھے۔

میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''قسطینا! یہ کافی چوٹ ہے۔ مجھے دیکھنے دو۔''

اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی میں نے پشت کی زپ کھولی اور اس کی کمر میری نگاہوں کے سامنے آگئی۔ یہ گہری رگڑ تھی جو قریباً ڈیڑھ فٹ تک چلی گئی تھی۔ ایک دو جگہ سے یہ زخم کی شکل اختیار کر گئی تھی۔

''کافی گہری خراش بلکہ رگڑ آئی ہے۔ دو تین جگہ سے خون رس رہا ہے اسے بینڈیج کی ضرورت ہے۔'' میں نے کہا اور اٹھ کر الماری کی طرف بڑھ گیا۔

یہاں مرہم پٹی کا وافر سامان موجود تھا۔ زخمیوں کا ابتدائی علاج کیا جا سکتا تھا۔ میں نے دو میڈیسن لیں۔ پائیوڈین کا محلول بھی لیا۔ پہلے پائیوڈین سے ''رگڑ'' کو صاف کیا پھر آئینٹمنٹ وغیرہ لگا کر روئی رکھی اور چار پانچ جگہ میڈیکل ٹیپ چپکا دی۔ وہ بغیر کوئی آہ کیے

خاموش بیٹھی رہی۔ اس کی حسین کمر میرے سامنے تھی۔ بے حد موزوں اور شفاف کمر۔ اس نے جیسے میری نگاہوں کی تپش کو محسوس کرتے ہوئے ہاتھ پیچھے موڑے اور زپ بند کر لی۔ اس نے ایک بار پھر تیز نظروں سے میری طرف دیکھا لیکن ان نظروں میں غصہ یا بیگانگی نہیں تھی۔

اس نے اپنی کہنی زمین پر ٹیکی اور ذرا نیم دراز ہو کر پہلو کے بل بیٹھ گئی۔ میری طرف کھوئے کھوئے انداز میں دیکھتی رہی پھر بولی۔ ''کتنا اچھا ہوتا، ہم کہیں اور ملے ہوتے، کسی اور وقت...... کچھ اور حالات میں......''

''مثلاً! کہاں......اور کب؟''

''اسی ڈی پیلس میں...... کسی برسات والی شام میں، یا سردیوں کی کسی چمکیلی دوپہر میں...... یہاں کی چمکیلی دوپہریں زبردست ہوتی ہیں۔ دو تین سال پہلے تک یہ سب کچھ کتنا خوب صورت تھا۔''

''کیسا تھا دو تین سال پہلے تک؟''

''میں تھی، میری والدہ تھیں...... میرے پیارے والد تھے اور زندگی کی گاڑی ڈینی فلاور سے بھی زیادہ خوب صورت پھولوں سے لدی ہوئی تھی۔ یہ گاڑی بڑے ہموار راستوں پر چل رہی تھی۔ پھر یہ سب کچھ بدل گیا۔ اقتدار کی ہوس ہماری خوشیوں کو کھانے لگی۔ جنگ کا ماحول پیدا ہونے لگا۔ چنگاریاں شعلے بننے لگیں۔ ایجنسی والوں نے رائے زل کے ساتھ مل کر ہماری جڑیں کاٹنا شروع کر دیں۔ ہم پر جینا حرام کر دیا، جاماجی کی رونقوں کو نظر لگ گئی۔ یہاں کے سبزہ زاروں میں کھیلتے ہوئے بچے، اور یہاں زندگی گزارنے والے بے گناہ لوگ موت کے منہ میں جانے لگے۔''

اس کی آواز بوجھل ہو گئی۔ وہ چند سیکنڈ خاموش رہ کر پھر بولی۔ ''عزت مآب ریان فردوس تو پہلے ہی برونائی چھوڑ کر پاکستان جا چکے تھے۔ ساری ذمے داریاں میرے والد کے کندھوں پر تھیں۔ وہ لڑتے رہے، اپنا دفاع کرتے رہے مگر مسئلہ یہی تھا...... وہ ایجنسی کے حرام خور امریکنوں کو اپنا مددگار سمجھ رہے تھے لیکن یہ ''خبیث گھس بیٹھیے'' رائے زل کے ساتھ مل کر سازشیں کر رہے تھے۔ اپنے پنجے گاڑ رہے تھے۔ یہ ان کی پشت پناہی ہی تھی کہ رائے زل ہر گزرنے والے دن کے ساتھ اپنے ہاتھ پاؤں پھیلاتا جا رہا تھا۔ وہ آئے روز ہمارے علاقوں پر حملہ کرتا تھا اور ہمیں امتحان میں ڈالتا تھا اور پھر ہمیں لڑنا پڑا۔ اس لڑائی میں رائے زل نہیں جیتا، سازشیں جیتیں اور امریکنوں کی چالبازی جیتی۔ جن دنوں لڑائی کا ماحول بن رہا تھا انہی دنوں والدہ بیمار ہو کر چل بسی تھیں۔ لڑائی میں والد نے بھی اپنی جان قربان کر دی۔

میں جانتی ہوں رائے زل اور گیرٹ نے ان کی موت کا جشن منایا تھا۔" قسطینا کی آنکھوں سے چنگاریاں چھوٹ رہی تھیں۔

میں نے کہا۔ "یہ رائے زل کیا چیز ہے قسطینا؟"

وہ بولی۔ "تم نے اسے دیکھا ہے؟"

"بس اس ویڈیو میں دیکھا تھا جو آپ نے ڈی پیلس کے ڈائننگ ہال میں دکھائی تھی یا پھر یہاں ان پوسٹروں میں جو گاڑیوں کے پیچھے لگے نظر آتے ہیں۔ وہ موٹا سا گول مٹول بندہ جس نے چیف گیرٹ سے خفیہ ملاقات کی تھی۔"

"بہت خطرناک شخص ہے اور اس سے بڑھ کر اس کی ماں۔ وہ ہر صورت عزت مآب کو برباد کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ عزت مآب نے اسے طلاق دی اور وہ ان کا یہ گناہ کسی صورت معاف کرنے کو تیار نہیں۔ بہت برس گزر گئے۔ وہ ان کو دن رات انگاروں پر چلا رہی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس سارے معاملے میں عزت مآب کا بھی تھوڑا بہت قصور رہا ہو لیکن ایسی کینہ پروری اور عداوت شاید ہی کسی عورت میں ہو جیسی اس ہاناوانی میں ہے۔"

"یہ رائے زل کی والدہ کا نام ہے؟"

"ہاں، اس کا مطلب مقامی زبان میں بہت اچھا ہے لیکن یہ ہاناوانی اس نام کے بالکل الٹ ہے۔ پرلے درجے کی بے رحم اور سنگدل۔ وہ ایک آسیب بن کر اس جزیرے پر مسلط ہے۔"

"ہاں، یہ بات تو میں نے خود بھی محسوس کی ہے قسطینا! جب بھی رائے زل کی والدہ کا ذکر آتا ہے، لوگوں کی آنکھوں میں ایک سایہ سا لہرا جاتا ہے۔ وہ کس عمر میں ہے؟"

"عمر ساٹھ کے قریب پہنچ چکی ہے مگر اس کی کمینگی اور شیطانیت کمزور ہونے کے بجائے جوان ہے، بلکہ جوان ہوتی جارہی ہے۔"

"کیا آپ کچھ تفصیل بتائیں گی؟"

قسطینا نے چھت کی دراڑ پر ایک نظر دوڑائی۔ دراڑ جوں کی توں تھی مگر کبھی کبھی باریک دھول جیسی چیز ہم پر گرنے لگتی تھی۔ اس دراڑ کو دیکھنا اور اس کے اوپر پڑے ہوئے بے پناہ بوجھ کا تصور کرنا بڑا لرزہ خیز تھا۔ ایسی دراڑوں اور "کریکس" کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ رکی رہیں تو برسوں بلکہ......صدیوں رکی رہیں اور حرکت میں آئیں تو سیکنڈوں میں موت اور بربادی کا بے مثال دہانہ کھول دیں۔ سر پر تلوار لٹکنے کا محاورہ بہت استعمال ہوتا ہے۔ اس وقت ہمارے سر پر تلوار نہیں تھی، موت کی دراڑ لٹک رہی تھی اور ہم کچھ نہیں جانتے تھے وہ

ہمیں کب تک مہلت دے گی۔

قسطینا نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''تم ماورائی باتوں پر یقین رکھتے ہو؟ میرا مطلب ہے ایسی چیزیں جن کو سائنس کی رُو سے ثابت نہ کیا جا سکے مگر ان کی موجودگی سے انکار بھی ممکن نہ ہو۔''

میں نے چند لمحے کے لیے سوچا، پھر کہا۔ ''اب سے کچھ عرصہ پہلے تک تو بالکل یقین نہیں رکھتا تھا...... مگر پاکستان آنے کے بعد، میں ایک انوکھے شخص سے ملا اور اس کے حوالے سے میں نے کچھ ایسے مناظر دیکھے جنہوں نے مجھے کسی حد تک ماورا اور غیر معلوم کا قائل کیا۔''

''کس کی بات کر رہے ہو؟''

''اگر زندگی رہی تو اس کے بارے میں آپ کو پھر کبھی بتاؤں گا۔''

(میرے ذہن میں وہی سجاول کے ڈیرے والے واقعات تھے۔ جب میں نے اسے ایک بند کمرے میں عجیب طرح کی مصروفیت میں دیکھا تھا۔ باگھ کا سوکھا ہوا جگر چبانا، کوئی مہلک شراب پینا...... اور پھر وہ غیر معمولی جسمانی قوت جو سجاول میں مقابلے کے وقت در آئی تھی۔ اس کا ناقابلِ بیان غیظ و غضب اور وہ مکا جس کی ایک اچٹتی ہوئی ضرب میں اب تک اپنے کندھے پر جھیل رہا تھا)

قسطینا نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''شاہ زائب! کبھی کبھی بہت روشن خیال ہونے کے باوجود ہمیں انہونیوں پر یقین کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ وہ انہونیاں ہماری آنکھوں کے سامنے ہوتی ہیں اور ہم انہیں جھٹلا نہیں سکتے۔ ہانا وانی کے حوالے سے بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ غیر معمولی قوتوں کی مالک ہے اور ان کی مدد سے لوگوں کو اپنے سحر میں جکڑ لیتی ہے۔ وہ وہی کرتے ہیں جو وہ ان سے چاہتی ہے۔ کچھ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ پیش گوئی کی خداداد صلاحیت رکھتی ہے اور یہ صلاحیت اس کے اندر دھیرے دھیرے اتنی ترقی کر گئی ہے کہ اسے بہت سی باتوں کا پتا وقت سے پہلے چل جاتا ہے اور اپنی اس صلاحیت کے زور پر وہ لوگوں کو اپنا مطیع کرتی ہے۔ اس نے جان بوجھ کر اپنے اردگرد اسرار کا ایک ہالہ سا بنا رکھا ہے۔ کچھ لوگ اسے ماذو وارا بھی کہتے ہیں، یہ مقامی زبان کا لفظ ہے اور اس کا مطلب ہے، قبر والی ملکہ۔''

''قبر والی ملکہ؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

''ہاں، یہ ہر ہفتے کم از کم ایک رات قبرستان میں گزارتی ہے۔ یہ قبرستان اس نے اپنے اسی محل کے اندر ہی بنا رکھا ہے۔ یہاں اس کے خاندان والوں اور عزیزوں کی قبریں ہیں۔

کچھ وفادار ساتھی بھی وہاں دفن ہیں۔ سو کے لگ بھگ قبریں تو وہاں ہوں گی...... ہر بدھ کی رات وہ قبر کے اندر سوتی ہے۔''

''میں سمجھا نہیں؟''

''تمہیں یہ سب کچھ عجیب لگے گا مگر حقیقت میں ایسا ہی ہے۔ اس نے پچھلے بیس برس سے اپنی قبر کھدوا رکھی ہے اس پر کتبہ بھی موجود ہے جس پر اس کا نام اور تاریخ ولادت وغیرہ لکھی ہے۔ یہ قبر اندر سے پختہ ہے۔ لحد میں باقاعدہ اس کا بستر ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس نے کوئی منت مان رکھی ہے۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ وہ کوئی درویشانہ زندگی گزار رہی ہے؟''

''توبہ توبہ۔'' قسطینا نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ''پرلے درجے کی رنگ باز اور حرصی عورت ہے۔ عزت مآب سے طلاق کے بعد اس نے دو شادیاں کی تھیں۔ ایک شوہر بیمار ہو کر مر گیا، دوسرا جو ایک فوجی افسر تھا، اسے چھوڑ کر یورپ بھاگ گیا اور کبھی واپس نہیں آیا۔ یہ کوئی چودہ پندرہ برس پہلے کی بات ہے۔ اب بھی وہ شاہانہ ٹھاٹ باٹ سے رہتی ہے۔ قیمتی لباس اور کروڑوں کی جیولری پہنتی ہے جس میں نایاب اور پُراسرار پتھر جڑے ہوتے ہیں۔ اس نے عزت مآب اور میری محترمہ پھوپی نور النسا کی زندگی جہنم بنانے کا تہیہ کیا ہوا ہے اور وہ کر رہی ہے۔ اس نے اپنے بیٹے رائے زل میں ہمارے خاندان کے خلاف کوٹ کوٹ کر زہر بھر دیا ہے اور وہ جیسے سب کچھ برباد کرنے کی قسم کھائے بیٹھا ہے۔''

رائے زل کی صورت میری نگاہوں میں گھومنے لگی۔ گول چہرہ، چھوٹی چھوٹی چمکیلی آنکھیں، فربہ جسم اور چال ڈھال میں عجیب سا غرور...... میں نے ابھی اس کی آواز نہیں سنی تھی مگر قیافہ تھا کہ آواز بھی اس کی شکل کی طرح بے حد غصیلی ہو گی۔

قسطینا نے کھوئی کھوئی آواز میں کہا۔ ''ایسا کیوں ہوتا ہے شاہ زائب! دنیا میں طاقتور اور شرارتی ذہنوں والے لوگ امن پسند لوگوں کا جینا کیوں حرام کرتے ہیں۔ کیوں ان کے سامنے مارنے یا مر جانے کے سوا کوئی تیسرا راستہ نہیں چھوڑتے......؟''

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا، ایک زور کا کڑاکا ہوا۔ چھت کا ایک کونہ ایک زوردار تڑاخے سے لرز گیا۔ یہ آواز دھماکے سے مشابہ تھی اور بے حد کرخت۔ ہمیں یہی لگا جیسے ہم ہزاروں ٹن کنکریٹ کے نیچے دب کر ناپید ہونے والے ہیں۔ بالکل اضطراری طور پر میں قسطینا کے اوپر گرا اور اسے ڈھانپ لیا۔ وہ جیسے میرے نیچے چھپ گئی۔ وہ قیامت کے لمحے تھے۔ ہماری دہشت زدہ نظریں چھت کے اس گوشے پر تھیں جو اچانک ہی تین چار فٹ نیچے

آ گیا تھا۔ وہاں سے دراڑ ایک دم کھل کر سات آٹھ انچ چوڑی ہو گئی تھی۔ بہت سی 'سیمنٹ ملی ریت' وہاں سے ڈھول کی طرح گری تھی اور پورے ہال میں پھیل گئی تھی۔ اگلا لمحہ کیسا ہو گا، کچھ معلوم نہیں تھا۔

یوں محسوس ہوا کہ آخری لمحے آ گئے ہیں۔ فرش پر قسطینا میری بانہوں میں تھی۔ اس نے اپنا سر میری چھاتی پر ڈال دیا تھا۔ اس وقت شاید ہم عورت مرد نہیں تھے صرف دو جسم تھے جو موت کے دہانے پر تھے اور کسی بھی وقت ہمارا گوشت پوست سیکڑوں ٹکڑوں کی شکل اختیار کر سکتا تھا۔

نہ جانے کتنی ہی دیر اسی طرح گزر گئی۔ ہم ایک دوسرے سے لگے ایک دوسرے کی دھڑکنیں سنتے رہے۔ موت ایک بار پھر مہلت دے رہی تھی۔ دراڑ کا پھیلاؤ رک گیا تھا۔ وہ یوں ساکت ہو گئی تھی جیسے اب مدتوں تک اسی طرح رہے گی اور یہ کوئی بعید بھی نہیں تھا۔ اٹلی میں پیسا کا مینار جھکا ہوا ہے۔ صدیوں سے یوں لگ رہا ہے کہ ابھی آندھی چلے گی، یا زلزلہ آئے گا اور وہ گر جائے گا، لیکن وہ نہیں گرا۔

اس کی نگاہ میرے بازو پر تھی۔ وہ جیسے جاننا چاہ رہی تھی کہ اس اتھل پتھل میں میرے بازو کو کوئی گزند تو نہیں پہنچی۔

اوپر بھاری مشینوں کی گڑگڑاہٹ اور زمین کی مدھم تھرتھراہٹ تھی۔ خطرے کی شدت کم ہوئی تو ہم ایک بار پھر دو انسانی جسموں کے بجائے مرد اور عورت کے قالب میں ڈھلنے لگے۔ ایک دوسرے کے لمس اور نشیب و فراز کو محسوس کرنے لگے۔

وہ کسمسا کر اٹھ بیٹھی۔ میری طرف دیکھے بغیر بولی۔ ''میرا خیال ہے، ہمیں دروازے پر پھر کوشش کرنی چاہیے۔''

''مجھے نہیں لگتا کہ اس سے کچھ حاصل ہو گا...... لیکن آپ کہتی ہیں تو ٹرائی کر لیتے ہیں۔''

دروازے کا لوہا اب بالکل ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ ہم نے چرخی گھمائی اور زور لگا کر ایک بار پھر دروازے کو باہر کی جانب دھکیلا۔ دوبارہ وہی کچھ ہوا جلے ہوئے گوشت اور دھوئیں و بارود کی بو نے ہماری حسِ شامہ کا امتحان لیا۔ تھوڑا سا پانی بھی رس کر اندر آنے لگا۔ غالباً یہ وہی ہزاروں گیلن پانی تھا جو آگ بجھانے کے لیے بالائی منزلوں پر استعمال کیا گیا تھا۔ اب بالائی منزلوں پر نسبتاً سکون تھا۔ مشینوں کی گڑگڑاہٹ اور ریسکیو والوں کی بلند آوازیں سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ شاید تلاش کا کام صبح کے اجالے کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا یا پھر ورکروں کو کچھ ریسٹ دیا جا رہا تھا۔

میں نے اور قسطینا نے ہر ممکن کوشش کی مگر دروازے کی درز کو تین چار انچ سے بڑھا نہیں سکے۔ اس کوشش کا نقصان یہ ہو رہا تھا کہ یہ ''شیلٹر ہال'' بارود، دھوئیں اور جلے ہوئے گوشت کی بو سے بھر گیا تھا۔ اس کے علاوہ فائر بریگیڈز کا استعمال شدہ پانی بھی تیزی سے اندر آنا شروع ہو گیا تھا۔ اگر یہ زمین دوز بنکر بھر جاتا تو ہم، جو بارود اور آگ سے ابھی تک بچے ہوئے تھے پانی میں ڈوب کر ختم ہو جاتے۔ ہم نے وزنی دروازے کو دوبارہ بھیڑا اور چرخی گھما کر لاک کر دیا۔

پانی پورے فرش پر پھیل گیا تھا اور واش رومز کی طرف بہہ رہا تھا۔ ہماری نگاہیں بار بار بے ساختہ چھت کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ دراڑ نے کم از کم تین مرتبہ ہمیں موت کی جھلکی دکھائی تھی اور پھر دم سادھ لیا تھا۔ جیسے کوئی خونی درندہ اپنے شکار کے ساتھ چوہے بلی کا کھیل کھیل رہا ہو۔

اچانک ایک مدھم آہٹ نے ہم دونوں کو بری طرح چونکایا۔ محسوس ہوا کہ کوئی ملبے میں سے راستہ بناتا نیچے آ رہا ہے۔ یہ کوئی کرین یا بلڈوزر وغیرہ تو ہرگز نہیں تھا۔ شاید کچھ لوگ مشینری کے بغیر ہی کوششیں کر رہے تھے۔ پانچ دس منٹ مزید گزرے اور یہ آوازیں مزید قریب سے ابھرنے لگیں۔ ملبے کے سرکنے، بھاری چیزوں کے گرنے اور شاید کسی کے بولنے کی آواز بھی ان آوازوں میں شامل تھی۔

ہمارے ذہنوں میں اب تک دراڑ کا خوف ہی حاوی تھا اور اس خوف نے دوسرے ہر طرح کے خطرات کو ذرا فاصلے پر کر دیا تھا مگر اب ایک بار پھر بیرونی خطرے کا احساس ہونے لگا۔ ہم نے اپنے ہتھیار اٹھا لیے اور سوچنے لگے کہ اگر دروازے کو باہر سے توڑنے کی دوبارہ کوشش کی گئی تو ہمیں کیا ردِعمل دکھانا ہو گا۔

اگلے دو تین منٹ میں وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ ہمیں اس شیلٹر کے عین سامنے کچھ لوگوں کی موجودگی کا احساس ہوا۔ دروازے کو پہلے زور زور سے دھکیل کر کھولنے کی کوشش کی گئی پھر اس پر ہتھوڑے سے ضربیں لگائی گئیں۔ لیکن ان ضربوں کی شدت اور نوعیت کچھ اور طرح کی تھی۔ یوں محسوس ہوا جیسے دروازے کو نقصان نہیں پہنچایا جا رہا بلکہ اس پر دستک دی جا رہی ہے۔ ضربوں میں ایک ردھم سا تھا۔ پہلے تین ضربیں اکٹھی...... پھر دو ضربیں...... پھر دو ضربیں...... پھر تین ضربیں اکٹھی......

میں نے قسطینا کے چہرے پر ہیجانی کیفیت دیکھی۔ وہ ایک دم دروازے کی طرف آئی۔ ''مجھے لگتا ہے...... یہ اپنے لوگ ہیں۔'' اس نے تیز سرگوشی میں کہا۔

"یہ دھوکا بھی تو ہوسکتا ہے۔"
"لیکن......" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔
اس نے اپنے کولٹ پسٹل کے دستے کو مخصوص انداز میں دروازے سے ٹکرایا۔ دوسری طرف ضربوں کا ردھم کچھ بدل گیا۔ قسطینا کی آنکھوں میں چمک ابھری وہ سرسراتے لہجے میں بولی۔ "یہ اپنے لوگ لگتے ہیں......لیکن بات پھر وہی ہے کہ......"
"سو فیصد گارنٹی کسی چیز کی بھی نہیں دی جا سکتی۔" میں نے جلدی سے اس کی بات مکمل کردی۔
جس طرح یہ بھاری بھرکم چھت بیٹھتی چلی جا رہی تھی، اب ہمارے لیے باہر نکلنے کا رسک لینا ضروری ہو گیا تھا۔ "کون ہے باہر......؟" قسطینا نے چلا کر اپنی آواز باہر پہنچائی۔
لیکن باہر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ ہتھوڑے یا ہتھوڑی سے ہی مخصوص ضرب لگائی گئی۔ اب اس کی کوئی سی وجہ بھی ہو سکتی تھی۔ ممکن تھا کہ جو لوگ باہر موجود ہوں وہ واقعی چکما دے رہے ہوں۔ مگر یہ بھی ہوسکتا تھا کہ وہ واقعی ہمارے مددگار ہوں لیکن بوجوہ پکار کر جواب نہ دے سکتے ہوں۔ اس دروازے کے آر پار آواز پہنچانے کے لیے بہت بلند آواز سے بولنا ضروری تھا۔
یہ شدید کشمکش کے لمحات تھے۔ قسطینا کو فیصلہ کرنا تھا اور ایک کمانڈر کی حیثیت سے اس میں فیصلے کی قوت موجود تھی۔ میں اس کی منشا سمجھتے ہوئے واش روم کے اندر چلا گیا اور رائفل کا سیفٹی کیچ ہٹا کر پوزیشن لے لی۔ قسطینا نے پستول چادر کے نیچے چھپایا اور چرخی گھما کر دروازہ کھول دیا۔ اس کام میں اسے کافی دقت ہوئی لیکن اس کا جو رزلٹ نکلا، وہ برا نہیں تھا۔ دروازے کے سامنے سے رکاوٹیں ہٹائی جا چکی تھیں اس لیے دروازہ کھل گیا جو پہلا شخص تیزی سے اندر داخل ہوا وہ اجنبی نہیں تھا وہ بن مشہد تھا۔ وہ گرے فورس کی مکمل وردی میں تھا۔ بلٹ پروف جیکٹ، سر پر ہیلمٹ، ہاتھوں پر دستانے اور گیس ماسک گلے میں جھول رہا تھا۔ اس کے ساتھ صرف ایک شخص اور تھا۔ وہ اپنی وردی سے گرے فورس کا لیفٹیننٹ نظر آتا تھا۔
"پلیز یور ہائی نس......جلدی کریں۔ ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔ وقت بہت کم ہے۔ ملبا ہٹانے کا کام کسی بھی وقت دوبارہ شروع ہوسکتا ہے۔" وہ عجلت میں بولا۔
"شاہ زائب، آجاؤ۔" قسطینا نے آواز دی۔
میں رائفل بدست واش روم سے نکل آیا۔ مجھے دیکھ کر بن مشہد [illegible] کی آنکھوں میں حیرت ابھری۔ غالباً وہ ابھی تک یہی سمجھ رہے تھے کہ قسطینا اس ائر [illegible] میں اکیلی ہے

(اور میں پکڑا جا چکا ہوں یا اوپر کا ٹکٹ کٹا چکا ہوں)۔ ہم شیلٹر کی حبس زدہ فضا سے باہر نکلے۔ بن مشہد کے ہاتھ میں ایک بڑی ٹارچ تھی۔ دوسرے ہاتھ میں بھرا ہوا سروس پستول تھا۔ دروازے کے سامنے جلے ہوئے ڈھانچوں اور ادھ جلے جسموں کا منظر لرزہ خیز تھا۔ یہی لاشیں تھیں جنہوں نے شیلٹر کے دروازے کو باہر کی طرف کھلنے سے روک رکھا تھا۔ ہم آگے پیچھے چلتے ایک ڈھلوان پر چڑھے۔ اگر ہمارا خیال تھا کہ ہم کوئی خاص دقت اٹھائے بغیر ملبے کے اس عظیم الشان ڈھیر سے نکل جائیں گے تو یہ خام خیالی تھی۔ اگلے دس پندرہ منٹ میں ہمیں دانتوں پسینے آ گئے۔ ہمیں آہنی سریوں اور کنکریٹ کے لاتعداد ٹکڑوں اور تودوں کے درمیان سے، کہیں پر رکوع کے بل جھک کر اور کہیں پیٹ کے بل رینگ کر گزرنا پڑا۔ کچھ جگہیں اتنی گرم تھیں کہ ہماری جلد جھلسنے لگی۔ ہمیں احساس ہوا کہ بن مشہد اور اس کا ساتھی کتنی جاں گسل کوشش سے ہم تک پہنچے ہیں۔ ایک جگہ لیفٹیننٹ کی ٹانگیں لکڑی کے بڑے بڑے ادھ جلے تختوں کے درمیان پھنس کر رہ گئیں اور بن مشہد اور قسطینا اسے وہاں سے بمشکل نکال پائے۔ میں اپنے بازو کی وجہ سے اس کٹھن سفر میں کسی کی مدد کرنے کے قابل نہیں تھا، خود کو گھسیٹتا چلا جا رہا تھا۔ یہی بڑی بات تھی۔ اب یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ رہی تھی کہ بن مشہد کو آقا جان وغیرہ کی طرف سے ہمارے بارے میں معلومات ملی تھیں اور وہ ہماری مدد کے لیے زمین دوز شیلٹر تک پہنچے تھے۔ ایک مسمار راہداری میں ہم نے پیراکی کے لباس میں چند خوبرو لڑکیوں کو دیکھا۔ وہ نہا رہی تھیں لیکن اپنے ہی خون میں۔ ایک چھت کے نیچے آ کر ان کی لاشیں بری طرح کچلی مسلی گئی تھیں۔ انہیں مرے ہوئے اور وہاں پھنسے ہوئے دو تین گھنٹے گزر چکے تھے۔ ایک کچن پر شاید براہِ راست کوئی راکٹ یا بم گرا تھا، وہ بری طرح تباہ ہوا تھا۔ وہاں دو خوب صورت ٹانگیں پڑی نظر آئیں، یہ کسی ایسے جوان فوجی کی ٹانگیں تھیں جس نے گرے نیکر پہن رکھی تھی مگر فوجی کا بالائی حصہ کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

بن مشہد کے عقب میں چلتے ہم پتا نہیں کس طرح اس ''عظیم الشان'' ملبے کے اندر سے نکلے۔ ملبے کا یہ ڈھیر قریباً سات گھنٹے پہلے تک ایک مشہور تفریحی کلب تھا جس کے اندر زندگی کی رنگینیاں دیوانہ وار ناچتی تھیں، وہاں داخل ہونے والے ہر فرد کو وہ ''سب کچھ'' ملتا تھا جس کی وہ تمنا کرتا تھا، مگر اب وہاں داخل ہونے والے افراد کو صرف بچے کھچے زخمی اور لاشیں مل رہی تھیں۔ کلب کے اطراف میں بے شمار ایمبولینسز اور فائر بریگیڈ کی گاڑیاں اپنی ریوالونگ لائٹس چمکا رہی تھیں۔ اس کے علاوہ بڑی بڑی سرچ لائٹس تھیں جو ملبے کے ان حصوں کو فوکس کر رہی تھیں جہاں کسی زندہ شخص کی موجودگی کے شواہد تھے باقی سارا نیوسٹی مکمل بلیک آؤٹ کی

زد میں تھا۔

بن مشہد ہمیں ملبے سے نکالتے ہی سیدھا ایک بند فوجی گاڑی میں لے آیا۔ یہ ایک بڑے سائز کی جیپ تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر پہلے سے ایک باوردی اہلکار موجود تھا۔ بن مشہد نے قسطینا سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''گستاخی کی معافی چاہتا ہوں یور ہائی نس، لیکن مجبوری ہے۔ آپ نشستوں کے درمیانی خلا میں لیٹ جائیں......اور آپ بھی مسٹر شاہ زیب، جب تک ہم نہ کہیں، آپ اپنی جگہ پر موجود رہیں۔''

''او کے۔'' قسطینا نے کہا۔ ''ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

''آرمی اسپتال، اس وقت وہی جگہ سب سے محفوظ ہے۔'' بن مشہد نے جواب دیا۔ اس کی یونیفارم کا برا حال تھا۔ ایک طرف سے سر کے بال بھی جلے ہوئے تھے۔ لیفٹیننٹ کی حالت اس سے بھی بری تھی۔ ہمیں ملبے سے نکالنے کے لیے ان دونوں نے یقیناً جان توڑ محنت کی تھی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا اس کوشش میں ان کا ایک ساتھی جو انجینئرنگ یونٹ سے تھا، شدید زخمی ہو کر اسپتال پہنچ چکا تھا۔

جو بمباری قسطینا نے چند گھنٹے پہلے برج کلب پر کرائی تھی اس نے اردگرد کی بہت سی عمارتوں کو بھی نقصان پہنچایا تھا۔ کئی کھنڈرات سے ابھی تک دھواں نکل رہا تھا اور امدادی ٹیمیں کارروائیوں میں مصروف تھیں۔ یہ سب کچھ آفیسر لوکاس کے سیل فون سے ملنے والے MESSAGES کی بدولت ہوا تھا اور شاید اس لیے بھی ہوا تھا کہ اس نے اپنی رات چمکانے کے لیے ایک ''پھول بیچنے والی'' کو بیڈ روم میں لے جانا چاہا تھا...... ہاں غلطیاں اپنا خراج وصول کرتی ہیں۔ ہم دونوں نشستوں کے درمیانی خلا میں سیدھے لیٹ گئے تھے، بس میرے گھٹنے تھوڑے سے اوپر اٹھے ہوئے تھے ان پر بن مشہد نے ایک ترپال نما کپڑا ڈال دیا۔ فوجی جیپ مختلف سڑکوں پر سے گزرتی رہی مگر ہم لیٹے ہونے کے سبب یہ مناظر نہ دیکھ سکے۔ تاہم ایمبولینسز اور سیکیورٹی کی گاڑیوں کے سائرن ہر جگہ سنائی دے رہے تھے۔

دس منٹ بعد ہم کسی عمارت میں داخل ہوئے۔ یہاں بھی ایمبولینسز کے سائرن چنگھاڑ رہے تھے۔ ملائی اور انگلش میں ''بہادر فوجیوں'' کے لیے خون کے عطیات کی اپیل کی جا رہی تھی۔ جیپ کھڑی ہو گئی۔ بن مشہد اور لیفٹیننٹ اتر کر چلے گئے۔ ڈرائیور جیپ کے آس پاس ٹہلتا رہا۔ ذہن میں کسی وقت شکوک بھی ابھرنے لگتے تھے مگر قسطینا چونکہ بن مشہد پر پورا اعتماد کر رہی تھی۔ اس لیے میں بھی کر رہا تھا۔ یہ یقیناً آرمی اسپتال تھا اور جس جگہ جیپ کھڑی تھی یہ اسپتال کا عقبی حصہ دکھائی دیتا تھا۔ یہاں بھی مکمل بلیک آؤٹ تھا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔

اسپتال کے اس عقبی گیٹ پر بھی چیکنگ ہو رہی تھی اور آتی جاتی گاڑیوں کو روکا جا رہا تھا۔
اچانک بن مشہد کی دھیمی لیکن تیز آواز ہمارے کانوں میں پڑی۔ ''اب آپ نکل آئیں اور میرے پیچھے تشریف لائیں۔''
ہم نے اس ہدایت پر عمل کیا اور ایک نیم تاریک راہداری پر چل کر ایک کمرے میں پہنچ گئے۔ کمرے میں ہلکی روشنی تھی۔ کھڑکیوں پر سیاہ کاغذ چپکائے گئے تھے۔ کمرے میں پہنچتے ہی قسطینا کو پُر جوش سلیوٹ کیا گیا۔ یہ سلیوٹ بن مشہد اور اس کے ساتھی لیفٹیننٹ کی طرف سے کیا گیا تھا۔ قسطینا نے سلیوٹ کا جواب دیا اور بن مشہد سے سب سے پہلا سوال یہ کیا۔ ''چیف گیرٹ کا کچھ پتا چلا؟''
بن مشہد نے چند سیکنڈ خاموش رہنے کے بعد کہا۔ ''یور ہائی نس! وہ بچ گیا ہے مگر شدید زخمی ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ شاید اسے ایجنسی والے علاج کے لیے امریکا بھجوا رہے ہیں۔ وہ لاشوں اور زخمیوں کے ایک ڈھیر میں دبا ہوا تھا۔ اس کے سر، چہرے اور سینے پر گہری چوٹیں آئی ہیں۔ اس کے کم از کم تین قریبی جرنیل موقع پر ہی ہلاک ہوئے ہیں۔ ان میں سے دو اس شیلٹر کے بند دروازے کے سامنے مرے ہیں جس میں آپ دونوں موجود تھے۔''
بن مشہد نے تینوں جرنیلوں کے نام قسطینا کو بتائے اور ان کی موت کی تفصیل سے آگاہ کیا۔ یہ سب بڑی خبریں تھیں مگر قسطینا کے چہرے پر دکھ تھا۔ اس دکھ کا تعلق یقیناً اصل ٹارگٹ چیف گیرٹ کے زندہ بچ جانے کا تھا۔
دفعتاً میری نگاہ بائیں جانب ایک بیڈ کے نیچے گئی اور میں بری طرح چونک گیا۔ یہاں دو افراد لمبے لیٹے ہوئے تھے۔ ان میں ایک مرد اور ایک عورت تھی۔ دونوں کے جسموں پر عزت مآب کی گرین فورس کی وردی تھی۔ غور سے دیکھنے پر انکشاف ہوا کہ یہ دونوں لاشیں ہیں۔ اب قسطینا کی نظر بھی لاشوں پر پڑ گئی تھی۔ دونوں لاشوں کی یونیفارمز پر خون کے دھبے موجود تھے جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لڑائی کے دوران میں مرے ہیں۔ ان کے چہروں پر ہلکی سی نیلاہٹ تھی اور اعضا سردی کے سبب اکڑے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ جیسے انہیں کولڈ اسٹوریج سے نکالا گیا ہو۔
''یہ کیا ہے؟'' قسطینا نے بن مشہد سے پوچھا۔
''یہ گرین فورس کے شہید ہیں جی...... ان کو وہاں دفنانے کا پروگرام ہے۔'' بن مشہد نے بغلی دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔
ہم دیکھ کر حیران ہوئے۔ اس دوسرے کمرے کا فرش اکھاڑا گیا تھا۔ ایک کونے میں

مٹی کا ڈھیر لگا ہوا تھا اور چار پانچ فٹ گہرا گڑھا نظر آرہا تھا۔
''یہ سب کس لیے بن مشہد؟'' قسطینا نے تعجب سے پوچھا۔
''ان دونوں کی جگہ آپ نے لینی ہے یور ہائی نس؟'' بن مشہد نے کہا۔
اس نے جو تفصیل بتائی اس سے پتا چلا کہ یہ سب کچھ ہمیں واپس اپنے علاقے میں بھیجنے کے لیے کیا جارہا ہے۔ آج دونوں طرف سے لڑائی میں ہلاک ہو جانے والے فوجیوں کی لاشوں کا تبادلہ کیا جارہا تھا۔ گرین فورس کی چالیس کے قریب لاشیں تھیں جو جاما جی بھیجی جارہی تھیں۔ اسی طرح وہاں سے کچھ لاشیں نیوسٹی آرہی تھیں۔ اس آپریشن کا انچارج لیفٹیننٹ بن مشہد ہی تھا۔ آج کسی وقت چالیس تابوت بارڈر پر پہنچانا اور وہاں سے قریباً اتنے ہی تابوت واپس ملٹری اسپتال لانا بن مشہد کی ذمے داری تھی۔ بن مشہد نے دو لاشوں کو یہیں دفنانے کا پلان بنا کر دو تابوت خالی کر لیے تھے۔ اب ہمیں بطور لاش ان تابوتوں میں سفر کر کے نیوسٹی کے زیر قبضہ علاقے سے نکلنا تھا۔
قسطینا نے بن مشہد سے تمام تفصیلات پوچھیں اور اس پلان سے مطمئن نظر آئی۔ ابھی ہمیں کم از کم چار پانچ گھنٹے اسپتال کے اسی پرائیویٹ کمرے میں گزارنا تھے۔ بن مشہد نے بھی دیکھ لیا تھا کہ قسطینا کی کمر پر بینڈ یج موجود ہے...... اور خون بھی رس رہا ہے۔ اس نے فوراً بہتر مرہم پٹی کا انتظام کیا۔ فی میل نرس کا حصول مشکل تھا۔ قسطینا کے لیے ایک بار پھر مجھے ہی نرسنگ کی ڈیوٹی انجام دینا پڑی۔ ایک بار پھر اس کی حسین کمر کی دل دھڑکا دینے والی تراش خراش سے واسطہ پڑا۔ قسطینا کو اینٹی بائیوٹک انجکشن بھی لگایا گیا۔ اکھاڑ پچھاڑ نے میرے کندھے کو بھی درد سے بھر دیا تھا۔ ایک پین کلر انجکشن اور کچھ ادویات میں نے بھی لیں۔
چیف گیرٹ کے زندہ بچ جانے کا سن کر قسطینا کچھ چپ چپ سی تھی۔ پاس ہی پارکنگ میں کھڑی کسی فوجی گاڑی میں رائے زل کی گرے فورس کے سپاہی بیٹھے تھے۔ وہ اپنا پسندیدہ ترانہ گارہے تھے۔

ہم بزدل دشمن کو اس کی بل میں سے نکال کر ماریں گے
اور ہماری بہادری دیکھ کر دشمن کی سرزمین ہمارے قدم چومے گی
پھل دار درختوں کی ساری ٹہنیاں ہمارے لیے جھک جائیں گی
اور وہاں کی خوبرو عورتیں
بڑی خوشی سے ہمارے گلے میں محبت کے ہار ڈالیں گی

بن مشہد نے کہا۔ ''رات والے فضائی حملے کے بعد ان لوگوں کا جوش و خروش کچھ ٹھنڈا پڑ

گیا ہے۔ ورنہ انہوں نے تو ہر جگہ آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ اسپتالوں میں زخمی بھی اٹھ اٹھ کر ناچ رہے تھے۔ آج بہت سے گھروں میں صفِ ماتم بچھی ہوئی ہے۔''

''بارڈر کی کیا پوزیشن ہے مشہد؟'' قسطینا نے پوچھا۔

''جوں کی توں ہے یور ہائی نس، وہ لوگ ٹیلوں تک تو پہنچ گئے تھے لیکن آگے نہیں بڑھے اور امید ہے کہ اب فوری طور پر بڑھیں گے بھی نہیں۔ ایک دو دن تو وہ لاشیں سنبھالیں گے اور نئی صف بندی کریں گے۔ اس فضائی حملے نے انہیں ہلا کر رکھ دیا ہے۔''

مجھے گفتگو میں شریک رکھنے کے لیے بن مشہد اور قسطینا انگلش میں بات کر رہے تھے۔ میرا دھیان بار بار سجاول کی طرف جا رہا تھا۔ وہ اسی جگہ کہیں موجود تھا۔ میں نے اس سے سجاول کا ذکر کیا تو وہ ذرا چونک گیا۔ بولا۔ ''رات کو ایمرجنسی میں چند زخمی لائے گئے تھے۔ ان میں سے ایک دراز قد بندے پر مجھے کچھ شک ہوا تھا...... شاید میں اسے چیک کرتا مگر پھر برج کلب پر فضائی حملہ ہو گیا اور ہم سب اس طرف متوجہ ہو گئے...... میں ابھی دوبارہ دیکھتا ہوں۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''کہاں جا رہے ہو؟'' قسطینا نے پوچھا۔

''شاید وہ ابھی ایمرجنسی میں ہو۔ اس کے ماتھے اور آنکھوں پر بھاری بینڈیج تھی۔ شلوار قمیص میں تھا...... میں دیکھتا ہوں۔''

''اگر ہو سکے تو اس کی فوٹیج بنا لاؤ۔'' میں نے کہا۔

بن مشہد نے اثبات میں سر ہلایا اور تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔ لیفٹیننٹ وکی نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ میری دھڑکن بڑھ گئی تھی۔ اگر سجاول مل جاتا تو میری ایک بہت بڑی پریشانی دور ہو جاتی۔ ڈی پیلس میں بھی اس کے لیے تشویش محسوس کی جا رہی تھی۔ خاص طور سے بیگم نورل اس کے لیے بے حد فکر مند تھیں کہ انہوں نے سجاول کو بھائی کا درجہ دیا ہوا تھا۔

اگلے چند منٹ بڑی مشکل سے گزرے۔ آخر بن مشہد اندر داخل ہوا۔ اس نے کہا۔ ''وہ دواؤں کے زیر اثر سو رہا ہے۔ میں اس کی فوٹیج بنا لایا ہوں۔''

میں نے بن مشہد کے سیل فون پر یہ فوٹیج دیکھی اور ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ اسپتال کے بیڈ پر جو کیم شحیم شخص لیٹا ہوا تھا، وہ سجاول نہیں تھا۔

میرے تاثرات دیکھ کر قسطینا نے مجھے تسلی دی اور کہا کہ ہم بہت جلد اس کا کھوج لگا لیں گے۔

سجاول کا پاکستان سے یہاں آنا اور آتے ساتھ ہی اوجھل ہو جانا میرے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔ وہ جو کچھ بھی تھا۔ دوستی کی حد تک میرے لیے برا ثابت نہیں ہوا تھا۔ ہتھ جوڑی والی لڑائی میں، میں نے اس کے سیکڑوں ساتھیوں کے سامنے اس کی عزت رکھی تھی اور اس سلوک کو اس نے فراموش نہیں کیا تھا۔ بے شک اس کے اندر لالچ موجود تھا مگر پاراہاؤس میں کروڑوں کی چوری والے معاملے میں وہ نہ صرف بے گناہ ثابت ہوا تھا بلکہ وہ اصل مجرم قادر اور مسروقہ سامان بھی پاراہاؤس میں واپس لایا تھا۔

میں اور قسطینا دیر تک سجاول کے بارے میں بات کرتے رہے۔ اسی دوران میں گڑگڑاہٹ کی مہیب آواز سنائی دی۔ یہ آواز کافی فاصلے سے آئی تھی مگر اس کی گونج اسپتال کے اس کمرے تک پہنچی تھی۔ بن مشہد نے فون کیا تو اس بات کی تصدیق ہوئی کہ ملبا ہٹانے کے دوران میں برج کلب کا بچا کھچا حصہ بھی زمین بوس ہو گیا ہے۔ مجھے اور قسطینا کو شیلٹر ہال کی چھت کی خوفناک دراڑ یاد آ گئی۔ نوے فیصد امکان اس بات کا تھا کہ وہ شیلٹر بھی اب نہیں رہا ہوگا۔

○......❖......○

یہ دو بڑی فوجی گاڑیوں پر قریباً چالیس عدد تابوت تھے۔ ان تابوتوں میں گرین فورس کے مرنے والوں کی لاشیں اور باقیات تھیں لیکن دو تابوت ایسے تھے جن میں لاشوں کے بجائے زندہ انسان تھے...... میں اور قسطینا۔ یہ انوکھا تجربہ تھا۔ ہم دونوں کے جسموں پر گرین فورس کی خون آلود وردیاں تھیں۔ ہمارے چہروں پر ہلکی سی نیلاہٹ اور مردنی پیدا کرنے کے لیے لیفٹیننٹ وکی نے کوئی لوشن سا لگایا تھا۔ تابوت بند کرنے سے پہلے بن مشہد نے قسطینا کا کولٹ پسٹل اس کے ساتھ ہی رکھ دیا تھا، ایک پستول میرے ساتھ بھی کر دیا گیا تھا تاکہ بوقتِ ضرورت کام آئے۔ ہمارے پاؤں کے انگوٹھے پر ایک ایک ٹیگ تھا جس پر ''مردہ نمبر'' تھا۔

دونوں گاڑیاں مختلف سڑکوں سے گزرتی آگے بڑھتی رہیں۔ یہ ایک چمکیلی دوپہر تھی۔ ٹریفک کا شور میرے کانوں تک پہنچ رہا تھا۔ گاہے بگاہے ہیلی کاپٹر کی پھڑپھڑاہٹ اور ایمبولینسز کے سائرن بھی سنائی دیتے تھے۔ ایک جگہ گاڑی رک گئی۔ اندازہ ہوا کہ ہم بارڈر پر پہنچ چکے ہیں۔ اب تابوتوں کو اتار کر گرین فورس کی گاڑیوں میں لادا جانا تھا۔ یہ مشکل مرحلہ تھا اور پول کھلنے کا سبب پیدا ہو سکتا تھا۔ دھڑکنوں میں اضافہ ہو گیا اور میں نے خود کو ہر ممکنہ صورتِ حال کے لیے تیار کر لیا۔ بہرطور یہ مرحلہ بھی بخیریت گزر گیا۔ چند منٹ بعد مجھے محسوس

ہوا کہ میرے تابوت کو بھی چند افراد نے کندھے پر لادا ہے اور کسی دوسری گاڑی میں بار کر دیا ہے۔

یہ گاڑیاں روانہ ہوئیں تو اطمینان کا احساس ہوا۔ اب ہم زیر قبضہ علاقے سے نکل چلے تھے۔ دس پندرہ منٹ کی سواری کے بعد ہم کسی وسیع عمارت کے احاطے میں داخل ہوئے۔ ایک بار پھر ہمارے تابوتوں کو کندھوں پر لاد کر گاڑیوں سے نکالنے کا عمل شروع ہوا۔ آوازوں سے پتا چلتا تھا کہ دونوں جانب مسلح دستے کھڑے ہمیں سلیوٹ کر رہے ہیں اور سلامی دے رہے ہیں۔ کسی جنگی ترانے کا میوزک بھی سنائی دے رہا تھا۔

تابوتوں کو کسی سرد جگہ پر رکھ دیا گیا۔ یہاں آتے ہی خنکی کا واضح احساس ہوا۔ اگلے آٹھ دس منٹ کافی تناؤ بھرے تھے۔ بن مشہد اور قسطینا کی ہدایت میرے لیے یہی تھی کہ میں خود تابوت میں سے نہیں نکلوں گا۔

آخر تابوت کا ڈھکنا اٹھایا گیا۔ ڈھکنا اٹھانے والی خود قسطینا ہی تھی۔ وہ مجھ سے تھوڑی دیر پہلے اپنے تابوت سے نکل آئی تھی۔ ''نکل آؤ۔'' اس نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

''ایک مردے کی مدد کا شکریہ۔'' میں نے جواب دیا اور اٹھ کر باہر نکل آیا۔ دوسرا شخص جو یہاں موجود تھا وہ حلمی تھا۔

''ویل ڈن یور ہائی نس۔'' اس نے قسطینا سے مخاطب ہو کر کہا۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''ویل ڈن مسٹر شاہ زیب۔''

یہ ایک ڈیڈ ہاؤس تھا۔ ٹمپریچر کافی کم تھا۔ یہاں نیم تاریکی تھی۔ کم و بیش چالیس تابوت بڑی ترتیب سے یہاں رکھے تھے ان کو جا مانجھ کے دو رنگے پرچم میں لپیٹا گیا تھا۔ ڈیڈ ہاؤس میں اس وقت حلمی اور اس کے ایک باوردی ساتھی کے سوا اور کوئی موجود نہیں تھا۔

قسطینا نے کہا۔ ''مسٹر حلمی! مجھے لگتا ہے کہ ہمیں یہاں سے نکالنے کے لیے رش کم کر دیا گیا ہے۔''

''بالکل ایسا ہی ہے یور ہائی نس۔''

''اب ان خالی تابوتوں کا کیا ہوگا؟''

''ان میں کچھ نہ کچھ بھر دیا جائے گا۔'' حلمی نے جواب دیا۔

ڈیڈ ہاؤس کے بغلی دروازے کے پاس ایک چینج روم موجود تھا۔ یہاں میرے اور قسطینا کے ناپ کے لباس موجود تھے۔ پہلے قسطینا اور پھر میں نے اپنی خون آلود یونیفارم اتاری، چہرہ صاف کیا اور بغلی دروازے پر پہنچ گئے۔ دروازے کے ساتھ ہی دو کاریں کھڑی تھیں۔ ان کی

کھڑکیوں کے شیشے "ٹینڈ ڈ" تھے۔ "اپنا خیال رکھنا۔" قسطینا نے عجیب لہجے میں کہا۔ "میں جلد رابطہ کروں گی۔"

وہ بڑی کار میں بیٹھ گئی۔ کار میں اس کی سہیلی ڈاکٹر ماریہ پہلے سے موجود تھی۔ میں چھوٹی کار میں بیٹھ کر ڈی پیلس کی طرف روانہ ہو گیا۔ آدھ گھنٹے بعد میں ڈی پیلس کی انیکسی میں انیق کے ساتھ موجود تھا۔ حسبِ معمول وہ اوٹ پٹانگ صورتِ حال میں تھا۔ وہ میرے والے کمرے میں بلند آواز میں کوئی کلام سن رہا تھا۔ کوئی کافی قسم کی چیز تھی۔ میں نے دستک دی تو اس نے دروازہ کھولا اور مجھے بخیریت دیکھ کر نہال ہو گیا۔ "آپ کی خیریت بہت نیک مطلوب تھی۔" وہ چہکا۔

میں نے کہا۔ "زینب کا کیا حال ہے؟"

"وہ بھی ٹھیک ہے۔" انیق کی آواز بمشکل میرے کانوں تک پہنچی۔

میں نے کہا۔ "یار یہ میوزک تو بند کرو۔"

"آپ اسے میوزک کہہ رہے ہیں۔ یہ تو بہت اونچا کلام ہے۔ ملنگی ڈیرے سے پاک بہن کی کیسٹ لے کر آیا تھا میں...... پاک بہن کا نام آپ کو بھولا تو نہیں ہو گا؟"

"نہیں نہیں یاد ہے۔ لیکن یہاں اس پاک بہن کو لوگوں کے کان پھاڑنے کے لیے کیوں استعمال کر رہے ہو؟"

"یہ معرفت کی اور تصوف کی باتیں ہیں جناب! اور میں روز بروز اس معرفت میں ڈوبتا چلا جا رہا ہوں...... مجھ پر نئے نئے راز آشکار ہو رہے ہیں۔ مجھے تو ڈر ہے کہ کسی دن میں ہوا میں ہی نہ اُڑ جاؤں۔"

"اگر یہ کام ہونا ہے تو اللہ کرے جلدی ہو جائے۔" میں نے کہا اور کمرے کا دروازہ اندر سے بولٹ کر دیا۔ کیسٹ پلیئر کی آواز بند کر کے میں نے بغلی دروازہ کھولا اور اس کمرے میں جھانکا جہاں زینب مقیم تھی۔ یہ دراصل سجاول والا کمرا ہی تھا۔ ٹیبل لیمپ کی مدھم روشنی میں وہ بستر پر سوئی ہوئی تھی۔ بال منتشر، چہرے پر معصومیت اور مظلومیت۔ اس کی گردن اور ہاتھوں وغیرہ پر ابھی تک اس تشدد کے نشانات موجود تھے جو خواجہ سرا خیام نے اس پر کیا تھا۔ مجھے لگا کہ اس کے رخساروں پر ان خشک آنسوؤں کا نمک چمک رہا ہے جو وہ سونے سے پہلے بہاتی رہی ہے۔ وہ کسی سازش کے چنگل میں تھی اور میں اس سازش کے تانے بانے توڑے بغیر چین سے بیٹھنے والا نہیں تھا۔

ہم نے دروازہ آہستہ سے بند کیا اور واپس میرے والے کمرے میں آ گئے۔ انیق یہ

جاننے کے لیے بے تاب تھا کہ میں دو راتیں کہاں گزار کر آیا ہوں؟ اور نیوسٹی کے کلب پر جو بہت بڑا اور کامیاب حملہ ہوا ہے، اس میں میرا بھی کوئی کردار ہے یا نہیں۔ میں نے اسے مختصر الفاظ میں آگاہ کیا۔ اس نے بھی مجھے مختصراً یہاں کے حالات بتائے۔ اس نے انکشاف کیا کہ ڈی پیلس کے رہائشی حصے میں زبردست بے چینی ہے۔ چھوٹے صاحب ہز ہائی نس ابراہیم کی طبیعت مسلسل خراب ہے۔ چند دنوں میں ہی ان کا وزن چودہ پندرہ پاؤنڈ کم ہو گیا ہے۔ وہ کچھ کھا پی نہیں رہے۔ ڈاکٹروں نے انہیں مسلسل ٹرینکولائزرز پر رکھا ہوا ہے۔

"ٹرینکولائزرز کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"وہ اٹھتے ہیں تو زینب کو پکارتے ہیں اور اس کی قبر پر جانا چاہتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ وہ اسے ڈھونڈنے کے لیے پاکستان جا رہے ہیں...... بیگم نسا نورل بیٹے کی حالت دیکھ دیکھ کر غش کھا جاتی ہیں۔ ڈی پیلس میں اور ڈی پیلس سے باہر بہت سی چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ابراہیم اپنی دلہن کی موت کا ذمے دار اپنے والد عزت مآب ریان فردوس کو قرار دے رہا ہے۔"

"ابراہیم کی حالت خطرے میں تو نہیں؟"

"کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ڈی پیلس کے ہی ایک حصے کو اسپتال کی شکل دے دی گئی ہے اور ڈاکٹروں کا ایک گروپ ابراہیم کو مانیٹر کر رہا ہے۔"

ایک دم میرا دھیان کبڈی پہلوان سیف کی طرف گیا۔ میں نے انیق سے پوچھا۔ "وہ سیف کہاں ہے؟"

"وہ بھی ایک نمونہ ہے جی......"

"تمہاری طرح۔" میں نے لقمہ دیا۔

"چلیں، میری طرح ہی سمجھ لیں۔ ہر وقت اپنے سیل فون سے چمٹا رہتا ہے۔ اب بھی اپنے مقامی یار کرخت سنگھ کے ساتھ اپنا موبائل ٹھیک کرانے گیا ہے۔ دونوں پنجابیوں میں گاڑھی چھن رہی ہے۔ اب بہانہ تو موبائل ٹھیک کرانے کا ہے لیکن پی کر آئیں گے لسی، اور ساتھ میں برفی شرفی کھائیں گے۔"

"اسے زینب کے بارے میں کوئی شک نہیں ہوا؟"

"ابھی تک تو نہیں ہوا۔ اس کا کمرا دوسری سائیڈ پر ہے۔ ہاں آپ کے بارے میں پریشان تھا۔ کئی بار پوچھ چکا ہے۔"

میں نے کہا۔ "زینب کی یہاں موجودگی زیادہ دیر راز نہیں رہے گی۔ ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا

ہوگا۔ کچھ لوگ اسے مارنا چاہتے تھے اور وہ اب بھی اس کے ارد گرد موجود ہیں۔''

''شاہ زیب بھائی! کسی طرح اس ہیجڑے خیام کا پتا چل جائے اور اس سے کچھ اگلوایا جا سکے تو بات بن سکتی ہے۔''

''لیکن اس تک پہنچا کیسے جائے؟ یکی بات ہے کہ تمہاری کارروائی کے بعد وہ بہت چوکس ہو چکا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے ساحلی گھر پر ٹھیک ٹھاک سیکیورٹی ہو۔''

''ویسے میں ایک نیا چلہ تو کاٹ رہا ہوں۔ اس میں چوتھی رات کے بعد ہزار ہزار کے کرنسی نوٹوں کی دھونی درکار ہے۔ تین چار نوٹ ہوں گے آپ کے پاس؟''

''کیا مطلب؟''

''دھونی کا مطلب نہیں سمجھتے آپ......؟''

میں اسے ٹانگ رسید کرنے کا ارادہ کر رہا تھا جب ایک کھٹکا سن کر چونک گیا۔ آواز اس چھوٹے سے ملحقہ کمرے سے آئی تھی جو کچن کے طور پر استعمال ہوتا ہوگا لیکن اب وہاں فالتو اشیا پڑی تھیں۔ میں اس کچن کی طرف بڑھا۔ ہلکی آواز پھر آئی۔ یہاں ایک بڑا ڈیپ فریزر بھی رکھا تھا۔ مجھے شک گزرا کہ آواز یہاں سے آئی ہے۔ میں نے انیق کی طرف دیکھا وہ بھی ڈیپ فریزر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے ڈھکن اٹھایا اور بے طرح ٹھٹک گیا۔ ڈیپ فریزر میں کھانے پینے کی اشیا نہیں تھیں، ایک بے حرکت انسانی جسم پڑا تھا...... بلکہ یہ دو جسم تھے جو اوپر تلے پڑے تھے۔ میں نے بالائی جسم کو دیکھا اور دوسری بار کرنٹ سا لگا۔ اگر میں غلط قیافہ نہیں لگا رہا تھا تو یہ ہیجڑے خیام مانش کا جسم تھا۔ آدھا سر گنجا، رخساروں پر پاؤڈر، آنکھوں میں کاجل، کانوں میں بالے نظر آ رہے تھے۔ اس نے ست رنگا لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی چوڑی ٹیپ مضبوطی سے چپکائی گئی تھی۔ فریزر کی سردی کے سبب اس کے سر کے بالوں اور بھنوؤں پر برف کے ذرات دکھائی دے رہے تھے۔

کیا وہ مر چکا تھا؟ لیکن اچانک اس نے آنکھیں کھولیں۔ میری طرف دیکھ کر ذرا حیران ہوا۔ پھر اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کی مگر وہ مضبوط چوڑی ٹیپوں کے ذریعے اپنے نیچے والے جسم سے بندھا ہوا تھا۔ نیچے یقیناً ایک لاش تھی، کیونکہ اس کا چہرہ خون سے لتھڑا تھا اور فریزر کے پیندے میں بھی خون جما نظر آ رہا تھا۔

میں نے جلدی سے فریزر کا ڈھکن بند کر دیا۔ اندر ہیجڑے نے ایک بار پھر حرکت کرنے کی ناکام کوشش کی اور فریزر میں سے ہلکی آواز بلند ہوئی۔ میری سمجھ میں آ گیا کہ پہلے بھی یہی آواز میرے کانوں تک پہنچی تھی اور...... انیق نے شاید یہی آواز دبانے کے لیے

اونچی آواز میں کیسٹ پلیئر آن کر رکھا تھا۔ میں نے حیران پریشان ہو کر انیق کی طرف دیکھا۔اس نے اسٹائل سے کندھے اچکائے جیسے خود بھی حیران ہو۔

میں اسے کھینچ کر کمرے میں لے آیا۔''یہ کیا تماشا ہے انیق؟''

''آپ فریزر کو تماشا کہہ رہے ہیں۔''

''میں تھپڑ ماردوں گا انیق، یہ کیا کیا ہے تم نے؟ کس کی اجازت اور مشورے سے کیا ہے؟ میں جب بھی واپس آتا ہوں تم نے کوئی نہ کوئی ''سرپرائز'' کھڑا کر رکھا ہوتا ہے۔'' میری آواز غصے سے کانپ رہی تھی۔

وہ سنبھل کر بولا۔''یقین کریں، میں نے کچھ نہیں کیا۔ جو کچھ کیا ہے اسی کی طرف سے ہوا ہے۔اس کی مصیبت اسے کھینچ کر یہاں لے آئی ہے۔''

''لیکن کیسے؟''

''آہستہ بولیں جی۔ زینب کو کسی گڑبڑ کا پتا چل گیا تو نیا سیاپا پڑ جائے گا...... یہ خود یہاں پہنچا ہے۔ کہتے ہیں نا کہ کبھی کبھی کنواں بھی پیاسے کے پاس آجاتا ہے۔ یہ ڈی پیلس کے خواجہ سراؤں کا انچارج ہے۔ کل رات یہ اپنے کسی کام سے یہاں آیا ہوا تھا۔ اس نے مجھے کہیں انیکسی کے آس پاس دیکھا اور بالائی منزل سے اتر کر نیچے آگیا۔ اسے شک ہو گیا تھا کہ چند دن پہلے اس کے گھر پر حملہ کرنے والا میں ہی ہوں۔ یہ اپنے ایک مسلح ساتھی کے ساتھ میرے پیچھے یہاں انیکسی میں آگیا۔ میں کمرے میں داخل ہونے ہی والا تھا جب ان دونوں نے مجھے روک لیا۔ خیام دراصل سری لنکا کا رہنے والا ہے۔ بنگالی کے علاوہ تھوڑی بہت اردو بھی جانتا ہے۔اس نے مجھ سے اردو میں سوال جواب کیے۔ میں نے کہا کہ یوں راستے میں کھڑے ہو کر بات کرنا ٹھیک نہیں۔ میں انہیں کمرے میں لے آیا۔ اندر آتے ہی خیام نے اپنی ریشمی قمیص کے نیچے سے کوئی ایک فٹ لمبا چھرا نکال لیا۔اس کے ساتھی ہیجڑے کے پاس پستول تھا۔

انیق نے بیڈ کے نیچے سے ایک چھرا نکال کر مجھے دکھایا۔اس کا پھل نو دس انچ سے کم نہیں تھا۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔''میں سمجھ گیا کہ یہ کمینہ مجھے پہچان چکا ہے۔ میں نے ٹائم ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا اور پستول والے خواجہ سرا پر حملہ کیا۔ میں نے اچانک ہاتھ مار کر اس کا پستول گرا دیا۔اس کمینے خیام نے بڑی طاقت سے میری کمر پر چھرے کا وار کیا۔ اگر یہ مجھے لگ جاتا تو کمر کی طرف سے دل میں اتر جاتا۔ میں نے خود کو بچایا اور یہ چھرا پانچ چھ انچ تک اس کے ساتھی کے سینے میں گھس گیا۔ ساتھ ہی میں نے اس کا

سر بھی دیوار سے ٹکرا دیا۔ وہ کٹے شہتیر کی طرح بیڈ پر جا گرا۔ میں نے گرا ہوا پستول اٹھا کر خیام پر تان لیا۔ کہانی گئی مک تے کلا گیا ٹھک......"

"زینب کو کچھ پتا نہیں چلا؟"

"درمیان والا دروازہ بند تھا اور وہ دوا کھا کر سوئی ہوئی تھی۔ یہ سارا واقعہ کل رات گیارہ بجے کے قریب ہوا تھا۔ پہلے تو جناب میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ پھر میں نے اس موٹے خیام کی مشکیں کس دیں اور منہ پر ٹیپ لگا دی۔ آج سویرے میں نے سوچا کہ دوپہر تک تو لاش بو دینے لگے گی۔ میں نے ڈیپ فریزر خالی کر کے اس میں لاش ٹھونس دی۔ پھر خیام کو بھی اس میں ٹھونس دیا اور اسے ٹیپوں کے ساتھ لاش سے جکڑ دیا۔ اسٹائل دیکھا ہے آپ نے؟ ایسا لگتا ہے کہ ایک ہیجڑا دوسرے کی گود میں تشریف فرما ہے۔"

انیق کی روداد سنسنی خیز تھی۔ وہ لاہور کے نامی گرامی گینگسٹر داؤد بھاؤ کا تربیت یافتہ تھا۔ بظاہر سیدھا سادہ اور بے ضرر لیکن وقت پڑنے پر اس کا ایک دوسرا روپ سامنے آتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "خیام سے کچھ پوچھ گچھ بھی کی؟"

"ابھی اس کا موقع ہی نہیں ملا۔ مجھے ڈر تھا کہ میں نے اس کے ہونٹوں سے ٹیپ ہٹائی تو یہ چلانا شروع کر دے گا۔ بڑی آگ ہے اس میں۔ لیکن اب فریزر میں جا کر کافی ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ دو تین گھنٹے ہو گئے ہیں۔ تھوڑا ٹائم اور نکل گیا تو بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔"

"اگر مر ہی گیا تو؟"

"نہیں جناب، میں نے تھرما اسٹیٹ تین پر سیٹ کیا ہوا ہے۔ اگر اب بھی زبان نہیں کھولے گا تو پھر کولنگ کچھ اور بڑھا دیں گے۔"

میں نے انیق کی طرف دیکھا۔ اس کی ذہانت اور ہوشیاری پر پہلے بھی شبہ نہیں تھا۔ اب یقین اور بڑھ گیا تھا۔ اس نے نہ صرف خیام پر غلبہ پایا تھا بلکہ اسے ایسے شکنجے میں جکڑ دیا تھا کہ وہ روایتی تشدد اور مار پیٹ کے بغیر ہی سب کچھ اگلنے پر آمادہ ہو رہا تھا۔ میں اس کی صورت دیکھ کر ہی جان گیا تھا کہ وہ برداشت کی آخری حدوں کو چھو رہا ہے۔ شاید انیق نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ کنواں خود چل کر پیاسے بلکہ...... پیاسوں کے پاس آ گیا تھا۔ میں نے انیق سے پوچھا کہ "سیف کو تو اس بارے میں پتا نہیں چلا؟"

"نہیں جی، ابھی تو نہیں لیکن ہے بڑا کھوچل۔ اسے شک ہے کہ ان دو کمروں کے اندر کچھ گڑبڑ چل رہی ہے۔"

میں نے اسے کہا کہ وہ میرے کمرے سے باہر "ڈونٹ ڈسٹرب" کا سائن لگا دے وہ

بولا۔ ''میں آپ کا رمز شناس ہو چکا ہوں، یہ سائن میں نے پہلے ہی لگا دیا ہے۔''
میں نے کہا۔ ''اسے دیکھو، کہیں زیادہ ہی ٹھنڈا نہ ہو جائے۔ آخر کو تو ہیجڑا ہی ہے۔''
وہ مسکرا کر کچن کی طرف چلا گیا۔ اس دوران میں، میں نے ایک بار پھر زینب والے کمرے میں جھانکا۔ وہ سو رہی تھی۔ میں نے دروازہ ہولے سے لاک کر دیا۔ یہاں پہنچنے سے پہلے میں نے قریباً دو گھنٹے تک ایک مرے ہوئے شخص کی خون آلود یونیفارم پہنے رکھی تھی۔ نہانے کی ضرورت تھی۔ میں فریش ہو کر واش روم سے نکلا تو انیق، خواجہ سرا خیام کو سوال جواب کے لیے تیار کر چکا تھا۔ خواجہ سرا کی حالت نا قابلِ بیان تھی۔ وہ ابھی تک فریزر کے اندر ہی تھا لیکن انیق نے فریزر کا ڈھکنا اٹھا دیا تھا اور خواجہ سرا خیام کے جسم کی کچھ ٹیپس اتار دی تھیں۔ ان ٹیپس کے کھلنے سے یہ ہوا تھا کہ وہ اٹھ کر بیٹھنے کے قابل ہو گیا تھا مگر وہ بیٹھا اپنے ساتھی کی لاش پر ہی ہوا تھا۔ اس نے انیق کے سامنے اپنے نیلگوں ہاتھ جوڑ رکھے تھے اور رحم کی درخواست کر رہا تھا۔ یہ درخواست صرف غوں غاں کی صورت میں ہی تھی کیونکہ اس کے ہونٹ بند تھے۔ چوڑی ٹیپ نے بدستور منہ کو ڈھانپ رکھا تھا۔
تیز دھار چھرا انیق کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے ایک بار پھر خیام سے تصدیق چاہی کہ اس کے ہونٹوں سے ٹیپ ہٹائی جائے تو وہ بلند آواز میں کچھ نہیں کہے گا۔ اس نے شدومد سے سر کو اوپر نیچے ہلا کر یقین دلایا۔ انیق نے ٹیپ ہٹا دی۔ اس کے بھدے ہونٹوں پر لپ اسٹک لگی تھی مگر باقی چہرہ نا قابلِ برداشت سردی کے سبب نیلا ہو رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چلا ورنہ وہ انیق کے قدموں میں گر پڑتا اور سردی کے عذاب سے جاں بخشی کی درخواست کرتا۔
ہم دونوں اس کے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ وہ بھیک مانگنے والے انداز میں بولا۔
''ہمار کو ادھر سے اٹھاؤ۔ ہمار کے اندر بروف (برف) جم گیا ہے۔ ہام مر جائے گا۔''
''نہیں مرو گے۔'' انیق نے اطمینان سے کہا۔ ''اب ڈھکن کھلا ہے اور تم جب تک سچ بولو گے، کھلا ہی رہے گا۔''
اس نے ڈیپ فریزر کے کھلے ڈھکن کی طرف یوں دیکھا جیسے وہ ڈھکن نہیں کوئی گلیشیئر ہے جو اس پر گرا تو وہ مر جائے گا۔
اس کی حالت قابلِ رحم تھی لیکن وہ رحم کا حق دار نہیں تھا۔ وہ کوئی نشیلا پان کھاتا تھا جس کے سبب اس کے جسم میں آگ بھر جاتی تھی۔ اپنی اسی کیفیت کے زیرِ اثر اس نے اپنی دسترس میں آئی ہوئی زینب فدا کو یوں مارا اور نوچا کھسوٹا تھا کہ وہ سرتاپا درد بن گئی تھی اور اس قسم کے رویے کا مظاہرہ وہ اب تک نہ جانے کتنی عورتوں سے کر چکا تھا...... اس کی شکل سے تو کچھ

خاص ظاہر نہیں ہوتا تھا لیکن اس کا اندر کالا تھا۔

اس بد خصلت خواجہ سرا نے آخری بار ہمیں نتائج سے ڈرانے کی ناکام کوشش کی جب انیق نے اسے پھر برف کی قبر (ڈیپ فریزر) میں لٹا کر ڈھکن لاک کرنا چاہا تو اس کا پتّا پانی ہو گیا۔ اگلے آدھ پون گھنٹے میں اس نے اپنی پھٹی ہوئی آواز میں رک رک کر جو کچھ بتایا وہ بڑا انکشاف انگیز تھا۔ اس کے بیان کا خلاصہ کچھ یوں ہے۔

یہ چند دن پہلے کی بات تھی جب کمان دار افغانی اس کے پاس آئے۔ یہ رات کا وقت تھا اور خیام اپنے ساحلی گھر میں ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ افغانی، خیام کو اپنے رازدار کی حیثیت دیتے تھے اور اعتماد کرتے تھے۔ انہوں نے خیام پر یہ انکشاف کیا کہ کل ڈی پیلس سے لاپتا ہو جانے والی دلہن زینب ان کے پاس ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ وہ کچھ دن تک پوری حفاظت سے خیام کے پاس رہے۔ خیام کے گھر کے نیچے ایک وسیع تہ خانہ موجود تھا۔ افغانی اور خیام کے درمیان پروگرام بنا کہ دلہن زینب کو اسی تہ خانے میں رازداری کے ساتھ رکھا جائے گا۔ افغانی صاحب نے خیام پر یہ انکشاف بھی کیا کہ عام لوگوں پر دلہن زینب کی موت ظاہر کرنی ہے۔ زینب کا شاہی لباس کسی دوسری لڑکی کو پہنا کر اور اس کے چہرے کو مسخ کر کے یا اس کے بالائی دھڑ کو بارود سے اڑا کر اس کی موت کا تاثر پیدا کیا جائے گا۔ اسی رات کمان دار افغانی نے بڑی رازداری کے ساتھ زینب کو خواجہ سرا خیام کے سپرد کر دیا اور ہر طرح اس کے آرام کا خیال رکھنے کی تاکید کی۔ خیام کے ذہن میں بہت سے سوال ابھر رہے تھے مگر اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ گرین فورس کے اہم ترین کمان دار سے کوئی استفسار کر سکتا۔

سب کچھ پلان کے مطابق چلتا رہتا تو شاید صورتِ حال مختلف ہوتی لیکن یہاں ایک گڑ بڑ ہوئی۔ اگلے روز شام کے بعد خواجہ سرا خیام کو افغانی کا فون آیا کہ زینب کے شاہی کپڑے درکار ہیں۔ کپڑوں کی اس تبدیلی کے دوران میں ہی کہیں خواجہ سرا خیام کی شیطانیت نے اس کے اندر زور مارا اور اس کی نیت خراب ہوگئی۔ اس نے تہ خانے کی تنہائی میں زینب کو نوچنا کھسوٹنا شروع کر دیا اس کے احتجاج پر وہ اس سے مار پیٹ کرنے لگا۔ وحشت کے عالم میں چلانے لگا۔ دنیا کی ساری خوب صورت عورتوں کو گالیاں دینے لگا اور ان سے طرح طرح کے نازیبا رشتے جوڑنے لگا۔ اسی دوران میں زینب کو موقع ملا اور وہ تہ خانے کی سیڑھیوں کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی۔ وہ کسی بھی طرح یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔ اوپر آ کر وہ بیرونی دروازہ ڈھونڈ رہی تھی۔ خیام اس کے پیچھے تھا۔ وہ بالکونی کی طرف نکل آئی۔ (یہی وقت تھا جب ساحل پر چہل قدمی کرتے ہوئے انیق نے اس کی پکار سنی اور یہ دیکھا کہ کوئی اسے واپس

کھینچ کر کمرے میں لے گیا ہے)

ہیجڑے خیام مانش کی روداد ختم ہو چکی تھی۔ ہم نے اس کی ویڈیو بھی بنائی تھی۔ وہ اسی طرح جہازی سائز کے ڈیپ فریزر میں اپنے ساتھی ہیجڑے کی لاش پر بیٹھا ہوا تھا۔ آنسو اس کے غازہ لگے رخساروں کو بڑی حد تک دھو چکے تھے۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ وہ کچھ خطرناک ترین لوگوں کی زد میں ہے اور وہ واقعی اسے زندہ فریز کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کریں گے۔ وہ زینب کے ساتھ اپنے سلوک کے لیے بھی بار بار معافی مانگ رہا تھا اور وعدے کر رہا تھا کہ اگر ہم اسے چھوڑ دیں تو وہ سب کچھ اپنے سینے میں دفن کر لے گا۔ بولتے بولتے کسی وقت اس کی آواز کافی بلند ہو جاتی تھی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں اس کی یہ پھٹی ہوئی آواز قریبی کمرے میں زینب کے کانوں تک نہ پہنچ جائے۔

میں نے انیق سے کہا۔ ”اپنا کیسٹ پلیئر آن کر آؤ۔“

اس نے فوراً عمل کیا۔ وال کلاک اب سہ پہر چار بجے کا وقت بتا رہا تھا۔ ہمیں خیام سے پوچھ گچھ کرتے قریباً ایک گھنٹا گزر چکا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”زینب کے شاہی کپڑے تم سے کون لے کر گیا تھا؟“

وہ بنگالی لہجے کی اردو میں بولا۔ ”خود افغانی شوب لے کر گیا۔ اگلے دن ہام نے یہ خبر شنا کہ بی بی کا لوش (لاش) ملا ہے۔“

”ظاہر ہے کہ وہ کسی اور لڑکی کی لاش ہوگی، اسے کیسے مارا گیا؟“

”ہمارے جتنی بڑی قوشم (قسم) چاہے لے لو۔ ہمارکو کچھ پتا نا ہیں۔“ وہ اپنی پھٹی ہوئی آواز میں گھگیایا۔

”افغانی صاحب! زینب کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”افغانی شوب (صاحب) یہی جانتے ہیں کہ لڑکی ابھی تک ہمارے پاس تہ خانے میں ہے۔“

”تم اس بات کو کب تک راز رکھ سکتے ہو؟“ انیق نے پوچھا۔

جواب میں خیام پھر ہچکیاں لینے لگا۔ اس نے کہا کہ ”وہ بے حد پریشان ہے۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ افغانی صاحب کو غصہ آ جائے تو بہت برا آتا ہے، وہ سوچ رہا تھا کہ ویسے ہی کہیں غائب ہو جائے۔“

انیق نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”لیکن اب تو تمہیں غائب ہونے کی ضرورت نہیں۔ اب تو تمہیں پتا چل گیا ہے کہ زینب ہمارے پاس ہے۔ اب تم جا کر افغانی صاحب کو بتاؤ اور بری

الذمہ ہو جاؤ۔''

وہ ایک بار پھر ہاتھ جوڑنے لگا اور اپنے نرخرے کو چھو کر عجیب و غریب انداز میں دہائی دینے لگا کہ اگر اس کی جان بخشی ہو جائے تو وہ چپ چاپ یہاں سے نکل جائے گا اور انڈیا میں کہیں ٹھکانا کر لے گا۔ اس کا حلیہ ویسے ہی بھونڈا تھا۔ روتے ہوئے وہ اور بھونڈا لگنے لگتا تھا۔ اس کی توند کو ہچکولے لگتے تھے اور گال تھرا اٹھتے تھے۔ وہ بار بار فریاد کر رہا تھا کہ اسے اس کے ساتھی کی لاش پر سے اٹھا لیا جائے اور فرش پر بٹھا دیا جائے۔ مجھ سے مشورہ کرنے کے بعد انیق نے اس کے ہونٹوں پر ایک بار پھر ٹیپ چپکا دی اور اس کے ہاتھ بھی اسی مضبوط ٹیپ سے جکڑ دیئے۔ اس کی کمر اور ٹانگوں کی ٹیپس اتار کر اسے اس کے ساتھی کی لاش سے جدا کیا گیا اور ڈیپ فریزر سے نکال لیا گیا۔

اسی دوران میں میرے سیل فون پر قسطینا کی کال آ گئی۔ وہ مجھے اپنے پاس آفس میں بلا رہی تھی۔ وہ کسی طرح کی مصلحت کو خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ کسی کو بتائے بغیر مجھے اپنے ساتھ نیوسٹی کی ''مہم'' پر لے گئی تھی اور آقا جان، حلمی اور افغانی جیسے اہم لوگوں کو یہ بات اچھی نہیں لگی ہو گی، اس کے باوجود وہ فوراً ہی مجھے دوبارہ اپنے پاس طلب کر رہی تھی۔

پندرہ منٹ بعد میں اس کے سامنے موجود تھا۔ اس نے نہا دھو کر لباس بدل لیا تھا۔ وہ پینٹ اور بیگی طرز کی ہاف سلیو شرٹ میں تھی۔ بوائے کٹ شہد رنگ بالوں میں ایک طرف مانگ نکالی گئی تھی اور وہ بچ رہے تھے۔ وہ ایک بڑے سے نقشے کو جدید طرز کی متحرک میز پر بچھا کر اس پر جھکی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے نقشے کو لپیٹا اور بولی۔ ''چلو آؤ، دوسرے کمرے میں بیٹھتے ہیں۔ یہاں تو ہر وقت دفتری ماحول رہتا ہے۔''

بغلی دروازہ کھول کر ہم اسی ریٹائرنگ روم میں آ گئے جہاں ہم ایک بار پہلے بھی بیٹھ چکے تھے اور ڈنر کر چکے تھے۔ یہیں پر ایک ڈیکوریشن پیس کے اندر وہ بے مثال اسپائی کیمرا نصب تھا جس نے مجھے کچھ نہایت پرائیویٹ مناظر دکھائے تھے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے کن اکھیوں سے اس ڈیکوریشن پیس کی طرف دیکھا۔ اس میں کئی رنگوں کے پتے اور کونپلیں وغیرہ تھیں۔ انہی میں وہ ''ہم رنگ کیمرا'' بھی چھپا ہوا تھا۔ بادی النظر میں وہ مجھے نظر نہیں آیا لیکن میں جانتا تھا وہ موجود ہے۔

کچھ دیر تک ہم اس یادگار ''ایئر ریڈ'' کی بات کرتے رہے جس نے نیوسٹی میں کھلبلی مچا دی تھی اور رائے زل کی گرے فورس کو کئی اہم کمانڈروں سے محروم کر دیا تھا۔ پھر گفتگو کا رخ

ان سنگین ترین چھ گھنٹوں کی طرف مڑ گیا جو ہم دونوں نے برج کلب کے شیلٹر میں گزارے تھے۔ قسطینا نے اس دراڑ کا ذکر کیا جو موت کی تلوار بن کر ہمارے سروں پر لٹکتی رہی تھی۔ وہ بولی۔ ''میں اس منظر کو بھول نہیں پا رہی جب دھماکے کے ساتھ چھت کئی فٹ نیچے آگئی تھی اور تم میرے اوپر گر گئے تھے۔ مجھے نہیں لگتا کہ اگر دس بیس ہزار ٹن ملبا تمہارے اوپر گر پڑتا تو میں پھر بھی بچی رہتی۔''

اسے مسکراتے دیکھ کر میں بھی مسکرا دیا۔ ''چلیں...... اپنی سی کوشش تو کی میں نے۔''

''تمہاری یہ کوشش اچھی لگی۔''

''اور مجھے بھی اس طرح آپ کے قریب آنا اچھا لگا۔'' میں نے بے ساختہ کہہ دیا۔

اس کے چہرے پر ہلکی سی سرخی لہرا گئی۔ یقیناً اسے وہ لمحات یاد آگئے تھے جب ہم دونوں شیلٹر کے فرش پر تھے اور میں نے اسے مضطرب ہو کر ڈھانپ لیا تھا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہی۔ مجھے خدشہ محسوس ہوا کہ اسے برا نہ لگ گیا ہو، کچھ دیر بعد اس نے دو کپس میں کولڈ کافی انڈیلی اور کھوئے کھوئے انداز میں بولی۔ ''شاہ زائب! میں جیسی بھی ہوں لیکن ایک صاف گو اور اسٹریٹ فارورڈ لڑکی ہوں، میری کچھ باتیں لوگوں کو اور خاص طور سے میرے بزرگوں کو بری بھی لگتی ہیں لیکن جو کچھ میرے دل میں ہوتا ہے وہی زبان پر بھی ہوتا ہے۔ اپنے ذاتی معاملات میں بھی میرا یہی رویہ ہے۔ میں نے کبھی اپنے بارے میں کچھ چھپایا نہیں۔ کالج کے ابتدائی دور میں ایک اسکول فیلو لڑکے سے میری دوستی ہوئی۔ دھیرے دھیرے اس دوستی کی نوعیت بدلنا شروع ہوئی۔ اس موقع پر بھی میں نے اپنے گھر والوں اور خصوصاً اپنے پیارے والد سے کچھ بھی نہیں چھپایا تھا۔ پھر وہ لڑکا برونائی کے ساحل پر ایک اسپیڈ بوٹ کے حادثے میں جان کی بازی ہار گیا۔ اس کے بعد دو تین سال تک میری زندگی بہت ڈسٹرب رہی پھر والد کی محبت نے مجھے مایوسی اور دکھ کے اس بھنور سے نکال لیا...... وہ لڑکا میری پہلی محبت تھا......''

وہ میری طرف دیکھے بغیر کافی کے گھونٹ لے رہی تھی۔

''اور دوسری محبت؟'' میں نے اچانک پوچھا۔

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا، پھر کافی کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔ ''دوسری محبت کوئی نہیں...... لیکن ایک سایہ سا میں اپنے آس پاس...... ضرور محسوس کرتی ہوں۔''

''کیسا سایہ؟'' میں نے بات آگے بڑھائی۔

اس نے پھر میری طرف دیکھا اور کپ ایک طرف رکھ دیا۔ اپنے دونوں ہاتھ سینے پر

باندھ کر نشست سے ٹیک لگائی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''شاہ زائب! شاید میں اس طرح معنی خیز گفتگو نہ کر پاؤں جس طرح لڑکیاں کرتی ہیں۔ اگر تم سننا چاہتے ہو تو میں اپنے دل کی کیفیت صاف صاف تمہیں بتا دیتی ہوں۔ اگر میں یہ کہوں کہ میں تم سے محبت کرنے لگی ہوں تو شاید یہ غلط ہو گا۔ ہاں یہ بات ہے کہ تم ایسٹرن کی حیثیت سے مجھے بہت زیادہ FASCINATE کرتے ہو۔ تم میرے لیے ایک محبوب لیجنڈ کی طرح ہو۔ ایک من پسند افسانوی شخصیت۔ تم سے مل کر اور جان کر یہ پسندیدگی مزید بڑھی ہے۔ میں تمہارے اور قریب آنا چاہتی ہوں...... تمہیں اور جاننا چاہتی ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''اگر آپ سیدھی بات کر رہی ہیں تو میں بھی سیدھی بات کرنا چاہوں گا۔ کیا قریب آنے سے آپ کا مطلب...... جسمانی قرب ہے؟''

اس کے چہرے پر پھر سرخی سی لہرائی لیکن وہ مختلف لڑکی تھی۔ جھینپنے کے بجائے بولی۔ ''شاید...... ایسا بھی...... ہو۔ جو لیجنڈ ہوتا ہے، جس کی پرستاری کا دعویٰ ہوتا ہے اسے چھونے کو بھی دل چاہتا ہے۔ اسے زیادہ سے زیادہ جاننے کی خواہش بھی ہوتی ہے۔ پتا نہیں کہ یہ محبت ہوتی ہے یا ''فینٹسی'' ہی کی ایک قسم...... میرا خیال ہے کہ ''فینٹسی'' ہی ہوتی ہے۔''

میں نے گہری سانس لی۔ ''یعنی چارم ختم، تجسس ختم اور فینٹسی بھی ختم؟''

''شاید...... یا شاید نہیں۔'' وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔

باالفاظ دیگر وہ صاف گوئی سے مجھے بتانا چاہ رہی تھی کہ وہ میرے قریب تو آنا چاہتی ہے مگر مجھ سے محبت کا دعویٰ نہیں کرتی۔

میں بھی اس سے کچھ ایسی ہی بات کہنا چاہ رہا تھا کہ میرا دل تو میرے پہلو میں موجود ہی نہیں ہے۔ وہ کہیں کھو چکا ہے، میں تو صرف ایک وقتی فرار چاہتا ہوں۔ خود کو کسی کی بانہوں اور گرم سانسوں میں گم کر دینا چاہتا ہوں......

''کیا سوچ رہے ہو ایسٹرن؟''

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آپ مجھے پھر ایسٹرن کہہ رہی ہیں۔''

''تم نے ہی تو کہا تھا کہ اکیلے میں، میں تمہیں اس نام سے پکار سکتی ہوں۔ ہاں سب کے سامنے اصل نام لوں۔''

''لیکن مسئلہ تو یہ ہے یور ہائی نس کہ آپ سب کے سامنے بھی اصل نام نہیں لیتیں۔ میرا نام شاہ زیب ہے...... شاہ زیب۔'' میں نے ''زیب'' پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اور آپ مجھے زائب کہتی ہیں۔''

وہ ہنس دی۔ ''یہ تو زبان کا مسئلہ ہے۔ آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گا۔''
میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''ایسے مسئلوں کو ٹھیک ہوتے کتنی دیر لگے گی۔''
خون نے ایک بار پھر اس کے چہرے کی طرف چڑھائی کی مگر وہ فوراً ہی سنبھل گئی اور سنجیدہ ہوگئی۔ چند ساعتوں میں ہی ایک لڑکی کے بجائے ایک کمانڈر نظر آنے لگی۔ کافی کی چسکی لے کر سامنے دیوار کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''شاہ زائب! ابھی تو میں خود کو جنگ کے بھنور میں محسوس کر رہی ہوں۔ اپنے والد کے قاتلوں سے انتقام کا خیال ایک بہت بڑے انگارے کی طرح میرے سینے میں دہک رہا ہے۔ میرے پاس اور کچھ بھی سوچنے سمجھنے کا وقت نہیں ہے......''
بالفاظ دیگر وہ مجھے بتا رہی تھی کہ ابھی تو وہ صرف ایک کمانڈر ہے اور صرف زندگی موت کی اس لڑائی کے بارے میں سوچ رہی ہے جو اس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے، اگر زندگی نے مہلت دی اور یہ لڑائی بھی تھم گئی تو پھر شاید وہ اپنے بارے میں سوچے اور جاماجی کی ان خوشگوار چمکیلی دوپہروں کے بارے میں سوچے جن کا تذکرہ اس نے کیا ہے۔
یہ بڑا ٹھنڈا ٹھار سا جواب تھا۔ میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ کافی ختم ہو چکی تھی۔ قسطینا کے سیل فون کی مدھم گھنٹی بھی بار بار سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔ ڈی پیلس کے احاطے میں ایک بار پھر رضا کاروں کے جتھے جمع ہو رہے تھے اور ان کے پُرجوش نعروں کی گونج یہاں تک پہنچ رہی تھی۔ کل رات کے کامیاب فضائی حملے نے یقیناً ان لوگوں میں نئی روح پھونک دی تھی۔
میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ''اب مجھے اجازت ہے؟'' میں نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔
''تمہارے وقت کا بہت شکریہ شاہ زائب! ابھی اہم افسروں سے میری ایک میٹنگ شروع ہونے والی ہے۔ اس میں محاذ کی بات ہوگی اور سوچا جائے گا کہ فضائی حملے کے نتیجوں کو کس طرح اپنے حق میں استعمال کیا جا سکتا ہے...... میں تمہیں بھی باخبر رکھنے کی کوشش کروں گی۔''
''شکریہ۔'' میں نے کہا اور اس سے اجازت لے کر دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے اٹھ کر میرا بازو پکڑ لیا...... اور بالکل غیر متوقع طور پر میرے ہونٹوں کو چوم لیا۔ یہ ایک طرح سے الوداعی بوسہ تھا لیکن اگر اس کا خیال تھا کہ میں یہ الوداعی لمس لے کر چپ چاپ دروازے سے نکل جاؤں گا تو یہ اس کی غلط فہمی تھی۔ میں نے جوابی کارروائی کی اور اسے اپنے اکلوتے صحت مند بازو کے حلقے میں لے کر کئی بوسے اس کے چہرے پر ثبت کیے۔ وہ گلنار ہو

گئی۔ کچھ کچھ خفا...... کچھ کچھ خوش۔ قریباً ایک منٹ تک ہم ایک دوسرے کی بانہوں میں کھوئے رہے پھر میں اسے خدا حافظ کہہ کر ریٹائرنگ روم سے باہر آ گیا۔

یہ ایک فرار تھا۔ کسی سے دور بھاگنے کی ایک کامیاب تگ و دو تھی اور مجھے لگ رہا تھا کہ سوچوں کی دھار کند ہو رہی ہے۔ کسی کا چہرہ اب خیالوں میں دھندلاتا جا رہا تھا۔ کسی دانشور کا کہا ہوا جملہ میرے کانوں میں گونج رہا تھا۔ زندگی آگے بڑھنے کا نام ہے، ایک ہی جگہ کھڑے رہنے والے پتھرا جاتے ہیں۔

O......❖......O

میں انیکسی میں پہنچا تو سیف واپس آ چکا تھا۔ انیق، سیف والے کمرے میں ہی موجود تھا۔ دونوں پاکستان کی پنجابی فلموں اور سلطان راہی وغیرہ پر گرما گرم تبصرے کر رہے تھے۔ بلند آواز میں ہنستے اور گپیں لگاتے انیق کو دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ اس نے قریبی کمرے میں ایک لاش کو ڈیپ فریزر میں بند کر رکھا ہے اور ڈی پیلس کے انچارج خواجہ سرا کی مشکیں کس کے اس کا حشر نشر کیا ہوا ہے۔

سیف مجھے دیکھتے ہی اچھل کر کھڑا ہو گیا...... اور آگے بڑھ کر مجھ سے معانقہ کیا۔ ”استاد جی! آپ اِدھر اُدھر ہوتے ہیں تو میرا دل ڈولنے لگتا ہے۔ بڑے برے برے خیال آنے لگتے ہیں...... آپ کے بازو کا کیا حال ہے؟“

میں نے کہا۔ ”پہلے تو ٹھیک تھا لیکن تم نے ابھی جو کبڈی والی جپھی ڈالی ہے اس سے پھر درد شروع ہو سکتا ہے۔“

”اوہو...... سوری سوری...... بس آپ کو دیکھ کر کچھ ہوش ہی نہیں رہتا، یقین کریں کچھ دیر پہلے تک آپ کے بارے میں اتنا فکر مند تھا کہ......“

”دو کلو کڑاہی گوشت بھی سارا نہیں کھایا گیا۔“ انیق نے جلدی سے لقمہ دیا اور دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

ہنستے ہوئے سیف کا چوڑا سینہ ڈھول کی طرح بجتا تھا اور رنگ سرخ ہو جاتا تھا۔ اپنے رنگ دار کرتے اور پرنے (بڑے رومال) کے ساتھ وہ صحیح معنوں میں پنجابی جوان نظر آتا تھا۔ وہ ویسے تو اپنا سیل فون ٹھیک کرانے گیا تھا لیکن کرخت سنگھ کے ساتھ دیسی مرغے کا کڑاہی گوشت اور بکرے کی چانپیں کھا کر آیا تھا۔ ساتھ ساتھ دونوں نے دیگر قسم کے گوشت پر بھی توجہ دی تھی۔ یعنی بے حد چست لباس والی وہ مقامی لڑکیاں جو بازاروں میں مختلف اشیا فروخت کرتی نظر آتی تھیں۔ سیف کا چہرہ شکم سیری کے سبب دمک رہا تھا۔ آتے ہوئے وہ

کوئی پھل بھی لے کر آیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ سنگھاڑے کی کوئی قسم ہے اور اسے ابال کر اور نمک لگا کر کھانے سے مرد کی کمر بڑی پکی ہو جاتی ہے۔ میرا حال احوال پوچھ کر وہ انیکسی کے مین کچن کی طرف چلا گیا تا کہ ان ''سنگھاڑوں'' کو ابالا جا سکے۔ انیق نے مجھ سے کہا کہ وہ خیام کی حالتِ زار کا جائزہ لے کر آتا ہے۔

میں صوفے پر بیٹھا تھا۔ میری نظر بیڈ پر پڑی۔ سنگھاڑوں کے چکر میں سیف اپنا سیل فون وہیں چھوڑ گیا تھا۔ فون میں وال پیپر کے طور پر اس نے اپنے خوب صورت گاؤں کی تصویر لگا رکھی تھی۔ سرسبز کھیت، لہلہاتے درخت اور ان کے پس منظر میں کچے پکے گھر۔ کتنی دلکشی ہوتی ہے اپنی مٹی اور اپنی دھرتی کے مناظر میں۔ دیہی پس منظر کی کچھ اور تصویریں بھی تھیں۔ میں یونہی بٹن پریس کر کے انہیں دیکھنے لگا۔ اچانک ایک ایسی تصویر میرے سامنے آئی جس نے مجھے ششدر کر دیا۔ مجھے لگا میرا دماغ چکرانے لگا ہے...... یہ تاجور تھی۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے تک میں کسی اور دنیا میں تھا۔ میں نے قسطینا کو چھوا تھا، اسے بانہوں میں لیا تھا اور مجھے لگا تھا کہ میں اپنے ''فرار'' میں کچھ اور آگے بڑھ آیا ہوں جو چہرہ پیچھے رہ گیا تھا، وہ اور پیچھے چلا گیا ہے، دھندلا گیا ہے، اب میں اس کی یادوں کے بندھنوں سے نکل رہا ہوں۔ مجھے ہرگز ہرگز امید نہیں تھی کہ اس دور دراز جزیرے میں وہ اچانک ایک بار پھر پوری رعنائیوں کے ساتھ میرے سامنے آن کھڑی ہو گی...... ہاں وہ کھڑی تھی...... وہ اس تصویر میں کھڑی تھی...... یہ کسی کھیت کی منڈیر تھی۔ تیز ہوا نے اس کی اوڑھنی اور اس کی دوریشمی لٹوں کو ہوا میں اڑا رکھا تھا۔ ہلکے گلابی رنگ کی پھول دار قمیص اس کے جسم کا حصہ بنی ہوئی تھی، اس کی دلکشی کو نمایاں کر رہی تھی...... ہاں وہ تاجور ہی تھی...... اور اس کی تصویر کبڈی شاہ سیف کے موبائل فون میں تھی...... میں واقعی چکرا کر رہ گیا۔

میں نے جلدی جلدی بٹن پریس کیا۔ فون کی فوٹو گیلری میں اس کی دو تین تصویریں اور بھی تھیں۔ ایک میں صرف چہرہ نظر آ رہا تھا۔ دوسری میں سائیڈ پوز تھا، وہ کیمرے کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ ہاتھوں میں ایک رنگ دار چنگیر تھی جس میں موم بتیاں روشن تھیں۔ یہ تصویر شاید مہندی یا ابٹن کی کسی تقریب میں اتاری گئی تھی۔

میرا دھیان سکھیرا اپنڈ کی طرف چلا گیا۔ چاند گڑھی سے نکل کر تاجور کی فیملی اس سکھیرا پنڈ میں ہی رہائش پذیر ہوئی تھی۔ سیف بھی سکھیرا پنڈ کا تھا۔ تو کیا یہ تصویریں وہیں پر اتاری گئی تھیں، میں نے دروازے سے باہر جھانکا۔ سیف ابھی مین کچن میں ہی مصروف تھا۔ میں اس کے موبائل کو چیک کرنے لگا۔ فوٹو گیلری سے میں ان باکس میں آیا۔ یہاں ایک بار پھر

مجھے بری طرح چونکنا پڑا۔ میں نئے اور پرانے میسج دیکھ رہا تھا۔ قریباً ڈیڑھ ماہ پرانے کچھ ''میسجز'' دکھائی دیئے۔ میں نے ایک میسج پڑھا اور ششدر رہ گیا۔ یہ سیف کی طرف سے تھا اور کچھ یوں تھا۔ ''نہیں تاجور! اتنا لمبا انتظار مجھ سے نہیں ہوگا۔ کل شام کا موقع نکالو۔''

اس کا جواب دیا گیا تھا۔ ''ابھی تھوڑی دیر بعد بات کریں گے۔''

ایک جگہ سیف کا میسج یوں تھا۔ ''آج ایک میچ کھیلنے سیالکوٹ جا رہا ہوں، دو دن لگ جائیں گے لیکن اتنی تسلی تو ہے کہ تمہاری تصویر میرے پاس ہے۔''

جواب میں لکھا گیا تھا۔ ''تمہاری خیر خیریت کے لیے دعا کرتی ہوں۔''

یہ سارے میسجز اردو ٹیکسٹ میں تھے۔ میرا ذہن گھڑ دوڑ کا میدان بنا ہوا تھا۔ مجھے پہلوان حشمت سے ہی معلوم ہوا تھا کہ سکھیرا گاؤں میں تاجور کا رشتہ طے ہو گیا ہے۔ دین محمد صاحب نے یہ رشتہ اپنی ہی طرح کے ایک زمیندار گھرانے میں طے کیا ہے۔

تو کیا تاجور کا رشتہ اسی سیف سے طے ہوا تھا؟

سوال کا جواب میرے اندر سے ہی آ رہا تھا اور یہ ''ہاں'' میں تھا۔ حالات بتا رہے تھے کہ سیف ہی تاجور کا ہونے والا شوہر ہے۔ میں سٹپٹا کر رہ گیا۔ میں سیف کو سکھیرا گاؤں سے اپنے پیچھے لگا کر لیے کے پارا ہاؤس تک لے آیا تھا...... اور پھر پارا ہاؤس سے یہاں اس دور دراز جزیرے میں۔ مجھے کیا پتا تھا کہ میں جس کی یادوں سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کر رہا ہوں وہ سیف کی صورت میں یہاں تک آ پہنچی ہے۔

پہلے جب میں اس سے فرار کی کوئی کوشش کرتا تھا...... (جاناں کی گھنی زلفوں میں پناہ لیتا تھا یا گلاس کو منہ لگاتا تھا) تو وہ تصور کی شکل میں میرے سامنے آتی تھی سرسوں کے زرد کھیت میں کھڑی دکھی نظروں سے میری طرف دیکھتی تھی۔ اپنی موجودگی کا احساس دلاتی تھی مگر آج وہ کیمرے کی تصویروں کی شکل میں میرے سامنے آ گئی تھی۔ اس نے مجھے سرتاپا جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ زرق برق لباس پہنے...... گول چنگیر میں موم بتیاں سجائے وہ کیمرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ مجھے لگا جیسے میری طرف دیکھ رہی ہے۔ مجھ سے پوچھ رہی ہے...... مجھے بتائیں، کیا میں اتنی ہی معمولی تھی کہ مجھے اس طرح بھلا دیا جاتا؟

میرے سینے میں آگ سی دہکنے لگی۔ یہ کیسی جلن تھی؟ دکھ تھا یا رقابت تھی؟ جو کچھ میں دیکھ رہا تھا، اس سے تو یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ سیف کو چاہتی ہے کیا وہ اس لیے چاہتی تھی کہ وہ اس کا منگیتر تھا...... یا وہ اس لیے منگیتر تھا کہ وہ اسے چاہنے لگی تھی...... اور ابھی تو ٹھیک سے یہ معلوم بھی نہیں تھا کہ کیا وہ سیف ہی ہے جس سے اس کے رشتے کی بات ہوئی ہے۔

پتا نہیں کیوں آنکھوں میں نمی کا احساس ہوا۔ میں اس سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا اور وہ کسی نہ کسی صورت میں سامنے آن کھڑی ہوتی تھی۔ اس نے مجھے دل نہیں دیا تھا......اور ٹھیک ہی کیا تھا۔ اس نے تین چار ماہ کے ''ساتھ'' میں جانچ لیا تھا کہ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں، جنہیں عرفِ عام میں شریف کہا جاتا ہے، مجھ میں خرابیاں تھیں میرے پیچھے کچھ بلائیں تھیں اور میں کچھ بلاؤں کے پیچھے تھا۔ وہ کئی موقعوں پر مجھے خطرناک روپ میں دیکھ چکی تھی......وہ میرے قریب آنے سے پہلے ہی مجھ سے دور ہوگئی تھی۔

لیکن اب اگر وہ یہ سمجھ رہی تھی کہ وہ ایک شریف گھریلو قسم کے زمیندار زادے کو اپنی زندگی میں شامل کر رہی ہے تو یہ بھی غلط تھا۔ سیف جو کچھ بھی تھا، میں اچھی طرح جان چکا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ کسی ایک کا بن کر رہنے والا نہیں ہے۔ اس کے مزاج میں رنگینی و بے قراری تھی......اور اس کی کچھ خطرناک مصروفیات بھی تھیں۔ اس نے اپنے گاؤں میں مختار جھارا جیسے گینگسٹر سے دشمنی پال رکھی تھی اور بھرا ہوا پسٹل ہر وقت اس کے لباس میں رہتا تھا اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ وہ بھی ایک چھوٹا موٹا گینگسٹر ہی تھا۔

راہداری کی طرف سے قدموں کی چاپ ابھری اور میں سمجھ گیا کہ سیف واپس آرہا ہے۔

اس نے آتے ساتھ ہی ایک مسرت بھرا بلند بانگ قہقہہ لگایا اور ابلے ہوئے سنگھاڑوں کی طشتری میرے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔ ''لیں جی استاد صاحب! دیکھیں کیسی مزیدار چیز ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ سنگھاڑے سے بھی آگے کی شے ہے۔ مزہ بھی اس سے بڑھ کر ہے۔'' اس نے کئی سنگھاڑے چھیل کر میرے سامنے رکھ دیئے۔ ساتھ میں کالا نمک اور مرچیں وغیرہ تھیں۔

اس کے بہت اصرار پر میں نے ایک ٹکڑا لیا، وہ بولا۔ ''جناب! یہ جو سنگھاڑا ہے نا، جوڑوں اور کمر کے لیے بڑا فائدے مند ہے اور آپ کو پتا ہی ہوگا جب کبڈی کھیلنے والا کسی کو جھپا مار کر روکتا ہے تو سارا زور جھپا مارنے والے کی کمر پر ہی پڑتا ہے یا پھر کلائیوں وغیرہ پر......''

میں نے آج تک اس سے اس کے ذاتی معاملات پر بات نہیں کی تھی۔ آج پہلی بار کی۔ میں نے دھیمی آواز میں پوچھا۔ ''کیسی زندگی گزار رہے ہو، کوئی شادی وغیرہ کا بھی سوچا ہے یا نہیں؟''

''شادی بھی کر لیں گے جناب، اتنی کون سی چھیتی پڑی ہے۔ اب آپ جیسا گرو ملا

ہے۔ کچھ سیکھ سکھالیں آپ سے۔‘‘
میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔’’کوئی نہ کوئی نظر میں تو ہوگی؟‘‘
’’میں نے شاید پہلے آپ کو...... یا پھر انیق کو بتایا تھا...... کہ ایک آئی ہوئی ہے نظر میں...... اپنے ہی پنڈ کی ہے...... منگنی تک بات پہنچ گئی ہوئی ہے...... ٹھہریں میں اس کی فوٹو دکھاتا ہوں آپ کو......‘‘
اس نے اِدھر اُدھر ڈھونڈنے کے بعد بستر سے اپنا موبائل فون اٹھایا اور اس میں سے تاجور کی تصویر نکال کر میرے سامنے کر دی۔ یہ وہی تصویر تھی جس میں وہ کسی منڈیر پر تیز ہوا کے سامنے کھڑی تھی۔ بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔
’’زبردست بھئی، ماشاء اللہ بہت اچھا میچ ہے۔‘‘
’’میچ تو ابھی شروع نہیں ہوا جی...... ابھی تو وہ ہو رہے ہیں...... وہ کیا کہتے ہیں وارم اپ۔‘‘ وہ شرارت سے مسکرایا۔
’’کس طرح کے لوگ ہیں؟‘‘
’’بڑی اچھی فیملی ہے جی۔ ان لوگوں کو سکھیرا میں آئے زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ لڑکی کے والد کا نام چودھری دین محمد ہے۔ بڑی اچھی طبیعت والے ہیں۔ ایسے لگنے لگا ہے جیسے ہمیشہ سے ہمارے ہی پنڈ میں رہتے ہیں۔ فیملی بھی چھوٹی ہے۔ لڑکی کے دو چھوٹے بھائی ہیں اور ماں باپ...... بس۔‘‘
’’انڈر اسٹینڈنگ ہوگئی ہے ایک دوسرے سے؟‘‘
’’اوہو، انڈر اسٹینڈنگ تو ایسی ہے جی کہ کیا بتاؤں۔ دو چار دن کہیں اِدھر اُدھر ہو جاؤں تو پسوڑیاں پڑ جاتی ہیں دوسری طرف۔‘‘ وہ ایک بار پھر زور سے ہنسا اور اس کا سینہ ڈھول کی طرح بجنے لگا۔
میں نے ایک بار پھر کن انکھیوں سے تصویر کی طرف دیکھا۔ وہ تیز ہوا میں اپنا دوپٹا سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔
سیف نے سنگھاڑوں کے ڈھیر میں سے ایک موٹا دانہ ڈھونڈا اور اسے چھیلتے ہوئے بولا۔’’لو جی، یہ والا کھا کر دیکھیں...... بس ایک کھالیں۔‘‘
اس سے پہلے کہ میں ہاں یا نہ میں جواب دیتا، دروازے پر انیق نظر آیا۔ اس کی طرف سیف کی پشت تھی۔ اس نے مجھے کمرے میں آنے کا اشارہ کیا۔ ساتھ ہی آواز بھی دے دی۔
میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔’’اچھا میں ابھی آتا ہوں۔‘‘

سیف کو وہاں چھوڑ کر میں کمرے میں پہنچا۔ انیق پریشان لگ رہا تھا بولا۔ ''وہ مسلسل روئے جارہی ہے۔ مجھے تو ڈر ہے اسے کچھ ہو نہ جائے۔''

ہم درمیانی دروازہ کھول کر سجاول والے کمرے میں داخل ہوئے۔ ٹیبل لیمپ کی روشنی میں زینب کی حالت پتلی نظر آرہی تھی۔ چند ہی دنوں میں وہ ہفتوں کی بیمار دکھائی دینے لگی تھی۔ اس نے دوپٹا مضبوطی سے اپنے سر پر جما رکھا تھا۔ ایک طرف کھانے کی ٹرے پڑی تھی جس میں سے بمشکل دو چار نوالے ہی اس نے لیے تھے۔

مجھے دیکھ کر وہ بلک پڑی۔ ''بھائی جی، میں واپس جانا چاہتی ہوں۔ مجھے اس قید خانے سے نکال دیں۔ میرا سانس رک رہا ہے۔ میں یہاں مرجاؤں گی۔''

میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''دیکھو زینب! ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے۔ ہم تمہیں یہاں سے نکالنے کے لیے پوری کوشش کررہے ہیں۔ تم جانتی ہو یہاں باقاعدہ لڑائی چھڑی ہوئی ہے۔ جونہی کوئی موقع ملتا ہے ہم اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔''

''مم...... مجھے لگتا ہے، مجھے بس تسلیاں دی جارہی ہیں۔ مجھ سے جھوٹ بولے جارہے ہیں۔ مجھے ابراہیم کے بارے میں بھی ٹھیک سے کچھ نہیں بتایا جارہا۔ ان کی حالت اب کیسی ہے۔ وہ کہاں ہیں؟ میں ایک بار ماں جی سے بھی بات کرنا چاہتی تھی۔ مجھے ان سے بھی نہیں ملوایا گیا۔'' (ماں جی سے مراد بیگم نورل تھی)

وہ زاروقطار رو رہی تھی۔ ڈر تھا کہ اس کی آواز بلند نہ ہوجائے۔ میں نے اسے بمشکل چپ کرایا...... اور یقین دلایا کہ اگلے اڑتالیس گھنٹوں میں موجودہ صورتِ حال ضرور تبدیل ہو گی۔ میں نے اسے اپنے سامنے کھانا کھلایا اور انیق کو اس کے بارے میں ضروری ہدایات دیں۔

ہم دوسرے کمرے میں پہنچے۔ کچن کا جائزہ لیا۔ ڈیپ فریزر میں لاش ٹھنڈی ہورہی تھی۔ خواجہ سرا خیام کو انیق نے اچھی طرح باندھ کر ایک کونے میں ڈالا ہوا تھا اور اسے پُرسکون رکھنے کے لیے کوئی ٹرینکولائزر دے دیا تھا۔ وہ اونگھ رہا تھا۔ ہمارے لیے شکر کا مقام تھا کہ زینب ابھی تک اس کچن کی صورتِ حال سے یکسر بے خبر تھی۔ جب کچن کا اور کمرے کا دروازہ لاک ہوجاتا تھا تو زینب تک آواز پہنچنے کے امکانات معدوم ہوجاتے تھے۔

میں اپنے کمرے میں واپس آگیا۔ کچھ دیر اکیلا رہنے کو جی چاہ رہا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے سیف سے بات چیت ہوئی تھی اور جو کچھ میں نے اس کے موبائل فون میں دیکھا تھا، اس نے مجھے تہ و بالا کردیا تھا لیکن حالات اتنی تیزی سے تبدیل ہورہے تھے کہ آرام سے بیٹھ کر

غمزدہ ہونے کا وقت بھی نہیں تھا۔

اچانک میرے فون کا میوزک بج اٹھا۔کوئی نامعلوم نمبر تھا۔ میں نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے ایک بھاری آواز سنائی دی۔ ''السلام علیکم۔ام کمانڈر افغانی بول رہا ہے۔کیا تم شاہ زیب بات کرر ہا ہے؟''

میں چونک گیا۔سنبھل کر کہا۔''جی ہاں، میں شاہ زیب ہوں۔ آپ نے کیسے زحمت کی؟''

''ام کو تمہارا نمبر حلمی نے دیا ہے۔ام تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہے۔کیا تم اس وقت ہمارے پاس آسکتا ہے؟''

''اگر آپ کا حکم ہے تو حاضر ہو جاتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے ام انتظار کرتا ہے۔'' خشک لہجے میں کہا گیا اور جگہ کا بتا کر فون بند کر دیا گیا۔

ایک طرح سے تو یہ اچھا ہی ہوا تھا۔خواجہ سرا خیام نے جو سنسنی خیز بیانات دیئے تھے، اس کے بعد کمانڈر افغانی سے ملنا ضروری ہو گیا تھا۔ زینب کی موت کا ڈراما رچانے میں کمانڈر افغانی بھی برابر کا شریک نظر آتا تھا۔ اب معلوم نہیں کہ وہ مجھے کس حوالے سے اپنے پاس طلب کر رہا تھا۔ میں نے سن گن لینے اور مشورہ کرنے کے لیے قسطینا کو کال کی۔ کئی بار کی کوشش کے باوجود کال اٹینڈ نہیں ہوئی۔ وہ شاید بہت مصروف تھی۔ اچانک مجھے اپنے اسپائی کیمرے کا خیال آیا۔ میں نے اپنے موبائل کو کیمرے کے ریسیور کی شکل دی دے۔ معمولی کوشش کے بعد قسطینا کے ریٹائرنگ روم کا منظر نظر آیا۔ کمرا خالی تھا۔اس کی یونیفارم جو عین سامنے دیوار پر جھول رہی ہوتی تھی موجود نہیں تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ کسی میٹنگ میں شریک ہے یا اگلے مورچوں کی طرف گئی ہے۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد میں کمانڈر افغانی کی طرف جا رہا تھا۔کمانڈر افغانی کی رہائش گاہ ڈی پیلس کے وسیع وعریض احاطے کے اندر ہی ایک جانب واقع تھی۔ میں رضا کاروں کے جتھوں کے درمیان سے پیدل گزرتا ہوا پانچ منٹ میں اس کے گیٹ پر پہنچ گیا۔ میں نے وہ سیل فون بھی اپنے ساتھ لے لیا تھا جس پر انیق نے خیام کا اعترافی بیان ریکارڈ کیا تھا۔ یہ میرے بہت کام آنے والا تھا۔

گیٹ پر مشین گنوں والے دو لمبے تڑنگے قبائلی پہرا دے رہے تھے۔ میری شناخت کے بعد مجھے اندر جانے کی اجازت دے دی گئی۔ میرا پستول میرے ساتھ ہی رہنے دیا گیا

تھا۔ایک شخص مجھے دوراہداریوں سے گزار کر گھر کی وسیع نشست گاہ میں لے گیا۔ یہاں فرش پر قالین بچھا تھا اور دیواروں کے ساتھ گاؤ تکیے رکھے تھے۔ دیواروں پر ہر طرح کا اسلحہ آویزاں تھا......شیر کے سر کی دو ٹرافیاں بھی نظر آرہی تھیں۔

لمبا تڑنگا افغانی پھیل کر ایک غالیچے پر نیم دراز تھا اور ڈرائی فروٹ کھا رہا تھا۔ میں افغانی کو کئی بار پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ وہ سراپا ایک جنگجو تھا۔اس کے ایک بازو پر اب بھی کچھ پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ یہ ان زخموں کی نشانی تھی جو اسے دو روز پہلے والی لڑائی میں آئے تھے۔اس نے مجھے اپنے قریب بیٹھنے کا اشارہ کیا۔قہوے اور ڈرائی فروٹ کی طشتری میری طرف کھسکا دی۔ ”تمہارا بازو اب کیسا ہے جوان؟“

”اب بہتر ہوں۔بس ہلکا سا درد ہے۔“

”درد والے کام تو تم خود کرتے ہو۔خو تم کو بی بی قسطینا کے ساتھ نہیں جانا چاہیے تھا۔ اگر امارے اختیار میں ہوتا تو ام تم کو ایسے کام کا اجازت ہرگز نہ دیتا۔“اس نے چبھتے لہجے میں کہا۔

”شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“

”ام ایک اور بہت ”زیادہ ٹھیک“ بات کرنا چاہ رہا ہے اور ام کو امید ہے کہ تم اپنے مغز کا استعمال کرے گا اور اس بات کو ردی کے ٹوکرے میں نہیں پھینکے گا۔“

میں نے چونک کر افغانی کی طرف دیکھا۔اس کی آنکھوں میں سرخی تھی۔نشست گاہ کے دروازے بند تھے۔اردگرد بھی شاید کوئی موجود نہیں تھا۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔”بی بی قسطینا کو جانتے ہو کون ہے؟......بی بی قسطینا محترم آدم شہید کا بیٹی ہے۔وہ یہاں فوج کا سپریم کمانڈر ہے......اور وہ اس جنگ کا سرداری کر رہا ہے جو ہمارے لیے زندگی موت کا جنگ بنا ہوا ہے۔اس پر بہت بھاری ذمے داریاں ہیں۔ام ہرگز ہرگز برداشت نہیں کرسکتا کہ کوئی اس کی ان ذمے داریوں میں خلل ڈالے۔“

”میں......سمجھا نہیں؟“

”تم سب سمجھ رہے ہو۔ام کو ایک شہید کی بیٹی کا نام بار بار زبان پر لانے پر مجبور مت کرو۔وہ ام سب کے لیے بہت قابلِ احترام ہے......ام اپنا سارا بات بس ایک فقرے میں کہہ دیتا ہے۔تم اس سے اپنا بار بار کا میل جول بند کردو۔“افغانی کے لہجے میں کسی شیر کی دبی دبی دہاڑ تھی۔

میں سب کچھ سمجھ رہا تھا، پھر بھی پوچھا۔”محترم کمانڈر آپ کس میل جول کی بات

کر رہے ہیں؟''

''اپنا زبان بند کرلو۔'' وہ نہایت سخت لہجے میں پھنکارا۔ ''بس، ام نے اپنا بات ایک فقرے میں کہہ دیا...... اب تم جا سکتے ہو۔'' اس نے ڈرائی فروٹ کی طشتری میرے سامنے سے ہٹا دی۔

ایک توقف کے بعد میں نے کہا۔ ''اگر میں نہ جاؤں تو؟''

اس نے میری طرف یوں آنکھیں پھاڑ کر دیکھا جیسے میں ابھی ابھی زمین شق کر کے برآمد ہوا ہوں۔ وہ بولا کچھ نہیں بس کئی لمحوں تک جگر پاش نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا۔ تب اس نے اٹھ کر نشست گاہ کے قالین پر ننگے پاؤں ایک چکر لگایا اور دوبارہ اپنی جگہ بیٹھ کر تین بار تالی بجائی۔ ایک گرانڈیل قبائلی اندر آیا اور سلام کر کے کھڑا ہو گیا۔ ''زمان اس لڑکی کو یہاں لے کر آؤ۔'' افغانی نے میری طرف دیکھ کر خونخوار لہجے میں کہا۔

میرے دل نے گواہی دی کہ میری نگاہیں چند ہی لمحوں میں کوئی لرزہ خیز منظر دیکھنے والی ہیں۔

وال کلاک کی ٹک ٹک کسی خطرے کا احساس دلا رہی تھی۔ لمبا تڑنگا افغانی خاموشی سے میری طرف دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ قدموں کی چاپ ابھری۔ وہی شخص اندر داخل ہوا جس کو افغانی نے زمان کہہ کر پکارا تھا اور لڑکی کو اندر لانے کا کہا تھا۔ وہ لڑکی کو لے آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک گول ٹرے تھی جس میں لڑکی کا سر تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ٹرے میں کوئی تربوز پڑا ہے اور تربوز کے سرخ گودے کی وجہ سے تربوز کو ڈھانپنے والے رومال پر سرخ داغ نظر آ رہے ہیں۔ یہ درحقیقت خون کے داغ تھے۔

افغانی کے اشارے پر زمان نے سفید رومال ہٹایا۔ منظر لرزا دینے والا تھا۔ لڑکی کی گردن کسی وزنی تیز دھار آلے سے ایک ہی وار میں کاٹ دی گئی تھی۔ ایک طرف سے سرخ و سپید چمڑی کسی جھالر کی طرح لٹکی نظر آتی تھی۔ لمبے سیاہ بال چوٹی کی شکل میں گندھے ہوئے تھے اور یہ چوٹی بھی کنڈلی مارے سانپ کی طرح گول ٹرے میں موجود تھی۔ خوب صورت لڑکی کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ واضح طور پر انڈین تھی، ماتھے پر سرخ بندیا بھی اس کے انڈین ہونے کے امکان کو قوی کر رہی تھی

افغانی اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ ”تم کو حیرانی ہو رہا ہوگا کہ اس چھوکری کا باقی جسم کہاں گیا۔ اس کا باقی جسم بہت تڑپتا مچلتا تھا۔ ہمارے سپاہیوں کا ایمان خراب کرتا تھا ام نے اس کو علیحدہ کر دیا ہے۔“

زمان نامی اس شخص نے بڑی بے پروائی سے خون آلود ٹرے کو سامنے ایک منقش تپائی پر رکھ دیا اور سلام کر کے الٹے پاؤں باہر نکل گیا۔

افغانی نے زہر خند انداز میں کہا۔ ”ام جنگ کا حالت میں ہے اور اس حالت میں ایسی غلطیوں کو معاف نہیں کیا جا سکتا۔ اس لڑکی کا نام نیرا ہے۔ اس نے ہمارے ایک بڑے فوجی افسر کو اپنے جال میں الجھانے کا کوشش کیا اور یہ کوشش کیا کہ حملے کی رات وہ اپنے مورچے میں

ہونے کے بجائے اس کے بستر پر ہو۔ یہ دشمن کا آلہ کار تھا......اور ساتھ میں اس کا بہن بھی۔ دونوں کو موت کا منہ دیکھنا پڑا۔''

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔''کمانڈر افغانی! آپ مجھے کیا سمجھانا چاہتے ہیں۔ میں بھی دشمن کا آلۂ کار ہوں؟ اور میرا سر بھی اسی طرح لوہے کی ٹرے میں رکھا جا سکتا ہے؟''

''خوچے، تم دشمن کا آلۂ کار نہیں ہے لیکن کام وہی کر رہا ہے...... بلکہ شاید ایسا کام دشمن کا آلۂ کار بھی اتنی آسانی سے نہ کر سکے۔ ام ابھی تم سے نرم لپظوں (لفظوں) میں بات کر رہا ہے۔ اگر تم اڑی مڑی دکھائے گا تو......ام ابھی تمہاری دم میں نمدہ پٹ کرے گا۔'' اس کی آنکھوں سے چنگاریاں چھوٹنے لگی تھیں۔''ام تم سے بالکل آخری بار کہہ رہا ہے۔ تم اپنی اس شکل کے ساتھ بی بی قسطینا کے قریب نظر نہیں آئے گا۔ اس کو اس کا کام کرنے دو۔ اگر ایسا نہیں ہوگا تو پھر ام اپنا کام کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔'' اس کا لہجہ مزید خطرناک ہو گیا۔

میرا پارا بھی آہستہ آہستہ چڑھنے لگا تھا۔ میں نے کہا۔''کمانڈر افغانی! مجھے لگتا ہے کہ تمہیں کوئی بہت بڑی غلط فہمی ہے اپنے بارے میں۔''

اس نے پھر چونک کر میری جانب دیکھا۔ جیسے حیران ہو کہ کوئی اس سے اس لہجے میں بھی بات کر سکتا ہے۔ اس نے ایک دم میرا گریبان پکڑ لیا اور دہاڑا۔''اوئے خدائی خوار...... اوئے خدائی خوار...... کیوں موت آگئی ہے تیری۔''

اس کی گرفت بے حد سخت تھی۔ مجھے دم گھٹتا محسوس ہوا۔ اس کی آواز سن کر تین مسلح افراد اندر آگئے۔ ان میں گول ٹوپی والا زمان بھی تھا۔ تینوں افراد کی رائفلیں ان کے ہاتھوں میں تھیں۔ افغانی نے دوسرے ہاتھ میں وہ گول ٹرے پکڑی جس میں کسی نیرا نامی خوبرو لڑکی کا سر تھا، اس نے ٹرے ترچھی کر کے سر نیچے گرا دیا۔ وہ فٹ بال کی طرح قالین پر لڑھک کر چند فٹ دور چلا گیا اور ذرا گھوم کر رک گیا۔ افغانی نے خالی ٹرے میری آنکھوں کے سامنے کی اور پھنکارا۔''ام کو اس ٹرے میں تیرا سر نظر آ رہا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں......بس تھوڑی ہی دیر میں۔''

اس نے اپنے کارندوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے نشست گاہ کے دونوں دروازے اندر سے بولٹ کر دیئے۔ ایک شخص نے آگے بڑھ کر ایل ایم جی کی سرد نال میری گدی سے لگا دی اور دوسرے نے بڑی احتیاط کے ساتھ پستول میری قمیص کے نیچے سے نکال لیا۔ سب کے تیور بگڑے ہوئے تھے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں اس کمرے میں داخل ہوا تھا تو صورتِ حال

بری نہیں تھی۔ افغانی نے مجھے باقاعدہ ڈرائی فروٹ پیش کیا تھا اور قہوے کی آفر کی تھی مگر اب میں خود کو غیظ و غضب کے گھیرے میں محسوس کر رہا تھا۔ بہر حال ایسے مرحلوں سے میں بہت مرتبہ گزر چکا تھا۔ میں جانتا تھا کہ افغانی میری جان لینے میں اتنی جلدی نہیں کرے گا۔ وہ مجھے اس قدر خوف زدہ کر دینا چاہتا تھا کہ میں اندر سے ٹوٹ جاؤں اور اپنے رویے پر پچھتاوا ظاہر کروں۔

میں نے کہا۔ ''کمانڈر افغانی! میں سمجھتا تھا کہ تم رضا کاروں اور سپاہیوں کی اتنی بڑی تعداد کی کمان کر رہے ہو...... تم ایک حوصلہ مند اور سمجھ دار بندے ہو گے لیکن تمہارے تیور دیکھ کر اور تمہاری باتیں سن کر مایوسی ہو رہی ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اپنی سپریم کمانڈر کے بارے میں اس طرح کی سوچ رکھو گے۔''

''اپنی گندی زبان سے اب ایک لفظ بھی نہ نکالنا ورنہ کلمہ پڑھنے کا مہلت بھی نہیں ملے گا۔'' افغانی چنگھاڑا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے ایک موٹے نمدے کے نیچے سے کوئی تین فٹ لمبی وزنی کٹار نکال لی۔ کٹار کمرے کی روشنی میں لشکارے مار رہی تھی۔ افغانی کا سارا جسم طیش سے لرز رہا تھا۔

میں نے اطمینان سے کہا۔ ''ٹھیک ہے خان، میرا سر بھی اس ٹرے میں سجا لو لیکن اس سے پہلے اگر تنہائی میں مجھ سے ''کچھ'' دیکھ لو تو تمہارے حق میں بہت اچھا ہو گا۔''

اس نے میرے فقرے پر غور کیا اور پھر دہاڑا۔ ''کیا دکھانا چاہتے ہو۔ دکھاؤ ابھی دکھاؤ۔''

''سب کے سامنے ٹھیک نہیں ہو گا۔ میرا پستول تو تم لے ہی چکے ہو۔ ان بندوں کو پانچ منٹ کے لیے باہر بھیج دو۔''

میرے اطمینان اور تاثرات نے کمانڈر افغانی کو سمجھا دیا کہ میری بات میں وزن ہے اور کوئی نہ کوئی بات ایسی ہے جس نے میرے اندر اتنی ہمت پیدا کر رکھی ہے۔ چند سیکنڈ تک بری طرح کھولنے کے بعد اس نے اپنے آدمیوں کو خفیف اشارہ کیا اور وہ باہر چلے گئے۔

میں نے کہا۔ ''افغانی صاحب! تم عزت مآب ریان فردوس اور اس کے خانوادے کے بہت بڑے خیر خواہ بن رہے ہو۔ تم نے اس جوان لڑکی کا سر صرف اس لیے قلم کر دیا کہ وہ ایک فوجی افسر کو اس کی ذمے داریوں سے غافل کر رہی تھی اور ایسی ہی سزا شاید تم مجھے بھی دینا چاہتے ہو کیونکہ تمہارے مطابق میں بھی سپریم کمانڈر کو غافل کر رہا ہوں۔ لیکن تم خود، عزت مآب اور اس کے گھرانے کے ساتھ کیا کر رہے ہو؟''

''کیا بکتا ہے؟ جو بھی بکواس کرنا ہے صاپ صاپ کرو۔''

''خان بہادر! تمہیں پتا ہی ہے کہ ڈی پیلس کے اندر کیا کہرام مچا ہوا ہے۔ چھوٹا صاحب ابراہیم زندگی موت کی کشمکش میں ہے۔ بڑی بیگم نورل نساء کو غش آ رہے ہیں۔ وہ اپنے بیٹے کی حالت کا ذمے دار عزت مآب کو ٹھہرا رہی ہیں...... اگلے ایک دو روز میں ڈی پیلس کے اندر سے بری سے بری خبر آ سکتی ہے......''

''تم سیدھا سیدھا بات کرو۔'' وہ پھر چنگھاڑا۔

''سیدھا سیدھا بات یہ ہے کہ ڈی پیلس میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کے ذمے دار تم ہو۔ تم وفادار ہونے کے باوجود اپنے مالکوں کو دھوکا دے رہے ہو۔ تمہاری وجہ سے وہاں صفِ ماتم بچھی ہوئی ہے اور یہ صفِ ماتم بچھا کر تم لڑائی بھی جیتنا چاہتے ہو، خوب، بہت خوب...... تمہارا منہ چومنے کو دل چاہتا ہے۔''

افغان فرطِ غضب سے کانپ رہا تھا۔ شاید برداشت کی آخری حدوں کو چھو رہا تھا۔ کٹار پر اس کی گرفت مضبوط ہوتی چلی جا رہی تھی۔ وہ کسی بھی لمحے مجھ پر جھپٹ سکتا تھا، میں نے کہا۔ ''میں ثبوت کے بغیر کچھ نہیں کہہ رہا ہوں افغانی صاحب! مجھے پتا ہے، اپنی جس دلہن کے لیے ابراہیم بسترِ مرگ پر جا گرا ہے، اسے تم نے ہی ڈی پیلس سے نکالا اور سمندر کے کنارے ایک گھر تک پہنچایا۔''

میرے اس آخری فقرے نے افغانی کے چہرے کا رنگ بدل دیا۔ آنکھوں سے نکلنے والی چنگاریاں کچھ مدھم پڑ گئیں۔ ان چنگاریوں کی جگہ ایک طرح کے تحیر نے لے لی۔ میں نے بات جاری رکھی۔ ''میں اس ہیجڑے خیام کے بارے میں بھی سب کچھ جانتا ہوں...... اور یہ بھی جانتا ہوں کہ اس نے تمہیں دلہن زینب کا جو شاہی لباس دیا تھا، اس سے تم نے کیا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔''

میں نے دیکھا کٹار پر افغانی کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں اب صرف استعجاب اور پریشانی تھی۔ وہ بمشکل اتنا ہی کہہ سکا۔ ''تم اپنے ہوش حواس میں تو ہو؟'' اپنی آواز کا کھوکھلا پن یقیناً اس کو خود بھی محسوس ہوا ہوگا۔

''بالکل ہوش میں ہوں کمانڈر افغانی! جو بات بھی کہہ رہا ہوں پکے ثبوت کے ساتھ کہہ رہا ہوں اور نیک نیتی سے بھی کہہ رہا ہوں...... مجھے اپنا دشمن نہ سمجھنا...... میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم جیسا بڑا اور ہردلعزیز سردار اس طرح کی غلطی کا مرتکب کیوں ہوا...... کیوں ایسی دلدل میں گرا کس وجہ سے؟''

''تت...... تم کن ثبوتوں کی بات کر رہا ہے؟ ام کو تمہارا کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہا۔''

''سمجھ تو تم کو سب کچھ آ رہا ہے کمانڈر افغانی! بس یقین نہیں آ رہا کہ یہ ہو چکا ہے۔''

اس نے کٹار دوبارہ موٹے نمدے کے نیچے رکھ دی۔ ایک نظر دروازوں اور کھڑکیوں کی طرف دیکھا۔ جیسے یقین کرنا چاہ رہا ہو کہ سب بند تو ہیں، اس کا رنگ اب سرخ کے بجائے ہلکا زرد نظر آنے لگا تھا اور یہ ایک بہت بڑی تبدیلی تھی۔ اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا...... اور خود بھی بیٹھ گیا۔ بیٹھنے سے پہلے اس نے ایک سیاہ شال سے کٹے ہوئے سر کو ڈھانپ دیا تھا تا کہ اس کی دید ماحول کو پراگندہ نہ کرے۔

اس نے کچھ دیر تک خود کو کمپوز کرنے کی کوشش کی پھر بولا۔ ''صاپ بتاؤ، تم کیا کہنا چاہتا ہے؟''

اس کا انداز کچھ نرم ہوا تو میں نے بھی اپنا لہجہ کچھ دھیما کر لیا میں نے کہا۔ ''صاف بات تو وہی ہے جس کا آپ کو بھی پتا ہے۔ آپ کو بیگم نورل نے دلہن زینب کے بارے میں جو کچھ کہا، آپ نے اس پر عمل کیا۔ آپ زینب کو ڈی پیلس سے نکال کر یہاں اپنے گھر لے آئے، آپ نے بیگم سے وعدہ کیا تھا کہ آپ زینب کو کسی بھی طرح جاماجی سے نکال کر واپس پاکستان پہنچا دیں گے اور آپ ایسا کر بھی سکتے تھے، اور کرنے کا ارادہ بھی رکھتے تھے...... یہاں تک تو سب ٹھیک تھا لیکن اس کے بعد جو ہوا وہ ٹھیک نہیں تھا بلکہ بہت غلط تھا۔''

افغانی کی سوالیہ نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ چہرے پر اضطراب تھا۔ میں نے بات جاری رکھی۔ ''آپ نے اچانک اپنا ارادہ بدل دیا...... بلکہ پورا کھیل ہی بدل ڈالا۔ آپ نے فیصلہ کیا کہ آپ زینب کو واپس پاکستان نہیں بھیجیں گے بلکہ یہیں اپنے پاس رکھیں گے۔ اس کے علاوہ آپ نے ایک اور سنگین فیصلہ بھی کیا...... اور وہ یہ کہ زینب کو زندہ ظاہر نہیں کیا جائے گا۔ ایک ایسا منظر نامہ بنایا جائے گا کہ زینب آپ کے گھر سے فرار ہو کر کنٹرول لائن کی طرف نکل گئی۔ وہ کہیں بھاگ جانا چاہتی تھی مگر اسی رات ہونے والی خوفناک گولا باری کی زد میں آ کر ماری گئی...... کیا میں یہاں تک ٹھیک کہہ رہا ہوں؟''

افغانی کے بارعب چہرے پر کھلبلی کی سی کیفیت تھی۔ وہ اپنی بھاری آواز کی لرزش چھپاتے ہوئے بولا۔ ''تم اپنی بات جاری رکھو۔ ام بعد میں جواب دے گا۔''

''اس منظر نامے میں حقیقت کا رنگ بھرتے ہوئے، آپ نے زینب کو بڑی خاموشی سے خواجہ سرا خیام کے گھر پر پہنچا دیا اور اسے ہدایت کی کہ وہ گھر کے تہ خانے میں زینب کے طویل قیام کا انتظام کرے۔ آپ نے زینب کا شاہی لباس حاصل کر لیا اور جوتے وغیرہ

بھی...... اس کے بعد کسی بدقسمت لڑکی کے جسم پر وہی لباس سجا کر اسے یوں بارود سے اڑایا گیا کہ اس کا بالائی دو فٹ دھڑ ہی غائب ہو گیا۔ اس کے بقایا جسم کو آپ نے زینب کی لاش قرار دیا اور اسے عزت مآب کی فیملی کے روبرو پیش کر دیا۔"

میں نے کمانڈر افغانی کے فراخ ماتھے پر پسینے کی چمک دیکھی، اس نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ "یہ سب کچھ تمہیں کیسے پتا چلا ہے؟ اور تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ یہ سب ویسے ہی ہے جیسے تمہارے علم میں آیا ہے؟"

میں نے سیل فون نکالا۔ اس کے ویڈیو سیکشن میں جا کر وہ ویڈیو پلے کر دی جس میں خیام نے اپنا طویل بیان ریکارڈ کرایا تھا۔ میں نے ویڈیو کا صرف وہ مختصر حصہ پلے کیا جس میں خیام سسکیاں لیتے ہوئے بتا رہا تھا کہ کمانڈر افغانی اس کے پاس آئے اور انہوں نے کہا کہ دلہن زینب کو حفاظت اور مکمل رازداری سے اپنے گھر کے تہ خانے میں رکھنا ہے، افغانی صاحب نے یہ بھی کہا کہ مکمل رازداری رکھنے کے لیے گھر کے ملازموں کو کچھ دن کے لیے چھٹی دے دی جائے...... وغیرہ وغیرہ۔

ڈیڑھ دو منٹ کا یہ کلپ ہی افغانی کے رہے سہے ہوش اُڑانے کے لیے کافی تھا۔ اس نے سگریٹ سلگا کر چند طویل کش لیے اور اٹھ کر ایک بار پھر ننگے پاؤں نشست گاہ کا ایک چکر لگایا۔ دوبارہ اپنی جگہ بیٹھتے ہوئے بولا۔ "مطلب یہ کہ تم نے جاسوسی کیا ہے اور بغیر کسی ڈر کے تم اور تمہارے ساتھی لوگ ہر حد تک گیا ہے......" افغانی کے لہجے میں ایک بار پھر تپش جھلک دکھانے لگی تھی۔

اس سے پہلے کہ یہ تپش بڑھ جاتی، میں نے کہا۔ "کمانڈر صاحب، اس موبائل فون میں سارے ثبوت موجود ہیں اور آپ یہ بات بھی ذہن میں رکھیں کہ یہ ثبوت میں نے کچھ اور لوگوں کے پاس بھی رکھوا دیئے ہیں۔ پورے بھروسے کے لوگ ہیں۔ صرف اسی صورت میں زبان کھولیں گے جب میں کہوں گا...... یا پھر کسی کٹار کے ذریعے میرا سر بھی کسی تھالی میں سجا دیا جائے گا۔"

افغانی نے ایک بار پھر تین تالیاں بجائیں۔ دروازہ کھلا اور زمان خان اندر داخل ہوا۔ افغانی نے اسے حکم دیا کہ کٹا ہوا سر اٹھا کر واپس لے جائے اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اگلے حکم تک ہم دونوں کی گفتگو میں مداخلت نہ کی جائے۔ زمان خان نے کٹے ہوئے سر کو ٹرے میں رکھ کر اوپر ایک اور رومال ڈالا۔ پہلے الٹے قدموں چلتا دروازے تک گیا پھر گھوم کر دروازے سے باہر نکلنے لگا۔ افغانی نے آواز دی۔ "ٹھہرو۔"

وہ گھوم کر اور جھک کر افغانی کی طرف متوجہ ہو گیا۔
افغانی بولا۔ ”کھانے پینے کے لیے کچھ لاؤ...... اور تازہ چائے بھی۔“
ایک دوسرا شخص اندر داخل ہوا اس کے ہاتھ میں ایک گیلا کپڑا تھا۔ اس نے قالین پر سے چھوٹے چھوٹے داغ اچھی طرح صاف کیے جو ”قلم شدہ“ سر کے لڑھکنے سے پڑ گئے تھے۔ اس کارروائی کے بعد وہ الٹے قدموں چل کر باہر نکل گیا۔ اب میرے اور افغانی کے درمیان جو گفتگو شروع ہوئی تو وہ مختلف لب و لہجے میں تھی۔ اسی گفتگو کے دوران میں افغانی کو ایک فون کال آ گئی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ کال قسطینا کی طرف سے ہی تھی، اس نے افغانی کو بتایا تھا کہ آج رات رائے زل کی طرف سے جوابی فضائی حملے کا خطرہ ہے۔ اس لیے ائیر ڈیفنس کو پوری طرح چوکس رکھا جائے۔ ڈی پیلس کے گرد دو اینٹی ائیر کرافٹ گنوں کا اضافہ کیا جائے اور رات کو مکمل بلیک آؤٹ ہو۔
قسطینا سے گفتگو ختم کر کے افغانی نے فون آف کر دیا اور پوری طرح میری طرف متوجہ ہو گیا۔ اس نے کہا۔ ”ام جاننا چاہتا ہے شاہ زیب کہ تم کہاں تک جانتا ہے۔ کیا تم کو معلوم ہے کہ زینب کو بڑی بیگم نے کیوں امارے سپرد کیا؟“
”ہاں افغانی صاحب، اب تو یہ بات بہت سے لوگوں کو معلوم ہو چکی ہے کہ باپ بیٹے میں زینب کے حوالے سے بہت زیادہ اختلاف پیدا ہو چکا ہے لیکن عام لوگوں کو یہ خبر نہیں کہ زینب کو حالات سے خوف زدہ کرنے کے بعد اس سے اپنے شوہر کے نام ایک خط لکھوایا گیا اور پھر اسے آپ کے حوالے کیا گیا تا کہ آپ اسے خاموشی سے پاکستان پہنچا دیں۔ عام لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ گھریلو تنازعے کی وجہ سے دلہن زینب خاموشی سے گھر چھوڑ کر چلی گئی اور غلطی سے خطرناک علاقے میں نکل کر جاں بحق ہوئی۔“
”یعنی یہ بات تو تم جانتا ہے کہ بڑی بیگم صاحب نے زینب کو امارے حوالے کیا تا کہ ام اس کو حفاظت سے پاکستان پہنچا دے لیکن تم یہ بات نہیں جانتا کہ ام نے اسے پاکستان کیوں نہیں پہنچایا۔“
”بالکل یہی بات ہے...... اور میں یہ بھی نہیں جانتا کہ اس کی موت والا نہایت خطرناک ڈھونگ کیوں رچایا گیا ہے؟ ایک ایسا ڈھونگ جس کی وجہ سے ابراہیم موت کے کنارے پہنچ گیا ہے اور ڈی پیلس کی گھریلو زندگی تباہی کے دہانے پر ہے۔“
”تمہارے خیال میں ایسا کیوں ہوا ہے؟“ افغان نے الٹا مجھ سے سوال کیا۔
”بظاہر تو یہی لگ رہا ہے کہ آپ زینب کو رازداری سے یہیں جاما جی میں رکھنا چاہتے

تھے......اپنے پاس۔''
''کیا تم ام پر اور اماری نیت پر کسی طرح کا شک تو نہیں کر رہا؟ ایک بات یاد رکھنا، وہ امارے لیے بیٹی کی طرح ہے۔''
''میں آپ پر اس طرح کے شک کا سوچ بھی نہیں سکتا لیکن مجھے اپنے سوالوں کا جواب چاہیے۔ اسے پاکستان کیوں نہیں بھیجا گیا اور اس کی موت والا سنگین ناٹک کیوں رچایا گیا؟''
''کچھ باتیں ایسا ہوتا ہے جن کو بندہ بیان کرنا چاہے تو بھی نہیں کر سکتا، اگر تم اماری نیت پر شک نہیں کر رہا تو پھر اس بات پر یقین رکھو کہ ام نے جو کچھ کیا، اچھے کے لیے کیا۔''
''اور جو اچھا ہو رہا ہے وہ آپ کے سامنے ہے، جاما جی کا ولی عہد موت کے منہ میں ہے اور یہ سب کچھ ایسے وقت ہو رہا ہے جب گرین فورس اور گرے فورس میں زندگی موت کی جنگ جاری ہے۔''
''ام مجبور تھا، ام کو کسی کا حکم ماننا تھا اور وہ ام نے مانا۔''
''اس کا نام پوچھ سکتا ہوں؟''
''ام مر کر بھی نہیں بتائے گا۔'' کمانڈر افغانی نے چٹانی لہجے میں کہا۔
''لیکن میرا خیال ہے کہ میں آپ کے بتائے بغیر بھی کافی حد تک سمجھ رہا ہوں۔ ٹھیک ہے آپ نہ بتائیں لیکن یہ تو بتا دیں کہ وہ ایسا کیوں چاہتا تھا؟''
افغانی نے سبز چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''جہاں تک امارا خیال ہے وہ اپنے طور پر ٹھیک تھا۔ کم از کم اس معاملے میں تو ٹھیک تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ لڑکی پاکستان چلا گیا تو چھوٹے صاحب ابراہیم اسے ڈھونڈنے کے لیے وہاں بھی پہنچ جائے گا جب تک یہ لڑکی زندہ ہے، باپ بیٹے کے درمیان حالات برے سے برا ہوتا جائے گا۔ وہ چاہتا تھا کہ یہ ٹنٹا ہمیشہ کے لیے خلاص کرنے کے لیے اس لڑکی کو ختم کر دیا جائے۔ باپ بیٹے کے رشتے کو بچا لیا جائے بلکہ اس پورے خاندان کو بچا لیا جائے۔ اس کا خیال تھا کہ ام یہ جنگ بھی تب ہی جیت سکتا ہے جب یہ خاندان اس تباہی سے بچے گا۔''
''اور آپ کے نزدیک وہ ٹھیک سوچ رہا تھا؟''
افغانی نے چند لمحے توقف کیا۔ اس کی پیشانی پر لکیروں کا جال سا تھا۔ طویل سانس لے کر بولا۔ ''ہاں اس خد تک تو وہ ٹھیک ہی تھا کہ اس خاندان کو بچنا چاہیے تاکہ اس جزیرے کو بچایا جا سکے......لیکن......'' وہ کہتے کہتے رک گیا۔
''آپ چپ ہو گئے افغانی صاحب؟''

اس نے پھر ٹھنڈی سانس بھری۔ ''لیکن جو کچھ بھی تھا، ام ایک معصوم بے گناہ لڑکی کا جان نہیں لے سکتا تھا۔ وہ جو امارے گھر میں ٹھہرا ہوا تھا اور اپنی ڈری ڈری آنکھوں سے اور امید بھری نظروں سے ام کو دیکھتا تھا، ہاں ام نہیں لے سکتا تھا اس کا جان۔''

''تو پھر؟'' میں نے پوچھا۔

افغانی نے پہلو بدلا۔ پیکٹ میں سے دو سگریٹ نکالے۔ ایک میری طرف بڑھایا اور دوسرا اپنے ہونٹوں سے لگا کر قیمتی لائٹر سے دونوں سگریٹ سلگائے۔ دھواں فضا میں چھوڑ کر بولا۔ ''ام کسی سے ڈرنے والا نہیں ہے۔ بے شک تمہارے پاس کئی ایک ثبوت ہے، لیکن امارا ضمیر صاپ ہے۔ اگر وقت پڑ گیا تو ام ہر بات کا سامنا کرلے گا۔ ام تم کو جو کچھ بتا رہا ہے اس لیے بتا رہا ہے کہ ام کو تمہارے اندر سے اچھائی کا خوشبو آیا ہے۔ تم ام سے وعدہ کرو کہ یہاں کی باتیں تم اپنے تک ہی رکھے گا۔ اس میں امارا اور تمہارا دونوں کا پائدہ ہوگا۔''

''کمانڈر افغانی! سچی بات تو یہی ہے کہ مجھے بھی آپ کے اندر سے اچھی خوشبو ہی آئی ہے۔ میں آپ کو نقصان پہنچانے کا کبھی نہیں سوچوں گا۔ بس ایک دو باتیں ایسی ہیں جن کی وضاحت ہو جائے تو میری الجھن دور ہو جائے گی۔''

کمانڈر افغانی نے طویل کش لے کر اپنے گرانڈیل جسم کو زرنگار گاؤ تکیے کا سہارا دیا اور بولا۔ ''شاہ زیب! کچھ لوگوں نے ام سے کہا...... بلکہ حکم دیا کہ ام اس لڑکی کو ختم کر کے اس کا لاش ڈی پیلس میں واپس پہنچا دے...... تاکہ چھوٹے صاحب ابراہیم کے ذہن سے ہمیشہ کے لیے اس لڑکی کا پتور (فتور) اتر جائے...... اور وہ ٹھنڈا ٹھار ہو کر اپنے گھر کے مالکوں کو ٹھیک کر لے۔ ام یہ حکم ماننے پر مجبور تھا اور ایسا کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ سو ام نے اس کا ایک درمیانی حل نکال۔ اور یہ حل وہی ہے جس کا پتا تم کو خواجہ سرا خیام مانش سے لگا ہے۔ بہت سوچ بچار کے بعد ام نے زینب کو خیام کے حوالے کر دیا اور ایک دوسری لڑکی کا لاش زینب کا لاش بنا کر ڈی پیلس میں پہنچا دیا۔''

''آپ نے ایک بے گناہ کو بچانے کے لیے ایک دوسری بے گناہ کو مارا؟''

''نہیں، اگر تم کو امارے اندر سے اچھا خوشبو آتا ہے تو پھر اس طرح کا بات کیوں سوچتا ہے؟ یہ جو زینب کی جگہ مرا یہ بے گناہ چھوکری نہیں تھا......'' پھر وہ ذرا رک کر بولا۔ ''ام نے تم کو بھی بتایا ہے نا کہ دو بہنیں نیوسٹی کا جاسوس تھا اور پکڑا گیا تھا۔ یہ دراصل چھ سات لڑکیوں کا ایک بے حیا ٹیم تھا۔ یہ خدائی خوار ہمارے فوجی اپسروں (افسروں) کو ورغلاتا تھا۔ ان کو رنگ رلیوں میں ڈالتا تھا اور ان سے اندر کا باتیں بھی معلوم کرتا تھا۔ عزت مآب کے حکم سے ان

میں سے پانچ چھوکریوں کو موت کی سزا کا حکم آیا تھا۔ یہ دونوں انڈین بہنیں نیرا اور میرا، بھی ان میں شامل تھا، بہت ہی اعلیٰ پائے کا بدمعاش تھا یہ دونوں انڈین بہنیں۔ دو تین قتل بھی ان کے ذمے تھے۔''

میں نے کہا۔''ان میں سے ایک کا کٹا ہوا سر تو میں نے ابھی دیکھا ہے، آپ کی بات کا مطلب یہ ہے کہ دوسری کو آپ نے زینب کی جگہ مارا؟''

''ہاں اس کا رنگ روپ اور قد کاٹھ زینب کے ماپق (مافق) تھا۔ ام نے اسے زینب کا شاہی لباس پہنایا اس کے پاؤں پر ویسا ہی مہندی لگایا گیا جیسا زینب کے پاؤں پر تھا۔ اسے زینب کے جوتے پہنائے گئے۔ اور اس کی موت کو توپ کے ذریعے بالکل آسان بنا دیا۔'' افغانی کے لب و لہجے میں ایک فوجی کمانڈر کی بے رحمی تھی۔

''توپ کے ذریعے؟'' میں نے پوچھا۔

''امارے قبیلوں میں کبھی کبھی پرانے رواج کے ماپق توپ کے منہ پر باندھ کر بھی موت کا سزا دیا جاتا ہے......''

مجھے سنسنی محسوس ہوئی۔ وہ بے سر اور بے کندھوں کی لاش یاد آ گئی جسے زینب کی لاش قرار دیا گیا تھا۔ اب پورا واقعہ میری سمجھ میں آ رہا تھا۔ یہ بات میں نے پہلے بھی سنی ہوئی تھی کہ قیدیوں کو توپ کے منہ سے باندھ کر اُڑانے کا رواج رہا ہے۔ آج اس رواج کی جیتی جاگتی بازگشت میں افغانی کی آواز میں سن رہا تھا۔

افغانی نے عمیق سانس لیتے ہوئے کہا۔''شاید کسی کو بھی توقع نہیں تھا کہ زینب کی موت کی خبر کا اثر ابراہیم پر اتنا زیادہ ہوگا...... وہ بستر پر ہی پڑ جائے گا۔ اب تو ام یہ سوچ کر پریشان ہوتا ہے کہ اگر ام نے اوپر سے آنے والے حکم کے مطابق اس بے چاری کو واقعی مار دیا ہوتا تو واپسی کا راستہ ناممکن ہو جاتا۔ اب بھی پتا نہیں یہ ممکن ہے یا نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ لوگوں کو ابراہیم کا مرنا تو قبول ہو مگر زینب کا واپس آنا قبول نہ ہو۔'' وہ گہری سوچ میں نظر آتا تھا۔ اس کی فراخ پیشانی پر سوچوں کا جال تھا۔ کھوئی کھوئی نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔

''اس سارے معاملے میں ام کو جو بہت زیادہ اپسوس ہوا ہے، وہ خیام مانش کی حالت پر ہوا ہے۔ اس کا قصور اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اس نے امارے حکم پر زینب کو اپنے پاس پناہ دیا ہے اور حپاظت (حفاظت) سے رکھا ہے۔ تم لوگوں نے اسے بہت بے دردی سے مارا ہے۔ وہ کسی پریزر (فریزر) کے اندر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا یہ ویڈیو تم نے کہاں بنایا ہے؟''

''آپ کا کیا خیال ہے، کہاں بنایا ہوگا؟''

"اس کے گھر میں ہی بنا ہوگا۔"

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔"آپ کا یہ خیال غلط ہے کمانڈر افغانی! اور اس کے ساتھ ساتھ یہ خیال بھی غلط ہے کہ خیام مانش نے زینب کو بڑی حفاظت اور رازداری سے رکھا ہوا تھا۔ خیام مانش پر آپ جو اندھا اعتماد رکھتے ہیں، وہ درست نہیں ہے۔ یقیناً آپ کے ذہن میں یہ سوال ابھر رہا ہوگا کہ میں نے زینب کا کھوج کیسے لگایا؟"

"کیسے لگایا؟" افغانی نے پوچھا، اس کی حیرانی میں پھر اضافہ ہو رہا تھا۔

میں نے کہا۔"لگتا ہے کہ آپ جنگی معاملوں میں بہت الجھے ہوئے ہیں۔ آپ کو یہ خبر ہی نہیں ہے کہ پچھلے کئی روز سے زینب، خیام مانش کے پاس نہیں ہے۔ اگر وہ آپ سے ایسا کہتا رہا ہے تو جھوٹ بولتا رہا ہے۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے؟" افغانی کی آواز لرز اٹھی۔

"یہ ہوا ہے کمانڈر افغانی! اور اس لیے ہوا ہے کہ آپ کے معتمد خیام مانش نے آپ کے اعتماد کا قتل کیا ہے۔"

کمانڈر افغانی منہ کھولے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے مختصر الفاظ میں اسے وہ سارا واقعہ کہہ سنایا، جب رات کے وقت انیق نے خیام کے ساحلی مکان میں زینب کے چلانے کی آوازیں سنیں اور اس کی مدد کو پہنچا۔ خیام کا سیڑھیوں سے گر کر بے ہوش ہونا، انیق کا زینب کو وہاں سے نکالنا اور محفوظ ٹھکانے پر پہنچانا، میں نے سب کمانڈر افغانی کے گوش گزار کیا۔ اس کے بعد یہ بھی بتایا کہ خیام کس طرح ڈی پیلس میں ہمارے ہتھے چڑھا اور کس طرح ہم نے اسے زبان کھولنے پر مجبور کیا۔

افغانی حیرت سے گنگ سنتا رہا۔ کہیں کہیں اس نے سوال بھی کیا۔ اسے خیام کے ساتھی ہیجڑے کی موت کا علم بھی ہوا۔ میں نے افغانی کو وضاحت سے بتایا کہ کس طرح ان دونوں خواجہ سراؤں نے میرے ساتھی انیق کی جان لینے کی کوشش کی اور کیسے خیام کا اپنا ہی چلایا ہوا چھرا اس کے ساتھی کے سینے میں اتر گیا۔

اس ساری رُوداد نے کمانڈر افغانی کو ہکا بکا کر دیا۔ خواجہ سرا خیام کا یہ روپ اس کے لیے بے حد حیران کن اور تکلیف دہ تھا۔ سب کچھ سن کر بھی اسے یقین نہیں ہو پا رہا تھا۔ میں نے اسے خیام کا مکمل ویڈیو بیان دکھایا۔ وہ کتنی دیر تک سر پکڑے بیٹھا رہا۔

بند کمرے سے باہر بڑی بڑی پگڑیوں والے پہریدار گھوم رہے تھے اور ان کے سائے کھڑکیوں پر لہرا رہے تھے۔

افغانی ایک بار پھر اٹھ کر بے قراری سے نشست گاہ میں ٹہلنے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ سگریٹ کے طویل کش بھی لے رہا تھا۔ میرے سامنے رک کر بولا۔ ''سچ بات یہ ہے برادر شاہ زیب کہ ام پچھلے تین چار روز سے سخت پریشان ہے۔ ابھی دو گھنٹے پہلے بھی ام چھوٹے صاحب ابراہیم کا حالت دیکھ کر آیا ہے۔ وہ مہینوں کا بیمار لگتا ہے...... اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ وہ امارے سامنے اپنی والدہ کے رُوبرو ہاتھ جوڑ رہا تھا۔ ان سے کہہ رہا تھا کہ وہ زینب کی قبر پر جانا چاہتا ہے۔ اس کی والدہ بیگم نورل نے مجھے یہ بھی بتایا کہ کل وہ ابراہیم کو قبرستان لے کر گیا تھا۔ وہاں پر اس نے قبر کھودنا شروع کر دیا، کہنے لگا کہ میں یہاں رہنا چاہتا ہوں...... یہ کہتے ہوئے بیگم نورل زاروقطار رونے لگا تھا۔''

''اس طرح کی باتیں تو میرے کانوں میں بھی پہنچ رہی ہیں کمانڈر...... میرا اپنا اندازہ بھی یہی ہے کہ چھوٹے صاحب اپنی دلہن کو بہت زیادہ چاہنے لگے تھے جن لوگوں نے دلہن کو ان سے دور کرنا چاہا انہیں بالکل اندازہ نہیں تھا کہ نوبت یہاں تک پہنچ جائے گی۔''

''اب ام کو ایک اور ڈر بھی محسوس ہو رہا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ صدمہ کسی صورت چھوٹے صاحب کا جان ہی لے جائے...... اور وہ بھی یہ جانے بغیر ہی دنیا سے سدھار جائے کہ اس کا دلہن ابھی زندہ ہے۔''

''تو کیا آپ چاہتے ہیں کہ...... اس کے زندہ ہونے کے بارے میں بتا دیا جائے؟''

''یہ بہت مشکل ہے برادر...... بلکہ ناممکن ہے۔ یہ مسئلہ اور بھی زیادہ بگڑ جائے گا اور اس کے ساتھ ساتھ کچھ لوگ ام کو بھی اپنا دشمن نمبر ایک سمجھنے لگے گا۔ یہ بہت الجھا ہوا معاملہ ہے۔ ام کو اس کا کوئی درمیانی حل نکالنا ہوگا۔''

''یعنی کوئی ایسا طریقہ جس سے ابراہیم کو پتا چل جائے کہ زینب ابھی زندہ ہے لیکن اس کا پتا صرف اسے چلے کسی اور کو نہیں۔''

''برادر! تم بہت جلد بات کی تہ تک پہنچ گیا ہے۔ امارے ذہن میں کچھ ایسا ہی سوچ آ رہا ہے۔ جس طرح کا حالت ابراہیم کا ہے، ام کو بہت زیادہ دیر بھی نہیں کرنا چاہیے۔ بس ایک دو دن کے اندر اس طرح کا کام ہو جانا چاہیے۔''

''زینب کے بارے میں اب آپ کا کیا حکم ہے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ ''سچی بات ہے، ام اس کے بارے میں تم کو کوئی ہدایت دیتے ہوئے شرمندگی محسوس کر رہا ہے۔ تم نے اس کو ایک ایسے چنگل سے نکالا ہے جس میں وہ اماری وجہ سے پھنسا۔ امارا خیال ہے کہ ابھی وہ تمہارے پاس ہی رہے تو بہتر ہے۔ ام ابھی سوچتا ہے کہ اس

کے لیے زیادہ بہتر جگہ کون سا ہوسکتا ہے۔ ویسے وہ ٹھیک تو ہے نا؟‘‘

میں نے اس حوالے سے کمانڈر افغانی کو پوری تسلی دی......اور پوچھا کہ اس نے اس بارے میں بیگم نورل کو کیا بتایا ہے؟

وہ بولا۔ ’’ام نے وہی بتایا جو ام کو مجبوری کے تحت بتانا تھا۔ ام نے کہا کہ اماری ذرا سی غفلت کا فائدہ اٹھا کر زینب امارے گھر سے نکل گیا اور بارڈر کی طرف جا کر گولا باری کا شکار ہوا۔ یہ سب کچھ بیگم کو بتانا بہت مشکل تھا مگر ام کو بتانا پڑا......‘‘

میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ’’اس خیام مانش کا اب کیا کرنا ہے؟‘‘

خیام کا نام سن کر افغانی کے چہرے پر درشتگی بکھر گئی (وہ اب اس کا پورا ویڈیو بیان دیکھ چکا تھا) وہ سخت لہجے میں بولا۔ ’’وہ اس حد تک گرا ہوا نکلے گا......ام کو ہرگز توقع نہیں تھا۔ اچھا ہوتا وہ بھی اپنے ساتھی کی طرح مر گیا ہوتا۔ ام ابھی اس کا انتظام کرتا ہے۔ اسے ایسی جگہ ڈالے گا جہاں برسوں تک پڑا سڑتا رہے گا۔‘‘

’’افغانی صاحب کہیں ایسا تو نہیں کہ خیام کے کسی اور ساتھی کو بھی اصل صورتِ حال کا علم ہو......؟‘‘

’’ابھی ام نے اس کا جو بیان دیکھا ہے، اس سے تو ایسا نہیں لگتا۔ پھر بھی، تم واپس جاؤ تو اس ’’کاپڑ‘‘ کے بچے سے پوچھ گچھ کر کے دیکھ لو۔ اگر ایسا کوئی بات ہوا تو ام بندوبست کر لے گا۔ بڑی اچھی طرح کر لے گا۔‘‘

کمانڈر افغانی سے یہ طویل ہنگامہ خیز نشست ختم ہوئی تو میں تیزی سے واپس انیکسی کی طرف روانہ ہو گیا۔ میرے باہر نکلنے سے پہلے افغانی نے میرا پستول مجھے واپس کر دیا تھا۔ کمانڈر افغانی کے ساتھ ہونے والی اس طویل گفتگو میں کہیں آقا جان کا نام نہیں آیا تھا لیکن پسِ پردہ آقا جان کا نام اس گفتگو میں موجود تھا۔ مجھے ایک سو ایک فیصد یقین تھا کہ وہ آقا جان ہی ہے جس نے کمانڈر افغانی کو اپنا ارادہ بدلنے پر مجبور کیا۔ اس کی سفا کی ہر شبہے سے بالاتر تھی۔ اسی سفاک نے کمانڈر افغانی کو حکم دیا تھا کہ زینب کو ہمیشہ کے لیے ہز ہائی نس ابراہیم کے راستے سے ہٹا دیا جائے۔

○......❖......○

میں انیکسی پہنچا تو انیق دروازے پر ہی کھڑا میرا انتظار کر رہا تھا، اس نے کاٹرائے کی پینٹ پر ہاف سلیو شرٹ پہن رکھی تھی۔ آج شیو وغیرہ بھی بنائی ہوئی تھی۔ جب بوٹ پہنتا تھا تو قد مناسب ہی لگنے لگتا تھا۔ تھوڑی سی رعایت کے ساتھ اسے ہینڈسم نوجوان کہا جا سکتا تھا لیکن

جب چہرے پر گاؤدی پن طاری کر لیتا تھا، تو شخصیت کا تاثر ماند پڑ جاتا تھا۔ کہتا تھا کہ اسے آج تک کسی لڑکی نے لفٹ نہیں کرائی، حالانکہ میں جانتا تھا، وہ لڑکیوں سے خود دور بھاگتا ہے۔

مجھے دیکھتے ہی بولا۔ ''آپ کہاں غائب ہو جاتے ہیں۔ یہ لڑکی رو رو کر میری جان لے لے گی۔ ایسے لگتا ہے کہ میں ایک والدہ ہوں اور ایک انتہائی مشکل بچہ میرے سپرد کر دیا گیا ہے۔''

''کیوں اب کیا ہوا ہے؟''

''اندر آ کر دیکھ لیں۔'' وہ بولا۔

میں اس کے ساتھ کمرے میں پہنچا اور پھر بغلی دروازہ کھول کر زینب والے کمرے میں پہنچ گیا۔ وہ جائے نماز پر لیٹی ہوئی تھی اور روتی جا رہی تھی۔ میں اس کے پاس بیٹھ گیا...... اور تسلی دینے لگا وہ بولی۔ ''بھائی جی! میرے دل کو کچھ ہو رہا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ بڑی سخت مصیبت میں ہیں۔ مجھے بلا رہے ہیں۔ آپ لوگ مجھے بتاتے کیوں نہیں۔ وہ اب کیسے ہیں؟ آپ لوگ مجھے ماں جی سے کیوں نہیں ملاتے؟''

میں نے کہا۔ ''زینب! ہمیں غافل اور بے فکر نہ سمجھو۔ میں ابھی تمہارے ہی سلسلے میں نکلا ہوا تھا۔ حوصلہ رکھو۔ بہت کچھ اچھا ہونے جا رہا ہے۔ بس تم دعا کرو۔''

''کب تک اچھا ہوگا؟ کیسے ہوگا؟ عزت مآب مجھے کبھی معاف نہیں کریں گے۔ وہ ان کو (ابراہیم کو) مار دیں گے یا خود کو کچھ کر لیں گے...... یا پھر میری جان لے لیں گے...... آپ مجھے ماں جی سے ملا دیں...... اگر نہیں تو مجھے ویسے ہی جان سے مار دیں، میں اپنا خون آپ دونوں کو معاف کرتی ہوں۔''

میں اس کی صورت دیکھنے لگا۔ رو رو کر جیسے اس کے جسم کا سارا پانی نچڑ گیا تھا۔ اس کے نرم ہونٹ خشک اور خوب صورت رخسار کھنڈر دکھائی دینے لگے تھے۔ وہ یہاں سے بہت دور...... چاند گڑھی میں مولوی فدا مرحوم کے جگر کا ٹکڑا تھی۔ چودھری عالمگیر جیسے زر پرستوں نے دولت کے لالچ میں اسے برباد کر دیا تھا اور وہ باقاعدہ فروخت ہو کر اپنے ملک سے ہزاروں میل دور یہاں آ گئی تھی۔ بس ایک بازو کے آسرے پر...... اور یہ بازو اس کے شوہر کا تھا مگر یہاں اس سے یہ بازو بھی چھن گیا تھا۔ ہاں، باپ کی دلاری سے پہلے باپ چھنا، پھر اپنا آنگن چھنا، پھر اپنے چھنے اور اب اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ ایک ننھی بچی کی طرح خود کو اپنے ہی بازوؤں میں سمیٹے، ڈری سہمی اس گوشے میں بیٹھی تھی۔ میں نے اسے دیکھا اور

ایک بار پھر دل ہی دل میں قسم کھائی کہ میں ہر حد تک اس کا ساتھ دوں گا۔

اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ کچھ دیر پہلے کمانڈر افغانی کی زبانی مجھے معلوم ہوا تھا کہ چھوٹے صاحب ابراہیم کی ضد سے مجبور ہو کر اس کے اہلِ خانہ اسے قبرستان میں زینب کی ''جھوٹی قبر'' پر لے گئے تھے۔ اب وہ پھر وہیں جانے کے لیے تڑپ رہا تھا۔ میں سوچنے لگا کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ ابراہیم کو زینب کے زندہ ہونے کی خبر دی جائے اور اس کا کوئی ٹھوس ثبوت بھی اسے فراہم کر دیا جائے...... تاکہ وہ خود کو سنبھال سکے۔ میں اس حوالے سے مختلف طریقوں کے بارے میں سوچتا رہا۔ زینب کو لے کر ڈی پیلس کے رہائشی حصے میں جانے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ نہ ہی ابراہیم کو بیماری کی حالت میں رہائشی حصے سے باہر لایا جا سکتا تھا۔ مزید برآں کچھ بھی کرنے سے پہلے ضروری تھا کہ ابراہیم کو مکمل رازداری کا پابند کیا جاتا، کیا اس کی حالت اس قابل تھی کہ اس سے بات کر کے اس سے کوئی وعدہ وعید لیا جا سکتا؟ اس طرح کے کئی سوالات تھے مگر بقول کمانڈر افغانی یہ اندیشہ بھی موجود تھا کہ کہیں ابراہیم مایوسی کی انتہا کو چھو کر اپنی زندگی سے ہی دور نہ ہو جائے...... اور اس طرح کا کوئی واقعہ کسی بھی وقت رُونما ہو سکتا تھا۔

میرا ذہن مسلسل آقا جان پر لعنتیں ارسال کر رہا تھا۔ وہ ہر موقع پر ایک بدترین روپ میں سامنے آتا تھا اور اس خبیث کی ''گڈ لک'' ایسی تھی کہ وہ کسی موقع پر بھی موردِ الزام نہیں ٹھہرتا تھا...... یا یوں کہہ لیں کہ اسے موردِ الزام ٹھہرایا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ اب بھی صورتِ حال کچھ ایسی ہی تھی۔ اس نے کمانڈر افغانی کو مجبور کیا تھا کہ وہ زینب کو پاکستان پہنچانے کے بجائے قتل کر دے۔ تاکہ یہ ٹنٹا ہمیشہ کے لیے ختم ہو مگر اب اس کے لیے اگر آقا جان کا گریبان پکڑا جاتا تو کمانڈر افغانی اور اس کے قریبی ساتھی اس سازش میں ملوث ٹھہرتے۔ عین جنگ کی حالت میں اس طرح کی اندرونی ہنگامہ خیزی کسی طور مناسب نہیں تھی۔

شام ہو چکی تھی۔ آج نیوسٹی کی طرف سے جوابی فضائی حملے کا شدید خطرہ تھا۔ پورے شہر میں بلیک آؤٹ تھا اور ہائی الرٹ بھی۔ میں کسی بھی طرح ابراہیم سے ملنا چاہتا تھا۔ میں نے بیگم نورل اور حلمی سے رابطے کی بہت کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ میں بغیر اطلاع کے ہی ڈی پیلس کے رہائشی حصے کی طرف چل دیا۔ انیق نے حسبِ معمول میرا راستہ روکا۔ ''کہاں جا رہے ہیں؟''

''تم میری بیوی نہیں ہو جو اس طرح انکوائری کرتی ہو۔''

''آپ بھی تو شوہر نہیں جو اس طرح چھپاتے ہیں۔''

''ضروری کام ہے، آکر بتاؤں گا۔''

وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ ''جہاں بھی جا رہے ہیں۔ سجاول بھائی جان کے سلسلے میں کوئی اچھی اطلاع لے کر آئیں۔ میرا تو اب دل بیٹھنے لگا ہے۔''

''اور تمہارے نزدیک اچھی اطلاع یہی ہے نا کہ اس کی موت کی تصدیق ہو جائے۔''

وہ اپنے گال پیٹنے لگا۔ ''توبہ توبہ، آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ میں نے تو اپنا کہا سنا انہیں معاف کر دیا ہے، ہر وقت ان کی بخشش ...... مم ...... میرا مطلب ہے خیریت کی دعائیں کرتا رہتا ہوں۔''

''اور وہ بددعا بھی واپس لوٹا جو ہر وقت اس کے لیے کرتے تھے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ تمہارے چلے شلے بھی اسی سلسلے میں تھے۔''

''کل کلاں آپ نے مجھ پر یہ الزام بھی لگا دینا ہے کہ سجاول بھائی کو غائب بھی دراصل میں نے ہی کروایا ہے۔ کوئی بات نہیں اللہ انصاف کرنے والا ہے۔ کل ہم کو بھی مرنا ہے۔ سجاول بھائی سے ملاقات ہوگی تو سب کچھ کھل جائے گا۔'' انیق نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس بھری اور آنکھوں میں آنسو بھر لایا۔ غضب کا اداکار تھا۔ اداس لہجے میں بولا۔ ''ایسے ہی کسی موقع کے لیے پہلوان حشمت راہی نے کیا خوب قطعہ کہا ہوا ہے

ہم مظلوم ہو کے بھی ظالم ٹھہرائے جاتے ہیں
بات بات پر ان کی محفل سے اٹھائے جاتے ہیں
ہمارے سامنے ہی وہ کرتے ہیں رقیب پر لطف و کرم
اس طرح سے دن رات وہ ہم کو سڑائے جاتے ہیں

دیکھئے کہ سڑائے جانا یعنی جلائے جانا یہاں کتنی خوب صورتی سے استعمال کیا ہے پہلوان جی نے ...... اس ایک لفظ سے ...... بلکہ یہ دو لفظ ہیں ''سڑائے جانا'' ...... ان سے کتنی طاقت پیدا ہوگئی ہے ان شعروں میں۔''

''میرے اندر بھی کافی طاقت پیدا ہوگئی ہے اور یہ طاقت میرے تھپڑ میں بھی آئے گی۔ لہٰذا بکواس نہ کرو۔ حالات ایسے نہیں کہ تمہارے اس مسخرے پن کو انجوائے کیا جا سکے۔''

''حالات سے مطلب یہ کہ سجاول صاحب واقعی ......''

''نہیں، سجاول تو ان شاءاللہ زندہ واپس آئے گا اور تمہارے سینے پر مونگ بھی دلے گا لیکن ابھی میں ابراہیم کی بات کر رہا ہوں۔''

میں نے انیق کو زینب کے بارے میں ضروری ہدایات دیں اور ڈی پیلس کے رہائشی

حصے کی طرف چل پڑا۔ (ویسے میں جانتا تھا کہ اندر سے انیق بھی اب سجاول کے لیے پریشان ہے)

حلمی کی اجازت سے میں ڈی پیلس کے پرائیویٹ پورشن تک پہنچ گیا مگر ابراہیم کی قیام گاہ کی طرف جانا دشوار محسوس ہو رہا تھا۔ یہاں کڑا پہرا تھا۔ ابراہیم کے ذاتی ملازمین کے چہرے ستے ہوئے تھے۔ ایک غمزدہ سا ماحول تھا۔ تب میری نظر سنبل پر پڑی۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا اور میری طرف چلی آئی۔ عزت مآب کی چہیتی رکھیل ہونے کی وجہ سے اس کی نقل و حرکت پر زیادہ پابندیاں نہیں تھیں۔ میرے پوچھنے سے پہلے ہی اس نے بتایا۔ ''ابراہیم کی حالت اچھی نہیں۔ صبح سے ڈاکٹر بار بار اس کے کمرے میں آ جا رہے تھے۔ دوپہر کے بعد وہ سو گیا تھا۔ ابھی جاگا نہیں، اس کے کچھ ٹیسٹ وغیرہ بھی ہوئے ہیں۔ زینب کی موت کا بہت زیادہ صدمہ لے لیا ہے اس نے۔''

ابھی ہم بات ہی کر رہے تھے کہ کسی اندرونی حصے سے بار بار دروازہ کھٹکھٹانے اور بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ سنبل کچھ دیر سنتی رہی پھر بولی۔ ''آپ ادھر ہی ٹھہریں، میں ابھی آتی ہوں۔''

وہ چلی گئی۔ میں وہیں بلند و بالا چھت والی راہداری میں کھڑا رہا۔ میرے اندازے کے مطابق آوازیں ابراہیم کے بیڈروم کی طرف سے آ رہی تھیں۔ دستک کی آواز بار بار ابھرتی تھی۔ کسی کے بولنے یا پکارنے کی آواز بھی آتی تھی۔ میری دھڑکن بڑھ گئی۔ دو تین منٹ بعد سنبل واپس آئی۔ اس کا سفید مینا اس کی گود میں تھا۔ سنبل کا رنگ بدلا ہوا تھا۔ ہانپی ہوئی آواز میں بولی۔ ''ابراہیم کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند ہے۔ بڑی بیگم بار بار دستک دے رہی ہیں۔ دروازہ نہیں کھل رہا۔''

اسی دوران میں دستک کی آواز بہت بلند ہو گئی۔ ساتھ ہی رونے دھونے کی صدائیں بھی آنے لگیں۔ محافظوں میں بھی افراتفری نظر آئی۔ میں سنبل کے ساتھ اندر کو لپکا۔ قالین پوش راہداری میں تیزی سے چلتے ہوئے ہم ابراہیم کے عظیم الشان بیڈروم کے سامنے پہنچ گئے۔ یہاں کہرام سا مچا ہوا تھا۔ بیگم نورل دہائی دے رہی تھیں۔ وہ اپنے لختِ جگر کو دروازہ کھولنے کا کہہ رہی تھیں۔ کئی دیگر افراد کے علاوہ سفید کوٹ والے دو ڈاکٹر صاحبان بھی یہاں موجود تھے۔ سب کے رنگ اڑے ہوئے تھے۔

اتنے میں عزت مآب ریان فردوس آتا دکھائی دیا۔ حاضرین مؤدب ہو گئے۔ وہ دو محافظوں کے ہمراہ تیزی سے توند ہلاتا چلا آ رہا تھا۔ اس نے آتے ساتھ ہی ملائی زبان میں

کڑک کر کچھ کہا۔ جو کچھ میری سمجھ میں آیا اس کے مطابق وہ بیگم نورل کو ڈانٹ رہا تھا کہ دروازے کو اس قابل کیوں رہنے دیا گیا کہ اسے اندر سے بولٹ کیا جا سکے۔

جواب میں بیگم نورل نے بھی چلا کر کہا۔ "یہ سب کچھ آپ کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ آپ کی وجہ سے۔"

ریان فردوس دیگر لوگوں کی پروا کیے بغیر گرجا۔ "تو پھر ٹھیک ہے، مر جانے دو۔ مرتا ہے تو مر جائے۔" بات حرف بحرف میری سمجھ میں نہیں آئی مگر مطلب یہی تھا۔ اس نے ایک فرشی گلدان کو زور سے ٹھوکر ماری اور اپنا زرنگار چغا لہراتا ہوا واپس مڑا۔

کچھ دور جا کر وہ پھر رک گیا۔ جیسے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہاں اپنا غیظ و غضب دکھائے یا صورتِ حال کو سنبھالنے کے لیے کچھ کرے۔ اتنے میں آقا جان بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس نے ملازمین کو حکم دیا کہ دروازہ توڑ دیا جائے۔ ایک گارڈ نے M16 رائفل کے وزنی دستے سے دروازے پر زوردار ضربیں لگانا شروع کیں۔

میں یہاں ابراہیم کو سنبھالنے کے لیے آیا تھا۔ اسے یہ بتانے کے لیے آیا تھا کہ وہ جس کے غم میں دن رات تڑپ رہا ہے وہ ابھی اس کی دنیا سے دور نہیں گئی ہے...... لیکن یہاں کچھ اور ہی منظر دکھائی دے رہا تھا۔

دروازہ ٹوٹ گیا۔ لوگ بھرا مار کر اندر داخل ہوئے۔ بیگم نورل سب سے آگے تھیں۔ جہازی سائز کے لگژری بیڈ پر ابراہیم بے سدھ پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اس کے چہرے کا رنگ "زندہ لوگوں" والا نہیں تھا۔ گہرا پیلا جس میں ہلکی سی سانولاہٹ آ گئی تھی۔ رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈیاں مزید گہری زردی کی زد میں تھیں۔

"ابراہیم...... ابراہیم......" بیگم نورل دردناک انداز میں چلائیں...... اور اسے چھونے کی کوشش میں اس کے بیڈ کے قریب قالین پر گر کر بے ہوش ہو گئیں۔ ایک ڈاکٹر ان کی طرف لپکا، دوسرا ابراہیم کی طرف۔ اس نے ابراہیم کی پلکیں اٹھا کر دیکھیں۔ اسٹیتھیس اسکوپ سے دھڑکن چیک کی۔ اس کے چہرے پر مایوسی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اسی دوران میں ایک سینئر ڈاکٹر دو نرسز کے ساتھ بھاگم بھاگ وہاں پہنچ گیا۔ اس نے بھی نوعمر ابراہیم کے وائٹل سائنز چیک کیے۔ "نو پلز" اس کی مدھم آواز بجلی بن کر سماعتوں پر کوندی۔

"رش کم کیا جائے، پلیز باہر جائیے۔" دوسرا ڈاکٹر انگلش میں پکار کر بولا۔

سینئر ڈاکٹر نے اپنے ہاتھوں کے ذریعے بے جان ابراہیم کے سینے پر مخصوص انداز میں بار بار دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ اسے طبی اصطلاح میں "سی پی آر" یا سینے کو پمپ کرنا کہتے ہیں۔

میں نے دیکھا، ابراہیم کے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر میڈیسن کی ایک شیشی کھلی پڑی تھی۔ یہ ایک SEDUCTIE تھی۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ ڈپریشن اور شدید گھبراہٹ کو کم کرنے کے لیے، ابراہیم نے دروازہ اندر سے بند کیا اور یہ دوا زیادہ مقدار میں لے کر لیٹ گیا۔

اسٹریچر پہنچ چکا تھا۔ ابراہیم کے ہلکے پھلکے جسم کو اسٹریچر پر ڈالا گیا اور ان قریبی کمروں کی طرف لے جایا گیا جنہیں باقاعدہ ایک اسپتال کی شکل دی گئی تھی۔ بیگم نورل کو ابراہیم کے بستر پر ہی لٹا دیا گیا تھا اور انہیں ہوش میں لانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

ہمیں باہر نکل جانے کی ہدایت کی گئی۔ عزت مآبِ ریان فردوس کے سوا سب باہر نکل آئے۔

یہ بڑی تشویش ناک گھڑیاں تھیں...... آخر اندر سے اطلاع آئی کہ چھوٹے صاحب ابراہیم میں زندگی کے آثار موجود ہیں اور ڈاکٹرز ان کی جان بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ امید کی کرن تھی۔ ابراہیم کے بھائی کمال احمد نے سسکنا شروع کر دیا۔ آقا جان نے آگے بڑھ کر بڑی ہمدردی سے اسے اپنے ساتھ لگایا اور اس کو پچکارنے لگا۔ اس کو دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ یہاں جو بھی آفت مچی ہے اسی شخص کی مچائی ہوئی ہے...... قریباً ایک گھنٹے کے بعد ابراہیم کی طبیعت سنبھل گئی۔ بیگم نورل بھی ہوش میں آ چکی تھیں اور بار بار بیٹے کے پاس جانا چاہ رہی تھیں مگر ڈاکٹرز کی ہدایت تھی کہ ابھی کوئی اس سے نہیں ملے گا۔

O......❖......O

رات کو فضائی حملے یا زمین سے ہیوی شیلنگ کا ڈر تھا...... لیکن یہ رات خیریت سے گزر گئی۔ بارڈر کی طرف سے کبھی کبھی چھوٹے ہتھیاروں کی فائرنگ ہوتی رہی۔ ہر کسی کی زبان پر ''برج کلب'' کی تباہی کا چرچا تھا۔ سنا جا رہا تھا کہ ملبے سے ابھی تک دیسی اور ولایتی افسروں کی اکا دکا لاشیں مل رہی ہیں۔

اگلے روز دوپہر کے فوراً بعد میں بیگم نورل کی اجازت سے ابراہیم سے ملنے پہنچا۔ وہ ابھی تک اسی پورشن میں تھا جسے اس کے لیے اسپتال کا درجہ دیا گیا تھا۔ ایک طرح سے وہ اب آئی سی یو سے نکل آیا تھا۔ ایک کمرے میں جہاں ہر طرح کی طبی سہولتیں موجود تھیں، ابراہیم سفید براق بستر پر بے حرکت لیٹا تھا۔ وہ تکیوں کے سہارے نیم دراز تھا اور شاید ابھی تھوڑی دیر پہلے اسے زبردستی چند لقمے کھلائے گئے تھے۔ (اسے کچھ نہ کچھ کھلایا جانا اس لیے بھی ضروری تھا کہ اسے اور کمال احمد کو روزانہ خاص زہر آمیز ڈوز دی جاتی تھی) اس کی آنکھوں کے گرد حلقے اور چہرے پر ویرانی تھی۔ اس وقت بھی وہ کسی سکون بخش دوا کے زیر اثر ہی دکھائی

دیتا تھا۔

مجھے دیکھ کر وہ جیسے اشک بار ہو گیا۔ میں نے قریب بیٹھ کر اس کا استخوانی ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تو وہ سسک پڑا۔ میں اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرنے لگا اور تسلی دینے لگا۔ ''شاہ زیب بھائی! وہ چلی گئی۔ مجھے ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئی۔ اب میں بھی نہیں رہوں گا۔ میں کس کے لیے رہوں گا؟'' وہ کربناک آواز میں بولا۔

اسے کھانسی کا شدید دورہ پڑا۔ ڈاکٹر بھاگا ہوا آیا۔ اسے پانی پلایا، سینے پر ہاتھ پھیرا۔ وہ قدرے پُرسکون ہوا تو سفید فام ڈاکٹر نے اشارے سے مجھے کہا کہ ابراہیم کو زیادہ بات نہ کرنے دی جائے۔

آنسو لگاتار ابراہیم کے دبلے پتلے چہرے پر بہہ رہے تھے۔ میں نے تیز نظروں سے اس کمرے کا جائزہ لیا۔ کوئی سی سی ٹی وی کیمرا یا آڈیو ڈیوائس دکھائی نہیں دیا۔ میں ابراہیم سے تسلی تشفی کی باتیں کرنے لگا...... تھوڑی دیر بعد پریشان حال بیگم نورل نے اندر جھانکا اور ابراہیم کو قدرے بہتر حالت میں دیکھ کر واپس چلی گئیں۔ میں نے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔

''ابراہیم! اگر میں آپ سے کہوں کہ میرے پاس آپ کے لیے ایک اچھی خبر ہے تو پھر؟''

''میرے لیے اب کوئی اچھی خبر نہیں ہو سکتی...... میں ایک زندہ لاش ہوں۔ آپ لوگ جو مرضی کر لیں، بہت جلد آپ لوگوں نے میرا مرا ہوا منہ دیکھنا ہے۔''

''ایسی مایوسی کی باتیں کیوں کرتے ہیں۔ آپ تو خدا پر اتنا یقین رکھتے ہیں۔ قدرت کے لیے کیا ممکن نہیں ہے۔''

وہ دلدوز آواز میں بولا۔ ''قدرت بھی تو اپنے بنائے ہوئے اصولوں کی پابند ہوتی ہے۔ مُردوں کو زندہ کون کرتا ہے؟''

''مگر جو مرے نہ ہوں...... جن کو بس مردہ ظاہر کر دیا گیا ہو، جو حقیقت میں زندہ ہوں؟''

وہ خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ بات کو سمجھ نہیں پایا، کہنے لگا۔ ''بے شک اسے شہادت کی موت ملی ہے اور شہید زندہ ہوتے ہیں لیکن وہ مجھ سے بہت دور چلی گئی ہے اور میں یہ صدمہ جھیلنے کے قابل نہیں ہوں۔ یہ مجھ سے ہو ہی نہیں سکتا۔'' اس کا لہجہ واقعی زندہ لاش کا سا تھا۔

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ابراہیم! میں ایک اور بات کہہ رہا ہوں۔ مجھے زینب کی موت میں شک ہے......''

وہ سکتہ زدہ سا میری جانب دیکھنے لگا۔ یوں محسوس ہوا جیسے اس کے سینے کی گہرائی میں دبا ہوا کوئی موہوم سا شبہ ایک دم جوان ہو کر اس کی آنکھوں میں آن وارد ہوا ہو۔ چند لمحوں بعد اس کے چہرے پر تلاطم سا نظر آنے لگا۔ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ''آ...... آپ کیا کہہ رہے ہیں شاہ زیب؟''

''وہی جو آپ سن رہے ہو ابراہیم...... مجھے اس میں شک ہے۔''

''کس بنیاد پر شک ہے؟ کیا...... آپ نے...... کچھ دیکھا ہے؟'' اس کی آواز جذبات کی شدت سے ٹوٹ رہی تھی۔ چہرے پر کئی رنگ آجا رہے تھے۔

میں نے کہا۔ ''ابراہیم! سب سے پہلے آپ کو مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا۔ اگر میں اس حوالے سے اپنے طور پر کوئی چھان بین کروں تو...... یہ بات صرف اور صرف میرے اور آپ کے درمیان رہے۔''

''کس طرح کی چھان بین؟''

''یہی کہ زینب کی لاش، واقعی زینب کی تھی؟''

وہ سرتاپا کانپ گیا۔ دل کی گہرائیوں میں ایک کرن کی طرح چمکنے والا شک اب اس کی آنکھوں میں آس کا دریا بن کر لشکارے مارنے لگا تھا۔ وہ ہانپ سا گیا۔ ''شاہ زیب! مم...... میں وعدہ کرتا ہوں، میں یہ بات صرف اپنے تک رکھوں گا......''

''اور یہ وعدہ بھی کریں کہ خود کو سنبھال کر رکھیں گے۔''

''میں کرتا ہوں، مگر مجھے بتائیں...... آپ کس بنیاد پر یہ شک کر رہے ہیں؟ پلیز...... پلیز...... میں کوئی مزید صدمہ سہنے کے قابل نہیں ہوں۔ مجھے کوئی ایسی امید نہ دلائیے گا جو پوری نہ ہو سکے...... مجھے نہ دلائیے گا۔''

''میں کوئی امید نہیں دلا رہا ابراہیم...... میں تو صرف کچھ شبہات دور کرنا چاہ رہا ہوں۔ مجھے ایک بڑے ذمے دار شخص نے کچھ بتایا ہے۔ میں اس بارے میں تصدیق کر کے کل آپ کو کچھ بتاؤں گا۔''

ابراہیم کی حالت پتلی ہونے لگی۔ بہرحال وہ کسی نہ کسی طور خود کو سنبھالے ہوئے تھا۔ یہ میں بھی جانتا تھا کہ اتنی بڑی خوش خبری اسے ایک دم سنانے کے نتیجے خراب نکل سکتے ہیں۔ میں نے ابھی اسے اس خوش خبری کے لیے تیار کیا تھا۔

میں واپس انیکسی آیا تو حسبِ معمول انیق بے چینی سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے مجھے یہ اطلاع دی کہ خیام یہاں سے جا چکا ہے اور ساتھ ہی ڈیپ فریزر میں سے اس کے

ساتھی کی لاش بھی اٹھائی جا چکی ہے۔ اس نے بتایا کہ تھوڑی دیر پہلے افغانی صاحب خود یہاں تشریف لائے تھے اور انہوں نے کہا تھا کہ ابھی وہ اپنے تین خاص بندوں کو یہاں بھیجیں گے اور وہ دونوں ہیجڑوں کو یہاں سے لے جائیں گے۔ پندرہ بیس منٹ پہلے وہ تینوں افراد آئے۔ ان کے پاس مضبوط ریگ زین کے دو بڑے تھیلے تھے۔ ان میں سے ایک شخص نے آتے ساتھ ہی خیام مانش کو انجکشن دے کر نیم بے ہوش کر دیا۔ پھر دونوں کو تھیلوں میں ڈال کر باہر کھڑی "فور وہیلر" میں لوڈ کر دیا۔

"چلو، خس کم جہاں پاک۔" میں نے کہا۔ "اب خیام جانے اور کمانڈر افغانی جانے۔"

ہم نے تھوڑی دیر اس بارے میں گفتگو کی پھر اصل موضوع پر آ گئے بالفاظ دیگر، ہم سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ یہ بات تو طے تھی کہ ابراہیم کو جلد از جلد زینب والی خوش خبری سنانا پڑے گی ورنہ اس کی وحشت اسے کسی گڑھے میں بھی دھکیل سکتی تھی مگر زبانی کلامی بات تو وہ ماننے والا نہیں تھا۔ تو کیا اسے فون وغیرہ کے ذریعے زینب کی آواز سنا دی جائے؟

میرے اس خیال کو انیق نے فوراً رد کیا، وہ بولا۔ "مجھے یقین ہے، وہ کسی صورت ابراہیم سے ملنے یا اسے کال کرنے پر رضامند نہیں ہو گی۔ وہ بڑی بیگم کے سامنے کوئی "بڑی قسم" کھا کر آئی ہے کہ ابراہیم سے رابطہ نہیں کرے گی اور وہ اپنے عہد سے پھرنے والی نہیں ہے۔"

"تو پھر؟"

ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ابراہیم کو کسی طرح انیکسی میں لایا جائے اور اس کمرے کی کسی کھڑکی وغیرہ سے اسے زینب کی جھلک دکھا دی جائے۔" انیق نے کہا۔

"نہیں، یہ گڑبڑ والا معاملہ ہے۔ ابراہیم کی ذہنی کیفیت کچھ ایسی ہے کہ وہ زینب کو دیکھ کر حواس کھو سکتا ہے۔ وہ اس سے ملنے کے لیے ہنگامہ مچا سکتا ہے اور یہ ان دونوں کے لیے بہت برا ہو گا۔ ایک طوفان جو تھما ہوا ہے پھر سے پوری شدت سے اٹھ کھڑا ہو گا۔ اس مرتبہ زینب کی جان سچ مچ بھی جا سکتی ہے۔"

"آپ کے ذہن میں کیا آتا ہے؟"

"سیل فون پر زینب کا ایک ویڈیو ریکارڈ کیا جائے اور ابراہیم کو دکھا دیا جائے۔"

"آپ کا مطلب ہے وہ ابراہیم کے لیے اپنا بیان ریکارڈ کرائے گی؟"

"کوئی ضروری نہیں۔ بس تم یا میں زینب سے چند باتیں کرتے ہیں اور ریکارڈ کر لیتے ہیں۔"

''لیکن......ابراہیم نکتہ نکال سکتا ہے کہ یہ ویڈیو شاید پہلے کا ہے۔''

''اس کا بھی حل ہے۔ یہ سامنے آج کا اخبار پڑا ہے۔ ریکارڈنگ کرتے ہوئے یہ اخبار زینب کے قریب رکھیں گے۔''

انیق نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ اتفاق کر رہا تھا۔

تھوڑی سی سوچ بچار کے بعد ہم نے اس تجویز پر عمل کیا۔ میں پہلے زینب کے پاس گیا۔ اس کے حلیے پر تنقید کی۔ اسے منہ ہاتھ دھونے اور بال سنوارنے کا کہا......وہ منہ ہاتھ دھونے کے لیے واش روم میں گئی تو میں نے اپنا فون ایک الماری کے اوپر اس طرح ''سیٹ'' کر دیا کہ وہ زینب کی ویڈیو بنا سکے اور اسے دکھائی بھی نہ دے۔ میں نے کیمرے کا رخ ایسا رکھا تھا کہ وہ کمرے کے صرف ایک گوشے کو فوکس کر رہا تھا۔ یہ پہچاننا بہت مشکل تھا کہ یہ ویڈیو کس جگہ بنائی گئی ہے۔

کچھ دیر بعد جب زینب باہر آ کر اپنی جگہ پر بیٹھی تو فون کے کیمرے نے ریکارڈنگ شروع کر رکھی تھی۔ کمرے میں تاریکی تھی، صرف مختصر جگہ کو ٹیبل لیمپ کی وجہ سے روشنی مل رہی تھی۔ انگریزی کا تازہ اخبار میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے اس میں سے زینب کو وہ تصویریں دکھائیں جن میں جنگ کی صورتِ حال واضح کی گئی تھی اور جاماجی کے نکتہ نظر سے کچھ اچھی اطلاعات تھیں۔ اخبار میں نے زینب کے قریب ہی رکھ دیا۔ تین چار منٹ کا یہ ویڈیو کلپ ابراہیم کی تشفی کے لیے کافی شافی تھا۔

ابھی میں زینب کے کمرے سے باہر نکلا ہی تھا کہ سیل فون پر ابراہیم کی کال آ گئی۔ وہ بہت دھیمے لہجے میں بول رہا تھا مگر اس کی آواز میں انتہائی مضطرب پکار تھی۔ وہ جاننا چاہ رہا تھا کہ کیا پیش رفت ہوئی ہے۔

میں نے کہا۔ ''ابراہیم! کچھ پیش رفت ہے۔ آپ اچھے کی امید رکھیں اور دعا کریں اس کے ساتھ ساتھ اپنا یہ وعدہ بھی یاد رکھیں کہ جو بھی نتیجہ ہو اسے آپ نے اپنے تک ہی محدود رکھنا ہے......اور خود کو سنبھالنا ہے۔''

''آپ جیسے کہہ رہے ہیں، ویسا ہی ہوگا لیکن پلیز شاہ زیب! مجھے زیادہ دیر انتظار کی سولی پر نہ لٹکائیں جو کچھ بھی ہے...... مجھے جلد آگاہ کریں۔'' وہ یوں ہانپ رہا تھا، جیسے میلوں دوڑ کر آیا ہو۔

اس کی قابلِ رحم حالت تھی۔ میں نے اس کی ڈھارس بندھائی اور اسے ذہنی طور پر بڑی خبر کے لیے تیار کیا۔

میں اس کا دل بہلانے کے لیے اور زینب کی طرف سے اس کا دھیان ہٹانے کے لیے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ میں اس سے اس جزیرے جاماجی کے بارے میں بھی جاننا چاہ رہا تھا۔ یہ بات تو میں جانتا تھا کہ یہ کئی پشتوں سے ریان فردوس کے خاندان کا ملکیتی جزیرہ ہے مگر اس کی علاقائی حیثیت کیا تھی؟

ابراہیم کی باتوں سے پتا چلا کہ قریبی خودمختار ملک کی عملداری یہاں نہ ہونے کے برابر ہے۔ ان لوگوں کا اپنا جھنڈا ہے۔ اب یہ اپنی علیحدہ کرنسی بھی رکھنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ درحقیقت یہ جزیرہ ایک ''مائیکرو اسٹیٹ'' کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ مائیکرو اسٹیٹ ایسی جگہوں کو کہا جاتا ہے جو خودمختار ہوتی ہیں اور ان کے اپنے قوانین ہوتے ہیں۔ یہ مائیکرو نیشن کی حیثیت بھی رکھتا تھا کیونکہ یہاں موجود قریباً ساری آبادی تین چار بڑے خاندانوں کی اولادوں سے ہی بنی تھی۔ امریکی ایجنسی کا یہاں موجود ہونا اس بات کا اشارہ تھا کہ ایجنسی کے ارادے نیک نہیں اور یہ ہمیشہ کی طرح یہاں کے اندرونی جھگڑوں سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔

ابراہیم کو یہ ساری گفتگو بالکل خشک محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا دھیان گھوم پھر کر اپنی دلہن زینب کی طرف ہی جاتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ اس بارے میں جتنی زیادہ بات کرے گا، اتنی ہی اس کی بے قراری اور وحشت بڑھتی جائے گی۔ میں نے اسے پھر تسلی تشفی دی اور اس بات چیت کو اختتام تک پہنچایا۔

تب تک رات کے نو بج چکے تھے۔ شہر میں آج پھر مکمل بلیک آؤٹ تھا۔ سڑکوں پر فوجی گاڑیاں جگہ جگہ کھڑی تھیں اور مورچوں میں گرین فورس کے سپاہی دشمن کی طرف سے کسی بھی جوابی حملے کے لیے چوکس تھے۔ اس وقت ڈی پیلس کے رہائشی حصے میں جانا کسی طور مناسب نہیں تھا۔ میں نے ابراہیم سے ملنے اور اسے زینب کے حوالے سے خوش خبری سنانے کا پروگرام صبح پر رکھا۔

انیق کے کمرے میں سیف بھی موجود تھا۔ وہ دونوں خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ خواجہ سرا خیام اور اس کے مردہ ساتھی کے روانہ ہو جانے کے بعد انیق خود کو کافی ایزی محسوس کر رہا تھا۔ اسی دوران میں کرخت سنگھ بھی وارد ہو گیا۔ وہ کافی عرصے سے جزیرہ جاماجی میں موجود تھا اور گرین فورس میں اس کی حیثیت حوالدار کی تھی۔ سیف کی طرح وہ بھی زبردست قسم کا کھابہ خور تھا۔ عشقیہ پنجابی گانے بھی الاپتا تھا اور پکا پینڈو ہونے پر فخر محسوس کرتا تھا۔

تاش کی بازی شروع ہو گئی۔ انہوں نے مجھے بھی شریک ہونے کو کہا مگر میرا ذہن دیگر

معاملوں میں الجھا ہوا تھا۔ سیف عرف سیفی کا وہ رنگ برنگا سیل فون قریب ہی پڑا تھا جس پر سکھیر اپنڈ کا وال پیپر تھا اور جس کے اندر تاجور کی تصویریں تھیں، ہاں اس سیل فون کی صورت میں وہ مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر تھی لیکن حقیقت میں بہت دور تھی۔ میں چاہتا تو سجاول کے ڈیرے پر اسے ہمیشہ کے لیے اپنی مٹھی میں بند کر سکتا تھا...... مگر جن سے محبت کی جاتی ہے ان کو پابند نہیں کیا جاتا۔ ان کو آزاد کر دیا جاتا ہے۔ اگر وہ آپ کے ہوتے ہیں تو کسی نہ کسی طور کبھی نہ کبھی آپ کے پاس واپس لوٹ آتے ہیں۔ اسے آزاد کرتے وقت شاید میرے دل کی گہرائیوں میں بھی کہیں یہ موہوم خواہش موجود تھی کہ وہ میری تمام تر خامیوں کو نظرانداز کرتے ہوئے...... اور میرے جذبے کی شدت کا اعتراف کرتے ہوئے ایک دن میری طرف پلٹ آئے گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ اس نے وہی کیا تھا جو کہتی تھی۔ اپنے والدین کی منشا کے عین مطابق اس نے اپنے ہی جیسے زمیندار گھرانے کے ایک نوجوان کو شریکِ حیات کے طور پر پسند کر لیا تھا۔

کتنا اچھا ہوتا، مجھے یہ سب کچھ پتا ہی نہ چلتا۔ وہ ہمیشہ میرے حالات سے اور میں اس کے حالات سے بے خبر ہی رہتا۔ میں تاش کی محفل چھوڑ کر اپنے کمرے میں آگیا اور بستر پر لیٹ گیا۔ سیل فون کی بیل ہوئی۔ یہ جاناں تھی۔ آج اس سے ملاقات ہوئے تین چار دن گزر چکے تھے۔ میں نے کال ریسیو کی۔ میرے حوالے سے وہ ہر وقت ''گرمجوش موڈ'' میں رہتی تھی لیکن آج وہ بھی بے حد افسردہ تھی۔ زینب کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا اور اب ابراہیم کے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا وہ جاناں کو بھی بری طرح ''بے قرار'' کر رہا تھا۔ اس نے سسکتے ہوئے کہا۔ ''مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا شاہ زیب کہ وہ ہم میں نہیں ہے۔ وہ گھریلو حالات سے ''اپ سیٹ'' ضرور تھی مگر یہ بالکل نہیں لگتا تھا کہ وہ یوں اچانک گھر چھوڑ جائے گی اور پھر ایسے دردناک حادثے کا شکار ہوگی۔''

ابھی جاناں کی بات جاری ہی تھی کہ ہیلی کاپٹروں کی پھڑ پھڑاہٹ سنائی دی۔ یہ آواز اب ہم بخوبی پہچاننے لگے تھے۔ یہ اپنے ہی ہیلی کاپٹر ''اپاچی'' کی آواز تھی۔ وہ ڈی پیلس کے گرد چکر لگا رہا تھا۔

''شاید دو ہیلی کاپٹر ہیں۔'' جاناں نے کہا۔

''مگر اپنے ہی ہیں۔ پریشانی کی بات نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

ابھی میری بات منہ میں ہی تھی کہ ایک زبردست دھماکے سے قرب و جوار لرز اٹھے۔ سامنے کارنس پر رکھے ہوئے دو بلوری ڈیکوریشن پیس فرش پر گر کر ٹوٹ گئے۔ فون پر جاناں

کے چلانے کی آواز آئی۔ ''یہ کیا ہوا شاہ زیب؟''

اس سے پہلے کہ میں جواب دیتا، ایک اور دھماکا ہوا اور اس کے ساتھ ہی گن شپ ہیلی کاپٹر نے تین چار بڑے برسٹ چلائے۔ ڈی پیلس کے وسیع وعریض احاطے میں کہرام سا مچ گیا۔ یہاں رضا کار دستوں نے کھلی جگہوں پر پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔ وہ براہِ راست فائرنگ کی زد میں آئے۔

میں نے فون بند کیا اور باہر کی طرف لپکا۔ انیق، سیفی اور کرخت سنگھ بھی احاطے کی طرف جا رہے تھے۔ میں دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ گرین فورس کا اپنا ہی بلیک ہاک ہیلی کاپٹر احاطے پر اندھا دھند برسٹ چلاتا ہوا ایک طرف اوجھل ہو گیا۔ ڈی پیلس کے اردگرد کم وبیش آٹھ اینٹی ائر کرافٹ گنیں اور راکٹ لانچرز موجود تھے مگر سب خاموش تھے۔ شاید کوئی بھی یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اپنے ہی ہیلی کاپٹرز کو نشانہ بنائے یا نہیں؟

انیکسی کے مین گیٹ کے عین اوپر ایک بم گرا۔ میں نے گیٹ کے ساتھ کھڑی دو گاڑیوں اور چند افراد کے پرخچے اُڑتے دیکھے۔ قریبی کمروں میں آگ کے بلند شعلے نظر آئے۔

''یہ کیا ہو رہا ہے شاہ زیب بھائی۔'' انیق چلایا۔ ''اپنے ہی ہیلی کاپٹر بم پھینک رہے ہیں۔''

یہ وہی بات ہو رہی تھی کہ گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے۔ ڈی پیلس اور اردگرد کی عمارتوں کا سارا ڈیفنس اور ہائی الرٹ دھرے کا دھرا رہ گیا تھا۔ دفاعی حصار کے اندر سے اپنے ہی دو ہیلی کاپٹر اُڑے تھے اور بارود کی بارش کر دی تھی۔ بیس تیس سیکنڈ کے اندر انہوں نے کم وبیش چھ بم گرائے (ہیلی کاپٹرز کے ذریعے بمباری میں استعمال ہونے والے یہ بڑے سائز کے BARREL BOMB مشین گنوں سے جو برسٹ چلائے گئے وہ اس کے علاوہ تھے۔

اس سے پہلے کہ نیچے سے اینٹی ائیر کرافٹ گنیں فائر کھولتیں یا راکٹ وغیرہ لانچ کیے جاتے، ہیلی کاپٹر اونچی پرواز کرتے ہوئے نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ اس تیز رفتار ترین آپریشن کے دوران میں شاید ایک ''اینٹی ائر کرافٹ'' ہی چند راؤنڈ فائر کر سکی تھی۔

ہر چہرہ سوالیہ نشان تھا۔ یہ کیا ہوا تھا؟ اپنے ہی پائلٹوں نے ڈی پیلس کو نشانہ بنا ڈالا تھا، کیا یہ غداری کا کوئی واقعہ تھا یا پھر ہیلی کاپٹروں میں گرین فورس کے بجائے گرے فورس کے پائلٹ پہنچ گئے تھے؟ یہ دوسرا امکان تو قرینِ قیاس نہیں تھا۔ زیادہ چانس اس امر کا تھا کہ یہ کوئی غداری کا معاملہ ہے۔

کم ازکم ایک بم ضرور ڈی پیلس کے خاص الخاص حصے پر گرا تھا۔ یہ وہی پورشن تھا جہاں شاہی فیملی کی قیام گاہیں تھیں۔ آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ ایسی ہی آگ انیکسی کے سامنے والے حصے میں بھی بھڑک اٹھی تھی۔ ہوا کا رخ انیکسی کے مرکزی حصے کی جانب تھا۔ گاڑھا سیاہ دھواں تیزی سے انیکسی میں بھرتا جا رہا تھا۔ انیق اور سیفی وغیرہ تو احاطے میں موجود زخمیوں کی مدد کو دوڑے، میں انیکسی کی طرف لپکا تاکہ زینب کو دیکھ سکوں۔ اپنے کمرے کا بغلی دروازہ کھول کر میں اس کے کمرے میں پہنچا۔ وہ ایک گوشے میں سمٹی ہوئی تھی اور کھانس کھانس کر بے حال ہو رہی تھی۔

مجھے دیکھتے ہی وہ مجھ سے چمٹ گئی۔ راہداری کی طرف بھاگتے قدموں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ لوگ انیکسی سے نکل رہے تھے۔ ہمیں بھی نکلنا چاہیے تھا لیکن ہمارا نکلنا مشکل تھا۔ زینب اس کمرے سے نکل آتی تو کئی نگاہوں کے سامنے آجاتی اور یہ اس کے لیے بہت برا ہوتا۔ وہ ڈی پیلس والوں کی نگاہوں میں مر چکی تھی اور ابھی اس کا ''مرے رہنا'' ہی اس کی سلامتی کے لیے بہتر تھا۔

''میرا سانس بند ہو رہا ہے۔'' وہ کراہی۔

''حوصلہ رکھو زینب! ابھی سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔'' میں نے اسے تسلی دی۔

فائر بریگیڈ کی گاڑیوں کے سائرن سنائی دینے لگے تھے پھر اندازہ ہوا کہ آگ پر پانی کی بوچھاڑیں شروع ہو گئی ہیں لیکن ہمارے لیے یہ صورتِ حال مزید سنگین ثابت ہوئی۔ گہرا سیاہ دھواں اور گاڑھا ہو گیا۔

میں نے ایک کپڑا بھگو کر اس کی طرف بڑھایا۔ ''اسے منہ پر رکھو، سانس آسانی سے آئے گا۔''

اس نے کھانستے کھانستے کپڑا منہ پر رکھ لیا۔ ایک ایسا ہی کپڑا میں نے بھی منہ پر رکھا مگر صورتِ حال بگڑتی چلی جا رہی تھی۔ ایک موقع پر جی میں آئی کہ میں زینب کو لے کر باہر نکل جاؤں مگر اب یہ کام مشکل ہو گیا تھا۔ آگ راہداری تک پہنچ گئی تھی۔ اس کمرے میں رہ کر تو شاید ہم آگ سے محفوظ رہتے لیکن باہر نکل کر نہیں رہ سکتے تھے۔ میں نے اپنی سانس روک لی تھی۔ میرا ''سی ڈائیونگ'' کا تجربہ کسی حد تک میرے کام آ رہا تھا مگر زینب کی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔ تو کیا وہ یہیں میرے ہاتھوں میں دم توڑ جائے گی؟ میں نے بے حد کرب کے عالم میں سوچا۔ اس نے دو تین الٹیاں کیں۔

اچانک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ میرے والے کمرے میں ایک ماسک موجود

تھا۔ ایسے ماسک کو ''اسموک فلٹر ماسک'' کہا جاتا ہے اور یہ ہنگامی حالات میں استعمال ہوتے ہیں۔ میں اندھوں کی طرح ہاتھ چلاتا اپنے کمرے میں پہنچا اور ''اسموک فلٹر'' لا کر زینب کے چہرے پر چڑھا دیا۔ ایک طرح سے یہ آخری کوشش تھی جو میں اس کے لیے کر سکتا تھا۔ ''اسموک فلٹر'' لگنے سے زینب کی حالت تو کچھ بہتر ہو گئی لیکن میرا سینہ آکسیجن کی طلب میں پھٹنے لگا۔ یوں لگتا تھا کہ چند سیکنڈ مزید گزر گئے تو میں ہوش میں نہ رہ سکوں گا۔

تو کیا میں زینب کو یہیں چھوڑ کر باہر نکلنے کی کوشش کروں؟ کوئی بیڈ شیٹ لپیٹوں اور دوڑ کر آگ میں سے گزرنے کا رسک لوں؟ کیا ابھی وقت ہے کہ ایسا کیا جا سکے؟ مگر اس سے بھی اہم سوال یہ تھا کہ کیا زینب دو تین منٹ بھی یہاں اکیلی گزار سکے گی۔ وہ قیامت کے لمحے تھے...... اور پھر وہ گزر گئے۔ ایک دم ہی دھواں چھٹنا شروع ہو گیا۔ یوں لگا جیسے کسی نے یکایک بہت بڑا اگیزاسٹ فین چلا دیا ہو جو دھوئیں کو کھینچتا چلا جا رہا ہو۔ دراصل فائر فائٹرز نے انیکسی کی دوسری جانب کے کئی دروازے کھول دیئے تھے جن کے سبب ہوا آر پار ہوئی تھی اور دھواں تیزی سے اوجھل ہونے لگا تھا۔

ہمیں جیسے پھر سے زندگی ملی تھی۔ آگ پر بھی تقریباً کنٹرول حاصل کر لیا گیا تھا۔ انیق ہمیں ڈھونڈتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ ہمیں صحیح سلامت دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خوشی امڈ آئی مگر پھر فوراً ہی اس خوشی پر سایہ سا لہرا گیا بولا۔ ''شاہ زیب بھائی، باہر بہت نقصان ہوا ہے۔ کافی لشکری مارے گئے ہیں۔ زخمی ہونے والے بھی بہت ہیں۔ یہ زیادہ تر مقامی لوگ ہی ہیں۔''

''رہائشی حصے کی طرف کیا سچویشن ہے۔ ابراہیم وغیرہ تو خیریت سے ہیں؟''

''جی ہاں، ابھی لاؤڈ اسپیکرز پر ہر ہائی نس قسطینا نے اعلان کیا ہے کہ اندرونی حصے میں خیریت ہے۔ چند افراد معمولی زخمی ہوئے ہیں۔ عزت مآب اور اہلِ خانہ کو کوئی گزند نہیں پہنچی۔''

انیق کو وہاں حیران پریشان زینب کے پاس چھوڑ کر میں باہر نکلا۔ احاطے میں ابھی تک بھگدڑ تھی۔ کم از کم تیس لاشیں اٹھائی جا چکی تھیں۔ زخمیوں کو اسٹریچرز پر لاد لاد کر لے جایا جا رہا تھا۔ ہر طرف یہی چرچا تھا کہ اپنے ہی ہیلی کاپٹرز نے یہ تباہی مچائی ہے۔ میں نے کچھ بڑی عمر کے رضا کاروں کے چہروں پر عجیب سی دہشت دیکھی، شروع میں تو میں اس دہشت کو کوئی خاص معنی نہیں پہنا سکا۔ لیکن پھر مجھ پر انکشاف ہوا کہ کچھ مقامی لوگ انہوں نے واقعے کو رائے زل کی والدہ ہاناوانی کی ''سحر کاری'' سے جوڑ رہے ہیں۔ وہ بڑے یقین سے کہہ رہے تھے کہ یہ وفاداری تبدیل کرنے، یا غداری کا معاملہ نہیں ہے، یہ سراسر عملیات کا نتیجہ ہے جن میں

ہانا وانی برسوں سے نہایت تجربہ کار تصور کی جاتی ہے۔ سننے میں یہ سب کچھ بڑا عجیب اور دقیانوسی لگ رہا تھا مگر جزیرے کے باشندے بڑے یقین سے ایسی باتیں کر رہے تھے۔ ایسی چہ میگوئیاں میں جاباجی میں پہلے بھی کئی مرتبہ سن چکا تھا۔

رات کا زیادہ تر حصہ بے قراری اور پریشانی میں ہی گزرا۔ خون کے عطیات کی اپیل کی جارہی تھی۔ میں نے خون دیا تو انیق، سیفی اور کرخت سنگھ نے بھی تقلید کی۔ رات کو آخری پہر میں کچھ دیر کے لیے سو گیا۔ جاگا تو دس بج رہے تھے۔ سیل فون دیکھا۔ وہ سائیلنٹ پر تھا۔ اس پر ابراہیم کی کم و بیش دس کالز آئی ہوئی تھیں۔ اس کی بے چینی سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ میں اب خود بھی یہ چاہتا تھا کہ اسے جلد از جلد زینب کے بارے میں بتا دیا جائے۔

میں نے بیگم نورل سے رابطہ کیا اور ان سے اجازت لے کر ابراہیم کے پاس اس کے کمرے میں پہنچ گیا۔ یہ اس کا بیڈروم نہیں تھا، وہی جگہ تھی جسے اسپتال کی شکل دی گئی تھی۔ وہ سفید بستر پر ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔ آنکھوں سے شب بیداری ظاہر ہوتی تھی۔ کمرے کی ایک کھڑکی کے شیشوں میں بڑی بڑی ''کریکس'' نظر آ رہی تھیں۔ یہ رات والے ہنگامے اور دھماکوں کے اثرات تھے۔ جونہی میں اندر داخل ہوا، ابراہیم کی آس بھری نظریں مجھ پر جم گئیں۔ وہ جیسے سرتاپا سوال بن گیا۔

اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور بولا۔ ''شاہ زیب...... مجھے کوئی...... اچھی خبر سنائیے گا۔ بری خبر سننے کی مجھ میں ہمت نہیں ہے......''

میں نے کہا۔ ''اگر میں کہوں کہ...... اچھی خبر نہیں ہے...... اور نہ ہی بری خبر ہے تو پھر؟''

''تو پھر...... آپ مجھے انتظار کی سولی پر لٹکائیں گے، مجھ میں انتظار کی ہمت بھی نہیں ہے۔'' اس کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔

''ابراہیم! آپ ایک وعدہ کریں۔ مجھ سے کوئی ایسا سوال نہیں پوچھیں گے جس کا جواب میں فی الحال آپ کو نہ دینا چاہوں، اور ایک بار پھر وہی تاکید بھی کہ...... جو کچھ میں کہوں گا، اسے ابھی صرف اور صرف اپنے تک محدود رکھیں گے۔''

اس کی ڈری ہوئی آنکھوں کے اندر امید کے سہمے سہمے جگنو چمکے۔ اس نے میرے ہاتھ پر اپنے دونوں ہاتھ رکھے اور لرزاں آواز میں بولا۔ ''میں وعدہ کرتا ہوں...... میں وعدہ کرتا ہوں۔''

''زینب زندہ ہے ابراہیم۔'' میں نے سرگوشی کی۔

وہ جیسے سکتہ میں چلا گیا۔ کتنی ہی دیر تک کچھ بول ہی نہیں سکا۔ پھر اس کے ہونٹ

کپکپائے۔ ''میرے ساتھ......کوئی مذاق نہ کیجیے گا......مم...... میں سہہ نہیں سکوں گا۔'' ایسی بے چارگی اور التجا تھی اس کے لہجے میں جسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

میں نے اس کا ہاتھ دبایا۔ ''نہیں ابراہیم! یہ سچ ہے آپ کی دلہن زندہ ہے۔ وہ ایک سازش تھی۔ آپ کو دور کرنے کی گہری سازش تھی۔ وقت آنے پر میں آپ کو ثبوت بھی دوں گا۔''

''وہ......وہ لاش کس کی تھی؟ میں کیسے یقین کرلوں۔ مجھے بتائیں......وہ زندہ ہے...... تو کہاں ہے؟''

میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور سیل فون نکال کر اسے زینب کا ویڈیو کلپ دکھا دیا۔ زینب کی تصویر، اس کی آواز، تازہ اخبار، سب کچھ اس میں موجود تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ اس نے کلپ کو دوبار ''پلے'' کیا، پھر سیل فون کو مٹھی میں دبایا اور سسکیوں سے رونے لگا، یہ بے پایاں مسرت کے آنسو تھے۔ میں نے اسے رونے دیا۔ کچھ دیر بعد وہ بولا۔ ''یہ سب کیسے ہوا ہے شاہ زیب بھائی۔''

وہ مجھے پہلی دفعہ ''بھائی'' کہہ کر بلا رہا تھا۔ میں نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''ابراہیم، میں تمہیں ایک دو روز میں سب کچھ بتا دوں گا۔ ابھی تمہیں تھوڑا سا صبر کرنا پڑے گا۔''

اس نے بھیگی آنکھوں کے ساتھ ایک بار پھر وڈیو پلے کیا۔ شاید وہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ ویڈیو کس جگہ بنایا گیا ہے جس جگہ اخبار نمایاں نظر آ رہا تھا۔ اس نے ویڈیو کو ''پاز'' دیا اور اخبار کو بغور دیکھنے کے بعد وہی فقرہ کہا جس کی میں توقع کر رہا تھا۔ ''شاہ زیب بھائی! یہ ویڈیو کلپ کل ہی بنا ہے۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ کانپتی آواز میں کہنے لگا۔ ''یہ کلپ آپ نے خود بنایا ہے۔ آپ کل اس سے ملے ہیں۔ وہ کہاں تھی؟ کس نے کیا ہے اس کے ساتھ ایسا؟ کیا یہ......عزت مآب نے کیا ہے؟ اور کس میں اتنی ہمت ہو سکتی ہے۔ مجھے کم از کم اتنا تو بتا دیں کہ وہ لاش اور کپڑے اور پاؤں کی مہندی......؟''

میں نے اس کی بات کاٹی۔ ''ابراہیم......ابھی فوری طور پر میں ان سوالوں کے جواب نہیں دے سکتا۔ ہاں یہ تسلی رکھیں کہ یہ عزت مآب نے نہیں کیا۔ اور آپ نے وعدہ کیا ہے ابھی مجھے مجبور نہیں کریں گے کہ میں جوابات دوں۔''

وہ جیسے سہم کر چپ ہو گیا۔ رکے ہوئے کلپ کو پھر دیکھنے لگا۔ ''یہ بیمار لگ رہی ہے شاہ

زیب بھائی! کتنی کمزور ہوگئی ہے۔ بہت پریشانی میں ہے۔''

''یہ پریشانی آپ کی وجہ سے ہے ابراہیم...... آپ یہ پریشانی دور کر سکتے ہیں۔'' وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا، میں نے کہا۔'' وہ آپ کی صحت کی طرف سے بہت فکرمند ہے جس طرح آپ نے اس کا یہ ویڈیو کلپ دیکھا ہے اور پھر سے جی اٹھے ہیں۔ اسی طرح وہ بھی آپ کو دیکھ کر اپنے غم کے گھیرے میں سے نکل آئے گی۔ آپ اس کے لیے دو چار فقرے بولیے اور اس سے کہیے کہ اب آپ کی صحت بہتر ہے۔ عزت مآب سے آپ کی بات چیت ہو رہی ہے، جلد ہی سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''لیکن......''

''پلیز ابراہیم، میں جو کہہ رہا ہوں ویسا کیجیے اور باقی مجھ پر چھوڑ دیجیے۔''

وہ رضامند نظر آنے لگا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ اپنی حالت تھوڑی سی بہتر بنالے۔ وہ اٹھا اور منہ ہاتھ دھونے کے لیے لرزتے قدموں کے ساتھ واش روم میں چلا گیا۔ اس نے واش روم میں ہی زینب کے لیے دو چار فقرے بولے اور میرے سیل فون پر ریکارڈ کر دیئے۔ باہر آ کر اس نے سیل فون میرے حوالے کر دیا۔ اس کی آنکھوں میں مسلسل خوشی کے آنسو چمک رہے تھے۔ وہ جیسے سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اپنی دلی کیفیت کا اظہار کس طرح کرے۔

میری نظر اس کے ہاتھوں پر پڑی، ہاتھوں کی جلد بالکل خشک ہو چکی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ ایک دو دن میں اس کی جلد پھٹنا شروع ہو جائے گی۔ پاکستان میں ابراہیم نے خود مجھے بتایا تھا کہ ان دونوں بھائیوں کے لیے روزانہ کی بنیاد پر مخصوص زہر کی ڈوز ضروری ہے۔ ورنہ ان کے جسم میں غیر معمولی تبدیلیاں شروع ہو جاتی ہیں جن میں ایک تبدیلی ''ڈی ہائیڈریشن'' بھی ہے۔ یقیناً ابراہیم کے ہاتھ پاؤں کی یہ حالت اسی وجہ سے تھی کہ وہ کھانا نہیں کھا رہا تھا اور یوں ''ڈوز'' سے بھی محروم تھا۔ میں نے اس سلسلے میں ابراہیم کو سمجھایا اور زور دیا کہ وہ اپنی صحت کی بحالی کی طرف توجہ دے، مجھے اندازہ ہوا کہ وہ سمجھ رہا ہے اس کی اندرونی خوشی کو محسوس کر کے میرا اپنا دل خوشی سے کھل اٹھا تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ ایک درد سا بھی لہر لے رہا تھا۔ کسی کی یاد آ رہی تھی۔ وہی جو بچھڑ گئی تھی...... اور اب اور دور چلی گئی تھی۔ پتا نہیں ان لمحوں میں وہ کیوں یاد آ گئی تھی۔ اپنے ہی خیالوں میں مگن میں ابراہیم کی قیام گاہ سے نکلا اور ڈی پیلس کی بلند و بالا قالین پوش راہداریوں میں چلتا احاطے کی طرف روانہ ہو گیا۔ احاطے میں نئی خندقیں کھودی جا رہی تھیں اور حفاظتی انتظامات کیے جا رہے تھے۔ کل رات والے نقصان کے باوجود رضاکار دستے پُرجوش تھے۔ ابھی میں نے احاطے میں چند قدم ہی اٹھائے تھے کہ ایک باوردی

لیفٹیننٹ تیز قدموں سے آیا اور مجھے سیلوٹ کرتے ہوئے بولا۔ ''ہر ہائی نس آپ کو یاد فرما رہی ہیں۔''

اس کی مراد قسطینا سے تھی۔ شاید اس نے مجھے اپنے آفس کی کھڑکی میں سے دیکھا تھا یا پھر کسی کلوز سرکٹ ٹی وی کیمرے میں۔ میں لیفٹیننٹ کے ساتھ اس کے آفس میں پہنچا۔ وہ وردی میں تھی اور ذرا مؤدب انداز میں کھڑی فون پر کسی سے بات کر رہی تھی۔ اس نے اشارے سے مجھے بیٹھنے کی ہدایت کی۔ میں بیٹھ گیا۔

وہ ملائی زبان میں کسی کو تسلی دے رہی تھی کہ یہ چھوٹا سا عارضی ''اپ سیٹ'' ہے۔ آخری فتح ہماری ہی ہونی ہے۔ ہمیں ثابت قدم رہنا چاہیے...... جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ عزت مآب ریان فردوس سے بات کر رہی ہے اور وہ ہمیشہ کی طرح جنگی صورتِ حال سے گھبرایا ہوا ہے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ریان فردوس کے دل و دماغ میں امریکیوں کا خوف گھر کر چکا ہے۔ یہ سوچ اس کا پیچھا چھوڑتی ہی نہیں کہ آخر کار امریکی ایجنسی نے غالب ہو جانا ہے۔

ریان فردوس سے بات ختم کر کے قسطینا کرسی پر بیٹھ گئی اور اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر کچھ دیر خود کو کمپوز کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ پھر اس نے گہری سانس لے کر میری طرف دیکھا۔ میرے بازو کی خیر خیریت دریافت کی اور پوچھا کہ میں کہاں سے آ رہا ہوں؟

میں نے بتایا کہ ابراہیم کو دیکھ کر آیا ہوں۔

وہ بولی۔ ''خدا کا شکر ہے کہ اس کی جان بچ گئی ہے۔ اس نے زینب کی موت کا بہت زیادہ صدمہ لے لیا ہوا ہے۔ اگر پرسوں بروقت اس کے کمرے کا دروازہ نہ توڑ دیا جاتا تو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔''

ایک دو منٹ اس بارے میں بات ہوئی پھر میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''کل رات والے واقعے کا کیا کھوج لگا ہے؟ سنا ہے کہ ہیلی کاپٹرز اپنے تھے اور ان میں پائلٹ بھی اپنے ہی تھے۔''

''یہ سراسر غداری کا معاملہ ہے۔ یہ ایجنسی والے ''باسٹرڈز'' جوڑ توڑ کے ماہر ہیں۔''

''لیکن یہاں تو کچھ اور طرح کی افواہیں بھی پھیلی ہوئی ہیں۔ اسے ہاناوانی کی سپر نیچرل صلاحیتوں کا شاخسانہ قرار دیا جا رہا ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ ان دونوں پائلٹس نے ایک خطرناک ''عاملہ'' کے لیے معمول کا کردار ادا کیا ہے۔''

''یہ سب بکواس ہے۔ میں ان باتوں کو نہیں مانتی۔ یہ سب یہاں کے مقامی لوگوں کی توہم پرستی ہے اور فرسودہ عقیدے ہیں۔''

"آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ ہانا وانی ایک نارمل عورت ہے۔ اس میں کوئی ایسی خاص بات نہیں جسے سپر نیچرل کہا جاسکے؟"

"میں صرف اتنا سمجھتی ہوں کہ وہ بے حد ذہین ہے۔ وہ غیر معمولی طور پر آنے والے وقت کو بھانپ لیتی ہے اور پیش گوئی کرسکتی ہے۔ اپنی اسی پیش گوئی کی صلاحیت کے زور پر وہ لوگوں کو اپنے اثر میں لے لیتی ہے......اور کچھ نہیں۔ باقی جو کچھ کہا جاتا ہے، وہ جھوٹ ہے۔ حقیقت اور سائنس سے بہت دور ہے۔"

"لیکن قسطینا! کچھ چیزوں کو تو سائنس بھی مانتی ہے۔ مثلاً ہپناٹزم اور خیال خوانی وغیرہ۔"

"یہاں پر ہپناٹزم کہاں سے آگیا؟" وہ ذرا چڑ کر بولی۔ "جن دو پائلٹس کی ہم بات کررہے ہیں، وہ اپنی ڈیوٹی خوش اسلوبی سے انجام دے رہے تھے۔ حالیہ دنوں بلکہ حالیہ مہینوں میں وہ جاماجی کی حدود سے باہر ہی نہیں گئے۔ پورے یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ وہ کبھی ہانا وانی سے نہیں ملے۔ پھر وہ کیسے اس عورت کے "معمول" بن گئے۔ یہ سب زبانی جمع خرچ ہے اور یقین کی کمزوری ہے۔"

"کہیں ایسا نہ ہو کہ رضا کاروں میں بددلی پھیلنا شروع ہوجائے۔" میں نے اندیشے کا اظہار کیا۔

"اس بات کا مجھے بھی ڈر ہے۔ یہ ہانا وانی اور رائے زل کا پرانا طریقہ ہے کہ افواہیں پھیلانے کے لیے اپنے جاسوس چھوڑ دیتے ہیں۔ میں نے اس سلسلے میں متعلقہ لوگوں کو ہدایات جاری کی ہیں۔ وہ مشکوک لوگوں کی ٹوہ لگا رہے ہیں۔"

میرا دل چاہ رہا تھا کہ زینب کے سلسلے میں قسطینا کو اعتماد میں لوں اور اسے بتاؤں کہ ان سب کا چہیتا آقا جان پسِ پردہ رہ کر کیا کیا کام دکھا رہا ہے۔ مگر میں اس حوالے سے جلد بازی بھی کرنا نہیں چاہتا تھا، آقا جان کی جڑیں ان لوگوں میں بہت گہری تھیں۔

کچھ افسران جن میں فوجی افسران بھی تھے، قسطینا سے ملاقات کے لیے پہنچ گئے۔ قسطینا نے مجھے جانے کی اجازت دے دی اور میں اس سے رخصت ہوکر انیکسی پہنچ گیا۔

انیکسی کا مین گیٹ اور قریب والے دو تین کمرے بالکل تباہ ہوگئے تھے۔ کئی دیواریں دھوئیں سے بالکل سیاہ دکھائی دے رہی تھیں۔ کل رات والی بمباری کے اثرات اکثر لوگوں کے چہروں پر تھے۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ ایک انجانا سا خوف بھی لوگوں کے چہروں پر دکھائی دیتا تھا۔ اس خوف کا تعلق اسراریت سے تھا۔ اپنے ہی پائلٹوں کا ڈی پیلس جیسی اہم

ترین جگہ پر حملہ کر دینا بے حد تشویش اور حیرت کا باعث تھا۔
میں اپنے کمرے کا بغلی دروازہ کھول کر زینب کے پاس پہنچا۔ انیق بھی وہیں موجود تھا اور اس کا دل بہلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے زینب کو وہ ویڈیو دکھائی جو ابھی کچھ دیر پہلے ابراہیم نے ریکارڈ کروائی تھی۔
بڑی صاف اور واضح ویڈیو تھی۔ ابراہیم نے زینب کو اپنی صحت کے بارے میں تسلی دی تھی اور ساتھ ہی یہ کہا تھا کہ عزت مآب سے وہ اور والدہ بات چیت کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔ زینب کی فرمائش پر میں نے ویڈیو کو دو تین بار پلے کیا۔ اس کے رنج و غم میں کمی محسوس ہونے لگی۔ وہ ایک بار پھر ضد کرنے لگی کہ وہ ماں جی یعنی بیگم نورل سے ملنا چاہتی ہے وہ بار بار سسکنے لگتی تھی۔
اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ جاما جی کے لوگوں کی نظر میں وہ مر چکی ہے۔ قریبی قبرستان میں اس کی قبر موجود ہے اور اس کے نام کا کتبہ لگا ہوا ہے۔ اب ماں جی سے ملنا یا عام لوگوں کے سامنے آنا اتنا آسان نہیں تھا۔ حسبِ معمول اسے تسلی تشفی دے کر میں اور انیق دوسرے کمرے میں آن بیٹھے۔
انیق نے کہا۔ ''وہ کل رات والے واقعے سے بہت متاثر ہوئی ہے۔ کہہ رہی تھی کہ آپ نے اسے بچانے کے لیے خود کو خطرے میں ڈال لیا۔ دھوئیں سے بچنے کے لیے بس ایک ہی ماسک تھا جو آپ نے اس کے چہرے پر چڑھایا۔''
''ہاں، ایک دفعہ تو مجھے بھی تارے نظر آ گئے تھے لیکن پھر دروازے کھلنے کی وجہ سے دھواں ایک دم نکلنا شروع ہو گیا۔''
اس کی حسِ ظرافت جو کسی بھی موقع پر پھڑک سکتی تھی، پھڑک اٹھی۔ بڑے اشتیاق سے بولا۔ ''ویسے میرا بہت دل چاہتا ہے جی کہ کسی وقت مجھ پر بھی کوئی ایسا وقت بنے، میں کسی مصیبت میں پھنسوں اور آپ ''انیق...... انیق'' پکارتے ہوئے میری مدد کو لپکیں۔''
میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''ہو سکتا ہے کہ ایسا وقت جلد ہی آ جائے، تم جس طرح سجاول کی شان میں قصیدے پڑھتے رہتے ہو، اس نے تمہیں اٹھا اٹھا کر پٹخنا ہے اور نچوڑنا ہے۔ مجھے ہی انیق...... انیق کہتے ہوئے تمہاری طرف لپکنا ہے اور یہ بات بھول جاؤ کہ وہ واپس نہیں آئے گا۔''
''اللہ کا نام لیں۔ شام کا وقت ہے۔ کیوں بری بری باتیں کرتے ہیں۔''
''یہ شام کا نہیں، دوپہر کا وقت ہے۔ میرا خیال ہے کہ سجاول کا نام سن کر تمہیں ویسے ہی

تارے نظر آنے لگتے ہیں۔"

"تارے تو مجھے امریش...... مم میرا مطلب ہے سجاول بھائی کے بغیر بھی نظر آ رہے ہیں۔ زینب کی بڑی سخت ڈیوٹی دینا پڑ رہی ہے۔ یہ دھڑکا علیحدہ سے لگا رہتا ہے کہ کہیں اس کا بھید نہ کھل جائے۔ ویسے میں آپ کو سچ بتاتا ہوں شاہ زیب بھائی، ہم زینب کو اب زیادہ دیر چھپا نہیں سکیں گے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہاں کے ملازمین اور گارڈز وغیرہ بھی شک میں پڑ چکے ہیں۔"

"تو پھر کیا کیا جائے؟"

"کمانڈر افغانی جس طرح خیام مانش کو یہاں سے لے کر گئے ہیں، زینب کو بھی لے جائیں۔ یقینی بات ہے کہ وہ اب اسے پوری حفاظت سے رکھیں گے۔"

"زینب نہیں مانے گی۔ میں نے اس سے تھوڑی سی بات کر کے دیکھی تھی۔ اسے کمانڈر افغانی سے بھی خوف آنے لگا ہے۔ حالانکہ افغانی نے اپنے طور پر اس کا بھلا ہی سوچا تھا۔ بہت بڑا رسک لیا تھا اس کی خاطر۔ وہ چاہتے تھے کہ اسے چند ہفتوں تک خیام کے گھر کے تہ خانے میں حفاظت سے رکھیں اور جب معاملہ ذرا ٹھنڈا پڑ جائے تو اسے یہاں سے نکال کر پاکستان پہنچا دیں...... یا پھر کسی اور جگہ جہاں وہ زندہ رہ سکے۔"

"کمانڈر افغانی سے یہ سب کچھ کروایا کس نے؟ انہیں تو بس یہ کرنا تھا کہ بیگم نورل کی ہدایت پر زینب کو پاکستان پہنچا دینا تھا؟"

"اس حوالے سے تمہارے دماغ شریف میں کون سا نام آتا ہے؟"

"میرے دماغ میں تو بس ایک ہی منحوس چہرہ ابھرتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں...... آدھا سر گنجا، پرلے درجے کا سڑیل لیکن بہت زیادہ خچرا۔ آقا جان...... آقا جان۔"

"خچرا نہیں ہے بے حد عیار کہو اور بہت خطرناک بھی۔ مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں وہ واقعی زینب کے لیے مہلک ثابت نہ ہو جائے۔"

"اسی لیے تو میں کہہ رہا ہوں کہ اب ہمیں زینب کو مزید اس کمرے میں نہیں رکھنا چاہیے۔"

"میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں قسطینا کو اس سلسلے میں اعتماد میں لوں۔" میں نے کہا۔

تھوڑی دیر تک میرے اور انیق کے درمیان اس موضوع پر بات ہوئی۔ پھر میں نے قسطینا کو کال کی اور اسے کہا کہ میں ایک ضروری بات کرنے کے لیے اس سے ملنا چاہتا ہوں۔

وہ بولی۔ "ایک گھنٹے بعد ایک اہم میٹنگ شروع ہونے والی ہے۔ تم دس پندرہ منٹ

تک آفس میں پہنچ جاؤ۔"

میں قسطینا سے دوبارہ ملنے کے لیے روانہ ہوا۔ سیفی کے کمرے کے پاس سے گزرا تو ٹھٹک گیا۔ اس کے کمرے کے دروازے کی نچلی درز سے دھواں نکل رہا تھا میں نے پہلے دستک دی، پھر دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ وہ کمرے میں نہیں تھا۔ واش روم میں پانی گرنے کی مدھم آواز آ رہی تھی۔ قالین پر سگریٹ کا ٹکڑا پڑا تھا جس نے قالین کے ایک کونے کو جلا دیا تھا۔ میں نے پاؤں مار کر سلگتے ہوئے قالین کو بجھایا۔ سیف کی بے پروائی پر غصہ آیا۔ وہ سگریٹ بھی پیتا تھا اس کا پتا مجھے آج ہی چلا تھا۔

میں وہیں بیٹھ گیا اور اس کے واش روم سے نکلنے کا انتظار کرنے لگا تاکہ اسے تھوڑی سی سرزنش کر سکوں۔ اسی دوران میں سیفی کے رنگ برنگے سیل فون کی بیل ہوئی۔ میوزک بجنے لگا۔ عیسیٰ خیلوی نغمہ سرا ہوا...... قمیص تیری کالی...... تے سوہنے پھلاں والی۔ سیل فون بیڈ پر تکیے کے پاس پڑا تھا۔ میں نے اس کی اسکرین دیکھی اور دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ اسکرین پر تاجور کی تصویر نظر آ رہی تھی اور نیچے لکھا ہوا تھا۔ "سجن پیارا" سیفی نے تاجور کا نمبر "سجن پیارا" کے نام سے سیو کر رکھا تھا۔

یہ ٹیکنالوجی کا کمال ہی تو تھا۔ پاکستان سے ہزاروں میل دور برونائی دارالسلام کے اس نواحی جزیرے میں ایک لڑکی کی کال آ رہی تھی۔ وہ پنجاب کے ایک دور دراز گاؤں کی کسی حویلی میں بیٹھی ہو گی اور اپنے محبوب کے لیے اس کی صدا یہاں ڈی پیلس کے اس کمرے تک پہنچ رہی تھی۔ سیل فون مجھ سے چند فٹ کی دوری پر تھا۔ میرا دل چاہا کہ میں ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑ لوں۔ کال ریسیو کر کے 'ہیلو' کہوں اور جواب میں تاجور کی آواز یا اس کے سانسوں کی آہٹ سنوں۔ اس سے کہوں۔ میں بدنصیب شاہ زیب بول رہا ہوں...... کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا...... تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔

لیکن میں ایسا نہیں کر سکا۔ میں ایسا کچھ کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اگر کرنا ہوتا تو پھر اسے جانے ہی کیوں دیتا۔

میوزک بند ہو گیا۔ اسکرین تاریک ہو گئی۔ وہ چہرہ اوجھل ہو گیا جو ہمیشہ کے لیے میرے دل کی گہرائیوں میں نقش ہو چکا تھا۔

دو تین منٹ بعد سیفی تولیے سے سر پونچھتا ہوا باہر نکل آیا۔ اس نے پہلے حیرانی سے مجھے دیکھا، پھر دھوئیں کی بو سونگھی، تب اس کی نگاہ قیمتی قالین کے جلے ہوئے کنارے پر پڑی۔ میں نے اسے بتایا کہ یہاں تماشا ہونے والا تھا۔ وہ کانوں کو ہاتھ لگانے لگا۔ "استاد صاحب!

میں کھلاڑی ہوں۔ تمبا کو شمبا کو کو ہاتھ نہیں لگاتا۔ یہ کرخت سنگھ کا کارنامہ ہے دو تین پیگ بھی لگائے ہوئے تھے اس نے...... سگریٹ کا ٹوٹا غلطی سے ایش ٹرے میں رکھنے کے بجائے نیچے پھینک دیا ہوگا۔''

''اور تم نے کتنے پیگ لگائے ہوئے تھے؟''

''صرف ایک...... آپ کو پتا ہی ہے کہ میں آپ سے جھوٹ نہیں بولتا۔''

اسی دوران میں اس نے اپنے فون کی اسکرین چیک کی...... اور ذرا مضطرب نظر آنے لگا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ کس کی 'مسڈ کال' ہے اور یہ کال وہ میرے سامنے ریسیو نہیں کر سکتا تھا۔ رسمی انداز میں بولا۔ ''آپ کا بہت بہت شکریہ جناب۔ اگر آپ نہ دیکھتے تو کیا پتا آگ ہی لگ جاتی۔ مجھے بہت شرمندگی محسوس ہو رہی ہے......'' پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''آپ کے لیے چائے منگواؤں بڑی زبردست قسم کی؟''

میں اس کا مطلب سمجھتے ہوئے بولا۔ ''نہیں، میں اب چلتا ہوں۔ آئندہ بہت احتیاط رکھنا۔''

''میں ابھی بات کرتا ہوں جی کرخت سنگھ سے۔''

میں باہر آ گیا...... سینے میں ایک دھواں سا بھرا ہوا تھا۔ قسطینا کی طرف جانے کو بھی دل نہیں چاہا۔ سگریٹ کی شدید طلب محسوس ہوئی۔ میں واپس کمرے میں آ گیا۔ سگریٹ سلگایا پھر چند تلخ گھونٹ الکحل کے لیے۔ برآمدے میں ٹہلنے لگا۔ نگاہ سیفی والے کمرے کی طرف اٹھ گئی۔ کھڑکی کے شیشوں میں سے سیفی نظر آ رہا تھا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا اور فون پر بات کر رہا تھا۔ یقیناً دوسری طرف تاجور ہی تھی۔ سیفی کے چہرے پر مسکراہٹیں تھیں۔ وقفے وقفے سے وہ بلند آواز میں ہنستا بھی تھا اور اس کے سفید دانت چمکنے لگتے تھے۔ میرے سینے میں بھرا ہوا دھواں کچھ اور گہرا کچھ اور گاڑھا ہو گیا۔ دم گھٹنے لگا۔ میں نے اب تک کی زندگی میں عورت کو کبھی بہت زیادہ اہمیت نہیں دی تھی اور جن کو کچھ اہمیت دی تھی، انہوں نے کئی گنا زیادہ ''مجھے'' اہمیت دی تھی اور وہ کوئی معمولی خواتین نہیں تھیں، یورپ کے ایک سے بڑھ کر حسین چہرے، مگر اس عام سی دیہاتی لڑکی نے میرے دل و دماغ کے ساتھ جو کچھ کیا تھا، وہ ناقابلِ یقین تھا۔

اسی دوران میں سیف نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا اور کھلی جگہ پر آ کر 'ہیلو...... ہیلو' کرنے لگا۔

''ہیلو تاج...... ہیلو تاج۔'' اس کی مدھم آواز میری سماعت تک پہنچی۔

دوسری طرف سے رابطہ منقطع ہو گیا تھا۔ یقیناً یہ سمندر پار سے ایک مہنگی کال تھی۔ دو چار منٹ میں ہی شاید دوسری طرف سے بیلنس ختم ہو گیا تھا۔

میں اپنی کمزوریاں چھپا نہیں رہا۔ اپنی قلبی وارداتوں کو صاف صاف بیان کر رہا ہوں۔ ان دنوں تاجور کے غم سے لڑنے کے لیے مجھے دو ہی طریقے سمجھ میں آتے تھے۔ الکحل کے تلخ کڑوے گھونٹ، یا پھر زلفوں کی چھاؤں اور گرم سانسوں کی سرسراہٹ۔ بے شک میرا دل یہ گواہی بھی دیتا تھا کہ یہ سب کچھ ٹھیک نہیں، یہ محبت کی توہین ہے...... لیکن میرے پاس دکھ کے حصار سے نکلنے کے لیے کوئی اور چارہ بھی نہیں تھا۔ دبلی پتلی نازک اندام جاناں میرے ساتھ وقت گزارنے کے لیے ہر وقت منتظر رہتی تھی۔ میرا دل چاہا کہ اسے فون کروں مگر پھر ارادہ ترک کر دیا۔ یہ بھی انسانی فطرت ہے کہ جو چیز اسے ہر وقت بلا رکاوٹ میسر ہوتی ہے، اس کے لیے طلب اور بے قراری کم ہو جاتی ہے۔ انسان نئی زمینوں پر قدم رکھنے کے لیے اور نئی فتوحات کے لیے ہر وقت بے چین رہتا ہے اسے بھی انسانی کمزوریوں میں سے ایک کمزوری یا کج روی ہی کہا جا سکتا ہے۔

میرا دل چاہا کہ ''قسطینا'' کے پاس پہنچوں۔ اسے خود میں الجھاؤں اور خود اس میں الجھوں۔ اس نے مجھے دس پندرہ منٹ میں آنے کے لیے کہا تھا۔ اب آدھ گھنٹے سے بھی زائد وقت گزر چکا تھا۔ میں نے ریفریجریٹر میں سے ایک کیک پیسٹری نکالی اور اسے احتیاط سے پلیٹ کر ہاتھ میں لے لیا۔

سیکیورٹی کے مختلف مراحل سے گزر کر میں ڈی پیلس کے اس حصے میں داخل ہوا جہاں قسطینا یعنی جاماجی کی سپریم کمانڈر کا شاندار دفتر تھا۔ وہاں جاماجی کا دو رنگ والا جھنڈا لہرا رہا تھا اور حفاظتی دستے کے ارکان چمکتی دمکتی وردیوں کے ساتھ چوکس کھڑے تھے۔ پروٹوکول کی گاڑیاں بھی موجود تھیں اور کچھ فاصلے پر ڈی پیلس کے ہیلی پیڈ پر ایک گن شپ ہیلی کاپٹر کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ میں اس کے آفس میں پہنچا تو وہ میری ہی منتظر تھی۔

''تم پورا آدھ گھنٹا لیٹ ہو۔'' اس نے شکوہ آمیز لہجے میں کہا۔

''لیکن یہ بھی تو پوچھیں کہ کیوں لیٹ ہوں؟''

''میرے خیال میں اس کے بجائے تم مجھے یہ بتاؤ کہ کیا بات کرنا چاہ رہے تھے؟'' اس نے اپنی رسٹ واچ دیکھتے ہوئے کہا۔

''اگر آپ بہت جلدی میں ہیں تو پھر کسی اور وقت سہی۔''

''نہیں، نہیں۔ ابھی کچھ وقت ہے، تم بتاؤ۔'' اس نے ذرا ایزی نظر آنے کی کوشش کی

اور سیل فون آف کر دیا۔

''میں آج خود کو تنہا محسوس کر رہا ہوں...... بہت زیادہ تنہا۔'' میں نے اپنی دلی کیفیت بیان کی۔

وہ مسکرائی۔ ''عجیب بات ہے۔ یہ بات ایک اسٹار کھلاڑی کہہ رہا ہے۔ جو اَن گنت دلوں کی دھڑکن ہے جس کے ایک اشارے پر اس کے ارد گرد اس کے چاہنے والوں کے جمگھٹے لگ سکتے ہیں۔''

''بعض دفعہ بندہ ہجوم میں بھی تو اکیلا ہوتا ہے۔''

''آج تو فائٹر، شاعرانہ موڈ میں نظر آ رہا ہے۔''

''بالکل ایسا ہی ہے۔''

''یہ...... تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟''

میں نے ریپر کھول کر بلیک فاریسٹ کی پیسٹری اس کے سامنے پیش شیشے کی تپائی پر رکھ دی۔ ''آج میری سالگرہ ہے اور پتا نہیں کیوں دل چاہ رہا تھا کہ آج میں یہ سالگرہ آپ کے ساتھ مناؤں۔''

''بھئی، واقعی شاعرانہ موڈ ہے۔'' اس نے کہا اور اٹھ کر الماری کی طرف گئی اور پیسٹری کاٹنے کے لیے چھری نکال لائی۔ ''چلو آؤ۔'' اس نے کہا۔

''کہاں؟''

''بھئی یہ آفس ہے، یہاں سالگرہ تو نہیں منائی جا سکتی نا؟'' وہ مسکرائی۔

ہم اٹھ کر ساتھ والے ریٹائرنگ روم میں آ گئے۔ یہ وہی سجا سجایا آرام دہ کمرا تھا جہاں ہم اس سے پہلے بھی کچھ ''اچھا وقت'' گزار چکے تھے۔ یہیں پر وہ بے مثال اسپائی کیمرا بھی نصب تھا جو اب تک نگاہوں سے اوجھل تھا اور گاہے بگاہے مجھے قسطینا کے حوالے سے انفارمیشن فراہم کرتا رہتا تھا۔

آج واقعی میری سالگرہ کا دن تھا...... اور مجھے کسی کی اچھی کمپنی کی ضرورت بھی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں میرا دل چاہ رہا تھا کہ قسطینا مجھے کچھ اور ''آگے بڑھنے'' کا موقع دے اور میں خود کو اس کی دلکش قربت میں کچھ دیر کے لیے فراموش کر دوں۔ قسطینا، دو تین اسنیکس لے آئی۔ میں نے پیسٹری کو کاٹ کر دو ٹکڑوں میں بدلا۔ قسطینا نے تالی بجائی اور ''ہپی برتھ ڈے'' کہا۔

اس نے اپنی گرین کیپ اتار دی اور اپنے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے بولی۔

''تمہیں کیا تحفہ دیا جائے شاہ زائب؟''

''میرے لیے آپ کسی بڑے تحفے سے کم نہیں ہیں۔'' میں نے بے ساختہ کہا۔

اس کے سرخ و سپید چہرے پر شرم کی سرخی لہرا گئی۔ شاید اسے پچھلی ملاقات کی ''گرمجوشی'' یاد آ گئی تھی۔ ''چلو تحفہ ادھار سہی'' وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے اور کیپ دوبارہ سر پر رکھتے ہوئے بولی۔ اس کی نگاہ بار بار وال کلاک کی طرف اٹھ رہی تھی۔

میں ابھی تک اپنی جگہ بیٹھا تھا۔ اچانک قسطینا کو احساس ہوا کہ وہ آدابِ میزبانی کے خلاف جا رہی ہے۔ میں ابھی تک بیٹھا تھا اور وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اسے میرے چہرے پر تھوڑا تاسف بھی نظر آیا ہوگا۔ وہ پھر سے میرے قریب بیٹھ گئی اور میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر میرے رخسار کو چوما۔ ''ہپی برتھ ڈے ٹو یو۔''

میں تو پہلے ہی کسی ایسی پیش رفت کا منتظر تھا۔ میں نے اسے اپنے اکلوتے سلامت بازو کے حصار میں لے لیا۔ اگلے ایک دو منٹ دوطرفہ گرمجوشی کے تھے۔ ایک دم میری نظر وال کلاک پر پڑی۔ میں پیچھے ہٹ گیا۔ ''قسطینا! اس وقت تو آپ کو میٹنگ میں ہونا چاہیے تھا۔ آپ لیٹ ہو رہی ہیں۔''

''لیٹ ہو چکی ہوں۔'' وہ اپنی جگہ لیٹے لیٹے بولی پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر اپنا سیل فون اٹھایا...... اور آن کیا۔ آن ہوتے ہی اس پر کال کے سگنلز آنے لگے۔ اس نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے حلمی کی مدھم آواز ابھری۔ ''یور ہائی نس، یہاں میٹنگ کے لیے آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔''

''سوری، میں میٹنگ میں نہیں آ سکوں گی۔ آپ خود اسے ہیڈ کرلیں اور جن پوائنٹس پر بات ہوئی تھی، وہ ڈسکس کرلیں۔''

''آ...... آپ خیریت سے تو ہیں؟'' حلمی کی فکرمند آواز ابھری۔

''طبیعت ذرا بوجھل ہے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹا آرام کرنا چاہتی ہوں۔ شام والی میٹنگ اور تقریر کا پروگرام وہی رہے گا۔'' اس کے لہجے میں لیڈرانہ طمطراق تھا۔

حلمی کو کچھ ضروری ہدایات دے کر قسطینا نے سیل فون کو سائیلنٹ پر کر دیا اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی، جیسے پوچھ رہی ہو...... ایسٹرن کنگ اب خوش ہو؟ میں واقعی خوش تھا۔ قسطینا نے مجھے کمپنی دینے کے لیے ایک اہم ملاقات کو کینسل کیا تھا لیکن کچھ ''گلٹی'' بھی محسوس کر رہا تھا۔ میں اس طرح اس کا حرج کرنا نہیں چاہتا تھا، میں نے کہا۔ ''مجھے شرمندگی ہو رہی ہے۔ شاید کچھ افسران ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ میں آپ کو ڈسٹرب کر رہا

ہوں۔"

"اب اور ڈسٹرب تو نہ کرو۔" وہ میری ناک کو چٹکی میں پکڑتے ہوئے بولی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔"میں ذرا "چینج" کر کے آتی ہوں۔"

چند منٹ بعد وہ ایک ایزی سے اسمارٹ لباس میں واپس آئی۔ یہ سفید پتلون اور سرخ رنگ کی ہاف سلیو شرٹ پر مشتمل تھا۔ پسٹل جو ہر لباس میں اس کی کمر سے بندھا رہتا تھا اب نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے مدھم آواز میں میوزک آن کر دیا اور بولی۔"کیا پیو گے ایسٹرن؟"

"جو آپ کی مرضی۔"

اس نے اپنے لیے سافٹ ڈرنک اور میرے لیے بیئر انڈیلی۔"تمہارے موڈ کے مطابق ٹھیک انتخاب کیا ہے نا؟" اس نے گلاس میری طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ اپنے مشروب کی چسکی بھرتے ہوئے بولی۔"کسی وقت لگتا ہے ایسٹرن! کہ کوئی بہت بھاری بوجھ اٹھائے پھرتے ہو...... کوئی لڑکی تھی؟"

"اگر میں کہوں کہ "ہاں"...... تو آپ کو کوئی فرق پڑے گا؟"

"مجھے ایسی باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا، میں نے بھی تو تمہیں بتایا تھا کہ میں نے ماضی میں ایک لڑکے کو چاہا تھا۔ تمہیں کیا فرق پڑا؟"

"ہاں، یہ سب کچھ ہماری زندگی کا حصہ ہوتا ہے۔ اگر ہم ایسی باتوں کو جھٹلاتے ہیں تو اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں۔ زندگی آگے بڑھنے کا نام ہے۔"

میں نے اسے اپنی زندگی کے مختلف نشیب و فراز کے بارے میں مختصراً بتایا اور سرسری انداز میں تاجور کا ذکر بھی کیا۔ میں اس کا ذکر اتنی شدت سے نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ رقابت محسوس کرنے لگتی۔ میں نے اسے بتایا کہ اب میری اور اس کی راہیں ہمیشہ کے لیے جدا ہو چکی ہیں۔ قسطینا نے بھی اپنے حالات کے بارے میں مختصر تذکرہ کیا...... اور اپنے پیارے والد کی موت کے بعد کے احساسات میرے ساتھ شیئر کیے۔ اسے اس بات کا دکھ تھا کہ "برج کلب" پر اتنے کامیاب حملے کے باوجود اس کے والد کا اصل قاتل چیف گیرٹ زندہ ہے۔ میں نے اسے تسلی دی کہ چیف گیرٹ مرتا تو شاید رائے زل کو اتنا نقصان نہ ہوتا جتنا کئی بڑے بڑے جرنیلوں کے جہنم واصل ہونے سے ہوا ہے اور چیف گیرٹ بھی کون سا سلامت ہے اسپتال کے آئی سی یو میں پڑا ہے۔

وہ بولی۔"ایسٹرن! تمہاری یہ بات تو درست ہے کہ برج کلب کی تباہی میں گرے فورس کی ہائی کمان بری طرح تہس نہس ہو گئی ہے۔ کئی اہم کمانڈر جان سے گئے ہیں۔ امریکن

ایجنسی کے اہم آفیسر بھی مرنے والوں میں شامل ہیں۔ اس حوالے سے ہم ایک پلان بنا رہے ہیں۔ شام والی میٹنگ بھی اسی سلسلے میں ہے۔''

''کس قسم کا پلان ہے؟''

''نہیں۔'' وہ مسکرائی۔ ''یہ کونفیڈینشل ہے۔ کم از کم ابھی تو میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔''

میں نے زور دینا مناسب نہیں سمجھا۔ ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ ہم ایک ہی آرام دہ صوفے پر ایزی موڈ میں بیٹھے تھے۔ میں ہاف سلیو شرٹ میں تھا۔ وہ میرے بازو پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔ ''تمہیں ٹی وی اسکرین پر اور انٹرنیٹ وغیرہ پر سیکڑوں دفعہ دیکھا تھا لیکن کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ تمہیں اس طرح چھو کر دیکھ سکوں گی۔ تم اپنے اس دائیں بازو کا استعمال بہت زیادہ کیا کرتے ہو اور کبھی کبھی اس کہنی سے چوٹ بھی لگاتے ہو۔'' اس نے بازو کو پلٹ کر میری کہنی دیکھی۔ وہاں ایک براؤن نشان سا تھا، جیسے گٹا پڑ گیا ہو۔ یہ اسی وجہ سے تھا کہ میں ''ایم ایم اے'' کی فائٹس میں اس کہنی کو اکثر ضرب لگانے کے لیے استعمال کرتا تھا۔ (ہر فائٹر کا کوئی نہ کوئی پسندیدہ ہتھیار تو ہوتا ہے)

وہ بولی۔ ''دیکھا، میں ٹھیک کہہ رہی تھی نا؟ تمہاری کہنی یہاں سے براؤن اور سخت ہو چکی ہے۔'' پھر جیسے اسے اچانک کچھ یاد آیا۔ اس نے میری شرٹ کو پتلون میں سے کھینچا اور اسے اوپر اٹھا کر میرے پہلو کی پسلیوں کو دھیان سے دیکھنے لگی۔ میں اسے روکتا ہی رہ گیا۔ اس نے ایک جگہ انگلی رکھی اور بولی۔ ''دیکھ لو، میں نے ڈھونڈ لیا نا۔''

یہ ایک بہت ہلکا سا نشان تھا۔ ڈیڑھ دو انچ کی مدھم لکیر سی تھی۔ میں اسے خود بھی فراموش کر چکا تھا لیکن اسے سب یاد تھا۔ کہنے لگی۔ ''تمہاری فائٹ ہوئی تھی۔ کوئی یورپی فائٹر ہی تھا۔ ملک یاد نہیں مگر نام اب تک یاد ہے۔ انتھونی برک...... بڑی خوفناک فائٹ تھی وہ...... پورا رِنگ خوناں خون ہو گیا تھا۔ تمہیں یاد ہے نا؟''

''تھوڑا تھوڑا۔'' میں نے اندازِ بے نیازی سے کہا اور مسکرایا۔

وہ بولی۔ ''اب تم سپر اسٹار بننے کی کوشش کر رہے ہو لیکن...... تم ہو بھی سپر اسٹار۔ اب اس نشان کو ہی دیکھو، یہ سیکڑوں ہزاروں لوگوں کو یاد ہو گا اور وہ واقعہ بھی یاد ہو گا۔ تم وہ لڑائی پوائنٹس پر جیت گئے تھے۔ لڑائی ختم ہونے اور ٹرافی اٹھانے کے بعد تم رِنگ سے نیچے آئے تھے اور اس وقت تم پر انتھونی کے ایک پرستار نے قینچی سے حملہ کر دیا تھا، پھر اس کے دو تین ساتھی بھی تم پر چڑھ دوڑے تھے۔ تم نے ایک کی ناک کی ہڈی توڑ ڈالی تھی دیگر کو تمہارے

پرستاروں نے سنبھال لیا تھا، اچھا خاصا ہنگامہ ہوا تھا، کئی لوگ گرفتار ہوئے تھے۔‘‘

’’زبردست۔‘‘ میں نے تعریفی انداز میں سر ہلایا۔’’آپ تو پوری وکی پیڈیا ہیں۔‘‘

وہ ستائشی نظروں سے دیکھ کر بولی۔’’میں اکیلی نہیں، ہزاروں بلکہ لاکھوں ہوں گے جنہیں تم سے زیادہ تمہارا پتا ہوگا۔ میں کوئی ناجائز تعریف یا قصیدہ خوانی نہیں کر رہی ہوں۔ یہ حقیقت ہے ایسٹرن کہ تم لاکھوں دلوں کی دھڑکن ہو۔ شاید تمہیں خود بھی اپنی پذیرائی اور مقبولیت کا احساس نہیں۔ میں اب تک ٹھیک سے سمجھ نہیں پائی کہ تم کیوں بتدریج Ring سے نکلے ہو، دنگا فساد میں پڑے ہو اور اب ایم ایم اے کے میدان میں بالکل ہی دکھائی نہیں دے رہے ہو۔‘‘

’’چلو، یہاں تو دکھائی دے رہا ہوں۔‘‘ میں نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

’’اور یہ اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات ہے۔‘‘

’’چلیں، یہ کہانی بھی آپ کو جلد سناؤں گا بشرط زندگی۔‘‘

اس نے میرے زخمی کندھے والے بازو پر ہاتھ چلایا۔ انداز وہی کھویا کھویا سا تھا تب اس نے سائیڈ ٹیبل پر سے مارکر پین اٹھایا اور میرے بازو کے پلاستر پر لکھ دیا۔’’گیٹ ویل سون۔‘‘

’’یہ کیا غضب فرما رہی ہیں۔ آپ کی لکھائی آپ کے کمانڈر اور بزرگ اچھی طرح پہچانتے ہیں۔‘‘

’’تو پھر کیا ہوا۔ کسی کے صحت مند ہونے کی دعا کرنا، کیا کوئی بری بات ہے؟‘‘

’’لیکن جاماجی گرین فورس کی ’’سپریم کمانڈر‘‘ جب یہ دعا اپنے ہاتھ سے کسی پردیسی کے بازو پر لکھتی ہے تو پھر یہ بری بات ہو جاتی ہے شاید آپ کو احساس نہیں کہ آپ کے کمانڈرز اور آفیسرز ہمارے میل جول کا کتنا برا منا رہے ہیں۔‘‘

’’کیا تم سے کسی نے کچھ کہا ہے؟‘‘

میں کہنا چاہتا تھا کہ، ہاں ایسا ہوا ہے۔ (کمانڈر افغانی کے ساتھ میری جو دھواں دھار گفتگو ہوئی تھی، اس کا نکتہ آغاز، میرا اور قسطینا کا میل جول ہی تھا) لیکن میں افغانی کا نام لینا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے بات بدلتے ہوئے کہا۔’’میں نے آقا جان صاحب کی نظروں میں اپنے لیے کئی دفعہ بیگانگی اور غصہ دیکھا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ ہماری ہر ملاقات کی رپورٹ ان تک پہنچتی ہے اور ان کے اندر طیش جمع ہو رہا ہے۔‘‘

’’نہیں ایسٹرن! انکل آقا جان کے بارے میں کوئی منفی بات ذہن میں نہ لاؤ۔ وہ ہر

طرح سے اس خاندان کے وفادار ہیں...... اور اب سے نہیں مدتوں سے ہیں۔ ان کا ہر قدم بہتری اور بھلائی کے لیے ہی ہوتا ہے۔"

"قسطینا! میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ آقا جان پر اس طرح اندھا اور غیر مشروط اعتماد کیوں کیا جاتا ہے۔ آخر وہ بھی انسان ہیں اور انسان خطا کا پتلا ہے۔"

"مگر وہ سب سے بہتر ہیں۔"

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے اپنا ہاتھ قسطینا کے ہاتھ پر رکھا۔ "قسطینا! اگر میں یہ بات کہوں کہ آقا جان بہت سی باتوں سے آپ کو بھی بے خبر رکھ رہے ہیں اور یہ کہوں کہ ڈی پیلس میں جو نہایت سنگین صورتِ حال بنی ہوئی ہے، اس کی وجہ آقا جان ہیں تو پھر؟"

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ "کیسی بات کہہ رہے ہو؟ اور سنگین صورتِ حال سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

"زینب کی موت کی وجہ سے ابراہیم خود بھی موت کے منہ میں ہے۔ اگر اسے کچھ ہو جاتا ہے تو بیگم نورل بھی شاید زندہ نہیں رہ سکیں گی۔ چھوٹے بھائی کو کچھ ہو گیا تو بڑا بھائی بھی باپ سے باغی ہو جائے گا۔ عین جنگ کی حالت میں ڈی پیلس کا شیرازہ بکھر جائے گا۔"

"ابراہیم کی حالت سے انکل کا کیا تعلق؟"

"بے حد گہرا تعلق ہے قسطینا! لیکن آپ لوگ بے خبر ہیں۔ میں آپ کو اپنا سمجھ کر یہ باتیں آپ سے کہہ رہا ہوں۔ امید کرتا ہوں کہ آپ انہیں اپنے تک ہی رکھیں گی۔ اگر میں آپ پر یہ انکشاف کروں کہ ابراہیم کی دلہن زینب ابھی زندہ ہے...... تو پھر؟"

اس نے حیران ہو کر بیئر کے گلاس کی طرف دیکھا۔ جیسے جانچنا چاہ رہی ہو کہ میں کہیں کوئی اور کڑک چیز بہت زیادہ مقدار میں تو نہیں پی گیا پھر لرزاں لہجے میں بولی۔ "مجھے تمہاری بات سمجھ میں نہیں آ رہی شاہ زائب۔"

میں نے پہلے قسطینا کو رازداری کا پابند کیا، پھر تفصیل کے ساتھ سب کچھ اس کے گوش گزار کر دیا...... آدھی رات کے وقت زینب کا ابراہیم کے نام خط لکھنا...... بیگم نورل کا اسے کمانڈر افغانی کے حوالے کرنا...... اور پاکستان پہنچانے کی ہدایت کرنا، کمانڈر کو آقا جان کا حکم کہ زینب کو قتل کر دیا جائے۔ افغانی کی رحم دلی...... زینب کو نہ مارنا اور اس کی ہلاکت کا ڈھونگ رچانا...... میں نے سب کچھ قسطینا کے گوش گزار کر دیا۔ وہ حیرت سے گنگ سنتی رہی۔ اس کا چہرہ رنگ پر رنگ بدلتا رہا۔ لیکن اس ساری روداد کے آخر میں مجھے ایک بار پھر حیرت کا شدید دھچکا لگا۔ حالانکہ یہ بات واضح تھی کہ یہ سب کچھ آقا جان کے ایما پر ہوا ہے اور اس نے قسطینا

اور بیگم نورل وغیرہ کو زینب کے قتل کے حکم سے بے خبر رکھا ہے......قسطینا نے آقا جان کے بارے میں کسی منفی رائے کا اظہار نہیں کیا۔ اس نے جو فقرہ کہا وہ مجھے بہت برا لگا۔ اس نے کہا۔ ''شاہ زائب! یقین تو نہیں آرہا کہ انکل نے زینب کے لیے ایسا کرنے کو کہا ہوگا، لیکن اگر ایسا ہے تو پھر......ضرور اس میں کوئی نہ کوئی بہتری رہی ہوگی۔''

میں بھڑک اٹھا۔ ''قسطینا! آپ کا مطلب ہے کہ ایک بے گناہ لڑکی کو جو اس خاندان کی بہو بھی ہے، بے دردی سے مار دینے میں کوئی بہتری پوشیدہ ہے؟''

''انکل کی کئی باتیں فوری طور پر سمجھ میں نہیں آتیں شاہ زائب......''

''مجھے بھی آپ کی بات سمجھ میں نہیں آرہی، نہ فوری طور پر، نہ آئندہ آئے گی۔ میں نے آپ کو جو بتانا تھا بتا دیا ہے......میرا مطالبہ اس لڑکی کی سلامتی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔'' میں اٹھ کھڑا ہوا۔

قسطینا نے میری ناراضگی دیکھ کر رویہ بدلا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے واپس بٹھا لیا۔ ''پلیز شاہ زائب! جذباتی نہ بنو۔ میں اس سلسلے میں خود انکل سے بات کروں گی۔ واقعے کی تہ تک پہنچوں گی اور اگر ان سے کوئی غلطی ہوئی ہے تو پھر وہ اس سلسلے میں جواب دہ بھی ہوں گے۔''

''صرف جواب دہ؟''

''پلیز شاہ زائب! ابھی ہم کسی طرح کے اختلافی مسائل نہیں چھیڑ سکتے۔ تمہیں پتا نہیں کہ اصل صورتِ حال کیا ہے۔ فی الوقت ہماری ساری پلاننگ کا دارومدار ہمارے اندر کی ہم آہنگی اور یکسوئی میں ہے۔''

وہ دوسری بار کسی ''پلاننگ'' کا ذکر کر رہی تھی۔ میں نے اس سلسلے میں استفسار کیا تو وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر میری طرف دیکھنے لگی۔ جیسے سوچ رہی ہو کہ مجھے اس حوالے سے بتائے یا نہیں۔

اس نے وال کلاک کی طرف دیکھا۔ کمرے کے اندر ہی ایک چکر لگایا۔ پھر میرے پاس بیٹھتے ہوئے ڈرامائی انداز میں بولی۔ ''شاہ زائب! ہم قریباً 72 گھنٹے کے اندر اندر رائے زل پر فیصلہ کن حملہ کرنے جارہے ہیں۔ اپنی پوری طاقت کے ساتھ...... بری، فضائی اور پانی کی طرف سے بھی۔ یہ تخت یا تختے والی بات ہوگی۔''

میں نے تعجب سے قسطینا کی طرف دیکھا۔ اگلے چند منٹ میں اس نے جو تفصیل بتائی، وہ سمجھ میں آتی تھی۔ برج کلب پر نہایت کامیاب فضائی حملے نے رائے زل کی گرے فورس کو

بہت سے اہم کمانڈروں سے محروم کر دیا تھا۔ سپہ سالار چیف گیرٹ اسپتال میں پڑا تھا۔ ان کی ساری صف بندی درہم برہم تھی۔ قسطینا اور اس کے اہم کمانڈروں نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کا سوچا تھا...... اور جمعے کی رات نیوسٹی پر فل فلیج ہلا بولنے جا رہے تھے۔ اس حملے کے لیے جو کوڈ ورڈ استعمال کیا جا رہا تھا وہ ''درخت کاٹنے'' کا تھا۔ حملے کے وقت کو ٹی ٹائم کا نام دیا گیا تھا۔ اسی طرح مختلف کوڈ ورڈ تھے۔

یہ ایک سنسنی خیز پلاننگ تھی۔ اسے بیان کرتے ہوئے قسطینا کی بادامی رنگ آنکھوں میں شعلوں کا عکس تھا۔ اس موقع پر دیگر موضوعات پر گفتگو کرنا نامناسب ہی معلوم ہو رہا تھا۔ قسطینا سے رخصت ہوتے وقت میں نے اس سے بس دو باتیں ہی کہیں۔ ایک تو یہ کہ جب وہ آقا جان سے زینب کے متعلق کسی طرح کے سوال جواب کرے تو اس میں کمانڈر افغانی کا ذکر بالکل نہ آئے اور دوسری یہ کہ وہ زینب کو اپنی حفاظت اور تحویل میں لے لے۔

قسطینا نے میری یہ دونوں باتیں مان لیں۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ اس معاملے میں کمانڈر افغانی کا نام ہرگز زبان پر نہیں لائے گی۔ زینب کے حوالے سے وہ بولی۔ ''میں ایک دو گھنٹے میں اسے رازداری سے یہاں اپنے پاس لانے کا انتظام کرتی ہوں۔''

وقتِ رخصت حسبِ سابق اس نے الوداعی انداز میں میرے رخسار کو چوما۔ ہم کچھ دیر کے لیے ایک دوسرے کی بانہوں میں گم رہے، پھر میں باہر نکل آیا۔

ڈی پیلس پر اور اردگرد کی عمارتوں پر شام کے سائے طویل ہو رہے تھے۔ سمندر کی طرف سے چلنے والی ہوا میں پام کے بلند درخت جھومتے اور ڈگمگاتے محسوس ہوتے تھے۔ کمانڈر افغانی اور اس کے رضاکار دستوں نے ڈی پیلس کے وسیع و عریض احاطے میں مستقل ڈیرے جما رکھے تھے۔ وہ وقفے وقفے سے عزت مآب کے حق میں نعرے لگاتے رہتے تھے۔ اس وقت بھی وہ بڑے جوش و خروش سے پریڈ میں حصہ لے رہے تھے۔ ایک فوجی افسر نے بڑی ستائشی نظروں سے میری جانب دیکھا۔ نہ جانے کیوں مجھے شبہ ہو رہا تھا کہ خاص خاص لوگوں کو پتا چل گیا ہے کہ میں ''ایم ایم اے'' کا ایک جانا پہچانا فائٹر بھی ہوں۔

میں انیکسی سے کافی دور تھا جب میری نظر ڈی پیلس کے مرکزی باغیچے کی طرف اٹھ گئی۔ میں نے دراز قد جاناں کو ایک فوارے کے پاس کھڑے دیکھا۔ اس کے لمبے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ وہ اپنے پسندیدہ لباس، یعنی ساڑی میں تھی۔ درمیانی فاصلہ کافی تھا، پھر بھی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ میری ہی طرف دیکھ رہی ہے۔ شاید اس نے مجھے قسطینا کی طرف جاتے اور وہاں سے آتے بھی دیکھا تھا۔ ان لمحوں میں وہ اداسی کی تصویر نظر آئی۔ جیسے خاموشی

کی زبان میں کہہ رہی ہو...... تمہاری اڑان بہت اونچی ہے، میں تم تک نہیں پہنچ سکتی، ہاں جو وقت تم مجھے دیتے ہو، وہی میرے لیے بہت غنیمت ہے۔

وہ میری جانب آنا چاہ رہی تھی لیکن اسی دوران میں ایک طرف سے سیفی نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں لڈو کا ڈبا تھا۔ اس نے لڈو میری طرف بڑھائے اور ٹھیٹ پنجابی انداز میں بولا۔

''لو جی استاد جی...... منہ میٹھا کرو۔ اصلی بوندی کے لڈو ہیں...... ہمارے دیہات میں یہی زیادہ چلتے ہیں۔''

''لیکن کس خوشی میں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''دو خوشیاں ہیں بادشاہو۔ پہلی تو یہ کہ میرا بچ بچاؤ ہو گیا۔ اگر قالین کو واقعی آگ لگ جاتی اور میں غسل خانے میں غسل فرماتا رہتا تو یقیناً کبڈی کے کھیل کو ایک بہت بڑے کھلاڑی سے ہاتھ دھونے پڑتے......''

''اور دوسری خوشی؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ کی دعا سے آپ کے اس نالائق شاگرد کو وردی مل گئی ہے۔ پرسوں جو مشقیں ہوئی تھیں، اس میں میرا ''کام'' دیکھ کر کمانڈر صاحب نے مجھے باقاعدہ لشکری بنا دیا ہے اور دس بندوں کی ایک ٹولی میرے انڈر کی ہے۔ مجھے پوری امید ہے کہ اس دفعہ میں لڑائی میں واقعی حصہ لے سکوں گا۔''

وہ بہت پُر جوش نظر آ رہا تھا۔ ایکشن اور سنسنی خیزی کا رسیا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے نزدیک یہ کفر اور اسلام کی لڑائی بھی تھی اور یہ بات مکمل نہیں تو کسی حد تک درست بھی تھی۔ بے شک نیوسٹی میں بھی اکثریت مسلمانوں کی ہی تھی لیکن وہاں دوسرے مذاہب کے لوگ بھی کافی تعداد میں موجود تھے۔ اس کے علاوہ امریکی ایجنسی سے گٹھ جوڑ کرنے کے بعد یہ نیوسٹی والے مکمل طور پر غیر مسلموں کے آلۂ کار بن گئے تھے۔ ایک طرح سے وہ باہمی دشمنی میں اندھے ہو کر جزیرے پر امریکن تسلط کی راہ ہموار کر رہے تھے۔

سیفی سے بات کرتے کرتے میں انیکسی تک پہنچ گیا۔ مڑ کر دیکھا، اب جاناں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں میرا دل چاہتا تھا کہ سنبل اور جاناں وغیرہ یہاں سے واپس پاکستان چلی جائیں۔ یہاں کے حالات نازک سے نازک تر ہو رہے تھے اور خبر نہیں تھی کہ آئندہ کیا اودھم مچنا ہے۔ سنبل بھی ابھی تک عزت مآب کی منظورِ نظر تھی لیکن یہ سچویشن کسی بھی صورت زیادہ دیر چلنے والی نہیں تھی۔ عزت مآب بھونرا صفت تھا۔ عنقریب کوئی اور پری چہرہ اس کی تنہائی کا ساتھی بن سکتا تھا۔ بلکہ مجھے کچھ ایسی اطلاع مل بھی رہی تھی۔ ایک انڈین لڑکی

جو بے مثال رقاصہ بھی تھی، بڑی تیزی سے عزت مآب کے قریب آ رہی تھی۔ عزت مآب شاید جلد ہی اسے اپنی خواصوں میں شامل کرنے والا تھا۔ اس عمل کو یہ لوگ ''ملازم رکھنا'' کہتے تھے۔

میں اپنے کمرے میں پہنچا ہی تھا کہ میرے سیل فون کی بیل ہونے لگی۔ میرا اندازہ تھا کہ یہ قسطینا ہوگی لیکن جب اسکرین دیکھی تو یہ جاناں کی کال تھی۔ میرے ریسیو کرنے سے پہلے ہی بیل خاموش ہو گئی۔ میں فون آف کر کے جیب میں رکھ رہا تھا جب اچانک قسطینا کا خیال آیا۔ وہ یقیناً ابھی اسی کمرے میں موجود تھی جہاں میرے اسپائی کیمرے نے گھات لگا رکھی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے ہم دونوں اسی کمرے میں موجود تھے۔ میں نے چند بٹن پریس کر کے سیل فون کو ''ویڈیو ریسیور'' کی شکل دے دی۔ دو چار سیکنڈ بعد قسطینا کے ریٹائرنگ روم کا منظر اسکرین پر ابھرا۔ میرا اندازہ درست تھا، وہ ابھی تک وہیں تھی۔ صوفے پر نیم دراز تھی۔ میرے سینے میں خوشگوار دھڑکنیں جاگیں...... وہ بڑے رومانی موڈ میں تھی۔ میڈونا کا گیت مدھم آواز میں گونج رہا تھا۔ قسطینا کے ہاتھ میں وہی پوسٹر تھا جو ایک روز پہلے ہی اس نے مجھے دکھایا تھا۔ اس پر میری ہی تصویر تھی۔ وہ بڑے پُرشوق انداز میں تصویر کو دیکھ رہی تھی، اس نے اپنا نچلا ہونٹ ہولے سے اپنے دانتوں تلے دبایا ہوا تھا پھر اس نے پوسٹر میں میرے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور چند سیکنڈ کے لیے چادر کی طرح پوسٹر کو اوڑھ لیا۔ یہی وقت تھا جب اس کے دو سیل فونز کی گھنٹیاں ایک ساتھ بجنے لگیں۔ وہ اٹھ بیٹھی، ایک دم ہی ایک نوجوان دوشیزہ سے ایک سنجیدہ و ذمے دار سالار نظر آنے لگی۔

اس نے ایک فون کی کال ریجیکٹ کی اور دوسرے کی وصول کرتے ہوئے اپنی قدرے بھاری آواز میں بولی۔ ''ہیلو حلمی، تیاری کی کیا صورتِ حال ہے؟''

جواب میں حلمی نے جو کچھ کہا، وہ میرے کانوں تک نہیں پہنچا۔ جواب میں قسطینا کی مدھم آواز نے میری سماعت تک رسائی حاصل کی۔ وہ بولی۔ ''ٹھیک ہے حلمی صاحب، مگر ایک بات یاد رہے، ہم نے اس حملے میں تحیر کا عنصر ہر صورت میں شامل رکھنا ہے۔ یہ حملہ جتنا اچانک ہوگا اتنا ہی کامیاب ہوگا۔ آپ بڑے افسروں کو تو پوری معلومات دیں مگر چھوٹے ''رینکس'' کو ابھی ان معلومات سے فاصلے پر رکھیں......''

وہ بات کرتے کرتے چند فٹ آگے نکل گئی۔ اس کی تصویر اوجھل ہو گئی اور آڈیو بھی اتنی مدھم ہو گئی کہ سنی نہیں جا رہی تھی۔ میں نے اپنے اسپائی کیمرے کی بیٹری چیک کی۔ وہ اب بھی تین روز تک مجھے مسلسل سگنل فراہم کر سکتا تھا۔ میں سلسلہ منقطع کر کے بستر پر دراز ہو گیا اور خود

کو قسطینا کے دلکش خیال میں الجھانے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے بہت کوشش کی، اس کے باوجود ''سجن پیارا'' کے الفاظ گاہے بگاہے میری نگاہوں میں چمکتے رہے...... سجن پیارا۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ یہ کچھ جانی پہچانی سی دستک تھی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے جاناں کھڑی تھی۔ وہ پھولدار ساڑی میں تھی۔ اس میں گلابی زرد اور سرخ رنگ نمایاں تھا۔ خوشبو کے ایک جھونکے کی طرح وہ اندر آ گئی۔ اب تک وہ ''زینب کی موت'' کے صدمے سے کافی حد تک سنبھل چکی تھی۔ آج وہ کچھ عجیب سے موڈ کے ساتھ آئی تھی۔ میری طرف نگاہِ غلط انداز سے دیکھ کر بولی۔ ''آج کل بہت مصروف ہو گئے ہیں آپ؟ بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ نظر آتے ہیں۔''

میں سمجھ گیا کہ وہ قسطینا کی بات کر رہی ہے۔ میں نے کہا۔ ''میرے اور تمہارے درمیان کسی طرح کا عہد و پیمان نہیں ہے جاناں، ہم دونوں ہر طرح آزاد ہیں۔''

''آپ صرف اپنی بات کریں تو بہتر ہے شاہ زیب! آپ واقعی آزاد ہیں۔ لیکن اب میں بھی آزاد ہونے کا سوچ رہی ہوں، میری غلامی...... آپ کو تکلیف دیتی ہے نا۔''

''کیسی باتیں کرتی ہو، ہم میں سے کوئی آقا یا غلام نہیں ہے۔ تم کسی وقت بہت زیادہ جذباتی ہو جاتی ہو۔ عجیب رویے کا مظاہرہ کرتی ہو۔''

''اب نہیں کروں گی شاہ زیب...... لیکن اس کے بدلے آپ کو مجھے کچھ دینا ہو گا۔''

''کیا؟''

وہ انوکھے انداز میں بولی۔ ''اپنی قیمتی زندگی میں سے صرف دو دن...... یعنی اڑتالیس گھنٹے۔ میں یہاں اپنے آخری اڑتالیس گھنٹے آپ کے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں، اس کے بعد میں پاکستان واپس چلی جاؤں گی۔ میں نے میڈم لورین سے بات کر لی ہے۔ انہوں نے بمشکل مجھے اپنی خدمت سے فارغ کیا ہے۔ میں نے ان کے لیے چار پانچ اچھے ناولز کی آڈیو ریکارڈنگ کر دی ہے جب تک انہیں کوئی اور مناسب ''ریڈر'' نہیں مل جاتی، ان کا گزارا ہو جائے گا۔''

میں نے ذرا چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر سچائی کی جھلک تھی۔ یہ جھلک میرے لیے دلی اطمینان کا باعث بنی۔ یہ میری دلی خواہش تھی کہ وہ عافیت سے واپس چلی جائے۔ میں نے اسے آفر کی تھی کہ میں اسے لاہور سے دور کراچی میں ایک محفوظ پناہ گاہ فراہم کر سکتا ہوں۔

''اڑتالیس گھنٹے والی شرط نے آپ کو پریشان تو نہیں کیا؟'' وہ میری طرف دیکھ کر معنی

خیز انداز میں بولی۔

اس کے انداز نے مجھے سب سمجھا دیا تھا۔ میں اس کی شرط ماننے سے انکار نہیں کر سکا۔ اس کی شخصیت میں بہت کچھ یکجا ہو گیا تھا۔ وہ بے چاری بھی تھی اور چارہ گر بھی۔ سوالی بھی تھی اور سخی بھی...... بہت کمزور بھی اور طاقتور بھی۔ یا شاید اس کی کمزوری اور بے چارگی ہی میرے لیے اس کی طاقت بن گئی تھی۔ وہ ان یادگار لمحوں کی اسیر تھی جب میں نے اس کی زندگی بچائی تھی اور وہ خود اسیر ہو کر بھی کامیابی سے مجھ پر اپنی قربت کا جال پھینک لیتی تھی۔ اب بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

وہ ایک یادگار رات تھی۔ نہ جانے جاناں کو بھی کیسے معلوم تھا کہ آج میری سالگرہ کا دن ہے۔ غالباً اس نے میرا نیا پاسپورٹ یا آئی ڈی کارڈ وغیرہ دیکھا تھا۔ بادل تو شام سے ہی منڈلا رہے تھے تاہم نو بجے تک گھنگور گھٹائیں چھا گئیں اور موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ یہ جزیرے کی بارش تھی، اور ایسی بارشیں جل تھل ایک کر دیتی ہیں۔ ایک بار آسمان سے پانی برسنا شروع ہوا تو برستا ہی چلا گیا۔ لوگ شام کے فوراً بعد ہی اپنی اپنی جگہوں پر قید ہو کر رہ گئے۔ جاناں نے کہا۔ ''میں آج آپ کو اپنے ہاتھ سے پکا کر کھلانا کھلانا چاہتی ہوں۔ ایسے موسم میں آپ کیا کھانا پسند کریں گے؟''

''میں تو باہر کی ہوا کھانا پسند کرتا، لیکن مجھے پتا ہے کہ تمہارے اڑتالیس گھنٹے شروع ہو چکے ہیں اور تم مجھے باہر نہیں نکلنے دو گی۔''

وہ مسکرائی۔ ''یہ بات تو بالکل سچ ہے۔ چلیں میں آپ کے لیے چکن والے پکوڑے بناتی ہوں اور ساتھ میں گرما گرم چائے۔''

''لیکن بات یہ ہے کہ......''

اس نے میرے ہونٹوں پر اپنا خوشبودار نرم ہاتھ رکھ دیا۔ ''نہیں، ان دو دنوں میں میری مرضی چلے گی اور میرا ہی مینیو۔''

''تو پھر مجھ سے پوچھا کیوں تھا؟...... اچھا چلو ٹھیک ہے...... چکن پکوڑے ہی بناؤ لیکن ذرا زیادہ بنانا۔ انیق اور وہ پیٹو سیفی بھی شامل ہوں گے۔''

''وہ دونوں میرے بارے میں کیا جانتے ہیں؟'' وہ ذرا شوخی سے بولی۔

''انہیں سب پتا ہے۔ تم آقا جان کی بیوی میڈم لورین کو انگلش ناولز پڑھ کر سناتی ہو اور کبھی کبھی ان کی ٹانگیں بھی دباتی ہو۔ اس کے علاوہ میری منہ بولی بیوی ہو...... اور وقتاً فو قتاً یہاں انیکسی میں مجھے یہاں اپنا ''اسٹیٹس'' یاد دلانے کے لیے آتی رہتی ہو۔''

''مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' وہ ادا سے بولی اور اپنی ساڑی کے پلو کو اپنی پتلی کمر کے گرد اچھی طرح لپیٹ کر کچن کی طرف چلی گئی۔ (یہ وہی اٹیچڈ کچن تھا جس کے فریزر میں دو روز تک دو ہیجڑے پڑے رہے تھے۔ ایک زندہ اور دوسرا لاش کی صورت میں۔ بہرحال اب وہاں بہت اچھی صفائی کی جا چکی تھی) جاناں کی ہدایت پر ایک باورچی نے فوراً ضروری اشیا فراہم کر دیں اور جاناں نے شتابی سے ہاتھ چلا کر ایک ہی گھنٹے میں چکن پکوڑے، سبزی رول اور سموسے تیار کر لیے۔ انیق اور سیفی بھی اس ''ڈنر کم ٹی'' میں شریک ہوئے اور گرجتی چمکتی بارش کا لطف بھی اٹھایا۔

بیڈ روم میں تنہائی ملتے ہی جاناں کسی ریشمی تھان کی طرح کھلتی چلی گئی۔ اس کے طویل بال ایک آبشار کی صورت میں تھے اور ایسی ہی درجنوں آبشاریں کھڑکیوں سے باہر بارش کے پانی کی صورت گر رہی تھیں۔ بجلی چمکتی تھی تو لمحے بھر کے لیے پام کے جھومتے درخت اور ڈی پیلس کی بلند برجیاں روشنی میں نہا کر نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی تھیں۔ وہ میرے بہت قریب تھی، اس کے ہونٹ کا تل مجھ سے بس چند انچ کی دوری پر تھا اور یہ تل نہیں تھا، یہ سوئی چبھونے کا وہ نشان تھا جو اس نے اپنے خون سے رومانی نظم لکھنے کے لیے بنایا تھا۔

میں اسے کیسے بھلا دوں
وہ تو میری رگ رگ میں بس چکا ہے
میں برف کے اندھیرے گھر میں تھی
اور پل پل ختم ہو رہی تھی میری زندگی......

وہ جذبے کی شدت کے ساتھ میری آغوش میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں زخمی سپاہی ہوں، ایک بازو والا۔ ڈاکٹر حضرات مجھے مکمل آرام کا مشورہ دے رہے ہیں۔''

''تو پھر کیا ہوا؟'' وہ حوصلے سے بولی۔ ''سب کچھ جسموں کا کھیل ہی تو نہیں ہوتا۔ آپ کے پاس رہنا...... آپ کو محسوس کرنا...... آپ کے ساتھ کچھ وقت گزارنا، یہی میرے لیے کافی ہے۔''

کسی محبت کرنے والی بلی کی طرح اس نے اپنا سر میرے بازو سے رگڑا۔ ہم باتیں کرتے رہے۔ اس نے بتایا کہ اس نے بیگم نورل سے درخواست کی تھی اور انہوں نے کمال مہربانی کا ثبوت دیتے ہوئے اس کی واپسی کا انتظام کر دیا ہے۔ اس نے بتایا کہ ہفتے کی صبح عزت مآب ریان فردوس کی ایک حاملہ خواص ہیلی کاپٹر کے ذریعے برونائی جائے گی۔ دو

لیڈی ڈاکٹرز بھی ساتھ ہوں گی۔ اسی ہیلی کاپٹر میں وہ بھی برونائی پہنچے گی اور وہاں دو روز رکنے کے بعد پاکستان روانہ ہو جائے گی۔

میڈم لورین اور بیگم نورل نے اسے کچھ تحفے بھی دیئے تھے۔ اس نے اپنے پرس میں سے کچھ جیولری نکال کر مجھے دکھائی۔ قیمتی جیولری تھی، ایک ہار میں روبی کے نفیس ٹکڑے جڑے ہوئے تھے۔ ایک جڑاؤ انگوٹھی اس کی انگلی میں تھی۔

اس نے جو کچھ بتایا، اس میں ایک بات تھوڑی سی پریشان کن تھی۔ وہ اپنی روانگی کا وقت ہفتے کی صبح بتا رہی تھی اور مجھ تک قسطینا کی زبانی جو ٹاپ سیکرٹ معلومات پہنچی تھیں، ان کے مطابق جمعرات اور جمعہ کی درمیانی شب نیوسٹی پر زوردار حملے کا امکان تھا۔ کئی دفعہ بندے کے ذہن میں کوئی سوال ابھرتا ہے اور اس کا جواب بھی فوراً ہی آ جاتا ہے۔ میرے فون پر کال کے سگنل آئے۔ یہ قسطینا کی کال تھی۔ ذرا دیر تذبذب میں رہنے کے بعد میں نے کال ریسیو کی۔ وہ بولی۔ ''ہیلو شاہ زائب! کیا ہو رہا ہے اس خوب صورت موسم میں؟''

اگر میں اسے بتا دیتا کہ کیا ہو رہا ہے تو یقیناً وہ بہت بدمزہ ہوتی۔ میں نے بس اتنا کہا۔ ''موسم انجوائے ہو رہا ہے۔''

اس نے کہا۔ ''یہاں جب اس طرح کی بارش ہوتی ہے تو جلدی ختم نہیں ہوتی۔ مجھے تو اب ''درخت کاٹنے'' والا پروگرام بھی آگے جاتا لگ رہا ہے۔ صبح تک بارش رک بھی جائے تو ایک دو دن تو مزید انتظار کرنا پڑے گا۔''

''یہ تو پھر اَپ سیٹ ہوا۔''

''نہیں، ہر کام میں کوئی نہ کوئی بہتری ہوتی ہے۔ اگر ''کٹائی'' کے دوران میں موسم ایسا ہو جاتا تو زیادہ مشکل ہوتی۔''

کچھ دیر اِدھر اُدھر کی بات کر کے اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس دوران میں جاناں دم سادھے بالکل ساکت ایک کونے میں بیٹھی رہی۔ جیسے اسے ڈر ہو کہ اس نے اونچی سانس بھی لی تو کمرے میں اس کی موجودگی کا پتا چل جائے گا۔

میں نے کہا۔ ''اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ سب جانتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہماری آج کی ملاقات کا پتا بھی اسے چل جائے۔ وہ بہت باخبر ہے۔ آخر کو سپریم کمانڈر ہے یہاں کی۔''

جاناں کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی بولی۔ ''کمانڈر کی حیثیت سے اسے پتا چل جائے تو کوئی بات نہیں۔ لیکن آپ کی سہیلی کی حیثیت سے پتا چلے تو اچھی بات نہیں

ہے۔"

"تم کچھ زیادہ ہی غلط فہمی کا شکار نہیں ہو رہی ہو؟"

"آپ کا مطلب ہے، تھوڑی بہت غلط فہمی کی گنجائش موجود ہے۔" وہ مسکرائی اور اس کے گداز ہونٹ کا تل نما نشان مزید واضح ہو گیا۔

میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس نے اپنے ہاتھوں کا استعمال کیے بغیر میرے ہونٹوں کو بند کر دیا۔ وہ اس سہانے موسم کو اور ان "قیمتی گھڑیوں" کو فضول کی بحث و تکرار میں کھونا نہیں چاہتی تھی۔

یک لخت بادل زور سے گرجے۔ یوں لگا کہ اچانک سیکڑوں من بارود کی بارش ہو گئی ہے۔ وہ بے ساختہ مجھ سے پیوست ہو گئی۔ شاید روزِ ازل سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ رات کی تاریکیوں میں جب جب آسمان سے پانی برسا ہے، جب جب بجلی کڑکی ہے اور بوچھاڑیں تیز ہوئی ہیں، مرد و زن کی قربت بڑھی ہے۔ ان کے دلوں میں ترنگ کی شدت میں اضافہ ہوا ہے۔

ابھی کچھ دیر پہلے اس نے بڑی سادگی سے کہا تھا کہ میرے قریب رہنا اور میرے ساتھ کچھ وقت گزارنا ہی اس کے لیے غنیمت ہے لیکن میں جانتا تھا کہ دل و دماغ کے کچھ اپنے تقاضے بھی ہوتے ہیں...... اور "میزبانی" کے بھی کچھ آداب بیان کیے جاتے ہیں۔ میں اس کے قریب تر ہوتا گیا......

یہ رات کا پچھلا پہر تھا۔ وہ میرے بازو پر سر رکھے لیٹی تھی۔ کمرے میں نیلگوں بلب کی بہت مدھم روشنی تھی۔ کھڑکیوں سے باہر بارش کی لے کبھی تیز اور کبھی مدھم ہو جاتی تھی۔ میں نے کہا۔ "کراچی چلی جاؤ تو بہتر ہے۔ وہاں میرے جاننے والے موجود ہیں۔ تم کسی بھی حوالے سے ان سے مدد مانگ سکتی ہو۔"

وہ بولی۔ "میرا اپنا ارادہ بھی کراچی کا ہی ہے۔ انسپکٹر قیصر، پاشا اور وریام جیسے لوگوں سے جتنا دور رہوں گی، اتنا ہی میرے لیے بہتر ہے۔ یہ لوگ انسانوں کی کھال میں جانور ہیں اور عورت کے لیے تو سراسر بھیڑیے ہیں۔"

"تمہیں اب ان بھیڑیوں سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں اب تمہارے ساتھ ہوں جاناں۔"

"آپ ساتھ کہاں ہیں؟ آپ تو یہاں ہیں...... بلکہ "بہت زیادہ" یہاں ہیں۔" وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

''لیکن یہ عارضی قیام ہے۔ مجھے بہت جلد پاکستان واپس پہنچنا ہے۔''
''تو پھر ابھی کیوں نہیں چلے جاتے، یہ لوگ اپنی لڑائی خود ہی لڑ لیں گے۔ آپ تو زینب کے لیے یہاں تھے نا۔ اور اب وہ بے چاری اس دنیا میں نہیں رہی......''
میں اسے کیسے بتاتا کہ وہ اس دنیا میں ہی ہے...... بلکہ ایک ساتھ والے کمرے میں موجود ہے اور اس کے اردگرد بہت سے خطرات منڈلا رہے ہیں۔ میں نے بات بدلتے ہوئے کہا۔ ''بیگم نورل اور ابراہیم وغیرہ کے لیے ان جابر امریکیوں سے ٹکر لینا بھی تو عین ثواب کا کام ہے......اور پھر سجاول کو بھی ڈھونڈنا ہے۔ کیا ہم اسی طرح اسے یہاں لاپتا چھوڑ کر جا سکتے ہیں؟''
وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ ''ٹھیک ہے۔ میں آپ کا انتظار کروں گی کراچی میں۔''
میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ ''کراچی تمہارے لیے اس لحاظ سے بھی بہتر ہے کہ وہ کمرشلز اور ٹی وی پروڈکشنز کا مرکز ہے۔ وہاں تمہیں اپنا شوق پورا کرنے کا بھرپور موقع مل سکتا ہے۔''
''لیکن میں یہ شوق پورا کروں گی تو قیصر اور پاشا جیسے بے رحم لوگوں کو ''اپنا شوق'' پورا کرنے کا موقع مل جائے گا۔ وہ مجھے ڈھونڈنے میں زیادہ دیر نہیں لگائیں گے۔'' پھر وہ ذرا توقف سے بولی۔ ''میں اپنا شوق پورا کرنے کے لیے، آپ کی واپسی کا انتظار کروں گی۔''
''او کے۔'' میں نے کہا۔
اس نے ایک بار پھر خود کو میری بانہوں میں گم کر دیا۔
رات بھر کی تابڑ توڑ بارش کے باوجود اگلا دن بھی بارش سے خالی نہیں تھا۔ ہوا چلتی تھی، بادل گھر کر آتے تھے، اندھیرا گہرا ہو جاتا تھا اور دھیمی پڑتی بارش پھر زور پکڑ لیتی تھی۔ زندگی جیسے جہاں کی تہاں ساکت ہو کر رہ گئی تھی۔ ڈی پیلس کے احاطے کے اندر اور باہر ہزاروں رضاکار موجود تھے۔ ان میں سے کچھ نے تو ڈی پیلس کے طویل طویل برآمدوں اور شیڈز میں پناہ لے لی تھی اور بہت سے ایسے بھی تھے جنہوں نے احاطے میں خیمے گاڑ رکھے تھے۔ یہ سب کے سب لوگ عزت مآب ریان فردوس کے خاندان کے وفادار تھے اور ریان فردوس کو دوبارہ پوری آن بان کے ساتھ یہاں کا مالک و مختار دیکھنا چاہتے تھے۔
جاناں بہت خوش تھی۔ ایک خوشی اسے اس بات کی بھی تھی کہ آج کا سارا دن اور پھر رات بھی اس کی تھی۔ انیکسی میں بہترین خانساماں کے علاوہ کئی ملازم بھی موجود تھے، لیکن

جاناں نے آج پھر اپنے ہاتھ سے دو تین ڈشز بنائیں اور اشتیاق سے مجھے اور انیق وغیرہ کو کھلائیں۔ ایک اچھی بات آج یہ ہوئی تھی کہ صبح منہ اندھیرے ہی پروگرام کے مطابق قسطینا نے اپنی قریبی دوست ڈاکٹر ماریہ اور اپنے دو ذاتی محافظوں کو ٹیکسی میں بھیجا تھا۔ ڈاکٹر ماریہ کمرے کے باہر والے دروازے سے زینب کے پاس پہنچی تھی، انیق نے زینب کو اس صورتِ حال کے لیے پہلے ہی مکمل تیار کر لیا تھا۔ زینب ایک چادر پوش پردہ دار عورت کی حیثیت سے ڈاکٹر ماریہ اور محافظوں کے ساتھ قسطینا کی تحویل میں پہنچ گئی تھی۔

دوپہر کے کچھ ہی دیر بعد بارش نے ایک بار پھر زور پکڑ لیا۔ یوں لگتا تھا کہ گہری شام ہو گئی ہے۔ ہریالی اور نباتات سے لدا ہوا یہ جزیرہ ہر طرف سے سمندری اور بارشی پانی کے نرغے میں تھا۔ ایک عجیب رومانی سا ماحول بنا ہوا تھا۔ جاناں نے مدھم آواز میں میوزک آن کر دیا۔ وہ اچھی موسیقی کے ساتھ ساتھ اچھی شاعری کی بھی شوقین تھی۔ سجاول کے ڈیرے پر بھی میں نے اسے بڑے انہماک سے ریڈیو پر پاکستانی اور انڈین گانے اور غزلیں سنتے دیکھا تھا۔

بے شک وہ ایک کچلی مسلی ہوئی لڑکی تھی۔ اس پر جھپٹنے والوں نے اسے مسمار کر کے رکھ دیا تھا مگر اس کے اندر کی رومانیت کو مسمار نہیں کر سکے تھے۔ اس کی یہی رومانیت اس کی توانائی تھی اور اسے بہت آگے بھی لے جا سکتی تھی۔ اس کی دلکشی، اس کا لمبا نازک بدن، آبشار جیسے بال اور رقص وغیرہ میں مہارت، یہ سب اس کے لیے آگے بڑھنے میں معاون عناصر تھے۔ یہ رات بھی پچھلی رات کا مکمل "ری پلے" تھی، مگر نصف شب کے کچھ دیر بعد یہ وہ اداس نظر آنا شروع ہو گئی۔ کچھ کھوئی کھوئی کچھ پریشان...... میں اس کی اس کیفیت کی وجہ کچھ کچھ سمجھ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ اب تم رومانی "موڈ" سے نکل کر سفر کے "موڈ" میں آتی جا رہی ہو۔"

"سفر پر نکلنا بھی تو ایک رومان ہی ہوتا ہے۔ بڑے بڑے شعر کہے گئے ہیں اس موقع کے لیے......

سفر کی شام بھی کیسی اداسی لے کے آتی ہے
جو رک جاؤں تو رسوائی، جو چلتا ہوں جدائی ہے

وغیرہ......"

اچانک میں بری طرح چونکا۔ مجھے ایک باریک سیٹی کی سی آواز دروازے کی طرف سے سنائی دی تھی۔ میں اٹھا اور بستر سے نیچے قدم رکھا۔ ایک تیز بو نتھنوں میں گھسی۔ یک دم

گلے میں پھندا سا لگ گیا۔ میں نے دروازے کی نچلی درز کی طرف دیکھا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ وہاں سے کوئی نہایت سریع الاثر اور بے رنگ گیس تیزی سے اندر داخل ہوئی ہے۔ میں نے سانس روک لی اور سائیڈ ٹیبل سے اپنا لوڈڈ پستول نکالا۔ یہی وقت تھا جب میرے کانوں میں جاناں کے کھانسنے کی تیز آواز آئی۔ وہ پہلو کے بل بستر پر گر گئی تھی۔ جو سانس سینے سے نکل گئی تھی، وہ اب واپس نہیں جا رہی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا گلا تھاما ہوا تھا۔ میں دروازے کی طرف لپکا۔ مگر جو گیس سانس روکنے سے پہلے سینے میں بھر گئی تھی وہ اپنا کام دکھا رہی تھی۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھانے لگا۔ میرا ہاتھ ابھی دروازے کے ہینڈل سے دور تھا کہ نگاہیں دھندلا گئیں۔ میرے دل سے آواز آئی......شاہ زیب! تم ایک سنگین صورتِ حال کا شکار ہوئے ہو اور اب بے ہوش ہو کر قالین پر گر رہے ہو۔ پھر میرا سر اور جسم کسی سخت چیز سے ٹکرایا اور میں مکمل اندھیرے میں ڈوب گیا۔

O......❖......O

یہ کون سی جگہ تھی۔ میں کہاں تھا؟ مجھے ہلکی سردی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ بے ہوشی اور غنودگی کی کوئی درمیانی کیفیت تھی۔ مجھے لگا کہ میں پنجاب کے کسی گاؤں میں ہوں۔ فصلوں اور مٹی کی بھینی خوشبو میرے نتھنوں میں گھس رہی ہے۔ تاجور مجھ پر جھکی ہوئی ہے۔ اپنے گرم ہاتھ سے میری سرد پیشانی سہلا رہی ہے۔ بڑی محبت سے مجھے پکار رہی ہے......شاہ زیب! مجھے یقین تھا، تم واپس آؤ گے۔ ہمارے درمیان جو دوری ہے وہ ختم ہو جائے گی...... غلط فہمیاں نہیں رہیں گی......

پھر مجھے محسوس ہوا کہ پہلوان حشمت کی آواز میری کانوں سے ٹکرائی ہے۔ وہ کہہ رہا ہے۔ ”یہ کیا ڈاکٹری پلستر چڑھا لیا ہے تم نے اپنے بازو پر؟ میں چار دن مالش کروں گا سب ٹھیک ہو جاوے گا۔ ہمارے گاؤں کا تو پانی ہی پیتے رہو تو سارے روگ دور ہو جاوت ہیں، کیوں تاجور؟“

تاجور نے اثبات میں جواب دیا......اور میرے اوپر جھکتے ہوئے بولی۔ ”یہ دیکھو...... یہ ہوش میں آ رہے ہیں۔“ میرے اوپر جھکنے سے اس کی دونوں لٹیں میرے چہرے کو چھونے لگیں۔ لیکن......لیکن تاجور کی آواز کچھ بدلی بدلی تھی اور یہ شاید بالوں کی لٹیں بھی نہیں تھیں نہ پہلوان حشمت تھا، نہ ہی وہ کسی سنہری گاؤں کی رنگین حویلی تھی۔ میرے سامنے چوڑی ناک والی ایک ہٹی کٹی حبشن بیٹھی تھی۔ وہ مجھے ہوش میں لانے کے لیے کچھ سنگھا رہی تھی۔ شاید ”کورامین“ قسم کی کوئی شے تھی۔ پہلوان حشمت کی جگہ ایک دبلا پتلا ملائیشین، جس کے

بارے میں بعدازاں پتا چلا کہ ڈاکٹر ہے جو میرے بازو کو ہلا جلا کر دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہلانے سے ہر بار میرے کندھے میں ناقابلِ بیان ٹیس اٹھتی تھی۔

اچانک مجھے سب کچھ یاد آ گیا۔ میں نے تیزی سے اٹھنے کی کوشش کی تب مجھے پتا چلا کہ میری گردن میں ایک رسّی ہے جس کا دوسرا سرا لکڑی کے ایک ''پلر'' سے بندھا ہوا ہے۔ میں جس فرش پر لیٹا تھا، وہ بھی لکڑی کا ہی تھا۔ میرے جسم پر ایک ٹراؤزر تھا اور یہ وہی ٹراؤزر تھا جو میں نے اپنے کمرے میں پہنا ہوا تھا۔ بالائی بدن عریاں تھا اور یہی وجہ تھی کہ مجھے سردی محسوس ہو رہی تھی۔

''میری ساتھی کہاں ہے؟'' میں نے چوڑی ناک والی حبشن سے پوچھا۔

وہ شستہ انگلش میں بولی۔ ''وہ جہنم میں ہے اور جلد ہی تم بھی جانے والے ہو...... ویسے وہ زندہ ہے اور تمہاری خیر خیریت کے بارے میں فکرمند ہے۔''

''میں کہاں ہوں۔ مجھے یہاں کون لایا ہے؟'' میں نے اٹھنے کی کوشش کی اور گردن میں موجود رسّی کے کھچاؤ نے دوبارہ لکڑی کے فرش پر لیٹے رہنے پر مجبور کر دیا۔ دھچکے کے سبب کندھے سے پھر ٹیسیں اٹھیں اور سر پر کسی گومڑ کا احساس بھی ہوا۔ یقیناً یہ بے ہوش ہونے کے بعد فرش پر گرنے کے مظہر نتائج تھے۔

میں نے ٹانگوں کو حرکت دینا چاہی تو اندازہ ہوا کہ وہ بھی کسی چیز سے بندھی ہوئی ہیں۔

''میرے کندھے میں بہت درد ہے۔ میں اٹھنا چاہتا ہوں۔'' میں نے بھنا کر کہا۔

دبلا پتلا ڈاکٹر بولا۔ ''اس لڑکی کے ساتھ موج میلہ کرتے ہوئے تو تمہارے کندھے میں درد نہیں ہوتا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ تمہارے کندھے کو آرام سے نہیں مشقت سے فائدہ ہوتا ہے۔ چلو ابھی مشقت کراتے ہیں تمہیں۔''

میرا رخ پہلو کی ایک طویل کھڑکی کی طرف تھا۔ دفعتاً زور سے بجلی چمکی۔ باہر بارش کی بوچھاڑیں اور ناریل کے بلند درخت جھومتے نظر آئے۔ اس بات کی تصدیق ہو رہی تھی کہ میں جاماجی میں ہی ہوں اور شاید ڈی پیلس سے بہت زیادہ دور بھی نہیں ہوں۔ ہاں...... بے ہوشی کے دورانیے کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ کیا یہ وہی رات تھی یا پھر پورا ایک دن گزر چکا تھا۔ مجھے سب سے زیادہ فکر جاناں کی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں جاناں کے بارے میں پھر استفسار کرتا، کمرے کی بلند و بالا کھڑکی کھلی اور مجھے دوسری طرف ایک ایسی شکل دکھائی دی جس نے نہ صرف میرے بدترین خدشات کو حقیقت کا روپ دیا، بلکہ میرے تن بدن میں آگ بھی لگا دی...... وہاں آقا جان کھڑا تھا۔ اپنی تمام تر نحوست اور شیطانیت کے ساتھ۔ غالباً اس نے

ضرورت سے زیادہ پی رکھی تھی۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا اور چھوٹی چھوٹی آنکھیں کچھ اور بھی چھوٹی ہو گئی تھیں۔ وہ اکثر نیلی جین پہنتا تھا۔ سردی کی وجہ سے اس نے رین کوٹ کے نیچے سویٹر بھی پہن رکھا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر بے حد زہریلے لہجے میں بولا ''بہت پھرتیاں دکھاتے تھے۔ آخر داڑھ کے نیچے آ ہی گئے ہونا۔''

''جاناں کہاں ہے؟'' میں نے اس کی چمکیلی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''وہ حرام زادی تمہاری اصلی نہیں، منہ بولی بیوی تھی۔ یہ بات ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں، اس کے لیے اتنا فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔''

''مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟'' میں دہاڑا۔

''اس کی ایک سو دس ریزن تو میں ابھی گنوا سکتا ہوں۔ لیکن جو تازہ ترین ریزن ہے اس کا پتا تمہیں بھی بڑی اچھی طرح ہے۔ بہت جوانی چڑھی ہوئی ہے تمہیں۔ عشق کا بخار بلکہ بہت سے عشقوں کے بخار چڑھ رہے ہیں۔ اب یہاں تمہاری ان ساری تکلیفوں کا شافی علاج ہو گا۔'' اس کا لہجہ از حد خطرناک تھا۔

میں سمجھ گیا کہ افغانی کی طرح وہ بھی میرے اور قسطینا کے میل جول کا ذکر کر رہا ہے۔ لیکن یہ کوئی ایک ہی بات نہیں تھی۔ میں جانتا تھا اسے میری طرف سے کافی گہری چوٹیں لگی ہوئی ہیں۔ پاکستان میں پارا ہاؤس کے اندر مجھے اور سجاول کو ایک دم جو مقام ملا تھا، اس نے آقا جان کو اندر سے جلا کر کوئلہ کر دیا تھا۔ پارا ہاؤس میں کم از کم تین مواقع ایسے آئے تھے جب میں نے آقا جان کے وفادار کارندوں کی درگت بنائی تھی اور اس شاندار درگت کے بعد ''بات چیت'' میں بھی آقا جان کو ہر بار ہزیمت اٹھانا پڑی تھی۔

آقا جان آہنی گرل والی کھڑکی کے عین سامنے برآمدہ نما جگہ پر کرسی ڈال کر بیٹھ گیا۔ اس کے دونوں طرف دو مسلح گارڈز موجود تھے۔ دونوں شکل و صورت سے انڈین یا پاکستانی دکھائی دیتے تھے۔ آقا جان نے ایک تیکھی نظر میرے بازو کے پلاستر پر ڈالی جہاں قسطینا نے ''گیٹ ویل سون'' کے الفاظ لکھ دیئے تھے۔ وہ اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ ''تم تو چھپے رستم نکلے۔ ایسٹرن کنگ...... مکس مارشل آرٹ کا مشہور کھلاڑی۔ سنا ہے بڑا تہلکہ مچایا ہے تم نے چھوٹی اسکرین اور انٹرنیٹ وغیرہ پر۔''

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس نے حبشی عورت اور سوکھے سڑے ڈاکٹر کو باہر جانے کا اشارہ کیا اور وہ مجھے وہیں بندھا چھوڑ کر باہر نکل گئے۔ آقا جان نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں بھی حیران تھا کہ میرے اچھے بھلے بندوں کی ٹھکائی ہو رہی ہے۔ یہ پتا

نہیں تھا کہ ایک ''لڑاکے بھیڈو'' سے واسطہ پڑا ہوا ہے۔ یہ تو ایسا ہی تھا کہ عام مرغ کو لڑنے والے مرغ سے لڑا دیا جائے۔'' وہ جیسے تماشا دیکھنے کے موڈ میں نظر آ رہا تھا۔ الکحل کی کثرت نے اس کا بھیجہ گھمایا ہوا تھا۔

اس نے ایک گارڈ کی طرف دیکھ کر اشارہ کیا۔ وہ سر جھکا کر ایک طرف چلا گیا۔ آقا جان کی ناک کا بل موٹا ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اپنے مخصوص سڑیل لہجے میں بولا۔ ''چلیں اب دیکھتے ہیں لڑاکے مرغ کے سامنے تمہاری کارکردگی کیا ہوتی ہے۔''

کچھ ہی دیر بعد تین صحت مند افراد کھڑکی کے سامنے نظر آئے۔ یہ تینوں ہی شکلوں سے ملائیشین نظر آتے تھے مگر حقیقت میں ان میں سے ایک جاپانی تھا اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا تھا میں نے اسے ایم ایم اے کی فائٹس میں کہیں دیکھا بھی ہوا تھا۔ آقا جان کے سامنے ایک میز سجا دی گئی تھی جس پر ناؤ نوش کے لوازمات پڑے تھے۔ وہ بڑی تسلی سے آرام دہ کرسی پر پھیل کر بیٹھ گیا اور بولا۔ ''چلو، آج کی شام کو ذرا دلچسپ بناتے ہیں۔ تمہارے لیے بھی اور اپنے لیے بھی۔'' اس کے ارادے بے حد خطرناک نظر آتے تھے۔ جب اس نے شام کا ذکر کیا تو میں سمجھ گیا کہ یہ وہی رات نہیں جب میں بے ہوش ہوا تھا، یہ اگلی رات ہے۔

اس نے تینوں میں سے ایک شخص کو اشارہ کیا۔ وہ ایک پختہ کار فائٹر کے انداز و اطوار رکھتا تھا۔ وہ عجیب وضع کے اس کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آ گیا اور دروازہ اندر سے بولٹ کر دیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کھلا ہوا چاقو تھا۔ اندر آتے ہی اس نے میری گردن اور پاؤں والی رسیاں کاٹ دیں اور پھر چاقو گرل دار کھڑکی میں سے باہر کھڑے محافظ کو دے دیا۔

میں لکڑی کے ٹھنڈے فرش سے اٹھ کھڑا ہوا۔ سر ابھی تک چکرا رہا تھا مگر مجھے خود پر اعتماد تھا۔ اس چکراتے سر اور زخمی بازو کے باوجود میں اس فائٹر کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ دو تین منٹ کے اندر میدان پوری طرح سج گیا۔ فالتو اشیا کمرے کی دیواروں کے ساتھ لگا دی گئیں اور میں ملائیشین کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ اس کی حرکات و سکنات نے مجھے سمجھا دیا تھا کہ وہ ایک منجھا ہوا، سخت مدِمقابل ہے لیکن وہ کچھ نروس بھی نظر آتا تھا۔ شاید اسے میرے بارے میں پہلے سے پتا تھا یا اسے بتا دیا گیا تھا۔

آقا جان نے نصف گلاس وہسکی اپنے اندر انڈیلی اور کرخت لہجے میں بولا۔ ''بازو کا ایکسکیوز اب تمہارے لیے کوئی ایکسکیوز نہیں ہے۔ تم ایک چمپئن فائٹر رہ چکے ہو۔ تمہارے جیسے فائٹر تو کبھی کبھی یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ وہ اپنے مدِمقابل کو ہاتھ لگائے بغیر صرف ٹانگوں سے مار گرائیں گے۔ کیوں کرتے ہیں نا دعویٰ؟''

میرے کندھے سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اور اس کی وجہ میرا، انیکسی میں بے ہوش ہو کر گرنا تھا۔ میں نے آقا جان کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''ایسے دعوے کیے جاتے ہوں گے لیکن دعویٰ کرنے والے کا بازو اس طرح ٹوٹا ہوا نہیں ہوتا۔''

آقا جان نے بھی بھرپور طنز کیا اور اس سے ملتی جلتی بات کہی جو تھوڑی دیر پہلے سوکھے سڑے ملائیشین ڈاکٹر نے کہی تھی، وہ بولا۔ ''اس ٹوٹے بازو کے ساتھ تم اپنی منہ بولی بیوی سے رنگ رلیاں منا سکتے ہو اور اسی بازو کے ساتھ نیوسٹی کا دورہ کر کے آسکتے ہو تو پھر اب یہ بازو تمہارے رستے میں روڑے کیوں اٹکا رہا ہے؟'' اس فقرے میں اس نے کم از کم تین غلیظ گالیاں بھی استعمال کی تھیں۔ گالیاں اس کی گفتگو میں بوچھاڑ کی طرح آتی تھیں اور جوں جوں اس کی ناک کا منحوس بل موٹا ہوتا تھا، یہ بوچھاڑ تیز ہوتی جاتی تھی۔

میں نے کہا۔ ''میں نے صرف تمہاری بات کا جواب دیا ہے، ورنہ میں تیار ہوں۔''

آقا جان کا اشارہ پاتے ہی ملائیشین فائٹر تیر کی طرح میری طرف آیا۔ اس کی گھبراہٹ دیکھ کر ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ مجھے ''بیک فٹ'' پر لانے کے لیے وہ پہلا حملہ ہی میرے زخمی کندھے پر کرے گا۔

اور یہی ہوا۔ میں چونکہ پہلے سے تیار تھا اس لیے میں نے نہ صرف اس کی مہلک کک سے خود کو بچایا بلکہ اس کی پسلیوں میں ایسا گھٹنا رسید کیا کہ وہ اڑتا ہوا لکڑی کی دیوار سے جا ٹکرایا۔ اگلے دو تین منٹ تک میرے اور اس کے درمیان گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ میرے زخمی کندھے نے مجھے آدھا کر ڈالا تھا یا شاید اس سے بھی کم...... اس کے باوجود میں نے اس خطرناک لڑائی کو تین چار منٹ سے زائد نہیں چلنے دیا۔ میری زوردار ٹھوکر کھا کر وہ آہنی گرل والی کھڑکی سے ٹکرایا۔ سر پر لگنے والی چوٹ زوردار تھی۔ وہ پاؤں پر کھڑا نہیں رہ سکا۔ بے ہوش ہو کر لکڑی کے فرش پر لڑھک گیا مگر یہ عارضی بے ہوشی تھی جس کا شکار عام طور پر باکسر اور فائٹرز وغیرہ ہوتے ہیں۔ پندرہ بیس سیکنڈ بعد اس نے اٹھنے کی کوشش کی اور دوبارہ لڑکھڑا کر بیٹھ گیا۔ اب وہ لڑنے کے قابل نہیں تھا۔

آقا جان نے اس کا مشکل سا نام پکارتے ہوئے کہا۔ ''چلو آجاؤ باہر۔''

وہ مجھے خونی نظروں سے گھورتا اور دیوار کا سہارا لیتا باہر چلا گیا۔ اس دوران میں دونوں مسلح محافظوں نے اپنی رائفلیں میری جانب تانے رکھی تھیں۔

فائٹ کی مشقت سے جہاں میرا بازو درد سے بھر گیا تھا، وہیں جسم بھی پسینے میں شرابور ہو گیا تھا۔ حالانکہ کچھ ہی دیر پہلے اسی کمرے میں، میں سردی محسوس کر رہا تھا۔ اب دوسرا فائٹر

اندر آیا۔ یہ پہلے سے زیادہ سخت جان اور پھرتیلا دکھائی دیتا تھا۔ میں نے آقا جان سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو، میں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جس کی وجہ سے تم مجھے اپنا دشمن سمجھنے لگو۔ میں نے اگر کبھی کچھ کیا بھی ہے تو اپنے دفاع میں کیا ہے۔ پھر بھی اگر تم سمجھتے ہو کہ میں دشمن ہوں تو یہ دشمنی میرے اور تمہارے درمیان ہے۔ اس لڑکی جاناں کو درمیان میں مت لاؤ۔''

''اس لڑکی کو کچھ نہیں کہوں گا...... بلکہ تمہیں بھی کچھ نہیں کہوں گا، یہ وعدہ ہے میرا۔ اگر ان تینوں بندوں کو نیچا دکھالو گے تو یہاں موجود کوئی بندہ تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔ ہاں، پچ بھی نہیں کرے گا۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے میرے مقابل آنے والے شخص کو آگے بڑھنے کا اشارہ کر دیا۔

اس شخص کی چال ڈھال نے ہی مجھے سمجھا دیا تھا کہ وہ ایم ایم اے کا کھلاڑی ہی نہیں، اسٹریٹ فائٹر یعنی گلیوں کا بدمعاش بھی ہے۔ اس کے منڈھے ہوئے سر اور چہرے پر زخموں کے کئی پرانے نشان تھے۔ وہ ایک چنگھاڑ کے ساتھ کسی بلا کی طرح مجھ پر جھپٹا۔ میں نے خود کو اس کے وار سے بچایا اور اگلے ایک منٹ تک میں بس خود کو بچاتا ہی رہا۔ وہ ذرا ہانپا تو میں نے اسے پاؤں سے ایک دو ضربیں لگائیں۔ اچانک اس نے کامیاب جھکائی دی۔ وہ میری پنڈلیوں پر جھپٹا اور ٹانگیں کھینچ کر مجھے پشت کے بل گرا دیا۔

اب فرشی لڑائی شروع ہوئی۔ پشت کے بل گرنے سے میرا زخمی بازو جھنجھنا اٹھا تھا اور یوں لگتا تھا کہ کوئی اس بازو کو کندھے سے اکھاڑ رہا ہے۔ مجھے اپنے مدِمقابل کے ''کیلیبر'' کا اندازہ ہو چکا تھا۔ وہ معمولی فائٹر نہیں تھا۔ میں اپنے زخمی بازو کو حتیٰ الامکان اس سے دور رکھ رہا تھا اور اپنے سلامت بازو سے اسے ''نیک لاک'' لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں اس کے نیچے سے تقریباً نکل آیا تھا جب اچانک اس کا داؤ چل گیا۔ میں اسے اپنے اکلوتے بازو کی گرفت میں نہ رکھ سکا، وہ تڑپ کر میرے پہلو میں آ گیا اور اس نے میری زخمی کلائی تھام لی۔ اس کا ایک پاؤں میری بغل پر اور دوسرا گردن پر تھا۔ یہ آرم لاک کی ایک پرفیکٹ پوزیشن تھی...... اور یہ سفاکی کا عروج بھی تھا۔ اس نے بغیر کسی وارننگ کے میرے بازو کو مروڑا۔ میرا کندھا بری طرح تڑخ گیا۔ ایک لمحے کے اندر مجھے اندازہ ہو گیا کہ ہڈی جوڑنے کے لیے جو پلیٹس یا پیچ وغیرہ لگائے گئے ہوں گے سب اپنی جگہ چھوڑ گئے ہیں۔ درد کی ایسی ناقابلِ بیان لہریں اٹھیں کہ میں بے ساختہ بلند آواز میں کراہ اٹھا۔ اس نے مجھے مشکل میں دیکھا تو وحشیانہ انداز میں مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ میرے چہرے پر تابڑتوڑ گھونسے رسید کیے اور میرے دوسرے بازو کو بھی

گرفت میں لینے کی کوشش کی۔ مجبور ہو کر میں نے اسے وہ ضرب لگائی جو میں اسٹریٹ فائٹ میں تو لگاتا تھا لیکن Ring میں عام طور پر نہیں لگاتا تھا۔ یہ کہنی کی ضرب تھی۔ یہ ضرب اس کے سینے پر سامنے کی طرف اس جگہ لگی جہاں سینے کی ہڈی ختم ہو جاتی ہے...... میرا مدِمقابل تڑپ کر دور جا گرا۔ میں نے اپنی رہی سہی قوت جمع کی اور اس کے اوپر ترچھا گر کر اس کی گردن اپنی ٹانگوں کی قینچی میں پھنسا لی۔ سینے پر لگنے والی ضرب نے اسے پہلے ہی نیم جان کر دیا تھا۔ اس نے دھندلائی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا اور لکڑی کے فرش پر ہاتھ مار کر اپنی شکست کا اعلان کر دیا۔

میں نے اسے چھوڑ دیا۔ لیکن میری اپنی حالت بھی کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی۔ میرا چہرہ میرے اپنے ہی خون میں لتھڑ گیا تھا اور بازو بے جان ہو کر توری کی طرح لٹک رہا تھا۔ میں اسے معمولی سی حرکت بھی دیتا تو پورا جسم درد کے ناقابلِ برداشت شکنجے میں آ جاتا تھا...... کھڑکی سے باہر کھڑے محافظوں نے ایک بار پھر اپنی رائفلیں میری سمت تان لیں۔ آقا جان کے حکم پر ہار مان لینے والے مدِمقابل کو سہارا دے کر کمرے سے باہر نکال لیا گیا۔ اسے سانس لینے میں بے حد دشواری ہو رہی تھی۔ میں جانتا تھا اسے ''اسپتال یاترا'' کرنا پڑے گی۔

اور ''اسپتال یاترا'' کی ضرورت فوری طور پر مجھے بھی تھی۔ اندھا دھند لڑائی میں میرے بازو کا پلاستر ایک جگہ سے کریک ہو چکا تھا اور وہاں خون کے بڑے بڑے دھبے نمودار ہو گئے تھے۔ ایک ٹخنہ بھی بری طرح سوج گیا تھا اور وہاں سے خون رس رہا تھا مگر جو لوگ مجھے لڑا رہے تھے، ان کی آنکھوں میں رحم کی کوئی رمق نہیں تھی۔

''ویل ڈن۔'' آقا جان نے تالی بجاتے ہوئے کہا۔ ''جیسا سنا تھا، ویسا ہی پایا۔ اس شام کا مزہ دوبالا کر دیا تم نے۔''

اس نے وہسکی کے دو گھونٹ لیے اور ذرا توقف کر کے بولا۔ ''چند منٹ ریسٹ کرنا چاہو گے یا اگلا کھلاڑی میدان میں اترے؟''

میں نے کہا۔ ''کھلاڑی تو کھیل کے میدان میں اترتے ہیں۔ یہ تو درندگی کا تماشا ہے۔ میں جانتا ہوں یہاں تمہاری سفاکی کے بنائے ہوئے اصول ہی لاگو ہوں گے۔''

''بکواس کرنا بہت اچھی طرح آتی ہے تمہیں۔ اسی لیے تو فٹافٹ آگے بڑھنے کے راستے بناتے ہو اور تو اور سپریم کمانڈر تک کو چکرا دیتے ہو۔'' اس نے ایک بار پھر ڈھکے چھپے الفاظ میں میرے اور قسطینا کے تعلق کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے غصیلے لہجے میں نفرت کی بجلی کوند رہی تھی۔ ایسی ہی بجلی بار بار باہر بھی کوندتی تھی اور بادلوں کی گرج در و دیوار کو دہلاتی تھی۔

میری حالت کو خاطر میں لائے بغیر، آقا جان نے جاپانی فائٹر کو اشارہ کیا اور یہاں ایک غیر متوقع بات ہوئی۔ جاپانی فائٹر نے آگے بڑھنے کے بجائے آقا جان کی طرف رخ کیا۔ اس کے قریب پہنچ کر وہ ادب سے جھکا اور کوئی بات اس کے گوش گزار کی۔

آقا جان نے حسبِ معمول تلخ لہجے میں جواب دیا۔ دونوں کے درمیان ہونے والے اس مکالمے کی آواز لحہ بہ لحہ بلند ہوتی گئی۔ آقا جان انگلش میں پھنکارا۔ ''تمہارا کام سوال اٹھانا نہیں توماشی۔ میں تم سے یہ بکواس کررہا ہوں کہ تم اس سے لڑو۔ اگر اس لڑائی میں یہ جان سے بھی مرتا ہے تو ماردو اسے......''

''لیکن یہ عام بندہ نہیں ہے سر۔'' جاپانی بھی شکستہ انگلش میں بولا۔ ''یہ میں جانتا ہوں اور آپ بھی جانتے ہیں، یہ ایسٹرن کنگ ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک مارشل آرٹ میں اس کے نام کا ڈنکا بجتا تھا۔''

''تب اس کا ڈنکا بجتا تھا اور اب یہ خود بجے گا، بلکہ بج چکا ہے۔'' آقا جان پھنکارا پھر جاپانی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگا۔ ''میں تمہیں حکم دے رہا ہوں، توڑ دو اس کی ہڈیاں...... مارڈالو۔''

جاپانی کا رنگ پہلے زرد ہوا پھر دھیرے دھیرے سرخ ہو گیا، وہ بولا۔ ''میں ہاتھ جوڑ کے معافی چاہتا ہوں یہ جس حالت میں ہے، میں اس پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتا۔ یہ Ring کے اصولوں کے بھی سراسر خلاف ہے۔''

آقا جان نے جاپانی کو اس کے بالوں سے پکڑ کر جھنجوڑا۔ ''میں تمہیں حکم دیتا ہوں توماشی۔''

''میں آپ کا نہیں حلمی صاحب کا ملازم ہوں اور اس وقت آپ کی پراپرٹی پر نہیں حلمی صاحب کی پراپرٹی پر ہوں۔''

''بکواس بند کرو۔ میں کہتا ہوں جاؤ اندر۔'' آقا جان نے اسے زور سے دھکا دیا۔ وہ ٹس سے مس نہیں ہوا تو آقا جان کا پارا حسب عادت آسمان کو چھو گیا، اس نے تھپڑ جڑ دیا۔ دوسرا تھپڑ پڑنے سے پہلے جاپانی نے آقا جان کی کلائی اپنے مضبوط ہاتھ میں جکڑ لی۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر تین چار گارڈز جاپانی پر پل پڑے۔ میں اس ہنگامے سے فائدہ اٹھانے کے لیے لنگڑاتا ہوا دروازے کی طرف لپکا۔ اس کے ہینڈل کو پکڑ کر جھنجوڑا مگر وہ حسبِ اندیشہ باہر سے بند تھا۔ گارڈز دیوانہ وار، جاپانی پر غلبہ پانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ انہیں روئی کی طرح دھنک ڈالے گا۔ لیکن اس سے پہلے ہی آقا جان غصے سے

چنگھاڑتا ہوا اس کے سر پر پہنچ گیا۔ اس نے جاپانی کی پشت پر صرف ایک فٹ کے فاصلے سے نائن ایم ایم کے پستول کا فائر کیا۔ ایک گولی نے شیر جیسے جوان کو پہلو کے بل فرش پر گرا دیا۔ دوسری گولی آقا جان نے جنونی انداز میں اس کی کنپٹی پر ماری۔

بجلی چمکی، آقا جان کا چہرہ کسی عفریت کا چہرہ نظر آیا۔ اس نے جاپانی کی لاش کو ٹھوکریں رسید کیں۔ وہ سیڑھیوں کے بالکل پاس پڑا تھا۔ لڑھک کر سیڑھیوں پر گیا اور پھر پلٹیاں کھاتا ہوا تمیں چالیس زینے نیچے پہنچ کر اوجھل ہو گیا۔

آقا جان نے قہرناک نظروں سے مجھے گھورا۔ اس کا یہ بدترین روپ میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ اس نے اوپر تلے وہسکی کے دو پیگ چڑھائے اور پھر پھیل کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ ملائی زبان میں فون پر کسی سے بات کرتا رہا۔ دو ملازم اس کے کندھے دبانے میں مصروف ہو گئے۔ فون پر بات ختم کر کے آقا جان نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ خود کو پُرسکون کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے ایک کپڑے سے وہ خون پونچھا جو میری ناک اور ہونٹوں سے قطروں کی صورت ٹپک رہا تھا۔ بازو اور کندھے سے اٹھنے والی ٹیسیں ناقابلِ برداشت تھیں۔

دو تین منٹ بعد آقا جان واقعی پُرسکون نظر آنے لگا اور اس کا ثبوت یہ تھا کہ اس کی ناک کے بل کی موٹائی کچھ کم ہو گئی تھی۔ اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''اب کیا ارادہ ہے تمہارا...... تم ان تینوں بندوں کو زیر کرنے والی شرط تو پوری نہیں کر سکے؟''

میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں میرے ساتھ جو کرنا ہے، وہ کر کے ہی رہنا ہے۔ یہ شرطیں وغیرہ تو تم بس دل لگی کے لیے بتا رہے ہو۔''

''نہیں نہیں...... میرے چمپئن شہزادے، تم دلیل سے بات کرو۔ میں تمہاری بات سنوں گا۔'' وہ سخت زہریلے لہجے میں بولا۔

میں نے کہا۔ ''دلیل کی بات تو پھر یہی ہے کہ تمہارے تیسرے بندے نے خود لڑنے سے انکار کیا، وہ دوسروں کی طرح بے غیرت نہیں تھا۔''

آقا جان نے وہسکی کے زیر اثر ''ٹن'' انداز میں ایک ہچکی لی اور اپنی چندیا سہلا کر بولا۔ ''ہاں، تمہاری دلیل میں وزن تو ہے۔'' پھر وہ اپنے مسلح محافظوں کی طرف رخ کر کے بولا۔ ''کیوں بھئی...... اس باغیرت کی بات میں وزن تو ہے؟''

''یس سر!'' دونوں محافظوں نے ایک ساتھ اپنے سروں کو حرکت دی۔ ویسے وہ بالکل اٹین شین حالت میں کھڑے رہے۔

آقا جان کسی جج کی طرح، فیصلہ کرنے والے انداز میں بولا۔ ''ٹھیک ہے باغیرت

بچے! میں اپنا وعدہ نبھاتا ہوں۔ اب یہاں موجود بندوں میں سے کوئی تمہیں ہاتھ نہیں لگائے گا۔" پھر وہ ذرا وقفہ دے کر بولا۔ "اب کچھ اور بندے تمہیں ہاتھ لگائیں گے۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے تالی بجائی۔ میں نے دھندلائی نظروں سے دیکھا پانچ کے قریب مزید افراد برآمدے میں پہنچ گئے۔ یہ سب شکلوں سے ہی چھٹے ہوئے بدمعاش اور لڑاکے لگتے تھے۔ ایک کے سوا ان کے جسموں پر گارڈز کی وردیاں تھیں۔ وہ میری طرف جلتی نظروں سے دیکھ رہے تھے مگر آنکھوں میں ایک طرح کا ہراس بھی تھا۔

آقا جان دانت پیس کر بولا۔ "چلو بھئی...... اندر چلے جاؤ...... ذرا مارا ماری کرو اس سے۔ تمہارے لیے بڑے اعزاز کی بات ہوگی کہ اتنے بڑے چمپئن کو اپنے ہاتھوں سے کٹ چڑھاؤ گے۔ تاریخ میں تمہارا نام لکھا جائے گا۔"

میں سمجھ گیا کہ بدترین لمحات آنے والے ہیں۔ مزاحمت کی گنجائش نہیں تھی۔ کھڑکی کے باہر سے دو چوکس محافظوں نے مجھے گن پوائنٹ پر رکھا ہوا تھا۔ پانچوں افراد بھرا مار کر اندر داخل ہوئے۔ مجھے یہی لگا جیسے آقا جان ڈنمارک یا ناروے وغیرہ کا کوئی سخت گیر نواب ہے۔ اپنے خاندان کی لڑکی سے میل جول رکھنے کے جرم میں مجھے اپنے نوکروں سے مروا دینا چاہتا ہے۔ اندر داخل ہونے والے افراد، میری حالتِ زار کی پروا کیے بغیر...... آتے ساتھ ہی مجھ پر پل پڑے۔ میں نے بچی کھچی طاقت کے مطابق مزاحمت کی۔ ایک شخص نے عقب سے میرے سر پر کسی سخت چیز سے شدید چوٹ لگائی۔ میں گھٹنوں کے بل گر گیا۔ وہ شہد کی زہریلی مکھیوں کی طرح مجھ سے چمٹ گئے۔ نہایت بے دردی سے مجھے مارنے لگے۔ اگر میری جگہ کوئی عام شخص ہوتا تو شاید چند سیکنڈ میں بے ہوش ہو جاتا۔ مجھے لگا کہ میرے پورے جسم پر وزنی ہتھوڑے برس رہے ہیں۔ میری ہڈیاں کڑکڑا رہی ہیں، رگ پٹھے ٹوٹ رہے ہیں۔ آہنی گرل والی کھڑکی سے باہر آقا جان پھیل کر آرام کرسی پر براجمان تھا اور اس تماشے سے اپنی روح کو "تسکین" فراہم کر رہا تھا۔ میں کچھ دیر تک تو اپنے ٹوٹے ہوئے کندھے کو طوفانی ضربوں سے بچانے کی کوشش کرتا رہا، پھر کچھ بھی میرے بس میں نہیں رہا، میرے ڈوبتے ہوئے ذہن میں ایک ہی سوال تھا۔ کیا یہ لوگ مجھے اسی جگہ مار ڈالیں گے...... یا ابھی مزید زندہ رکھیں گے۔ سرسوں کے کھیت میں کھڑی، مسکراتی لڑکی، بالوں کی دو لٹیں...... اور پھر سب کچھ اندھیروں میں ڈوب گیا۔

O......❖......O

اس مرتبہ بھی میں کافی دیر بے ہوش رہا۔ بے ہوشی کی اس کیفیت میں شعور بھی کسی حد

تک کام کررہا تھا۔ کسی وقت شدید سردی کا احساس ہوتا اور مجھے لگتا کہ برفیلے پانی میں ڈوبتا چلا جارہا ہوں۔ کسی وقت یہ برفیلا پانی جسمانی چوٹوں پر مرچوں کی طرح لگتا اور پورا جسم جلن اور درد سے بھر جاتا۔ کیا میں مر رہا ہوں...... کیا میں مرنے والا ہوں؟ کیا میرے بدن کا سارا خون کسی زخم کے راستے بہہ جائے گا اور میں لکڑی کے اس سرد فرش پر لاش کی صورت پڑا رہ جاؤں گا؟

کیا بارش اب بھی ہورہی ہے؟ بارش کے ساتھ ہی جاناں کا خیال بھی ذہن میں آگیا۔ میں نے اپنی منوں بھاری پلکوں کو بمشکل اٹھایا اور اردگرد دیکھنے کی کوشش کی۔ کسی زخم کا خون میری آنکھوں میں بھر چکا تھا۔ میں نے کوشش کی اور اٹھ بیٹھا۔ مجھے لگا کہ کندھے کے بعد میرا ٹخنہ بھی ٹوٹ چکا ہے۔ پسلیاں بھی چٹخی ہوئی لگتی تھیں۔ ذرا سی حرکت بھی برداشت نہیں کر پا رہی تھیں...... ہاں میں چمپئن تھا اور چمپئن کو اس طرح مارا گیا تھا کہ وہ اٹھنے کے قابل بھی نہیں تھا...... اور کچھ دیر پہلے ایک باصلاحیت جاپانی فائٹر کو صرف ایک گولی نے بے بس کر کے زمین پر لٹا دیا تھا۔ کیا یہی ہوتا ہے مارشل آرٹ؟ کیا یہی ہے ذاتی دفاع کی تربیت؟ بے شک یہی کڑوی حقیقت تھی جس نے مجھے ڈنمارک میں مارشل آرٹ سے دور اور مارا ماری سے قریب کیا تھا۔ میں اپنے فائٹر دوست کی موت کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔

میرے سینے میں آگ سی بھڑکنے لگی۔ آقا جان کا منحوس چہرہ اپنی پوری کراہت کے ساتھ نگاہوں کے سامنے آیا۔ اس نے کتنے اطمینان سے جاپانی کو مارا تھا، ایسے ہی اطمینان سے اس نے زینب کے قتل کا حکم بھی دیا ہوگا۔ اور ایسے ہی نہ جانے کن کن لوگوں سے ان کی زندگی چھینی ہوں گی۔ میں نے آنکھوں میں جمع ہوجانے والا خون صاف کیا۔ کمرے کا مضبوط دروازہ باہر سے لاک تھا۔ میں گرل دار کھڑکی سے باہر جھانکنے کی کوشش کرنے لگا۔ ایک اندازہ سا تھا کہ رات کا آخری پہر ہے۔ مثانے پر بے پناہ دباؤ محسوس ہورہا تھا۔ میں دیوار کا سہارا لیتا ہوا کمرے کے ایک گوشے میں گیا۔ یہاں ایک چھوٹا سا تاریک باتھ روم موجود تھا۔ کچھ دیر بعد باتھ روم سے نکلا تو نقاہت نے مزید یلغار کی۔ کھڑکی کے قریب کسی چیز سے الجھ کر اوندھے منہ گرا۔ اٹھنے کے بجائے وہیں لیٹے رہنا زیادہ سہل لگا۔ کچھ دیر بعد درد اور نقاہت کی لہروں پر غنودگی غالب آگئی۔

اگلا دن بڑا چمکیلا اور شفاف تھا۔ دو روز کی زبردست بارش کے بعد نکھری ہوئی دھوپ نکلی تھی۔ میں نے گرل دار کھڑکی سے باہر دیکھا۔ اس ساری جگہ کی بناوٹ عجیب سی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ یہ عمارت نہیں کوئی بہت بڑا گھونسلا ہے جس کے کئی پورشن ہیں۔ کھڑکی میں سے پام

کے چند بلند درخت بھی نظر آتے تھے۔ ان درختوں پر بھی گھونسلے تھے۔ دو دو درختوں پر ایک ایک گھونسلا بنایا گیا تھا۔ اس گھونسلے تک جانے کے لیے لکڑی کے چوڑے تختوں والی آسان سیڑھیاں تھیں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہ گھونسلے اندر سے آرام دہ کمروں کی طرح ہیں۔

میں نے کہیں سنا تھا کہ کچھ لوگوں کو پرندوں کی طرح گھونسلوں میں رہنے کا ''کریز'' ہوتا ہے اور وہ تفریح کے لیے ایسے گھونسلے تعمیر کرتے ہیں، شاید حلمی بھی کچھ ایسا ہی شوق رکھتا تھا۔ میری ادھوری معلومات کے مطابق یہ جگہ، حلمی کی پراپرٹی تھی۔ جاناں کہاں ہوگی؟ یہ سوال تیر کی طرح ایک بار پھر میرے سینے میں پیوست ہوا۔

میں اٹھ کر کھڑکی تک پہنچا۔ اپنا چہرہ گرل سے لگایا اور رہی سہی توانائی جمع کر کے پکارنے لگا۔ ''کہاں ہو تم لوگ...... میری بات سنو...... کہاں ہو؟''

یہ فقرہ میں نے کئی بار دہرایا لیکن کوئی سامنے نہیں آیا۔ اردگرد زیادہ نہیں تو دو چار لوگ تو موجود تھے لیکن مجھے مکمل نظر انداز کر رہے تھے۔

ڈینی فلاورز کی بھینی بھینی مہک میرے اس یخ بستہ قفس تک پہنچ رہی تھی۔ یہ کھلا علاقہ یقیناً جزیرے کا ہی حصہ تھا اور نباتات سے اَٹا ہوا تھا۔ میں نے قسطینا کے بارے میں سوچا اس نے میری اور جاناں کی گمشدگی کو کس طرح لیا ہوگا؟ وہاں کیا صورتِ حال ہوگی؟ بہت سے سوالات تھے۔ پچھلے قریباً 48 گھنٹوں سے میرے منہ میں خوراک کا ایک ذرہ تک اڑ کر نہیں گیا تھا۔ لیکن یہاں کسی کو پروا نہیں تھی۔

میرا ٹخنہ بے طرح سوجتا جا رہا تھا۔ بازو کی حالت کا تو ذکر ہی کیا۔ وہ جیسے میرے جسم کا حصہ ہی نہیں تھا۔ اس میں ذرا سی حرکت ناقابلِ برداشت ہو جاتی تھی۔ کیا میں ہمیشہ کے لیے ایک بازو سے معذور ہو چکا ہوں۔ یہ سوال بے حد اذیت ناک تھا۔

وہ سارا دن گزر گیا۔ یوں لگتا تھا کہ آقا جان بھی اس جگہ موجود نہیں۔ دور سے گزرنے والے ایک دو گارڈز کے علاوہ کوئی دکھائی نہیں دیا۔ اسی طرح کہیں سے دور سے رکھوالی کے کتوں کی آواز بھی گاہے بگاہے کانوں تک پہنچی۔ اسی طرح رات ہو گئی۔ چلا چلا کر اب تو میرا گلا بھی جواب دینے لگا تھا۔ آخر کچھ ہلچل محسوس ہوئی۔ کسی گاڑی کی آواز بھی آئی پھر ایک فقرہ کانوں تک پہنچا۔ کوئی انگلش میں کہہ رہا تھا۔ ''آقا جان آگئے ہیں۔''

ایک دوسری آواز نے کہا۔ ''لیکن زیادہ دیر ٹھہریں گے نہیں۔ سب کچھ ایمرجنسی میں ہو رہا ہے۔ تمہیں کچھ اندازہ ہوا؟''

پہلی آواز نے کہا۔ ''سب ٹاپ سیکرٹ چل رہا ہے...... آگے بڑھنے کا آرڈر ہوگا تو

بات کلیئر ہوگی۔"

آوازیں معدوم ہوگئیں۔ نقاہت کے سبب میں ایک بار پھر نیم بے ہوشی یا غنودگی کے نرغے میں چلا گیا۔ میں دوبارہ اپنے حواس میں آیا تو کھڑکی سے باہر اندھیرا تھا۔ میرا بالائی جسم عریاں تھا اور مچھروں نے بے تحاشا کاٹا تھا۔ شاید میں جاگا بھی اسی بے چینی کی وجہ سے تھا۔ میرے سامنے ہی چند فٹ کے فاصلے پر ایک ٹرے رکھی تھی جس میں چاول کی پلیٹ اور کسی ترکاری کا سالن تھا۔ میرا کندھا درد سے پھٹا جا رہا تھا، اس درد نے شاید بھوک کو بھی پس منظر میں دھکیل دیا تھا۔ اچانک میں چونک گیا۔ تاریک رات کے اس سناٹے میں مجھے دروازے پر ہلکی سی آہٹ سنائی دی۔ جیسے کوئی لرزتے ہاتھوں سے دروازے کے تالے میں چابی لگانے کی کوشش کر رہا ہو۔ میں دروازے کے قریب چلا گیا۔ میں رہی سہی قوت جمع کر کے یہاں سے نکلنے کی کامیاب کوشش کر سکتا تھا۔ جونہی تالے میں چابی گھومی، میں کسی بھی ردِعمل کے لیے تیار ہو گیا۔ لیکن دروازہ کھول کر اندر آنے والا ہیولا، مجھے اپنی جگہ سکتہ زدہ کر گیا۔ وہ ایک لڑکی تھی...... وہ جاناں تھی...... اور وہ زخمی تھی۔ وہ جیسے لڑکھڑا کر میرے اکلوتے بازو پر گری۔

"جاناں۔" میں نے اسے پہچان کر تیز سرگوشی کی۔

"دروازہ بند کر دیں۔" وہ کراہ کر بولی۔

میں نے دروازہ اندر سے بولٹ کر دیا اور اسے سہارا دیتے ہوئے اس گوشے تک لایا جہاں ناریل کے چھلکے کی چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ جاناں کے جسم پر مکمل لباس کے بجائے ایک سفید چادر ہے جسے اس نے ایک چھوٹی ساڑی کی طرح اپنے جسم کے گرد لپیٹ کر گرہ دی ہوئی ہے۔ جاناں کے پیٹ کے قریب زخم تھا جہاں سے خون کا اخراج نمایاں نظر آتا تھا۔

"یہ کیا ہوا جاناں؟" میں نے تڑپ کر کہا۔

"چاقو لگا ہے، لیکن زخم...... زیادہ...... نہیں۔" وہ کراہی۔

تب مجھے دوسری بار شدید حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔ جاناں کے اپنے ہاتھ میں بھی ایک خون آلود چاقو نظر آ رہا تھا۔ "یہ تم نے کیا کیا ہے جاناں؟ کیا کسی کو مارا ہے؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے اسے دیوار کے ساتھ ٹیک لگانے کو کہا۔ وہ بیٹھ گئی تو میں نے اٹھ کر کمرے کی کھڑکی بند کر دی۔ چارسُو سناٹا تھا۔ بس کسی وقت رکھوالی کا کوئی کتا شور مچا کر اپنی موجودگی کا احساس دلاتا تھا۔ کمرے کی مدھم روشنی میں، میں نے ذرا دھیان

سے جاناں کو دیکھا اور لرز گیا۔ اس کے چہرے، گردن اور بازوؤں پر کئی نیل اور چوٹوں کے نشان تھے۔ اس کا حلیہ گواہی دے رہا تھا کہ اسے ''جارحیت'' کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ میری نظر ایک بار پھر اس خون آلود چاقو پر جم گئی جو اس نے مضبوطی سے اپنے دائیں ہاتھ میں دبایا ہوا تھا۔

جس طرح میں اسے دیکھ رہا تھا، وہ بھی میرے بازو کے خون آلود پلاستر اور میرے جسم کے خونچکاں زخموں کو دیکھ رہی تھی۔ وہ جیسے سسک کر میرے گلے سے لگ گئی۔ یوں گلے لگنے سے جہاں مجھے تکلیف ہوئی یقیناً وہ بھی درد سے بھر گئی ہو گی۔ ''میں جانتی ہوں شاہ زیب! آپ کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے...... مجھے پتا ہے۔''

''لیکن مجھے نہیں پتا، تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے...... مجھے بتاؤ جاناں، تمہارا زخم تم تو کہہ رہی ہو کہ یہ زیادہ زخم نہیں ہے......لیکن تمہارا خون تیزی سے بہہ رہا ہے۔'' میں نے اس کے پیٹ پر نگاہیں جماتے ہوئے کہا۔

''آپ میری فکر چھوڑو شاہ زیب! مجھے کچھ نہیں ہو گا۔ آپ کو کچھ اور فکر کرنا ہو گی۔ کچھ بہت برا ہونے جا رہا ہے۔ بہت زیادہ برا۔'' اس نے ذرا توقف کیا اور بولی۔ ''آج رات عزت مآب کی گرین فورس...... نیوسٹی پر زوردار حملہ کرنے جا رہی ہے، سمجھیں کہ تخت یا تختہ کرنے جا رہی ہے لیکن یہ حملہ ناکام ہو گا۔ بری طرح ناکام ہو گا۔ سب کچھ برباد ہو جائے گا۔ ڈی پیلس کی بھی اینٹ سے اینٹ بج جائے گی۔ ہو سکتا ہے...... ہو سکتا ہے......عزت مآب، ابراہیم، کمال احمد، بیگم نورل، قسطینا سب مارے جائیں۔'' وہ سخت جذباتی انداز میں بولتی چلی گئی۔

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو جاناں، ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟''

''اس لیے کہ...... گھر کا بھیدی ہی سب کچھ اجاڑ رہا ہے۔ آقا جان، صرف بد اخلاق اور ظالم ہی نہیں، بہت بڑا غدار بھی ہے۔ ڈی پیلس والے اس پر اندھا اعتماد کرتے ہیں، لیکن آج کی رات ان کے اعتماد کا خون ہو جائے گا۔ میں سب کچھ آنکھوں سے دیکھ چکی ہوں، کانوں سے سن چکی ہوں......''

وہ بری طرح ہانپ گئی، درد اور گھبراہٹ کی شدت سے کچھ بول نہیں سکی۔ میں نے گردن کے نیچے اس کا سینہ سہلایا تاکہ اسے سانس لینے میں آسانی ہو۔ اس کی حالت بتا رہی تھی کہ اس کا زخم اس کے بیان کے برعکس سنگین نوعیت کا ہے۔ میں نے اسے سہارا دے کر چٹائی پر لٹا دیا۔ ''جاناں! پلیز پہلے مجھے بتاؤ یہ سب کیسے ہوا؟ کس نے زخمی کیا تمہیں۔ اور یہ

چاقو...... تمہارے ہاتھ میں کیسے ہے؟ کیا تم نے بھی کسی کو مارا ہے؟''

اس نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا، عجیب لہجے میں بولی۔ ''دو بندوں کو مارا ہے میں نے...... تیسرا بھی شاید بچ نہیں سکے گا۔'' اس نے باقاعدہ اپنے خون آلود ہاتھ کی تین انگلیاں کھڑی کیں۔ میں ششدر رہ گیا۔

عجب صورتِ حال تھی۔ میں خود بھی سخت زخمی تھا لیکن اس وقت جاناں کے زخموں کے بارے میں جاننا چاہ رہا تھا۔ اس نے رک رک کر اگلے تین چار منٹ میں مختصراً جو کچھ بتایا، اس نے ایک نقشہ سا میرے سامنے کھینچ دیا۔ وہ نقشہ کچھ اس طرح تھا۔

یہ جگہ جہاں ہم موجود تھے، شہر سے دور جزیرے کے ایک سرے پر تھی۔ چاروں طرف گھنا جنگل اور گھاٹیاں تھیں۔ یہ کبھی حلمی کے لیے ایک تفریح گاہ ہوتی تھی۔ یہاں وہ اور اس کے دوست اپنی گرل فرینڈز اور رکھیلوں کے ساتھ قیام کرتے تھے۔ گھونسلا نما گھروں میں ناؤ نوش کی محفلیں چلتی تھیں لیکن اب کافی عرصہ سے یہ جگہ خالی تھی، اسے آقا جان اور حلمی کے نجی ٹارچر سیل کی سی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔

مجھے اور جاناں کو بھی یہاں لایا گیا تھا۔ جاناں کو تو اب تک بڑے آرام سکون سے رکھا گیا تھا۔ تاہم میرے لیے یہ جگہ واقعی عقوبت خانہ ثابت ہوئی تھی۔ یہاں آنے کے بعد جاناں، آقا جان اور حلمی وغیرہ کے خاص کارندے آرب کے سپرد ہو گئی تھی۔ (یہ آرب وہی تھا جس نے کچھ روز پہلے ہوٹل واشنگٹن میں غیر ملکی عورتوں کے ساتھ زیادتی میں حصہ لیا تھا) جاناں تین روز سے اسی کے پاس تھی۔ ڈی پیلس میں بے ہوش ہونے کے قریباً 18 گھنٹے بعد اسے یہیں آرب کے کمرے میں ہوش آیا تھا۔ ہوش میں آنے کے باوجود اس نے خود کو نیم بے ہوش ہی ظاہر کیا اور بے سدھ پڑی رہی۔ آرب اس وقت کمرے میں ہی تھا۔ کچھ دیر بعد جاناں نے دیکھا، کہ وہ دودھ کے ایک گلاس میں کچھ ملا رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد اس نے جاناں کو ذرا جھنجوڑ کر اٹھایا۔ دونوں کے درمیان کچھ سوال جواب ہوئے۔ پھر آرب نے جاناں سے تسلی تشفی کی باتیں کیں اور اس سے کہا کہ وہ کل رات سے بھوکی ہے، یہ دودھ پی لے۔

یہاں جاناں نے تھوڑی سی ہوشیاری دکھائی۔ اس نے آرب کے سامنے ایک دو گھونٹ لیے لیکن جب وہ ایک کال اٹینڈ کرنے کے لیے اپنے سیل فون کی طرف متوجہ ہو گیا تو جاناں نے دودھ ایک ''ڈسٹ بن'' میں انڈیل دیا...... اور پھر بستر پر لیٹ گئی۔

آرب کے خیال کے مطابق وہ اگلے کئی گھنٹوں کے لیے پھر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو

چکی تھی۔ مگر وہ ہوش میں تھی۔ نصف شب کے بعد جب اردگرد خاموشی تھی، اس نے اس اپارٹمنٹ سے نکلنے کی تگ ودو کی (یہ وہی وقت تھا جب کل آقا جان کے کارندوں نے مجھے مار مار کر ادھ موا کر ڈالا تھا اور میں یہاں لکڑی کے فرش پر بے ہوش پڑا تھا) جاناں کو الماری کی دراز سے ایک چابی ملی۔ وہ اس چابی کو مختلف تالوں میں لگا لگا کر دیکھنے لگی۔ یہ چابی کسی باہر کے دروازے کو تو نہیں لگی مگر ایک اندرونی دروازے کو لگ گئی۔

یہ ایک اور چھوٹے سائز کا کمرا تھا۔ یہاں بھی باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا، لیکن یہاں جاناں کو کچھ مدھم آوازیں سنائی دیں۔

ان آوازوں نے جاناں کو چونکا دیا۔ ان میں آقا جان کی آواز بھی شامل تھی۔ یہاں کچھ لوگ مٹھائی کھا رہے تھے اور ایک دوسرے کو پیشگی مبارکباد دے رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ کسی کو کوئی بہت اہم عہدہ ملا ہے یا ملنے والا ہے، اور اس کی خوشی منائی جا رہی ہے۔

یہاں پر جو انتہائی انکشاف انگیز گفتگو ہو رہی تھی اس میں سے زیادہ تر اردو میں تھی، کہیں کہیں انگلش کے فقرے بھی بولے جا رہے تھے۔ اس گفتگو سے جاناں کو معلوم ہوا کہ کل رات (یعنی آج رات) پچھلے پہر نیوسٹی پر ایک فیصلہ کن حملہ کیا جا رہا ہے۔ مگر حملے سے پہلے ہی حملہ ناکام کرنے کی پوری منصوبہ بندی ہو چکی ہے۔ نہ صرف یہ کہ ''حملہ'' راز نہیں رہا بلکہ حملے سے قبل ہی گرین فورس کی کمر توڑی جا رہی ہے۔

جاما جی میں گرین فورس کے تین بڑے ''ایمونیشن ڈپوز'' تھے۔ رازداری کے پیش نظر یہاں سے اسلحہ بالکل آخری وقت میں اگلے مورچوں میں منتقل کیا جانا تھا۔ لیکن اب یہ اسلحہ کبھی منتقل نہیں ہونا تھا۔

آج رات ایک بجے کے قریب یہ تینوں بڑے اسلحہ گودام دھماکوں سے اُڑا دیئے جانے تھے۔ یہ تینوں دھماکے ایک ساتھ ہونا تھے۔ یقیناً ان میں سیکڑوں لوگوں کی جان آناً فاناً چلی جانا تھی۔ اس کے ساتھ ہی رائے زل کی فورس کو کنٹرول لائن عبور کر کے حملہ کر دینا تھا اور چند میل دور ڈی پیلس میں پہنچ کر دم لینا تھا۔

جاناں کا کھینچا ہوا یہ نقشہ بے شک مختصر الفاظ میں تھا، مگر اس کا ''امپیکٹ'' اتنا شدید تھا کہ میں سرتاپا لرز گیا۔ یہ بہت بڑا اور خوفناک انکشاف تھا۔ مجھ میں اب اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں جاناں کی باقی رُوداد سن سکوں اور یہ جان سکوں کہ وہ دو افراد کو قتل اور ایک کو شدید زخمی کر کے یہاں تک کیسے پہنچی۔

میں نے جاناں سے اس انکشاف انگیز گفتگو کے سلسلے میں بہ عجلت دو تین سوال مزید

پوچھے مجھے یقین ہونے لگا کہ یہاں بہت کچھ برا ہونے والا ہے اور آقا جان جواب تک چھپا دشمن ہے بالکل کھل کر سامنے آگیا ہے (لیکن یہ سوال ابھی تک جواب طلب تھا کہ ڈی پیلس والے اب بھی اس دشمنی سے آگاہ ہوئے ہیں یا نہیں)

میں نے کہا۔ ''جاناں! اب ساڑھے گیارہ بجے ہیں۔ اگر تمہاری معلومات درست ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ڈپوز کی تباہی میں صرف ڈیڑھ گھنٹا رہ گیا ہے۔''

جاناں نے میری بات کے جواب میں اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے کہا۔ ''جن بندوں کو تم نے مارا ہے، ان میں سے کسی کے پاس سیل فون تھا؟''

''سیل فون تو شاید تینوں کے پاس ہوں گے لیکن کچھ فائدہ نہیں۔'' اس نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری۔ ''شاید آپ کو پتا نہیں کل پھر ڈی پیلس کے آس پاس کچھ گولے گرے ہیں۔ اس سے دو بڑے سیل ٹاورز تباہ ہو گئے ہیں اور سب موبائل فون بند ہیں۔''

''تو پھر؟''

''مجھے تو یہی لگتا ہے کہ...... آپ یہاں سے باہر...... کسی سے رابطہ نہیں کر سکتے...... آپ کو یہاں سے نکلنے کے لیے خود ہی کوشش کرنا ہوگی لیکن......''

''لیکن کیا؟''

''ابھی نہیں شاہ زیب...... ابھی نہیں۔ آپ اس کمرے سے باہر قدم نکالیں گے تو یہ لوگ آپ کو گولیوں سے چھلنی کر دیں گے۔ میں نے سب کچھ دیکھ لیا ہے۔ ابھی آپ کو آدھ گھنٹا انتظار کرنا ہوگا......'' وہ رک رک کر بول رہی تھی۔

''آدھ گھنٹا؟ کیا مطلب؟''

''کھڑکی سے باہر آپ نے درختوں پر تین گھونسلے سے بنے دیکھے ہیں نا؟'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بولی۔

''اب یہ گھونسلے، سیکیورٹی اور نگرانی کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ ان میں مشین گنوں والے ملائیشین گارڈز چوکس بیٹھے رہتے ہیں۔ پورے بارہ بجے ان کی ڈیوٹی بدلے گی۔ تینوں گارڈز سیڑھیاں اتر کر نیچے آئیں گے اور نئے آنے والے اوپر جائیں گے۔ میرے خیال میں یہی وقت ہوگا آپ کے نکلنے کا...... اور اپنی قسمت آزمانے کا۔ لیکن میں پھر کہتی ہوں، یہاں سے نکلنا آسان نہیں ہوگا...... یہاں بہت سخت نگرانی ہے...... اور شاید آپ کو ایک اور بات کا پتا نہ ہو...... یہاں بس ہم دونوں ہی نہیں ہیں۔''

''کیا مطلب؟ کوئی اور بھی ہے؟''

''ہاں۔'' وہ کراہی۔ ''میڈم قسطینا کے کئی اور وفادار ساتھیوں اور فوجی افسروں کو بھی پکڑ کر یہاں بند کیا گیا ہے...... یہ ایک بڑی سوچی سمجھی سازش ہے......'' تکلیف کی شدت کے سبب اس کی آواز ٹوٹنے لگی۔

میں نے اس کے زخم کو سمجھنا چاہا۔ زخم زیادہ بڑا نہیں تھا لیکن خون بہت زیادہ مقدار میں بہہ چکا تھا۔ اس نے عجیب نظروں سے میری طرف دیکھا......اور میرے خونچکاں بازوؤں کو چوم لیا۔

وہ شمع کی طرح پگھل رہی تھی، ختم ہو رہی تھی۔ گھڑی کی سوئیاں سرک رہی تھیں۔ تین دن پہلے تک وہ کراچی جانے والی تھی مگر مجھے لگا کہ اب وہ کراچی نہیں جا رہی......میرے سینے میں دل، ایک بہت بڑے انگارے کی طرح دہک اٹھا۔ اس دہکے ہوئے دل نے گواہی دی کہ یہ رات اپنے اندر بہت سے ستم چھپا کر لائی ہے۔ یہ سناٹا ایک طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہونے والا تھا۔

اس کے نیم عریاں جسم کے گرد لپٹی ہوئی چادر خون آلود ہو چکی تھی اور اب خون کے قطرے لکڑی کے فرش پر بھی ٹپک رہے تھے۔ میں نے اس کا سر اپنی گود سے نکال کر اٹھنا چاہا۔ اس نے مجھے روک دیا۔

''نہیں شاہ زیب! کوئی فائدہ نہیں۔ مجھے نہیں لگتا کہ میں اب بچوں گی۔ آپ کسی کو مدد کے لیے پکار کر......اس کے سوا......اور کچھ نہیں کریں گے کہ اپنا چانس ختم کر لیں گے۔ یہاں سے نکل نہیں سکیں گے......پلیز رہنے دیں۔''

اس نے جیسے مجھے جکڑ لیا۔ ''لیکن تمہارا خون بند ہونا چاہیے جاناں۔'' میں نے کہا۔

''یہ لیں، میں اس پر یہ تولیا رکھ لیتی ہوں۔'' اس نے ایک تولیا پکڑ کر اپنے پیٹ کے زخم کے اوپر دبا لیا۔ پھر ذرا وقفے کے بعد بولی۔

''آپ کو پتا ہے میں نے کراچی نہیں جانا تھا۔ یہاں سے جانا میرے پروگرام میں ہی نہیں تھا۔ میرا ارادہ کچھ اور تھا۔'' میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ میری حیرت کو نظر انداز کرتے ہوئے کہنے لگی۔

''میں اپنی جان لینے کا پکا ارادہ کر چکی تھی شاہ زیب......لیکن...... سچی بات نہیں چھپاؤں گی......جوں جوں وقت قریب آ رہا تھا میں خوف زدہ ہوتی جا رہی تھی۔ اپنی جان خود لینا آسان تو نہیں ہوتا نا۔ میرا ارادہ ڈانواں ڈول ہو رہا تھا۔''

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ تم......کس وقت کی بات کر رہی ہو؟''

''48 گھنٹے کی۔'' وہ عجیب لہجے میں بولی۔ ''یہ 48 گھنٹے میں نے آپ سے اسی خاطر لیے تھے کہ پھر...... میں نے بھی نہیں رہنا تھا۔''

میں چکرا گیا۔ مجھے یاد آیا کہ دوسری رات جوں جوں اپنے اختتام کو پہنچ رہی تھی، جاناں سوچ کے کسی گہرے بھنور میں ڈوبتی جا رہی تھی۔ وہ مجھ سے ہی نہیں اپنے آپ سے بھی دور ہو گئی تھی۔ بارش کی اس رات کا ہر ہر لمحہ مجھے یاد تھا۔ جاناں کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔ ''ہاں شاہ زیب! یہ دیکھیں...... یہ کیا ہے؟'' اس نے اپنا خون آلود ہاتھ اوپر اٹھایا۔ کانپتے ہوئے ہاتھ کی ایک انگلی میں انگوٹھی تھی۔ وہ بولی۔ ''یہ تھا میری موت کا سامان...... اسے کھول کر دیکھیں۔''

میں نے جاناں پر حیرت کی نگاہ ڈالی، پھر انگوٹھی کو دیکھا۔ یہ وہی انگوٹھی تھی جو میں نے بے ہوشی والی رات کو اس کے ہاتھ میں دیکھی تھی۔ میرا خیال تھا کہ یہ ان تحائف میں شامل ہے جو جاناں کو الوداع کہتے ہوئے بیگم نورل اور میڈم لورین نے دیئے تھے مگر ایسا نہیں تھا۔ میں نے انگوٹھی کو غور سے دیکھا۔ اس کے اوپر ایک ڈھکنا سا تھا۔ میں نے ناخن کی مدد سے ڈھکن کا کلپ کھولا۔ اندر کوئی زرد پاؤڈر تھا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہ زہر ہے۔

میں بے حد حیرت سے جاناں کی نیم وا آنکھوں کو دیکھنے لگا۔ وہ ایک بار پھر کربناک انداز میں بولی۔ ''یہ سچ ہے شاہ زیب! میں اب واپس جانا نہیں چاہتی تھی۔ وہاں میرے لیے خطروں اور ملامتوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ماں باپ شاید میرا منہ دیکھنے کے روادار بھی نہ ہوتے...... اب دیکھیں، ہے نا خوشی کی بات۔ میری زندگی بیکار سہی لیکن موت بیکار نہیں ہے۔ کچھ نہ کچھ تو آپ کے کام آ رہی ہے۔''

پھر اس نے نہایت مختصر الفاظ میں مجھے بتایا کہ وہ یہاں تک کیسے پہنچ پائی۔

آج رات یہ سارے لوگ بڑی ترنگ میں تھے۔ آرب پہلی رات سے جاناں کی طرف متوجہ تھا۔ آج اس نے اور اس کے ایک دوست نے ڈرنک کی اور پھر اس پر چڑھ دوڑے۔ جاناں کوئی چھوئی موئی لڑکی نہیں تھی۔ نوجوان ہونے کے باوجود بہت سے خطرناک مرحلوں سے گزر چکی تھی۔ اس نے آرب اور اس کے ''تھائی'' ساتھی کو خود میں الجھائے رکھا۔ (اس تھائی کا ایک ہاتھ کہنی کے نیچے سے کٹا ہوا تھا اور وہ بوالہوسی میں شیطان کو بھی مات دیتا تھا۔ میں نے ہوٹل واشنگٹن والے واقعے میں بھی اس کی گھناؤنی مصروفیات دیکھی تھیں) جاناں کی حکمتِ عملی سے، آرب اور اس کا ساتھی ضرورت سے زیادہ پی گئے۔ تب جاناں نے آرب کے لباس تک رسائی حاصل کی جو ایک ہینگر پر لٹکا ہوا تھا۔ لباس کے نیچے ایک چرمی بیلٹ تھی،

جس میں دو دھاری خنجر اڑسا ہوا تھا۔ کمرے میں میوزک کی دھنا دھن گونج رہی تھی۔ آرب اور اس کا "ہم نوالہ و پیالہ ساتھی" بالکل مدہوش پڑے تھے۔ آنکھیں بند کر کے اپنی بالادستی کا سرور لے رہے تھے۔ جاناں نے پہلے آرب اور پھر اس کے ساتھی کی گردن پر پے در پے وار کیے اور انہیں موقع پر ہی بے جان کر ڈالا۔ آوازیں سن کر ایک تیسرا شخص دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔ جاناں نے دروازہ اس طرح کھولا کہ خود دروازے کی اوٹ میں ہوگئی۔ اندر آنے والا ایک ادھیڑ عمر گارڈ تھا۔ جاناں نے دونوں ہاتھوں سے اس کی پسلیوں پر دو دھاری خنجر کا گہرا وار کیا۔ وہ گر گیا تو جاناں اس کے سینے پر چڑھ گئی اور اوپر تلے وار کر کے اسے وہیں ختم کر دیا۔

جاناں نے یہاں تین دن کے قیام میں جہاں اور بہت سی معلومات حاصل کی تھیں، وہاں یہ بھی جان لیا تھا کہ یہی ادھیڑ عمر گارڈ اس عقوبت خانے کی نگرانی کر رہا ہے جہاں میں موجود ہوں۔ اس نے اس ادھیڑ عمر شخص کی جیبیں ٹٹولیں اور چابیاں ڈھونڈنے میں کامیاب رہی۔ جب وہ اس مقتول گارڈ کی جیبوں سے چابیاں ڈھونڈ رہی تھی اس سے غلطی ہوئی۔ اس نے اپنا خون آلود خنجر فرش پر رکھ دیا تھا۔ پہلے دونوں بندوں میں سے آرب تو ختم ہو چکا تھا مگر دوسرا زندہ تھا۔ اس کے گلے کی بہت سی رگیں کٹ گئی تھیں مگر وہ سانس لے رہا تھا۔ اس نے خنجر اٹھایا اور فرش پر پڑے پڑے جاناں پر کاری وار کیا۔ جاناں یہ زخم کھانے کے بعد اٹھ کر بھاگی۔ اس نے دروازہ باہر سے لاک کر دیا تھا۔ اس کو معلوم نہیں کہ بعد میں کیا ہوا۔ اندازہ یہی تھا کہ وہ کٹے گلے والا مدہوش گارڈ بھی دوبارہ نہیں اٹھ سکا اور نہ ہی کسی کو پکار سکا۔ جاناں اپنا زخمی پیٹ دبا کر میرے کمرے یعنی ٹارچر سیل تک پہنچی۔ پہلی چابی تو تالے میں نہیں لگی لیکن دوسری کارآمد رہی۔ وہ تالا کھول کر اندر آ گئی۔

جاناں کا مختصر بیان ختم ہو گیا۔ گھڑی کی سوئیاں سرک رہی تھیں۔ وہ 12 کے ہندسے پر گلے ملنے جا رہی تھیں اور مجھ سے گلے ملنے والی مجھ سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ "مم...... مجھے پانی پلائیں شاہ زیب!" وہ بمشکل بولی۔

میں نے اس کا سر بہ آہستگی اپنی گود سے نکالا اور لنگڑاتا ہوا ٹارچر سیل کے گوشے میں گیا۔ یہاں پلاسٹک بوتل میں پینے کا پانی تھا، ساتھ میں اسٹیل کا گلاس رکھا تھا۔ میں پانی بھر کر لایا اور جاناں کا سر پھر گود میں رکھ کر بیٹھ گیا۔ سردی کے باوجود وہ قریباً سارا گلاس پی گئی۔ خون بہت زیادہ بہہ جائے تو اسی طرح نسیں خشک ہو جاتی ہیں۔ وہ ماڈل گرل بننے کے لیے گھر سے نکلی تھی...... بری طرح لوٹی کھسوٹی گئی تھی...... شاید وہ ٹھیک ہی کہتی تھی۔ واپسی پر اس کے لیے ملامتوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

یکا یک مجھے لگا کہ وہ چپ ہوگئی ہے۔ یہ بے ہوشی کی علامت تھی۔ میں نے اسے ہلایا۔

''جاناں...... جاناں...... آنکھیں کھولو۔''

چند سیکنڈ بعد مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ...... وہ زندہ نہیں ہے۔ میں نے گردن پر انگلیاں رکھ کر اس کی نبض دیکھی، اس کی سانسوں کو محسوس کیا۔ وہ جو شوبز کی دنیا میں تہلکہ مچانے نکلی تھی، زندگی کے اسٹیج سے بڑی خاموشی کے ساتھ آؤٹ ہوگئی تھی۔ میری آنکھیں جل اٹھیں، سینہ دہک گیا۔ گھڑی کی سوئیاں متحرک تھیں۔ میرے پاس تو اتنا وقت بھی نہیں تھا کہ کچھ دیر اس کا سوگ ہی منا سکتا۔

میں نے خون آلود خنجر اٹھایا۔ اسے تولیے سے پونچھا اور ایک بڑے رومال میں لپیٹ کر نیفے میں اڑس لیا۔ میرے رگ و پے میں بجلیاں کوند رہی تھیں۔ یورپ کے نائٹ کلبوں میں مار دھاڑ کے دوران میں یہی کیفیت تھی جو مجھ پر طاری ہوا کرتی تھی۔ میں ''کبھی فاؤل نہ کرنے والا'' کھلاڑی نہیں رہتا تھا۔ سراسر فاؤل کھیلنے والا کھلاڑی بن جاتا تھا۔ یہ مارشل آرٹ سے ''گینگسٹری'' تک کا سفر تھا جو مجھے کرنا پڑا تھا۔

میں نے کھڑکی تھوڑی سی کھول لی۔ میرا بالائی جسم عریاں تھا۔ سرد ہوا کے جھونکے سینے اور پیٹ سے ٹکرائے۔ شفاف آسمان پر تارے پلکیں جھپک رہے تھے۔ شاید انہیں بھی اس طوفان کی خبر تھی جو اس جزیرے کے طول و عرض میں برپا ہونے والا تھا۔ فاصلے پر وہ تین گھونسلے نظر آرہے تھے جن میں مدھم روشنی چالیس پچاس گز کی دوری سے بھی صاف دکھائی دیتی تھی۔ گھڑی نے بارہ بجے کا اعلان کیا۔ دس پندرہ سیکنڈ بعد مجھے اندازہ ہوا کہ درختوں کی بلندی پر واقع ان گھونسلا نما کمروں کے دروازے یکے بعد دیگرے کھلے ہیں۔ چند سیکنڈ مزید گزرے پھر سیڑھیوں پر متحرک ہیولے نظر آنے لگے۔ جاناں نے یہی تو کہا تھا۔ نگراں گارڈز اپنی کمین گاہوں سے اتریں گے اور ان کی جگہ نئے گارڈز لیں گے اور یہی وقت ہوگا میرے حرکت میں آنے کا...... ہاں وہ یہی وقت تھا۔ میں نے پلٹ کر جاناں کی پیشانی پر الوداعی بوسہ دیا۔ اس کے جسم پر خون آلود چادر درست کی اور دروازے کا بولٹ گرا کر باہر نکل آیا۔

جاناں نے اس جگہ کی نشاندہی کر دی تھی جہاں وہ دو افراد کو مردہ اور ایک کو زخمی چھوڑ کر آئی تھی۔ وہ کمرا زیادہ فاصلے پر نہیں تھا اور وہاں سے موسیقی کی مدھم آواز بھی ابھر رہی تھی۔ لیکن میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں کوئی آتشیں ہتھیار حاصل کرنے کے لیے ادھر کا رخ کر سکتا۔ میں دائیں طرف مڑا اور ایک دیوار کے ساتھ ساتھ جھک کر چلتا گیا، پھر بلند درختوں کی مخالف سمت میں بھاگنے لگا۔ میں ان تین مچان نما پوسٹوں سے جلد از جلد دور نکل جانا چاہتا

تھا مگر جاناں نے کہا تھا کہ نکلنا اتنا آسان نہیں ہوگا اور اس نے ٹھیک کہا تھا۔
''ہالٹ......کون ہے؟'' ایک کرخت آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔
پکارنے والا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں اپنی جگہ رک گیا۔ میں نے خنجر کو اس طرح پکڑا کہ وہ میرے ہاتھ میں ہی رہا لیکن کلائی کے ساتھ لگ کر نظروں سے اوجھل بھی ہو گیا۔
حسب توقع دوسرا حکم ملا۔ ''ہاتھ اوپر اٹھاؤ......سیدھے کھڑے رہو۔''
میں نے ایک ہاتھ اوپر اٹھا دیا۔ دوسرا ہاتھ مجروح تھا اور اس قابل ہی نہیں تھا کہ میں اسے اٹھا سکتا۔
دو باوردی سپاہی لپک کر میری طرف آئے۔ دونوں کے ہاتھوں میں آٹومیٹک رائفلیں تھیں۔ لیکن وہ اتنے چوکس نہیں تھے یا پھر یہ کہ ان کی خود اعتمادی ضرورت سے زیادہ تھی۔ انہوں نے میرے قریب آنے کی غلطی کی۔ میں نے اچانک جھک کر ایک شخص کی BELLY میں خنجر کا بے رحم وار کیا۔ دوسرے نے بدحواسی میں مجھ پر فائر کھولا۔ میں خود کو زمین پر گرا چکا تھا۔ اس کی چلائی ہوئی گولیاں اس کے ساتھی کے گھٹنوں میں لگیں۔ جب تک وہ رائفل کا رخ پھیرتا میری ٹانگ کی مہلک ضرب اس کی گردن توڑ چکی تھی۔ وہ لہراتا ہوا میرے اوپر گرا اور جیسے اپنی رائفل خود میرے سپرد کر دی۔ خنجر سے زخمی ہونے والے کے ہاتھ سے رائفل نکل چکی تھی۔ وہ پہلو کے بل کچی زمین پر گرا ہوا تھا۔ اس کی سبز قمیص پر ایک بڑا ''کٹ'' آ چکا تھا اور اس ''کٹ'' کے اندر سے اس کے اندرونی اعضا لٹک رہے تھے۔ جب زندگی اور موت ٹکراتی ہیں تو پھر ایسے ہی لرزہ خیز مناظر دیکھنے میں آتے ہیں۔ اس بری حالت میں بھی اس نے کچھ کارکردگی دکھائی اور اپنے گلے میں جھولتی ہوئی سیٹی بجا دی۔
یہ سیٹی رائیگاں نہیں گئی۔ یکا یک ارد گرد ہلچل نظر آئی۔ ایک دو سرچ لائٹس بھی چمک اٹھیں۔ تب میرے کانوں سے وہ پُرخطر آواز ٹکرائی جس کا اندیشہ تھا۔ یہ رکھوالی کے کتوں کی آواز تھی۔ وہ تیر کی طرح میری ہی طرف لپک رہے تھے۔ ابھی وہ کافی فاصلے پر تھے مگر آوازوں سے پتا چلتا تھا کہ وہ پانچ دس سیکنڈ کے اندر میرے سر پر ہوں گے۔ ان کی تعداد کم از کم دو تو تھی، ان کے آگے لگ کر بھاگنا تو بیکار تھا۔ میرا زخمی جسم اور ٹخنا مجھے اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دیتا تھا کہ تیز بھاگوں۔ میں نے وہیں رکنے اور انتظار کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہلاک ہونے والے گارڈ کی رائفل اب میرے ہاتھ میں تھی۔ اس کی رسٹ واچ میرے ٹراؤزر کی جیب میں منتقل ہو چکی تھی۔ زخمی کی رائفل کا میگزین بھی میں نے اتار کر اپنے ٹراؤزر کے نیفے میں اڑس لیا۔ میری نگاہیں سامنے جمی ہوئی تھیں اور پھر مجھے پہلا مشتعل کتا دکھائی دیا۔ وہ ایک

''سلوکی ہاؤنڈ'' تھا۔ اس کا دبلا پتلا لیکن مہلک ہیولا بلا کی رفتار سے میری طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے پیچھے ایک اور تھا اور اس کے پیچھے بھی ایک دو مزید تھے شاید۔ میں نے رائفل مردہ گارڈ کے فربہ جسم پر رکھ کر شست باندھ لی۔ آخر وقت تک انتظار کیا اور جب سلوکی ہاؤنڈ صحیح نشانے پر آیا تو ٹریگر دبا دیا۔ اکلوتے ہاتھ سے ایسی طاقتور رائفل کو کنٹرول کرنا آسان نہیں تھا مگر کامیابی ہوئی۔ پانچ گولیوں کا مختصر برسٹ ہراول کتے کے سر کے چیتھڑے اڑا گیا۔ دوسرے برسٹ نے دوسرے کتے کو چاٹ لیا۔ لیکن تیسرا میرے اوپر آ پڑا۔ اس کی بدبودار قاتل تھوتھنی میری گردن کی طرف بڑھی، مگر رائفل کے بیرل کی طوفانی ضرب سے میں نے اسے دور پھینک دیا۔ اسی دوران میں مجھے چوتھے کتے کو شوٹ کرنے کا موقع مل گیا۔ ضرب کھانے والا مجھ پر دوبارہ نہیں جھپٹا۔ کچھ فاصلے پر چکرانے لگا اور اپنی آواز سے میرے کانوں کے پردے پھاڑنے لگا۔ میں اٹھ کر دوڑا۔ ٹخنا گرم ہو کر کچھ رواں ہو گیا تھا مگر لنگڑاہٹ باقی تھی۔ کتا میرے ساتھ ساتھ دوڑنے لگا۔ جیسے اپنے مالکوں کے پہنچنے تک مجھے گھیر کر رکھنا چاہتا ہو۔ میری رائفل سے نکلنے والے سنگل شاٹ نے اسے بھی لوٹ پوٹ ہونے پر مجبور کیا۔ تب تک مجھے درجن بھر ٹارچوں کی روشنیاں نظر آنے لگی تھیں۔

اب مسئلہ گمبھیر تھا۔ میں تقریباً کھلی جگہ پر تھا۔ صرف ایک گرے ہوئے درخت کا تنا تھا جس کا قطر بمشکل ڈھائی فٹ ہو گا۔ اس تنے کی آڑ مجھے زیادہ دیر حملے سے محفوظ نہیں رکھ سکتی تھی۔ دائیں طرف ناریل اور کیلے کے درختوں کے پاس ایک بڑا سا اسٹائلش بورڈ نظر آ رہا تھا، اس پر ''آشیانے'' کا لفظ انگلش حروف میں لکھا تھا۔ پروپرائٹر کے طور پر حلمی کا نام تھا۔ (یہ ساری جگہ ہی آشیانوں کی طرز پر بنائی گئی تھی اور ماضی میں عیاشیوں کے لیے استعمال ہوتی تھی، لیکن اب یہاں غالباً حلمی اور آقا جان کے ذاتی دشمنوں کی ''مہمان نوازی'' ہوتی تھی) مجھے ہوا کے دوش پر للکارتی ہوئی آواز سنائی دی۔ کسی غیر ملکی نے انگلش میں کہا۔ ''وہاں ڈھلوان پر ہے...... جانے نہ پائے۔''

ایک دوسری آواز نے ہندی لہجے کی اردو میں پکارا۔ ''زندہ پکڑنا ہے۔ بھاگے تو ٹانگوں پر گولی مارو۔''

پہلی آواز نے پھر کچھ کہا لیکن الفاظ سمجھ میں نہیں آئے۔ میں جانتا تھا، میرے پاس ایمونیشن زیادہ نہیں ہے۔ میں نے رائفل کو سنگل شاٹ پر سیٹ کر لیا۔ ایک ٹارچ کا نشانہ لے کر میں نے سیدھا فائر کیا۔ دھماکے کے ساتھ ہی شعلہ لپکا اور ٹارچ اوجھل ہو گئی۔ جواب میں آٹھ دس فائر ہوئے۔ ان میں سے کچھ تو ہوائی تھے اور دو تین گولیاں درخت کے تنے سے

ٹکرائیں۔

میں نے پھر دو فائر کیے۔ مقصد یہی تھا کہ یہ لوگ میرے قریب آنے سے گھبرائیں۔ میرے دماغ میں چنگاریاں سی چھوٹ رہی تھیں لیکن یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ اندھا دھند بھاگ اٹھنا میرے بس میں نہیں تھا۔ اکلوتا ہاتھ رائفل کو ٹھیک سے سنبھال نہیں پا رہا تھا مگر دماغ میں بھڑکنے والی چنگاریوں نے توانائی میں خاطر خواہ اضافہ کر دیا تھا۔

قریباً دو منٹ تک یہ چاند ماری جاری رہی۔ اس دوران میں پاس ہی آوارہ گھومتے ہوئے ایک خچر کو گولی لگی اور وہ کربناک آواز میں چلا کر گر گیا۔ گارڈز لحہ بہ لحہ قریب آتے جا رہے تھے۔ پھر غیر ملکی لہجے میں انگلش بولنے والے نے صدا لگائی۔ ”تم بچ نہیں سکتے ہو۔ اسی جگہ مرنے سے بچنا چاہتے ہو تو خود کو حوالے کر دو۔“

میں نے اس کا جواب یوں دیا کہ آٹھ دس گولیوں کا لمبا برسٹ چلایا اور نشیب میں بھاگ کھڑا ہوا۔ یہ ساری ”ڈھلوان“ گھاس سے اٹی ہوئی تھی۔ ٹخنے پر دباؤ نہیں پڑ رہا تھا مگر جان بچانے کی فطری خواہش بھگائے لیے جا رہی تھی۔ ذہن میں یہ بات تھی کہ شاید آگے گھنے درختوں میں گھس کر بچنے کا کوئی موقع مل جائے۔

”ہالٹ...... رک جاؤ...... گولی مار دیں گے۔“ دور سے ایک للکارتی ہوئی آواز نے پیچھا کیا۔

بھاگتے بھاگتے میری پنڈلی میں ایک ناقابلِ برداشت ٹیس اٹھی۔ یہی لگا کہ پگھلا ہوا سیسا ٹانگ میں اتر گیا ہے لیکن ایسا نہیں تھا۔ ٹخنا بے طرح مڑا تھا۔ میں چند میٹر ڈھلوان پر لڑھک کر کسی نرم چیز پر گرا۔ یہ دو گھوڑوں والی ایک چھکڑا نما گاڑی تھی۔ اس پر بھوسا لدا ہوا تھا۔ میرے گرتے ہی گاڑی نے ایک شدید جھٹکا کھایا۔ دونوں گھوڑے اچھلے۔ ہنہنائے اور تیزی سے بھاگنے لگے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے غیبی مدد کہوں یا کسی نئی مصیبت کا پیش خیمہ۔

زمین قدرے ڈھلوان تھی۔ گھوڑے سرپٹ دوڑتے جا رہے تھے۔ گاڑی بان انہیں روکنے کی کوشش میں تھا۔ وہ ملائی زبان میں چلا رہا تھا۔ ”رک جاؤ...... حرام زادو رک جاؤ۔“

مگر ”حرازادے“ کچھ بھی سننے کے موڈ میں نہیں تھے۔ گاڑی کئی کئی بالشت اچھل رہی تھی پھر میں نے گاڑی بان کو قلابازی کھا کر سرسبز ڈھلوان پر گرتے اور لڑھکتے دیکھا۔ اس کا یہ حال دیکھ کر میں نے خود کو پوری طاقت سے گاڑی کے چوبی جنگلے سے چمٹا لیا تھا۔ ایک ڈیڑھ منٹ کے اندر ہی اردگرد کا منظر تبدیل ہو گیا۔ تاروں کی چھاؤں میں اب ٹیلوں کے بجائے

قدرے ہموار زمین نظر آ رہی تھی۔ درخت بھی یہاں کم تھے، ہاں سبزہ ہر جگہ ایک سا ہی تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اب گاڑی کسی بھی وقت الٹ جائے گی یا پھر سرپٹ بھاگتے ہوئے گھوڑے اپنا توازن برقرار نہیں رکھ پائیں گے۔

میں نے عقب میں دیکھا۔ کسی ٹارچ کی روشنی یا کوئی اور لائٹ دکھائی نہیں دی۔ تاہم اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ کوئی پیچھے نہیں آ رہا۔ وہ لوگ یقیناً آ رہے تھے مگر درمیانی فاصلہ بہت زیادہ تھا۔ ایک دم دل اچھل کر رہ گیا۔ سامنے ایک پل نظر آ رہا تھا مگر چوڑائی ہرگز اتنی نہیں تھی کہ یہ دو گھوڑوں والی گاڑی اس پر سے گزر سکتی۔ گھوڑے تیر کی طرح پل کی طرف بھاگے جا رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سوچتا یا کرتا ایک زوردار دھماکے کے ساتھ گھوڑا گاڑی پل سے ٹکرائی۔ مجھے جیسے کسی عفریت نے اپنے نہایت طاقتور ہاتھوں سے ہوا میں اچھال دیا۔ مجھے کچھ پتا نہیں کہ میں کتنی دیر ہوا میں رہا اور پھر قلابازی کھا کر ایک زوردار چھپاکے سے نیم سرد پانی میں گرا۔ پانی میں گرنے کے بعد پہلا احساس یہی تھا کہ میں اتنے تیز رفتار حادثے کا شکار ہونے کے باوجود زخمی ہونے سے محفوظ رہا ہوں...... یا یوں کہہ لیا جائے کہ مزید زخمی ہونے سے محفوظ رہا ہوں۔ ڈبکی کھا کر سطح آب پر آنے کے بعد میں نے اوپر بلندی کی طرف دیکھا۔ پل کم و بیش تیس فٹ کی اونچائی پر تھا۔ گاڑی کا ایک پہیہ میرے قریب ہی پانی میں تیر رہا تھا، باقی گاڑی پل میں پھنسی ہوئی تھی اور اسے نامعلوم وجہ سے آگ لگ چکی تھی۔ اس آگ کا سبب کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ تصادم سے پیدا ہونے والی چنگاریاں یا پھر گاڑی سے جھولتا ہوا کوئی آئل لیمپ وغیرہ۔ بہر حال بھوسے میں سے شعلے نکل رہے تھے اور پوری گاڑی کو لپیٹ میں لے رہے تھے۔ گھوڑوں کا کچھ پتا نہیں تھا۔

تیراکی میں میری مہارت کام آئی۔ میں ایک ہاتھ سے تیرتا ہوا کنارے تک پہنچا۔ یہ آبی گزرگاہ ایک ندی کی طرح تھی اور دونوں طرف کے کنارے کافی اونچے تھے۔ خوش قسمتی سے میں ایسی جگہ گرا تھا جہاں سے نکلنا زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا۔ ہموار زمین پر پہنچتے ہی میں نے مڑ کر دیکھا، دور فاصلے پر وہ روشنیاں نظر آنا شروع ہو گئی تھیں جو میرے تعاقب میں تھیں۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس سخت ناہموار زمین پر یا تو ہیوی ڈیوٹی جیپیں چلتی ہوں گی یا پھر گھوڑے وغیرہ۔ جو روشنیاں مجھے دکھائی دے رہی تھیں وہ گاڑیوں کی تو نہیں تھیں۔ یہ پیدل افراد ہو سکتے تھے یا گھڑ سوار...... روشنیاں ٹارچوں اور سرچ لائٹس کی تھیں۔

ایک گھوڑا جو حادثے کے وقت گھوڑا گاڑی سے علیحدہ ہو گیا تھا پل کے بیچوں بیچ ساکت کھڑا تھا، جیسے حیران ہو کہ یہ سب کیا ہوا ہے؟ جلتی ہوئی گھوڑا گاڑی نے پل کو بلاک کر

رکھا تھا۔ اپنی رائفل کا خیال آیا تو پتا چلا کہ وہ اب میرے پاس نہیں ہے۔ حادثے کے دوران میں نہ جانے وہ کب مجھ سے جدا ہو گئی تھی۔ کاٹرائے کے ٹراؤزر میں اڑسا ہوا میگزین بھی کہیں پانی میں بہہ گیا تھا۔ میرے پاؤں ننگے تھے اور بھیگا ہوا بالائی جسم بھی عریاں تھا۔ اپنی شدید جسمانی تکلیف کی پروا کیے بغیر میں نے دوڑنا شروع کر دیا۔ میں جانتا کہ میرا دوڑنا کتنا ضروری ہے۔ مجھے جلد از جلد کسی ذمے دار شخص تک پہنچنا تھا اور اسے بتانا تھا کہ اگلے آدھ پون گھنٹے میں یہاں کیا ہونے جا رہا ہے۔ ایک بہت بڑی سازش تھی جو ڈی پیلس کے لیے شکست اور تباہی کا پیغام لے کر آ رہی تھی، اس کے ساتھ ساتھ بے شمار عام لوگوں کی زندگیاں بھی داؤ پر لگنے والی تھیں۔ جو کچھ جاناں نے مجھے اپنے آخری لمحوں میں بتایا تھا وہ کسی بھی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ ایک مرتی ہوئی لڑکی کی باتیں تھیں، وہ جو کہہ رہی تھی اپنے علم کے مطابق سچ کہہ رہی تھی...... اور یہ بڑا ہولناک سچ تھا۔ آقا جان اپنے سارے بھید کھول کر اور ننگا ہو کر سامنے آ گیا تھا۔ وہ اور اس کے حواری ایمونیشن کے تین مرکزی گودام تباہ کر کے موجودہ لڑائی کا پورا نقشہ تبدیل کرنے والے تھے اور جن کے ساتھ یہ عظیم الشان دھوکا ہونے والا تھا۔ وہ یکسر بے خبر تھے۔ وہ اپنے زعم میں رائے زل پر ایک فیصلہ کن اٹیک کرنے جا رہے تھے۔

جاناں کے آخری جملے میرے کانوں میں گونجنے لگے...... ''آپ میری فکر چھوڑو شاہ زیب! مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ آپ کو کچھ اور فکر کرنا ہوگی۔ کچھ بہت برا ہونے جا رہا ہے۔ بہت زیادہ برا......''

پھر اس نے اٹکتی ہوئی سانسوں میں کہا تھا...... ''آج رات عزت مآب کی فورس، نیوسٹی پر زوردار حملہ کرنے جا رہی ہے لیکن یہ حملہ بری طرح ناکام ہوگا...... سب کچھ برباد ہو جائے گا...... ہو سکتا ہے کہ عزت مآب، ابراہیم، بیگم نورل اور قسطینا سب مارے جائیں۔''

میں نے کہا تھا۔ ''یہ تم کیا کہہ رہی ہو جاناں۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟''

اس کے جواب کی بازگشت میری سماعت میں گونجنے لگی۔ ''گھر کا بھیدی ہی سب کچھ اجاڑ رہا ہے...... آقا جان بد اخلاق اور ظالم ہی نہیں بہت بڑا غدار بھی ہے۔ ڈی پیلس والے اس پر اندھا اعتماد کرتے ہیں لیکن آج کی رات ان کے اعتماد کا خون ہو جائے گا۔ میں سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی ہوں۔''

تو یہ ایک دیرینہ اعتماد کے خون کی رات تھی۔ مجھے لگا کہ میرے زخمی جسم اور زخمی کندھوں پر ایک نہایت گراں ذمے داری ہے۔ مجھے کسی نہ کسی صورت یہ اطلاع بیگم نورل، عزت

آب، قسطینا یا ان کے کسی بھی وفادار تک پہنچانی ہے۔ میں سوچ رہا تھا، ہانپ رہا تھا اور اپنے زخمی جسم کے ساتھ ناہموار راستوں پر بھاگ رہا تھا۔ ٹخنا ہر قدم پر درد سے بھر جاتا تھا لیکن اب میں نے اس پر دھیان دینا چھوڑ دیا تھا۔ خون آلود پلاستر والے زخمی بازو کو میں نے دائیں ہاتھ سے سہارا دے رکھا تھا۔ یہ ویران جگہ تھی لیکن کافی دور فاصلے پر درختوں کے درمیان سے آبادی کی روشنیاں جھلکتی تھیں۔ یقیناً یہ شہر کی مضافاتی روشنیاں تھیں۔ درمیانی فاصلہ معلوم نہیں کتنا تھا...... دو کلومیٹر یا تین کلومیٹر...... یا اس سے بھی زیادہ۔

میرا دل چاہا، میں بھاگتے بھاگتے پکارنا شروع کر دوں...... کوئی ہے...... کوئی ہے......

لیکن اس پکار کا نتیجہ الٹا بھی نکل سکتا تھا۔ کوئی ایسا شخص یا اشخاص میری راہ میں آسکتے تھے، جو مجھے درکار نہ ہوتے۔ مجھے اپنے تعاقب کی بھی مسلسل فکر تھی۔ وہ لوگ کسی بھی وقت مجھ تک پہنچ سکتے تھے۔ تاہم ابھی عقب میں دور تک ان کے آثار نہیں تھے۔

بھاگتے ہوئے میری نگاہ بار بار گھڑی کی سوئیوں کی طرف اٹھتی تھی۔ منٹوں کی سوئی بتدریج ایک کے ہندسے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اب وہ چھ کو کراس کر چکی تھی۔ مطلب یہ تھا کہ جاماجی میں قیامت برپا ہونے میں تیس منٹ سے زیادہ نہیں ہیں۔

ذہن میں کئی سوال ابھر رہے تھے...... کیا مجھے راستے میں کوئی ایسی سواری مل جائے گی جو جلد از جلد شہر کی حدود میں پہنچا سکے؟

کیا کوئی ایسا وفادار افسر یا اہم شخص مل جائے گا جسے میں حقیقت حال سے آگاہ کر سکوں؟

کیا میں اسی طرح زخمی ٹخنے کے ساتھ بھاگتے بھاگتے تھک کر گر تو نہیں جاؤں گا؟

مجھے یہ سب کچھ میراتھن ریس جیسا لگ رہا تھا۔ میراتھن ریس میں یونان کی ''جنگ میراتھن'' کا ایک زخمی سپاہی فتح کی خبر لے کر بھاگتا ہوا میدانِ جنگ سے ایتھنز کی طرف گیا تھا۔ میں بھی ایک خبر لے کر بھاگ رہا تھا لیکن یہ فتح کی خبر نہیں تھی۔ یہ ایک خطرناک سازش کی خبر تھی۔ یہ ایک ''وفادار'' کی بے وفائی اور غداری کی اطلاع تھی۔ اس کا بروقت پہنچنا ضروری تھا ورنہ بہت کچھ ختم ہو جاتا تھا۔

میری پنڈلیاں شل ہونے لگیں، ہمت جواب دینے لگی۔ دل سے آواز آئی۔ ''شاہ زیب! تم نہیں پہنچ پاؤ گے۔ اس ویرانے میں بھاگتے بھاگتے کسی کھائی میں گرو گے اور اٹھ نہ سکو گے۔ اچانک میں سرچ لائٹ میں نہا گیا۔ دائیں طرف ٹیلوں سے کسی نے پکار کر کہا۔

''رک جاؤ، تم گن پوائنٹ پر ہو۔''

میں چند قدم بھاگ کر رک گیا۔ سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ بالائی جسم پسینے سے شرابور تھا۔ تین باوردی سپاہی لپک کر میرے سامنے آگئے۔ ان کی وردیاں سبز تھیں اور ان میں سے ایک سینئر نظر آتا تھا۔ میں نے اس سے انگلش میں کہا۔ ''میرا نام شاہ زیب ہے۔ میں ڈی پیلس کے مہمان خانے میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ میرے پاس عزت مآب کے لیے ایک بہت ہی اہم اطلاع ہے۔ پلیز...... مجھے جلد سے جلد کسی ذمے دار شخص تک یا پھر عزت مآب تک پہنچائیں۔''

''لیکن......تم کہاں سے آرہے ہو؟'' آرمی آفیسر نے اجنبی لہجے میں کہا۔ یقیناً وہ مجھے نام اور شکل سے نہیں پہچانتا تھا۔

میں نے کہا۔ ''دیکھو آفیسر! میرے پاس وقت نہیں ہے۔ بلکہ ہم میں سے کسی کے پاس بھی وقت نہیں ہے۔ پندرہ بیس منٹ کے اندر یہاں بہت کچھ ہو جائے گا۔ کیا تم موبائل فون پر کسی بڑے افسر سے میری بات کرا سکتے ہو۔ وہ یقیناً مجھے پہچان جائے گا۔''

''موبائل فون تو بند پڑے ہیں۔'' آفیسر نے جاناں کی اطلاع کی تصدیق کی۔

''کوئی وائرلیس سیٹ نہیں ہے تمہارے پاس؟''

''نہیں، اس وقت تو نہیں ہے۔'' آفیسر نے جواب دیا۔ تاہم اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اس نے بھی معاملے کی اہمیت کو محسوس کر لیا ہے اور مجھے پوری سنجیدگی سے لے رہا ہے۔

میں نے کہا۔ ''آفیسر میرے پیچھے کچھ لوگ ہیں۔ وہ یہاں تک بھی پہنچ سکتے ہیں۔ مجھے یہاں سے نکلنا ہے۔''

اس نے چند لمحے تک بغور میرا جائزہ لیا پھر مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے درختوں کی طرف بڑھا۔ یہاں ایک فوجی جیپ موجود تھی۔ ان لوگوں نے مجھے جیپ پر سوار کیا اور حتی الامکان رفتار سے شہر کی طرف بڑھے۔ راستے میں وہ بار بار مجھ سے پوچھتے رہے کہ معاملہ کیا ہے؟ اور میری یہ درگت کیسے بنی ہے؟ لیکن میں ان کے سامنے زبان کھولنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے شکوک نے گھیرا ہوا تھا۔ ان تینوں میں سے بھی کوئی آقا جان کا وفادار ہو سکتا تھا۔

جیپ شہر میں داخل ہوئی اور آندھی کی رفتار سے ڈی پیلس کی طرف بڑھنے لگی۔ رات کے اس پہر بھی سڑکوں پر فوجی گاڑیوں کی غیر معمولی نقل و حرکت جاری تھی۔ تاریک آسمان پر کسی ہیلی کاپٹر کی پُراسرار پھڑ پھڑاہٹ بھی سنائی دے رہی تھی۔ ایک اسپتال کے باہر بے شمار خالی ایمبولینسز قطار میں کھڑی تھیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ سب اسی فیصلہ کن حملے کی تیاریاں ہیں جو آج رات گرین فورس کی طرف سے گرے فورس پر کیا جانا ہے۔ ہم ڈی پیلس

کے پہلو سے ہوتے ہوئے مین گیٹ کی طرف بڑھے۔ میں نے دیکھا کہ ڈی پیلس کے ایک مغربی گیٹ کو اینٹوں کی چنائی سے بند کیا جا رہا ہے۔

ڈی پیلس کے بیرونی ناکے کے سامنے پہنچ کر جیپ کے بریک زور سے چرچرائے۔ شناخت کے لیے دو شاہی گارڈز جیپ کی طرف بڑھے، میں ان کے پہنچنے سے پہلے ہی نیچے اتر آیا۔ یہ لوگ مجھے پہچانتے تھے لیکن میرے ابتر حلیے نے انہیں بری طرح چونکایا۔

''سر! آپ یہاں اس حال میں؟'' ایک گارڈ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''مجھے فوراً ملنا ہے۔ عزت مآب، قسطینا صاحبہ یا کمانڈر افغانی......کوئی بھی ہو۔''

میری عجلت اور میرے حلیے نے گارڈز کو ٹھٹکا دیا تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مجھے فوری طور پر اندر جانے دیں یا سوال جواب کریں۔

سینئر گارڈ نے ملائیشین لہجے کی انگلش میں کہا۔ ''جناب! آپ مناسب لباس میں نہیں ہیں۔ آپ گاڑی میں تشریف رکھیں۔ میں آپ کے لیے کپڑے فراہم کرتا ہوں۔''

میں نے تڑخ کر کہا۔ ''میرے کپڑوں کو چھوڑو۔ یہ موسٹ ارجنٹ معاملہ ہے۔ میں کسی بڑے افسر سے بات کرنا چاہتا ہوں......فوراً۔''

میں آگے بڑھا تو گارڈ میرے راستے میں حائل ہوا۔ میں نے اسے الٹے ہاتھ کا تھپڑ رسید کیا۔ گارڈز ہکا بکا رہ گئے۔ یہی وقت تھا جب کسی گاڑی کے بریک بلند آواز میں چرچرائے۔ میں نے مڑ کر دیکھا اور سناٹے میں رہ گیا۔ یہ آقا جان کی بلیک مرسیڈیز گاڑی تھی۔ کھڑکی میں سے آقا جان کا چہرہ نظر آرہا تھا۔ ٹیوب لائٹس کی روشنی میں اس کے تاثرات صاف نظر آرہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں حیرت ہی حیرت تھی۔ میں سمجھ گیا کہ اب صورتِ حال خراب تر ہونے جارہی ہے۔ وہ تڑپ کر گاڑی میں سے نکلا اور سیدھا میری طرف آیا۔

ہماری آنکھیں چار ہوئیں۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ سیدھی گولی میرے ماتھے پر مارتا تا کہ میں ایک لفظ بولے بغیر راہی عدم ہوتا۔

وہ ششدر تھا کہ میں اس کے عقوبت خانے کے نہایت سخت حصار کو توڑ کر یہاں موجود تھا۔ موبائل سروس بند تھی ورنہ اب تک یقیناً اس کو خبر مل چکی ہوتی کہ میں ''آشیانوں'' سے فرار ہو چکا ہوں۔

''کیا ہو رہا ہے یہاں؟'' آقا جان غیظ و غضب کے عالم میں چنگھاڑا اور بالکل میرے مقابل آن کھڑا ہوا۔

''میرے راستے سے ہٹو۔ میں اندر جانا چاہتا ہوں۔''

''مجھے بتاؤ، تم آ کہاں سے رہے ہو۔ تمہارے حواس ٹھیک نہیں لگتے۔''
''تمہیں بھی پتا ہے کہ میرے حواس ٹھیک کیوں نہیں ہیں؟'' میں نے بھی نفرت سے جواب دیا۔
''اس کو سنبھالو۔'' آقا جان نے اپنی ناک کے بل کو کچھ اور موٹا کرتے ہوئے ذاتی گارڈز کو حکم دیا۔
اس سے پہلے کہ آقا جان کا فقرہ پوری طرح مکمل ہو پاتا۔ میرے دائیں ہاتھ کا طوفانی تھپڑ آقا جان کے گال پر پڑا۔ تھپڑ کی آواز اتنی زوردار تھی کہ دور تک گونجی۔ آقا جان کے نیم گنجے سر سے پی کیپ اچھل کر دور جا گری۔ وہ خود بھی لڑکھڑا کر دو قدم پیچھے چلا گیا۔ چند لمحوں کے لیے جیسے ہر کوئی سناٹے میں رہ گیا تھا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جاماجی کے بااثر ترین شخص کے منہ پر اس طرح سرِعام زناٹے کا تھپڑ رسید کیا جائے گا۔ یہ تھپڑ، عزت و احترام اور مرعوبیت کے اس طویل سلسلے کا اختتام تھا جس نے لوگوں کی گردنیں آقا جان کے سامنے جھکا رکھی تھیں، وہ اس کی غیر مشروط اطاعت کرتے چلے جا رہے تھے...... اور یہ تھپڑ آقا جان کے منہ پر ہی نہیں پڑا تھا اس پورے غدار ٹولے کے منہ پر پڑا تھا جس نے بڑی رازداری سے ایک بھیانک سازش کے تانے بانے بنے تھے۔
چند لمحوں بعد آقا جان کو اور اس کے اردگرد موجود لوگوں کو جیسے ہوش آیا۔ گارڈز شہد کی مکھیوں کی طرح مجھ سے چمٹ گئے۔ یہی وقت تھا جب میری نگاہ ڈی پیلس کے مین گیٹ کی طرف اٹھی۔ میں نے پروٹوکول کی گاڑیوں کے درمیان قسطینا کی بلٹ پروف لینڈ کروزر دیکھی۔ وہ خود بھی اس میں موجود تھی۔ وہ شاید اگلے مورچوں کی طرف جا رہی تھی۔
میں نے اپنا رخ اس کی طرف پھیرا اور پھیپھڑوں کی پوری طاقت سے چلایا۔ ''قسطینا...... قسطینا......'' خود کو چھڑانے کی کوشش میں، میں گرا اور میرے ساتھ کئی گارڈز گرے۔
میری آواز موٹر سائیکلوں کے ہوٹرز میں دب رہی تھی۔ میں نے ایک بار پھر قسطینا کو پکار کر اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا مگر اس سے پہلے ہی آقا جان نے میرے ہونٹوں پر اپنی ہتھیلی مضبوطی سے جما دی۔ میرا باقی جسم گارڈز نے جکڑا ہوا تھا۔ آقا جان کے اکہرے جسم میں اتنی طاقت تو نہیں تھی لیکن ان لمحوں میں شاید اس کے اندر اضافی طاقت آ گئی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے میرے بال جکڑ رکھے تھے اور دوسرے سے منہ دبا رکھا تھا۔ مجھے شدید ترین بے بسی کا احساس ہوا۔ قسطینا اور اس کے پروٹوکول کی گاڑیاں مجھ سے پچیس تیس فٹ کی دوری سے

گزر گئیں۔ جونہی یہ گاڑیاں نگاہوں سے اوجھل ہوئیں، آقا جان کے اشارے پر اس کے ایک تنومند ذاتی گارڈ نے رائفل کے آہنی کندے سے میرے سر پر دو بھرپور ضربیں لگائیں، میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ پہلی ضرب عین کنپٹی پر لگی تھی۔ (نیم بے ہوشی کی کیفیت میں بھی اس ضرب کی اذیت محسوس ہو رہی تھی)

یہ ویسی ہی عارضی بے ہوشی تھی جو Ring میں بھی فائٹرز پر طاری ہو جاتی ہے۔ خاص طور سے باکسرز پر۔ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ کچھ لوگ مجھے بے رحمی سے گھسیٹ کر کسی گاڑی وغیرہ میں ڈال رہے ہیں۔ دور افتادہ آوازیں بھی کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ پھر دماغ پر چھایا ہوا اندھیرا چھٹنا شروع ہو گیا۔ گاڑی تیز رفتاری سے جا رہی تھی لیکن ابھی شہر کے اندر ہی تھی۔ لگتا تھا کہ ڈی پیلس سے زیادہ دور نہیں گئی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ میں گاڑی کے فرش پر اوندھا پڑا ہوں۔ میرے ہاتھ پشت پر کسی چیز سے جکڑے ہوئے ہیں اور میری پشت پر کئی ایک فوجی بوٹ ہیں۔ گاڑی میں بیٹھے ہوئے سپاہیوں نے مجھے پاؤں تلے دبا رکھا تھا۔ یقیناً یہ آقا جان کے وفادار جتھے کے افراد تھے۔

کیا یہ لوگ مجھے پھر اسی منحوس جگہ لے جا رہے ہیں جسے ''آشیانے'' کا نام دیا جاتا ہے؟ یا پھر کہیں آگے جا کر یہ لوگ مجھے شوٹ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟ اچانک گاڑی رک گئی۔ گاڑی ایک شدید جھٹکے سے رکی تھی۔ جیسے اسے زبردستی روکا گیا ہو۔ پھر ایک ہنگامہ سا شروع ہو گیا۔ میری نگاہ بدستور دھندلائی ہوئی تھی۔ سر بے طرح چکرا رہا تھا۔ میں بس یہی دیکھ سکا کہ کچھ لوگ گاڑی میں موجود فوجیوں پر پل پڑے ہیں۔ میں نے دھندلائی نگاہوں سے انیق کی جھلک دیکھی۔ وہ ایک سپاہی کے سر پر رائفل کا دستا رسید کر رہا تھا پھر میں نے کرخت سنگھ کو دیکھا جو ایک دوسرے سپاہی سے لپٹا ہوا تھا۔ گاڑی میں للکارے گونج رہے تھے۔ ان للکاروں میں شاید کبڈی شاہ، سیف کی آواز بھی شامل تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ اس بدترین وقت میں میرے دوست پہنچ گئے ہیں۔ دو تین گولیاں چلیں...... پھر ایک برسٹ فائر ہوا۔ میں نے کرخت سنگھ کو گرتے ہوئے دیکھا۔

دفعتاً ''ہالٹ...... ہالٹ'' کی بہت سی آوازیں بلند ہوئیں۔

میرا ذہن اندھیرے اجالے کے بھنور میں تھا۔

نیم بے ہوشی کی کیفیت میں یہ احساس بھی ہوا کہ کچھ اور مسلح افراد یہاں پہنچ گئے ہیں اور انہوں نے اس شدید ہنگامے کو کنٹرول کر لیا ہے۔ تب میرے کانوں میں کمانڈر افغانی کی گونجدار آواز بھی پڑی۔ وہ کسی سے مخاطب ہو کر کہہ رہا تھا۔ ''سب اپنا اپنا ہتھیار نیچے رکھ دو۔

نہیں نہیں، تم بھی رکھ دو۔''
پھر اس نے شاید میرے ساتھیوں میں سے کسی کو مخاطب کیا تھا۔''اماری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔تم لوگ جانوروں کے ماپق (مافق) آپس میں لڑ رہا ہے۔اوپر سے لڑائی کا وقت امارے سر پر کھڑا ہے۔کیا تم لوگ دیوانہ ہو گیا ہے؟''
کمانڈر افغانی کے کسی ساتھی کی آواز آئی۔وہ افغانی سے کہہ رہا تھا۔''خاناں! یہ سردار بہت زخمی ہے۔اس کو پوراً اسپتال پہنچانا پڑے گا۔''
یہ فقرہ غالباً کرخت سنگھ کے بارے میں کہا گیا تھا۔میری آنکھوں کے سامنے چنگاریاں سی اُڑ رہی تھیں مگر اتنا ضرور تھا کہ اب میں اردگرد کے مناظر دیکھ سکتا تھا۔میں گاڑی کے اندر ہی تھا۔کمانڈر افغانی مجھ پر جھکا ہوا تھا۔''یہ سب کیا ہے برادر! تم ٹھیک تو ہو نا؟''اس نے میرے ہاتھ کھولتے ہوئے کہا۔
''مجھے چھوڑو افغانی صاحب، تم دوسروں کی فکر کرو۔ہم سب پر بہت بڑا ظلم ہونے والا ہے......اور یہ ظلم آقا جان کروا رہا ہے۔ہمارے پاس ٹائم بہت کم ہے۔میں آپ کو تفصیل نہیں بتا سکتا۔اگلے چند منٹ کے اندر ہماری فورس کے تینوں بڑے ایمونیشن ڈپوز میں دھماکے ہونے والے ہیں، سب برباد ہو جائے گا۔''
''خو، تم کیا بات کرتا ہے۔تم کو کس نے بتایا ہے؟''
''افغانی صاحب! میں آپ کو پھر بتاتا ہوں، یہ سوال جواب کا وقت نہیں ہے۔مجھے بتائیں، یہاں آپ کے پاس وائرلیس موجود ہے؟''
''ہاں، یہ سامنے میرا گاڑی کھڑا ہے۔اس میں ہے وائرلیس۔''
''آپ ایک سیکنڈ ضائع کیے بغیر ان تینوں جگہوں پر رابطہ کریں۔وہاں پر اس وقت جو انچارج ہیں۔ان کو بتائیں کہ یہاں دھماکا خیز مواد ہے۔وہ اسے فوراً ڈھونڈیں۔''
کمانڈر افغانی ایک پیدائشی جنگجو اور جہاندیدہ شخص تھا۔میرے تاثرات نے اسے سمجھا دیا کہ معاملہ سنگین ہی نہیں سنگین تر ہے۔
میں نے دیکھا کہ آقا جان کے وہ وفادار گارڈز جنہوں نے مجھے دوبارہ اغوا کرنے کی ناکام کوشش کی تھی سڑک پر اوندھے لیٹے تھے اور کمانڈر افغانی کے لشکریوں نے ان پر رائفلیں تان رکھی تھیں۔
کمانڈر افغانی کا چہرہ دھواں ہو گیا تھا۔اس نے مجھ سے دو تین مختصر سوال مزید پوچھے اور پھر وائرلیس کرنے کے لیے اپنی ہائی ایکس گاڑی کی طرف لپکا۔میرے جسم پر جیسے زخموں

اور چوٹوں کی بہار آئی ہوئی تھی۔ اس بہار میں ایک شگوفہ اور کھلا تھا۔ یہ میری کنپٹی کی وہ مہلک چوٹ تھی جس نے مجھے تین چار منٹ کے لیے قرب وجوار سے بیگانہ کر ڈالا تھا۔

انیق نے مجھے سہارا دے کر بٹھایا۔ پانی پلایا۔ سیف بھی میرے بارے میں بے حد فکرمند دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''کرخت سنگھ کو کیا ہوا ہے؟''

''ایک گولی لگی ہے جی پیٹ میں...... اسپتال لے گئے ہیں۔ ان شاء اللہ سنبھل جائے گا۔'' انیق بولا۔ اس کی آنکھوں میں سوال ہی سوال تھے۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ پچھلے تین دن میں کہاں اور کس حال میں رہا ہوں۔ ابھی میں نے اسلحہ گوداموں میں دھماکوں کی جو بات کہی تھی وہ بھی انیق اور سیف نے سنی تھی اور اس حوالے سے بھی وہ شدید الجھن اور پریشانی میں تھے۔

''کیا ٹائم ہوا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ایک بجنے میں دس منٹ ہیں۔'' انیق نے میری ہی رسٹ واچ دیکھ کر جواب دیا۔

''او گاڈ...... بہت تھوڑا وقت ہے...... شاید ہی یہ لوگ ''پلانٹڈ مواد'' ڈھونڈنے میں کامیاب ہوسکیں۔''

اگلے آٹھ دس منٹ بے حد اضطراب انگیز تھے۔ کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ مجھے پتا چلا کہ کمانڈر افغانی مسلسل وائرلیس پر مصروف ہے، اس نے ہرہائی نس قسطینا سے بھی رابطہ کرلیا ہے۔ وہ دونوں متعلقہ لوگوں کو مسلسل ہدایات دے رہے ہیں۔ زمین پر لیٹے ہوئے گارڈز کے ہاتھ پشت پر باندھ دیئے گئے تھے اور مسلح رضا کاروں نے انہیں ایک بند گاڑی میں ڈال دیا تھا۔ بہت سے ہتھیار بند لشکری میرے گرد بھی حفاظتی گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ آخر وہ وقت آیا جب گھڑی کی سوئیوں نے ایک بجے شب کا وقت بتایا۔ سیکنڈوں کی سوئی آگے کو سرکتی رہی۔ اس نے ایک چکر مکمل کیا، پھر دوسرا پھر تیسرے چکر میں داخل ہوگئی۔ اب امکان پیدا ہورہا تھا کہ شاید کمانڈر افغانی حالات کو سنبھالنے میں کامیاب ہوگیا ہے۔ اسلحہ گوداموں کے اندر دھماکا خیز مواد کی نشاندہی ہوگئی ہے...... ایک دوسرا امکان یہ بھی ذہن میں آرہا تھا کہ شاید...... شاید جاناں تک جو معلومات پہنچیں، وہ درست نہ ہوں یا ان کی ٹائمنگ کے حوالے سے کوئی کمی بیشی ہو۔ لیکن پھر...... سیکنڈوں کی سوئی کا تیسرا چکر مکمل نہیں ہوسکا۔ شہر کے کنٹونمنٹ ایریا کی طرف سے ایک دھماکا سنائی دیا اور یہ ایسا دھماکا تھا جو محاورتاً نہیں حقیقتاً کانوں کے پردے پھاڑ سکتا تھا۔ یوں لگا جیسے پورا جزیرہ بارود سے اڑ گیا ہے۔ میں نے گاڑی کی کھڑکی میں سے ایک ہیبت ناک شعلہ آسمان کی طرف اٹھتے دیکھا۔

اردگرد موجود لشکری جیسے چلا اٹھے تھے۔ انیق میرے بالکل قریب بیٹھا تھا، وہ پکارتا جا رہا تھا۔ ''او مائی گاڈ......او مائی گاڈ۔''

شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ جاناں کی معلومات بالکل درست تھیں۔ ایک ایمونیشن ڈپو تباہ ہو چکا تھا۔

ابھی ہم اس دھماکے سے سنبھل بھی نہ پائے تھے کہ دوسرا فلک شگاف دھماکا ہوا۔ یہ شہر کے مغربی مضافات میں کہیں ہوا تھا۔ اس دھماکے کی آواز ہم تک بعد میں پہنچی، پہلے وہ خیرہ کن چمک پہنچی جو اس بہت بڑے بلاسٹ کا نتیجہ تھی۔ تب سماعت شکن آواز کانوں سے ٹکرائی اور زمین دہل گئی۔

میں بے قرار ہو کر گاڑی سے باہر نکل آیا۔ میں نے دیکھا کمانڈر افغانی اپنی ہائی ایکس گاڑی کے اندر، اپنا سر دونوں ہاتھوں میں پکڑے بیٹھا ہے۔ اس کے اردگرد موجود بڑے بڑے پگڑوں والے لشکری بھی سکتہ زدہ کھڑے تھے۔ ''یہ کیا ہو گیا جی؟'' انیق نے سراسیمہ لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

ہم کمانڈر افغانی کے قریب پہنچے۔ اس کا چہرہ مسمار کھنڈر کا نمونہ پیش کر رہا تھا، آنکھیں سرخ تھیں، اس کے قریب رکھے وائرلیس سیٹ سے مسلسل ایک پکارتی ہوئی آواز آ رہی تھی۔ کمانڈر افغانی کا کوئی ماتحت دردناک آواز میں کہہ رہا تھا۔ ''دونوں ڈپو تباہ ہو گئے ہیں جناب......اوور۔''

چند سیکنڈ بعد وہ پھر بولا۔ ''دونوں ڈپو تباہ ہو گئے جناب...... ہر طرف آگ لگی ہوئی ہے۔ چھوٹے چھوٹے دھماکے بھی ہو رہے ہیں......اوور۔''

افغانی اس کال کا کوئی جواب نہیں دے رہا تھا شاید وہ دینے کے قابل ہی نہیں تھا۔ اس کا دماغ کہیں اور تھا...... مجھے بھی پتا تھا کہ اس کا دماغ کہاں ہے یقیناً دوسروں کی طرح اس کی ''سماعت'' بھی ایک تیسرے دھماکے کے خوف سے سہمی ہوئی تھی۔

میں نے دیکھا کنٹونمنٹ ایریا کی طرف شعلے آسمان سے باتیں کر رہے ہیں، ان کی سرخی رات کی تاریکی پر حاوی ہوتی چلی جا رہی تھی۔ تباہ ہونے والا دوسرا ڈپو کچھ فاصلے پر تھا، مگر وہاں کے شعلے بھی صاف دکھائی دیتے تھے۔

اور پھر تیسرا دھماکا ہوا۔ یہ دھماکا حیرت انگیز طور پر زیادہ شدید نہیں تھا، حالانکہ یہ بھی کنٹونمنٹ میں ہی ہوا تھا۔ اس کا مقام کنٹونمنٹ کا شمالی حصہ تھا۔ یہاں بھی پھنکارتے ہوئے شعلوں اور دھوئیں کے بادلوں کی ''رونمائی'' ہوئی۔ اب پورے شہر میں خطرے کے سائرن

گونج رہے تھے۔ فضا میں ہیلی کاپٹر چکراتے نظر آئے اور سڑکوں پر ایمبولینسز اور فائر فائٹرز کی گاڑیاں شور مچانے لگیں۔

اسی دوران میں کمانڈر افغانی کا سکتہ ٹوٹ گیا۔ وائرلیس پر اس سے قسطینا نے رابطہ کیا۔ وہ اگلے مورچوں سے بول رہی تھی۔ اس کی لرزتی کانپتی آواز وائرلیس سیٹ پر ابھری۔ ''ہیلو افغانی...... قسطینا اسپیکنگ...... ہیلو افغانی...... یہ سب کیا ہوا ہے...... اوور۔''

افغانی نے ملائی زبان میں جواب دیا۔ ''یہ گہری سازش ہے قسطینا بی بی، شاہ زیب یہاں موجود ہے آپ بات کریں، اوور۔''

میں نے وائرلیس پر آ کر کہا۔ ''یور ہائی نس! میرے پاس مکمل ثبوت ہیں۔ یہ سب کچھ آقا جان کا کیا ہوا ہے۔ وہ غدار ہے۔ وہ جہاں کہیں بھی ہے، آپ اسے فوراً گرفتار کریں۔ اوور۔''

''شاہ زایب! تم یہ کیسی بات کہہ رہے ہو، انکل کے بارے میں اس طرح کی زبان استعمال نہ کرو۔ یہ تو......''

''پلیز یور ہائی نس!'' میں نے بڑی درشتی سے اس کی بات کاٹی۔ ''آپ یہ کیا کہہ رہی ہیں۔ کیا آپ سب لوگوں نے اپنی آنکھیں اور کان بالکل بند کر لیے ہیں۔ ایک بندہ آپ کو برباد کر رہا ہے۔ آپ کی آنکھوں کے سامنے آپ کے گلے پر چھری چلا رہا ہے اور آپ اس پر اپنا اعتماد اور اپنی محبتیں نچھاور کر رہی ہیں، ٹھیک ہے تو پھر کرتی رہیں محبتیں نچھاور۔ کافی کچھ آپ نے دیکھ لیا ہے اور بہت کچھ ابھی تھوڑی دیر میں دیکھ لیں گی۔ وہ خبیث شاید آج رات ہی رائے زل کے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑا نظر آئے گا۔ آج رات ہی......'' میں نے اپنے الفاظ دہرائے۔ میری آواز غصے سے چیخ رہی تھی۔

''آقا جان ہیں کہاں؟ اوور۔'' قسطینا نے پوچھا۔

''آپ سپریم کمانڈر ہیں۔ یہ آپ کو پتا ہونا چاہیے۔ مجھے یقین ہے، اگر آپ نے اگلے چند منٹ میں اس غدار کو گرفتار نہ کر لیا تو وہ آپ کو نظر نہیں آئے گا اور میں آپ کو یہ بھی بتا رہا ہوں، تھوڑی دیر کے اندر ہی رائے زل کی فورس ''کنٹرول لائن'' پار کرنے والی ہے...... اور یہ جو کچھ ہو رہا ہے...... آپ کے اسی چہیتے...... بدبخت انکل کی وجہ سے ہو رہا ہے، اوور اینڈ آل۔'' میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔ میرے سینے میں شعلے بھڑک رہے تھے۔

ڈی پیلس والے اندھے بہرے تھے کہ سب کچھ دیکھ کر بھی کچھ نہیں سمجھ رہے تھے؟ میں نے یہی سوال کمانڈر افغانی سے کیا۔

وہ بولا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہا ہے برادر! اب تو اس بات میں کوئی گنجائش نہیں رہا کہ آقا جان وہ نہیں جو نظر آتا ہے، یہ دو چہرے والا بندہ ہے۔''

''اور یہ دو چہرے والا بندہ آپ سب کا بیڑا غرق کر چکا ہے۔ آپ کو کچھ کچھ تو سمجھ میں آ ہی گیا ہو گا کہ اب آپ کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ گرے فورس بس تھوڑی ہی دیر میں آپ لوگوں پر چڑھ دوڑنے والی ہے۔''

کمانڈر افغانی جیسے جنگجو کا چہرہ بھی زرد نظر آنے لگا تھا، وہ بولا۔ ''امارا خیال ہے کہ ام کو وہ بڑا پل اُڑا دینا چاہیے جو ہوائی اڈے سے ڈی پیلس کی طرف آتا ہے۔''

''اُڑا نہیں دینا چاہیے اُڑا دو...... ابھی اُڑا دو۔'' میں نے تقریباً چلاتے ہوئے کہا۔

ایک دوسرے وائرلیس سیٹ پر بھی کوئی پیغام آ رہا تھا۔ کمانڈر افغانی کا ایک ماتحت یہ پیغام سننے میں مصروف تھا۔ انیق بھی پاس ہی کھڑا تھا۔ اس نے آ کر مجھ سے کہا۔ ''شاہ زیب بھائی! ان بری خبروں کے درمیان ایک چھوٹی سی اچھی خبر بھی ہے۔ تیسرا ایمونیشن ڈپو مکمل طور پر تباہ ہونے سے بچ گیا ہے۔ آپ نے سنا ہی ہے۔ وہاں ہونے والا دھماکا زیادہ شدید نہیں تھا۔''

''کیا خبر آئی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بتایا جا رہا ہے کہ ڈپو کے صرف ایک بیرونی حصے میں دھماکا ہوا ہے۔ اندرونی حصوں سے دھماکا خیز مواد ہٹایا جا چکا تھا۔''

اگر یہ خبر درست تھی تو کسی حد تک امید افزا تھی۔ جاناں کی قربانی اور میری بھاگ دوڑ مکمل طور پر رائیگاں نہیں گئی تھی۔ جو کچھ یہاں ہو چکا تھا اس کے مطابق تو اب ایک ایک گولی کی قدر و قیمت تھی۔ اگر تیسرے ڈپو کا بڑا حصہ بلاسٹ ہونے سے بچ گیا تھا تو پھر گرین فورس کو اپنا دفاع کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ گولا بارود تو مہیا ہو ہی سکتا تھا۔

کمانڈر افغانی اپنے بکھرے بالوں کے ساتھ میری طرف آ رہا تھا۔ ''قسطینا صاحبہ سے رابطہ ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ اِدھر ہی آ رہا ہے۔'' کمانڈر افغانی نے جواب دیا۔

''پل اُڑانے کا کیا بنا؟'' میں نے ذرا جھنجلا کر پوچھا۔

''امارے ایک دو دستے پل کی دوسری طرف ہے۔ قسطینا بی بی نے ان کو پوراً پیچھے آنے کا آرڈر دیا ہے۔ اس کے بعد بلیک ہاک ہیلی کاپٹرز کے ذریعے پل پر بم گرائے جائیں گے۔''

شہر کے اردگرد تین جگہوں پر شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ افق بالکل سرخ نظر آرہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ان خوفناک دھماکوں کے سبب پورے شہر کا درجۂ حرارت بڑھ گیا ہے۔ سردی میں کمی محسوس ہو رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے دھماکوں کی آواز اب بھی آرہی تھی۔ پورے شہر میں ایمبولینسز اور فائر بریگیڈ کی گاڑیوں کے سائرن گونج رہے تھے۔ لیکن یہ تو ابتدا تھی۔ میں جانتا تھا کہ ابھی کچھ دیر میں شہر پر کیا قیامت ٹوٹنے والی ہے۔ گرین فورس کا بیشتر گولا بارود برباد ہو چکا تھا۔ رائے زل اور اس کی ماں ہاناوانی، ایجنسی کی مدد سے اپنا کاری وار کرنے میں کامیاب رہے تھے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ انہوں نے یہ وار ایک غدار کی مدد سے کیا تھا تو بالکل غلط نہ ہوگا۔ غیر ملکی آقا اور قابضین ہمیشہ ''مقامی غداروں'' سے مل کر ہی کاری وار کرتے ہیں...... تاریخ اس امر کی گواہ ہے۔ گرین فورس کے چھوٹے چھوٹے کانوائے سڑک پر سے گزر رہے تھے۔ وہ ابھی عزت مآب، جاماجی اور قسطینا کے نام کے پُر جوش نعرے لگا رہے تھے۔ انہیں ٹھیک سے معلوم نہیں تھا کہ لڑائی شروع ہونے سے پہلے ہی انہیں ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا جا چکا ہے۔ اب ان کا سامنا ''بڑے کڑے وقت'' سے ہونے والا ہے۔

ہیوی بائیکس کے ہوٹر سنائی دیئے اور پروٹوکول کی سبز گاڑیاں نظر آئیں۔ پتا چلا کہ قسطینا پہنچ گئی ہے۔ وہ بڑی تیزی کے ساتھ اپنی گاڑی سے اتری۔ وہ مکمل وردی میں تھی...... لیکن افغانی کی طرح اس کا رنگ بھی اُڑا ہوا تھا۔

وہ حیرت سے میرے ابتر حلیے کو دیکھنے لگی پھر جلدی سے مجھے اپنی بلٹ پروف گاڑی کے اندر لے گئی بولی۔ ''شاہ زائب! پوچھنے والے سوال تو بہت سے ہیں۔ لیکن مجھے بتاؤ کہ انکل کے خلاف تمہارے پاس کوئی ثبوت ہے؟''

میں نے اپنے طیش کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''قسطینا ایک نہیں ''ایک سو ایک'' ثبوت ہیں، لیکن یہ وقت ثبوتوں کا نہیں۔ آپ فوراً آقا جان کو گرفتار کریں۔''

''ان کا کہیں پتا نہیں چل رہا۔''

''تو پھر ثبوتوں کی جان کو کیوں رو رہی ہیں۔ اس نمک حرام کو پتا چل گیا ہوگا کہ اس کا پول کھل گیا ہے۔ وہ اپنے وفادار جتھے کے ساتھ غائب ہو گیا ہوگا۔ اب وہ لڑائی کے دوران میں ہی سامنے آئے گا اور میں آپ کو گارنٹی دیتا ہوں۔ وہ گرین فورس کی گاڑی پر نہیں گرے فورس کی گاڑی پر سوار ہوگا...... اب یہ ساری بیکار کی باتیں ہیں قسطینا! اب اس کام پر توجہ فرمائیں جو آپ کر سکتی ہیں ورنہ بڑے افسوس سے کہتا ہوں، آپ لوگوں کو پچھتانے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔ کمانڈر افغانی نے پل اُڑانے والی جو بات کہی ہے اس سے بہتر اور کوئی کام

نہیں ہو سکتا۔ آپ فوراً اسے اڑانے کا حکم دیں۔ سو پچاس فوجی دوسری طرف رہ بھی جاتے ہیں تو کوئی بات نہیں۔'' میرا زخم زخم جسم اور میرے لہجے کی عجلت قسطینا پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ ناگواری کے باوجود وہ میری گفتگو سننے اور اسے اہمیت دینے پر مجبور ہو رہی تھی۔

وہ ایک بار پھر وائرلیس سیٹ کی طرف متوجہ ہو گئی اور متعلقہ لوگوں کو احکامات دینے لگی۔ میری نگاہ قسطینا کی سہیلی ڈاکٹر ماریہ پر پڑی۔ وہ بھی قسطینا کے ساتھ ہی گاڑی پر یہاں پہنچی تھی اور اب میری طرف آ رہی تھی۔ اس کا لباس حسبِ معمول پینٹ شرٹ ہی تھا۔ پاؤں میں جوگرز تھے۔ وہ بے حد ذہین اور چست دکھائی دیتی تھی۔ اس نے پاس آ کر میری چوٹوں کو دیکھا اور شستہ انگلش میں پوچھا۔ ''مسٹر شاہ زیب! یہ سب کیسے ہوا ہے؟ ہم لوگ تین دن سے آپ کے لیے پریشان تھے اور میڈم لورین کو ناول سنانے والی لڑکی...... اسے بھی یہاں بہت ڈھونڈا گیا ہے۔ لگتا ہے کہ آپ دونوں اکٹھے ہی تھے اور آپ کو زبردستی یہاں سے لے جایا گیا تھا۔''

''تم درست کہہ رہی ہو ڈاکٹر ماریہ! لیکن اس وقت ایسے سوال جواب کی مہلت نہیں، ہمیں اور بہت کچھ کرنا ہے۔''

''مثلاً کیا؟'' وہ پریشان لہجے میں بولی۔

''مثلاً یہ کہ میرا یہ ٹخنا...... یہ درد سے پھٹا جا رہا ہے...... اور یہ بازو۔''

اس نے سوچتے ہوئے ٹخنے کو دھیان سے دیکھا۔ ''مسٹر شاہ زیب! مجھے لگتا ہے بہت بری موچ ہے۔ ایکسرے کی ضرورت ہے۔''

''اس ''لاڈ پیار'' کا وقت نہیں ہے ڈاکٹر ماریہ! ہم سب اس وقت ایمرجنسی میں ہیں۔ آپ ''سن کرنے والا'' انجکشن دے دیں اور میرے اس بازو کو چھاتی کے ساتھ اس طرح باندھ دیں کہ یہ میری موومنٹ میں رکاوٹ نہ ڈالے۔''

''لیکن مسٹر شاہ زیب......''

''پلیز شٹ اپ...... پلیز۔'' میں نے جھنجلا کر اس کی بات کاٹی۔ ''اگر تم کر سکتی ہو تو وہ کرو جو میں کہہ رہا ہوں، ورنہ کوئی اور انتظام کرتا ہوں۔''

میرا لب ولہجہ دیکھ کر ڈاکٹر ماریہ کو مزید بولنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔ وہ اپنا سر اثبات میں ہلا کر قسطینا کی بلٹ پروف لینڈ کروزر کی طرف گئی اور چند لمحے بعد ایک میڈیکل باکس لے کر میری طرف آ گئی۔ اس نے میرے ٹخنے پر سن کرنے والا انستھیٹک اسپرے کیا اور پھر زیادہ طاقت کا درد کُش انجکشن دے دیا۔ میرے خون آلود پلاستر والے مفلوج بازو کو ایک لچک دار

پٹی کے ذریعے میرے سینے سے باندھ دیا۔ وہ میری کنپٹی کے گومڑ پر آئس بیگ کی ٹکور کرنا چاہتی تھی لیکن میں نے منع کر دیا۔

اس دوران میں قسطینا وائرلیس سیٹ سے فارغ ہو کر میری طرف آ گئی۔ وہ جو عام حالات میں ایک خوبرولڑکا دکھائی دیتی تھی۔ اب سرتاپا فوجی کمانڈر نظر آ رہی تھی۔ اس نے ہانپی ہوئی سی آواز میں کہا۔ ''تمہاری معلومات درست ہیں شاہ زائب! انٹیلی جنس کی اطلاعات بتا رہی ہیں کہ رائے زل کی فورس حرکت میں آ رہی ہے۔ وہ کنٹرول لائن عبور کرنے کے لیے پوری طرح تیار ہیں۔''

''آپ نے پل اُڑانے کے آرڈر کیے؟''

''ہاں، پانچ منٹ کے اندر ہیلی کاپٹر فلائی کرنے والے ہیں یا شاید اس سے بھی پہلے۔''

قسطینا کی دوسری بات درست تھی۔ ابھی بمشکل دو تین منٹ ہی ہوئے تھے کہ ائیر پورٹ کی طرف ہیلی کاپٹرز کی پروازیں نظر آئیں اور پھر زبردست چمک کے ساتھ دھماکے شروع ہو گئے۔ پل پر بمباری ہو رہی تھی۔

قسطینا نے اپنے سامنے جنگی نقشہ پھیلا لیا تھا۔ کمانڈر افغانی سمیت دو تین اور فوجی آفیسر اس پر جھکے ہوئے تھے۔ قسطینا ان لمحوں میں سرتاپا ایک سپہ سالار دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے ایک جگہ اپنی انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ دوسرا پل قریباً چھ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے لیکن اس پر اس طرح بمباری نہیں کی جا سکتی۔ پل کے دونوں سروں پر گنجان آبادی ہے۔''

''پہلے یہاں سے شہریوں کو نکالنا پڑے گا۔'' کمانڈر افغانی نے کہا۔

''مگر اتنی دیر میں رائے زل پل پر قبضہ کر لے گا۔ وہ اس پل کی جنگی اہمیت سے آگاہ ہے......اور ائیر پورٹ والے پل کی تباہی کے بعد تو یہ پل اور بھی اہم ہو گیا ہے۔'' قسطینا نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔

ابھی وہ یہ بات کہہ ہی رہی تھی کہ وائرلیس پر سگنل آنے لگے۔ اس نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف قسطینا کا ایک گھبرایا ہوا میجر تھا۔ اس نے بتایا کہ گرے فورس نے کنٹرول لائن پار کر لی ہے اور تیزی سے ''کالے پل'' کی طرف بڑھ رہی ہے۔'' (اس دوسرے پل کو مقامی طور پر کالے پل کا نام دیا جاتا تھا)

یہ اطلاع ملتے ہی قسطینا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''ہمیں اس پل کا دفاع کرنا ہو گا یا اسے گرانا ہو گا۔'' وہ پُرعزم لہجے میں بولی۔

''میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گا۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''تم زخمی ہو۔ کسی نے بہت برا حال کیا ہے تمہارا......''

''جس نے کیا ہے اس کا نام میں نے آپ کو بتایا ہے لیکن جو کچھ بھی ہے میں اس اہم ترین موقع پر پیچھے رہنا نہیں چاہتا اور نہ ہی میرے ساتھی رہیں گے۔ عزت مآب ہمیں یہاں لائے تھے تو کسی مقصد سے ہی لائے تھے۔''

قسطینا نے نظر بھر کر میری طرف دیکھا اور سمجھ گئی کہ یہ ویسی ہی صورتِ حال ہے جیسی کچھ دن پہلے سرنگ میں پیش آئی تھی اور میں اپنے فیصلے پر ڈٹ گیا تھا۔ وہ ایک گہری سانس لے کر اپنی ٹویوٹا لینڈ کروزر میں بیٹھ گئی۔ میں نے دوسری گاڑی کی طرف بڑھنا چاہا تو اس نے مجھے روکتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم نے جانا ہی ہے شاہ زائب! تو میرے ساتھ آ جاؤ۔''

میں نے دیکھا۔ انیق اور سیف ایک دوسری فوجی گاڑی میں سوار ہو رہے تھے۔ میں نے کہا۔ ''نہیں یور ہائی نس۔ میں اپنے دوستوں کے ساتھ رہنا چاہوں گا۔''

میرے لہجے کی رکھائی اس رویے کا ردِعمل تھی جو قسطینا ابھی تک اپنے ''انکل آقا جان'' کے حوالے سے دکھا رہی تھی۔

اس روکھے پن کو محسوس کر کے اس نے ''اوکے'' کہا اور ڈاکٹر ماریہ وغیرہ کے ساتھ بلٹ پروف گاڑی میں سوار ہو گئی۔ سوار ہونے سے پہلے اس نے ایک واکی ٹاکی پر اپنے آفیسرز کو اطلاع دی کہ وہ کالے پل کی طرف آ رہی ہے۔ اس کے پہنچنے تک وہاں موجود لوگ ہر صورت میں پل کا دفاع کریں۔ کمانڈر افغانی کی ہائی ایکس سب سے آگے تھی۔ گاڑیوں کا یہ قافلہ برق رفتاری سے بلیک برج یعنی کالے پل کی طرف روانہ ہوا۔ ائیر پورٹ والے پل پر ہونے والی بمباری اب ختم ہو چکی تھی اور اس جگہ سے بھی شعلے اور دھواں بلند ہو رہا تھا۔ ہم نے بے شمار پرائیویٹ گاڑیوں کو سڑکوں پر دیکھا، یہ لوگ جنگ کے بادلوں کو دیکھ کر مغربی ساحل کی طرف نکل رہے تھے۔ ہم ان کی مخالف سمت میں جنگ کے بادلوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ چند ہی ہفتے پہلے جب میں اور انیق کوٹلی سے آگے سردار سجاول کے ڈیرے پر تھے ہم نے سوچا بھی نہ تھا کہ اس قسم کے حالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ زیادہ سے زیادہ یہی خیال تھا کہ کوئی گینگ وار قسم کی صورتِ حال ہو گی لیکن یہاں تو کچھ اور ہی نقشے تھے، جزیرے کی حد تک باقاعدہ جنگ کی شکل نظر آ رہی تھی۔ بھاری اسلحہ، اینٹی ائیر کرافٹ گنیں، مارٹر اور بوفر توپیں، راکٹ لانچرز...... یہاں تک کہ ہیلی کاپٹرز کے ذریعے بمباری بھی کی جا رہی تھی۔ میں اپنی دائیں جانب پرائیویٹ گاڑیوں کی طویل قطار دیکھ رہا تھا۔ گاڑیوں کی کھڑکیوں میں بچے سہمے دکھائی دیتے تھے، جیسے خاموشی کی زبان میں گرین فورس کے سپاہیوں سے پوچھ رہے

ہوں۔''کیا تم ہم کو بچا پاؤ گے؟'' مردوں کے چہرے بجھے ہوئے تھے۔ بہت سی عورتیں دعائیہ انداز میں کچھ بڑبڑاتی نظر آتی تھیں۔ جاما جی میں اکثریت شریف النفس مسلمانوں کی تھی۔ اگر ان کا سربراہ (ریان فردوس) اچھا مسلمان اور اچھا انسان نہیں تھا تو اس میں ان کا کیا قصور تھا۔ دوسری طرف نیوسٹی میں رائے زل تو سرے سے خدا کو مانتا ہی نہیں تھا۔ اس کی والدہ نے بھی عیسائیت، بدھ مت اور عملیات کو ملا کر اپنا کوئی علیحدہ ہی شوشہ چھوڑا ہوا تھا اور اس سے بھی تشویشناک بات یہ تھی کہ یہ لوگ جارحیت پسند تھے۔ امریکنوں کے ساتھ مل کر جاما جی والوں سے جینے کا حق چھین رہے تھے۔

ابھی ہم دو ڈھائی کلومیٹر آگے ہی گئے تھے کہ قسطینا کی گاڑی رک گئی۔ اس کے عقب میں فوجی گاڑیاں بھی رک گئیں۔ فوجی گاڑیوں کے پیچھے قریباً درجن بھر گاڑیوں میں رضا کار یعنی لشکری بھی آ رہے تھے۔ انہیں بھی ٹھہرنا پڑا۔

میں نے ڈیڑھ دو منٹ انتظار کیا پھر گاڑی سے اتر کر قسطینا کی گاڑی تک پہنچا۔ وہ کچھ پریشان نظر آ رہی تھی۔ اس کا ماتحت وائرلیس پر کسی سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرے پوچھنے پر ڈاکٹر ماریہ نے بتایا۔''کمانڈر افغانی کے ایک ماتحت کی کال آئی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ ابھی آگے نہ آئیں۔ آگے خطرہ ہے۔''

''کیسا خطرہ؟ ابھی تو ہم پل سے چار میل دور ہیں۔'' میں نے کہا۔

''شاید کوئی گڑبڑ ہے۔''

میں نے دیکھا کچھ دور کمانڈر افغانی بھی اپنی ڈاڑھی میں انگلیاں چلا رہا تھا اور وائرلیس پر بات کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔''ہیلو ام افغانی بول رہا ہے اوور...... ہیلو ام افغانی بول رہا ہے اوور۔'' وہ بار بار یہ فقرہ دہرا رہا تھا۔ وائرلیس میں سے شور کے سوا کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔

مارٹر توپوں کی گھن گرج سنائی دینے لگی تھی اور یہ آوازیں کالے پل کی جانب سے ہی آ رہی تھیں۔ بارود کی چمک سے تاریک افق پر مسلسل جھماکے سے ہو رہے تھے۔ میں کمانڈر افغانی کی ہائی ایکس گاڑی کے پاس جا کر کھڑا ہوا تھا۔ دفعتاً افغانی کا اپنے ماتحت سردار سے پھر رابطہ ہو گیا۔ ماتحت سردار کی خاصی گھبرائی ہوئی آواز آئی۔''خاناں! ادھر بہت گڑبڑ ہو گیا۔ ابھی آپ لوگ وہیں رکے رہیں۔ اوور۔''

''اوئے خدائی خوار! کچھ بکو گے بھی کہ کیا آپت (آفت) ٹوٹا ہے؟''

''خاناں! پل پر موجود سپاہیوں نے بالکل بھی مقابلہ نہیں کیا۔ ایک گولی بھی نہیں چلایا

حرامی کے بچوں نے۔ وہ سب کا سب دشمن سپاہیوں کے ساتھ مل گیا ہے۔ پل پر قبضہ ہو چکا ہے۔ رائے زل کے سپاہیوں کی بکتر بند گاڑیاں بڑی تیزی سے پل کراس کر کے اماری طرپ آرہا ہے۔ ام اپنی سیکنڈ دپاعی لائن پر ہے اوور۔''

کمانڈر افغانی دانت پیس کر رہ گیا۔ اس نے یہ اطلاع جا کر قسطینا کو دی۔ قسطینا کے چہرے کا رنگ بھی بدل گیا۔ میں نے انہیں مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ ''میری ناقص رائے یہ ہے کہ یہ خبر پھیلنی نہیں چاہئے۔ خاص طور سے کمانڈر افغانی کے لشکریوں میں۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو شاہ زائب؟'' قسطینا نے پوچھا۔

''آپ کو پتا ہی ہے کہ مقامی رضا کار (لشکری) ہیلی کاپٹرز کی بمباری والے واقعے سے کتنے خوف زدہ ہوئے تھے۔ وہ اسے ہاناوانی کی ''جادوگری'' سے جوڑنا شروع ہو گئے تھے۔''

قسطینا اور کمانڈر افغانی سمجھ گئے کہ میں کس واقعے کا ذکر کر رہا ہوں (اپنے ہی ہیلی کاپٹروں نے ڈی پیلس پر بم گرا دیئے تھے۔ بعدازاں یہ دونوں ہیلی کاپٹر نیوسٹی میں جا اترے تھے)

وائرلیس پر جو تشویش ناک اطلاع ملی تھی، اس کی تصدیق ہونا شروع ہو گئی تھی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ اب لڑائی کالے پل کی دوسری جانب نہیں ہماری جانب ہو رہی ہے۔ مارٹرز اور بوفرز وغیرہ کے گولے جو بہ آسانی چار پانچ کلومیٹر کا فاصلہ طے کر سکتے ہیں ہمارے قرب و جوار میں گر رہے تھے۔ قسطینا کے اندر کی جنگجو لڑکی پوری طرح بیدار ہو چکی تھی۔ اس نے وائرلیس سیٹ پر پہلے عزت مآب کو صورتِ حال سے آگاہ کیا، پھر اپنے سپاہیوں سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''ہم اپنے ایک ایک انچ کا دفاع کریں گے۔ ہم لڑنے کے لیے آگے بڑھ رہے ہیں۔''

قسطینا کا حکم سننے کے فوراً بعد کمانڈر افغانی نے متعلقہ افسران کو کال کی کہ فوراً انفنٹری ے : ستے پل ی طرف روانہ ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے ایمونیشن مورچوں تک پہنچانے کی ہدایت بھی کر دی۔ یہ وہی ایمونیشن تھا جو تیسرے ڈپو میں موجود تھا۔ اگر یہ ڈپو بھی تباہ ہو گیا ہوتا تو گرین فورس گولا بارود کی نایابی کے سبب نہتی تصور ہوتی۔ گاڑیاں پھر برق رفتاری سے آگے بڑھنا شروع ہوئیں۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ کھلی جنگ شروع ہو گئی ہے۔ ہر طرف دھماکے اور چھوٹے ہتھیاروں کی گونج تھی۔ سمندر کی طرف سے بھی راکٹ لانچر وغیرہ فائر ہو رہے تھے۔ ہمارا فوجی کانوائے آٹھ دس منٹ کے اندر اس مقام پر پہنچ گیا جہاں گرین

اور گرے فورس میں گھمسان کی جنگ ہو رہی تھی۔ میں نے سیف عرف سیفی کی طرف دیکھا، اس کا سینہ پھولا ہوا تھا اور آنکھوں میں تیز چمک تھی جیسے اسے اپنا من پسند ماحول ملا ہو اور وہ اپنی صلاحیتوں کو آزمانے کے لیے بے تاب ہو۔ رضا کاروں کی وردی بھی یوں تو سبز رنگ کی تھی تاہم وہ پینٹ قمیص سے زیادہ شلوار قمیص سے مشابہ تھی۔ سیف کے پاس وہ رائفل بھی موجود تھی جو اسے بھرتی کے وقت دی گئی تھی۔ وہ جیسے ایک اشارے پر میدانِ جنگ میں کود پڑنا چاہتا تھا مگر کودنا اتنا آسان نہیں تھا۔ یہ شہر کی کوئی سڑک نہیں تھی، یہ دہکا ہوا بارڈر تھا۔ یہاں آگ برس رہی تھی اور موت ناچ رہی تھی۔ ایسے مناظر میں نے اس سے پہلے صرف جنگی فلموں میں دیکھے تھے۔ بھروسا نہیں ہو رہا تھا کہ آج ہم بھی اس کا حصہ ہیں۔ اگلے مورچوں میں گرین فورس کے جانبازوں نے سر دھڑ کی بازی لگائی ہوئی تھی اور رائے زل کی گرے فورس کو روکنے کی پوری کوشش کر رہے تھے۔

قسطینا نے جنگی ہیلمٹ پہن لیا تھا، وہ اگلے مورچوں میں جانے کا ارادہ رکھتی تھی مگر کمانڈر افغانی، کمانڈر فارس اور کیپٹن سعد وغیرہ اس کے راستے میں ڈٹ گئے۔ کمانڈر افغانی نے ملائی زبان میں صاف کہہ دیا کہ وہ قسطینا کو آگے نہیں جانے دے گا۔ اس نے کہا۔ ''آپ ہمارے سپہ سالار ہیں۔ آپ کو کچھ ہو گیا تو ہم لڑنے سے پہلے ہی ہار جائیں گے۔''

قسطینا بولی۔ ''اگر ہم رائے زل کو یہاں روکنے میں کامیاب نہ ہوئے تو بھی ہار ہمارا مقدر بن جائے گی۔ یہ بڑی اہم گھڑیاں ہیں۔''

کمانڈر افغانی نے سینہ تان کر کہا۔ ''آپ ان اہم گھڑیوں میں ہماری رہنمائی کریں۔ ہم اگلے مورچوں میں جا رہے ہیں۔ اگر ہم زندہ نہ رہے تو پھر جو چاہے کر لیجیے گا۔''

کمانڈر فارس، کیپٹن سعد اور کئی دیگر اہم فوجی افسران نے بھی قسطینا کا راستہ روک دیا۔ آخر قسطینا کو بات ماننا پڑی۔ وہ پچھلے مورچوں میں رہی اور سیکڑوں جنگجو، کمانڈر افغانی کی قیادت میں فلک شگاف نعرے لگاتے اگلے مورچوں کی طرف لپک گئے۔ ہم قسطینا اور ڈاکٹر ماریہ وغیرہ کے ساتھ پچھلے مورچوں میں رہے، لیکن یہ مورچے بھی کچھ ایسے محفوظ نہیں تھے۔ خندقیں کھود کر ان کے سامنے ریت کی بوریوں کی دیواریں کھڑی کی گئی تھیں۔ یہاں شیل پھٹ رہے تھے اور گولیاں سیٹیاں بجاتی سروں کے اوپر سے گزر رہی تھیں۔ کسی وقت روشنی کا کوئی گولا فضا میں بلند ہوتا اور چند سیکنڈ کے لیے قرب و جوار جیسے دن کی روشنی میں نہا جاتے۔ صاف پتا چلتا تھا کہ جنگ لحہ بہ لحہ ہماری طرف بڑھتی چلی آ رہی ہے۔

ایک وائرلیس سیٹ قسطینا کے پاس رکھ دیا گیا تھا۔ قسطینا اس پر مصروف ہو گئی۔ وہ اپنی

فورس کے نبرد آزما یونٹوں کو مسلسل ہدایات دینے لگی۔ وہ ان کا حوصلہ بڑھا رہی تھی اور انہیں برابر آگے بڑھنے کے لیے کہہ رہی تھی۔ اس کے عقب میں اس کا ذاتی باڈی گارڈ براڈے چٹان کی طرح کھڑا تھا۔

میں اب کسی حد تک ملائی سمجھنے لگا تھا پھر بھی ''بڑے فقرے'' میرے پلے نہیں پڑتے تھے۔ میری سہولت کے لیے انیق ان کا مفہوم مجھے بتا تا تھا اس نے کہا۔ ''گرین فورس کی پیش نہیں چل رہی۔ وہ بہادری سے لڑ رہے ہیں لیکن پیچھے بھی ہٹ رہے ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ جلد ہی حملے کا رخ ڈی پیلس کی طرف ہو جائے گا۔ اگر ایسا ہے تو پھر ہمارے پیچھے ایک اور دفاعی لائن تیار ہو جانی چاہیے۔''

''آپ قسطینا صاحبہ سے بات کریں۔'' انیق نے کہا۔

قسطینا کی گفتگو میں ذرا وقفہ آیا تو میں نے کہا۔ ''یور ہائی نس! اس طرح کی لڑائی کا مجھے کوئی تجربہ نہیں اور نہ ہی کوئی دعویٰ ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ آپ کے جاں نثار سپاہی پوری کوشش کے باوجود یہ حملہ روک نہیں پا رہے، آپ کو اپنی تھرڈ دفاعی لائن مضبوط کر لینی چاہیے۔''

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ''تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو شاہ زائب! میرے ذہن سے یہ بات نکلی ہوئی تھی۔ میں ابھی حلمی کو آرڈر کرتی ہوں۔''

میرا پارا پھر چڑھنے لگا۔ میں نے خود پر حتی الامکان کنٹرول کرتے ہوئے کہا۔ ''قسطینا! آپ اتنی اہم ذمے داریاں سنبھالے ہوئے ہیں لیکن آپ سمجھ نہیں پا رہیں۔ حلمی اور آقا جان ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ یہ آپ کو بہت زیادہ نقصان پہنچا چکے ہیں اور ابھی مزید پہنچانے والے ہیں۔ بہت جلد آپ کو سب پتا چل جانا ہے مگر تب تک بہت دیر ہو چکی ہو گی۔''

میں نے خود کو بہت حد تک سنبھالا تھا لیکن میرے لہجے میں جو غم و غصہ اور تپش تھی وہ لہجے سے چھلک کر باہر آ رہی تھی۔

قسطینا نے کچھ دیر تک خاموشی سے مجھے گھورا پھر بحث کا ارادہ ترک کر کے طویل سانس لی اور بولی۔ ''ٹھیک ہے، اس بارے میں پھر بات کریں گے۔ میں کسی اور بندے کو آرڈر کرتی ہوں۔''

رائے زل کے حملے میں شدت آتی جا رہی تھی۔ گھمسان کا رن پڑ گیا تھا۔ بزوکا، مارٹر ملٹی پل راکٹ لانچرز (MRL) دونوں طرف سے بے دریغ استعمال ہو رہے تھے۔ شاید قسطینا نے یہ بات ٹھیک ہی کہی تھی کہ یہ بڑی اہم لڑائی ہے۔ اس جگہ جو جیت جاتا اس کا پلڑا غیر

معمولی طور پر بھاری ہو جانا تھا۔ گرین فورس کے تازہ دم دستے بھی جوق در جوق یہاں پہنچ گئے تھے اور قسطینا کی ہدایت پر مختلف جگہوں پر ڈٹ گئے تھے۔

قسطینا بے حد بے قراری سے خندق کے اندر ٹہلنے لگی۔ اس کی بے چینی عروج پر تھی۔ مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''شاہ زائب! میں یہاں پیچھے نہیں رہ سکتی۔ میرے سپاہیوں کو میری ضرورت ہے۔ مجھے آگے جانا ہی ہوگا۔''

''آگے کمانڈر افغانی اور کمانڈر فارس جیسے لوگ موجود ہیں۔ وہ بڑے اچھے طریقے سے لڑ رہے ہیں اور لڑا رہے ہیں۔ آگے جا کر آپ کو کچھ ہو گیا تو آپ کی فوج الٹے پاؤں بھاگے گی اور مڑ کر نہیں دیکھے گی۔''

مارٹر یا بزوکا کا ایک شیل ہمارے مورچوں کے بالکل پاس گرا۔ زبردست چمک اور دھماکے کے ساتھ بہت سی مٹی اور ریت ہم پر گری۔ اس کے ساتھ ہی مشین گن کی گولیوں کی باڑیں ریت کی بوریوں سے ٹکرانے لگیں۔

میں نے کہا۔ ''میری سمجھ میں تو ایک اور بات آ رہی ہے قسطینا۔ یہی مورچے اب اگلے مورچے بننے والے ہیں۔ ہمارے دستے پیچھے ہٹ رہے ہیں۔''

میری بات تلخ اور تشویشناک تھی مگر حقیقت تھی۔ بے حد جرأت اور بے جگری سے لڑنے کے باوجود گرین فورس پیچھے ہٹ رہی تھی۔ فوجی ایمبولینسز زخمیوں اور لاشوں کو پیچھے لا رہی تھیں۔ آرٹلری بھی آہستہ آہستہ پیچھے آ رہی تھی۔ اب گولے اور راکٹ ہمارے سروں کے اوپر سے گزر کر پیچھے ٹیلوں پر گر رہے تھے۔

قسطینا مسلسل وائرلیس سیٹ پر چلانے لگی۔ وہ اہم کمانڈروں کا حوصلہ بڑھا رہی تھی۔ انہیں ہدایات دے رہی تھی۔ وہ بار بار کمانڈر افغانی سے بھی رابطہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی مگر اس کا رابطہ کٹ چکا تھا۔ جلد ہی وہی کچھ ہوا جسے ہم سب محسوس کر رہے تھے۔ ہم اپنے مورچوں میں رہتے ہوئے بھی لڑائی کا حصہ بن گئے۔ ہمارے اردگرد دائیں بائیں ہر طرف لڑائی ہونے لگی۔ مجھے موت سے کبھی خوف نہیں آیا تھا۔ اب بھی نہیں آیا، لیکن یہ خیال ضرور آیا کہ اگر ہم اسی جگہ لڑتے ہوئے ختم ہو گئے تو میرے کئی کام ادھورے رہ جائیں گے۔ یورپی گینگسٹر ڈیرک سے بدلہ کون چکائے گا؟ زینب اپنے گرداب سے کیسے نکلے گی؟ ابراہیم کا کیا بنے گا؟ زہریلے آقا جان کا سر کون کچلے گا...... اور پھر...... وہ دور ریشمی لٹوں والی لڑکی شاید کبھی نہ جان پائے گی کہ جزیرہ جاماجی کے ایک تاریک مورچے میں اپنی زندگی ہار جانے والا اس کے بارے میں کیا کیا سوچتا تھا۔

بہر حال میرے ان سارے خیالوں کی عمر آٹھ دس سیکنڈ سے زیادہ نہیں تھی۔ میں فوراً مستقبل سے حال میں آ گیا۔ حال...... جہاں زندگی موت کی جنگ ہو رہی تھی۔ آگ برس رہی تھی اور خون اچھل رہا تھا۔ قسطینا نے اپنے باڈی گارڈ براڈے کو حکم دیا۔ ''شاہ زائب صاحب کے لیے لباس اور بلٹ پروف جیکٹ لاؤ۔ بلکہ تین جیکٹس لاؤ۔ دو ان کے ساتھیوں کے لیے۔''

براڈے حکم کا بندہ تھا۔ ہر بات پر صرف سر جھکانا جانتا تھا۔ وہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر مورچے سے باہر رینگ گیا اور عقب میں ان گاڑیوں کی طرف چلا گیا جہاں رسد کا سامان موجود تھا۔ جاماجی میں میری آمد کے تین دن بعد ہی براڈے نے مجھے زبردست رنج پہنچایا تھا۔ میرے بازو کی اب جو حالت تھی اس کا آغاز براڈے کے ہتھوڑا نما گھونسوں اور ٹھوکروں سے ہی ہوا تھا۔ تاہم بعد میں اس نے قسطینا کے کہنے پر مجھ سے معافی مانگی تھی۔ وہ ایک سچے جاں نثار کی تمام تعریفوں پر پورا اترتا تھا۔ چار پانچ منٹ میں ہی وہ برستی گولیوں کے درمیان میں سے مطلوبہ چیزیں لے کر مورچے میں پہنچ گیا۔ مورچے کی گہرائی اتنی ضرور تھی کہ اس میں حفاظت کے ساتھ کھڑا ہوا جا سکتا تھا۔ میں نے اپنے ٹراؤزر کے اوپر سے ہی گرین پتلون پہن لی۔ قمیص اور بلٹ پروف جیکٹ پہننے میں انیق نے میری مدد کی۔ سیف بھی بلٹ پروف جیکٹ پہن چکا تھا اور اس کا چہرہ جوش سے تمتمایا ہوا تھا۔ دھماکے اور شعلے اس کے لیے جیسے کسی تہوار کی آتش بازی کی طرح تھے۔ پنجاب کی ساری دلیری اور توانائی اس کے مضبوط پیکر میں جمع تھی۔ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''استاد صاحب! میں آسانی سے مرنے والا نہیں ہوں۔ لیکن اگر یہاں لڑتے ہوئے مجھے کچھ ہو گیا تو آپ میرے گاؤں ضرور جانا اور میرے گھر والوں کو بتانا کہ سیفی نے ایک فوجی کی طرح کافروں سے لڑتے ہوئے جان دی ہے۔''

لڑائی کا زور کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ روشنی کا گولا پھٹتا تھا، تو تین چار سو میٹر کے فاصلے پر گرزبے فورس کی بیسیوں بکتر بند گاڑیاں نظر آتی تھیں۔ ان کے عقب میں انفنٹری کے لوگ پیش قدمی کرتے چلے آ رہے تھے۔

تو یوں ہوتی ہیں لڑائیاں...... یوں اپنی سرزمینوں کا دفاع کیا جاتا ہے...... یوں جانیں ہتھیلیوں پر رکھی جاتی ہیں۔ سیکڑوں مرتبہ ستمبر 65ء، اور دسمبر 71ء کی جنگوں کے بارے میں سنا تھا لیکن آج جو کچھ تھا ہڈ بیتی کے زمرے میں آ رہا تھا۔ آج پتا چل رہا تھا کہ کیسے پاکستانی فوجیوں نے اپنے سے کئی گنا بڑی طاقت کے حملوں کو روکا ہوگا۔ کیسے اپنے بڑے بڑے شہروں کے سامنے اپنے سینوں کی دیوار کھڑی کی ہوگی۔ یہ زندگی اور آگ کا ٹکراؤ تھا۔ یہ

انسانی گوشت اور بارود کا تصادم تھا۔
میں نے دیکھا قسطینا کے ہاتھوں میں امریکن میڈیم مشین گن M240 نظر آ رہی تھی۔ اس نے پوزیشن لے لی اور فائرنگ شروع کر دی۔ جونہی اس نے خود فائرنگ شروع کی اس کے اردگرد موجود اس کے ذاتی گارڈز اور جان نثار فوجیوں نے تکبیر کا نعرہ بلند کیا اور پوری شدت سے جنگ کا حصہ بن گئے۔ کمانڈر افغانی کے دستے پسپا ہوتے ہوتے اب ہماری دائیں جانب ٹیلوں تک پہنچ چکے تھے۔ پتا چل رہا تھا کہ ایک کمانڈر واحد کی قیادت میں ہلا بولنے والے بہت سے فوجی اپنی جان کا نذرانہ پیش کر چکے ہیں یا زخمی ہو چکے ہیں۔ جو باقی تھے وہ مختلف ٹکڑیوں میں بٹ کر لڑ رہے تھے۔ درختوں کے درمیان گرے فورس کی بکتر بند گاڑیاں اب صاف نظر آ رہی تھیں۔ عقب سے آرٹلری ان کو بھرپور COVER دے رہی تھی۔
قسطینا نے وائرلیس پر ''براڈ کاسٹ کال'' کرتے ہوئے دستوں کو حکم دیا کہ وہ پوری فائر پاور استعمال کریں اور بکتر بند گاڑیوں کی پیش قدمی روکیں۔
وائرلیس کے شور میں سے جو جوابات ابھر رہے تھے وہ اس طرح کے تھے۔
''ہم کھلی جگہ پر ہیں یور ہائی نس۔ ہمارے سامنے کوئی آڑ نہیں، اوور۔''
''ہمارا ایمونیشن ختم ہو رہا ہے یور ہائی نس۔ ایمونیشن کی سخت ضرورت ہے اوور۔''
''ہم اپنی جگہ ڈٹے ہوئے ہیں یور ہائی نس، دشمن کو ہماری لاشوں پر سے گزرنا ہوگا، اوور۔''
اگلے آٹھ دس منٹ، قسطینا کی قیادت میں ایک زوردار جوابی حملے کے تھے۔ انیق اور سیف بھی فائرنگ پاور کا حصہ بنے ہوئے تھے۔ میں نے "MI6" رائفل کی نال بوریوں کے درمیان رخنے میں رکھی ہوئی تھی اور اپنے سامنے فائر کر رہا تھا۔ ہدف وہ بکتر بند گاڑیاں اور ان کے پیچھے پیچھے پیش قدمی کرتے ہوئے پیدل فوجی ہی تھے۔
اسی دوران میں کم و بیش پانچ بکتر بند گاڑیاں آرٹلری کے گولوں اور راکٹوں سے تباہ ہوئیں۔ کچھ پیچھے ہٹ کر درختوں میں روپوش ہونے لگیں۔ حملہ رک گیا تھا یا کم از کم وقتی طور پر وقفہ آ گیا تھا۔ جب دھماکوں سے روشنی پھیلتی تھی تو سامنے کھلی جگہ پر لاشیں نظر آتی تھیں۔ اتنے میں قسطینا کا رابطہ کمانڈر افغانی سے ہو گیا۔ اس نے بتایا کہ وہ اپنے لشکریوں اور باقاعدہ فوجیوں کے ساتھ دائیں جانب کے ٹیلوں پر موجود ہے۔
''کیا تم زخمی ہو؟'' قسطینا نے اس کی آواز کی لرزش محسوس کر کے پوچھا۔

اس نے نفی میں جواب دیا۔ (بعدازاں پتا چلا کہ اس کا یہ جواب درست نہیں تھا) کمانڈر افغانی نے قسطینا سے میری اور دیگر لوگوں کی خیریت کے بارے میں بھی دریافت کیا۔ میں نے افغانی سے خود مخاطب ہوتے ہوئے اردو میں کہا۔ ''کمانڈر اگر آپ بلندی پر ہیں تو سامنے بھی دیکھ سکتے ہوں گے۔ بکتر بند گاڑیاں کچھ پیچھے ہٹ گئی ہیں۔ اب یہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟''

افغانی نے کہا۔ ''جہاں تک ام کو پتا چل رہا ہے یہ لوگ سمجھ گیا ہے کہ بکتر بند کے اندر ان کا نقصان ہوگا۔ اب وہ ان مورچوں میں گھس کر بیٹھ رہا ہے جو ابھی ام لوگوں نے خالی کیا ہے۔''

افغانی کی آواز کے پس منظر میں لشکریوں کے جنگی نعرے اور زخمیوں کی کراہیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ پتا چل رہا تھا کہ افغانی کے دستوں میں بھی کافی جانی نقصان ہوا ہے۔ فائرنگ کی آوازیں اور دھماکوں کی گونج ایک بار پھر شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ یہ ایک اور بھرپور حملہ تھا جو رائے زل کی فوج ''ڈی پیلس'' کی طرف بڑھنے کے لیے کر رہی تھی۔ یہ حملہ کم و بیش آدھ گھنٹا جاری رہا۔ دونوں طرف سے بے تحاشا بارود برسایا گیا۔ ایجنسی کے سیکڑوں امریکن گارڈز رائے زل کی گرے فورس کی بھرپور مدد کر رہے تھے۔ امریکنوں کی للکارتی ہوئی آوازیں کسی وقت ہمارے مورچوں تک پہنچ جاتی تھیں۔ دشمن کی فائر پاور زیادہ تھی اور ہتھیار بھی نسبتاً جدید تھے۔ اس لیے ان کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ مگر آسانی ان کے لیے بھی نہیں تھی۔ انہیں ایک ایک انچ زمین کے لیے لڑنا پڑا تھا اور اب پچھلے آدھے گھنٹے سے وہ بالکل آگے نہیں بڑھ پا رہے تھے۔ اچانک وہ کچھ ہوا جس کی توقع ہم نے ہرگز نہیں کی تھی۔ پہلے شدید ترین فائرنگ اور شیلنگ ہوئی پھر درجنوں بکتر بند گاڑیاں ہماری طرف برق رفتاری سے بڑھیں۔ ان کے پیچھے مسلح افراد لپکتے چلے آرہے تھے۔ یہ کمپنی کے ماہر ترین گارڈز تھے اور گرے فورس کے چنے ہوئے آزمودہ کار سپاہی تھے۔ فوجی زبان میں اسے ''چارج'' کرنا کہتے ہیں۔ اس میں حریف کو حیران اور خوف زدہ کرنے کا ارادہ شامل ہوتا ہے۔ چند سیکنڈ کے اندر سیکڑوں مسلح افراد ہمارے سروں پر تھے۔ یہ ایک طرح سے دست بدست لڑائی کا آغاز تھا۔ ہم اب بھی اپنے مورچوں میں رہتے تو وہ ہم پر ہینڈ گرینیڈز پھینکتے اور اندھا دھند فائرنگ سے ہمیں مورچوں میں ہی بھون کر رکھ دیتے۔

''باہر نکلو۔'' قسطینا چلائی اور خود بھی کسی شیرنی کی طرح باہر نکلی۔

نعروں سے فضا گونجی اور دونوں طرف کے سیکڑوں افراد ایک دوسرے پر پل پڑے۔

اب گرینیڈ استعمال نہیں ہو سکتے تھے، نہ ہی بڑی رائفلیں...... سنگینیں چل رہی تھیں۔ پستول استعمال ہو رہے تھے۔ خنجر جنہیں عرفِ عام میں آرمی ڈیگرز کہا جاتا ہے چمک رہے تھے۔ یہ دست بدست لڑائی تھی...... ہاں یہ میرا میدان تھا...... یہ مارشل آرٹ کی ایک شکل تھی۔ میں زخمی تھا، ایک بازو بالکل کام نہیں کر رہا تھا لیکن میں پورے جوش وخروش سے اس لڑائی میں کود پڑا۔ خود کو ایک امریکن کی قاتل سنگین سے بچاتے ہوئے میں نے اس کے چہرے پر سر کی ٹکر رسید کی اور پھر 38 بور پسٹل کی گولی اس کے سینے میں اتار دی۔

کسی نے مجھے عقب سے اپنی بانہوں میں جکڑا۔ انیق نے خنجر کا نوانچ لمبا پھل اس کے پہلو میں اتارا اور ٹانگ مار کر اسے دور پھینک دیا۔ ہم اپنے سامنے آنے والے افراد سے بھڑ گئے۔ پورے جوش اور توانائی کے ساتھ۔ جاناں کی خون آلود لاش کا تصور میری نگاہوں میں تھا۔ اس دن پتا چلا کہ وسیع پیمانے پر ہونے والی عام جنگ میں لڑنے والوں پر کبھی ایک وحشت سی طاری ہو جاتی ہے، ایک جنون...... ایک خود فراموشی...... زخم اور موت اپنی حقیقت کھو دیتے ہیں۔ کم از کم تین گولیاں میری بلٹ پروف جیکٹ میں لگ چکی تھیں۔ ایک سنگین نے زخمی بازو کے پلاسٹر کو مزید ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔

سیف کی پکارتی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ''وہ دیکھو جی...... بی بی جی مشکل میں ہیں۔''

وہ واقعی مشکل میں تھی۔ ایجنسی اور رائے زل کے درجنوں سپاہی اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ چند جاں نثاروں کے سوا اس کے اردگرد اور کوئی نہیں تھا۔ گھمسان کا رن پڑا ہوا تھا۔

''آ جاؤ انیق۔'' میں نے پکار کر کہا۔

ہم اس خطرناک صورتِ حال کی طرف لپکے۔ ہم نے اس کے اردگرد گھیرا بنانے کی کوشش کی لیکن گھیرا توڑ دیا گیا...... کمانڈر واحد کے سینے پر مشین پسٹل کا ایک پورا برسٹ لگا اور میں نے اسے ایک کھائی میں گرتے دیکھا۔ میں نے دیکھا سیف کے ساتھ دو امریکن پوری وحشت کے ساتھ گتھم گتھا تھے۔ اس بدترین صورتِ حال میں ایک موقع ایسا بھی آیا جب قسطینا کے سامنے فقط براڈے، میں اور انیق رہ گئے تھے۔

''مار دوں گا۔'' براڈے بڑی وحشت سے چلایا اور اس نے قسطینا کی طرف بڑھنے والے ایک خنجر بردار ملائیشین کو سنگین میں پرو کر دور پھینک دیا۔

وہ میری زندگی کی یادگار مزاحمت تھی...... اور یہ ایک ہاتھ سے کی جانے والی مزاحمت

تھی۔ اس دوران مین ایک امریکن رائفل بردار کی سنگین براڈے کے پہلو میں لگی اور اس کی پسلیاں چیرتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی۔ وہ قربان ہو کر اپنی مالکہ کے قدموں میں گرا۔ مجھے یہی لگا شاید اب ہم بھی بچ نہیں سکیں گے لیکن غالباً یہ ایک امتحان تھا۔ ہم تین چار افراد کی ثابت قدمی نے صورتِ حال کو تیزی سے تبدیل کیا۔ قسطینا کے اردگرد مزاحمت کرنے والوں کی تعداد ایک بار پھر بڑھنے لگی۔ وہ خود بھی جلالی کیفیت میں تھی۔ پسپا ہونے والوں کو پکار رہی تھی۔

یہی وقت تھا جب تاریک آسمان پر گرین فورس کے گن شپ ہیلی کاپٹرز نمودار ہوئے۔ انہوں نے گرے فورس کی صفوں پر فائرنگ اور بمباری شروع کر دی۔ یہ موقع بہت مختصر تھا لیکن غنیمت تھا۔ ہم قسطینا کو حصار میں لے کر پیچھے ہٹتے چلے گئے اور تھرڈ ڈیفنس لائن پر پہنچ گئے۔

یہ ڈیفنس لائن کافی مضبوط تھی اور ذرا بلندی پر بھی تھی۔ بہت سی خندقیں کھودی جا چکی تھیں اور کچھ کھودی جا رہی تھیں۔ درجنوں نیم پختہ مورچے بھی ڈھلوانوں پر موجود تھے۔ گرین فورس کی یہ ڈیفنس لائن ڈی پیلس سے فقط تین کلومیٹر کی دوری پر تھی۔

ہم ایک محفوظ مورچے میں پہنچ گئے تھے۔ قسطینا نے وائرلیس پر کمانڈر افغانی سے رابطہ کرتے ہوئے کہا۔ ''افغانی! ہم پچھلی ڈیفنس لائن پر پہنچ گئے ہیں۔ تم بھی آہستہ آہستہ پیچھے ہٹو اور جہاں جہاں موقع ملے بارودی سرنگیں رکھتے آؤ۔''

افغانی نے جواب دیا کہ اس کے دستے بکھرے ہوئے ہیں۔ وہ انہیں اکٹھا کرنے اور پیچھے ہٹانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس نے کمانڈر واحد کی شہادت کی بھی تصدیق کی۔

اسی دوران میں وائرلیس پر عزت مآب ریان فردوس کی کال آ گئی۔ وہ تین کلومیٹر پیچھے ڈی پیلس کی محفوظ چار دیواری میں بیٹھا تھا مگر یوں ہانپا ہوا تھا جیسے میدانِ جنگ میں ہو۔ اس نے کہا۔ ''یہ میں کیا سن رہا ہوں قسطینا، کہا جا رہا ہے کہ رائے زل ''بلیک برج'' سے کافی آگے آ گیا ہے؟ اوور۔''

''جی ہاں عزت مآب! پل پر موجود حفاظتی دستے نے دھوکا دیا ہے۔ وہ لوگ رائے زل کے ساتھ مل گئے ہیں۔ ہمیں پیچھے ہٹنا پڑا ہے۔ اب ہم اپنی تھرڈ ڈیفنس لائن پر ہیں۔ امید ہے ہم انہیں یہاں سے آگے نہیں بڑھنے دیں گے، اوور۔''

ریان فردوس کی گھبرائی ہوئی آواز ابھری۔ ''مجھے پتا چلا ہے کہ کمانڈر واحد اور کیپٹن سعد وغیرہ بھی شہید ہو گئے ہیں، اوور۔''

''آپ کی اطلاع درست ہے عزت مآب۔ لیکن آپ پریشان نہ ہوں۔ آپ کی آن پر کٹ مرنے کے لیے ''تیار لوگوں'' کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ رائے زل کو آپ تک پہنچنے کے لیے آگ اور خون کا دریا پار کرنا ہوگا، اوور۔''

''یہاں ڈی پیلس میں بہت خوف پایا جا رہا ہے۔ عورتوں اور بچوں کا زیادہ برا حال ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ عورتوں اور بچوں کو ہیلی کاپٹر کے ذریعے یہاں سے نکال دینا چاہیے، اوور۔'' ریان فردوس کی آواز میں جھنجلاہٹ تھی۔

انیق نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میری طرح وہ بھی ریان فردوس کی اس بات کا مطلب اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ عورتوں اور بچوں میں ریان فردوس خود کو بھی شامل کر رہا تھا اور یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ قسطینا نے جلدی سے کہا۔ ''گستاخی معاف عزت مآب! آپ یہ غلطی ہرگز نہ کیجیے گا۔ ہر طرف بارود برس رہا ہے۔ ہیلی کاپٹر ڈی پیلس سے نکل نہیں پائے گا اور دوسری بات یہ جناب...... کہ آپ کو ہر صورت ڈی پیلس میں رہنا ہے۔ آپ کی یہاں موجودگی سے ہی سپاہیوں اور لشکریوں کے حوصلے بلند رہیں گے، اوور۔''

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔'' ریان فردوس نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یہ آقا جان اور حلمی وغیرہ کہاں دفع ہو گئے ہیں۔ ان سے رابطہ کیوں نہیں ہو پا رہا؟ اوور۔''

قسطینا نے گڑبڑا کر میری طرف دیکھا، پھر بولی۔ ''میرا رابطہ بھی نہیں ہو پا رہا لیکن لگتا ہے کہ کچھ دیر میں صورتِ حال واضح ہو جائے گی۔'' اسی دوران میں زوردار دھماکوں کے ساتھ راکٹ ہمارے مورچوں کے آس پاس گرنا شروع ہو گئے۔ قسطینا نے کہا۔ ''سوری عزت مآب! ہم پر پھر حملہ ہو رہا ہے، اوور اینڈ آل۔''

اس نے سلسلہ منقطع کیا اور وائرلیس پر اپنے کسی آفیسر کو حکم دیا کہ وہ MRL والی گاڑیوں کو آگے لائیں اور گرے فورس پر جوابی ''راکٹ حملہ'' کیا جائے۔

یہ نیا حملہ اور جوابی حملہ قریباً دس منٹ جاری رہا۔ دونوں طرف سے راکٹ لانچر، توپیں اور بھاری مشین گنز استعمال ہوئیں۔ اسی دوران میں کمانڈر افغانی بھی اپنی درجنوں گاڑیوں اور سیکڑوں سپاہیوں و لشکریوں کے ساتھ پیچھے ہٹ کر تھرڈ ڈیفنس لائن پر پہنچ گیا۔ وہ زخمی شیر کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ وہ قسطینا کے پاس مورچے میں پہنچا تو اس کے چہرے اور ڈاڑھی پر خون کے چھینٹے تھے۔ اس کی ایک ران بری طرح زخمی تھی اور خون آلود پٹیوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ بڑی بڑی پگڑیوں والے درجنوں قبائلی جاں نثار اس کے اردگرد تھے۔

یہ رات کے قریباً تین بجے کا عمل تھا۔ لڑائی میں ایک مختصر وقفہ آ گیا تھا۔ کمانڈر افغانی کی

زبانی مجھے معلوم ہوا کہ اسپتال میں کرخت سنگھ کی حالت اب کچھ سنبھل گئی ہے (درحقیقت کرنت سنگھ، سیف اور انیق نے مجھے آقا جان کے وفاداروں کی مہلک گرفت سے نکالنے کے لیے بہت دلیرانہ مزاحمت کی تھی۔ اسی دوران میں وہاں کمانڈر افغانی کا دستہ بھی پہنچ گیا تھا)

کمانڈر افغانی اور قسطینا مورچے کے ایک گوشے میں رازداری سے گفتگو کرنے لگے۔ دونوں کے چہرے تمتما رہے تھے۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ گفتگو آقا جان کے اسی نئے روپ کے بارے میں ہے جس نے ہائی کمان کو ششدر کر دیا ہے۔

کچھ دیر بعد قسطینا میری طرف آئی۔ اس کے چہرے پر جنگ کی افراتفری کے ساتھ ساتھ دکھ کی پرچھائیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ وہ جاناں کی موت سے آگاہ ہو چکی تھی۔ اس نے مجھ سے اظہارِ افسوس کیا۔ اسی دوران میں وائرلیس پر دوبارہ سگنل آنے شروع ہو گئے۔ چند سیکنڈ کے توقف کے بعد وائرلیس سیٹ کے شور میں ریان فردوس کی آواز دوبارہ ابھری۔

''ہمارے پاس کتنا ایمونیشن ہے، ہم کب تک لڑ سکتے ہیں؟ اوور۔''

قسطینا نے کہا۔ ''سٹر شاہ زائب کی ہمت اور کوشش کی وجہ سے، ہمارا ایک ڈپو تباہ ہونے سے بچا رہا ہے جناب۔ مجھے پوری امید ہے کہ ہم تین چار روز تک ڈٹ کر رائے زل کا مقابلہ کر سکتے ہیں، اوور۔''

وہ تین چار روز کی بات کر رہی تھی لیکن مجھے نہیں لگتا تھا کہ اگر لڑائی اسی شدت سے جاری رہی تو ہم دو دن سے زیادہ نکال سکیں گے۔

کافی دنوں بعد میں نے ابراہیم کی آواز سنی۔ وہ اور کمال احمد بھی باپ کے پاس ہی موجود تھے۔ ابراہیم نے کہا۔ ''ہم کوشش کر رہے ہیں کہ برونائی سے مزید ایمونیشن اور کمک ہمیں پہنچ سکے۔ اس کے علاوہ میں، شاہ زیب بھائی سے بھی بات کرنا چاہتا ہوں، کیا وہ کہیں قریب ہی موجود ہیں؟ اوور۔''

قسطینا نے مجھے اشارہ کیا۔ میں مائیک پر آ گیا۔ ''جی یور ہائی نس، میں شاہ زیب عرض کر رہا ہوں، اوور۔''

''شاہ زیب بھائی! ہمیں خبریں مسلسل پہنچ رہی ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ نے قسطینا کو جس طرح مشکل صورتِ حال سے نکالا ہے۔ اس نے ہم سب کو بہت متاثر کیا ہے۔ ڈی پیلس میں بھی آپ کی اور آپ کے ساتھیوں کی تعریف ہو رہی ہے، اوور۔''

''بہت شکریہ یور ہائی نس، میں خود کو اتنی ستائش کے قابل نہیں سمجھتا، اوور۔''

''شاہ زیب بھائی، تین دن پہلے جب آپ ڈی پیلس سے اوجھل ہوئے تو آپ کے ساتھ ہی آپ کی پاکستانی ساتھی جاناں بھی اوجھل ہوئی، وہ کہاں ہے اوور۔''

''ابھی تھوڑی دیر پہلے ''ہر ہائی نس قسطینا'' نے ڈپو کے بچ جانے کے حوالے سے جو تعریف کی ہے اس کی اصل مستحق وہی ہے۔ ڈپوز کے حوالے سے ساری معلومات اسی نے دی تھیں۔ اس وقت وہ شدید زخمی تھی۔ اس نے میرے ہاتھوں میں دم توڑا ہے، اوور۔''

''کیسے ہوا یہ سب کچھ؟ اوور۔'' ابراہیم کی آواز میں دکھ تھا۔

''شاید یہ تفصیل بیان کرنے کا موقع نہیں۔ لیکن یہ جو کچھ بھی ہوا آقا جان......'' ابھی میرا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ قسطینا نے پھرتی سے سیٹ آف کر دیا۔

''نہیں شاہ زائب! یہ وقت ایسی باتیں کرنے کا نہیں۔ انکل کے بارے میں جو بھی صحیح یا غلط ہے وہ بہت جلد سامنے آنے والا ہے۔ ہم اپنے آپ کو مایوسی سے جتنی دیر تک دور رکھ سکتے ہیں، ہمیں رکھنا چاہیے۔''

میں ایک بار پھر دانت پیس کر رہ گیا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا مورچے سے باہر کمانڈر افغانی کا معاون سیکنڈ کمانڈر فارس جان نظر آیا۔ اس کے آگے پیچھے کچھ اور چہرے بھی تھے جو مورچے میں جھانک رہے تھے۔ چند ایک باقاعدہ فوجی بھی دکھائی دیئے۔ ''کیا بات ہے فارس جان؟'' قسطینا نے انگلش میں پوچھا۔

فارس جان انگلش روانی سے بولتا تھا۔ اس نے کہا۔ ''یور ایکسی لینسی! یہ لوگ مسٹر شاہ زیب کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ ان کو اپنے درمیان دیکھ کر بہت خوش ہیں......ان میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو ان کو ایک فائٹر چمپئن کی حیثیت سے جانتے ہیں۔''

کئی لوگوں نے باہر کھڑے جھک کر مجھ سے ہاتھ ملایا۔ ایک گھنی ڈاڑھی والا پُر جوش قبائلی جس کے ماتھے پر تازہ زخم تھا اردو میں بولا۔ ''خدا گواہ ہے ام جھوٹ نہیں بول رہا۔ آپ نے ام سب کو اپنا گرویدہ کیا ہے۔ آپ نے بہت مشکل وقت میں امارے سپہ سالار کا حپاظت کیا، امارا خون سیروں کے حساب سے بڑھ گیا ہے۔ ان شاء اللہ ام ان ''پرنگیوں'' (فرنگیوں) کے سامنے اور ان کے جوڑی داروں کے سامنے دیوار بن کے دکھائے گا۔''

وہ لوگ پُر جوش نعرے لگانے لگے۔ قسطینا نے انہیں بمشکل چپ کرایا اور کہا کہ لڑائی رکی نہیں۔ اس میں چھوٹا سا وقفہ آیا ہے۔ وہ لوگ صفیں درست کر رہے ہیں، ہمیں بھی صفیں درست کرنی چاہئیں۔ بہت سی جگہوں پر خندقیں بھی پوری گہرائی میں نہیں کھودی جا سکیں۔ سب لوگ اس وقفے کو غنیمت سمجھیں اور اس ڈیفنس کو مضبوط کریں۔ جو لوگ زخمی ہیں انہیں

پیچھے بھیجنے کا انتظام کیا جائے۔

سپریم کمانڈر کی ہدایت پر افسر اور جوان مختلف اطراف میں منتشر ہو گئے۔ جس وی ٹائپ مورچے میں ہم موجود تھے، وہ لمبائی میں پندرہ بیس فٹ کے قریب تھا۔ اس کے اوپر نو دس انچ موٹے کنکریٹ کا ''شیڈ'' تھا۔ انیق نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا، ہم مورچے کے آخری گوشے میں پہنچ گئے۔ یہاں گولیوں کے بکس اور خشک راشن کے پیکٹ دکھائی دے رہے تھے۔ ہم ان کے قریب ہی بیٹھ گئے۔ انیق نے کہا۔ ''شاہ زیب بھائی! جاناں کی موت کا بہت صدمہ ہے، میں آپ کو مزید پریشان کرنا نہیں چاہتا، لیکن ایک بات ایسی ہے جو آپ کو بتانا بھی ضروری ہے......''

''تمہید بھی کیا ضروری ہے؟''

''شاید ضروری ہے، کیونکہ یہ بات ایسی ہی عجیب ہے۔''

''اب کچھ بک بھی چکو۔''

وہ پوری سنجیدگی سے بولا ''بھائی! میں نے سجاول کو دیکھا ہے۔''

میرے سر پر جیسے مارٹر کا گولا آن گرا۔ میں نے ششدر ہو کر اسے گھورا۔ ''کیا کہہ رہے ہو...... کہاں دیکھا ہے؟''

''ابھی تھوڑی دیر پہلے لڑائی میں۔ جب ہم پر چارج ہوا اور دست بدست لڑائی ہوئی۔ وہ مجھ سے کافی فاصلے پر تھا لیکن...... میری نگاہیں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔ وہ سجاول ہی تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اس نے بلٹ پروف جیکٹ بھی پہن رکھی تھی، میری آنکھوں کے سامنے اس نے ہمارے ایک لشکری کے سینے میں رائفل کی سنگین گھونپی۔ پھر میں نے اس کا وہ طوفانی مکا بھی دیکھا، جس کا ذکر آپ کئی بار کر چکے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ دست بدست لڑائی میں اس کے اس مہلک ''پنچ'' نے دو تین جبڑے تو ضرور توڑے ہوں گے۔''

''میں نہیں مانتا انیق! تمہیں دھوکا ہوا ہے......''

''نہیں شاہ زیب بھائی! وہ سجاول ہی تھا۔ میں آپ سے کہتا تھا نا...... کہ یہ بندہ اندر سے کچھ اور ہے...... یہ کسی بھی وقت بدل سکتا ہے۔ ایسے لوگوں کی وفاداری کا بس ایک ہی پیمانہ ہوتا ہے...... دولت۔ جہاں دولت زیادہ نظر آتی ہے یہ ادھر ہی رخ پھیر لیتے ہیں۔ آقا جان اور حلمی جیسے لوگوں کی مثال آپ کے سامنے ہی ہے۔''

''تم...... سجاول کو آقا جان وغیرہ سے کیوں ملا رہے ہو؟''

''اس لیے بھائی کہ وہ ان جیسا ہی ہے۔ میری ناقص عقل تو یہی کہہ رہی ہے کہ اس نے

پارا ہاؤس میں قادر خان سے جو چوری کا مال واپس کرایا تھا وہ بھی صرف اپنا اعتماد قائم کرنے کے لیے تھا۔ ایسے لوگ بڑے فائدے کے لیے چھوٹے نقصان برداشت کیا ہی کرتے ہیں۔''

''انیق! تمہاری رائے اس کے بارے میں کبھی بھی اچھی نہیں رہی۔ اب بھی اچھی نہیں ہے۔ جو کچھ تمہیں نظر آیا ہے وہ بھی تمہاری اسی ''رائے'' کا شاخسانہ لگتا ہے۔ یہ بات کسی صورت مانی جانے والی نہیں کہ تم نے جس شخص کو رائے زل کے سپاہیوں کے ساتھ دیکھا ہے وہ سجاول ہے......''

اس سے پہلے کہ میں کچھ مزید کہتا، کسی قریبی مورچے سے کسی سپاہی نے جوش کے عالم میں ایک اونچی تان بلند کی۔ عجب تان تھی، جس میں زخموں کا کرب بھی تھا اور محاذ جنگ کا انوکھا جوش بھی۔ اس تان کا جواب ایک دو دیگر مورچوں سے آیا۔ پھر اس تان میں کچھ مزید لوگ شامل ہو گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ تان ایک جنگی ترانے کا روپ دھار گئی۔ یہ ترانہ اردگرد کے مورچوں میں کورس کی شکل میں گونجنے لگا (ایسا ہی ایک ترانہ رائے زل کی فوج میں بھی مقبول تھا......ہم بزدل دشمن کو اس کے بل میں سے نکال کر ماریں گے اور ہماری بہادری دیکھ کر وہاں کی خوبرو عورتیں، وغیرہ وغیرہ......) گرین فورس کے بہت سے سپاہی اور لشکری احتیاطی پہلو کو نظرانداز کرتے ہوئے مورچوں میں کھڑے ہو گئے اور ترانہ گانے لگے۔ ملائی زبان کے اس ترانے کے سارے الفاظ تو میری سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔ انیق نے میرے لیے اس کا ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ کچھ یوں تھا۔

ہم نے جی جان سے جینا ہے
اور سینہ تان کے جینا ہے
ہم نے عزم کرلیا
جنگ میں قدم دھرلیا
جس دشمن نے ہمارے بچوں کی مسکراہٹ چھینی
جس دشمن نے ہم پر زندگی حرام کی
ہم اس سے لڑیں گے
آخری گولی تک اور آخری سر تک
ہم پیچھا کریں گے اس کا قبر تک
ہم سروں پر کفن باندھ کر نکلے ہیں
ہم جاتے اندھیرے تک لڑیں گے

ہم سچے سویرے تک لڑیں گے اور اگر ہم واپس نہ آسکے تو ہمارے بچوں سے کہنا ہم سرخرو ہوئے۔

قسطینا خود بھی اس جنگی نغمے سے متاثر نظر آتی تھی۔ وہ بلند آواز سے تو نہیں گا رہی تھی مگر زیرلب یہ بول دہراتی چلی جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں عزم تھا اور شاید اپنے پیارے والد کی خونچکاں لاش کا منظر بھی۔

رات کا باقی حصہ صف بندیاں کرتے ہوئے ہی گزرا۔ مزید گولا بارود مورچوں میں پہنچا دیا گیا تھا اور کچھ تازہ دم دستے بھی آ گئے تھے۔ میرے ذہن میں مسلسل انیق کی کہی ہوئی بات گونج رہی تھی۔ وہ اپنی دی ہوئی اطلاع پر قائم تھا اور پورے وثوق سے کہہ رہا تھا کہ اس نے سجاول کو گرے سپاہیوں کی طرف سے لڑتے ہوئے دیکھا ہے۔

میرے ذہن میں بھی کبھی کبھی شک کی لہر سی اٹھنے لگی۔ رائے زل اور ایجنسی والے جوڑ توڑ کے ماہر لگتے تھے۔ انہوں نے آقا جان اور حلمی جیسے لوگوں کو عزت مآب کے لیے آستین کا سانپ بنا ڈالا تھا، سجاول کی حیثیت تو پھر ایک ''نئے آدمی'' کی تھی۔ سجاول کے حوالے سے لالچ والی بات بھی اپنی جگہ درست تھی، اس میں پیسے کی ہوس بدرجہ اتم موجود تھی۔ میں سوچتا رہا اور الجھتا رہا۔

کچھ چلاتی ہوئی سی آوازوں نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔ یہ آوازیں کسی پاس والے مورچے سے بلند ہو رہی تھیں۔ ان میں ایک آواز کمانڈر افغانی کی تھی۔ دوسری کسی مقامی شخص کی۔ افغانی دہاڑا۔ ''تم بزدل ہو، تمہارے خون میں بزدلی ہے۔''

دوسرا شخص بولا۔ ''ہم بزدل ہوتے تو اپنے خرچے پر لڑنے مرنے کے لیے گھروں سے نہ نکلتے......''

افغانی نے کوئی اور بات کہی۔ یہ ملائی جملہ پوری طرح میری سمجھ میں نہیں آیا۔ جواب میں دوسرا شخص بھڑک اٹھا۔ دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ قسطینا انہیں چھڑانے کے لیے مورچے سے نکلی۔ میں اور انیق وغیرہ بھی نکلے۔ لحیم شحیم کمانڈر افغانی اپنے ہی جیسے ایک توانا شخص سے برسرپیکار تھا۔ دونوں گر گئے تھے اور ایک دوسرے کو مکے رسید کر رہے تھے۔

''رک جاؤ...... میں کہتی ہوں پیچھے ہٹ جاؤ۔'' قسطینا چلائی۔

ان دونوں پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ دونوں اب اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور دست و گریباں تھے۔ کمانڈر افغانی نے اپنے حریف کو ٹانگ رسید کی۔ وہ لڑکھڑا کر کئی قدم پیچھے گیا، پھر اس نے اپنا ہاتھ پستول کے ہولسٹر کی طرف بڑھایا۔ یہ خطرناک صورتِ حال دیکھ کر سیف نے

پھرتی دکھائی اور افغانی کے حریف کو عقب سے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ اس کے دونوں بازو بھی سیف کی گرفت میں آ گئے تھے۔ وہ بہت مچلا پھڑ کا لیکن یہ کبڈی کے کھلاڑی کا چھا تھا، وہ کامیاب نہیں ہو سکا، کمانڈر افغانی کو قسطینا نے روک لیا تھا۔

یہ کوئی اچھا شگون نہیں تھا۔ عین لڑائی کے دوران میں آپس کی جنگ؟ کمانڈر افغانی کا حریف بھی کوئی کمانڈر ہی تھا۔ وہ مسلسل بول رہا تھا، دوسری طرف افغانی بھی گالم گلوچ کر رہا تھا۔ قسطینا نے دونوں کو بمشکل ٹھنڈا کیا۔ اپنے ہاتھوں سے دونوں کے ہتھیار ان کے جسموں سے علیحدہ کر کے ایک ماتحت کے حوالے کیے۔ پھر ان دونوں کو لے کر ایک قریبی مورچے میں اتر گئی۔ غالباً ان کے درمیان تصفیہ کرانا چاہ رہی تھی۔ جھگڑا کس بات پر شروع ہوا، یہ ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا تھا۔

دس پندرہ منٹ بعد وہ کمانڈر فارس کے ساتھ مورچے سے باہر آئی اور اپنے مورچے میں پہنچی تو اس کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ تاہم اس نے بتایا کہ معاملہ ٹھنڈا ہو گیا ہے اور کمانڈر افغانی واپس اپنے مورچے میں چلا گیا ہے۔ لڑائی کی وجہ کا اس نے گول مول جواب دیا۔ میں نے بھی دوسروں کے سامنے اصرار مناسب نہیں سمجھا۔

اب سورج نکل آیا تھا۔ پام کے درخت اور سرسبز ٹیلے دور تک روشن تھے۔ جو مناظر رات کی تاریکی میں چھپے رہے تھے وہ اب واضح نظر آرہے تھے۔ جگہ جگہ جلی ہوئی فوجی گاڑیوں کے ڈھانچے تھے۔ کسی کسی گاڑی یا بکتر بند میں اب بھی آگ سلگ رہی تھی۔ سرسبز ڈھلوانوں پر جہاں جہاں کوئی گولا یا راکٹ گرا تھا وہاں بڑے بڑے گول نشان بن گئے تھے اور یہ نشان سیکڑوں کی تعداد میں تھے۔ بہت سے درخت جڑوں سے اکھڑ کر زمین پر پڑے تھے۔ چند مقامات پر لاشیں بھی دکھائی دیں۔

ناشتا مورچوں میں ہی ہوا۔ دونوں طرف دفاع اور حملے کی تیاری بھی ساتھ ساتھ جاری تھی۔ اپنے قریبی ساتھیوں اور خاص طور سے باڈی گارڈ براڈے کی ہلاکت پر قسطینا افسردہ نظر آتی تھی۔ لیکن جب لڑنے والے حالتِ جنگ میں ہوتے ہیں تو مرنے والے ساتھیوں کا سوگ منانے کا وقت بھی کہاں ہوتا ہے۔ میرے ٹخنے اور مفلوج بازو میں پھر شدید درد شروع ہو گیا تھا۔ میں نے ڈاکٹر ماریہ سے ایک درد کش انجکشن مزید لگوالیا۔

ناشتے کے بعد قسطینا مورچے سے باہر نکل آئی اور اس ڈیفنس لائن کا معائنہ کرنے لگی۔ میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ وہ ایک سرسبز ڈھلوان پر کھڑی تھی اور سبزے سے ڈھکی ہوئی ایک چٹان کی اوٹ لے رکھی تھی۔ ہم دونوں کے پاس ٹیلی اسکوپس تھیں۔ میں نے ٹیلی اسکوپ میں ان مورچوں کا جائزہ لیا جو رات کو ہمیں چھوڑنا پڑے تھے۔ وہاں اب رائے زل کی گرے آرمی کا قبضہ تھا اور اگلے حملے کے لیے ان کی بھرپور تیاری نظر آرہی تھی۔ ایجنسی کے سفید فام ان کے شانے سے شانہ ملا کر کھڑے تھے۔

میں نے قسطینا سے کہا۔ ”اگلے 48 گھنٹے میں کچھ بھی ہو سکتا ہے قسطینا! میں زینب کے حوالے سے فکرمند ہوں۔“

”وہ بالکل محفوظ ہے شاہ زائب! ڈی پیلس کے اندر ہی ہے۔ ماریہ کی رہائش گاہ کے

سیکنڈ فلور پر۔''

''اب اس کی دیکھ بھال کون کر رہا ہے؟''

''ماریہ کی دو خاص ملازمائیں۔ وہ دونوں پوری طرح قابلِ بھروسا ہیں۔''

میں نے دل میں سوچا، قابلِ بھروسا تو وہ خبیث ہیجڑا خیام مانش بھی تھا۔ قسطینا نے جیسے میرا ذہن پڑھ لیا بولی۔ ''شاہ زائب! دل میں کوئی وہم نہ لاؤ۔ میں بھی جانتی ہوں کہ زینب کی حفاظت کتنی ضروری ہے۔ سمجھو اب وہ میرے ذمے داری ہے۔''

وہ ایک بار پھر ٹیلی اسکوپ کے ذریعے فرنٹ کا جائزہ لینے لگی۔ میں نے بھی آنکھیں ٹیلی اسکوپ کے عدسوں سے لگا دیں۔ کہیں کہیں ریت کی بوریوں کے عقب میں گرے فورس کے سپاہیوں کی نقل و حرکت دکھائی دیتی تھی۔ میرے ذہن میں ایک بار پھر سجاول کا خیال آ گیا۔ کیا انیق کی نظر نے درست کام کیا تھا؟ کیا سجاول سیالکوٹی واقعی گرے فورس کے جنگ بازوں میں کہیں موجود تھا...... انہی بکتر بند گاڑیوں کے آس پاس کہیں گھوم رہا تھا؟

فارس جان کی آواز نے مجھے اور قسطینا کو چونکایا۔ وہ مورچے کے پاس اٹین شین کھڑا تھا اور قسطینا کو بتا رہا تھا کہ وائرلیس پر اس کی کال ہے۔ وہ سپاہیانہ چال چلتی مورچے میں چلی گئی۔ دو چار منٹ بعد اس نے مجھے بھی مورچے میں بلایا اور بتایا کہ مجھے ڈی پیلس جانا ہے۔

''کس سلسلے میں یور ہائی نس؟'' میں نے پوچھا۔

''ابراہیم تم سے ملنا چاہتا ہے ابھی۔''

''لیکن...... اس وقت تو میں یہاں رہنا چاہتا ہوں۔''

''نہیں شاہ زائب! وہ پریشان ہے۔ شاید تم اس کی ڈھارس بندھا سکو۔ میرا خیال ہے کہ بیگم پھوپھو (بیگم نورل) بھی تم سے ملنا چاہیں گی۔'' پھر قسطینا کی نگاہ میرے بازو کے ٹوٹے ہوئے خون آلود پلاستر پر مرکوز ہوگئی۔ وہ رنجیدہ لہجے میں بولی۔ ''شاہ زائب! میں تمہارے بازو کی طرف سے بھی سخت فکرمند ہوں۔ تم پین کلر انجکشن سے کام چلا رہے ہو۔ یہ کسی طور بھی درست نہیں۔ تم واپس جا رہے ہو تو متعلقہ ڈاکٹر کو بھی چیک کراؤ۔ میں اس حالت میں تمہیں اپنے ساتھ دیکھنا نہیں چاہ رہی۔''

''لیکن میں اس حالت میں بھی یہاں رہنا چاہتا ہوں۔'' میں نے زیرِ لب کہا۔

''کیا کہہ رہے ہو؟'' اس نے چونک کر پوچھا۔

''کچھ نہیں۔''

وہ میری طرف خفگی بھری نظروں سے دیکھ کر رہ گئی۔

کچھ ہی دیر بعد میں اور انیق ایک اسپیشل فوجی جیپ پر سوار ڈی پیلس کی طرف جارہے تھے۔ جیپ ایک کیپٹن ڈرائیو کررہا تھا۔ مورچوں میں موجود سپاہی اور لشکری ہماری طرف دلچسپی کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ خصوصاً وہ میری طرف دیکھ کر ہاتھ ہلا رہے تھے۔ کچھ نے پُرجوش نعرے بھی بلند کیے۔ حقیقت یہ تھی کہ مجھے یہ ''پروٹوکول'' زیادہ بھا نہیں رہا تھا۔ خوامخواہ کندھوں پر ایک بوجھ سا پڑتا محسوس ہورہا تھا۔

ہم شہری حدود میں داخل ہوئے تو ہر طرف جنگی حالات نظر آئے۔ مقامی باشندے شاید راشن وغیرہ اکٹھا کرنے کے لیے بازاروں میں نکل آئے تھے۔ فلنگ اسٹیشنوں پر بھی گاڑیوں کا رش تھا۔ کہیں کہیں خندقیں کھودی جارہی تھیں۔ پتا چلا کہ جاماجی کے سول اور آرمی اسپتالوں میں بڑی تعداد میں لاشیں اور زخمی پہنچے ہیں۔ تین چار دن پہلے ہونے والی بمباری کے اثرات بھی جگہ جگہ دکھائی دیتے تھے۔

ایک جگہ بہت سی کرینیں اور لفٹیں مصروف کار تھیں۔ کیپٹن نے بتایا۔ ''یہی وہ بڑا مواصلاتی ٹاور ہے جو تین دن پہلے ہونے والی بمباری میں تباہ ہوا ہے۔ اسے ٹھیک کرنے کی کوشش ہورہی ہے۔ ممکن ہے کہ آج دوپہر تک موبائل فون سروس بحال ہوجائے۔

ہم ڈی پیلس کے قریب پہنچے تو وہاں بھی زبردست حفاظتی انتظامات نظر آئے۔ کوشش کی جارہی تھی کہ ڈی پیلس کے اردگرد خاردار تاروں اور بارودی سرنگوں کا ایک حصار سا قائم کردیا جائے۔ ڈی پیلس کے گرد موجود پختہ مورچوں کو بھی سامان حرب سے لیس کیا جارہا تھا۔ ڈی پیلس کے مین گیٹ کے قریب ایک اور منظر نے مجھے چونکایا۔ یہاں دیواروں پر کچھ پوسٹرز لگے ہوئے تھے جن میں عزت مآب ریان فردوس، قسطینا، ابراہیم اور کمال، آقا جان اور کمانڈر افغانی وغیرہ کی تصویریں تھیں۔ ان میں سے مجھے آقا جان کی تصویریں پھٹی ہوئی نظر آئیں۔ پوسٹرز کے ٹکڑے زمین پر پڑے تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ آقا جان کی تاریخی بے وفائی کا پردہ چاک ہونا شروع ہوگیا ہے۔

سیکیورٹی کے مختلف مراحل سے گزر کر میں ڈی پیلس کے اندر پہنچا۔ ڈی پیلس کی پُرشکوہ عمارت کے اندر بھی جنگ کی سراسیمگی نظر آرہی تھی۔

اچانک ایک طرف سے ایک لڑکی نمودار ہوئی جو ساڑی میں ملبوس تھی۔ اس کے لمبے بال ہوا میں لہرارہے تھے۔ اس نے ایک عجیب حرکت کی۔ وہ لپک کر آگے بڑھی۔ گھٹنوں کے بل بیٹھی اور میرا پاؤں چومنے کی کوشش کی۔ میں جلدی سے ایک قدم پیچھے ہٹ گیا...... سیکیورٹی اہلکاروں نے لڑکی کو تھام لیا۔ وہ ڈی پیلس کی انڈین ملازماؤں میں سے کوئی تھی۔ اس

کا چہرہ اندرونی جوش سے تمتما رہا تھا۔ آنکھوں میں چمک تھی۔ وہ پکار کر بولی۔ ''میں آپ کو مبارک باد دیتی ہوں...... مبارک دیتی ہوں۔ آپ نے میرا کلیجا ٹھنڈا کیا...... آپ نے بہت سے لوگوں کا کلیجا ٹھنڈا کیا۔ اس خبیث کے منہ پر تھپڑ مارا۔ آپ عظیم ہو...... آپ نے عظیم کام کیا۔'' وہ دیوانوں کی طرح چلا رہی تھی۔ اہلکار اسے بمشکل سنبھال کر اور سمجھا بجھا کر پیچھے لے گئے۔

میں سمجھ گیا کہ وہ کس تھپڑ کا ذکر کر رہی تھی۔ وہی جو کل رات مین گیٹ کے سامنے آقا جان کے گال پر پڑا تھا۔

میں سیکیورٹی اہلکاروں کے ساتھ چلتا مختلف کوریڈورز سے گزرا اور ابراہیم کے پاس اس کی شاندار نشست گاہ میں پہنچ گیا۔ ہنگامی حالات کی سنگینی اس کے دبلے پتلے چہرے سے بھی نظر آ رہی تھی مگر وہ مردنی نہیں تھی جو اپنی دلہن زینب سے جدائی کے بعد اس کے چہرے پر دکھائی دی تھی۔ ایک جدید وائرلیس سیٹ اس کے پاس رکھا تھا جس پر میدانِ جنگ کی اطلاعات موصول ہو رہی تھیں۔ میرے پہنچنے پر اس نے سیٹ کی آواز بہت دھیمی کر دی۔ اٹھ کر مجھے گلے لگایا۔ میرے بازو اور ٹخنے کی حالت نے اسے پریشان کیا، وہ بولا۔ ''بہت کچھ ثابت ہو چکا ہے۔ اس کے باوجود یقین نہیں آ رہا کہ یہ سب کچھ آقا جان کا کیا دھرا ہے۔ دماغ ہی کام نہیں کر رہا...... ہم انہیں کیا سمجھتے رہے، اور وہ کیا نکلے۔''

میں خاموش رہا۔ وہ کہنے لگا۔ ''کل رات جب ڈی پیلس میں یہ چرچا ہوا کہ آپ زخمی حالت میں مین گیٹ پر پہنچے ہیں اور آپ نے آقا جان کے منہ پر تھپڑ مارا ہے تو ڈی پیلس میں سنسنی پھیل گئی۔ والدہ محترمہ بہت غصے میں تھیں۔ عزت مآب بھی ششدر تھے مگر پھر جب دو گھنٹے بعد یہ پتا چلا کہ آقا جان اور حلمی غائب ہیں اور ان کے تین سو کے لگ بھگ قریبی ساتھی بھی یہاں سے فرار ہو گئے ہیں تو حقیقت کھلنا شروع ہو گئی۔ وہ سب کچھ سچ ثابت ہونے لگا جو آپ کئی روز پہلے سے کہہ رہے تھے۔ پھر آپ کا وہ تھپڑ بھی ہر ایک کی سمجھ میں آنے لگا......''

میں نے کہا۔ ''اس بات پر شکر ہی کیا جا سکتا ہے...... آپ کے بزرگوں کی آنکھیں دیر سے کھلیں لیکن کھلی تو ہیں۔''

کوئی جاں سوز دکھ ابراہیم کو جیسے اندر سے کاٹ رہا تھا۔ وہ دل فگار لہجے میں بولا۔ ''شاہ زیب بھائی! بہت غیر یقینی حالات ہیں۔ کچھ پتا نہیں کل کیا ہو جائے۔ میں ہر صورت زینب سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس خطرناک سچویشن میں اسے ہر گھڑی اپنے سامنے دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''لیکن ابراہیم آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ ابھی صبر و تحمل کا مظاہرہ کریں گے۔ کوئی

ایسا اصرار نہیں کریں گے جس کی وجہ سے اس کی زندگی پھر خطرے میں پڑ جائے۔''

''شاہ زیب بھائی! وہ وعدہ عام حالات کے لیے تھا، اب تو زندگی موت کا سوال پیدا ہو رہا ہے۔'' اس کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ مجھے اس نوخیز دولھے پر ترس آنے لگا۔ جب ابراہیم کا اصرار بڑھ گیا تو میں نے کہا۔ ''ابراہیم! میری ایک شرط ہے۔ میں کچھ بھی کرنے سے پہلے ایک بار آپ کی محترم والدہ سے ملنا چاہوں گا۔''

''میں آپ کی شرط مانتا ہوں۔'' وہ فوراً بولا۔ ''لیکن اس کے بعد آپ نے مجھے زینب سے ملانا ہے۔''

''میری پوری کوشش ہوگی لیکن بات صرف ملانے کی ہو رہی ہے ابراہیم! مجھے لگتا ہے کہ آپ کی یہ خواہش کہ اسے ہر وقت نگاہوں کے سامنے رکھیں، پوری نہیں ہوگی۔''

وہ جز بز نظر آنے لگا مگر بحث بھی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے انٹر کام پر اپنی والدہ بیگم نورل سے رابطہ کیا اور انہیں بتایا کہ شاہ زیب بھائی ڈی پیلس میں ہیں اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف سے بتایا گیا کہ کچھ اہم سول اور ملٹری آفیسرز سے میٹنگ ہو رہی ہے۔ وہ آدھ گھنٹے بعد کال کرتی ہیں۔

اسی دوران میں خطرے کے سائرن بجنے لگے۔ فضائی حملے کا خدشہ تھا۔ ایسے سائرن دن میں کئی بار بجتے تھے اور پھر خطرہ ٹلنے کے سائرن گونجنے لگتے تھے۔ اس دفعہ بھی ایسا ہی ہوا۔ ڈی پیلس کی راہداریوں اور غلام گردشوں میں ہلچل کے آثار محسوس ہوئے۔ خواتین اور خواجہ سراؤں کی چلاتی ہوئی سی آوازیں نشست گاہ تک پہنچیں۔ کچھ دیر کی افراتفری کے بعد خطرہ ٹلنے کا اعلان ہو گیا۔

ابراہیم نے کہا۔ ''شاہ زیب بھائی! آپ پر بہت اعتماد کرنے لگا ہوں، آپ سے وہ باتیں بھی کہہ دیتا ہوں جو کسی اور سے نہیں کہتا۔ لگتا ہے کہ آپ سے برسوں کا ساتھ ہے۔'' اس نے چند لمحے توقف کے بعد بات جاری رکھی۔ ''شاید آپ کو پتا نہ ہو رائے زل اور اس کی والدہ ہم سے براہِ راست بھی رابطہ کر رہے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ سسٹر قسطینا، کمانڈر افغانی اور دوسرے بڑے کمانڈروں سے ہٹ کر ہم سے بات کر رہے ہیں۔''

''کیا کہہ رہے ہیں؟''

''وہ کہہ رہے ہیں کہ ہم گرے فورس اور ایجنسی کے اتحاد کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے ہم ہتھیار پھینک دیں۔ ہماری سلامتی کی ضمانت دی جائے گی۔ ہماری عزت اور مرتبے پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔''

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''وہ عزت مآب کی نرم طبع اور امن پسندی سے آگاہ ہیں۔ وہ انہیں دھمکا رہے ہیں۔ جہاں تک ان کے وعدوں کا تعلق ہے۔ آپ خود ہی کہتے ہیں کہ مکاری اور عیاری میں رائے زل کا الگ مقام ہے۔ وہ شہر میں گھس گیا تو کسی کو رحم کے قابل نہیں سمجھے گا۔ گن گن کر اپنی محرومیوں کے بدلے لے گا۔ ابراہیم! مجھے یہاں کے حالات کا زیادہ تجربہ نہیں مگر جہاں تک میں دیکھ رہا ہوں آپ لوگوں کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ پوری طاقت سے شہر کا دفاع کریں۔''

''کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔'' ابراہیم نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ''وہ مقامی جو رضا کاروں کی حیثیت سے اس لڑائی میں شامل ہوئے ہیں، اندر سے کچھ بے چین ہیں۔ ان میں کچھ افواہیں پھیل رہی ہیں۔ کل رات پل پر موجود حفاظتی دستے نے کوئی مزاحمت نہیں کی اور اس کا ہمیں بہت نقصان اٹھانا پڑا۔ اب یہ واقعہ بھی راز نہیں رہا ہے۔ کچھ توہم پرست لوگ اسے بھی پائلٹوں والے واقعے سے ملا رہے ہیں، ان کا خیال ہے کہ حفاظتی دستے کے لوگ بھی ہاناوانی کی سحر کاری کا شکار ہوئے ہیں۔ ہاناوانی کی پُراسرار صلاحیتیں کام دکھا رہی ہیں اور رائے زل کے خلاف لڑنے والے سب لوگ اس کی زد میں آ رہے ہیں۔''

''یہ سب بکواس ہے ابراہیم ...... یہ سب کچھ ہمارے واہموں اور اندرونی خوف کی کارستانیاں ہوتی ہیں۔ اگر ہاناوانی اتنی ہی بڑی پیش گو اور غیب داں تھی تو یہ کیوں نہ جان سکی کہ یکے بعد دیگرے اس کے تین شوہر اسے لات مار کر چلے جائیں گے۔ وہ ہرہائی نس قسطینا کے ان جاسوسوں کے بارے میں کیوں نہیں جان سکی جو نیوسٹی میں اس کے اردگرد ہی موجود ہیں۔ اگر ایسی بات ہوتی تو چند دن پہلے وہ برج کلب پر ہونے والے مہلک فضائی حملے سے پہلے ہی اپنے بہترین فوجی کمانڈروں کو وہاں سے نکال لیتی یا انہیں وہاں جانے ہی نہ دیتی، ایسا کچھ نہیں ہے ابراہیم۔''

اسی دوران میں وائرلیس سیٹ پر سگنل آنے لگے۔ ابراہیم نے منہ میں کچھ پڑھا۔ جیسے کسی اچھی خبر کے لیے دعا مانگ رہا ہو۔ لیکن یہ اچھی خبر کا وقت نہیں تھا۔ میجر صولت کی آواز وائرلیس پر ابھری۔ ''سر یہاں ایک اَپ سیٹ ہوا ہے؟''

''کہو۔''

''کمانڈر افغانی اور کمانڈر راوان میں کچھ دیر پہلے سخت جھگڑا ہوا تھا۔ کمانڈر راوان کا کہنا ہے کہ وہ مزید لڑائی جاری نہیں رکھ سکتا۔''

''وہ کیوں؟''

"جناب! وہ اسی کل رات والے واقعے کو بنیاد بنا رہا ہے۔ پل کا حفاظتی دستہ ایک بھی گولی چلائے بغیر رائے زل کی فورس سے مل گیا تھا۔ اسے پُراسرا کہا جا رہا ہے، کمانڈر راوان اور اس کے ساتھی اس حوالے سے خوف میں مبتلا ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے کمانڈر راوان اپنے بہت سے ساتھیوں کے ساتھ واپس چلا گیا ہے۔"

"اوہ خدایا" ابراہیم نے اپنا سر پکڑ لیا۔ وہ کچھ دیر تک بول ہی نہیں سکا پھر "اوور اینڈ آل" کہہ کر وائرلیس سیٹ بند کر دیا۔

"ہزار ڈیڑھ ہزار افراد تو ضرور اس کے ساتھ چلے گئے ہوں گے۔" ابراہیم نے افسردہ لہجے میں کہا۔

"کوئی فرق نہیں پڑتا ابراہیم۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "جو لوگ آدھے دل کے ساتھ لڑتے ہیں۔ وہ لڑائی میں نہ ہی ہوں تو بہتر ہوتا ہے۔"

ابراہیم اپنی پیشانی مسل رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ کمانڈر راوان وہی ہے جس نے ابھی تھوڑی دیر پہلے میرے سامنے افغانی سے جھگڑا کیا تھا اور پستول نکالنے تک نوبت آ گئی تھی۔ افغانی نے اسے بزدلی کا طعنہ بھی دیا تھا۔

ابراہیم نے کہا۔ "یہ افواہیں بھی پھیلی ہوئی ہیں کہ لڑائی شروع ہونے سے ایک رات پہلے ہانا وانی نے ایک کھلی قبر میں بیٹھ کر صبح تک عملیات کیے ہیں اور اب بھی وہ اپنی فورس کے ساتھ ہے اور پیچھے پیچھے آ رہی ہے۔"

یہ باتیں جاری تھیں کہ وائرلیس پر بیگم نورل کا پیغام آ گیا۔ وہ مجھے بلا رہی تھیں۔ پروگرام کے مطابق میں نے اکیلے ہی ان کے پاس جانا تھا۔ میں اٹھ کر چل دیا۔ ایک خواجہ سرا اور ایک ترک پہرے دار خاتون میرے ساتھ ہو لیے تاکہ مجھے بیگم نورل تک پہنچا سکیں۔ ڈی پیلس کے اندر سراسیمگی کی کیفیت تھی۔ وہ وسیع ہال جہاں عزت مآب ریان فردوس کے لیے راگ رنگ کی محفلیں سجتی تھیں، ویران پڑا تھا۔ پری پیکر رقاصائیں بجھی بجھی تھیں۔ میں نے عزت مآب کی دو حسین و جمیل خواصوں کو دیکھا، وہ ہمیشہ بے باک لباس میں نظر آئی تھیں، لیکن آج انہوں نے دوپٹے مضبوطی سے سروں پر جمائے ہوئے تھے اور کسی ایسی محفل میں شریک تھیں جس میں بلا ٹالنے کے لیے کچھ پڑھا جا رہا تھا۔ ایک ملنگ نما خواجہ سرا مختلف کمروں میں کالی مرچوں کی دھونی دیتا پھر رہا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد میں سیکیورٹی کے مراحل سے گزرنے کے بعد بیگم نورل کی وسیع نشست گاہ میں موجود تھا۔ وہ حسب معمول ایک برقع نما لبادے میں نظر آئیں۔ چہرہ حجاب میں تھا۔

ہاتھ میں تسبیح گردش کر رہی تھی۔ رسمی کلمات کے بعد انہوں نے میرے زخمی بازو کا احوال پوچھا اور اس امر پر میری اور میرے ساتھیوں کی تعریف کی کہ ہم دلیری سے لڑے اور ہم نے ایک مشکل وقت میں قسطینا کو گھیرے سے نکالا۔ وہ بولیں۔ ''تم لوگوں نے ثابت کیا ہے کہ عزت مآب نے تمہیں یہاں اپنے ساتھ لانے کا جو فیصلہ کیا تھا...... وہ غلط نہیں تھا۔''

پھر وہ ایک دم افسردہ ہو گئیں۔ میں سمجھ گیا کہ ان کا دھیان کس طرف گیا ہے۔ وہ آہ بھر کر بولیں۔ ''کاش اس وقت سجاول بھی تمہارے ساتھ ہوتا۔ سجاول کا خیال آتا ہے تو دل پر ایک تیر سا لگتا ہے۔ اس نے پاکستان میں ہمارے لیے بہت کچھ کیا، لیکن یہاں آتے ہی اسے کسی کی نظر لگ گئی۔''

میں اسے کیا بتاتا کہ پاکستان میں بھی اس نے کارکردگی کم دکھائی تھی اور کریڈٹ زیادہ پایا تھا اور یہاں آکر بھی اب اس کے بارے میں کچھ زیادہ اچھی اطلاعات نہیں مل رہی تھیں۔ اگر بیگم نورل کو معلوم ہو جاتا کہ وہ گرے فورس کی طرف سے لڑتے ہوئے دیکھا گیا ہے تو شاید انہیں ہارٹ اٹیک ہی ہو جاتا۔

وہ آنسو پونچھ کر بولیں۔ ''تم کیا کہنا چاہ رہے تھے شاہ زائب۔'' وہ انگلش روانی سے بولتی تھیں مگر قسطینا کی طرح وہ بھی مجھے شاہ زیب کے بجائے شاہ زائب ہی پکارتی تھیں۔

میں کچھ کہنے کے لیے مناسب الفاظ ہی ڈھونڈ رہا تھا جب وہ بولیں۔ ''ایک منٹ...... پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ ابراہیم اب تمہیں کیسا لگ رہا ہے۔''

''پہلے سے بہتر ہے یور ہائی نس۔''

''اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ اب تھوڑا بہت کھانا بھی کھا رہا ہے۔ خود کو سنبھالنے کی بہت کوشش کر رہا ہے۔''

''آپ کو معلوم ہے وہ کیوں بہتر ہو رہا ہے؟'' میں نے ڈرامائی انداز میں پوچھا۔ وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگیں۔ میں نے کہا۔ ''یور ہائی نس...... میں آپ کو ایک بہت اہم بات بتانا چاہتا ہوں۔ شاید میں یہ بات ابھی کچھ دیر اور راز ہی رکھتا لیکن جنگ شروع ہو گئی ہے۔ حالات غیر یقینی ہیں۔ ابراہیم کا اصرار بڑھتا جا رہا ہے۔ وہ اپنی دلہن زینب سے ملنا چاہتا ہے۔''

بیگم نورل کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہی تھیں...... مر جانے والوں کو زندہ کون کر سکتا ہے۔

میں نے کہا۔ ''ابراہیم کی حالت اس لیے بہتر ہو رہی ہے کہ میں نے ابراہیم کو زینب

سے ملنے کی آس دلائی ہے۔''
بڑی بیگم کا چہرہ کچھ اور تاریک ہو گیا۔ حیران نظروں سے میری طرف دیکھ کر بولیں۔
''تم اپنے حواس میں تو ہو شاہ زائب! یہ کیا کہہ رہے ہو تم، تم...... اس طرح...... اسے جھوٹی آس کیوں دلا رہے ہو؟''
''آپ کو کچھ بھی مزید بتانے سے پہلے میں آپ سے ایک وعدہ چاہتا ہوں بڑی بیگم...... اور وہ یہ کہ آپ کمانڈر افغانی کا قصور جانے بغیر اسے پیشگی معاف کریں۔''
بیگم نورل کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ شدید الجھن بھی۔ اگلے چار پانچ منٹ میں جو گفتگو ہوئی اس میں، میں نے بیگم نورل کو کچھ بھی بتائے بغیر ان سے کمانڈر افغانی، قسطینا، ماریہ اور اپنے لیے پیشگی معافی لے لی۔ جب وہ معافی دے چکیں تو میں نے کہا۔ ''بڑی بیگم! میں ابراہیم کو جھوٹی آس نہیں دلا رہا۔ آپ کی بہو زینب زندہ ہے۔''
حسبِ توقع بیگم نسا نورل پر حیرت کا شدید ترین حملہ ہوا۔ میں نے دھیرے دھیرے اور درجہ بدرجہ سب کچھ بیگم نورل کے گوش گزار کر دیا۔ انہیں بتا دیا کہ یہ سازش کس نے اور کیسے کی۔ آقا جان نے کس طرح کمانڈر افغانی کو مجبور کیا کہ وہ دلہن زینب کو پاکستان بھیجنے کے بجائے جان سے مار ڈالے۔ کمانڈر افغانی نے اسے کس طرح خواجہ سرا خیام کے پاس چھپانا چاہا اور وہاں اس پر کیا بیتی۔
بیگم نورل حیرت اور دکھ کے شدید بہاؤ میں تھیں اور گاہے گاہے سوالات بھی پوچھ رہی تھیں۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ اگر یہ سب کچھ آقا جان نے کیا تو کیوں؟ میں نے انہیں بتایا۔ ''وہ یہی چاہتا تھا یور ہائی نس جو کچھ ہوا۔ زینب کی نقلی لاش دیکھنے کے بعد ابراہیم شدید ترین صدمے کا شکار ہوئے۔ ابراہیم کی حالت کی وجہ سے آپ اور عزت مآب میں سنگین اختلافات ہوئے۔ عین جنگ کے موقع پر ایک خطرناک بحران ڈی پیلس میں پیدا ہو گیا اور اگر خدانخواستہ...... میرے منہ میں خاک ابراہیم کو کچھ ہو جاتا تو آپ اور عزت مآب کہاں کھڑے ہوتے؟''
چند منٹ بعد جب طویل گفتگو اختتام کو پہنچی تو بیگم نورل زار و قطار رو رہی تھیں۔ انہوں نے کہا۔ ''کہاں ہے میری بہو، میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔''
''وہ یہیں ڈی پیلس میں ہے بڑی بیگم۔ لیکن پہلے آپ کو یہ دیکھنا ہو گا کہ اس کی موجودگی یہاں راز رہ سکتی ہے یا نہیں اور کیا عزت مآب کی طرف سے اس کی زندگی کو خطرہ لاحق تو نہیں ہو جائے گا؟ آپ اچھی طرح جانتی ہیں وہ ڈی پیلس میں اس کا وجود برداشت

نہیں کر سکتے۔''

''میں سب کچھ سمجھ رہی ہوں شاہ زائب! میں اب اس کے سلسلے میں ہر طرح کی ذمے داری لیتی ہوں۔'' بیگم نورل نے اشک بار لہجے میں کہا۔ وہ دیوانی سی ہو رہی تھیں اور جلد از جلد زینب کو دیکھنا چاہتی تھیں۔

○......❖......○

اگلا ایک ڈیڑھ گھنٹا کافی سنسنی خیز تھا۔ بڑی بیگم نورل بڑی رازداری سے ڈاکٹر ماریہ کی رہائش گاہ پر پہنچیں (یہ رہائش گاہ ڈی پیلس کے اندر ہی تھی) وہ قریباً آدھ گھنٹا وہاں رہیں۔ اس کے بعد ابراہیم کی باری آئی۔ وہ جیسے اپنی اندرونی خوشی اور اضطراب کو سنبھال نہیں پا رہا تھا۔ اس کے ہونٹ بار بار خشک ہو رہے تھے اور گردن کی شریانیں دھڑکتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ ڈاکٹر ماریہ کی رہائش گاہ کی طرف جانے سے پہلے وہ بے ساختہ مجھ سے بغل گیر ہو گیا، اور بس اتنا ہی کہہ سکا۔ ''شکریہ۔ آپ کا بہت شکریہ۔''

میں واپس قسطینا کے پاس مورچوں میں جانا چاہ رہا تھا لیکن دل یہ بھی چاہ رہا تھا کہ جب ابراہیم اپنی زندہ سلامت دلہن سے مل کر واپس آئے تو میں اس کا مطمئن چہرہ دیکھ سکوں۔ بہرحال مورچوں میں پہنچنا زیادہ ضروری تھا۔ جس بارشی رات میں مجھے اور جاناں کو انیکسی سے اٹھا کر آقا جان کے خفیہ عقوبت خانے میں پہنچایا گیا، میرا سارا سامان انیکسی میں ہی پڑا رہ گیا تھا۔ ان ذاتی اشیا میں میرا موبائل فون اور پرس بھی شامل تھا۔ انیق باہر والے کمرے میں بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے اسے ساتھ لیا اور ڈی پیلس کے اندرونی حصے سے نکل کر انیکسی کی طرف بڑھا۔ وسیع و عریض احاطے میں جا بجا تین دن پہلے ہونے والی بمباری کے آثار تھے۔ پانی کی کچھ پائپ لائنیں پھٹ گئی تھیں جن کی مرمت کی جا رہی تھی۔ وہ جگہ بھی بری طرح متاثر ہوئی تھی جہاں سپریم کمانڈر قسطینا کا آفس تھا۔ شکر تھا کہ اس حملے کے وقت قسطینا یا کوئی دوسرا اہم عہدے دار آفس میں موجود نہیں تھا۔

میں اور انیق انیکسی میں پہنچے۔ میں نے اپنی چیزیں سمیٹیں۔ جاناں کی کئی اشیا نظر آئیں، جنہیں دیکھ کر دل ملول ہوا۔ سیل فون کو آن کیا۔ اس پر چند میسج تھے جو ابراہیم نے میری تلاش کے دوران میں کیے تھے۔ اچانک مجھے اس اسپائی کیمرے کا خیال آیا جو میں نے قسطینا کے آفس کے ریٹائرنگ روم میں لگایا تھا۔ آفس اور ریٹائرنگ روم بمباری سے متاثر ہوئے تھے۔ پتا نہیں کہ میرے کیمرے کا کیا بنا تھا۔

میں نے کیمرے کا انجام جاننے کے لیے اپنے سیل فون کو ریسیور میں تبدیل کیا۔ یہ

جان کر حیرانی ہوئی کہ یہ باکمال اسپائی کیمرا اب تک سگنل دے رہا ہے۔ میں نے اسے ایکٹو کیا۔ موبائل کی اسکرین پر کمرے کا منظر دکھائی دینے لگا لیکن میں بری طرح چونکا۔ یہ قسطینا کے ریٹائرنگ روم کا منظر نہیں تھا۔ یہ کسی اور کمرے کا منظر تھا۔ یہ کمرا میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ میں ششدر رہ گیا۔ کیا کیمرے کو وہاں سے اتار کر اس دوسرے کمرے میں لایا گیا تھا یا پھر وہ ڈیکوریشن پیس ہی وہاں سے نکال کر کسی دوسرے کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا؟

چند سیکنڈ بعد مجھے حیرت کا دوسرا دھچکا لگا۔ مجھے ایک مدھم آواز سنائی دی۔ یہ آواز ابراہیم کے علاوہ اور کسی کی نہیں تھی۔ الفاظ میری سمجھ میں نہیں آئے لیکن جواب میں جو آواز سنائی دی وہ شناخت ہوئی اور اس کے الفاظ بھی سمجھ میں آئے۔ یہ زینب کی شرمگیں آواز تھی۔ اس نے کسی بات پر ابراہیم کو ''تھینک یو'' بولا تھا۔

میں ہکا بکا تھا۔ (بعدازاں پتا چلا، قسطینا کے ریٹائرنگ روم کو نقصان پہنچا تھا۔ وہاں موجود کئی چیزیں برباد ہوگئی تھیں لیکن کچھ بچی بھی تھیں، جن میں یہ ڈیکوریشن پیس بھی تھا۔ اُسے ڈاکٹر ماریہ نے اٹھا کر اپنی رہائش گاہ میں رکھ دیا تھا۔ اب یہ ایک زبردست اتفاق تھا کہ یہ ڈیکوریشن پیس اسی کمرے میں پڑا تھا جہاں زینب نے پناہ لے رکھی تھی) چند سیکنڈ بعد مجھے زینب نظر آئی۔ اس کے بال ڈھیلی ڈھالی چوٹی کی صورت بندھے ہوئے تھے۔ برونائی طرز کے لمبے گلابی چغے میں وہ پیاری لگ رہی تھی۔ سر پر سفید اور گلابی پھولوں والا کامدار دوپٹا تھا۔ کانوں میں بڑے بڑے آویزے اور گلے میں طلائی ہار۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ایک کھڑکی کا مخملی پردہ درست کیا۔ یہی وقت تھا جب ابراہیم بھی کیمرے کے فریم میں داخل ہوا۔ یوں لگا کہ اس کی آنکھیں نم ہیں۔ وہ بڑے جذباتی انداز میں زینب کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ محبوب دلہن جو اس کی ہو کر بھی اس کی نہیں تھی۔ اس نے انگلش میں ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ ''زینب! تم نہیں جانتیں یہ گھڑیاں میرے لیے کتنی بڑی خوشی لے کر آئی ہیں...... اور تم یہ بھی نہیں جانتیں کہ میں نے تمہاری جدائی کے دن کس طرح کاٹے ہیں۔''

ان الفاظ میں سے شاید دو چار لفظ ہی زینب کی سمجھ میں آئے ہوں گے۔ ابراہیم نے اپنے جذبات کے اظہار کے لیے اردو کے ٹوٹے پھوٹے الفاظ کا سہارا لیا۔ ''تم سے محبت...... بہت بہت...... آنسو...... انتظار......''

وہ بولی۔ ''میں بھی...... بہت روئی ہوں... کئی بار تو دل چاہتا تھا کہ اپنی جان لے لوں۔''

وہ اسے شانوں سے تھام کر بولا۔ ''بہت محبت...... تم نہیں...... تو سب خالی......

میں...... میں......'' اس کی اردو ساتھ چھوڑ گئی۔ وہ اشکبار لہجے میں، انگلش میں بولتا چلا گیا۔ ''تمہاری موت کی خبر نے مجھے زندہ درگور کر دیا تھا۔ مجھے موت بہت آسان لگنے لگی تھی۔ اب بھی اپنی قسمت پر یقین نہیں آ رہا۔ کیا میں واقعی اتنا خوش قسمت ہوں؟ تمہیں پھر سے جیتا جاگتا اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں۔ کہیں یہ نگاہوں کا دھوکا تو نہیں ہے؟'' اس نے زینب کو اپنے گلے سے لگا کر بھینچ لیا۔ جیسے یقین کرنا چاہ رہا ہو کہ وہ واقعی اس کے سامنے اس کمرے میں موجود ہے۔

یہ ایک رومانی منظر تھا۔ میں نے کچھ دیر کے لیے اسکرین سے نگاہیں ہٹا لیں۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ سامنے انیق کھڑا تھا۔ ''چلیں جی؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں، پانچ دس منٹ ٹھہرو۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ایک ضروری کال کرنی ہے۔''

وہ ''اوکے'' کہتا ہوا دوسری طرف چلا گیا۔ دروازہ بند کر کے میں دوبارہ موبائل فون کی اسکرین کی طرف متوجہ ہوا تو منظر کچھ اور جذباتی ہو چکا تھا۔ وہ دونوں گلے لگے ہوئے تھے اور شاید دونوں رو رہے تھے۔

شہر میں ایک بار پھر خطرے کے سائرن بجنے شروع ہو گئے تھے۔ کہیں دور ہیلی کاپٹرز کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ بھی سنائی دی۔ اینٹی ائرکرافٹ گنوں نے فائرنگ کی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ خطرہ ٹلنے کے سائرن گونجنے لگے۔ دو تین منٹ کے لیے ابراہیم اور زینب کیمرے کے فریم سے نکل گئے تھے۔ تب ابراہیم دوبارہ فریم میں آیا۔ اس نے کھڑکی کا پردہ ذرا سا ہٹا کر باہر جھانکا اور اسے دوبارہ برابر کر دیا۔ اب کنٹرول لائن کی طرف سے پھر توپوں کی گھن گرج سنائی دینے لگی تھی۔ یہ رات کی طرح شدید تو نہیں تھی مگر مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ زینب فریم میں داخل ہوئی اور بڑے جذب کے ساتھ ابراہیم کی بانہوں میں سما گئی۔ اس کی مدھم آواز بڑی وضاحت سے میری سماعت تک پہنچی۔

''میں آپ کی ہو جانا چاہتی ہوں ابراہیم! مجھے اپنا بنا لیں۔ میں آپ کو خود سے اور دور نہیں رکھ سکتی۔ مجھے ایسی زندگی نہیں چاہیے جو آپ کو تڑپاتی رہے...... اور اب زندگی کا بھروسا بھی کیا ہے۔ کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔'' اس نے اپنا چہرہ ابراہیم کے بازوؤں میں گھسا دیا۔

وہ اردو بول رہی تھی۔ لیکن محبت کی اپنی زبان ہوتی ہے۔ وہ ایک دوسرے کی باتیں بہت کم سمجھ پا رہے تھے لیکن پھر بھی سب کچھ سمجھ رہے تھے۔ میں نے حیران ہو کر دیکھا......

زینب نے اپنا شال نما دوپٹا سر سے سرکا دیا۔ وہ فرش پر گر گیا۔ اس نے سامنے کی طرف اپنے ریشمی چغے کی کسی ڈوری کو ڈھیلا کر دیا تھا۔ وہ ایک دوسرے کی بانہوں میں الجھے تو ریشمی چغا سرسرا کر اس کے شانوں سے نیچے چلا گیا۔ یہ وقت ابراہیم کے لیے بھی ایک کڑے امتحان کی طرح تھا۔ وہ جیسے ایک مدوجزر میں ڈوب ابھر رہا تھا۔ جیسے ایک ہی جسم کے ساتھ دو مختلف راستوں پر سفر کرنا چاہ رہا تھا۔ اپنے ''زہریلے خون'' کے ساتھ زینب سے دور بھی جانا چاہ رہا تھا اور آنکھیں بند کر کے اس کی بانہوں میں کھونا بھی چاہتا تھا۔

اس نے خود کو پیچھے ہٹانے کی کوشش کی لیکن محبوب دلہن کی کشش بے پناہ تھی۔ مجھے اس کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر وہ مکمل خود سپردگی کی کیفیت میں تھی۔ ایک مشرقی بیوی کی محبت کی یہ ایک بے بدل مثال تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے شوہر کے پاس اس کے لیے موت ہے مگر وہ شوہر کی تڑپ کو اپنی زندگی سے زیادہ اہمیت دے رہی تھی۔

وہ دونوں کیمرے کے بالکل نزدیک تھے۔ کیمرے کا نہایت حساس آڈیو سسٹم ان کی مدھم سرگوشیاں بھی ''پک'' کر رہا تھا۔ ''نو زینب! آئی کانٹ ڈو دس۔ نہیں زینب۔'' اس نے آخری ایک دو لفظ اردو میں کہے۔

وہ عجب لہجے میں بولی۔ ''نہیں، مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ آپ ان باتوں کا نہ سوچیں۔ اگر اللہ کو زندگی منظور ہے تو......'' بعد کے الفاظ سمجھ میں نہیں آسکے۔

چند لمحوں کے لیے مجھے لگا کہ وہ کچھ ہونے جا رہا ہے جو ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔ وہ دونوں ایک طوفان کی زد میں تھے۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں انیکسی میں سے نکلتا تو صرف ایک منٹ میں اس کمرے تک پہنچ سکتا تھا جہاں وہ دونوں موجود تھے لیکن میری دلی خواہش تھی کہ مجھے مداخلت نہ کرنا پڑے......اور میری یہ خواہش پوری ہوئی۔

ابراہیم کی کراہتی ہوئی سی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ''میں...... یہ نہیں کر سکتا زینب...... میں تمہاری زندگی سے نہیں کھیل سکتا......''

اس نے بمشکل خود کو اپنی محبوب بیوی سے علیحدہ کیا اور اس کے دونوں مرمریں ہاتھ تھام کر چومنے لگا۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ ''میری زینب......میری پیاری زینب......اگر ہماری محبت سچی ہے تو ہم ضرور ملیں گے۔ ہزار رکاوٹوں کو عبور کر کے بھی ملیں گے اور اگر خدانخواستہ...... بدقسمتی نے ساتھ نہ چھوڑا...... ہمارے جسم نہ بھی مل سکے......تو روحیں تو ملی ہوئی ہیں۔'' وہ بہ زبان انگریزی بولتا چلا گیا۔

زینب کچھ دیر بھیگی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کے چہرے پر دکھ اور

خوشی کی ملی جلی کیفیت تھی۔ پھر وہ دوبارہ اپنے شوہر سے چمٹ گئی لیکن اب اس کا انداز مختلف تھا۔ ابراہیم نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور بڑی محبت سے اس کا شال نما دوپٹا اس کے سر پر رکھ دیا۔

O......❖......O

چند کلومیٹر دور فرنٹ پر جو فائرنگ ہو رہی تھی اس سے پتا چل رہا تھا کہ حملے کی شدت بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ دوسری طرف یہ پتا بھی چل رہا تھا کہ رائے زل کی فائرنگ پاور بہت زیادہ ہے جبکہ قسطینا اور کمانڈر افغانی سنبھال سنبھال کر ایمونیشن استعمال کر رہے ہیں۔ اُن کی طرف سے اگر چار شیل فائر ہوتے تھے تو ادھر سے شاید ایک جاتا تھا۔

''ہمارا فوراً محاذ پر پہنچنا ضروری ہے۔'' میں نے انیق سے کہا۔

''میں تو کب سے تیار بیٹھا ہوں، آپ کی کال ہی لمبی ہوتی جا رہی تھی۔'' اس نے چبھتے لہجے میں کہا۔

ہم باہر نکلے۔ ایک بار پھر درجنوں رضا کار اور سپاہی میری طرف لپکے اور مجھے دیکھ کر پُرجوش نعرے لگانے لگے۔ دو فوجی افسر تیزی سے میری طرف بڑھے اور انہوں نے مجھے روک لیا۔ ''سوری جناب! آپ کے راستے میں آ رہے ہیں، آپ کو عزت مآب نے طلب فرمایا ہے۔'' ایک آفیسر نے شستہ انگلش میں کہا۔

میں اور انیق ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ ساتھ ہی ذہن میں خطرے کی گھنٹی بھی بجی...... بہرحال انکار کی گنجائش نہیں تھی۔ پانچ منٹ بعد ہم ڈی پیلس کے اس اہم ترین حصے میں موجود تھے جہاں ریان فردوس کی رہائش تھی۔ انیق ایک بار پھر بیرونی نشست گاہ میں رہا تھا۔ یہاں مرتبے کے لحاظ سے ڈی پیلس کے بہترین گارڈز اور مسلح ترک خواتین موجود تھیں۔ دو تین ڈری سہمی خواصیں بھی نظر آئیں جن میں سنبل بھی شامل تھی۔ آج ہر وقت اس کے سینے سے چمٹا رہنے والا میمنا بھی کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر پہلے مجھے انیق کی زبانی یہ جان کر حیرت ہوئی تھی کہ ان سنگین ترین حالات میں بھی تین چار دن پہلے ریان فردوس ایک نئی لڑکی کو حرم میں داخل کرنے سے باز نہیں آیا۔ یہ وہی بھارتی حسینہ تھی جو آج کل سنبل کی جگہ لینے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں عزت مآب کی پُرشکوہ نشست گاہ میں داخل ہوا تو اس سترہ اٹھارہ سالہ کافر ادا حسینہ کی ایک جھلک نظر آئی۔ جونہی ہم اندر گئے وہ خادماؤں کے جھرمٹ میں ایک عقبی دروازے میں اوجھل ہو گئی۔

''تخلیہ۔'' میرے اندر داخل ہوتے ہی ریان فردوس نے حکم دیا۔

چند ہی سیکنڈ بعد وسیع نشست گاہ میں صرف ریان فردوس ایک مترجم اور دو گارڈز رہ گئے لیکن گارڈز اتنی دوری پر کھڑے تھے کہ ہماری آواز آسانی سے ان تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔
میرے اور ریان فردوس کے درمیان مترجم کے ذریعے جو گفتگو ہوئی وہ کچھ اس طرح تھی۔
ریان فردوس نے پوچھا۔ ''تم کیا لینے آئے تھے یہاں، تم تو محاذ پر دادِ شجاعت دے رہے تھے؟'' اس کے لہجے میں طنز کی کاٹ تھی۔
میں نے ادب سے کہا۔ ''عزت مآب! مجھے ہز ہائی نس ابراہیم نے طلب فرمایا تھا۔''
''تم سے جاننا چاہ رہا ہوگا کہ رائے زل اور چیف گیرٹ کے سپاہی کتنی دیر تک ڈی پیلس میں داخل ہوں گے...... اور کب تک ہماری عورتوں کے سروں سے چادریں اور ہمارے قدموں کے نیچے سے زمین کھینچنا شروع کر دیں گے؟'' ریان فردوس کا لہجہ مسلسل زہر آلود تھا۔
''گستاخی معاف! میں عزت مآب کے غصے کی وجہ سمجھ نہیں پا رہا۔ آپ کے وفادار سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہیں۔ آپ کی آن پر کٹ مرنے کے لیے تیار ہیں۔''
''بکواس بند کرو۔'' ریان فردوس دہاڑا۔ ''یہ باتیں سن سن کر میرے کان پک گئے ہیں۔ میری آن پر کٹ مرنے سے کیا ہوگا؟ کیا وہ خونی طوفان رک جائے گا جو ڈی پیلس کے دروازوں پر دستک دے رہا ہے۔ تم جیسے لوگوں نے...... اور قسطینا اور افغانی جیسے لوگوں نے خود اپنے گلے میں موت کا پھندا ڈالا ہے۔ اب وہ لوگ تمہیں جاما جی کی گلیوں میں گھسیٹتے پھریں گے۔ تم بے وقوفوں نے کیا سمجھا تھا، برج کلب کو تباہ کر لیا تو فتح کا راستہ کھل گیا تمہارے لیے؟ پھولوں کے ہار پڑ گئے تمہاری گردنوں میں؟''
میں نے کہا۔ ''عزت مآب! میں آپ کا ایک ادنیٰ سپاہی ہوں۔ میری یہ حیثیت نہیں کہ آپ کے سامنے دلیلیں پیش کروں، لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ برج کلب کی تباہی نے رائے زل اور ایجنسی کی کمر توڑ دی تھی۔ جاما جی کا فیصلہ کن حملہ ان کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک سکتا تھا لیکن اپنوں کی غداری نے دشمن کو چوکس کر دیا اور گرین فورس کو ایمونیشن سے محروم کر کے کمزور کرنے کی کوشش کی مگر دشمن کے سامنے سینہ تان کر کھڑی ہونے والی گرین فورس اور ہزاروں رضا کار اب بھی ناامید نہیں ہیں۔ وہ ایک ایک انچ کا دفاع کر رہے ہیں۔''
''بکواس بند کرو۔'' وہ چنگھاڑا۔ ''یہ گھسے پٹے جملے مجھے مت سناؤ۔ وہ ایک ایک انچ کا دفاع کریں یا ایک ایک ملی میٹر کا، وہ رائے زل اور ایجنسی کی مشترکہ طاقت کو روک پا رہے ہیں یا نہیں۔ بولو...... روک پا رہے ہیں یا نہیں؟''
ریان فردوس کی چنگھاڑیں سن کر بیگم نورل بھی اندر چلی آئیں۔

بیگم نورل نے میرا دفاع کرنا چاہا تو ہمارے سامنے ہی بیگم نورل اور ریان فردوس میں تند و تیز جملوں کا تبادلہ شروع ہو گیا۔ یہ ملائی زبان کا مکالمہ تھا جو کچھ میری سمجھ میں آ رہا تھا وہ کچھ اس طرح سے تھا۔ ریان فردوس غیظ و غضب کے عالم میں بیگم نورل اور دوسرے ناعاقبت اندیشوں کو لتاڑ رہا تھا۔ وہ بیگم نورل سے کہہ رہا تھا کہ اس کی خودسر بھتیجی (قسطینا) اس ساری صورتِ حال کی اصل ذمے دار ہے۔ طیش میں ریان فردوس کی جلد کے سرخ داغ اور سرخ ہو گئے تھے۔

دوسری طرف بیگم نورل بھی پھٹ پڑی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ بے موت مرنے سے لڑ کر جان دینا بہتر ہے اور صورتِ حال کی بات کرتے ہوئے ہم اپنے اندر کے غداروں کو کیوں بھول جاتے ہیں۔ آقا جان اور حلمی جیسے لوگوں نے کیا کیا ہے ہمارے ساتھ۔

میں یہ جان کر دنگ رہ گیا کہ ریان فردوس اب بھی آقا جان کی حمایت کر رہا تھا۔ اس کو شک کی گنجائش دے رہا تھا۔ بیگم نورل کا پیمانہ صبر بھی لبریز ہو گیا۔ وہ آقا جان کو کوسنے دینے لگیں۔

ریان فردوس گرجا۔ ''تم لوگوں کا اندھا جوش تمہیں موت کے گڑھے میں دھکیلے گا۔ میں تو اب بھی کہتا ہوں اس عقل کی اندھی کو سمجھاؤ...... وہ ہتھیار پھینک دے۔ وہ لوگ اب بھی صلح کی آفر کر رہے ہیں۔''

بیگم نورل نے کہا کہ وہ جانتی ہے یہ صلح کیسی ہو گی۔ آپ کے وفاداروں کو آپ کے سامنے چن چن کر موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔

اس بحث کے دوران میں ہی مارٹرز اور بزوکا وغیرہ کے شیل ڈی پیلس سے تقریباً نصف کلومیٹر کے فاصلے پر پھٹنے لگے۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ رائے زل اور ایجنسی کا اتحاد پیش قدمی کر رہا ہے۔ قسطینا اور کمانڈر افغانی بے جگری سے لڑنے کے باوجود پسپا ہو رہے ہیں۔ شیل پھٹنے کی ہولناک آوازوں سے ڈی پیلس میں کہرام سا مچ گیا۔ بالائی منزل سے بھی بے شمار خواتین کے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

اس افراتفری کا فائدہ اٹھا کر میں عزت مآب کی نشست گاہ سے باہر نکل آیا۔ میں اب انیق کو لے کر جلد از جلد ''فرنٹ'' پر قسطینا کے پاس پہنچنا چاہتا تھا۔ ابھی میں نشست گاہ سے بیس پچیس قدم دور ہی آیا تھا کہ ایک طرف سے سنبل نکلی۔ اس نے مجھے روک لیا۔

''تم بہت جلدی میں ہو لیکن میری ایک بات سن لو۔'' وہ میرے سامنے کھڑی ہو گئی تھی۔

''جلدی کہو۔'' اس کے التجا آمیز لہجے نے مجھے رکنے پر مجبور کر دیا۔

''یہاں بڑی ڈراؤنی باتیں ہو رہی ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ جن لوگوں نے حملہ کیا ہے، ان میں سے کچھ جادو اور کالا علم جانتے ہیں۔ وہ اس کے زور پر سب کو ختم کر دیں گے۔ یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ...... کہ......'' وہ بول نہ سکی۔ گلا رندھ گیا۔

''کیا کہا جا رہا ہے؟''

''یہ بڑے ظالم لوگ ہیں۔ کل رات انہوں نے جن جگہوں پر قبضہ کیا ہے، وہاں عورتوں اور لڑکیوں کو پکڑ کر لے گئے ہیں۔ ان کے ساتھ بہت برا کر رہے ہیں۔ بہت سی عورتوں کو مار دیا گیا ہے۔'' سنبل کی آواز لرز رہی تھی۔

''تم فکر نہ کرو سنبل! ہم تمہاری حفاظت کریں گے۔ یہاں ہزاروں لوگ ہیں جو آخری آدمی اور آخری گولی تک لڑنے کے لیے تیار ہیں۔''

''مم...... میں کسی بھی طرح یہاں سے نکلنا چاہتی ہوں۔ سنا ہے کہ تمہاری یہاں بہت مانی جا رہی ہے۔ کیا تم میری مدد کر سکتے ہو۔ عزت مآب نے مجھے جو تحفے دے رکھے ہیں ان کی قیمت بہت زیادہ ہے۔ پورا ایک صندوق بھرا پڑا ہے۔''

''بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ یہاں بہت سے لوگوں کے پاس بہت سے صندوق بھرے پڑے ہیں۔ حوصلہ رکھو اور وقت کا انتظار کرو۔'' میں نے ترش لہجے میں کہا اور آگے بڑھ گیا۔

وہ چھوٹے دل دماغ کی پیشہ ور لڑکی تھی۔ اس سے ایسی ہی بات کی توقع کی جا سکتی تھی۔ میں انیق کو لے کر اندرونی پورشن سے نکلا اور ایک بار پھر احاطے میں پہنچا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم کیپٹن کے ساتھ اسپیشل فوجی گاڑی میں بیٹھے تیزی سے محاذ کی طرف جا رہے تھے۔ شہری آبادی پر گولے گرنے کا آغاز ہوا تھا تو خود بخود ہی لوگوں کا انخلا شروع ہو لیا تھا۔ سڑک پر گاڑیوں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ لوگ جزیرے کے محفوظ مقامات کی طرف جانے کی کوشش کر رہے تھے مگر راستے مسدود تھے۔ ہماری گاڑی خصوصی پروٹوکول کے ذریعے آگے بڑھتی اور ایمرجنسی گاڑیوں والی لین میں سفر کرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی گئی۔ زندگی میں کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس قسم کے حالات کا سامنا ہوگا۔ یہ اسٹریٹ فائٹنگ اور گینگ وار سے بہت آگے کی چیز تھی۔ شہری بیشتر آبادی راہ فرار اختیار کر چکی تھی، اب مارٹرز اور بزوکا وغیرہ کے گولے خالی گھروں کو کھنڈر بنا رہے تھے۔ جگہ جگہ گھروں اور گاڑیوں کو آگ لگی ہوئی تھی۔

''مجھے لگتا ہے بھائی کہ سچویشن ہمارے اندازے سے زیادہ خراب ہے۔'' انیق نے

ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
میں نے دیکھا...... ایک موبائل فوجی اسپتال کے قریب قسطینا کی خاص بم پروف گاڑی کھڑی تھی۔ یہ موبائل اسپتال ایک بڑے ٹرالر میں قائم تھا اور اس پر ریڈ کراس کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ ساتھ میں گرین فورس کا جھنڈا بھی تھا۔
انیق نے کہا۔ ''اگر ہر ہائی نس قسطینا کی گاڑی یہاں موجود ہے تو عین ممکن ہے کہ وہ مورچوں میں زخمی ہونے کے بعد یہاں پیچھے آ گئی ہوں۔''
انیق کی بات میں وزن تھا۔ موبائل اسپتال کے اردگرد پروٹوکول کی گاڑیاں نظر آرہی تھیں اور دو چار ایسی گاڑیاں بھی تھیں جو اعلیٰ فوجی افسران کے استعمال میں لائی جارہی تھیں۔
موبائل اسپتال ایک ٹیلے کی آڑ میں پارک کیا گیا تھا۔ میرے کہنے پر کیپٹن نے گاڑی کا رخ اسپتال کی جانب کر دیا۔ ہمارے اوپر سے توپوں کے شیل ایک باریک گونج پیدا کرتے ہوئے گزر رہے تھے۔
ہمیں کمانڈر فارس نظر آیا۔ اس نے سراسیمہ لہجے میں کہا۔ ''ہر ہائی نس زخمی ہوگئی ہیں۔ بازو اور گھٹنے پر زخم آئے ہیں۔ زخم تو زیادہ سنگین نہیں لیکن خون کافی بہا ہے۔''
میں ٹرالر کے اندر پہنچا۔ خون کا اخراج روکنے کے لیے قسطینا کے بازو اور ٹانگ پر بینڈیج کی جا چکی تھی۔ زیادہ خون بہہ جانے سے اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا مگر وہ بے قرار نظر آرہی تھی۔ اس نے ڈاکٹر سے کہا۔ ''میں باہر جانا چاہتی ہوں۔ میرے سپاہیوں کو میری ضرورت ہے۔''
''لیکن آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ یہ عارضی بندوبست ہے۔ آپ کا خون پھر رسنا شروع ہو جائے گا۔'' ڈاکٹر نے ادب سے کہا۔
قسطینا ڈاکٹر کا ہاتھ جھٹک کر اٹھ بیٹھی۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی ایک شیل ٹرالر سے صرف پچاس ساٹھ فٹ کی دوری پر گرا اور اس کے پرخچے کنٹینر کی دیواروں سے ٹکرائے۔
ابھی ہم اس دھماکے سے سنبھل بھی نہ پائے تھے کہ دوسرا شیل آیا اور اس نے اس گاڑی کو نشانہ بنایا جس پر دو چار منٹ پہلے ہم یہاں پہنچے تھے۔ گاڑی تباہ ہوگئی اور اس کے ساتھ ہی وہ کیپٹن بھی اپنی سرزمین پر قربان ہو گیا جو ہمیں یہاں تک لے کر آیا تھا۔ اس کے جوان جسم کے ٹکڑے ہمارے سامنے بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی گرین شرٹ کی دھجیاں ایک درخت پر ٹنگی نظر آئیں۔
''لگتا ہے کہ دباؤ بڑھتا جا رہا ہے۔'' میں نے قسطینا سے مخاطب ہو کر کہا۔

میری بات کی تائید گولیوں کی ایک بوچھاڑ نے کی جو 18 پہیوں والے اس دیوہیکل ٹرالر سے ٹکرائی تھی۔ تب ہماری نگاہ دائیں جانب اٹھی۔ گرین فورس کی چند بکتر بند گاڑیاں اور ''ملٹی پل راکٹ لانچرز آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ رہے تھے۔ یہ مزید پسپائی کے آثار تھے۔ یہی وقت تھا جب دو ہائی ایکس گاڑیاں آندھی کی رفتار سے موبائل اسپتال کے قریب آ کر رکیں۔ ان میں سے ایک گاڑی کے اندر سے کمانڈر افغانی برآمد ہوا اور بھاگتا ہوا موبائل اسپتال کے اندر پہنچ گیا۔ اس نے کہا۔ ''یور ہائی نس قسطینا! کمانڈر راوان کوئی ڈیڑھ ہزار لشکریوں کے ساتھ لڑائی سے باہر ہو گیا ہے۔ دشمن کا دباؤ بڑھتا جا رہا ہے۔ ہمیں اب آخری دفاعی لائن پر پہنچنا ہو گا۔''

آخر دفاعی لائن کا سن کر قسطینا کا زرد رنگ مزید زرد ہو گیا۔ وہ بھی سمجھ رہی تھی کہ آخری دفاعی لائن ڈی پیلس ہی ہے۔

''رائے زل کے دستے کتنی دور ہیں؟'' قسطینا نے پوچھا۔

''جنوب کی طرف سے وہ دو کلومیٹر سے زیادہ نہیں ہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ فوراً ڈی پیلس تک پیچھے ہٹ جائیں اور ڈی پیلس کے دروازے اندر سے بند کر لیں۔ میں اور میرے ساتھی رائے زل کو آگے بڑھنے سے روکتے ہیں۔'' افغانی کا لہجہ چٹان تھا۔

''نہیں کمانڈر افغانی! میں میدان چھوڑ کر ڈی پیلس میں پناہ نہیں لوں گی۔ آپ سب کے ساتھ لڑوں اور مروں گی۔''

''ہم ڈی پیلس میں مورچا بند ہو کر رائے زل کو اور ایجنسی والوں کو کئی دن تک روک سکتے ہیں۔ اس دوران میں برونائی سے کمک آ جائے گی۔'' افغانی نے دلیل دی۔

چند منٹ تک افغانی اور قسطینا میں زوردار بحث ہوئی۔ آخر افغانی نے قسطینا کو قائل کر لیا کہ وہ اپنے دستوں کے ساتھ پیچھے ہٹتی چلی جائے اور ڈی پیلس کی بلند فصیلوں کے اندر پہنچ جائے۔ طے ہوا کہ کمانڈر افغانی، کمانڈر فارس اور ان کے سب سے تربیت یافتہ دستے جن کو پاسبان کہا جاتا تھا، آخری دفاعی لائن پر دشمن کی پیش بندی روکیں گے، کم از کم اس وقت تک، جب تک قسطینا اپنے دستوں اور باقی محفوظ فوج کے ساتھ ڈی پیلس میں داخل نہیں ہو جاتی۔

میں نے افغانی سے مخاطب ہو کر اردو میں کہا۔ ''کمانڈر افغانی! میں تمہارے ساتھ رہنا چاہوں گا۔''

''برادر! امارے خیال میں تمہارا ضرورت بی بی قسطینا کے ساتھ زیادہ ہے۔''

''آپ نے سارے خطرے مول لینے کا ٹھیکا نہیں لے رکھا۔ کچھ ہاتھ پاؤں ہمیں بھی

چلانے دیں۔''

''اوئے میرے برادر! تم یہ کیا کہہ رہا ہے؟ تم نے ہاتھ پاؤں ہلایا ہے تو اللہ نے مدد پر مایا ہے اور بی بی قسطینا دشمن کے گھیرے سے نکلا ہے۔ اب بھی تم اس کی حیاظت کا ذمے داری اٹھاؤ۔''

''میں سمجھتا ہوں کہ بی بی قسطینا کی حفاظت وہی لوگ کریں گے جو ان کو سلامتی سے ڈی پیلس میں داخل ہونے کا موقع دیں گے اور میں ان لوگوں میں ہی شامل رہنا چاہتا ہوں۔''

قسطینا نے عجیب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ان میں غصہ بھی تھا، ستائش بھی تھی اور محبت بھی۔ لیکن وہ کچھ بولی نہیں۔ وہ اب تک اچھی طرح جان چکی تھی کہ میں بے شک اس کو یور ہائی نس اور یور ایکسی لینسی کہتا ہوں لیکن کرتا وہی ہوں جو میری مرضی ہوتی ہے۔ درحقیقت میں نے یہاں اپنا آپ منوایا تھا اور یہ لوگ میری بات کو اہمیت دینے پر مجبور تھے۔ ویسے بھی اب یہ لڑائی مجھے اپنی لڑائی لگ رہی تھی۔ میں نے زینب کی حفاظت کی ذمے داری اپنے کاندھوں پر لی ہوئی تھی، میں نے جاناں کی لاش اپنے ہاتھوں میں اٹھائی تھی، میں نے آقا جان سے نفرت اور دشمنی کا پیچ لڑایا ہوا تھا اور یہ حریص امریکن...... ان کے لیے میرے دل میں انگارے تھے...... ہاں میرا دشمن اول جان ڈریک بھی تو ایک امریکن ہی تھا۔

O......❖......O

اور یہ سہ پہر کے بعد کا وقت تھا۔ ڈی پیلس کے عین سامنے فیصلہ کن لڑائی ہو رہی تھی۔ یہ ڈی پیلس کا مشرقی مین گیٹ تھا۔ جیسا کہ میں نے پہلے بتایا ہے کہ ڈی پیلس کے باقی دو گیٹس کو موٹی دیواریں لگا کر قریباً بیس فٹ بلندی تک چن دیا گیا تھا۔ اب وہ گیٹ ڈی پیلس کی قلعہ نما فصیل کا حصہ بن چکے تھے۔ اب صرف یہی مین گیٹ تھا۔ اس گیٹ کو بھی چند دن پہلے بے حد محفوظ شکل دی جا چکی تھی۔ یہ خاص قسم کے اسٹین لیس اسٹیل کی کئی انچ موٹی چادر تھی جو دو طرف سے سلائیڈ کر کے بند ہوتی تھی۔ گولی تو کیا اسے راکٹ اور ہیوی شیل بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے۔ اس کی دو پرتیں تھیں اور دونوں پرتوں کے درمیان شدید دھماکوں کا دباؤ برداشت کرنے والے ''ویکیومز'' تھے۔

آگے اور پیچھے کے وسیع و عریض احاطوں والا ڈی پیلس عملی طور پر ایک قلعے کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ اس کے سب سے اونچے برج پر جاماجی کا ایک دیوہیکل پرچم لہرا رہا تھا۔ بیس فٹ اونچی دیوار پر M16 اور ''بیلٹ فیڈڈ'' ٹائپ کی ہیوی مشین گنیں نصب تھیں۔ اندر کی طرف پختہ چبوتروں پر مارٹر اور بزوکا وغیرہ کی قطاریں تھیں۔

گرین فورس کے دستے پیچھے ہٹتے ہوئے ڈی پیلس میں داخل ہوتے جا رہے تھے......
اور سامنے والے وسیع احاطے میں پوزیشنیں سنبھال رہے تھے۔ کچھ چھتوں پر مورچا زن ہو گئے تھے۔ (لشکری یعنی رضا کار اس سے پہلے ہی ڈی پیلس میں پہنچ گئے تھے یا پھر ساحل کی طرف نکل گئے تھے)

افغانی اور دیگر کمانڈر، پاسبان نامی جانبازوں سمیت تقریباً دو درجن پختہ مورچوں میں موجود تھے اور حملہ آور گرے فورس کے سامنے دیوار بنے ہوئے تھے۔ میں اور انیق بھی ان لوگوں کے ساتھ ہی موجود تھے۔ سیف کو بہت سی جھاڑیں پلا کر میں نے ڈی پیلس میں بھیج دیا تھا۔ جب تک قسطینا اپنے خاص دستوں سمیت ڈی پیلس میں نہیں پہنچ گئی، ہم پر بے پناہ دباؤ رہا۔ اس کے بعد ہم نے خود کو قدرے ''ایزی'' محسوس کیا۔ مگر بارود اب بھی بارش کی طرح ہم پر برس رہا تھا۔ جلتے گوشت اور بارود کی بو مل جل کر دماغ پر عجیب اثر کرتی ہے۔ کانوں کے پردے مسلسل لرزتے رہتے ہیں اور کسی وقت بہرے پن کی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ ہم نے آخر وقت تک ڈی پیلس میں داخل ہونے والے ساتھیوں کو COVER دیا۔ پھر پاسبان بریگیڈ کے جانباز بھی چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں ڈی پیلس میں داخل ہونے لگے۔

آخر وہ اسٹیج آئی جب کمانڈر افغانی نے مجھ سے کہا۔ ''برادر! اب ام کو بھی پیچھے ہٹنا ہے لیکن یہ کافی مشکل کام ہے۔ جونہی ام مورچوں سے نکلے گا اور پیچھے جائے گا یہ خنزیر کا بچہ ام پر چڑھائی کرے گا۔''

''یہ بات تو ہے۔'' میں نے تائید کی۔ ''ہم قریباً سو میٹر تک کھلی جگہ پر ہوں گے۔''

افغانی نے وائرلیس پر ڈی پیلس کے اندر رابطہ کیا اور اپنے کسی ساتھی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''ہیلو رازی خان! اب ام کو آرٹلری کا ہیوی فائر کا ضرورت ہے۔ میجر وارث کے ساتھ مل کر بھرپور حملہ کرو تا کہ ام پیچھے ہٹ سکے۔''

دوسری طرف سے پُر جوش جواب ملا۔ ''ام تیار ہے۔ کیا ام ٹھیک دو منٹ بعد حملہ شروع کر دے؟''

افغانی نے کہا۔ ''ہاں...... اور اس کے ساتھ ہی گیٹ بھی کھلوا دینا۔''

یہ واقعی نازک ترین صورتِ حال تھی۔ دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ ہم پانچ دس منٹ سے زیادہ، ڈی پیلس سے باہر نہیں رہ سکتے تھے اور اندر جاتے ہوئے بھی شدید ترین خطرے سے گزرنا تھا۔

میری پریشانی دیکھ کر کمانڈر افغانی نے جوش سے میرا کندھا تھپتھپایا۔ ''ام کو تمہارے

حوصلے نے بہت متاثر کیا۔ امارا زندگی رہا اور تم جیسے لوگوں کا ساتھ رہا تو ام ان ''پرنگیوں'' کو ناکوں چنے چبوا دے گا۔''

کمانڈر افغانی نہیں جانتا تھا اور مجھے بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ آخری ''بات'' ہے جو ہم ایک دوسرے سے کر رہے ہیں۔

ٹھیک دو منٹ بعد افغانی کے آرڈر کے مطابق ڈی پیلس کی فصیل نما دیوار کے اوپر سے ہیوی مشین گنز، مارٹرز اور ایم آر ایل کا شدید ترین اٹیک گرے فورس پر ہو گیا۔ ہمارے سامنے گرد اور دھوئیں کی دیوار سی کھڑی ہو گئی، اس گرد اور دھوئیں میں مسلسل دھماکے اور شعلے تھے۔ میں نے مڑ کر دیکھا ڈی پیلس کا عظیم الشان سلائیڈنگ دروازہ کھلنا شروع ہو گیا تھا۔

افغانی اور اس کے قریباً ایک سو ساتھی مورچوں سے نکل کر دروازے یعنی گیٹ کی طرف بڑھے، میں اور انیق بھی اس جتھے میں شامل تھے۔ بیشتر افراد الٹے پاؤں، فائرنگ کرتے ہوئے جا رہے تھے۔ کچھ منہ پھیر کر بھی دوڑ رہے تھے۔ یہ موت کا سفر تھا۔ میرے سامنے کئی افراد زخمی ہو کر گرے۔ بالآخر ہم گیٹ میں داخل ہو گئے۔ گیٹ اب پورا کھلنے کے بعد بند ہونا شروع ہو گیا تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ افغانی اب بھی گیٹ کی دوسری طرف موجود تھا۔ بحری جہاز کے کپتان کی طرح وہ اب بھی خطرے کے بھنور میں تھا۔ میں نے دیکھا، وہ ایک زخمی ساتھی کو بازو سے گھسیٹتا ہوا گیٹ کی طرف لا رہا ہے۔ وہ دوسرے ہاتھ سے کلاشنکوف کا فائر کر رہا تھا۔ پھر میں نے اسے بھی زخمی ہو کر گھٹنوں کے بل گرتے دیکھا۔ میں نے بے قرار ہو کر اس کی طرف لپکنا چاہا مگر انیق نے مجھے پکڑ لیا۔ اسی دوران میں گیٹ بھی سلائیڈ کر کے مکمل بند ہو گیا۔

ہم نے سائیڈ پر لگے سی سی ٹی وی مانیٹر پر دیکھا۔ کمانڈر افغانی اور اس کے دو تین ساتھی سینہ تان کر حملہ آوروں کے سامنے کھڑے تھے۔ گولیوں کی باڑیں ان کے جسموں سے ٹکرائیں اور انہیں چھلنی کر گئیں۔ لیکن مرتے دم تک وہ بھی جوابی فائرنگ کرتے رہے۔ یہ بہادروں کی موت تھی، یہ سرفروشوں کا اندازِ سفر تھا...... تاریخ کے صفحات ایسے لوگوں کی رُودادِ شجاعت سے بھرے پڑے ہیں۔

○......❖......○

ڈی پیلس گھیرے میں آ چکا تھا۔ رات کا اندھیرا چھا گیا تھا اور لڑائی وقتی طور پر رک گئی تھی۔ یہ ایک بڑے سخت دن کا اختتام تھا۔ ڈی پیلس کے اطراف میں اَن گنت لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ ان میں دشمن کی لاشیں تھیں اور اپنی بھی۔ زخمی ہونے والے بھی سیکڑوں میں تھے۔

مقامی لوگوں کے مطابق بھی افغانی کی شہادت کنفرم ہو چکی تھی مگر اس شہادت نے لشکریوں اور سپاہیوں کے حوصلے توڑے نہیں تھے مزید مضبوط کیے تھے۔قسطینا نے فوری طور پر کمانڈروں اور انتظامی عہدیداروں کی ایک میٹنگ طلب کی۔ بیگم نورل اور ریان فردوس کی نمائندگی کرتے ہوئے ابراہیم بھی یہاں موجود تھا۔

قسطینا نے کہا۔"اب یہ زندگی اور موت کی جنگ بن چکی ہے۔آج ہمارے شہید ہونے والے ساتھیوں نے ہمارے سامنے ایک ہی راستہ کھلا چھوڑا ہے اور وہ راستہ ہے لڑ کر جینے کا یا مرنے کا......اور میرا خیال ہے یہاں موجود سب لوگ بے توقیری کی زندگی سے عزت کی موت کو ترجیح دیں گے۔آخری سانس تک لڑنا چاہیں گے۔"

بہت سے پُر جوش نعرے ہال کمرے میں گونجنے لگے۔کچھ لوگوں نے افغانی کے بڑے بڑے پوسٹرز فضا میں بلند کیے اور اسے زبردست خراجِ تحسین پیش کیا۔افغانی کا دست راست کمانڈر فارس جان اپنی نشست پر کھڑا ہو گیا اور اس نے تقریر کرنے والے انداز میں کہا۔

"آج ہم اس شہید کے وارث بن گئے ہیں جس نے ڈی پیلس کے دروازے کے سامنے آخری سانس تک مزاحمت کی اور اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا۔اس نے ہمارے سینوں میں نہ بجھنے والی آگ کو کچھ اور ہوا دی ہے۔ہم ان شاء اللہ اس آگ میں رائے زل اور اس کے خانوادے کو راکھ کر چھوڑیں گے......"

کمانڈر افغانی کے برعکس فارس جان انگلش بھی ٹھیک بول لیتا تھا۔اس کی پُر جوش تقریر کے بعد سپریم کمانڈر قسطینا نے صلاح مشورے شروع کیے۔قسطینا نے سب سے آراء طلب کیں۔میری باری آئی تو اس نے مجھے بھی بولنے کے لیے کہا۔

ذرا تذبذب کے بعد میں نے کہا۔"میں کوئی عسکری تجربہ نہیں رکھتا اور نہ اس حوالے سے میرا کوئی دعویٰ ہے۔ہاں میں نے کچھ گینگ وارز دیکھی ہیں اور لڑنے والوں کی نفسیات سمجھتا ہوں۔مجھے لگتا ہے کہ ہم اس وقت ایک محدود جگہ پر کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ہمیں نشانہ بنایا جانا آسان ہے اور یقیناً بنایا بھی جائے گا۔"

"ام آپ کی بات کی تائید کرتا ہے۔" کمانڈر فارس جان نے کہا۔"ام پر زمین سے گولا باری ہوگا اور ہوائی (فضائی) حملہ بھی بہت نقصان دہ ہوسکتا ہے۔"

میں اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، کچھ دن پہلے لڑائی کی شروعات میں ایجنسی کے بہت سے امریکی پکڑ کر ڈی پیلس میں لائے گئے تھے۔ان میں عورتوں اور بچوں کے علاوہ کافی تعداد مردوں کی بھی تھی۔عزت مآب ..... نے ان سب لوگوں

کو اپنی حفاظت میں لے لیا تھا۔ یقیناً وہ لوگ اب بھی یہیں ڈی پیلس میں ہوں گے۔''

''تم کیا کہنا چاہتے ہو مسٹر شاہ زائب؟''

''جہاں تک میں ان گوروں کو جانتا ہوں، وہ خود کو آسمان سے اتری ہوئی مخلوق سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک ان کے ایک ''ہم قوم'' کی جان عام لوگوں کی سو جانوں سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔''

ابراہیم نے کہا۔ ''کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ان مرد قیدیوں کو بارگیننگ کے لیے استعمال کیا جائے؟''

''ایسا ہو سکتا ہے۔ یہ سب کے سب بہت اہم لوگ ہیں۔ ایجنسی والے ہر صورت ان کی جان بچانا چاہیں گے۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ اگر ہم اپنے اس ''آپشن'' کو اچھے طریقے سے استعمال کریں تو رائے زل اور ایجنسی میں اختلاف بھی پیدا ہو جائے۔''

کسی نے کہا۔ ''لیکن عورتیں اور بچے......؟''

''میں عورتوں اور بچوں کی نہیں صرف مردوں کی بات کر رہا ہوں۔ وہ مرد جو ہماری آستینوں کے سانپ بنے ہوئے تھے اور ہم سے جنگ کرنے کے لیے یہاں موجود تھے۔ میری رائے میں، رائے زل تک یہ پیغام پہنچایا جائے کہ وہ لوگ زندہ سلامت ہیں اور ہمارے پاس یہاں ڈی پیلس میں ہیں۔''

''بات تو ٹھیک ہے۔'' قسطینا نے کہا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنا فقرہ مکمل کرتی ایک زوردار دھماکے نے اس ہال کمرے کے در و دیوار لرزا دیئے۔

اور یہ ایک دھماکا نہیں تھا۔ یکے بعد دیگرے سماعت شکن دھماکے شروع ہو گئے۔ کمانڈر فارس جان چلایا۔ ''وہ حرامی ہر حد تک جانے کے لیے تیار ہے۔ وہ ڈی پیلس پر حملہ کر رہا ہے......'' اس کی آواز دھماکوں کے شور میں دب کر رہ گئی۔

میٹنگ ادھوری ہی چھوڑ دی گئی۔ سب لوگ ہال کمرے سے نکل کر پناہ گاہوں کی طرف لپکے۔ قسطینا بالائی منزل کے ایک مضبوط بنکر میں چلی گئی۔ وہ بھی زخمی تھی مگر اس نے اپنی چوکسی میں کوئی فرق نہیں آنے دیا تھا۔ بالائی منزل سے وہ ڈی پیلس کی فصیل نما دیوار اور دیوار سے آگے بھی دیکھ سکتی تھی۔ میں اور کمانڈر فارس جان بھی اس کے ساتھ تھے۔ اب رات کے قریباً نو بج چکے تھے۔ شدید گولا باری ایک مہلک آتش بازی کا منظر پیش کر رہی تھی۔ ہمارے سامنے درجنوں گولے ڈی پیلس کے مختلف حصوں پر گرے۔ شعلے بھڑکنے لگے اور آہ و بکا کی آوازیں ایک بلند و بالا شور کا روپ دھار گئیں۔

یہ دوطرفہ ہیوی شیلنگ قریباً دس منٹ جاری رہی۔ڈی پیلس کی فصیل کا ایک حصہ منہدم ہو گیا لیکن یہ جزوی نقصان تھا۔ یہاں سے اندر نہیں آیا جا سکتا تھا۔ گولا باری تھمی تو میں بنکر سے نکل کر اس حصے کی طرف دوڑا جہاں ڈاکٹر ماریہ کی رہائش گاہ تھی۔ وہاں سے بھی دھواں اٹھ رہا تھا۔ بھاگتے ہوئے میرا ٹخنا چیخ رہا تھا۔ مجھے سب سے زیادہ فکر زینب کی تھی۔ابراہیم مجھ سے پہلے ہی یہاں پہنچ چکا تھا۔ وہ اندرونی حصے میں چلا گیا۔ایک منٹ بعد باہر آ کر اس نے مجھے سرگوشی میں بتایا۔''اللہ کا شکر ہے وہ بالکل محفوظ ہے۔ایک ملازمہ کو کچھ زخم آئے ہیں۔''

ہم ڈی پیلس کے اس حصے کی طرف بڑھے جہاں زیادہ تباہی ہوئی تھی اور باقاعدہ آگ لگی ہوئی تھی۔ڈی پیلس کی بلندیوں پر لہرانے والا جاماجی کا جہازی سائز کا جھنڈا ٹوٹ کر احاطے میں گرا پڑا تھا۔شعلوں کی روشنی میں کچھ لاشیں بھی نظر آئیں۔

''او مائی گاڈ۔'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

سامنے خانساماں از میر طیب مردہ حالت میں پڑا تھا۔کسی شیل کا پرچا اس کی فربہ گردن کو چیر کر نکل گیا تھا۔اس کی پالتو بندریا لوسی اس کے چاروں جانب چکرا رہی تھی۔اس کے اپنے پاؤں سے بھی خون بہہ رہا تھا۔ ہم ملبے کو پھلانگتے ہوئے آگے بڑھے۔ایک لاش سے ابراہیم کو ٹھوکر لگی۔ وہ گرتے گرتے بچا۔ میں نے دیکھا، یہ اس لڑکی کی لاش تھی جس نے مجھے ایک دن پہلے ڈی پیلس کے ایک کوریڈور میں روکا تھا اور میرے پاؤں چومنے کی کوشش کی تھی۔اس کا کلیجا اس بات پر ٹھنڈا ہوا تھا کہ میں نے آقا جان کے منہ پر سرِ عام ایک یادگار تھپڑ رسید کیا ہے اور اب وہ ہر خوشی غمی سے آزاد ہو چکی تھی۔

''یہ دیکھیں شاہ زیب بھائی!'' ابراہیم نے کہا۔

مجھے سنبل کے سفید میمنے کی خونچکاں لاش نظر آئی۔ اس کی انتڑیاں پیٹ سے باہر تھیں ....تو کیا سنبل کی لاش بھی یہیں کہیں پڑی ہو گی؟ میں نے بڑے کرب کے ساتھ سوچا۔

یہاں روشنی بہت کم تھی۔ڈی پیلس کے اس حصے میں بجلی کا نظام درہم برہم ہو چکا تھا۔ ایک سیکیورٹی گارڈ نے ایک ٹارچ ابراہیم کو اور دوسری مجھے تھما دی۔ میں ٹارچ کی روشنی میں اردگرد کے مناظر دیکھنے لگا۔اگر میمنا یہاں موجود تھا تو سنبل بھی مردہ یا زخمی حالت میں یہاں پائی جا سکتی تھی۔

سنبل تو کہیں دکھائی نہیں دی مگر جو دیگر مناظر نظر آئے وہ لرزہ خیز تھے۔درحقیقت یہ

ڈی پیلس کا وہ حصہ تھا جہاں بڑی تعداد میں عورتوں اور بچوں نے پناہ لے رکھی تھی۔ مارٹرز وغیرہ کے کئی شیل یہاں گرے تھے۔ پتا چلا تھا کہ یہ شیل 300 پونڈ سے زائد وزنی ہوتے ہیں اور ایک قوس بناتے ہوئے بلندی سے نیچے آتے ہیں۔ ان شیلز نے زبردست جانی نقصان کیا تھا۔ ننھی کلیاں خون میں لتھڑی ہوئی تھیں۔ ایک چھ سات سالہ نازک اندام لڑکا ایک بھاری ستون کے نیچے یوں پچکا ہوا تھا کہ اس کی صرف پنڈلیاں اور جوتے ہی نظر آرہے تھے۔ کئی عورتوں کی کٹی پھٹی لاشیں یہاں موجود تھیں۔ ایک عورت اوندھی پڑی تھی اور اس نے اپنے شیرخوار کو آخری دم تک سینے سے چمٹائے رکھا تھا۔ ماں بچہ دونوں ختم ہو چکے تھے۔

سینہ شق ہونے لگا۔ سماعت سن ہوگئی۔ ہر طرف ماتمی آوازیں گونج رہی تھیں۔ پاسبان بریگیڈ کے جوان زخمیوں کو ملبے کے نیچے سے نکالنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ ان میں کچھ عام لوگ بھی شامل ہو گئے تھے۔ مجھے ان مددگاروں میں انیق اور سیف بھی دکھائی دیئے۔ ابراہیم کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ حرکات وسکنات سے نقاہت ٹپکتی تھی۔ مجھے ڈر لگا کہ اس لڑکے کو کچھ ہو نہ جائے۔ میں اسے لے کر وہاں سے نکل آیا۔ ہم ڈی پیلس کے فرسٹ فلور پر پہنچے۔ یہاں بلندی سے ڈی پیلس کے اردگرد کے مناظر نظر آئے۔ قریباً نصف کلومیٹر کے فاصلے پر ان گنت روشنیاں چمک رہی تھیں۔ بے شمار ''توپ گاڑیاں'' اور بکتر بند دستے ڈی پیلس کو گھیر چکے تھے۔ کسی بھی وقت دوبارہ اندھا دھند گولا باری شروع ہو سکتی تھی۔ میرے بدن میں آگ سی دہک رہی تھی۔ میں سیدھا قسطینا کے پاس پہنچا۔ جواں سال کمانڈر فارس جان بھی قریب ہی موجود تھا۔

میں نے کہا۔ ''یور ہائی نس! یہ لوگ درندگی پر اتر آئے ہیں۔ ان کو روکنے کا اب ایک ہی طریقہ ہے۔ ان امریکیوں کو ان کے سامنے لایا جائے۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو شاہ زائب؟''

''امریکن قیدیوں میں جو مرد ہیں، انہیں علیحدہ کیا جائے اور ان کو اپنے بچوں، عورتوں کے تحفظ کے لیے استعمال کیا جائے۔ ان کو انسانی ڈھال بنایا جائے۔''

قسطینا کی آنکھوں میں سوچ ابھری اور کمانڈر فارس کا چہرہ تمتما اٹھا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''کہتے ہیں کہ محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے اور جب دشمن ایسے بے رحم ہتھکنڈوں پر اتر آئے تو پھر دفاع کرنے والے کو بھی ہر طریقہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ ان کے مردوں کو تہ خانوں سے نکال کر ڈی پیلس کے مختلف حصوں میں باندھ دیا جائے۔ اس شیطان رائے زل اور چیف گیرٹ کو بتایا جائے کہ اگر وہ ڈی پیلس کے رہائشی حصوں پر گولا

باری کریں گے تو سب سے پہلے ان امریکنوں کے چیتھڑے اڑیں گے۔''

کمانڈر فارس جوش سے دایاں ہاتھ اٹھا کر بولا۔''ام آپ کی بات کی پوری حمایت کرتا ہے۔ یہ بھیڑیے ہیں...... ان کو چیر پھاڑ سے روکنے کا یہ بہت مناسب طریقہ ہے۔ امارا دھیان پہلے ہی اس طرپ چلے جانا چاہیے تھا۔''

قسطینا نے کہا۔لیکن اگر......''

''لیکن...... کچھ نہیں یور ہائی نس۔آپ ذرا جا کر زنان خانے کا منظر ملاحظہ فرمائیں۔ دیکھیں وہاں کیسے عورتوں اور بچوں کے چیتھڑے اڑے ہوئے ہیں...... اور ابھی اور اڑنے والے ہیں۔''

کمانڈر فارس جان نے کہا۔''گستاخی معاف یور ہائی نس! اب ہمیں یہ کرنا ہی پڑے گا۔''

قسطینا کی خاموشی نیم رضامندی کی طرح تھی۔کمانڈر فارس نے اسے زوردار سلیوٹ کیا اور باہر نکل گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد ہم ڈی پیلس کے تہ خانوں میں تھے۔اب یہاں قریباً چار سو امریکی مرد وزن جمع ہو چکے تھے۔ان میں نصف تعداد عورتوں اور بچوں کی تھی۔ان امریکنوں میں کئی بڑے صنعت کار اور تاجر تھے جو اس جزیرے میں بہتر موقعوں کی تلاش میں پہنچے ہوئے تھے۔ کچھ ریسرچر تھے۔ یہ بات خاص و عام میں کہی سنی جا رہی تھی کہ اس چھوٹے سے جزیرے میں معدنیات کا خزانہ موجود ہے۔قیدیوں میں کچھ ایسے مال دار سیاح بھی تھے جو اہلِ خانہ سمیت یا تنہا اس جزیرے کی سیاحت کو آئے ہوئے تھے لیکن اس وقت یہ سب کے سب مصیبت میں تھے۔ان کی حالت قیدیوں جیسی ہی تھی۔لباس وہی تھے جو کئی دن پہلے بھی ان کے جسموں پر دکھائی دیئے تھے۔ اکثر مردوں کی شیو بڑھی ہوئی تھی۔ تاہم ان لوگوں کو خوراک وغیرہ کی کمی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ دیگر سہولتیں بھی انہیں حاصل تھیں۔ جب گرین فورس کے سپاہیوں نے مردوں کو عورتوں سے علیحدہ کرنا شروع کیا تو شور برپا ہو گیا۔عورتیں چلانے لگیں۔ بچے اپنے باپوں سے لپٹنے لگے، کئی خواتین نے مزاحمت شروع کر دی۔ ان کا خیال یہ تھا کہ ان کے مردوں کو قتل کرنے کے لیے باہر لے جایا جا رہا ہے۔

''عزت مآب ہم پر رحم کرو...... عزت مآب ہماری بات سنو...... تم کہاں ہو عزت مآب......'' ایک درمیانی عمر کی عورت دردناک انداز میں پکاری۔

میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔''واویلا مت مچاؤ۔ ہم انہیں پھانسی چڑھانے نہیں

لے جا رہے۔ بس ان کو دوسری جگہ رکھنے کا حکم ہے۔''

''تم جھوٹ بول رہے ہو...... بکواس کر رہے ہو۔'' وہ عورت انگلش میں چلا کر بولی اور میرا گریبان پکڑنے کے لیے آگے بڑھی۔ راستے میں ہی کمانڈر فارس کا زبردست تھپڑ اس کے منہ پر پڑا اور وہ عورتوں پر جا گری۔

فارس انگلش میں گرجا۔ ''ابھی ان حرام زادوں کو کچھ نہیں ہوگا لیکن اگر دنگا کرو گی تو پھر ہم واقعی ان کو شوٹ کر دیں گے۔''

فارس جان کے تاثرات دیکھ کر عورتیں سہم گئیں، تاہم کئی ایک نے مزاحمت جاری رکھی۔ گرین فورس کے جوان، مردوں کو دھکیلتے ہوئے باہر لے آئے۔ عورتوں اور بچوں کو وہیں بند رہنے دیا گیا۔ پروگرام کے مطابق ہم وہ خاص جگہیں پہلے ہی چن چکے تھے جہاں ان تقریباً ڈیڑھ سو افراد کو باندھا جانا تھا۔ ان میں سے قریباً سو افراد کو بالائی منزل کی کھڑکیوں کے قریب اور باقی افراد کو نیچے باندھنے کا پروگرام تھا۔ یہ ساری کارروائی بڑی شتابی سے پندرہ بیس منٹ کے اندر مکمل ہوگئی۔ کمانڈر فارس نے اس سے پہلے ہی رائے زل سے وائرلیس پر رابطہ کیا اور اسے بتا دیا کہ اب اگر ڈی پیلس پر گولا باری ہوگی تو پہلے ڈیڑھ سو امریکنوں کی جان جائے گی۔

اس کارروائی کا نتیجہ عین ہماری توقع اور منشا کے مطابق نکلا۔ گرے فورس اور ایجنسی کا اتحا، ڈی پیلس پر گولا باری کے دوسرے دور کے لیے بالکل تیار نظر آتا تھا، لیکن اس بندوبست کے بعد وہاں خاموشی چھا گئی۔ یہ تدبیر کارگر ہوتے دیکھ کر گرین فورس کے جوانوں اور رضا کاروں کے چہرے دمک اٹھے۔ ان میں اعتماد دکھائی دینے لگا۔ جاما جی کے گرے ہوئے جھنڈے کی جگہ ایک نیا جھنڈا لہرایا گیا اور ایک بار پھر جنگی نعرے سنائی دینے لگے۔ اسی دوران میں مجھے تابوتوں کی ایک طویل قطار دکھائی دی۔

انیق نے بتایا۔ ''یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے لڑائی میں جان دی ہے۔ کمانڈر افغانی، کمانڈر واحد اور براڈے کے جسدِ خاکی بھی ان میں شامل ہیں۔ ان تابوتوں کو آخری رسوم سے پہلے سرد خانے کی طرف لے جایا جا رہا ہے۔''

بہت سے لوگ ان تابوتوں کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ اپنے کمانڈر افغانی کے لیے اور دیگر شہیدوں کے لیے ان کے جذبات چھلکے پڑ رہے تھے۔ وہی جنگی ترانہ یہاں بھی کورس کی شکل میں پڑھا جانے لگا۔

ہم جاتے اندھیرے تک لڑیں گے

ہم سچے سویرے تک لڑیں گے
اور اگر ہم واپس نہ آسکے
تو ہمارے بچوں سے کہنا ہم سرخرو ہوئے

قسطینا نے ایک بار پھر کمانڈرز اور آفیسرز کی میٹنگ طلب کی۔ اس مرتبہ بیگم نورل بھی اس میں شریک ہو رہی تھیں (وہ عزت مآب کی نمائندگی کر رہی تھیں جو مبینہ طور پر صدمے کی کیفیت میں تھے) اس میٹنگ میں رائے زل اور امریکن افسروں سے لینڈ لائن یا وائرلیس کے ذریعے بات چیت ہونے جا رہی تھی۔ قسطینا نے مجھے بھی طلب کیا تھا لیکن میری حالت بری تھی۔ یہ اور بات ہے کہ میں کسی کو بتا نہیں رہا تھا۔ بازو اور ٹخنے سے مسلسل درد کی ناقابلِ بیان ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ اب لڑائی میں کچھ وقفہ آیا تھا تو میرا دل چاہ رہا تھا کہ بازو کا پلاستر اتر واؤں اور دیکھوں کہ اس کی کیا درگت بنی ہے۔ انیق کا خیال بھی یہی تھا کہ مجھے فوراً سے پیشتر بازو کا معائنہ کرانا چاہیے۔

میں نے کہا۔ ''معائنہ کراؤں گا تو وہ مجھے پکڑ کر وہیں اسپتال میں بٹھا لیں گے اور یہ میں ابھی نہیں چاہتا۔''

''کیا مطلب؟''

''اگلے دو تین دن کافی نازک ہیں۔ میں ابھی بستر پر لمبا لیٹنے کا پروگرام نہیں رکھتا۔''

''نازک دنوں سے کیا مطلب؟''

''کچھ بھی ہو سکتا ہے۔'' میں نے کہا۔ پھر انیق کو بتایا کہ میں چاہتا ہوں، ڈاکٹر ماریہ کو اعتماد میں لے کر اسے بازو کی صورتِ حال دکھا دوں۔''

قریباً پندرہ منٹ بعد میں اس کشادہ کمرے میں موجود تھا جہاں ہمیں رات گزارنا تھی۔ میں نے بڑی رازداری سے ماریہ کو بلایا تھا اور اس سے کہا تھا کہ وہ مجھے ''پرائیویٹلی'' دیکھے اور جو عارضی بندوبست ہو سکتا ہے وہ کرے۔ وہ اپنا میڈیکل باکس اور ایک دو سرجیکل اوزار ساتھ لائی تھی۔ اس نے خون آلود پلاستر کو کاٹا اور بازو سے علیحدہ کیا۔ بازو کی حالت نے اس کی تشویش میں اضافہ کیا۔ ''نہیں شاہ زیب صاحب۔'' وہ شستہ انگریزی میں بولی۔ ''آپ نے تو بہت بیڑا غرق کر لیا ہوا ہے۔ یہ تو فوری آپریشن کا کیس ہے۔''

اسی دوران میں کمرے میں موجود لینڈ لائن فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے دایاں ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف قسطینا کے سیکرٹری کی آواز تھی، وہ بولا۔ ''مسٹر شاہ زیب بات کر رہے ہیں؟'' میں نے اثبات میں جواب دیا۔ اس نے اطلاع دی۔ ''ہر ہائی نس آپ

سے بات کرنا چاہتی ہیں۔'' چند سیکنڈ بعد ریسیور میں قسطینا کی رعب دار آواز سنائی دی۔ ''ہیلو شاہ زائب! تم میٹنگ میں کیوں نہیں آئے۔ سب نے تمہارے بارے میں پوچھا۔''

میں نے ڈاکٹر ماریہ کو آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ ''بس ایک بہت ضروری کام تھا، بعد میں بتاؤں گا۔''

وہ بولی۔ ''تمہارے لیے اطلاع ہے کہ 72 گھنٹے کے لیے لڑائی روکنے کی ہماری تجویز رائے زل اور اس کی امی جان صاحبہ نے مان لی ہے۔ اس دوران میں ہم بات چیت کے ذریعے خونریزی ٹالنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔''

''ویل ڈن۔''

''ویل ڈن تمہارے لیے بھی۔ مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں کہ تمہاری اس بروقت تجویز نے کام کیا ہے...... اور مجھے امید ہے تمہاری تجویزیں آئندہ بھی کام کریں گی۔''

''شکریہ...... لگتا ہے کہ یہ وقفہ ہمارے لیے کافی فائدہ مند ثابت ہوگا۔''

وہ بولی۔ ''معلوم ہوا ہے کہ رائے زل اور اس کی والدہ تو فوراً حملہ کرنے کے حق میں تھے مگر ایجنسی والوں کو ہم وطن امریکنوں کی جانیں عزیز ہیں۔ انہی کے دباؤ پر لڑائی تھمی ہے۔''

قسطینا کا دھیان کئی سمتوں میں بٹا ہوا تھا، پھر بھی اس نے میرے بازو کے زخم کے سلسلے میں بات کی اور مجھے فوری معائنہ کرانے کا حکم دیا۔

کال ختم ہوئی تو ڈاکٹر ماریہ سر پکڑے بیٹھی تھی۔ بولی۔ ''مسٹر شاہ زیب! تم نے اپنے بازو کا حشر خراب کر لیا ہے۔ میں بہت دکھ کے ساتھ یہ محسوس کر رہی ہوں کہ شاید ''مکس مارشل آرٹ'' کا میدان ایک بڑے کھلاڑی سے محروم ہو چکا ہے۔''

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''یہ تو بعد کی باتیں ہیں ڈاکٹر ماریہ! فی الحال ڈنگ ٹپاؤ کارروائی کیا ہو سکتی ہے؟ میں کسی بھی صورت اگلے دو تین دن تک آپریشن کے چکر میں پڑنا نہیں چاہتا۔''

''لیکن خدانخواستہ...... خدانخواستہ اگر تمہیں بازو کٹوانا پڑ گیا تو پھر؟''

کافی بحث مباحثے کے بعد ڈاکٹر ماریہ مجھے عارضی ''ٹریٹ منٹ'' دینے کے لیے تیار ہوئی۔ اس نے طاقتور قسم کا اینٹی بائیوٹک انجکشن لگایا کیونکہ کندھے بلکہ پورے بازو میں سوجن اور انفیکشن موجود تھی۔ اس نے درد کش انجکشن بھی دیا۔ اس کے بعد ایک دو زخم صاف کیے اور کندھے سمیت بازو کو اس طرح پلاسٹک کے خول اور پٹیوں میں جکڑ دیا کہ ٹوٹی اور کھسکی ہوئی ہڈی کا مزید نقصان نہ ہو۔ آخر میں اس نے کہا۔ ''یہ سب کچھ آپ کے مجبور کرنے پر ہے

مسٹر شاہ زیب! میں بری الذمہ ہوں۔"

انیق، انجکشن اور انفیوژن وغیرہ اچھی طرح لگا دیتا تھا۔ ماریہ نے اسے سمجھا دیا کہ اینٹی بائیوٹک اور پین کلرز کس طرح اور کتنے وقفے سے لگنے ہیں۔

وہ رات نسبتاً پُرسکون تھی۔ مگر اس سکون کے پیچھے طوفان کی پھنکاریں بھی موجود تھیں۔ دونوں طرف کی فورسز مورچوں کے اندر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بیٹھی تھیں اور انگلیاں ٹریگرز پر رکھی ہوئی تھیں۔ ڈی پیلس کے اندر تین سو کے قریب کمرے تھے پھر بھی یہ کم پڑ رہے تھے۔ میں، انیق اور سیف ایک ہی کمرے میں تھے۔ کئی لوگ مجھ سے ملنا چاہ رہے تھے اس لیے اس کمرے سے باہر گارڈز کا پہرا لگا دیا گیا تھا۔ بہت طاقتور اور مرغن قسم کا فوجی کھانا کھانے کے بعد ہم لیٹ گئے۔ خاص طور سے مجھے تو یہی لگا کہ ایک عرصے بعد آرام دہ بستر اور خطرے سے خالی رات نصیب ہوئی ہے۔ انجکشنز کی وجہ سے درد کو بھی آرام تھا۔ راوی "کافی حد تک" چین لکھ رہا تھا۔

جزیرے میں جو ڈاک آتی تھی، آج اس میں ایک خط انیق کے لیے بھی تھا، بلکہ یہ دو خط تھے جو اس دور دراز جگہ تک پہنچے تھے۔ ایک خط کا ذکر میں آگے جا کر کروں گا، ایک خط کا ذکر کر دیتا ہوں۔ اس خط نے ان سنگین اور دکھی حالات میں بھی ہمارے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھیر دی۔ یہ پہلوان حشمت کا خط تھا۔ میں اس کا کچھ حصہ بیان کرتا ہوں۔

"یہاں سب خیریت ہے۔ حقیقت بتا تا ہوں، تم اور شاہ زیب بہت یاد آوت ہو۔ میرا بہت دل چاہتا تھا کہ تم لوگوں کے حمراہ اس طویل سفر پر نکلوں مگر قسمط کو منظور نہیں تھا۔ یہاں مجھے عالمگیر اور پیر ولایت کی طرف سے شدید خطرات لاحق رہتے ہیں۔ سوچتا ہوں بیوی بچوں کے ساتھ شہر کی طرف نکل جاؤں لیکن شہر مجھ کو راس آئے گا نہ میری شاعری کو۔ میری شاعری کی ساری جڑیں تو میری دھرتی اور کھیتوں کھلیانوں میں ہیں۔ بڑی عمر کے پودے کو اس کی جگہ سے پٹ کر کہیں اور لگایا جاوے تو اس کا سوا سطیاناس ہو جاوت ہے۔

ہر پودا ہر زمیں پر نا ہیں ہوتا
کہیں پر ہوتا ہے کہیں پر نا ہیں ہوتا
کچھ بستیوں میں انسان بھی مرجھاتے ہیں
بکریوں کی طرح سر اپنے جھکاتے ہیں
نہ کچھ پیتے ہیں، نہ کچھ کھاتے ہیں

میں بھی بیمار بکری بننا نہیں چاہتا۔ اس سے تو بہتر ہے کہ اسی گاؤں کے کسی گوشے میں چپ چاپ پڑا رہوں اور اگر میری قسمت میں عالمگیر کے ہاتھوں ذبح ہونا ہی لکھا ہے تو ہو جاؤں۔ تم لوگوں کی واپسی کا ہر گھڑی انتظار رہتا ہے۔ پتا نہیں کن غورکھ دھندوں میں پھنسے ہوئے ہو۔ تاجور چلی گئی، ریشمی کا بھی ویاہ ہو گیا ہے۔ آہستہ آہستہ چاند گڑھی ویران ہوتا جارہا ہے۔ تم آؤ گے تو شاید کچھ رونق ہووے گی......وہ کیا شعر ہے

غلوں میں رنگ بھرے، بادِ نو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ غلشن کا قاروبار چلے

آگے جا کر ایک جگہ پہلوان حشمت راہی صاحب یوں رقمطراز تھے...... پہلے چنگا ویلا تھا، ہمارے حساب سے...... ڈانگ سوٹے کی لڑائی میں ہڈیاں شڈیاں ٹوٹتی تھیں۔ مریض آتے تھے۔ اب تو فائرنگ کا دور ہے، ٹھاہ گولی اندر جان باہر۔ بس تھوڑا بہت موٹر سائیکل کا آسرا ہے۔ کبھی کبھی تو سوچتا ہوں کہ ہڈی جوڑ کے کام کو خیر آباد کہہ دوں، اپنی ساری طوانائی شاعری پر لگاؤں۔ اب خیر سے مجھے، میلوں ٹھیلوں میں ہونے والے مشاعروں میں دعوت دی جانے لگی ہے......تم لوگ آؤ گے تو تمہیں دکھاؤں گا۔"

خط پڑھنے کے بعد میں اور انیق دیر تک پہلوان کی باتیں کرتے رہے۔ سادہ لوح لیکن محبت سے لبالب بھرا ہوا شخص۔ پہلوان کے بعد گفتگو کا رخ سجاول کی طرف مڑ گیا۔ ایک بار پھر انیق کا یہ سنسنی خیز دعویٰ زیر بحث آیا کہ اس نے گھمسان کی لڑائی میں سجاول سیالکوٹی کی جھلک دیکھی ہے، پندرہ بیس منٹ کی گفتگو کے بعد ہم کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ ہماری گفتگو کے دوران میں ہی سیف سو گیا (اس نے دو چھوٹے پیگ لگائے تھے) ویسے بھی وہ بہت تھکا ہوا تھا۔ انیق بھی تھوڑی ہی دیر میں سو گیا، مگر میں جاگتا رہا۔

ذہن میں خیالات کا ہجوم تھا۔ واقعات اتنی تیزی سے رُونما ہو رہے تھے کہ سوچیں درہم برہم ہو گئی تھیں۔ سجاول کی گمشدگی، جاناں کی غم ناک موت، آقا جان کی کھلی غداری، گرین فورس کی پسپائی، کمانڈر افغانی کی جدائی......اور بہت کچھ۔

اچانک مجھے اپنے سیل فون کا خیال آیا۔ تجسس جاگا کہ اپنے اسپائی کیمرے کو دیکھوں، میں نے سیل فون کی مطلوبہ "اپلی کیشن" میں جا کر ویڈیو ریسیور کو فعال کیا۔ میرے لیے یہ ایک خوشگوار اتفاق تھا کہ کیمرا ابھی تک سگنل دے رہا تھا اور شادی شدہ جوڑا بھی کمرے میں موجود تھا۔ ابراہیم ایک شاندار صوفے پر بیٹھا تھا۔ زینب اس کے عقب میں موجود تھی اور بڑی محبت سے اس کے سر میں کسی چیز کی مالش کر رہی تھی۔ دونوں کا بس سائیڈ پوز دکھائی دے رہا

تھا۔ وہ کچھ فاصلے پر تھے اس لیے گفتگو پلے نہیں پڑ رہی تھی۔ نئی دلہنوں جیسے خوش رنگ لباس میں سرو قد زینب دلکش نظر آ رہی تھی۔ اس کی ست رنگی چوڑیاں چھنچھنا رہی تھیں۔ ابراہیم نے اس کا نازک ہاتھ اپنے سر سے ہٹا کر اپنے چہرے کی طرف کیا اور پشت کی طرف سے چوم لیا۔ وہ شرما گئی۔ پھر اس نے عقب سے ابراہیم کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور اس پر جھک گئی، اس کے رخسار پر اپنا رخسار رکھ دیا۔

میں نے ایک خوش گوار احساس کے ساتھ رابطہ منقطع کر دیا۔ ان دونوں کو ملا کر مجھے ایک انجانی مسرت ہوئی تھی۔ مگر ابھی یہ ملاپ ادھورا تھا۔ ابھی ان کے درمیان سے ایک خوفناک رکاوٹ کا ہٹایا جانا ضروری تھا...... زینب اور ابراہیم کو مسرور دیکھ کر میرا دھیان ایک بار پھر اپنی اس ''محبت'' کی طرف چلا گیا جو مجھ سے دور ہو چکی تھی۔ کاش کسی نے ہم کو بھی ملانے کی کوشش کی ہوتی، جدائی سے بچا لیا ہوتا۔

○......❖......○
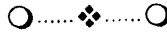
کھڑکیوں سے باہر خنک اندھیرا تھا۔ فضائی حملے وغیرہ کا اندیشہ نہیں تھا۔ پھر بھی احتیاطاً ڈی پیلس کی بہت سی روشنیاں بند تھیں۔

میری توجہ اپنی دائیں طرف سوئے پڑے گبرو جوان سیف پر مرکوز ہو گئی۔ زندگی کے ہر رنگ سے بھرا ہوا، زندہ دل شخص تھا۔

اس کے پاس ہی اس کا موبائل فون بھی پڑا تھا۔ پتا نہیں کیوں میں نے وہ فون اٹھا لیا۔ اس کے مختلف فولڈرز میں جھانکتا رہا۔ اخلاقی طور پر یہ غلط تھا مگر نہ جانے کیوں، میں یہ کر رہا تھا۔ میسج، کونٹیکٹس، کال لاگ...... گیلری...... وائس ریکارڈر...... میں کئی آپشنز میں گیا۔ گیلری میں موجود تصویروں اور ویڈیوز میں بھی کئی دیہی منظر نظر آئے۔ ایک ویڈیو کبڈی کے کسی سنسنی خیز میچ کی تھی۔ ایک انعامی تقریب کی جس میں سیف ٹیم کے کپتان کی حیثیت سے ایک بڑا کپ اٹھائے کھڑا تھا۔ کئی چھوٹے بڑے ویڈیو کلپس ایک میلے کے تھے۔

یکا یک مجھے حیرت کا شدید دھچکا محسوس ہوا۔ ایک کلپ میں مجھے تاجور اپنی کسی سہیلی کے ساتھ نظر آئی۔ میری رگوں میں خون سنسنا اٹھا۔ میں نے چور نظروں سے پہلے سیف اور پھر انیق کی طرف دیکھا۔ دونوں دنیا و مافیہا سے بے خبر تھے۔

میں نے ہیڈ فون لگا کر یہ کلپ پلے کیا۔ میں دنگ رہ گیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہ ویڈیو کلپ تاجور کی بے خبری میں بنایا گیا ہے۔

کسی جگہ پہلے سے موبائل سیٹ کر دیا گیا تھا اور ریکارڈنگ کی گئی تھی۔ کمرے میں روشنی

کم تھی پھر بھی دونوں لڑکیوں کے چہرے قریباً صاف نظر آتے تھے۔ ساتھی لڑکی نے مدھم آواز میں کہا۔ ''تاجو...... دیکھ میں نے تو اپنی ساری ''ای چی، پی چی'' تجھے بتا دی ہے۔ کچھ بھی چھپایا نہیں۔ اب تُو بھی کچھ بتا نا......کون تھا وہ؟''

''بس اتنا ہی ہے، جتنا بتا دیا تجھے......اور اب کچھ بھی نہیں ہے۔ اب تو وہی کچھ ہے جو ماں پیو نے میرے لیے چنا ہے۔''

''اوئے، تو میں کب کہہ رہی ہوں تُو پھر اس کے پاس جا بیٹھ۔ یہی پوچھ رہی ہوں نا کہ کب ملا تھا؟ کیسے ملا تھا؟'' وہ شوخی سے بولی۔

تاجور نے ایک لمبی سانس لی۔ ''بس کوئی تھا بانو، چاندگڑھی کا نہیں تھا۔ باہر سے آیا تھا۔ کچھ دیر وہاں رہا۔ پھر وہ اپنے راستے، میں اپنے راستے۔'' وہ عجیب لہجے میں بولی اور اس کی لٹیں چہرے پر ڈھلک آئیں۔

''کوئی بات......کوئی ملاقات؟''

''بس ایک دو دفعہ......دور دور سے۔ اور اب تُو نا چھوڑ اس گل کو۔ جو ختم ہو گئی اس کو دہرانے سے فائدہ؟''

''میں نہیں مانتی۔'' وہ مکئی کا بھٹا کھاتے ہوئے بولی۔

''کیا نہیں مانتی؟''

''یہی کہ پہلی محبت کبھی ختم ہوتی ہے۔ لڑکی کے دل کے اندر تو رہتی ہے نا ہمیشہ......کئی بچوں کی ماں بن کر بھی۔''

ایک دم جیسے تاجور بھی کھو سی گئی۔ اپنے اٹھے ہوئے گھٹنے پر ٹھوڑی ٹیک کر بولی۔ ''ایسا کیوں ہوتا ہے بانو؟ کچھ لوگ پاس ہو کر بھی دور...... کچھ دور ہو کر بھی پاس۔ ان کو جتنا بھلاؤ......بھولتے نہیں۔''

''تو پھر اس کو روک لینا تھا، منا لینا تھا......؟''

''کیسے روکتی...... کیسے مناتی...... وہ میرے لیے نہیں تھا، نہ میں اس کے لیے تھی۔ وہ کسی اور دنیا کا رہنے والا تھا۔ بڑی اُچی اڈاری تھی اس کی۔ میرے پروں میں اتنی طاقت کہاں تھی؟''

''تُو نے اس کو کہہ کے تو دیکھنا تھا۔ کیا پتا وہ اپنی اڈاری ختم کر دیتا۔''

''ہاں......شاید یہ غلطی تو ہوئی۔'' اس نے بھرائی ہوئی سی آواز میں کہا۔

''دل کرتا ہے کہ وہ پھر ملے؟''

تاجور نے جیسے چونک کر سہیلی کی طرف دیکھا اور بدلے لہجے میں بولی۔ ''بانو! تُو نے کن باتوں میں لگا لیا ہے مجھ کو۔ چھوڑ دے بس اس بات کو۔ جو چیز نہیں ہے، وہ بس نہیں ہے۔ آئندہ سے میرے نال اس طرح کی باتیں نہ کرنا......

اب جو کچھ ہے میرے لیے وہی ہے جس کے گھر میں نے جانا ہے......اور کچھ نہیں۔''

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

سہیلی نے ہاتھ پکڑ کر اسے بٹھانا چاہا مگر پھر دونوں کیمرے کے فریم سے آؤٹ ہو گئیں۔ ان کی آوازیں بھی فیڈ آؤٹ ہو گئیں۔

گاؤں کی گلی میں کسی کتے کی آواز سنائی دی۔ پھر کسی مرغ نے بے وقت کی بانگ لگائی اور خاموشی چھا گئی۔ ویڈیو کلپ ختم ہو گیا۔

میں اپنی جگہ سکتہ زدہ سا بیٹھا تھا۔ میں اس سے کتنی دور چلا آیا تھا، مگر وہ پھر بھی کسی نہ کسی صورت، کسی نہ کسی طور میرے سامنے آجاتی تھی۔

یہ الفاظ بار بار میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ ''ہاں، یہ غلطی تو ہوئی ہے...... یہ غلطی تو ہوئی ہے۔'' اس کے لہجے کا کرب...... اداسی...... دکھ......سب کچھ میری سماعت کو گھائل کر رہا تھا۔

میں نے کن انکھیوں سے سیف کی طرف دیکھا جو بیڈ پر پھیل کر لیٹا ہوا تھا۔ اس کے مدھم خراٹے سنائی دے رہے تھے۔ مجھے سیف پر بھی حیرت ہوئی۔ وہ اس طرح کا ویڈیو کلپ کتنی بے پروائی سے اپنے موبائل فون میں لیے پھر رہا تھا۔ یقیناً یہ اس نے اس بانو نامی لڑکی کی مدد سے بنوایا تھا۔ کیوں بنوایا تھا؟ کیا وہ تاجور پر کسی طرح کا دباؤ ڈالنا چاہتا تھا یا پھر یہ ویسے ہی ''نوجوان پریمیوں'' والی بے وقوفی تھی؟

ساحل کی طرف کوئی ہیلی کاپٹر پہرا دینے والے انداز میں مسلسل چکرا رہا تھا۔ اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے نمبر دیکھا۔

یہ وہی فون تھا جس پر قسطینا نے دو گھنٹے پہلے بات کی تھی۔ اب وہ پھر کال کر رہی تھی۔ رات کے اس پہر کی کال کیا معنی رکھتی تھی......

پہلے قسطینا کے سیکرٹری کی آواز آئی، پھر وہ خود فون لائن پر آگئی۔ ''ہیلو شاہ زائب! کیا کر رہے ہو؟'' اس نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

''کچھ خاص نہیں، بس سونے کی تیاری تھی۔''

''دیکھو، مجھ سے جھوٹ نہ بولا کرو اور یہ مت بھولو کہ میں تمہاری پرستار بھی ہوں اور

پرستار اپنے اسٹار میں ہر خوبی دیکھنا چاہتا ہے۔ اس میں سچ کی خوبی بھی شامل ہے۔"

"میں نے کیا جھوٹ بولا ہے؟"

"تم بولنے والے ہو...... مجھے بتاؤ تم نے اب تک اسپتال جا کر اپنا معائنہ کیوں نہیں کروایا...... کیا تمہارا ارادہ سچ مچ اپنا بازو کٹوانے کا ہی ہے؟" وہ بڑے درد سے بولی۔

"نہیں قسطینا! لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگلے چند پہر بڑے نازک ہیں۔ یہ لڑائی کوئی بھی رخ اختیار کر سکتی ہے۔ اس دوران میں اگر میں آپریشن کرا کے بستر پر جا لیٹتا تو میرے لیے بڑی شرمندگی اور دکھ کی بات ہوگی۔ میں نے ڈاکٹر ماریہ سے ٹریٹ منٹ لی ہے۔ انہوں نے نئی بینڈیج بھی کر دی ہے۔ میں اب کافی بہتر محسوس کر رہا ہوں۔"

"تم پرلے درجے کے ضدی اور ہٹ دھرم ہو شاہ زائب! تم بہت بڑی بے وقوفی کر رہے ہو اور اس بے وقوفی کے جواز پیش کر رہے ہو۔ میں بہت مایوس ہوئی ہوں۔ میری طرف سے جو مرضی کرتے پھرو۔" اس نے بڑبڑا کر کھٹاک سے فون بند کر دیا۔

لیکن بیس تیس سیکنڈ بعد ہی فون کی بیل دوبارہ ہونے لگی۔ دوبارہ قسطینا کی کال تھی۔ حسبِ سابق پہلے سیکرٹری نے بات کی پھر وہ لائن پر آگئی۔ چند سیکنڈ بعد اس کی قدرے بوجھل آواز ابھری۔ "سوری شاہ زائب! مجھے غصہ آگیا تھا۔ مجھے اس لہجے میں بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔"

"آپ سپریم کمانڈر ہیں۔ آپ سوری کہہ کر مجھے شرمندہ کر رہی ہیں۔"

"میں نے کہا ہے نا کہ میں ایک لیجنڈ کی پرستار بھی ہوں۔ اس حوالے سے میری فکر مندی بہت زیادہ ہے اور مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ تمہیں اپنے سامنے "لائیو" دیکھ کر اور تم سے مل کر میری پسندیدگی اور چاہت میں بہت اضافہ ہوا ہے۔ کل تم نے جس طرح ایک نہایت خطرناک موقعے پر میرے سامنے خود کو ڈھال بنایا اور آخر وقت تک ڈٹے رہے...... میں کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ میرے لیے وہ یادگار لمحے تھے۔ کاش میں انہیں ہمیشہ کے لیے کیمرے کی آنکھ میں محفوظ کر سکتی۔"

میں نے کہا۔ "چلیں کوئی بات نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایسے مزید موقعے آئیں۔"

"اسی لیے تو کہتی ہوں کہ تمہیں صحت مند اور تندرست ہونا چاہیے۔ لڑائی رک گئی ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ لڑائی رکنے میں بھی تمہاری تجویز کا بہت زیادہ عمل دخل ہے۔ امریکن قیدیوں کو سامنے لانے سے رائے زل کی بے رحمی کو لگام پڑ گئی ہے۔ پوری امید ہے کہ اگلے تین چار روز فائر بندی جاری رہے گی اور اس دوران میں شاید خون خرابے سے بچنے کا کوئی

راستہ بھی نکل آئے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم اپنے بازو کو دوبارہ ''آپریٹ'' کرالو۔ میں سچ کہتی ہوں، میں بہت فکرمند ہوں۔'' آخر میں قسطینا کی آواز جذبات سے بوجھل ہو گئی۔

''لیکن قسطینا......''

''پلیز...... میری خاطر۔'' اس نے میری بات کاٹ کر عجیب سے لہجے میں کہا۔ اس لہجے میں خاص قسم کی اپنائیت تھی۔

''آپ میری کمانڈر رہیں...... آپ حکم دے سکتی ہیں...... مگر......''

''اگر سپریم کمانڈر مان رہے ہو تو پھر اگر مگر تو نہ کرو...... پلیز۔''

''او کے!'' میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

فون کال ختم ہوئی تو میں مخمصے میں پڑ گیا۔ وہ بڑی حد تک درست بھی کہہ رہی تھی۔ ڈاکٹر ماریہ کا بھی یہی کہنا تھا کہ میں اپنے بازو پر ظلم کر رہا ہوں۔ تو پھر کیا کروں؟ اسپتال میں جا کر لیٹ جاؤں۔ بازو کے علاوہ بھی میرے جسم پر کئی شدید چوٹیں آقا جان کی کرم فرمائی کی گواہی دیتی تھیں۔

پتا نہیں کب تک سوچتا رہا۔ سوچتے سوچتے نیند آ گئی۔ آنکھ کھلی تو دھماکے ہو رہے تھے۔ پہلے تو مجھے لگا کہ شاید سماعت کا دھوکا ہے مگر پھر میں نے بوفرگن کے ہیوی دھماکوں کی آوازیں سنیں۔ یہ شیل ڈی پیلس کے عقبی احاطوں پر فائر کیے گئے تھے۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ انیق اور سیف مجھ سے پہلے ہی جاگ چکے تھے۔ انیق نے پریشان لہجے میں کہا۔ ''بڑی توپ کا فائر آ رہا ہے۔''

اس کے ساتھ ہی ڈی پیلس کی فصیل پر سے جوابی فائر بھی ہونے لگا۔ دھماکوں کی گونج درودیوار میں سرائیت کرنے لگی۔

''یہ کیا ہو رہا ہے جی؟ سیف نے کہا۔ ''رات کو تو ''جنگ بندی'' ہوئی ہے اور دن چڑھتے ہی ختم بھی ہو گئی ہے۔''

''لگتا ہے کوئی فاؤل کھیل رہا ہے۔'' انیق نے کہا۔

''ایسا فاؤل تو کبڈی میں بھی برداشت نہیں ہوتا۔ یہ تو سچی مچی کی جنگ ہے۔'' سیف نے کہا اور اس کا پنجابی خون جوش مار کر اس کے چہرے کو سرخ کرنے لگا۔

بمشکل دو منٹ بعد یہ فائرنگ رک گئی مگر اس مختصر فائرنگ نے اس خوشگوار خیال کو چکنا چُور کر دیا کہ اگلے دو تین روز عافیت سے گزریں گے۔ گولا باری کا آغاز گرے فورس کی طرف سے ہی ہوا تھا۔ کیا وہ کسی طرح کا دباؤ ڈالنا چاہتے تھے یا یہ بتانا چاہتے تھے کہ وہ بڑے حملے کو

زیادہ دیر تک ملتوی نہیں رکھیں گے۔ڈی پیلس کے اہم مقامات پر امریکن قیدیوں کو باندھ دیا گیا تھا، اس کے باوجود گرے فورس اور ایجنسی کی گولا باری دیدہ دلیری کے زمرے میں ہی آتی تھی۔

اچانک کمانڈر فارس دوڑتا ہوا ہم تک پہنچا۔وہ مجھے ایک طرف لے جا کر بولا۔''برادر شاہ زیب! بہت گڑبڑ ہو گیا ہے۔قسطینا بی بی اور عزت مآب میں جھگڑا ہونے والا ہے اگر آپ اس جھگڑے کو روکنے کے لیے کچھ کر سکتا ہے تو پلیز کرے۔''

''ہوا کیا ہے؟''

''عزت مآب کے حکم پر ان کے اسپیشل گارڈز نے ان امریکنوں کو کھولنا شروع کر دیا ہے، جن کو کل رات خاص جگہوں پر باندھا گیا تھا۔قسطینا بی بی بہت زیادہ طیش میں ہے، وہ اسپیشل گارڈز کو روکنے کے لیے جا رہا ہے۔وہاں ہنگامہ ہو سکتا ہے۔''

اطلاع تشویش ناک تھی۔میں اور انیق کمرے سے نکلے اور کمانڈر فارس جان کے پیچھے چلتے دوسری منزل کی سیڑھیوں تک پہنچے۔یہاں پر کل رات جن دو امریکنوں کو ستونوں کے ساتھ باندھا گیا تھا، وہ اب وہاں نہیں تھے۔یہ منظر کمانڈر فارس جان کی اطلاع کی تصدیق کر رہا تھا۔لگتا تھا کہ کئی جگہوں سے امریکنوں کو کھولا جا چکا ہے۔شاید ابھی تھوڑی دیر پہلے جو گولا باری کی گئی وہ بھی اسی بدلتی ہوئی صورتِ حال کا نتیجہ تھی۔

دوسری منزل سے ڈی پیلس کا عقبی احاطہ نظر آنے لگا۔ابھی تھوڑی دیر پہلے جو گولا باری کی گئی تھی اس میں دو تین گولے اس احاطے میں گرے تھے۔یہاں مجھے لکڑی کے کچھ ٹوٹے ہوئے تختے اور خون کے دھبے نظر آئے۔

فارس جان دانت پیس کر بولا۔''خو آپ نے دیکھا ان حرام زادوں کا کرتوت یہ لکڑی کا سارا ٹکڑا تابوتوں کا ہے۔یہاں دو شہیدوں کا نماز جنازہ ادا کیا جا رہا تھا۔شہیدوں کی میتوں کو بھی شہید کر دیا گیا ہے۔کم از کم آٹھ بندوں کا جان گیا ہے۔زخمی ہونے والا بھی کافی (کافی) ہے۔''

ہم چند قدم آگے گئے تو بڑے کوریڈور سے قسطینا برآمد ہوئی۔وہ یونیفارم میں تھی ہولسٹر اس کی پتلی کمر سے ہچکولے کھا رہا تھا۔اس کے دائیں بائیں اور عقب میں اس کے حفاظتی دستے کے چوکس رائفل مین تھے۔وہ تمتمائے چہرے کے ساتھ لمبے ڈگ بھرتی ہوئی سامنے والے ٹیرس کی طرف جا رہی تھی۔ہم بھی اس کے ساتھ ہو لیے۔ٹیرس میں پہنچے تو وہاں بھی ہلچل نظر آئی۔میں نے دیکھا۔عزت مآب کے اسپیشل گارڈز یہاں کثیر تعداد میں موجود تھے۔

وہ ٹیرس کے آہنی جنگلے سے بندھے ہوئے امریکن قیدیوں کو کھول رہے تھے۔ سرخ ٹماٹر سے چہرے والا ایک فربہ اندام امریکی جو صورت سے ہی کسی بڑے ہوٹل یا نائٹ کلب کا مالک نظر آتا تھا، بلند آواز سے کچھ بول رہا تھا۔ دو اسپیشل گارڈز اس کے پاؤں کی رسیاں کھولنے کے لیے نیچے جھکے ہوئے تھے۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' قسطینا چلائی

اسپیشل گارڈز قسطینا کو دیکھ کر ٹھٹکے اور سیدھے کھڑے ہو گئے۔ ''یہ کیا کر رہے ہو تم لوگ؟'' قسطینا نے دوبارہ دہاڑ کر پوچھا۔

''یہ عزت مآب کا حکم ہے۔ ہم حکم کی تعمیل کر رہے ہیں۔'' ایک گارڈ نے جواب دیا۔

''تم ان کو نہیں کھول سکتے۔ ان کو باندھنے کا فیصلہ باہمی مشورہ سے ہوا تھا، اب اگر ان کو کھولنا ہے تو بھی فیصلہ باہمی مشورے سے ہوگا۔''

''گستاخی معاف یور ہائی نس! ہمیں یہ کام ابھی کرنے کا حکم ہے۔'' گارڈ نے مستحکم لہجے میں کہا اور موٹے امریکی کے پاؤں کھولنے کے لیے دوبارہ جھک گیا۔

قسطینا نے ہولسٹر میں سے اپنا چمکدار ریوالور نکال لیا۔ ''میں کہتی ہوں پیچھے ہٹ جاؤ۔ میں شوٹ کر دوں گی۔''

اسی دوران میں اسپیشل گارڈز کے دستے کے عقب سے عزت مآب ریان فردوس نمودار ہوا۔ اس کے چہرے کے سرخ داغ طیش کے وقت گہرے سرخ بلکہ سیاہی مائل ہو جاتے تھے۔ یوں لگتا تھا چہرے پر سیاہی کے دھبے ہوں۔ وہ اپنے فربہ جسم کو جھلاتا تیزی سے آگے آیا۔ خونی نظروں سے قسطینا کو دیکھا اور ملائی زبان میں بولا۔ ''یہ میرا حکم ہے۔ تم چلاؤ گولی، میں خود ان کو کھولوں گا۔''

وہ رکوع کے بل جھکا اور اس نے خود اپنے ہاتھوں سے ایک تیز دھار خنجر کو حرکت دے کر امریکی کی مشکیں کاٹ دیں۔ امریکی کو اسپیشل گارڈ نے اپنی حفاظت میں لے لیا۔ قسطینا غصے سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ ریان فردوس پھنکارا۔ ''چلا سکتی ہو تو چلاؤ گولی، مار سکتی ہو تو مار دو مجھے۔ میرا کوئی گارڈ تمہیں نہیں روکے گا۔''

تب وہ چند میٹر کے فاصلے پر ایک اور امریکی کی طرف بڑھا۔ یہ بھی کوئی جواں سال بزنس مین ہی لگتا تھا۔ اسے بھی کھڑی حالت میں جنگلے کے ساتھ باندھا گیا تھا اور اس کا رخ ڈی پیلس کی فصیل نما دیوار کی طرف تھا۔ قسطینا نے اپنے طیش کو حتی الامکان ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ''عزت مآب! آپ ایسا نہیں کر سکتے۔ یہ لوگ ہمارے اور ہمارے بچوں کے ٹکڑے کر ڈالیں گے۔''

ریان فردوس گرجا۔ ''اگر وہ ٹکڑے کرنے پر آہی گئے تو پھر ایسے بھی کسی کو نہیں چھوڑیں گے۔ تم...... تم کل کی بچی ہو...... اتنی ہی بات کرو جتنی تمہاری حیثیت اور تمہاری عقل ہے۔ یہ تمہاری بھول ہے کہ ان امریکنوں کو یہاں وہاں باندھ کر ہم ان لوگوں کو حملے سے روک سکتے ہیں۔ یہ حملہ تو پھر بھی ہوگا اور زیادہ خوفناک ہوگا۔''

مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میں بول پڑا۔ ''عزت مآب! اپنی حیثیت سے بڑھ کر بول رہا ہوں۔ مجھے معاف کیا جائے لیکن جہاں تک تم مجھ ناچیز کا تجربہ ہے، ان امریکنوں کی ایک جان، ہم لوگوں کی سو جانوں سے زیادہ ''قیمتی'' ہوتی ہے۔ یہ اپنے ایک ہم وطن کو بچانے کے لیے درجنوں غیر امریکیوں کو قتل کر سکتے ہیں اور اپنی ایک جان کی حفاظت کی خاطر لاکھوں ڈالر کا گولا بارود برباد کر سکتے ہیں۔ اگر ان کے سامنے ڈیڑھ سو امریکنوں کی زندگی موت کا سوال ہوگا تو یہ کبھی حملہ نہیں کریں گے۔'' میری بات کو مترجم نے ریان فردوس تک پہنچایا۔

''تم بکواس کرتے ہو۔'' ریان فردوس گرجا۔ ''ان کا حملہ اب ہو کر رہنا ہے اور گر اس حملے میں ان امریکنوں کا نقصان بھی ہو گیا تو وہ قتلِ عام کر دیں گے اور قیدیوں کو اس طرح باندھنا اور انسانی ڈھال بنانا جنگی جرم بھی ہے......''

قسطینا نے چیخ کر کہا۔ ''اور کیا وہ کوئی جنگی جرم نہیں کر رہے ہے۔ اب تک درجنوں جرم کیے ہیں انہوں نے۔ جان بوجھ کر معصوم بچوں کو مارا ہے، دہشت پھیلانے کے لیے عورتوں کا ریپ کر رہے ہیں اور اب یہ تازہ ترین کارنامہ بھی آپ نے دیکھ لیا ہوگا۔ فائر بندی کے ٹکڑے کر کے جنازوں پر گولا باری کی ہے۔ بات صرف اتنی ہے عزت مآب کہ...... آپ خوف زدہ ہیں۔ آپ...... ہر قیمت پر جنگ سے بچنا چاہتے ہیں اور قیمت بہت بڑی ہے۔ آپ صرف اپنی جان بچانے کے لیے جاماجی کے ہزاروں لوگوں کو بدترین موت کے حوالے کر دیں گے۔''

''گستاخ...... بے شرم...... اپنی زبان بند کر۔ تُو مجھے سب کے سامنے بزدل کہہ رہی ہے اور اگر کوئی اس سے بڑی گالی ہے تو وہ بھی دے لے مجھے...... آج جتنی بھی بھڑاس تیرے دل میں ہے نکال لے...... بلکہ...... بہتر یہ ہے کہ تُو مجھے گولی ہی مار دے۔ یہ لے پکڑ...... یہ لے پکڑ...... یہ میرے ہی پستول سے مار دے مجھے۔''

ریان فردوس نے اپنا طلائی دستے والا پستول زبردستی قسطینا کے ہاتھ میں تھمانے کی کوشش کی۔ ساتھ ساتھ وہ مسلسل آگ اگل رہا تھا۔ پستول نیچے گر پڑا۔ جسے ریان فردوس کے باڈی گارڈز نے اٹھا لیا۔

ریان فردوس بپھرا ہوا دوسرے امریکن قیدی کی طرف بڑھا اور اپنے ہاتھ سے اس کی بندش کاٹنے لگا۔ سب سکتہ زدہ کھڑے تھے۔ قسطینا سمیت کسی میں بھی اتنی ہمت نہیں تھی کہ ریان فردوس کو اس عمل سے روک سکتا۔ تب وہ تیسرے قیدی کی طرف بڑھا۔ میں نے دیکھا قسطینا غم و غصے کے سبب تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ پھر وہ تیزی سے مڑی اور لمبے ڈگ بھرتی سیڑھیوں کی طرف چلی گئی۔ اس کے ذاتی دستے کے درجنوں مسلح گارڈز اس کے عقب میں تھے۔ کمانڈر فارس جان اور چند دیگر کمانڈر بھی اس کے ساتھ تھے۔

○......❖......○

بہت سے اہم افراد کا خیال تھا کہ ریان فردوس جو کچھ کر رہا ہے غلط ہے، لیکن کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ ریان فردوس کو روک سکتا۔ قسطینا، بیگم نورل، ابراہیم سب اپنی اپنی جگہ پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ سپاہیوں اور لشکریوں میں اب بھی بے شمار لوگ ایسے تھے جو بند آنکھوں سے ریان فردوس کی اطاعت کرنا اپنا فرضِ منصبی سمجھتے تھے...... کیونکہ وہ ان کا آقا و مالک تھا۔ اس صورت میں خدشہ تھا کہ دو دھڑے بن جاتے اور ان میں باہمی تصادم ہو جاتا۔ دو تین دن میں ہی صورتِ حال کیا سے کیا ہو گئی تھی۔ قسطینا اور اس کی ہائی کمان نے نیوسٹی پر ایک زوردار حملے کا پروگرام بنایا تھا۔ اس مشن کو ''درخت کاٹنے'' کا کوڈ ورڈ دیا گیا تھا۔ درخت تو نہیں کٹے تھے الٹا انسانوں کی فصل کٹنا شروع ہو گئی تھی اور اس میں بڑا کردار آقا جان کی غداری کا تھا۔ کسی وقت ذہن میں یہ سوال بھی ابھرتا تھا کہ اگر آقا جان، رائے زل وغیرہ سے ملا ہوا تھا تو اس نے برج کلب پر فضائی حملہ کرانے میں ہماری مدد کیوں کی؟ اس کا جواب یہ تھا کہ وہ کبھی کبھی وکٹ کے دونوں جانب کھیلتا تھا۔ اس کا اصل مقصد تو یہی تھا کہ زیادہ سے زیادہ بدامنی پھیلے اور اسے اپنے مذموم مقاصد پورا کرنے کا موقع ملے۔

یہ دوپہر کا وقت تھا۔ چمکیلی دھوپ نکلی ہوئی تھی مگر ڈی پیلس پر بے یقینی اور خوف کے گہرے سائے تھے۔ پتا چل رہا تھا کہ رائے زل کی والدہ ہانا وانی گرے فورس کے ساتھ ہے اور اس کے حوالے سے ڈی پیلس میں پُراسرار افواہیں گردش کر رہی ہیں۔ لشکریوں میں عجیب سی مایوسی اور دہشت پھیلی ہوئی تھی۔ دوسری طرف حملہ آوروں کا زور بڑھتا جا رہا تھا۔ انہوں نے ڈی پیلس کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا اور یوں لگتا تھا کہ ایک ایک انچ پر توپیں اور ایم آر ایل نصب کر دیئے گئے ہیں۔ گرے فورس کے ہیلی کاپٹرز آزادانہ ڈی پیلس پر پروازیں کر رہے تھے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے انیق جوسن گن لے کر آیا تھا اس سے پتا چلا تھا کہ ریان

فردوس اب براہِ راست رائے زل اور ایجنسی والوں سے مذاکرات کر رہا ہے۔ ریان فردوس کا بڑا بیٹا کمال احمد بھی کسی حد تک اپنے والد اور والد کے ہمنواؤں کا ساتھ دے رہا تھا۔

اسی دوران میں مجھے کمانڈر فارس تیز قدموں سے اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ اس کے چہرے پر تلاطم تھا۔ مجھے ایک طرف لے جا کر بولا۔ ''برادر شاہ زیب! ام کو لگتا ہے کہ قسطینا بی بی بہت زیادہ پریشان ہے۔ اس نے پچھلے دو گھنٹے سے خود کو کمرے میں بند کیا ہوا ہے۔ کوئی پون (فون) سن رہا ہے، نہ دروازہ کھول رہا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اب تو موبائل فون بھی کھل گئے ہیں۔ اس کے ذاتی نمبر پر رابطہ کرو۔''

''کیا ہے جی۔ وہ بند کر دیتا ہے۔ امارا خیال ہے کہ آپ اس کو سمجھانے اور تسلی دینے کا کوشش کر سکتا ہے۔ آپ امارے ساتھ چلے تو شاید کچھ بہتر ہو جائے۔''

سیف اپنی دیسی خوراک ڈھونڈنے نکلا ہوا تھا۔ وہ ہر حال میں خوش رہنے والا بندہ تھا۔ تاہم انیق کل سے بجھا بجھا نظر آتا تھا۔ اس کی بڑی وجہ خانساماں ازمیر طیب کی موت تھی۔ ازمیر طیب اس کا گہرا دوست بن چکا تھا۔ میں نے انیق کو صورتِ حال سے آگاہ کیا اور کمانڈر فارس جان کے ساتھ قسطینا کی طرف چل دیا۔

قریباً دس منٹ بعد میں قسطینا کے سامنے اس کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ اس نے بمشکل دروازہ کھولا تھا اور اب بھی سخت مضطرب نظر آ رہی تھی۔ وہ جین اور جرسی میں تھی۔ دونوں ہاتھ پشت پر باندھے بے چینی سے کمرے میں چکرا رہی تھی۔ آنکھیں سرخ انگارہ تھیں۔

میں نے کہا۔ ''قسطین! آپ نے ناشتا بھی نہیں کیا، کچھ کھا پی لیں۔''

''میرے خیال میں زہر ہی کھا لیا جائے۔'' وہ عجیب دکھی لہجے میں بولی۔

''آپ اتنی مایوس کیوں ہو رہی ہیں۔ جنگ میں کئی موقعے ایسے آتے ہیں جب پیچھے ہٹنا پڑتا ہے۔ یہ شکست نہیں ہوتی، وقت کا تقاضا ہوتا ہے۔''

''اس سے پیچھے اور کیا ہٹیں گے ہم؟'' وہ تڑخ کر بولی۔ ''وہ ہمارے گھر میں گھسنے والے ہیں، ہمیں برباد کرنے والے ہیں۔''

''ہم کو حقیقت سے آنکھ نہیں چرانی چاہیے قسطینا۔ ہماری فورس کے پاس ایمونیشن نہ ہونے کے برابر ہے۔ کمانڈر اوان اپنے ساتھیوں کے ساتھ علیحدہ ہو چکا ہے۔ آقا جان اور حلمی وغیرہ ایجنسی کی گود میں جا بیٹھے ہیں۔ لشکریوں کی بڑی تعداد میں خوف پایا جا رہا ہے۔ ایسی صورت میں لڑائی کتنی دیر جاری رکھی جا سکتی ہے؟''

وہ طیش میں بولی۔ ''اگر یہ سب کچھ ہی کرنا تھا تو اس وقت کیوں نہ کر لیا گیا جب ابھی

یہاں لاشیں گرنا شروع نہیں ہوئی تھیں۔ میرے والد ابھی زندہ تھے۔ سیکڑوں بے گناہ سانس لے رہے تھے۔ جب یہاں قربانیاں دی جا رہی تھیں اس وقت...... یہ شخص پاکستان میں چھپ کر بیٹھا تھا۔ آج جو کچھ یہاں ہو رہا ہے یہ اسی شخص کی کم ہمتی اور بزدلی کا نتیجہ ہے۔''

میں نے کہا۔'' آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں قسطینا...... مگر ہمیں دوسرے پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ اب یہاں جو صورتِ حال بنی ہوئی ہے، اس میں غداری کا بھی بہت عمل دخل ہے۔ اب اگر گرین فورس کے پاس ایمونیشن نہیں تو اس کی بڑی وجہ آقا جان اور حلمی کی غداری ہے۔''

'' تو کیا اب یہ غدار نقصان نہیں پہنچائیں گے؟ تمہارا کیا خیال ہے اگر کسی معاہدے کے ساتھ رائے زل ڈی پیلس میں داخل ہو گیا تو، آقا جان جیسے لوگ ہمیں معاف کریں گے؟ وہ چن چن کر ان لوگوں کو ماریں گے جن سے نفرت کرتے ہیں۔''

'' آپ ایک مفروضے پر بات کر رہی ہیں قسطینا! ابھی ہمیں حالات کا رخ دیکھنا چاہیے اور اپنے آپ کو لڑائی کے لیے پوری طرح تیار رکھنا چاہیے۔ سیکڑوں نہیں ہزاروں لوگ ہیں جو آپ کے ایک اشارے پر کٹ مرنے کے لیے تیار ہیں۔''

'' لیکن میں کیوں کسی کو کٹ مرنے کا کہوں۔ میں نہیں کہوں گی۔ بالکل نہیں کہوں گی۔'' وہ چلا کر بولی اور اس کی شفاف گردن کی رگیں پھول گئیں۔'' میں باز آئی ایسی کمانڈری سے، میں باز آئی ایسی لڑائی سے۔ میں لعنت بھیجتی ہوں۔''

اس نے ایک چرمی غلاف کے اندر سے تیز دھار آرمی ڈیگر نکالا اور اپنی گرین یونیفارم کی طرف لپکی۔ یہ یونیفارم قریب ہی اپنے تمغوں سمیت ایک ہینگر پر جھول رہی تھی۔ اس نے وحشت کے عالم میں یونیفارم پر خنجر کے پے در پے وار کرنے شروع کر دیئے اور اسے پھاڑ کر رکھ دیا۔

میں اسے سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ چلا رہی تھی۔'' مجھے نہیں چاہیے یہ وردی۔ یہ کچھ نہیں کر سکی۔ کچھ نہیں کر سکی اور تو اور میرے ڈیڈ کی موت کا بدلہ تک نہیں لے سکی۔'' وہ جیسے دیوانی سی ہو رہی تھی۔

میں نے اسے اپنے بازو کے حلقے میں لینا چاہا۔ وہ مزاحمت کر رہی تھی لیکن پھر میرے زخمی بازو کو دیکھ کر وہ ایک دم نڈھال سی ہو گئی۔ اس نے اپنا سر میرے سینے پر ڈال دیا اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ میں اسے اپنے ساتھ لگائے لگائے صوفے پر بیٹھ گیا۔ رائے زل کی گرے فورس کے دو گن شپ ہیلی کاپٹر بہت نیچی پرواز کرتے ہوئے ڈی پیلس کے اوپر سے

گزرے۔ پروں کی پھڑ پھڑاہٹ جیسے فرشتہ اجل کے پروں سے مشابہ تھی۔ میں نے اس کا کندھا سہلاتے ہوئے کہا۔ ''قسطینا، آپ کو اس طرح ہمت نہیں ہارنی چاہیے۔ ہر مشکل کے بعد آسانی کا امکان ہوتا ہے۔ یہ ادیب اور شاعر لوگ جو یہ بات کہتے ہیں کہ رات جتنی اندھیری ہوتی ہے صبح اتنی ہی قریب ہوتی ہے، کچھ غلط نہیں کہتے۔ ہارتا تو دراصل وہی ہے، جو امید کا دامن چھوڑتا ہے۔ میں نے اتنے وسیع پیمانے پر ہونے والی لڑائی میں تو کبھی حصہ نہیں لیا مگر Ring کے اندر کئی بڑے مشکل مرحلوں سے گزرا ہوں اور میں نے سیکھا ہے کہ جہاں بندے کی ہمت جواب دینے والی ہوتی ہے وہاں اکثر کامیابی آس پاس ہی کھڑی ہوتی ہے۔''

وہ جیسے کراہ کر بولی۔ ''اب میں کیا ہمت کروں؟ جاماجی کا اصل مالک اور مختار تو وہی بندہ ہے نا، جو اپنے ہاتھوں سے امریکنوں کی رسیاں کھول رہا ہے اور ان رسیوں سے ہم سب کے لیے موت کا پھندا تیار کر رہا ہے۔ کاش ہم اس عمل کو روک سکتے ...... مجھے لگتا ہے ہمارے بہت سے شہیدوں کو روحیں تڑپ اٹھی ہوں گی اور ان میں میرے پیارے والد کی روح بھی ہو گی۔ وہ ہر رات میری آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ مجھ سے پوچھتے ہیں۔ قسطینا! میرے قاتل کا کیا ہوا؟ اس شخص کا کیا ہوا جس نے میرا خون بہانے کے بعد جشن منایا تھا اور مٹھائیاں تقسیم کی تھیں۔''

وہ بولتی جا رہی تھی اور سسک رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے رسنے والی نمی میری قمیص میں سرائیت کر رہی تھی۔ آج پہلی بار مجھے محسوس ہوا کہ بہت بہادر اور عالی دماغ ہونے کے باوجود وہ ایک لڑکی بھی ہے۔ جو غم اور مایوسی کے گھیرے میں آ کر ٹوٹ سکتی ہے۔ اس کے آنسو چھلک سکتے ہیں۔ پچھلے چند دنوں میں جو پے در پے صدمات اور مایوسیاں اسے سہنا پڑی تھیں، انہوں نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

میں اس کے بالوں میں انگلیاں چلانے لگا اور نہایت ہمدردی کے ساتھ اس کی دلجوئی کی کوشش کرنے لگا۔ جس فوجی خنجر سے اس نے اپنی یونیفارم کے ٹکڑے ٹکڑے کیے تھے وہ ابھی تک اس کے ہاتھ میں دبا تھا۔ وہ جیسے بھول ہی چکی تھی کہ خنجر اس کے ہاتھ میں ہے میں نے آہستگی سے اس کی انگلیاں کھولیں اور نکیلا خنجر اس کے ہاتھ سے چھڑایا۔

وہ مجھ سے علیحدہ ہو گئی۔ اس نے طیش کے عالم میں اپنے آنسو پونچھے۔ میں نے اس کے لیے ایک سافٹ ڈرنک بنایا اور گلاس اس کی جانب بڑھایا۔ اس نے بیزاری کے عالم میں گلاس مجھ سے لے کر ایک طرف رکھ دیا۔

کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ انسان کے ذہن میں کوئی سوال ابھرتا ہے اور اس کا جواب بھی

تھوڑی ہی دیر میں اس کے سامنے آجاتا ہے۔ ابھی مجھے قسطینا سے باتیں کرتے پانچ دس منٹ ہی ہوئے تھے کہ میرے سیل فون پر کال کے سگنل آئے۔ یہ انیق کی کال تھی۔ میں نے کال ریسیو کی وہ بولا۔ ''شاہ زیب بھائی! بری خبروں کے درمیان آپ کے لیے ایک اچھی خبر...... یا شاید یوں کہنا چاہیے کہ قسطینا صاحبہ کے لیے ایک اچھی خبر۔''

''سسپنس نہ بڑھاؤ، بات کرو۔''

''سسپنس ہی تو اسٹوری کی جان ہوتا ہے جناب، فلم کا سسپنس ہی ہوتا ہے جو فلم بین کو آخری سین تک سنیما ہاؤس میں بٹھائے رکھتا ہے۔''

''مگر سسپنس بوگس ہو تو کچھ فلم بین کرسیاں بھی توڑ دیتے ہیں۔ اس نسبت سے تمہارے سر کی شامت بھی آسکتی ہے۔''

''میں جانتا ہوں جناب! آج کل آپ بہت سیریس موڈ میں ہیں۔ لہٰذا کوئی بوگس سسپنس پیش کر کے اپنی شامتِ اعمال کو دعوت نہیں دوں گا۔''

''اب بک بھی چکو۔''

''مصدقہ اطلاع یہ ہے کہ ایجنسی کا چیف گیرٹ جو برج کلب کے فضائی حملے میں شدید زخمی ہوا تھا، چل بسا ہے۔''

میری رگوں میں خون سنسنا اٹھا۔ یہ قسطینا کے دشمن نمبر ایک کی بات ہو رہی تھی۔ یہی شخص تھا جسے قسطینا اپنے والد کی موت کا ذمے دار سمجھتی تھی۔

میں نے اپنے اندرونی جذبات کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں کیسے پتا چلا ہے؟ ہوسکتا ہے کہ یہ کوئی افواہ ہو؟''

''افواہ ہوتی تو میں آپ کا قیمتی وقت ضائع نہ کرتا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے پاسبان بریگیڈ کے ایک اہم ترین جاسوس نے بھی اپنے خفیہ پیغام کے ذریعے اس خبر کی تصدیق کر دی ہے۔ پتا چلا ہے کہ کل رات چیف گیرٹ کی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی تھی۔ آج اسے ایک اسپیشل طیارے کے ذریعے امریکا روانہ کیا جانے والا تھا پھر ڈاکٹروں نے کہا کہ اس کی حالت سفر کے قابل نہیں۔ سب تیاری مکمل تھی مگر ابھی کوئی ایک گھنٹا پہلے وہ آنجہانی ہوگیا۔''

انیق سے بات ختم کرتے ہی میں نے قسطینا سے کہا۔ ''بری خبروں کے درمیان ایک اچھی خبر...... ذرا دل تھام کر سنیں۔'' وہ پوری طرح میری طرف متوجہ ہوگئی۔ میں نے کہا۔ ''گیرٹ آج نیوسٹی کے فوجی اسپتال میں دم توڑ گیا ہے۔ ابھی کوئی ایک گھنٹا پہلے اس نے آخری سانس لی ہے۔''

میں نے دیکھا قسطینا کے بجھے ہوئے چہرے پر روشنی پھیلی اور اس نے کئی رنگ بدلے۔
''مجھے یقین نہیں آرہا شاہ زائب!'' وہ لرزاں آواز میں بولی۔
یہی وقت تھا جب قسطینا کے سیل فون اور لینڈ لائن فون کی گھنٹیاں ایک ساتھ بجنے لگیں۔ اس نے لپک کر لینڈ لائن فون ریسیو کیا۔ دوسری طرف سے ملنے والی اطلاع کو اس نے بڑے غور سے سنا۔ اس کے چہرے کا رنگ بدلتا چلا گیا۔ پھر اس نے سیل فون کی کال سنی۔ یہ کال کمانڈر فارس جان کی طرف سے تھی۔ اس کال کا موضوع بھی چیف گیرٹ کی موت ہی تھی۔

''میں مزید تفصیل جاننا چاہوں گی، فوراً...... اور اگر کوئی تصویر وغیرہ بھی ہو سکے تو مہیا کرو۔'' قسطینا نے کمانڈر فارس سے کہا۔ خوشی کے مارے اس کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔

کمانڈر فارس جان سے بات ختم کر کے اس نے میری طرف دیکھا۔ اب پھر اس کی خوب صورت آنکھوں میں آنسو تھے، لیکن اب یہ خوشی کے تھے۔ وہ بے حد جذباتی انداز میں بولی۔ ''شاہ زائب تم نے مجھے بہت اچھی خبر سنائی۔ جی چاہتا ہے تمہارا منہ موتیوں سے بھر دوں۔''

پھر وہ بھاگ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ مجھے آگے پیچھے جھلاتی ہوئی، پُر جوش لہجے میں بولی۔
''میں سمجھتی ہوں، برج کلب پر ہمارا حملہ آج کامیاب ہوا ہے۔ اس حملے نے اپنا مقصد...... اپنا اصل مقصد آج حاصل کیا ہے۔ آج اس موذی درندے کی زندگی ختم ہو گئی ہے جس نے میرے ڈیڈ کی جان لی اور اس کے ساتھ ساتھ بے شمار پُرامن اور بے گناہ لوگوں کو خون میں نہلایا۔''

مجھ سے علیحدہ ہو کر وہ ایک بار پھر اپنے سیل فون پر چھبٹی گیرٹ کی موت کے بارے میں مزید تفصیلات حاصل کرنے لگی۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ ایجنسی کے اس اہم ترین شخص کی موت کی خبر تیزی سے پھیل گئی ہے۔ بے شک اس خبر سے، جنگ کی موجودہ صورتِ حال پر تو کوئی فرق نہیں پڑنا تھا مگر یہ خبر بہت سے لوگوں کے لیے سکون کا باعث ضرور تھی۔ میں نے کہا۔
''قسطینا! دیکھو ابھی تھوڑی دیر پہلے ہم یہی بات کر رہے تھے نا، کہ خوشی سے غم کے اور غم سے خوشی کے اسباب نکل آتے ہیں۔ گھپ اندھیرے میں بھی روشنی کی کوئی نہ کوئی کرن ضرور چھپی ہوتی ہے۔''
وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر کھڑی تھی۔ ''ہاں، شاہ زائب! یہ خبر واقعی مایوسی کے

سمندر میں خوشی کا ایک جزیرہ ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ قدرت نے میرے کندھوں پر سے ایک بڑا بوجھ ہٹا دیا ہے۔ بے شک ابھی باقی کے حالات جوں کے توں ہیں مگر میں ذاتی طور پر خود کو ایک بہتر کیفیت میں محسوس کر رہی ہوں۔"

میں نے اس کا موڈ مزید بہتر کرنے کے لیے مسکرا کر کہا۔ "یاد رکھیے، آپ نے میرا منہ موتیوں سے بھرنے کا وعدہ کیا ہے۔"

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ان لمحوں میں وہ جنگجو قسطینا نہیں، ایک الھڑ لڑکی نظر آئی۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی شوخی ابھری۔ اس نے اپنے بوائے کٹ بالوں کو پیشانی سے ہٹایا اور آگے بڑھ کر مجھے چوم لیا۔

"زبردست۔" میں نے اس کی ادا کو سراہا۔

اس کے چہرے پر شفق کا رنگ لہرایا۔ مگر پھر فوراً ہی وہ سنجیدہ دکھائی دینے لگی۔ اس نے الماری کی طرف جا کر اپنا آفس بیگ نکالا۔ اس میں سے اپنے والد "آدم محترم" کی فریم شدہ تصویر نکالی۔ کھوئے کھوئے انداز میں اس پر ہاتھ پھیرا اور پھر اسے بوسہ دیا۔ "پیارے ڈیڈ! وہ شخص آج اس دنیا میں نہیں رہا جس نے آپ کی موت پر جشن منایا تھا۔ جاماجی کی زمین آج اس کے بوجھ سے آزاد ہے۔"

اس نے تصویر کو دوبارہ بوسہ دیا اور اپنے آفس بیگ میں واپس رکھ دیا۔

☆☆☆

اگلا دن بڑا ہنگامہ خیز تھا۔ نو دس بجے تک تو خوف و ہراس کی فضا موجود رہی۔ وہ ہزاروں شہری بھی سہمے رہے جنھوں نے ڈی پیلس کی وسیع و عریض چار دیواری میں پناہ لے رکھی تھی مگر پھر اچانک یہ خبر پھیلی کہ عزت مآب اور رائے زل میں ہونے والے مذاکرات ایجنسی کی مدد سے کامیاب ہو گئے ہیں اور فوری لڑائی کا خطرہ ٹل گیا ہے۔

کچھ دیر بعد مجھے کمانڈر فارس جان کی شکل نظر آئی۔ آج میں پہلی بار اسے جنگی لباس کے بغیر دیکھ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ قسطینا، میجر وارث اور کچھ دیگر کمانڈرز کی طرح وہ بھی موجودہ صورتِ حال سے لاتعلق ہو گیا ہے۔ اس نے کہا۔ "شاہ زیب بھائی! جو کچھ ہو رہا ہے، ام کو اس کا بالکل توقع نہیں تھا۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ام نے اب تک جو بھی قربانیاں دیا وہ سب بیکار ہو گیا۔"

"لیکن یہ بھی تو پتا چلے کہ معاہدہ کیا ہوا ہے؟"

"جو کچھ ام کو معلوم ہوا ہے اس کے مطابق تو ام نے ایک طرح سے ہتھیار ڈال دیا

ہے۔ رائے زل اور ایجنسی کا لوگ دندناتا ہوا ڈی پیلس میں داخل ہو جائے گا۔''

''لیکن کچھ شرطوں کی بات بھی تو کی جارہی ہے۔''

''شرطوں کا بات یہ ہے کہ رائے زل اور ایجنسی کا لوگ ڈی پیلس میں داخل تو ہوگا مگر دو دن بعد یہاں سے واپس چلا جائے گا۔ اس دوران میں معاہدے کی کاغذی کارروائی مکمل کرلیا جائے گا۔ دو دن بعد ڈی پیلس کے علاوہ جاماجی کا علاقہ بھی خالی کر دیا جائے گا۔ دوسری شرط کے مطابق جزیرے کا نیا سرحد مقرر کیا جائے گا۔ اس سرحد کے مطابق آدھا علاقہ رائے زل کے پاس جائے گا اور آدھا عزت مآب اور اس کے دونوں بیٹوں کے پاس رہے گا، وہ اپنے علاقے میں خودمختار ہوں گے تیسری شرط یہ ہے کہ آئندہ کم ازکم پندرہ سال کے لیے کسی طرح کا کوئی بھی لڑائی نہیں کیا جائے گا اور دونوں پریق (فریق) ایک دوسرے کی ملکیت کا احترام کرے گا۔ اس کے علاوہ دونوں طرپ کے قیدیوں کے لیے بھی کچھ باتیں طے کیا گیا ہے۔''

''آقا جان اور حلمی وغیرہ کے بارے میں کیا پتا چلا؟'' میں نے پوچھا۔

''کہا تو یہ جارہا ہے کہ یہ معاہدہ کرانے میں اصل کردار آقا جان کا ہی ہے۔ آقا جان ہی دونوں پریقوں کو مذاکرات کی میز تک لایا ہے۔ معاہدے کی ایک شق کے مطابق آقا جان صیب کو ڈی پیلس میں کوئی نہایت اہم عہدہ بھی دیا جارہا ہے۔''

میری نگاہوں میں چند دن پہلے کا وہ منظر گھوم گیا جب جاں بلب جاناں مجھے اپنی حاصل کردہ معلومات سے آگاہ کررہی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ آقا جان اور اس کے دوست اس بات پر مٹھائی تقسیم کررہے تھے کہ آقا جان کو کوئی نہایت اہم مرتبہ حاصل ہونے والا ہے۔

میں نے کہا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے کہ فارس جان! یہاں دھوکا تو نہیں ہورہا؟ میرا مطلب ہے ڈی پیلس میں گھسنے کے بعد رائے زل اور اس کی ماں یہاں سے نکل جائیں گے؟''

''کچھ کہا نہیں جاسکتا۔'' فارس جان ذرا الجھن سے بولا۔ ''لیکن بتایا جارہا ہے کہ اس وقت زبردست دوستانہ ماحول پیدا ہوگیا ہے۔ ہاناوانی نے اپنے سابق شوہر عزت مآب سے پون پر براہِ راست بات کی ہے اور اسے یقین دلایا ہے کہ معاہدے کی ایک ایک شرط کا پاسداری کیا جائے گا۔ ہاناوانی نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ کسی ایک بے گناہ کا خون بھی اپنے سر لینا نہیں چاہتا۔ دوسری طرپ یہ بھی کہا جارہا ہے کہ کمال احمد اپنے سوتیلے بھائی رائے زل سے ملاقات کے لیے خود ڈی پیلس سے باہر گیا ہے۔ رائے زل نے کمال احمد کو چھوٹا بھائی

کہہ کر اسے گلے سے لگایا ہے...... اور رائے زل کے خاص دستے نے کمال احمد کو باقاعدہ سلامی پیش کی ہے۔''

''ایجنسی والے کیا کہتے ہیں؟ برج کلب پر فضائی حملے میں اُن کا نقصان ہی زیادہ ہوا تھا۔ چیف گیرٹ کی ہلاکت بھی اسی حملے کا نتیجہ ہے۔''

''لیکن اس وقت تو ایجنسی والا بھی خاصا ملائم نظر آتا ہے برادر۔ ان کے ایک کمانڈر نے کہا ہے کہ عزت مآب نے سیکڑوں امریکن قیدیوں کو موت سے بچایا ہے اور ان کو اپنی حفاظت میں رکھنے کے لیے اپنے کئی ساتھیوں کا مخالپت بھی مول لیا ہے۔''

دوپہر کے بعد مقامی ٹی وی پر ریان فردوس کی شکل نظر آئی۔ اس کے چربی دار چہرے سے اطمینان جھلک رہا تھا۔ اس کے تاثرات یہ بتا رہے تھے کہ وہ اپنی ملکیت اور خودمختاری بچ جانے کے حوالے سے مطمئن ہے۔ اس نے ملائی زبان میں خطاب کیا اور اپنے لوگوں کو معاہدے کی تفصیلات بتائیں۔

آخر میں اس نے کہا۔ ''اب گرے فورس اور ایجنسی والوں کی حیثیت ہمارے مہمانوں کی سی ہے۔ ان کے خلاف ڈی پیلس کے اندر یا باہر کسی طرح کی کوئی کارروائی نہیں ہونی چاہیے۔ بلکہ میں چاہتا ہوں کہ ہم ان کا اچھے طریقے سے استقبال کریں۔ بیشتر تنازعات ختم ہو چکے ہیں اور اب ہم امن اور صلح جوئی کے ایک نئے دور کا آغاز کرنے جا رہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ڈی پیلس کی طرح ڈی پیلس سے باہر بھی مہمانوں کا خوش دلی سے استقبال کیا جائے۔''

اس تقریر کے بعد میں کمرے سے باہر نکلا تو ڈی پیلس کی فضا مختلف نظر آئی۔ وہ لوگ جو پچھلے دو دن سے خود کو محاصرے میں سمجھ رہے تھے اور بدترین حالات سے ڈر رہے تھے اب اطمینان میں دکھائی دیتے تھے۔ کچھ جگہوں پر میں نے دیکھا کہ راستوں کی صفائی کی جا رہی ہے اور آرائشی لائٹس وغیرہ آویزاں اور نصب کی جا رہی ہیں۔ ایک جگہ تین لوڈرز کھڑے تھے اور یہ اوپر تک ڈینی فلاورز سے لدے ہوئے تھے۔ مستعد ملازمین ٹوکروں کے ذریعے یہ پھول لوڈر سے اتار کر اندر پہنچانے میں مصروف تھے۔ ڈی پیلس میں ہر طرف خوشی اور اطمینان کی لہر سی محسوس ہوتی تھی لیکن میں سوچ رہا تھا کہ رائے زل اور آقا جان وغیرہ کے یہاں آنے کے بعد میرا اور فارس جان جیسے لوگوں کا کیا بنے گا۔ دو دن پہلے جب ابھی بڑا حملہ نہیں ہوا تھا میں آقا جان کی حبسِ بے جا سے باقاعدہ فرار ہوا تھا اور اس فرار کے دوران میں آقا جان کے کئی اہلکار میری وجہ سے اپنی جان بھی ہار بیٹھے تھے۔

میں ڈی پیلس کے ایک وسیع برآمدے میں پہنچا تو یہاں بھی استقبال کی تیاریاں نظر آئیں۔ خدام اور خواجہ سرا محرابی دروازوں میں پھولوں کی سجاوٹ کررہے تھے...... اور ملائی زبان کے کچھ رنگین بینرز بھی یہاں وہاں آویزاں کیے جارہے تھے۔

میں نے ایک بات واضح طور پر محسوس کی۔ میں جدھر جاتا تھا لوگ مجھے اشتیاق سے دیکھتے تھے۔ اکثریت اب مجھے پہچاننے لگ گئی تھی اور ان کی آنکھوں میں میرے لیے احترام نظر آتا تھا۔ کئی چھوٹے بڑوں نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ ایک دو عمر رسیدہ افراد نے حوصلہ افزائی کے انداز میں میری پیٹھ تھپکی۔ وہ مجھ سے سوال بھی پوچھ رہے تھے۔ ایک صحافی ٹائپ لڑکی نے مجھ سے پوچھا۔ ''کیا آپ موجودہ صورتِ حال سے مطمئن ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''میں اس سوال کا جواب کیسے دے سکتا ہوں مجھے یہاں کے حالات کا زیادہ تجربہ نہیں۔ عزت مآب اور ان کے رفقا جو کررہے ہیں سوچ سمجھ کر ہی کررہے ہوں گے۔''

لڑکی نے پوچھا۔ ''آپ کا کیا خیال ہے، گرے فورس کے لوگ ڈی پیلس میں کب تک رہیں گے؟''

''کہا تو یہی جارہا ہے کہ زیادہ سے زیادہ تین دن۔ اور امید ہے کہ ایسا ہی ہوگا۔''

جدید لباس والی لڑکی سے میری یہ بات چیت انگلش میں ہورہی تھی وہ بولی۔ ''کچھ لوگ مادام ہاناوانی کی آمد سے خوف زدہ بھی ہیں۔ خاص طور سے مقامی لوگ اور رضا کار۔ ان کا خیال ہے کہ وہ پُراسرار قوتوں کی مالک ہیں۔ وہ یہاں آکر کچھ انوکھا کریں گی اور لوگ دل سے نہ چاہتے ہوئے بھی ان کے مطیع ہو جائیں گے۔ آج کے دور میں تو یہ سب باتیں عجیب ہی لگتی ہیں۔''

''میں ذاتی طور پر ان باتوں پر یقین نہیں رکھتا۔ بہر حال آپ ایسے سوال کسی مذہبی اسکالر یا سائیکاٹرسٹ سے پوچھیں۔''

میں وہاں سے کھسکنا چاہ رہا تھا مگر اسی دوران میں ایک اور خاتون تیزی سے میری طرف بڑھی۔ اس کے ہاتھ میں مائک تھا اور پہلو میں کیمرامین۔ اس نے آتے ہی سوال داغا۔ ''مسٹر شاہ زیب! لڑائی میں آپ ایک ہیرو کے طور پر ابھرے ہیں۔ آپ نے جس طرح ایک نہایت نازک موقع پر ہرہائی نس کی حفاظت کی...... اور اس سے پہلے ایمونیشن ڈپو کو مکمل تباہی سے بچایا، لوگ آپ کے گرویدہ ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے جو نیا معاہدہ ہوا ہے وہ کس حد تک ہمارے حق میں ہے؟''

میں نے کہا۔ ”پہلی بات تو یہ ہے کہ میں خود کو ہیرو سمجھنے کی غلطی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ایسے حالات میں اکثر ہیروز کو پھانسی چڑھتے ہوئے ہی دیکھا گیا ہے۔ میں ایک عام ایم ایم اے فائٹر ضرور ہوں...... حالات کے دھارے میں بہہ کر آپ لوگوں کے درمیان پہنچ گیا ہوں اور اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق حق کا ساتھ دینے کی ناچیز کوشش کر رہا ہوں......“

اس نے میری بات کاٹی۔ ”آپ ایم ایم اے کے عام فائٹر نہیں ہیں۔ اس دُور دراز جزیرے میں بھی بہت سے لوگ ایسے ہیں جو آپ کو ایک بڑے چمپئن کی حیثیت سے جانتے ہیں اور آپ کو یہاں اپنے درمیان پا کر بے حد حیران اور خوش ہیں۔ کہا جا رہا ہے کہ بڑے حملے سے پہلے آپ کو محترم آقا جان کے کچھ لوگوں نے ڈی پیلس سے اغوا کر کے نامعلوم جگہ پر پہنچایا تھا، جہاں آپ کو غالباً تشدد کا نشانہ بھی بنایا گیا۔ اب سننے میں آ رہا ہے کہ معاہدے کی رُو سے محترم آقا جان کو یہاں ایک نہایت اہم عہدہ دیا جا رہا ہے، آپ کیا سمجھتے ہیں کہ اس نئی صورتِ حال میں ہز ہائی نس قسطینا اور آپ جیسے دیگر لوگوں کے لیے مشکلات کھڑی نہیں ہوں گی؟“

”میرا خیال ہے کہ یہ سارے معاملات ہماری ہائی کمان کی نگاہوں سے بھی اوجھل نہیں ہیں۔ جب اس طرح کے معاہدے ہوتے ہیں تو ان میں یہ سارے پہلو مدِ نظر رکھ کر شرائط طے کی جاتی ہیں۔“

دینے کو تو میں نے صحافی خاتون کو جواب دے دیا تھا مگر یہ سوال میرے اپنے ذہن میں بھی پوری شدت سے موجود تھا۔ چند منٹ بعد دونوں فی میل صحافیوں سے جان چھڑا کر میں ڈی پیلس کے اس حصے میں پہنچا جہاں ابراہیم کی رہائش گاہ تھی۔ دربان سے معلوم ہوا کہ ہز ہائی نس چھوٹے صاحب یہیں پر ہیں۔ میں نے اپنے آنے کی اطلاع اندر پہنچائی۔ مختلف مراحل سے گزر کر میں ابراہیم کے رُو برو پہنچ گیا۔

وہ اب باقاعدہ اٹھ کر مجھ سے ہاتھ ملاتا تھا اور بات چیت میں اپنے شاہی تکلف کو بالائے طاق رکھ دیتا تھا۔ دیگر لوگوں کی طرح مجھے اس کے چہرے پر بھی اطمینان ہی نظر آیا۔ اس نے کہا۔ ”شاہ زیب بھائی! خدا کا شکر ہے کہ خونریزی کا خطرہ ٹل گیا ہے۔ معاہدے کے لیے دونوں طرف سے پیش رفت ہوئی ہے۔ اس میں کسی کی سبکی بھی نظر نہیں آ رہی۔“

”مگر ایک بات تو سوچنے کی ہے نا ابراہیم! آقا جان ہمارے دشمنوں کے کندھوں پر سوار ہو کر یہاں آ رہا ہے اور اب اس کی حیثیت اور طاقت میں بہت اضافہ ہو جائے گا کیا وہ......“

''آپ پریشان نہ ہوں۔'' ابراہیم نے میری بات کاٹی۔ ''ان سارے معاملات پر میں نے بھائی کمال احمد سے تفصیلی بات کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ معاہدے کی اہم ترین شقوں میں ایک یہ بھی ہے کہ سسٹر قسطینا، شہید افغانی کے بھائی رازی خاں، کمانڈر فارس جان، میجر وارث اور ایسے تمام اہم افراد اور ان کے ساتھیوں کو مکمل تحفظ دیا جائے گا۔''

''ایسی شرائط کا ضامن کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''دونوں طرف کے اہم ترین افراد...... اور اس کے ساتھ ساتھ ایجنسی...... ایجنسی والے عزت مآب کو بہت اہمیت دے رہے ہیں کہ انہوں نے لڑائی میں غیر جانبداری اختیار کی اور اس کے ساتھ ساتھ امریکی قیدیوں کی جان بچائی۔''

''لیکن میری معلومات کے مطابق، ایجنسی میں کئی بڑے خطرناک قسم کے آفیسر موجود ہیں۔ ان کا کینہ ابھر کر سامنے آسکتا ہے۔''

''میرا دل گواہی دیتا ہے شاہ زیب بھائی، ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ لیکن ہم مزید احتیاط یہ کریں گے کہ آپ...... آپ کے ساتھی اور دیگر ایسے افراد جن کو کسی طرح کا خطرہ ہوسکتا ہے اگلے 72 گھنٹے تک ایک ہی جگہ رہیں گے۔ پاسبان بریگیڈ کے جانباز آپ لوگوں کو اپنے حفاظتی دائرے میں رکھیں گے۔ 72 گھنٹے بعد ان لوگوں نے یہاں سے چلے جانا ہے۔ اس کے بعد ان شاء اللہ سب کچھ بڑی تیزی سے معمول پر آئے گا۔''

اسی دوران میں سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ یہ ابراہیم کا فون تھا اور بغلی کمرے میں پڑا تھا۔ وہ فون لینے کے لیے کمرے میں گیا۔ دروازہ کھلا تو میری نگاہ چند سیکنڈ کے لیے اندر گئی۔ مجھے کمرے کی دو دیواریں نظر آئیں جن پر زینب کی بہت سی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ زیادہ تر تصویریں ایسی تھیں جن میں وہ دلہن کے دلکش سرخ جوڑے میں تھی۔ گہنوں اور پھولوں سے لدی ہوئی ایک پری پیکر لیکن معصوم لڑکی۔ کمرے کا دروازہ بند ہوگیا۔ ابراہیم دو تین منٹ کی گفتگو کے بعد واپس میرے پاس آگیا۔ خود ہی بولا۔ ''زینب کی کال تھی۔ بالکل چڑیا کی طرح دل ہے اس کا...... بہت جلد سہم جاتی ہے۔ کہہ رہی تھی کہ اسے عزت مآب سے بہت ڈر لگتا ہے۔ اگر انہیں پتا چل گیا کہ وہ یہاں ہے تو وہ قیامت بپا کر دیں گے۔''

''خدشا تو اس کا درست ہے۔'' میں نے کہا۔ پھر ذرا توقف سے پوچھا۔ ''کیا آپ نے اسے بتا دیا ہے کہ جاناجی میں اس کے حوالے سے کیا سمجھا جارہا ہے؟''

''ہاں، میں نے اسے اندھیرے میں رکھنا مناسب نہیں سمجھا۔ اسے بتا دیا ہے کہ یہاں بہت سے لوگوں کی نگاہوں میں وہ زندہ نہیں ہے اور اس کے حد سے بڑھتے ہوئے ڈر کی وجہ

بھی یہی ہے۔ کبھی کبھی تو دل میں آتا ہے کہ حالات ذرا بہتر ہو جائیں تو اسے لے کر خاموشی سے کہیں نکل جاؤں۔ پاکستان یا پھر کسی بھی دور کے ملک میں۔ جہاں صرف ہم دونوں ہوں۔''

''مگر......آپ جہاں بھی جائیں گے، آپ کی مجبوریاں تو آپ کے ساتھ جائیں گی نا، آپ زینب کو اپنا نہیں سکیں گے۔''

وہ جیسے چونک گیا۔ شاید کچھ دیر کے لیے اس ''دیوار'' کو بھول گیا تھا جو ان دونوں کے درمیان حائل تھی۔ ایک بلند و بالا دیوار۔ یہ زہر کی دیوار تھی...... یہ موت کی حد بندی تھی۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں گہری اداسی کے سائے لہرانے لگے۔

اس نے اپنی چھوٹی چھوٹی نوخیز ڈاڑھی میں بے چینی سے انگلیاں چلائیں۔ ''میں اپنی ان مجبوریوں کا کیا کروں بھائی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ کسی وقت تو اتنا دکھی ہو جاتا ہوں، جی چاہتا ہے کہ جن کی وجہ سے میں اور بھائی کمال یہ دکھ جھیل رہے ہیں ان کو گولیوں سے چھلنی کر ڈالوں۔ ہر اندیشے کو بالائے طاق رکھ دوں۔''

''میرا خیال ہے کہ آپ اپنی سوتیلی والدہ ہاناوانی کی بات ہی کر رہے ہیں۔''

وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد گویا ہوا۔ ''بے شک یہی عورت ہے جس نے کئی برس پہلے عزت مآب کو زہر دے کر زندگی موت کی کشمکش سے دوچار کیا تھا اور اب جزیرے کے سب سے بڑے پیشن گو کے مطابق ہم دونوں بھائیوں کی زندگی بھی اسی خطرے سے دوچار ہے۔''

''جزیرے کا سب سے بڑا پیشن گو؟...... یہ بات میں دوسری تیسری مرتبہ سن رہا ہوں۔ یہ شخص ہے کون؟''

''اسی عورت ہاناوانی کا سگا بھائی۔'' ابراہیم نے نفرت سے کہا۔ ''یہ دونوں بہن بھائی قدرتی طور پر پیشن گوئی کی زبردست صلاحیت لے کر پیدا ہوئے تھے، اور ان کی اس صلاحیت سے ان کے بدترین مخالف بھی انکار نہیں کر سکتے۔ ہاناوانی کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا تھا کہ وہ اپنی آنکھوں میں ایک جادو رکھتی ہے اپنی جانب دیکھنے والے کو مسخر کر لیتی ہے۔ یہ ہم شکل بہن بھائی تھے۔ کچھ اور پُراسرار مشابہتیں بھی ان دونوں [illegible] ہیں۔ مثلاً دونوں کے ہاتھوں میں چھ چھ انگلیاں ہیں۔ ان کی عادات بھی آپس میں بہت ملتی تھیں۔ لیکن پھر بتدریج ان دونوں کے راستے الگ ہو گئے۔ ہاناوانی عیش و عشرت، لالچ اور ہوس کی طرف چلی گئی۔ اس کا بھائی حاذق ذکری درویش صفت ہو گیا اور جنگلو کی طرف نکل گیا۔ برسوں پہلے محترم

ذکری نے ہی ہمارے والدین کو وارننگ دی تھی کہ ہاناوانی کسی نہ کسی موقعے پر ہم دونوں بھائیوں کو زہر کے ذریعے موت کے گھاٹ اتارے گی۔ اسی شدید خطرے کی پیش بندی کرتے کرتے ہماری زندگیاں بدحال و تباہ ہوگئیں۔''

ابراہیم نے گہرے دکھ میں ڈوب کر صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی اور آنکھیں موند لیں۔ اس کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ سانس تیزی سے آ جا رہی تھی۔ میں نے منرل واٹر کی بوتل سے پانی گلاس میں انڈیلا۔

وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگا۔ پھر جلدی سے میری کلائی پکڑ لی۔ ''یہ کیا کر رہے ہیں۔ آپ اس گلاس میں نہیں پی سکتے۔''

''نہیں ابراہیم! میں آپ کو ہی دے رہا ہوں۔'' میں نے گلاس اس کی طرف بڑھایا۔

اس کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ ایک گھونٹ بھر کر کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔ ''یہ میرا گلاس ہے۔ میں نے اسے زہر آلود کر دیا ہے۔ میرے استعمال کا ہر برتن زہر آلود ہو جاتا ہے۔ ہر چیز...... ہر چیز......'' اس کا گلا رندھ گیا۔

اسی دوران میں اس کے سیل فون پر پھر زینب کی کال آگئی۔ وہ انگلش نہیں جانتی تھی اور وہ اردو نہیں جانتا تھا۔ پھر بھی یہ ان دونوں کی غیر معمولی محبت تھی کہ وہ ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اپنا مدعا ایک دوسرے کو سمجھا دیتے تھے۔ زینب اب ملائی کے کچھ اہم الفاظ بولنا شروع ہوگئی تھی۔ ابراہیم نے اردو کے کچھ الفاظ سیکھ لیے تھے۔ کہیں کہیں وہ انگریزی کے آسان الفاظ بھی گھسا دیتے تھے۔ زینب، وہیں ڈاکٹر ماریہ کے پورشن میں تھی۔ ابراہیم سے پوچھ رہی تھی کہ اس نے سر کے درد کی دوا کھائی ہے یا نہیں۔

وہ کہہ رہا تھا۔ ''پین نہیں...... اب سر...... گڈ ہوتا......'' یہ اردو ملی انگلش تھی۔

میں واپس اپنے کمرے میں پہنچا تو انیق اور سیف خاموش بیٹھے تھے۔ سیف کافی اداس نظر آ رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا ہوا سیفی؟''

اس سے پہلے ہی انیق بول اٹھا۔ ''لگتا ہے اسے بھابی...... میرا مطلب ہے ہونے والی بھابی یاد آ رہی ہے۔''

میرے دل پر چوٹ سی لگی۔ انیق نے عام سے انداز میں کتنی تلخ بات کہہ دی تھی۔ ابھی تک اسے معلوم نہیں تھا کہ جس کو وہ ہونے والی بھابی کہہ رہا ہے، وہ اصل میں کون ہے؟

سیف نے بیزاری سے سر ہلایا۔ ''نہیں استاد جی! یہ بات نہیں ہے۔ دراصل میرا تو سارا مزہ ہی کرکرا ہوگیا ہے۔ لڑائی گرم تھی تو میں بھی گرم تھا۔ اب تو بالکل ''شہتوت جلیبا ٹھنڈا

ٹھار'' بن گیا ہوں۔ کیا فائدہ ہوا اتنی دور یہاں آنے کا۔''

''بڑے ناشکرے ہو بھئی۔'' انیق نے کہا۔ ''اتنی مارا ماری تو تمہاری نسلوں میں سے کسی نے نہیں دیکھی ہوگی۔ کیا یہاں ایٹم بم ہی گرتا تو تمہاری تسلی ہوتی۔''

''ایٹم بم نہ گرتا...... لیکن...... کم از کم دو چار پھٹ لگتے مجھے...... ایک آدھ ہڈی ٹوٹتی...... ذرا ہائے شائے ہوتی۔''

''اور اگر ہڈی کے بجائے تمہارا ناریل ہی ٹوٹ جاتا، مارٹر کا گولا لگنے سے؟''

''تو بھی کوئی گل نہیں تھی شہزادے، پر یہ روکھا پھیکا کام تو نہ ہوتا۔'' اس نے ایک بار پھر منہ لٹکا لیا۔

عمر میں وہ مجھ سے دو ڈھائی سال ہی چھوٹا تھا مگر مجھے استاد جی اور استاد صاحب کہتا تھا۔ میں بھی اسے ٹوکتا نہیں تھا۔ پتا نہیں کیوں، اب مجھے اس کا خیال رہنے لگا تھا۔ کبھی کبھی اس کے بارے میں تھوڑی سی منفی سوچ بھی ذہن میں ابھرتی تھی۔ اس سوچ کا تعلق تاجور کے خفیہ ویڈیو کلپ سے تھا۔ سیف نے یہ کلپ کیوں بنوایا تھا۔ کیا وہ اس پر کسی قسم کا شک کرتا تھا۔ اس کلپ میں تاجور اس بات کا اعتراف کرتی نظر آئی تھی کہ وہ ''کسی'' سے پیار کرتی تھی۔

انیق نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ویسے جناب عالی! اداس تو آپ بھی بہت لگ رہے ہیں۔ کوئی پرانی بات تو یاد نہیں آ گئی؟''

میں خاموش رہا، وہ بولا۔ ''آپ نہ بھی بتائیں گے تو مجھے پتا تو چل ہی جانا ہے۔ اتنی آلتی پالتیاں ماری ہیں اور اتنے مشکل چلے کاٹے ہیں، بندے کے اندر جھانکنا آ گیا ہے مجھے۔ میں زیادہ ''شو'' نہیں کرتا ورنہ ان مقامی لوگوں نے تو باقاعدہ میری پرارتھنا شروع کر دینی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''زیادہ خوش فہمی میں نہ رہو۔ کوئی اتنا نور بھی نہیں برس رہا تمہارے چہرے پر...... اس کے علاوہ کئی علاقوں میں یہ رواج بھی ہے کہ پرارتھنا بعد میں کرتے ہیں پہلے پیر صاحب کی قبر بناتے ہیں۔''

''آپ نے مجھے ہمیشہ ''انڈر اسٹیمیٹ'' کیا ہے۔ اچھا، میں ابھی آپ کو آپ کے دل کی باتیں بتاتا ہوں۔''

اس نے آنکھوں کو بھینگا کیا اور بولا۔ ''ہو جا فوکس...... ہو جا فوکس...... لو جی ہو گیا فوکس۔'' اسی طرح آنکھیں بھینگی کیے کیے بولا۔ ''یہ تھری ڈی غیب دانی ہے جناب! میرا

اندازہ ہے کہ آپ کو اس وقت دو باتیں زیادہ پریشان کر رہی ہیں۔ ایک تو وہی سجاول بھائی والی۔ آپ بہت الجھن میں ہیں۔ کیا میں غلط فرما رہا ہوں...... میرا مطلب ہے کہہ رہا ہوں؟''

''یہاں تک تو تم ٹھیک بک رہے ہو۔''

اس نے ''بک رہے ہو'' کو نظر انداز کرتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ''آپ ابھی تک اس بات کو تسلیم نہیں کر پا رہے ہے کہ میں نے آپ کو جو اطلاع دی ہے وہ درست ہے۔ آپ ابھی تک امریش...... مم...... میرا مطلب ہے، سجاول بھائی کو گمشدہ ہی سمجھ رہے ہیں۔''

اس نے ذرا توقف کیا۔ اپنی بھینگی آنکھوں کو ٹھیک کر کے ذرا آرام دیا، پھر دوبارہ بھینگا کر کے بولا۔ ''دوسری پریشانی آپ کو پرانی باتوں کے حوالے سے ہے۔ آپ کو کوئی بہت پریشان کر رہا ہے، بہت زیادہ۔'' اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔

میں جانتا تھا کہ وہ بونگیاں مار رہا ہے مگر اتفاقاً اس وقت اس کی دونوں باتیں درست تھیں۔ میرے ذہن میں جو چند الجھنیں تھیں، وہ یہی تھیں۔ سجاول کہاں ہے؟ زینب کا کیا بنے گا اور اسے کب تک چھپایا جا سکے گا؟ ہاناوانی اور رائے زل کس قماش کے لوگ ہیں اور...... اور فون کے ویڈیو کلپ میں نظر آنے والی تاجور، جو میری زندگی کا سب سے بڑا زخم تھی...... اس کی آواز پچھلے کئی پہر سے مسلسل میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ ''ہاں یہ غلطی تو ہوئی ہے...... یہ غلطی تو ہوئی ہے۔'' یہ اس نے کیا کہہ دیا تھا۔ بار بار ذہن میں سوال ابھرتا تھا کہ اگر وہ یہ غلطی نہ کرتی (یعنی مجھے میری دنیا چھوڑ کر اپنی دنیا میں آنے کا کہتی) تو کیا میں مان لیتا؟ ایک شریف شہری بن کر گھر گرہستی کی زندگی گزارنے لگتا؟ کیا میرے لیے یہ ممکن ہوتا کہ اپنے پیچھے لگی ہوئی بلاؤں سے پیچھا چھڑا کر اس کے ساتھ دنیا کے کسی گمنام گوشے میں گم ہو جاؤں؟ کیا میرا پیچھا کرتی ہوئی موت مجھے مہلت دے دیتی؟ میں جانتا تھا کہ ایسا نہیں ہے۔ مجھے تو بہت جلد ایک بار پھر ٹیکساری گینگ کی زد میں آنا ہی ہے، جو میرے اردگرد ہوں گے وہ بھی بدترین آزمائش کا شکار ہو جائیں گے۔

سیف کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''میں امن آشتی کے اس ماحول سے مایوس تو ضرور ہوا ہوں لیکن ایک بات پر آپ مجھے شاباش دیں۔''

انیق نے فوراً لقمہ دیا۔ ''کوئی کبڈی شبڈی جیتی ہے تم نے؟''

''کوئی یہاں کبڈی کھیلے گا تو جیت کر بھی دکھا دوں گا۔ فی الحال دوسری بات پر شاباش مانگ رہا ہوں۔''

''کون سی بات؟'' میں نے دریافت کیا۔
''میری تیز نظر اور بندے کو پہچان لینے کا فن۔''
''کس کو پہچانا تم نے؟''
''آپ کو، اور کس کو۔ جب سکھیر اپنڈ سے میں آپ کے پیچھے لگا تو مجھے کچھ پتا نہیں تھا، آپ کون ہیں۔ یہ تو یہاں آکر معلوم ہوا ہے کہ میری طرح آپ بھی کھلاڑی ہیں۔ بلکہ میں کیا چیز ہوں آپ کے سامنے۔ آپ بہت بڑے چمپئن ہیں۔''
میرے اندر جھنجلاہٹ کی لہر سی اٹھی۔ میں نے کہا۔ ''تو چھت پر چڑھ جاؤ اور سب مل کر ڈھول بجانا شروع کر دو۔ ساتھ ساتھ میرے چمپئن ہونے کی منادی بھی کرو۔''
میرے لب و لہجے نے سیف اور انیق دونوں کو چونکا دیا۔ سیف کا رنگ اُڑا ہوا سا نظر آیا۔ میں نے بوتل کھول کر الکحل کے چند گھونٹ لیے اور نیم دراز ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ دراصل جس طرح یہاں جاماجی میں میرے ''چیمپئن'' ہونے کا چرچا ہو گیا تھا اور بہت سے لوگ مجھے ایسٹرن کی حیثیت سے جان گئے تھے، مجھے بے حد جھلاہٹ ہو رہی تھی۔ مجھے یقین ہونے لگا تھا کہ اب ڈنمارک میں موجود میرے جانی دشمنوں کو مجھ تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔
کچھ دیر بعد سیف کی بجھی ہوئی سی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ''مجھے افسوس ہے جی کہ آپ کو میری بات بری لگی۔ میں معافی چاہتا ہوں۔''
میں نے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ چند منٹ بعد طبیعت کچھ بحال ہوئی تو میں نے کہا۔ ''مجھے بھی معاف کر دو۔ میں غصے میں بول گیا۔ دراصل...... کچھ مسئلے ہیں جن کی وجہ سے میں اپنا آپ چھپانا چاہتا تھا، لیکن جتنی کوشش کی اتنا ہی کام خراب ہوا۔''
اس سے پہلے کہ کوئی مزید سوال جواب ہوتا دھما دھم کی بلند آواز سے فوجی بینڈ بجنا شروع ہو گیا یہ بہت بڑا بینڈ تھا اور اس کی آواز جیسے پورے ڈی پیلس میں پھیل رہی تھی۔ ہم یہ منظر دیکھنے کے لیے تیسری منزل پر چلے گئے۔ قریباً ایک سو کے قریب فوجی سازندے دو قطاروں میں کھڑے شاندار استقبالیہ دھنیں بکھیر رہے تھے، اور ان کے درمیان ایک طویل سرخ قالین بچھا تھا۔ یہ صرف ریہرسل تھی۔
ڈی پیلس کی فصیل کا منظر بالکل بدل چکا تھا۔ مارٹر گنیں، ملٹی پل راکٹ لانچر اور فلیم تھروور کی طرح کا سارا اسلحہ ہٹایا جا چکا تھا۔ رائے زل کی گرے فورس اور ایجنسی کا اتحاد بھی

اپنے سب ہلکے بھاری ہتھیار پیچھے لے گیا تھا۔ فصیل پر صرف چند توپیں رہ گئی تھیں۔ ایک افسر نے بتایا کہ یہ سلامی میں داغنے کے لیے رکھی گئی ہیں۔

فصیل سے باہر کا منظر بھی دور تک نظر آرہا تھا۔ شہر کی گلیوں میں شام کے سائے طویل ہونا شروع ہو گئے تھے۔ لوگوں کی چہل پہل نظر آ رہی تھی۔ مختلف جگہوں اور چوراہوں پر آرائشی لائٹس لگائی جا رہی تھیں۔ کئی جگہ رنگ برنگی جھنڈیاں بھی دکھائی دیں۔ عزت مآب کے حکم کے مطابق شہر کے لوگ نیوسٹی والوں کے استقبال کے لیے نکل آئے تھے۔

سیف نے ہوا میں سونگھتے ہوئے کہا۔ ''لگتا ہے کہ بریانی کی دیگیں پک رہی ہیں......اور شاید مچھلی وغیرہ بھی بھونی جا رہی ہے۔''

انیق بولا۔ ''تمہاری بات کو رَد نہیں کیا جا سکتا۔ کھانے کے معاملے میں تمہاری سونگھنے کی حس کسی بھی گھریلو اور جنگلی جانور سے زیادہ تیز ہے۔''

سیف اسے گھور کر رہ گیا۔ ویسے وہ درست کہہ رہا تھا۔ مختلف پکوانوں کی خوشبو ڈی پیلس کے وسیع وعریض کچن کی طرف سے اُمڈ رہی تھی اور شہر کے گلی کوچوں میں بھی چکرا رہی تھی۔ ڈی پیلس کے عظیم الشان کچن کا خیال آیا تو دھیان خود بخود خانساماں ازمیر طیب کی طرف چلا گیا۔ مسکراتے ہوئے چہرے والا وہ فربہ اندام شخص اپنے تمام تر ہنر کے ساتھ بارود کی بھینٹ چڑھ گیا تھا اور وہ اکیلا نہیں تھا۔ کمانڈر افغانی، میجر واحد، کیپٹن سعد اور نہ جانے کتنے مزید ایسے تھے جن کی لاشوں کے کفن بھی ابھی میلے نہیں ہوئے تھے مگر جاماجی میں استقبالیہ تیاریاں ہو رہی تھیں۔ مجھے پہلی دفعہ اندازہ ہوا کہ جنگ کی اپنی اخلاقیات ہوتی ہے اور یہ امن کی معاشرت اور اخلاقیات سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ جنگ کرنے والے اپنے پیاروں کی لاشوں کے قریب بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں اور اپنے زخمی ساتھیوں کی آہ و بکا کے درمیان اپنی نیند پوری کرتے ہیں۔ دشمن کی عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کے لیے ان کا رویہ بالکل مختلف ہو جاتا ہے۔ محبت، نفرت، شرم و حیا اور رحم دلی، سب کے پیمانے بدل جاتے ہیں۔ یہاں بھی یہی کچھ ہو رہا تھا۔ دونوں طرف سے مرنے والوں کو فراموش کر دیا گیا تھا اور ایک نیا ماحول استوار کیا جا رہا تھا۔

شام کے فوراً بعد پورا ڈی پیلس بقعۂ نور بن گیا۔ جگہ جگہ سرخ قالین بچھ گئے۔ موسیقی کی دُھنیں بکھرنے لگیں۔ ایک خادم نے آکر اطلاع دی۔ ''ڈی پیلس کا مین گیٹ کھول دیا گیا ہے۔ گرے فورس کے دستے اندر آنا شروع ہو گئے ہیں۔''

''میرا خیال ہے ہمیں تیسری منزل پر چلنا چاہیے۔ وہاں سے بہتر نظارہ ہو سکے گا۔''

انیق نے رائے دی۔

ہم زینے طے کر کے تیسری منزل پر پہنچ گئے۔ ہمیں بالکونیوں سے نیچے بہت سے مسلح افراد دکھائی دیئے۔ ''یہ کون لوگ ہیں؟'' میں نے ایک آفیسر سے دریافت کیا۔

''یہ پاسبان بریگیڈ کے جوان ہیں۔ یہ ڈی پیلس کے اس حصے کو اپنے گھیرے میں رکھیں گے...... ہر ہائی نس قسطینا، میجر وارث اور کمانڈر فارس جان کے علاوہ اور بہت سے اہم لوگ اسی پورشن میں موجود ہیں۔''

اسی دوران میں مجھے کمانڈر فارس جان اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں ٹیلی اسکوپ تھی۔ ہم ایک بالکونی میں کھڑے ہو گئے اور دیوہیکل ستونوں کی اوٹ سے مین گیٹ کا منظر دیکھنے لگے۔ سب سے پہلے ایجنسی کے امریکی گارڈز اور ان کی جیپیں ڈی پیلس میں داخل ہو رہی تھیں۔ ایجنسی کے گارڈز کی وردیاں بھی یوں تو سبز تھیں لیکن وہ اپنی دھاری دار ٹوپیوں کی وجہ سے گرین فورس سے الگ پہچانے جاتے تھے، دونوں طرف کھڑے خوش پوش بچے گاڑیوں پر پھول نچھاور کرنے لگے۔ امریکی بھی خوش دلی سے ہاتھ لہرا رہے تھے اور سلام کر رہے تھے۔ بے شک یہ لوگ مسلح تھے مگر فضا سراسر دوستانہ تھی۔ ایجنسی کی بیسیوں گاڑیاں ڈی پیلس میں داخل ہو چکیں تو گرے فورس کی چھوٹی بڑی گاڑیاں دکھائی دینے لگیں۔ ان پر نیوسٹی کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ میں نے ٹیلی اسکوپ سے دیکھا۔ پیدل اور گاڑی سوار سپاہیوں کی طویل قطار تھی جو شہر کی گلیوں میں رینگتی ہوئی ڈی پیلس کے مین گیٹ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ عزت مآب کے حکم کے مطابق شہری ان گاڑیوں پر گل پاشی کر رہے تھے۔ عزت مآب مفاہمت کی پالیسی کا علم بردار تھا اور یہ پالیسی اس وقت جوبن پر نظر آتی تھی۔

دفعتاً میری نگاہ ایک بلند فوجی ٹرک پر پڑی۔ عجیب وضع کے اس ٹرک پر شیشے کا ایک باکس سا تھا۔ باکس میں کچھ لوگ موجود تھے۔ دو رویہ کھڑے تماشائی ان لوگوں کو دیکھنے کے لیے امڈے پڑ رہے تھے۔ طاقتور اسٹریٹ لائٹس میں سب کچھ صاف دکھائی دیتا تھا۔

کمانڈر فارس جان نے اپنی ٹیلی اسکوپ آنکھوں سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''یہ رائے زل اور ہاناوانی کا ٹرک ہے۔ پوری طرح بم پروف ہے۔ اس کے اوپر جو شیشہ لگا ہے وہ بھی بلٹ پروف ہے اور دھماکوں کو برداشت کر سکتا ہے۔''

سیف نے کہا۔ ''گولی کو روکنے والے تو بہت سے شیشے نکل آئے ہیں مگر فرشتے کو روکنے والا شیشہ کوئی نہیں بن سکا۔''

فارس جان بولا۔ ''واہ پنجابی برادر، تم نے سوا لاکھ کا بات کیا ہے۔ ایک نہ ایک دن تو

اس بڈھی چڑیل کے چنے پڑھے ہی جانے ہیں۔''

میں نے ایک بار پھر ٹیلی اسکوپ آنکھوں سے لگائی اور ٹرک کو دیکھنے لگا۔ اردگرد سیکڑوں مسلح افراد تھے اور یہ قافلہ رینگتا ہوا ڈی پیلس کے مین گیٹ تک پہنچ چکا تھا۔ یہی وقت تھا جب یکے بعد دیگرے سلامی کی توپیں داغی گئیں اور بینڈ زور شور سے دُھنیں بکھیرنے لگے۔ گھروں کی چھتوں اور بالکونیوں میں کھڑے لوگ جھنڈیاں لہرا رہے تھے اور گل پاشی کررہے تھے۔ یقین سے نہیں کہا جاسکتا تھا کہ ان میں سے کتنے لوگ مجبوراً اور کتنے خوش دلی سے یہ کام انجام دررہے ہیں۔ بہرحال یہ حقیقت سب کے لیے اطمینان بخش تھی کہ خونریزی کا خطرہ ٹل گیا تھا۔

اور پھر مجھے ٹیلی اسکوپ میں سے رائے زل اور اس کی والدہ محترمہ کی ''شکل مبارک'' دکھائی دینے لگی۔ ایک زرنگار کرسی پر خوش پوش رائے زل بڑے کروفر کے ساتھ بیٹھا تھا۔ وہ گوشت اور چربی کا ایک گولا سا دکھائی دیتا تھا۔ میں اس سے پہلے قسطینا کے بنائے ہوئے خفیہ ویڈیو کلپ میں بھی اس ظالم موٹے کی ''زیارت'' کرچکا تھا۔ وہ مسکرا کر تماشائیوں کی طرف دیکھتا تھا تو صاف پتا چلتا تھا کہ یہ مسکراہٹ اس نے اپنے منحوس چہرے پر بہت مشکل سے چڑھائی ہے۔ رائے زل کے پہلو میں دوسری زرنگار کرسی پر وہ عورت موجود تھی جس کی سحرکاری نے یہاں کے لوگوں کے ذہنوں کو جکڑ رکھا تھا۔ اسے کئی ناموں سے پکارا جاتا تھا جن میں ایک نام ماذو وارا بھی تھا، یعنی قبر کی ملکہ۔ اور یہ قبر کی ملکہ اب بڑے طمطراق سے شاہی نشست پر براجمان تھی۔ اس نے سفید اور سیاہ رنگ کا لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ درجنوں ہی گہنے اس کے جسم پر نظر آرہے تھے اور ان گہنوں میں قیمتی پتھر لشکارے مارتے تھے۔ وہ کسی مجسمے کی طرح ساکت بیٹھی تھی۔ بس کسی وقت اپنا ایک ہاتھ تھوڑا سا اٹھاتی تھی اور لوگوں کے سلاموں کا جواب دیتی تھی۔ یہ رات کا وقت تھا پھر بھی لگتا تھا کہ اس نے گہرے رنگ کا چشمہ لگا رکھا ہے۔ ہاں یہی تھی مادام ہاناوانی۔ وہ کئی دہائیوں سے ریان فردوس، نسانورل اور ان کے دو بیٹوں پر عرصۂ حیات تنگ کیے ہوئے تھی اور آج بالآخر وہ فاتحانہ انداز میں ڈی پیلس میں داخل ہوگئی تھی۔ سوچنے کی بات یہ تھی کہ کیا کئی دہائیوں سے چلنے والی وہ دشمنی واقعی اپنے اختتام کو پہنچ رہی ہے جس نے اس جزیرے کے عام لوگوں کی زندگیاں حرام کررکھی تھیں۔ کیا واقعی امن کا دور دورہ ہوگا اور ان چمکیلی خوشگوار دوپہروں کا دور واپس آجائے گا جس کا ذکر قسطینا نے کیا تھا؟ یا پھر کوئی گڑبڑ ہوجائے گی اور ریان فردوس اور کمال احمد کی صلح جوئی کسی سازش کے خنجر سے لہولہان ہوجائے گی۔

ڈی پیلس کا بغلی احاطہ جو کم و بیش سات ایکڑ پر مشتمل تھا مہمانوں کی گاڑیوں کی پارکنگ کے لیے پہلے ہی خالی کرا لیا گیا تھا۔ اب گاڑیاں اندر آتی جا رہی تھیں اور گرین فورس کے چاق و چوبند جوان پارکنگ میں ان کی رہنمائی کرتے جا رہے تھے۔

رائے زل اور ہاناوانی والا بلند و بالا ٹرک ہمارے سامنے سے گزرتا ہوا اس بڑے چبوترے کی طرف گیا جہاں عزت مآب ریان فردوس، نسانورل اور درجنوں اہلِ خانہ، رائے زل اور ہاناوانی کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ دونوں فریقین اس حیران کن تبدیلی پر خوش نظر آتے تھے۔ درحقیقت یہ ایک بہت بڑی کایا کلپ تھی جو ہمارے سامنے رُونما ہو رہی تھی۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا بھی ہے۔ برسوں پرانے تنازعات اچانک اپنے حل کی جانب آ جاتے ہیں اور بدترین حالات ایک خوشگوار ماحول میں ڈھلنے لگتے ہیں۔

ڈی پیلس میں اور ڈی پیلس سے باہر وہ ایک بارونق رات تھی۔ شہر کے تاجروں اور ہوٹل مالکان نے نیوسٹی کے سپاہیوں کے لیے اپنی دکانوں اور طعام گاہوں کے دروازے کھول دیئے تھے۔ انہیں ہر طرح کی سہولتیں فراہم کی جا رہی تھیں۔ ڈی پیلس کے اندر گرے فورس کے کمانڈروں اور افسروں کے لیے قیام و طعام کے علاوہ تفریح کے مواقع بھی فراہم کیے گئے تھے۔ کہا جا رہا تھا کہ مادام ہاناوانی اور رائے زل نے محل کے خاص الخاص حصے میں قیام کیا ہے اور ان کی ہر طرح خاطر مدارت کی جا رہی ہے۔ جذبۂ خیر سگالی کے طور پر رائے زل نے گرین فورس کے کم و بیش ایک ہزار قیدی فوراً رہا کرنے کا اعلان کیا تھا۔ دوسری طرف ریان فردوس نے بھی چار پانچ سو کے قریب قیدی رہا کر دیئے تھے۔ چار سو کے لگ بھگ امریکی قیدی اس کے علاوہ تھے۔

میرے بازو میں پھر شدید درد شروع ہو چکا تھا۔ ہلکا سا بخار بھی محسوس ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر ماریہ نے عارضی بندوبست کے طور پر جو انجکشن تجویز کیے تھے وہ انیق نے مجھے لگائے اور بینڈیج کی حالت بھی درست کی۔ رات کے دس بجنے والے تھے۔ میں قسطینا کو دیکھنے اس کے کمرے میں پہنچا تو وہ وہاں اپنی سہیلی ڈاکٹر ماریہ کے ساتھ موجود تھی۔ چیف گیرٹ کی موت نے قسطینا کے دل و دماغ پر سے ایک بڑا بوجھ ہٹا کر اسے مطمئن اور خوش کیا تھا مگر اب وہ پھر پریشان دکھائی دیتی تھی۔ اس کی پریشانی کی علامت یہ ہوتی تھی کہ وہ اپنے بائیں کان کی لو کو ہولے ہولے کھینچتی رہتی تھی۔ ڈاکٹر ماریہ بھی گم صم سی تھی۔

میں نے کہا۔ ”کیا بات ہے قسطینا؟ اب تو لگتا ہے کہ سب کچھ اچھا ہونے جا رہا ہے۔“

”لیکن میرے لیے سب کچھ اچھا نہیں ہے۔ میں اس شخص سے بہت بیزار ہوں۔ اس

کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتی۔"

"آپ کس کی بات کر رہی ہیں؟"

"رائے زل کی۔" وہ نفرت سے بولی۔"کچھ دیر بعد رات کا کھانا کھایا جانے والا ہے۔ پھوپی جان (نسانورل) مجھے اور ماریہ کو بھی بلا رہی ہیں اور وہ رائے زل کے کہنے پر ہی بلا رہی ہوں گی۔"

"اگر آپ نہیں جانا چاہتیں تو انکار کر دیں۔"

"انکار ہی کیا تھا لیکن پھر ابراہیم کی فون کال آ گئی۔ اب میں نے فون ہی بند کر دیا ہے۔"

مجھے یہ بات ابراہیم سے معلوم ہوئی تھی کہ ماضی میں رائے زل، ڈاکٹر ماریہ میں بہت دلچسپی لیتا رہا ہے۔ ڈاکٹر ماریہ بہت زیادہ خوب صورت تو نہیں تھی مگر اس میں ایک طرح کی ذہانت آمیز کشش تھی۔ اس کی عمر اٹھائیس تیس سال کے درمیان تھی۔ میری معلومات کے مطابق اس کی ماں برٹش اور والد برونائی کا تھا۔ قریباً تین سال پہلے اپنے ملائی خاوند سے اس کی علیحدگی ہو چکی تھی۔ اب ایک تین سالہ بچہ اس کے ساتھ تھا۔

میں نے قسطینا سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔"ڈاکٹر ماریہ تو آپ سے بھی زیادہ پریشان ہیں۔ شاید یہ بھی جانا نہیں چاہتیں۔"

"ہاں کچھ ایسی ہی بات ہے۔" قسطینا نے کہا۔

اسی دوران میں ڈاکٹر ماریہ کے فون کا میوزک بجنے لگا۔ ڈاکٹر ماریہ نے نمبر پڑھنے کے بعد سوالیہ نظروں سے قسطینا کی طرف دیکھا۔ قسطینا بیزاری سے بولی۔"بند کر دو۔" چند سیکنڈ بعد میوزک بند ہوا تو ڈاکٹر ماریہ نے فون آف کر دیا۔

ہم نے کچھ دیر تک موجودہ صورتِ حال کے بارے میں گفتگو کی۔ پھر ڈاکٹر ماریہ نے اپنے ہلکے براؤنش بالوں کو کانوں کے پیچھے اڑسا اور میرے بازو کی طرف دیکھنے لگی۔ میں سمجھ گیا کہ اب میرے بازو کی حالتِ زار، زیرِ بحث آ جائے گی۔ میں نے آنکھ کے خفیف اشارے سے اسے منع کر دیا اور پھر موقع ملتے ہی وہاں سے کھسک آیا۔

وہ رات خیر خیریت سے گزر گئی۔ صبح معلوم ہوا کہ ڈی پیلس میں مادام ہاناوانی اور رائے کی خوب آؤ بھگت ہو رہی ہے۔ تحفے تحائف کا تبادلہ بھی ہوا ہے۔ گلے شکوے بھی ہو رہے ہیں اور ساتھ ساتھ دُور بھی کیے جا رہے ہیں۔ یہ خیال بھی ظاہر کیا جا رہا تھا کہ آج شام شاید مادام ہاناوانی مقامی ٹی وی پر کوئی "اسپیچ" وغیرہ بھی دیں گی۔

سہ پہر کا وقت تھا جب سیف میرے پاس، بھاگا ہوا آیا۔ کہنے لگا۔ ''استاد صاحب وہاں شہر میں ایک جگہ کچھ گڑبڑ لگ رہی ہے۔ میں نے ابھی دوربین سے دیکھا ہے۔''

میں اور انیق باہر نکلے اور سیف کے ساتھ بالکونی کی طرف گئے۔ سیف سے ٹیلی اسکوپ لے کر میں نے ڈی پیلس کی فصیل سے باہر دیکھا۔ شہر کی ایک سڑک پر واقعی گڑبڑ محسوس ہوئی۔ یوں لگا کہ مقامی لوگ کسی بات پر شدید احتجاج کر رہے ہیں اور رائے زل کی گرے فورس کے لوگ انہیں سمجھانے بجھانے کی کوشش میں ہیں۔ اسی دوران میں دو فائر بھی سنائی دیئے۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ ہوائی فائر تھے لیکن انہوں نے چونکایا۔

سیف بولا۔ ''استاد محترم! ہمیں دیکھنا چاہیے۔ یہ نہتے لوگ ہیں کہیں کوئی مسئلہ نہ ہو جائے۔''

''یار! تم زیادہ رستم زماں نہ بنو۔'' انیق نے اسے ٹوکا۔ ''ہمیں یہاں سے نہ نکلنے کی ہدایت کی گئی ہے۔''

اسی دوران میں، میں نے دوبارہ ٹیلی اسکوپ میں دیکھا۔ معاملہ کچھ گمبھیر نظر آیا۔ احتجاج کرنے والوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ گرے فورس کے مسلح سپاہی انہیں رائفلوں کے دستوں سے پیچھے دھکیل رہے تھے۔ ''گرین فورس'' اردگرد کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے فون پر کمانڈر فارس جان سے رابطہ کرنا چاہا مگر رابطہ نہیں ہو سکا۔ میں، انیق اور سیف کے ہمراہ سیڑھیاں اتر کر تیزی سے نیچے آیا۔ ہم ایک گاڑی پر ڈی پیلس کے مین گیٹ تک گئے اور پھر وہاں سے پیدل آگے بڑھے۔ اب ڈی پیلس کے قریباً سب محافظ اور اہم لوگ مجھے اچھی طرح پہچانتے تھے۔ مجھے باہر جانے سے کسی نے نہیں روکا۔ ہم نے ایک چوراہا پار کیا اور دو چھوٹی سڑکوں سے گزر کر ہنگامے والی جگہ پر پہنچ گئے۔ ایک پرائمری اسکول کی عمارت کے سامنے تین چار سو کے قریب مقامی لوگ جمع ہو چکے تھے، ان کے چہرے تمتمائے ہوئے تے اور وہ غصیلے نعرے لگا رہے تھے۔

انیق نے دو تین مقامی افراد سے بات کی پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''معاملہ سنگین ہے جی۔ آپ قسطینا صاحبہ سے رابطہ کریں اور ان سے کہیں کہ وہ فوراً نوٹس لیں اور گرین فورس کے جوانوں کو بھیجیں۔''

''لیکن ہوا کیا ہے؟''

''یہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ ''گرے فورس'' والے کچھ عورتوں کو پکڑ کر یہاں لائے ہیں اور ان سے مار پیٹ کر رہے ہیں۔ یہ عورتیں عبدالکریم کی فیملی کی ہیں۔ شاید ان پر تشدد کر کے

ان سے عبدالکریم کے بارے میں پوچھا جا رہا ہے۔"
کریم کا نام سنتے ہی اس کی ساری کہانی اور سارا حلیہ میرے ذہن میں آ گیا۔ ناکردہ جرموں کی پاداش میں ایجنسی والوں نے اس شخص کو "دہشت گرد" بنا رکھا تھا۔ اس کا اصل جرم صرف اتنا تھا کہ اس نے اپنے بچے کو ٹکر مارنے والی ایک کار سوار امریکن لڑکی کو صرف تھپڑ مارا تھا۔ اس پر پولیس اسٹیشن میں شرمناک تشدد کیا گیا اور اسے بچانے کی کوشش میں اس کا بھائی بھی لپیٹ میں آ گیا۔ بس اس "گناہ" کی سزا میں اس کی پوری فیملی تباہ ہوئی تھی۔ اس کا بھائی مارا گیا تھا اور اپنے ہی اس بھائی کی کھوپڑی کا ایک پرخچا کریم کی ٹانگ میں لگا تھا جس نے اس کی ٹانگ کی رگیں کاٹ کر اسے ہمیشہ کے لیے ایک حسرت ناک لنگڑاہٹ دے دی تھی۔ غالباً یہ سب کچھ ہونے کے باوجود اسے ابھی تک معاف نہیں کیا گیا تھا اور اسے ڈھونڈنے کے لیے اس کے اہلِ خانہ کو پکڑ کر یہاں بند کر دیا گیا تھا۔

ہجوم اور ہجوم کا طیش بڑھتا جا رہا تھا۔ کوئی بھی ناخوشگوار واقعہ پیش آ سکتا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ یہاں گرین فورس کا کوئی اہم شخص دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بس اکا دکا سپاہی موجود تھے جو فاصلے پر کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ میں تیزی سے اسکول کے گیٹ کی طرف بڑھا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ اس وسیع دو منزلہ اسکول کو گرے فورس کے فوجیوں کی رہائش کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے اور اسی اسکول کے ایک حصے کو شاید تفتیشی مرکز کی حیثیت دے دی گئی تھی۔

گیٹ پر کھڑے ایک تنومند فوجی افسر سے میری ملاقات ہوئی۔ یہ شخص رینک کے اعتبار سے کرنل وغیرہ لگتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں میگافون تھا۔ اسی میگافون پر وہ ذرا دیر پہلے ہجوم کو سمجھانے بجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کی سیاہ آنکھوں میں شناسائی کی جھلک نمودار ہوئی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ مجھے ڈی پیلس کے ایک اہم فرد کی حیثیت سے جانتا ہے۔ "کیا بات ہے مسٹر؟" اس نے اپنے اندرونی طیش کو دباتے ہوئے بظاہر شائستہ لہجے میں کہا۔

"سوری، میں مداخلت کر رہا ہوں۔ مجھے بتایا جا رہا ہے کہ یہاں کچھ خواتین کو پکڑ کر لایا گیا ہے اور ان سے مار پیٹ کی جا رہی ہے؟"

"آپ کی انفارمیشن درست نہیں۔ یہاں پانچ افراد لائے گئے ہیں جن میں سے صرف دو خواتین ہیں اور ان خواتین سے مرد نہیں "خواتین اہلکار" ہی پوچھ گچھ کر رہی ہیں۔ ہم نے ان لوگوں کو ڈی پیلس کی پیشگی اجازت کے بعد ہی پکڑا ہے۔"

''ان سے کیا پوچھ گچھ ہو رہی ہے؟''

''انہوں نے ایک ایسے شخص کو پناہ دینے کا جرم کیا ہے جو کئی جنگی جرائم کا ارتکاب کر چکا ہے اور ہمیں فوری مطلوب ہے۔''

میں نے زہرخند لہجے میں کہا۔''شاید آپ عبدالکریم کی بات کر رہے ہیں جو ایک ٹانگ سے معذور ہے اور جس کی پوری فیملی کو اس لیے موت کے گھاٹ اتارا جا چکا ہے کہ وہ ایک امریکن لڑکی کو اپنے پلید ہاتھ سے چھونے کا قصوروار ہوا تھا۔''

وہ روکھے لہجے میں بولا۔''مجھے تفصیلات معلوم نہیں۔ میں وہی کر رہا ہوں جو مجھے حکم ملا ہے اور آپ براہ مہربانی ان لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کریں ورنہ معاملہ بگڑ جائے گا۔''

اسی دوران میں ہجوم میں سے ایک بپھرا ہوا نوجوان گرے فوجیوں کا گھیرا توڑ کر مجھ تک پہنچ گیا۔ اس نے گرے کرنل کی طرف اشارہ کیا اور چلا کر بولا۔''یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ یہاں کوئی لیڈی اہلکار نہیں ہے۔ یہاں صرف یہ...... بھیڑیے ہیں جو ان عورتوں کو نوچ رہے ہیں ہمارے ہی شہر میں، ہمارے ہی سامنے ان کی عزت پامال کرنا چاہ رہے ہیں۔ ہم یہ نہیں ہونے دیں گے۔''نوجوان کے لمبے بال کندھوں تک پہنچ رہے تھے۔

گرے فورس کا کرنل دھاڑا۔''ایسے کام تم لوگوں کے ہیں...... اور تم نے کیے ہیں، ہم کچھ بھی بھولے نہیں ہیں۔ خود کو فتح مند سمجھنے کے بعد تم لوگوں نے واشنگٹن ہوٹل میں کیا کیا تھا۔ وہاں جن حرامیوں نے بے گناہ غیر ملکی عورتوں پر ظلم توڑا ان میں یہ لنگڑا بھی شامل تھا اور یہ کوئی ایک جرم نہیں ہے اس کا۔''

اب بات میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ واشنگٹن ہوٹل میں جو کچھ ہوا تھا اس کا بدلہ چکانے کے لیے اور کریم کو ڈھونڈنے کے لیے کچھ لوگوں کو تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا تھا جن میں دو عورتیں بھی شامل تھیں۔ ہم اسکول کے گیٹ کے بالکل پاس کھڑے تھے، اچانک اندر سے کسی لڑکی کے چلانے کی دردناک آواز آئی۔ اس آواز نے جیسے ہمارے سینوں میں انگارے بھر دیئے۔ لمبے بالوں والا نوجوان تڑپ کر گرے کرنل کی طرف بڑھا مگر میں نے اسے راستے میں ہی دبوچ لیا۔''نہیں، پیچھے ہٹو، خود کو کنٹرول کرو۔ مجھے بات کرنے دو۔''

میں نے فون نکالا۔ پہلے قسطینا سے بات کرنا چاہی، لیکن پھر اسے مزید پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ میں نے پہلے ابراہیم اور پھر بیگم نسانورل کو ٹرائی کیا۔ نسانورل سے بات ہو گئی۔ میں نے مؤدب لہجے میں کہا۔''محترم بیگم! یہاں پرائمری اسکول کی عمارت میں گرے فورس کے لوگ کریم کے گھرانے کی کچھ عورتوں اور مردوں کو تشدد کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ کیا

دونوں طرف کے لوگوں کا تحفظ معاہدے کی شقوں میں نہیں؟''

''بے شک ایسا ہے۔'' بیگم نورل نے تحمل سے کہا پھر ذرا توقف سے بولیں۔ ''لیکن جو لوگ جنگی جرائم میں ملوث ہیں ان پر تو مقدمات چلیں گے، چاہے وہ ہماری جانب ہوں یا ان کی۔''

''لیکن......لیکن میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں بڑی بیگم! یہ شخص کسی جنگی جرم میں شامل نہیں۔ یہ لوگ واشنگٹن ہوٹل کے جس واقعے کا حوالہ دے رہے ہیں وہ میرے سامنے ہوا تھا۔ یہ شخص وہاں صرف پہرے داروں میں شامل تھا اور خود ہر ہائی نس قسطینا نے اسے وہاں مقرر کیا تھا۔''

''لیکن جو کچھ بھی ہے، ایسے لوگوں کو بھاگنا نہیں چاہیے۔ انہیں خود کو انصاف کے لیے پیش کرنا چاہیے۔''

''گستاخی کی معافی چاہتا ہوں۔ لیکن یہاں جو کچھ عورتوں کے ساتھ ہو رہا ہے، اس نے لوگوں میں شدید غصہ پیدا کر دیا ہے۔ کوئی حادثہ ہو سکتا ہے۔ آپ اس عمل کو روکیں اور ساتھ ہی گرین فورس کے کسی دستے کو یہاں بھیجیں تاکہ صورتِ حال کنٹرول کی جا سکے۔''

بیگم نورل چند سیکنڈ تک تذبذب میں رہنے کے بعد بولیں۔ ''تم ایک منٹ ہولڈ کرو۔ میں عزت مآب سے بات کرتی ہوں۔''

میں نے ہولڈ آن کیا۔ ایک منٹ سے پہلے ہی بیگم نورل کی آواز دوبارہ ابھری۔ ''شاہ زیب! تم وہاں سے فوراً واپس آ جاؤ۔ عزت مآب ایک ذمے دار آفیسر کو بھیج رہے ہیں۔'' اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہو گیا۔

اندازہ ہوا کہ بیگم نورل کو عزت مآب کی طرف سے سخت جواب ملا ہے۔ شاید ''عزت مآب'' کی طرف سے مجھے ایک آدھ صلوات بھی سنائی گئی ہو اور کہا گیا ہو کہ مجھے اس پھڈے میں ٹانگ اڑانے کے لیے کس نے کہا ہے۔ دوسری بات یہ سمجھ میں آ رہی تھی کہ عزت مآب ریان فردوس یہاں گرین فورس کا دستا بھیجنے کے حق میں نہیں تھا۔ اسے اندیشہ تھا کہ کوئی ٹکراؤ نہ ہو جائے۔ وہ کسی آفیسر کو بھیج رہا تھا یہ بزدلی کی بڑی عمدہ مثال تھی۔ اپنے ہی شہر میں اپنے ہی لوگوں کی حفاظت نہیں کی جا رہی تھی۔

اچانک وہ کچھ ہوا جس کی توقع کسی نے نہیں کی تھی۔ کسی قریبی مکان کی چھت سے رائے زل کی گرے فورس کے سپاہیوں پر ایل ایم جی کے تین چار برسٹ چلائے گئے۔ میں نے پانچ چھ سپاہیوں کو زخمی ہو کر گرتے دیکھا۔ ہجوم ایک تند ریلے کی طرح گرے سپاہیوں کی

طرف بڑھا۔ ان کی تعداد وہاں تیس چالیس سے زیادہ نہیں تھی۔ ہجوم سیکڑوں میں تھا۔ لوگوں کے ہاتھوں میں کنداور تیز دھار آلات کے علاوہ آتشیں ہتھیار بھی دکھائی دے رہے تھے۔ ہجوم اتنی سرعت سے جھپٹا تھا کہ گرے فورس والوں کو مزاحمت کا موقع ہی نہیں ملا۔ یہ ایک طوفانی ریلا تھا۔ غیظ وغضب سے بھرا ہوا اور ہر رکاوٹ کو روندتا ہوا۔ گرے فورس والے شاید چند گولیاں ہی چلا سکے ہوں گے۔ ہجوم ان پر ٹوٹ پڑا۔ تیز دھار آلات چمکے۔ تابڑ توڑ فائر ہوئے۔ میں نے ایک ادھیڑ عمر شہری کو دیکھا۔ اس نے صرف دو تین فٹ کے فاصلے سے گرے فورس کے ایک سپاہی کے سر میں گولی ماری اور دوسرے پر جھپٹ پڑا۔ یہاں کسی کو روکا نہیں جا سکتا تھا۔ میں اور انیق ہکا بکا کھڑے تھے...... ہاں سیف مار دھاڑ کرنے والوں میں شامل ہو گیا تھا۔ یہ لرزہ خیز مناظر تھے۔ گرے فورس کے سپاہیوں کی لاشیں لوگوں کے پاؤں تلے کچلی جا رہی تھیں۔

''میرے خیال میں ہمیں اندر دیکھنا چاہیے۔'' میں نے ہولسٹر سے پستول نکالتے ہوئے کہا۔

میں اور انیق اسکول کی عمارت میں داخل ہوئے۔ ہم اس طرف بڑھے جہاں کسی لڑکی کے چلانے کی آواز سنائی دی تھی۔ اسکول کی کینٹین کے پاس یہ دو مستطیل کمرے تھے۔ ہم اندر گھسے تو تکلیف دہ مناظر نظر آئے۔ دو مردوں اور ایک لڑکی کو بالکل برہنہ حالت میں چھت سے لٹکایا گیا تھا۔ آہنی زنجیروں کے تناؤ کی وجہ سے ان کی کلائیاں چھلی ہوئی تھیں اور جسموں پر شدید مار پیٹ کے نشان تھے۔ باقی دو قیدی جن میں ایک جواں سال عورت بھی تھی، سہمے ہوئے ایک کونے میں سمٹے تھے۔ تیسرا فرش پر تھا اور مر چکا تھا۔ اس کے جسم کے نازک حصے ناپید تھے۔ ان پر تیز دھار آلہ استعمال ہوا تھا...... اندازہ ہو رہا تھا کہ باہر کے حالات دیکھ کر اسکول کے اندر موجود چند گرے فوجی راہِ فرار اختیار کر گئے ہیں۔

ہمارے پیچھے ہی پیچھے درجنوں بپھرے ہوئے لوگ اندر پہنچ گئے۔ ان کے سروں پر جیسے خون سوار تھا۔ ہم نے برہنہ لڑکی کو ایک چادر سے ڈھانپا اور اس کی زنجیر کھول کر اسے نیچے اتارا۔ وہ نیم بے ہوش تھی۔ دونوں مردوں کی حالت بھی ملتی جلتی یہ تھی۔ مشتعل لوگ اسکول کے کونوں کھدروں میں گرے سپاہیوں کو ڈھونڈ رہے تھے۔ صرف ایک شخص ملا۔ اس سے پہلے کہ ہم اس کو بچانے کی کوشش کرتے، تین چار فائر ہوئے اور وہ مٹی کا ڈھیر ہو کر نیچے گر گیا۔

میں نے کہا۔ ''یہ بہت بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ انیق، ہمیں فوراً اپنے ٹھکانے پر واپس پہنچنا چاہیے۔''

انیق نے تائید کی۔ ہم نے سیف کو ساتھ لیا اور فوراً اپنے کمرے تک پہنچ گئے۔ یہ ڈی پیلس کا وہی پورشن تھا جہاں قسطینا، کمانڈر فارس اور میجر وارث وغیرہ سمیت بہت سے اہم افراد موجود تھے۔ اس پورشن کو پاسبان بریگیڈ کے جانبازوں نے اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ اسکول کے سامنے ہونے والے خونی تصادم کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل رہی تھی۔ میں نے قسطینا سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر فوری طور پر کامیابی نہیں ہوئی۔ ہاں چند منٹ بعد کمانڈر فارس سے رابطہ ہو گیا۔ وہ خاصا گھبرایا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ ''برادر! معاملہ خراب ہو گیا ہے۔ ابھی ام کو پون پر پتا چلا ہے کہ شہر کی سپر مارکیٹ میں بھی خون خرابا ہوا ہے۔ گرے پورس کا لوگ ایک مسجد میں جوتوں سمیت گھس گیا۔ امام صیب کے منع کرنے پر انہیں تھپڑ مارا گیا جس پر کسی جوشیلے نے تھپڑ مارنے والے کو چھرا گھونپ دیا۔ ایک دم لڑائی کا آگ بھڑک اٹھا۔ کہا جا رہا ہے کہ لوگ گرے سپاہیوں پر پل پڑے۔ سات آٹھ سپاہیوں کو موقع پر ہی مار دیا گیا ہے اور دو چار کی لاشوں کو آگ بھی لگا دی گیا ہے۔''

''قسطینا صاحبہ کو فوراً ایکشن لینا چاہیے۔ گرین فورس کہیں نظر نہیں آ رہی۔ یہ لوگ کہاں ہیں؟ قسطینا صاحبہ اور میجر وارث کمانڈروں سے رابطہ کریں۔''

''ہر ہائی نس قسطینا تو بالکل لاتعلق ہو گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ام اب کچھ نہیں کرے گا۔ عزت مآب جانے اور رائے زل جانے۔ اور...... امارے خیال میں وہ...... ٹھیک بھی کہتا ہے۔ عزت مآب نے امریکن قیدیوں کا رسیاں کھول کر ام سب کا باگیں دشمن کے ہاتھوں میں پکڑا دیا ہے اور آپ نے جو دوسرا بات پوچھا ہے کہ امارا گرین پورس کا لوگ کہیں نظر کیوں نہیں آ رہا تو اس کا جواب بھی بڑا پریشان کن ہے۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''عزت مآب کا احتیاط پسندی ام سب کا بیڑا غرق کر رہا ہے۔ عزت مآب کے حکم پر رات ہی کو امارے بہت سے دستے ڈی پیلس سے نکل گئے تھے۔ وہ اب چھاؤنی میں ہے۔ عزت مآب نہیں چاہتا تھا کہ گرے پورس اور گرین پورس ایک دوسرے کے سامنے رہے اور دونوں طرپ کا لوگ مسلح ہونے کی وجہ سے کوئی ہنگامہ کھڑا ہو جائے۔ اب دیکھو جی، ہنگامہ کھڑا ہو گیا ہے اور امارا پورس کہیں نظر نہیں آ رہا، اللہ خیر کرے۔''

میرے ذہن میں ایک اور بات بری طرح چبھ رہی تھی۔ کریم کے گھرانے کے مرد و زن کو پکڑنے والے اور ان کو اسکول میں لا کر تشدد کرنے والے سب کے سب گرے فورس کے لوگ تھے، ان میں ہمیں ایک بھی امریکن دکھائی نہیں دیا تھا۔ حالانکہ ایسے معاملوں میں وہ

اب پیش پیش نظر آ رہے تھے کیا اس کے پیچھے بھی کوئی سازش تھی۔
ابھی ہماری گفتگو جاری ہی تھی کہ معلوم ہوا، صورتِ حال کو کنٹرول کرنے کے لیے رائے زل بنفس نفیس ڈی پیلس سے باہر گیا ہے۔ عزت مآب کا بڑا بیٹا کمال احمد بھی اس کے ساتھ ہے۔ وہ لوگ اسی بم پروف فوجی ٹرک پر سوار ہیں جس پر ہم نے انہیں کل رات دیکھا تھا۔ اس کے قریباً دس منٹ بعد ہی یہ دوسری خبر پہنچی کہ کسی گھر کی چھت سے رائے زل کے ٹرک پر بھی اندھا دھند فائرنگ کی گئی ہے اور اس فائرنگ میں ٹرک کے پیچھے چلنے والے کئی گرے سپاہی مارے گئے ہیں۔
دو تین منٹ بعد ہی ڈی پیلس کے باہر اسکول کے چوراہے کی جانب سے تابڑ توڑ فائرنگ کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ آٹو میٹک رائفلوں سے سنگل فائر ہو رہے تھے اور برسٹ بھی چلائے جا رہے تھے۔ صورتِ حال کی سنگینی نے مجھے اور کمانڈر فارس جان کو قسطینا تک پہنچنے پر مجبور کر دیا۔ وہ بدستور سادہ لباس ''شرٹ، جرسی اور جین'' میں تھی۔ وہ اپنے کمرے می بھوکی شیرنی کی طرح چکرا رہی تھی۔
شہر میں ہونے والی فائرنگ کی آوازیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ میں نے کہا۔ ''قسطینا! آپ نے، عزت مآب یا بیگم نورل سے رابطہ کیا؟''
''مجھے کوئی ضرورت نہیں، ان سے رابطہ کرنے کی اور میں ہوتی بھی کون ہوں رابطے کرنے والی؟ یہ ان کی پراپرٹی ہے، ان کا جزیرہ ہے، وہ یہاں سیاہ سفید کے مالک ہیں، ہم تو ان کے لیے کرائے کے لوگ ہیں۔ ان کے حکم پر لڑنے مرنے والے...... بس۔''
وہ غم و غصے کے تند ریلے میں بہہ رہی تھی۔
میں نے کہا۔ ''یہ جو جھگڑا ہوا ہے اس میں ایجنسی والے کہیں نظر نہیں آ رہے یور ہائی نس۔''
''وہ نظر آئیں گے بھی نہیں۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی۔ ''ہاں، ابھی وہ نظر آئیں گے بھی نہیں۔ وہ اپنا کام دوسروں سے کرانا بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ روس ہو، افغانستان ہو یا عراق...... کس جگہ وہ خود لڑے ہیں۔ مکار لومڑ...... اور یہاں وہ بڈھی کھوسٹ ہاناوانی بھی ان کے ساتھ ملی ہوئی ہے، اس کے سینے میں کینے کی آگ جل رہی ہے۔ وہ ایک ایک کو بھسم کر کے دم لے گی۔''
''آپ کا مطلب ہے کہ معاہدہ ایک دھوکا تھا؟''
''سراسر دھوکا، فراڈ اور ایک بے رحم ڈراما۔''

''آپ کا کیا خیال ہے، رائے زل بھی اس دھوکے میں پوری طرح شریک ہے؟''

''وہ اور اس کی ماں ایک ہیں۔ وہ وہی کرتا ہے جو اس کی ماں کہتی ہے۔ یہ دونوں ہم کو تو دھوکا دے رہے ہیں اپنے لوگوں کو بھی دھوکا دے رہے ہیں۔ اگر دونوں طرف کے لوگوں کے دلوں میں کہیں تھوڑی بہت اخوت اور نرمی رہ بھی گئی ہے تو وہ اسے بھی ملیا میٹ کر دینا چاہتے ہیں۔ ''چاہتے'' بھی کیا ہیں، کر چکے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ اب...... یہاں قتلِ عام شروع ہو سکتا ہے۔''

ابھی ہماری گفتگو جاری ہی تھی کہ ہم نے ڈی پیلس کی دوسری منزل سے ایک خوفناک منظر دیکھا۔ ڈی پیلس سے باہر ایک کہرام سا مچا ہوا تھا۔ اسکول کی عمارت کے سامنے جو مشتعل ہجوم جمع ہوا تھا اور پُر جوش نعرے لگا رہا تھا وہ اب بھیڑ بکریوں کی طرح بھاگتا ہوا ڈی پیلس کے مین گیٹ کی طرف آ رہا تھا۔ عقب سے ان پر گرے فورس کے سپاہی اندھا دھند فائرنگ کر رہے تھے۔ لوگ بھاگ رہے تھے، گر رہے تھے، پاؤں کے نیچے کچلے جا رہے تھے۔ ان میں جوان مرد و زن بھی تھے اور بچے بوڑھے بھی۔ شاید انہیں واقعی قتلِ عام کا حکم دے دیا گیا تھا۔

وہ لوگ بھاگتے ہوئے ڈی پیلس کی طرف آ رہے تھے۔ شاید یہاں پناہ لینا چاہ رہے تھے۔ اپنے ''عزت مآب'' کی حفاظت میں آنا چاہتے تھے، مگر اس سے پہلے کہ وہ مین گیٹ تک پہنچے، ان پر ڈی پیلس کی فصیل سے بھی فائرنگ شروع ہو گئی۔ فائرنگ کرنے والے گرے فورس کے لوگ ہی تھے۔

طرفہ تماشا تھا۔ کل رات جو لوگ بڑی خوش دلی سے گرے فورس کا استقبال کر رہے تھے وہ گولیوں سے بھونے جا رہے تھے اور جو خوش دلی سے استقبال کرا رہے تھے وہ اب گولیاں چلا رہے تھے۔ شاید اسی طرح کا قتلِ عام تاریخ کے ایک بدنام کردار جنرل ڈائر نے جلیانوالہ باغ میں بھی کرایا تھا۔ کچھ ہی سیکنڈز میں ہم نے اَن گنت افراد کو اپنے سامنے ڈھیر ہوتے دیکھا۔ اب ہمارے لیے رکنا اور تماشا دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ قسطینا کو اس کے حال پر چھوڑ کر ہم سیڑھیوں کی طرف لپکے۔ کمانڈر فارس کے علاوہ انیق اور سیف بھی ہمراہ تھے۔ میرے ہاتھ میں ایم ایم جی تھی۔ انیق اور سیف بھی آٹومیٹک رائفلوں سے مسلح تھے۔ کمانڈر فارس اپنے ساتھیوں کو ایکشن میں لانے کے لیے ٹیرس کی طرف نکل گیا۔

ہم نیچے پہنچے تو انیق نے پکار کر کہا۔ ''[illegible] زیب بھائی!''

میں نے انیق کی نظر کا تعاقب کیا، ڈی [illegible] بھی گرے فورس والے عام لوگوں

کولمحوں میں موت سے ہمکنار کر سکتی تھی۔

اگلے تیس چالیس سیکنڈز تک میں خود کو اس سے بچاتا ہی رہا۔ اس دوران میں، میں نے کم و بیش چار بار خود کو اس کے قاتل گھونسے سے بچایا۔

اچانک سیف بھی اس لڑائی میں کود پڑا۔ اس نے پھرتی دکھائی اور یکا یک سجاول کو عقب سے اپنے جپھے میں لے لیا۔ کبڈی کے کھلاڑی کی حیثیت سے اسے اپنی اس گرفت پر بڑا ناز تھا مگر مدِ مقابل کوئی عام شخص نہیں تھا۔ میں چلایا۔ ''سیف! یہ کیا کر رہے ہو...... پیچھے ہٹ جاؤ۔''

ابھی میرے الفاظ منہ میں ہی تھے کہ سجاول نے اندھا دھند زور لگایا۔ اس کے دونوں بازو بھی سیف کی گرفت میں تھے مگر پاؤں تو آزاد تھے۔ وہ وحشت کے عالم میں پیچھے کی طرف گیا اور سیف کو ایک دیوار سے ٹکرا دیا۔ سیف کی گرفت ختم ہوگئی۔ سجاول کسی درندے کی طرح دہاڑتا ہوا سیف کی طرف پلٹا اور یہی وہ اینگل تھا جہاں سے وہ سجاول کے قاتل گھونسے کی زد میں آسکتا تھا۔ میں جھپٹ کر سجاول کی طرف گیا اور اس مرتبہ میں نے اسے عقب سے جکڑنے کی ادھوری کوشش کی پھر بھی سجاول کی شدید ٹھوکر کام کر گئی۔ یہ ٹھوکر سیف کے پیٹ میں لگی اور وہ جیسے ہوا میں اڑتا ہوا کمرے سے باہر جا گرا۔ غالباً وہ اٹھ کر دوبارہ سجاول کی طرف آنے کی حماقت کرتا مگر انیق نے اسے پکڑ لیا۔

ایک بار پھر خود کو سجاول کے گھونسے سے بچاتے ہوئے میں سجاول سے لپٹ گیا اور اڑنگا لگا کر اسے پشت کے بل گرانے کی کوشش کی مگر وہ سنبھل گیا۔ اس کارروائی کے دوران میں ایک ریفریجریٹر پہلو کے بل گرا اور اس میں سے شارٹ سرکٹ کی آوازیں آئیں۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کمرے سے باہر بھی کشت و خون عروج پر ہے۔ کہرام سا مچا ہوا تھا۔ ہلکے اور بھاری ہتھیاروں سے تابڑ توڑ فائرنگ ہو رہی تھی۔ بے شک میں ایم ایم اے چیمپئن تھا۔ اپنے سخت ترین حریفوں کو بھی بیک فٹ پر لانے کے بے شمار طریقے جانتا تھا مگر میرے زخمی بازو نے مجھے آدھا کر دیا تھا اور اصل میں یہ زخم بھی اسی سجاول سیالکوٹی کا دیا ہوا تھا۔ اچانک میں اوندھے منہ گرا اور مجھے اندازہ ہوا کہ میں ''نیک لاک'' کا شکار ہو گیا ہوں۔ عام فہم الفاظ میں، میری گردن سجاول کے بازو کے شکنجے میں آگئی تھی۔ دوبدو فائٹ میں اکثر اس طرح کے مواقع آجاتے ہیں۔ بندہ اپنے حریف کے کسی خطرناک ہتھکنڈے سے بچنے کی تگ و دو میں رہتا ہے اور کسی کم خطرناک داؤ کا شکار ہو جاتا ہے۔ آہنی جسم والا سجاول میری پشت پر سوار تھا اور اپنے بازو کا بے پناہ دباؤ ڈال کر میری سانس کی ڈور منقطع کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میری

آنکھوں کے سامنے تارے ناچ گئے۔ انیق بھی جان گیا تھا کہ بپھرا ہوا سجاول کسی بھی لمحے میری گردن توڑ سکا ہے وہ دیوانہ وار سجاول پر جھپٹا اور اس کے کندھے اور سر پر رائفل کے دستے سے شدید ضربات لگائیں۔ سجاول جیسے جنون کی کیفیت میں تھا اور تکلیف اس کے لیے بے معنی ہو چکی تھی۔

''ماردوں گا پیچھے ہٹ جاؤ۔'' انیق کی آواز جیسے میلوں دور سے میرے کانوں تک پہنچی۔

میں نے دھندلائی نظروں سے دیکھا، اس نے چند فٹ پیچھے ہٹ کر رائفل کا رخ سجاول کی طرف کرلیا تھا۔ سجاول، انیق کے لیے امریش پوری تھا اور آج اس نے واقعی امریش پوری بن کے دکھا دیا تھا۔ لیکن میرا دل ایک اور گواہی دے رہا تھا۔ سجاول وہ نہیں تھا جو نظر آرہا تھا۔ وہ کسی کے ''زیراثر'' تھا۔ میں نے اس کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے اس کے چہرے پر کسی اور کی آنکھیں دھری ہیں۔

سخت ترین اذیت میں ہونے کے باوجود میں نے انگلی کے اشارے سے انیق کو گولی چلانے سے منع کیا۔ آخری کوشش کے طور پر میں نے خود کو چند انچ آگے کی جانب سرکایا اور اپنا ہاتھ بجلی کے اس تار تک پہنچا دیا جو ریفریجریٹر گرنے سے علیحدہ ہوا تھا۔ پیچھے سے یہ تار ابھی تک ساکٹ میں لگا ہوا تھا۔ میں جانتا تھا کہ کرنٹ مجھے بھی لگے گا لیکن میں اس کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب میں نے تار کا ٹوٹا ہوا سرا سجاول کے بازو سے ٹچ کیا تو وہ پھڑک کر پہلو کے بل گرا۔ شاک مجھے بھی کم نہیں لگا تھا لیکن میں فوراً سنبھل کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے جو ٹھوکر سجاول کے سر پر لگائی وہ ان ممنوعہ ضربات میں سے ایک تھی جو مکس مارشل آرٹ میں سنگین فاؤل کہلاتی ہیں۔ لیکن میرے پاس اس کے سوا چارہ نہیں تھا۔ میں مجروح تھا اور میرا حریف مجھے ہرانے کے لیے نہیں، مارنے کے لیے لڑ رہا تھا۔ میرے جوتے کی ٹھوکر عین اس کی کنپٹی کے وسط میں لگی اور وہ یوں بے حرکت ہو گیا، جیسے مدتوں سے ساکت پڑا ہو۔

رائفل ابھی تک انیق کے ہاتھوں میں تھی اور اس کا رخ سجاول کی طرف تھا۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ چند سیکنڈ پہلے تک اس پر گولی چلانے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔

''اس نے آپ کو مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔'' انیق نے لرزاں آواز میں کہا۔

''مجھے لگتا ہے، یہ اپنے ہوش حواس میں نہیں ہے۔''

''مجھے تو لگتا ہے جی کہ یہ کبھی بھی اپنے ہوش حواس میں نہیں تھا۔''

''یہ بحث کا وقت نہیں انیق۔'' میں نے سجاول کی نبض دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اسے فوراً گھسیٹ کر اس ریفریجریٹر کے پیچھے کرو۔''

انیق اور سیف نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ کمرے کا بیشتر فرنیچر ٹوٹ چکا تھا۔ کتابوں کی الماریاں الٹی ہوئی تھیں اور فرش پر لکڑیاں اور شیشے بکھرے تھے۔ باہر سے چند اندھی گولیاں آئیں اور اسٹڈی روم کی ایل سی ڈی کو چکنا چور کر گئیں۔ ہم نے خود کو نیچے گرالیا۔ ڈی پیلس کے احاطوں اور راہداریوں میں قیامت کا سماں تھا۔ اب دستی بموں کے دھماکے بھی شروع ہو گئے تھے۔ وحشت زدہ آواز میں ''لاؤڈ اسپیکرز'' پر کچھ اعلانات کیے جا رہے تھے مگر کسی کو ان کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ ویسے بھی یہ ملائی زبان میں تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ گرے فورس کے کسی کمانڈر کی طرف سے اپنے فوجیوں کو کنٹرول کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ان سے کہا جا رہا ہے کہ وہ بے گناہ لوگوں کے خون سے ہاتھ نہ رنگیں مگر چند لمحے بعد انیق نے انکشاف کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ اسی حرامی رائے زل کی آواز ہے۔ طیش میں اندھا ہو رہا ہے۔ سپاہیوں کو حکم دے رہا ہے کہ جو بھی مزاحمت کرے اسے کچل ڈالو کسی کو معاف نہ کرو۔ انہیں بتاؤ کہ ہماری دوستی کیا ہے اور دشمنی کیا ہے۔''

○......❖......○

اس دلچسپ داستان کے بقیہ واقعات
پانچویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں

میں ششدر رہ گیا۔ میرا دھیان ایک بار پھر زینب اور ابراہیم کی طرف چلا گیا۔ میں نے انیق سے کہا۔ ''تم یہیں رہو سجاول کے پاس۔ ہر صورت میں اس کی حفاظت کرنی ہے۔ ہم زینب اور ابراہیم کو دیکھتے ہیں۔''

انیق نے اپنی گن سمیت تباہ حال اسٹڈی روم میں پوزیشن لے لی۔ میں اور سیف اس دو منزلہ رہائشی پورشن کی طرف بڑھے جو ڈاکٹر ماریہ کی رہائش گاہ تھا۔ یہاں بھی لاشیں بکھری ہوئی تھیں تاہم لڑائی کا زور اس طرف کم تھا۔ زیادہ مارکاٹ ڈی پیلس کے خاص الخاص حصے میں ہو رہی تھی۔ وہاں عزت مآب اور اس کی فیملی کے بہت سے اہم لوگ موجود تھے۔ ان اہم لوگوں کے علاوہ وہاں سنبل سمیت وہ درجنوں خواصیں بھی موجود تھیں جو عزت مآب کے حرم کا حصہ تھیں اور وہ رقاصائیں اور خوبرو ملازمائیں جو عزت مآب کے اردگرد کے ماحول کو دلکش بناتی تھیں۔ وہ سب کچھ اس وقت شدید خطرے کی زد میں تھا۔ عزت مآب ریان فردوس کی امن پسندی اور کم ہمتی اسے ڈبونے جا رہی تھی۔ وہ ایجنسی اور سابقہ بیوی کے سامنے جھکتا چلا گیا تھا۔ اسے امید تھی کہ شاید وہ لوگ اس سے مہربانی کا سلوک کریں گے مگر جنگ کا اپنا بہاؤ ہوتا ہے اور لڑنے والوں کی اپنی نفسیات اور اخلاقیات۔

ہر طرف پگھلا ہوا قاتل سیسہ تیر رہا تھا۔ ہم جھک کر دوڑتے اور مختلف چیزوں کی آڑ لیتے ہوئے مطلوبہ پورشن تک پہنچ گئے۔ ہم نے کسی سے بھی براہِ راست تصادم سے بچنے کی کوشش کی تھی اور کامیاب رہے تھے۔ پورشن کے ایک حصے میں کسی دستی بم کی وجہ سے آگ بھڑک اٹھی تھی اور گاڑھا دھواں اٹھ رہا تھا۔

میں اس کمرے میں پہنچا جہاں ایک ڈیکوریشن پیس کے اندر میرا پن ہول اسپائی کیمرا موجود تھا اور مجھے اس کمرے کے کچھ رومانی مناظر بھی دکھاتا رہا تھا (اب چارجنگ ختم ہونے کے سبب یہ کیمرا بند ہو چکا تھا) میں کمرے میں پہنچا تو میرا اندازہ سو فیصد درست نکلا۔ ابراہیم

بھی یہاں موجود تھا۔ زینب نے اپنی براؤن شال کو اسکارف کی طرح چہرے کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ وہ جائے نماز پر بیٹھی تھی اور دعائیہ انداز میں کچھ بڑبڑاتی چلی جا رہی تھی۔ ڈاکٹر ماریہ کا رنگ بھی خوف سے سفید دکھائی دے رہا تھا۔ ابراہیم کے کندھے سے ہولسٹر جھول رہا تھا۔ بے شک وہ بھی اپنی فیملی کی طرح ایک امن پسند لڑکا تھا مگر اس وقت مرنے مارنے پر آمادہ نظر آتا تھا۔

مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ایک چمک ابھر آئی۔ ''شاہ زیب بھائی! ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا ورنہ یہ لوگ اس طرف بھی چڑھ دوڑیں گے۔'' اس کی آواز صورتِ حال کی سنگینی کے سبب کانپ رہی تھی۔

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ وہ چاروں طرف دندناتے پھر رہے ہیں۔ کسی بھی وقت ہلا بول سکتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''کوئی محفوظ ٹھکانا ہے آپ کی نظر میں؟''

''میری نظر میں ہے۔'' ماریہ شستہ انگلش میں بولی۔ ''لیکن اس کے لیے ہمیں ڈی پیلس سے باہر نکلنا پڑے گا۔''

''ابھی ہم شاید نکل سکتے ہیں۔'' میں نے نیچے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس رہائشی پورشن کے عین سامنے ایک آرمڈ گاڑی کھڑی تھی۔ گاڑی کے اگنیشن میں لگی ہوئی چابی بھی مجھے صاف نظر آرہی تھی۔ گرے فورس کی اس گاڑی میں ہم یہاں سے نکلنے کی کوشش کر سکتے تھے۔ میں نے ابراہیم کو آگاہ کیا۔ اس نے میری رائے سے اتفاق کیا۔ جب وہ تینوں اپنا مختصر سامان سمیٹ رہے تھے، میں نے نگاہ بچا کر اپنا اسپائی کیمرا ڈیکوریشن پیس سے علیحدہ کر لیا۔ میں نے سیف سے کہا۔ ''تم مرنے مارنے کے لیے تڑپ رہے ہو نا، یہ شوق یہاں پورا ہو سکتا ہے۔ تیار رہو۔''

وہ بولا۔ ''مارنے کے لیے تڑپ رہا ہوں، مرنے کے لیے نہیں۔ ابھی آپ کے شاگرد نے دنیا میں دیکھا ہی کیا ہے جناب۔''

اس نے ہلکے پھلکے انداز میں جواب دیا تھا لیکن لگتا تھا کہ اندر سے اب وہ بھی کچھ دہل گیا ہے۔

میری ہدایت کے مطابق ''زینب فدا'' اور ماریہ نے خود کو لمبی چادروں میں سرتاپا چھپا لیا۔ ابراہیم نے بڑی سرعت سے ایک خادم کا لباس پہن لیا تھا۔ سر پر ایک بوسیدہ ٹوپی کے ساتھ وہ بالکل بدلے حلیے میں نظر آتا تھا۔ میں نے رائفل چیک کی اور انہیں لے کر آگے بڑھا۔ سیف سب سے پیچھے تھا۔ اس کی آنکھوں میں وہی چمک تھی جو خطرے کے کھلاڑیوں کا

خاصا ہوتی ہے اچانک مجھے خیال آیا۔ میں نے ڈاکٹر ماریہ سے پوچھا۔ ''ڈاکٹر آپ کا بچہ؟''
''وہ یہاں نہیں ہے۔ پچھلے ہفتے میں نے اسے برونائی بھیج دیا تھا۔ اس کی خالہ کے پاس۔''

ہم چند زینے طے کر کے اس رہائش گاہ کے مین دروازے تک پہنچ گئے۔ اب مشکل مرحلہ تھا۔ ہم نے پچیس تیس میٹر کا فاصلہ کھلی جگہ پر بھاگ کر طے کرنا تھا اور رہائش گاہ کے پہلو میں کھڑی آرمڈ گاڑی تک پہنچنا تھا۔ پہلے میں نے گیٹ کھول کر باہر جھانکا۔ مجھے درجنوں بپھرے ہوئے گرے فوجی نظر آئے۔ وہ فوجی گاڑیوں پر سوار اسی جانب آ رہے تھے۔ میں نے دیکھا وہ اپنے راستے میں آنے والے ہر سویلین کو بے دریغ شوٹ کر رہے تھے۔

میں نے دروازہ کھولا۔ ہم سب مقررہ سمت میں دوڑے۔ ابھی ہم آٹھ دس میٹر آگے ہی گئے تھے کہ ایک گولی آئی اور ڈاکٹر ماریہ کے اس پستہ قد ملازم کو چاٹ گئی جو ہمارے ساتھ ہی جان بچانے کے لیے بھاگا تھا۔ اسے دیکھنے کا موقع کہاں تھا...... ہم بھاگتے رہائش گاہ کے پہلو میں پہنچے اور میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ دس پندرہ سیکنڈ پہلے جو آرمڈ گاڑی وہاں موجود تھی...... وہ اب موجود نہیں تھی۔ وہ کافی دور جا چکی تھی۔ ہماری حالت اس شخص کی سی تھی جو طوفانی ژالہ باری سے بچنے کے لیے کسی شیڈ کے نیچے پناہ لے اور وہ شیڈ فوراً ہی طوفان کے زور سے ہوا میں اُڑ جائے۔

میں نے دیکھا ڈی پیلس کے پورچ کی طرف سے ایک فوجی جیپ نے یوٹرن لیا اور سیدھی ہماری جانب روانہ ہوئی۔ شاید جیپ پر موجود گرے فوجیوں نے ہمیں بھاگتے اور رکتے دیکھ لیا تھا۔

میں نے ابراہیم سے کہا۔ ''آپ بھاگیں اور مڑ کر نہیں دیکھیں، جلدی کریں۔''

ابراہیم، زینب اور ڈاکٹر ماریہ ڈی پیلس کے طویل برآمدوں کی طرف دوڑے جیپ تیزی سے قریب آ رہی تھی۔ اس پر ایک اسٹینڈ تھا اور اسٹینڈ پر M16 مشین گن نصب تھی۔ گولیوں والی سنہری بیلٹ سہ پہر کی دھوپ میں چمک رہی تھی۔ یہ بیلٹ حرکت میں آ جاتی تو یقیناً ہمارے جسموں میں درجنوں سوراخ ہو جاتے۔ صرف ایک برسٹ چلانے کا موقع تھا...... اور اپنے اکلوتے ہاتھ سے یہ برسٹ میں نے جیپ کے ڈرائیور پر چلایا۔ (سیف تب تک نشانہ ہی لے رہا تھا) جیپ تیزی سے گھومی اور کئی قلابازیاں کھا کر آگ کے گہرے زرد گولے میں بدل گئی۔

سیف نے تعجب سے میری طرف دیکھا۔ ہم اپنے ساتھیوں کے عقب میں دوڑے۔

زینب بھاگتے ہوئے گر گئی تھی۔ اس کے اٹھنے اور دوبارہ دوڑنے تک ہم ان سے جا ملے۔ زخمیوں اور لاشوں کو پھلانگتے ہوئے ہم برآمدوں تک پہنچے۔

''وہ پیچھے آرہے ہیں۔'' سیف کی ہانپی آواز میری کانوں سے ٹکرائی۔

میں نے دیکھا دو جیپیں بلا کی رفتار سے ہماری طرف آرہی تھیں۔ بے شک ہم پھنس چکے تھے۔ ابراہیم کا چہرہ بالکل زرد نظر آنے لگا۔ ہم برآمدے میں داخل ہوئے۔ یہ برآمدہ دراصل ایک راستے کی طرح تھا جس پر چھت تھی۔ یہ چھت والا راستہ احاطے کے آر پار بہت دور تک چلا گیا تھا۔ کل رات یہاں جو آرائشی گلدان رکھے گئے تھے، ان میں سے زیادہ تر اب ٹکڑوں کی شکل میں تھے اور حسرت کی تصویر نظر آتے تھے۔ سرخ قالینوں پر گلدستے بکھرے ہوئے تھے۔ شاید یہ وہی گلدستے ہوں جو کل رات یہاں کے بچوں نے بڑی معصومیت سے رائے زل اور اس کی والدہ کو پیش کیے تھے اور شاید وہ بچے بھی یہیں کہیں لاشوں یا زخمیوں میں پڑے ہوں۔ محرابی دروں والے اس برآمدے میں کئی دہشت زدہ لوگوں نے پناہ لے رکھی تھی۔ ہم برآمدے کو پار کر کے دوسری طرف کے احاطے میں اتر گئے۔ یوں لگا کہ اب کسی بھی وقت ہم پر گولیاں برس سکتی ہیں۔ اچانک دائیں طرف سے ایک بڑی بکتر بند گاڑی نمودار ہوئی اور زوردار بریک کے ساتھ عین ہمارے سامنے رکی۔ میں نے انگلی رائفل کے ٹریگر پر رکھ لی۔ گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے، پی کیپ والے شخص نے میری طرف دیکھا...... وہ انیق تھا۔

''آجاؤ شاہ زیب بھائی۔'' وہ چلایا۔

میں نے پہلے زینب اور ڈاکٹر ماریہ کو گاڑی میں دھکیلا۔ پھر ہم خود گھس گئے۔ انیق نے کلچ چھوڑا اور ایکسلریٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھاتا چلا گیا۔ ساتھ ہی اس نے اپنا ہاتھ ہارن پر رکھ دیا تھا۔

''سجاول کہاں ہے؟'' میں نے بلند آواز میں پوچھا۔

''جہاں اسے ہونا چاہیے۔''

''بکواس بند کرو۔ کہاں ہے وہ؟''

اس نے سہمنے کی ایکٹنگ کی اور بولا۔ ''یہیں پر ہے جی۔ پچھلی سیٹوں کے پیچھے۔''

جب انیق مشکل ترین حالات میں بھی ہلکا پھلکا انداز اختیار کرتا تھا، مجھے اچھا لگتا تھا۔ اس کی جی داری کی گواہی ملتی تھی۔

ایک برسٹ آیا اور گاڑی کے پہلو سے ٹکرایا۔ مجھے لگا کہ جوابی فائرنگ کی ضرورت

نہیں۔ ہم ڈی پیلس کے عظیم الشان مین گیٹ کے قریب پہنچ چکے تھے۔ وہی گیٹ جس کے سامنے کمانڈر رافغانی نے اپنی جان دے کر خود کو سرخرو کیا تھا۔

گاڑی کو تیز رفتاری سے آتے دیکھ کر گرے فورس کے دو گارڈز نے رکاوٹی لیور کو نیچے گرانا چاہا مگر میری اور سیف کی چلائی ہوئی گولیوں نے انہیں زخمی کر کے گرا دیا۔ دو مزید گارڈز کو کچلتے ہوئے ہم ڈی پیلس سے باہر نکل آئے۔

شہر کی سڑکوں پر بھی لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ کئی جگہ زخمی کراہتے اور مدد کے لیے پکارتے دکھائی دیئے لیکن میری اولین ترجیح زینب اور ابراہیم کی حفاظت تھی۔ میں نے اس یتیم، بے آسرا لڑکی کے سر پر ہاتھ رکھا تھا اور خود سے عہد کیا ہوا تھا کہ اس کو اس گرداب سے نکالنے کی پوری کوشش کروں گا۔ جہاں جہاں سے ہم گزر رہے تھے وہاں کئی عمارتوں میں شعلے بھڑک رہے تھے۔ گرے فورس کے لوگ وحشی ہو رہے تھے۔ ان کی گاڑیاں ہر طرف فراٹے بھر رہی تھیں اور اہلِ شہر میں موت کی سوغات بانٹ رہی تھیں۔ اپنے بیس تیس سپاہیوں کے قتل کی پاداش میں یہ لوگ شاید پورے جاماجی کو قبرستان بنانے کا ارادہ رکھتے تھے۔

ان مناظر سے اپنی نگاہ کو محفوظ رکھنے کے لیے زینب نے اپنا سر ابراہیم کے شانے سے ٹکا کر اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ ڈاکٹر ماریہ کی ہدایت پر انیق نے گاڑی کا رخ ایک بغلی سڑک کی طرف موڑ دیا۔ انیق گرے فورس کی وردی میں تھا مگر یہ ادھوری وردی تھی۔ اس نے کسی گرے فوجی کی جرسی اور ٹوپی پہن رکھی تھی۔ گاڑی تیزی سے جنوب کی طرف بڑھنے لگی۔

چند منٹ بعد گاڑی ایک ایسی جگہ پر رکی جو گھنے درختوں اور جھاڑ جھنکاڑ سے اٹی ہوئی تھی۔ سب سے پہلے ڈاکٹر ماریہ تیزی کے ساتھ نیچے اتری۔ اس نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ پھر ہم سب اتر آئے۔ کہیں پاس ہی بلندی پر ایک اپاچی ہیلی کاپٹر چکرا رہا تھا۔ کیا پتا ہمیں ہی ڈھونڈ رہا ہو۔ میں نے عقبی نشستوں کے پیچھے جھانکا۔ یہاں سجاول انٹاغفیل حالت میں موجود تھا۔ اس کی کنپٹی پر ایک نمایاں گومڑ نظر آ رہا تھا، جس کی سرخی اس کے رخسار تک چلی گئی تھی۔ انیق نے احتیاطاً اس کے ہاتھ نائیلون کی رسّی سے پشت پر جکڑ دیئے تھے۔ میں نے سجاول کی نبض دیکھ کر تسلی کی۔

ماریہ نے ہمیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ بیس تیس میٹر آگے ایک دراڑ نظر آئی۔ ہم دراڑ میں داخل ہوئے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہ دراڑ اسی سرنگ میں داخل ہوئی ہے، جہاں سے گزر کر میں اور قسطینا چند روز پہلے نیوسٹی کے علاقے میں داخل ہوئے تھے۔ سمندر بھی یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔

ڈاکٹر ماریہ کی ہدایت پر ہم نے ایک بڑے تکونی پتھر کو دھکیلا۔ یہ دیکھ کر شدید حیرت ہوئی کہ بیسیوں ٹن وزنی یہ پتھر صرف میرے اور انیق کے دھکیلنے سے ایک طرف سرک گیا۔ پتھر کے نیچے باقاعدہ ایک مضبوط ریلنگ لگی ہوئی تھی مگر یہ پتھر کے سرکنے کے بعد ہی نظر آتی تھی۔

''یہ تو پکا انتظام لگ رہا ہے۔'' انیق نے سرگوشی کی۔

''ہاں اس ہنگامی پناہ گاہ کا انتظام قسطینا کی ہدایت پر کمانڈر افغانی نے تین چار ماہ پہلے کیا تھا۔'' ماریہ نے آگاہ کیا۔

چند زینے اتر کر ہم ایک تنگ راستے پر مڑے اور آٹھ دس قدم چل کر ایک کمرے میں پہنچ گئے۔ ماریہ نے ایک بٹن دبا کر روشنی کی۔ ہماری آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ یوں لگا جیسے ہم ایک سرنگ سے نکل کر فائیو اسٹار ہوٹل کے ''سویٹ'' میں آگئے ہیں۔ یہاں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ ایک دیوار کے ساتھ اوپر تلے چار بیڈ فکس کیے گئے تھے۔ دوسری دیوار کے ساتھ بھی اوپر تلے اسی طرح تین بیڈ تھے۔ فریج، ایل سی ڈی اور مائیکرو اوون وغیرہ بھی دکھائی دیتے تھے۔ ساتھ ہی دوسرا کمرا تھا اور اس کمرے میں واش روم کی سہولت موجود تھی۔ اس دوسرے کمرے میں دو الماریوں کے اندر کافی سارا خشک راشن اور پانی کی بوتلیں بھری ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ اسلحہ اور میڈیکل ایڈ کا سامان بھی تھا۔ ابراہیم نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ ہمیں بکتر بند گاڑی فوراً وہاں سے ہٹا دینی چاہیے۔''

''ہاں یہ ضروری ہے۔'' انیق بولا۔ ''میں اسے کچھ فاصلے پر چھوڑ آتا ہوں۔''

ڈاکٹر ماریہ نے کہا۔ ''لیکن تم اس علاقے سے انجان ہو۔ واپسی میں بھی تمہیں دشواری ہوگی۔ میں ساتھ چلتی ہوں۔''

''او کے......لیکن سیف کو بھی لے جاؤ۔'' میں نے مشورہ دیا۔

انیق، ماریہ اور سیف کے ساتھ باہر کی طرف لپکا۔ میں نے کہا۔ ''اوئے باندر! کہاں بھاگے جا رہے ہو۔ سجاول کو نہیں اتارنا؟''

''آپ کی یادداشت بڑی تیز ہے۔ میرا خیال تھا کہ آپ بھول جائیں گے۔''

''یادداشت تو تمہاری بھی افلاطون سے کم نہیں۔ مگر دماغ میں کیڑا ہے۔'' میں نے کہا۔

ہم سرنگ کی اسی بغلی دراڑ سے باہر نکلے۔ گرانڈیل سجاول کو بمشکل گاڑی کے پچھلے دروازے سے نکالا۔ سیف اور انیق نے اپنے ہاتھوں سے ایک کرسی کی شکل بنائی۔ سجاول کو اس پر نیم دراز کیا گیا۔ میں نے اپنے اکلوتے ہاتھ سے سجاول کے جسم کو سہارا دیا۔ اسی طرح

ہم اسے پناہ گاہ میں لے آئے اور ایک بڑے بستر پر لٹا دیا۔

ہیلی کاپٹر کی آواز اب معدوم تھی۔ یہ اچھا موقع تھا۔ میں نے انیق اور ماریہ سے کہا کہ وہ فوراً گاڑی کو محفوظ فاصلے پر چھوڑ آئیں۔ سیف بھی ان کے ساتھ چلا گیا۔

زینب مسلسل صدمے کی کیفیت میں تھی۔ چاند گڑھی میں وہ پُرسکون اور خاموش زندگی گزار رہی تھی۔ اسے صرف اپنی بیماری سے لڑنا پڑتا تھا مگر اب تو وہ ایک طوفان کی زد میں تھی۔ اس بے چاری کی نگاہیں ایسے ایسے خونی مناظر دیکھ رہی تھیں کہ وہ بنیادوں تک ہل گئی تھی اور یہ ایسے مناظر تھے جو مجھ جیسے شخص کو بھی تحیر میں مبتلا کر رہے تھے۔ کٹے ہوئے ہاتھ پاؤں، تڑپتے پھڑکتے جسم، شکم سے باہر نکل آنے والی انتڑیاں اور خون کی روانی...... میری نظر میں بار بار ڈی پیلس کا ایک منظر گھوم رہا تھا۔ ایک دہشت زدہ لڑکی نے جان بچانے کے لیے اپنا سرگرے سپاہی کے پاؤں پر رکھ دیا تھا اور اس نے اسی حالت میں اسے گولی ماردی تھی۔ ابھی کچھ معلوم نہیں تھا کہ محل کے اندرونی حصے میں عورتوں، مردوں کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ ابراہیم کے ہونٹ بار بار خشک ہو رہے تھے۔ وہ اپنی والدہ، بھائی اور والد کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے اپنا سیل فون نکالا۔ اچانک ایک خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں لپکا۔ میں نے فون ابراہیم کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔ ”نہیں ابراہیم، ہم سیل فون استعمال نہیں کریں گے۔ یہ ہماری نشاندہی کر دیں گے۔“

میں نے اس کا سیل فون آف کر دیا۔ پھر اپنا اور دوسروں کے فون بھی آف کر دیئے۔

انجکشنز کا اثر ایک بار پھر ختم ہو رہا تھا۔ بازو میں کندھے سے لے کر ہاتھ تک شدید ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔ ہاتھ سوج بھی چکا تھا۔ پٹیوں کے اندر کندھے کی کیا صورتِ حال تھی، اللہ جانتا تھا یا پھر ڈاکٹر ماریہ اندازہ لگا سکتی تھی۔ میں نے سوچا کہ وہ آتی ہے تو اینٹی بائیوٹک اور دردکش کی مزید ڈوز لیتا ہوں لیکن اس سے پہلے ہی ایک اور مصیبت کا سامنا ہو گیا۔ مجھے، کہیں بالکل پاس سے کھٹ پٹ کی آوازیں آئیں، پھر کوئی بھاری مردانہ آواز میں بولا۔ یہ آواز انیق یا سیف کی ہرگز نہیں تھی۔

ابراہیم کی آنکھوں میں خوف کے سائے کچھ اور گہرے ہو گئے۔ ”کہیں...... ہمیں ٹریس تو نہیں کر لیا گیا؟“ وہ گھٹی ہوئی آواز میں بولا۔

میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ لائٹ آف کی اور اپنی ایم ایم جی سنبھال کر سلائیڈ کرنے والے پتھر کی طرف بڑھا۔ اس پتھر کو اندر سے اسٹاپ کرنے کے لیے کوئی کھٹکا وغیرہ نہیں لگایا گیا تھا۔ اسے کسی بھی وقت باہر سے کھولا جا سکتا تھا۔

لیکن کھولتا وہی جس کو پتا ہوتا کہ یہ بے ڈھنگا پتھر سرک سکتا ہے۔ میں بالکل دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ ایم ایم جی کا وزن گیارہ کلوگرام سے کم نہیں تھا۔ یہ قریباً چار فٹ لمبی تھی۔ ایسی گنز سولہ سترہ سو میٹر تک بہ آسانی ٹارگٹ کو نشانہ بنا لیتی ہیں۔ اسے ایک ہاتھ سے سنبھالنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ میں نے دوسرے بازو کی کہنی سے گن کو سہارا دے لیا اور انگلی ٹریگر پر رکھ لی۔ یکا یک بھاری بھرکم پتھر نے ایک طرف سے سلائیڈ کیا۔ پہلے ٹارچ کی روشنی نظر آئی پھر ایک وزنی فوجی بوٹ۔ ایک شخص اندر داخل ہوا۔ میں تڑپ کر سامنے آ گیا۔ اس سے پہلے کہ میں ہینڈز اَپ کی آواز بلند کرتا یا گولی چلاتا...... میری نگاہ ایک چہرے پر پڑی اور میں جامد کھڑا رہ گیا۔ یہ قسطینا تھی۔ اس کے آگے میجر وارث اور پیچھے کمانڈر فارس جان تھا۔ کمانڈر فارس جان بھی میری طرف رائفل سیدھی کر چکا تھا۔ مجھے پہچانتے ہی اس کی رائفل جیسے خود بخود جھک گئی۔ ''او برادر! آپ یہاں؟'' کمانڈر فارس جان نے کہا اور مجھ سے لپٹ گیا۔

قسطینا کے چہرے پر غم، خوشی اور تحیر کی ملی جلی کیفیت تھی۔ وہ بولی۔ ''اس کا مطلب ہے ڈاکٹر ماریہ بھی یہاں ہے۔''

''جی یور ہائی نس۔'' میں نے کہا۔ ''وہی ہمیں یہاں تک لائی ہیں۔ انیق کے ساتھ ذرا باہر گئی ہیں۔ ابھی آ جاتی ہیں۔''

''ہم تمہارے لیے بہت پریشان تھے۔'' قسطینا دکھی آواز میں بولی۔ ''وہاں ڈی پیلس میں بہت برا ہو رہا ہے۔ اوپر والا عزت مآب اور پھوپی جان کی فیملی پر رحم کرے......''

اسی دوران میں ابراہیم بھی اندرونی دروازے پر نظر آیا۔ وہ اسی خادم والے لباس میں تھا۔ قسطینا جلدی سے آگے بڑھی اور ''بھائی'' کہہ کر اسے گلے سے لگا لیا۔

ابراہیم نے کہا۔ ''سسٹر! والد اور والدہ کا کچھ پتا چلا؟''

''نہیں ابراہیم! بس دعا کرو۔ وہاں سب کچھ کنٹرول سے باہر ہے۔ ایجنسی کی سازش کامیاب رہی ہے۔ انہوں نے بھائیوں کو بھائیوں کے خون کا پیاسا بنایا ہے۔ رائے زل اور ہانا وانی ان کے آلۂ کار بنے ہوئے ہیں۔ انہوں نے گرے فورس میں اتنی نفرت بھری ہے کہ وہ سب کچھ برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کو بھی معاف نہیں کر رہے۔ میں ہرگز آنا نہیں چاہتی تھی لیکن...... یہ دونوں...... انہوں نے مجھے مجبور کر دیا۔''

اس کا اشارہ کمانڈر فارس اور میجر وارث کی طرف تھا۔

''آپ کا زندہ اور محفوظ رہنا ضروری ہے یور ہائی نس، ورنہ جاما جی بالکل بے سہارا ہو جائے گا۔'' میجر وارث نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔

اسی دوران میں قسطینا کی نگاہ دوسرے کمرے میں موجود سجاول پر پڑ گئی۔ وہ بستر پر بے ہوش پڑا تھا۔ وہ حیران رہ گئی۔ ''یہ کون ہے؟''

''میرا وہی دوست جو اسپتال پر ہونے والے حملے میں گم ہوا تھا۔''

قسطینا نے اسے سرتاپا دھیان سے دیکھا۔ ''اچھا...... یہ ہے وہ جسے پھوپھو نورل بھائی کہتی ہیں...... لیکن...... یہ یہاں کیسے پہنچا...... اور اس نے گرے فورس کی وردی......''

''یہ ذرا لمبی کہانی ہے۔ آپ کو تفصیل سے بتاتا ہوں......''

اس سے پہلے کہ قسطینا مزید کچھ کہتی ایک بار پھر کمرے سے باہر کھٹ پٹ کی آوازیں آئیں۔ ڈاکٹر ماریہ کی سریلی آواز ہم نے پہچان لی۔ میں نے آگے بڑھ کر سلائیڈنگ پتھر کو حرکت دی۔ حیرانی ہوتی تھی کہ یہ پتھر اتنی آسانی سے حرکت کرتا تھا۔

اینق، سیف اور ماریہ اندر آ گئے۔ ماریہ نے قسطینا کو دیکھا اور دوڑ کر اس سے لپٹ گئی۔ دونوں غم واندوہ کی تصویر تھیں۔ شہر کی طرف اب بڑے دھماکے سنائی دے رہے تھے اور ہیلی کاپٹرز کی پروازیں بھی جاری تھیں۔

قسطینا نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''عزت مآب نے رات کو ایک اور غلطی کی۔ انہوں نے گرین فورس کے زیادہ تر یونٹوں کو چھاؤنی میں بھیج دیا...... وہ چاہتے تھے کہ خیرسگالی کی فضا خراب نہ ہو جائے۔ اب ان تمام یونٹوں کو چھاؤنی کے اندر ہی بند کر دیا گیا ہے ان لوگوں کے پاس ایمونیشن نہ ہونے کے برابر ہے۔ جو دستے باہر تھے انہیں بھی گھیر کر غیر مسلح کر دیا گیا ہے۔ اب ہر طرف گرے فوجی اور ایجنسی کے سفید سؤر ہی دندنا رہے ہیں۔''

میجر وارث نے اپنی چوڑی ٹھوڑی کو کھجا کر انگلش میں کہا۔ ''ان ساری خبروں میں بس ایک چھوٹی سی خبر کو کچھ امید افزا کہا جا سکتا ہے۔ پتا چلا ہے کہ ایجنسی کے امریکن گارڈز نے عزت مآب اور بیگم نورل کو اپنی حفاظت میں لے لیا ہے۔ گرے فوجی ان تک نہیں پہنچ سکیں گے۔''

دفعتاً میرا دھیان ماریہ کے فون پر گیا۔ میں نے کہا۔ ''ہم کو اپنے فون آف کر دینے چاہئیں یہ ہماری لوکیشن بتائیں گے۔''

''ہاں، یہ بالکل ٹھیک بات ہے۔'' قسطینا نے تائید کی اور اپنا فون نکال کر آف کر دیا۔ ڈاکٹر ماریہ نے بھی آف کر دیا۔ مگر آف کرنے سے پہلے اس نے قسطینا کو کچھ دکھایا بھی۔ قسطینا اور ڈاکٹر ماریہ کی طرح دیگر نے بھی فون آف کر دیئے۔ یہی وقت تھا جب کمانڈر فارس جان کی نگاہ دوسرے کمرے میں بیٹھی زینب پر پڑ گئی اور وہ بالکل ہلدی نظر آنے لگا۔ اس نے

آنکھیں سکیڑ کر دوبارہ زینب کو دیکھا۔ زینب نے چہرہ پھیر لیا تھا مگر تب تک فارس جان کو پتا چل چکا تھا کہ یہ ابراہیم کی وہی دلہن ہے جو چند دن پہلے موت سے ''ہمکنار'' ہو چکی ہے۔ مجھے میجر وارث کے چوڑے چکلے چہرے پر بھی ہوائیاں اُڑتی نظر آئیں۔ اس نے بھی زینب کو دیکھا تھا۔ ''یہ ام...... کیا...... دیکھ رہا ہے...... برادر؟'' فارس جان نے نہایت تحیر آمیز سرگوشی کی۔ ''کک...... کہیں امارا آنکھیں دھوکا تو نہیں کھا رہا؟''

پھر فارس جان نے میجر وارث کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اسی کی طرح حیرت کے سمندر میں ہچکولے کھا رہا تھا۔ میں ان دونوں کو بازو سے تھام کر اس چیمبر کے گیلری نما کمرے میں لے گیا۔

''کیا ہماری نگاہیں دھوکا کھا رہی ہیں؟'' میجر وارث نے سنسناتی آواز میں پوچھا۔

''نہیں میجر! آپ ہز ہائی نس کی دلہن کو ہی دیکھ رہے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ زندہ ہے۔'' دونوں کے منہ شدید تعجب کے سبب کھلے تھے۔

میں نے انہیں مختصر ترین الفاظ میں اصل صورتِ حال کے متعلق اہم باتیں بتائیں اور آگاہ کیا کہ عزت مآب کی ضد کی وجہ سے زینب فدا کسی سازش کا شکار ہوئی تھی۔

اسی دوران میں بڑے کمرے کے اندر اُٹھا پٹخ کی آوازیں آنا شروع ہوئیں۔ ''شاہ زائب! جلدی آؤ۔'' قسطینا نے پکارتے ہوئے کہا۔

میں کمرے میں پہنچا تو گرانڈیل سجاول بستر سے اٹھنے کے لیے مچل رہا تھا۔ کبڈی شاہ سیفی نے اسے بازوؤں میں کسا ہوا تھا اور انیق نے اس کی ٹانگیں دبوچ رکھی تھیں۔ شکر کا مقام تھا کہ اس کے ہاتھ ابھی تک پشت پر بندھے تھے ورنہ وہ ان دونوں میں سے کسی ایک کا جبڑا تو ضرور توڑ دیتا اور غالب امکان یہی تھا کہ انیق کا توڑتا۔ انیق کو دیکھ کر ہمیشہ سے اس کا پارہ چڑھ جاتا تھا، اور اب تو ویسے بھی وہ اپنے حواس میں نہیں تھا۔

اس کی شرابی نگاہیں مجھ پر پڑیں تو آنکھوں میں کچھ اور بھی خون اتر آیا۔ عجیب آواز میں دہاڑا۔ ''چھوڑوں گا نہیں تجھے...... مار ڈالوں گا۔ زندہ جلا دوں گا۔ یہ سب تیری وجہ سے ہے۔'' آخر میں اس نے ایک بھاری بھرکم گالی بھی میری طرف اچھالی۔

اس نے اتنا زور لگایا کہ سیفی سمیت فرش پر گر پڑا۔ سیفی نے پھر بھی اسے چھوڑا نہیں۔ ہاں انیق اس کی ٹانگیں کھا کر دور جا گرا...... اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ جیسے پوچھ رہا ہو کہ، حکم ہو تو کوئی کاری چوٹ لگاؤں اُمر یش پوری کو؟

اب کی بار کمانڈر فارس جان اور انیق نے مل کر سجاول کی ٹانگیں دبوچیں۔ میں نے اس

کا چہرہ دونوں ہاتھوں سے پکڑتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں کیا ہوا ہے سجاول! ہمیں ہمارا قصور تو بتاؤ۔ ہم تو دیوانوں کی طرح تمہیں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ ہر پل تمہارے لیے پریشان رہے ہیں۔''

''بکواس بند کرو۔ میں تمہیں بڑی چنگی طرح پہچان گیا ہوں...... تم نے میری زندگی تباہ کر دی۔ تم میری ماں کے قاتل ہو۔ وہ تمہاری وجہ سے مری ہے۔ میں نے تم سے کہا تھا...... میں نے کہا تھا...... تمہاری وجہ سے اسے کچھ ہوا تو میں نہیں چھوڑوں گا تمہیں۔''

وہ ایک بار پھر میری طرف جھپٹا، مگر سیفی کا جن چھا بے مثال تھا۔ سجاول مسلسل بول رہا تھا۔ پتا نہیں کیا کیا اول فول کہہ رہا تھا۔ اس کی نگاہ انیق پر پڑتی تھی تو بھی اس کی آنکھوں میں بجلی سی کوند جاتی تھی۔ میں نے ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ ایک اجنبی کی آنکھیں تھیں۔ وہ کسی اثر میں تھا۔ پتا نہیں کیوں ہاناوانی کا تصور ابھر کر میرے سامنے آ گیا۔ اس کے بارے میں یہی تو کہا جاتا تھا، وہ لوگوں کے ذہن بدل دیتی ہے۔ انہیں اپنا مطیع کر لیتی ہے۔ تو کیا سجاول کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہو چکا تھا......؟

وہ جنونی لہجے میں بول رہا تھا۔ ''تو نے میری ماں کو دھوکا دیا۔ میری بھتیجی کو دھوکا دیا۔ اس سے شادی کے جھوٹے وعدے کیے...... وہ کون تھی؟ وہ سجاول سیالکوٹی کی بھتیجی تھی۔ وہ مر گئی...... ماں بھی مر گئی۔ تمہیں بھگتنا پڑے گا، تمہاری نسلوں کو بھگتنا پڑے گا۔''

میں نے ڈاکٹر ماریہ کو اشارہ کیا۔ وہ جیسے پہلے سے ہی منتظر تھی۔ وہ میڈیکل ایڈ والی الماری کی طرف گئی۔ دو منٹ بعد وہ ایک انجکشن لیے نمودار ہوئی اور سجاول کے توانا بازو میں انجیکٹ کر دیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اس کی پلکیں بوجھل ہونے لگیں۔ اس کی مزاحمت کمزور پڑ گئی اور پھر اس نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیئے۔

سب متحیر اور گم صم تھے۔ ان سب نے دیکھا تھا کہ سجاول اپنے حواس میں نہیں۔ اور ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ کسی دوا کے زیر اثر ہو یا اس نے کوئی نشہ وغیرہ کر رکھا ہو۔ وہ ایک غیر معمولی مدہوشی میں تھا۔ ڈاکٹر ماریہ نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ ہم اسی گیلری نما چھوٹے کمرے میں آ گئے۔ وہ دروازہ بند کر کے میرے سامنے بیٹھ گئی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''آپ نے اپنے دوست کو اس حالت میں دیکھا ہے اور حیران ہوئے ہیں۔ ہم اس سے پہلے بھی کئی لوگوں کو اس سے ملتی جلتی کیفیت میں دیکھ چکے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کو مادام ہاناوانی سے خاص ملاقات کا شرف حاصل ہوتا ہے۔ وہ لوگوں کو اپنے اثر میں لے لیتی ہے......''

میں نے حیران ہو کر کہا۔ ''ماریہ آپ تو ڈاکٹر ہیں۔ آپ سے تو صرف اسی بات کی توقع کی جاسکتی ہے جو سائنس کے مطابق ہو۔''

''ہپناٹزم بھی تو ایک سائنس ہے، یہ پیرا سائیکالوجی کا وہ شعبہ ہے جس میں دن رات تحقیق ہو رہی ہے اور آئے دن نئے اسرار سامنے آرہے ہیں۔ بڑے بڑے سائیکاٹرسٹ، نیورو فزیشن اور مینٹل ہیلتھ ریسرچر یہ اعتراف کر رہے ہیں کہ انسانی ذہن کی دنیا لامحدود ہے۔ ہم فی الوقت ایک سمندر کے کنارے پر کھڑے ہیں۔''

''آپ کہنا چاہ رہی ہیں کہ میرا دوست کسی ٹرانس میں ہے؟''

''کوئی معمولی ٹرانس نہیں۔ ابھی تفصیل بتانے کا وقت نہیں۔ میں آپ کو پھر بتاؤں گا۔''

میں نے کہا۔ ''وہ جو باتیں کر رہا تھا وہ تو......''

''وہ باتیں حقیقت میں نہیں ہیں۔'' ڈاکٹر ماریہ نے میری بات کاٹی۔ ''وہ باتیں اس کے ذہن میں بٹھائی گئی ہیں۔ وہ وہی کچھ دیکھ رہا ہے جو اسے دکھایا جارہا ہے۔'' ماریہ کی آواز میں عجیب سی لرزش تھی۔

''لیکن کسی کو کیا معلوم کہ اس کی ماں اور بھتیجی......''

''کیا پتا کسی ''سجیشن'' کے ذریعے یہ سب کچھ تمہارے دوست سے ہی اگلوایا گیا ہو۔'' ماریہ نے پھر میری بات کاٹی اور اپنی بات جاری رکھی۔ ''ہپناٹزم اور مسمریزم پرانے الفاظ ہیں لیکن اب یہ علوم ایک نئے دور میں داخل ہو رہے ہیں۔ بے حد حیران کن اور ٹھوس صورت میں سامنے آرہے ہیں۔''

اچانک مجھے اور ڈاکٹر ماریہ کو ٹھٹکنا پڑا۔ اس پناہ گاہ کے بڑے کمرے سے قسطینا کی پریشان کن آواز ابھری تھی۔ ''او گاڈ...... او مائی گاڈ۔'' اس نے کہا۔

اس کے ساتھ ہی کمانڈر فارس جان اور میجر وارث بھی ایک ساتھ کچھ بولے تھے۔ میں اور ڈاکٹر ماریہ بڑے کمرے میں پہنچے۔ یہاں ایل سی ڈی پر مقامی چینل آن تھا۔ جو خبر اسکرین پر چل رہی تھی وہ بڑی دلدوز تھی۔ بریکنگ نیوز کے ساتھ نیوز کاسٹر چلا رہی تھی۔ ''ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا...... لیکن اطلاعات یہی آرہی ہیں کہ عزت مآب پر حملہ ہوا ہے۔ ان کے شدید زخمی ہونے کی اطلاعات ہیں۔ بیگم نورل کے زخمی ہونے کی اطلاعات بھی ہیں۔ کہا جارہا ہے کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے گرے فورس کے کچھ سپاہی، ایجنسی والوں کا حفاظتی گھیرا توڑ کر عزت مآب تک پہنچے ہیں۔''

دوسری نیوز کاسٹر مزید سنسنی خیز لہجے میں چلائی۔ ''ہم آپ کو تازہ ترین اطلاع دے رہے ہیں...... ہم بڑے افسوس کے ساتھ اعلان کر رہے ہیں۔ ہمارے باوثوق ذرائع بتا رہے ہیں کہ عزت مآب ریان فردوس اپنے محل کے اندر شدید زخمی ہو چکے ہیں۔ گرے فورس کے مشتعل سپاہی ان کے بیڈ روم کا دروازہ توڑ کر اندر گھسے ہیں۔ وہاں کئی فائر بھی سنائی دیئے ہیں...... صورتِ حال نازک ہے۔''

یکایک اسکرین پر بڑے بڑے سرخ حروف میں یہ دردناک الفاظ ابھرے...... ہم بڑے دکھ کے ساتھ آپ کو یہ اطلاع دے رہے ہیں کہ عزت مآب اب ہم میں نہیں رہے۔

نیوز کاسٹر چلانے والے انداز میں بولی۔ ''جی ہاں، ہم اپنے ناظرین تک بڑے دکھ سے یہ افسوس ناک خبر پہنچا رہے ہیں۔ عزت مآب اب ہم میں نہیں رہے۔ ذرائع کے مطابق ان کے سینے اور سر میں کم از کم دس گولیاں لگی ہیں۔ پہلے خبر آئی تھی کہ وہ شدید زخمی ہیں مگر اب بتایا جا رہا ہے کہ وہ دم توڑ گئے ہیں۔ بیگم نورل اور ان کے دونوں بچوں کے بارے میں بھی کچھ پتا نہیں کہ وہ کہاں ہیں۔ تاہم کچھ ذرائع کا کہنا ہے کہ انہوں نے بیگم نورل کو زخمی حالت میں دیکھا ہے۔''

اسکرین پر EXCLUSIVE نیوز چل رہی تھی اور کمرے میں قسطینا سمیت جتنے بھی افراد تھے، سب سکتے میں تھے۔

دس بیس سیکنڈ بعد ایک نیوز کاسٹر بے حد جذباتی لہجے میں بولا۔ ''اور ناظرین! یہ تازہ ترین ویڈیو ہے جو ہم نے حاصل کی ہے...... آپ دیکھ سکتے ہیں...... اس میں گرے فوجیوں کو اندر گھستے اور عزت مآب پر حملہ آور ہوتے دکھایا گیا ہے۔ یہ دیکھئے...... یہ کچھ دیر پہلے کے مناظر ہیں۔ گرے سپاہی تعداد میں بہت زیادہ ہیں۔ وہ ایجنسی اہلکاروں کو دھکیلتے ہوئے عزت مآب اور بیگم نورل کی طرف بڑھ رہے ہیں......''

ویڈیو کلپ واقعی دہلا دینے والا تھا۔ کیمرے کی آنکھ نے سنسنی خیز مناظر محفوظ کیے تھے۔ فی الحال یہ مناظر بغیر کسی ایڈیٹنگ کے آن ائیر کیے جا رہے تھے۔ گرے فوجی چنگھاڑتے ہوئے ڈی پیلس کے خاص الخاص حصے میں گھسے۔ ریان فردوس اور بیگم نورل آپس میں بات کر رہے تھے۔ گرے فوجی سیدھے ان کی طرف لپکے۔ ایجنسی کے امریکن اہلکاروں نے شاہی جوڑے کو اپنے گھیرے میں لینا چاہا مگر گرے فوجیوں نے اس حفاظتی حصار کو توڑ دیا۔ تب بیگم نورل اپنے خاوند کے سامنے ڈھال بنیں۔ ان کے سر پر بے دردی سے رائفل کے بٹ مارے گئے۔ وہ گر پڑیں، صورتِ حال مخدوش دیکھ کر ریان فردوس اپنے بیڈ روم کی طرف

بھاگا۔ اس نے بیڈروم میں گھس کر دروازے کو اندر سے بولٹ کرنا چاہا، لیکن اس سے پہلے کہ دروازہ مکمل طور پر بولٹ ہوتا، گرے فوجی اسے دھکیلتے ہوئے بیڈروم میں گھس گئے۔ ریان فردوس کے چہرے پر رائفل کے دستے سے جو تباہ کن ضرب لگائی گئی وہ ٹی وی اسکرین پر صاف نظر آئی۔ ریان فردوس کی مخملی ٹوپی اچھل کر دور جا گری تھی۔ اس کے بعد اوپر تلے پانچ چھ فائر سنائی دیئے اور بیگم نورل کے دردناک انداز میں رونے کی آوازیں آئیں۔''

اس فوٹیج کو بڑی تیزی سے اسکرین پر بار بار دکھایا جانے لگا۔ ساتھ ساتھ نیوز کاسٹرز کا واویلا جاری تھا۔ وہ اب پورے یقین کے ساتھ ریان فردوس کی موت کی تہلکہ خیز اطلاع دے رہے تھے۔

میں نے دیکھا ابراہیم ہچکیوں سے رو رہا تھا۔ زینب اس کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی۔ قسطینا بھی دونوں ہاتھوں میں سر پکڑ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ یہ ایک برا دن تھا۔ بہت برا دن تھا۔ جارحیت کے سامنے کمزوری اور امن پسندی کا دوسرا نام موت ہے۔ یہ بات آج ثابت ہو رہی تھی۔

ایل سی ڈی کی جہازی سائز اسکرین پر مختلف مناظر دکھائے جا رہے تھے۔ چینل کا نمائندہ مائیک اور کیمرا مین کے ساتھ تہلکہ خیز مناظر کو آن ائیر کر رہا تھا۔ ایک جگہ گرے فوجی، زخمیوں کو فائرنگ کے ذریعے اذیت سے نجات دلا رہے تھے۔ ایک جگہ دو دو، تین تین سالہ بچوں کی حسرت ناک لاشوں پر کچھ عورتیں نوحہ کناں تھیں۔ پس منظر میں تابڑ توڑ فائرنگ کی آوازیں تھیں۔ ایک لرزہ خیز منظر میں دکھایا گیا کہ ٹریفک جام میں درجنوں کاریں پھنسی ہوئی تھیں۔ چند گرے فوجیوں نے ایک پرائیویٹ گاڑی میں سے ایک نوجوان لڑکی کو گھسیٹ کر باہر نکالا اور اس کے وارثوں کے سامنے اسے اپنی گاڑی میں ڈال لیا۔ لڑکی کے ایک عمر رسیدہ وارث نے مزاحمت کی تو اس کی دونوں ٹانگوں میں گولیاں مار کر اسے سڑک پر لمبا لٹا دیا گیا۔

''بند کر دو...... اسے بند کر دو۔'' قسطینا دہاڑی۔

فارس جان نے ریموٹ کنٹرول اٹھا کر ایل سی ڈی آف کر دی۔

قسطینا کی آنکھوں میں آتشیں آنسو تھے۔ وہ بولی۔ ''یہ سب ڈراما ہے۔ کسی نے عزت مآب کو بچانے کی کوشش نہیں کی۔ ان حرامی ایجنسی والوں نے صرف لوگوں کو مطمئن کرنا چاہا ہے۔''

''آپ بالکل درست کہہ رہی ہیں۔'' میجر وارث نے تائید کی۔ ''وڈیو میں بھی صاف نظر آ رہا ہے، انہوں نے دکھاوے کے طور پر گرے سپاہیوں کو روکا ہے، کسی نے ایک گولی بھی

نہیں چلائی، یہ سب ناٹک ہے۔"
قسطینا آنسو پونچھتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ ابراہیم، زینب، ڈاکٹر ماریہ، فارس جان سب ماتمی کیفیت میں تھے۔ ہمارا حالات سے باخبر رہنا ضروری تھا۔ شہر پر گن شپ ہیلی کاپٹرز پرواز کر رہے تھے اور گاہے بگاہے فائرنگ کی آوازیں بھی آتی تھیں۔ میں نے ایل سی ڈی دوبارہ آن کر دی۔ تاہم اس کی آواز مدھم رکھی۔ نیوز میں کرفیو کی بات کی جارہی تھی اور لوگوں سے کہا جارہا تھا کہ وہ اپنے گھروں میں رہیں۔
پھر اچانک اسکرین پر آقا جان کی صورت نظر آئی۔ وہ زاروقطار رو رہا تھا۔ سفید رومال سے بار بار اپنی ناک اور اپنا گنجا سر پونچھ رہا تھا۔
اینکر نے پوچھا۔"جناب! آپ کا کیا خیال ہے، ایجنسی کے درجنوں مسلح گارڈز عزت مآب کی جان کیوں نہ بچا سکے، لوگ کہتے ہیں کہ گارڈز کی طرف سے قرار واقعی مزاحمت دیکھنے میں نہیں آئی؟"
"یہ بالکل غلط ہے۔" آقا جان گلوگیر آواز میں بولا۔"ایجنسی پوری ذمے داری سے عزت مآب کی حفاظت کر رہی تھی اور انہیں اس ڈیوٹی کے لیے کسی نے مجبور نہیں کیا تھا۔ یہ ذمے داری ایجنسی نے خود اٹھائی تھی۔"
"تو پھر یہ سب کیسے ہوا؟ کہاں کوتاہی ہوئی؟"
"یہ بات تو طے ہے کہ عزت مآب پر حملہ کرنے والے فسادی فوجی باہر سے ڈی پیلس میں نہیں گھسے۔ یہ پہلے سے محل میں موجود تھے اور کسی قریبی جگہ چھپے ہوئے تھے۔ ان کا چارج اتنا شدید اور اچانک تھا کہ ایجنسی کے گارڈز فوری ری ایکشن نہ دے سکے۔"
"اُلو کا پٹھا...... حرام زادہ۔" کمانڈر فارس جان دانت پیس کر بولا۔"یہ غدار ابنِ غدار ہے۔ حرامی مگرمچھ کے آنسو بہا رہا ہے۔ ام کو یقین ہے کہ اس نے کتے کا موت مرنا ہے...... ایک دن پھانسی کا پھندا اس کے گلے میں ہوگا اور لوگ اس کے جسم پر جوتیاں برسائے گا۔" اس کا یہ تبصرہ آقا جان کے لیے تھا۔
اسکرین پر آقا جان اب مقامی لوگوں سے اپیل کر رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔"یہاں جو کچھ بھی ہوا چند شرپسندوں کی وجہ سے ہوا ہے۔ ان لوگوں کی حماقت نے بھائی چارے کی اس بے مثال فضا کو تباہ و برباد کر دیا جو کل رات تک یہاں موجود تھی۔ بہت سے بے گناہ لوگوں کی جانیں گئی ہیں اور مزید نقصانات کا اندیشہ ہے۔ میری اپنے لوگوں سے درخواست ہے کہ وہ عزت مآب کی موت کے صدمے کو صبر اور حوصلے کے ساتھ برداشت کریں اور شرپسندوں کی

چالوں سے بچیں۔"

اینکر نے کہا۔"جناب! ابھی تک عزت ماب کی فیملی کے بارے میں واضح اطلاعات نہیں ہیں۔ بیگم نورل، ہز ہائی نس ابراہیم اور کمال احمد وغیرہ کہاں اور کس حال میں ہیں؟"

"اللہ کا شکر ہے کہ بیگم نور محفوظ ہیں۔ انہیں کچھ زخم آئے ہیں اور وہ اسپتال میں ہیں۔ ابراہیم اور کمال احمد کے بارے میں صورتِ حال ابھی غیر یقینی ہے مگر بہت جلد ان کی خیریت کی تصدیق بھی ہو جائے گی۔"

"جناب! کہا جا رہا ہے کہ کمال احمد گرے فورس کی حراست میں ہیں اور وہ بھی شدید زخمی ہیں؟"

"یہ سب افواہیں ہیں۔" آقا جان نے اپنی ناک پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔"میں یہی تو گزارش کر رہا ہوں کہ شر پسندوں کی باتوں میں نہ آئیں۔"

"یہ بھی کہا جا رہا ہے جی کہ ایکسی لینسی رائے زل نے ان تمام افراد کو فوری گرفتار کرنے کا حکم دے دیا ہے جن پر کسی بھی طرح کے جنگی جرائم کا شبہ ہے۔ ان کو سرسری سماعت کے بعد پھانسیاں لگائے جانے کا پروگرام ہے۔"

"یہ سب افواہیں ہیں، نو کمنٹس۔"

"بتایا جا رہا ہے کہ عبدالکریم اور بیس دیگر شہریوں کو اہم جنگی مجرم قرار دے دیا گیا ہے اور ان کے سر کی قیمت مقرر کی جا رہی ہے؟"

"ابھی اس بارے میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں ہوا۔ جیسے ہی کوئی فیصلہ ہوا آپ کو آگاہ کیا جائے گا۔ تھینکس۔" آقا جان نے کہا اور جان چھڑا کر ایک طرف نکل گیا۔ اس کے قریبی ساتھی عقب میں تھے اور ان میں تھری پیس سوٹ والا حلمی بھی تھا۔ بظاہر مغموم لیکن اندر سے یقیناً مسرور۔ ایک جگہ مظاہرین کی ایک چھوٹی سی ٹولی کو دکھایا گیا جو ریان فردوس کے قتل پر ڈرا ڈرا احتجاج کر رہی تھی۔

وہ رات بڑی سنسنی خیز اور تشویش ناک تھی۔ ہم اس محفوظ پناہ گاہ میں تھے لیکن شہر جنگ کے قاتل بادلوں میں چھپا تھا۔ میرے ذہن میں کئی سوال بری طرح چبھ رہے تھے۔ ہم یہاں کب تک محفوظ رہیں گے؟ سجاول کا کیا بنے گا؟ کیا وہ جلدی اپنے حواس میں واپس آ جائے گا؟ ڈاکٹر ماریہ نے اس کے بارے میں جو تبصرہ کیا وہ کس حد تک درست ہے۔ قسطینا اب کیا سوچ رہی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

○.....❖.....○

رات کا دوسرا پہر تھا۔ میں نے دیکھا قسطینا اور ماریہ ایک طرف صوفے پر بیٹھی سرگوشیاں کررہی ہیں۔ ڈاکٹر ماریہ بار بار اپنے آنسو پونچھنے لگتی تھی۔ میرے کندھے کا درد پھر پریشان کررہا تھا لیکن نہ جانے کیا بات تھی اب درد میں شدت کم تھی۔ خدا خدا کرکے قسطینا اور ماریہ کی باتیں ختم ہوئیں اور میں نے ماریہ کو اپنی طرف بلایا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ میری ''بینڈ تج'' چیک کرے۔ یہاں میڈیکل بلکہ سرجری کا سامان بھی موجود تھا لیکن سرجری یہاں کیسے ہوسکتی تھی۔ ڈاکٹر ماریہ نے میرے بازو کے زخموں کو صاف کرنے اور نئی پٹیاں باندھنے میں قریباً آدھ گھنٹا لگایا۔

میں نے کہا۔ ''ویسے میرا درد اب کم ہے۔''

''اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ ٹھیک ہورہے ہیں۔''

''یہ مطلب ہے ڈاکٹر؟''

''یلشن کنٹرول ہوگیا ہے اور پین کلر کام کررہی ہیں۔''

''مطلب یہ کہ ابھی ایسا چل سکتا ہے؟''

''ممکن ہے کہ آپ کی ہڈی غلط جڑنا شروع ہوگئی ہو۔ ایسی صورت میں بھی علاج تو کرانا پڑتا ہے۔ ورنہ زندگی بھر کی معذوری حصے میں آجاتی ہے۔''

''آپ کچھ پریشان لگ رہی ہیں۔'' میں نے بات بدلتے ہوئے کہا۔

''کیا یہاں کوئی ایسا بھی ہے جو پریشان نہیں ہے؟''

''لیکن آپ کچھ زیادہ ہیں۔ کہیں بچے کی فکرمندی تو نہیں؟''

''بچے کی فکرمندی کس ماں کو نہیں ہوتی۔'' اس نے اپنے بالوں کی براؤنش لٹوں کو کانوں کے پیچھے اڑستے ہوئے کہا۔ ''پھر یہاں جو حالات ہیں وہ بھی تو سب کے سامنے ہیں مسٹر شاہ زیب۔''

مگر...... میں نے کچھ نوٹ کیا تھا اور جو میں نے نوٹ کیا تھا وہ مسلسل ذہن میں کچوکے لگا رہا تھا۔ جب میں نے سب کو فون بند کرنے کے لیے کہا تھا، اس وقت ڈاکٹر ماریہ اپنے فون کی اسکرین کو بڑے ٹھٹکے ہوئے انداز میں دیکھ رہی تھی اور اس نے یہ اسکرین قسطینا کو بھی دکھائی تھی۔

میری مرہم پٹی کے کچھ ہی دیر بعد ماریہ سکون بخش گولیاں کھا کر سوگئی۔ ابراہیم مسلسل نوافل پڑھ رہا تھا۔ زینب گٹھڑی سی بنی ایک کونے میں پڑی تھی۔ شہر کے طول و عرض سے اس پہر بھی فائرنگ کی صدائیں آرہی تھیں۔ کسی وقت کوئی بڑا دھماکا بھی سنائی دے جاتا تھا۔ اسی

دوران میں مجھے قسطینا سے بات کرنے کا موقع ملا۔ میں نے کہا۔ ''ایک سوال پوچھوں ناراض تو نہیں ہوں گی؟''

وہ سرخ آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ ''پوچھو۔''

''ڈاکٹر ماریہ بہت گم صم ہیں۔ ان کے ساتھ کوئی خاص مسئلہ ہے؟''

''اس نے کوئی بات کی ہے تم سے؟''

''اس نے تو نہیں کی۔ مگر مجھے لگتا ہے کہ کوئی بات ہے۔ آپ نے کل رات استقبالیہ جشن کے وقت بتایا تھا کہ بیگم نورل نے آپ اور ماریہ کو کھانے پر طعام گاہ میں بلایا ہے اور مجھے یہ بھی پتا چلا تھا کہ آپ ماریہ کو وہاں رائے زل کے سامنے لے جانا نہیں چاہتیں۔ مجھے اس حوالے سے ماضی کی کچھ سن گن بھی ملی ہے......''

''مجھے لگتا ہے کہ تمہاری سونگھنے کی حِس ضرورت سے زیادہ تیز ہے۔''

''اگر آپ دیکھنے کی حِس کی بات کرتیں تو شاید زیادہ بہتر ہوتا۔''

''کیا مطلب؟''

''جب چند گھنٹے پہلے آپ یہاں پناہ گاہ میں آئیں تو میں نے ڈاکٹر ماریہ کو اپنے سیل فون کی اسکرین دیکھ کر چونکتے دیکھا تھا اور ڈاکٹر ماریہ کے ساتھ آپ بھی بری طرح چونکی تھیں...... کیا کوئی برا ''میسج'' تھا؟''

قسطینا کی آنکھوں میں پہلے جلالی کیفیت نظر آئی۔ پھر وہ ٹھنڈی سانس بھر کر میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے لوہا گرم دیکھ کر چوٹ لگائی۔ ''اگر آپ مجھے کچھ بتائیں گی تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ وہ مجھ تک محدود رہے گا۔''

وہ یک ٹک مجھے دیکھتی چلی گئی۔ بول کچھ نہیں رہی تھی۔ ٹیوب لائٹ کی روشنی میں ایک خوبرو لڑکا نظر آ رہی تھی مگر اس خوبرو لڑکے کے اندر جو ذہین اور جنگجو عورت چھپی تھی، اس سے میں بخوبی آگاہ ہو چکا تھا...... ہماری خاموشی طویل اور بوجھل ہوتی چلی گئی۔ اس سے پہلے کہ میں کسی بہانے اس خاموشی کو توڑتا، وہ بول اٹھی۔ ''یہ رائے زل پرلے درجے کا مطلب پرست اور شیطان صفت آدمی ہے۔ اپنی ضد پوری کرنے کے لیے ہر حد تک جاتا ہے۔''

''کیا...... اس نے...... ڈاکٹر ماریہ کے حوالے سے کوئی پیغام بھیجا ہے؟'' میں نے بھی قسطینا کی طرح مدھم آواز میں پوچھا۔

''ہاں۔'' وہ سرگوشی کے سے انداز میں بولی۔ ''وہ اسے بلا رہا ہے۔ کہہ رہا ہے کہ اگر ماریہ نے اس کی بات نہیں مانی تو وہ اپنے غم و غصے کو سنبھال نہیں سکے گا۔ اس کا خمیازہ ڈاکٹر

ماریہ کے قریبی عزیزوں بلکہ پورے شہر کو بھگتنا پڑے گا...... اگر وہ آجاتی ہے تو وہ پچھلی ہر بات کو بھول جائے گا اور اس کے ساتھ کسی طرح کی کوئی زبردستی نہیں ہوگی۔"

قسطینا نے نفرت سے ڈسٹ بن کی طرف تھوک دیا۔ بولی۔"اس سے بڑی زبردستی کیا ہوگی کہ وہ جس کی شکل دیکھنا نہیں چاہتی اس کے پاس چلی جائے گی۔ وہ ایک تین سالہ بچے کی ماں بن چکی ہے۔ چار پانچ سال سے زیادہ گزر چکے ہیں ان باتوں کو، لیکن وہ اب بھی اپنی سوئی کو وہیں پر اٹکا رہا ہے۔"

میں نے دس پندرہ فٹ کے فاصلے پر سوئی پڑی ڈاکٹر ماریہ کو دیکھا۔ وہ بہت خوب صورت نہیں تھی۔ عمر بھی اب تیس کے نزدیک تھی۔ تاہم اس کے چہرے پر ایک ذہانت آمیز دلکشی موجود تھی۔ جسم بھرا ہوا اور چہرے کی جلد میں گندمی اور گورے پن کا شفاف امتزاج تھا۔ وہ جیسے نیند کی حالت میں بھی کسی شدید بے چینی میں تھی۔

"آپ نے کیا سوچا ہے اس سلسلے میں؟"

قسطینا کے حساس نتھنے بے ساختہ پھول گئے وہ بولی۔"میں......اس کو...... بھیجنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔"

"اگر ایسا ہے تو پھر ڈاکٹر ماریہ کہیں نہیں جائے گی۔" میں نے کہا۔ میرے اندر کے انگارے دہک اٹھے۔ غصیلے مرد کی جانب سے عورت کی تذلیل اور بے حرمتی کا خیال مجھے ہمیشہ اندر سے دہکا دیتا تھا۔ برسوں پہلے گاڑی کے اندر میری دوست ڈیزی کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا وہ کبھی میرے ذہن سے نکل نہیں سکا تھا۔

"تو کیا کرو گے تم؟" قسطینا نے مجھ سے پوچھا۔

"کچھ بھی کیا جا سکتا ہے۔ رائے زل کی شہ رگ بھی ناپی جا سکتی ہے۔" میں نے کہا۔

"میں نہیں سمجھتی کہ کوئی ہمیں رائے زل کے نزدیک پَر بھی مارنے دے گا۔ یہ تو دیوانے کا سپنا ہے۔"

"بڑے بڑے مشکل سپنے اپنی تعبیر پا لیتے ہیں۔ کہتے ہیں نا کہ جہاں الجھن ہوتی ہے وہاں کوئی راستہ بھی ہوتا ہے۔"

"لیکن...... میں نہیں سمجھتی شاہ زائب کہ تم...... اپنے اس ایک بازو کے ساتھ کچھ کرنے کے قابل ہو، تم بہت ڈھیٹ واقع ہوئے ہو، میں نے تم سے کتنی بار کہا کہ سرجری کرالو۔"

"اگر میں اسپتال میں ایڈمٹ ہو جاتا تو اس وقت جاما جی کی سپریم کمانڈر کو تسلی کون دے رہا ہوتا؟ ویسے بھی ون آرمڈ باکسر نام کی فلم تو آپ نے دیکھی ہوگی۔"

''ہاں، میں نے بھی دیکھی ہے'' انیق اپنی زبان کی کھجلی روک نہیں سکا اور غنودگی کے عالم میں بول اٹھا۔ ''بہت مار پڑتی ہے اس میں وانگ یو کو۔ اور مجھے آپ کا مستقبل بھی زیادہ روشن نہیں لگتا۔''

انیق نے پونکہ یہ فقرہ اردو میں کہا تھا لہٰذا قسطینا کی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھنے لگی میں نے کہا۔ ''یہ کہہ رہا ہے کہ میں آپ کا دوسرا ہاتھ بن جاؤں گا، آپ کیوں فکر کر رہے ہیں۔''

''بہت برا وقت ہے، اللہ توبہ کریں، سچ بولیں۔'' انیق درویشی انداز میں بولا۔

''تم اپنی بکواس بند کرو اور سو جاؤ۔'' میں پھنکارا۔

اس نے سہمنے کی ایکٹنگ کی اور کروٹ بدل لی۔ کروٹ بدلی تو سامنے بے ہوش سجاول کی شکل نظر آئی۔ ایک دم پھدک کر دوسری طرف کروٹ بدل لی۔

قسطینا مزید دھیمی آواز میں بولی۔ ''جو کچھ بھی ہے ہانا وانی ایک عورت ہے۔ اس کو سوچنا چاہیے کہ اس کا بیٹا بے لگام ہو کر کیا ارادے کر رہا ہے۔ کاش میں اس سے فون پر ہی بات کر سکتی، مگر فون آن نہیں کیے جا سکتے۔''

اچانک قسطینا کو چپ ہونا پڑا۔ ماریہ کسمسائی تھی، پھر ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ''نہیں، نہیں...... یہ ٹھیک نہیں۔ ان لوگوں کا کوئی گناہ نہیں...... کوئی نہیں۔'' وہ بدحواسی میں دائیں بائیں ہاتھ چلانے لگی، پھر ایک دم سنبھل گئی۔ قسطینا نے اسے پانی پلایا اور دلاسا دیا وہ پھر سو گئی یا شاید اونگھنے لگی۔

صبح میں اور ابراہیم جاگے تو گھڑیاں صبح سات بجے کا وقت بتا رہی تھیں۔ ڈاکٹر ماریہ ہم سے پہلے ہی جاگ چکی تھی۔ وہ ایل سی ڈی کے سامنے سکتے کی سی کیفیت میں بیٹھی تھی۔ اسکرین پر جو مناظر نظر آ رہے تھے وہ واقعی سکتہ کر دینے والے تھے۔ ہم نے ڈی پیلس کے پائیں باغ کو دیکھا۔ گلاب کے تختوں، ڈینی کی کیاریوں اور رنگ برنگے پانی کے درجنوں فواروں اور آبشاروں کے درمیان ایک جدا منظر تھا۔ درختوں پر جھولے نظر آ رہے تھے لیکن یہ ''وہ جھولے'' تھے جو ایک رسّی کے ساتھ گردن کے بل جھولے جاتے ہیں۔ کم و بیش پندرہ افراد کی لاشیں درختوں سے جھول رہی تھیں۔

مقامی ٹی وی چینل کی زبان بھی بالکل بدل چکی تھی۔ نیوز کاسٹر دو دن پہلے تک جن لوگوں کو گرین فورس کے شیر اور حریت کے جانباز قرار دے رہے تھے، اب دہشت گرد اور جنگی مجرم گردان رہے تھے۔ پھانسی پانے والوں میں قسطینا کے کچھ قریبی ساتھی اور پاسبان بریگیڈ

کے جوان تھے۔ پھانسی دینے کے بعد ان پر گولیاں بھی برسائی گئی تھیں۔ ان میں ایک عورت بھی تھی۔ عورت کی آہستہ آہستہ گھومتی لاش کا چہرہ سامنے آیا تو میں تھرا گیا۔ وہ ریان فردوس کی ایک خوب صورت خواص تھی۔ عورت کو اس طرح پھانسی پر لٹکا کر رائے زلق اور ہانا وانی نے اشارہ دے دیا تھا کہ وہ کس حد تک جا سکتے ہیں۔ کمال احمد کے بارے میں پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے۔ یہ بھی کہا جا رہا تھا کہ ریان فردوس کی تین چار پرانی خواصوں نے گرفتاری اور ذلت کے خوف سے خودکشی کر لی ہے۔

نیوز کاسٹر کہہ رہا تھا۔ ''کل ساری رات چھاپوں کا سلسلہ جاری رہا۔ مختلف علاقوں سے کم و بیش دو سو ایسے افراد کو پکڑا گیا ہے جن پر جنگی جرائم میں شریک ہونے کے قوی امکان ہیں۔ ان میں دس افراد ایسے ہیں جنہوں نے ہوٹل واشنگٹن میں گھس کر امریکی خواتین سے ناروا سلوک کیا۔ ان میں سے کئی ایک کی فوٹیج بھی حاصل کر لی گئی ہیں۔ کہا جا رہا ہے کہ ڈاکٹر ماریہ اور بیگم نورل کے دو قریبی عزیز بھی ان میں شامل ہیں۔ جب ماریہ کے دو قریبی عزیزوں کی تصویریں دکھائی گئیں تو وہ چلا اٹھی۔ ''حرام زادے، جھوٹے، کمینے...... یہ کیسے ہوسکتا ہے، یہ کیسے ہوسکتا ہے۔''

ڈاکٹر ماریہ کی پکار پر سب جاگ گئے۔ وہ رو رہی تھی۔ مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''دیکھیں ذرا...... دیکھیں ان کی صورتیں، ان کی عمریں، کیا آپ سوچ بھی سکتے ہیں کہ یہ کسی ایسے جرم میں شریک ہو سکتے ہیں؟''

وہ شاید ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ ان دونوں کی عمریں پینتالیس پچاس کے قریب تھیں اور وہ صورتوں سے ہی نفیس اور شریف النفس قسم کے لوگ لگتے تھے۔

اس نے انتہائی جذباتی عالم میں گولیوں کی ایک وزنی بیلٹ ایل سی ڈی پر پھینکنے کی کوشش کی، قسطینا نے اسے روک لیا۔ اسے گلے سے لگایا اور اس کے براؤن بالوں کو سنوارنے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ کہہ رہی تھی۔ ''حوصلہ رکھو ماریہ...... ہم یہ نہیں ہونے دیں گے۔ ہم کوئی نہ کوئی حل نکالیں گے۔ ابھی وہ کسی کو سزائے موت دینے میں اتنی جلدی نہیں کریں گے۔''

کہنے کو تو قسطینا کہہ رہی تھی مگر آواز کا کھوکھلا پن شاید اسے بھی محسوس ہو رہا تھا۔ انہوں نے کل سرسری سماعت کی بات کی تھی اور رات کو پندرہ لوگ لٹکا بھی دیئے تھے...... وہ کچھ بھی کر سکتے تھے۔

وہ سارا دن بھی تشویش ناک خبروں کے نرغے میں گزر گیا۔ سجاول تھوڑی دیر کے لیے

ہوش میں آیا تھا۔ اس نے پھر بدحواسی کی باتیں شروع کر دیں۔ جونہی مجھ پر یا انیق پر اس کی نظر پڑتی تھی وہ بالکل آگ بگولا ہو جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ بعض اوقات ہپناٹزم کا ماہر اپنے معمول کو کچھ لوگوں یا جگہوں وغیرہ کی تصویریں دکھاتا ہے...... اور اس حوالے سے معمول کے ذہن میں نفرت اور خوفناک عداوت بھر دیتا ہے، کیا سجاول کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوا تھا؟ میں اس بارے میں ڈاکٹر ماریہ سے سوالات کرنا چاہتا تھا لیکن وہ تو صبح سے بالکل گم صم بیٹھی تھی۔ کچھ کھایا پیا نہیں تھا۔ رنگ زرد ہو رہا تھا۔ ٹی وی پر اتنی منفی خبریں آ رہی تھیں کہ ہم اسے بار بار بند کر دیتے تھے۔ ابراہیم کے کندھے سے لگ کر بیٹھی ہوئی زینب بار بار امید بھری نظروں سے میری جانب دیکھتی تھی۔ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہی ہو..... میں ابھی مرنا نہیں چاہتی۔ مجھے مرنے سے بہت ڈر لگتا ہے۔ ابراہیم کو بھی بہت ڈر لگتا ہے۔ ہم زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ اگر کوئی مصیبت بن گئی تو ہم آپ کی طرف ہی دیکھیں گے۔ ہمیں بہت بھروسا ہے آپ پر...... اور یہ بھروسا صرف زینب میں ہی نہیں تھا...... اور بہت سے لوگوں میں بھی تھا۔ پتا نہیں کہ یہ بھروسا کیسے پروان چڑھ گیا تھا؟ دو دن پہلے ڈی پیلس میں اور شہر میں گھومتے پھرتے ہوئے، یہ بھروسا میں نے کئی لوگوں کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ قسطینا کی طرح شاید وہ مجھے بھی کوئی نجات دہندہ قسم کی چیز سمجھنے لگے تھے۔ میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتا تھا اور نہ ہی کوئی ایسی ذمے داری اٹھانے کا اہل تھا۔ غالباً ایک دو اتفاقیہ واقعات کی وجہ سے یہ سوچ پروان چڑھ رہی تھی۔ کسی وقت مجھے جھنجلاہٹ ہونے لگتی تھی۔

○......❖......○

رات کو ایک عجیب واقعہ ہوا۔ حالات کے بارے میں سوچتے سوچتے میں کچھ دیر کے لیے سو گیا تھا۔ ابراہیم نے مجھے جھنجوڑ کر جگایا۔ اس نے کہا۔ ''شاہ زیب بھائی! ڈاکٹر ماریہ یہاں نہیں ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے اس کے خالی بستر کی طرف دیکھا۔

''وہ شاید باہر نکل گئی ہے۔ سسٹر قسطینا اسے دیکھنے نکلی ہے۔''

میں اور انیق فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ اپنی رائفلیں تھام کر اور ٹارچیں لے کر ہم داخلی راستے کی طرف بڑھے۔ سلائیڈ کرنے والا پتھر اپنی جگہ سے ہٹا ہوا تھا۔ ہم سرنگ میں آ گئے۔ یہ رات کے قریباً بارہ بجے کا عمل تھا۔ گہری تاریکی تھی۔ کچھ ہی فاصلے پر قسطینا اور کمانڈر فارس جان کے ہیولے دکھائی دیئے۔ ہم دوڑتے ہوئے ان کے پاس پہنچے۔ قسطینا مایوس لہجے میں بولی۔ ''وہ کہیں نہیں ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ شہر کی طرف نکل گئی ہے۔''

''مگر کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کا جواب تو وہی دے سکتی ہے۔'' قسطینا شدید غم و غصے میں تھی۔

قسطینا کی ہدایت پر دیگر لوگ اسے سرنگ کے اندر اور آس پاس تلاش کرنے لگے لیکن وہ ٹارچیں روشن نہیں کر سکتے تھے اور نہ زیادہ آگے جا سکتے تھے۔ سیل فون بھی آن نہیں کیے جا سکتے تھے۔ قسطینا نے سب کو واپس بلا لیا۔

''قسطینا! آپ کو اندازہ ہوا کہ وہ کتنی دیر سے غائب ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''شاید وہ ہمارے سونے کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ اپنی مرضی سے گئی ہے۔'' قسطینا نے مدھم، دل گرفتہ آواز میں کہا۔

''یہ آپ کیسے کہہ سکتی ہیں؟''

قسطینا نے کاغذ کی ایک چھوٹی سی پرچی میری طرف بڑھائی۔ اس پر انگلش میں بس دو فقرے گھسیٹے گئے تھے۔ ''ڈیئر قسطینا! مجھے معاف کر دینا۔ میں یہاں سے جا رہی ہوں۔''

میں نے قسطینا کی طرف دیکھا۔ ''کہاں گئی ہو گی وہ؟''

''جہاں اس کو بلایا جا رہا تھا۔'' قسطینا نے غم و غصے میں ڈوب کر کہا۔ ''اس نے...... اپنے طور پر قربانی دی ہے...... اپنے عزیزوں کے لیے...... جاماجی کے شہریوں کے لیے...... پتا نہیں کہ وہ کہاں تک صحیح ہے۔''

میرے سینے کے انگارے ایک دم سے پھر دہک اٹھے۔ رائے زل کی نفرت انگیز صورت نگاہوں میں ابھری۔ کسی جنگلی ریچھ جیسی چھوٹی چھوٹی آنکھیں، پھولا ہوا چہرہ اور تھل تھل کرتا جسم۔ جی چاہا وہ سامنے ہو اور اس کے ٹکڑے کر ڈالوں۔ لیکن وہ سات دروازوں اور سات پہروں میں تھا۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ اگلی رات نو بجے ایک اور دردناک سین ٹی وی چینل کی اسکرین پر ابھرا۔ ڈی پیلس کے مین گیٹ کے عین سامنے بیس مزید افراد کو پھانسی دے دی گئی۔ صرف اتنا لحاظ رکھا گیا کہ پھانسی کے عمل کو براہِ راست نہیں دکھایا گیا۔ چند منٹ بعد LIVE مناظر دکھا دیئے گئے۔ پہلے کی طرح لاشوں پر یا پھر نیم جان جسموں پر گولیاں بھی برسائی گئی تھیں۔ کئی جسموں سے ابھی تک خون ٹپک رہا تھا۔ چہروں پر غلاف چڑھانے کی زحمت بھی نہیں کی گئی تھی اور وہ اذیت کے سبب بگڑے ہوئے تھے۔ ان میں ڈاکٹر ماریہ کے دو عزیزوں کے چہرے نہیں تھے...... اور اس کی وجہ بھی سمجھ میں آنے والی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد ایک اسپتال کا منظر دکھایا گیا۔ چھوٹی چھوٹی آنکھوں والا گوشت اور چربی کا ڈھیر، رائے زل اپنے لاؤلشکر اور درجنوں مسلح گارڈز کے ساتھ اسپتال میں اپنے زخمی

سپاہیوں کی عیادت کے لیے گیا تھا۔ وہ ان کے شانے تھپک رہا تھا اور مکاکس کے ان کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ کچھ سویلین بھی موجود تھے۔ ان میں ہمیں ڈاکٹر ماریہ بھی نظر آئی۔ وہ رائے زل کے عقب میں سر جھکائے خاموش چل رہی تھی۔ رائے زل نے اس کی طرف متوجہ ہو کر ایک دو جملے بھی کہے۔ جیسے مریض سپاہیوں کی حالت کے بارے میں تبصرہ کر رہا ہو۔ یہ بڑے تکلیف دہ مناظر تھے۔ ڈاکٹر ماریہ، رائے زل کے قبضے میں جا چکی تھی۔

نیوز بلیٹن میں پورے شہر میں کرفیو کے مناظر دکھائے گئے۔ نیوز کاسٹر نے نمائندے سے پوچھا۔ ''کیا شہر میں امن ہے؟''

''جی ہاں، کہیں سے گڑبڑ کی کوئی اطلاع نہیں۔ آج بیس جنگی مجرموں کو سرِعام پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ ہر طرح کے حفاظتی انتظام موجود تھے۔ بس مین مارکیٹ کی طرف کچھ شر پسندوں نے ان سزاؤں پر ردِعمل دکھایا اور مٹھی بھر لوگوں نے توڑ پھوڑ کی کوشش کی۔ گرے فورس نے دس افراد کو گرفتار کر کے مقدمات درج کر لیے ہیں۔''

نیوز کاسٹر نے پوچھا۔ ''شہر اور ڈی پیلس کی مجموعی صورتِ حال کیا ہے؟''

نمائندہ بولا۔ ''خدشہ تھا کہ ریان فردوس کی ہلاکت پر کچھ لوگ ردِعمل کا اظہار کریں گے۔ مگر ابھی تک سکون ہے اور لوگ اپنے روزمرہ کے کاموں کی طرف متوجہ ہونے کے لیے کرفیو اٹھائے جانے کا انتظار کر رہے ہیں۔ کہا جا رہا ہے کہ ریان فردوس کی تدفین کے بعد ہی کرفیو اٹھایا جائے گا۔ دوسری طرف قسطینا اور کمانڈر افغانی کے کئی قریبی ساتھیوں نے اپنی ہائی کمان کی پالیسیوں سے اختلاف کرتے ہوئے خود کو سرنڈر کیا ہے۔ ایسے لوگوں میں سپریم کمانڈر قسطینا کی قریبی سہیلی اور مشیر ڈاکٹر ماریہ بھی شامل ہیں۔ آج وہ خود ڈی پیلس پہنچی ہیں اور عزت مآب رائے زل سے ملاقات کی ہے۔''

میں دانت پیس کر رہ گیا۔ رائے زل نے اپنی ضد پوری کی تھی اور ماریہ کو اپنی دسترس میں لے آیا تھا۔ انیق نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ''کہیں ایسا تو نہیں ہوگا کہ ڈاکٹر ماریہ...... میرا مطلب ہے...... کیا ہماری یہ پناہ گاہ محفوظ رہ سکے گی؟''

میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا ہے۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''جہاں تک میں ماریہ کو جانتا ہوں...... وہ جان تو دے سکتی ہے لیکن اس طرح کی بے وفائی نہیں کر سکتی۔ وہ ہماری اس پناہ گاہ کے بارے میں کسی کو بھنک بھی نہیں پڑنے دے گی۔''

''لیکن یقین سے تو کچھ نہیں کہا جا سکتا نا؟''

''یقین سے تو پھر کسی کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ تمہیں دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ تم جیسے اوٹ پٹانگ اور معصوم سے پیچھے کتنا خطرناک شخص چھپا ہوا ہے۔ داؤد بھاؤ جیسے گینگسٹر کا دستِ راست......''

''وہ تو پرانی بات ہو گئی جناب! اب تو میں آپ کا دستِ راست ہوں۔'' دفعتاً مجھے اس دلچسپ خط کا خیال آ گیا جو پہلوان حشمت نے انیق کو لکھا تھا۔ وہ خط پتا نہیں کہاں کہاں کی خاک چھان کر ہم تک پہنچ گیا تھا۔ انیق نے ایک دوسرے خط کا ذکر بھی کیا تھا۔ لیکن حالات اتنے تیز رفتار تھے کہ میں ابھی تک وہ دوسرا خط دیکھ ہی نہیں سکا تھا۔ میں انیق سے پوچھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اچانک مجھے اور انیق دونوں کو خاموش ہونا پڑا۔ قسطینا نے اٹھ کر ایل سی ڈی کی آواز مزید دھیمی کی۔ اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ وہ اپنی یونیفارم کے ٹکڑے کر چکی تھی لیکن ایک ''نادیدہ یونیفارم'' جیسے اب بھی اس کے جسم پر موجود تھی۔ وہ مدھم آواز میں بولی۔

''ہم یہاں چوہوں کی طرح دبک کر بیٹھنے کے لیے نہیں آئے ہیں۔ نہ ہی ہم یہاں بیٹھ کر ٹی وی پر دل دوز مناظر دیکھ سکتے ہیں۔ ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔ میں آپ کو دعوت دیتی ہوں کہ آپ اپنے اپنے طور پر سوچیں کہ ہمارا آئندہ لائحہ عمل کیا ہو۔ ٹھیک چوبیس گھنٹے بعد ہم ایک اہم میٹنگ کریں گے۔''

سب نے اس بات کی تائید کی پھر سب خاموش ہو گئے۔ جیسے اپنے اپنے طور پر انہوں نے واقعی کچھ سوچنا شروع کر دیا ہو۔ میں نے کن انکھیوں سے زینب کی طرف دیکھا۔ جب سے اس نے ریان فردوس کے اندوہناک قتل کی خبر سنی تھی، مسلسل رو رہی تھی۔ حالانکہ ریان فردوس اس کا وہ جابر سسر تھا جو اس کا سایہ بھی ڈی پیلس میں دیکھنا نہیں چاہتا تھا......اور جس کی وجہ سے وہ زندہ ہونے کے باوجود مردہ تصور کر لی گئی تھی مگر وہ اس کے لیے بھی اشک بار تھی۔ شاید ایسے ہی لوگوں کے لیے کہا کرتے ہیں۔

چوٹ لگے کسی کو تڑپتے ہیں ہم میر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

زینب شیشے جیسی شفاف لڑکی تھی۔ ابراہیم جیسے ''پرنس'' نے اسے چاہا تھا اور وہ واقعی اس قابل تھی کہ اسے چاہا جاتا۔

سناٹے میں ایک مدھم نغمہ ابھرا اور سب کو متوجہ کر گیا۔ کمانڈر فارس ایک دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ کھویا کھویا خاموش۔ قسطینا کی طرح اس کے بازو پر بھی پٹی نظر آ رہی تھی۔ اس کے پاس ایک چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر تھا۔ اس پر وہی ترانہ ریکارڈ تھا جو جاماجی کے طول و عرض

میں فوجی اور لشکری اکثر گنگناتے تھے۔

ہم نے جی جان سے جینا ہے
اب سینہ تان کے جینا ہے
ہم جاتے اندھیرے تک لڑیں گے
ہم سچے سویرے تک لڑیں گے

اور اس کے آخری بول تھے

اور اگر ہم واپس نہ آسکے
ہمارے بچوں سے کہنا ہم سرخرو ہوئے

قسطینا کی پُرحرارت گفتگو کے بعد اس ترانے نے سب کے دلوں میں مایوسی کی تاریکی کو تھوڑا کم کیا۔ حتیٰ کہ ابراہیم کے چہرے پر بھی کچھ روشنی نظر آئی۔ کہیں دور شہر میں اچانک آٹومیٹک رائفلوں کے کئی طویل برسٹ چلے...... اور پھر پہلے کی طرح خاموشی چھا گئی۔ اسی دوران میں سجاول ایک بار پھر کسمسانے لگا۔ اس کی مشکیں بدستور کسی ہوئی تھیں۔ بے ہوشی کی حالت میں اسے میجر وارث نے گلوکوز ڈرپ کے ذریعے کچھ توانائی مہیا کر دی تھی۔ اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ اسے کھانے پر مجبور کیا جاسکتا۔ ہوش میں آنے کے بعد اس کی نگاہ سیدھی مجھ پر پڑی۔ بڑی بڑی عقابی آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ تھیں۔ جب وہ ہاتھ پاؤں ہلانے میں ناکام ہوا تو کراہا اور پھر گرج کر بولا۔ ''تم اچھا نہیں کر رہے۔ تمہیں پچھتانا پڑے گا سب کو پچھتانا پڑے گا۔''

''لیکن میرا قصور تو بتا دو سجاول۔'' میں نے قریب آتے ہوئے کہا۔

''تمہارا کوئی قصور نہیں۔ تم دونوں بے قصور ہو سارے قصور میرے ہیں۔'' اس نے بے قراری سے دائیں بائیں سر ہلایا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی وحشت میں کمی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ ایک خوش آئند بات تھی۔ اگر واقعی یہ سب کچھ خاص قسم کے ہپناٹزم کی وجہ سے تھا تو پھر ہوسکتا تھا کہ سجاول آہستہ آہستہ اپنے ''ٹرانس'' میں سے باہر نکل رہا ہو۔ ڈاکٹر ماریہ نے بھی تو اسی قسم کی بات کہی تھی۔

وہ غنودگی میں تھا۔ میں نے میجر وارث سے کہا کہ اسے دوبارہ بے ہوشی کی ڈوز دے دیں تو بہتر رہے گا۔ میجر وارث نے میری تائید کی اور انجکشن بھرنے کے لیے ساتھ والے کمرے میں چلا گیا۔ میجر وارث کا پیٹ خراب تھا۔ اسے بار بار واش روم میں جانا پڑ رہا تھا (لیکن یہ کسی ذہنی تناؤ یا گھبراہٹ کے سبب نہیں تھا۔ وہ ایک مانا ہوا دلیر آفیسر تھا) سجاول کو

دوبارہ انجکشن لگ گیا تو انیق کے چہرے پر اطمینان نظر آیا۔ میں سجاول کی طرف دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا اس نے اپنی خاص کیفیت میں مجھ پر بے سروپا الزام لگائے تھے۔ وہ جیسے مدہوشی کی حالت میں بولتا چلا گیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ اپنی ماں یعنی ''ماؤ'' سے بہت محبت کرتا ہے اور اس نے ایک دفعہ کہا تھا کہ ماؤ ہر صورت میں اپنی پوتی مانی کی شادی میرے ساتھ کرنا چاہتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو وہ مر جائے گی۔ لیکن وہ نہیں مری تھی اور نہ اس کی افلاطون پوتی کی صحت پر کچھ زیادہ اثر پڑا تھا۔ اب پتا نہیں یہ باتیں سجاول کے ذہن میں کیسے بیٹھ گئی تھیں کہ وہ دونوں مر چکی ہیں اور میں ان کا قاتل ہوں۔ برین واشنگ ایک سائنسی طریقہ کار ہے۔ کیا سجاول کی برین واشنگ ہو چکی تھی؟

ٹی وی چینل درختوں سے جھولتی لاشوں کو وقفے وقفے سے دکھاتا چلا جا رہا تھا۔ ان میں زیادہ تر قسطینا کے قریبی ساتھی ہی تھے۔ چار پانچ لوگ ایسے تھے جو میرے ساتھ ہی ''آشیانے'' نامی جگہ پر ٹارچر جھیلتے رہے تھے۔ قسطینا میرے پاس ہی دیوار سے ٹیک لگائے قالین پر بیٹھی تھی۔ اس نے چینل بدل دیا۔ یہاں پر بھی ایک ہنگامہ ہی تھا۔ آٹھ دس مردوں اور چار پانچ عورتوں کی ایک ٹولی کسی اندرونی سڑک پر مظاہرہ کر رہی تھی۔ ایک لڑکی جو شاید کالج کی طالبہ تھی بار بار اپنی عینک سنبھال رہی تھی اور مائیک کے سامنے دہاڑ رہی تھی۔ ''اس کے سر کی قیمت مقرر کرنے والے بھول رہے ہیں کہ بہادری اور جانبازی کی کوئی قیمت نہیں ہوتی اور وہ جانباز لوگ ہیں۔ ہمارے ہم وطن نہیں لیکن ہم وطنوں سے بڑھ کر انہوں نے ساتھ دیا ہے ہمارا...... اور وہ تھپڑ جو ایک ظالم کے گال پر پڑا تھا اس کی گونج کبھی ختم نہیں ہو گی...... کبھی نہیں۔''

لڑکی کے ساتھی نوجوان نے بھی کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تھا کہ گرے فورس کے مسلح جوان ان پر ٹوٹ پڑے۔ مظاہرین پر نہایت بے دردی سے رائفلوں کے کندے برسائے گئے۔ عورتوں کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا گیا۔ ایک زنانہ فورس بھی نظر آئی۔ لیکن غور سے دیکھنے کے بعد پتا چلا کہ یہ زنانہ نہیں، یہ کیل کانٹے سے لیس چار پانچ تنومند ہیجڑے تھے۔ وہ عورتوں کو بے دردی سے بید رسید کر رہے تھے۔ میری رگوں میں خون سنسنا گیا۔ یقیناً انیق کی بھی یہی کیفیت ہوئی ہو گی۔ ہمیں خیام دانش بھی نظر آیا۔ وہ عینک والی لڑکی کو بری طرح پیٹتا ہوا فورس کی گرے گاڑی میں دھکیل رہا تھا...... بے شک وہ خیام ہی تھا۔

کلپ ختم ہو گیا۔ نیوز کاسٹر نے جو خبر دی اس کا تعلق حیران کن طور پر براہِ راست مجھ سے تھا۔ مجھ پر انکشاف ہوا کہ میرے سر کی ایک معقول قیمت مقرر کی گئی ہے۔ میں ایک گھس

بیٹھیا، دہشت گرد قرار پایا تھا اور شاید میرا اس سے بھی بڑا ''کارنامہ'' یہ تھا کہ میں نے آقا جان کو ڈی پیلس کے گیٹ پر ایک یادگار تھپڑ سے نوازا تھا۔ انیق میری بائیں جانب بیٹھا تھا۔ سرگوشی میں بولا۔ ''آپ کو مبارک ہو، پاکستانی کرنسی میں قریباً تین کروڑ روپیا اچھی خاصی رقم ہوتی ہے۔''

شاید وہ کچھ مزید کہتا لیکن اسی دوران میں قسطینا بول اٹھی۔ ''شاہ زیب! تم بھی ان لوگوں میں شامل ہو گئے ہو جن کو ڈھونڈنے کے لیے یہ خبیث ہر حد تک جائیں گے۔ تمہیں اب حد سے زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔''

''اور آپ کو بھی۔ شاید آپ کو معلوم نہیں کہ آپ کے لوگوں کو آپ کی کتنی ضرورت ہے۔''

اس نے عجیب نظروں سے میری طرف دیکھا پھر میرے بازو کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں کرب ابھر آیا۔ انیق کی وجہ سے کچھ بولی نہیں۔

○......❖......○

اور یہ اسی رات کا درمیانی پہر تھا۔ میرے ذہن میں پریشان خیالات کا ہجوم تھا۔ نیند ابھی نہیں آ رہی تھی، باقی قریباً سب ہی سو چکے تھے۔ اچانک مجھے آہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے میجر وارث کو دیکھا۔ وہ ایک بار پھر واش روم کی طرف گیا لیکن چند ہی سیکنڈ بعد نکل آیا۔ وہ بے آواز چلتا اس کمرے کی طرف بڑھا جہاں باہر نکلنے کا راستہ تھا۔ مجھے الجھن سی ہوئی۔ میں بھی دبے پاؤں اٹھ کر میجر کے پیچھے گیا۔ دل اچھل کر رہ گیا۔ یقین نہیں آیا کہ میجر وارث ایسا کر سکتا ہے۔ میجر کے ہاتھ میں اس کا سیل فون تھا۔ وہ اس کا چارجر علیحدہ کر چکا تھا اور اب اسے ''آن'' کر رہا تھا۔

''میجر۔'' میں نے کہا۔

وہ پلٹا اور تب اس نے حیران کن تیزی کے ساتھ اپنے کوٹ میں سے نائن ایم ایم پستول نکال لیا۔ میں نے جھک کر اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور اسے لیتا ہوا فرش پر گرا۔ اسی دوران میں اس نے گولی چلا دی۔ دھماکے کی آواز پناہ گاہ میں بڑی شدت سے گونجی تھی۔

اس سے پہلے کہ میجر وارث دوسرا فائر کرتا، فارس جان نے اس کا پستول والا ہاتھ دبوچ لیا۔ کلائی مروڑی گئی تو نائن ایم ایم کا پستول میجر وارث کے ہاتھ سے گر گیا جسے کمانڈر فارس جان نے ٹھوکر مار کر دور پھینک دیا۔ فارس جان کے ایک بھرپور گھونسے نے میجر وارث کا رہا سہا دم خم بھی ختم کر دیا اور وہ دیوار سے ٹیک لگا کر بری طرح خون تھوکنے لگا۔ اس کا نچلا ہونٹ

کٹ کر رہ گیا تھا۔ میں نے میجر کا فون فوراً آف کر دیا۔

فارس جان نے اپنی رائفل میجر کی طرف سیدھی کر لی تھی، وہ پھنکارا۔ ''تم سے یہ توقع نہیں تھی میجر! ام تمہارے بارے میں اس طرح کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔''

میجر وارث عجب دہشت زدہ لہجے میں بولا۔ ''تم کو کچھ پتا نہیں یہاں کیا ہو رہا ہے۔ تم لوگ بے وقوفوں کی جنت میں رہ رہے ہو۔ سمجھ رہے ہو کہ تم یہاں گھس کر بیٹھے رہو گے اور بچے رہو گے اور پھر یہاں سے نکل کر دوبارہ گرین فورس کی کمان سنبھال لو گے۔ اب کچھ نہیں ہوگا...... کچھ نہیں ہو سکے گا۔''

''تمہارے منہ میں خاک، کیوں نہیں ہوگا اس طرح۔'' ابراہیم طیش سے بولا۔

''اس لیے کہ وہاں شہر میں بہت کچھ بدل چکا ہے۔ ہر ہائی نس قسطینا بہت اچھی طرح جانتی ہیں۔ کل انہوں نے بھی میرے ساتھ ٹی وی پر وہ سین دیکھے ہیں۔ ہم اس سے پہلے صرف کمانڈراوان کو رو رہے تھے کہ وہ رائے زل کے ساتھ جا ملا ہے، اب ہمارے آدھے کمانڈران کے ساتھ ہیں۔ ان میں سے بہت سوں کے نام بھی تم لوگوں کو معلوم نہیں لیکن میں جانتا ہوں۔ کمانڈر نجیب، کمانڈر ہادی، کمانڈر بن لوئی...... اور اس طرح کے درجنوں اور...... اب کچھ نہیں ہو سکتا۔''

''اور اسی لیے تم ہم سب کو پکڑوانے کے لیے کال ملا رہے تھے۔'' میں نے زہر خند لہجے میں کہا۔

''نہیں...... میں میجر بن لوئی سے رابطہ کرنا چاہ رہا تھا۔ اس سے مشورہ کرنا چاہ رہا تھا۔ خود گرفتاری دینے کی صورت میں ہم عام معافی والوں کی صف میں شامل ہو سکتے ہیں۔''

''یہ تو بعد کی باتیں ہیں۔'' فارس جان نے دانت پیس کر کہا۔ ''اگر تمہارے فون آن کرنے کی وجہ سے وہ لوگ یہاں تک پہنچ گئے تو پھر؟''

''وہ ویسے بھی یہاں پہنچ جائیں گے، انہیں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ میرا مشورہ تو یہی ہے کہ......''

فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی کمانڈر فارس جان کی پٹھانی چپل کی زبردست ٹھوکر میجر وارث کی پسلیوں میں لگی اور وہ تکلیف کی شدت سے دہرا ہو گیا۔

میں نے اسے مزید ضربات لگانے سے روک دیا۔ قسطینا کے ہاتھ میں میجر وارث کا فون تھا، وہ بولی۔ ''مجھے لگتا ہے کہ فون ابھی صرف آن ہی ہوا تھا۔ اس کی سم ایکٹو نہیں ہوئی تھی۔''

''اور ہوسکتا ہے کہ پوری طرح آن بھی نہ ہوا ہو۔'' میں نے کہا۔

''اللہ کرے ایسا ہی ہو۔'' فارس جان کی آنکھوں میں میجر وارث کے لیے سرخی تھی۔

میں تو میجر وارث کو زیادہ عرصے سے نہیں جانتا تھا مگر اس کو قریب سے جاننے والے یعنی ابراہیم، قسطینا، فارس جان وغیرہ ششدر تھے۔ انہیں یقین نہیں آرہا تھا کہ وارث جیسا مضبوط آدمی اس طرح ٹوٹ سکتا ہے۔ شاید ٹھیک ہی کہتے ہیں، شدید اور مسلسل تناؤ کی کیفیت بندے کو اندر سے مسمار کر دیتی ہے۔

کہنے کو تو میجر وارث یہ کہہ رہا تھا کہ وہ اپنے کسی ساتھی فوجی افسر سے مشورہ کر رہا تھا کہ ہم سب کے لیے بہتری کی صورت نکل سکے۔ لیکن حقیقت شاید یہ نہیں تھی۔ وہ خود کو اور اپنے اہل وعیال کو مصیبت سے نکالنا چاہ رہا تھا۔ اچانک وہ ہوا جس کی توقع نہیں تھی۔ کمانڈر فارس جان ایک نہایت چوکس شخص کا نام تھا لیکن اس سے ذرا سی غفلت ہوئی۔ وہ میجر وارث کا نائن ایم ایم پستول فرش سے اٹھانے کے لیے جھکا اور چند ساعتوں کے لیے میجر وارث کو فراموش کر گیا۔ میجر وارث بجلی کی طرح اپنی جگہ سے حرکت میں آیا، اس سے پہلے کہ ہم میں سے کوئی اپنا ردِعمل ظاہر کر پاتا، فارس جان کی آٹومیٹک رائفل میجر وارث کے ہاتھوں میں آ چکی تھی۔ یہ نہایت خطرناک کام ہوا تھا۔ میجر نے وحشت کے عالم میں رائفل کا رخ ہماری طرف کیا۔ سب سے پہلے نوجوان کمانڈر فارس جان ہی اس کے نشانے پر آنے والا تھا۔ آٹومیٹک رائفل کی لرزہ خیز ''تڑتڑ'' سے پناہ گاہ گونج اٹھی لیکن یہ برسٹ میجر وارث نے نہیں انیق نے چلایا تھا۔ یہ ایک نہایت بروقت کارروائی تھی۔ آدھے سیکنڈ کی تاخیر بھی ہو جاتی تو قسطینا اور ابراہیم سمیت ہم گولیوں کی زد میں ہوتے۔ میجر وارث اچھل کر پتھریلی دیوار سے ٹکرایا۔ رائفل اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ اس کے براؤن کوٹ پر سرخ رنگ کے کم وبیش ایک درجن نقطے نمودار ہو چکے تھے۔

چند سیکنڈ تک سکتے کی سی کیفیت میں رہنے کے بعد قسطینا نے انیق کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''ویل ڈن...... ویری ویل ڈن۔'' اس کی آواز لرز رہی تھی۔

فارس جان نے بھی آگے بڑھ کر انیق کا کندھا تھپکا۔ انیق ہمارے عقب میں کھڑا تھا اور ساری صورتِ حال کو بغور دیکھ رہا تھا۔ لہٰذا جب میجر وارث ایک دم پینترا بدل کر فارس جان پر جھپٹا تو انیق نے اپنا کردار ادا کیا۔ وہ ہر قدم پر ایک بہترین ساتھی ثابت ہو رہا تھا۔

○......❖......○

میجر وارث کی لاش کو پناہ گاہ کے پاس ہی دفنا دیا گیا۔ زمین بہت پتھریلی تھی۔ بمشکل

اتنا گڑھا ہی کھودا جاسکا کہ اس کی لاش اچھی طرح ڈھک جائے۔ ایک سوگواری کیفیت تھی، کہتے ہیں کہ چڑھتے سورج کی پوجا کی جاتی ہے۔ یوں لگتا تھا کہ رائے زل کی حیثیت بھی چڑھتے سورج کی ہوگئی ہے اور قسطینا کی صفوں میں جو کمزور لوگ تھے وہ ہمت ہار کر رائے زل اور اس کی ماں کی طرف رجوع کر رہے تھے۔ ایجنسی کی پوری پوری آشیرباد بھی ماں بیٹے کے ساتھ تھی۔

سہ پہر کو ڈی پیلس کے عقبی قبرستان میں ریان فردوس کی تدفین بھی ہوگئی۔ عزت مآب ریان فردوس جو کچھ دن پہلے تک یہاں سیاہ وسفید کا مالک تھا اور جس کے ایک اشارے پر سینکڑوں خدام سر جھکا کر حاضر ہو جاتے تھے، بے چارگی کا نمونہ تھا۔ اس کے جنازے کے جو مختصر مناظر ٹی وی اسکرین پر دکھائے گئے، ان میں چالیس پچاس افراد سے زیادہ دکھائی نہیں دیتے تھے۔ ان میں سے بھی زیادہ تعداد ڈی پیلس کے ملازموں کی تھی۔ تدفین کی جگہ کے اردگرد کڑا پہرا تھا۔ ریان فردوس کے مذہب کے بارے میں پورے یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا مگر زخمی بیگم نورل کی درخواست پر اس کی تدفین مسلمانوں کے طریقے سے ہی ہوئی تھی۔

نیوز کاسٹر نے جاماجی شہر کے مناظر دکھاتے ہوئے کہا۔ ''شہر میں اِکا دُکا معمولی واقعات کے سوا امن وامان ہے۔ آج صبح دو گھنٹے کے لیے کرفیو میں نرمی کی گئی، لوگوں نے ضروریات زندگی خریدیں......''

کیمرا گلی کوچوں کے مناظر دکھا رہا تھا۔ وہاں بظاہر سکون تھا لیکن کون کہہ سکتا تھا کہ ان بند دروازوں اور کھڑکیوں کے پیچھے کتنا اضطراب ہے، کتنا غم وغصہ ہے، جو کچھ بھی تھا ریان فردوس ان کا حاکم تھا۔ بے شمار لوگ ایسے تھے جو تین پشتوں سے اس خاندان کو یہاں کا مالک ومختار سمجھتے تھے۔ انہوں نے ٹی وی پر ریان فردوس کی خون میں لتھڑی ہوئی لاش دیکھی تھی، زخمی بیگم نورل کو بَین کرتے ہوئے دیکھا اور سنا تھا۔ وہ ان کے دونوں بچوں کے بارے میں فکر مند تھے۔ بے شک دیواروں اور بند دروازوں کے پیچھے کچھ نظر نہیں آرہا تھا مگر شدید اضطراب اور غم وغصہ تو اپنی جگہ موجود تھا۔

اسکرین پر نیم گنجے آقا جان کو دکھایا گیا۔ وہ اپنے سفید رومال سے بار بار سر کا پسینہ پونچھ رہا تھا اور غمناک لہجے میں رپورٹر کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا۔ رپورٹر نے کہا۔ ''آپ اس نہایت اہم واقعے کے بارے میں کیا کہتے ہیں جناب؟''

آقا جان بولا۔ ''میں اپنی بات دہراؤں گا۔ یہ ایک چھوٹا سا گروہ تھا جو زبردستی عزت

مآب کے رہائشی حصے تک پہنچا اور حملہ آور رہوا۔ آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ ساٹھ کے لگ بھگ گرے فوجی تھے اور یہ جو کچھ ہوا ہے ان کے ذاتی فعل کے زمرے میں آتا ہے۔''

''جناب، لوگ پوچھ رہے ہیں کہ وہ لوگ اب کہاں ہیں اور ان کو کیے کی سزا کیسے ملے گی؟''

''میں میڈیا کے ذریعے لوگوں کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ کل رات ان فوجیوں میں سے قریباً ایک درجن تو پل کے دوسری جانب جنگل میں مارے گئے ہیں۔ وہاں تقریباً دو گھنٹے تک فائرنگ کا تبادلہ ہوا۔ باقی لوگوں کے بارے میں اطلاع ہے کہ وہ افراتفری کا فائدہ اٹھا کر جزیرے سے نکل چکے ہیں لیکن ایسی بات نہیں کہ ہم ان کی طرف سے غافل ہو جائیں گے۔ انہیں ڈھونڈنے اور کیفرِ کردار تک پہنچانے کی پوری کوشش کی جائے گی۔ ان لوگوں نے باہمی محبت اور مفاہمت کی فضا کو بُری طرح برباد کیا ہے اور یہ کوئی چھوٹا جرم نہیں۔''

رپورٹر نے ذرا جھجکتے ہوئے کہا۔ ''جناب! کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ان لوگوں کو ڈھونڈنے کے لیے کیا کارروائی ہو رہی ہے...... اور وہ فوجی جو جنگل میں مارے گئے ہیں، ان کی لاشیں کہاں ہیں؟''

آقا جان کی ناک کا بل موٹا ہو گیا۔ ''آپ لوگ ایسے سوالات مت کریں جن سے شک وشبے کی فضا پیدا ہو۔ یہ بہت نازک وقت ہے ہم سب کے لیے۔''

رپورر نے کہا۔ ''جناب! بہت سے لوگ ریان فردوس کے دونوں بچوں کے بارے میں پریشان ہیں۔ انہیں ڈھونڈنے کے لیے کیا اقدام کیے گئے ہیں؟''

''ہمارے پاس جو اطلاعات ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ کمال احمد اور ابراہیم دونوں سلامت ہیں لیکن ابراہیم کے حوالے سے اس شبہے کا اظہار کیا جا رہا ہے کہ وہ قسطینا اور شاہ زیب کے قبضے میں ہے۔ ہم ان لوگوں کا کھوج لگانے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔''

''کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں جناب کہ...... ان لوگوں نے ہز ہائی نس ابراہیم کو یرغمال بنا رکھا ہے؟''

''یہ کہنا ابھی قبل از وقت ہے لیکن حالات اسی قسم کی صورتِ حال کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔''

آقا جان ''بہت شکریہ'' کہہ کر جان چھڑانا چاہ رہا تھا مگر رپورٹر نے پھر اسے گھیر لیا۔ ''صرف ایک سوال جناب! ابھی تھوڑی دیر پہلے خبر آئی ہے کہ نہایت مطلوب شخص عبدالکریم کو نجف کالونی کی طرف ایک عمارت میں گھیر لیا گیا ہے اور وہاں فائرنگ کا تبادلہ ہو رہا ہے۔ کیا

یہ اطلاع درست ہے؟''

''مجھے بھی ابھی ابھی یہ نیوز ملی ہے جیسے ہی تصدیق ہوتی ہے آپ کو مطلع کیا جائے گا۔

بہت شکریہ۔'' آقا جان نے بیزار لہجے میں کہا اور مشیروں کے ساتھ ایک دروازے میں داخل ہو گیا۔

تین چار منٹ بعد ہی دوسرے ٹی وی چینل نے اس مقام کی ''لائیو کوریج'' شروع کر دی جہاں مبینہ طور پر عبدالکریم اور اس کے دو ساتھیوں کو گھیر لیا گیا تھا۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا۔ ایجنسی کے امریکن گارڈز اور رائے زل کے گرے سپاہیوں نے ایک تین منزلہ رہائشی عمارت کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ چھت کی منڈیر کے عقب میں دو ہیولے متحرک دکھائی دیتے تھے اور کبھی کبھی چھت پر سے سنگل فائر بھی کیا جا رہا تھا۔ نیوز کاسٹر چلا رہا تھا۔ ''یہ دیکھئے ناظرین! ایک بندہ مارا جا چکا ہے لیکن دو مسلسل مزاحمت کر رہے ہیں۔ انہوں نے قریباً ایک گھنٹے سے دو سو کے لگ بھگ مسلح سپاہیوں کو خود سے دور رکھا ہوا ہے۔ ہماری اطلاعات کے مطابق ایک امریکن گارڈ اور چار گرے سپاہی اس کاؤنٹر فائر میں جان کی بازی ہار چکے ہیں۔''

اس دوران میں صاف دکھائی دیا۔ چھت پر موجود دو ہیولوں میں سے ایک نے چار پانچ فٹ اونچی منڈیر کے اوپر سے سر نکال کر ایک طویل برسٹ چلایا۔ ایک للکارا مارا۔ چند سنگل شاٹ فائر کیے اور پھر بھاگتا ہوا ایک اوٹ میں چلا گیا۔ بھاگتے ہوئے وہ واضح طور پر لنگڑا رہا تھا یقیناً یہ کریم ہی تھا۔ اس کی جرأت دیدنی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ آخری دم تک مقابلہ کرنے کی ٹھانے ہوئے ہے۔

نیوز کاسٹر بلند آواز میں بول رہا تھا۔ ''آپ ایمبولینسز کی آوازیں سن رہے ہوں گے۔ لگتا ہے کچھ اور لوگ زخمی ہوئے ہیں۔ انہیں پیچھے لایا جا رہا ہے۔ ناظرین! یہ ''ایکسکلیوسو'' مناظر آپ ہماری اسکرین پر دیکھ رہے ہیں، ایجنسی کے دو مزید امریکن گارڈز شدید زخمی ہوئے ہیں۔ ایک کی حالت بہت نازک لگ رہی ہے۔''

اسی دوران میں تابڑ توڑ فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں۔

قسطینا نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''اب یہ حرامی اندر گھس جائیں گے۔''

''یہ کون سی بہادری ہے۔'' فارس جان بولا۔ ''بلٹ پروف جیکٹس، ہیلمٹ سب کچھ تو پہن رکھا ہے انہوں نے۔ سر سے پیر تک لوہے میں ڈوبے ہوئے ہیں باسٹرڈز۔''

دو تین منٹ مزید گزر گئے۔ پھر قسطینا کا یہ اندازہ درست ثابت ہوا کہ ایجنسی اور گرے فورس والے اب چارج کریں گے۔ وہ لوگ بھرا مار کر اندر گھس گئے۔ دو تین منٹ تک

فائرنگ کی آوازیں آتی رہیں۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ جی دار بڑی ''جی داری'' سے مقابلہ کر رہا ہے۔ آخر میں یہ نیوز آئی کہ کریم کا ساتھی مارا گیا ہے اور کریم کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔

قسطینا زخمی شیرنی کی طرح بے چین تھی۔ پناہ گاہ میں چکرا رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ اس کے ساتھی چن چن کر مارے جا رہے تھے یا پھر کچھ ہمت ہار کر رائے زل کے سامنے سر جھکا رہے تھے۔

O......❖......O

اس پناہ گاہ میں آج ہمیں چھٹا دن تھا۔ یہاں خشک خوراک اور پانی کا وافر ذخیرہ موجود تھا۔ بجلی سمیت ہر سہولت یہاں موجود تھی۔ شروع میں میرا خیال تھا کہ شاید اس ویران سرنگ میں جنریٹرز کے ذریعے بجلی فراہم کی جاتی ہے لیکن جنریٹرز کی آواز کا دور دور پتا نہیں تھا۔ بعدازاں قسطینا نے بتایا تھا کہ یہاں الیکٹریسٹی کی خفیہ پاور لائن موجود ہے۔ نکاسی آب کا بہترین انتظام بھی یہاں موجود تھا۔

سجاول کی حالت میں معمولی سا فرق آیا تھا۔ ہم نے مشورہ کر کے اس کے ہاتھ پاؤں کھول دیئے تھے اور اسے پناہ گاہ کے گیلری نما چھوٹے کمرے میں بند کر دیا تھا۔ یہاں تمام سہولیات موجود تھیں۔ دروازہ مضبوط لوہے کا تھا۔ دو دن سے انیق اسے انجکشن کے ذریعے ہلکے ٹرنکولائزر دے رہا تھا۔ وہ سستی اور غنودگی میں رہتا تھا۔ کل دوپہر دوا کا اثر کم ہوا تو اس نے خوب غل غپاڑا کیا تھا۔ نام لیے بغیر مجھے اور انیق کو گالیاں دی تھیں۔ کچھ چیزیں بھی توڑی پھوڑی تھیں مگر پھر بے دم سا ہو کر گر گیا تھا۔ رات کو میں نے کھڑکی کی جھری میں سے دیکھا تھا، وہ بھوک سے بے تاب ہو کر بسکٹس کے ایک ڈبے میں سے بسکٹ کا پیکٹ نکال رہا تھا۔

زینب بدستور سہمی ہوئی تھی۔ اسے ریان فردوس کی موت کا بہت دکھ تھا۔ وہ اپنی ساس یعنی بیگم نورل کو بھی بہت یاد کرتی تھی۔ ہم کوشش کرتے تھے کہ وہ ٹی وی نہ دیکھے۔ ابراہیم نے وہ نیوز سنی تھی جس میں آقا جان نے خیال ظاہر کیا تھا کہ ابراہیم کو قسطینا اور میں نے یرغمال بنا رکھا ہے۔ اسے بہت طیش آیا تھا لیکن ہماری طرح وہ بھی کیا کر سکتا تھا۔ ابراہیم نے ایک بہت بڑی عقل مندی کی تھی۔ ڈی پیلس سے فرار ہوتے وقت ہم بہت جلدی میں تھے، اس کے باوجود ابراہیم اپنے ساتھ اپنا ''تریاق'' لانا نہیں بھولا تھا۔ یعنی وہی خاص زہر جو روزانہ ایک خاص مقدار میں اس کی خوراک میں ملایا جانا ضروری تھا۔ اگر وہ یہ عقل مندی نہ کرتا تو شاید اب تک اس کی حالت بہت نازک ہو گئی ہوتی۔

سیف یوں تو ٹھیک تھا تاہم کسی وقت چپ سا ہو جاتا تھا۔ میں اس کیفیت کی وجہ اچھی

طرح سمجھ رہا تھا۔ وہ اپنا رنگ رنگیلا موبائل فون آن نہیں کر سکتا تھا۔ اس فون میں اس کے لیے بہت کچھ "کھٹا میٹھا" موجود تھا۔ میں انیق اور سیف سے باتیں کر رہا تھا جب دوسرے کمرے سے قسطینا کی آواز آئی۔ "ادھر آؤ شاہ زائب! یہ دیکھو، یہ خنزیر کا بچہ کیا بکواس کر رہا ہے۔"

میں دوسرے کمرے میں پہنچا۔ قسطینا نے حسبِ معمول دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی اور ایل سی ڈی پر نیوز دیکھ رہی تھی۔ اسکرین پر رائے زل کا منحوس چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ریان فردوس کی زرنگار نشست پر براجمان تھا۔ اس کے عقب میں اس کے کئی مشیر اور ماتحت مؤدب کھڑے تھے۔ رائے زل ٹی وی کے نمائندے کو بریفنگ دیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "جن بیس لوگوں کے سر کی قیمت مقرر کی گئی ہے، وہ جنگی جرائم اور دہشت گردی کے مرتکب ہیں...... اور ان کی حیثیت انتہائی مطلوب افراد کی ہے۔ یہ عبدالکریم بھی ان میں شامل ہے۔ ہم ایسے لوگوں کو عبرت کا نشان بنانا چاہتے ہیں۔ عبدالکریم اور تین دیگر افراد کو سرِعام سزائے موت کا فیصلہ کسی صورت تبدیل نہیں ہوگا۔ یہ مٹھی بھر لوگ ہیں جو احتجاج کر رہے ہیں۔ ان کی کوئی حیثیت نہیں۔"

ٹی وی کے نمائندے نے کہا۔ "عزت مآب! بڑے ادب سے یہ سوال پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا موجودہ حالات میں کریم کی سرِعام پھانسی سے ایک طبقے کی بے چینی میں اضافہ نہیں ہوگا؟"

رائے زل کی بھالو جیسی چھوٹی چھوٹی آنکھیں طیش کی یلغار سے دہک گئیں۔ خود پر مشکل ضبط کرتے ہوئے بولا۔ "بے چینی ناانصافی سے بڑھتی ہے۔ جنگی جرائم میں شریک افراد کو کڑی سزائیں دینے سے بے چینی کم ہوگی۔ ہم ان بیس افراد کی فہرست میں سے ہر شخص کو اسی طرح انصاف کے کٹہرے میں لائیں گے۔ آپ لوگ سوال کرنے سے پہلے اس کا وزن تولا کریں۔"

رائے زل کا لہجہ اتنا زہریلا تھا کہ کسی "میڈیا پرسن" کو مزید سوال کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ میں نے ٹی وی اسکرین پر رائے زل کے عقب میں کھڑے خواتین و حضرات کو دیکھا، ان میں دلکش خدوخال والی دراز قد ڈاکٹر ماریہ بھی موجود تھی۔ ان سب افراد نے ایک ہی طرح کی یونیفارم پہن رکھی تھی۔ ایک گہری گرے پینٹ اور ہلکے گرے رنگ کا چمکیلا کوٹ، یہ بند گلے کا کوٹ تھا اور کالر پر سرخ دھاری سی تھی۔

رائے زل کا ایک مشیر آگے بڑھا اور اپنے سفید بالوں میں انگلیاں پھیر کر شستہ انگلش میں بولا۔ "عزت مآب جناب رائے زل نے اپنے لیے جو ٹیم منتخب کی ہے، میں اس کا

تعارف کرانا چاہتا ہوں۔ وہ ایک ایک نام لیتا گیا اور بتاتا گیا۔ یہ سیکرٹری ہیں...... یہ پرسنل سیکرٹری...... یہ سیکیورٹی انچارج...... یہ مشیر برائے فوجی امور...... یہ مالی امور کے مشیر......
ڈاکٹر ماریہ کا تعارف کراتے ہوئے اس نے بتایا، ڈاکٹر ماریہ، عزت مآب کی ذاتی معالج......''

مجھے اپنی آنکھوں میں جلن محسوس ہوئی۔ ہم سب جانتے تھے کہ رائے زل نے ڈاکٹر ماریہ کو کس قسم کے ''علاج'' کے لیے بالجبر اپنے پاس بلایا ہے۔ ماریہ کا سرخ دھاری والا کالر مجھے ایسے پٹے کی طرح لگا جو کسی پالتو جانور کے گلے میں ڈالا جاتا ہے۔

چوبیس گھنٹے کے اندر اندر کریم پر مقدمہ چلا کر اسے موت کی سزا سنادی گئی اور سزا پر عمل درآمد کا اعلان بھی کر دیا گیا۔ اسے اگلے روز سہ پہر تین بجے ڈی پیلس کے عین سامنے تین دیگر افراد سمیت پھانسی پر لٹکایا جانا تھا۔

قسطینا کی حالت دیدنی تھی۔ کریم ان لوگوں میں سے تھا جنھوں نے آزادی اور دفاع کی اس جدوجہد میں بہت زخم کھائے تھے اور ثابت قدم رہے تھے۔ اب اسے عبرت کی مثال بنایا جا رہا تھا۔ قسطینا کسی بھی صورت اسے بچانا چاہتی تھی۔ کوئی بات چیت، کوئی سودے بازی...... یا پھر کوئی کمانڈو ایکشن۔ لیکن کچھ بھی قابلِ عمل نظر نہیں آرہا تھا۔ قسطینا رنج والم کے گھیرے میں تھی۔ ریان فردوس کی موت اور ڈاکٹر ماریہ کے اچانک چلے جانے کے بعد یہ تیسرا شدید دھچکا تھا جو اسے پہنچ رہا تھا۔

اسی سوچ بچار میں رات ہوگئی۔ وقت آگے کو سرکتا رہا اور پھر وہ برا وقت آن پہنچا جس کو بالآخر پہنچنا تھا۔ رائے زل کے حکم کے مطابق کریم کی پھانسی کو خصوصی اہمیت دی گئی تھی اور دیگر پھانسیوں کے برعکس اسے ٹی وی پر براہِ راست دکھایا جا رہا تھا۔ یہ ہفتہ وار تعطیل کا دن تھا۔ ڈی پیلس کے سامنے پام کے بلند درختوں اور پُرشکوہ عمارات پر سنہری دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ ہاں جزیرے کی انہی خوشگوار چمکیلی دوپہروں میں سے ایک دوپہر جن کا ذکر ایک دن قسطینا نے کیا تھا۔ بے شک یہ ویسی ہی دوپہر تھی، دھوپ اور ہوا کا بہاؤ بھی ویسا ہی تھا مگر اس سارے منظر کو موت کی بے رحم سرخی نے ڈھانپ لیا تھا۔ مناظر کی اصل روح تو حالات سے مشروط ہوتی ہے۔

عارضی پھانسی گھاٹ کے گرد عوام الناس کا جم غفیر تھا۔ وہ خوف، غصے اور دلچسپی کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ وہاں موجود تھے۔ یقیناً بے شمار لوگ اپنے گھروں میں ایسے بھی بیٹھے ہوئے تھے جن کے سینے غم کی شدت سے پھٹے جا رہے تھے۔ وہ اپنے ایک ہیرو کو اپنے سامنے موت کے منہ میں جاتا دیکھ رہے تھے......اور شاید اس کی زندگی کے حوالے سے اب بھی کسی معجزے

کے منتظر تھے۔

پھر ہم نے ٹی وی اسکرین پر پھانسی کے مجرموں کو دیکھا۔ کیمرے نے زوم کر کے کریم کو قریب سے دکھایا۔ وہ ایک زخمی سپاہی کی طرح لنگڑاتا ہوا آرہا تھا، مگر سینہ تان کر اور سر کو بلند کر کے...... پھانسی گھاٹ کی چوبی سیڑھیوں کے پاس پہنچ کر اس نے پُر جوش انداز میں نعرہ بلند کیا۔ اسے رائفل کے بٹ رسید کیے گئے لیکن وہ مسلسل نعرے بلند کرتا رہا۔ اسے گھسیٹ کر سیڑھیوں سے اوپر لے جایا گیا۔ ہجوم میں ایک لہر سی پیدا ہوئی۔ بالکل جیسے پانی تھوڑا سا آگے بڑھتا ہے پھر پیچھے ہٹ جاتا ہے۔

جب تک کریم کے چہرے پر سیاہ نقاب نہیں چڑھا دیا گیا، وہ اور اس کے تین ساتھی مسلسل نعرے لگاتے رہے۔

آگے دیکھنے کی ہمت ہم میں نہیں تھی۔ فارسٹ جان نے ٹی وی آف کر دیا۔ تین چار منٹ بعد جب اسے دوبارہ آن کیا تو کریم کو پھانسی ہو چکی تھی۔ کریم کے ساتھ اس کے تین ساتھیوں کی لاشیں بھی رسوں سے جھول رہی تھی۔ حسبِ دستوران کے جسموں پر جان کنی کے عالم میں گولیاں بھی برسائی گئی تھیں۔ خون کے قطرے ابھی تک ٹپک رہے تھے۔ ہجوم عجب بے کسی کے عالم میں منتشر ہونا شروع ہو گیا تھا مگر کچھ ٹولیاں ایسی بھی تھیں جو خوشی کا اظہار کر رہی تھیں۔

میری نگاہوں میں وہ منظر گھوم گیا جب چند منٹ قبل عبدالکریم لنگڑاتا اور نعرے لگاتا ہوا پھانسی گھاٹ کی طرف آرہا تھا۔ سچ ہی کہتے ہیں۔ جس دھج سے کوئی مقتل کو گیا وہ شان سلامت رہتی ہے۔

اس سارے منظر میں سے مجھے جو چیز سب سے زیادہ تکلیف دہ محسوس ہوئی تھی وہ آخری وقت میں بھی کریم کو تشدد کا نشانہ بنایا جانا تھا۔ دنیا سے جانے والے شخص کو بالکل آخری وقت میں تھوڑا بہت احترام تو دیا جاتا ہے مگر کریم کو اس وقت بھی زدوکوب کیا گیا تھا۔ اس نے اپنے جذبے اور اپنی حب الوطنی کے تحت نعرہ ہی لگایا تھا۔ کسی کو گالی تو نہیں دی تھی۔ برا بھلا تو نہیں کہا تھا...... اور پھر پھانسی کے وقت، جان کنی میں مبتلا جسم کو گولیاں مارنا...... یہ سب کیا تھا؟ یہ ''خوب صورت'' رسم کس کی ایجاد کردہ تھی۔ شاید رائے زل کی یا اس کی ماں کی...... یا پھر شاید یہ رسم اس نفرت کی مرہونِ منت تھی جو ان لوگوں کے سینوں میں مدتوں سے ایک آتشیں سمندر کی طرح ہلکورے لے رہی تھی۔

وہ بہت دکھ اور کرب والی رات تھی، میں دیر تک جاگتا رہا۔ میرے اندر ان جابر

حالات کا باغی سر اٹھا رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں میرا دل کچھ کر گزرنے کو چاہ رہا تھا۔ میں تصور کی نگاہ سے ڈاکٹر ماریہ کو رائے زل کے بستر پر بے بس دیکھتا تھا اور میرا خون میرے سر کی طرف یلغار کرتا تھا۔ میں اب تک کے سارے حالات کو ٹی وی اسکرین پر بغور دیکھتا رہا تھا اور نہ جانے کیوں میرا دل کہہ رہا تھا کہ میں کسی نہ کسی طرح رائے زل کو شدید نقصان پہنچا سکتا ہوں۔ ڈنمارک اور لندن وغیرہ میں جو گینگ فائٹس ہوتی تھیں، ان میں بھی کبھی کبھی مجھ پر ایسی ہی آگاہی والی کیفیت طاری ہو جاتی تھی اور میں بلا جھجک کسی خطرناک سچویشن میں کود پڑتا تھا۔ میرے ذہن میں کوئی پلان نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ مجھے یہاں کے اسٹور روم میں ایک ایسا لباس نظر آیا تھا جو غوطہ خوری میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک چھوٹا سا آکسیجن سلنڈر اور ہیلمٹ وغیرہ بھی یہاں موجود تھا میں نے اس جگہ کا نقشہ بہت اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ ساحل یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اگر میں کسی طرح کنارے پر پہنچ جاتا تو پانی کے نیچے تیر کر اپنی منزل کی طرف جا سکتا تھا۔ میری منزل ہیجڑے خیام کا گھر تھی، جو میرے اندازے کے مطابق یہاں سے بہت دور نہیں تھا۔ یہ گھر بالکل سمندر پر واقع تھا۔ خیام کو ڈی پیلس کے خواجہ سراؤں کا انچارج کہا جاتا تھا۔ خیام میری گرفت میں آجاتا تو عین ممکن تھا کہ رائے زل یا پھر مادام ہانا وانی تک پہنچنے کا کوئی راستہ نکل آتا۔ اندیشے تھے، بہت سے تھے لیکن پھر بھی میں نے پلاننگ کر لی۔ رات کو جب انیق اور سیف سو گئے تو میں نے انیق کے نام ایک چھوٹا سا خط لکھا جس میں اسے ضروری ہدایات دیں۔ زینب کے حوالے سے خاص تاکید کی اور پھر ''ایڈونچر'' کے لیے تیار ہو گیا۔

○......❖......○

یہ رات کا تیسرا پہر تھا۔ یوں کہا جائے کہ تیسرے پہر کا آغاز ہی ہوا تھا۔ غوطہ خوری کے لوازمات والا بیگ میرے دائیں ہاتھ میں تھا۔ اپنے اس اکلوتے صحت مند ہاتھ کے ساتھ میں ایک مشکل کام کے لیے نکل رہا تھا۔

پناہ گاہ سے نکل کر ابھی میں تیس چالیس میٹر ہی آگے آیا تھا کہ ایک آواز نے میرے قدم تھام لیے۔ ''رکو...... کہاں جا رہے ہو؟'' یہ قسطینا کی آواز تھی۔

میں طویل ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ وہ میرے قریب چلی آئی۔ ''تم نے یہ کیسے سمجھ لیا شاہ زائب کہ میں تمہیں اس طرح جانے دوں گی۔ اگر خودکشی وغیرہ کا ارادہ ہے تو اس کے کئی اور بھی آسان طریقے ہیں۔''

''آپ مجھے ہرگز طعنہ نہیں دے سکتیں۔ آپ کچھ روز پہلے خود بھی تو اس طرح کی مہم

جوئی کر چکی ہیں۔ وہ بھی تو خودکشی جیسا ہی کام تھا۔''

''میں سمجھ گئی ہوں۔ تمہارا اشارہ برج کلب والے حملے کی طرف ہے۔ لیکن اس کام میں ایک پلاننگ تھی۔ بن مشہد وغیرہ ساری منصوبہ بندی کا حصہ تھے۔ ہم یہاں کے ایک ایک چپے سے واقف ہیں۔ تم ابھی یہاں کے بارے میں کیا جانتے ہو؟ کیا پلاننگ ہے تمہاری۔''

اس نے میرے ہاتھ کے بیگ کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے بوائے کٹ بال پچھلے پہر کی ساحلی ہوا میں لہرا رہے تھے۔

میں نے وہیں پتھروں پر بیٹھ کر اسے بتایا کہ میرے ذہن میں کیا ہے اور میں کس طرح خیام تک پہنچنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

وہ میری ساری رُوداد سننے کے بعد ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''شاہ زائب! میں تمہارے اس جذبے اور اس سوچ کی قدر کرتی ہوں کہ تم اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر جزیرے کے اس نئے جابر حاکم تک پہنچنا چاہتے ہو لیکن جو طریقہ تم اختیار کر رہے ہو اس میں بہت سی خامیاں ہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ اگر تم نے واقعی جانا ہے تو پھر اکیلے نہیں جاؤ گے۔''

''کیا مطلب قسطینا؟''

وہ ہولے سے مسکرائی۔ تاروں کی چھاؤں میں اس کی پھیکی سی مسکراہٹ مجھے صاف نظر آئی۔ ''تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔'' وہ بولی۔ ''جب میں مالن کے بھیس میں نیوسٹی جا رہی تھی، تم نے مجھے روکا تھا اور ساتھ جانے پر اصرار کیا تھا۔ آج میں کر رہی ہوں۔''

''آ......آپ ساتھ جانا چاہ رہی ہیں؟''

''جانا چاہ نہیں رہی...... میں جاؤں گی......اور تمہیں وہ راستہ بھی بتاؤں گی جس پر چل کر کامیابی کی امید کی جا سکتی ہے۔''

''لیکن قسطینا! میں نہیں چاہتا کہ آپ اپنے آپ کو کسی خطرے میں ڈالیں۔ خدانخواستہ آپ کو کچھ ہو گیا تو جاما جی کے لوگ بالکل بے آسرا ہو جائیں گے۔ وہ بہت زیادہ انحصار کرتے ہیں آپ پر۔''

''اب تو وہ تم پر بھی کافی انحصار کرنے لگے ہیں۔ تمہاری حیثیت یہاں بہت اہم ہو رہی ہے۔ دیکھو...... میرے سر کی کوئی قیمت مقرر نہیں جبکہ تمہارے سر کی ہے۔''

''قسطینا! مجھے بتائیں، آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں؟''

''سب سے پہلے تو اپنا یہ غوطہ خوری کا سامان واپس اسٹور میں رکھو۔ میرا خیال ہے کہ ساحل کے چپے چپے کی نگرانی ہو رہی ہے۔ تمہارا پانی تک پہنچنا ہی ناممکن ہے۔ اس کے

بعد اپنے اس اکلوتے ہاتھ سے اتنا لمبا فاصلہ طے کر کے خیام کے گھر تک پہنچنا اور اندر داخل ہونا...... نہیں...... نہیں۔'' اس نے فیصلہ کن انداز میں نفی میں سر ہلایا۔

''تو پھر؟''

''ہم ایک اور طرح سے قسمت آزمائیں گے۔'' وہ پُرسوچ لہجے میں بولی۔ اس کی آنکھوں میں مشتعل چمک تھی۔

وہ مجھے لے کر واپس پناہ گاہ میں آ گئی۔ سلائیڈنگ پتھر کو بے آواز حرکت دے کر ہم اندر داخل ہوئے۔ سب سو رہے تھے۔ صرف اس کمرے سے آوازیں آ رہی تھیں جہاں سجاول بند تھا۔ وہ نشہ آور انجکشن کے زیر اثر تھا اور خود کو شاید اپنے آزاد کشمیر والے ڈیرے پر محسوس کر رہا تھا۔ وہ اپنے قائم مقام فیض محمد کو پکار رہا تھا اور ساتھ ساتھ اپنے کسی ڈکیت ساتھی کو گالیاں دے رہا تھا۔ پھر وہ اپنی بھتیجی، آفت کی پرکالہ ''مانی'' سے ڈانٹ ڈپٹ کرنے لگا۔

○......❖......○

قریباً ایک گھنٹے بعد میں دوبارہ پناہ گاہ سے نکل رہا تھا۔ اس مرتبہ میرے ساتھ قسطینا بھی تھی۔ جزیرے کی کچھ مسلمان خواتین مکمل پردہ بھی کرتی تھیں اور ایک برقع نما لبادے میں نظر آتی تھیں۔ اس وقت قسطینا بھی ایک ایسے ہی سیاہ بوسیدہ لبادے میں تھی۔ اس کے سر پر ایک ٹوپی تھی اور اس ٹوپی کے سامنے سیاہ رنگ کے باریک کپڑے کا نقاب جھول رہا تھا جس کے آر پار وہ دیکھ سکتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں روزمرہ استعمال کی ایک ٹوکری تھی جس میں ڈرائی فروٹ اور بسکٹ وغیرہ تھے۔ میں بھی مقامی طرز کے لباس میں تھا۔ قسطینا نے فارس جان کی مدد سے میرے سر پر ایک سفید بینڈیج اس طرح سے کر دی تھی کہ میری ایک آنکھ اور ایک رخسار بھی اس میں چھپ گئے تھے۔ ایک چھوٹی بینڈیج ٹیپ کے ذریعے میری ٹھوڑی پر بھی چپکائی گئی تھی۔ یوں چہرہ ناقابلِ شناخت ہو کر رہ گیا تھا۔ بائیں بازو پر پہلے سے پٹیاں موجود تھیں۔ میں جنگ سے متاثرہ ایک مقامی زخمی کے روپ میں بالکل ''فٹ'' نظر آ رہا تھا۔ میرا پستول قسطینا نے ایک لچکیلے بینڈ کے ذریعے اپنی ٹانگ سے باندھ لیا تھا۔ نکلنے سے پہلے قسطینا نے فارس جان کو ضروری ہدایات دے دی تھیں۔ اب رات کا آخری پہر شروع ہو چکا تھا۔ ساحل کی طرف سے سرد ہوا کی آ رہی تھی۔ کسی بدھ مندر کی گھنٹیاں بجنا شروع ہو گئی تھیں۔ شہر کی جانب عمارتوں کی روشنیاں اونگھ رہی تھیں اور مکمل خاموشی تھی۔ ہم باتیں کرتے جا رہے تھے۔

میں نے کہا۔ ''کچھ تو بتاؤ قسطینا! ہم جا کہاں رہے ہیں؟''

''سمجھو، ایک بہت بڑا شارٹ کٹ لگا رہے ہیں رائے زل تک پہنچنے کے لیے۔ اگر

ایک بندے تک پہنچ گئے تو...... رائے زل کے آس پاس بھی پہنچ گئے۔''

''کون بندہ ہے؟''

''آقا جان کا ذاتی باڈی گارڈ...... ہمایوں آسیاں۔ یہ شخص یہاں مضافات میں اپنے فارم میں رہتا ہے۔ آقا جان آج کل ہر وقت رائے زل کے دائیں بائیں نظر آتا ہے۔ مطلب یہ کہ آسیاں بھی رائے زل کے آس پاس ہی ہوگا۔'' (یہ پہلی بار تھی کہ قسطینا نے انکل آقا جان کے بجائے صرف آقا جان کہا تھا) قسطینا کی بات سمجھ میں آرہی تھی۔ اس میں اہم نکتہ یہی تھا کہ یہ آسیاں نامی باڈی گارڈ شہر میں نہیں بلکہ یہاں مضافات میں کہیں رہتا تھا۔ جہاں تک ہم بہ آسانی پہنچ سکتے تھے۔

میں نے قسطینا سے پوچھا۔ ''کتنی دور جانا ہوگا؟''

''مشکل سے دوڈھائی کلومیٹر۔'' وہ بولی۔

ہم پام کے پیڑوں اور کیلے کے گھنے درختوں کے درمیان سے گزر رہے تھے۔ ایک پنسل ٹارچ قسطینا کے ہاتھ میں تھی، جہاں شدید ضرورت ہوتی تھی وہ ایک سیکنڈ کے لیے ٹارچ کو روشن کر لیتی تھی۔ ایک مثبت تبدیلی یہ تھی کہ میرے بازو کا درداب بہت کم ہو گیا تھا۔ سوجن بھی نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ غالباً ڈاکٹر ماریہ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ انفیکشن ختم ہورہا تھا اور ہڈی نے جڑنا شروع کر دیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ غلط طریقے سے جڑ رہی تھی اور میں بازو کو ایک حد سے زیادہ حرکت نہیں دے سکتا تھا۔

ایک جگہ ہمیں سپاہیوں کی نقل و حرکت کا شبہ ہوا۔ ہم نے راستہ بدل لیا اور زیادہ گھنے درختوں میں سفر کرتے آگے بڑھتے رہے۔ آخر ایک جگہ مدھم روشنیاں دکھائی دیں اور رکھوالی کے کتوں کی آوازیں آئیں۔ یہاں ایک فارم ہاؤس کی چار دیواری تھی۔ فارم ہاؤس زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اس کے اندر ''رہائشی عمارت'' سامنے ہی دکھائی دے رہی تھی۔ لکڑی کے پھاٹک کے ساتھ ایک کال بیل موجود تھی۔ تاہم قسطینا نے کال بیل کے بجائے پھاٹک پر دستک دی۔ میں دیوار کی اوٹ میں ہو چکا تھا۔ دو سیکنڈ بعد پھاٹک کے اوپر سے ایک سر نظر آیا۔ ''کون ہے؟'' ملائی زبان میں پوچھا گیا۔

قسطینا نے مصیبت زدہ آواز میں کچھ کہا۔ گیٹ کیپر نے چھوٹا دروازہ کھولا اور باہر نکلا۔ رائفل اس کے کندھے سے جھول رہی تھی۔ قسطینا نے برقع نما لبادے کے اندر سے پستول نکال کر گیٹ کیپر کے سر سے لگا دیا۔ ''خبردار! جان سے مار ڈالوں گی۔'' وہ سفاک لہجے میں بولی۔

اسی دوران میں، میں نے عقب سے نمودار ہو کر اس کے سر کے بال مٹھی میں جکڑ لیے اور رائفل اس کے کندھے سے اتار لی۔

گیٹ کیپر سکتہ زدہ تھا۔ وہ قسطینا کی طرف دیکھے چلا جا رہا تھا۔ شاید اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں اسے گھسیٹ کر ایک طرف خودرَو پودوں میں لے گیا۔ اس کی نگاہیں ابھی تک قسطینا پر جمی ہوئی تھیں جس نے اب چہرے سے نقاب اٹھا دیا تھا۔

میں نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ''ہاں، یہ وہی ہیں جن کا شبہ تمہیں ہو رہا ہے۔ بہت بڑی مصیبت سے بچنا چاہتے ہو تو جو کچھ کہنے والے ہیں اس پر عمل کرو۔''

یہی بات قسطینا نے ملائی زبان میں بھی گیٹ کیپر تک پہنچا دی۔ وہ اب تھرتھر کانپ رہا تھا۔ جاما جی کی سپریم کمانڈر اس کے سامنے تھی۔ دو چار منٹ کے اندر ہم اس شخص کو اپنے ڈھب پر لے آئے۔ قسطینا نے اس سے کہا کہ اگر وہ فارم ہاؤس کی رہائشی عمارت کے بارے میں درست اطلاعات دے گا اور تعاون کرے گا تو اس کی جان بخشی ہو جائے گی۔

گیٹ کیپر بے حد دہشت زدہ تھا۔ اس نے تعاون کا یقین دلایا اور بتایا کہ گھر میں فی الوقت صرف تین افراد ہیں۔ مالک آسیاں......ایک لڑکی اور ایک باورچی۔

قسطینا نے پوچھا۔ ''آسیاں کی بیوی کہاں ہے؟''

گیٹ کیپر نے بتایا کہ وہ جھگڑ کر اپنے میکے گئی ہوئی ہے۔ مالک آسیاں نے اپنی تنہائی دور کرنے کے لیے ڈی پیلس کی ایک ملازمہ کو عارضی طور پر اپنے پاس رکھا ہوا ہے

ہمیں گھر کے بارے میں مکمل معلومات حاصل ہو گئیں تو ہم پھاٹک کے چھوٹے دروازے کے ذریعے اندر داخل ہوئے۔ پھاٹک کے قریب ہی دو سرونٹ کوارٹر موجود تھے۔ ان میں سے ایک کے اندر ملائیشین باورچی سو رہا تھا۔ قسطینا نے تصدیق کر لی تھی کہ باورچی کے پاس کوئی موبائل فون وغیرہ نہیں ہے۔ باورچی کو سرونٹ کوارٹر کے اندر ہی مقفل کر دیا گیا۔ اس کے بعد گیٹ کیپر مراد نے اپنے موبائل فون کے ذریعے آسیاں کو جگایا اور اسے یہ پریشان کن اطلاع دی کہ پھاٹک سے باہر ایک لاش پڑی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایسی اطلاع نہیں تھی جو آسیاں کو اس کے بیڈ روم سے نہ نکالتی۔

ہماری موجودگی کے سبب رکھوالی کے کتے مسلسل شور مچا رہے تھے اور یقیناً یہ آوازیں آسیاں کے کانوں تک بھی پہنچ رہی تھیں۔ عین ممکن تھا کہ وہ کتوں کی اس بے چینی کو بھی لاش کی موجودگی سے جوڑ رہا ہو۔ کچھ ہی دیر بعد لمبا تڑنگا آسیاں ہمیں برآمدے سے نکل کر پھاٹک کی طرف آتا دکھائی دیا۔ اس کی حرکات و سکنات میں بلا کی چستی تھی۔ میں، قسطینا اور

گیٹ کیپر مراد ایک بار پھر پھاٹک سے باہر کھڑے تھے۔ گیٹ کیپر مراد والی ٹرپل ٹو رائفل میرے ہاتھ میں تھی۔

جونہی آسیاں باہر نکلا میں نے رائفل کی نال اس کی کنپٹی سے لگا دی۔ ''خبر دار۔'' میں نے دہاڑ کر کہا۔

اس نے پھرتی سے پلٹنا چاہا۔ اس وقت دو کام ایک ساتھ ہوئے۔ قسطینا نے اس کے ہولسٹر میں سے پستول کھینچا اور میں نے اس کی کمر پر ٹانگ رسید کر کے اسے کئی قدم دور پھینک دیا۔ وہ اوندھے منہ گرا تھا۔ قسطینا نے اپنا پاؤں اس کی گدی پر رکھ دیا۔ اس نے بھی اب قسطینا کو دیکھ لیا تھا۔ جو کچھ بھی تھا، وہ جاماجی کی سپریم کمانڈر تھی۔ اس کا رعب مدِمقابل کو متاثر کرتا تھا۔

آسیاں اگر آقا جان کا ذاتی باڈی گارڈ تھا تو یونہی نہیں ہوگا، وہ کسی بھی وقت خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔ اس کی باڈی لینگویج بھی یہی بتاتی تھی۔ میں اس کے حوالے سے کوئی رسک لینا نہیں چاہتا تھا۔ سرونٹ کوارٹر میں سے ایک رسی میں پہلے ہی ڈھونڈ چکا تھا۔ میں نے گیٹ کیپر مراد کو گن پوائنٹ پر حکم دیا کہ وہ اوندھے پڑے آسیاں کے ہاتھ اس کی پشت پر باندھ دے۔ مراد کو ایسا کرنا پڑا۔ اب میں نے اپنے چہرے کی پٹیاں اتار دی تھیں۔

قسطینا نے ''ہمایوں آسیاں'' کے لباس کی تلاشی لی اور اس کے موبائل فون کے علاوہ پستول کا ایک بھرا ہوا میگزین نکال لیا۔ اس دوران میں آسیاں کسی علاقائی زبان میں مسلسل بڑبڑا رہا تھا۔ (بعدازاں قسطینا نے مجھے بتایا کہ وہ گیٹ کیپر مراد کو گندی گالیاں دے رہا تھا اور اسے کوس رہا تھا کہ وہ گیٹ کی حفاظت نہیں کر سکا)

آسیاں کے ہاتھ باندھنے کے بعد ہم اسے اور مراد کو اندر لے آئے۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ مراد اور آسیاں نے مجھے شناخت نہیں کیا۔ اندر ایک کمرے میں ڈبل بیڈ کے ایک کنارے پر ایک لڑکی دنیا و مافیہا سے بے خبر سو رہی تھی۔ کچھ دیر پہلے گیٹ کیپر مراد نے بتایا تھا کہ وہ ڈی پیلس کی کوئی ملازمہ ہے جو آسیاں کی تنہائی دور کرنے کے لیے یہاں موجود ہے۔ لیکن میں اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اپنی نگاہوں پر بھروسا نہیں ہوا۔ میرے سامنے جو لڑکی آقا جان کے ذاتی محافظ آسیاں کے بستر پر سو رہی تھی...... وہ سنبل تھی۔ عزت مآب ریان فردوس کی نہایت چہیتی خواص...... لیہ کے پاراہاؤس میں وہ کھلنے اور بند ہونے والے ایک مشینی پھول میں بیٹھ کر بطور تحفہ ریان فردوس کی خدمت میں پیش ہونے گئی تھی (اس پھول میں ایک دوسری لڑکی آقا جان نے ریان فردوس کے پاس بھجوا دی تھی مگر سنبل کو پھر بھی اپنی خوب صورتی کا خراج

مل گیا تھا اور ریان فردوس نے اسے سرراہ دیکھ کر اپنے پاس طلب کرلیا تھا) آج وہی سنبل دو ٹکے کے ایک گارڈ کے پاس موجود تھی۔ کہاں جاماجی کا رب پتی فرمانروا اور کہاں ایک ملازم۔ شاید یہ بھی رائے زل اور آقا جان کی نفرت اور حقارت کا ایک اظہار تھا۔ مقتول فرمانروا کی منظورِ نظر کو نچلے درجے کے ماتحتوں کے حوالے کردیا گیا تھا۔

میں نے سنبل کو جگایا۔ اس کے بال منتشر تھے۔ وہ کچھ دیر خالی خالی نظروں سے ہماری طرف دیکھتی رہی تب اس نے یکا یک مجھے پہچان لیا۔ اس کے گورے چٹے چہرے پر حیرت کی یلغار ہوئی۔ وہ ایک دم بستر سے اتر آئی۔ ''تم یہاں......؟''

''ہاں......لیکن تم یہاں کیسے؟''

اس نے ڈری ڈری نظروں سے اردگرد دیکھا۔ تب اس کی نگاہ آسیاں پر پڑی۔ اس کے چہرے کی خراشیں اور اس کے بندھے ہوئے ہاتھ دیکھ کر اس کی حیرت دوچند ہوگئی۔ تاہم اس کے ساتھ ہی اس کا اعتماد بھی کچھ بحال ہوا۔ وہ میرے پہلو میں آن کھڑی ہوئی۔ ''میں یہاں رہنا نہیں چاہتی۔ مجھے یہاں سے لے چلو۔ سجاول صاحب کہاں ہیں؟ مجھے ان کے پاس لے چلو، یہ سب بدمعاش لوگ ہیں۔ انہوں نے مجھ سے سب کچھ چھین لیا ہے۔ کچھ بھی میرے پاس نہیں رہنے دیا۔'' وہ اپنے خالی ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے اشک بار لہجے میں بولی۔ یہ وہی ہاتھ تھے جن پر جڑاؤ چوڑیوں اور انگوٹھیوں کی بہار نظر آتی تھی۔

''تمہیں یہاں لایا کون تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے کچھ پتا نہیں۔'' وہ سسکی۔ ''عزت مآب کو مارنے کے بعد انہوں نے لوٹ مار مچا دی۔ کئی عورتوں کو پکڑ لیا۔ ان میں، میں بھی تھی۔ مجھ سے میرا سارا سامان چھین لیا۔ وہ سارے تحفے بھی جو وہ (ریان فردوس) مجھے دیتے رہے تھے۔ پورا صندوق بھرا ہوا تھا۔'' وہ جیسے کراہ اٹھی۔

''ڈی پیلس سے باہر کیسے نکلیں تم؟''

''پہلے مجھے آقا جان کا ایک بھانجا اپنے ساتھ لے گیا۔ پھر مجھے اپنے ایک عیسائی ملازم کے حوالے کردیا۔ اس نے میری انگوٹھیاں، چوڑیاں اور کانوں کی بالیاں تک اتروالیں۔ یہ دیکھو میرے کان۔'' اس نے اپنا ایک زخمی کان دکھایا اور آنسو ٹپ ٹپ اس کے رخساروں سے پھسلنے لگے۔

کچھ دیر چپ رہ کر وہ بولی۔ ''وہاں سے مجھے یہ کمینہ لے آیا۔ میں دو دن سے اس کے پاس ہوں۔ کل یہ اپنے دو دوستوں کو بھی یہاں لے کر آیا ہوا تھا۔'' وہ ایک بار پھر رو پڑی۔

جنگ کے بارے میں یہی کہا جاتا ہے کہ یہ منہ زور پانی کی طرح اپنے راستے خود بناتی ہے۔ سارے معاشرتی اور اخلاقی معیار بدل جاتے ہیں۔ فرش پر رینگنے والے آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگتے ہیں اور آسمان پر پرواز کرنے والے گندی نالیوں میں دیکھے جاتے ہیں۔ یہ سنبل کچھ دن پہلے تک ریان فردوس کی اہم ترین خواص تھی مگر آج گلی گلی میں رُل رہی تھی۔ وہ عالی شان بیڈروم، وہ زرق برق لباس، وہ ہر وقت سینے سے لگا ہوا میمنا، وہ خادماؤں کے جھرمٹ...... وہ سب کچھ ناپید تھا۔ چار دن کی چاندنی پھر اندھیری رات...... شاید اس کی اس خواری میں آقا جان کی کینہ پروری کا بھی دخل رہا ہو۔ اسے عرصے سے اس بات کا قلق تھا کہ اس کی منظورِ نظر لڑکی کی جگہ سنبل کو ریان فردوس کے حرم میں اہمیت دی گئی ہے۔

قسطینا نے سنبل کو تسلی دی اور اس کے آنسو پونچھے۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ ہم نے گیٹ کیپر مراد کی اچھی طرح تلاشی لینے کے بعد اسے ایک واش روم میں مقفل کر دیا اور آسیاں کو گھر کے بیسمنٹ میں لے جا کر اس سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔ وہ بہت سخت ہڈی کا تھا۔ آسانی سے کچھ اُگلنے والا نہیں تھا۔ مگر ہمارے پاس بھی رحم کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ دس منٹ کے کلاسیکل تشدد نے آسیاں کی ساری تن فن ختم کر دی۔ اس کی ناک اور منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ کلائی کی دونوں ہڈیاں ٹوٹ چکی تھیں اور میں اس کے ہاتھ کو ذرا سی حرکت دیتا تو وہ بلبلا اٹھتا تھا۔

اس سے جو کچھ معلوم ہوا اس کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا۔ آج شام آقا جان اور حلمی کو ایک اہم میٹنگ میں ملنا تھا۔ یہ دراصل ایک جلسہ تھا۔ ائیر پورٹ کی طرف ایک بڑے فٹ بال اسٹیڈیم میں آج، یہاں کا نیا فرمانروا ارائے زل لوگوں سے خطاب کر رہا تھا۔ (کہنے کو تو وہ فرمانروا تھا لیکن جاننے والے جانتے تھے کہ وہ ایجنسی کا کٹھ پتلی ہے) یہ جلسہ سہ پہر چار بجے کے لگ بھگ ہونا تھا۔ سیکیورٹی کے انتہائی سخت انتظامات تھے۔ ذاتی باڈی گارڈ کی حیثیت سے آسیاں آؤٹ ڈور میں ہر گھڑی آقا جان کے ساتھ رہتا تھا۔ آسیاں اس چار رکنی موٹر سائیکل سوار اسکواڈ کا رکن تھا جو آقا جان کی گاڑی کے ساتھ ساتھ چلتا تھا۔ آسیاں کی ''ہیوی سرکاری بائیک'' آقا جان کی مرسیڈیز کے آگے دائیں جانب رہتی تھی۔ جب آقا جان گاڑی سے اتر کر کسی ''پبلک پلیس'' پر جاتا تھا تو آسیاں اور اس کا بائیں جانب والا ساتھی آقا جان کے عقب میں پیدل ہوتے تھے۔ آسیاں نے شدید اذیت کا شکار ہونے کے بعد ہمیں جو معلومات دیں ان سے پتا چلا کہ موٹر سائیکل سواروں کی یونیفارمز، بلٹ پروف جیکٹس، موٹر سائیکلز اور دیگر سارے لوازمات سیکیورٹی کے ''برانچ آفس'' میں ہوتے ہیں۔ یہ برانچ آفس

ڈی پیلس کے قریب ہی واقع تھا۔ یہ لوگ برانچ آفس سے تیار ہو کر اور اپنی بائیکس لے کر نکلتے تھے اور ڈی پیلس کے مین گیٹ پر تیار کھڑے ہو جاتے تھے۔ جونہی آقا جان کی گاڑی ڈی پیلس سے برآمد ہوتی تھی وہ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگتے تھے۔

آسیاں کی ساری باتیں سننے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ میں آج سہ پہر آسیاں کی جگہ لوں گا۔ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ برانچ آفس میں داخل ہونا ہی جوئے شیر لانے کے برابر تھا۔ یہاں سی سی ٹی وی کیمرے تھے۔ جگہ جگہ آٹو میٹک شناخت کا سسٹم تھا......

جدید ''سینسرز'' پر فنگر پرنٹ اسکین ہوتے تھے اور سلائیڈنگ دروازے خود بخود کھلتے تھے۔ صرف ایک چیز ایسی تھی جو کسی حد تک میرے حق میں جاتی تھی اور وہ یہ کہ برانچ آفس کے تین چار بیرونی کیمرے کام نہیں کر رہے تھے۔

گھر کے بیسمنٹ میں آسیاں سے ہماری تفتیش جاری تھی کہ اس کے سیل فون پر کال آ گئی۔ اس سلسلے میں ہم آسیاں کو پہلے ہی کڑی ہدایات دے چکے تھے۔ میرے اشارے پر اس نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف ایجنسی کا کوئی امریکن آفیسر انگلش میں بات کر رہا تھا۔

''ہیلو آسیاں! تم ٹائمنگ نوٹ کر چکے ہو؟''

''جی سر۔'' آسیاں نے اپنی آواز حتی الامکان نارمل رکھتے ہوئے کہا۔

''تمہیں دو بجے ڈی پیلس کے مین گیٹ پر ہونا چاہیے۔ آقا صاحب ڈھائی بجے کے بعد کسی بھی وقت باہر آ سکتے ہیں۔''

''جی سر۔''

''کوئی سوال؟''

''سر! ہم چاروں ہوں گے؟''

''نہیں...... تم دونوں جاؤ گے۔ مختار اور راجر کی ڈیوٹی اوان صاحب کے ساتھ ہے۔''

''اوکے سر۔'' آسیاں نے اپنی کراہ دباتے ہوئے کہا۔ اس نے اپنی ٹوٹی ہوئی کلائی کو دوسرے ہاتھ سے تھام رکھا تھا۔

بات ختم کرنے کے بعد وہ لمبی سانسیں لینے لگا۔ اس کی پیشانی پسینے سے تر تھی۔ اس کے اور امریکن آفیسر کے درمیان جو گفتگو ہوئی تھی۔ وضاحت طلب تھی۔ آسیاں نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ اس وقت ''وی آئی پیز'' کی نقل و حرکت بہت زیادہ ہے۔ اس لیے آقا جان کے ساتھ چار گارڈز کے بجائے دو گارڈز ہوں گے۔ (ان میں سے ایک آسیاں تھا)

آسیاں کا پیٹ اور کندھے وغیرہ ہم نے کرسی کے ساتھ باندھ رکھے تھے۔ اس کے بالائی کپڑے پھٹ چکے تھے اور اندر سے کسرتی جسم جھلک دکھا رہا تھا۔ قسطینا کے جاں بحق ہونے والے گارڈ براڈے کی طرح آسیاں بھی فولادی شخص تھا۔ مگر فی الوقت یہ فولاد ہمارے لیے گرم لوہا بنا ہوا تھا، ہم اسے جس طرف چاہے موڑ رہے تھے۔ جب میں نے ایک تیز دھار چاقو سے آسیاں کے دائیں ہاتھ کا انگوٹھا اچانک کاٹ ڈالا تو وہ درد سے چلا اٹھا۔ اس کی بھاری بھرکم آواز تہہ خانے میں گونج کر رہ گئی۔ اس کی آنکھوں میں شدید حیرت تھی۔ جیسے خاموشی کی زبان میں مجھ سے پوچھ رہا ہو...... یہ کیا کر دیا؟ سب کچھ تو بتا رہا ہوں۔ کس بات پر اڑی کی ہے؟

خون زخم میں سے تیزی کے ساتھ نکل رہا تھا۔ طیش اور درد سے بے تاب ہو کر آسیاں نے خود کو چھڑانا چاہا۔ کرسی الٹ گئی۔ وہ پہلو کے بل کرسی سمیت گرا۔ مکرر ارشاد کے طور پر قسطینا نے اس کے کھوپڑے کو رائفل کے دستے سے بجایا۔ وہ کسی علاقائی زبان میں دہاڑنے لگا اور واویلا کرنے لگا۔ اس کا کٹا ہوا انگوٹھا فرش پر پڑا تھا اور کریہہ منظر پیش کر رہا تھا۔

''یہ کیوں کیا؟'' قسطینا کو بھی تھوڑی سی حیرت ہوئی، کیونکہ آسیاں ہر طرح تعاون کر رہا تھا۔

''یہ انگوٹھا کام آئے گا۔'' میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ آواز بس اتنی تھی کہ قسطینا ہی سن سکی۔

پہلے تو قسطینا نے خالی خالی آنکھوں سے میری طرف دیکھا پھر ایک دم اس کی آنکھوں میں چمک نمودار ہوئی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔

میں نے کٹے ہوئے انگوٹھے کو ایک ٹشو پیپر میں لپیٹا اور پھر پولیتھین کے ایک چھوٹے لفافے میں ڈال لیا۔

''ماردو...... مجھے جان سے ہی ماردو۔'' آسیاں دہاڑ رہا تھا۔

قسطینا بے رحم لہجے میں بولی۔ ''گھبراؤ مت، تمہاری یہ خواہش بھی پوری کر دیں گے۔ کوئی ایسا افسوس نہیں ہوگا ہمیں، تمہاری کھوپڑی توڑ کر۔''

اس کے ہاتھ کا خون بند کرنے کے لیے میں نے وہاں روئی رکھ کر چوڑی ٹیپ چپکا دی مگر خون کے قطرے پھر بھی گرتے رہے۔ اس کے واویلے کے باوجود میں نے اس کے ہاتھ پھر کرسی سے باندھ دیئے۔

قسطینا نے اس کی بندشیں چیک کیں اور ہم بیسمنٹ کا دروازہ لاک کر کے اوپر آ گئے۔

سنبل یہاں سکڑی سمٹی ایک صوفے پر بیٹھی تھی۔ وہ جسمانی اور مالی طور پر بری طرح لوٹی گئی تھی مگر یوں لگتا تھا کہ اسے مالی نقصان کا زیادہ دکھ ہے۔ میں نے آسیاں کے ذاتی کمرے کی تلاشی لی۔ جلد ہی مجھے ایک الماری کے خفیہ خانے سے پندرہ بیس گرام ہیروئن...... کچھ نقدی اور سونے کے ایک درجن بسکٹ مل گئے۔ نقدی اور سونا ملا کر کافی مالیت بنتی تھی۔ میں نے سنبل سے کہا۔ ''گھبراؤ مت، یہ سب تمہارا ہے۔'' اس کے ساتھ ہی میں نے برونائی ڈالرز، امریکن ڈالرز اور سونے کے بسکٹ سنبل کے سامنے رکھ دیئے۔

اس کی بجھی ہوئی آنکھوں میں روشنی نمودار ہوگئی مگر چہرے پر خوف بھی تھا۔ وہ ہراساں نظروں سے اردگرد دیکھ رہی تھی۔ ''وہ کہاں گیا ہے؟'' وہ بولی۔

''تہ خانے میں ہے۔ اس کی طرف سے بے فکر رہو۔''

''وہ بہت زور زور سے بول رہا تھا اور رو رہا تھا۔ کیا تم لوگوں نے اسے مارا ہے؟''

''کیا نہیں مارنا چاہیے تھا؟''

''وہ بہت خطرناک شخص لگتا ہے......'' وہ بولی۔

''اس کی کافی ساری خطرناکی، ناک کے راستے نکل چکی ہے۔ باقی بھی نکل جائے گی۔'' قسطینا دوسرے کمروں کی تلاشی لے رہی تھی۔ کھٹ پٹ کی مدھم آوازیں آرہی تھیں۔ اچانک مجھے قسطینا کی ہلکی سی کراہ سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی اوپر تلے تین فائر ہوئے اور درو دیوار گونج گئے۔

سنبل کی آنکھوں میں بے پناہ خوف اُمڈ آیا۔ وہ لپک کر واش روم میں گھس گئی۔ میں پستول نکال کر قسطینا کی طرف لپکا۔ وہ اس دروازے کے پاس تھی جہاں سے سیڑھیاں تہہ خانے میں جاتی تھیں۔ میں نے دیکھا قسطینا کے ہاتھ میں رائفل ہے اور چند فٹ کے فاصلے پر آسیاں مردہ پڑا ہے۔ کرسی ابھی تک اس کی پشت سے بندھی ہوئی تھی، مگر وہ کسی طرح اپنے ہاتھ کھولنے میں کامیاب رہا تھا۔ اس کے پاس ڈپلی کیٹ چابی موجود تھی۔ اس نے تہہ خانے کا دروازہ کھول کر سیڑھیاں طے کی تھیں۔ کرسی کی ایک ٹوٹی ہوئی وزنی ٹانگ اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے اسی ٹانگ سے قسطینا پر عقب سے وار کیا اور اس کی فائرنگ کا نشانہ بن گیا۔ قسطینا کے سر پر چوٹ آئی تھی مگر بہت شدید نہیں تھی۔

''کافی جلدی خواہش پوری ہوگئی اس کی۔'' میں نے کہا۔

قسطینا بولی۔ ''فائرنگ کی آواز باہر بھی گئی ہوگی۔ کہیں فارم میں سے کچھ لوگ یہاں نہ پہنچ جائیں۔ بیرونی دروازے لاک کردو۔''

میں نے دروازے لاک کر دیئے۔

قریباً پانچ منٹ تک ہم بالکل الرٹ رہے لیکن فارم ہاؤس کے باقی حصے میں کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا۔ شاید اس فائرنگ کو ہوائی فائرنگ سمجھا گیا تھا یا کسی دوسری روٹین میں لے لیا گیا تھا۔ اگلے ایک گھنٹے کے اندر ہم اپنی پلاننگ کے مطابق آگے بڑھنے کے لیے بالکل تیار تھے۔ یہ ایک بڑی مکمل منصوبہ بندی تھی مگر منصوبہ کتنا بھی پرفیکٹ ہو جب تک اس پر عمل شروع نہ ہو اس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ قسطینا بدستور برقع نما لبادے میں تھی۔ میں نے اپنے چہرے کو پی کیپ اور چوڑے شیشوں والی عینک سے چھپانے کی کوشش کی تھی۔

O......❖......O

آسیاں کی لاش کو تہہ خانے میں چھپانے کے بعد ہم نے گھر میں اپنی موجودگی کے تمام آثار ختم کیے۔ ہم نے گیٹ کیپر مراد کو بھی اسی سرونٹ کوارٹر میں بند کر دیا، جہاں آسیاں کا خانساماں موجود تھا۔ دونوں کے منہ میں کپڑے ٹھونس کر ان کی مشکیں بے حد احتیاط سے کس دی گئی تھیں۔ سرونٹ کوارٹر کے مختصر باتھ روم میں وہ دونوں جیسے ''پیک'' ہو کر رہ گئے تھے، ہم ان کی طرف سے مطمئن تھے۔

ہم نے آسیاں کی 2002ء ماڈل کی ٹوسیٹر گاڑی پر سفر کیا۔ سنبل بھی ہمارے ساتھ تھی۔ پروگرام کے عین مطابق ہم نے سنبل کو بڑی رازداری کے ساتھ ایک رہائشی کالونی کے چھوٹے سے گھر میں اتار دیا۔ یہ ایک ایسے لیکچرار کا گھر تھا جو ہر طرح سے قسطینا کا وفادار تھا اور سنبل جہاں سو فیصد محفوظ تھی۔

سنبل کے بوجھ سے آزاد ہونے کے بعد ہمارا اصل کام شروع ہوا۔ اب دن کا اجالا اچھی طرح پھیل چکا تھا مگر سڑکوں پر آمدورفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ بس کسی وقت کوئی پرائیویٹ یا فوجی گاڑی فراٹے کے ساتھ گزر جاتی تھی۔ جگہ جگہ بمباری اور گولہ باری کے آثار بھی نظر آتے تھے۔ درختوں کے درمیان ایک بغلی سڑک پر ہم نے آسیاں کی ٹوسیٹر گاڑی روک لی۔ یہ جگہ رکنے کے لیے ہر لحاظ سے محفوظ تھی۔

''اب بتاؤ کیا کرنا ہے؟'' قسطینا نے سامنے سڑک پر دیکھتے ہوئے کہا۔

''برانچ آفس کے اندر گھسنا ہے۔''

وہ بولی۔ ''اندر گھسنے کے لیے یہ وقت بہترین ہے مگر اس وقت بھی داخلی دروازے پر ایک دو گارڈز تو ضرور موجود ہوں گے۔''

''انہیں آپ سنبھال لیجیے گا۔ اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو پھر یہ تو ہے نا۔'' میں نے جیکٹ کے

نیچے پستول کو چُھو کر کہا۔ یہ جیکٹ اور پستول آسیاں ہی کا تھا۔

آسیاں کا کٹا ہوا انگوٹھا پولیتھین کے لفافے میں لپٹا ہوا میری پتلون کی جیب میں موجود تھا اور میں اسی کی مدد سے برانچ آفس کی نہایت سخت سیکیورٹی کے حصار میں گھسنے والا تھا۔ پروگرام کے مطابق مجھے وہاں سے آسیاں کا مکمل لباس، اس کا اسپیشل آئی ڈی، اس کی پائلٹ موٹر بائیک اور دیگر اشیا حاصل کرنا تھیں اور پھر آقا جان کے پروٹوکول کا حصہ بن کر اس کے قافلے کے ساتھ فٹ بال اسٹیڈیم پہنچنا تھا۔ یقینی بات تھی کہ اگر میں بخیریت اسٹیڈیم تک پہنچ گیا تو پھر مجھے اسٹیج تک پہنچنے میں بھی دشواری نہیں ہو گی۔ نئے عزت مآب رائے زل کو بھی اسٹیج پر ہی ہونا تھا، وہاں اسے نشانہ بنانا میرے لیے بہت زیادہ مشکل نہیں تھا۔ اصل مشکل اسے نشانہ بنانے کے بعد میرا صحیح سلامت رہنا تھا۔ یقینی بات تھی کہ ایسے موقعوں پر فائرنگ کرنے والے کو فوراً چھاپ لیا جاتا ہے اور اس کی تکا بوٹی بھی موقع پر ہی کر دی جاتی ہے۔

اس صورتِ حال سے بچنے کے لیے قسطینا نے ایک پلان تیار کیا تھا۔ اس کی ذہانت کی داد دینا پڑتی تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ جاماجی کی سپریم کمانڈر رہ چکی تھی۔ محترم آدم جیسے جانباز مجاہد کی بیٹی تھی۔ فنِ حرب اس کے خون میں شامل تھا۔ وہ آسیاں کے گھر سے ایک خاص چیز اپنے ساتھ لے کر آئی تھی۔ یہ شے خاصی وزنی تھی اور سیاہ رنگ کے ایک بڑے شاپر میں لپیٹ کر نشستوں کے نیچے گھسا دی گئی تھی۔ یہ امریکی ساخت کا ایک نہایت طاقتور ٹائم بم تھا۔ قسطینا کے اندازے کے مطابق اس میں کم و بیش دس کلو ٹی این ٹی موجود تھا۔ یہ بم قسطینا کو آسیاں کے گھر کے تہہ خانے سے ملا تھا اور اس نے فوراً اس سے کام لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

وہ بڑے اطمینان سے بولی۔ ''شاہ زائب! مجھے یقین ہے یہ تدبیر کام کرے گی۔ شرط یہی ہے کہ ہماری ٹائمنگ بالکل درست ہو۔''

''ٹائمنگ کی فکر آپ نہ کریں مگر کیا آپ اس ڈیوائس کے ساتھ مطلوبہ فاصلے تک پہنچ پائیں گی؟''

''شاہ زائب! اس فٹ بال اسٹیڈیم اور اس کے قرب و جوار کو میں اسی طرح جانتی ہوں جس طرح تم اپنے ہاتھ کی ہتھیلی کو۔ پارکنگ لاٹ کا بڑا حصہ اسٹیڈیم کی شمالی جانب ہے۔ یہاں سے اسٹیڈیم کا فاصلہ نصف کلومیٹر سے زیادہ نہیں ہو گا۔ اسٹیج کا فاصلہ 200 میٹر کے لگ بھگ مزید ہو جائے گا۔ مجھے پورا یقین ہے وہاں تک دھماکے کی آواز کافی شدت سے پہنچے گی۔ دو تین سیکنڈ کے لیے تو ہر شخص اس آواز کی طرف متوجہ ہو جائے گا۔ ان دو تین سیکنڈ میں تم اپنے پسٹل کی پانچ چھ گولیاں تو رائے زل کی چربی میں اتار ہی سکتے ہو۔''

''اس کے بعد؟''

''اس کے بعد ظاہر ہے افراتفری کا عالم ہوگا۔ اگر تمہاری قسمت اچھی ہوئی......اور مجھے یقین ہے کہ وہ اچھی ہے تو تم وہاں سے مکھن کے بال کی طرح نکل سکو گے۔''

''آپ کو یقین ہے کہ پارکنگ لاٹ میں گاڑی لے جاتے وقت سخت چیکنگ نہیں ہو گی؟''

''مجھے یقین ہے۔ تمہیں بتایا ہے نا کہ پارکنگ لاٹ کے اگلے کنارے اور اسٹیڈیم کی بیرونی دیوار کا فاصلہ نصف کلومیٹر کے قریب ہے۔ اس عوامی پارکنگ میں سخت سیکیورٹی ضروری نہیں سمجھی جاتی۔ پارکنگ لاٹ میں داخل ہونے کے بعد میں کوشش کروں گی کہ پارکنگ لاٹ کے اگلے کنارے تک پہنچ جاؤں۔''

''کیا وقت ہوا ہے آپ کی گھڑی میں؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے اپنے چمکدار بوائے کٹ بالوں میں انگلیاں چلائیں اور رسٹ واچ دیکھتے ہوئے بولی۔ ''چھ بج کر اٹھارہ منٹ اور بیس سیکنڈ۔''

میں نے اس کی رسٹ واچ دیکھتے ہوئے اپنی گھڑی پر ٹائم درست کرلیا۔ کتنے بجے بلاسٹ ہوگا؟'' میں نے اس سے دریافت کیا۔

''تین بج کر پچپن اور ستاون منٹ کے درمیان۔ ان دو منٹس میں تم پوری طرح چوکس رہو گے، انگلی ٹریگر پر اور نگاہیں رائے زل پر۔''

''او کے۔''

''اور اب میرے خیال میں ہمیں برانچ آفس کی طرف چلنا چاہیے۔''

میں نے انجن اسٹارٹ کر کے گاڑی آگے بڑھا دی۔ پانچ منٹ بعد ہم سیکیورٹی آفس کے عین سامنے چھوٹی سڑک پر موجود تھے۔ ہم نے آسیاں کی زرد ٹو سیٹر کار درختوں میں چھپا دی تھی......اور اب ڈینی فلاور کے پودوں کے پیچھے کھڑے آفس کے گیٹ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ صبح کے ان اولین لمحوں میں آفس کے مین گیٹ پر صرف دو گارڈز نظر آ رہے تھے۔ یہ عمارت زیادہ بڑی نہیں تھی مگر اس کی باؤنڈری لائن پندرہ فٹ کے لگ بھگ اونچی تھی۔

ایک گارڈ کسی کام سے اندر گیا تو قسطینا بولی۔ ''میں اس دوسرے کو باتوں میں لگاتی ہوں تم اندر چلے جاؤ...... یہ اچھا موقع ہے۔''

اس نے اپنے برقع نما لبادے کے سامنے والے بٹن کھولے...... مجھ سے چاقو لے کر اپنی قمیص کو سامنے سے کٹ لگایا اور گریبان کو نیچے تک چاک کر دیا۔ پھر برقعے کو سر اور چہرے

پر درست کیا۔ اب نقاب میں سے بس اس کی آنکھیں ہی دکھائی دیتی تھیں۔ تیز چمک والی آنکھیں...... جن میں دلیری اور بے خوفی کی یلغار تھی۔ اس نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور ہولے سے دبا کر بولی۔ ''گڈ لک ایسٹرن۔''

''گڈ لک یور ہائی نس۔'' میں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا اور بائیں جانب والے درختوں میں چلا گیا۔

میں گارڈ کی نگاہ بچا کر چلتا ہوا گیٹ کے اتنا نزدیک پہنچ گیا جتنا پہنچ سکتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ قسطینا باہر نکلی اور گارڈ کے پاس پہنچ گئی۔ اس نے گارڈ سے کچھ کہا اور اپنا لباس دکھا کر درختوں کی طرف اشارہ کیا جیسے بتا رہی ہو کہ کوئی اس سے دست درازی کر کے درختوں کی طرف نکل گیا ہے۔ میرے لیے اتنا وقت کافی تھا۔ میں تیزی سے گیٹ کے اندر چلا گیا۔ اس آفس کا پورا نقشہ آسیاں مجھے ازبر کرا چکا تھا۔ میں دس پندرہ قدم سیدھا چلنے کے بعد اس پورشن کی طرف مڑ گیا جہاں واش رومز تھے۔ میں نے ایک الماری میں سے کسی کا تولیا اور صابن نکالا اور ایک واش روم میں گھس گیا۔ دھڑکن بڑھ چکی تھی۔ یہ سب رسک ہی رسک تھا، امید تو یہی تھی کہ مین گیٹ اور ڈرائیو وے کے کیمرے خراب ہوں گے اور مجھے گھستے دیکھا نہیں گیا ہو گا۔ لیکن اگر ایسا نہیں تھا تو چند سیکنڈ کے اندر الارم وغیرہ بج سکتے تھے۔

قریباً دو منٹ خیریت سے گزر گئے تو مجھے کچھ تسلی ہوئی۔ میں نے شاور کھول رکھا تھا تا کہ پانی گرنے کی آواز آتی رہے۔ میرا نہانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا، ہاں میں نے سر تھوڑا سا گیلا کر لیا تھا۔ میں نے زرد رنگ کا تولیا سر پر ڈالا اور سر رگڑتا ہوا باہر نکل آیا۔ یہ تولیا سی سی ٹی وی کیمروں سے میری شناخت چھپا رہا تھا۔ آسیاں کے کٹے ہوئے انگوٹھے سے کام لینے کا وقت آ گیا تھا۔ دو افراد کے درمیان سے گزر کر میں ایک کوریڈور میں مڑا۔ میرے سامنے پہلا سلائیڈنگ دروازہ تھا۔ دروازے کی سائیڈ پر فنگر پرنٹ چیک کرنے والا سینسر لگا تھا۔ میں جدید ٹیکنالوجی کو جدید چکما دینے جا رہا تھا۔ آسیاں کا کٹا ہوا انگوٹھا میری مٹھی میں تھا۔ میں نے بڑے اعتماد سے انگوٹھے کو ''سینسر'' پر رکھا۔ رزلٹ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ دروازہ بدستور بند تھا۔ میں نے انگوٹھے کو تھوڑا سا دبایا۔ ایک ہلکی سرسراہٹ کے ساتھ ٹھوس اسٹیل کا دروازہ کھلتا چلا گیا۔

میں اندر داخل ہو گیا۔ صبح سویرے دفتر میں عملہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ میں نے تولیا بدستور سر پر رکھا ہوا تھا اور اسے گاہے بگاہے سر پر رگڑ رہا تھا۔ چند قدم چلنے کے بعد میں نے ایک اور دروازہ اسی طرح آنجہانی آسیاں کے انگوٹھے کی مدد سے کھولا۔ سامنے ایک ہال نما

کمرا تھا۔ یہاں دو افراد کمپیوٹرز پر مصروف تھے۔ وہ میل اور فی میل تھے۔ انہوں نے ذرا تعجب سے مجھے دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھ سے کوئی سوال کرتے، میں سر گڑتا ہوا تیزی سے دوسرے کمرے میں داخل ہوگیا۔ یہ سارا اعتماد کا کھیل تھا۔

میں اب جس کمرے میں پہنچا تھا وہ میرا کمرا تھا۔ یعنی ''مرحوم و مغفور'' ہمایوں آسیاں کا۔ آقا جان کے اہم ترین سیکیورٹی افسروں میں سے ایک...... اس کا باڈی گارڈ اور اس کے قافلے کے آگے آگے ڈھال بن کر چلنے والا آسیاں جو اب اپنے گھر میں تہہ خانے کے ''سیپٹک ٹینک'' میں مردہ پڑا تھا۔ میں نے آسیاں کے انگوٹھے کو ایک جدید الماری کے ''سینسر'' پر رکھا اور الماری کا دروازہ ایک طرف سلائیڈ کر گیا۔ یہاں آسیاں کا پورا کاسٹیوم موجود تھا۔ یعنی لباس، جوتے، بلٹ پروف جیکٹ اور بالائی جیکٹ جس پر سیکیورٹی ڈپارٹمنٹ کا مونوگرام تھا۔ آسیاں کا گلے میں آویزاں کرنے والا آئی ڈی، اور سرکاری پسٹل بھی یہاں موجود تھا۔ اس کے علاوہ فل سائز ہیلمٹ جو اب میری شناخت چھپانے میں مدد کر سکتا تھا۔

میں نے تسلی کر لی تھی۔ کمرے میں سی سی ٹی وی کیمرا موجود نہیں تھا۔ آسیاں کا سیل فون میرے پاس ہی موجود تھا مگر فی الحال میں نے اسے آف کر دیا۔ میرا ڈیوٹی ٹائم یعنی آسیاں کا ڈیوٹی ٹائم شروع ہونے میں ابھی کم و بیش چار گھنٹے باقی تھے مگر میں نے ابھی سے اس کا روپ دھار لیا، بلکہ ہیلمٹ بھی سر پر دھر لیا۔

اپنی موٹر بائیک چیک کرنے کے لیے میں آفس کے عقبی پورشن میں آگیا۔ ایک جدید گیراج میں چھ عدد شاندار ہیوی موٹر بائیکس موجود تھیں۔ صبح سویرے عملے کا کوئی فرد یہاں موجود نہیں تھا۔ آسیاں کی موٹر بائیک کا نمبر مجھے زبانی یاد تھا۔ بائیک کی چابی مجھے اس کی الماری میں سے مل گئی تھی۔ میں نے اگنیشن آن کر کے موٹر بائیک کو اسٹارٹ کرنا چاہا اور اس وقت مجھ پر انکشاف ہوا کہ میں نے ریہرسل کر کے اچھا ہی کیا ہے۔ موٹر بائیک اسٹارٹ نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے اسے چیک کیا اور پتا چلا کہ یہاں بھی ہینڈل کی نچلی جانب ایک فنگر پرنٹ سینسر موجود ہے۔ یعنی موٹر بائیک کو بھی فنگر پرنٹس کی ضرورت تھی۔ یہاں پھر آسیاں کا انگوٹھا استعمال ہوا۔ پانچ ہارس پاور کی یاماہا ایک دلکش آواز کے ساتھ جاگ گئی۔

یہی وقت تھا جب مجھے اپنے عقب میں آہٹ کا احساس ہوا۔ ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجی اور اس کے ساتھ ہی میرا دھیان اس تیز دھار فوجی خنجر کی طرف چلا گیا جو میری جیکٹ کے نیچے موجود تھا۔ خنجر میری گرفت سے بس سات آٹھ انچ کے فاصلے پر تھا...... میں نے مڑ کر دیکھا، دو افراد اندر داخل ہو رہے تھے۔ شکلوں اور حلیے سے جاپانی لگتے تھے۔ غالباً وہ موٹر

بائیکس کی دیکھ بھال کے لیے یہاں موجود تھے۔
ایک جاپانی نے جھک کر انگلش میں کہا۔"جناب! آپ اتنے سویرے یہاں؟"
میں نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا اور موٹر بائیک کے انجن کی طرف جھک گیا جیسے اس کی آواز پر غور کر رہا ہوں۔
"کوئی مسئلہ ہے سر؟" دوسرے جاپانی نے پوچھا۔
"نہیں، سب ٹھیک ہے۔" میں نے ہیلمٹ کے اندر بری طرح کھانستے ہوئے اور بیٹھی ہوئی نزلہ زدہ آواز میں کہا۔
"آپ کی......طبیعت خراب لگ رہی ہے جناب۔"
مجھے ایک بار پھر کھانسی کا دورہ پڑا اور میں نے کھانستے کھانستے ہی اثبات میں سر ہلا دیا۔
"آپ کو آرام کرنا چاہیے۔" پہلا جاپانی جو غالباً ہیڈ مکینک تھا، ہمدردی سے بولا۔
میں کھانستے ہوئے ہی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔"مسٹر الیگزینڈر کتنے بجے تک آئیں گے سر؟" دوسرے جاپانی نے عقب سے ہانک لگائی۔
میں نے بالکل بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔"مجھے ٹھیک پتا نہیں۔ اور اگر کوئی میرا پوچھے تو کہنا میں کچھ دیر کے لیے کمرے میں آرام کر رہا ہوں۔"
"او کے سر۔" جاپانی کی طرف سے جواب ملا۔ میں آگے بڑھ گیا۔
اب تک تو خیریت گزر رہی تھی۔ آگے کا کچھ پتا نہیں تھا۔ ایک اندھا کنواں تھا جس میں سے کچھ بھی برآمد ہو سکتا تھا۔ برانچ آفس میں اب تھوڑی بہت چہل پہل نظر آنے لگی تھی۔ ہیلمٹ بہت زبردست تھا۔ لوئر پورشن کافی چوڑا تھا۔ میری آنکھوں اور ناک کا کچھ حصہ ہی دکھائی دیتا تھا۔ سامنے سے سیکیورٹی کی ایک اہلکار مکمل یونیفارم میں آتی دکھائی دی۔ میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہوگئی۔ تاہم خیریت گزری۔ فی میل اہلکار نے مجھے بغور نہیں دیکھا اور سر جھکا کر سلام کرتی ہوئی گزر گئی۔
میں اپنے یعنی آسیاں کے کمرے میں پہنچ گیا اور دروازہ اندر سے بولٹ کر لیا۔ اس بار بھی دروازہ کھولنے میں آسیاں کا بے جان انگوٹھا ہی استعمال ہوا تھا۔ انگوٹھا اب کچھ سخت ہو گیا تھا۔ اور اس کا رنگ بھی بدل رہا تھا۔ میں نے تو آسیاں کا صرف انگوٹھا حاصل کیا تھا بعض لوگ آنکھیں تک نکال لیتے ہیں اور ان کے ذریعے فنگر پرنٹ سنیسرز کو دھوکا دیتے ہیں۔
آرام دہ بیڈ پر لیٹ کر میں آنے والی ہنگامہ خیز گھڑیوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ میرا دھیان بار بار قسطینا کی طرف بھی جا رہا تھا۔ وہ ارادے کی پکی تھی اور مقصد کے حصول کے

لیے کوئی بھی قدم اٹھانے کے لیے تیار رہتی تھی۔ داخلی دروازے پر موجود گارڈ کو پوری طرح اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے اس نے اپنا لباس پھاڑا تھا اور نیم عریانی کی پروا بھی نہیں کی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ انسانی رویوں اور نفسیات کو اچھی طرح سمجھتی ہے، مجھے وہ سین یاد آ گیا جب کچھ روز قبل ہم دونوں نیوسٹی میں داخل ہوئے تھے اور چیف گیرٹ پر وار کرنے کے لیے برج کلب میں پہنچے تھے۔ قسطینا نے ایک موقع پر بڑا برمحل قدم اٹھایا تھا۔ نشے میں دھت فوجی افسر نے اسے اپنے ساتھ ڈانس کی دعوت دی جو قسطینا نے فوراً قبول کر لی تھی۔ دورانِ رقص گرے افسر نے قسطینا کے چہرے پر بوسوں کی بوچھاڑ کر دی تھی جسے اس نے خندہ پیشانی سے برداشت کیا تھا۔ تاہم اگلے پندرہ بیس منٹ کے اندر اس نے بدلہ چکا دیا تھا اور فوجی افسر کو کلب کے ایک کمرے میں موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

برانچ آفس میں رونق بڑھتی جا رہی تھی۔ آوازوں سے پتا چلتا تھا کہ روزمرہ کے کام اپنی پوری رفتار سے شروع ہو چکے ہیں۔ گھڑی کی سوئیاں آگے کو سرک رہی تھیں۔ عمل کا وقت قریب آ رہا تھا۔

○.....❖.....○

دو بج کر پانچ منٹ ہوئے تھے جب میں نے آسیاں والا سیل فون آن کیا۔ ابھی سیل فون آن ہوئے بمشکل دو منٹ ہی ہوئے تھے کہ اس پر کال آ گئی۔ حسبِ توقع یہ میرے ساتھی پائلٹ (موٹر سائیکل سوار) الیگزینڈر کی ہی تھی۔ میں نے کال ریسیو کی۔ اس کی چنگھاڑتی ہوئی آواز ابھری ”کہاں دفع ہو گئے ہو، فون بھی بند کیا ہوا ہے۔ وقت دیکھ رہے ہو کیا ہوا ہے، میں باہر کھڑا تمہاری جان کو رو رہا ہوں۔“ الیگزینڈر جیسے پھٹ پڑا۔

میں نے بری طرح کھانستے ہوئے کہا۔ ”سوری، بس آ رہا ہوں۔ میڈیسن لی تھی۔ نیند آ گئی۔“ میری آواز بے حد بھرائی ہوئی تھی۔

”شٹ اَپ، تھوڑی دیر اور سو لو۔“ اس نے انگلش میں کہا اور جھلائے ہوئے انداز میں فون بند کر دیا۔

میں تیار تو پہلے سے تھا، گلے میں آئی ڈی کارڈ آویزاں کیا اور بھاگم بھاگ گیراج تک پہنچا۔ ہیوی یاماہا میں چابی گھمائی۔ آسیاں کے انگوٹھے نے ایک بار پھر مدد کی۔ بائیک اسٹارٹ ہوئی اور میں اسے ڈرائیو وے سے گزار کر باہر لے آیا۔ ڈی پیلس کا عظیم الشان مین گیٹ یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اردگرد سخت حفاظتی انتظامات نظر آ رہے تھے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر تین چیک پوسٹیں تھیں جہاں گرے فوجی اور ایجنسی کے امریکن چوکس کھڑے تھے۔

گرین فورس کے اہلکار کہیں دکھائی نہیں دیتے تھے۔ میں نے دیکھا ڈی پیلس کے ایک بلند برج پر نیوسٹی کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ جگہ جگہ فربہ اندام رائے زل اس کی والدہ ہاناوانی اور آقا جان کی تصویریں نظر آ رہی تھیں...... اور شاید یہی آقا جان چاہتا تھا۔

پروٹوکول کی گاڑیاں اپنی جگہ پر موجود تھیں۔ الیگزینڈر کی موٹر بائیک سب سے آگے تھی۔ وہ بائیں جانب تھا۔ میں نے دائیں جانب اپنی بائیک لگا دی۔ اس کا ہوٹر چیک کیا اور چوکس ہو کر بیٹھ گیا۔ الیگزینڈر نے میری طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ اس کی یہ خفگی میرے لیے سودمند تھی۔ آقا جان کی گاڑی اب کسی بھی وقت نمودار ہو سکتی تھی۔ سب تناؤ کی کیفیت میں تھے...... اور پھر ڈی پیلس کا عظیم الشان مین گیٹ جو کسی قلعے کے دروازے کی طرح نظر آتا تھا سلائیڈ کر کے کھلا اور سیاہ مرسیڈیز برآمد ہوئی جس پر نیوسٹی کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ اس کے عقب میں بھی کچھ سرکاری گاڑیاں موجود تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ آقا جان کو یہاں نائب حکمران کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ جونہی پُرشکوہ مرسیڈیز رینگتی ہوئی ہمارے قریب پہنچی ہم بھی حرکت میں آ گئے۔ ہوٹر بجنا شروع ہو گئے اور آقا جان کا قافلہ تیزی سے فٹ بال اسٹیڈیم کی طرف بڑھنے لگا۔ آقا جان اور دیگر وی آئی پیز کے روٹ پر تمام ٹریفک بند کر دی گئی تھی۔ دونوں طرف چوکس مسلح اہلکار کثیر تعداد میں موجود تھے۔ چڑیا بھی پَر نہیں مار سکتی تھی۔ مختلف راستوں سے گزرتے ہوئے ہم اس چوراہے پر پہنچے جہاں سے ایک سڑک حلمی کی پراپرٹی ''آشیانے'' کی طرف جاتی تھی۔ آشیانے نامی اس تفریح گاہ کو اب یہ لوگ عقوبت خانے کے طور پر استعمال کرتے تھے۔

پتا نہیں کیوں اس سڑک کو دیکھتے ہی مجھے جاناں یاد آ گئی۔ اس کا قاتل بھی تو یہ آقا جان ہی تھا۔ آقا جان کے ہی ایک کارندے کے خنجر سے زخمی ہو کر وہ مجھ تک پہنچی تھی اور پھر میری گود میں دم توڑا تھا۔ وہ کچلی مسلی ہوئی لیکن بہت رومان پسند لڑکی تھی...... خوب صورت تصورات کی دنیا میں رہنے والی۔ اس نے مرنے سے پہلے بڑی چاہت سے ایک نظم لکھی تھی اور اس میں اپنے خون کی روشنائی استعمال کی تھی۔

میں اسے کیسے بھلا دوں
وہ تو میری رگ رگ میں بس چکا ہے
میں برف کے اندھیرے گھر میں تھی
اور پل پل ختم ہو رہی تھی میری زندگی
وہ سورج بن کر آیا

تیرگی چھٹ گئی
برف بھی پگھل گئی
میں پھر سے جی اٹھی......

ہوٹر گونج رہے تھے۔ ایمرجنسی لائٹس چمک رہی تھیں۔ ڈھلتے سورج کی روشنی میں آقا جان کا قافلہ خالی سڑکوں پر فراٹے بھرتا فٹ بال اسٹیڈیم تک پہنچ چکا تھا۔ یہاں جگہ جگہ خاردار تاروں کی باڑیں تھیں۔ اسٹیڈیم میں عوام الناس کے داخلے کے لیے علیحدہ راستے تھے۔ آج یہاں رائے زل نے اپنا فاتحانہ خطاب کرنا تھا۔ اندازہ تو یہی ہوتا تھا کہ یہ خطاب سننے والوں کی زیادہ تعداد نیوسٹی سے تعلق رکھتی ہوگی۔ آقا جان کا طویل قافلہ بڑی شان کے ساتھ اسٹیڈیم کے وی آئی پی گیٹ سے اندر داخل ہوا۔ اسٹیڈیم میں خاصی بڑی تعداد میں لوگ موجود تھے اور مزید آ رہے تھے۔ ہر طرف رائے زل کی تصویروں اور نیوسٹی کے جھنڈوں کی بہار تھی۔ کہیں کہیں جاما جی کا دو رنگا پرچم بھی دکھائی دے جاتا تھا۔ سیکیورٹی کے انتظامات یہاں بھی بہت سخت تھے۔ پنڈال اور اسٹیج کے درمیان کم و بیش چالیس میٹر کا فاصلہ رکھا گیا تھا۔ اسٹیج خاصی بلندی پر تھا اور اس کے سامنے کی جانب قریباً 6x50 فٹ کا بلٹ پروف شیشہ تھا۔ اسٹیج اور پنڈال کے درمیان خاردار تاروں کے چھلے اور سینکڑوں گارڈز تھے۔ اسٹیج پر جانے کے لیے ایک عارضی لفٹ لگائی گئی تھی۔ ایک ایک فرد کا آئی ڈی چیک کرنے کے بعد اسے اوپر جانے دیا جا رہا تھا۔

ہم آقا جان کے ساتھ ہی بغیر کسی خصوصی چیکنگ کے اسٹیج پر پہنچ گئے۔ جب آقا جان اپنی مرسیڈیز سے باہر نکلا تھا اس وقت مجھے پتا چلا تھا کہ اس کے ساتھ ہر وقت سوٹ بوٹ میں رہنے والا حلمی بھی موجود ہے۔ ابھی آقا جان اور حلمی وغیرہ کو اپنی نشستیں سنبھالے ہوئے چار پانچ منٹ ہی ہوئے تھے کہ ہوٹروں کی آوازیں پھر سنائی دینے لگیں۔ سیکیورٹی اہلکاروں میں ہلچل نظر آئی اور اس کے ساتھ ہی پنڈال میں بھی جوش کی لہر سی دکھائی دینے لگی۔

''عزت مآب زندہ باد۔''

''مادام ہانا زندہ باد۔''

''انقلاب......انقلاب۔''

ہر طرف ایسے ہی نعروں کی گونج تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ نعرے لگانے والے زیادہ تر نیوسٹی کے لوگ ہی تھے جن کو خصوصی انتظامات کر کے جلسہ گاہ تک پہنچایا گیا تھا۔ معلوم ہوا کہ جزیرے کا فاتح اور نیا فرمانروا رائے زل تشریف لا رہا ہے۔ درجنوں چمچماتی گاڑیوں اور موٹر

بائیکس کے پروٹوکول کے ساتھ اس کا شاندار قافلہ اسٹیڈیم میں داخل ہوا اور اسٹیج کے عین نیچے پہنچ گیا۔ رائے زل نئے ماڈل کی لیموزین میں تھا۔ سرخ قالینوں پر اس کا استقبال دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ بچیوں نے اسے گلدستے پیش کیے اور وہ سیکیورٹی کے نہایت سخت حصار میں لفٹ کے ذریعے اسٹیج پر پہنچ گیا۔ وہ برونائی طرز کے لمبے چغے میں تھا۔ اس چغے میں اس کا چربی دار جسم جیسے مچل مچل جا رہا تھا۔ چغے کا پچھلا حصہ ڈیڑھ دو میٹر تک فرش پر گھسٹتا آرہا تھا۔ اس کے سر پر طلائی تاروں اور قیمتی جواہرات سے مزین ایک شاندار ٹوپی تھی۔

جونہی وہ اسٹیج پر پہنچا اور اس نے عوام الناس کی طرف دیکھ کر اپنے دونوں ہاتھ ہلائے پنڈال میں مدوجزر کی کیفیت پیدا ہوئی۔ سینکڑوں پرچم لہرانے لگے اور اسٹیڈیم فلک شگاف نعروں سے گونج اٹھا۔

رائے زل کی تقریر سے پہلے چند تقاریر اور بھی تھیں۔ سب سے پہلے وہ شخص مائیک پر آیا جس نے عین اس وقت قسطینا اور افغانی سے غداری کی تھی جب جنگ پورے زور پر تھی۔ دقیانوسیت کے مرے ہوئے اس کمانڈر کا نام اوان تھا۔ اس نے علی الاعلان کہا تھا کہ مادام ہاناوانی اپنے خلاف چلنے والوں کو بھسم کر ڈالے گی۔ وہ اپنے ہزاروں رضا کاروں کے ساتھ جنگ سے باہر ہو گیا تھا۔

اب وہ لمبے چوڑے بلٹ پروف شیشے کے عقب میں کھڑا ہو کر زوردار خطاب کر رہا تھا۔ رائے زل اور اس کی ماں کی شان میں قصیدے پڑھ رہا تھا۔

اوان کے بعد حلمی کو مختصر خطاب کی دعوت دی گئی۔ اس نے آتے ساتھ قسطینا پر لفظی گولہ باری شروع کر دی۔ ملائی میں بولا۔ ''وہ اقتدار کی بھوکی ہے۔ اس کی وجہ سے امن کا معاہدہ سبوتاژ ہوا اور بھائی چارے کی وہ فضا برباد ہوئی جو ''عزت مآب رائے زل'' کی آمد کے وقت پیدا ہوئی تھی۔ جاماجی کے لاکھوں شہریوں نے عزت مآب کے لیے دیدہ و دل فرشِ راہ کر دیئے تھے مگر اس کے ساتھیوں نے پُرامن گرے فورس پر حملے کیے اور نتیجے میں سینکڑوں بے گناہ مارے گئے۔''

حلمی نے آقا جان کی شان میں بھی زبردست قصیدہ گوئی کی اور اسے عظیم لیڈر قرار دیا۔ وہ بولا۔ ''اگر عزت مآب رائے زل نے محترم آقا جان کو جاماجی میں اپنا نائب بنایا ہے اور وسیع اختیار دیئے ہیں تو یقیناً وہ خود کو اس کا اہل بھی ثابت کریں گے۔ یہ محترم آقا جان ہی ہیں جن کی وجہ سے خونریزی کا طوفان رکا اور آج نیوسٹی اور جاماجی کے لوگ اپنے اختلاف بھلا کر ایک پرچم تلے جمع ہیں۔''

ہجوم میں سے آقا جان کے حق میں نعرے بلند ہوئے اور ہزاروں پرچم لہرائے گئے۔
آقا جان کی چندیا سہ پہر کی دھوپ میں چمک رہی تھی اور میرا دل چاہ رہا تھا کہ سب سے پہلے اسی کی چندیا میں گولی اتاروں۔ گھڑی کی سوئیاں حرکت میں تھیں۔ چھوٹی سوئی چار کے ہندسے کے نزدیک پہنچ چکی تھی اور بڑی دس سے آگے نکلی ہوئی تھی۔ تین بج کر ترپن منٹ ہو چکے تھے۔ صرف دو منٹ کا فرق رہ گیا تھا۔ الیگزینڈر کی طرح میرا مشین پسٹل بھی ایک بیلٹ کے ذریعے میرے کندھے سے جھول رہا تھا۔ پسٹل کا میگزین سیدھا اور لمبا تھا۔ اس میں خاصی گولیوں کی گنجائش تھی۔ یہ نائن ایم ایم کی گولیاں تھیں۔ یہ معروف برانڈ MAC10 کا پسٹل تھا۔ وہ میری ناف کے قریب تھا اور اس کی نال تھوڑا نیچے جھکی ہوئی تھی۔ الیگزینڈر صدارتی کرسی کی دوسری جانب دس پندرہ قدم کے فاصلے پر تھا اور آقا جان کے عین عقب میں چوکس کھڑا تھا۔ بالکل اٹین شین...... باڈی گارڈز کے مؤدب انداز میں وہ اپنے سر کو ساکت رکھے ہوئے تھا، بس آنکھوں کو حرکت دے رہا تھا۔ کم از کم آٹھ مزید باڈی گارڈز اس وسیع اسٹیج پر موجود تھے۔ میں نے خود کو جان بوجھ کر آقا جان سے دور اور رائے زل سے نزدیک رکھا ہوا تھا۔

آخر وہ وقت آ گیا جب تالیوں اور نعروں کے بے پناہ شور میں کرخت چہرہ آقا جان اپنے جسم کو جھلاتا ہوا مائیک پر پہنچا۔ میری دھڑکن کی رفتار بڑھ چکی تھی۔ تین بج کر پچپن منٹ ہو چکے تھے۔ اگر قسطینا اپنے پلان میں کامیاب ہوئی تھی تو پھر اگلے ڈیڑھ دو منٹ کے اندر اسٹیڈیم سے کچھ فاصلے پر ایک زوردار دھماکا ہونے والا تھا۔
میں نے MAC10 مشین پسٹل کا رخ غیر محسوس طور پر رائے زل کی جانب موڑ لیا اور انگلی ٹریگر پر رکھ لی۔ پسٹل، برسٹ پر تھا۔ آقا جان خطاب کا آغاز کر چکا تھا۔ اس نے بڑے دھیمے انداز میں اسٹارٹ لیا تھا۔ سب سے پہلے اس نے عزت مآب ریان فردوس کی ''حادثاتی'' موت پر افسوس کا اظہار کیا۔ وہ بولا۔ ''ہم ہرگز وہ نہیں چاہتے تھے جو ہوا۔ ہم نے بیشتر مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچایا ہے، جو باقی رہ گئے ہیں وہ بھی اپنے انجام کو پہنچیں گے اور اگر......''

یہ آخری الفاظ تھے جو آقا جان نے بولے۔ فلک شگاف دھماکے نے جیسے سماعتوں کو سن کر دیا۔ پورا اسٹیج بری طرح لرزا تھا۔ مجھے اسی ساعت کا انتظار تھا...... شاید ہزاروں کے اس مجمع میں، میں واحد...... ہاں واحد شخص تھا جس نے دھماکے کے رخ پر نہیں دیکھا تھا۔ میری نگاہ تو صدارتی نشست سے چپکی ہوئی تھی۔ وہی نشست جس پر ریچھ نما رائے زل اپنی ساری

چربی اور ساری خباثت کو سمیٹے بیٹھا تھا۔ میں نے ٹریگر دبایا۔ کم از کم پانچ گولیاں رائے زل کو لگیں۔ دوسرے سیکنڈ میں پسٹل کا رخ آقا جان کی طرف ہو چکا تھا۔ مگر وہ اپنی جگہ پر نہیں تھا۔ خوف کے سبب نیچے گر چکا تھا۔ یا اس کی ''پھرتی'' اسے کسی اوٹ میں لے گئی تھی۔ مجھے حلمی نظر آیا اور میں نے اگلا برسٹ اس کے نام کر دیا۔ پسٹل بدستور نارمل انداز میں میری ناف پر جھول رہا تھا۔ یہ سب کچھ زیادہ سے زیادہ دو یا تین سیکنڈ میں مکمل ہو گیا تھا۔

پھر لوگ جیسے سکتے کی کیفیت سے نکلے اور یکا یک ہر طرف کہرام مچ گیا۔ درجنوں ''معززین'' نے جانیں بچانے کے لیے اسٹیج سے چھلانگیں لگا دیں۔ رائے زل صدارتی کرسی پر بے حرکت بیٹھا تھا، ابھی شاید کسی کو پتا نہیں چلا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو چکا ہے۔ ابھی تو غالباً اس کے زخموں سے خون بہنا بھی شروع نہیں ہوا تھا۔ اس کے باڈی گارڈز اس کی طرف جھپٹ رہے تھے جیسے اسے اپنے حفاظتی گھیرے میں لینا چاہ رہے ہوں۔ وہ جانتے نہیں تھے کہ پورے حفاظتی انتظامات کے ساتھ بلٹ پروف جیکٹ پہن کر بلٹ پروف شیشے کے پیچھے بیٹھنے والا سامنے سے نہیں عقب سے نشانہ بن چکا ہے۔

کچھ دیگر لوگوں کی طرح میں نے بھی نیچے کی طرف آٹھ دس زینے طے کیے اور پھر قریباً پندرہ فٹ کی بلندی سے چھلانگ لگا دی۔ میں پنجوں کے بل گرا۔ کچھ بوجھ میں نے دائیں ہاتھ سے سہارا۔ بائیں کندھے میں شدید ٹیس اٹھی۔ مگر اس وقت ٹیسوں پر دھیان دینے کا موقع نہیں تھا۔ ہر طرف ایک قیامت بپا تھی۔ سیکیورٹی اہلکاروں سمیت کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہوا ہے۔ وہ فائرنگ کا منبع ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کچھ صرف بھاگ دوڑ میں مصروف تھے۔

○○

اسٹیڈیم سے باہر پارکنگ لاٹ کی جانب دو اور چھوٹے دھماکے ہوئے۔ شعلے بلندی کی طرف گئے اور دھوئیں کے بادل مزید گہرے ہو گئے۔ یقیناً دھماکے کے بعد مزید گاڑیاں آگ پکڑ رہی تھیں۔ آسیاں کا کٹا ہوا انگوٹھا میرے لیے ''اسم اعظم'' کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ میں نے اسے موٹر بائیک کے چوکور سینسر پر رکھا۔ اسے اسٹارٹ کیا اور ہر طرف پھیلی ہوئی افراتفری کا حصہ بن گیا۔ چند ہی سیکنڈ بعد میں اسٹیڈیم سے باہر تھا۔ ایمبولینسز اور فائر بریگیڈ کی گاڑیوں کے سائرن اپنی کریہہ آوازوں میں چلانا شروع ہو گئے تھے۔ مجھے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ میں یہ سب کچھ کر چکا ہوں...... اور اب سلامتی سے سڑک پر موجود ہوں۔ یہ سب کچھ جاگتی آنکھوں کے خواب جیسا تھا۔

○......❖......○

رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ میں سلائیڈنگ پتھر کو حرکت دے کر اپنی خفیہ پناہ گاہ میں داخل ہوا۔ میری نگاہوں نے سب سے پہلے قسطینا کو ڈھونڈا۔ وہ مجھ سے پہلے ہی پناہ گاہ میں پہنچ چکی تھی۔ وہ دوڑ کر آئی اور سب کی پروا کیے بغیر مجھ سے بغلگیر ہو گئی۔ ''ویل ڈن شاہ زائب! تم نے کر دکھایا، تم نے واقعی کر دکھایا۔'' وہ جوش کے عالم میں مجھے بھینچ کر بولی۔

''آپ......سب خیریت سے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''بالکل خیریت سے ہیں۔'' وہ بولی۔ ''لیکن تمہارا شکار خیریت سے نہیں ہے۔ رائے زل شدید زخمی ہو کر اسپتال پہنچ چکا ہے۔ اس کی حالت نازک ہے۔''

''حلمی صاحب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔'' انیق نے پاس ہی سے لقمہ دیا۔

''ہاں وہ موقع پر ہی ختم ہو گیا تھا۔'' قسطینا نے تائید کی۔ ''آقا جان نے اسٹیج سے چھلانگ لگائی تھی۔ اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔''

ٹی وی پر بریکنگ نیوز چل رہی تھیں۔ ایک تہلکہ سا مچا ہوا تھا۔ رائے زل کی حالت کے بارے میں پل پل کی خبر دی جا رہی تھی۔ سرکاری ذرائع کہہ رہے تھے کہ رائے زل کی گردن اور جبڑے میں تین گولیاں لگی ہیں اور ان کی حالت بہتر ہو رہی ہے۔ مگر صحافتی ذرائع بتا رہے تھے کہ رائے زل کو چھ کے قریب گولیاں لگی ہیں اور ان کی ریڑھ کے بالائی مہرے بے طرح متاثر ہوئے ہیں۔

''آپ یہاں کیسے پہنچیں؟'' میں نے قسطینا سے پوچھا۔

''پانچ چھ میل تک ایک گاڑی سے لفٹ لی، پھر پیدل مارچ کیا......اور تم؟''

''میں آسیاں کی موٹر بائیک پر تھا۔ سٹی سینٹر سے نکل کر ائیرپورٹ کی طرف آ گیا، پھر خطرہ محسوس ہوا۔ موٹر بائیک سمیت ایک زیر تعمیر پلازا کی بیسمنٹ میں چلا گیا۔ قریباً دو گھنٹے وہاں رکا۔ پھر آسیاں والی یونیفارم اتار دی۔ نیچے یہی اپنے کپڑے موجود تھے۔ موٹر بائیک، سیل فون، ہیلمٹ وغیرہ سب کچھ وہیں چھوڑ دیا۔ چھپتا چھپاتا ہائی وے تک پہنچا اور پھر ٹیلوں میں شارٹ کٹ لگا کر یہاں آ گیا۔ آپ کی پیش گوئی صحیح رہی، قسمت نے بھی ساتھ دیا ہے۔''

قسطینا، فارس جان اور ابراہیم وغیرہ کی آنکھوں میں سوال تو اور بھی تھے مگر ٹی وی پر جو نیوز چل رہی تھیں وہ بھی بے حد توجہ طلب تھیں۔ نیوز رپورٹر انتہائی سنسنی خیز آواز میں بول رہا تھا۔ اب تک جو اطلاعات موصول ہوئی ہیں ان کے مطابق قریباً تین بج کر چھپن منٹ پر اسٹیڈیم کے شمالی پارکنگ لاٹ میں کھڑی ایک ٹو سیٹر گاڑی میں خوفناک دھماکا ہوا اور کئی گاڑیوں کو آگ لگ گئی۔ عین یہی وقت تھا جب جلسہ گاہ میں اسٹیج کے انتہائی سخت سیکیورٹی

سسٹم کو ناکام بنا کر عزت مآب رائے زل پر فائرنگ کی گئی۔ اب یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ دھماکے اور فائرنگ میں گہرا ربط تھا، جس ٹو سیٹر گاڑی میں دھماکا ہوا یہ محترم آقا جان کے اسی باڈی گارڈ ہمایوں آسیاں کے زیر استعمال تھی جو اپنے گھر کے سپٹک ٹینک میں مردہ پائے گئے ہیں۔ مسٹر آسیاں کی موٹر بائیک اور دیگر اشیا کا ابھی تک کوئی سراغ نہیں ملا۔''

نیوز اسٹوڈیو میں بیٹھے نیوز کاسٹر نے اپنے رپورٹر سے پوچھا۔ ''کہا جا رہا ہے کہ مجرموں نے نہایت ہوشیاری کا ثبوت دیتے ہوئے باڈی گارڈ آسیاں کا دایاں انگوٹھا کاٹا اور اسی انگوٹھے کو برانچ آفس میں گھسنے کے لیے استعمال کیا۔ کیا یہ بات درست ہے؟''

رپورٹر نے مائیک کو ہونٹوں کے قریب کرتے ہوئے کہا۔ ''جی ہاں، برانچ آفس سے جو شواہد مل رہے ہیں، ان سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مسٹر آسیاں کے کٹے ہوئے انگوٹھے کی مدد سے تمام سینسرز کو دھوکا دیا گیا اور ہر مطلوبہ چیز تک رسائی حاصل کی گئی۔''

نیوز کاسٹر نے کہا۔ ''لیکن یہاں سوال اٹھتا ہے کہ مجرم یا مجرمان آفس میں داخل کیسے ہوئے، سی سی ٹی وی کیمرے کیا کر رہے تھے؟''

''آپ نے بڑا اہم سوال پوچھا ہے۔ جو تازہ اطلاعات مل رہی ہیں ان سے پتا چل رہا ہے کہ سیکورٹی مہیا کرنے والوں کی اپنی سیکیورٹی بھی ٹھیک نہیں تھی۔ آفس کے بیرونی حصے کو ''کورتج'' دینے والے کم از کم تین کیمرے خراب پڑے تھے۔ اس کے علاوہ......''

''ایک منٹ ٹھہریں۔'' نیوز کاسٹر نے اپنے رپورٹر کو روکا اور بولا۔ ''ناظرین! اس وقت محترم جناب آقا جان اسپتال سے میڈیا کو بریف کر رہے ہیں۔ ہم آپ کو وہاں لیے چلتے ہیں۔''

چند سیکنڈ بعد ایل سی ڈی کی اسکرین پر آقا جان کی پریشان شکل نظر آئی۔ اس کی ناک کا بل ہمیشہ سے زیادہ موٹا نظر آ رہا تھا۔ چہرے پر تازہ خراشیں بھی تھیں۔ ایک ٹانگ پلاستر میں جکڑی ہوئی تھی۔ وہ بستر پر نیم دراز تھا۔

اشک بار لہجے میں بولا۔ ''حلمی نے جام شہادت نوش کیا ہے۔ ہم سب بھی جاماجی کی خاطر اپنی جانیں دینے کے لیے تیار ہیں۔ کسی بھی صورت ان باغیوں کے سامنے سر نہیں جھکائیں گے۔ ہم حق پر ہیں اور حق والے کسی چیز سے ڈرتے نہیں ہیں......''

''بس اسٹیج سے چھلانگ لگاتے ہیں۔'' انیق نے ہولے سے لقمہ دیا۔

آقا جان نے بات جاری رکھی۔ ''میں اپنے عوام کو بتانا چاہتا ہوں کہ عزت مآب رائے زل کی حالت بہتر ہو رہی ہے۔ بہترین ڈاکٹروں کی ایک ٹیم ان کو ہر ممکن طبی سہولت دے رہی

ہے۔آپ ان کے لیے دعا کریں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس سانحے کے ''ذمے دار'' بدترین انجام سے بچ نہیں سکیں گے۔ ہم ان کے گرد گھیرا تنگ کر رہے ہیں۔ انہیں زمین کی ساتویں تہہ سے ڈھونڈ نکالیں گے۔''

ایک نمائندے نے سوال کیا۔''جناب! یہ خیال ظاہر کیا جا رہا ہے کہ یہ حملہ عبدالکریم اور اس کے ساتھیوں کو سرِعام پھانسی دینے کا ردِعمل ہے...... اور اس حملے کی ماسٹر مائنڈ قسطینا اور اس کے قریبی ساتھی ہیں۔اس بارے میں جناب کا کیا خیال ہے؟''

''ہم ہر پہلو سے تفتیش کر رہے ہیں۔ بہت جلد حقائق آپ کے سامنے ہوں گے۔ جہاں تک سرِعام پھانسیوں کا تعلق ہے...... یہ پھانسیاں قانون کے تقاضے پورے کرنے کے بعد دی جا رہی ہیں اور یہ آئندہ بھی ہوں گی۔ ہم اپنے اصولی موقف سے ایک انچ پیچھے نہیں ہٹیں گے۔''

ابھی آقا جان کی بریفنگ ختم ہی ہوئی تھی کہ ایک اور بریکنگ نیوز کے الفاظ اسکرین پر چمکنے لگے۔ نیوز کاسٹر نے سنسنی خیز اعلان کیا۔''اور ناظرین، یہ تازہ ترین فوٹیج ہمیں موصول ہوئی ہے، ہم آپ کے ساتھ شیئر کر رہے ہیں......''

اس کے ساتھ ہی برانچ آفس کے اندر کی ایک فوٹیج اسکرین پر دکھائی جانے لگی۔ یہ وہی مناظر تھے جب میں واش روم کے اندر سے سر پر زرد تولیا ڈال کر نکلا تھا اور اپنے بال رگڑتا ہوا کمرے کی جانب گیا تھا۔ تصویر واضح نہیں تھی مگر قد کاٹھ پہچانا جا رہا تھا۔ میرے متحرک ہیولے کے گرد سرخ دائرہ دکھایا جا رہا تھا۔

نیوز کاسٹر پُرجوش انداز میں بولنے لگا۔''تفتیشی ادارے کے مطابق یہ وہ شخص ہے جو سیکیورٹی سسٹم کو دھوکا دے کر دفتر میں داخل ہوا اور پھر باڈی گارڈ آسیاں کے روپ میں یہاں سے نکلا۔ یہ فوٹیج دیکھنے کے بعد اس خیال کو مزید تقویت مل رہی ہے کہ شاید یہ وہی شاہ زیب ہے جو بیس عدد نہایت مطلوب افراد کی فہرست میں شامل ہے...... اور یہی وہ شخص ہے جس نے بعدازاں جلسہ گاہ میں عزت مآب کو نشانہ بنایا ہے۔ یہاں ہم آپ کو ایک بار پھر بتاتے چلیں کہ آج سہ پہر فٹ بال اسٹیڈیم میں ہونے والے سنگین حملے میں جناب حلمی شہید اور عزت مآب سخت زخمی ہوئے ہیں۔ ہجوم میں بھگدڑ مچنے کے سبب پانچ افراد کے جاں بحق اور پچاس سے زائد کے زخمی ہونے کی اطلاعات ہیں۔ اس کے علاوہ پارکنگ لاٹ میں قریباً دس کلو بارود کا جو دھماکا ہوا اس میں درجنوں گاڑیاں تباہ ہوئیں اور دو افراد جان سے گئے۔''

نیوز کاسٹر کا شور وغل جاری تھا۔ قسطینا کی زبانی مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ سنبل کو بھی

بحفاظت یہاں لے آئی ہے۔ سنبل ساتھ والے کمرے میں سو رہی تھی۔ اتنے میں، میں ایک شخص کو دیکھ کر بری طرح چونک اٹھا۔ یہ شخص ٹی وی اسکرین پر نہیں ہماری پناہ گاہ کے اندرونی دروازے پر نمودار ہوا تھا۔ یہ بن مشہد تھا۔ گرین فورس کا وہی جانباز جو ایک گرے کیپٹن کی حیثیت سے نیوسٹی میں موجود تھا اور جس نے برج کلب والے مشن میں ہماری بھرپور مدد کی تھی۔ ہم ایک دوسرے کی طرف بڑھے اور بغلگیر ہو گئے۔ اس نے بڑی محبت سے میرے شانے کو چوما اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''یس مسٹر شاہ زیب! آپ نے یادگار مزاحمت کا حق ادا کر دیا۔ آج کا حملہ جاما جی کی تاریخ میں یاد رکھا جائے گا۔''

''لیکن تم یہاں کیسے؟'' میں نے اسے خود سے جدا کرتے ہوئے پوچھا۔

قسطینا بولی۔ ''یہ میرے ساتھ یہاں پہنچا ہے۔ تم نے مجھ سے پوچھا نہیں کہ اسٹیڈیم کی پارکنگ میں دھماکے کے بعد جس شخص نے مجھے لفٹ دی وہ کون تھا؟ وہ مشہد ہی تھا۔ بہت برے وقت میں میری نگاہ اس پر پڑ گئی اور میں اس کی گاڑی میں گھس گئی۔''

''ونڈرفل، یہ تو زبردست کام ہوا۔'' میں نے بے ساختہ کہا۔

قسطینا کے سامنے بن مشہد بے حد مؤدب نظر آ رہا تھا۔ اس نے انکساری سے کہا۔ ''یہ میرے لیے بے حد اعزاز کی بات ہے کہ چند دن میں، میں نے دوسری بار اپنی سپریم کمانڈر کو ریسکیو کیا ہے۔''

فارس جان بھی بن مشہد کی کارکردگی سے بہت خوش نظر آتا تھا۔ اس نے بن مشہد کا کندھا تھپک کر اس کے لیے تعریفی جملے کہے۔

قسطینا بولی۔ ''لیکن مشہد کچھ اہم باتیں بھی بتا رہا ہے اور یہ تشویش ناک ہیں۔ مشہد کا خیال ہے کہ ہم اس پناہ گاہ میں اب زیادہ دیر محفوظ نہیں رہ سکیں گے۔''

ابراہیم نے کہا۔ ''میں بھی بن مشہد کے خیال کی تائید کرتا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ اب ہماری تلاش کا کام بہت وسیع پیمانے پر شروع ہو جائے گا۔ ہمیں جو فیصلہ بھی کرنا ہے، اگلے ایک آدھ روز میں کر لینا چاہیے۔''

میں نے کہا۔ ''کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ہمارے پاس اس سے اچھی کوئی پناہ گاہ ہے؟''

قسطینا اور فارس جان نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر قسطینا نے ہولے سے اثبات میں سر ہلایا۔ ''میرا خیال ہے کہ ہم ابھی کھانے کے بعد اس بارے میں بات کرتے ہیں۔''

زینب حسبِ معمول شال میں لپٹی لپٹائی ایک گوشے میں بیٹھی تھی اور ڈبڈبائی نظروں

سے میری جانب دیکھ رہی تھی۔ وہ خاموشی کی زبان میں مجھے بتا رہی تھی کہ اس نے یہاں میری غیر موجودگی کو بری طرح محسوس کیا ہے۔ میں بے ساختہ اس کی طرف بڑھا اور اس کے قریب بیٹھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ وہ ساکت بیٹھی رہی۔ جیسے کسی بھی طرح کا اظہار اس کے لیے ممکن نہ ہو۔ میں اس کے سر پر ہاتھ رکھتا تھا تو پورا چاندگڑھی اور چاندگڑھی کے سارے حالات نگاہوں کے سامنے لہرا جاتے تھے۔ وہ ''بڑے بڑے پَروں والے عقابوں'' میں پھنسی ہوئی ایک چڑیا تھی اور میں نے اپنی بساط کے مطابق اس کے تحفظ کی قسم کھائی تھی۔

تازہ ترین خبروں کا سلسلہ جاری تھا۔ میں چھوٹے کمرے میں جا کر سجاول کو دیکھنا چاہ رہا تھا۔ میں کمرے کی طرف بڑھا تو انیق نے مجھے روک لیا۔ ''ٹھہریں، وہ سو رہا ہے۔''

''طبیعت کیسی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''پہلے سے بہت بہتر ہے اور یہ بہتری یوں ہی نہیں آئی جناب، اس کے لیے بڑی محنت ہوئی ہے۔ ایک طویل چلہ کاٹا ہے میں نے۔ کل آدھی رات ایک ٹانگ پر کھڑا رہا ہوں۔ سانس روک کر اور منہ بند کر کے۔''

میں نے کہا۔ ''اتنی دیر اگر تم نے واقعی منہ بند رکھا ہے تو بڑا کام کیا ہے۔''

''آپ مذاق فرما رہے ہیں مگر یقین کریں امرِیش...... مم...... میرا مطلب ہے سجاول صاحب میں جو اچھی تبدیلی آ رہی ہے وہ میرے خاص وظیفوں کا ہی نتیجہ ہے۔ ابھی تو آپ کنجوسی کر رہے ہیں۔ اگر دھونی کا انتظام کر دیں تو سجاول صاحب چاروں خانے فٹ ہو جائیں۔''

''دھونی؟ کیا مطلب؟''

''میں نے آپ سے گزارش کی تھی کہ ہزار ہزار کے پانچ چھ نوٹوں کو جلا کر ان کی دھونی اپنے چلے میں شامل کرنا چاہتا ہوں مگر آپ غور ہی نہیں فرما رہے۔''

میں نے کہا۔ ''میرا تو خیال ہے کہ تمہیں نوٹوں کے بجائے لال مرچوں کی دھونی کی ضرورت ہے اور وہ بھی الٹا لٹکا کر۔ جب بھی بات چیت کا وقت ملتا ہے تمہاری بکواس شروع ہو جاتی ہے۔ کئی ''اہم باتیں'' بیچ میں رہ جاتی ہیں۔''

وہ شرما کر بولا۔ ''میری شادی کا ذکر تو ابھی آپ گول ہی رہنے دیں تو بہتر ہے۔''

میں نے کہا۔ ''زیادہ غلط فہمی میں نہ رہو۔ اتنی جلدی تمہیں رشتہ ملنے والا بھی نہیں ہے۔ میں کچھ اور بات کہہ رہا ہوں۔''

''کون سی بات؟'' وہ ذرا قریب کھسک آیا۔

''وہی خط والی بات...... وہ دوسرا خط کون سا تھا جو پہلوان حشمت نے ارسال کیا تھا؟'' میں نے سرگوشی میں کہا۔

''او...... آچھا...... وہ تو واقعی لیٹ سے لیٹ تر ہوتا جارہا ہے۔ میں نے بھی کھولا نہیں ہے، ابھی تھوڑی دیر میں جب سب سونے کے لیے لیٹ جائیں گے تو پڑھ لیں گے۔''

میں نے اٹھ کر سجاول والے کمرے میں جھانکا۔ وہ کروٹ لے کر سو رہا تھا۔ اس کے چہرے کی اضطرابی کیفیت اب ماند نظر آتی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اب وہ کچھ کھا پی بھی رہا ہے۔ میں نے فی الوقت اسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

رات کا کھانا حسب معمول خشک راشن پر مشتمل تھا۔ اس راشن میں میٹھے اور نمکین بسکٹس، انرجی بارز اور چاکلیٹس کے علاوہ ہنٹر بیف بھی شامل تھا۔ سادے پانی کے علاوہ دیگر ڈرنکس بھی موجود تھے۔ کھانے کے بعد ایک بار پھر نیوز واچنگ شروع ہوئی تاہم کسی دوسری پناہ گاہ میں شفٹ ہونے والا موضوع زیر بحث نہیں آیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بن مشہد موجود نہیں تھا، کمانڈر فارس جان نے بتایا کہ وہ کسی ضروری کام سے نکلا ہے۔

میں نے کہا۔ ''فارس جان! بن مشہد کو پتا ہے کہ ہم کہاں ہیں۔ اس کا یوں نکلنا خطرناک بھی ہوسکتا ہے۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ......''

''نہیں نہیں، میں اس کی وفاداری پر شبہ نہیں کررہا لیکن اگر خدانخواستہ...... خدانخواستہ وہ کہیں پکڑا جاتا ہے تو؟''

''آپ اس بارے میں کوئی پکر (فکر) نہ کریں۔'' فارس جان مسکرا کر بولا۔ ''وہ جاسوس ہے اور اسے تشدد سہنے کا اتنا زیادہ ٹریننگ دیا گیا ہے کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتا۔''

''پھر بھی رسک تو ہے۔''

''ام آپ کو یقین دلاتا ہے، مشہد ان چند لوگوں میں سے ہے جو مر تو سکتا ہے پر اپنی زبان نہیں کھول سکتا۔''

پھر فارس جان نے ایک واقعہ سنایا کہ کس طرح مشہد کے ایک ساتھی نے پکڑے جانے کے بعد سائنائڈ کا کیپسول نگل لیا تھا...... اور مزید احتیاط کے طور پر تیسری منزل کی کھڑکی سے چھلانگ بھی لگا دی تھی۔ دراصل یہ لوگ گرین فورس کے مشہور و معروف پاسبان بریگیڈ سے لیے گئے تھے۔

○......❖......○

رات دس بجے کے لگ بھگ زینب اور ابراہیم سونے کے لیے لیٹ گئے۔ فارس جان بھی اونگھ رہا تھا۔ قسطینا کسی گہری سوچ میں گم لیٹی ہوئی تھی۔ شاید آج جو تہلکہ خیز دن گزرا تھا اس کے خونی مناظر اس کی نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ سنسنی خیز خبروں کی تکرار سے اکتا کر ہم نے ٹی وی آف کر دیا تھا۔

میں، انیق اور سیف پاس پاس ہی لیٹتے تھے۔ یہ بیڈز دیوار کے ساتھ اوپر نیچے فکس تھے۔ سیف سب سے اوپر والے بیڈ پر ہوتا تھا۔ وہ بھی آج جلدی لیٹ گیا تھا۔ میں اور انیق دیوار سے ٹیک لگائے فرشی گدے پر بیٹھے تھے۔ انیق نے ایک تکیے کے غلاف میں سنبھالا ہوا خط نکالا۔ لفافہ کھولا۔ اس میں کاپی سائز کے دو کاغذ تھے۔ ایک پہلوان حشمت کی طرف سے تھا۔ یہ مختصر تحریر تھی۔ پہلوان نے اپنے مخصوص عالمانہ انداز میں لکھا تھا۔

''شاہ زیب! تم ابھی ریشمی کو بھولے تو ناہیں ہو گے۔ اور وہ بھی ''کیامت'' تک تمہیں ناہیں بھول سکتی۔ تم نے اسے پردے والی سرکار کے چنگل سے رہائی دلائی۔ ایک طرح سے تم اسے موت سے زندگی کی طرف واپس لائے۔ اب اس کی شادی ہو چکی ہے۔ چند روز پہلے وہ میرے پاس آئی اور اس نے یہ خط مجھے دیا اور بڑی آجزی سے درخواست کی کہ میں اسے تم تک پہنچا دوں، سو اپنا فرض پورا کر رہا ہوں۔

ہم تو محبتوں کے سفیر ہیں
ہم تو ازل سے فلیر (فقیر) ہیں
اسی لیے ہے دامن چاک ہمارا
ہاں اسی لیے ہم لیر و لیر ہیں

(لیر و لیر یعنی ٹکڑے ٹکڑے)

دوسرے کاغذ کی تحریر اور روشنائی مختلف تھی۔ یہ ریشمی ہی کا لکھا ہوا تھا۔ اس نے مجھے شاہ زیب بھائی کہہ کر مخاطب کیا تھا اور لکھا تھا......

''آپ نے میرے لیے جو کچھ کیا، میں اسے کبھی بھلا نہ سکوں گی۔ آپ نہ ہوتے تو وہ ملنگی ڈیرا ضرور میری جان لے لیتا۔ جب تک زندہ ہوں آپ کو دعائیں دوں گی۔ میں جانتی ہوں آپ نے یہ سب کچھ میری بچپن کی سہیلی تاجور کے کہنے پر کیا۔ اس طرح سے میں تاجور کی بھی احسان مند ہوں۔ لیکن میں تاجور کے بارے میں بہت دکھی بھی ہوں۔ ایک سہیلی کی حیثیت سے اسے جتنا بھی جانتی ہوں شاید کوئی اور نہ جانتا ہوگا۔ پتا نہیں کہ مجھے آپ سے یہ بات کہنی چاہیے یا نہیں لیکن سچ یہی ہے کہ وہ پوجنے کی حد تک آپ سے پیار کرتی ہے اور

جہاں تک میں نے سمجھا ہے، آپ بھی اسے دل کی گہرائیوں سے چاہتے ہیں۔ مجھے نہیں پتا کہ آپ کے درمیان یہ دوریاں کیسے آگئی ہیں۔ اگر یہ دوریاں تاجور کی وجہ سے آئی ہیں تو میں پورے یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ اب پچھتا رہی ہوگی۔ میں اچھی طرح...... بہت اچھی طرح جانتی ہوں کہ وہ آپ کے سوا کسی اور کے ساتھ کبھی خوش نہیں رہ سکے گی۔ وہ ایک جھوٹی زندگی جیئے گی۔

سوچتی ہوں، کاش میرے پَر ہوتے، میں اڑ کر آپ دونوں کے پاس پہنچ جاتی۔ آپ کی غلط فہمیاں دور کرتی اور آپ کو پھر سے ملا دیتی۔ لیکن میں ایک بے بس لڑکی ہوں۔ بس ہاتھ جوڑ کر آپ سے ایک درخواست کرتی ہوں جس طرح بھی ہو، آپ اسے خود سے دور نہ جانے دیں، وہ آپ کو کھو کر عمر بھر روتی رہے گی۔ میں ایک بار پھر کہتی ہوں، جتنا میں اسے جانتی ہوں اور کوئی نہیں جانتا۔

فقط آپ کی ہمدرد اور احسان مند۔''

خط نے میرے رگ و پے میں عجیب سی سنسنی دوڑا دی تھی۔ میں نے کن انکھیوں سے سیف کی طرف دیکھا۔ صرف چند فٹ کی دوری پر وہ اپنے بیڈ پر موجود تھا۔ جو خط میرے ہاتھ میں لرز رہا تھا وہ اس لڑکی کے بارے میں تھا جو اس کی منگیتر تھی اور بہت جلد اس کے ساتھ شادی کے بندھن میں بندھنے والی تھی۔

میں انیق کو چند دن پہلے آگاہ کر چکا تھا کہ سیف وہی ہے جس کے ساتھ سکھیرا گاؤں میں تاجور کی منگنی ہوئی ہے۔ انیق کو بتانے سے میرا مقصد یہی تھا کہ کہیں وہ بے دھیانی میں سیف کے سامنے میرے اور تاجور کے تعلق کا ذکر نہ کر بیٹھے۔ میری طرح انیق کو بھی یہ جان کر ازحد حیرت ہوئی تھی کہ سیف، تاجور کا ہونے والا شوہر ہے۔ اسے ایک زبردست اتفاق ہی کہا جا سکتا تھا کہ اس وقت وہ یہاں پاکستان سے ہزاروں میل دور اس جزیرے میں ہمارے ساتھ موجود تھا۔

انیق نے بھی بغور سیف کی طرف دیکھا پھر سرگوشی میں بولا۔ ''سو رہا ہے۔''

میں نے خط کو ایک بار پھر پڑھا۔ یہ ایک سہیلی کے لیے ایک لڑکی کے سچے کھرے جذبات اور دکھ بھرے احساسات تھے۔ نہ جانے کیوں میری نگاہوں میں ایک بار پھر وہ ویڈیو کلپ گھوم گیا، جو چند روز پیشتر میں نے ڈی پیلس کے ایک کمرے کے اندر سیف کے موبائل میں دیکھا تھا۔ تاجور کا جھکا ہوا سا سر، پیشانی پر جھولتی لٹیں...... اور اس کی کھوئی کھوئی سی آواز...... ہاں یہ غلطی تو ہوئی ہے...... یہ غلطی تو ہوئی ہے۔

غلطی تو شاید مجھ سے بھی ہوئی تھی۔ میں اس کو اپنے اتنا قریب لا کر...... قریب نہیں رکھ سکا تھا۔ وہ میری طرزِ زندگی سے خوف زدہ ہو کر مجھ سے کچھ فاصلے پر چلی گئی تھی۔ میں نے بھی یہ فاصلہ پاٹنے کی کوشش نہیں کی تھی اور اسے دور جانے دیا تھا۔

ریشمی کے دل میں ہم دونوں کے لیے تڑپ موجود تھی۔ وہ جانتی تھی کہ میں نے چاند گڑھی میں تاجور کے لیے بہت کچھ کیا تھا۔ وہ پیر ولایت اور اپنے غنڈے منگیتر اسحاق کے چنگل میں پھنسی ہوئی تھی۔ میں نے اسے اور اس کی فیملی کو اس گھیرے سے نکالا۔ پیر ولایت کا اور عالمگیر کا زور توڑا...... اور پھر یہاں تک بھی ہوا کہ اسحاق عرف ساقے سے تاجور کی جان ہمیشہ کے لیے چھوٹ گئی۔ بظاہر ہمارے راستے میں کوئی بہت بڑی رکاوٹ نہ رہی لیکن پھر ہم خود ہی اپنے راستے کی رکاوٹ بن گئے۔ پتا نہیں کہ کبھی کبھی ایسا کیوں ہوتا ہے۔ پیار خود ہی اپنا دشمن ہو جاتا ہے۔ کوئی بیرونی رکاوٹ نہیں ہوتی لیکن وہ خود ہی اپنے لیے اَنا، خوف یا اصول کی کوئی دیوار کھڑی کر لیتا ہے۔ میں ان لوگوں میں سے بننا نہیں چاہتا تھا جو ساری عمر ان دیواروں سے ٹکرا کر خود کو لہولہان کرتے رہتے ہیں مگر نہ جانے کیوں حالات بار بار تاجور کی شبیہہ کو میرے سامنے لے آتے تھے۔

اس رات میں دیر تک جاگتا رہا۔ غنودگی کی حالت میں، میں نے اسے اپنے سامنے دیکھا۔ وہ چاند گڑھی کی سنہری دھوپ میں کیکروں اور بیریوں کے پاس کھڑی تھی۔ سردیوں کی شام تیزی سے ڈھلتی جا رہی تھی۔ تاجور کے پس منظر میں کچے پکے گھروندوں سے چولہوں کا دھواں اٹھ رہا تھا۔ وہ اداس لہجے میں بولی۔ ”جب مجھے اپنے پاس رکھنے کا موقع تھا، آپ کوشش کر کے مجھے روک سکتے تھے، آپ نے کچھ نہ کیا۔ اب کیوں مجھے یاد کرتے ہیں، اب مجھے میرے راستے پر چلنے دیں......“

میں نے کہا۔ ”میں کچھ نہیں کرتا تاجور، تم خود ہی کسی نہ کسی صورت میں میرے سامنے آ جاتی ہو۔ مجھے درہم برہم کر دیتی ہو۔“

”میں دل کی گہرائیوں سے کہتی ہوں شاہ زیب! اب مجھے بھول جائیں۔ اب میرا سب کچھ وہی ہے جس سے میرے ماں باپ نے میرا ناتا جوڑا ہے۔ وہ اب آپ کے پاس ہے شاہ زیب! اسے کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ اسے صحیح سلامت میرے پاس واپس بھیج دیجیے گا۔ میری اور میرے ماں باپ کی نظریں دن رات اس کا راستہ دیکھ رہی ہیں۔“

میرے تصور کی نگاہیں تاجور کا طواف کرتی رہیں۔ سورج کی الوداعی کرنیں اس کے بے مثل چہرے کو بوسے دے رہی تھیں۔ میں دھیمے قدموں سے اس کی طرف بڑھا۔ کھوئے

کھوئے سے انداز میں بولا۔ ''تاجور! ایک آخری بار تم کو چھونا چاہتا ہوں، کیا چھو لوں؟''

وہ بے حرکت کھڑی رہی۔ جیسے کچھ بھی کہنا نہ چاہتی ہو۔ میں اس کی طرف جھکا۔ خود کو اس کے چہرے کے قریب کیا۔ اس کے چہرے پر گریز نمودار ہوا، جیسے کوئی ناپسندیدہ بو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی ہو۔ شاید یہ الکحل کی بو تھی جو میرے منہ سے اٹھ رہی تھی۔ میں نے اسے اپنے ہاتھوں سے چھونا چاہا تو وہ پھر پیچھے ہٹ گئی۔ میں نے دیکھا میرے ہاتھوں پر خون کے چھینٹے تھے۔ یہ کس کا خون تھا؟ شاید کسی ایسے شخص کا جسے میں نے قتل کیا تھا۔

وہ ایک دم اوجھل ہوگئی۔ کھیت کھلیان، مویشیوں کی گھنٹیاں، کچے گھروندے اور ان میں سے اٹھتا ہوا چولہوں کا دھواں، سب کچھ اوجھل ہوگیا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور پاؤں بیڈ سے نیچے اتار دیئے۔

○......❖......○

اگلے روز صبح سویرے سجاول سے ملاقات ہوئی۔ میں ہمت کر کے اور تالا کھول کر سجاول کے پاس اس کے کمرے میں ہی چلا گیا۔ ویسے میں اس کی طرف سے کسی بھی قسم کی ناگہانی حرکت کے لیے تیار تھا۔ وہ چارپائی نما بیڈ پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھا تھا۔ اس کے بدن پر اب تک وہی گہرے کلر کی وردی تھی جو شلوار قمیص سے مشابہ تھی۔ (رائے زل کے رضا کار ایسی وردی پہنتے تھے) سجاول نے مجھے دیکھ کر تیوری چڑھائی۔ کچھ دیر خاموش رہا پھر قہرناک لہجے میں بولا۔ 'تم نے، تم دونوں نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ دھوکے باز ہو تم دونوں، میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔'' طیش کے سبب اس کے منہ سے جیسے جھاگ نکل رہا تھا۔

''یہی تو میں اب تک پوچھ رہا ہوں، میرا قصور بتاؤ۔''

''تم نے مجھے اکیلا چھوڑ دیا۔'' وہ پھنکارا۔ ''مڑ کر میری خبر نہ لی۔ نہ کوئی میری مدد کے لیے آیا۔ اور وہ جو مجھے اپنا بھائی کہتی تھی اس نے بھی نہ پوچھا کہ میں کس حال میں ہوں۔ وہاں کس طرح میری کھال ادھیڑی جاتی رہی ہے۔'' اس نے اپنا ایک بازو ننگا کیا جس پر چوٹوں کے گہرے نشان موجود تھے۔

''میں سچ کہتا ہوں سجاول، ہم تمہیں ڈھونڈنے کی پوری کوشش کرتے رہے ہیں۔ بڑی بیگم بھی تمہارے لیے ازحد پریشان رہی ہیں۔''

''سب بکواس ہے۔'' وہ دہاڑا۔ ''یہ سب کیا ہو رہا ہے میرے اردگرد۔ اس سے تو لگتا ہے کہ تم لوگ مجھے ڈھونڈنے کے لیے پریشان نہیں تھے، پکڑنے کے لیے تھے، مجھے نہیں پتا یہ کیا سازش ہو رہی ہے۔ مجھے کیوں باندھ کر رکھا ہوا ہے تم لوگوں نے یہاں۔''

وہ بھڑک اٹھا تھا۔ چند سیکنڈ کے لیے مجھے لگا کہ وہ بپھر کر مجھ پر پل پڑے گا لیکن پھر اس نے خود کو سنبھالا۔ عجیب لہجے میں پھنکارا۔ ''مجھے بتاؤ...... یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے، میں کس طرح پہنچا ہوں یہاں؟''

''تمہیں کیا یاد پڑتا ہے سجاول؟''

وہ الجھن سے بولا۔ ''میں ان کی جیل میں تھا۔ میرے سر پر شاید کوئی چوٹ لگ گئی تھی...... میں گر گیا تھا...... مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا......''

''تمہیں واقعی بہت کچھ یاد نہیں آ رہا سجاول۔ لیکن تمہاری یادداشت میں جو گڑبڑ ہے یہ کسی چوٹ یا نشے کی وجہ سے نہیں ہے۔''

''تو کس وجہ سے ہے؟'' اس نے پیشانی مسلی۔

''میں ابھی بتاؤں گا تو تمہیں یقین نہیں آئے گا، ہو سکتا ہے کہ ایک آدھ دن میں تمہیں خود ہی کچھ یاد آ جائے۔''

وہ ایک بار پھر طیش میں آ گیا۔ ''تم زیادہ ڈرامے نہ کرو، مم...... مجھے سخت چوٹ ماری گئی ہے...... اور یہ تم میں سے ہی کسی نے ماری ہے۔'' اس نے اپنی کنپٹی کے نیلگوں گومڑ کو سہلایا۔ مجھے یاد آیا کہ ڈی پیلس میں کس طرح اپنا دفاع کرتے ہوئے مجھے سجاول کو یہ ضرب لگانا پڑی تھی۔

یہ واقعی بڑی ظالم چوٹ تھی۔ اگر یہ تھوڑی سی مزید سخت ہوتی تو سجاول کی جان بھی جا سکتی تھی۔ سجاول کا پارا پھر چڑھ رہا تھا۔ انیق ادھ کھلی کھڑکی میں سے یہ سب کچھ تاڑ رہا تھا۔ اس کے کہنے پر سیف نے مجھے پکارا۔ ''شاہ زیب بھائی! ذرا جلدی بات سنیں۔'' یہ بڑی بروقت ''کال'' تھی۔

''میں ابھی آیا۔'' کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا اور آہنی دروازہ حسبِ سابق باہر سے بند کر دیا۔

سجاول چنگھاڑا۔ ''ہتھکڑیاں لگا دو مجھے، بیڑیاں پہنا دو۔ کسی پنجرے میں بند کر دو۔ نہیں تو میں چیر پھاڑ ڈالوں گا تمہیں......'' اس نے کمرے میں کسی چیز کو ٹھوکر ماری اور اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ بہرحال اس کے بعد کوئی پریشان کن آواز نہیں آئی۔

دوسرے کمرے میں پہنچ کر انیق نے کہا۔ ''شاہ زیب بھائی! اب بھی دھونی کے لیے مان جائیں۔ ہزار ہزار کے نہ سہی، سو سو کے نوٹ ہی دے دیں۔ اگر کیش نہیں تو چیک کی دھونی بھی دی جا سکتی ہے لیکن کراس نہیں ہونا چاہیے۔''

شاید وہ مزید بک بک کرتا مگر میری صورت دیکھ کر سنجیدہ ہو گیا۔ میں نے قالین پر بیٹھ کر

دیوار سے ٹیک لگائی۔ سجاول کی حالت میں واضح بہتری نظر آ رہی تھی۔ آج اس نے گالی گلوچ نہیں کیا تھا۔ نہ ہی یہ ''سنگین الزام'' لگایا تھا کہ میری وجہ سے اس کی ماؤ کو اور بھتیجی کو جان سے ہاتھ دھونے پڑے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ اگر وہ خود کوئی ایسی بات نہیں کہہ رہا تھا تو ہمیں بھی یاد کرانے کی کیا ضرورت تھی۔

ڈاکٹر ماریہ نے ہپناٹزم کے بارے میں جو باتیں کہی تھیں وہ بڑی مدلل تھیں۔ اب سجاول کی کیفیت کے نشیب و فراز دیکھ کر میری نظر میں ان باتوں کی اہمیت بڑھ رہی تھی۔ ابھی میں، انیق اور سیف کمرے میں بند سجاول کے حوالے سے ہی بات کر رہے تھے کہ پناہ گاہ کا تکونی پتھر سرکنے کی مدھم آواز آئی۔ قسطینا دہانے کے بالکل قریب تھی، اس نے فوراً اپنی آٹومیٹک رائفل سنبھال لی۔

اندر آنے والا بن مشہد تھا۔ بن مشہد کے چہرے پر زلزلے کی کیفیت نظر آ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان تھا، میں اسے بھی پہچانتا تھا۔ دونوں کے کپڑے بھیگے ہوئے تھے۔ پتا چلتا تھا کہ باہر بارش ہو رہی ہے۔

بن مشہد نے سلائیڈنگ پتھر کو دھکیل کر داخلی راستہ بند کر دیا۔ قسطینا سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''یور ہائی نس! ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ وہ لوگ ٹیلوں تک تو پہنچ چکے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ ہمارے قدموں کے نشان ان کی رہنمائی کریں گے۔ بے شک پتھریلی زمین ہے لیکن کہیں کہیں بھربھری مٹی اور ریت بھی ہے۔''

''تمہاری کیا رائے ہے بن مشہد؟'' قسطینا نے پوچھا۔

''ہمیں یہاں سے نکلنے میں بالکل دیر نہیں کرنی چاہیے۔ بارش ہو رہی ہے، نگرانی بہت کم ہے۔ یہ اچھا موقع ہے۔''

''کیسے جائیں گے؟'' ابراہیم نے پوچھا۔

''یور ہائی نس! گاڑی کا انتظام ہے، اللہ نے چاہا تو دشواری نہیں ہوگی۔''

''فوجی گاڑی ہے؟'' فارس جان نے سوال کیا۔

''جی ہاں، گرے فوجیوں کے ''میس'' کے لیے گوشت لے کر جا رہے ہیں۔ سفر کے لیے یہ گاڑی بہترین رہے گی۔''

''لیکن جانا کہاں ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔

''قریباً پانچ میل کا سفر ہے خشکی پر اور قریباً آدھ گھنٹے کا پانی پر۔'' قسطینا نے مختصر جواب دیا۔ میں سمجھ گیا کہ فی الوقت وہ تفصیل میں جانا نہیں چاہتی۔

میں نے سوالیہ نظروں سے فارس جان کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اس صورتِ حال سے مطمئن نظر آ رہا تھا۔

○……❖……○

اگلے آدھے گھنٹے میں بے حد تیزی کے ساتھ پناہ گاہ چھوڑنے کی تیاری کر لی گئی۔ اس تیاری میں سب سے اہم کردار انیق نے ہی ادا کیا تھا۔ اس نے سجاول کے لیے جو چائے بھجوائی تھی وہ نشہ آور تھی۔ سجاول پہلے ہی مسکن ادویات کے زیراثر تھا، اسے انٹاغفیل ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ جب وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا تو مزید احتیاط کے طور پر اسے ایک انجکشن بھی دے دیا گیا۔ اس کے لیے ایک دستی اسٹریچر گاڑی میں موجود تھا۔

وقتِ رخصت پناہ گاہ سے ہر وہ ثبوت مٹا دیا گیا جو کسی بھی طور پر ہمارے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتا تھا۔ داخلی راستے کے قرب و جوار سے قدموں کے نشان بھی ختم کیے گئے۔

دوپہر کے بارہ بجے کا وقت ہو گا جب ہم سب سرنگ میں سفر کر کے ایک گھاٹی میں نکلے۔ بادل اتنے گہرے تھے کہ دن کے وقت بھی رات کا سماں تھا۔ بارش مسلسل ہو رہی تھی۔ قریب ہی گرے فورس کا ایک ٹرک کھڑا تھا جس کو ایک بڑی ترپال نے ڈھانپا ہوا تھا۔ ترپال کے نیچے ذبح کیا ہوا گوشت تھا۔ مگر یہ کسی حلال جانور کا نہیں سوٴر کا گوشت تھا۔ درجنوں ایسے سوٴر جن کی کھال اتری ہوئی تھی اور پیٹ آلائشوں سے صاف تھا، ٹرک میں پڑے تھے۔ ہمیں بھی ترپال کے نیچے ان کے ساتھ ہی لیٹنا تھا۔ سب سے زیادہ کراہیت زینب فدا محسوس کر رہی تھی۔ اس نے بمشکل اپنی ابکائی روکی اور پھر ابراہیم کے ساتھ گوشت کے اوپر پہلو کے بل لیٹ گئی۔ سنبل نے بھی کچھ دیر ہچکچانے کے بعد اس کی تقلید کی۔ قسطینا اور فارس جان سمیت ہم سب نیم گرم گوشت کے اوپر لیٹ گئے۔ بن مشہد اور تبارک نے ہمارے اوپر ترپال کھینچ دی۔ بڑی مضبوط ترپال تھی۔ بارش کے تریڑے اس پر پڑتے تھے تو آواز پیدا ہوتی تھی۔ ہمارا اسلحہ ہمارے ہاتھوں میں تھا، میں نے پشت کے بل لیٹ کر مشین پسٹل اپنے سینے پر رکھ لیا تھا تا کہ کسی بھی وقت استعمال میں لا سکوں۔ قسطینا میری بائیں جانب تھی اور اس نے بھی اپنی آٹومیٹک رائفل اپنے پیٹ پر رکھی ہوئی تھی۔ اس کی نال میری پسلیوں سے چھو رہی تھی۔

میں نے ہولے سے کہا۔ ”کہیں شوٹ ہی نہ فرما دیجیے گا۔“

”مرنے سے ڈرتے ہو؟“

”مرنے سے تو نہیں ڈرتا...... لیکن اتنی بارش میں کفن دفن کا انتظام ذرا مشکل ہو جاتا

ہے۔‘‘

’’مریں تمہارے دشمن۔‘‘ اس نے سرگوشی میں کہا اور رائفل کا رخ بدل لیا۔ پھر ذرا وقفے سے بولی۔ ’’ویسے تمہارے مشین پسٹل کا رخ بھی میری ہی طرف ہے لیکن مجھے تو تمہارے پسٹل سے بالکل خوف نہیں آتا۔ بلکہ اس کی گولی سے مرنا کافی آسان ہوگا۔‘‘

بہت زور سے بجلی کڑکی ہم سب تھرا کر رہ گئے۔ میں نے کہا۔ ’’میرا خیال ہے کہ ہمیں موت وغیرہ سے ہٹ کر کوئی بات کرنی چاہیے۔ موسم ٹھیک نہیں ہے۔‘‘

ٹرک نے ایک تیز ٹرن لیا اور پھر اونچے نیچے راستے پر بری طرح اچھلنے لگا۔

انیق بولا۔ ’’مجھے لگتا ہے کہ شاید مشہد صاحب نے کسی نالے کو بائی پاس کیا ہے۔‘‘

قسطینا بولی۔ ’’تم شکل سے ضرور اُلو لگتے ہو لیکن باتیں سمجھداری کی کرتے ہو۔‘‘

’’بہت شکریہ یور ہائی نس۔‘‘ انیق نے خوش ہو کر کہا۔

اتنی بات تو میری سمجھ میں آ گئی تھی کہ ہم جزیرے سے نکل رہے ہیں اور کھلے سمندر میں کسی اور جگہ پر جا رہے ہیں مگر ہماری معلومات کے مطابق کوسٹل گارڈز پورے ساحل کی زبردست نگرانی کر رہے تھے۔ ان کو چکما دینے کا بن مشہد کے پاس کوئی خاص پلان تھا۔ وقتِ رخصت قسطینا نے مجھے صرف اتنا بتایا تھا کہ بن مشہد نے کسی لانچ کے ملاح سے بات کی ہے اور اس سے معاملہ طے ہوا ہے۔ قسطینا چیف گیرٹ کو اپنے والد کا اہم ترین قاتل سمجھتی تھی اور وہ برج کلب والے فضائی حملے کے بعد ہلاک ہو چکا تھا۔ قاتل نمبر دو یہی رائے زل تھا اور وہ شدید زخمی ہو کر اسپتال میں بے ہوش پڑا تھا۔ بے شک سرکاری ذرائع بتا رہے تھے کہ اس کی حالت کچھ بہتر ہے لیکن یہ اطلاعات قابلِ بھروسا نہیں تھیں۔ بہت دنوں بعد قسطینا قدرے خوش نظر آ رہی تھی اور ہلکے پھلکے انداز میں بات کر رہی تھی۔

چند منٹ تک غیر ہموار راستے پر ہچکولے کھانے کے بعد بریڈ فورڈ کا ٹرک ایک جگہ رک گیا۔ بن مشہد کی ہدایت کے مطابق ہم اپنی جگہوں پر بے حرکت پڑے رہے۔ بے حرکت لیکن پوری طرح تیار۔

تازہ ذبح کیے گئے جانوروں کے گوشت کی گرمی اب نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ ایک طرح کی نمی اور چپچپاہٹ کا احساس ہو رہا تھا۔ زینب نے نہ جانے کس طرح اپنی ابکائیاں روکی ہوئی تھیں۔ بارش قدرے ہلکی ہو گئی تھی لیکن جب میں نے ترپال کا ایک کونا ہٹا کر باہر جھانکا تو گہرے بادلوں نے بدستور رات کا سماں پیدا کر رکھا تھا۔ کچھ ہی فاصلے پر سمندر کا پانی ہلکورے لے رہا تھا اور لہروں کا ہلکا ہلکا شور بارش کی آواز میں گڈمڈ ہو رہا تھا۔ پام کے بلند

درخت ہمارے سروں پر جھوم رہے تھے۔ کچھ فاصلے پر ایک بڑی لانچ نظر آئی۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ اس لانچ پر گرے فورس کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ بہر حال یہ فوجی لانچ نہیں لگتی تھی۔ بن مشہد اور تبارک اونچے پتھروں کے درمیان کھڑے درمیانی عمر کے ایک ملاح نما شخص سے گفتگو کر رہے تھے۔ تبارک کے ہاتھ میں چھتری تھی جو اس نے مشہد پر اور خود پر تان رکھی تھی۔ تنومند ملاح کے ہاتھ میں بھی ایک چھتری تھی، یوں محسوس ہوا کہ کچھ لین دین ہو رہا ہے۔ ایک ہیلی کاپٹر بہت نیچے پرواز کرتا ہوا ہمارے سروں کے اوپر سے گزر گیا۔ میں نے ترپال پھر اوڑھ لی۔

سنبل کی منمناتی ہوئی سی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ''اور کتنی دیر اس طرح لیٹنا پڑے گا، میری تو کمر ٹوٹ گئی ہے۔''

''بس تھوڑی دیر اور۔'' میں نے تیز سرگوشی میں کہا۔ ''لیکن اونچی آواز میں نہ بولو۔ ورنہ سچ مچ کوئی کمر توڑنے والا آجائے گا۔''

وہ چپ ہو گئی۔ جو ڈالرز اور سونے کے ٹکڑے (بسکٹس) اسے آسیاں کے گھر سے حاصل ہوئے تھے، وہ ریگزین کے ایک مضبوط بیگ میں تھے اور سنبل نے اپنے سینے سے لگا رکھے تھے۔ نیم بے ہوش سجاول بھی سنبل کے قریب ہی پشت کے بل پڑا تھا۔ اسے فارس جان، انیق اور مشہد نے مل کر ٹرک میں ''لوڈ'' کیا تھا۔ سیف نے بھی ہاتھ بٹایا تھا۔ ویسے انیق نے ایک انجکشن بھر کر تیار رکھا ہوا تھا کہ اگر راستے میں وہ کوئی گڑبڑ کرے تو اس کے بازو میں سوئی ٹھوکی جا سکے۔

دس پندرہ منٹ بعد قدموں کی آواز آئی پھر ترپال کے ایک گوشے کو اٹھایا گیا۔ بن مشہد نے اپنا سر اندر گھسایا اور قسطینا سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''یور ہائی نس! سب او کے ہے۔ بارش ہو رہی ہے۔ باہر نکلنے کے لیے یہ اچھا موقع ہے۔ گرے گارڈز ہم سے زیادہ دور نہیں ہیں۔ ہمیں بڑی تیزی لیکن بڑی احتیاط کے ساتھ لانچ پر پہنچنا ہوگا۔''

''ہم تیار ہیں۔'' قسطینا نے کہا۔

''ہم پہلے خود لانچ میں پہنچیں گے، اس کے بعد مسٹر سجاول کو اسٹریچر پر لے جائیں گے۔''

''بالکل ٹھیک ہے۔'' انیق نے فوراً تائید کی۔ انداز میں شرارت تھی۔

میں نے کہا۔ ''وہ ہوش میں آتا جا رہا ہے اور میں تمہاری باتیں ریکارڈ بھی کر رہا ہوں۔''

''میں نے کوئی بری بات تو نہیں کہی جناب۔'' انیق بولا۔

''نہیں...... اس کے بارے میں تمہاری ساری باتیں ہی اچھی ہوتی ہیں۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ وہ خاموش ہو گیا۔ (ویسے چند دن پہلے میجر وارث کو بروقت شوٹ کر کے، انیق نے جو کارکردگی دکھائی تھی، اس نے مجھے دلی طور پر متاثر کیا تھا)

بن مشہد اور تبارک نے ہمارے اوپر سے ترپال ہٹا دی۔ ہم احتیاط سے نیچے اترے۔ زینب اور سنبل کو اترنے میں ذرا دشواری ہوئی۔ زینب کو ابراہیم اور قسطینا نے سہارا دے کر اتارا۔ سنبل کی مدد میں نے اور انیق نے کی۔ میرے بازو کی سوجن ختم ہو چکی تھی اور درد بھی نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا مگر تشویش ناک بات یہ تھی کہ میں اس بازو کو آزادانہ حرکت نہیں دے سکتا تھا۔

بن مشہد اور تبارک نے قسطینا اور ابراہیم پر چھتریاں تاننا چاہیں لیکن دونوں نے ہی انکار کر دیا۔ صورتِ حال ان تکلفات کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ ہم سب پتھروں اور پودوں کے درمیان جھک کر بھاگتے اور کبھی تیز چلتے لانچ تک پہنچ گئے۔ وہ تیز لہروں پر ہچکولے کھا رہی تھی اور بھیگا ہوا جھنڈا پھڑ پھڑا رہا تھا۔ لہریں کنارے کے پتھروں سے ٹکرا کر جھاگ اڑاتی تھیں اور خشکی پر آگے تک چلی جاتی تھیں۔ ہم ایک عارضی پلیٹ فارم کے ذریعے قطار کی شکل میں لانچ کے اندر چلے گئے اور پھر ایک سیڑھی کے ذریعے نچلے حصے میں اتر گئے۔ اس لانچ پر سامنے کی جانب ''آن گورنمنٹ ڈیوٹی'' کے الفاظ لکھے ہوئے تھے۔ لانچ کے نچلے حصے میں شراب کی بوتلوں کے بہت سے خالی کریٹ پڑے تھے۔ ڈبا بند خوراک کے کچھ کارٹن بھی تھے جن پر ''آرمی سپلائی'' کے الفاظ درج تھے۔ پتا چلا کہ یہ فوجی لانچ تو نہیں لیکن فوجیوں کے کارگو اور رسد کے لیے استعمال ہو رہی ہے۔ اسی لیے اس پر گرے فورس کا پرچم بھی لہرا رہا تھا۔

لانچ چلانے والا ایک گندا سا ملائیشین تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی کھچڑی داڑھی تھی۔ آنکھیں کثرت شراب نوشی سے سوجی ہوئی تھیں۔ اس نے قسطینا اور سنبل وغیرہ کو بڑی بھوکی نظروں سے دیکھا اور ہم سے مخاطب ہوتے ہوئے اپنے پیلے دانتوں کی نمائش کی۔ اس کا نام واٹسن معلوم ہوا۔

انیق نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''موسیو واٹسن! آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی، میرا خیال ہے کہ اب ہمیں فوراً یہاں سے نکلنا چاہیے۔''

''اوکے، میں تیار ہوں۔'' وہ بھرائی ہوئی پاٹ دار آواز میں بولا اور لانچ کے کنٹرول کی طرف بڑھا۔

بن مشہد نے کہا۔ ''ٹھہرو بھئی! ابھی ایک سواری اور ہے۔ ہم لا رہے ہیں۔''

واٹسن رک گیا۔ انیق نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ''ایک تو، اسے کوئی بھولتا بھی نہیں۔''
اس کا اشارہ یقیناً سجاول کی طرف ہی تھا۔
میں نے کہا۔ ''ہم خیر خیریت سے کہیں پہنچ جائیں، پھر میں اس بارے میں تم سے نمٹتا ہوں۔''
اس نے مسمسی صورت بنالی اور سیف کو لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ''آؤ بھئی لے آئیں بھا جی سجاول کو۔'' اس نے کہا۔
وہ دونوں بن مشہد کے ساتھ باہر چلے گئے۔
تین چار منٹ بعد سجاول بھی لانچ میں موجود تھا۔ واٹسن کی جیب گرم ہو چکی تھی۔ اس نے رم کی ایک بوتل کھولی اور ایک چوتھائی غٹا غٹ چڑھا گیا۔ قسطینا اسے گھور رہی تھی۔ وہ بولا۔ ''میڈم! پریشان نہیں ہونا۔ میں ساری بھی چڑھا جاؤں تو لانچ کو ڈولنے نہیں دوں گا۔ جس طرح ایک عورت ایک بھرپور مرد کے اشاروں پر چلتی ہے، یہ بھی میرا کہا مانتی ہے۔'' اس نے فقرہ مکمل کرتے ہوئے ایک آنکھ دبائی۔
قسطینا برا سا منہ بنا کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ وہ جانتا نہیں تھا کہ جسے وہ بے پروائی سے میڈم کہہ رہا ہے وہ اس جزیرے کی اہم ترین شخصیت ہر ہائی نس قسطینا ہے اور جو دبلا پتلا سا لڑکا، لکڑی کے ایک کارٹن پر بھیگے کپڑوں اور بھیگے بالوں کے ساتھ بیٹھا ہے وہ یہاں کا ولی عہد ہز ہائی نس ابراہیم ہے۔ وہ قسطینا اور ابراہیم وغیرہ کو پہچان نہیں پایا تھا اور ہمیں ان ''عام شہریوں'' میں سے ہی سمجھ رہا تھا جو بدمست گرے فوجیوں اور رائے زل کے ڈر سے جاما جی سے چوری چھپے نکل رہے تھے۔
اتنے میں بن مشہد لمبے ڈگ بھرتا ہوا نیچے آ گیا۔ واٹسن سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''بڑے بھائی، لگتا ہے تم کچھ زیادہ ہی چڑھا گئے ہو، اگر کہو تو لانچ میں چلا لوں۔''
''کاٹھ کے الو ہو تم۔ میں بتا تو رہا ہوں، یہ لانچ نہیں میری عورت ہے۔ ہم ایک دوسرے کو بڑی اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ اب تو یہ بھی کہتی ہے کہ مجھے نشے کے بغیر ہاتھ مت لگاؤ۔''
بن مشہد نے کہا۔ ''کچھ مردوں کو غلط فہمی بھی تو ہوتی ہے کہ وہ اپنی عورتوں کو بہت اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ان کی پیٹھ پیچھے وہ انہیں گالیاں دیتی ہیں۔''
''کیا مطلب؟ کیا کہنا چاہتے ہو؟'' واٹسن نے کڑے تیوروں کے ساتھ کہا۔
''مجھے افسوس ہے واٹسن! تم مزید شراب نہیں پی سکو گے۔ ہاں تم نے کہا ہے کہ تمہاری

بیوی بیمار ہے اور اسے علاج کے لیے پیسوں کی ضرورت ہے۔ تمہاری جیب میں جو پیسے ہیں وہ تمہاری بیوی تک ضرور پہنچ جائیں گے اور امید ہے کہ یہ لانچ بھی تمہارے گھر والوں تک پہنچ جائے گی۔''

تبارک بڑی خاموشی کے ساتھ واٹسن کے عقب میں کھڑا تھا۔ اس نے ایک بڑے اسکریو رینچ کی زوردار ضرب واٹسن کے سر کے عقبی حصے میں لگائی۔ وہ لکڑی کے فرش پر اوندھے منہ گرا۔ زینب اور سنبل بے ساختہ چلا اٹھی تھیں۔ واٹسن جو پہلے ہی بدمست تھا۔ نیم بے ہوش ہو گیا۔ بن مشہد اور تبارک اسے گھسیٹ کر لوہے کی سیڑھی سے اوپر لے گئے لیکن اس سے پہلے انہوں نے واٹسن کے بدبودار کوٹ کی جیبوں سے لانچ کی چابیاں اور بڑے نوٹوں کی دو گڈیاں نکال لی تھیں۔ تیسری چیز جو نکلی وہ ایک بڑا شکاری چاقو تھا۔ کمانڈر فارس جان بھی ان تینوں کے ساتھ ہی اوپر گیا۔

سنبل نے میرا بازو دباتے ہوئے کہا۔ ''کیا یہ اس کو مار دیں گے؟''

''نہیں، اوپر جا کر بند کر دیں گے۔'' میں نے سنبل کو مزید خوف زدگی سے بچانے کے لیے جھوٹ بولا ورنہ ادھیڑ عمر واٹسن کی موت میں بن مشہد کی آنکھوں میں پڑھ چکا تھا اور شاید اپنی ''منزل'' کو راز رکھنے کا یہی ایک محفوظ ترین طریقہ تھا۔ ڈالرز کی خاطر مالکوں کو دھوکا دینے والا، ہمیں بھی دھوکا دے سکتا تھا۔

چند سیکنڈ بعد سائیلنسر لگے پستول کی مدھم آواز لانچ کے اس زیریں حصے تک پہنچی۔ قسطینا نے میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ واٹسن ختم ہو چکا تھا۔

قریباً پندرہ منٹ بعد یہ لانچ تھرتھرائی اور پھر حرکت میں آ گئی۔ ہم کھلے سمندر کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔

''کیا تبارک بھی ہمارے ساتھ ہے؟'' میں نے قسطینا سے پوچھا۔

''ہاں، وہ ٹرک کو کچھ فاصلے پر چھوڑ کر واپس آ گیا ہے اور ہمارے ساتھ ہے۔'' قسطینا نے جواب دیا۔

لانچ ہچکولے کھاتی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ بارش زوروں پر تھی۔ ایک طرح سے ہمارے اوپر نیچے اور دائیں بائیں ہر طرف پانی ہی تھا۔ اس پانی میں بہت سے خطرات چھپے ہوئے تھے۔ لانچ کے خراب ہو جانے کا خطرہ، کوسٹل گارڈز کی نظر میں آ جانے کا خطرہ، راستے سے بھٹک جانے کا خطرہ۔ بن مشہد بڑی مشاقی سے لانچ کو شمال مغرب کی طرف اڑائے چلا جا رہا تھا۔ ہم ہر قسم کے خطرے سے نمٹنے کے لیے پوری طرح تیار تھے۔

اچانک ایک جگہ لانچ کی رفتار آہستہ ہوئی اور پھر وہ رک گئی۔ ''پرابلم۔'' قسطینا نے زیرلب کہا۔

زینب اور سنبل کے چہرے زرد ہو گئے۔ لیکن میں نے پہلی مرتبہ یہ دیکھا کہ ابراہیم نارمل رہا۔ اس کے لباس میں بھرا ہوا پستول موجود تھا اور وقت پڑنے پر وہ اسے استعمال کرنے کا ارادہ بھی رکھتا تھا۔ زینب دعائیہ انداز میں کچھ بڑبڑانے لگی۔ قسطینا نے اٹھ کر بلب آف کر دیا اور لانچ کے اس زیریں پورشن میں تاریکی پھیل گئی۔ میں، سیف کے سانسوں کی تیز آواز سن رہا تھا۔ وہ لڑائی بھڑائی کے معاملوں میں بڑا جذباتی تھا۔ خاص طور سے میرے کندھے سے کندھا ملا کر لڑنے کے لیے وہ ہر وقت تیار رہتا تھا۔

ہم اوپر سے آنے والی آوازوں کو سننے کی کوشش کر رہے تھے لیکن کچھ پلے نہیں پڑ رہا تھا۔ کمانڈر فارس جان نے کہا۔ ''امارے خیال میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں، یہ روٹین کا چیکنگ ہے جو یہ لوگ کرتا ہے۔''

انیق نے کہا۔ ''لیکن اگر انہوں نے لانچ پر آ کر چیکنگ کی تو بھانڈا پھوٹ جائے گا۔''

''خوتب بھانڈا ہی نہیں اور بھی بہت کچھ پھوٹے گا۔'' فارس جان نے رائفل کے دستے پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا۔

قسطینا اس کی سپہ سالار تھی اور وہ اس کی حفاظت کے لیے جاں نثار کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا تھا۔

بہر حال فارس کا کہا درست ثابت ہوا۔ شدید تناؤ کے دو تین منٹ گزر گئے اور لانچ ایک فرحت بخش ہچکولے کے ساتھ آگے روانہ ہو گئی۔

قریباً پچیس منٹ کے تیز رفتار سفر کے بعد ہم چھوٹے چھوٹے ٹاپوؤں کے ایک سلسلے میں داخل ہوئے اور پھر ایک الگ تھلگ ٹاپو کے قریب جا کر رک گئے۔ یہاں اردگرد چھ سات کلومیٹر تک پانی کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا سوائے ایک پرانے زنگ آلود جہاز کے۔ لیکن یہ پورا جہاز نہیں تھا صرف اس کی دم کا کچھ حصہ تھا۔ باقی جہاز پانی کے اندر تھا اور ریت اور چٹانوں میں کہیں پھنسا ہوا تھا۔ اسے ڈوبے ہوئے شاید کئی عشرے گزر چکے تھے۔ یہ کوئی بہت بڑا جہاز نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ یہاں سمندر بھی بہت گہرا نہیں ہے۔ ٹاپو سے جہاز کا فاصلہ ایک کلومیٹر کے لگ بھگ تھا۔

ہماری لانچ جھاڑ جھنکاڑ اور آبی نباتات سے ڈھکے ہوئے ایک کنارے پر جا کر رکی۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا۔ بارش اب پھوار کی صورت برس رہی تھی اور کچھ روشنی بھی ہو گئی تھی۔ یہاں

چاروں طرف مکمل سکوت تھا۔ ہم ایک ایک کر کے احتیاط کے ساتھ لانچ سے اتر آئے اور نباتات سے اَٹے ہوئے اس چھوٹے سے ٹاپو پر قدم رنجہ فرمایا۔ قسطینا نے بھیگی ہوئی سرد ہوا میں گہری سانس لی اور بولی۔ ''اس ٹاپو کو فاری یا فاری پولاؤ کہا جاتا ہے۔ مقامی زبان میں فاری کا مطلب بدقسمت ہے۔''

''بدقسمت کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''وہی ڈوبا ہوا جہاز جو سامنے نظر آرہا ہے۔ چند ماہی گیروں کو اس ٹاپو کے اردگرد حادثات بھی پیش آئے اور پھر لوگوں نے اس طرف آنا ہی چھوڑ دیا۔ بس اسی طرح سے لوگوں کے عقیدے بنتے ہیں۔ حالانکہ یہ بدقسمت نہیں بلکہ خوش قسمت اور بہت خوب صورت ٹاپو ہے۔''

''خوش قسمت کس حوالے سے؟''

وہ مسکرائی۔ ''ساری باتیں یہیں کھڑے پوچھ لو گے، ہمیں آگے چلنا چاہیے، کوئی ہیلی کاپٹر اس طرف آنکلا تو مصیبت پڑ جائے گی۔''

بن مشہد نے لانچ کو چوڑے پتوں والے بڑے بڑے آبی پودوں کے نیچے کیموفلاج کر دیا۔ مگر وہ اب بھی کہیں کہیں سے دکھائی دے رہی تھی۔ قسطینا میری نظر کے زاویے کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں شاہ زائب! بن مشہد اپنے کام میں ماہر ہے۔ یہ اس پر شاخیں وغیرہ کاٹ کر اس طرح پھیلائے گا کہ کوئی اس کے قریب آ کر بھی اس کو شناخت نہیں کر سکے گا۔''

ہم نہایت گھنے درختوں کے درمیان سنبھل سنبھل کر آگے بڑھنے لگے۔ سجاول والا اسٹریچر انیق اور کمانڈر فارس جان نے اٹھا رکھا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ تھک گئے تو اسٹریچر سیف اور بن مشہد نے اٹھا لیا۔ بن مشہد آگے اور سیف پیچھے تھا۔ میں بن مشہد کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ بارش کچھ دیر کے لیے تھم گئی تھی مگر گھنے درخت اب بھی چھینٹے پھینک رہے تھے۔ ہر طرف نکھری ہوئی ہریالی تھی۔ کسی وقت نامعلوم پرندوں کی آوازیں بھی سنائی دے جاتی تھیں۔ پرندوں اور حشرات کے علاوہ کئی پودے بھی ہمارے لیے بالکل اجنبی تھے۔

میں نے بن مشہد کے پہلو میں چلتے ہوئے اس سے پوچھا۔ ''والٹس کی لاش کہاں پھینکی؟''

''راستے میں۔'' اس نے ہولے سے کہا۔ ''اسے مار کر افسوس ہوا لیکن یہ ضروری تھا۔''

''یہ ٹاپو زیادہ بڑا تو نہیں لگتا۔'' میں نے موضوع بدلا۔

''نہیں، تین چار میل سے زیادہ لمبائی نہیں ہے۔ چوڑائی بھی ڈیڑھ میل کے لگ بھگ ہو گی۔ ہمیں بس تین چار سو میٹر آگے جانا ہے۔''

''ہر ہائی نس قسطینا کا کہنا ہے کہ کوئی زمین دوز پناہ گاہ ہے؟''

''جی ہاں، دیکھ کر آپ کا دل خوش ہو جائے گا۔ یہ لوگ پوری گرے فورس کو بھی ڈھونڈنے پر لگا دیں تو ان شاء اللہ ہم تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ خوراک وغیرہ کی بھی کوئی کمی نہیں ہو گی یہاں......صرف ایک مسئلہ ہو گا۔''

''وہ کیا؟''

''یہ جگہ اردگرد سے بالکل کٹی ہوئی ہے۔ ہم سیل فون وغیرہ استعمال نہیں کر سکیں گے۔ یہ پتا نہیں چل سکے گا کہ جاما جی میں اور اردگرد کیا ہو رہا ہے۔''

ہم چلتے جا رہے تھے۔ کئی جگہ درخت اور پودے اتنے گھنے تھے کہ تبارک کو شاخیں توڑنی یا کاٹنی پڑ رہی تھیں۔ ہمارے اردگرد چھوٹے بڑے پتھر اور سبزی مائل چٹانیں تھیں۔ ایسے ہی ایک بڑے پتھر کے پاس پہنچ کر ہم رک گئے۔ یہ کائی اور روئیدگی کے سبب سبزی مائل مٹیالے رنگ کا نظر آ رہا تھا۔ بن مشہد اور تبارک پتھر کے قریب کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے انیق اور سیف کو بھی مدد کے لیے بلا لیا۔

میں سمجھ گیا کہ یہاں کیا ہونے جا رہا ہے۔ ہماری پہلی پناہ گاہ کی طرح یہاں بھی ایک سرکنے والا پتھر موجود تھا۔ انہوں نے مل کر اسے دھکیلا۔ اگر یہ کوئی عام پتھر ہوتا تو شاید دو درجن افراد بھی اسے اس کی جگہ سے ہلا نہ سکتے مگر اب چار پانچ افراد نے اسے ایک جانب سرکا دیا۔ یہاں بھی وہی سسٹم نظر آیا۔ یہ پتھر ایک نہایت مضبوط فولادی ریلنگ پر بال بیرنگز کے ذریعے حرکت کرتا تھا۔ پتھر ہٹا تو قریباً آٹھ فٹ ضرب چھ فٹ کے خلا میں سیڑھیاں نظر آئیں۔ یہ پتھروں کو تراش کر بنائی گئی تھیں اور کسی اسپتال کی سیڑھیوں کے مانند بہت ایزی تھیں۔

بن مشہد اور تبارک اپنے ساتھ جو مختصر سامان لائے تھے ان میں چار عدد طاقتور ٹارچیں بھی موجود تھیں۔ ان میں دو ٹارچیں ایسی تھیں جو سر پر پہنے جانے والی آہنی ٹوپی میں نصب تھیں۔ تبارک اور بن مشہد نے یہ کیپ ٹارچز پہن لیں۔ ان کی روشنی دور تک جانے لگی۔ سبزی مائل پتھر کو دوبارہ سرکا کر خلا کو بند کر دیا گیا۔ ہم بارش کی رم جھم سے محفوظ ہو گئے۔ سیڑھیاں اتنی آسان تھیں کہ سجاول کے اسٹریچر کو حرکت دینے میں بھی کوئی دشواری نہیں ہو رہی تھی۔

''یہ ہم کہاں اترتے جارہے ہیں شاہ زیب بھائی؟'' انیق نے ڈری ڈری آواز میں کہا۔

''زیادہ اداکاری نہ کرو۔'' میں نے کہا۔ ''ویسے بھی تمہیں ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم نے کئی سخت چلے کاٹے ہوئے ہیں۔ پیر کامل کی منزل تک پہنچنے والے ہو۔''

''لیکن میں ایسی جگہ مرنا نہیں چاہتا جہاں میرا مزار ہی نہ بن سکے۔ کل کلاں میرے ماننے والے مجھے کہاں ڈھونڈتے پھریں گے...... اور سنا ہے کہ خونی چمگادڑیں تو پیری فقیری کے حوالے سے ویسے بھی زیادہ نالج نہیں رکھتیں۔''

''مجھے تو تمہارے سوا یہاں کوئی چمگادڑ نظر نہیں آرہی اور میرا خیال ہے کہ ہوگی بھی نہیں۔''

سیف نے کہا۔ ''یہ پانی کی آواز کیسی آرہی ہے؟''

آواز واقعی آرہی تھی۔ میں نے سوالیہ نظروں سے قسطینا کی طرف دیکھا۔ ٹارچ کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ وہ ہولے سے مسکرائی۔ ہم چند قدم مزید آگے گئے اور آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ یقین نہیں آیا کہ ہم سب کچھ اپنی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ زیرزمین پانی کا ایک دریا بہہ رہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے پتھروں سے ٹکراتا یہ پانی تیزی سے نشیب کی طرف بڑھتا چلا جارہا تھا۔ یہاں سبزہ نہیں تھا مگر آبِ حیات کی جھلکیاں نظر آتی تھیں۔

انیق نے لرزاں آواز میں کہا۔ ''مجھے احمد رشدی کا ایک پرانا گانا یاد آرہا ہے۔ قسمت کا لکھا ٹل سکتا ہے...... دریا انڈر گراؤنڈ چل سکتا ہے...... جم سکتی ہے سورج کی کرن...... وغیرہ وغیرہ......''

سیف بولا۔ ''یارا! احمد رشدی کو یاد کرنے کے لیے یہ کوئی مناسب جگہ نہیں ہے۔ کوئی اللہ توبہ کرو۔''

یہ ایک وسیع و عریض جگہ تھی۔ ہم بولتے تھے تو ہماری آوازیں بلند و بالا چھت سے ٹکرا کر دیر تک گونجتی تھیں۔ میں نے زیرزمین بہنے والے دریاؤں کے بارے میں سنا تھا مگر کبھی کسی ایسے دریا کو اپنی آنکھوں سے دیکھوں گا، یہ توقع نہیں تھی۔ اس سارے نظارے میں عجیب سی ہیبت آمیز دلچسپی تھی۔ اتنی بلند چھت کے نیچے اس بارشی دریا کے کنارے کھڑے ہم کیڑے مکوڑے ہی نظر آتے تھے۔ کوئی عجیب وضع کا کیکڑے زینب کے پاؤں پر چڑھا تو اس نے چلانا شروع کر دیا۔ ابراہیم نے کیکڑے کو ہٹایا اور اپنے پاؤں تلے مسلا۔ ''آگے نکلنا چاہیے۔'' قسطینا نے کہا اور اس کی آواز دیر تک پتھریلی دیواروں میں گونجتی رہی۔

قریباً پانچ منٹ بعد ہم ایک شاندار چیمبر میں موجود تھے۔ اس پتھریلے چیمبر کے اردگرد اور بھی کئی چھوٹے بڑے چیمبر اور راہداریاں موجود تھیں۔ یہ سب کچھ قدرتی تھا۔ بے حد صاف ستھرا اور ہوادار۔ اگر کوئی کمی تھی تو وہ روشنی کی تھی۔ اس کمی کو مومی شمعوں کی مدد سے دور کیا گیا۔ ہماری پہلی پناہ گاہ کی طرح یہاں بھی بیشتر ضروریات زندگی اور آسائشیں موجود تھیں۔ بستر، کرسیاں اور میز۔ لکڑی کی الماریاں جن پر خوب صورتی سے رنگ روغن کیا گیا تھا۔ یہاں دو کچن بھی موجود تھے اور گیس سلنڈر بھی دکھائی دیئے۔

قسطینا نے کہا۔ ''یہاں دو بڑے جنریٹرز اور کافی آئل بھی موجود ہے لیکن یہ سسٹم چونکہ طویل عرصے سے استعمال نہیں ہوا اس لیے چالو حالت میں نہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہم جلد ہی اسے قابلِ استعمال بنالیں گے۔''

''ایسی کتنی پناہ گاہوں کا انتظام کر رکھا ہے آپ نے؟'' میں نے پوچھا۔

''صرف دو۔'' وہ بولی۔ ''ایک وہ تھی جہاں سے ہم آئے ہیں، اور ایک یہ جہاں موجود ہیں اور یہ پناہ گاہیں بھی ڈیڈ کی دوراندیشی کا نتیجہ تھیں۔ انہیں اندازہ تھا کہ دھیرے دھیرے رائے زل کا دباؤ ہم پر بڑھتا جائے گا۔ انہوں نے عزت مآب اور فیملی کی حفاظت کے لیے یہ انتظام کیا تھا مگر حالات کے تیور دیکھ کر عزت مآب تو ویسے ہی پاکستان چلے گئے تھے۔'' شاید وہ اور بھی کچھ کہتی مگر ابراہیم تھوڑی دور دوسرے کمرے میں موجود تھا۔ قسطینا نہیں چاہتی تھی کہ ابراہیم کے والد کے بارے میں کوئی سخت بات ابراہیم کے کانوں تک پہنچے۔

انیق کچھ فاصلے پر بیٹھا تھا اور اپنے گیلے جوتے اتار رہا تھا۔ اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''یا اللہ خیر، ہمیں ہر طرح کی بلاؤں سے محفوظ رکھ۔''

پہلے تو مجھے پتا نہیں چلا کہ اس نے یہ دعائیہ انداز کیوں اختیار کیا ہے پھر میری نگاہ سجاول والے اسٹریچر پر پڑی۔ اس نے کسمسانا شروع کر دیا تھا اور سر کو دائیں بائیں حرکت دے رہا تھا۔ میں اسے دیکھنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے سکون بخش دوا کی ایک اور ڈوز کی ضرورت تھی۔

○......❖......○

رات تک ہم اپنی اپنی جگہ پر "سیٹ" ہو چکے تھے۔ یہ واقعی ایک وی آئی پی پناہ گاہ تھی۔ زمین دوز دریا کا شور یہاں ایک مدھم موسیقی کی طرح گونجتا تھا۔ مومی شمعوں کا ایک بڑا ذخیرہ یہاں موجود تھا۔ اس کے علاوہ گیس لیمپس بھی تھے۔ بہت دنوں کے بعد ہم نے خشک راشن کے بجائے تازہ پکا ہوا کھانا کھایا۔ یہ کھانا تیار کرنے میں زینب، سنبل اور سیف نے حصہ لیا۔ سیف پنجابی پٹھا تھا۔ خوراک کھانا تو جانتا ہی تھا، پکانا بھی خوب جانتا تھا، اس نے پراٹھے تیار کیے۔ ساتھ میں سفید چنوں کا سالن تھا۔ لاہوری کھانے کا مزہ آگیا۔ ابراہیم تو خیر پاکستان میں رہ کر آیا تھا لیکن قسطینا اور بن مشہد وغیرہ کے لیے یہ ذائقہ اجنبی تھا۔ قسطینا سوں سوں کرتی رہی اور ہمارا دل رکھنے کے لیے کھاتی بھی رہی۔

کھانے کے بعد باقی تو باہر چلے گئے۔ میں، قسطینا، فارس جان اور ابراہیم بیٹھے رہے۔ اسی دوران میں کیپٹن ڈاکٹر تبارک بھی اجازت لے کر اندر آگیا اور بیٹھ گیا۔ کمانڈر فارس جان نے شستہ انگلش میں قسطینا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "یور ہائی نس! آپ کے لیے بلکہ ہم سب کے لیے ایک اچھی خبر ہے۔" فارس کے چمکدار چہرے پر دبا دبا جوش تھا۔

"کس حوالے سے؟" قسطینا نے دریافت کیا۔

فارس جان نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر ارادہ بدل کر بولا۔ "ڈاکٹر تبارک تم خود ہی بتاؤ۔"

تبارک نے مؤدب انداز میں کہا۔ "یور ہائی نس! میڈیا پر رائے زل کی صحت میں بہتری کے متعلق خبریں چلائی جارہی ہیں لیکن صورتِ حال اِن کے بالکل برعکس ہے۔ آپ کا یہ خادم اس وقت خود اسپتال میں موجود تھا جب زخمی رائے زل اور مردہ حلمی صاحب کو وہاں لایا گیا۔ میری موجودگی میں ہی سینئر سرجنوں نے رائے زل کو آپریٹ بھی کیا تھا۔ رائے زل نے بلٹ پروف جیکٹ پہن رکھی تھی مگر وہ اس کے کوئی کام نہ آئی۔ محترم شاہ زیب نے بڑی عقلمندی سے

اس کے سر کو نشانہ بنایا تھا۔ کم از کم ایک گولی رائے زل کی گردن میں ایسی لگی ہے جس نے اس کی ''اسپائنل کینال'' کو تباہ کر دیا ہے۔ اس کا نچلا دھڑ بالکل کام نہیں کر رہا اور ایک نیورو فزیشن کی حیثیت سے مجھے لگتا ہے کہ یہ کبھی کام کرے گا بھی نہیں۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ وہ مفلوج ہو گیا ہے؟'' قسطینا نے سنسنی آمیز لہجے میں پوچھا۔

''ایک سو ایک فیصد یور ہائی نس، نائن ایم ایم پسٹل کی دو گولیاں اس کی گردن میں لگی ہیں مگر ریڑھ کے بالائی مہروں میں لگنے والی گولی نے اس کے دماغ کا رشتہ بدن کے نچلے حصے سے کاٹ ڈالا ہے۔ کوئی کرشمہ نہ ہو جائے ورنہ ایسے مریض کبھی ٹھیک نہیں ہوتے، ان کے زیریں جسم کے سارے افعال ختم ہو جاتے ہیں۔ جتنی دیر جیتے ہیں اذیت کی زندگی جیتے ہیں۔''

قسطینا نے ایک گہری سانس لی پھر کچھ دیر خاموش رہی پھر بولی۔ ''کہتے ہیں کہ دشمن کی موت اور تکلیف پر خوش نہیں ہونا چاہیے کیونکہ ایک دن آپ کے دوستوں کو بھی ایسی ہی صورتِ حال کا سامنا کرنا ہوتا ہے لیکن کچھ دشمن سانپوں اور بچھوؤں سے کہیں زیادہ زہریلے اور خطرناک ہوتے ہیں، ان کا سر کچلا جائے تو...... سکون کا سانس تو آتا ہی ہے، کیوں ابراہیم؟''

ابراہیم کے چہرے سے بھی اطمینان جھلک رہا تھا۔ وہ متانت سے بولا۔ ''آپ ٹھیک کہتی ہیں سسٹر قسطینا۔ وہ ایک خونی درندہ ہے اور اس کا مفلوج ہو جانا خوش آئند ہے۔''

ڈاکٹر تبارک نے کہا۔ ''میں پھر عرض کرتا ہوں جناب کہ یہ کوئی عارضی کیفیت نہیں ہے۔ قدرت نے اس شخص کو اس کی چیرہ دستیوں کی قرار واقعی سزا دی ہے۔ وہ اب صحت کی طرف لوٹ نہیں سکے گا۔ اگر میں یہ کہوں تو شاید بے جا نہ ہو کہ وہ اب ایک زندہ لاش ہے۔''

میری نگاہوں میں نہ جانے کیوں ذہین آنکھوں والی دلکش ڈاکٹر ماریہ کا چہرہ گھوم گیا۔ وہ اپنے عزیزوں اور اہلِ شہر کو رائے زل کے غیظ و غضب سے بچانے کے لیے خاموشی سے اس کے پاس چلی گئی تھی۔ اپنی حیثیت کے مطابق اس نے جو قربانی دی تھی وہ معمولی نہیں تھی، ڈاکٹر ماریہ جیسے نہ جانے کتنے مرد و زن مادام ہانا دانی کے ستمگر بیٹے کی من مانیوں کا شکار ہو چکے تھے۔ مجھے لگا میرے سینے کے انگاروں پر ایک نرم پھوار سی پڑ گئی ہے۔

قسطینا نے ستائشی نظروں سے میری جانب دیکھا اور ٹھہری ہوئی آواز میں بولی۔ ''اب تک جو کچھ ہوا ہے، اس میں 80 فیصد کردار شاہ زائب کا ہے۔ میں دل کی گہرائیوں سے شاہ زائب کی ممنون ہوں۔'' (میری تعریف کرتے ہوئے وہ کبھی جھجکتی نہیں تھی۔ حالانکہ ڈی پیلس

میں کئی کمانڈر اس کا برا بھی مناتے رہے تھے)
میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس نے بڑی ادا سے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا حکم دیا۔ فارس جان اور تبارک مسکرانے لگے۔
ابراہیم نے نمناک آنکھوں کے ساتھ کہا۔ ''میں جانتا ہوں ہمارے محترم ماموں آدم کو شہید کرنے کے بعد چیف گیرٹ اور رائے زل نے جشن منایا تھا اور شیرینی تقسیم کی تھی۔ ہم شیرینی تو تقسیم نہیں کریں گے لیکن یہ دعا ضرور مانگیں گے کہ جن لوگوں نے ہم پر ظلم کے پہاڑ توڑے ہیں، خدا ان کو نیست و نابود کرے۔ دنیا میں جہاں جہاں بھی طاقتور...... کمزوروں کی آواز کو دبا رہے ہیں اور ان پر عرصہ حیات تنگ کر رہے ہیں ان کو ذلت اور رسوائی نصیب ہو۔''

یہ اسی شب کا واقعہ ہے۔ میں اپنے آرام دہ بستر پر سونے کے لیے لیٹا تھا۔ بارشی موسم کے باعث ہلکی خنکی محسوس ہوتی تھی۔ فضا میں معدنیات کی دھیمی سی مہک تھی۔ کمر تک کمبل اوڑھ کر میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اچانک احساس ہوا کہ کوئی آہستگی سے بستر پر بیٹھا ہے اور اس نے میری پنڈلیاں تھام لی ہیں۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ یہ سیف تھا۔ وہ میری ٹانگیں دبانے لگا۔ ''اوئے کبڈی شاہ! یہ کیا کر رہے ہو؟'' میں نے اپنی ٹانگیں سمیٹنا چاہیں۔
اس نے بڑی مسکین صورت بنالی۔ ''آپ کو اللہ سوہنے کا واسطہ استاد جی، مجھے یہ کرنے دیں۔ مجھے بہت اچھا لگے گا۔''
''یار! کیوں جونک بن کر مجھ سے چمٹ گئے ہو۔ سچ پوچھو تو میں اس گھڑی کو پچھتا رہا ہوں جب تمہیں ساتھ لانے پر راضی ہو گیا تھا۔''
وہ ڈھٹائی سے مسکرایا۔ ''اور میں اس گھڑی کو انمول سمجھ رہا ہوں جب آپ راضی ہوئے تھے، یقین کریں مجھے اس وقت کچھ پتا نہیں تھا کہ آپ اتنے بڑے چمپئن ہیں، اس ویلے بس مجھے یہ لگا تھا کہ آپ میں کچھ نہ کچھ ہے، کچھ بہت خاص۔''
میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''اچھا چلو ٹھیک ہے، مجھ میں کچھ بہت خاص ہے، لیکن اب آگے کیا کرنا ہے؟''
''آگے آپ کے ساتھ رہنا ہے جی، آپ کو پیر استاد مانا ہے، بلکہ پکڑا ہے۔''
''اور کبڈی والے جس کو پکڑ لیتے ہیں اسے چھوڑتے نہیں۔'' میں نے اس کا فقرہ مکمل کرتے ہوئے کہا۔ اس نے بتیسی نکال دی۔ وہ اپنے ہاتھوں کو مسلسل میری پنڈلیوں پر حرکت دے رہا تھا۔

میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''سیف! کچھ لوگ یہاں سے ہزاروں میل دور پاکستان میں بہت شدت سے تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے۔ ان کو تمہاری ضرورت ہے، تم اس طرح بے وجہ اپنی جان جوکھم میں نہ ڈالو۔''

''میری جان جوکھم میں اس وقت ہوگی جب میں آپ سے دور ہوں گا۔ یقین کریں، میں بہت مزے میں ہوں۔ آپ سے مل کر تو مجھے کبڈی بھی معمولی چیز لگنے لگی ہے۔ میں آپ سے کچھ سیکھنا چاہتا ہوں۔ آپ جیسا تو شاید میں کبھی بھی نہ بن سکوں لیکن آپ کا شاگرد کہلوانا بھی میرے لیے کچھ کم شان کی بات نہیں ہوگی۔''

''کبڈی کو معمولی نہ کہو، ہر فن کا اپنا مقام ہوتا ہے...... ایک اور بات تم سے کہنا چاہتا ہوں۔ سگریٹ نوشی چھوڑ دو...... اور وہ جو کبھی کبھی ہونٹ تر کرتے ہو وہ بھی ٹھیک نہیں۔''

''لیکن استاجی......''

وہ کہتے کہتے رک گیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا ہے۔ اس نے اچھا کیا کہ نہیں کہا ورنہ بات لمبی ہو جاتی۔ اسے پتا تھا کہ میں غم واندوہ کی کیفیت میں الکحل لیتا ہوں...... مگر یہ پتا نہیں تھا کہ کیوں لیتا ہوں۔ اسے یورپ کے نائٹ کلبوں اور ڈنمارک کے ان آتشیں شب وروز کی بھی خبر نہیں تھی جو میں نے بارود کی بو اور خون کے چھینٹوں کے درمیان گزارے تھے۔

وہ باتیں کرتا رہا، اس کے اندر ایک تڑپ سی تھی۔ وہ کچھ بن کر دکھانا چاہتا تھا۔ اپنے اہل علاقہ کو، اپنے گھر والوں کو اور شاید...... تاجور کو بھی۔ میں اسے فل اسٹاپ نہ لگاتا تو شاید وہ اسی طرح صبح کر دیتا۔ وہ جا کر اپنے بستر پر لیٹ گیا تو میں اپنے خیالوں میں گم ہو گیا۔ ریشمی کا وہ خط ابھی تک میری جیب میں سرسرا رہا تھا جس میں تاجور کا تذکرہ تھا اور چاند گڑھی کی چاندنی راتوں کی مہک سمائی ہوئی تھی۔

میں تاجور کے بارے میں جتنا بھی سوچتا تھا، میری سوچ ایک نقطے پر آ کر رک جاتی تھی۔ جو خونخوار بھیڑیے میرے پیچھے لگے ہوئے تھے انہوں نے بہت جلد مجھ تک پہنچنا تھا۔ میں ان کی تھوتھنیوں کی بُو سونگھ رہا تھا۔ ان کے قدموں کی دھمک سن رہا تھا۔ میں نے تو ان کی زد میں آنا ہی تھا جو میرے اردگرد ہوتے وہ بھی لہولہو ہو جانا تھے۔ کیا تاجور جیسی نازک، شبنم سی پاکیزہ اور شفاف لڑکی کی محبت کا صلہ یہی تھا کہ اسے زندگی کی شروعات میں ہی دردناک موت کی سزا دے دی جاتی۔ میں جان ڈیرک جیسے درندوں کا سایہ بھی اس کے آس پاس دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ جاماجی میں میری شہرت کے بعد میرا دل گواہی دینے لگا تھا کہ جان ڈیرک سے

سامنا اب دور کی بات نہیں۔ ہاں...... وہی تھوتھنیوں کی بُو، وہی قدموں کی دھمک، وہی آنکھوں سے نکلتے ہوئے شعلے۔ وہ آرہے تھے...... یا آنے والے تھے۔ دل کی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ جی چاہا کہ ایک بار پھر وہ خط نکال کر پڑھوں لیکن حاصل کیا تھا اور سیف چند فٹ کی دوری پر دوسرے بستر پر سو رہا تھا۔ میں نے خط نکالا اور کمبل کے اندر ہی اس کے پُرزے کر دیئے۔ ان پُرزوں کو چولھے میں جھونکنے کے لیے میں کچن نما کمرے کی طرف گیا۔ یہاں بن مشہد ایک کیتلی میں اپنے لیے ادرک کی چائے تیار کر رہا تھا۔ میں نے خط کے ٹکڑے آگ میں پھینک دیئے۔

کھڑکی سے باہر دیکھا، دور فاصلے پر دریا کا منظر نظر آیا۔ پانی بدستور رواں تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ باہر بارش بھی ہو رہی ہو گی۔ بلند و بالا سنگلاخ چھت کے نیچے بہتا ہوا یہ دریا عجیب نظارہ پیش کرتا تھا۔ جس روشنی میں دریا کا پانی نظر آرہا تھا وہ ایک سرچ لائٹ سے پھوٹ رہی تھی۔ یہ سرچ لائٹ دریا کے کنارے ایک شخص کے پاس رکھی تھی۔ وہ شخص بڑی خاموشی سے رات کے اس پہر ایک پتھر سے ٹیک لگائے چپ چاپ بیٹھا تھا۔ ''آپ کو پتا ہے یہ کون ہے؟'' بن مشہد نے مجھ سے پوچھا۔

''کمانڈر فارس لگتا ہے...... لیکن...... یہ اس وقت یہاں اداس بیٹھا ہے۔''

''اس کی اداسی نئی نہیں ہے۔ کافی پرانی ہے۔ یہ کسی سے محبت کرتا ہے۔''

''اوہ......!'' میں نے ہونٹ سکیڑے۔ ''کیسے کیسے جری جوان، کیوپڈ کے تیر کا شکار ہوتے ہیں، کون ہے وہ؟''

''پتا نہیں...... لیکن ہے ضرور۔'' بن مشہد نے زیرِ لب مسکرا کر کہا۔

''کوئی رکاوٹ ہے راستے میں؟''

''لگتا تو ایسے ہی ہے جی۔'' بن مشہد نے مختصر جواب دیا۔

میں نے غور سے مشہد کی طرف دیکھا۔ اس کے تاثرات سے اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ واقعی بے خبر ہے، یا چھپا رہا ہے۔

○......❖......○

وقت گزر رہا تھا۔ ہمیں اس زیرِ زمین آبی دھارے کے کنارے بسیرا کیے ہوئے اب دو ہفتے ہونے کو آئے تھے۔ یہاں کی زندگی بڑی عجیب اور دلچسپ تھی۔ دن اور رات کا پتا صرف گھڑی کی سوئیوں سے چلتا تھا۔ پانی کی موسیقی مسلسل سنائی دیتی تھی۔ یہاں مچھلیاں بھی تھیں اور کبھی کبھار دو چار خاص قسم کے پرندے بھی سنگلاخ دیواروں سے چمٹے نظر آتے تھے۔

مچھلیوں اور پرندوں کا شکار کرنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ یہاں اکثر ہوا چلتی رہتی تھی اور جب ہم باتیں کرتے تھے یا شکار کے وقت بلند آواز میں بولتے تھے تو بازگشت دیر تک سنائی دیتی تھی۔

سجاول اب پہلے سے بہت بہتر تھا۔ اسے خود بھی احساس ہو رہا تھا کہ وہ ماضی قریب میں کسی شدید ذہنی تناؤ کا شکار رہا ہے جس کے سبب اس کی یادداشت پر بھی اثر پڑا ہے۔ اسے صرف اتنا یاد تھا کہ اسپتال والی لڑائی کے دوران میں وہ پکڑا گیا تھا اور پھر گرے فوجیوں نے اسے کسی قلعہ نما جگہ میں لے جا کر بری طرح مارا پیٹا تھا۔ بعد کے واقعات اس کے ذہن سے محو تھے۔ وہ اس صورتِ حال کو اپنے سر پر لگنے والی چوٹ کا نتیجہ سمجھتا تھا مگر میری معلومات کچھ اور کہتی تھیں اور جو وہ کہتی تھیں وہ بے حد انوکھا اور ناقابلِ یقین تھا۔ فی الحال میں اس حوالے سے سجاول کے ساتھ زیادہ بحث کرنا نہیں چاہتا تھا۔

قسطینا آج کل نسبتاً اچھے موڈ میں تھی۔ چیف گیرٹ کی موت اور رائے زل کے زندہ لاش بن جانے کے بعد اسے یہی لگتا تھا کہ اس کے مشن کا ایک حصہ مکمل ہو گیا ہے۔ اب وہ اپنے آپ کو کچھ وقت دینا چاہتی تھی اور جزیرے کے حالات کو بھی دیکھنا چاہتی تھی کہ کس رخ پر جاتے ہیں۔ اسے یقین تھا کہ بہت جلد جزیرے کے عوام میں بے چینی کی لہر زبردست تحریک کی شکل اختیار کرے گی۔ وہ خوف کی دیواریں توڑ کر سڑکوں پر نکلیں گے اور یہی وقت میدانِ عمل میں آنے کا ہو گا۔ تاہم کسی وقت وہ اپنے قریبی ساتھیوں کی موت اور جدائی پر غم زدہ بھی ہوتی تھی۔ یہ وقفے چھوٹے لیکن گمبھیر ہوتے تھے۔ وہ مسلسل میرے قریب بھی آ رہی تھی۔ کسی وقت شام کے بعد ہم چھوٹی ٹارچیں لے کر دریا کے ساتھ ساتھ آگے نکل جاتے۔ عجیب وضع کی چٹانوں اور آبی حیات کا نظارہ کرتے۔ ہمیں ایسے حشرات نظر آتے جو اس زیرِ زمین آبی گزرگاہ کی بلند چھت سے جھالروں کی طرح لٹک رہے ہوتے اور ان میں سے جگنوؤں جیسی روشنی پھوٹتی۔ ایسی مچھلیاں دیکھتے جو ہفت رنگ ہوتیں اور ان کے شفاف جسموں میں سے اندرونی اعضا دکھائی دیتے تھے۔ یہ بڑی عجیب دنیا تھی۔

کبھی کسی تنہا گوشے میں، میں اسے چھوتا اور اس کے چہرے پر رنگ بکھر جاتے۔ میں اس کے لیے ایک ''لونگ لیجنڈ'' تھا۔ وہ مجھ سے ملنے سے بہت پہلے ہی میری پرستار تھی۔ اب وہ مجھے چھونا چاہتی تھی، مجھے زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتی تھی۔ مجھے بھی کسی کو بھلانے کے لیے اس کی ضرورت تھی۔

ایک دن ایسی ہی ایک طلسماتی شام کے اندھیرے میں ہم دریا کے کنارے پتھروں کی اوٹ میں نیم دراز تھے۔ اس نے میری قمیص کے سارے بٹن کھول دیئے۔ میرے سینے کو

چھوتی چھوتی میرے زخمی کندھے تک چلی گئی۔ اس کو چوم کر بولی۔ ''شاہ زائب! مجھے تمہارے بازو کی بہت فکر رہتی ہے۔ کیا اب یہ کبھی ٹھیک نہیں ہو سکے گا؟''

''کیوں نہیں، اس گھیرے سے نکلیں گے تو سب کچھ ممکن ہو جائے گا۔''

''ہوں......!'' اس نے ہنکارا ابھرا۔ کچھ دیر خاموش رہ کر بولی۔ ''لیکن اس گھیرے سے نکلنے کے بعد ''بہت کچھ'' ناممکن بھی تو ہو جائے گا۔''

''کیا مطلب؟''

''پتا نہیں حالات کیا ہوں، تم کہاں جاؤ، میں کہاں جاؤں؟''

''تو پھر؟''

''میں مرنے سے پہلے، خوب اچھی طرح جینا چاہتی ہوں۔''

''وہ کس طرح؟''

وہ مسکرائی۔ ''ہر طرح...... اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایسٹرن کنگ کو بہت اچھی طرح جاننا چاہتی ہوں۔ بہت قریب سے۔'' اس نے اپنا سر میرے سینے پر ڈال دیا اور میرے بالوں میں انگلیاں چلانے لگی۔

کتنی ہی دیر ہم اسی طرح لیٹے رہے۔ دل کے سرپٹ دوڑنے کی آواز سنتے رہے۔ ایک دم اس نے میرے سینے سے سر اٹھایا اور بولی۔ ''شاہ زائب! کیا ہم شادی نہیں کر سکتے؟''

میں اس اچانک سوال پر سناٹے میں رہ گیا۔ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ بھی بیٹھ گئی اور ذرا شوخی سے میری طرف دیکھنے لگی۔ بہت بڑی کمانڈر تھی...... لیکن تھی تو ایک لڑکی ہی۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے قسطینا؟'' میں نے کہا۔

''جب ہم ایک دوسرے کے قریب آنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے آمادہ ہیں تو یہ بھی ہو سکتا ہے۔''

''لیکن...... صرف ایک دوسرے کے قریب آنے کے لیے...... شادی؟ کہتے ہیں کہ شادی تو ایک بہت بڑے بندھن کا نام ہے، زندگی بھر ساتھ نبھانے کا وعدہ......''

''یہ تو دقیانوسی باتیں ہیں لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے شاہ زائب! میں شاید تمہارے ساتھ گزارنے کے لیے ایک زندگی کو بھی کم سمجھتی ہوں۔''

''آپ جذباتی ہو رہی ہیں۔''

''وہ تو میں ہوں، اور خاص طور پر تمہارے لیے۔'' وہ میری انگلیوں کی ساخت اور

ہاتھوں کی بناوٹ کو دیکھنے لگی۔ اپنے ہاتھوں کو میرے ہاتھوں میں الجھانے لگی۔ باہر شاید بارش تھی، دریا کا بہاؤ تیز ہو رہا تھا۔

رات کو میں دیر تک سوچتا رہا، میں جانتا تھا کہ اپنی ذات کے تمام تر وقار کے باوجود وہ مجھے بہت چاہتی ہے۔ یہ مجھ سے زیادہ میرے جسم کی اور شاید میری ناموری کی چاہت تھی۔ میں اس کے لیے سپر اسٹار تھا اور وہ جیسے مجھے ''ڈسکور'' کرنے کی خواہش مند تھی۔ دوسری طرف میں اس کی طرف مائل تھا تو یہ میری بھی ضرورت تھی۔ میں خود فراموشی چاہتا تھا اور قسطینا کی حسین قربت اس کا بہترین ذریعہ بن سکتی تھی۔ گویا محبت تو میری طرف بھی نہیں تھی۔ تو پھر یہ کیا تھا؟ سوچتے سوچتے میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ میں کئی دنوں سے ایک شک میں مبتلا تھا۔ اس شک کا تعلق فارس جان سے تھا۔ میں نے وال کلاک پر نظر دوڑائی۔ رات کے گیارہ بجے تھے۔ سب سو رہے تھے، میں بغیر آواز پیدا کیے اپنی جگہ سے اٹھا اور فارس کے کمرے کی طرف بڑھا۔ راستے میں ابراہیم کا کمرا تھا۔ میں نے کھڑکی سے جھانکا، وہ نیا نویلا دولہا اپنے بیڈ پر تنہا سو رہا تھا۔ اس کی بے بس دلہن کسی اور کمرے میں تھی۔ یہ کیسی مجبوری تھی، ایک ناقابلِ عبور دیواران کے راستے میں کھڑی تھی۔

میں کھڑکی کے سامنے سے گزر کر اس کمرے میں پہنچا جہاں فارس اور بن مشہد سو رہے تھے۔ لیمپ کی روشنی بہت مدھم تھی۔ فارس جان کی سیاہ جیکٹ ایک ہینگر سے جھول رہی تھی۔ اس جیکٹ کی اندرونی جیب میں ایک ڈائری تھی۔ میں نے فارس جان کو کئی مرتبہ یہ ڈائری لکھتے دیکھا تھا۔ میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ ڈائری نکالی اور واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ ڈائری کے پہلے ہی صفحے پر یہ شعر تھا۔

نہیں تیرا نشیمن، قصر سلطانی کے گنبد پر......

یہ شعر فارس جان کے مجاہدانہ مزاج کی عکاسی کرتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں واقعی ایک عقاب کی سی چمک تھی۔ بلند قد، چوڑا سینہ، دوستوں میں بہت نرم مزاج اور خوش اخلاق، دشمنوں کے لیے فولاد کی طرح سخت اور سراپا قہر۔

میں نے اگلا صفحہ پلٹا...... پھر اس سے اگلا...... پھر کئی صفحات پلٹ ڈالے۔ لیکن اگر میرا خیال تھا کہ فارس جان کی اس ڈائری سے مجھے اس کی زندگی میں جھانکنے کا کوئی موقع ملے گا، تو سخت مایوسی ہوئی۔ پہلے صفحے کے سوا یہ ساری ڈائری کسی ناقابلِ فہم زبان میں لکھی تھی۔ رسم الخط بھی بالکل اجنبی تھا۔ مجھے تو یہ پشتو بھی نہیں لگتی تھی، میں جگہ جگہ سے دیکھتا رہا۔ سوائے تاریخوں کے کوئی ایک لفظ پلے نہیں پڑا۔ شاید اسی لیے فارس جان نے یہ ذاتی ڈائری اتنی بے

پروائی سے جیب میں ڈالی ہوئی تھی۔

یکا یک میرا دھیان انیق کی طرف چلا گیا۔ مایوسی کے اندھیرے میں امید کی کرنیں چمکیں۔ انیق کی خوبیوں میں سے ایک اہم ترین خوبی اس کی زبان فہمی تھی۔ وہ اَن گنت زبانوں کی شد بد رکھتا تھا۔ اس کی یہ صلاحیت کرشماتی تھی۔

میں نے اسی وقت اسے جگا دیا۔ وہ میرے قریب ہی لیٹا ہوا تھا۔ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ سب سے پہلے اس نے سجاول کی جانب ہی دیکھا جو ساتھ والے کمرے میں ڈبل بیڈ پر خراٹے لے رہا تھا۔ اس نے اطمینان کی سانس لی پھر بولا۔ ''مجھے تو لگا تھا کہ امریش پوری میرے سینے پر چڑھ کر بیٹھ گیا ہے۔''

''اگر ایسے ہی کرتے رہو گے تو ایک دن ضرور چڑھے گا۔'' میں نے کہا اور اسے اپنے ساتھ لے کر اپنے بیڈ کی طرف آ گیا۔ اس نے پوری طرح جاگنے اور میری بات سمجھنے میں تین چار منٹ لگا دیئے۔ میں نے ڈائری اس کے سامنے کر دی۔ وہ صفحات پلٹنے لگا اور بغور دیکھنے لگا آخر بولا ''اس کا ایک لفظ میرے پلے نہیں پڑا۔''

''بکواس نہ کرو۔'' میں نے اسے جھاڑا۔

وہ بولا۔ ''ناراض کیوں ہو رہے ہیں۔ کہہ تو رہا ہوں کہ جتنے صفحے دیکھے ہیں ان میں سے ایک لفظ میرے پلے نہیں پڑا، باقی تقریباً سارے پڑ گئے ہیں۔''

میری دھڑکن بڑھ گئی۔ ''ایک نمبر کے کھوچل ہو تم، بتاؤ کیا لکھا ہے؟''

''یہ دراصل پشتو اور ہندکو کی ملی جلی شکل ہے۔ مجھے تو یہ اپنے کمانڈر صاحب کی پریم کہانی لگ رہی ہے۔ جگہ جگہ اپنے دل کی واردات بیان کی گئی ہے۔ یہ ڈھائی تین سال کے اندراجات ہیں۔''

''لکھا کیا ہے؟''

میرے کہنے پر انیق نے پڑھنا شروع کیا۔ جہاں غیر اہم واقعات ہوتے تھے وہ چھوڑ دیتا تھا۔ کچھ حصوں کو ٹھیک سے سمجھنے کے لیے دوبارہ پڑھتا تھا۔ تفصیل میں جانے سے ذکر طویل ہو جائے گا۔ یہ کمانڈر فارس جان کی چشم کشا ڈائری تھی۔ ہم پر یہ انکشاف ہوا کہ کمانڈر فارس جان اپنی سپریم کمانڈر قسطینا کی دیرینہ محبت میں گرفتار ہے۔ شروع کے ڈیڑھ دو برسوں میں یہ محبت بالکل خاموش رہی۔ پھر ایک دو ایسے واقعات ہوئے کہ قسطینا بھی فارس جان کے سینے میں سلگنے والی آگ کی تپش سے آگاہ ہو گئی۔ تاہم اس نے کبھی فارس جان کو کوئی مثبت اشارہ نہیں دیا۔ دوسری طرف فارس جان ادب و احترام کے دائرے کا اسیر تھا۔ فارس جان

نے اپنی طویل ڈائری میں قسطینا کو ''ق'' کے علامتی نام سے لکھا تھا۔ اپنی ڈائری میں اس نے کئی جگہ تحریر کیا تھا کہ وہ انہیں پرستش کی حد تک چاہتا ہے مگر یہ کبھی نہیں چاہے گا کہ اس کی وجہ سے ان کے نام پر کوئی حرف آئے۔

لحاف کی اوٹ میں رکھ کر ہم بڑی احتیاط سے یہ انکشاف انگیز ڈائری پڑھتے رہے اور حیران ہوتے رہے۔ چند دن پہلے بن مشہد نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ فارس جان کسی کی محبت میں ڈوبا ہوا ہے۔

○......❖......○

یہ منظر قسطینا کے آرام دہ کمرے کا تھا۔ رات کا وقت تھا۔ ہوا میں معدنیات کی خوشبو اور بہتے دریا کی موسیقی تھی۔ گیس لیمپ کی روشنی میں قسطینا کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی نظر آ رہی تھی۔ ایسی نمی میں پہلی بار قسطینا کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا اور یہ بھی میری بات ہی کی وجہ سے آئی تھی۔ دراصل آج فیصلے کی رات تھی۔ آج رات ہمیں طے کرنا تھا کہ ہم نے خود کو کسی بندھن میں باندھنا ہے یا نہیں۔ اور میں نے چند سیکنڈ پہلے وہ بات کہہ دی تھی جسے کہنا میرے لیے نہایت مشکل تھا۔ میں نے کہا تھا۔ ''قسطینا! مجھے نہیں لگتا کہ شادی جیسا کوئی بندھن ہمیں خوشی دے سکے گا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کو کھو دیں گے۔''

اس نے گیس لیمپ کی لو کچھ اونچی کر دی۔ اپنی آنکھوں کے کناروں کو چھوٹی انگلی سے صاف کیا اور گہری سانس لے کر بولی۔ ''اس کا مطلب ہے...... آج کی رات ملن کا نہیں جدائی کا آغاز ہو گا۔''

''قسطینا!'' میں نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ''میں شاید اس قابل تو نہیں ہوں لیکن میں آپ کے لیے ایک لیجنڈ ہوں۔ ایک مشہور و معروف کھلاڑی جو آپ کو صرف اسکرین پر نظر آیا کرتا تھا۔ اب وہ اسٹار کھلاڑی آپ کے سامنے ہے...... لیکن قسطینا اسٹار اس وقت تک ہی اسٹار ہوتا ہے جب تک وہ دور ہوتا ہے۔ قریب سے دیکھنے پر تو چاند میں بھی گڑھوں کے سوا اور کچھ نہیں ملتا۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' اس نے اپنے بوائے کٹ بالوں میں انگلیاں چلائیں۔

''آپ کا اور میرا فاصلہ یکسر ختم ہو جائے گا تو پھر آپ کا تجسس اور آپ کی ''فینٹسی'' بھی ختم ہو جائے گی۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، ایسا ہی ہو گا۔ آپ اپنی نادانی پر حیران ہوں گی۔ پلیز قسطینا! اس فاصلے کو باقی رہنے دیں، ورنہ سب کچھ بے وقعت ہو جائے گا۔''

وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ اس نے کھڑکی کی طرف منہ پھیر لیا۔ وہ آج بڑے خوب صورت

لباس میں تھی۔ باہر اندھیرا تھا اور دریا صرف اپنے شور کی صورت میں دکھائی دیتا تھا۔ یہ میرے لیے بھی بڑے کٹھن لمحے تھے لیکن میں جانتا تھا کہ اس میں ہم دونوں کی بہتری ہے۔ میں بھی صرف اپنی خودفراموشی کے لیے قسطینا کے جذبات سے کھیلنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ ایک بہادر اور باکمال لڑکی تھی۔ جاماجی کے ہزاروں لاکھوں لوگ اسے چاہتے تھے۔ آنے والے دنوں میں وہ کمانڈر فارس جان جیسے شخص کے ساتھ مل کر کچھ بھی کر سکتی تھی۔

کافی دیر بعد اس نے کھڑکی سے رخ پھیر کر میری طرف دیکھا۔ ''مجھے تمہارے سہارے کی ضرورت تھی شاہ زائب! لیکن...... میں سمجھ گئی ہوں......تمہاری محبتیں کسی اور کے لیے ہیں۔ شاید وہی پاکستانی لڑکی جس کا تم نے ذکر کیا تھا۔''

''میں اس بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا قسطینا! لیکن ایک اور بات ہے جو میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں۔'' وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ ''کوئی اور ہے قسطینا جو آپ کو بے انتہا شدتوں سے چاہتا ہے۔ وہ آپ کا انمول ساتھی بن سکتا ہے۔ میں تو ایک پردیسی ہوں۔ کل یہاں نہیں ہوں گا۔ وہ آپ کا مستقل سہارا ثابت ہوگا۔ ہر ہر موڑ پر آپ کا ساتھ دے گا۔ آپ کی زندگی کو واقعی زندگی کر دے گا۔''

''تم کس کی بات کر رہے ہو؟''

''آپ نے مجھے لونگ لیجنڈ کہا ہے۔ آپ کا لونگ لیجنڈ آپ سے پہلی اور آخری بار ایک درخواست کر رہا ہے، اسے مایوس نہ کیجیے گا۔ ایک بار نہایت ٹھنڈے دل سے اپنی روح کی گہرائیوں میں جھانک کر ضرور دیکھ لیجیے گا۔ شاید وہ آپ کو وہاں نظر آجائے۔''

''کون نظر آجائے شاہ زائب؟''

میں نے فارس جان کی کارڈ سائز تصویر نکال کر قسطینا کے سامنے ساگوان کی ٹیبل پر رکھ دی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

قسطینا کے چہرے پر زلزلے کی سی کیفیت تھی۔ وہ یک ٹک تصویر کو دیکھتی رہی۔ پھر اس نے پلکیں اٹھائیں، ان میں غیظ و غضب نہیں تھا۔ ایک حیرانی آمیز حزن تھا۔ پھر یہ حزن دھیرے دھیرے ایک ملائمت میں ڈھل گیا۔ میں نے دیکھا جاماجی کی سابقہ سپریم کمانڈر کی آنکھوں سے دو آنسو ڈھلے اور اس کے رخساروں پر پھسل گئے۔ لگتا تھا کہ اشار اور فاصلے والی بات اس کی سمجھ میں آرہی ہے...... اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے دل کی گہرائیوں میں کوئی دھندلا سا چہرہ بھی اسے نظر آرہا ہے۔

O......❖......O

اگلے روز میں نے خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ کل رات قسطینا سے میری بڑی اہم بات چیت ہوئی تھی اور مجھے خوشی تھی کہ قسطینا نے میری باتوں کو سمجھا ہے۔ کچھ بھی تھا وہ ایک غیر معمولی ذہین اور جانباز کمانڈر تھی۔ دیکھنے میں ایک خوبرو لڑکا نظر آتی ہوگی مگر اس کے اندر ایک بہادر لیڈر کی تمام خوبیاں موجود تھیں اور یقیناً ان میں سے ایک خوبی یہ بھی تھی کہ اسے اپنے جذبات کو سنبھالنا اور خود کو حالات کے مطابق ڈھالنا آتا تھا۔ میں نے اسے جذبات کے راستے سے ہٹا کر حقیقت کا راستہ دکھایا تھا اور مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اس نے میری رہنمائی کو سنجیدگی سے لیا ہے۔

اچانک کمرے میں برقی روشنی پھیل گئی۔ سیف نے نعرہ لگایا۔ ''آ گئی۔''

انیق ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ''یہ پاکستانی آواز کہاں سے آئی ہے۔''

''کیا مطلب؟'' سیف نے پوچھا۔

''یہ آ گئی اور چلی گئی والی آوازیں تو ہمارا قومی ورثہ ہیں۔ یہاں کس نانہجار نے لائٹ بھیجی ہے اور کس بے وقوف نے نعرہ لگایا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''زیادہ مسخری نہ کرو۔ خدا کا شکر کرو کہ جنریٹرز نے کام شروع کر دیا ہے۔''

اسی دوران میں بن مشہد نے بھی اندر آ کر یہی مژدہ سنایا وہ بولا۔ ''اب ہو سکتا ہے کہ ہم کو برے بھلے ٹی وی سگنلز بھی ملنے لگیں۔ یہاں دو چھوٹے سائز کے ٹی وی سیٹ موجود ہیں۔ میں ابھی چیک کرتا ہوں۔''

قریباً پانچ منٹ بعد بن مشہد ایک پورٹیبل ٹی وی لے کر اندر داخل ہوا۔ اسکرین قریباً 16 انچ کی رہی ہوگی۔ اس پر شائیں شائیں کی آواز کے ساتھ مدھم تصویر بھی آ رہی تھی کئی دنوں بعد جو پہلی نیوز ہم نے سنی۔ وہی تکلیف دہ تھی۔ ایک ٹاک شو میں تین افراد بیٹھے محو گفتگو تھے۔ اینکر پرسن نے کہا۔ ''کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہر ایکسی لینسی مادام ہاناوانی کی پیشین گوئی درست ثابت ہوئی ہے۔ انہوں نے برسوں پہلے کہہ دیا تھا کہ محترم ریان فردوس کے دونوں بیٹوں کی موت زہر کی وجہ سے ہوگی۔''

ایک صحافی نے کہا۔ ''لیکن...... کمال احمد کی موت کی وجہ زہر خورانی کیسے ہوگئی۔ وہ تو فاقہ کشی کی وجہ سے جاں بحق ہوئے جس ویران گودام میں انہوں نے خود کو چھپایا تھا وہ اندر سے مقفل ہو گیا۔ بدقسمتی سے وہ باہر نہ نکل سکے اور نہ ان کی آواز کسی تک پہنچ سکی۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' اینکر پرسن نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اگر

غور کیا جائے تو بات پھر وہیں پر آ جاتی ہے جیسا کہ ہم جانتے ہیں...... بلکہ اب تو عام لوگ بھی جان گئے ہیں کہ کمال احمد اور ابراہیم کو کھانے میں روزانہ زہر کی ڈوز دی جاتی تھی تا کہ ان پر زہر اثر نہ کر سکے مگر جب فاقہ کشی کی وجہ سے محترم کمال احمد کو ڈوز نہ ملی تو ان کا جسم اس کمی کو برداشت نہ کر پایا۔ یعنی ان کی موت تو زہر کی وجہ سے ہی ہوئی نا۔''

شرکاء میں سے دوسرے شخص نے اپنا گنجا سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کی بات کی تائید کرتا ہوں۔ آپ نے واقعی ایک اچھا نقطہ نکالا ہے۔ مادام کی پیشین گوئی تو یہی تھی نا کہ دونوں بھائیوں کی موت زہر کی وجہ سے ہوگی۔''

میں نے دیکھا ابراہیم کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں پر آنسوؤں کی یلغار ہوئی اور اس نے سسکیاں لینا شروع کر دیں۔ زینب اس کے پاس ہی کھڑی تھی۔ یہ ٹاک شو چونکہ انگلش میں تھا اس لیے زینب کی سمجھ میں یہ باتیں نہیں آئی تھیں۔ تاہم اپنے شوہر کو اشکبار دیکھ کر وہ بھی خشک پتے کی طرح لرزنے لگی تھی۔

''کیا ہوا انیق بھائی؟'' اس نے قریب کھڑے انیق کو کندھے سے ہلا کر پوچھا۔

انیق نے سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھا پھر زینب کو بتا دیا کہ ٹاک شو کے ذریعے کیا خبر ہم تک پہنچی ہے۔

ٹاک شو میں ہونے والی گفتگو سے پتا چلتا تھا کہ کمال احمد کی موت والا واقعہ چار پانچ روز پرانا ہے اور اب اس پر خیال آرائیوں کا سلسلہ چل رہا ہے۔ زینب نے بھی زار و قطار رونا شروع کر دیا تھا۔ وہ بڑی معصوم روح تھی۔ اس کے تقریباً سارے سسرالیوں نے ہی اسے نظر کرم سے محروم رکھا تھا لیکن وہ ان کی مصیبت یا موت کا سن کر یوں دکھی ہوتی تھی جیسے وہ اس کے خونی رشتے ہوں۔

کمانڈر فارس جان بھی اب شائیں شائیں کرتے ٹی وی کے قریب آن کھڑا ہوا تھا اور تکلیف دہ گفتگو کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ دانت پیس کر بولا۔ ''ڈی پیلس پر مال زادوں کا قبضہ ہو چکا ہے۔ یہ پیدائشی جھوٹے ہیں۔ ان کے منہ میں زبان نہیں کسی بہت پلید جانور کا چمڑا ہے جو صرف بکواس کرنا جانتا ہے۔ انہوں نے ہز ہائی نس کمال احمد کو خود مارا ہوگا۔ اب لوگوں کو بتایا جا رہا ہے کہ وہ کسی گودام میں بند ہونے سے مرا ہے۔ یہ سب حرام زادہ مل کر بیگم ورل کو اذیت دینا چاہتا ہے۔ پہلے اس کے شوہر کا لاش اسے دکھایا، پھر اس کے جوان بیٹے کا......''

فارس جان کی آنکھوں میں آتشیں آنسو تھے۔

قسطینا اور تبارک بھی آ گئے۔ بہت دیر سوگ کی سی کیفیت رہی۔ سب ابراہیم کو دلاسا

دینے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔

ٹی وی پر جو کچھ بتایا جا رہا تھا، اس سے پتا چل رہا تھا کہ رائے زل کی حالت کو ابھی تک پوشیدہ رکھا جا رہا ہے۔ عوام کو یہی بتایا جا رہا ہے کہ وہ روبصحت ہے۔ جاما جی کے شہری علاقے میں ظلم و ستم کا بازار بدستور گرم تھا۔ مخالفین کو چن چن کر ختم کیا جا رہا تھا اور جیلوں میں ٹھونسا جا رہا تھا۔ ہماری تلاش کا کام بھی زور و شور سے جاری تھا۔

ایک موقعے پر نیوز کاسٹر نے کہا۔ ''یہ بات اب تقریباً ثابت ہو چکی ہے کہ قسطینا، کمانڈر فارس اور شاہ زیب وغیرہ نے چھوٹے صاحب ابراہیم کو ان کی دلہن سمیت یرغمال بنا رکھا ہے۔ وہ سرنگ کے اندر جس پناہ گاہ میں کئی دن چھپے رہے ہیں وہاں سے بھی اس بات کے ٹھوس ثبوت ملے ہیں کہ ابراہیم اور زینب ان کے ساتھ ہیں۔ وہاں سے یہ شواہد بھی ملے ہیں کہ کسی کو وہاں رسیوں سے باندھ کر رکھا گیا تھا۔ غالب امکان یہ ہے کہ وہ ہز ہائی نس ابراہیم ہوں گے۔''

پھر نیوز کاسٹر نے اپنے رپورٹر سے سوال جواب شروع کر دیئے۔ فیلڈ رپورٹر نے ایک سوال کے جواب میں کہا۔ ''اب تفتیش کرنے والے حکام یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ قسطینا اور اس کے ساتھی شاید جزیرے سے راہِ فرار اختیار کر چکے ہیں۔ اس سلسلے میں اس فوجی ٹرک کا حوالہ بھی دیا جاتا ہے جو پچھلے ہفتے کے شروع میں ساحل سے کچھ فاصلے پر کھڑا ملا تھا۔ اس پر فوجی میس کے لیے پورک (سؤر کا گوشت) لے جایا جا رہا تھا۔

میں نے قسطینا کو اشارہ کیا کہ وہ ابراہیم کو دوسرے کمرے میں لے جائے اور تسلی تشفی دے۔

اسی دوران میں مجھے سنبل نظر آئی۔ اس نے قریب آ کر کہا۔ ''سجاول صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔ کچھ کہنا چاہتے ہیں۔''

کچھ دنوں سے سجاول کی حالت کافی اچھی تھی۔ میں اس کے کمرے میں پہنچا تو وہ سکون سے بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگا۔ ''آؤ ذرا باہر چلتے ہیں۔''

میں اس کی بات پر دل ہی دل میں مسکرایا۔ یہاں کوئی ''باہر'' تو تھا ہی نہیں۔ اگر بہتا ہوا پانی تھا تو وہ بھی زیرِ زمین تھا۔ مچھلیاں، پرندے، یا چند پودے نظر آتے تھے تو وہ بھی انڈر گراؤنڈ ہی تھے۔ یہ ایسی جگہ تھی جس نے کبھی سورج کی روشنی دیکھی ہی نہیں تھی۔

ہم نے چھوٹی لائٹس اٹھائیں اور ٹہلتے ہوئے دریا کے کنارے آ گئے۔ روشنی پانی کی لہروں پر اور بنجر پتھروں پر جھلملانے لگی۔ ہم ایک پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔

سجاول نے نارمل انداز میں کہا۔ ''یار! میرے ہوش ٹھکانے پر نہیں تھے۔ پتا نہیں کیا کیا بکتا رہا ہوں، میرا کہا سنا معاف کرنا۔

میں نے اپنا ہاتھ اس کے بھاری بھر کم ہاتھ پر رکھ دیا۔ ''سجاول! اگر دل صاف ہوں تو پھر زبان سے کہا گیا، برے سے برا لفظ بھی کوئی معنی نہیں رکھتا۔''

وہ لمبی سانس لے کر بولا۔ ''شاہ زیب! تُو نے مجھے بدلا ہے۔ نہیں تو میں بالکل اور طرح کا بندہ تھا۔ میں نے زندگی میں کبھی کسی کو دوست نہیں بنایا اور نہ شاید کبھی بناؤں گا۔''

''تو پھر مجھے کیوں بنایا؟'' میں ہولے سے مسکرایا۔

وہ بدستور کھوئی کھوئی آواز میں بولا۔ ''کوئی ویلہ (وقت) ایسا ہوتا ہے جس میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ یہ طاقت بہت کچھ بدل دیتی ہے...... میں اپنی اور تیری ہتھ جوڑی کو کبھی نہیں بھول سکوں گا۔ وہ میری اب تک کی زندگی کی سب سے بڑی لڑائی تھی اور وہ بھی اپنے ڈیرے پر...... اپنے سارے کارندوں اور ساتھیوں کے سامنے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر میں اس لڑائی میں ہار جاتا تو شاید سردار بھی نہ رہ سکتا...... اور کیا پتا کہ کسی کو منہ بھی نہ دکھاتا اور چپ چاپ کسی طرف نکل جاتا۔''

''چلو چھوڑو ان پرانی باتوں کو سجاول۔''

''لیکن میرے لیے یہ بات کبھی پرانی نہیں ہوگی۔ تم نے میرے لوگوں کے سامنے میری عزت رکھی اور میری ہار کو اپنی ہار بنا لیا۔ ایسے کاموں کے لیے لوہے کا جگر چاہیے ہوتا ہے شاہ زیب! اور میں سمجھتا ہوں کہ تم لوہے کا جگر رکھتے ہو۔''

''یار! اب تم شرمندہ کر رہے ہو۔ کوئی اور بات کرو۔''

وہ کچھ دیر خاموش رہ کر بولا۔ ''سنا ہے تم یہاں جاماجی میں بھی بہت مشہور ہو گئے ہو۔ تم نے لڑائی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے اور ایک بڑے نازک موقع پر کمانڈر قسطینا کی جان بھی بچائی ہے؟''

میں نے کہا۔ ''تمہاری یہ مشہوری والی بات ٹھیک ہے...... لیکن اس حوالے سے مجھے تم سے ایک چھوٹا سا شکوہ بھی ہے۔'' میں نے آخری الفاظ مسکراتے ہوئے کہے تھے۔

وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

خاموشی ذرا طویل ہوئی تو میں نے کہا۔ ''سجاول! میں نے تمہیں ایک دفعہ بتایا تھا کہ میرے پیچھے کچھ لوگ ہیں۔ انہی کی وجہ سے میں نے اپنی شناخت کو چھپا رکھا تھا...... سجاول، وہ بہت خطرناک ہیں۔ ان جیسے لوگ تم نے پہلے نہیں دیکھے ہوں گے۔ وہ میرے خون کے

پیاسے ہیں۔ مجھے تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ مجھے نہیں لگتا کہ وہ اب زیادہ دیر مجھ سے دور رہیں گے۔"

سجاول کا چہرہ بجھ سا گیا۔ آنکھوں میں گہری تشویش اُمڈ آئی۔

میں نے کہا۔"میں خدانخواستہ تمہیں کوئی الزام نہیں دے رہا۔ تم نے اگر قسطینا کو میرے بارے میں بتایا تو وہ کسی بری نیت سے نہیں تھا۔ بلکہ یہ تمہارے اندر کی خوشی تھی کہ تمہارا دوست ایک جانا پہچانا شخص ہے اور ویسے بھی یہ بات جلد یا بدیر کھلنی ہی تھی۔ اس کا کوئی نہ کوئی بہانہ بن ہی جانا تھا۔ کوٹلی میں بھی تمہارے ایک کارندے باقر نے مجھے پہچان لیا تھا۔"

"کون لوگ ہیں وہ، جو تمہیں ڈھونڈ رہے ہیں؟" سجاول نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"چلو، یہ موضوع پھر کسی وقت سہی، ابھی کوئی اور بات کرتے ہیں۔ تمہاری طبیعت اب کیسی ہے؟"

وہ میرے فقرے کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔"شاہ زیب! میں ان لوگوں میں سے نہیں جو زبان سے "یار یار" کی رٹ لگاتے ہیں لیکن میرے دل نے تمہیں اپنا یار سمجھا ہے......اور جو یار کے دشمن ہوتے ہیں وہ اپنے دشمن ہوتے ہیں۔ کبھی موقع پڑا تو میں یہ ثابت کر کے دکھادوں گا۔" سجاول کے لہجے میں پنجاب کے بہتے پانیوں کا زور اور سرکش ہواؤں کی آشفتہ سری تھی۔

"ابراہیم کے بھائی کمال کے بارے میں کچھ پتا چلا؟" میں نے سجاول سے پوچھا۔

اس نے چونک کر انکار میں سر ہلایا۔ میں نے اسے بتایا۔"عزت مآب ریان فردوس کے بعد اسے بھی مار دیا گیا ہے لیکن کہا یہ جا رہا ہے کہ اپنی موت کا سبب وہ خود بنا ہے۔"

سجاول نے تاسف سے سر ہلایا۔"بیگم نورل پر تو ظلم کے پہاڑ ٹوٹ گئے ہیں، انیق مجھے بتا رہا تھا کہ وہ زخمی بھی ہیں؟"

"ہاں جب گرے فوجیوں نے ریان فردوس کو قتل کیا تو بیگم نورل نے شوہر کے سامنے ڈھال بننے کی کوشش کی۔ سنا ہے انہیں کافی زخم آئے تھے۔ بہر حال اب وہ بہتر ہیں......جن دنوں لڑائی ہو رہی تھی وہ تمہیں بھی یاد کرتی رہی ہیں۔"

"بڑی چنگی عورت ہے۔ میں دل سے اس کی عزت کرتا ہوں۔ اگر ہمیں اس کی مدد کرنے کا کوئی موقع مل جائے تو بڑی اچھی گل ہو گی۔"

سجاول کو تجسس تھا کہ اس کے بعد ڈی پیلس اور نیوسٹی میں کیا ہوتا رہا ہے۔ میں نے اسے چیدہ چیدہ حالات سے آگاہ کیا۔ میں بھی اس کے حالات تفصیل سے جاننا چاہتا تھا لیکن

میری خواہش تھی کہ میں اصرار نہ کروں بلکہ وہ خود ہی بتائے تاکہ اس کے ذہن پر بوجھ نہ پڑے۔

اچانک انیق کی آواز آئی۔ وہ پناہ گاہ کے بیرونی دروازے پر کھڑا تھا اور مجھے آواز دے کر بلا رہا تھا۔ ''ایک تو تمہارا یہ نکو شہزادہ تمہیں کہیں چین نہیں لینے دیتا۔'' سجاول نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔

ہم تاریک دریا کے تاریک کنارے سے اٹھ کر انیق کے پاس پہنچے۔ وہ بولا۔ ''قسطینا آپ دونوں کو بلا رہی ہیں۔ رائے زل کے بارے میں خبر چل رہی ہے

میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ وہ مر گیا ہے۔ تبارک کے مطابق اور دیگر خبروں کے مطابق اس کی حالت بڑی پتلی تھی مگر جب میں نے انیق کا چہرہ دیکھا تو اس پر مختلف تاثرات نظر آئے۔ ہم اندر پہنچے۔ برقی روشنی نے اب اس پناہ گاہ کو مزید پُرآسائش بنا دیا تھا۔ قسطینا، فارس جان، بن مشہد اور تبارک وغیرہ ٹی وی کے سامنے حیران بیٹھے تھے۔ اسکرین پر نگاہ دوڑانے کے بعد میں بھی ششدر نظر آنے لگا۔ وہاں فربہ اندام رائے زل اپنے تمام تر رعب داب اور ہیبت کے ساتھ موجود تھا۔ وہ ڈی پیلس کی عظیم الشان نشست گاہ میں تھا۔ طلائی تاروں والی مرقع ٹوپی، شاہی چغہ اور ہیروں جڑی جوتی، معززین کی ایک طویل قطار اس کے سامنے مؤدب دکھائی دے رہی تھی۔ وہ ان کے ساتھ مصافحہ کرتا اور مسکراہٹیں بکھیرتا آگے بڑھ رہا تھا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' میں نے حیرت سے ڈاکٹر تبارک کی طرف دیکھا۔

''یقین نہیں آ رہا۔'' تبارک نے بھی شدید الجھن سے کہا۔ ''بیس پچیس دن تو کیا یہ شخص بیس پچیس مہینوں میں بھی ٹھیک نہیں ہو سکتا تھا اور...... اسے دیکھ کر تو لگتا ہے کہ اسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا......''

نشست گاہ میں ایک جانب رائے زل کی والدہ ہاناوانی بڑی شان سے براجمان تھی۔ چوڑی چکلی عورت، جڑاؤ گہنوں سے سجی ہوئی اور کسی مجسمے کی طرح ساکت۔ اس نے نشست گاہ کے اندر بھی سیاہ عینک لگا رکھی تھی اور یہ عینک اس کی شخصیت کو مزید پُراسرا بناتی تھی۔ اس سے دو تین میٹر دور ایک نسبتاً چھوٹی نشست پر آقا جان بھی موجود تھا۔ اس کی ایک ٹانگ پر پلاستر کی موجودگی کا پتا چلتا تھا۔

کیپٹن بن مشہد نے اسکرین کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کہیں...... ایسا تو نہیں کہ یہ کوئی اور ہو، رائے زل نہ ہو۔''

''نہیں۔'' قسطینا نے پورے یقین سے کہا۔ ''یہ رائے زل ہی ہے۔'' پھر وہ یک دم جیسے چونک سی گئی۔ اس کے تاثرات بدل گئے۔ اس نے ایک بار پھر اسکرین کو دھیان سے دیکھا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ سرسراتے لہجے میں بولی۔ ''ہاں...... یہ ہوسکتا ہے کہ جسے جلسہ گاہ میں گولیاں لگیں، وہ رائے زل نہ ہو۔'' ہم سب سناٹے میں رہ گئے۔

نیوز کاسٹر، تبصرہ کررہا تھا۔ ''آج پورے جزیرے کے لیے نہایت خوشی کا دن ہے۔ جزیرے کی سب سے ہردلعزیز شخصیت عزت مآب رائے زل موت کو شکست دے کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور پھر سے اپنے عوام کے درمیان ہیں۔ یہ سب کچھ ایک کرشمے کی طرح ہے۔ اب میں نامور صحافی مسٹر مائیکل کے تاثرات سے آپ کو آگاہ کرتا ہوں۔ اس نے نامور صحافی کو لائن پر لیا۔ اس نے دھیمے لیکن لرزاں لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ''میں ابھی کچھ لوگوں سے بات کررہا تھا۔ اکثریت کا یہ کہنا ہے کہ یہ ایکسی لینسی مادام ہاناوانی کی کرشماتی شخصیت کا ایک اور کھلا ثبوت ہے۔ جب بہترین امریکن اور آسٹروی ڈاکٹرز بھی عزت مآب کی صحت کی طرف سے ناامید تھے۔ مادام نے فرمایا تھا کہ اوپر والے نے چاہا تو چند دن میں ان کا فرزند اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے گا اور اپنے لوگوں کے درمیان ہوگا۔ اس وقت بہت سے لوگوں نے اس بیان کو ایک دکھی اور مضطرب ماں کی ذاتی سوچ قرار دیا تھا لیکن آج سب کچھ ہمارے سامنے ہے۔ بے شک یہ اکیسویں صدی ہے۔ بے شک سائنس بہت آگے جا چکی ہے لیکن سائنس کتنی بھی آگے چلی جائے۔ صدیاں کتنا بھی سفر طے کر لیں مگر انہونیوں کی گنجائش تو ہمیشہ رہی ہے اور رہے گی۔ اور یہ انہونیاں اسی سائنس کے اندر سے پھوٹیں گی، جس کے ہم گرویدہ ہیں۔''

تبصرہ کرنے والا بول رہا تھا لیکن ہمارے کانوں میں قسطینا کے الفاظ ہی گونج رہے تھے۔ اس نے کہا تھا کہ بے شک یہ رائے زل ہی ہے...... لیکن ہوسکتا ہے کہ جلسہ گاہ میں نشانہ بننے والا رائے زل نہ ہو...... اس سے مشابہت رکھنے والا کوئی اور شخص ہو۔ (وی آئی پیز کی سیکیورٹی کے جو انتظامات کیے جاتے ہیں، ان میں اکثر اس طرح کے اقدامات بھی اٹھائے جاتے ہیں)۔

قسطینا نے تبارک سے پوچھا۔ ''کیپٹن! تمہارا کہنا ہے کہ تم نے اسپتال میں رائے زل کو قریب سے دیکھا تھا۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ رائے زل ہی تھا؟''

تبارک مؤدب لہجے میں بولا۔ ''یور ہائی نس! میں نے آپ کو بتایا تھا کہ وہاں اسپتال میں سیکیورٹی بے حد سخت تھی۔ غیر معمولی اقدام کیے گئے تھے۔ دو تین بڑے ڈاکٹرز اور خاص

میڈیکل اسٹاف کے علاوہ کسی کو رائے زل کے روم میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ میں نے بھی کچھ فاصلے سے ہی دو تین بار رائے زل کو دیکھا تھا، اس وقت ان کے چہرے پر آکسیجن ماسک بھی تھا۔"

قسطینا نے اپنے کان کی لو کو کھینچتے ہوئے کہا۔ "میرے خیال میں نوے فیصد امکان اس بات کا ہے کہ جلسہ گاہ کی اسٹیج پر بیٹھا ہوا شخص رائے زل نہیں تھا۔"

"لیکن اسے کچھ ہی دیر بعد مائیک پر آکر تقریر بھی تو کرنا تھی؟" میں نے نقطہ اٹھایا۔

"ہوسکتا ہے شاہ زائب کہ...... تقریر سے چند منٹ پہلے نقلی رائے زل اٹھ کر بیک اسٹیج پر جاتا اور اصلی آکر خطاب شروع کر دیتا۔"

بن مشہد نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "یور ہائی نس! میں نے بھی کچھ اس سے ملتی جلتی بات سنی ہوئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سیکیورٹی کے لیے رائے زل سے مشابہت رکھنے والا ایک شخص موجود ہے۔ بالکل ایک جیسی دو گاڑیاں بھی موجود ہیں۔ نیوسٹی میں آتے جاتے یہ دونوں گاڑیاں استعمال ہوتی ہیں اور کچھ پتا نہیں ہوتا کہ کس گاڑی میں واقعی رائے زل موجود تھا۔"

ابراہیم نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ جلسہ گاہ کی اسٹیج پر بھی اصلی اور "ڈپلی کیٹ" رائے زل میں کوئی فرق محسوس نہ ہوسکا؟"

بن مشہد نے مؤدب لہجے میں کہا۔ "جناب! اگر آپ جلسہ گاہ کی وڈیو دیکھیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ...... مسٹر رائے زل کو جس جگہ بٹھایا گیا تھا وہاں خاص انداز سے لائٹنگ کی گئی تھی۔ حالانکہ ابھی دن کی روشنی موجود تھی اور لائٹنگ کی ایسی خاص ضرورت بھی نہیں تھی۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو کیپٹن؟" ابراہیم نے کہا۔

"باقی اسٹیج کی نسبت اس جگہ روشنی ترچھی اور زردی مائل تھی جہاں مسٹر رائے زل، حلمی اور آقا جان وغیرہ بیٹھے تھے۔ ایسی روشنی چیزوں کو وضاحت سے دکھانے کے بجائے ان میں دھندلاہٹ لے آتی ہے۔ اس تکنیک کو اسٹیج ڈراموں وغیرہ میں استعمال کیا جاتا ہے...... اگر وہ واقعی ڈپلی کیٹ رائے زل تھا تو اس کے لیے یہ روشنی موزوں تھی۔"

میں نے دیکھا قسطینا کی آنکھوں میں ایک دکھ سا کروٹیں لینے لگا تھا۔ وہ اپنے ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ سے مسل رہی تھی۔

ٹی وی کے سگنل زیادہ واضح نہیں تھے۔ پھر بھی اسکرین پر کچھ پُرجوش لوگوں کے چہرے نظر آرہے تھے۔ ان لوگوں میں سے کچھ نے اپنے ہاتھوں میں بڑے بڑے پوسٹرز بھی اٹھا

رکھے تھے۔ ان پوسٹرز میں ہاناوانی کو کسی کھلی قبر میں بیٹھے دکھایا گیا تھا اور اس کے سر کے اوپر ایک ''نورانی'' دائرہ معلق تھا۔ پوسٹرز پر بڑے بڑے حروف میں لکھا تھا...... عہدِ حاضر کی لاثانی درویش...... ہمارے ماذوورا (یعنی قبر کی ملکہ)

اسکرین پر نظر آنے والے تقریباً تمام لوگ جزیرے کے مقامی باشندے تھے۔ ان میں یقیناً کچھ ایسے رضا کار بھی شامل ہوں گے جنہوں نے جنگ کے آغاز پر ہی خوف زدہ ہو کر اپنے راستے قسطینا اور کمانڈر افغانی سے جدا کر لیے تھے۔ پوسٹرز کی تحریر ملائی زبان میں تھی۔ اس کا ترجمہ انیق نے میرے لیے کیا تھا۔

یوں لگ رہا تھا کہ ہاناوانی کا جادو اب سر چڑھ کر بول رہا ہے اور ہر طرف اس کے اور رائے زل کے نام کا ڈنکا بج رہا ہے۔ اگر واقعی جلسہ گاہ میں رائے زل کو گولی نہیں لگی تھی تو پھر یہ ان ''ماں بیٹے'' کی بڑی خوش قسمتی تھی۔ اب یہ خرانٹ عورت اس واقعے کو بھی اپنی ماورائی صلاحیتوں کی تشہیر کے لیے استعمال کر رہی تھی۔

○......❖......○

ہمارے شب و روز اس زیرزمین دنیا کی تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہی بہتے پانی کا شور، کسی وقت کسی پرندے کی پھڑ پھڑاہٹ...... یا پھر سنگلاخ پتھروں سے ٹکرا کر ہماری گونجتی ہوئی آوازیں۔ بن مشہد نے بتایا تھا کہ اس زیرزمین آبی دھارے میں سمندر کا پانی بھی شامل ہے۔ یہی وجہ تھی کہ یہاں چھوٹی بڑی مچھلیاں اور دیگر آبی حیات نظر آتی تھی۔ یہ پانی آگے جا کر نہ جانے زمین کی کس گہرائی میں گر جاتا تھا۔

یہاں وقت کا حساب بس گھڑیوں کی مدد سے ہوتا تھا۔ باہر کی کوئی آواز ہم تک نہیں پہنچتی تھی۔ موسم کی بات کی جائے تو خنکی کچھ کم محسوس ہو رہی تھی۔ اور بن مشہد کا کہنا تھا کہ باہر بہار کی آمد آمد ہے۔ جزیرے میں بہار کی آمد پر کوئی تہوار بھی منایا جاتا تھا۔ یہ ویلنٹائن تو نہیں تھا مگر اسی طرز کا تھا۔ شادی شدہ جوڑے اور پیار کرنے والے ایک دوسرے کو تحائف دیتے تھے۔

تہوار کے دن صبح بن مشہد کچھ اداس اداس نظر آیا۔ شاید اسے اپنی فیملی یاد آ گئی تھی۔۔۔ وہ بیوی بچے جو جنگ کی آگ نے بھسم کر ڈالے تھے۔ وہ ایک جانباز تھا اور اپنی جان پر کھیل کر قسطینا کے لیے خدمات انجام دے رہا تھا اور شاید اس کی یہی مصروفیت تھی جس کی وجہ سے وہ دھیرے دھیرے اپنے بے پناہ صدمے کو بھولتا جا رہا تھا۔

بن مشہد کے برعکس اس دن کمانڈر فارس جان مجھے کچھ خوش دکھائی دیا۔ وہ تاریک دریا

کے کنارے پتھر سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔قریب ہی ''پورٹ ایبل لائٹ'' رکھی تھی۔ یہاں ہمیں کسی قسم کا خطرہ تو نہیں تھا اس کے باوجود رائفل فارس جان کے کندھے سے لٹکی رہتی تھی اور گولیوں والی بیلٹ اس کی کمر پر دکھائی دیتی تھی۔شاید یہ اسلحہ اس کے جسم کا اٹوٹ انگ بن چکا تھا۔اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر تھا۔ یہ وہی ٹیپ ریکارڈر تھا جس پر فارس جان نے جاماجی کے سپاہیوں کا مقبول ترانہ ریکارڈ کر رکھا تھا۔ ہم سچے سویرے تک لڑیں گے......ہم جاتے اندھیرے تک لڑیں گے......لیکن آج فارس جان ترانہ نہیں سن رہا تھا بلکہ یہ ایک رومانی پشتو گیت تھا،اور پشتو گیتوں کی طرز تو بے مثال ہوتی ہے۔

مجھے دیکھ کر اس نے ٹیپ ریکارڈر آف کر دیا۔''آئیں،بیٹھیں،شاہ زیب صاحب۔'' وہ بڑے خلق سے بولا۔

میں نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔''سنا ہے،آج جاماجی کا کوئی تہوار ہے؟''

وہ مسکرایا۔''اس اندھیری پاتال میں تہواروں کا کیا پتا چلتا ہے۔''

''لیکن دلوں کا تو اپنا موسم ہوتا ہے اور اپنا ماحول۔ اندھیرے میں بھی کرنیں چمکتی ہیں۔''

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور میرے چہرے پر کوئی خاص تاثر نہ پا کر بولا۔

''خو آپ تو ایک گریٹ فائٹر ہے،لیکن کسی وقت تھوڑا سا شاعر بھی لگتا ہے۔''

میں کہنا چاہتا تھا کہ تم بھی تو ایک جنگجو کمانڈر ہو مگر کسی کی محبت میں ڈوبے ہوئے ہو، لیکن میں خاموش رہا۔ ویسے میں جانتا تھا کہ آج کل قسطینا اور فارس جان میں بات چیت ہوتی ہے اور کسی وقت قسطینا کا رویہ فارس سے خاصا مہربانی کا بھی ہو جاتا ہے۔ مجھے بے حد خوشی تھی کہ قسطینا نے میری بات کو سمجھا تھا......اور شاید اسے دل سے قبول بھی کیا تھا۔ وہ کوئی عام لڑکی نہیں تھی۔ اس کے اندر ایک بہت فعال اور جہاندیدہ روح تھی۔ وہ کچھ دنوں کے لیے رومانیت کے دھارے میں ضرور بہی تھی لیکن اب اس نے حقائق کو دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ وہ ایک انقلابی مزاج رکھتی تھی اور اس مزاج کے لیے اس کو کمانڈر فارس جان سے بہتر ساتھی کون مل سکتا تھا۔ آج بھی میں نے دیکھا تھا کہ فارس جان اور قسطینا دیر تک کامن روم میں بیٹھے باتیں کرتے رہے تھے۔کسی وقت فارس جان کے سرخ و سپید چہرے پر مسکراہٹ بھی نمودار ہوتی تھی پھر قسطینا نے فارس جان کے بازو کا زخم بھی بڑی توجہ سے دیکھا تھا اور اسے کوئی مشورہ دیا تھا۔ یہ زخم،دو تین ہفتے پہلے ہونے والی گھمسان کی لڑائی کے نتیجے میں آیا تھا۔

''آج کل ابراہیم کو کیا ہے برادر؟'' فارس جان نے اچانک مجھ سے سوال کیا۔

''کیوں کیا ہوا؟''

''وہ اہم کو کچھ کمزور اور بیمار لگتا ہے۔''

کمزور تو مجھے بھی لگتا ہے......شاید اس نے والد اور بھائی کی موت کا زیادہ صدمہ لیا ہے۔''

''ہاں، یہ بات بھی ہوگا، مگر شاید اس کے علاوہ بھی کچھ ہے، آپ نے اس کا رنگ دیکھا ہے کتنا پھیکا پڑ رہا ہے کہیں......'' فارس کہتے کہتے چپ ہوگیا۔

''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

وہ اپنے بالکل سیدھے بالوں میں انگلیاں چلا کر پُرسوچ لہجے میں بولا۔ ''برادر! کہیں ایسا تو نہیں کہ ابراہیم کو NEUROTOXI کا جو ڈوز دیا جاتا ہے وہ کم زیادہ ہوگیا ہو۔''

○......❖......○

NEUROTOXI اس زہریلے عنصر کا نام تھا جو ابراہیم اور کمال احمد ایک عرصے سے استعمال کررہے تھے۔ چند دن پہلے کمال احمد کی موت بھی اسی وجہ سے ہوئی تھی کہ اسے یہ ڈوز نہیں مل سکی تھی۔ اچانک میرے ذہن میں اندیشہ جاگا یہ تو مجھے معلوم تھا کہ ابراہیم نے ہوشیاری کا ثبوت دیا تھا اور ڈی پیلس سے نکلتے وقت اس ''زہر'' کی معقول مقدار اپنے ساتھ لے آیا تھا جو اس کے لیے تریاق کی حیثیت رکھتی تھی۔ اب کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ یہ ''تریاق'' ختم ہوتا جارہا ہو اور اس کے اثرات ابراہیم کی صحت پر پڑ رہے ہوں۔

میں اسی وقت ابراہیم کے کمرے میں اس سے ملنے پہنچ گیا۔ میں نے دروازے پر دستک دی۔ جواب نہیں ملا تو دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ وہ نماز پڑھنے میں مصروف تھا۔ یہ وہی کمرا تھا جو اس پناہ گاہ میں عزت مآب ریان فردوس کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ یہاں میوزک کے لیے زبردست آڈیو سسٹم موجود تھا اور ایک گوشہ ''بار روم'' کی ضروریات پوری کرنے کے لیے بنایا گیا تھا لیکن اب یہاں کا ماحول بالکل مختلف تھا۔ یہاں عبادت کی جارہی تھی اور جس کو یہاں رہنا تھا وہ مکافات کا شکار ہو کر منوں مٹی کے نیچے سو رہا تھا۔

ابراہیم کو نماز میں مصروف چھوڑ کر میں زینب والے کمرے میں آگیا۔ آج محبت کے تہوار کی رات تھی۔ لیکن زینب اور ابراہیم آج بھی الگ الگ کمروں میں الگ الگ سونے والے تھے...... زینب دوزانو بیٹھی ابراہیم کا کوئی لباس استری کرنے میں مصروف تھی۔ مجھے دیکھ کر جلدی سے دوپٹا سر پر رکھ لیا اور مؤدب کھڑی ہوگئی۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس کے سامنے نشست پر بیٹھ گیا۔ آج کل وہ بالکل سادہ نظر آتی تھی۔ بناؤ سنگھار نہیں کرتی

تھی اور نہ چمکیلا لباس پہنتی تھی۔ ایک وجہ تو سسر اور جیٹھ کی موت بھی تھی، لیکن میرا اندازہ تھا کہ اس کی مکمل سادگی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ کسی بھی طرح ابراہیم کے جذبات میں کوئی ہلچل نہیں چاہتی تھی۔ کسی طرح کا تناؤ...... کسی طرح کا احساسِ محرومی۔

رسمی گفتگو کے بعد میں نے کہا۔ ''زینب! مجھے ابراہیم کچھ کمزور لگ رہا ہے۔ کیا وجہ ہے؟ وہ ٹھیک تو ہے؟''

زینب نے پہلے تو بات گول کرنے کی کوشش کی مگر پھر اس نے جو بات بتائی وہ میرے اندیشے کے عین مطابق تھی۔ اس نے بتایا کہ ابراہیم اپنے کھانے میں جو زرد رنگ کی دوا (زہر) استعمال کرتے ہیں اس کی مقدار اب انہوں نے کم کر دی ہے ان میں جو تبدیلی آئی ہے اس کی وجہ یہی ہے۔''

''تم نے پوچھا نہیں کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟''

''پوچھا تھا لیکن انہوں نے بتایا نہیں۔ میں نے زیادہ زور بھی نہیں دیا۔ کیونکہ وہ پھر دکھی ہو جاتے ہیں۔'' زینب نے اپنے معصوم لہجے میں کہا۔

''کہیں ایسا تو نہیں زینب! کہ وہ دوا اب کم مقدار میں رہ گئی ہو اور ابراہیم اسے بچا کر استعمال کر رہا ہو۔''

''یہ بھی ہو سکتا ہے...... مگر وہ دوا کو بڑی احتیاط سے الماری میں تالا لگا کر رکھتے ہیں۔ میں نے تو کبھی دیکھی بھی نہیں جی۔''

اسی دوران میں قدموں کی چاپ ابھری اور ابراہیم دروازے پر نمودار ہوا۔ دبلا پتلا لڑکا جو مصائب کے گھیرے میں تھا۔ اس کے رخساروں کی ہڈیاں نمایاں اور جلد زردی مائل نظر آتی تھی۔ میں نے بہتر سمجھا کہ اس سے اس کے کمرے میں جا کر بات کی جائے۔

کمرے میں میرے اور ابراہیم کے درمیان چند منٹ گفتگو ہوئی۔ میں نے صاف محسوس کیا کہ وہ بات کرتے ہوئے ہانپ جاتا ہے اور اس کی دبلی پتلی گردن پر پسینے کی نمی بھی جھلک دکھاتی ہے۔ جلد ہی میں اصل موضوع پر آ گیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس نے اپنی خوراک میں تبدیلی کیوں کی ہے، جتنی ڈوز وہ مدتوں سے لے رہا ہے اس میں کمی کی وجہ کیا ہے؟

وہ سمجھ گیا کہ میرے اصرار پر زینب نے مجھے اس بارے میں بتا دیا ہے۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا، پھر ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ''شاہ زیب بھائی! آپ سمجھ رہے ہیں کہ جو زہر میں کھانے میں استعمال کرتا ہوں اس کی مقدار کم رہ گئی ہے اور میں اس کی بچت کر رہا ہوں۔''

''بالکل۔ میرے ذہن میں تو یہی بات آئی ہے۔''

''ایسا نہیں ہے بھائی۔'' وہ عجیب دکھ بھرے انداز میں بولا۔

''تو پھر کیا بات ہے؟''

''میں نے جان بوجھ کر ڈوز کم کی ہے۔''

''یہ جانتے ہوئے بھی کہ کمال احمد کو ڈوز نہ ملنے کی وجہ سے ہی موت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔''

''تو مر ہی جاؤں گا نا۔'' وہ میری طرف دیکھے بغیر بولا۔

''یہ کیسی باتیں کر رہے ہو ابراہیم؟''

اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری، پھر چند گھونٹ پانی پیا اور بولا۔''شاہ زیب بھائی! میں ایسی زندگی جینا نہیں چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ یا تو مجھے اس مجبوری سے چھٹکارا مل جائے یا پھر یہ زندگی ختم ہو جائے۔ میں...... جان بوجھ کر اپنی ڈوز کم کر رہا ہوں مجھے بہت تکلیف اٹھانا پڑ رہی ہے لیکن میں اپنی اور زینب کی خاطر یہ سب کچھ جھیل رہا ہوں اور جھیلوں گا۔''

میں نے دیکھا پسینہ اس کی پیشانی پر نمودار ہونے لگا تھا۔ وہ کھینچ کھینچ کر سانس لے رہا تھا۔''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ابراہیم؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں ٹھیک ہوں، یہ وقتی بے چینی ہے۔'' اس نے پھر چند گھونٹ پانی پیا۔ جذباتی لہجے میں بولا۔''میں اب اس سے دور نہیں رہوں گا۔ اسے پاؤں گا یا ختم ہو جاؤں گا اور اسے آزاد کر دوں گا۔'' اس کا اشارہ یقیناً زینب کی طرف ہی تھا۔

اس کا پورا جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ پھر وہ لیٹ گیا۔ پسینہ اس کے مساموں سے پھوٹ نکلا۔ وہ بستر پر پہلو بدلنے لگا۔ میں نے دیکھا اس کی جلد پر کہیں کہیں ہلکے سرخ دھبے نمودار ہو رہے تھے۔ ایسے ہی گہرے دھبے ریان فردوس کی جلد پر مستقل نظر آتے تھے۔

''ابراہیم...... تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں۔'' میں نے اسے شانے سے پکڑ کر ہلایا۔

''یہ عارضی ہے...... میں جلد ٹھیک ہو جاؤں گا۔'' وہ بولا۔ پھر اس نے زینب کو آوازیں دیں۔

زینب شاید پہلے سے ہی منتظر تھی۔ جلدی سے اندر آ گئی۔ ابراہیم کی حالت دیکھ کر وہ فوراً دوزانو اس کے سرہانے بیٹھ گئی اور اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہی تھی آپ فکر نہ کریں۔ چلے جائیں۔ میں انہیں سنبھال

لوں گی۔

میں باہر آ گیا۔ ذہن میں ہلچل تھی۔ کمال احمد کی موت بھی تو ایسے ہی ہوئی تھی۔ ابراہیم اتنا بڑا رسک کیوں لے رہا تھا۔ شاید...... یہ محبت کی طاقت تھی جو اسے اتنے بڑے خطرے سے لڑا رہی تھی۔

میں باہر تو آ گیا مگر میرا دھیان مسلسل ابراہیم کی طرف ہی رہا۔ میں نے تصور کی نگاہ سے دیکھا کہ زینب نے ابراہیم کو اپنی بانہوں میں سمیٹا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ لیٹی ہوئی ہے۔ اس کی تکلیف کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کر رہی ہے اور اس میں کسی حد تک کامیاب بھی ہے۔ وہ دوسروں کا درد محسوس کرنے والی اور درد کو چن لینے والی لڑکی تھی۔ اپنے شوہر کا درد کیوں نہ چنتی۔

مجھے ڈی پیلس کا ایک منظر یاد آ گیا۔ بند کمرے میں وہ اپنے شوہر کی محبت میں سرشار ہو کر اس کی بانہوں میں چلی گئی تھی۔ اس نے گوارا نہیں کیا تھا کہ وہ ابراہیم کی جائز بیوی بن کر بھی اسے اپنے لیے ترساتی رہے۔ تمام خوف بالائے طاق رکھ کر اس نے خودسپردگی کا انداز اختیار کیا تھا مگر ابراہیم کی محبت اور سچی لگن کی داد دینا پڑتی تھی اس نے زینب کی زندگی کی خاطر خود کو باکمال طریقے سے روک لیا تھا۔ مجھے محسوس ہوا تھا کہ اس واقعے کے بعد ابراہیم کے لیے زینب کی محبت میں بہت اضافہ ہوا ہے۔

○......❖......○

زیرزمین مسلسل برقی روشنی میں رہ کر دل و دماغ کی عجیب کیفیت ہو گئی تھی کسی وقت عجب سی اداسی حواس پر چھا جاتی تھی۔ یہ بات اب نیوز سے ثابت ہو چکی تھی کہ رائے زل پوری طرح صحت مند ہے اور پوری توانائیوں کے ساتھ روزمرہ کے کام کر رہا ہے۔ اب یہی بات قرین قیاس لگتی تھی کہ جلسہ گاہ میں زخمی ہونے والا رائے زل نہیں تھا۔ کسی وقت عجیب سی بے چینی مجھے گھیر لیتی تھی۔ اس وقت کچھ ایسا ہی تھا۔ میں آرام دہ بستر پر ٹیک لگائے نیم دراز تھا مگر یہ آرام دہ بستر کانٹوں کا بستر بنا ہوا تھا۔ کوئی ٹوٹ کر یاد آ رہا تھا...... وہ کہاں تھی، کیا کر رہی تھی؟ ہرے بھرے کھیتوں اور باغوں پر سورج چمک رہا ہوگا۔ بہار کی ہوا دلوں میں پھول کھلا رہی ہوگی۔ ریشمی کا لکھا ہوا خط جو نہ جانے کہاں کہاں کا سفر کر کے جزیرے تک آ پہنچا تھا ایک بار پھر دماغ کو کچوکے لگانے لگا۔ وہ خط میں نے پھاڑ دیا تھا مگر اس کے سارے لفظ ذہن پر نقش تھے...... ریشمی نے تاجور کے بارے میں لکھا تھا۔ وہ جھوٹی زندگی جیے گی۔ وہ ساری عمر روتی رہے گی۔ جتنا میں اسے جانتی ہوں کوئی نہیں جانتا......

میرے خیالوں کا تانا بانا انیق کی اچانک آمد سے ٹوٹا، وہ ہمیشہ کی طرح بلائے ناگہانی کی طرح ہی نازل ہوا تھا۔ بالکل یہی لگا جیسے اسے کسی نے زور سے دھکا دیا ہو اور وہ گرتے گرتے بچا ہو، اس کے عقب میں کوئی نہیں تھا۔

''یہ کیا کر رہے ہو؟'' میں نے قدرے غصے سے کہا۔

''دھکے کھا رہا ہوں جی......اور کیا کر رہا ہوں۔''

''کس نے دیا ہے دھکا، یہاں تو کوئی نہیں؟''

اس نے بتیسی نکالی۔ ''دراصل...... میں دھکے کھانے کی پریکٹس کر رہا ہوں جناب...... عنقریب مجھے دھکے پڑنے والے ہیں اور اس کے لیے تیاری ضروری ہے۔''

''کس سے دھکے پڑنے والے ہیں؟''

''امریش پوری صاحب سے...... اور کس سے؟ اب وہ ماشاء اللہ صحت مند ہو چکے ہیں۔ ان کے ہوش و حواس بھی ٹھیک کام کر رہے ہیں۔ بہت جلد انہوں نے کسی نہ کسی کیس میں میرا ریمانڈ لے لینا ہے۔ بقول پہلوان حشمت، بکرے کی ماں کب تک میں میں کرے گی۔''

''زیادہ بدگمانی اچھی نہیں ہوتی۔'' میں نے کہا۔

''آپ اسے بدگمانی کہتے ہیں؟'' اس نے اپنی قمیص کا بھیگا ہوا گریبان مجھے دکھاتے ہوئے کہا۔

''کیا ہوا ہے؟''

انیق اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ ''ابھی کچھ دیر پہلے مجھے امریش صاحب کے کمرے سے خرخراہٹ کی عجیب آوازیں آئیں، جیسے ان کے گلے میں کوئی پھندا سا لگ گیا ہو، میں یہی سمجھا کہ ان کا آخری وقت آ گیا ہے......اور دعائیں قبول ہو گئی ہیں۔ ایسے وقت میں چمچ سے پانی پلاتے ہیں، میں ان کے کمرے میں گھسنا چاہ رہا تھا جب یہ اتنی بڑی کلی انہوں نے میرے منہ پر کر دی۔ کلی بھی کیا پورا کلا تھا۔ دراصل جناب گلا صاف کرنے کے لیے غرارے فرما رہے تھے۔ اب چاہیے تو یہ تھا کہ معذرت کرتے......لیکن امریش پوری اور معذرت؟ الٹا مجھے ہی ڈانٹ پھٹکار شروع کر دی۔ بلکہ ڈانٹ بھی کم تھی پھٹکار زیادہ تھی۔ دراصل امریش پوری......''

یکا یک انیق کو چپ ہونا پڑا۔ سجاول اندر آ گیا تھا۔ قدرے اچھے موڈ میں تھا بولا۔ ''یہ ہر وقت کسی امریش پوری کی باتیں ہوتی رہتی ہیں؟''

انیق غضب کا اداکار تھا۔ بڑی جلدی اپنے تاثرات بدل لیتا تھا سنبھل کر بولا۔ ''وہ آپ کو بتایا تھا نا کہ انڈیا میں میرا ایک چاچا ہے...... یوں کہہ لیں کہ چاچا بنا ہوا ہے۔''

وہ اپنا ماتھا مسل کر بولا۔ ''یار انڈیا والے چاچے کو چھوڑو، اس پاکستانی چاچے کے لیے ایک کپ چائے لے کر آؤ، بلکہ ہم دونوں کے لیے لے آؤ، کیوں شاہ زیب؟'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

انیق نے مجھ سے انگلش میں پوچھا۔ ''اس کی چائے میں تھوڑا سا زہر ملا لاؤں؟''

سجاول اپنی پاٹ دار آواز میں بولا۔ ''تم سے کئی دفعہ بکواس کی ہے کہ میرے سامنے منہ ڈنگا کر کے انگلش نہ بولا کرو۔''

''اوہ سوری جی، غلطی ہو گئی۔'' انیق نے سہم جانے کی اداکاری کی اور کسی مزید سوال سے پہلے ہی باہر نکل گیا۔

''یہ کیا بک رہا تھا؟'' سجاول نے پوچھا۔

''کچھ نہیں...... بس انگلش میں منہ مارنے کا شوق ہے...... کہہ رہا تھا کہ کبھی کبھی قہوہ بھی پی لیا کریں۔''

سجاول نے مجھے گھور کر دیکھا اور بولا۔ ''اس کو باندھ کر رکھو۔ کسی دن ضائع ہو جائے گا۔''

''اِدھر کیسے نکل آئے؟'' میں نے سجاول سے پوچھا۔

''ایک اُڑتی سی بات کان میں پڑی ہے ابھی۔ کہتے ہیں کہ آلے دوالے ہماری ہی تلاش ہو رہی ہے۔ میرا مطلب ہے کہ وہ لوگ پانی میں بھی آ گئے ہیں۔''

''پانی میں؟''

''ہاں، ابھی کوئی خبر چلی ہے کہ آس پاس جو ٹاپو وغیرہ ہیں، ان پر ڈھونڈا جا رہا ہے ہمیں۔''

''اطلاع تشویشناک تھی۔ اس سے پہلے کہ میں مزید کچھ پوچھتا، قسطینا اور فارس جان تیز قدموں سے ہماری طرف آتے دکھائی دیئے۔ میں اور سجاول احتراماً قسطینا کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ قسطینا نے بیٹھنے کے بجائے کھڑے رہنا ہی مناسب سمجھا۔ بولی۔ ''شاہ زائب! میں چاہتی تھی کہ تم سے بھی مشورہ کر لیا جائے نیوز کے مطابق صورتِ حال کچھ تشویش ناک ہے۔ پتا چلا ہے کہ رائے زل کے کوسٹل گارڈز اردگرد کے سمندر میں حرکت کر رہے ہیں۔ نیوز میں کچھ ویڈیوز بھی دکھائی گئی ہیں، آس پاس کے کچھ ٹاپوؤں پر بھی سرچ آپریشن

ہوا ہے۔"

میں نے کہا۔" آپ کو اندیشہ ہے کہ وہ لوگ یہاں بھی پہنچ سکتے ہیں؟"

" بالکل یہ اندیشہ موجود ہے لیکن اطمینان کی بھی ایک دو باتیں ہیں۔ پہلی تو یہ کہ یہاں آس پاس چھوٹے موٹے درجنوں ٹاپو ہیں۔ ہمارے والا ٹاپو ان میں سے ایک ہے...... دوسری یہ کہ اس پناہ گاہ کا راستہ، سرنگ والی پناہ گاہ کی طرح لاجواب ہے کوئی داخلی راستے کے آس پاس بھی گھومتا رہے گا تو اسے پتا نہیں چلے گا کہ اس پتھر کو اس کی جگہ سے سرکایا جا سکتا ہے۔"

" بالکل آپ بجا فرما رہی ہیں۔" فارس جان نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے انگلش میں کہا۔" کوئی اس چٹان کے پاس سال بھر خیمہ لگا کر بیٹھا رہے تو بھی اس کی اصل نہیں جان سکتا۔ وہ سب کچھ بے مثال ہے۔"

" لیکن ایک بات کا اندیشہ ضرور ہے۔" قسطینا نے کہا۔" وہ لانچ جو بن مشہد نے کنارے پر کیموفلاج کی ہے، ہمارا پول کھول سکتی ہے۔ بے شک اسے بہت اچھی طرح چھپا دیا گیا ہے مگر رسک تو اپنی جگہ موجود ہے۔"

" تو کیا سوچا ہے آپ نے؟" میں نے پوچھا۔

" دو طریقے ہیں یا تو اس کے پیندے میں سوراخ کر کے اسے ڈبو دیا جائے لیکن اس میں مسئلہ یہ ہے کہ یہاں سمندر بہت گہرا نہیں ہے۔ کوئی جدید آلہ اس ڈوبی ہوئی لانچ کی نشاندہی کر سکتا ہے پھر یہ بھی ہے کہ لانچ میں موجود کچھ اشیا تیر کر پانی کی سطح پر آ سکتی ہیں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ لانچ کو ویسے ہی یہاں سے روانہ کر دیا جائے۔"

" کیا مطلب یور ہائی نس؟" میں نے پوچھا۔

" اس میں کافی فیول موجود ہے۔ اسے اسٹارٹ کر کے اور اس کے کنٹرول کو ایڈجسٹ کر کے کھلے سمندر میں چھوڑ دیا جائے۔ وہ خود ہی سفر کر کے یہاں سے بہت دور نکل جائے گی۔"

دو چار منٹ اس موضوع پر بات ہوئی۔ اس دوران میں ابراہیم، بن مشہد اور تبارک بھی پہنچ گئے۔ مشورے سے یہی فیصلہ ہوا کہ لانچ کو اسٹارٹ کر کے کھلے سمندر میں چھوڑ دینے والا آپشن مناسب ہے۔ اس کام کے لیے کسی ایک فرد کو اس پناہ گاہ سے باہر نکلنا تھا اور لانچ تک پہنچنا تھا۔ انیق، بن مشہد اور تبارک تینوں نے خود کو اس کام کے لیے پیش کیا۔ بہرحال فیصلہ تبارک کے بارے میں ہوا۔ وہ لانچ کے کنٹرول کو دوسروں سے بہتر سمجھتا تھا۔

یہ کام جتنی جلدی ہو جاتا اتنا ہی بہتر تھا۔ کچھ غور وفکر کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ تبارک اور بن مشہد دونوں باہر جائیں گے، بن مشہد داخلی راستے سے قریباً پچاس میٹر آگے اونچی جگہ پر کھڑا رہ کر ارد گرد نظر رکھے گا اور اگر کوئی خطرہ محسوس ہوا تو بذریعہ واکی ٹاکی تبارک کو خبردار کرے گا۔ تبارک نیچے جا کر لانچ کو روانہ کرے گا اور اس میں سے چند ضروری اشیا لے کر واپس آ جائے گا۔

میں نے کہا۔ ''پتھر کو دھکیلنے کے لیے کم از کم تین بندوں کی ضرورت تو ہوتی ہے میں اور فارس جان بھی چلے جاتے ہیں ہم باہر نہیں نکلیں گے۔''

قسطینا نے اس تجویز کو قبول کیا لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ فارس جان کے ساتھ میں نہیں بلکہ سیف جائے گا۔

''سیف کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بولی۔ ''تم فی الحال اپنے زخمی کندھے کو سنبھالو۔ مجھے اس کی بے حد فکر ہے۔''

''میں اب ٹھیک ہوں یور ہائی نس۔'' میں نے بازو کو حرکت دیتے ہوئے کہا۔

''جتنے ٹھیک ہو، میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ تمہیں مزید آرام کی ضرورت ہے۔''

''لیکن......''

''لیکن کچھ نہیں۔'' اس کا لہجہ قطعی تھا۔ ''اگر مجھے یور ہائی نس کہتے ہو تو پھر میری بات بھی ماننا پڑے گی۔''

میں اس کے معنی خیز لہجے کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ اب وہ بے تکلفی والی بات ختم ہو رہی تھی۔

قریباً ایک گھنٹے بعد تبارک باقی ساتھیوں کے ہمراہ داخلی راستے کی طرف روانہ ہو گیا۔ ان کو قریباً ڈیڑھ سو پتھریلی سیڑھیاں چڑھ کر داخلی راستے تک پہنچنا تھا اور پھر پتھر کو سرکا کر تبارک اور بن مشہد کو باہر نکلنا تھا۔ سب ہی کے پاس آتشیں اسلحہ موجود تھا۔ یہاں آٹھ دس واکی ٹاکی بھی تھے جن میں دو اس وقت بن مشہد اور تبارک کے پاس تھے۔

سیف اس ساری صورتِ حال پر خوش نظر آ رہا تھا۔ ایسے ماحول میں اس کا جوان خون جوش مارتا تھا اور اس کی جی داری، سرخی بن کر اس کے توانا چہرے پر جھلک دکھانے لگتی تھی۔ وہ لوگ چلے گئے۔ قسطینا نے ایک واکی ٹاکی آن کر لیا تھا اور اس کے ذریعے فارس جان سے مسلسل رابطہ رکھے ہوئے تھی۔ وہ لوگ داخلی راستے پر پہنچے، انہوں نے کامیابی سے پتھر کو سرکایا۔ پھر تبارک اور بن مشہد باہر نکل گئے۔ جاتے ہوئے انہوں نے فارس اور سیف کے

ساتھ مل کر وزنی پتھر کو پھر اس کی جگہ پر کر دیا۔

آٹھ دس منٹ گزر رہے ہوں گے جب ہمیں فائر کی بہت مدھم آواز سنائی دی۔ یہ اتنی مدھم تھی کہ بس گمان ہوتا تھا کہ کہیں ہیوی رائفل سے گولی چلائی گئی ہے۔ کچھ دیر بعد ایسی ہی آواز دوبارہ آئی۔ قسطینا نے سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھا۔

میں نے کہا۔ ''لگتا تو یہ فائر ہی ہے۔''

''تبارک یا مشہد کو کیا ضرورت پڑی ہے گولی چلانے کی؟''

ابراہیم نے کہا۔ ''شاید کوئی اچھا شکار نظر آ گیا ہو ان میں سے کسی کو۔ یہاں پرندے اور حلال جانور تو موجود ہیں۔''

ہمارے ان جملوں کے دوران میں ہی فارس جان کی آواز واکی ٹاکی پر ابھری۔ اس نے قسطینا کو مخاطب کرتے ہوئے ملائی زبان میں پوچھا۔ ''یور ہائی نس! آپ نے بھی گولی چلنے کی آواز سنی ہے؟''

''ہاں فارس، ہم اسی کے بارے میں بات کر رہے تھے۔''

''اگر آپ کہیں تو میں باہر جا کر دیکھوں؟'' فارس نے پوچھا۔

''نہیں، ابھی انتظار کرو۔'' قسطینا نے جواب دیا اور اگر ہو سکے تو تبارک یا مشہد سے رابطہ کرو۔''

''او کے۔'' فارس جان نے کہا۔

ابھی بمشکل دو تین منٹ ہی گزرے تھے کہ فارس جان کی سنسناتی آواز واکی ٹاکی پر ابھری۔ ''یور ہائی نس! گڑبڑ ہو گئی ہے۔ باہر کچھ لوگ موجود ہیں۔ کیپٹن بن مشہد اندر آ گیا ہے ہم نے راستہ بند کر دیا ہے۔''

فارس جان کا مطلب یہ تھا کہ ان تینوں نے ہنگامی صورتِ حال کے پیش نظر پتھر کو دھکیل کر دہانے کو ڈھانپ دیا ہے۔

''بن مشہد کیا کہتا ہے؟'' قسطینا نے پوچھا۔

''بن مشہد کو چھ سات کے قریب لوگ نظر آئے ہیں لیکن ہو سکتا ہے ان کے مزید ساتھی بھی ہوں۔''

''کیپٹن تبارک سے رابطہ ہوا؟'' قسطینا نے پوچھا۔

''نہیں، مگر مشہد کوشش کر رہا ہے۔'' فارس جان کی ہانپی ہوئی آواز ابھری۔

یہ ہم میں سے کسی کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ تبارک اور بن مشہد باہر نکلیں گے تو باہر

لوگ موجود ہوں گے۔

یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں؟ کیا واقعی گرے فورس اور ایجنسی کے لوگ ہمیں تلاش کرتے ہوئے یہاں پہنچ چکے تھے؟ اگر ایسا تھا تو انہوں نے فائرنگ کس پر کی تھی؟ کیا تبارک نشانہ بن چکا تھا؟ یہ بات تو طے تھی کہ اتنی جلدی تبارک اپنا کام مکمل نہیں کر پایا ہوگا اور لانچ یہیں ٹاپو کے کنارے موجود ہوگی، اگر لانچ موجود تھی تو پھر یہ بات بھی یقینی تھی کہ ہمارا یہاں ٹاپو پر موجود ہونا راز نہیں رہے گا۔

قسطینا نے کہا۔''میرا خیال ہے ہمیں آگے جانا چاہیے۔''

ہم نے اپنی رائفلیں سنبھالیں، فالتو راؤنڈ ساتھ لیے اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔ ابراہیم بھی جانا چاہتا تھا مگر زینب اور سنبل کے پاس بھی کسی کا رہنا ضروری تھا۔ قسطینا نے لائٹ والی کیپ پہن لی تھی۔ میرے ہاتھ میں طاقتور ٹارچ تھی۔ سجاول بھی قدرے سُست قدموں سے ہمارے پیچھے آ رہا تھا۔

پتھر کے طویل زینے طے کر کے ہم بالآخر دہانے تک پہنچ گئے۔ اب بالکل خاموشی تھی۔ مزید کوئی فائر بھی سنائی نہیں دیا تھا۔ سب کو تبارک کا انتظار تھا۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ تبارک کی آمد کا پتا کیسے چلے گا۔ اس کے دو طریقے تھے یا تو وہ کسی ٹھوس شے کے ذریعے سرکنے والے پتھر کو ٹھونک کر آواز پیدا کرتا یا اگر اس کا واکی ٹاکی کام کر رہا تھا تو اس کے ذریعے رابطہ کرتا۔ بغیر تبارک کو پہچانے پتھر کو سرکانے میں بہت رسک تھا۔

قریباً دس منٹ اسی شش و پنج میں گزر گئے پھر دو تین مزید فائر سنائی دیئے چونکہ اس مرتبہ ہم دہانے کے بالکل پاس تھے اس لیے واضح آواز آئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ ان میں سے ایک فائر کسی شاٹ گن کا ہے۔ یعنی شکار والا امکان بھی رد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ تبارک کی طرف سے ابھی تک کوئی رابطہ نہیں تھا۔ قسطینا اور فارس جان بار بار اسے واکی ٹاکی پر سگنل بھیج رہے تھے۔ اچانک تبارک کی طرف سے جواب آ گیا۔ اس کے لہجے نے ہم سب کو چونکایا وہ تکلیف میں محسوس ہوتا تھا۔ اس نے بتایا کہ ٹاپو پر کچھ مسلح لوگ موجود ہیں۔ وہ ان سے بچنے کی کوشش میں ایک پتھر سے پھسل کر ایک تنگ کھائی میں گر گیا ہے اور اس کی ٹانگ پر سخت چوٹ آئی ہے۔

یہ ایک بری خبر تھی۔ قسطینا نے اسے تسلی دی اور کہا کہ وہ اپنی لوکیشن بتائے اور کیا وہ کھائی سے نکلنے کی کوشش کر سکتا ہے؟

''کوشش کر تو رہا ہوں یور ہائی نس...... لیکن چڑھائی بالکل سیدھی ہے۔''

''چوٹ کس نوعیت کی ہے؟''قسطینا نے پوچھا۔
''ٹخنے اور پنڈلی پر ضرب آئی ہے۔'' کیپٹن ڈاکٹر تبارک نے اپنی کراہ دباتے ہوئے کہا۔
جیسا کہ بعدازاں پتا چلا وہ ہم سے چھپا رہا تھا، اس کی ٹانگ تین جگہ سے بری طرح ٹوٹ چکی تھی۔
فارس جان نے اس سے پوچھا۔''لانچ کی صورتِ حال کیا ہے؟''
''میں اس تک نہیں پہنچ سکا کمانڈر، وہ لوگ ایک دم نمودار ہوئے۔ میں ان سے چھپنے کے لیے ایک جھنڈ میں گھس گیا جب وہ جھنڈ کی طرف آئے تو میں وہاں سے بھاگا اور تب یہ حادثہ ہوا۔'' تبارک کی آواز درد کی شدت سے ٹوٹ رہی تھی۔
''انہوں نے تمہیں دیکھا؟''قسطینا نے پوچھا۔
''میرا خیال ہے یور ہائی نس، وہ نہیں دیکھ سکے۔''
''وہ فائر کیسے تھے؟''
''مجھے لگتا ہے کہ وہ پرندوں کا شکار کھیل رہے ہیں لیکن وہ شکاری نہیں ہیں یور ہائی نس! وہ ایجنسی اور گرے فورس کے لوگ ہیں، ان میں سے کئی باقاعدہ یونیفارم میں ہیں۔''
میں نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے واکی ٹاکی پر پوچھا۔''تمہارا کیا خیال ہے کیپٹن تبارک! تم وہاں ان کی نظر سے محفوظ ہو؟''
''میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا، ابھی تھوڑی دیر پہلے...... جو دو تین فائر سنائی دیئے ہیں وہ ذرا فاصلے پر ہوئے ہیں لیکن اگر وہ لوگ...... اس طرف آ گئے تو کھائی میں ضرور جھانکیں گے۔ ابھی سورج ڈوبنے میں قریباً ایک گھنٹا باقی ہے...... تب تک تو خطرہ موجود ہے۔''
وہ بولتے ہوئے کوشش کر رہا تھا کہ اس کی آواز میں زیادہ تکلیف نہ جھلکے مگر پھر بھی کسی وقت آواز ٹوٹ سی جاتی تھی۔
کچھ دیر بعد اس نے بتایا کہ اسے کوئی چیز ٹھونکے جانے کی آوازیں کافی قریب سے آ رہی ہیں، اس نے اندیشہ ظاہر کیا کہ شاید وہ لوگ کہیں پاس ہی موجود ہیں اور سفری خیمے لگا رہے ہیں اگر تبارک کا اندازہ درست تھا تو اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ لوگ جلدی یہاں سے جانے والے نہیں۔
جونہی ہماری گھڑیوں کے مطابق سورج ڈوب گیا اور اندھیرا چھا گیا ہم نے ٹارچیں

بجھائیں اور بڑی احتیاط سے سلائیڈنگ پتھر کو حرکت دی۔ تازہ ہوا کے جھونکے نباتات کی خوشبو کے ساتھ اندر آئے۔ کمانڈر فارس اور میں نے سر نکال کر احتیاط سے باہر دیکھا۔ کچھ فاصلے پر روشنیاں نظر آئیں۔ ''اوہ خدایا۔'' فارس جان نے ہونٹ سکیڑ کر کہا۔

یہ روشنیاں تقریباً اسی جگہ پر نظر آ رہی تھیں جہاں کیپٹن تبارک نے اپنی لوکیشن بتائی تھی۔ درمیان میں شاید چالیس پچاس میٹر کا فاصلہ رہا ہوگا۔

''میرے اندازے کے مطابق یہ آٹھ ٹینٹ ہیں۔ دو درجن کے قریب افراد تو رہے ہوں گے۔'' میں نے کہا۔

''امارا خیال ہے برادر! اس سے بھی زیادہ ہیں۔ وہ دیکھو نیچے دو تین اور خیمہ بھی نظر آ رہا ہے۔''

اب قسطینا نے بھی سر باہر نکال لیا تھا اور اردگرد کا جائزہ لے رہی تھی۔ صورتِ حال واقعی سنگین تھی۔ اچانک ہوا کے دوش پر تیر کر ایک ہلکا سا پُرمسرت قہقہہ سنائی دیا پھر کسی نے امریکن لہجے میں انگلش بولی اور اپنے کسی ساتھی کے پیچھے بھاگا۔ یوں لگا کہ وہ تیزی سے ہماری طرف بڑھ رہے ہیں۔ قسطینا نے سر اندر کر لیا اور تیزی سے بولی۔ ''بند کر دو۔''

میں اور فارس اس کے کہنے سے پہلے ہی پتھر کو حرکت دے چکے تھے۔ وہ سلائیڈ کر کے دہانے کو ڈھانپ گیا۔ اب پتھر کی سلائیڈنگ رواں ہوگئی تھی اور وہ آسانی سے حرکت کرتا تھا۔ اس کی ''روک'' ہٹا کر ایک بندہ بھی اسے پوری قوت سے دھکیلتا تو وہ متحرک ہو سکتا تھا۔ ہم سب کچھ دیر دم بخود کھڑے رہے۔ پھر قسطینا نے دوبارہ ٹارچ روشن کر لی اور واکی ٹاکی آن کر لیا۔

کیپٹن تبارک بدستور مشکل میں تھا۔ قسطینا نے اسے بتایا کہ اس سے کچھ فاصلے پر ان لوگوں نے کیمپ لگا لیے ہیں...... ان کی تعداد بھی توقع سے زیادہ ہے۔

تبارک بولا۔ ''مجھے بھی یہی لگ رہا تھا کہ وہ یہاں کیمپنگ کا ارادہ رکھتے ہیں۔''

''تمہارا درد اب کیسا ہے کیپٹن؟'' کمانڈر فارس جان نے پوچھا۔

''درد تو ہے لیکن درد سے بھی بڑا مسئلہ یہ ہے کہ کھائی کی تین دیواریں تو تقریباً سیدھی ہیں۔ چوتھی جانب سے اوپر آنے کی کوشش کی جا سکتی تھی لیکن دو تین گھنٹے پہلے یہاں بارش ہوئی ہے اور اس نے بے حد پھسلن کر دی ہے۔''

کمانڈر فارس جان، بن مشہد اور انیق وہاں موجود رہے، ہم سیڑھیاں اتر کر واپس پناہ گاہ میں آ گئے۔ تبارک کا پناہ گاہ سے باہر رہ جانا بے حد تشویشناک تھا۔ بن مشہد نے ٹھیک ہی

کہا تھا اگر گرے فورس اور ایجنسی والے مہینوں سر پٹختے رہتے تو بھی اس جگہ کا کوئی سراغ نہیں پا سکتے تھے لیکن اگر کیپٹن تبارک ان کے ہتھے چڑھ جاتا تو پھر وہ تشدد کر کے اس سے سب کچھ اگلوا سکتے تھے۔ بندہ کتنا بھی مضبوط ہو ایک حد تک ہی برداشت کر سکتا ہے۔

وہ رات بڑی پریشان کن تھی۔ جب تک یہ خیمہ زن مسلح افراد یہاں سے کوچ نہ کرتے تبارک کو اس کھائی سے نکالنا ممکن نہیں تھا۔ دوسری جانب یہ خطرہ بھی تھا کہ اگر وہ صبح تک وہاں رہا تو پھر اس کے دیکھے جانے کا امکان پیدا ہو جائے گا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ تبارک نے اب واکی ٹاکی پر بتا دیا تھا کہ اس کی ٹانگ ٹوٹ چکی ہے اور وہ از خود کھائی سے باہر نہیں نکل سکتا۔ اب وہ اپنے درد کو سہہ نہیں پا رہا تھا اور بات کرتے ہوئے اس کے منہ سے بے ساختہ کراہ نکل جاتی تھی۔ آدھی رات کے بعد قسطینا نے فارس جان، بن مشہد اور انیق کو بھی دہانے سے واپس بلا لیا۔ اب وہاں ان کے رکے رہنے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ رات بارہ بجے کے لگ بھگ کیپٹن تبارک نے بتایا کہ اس کی ٹانگ کا درد بہت زیادہ ہے۔ اس نے نیچے لیٹ کر ٹانگ کو کھائی کی دیوار پر اس طرح ٹکا دیا ہے کہ وہ اونچی ہو گئی ہے اور درد میں کچھ افاقہ ہو گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ڈاکٹر ہونے کے ناتے وہ اس طرح کے کلیے جانتا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اس نے اپنے اوپر کچھ خشک شاخیں اور گھاس پھونس اس طرح پھیلا لیا ہے کہ اسے آسانی سے دیکھا نہ جا سکے۔

وہ ہمیں تسلیاں دے رہا تھا مگر ہم جانتے تھے کہ اس کی حالت اتنی اچھی نہیں۔ قسطینا مسلسل جاگ رہی تھی۔ میں اور فارس جان بھی سو نہیں پا رہے تھے۔ ابراہیم کو بہت صبح اٹھنا ہوتا تھا اس لیے وہ سو گیا تھا، سجاول بھی سو گیا تھا۔ زینب اونگھ رہی تھی اور سنبل کے ہلکے خراٹے ساتھ والے کمرے میں سنائی دے رہے تھے۔

قسطینا نے کہا۔ ”خدا کرے کہ کل یہ لوگ پڑاؤ اٹھا لیں۔“

”لیکن مجھے نہیں لگتا کہ ایسا ہو گا بلکہ یہ اندیشہ بھی موجود ہے کہ کل مزید لوگ یہاں آ جائیں۔“ میں نے کہا۔

”ہاں اگر ان لوگوں نے لانچ دیکھ لی تو پھر یہ یہاں سے ٹلیں گے نہیں......“

اسی طرح کی گفتگو میں رات کا تیسرا پہر بھی اختتام تک پہنچ گیا۔ مجھے توقع نہیں تھی مگر کہتے ہیں کہ نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے۔ یکے بعد دیگرے قسطینا اور فارس جان بھی سو گئے۔ میں نے قسطینا کا واکی ٹاکی آف کر دیا۔ کیونکہ دوسری طرف اب مکمل خاموشی تھی۔ شاید کیپٹن تبارک بھی درد سے نڈھال ہو کر سو گیا تھا...... یا پھر بے ہوشی کی حالت میں چلا گیا تھا۔ میں

نے کامن روم کا جائزہ لیا...... اور اس کام کے لیے تیار ہو گیا جس کا منصوبہ کافی دیر سے میرے ذہن میں پنپ رہا تھا۔ میں جانتا تھا...... اور یہ میرے دل کی گواہی بھی تھی کہ اگر صبح ہونے سے پہلے کیپٹن تبارک کو ریسکیو نہ کیا گیا تو رسک بہت بڑھ جائے گا...... اور یہ بھی ممکن تھا کہ کیپٹن تبارک کی جان چلی جائے۔

○......❖......○

جس کھائی میں کیپٹن تبارک گرا تھا اس کا حدود اربع اس نے کافی حد تک بتا دیا تھا۔ نائیلون کی ایک مضبوط رسی کا میں نے انتظام کر لیا تھا۔ اس رسی کو کسی قریبی درخت کے ساتھ باندھ کر اور کھائی میں اتر کر تبارک کو باہر لایا جا سکتا تھا۔ میں اکیلا جانا چاہتا تھا اور مجھے 80 فیصد یقین تھا کہ میں یہ کام کر لوں گا۔ MAC10 کا مشین پسٹل میری جیکٹ کے نیچے موجود تھا رسی میں نے کمر کے گرد لپیٹ لی تھی اور طاقتور ٹارچ ہاتھ میں تھی۔ میرا کندھا اب تقریباً ٹھیک تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ میں اسے کچھ خاص سمتوں میں حرکت نہیں دے سکتا تھا۔ ایک عام شخص کے لیے تو شاید یہ اتنا بڑا مسئلہ نہ ہو لیکن جب بات MMA جیسی فائٹنگ کی ہو اور جان ڈیرک جیسے لوگوں سے ٹکرانے کی ہو تو پھر یہ ایک بڑا بلکہ بہت بڑا مسئلہ تھا۔

میں نے بے حد خاموشی کے ساتھ پتھریلی سیڑھیاں طے کیں اور دہانے تک پہنچ گیا۔ رگوں میں لہو کی گردش تیز ہو چکی تھی اور ایک طرح کا تناؤ تھا۔ میں اکیلا اس لیے نکلا تھا کہ ناکامی کے امکانات بھی موجود تھے۔ بالفرض میں پکڑا جاتا تو مجھے اپنے اوپر یہ اعتماد تھا کہ میری ہڈیوں سے میرا گوشت علیحدہ بھی کر دیا جائے تو مجھ سے میری مرضی کے خلاف کچھ اگلوایا نہیں جا سکے گا۔ پکڑے جانے اور پھر اپنی زبان بند نہ رکھ سکنے کا مطلب یہی تھا کہ پناہ گاہ میں موجود سب لوگ گرے فورس اور ایجنسی کی گرفت میں آ جاتے اور اسی سنگین ترین خطرے سے بچنے کے لیے تو میں تبارک کو ریسکیو کرنا چاہتا تھا۔

میں نے چند گھنٹے پہلے ہی جانچ لیا تھا کہ دہانے کا پتھر اب روانی سے حرکت کرتا ہے، اس کے اندر کی طرف ایک ''روک'' لگی ہوئی تھی۔ میں نے یہ روک ہٹائی، کافی کوشش کرنا پڑی لیکن ناکامی نہیں ہوئی۔ میں نے پتھر کو اس حد تک سلائیڈ کر لیا کہ وہاں سے باہر نکل سکوں۔ سلائیڈنگ کے وقت مدھم آواز بھی پیدا ہوئی جو سناٹے کے سبب نمایاں محسوس ہوئی۔ بہر حال کیمپ خاصے فاصلے پر تھے۔ اندیشہ نہیں تھا کہ وہاں کچھ سنا گیا ہو گا۔ دھکیل کر میں نے پتھر کو پھر برابر کر دیا۔

ہریالی اور بلند درختوں سے لدا ہوا یہ ٹاپورات کی ان آخری گھڑیوں میں بالکل خاموش

تھا۔ کسی شب بیدار جانور کی آواز بھی سنائی نہیں دیتی تھی۔ یقینی بات تھی کہ لاتعداد پرندے اردگرد موجود ہوں گے لیکن وہ اپنے گھونسلوں میں دبکے ہوئے تھے۔ صاف آسمان پر ستاروں کی چمک تھی اور سمندر کی طرف سے خنک ہوا چل رہی تھی۔ دائیں جانب ذرا نشیب میں قریباً 100 میٹر دور خیموں کی روشنیاں موجود تھیں۔ ان سے تھوڑا ہٹ کر وہ کھائی تھی جہاں کل شام سے کیپٹن تبارک شدید اذیت جھیل رہا تھا۔

میں محتاط انداز میں اس جانب بڑھا۔ ٹارچ روشن کرنے کا رسک نہیں لیا جا سکتا تھا۔ مشین پسٹل جیکٹ کے نیچے تھا اور ایک اسٹریپ کے ساتھ میرے گلے میں جھول رہا تھا۔ میں اسے ایک سیکنڈ کے نوٹس پر استعمال کر سکتا تھا۔

واکی ٹاکی میرے پاس موجود تھا مگر اسے استعمال کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ تبارک کی طرف مکمل خاموشی تھی اور اس سے اندیشہ جاگتا تھا کہ شاید وہ بے ہوش ہو گیا ہے۔

میں چالیس پچاس قدم ہی آگے گیا تھا کہ ایک مدھم سی آواز سنائی دی۔ میں اسے کوئی معنی نہیں پہنا سکا۔ ایک دو منٹ کے توقف کے بعد میں پھر آگے بڑھا، ایک ڈھلوان سے اترتے ہوئے مجھے یک دم ٹھٹکنا پڑا، میرے عقب میں کوئی موجود تھا۔ میرا ہاتھ پسٹل کے دستے پر تھا، میں تیزی سے مڑا۔ میرے سامنے سیف کھڑا تھا۔ وہ گھبرا کر بولا ''یہ میں ہوں استاد جی۔''

اس نے اپنی آواز پست رکھی تھی پھر بھی وہ کچھ فاصلے تک تو گئی ہوگی۔ میں دانت پیس کر رہ گیا۔ دل تو یہی چاہا کہ ٹریگر دبا دوں۔ ''یہ کیا حماقت ہے۔ تم ہوش میں تو ہو؟'' میں نے سرسراتی آواز میں کہا۔

''استاد جی! مجھ سے رہا نہیں گیا۔ آپ اکیلے نکل آئے تھے اور میں چنگی طرح جانتا ہوں کہ آپ کتنا خطرے والا کام کرنے لگے ہیں۔''

''جی تو یہی چاہ رہا ہے کہ اپنا سر پھاڑ لوں یا تمہارا......'' میں غصے کی زیادتی کے سبب مزید کچھ نہ کہہ سکا۔

اب میں گھاٹی کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ اسے واپس بھیج دینے کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا۔ نہ ہی لڑنے جھگڑنے سے کچھ حاصل تھا۔ وہ لجاجت سے بولا۔ ''ہو سکتا ہے جی کہ یہ اکیلے بندے کا کام ہی نہ ہو۔ ہم دو ہوں گے تو کیپٹن صاحب کو آسانی سے نکال سکیں گے۔ اس کی آواز قدرے اونچی ہوگئی تھی۔

''اچھا اب ذرا بکواس آہستہ کرو۔'' میں نے تیز سرگوشی کی۔

رائفل اس کے کندھے سے جھول رہی تھی اور وہ ہر قسم کے ایکشن کے لیے بے تاب نظر آتا تھا۔لہو کا گھونٹ پی کر میں نے اسے بتایا کہ ہم کھائی کے بالکل پاس پہنچ گئے ہیں اور خیموں کی روشنیاں بھی سامنے ہی نظر آرہی ہیں، ہمیں احتیاط سے آگے جانا ہوگا۔

ہم جھک کر اور سنبھل سنبھل کر پاؤں رکھتے ہوئے آگے بڑھے۔ پاس ہی وہ بڑے پتھر نظر آئے جن کے عقب میں تبارک نے کھائی کی نشاندہی کی تھی۔ نگاہیں اب اندھیرے میں کافی حد تک دیکھ رہی تھیں۔ ہم اوندھے لیٹ گئے اور احتیاط سے کھسکتے ہوئے کھائی کے کنارے تک پہنچ گئے۔نوے فیصد امکان اس بات کا تھا کہ یہ وہی کھائی ہے جس میں شدید زخمی کیپٹن تبارک پڑا ہوا ہے۔کوئی آواز کوئی سرسراہٹ سنائی نہیں دیتی تھی۔کیپٹن کے پاس بھرا ہوا پستول موجود تھا۔اس بات کا اندیشہ بھی تھا کہ وہ ہماری آمد سے خوف زدہ ہوتا اور فائر کر دیتا۔مسئلہ یہ تھا کہ اس کا واکی ٹاکی یکسر خاموش تھا۔میرے ذہن میں تدبیر آئی۔ میں نے ایک بار پھر واکی ٹاکی پر سگنل بھیجے۔بھنبھناہٹ کی نہایت باریک اور مدھم آواز سنائی دی۔

یہ آواز تاریک کھائی میں سے ہی آئی تھی۔تصدیق کے لیے میں نے دوبارہ کال کی اور تصدیق ہوئی۔کیپٹن تبارک یہیں پر تھا۔ یہ بات بھی تقریباً یقینی ہوگئی کہ وہ ہوش میں نہیں ہے۔ واکی ٹاکی بالکل ٹھیک کام کر رہا تھا مگر تبارک کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔نیچے اترنے کے لیے میری بے تابی بڑھ گئی۔ٹارچ روشن کرنا کسی طور بھی مناسب نہیں تھا۔

سیف نے سرگوشی کی۔''سگنل کی آواز سے تو یہی پتا چلتا ہے کہ دس بارفٹ سے زیادہ گہرائی نہیں۔''

''شاید۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔

''جناب! اگر اجازت ہو تو میں اتروں؟''

''تم اجازت لیتے ہوئے اچھے نہیں لگتے۔بس چھلانگ لگا دو اندر۔''

''سوری جی، غلطی ہوگئی، دراصل......''

''اچھا، اب مزید جھوٹ نہ بولنا...... اِدھر اُدھر کوئی ایسا درخت دیکھو جس سے رسی باندھی جا سکے۔''

سیف نے ایک درخت دیکھ کر رسی باندھ دی اور باقی رسی نیچے گرادی۔ میں نے آہستہ آہستہ نیچے اترنا شروع کیا اور یہی وقت تھا جب میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ مجھے نیچے گہرائی سے پستول کا سیفٹی کیچ ہٹائے جانے کی بہت مدھم آواز سنائی دی تھی۔اس کا مطلب تھا کہ کیپٹن تبارک بے ہوش نہیں ہے۔اگلا لمحہ فائر کا بھی ہوسکتا تھا۔اب قدرے بلند آواز سے

بولے بغیر گزارا نہیں تھا۔ میں نے تیز سرسراتے لہجے میں کہا۔ "تبارک! یہ میں ہوں شاہ زیب!"

"اوہ گاڈ...... تھینکس گاڈ۔" نیچے آٹھ دس فٹ کی گہرائی سے تبارک کی کراہتی ہوئی آواز آئی۔

کھائی کی ایک دیوار عمودی نہیں تھی بلکہ بچوں کی سلائیڈ جیسی تھی۔ رسی کی مدد سے نیچے اترنا مجھے زیادہ دشوار محسوس نہیں ہوا۔ ٹارچ اب بھی روشن نہیں کی جاسکتی تھی۔ میں نے نیم تاریکی میں بغور دیکھا۔ کیپٹن تبارک کی حالت پتلی تھی۔ ٹانگ تو ٹوٹ ہی چکی تھی، سر اور چہرے پر بھی چوٹوں کے آثار تھے۔

میں نے اسے اپنے ساتھ لگایا۔ "تمہیں بہت برداشت کرنا پڑا ہے تبارک! لیکن اب ہم آگئے ہیں۔"

"آپ نے بڑا خطرہ...... مول لیا...... ہے۔" وہ کراہتے ہوئے بولا۔

"لیکن تم کال ریسیو کیوں نہیں کررہے تھے؟"

"واکی ٹاکی میرے پاس نہیں ہے، وہ نیچے گر چکا ہے۔" اس نے ایک چھوٹے گڑھے کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے نیچے جھک کر اور ہاتھ لمبا کر کے واکی ٹاکی تلاش کیا۔ وہ مجھے مل گیا۔ تبارک نے کہا۔ "مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اسے نکال سکتا۔"

میں نے کہا۔ "میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ بھی تمہاری ہمت ہے کہ تم اب تک ہوش میں ہو۔"

میں نے اس کی دائیں ٹانگ کو بغور دیکھا۔ اس نے گھٹنے اور ٹخنے کے درمیان پنڈلی پر چند شاخیں رکھ کر اوپر اپنی قمیص کی دھجیاں باندھ دی تھیں۔ یوں خود ہی اپنے آپ کو فرسٹ ایڈ دی ہوئی تھی، آخر کو آرمی ڈاکٹر تھا۔

میں اس کے لیے ایک درد کش انجکشن بھر کر ساتھ لایا تھا۔ میں نے اس کے بازو پر یہ سریع الاثر انجکشن دیا۔ تین چار منٹ کے اندر اس کی حالت کچھ بہتر ہوگئی۔

میں نے تبارک سے کہا۔ "کیپٹن! تمہیں بس تھوڑی سی مزید ہمت کرنا پڑے گی۔ یہ ڈھلوان ایسی نہیں ہے جس پر چڑھا نہ جاسکے۔ میں تمہارے بائیں پاؤں کو اپنے ہاتھ کی سپورٹ دوں گا۔ تم اس پاؤں کے زور پر اوپر کی طرف "کرال" کرنا۔ دس بارہ فٹ سے زیادہ گہرائی نہیں ہے یہ۔"

کیپٹن تبارک کی قوتِ برداشت قابلِ داد تھی۔ ایک موقع پر کمانڈر فارس جان نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ بن مشہد اور تبارک کا تعلق پاسبان بریگیڈ کے خاص الخاص یونٹ سے ہے۔ یہ لوگ دشمن کے علاقے میں ڈیوٹی انجام دیتے ہیں اور گرفتاری کی صورت میں زبان کھولنے کے بجائے موت کو گلے لگانا بہتر سمجھتے ہیں۔

میں نے رسی کا ایک سرا کیپٹن تبارک کی کمر سے باندھ دیا اور سیف کو دبی آواز میں ہدایت کی کہ وہ رسی کو پوری طرح تان کر رکھے تاکہ کیپٹن کو سہارا ملتا رہے۔

''آپ بے فکر رہیں جی۔'' سیف نے پُرجوش سرگوشی کی۔

کیپٹن کی دائیں ٹانگ بے جان شے کی طرح اس کے جسم کے ساتھ لٹک رہی تھی۔ اس نے بائیں ٹانگ کے زور پر اوپر چڑھنا تھا۔ وہ کراہتا ہوا ڈھلوان پر اوندھے منہ لیٹ گیا۔ سیف نے رسی تان لی۔ میں نے کیپٹن کے بائیں پاؤں کو اپنے ہاتھ کی ٹیک دی، اس نے زور لگایا۔ اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ کراہ نکلی تاہم وہ ڈیڑھ دو فٹ اوپر جانے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ عمل میں نے اور کیپٹن تبارک نے وقفے وقفے سے پانچ چھ مرتبہ دہرایا...... بالآخر ہم باہر نکل آئے، یہ ایک طویل کوشش تھی۔

''زبردست کیپٹن! تم نے کر دکھایا۔'' میں نے اس کی کمر سے رسی کھولتے ہوئے کہا۔

وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ میرے اپنے کندھے میں بھی ہلکا درد ہونے لگا تھا مگر یہ ایسا نہیں تھا کہ اس کے بارے میں سوچا جاتا۔

سیف نے درخت سے رسی کھول کر اسے گول گول لپیٹا اور اپنے کندھے سے لٹکا لیا۔ ہماری بائیں جانب فقط تیس چالیس میٹر کی دوری پر گرے فورس اور ایجنسی کے کیمپس کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ کیپٹن تبارک نے تکلیف زدہ آواز میں کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ ہمیں واکی ٹاکی بند کر دینے چاہئیں۔''

''میں نے کر دیئے ہیں۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ (اس وقت واکی ٹاکی پر سگنل کی آواز آنا بہت خطرناک تھا)

''کیا یہ اچھا نہیں ہوگا کہ میں کیپٹن صاحب کو اپنی کمر پر لاد لوں؟'' سیف نے پوچھا۔

''کر لو گے؟''

''کیوں نہیں جی۔ جب ہم کبڈی کی پریکٹس کرتے ہیں تو اس میں ہل بھی کھینچتے ہیں۔ کمر لوہے کی طرح پکی ہو جاتی ہے۔'' وہ سینہ تان کر بولا۔

کیپٹن تبارک کو کھڑا کرنا اور پھر کمر پر لادنا ایک مشکل مرحلہ تھا۔ میں نے اسے بمشکل

اٹھایا۔ جب سیف نے اسے کمر پر لاد کر اپنا توازن درست کیا تو تبارک کو دھچکا لگا۔ اس کے منہ سے بے ساختہ ایک بلند کراہ نکلی۔ چند لمحوں کے لیے ہم تینوں ہی ٹھٹک گئے۔ آواز خاصی اونچی تھی۔ ہم درختوں کے پیچھے ساکت ہو کر ردِعمل دیکھنے لگے۔ خاموشی کے سوا اور کچھ محسوس نہیں ہوا مگر پھر اچانک کیمپنگ کی طرف چند روشنیوں نے حرکت کی۔ بائیں جانب نشیب کے درختوں میں بھی کچھ سرسراہٹ سنائی دی۔ ہم تاریکی میں تھے اور درختوں کے سائے ستاروں کی معمولی روشنی کو بھی روکے ہوئے تھے۔ یہ توقع ہرگز نہیں تھی کہ وہ لوگ آسانی سے ہم کو دیکھ پائیں گے...... یہی وجہ تھی کہ جب ڈیڑھ دو منٹ بعد ایک سایہ تاریکی سے برآمد ہو کر کسی بلا کی طرح مجھ پر جھپٹا تو میں ششدر رہ گیا۔

چونکہ میں کسی ایسے حملے کے لیے قطعی تیار نہیں تھا۔ میں پہلو کے بل پتھروں پر گرا۔ ایک بھرپور مکا میری ٹھوڑی پر لگا اور دماغ میں چنگاریاں سی چھوٹ گئیں۔ دو توانا افراد مجھ سے لپٹ گئے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اندازہ ہوا کہ دو تین افراد سیف پر بھی جھپٹ پڑے ہیں اور کیپٹن تبارک، سیف کی کمر سے پھسل کر پتھروں پر گر گیا ہے۔ ''یو باسٹرڈ'' مجھ سے بھڑنے والا ایک شخص پھنکارا۔

اس کے لہجے نے مجھے سمجھا دیا کہ وہ امریکن ہے، میرے دماغ میں پہلے ہی چنگاریاں ناچ رہی تھیں۔ امریکی لہجے نے انہیں اور بھڑکا دیا۔ میرے سر کی طوفانی ضرب چہرے پر سہہ کر امریکی ڈھلوان پر لڑھکا۔ اس دوران میں دوسرے نے میرے سر پر رائفل کا بٹ رسید کیا۔ یہ بھی امریکی تھا اور ایجنسی کی یونیفارم میں تھا۔ میں نے اسے گھما کر ایک درخت سے دے مارا۔

''اوئے ماردوں گا'' مجھے سیف کی بھڑک سنائی دی۔ وہ دو افراد سے گتھم گتھا تھا۔ تبارک مجھے نظر نہیں آیا۔

پہلا امریکی اٹھ کر پھر مجھ پر جھپٹا مگر اب دو مزید سفید فام اس کے ساتھ تھے۔ وہ مجھے تر نوالہ جان کر آگے بڑھے تھے۔ ان کے انداز میں بہت اعتماد تھا۔ اس اعتماد کی غالباً دو وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ میں دیسی تھا...... دوسرے وہ امریکن ایجنسی کے تربیت یافتہ لوگ تھے اور لڑائی کی اعلیٰ ترین تکنیک جانتے تھے، ان کی پہلی بات تو یقیناً درست تھی کہ میں دیسی تھا لیکن دوسری بات درست نہیں تھی۔ لڑائی کی تکنیک میں، میں ان سے کہیں آگے تھا۔ میں نے چند سیکنڈ میں ان کو ناکوں چنے چبوا دیے۔ ایک کی ٹانگ ٹوٹ گئی اور دوسرا ڈھلوان پر لڑھک کر چالیس پچاس فٹ نیچے چلا گیا۔ تیسرے شخص نے میری ٹانگ پر فائر کرنا چاہا لیکن تب

تک میں بھی اپنے گلے میں جھولتے ہوئے مشین پسٹل پر گرفت مضبوط کر چکا تھا۔ میری چلائی ہوئی گولی امریکی کی گردن چیر کر گزر گئی۔

یہی وقت تھا جب ہم سب تیز روشنیوں میں نہا گئے۔ بالکل یہی لگا کہ دن نکل آیا ہے۔

''ہینڈز اَپ...... ہینڈز اَپ......'' کئی آوازیں سنائی دیں۔

سیف کے ہاتھ میں چھرا تھا اور اس نے چھریرے بدن والے ایک گرے فوجی کو عقب سے جکڑا ہوا تھا۔ چمکتا ہوا تیز دھار چھرا فوجی کی گردن پر تھا۔ فوجی نے دیگر حملہ آوروں کی طرح سیاہ عینک لگا رکھی تھی اور وہ رینک کے اعتبار سے گرے فورس کا لیفٹیننٹ نظر آتا تھا۔ اسی دوران میں ہمارے عقبی درختوں میں بھی کئی طاقتور سرچ لائٹس روشن ہو گئیں۔ مطلب صاف تھا کہ ہم گھیرے میں آچکے ہیں۔ گھیرنے والے تاریکی میں تھے اور ہم جیسے دن کی روشنی میں نہائے ہوئے تھے۔

جس امریکی کی گردن پر میری نائن ایم ایم پسٹل کی گولی لگی تھی، وہ بے سدھ پڑا تھا مگر سانس لے رہا تھا۔ خون کی ایک چوڑی لکیر گھاس کی پتیوں اور کنکروں کو پھلانگتی چلی جا رہی تھی۔ اس نیم مردہ کے چہرے پر بھی عینک تھی۔ اب یہ بات سمجھ میں آرہی تھی کہ یہ امریکی تاریکی کے باوجود اتنی تیزی سے ہم تک کیسے پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے ''اینٹی ڈارک'' چشمے لگا رکھے تھے۔ اس کے علاوہ دیگر لوازمات، بلٹ پروف جیکٹس، ہیلمٹس، ہیڈ فونز، کیپ لائٹس سب کچھ ان کے جسموں پر سجا ہوا تھا۔ سپر پاور کے 'سپر' لوگ......

اب وہ چاروں طرف سے دہاڑ رہے تھے۔ ''ہتھیار پھینک دو...... اوندھے منہ لیٹ جاؤ...... اپنے ہاتھوں کو اپنے جسموں سے دور رکھو۔''

یقینی بات تھی کہ تاریکی میں درجنوں رائفلیں ہماری طرف اٹھی ہوئی ہیں۔ سیف نے میری طرف دیکھا اور اس نے گرے فوجی پر اپنی آہنی گرفت کچھ اور مضبوط کر دی، اس کے ساتھ ہی اس کی سیاہی مائل گردن پر اپنے چھرے کا دباؤ بڑھا دیا۔ لیکن وہ بے چارہ جانتا نہیں تھا کہ اس ایک گرے لیفٹیننٹ کی یہاں کوئی اہمیت نہیں ہے، ہم اس کی موت کا ڈراوا دے کر اپنی طرف بڑھنے والے دشمنوں کو روک نہیں سکتے تھے۔ وہ درجنوں میں تھے اور انہوں نے اپنی انگلیاں ٹریگرز پر رکھی ہوئی تھیں۔ وہ ہم دونوں کو فوری طور پر نہ بھی مارتے تو بری طرح زخمی کر سکتے تھے۔

''ہتھیار نیچے...... ہاتھ اوپر...... اوندھے لیٹ جاؤ۔'' کوئی امریکی آفیسر گرجا۔ ان کی آوازوں سے پتا چل رہا تھا کہ وہ گھیرا تنگ کرتے جا رہے ہیں۔

میں نے سیف کو اشارہ کیا۔ اس نے گرے لیفٹیننٹ کو چھوڑ دیا۔ لیفٹیننٹ نے سیف کو انگلش میں گالی دی اور چند قدم پیچھے ہٹ کر اپنا سروس پستول نکال کر مجھ پر دہاڑا۔ ''اپنا پسٹل گلے سے اتار کر دور پھینکو...... اوندھے لیٹ جاؤ...... جلدی کرو۔''

فی الحال ہدایات ماننے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ میں نے MAC10 پسٹل گلے سے اتار کر دور پھینک دیا اور اوندھا لیٹ گیا۔ تھوڑی سی پس و پیش کے بعد سیف نے بھی میری تقلید کی۔ زمین سنگلاخ اور ٹھنڈی تھی۔ ہمارے گرد گھیرا مزید تنگ ہو گیا۔ روشنیاں ہمیں فوکس کرنے لگیں۔

''اپنے ہاتھ موڑ کر پشت پر رکھو، ہیڈ ڈاؤن...... سیدھے لیٹے رہو۔'' امریکی لہجے کی گرجدار آوازیں پھر سنائی دیں۔

میں نے ہاتھ پیچھے موڑے۔ کلائیوں پر سرد لوہے کا لمس محسوس ہوا۔ ہمیں ہتھکڑیاں پہنائی جا رہی تھیں۔

کیپٹن تبارک کی کراہ سنائی دی۔ اس کراہ سے کم از کم یہ اطمینان تو ہوا کہ وہ زندہ ہے۔ کڑک دار فوجی آوازوں سے پتا چلتا تھا کہ اسے بھی ہتھکڑی پہنائی جا رہی ہے۔

ایک امریکن اپنی ٹانگیں چوڑی کیے میرے اوپر کھڑا تھا۔ اس نے میرے سر کے عقبی بالوں کو اپنی سخت مٹھی میں جکڑا اور پھنکارا۔ ''تمہارے باقی ساتھی کہاں ہیں۔ جلدی بتاؤ...... ورنہ شوٹ کروں گا۔''

میں اوندھا لیٹا تھا۔ مجھے اس کی منحوس شکل نظر نہیں آ رہی تھی اور یہ اچھا ہی تھا ورنہ ہو سکتا تھا کہ میں اپنے طیش کو سنبھال نہ سکتا اور اس کے چہرے کو اگالدان کے طور پر استعمال کر گزرتا۔ اس نے میرے سر کو دو تین بار سخت زمین پر پٹخا اور پھر پسلیوں میں ٹھوکریں رسید کرنے لگا۔ دو تین امریکی سیف کو بھی مار رہے تھے اور اس سے باقی ساتھیوں کا پوچھ رہے تھے۔ درختوں میں چاروں طرف سرچ لائٹس اور طاقتور ٹارچیں گردش کرنے لگی تھیں۔ وہ لوگ باقی افراد کو ڈھونڈ رہے تھے۔ ان کی تعداد ہماری توقع سے کہیں زیادہ تھی۔ کم و بیش چالیس افراد تو ہمیں یہاں نظر آ رہے تھے۔ یقینی بات تھی کہ کچھ خیموں میں بھی ہوں گے اور دو چار ان بوٹس کے پاس بھی جن پر یہ لوگ یہاں پہنچے تھے۔ ہر طرف ان کے للکارے گونجتے محسوس ہوتے تھے۔ شکر کا مقام تھا کہ ہم سلائیڈنگ پتھر سے قریباً ڈیڑھ سو میٹر کے فاصلے پر تھے اور یہاں اَن گنت پتھر تھے اور چٹانیں تھیں۔ اگر یہ لوگ سلائیڈنگ پتھر کے بارے میں کوئی آئیڈیا رکھتے بھی تھے تو اسے ڈھونڈنا جوئے شیر لانے کے برابر تھا۔

ایک اسٹریچر وہاں پہنچ چکا تھا۔ کیپٹن تبارک کو اسٹریچر پر لٹا دیا گیا۔ مجھے اور سیف کو گن پوائنٹس پر خیموں کی طرف دھکیلا جانے لگا۔

○......❖......○

ہم کو ایک بڑے خیمے میں لایا گیا تھا۔ اب دن کا ہلکا ہلکا اجالا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ دن امید کی روشنی لے کر آتا ہے مگر یہ دن ہمارے لیے بے حد سختی لے کر آیا تھا۔ میں اور سیف خیمے میں اوندھے پڑے تھے۔ تبارک اسٹریچر پر تھا۔ اس اونچی چھت والے خیمے کو درجنوں مسلح سپاہیوں نے گھیر رکھا تھا۔ جو تین چار امریکی گارڈز ہمارے ساتھ لڑائی میں زخمی ہوئے تھے ان میں دو کی حالت تشویشناک تھی۔ انہیں طبی امداد کے لیے فوراً جاماجی کی طرف روانہ کر دیا گیا تھا۔ ان کی روانگی کا پتا ایک اسپیڈ بوٹ کی آواز سے چلا تھا جو ٹاپو کے کنارے سے جاماجی کی طرف روانہ ہوئی تھی۔

ایک ہٹا کٹا امریکن جو سیکیورٹی ایجنسی کا آفیسر تھا۔ میرے عین سامنے کرسی ڈال کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کے حکم پر دو رائفل مینوں نے مجھے اٹھا کر فرش پر بٹھا دیا۔ ہلکی نیلی آنکھوں والے آفیسر نے بڑی جگر پاش نظروں سے مجھے دیکھا اور بولا۔ ''ایم ایم اے کا اتنا بڑا فائٹر اور اس حال میں۔ تمہاری بدبختی پر رونا آرہا ہے۔ بہتر ہوتا کہ اس طرح پکڑے جانے کے بجائے تم ڈی پیلس پر ہونے والی لڑائی میں ہی ٹھکانے لگ گئے ہوتے۔''

''موت کا وقت مقرر ہے، وہ پہلے کیسے آجاتی؟'' میں نے کہا۔

''لیکن اب موت کی توقع نہ رکھو۔ وہ اتنی آسانی سے نہیں ملے گی۔'' وہ زہرخند لہجے میں بولا۔ چند لمحے خاموش رہ کر کرسی پر بیٹھا بیٹھا آگے کو جھکا اور گمبھیر لہجے میں کہنے لگا۔ ''میرا ایک بڑا ہمدردانہ مشورہ ہے تم کو۔ جو جو کچھ تم سے پوچھا جائے بتاتے چلے جاؤ۔ ورنہ بڑا سخت عذاب جھیلنا پڑے گا۔ جو بندہ تم سے پوچھ گچھ کے لیے آرہا ہے وہ پیدائشی ظالم ہے۔ آنکھوں آنکھوں میں بندے کی جان کھینچ لیتا ہے......''

ابھی آفیسر کا فقرہ مکمل ہوا ہی تھا کہ بھیڑیے جیسے چہرے والا ایک گرانڈیل امریکن اندر داخل ہوا۔ اس کا قد ساڑھے چھ فٹ سے بھی نکلتا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جیسے آگ سی روشن تھی۔ وہ ٹانگیں چوڑی کر کے ہم تینوں کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اپنی انگلیوں کے پٹاخے نکالے اور مجھے گھور کر نہایت زہریلے لہجے میں بولا۔ ''تو تم ہو جس نے ڈی پیلس کے سامنے آقا جان کو تھپڑ مارا تھا۔''

کرسی پر بیٹھے آفیسر نے کہا۔ ''بے شک یہی ہے۔''

گرانڈیل امریکن بولا۔ ''بہت بھاری قیمت چکانا پڑے گی اسے۔ اس کی آنے والی سات پشتوں میں بھی کوئی اس طرح کی حرکت نہیں کرے گا اور ہو سکتا ہے کہ ان کی مائیں صرف ٹنڈے پیدا کریں جو کسی کو تھپڑ مارنے کے قابل ہی نہ ہوں۔'' اس کی آنکھیں ہی نہیں پورا چہرہ جیسے شعلوں کی آنچ پر تھا۔ اپنی توانا گردن گھما کر اس نے اردگرد دیکھا۔ جیسے درندہ، کسی ریوڑ کے پیچھے بھاگتے ہوئے، اپنے شکار کے لیے کمزور جانور چن لیتا ہے اس نے کیپٹن ڈاکٹر تبارک کو چن لیا۔ وہ ایکشن میں آنے والا تھا اس لیے نیلی آنکھوں والا آفیسر اور دیگر افراد خیمے سے باہر نکل گئے۔ خیمے میں صرف ہم تینوں یعنی میں، سیف اور کیپٹن تبارک رہ گئے۔ گرانڈیل آفیسر ٹانگیں کھولے ہمارے سامنے کھڑا تھا اور اس کے عقب میں اس کے ساتھ آنے والے دو مسلح اہلکار تھے۔ یہ خیمہ باہر سے بھی کڑے پہرے میں تھا۔ فضا میں ہیلی کاپٹرز کی پھڑ پھڑاہٹ سنائی دینے لگی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ ہر طرف گھنٹیاں بج گئی ہیں اور اب اس سنسان ٹاپو کی ''رونق'' میں گوناگوں اضافہ ہونے والا ہے۔

وہ کیپٹن تبارک کے عین سامنے پہنچ کر بولا۔ ''میرا نام تو جیک ہے لیکن مجھے پیار سے لوگ ہٹلر کہتے ہیں اور یہ بھی بتا دوں کہ ہٹلر میرے سامنے پانی بھرتا ہے۔'' اس کے لہجے میں واقعی کسی خونخوار جانور جیسی دہشت ناکی تھی۔

اسٹریچر پر لیٹا ہوا تبارک بس کراہ کر رہ گیا۔ لونگ ہٹلر یعنی لمبے ہٹلر نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''تم حرام زادے تو ہو ہی غدار بھی ہو۔ گرے فورس کے درمیان رہ کر ہی گرے فورس کی جڑیں کاٹتے رہے ہو۔ جاسوسی کرتے رہے ہو اور جاسوس کی سزا کچھ اور کڑی ہو جاتی ہے۔ کیا خیال ہے اس سزا تک پہنچنا چاہتے ہو یا پہلے ہی کچھ بتا دو گے۔''

''تم کیا پوچھ رہے ہو؟'' تبارک نے اپنی اذیت دباتے ہوئے کہا۔

''بڑا آسان سوال ہے۔ آدم کی بیٹی قسطینا، ریان فردوس کا بیٹا ابراہیم، وہ افغانی چرغہ فارس جان اور باقی بھگوڑے کہاں ہیں؟''

''وہ یہاں نہیں ہیں، وہ جا چکے ہیں۔''

''تو پھر کس ماں کی گود میں گھس کر بیٹھے ہوئے ہیں؟''

''مجھے نہیں پتا...... ہم تینوں میں سے کسی کو نہیں پتا...... ہم...... ٹاپو کے اس حصے میں آئے تھے...... مم...... میں کھائی میں گر گیا...... یہ لوگ مجھے نکالتے رہے...... وہ ہنگامی طور پر یہاں سے چلے گئے۔''

''تمہیں پیدا کرنے والی یقیناً کسی ''بہت بڑے جھوٹے'' کے ساتھ سوتی رہی ہے۔'' وہ

اپنے وزنی بوٹ سے تبارک کے سر پر ٹھوکر لگا کر بولا۔ ''تم بھگوڑے جس لانچ پر یہاں پہنچے تھے وہ ہم نے ڈھونڈ لی ہے اور وہ یہیں پر موجود ہے۔''

''ہمارے پاس دو لانچیں تھیں۔'' تبارک نے حاضر دماغی سے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے، تمہاری بات مان لی۔ دو لانچیں موجود تھیں اور جب باقی بھگوڑوں کو پتا چلا کہ ہم آ رہے ہیں تو وہ ہنگامی طور پر یہاں سے نکل گئے لیکن میرے چاند! میرے ہیرے، مجھے یہ بتاؤ کہ تم لوگوں کے پاس واکی ٹاکی تھے۔ انہوں نے تمہیں اطلاع نہیں کی کہ ہم رفو چکر ہو رہے ہیں۔''

''یہاں...... پر...... سگنل آنے بند ہو گئے تھے۔'' تبارک نے پھر حاضر دماغی کا مظاہرہ کیا۔

''تمہارا مطلب ہے کہ وہ جگہ یہاں سے دور ہے لیکن میرے چاند! اس جگہ کا پتا تو تمہیں بتانا ہو گا تاکہ ہم وہاں کی زیارت کر کے اپنی آنکھوں کو ٹھنڈک دے سکیں کہ ہاں یہ ہے وہ مقام جہاں آدم کی بھگوڑی بیٹی نے قیام فرمایا تھا۔''

تبارک نے کہا۔ ''وہ ہم سب کے لیے قابلِ احترام ہیں، تم لوگ ان کا نام تمیز سے لو۔''

''وہ ایک بار مل جائے...... پھر ''سب کچھ'' تمیز سے ہی کریں گے۔'' لونگ ہٹلر معنی خیز انداز میں بولا اور ایک مزید ٹھوکر تبارک کے سر پر رسید کی۔

صورتِ حال بگڑتی جا رہی تھی۔ لونگ کے اشارے پر ایک شخص باہر سے آیا اور تبارک کی شدید زخمی ٹانگ پر کچھ باندھنا شروع کر دیا۔ ٹانگ اوٹ میں تھی مجھے نظر نہیں آ رہا تھا کہ تبارک کو کس طرح کی ''ٹریٹ منٹ'' دی جا رہی ہے۔ قریباً ایک منٹ بعد جب وہ شخص اپنی جگہ سے اٹھا تو لونگ ہٹلر کی صحیح سفاکی کھل کر سامنے آئی۔ یہ سب کچھ واقعی بدترین بربریت کے زمرے میں آتا تھا۔ تبارک کے ٹخنے سے نائیلون کی موٹی رسی باندھی گئی تھی۔ یہ وہی رسی تھی جس کی مدد سے کچھ دیر پہلے ہم نے تبارک کو کھائی سے نکالا تھا۔

دراز قد امریکن کے اشارے پر دو افراد تبارک کو رسی کی مدد سے گھسیٹتے ہوئے خیمے سے باہر لے گئے۔ تبارک بے حد قوتِ برداشت کے باوجود ذبح ہونے والے جانور کی طرح چلا اٹھا تھا۔ اسے خیمے کے عین سامنے ایک درخت سے الٹا لٹکا دیا گیا۔ خیمے کے کھلے ہوئے دَر سے مجھے اور سیف کو سب کچھ صاف نظر آ رہا تھا۔ سورج کی روپہلی کرنوں میں تبارک کے تڑپنے پھڑکنے کا منظر دردناک تھا۔ وہ زخمی ٹانگ جس کو بے حد احتیاط اور علاج کی ضرورت تھی، تبارک کے جسم کا سارا بوجھ سہارے ہوئے تھی۔ وہ اذیت کی انتہا کو چھو رہا تھا۔ جیک

عرف لونگ کے حکم پر دو گرے فوجیوں نے اپنی بھاری بھرکم چرمی پیٹیاں اتار لیں اور تبارک کو اندھا دھند پیٹنے لگے۔ ایک منٹ کے اندر اندر وزنی بکلز نے تبارک کو لہولہان کر دیا۔ نیچے گھاس سرخ دکھائی دینے لگی۔

لونگ ہٹلر بار بار معروف انگلش گالی بک رہا تھا اور تبارک سے پوچھ رہا تھا۔ ''کہاں ہے تمہاری ماں...... کہاں ہے تمہارا باپ؟''

ماں سے مراد قسطینا اور باپ سے مراد ابراہیم تھا۔ شاید تبارک بھی اب جان گیا تھا کہ جان بچنا مشکل ہے۔ جب لونگ نے اسے تیسری بار ''غدار حرامی'' کہا تو وہ چلا اٹھا۔ ''غدار میں نہیں تم ہو...... تم ہو سفید سؤر! تم لوگ یہاں عزت مآب کی فیملی کی سیکیورٹی دینے آئے تھے۔ ان کے ٹکڑوں پر پلتے رہے اور انہی پر چڑھ دوڑے۔ لالچ اور ہوس نے تمہیں اندھا ہی نہیں کیا، بے غیرت بھی بنا ڈالا۔ تم دنیا میں جہاں جاتے ہو، یہی کرتے ہو...... یہی کرتے ہو..... حرام تمہارے خون میں شامل ہے۔''

اب ''لونگ'' خود بھی بہیمانہ تشدد میں شامل ہو گیا۔ وہ الٹے لٹکے کیپٹن تبارک کے سر اور چہرے کو اپنے وزنی بوٹ کی ٹھوکروں سے لہولہان کرنے لگا...... وہ دہاڑا۔ ''اپنے ساتھیوں کا بتاؤ ورنہ اسی جگہ تمہاری ہوا پرواز کر جائے گی۔''

''نہیں بتاؤں گا...... میرے جسم کا ایک ایک ریشہ الگ کر دو گے تو بھی نہیں بتاؤں گا...... اپنی زمین کے لیے...... اپنے جاماجی کے لیے ایک نہیں سو جانیں بھی قربان ہیں۔'' وہ سینے کی پوری قوت سے پکارا۔

میں نے اس کے ایک ٹوٹے ہوئے دانت کو زمین پر گرتے ہوئے صاف دیکھا۔ اس کی ٹھوڑی کا گوشت پھٹ کر لٹک رہا تھا۔

ہاں مجھے ٹھیک ہی بتایا گیا تھا۔ بن مشہد اور تبارک وغیرہ پاسبان بریگیڈ کے سخت جان ترین لوگوں میں سے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو وردی یا تنخواہ کے لیے نہیں اپنے جذبات...... اپنے سچے کھرے احساسات کے لیے کام کرتے تھے۔ ایسے لوگ کسی بھی جگہ ہوں، کسی بھی ادارے سے منسلک ہوں، قابلِ فخر ہوتے ہیں۔

مجھے اور سیف کو ابھی تک کچھ نہیں کہا گیا تھا۔ شاید یہ بھی ان لوگوں کی حکمتِ عملی ہی تھی۔ ہمیں اپنے ساتھی کا دردناک انجام دکھایا جا رہا تھا اور ہمیں اندر سے توڑنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ اب ہمارے پاؤں کو بھی ''کیبل ٹائی'' کی مدد سے کسا جا چکا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اس ٹاپو پر ہیلی کاپٹرز کا اترنا ممکن نہیں وہ ہوا میں ہی پھڑ پھڑا رہے تھے تاہم پانی کے راستے

سے لانچیں اور اسپیڈ بوٹس یہاں پہنچنا شروع ہو گئی تھیں۔ مجھے اپنے اردگرد نئے چہرے نظر آ رہے تھے۔ تمتمائے ہوئے سفاک چہرے۔ ان چہروں کے تاثرات گواہی دے رہے تھے کہ آنے والی گھڑیاں ہمارے لیے بے حد سخت ہیں۔

سیف نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''استاد صاحب! میں ایک بار پھر معافی مانگتا ہوں۔''

''معافی کس بات کی؟'' میں نے کہا۔ ''جو کچھ ہوا ہے تمہاری وجہ سے نہیں ہوا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جو ہُوا ہے اس کی وجہ سے تم بھی پھنس گئے ہو۔''

سیف باہر نظر دوڑاتا ہوا بولا۔ ''یہ تو بہت زیادہ لوگ ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ قسطینا بی بی اور کمانڈر فارس وغیرہ ہماری مدد کرنے کا سوچ کر باہر نکل آئیں؟''

''اللہ کرے کہ وہ اس طرح نہ سوچیں۔'' میں نے بھی سرگوشی میں کہا۔ ہم اردو بول رہے تھے اس بات کا امکان نہیں تھا کہ دس پندرہ قدم دور کھڑے مسلح امریکن ہماری بات سن لیں گے۔

سیف نے کہا۔ ''فائرنگ کی آوازیں تو انہوں نے یقیناً سن ہی لی ہوں گی اگر انہوں نے پتھر کو نیچے سے ''روک'' لگالی ہے تو پھر اس کو کھسکایا تو بالکل نہیں جا سکے گا۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ایک امریکن رائفل مین ٹہلتا ہوا چند قدم آگے آ گیا تھا۔ ہم دونوں پر عقابی نظر رکھی جا رہی تھی اور ہر ہر حرکت کو نوٹ کیا جا رہا تھا۔

خاموش ہو جانے کے باوجود سیف کی آنکھوں میں ایک سوال تھا۔ کیا ہم کیپٹن تبارک کے لیے کچھ کر سکتے ہیں؟ جواب نفی میں تھا۔ کم از کم فی الحال تو نفی میں تھا۔ کچھ کرنے کا سوچنا ایسے ہی تھا جیسے خودکشی کا سوچا جائے۔ اسی دوران میں گرے فورس کا ایک ملائیشین میجر تیز قدم اٹھاتا ہوا جیک عرف لونگ کے پاس پہنچا۔ اس نے انگلش میں کہا۔ ''نو سر! ابھی تک کوئی کھوج نہیں ملا۔ زمین بھی گھاس والی ہے یا پھر پتھریلی ہے۔ قدموں کے نشان ملنا بھی مشکل...... بلکہ ناممکن ہیں۔''

''ناممکن کا لفظ کم ہی استعمال کیا جائے تو اچھا ہے۔'' بلند قامت لونگ نے زہریلے لہجے میں کہا۔

میجر نے اپنا سیل فون لونگ کی طرف بڑھایا اور اس پر موجود کچھ ڈیٹا لونگ کو دکھایا اس ڈیٹا کا تعلق کیپٹن تبارک سے ہی تھا۔ تبارک کے سارے کوائف اور سروس ریکارڈ وغیرہ۔ لونگ بلند آواز سے پڑھتا گیا۔ تبارک کی فیملی کی کچھ تصاویر بھی اس ڈیٹا میں موجود تھیں۔

فاصلے کے باوجود میری نگاہ ان تصاویر تک پہنچ رہی تھی۔
تبارک کی حالت اب ناگفتہ بہ تھی۔ اس کے بالائی جسم پر صرف ایک بنیان تھی اور یہ سفید سے سرخ رنگ میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اس کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ اس بری طرح کھچی ہوئی تھی کہ اپنی اصل لمبائی سے قریباً ایک فٹ بڑی نظر آتی تھی۔ یہ بڑا ہولناک منظر تھا اور اسے نظر بھر کر دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ کیپٹن تبارک اب نیم بے ہوشی کی سی کیفیت میں تھا۔ اس کا جوان خون مسلسل سبز گھاس پر ٹپک رہا تھا اور پھیل رہا تھا۔ وہ آہنی برداشت رکھتا تھا مگر جیسے ''لونگ'' نے ابھی کہا تھا کہ ''ناممکن'' کا لفظ ٹھیک نہیں...... کیا کہا جا سکتا تھا کہ سب کچھ اتنا کرب ناک ہو جاتا کہ تبارک کی برداشت سے باہر ہو جاتا۔
میجر سے ناکامی کی اطلاع ملنے کے بعد لونگ کا پارہ کچھ اور چڑھ گیا اس نے اشارہ کیا اور چار بپھرے ہوئے امریکی گارڈز نے اندر آ کر مجھے اور سیف کو بیلٹس اور ٹھوکروں سے بے طرح پیٹنا شروع کر دیا۔ باہر تبارک پر بھی ایک بار پھر بے رحم ہلا بول دیا گیا تھا۔ میں ایسی چوٹوں کا ہمیشہ سے عادی تھا مگر سیف بری طرح کراہ رہا تھا۔ ردِعمل کے طور پر اس نے امریکی گارڈز پر اپنی بندھی ہوئی ٹانگیں بھی چلائیں اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسے زیادہ بے دردی سے مارا گیا۔ اس کے ناک منہ سے خون جاری ہو گیا اور رخسار پر بھی گہری چوٹ آئی۔
لونگ کے اشارے پر ہمیں پیٹنے والے باہر چلے گئے۔ شاید لونگ ابھی اپنی ساری توجہ کیپٹن تبارک پر ہی مرکوز رکھنا چاہتا تھا۔ تبارک کی ٹھوڑی کی کھال اب کئی انچ نیچے لٹک رہی تھی اور ایک سرخ جھالر کا منظر پیش کرتی تھی۔ وہ منہ میں کچھ بڑبڑا رہا تھا شاید پڑھ رہا تھا۔
لونگ نے زہرخند لہجے میں کہا۔ ''جنت میں جانے کا بہت شوق ہوتا ہے نا تم لوگوں کو۔ امید ہے کہ آج ہی جنت کا دروازہ کھل جائے گا تمہارے لیے۔ بس ابھی ایک دو گھنٹے کے اندر۔''

اس نے ایک بار پھر تبارک سے کچھ پوچھا جس کا جواب اس نے چٹانی خاموشی سے دیا۔ سیل فون لونگ کے ہاتھ میں تھا۔ اس میں کیپٹن تبارک کا ڈیٹا تھا اور یقیناً اس کی فیملی کی تصویریں بھی...... لونگ پنجوں کے بل...... الٹے لٹکے ہوئے تبارک کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے تبارک کو ایک تصویر دکھا کر کوئی بے ہودہ بات کی۔ یقیناً یہ بات اتنی ہی بے ہودہ ہو گی کہ نیم جان تبارک برداشت نہیں کر سکا۔ اس نے لونگ کے منہ پر تھوک دیا۔ شعلہ صفت لونگ کا پارہ ایک دم ساتویں آسمان کو چھو گیا۔ اس نے جواباً تبارک کے منہ پر تھوکا۔ ''باسٹرڈ...... باسٹرڈ۔'' وہ چلایا۔

پھر اس نے دو قدم پیچھے ہٹ کر اپنے سروس پسٹل کی چار گولیاں تبارک کے سر اور سینے میں اتار دیں۔ الٹا لٹکا ہوا کیپٹن تبارک کا جسم تین چار بار اچھلا اور پھر ذرا سے اینٹھ کر ساکت ہو گیا۔ اس کے بچے کھچے خون کی دھاریں سرسبز گھاس کو بھگونے لگی تھیں۔

ہم نے جی جان سے جینا ہے
اور سینہ تان کے جینا ہے
ہم جاتے اندھیرے تک لڑیں گے
اور سچے سویرے تک لڑیں گے
اور اگر ہم واپس نہ آسکے
تو ہمارے بچوں سے کہنا
ہم سرخرو ہوئے

ابھی تھوڑی دیر پہلے لونگ نے تبارک کی موت کے حوالے سے ایک دو گھنٹے کی بات کی تھی لیکن ایک دو منٹ بعد ہی وہ زندگی کی سرحد پار کر گیا تھا۔ اس نے ٹھیک ہی کہا تھا، موت کا وقت مقرر ہے۔

میں غم و اندوہ کی شدت سے جیسے چیخ کر رہ گیا اور شدید اضطرابی کیفیت میں چلایا۔
''دیکھو لونگ اتنا ظلم کرو جتنا سہہ سکو۔ تمہیں بھگتنا پڑے گا...... بھگتنا پڑے گا......''

لونگ نے بھنا کر پستول میری طرف سیدھا کیا...... اور باقی کی چار گولیاں مجھ پر داغ دیں۔ دھماکوں سے فضا لرز اٹھی۔ یہ گولیاں میرے سر کے بالوں اور چہرے کے آس پاس سے گزریں، اور خیمے کی دہری پرت میں سوراخ کرتی ہوئی نکل گئیں۔ ظاہر ہے کہ آفیسر لونگ کا نشانہ اتنا کچا نہیں تھا۔ وہ فی الحال مجھے صرف دہشت زدہ کرنا چاہتا تھا۔

باہر سے آنے والی آوازوں سے پتا چلتا تھا کہ پورے ٹاپو پر قسطینا، ابراہیم اور کمانڈر فارسن وغیرہ کی تلاش جاری ہے۔ اب لونگ کی قہرناک نگاہیں سیف پر مرکوز تھیں۔

جیسے کسی بہت سنسنی خیز میچ میں پھنسی ہوئی ٹیم کا بیٹسمین آؤٹ ہوتا ہے تو اگلے بیٹسمین کے سینے میں دھڑکن کے گولے پھٹنے لگتے ہیں کیونکہ اب اسے گراؤنڈ میں اور پچ پر جانا ہوتا ہے۔ کچھ یہی کیفیت شاید سیف بھی محسوس کر رہا تھا۔ اسے اب تفتیش کے میدان میں بدترین ٹارچر کی پچ پر جانا تھا۔

میرے سخت احتجاج کے باوجود قریباً پندرہ منٹ بعد کیپٹن تبارک کی جگہ سیف درخت سے الٹا لٹکا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اسے دونوں ٹانگوں سے باندھ کر لٹکایا گیا تھا...... اور اس

کے ہاتھ پشت پر ہتھکڑی میں جکڑے ہوئے تھے۔ سیف انگلش نہیں بول سکتا تھا لہٰذا تفتیش میں مدد دینے کے لیے ایک اردو بولنے والا بھی موجود تھا۔ یہ گرے فورس کا ایک انڈین اردلی تھا۔ لونگ نے سیف سے بھی وہی سوال کیا جو کچھ دیر پہلے تبارک سے کیا جاتا رہا تھا۔ اس کے بعد اس پر تشدد کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس پر بے تحاشا بیلٹس برسائی گئیں پھر اس کے گوشت کو پلاس کی مدد سے نوچا جانے لگا۔ یہ اتنا تکلیف دہ عمل تھا کہ سیف کی کربناک آہ و بکا دور دور تک گونجنے لگی۔

میں نے آنکھیں بند کر لی تھی مگر کان تو کھلے تھے اور کانوں میں انگلیاں میں اس لیے نہیں ٹھونس سکتا تھا کہ ہاتھ پشت پر جکڑے ہوئے تھے۔ یہ آوازیں سننے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے حالات نے کس بری طرح ہمیں جکڑا تھا۔ لانچ کو کنارے سے ہٹائے جانے کا فیصلہ قسطینا نے سب کے مشورے سے کیا تھا...... مگر شاید یہ فیصلہ اتنا درست نہیں تھا یا شاید فیصلہ تو درست تھا مگر قسطینا کو یہ توقع نہیں تھی کہ تلاش کرنے والے اتنی جلدی اس ٹاپو پر بھی چلے آئیں گے۔ تبارک اور بن مشہد لانچ کو یہاں سے روانہ کرنے کے لیے نکلے تھے اور نتیجہ یہ ہوا تھا کہ تبارک حادثاتی طور پر کھائی میں گر گیا۔ تبارک کا باہر رہنا شدید خطرے کی علامت تھا۔ اسے بے پناہ اذیت سے نکالنے اور واپس پناہ گاہ میں لانے کے لیے میں باہر آیا تھا...... اور میرے پیچھے سیف نے باہر آنے کی غلطی کی...... اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ بھی سراسر حالات کی کارفرمائی تھی۔ جب ہم زخمی تبارک کو لے کر پناہ گاہ کی طرف جانے والے تھے یہ لوگ ہماری موجودگی سے آگاہ ہو گئے تھے اور اب یہاں کیل کانٹے سے لیس بے شمار گرے فوجی اور ایجنسی کے گارڈز جمع ہو چکے تھے۔ کوسٹل گارڈز نے ٹاپو کو گھیر لیا تھا۔ اس صورتِ حال میں قسطینا اور باقی ساتھیوں کی دانشمندی ہی تھی کہ انہوں نے باہر آنے کی غلطی نہیں کی تھی۔ یقیناً انہوں نے اپنے واکی ٹاکیز بھی بند کر دیئے تھے اور مکمل خاموشی اختیار کر لی تھی۔

دوپہر تک سیف تقریباً نیم جان ہو چکا تھا اس کا پسینہ اور خون دھاروں کی صورت گر رہا تھا اور بالائی دھڑ پر بے شمار گہرے نیل اور چھوٹے بڑے زخم تھے۔ ایک حد تک جا کر انسان کی اذیت بھی اس کا ساتھ چھوڑنے لگتی ہے مگر تشدد کرنے والے اذیت کی حس کو برقرار رکھنے کے لیے نت نئے طریقے ڈھونڈ لیتے ہیں۔ سیف کے زخموں پر محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً نمک چھڑکا گیا...... اور پلاس سے جسم کے مختلف حصوں کو نوچا گیا۔ ایک دومرحلے پر مجھے محسوس ہوا کہ اس

کی قوتِ برداشت جواب دے جائے گی اور وہ کچھ نہ کچھ بول دے گا۔ ایسے ہی ایک مرحلے پر میں نے وحشیانہ خصوصیات رکھنے والے لونگ کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ میں نے اس سے کہا کہ میں اسے کچھ بتانا چاہتا ہوں۔

''شرط یہ ہے کہ جھوٹ نہیں بولو گے۔'' وہ زہری ناگ کی طرح پھنکارا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اور وقت گزارنے کی کوشش بھی نہیں کرو گے۔''

میں نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔ حالانکہ دونوں مرتبہ میں نے غلط سر ہلایا تھا۔

''کہاں ہے بھگوڑی، اور باقی بھگوڑے؟'' لونگ نے میرے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس کی شکل ہی نہیں، اس کی ساری خوبو بھیڑیے والی تھی۔ بھیڑیا جو شکار کو زندہ ہی نوچ لیتا ہے۔

میں نے کہا۔ ''سیف ٹھیک بتا رہا ہے۔ وہ لوگ دوسری لانچ پر یہاں سے نکل گئے ہیں۔''

''کہاں گئے ہیں؟''

''برونائی کی طرف۔''

اس نے میرے منہ پر زناٹے کا تھپڑ مارا۔ ''بکواس کرتے ہو تم۔ سارے راستوں کی نگرانی ہو رہی ہے۔ آبی مخلوق کے علاوہ ہر چیز کو چیک کیا جا رہا ہے۔'' وہ پھنکارا۔

میرے منہ میں خون کا نمکین ذائقہ گھل گیا تھا۔

اس کے ساتھ ہی وہ باہر نکلا اور ایک بار پھر سیف پر پل پڑا۔ اس کے ماتحت بھی اس کا ساتھ دینے لگے۔ مارا تو سیف کو جا رہا تھا مگر اذیت کی انتہا کو میں چُھو رہا تھا۔ وہ میرے لیے یہاں تھا۔ غلط تھا یا صحیح تھا مگر اس کے یہاں ہونے کی وجہ میں تھا۔ ڈھائی تین بجے کے لگ بھگ سیف بے ہوش ہو گیا۔ کبڈی کے میدان کا نامور گھبرو کھلاڑی کسی چیتھڑے کی طرح درخت سے الٹا لٹک رہا تھا۔ اب وہ لوگ اسے مزید اذیت نہیں دے سکتے تھے اس لیے اسے نیچے اتار کر کچھ طبی امداد دی گئی۔

کچھ دیر بعد وہ ہوش میں تو آ گیا لیکن نیم جان تھا۔ دو گرے فوجی اس کی بغلوں کے نیچے گھس گئے اور اسے کھینچتے ہوئے خیمے کے اندر لے آئے۔ وہی نیلی آنکھوں والا امریکی آفیسر اندر داخل ہوا جس نے مجھے مخلصانہ مشورہ دیا تھا کہ لونگ کے ہتھے چڑھنے سے پہلے ہم اپنے ساتھیوں کے بارے میں بتا دیں۔ نیلی آنکھوں والے کا نام پال کورنی معلوم ہوا۔ اس

کی ہدایت پر ایک گرے فوجی نے میرے دونوں پاؤں کو باندھنے والی کیبل ٹائی کھول دی اور اس کی جگہ ایک بیڑی پہنا دی۔ اس کے بعد میرے ہاتھ پشت پر سے کھولے گئے اور آگے کی طرف بیڑی کے دوسرے سرے سے لگی ہتھکڑی میں لاک کر دیئے گئے۔ یہ بیڑی لگنے کے بعد میرے ہاتھ آگے کی طرف تو ہو گئے تھے مگر پوزیشن یہ ہو گئی تھی کہ اب میں سیدھا کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر مجھے چلنا بھی ہوتا تو چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا رکوع کی حالت میں ہی چل سکتا تھا۔ بدنام زمانہ کیمپ گانتاناموبے میں بھی عراق جنگ کے قیدیوں کو ایسے ہی چلتے پھرتے دکھایا جاتا تھا۔ ایسی ہی بیڑی سیف کو بھی پہنا دی گئی جو خیمے کے ''میٹ'' پر پشت کے بل بے سُدھ لیٹا تھا۔ اس کارروائی کے دوران میں دو رائفلیں ایک لحظے کے لیے بھی میری جانب سے نہیں ہٹی تھیں۔ دونوں رائفل مین بالکل ریڈ الرٹ رہے تھے۔ نیلی آنکھوں والا پال میرے قریب آیا اور بولا۔ ''میری سفارش پر تم دونوں کو چند گھنٹے کی مہلت دی جا رہی ہے اپنا اچھا برا ٹھیک طرح سوچ لو۔ بہت بری موت سے بچنا چاہتے ہو تو منہ کھول دو۔ اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے تم دونوں کے پاس۔''

''مشورے کا شکریہ۔''

''میری یہ باتیں چند گھنٹے بعد بہت یاد آئیں گی تمہیں۔ اول تو لونگ تم دونوں کو اتنی آسانی سے مرنے نہیں دے گا اور اگر مر بھی گئے تو جان مفت میں جائے گی تمہاری۔ آدم کی بیٹی اور اس کے ساتھیوں کو ہر صورت ہم نے اب ڈھونڈ ہی لینا ہے۔ لہٰذا ایک بار پھر مشورہ ہے بہت گندی موت سے بچ جاؤ۔''

میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی اس نے چٹکی بجائی اور اپنے ماتحت سے کہا کہ ہم دونوں کی چوٹوں کو میڈیکلی ٹریٹ کیا جائے اور ہمیں کھانے کے لیے کچھ دیا جائے۔

سیف کی حالت دیکھ دیکھ کر میرا دل رو رہا تھا۔ وہ نیم بے ہوشی میں کراہتا چلا جا رہا تھا۔ کسی وقت کچھ بڑبڑانے لگتا تھا۔ الفاظ سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ میں نے اس کا سر اونچا کر کے اسے تھوڑا سا پانی پلایا۔ اسی دوران میں ایک آرمی ڈاکٹر اپنے اسسٹنٹ کے ساتھ آن وارد ہوا۔ سیف کے جسم پر زخم تو اَن گنت تھے لیکن کچھ زخم ایسے تھے جن سے مسلسل خون رِس رہا تھا۔ اس اخراج کو روکنے کے لیے ملائیشین ڈاکٹر نے میڈیکل ٹیپ کے ذریعے آٹھ دس پٹیاں سیف کے جسم سے چپکا دیں۔ میرے ایک دو زخموں کو بھی مرہم پٹی سے نوازنے کی کوشش کی گئی لیکن میں نے انکار کر دیا۔ ''اس کی وجہ؟'' ڈاکٹر نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''ابھی اور بہت سے زخم لگنے ہیں کہاں کہاں مرہم رکھو گے۔ رہنے دو یہ ناٹک۔ میرا

لہجہ بھی طنزیہ تھا۔

ہمارے اس جہازی سائز خیمے کے گرد اتنا کڑا پہرہ تھا کہ چڑیا بھی پَر نہیں مار سکتی تھی۔ ہمارے تفتیشی افسر لونگ کو کسی ضروری کام سے جاماجی جانا پڑ گیا تھا۔ اسے چار پانچ گھنٹے تک واپس آجانا تھا اور یہی چار پانچ گھنٹے ہمیں سوچ بچار کے لیے بھی دیئے گئے تھے۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اس وقفے کے بعد مجھ پر اور سیف پر ہونے والا تشدد مزید بھیانہ ہو جائے گا۔ میرا دل گواہی دینے لگا تھا کہ اب سیف شاید زیادہ دیر برداشت نہ کر سکے گا۔ وہ مسلسل بڑبڑا رہا تھا۔ جو چند الفاظ میری سمجھ میں آئے ان سے اندازہ ہوا کہ وہ اذیت کی انتہا کو چھو رہا ہے۔

اس کے الفاظ کچھ اس طرح کے تھے...... مجھے مار دو...... جلدی مار دو...... میں کچھ بولنا نہیں چاہتا...... میں کیا بولوں...... میں کیا کہوں......''

یہ بے ربط الفاظ تھے مگر ان کے اندر ایک ناقابلِ بیان کرب چھپا تھا۔ میری آنکھوں میں شاید ہی کبھی نمی آئی ہو لیکن ان لمحوں میں آگئی۔ اپنے سیلانی پن اور جذباتی رویے کی وجہ سے وہ ہنستا کھیلتا اپنے سکھیرا گاؤں سے نکلا تھا اور یہاں موت کے شکنجے میں جکڑا گیا تھا۔ میں نے اس کے خون آلود بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ ''تمہیں کس نے کہا تھا سیف کہ میرے پیچھے آؤ۔ تم نے اپنی جان کو اتنی بڑی مصیبت میں کیوں ڈالا؟''

اس نے مچی مچی آنکھوں سے میری طرف دیکھا، جیسے میرا فقرہ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر آنکھیں بند کر لیں آنکھوں کے گوشوں سے دو موتی اس کی کنپٹیوں کی طرف رینگ گئے۔

میں نے اب تک کی زندگی میں کئی برے وقت دیکھے تھے، لیکن یہ شکنجہ بے حد سخت اور بے رحم تھا۔ میں تو شاید اس شکنجے کی سختی کو کسی نہ کسی طرح جھیل لیتا اور آخری سانس تک اپنی زبان بند رکھتا لیکن میں نے محسوس کر لیا تھا کہ سیف ایسا نہیں کر سکے گا اور وہ ایسا نہ کر سکتا تو جو کچھ ہونا تھا اس کا تصور بھی جانکاہ تھا۔ قسطینا، ابراہیم اور کمانڈر فارس وغیرہ کو بدترین موت کے گھیرے میں آجانا تھا اور سب سے بڑھ کر زینب عقابوں میں گھری ہوئی چڑیا، میں نے جس سے وعدہ کر رکھا تھا کہ اپنی زندگی میں اس پر کوئی آنچ نہ آنے دوں گا، میں نے تصور کی نگاہ سے اس معصوم چڑیا کو لونگ جیسے بے رحم عقابوں کے پنجے میں دیکھا اور سرتاپا پسینے میں ڈوب گیا۔

بن مشہد نے شاید ٹھیک ہی کہا تھا کہ ہمارے دشمن برسوں بھی سر پٹختے رہیں تو اس بے مثال پناہ گاہ کا کھوج نہیں لگا سکتے۔ لیکن یہ بے مثال پناہ گاہ میرے یا سیف کے منہ سے ادا

ہونے والے ایک دولفظوں سے بدترین قتل گاہ بن سکتی تھی۔ میں کھوئی کھوئی نظروں سے سیف کی طرف دیکھتا رہا۔ گھڑی کی سوئیاں بڑی تیزی سے ہماری مہلت کو ختم کر رہی تھیں۔ دور دور تک امید کی کوئی کرن نہیں تھی...... بالآخر میں ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔ یہ بے حد سخت فیصلہ تھا مگر یہی فیصلہ سیف کے لیے بہتر تھا اور ہم سب کے لیے بھی۔ میں نے اپنے سینے پر کوہ ہمالیہ سے بھی بڑا وزن رکھ کر سیف کو اس اذیت سے چھٹکارہ دلانے کا فیصلہ کرلیا۔ ہاں اس کے سوا اب کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں نے اور میری چھٹی حس نے بہت اچھی طرح پرکھ لیا تھا۔

○......❖......○

شام گہری ہورہی تھی۔ اس ویران ٹاپو پر ہر طرف روشنیاں چمکنے لگیں اور وزنی بوٹوں کی دھمک سے نشیب و فراز لرزنے لگے۔ سمندر یہاں سے بس سوڈیڑھ سو میٹر ہی دور تھا۔ اسپیڈ بوٹس اور لانچیں مسلسل آجارہی تھیں۔ ایسی ہی کسی اسپیڈ بوٹ یا لانچ پر درندہ صفت لونگ بھی یہاں واپس پہنچنے والا تھا اور ہم دونوں کو پھر زندگی اور موت کے درمیان لٹکانے والا تھا۔

میں نے کوشش کر کے سیف کو ایک بڑے کشن کے سہارے نیم دراز کر دیا۔ ''کچھ کھاؤ گے سیفی؟'' میں نے نرمی سے پوچھا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''تھوڑا سا دودھ پی لو۔'' میں نے کہا۔ اس نے پھر انکار کیا۔ ''بہت درد ہورہا ہے نا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں استاد صاحب!'' وہ بمشکل بول پایا۔ اس کا گلا اور سینہ اندر سے زخمی تھا۔

''آرام آجائے گا۔ میں دودھ میں دوا ڈال رہا ہوں۔''

''یہ...... یہ ہمیں...... مار کیوں نہیں دیتے؟'' وہ بڑے کرب سے بولا۔

''مارنے میں ان کا نقصان ہے۔'' میں نے اس کے خون آلود بالوں کو پیشانی سے ہٹایا۔

پہریدار خیمے سے کچھ فاصلے پر چلے گئے تھے اور یہ نیلی آنکھوں والے پال کے حکم سے ہی ہوا تھا۔ شاید وہ چاہتا تھا کہ ہم دونوں یکسوئی سے گفتگو کرسکیں۔ کھانے پینے کا وافر سامان ہمارے اردگرد رکھا ہوا تھا۔ اس میں ڈبا بند خوراک، مچھلی اور جوسز وغیرہ شامل تھے۔ میں نے ایک ڈبے میں سے دودھ ایک کپ میں انڈیلا۔ میری قمیص کے ایک کف کی سلائی کے اندر وہ تھوڑا سا زہر موجود تھا جو جاناں سے برآمد ہوا تھا...... ارینک نامی یہ زہر میں نے ایک انچ کے ایک کاغذ میں تہہ کر کے اپنے کفی کے اندر کسی نازک ترین وقت کے لیے چھپا رکھا تھا اور یہ

نازک ترین وقت تھا۔ میں نے انگوٹھے کی مدد سے قمیص کے کف کی یہ کچی سلائی ادھیڑی اور کاغذ کی تہہ کھول کر زرد سفوف دودھ میں انڈیل دیا۔ سیف بے چارے میں دیکھنے کی سکت کہاں تھی۔ ایجنسی کے گارڈ بھی فاصلے پر تھے۔ کسی کو بھنک نہیں پڑی۔

کہنے والے کہہ سکتے ہیں کہ وہ میرا رقیب تھا۔ کہنے والے کہہ سکتے ہیں کہ میں ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتا تھا۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ میرے لاشعور میں موجود تھا کہ سیف میرے راستے سے ہٹ جائے لیکن میں جانتا ہوں اور پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ فیصلہ میری زندگی کا دردناک ترین فیصلہ تھا...... اور میں جانتا تھا کہ نیچے چھپی ہوئی زینب اور دیگر لوگوں کو بچانے کے لیے اور کوئی راستہ نہیں رہا۔

یہ وہ زہر تھا جو جاناں کی انگوٹھی میں تھا اور اس نے اپنی جان لینے کے لیے رکھا ہوا تھا۔ جیسے دانے دانے پر مہر ہوتی ہے شاید زہر زہر پر بھی ہوتی ہے۔ میں نے بائیں ہاتھ سے سیف کا سر کشن پر تھوڑا سا اٹھایا۔ اس کی ناک کی ہڈی شاید ٹوٹ چکی تھی۔ آنکھیں سوجتی جا رہی تھیں۔ میں نے پیار سے کہا۔ ''لو سیفی، پی لو۔''

اس نے نیم وا آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا ہو...... آپ کے ہاتھوں تو زہر بھی پی سکتا ہوں...... اس نے دو گھونٹ لیے پھر رک گیا۔ بھرائی ہوئی کربناک آواز میں بولا۔ ''آپ...... مجھ سے...... ناراض تو نہیں؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

وہ ایک نادان جوشیلے بچے کی طرح پناہ گاہ سے نکل کر میرے پیچھے چلا آیا تھا۔ غلطی تو بڑی نہیں تھی لیکن کبھی کبھی چھوٹی غلطی کی بڑی سزا جھیلنا پڑتی ہے۔ چند گھونٹ میں وہ باقی کا دودھ بھی پی گیا۔ میں نے اس کا سر دوبارہ کشن نما تکیے پر ٹکا دیا اور چوڑی پیشانی پر بوسہ دیا۔ دودھ والے کپ کو میں نے پانی سے کھنگال دیا۔

دو تین منٹ بعد ہی سیف کی حالت بگڑنا شروع ہو گئی۔ وہ سینہ مسلنے لگا اور بری طرح کراہنے لگا۔ گرے سپاہیوں نے اسے تڑپتے مچلتے دیکھ لیا۔ وہ اس کی طرف لپکے۔ لونگ بھی، انڈین مترجم سمیت بھاگا ہوا آیا۔ وہ اسے مرتا کیسے دیکھ سکتا تھا۔ اس نے سیف کے سر کے خون آلود بالوں کو پکڑا اور اس کا چہرہ اونچا کیا یہی وقت تھا جب سیف نے ابکائی لی اور خون الٹی کر دی۔

''کیا ہوا ہے اسے؟'' لونگ دہاڑا۔ پھر خیمے کے دروازے کی طرف منہ کر کے پکارا۔ ''ڈاکٹر کو بلاؤ، جلدی کرو...... اس کو مرنا نہیں چاہیے۔''

وہ رنگ رنگیلا پنجابی گھبرو تھا، محبت سے بھرا ہوا، زندگی کے سارے رنگوں سے لبریز۔ اس کے ماں باپ اس کے سر پر سہرا سجانے کے سپنے دیکھ رہے تھے اور وہ یہاں، سکھیرا گاؤں سے ہزاروں میل دور اس خیمے میں دم توڑ رہا تھا۔ امریکی ڈاکٹر اپنے لوازمات کے ساتھ بھاگا ہوا پہنچ گیا لیکن تب تک سیف کے سانس پورے ہو چکے تھے میرا ہاتھ اس نے اپنے ہاتھ کی مضبوط گرفت میں لے رکھا تھا۔ وہ کبڈی شاہ تھا۔ بے مثال گرفت رکھتا تھا لیکن آج وہ میری کلائی پر اور اپنی زندگی پر گرفت برقرار نہ رکھ سکا...... گرفت ختم ہوگئی...... وہ مر گیا۔

○......❖......○

رات گزر چکی تھی، یہ اگلا دن تھا۔ سورج چمک رہا تھا۔ میرے اردگرد بہت سی آوازیں تھیں۔ میں اسی درخت سے الٹا جھول رہا تھا جس سے پہلے کیپٹن تبارک جھولا تھا اور پھر سیفی۔ دونوں مر گئے تھے اور اب یقیناً میری باری تھی۔ لونگ نے صبح سویرے مجھے اسی بے دردی سے پٹوایا تھا جس سے تبارک اور سیفی کو پٹوایا گیا تھا۔ موٹے بکلز والی بیلٹس کے ذریعے یہ بڑی ظالمانہ مار تھی۔ میرے جسم پر صرف پتلون تھی اور کھال جگہ جگہ سے ادھڑ چکی تھی۔ میرے خون کے قطرے بھی اس جگہ گر رہے تھے جہاں پہلے تبارک اور سیفی کے گرے تھے۔

مارنے والوں کا سوال ایک ہی تھا۔ ''تمہارے باقی ساتھی کہاں ہیں؟''

میرا جواب بھی ایک ہی تھا۔ ''وہ دوسری لانچ پر یہاں سے جا چکے ہیں مجھے ٹھیک سے کچھ پتا نہیں۔''

جب جب یہ جواب میں نے دیا تھا۔ میرے جسم کو بدترین اذیت سہنا پڑی تھی اور میرے زخموں اور اندرونی چوٹوں میں اضافہ ہوا تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ ان لوگوں نے کیپٹن ڈاکٹر تبارک اور سیفی کی لاشوں کے ساتھ کیا کیا ہے۔ نہ ہی یہ پتا تھا کہ وہ اب تک سیفی کی فوری موت کا سبب جان سکے ہیں یا نہیں۔ دراصل ان لوگوں کے پاس اتنا وقت ہی نہیں تھا کہ باریک بینی کے ساتھ کچھ دیکھ سکتے۔ وہ تو بس جلد از جلد کوئی نتیجہ نکالنا چاہتے تھے ہمیں تشدد کی چکی میں پیس کر وہ راز اگلوانا چاہتے تھے جو وہ اپنے طور پر کسی بھی طرح جاننے کے قابل نہیں تھے ہاں ایک بات تھی۔ مجھ سے مار پیٹ کے دوران میں ایک مرتبہ بڑی اچھی طرح میری پتلون کی تلاشی لی گئی تھی۔ میں نے دھندلائے ہوئے ذہن کے ساتھ سوچا تھا کہ شاید انہیں سیفی کی موت کے سلسلے میں کسی طرح کی زہرخورانی کا شک ہوا ہے۔

مجھے اذیت سہنا آتا تھا۔ میں MMA کا یورپی چیمپئن تھا۔ میں نے خونخوار فائٹرز کے حملے سہے تھے اور خود کو اپنے قدموں پر کھڑا رکھا تھا۔ اذیت سہنا اور جوابی وار کرنا میری فطرت

کا حصہ بن چکا تھا۔ فی الوقت میں جوابی وار کے قابل تو نہیں تھا لیکن میری قوتِ برداشت نے میرے جلادوں کو انگشت بدنداں کر دیا تھا۔ میں اپنے جسم کو جیسے اپنے ذہن سے بہت دور لے گیا تھا۔

میں اور میرا مرحوم دوست مامون۔ جمنازیم میں سخت ترین تربیتی سیشن کیا کرتے تھے۔ ماضی کی صدائیں میرے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ میں کہتا۔ ''مامون! مجھے خوب مارو بس چہرے پر کوئی زخم نہ آئے۔''

''ہڈی چاہے ٹوٹ جائے؟''

''توڑ سکتے ہو تو توڑ دو۔''

وہ مجھے بے دریغ پیٹنے لگتا۔ میں صرف دفاع کرتا۔ وہ ہانپ جاتا۔ کچھ دیر بعد میں اسے مارتا اور وہ صرف دفاع کرتا۔ چوٹیں مزہ دینے لگتیں...... اذیت ایک نشے کی طرح محسوس ہوتی۔ ایسا نشہ جس میں جوابی وار کی خواہش ایک آگ کی طرح دہکتی وہی تربیتی سیشن تھے جنہوں نے مجھے یورپ کے ایم ایم اے دنگلوں کا سخت ترین حریف بنایا تھا۔ اب پچھلے کئی گھنٹے سے ایک ایسا ہی سیشن چل رہا تھا۔ مگر یہ تربیتی نہیں تھا۔ یہ جان نکال دینے والا سیشن تھا۔ اس میں احتیاط بس ایک ہی کی جا رہی تھی کہ جس کی جان نکالی جا رہی ہے اس کی جان کہیں سچ مچ نکل ہی نہ جائے۔

میرے زخموں میں نمک بھرا گیا تھا اور الکحل اچھالی گئی تھی۔ میری سانس روکی گئی تھی اور میرے جسم کے نازک حصوں پر ضربات لگائی گئی تھیں۔

کچھ دیر کے لیے میں شاید ہوش وحواس سے بیگانہ بھی ہو گیا تھا۔ شاید اسی لیے اب مجھے تھوڑا سا وقفہ دیا گیا تھا مگر میں بدستور لٹک رہا تھا۔

میں اچھی طرح جانتا تھا، جب تک میں اپنی زبان بند رکھوں گا تب تک میرے ساتھی محفوظ رہیں گے...... اور وہ ڈرا سہا جوڑا بھی جو ہر مصیبت کے وقت صرف اور صرف میری طرف دیکھتا تھا۔ زینب اور ابراہیم...... کسی وقت تو وہ مجھے ڈرے سہمے بچوں کی طرح لگتے تھے۔ جدائی اور موت کے اندیشوں میں گھرے ہوئے، ان کے نزدیک میں وہ سب کچھ کر سکتا تھا جو کرنا چاہتا تھا۔ وہ غیر شعوری طور پر مجھ پر بے حد بھروسا کرنے لگے تھے، آج بہت سی دوسری باتوں کے ساتھ ساتھ یہ ''بھروسا'' بھی کڑے امتحان سے دوچار تھا۔

میں نے پلکیں جھپکائیں تو آنکھوں میں جمع ہو جانے والے خون کے سبب چپچپاہٹ کا احساس ہوا۔ دھوپ بھی سرخ نظر آئی۔ میں نے تصور ہی تصور میں زینب اور ابراہیم کو مخاطب

کرتے ہوئے کہا۔ ”تم دونوں کی محبت میری آواز کو خاموش رکھے گی۔ آخری دھڑکن اور آخری سانس تک...... اور مجھے امید ہے کہ تم بچ جاؤ گے پھر گرما کی کسی سہانی شام کو یا چاندنی رات کو تم اپنی پناہ گاہ سے باہر نکلو گے ایک محفوظ زندگی کو اپنے سامنے جگمگاتا ہوا پاؤ گے۔

میری نگاہوں میں ابراہیم کا چہرہ گھومنے لگا۔ اس سے آخری ملاقات یاد آئی۔ اس نے اپنے ”عارضے“ سے ایک دلیرانہ لڑائی شروع کر دی تھی۔ وہ زہر کی ڈوز کم کر رہا تھا اور اپنی تکلیف سے دیوانہ وار لڑ رہا تھا۔ پتا نہیں کہ اب اس کی حالت کیسی تھی پھر مجھے سجاول کا خیال آیا۔ مجھے اس کی طرف سے اندیشہ تھا۔ وہ ایک جوشیلا اور سرکش شخص تھا۔ وہ دوستی کا حق ادا کرنے کے لیے باہر نکلنے کی کوشش کر سکتا تھا لیکن اس کی ذہانت بھی ہر شبہے سے بالاتر تھی۔ یقیناً پرسوں رات آخری پہر ہونے والی تابڑ توڑ فائرنگ سے ہی ان سب لوگوں کو پتا چل گیا ہو گا کہ باہر بہت زیادہ نفری اور مزاحمت موجود ہے۔ عین ممکن تھا کہ ٹی وی کی نیوز سے بھی انہیں کچھ نہ کچھ اندازہ ہو گیا ہو۔

امریکن ڈاکٹر میرے پاس آیا۔ اسی ”لٹکی ہوئی حالت“ میں اس نے میرا طبی معائنہ کیا اور تیکھے لہجے میں بولا۔ ”گڈ، تم مزید تشدد کے لیے اب بالکل فٹ ہو۔“

پھر اس نے رخ پھیر کر لونگ کے ایک حبشی ماتحت کو آواز دی۔ ”آجاؤ دوستو! چیمپ فٹ ہے۔“

یہ ”سیشن“ پہلے سے زیادہ سخت تھا۔ اس مرتبہ بھیڑیا صفت لونگ نے پلاس کا استعمال بھی کیا۔ میرے جسم کو کئی جگہ سے نوچا گیا اور بے دردی سے مسلا گیا۔ میں اب بلند آواز سے کراہ رہا تھا۔ ضبط کے بند دیر ہوئی ٹوٹ گئے تھے۔ میرے انگوٹھے کے ناخن کو اس بے رحمی سے اکھاڑا گیا کہ گوشت کا ایک ٹکڑا بھی ساتھ ہی اتر گیا اس کے بعد بائیں ہاتھ کی ایک انگلی کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا۔

”مرہم لگاؤ اس کے زخموں پر۔“ لونگ کی بھاری آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

یہ مرہم دراصل تیز ترین شراب 69 کی شکل میں تھا۔ اس میں الکحل کی مقدار بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اسے میرے پورے جسم پر انڈیل دیا گیا۔ اسپرٹ نے جیسے میرے پورے جسم پر دہکے ہوئے خنجر چلا دیئے۔ تکلیف برداشت سے باہر ہو گئی، میرا جسم کئی بار مچلا...... اور پھر ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

پتا نہیں کہ کتنی دیر بعد حواس کچھ بحال ہونا شروع ہوئے۔ اردگرد کی آوازیں جیسے ہزاروں میل دور سے میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ اس نیم بے ہوشی اور غشی کی سی کیفیت

میں میرے تصور نے مجھے چند مناظر دکھائے۔ایسے تصوراتی مناظر عموماً عجیب اور بے ربط ہی ہوا کرتے ہیں۔

میں نے دیکھا میرے اردگرد بہت سے بھیڑیے ہیں۔موٹے گلے، چھوٹی آنکھیں اور دہشت ناک آوازیں۔لیکن ان کی تھوتھنیوں کی جگہ بڑے بڑے پلاس ہیں۔وہ ان پلاسوں کی مدد سے مجھے نوچ رہے ہیں۔پھر کسی شیر کی دہاڑ سنائی دیتی ہے وہ سب مجھ سے دور چلے جاتے ہیں۔سامنے ڈھلوان والے جنگل میں چھپ جاتے ہیں...... کچھ دیر بعد میرے تصور کی نگاہ نے مجھے تاجور کی جھلک دکھائی۔وہ میری طرف آرہی تھی۔اس کے پیچھے پہلوان حشمت تھا وہ دونوں دیہاتی لباس میں میری طرف بھاگے آرہے تھے۔مجھے اس درخت سے اتارنا چاہتے تھے......لیکن جب تاجور میرے پاس پہنچی تو ایک دم اس نے اپنا دوپٹا ناک پر رکھ لیا۔

میں نے پوچھا۔''کیا ہوا تاجور؟''

''آپ سے شراب کی بو آرہی ہے۔آپ تو شراب میں ڈوبے ہوئے ہیں۔میں آپ کے پاس نہیں آسکتی۔'' وہ وہیں رک جاتی ہے۔ہانپا ہوا پہلوان حشمت بھی وہیں رک جاتا ہے۔

''ہاں......تم سے بو آوت ہے۔میں جانت ہوں تم وہسکی میں ڈوبے ہو۔'' وہ وہیں اپنی جگہ ساکت ہوتے ہیں۔میں الٹا لٹکا دیکھتا رہتا ہوں۔میرے پورے جسم کو انگارے جلا رہے ہیں۔

''میں آپ کے پاس نہیں آسکتی شاہ زیب۔'' وہ مصمم ارادے سے کہتی ہے اور پہلوان حشمت کو اپنے ساتھ لے کر واپس مڑتی ہے۔

وہ ڈھلوانی جنگل کی طرف جارہی ہے......اور وہاں وہ بھیڑیے چھپے ہوئے ہیں جن کی تھوتھنیوں کی جگہ خون آلود پلاس ہیں، بڑے بڑے پلاس۔

میں پکارتا ہوں۔''رک جاؤ تاجور، اُدھر نہ جاؤ۔وہ ماردیں گے......وہ نوچ لیں گے۔''

وہ نہیں سنتی۔پہلوان حشمت بھی نہیں سنتا۔دونوں بڑھتے جاتے ہیں۔

''میری بات سنو تاجور! وہاں بہت خطرہ ہے۔رک جاؤ......واپس آجاؤ......اچھا میں تم سے وعدہ کرتا ہوں۔میں اب یہ نہیں پیوں گا، مجھ سے کبھی بو نہیں آئے گی۔میں تم سے وعدہ کرتا ہوں۔تم رک جاؤ......واپس آجاؤ۔''

وہ مڑتی ہے۔ہوا اس کی لٹوں کو اڑاتی ہے۔وہ ہولے سے مسکراتی ہے اور اوجھل ہو جاتی ہے۔پہلوان حشمت بھی اوجھل ہو جاتا ہے......میرے چہرے پر سرد پانی کے چھینٹے مارے جارہے تھے۔مجھے لگا......بلکہ مجھ پر انکشاف ہوا کہ میرے سر کے اندر جو بے پناہ دباؤ

جمع ہو چکا ہے وہ اب نہیں ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اب الٹا لٹکنے کے بجائے زمین پر لیٹا ہوا ہوں۔

یہ خیمہ تھا۔ امریکی اور ملائیشین ڈاکٹر میرا معائنہ کررہے تھے۔ بی پی آپریٹس نے میرے بازو کو جکڑ رکھا تھا۔ جکڑن کم ہوئی۔ امریکی ڈاکٹر نے کہا۔''بی پی بہت بڑھ گیا تھا۔ دماغی شریان پھٹنے کا چانس بن جانا تھا۔''

''ایک ڈرپ لگادی جائے...... یا پھر انفیوژن؟'' ملائیشین ڈاکٹر کی آواز آئی۔

''گلوکوز ڈرپ ٹھیک رہے گی۔'' امریکی نے کہا۔

میرا تخیل ابھی تک کام کررہا تھا۔ کانوں میں اپنی ہی آواز گونج رہی تھی...... میں تم سے وعدہ کرتا ہوں۔ میں اب یہ نہیں پیوں گا مجھ سے کبھی بو نہیں آئے گی......

مجھے بارہا محسوس ہوا تھا کہ مجھے تاجور سے دور کرنے میں کچھ کردار اس بو کا بھی ہے۔ پتا نہیں کیوں دھیرے دھیرے مجھے اس بو سے نفرت ہونے لگی تھی۔ وہیں لیٹے لیٹے میں نے دل ہی دل میں کہا کہ میں اس جان لیوا مصیبت سے نکل گیا تو زندگی بھر الکحل کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ کچھ ایسا ہی عہد کسی بادشاہ نے بھی کیا تھا۔ شاید بابر نے، پانی پت کی فیصلہ کن لڑائی سے پہلے عہد کیا تھا کہ وہ زندگی کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔

وہ رات بھی بے پناہ اذیت اور دکھ کی رات تھی۔ تارک اور سیف کی موت کا غم میرے سینے پر کسی پہاڑ کی طرح ٹھہرا ہوا تھا۔ خاص طور سے سیف عرف سیفی کا غم۔ وہ پُرجوش زندگی کا طالب تھا اور اس طلب میں وہ اس اندوہناک منزل تک آپہنچا تھا۔ اس کے آخری الفاظ اب تک میرے کانوں میں تھے۔ آپ...... مجھ سے...... ناراض تو نہیں؟ میری چوٹیں اور میرے زخم آگ کی طرح دہک رہے تھے۔ لونگ اور اس کے ماتحت مجھے اتنی اذیت بھی دینا نہیں چاہتے تھے کہ میں مرجاؤں اور اتنی رعایت بھی نہیں برتنا چاہتے تھے کہ وقت ان کے ہاتھ سے نکل جائے یقیناً رائے زل اور آقا جان جیسے لوگوں کا ان پر بے پناہ دباؤ تھا۔

آدھی رات کے وقت ایک گرے لیفٹیننٹ نے مجھے ٹھوکر مار کر جگایا اور بولا۔''اب بھی وقت ہے۔ سوچ لو۔ لونگ جیک صاحب کا کہنا ہے کہ کل صبح والا تفتیشی سیشن تمہارے لیے بہت خوفناک ہوگا......اور شاید آخری بھی۔''

فقرے کے آخری تین چار الفاظ پر تو میں ہرگز یقین نہیں کرسکتا تھا۔ مجھے جان سے مار دینا کسی صورت بھی ان لوگوں کے حق میں نہیں تھا۔ ہاں، زندگی اور موت کے درمیان لٹکانا ان کو ''سوٹ'' کرتا تھا۔

○......❖......○

''صبح ایک بار پھر امریکی ڈاکٹر نے میرا طبی معائنہ کیا۔ اس نے تھوڑا سا اعتراض بھی کیا، اس کے باوجود تفتیشی اہلکار مجھے خیمے سے باہر اسی درخت کے پاس لے گئے جو اس سے پہلے دو افراد کی جان لے چکا تھا۔ میری حالت چونکہ اتنی اچھی نہیں تھی لہٰذا مجھے بیڑی ڈالنے کا تردد نہیں کیا گیا تھا۔ صرف ہاتھ پشت پر جکڑ دیئے گئے تھے۔ جب یہ لوگ مجھے درخت کی طرف لے جا رہے تھے، میری نگاہ ایک عجیب وضع کی گاڑی پر پڑی۔ یہ آٹو رکشا کے سائز کی گاڑی بیس پچیس فٹ کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ یہ بکتر بند تھی اور اس کے پہیوں کی جگہ ٹینک کی طرز پر آہنی بیلٹ تھی۔ غالباً اس گاڑی کو کسی بڑی لانچ پر لاد کر یہاں ٹاپو پر لایا گیا تھا تاکہ جانی نقصان سے محفوظ رہ کر قسطینا وغیرہ کی تلاش کی جا سکے۔ اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک موٹا سا امریکی بیٹھا اونگھ رہا تھا۔

میرے دھندلائے ہوئے سے ذہن میں یہ سوچ ابھری کہ اگر میں کسی طرح اس گاڑی میں گھس جاؤں تو ہر قسم کی فائرنگ سے محفوظ ہو جاؤں گا اور کسی جانب نکلنے کی کوشش کر سکوں گا۔ جتنی تیزی سے یہ خیال میرے ذہن میں آیا اتنی ہی تیزی سے یہ بھی آیا کہ میں پشت پر بندھے ہاتھوں سے بھی کچھ نہ کچھ کام لے سکتا ہوں۔

کسی گرفتار شخص کے ہاتھ پشت پر باندھ دیئے جائیں تو اسے بہت محفوظ تصور کر لیا جاتا ہے، لیکن اگر تھوڑا سا غور کیا جائے تو پشت پر بندھے ہاتھوں سے بھی خاصی سنگین قسم کی کارروائی کی جا سکتی ہے۔

پلک جھپکتے میں میں نے قسمت آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں ایک کالے امریکی گارڈ کے پاس سے گزر رہا تھا۔ میری بائیں بغل کے نیچے ایک امریکی نے اپنی مضبوط گرفت بنا رکھی تھی اور ایک طرح سے مجھے سہارا دیتا ہوا درخت کے پاس لے جا رہا تھا۔ میرے اندر اتنی توانائی تو نہیں تھی لیکن جتنی بھی بچی کھچی توانائی تھی میں نے اسے جمع کیا۔ میری نگاہوں کے سامنے تبارک اور سیفی کے موت کے مناظر گھومے۔ ایک آتشیں لہر سی بدن میں اٹھی۔ میں دیکھ چکا تھا کہ کالے امریکی کے ہولسٹر میں اس کا سروس پستول موجود ہے اور ہولسٹر کا بکل بھی بند نہیں۔ میرے ہاتھوں اور ہولسٹر کے درمیان بمشکل دو فٹ کا فاصلہ تھا۔ میں پیچھے کی طرف گیا۔ خود کو، گھٹنوں میں خم دے کر، تھوڑا سا نیچے کیا اور ہولسٹر میں سے پستول نکال لیا۔ سیفٹی کیچ ہٹا کر میں نے پہلا فائر اسی گارڈ پر کیا جس نے مجھے بغل سے تھام رکھا تھا۔ گولی اس کے پہلو میں لگی۔

''اوہ گاڈ۔'' وہ بے ساختہ پکارا۔

میں نے تڑپ کر خود کو اس کی گرفت سے چھڑایا اور منی سائز بکتر بند کی طرف بڑھا۔ سارے بدن پر چوٹیں تھیں لیکن نہ جانے اس وقت اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی۔ میں نے دو تین فائر مزید کیے اور لپک کر بکتر بند میں گھس گیا۔ یہ سارا عمل بمشکل تین چار سیکنڈ میں مکمل ہو گیا تھا۔ بکتر بند کے دروازے کا جائزہ میں پہلے ہی لے چکا تھا، اس لیے اسے بند اور لاک کرنے میں مجھے زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا سُست الوجود امریکی اب جاگ گیا تھا اور سرخ انگارہ آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ سرخی غصے یا جوش کے سبب نہیں بلکہ نیند کے سبب تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس سرخی میں بے حد تحیر بھی تھا۔ اس نے خود کو حرکت دینا چاہی لیکن اب اس کے لیے دیر ہو چکی تھی۔ میں نے اپنے، پشت پر بندھے ہاتھوں کو موڑ کر پستول اس کے چربی دار پہلو سے لگا دیا تھا۔

”خبردار! جان سے مار دوں گا۔“ میں نے ”قاتل“ لہجے میں کہا۔

ڈرائیور اپنا ہاتھ ہولسٹر کی طرف لے جا رہا تھا۔ وہیں کا وہیں رک گیا۔

”اسٹارٹ کرو اپنی اس والدہ کو۔“ میں نے امریکیوں کے ہی لب و لہجے میں حکم دیا۔

وہ میری آنکھوں میں اپنی موت دیکھ چکا تھا۔ اس نے لرزاں ہاتھوں سے اگنیشن میں چابی گھمائی۔ گاڑی اسٹارٹ ہو گئی۔

یہی وقت تھا جب بکتر بند کو کئی فائر لگے۔ یقیناً مجھے ہی نشانہ بنانے کی اضطراری کوشش کی گئی تھی۔ بکتر بند کی کھڑکیاں، روزنوں کے مانند چھوٹی اور بلٹ پروف تھیں۔

”ساحل کی طرف چلو۔“ میں نے بندھے ہاتھوں سے ہی پستول اس کی توند میں گھسیڑتے ہوئے کہا۔

اس نے چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد گیئر کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا اور یہی وقت تھا جب وہ کام ہوا جس کی مجھے ہرگز توقع نہیں تھی۔ عقب سے کسی نے میری گردن کو اپنے بازو کے شکنجے میں لے لیا۔ دراصل پچھلی نشست پر بھی ایک شخص لیٹا ہوا تھا جس پر میری نظر نہیں پڑی تھی۔ مجھے مصیبت میں دیکھ کر فربہ اندام ڈرائیور نے دروازہ کھول کر خود کو باہر لڑھکا دیا۔ میں نے جھلاہٹ میں گولی چلائی مگر وہ ہوا میں گئی۔ میرے بازو پشت پر تھے میں اس شخص کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا جس نے مجھے عقب سے دبوچا تھا۔ پھر بھی میں نے سر کے پچھلے حصے سے اس کے چہرے پر تسلی بخش ضرب لگائی۔ اسی دوران میں دو تین ہٹے کٹے امریکی گارڈز مجھ پر پل پڑے۔ پستول میرے ہاتھ سے چھین لیا گیا۔ وہ غلیظ گالیاں بک رہے تھے اور مجھ پر جھپٹ رہے تھے...... مجھے مکے رسید کیے گئے اور گھسیٹ کر پھر اسی درخت کے قریب

پہنچا دیا گیا۔ میں نے دیکھا، میری گولی سے زخمی ہونے والے گارڈ کو اٹھا کر ایک ٹینٹ میں لے جایا جا رہا تھا۔

لونگ کے حکم پر مجھے سب سے پہلے وہی ڈبل ایکشن بیڑی پہنائی گئی جو پاؤں کے علاوہ ہاتھوں کو بھی جکڑ لیتی تھی اور زیرِ عتاب شخص رکوع کے بل چلنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ یہ بیڑی پہنانے کے بعد مجھے الٹا تو نہیں لٹکایا گیا۔ وہیں پتھریلی زمین پر پھینک کر مار پیٹ شروع کر دی گئی اس مار پیٹ میں کل سے زیادہ شدت اور غضب ناکی تھی۔ وجہ ظاہر تھی میں نے تھوڑی دیر پہلے ''عدم تعاون'' کی زبردست مثال قائم کی تھی۔ آلو اور سؤر کے گوشت پر پلے ہوئے ایک ہٹے کٹے گارڈ کو گولی مار کر شدید زخمی کر دیا تھا۔

جو کچھ ہو رہا تھا نا قابلِ بیان تھا۔ وہ مجھے جان سے بھی نہیں مار سکتے تھے اور کسی طرح کا رحم کرنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ تشدد کا وہ سیشن اپنی مثال آپ تھا۔ اس سیشن میں جو بدترین کام ہوا تھا کہ میرا زخمی کندھا ایک بار پھر انگارہ بن گیا تھا۔ پتا نہیں کہ اس میں کیا نئی ٹوٹ پھوٹ ہو گئی تھی۔ میری کنپٹی پر لگنے والی، وزنی بوٹ کی ایک شدید ضرب کے بعد میری آنکھوں تلے پھر اندھیرا چھا گیا۔ کانوں میں دور افتادہ آوازیں آ رہی تھیں۔ کوئی بڑی اسپیڈ بوٹ کنارے پر آ کر رکی تھی۔ کوئی امریکی وائرلیس پر بلند آواز میں پیغامات دے رہا تھا۔ گرے فورس کے دو فوجی آپس میں کسی بات پر جھگڑ رہے تھے۔

میں پہلو کے بل سخت زمین پر پڑا تھا۔ مجھے لگا کہ میری گردن پر کچھ بہہ رہا ہے۔ نیم بے ہوشی کی سی کیفیت تھی۔ اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ یہ خون ہے یا پسینہ۔ سورج چمک رہا تھا۔ زخموں پر اس کی تپش محسوس ہوتی تھی۔ امریکی ڈاکٹر کی دور افتادہ آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''ابھی کچھ ریسٹ دی جائے اسے۔''

''دو مہینے کی ریسٹ دے دی جائے۔'' لونگ کی کرخت طنزیہ آواز سنائی دی۔

''بی پی زیادہ نیچے گر گیا ہے۔ کہیں یہ بھی ہاتھ سے نہ نکل جائے۔'' یہ آواز شاید نیلی آنکھوں والے پال کی تھی لیکن حواس پر گہری دھندسی چھائی ہوئی تھی۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ اسی کی آواز ہے۔

ان وحشیوں میں صرف ایک وہی تھا جو نسبتاً نرم رویہ رکھے ہوئے تھا یا پھر ڈاکٹر کی بات میں تھوڑا سا توازن ہوتا تھا لیکن یہ توازن کسی ہمدردی کی وجہ سے نہیں اپنی پیشہ ورانہ ذمے داری کے تحت تھا۔

نیم بے ہوشی ہی کی حالت میں مجھے اندازہ ہوا کہ میں نے دو تین دفعہ قے بھی کی ہے۔۔ دھندلائی ہوئی نظروں سے میں نے اوپر نیلگوں آسمان کی طرف دیکھا۔ چیلیں پرواز کررہی تھیں اور ان سے بھی اوپر دو ہیلی کاپٹر پھڑ پھڑا رہے تھے۔ شاید اس چھوٹے سے جزیرے (ٹاپو) کی فضائی نگرانی بھی ہورہی تھی۔

کیا میں مرنے والا ہوں؟ میں نے خود سے سوال کیا، کیا ان لوگوں کی نفرت اور درندگی میری جان لے جائے گی؟ ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے...... وہ لے لیں جان۔ لیکن میں بھی انہیں کچھ بتا کر نہیں دوں گا ایک لفظ نہیں...... ایک عجیب سی ضد اور ایک بے نام توانائی میرے اندر پروان چڑھتی جارہی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں جیسے خود سے کہا...... شاہ زیب! تم کوئی عام شخص نہیں ہو۔ تم یورپی چیمپئن ہو ان امریکیوں پر ثابت کردو کہ مزاحمت کیا ہوتی ہے؟ چپ کے معنی کیا ہوتے ہیں...... اور برداشت کس بل کا نام ہے......

رات گزر گئی۔ صبح پھر اپنی ''خودساختہ جہنم'' کا فرشتہ لونگ میرے سر پر کھڑا تھا۔ وہ غالباً پھر مجھے تشدد کی ٹکٹکی پر کسنا چاہ رہا تھا مگر پال اسے تھوڑے انتظار اور تحمل کا کہہ رہا تھا۔ دونوں میں باقاعدہ بحث شروع ہوگئی تھی۔ کبھی کبھی اس بحث میں ڈاکٹر بھی کوئی فقرہ جوڑ دیتا تھا۔

کئی زوردار ٹھوکریں میری زیریں پسلیوں پر لگیں اور میرا پورا جسم جھنجھنا اٹھا۔ میری ناف میں درد کی شدید ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ ٹھوکریں مارنے والا یقیناً لونگ ہی تھا۔ وہ گالیاں بکتا ہوا، غالباً خیمے سے باہر چلا گیا تھا، مجھ پر بار بار تاریکی کے حملے ہورہے تھے۔ آوازیں دور چلی جاتی تھیں اور میں اردگرد کے ماحول سے بے خبر ہوجاتا تھا۔

پھر مجھے اندازہ ہوا کہ مجھے پیشاب کی نالی لگی ہوئی ہے اور میں خیمے کے بجائے کسی گاڑی یا کشتی میں ہوں۔ یہ کشتی ہی تھی۔ اس کے ہچکولے کشتی جیسے تھے۔ میرے بازو میں کوئی انجکشن دیا جارہا تھا۔ میرے دھندلائے ہوئے ذہن میں یہ خیال ابھرا کہ مجھے ٹاپو سے واپس جاماجی لے جایا جارہا ہے۔

○......❖......○

میرے اگلے چار پانچ روز ایک عجیب سی دھند میں لپٹے ہوئے تھے۔ مجھے اندازہ ہورہا تھا کہ میں نشہ آور دواؤں کے زیر اثر ہوں۔ کسی وقت حواس ٹھیک بھی کام کرنے لگتے تھے، میرے کندھے کا آپریشن ہوچکا تھا اور اس میں پلیٹیں وغیرہ بھی ڈال دی گئی تھیں۔ میرے زخموں اور اندرونی ضربات کو بھی ٹریٹ کیا جارہا تھا۔ جس انگوٹھے سے ناخن کھینچا گیا تھا اس کا زخم بگڑا ہوا تھا۔ پورے انگوٹھے میں انفیکشن تھا۔ ایک دو بار میں نے نیلی آنکھوں والے پال کو

بھی اپنے قریب دیکھا۔ ایک دن اس نے نرم لہجے میں کہا۔ ''دیکھو مسٹر ایسٹرن کنگ! اپنے آپ پر ظلم مت کرو۔ تمہارے پاس اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں کہ تم ہمیں قسطینا اور ابراہیم وغیرہ تک پہنچا دو۔''

میں نے بمشکل بولتے ہوئے کہا۔ ''میرا جواب وہی ہے جو میں دے چکا ہوں اور یہ آئندہ بھی یہی رہے گا۔''

''لیکن آئندہ صورتِ حال ایسی نہیں رہے گی، جیسی اب ہے۔ لونگ تمہیں جلد از جلد واپس مانگ رہا ہے۔ میں نے تمہارے لیے کافی بھاگ دوڑ کی ہے اور فی الحال ان لوگوں کو تم سے دور رکھا ہوا ہے جو تمہیں انسان سے ایک پھٹے پرانے خون آلود چیتھڑے میں تبدیل کر دینا چاہتے ہیں۔''

''حیرت ہوتی ہے کہ تم بھی امریکی ہو۔'' میرا لہجہ طنزیہ تھا۔

''سارے امریکی ایک سے نہیں...... بلکہ شاید کوئی قوم اور کوئی نسل بھی ساری کی ساری اچھی یا بری نہیں ہوتی۔''

اگر تم اچھے ہو تو پھر یہ تمہاری ایک نہیں چلنے دیں گے، میں جانتا ہوں کہ یہ سب میرے خون کے پیاسے ہیں۔ میں تب تک ہی زندہ ہوں جب تک اپنی زبان نہیں کھولتا۔''

''مگر تمہاری یہ زندگی موت سے کئی گنا بدتر ہو گی ایسٹرن عرف شاہ زیب! ہاں اگر تم زبان کھول دو، میں تمہیں کچھ گارنٹیاں دینے کو تیار ہوں۔''

''جہاں آقا جان اور رائے زل جیسے لوگ موجود ہیں، وہاں ایسی گارنٹیاں کوئی معنی نہیں رکھتیں مسٹر پال! ویسے بھی جب میں قسطینا اور ابراہیم کے بارے میں کچھ جانتا ہی نہیں تو بتا کیسے سکتا ہوں۔''

پال کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے بولا۔ ''مجھے ڈر ہے کہ تمہاری یہ ہٹ دھرمی تمہیں لے ڈوبے گی۔ کھیل کا میدان ایک اسٹار کھلاڑی سے محروم ہو جائے گا اور مزید ستم یہ کہ...... یہ قربانی رائیگاں جائے گی۔ آخر کو تو ہم نے ان بھگوڑوں کو ڈھونڈ ہی لینا ہے۔ تم جانتے ہی ہو، بڑے بڑے نامور لوگ اپنی پوری کوشش کے باوجود ہم سے چھپ نہیں سکے۔ جب ہم تہیہ کرتے ہیں تو پھر ڈھونڈ لیتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''میرا سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔ تمہاری باتیں میرے سر میں ہتھوڑوں کی طرح لگ رہی ہیں۔'' میں نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے پھر بات کریں گے۔ ویسے بھی تمہارے انجکشنز کا وقت ہو چکا ہے۔'' پال

نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

یوں لگتا تھا کہ میرے جسم کا 75 فیصد حصہ پٹیوں میں جکڑا ہوا ہے یا پھر اس پر کوئی آئینٹمنٹ وغیرہ لگی ہے۔ کندھا اور بازو بھی پلاستر میں تھا۔ میرے کمرے کے گرد سخت پہرہ تھا۔ سی سی ٹی وی کیمرے مجھے فوکس کیے ہوئے تھے۔ اسٹیل کی ایک زنجیر میرے ٹخنے سے باندھ کر بیڈ سے منسلک کر دی گئی تھی۔

کچھ عرصہ پہلے جب آقا جان نے مجھے اور جاناں کو اٹھوا کر ''آشیانے'' نامی عقوبت خانے میں پہنچایا تھا تو وہاں بھی مجھے بری طرح زدوکوب کیا گیا تھا۔ لیکن اب جو تشدد ہوا تھا اس نے ''آشیانے'' والے واقعے کو بالکل غیر اہم بنا ڈالا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ اگر میں ایک پروفیشنل نہ ہوتا تو لونگ کی دی ہوئی اذیت...... تبارک اور سیف کی طرح میری بھی جان لے چکی ہوتی۔

○......❖......○

چھ سات دن تک چند گہری چوٹوں کے سوا میرے باقی زخم مندمل ہونا شروع ہو گئے۔ یہ گہری چوٹیں ٹانگوں اور پسلیوں پر تھیں۔ ایک دن نہایت سخت سیکیورٹی میں مجھے اسپتال سے ڈی پیلس لے جایا گیا۔ میرا کندھا اب اس قابل ہو گیا تھا کہ بازو کو پیچھے کی طرف موڑ کر میرے ہاتھ ہتھکڑی میں جکڑے جاسکتے۔ بند گاڑی کی کھڑکیوں کے شیشے ''ون سائیڈڈ'' تھے، میں باہر دیکھ سکتا تھا لیکن باہر والے اندر نہیں جھانک سکتے تھے۔

جانی پہچانی سڑکیں نظر آئیں۔ جنگ کی تباہ کاری کے آثار اب بھی اکثر جگہ دکھائی دے رہے تھے۔ تاہم لگتا تھا کہ عام لوگوں کی زندگی معمول پر آنا شروع ہو گئی ہے جگہ جگہ گرے سپاہی اور ایجنسی کے امریکی گارڈز دکھائی دیتے تھے۔ اہم سڑکوں پر ناکہ بندیاں بھی موجود تھیں۔ میں نے چہرہ شیشے سے لگا رکھا تھا۔ سوچا کہ اگر عام شہری مجھے دیکھتے تو یقیناً بہت سے پہچان لیتے اور ہوسکتا ہے کہ کچھ مجھے دیکھ کر خوشی اور جوش کا اظہار بھی کرتے۔ اب یہاں میرا ایک نام تھا۔

ڈی پیلس کے اندر پہنچے تو انیق اور سیف کی یاد بری طرح آئی۔ خاص طور سے سیف یاد آیا۔ وہ انہی در و دیوار میں چوکڑیاں بھرتا تھا اور کرخت سنگھ کے ساتھ مل کر دیسی کھانے اور دیسی مصروفیات انجوائے کرتا تھا کبھی دیسی مرغی کا کڑاہی گوشت ڈھونڈنے نکلا ہوا ہے، کبھی سنگھاڑے کھا رہا ہے اور کبھی انیق سے سلطان راہی کی داستانِ حیات سن رہا ہے۔ اب وہ سب کچھ یہاں نہیں تھا۔ کرخت سنگھ کے بارے میں اتنا پتا چل سکا تھا کہ مجھے بچانے کی

کوشش کے بعد وہ زخمی ہو کر اسپتال پہنچا تھا اور شاید اب روبصحت ہے۔

ڈی پیلس میں مجھے ایک نہایت آرام دہ اپارٹمنٹ میں رکھا گیا، لیکن آرام دہ ہونے کے باوجود یہ کسی لاک اَپ کی طرح بند اور محصور تھا۔ صرف دو آہنی دروازے تھے جو سلائیڈ کرتے تھے۔ ایک کھڑکی تھی جس میں لاک اَپ ہی کی طرح شفاف ٹھوس اسٹیل کی سلاخیں لگی تھیں۔ اپارٹمنٹ میں کوئی ایک ایسی شے بھی موجود نہیں تھی جسے کسی بھی طرح حملے یا دفاع کے لیے استعمال کیا جا سکتا۔ اس اپارٹمنٹ کی چھت پر پانچ کلوز سرکٹ کیمرے دکھائی دیتے تھے جو ایک ایک انچ کو کور کر رہے تھے۔ اپارٹمنٹ کو ہر طرف سے مسلح گارڈز نے گھیرا ہوا تھا۔

رات کو پال مجھ سے ملنے کے لیے آیا۔ اس کی آمد سے پہلے گارڈز نے مجھے حکم دیا کہ میں سلاخوں کے قریب کھڑا ہو کر اپنے بازو پیچھے کی طرف موڑوں۔ میں نے ہدایت پر عمل کیا۔ میرے ہاتھ الٹی ہتھکڑی میں جکڑ دیئے گئے۔ پال اندر آ گیا۔ غالباً مجھے انتہائی خطرناک قیدی کا درجہ دیا گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میرے ہاتھ بندھے ہونے کے باوجود پال کورنی مجھ سے آٹھ دس فٹ کی دوری پر بیٹھا۔

سلاخ دار کھڑکی میں سے رائفل مین مجھ پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھے۔ پال نے کہا۔
''کیمرے اور آڈیو سسٹم بند ہے۔ ہم یہاں جو گفتگو کریں گے وہ بالکل محفوظ ہو گی۔''

''تم لوگوں کی بات پر یقین کرنا کافی مشکل ہوتا ہے لیکن کر لیتا ہوں۔''

''تم پر ضرورت سے زیادہ سختی ہوئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اب تمہیں کچھ راحت ملے اور تم ٹھنڈے دل و دماغ سے کچھ سوچ سکو۔''

''!تم کسی راحت کی بات کر رہے ہو۔ کیا تم لوگ میری فرینڈ جاناں کو واپس لا سکتے ہو، کیپٹن تبارک اور میرے دوست سیف کو پھر سے زندہ کر سکتے ہو۔ وہ ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کی شادی کے دن گنے جا رہے تھے۔ تم لوگوں کی وجہ سے وہ اپنی زمین سے ہزاروں میل دور یہاں ایڑیاں رگڑ کر مرا ہے۔ پتا نہیں اسے کفن بھی نصیب ہوا ہے یا نہیں۔''

''تمہارے دونوں ساتھیوں کی موت کا بہت افسوس ہے ایسٹرن! لیکن ان کی لاشوں کو پورا احترام دیا گیا ہے۔ انہیں یہاں لا کر مسلمانوں کے طریقے سے دفنایا گیا ہے۔''

''بہت شکریہ۔'' میں نے طنزاً کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ مجھے بھی کافی احترام دیا جائے گا مگر لاش بنانے کے بعد۔''

''میں دل و جان سے چاہتا ہوں کہ تم زندہ رہو، لیکن اس کے لیے تمہیں یہ تو بتانا ہی پڑے گا کہ تمہارے ساتھی کہاں ہیں۔ انہیں زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔''

''مجھے نہیں پتا اور اگر ہوتا بھی تو میں ہرگز نہ بتاتا۔''

''ابھی تم نے لونگ کی سنگدلی کا بس آٹھ دس فیصد دیکھا ہے۔ اس کے پاس تمہاری زبان کھلوانے کے ایک سو ایک طریقے ہیں ڈیئر ایسٹرن۔''

''تو تم اسے کوشش کرنے دو۔'' میں نے کہا۔ میرے اندر پھر وہی کیفیت پروان چڑھنے لگی جس نے مجھے کئی روز تک لونگ کی بے پناہ سفاکی سہنے کا حوصلہ بخشا تھا اور پُرعزم رکھا تھا۔

''چلو، پہلے میں تو کوشش کرلوں۔'' وہ مسکرایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

اس کے جانے کے بعد گارڈز نے مجھے پھر سلاخوں کے پاس بلایا اور میری الٹی ہتھکڑی کھول دی۔ وہ ہتھکڑی لگاتے یا کھولتے تھے میرے انگوٹھے کا زخم تکلیف دیتا تھا۔

رات کے نو دس بجے ہوں گے جب میرے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھلا اور خوب صورت قامت والی ایک حسین وجمیل انڈین لڑکی اندر داخل ہوئی۔ اس کے ساتھ ایک باوردی ملازم بھی تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑی طشتری تھی اور کھانے کے بہت سے لوازمات تھے۔ لڑکی کی عمر بمشکل بیس بائیس سال ہوگی۔ وہ نہایت ہیجان خیز لباس میں تھی۔ بال گہرے سیاہ، آنکھیں چمکدار بادامی اور بدن آئینے کی طرح شفاف۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا وہ ایک ماڈل گرل تھی۔ اس کا نام بینش کرسٹل تھا۔ بنیا بھی کہتے تھے۔ وہ کسی بھی عابد، زاہد کے ایمان کا بیڑا غرق کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ اس کی بادامی آنکھوں میں دعوت اور خودسپردگی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اس نے شستہ انگلش میں مجھ سے لگاوٹ کی باتیں شروع کیں۔ ساتھ ہی مجھے یہ بھی بتایا کہ اس وقت سارے سی سی ٹی وی کیمرے بند ہیں اور ہم مکمل خلوت میں ہیں۔

اس نے ایک جدید الماری کھولی۔ یہ شراب اور وہسکی کی بوتلوں سے بھری ہوئی تھی۔ (جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، یہ بوتلیں خاص قسم کے ''اَن بریک ایبل'' شیشے کی تھیں۔ مقصد یہی تھا کہ میں اس شیشے سے کسی کو یا خود کو نقصان نہ پہنچا سکوں۔ وہاں موجود پیمانے بھی اسی خاص شیشے کے تھے) لڑکی بینش کے لباس میں بھی کوئی بکل کوئی ڈوری وغیرہ نہیں تھی۔ وہ سارا لباس ہی بس ایک ڈیڑھ میٹر کپڑے پر مشتمل تھا۔ بس ہلکی پھلکی گلابی شرٹ اور نیکر۔

شراب کو دیکھ کر ایک ترنگ سی دل میں اٹھی۔ غم کے بے پناہ حصار سے نکلنے کے لیے مجھے کسی سہارے کی ضرورت تھی لیکن پھر اپنا عہد یاد آیا۔ وہ عہد میں نے کس سے کیا تھا؟ کسی عام شخص سے نہیں اس ہستی سے جو شاید میری رگوں میں خون بن کر دوڑتی تھی اور دل میں دھڑکن بن کر رہتی تھی۔

میں الماری کی طرف بڑھتا بڑھتا رک گیا۔ پلٹ کر بستر پر نیم دراز ہو گیا۔ لڑکی اندر سے ڈری سہمی تھی۔ یقیناً وہ جانتی تھی کہ اسے یہاں بھیجنے والوں نے اسے ایک نہایت خطرناک قیدی کے سپرد کیا ہے۔

''کیا رائے زل واقعی زندہ ہے؟'' میں نے لڑکی سے پوچھا۔

''میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھی۔'' وہ دبے لہجے میں بولی۔

''وہ تو قبر کے کنارے پہنچ چکا تھا پھر بھلا چنگا کیسے ہو گیا؟''

''کچھ لوگ اسے میڈیکل کا کرشمہ کہتے ہیں جی...... کچھ مادام ہاناوانی کی خاص صلاحیتوں کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ بہت سے مقامی لوگوں نے تو مادام کے مجسمے بنانا شروع کر دیئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جاماجی پر ہی نہیں ایک دن پورے برونائی پر مادام کا حکم چلے گا۔''

''تمہارا اپنا کیا خیال ہے بینا کرسٹل؟''

''میں...... زیادہ کچھ نہیں جانتی۔'' وہ ہولے سے بولی اور اشتعال دلانے والے انداز میں بل کھا کر میرے قریب نیم دراز ہو گئی۔ اس کا بالائی لباس اس کے سرکش جسم سے برسرِ پیکار تھا اور قطعی بے بس نظر آتا تھا۔

میں نے ذرا غصے سے کہا۔ ''یہ کیا طریقہ ہے؟ یہ کیا پہن رکھا ہے تم نے؟''

وہ اس کا دوسرا مطلب سمجھی۔ ذرا متذبذب رہنے کے بعد بولی۔ ''م...... میں سمجھی نہیں۔ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں...... اسے اتار دوں؟''

''نہیں میں یہ چاہتا ہوں کہ تم اپنے یہ فتنہ پرور کندھے ڈھانپ لو اور کوئی شال وغیرہ لے کر وہاں سامنے کرسی پر بیٹھو۔'' میں نے روکھے لہجے میں کہا۔

وہ جلدی سے بستر سے اتر گئی۔ میری ہدایت کے مطابق اس نے الماری کھول کر ایک بیڈ شیٹ نکالی اور اس سے اپنا بالائی جسم ڈھانپ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ میں وہ کچھ نہیں چاہتا جو وہ مجھے آفر کرنے کے لیے یہاں آئی ہے۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ''تمہاری معلومات کمال احمد کی موت کے بارے میں کیا ہیں؟ کیا واقعی اس نے خود کو کسی گودام میں بند کر لیا تھا جہاں خوراک نہ ملنے کے سبب اس کی جان چلی گئی؟''

''میری معلومات اس کے بارے میں زیادہ نہیں، لیکن نیوز میں یہی بات آئی ہے اور عام لوگوں کا خیال بھی یہی ہے کہ مسٹر کمال احمد خوراک کے ساتھ کوئی خاص دوا لیتے تھے۔ وہ دوا نہ ملنے کے سبب ان کی موت واقع ہو گئی۔''

''کمال احمد کی والدہ بیگم نورل اب کہاں ہیں؟''

''مجھے ان کے بارے میں کچھ پتا نہیں۔''

''پتا تو تمہیں سب کچھ ہو گا لیکن شاید تمہیں یہاں بھیجنے والے تمہارے آقاؤں نے کہا ہوا ہے کہ زبان بند رکھنی ہے، بس اپنے کانوں سے کام لینا ہے۔''

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ مجھے صرف آپ کو کمپنی دینے کے لیے یہاں بھیجا گیا ہے۔''

''کمپنی دینے کے لیے انہوں نے اپنی کسی ہم قوم کو یہاں کیوں نہیں بھیجا۔ حالانکہ بہت سی امریکن کال گرلز بھی یہاں پائی جاتی ہیں۔''

وہ پریشان نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی، ماتھے پر پسینے کی چمک تھی۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''کسی امریکن یا یورپین کو اس لیے یہاں نہیں بھیجا گیا کہ ان لوگوں کی ایک جان ہماری سو جانوں سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔ مجھ سے خوف زدہ ہیں یہاں کے سفید سوّر۔ میرے ہاتھ الٹی ہتھکڑی میں جکڑے بغیر میرے سامنے نہیں آتے لیکن تمہیں میرے حوالے کر دیا گیا ہے، میرے ہاتھ باندھے بغیر۔''

وہ کچھ اور سہم گئی۔ ''میں تو بس وہی کرتی ہوں...... جو مجھے حکم دیا جاتا ہے۔''

''ہم ہمیشہ سے وہی کرتے ہیں جو ہمیں حکم دیا جاتا ہے۔ اسی لیے انگریزوں نے دو سو سال ہم پر حکومت کی۔ اسی لیے ہم اب بھی ان کے غلام ہیں۔ عظیم برطانیہ...... سپر پاور امریکہ اور اس کے حواری، یہی تو ہیں ہمارے آقا......'' میں نے کئی اور سخت جملے کہے۔

پال نے کہا تھا کہ کلوز سرکٹ کیمرے بند ہیں، کسی طرح کا آڈیو سسٹم بھی آن نہیں، مگر اس پر یقین کرنا مشکل تھا۔ میں اسی لیے دل کی بھڑاس نکال رہا تھا۔ اس بے چاری کو واقعی ایک لاوارث چیز کی طرح میرے سامنے پھینک دیا گیا تھا۔ فرض محال اس کی جگہ کوئی امریکی ماڈل گرل ہوتی اور میں اس کی گردن توڑنے کی دھمکی دے کر کوئی مطالبہ منوانے کی کوشش کرتا تو ان لوگوں کو دانتوں پسینے آ جاتے۔ اس کے لیے انہوں نے ایک انڈین پارسی لڑکی کو چنا تھا۔ اچانک میں بہت بری طرح چونک گیا۔ لڑکی کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھرے وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ کچھ دیر تک پشیمان نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ میں اسی طرح بستر پر نیم دراز تھا۔ اس نے نیچے بیٹھ کر میرے پاؤں پکڑ لیے۔ ''پلیز مجھے اس طرح دور مت رکھیے... میں آپ کی خدمت کے لیے بھیجی گئی ہوں۔ ناکام واپس جاؤں گی تو مجھ سے باز پرس ہو گی۔''

لڑکی کی بات چونکانے والی تھی مگر اس سے زیادہ چونکانے والا وہ کام تھا جو اس نے کیا۔

اس نے کاغذ کا ایک پرزہ میری جراب میں اڑس دیا تھا۔

میں سناٹے میں رہ گیا۔ لڑکی سے میرا رویہ تبدیل ہو گیا۔ میں جو اسے یہاں سے بھگانے کے چکر میں تھا، رک گیا۔ ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ کھانے کی طشتری بیڈ پر لے آئے۔ میں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور اسے بھی بیٹھنے کو کہا۔ روسٹ چکن، سی فوڈ اور ایک دو کانٹی نینٹل ڈشیں تھیں۔ کھانے کے دوران بھی اس سے عام نوعیت کی گفتگو ہوتی رہی۔ بے شک کیمرے بند تھے لیکن 75 فیصد امکان اس بات کا موجود تھا کہ ہمیں دیکھا اور سنا جا رہا ہو گا۔

کاغذ پر کیا لکھا تھا، میں جلد از جلد جاننا چاہتا تھا لیکن اس اپارٹمنٹ میں کوئی ایسی جگہ موجود نہیں تھی جہاں جا کر اسے پڑھا جا سکے۔ واش روم بھی محفوظ نہیں تھا۔ آخر وہی ڈراما کرنا پڑا جو کیا جا سکتا تھا۔ میں خود کو بتدریج بینش کے قریب کرتا چلا گیا۔ اس کا لباس پہلے بھی قابلِ ذکر نہیں تھا، اب بالکل ہی ناپید ہو گیا۔ ہم بیڈ پر دراز ہو گئے اور ہلکے گلابی رنگ کی وہ ریشمی چادر اوڑھ لی جو ''ایسے موقعوں'' پر اکثر اوڑھی جاتی ہے۔ اس ہلکی گلابی چادر نے ہمیں چھپا لیا مگر کمرے میں جلنے والی ٹیوب لائٹ کی بالکل مدھم سی روشنی ہم تک پہنچ رہی تھی۔ یہ روشنی نہ ہونے کے برابر تھی مگر اتنی ضرور تھی کہ میں آنکھیں سکیڑ کر وہ پرچی نما کاغذ پڑھ سکتا۔

بہت باریک لکھائی تھی۔ شکستہ انگلش میں چند سطور لکھی گئی تھیں...... بلکہ یوں لگتا تھا کہ جلدی میں گھسیٹی گئی ہیں، لکھا تھا۔

''وہ ضرور تم کو زیر کرنے کی کوشش کرے گی۔ اور ایسا کرنا اس کے لیے مشکل بھی نہیں لیکن میرا دل کہتا ہے کہ تم ایک طاقتور ذہن رکھتے ہو۔ تم کوشش کرو تو اپنا دفاع کر سکتے ہو۔ جب وہ تمہاری آنکھوں میں دیکھے تو اپنی سانس اندر کھینچ کر روک لو۔ اپنے جسم کو ڈھیلا نہ چھوڑو۔ اس کی دونوں آنکھوں کے بجائے کسی ایک آنکھ پر زیادہ توجہ دو اور سب سے اہم بات...... خود کو کسی جسمانی یا ذہنی تکلیف میں مبتلا کر لو۔ مثلاً اگر تمہارے ہاتھ میں کوئی نکیلی چیز ہے تو اسے اپنی ہتھیلی میں چبھو لو۔ اپنے کسی زخم کو چھیل لو...... یا ایسا کچھ بھی کر لو یا پھر خود کو ذہنی اذیت میں مبتلا کرنے کے لیے کوئی ایسا واقعہ اپنے ذہن میں لاؤ جو تمہاری زندگی میں بہت دردناک ثابت ہوا ہو۔

وہ میری ہمشیرہ ہے۔ میں اس کی عادات بڑی اچھی طرح جانتا ہوں، وہ اپنے شکار پر صرف تین مرتبہ جھپٹتی ہے۔ ناکام ہو جائے تو پھر کوشش نہیں کرتی۔ میرا دل کہتا ہے کہ تم اسے ناکام کر سکتے ہو۔

تمہارا خیر خواہ حاذق ذکریا۔

میرے دل و دماغ میں زبردست ہلچل مچ گئی۔ یہ کیا تحریر تھی؟ کس نے لکھی تھی؟ یہ نام کچھ جانا پہچانا لگ رہا تھا۔ حاذق ذکریا نے کسی ہمشیرہ کا ذکر کیا تھا پھر سب کچھ ایک برق کی طرح ذہن میں کوند گیا۔

قسطینا نے بتایا تھا کہ مادام ہاناوانی کا ایک بڑا بھائی بھی تھا۔ وہ بھی ہاناوانی ہی کی طرح کچھ پُراسرا صلاحیتیں رکھتا تھا۔ برسوں پہلے ہاناوانی اور اس کے بھائی حاذق ذکری میں اختلافات پیدا ہو گئے تھے۔ ہاناوانی عیش و عشرت اور جاہ وحشمت کی طرف چلی گئی، اس کا بڑا بھائی حاذق ذکری درویش صفت ہو کر جنگلوں کی طرف چلا گیا۔ میں نے ایک بار پھر کاغذ کی تحریر پر اس کا نام پڑھا۔ تمہارا خیر خواہ حاذق ذکریا۔

ہاں یہ وہی تھا۔ میں نے چادر کے نیچے بینش کی طرف دھیان سے دیکھا۔ میری ہدایت کے مطابق وہ مجھ سے لپٹی ہوئی تھی اور اپنی حرکات وسکنات سے یہی ظاہر کر رہی تھی کہ ہم اس ریشمی چادر کے نیچے ایک دوسرے کی بانہوں میں گم ہیں۔ حقیقت اس سے بہت مختلف تھی۔ مرد و زن کی قربت والا احساس دور دور تک موجود نہیں تھا۔

میں نے اسے اپنے ساتھ لپٹایا۔ میرے ہونٹوں اور اس کے بائیں کان کے درمیان کوئی فاصلہ نہ رہا۔ میں نے نہایت مدھم سرگوشی کی۔ ''کس نے دیا یہ کاغذ؟''

''گروجی نے؟''

''کون گروجی؟''

''مادام ہاناوانی کے بڑے بھائی، وہ ایک پاس والے ٹاپو میں رہتے ہیں۔ لوگ کشتیوں پر بیٹھ کر ان سے ملنے جاتے ہیں اور دعائیں وغیرہ کراتے ہیں۔'' بینش نے میرے کان میں جوابی سرگوشی کی۔

''تم ان سے کب ملی ہو؟''

''تین دن پہلے، میں اپنی والدہ کے ساتھ وہاں گئی تھی، اور بھی بہت سی لڑکیاں جاتی ہیں، کچھ شوبز والی ہیں، کچھ یہاں ڈی پیلس میں ملازمت کرتی ہیں۔''

''لیکن کہتے ہیں کہ مادام ہاناوانی اور اس کے بھائی حاذق میں جھگڑا ہے۔ وہ ایک دوسرے سے ملتے نہیں ہیں۔ تم ڈی پیلس میں ملازم ہو پھر بھی حاذق ذکریا کو گرو کہہ رہی ہو۔''

''وہ واقعی بہت بڑے گرو ہیں۔ مادام ہاناوانی کی طرف سے کوئی پابندی نہیں ہے کہ لوگ گرو حاذق ذکری جی سے نہ ملیں۔''

''یہ تحریر تم تک کیسے پہنچی؟''

''گروجی نے میری والدہ کو دی تھی......اور کہا تھا کہ تمہاری بیٹی کا ستارہ چمک رہا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ ایک بڑا کام کرے۔ میری والدہ نے بڑے کام کی وضاحت چاہی تو انہوں نے کہا...... مجھے لگتا ہے کہ تمہاری بیٹی ڈی پیلس میں ایک خاص کام کے لیے چنی جائے گی۔ اسے ایک بہت خاص بندے کے پاس بھیجا جائے گا اگر یہ وہاں جائے تو پھر میرا ایک کام کرے۔ میں ایک پرچی دوں گا، یہ پرچی اسے اس خاص بندے تک پہنچانا ہوگی۔ والدہ نے گروجی کے قدم چھوئے اور یہ پرچی ان سے لے لی۔'' بینش میرے کان میں مدھم سرگوشیاں کررہی تھی اوراس کی گرم سانس میرے چہرے سے ٹکرا رہی تھی۔

اگراس کمرے میں خفیہ کیمرے موجود بھی تھے تو گلابی رنگ کی اس سلکی چادر نے انہیں یکسر ناکام بنا رکھا تھا۔ وہ ایک پُرکشش لڑکی تھی اور بڑے ہیجان خیز انداز میں میرے ساتھ لپٹی ہوئی تھی مگر ان دنوں میرا دل و دماغ جس کیفیت میں سے گزر رہے تھے، میرے اندر رومانی احساسات کا دور دور تک نشان نہیں تھا۔ میں نے اپنے پیاروں کو کھویا تھا۔ اپنے جسم اور اپنی روح پر بے پناہ اذیت جھیلی تھی۔ میرے سینے میں انگاروں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ میں نے عین اس کے کان میں سرگوشی کی۔ ''تمہیں یہ سب کرتے ہوئے ڈر نہیں لگا؟''

وہ منمنائی۔ ''ڈر تو بہت لگ رہا تھا۔ آپ سے بھی، اور اپنے کام سے بھی۔ لیکن گروجی کے لیے تو ہم سب کی جان بھی حاضر ہے۔ انہوں نے بہت کچھ دیا ہے اپنے چاہنے والوں کو......اوراب بھی دے رہے ہیں۔''

میں نے ہاتھ بڑھا کر کمرے کی لائٹ آف کردی۔ اندھیرا چھا گیا مگر آج کل جس طرح اینٹی ڈارک عینکیں موجود ہیں اینٹی ڈارک کیمرے بھی زیر استعمال ہیں۔ ہمارا چادر کے نیچے ہی رہنا ضروری تھا۔ میرا ذہن مختلف کڑیاں جوڑ رہا تھا۔ اوراس کوشش میں کامیاب تھا۔ میرا دل گواہی دینے لگا کہ عنقریب مجھے مادام ہاناوانی کے سامنے لے جایا جائے گا۔ قبر کی ملکہ المعروف ماذوودارا۔ وہی عورت جو آنکھوں کے جادو کی ماہر تصور کی جاتی ہے اس تحریر کے ذریعے میرے ایک خیرخواہ نے مجھے اس آزمائش کے لیے تیار کیا تھا۔ لیکن میں تو اس خیرخواہ کو صرف نام سے جانتا تھا، کبھی میرا اوراس کا آمنا سامنا نہیں ہوا تھا مگر لگتا تھا کہ وہ میرے حالات سے پوری طرح واقف ہے، اور میری مدد کرنا چاہتا ہے۔ اسے اندیشہ تھا کہ ہاناوانی ہپناٹزم کے حوالے سے، مجھ پر اپنی صلاحیتوں کا استعمال کرے گی اور جو کام بدترین تشدد سے نہیں ہو پایا وہ "SUGGESTION" کے ذریعے کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

اسی قسم کا اندیشہ میرے اپنے ذہن کی گہرائیوں میں بھی کہیں موجود تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ پُراسرا شخص کی یہ پُراسرا تحریر میرے دل کو لگی تھی۔ اس تحریر کو ایک بار پھر پڑھنے کے بعد میں نے چادر کے اندر ہی منہ میں ڈال کر چبالیا اور نگل لیا۔

میں نے بینش کے کان میں پوچھا۔ ”کیا تم پھر گرو جی سے ملو گی؟“

”میں نہیں جانتی۔ اس کا پتا میری والدہ کو ہوگا۔“

میں نے کہا۔ ”تم میرے بارے میں کیا جانتی ہو؟“

”آپ ہر ہائی نس قسطینا کے قریبی ساتھی ہیں۔ لڑائی میں آپ نے جان کی بازی لگا کر ہر ہائی نس قسطینا کی جان بچائی۔ جزیرے میں بہت سے لوگ ہیں جن کی نظروں میں آپ ایک ہیرو ہیں۔ میں...... سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ ایک دن اس طرح آپ کی خدمت میں بھیجی جاؤں گی۔ آپ کے جسم پر اتنے زخم دیکھ کر مجھے دکھ بھی ہوا ہے اور آپ سے بہت ڈر بھی لگا۔ مجھے خطرہ تھا کہ آپ کا غصہ مجھ پر نکلے گا اور میں کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤں گی لیکن گرو جی کی باتوں کا حوصلہ بھی تھا...... ان کا دیا ہوا حوصلہ بہت طاقت رکھتا ہے، بہت زیادہ۔“

میں نے کہا۔ ”اگر تمہارا یا تمہاری والدہ کا رابطہ پھر گرو جی سے ہو تو ان سے کہو کہ میں نے ان کی بات کو سمجھا ہے اور اس پر پوری طرح عمل کی کوشش کروں گا۔ میری طرف سے ان کا شکریہ ادا کرو......“

”جیسے آپ کا حکم ہو۔“ وہ بولی۔

”ان سے کہنا...... میں چاہتا ہوں کہ مجھے ان کی رہنمائی پھر بھی ملتی رہے۔“

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد میں نے سرگوشی کی۔ ”تم بہت خوب صورت ہو، کوئی بھی مرد تمہاری خواہش کر سکتا ہے۔ اس صورتِ حال کو اپنی ناقدری یا بے عزتی نہ سمجھنا۔“

”میں جانتی ہوں کہ آپ بہت مشکل حالات سے گزر رہے ہیں۔ میرے لیے یہی بڑے اعزاز کی بات ہے کہ میں آپ کے کسی کام آسکی ہوں۔ آپ ان لوگوں میں سے ہیں، جن سے...... جاماجی کے عوام نے...... اچھے دنوں کی امید باندھ رکھی ہے۔“

ہم نے ایک دوسرے کے کان میں چند سرگوشیاں مزید کیں، ان سے مجھے یہی پتا چلا کہ جن بیس لوگوں کے سروں پر انعام مقرر کیا گیا تھا، ان میں سے آدھے سے زیادہ مل گئے ہیں اور انہیں رائے زل کے حکم پر سرِعام پھانسی بھی دے دی گئی ہے۔ اب زیادہ زور ہر ہائی نس قسطینا اور ان کے ساتھیوں کی تلاش پر ہے۔ یوں لگتا ہے کہ حکومتی مشینری کو اس کے سوا اور

کوئی کام ہی نہیں۔ رات دن ان کی تلاش جاری ہے۔

ان سرگوشیوں کے دوران میں ہم کسی وقت دو چار فقرے قدرے بلند آواز میں بھی بولتے تھے تا کہ اگر ہماری آواز سنی جا رہی ہو تو کسی کو ہماری مسلسل خاموشی پر شک نہ ہو۔ تحریر کے حوالے سے میرے ذہن میں زبردست ہلچل تھی۔

○......❖......○

اور پھر وہ دن آیا جب میں نے خود کو اس خطے کی سب سے انوکھی اور پُراسرا عورت کے رُوبرو پایا۔ میرے ہاتھ پشت پر ہتھکڑی میں جکڑے تھے اور پاؤں کو بھی کیبل ٹائی کی مدد سے باندھا گیا تھا۔ میں ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ یہ ڈی پیلس کا وہی پُرشکوہ کمرا تھا جو کبھی وڈے صاحب ریان فردوس کے بیڈ روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ مادام ہاناوانی مجھ سے آٹھ دس فٹ کی دوری پر ایک عالیشان نشست پر بیٹھی تھی۔ کمرے کی لائٹنگ اس طرح کی گئی تھی کہ ہاناوانی کے گرد روشنی کا ایک ہالہ سا نظر آتا تھا۔ کمرے کی روشنیوں نے پورے ماحول کو ایک اونگھتی ہوئی سی کیفیت دے دی تھی۔ میری کرسی نہایت آرام دہ تھی اور میری پلکوں پر ایک عجیب سا بوجھ تھا۔ اب مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ مجھے ہاناوانی کی خدمت میں پیش کرنے سے پہلے جو کھانا دیا گیا تھا اس میں کوئی خاص نشہ آور چیز موجود تھی۔

ہاناوانی نہایت بیش قیمت لباس میں تھی۔ اس کے زیورات میں قیمتی پتھر اور موتی جگمگا رہے تھے، ایک مسحور کن سی خوشبو اس کے جسم سے پھوٹتی محسوس ہوتی تھی۔ سیاہ چشمہ پہنے وہ ہمیشہ کی طرح بالکل ساکت بیٹھی تھی۔ گارڈز مجھے اس کے مقابل چھوڑ کر جا چکے تھے اور اب ہم دونوں کے سوا اس کمرے میں اور کوئی نہیں تھا۔ مجھے لگا کہ میرا سر چکرا رہا ہے اور ایک کمزوری سی میرے اندر اترنا چاہ رہی ہے۔ مجھے تحریر میں کہی ہوئی باتیں یاد آئیں۔

اپنے جسم کو ڈھیلا مت چھوڑنا۔ سانس روک کر رکھنا۔

اس عورت کی دونوں آنکھوں کے بجائے ایک آنکھ میں دیکھنے کی کوشش کرنا خود کو کسی ذہنی یا جسمانی کوفت میں مبتلا رکھنا۔

پھر مادام ہاناوانی نے اپنا سیاہ چشمہ اتارا۔ میں بے ساختہ اس کی طرف دیکھنے پر مجبور ہوا۔ یوں لگا اس کے زیورات کی طرح اس کی آنکھوں میں بھی دو ہیرے ہی رکھے ہیں۔ میں نے سمجھا تھا کہ وہ کچھ بولے گی...... کچھ کہے گی مجھ سے۔ مگر جو کچھ ہوا وہ بالکل مختلف اور اچانک تھا۔ اردگرد کا سارا ماحول جیسے کسی دھند میں چھپ گیا۔ مجھ سے بہت دور چلا گیا۔ میرے سامنے ایک بہت بڑا بھنور تھا لیکن یہ پانی کا نہیں سات رنگوں کا بھنور تھا۔ ساتوں رنگ

بے حد تیزی سے گھوم رہے تھے۔ بھنور کی اندرونی آنکھ مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ میرے ڈوبتے ہوئے ذہن میں وہی بات آئی کہ بھرپور مزاحمت کرنی ہے اور خود کو ذہنی یا جسمانی طور پر کسی تکلیف میں مبتلا رکھنا ہے۔ میں نے اپنی پشت پر بندھے ہوئے دائیں ہاتھ کو حرکت دی۔ ایک بات جیسے پہلے سے میرے ذہن میں موجود تھی۔ ہاتھ کا انگوٹھا بری طرح مجروح تھا۔ ہلکی سی ٹھیس بھی برداشت نہیں ہوتی تھی۔ میں نے بیدردی سے اپنے اس انگوٹھے کو موڑا اور شہادت کی انگلی سے اسے دبا دیا۔ درد کی ناقابلِ بیان لہریں انگوٹھے کی پور سے لے کر کہنی تک پھیلنے لگیں۔

مجھے صاف محسوس ہوا کہ ست رنگے بھنور کی بے پناہ کشش قدرے کم ہو گئی ہے جو نادیدہ ڈوریں مجھے اس کی طرف کھینچ رہی تھیں، ان کا تناؤ کم ہو گیا ہے۔ کچھ دیر یہ زبردست کشمکش جاری رہی، پھر مجھے اپنے اردگرد دو بے حد بدہیئت عورتیں نظر آئیں۔ سیاہ بھجنگ...... اور سرخ آنکھوں والی۔ انہوں نے اپنے بال کھول رکھے تھے اور بَین کر رہی تھیں۔ ان کے لمبے دانت چمکارے مارے تھے۔ وہ مجھے اس بھنور کی طرف ہانک رہی تھیں۔ ''ہم چاند گڑھی سے آئی ہیں۔ ہم نے وہاں بھی بہت خون پیا ہے۔'' وہ پکار رہی تھیں۔

اپنے انگوٹھے پر دباؤ بڑھاؤ...... تکلیف پیدا کرو...... تکلیف پیدا کرو۔ میرے ذہن میں سے ایک آواز بلند ہوئی۔

میں نے انگوٹھے کو مسل ڈالا۔ مجھے لگا کہ خون رِسنے لگا ہے۔ پس بہنے لگی ہے۔ درد کی لہریں بلند و بالا تھیں۔ بَین کرتی ہوئی اور کریہہ آوازوں میں چلاتی ہوئی ایک عورت کا چہرہ بالکل، میرے ازلی دشمن جان ڈیرک جیسا ہو گیا۔ وہ عورت مردانہ آواز میں دہاڑنے لگی۔ بہت اذیت دے کر ماروں گا۔ موت کو ترسو گے...... دہاڑنے کے ساتھ ساتھ وہ عورت بھی دوسری عورت کی طرح مجھے ست رنگے بھنور کی طرف دھکیل رہی تھی۔ میں اپنی جگہ جم کر کھڑا رہا۔ میرے ہاتھ میں اٹھنے والی درد کی لہریں مجھے حواس کھونے سے بچاتی رہیں...... کچھ دیر یہ جان لیوا کشمکش بھی جاری رہی...... پھر ختم ہو گئی۔

مجھے لگا کہیں بہت دور سے مادام ہاناوانی کی بھنبھناہٹ جیسی آواز میرے کانوں تک پہنچ رہی ہے۔ وہ مسلسل بول رہی ہے مگر نظر آ رہی ہے نہ ٹھیک سے سنائی دے رہی ہے۔ ست رنگا بھنور بھی میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ اس میں ستارے سے چمک رہے تھے۔ حالت مدہوشی میں بھی میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ اگر میں اس بھنور میں چلا گیا تو پھر وہی ہو گا جو ہاناوانی مجھ سے چاہے گی۔

اچانک اس بہت بڑے بھنور کے اندر سے سیاہ نقطے سے نمودار ہوئے۔ وہ ذرا واضح ہوئے تو پتا چلا کہ انسانی سر ہیں۔ یہ سر اور سیاہ بال واضح ہوتے چلے گئے۔ یہ خوبرو لڑکیاں تھیں۔ سر سے پاؤں تک عیاں۔ بدن سانچے میں ڈھلے ہوئے اور بلوری، نظر ان پر پڑے تو پھر حرکت کرنا بھول جائے۔ ان کی آنکھوں میں خمار ہی خمار تھا۔ پھر ان کے درمیان سے تاجور نمودار ہوئی۔ پری پیکر، کشش کی مورتی، مہ رخ مہ جبیں۔ اس کے جسم پر گلاب کے پھولوں کا لباس تھا جو اسے کہیں سے چھپاتا تھا، کہیں سے عیاں کرتا تھا۔ اس کی آنکھوں کا بے پناہ نشہ مجھے اپنی طرف بلا رہا تھا۔ اس نے عجیب گونجتی ہوئی سی آواز میں کہا۔ ''مجھے جھوٹ نہ سمجھیں...... میں سچ ہوں...... مجھے چھو کر دیکھ لیں، آپ کو یقین آجائے گا۔ آپ حیران رہ جائیں گے کہ خیال کس طرح حقیقت میں بدلتا ہے۔''

ذہن میں دُھند بھرتی جا رہی تھی، میرے اندر کچھ کمزور پڑ رہا تھا۔ اگر یہ صرف تخیل کی کارفرمائی تھی تو بھی اتنی دلکش تھی کہ میں اسے چھونا چاہتا تھا۔ میں اس کے جسم کے سارے پھول چن لینا چاہتا تھا اور پھر اسے بانہوں میں لے کر اپنی تمام تر آسودگی کے ساتھ اسی بھنور کے اندر مر جانا چاہتا تھا، کوئی میرے اندر سے کہہ رہا تھا اگر یہ سب کچھ تخیل اور فریب نظر بھی ہے تو بھی اتنا پُرلطف ہوگا کہ تاقیامت اس کے سرور میں ڈوبے رہو گے۔

ایک دوسری آواز دل کے نہاں خانوں سے ابھری۔ خود کو کمزور نہ پڑنے دینا...... خود کو ذہنی یا جسمانی اذیت میں مبتلا کرنا...... کرتے چلے جانا......

میں نے خود کو ذہنی اذیت دی۔ جاناں کی موت...... اس کی خون میں لتھڑی ہوئی انگلیاں...... موت کی ہچکیاں، سیف کا آخری فقرہ...... آپ مجھ سے ناراض تو نہیں...... زہر کی اذیت سے اس کا تڑپتا ہوا زخمی جسم...... عبدالکریم کی پھانسی اور نزع کے عالم میں اس کے جسم پر گولیوں کی بوچھاڑ...... میں نے جسمانی اذیت کو بھی اس میں شامل کیا۔ میرے انگوٹھے کا زخم پھٹ گیا۔ مجھے لگا میرے ہاتھ پر لہو کی ''چپچپاہٹ'' ہے پورا بازو درد کی شدت سے لرز رہا ہے۔ ٹیسیں تیز تر ہوتی جا رہی ہیں۔ پتا نہیں کہ کتنا وقت اسی طرح گزرا، پھر ست رنگے بھنور میں چمکتے ہوئے ستارے بجھ گئے۔ تاجور کا چہرہ اوجھل ہو گیا۔ بھنور کے رنگ ماند پڑنے لگے۔ اور پھر...... معدوم ہو گئے۔ مجھے لگا، کسی نے میرے سینے پر زور سے لات رسید کی ہے اور میں کرسی سمیت فرش پر لڑھک گیا ہوں...... میرے حواس بحال ہونے لگے...... میں نے دیکھا کہ مادام ہاناوانی والی پُرشکوہ نشست اب خالی پڑی ہے۔

○......❖......○

اندازہ ہو رہا تھا کہ مجھے لات مار کر کرسی سمیت نیچے گرانے والی خود مادام ہاناوانی ہی تھی۔ غالباً مجھے زیر کرنے کی کوششوں میں ناکام ہونے کے بعد اس نے جھنجلاہٹ میں یہ حرکت کی تھی۔ مجھے لگا کہ جیسے میں ایک طویل سفر کر کے آیا ہوں اور تھکن سے چُور ہوں۔ پتا نہیں کہ میں کتنی دیر یہاں بیٹھا ہاناوانی کو "سہتا" رہا تھا۔ سات رنگوں کا ایک بہت بڑا بھنور سا تھا جو مجھے اندر ڈبونا چاہتا تھا۔ میں نے اپنی تمام تر قوت برداشت کو بروئے کار لا کر خود کو اس بھنور سے دور رکھا تھا۔ اپنے انفیکشن زدہ سوجے ہوئے انگوٹھے کو میں نے اس بری طرح کچلا تھا کہ زخم پھٹ سا گیا تھا اور ہتھیلی پر لہو کی چپچپاہٹ تھی۔

کچھ دیر بعد تین مسلح اور چوکس گارڈز اندر داخل ہوئے، میرے ہاتھ بدستور پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ گارڈز نے مجھے کرسی سے علیحدہ کیا اور پھر بڑی احتیاط کے ساتھ کمرۂ خاص سے نکال کر میرے اپارٹمنٹ میں لے گئے۔ میرا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا لیکن دل کہہ رہا تھا کہ میں اس بے پناہ ماورائی دباؤ کو ناکام بنانے میں کامیاب رہا ہوں جسے ہاناوانی کی آنکھوں کا طلسم کہا جاتا ہے۔ میں نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ ہاناوانی کے سامنے جانے کے بعد میرے ساتھ ہوا کیا تھا؟ میں کچھ خاص یاد نہیں کر سکا۔ بس یہی یاد آیا کہ ہاناوانی قیمتی گہنوں سے لدی پھندی بڑی شان سے میرے سامنے اپنی شاہی نشست پر بیٹھی تھی پھر اس نے اپنی سیاہ عینک اتاری تھی۔ ایک عجیب سی دھندلاہٹ اور خود فراموشی نے مجھے گھیر لیا تھا۔ یہ بھی یاد آیا کہ ہاناوانی نے جب اپنی عینک اتاری تو مجھے اس کے ہاتھ کی چھ انگلیاں نظر آئی تھیں۔ ذکری نے مجھے بتایا تھا کہ ہاناوانی اپنے شکار پر عموماً تین بار جھپٹتی ہے۔ اگر یہ تین کوششیں ناکام ہوں تو پھر وہ مزید کوششیں نہیں کرتی۔ یوں لگ رہا تھا کہ میں اس کی تین زبردست قسم کی کوششیں جھیل چکا ہوں۔

مجھے اپارٹمنٹ میں لاک کرنے کے بعد حسبِ معمول آہنی راڈز والی کھڑکی کی طرف بلایا گیا۔ میں نے کھڑکی کے قریب جا کر اپنی پشت کھڑکی کی طرف کر لی۔ گارڈز نے میری الٹی ہتھکڑی کھول دی اور میں اپنے کمرے کی طرف آ گیا۔ میں نے اپنی بند مٹھی کھول کر انگوٹھے کا حشر نشر دیکھا۔ اسے مرہم پٹی کی ضرورت تھی۔ انگوٹھے کے زخم سے بہنے والے خون نے ہتھیلی کو سرخ کر دیا تھا۔

اسی دوران میں سی سی ٹی وی کیمرے پر بھی میرے زخم کو دیکھ لیا گیا۔ کمرے میں لگے ہوئے اسپیکر پر فوراً آواز ابھری۔ "تمہارے زخم کو بینڈیج کی ضرورت ہے۔ فوراً کھڑکی کی طرف آؤ۔"

میں کھڑکی کی طرف چلا گیا۔ ذرا دیر بعد ملائیشین ڈاکٹر بھی وہاں آن موجود ہوا۔ ''کیا ہوا تمہارے انگوٹھے کو؟'' اس نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

''دروازے میں لگ گیا ہے۔'' میں نے مبہم جواب دیا۔

اس نے میڈیکل باکس کھول کر زخم کو صاف کیا اور اچھی طرح بینڈ تیج کرنے کے بعد کھانے کے لیے بھی دوا دی۔ وہ کچھ الجھن میں نظر آرہا تھا۔ جیسے سوچ رہا ہو کہ انگوٹھے کی یہ حالت کیسے ہوئی ہے۔ ممکن تھا کہ وہ بعد میں سی سی ٹی وی کی فوٹیج دیکھ کر بھی کچھ اندازہ لگانے کی کوشش کرتا۔ بہرحال یہ بات ان میں سے کسی کے وہم وگمان میں بھی نہیں آسکتی تھی کہ میں نے ان کی مادام ہاناوانی کے ''ٹرانس'' سے بچنے کے لیے خود کو یہ جسمانی اذیت پہنچائی ہے۔

جس راز کو میں نے سینے میں دفن کیا تھا، وہ اب واقعی دفن ہو چکا تھا۔ میرا تہیہ تھا کہ اب کسی بھی صورت اس کو باہر نہیں آنے دوں گا۔ ابھی تک میں اپنے اس ارادے میں مکمل کامیاب تھا۔ امریکی لونگ جیک کا بے پناہ تشدد اس راز کی قبر کشائی نہیں کر سکا تھا اور اب اپنی آنکھوں میں جادو رکھنے والی مادام ہاناوانی بھی اس کوشش میں بظاہر ناکام ہوئی تھی۔ آئندہ کیا ہونا تھا، اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔

O.....◆.....O

اگلے پانچ چھ روز تک مجھے لونگ کی منحوس شکل تو نظر نہیں آئی۔ تاہم مجھ سے پوچھ گچھ کے مختلف طریقے اختیار کیے جاتے رہے۔ یہ سارے طریقے نرمی کے تھے اور ان میں تکنیک سے کام لینے کی کوشش کی گئی تھی۔ ایک امریکی سائیکاٹرسٹ نے اپنے قریباً دس گھنٹے مجھ پر ضائع کیے اور آزاد تلازمے اور کونسلنگ کا طریقہ اپنا کر میرے اندر سے کچھ نکالنے کی ناکام کوشش کرتا رہا پھر ایک دن مجھ پر ''جھوٹ سچ'' جاننے والا آلہ آزمایا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ جھوٹ بولنے والے کی نبض کی رفتار میں فوراً ردوبدل ہوتا ہے اور کچھ کیمیائی تبدیلیاں وغیرہ آتی ہیں۔ ایک دن مجھے ایک انجکشن دیا گیا۔ بتایا تو یہ گیا کہ یہ انگوٹھے اور دیگر زخموں کی انفیکشن روکنے کے لیے ہے لیکن حقیقت مختلف تھی۔ اس انجکشن کے بعد مجھ پر غنودگی طاری ہوئی مگر یہ صرف غنودگی نہیں تھی۔ اس میں ایک عجیب طرح کی یاسیت اور پژمردگی تھی۔ جی چاہ رہا تھا کہ اس ماحول اور اردگرد کے سارے حالات سے فرار اختیار کر کے کہیں دور چلا جاؤں۔ بھاڑ میں جائے یہ سب کچھ۔ ان لوگوں کی بات مان لوں اور اپنی جان چھڑا لوں۔

نیلی آنکھوں والا پال اس کیفیت کا فائدہ اٹھانے کے لیے میرے سامنے آن بیٹھا اور مختلف سوال شروع کر دیئے۔ اس نے مجھے یہ چکما دینے کی کوشش بھی کی کہ مادام ہاناوانی اور

بیگم نورل کے درمیان مفاہمت ہوگئی ہے اور بڑا اچھا ماحول پیدا ہورہا ہے۔ اگر میں اپنے ساتھیوں کا اتا پتا بتادوں تو ان کے ساتھ رعایتیں ہوسکتی ہیں اور یہ بھی کوئی بڑی بات نہیں کہ انہیں عام معافی مل جائے۔

میں نے غنودہ لہجے میں کہا۔ ''اگر انہیں معافی ہی دینی ہے تو پھر ایسے ہی دے دو۔ ان کا پیچھا چھوڑ دو۔''

پال بولا۔ ''قانون کے کچھ تقاضے ہیں۔ وہ تو ہر صورت پورے ہونے ہی ہیں۔''

''تم لوگ جتنے بڑے قانون پسند ہو۔ دنیا اچھی طرح جانتی ہے۔''

پال کا چہرہ سرخ ہوگیا لیکن تحمل سے بولا۔ ''دنیا اور بھی بہت کچھ جانتی ہے۔ وہ یہ بھی جانتی ہے کہ ہم نے عراق کے صدام کو کہاں سے کھینچ کر باہر نکال لیا تھا اور اسامہ......''

وہ بولتا چلا جارہا تھا۔ اس کی آواز میرے کانوں میں جیسے کہیں دور سے پہنچ رہی تھی۔ میرے اندر کی اولوالعزمی نہ جانے کہاں اوجھل تھی، جی چاہ رہا تھا کہ اس مسلسل پوچھ گچھ سے جان چھڑا کر سوجاؤں۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوجاؤں مگر یہ بات بھی ذہن میں موجود تھی کہ مجھ پر کسی خاص قسم کی میڈیسن کا اثر ہے اور میں فی الوقت نارمل حالت میں نہیں ہوں۔

پال کی وہ ساری گفتگو بھی اس کے لیے لاحاصل ہی رہی۔ میں اس کی یہ بات کسی صورت مان نہیں سکتا تھا کہ جس مادام ہاناوانی نے بیگم نورل کو بیوہ کیا ہے اور اس کے جوان بیٹے کمال احمد کی جان لی ہے وہ اس سے کسی طرح کی مفاہمت کرے گی۔ مجھ سے سخت قسم کی پوچھ گچھ جاری تھی لیکن اس پوچھ گچھ کا میرے لیے ایک مثبت پہلو بھی تھا۔ پوچھ گچھ ہوتی تھی تو مجھے تسلی ہوجاتی تھی کہ میرے ساتھی اب تک محفوظ و مامون ہیں۔

O......❖......O

یہ اگلے روز کی بات ہے۔ میں چمکیلے راڈز والی کھڑکی کے پاس کھڑا ڈاکٹر سے اپنے انگوٹھے کی پٹی کروارہا تھا کہ دو گارڈز آدھمکے۔ جونہی ڈاکٹر اپنے کام سے فارغ ہوا۔ مجھے الٹی ہتھکڑی لگوانے کا حکم دیا گیا۔ میں نے ہتھکڑی لگوالی۔

''مجھے باہر لے جایا جارہا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، کسی کو اندر لایا جارہا ہے۔'' امریکی گارڈ نے خشک لہجے میں جواب دیا پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''اپنے پاؤں بھی راڈز کے ساتھ لگاؤ۔''

''وہ کیوں؟''

''تمہیں دس مرتبہ کہا جاچکا ہے......سوال جواب نہیں......صرف وہ کیا کرو جو تم سے

درخواست کی جاتی ہے۔" گارڈ کے لہجے میں زہرناکی تھی۔
میں نے پاؤں بھی آگے کر دیئے۔ ایک بیڑی نما زنجیر پہنا دی گئی۔ اس کی وجہ سے میں بمشکل نو دس انچ کا قدم ہی اٹھا سکتا تھا۔ آج یہ خاص "میزبانی" ظاہر کر رہی تھی کہ کوئی خاص بات ہے۔ شاید کوئی خاص بندہ ملنے آرہا تھا۔
اور پھر یہ خاص بندے والا قیافہ درست ثابت ہو گیا۔ دس منٹ بعد جو شخص میرے اپارٹمنٹ کا داخلی دروازہ کھول کر اندر آیا میں، اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ میرے لیے اجنبی نہیں تھا مگر مجھے یہ ہرگز توقع نہیں تھی کہ میں اسے یہاں دیکھوں گا۔ وہ شکیل داراب تھا۔ داراب فیملی کا وہ سیاست زادہ جو پاکستانی سیاست اور حکومت میں کچھ نہ ہونے کے باوجود بہت کچھ تھا۔ لشکارے مارتا ہوا خوب صورت چہرہ...... خوش لباس، خوش رو لیکن اندر سے شاید اتنا ہی کالا۔ اس سے میرے آخری ملاقات کافی دن پہلے لیہ کے پارا ہاؤس میں ہوئی تھی۔ اس وقت ہم عزت مآب ریان فردوس کے ساتھ برونائی آنے کی تیاری کر رہے تھے۔ شکیل داراب نے کہا تھا کہ وہ بھی چند روز تک ہمارے پاس پہنچ رہا ہے مگر اب اس نے قریباً تین ماہ بعد شکل دکھائی تھی۔
اس نے کھڑکھڑاتی ہوئی سفید شلوار قمیص پہن رکھی تھی اور خوشبو میں بسا ہوا تھا۔ اس نے میری طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن پھر اسے یاد آیا کہ میرے ہاتھ تو اس کی حفاظت کے لیے پشت پر باندھے گئے ہیں۔ وہ میرے سامنے نشست پر بیٹھ گیا اور اپنے رعب دار لہجے میں بولا۔ "مجھے تمہارے حوالے سے یہی اندیشہ تھا کہ تم وہاں جا کر خود کو کسی نہ کسی مصیبت میں گرفتار کر لو گے، تمہارے اندر سیلانی روح ہے۔"
میں نے کہا۔ "میرے خیال میں تو تمہاری روح مجھ سے زیادہ سیلانی ہے۔"
"کیا مطلب؟"
"تمہاری روح گھاٹ گھاٹ کا پانی پیتی ہے جس طرف فائدہ زیادہ نظر آتا ہے اسی طرف چلی جاتی ہے۔"
"شاید تم ریان فردوس کی بات کر رہے ہو۔ مجھے اس کی موت کا افسوس ہے مگر اس نے بھی تمہاری طرح بہت غلطیاں کی ہیں۔ وہ سمجھنے لگا تھا کہ آدم کی بیٹی اور کمانڈر افغانی جیسے لوگ بہت طاقتور ہیں اور یہ سارے جوشیلے لوگ اسے یہاں کا صحیح حکمران بنا کر دم لیں گے۔ وہ ڈبل گیم کھیلتا رہا اور آخر مارا گیا۔"
"اس نے کوئی ڈبل گیم نہیں کھیلی تھی۔ وہ تو آخر تک قسطینا اور بیگم نورل کو لتاڑتا رہا اور

انہیں مشورے دیتا رہا کہ وہ رائے زل اور امریکی ایجنسی کے پاؤں چھو لیں۔ عین جنگ میں بھی اس نے امریکی قیدیوں پر اپنی محبت نچھاور کی اور ''مفاہمت'' کی خاطر ان کو رہائی دلائی۔ اپنے ہاتھوں سے ان کی زنجیریں کاٹیں اور اس کے بدلے میں اپنے لیے امن اور اپنی عیاشیوں کا تحفظ مانگا مگر یہ لوگ اپنے خیرخواہوں کو ٹشو کی طرح استعمال کر کے پھینک دینے کے عادی ہیں۔ ریان فردوس کو بھی موت کے گڑھے میں پھینک دیا۔ اس کے بیٹے کو بھی دردناک موت سے دوچار کیا اور ابھی نہ جانے کس کس کی باری آنی ہے۔''

شکیل داراب مسکرایا اور اس کے سفید کلیوں جیسے دانت چمک اٹھے وہ بولا۔ ''تم ریان فردوس کی جن کارروائیوں کا ذکر کر رہے ہو، وہ بہت دیر سے ہوئیں۔ اس وقت تک تو رائے زل اور امریکی یہ لڑائی تقریباً جیت چکے تھے۔ بہرحال میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا، میں چاہتا ہوں کہ کچھ آئندہ کے بارے میں سوچا جائے۔''

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''اگر تم رائے زل اور ایجنسی کے نمائندے بن کر آئے ہو تو مجھے تمہاری بے حسی پر حیرت ہے۔''

''شاہ زیب! مجھے لگ رہا ہے کہ تم کچھ چیزوں کو غلط اینگل سے دیکھ رہے ہو۔ ریان فردوس کو تو میں جانتا تک نہیں تھا۔ میری دوستی آقا جان سے تھی۔ آقا جان کے ذریعے ہی ریان فردوس سے علیک سلیک شروع ہوئی۔ اب بھی میں آقا جان ہی کے پاس آیا ہوں، کل رات میرے اور آقا جان کے درمیان مشورہ ہوا تھا جس کے بعد میں نے تم سے ملنے کا فیصلہ کیا۔''

''اگر تم وہی سوال کرنا چاہتے ہو جو اب تک پچاس ہزار دفعہ مجھ سے کیا جا چکا ہے تو میرا مشورہ ہے کہ اپنا وقت اور توانائی ضائع نہ کرو، مجھ سے میری زندگی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو گا۔''

''تم بہت زیادہ بدگمان لگ رہے ہو۔''

''میں نے یہاں اپنے دوست کھوئے ہیں شکیل صاحب، ان کو تڑپ تڑپ کر مرتے دیکھا ہے...... اور میرے ساتھ جو جو کچھ ہوتا رہا ہے، اس کی نشانیاں بھی تمہیں میرے جسم اور چہرے پر نظر آ رہی ہوں گی۔ میرے سینے میں انگارے دہک رہے ہیں میرا مشورہ تم کو یہی ہے کہ خود کو ان انگاروں سے دور رکھو۔''

وہ ٹھنڈے مزاج کا گہرا شخص تھا۔ خاموشی سے میری طرف دیکھتا رہا۔ اس نے اپنا جڑاؤ سگریٹ کیس نکالا۔ میری معلومات کے مطابق غریب پاکستان کے اس غریب سیاست داں

کے سگریٹ کیس اور لائٹر کی قیمت 40 لاکھ روپے کے لگ بھگ تھی۔ اس نے سگریٹ میرے ہونٹوں کی طرف بڑھایا مگر میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔ اس نے سگریٹ اپنے ہونٹوں میں دبایا اور سلگا لیا۔

میں جب بھی اس شخص کی آنکھوں میں دیکھتا تھا، مجھے ان میں ایک گھناؤنا پن نظر آتا تھا۔ مجھے درمیانی عمر کی پُرکشش ناہید یاد آجاتی تھی۔ شکیل نے اپنی اس اسکول ٹیچر سے عشق کیا (حالانکہ اسے عشق کہنا بھی اس جذبے کی توہین ہے) پھر اسے اپنے ساتھ خفیہ شادی پر مجبور کیا اور اس سے جی بھر جانے کے بعد ''دوسروں'' کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ ان بااختیار امیرزادوں میں سے تھا جن کے لیے پورے پورے شہر ''شکارگاہوں'' کی حیثیت رکھتے ہیں۔

وہ بولا۔ ''دیکھو شاہ زیب! تم اپنے دل دماغ کو ٹھنڈا رکھو اور اپنے آپ کو بڑی مصیبت میں پھنسا چکے ہو، اس سے نکلنے کی کوشش کرو۔ یہاں ان لوگوں کا اپنا ہی قانون اور انصاف ہے۔ تم اسے ایک مائیکرو اسٹیٹ بھی کہہ سکتے ہو۔ یہاں تمہارے ساتھ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے، مجھ سے کھل کر بات کرو تاکہ میں تمہاری مدد کر سکوں اور ہاں...... کیمروں وغیرہ کی کوئی پریشانی نہیں ہے۔ یہاں کا آڈیو ویڈیو سسٹم بالکل بند ہے۔ ہمارے درمیان جو گفتگو ہو رہی ہے، وہ بس ہم دونوں کے درمیان ہے۔''

اس کے کہنے سے پہلے ہی میں دیکھ چکا تھا کہ چھت میں موجود کیمروں کے شٹر آٹومیٹک طور پر بند ہو گئے ہیں۔ عین ممکن تھا کہ صوتی آلات بھی بند ہوں لیکن یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

میں نے کہا۔ ''میں تم سے کچھ بھی چھپا نہیں رہا، میرا جو بھی حشر نشر ہے تمہارے سامنے ہے۔ تم بھی کھل کر بتا دو کہ کس مقصد کے لیے یہاں پہنچے ہو؟''

وہ توقف کے بعد دھیمے لہجے میں بولا۔ ''شاہ زیب! ایک بات تو میں تمہیں صاف بتا دوں، یہ لوگ تم سے تمہارے ساتھیوں کے بارے میں جانے بغیر تم کو چھوڑیں گے نہیں، تم خودکشی وغیرہ کر لو تو اور بات ہے ورنہ یہ تمہیں زندگی اور موت کے درمیان لٹکا کر رکھیں گے۔ اب رہا یہ سوال کہ وہ کون سا درمیانی راستہ ہو سکتا ہے جو تمہیں قبول ہو اور تمہیں پکڑنے والوں کو بھی۔ ایسے معاملات میں کچھ لو اور کچھ دو کے اصول پر عمل کرنا پڑتا ہے۔''

''سیاست داں ہو تو سیاست والی بات ہی کرو گے۔'' میں نے کہا۔

''نہیں، میں ایک ایسے درمیانی راستے کی بات کر رہا ہوں جس سے تمہاری زندگی بچ جائے اور تم بری موت کے اس پھندے سے نکل سکو۔'' اس نے پھر ایک توقف کیا۔ سگریٹ

کا ایک کش لے کر بولا۔ ''تم نے ڈی پیلس کے سامنے آقا جان کے منہ پر تھپڑ مارا، اس تھپڑ کی گونج پورے جاماجی میں سنائی دی اور شاید یہ گونج اب تک موجود ہے۔ تمہاری اس بے وقوفی نے تمہارے حالات بہت زیادہ خراب کر دیئے ہیں۔ پھر بھی میں نے آقا جان سے بات کی ہے اگر دوسرے مسئلے حل ہو جائیں تو اس تھپڑ کا مسئلہ بھی حل ہو سکتا ہے۔ معافی کے دو چار لفظ بول دینے سے یہ معاملہ ختم ہو جائے گا۔''

''اور دوسرے مسئلے کیا ہیں؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ تم قسطینا اور دیگر ساتھیوں کی گرفتاری میں مدد کرو، میں تم سے وعدہ کرتا ہوں شاہ زیب کہ تمہارے دونوں ساتھیوں سجاول اور انیق کو کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔ اس کے علاوہ جو پاکستانی لڑکی زینب یہاں موجود ہے، وہ بھی بالکل محفوظ رہے گی۔ ایک دو ہفتوں کی رسمی کارروائی کے بعد ان تینوں کو یہاں سے پاکستان روانہ کر دیا جائے گا بلکہ چاروں کو، میری معلومات کے مطابق کوئی سنبل نامی لڑکی بھی یہاں موجود ہے۔''

''اور میرے بارے میں کیا نوید لائے ہو؟'' میرا لہجہ پھر طنزیہ تھا۔

''تم پر دو بڑے الزامات ہیں۔ ایک تو تم نے آدم کی بیٹی قسطینا سے مل کر برج کلب پر خوفناک فضائی حملہ کرایا جس میں ایجنسی کے چیف گیرٹ کی جان گئی۔ دوسرے آقا جان کا دوست اور دست راست حلمی تمہارے ''مشین پسٹل'' کی فائرنگ سے ہلاک ہوا۔ دونوں معاملات سنگین ہیں۔ اس سنگینی کا اندازہ اس بات سے بخوبی ہو جاتا ہے کہ تمہارے سر کی قیمت لگ بھگ تین کروڑ روپیہ مقرر کی گئی تھی...... اب بھی کچھ لوگ تمہارے خون کے پیاسے ہیں...... لیکن میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہیں رعایتیں دی جائیں گی۔ ابھی یہ کہنا تو قبل از وقت ہوگا لیکن تمہیں سلطانی گواہ بنانے کی کوشش بھی کی جا سکتی ہے۔'' شکیل اپنی تمام تر دانش وری کے ساتھ بغور میری طرف دیکھ رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ''شکیل صاحب! تم جس حرام زادے آقا جان کی بات کر رہے ہو، میں اسے بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ کسی انسان کا بچہ نہیں۔ شاید کسی بھیڑیے اور مکار لومڑی کے ملاپ سے تولد ہوا ہے۔ وہ عریاں ہو کر گرم توے پر بیٹھ جائے تو بھی اس کی بات کا یقین نہیں کیا جا سکتا۔''

شکیل کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا، بولا۔ ''شاہ زیب! تم اپنے لیے بڑے خوفناک گڑھے کھود رہے ہو۔ یہ لوگ ان کو آخر کار ڈھونڈ لیں گے۔ تم اگر ہٹ دھرمی چھوڑ دو تو اپنے ساتھ ساتھ ان کا بھی بھلا کرو گے۔''

''میں ہٹ دھرمی تو تب کروں جب مجھے ان کے بارے میں کچھ معلوم ہو، وہ ہم تینوں کی بے خبری میں ٹاپو سے چلے گئے۔ کہاں گئے ہمیں کچھ پتا نہیں تھا۔ اس کے باوجود میرے دونوں ساتھیوں کو بدترین تشدد کے ذریعے مار دیا گیا۔ اب میرے ساتھ بھی جو کرنا چاہتے ہیں، کرلیں۔''

میرے اور شکیل داراب کے درمیان قریباً ایک گھنٹے بات چیت ہوئی۔ اس نے ایک ماہر سیاست داں کی طرح مجھے ڈر اور لالچ، دونوں طریقوں سے قائل کرنے کی کوشش کی۔ اس نے دبے لفظوں میں یہ بھی کہا کہ یہ چھوٹا سا جزیرہ معدنی دولت سے مالا مال ہے اور یہی وجہ ہے کہ غیر ملکی اس میں اتنی دلچسپی لے رہے ہیں۔ اس نے کہا کہ اگر یہاں سرمایہ کاری کا کوئی سین بن جائے تو ایک سوڈالر لگا کر ایک ہزار ڈالر کمانا کوئی مشکل نہیں ہوگا۔

شکیل داراب کی یہ ساری گفتگو میرے لیے بے کار تھی۔ وہ بھی جان گیا کہ میں کتنی بیزاری کے عالم میں یہ سب کچھ سن رہا ہوں۔ جہاندیدہ شخص تھا پھر آنے کا کہہ کر واپس چلا گیا۔

○......❖......○

اگلے چار پانچ دن میں کوئی اہم واقعہ رُونما نہیں ہوا۔ میرا کندھا اب آسانی سے حرکت کرنے لگا تھا۔ انگوٹھے کا زخم بھی ٹھیک ہو رہا تھا۔ اپارٹمنٹ میں کوئی ایسا ذریعہ نہیں تھا جس سے مجھے باہر کے حالات کی خبر ہوسکتی۔ پال نے دبے لفظوں میں مجھے ایک دفعہ پھر پیشکش کی کہ اگر میں چاہوں تو ذہنی سکون اور تفریح کے لیے کوئی لڑکی میرے پاس بھیجی جاسکتی ہے۔ میں اسے کیسے بتاتا کہ میرا ذہنی سکون تو میرے مرنے والے ساتھی اپنے ساتھ لے گئے ہیں اور میرا ذہنی سکون تو ان لوگوں کی سلامتی سے مشروط ہے جو یہاں سے دور ایک چھوٹے سے ٹاپو کے زیرزمین مکین ہیں، ایک تاریک دریا کے کنارے ایک ایسی سنگلاخ تاریکی میں دن رات گزار رہے ہیں جہاں مصنوعی روشنی کے بغیر ایک دوسرے کے ہیولے بھی دکھائی نہیں دیتے۔

پھر بھی میں نے اس خیال سے پال کی آفر قبول کرلی کہ انڈین لڑکی بینش سے دوبارہ ملاقات کا موقع مل جائے گا۔ بے شک اس کے ساتھ نامناسب حالت میں چادر کے نیچے لیٹنا مجھے بالکل اچھا نہیں لگا تھا، مگر یہ ایک مجبوری تھی۔ ''وہی انڈین آئے گی؟'' میں نے پال سے پوچھا۔

وہ مسکرایا اور اس کی نیلگوں آنکھوں میں چمک نمودار ہوئی۔ ''اچھا ماڈل ہے، لگتا ہے

اس کی ڈرائیونگ تمہیں پسند آئی ہے۔''

میں اندر ہی اندر کھول کر رہ گیا، تاہم پال کو اثبات میں جواب دیا۔

شام کے بعد خوب صورت پارسی لڑکی بینش ایک بار پھر میرے پاس تھی۔ اس رات بھی وہی پہلے والا ڈراما رچایا گیا۔ میں نے لڑکی کے لیے لگاوٹ اور بے تابی کا مظاہرہ کیا۔ قربت کے ابتدائی مراحل کی پرفارمنس دینے کے بعد، وہ اپنے برائے نام لباس سے آزاد ہو گئی، میرے جسم پر بھی فقط زیریں لباس تھا۔ ہم نے چادر کی پناہ لی۔ کمرے کی لائٹس آف ہو چکی تھیں۔ میں نے اسے بانہوں میں لے لیا اور ہم نے ایک دوسرے کے کانوں میں نہایت مدھم سرگوشیاں شروع کیں۔

''تم ماڈل ہو...... اور اچھی اداکاری کرتی ہو۔''

''شکریہ۔'' وہ منمنائی۔

''اس صورتِ حال کے لیے سوری جس میں ہم یہاں موجود ہیں۔'' میں نے کہا پھر ذرا توقف سے اپنی بات جاری رکھی۔ ''گرو جی سے تمہاری ملاقات ہوئی؟''

اس نے میرے کان سے ہونٹ لگاتے ہوئے کہا۔ ''جی ہاں، میں نے آپ کا پیغام ان تک پہنچا دیا تھا اور آپ کا ''شکریہ'' بھی۔''

''کیا کہا انہوں نے؟ میرا مطلب ہے کہ ''میرے راہنمائی'' والے سوال کا انہوں نے کیا جواب دیا۔''

''وہ کہنے لگے اوپر والے نے چاہا تو سب اچھا ہو گا۔ دیر ہو سکتی ہے، اندھیر نہیں۔ کچھ مشکلات بھی نظر آ رہی ہیں مگر بندے کی ہمت کے سامنے کوئی مشکل...... مشکل نہیں ہوتی۔'' وہ بالکل سانسوں میں بول رہی تھی۔ شاید اس کی آواز اس کے اپنے کانوں تک بھی نہ پہنچتی ہو، ایسا ہی لہجہ میری سرگوشیوں کا بھی تھا۔

میں نے کہا۔ ''اگر اب ملاقات ہو تو ان سے کہو کہ اس جزیرے کا دشمن آقا جان سے بڑا اور کوئی نہیں۔ میں اس کو جڑوں سے اکھاڑنے کے لیے یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں۔ اگر وہ اس سلسلے میں میری کوئی راہنمائی کر سکتے ہیں تو ضرور کریں۔''

ہم سرگوشیاں کرتے رہے اور کبھی کبھی ڈاج دینے کے لیے قدرے بلند آواز میں بھی بولتے رہے۔ میں جسمانی طور پر اس کے بہت قریب مگر ذہنی طور پر بہت دور تھا اور دور ہی رہنا چاہتا تھا۔ وہ ایک پڑھی لکھی، خوش گفتار اور گل بدن لڑکی تھی۔ اگر چند ہفتے پہلے مجھ سے اس طرح ملی ہوتی تو شاید صورتِ حال مختلف ہوتی۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ”بیگم نسا نورل کے بارے میں کچھ پتا ہے؟“

”جو کچھ نیوز میں آرہا ہے اس کے مطابق وہ بے حد کمزور اور لاغر نظر آتی ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ مادام ہاناوانی پوری پوری سوکن بنی ہوئی ہے اور بیگم نورل سے گن گن کر بدلے لے رہی ہے۔ عزت مآب کی موت کے بعد ان کے بڑے بیٹے کمال احمد کی موت کا پتا آپ کو چل ہی گیا ہوگا؟“ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بولی۔ ”اب عزت مآب رائے زل، شب وروز ہز ہائی نس ابراہیم کو تلاش کروا رہے ہیں۔ شاید ان کو ہز ہائی نس قسطینا سے بھی کچھ زیادہ ابراہیم کی ضرورت ہے۔“

”رائے زل کے شدید زخمی ہونے اور پھر آناً فاناً صحت یاب ہو جانے کے بارے میں عام لوگوں کا کیا خیال ہے؟“ میں نے بینش سے پوچھا۔

وہ بولی۔ ”اس بارے میں دو طرح کی رائے ہے جی۔ کچھ لوگ تو اسے مادام ہاناوانی کی روحانیت کا کرشمہ قرار دیتے ہیں مگر پڑھے لکھے لوگوں کا خیال یہی ہے کہ جس شخص کو جلسہ گاہ کے اسٹیج پر گولیاں لگیں، وہ رائے زل نہیں بلکہ ان سے مشابہت رکھنے والا شخص تھا...... جسے سیکیورٹی خدشات کی وجہ سے وہاں بٹھایا گیا تھا۔“

”رائے زل کی مصروفیات آج کل کیا ہیں؟“

وہ ذرا جھجک کر بولی۔ ”ان کی سب سے بڑی مصروفیت تو شراب اور عورت ہی ہے...... آج کل ڈی پیلس اس ”مصروفیت“ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ آقا جان کا چہیتا خواجہ سرا خیام، ہر روز عزت مآب رائے زل کے لیے نت نئے خوب صورت چہرے ڈھونڈ کر لاتا ہے۔“

مجھے ڈاکٹر ماریہ کا خیال آیا۔ میں نے بینش سے پوچھا۔ ”کیا ڈاکٹر ماریہ بھی رائے زل کے پاس ہے؟“

”جی ہاں...... جو لوگ واقف حال ہیں، وہ یہی سمجھتے ہیں کہ ڈاکٹر ماریہ ازخود رائے زل کے پاس نہیں آئی تھی بلکہ اسے مجبور کر کے بلایا گیا تھا۔ رائے زل بہت عرصے سے ڈاکٹر ماریہ پر میلی نظر رکھتے تھے۔ اب لڑائی میں فتح پانے کے بعد انہوں نے ڈاکٹر ماریہ کو حاصل کرنا بھی ضروری سمجھا۔ اب وہ بے چاری کسی پالتو کی طرح رائے زل کے پیچھے پیچھے رہتی ہے۔ رائے زل کے بارے میں مشہور ہے کہ...... وہ لڑکپن سے جنسی فتوحات کا شوق رکھتا ہے......“ وہ شاید کوئی واقعہ بتانا چاہتی تھی مگر جھجک کے باعث خاموش ہوگئی۔

میں نے کہا۔ ”ڈاکٹر ماریہ کا ایک بچہ بھی تو تھا؟“

”جی ہاں، وہ اب ڈاکٹر ماریہ کے پاس ہی ہے۔ ڈاکٹر ماریہ کے قریبی عزیز بھی رائے

زل اور ہاناوانی کے عتاب سے نکل گئے ہیں...... بلکہ ان میں سے کچھ کو نئے انتظامیہ میں عہدے بھی دیئے جا رہے ہیں۔''

رائے زل کا ریچھ نما جثہ اور چھوٹی چھوٹی آنکھیں میرے تصور میں گھومنے لگیں۔ سینے میں دھواں سا بھرنے لگا۔

صبح ناشتے کے بعد میں نے بینش کو رخصت کر دیا۔ اس حبس زدہ بے خبری میں وہ میرے لیے تازہ ہوا کا ایک جھونکا ثابت ہو رہی تھی۔

یہ تیسرے یا چوتھے روز کی بات ہے۔ میں بینش کو ایک بار پھر بلانے کے لیے پال سے رابطہ کرنے کا سوچ رہا تھا کہ وہ خود ہی آ گیا۔ حسبِ معمول اس کی آمد سے پہلے مجھے راڈز والی کھڑکی کے پاس بلایا گیا اور ہاتھ الٹی ہتھکڑی میں جکڑے گئے۔ چند منٹ بعد نیلی آنکھوں والا دراز قد امریکی اندر آ گیا۔

آج پال کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ اس نے مجھے یہ باور کرا رکھا تھا کہ میری اور اس کی ملاقات کے وقت کیمروں اور ڈکٹا فون وغیرہ بند رہتے ہیں۔ وہ امریکن لہجے میں بولا۔ ''ایسٹرن! میرے پاس تمہارے لیے کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ تمہارا برا وقت ایک بار پھر شروع ہونے والا ہے۔''

''میرا برا وقت ختم ہی کب ہوا تھا جو پھر شروع ہو گا؟'' میں نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔

''شاید میں تمہیں یقین نہیں دلا سکا مگر یہ حقیقت ہے کہ مجھے تم سے دلی ہمدردی ہے...... میں سمجھتا ہوں کہ یہ تمہارے پاس آخری موقع ہے۔ آج کسی وقت تمہارا پاکستانی دوست مسٹر شکیل تم سے ملنے اور تمہیں قائل کرنے کی آخری کوشش کرے گا۔ اگر اسے پہلے کی طرح ناکامی ہوئی تو تمہیں فوراً لونگ اور اس کی تفتیشی ٹیم کے حوالے کر دیا جائے گا اور یہ بات مانی جاتی ہے کہ یہ لوگ آخر کار پتھر کو بھی بولنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔''

میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''تمہاری محبت کا شکریہ پال، لیکن پہلی بات تو یہ ہے کہ شکیل داراب میرا دوست نہیں، فقط ایک ''جاننے والا'' ہے۔ ایسے مفاد پرست سیاست داں کسی کے دوست ہوتے بھی نہیں۔ دوسری بات یہ کہ اگر تم لوگوں کا سوال وہی رہے گا تو میرا جواب بھی وہی رہے گا...... چاہے یہ سلسلہ سو سال بھی چلتا رہے۔ تم لوگ اپنا ستم آزما لو، میں اپنی برداشت آزماؤں گا۔''

''میں جانتا ہوں ایسٹرن کہ ہمارا واسطہ MMA کے ایک نہایت سخت جان چمپئن سے

پڑا ہے اور وہ برداشت کی آخری حد تک جائے گا لیکن برداشت کی آخری حد کے بعد اچانک موت کا علاقہ بھی تو شروع ہو جایا کرتا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ اتنا بڑا باصلاحیت فائٹر ایسی دردناک موت کا شکار ہو جائے۔ میں تمہیں ایک بار پھر مخلصانہ مشورہ دیتا ہوں کہ اپنے ساتھیوں کی گرفتاری میں مدد کرو۔ اس طرح تم اپنے علاوہ ان کے لیے بھی کچھ رعایتیں حاصل کر لو گے۔''

میں نے کہا۔ ''جس طرح کی رعایتیں تم لوگ کرتے ہو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ عزت مآب ریان فردوس کی موت اس کی ایک بہت بڑی مثال ہے......''

''دیکھو ایسٹرن! ایکسی لینسی ریان فردوس کو ایک مشتعل گروہ نے مارا تھا، اور ذمے داروں کو سزائیں بھی مل چکی ہیں، اگر وہ واقعہ......''

پال کو اپنی بات مکمل کیے بغیر خاموش ہونا پڑا۔ اپارٹمنٹ کے دروازے پر کوئی موجود تھا۔ پال اٹھ کر دروازے کی طرف گیا۔ باہر کوئی بااختیار شخص تھا۔ پال کو دروازہ کھولنا پڑا۔ طویل قامت لونگ جیک کسی بگولے کی طرح اندر آ گیا۔ اس کے ساتھ کوئی نصف درجن مسلح گارڈز موجود تھے۔

اس نے میری طرف خونخوار نظروں سے دیکھا اور دانت پیس کر بولا۔ ''لے چلو اس کو۔''

پال ان کے راستے میں آیا۔ ''اس کا کیا مطلب ہے لونگ! مجھے تھوڑی دیر پہلے بتایا گیا تھا کہ ابھی مسٹر شکیل کو یہاں بھیجا جائے گا......اور مزید کوشش کی جائے گی۔''

پال کی بات کے جواب میں لونگ پھنکارا۔ ''یہ نیا حکم ہے۔ کوئی مزید کوشش نہیں ہو گی۔ کتے کی دم ہمیشہ ٹیڑھی ہی رہتی ہے۔''

وہ مجھے دبوچنے کے لیے خود آگے بڑھا۔ پال نے پھر اس کا راستہ روکا۔ ''لونگ ذرا صبر کرو، پہلے مجھے رائے زل صاحب سے بات کرنے دو۔''

''میں بھی رائے زل صاحب کے پاس سے ہی آ رہا ہوں۔ صبر کا نتیجہ ہم سب نے دیکھ لیا ہے۔ اب اور انتظار حماقت کے سوا اور کچھ نہیں، تم پیچھے ہٹو۔''

''لیکن......میں رائے زل سے بات کے بغیر اسے لے جانے نہیں دوں گا۔''

''آفیسر! تم اپنی حد میں رہو۔'' لونگ دہاڑا اور میرا گریبان اپنی آہنی مٹھی میں جکڑ لیا۔ دو آٹومیٹک رائفلوں کے بیرل میرے سر سے لگ چکے تھے۔ میرے ہاتھ الٹی ہتھکڑی میں تھے۔ مزاحمت کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔

چند ہی سیکنڈ میں لونگ اور پال کے درمیان تصادم کی صورتِ حال پیدا ہوگئی۔ جب لونگ نے پال کو دھکا دیا تو پال کے ساتھ آنے والے دو گارڈز آگے بڑھے مگر لونگ کے ساتھ آنے والے گارڈز تعداد میں زیادہ اور زیادہ مشتعل تھے۔ انہوں نے پال کے گارڈز کو پیچھے ہٹا دیا۔ اسی دوران میں لونگ کی تفتیشی ٹیم کے کچھ مزید ارکان موقع پر پہنچ گئے۔ انہوں نے پال کو راستے سے ہٹایا اور مجھے کھینچتے ہوئے اپارٹمنٹ سے باہر لے آئے۔

پال اپنے سیل فون پر غالباً رائے زل یا مادام سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آثار سے پتا چل رہا تھا کہ کوشش کامیاب نہیں ہو رہی۔ وہ مجھے لونگ کے حوالے کرنا نہیں چاہ رہا تھا، مگر لونگ کا زور چل گیا اور وہ مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔

اس بار میرا مسکن ڈی پیلس کے اندر ہی ایک ٹارچر سیل ٹھہرا۔ یہ سیل ڈی پیلس کے وسیع و عریض عقبی احاطے میں واقع قبرستان کے قریب تھا۔ یہ وہی اندرونی قبرستان تھا جہاں کمانڈر افغانی اور دیگر لوگوں کو دفن کیا گیا تھا۔ شاید یہیں پر کہیں کمال احمد اور ریان فردوس کی قبریں بھی تھیں۔ وہی ریان فردوس جو چند روز پہلے تک ایک بادشاہ کی سی شان و شوکت کے ساتھ ڈی پیلس میں دادِ عیش دیتا تھا۔ آج یہاں دو گز زمین میں منوں مٹی کے نیچے سمایا ہوا تھا۔ اس کی منظورِ نظر خواصیں جو سات پردوں میں رہتی تھیں نچلے درجے کے ملازموں اور فوجی افسروں کے حوالے تھیں۔ یا دو دو ٹکے میں فروخت ہو رہی تھیں۔ اس کی ایک مثال سنبل کی صورت میں میرے سامنے تھی، جسے ہم نے آسیان نامی سیکیورٹی اہلکار کے چنگل سے نکالا تھا۔

یہ ٹارچر سیل دوسری جنگ عظیم کے عقوبت خانوں کی یاد دلا رہا تھا۔ سیاہی مائل پتھریلی دیواریں، آہنی سلاخیں، وزنی آہنی دروازے، کہیں کہیں ایذا رسانی کے آلات دیواروں پر سجے ہوئے لیکن، نصف درجن مسلح گارڈز مجھے جس کمرے میں لے کر آئے وہ باقی عقوبت خانے سے مختلف دکھائی دیتا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ عقوبت خانے کا یہ پورشن حال ہی میں جدید تقاضوں کے مطابق تعمیر کیا گیا ہے۔ مجھے ایک ایسے چوکور کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں ایک سلائیڈنگ دروازے کے سوا آنے جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ دیواروں اور فرش پر فوم جیسے کسی نرم میٹریل کی تہہ تھی۔ کمرے میں خاص فوم ہی کا ایک بیڈ موجود تھا جس کے ساتھ واش روم کا چھوٹا دروازہ تھا۔ سلائیڈنگ دروازے کے اندر ہی ایک چھوٹا سا روزن تھا۔ قریباً ڈیڑھ فٹ ضرب ایک فٹ کے روزن میں اسٹیل کے چمکیلے راڈ لگے ہوئے تھے۔ اس روزن کا مقصد بھی یقیناً وہی تھا جو پہلے اپارٹمنٹ میں راڈز والی بڑی کھڑکی کا تھا۔ اس کھڑکی میں ہاتھ ڈال کر میری الٹی ہتھکڑی کھولی اور لگائی جاتی تھی۔

میں کوئی مزاحمت نہیں کر رہا تھا، اس کے باوجود وہ لوگ مجھے دھکے دیتے اور ٹھوکریں مارتے ہوئے اس کمرے تک لائے اور دروازہ باہر سے لاک کر دیا۔ عقوبت خانے کے کسی اور کمرے میں کسی دوسرے قیدی پر تشدد ہو رہا تھا۔ وہ ذبح ہونے والے جانور کی طرح چلا رہا تھا اور رحم کی بھیک مانگ رہا تھا۔ مدھم آواز میرے کمرے تک بھی پہنچ رہی تھی۔ وہ برونائی یا جاماجی کا ہی کوئی باشندہ لگتا تھا۔

کسی نے ملائی زبان میں کڑک کر کہا۔ ''بولو...... مادام زندہ باد۔''

اس شخص نے فوراً کہا۔ ''مادام زندہ باد۔''

''زور سے بولو۔'' پہلی آواز کی گرج پھر ابھری۔ وہ شخص زور سے بولا۔ ''مادام زندہ باد...... مادام زندہ باد۔''

''اور زور سے بولو۔'' کڑک کر کہا گیا، اس کے ساتھ ہی قیدی کو کسی چیز سے مارے جانے کی آواز آئی۔

وہ پھیپھڑوں کی پوری طاقت سے پکارا۔ ''مادام زندہ باد......'' زور سے بولنے کے سبب اسے شدید کھانسی ہونے لگی۔ اسے شاید پانی وغیرہ پلایا گیا۔

گرج دار آواز نے پھر کہا۔ ''زور سے بولو...... میں اپنے باپ کا تخم نہیں ہوں۔''

بدنصیب شخص لاچاری کے عالم میں پکارا۔ ''میں اپنے باپ کا تخم نہیں ہوں۔''

''بولتے جاؤ۔'' ساتھ ہی تھپڑ کی زوردار آواز گونجی۔ وہ شخص کسی طوطے کی طرح یہ فقرہ بولتا چلا گیا۔

اسی دوران میں عقوبت خانے کے کسی دوسرے حصے سے کسی جواں سال عورت کی آہ و بکا بلند ہونے لگی۔ اسے بھی کسی چیز سے پیٹا جا رہا تھا اور وہ ترس ناک انداز میں رو پیٹ رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ عقوبت خانوں میں اس طرح کی آوازیں بھی ٹارچر کا ہی ایک حصہ ہوتی ہیں۔ ان کے ذریعے زیر تفتیش لوگوں کے ''نروس'' کو توڑا جاتا ہے۔ اگر یہ آوازیں مجھ تک پہنچ رہی تھیں تو ان کا مقصد بھی یقیناً یہی تھا۔ میں خاص فوم کے بستر پر لیٹ گیا اور خود کو ان آوازوں سے دور کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

میرے ذہن میں کمال احمد کا خیال آیا۔ کہا تو یہی جا رہا تھا کہ وہ ڈر کر کسی جگہ چھپ گیا اور وہاں مقفل ہو کر رہ گیا۔ کھانے میں زہر کی مقررہ ڈوز نہ ملنے کے سبب اس کی موت واقع ہو گئی لیکن جابر رائے زل سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ کیا پتا کہ کمال کو بھی کسی ایسے ہی ٹارچر سیل میں ایذا دے کر مار دیا گیا ہو اور اگر وہ کھانا نہ ملنے کے سبب مرا تھا تو یہ بھی کوئی کم اذیت ناک

بات نہیں تھی۔ میرا دھیان ایک بار پھر ابراہیم اور زینب کی طرف چلا گیا۔ اپنی محبوب بیوی کی خاطر ابراہیم نے خود کو ایک خطرناک مجبوری سے آزاد کرانے کی کوشش شروع کر رکھی تھی۔ اس نے زینب کو ایک دفعہ کھونے کے بعد پایا تھا۔ اب وہ دونوں پھر جدا ہو جاتے تو یہ بہت بڑا المیہ تھا۔

چوبیس گھنٹے تک تو مجھ پر کوئی آفت نہیں ٹوٹی۔ صرف یہ ہوتا رہا کہ اس عقوبت خانے کے مختلف کمروں سے بلند ہونے والی کربناک آوازیں مجھے بے طرح جھنجوڑتی رہیں۔ اگلے روز مجھے روزن کے قریب بلا کر میرے ہاتھ الٹی ہتھکڑی میں باندھے گئے اور پھر چند منٹ بعد مجھے لونگ کی منحوس شکل نظر آ گئی۔ وہ جس طرح کل مجھے اچانک اپارٹمنٹ کے آرام دہ ماحول سے کھینچ کر یہاں لے آیا تھا، میرا یہ شک یقین میں بدل رہا تھا کہ اپارٹمنٹ میں سی سی ٹی وی کیمرے بند ہونے کے باوجود مجھے دیکھا اور سنا جا رہا تھا۔ پال کے ساتھ گفتگو کے دوران میں جب میں نے دوٹوک لہجے میں کہا کہ شکیل داراب کو مجھ سے دوبارہ ملاقات کر کے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا تو مجھے فوراً ٹارچر سیل منتقل کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔

لونگ نے کسی بھیڑیے ہی کی طرح میرا منہ اپنے آہنی پنجے میں جکڑا اور اتنے زور سے دبایا کہ مجھے اپنا جبڑا ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ پھنکارا۔ ''اب سب کچھ بکو گے، کیونکہ موت کی بھیک مانگنے سے بھی موت ملے گی نہیں۔''

میں نے اطمینان سے کہا۔ ''زندگی کی طرح موت بھی تمہارے اختیار میں نہیں۔ تم کیپٹن تبارک کو مارنا نہیں چاہتے تھے لیکن وہ تمہاری ہی فائرنگ سے مر گیا۔ اب بھی کچھ ایسا ہی ہو جانا ہے اور مجھے پتا ہے میں قبرستان سے زیادہ دور بھی نہیں ہوں۔''

ابھی ہماری گفتگو جاری ہی تھی کہ میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ اسٹیل کا دروازہ سلائیڈ کر کے کھلا اور میں نے نیم گنجے آقا جان کو اپنے سامنے پایا۔ وہ شاندار لباس میں تھا۔ اب اس کی حیثیت جاماجی کے نائب فرمانروا کی تھی۔ اس کے عقب میں مسلح شاہی دستہ بھی نظر آیا لیکن وہ باہر ہی رک گیا۔ ان میں سے صرف دو تنومند گارڈز اندر آئے۔

آقا جان کی آنکھوں میں کینہ اور نفرت کی بجلی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اس نے مجھے سر کے بالوں سے پکڑ کر آگے پیچھے جھلایا اور سرسراتی آواز میں بولا۔ ''کیوں باسٹرڈ! اونٹ پہاڑ کے نیچے آیا ہے یا نہیں؟''

''تم پہاڑ نہیں ہو آقا جان! کچرے اور غلاظت کا ڈھیر ہو۔ ایسے ڈھیر ایک ہی تیز بارش میں زمین کے برابر ہو جایا کرتے ہیں۔''

اس نے بھڑک کر کئی زوردار طمانچے میرے چہرے پر رسید کیے۔ یقیناً یہ اس ایک طمانچے کا بدلہ تھا جو میں نے ڈی پیلس کے سامنے اس کے منہ پر مارا اور گونج پورے جاماجی نے سنی تھی۔ ایک بااختیار شخص کے منہ پر یہ طمانچہ ضرب المثل بن گیا تھا۔ آقا جان ایک ہزار طمانچے بھی میرے منہ پر مار لیتا تو اس ''فی البدیہہ'' طمانچے کا داغ نہیں دھل سکتا تھا۔

آقا جان کے اشارے پر دونوں تنومند گارڈز مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ وہ مجھے بے طرح زدوکوب کرنے لگے۔ میرے لباس کے ٹکڑے کر دیئے گئے۔ ایک تار بھی باقی نہیں بچا۔ کلیجا ٹھنڈا کرنے کے لیے لونگ بھی اس مار پیٹ میں شریک ہو گیا۔ کئی بار مجھے اٹھا اٹھا کر دیواروں سے پٹخا گیا۔ مجھے اپنے سامنے ایسی بیدردی سے پٹوا کر آقا جان کا سینہ خوشی سے پھول رہا تھا۔

نیم بے ہوشی کے عالم میں مجھے اندازہ ہوا کہ آقا جان نے میرے سر پر ایک سخت ٹھوکر لگائی ہے اور مغلظات بکتا باہر چلا گیا ہے۔ اپنی زخمی ٹانگ کے سبب اس کی چال میں ہلکی سی لنگڑاہٹ اب بھی موجود تھی۔ اس کی یہ ٹانگ حلمی کی موت کے وقت ٹوٹی تھی (میری فائرنگ سے بچنے کے لیے اس نے جلسہ گاہ کے اسٹیج سے چھلانگ لگائی تھی)

میں اپنی جگہ پڑا رہا۔ کچھ دیر بعد مجھے محسوس ہوا کہ مجھے ٹھنڈ لگ رہی ہے۔ میرا جسم لباس سے محروم تھا۔ پاؤں بھی ننگے تھے۔ تاہم مجھے پتا چلا کہ میری الٹی ہتھکڑی اب کھلی ہوئی ہے۔ میں نے سوچا یہ لباس نہ ہونے کی وجہ سے سردی محسوس ہوئی ہے لیکن یہ سردی کا موسم کہاں تھا؟ پھر یہ ٹھنڈ؟ میں اپنی کہنیوں پر زور دے کر بمشکل خود کو فرش سے بلند کر پایا۔ بند کمرے میں اب میرے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ کئی تازہ چوٹوں سے خون رِس رہا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ سردی بڑھتی جا رہی ہے۔ بے شک یہ مصنوعی سردی تھی کمرے کے نامعلوم حصوں سے ایئر کنڈیشنز کی یخ ہوا اندر داخل ہو رہی تھی۔ شروع میں تو یہ ہوا زیادہ بری نہیں لگی مگر پھر بتدریج یہ تکلیف دہ ہوتی گئی۔ میں نے کپکپانا شروع کر دیا۔

پندرہ بیس منٹ کے اندر ہی یہ نوبت آ گئی کہ میرے ہاتھ پاؤں سن ہونے لگے۔ شاید اذیت رسانی کا نیا طریقہ مجھ پر آزمایا جا رہا تھا۔ بلکہ یقیناً ایسا ہی تھا۔ ٹمپریچر مسلسل گرتا چلا گیا۔ میں جیسے کسی ڈیپ فریزر میں لگ گیا۔ جسم کو گرم رکھنے کے لیے میں نے چلنا پھرنا شروع کر دیا۔ میں پنجوں کے بل اچھلتا رہا اور اپنے اندر حرارت پیدا کرتا رہا۔ ایسے طریقے سخت سردی میں کارگر ہوتے ہیں مگر ایک خاص حد تک۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ درجۂ حرارت صفر سے کافی نیچے جا چکا ہے۔ شاید پندرہ بیس تک۔

میرے بالائی جسم کے سارے رگ پٹھے، پتھر کی طرح سخت ہونا شروع ہو گئے۔ سانس بھاپ کی صورت خارج ہو رہی تھی۔ میں دیکھ کر چونکا کہ بازوؤں اور ٹانگوں پر برف کے باریک ذرات نمودار ہو رہے ہیں۔ کمرے کے کسی خفیہ اسپیکر سے لونگ کی مکروہ آواز ابھری۔ ''کہتے ہیں کہ آگ کی طرح ایک جہنم برف کا بھی ہے۔ آج تم برف کے جہنم میں ہو۔ یہ جہنم تمہیں مارے گا نہیں، مگر تم زندہ بھی نہیں رہو گے۔ حل صرف ایک ہی ہے۔ ہمارے سوالوں کے جواب دے دو۔''

میں نے جواب میں کچھ کہنا چاہا مگر یوں محسوس ہوا کہ باقی جسم کی طرح جبڑا بھی اکڑ گیا ہے۔ بولنے کے لیے جبڑے کو حرکت دینا ضروری ہوتا ہے۔ جسم پر برف جم رہی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے جن زخموں سے خون رِس رہا تھا، وہ اب خشک نظر آنے لگے تھے۔ میں نے کمرے کے مختلف حصوں کا جائزہ لینا شروع کیا مگر کوئی ایسا خاص راستہ یا سوراخ وغیرہ نظر نہیں آئے جہاں سے یہ جان لیوا ٹھنڈ کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ لونگ بدستور دھمکا رہا تھا۔ اس کی کرخت آواز میرے کانوں میں جیسے نشتر چبھو رہی تھی۔ وہ گالیاں بک رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ''میں تمہیں بتاؤں گا کہ تشدد کسے کہتے ہیں اور تم جیسے ڈھیٹ سؤروں کی زبانیں کیسے کھلوائی جاتی ہیں۔''

سردی بڑھتی چلی گئی، ایک جان لیوا تیزی کے ساتھ مجھے جکڑتی چلی گئی۔ وہ سلاخ دار روزن جس میں سے مجھے الٹی ہتھکڑی لگائی اور کھولی جاتی تھی اب بند تھا...... صرف ٹھنڈ کے آنے کے راستے تھے، باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں ایک کونے میں خود کو اپنے آپ میں سمیٹ کر بیٹھا رہا۔ دھیرے دھیرے مجھے لگنے لگا کہ میں برف کی قبر میں دفن ہو رہا ہوں۔ دماغ سن ہوتا چلا جا رہا تھا پھر ایک غشی سی طاری ہونے لگی۔ اس غشی نے مجھے اردگرد کے ماحول اور اپنے آپ سے بیگانہ کر دیا۔

میں نے تصور میں دیکھا کہ میں برہنہ بدن کسی برف زار میں بھٹک رہا ہوں۔ میرے ہاتھ پاؤں نیلے پڑے ہوئے ہیں۔ جاناں کی آواز میرے کانوں سے ٹکراتی ہے......

میں اسے کیسے بھلا دوں
وہ تو میری رگ رگ میں بس چکا ہے
میں برف کے اندھیرے گھر میں تھی
اور پل پل ختم ہو رہی تھی میری زندگی......

میں دائیں بائیں دیکھ رہا ہوں۔ وہ شاید کہیں آس پاس ہی موجود ہے پھر وہ ایک

برفیلے ٹیلے کے پیچھے سے نمودار ہوتی ہے۔ لمبا قد، نازک بدن، آبشار جیسے طویل بال۔ وہ بھاگتی ہوئی میری طرف آتی ہے، اس کی دائیں بغل کے نیچے ایک رول کیا ہوا کمبل ہے اور دوسرے ہاتھ میں دنیا کی سب سے خوب صورت چیز...... حرارت بخش آگ۔ یہ جلتی ہوئی لکڑیاں ہیں، وہ کمبل میرے برہنہ جسم پر ڈالتی ہے اور جلتی ہوئی لکڑیاں میرے قریب رکھ دیتی ہے۔

''آپ نے میری مدد کی تھی۔ آج میں آپ کی مدد کر رہی ہوں۔'' اس کی گونجتی ہوئی آواز میرے کانوں سے ٹکراتی ہے۔

میں اپنے تصور میں ہی سوچتا ہوں...... یہ تو مر چکی ہے، پھر یہاں کیسے ہے؟ کیا وہ سچ مچ یہاں ہے؟ میں نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا، وہ اردگرد کہیں نہیں تھی۔ نہ نرم گرم کمبل تھا نہ حرارت بخش آگ۔

میں نے اپنا جسم دیکھا، وہ واقعی نیلا پڑ رہا تھا۔ نیلگوں ہاتھ پاؤں جن پر برف کی سفیدی تھی۔ کیا واقعی کچھ ایسا ہو جائے گا جس کی توقع اس حرام زادے لونگ کو بھی نہیں ہوگی۔ اچانک میرے دل کی دھڑکن تھم جائے گی اور رگوں میں خون جم جائے گا۔ میں نے کئی چہروں کو اپنے تصور میں دیکھا۔ سریلی آواز والی ریشمی...... جو کبھی اپنے ظالم شوہر پرویز سے تنگ تھی۔ اب اسے اس شوہر سے ہمیشہ کے لیے نجات مل چکی تھی۔ اس کی شادی دوسری جگہ ہو چکی تھی پھر میری نگاہوں کے سامنے چاچا رزاق کا چہرہ آیا جو کبھی ایک گول کیپر تھا۔ اس نے اپنی بیٹی ریشمی کے لیے ملنگی ڈیرے پر لازوال قربانی دی تھی اور خوبرو رضوان ٹی، جو ایک کڑے امتحان سے گزرا تھا اور اس کے اندر سے ایک باہمت نوجوان برآمد ہوا تھا۔ ماضی قریب کے یہ سارے چہرے مجھے ایک برفیلی دھند میں چھپے نظر آ رہے تھے۔

مجھے لگا کہ اذیت کی انتہا کو چھو کر میرے اندر کچھ ٹوٹ رہا ہے۔ کیا یہ قوتِ مدافعت تھی جو کمزور پڑ رہی تھی۔ میں اس صورتِ حال سے فرار چاہتا تھا...... چاہے یہ تھوڑی دیر کے لیے ہی ہوتا۔ میں نے اپنے جسم اور دل و دماغ کی تمام قوت جمع کی اور ایک ناقابلِ شناخت آواز میں بمشکل بولا۔ ''لونگ! مجھے لگتا ہے...... کہ تم...... مجھے کھو دو گے...... تمہیں کچھ حاصل...... نہیں ہو پائے...... گا۔''

''تو پھر بولو، کیا چاہتے ہو؟''

''تم بھی...... جانتے ہو...... میں کیا...... چاہتا...... ہوں۔'' میں بے حد دشواری سے یہ کپکپاتا فقرہ مکمل کر پایا۔

"حرارت؟" لونگ نے پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

اس نے شاید گہری سانس لے کر کہا تھا۔ "چلو، تم بھی کیا یاد کرو گے۔"

سردی بتدریج کم ہونے لگی۔ نیم غشی کی سی کیفیت میں مجھے لگا کہ میری رگوں میں جمتا ہوا خون پھر رواں ہورہا ہے۔ میں وہیں فرش پر پڑا رہا۔ جی چاہ رہا تھا کہ میں فرش یا دیواروں پر منڈھے ہوئے ریگ زین اور فوم کو پھاڑ دوں اور سردی سے بچنے کے لیے اس کے اندر گھس جاؤں اور شاید آدھ پون گھنٹا پہلے میں نے یہ کوشش کی بھی تھی مگر ناکام رہا تھا...... یہ ریگزین اور فوم نہیں تھا کوئی اینٹی فائر قسم کا میٹریل تھا۔

ٹمپریچر بتدریج اوپر آتا گیا۔ میں اب قدرے بہتر محسوس کر رہا تھا۔ پتھرائے گئے رگ پٹھے بھی اب کچھ رواں محسوس ہونے لگے۔ میں نے خود کو بمشکل اٹھایا اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا...... پانچ دس منٹ کے اندر ٹمپریچر نارمل ہوا...... اور پھر بڑھنا شروع ہو گیا۔ حرارت پہلے تو کچھ سکون دیتی رہی...... جیسے دسمبر کے ٹھٹھرے دنوں کی دھوپ جسم میں جذب ہورہی ہو، مگر پھر اس "دھوپ" سے جسم میں سوئیاں سی چبھنا شروع ہو گئیں۔ ٹمپریچر بڑھتا جارہا تھا میں سمجھ گیا کہ اب میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ پہلے برف کا جہنم اور اب آگ کا جہنم۔

حرارت بڑھتی چلی گئی۔ میرے دو چار زخموں سے پھر خون رِسنا شروع ہو گیا۔ سر اور سینے کے بالوں میں رکی ہوئی برف بھی پہلے پگھلی پھر بڑھتی ہوئی حرارت میں اوجھل ہونے لگی۔ دیواروں اور فرش پر منڈھا ہوا فوم اور ریگ زین شدید سردی کے بعد وہ شدید گرمی بھی آسانی سے برداشت کر رہا تھا۔ میرے پاؤں جلنے لگے اور جسم کے ہر مسام سے پسینہ دھاروں کی طرح بہہ نکلا۔ مجھے وہ مناظر یاد آگئے جب میں اور قسطینا ائر ریڈ شیلٹر میں چھپے تھے اور آتشزدگی کے سبب وہ شیلٹر تندور کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ یہ تندور اس تندور سے زیادہ دہک رہا تھا۔ شدید ترین جلن پاؤں کے تلوے محسوس کر رہے تھے۔ میں کبھی ایک پاؤں اٹھاتا کبھی دوسرا۔ ایک دو منٹ بعد اس طرح بھی گزارا ممکن نہ رہا، میں چلانے لگا۔

یہ اذیت ناقابلِ برداشت تھی۔ آگ تو جلا دیتی ہے اور ایک دو منٹ کے اندر ختم کر دیتی ہے۔ لیکن اگر درجہ حرارت کو اس طرح بڑھایا جائے کہ بندے کو آگ تو نہ لگے مگر وہ دھیمی آنچ پر روسٹ ہونا شروع ہو جائے تو اس تکلیف کا اندازہ لگانا مشکل ہو گا اور میں اسی تکلیف سے گزر رہا تھا۔ بے انتہا تپی ہوئی دیواریں اور تپا ہوا فرش۔ کوئی جائے پناہ نہیں تھی۔ کوئی گوشۂ اماں نہیں تھا۔ میں تلوؤں کو جلنے سے بچانے کے لیے، ہاتھوں کے بل آگے کو گر گیا۔ وہ

پوزیشن ہوگئی جو ڈنٹر پیلنے کے وقت ہوتی ہے۔تلووں کو ذرا سکون ملا تو ہتھیلیاں کباب ہونے لگیں۔ میں تڑپ کر پھر پاؤں پر کھڑا ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ جب تلوے جلتے ہیں تو مامتا بھی گہنا جاتی ہے......اس بندریا کی حکایت بیان کی جاتی ہے جس نے خود کو جلن سے بچانے کے لیے اپنا بچہ پاؤں کے نیچے رکھ لیا تھا۔ میں شاید اس کیفیت کو لفظوں میں بیان نہ کرسکوں جو مجھ پر طاری تھی۔ میں واقعی مر جانا چاہتا تھا۔

لونگ کی آواز کانوں سے ٹکرائی۔ ''جلدی سے بول دو......ورنہ ابھی اور بہت کچھ باقی ہے۔''

ایک سیکنڈ صرف ایک سیکنڈ کے لیے میرے دل میں آیا کہ خود اپنی جان لے لوں مگر کس طرح؟ ان لوگوں نے کسی طرح کے چھٹکارے کا کوئی راستہ ہی نہیں چھوڑا تھا۔ کئی دفعہ تشدد کے گھیرے میں آئے ہوئے قیدی خود کو زخمی کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں مگر یہاں تو کوئی ایسی شے موجود ہی نہیں تھی جس سے کسی بھی طرح خود کو یا کسی دوسرے کو نقصان پہنچایا جا سکے۔ حتیٰ کہ دیواروں اور فرش پر بھی خاص قسم کا فوم منڈھ دیا گیا تھا اور اس کے اوپر ریگ زین نما میٹریل کی دبیز تہہ تھی۔

تکلیف جب حد سے بڑھ جاتی ہے تو قدرت کا نظام حرکت میں آتا ہے۔ انسانی ذہن کا رابطہ اس کے جسم سے منقطع ہونے لگتا ہے۔ میں بھی اس وقت کا انتظار کر رہا تھا۔ عین اس وقت جب سانس سینے میں اٹک رہی تھی اور جس پر آبلے سے نمودار ہونے لگے تھے، میں ہوش وحواس کھو کر گر گیا۔ مجھے احساس ہوا کہ میں دائیں پہلو پر گرا ہوں اور یہ پہلو تپتے ہوئے فرش کے لمس سے چیخ اٹھا ہے۔

دوبارہ حواس بحال ہوئے تو ایک اندازہ سا ہوا کہ دو تین گھنٹے گزر چکے ہیں۔ اس عقوبت خانے کا ٹمپریچر اب نارمل تھا۔ دروازے میں موجود وہ مختصر روزن بھی کھلا ہوا تھا جس میں اسٹیل کے راڈ لگے تھے۔ روزن چونکہ کھلا ہوا تھا اس لیے کسی قریبی کمرے سے کسی قیدی سے مار پیٹ کی مدھم آوازیں آ رہی تھیں اور اس کی آہ و بکا بھی سنائی دے رہی تھی۔ غالباً مارنے والوں کے حکم پر وہ گاہے بگاہے پکارنے لگتا تھا۔ ''عزت مآب (رائے زل) زندہ باد......''

میں نے اپنے جسم پر نگاہ ڈالی۔ ہتھلیوں اور تلووں پر آبلے تھے۔ سارے جسم پر چھوٹے بڑے سرخ نشان نظر آ رہے تھے۔ یہ شدید جلن کا نتیجہ تھے۔ خاص طور سے جس پہلو میں گرا تھا وہ زیادہ سرخ نظر آتا تھا۔ بے ہوشی کی ہی حالت میں مجھے ایک انڈر ویئر پہنایا گیا تھا اور

میرے جسم کے متاثرہ حصوں پر ''فلیمازین'' قسم کی کوئی دوا لگائی گئی تھی۔

لونگ کی آواز سنائی دی۔ ''تھوڑا آرام کرلو، پھر دوبارہ کام شروع کریں گے۔''

میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''لونگ جیک! اتنا ہی ظلم کرو جتنا سہہ سکتے ہو۔''

لونگ نے ایک زہر بھرا قہقہہ بلند کیا۔ ''تم اسے ظلم کہتے ہو، یہ تو ایک ٹریلر ہے۔ فلم ابھی باقی ہے اور یہ ٹریلر بھی ہم نے تمہاری فرمائش پر ہی تمہیں دکھایا ہے۔ تم نے ہی تو کہا تھا کہ تمہیں حرارت دی جائے۔''

○......❖......○

اگلے دس پندرہ روز اس قدر بھیانک تھے کہ میں ان کی کیفیت کو لفظوں میں بیان کرنا چاہوں تو اس کے لیے دفتر درکار ہوں گے...... اور اظہار کا حق شاید پھر بھی ادا نہ ہو سکے۔ وہ ایک ایسی اذیت تھی جو صرف محسوس کی جا سکتی تھی۔ جسم کو جلا دینا اور بات ہے مگر جسم کو ہلکی آنچ پر جلن کے ناقابلِ برداشت کرب سے دوچار کرنا اور بات۔ ایک دو مواقع ایسے آئے جب مجھے واقعی مرنے کی خواہش ہوئی۔

ٹمپریچر جب بڑھنا شروع ہوتا تھا تو پہلے جسم گرم ہوتا تھا، پھر پسینہ دھاروں کی صورت میرے مساموں سے بہتا تھا اور شدید پیاس محسوس ہونے لگتی تھی۔ گلے میں کانٹے سے پڑتے تھے پھر پسینہ خشک ہونے لگتا تھا اور ناقابلِ بیان جلن کا آغاز ہوتا تھا۔ اس جلن سے بچنے کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں ہوتی تھی۔ جہاں جہاں پہلے سے آبلے موجود ہوتے تھے وہ جگہ زیادہ اذیت دیتی تھی۔ بالآخر میں چلانے لگتا تھا۔ اپنے ہی جھلستے ہوئے بالوں کی بو میرے نتھنوں سے ٹکراتی تھی۔

لونگ کی دورافتادہ آواز میرے کانوں تک پہنچتی تھی۔ ''میرے سوال کا جواب دو ایسٹرن، اور اپنی جان چھڑالو۔''

جب جب یہ آواز میرے کانوں سے ٹکرائی تب تب میرے اندر ایک ضد پیدا ہوتی تھی، ایک جنون جاگتا تھا...... میں مر جاؤں گا لیکن زینب، ابراہیم، سجاول اور دیگر ساتھیوں کی نشاندہی نہیں کروں گا۔ مجھے بھون ڈالو، میرے گوشت کے ریشے ریشے کو جدا کر دو، میری ہڈیوں میں درد کی ہزار ہا میخیں ٹھونک دو، لیکن میں اپنے ساتھیوں کے بارے میں اپنی زبان نہیں کھولوں گا۔ تمہارا واسطہ ایک چیمپ سے پڑا ہے، اور وہ RING کا چیمپ ہی نہیں، وہ درد سہنے کا بھی چیمپ ہے، وہ تم گوروں کو جیت کر دکھائے گا...... تم کو مر کر دکھائے گا۔

قدرت نے انسان سے وعدہ کر رکھا ہے کہ کسی ذی نفس کو اس کی برداشت سے بڑھ کر

تکلیف نہیں دی جائے گی۔ اس وعدے پر میرا یقین پختہ ہونا شروع ہو گیا تھا۔ میری برداشت آخری حدوں کو چھونے لگتی تو میں اس وعدے کے ایفا ہونے کا انتظار کرتا۔ میں اس بے ہوشی کا انتظار کرتا جو جسم اور ذہن کا رابطہ منقطع کر کے انسان کو ''نامعلوم'' کی دنیا میں پہنچا دیتی ہے اور پھر وہ بے ہوشی لپکتی ہوئی آتی، مجھے اپنی ٹھنڈی آغوش میں لے لیتی۔ میں اپنے آبلوں اپنے پیپ آلود زخموں اور اپنی بے پناہ جلن سے بہت دور چلا جاتا۔

ایک بار پھر مجھے طبی امداد دی جاتی۔ میرے جسم کے مختلف حصوں پر آئنٹمنٹ وغیرہ لگائی جاتی اور غالباً اینٹی بائیوٹک بھی انجیکٹ کی جاتی لیکن یہ دیکھ بھال کسی ہمدردی کی بنا پر نہیں ہوتی تھی۔ اس دیکھ بھال کا واحد مقصد یہی تھا کہ میں درد سہنے کے لیے زندہ رہوں اور میرے جسم کی کھال بھی زندہ رہے تاکہ درد سہہ سکے۔

ایک روز میں نیم بے ہوشی کے عالم میں تھا کہ مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کے ساتھ ہی گردن پر بے پناہ بوجھ پڑا ہوا تھا۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ مجھے ہیجڑے خیام مانش کا چہرہ نظر آیا۔ ہاں یہ وہی تھا اور میرے بالکل قریب کھڑا تھا۔ اس نے اپنا پاؤں میری گردن پر رکھا ہوا تھا اور سرمہ لگی آنکھوں سے قہرناک انداز میں میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اپنے ہاتھوں کو حرکت دینا چاہی اور تب مجھے اندازہ ہوا کہ میرے ہاتھ پاؤں ایک بار پھر جکڑے ہوئے ہیں۔ پاؤں میں بیڑی اور ہاتھوں میں الٹی ہتھکڑی تھی۔

مجھے ہوش میں آتے دیکھ کر خیام نے اپنا پاؤں میری گردن پر سے ہٹا لیا۔ میں نے کوشش کی اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ خیام بنگالی لہجے کی اردو میں بولا۔ ''توم کا کیا حال ہے چمپئن شوپ؟'' وہ س کو ش بولتا تھا۔

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کا فربہ جسم حسبِ معمول زرق برق کپڑوں میں کسا ہوا تھا۔ اس نے رخساروں پر غازہ تھوپا ہوا تھا جو اس کا سانولا رنگ چھپانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ ہونٹوں پر سرخی تھی اور اس سرخی کو پان کی لالی نے مزید بھدا کر دیا تھا۔ وہ اپنی پھٹی ہوئی سی آواز میں دوبارہ گویا ہوا۔ ''توم کے شاتھ شونے کو من چاہتا ہے (ساتھ سونے کو دل چاہتا ہے) پر اتنے زخم ہیں تمہاری باوڈی پر کہ گھن آتی ہے۔''

''شکریہ۔'' میں نے کراہتے ہوئے کہا۔

وہ عورتوں کی طرح بل کھا کر بولا۔ ''اپنا کلیجا ٹھنڈا کرنے کے کچھ اور بھی طور یقے (طریقے) ہیں میرے پاش۔''

اس نے اپنی زرق برق قمیص اوپر اٹھائی۔ پیٹ پر چمڑے کی ایک موٹی بیلٹ بندھی

ہوئی تھی جس پر کہیں کہیں اسٹیل کے بٹن چمکتے تھے۔اس نے بیلٹ کھول لی اور اسے کسی کوڑے کی طرح لہرا کر بولا۔''شیانے کہتے ہیں...... جلی ہوئی کھال پر چوٹ پڑے تو شخت تو کلیف (سخت تکلیف) ہوتی ہے۔اس تو کلیف سے پہلے ہی کچھ بول دو تو آچھا ہے......''

مجھے بولنا ہوتا تو بہت پہلے بول چکا ہوتا۔اب تو ایسے لگ رہا تھا جیسے زیادہ سفر طے ہو گیا ہے، تھوڑا باقی ہے۔کسی دن کچھ ایسا ہو گا کہ حرکت قلب بند ہو گی اور مجھے زندگی موت کے درمیان لٹکائے رکھنے کے خواہش مند، منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔

ہیجڑے خیام نے پان چباتے ہوئے وہی سوال کیا جواب تک ہزاروں دفعہ کیا جا چکا تھا۔میرا جواب بھی وہی تھا جو میں ہزاروں دفعہ دے چکا تھا۔ہیجڑے خیام کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے خاص طور سے انیق کی بازیابی میں دلچسپی ہے۔یہ انیق ہی تھا جس نے اسے تگنی کا ناچ نچایا تھا اور اسے، اس کے مردہ ساتھی سمیت کئی پہر تک ایک فریزر میں بند رکھا تھا۔

سوال جواب کے ایک مرحلے میں خیال جھنجلا گیا۔اس نے وہی کیا جس کی اس سے توقع تھی۔وہ مجھ پر پل پڑا، چمڑے کی وزنی بیلٹ سے مجھے بے دریغ مارنے لگا اور اپنی ٹھوکروں سے میرے جسم کے نازک حصوں کو نشانہ بنانے لگا۔وہ ایک جنونی تھا۔اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔یقیناً اسی طرح اس نے زینب فدا کو بھی نشانہ بنایا ہو گا۔تب کوئی خاص قسم کا آتشیں پان کھا کر وہ زینب پر پل پڑا تھا اور اسے نوچ کھسوٹ کر رکھ دیا تھا۔(اگر اس وقت انیق تک زینب کی فریاد نہ پہنچی ہوتی تو پتا نہیں کیا ہو جاتا)۔

وہ مجھے مار مار کر ہانپ گیا تو ایک بار پھر میری گردن پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا۔اس کے زنانہ جوتے کی ایڑی میری رگوں کو مسل رہی تھی۔اس نے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر کچھ کارڈ سائز فوٹو گراف نکالے، اور مجھے دکھاتے ہوئے بولا۔''اش طرح کا انجام ہوئے گا تم کا۔اش طرح کا ہوئے گا۔''

یہ ان بدنصیب قیدیوں کی تصویریں تھیں جنہیں شدید ٹمپریچر والے اسی کمرے میں اذیت کے دوزخ سے گزارا گیا تھا۔ان میں دو تین تصویریں عورتوں کی تھیں، باقی مرد تھے اور ان مردوں میں زیادہ تر گرین فورس کے لوگ تھے۔انہیں واقعی ہلکی آنچ پر روسٹ کر دیا گیا تھا۔آخری وقت میں ان کے سر کے بال چرمر ہو گئے تھے۔پلکیں گل گئی تھیں، کئی جگہ سے جسم کی کھال پک کر لٹک گئی تھی۔آبلے پھٹ گئے تھے اور رنگت سیاہی مائل سرخ ہو گئی تھی۔ لاشوں کی یہ حالت دیکھنے جانے کے لائق نہیں تھی۔

خیام کا پاؤں بدستور میری گردن پر تھا۔ وہ اپنے ''پان رنگے دانت'' پیس کر بولا۔'' چند دن پہلے توم کو موقع دیا گیا تھا کہ توم کچھ شوچ شمجھ لے۔ پر توم نے شمجھا کہ توم اشی طرح اش بینش کے ساؤتھ (ساتھ) عیش کرتا رہے گا۔''

بولتے ہوئے وہ بے رحمی سے میری گردن پر اپنے پاؤں کا دباؤ بھی بڑھا دیتا تھا۔ بے بسی حد سے تجاوز کر رہی تھی مگر میں اس ہیجڑے کو بتانا چاہتا تھا کہ بندھے ہاتھوں اور بندھی ٹانگوں کے ساتھ بھی اس جیسے غلیظ جانور کے ساتھ کچھ نہ کچھ تو کیا جا سکتا ہے۔ یقیناً اسے میرے حوالے سے کچھ ہدایات بھی دی گئی ہوں گی مگر وہ عالم طیش میں بے پروائی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ میں نے اپنے پاؤں سے اس کے جسم کا فاصلہ اور زاویہ بھانپ لیا۔ جونہی موقع ملا میں نے اپنی رہی سہی قوت جمع کر کے اپنے جسم کو موڑا، سر کی جانب اٹھایا اور بندھے ہوئے پاؤں سے ایک شدید ضرب خیام کی پشت پر لگائی۔ اس کا سارا وزن ایک ٹانگ پر تھا، کیونکہ دوسرا پاؤں اس نے میری گردن پر رکھا ہوا تھا۔ ضرب کھا کر وہ اڑتا ہوا دروازے سے ٹکرایا...... یہ ''ایم ایم اے'' کے فائٹر کی ضرب تھی۔ اگر دروازے پر فوم کی تہہ نہ ہوتی تو شاید خیام کا سر دو ٹکڑے ہو گیا ہوتا۔ پھر بھی چوٹ کم شدید نہیں تھی۔ وہ الٹ کر میرے قدموں میں گرا۔ میں نے اس کی ناک سے خون کی پچکاری نکلتے دیکھی۔ میں نے لیٹے لیٹے دونوں پاؤں سے پھر اس کی ریڑھ کی ہڈی پر کاری چوٹ لگائی۔ وہ تڑپ کر کئی فٹ پیچھے گیا۔ پھر وہیں کمر پکڑ کر بل کھانے لگا۔ اس کی کربناک آواز کمرے میں گونج رہی تھی۔ ''ہائے مار دیا، ہائے توڑ ڈالی ہوڈی (ہڈی)۔''

سی سی ٹی وی پر سب کچھ دیکھ لیا گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں خود کو رول کر کے پھر خیام کے قریب جاتا اور مزید ضرب لگاتا، دروازہ کھلا اور امریکن گارڈز جھپٹتے ہوئے اندر پہنچ گئے۔ وہ مجھ پر پل پڑے اور رائفل کے کندوں سے بے دریغ مارنے لگے۔ چند گارڈز نے واویلا کرتے ہوئے فربہ اندام خیام کو ڈنڈا ڈولی کر کے اٹھایا اور تیزی سے باہر لے گئے۔ وہ اب ٹھیٹ بنگالی میں پتا نہیں کیا کیا بول رہا تھا۔

کہتے ہیں کہ انسان کو بدترین حالات میں بھی کوشش جاری رکھنی چاہیے۔ میں بھی کوشش کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔ ایسا ہی ایک موقع مجھے اس وقت نظر آیا جب خواجہ سرا خیام کو دروازے سے باہر نکالا جا رہا تھا۔ وہ باہر نکل چکا تھا مگر دروازہ ابھی پوری طرح بند نہیں ہوا تھا۔ دروازے سے میرا فاصلہ اتفاقاً بہت کم تھا۔ میں اپنے پنجوں کے بل اچھلا اور جست کرتا ہوا دروازے سے باہر گرا۔ گرتے ساتھ ہی میں اپنے بندھے ہوئے ہاتھ

پاؤں کے ساتھ ماربل کے فرش پر رول کرنے لگا۔ رول کرتا اور لڑھکتا ہوا میں پلک جھپکتے میں قالین پوش سیڑھیوں تک جا پہنچا۔ میں نے بلا توقف خود کو سیڑھیوں سے گرا دیا۔ جہاں نصف سیڑھیاں مکمل ہوتی تھیں وہاں مجھے ایک طویل کھڑکی نظر آرہی تھی جس میں اوپر تک قریباً دو مربع فٹ کے شیشے لگے ہوئے تھے۔ اگر میں شیشہ توڑ کر خود کو باہر گرا دیتا تو کم از کم اس جہنمی ٹارچر سیل میں مرنے سے تو بچ سکتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ میں شدید زخمی ہوتا اور مجھے کچھ عرصے کے لیے ''ہاسپٹلائزڈ'' کرنا پڑ جاتا۔ یا پھر کوئی کرشمہ بھی رُونما ہو سکتا تھا۔ مسلح گارڈز تیزی سے سیڑھیوں کی طرف لپک رہے تھے۔ میرے پاس شاید ایک یا دو سیکنڈ کا وقت تھا۔ میں جانتا نہیں تھا کہ میں کس فلور پر ہوں۔ بس ایک اندازہ سا تھا کہ یہ فرسٹ فلور ہے۔ میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہوا، میں نے سر کی ضرب سے ایک شیشے کو چکنا چُور کیا مگر اس سے پہلے کہ میں خود کو باہر گرا پاتا، ایک گارڈ نے میری گردن میں ہاتھ ڈال دیا۔ اگلے ہی لمحے کوئی نصف درجن گارڈز مجھ سے چمٹ چکے تھے۔

''چھوڑ دو مجھے۔'' میں وحشت میں چلایا۔

میری بات کا جواب انہوں نے ٹھوکروں اور گھونسوں سے دیا۔ مجھے سیڑھیوں پر گھسیٹتے ہوئے وہ واپس سیل میں لے آئے۔ ان کا طیش بلندیوں کو چھو رہا تھا۔ اسپیکر سے ابھرنے والی لونگ کی آواز نے انہیں مزید مار پیٹ سے روک دیا۔ یقیناً وہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ مجھے کوئی ایسی شدید چوٹ لگ جائے جس کے بعد مجھے ''حرارت'' والی اذیت نہ دی جا سکے یا اس کا سلسلہ کچھ دنوں کے لیے موقوف کرنا پڑے۔

ایک دو منٹ بعد ہی میرا یہ اندازہ درست ثابت ہو گیا۔ دروازہ اور روزن دونوں آٹومیٹک طریقے سے بند ہو گئے۔ بیپ کی وہی مختصر سی منحوس آواز آئی جو تب پیدا ہوتی تھی جب ٹمپریچر بڑھنا شروع ہوتا تھا۔ اب یہ آواز مجھے اتنی دہشت ناک لگتی تھی کہ اسے سنتے ہی دم گھٹنے لگتا تھا۔ ٹمپریچر دھیرے دھیرے بڑھنا شروع ہو گیا۔ لگتا تھا کہ آج مجھے اپنی کوشش کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا اور یہ ٹمپریچر زیادہ اوپر جائے گا۔ اگر دیکھا جاتا تو میں نے ایک بیکار کوشش ہی کی تھی۔ میرے ہاتھ پشت پر بندھے تھے اور پاؤں بھی آزاد نہیں تھے۔ میں کھڑکی سے باہر کود بھی جاتا تو کہاں جا سکتا تھا۔ شاید یہ ایک اضطراری کوشش تھی۔ ویسی ہی کوشش جیسی، زنجیر سے بندھا ہوا جانور کرتا ہے۔ جانتا بھی ہے کہ چھوٹ نہیں سکتا، پھر بھی زنجیر سے الجھتا رہتا ہے۔

ٹمپریچر بتدریج اوپر آرہا تھا۔ مجھے لگا کہ میری ہمت جواب دینے لگی ہے۔ کچھ بھی تھا،

میں گوشت پوست کا انسان تھا، جس کی قوتِ مدافعت اور برداشت کی ایک نہ ایک حد ہوتی ہے۔ ''کیا کروں؟ کیا کروں؟'' میں نے جیسے دل ہی دل میں پکار کر خود سے پوچھا۔

کیا وقتی فرار کا کوئی راستہ ڈھونڈوں؟

کیا ان لوگوں کو کوئی ڈاج دے کر عارضی ریلیف حاصل کروں۔

ہمت ہارنے اور ہتھیار پھینکنے کی تو کوئی گنجائش ہی نہیں تھی، اگر میں ایسا کرتا تو پھر جوان جہان سیفی کی موت کس خانے میں فٹ ہوتی؟ میں نے اسے اپنے ہاتھوں سے مارا تھا تا کہ وہ تشدد کے سامنے کہیں اپنی زبان نہ کھول دے۔

''کیا سوچ رہے ہو بد بخت چمپئن؟'' لونگ کی مکروہ آواز اسپیکر سے نکل کر اس ٹارچر سیل میں گونجی۔

''میں...... مسٹر پال سے ملنا چاہتا ہوں...... یا پھر شکیل داراب سے۔''

''ان لوگوں سے ملنے کا وقت گزر چکا ہے۔'' لونگ نے سفاک لہجے میں کہا۔

''لیکن......''

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں باسٹرڈ، اب تم کو صرف اپنے ساتھیوں کی نشاندہی کرنی ہے...... اور کچھ نہیں...... کچھ بھی نہیں۔''

اسپیکر آف ہو گیا۔ ٹمپریچر میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ پسینے کی دھاریں نکلنا شروع ہوئیں۔ بہت جلد یہ پسینہ خشک ہو جانا تھا۔ گلے میں پیاس سے کانٹے پڑ جانا تھے۔ پھر وہی جسم و جاں کو جھلسا دینے والی تپش...... وہی جان لیوا جلن۔

O......❖......O

یہ بڑا منفرد عقوبت خانہ تھا۔ ہر جگہ فوم اور ریگ زین کی وہی ایک ڈیڑھ انچ موٹی تہہ تھی جو شاک آبزرور کا کام کرتی تھی۔ ایک دن میں نے اس پر بے تحاشا مکے برسائے۔ یہ مکے میں نے عام دیوار پر برسائے ہوتے تو میری کھال چھل جاتی اور ہاتھ کی ہڈیاں ننگی ہو جاتیں مگر یہاں مکے برسانے سے ہاتھ پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ یہ خاص قسم کا ریگ زین تپ کر انگارہ ہو جاتا تھا مگر نہ پگھلتا تھا نہ کسی اور طرح متاثر ہوتا تھا۔ عقوبت خانے کے علاوہ واش روم میں بھی فرش اور دیواروں پر یہی میٹریل استعمال کیا گیا تھا۔

مجھے جو کھانا دیا جاتا تھا، وہ ڈسپوزایبل برتنوں میں ہوتا تھا۔ کھانا کسی وقت میں کھاتا تھا کسی وقت پڑا ہی رہنے دیتا تھا۔ ایک بار جی میں آئی کہ کھانا بالکل بند کر دوں تاکہ جسم میں اتنی جان ہی نہ رہے کہ اذیت محسوس کر سکے۔ لیکن یہ بے سود تھا۔ میرے اندر جسم و جاں کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے یہ لوگ مجھے ''انفیوژن'' کے ذریعے خوراک دے سکتے تھے یا طاقت کے انجکشنز لگا سکتے تھے۔

بے بسی کے عالم میں یہ سوچ بھی ذہن میں آئی تھی کہ کچھ قیدی مسلسل اذیت سے نجات حاصل کرنے کے لیے اپنی کلائیوں وغیرہ کی شریانوں کو اپنے ہی دانتوں سے ادھیڑ دیتے ہیں اور خون کے زیدہ اخراج کے سبب ایک ایسی نقاہت کا شکار ہوتے ہیں جو خاموشی سے موت میں بدل جاتی ہے۔

لیکن کیا اس طرح اپنی جان لینا ٹھیک تھا؟ کیا یہ بزدلی نہیں تھی؟ کیا یہ قدرت کے اس وعدے پر شک نہیں تھا کہ وہ اوپر والا کسی ذی نفس کو اس کی برداشت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا؟ ایسا سوچ کر ایک عجیب سا حوصلہ پیدا ہوتا تھا۔

لونگ کی اس بے مثال اذیت رسانی کے دوران میں، دو تین دن کا وقفہ بھی آجاتا تھا۔ یہ وقفہ اس لیے ہوتا تھا کہ میری چمڑی کی حالت بہتر ہو جائے اور وہ بہتر طریقے سے جلن کی

اذیت کو محسوس کر سکے۔

ایک ایسے ہی وقفے کے دوران میں، میں فرش پر نیم بے ہوش پڑا تھا۔ ہاتھ سیدھی ہتھکڑی میں اور پاؤں بیڑی میں جکڑے ہوئے تھے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے دو افراد اندر داخل ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک ''سوئیپر'' تھا۔ اس نے فرش پر سے خون اور پیپ کے وہ داغ صاف کیے تھے جو میرے زخموں کے سبب لگے تھے۔ دوسرا ڈاکٹر تھا جس نے مجھے اینٹی بائیوٹک انجکشن لگایا تھا اور جو تین چار سیریس زخم تھے، ان پر بینڈیج کی تھی۔ مجھے تیز بخار بھی محسوس ہو رہا تھا۔

کہتے ہیں کہ ہر رات کے بعد سویرا ہے۔ میری یہ رات بہت طویل اور اندھیری ہوتی جا رہی تھی۔ میرا سویرا نظر نہیں آ رہا تھا مگر دل کی گواہی تھی کہ سویرا آئے گا۔ اندھیرا بہت گہرا ہو جاتا ہے تو صبح کی امید بھی توانا ہو جاتی ہے۔

میں نے نیم وا آنکھوں سے دیکھا۔ سلاخ دار روزن سے باہر تمتمائے چہرے والا سفاک امریکی لونگ جیک کھڑا تھا۔ بھیڑیا...... سو فیصد بھیڑیا۔ ایسے ہی لگتا تھا کہ کسی انسان کے جسم پر خونخوار بھیڑیے کا سر رکھ دیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ایک اور شخص تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ کوئی ڈینش ہے۔ اس کے طور اطوار اور حلیہ دیکھ کر نہ جانے مجھے کیوں لگ رہا تھا کہ یہ ڈنمارک میں میرے ہی شہر کوپن ہیگن کا رہنے والا ہوگا۔ لونگ اور وہ شخص آپس میں کچھ دیر کھسر پھسر کرتے رہے، پھر وہ شخص اپنے سیل فون پر بات کرتا ہوا دوسری طرف چلا گیا۔

لونگ میرے قریب آیا۔ اس نے روزن میں سے مجھے جھانکا۔ نہایت سرد لہجے میں بولا۔ ''اب بھی وقت ہے سنبھل جاؤ...... تم نے صرف یہ محاورہ سنا ہوا ہے کہ بندہ زندگی اور موت کے درمیان لٹکتا ہے۔ میں تمہیں اور تمہارے ہوتوں سوتوں کو سچ مچ زندگی موت کے درمیان لٹکاؤں گا......''

اس کے ساتھ ہی اس نے روزن سے میری جانب تھوکا اور گالیاں بکتا ہوا آگے نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی آواز کسی دوسرے بدنصیب قیدی کے کمرے سے آ رہی تھی۔

لونگ کے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے اور سینے میں بے چینی کی ایک نئی لہر اٹھنے لگی تھی۔ لونگ کے ساتھ ایک ڈینش نظر آیا تھا...... اور لونگ نے میرے ہوتوں سوتوں کی بات کی تھی۔ اس کا کیا مطلب تھا؟ کیا وہ میرے کسی قریبی عزیز پر ہاتھ ڈالنے کا سوچ رہا تھا۔ ڈنمارک میں میرے والد اور والدہ کے علاوہ اور کون تھا...... اور ان کے حوالے سے مجھے بہت

تسلی تھی۔ وہ فی الوقت بہت محفوظ تھے اور اگر خدانخواستہ ان کی طرف سے کوئی غلطی نہ ہوتی (جس کا امکان بہت کم تھا) تو وہ کسی کی زد میں نہیں آسکتے تھے۔ درحقیقت وہ ڈنمارک میں تھے ہی نہیں۔ پلاننگ کے مطابق اب وہ سویڈن کے شہر اوسلو میں تھے اور انہوں نے خود کو اپنی چار دیواری میں اس حد تک محدود کرلیا ہوا تھا کہ ان تک پہنچنا ناممکن تھا۔

اور ان کو اس محفوظ ٹھکانے پر میں نے اس لیے نہیں پہنچایا تھا کہ مجھے لونگ کی طرف سے خطرہ تھا۔ جب وہ روپوش ہوئے اس وقت تک تو لونگ اور رائے زل وغیرہ کی دشمنی کا نام ونشان بھی نہیں تھا۔ ان کی روپوشی دراصل اسی سنگین ترین دشمنی کا نتیجہ تھی جس کا تعلق یورپی گینگسٹر جان ڈیرک سے تھا۔ میں نے جان ڈیرک پر جو آخری وار کیا تھا، وہ اس کی نسلوں کو یاد رہنا تھا اور یہی وار تھا جس کے بعد جان ڈیرک اور اس کے نیٹ ورک کا ہر فرد خونخوار ہو کر دیوانہ وار مجھے ڈھونڈ رہا تھا۔ میں نے جان ڈیرک کے بے حد لاڈلے بیٹے پر ہاتھ ڈالا تھا۔ جرائم کی دنیا کا وہ شہزادہ جس کی طرف کوئی میلی نظر سے دیکھنے کی ہمت بھی نہیں رکھتا تھا۔ میں نے اس کو کوپن ہیگن کی سڑکوں پر برہنہ دوڑایا تھا اور پھر ایک چوراہے میں اسے سڑک پر لٹا کر ذبح کر ڈالا تھا۔ اس کی گردن سے ابلتا ہوا خون اور خون سے نکلتی ہوئی بھاپ آج تک میری نگاہوں کے سامنے تھی۔ اس وقت میں نے اس مقتول سے نو، دس الفاظ پر مشتمل جو فقرہ کہا تھا، وہ بھی مجھے آج تک یاد تھا، میں نے کہا تھا...... تمہارا باپ ٹھیک ہی کہتا تھا، مجھ سے دور رہو۔

جان ڈیرک کے اکلوتے بیٹے کا قتل جرائم کی دنیا کا ایک بہت بڑا واقعہ تھا۔ مجھے یقین تھا کہ جان ڈیرک کا ٹیکساری گینگ اور ان کے ہمنوا گروپ ہر جگہ دیوانہ وار میری بُو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ میں زیادہ دیر ان سے دور نہیں رہ سکتا تھا...... اور جب سے جاماجی میں مجھے ایسٹرن کی حیثیت سے پہچان لیا گیا تھا، مجھے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ میرے گرد موت کا گھیرا تنگ ہو رہا ہے۔

بات دور نکل گئی۔ میں ذکر کر رہا تھا لونگ کا اور اس کی مبہم دھمکی کا۔ میں نیم بے ہوش سا سیل کے فرش پر پڑا رہا اور سوچتا رہا کہ دو دن خیریت سے گزر گئے ہیں۔ آج تیسرا دن تھا اور یقینی بات تھی کہ آج پھر مجھ پر گرمی یا سردی سے شدید حملہ کیا جائے گا۔ زخموں کا برا حال تھا اور جب زخموں کی صورتِ حال ایسی ہوتی تھی تو ''ذائقے کی تبدیلی'' کے لیے مجھے گرم جہنم کے بجائے سرد جہنم کی سیر کرادی جاتی تھی۔

اور پھر قریباً ایک گھنٹے بعد یہی ہوا۔ بیپ کی منحوس آواز آئی اور سیل کا ٹمپریچر مسلسل گرنا

شروع ہو گیا۔ بے پناہ اذیت کے اگلے دو گھنٹے شروع ہو چکے تھے۔

میں جیسے برف کے ایک غار میں تھا۔ میرے حواس میرا ساتھ چھوڑتے چلے جا رہے تھے۔ لگتا تھا کہ میرے کاسۂ سر میں میرا دماغ سکڑ کر رہ گیا ہے، برف کا ڈھیلا بن گیا ہے۔ میں اپنے حواس کھو دوں گا یا پھر میرے جسم سے میرے دل و دماغ کا رشتہ ہمیشہ کے لیے منقطع ہو جائے گا۔

○......❖......○

نیلی آنکھوں والے پال کی دور افتادہ آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ شاید کسی سے جھگڑ رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”ٹھیک ہے، تم میری بکواس پر دھیان نہ دو مگر یہ سینئر موسٹ ڈاکٹر ہے اس کی بات کو تم کیسے جھٹلا سکتے ہو۔ اب یہ بندہ مر جائے گا اور تم اپنی، خون کی پیاس بجھا کر ٹھنڈے ٹھار ہو کر بیٹھ جاؤ گے۔“

بھیڑیا صفت لونگ جیک کی پھنکار میری سماعت سے ٹکرائی۔ ”آفیسر! میں نے اسے ایکسی لینسی رائے زل سے حاصل کیا ہے، وہی مجھ سے واپس لے سکتے ہیں۔ تم بار بار اس معاملے میں اپنی گندی ناک نہ گھسیڑو، ورنہ پچھتاؤ گے۔“

جواب میں پال نے بھی کوئی سخت بات کہی جو میرے کانوں تک نہیں پہنچی۔ بس اس کے آخری الفاظ میری سمجھ میں آئے۔ ”ابھی چند منٹ میں تحریری آرڈر بھی تم تک پہنچ جائے گا۔“

”تو پھر ابھی یہاں سے جاؤ آفیسر۔“ لونگ چیخ کر بولا۔ ”جب تحریری آرڈر آئے گا تو دیکھ لوں گا۔“

وہ لڑتے جھگڑتے میرے سرد جہنم سے دور چلے گئے۔ سردی اب بتدریج کم ہوتی جا رہی تھی، کیونکہ روزن کھلا تھا اور ہیوی ایئر کنڈیشنرز بھی بند کر دیئے گئے تھے۔

چند گھنٹے بعد نیم غنودگی کی سی کیفیت میں مجھے احساس ہوا کہ میں اب اس منحوس ٹارچ سیل سے باہر ہوں......اور شاید اس اپارٹمنٹ میں ہوں جہاں سے مجھے پال سے چھین کر لے جایا گیا تھا۔ میں نے کوشش کر کے اپنی پلکیں اٹھائیں اور آنکھوں کو نیم وا کیا۔ مجھے اپارٹمنٹ کی چھت نظر آئی۔ میں آرام دہ بستر پر چت لیٹا تھا۔ ہاں یہ وہی اپارٹمنٹ تھا۔ میرے نتھنوں میں اسپرٹ کی بو گھس رہی تھی۔ شاید ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے کوئی انجکشن لگایا گیا تھا۔ میرے زخموں کی پٹیاں بھی بدلی گئی تھیں۔ میں نے اپنے ہاتھوں کو حرکت دی، وہ فی الوقت آزاد تھے، پاؤں کو بھی حرکت دی جا سکتی تھی۔

غالباً مجھے کوئی سکون بخش دوا دی گئی تھی۔ بہت جلد مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی اور میں سو گیا۔

سونے جاگنے کا یہ دورانیہ قریباً دو دن جاری رہا۔ میری جلی ہوئی کھال کو طبی امداد دی جا رہی تھی۔ جلن کی وجہ سے سر کے بال چرمر ہو کر تباہ حال ہو گئے تھے۔ یہاں اپارٹمنٹ میں لا کر میرے سر پر مشین چلائی گئی تھی اور بال بالکل چھوٹے کر دیئے گئے تھے۔ سر کے متاثر حصوں پر بھی آئنٹمنٹ لگائی گئی تھی۔ مجھے صرف سیال خوراک دی جا رہی تھی۔ سائیڈ ٹیبل پر جوسز، انرجی ڈرنک اور دودھ وغیرہ کی بوتلیں رکھی تھیں۔ زیادہ طلب ہوتی تو میں خود ہی چند گھونٹ لے لیتا تھا۔

پال سے ابھی تک ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ نہ ہی شکیل داراب نے شکل دکھائی تھی۔ آئندہ میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا، مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ ایک دن میں نے نیم غنودگی میں اٹھ کر دودھ کی بوتل کی طرف ہاتھ بڑھایا تو کسی نے خود ہی گلاس بھر کر میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے گلاس تھام کر اپنے مددگار کو دیکھا اور سکتے میں رہ گیا...... زمین پھٹ جاتی یا آسمان ٹوٹ کر ٹکڑوں کی صورت میں نیچے گرنے لگتا تو شاید مجھے اتنی حیرت نہ ہوتی جتنی اس کو دیکھ کر ہوئی۔ پھر یہ خیال ذہن میں آیا کہ شاید میں ابھی غنودگی کی حالت میں ہوں اور میرا تخیل مجھے دھوکا دے رہا ہے۔ لیکن نہیں...... وہ جیتی جاگتی تاجور تھی...... اور میرے سامنے بیٹھی تھی۔

وہی پاکستانی رواج کا لباس، شلوار قمیص اور دوپٹا نما چادر۔ اس کی کلائیوں میں ہمیشہ کانچ کی چوڑیاں نظر آیا کرتی تھیں مگر آج یہ چوڑیاں نہیں تھیں۔ شاید اسے میرے اپارٹمنٹ میں بھیجنے سے پہلے چوڑیاں اور ایسی دیگر اشیا اس کے جسم سے علیحدہ کی گئی تھیں تاکہ میں ان اشیا کا کوئی غلط استعمال نہ کر سکوں۔

تاجور کو اپنے سامنے دیکھ کر میرے اندر سے خوشی کی ایک بلند و بالا لہر اٹھی۔ نہ جانے ان لمحوں میں کیوں میرا دل چاہا کہ میں سب اندیشے بالائے طاق رکھ کر، اردگرد کے ہر منظر کو فراموش کر کے اسے اپنی بانہوں میں بھر لوں۔ اس کی پیشانی پر لہراتی لٹیں پیچھے ہٹاؤں اور اسے چومتا چلا جاؤں۔ دل کی گہرائیوں سے اٹھنے والی پیار کی یہ لہر بہت بلند و بالا اٹھی مگر یہ جتنی جلدی اٹھی تھی اتنی ہی جلدی اوجھل بھی ہو گئی۔ یہاں کلوز سرکٹ کیمرے تھے۔ سب کچھ دیکھا اور سنا جاتا تھا۔ میں نے بے ساختہ آگے بڑھ کر تاجور کے دونوں ہاتھ تھام لیے، دو مہکے ہوئے گلاب جن کو چھوتے ہی پورے جسم میں انبساط کی کرنیں پھیل گئیں۔

”تاجور! تم یہاں؟“ میں بس اتنا ہی کہہ سکا۔

”آپ تو بہت زیادہ زخمی ہیں...... مم...... میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ آپ کو اس حالت میں دیکھوں گی۔“

”مجھے اپنی نگاہوں پر یقین نہیں ہو رہا۔“ میرا لہجہ لرزاں تھا۔

”یقین تو مجھے بھی نہیں ہو رہا شاہ زیب، لیکن......“ وہ کہتے کہتے خاموش ہوگئی۔ شاید وہ کہنا چاہ رہی تھی کہ...... ”لیکن اتنا مجھے پتا تھا کہ آپ جس طرح کی زندگی گزار رہے ہیں، آپ کے ساتھ عنقریب کچھ بہت برا ہو جانا ہے اور آج میں نے یہ ”برا“ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔“

”آ...... آپ یہ دودھ پی لیں۔“ اس نے گلاس پھر میری طرف بڑھایا۔

اچانک میری ساری خوشی کافور ہوگئی۔ میرے پورے جسم پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ تاجور کو اپنے سامنے دیکھ کر میں دس پندرہ سیکنڈ کے لیے سب کچھ بھول گیا تھا مگر اب ہر چیز یاد آ گئی تھی۔ مجھے لگا جیسے مجھے اچانک تپتی، دہکتی ہوئی زنجیروں میں جکڑ لیا گیا ہے اور ان زنجیروں کو اتنی زور سے بھینچا جا رہا ہے کہ زنجیروں کا لوہا میرے گوشت میں گھس رہا ہے اور ہڈیوں کو کاٹ رہا ہے۔ تاجور کو ہزاروں میل دور سے اٹھا کر میرے سامنے کیوں لایا گیا تھا۔ شاید وہ لوگ جانتے تھے کہ یہ لڑکی دنیا کی وہ واحد ہستی ہے جو مجھے بولنے پر مجبور کر سکتی ہے۔ یہ میرے دشمنوں کی بہت بڑی اور بے انتہا سنگین چال تھی۔

یہ چال کس نے چلی تھی؟ کس نے چلی تھی؟

فوراً ہی جو چہرہ میرے تصور میں آیا، وہ شکیل داراب کا تھا۔ گورا چٹا، لشکارے مارتا، وجیہہ چہرہ...... یقیناً یہی شخص تھا، یہی تھا جس نے یہ زہریلا خنجر میرے دل میں پیوست کیا تھا۔ پتا نہیں یہ لوگ تاجور اور اس کی فیملی تک کیسے پہنچے اور کیسے تاجور کو یہاں جاماجی میں اور میرے اپارٹمنٹ تک لانے میں کامیاب ہوئے۔ یقیناً اس کے پیچھے ایک طویل اور کٹھن کوشش تھی۔ شکیل داراب جیسے بااثر شخص سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ پاکستان میں اس کے ہاتھ بہت لمبے تھے۔ یقیناً اس نے اپنے ان لمبے ہاتھوں کو چاند گڑھی اور چاند گڑھی سے آگے سکھیرا گاؤں تک پہنچا دیا تھا اور وہاں سے تاجور کو اُچک کر یہاں میرے سامنے لے آیا تھا...... ہاں یہ شکیل داراب ہی تھا۔ میرے دل نے گواہی دی۔ ایک سیکنڈ میں ہی سب کچھ میرے ذہن سے گزر گیا۔ دودھ کا گلاس میں نے تاجور کے ہاتھ سے نہیں لیا اور بستر سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

''آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' تاجور کی منمناتی سی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔
میں خاموش رہا۔ میرے اندر ایک جنگ جاری تھی۔ ایک ہلچل مچی ہوئی تھی، فیصلہ سخت تھا لیکن میں نے کر لیا۔ دل پر ایک کوہ ہمالیہ جیسا وزن رکھ کر میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔
''میرا خیال ہے کہ تمہیں پاکستان سے شکیل داراب صاحب لائے ہیں یہاں؟''
''ہاں۔'' اس نے اثبات میں سر ہلا کر جھکا لیا۔
''کس لیے؟''
''وہ کہتے ہیں کہ آپ کو مدد کی ضرورت ہے۔ آپ ایک بڑی مشکل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ آپ نے کوئی...... ضد پکڑی ہوئی ہے...... اور وہ ضد آپ کو بہت نقصان دینے والی ہے۔''
''چلو، اگر ایسا ہے بھی تو...... تم اس سلسلے میں کیا مدد کر سکتی ہو؟''
''ان کا خیال ہے کہ...... میں آپ کو سمجھاؤں گی...... تو شاید آپ سمجھ جائیں گے۔''
''اور تمہارا اپنا کیا خیال ہے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے روکھے پن سے دریافت کیا۔
''میں...... کیا کہہ سکتی ہوں؟'' اس کی گردن بدستور جھکی ہوئی تھی۔
میں نے کہا۔ ''ہو سکتا ہے کہ تمہیں یہاں لانے والے بھی اس وقت ہماری یہ باتیں سن رہے ہیں۔ اگر وہ سن رہے ہیں تب بھی اور اگر نہیں سن رہے تب بھی...... میرا جواب وہی ہے جو پہلے دن تھا اور یہ جواب میری موت تک یہی رہے گا۔''
تاجور نے لرز کر میری طرف دیکھا۔ میرے زخموں سے چُور جسم نے اسے پہلے ہی بے حد ہراساں کر رکھا تھا، اب میرے لب و لہجے نے اسے بالکل کاٹ کر رکھ دیا۔
وہ کچھ دیر خاموش رہی۔ پھر بالوں کی ریشمی لٹیں اپنے کانوں کے پیچھے اڑس کر اس نے اپنی دلکش آنکھوں سے میری جانب دیکھا اور نرم لہجے میں بولی۔ ''شاہ زیب! آخر...... وہ...... کون لوگ ہیں...... جن کی خاطر...... آپ اپنے آپ پر اتنا ظلم سہہ رہے ہیں۔ میں...... آپ کی منت کرتی ہوں...... مجھے کچھ بتائیں...... میری عقل اتنی تو نہیں...... لیکن شاید میں آپ کو کچھ مشورہ دے سکوں۔''
''سوری تاجور! میں اس سلسلے میں کسی سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتا۔ میں نے یہ ورق اپنی کتاب سے پھاڑ دیا ہے۔'' میرا لہجہ سخت تھا۔
اس نے اپنا نچلا ہونٹ ہولے سے دانتوں میں دبایا اور روہانسی نظر آنے لگی۔ خود پر ضبط

کرتے ہوئے، اس نے تھوڑا توقف کیا اور کہنے لگی۔ ''کیا...... یہ بھی نہیں پوچھیں گے کہ میں...... اتنی دور یہاں کیسے پہنچی ہوں...... کن حالات سے گزری ہوں اور باقی لوگ کیسے ہیں؟''

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''تاجور! ہوسکتا ہے کہ تمہیں میری بات سخت لگے، لیکن حقیقت یہی ہے جو میں تمہیں بتا رہا ہوں۔ ہماری راہیں اسی دن جدا ہوگئی تھیں جب میں نے تمہارے نئے گاؤں پہنچ کر تمہیں موٹر سائیکل سے اتارا تھا۔ ہمارے درمیان جو کچھ بھی تھا...... وہ اب ایک باسی کڑی کی طرح ہے۔ اگر شکیل یا لونگ جیسا کوئی بے وقوف یہ سمجھتا ہے کہ وہ تمہیں میرے سامنے لا کر اس باسی کڑی میں ابال لاسکتا ہے تو یہ اس کی بھول ہے۔''

اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ ''میں جانتی ہوں شاہ زیب! میرے اور آپ کے درمیان اب بہت فاصلہ ہے لیکن کبھی یہ فاصلہ اتنا نہیں تھا، میں سچ کہتی ہوں مجھے آپ کی یہ حالت دیکھ کر بہت دکھ ہوا ہے اور وہ لوگ...... یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ آپ کو بولنے پر مجبور کرنے کے لیے ہر حد تک جائیں گے۔ آپ...... ان کی کچھ باتیں مان کیوں نہیں لیتے؟ شکیل صاحب بتا رہے تھے کہ اس سے آپ کو کچھ رعایتیں مل جائیں گی اور ان لوگوں کو بھی جن کو آپ بچانا چاہ رہے ہیں۔''

''کیا تمہیں ایک لیکچرار کے طور پر میرے پاس بھیجا گیا ہے؟'' میں نے پُرتپش لہجے میں کہا۔

وہ زیرک تھی۔ سمجھ گئی کہ اب میری بے رُخی مزید بڑھ جائے گی۔ اس نے ایک دم موضوع بدلا۔ ''ایک انڈین ملازمہ ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے بتا کر گئی ہے کہ دس بجے آپ کی دوا کا وقت ہے اور دس بس بج ہی گئے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''ویسے میری خواہش ہے کہ یہ دوا میں خود کھاؤں...... اور ایک خواہش یہ بھی ہے کہ...... یہ لوگ مجھے اکیلا چھوڑ دیں۔''

میں نے چھت کی طرف منہ کیا اور نادیدہ کیمروں سے مخاطب ہو کر چلایا۔ ''مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ لے جاؤ اس کو یہاں سے...... لے جاؤ۔''

کوئی جواب نہیں آیا۔ وہ لوگ یہی ظاہر کر رہے تھے کہ کلوز سرکٹ کیمرے بند ہیں اور ہم دونوں پرائیویسی میں بات چیت کر رہے ہیں۔ جب انہوں نے ایسا ظاہر کرنا ہوتا تھا تو کیمروں کے شٹر بند ہو جاتے تھے مگر اس صورتِ حال پر یقین کرنا مشکل تھا۔

تاجور سہمی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس اپارٹمنٹ میں رات دن کا علم صرف

وال کلاک سے ہی ہوتا تھا اور وال کلاک میں بھی چونکہ شیشہ موجود تھا، اس لیے وہ اپارٹمنٹ کے اندر نہیں تھا۔ اسے دیکھنے کے لیے مجھے راڈز والی کھڑکی کے پاس جانا پڑتا تھا۔

میں نے کھڑکی میں سے دیکھا، رات کے دس بج رہے تھے۔ میں تاجور کے پاس واپس اپنے بیڈروم میں پہنچا اور اسے بے رخی سے مخاطب کر کے بولا۔ ''میں اپنی دوا خود کھالوں گا۔ اگر تم چاہو تو ساتھ والے کمرے میں جا کر سو سکتی ہو۔''

وہ نمناک آنکھوں سے مجھے دیکھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ میں نے میڈیسن لی اور پہلو کے بل اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ میرے اندر اور باہر کی کیفیت میں زمین آسمان کا فرق تھا جو سرد مہری اور جھنجلاہٹ میں ظاہر کر رہا تھا اس کے برعکس میرے اندر ایک طوفان برپا تھا۔ تاجور میرے پاس تھی۔ چند فٹ کی دوری پر، ایک ہی چھت کے نیچے، میں اسے اپنی پلکوں پر بٹھانا چاہتا تھا۔ اس کے سانسوں کی خوشبو اپنے اندر اتارنا چاہتا تھا۔ اس سے گھنٹوں اور پہروں باتیں کرنا چاہتا تھا۔ ڈھیروں سوال تھے جو میرے سینے میں مچل رہے تھے۔ وہ کہاں سے آئی ہے؟ کیسے لائی گئی ہے؟ اس کے ساتھ اور کوئی بھی ہے؟ چاندگڑھی اور سکھیرا گاؤں کے حالات کیا ہیں؟ اس کے والد دین محمد صاحب، اس کے چھوٹے بھائی اسفند اور راحیل عرف کاکا...... اس کی والدہ، سب لوگ کیسے ہیں؟ اور پھر وہ ویڈیو کلپ جو میں نے بدنصیب سیفی کے فون میں دیکھی تھی۔ اس میں تاجور نے کہا تھا...... غلطی ہوئی ہے...... ہاں یہ غلطی تو ہوئی ہے۔

کتنا بڑا ستم تھا، حالات کا کتنا بے رحم جبر تھا۔ وہ ایک ہی چھت کے نیچے میرے ساتھ موجود تھی اور میں نے اسے ساتھ والے کمرے میں بھیج دیا تھا۔ کیا ایسے حالات میں وہ سو سکتی تھی؟ کیا ایسے حالات میں، میں سو سکتا تھا؟ میں بستر پر مسلسل کروٹیں بدلتا رہا۔ وہ سمجھ دار تو بہت تھی، کیا وہ بات کی تہہ تک پہنچ پا رہی تھی کہ میری یہ شدید بے رخی کیوں ہے، یہ شدید بے رخی تاجور کو اس دردناک انجام سے بچانے کی ایک ناتواں سی کوشش تھی جو میں اپنے سامنے دیکھ رہا تھا۔ میرا دل سینے میں ٹکڑے ہو کر بکھرنے لگا۔ سوال بے حد سفاک تھا، مگر ایک ٹھوس حقیقت بن کر میرے سامنے موجود تھا۔ کیا میرے زبان کھلوانے کے لیے میرے سامنے تاجور کو تشدد کے شکنجے میں کسا گیا تو میں چپ رہ سکوں گا؟

میری پیشانی پسینے سے تر ہو گئی۔ شکیل داراب کی مدد سے ان لوگوں نے مجھے ایک ایسے دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا جہاں میرا جسم دو ٹکڑے ہو رہا تھا۔

وہ بڑی کربناک رات تھی، شاید ان راتوں سے بھی زیادہ جو میں نے ٹارچر سیل میں

''زندہ روسٹ'' ہوتے ہوئے گزاری تھیں۔ رات آخری پہر شاید تھوڑی دیر کے لیے میں سو گیا۔ کسی نے میرا شانہ ہلا کر مجھے جگایا تھا۔ میں نے پلکیں اٹھائیں تو وہی سادہ و ملیح چہرہ میرے سامنے تھا جو میرے دل کا انمٹ داغ بن چکا تھا۔ ابھی میرا ذہن پوری طرح بیدار نہیں ہوا تھا۔ بس اس کا چہرہ نظر آیا تھا، وہ حالات نظر نہیں آرہے تھے جن میں یہ چہرہ موجود تھا۔ جی چاہا اس کھینچ کر اپنے اوپر گرا لوں......لیکن اگلے ہی لمحے میں اس سے سینکڑوں میل کے فاصلے پر چلا گیا......ذہن بیدار ہو گیا تھا۔ خوفناک حالات اپنی تمام تر شدت کے ساتھ احاطۂ شعور میں آ گئے تھے۔

''آپ کی دوا کا وقت ہو گیا ہے شاہ زیب!'' تاجور نے کہا۔ اس کے ہاتھ میں میڈیسن اور پانی سے بھرا ہوا ڈسپوزایبل مگ تھا۔

میں نے دوا اس کے ہاتھ سے لے لی اور وہیں بستر پر بیٹھے بیٹھے پانی کے ساتھ نگل لی۔ ''میں نے تمہیں رات کو ہی کہا تھا کہ یہ زحمت نہ کرو......اب تم جا سکتی ہو۔''

''آ......آپ نہائیں گے؟'' اس نے پوچھا، پھر میرے زخموں پر جا بجا چپکی ہوئی پٹیاں دیکھیں اور ''سوری'' کہہ کر رہ گئی۔

میں نے کہا۔ ''تمہاری بے حد مہربانی ہے، میرے لیے پریشان ہونے کی کوشش نہ کرو۔ ہو سکے تو جو لوگ تمہیں یہاں لائے ہیں ان سے بات کرو۔ انہیں بتاؤ کہ وہ گائے کے بجائے بیل کا دودھ دھونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انہیں کچھ حاصل نہیں ہو گا۔''

وہ منمنائی۔ ''میں اپنی مرضی سے یہاں نہیں آئی ہوں اور شاید مرضی سے جا بھی نہیں سکتی ہوں۔''

''لیکن......مجھ سے......اپنی شکل دور تو رکھ سکتی ہو۔'' میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ مجھ میں اتنی ہمت ہی نہیں تھی کہ اپنے بے رحم فقرے کا ردِعمل اس کے چہرے پر دیکھ سکوں۔

میرا خیال تھا کہ وہ دوسرے کمرے میں چلی جائے گی مگر قدموں کی آواز نہیں آئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ وہیں کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں سے ایک موتی ٹپک کر اس کے سینے پر گرا۔ وہ اپنے مرمریں ہاتھوں کی انگلیاں مروڑ رہی تھی۔ دفعتاً میری نگاہ اس کے بائیں ہاتھ کی انگلی پر پڑی۔ اس میں ایک چھوٹی انگوٹھی چمک رہی تھی......اس کی منگنی کی انگوٹھی۔ میرے سینے پر ایک نیا تیر لگا اور اندر تک دھنس گیا۔ میری نگاہوں کے سامنے کبڈی شاہ سیفی کا خوبرو چہرہ گھوم گیا۔ زندگی سے بھرپور سرخ و سپید چہرہ۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے اس کی جان لی

تھی۔ انگوٹھی کی چمک میری آنکھوں کو خیرہ کرنے لگی۔ میں جیسے اندھا ہو گیا۔ اپنا سر جھکا کر میں نے اپنے اوپر اٹھے ہوئے گھٹنوں پر رکھ لیا۔

''کیا ہوا، آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' تاجور کی پریشان آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ''آپ کے چہرے سے بخار لگ رہا ہے۔''

''میں ٹھیک ہوں، تم جاؤ یہاں سے۔'' میں نے اسی طرح اپنا سر گھٹنوں میں دیئے دیئے کہا۔ وہ تھوڑی دیر کھڑی رہی...... شاید تذبذب میں تھی پھر اس نے ہمت کی اور آگے بڑھ کر اپنے ہاتھ سے میری پیشانی چھوئی۔

میں نے درشتگی سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور گرج کر بولا۔ ''میں نے کہا ہے نا کہ تم جاؤ یہاں سے۔ مجھے تمہاری کوئی ضرورت نہیں...... اور میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تمہیں بھی میری کوئی ضرورت نہیں۔ میں مروں یا جیوں تمہیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔ اگر تم یہاں آئی ہو تو اس میں تمہارا کوئی مقصد ہے، تمہارا کوئی مطلب ہے۔''

''مم...... میرا کیا مقصد ہو سکتا ہے شاہ زیب؟'' وہ لرز گئی۔

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر زہریلے لہجے میں کہا۔ ''شکیل داراب کافی مالدار آدمی ہے، اپنا مطلب نکالنے کے لیے وہ کافی روپیہ دے سکتا ہے تمہیں اور تمہاری فیملی کو......''

''آپ...... یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ کو بولنے پر راضی کرنے کے لیے میں نے کسی سے پیسہ لیا ہو گا؟''

''تو اور کیا وجہ ہو سکتی ہے؟'' میں اسی تند لہجے میں بولا۔ ''جتنی محبت تمہیں مجھ سے ہے میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ تمہارے نزدیک میں ایک شرابی، بدکار، بدمعاش شخص ہوں...... اور میں ہوں...... میں ہوں...... تم مجھ پر تھوک کر اپنی پاک صاف دنیا میں جا چکی ہو۔ تمہیں میری صحت سلامتی سے کیا غرض ہو سکتی ہے۔ اگر اب تم یہاں ہو تو اس کے پیچھے دھن اور دھونس کی کارفرمائی ہے...... اور ہو سکتا ہے کہ دھن کی کارفرمائی زیادہ ہو۔''

وہ سرتاپا لرز رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی۔ ''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا کہ آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں...... کیا...... آپ کی کوئی مجبوری ہے...... یا آپ واقعی مجھ کو اتنا گرا ہوا سمجھتے ہیں۔''

''وقت سے بڑا جلاد کوئی نہیں ہوتا۔ لوہے کو زنگ بنا دیتا ہے، صندل کو راکھ کر دیتا ہے۔ ہمارے درمیان بھی بہت کچھ بدل چکا ہے تاجور! بہتر ہے کہ تم چلی جاؤ یہاں سے۔'' میں بیزار انداز میں بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔

اٹھتے ہوئے ہاتھ بستر کی تین چار فٹ اونچی ٹیک سے ٹکرایا۔ یہاں بھی کلائی پر زخم تھا۔ سفید بینڈ یج کے نیچے سے تھوڑا سا خون رِس پڑا۔ تاجور جیسے تڑپ کر آگے بڑھی۔ اس نے اتر جانے والی بینڈ یج کو درست کرنا چاہا۔ میں نے اس کا بازو تھام کر اسے روک دیا۔ ''دیکھو تاجور! مجھے ان چونچلوں کی کوئی ضرورت نہیں اور میں پھر کہتا ہوں یہاں سے چلی جاؤ تو اچھا ہے، میں اپنے حواس میں نہیں ہوں۔ میرے اندر آگ بھڑک رہی ہے اگر...... کچھ ہو گیا تو اچھا نہیں ہوگا۔''

''لیکن شاہ زیب! میں نے......''

''چلی جاؤ یہاں سے، میں کہتا ہوں چلی جاؤں۔'' میں اتنی زور سے بولا کہ اپارٹمنٹ گونج اٹھا۔

اس کے ساتھ ہی میں نے تاجور کے گریبان میں ہاتھ ڈالا اور اس کی پھولدار قمیص نیچے تک پھاڑ ڈالی۔ وہ سکتہ زدہ تھی۔ میں نے اس کے بال مٹھی میں جکڑے اور اس کے دونوں رخساروں کو اپنے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور انگلیوں کے درمیان زور سے بھینچا۔ اس کی شکل بگڑ گئی۔ خوب صورت آنکھوں میں ہراس آمیز حیرت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ میرا انداز پُرغضب تھا...... میں نے جنونی لہجے میں کہا۔''میرے پرانے زخموں کو مت کریدو۔ تمہاری یہ خوب صورتی، اور یہ تنہائی تمہیں نقصان بھی پہنچا سکتی ہے۔ میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑ دیتا ہوں، تم چلی جاؤ یہاں سے۔'' میں نے باقاعدہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

اس نے اپنے پھٹے ہوئے گریبان کو مٹھی میں بھینچ لیا۔ آنکھوں کے کٹورے آنسوؤں سے بھرے ہوئے تھے پھر وہ تیزی سے مڑی اور دوسرے کمرے میں جا کر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ میں نے سائیڈ ٹیبل کو زور سے ٹھوکر ماری......اور کلائی کی خون آلود پٹی اتار کر پھینک دی۔

وہ سارا دن مکمل خاموشی میں گزر گیا۔ ایک عجیب بے بسی کی کیفیت تھی۔ میر[illegible] کو اپنی پلکوں پر بٹھانا چاہتا تھا جس کے قدموں میں اپنی دھڑکنیں بچھا دینا چاہتا تھا۔ وہ ہزاروں میل دور سے معجزانہ طور پر میرے پاس پہنچی تھی اور میں اسے خود سے دور کرنے اور ٹھکرانے پر مجبور تھا۔

لیکن یہ سب کرنے کے باوجود میں مطمئن نہیں تھا۔ کیا میری یہ کوشش فائدہ مند ثابت ہو سکے گی۔ کیا اس سے ان حالات پر کچھ فرق پڑے گا جو تاجور کے ساتھ پیش آنے والے تھے، کہیں ایسا تو نہیں ہوگا کہ......

اس سے آگے میں سوچ بھی نہ سکا۔ میں نے سیفی کو اپنے ہاتھوں سے مارا تھا۔ کیا زینب ابراہیم اور اپنے ساتھیوں کو بچانے کے لیے اور تاجور کو بدترین تشدد سے محفوظ رکھنے کے لیے، میں تاجور کے ساتھ بھی ایسا کچھ کر سکتا تھا؟ میں اس کی جان لے سکتا تھا؟ یہ سوچ کر ہی جسم کے ہر مسام سے پسینہ بہہ نکلا۔ اس سے بہتر تو پھر یہ تھا کہ میں کسی طرح خود اپنی جان لے لیتا۔

دوپہر کے وقت حسبِ معمول پہریدار نے مجھے حکم دیا کہ میں راڈز والی کھڑکی کے پاس آؤں اور خود کو ہتھکڑی لگواؤں۔ اب یہ سب کچھ معمول کا حصہ بن چکا تھا اور احتجاج یا مزاحمت کا سوچنا بیکار تھا۔ مجھے لگا کہ کوئی مجھ سے ملنے آ رہا ہے۔

میں کھڑکی کے پاس پہنچ گیا۔ میرے ہاتھ ہتھکڑی میں جکڑ دیئے گئے، پھر پاؤں بھی جکڑ دیئے گئے۔ لیکن مجھ سے ملنے کوئی نہیں پہنچا۔ نہ ہی اسپیکر پر میرے لیے کوئی ہدایت جاری ہوئی۔ دس منٹ بعد دو گارڈز دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے تاجور بھوکی پیاسی دوسرے کمرے میں بند تھی۔ گارڈز نے اسے وہاں سے نکالا اور اپنے ساتھ لے کر باہر چلے گئے۔ تاجور کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ اَن گنت سوال تھے ان آنکھوں میں، پھر وہ باہر چلی گئی۔

دس منٹ بعد لونگ کی کرخت آواز اسپیکر کے ذریعے میرے اپارٹمنٹ میں سنائی دی۔

"ڈراما اچھا کر لیتے ہو۔" وہ بولا۔

"کیسا ڈراما؟"

"اپنی لور...... اپنی ڈارلنگ...... اپنی سویٹ ہارٹ کے ساتھ تمہارا ڈراما۔"

"اگر تم اسے ڈراما سمجھتے ہو تو تمہاری مرضی ہے۔ میری صحت پر اس سے کوئی اثر نہیں پڑتا۔"

"تمہاری صحت پر اس سے اثر پڑے گا...... اور یادگار اثر پڑے گا۔ میں جو کچھ اس لڑکی کے ساتھ کراؤں گا وہ تمہیں سب کچھ اسکرین پر نظر آئے گا اور ان میں سے کوئی ایک منظر بھی ایسا نہیں ہوگا جو تمہارے دیکھنے کے قابل ہو۔"

میں اندر سے ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گیا، مگر اپنے تاثرات کو سنبھالے رکھا۔ "تم ظلم کرو گے اور اس کا خمیازہ بھی تمہیں ایک دن ضرور بھگتنا پڑے گا لیکن اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ اس طرح تم مجھ سے کچھ اگلوانے میں کامیاب رہو گے تو یہ تمہاری بہت بڑی بھول ہے۔ میرے پاس تمہیں بتانے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔" میں نے آخری جملے کے ایک ایک لفظ پر زور دے

کر کہا۔

''ابھی تھوڑی دیر میں سب کچھ سامنے آجائے گا۔'' لونگ کی آواز وحشت ناک تھی۔

میں جانتا تھا کہ وہ بہت کچھ کر سکتا ہے...... اپنے شکنجے میں آنے والے شخص کو وہ اس بیدردی سے نچوڑتا تھا کہ وہ موت کو ترسنے لگتا تھا اور وہ تو ایک لڑکی تھی۔ نرم دل اور ذرا سی بات پر آنکھوں کے کٹورے بھر لینے والی۔ جسمانی لحاظ سے بے شک دودھ مکھن کی پلی تھی اور عام شہری لڑکیوں سے مختلف تھی مگر تھی تو لڑکی۔ ایک طاقتور مرد بھی اسے زیر کرنے کے لیے کافی تھا۔ اس کے ساتھ یہاں کیا کچھ نہیں ہو سکتا تھا اور مجھ میں اتنی ہمت ہرگز نہیں تھی کہ اس کو مصیبت میں دیکھ سکتا، یا اس کی آواز سن سکتا۔ یہ میری زندگی کا مشکل ترین دورانیہ تھا۔

اور پھر قریباً ایک گھنٹے بعد سب کچھ میرے سامنے آ گیا۔ اس کھڑکی کے عین سامنے ایک ایل سی ڈی لا کر رکھی گئی جس کے اندر ہاتھ ڈال کر مجھے ہتھکڑی وغیرہ لگائی جاتی تھی۔ چند منٹ بعد اسکرین پر ایک لرزہ خیز منظر نمودار ہوا۔ وہی تاجور جو قریباً ڈیڑھ گھنٹا پہلے اس اپارٹمنٹ سے چادر میں لپٹی لپٹائی اور میری طرف حسرت سے دیکھتی ہوئی گئی تھی۔ ایک کمرے کی چھت سے لٹکی ہوئی تھی۔ چادر اس کے سر سے کھینچی جا چکی تھی۔ وہ صرف شلوار قمیص میں تھی۔ دونوں پاؤں بھی ننگے تھے۔ اس کے ہاتھ نائیلون کی ایک رسی سے باندھ کر چھت کے پنکھے سے منسلک کر دیئے گئے تھے۔ رسی کا سائز ایسا تھا کہ تاجور کے پاؤں کے صرف اگلے پنجے فرش سے چھوتے تھے۔ کہا جا سکتا تھا۔ کہ وہ نہ لٹک رہی تھی، نہ فرش پر تھی۔ اس کے چہرے پر دنیا جہاں کا درد اور خوف سمٹا ہوا تھا۔

فرنیچر سے آراستہ اس کشادہ کمرے میں تین ہٹے کٹے نقاب پوش موجود تھے۔ فقط ان کی آنکھیں نظر آتی تھیں۔ ان آنکھوں سے ان کی قومیت وغیرہ کا پتا چلنا دشوار تھا۔ تینوں کے جسموں پر ایک ہی طرح کے ہلکے نیلے چست لباس تھے۔ ان میں سے دو کے ہاتھ میں بید کی لمبی چھڑیاں تھیں جو انہوں نے جارحانہ انداز میں افقی رخ پر اٹھا رکھی تھیں۔

اندازہ ہوتا تھا کہ اسکرین پر اس بند کمرے کا منظر نظر آنے سے پہلے ہی تاجور کے ساتھ تھوڑی سی مار پیٹ ہو چکی ہے کیونکہ اس کی ٹانگیں لرز رہی تھیں اور آنکھوں میں آنسو تھے۔

کمرے میں لونگ جیک کی کرخت آواز گونجی۔ ''یہ تمہاری پاکستانی ہمشیرہ انگلش نہیں جانتی ورنہ میں اسی سے کہتا کہ تم سے اپنی جان بخشی کے لیے التجا کرے۔ تم ہی ہو جو اس کی جان چھڑا سکتے ہو۔''

میں نے کہا۔ ''لونگ! میں تمہیں وارننگ دیتا ہوں، اسے کچھ نہ کہنا۔ ورنہ وہ کچھ ہو گا جو تم......سوچ بھی نہیں سکتے۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟'' لونگ نے زہر خند لہجہ اختیار کیا۔ ''یہ تو تمہاری کچھ لگتی ہی نہیں۔ اس کے برے بھلے کا تمہاری صحت پر کیا اثر پڑتا ہے۔''

''دیکھو لونگ، جو کچھ ہے تمہارے اور میرے درمیان ہے۔ یہ بزدل ہیجڑوں والا کام نہ کرو۔ ایک عورت کو درمیان میں مت لاؤ'' میں اتنی زور سے بولا کہ مجھے اپنے گلے کی رگیں پھٹتی محسوس ہوئیں۔

''یہ ایک عورت نہیں۔ یہ تمہاری محبوبہ ہے۔ تم اس کے ساتھ سونے کے لیے دن رات تڑپتے ہو لیکن اب اس کے ساتھ جو کچھ ہو گا اس کے بعد تم کم از کم اپنی یہ تڑپ تو بھول جاؤ گے۔''

''میں سب کچھ جلا ڈالوں گا، راکھ کر دوں گا۔'' میں دھاڑا اور کھڑکی کی سلاخوں پر تابڑ توڑ مکے برسائے۔ یہ سلاخیں دراصل ٹھوس اسٹیل کے چمکیلے راڈز تھے۔ شروع میں ان کے اوپر کچھ نہیں تھا لیکن چند دن پہلے جب میں نے جارحانہ انداز اختیار کیا تو ان کے اوپر بھی خاص قسم کے فوم اور ریگ زین کی وہی تہہ چڑھا دی گئی جو باقی اپارٹمنٹ میں ہر جگہ موجود تھی۔

اسٹیل کے راڈز جھنجھنا اٹھے لیکن اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ شاید ان پر سو گنا زیادہ طاقت سے ضرب لگائی جاتی تو بھی انہیں کوئی خاص فرق نہ پڑتا۔

''میرے مطالبے کچھ زیادہ نہیں ہیں شاہ زیب!'' لونگ نے کہا۔ ''مجھے تمہارے بھگوڑے ساتھیوں کا پتا چاہیے۔ ہم ان کو انصاف کے کٹہرے میں لانا چاہتے ہیں۔ جب تک تم اپنی پلید زبان کو حرکت دے کر ان کا پتا نہیں اگلو گے تمہاری جان چھوٹے گی نہیں اور نہ تمہاری اس سویٹ ہارٹ کی مشکل آسان ہو گی۔''

اس کے ساتھ ہی اپنے باس کا کوئی اشارہ پا کر دو نقاب پوشوں نے تاجور کو چھڑیوں سے پیٹنا شروع کر دیا۔ وہ اس کے ٹخنوں اور پنڈلیوں کو نشانہ بنا رہے تھے۔ یہ میری زندگی کا دلدوز ترین منظر تھا۔ ٹخنوں اور پنڈلیوں پر چوٹ لگتی تھی تو تاجور تڑپ کر پاؤں اوپر اٹھاتی تھی۔ ایسے میں نائیلون کی رسی کو ہلکا سا جھٹکا لگتا تھا اور تاجور رسی سے جھول جاتی تھی۔ اس کی کربناک آواز سے کمرا گونج اٹھتا تھا اور میں جانتا تھا...... یہ تو ابھی ابتدا ہے۔ اس کمرے میں بہت کچھ ہونے والا تھا......شیطان ننگا ہو کر ناچنے والا تھا۔

سب کچھ میری برداشت سے باہر ہونے لگا۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں مگر کان تو کھلے ہوئے تھے۔ میرے ہاتھ سامنے کی طرف ہتھکڑی میں تھے۔ اگر میں کان بند کرنا چاہتا تو صرف ایک کان میں انگلی ٹھوس سکتا تھا۔ دوسرے کان میں انگلی ٹھونسنے کے لیے تیسرا ہاتھ درکار تھا اور وہ میرے پاس نہیں تھا۔

میرا جی پھر چاہا کہ میں ان لمحوں میں اپنی جان لے لوں، مگر کیسے؟ اس اپارٹمنٹ میں کوئی ایسی...... چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی نہیں رہنے دی گئی تھی جس سے میں خود کو یا کسی دوسرے کو نقصان پہنچا سکتا۔ ڈسپوزایبل برتن، ان بریک ایبل شیشے کی بوتلیں اور گلاس، بجلی کا ہر تار چھپا ہوا اور محفوظ...... در و دیوار پر خاص فوم اور ریگ زین کی تہ۔ یہاں زندگی اور موت کے درمیان لٹکائے جانے کا پورا انتظام موجود تھا۔

میں کیا کروں؟ کس طرف جاؤں؟ میں نے جیسے اپنے آپ سے یہ سوال پوچھا۔ جواب کوئی نہیں تھا اور تاجور کی فریادی آواز میری برداشت سے باہر تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے لونگ سے کہا تھا کہ اگر وہ تاجور کے حوالے سے اپنے بھیانک ارادوں سے پیچھے نہ ہٹا تو میں سب کچھ جلا ڈالوں گا، راکھ کر ڈالوں گا...... مگر غور کیا جاتا تو یہ صرف الفاظ تھے۔ ان الفاظ کو عملی جامہ پہنانے کا کوئی وسیلہ دور دور نظر نہیں آتا تھا اور پھر میں نے دیکھا کہ ایک نقاب پوش روتی بلکتی تاجور کی طرف بڑھا۔ تاجور کی قمیص کا گریبان پہلے سے پھٹا ہوا تھا (یہ میری وحشت کا نتیجہ تھا) اس نے پھٹے ہوئے گریبان کو گرہ دے رکھی تھی۔ نقاب پوش نے بڑے سکون سے یہ گرہ کھول دی۔ اس کا بالائی جسم نیم عریانی کی زد میں آ گیا۔

وہ تشدد پر آمادہ تھے اور ہر قسم کے تشدد پر آمادہ تھے...... اور میں جانتا تھا کہ یہ تشدد تاجور سے زیادہ مجھ پر کیا جا رہا ہے جب میں اس تشدد کو دیکھنے کے لیے موجود نہ ہوں گا تو یہ رک جائے گا اور مجھے اسے روکنا تھا، ہر صورت روکنا تھا۔ انسان خود اپنا سانس بند کر کے اپنی زندگی نہیں چھین سکتا، ورنہ میں یہ بھی کر گزرتا۔

میری سمجھ میں اور کچھ نہیں آیا۔ میں بس ایک ہی ردِعمل دے سکتا تھا اور وہ میں نے دیا...... میں نے اپنے دانتوں سے اپنی کلائیوں کی شریانیں بھنبھوڑ ڈالیں۔ میں نے سائیڈ کے نکیلے دانتوں کی مدد سے اپنے گوشت کو چیرا اور نسیں کاٹ ڈالیں۔ دونوں کلائیوں سے خون کی پچکاریاں سی نکلیں اور پھر خون روانی سے بہنے لگا۔ چند سیکنڈ...... صرف چند سیکنڈ کے اندر فرش کا ایک بڑا حصہ خون سے سرخ نظر آنے لگا۔

نقاب پوشوں کی توجہ اب تاجور کی طرف سے ہٹ گئی تھی۔ اب وہ ایک دیوار کی طرف

دیکھ رہے تھے۔ یقیناً وہاں بھی کوئی ایل سی ڈی موجود تھی جس پر لونگ اور اس کے یہ نقاب پوش ہرکارے میرے اپارٹمنٹ کے مناظر دیکھ رہے تھے۔

لونگ گرجا۔ ''تمہارے یہ ناٹک اس لڑکی کو اس مشکل سے نکال نہیں سکتے۔ راستہ صرف اور صرف ایک ہی ہے جو میں نے تم کو بتایا ہے۔''

تاجور مسلسل پکار رہی تھی۔ ''بچاؤ...... میری مدد کرو...... شاہ زیب! میں مر جاؤں گی، شکیل صاحب، میں مر جاؤں گی۔''

وہ شکیل داراب کو بھی پکار رہی تھی۔ حالانکہ اسے اس ناقابلِ بیان عذاب سے دوچار کرنے والا وہی سیاست زادہ تھا۔

خون بہتا چلا جا رہا تھا...... تھوڑی ہی دیر میں میرے جسم پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ میں بستر پر بیٹھ گیا۔ خون..... گرم خون میری جھولی میں گرنے لگا اور بیڈ شیٹ کو بھگونے لگا۔ اب تک تقریباً چار منٹ سے زیادہ گزر چکے تھے۔

''دیکھو اس حرامی کو۔'' لونگ کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کسی اہلکار کو میرے بارے میں حکم دے رہا ہے۔

میں اپنی جگہ سے ڈگمگاتا ہوا اٹھا۔ آہنی بیڑی کی وجہ سے میں چھوٹے چھوٹے سے قدم ہی لے سکتا تھا۔ چھوٹے قدم اٹھاتا، میں واش روم تک پہنچا اور خود کو اندر بند کر لیا۔ چند سیکنڈ کے اندر ہی مسلح امریکن گارڈز اپارٹمنٹ کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے۔ تاجور کی آہ و بکا واش روم میں بھی سنائی دے رہی تھی...... وہ مسلسل مدد کے لیے پکار رہی تھی۔ میں اسے بتا سکتا تو ضرور بتاتا کہ خود کو موت کے منہ میں جھونک کر میں اس کی مدد ہی تو کر رہا ہوں۔ ویسے مجھے یہ بھی پتا تھا کہ یہ لوگ اتنی آسانی سے مجھے مرنے نہیں دیں گے۔

واش روم کے بند دروازے پر دھڑا دھڑ رائفلوں کے کندے برسائے جانے لگے۔ دوسری طرف واش روم کے لگژری ٹب کے اندر میرا خون مسلسل گر رہا تھا۔ پندرہ بیس سیکنڈ کے اندر اندر گارڈز نے واش روم کا دروازہ توڑ دیا اور مجھ پر جھپٹے۔ اسپیکرز پر لونگ کی کرخت آواز گونجی۔ ''پہلے اس باسٹرڈ کی کلائیاں دباؤ...... تاکہ اس کا خون بند ہو، جلدی کرو۔''

دو گارڈز نے میری ادھڑی ہوئی کلائیوں کو دبا لیا۔ تب تک میرا سر بری طرح گھومنا شروع ہو گیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ واش روم میں ہر طرف خون ہی خون ہے۔ کچھ یہی حال بیڈ اور بیڈ کے ارگرد کے فرش کا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانا شروع ہو گیا۔ وہ لوگ مجھے کھینچ کر اور گھسیٹ کر باہر لا رہے تھے اور میں ایک ایک انچ پر مزاحمت کر رہا تھا۔ گاہے

بگا ہے میری کلائیاں گارڈز کی گرفت سے نکل جاتی تھیں اور خون کی دھاریں سی بہنے لگتی تھیں۔ تاجور اب خاموش تھی۔ شاید چھت سے لٹکے لٹکے اس نے بھی اسکرین پر اپارٹمنٹ کا خونی منظر دیکھا تھا اور مبہوت ہوگئی تھی۔

میں جتنی زیادہ مزاحمت کر رہا تھا، کلائیوں سے خون نکلنے کی رفتار اتنی ہی بڑھ جاتی تھی۔ تب میں نے دھندلائی ہوئی نگاہوں سے سفید کوٹ والے دو ڈاکٹرز کو دیکھا، وہ اپارٹمنٹ کے دروازے میں داخل ہونے کے بعد تیزی سے میری طرف بڑھ رہے تھے۔ ان کے مجھ تک پہنچنے سے پہلے ہی میرا ذہن اتھاہ تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

○......❖......○

میں کہاں ہوں؟ یہ کون سی جگہ ہے؟ میرے اردگرد کون لوگ ہیں؟ سب سے پہلا خیال تاجور کا ہی آیا۔ وہ بدترین مشکل میں تھی۔ وہ تاجور تھی، اور تاراج ہونے جارہی تھی۔ اسے تاراج ہونے سے بچانے کے لیے میں نے وہ کچھ کیا تھا جو میرے بس میں تھا۔ کیا وہ بچ گئی تھی؟ اس کا جواب مجھے فوراً ہی مل گیا۔ وہ میرے قریب موجود تھی۔ یہ اسپتال کا کمرا تھا۔ میں سفید بستر پر چت لیٹا تھا۔ میری دونوں کلائیوں پر بھاری پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ پہلے سے موجود زخموں پر بھی ٹیپ سے تازہ پٹیاں چپکائی گئی تھیں۔ اس کمرے میں قریباً دو فٹ ضرب پانچ فٹ کا خلا تھا جس میں شیشہ لگا ہوا تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ بلٹ پروف شیشہ تھا۔ مجھے ہوش میں آتے دیکھ کر تاجور نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ اس کی آنکھیں ورم زدہ تھیں، بال منتشر اور رنگت اڑی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔

میں نے اسے دیکھ کر اٹھنے کی کوشش کی۔ اس نے میرے سینے پر ہاتھ کا دباؤ ڈال کر مجھے لیٹے رہنے پر مجبور کر دیا۔ ”نہیں شاہ زیب۔“ وہ کمزور آواز میں بولی۔ ”آپ ابھی لیٹے رہیں۔ آپ کی طبیعت بہت مشکل سے سنبھلی ہے۔“

وہ اب ہلکے براؤن رنگ کی شلوار قمیص میں تھی۔ سر پر سفید پھولوں والی ایک براؤن اوڑھنی تھی۔ اس کی کلائیوں پر نیلگوں نشان دیکھ کر میں تڑپ اٹھا۔ یہ نائیلون کی رسی کے نشان تھے۔ میں نے دیکھا مستطیل شیشے کی دوسری جانب خونخوار چہروں والے وہی امریکن گارڈز موجود تھے جنھوں نے کئی ہفتوں سے مجھ پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ میرے بستر کے اردگرد کئی طبی آلات اور انفیوژن کو ہینگ کرنے والے اسٹینڈ رکھے تھے۔ آکسیجن سلنڈر اور ماسک وغیرہ بھی پڑا تھا، جو غالباً شروع میں استعمال ہوا تھا۔ تاجور نے دل گرفتہ لہجے میں مجھے بتایا کہ مجھے خون کے کئی بیگ چڑھائے جا چکے ہیں اور ابھی شاید مزید کی ضرورت پڑے۔ اس

نے یہ بھی بتایا کہ ہم اس وقت جاما.جی کے سب سے بڑے اور جدید اسپتال میں ہیں۔ مجھے یہاں آئے ہوئے آج دوسرا دن ہے۔

میں نے دل کڑا کر کے کہا۔ ''تاجور! مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔ تم ٹھیک تو ہو؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں شاہ زیب۔''

''یہ سفید سور تمہیں پیٹ رہے تھے...... تمہیں چھت سے لٹکایا ہوا تھا۔''

شرمندگی اور دکھ کے سبب تاجور نے نگاہیں جھکا لیں۔ بمشکل بولی۔ ''جب آپ نے خود کو زخمی کیا اور کمرے میں ہر طرف خون کے چھینٹے نظر آئے تو ان کی ساری توجہ آپ کی طرف ہوگئی...... پھر میرے ہاتھ بھی کھول دیئے گئے۔''

تاجور کے لہجے میں عجیب سا تردد اور دکھ تھا۔ یقیناً اس کی وجہ وہ رویہ ہی تھا جو میں نے اپارٹمنٹ میں اس سے روا رکھا تھا۔ لونگ وغیرہ کو دکھانے کے لیے میں نے تاجور سے نہایت سخت زبان میں بات کی تھی اور اس کا گریبان تک پھاڑ دیا تھا۔ بہرحال تاجور نے یہ بھی تو دیکھا تھا کہ جب اس پر تشدد شروع ہوا تو میں نے اسے بچانے کے لیے ہر ممکن کوشش کی اور اپنی رگیں کاٹ لیں۔ وہ بڑا خوفناک تجربہ تھا۔ خود کو موت کی طرف لے جانے کے لیے اپنے گوشت کو اپنے ہی دانتوں سے نوچنا اور پھاڑنا، میرے منہ میں جیسے ابھی تک اپنے خون کا نمکین ذائقہ گھلا ہوا تھا......

تاجور میرے بستر سے دو فٹ کی دوری پر خاموش بیٹھی تھی۔ میں نے سر موڑا تو میری نگاہ اس کے پاؤں پر پڑی۔ اس نے چپل پہن رکھی تھی۔ پاؤں سوجے ہوئے تھے اور ان پر نیلگوں نشان تھے۔ ایک بار پھر دل کٹ کر رہ گیا۔

''تم کب سے یہاں میرے پاس ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''کل سے ہی...... مجھے آپ کی دیکھ بھال کے لیے کہا گیا ہے۔''

''صرف دیکھ بھال کے لیے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔ میں جانتا تھا کہ اسے کچھ اور ہدایات بھی دی گئی ہوں گی۔ شاید وہ تاجور کے ذریعے میرے منہ کا تالا کھلوانے کی ایک اور کوشش کرنا چاہتے تھے۔ ایک اور ''ٹارچر فری'' کوشش۔ عورت کے آنسوؤں کو دنیا کی سب سے بڑی آبی قوت کہا گیا ہے...... اور اس وقت یہ آنسو تاجور کی آنکھوں میں موجود تھے۔ وہ لرز رہے تھے اور کہہ رہے تھے...... ہم بہت برے دن دیکھ رہے ہیں، بہت ہی برے۔ ہم بہت بہہ چکے ہیں، ابھی ہمیں اور کتنا بہنا ہے؟

اسپتال کے اس وی آئی پی کمرے میں ایل سی ڈی اور ریفریجریٹر سمیت کئی سہولتیں موجود تھیں، مگر میں نے دیکھا کہ ایل سی ڈی کی پاور وائر کاٹ دی گئی تھی۔ یہ کام شاید ابھی کچھ دیر پہلے ہی کیا گیا تھا۔

شیشے میں سے گارڈز نے تاک لیا تھا کہ میں ہوش میں آ گیا ہوں۔ چند سیکنڈ بعد ہی چار مسلح گارڈز دندناتے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔ بیڈ کے ساتھ اسٹریپس موجود تھیں۔ مجھے ان اسٹریپس میں کس دیا گیا تا کہ میں طیش کے عالم میں کسی طرح کا ردِعمل نہ دکھا سکوں۔

ایک کے سوا باقی گارڈز باہر نکل گئے تو ایک امریکن ڈاکٹر اور ملائیشین کمپاؤنڈر اندر آ گئے۔ گارڈز کی طرح ان کے چہروں پر بھی کچھ سنسنی سی دکھائی دے رہی تھی۔ میرے وائٹل سائنز چیک کیے گئے۔ میڈیکل فائل میں کچھ اندراجات ہوئے۔ ڈاکٹر نے مجھے بازو میں دو انجکشن دیئے۔ اس کے انجکشن دینے کے جھلائے ہوئے انداز سے ہی پتا چلتا تھا کہ وہ میرے خلاف بھرا بیٹھا ہے۔ بڑبڑانے والے انداز میں بولا۔ ''تم جہاں جاتے ہو...... اپنے ساتھ نحوست اور مصیبت لاتے ہو۔''

''تم لوگوں کے بارے میں میرا خیال بھی کچھ ایسا ہی ہے۔'' میں نے ترکی بہ ترکی کہا۔

میری بات کی گہرائی نے امریکی ڈاکٹر کو سرخ کر دیا۔ دانت پیس کر بولا۔ ''مجھے لگتا ہے...... تم نے بلک بلک کر مرنا ہے...... اور یہ لڑکی اگر زندہ بچ گئی تو ساری زندگی تمہاری بدبختی کو اور اپنی حالت کو روتی رہے گی۔''

''جس کو اپنے باپ کا پتا نہ ہو، وہ آنے والے وقت کے بارے میں کیا بتا سکتا ہے۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''شٹ اَپ۔'' وہ زور سے گرجا۔ ممکن تھا کہ مجھ پر ہاتھ بھی اٹھاتا مگر پھر امریکن طرز کی گالیاں بکتا ہوا باہر نکل گیا۔ کمپاؤنڈر اور گارڈ بھی اس کے پیچھے گئے۔

تاجور نے روہانسے لہجے میں کہا۔ ''مجھے لگتا ہے شاہ زیب! اسپتال سے باہر کوئی سخت قسم کی گڑبڑ ہے۔ یہ سارے لوگ پریشان نظر آ رہے ہیں۔''

''کیسی گڑبڑ؟'' میں نے پوچھا۔

وہ رک رک کر بولی۔ ''ابھی کوئی ایک گھنٹا پہلے میں نے ویسے ہی یہ سامنے والا ٹی وی لگایا تھا۔ کوئی خبروں والا چینل لگا ہوا تھا۔ ایک بہت بڑا جلوس دکھایا جا رہا تھا۔ ہر طرف سر ہی سر نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے ایک عمارت کو گھیرا ہوا ہے......'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

میں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ ذرا تذبذب کے بعد وہ آہستہ سے بولی۔ ''مجھے

لگتا ہے کہ انہوں نے اسی اسپتال کو گھیرا ہوا ہے۔ جب یہ لوگ گاڑی پر بٹھا کر مجھے یہاں لائے تھے تو میں نے اسپتال کو باہر سے دیکھا تھا...... مجھے تو وہ یہی جگہ لگتی ہے۔''

میری رگوں میں خون کی گردش بڑھ گئی۔ میں نے ٹی وی کی طرف دیکھا۔ وہ میری نظر کا زاویہ سمجھ کر بولی۔ ''میرے ٹی وی لگانے پر وہ سخت غصے میں آ گئے تھے۔ پتا نہیں انگریزی میں کیا کیا بول رہے تھے۔ انہوں نے ٹی وی کی تار ہی کاٹ ڈالی ہے۔''

میں نے شیشے سے باہر دیکھا۔ گارڈز ریڈ الرٹ تھے۔ ان کی رائفلوں کے رخ عمودی تھے اور انہوں نے انگلیاں ٹریگرز پر رکھی ہوئی تھیں۔ تاجور اور مجھ سے زیادہ ان کی توجہ کسی اور طرف تھی۔ مجھے ہیلی کاپٹر کی مدھم آواز بھی سنائی دی۔ پھر فائرنگ کی ہلکی سی گونج۔ کہا نہیں جا سکتا تھا کہ یہ سیدھی فائرنگ ہے یا ہوائی۔ مجھے شک ہوا کہ آنسو گیس کی ہلکی سی بو بھی فضا میں موجود ہے۔

سوال یہ تھا کہ اگر واقعی اس اسپتال کا گھیراؤ کیا گیا ہے تو کیوں؟ اور گھیرنے والے لوگ کون تھے؟ میرے کانوں میں وہ الفاظ گونجے جو امریکی ڈاکٹر نے تھوڑی دیر پہلے بولے تھے۔ ''تم جہاں بھی جاتے ہو، اپنے ساتھ نحوست اور مصیبت لے کر آتے ہو۔''

کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ وہ ہجوم جو ابھی تھوڑی دیر پہلے تاجور نے دیکھا اور جس کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ اس نے اسی اسپتال کو گھیرا ہوا ہے، وہ یہاں میری وجہ سے موجود ہو۔ میں کسی خوش فہمی میں مبتلا ہونا نہیں چاہتا تھا کیونکہ جاما جی کے عام لوگ ابھی اپنا ردِعمل ظاہر کرنے میں ناکام تھے۔ میں نے افغانی کی میت پر گولا باری دیکھی تھی۔ میں نے ریان فردوس کا مختصر جنازہ دیکھا تھا۔ میں نے حریت پسند عبدالکریم اور دیگر بے گناہوں کی پھانسیوں کے مناظر بھی ملاحظہ کیے تھے...... اور نوجوان پرنس کمال احمد کی دردناک موت پر بھی شہر کے مناظر میری نظروں سے گزرے تھے۔ کہیں بھی لوگوں کا متوقع ردِعمل ظاہر نہیں ہوا تھا۔ مختلف جگہوں پر چھوٹی چھوٹی ٹولیوں نے احتجاج کیا تھا لیکن اجتماعی ری ایکشن سامنے نہیں آیا تھا۔ کیا آج واقعی کوئی ایسی بات ہوئی تھی کہ لوگ بڑی تعداد میں جمع ہوئے تھے اور انہوں نے رائے زل اور ایجنسی کے مسلح ہرکاروں کے رنگ زرد کیے تھے؟

میں اور تاجور جہاں موجود تھے وہاں سے کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔ آوازیں ہم تک پہنچتی تو تھیں لیکن بہت مدھم صورت میں۔ کچھ دیر پہلے ایک ایسی آواز آئی تھی جیسے کہیں پاس ہی کوئی بہت بڑا شیشہ چکنا چور ہوا ہو۔ پھر چھت پر بھاگتے قدموں کی آہٹیں ابھری تھیں۔ یہ آہٹیں، مردانہ اور زنانہ دونوں طرح کی تھیں۔ ہیلی کاپٹر بھی نیچی پرواز کر کے آگے نکل جاتا

تھا۔ یہ سب کچھ ایک طرح کا اضطراب ظاہر کرتا تھا لیکن یقین سے کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ فائرنگ کی آواز دوبارہ نہیں ابھری تھی۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اب لوگ منتشر ہو چکے ہوں۔ رائے زل اور ایجنسی کے سفاک ہرکاروں کے سامنے اور کالے قوانین کی موجودگی میں کون ثابت قدمی سے احتجاج کر سکتا تھا۔

میرے ہاتھ کے انگوٹھے کا زخم ابھی تک ٹھیک نہیں تھا۔ انگوٹھا کہیں ذرا سا بھی بچ ہو جاتا تھا تو خون رِسنے لگتا تھا۔ یہی زخمی انگوٹھا تھا جسے میں نے بری طرح کچل کر خود کو اذیت میں مبتلا کیا تھا اور مادام ہاناوانی کے وار سے خود کو بچایا تھا۔ حاذق ذکری کی بتائی ہوئی یہ بات بالکل درست ثابت ہوئی تھی کہ مادام ہاناوانی اپنے شکار پر زیادہ سے زیادہ تین بار جھپٹتی ہے اور اگر فرض محال ناکام ہو جائے تو پھر کوشش نہیں کرتی۔

ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق میرے انگوٹھے کے زخم اور دو تین دیگر زخموں کو چند گھنٹوں کے لیے پٹی کے بغیر چھوڑ دیا گیا تھا...... اب ان پر دوبارہ بینڈیج کرنے کے لیے کمپاؤنڈر اندر آیا۔ یہ ملائیشین کمپاؤنڈر میرے انگوٹھے کی پٹی کرتے کرتے اچانک ہولے سے بولا۔ ”آپ کے لیے اچھی خبر ہے۔ لوگ آپ کو رہا کرانے کے لیے اسپتال سے باہر جمع ہیں۔ بہت بڑی تعداد ہے۔ امید ہے وہ کامیاب ہو جائیں گے۔“

میں سمجھ گیا کہ یہ ملائیشین کمپاؤنڈر بھی بن مشہد وغیرہ کی طرح قسطینا کے ان ”انفارمرز“ میں سے ہے جو رائے زل کی صفوں میں موجود تھے اور جانفشانی سے اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔

میں نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔ ”ان لوگوں کو پتا کیسے چلا کہ میں یہاں موجود ہوں؟“

کمپاؤنڈر نے اپنی ساری توجہ میرے زخمی انگوٹھے پر مبذول رکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ بھی ایک اچھا اتفاق تھا۔ کل دوپہر جب آپ کو زخمی حالت میں ڈی پیلس سے یہاں اسپتال لایا جا رہا تھا۔ آپ کو لانے والی ایمبولینس کا تصادم ایک فوجی گاڑی سے ہو گیا۔ آپ کو ایمبولینس سے نکال کر ایک دوسری گاڑی میں منتقل کیا جا رہا تھا جب کئی لوگوں نے آپ کو پہچان لیا۔ ان میں میڈیا کے ایک دو بندے بھی تھے......“

میں اور کمپاؤنڈر اس انداز میں گفتگو کر رہے تھے جیسے یہ انگوٹھے کے بگڑے ہوئے زخم کے بارے میں ہو۔

میں نے انگوٹھے کے جوڑ کو انگلی سے دباتے ہوئے کہا۔ ”ہجوم کتنا بڑا بھی ہو رائے زل کے ہرکارے ان پر فائر کھول دیں گے۔ نہتے لوگ کہاں تک کھڑے رہیں گے؟“

کمپاؤنڈر نے نفی میں سر ہلایا۔ ''معاملہ اتنا سیدھا نہیں رہا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہجوم بہت بڑا ہے اور مزید بڑھ رہا ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ مادام ہانا وانی بھی اس وقت اسی اسپتال میں موجود ہیں۔'' کمپاؤنڈر کی آواز میں دبا دبا جوش تھا۔

''وہ کیوں؟'' میں نے پوچھا۔ ہمارے درمیان یہ گفتگو انگلش میں ہو رہی تھی۔

''وہ بیمار ہیں۔'' کمپاؤنڈر نے جواب دیا اور انگوٹھے سے فارغ ہو کر میرے گھٹنے کے زخم کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کے ہاتھوں پر پولیتھین کے دستانے تھے اور وہ اپنے کام میں ماہر نظر آتا تھا۔ اس کی سفید شرٹ پر اس کا نام ارکب لکھا ہوا تھا۔

''کیا بیماری ہے اس کو؟'' میں نے پوچھا۔

کمپاؤنڈر ارکب نے عجیب انداز سے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ مادام کی بیماری کی وجہ آپ کی ذات سے جڑی ہوئی ہے۔''

''میری ذات سے؟''

''مادام کو آپ سے کوئی صدمہ پہنچا ہے مگر فی الحال اس بارے میں بس اُڑتی اُڑتی سی بات میرے کانوں تک پہنچی ہے، یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔''

اچانک ایک بار پھر میں اور تاجور چونک گئے۔ باہر سے کئی سنگل فائر سنائی دیئے۔ اس کے ساتھ ہی دو چھوٹے برسٹ چلائے گئے۔ کمپاؤنڈر ارکب بھی ٹھٹک سا گیا مگر اپنے کام میں مشغول رہا۔

''لگتا ہے معاملہ بگڑ رہا ہے۔'' میں نے زخم کو سہلاتے ہوئے کہا۔

''مگر زیادہ نہیں بگڑے گا۔'' ارکب بولا۔ ''انتظامیہ کسی صورت بھی مادام کی سلامتی کو خطرے میں نہیں ڈالے گی۔ زیادہ امکان اسی بات کا ہے کہ شدید خون خرابے سے بچنے کے لیے یہ لوگ آپ کو آپ کے حمایتیوں کے حوالے کر دیں گے۔''

''مگر...... ایسا ہو گیا تو...... یہ حمایتی جائیں گے کہاں۔ ظاہر ہے کہ سارا ہجوم تو ہمارے ساتھ نہیں رہے گا۔ لوگ بکھر جائیں گے۔ پھر جب تعداد کم ہو گی یہ لوگ دوبارہ ہتھکڑیاں لے کر میرے سر پر پہنچ جائیں گے۔''

''بات اتنی سادہ نہیں ہے شاہ زیب صاحب، آپ دیکھتے جائیں کیا ہوتا ہے۔''

اسی دوران میں گونجتی ہوئی مدھم آوازیں ہمارے کانوں تک پہنچنے لگی تھیں۔ یہ دو چار سو یا دو چار ہزار لوگ نہیں تھے۔ یہ بہت بڑی تعداد میں تھے۔ ایک گونج تھی جو پھیل رہی تھی اور در و دیوار کو لرزا رہی تھی۔ شاید ٹھیک ہی کہتے ہیں، سچ کو ظلم سے دبایا نہیں جا سکتا۔ اس حوالے

سے دیر ہو سکتی ہے اندھیر نہیں۔ خلقِ خدا بالآخر خوف کی دیواریں پھاندتی ہے، جبر کے پردے چاک کرتی ہے، سینے تن جاتے ہیں، جھکے ہوئے سر بے ساختہ اٹھ جاتے ہیں، آنکھوں میں بجلیاں لپکتی ہیں اور نقد جاں ہتھیلیوں پر لے کر لوگ نکل آتے ہیں، ہاں برداشت شرط ہے...... اور صبر شرط ہے اور شرط ہے وہی مستقل مزاجی، دنیا کے دانشور جس کی تلقین کرتے ہیں۔

میں نے ابھی لوگوں کے اس بپھرے ہوئے جم غفیر کو دیکھا نہیں تھا، صرف ان کی آوازیں سنی تھیں، فقط ان کے نعرے میرے کانوں میں پڑے تھے اور مجھے یقین ہونے لگا تھا کہ واقعی کچھ ہو جائے گا۔ کچھ ایسا جو اس جزیرے میں ایک انقلاب کی بنیاد رکھ دے گا۔

کمپاؤنڈر ارکب کچھ کاٹن وغیرہ لینے کے بہانے باہر گیا۔ اس دوران میں، میں نے شیشے میں سے جھانکا، گارڈز کی تعداد بڑھ گئی تھی۔ انہوں نے جیسے اسپتال کے اس وی آئی پی کمرے کو اپنے نرغے میں لے لیا تھا۔ وہ کندھے سے کندھا جوڑ کر کھڑے تھے۔ قریباً تین منٹ بعد ارکب واپس آیا۔ اس نے میری دائیں پسلیوں کے زخم کو صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''لوگوں نے مزید تنگ کر دیا ہے۔ وہ پتھراؤ کر رہے ہیں اور بیرونی شیشے توڑ رہے ہیں۔ گرے سپاہی قطاریں باندھ کر تیار کھڑے ہیں لیکن اگر وہ سیدھی گولی چلائیں گے تو بہت خون خرابا ہوگا۔ مادام کی زندگی بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔''

''اس کا اینڈ کیا ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

گرے کمانڈوز اور جلوس کو لیڈ کرنے والوں میں بات چیت ہو رہی ہے۔ لگتا ہے کہ ابھی چار پانچ منٹ میں نتیجہ نکل آئے گا۔''

''اس گفتگو میں ایجنسی شریک نہیں؟''

''ایجنسی کے لوگ بھی ہیں۔''

ابھی ارکب کا فقرہ اس کے منہ میں ہی تھا کہ امریکن گارڈز نے ٹھکا ٹھک سلیوٹ مارے اور ہر طرف ہلچل نظر آئی۔ معلوم ہوا کہ رائے زل کا دست راست کمانڈر اوان اور ایک بڑا امریکی آفیسر یہاں پہنچے ہیں۔ اس بڑے امریکی آفیسر کے ساتھ مجھے نیلی آنکھوں والا پال کورنی بھی نظر آیا اور میرے دل نے گواہی دی کہ میرے اور تاجور کے لیے صورتِ حال کچھ بہتر ہونے جا رہی ہے مگر ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ امریکی آفیسرز کے حکم پر پہلے میرے جسم کی بالائی اسٹریپس کھولی گئیں اور مجھے اٹھا کر بٹھا دیا گیا۔ میرے ہاتھوں کو حسبِ معمول الٹی ہتھکڑی لگائے جانے کا پروگرام تھا مگر کلائیوں کی بھاری پٹیوں کی وجہ سے یہ ممکن

نہ ہوا اور میرے ہاتھ کیبل ٹائی میں جکڑے گئے۔
کمانڈر راوان کی آنکھوں میں میرے لیے نفرت ہلکورے لے رہی تھی۔ یہ وہی کمانڈر راوان تھا جس نے عین گھمسان کی لڑائی میں اپنے ہزاروں ساتھیوں سمیت علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ اس نے توہم پرستی کی بری مثال پیش کی تھی۔ اس کا موقف تھا کہ مادام ہاناوانی کی آنکھوں کا جادو رضا کاروں اور سپاہیوں کے دل و دماغ کو جکڑ رہا ہے اور شکست یقینی ہوتی جا رہی ہے۔ اب کمانڈر راوان کو اپنی بے وفائی کا صلہ ملا تھا اور وہ کلیدی عہدے پر فائز تھا۔
مجھے اور تاجور کو قریباً ایک درجن مسلح افراد کے نرغے میں کمرے سے باہر لایا گیا۔
''تمہارے لیے وہیل چیئر لائی جائے؟'' پال نے سپاٹ لہجے میں مجھ سے پوچھا۔
''نہیں شکریہ۔'' میں نے کہا اور تاجور کے ساتھ لنگڑاتا ہوا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا باہر آ گیا۔ میرے جسم پر پتلون تھی۔ بالائی جسم زخموں کی وجہ سے عریاں تھا۔
ایک کوریڈور سے گزر کر ہم ایک برآمدہ نما جگہ پر پہنچے۔ یہاں بے شمار شیشے کی کرچیاں بکھری ہوئی تھیں۔ آنسو گیس کی بُو بھی محسوس ہو رہی تھی۔ ہم نے دیکھا اسپتال کی بیرونی چار دیواری سے باہر اور وسیع گیٹ کے سامنے مشتعل لوگوں کا ایک جمِ غفیر تھا۔ کم از کم جہاں تک ہماری نگاہ جا رہی تھی وہاں تک تو سر ہی سر نظر آتے تھے۔ چہرے تمتمائے ہوئے اور جوش و خروش دیدنی تھا۔ مظاہرین کے اس لہریں لیتے ہوئے سیلاب کے سامنے ایجنسی کے سفید فام گارڈز اور سینکڑوں گرے فوجیوں نے بند باندھ رکھا تھا۔ لگتا تھا کہ کسی وجہ سے یہ بند کسی بھی وقت ٹوٹ سکتا ہے۔

O......❖......O

مجھے دیکھ کر فلک شگاف نعرے بلند کیے گئے۔ ہجوم میں ایک ایسی لہر پیدا ہوئی جو گرے فوجیوں کو دھکیلتے ہوئے کچھ مزید پیچھے لے آئی۔ مجھے بھروسا نہیں ہو رہا تھا کہ یہ سب کچھ میرے لیے ہو رہا ہے۔ ایم ایم اے کے فائٹر کی حیثیت سے میرے ہزاروں پرستار تھے مگر اس طرح کے پرستار میں نے کبھی نہیں دیکھے تھے...... ستم زدہ چہرے، امید بھری آنکھیں۔
مجھے اور تاجور کو فوراً مظاہرین کے سرکردہ لیڈروں کے حوالے کر دیا گیا اور انہوں نے مجھے اپنے حصار میں لے کر ایک اسٹیشن وین میں بٹھا دیا۔ عجیب منظر تھا۔ مجھ پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کی جا رہی تھیں۔ عورتیں، مرد، جوان اور بوڑھے مجھے دیکھنے کے لیے اُمڈے پڑ رہے تھے۔ میرے ہاتھ پشت پر سے کھول دیئے گئے، عورتیں اور بوڑھے مرد میرے ساتھ ساتھ تاجور کی بلائیں بھی لے رہے تھے۔ بڑے جذباتی انداز میں میری پیشانی اور ہاتھوں کو

بوسے دیئے جانے لگے۔

ایک شخص نے کپکپاتے لہجے میں کہا۔ ''تم نے ان حرام زادوں کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ تم نے ہمارے سر فخر سے بلند کیے ہیں۔ ہم ان سے تمہارے ایک ایک زخم کا بدلہ لیں گے۔''

ایک دوسری آواز نے کہا۔ ''ہم تمہیں سلام کرتے ہیں۔ تمہاری عظمت کو سلام کرتے ہیں۔ ہم سب تمہارے ساتھ مل کر جاماجی کی تقدیر بدلیں گے۔''

بہت بلند بانگ فقرے بولے جارہے تھے۔ جذباتی ماحول تھا اور مجھے ایک ایسا درجہ دیا جارہا تھا، میں خود کو جس کے قابل نہیں سمجھتا تھا۔ جلوس میں سینکڑوں لٹھ بردار اور ڈنڈا بردار ایسے تھے جنہوں نے چہروں پر اسکائی ماسک چڑھا رکھے تھے تاکہ فوٹیج میں ان کی شکلیں نظر نہ آئیں۔ انہوں نے اسٹیشن وین کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اگر ایجنسی اہلکار اور گرے فوجی ہجوم پر سیدھی فائرنگ کرتے تو جواب میں ان پر بھی فائرنگ کی جا سکتی تھی۔

ہزاروں پُرجوش افراد کے گھیرے میں اسٹیشن وین نے اسپتال کی مخالف سمت میں رینگنا شروع کر دیا۔ نوجوان وین کی چھت پر چڑھ گئے اور انہوں نے جاماجی کے دورنگے پرچم لہرا دیئے۔ مظاہرین کے دو لیڈر بھی میرے اور تاجور کے ساتھ اسٹیشن وین میں ہی موجود تھے۔ وین میں طبی امداد کا کافی سامان بمع آکسیجن سلنڈر وغیرہ موجود تھا۔ لیکن فی الحال مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں تھی۔ میں تو لوگوں کے بے پناہ جوش وخروش اور فلک شگاف نعروں میں ڈوبا ہوا تھا۔

ایک نوجوان نے وین کی کھڑکی سے منہ لگایا۔ اس کا چہرہ اسکائی ماسک میں چھپا ہوا تھا، صرف آنکھیں نظر آرہی تھیں۔ وہ پکار کر بولا۔

کیوں دور دور رہندے او حضور میرے کولوں
مینوں دس دیو ہویا کی قصور میرے کولوں

میں اچھل کر رہ گیا۔ یہ انیق کی آواز تھی۔ انیق اور یہاں؟ میں سناٹے میں رہ گیا۔ میں نے اسے فوراً اندر بلا لیا۔ وہ آبدیدہ ہو کر میرے گلے لگ گیا۔ اس نے کتنی ہی دیر میرے کندھے سے سر ٹکائے رکھا، پھر میرے جسم کے زخموں کو دیکھا اور مزید رنجیدہ ہونے لگا۔

میں نے اردو میں اس سے پوچھا۔ ''تم اکیلے ہو؟''

''نہیں بھائی! میرے ساتھ آپ کا امریش پوری بھی ہے۔''

''وہ کہاں ہے؟''

''وہ بھی آپ کے آس پاس ہی ہے۔اس کا چہرہ بھی میری طرح ماسک میں چھپا ہوا ہے لیکن اگر نہ بھی چھپا ہوتو آپ اسے مشکل سے پہچان سکیں گے۔ابھی آپ کو تفصیل کا پتا چل جائے گا۔''

میں سناٹے میں تھا۔ان لوگوں نے پناہ گاہ سے باہر نکل کر بہت بڑا رسک لیا تھا۔ میرے چہرے پر گہری تشویش دیکھ کر انیق نے سرگوشی کی۔''آپ فکر مند نہ ہوں۔باقی لوگ وہیں پر ہیں اور بالکل محفوظ ہیں۔''

''ہمیں کہاں لے جایا جارہا ہے؟''

''زیادہ دور نہیں۔شہر کے اندر ہی مرکوزا نامی علاقے میں۔یہ وہ علاقہ ہے جہاں ہائی نس قسطینا اور ریان فردوس مرحوم کے حمایتی بہت بڑی تعداد میں آباد ہیں۔یہ علاقہ حکومت مخالف سرگرمیوں کا مرکز بنا ہوا ہے۔ان لوگوں نے چھوٹی سڑکوں اور گلیوں میں اپنے گیٹ لگا لیے ہیں گرے فوجیوں اور گورے گارڈز کو اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ ان گلیوں میں گھس سکیں۔''

جلوس آگے کو رینگتا رہا۔شرکا کی تعداد کم نہیں ہوئی تھی بلکہ شاید اس میں کچھ اضافہ ہی ہوا ہو۔مجھے جگہ جگہ ایسے کتبے نظر آئے جن میں قسطینا کی تصویر نظر آتی تھی۔وہ مکمل فوجی لباس میں تھی اور اس کے دونوں ہاتھ بلند تھے۔اس نے ایک ہاتھ سے وکٹری کا نشان بنا رکھا تھا اور دوسرے میں رائفل تھام رکھی تھی۔کچھ مظاہرین نے ایسے کتبے بھی اٹھا رکھے تھے جن پر کمانڈر فارس جان کی تصویر تھی۔اس تصویر میں اس کے سر پر ایک سفید پٹی نظر آتی تھی جس پر عربی میں کچھ لکھا تھا جو تیسری تصویر مجھے جابجا نظر آئی اور جس نے مجھے ششدر کیا وہ ایک زخمی شخص کی تھی۔اس کا بالائی دھڑ بالکل عریاں تھا۔وہ ایک دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔اس کے ہاتھ پاؤں زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔اس کے زخم اتنے زیادہ اور اتنے شدید تھے کہ کئی جگہ سے اس کی کھال کسی جھالر کی طرح لٹک رہی تھی۔یہ کوئی اور نہیں...... میں تھا اور میری یہ تصویر اسی جہنمی ٹمپریچر والے ٹارچر سیل میں اتاری گئی تھی جہاں بہت دنوں تک مجھے زندگی میں ہی موت کا مزہ چکھایا گیا تھا۔میری یہ تصویر درجنوں ہاتھوں میں نظر آرہی تھی۔

''یہ کیا ہے انیق؟''

''وہی کچھ جو آپ کے ساتھ ہوا ہے اور جس نے یہاں کے لوگوں کے دلوں میں آگ بھڑکائی ہے۔آپ کی یہ تصویر آپ کے ایک معالج کے ذریعے ہی ٹارچر سیل سے باہر آئی اور ہر طرف پھیل گئی۔اس وقت یہ تصویر مرکوزا کے علاقے میں قریباً ہر دیوار پر نظر آتی ہے۔'' وہ

خاموش ہو گیا۔

ہاں تکلیفیں رائیگاں نہیں جاتیں...... ہاں برداشت اپنا صلہ پاتی ہے......اور بے شک اندھیرا جب بہت گہرا ہو جاتا ہے تو ''اجالے'' اپنی جھلک دکھانا شروع کر دیتے ہیں۔ میں بھی وہی جھلک دیکھ رہا تھا۔ جاماجی کے لوگ، جنہوں نے بڑے بڑے واقعات پر ٹولیوں کی صورت میں چھوٹے چھوٹے احتجاج کیے تھے، آج ایک عظیم الشان جلوس کی صورت میں نظر آ رہے تھے اور یہ سب کے سب ''چارجڈ'' لوگ تھے۔ مرنے مارنے پر آمادہ۔ میں سمجھ گیا کہ انیق میرے جس معالج کا ذکر کر رہا ہے وہ وہی کمپاؤنڈر ہے۔

یہ سہ پہر کا وقت تھا۔ چھتوں پر جگہ جگہ گرے فورس کے مسلح اہلکار دکھائی دیتے تھے۔ بلندی پر ہیلی کاپٹرز پرواز کر رہے تھے۔ مگر عوام کی اتنی بڑی تعداد کے خلاف کارروائی کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ جلوس جلد ہی شہر کے اس گنجان علاقے میں داخل ہو گیا جس کا نام انیق نے مرکوزا بتایا تھا۔ یہاں دو تین منزلہ عمارتیں تھیں اور تنگ گلیوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ گھروں کی چھتوں اور بالکونیوں میں لاتعداد لوگ موجود تھے۔ اسٹیشن وین پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کی جانے لگیں۔ لوگ اسٹیشن وین پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ جوشِ محبت کچھ ایسا تھا کہ وہ وین کو ہاتھ لگانے کو ہی اپنی کامیابی سمجھ رہے تھے۔ مجھے اپنے زخم زخم جسم والی اتنی تصویریں یہاں نظر آئیں کہ میں حیران رہ گیا۔

یہ سب کیا تھا؟ کیسے ہوا تھا۔ جاماجی کے خاموش پانیوں میں یہ طوفان کیسے ابھرا تھا۔ مجھے گلیوں میں جگہ جگہ آہنی گیٹ نظر آئے جہاں لٹھ بردار نوجوان ٹولیوں کی صورت پہرا دے رہے تھے۔ اندازہ ہوا کہ مزید گیٹ بھی لگائے جا رہے ہیں ترانہ گونج رہا تھا۔

ہم نے جی جان سے جینا ہے
اور سینہ تان کے جینا ہے
ہم نے عزم کر لیا
جنگ میں قدم دھر لیا......

○......❖......○

یہ ایک آراستہ کمرا تھا۔ میں بستر پر نیم دراز تھا۔ ابھی ایک مسلم ملائیشیائی ڈاکٹر میرا معائنہ کر کے گیا تھا۔ انیق اندر داخل ہوا۔ اس کے ساتھ ایک بھاری بھرکم سکھ تھا۔ بڑا سا پگڑ اور کمر کے ساتھ کرپان بندھی ہوئی تھی۔

''کیا حال ہے شاہ زیب؟'' اس نے جذباتی آواز میں کہا۔ میں نے پہچان لیا۔ وہ

سجاول تھا۔ سردار سجاول سیالکوٹی۔ انیق کی شباہت بھی بہت حد تک بدلی ہوئی تھی۔ اس کے بالوں کا رنگ براؤن تھا اور وہ گھونگریالے نظر آ رہے تھے۔ اس کے رخساروں میں ابھار پیدا کیا گیا تھا جس کی وجہ سے آنکھیں چھوٹی ہو کر بالکل بدل گئی تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ ٹاپو کی زیرِ زمین پناہ گاہ میں جہاں اور بے شمار سہولتیں موجود ہیں، وہاں حلیے میں تبدیلی لانے کے لوازمات بھی دستیاب ہیں۔ انیق نے گاڑی میں ہی مجھے بتا دیا تھا کہ یہاں مرکوزا میں اس کی اصلیت کا علم صرف یہاں کے میسر بازان گوہر کو ہے۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ یہاں رحمانی کے نام سے موجود ہے اور سجاول، پربت سنگھ کے نام سے۔ سجاول کو دیکھ کر عجیب سی توانائی کا احساس ہوا۔ میں نے نم آنکھوں سے اسے دیکھا۔ وہ میرے قریب بستر پر بیٹھ گیا اور بغلگیر ہونے والے انداز میں ہولے سے میرے ساتھ لگ گیا۔ انیق کی آنکھوں میں بھی نمی تھی۔

سجاول بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''تیرا کیا حال ہو گیا ہے شاہ زیب! لیکن ہم تیرے ایک ایک زخم کا حساب لیں گے۔''

انیق نے کہا۔ ''اور شاہ زیب بھائی! آپ نے جس برداشت کا ثبوت دیا ہے اور جس طرح ان گوروں کے سامنے ڈٹے ہیں، اس نے لوگوں کو جھنجوڑ کر رکھ دیا ہے۔ بہت بڑی تبدیلی آئی ہے یہاں۔''

میں نے سب سے پہلے زینب اور ابراہیم کا پوچھا۔

انیق نے کہا۔ ''وہ دونوں خیریت سے ہیں بھائی! قسطینا صاحبہ، کمانڈر فارس، سنبل وغیرہ بھی سب خیریت سے ہیں۔ صرف بن مشہد علیل ہے۔ اسے شدید قسم کا ملیریا ہے لیکن اب وہ بھی بہتر ہو رہا ہے۔''

انیق نے پریشان نظروں سے میری جانب دیکھا اور بولا۔ ''کیپٹن تبارک اور سیف؟''

اس کا سوال سن کے میرے دل پر گھونسا سا لگا۔ ذرا توقف کے بعد میں نے کہا۔ ''ان دونوں کے بارے میں اچھی خبر نہیں ہے میرے دوستو۔'' میری نحیف آواز کچھ اور نحیف ہو گئی تھی۔

''زخمی ہیں؟'' انیق نے پوچھا۔

''نہیں...... وہ ہم میں نہیں ہیں۔'' انیق اور سجاول دونوں گم صم ہو گئے۔ ان کے چہرے الم کی تصویر تھے۔ خاص طور پر انیق کے لیے سیف کی موت کی خبر بہت بڑا دھچکا تھی۔ وہ کتنی ہی دیر کچھ بول نہ سکا۔

میں نے مختصر لفظوں میں انہیں بتایا کہ کس طرح کیپٹن تبارک کو کھائی سے نکالنے کے

بعد ہم رائے زل کے امریکی گماشتوں کی زد میں آ گئے اور کس طرح ہم سے وہیں ٹاپو پر دردناک تفتیش کا آغاز ہوا۔

انیق کی آنکھوں میں جیسے آگ سی بھڑکنے لگی تھی، کچھ یہی کیفیت سجاول کی بھی تھی۔

میں نے انیق اور سجاول کو ایک ساتھ مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''تم لوگوں کی موجودگی چھپاتے چھپاتے تبارک اور سیف کی جان گئی...... میں نے بدترین تشدد سہا، لیکن تم دونوں اب یہاں موجود ہو، تم نے اتنا بڑا رسک کیوں لیا؟''

سجاول نے انیق کی طرف اور انیق نے سجاول کی طرف دیکھا۔ سجاول نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''یہ رسک ہم نے صرف تین چار دن پہلے لیا ہے، اور پوری طرح سوچ سمجھ کر...... کسی طرح کا کچا کام نہیں کیا تھا ہم نے......اور اب بھی ہم پکے قدموں پر ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

سجاول کی پیشانی اور کنپٹیاں وغیرہ مکمل طور پر پگڑی نے چھپائی ہوئی تھیں۔ گھنی بھاری مونچھوں اور داڑھی نے چہرے کو کافی حد تک ناقابلِ شناخت بنا دیا تھا۔ یہ نقلی داڑھی بالکل اصلی کی طرح تھی۔ وہ میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے تھوڑا سا نیچے جھکا اور اپنی ریشمی قمیص پیٹ پر سے تھوڑی سی اٹھا دی۔ اس کی بالوں بھری توند کے ساتھ کوئی چیز بندھی ہوئی تھی۔ میں نے پہچان لیا۔ یہ وہی دھما کا خیز ڈیوائس تھا جو برج کلب والے مشن پر جاتے ہوئے قسطینا نے اپنی کمر سے باندھا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ ایک چھوٹی سی ڈوری کے ساتھ لگا ہک کھینچتے ہی یہ ڈیوائس پھٹ کر جسم کے ٹکڑے کر سکتا ہے۔

انیق نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''ایسی ہی بیلٹ میری کمر سے بھی بندھی ہوئی ہے بھائی۔ ہم دونوں نے پناہ گاہ چھوڑنے سے پہلے خدا کو حاضر ناظر جان کر قسم کھائی تھی اور تحریری عہد کیا ہے کہ اگر ہم پناہ گاہ سے باہر پکڑے گئے تو گرفت میں آنے سے پہلے ہی خود کو اڑا لیں گے اور اس عمل میں ایک لمحے کی تاخیر بھی نہیں کریں گے۔''

انیق کے لہجے میں چٹانی ارادہ تھا۔ اس نے بھی اپنی قمیص اٹھا کر مجھے اپنی دھما کا خیز بیلٹ کی جھلک دکھائی اور بولا۔ ''اللہ کا شکر ہے کہ پچھلے تین چار دن میں تو ان بیلٹوں کی ڈوریاں کھینچنے کی نوبت نہیں آئی۔''

''مگر تمہیں نکلنا نہیں چاہیے تھا۔ وہ اتنی محفوظ جگہ ہے انیق کہ یہ لوگ برسوں بھی سر مارتے رہیں تو اس کا کھوج نہیں پا سکتے...... وہاں طویل مدت تک رہنے کے لیے کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔''

سجاول نے ایک طویل اور بوجھل سانس لی۔ ”وہاں کسی چیز کی کمی نہیں تھی مگر تمہاری کمی تو تھی۔ تم وہاں نہیں تھے اور ٹی وی کے ذریعے جو خبریں ہم تک پہنچتی تھیں، ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ تم بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہو۔ ہم میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ تمہیں بلک بلک کر مرنے دیتے اور وہاں چھپ کر بیٹھے رہتے۔ قسطینا سمیت ہم سارے کے سارے بہت دکھی تھے۔ دن رات سوچتے تھے کہ کس طرح تمہاری مدد کی جائے پھر میں نے اور تمہارے نکو شہزادے نے پہل کی۔ نکو شہزادے نے اپنے چہرے پر تھوڑا سا رنگ روغن کیا اور میرے لیے یہ سکھوں والا لباس ڈھونڈا۔ آدھی رات کے بعد جب سارے سو رہے تھے ہم نے فیصلہ کیا اور پکے ارادے کے ساتھ وہاں سے نکل کھڑے ہوئے۔“

انیق نے کہا۔ ”میں ہر ہائی نس قسطینا کے لیے ایک تحریر چھوڑ آیا تھا جس سے انہیں ہماری روانگی کا علم ہو گیا۔“

”میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔“ میں نے ماتھا پکڑ لیا۔ ”اس ٹاپو سے تمہارا نکلنا، سمندر پار کر کے یہاں جزیرے تک پہنچنا...... یہ سب کیسے ممکن ہوا۔“

سجاول نے اپنے صندوق جیسے سینے پر ہاتھ پھیرا۔ ”جب چھاتی میں آگ ہو ناں...... اور سر اپنی تلی (ہتھیلی) پر رکھ لیا جائے تو بڑے بڑے اوکھے کام بھی آسان ہو جاتے ہیں۔ یہ قصہ تمہیں بعد میں سنائیں گے۔ فی الحال کچھ اور سوچنے کی ضروری باتیں ہیں۔“

باہر سے مدھم شور سنائی دیتا تھا۔ وقفے وقفے سے سینکڑوں لوگ نعرہ زنی کرنے لگتے تھے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے بتایا گیا تھا کہ مرکوزا کے بے شمار لوگ سڑکوں پر موجود ہیں، وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں اور مجھے دیکھنا چاہتے ہیں۔ میں ان کے نزدیک مقامی ہیروز کی صف میں تو اسی روز شامل ہو گیا تھا جب رائے زل کے حملے کے وقت ڈی پیلس سے چند کلومیٹر کی دوری پر گھمسان کی لڑائی میں، میں نے ان کی لیڈر قسطینا کا دفاع کیا تھا مگر اب حلمی کو قتل کرنے اور اس کے بعد ایجنسی کا بے پناہ تشدد سہنے اور ثابت قدم رہنے کے بعد میں ان کے لیے بے حد اہم ہو گیا تھا۔ سجاول اور انیق یہاں تاجور کی موجودگی پر بھی از حد حیران تھے۔ انہیں کل ہی علم ہوا تھا کہ تاجور بھی یہاں موجود ہے۔ میں نے انہیں مختصر الفاظ میں بتایا کہ موجودہ صورتِ حال میں شکیل داراب کا کیا کردار ہے اور تاجور کن حالات میں اور کیسے یہاں پہنچی ہے۔ وہ دونوں بے حد حیرت سے سنتے رہے۔ کافی دیر بعد جب موضوع بدلا تو میں نے انیق سے پوچھا۔ ”یہاں پہنچنے کے بعد تمہارے ارادے کیا تھے؟“

”ہم کسی بھی طرح آپ تک پہنچنا اور آپ کو بچانا چاہتے تھے۔ ذہن میں کوئی پلان نہیں

تھا لیکن ارادہ صرف ایک ہی تھا، جان ہتھیلی پر رکھنی ہے اور مرنا ہے یا کچھ کرنا ہے۔'' انیق کا یہ لب ولہجہ میں پہلی بار سن رہا تھا۔ وہ عام قد کاٹھ کا تھا مگر جب اس انداز سے بولتا تھا تو اس میں بلند پہاڑوں کی آن بان نظر آتی تھی۔

اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مشکور انداز میں آسمان کی جانب دیکھا اور کہا۔

''ابھی ہم سوچ بچار میں ہی تھے کہ قدرت نے مدد کی۔ ہمیں پتا چلا کہ ڈی پیلس کے نزدیک ایک ایمبولینس اور آرمی کی گاڑی میں تصادم ہوا ہے۔ ایمبولینس میں موجود مریض کو دوسری گاڑی میں منتقل کرتے ہوئے معلوم ہوا کہ وہ مریض آپ ہیں اور بے حد زخمی حالت میں ہیں۔ یہ واقعہ جنگل کی آگ کی طرح پورے شہر میں پھیل گیا۔ اس کے بعد مرکوزا اور دوسرے علاقوں کے لوگ وکٹوریہ اسپتال کے گرد جمع ہونا شروع ہو گئے، کسی کو توقع نہیں تھی کہ لوگ اتنی بڑی تعداد میں نکلیں گے اور معاملہ یہ رخ اختیار کرے گا۔''

میرا دھیان بار بار ابراہیم کی طرف جا رہا تھا جب میں پناہ گاہ سے نکلا تو اس کی حالت اچھی نہیں تھی۔ اس نے زینب کی خاطر اپنی ''زہر کی ڈوز'' خطرناک حد تک کم کر دی تھی اور سخت مشکل میں تھا۔ میں نے انیق اور سجاول کو اس بارے میں کریدا۔ ان کے جوابات سے یہی اندازہ ہوا کہ وہ بدستور اسی حالت میں ہے۔

ہمارے گفتگو کے دوران میں ہی مرکوزا کا میئر بازان گوہر بھی اجازت لے کر اندر آ گیا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو ریان فردوس کی فیملی کے قدیم خدمت گار تھے اور اس فیملی کی وفاداری ان میں رچ بس چکی تھی۔ کمال احمد کی موت نے بازان گوہر کے سینے پر گہرا گھاؤ لگایا تھا اور اب وہ ابراہیم کی سلامتی کے بارے میں از حد فکر مند تھا۔ انیق اور سجاول کی طرح میں نے بھی اسے تسلی دی کہ عزت مآب ریان فردوس کا اصل وارث پرنس ابراہیم صحیح سلامت ہے اور جلد ہی اپنے لوگوں کے درمیان ہو گا۔

گفتگو شروع ہوئی تو میں نے بازان گوہر سے کہا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے میئر! رائے زل اور ایجنسی یہ سب کچھ ٹھنڈے پیٹوں برداشت کر لے گی۔ اسپتال میں تو وہ مادام کی موجودگی کی وجہ سے مجبور تھے مگر اب وہ اس علاقے پر چڑھ دوڑیں گے۔''

''یہ سب اتنا آسان بھی نہیں ہے شاہ زیب صاحب۔'' میئر شستہ انگلش میں بولا۔ ''یہاں کا بچہ بچہ ان کے راستے میں رکاوٹ بن کر کھڑا ہو جائے گا۔ ہم نے علاقے کے زیادہ تر راستے لوہے کے گیٹ لگا کر بند کر دیئے ہیں۔ اب ہم باقی راستوں کو بھی بند کریں گے۔''

''مگر کوئی حکومت بھی اپنے شہر میں ''نوگو ایریاز'' برداشت نہیں کرتی۔ یہ رائے زل

کیسے کرے گا جبکہ اسے اب یہ پتا ہے کہ میں یہاں موجود ہوں۔ یہ لوگ شاید ایک آدھ دن میں ہی یہاں کوئی بڑی کارروائی کر گزریں گے...... میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ آپ لوگوں نے مجھے یہاں لاکر اہلِ علاقہ کے لیے ایک بہت بڑا خطرہ مول لیا ہے۔''

''خطرہ تو اب مول لینا ہی لینا ہے مسٹر شاہ زیب! ورنہ عمر بھر کی ذلت اور غلامی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب طبلِ جنگ بج چکا ہے۔''

باذان گوہر کی عمر پینتیس سال سے اوپر تھی۔ چوڑی کاٹھی، روشن چہرہ ارادے کا بہت مضبوط نظر آتا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا، اس کے سیل فون پر کال آئی۔ کسی نے ملائی زبان میں اسے بتایا کہ گیٹ نمبر 8 کے سامنے گرے فورس اور ایجنسی کی گاڑیاں جمع ہو رہی ہیں۔ دیگر سڑکوں پر بھی گرے فورس کا گشت بڑھ گیا ہے۔

باذان گوہر نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''یہ ابھی اندر گھسنے کی جرأت نہیں کر سکتے...... اس وقت یہ جلے پاؤں والی بلی ہیں...... ان کو چکرانے دو۔''

''معاف کرنا میئر، مجھے خون خرابے کی بُو آ رہی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے یہاں کسی ایک بے گناہ شہری کی زندگی کو بھی نقصان پہنچے۔''

''خون خرابے سے ڈرنے کا وقت اب گزر چکا ہے مسٹر شاہ زیب! ہمیں ایک ایک کر کے مارا جا رہا ہے۔ ہماری عورتوں کو بے عزت کیا جا رہا ہے۔ ہمارے گھروں کو لوٹا جا رہا ہے۔ اب بات تخت یا تختے کی طرف جا رہی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں مسٹر شاہ زیب کہ ایجنسی کے افسروں میں ایک دو دور اندیش لوگ بھی موجود ہیں۔ ان میں سے ایک مسٹر پال کورنی ہیں۔ مجھے نہیں لگتا کہ ایسے لوگ رائے زل کو اتنے بڑے خون خرابے کی اجازت دیں گے۔''

''رائے زل کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہیں جہاں بے رحم ڈکٹیٹر ہوتے ہیں۔ سات پہروں میں اور سات پردوں میں چھپا ہوا۔ جب سے آپ نے اس پر قاتلانہ حملہ کیا ہے وہ پبلک مقامات پر شاذ و نادر ہی نظر آتا ہے۔ وہ عیاشیوں میں ڈوبا ہوا جنس زدہ ریچھ ہے۔ باہر سے جتنا بارعب اور دبنگ اندر سے اتنا ہی کمینہ اور بزدل۔ یہ ریچھ اب زیادہ دیر تک ہمارے گوشت اور ہمارے دل میں اپنے پنجے نہیں گاڑ سکتا۔'' باذان گوہر کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

ایک شخص اندر آیا اس نے ادب سے جھک کر میئر باذان کے کان میں کچھ کہا اور باہر چلا گیا۔ باذان گوہر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''مسٹر شاہ زیب! آپ کی حالت ابھی ایسی نہیں کہ آپ سے طویل ملاقاتیں کی جائیں۔ ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ ابھی شاید آپ کو مزید

خون کی ضرورت پڑے۔ آپ آرام کریں۔ آپ کی ساتھی خاتون مس تاجور بھی کچھ پریشان ہیں۔ وہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں، ہم اپنی گفتگو کل دوپہر تک کے لیے ملتوی کرتے ہیں۔''

کچھ ہی دیر بعد تاجور ایک بار پھر میرے پاس کمرے میں موجود تھی۔ رو رو کر اس کا برا حال تھا۔ اس نے چھوٹتے ہی مجھ سے کہا۔ ''شاہ زیب! اب تو آپ اپنے لوگوں میں آ گئے ہیں...... اپنے مددگاروں میں پہنچ گئے ہیں۔ میں آپ سے منت کرتی ہوں، آپ مجھے شکیل صاحب کے پاس واپس بھجوا دیں۔''

''تم شکیل صاحب کے پاس واپس جا کر کیا کرو گی؟''

''وہ مجھے پاکستان واپس لے جائیں گے۔ میرے امی ابو، میرے بھائی، سب بے چینی سے میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔''

میں نے اس سے پوچھا کہ وہ یہاں کیسے اور کیونکر پہنچی ہے۔ اس نے جو کچھ آنسوؤں اور سسکیوں کے درمیان بتایا اس کا خلاصہ کچھ یوں تھا...... شکیل داراب بہت لمبے ہاتھوں والا شخص تھا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ کسی کو ڈھونڈنا چاہتا اور ڈھونڈ نہ سکتا۔ اس نے یہاں جاماجی میں میرا صاف انکار سننے کے بعد تاجور کو یہاں لانے کا فیصلہ کیا۔ اس نے کچھ دن پہلے برونائی سے فلائٹ پکڑی اور پاکستان پہنچ گیا۔ اس کے اَن گنت گماشتوں نے دن رات کوشش کر کے سکھیرا گاؤں میں تاجور کا سراغ لگا لیا۔ تاجور اور اس کے گھر والے ایک دم وی آئی پی بن گئے۔ دین محمد کو زرعی خدمات میں انعام دینے کے بہانے بمع اہل و عیال اسلام آباد بلا لیا گیا اور وہاں فوری طور پر انہیں ایک فارم ہاؤس الاٹ کر دیا گیا۔ شکیل داراب کی بیوی نے تاجور کو آناً فاناً اپنی بہن کا درجہ دے دیا اور میاں بیوی اسے لے کر یہاں جاماجی پہنچ گئے...... یہ سب کچھ اتنی تیز رفتاری سے ہوا کہ تاجور سمیت اس کے سب گھر والے حیران رہ گئے۔

تاجور کی پوری رُوداد سننے کے بعد میں نے کہا۔ ''تاجور! مجھے حیرانی ہو رہی ہے کہ تم اب بھی شکیل داراب کے پاس جانا چاہ رہی ہو۔ کیا ڈی پیلس میں چھت سے لٹکنے کے بعد بھی تم یہی سمجھتی ہو کہ تم شکیل کی بیوی کی بہن ہو اور وہ تمہارا خیر خواہ ہے؟''

''ہو سکتا ہے...... شش شکیل صاحب کو پتا ہی نہ ہو کہ...... میرے ساتھ ایسا کیا گیا ہے۔'' وہ ہکلائی۔

''کبوتر کی طرح آنکھیں بند مت کرو۔ وہ حرام زادہ تمہیں یہاں صرف اس لیے لایا ہے کہ تم پر تشدد کر کے میری زبان کھلوا سکے۔ وہ جانتا ہے تم میرے لیے کیا حیثیت رکھتی ہو تاجور۔'' میں روانی میں کہہ گیا۔

وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگی۔ ایک ہی لمحے میں اس کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ اس نے پیشانی پر جھولتی ہوئی دو ریشمی لٹوں کو ہٹا کر کانوں کے پیچھے اڑسا اور دکھی انداز میں بولی۔ ''میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ شکیل صاحب کے پاس واپس چلی جاؤں میرے گھر والے ان کے پاس ہیں۔''

''اس شاطر شخص کے پاس جا کر تم اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کرو گی تاجور، اور میں تمہیں یہ نہیں کرنے دوں گا۔ کم از کم ابھی تو نہیں۔'' میرے لہجے میں سختی، محبت، خلوص سبھی کچھ شامل تھا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولی۔ ''یہ لوگ جو ہمیں یہاں لے کر آئے ہیں، کون ہیں، کیا چاہتے ہیں آپ سے؟''

''تاجور، یہ سمجھو کہ یہ مظلوم اور پسے ہوئے لوگوں کا ایک گروہ ہے۔ یہ یہاں کے جابر حاکموں کے خلاف بغاوت کا علم بلند کر رہا ہے۔ جلد ہی یہاں زور کا معرکہ ہونے والا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ شکیل داراب جیسے مطلب پرست بھی اس رگڑے میں آ جائیں۔''

وہ ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ میں نے کہا۔ ''تاجور! میں اپنے رویے پر تم سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ میں نے ڈی پیلس کے اپارٹمنٹ میں تم سے بڑی سخت باتیں کیں۔ تمہارا گریبان تک پھاڑ ڈالا......دراصل......''

''میں سمجھتی ہوں شاہ زیب۔'' اس نے میری بات کاٹی۔ ''آپ ان لوگوں پر ظاہر کر رہے تھے کہ آپ کو میری کوئی پروا نہیں۔ میں سب سمجھ رہی تھی۔''

''وہاں کیمرے اور خفیہ آڈیو سسٹم موجود تھا تاجور، ان لوگوں نے یقیناً سب دیکھا ہو گا۔''

''آپ نے جس طرح مجھے بچانے کے لیے اپنے بازو زخمی کیے وہ میں کبھی بھول نہیں سکوں گی۔ مجھے اسکرین پر سب کچھ نظر آ رہا تھا۔'' وہ جیسے جھرجھری لے کر بولی۔

''یہ سب مصیبتیں بھی تو تم پر میری ہی وجہ سے ٹوٹ رہی ہیں تاجور، میں نے تمہیں تمہارے بچپن کے منگیتر اسحاق سے تو بچایا مگر اسحاق سے کہیں زیادہ خطرناک لوگوں کی دشمنیاں تمہاری جھولی میں ڈال دیں۔''

''یہ سب کچھ...... قدرت نے میری قسمت میں لکھا ہوا تھا شاہ زیب! اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں۔ اب آپ...... اگر کچھ کر سکتے ہیں تو یہ کریں کہ مجھے کسی طرح واپس پاکستان بھجوا دیں۔ میرے گھر والے بے حد پریشان ہوں گے۔ پتا نہیں کہ شکیل صاحب نے انہیں کر

کے کیا بتایا ہے۔ میری امی تو ایک ایک دن گن کر گزار رہی تھیں۔"

"کس بات کے لیے؟"

وہ کچھ دیر خاموش رہی، پھر مجھ سے نگاہیں ملائے بغیر بولی۔ "میری منگنی ہو چکی ہے شاہ زیب، اگلے مہینے میری شادی تھی۔"

اپنی طرف سے اس نے مجھ پر ایک بڑا انکشاف کیا تھا۔ حالانکہ یہ سب میں بہت عرصہ پہلے جان چکا تھا۔ میں نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ "مبارک باد والے حالات تو نہیں لیکن پھر بھی مبارک ہو، کہاں ہوئی ہے تمہاری منگنی؟"

"سکھیر اگاؤں کے ہی لوگ ہیں۔"

"کیا کرتا ہے لڑکا؟" میں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔

اس کے چہرے پر شرم کی سرخی لہرائی۔ سر جھکائے جھکائے بولی۔ "ہماری ہی طرح زمینداری ہے۔"

"آج کل کہاں ہے وہ؟" میں نے پوچھا۔

میرا یہ سوال اسے بے محل محسوس ہوا۔ ذرا اٹک کر گھبرائے انداز میں کہنے لگی۔ "وہ آج کل کام کے سلسلے میں گاؤں سے باہر ہیں...... بہاولپور گئے ہوئے ہیں۔"

"تم خوش ہو تاجور؟" میں نے اچانک دریافت کیا۔

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور دوبارہ پلکیں گرالیں۔ اس نے وہی جواب دیا جو قریباً ہر مشرقی لڑکی دیتی ہے کہنے لگی۔ "جہاں میرے ماں باپ خوش ہیں، وہیں میں بھی خوش ہوں...... اور...... اور مجھے آپ سے بہت زیادہ معافی بھی مانگنی ہے شاہ زیب! اگر کسی بھی وجہ سے میں نے آپ کا دل دکھایا ہو، میری کسی بات سے آپ کو رنج ہوا ہو تو مجھے معاف کر دیں۔"

"معافی تو غلطی پر مانگی جاتی ہے تاجور...... اور تم نے کون سے غلطی کی۔ تم نے اس لیے اپنا راستہ مجھ سے جدا کیا تھا کہ میں خطرناک اور گمراہ زندگی گزار رہا ہوں، بہت جلد مصیبتوں کا شکار ہو جاؤں گا...... اور میں ہو چکا ہوں۔ سب کچھ تمہارے سامنے ہے اور ابھی پتا نہیں کہ مزید کیا کچھ ہونا ہے۔" میں نے اپنے زخم زخم جسم کی طرف اشارہ کیا۔

وہ سسک اٹھی۔ "تو پھر...... تو پھر کیوں نہیں چھوڑ دیتے یہ سب کچھ؟"

میں گم صم اس کی جانب دیکھتا رہا، پھر ہولے سے کہا۔ "یہ وہی سوال ہے جو تم جیسی ہمدرد عورتوں نے اَن گنت مرتبہ گمراہ مردوں، گینگسٹروں اور قاتلوں سے کیا ہے، اور اس کا

جواب بھی وہی صدیوں پرانا ہے تاجور...... میں تو کمبل کو چھوڑتا ہوں کمبل مجھے نہیں چھوڑتا۔ ہم جیسے لوگوں کے لیے اکثر واپسی کے راستے بند ہو جاتے ہیں۔ انہیں صرف آگے ہی جانا ہوتا ہے۔''

وہ عجب بے تابی سے بولی۔ ''آپ...... کہیں چھپ جائیں...... کہیں دور چلے جائیں...... اتنی بڑی دنیا ہے، کسی کونے میں، کسی کونے میں......'' وہ باقاعدہ رونے لگی۔

کمرے کی ایک کھڑکی میں سے تاریک رات کے چند ستارے جھلک دکھا رہے تھے۔ مرکوزا کی گلیوں میں ابھی تک ہلکا ہلکا شور اور نعرے تھے۔ میں نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ ''اس دنیا میں بڑے لمبے ہاتھوں والے لوگ موجود ہیں تاجور اور جب وہ کسی کو ڈھونڈنا چاہیں تو ڈھونڈ لیتے ہیں اب دیکھو، تمہیں بھی سکھیرا گاؤں سے ڈھونڈ ہی لیا گیا نا...... اور اگر تم پھر کہیں چھپو گی تو شکیل جیسے لوگ پھر تمہیں ڈھونڈ لیں گے...... اس لیے میرا فیصلہ ہے کہ ابھی تم کہیں نہیں جاؤ گی۔ میں تمہیں زندہ سلامت دیکھنا چاہتا ہوں تاجور۔'' میں نے اپنا زخمی ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھا۔

وہ جیسے اپنے آپ میں سمٹ سی گئی۔ وہ شاید اب اپنے آپ کو کسی کی امانت سمجھ رہی تھی اور وہ جانتی نہیں تھی کہ وہ اپنے جس منگیتر کا ذکر کر رہی ہے اور جس سے شادی کی بات پر اس کا چہرہ سرخ ہوتا ہے...... وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔

O......❖......O

اگلے روز صبح سویرے انیق سے دوبارہ ملاقات ہوئی۔ اسے بدلے ہوئے حلیے میں شناخت کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ یہاں اسے رحمانی کے نام سے پکارا جا رہا تھا۔ اسے اور سجاول کو لوگ رضا کار دستے کا فرد سمجھ رہے تھے۔ انیق نے مجھے بتایا کہ کل رات گرے فورس کے کچھ اہلکاروں نے مرکوزا کے ایک محلے میں داخل ہونا چاہا۔ وہ دو افراد کو گرفتار کرنا چاہتے تھے مگر اہل علاقہ نے یہ کوشش ناکام بنا دی۔ انہوں نے گیٹ بند کر دیئے اور وہاں تین چار سو افراد جمع ہو گئے۔ گرفتاری کے لیے آنے والے واپس چلے گئے۔ انیق نے کہا۔ ''ابھی میں دیکھ کر آیا ہوں۔ کئی جگہ لوہے کے گیٹ لگائے جا رہے ہیں۔ یہاں مجھے مشہور بریگیڈ پاسبان کے لوگ بھی نظر آئے ہیں...... مجھے لگتا ہے کہ مرکوز والوں کے تیور خطرناک ہیں۔ آپ کی یہاں موجودگی کو بھی وہ ایک بڑا اچھا شگون سمجھ رہے ہیں۔ میں تو دیکھ کر حیران ہو رہا ہوں جی لگتا ہے کہ ان لوگوں نے آپ کو قسطینا صاحبہ ہی کی طرح اپنے سر آنکھوں پر بٹھا لیا ہے۔''

''اور یہ غلط ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ میں ان کی توقعات پر پورا اتر سکتا ہوں۔''

''مگر انہوں نے تو توقعات لگا لی ہیں۔ آپ کی وہ تصویر یہاں چپے چپے پر لگی ہے جس میں آپ زخموں کے سبب نیم جان ہیں اور گرمی کی وجہ سے آپ کی کھال جگہ جگہ سے جھلس گئی ہے۔ میں خود حیران ہوں بھائی کہ آپ نے اتنی تکلیف کیسے برداشت کی۔ مجھے کل دو بڑی عمر کے ملائیشین ایسے بھی ملے جو آپ کو سپر نیچرل قرار دے رہے تھے۔''

''سپر نیچرل؟''

''جی ہاں اور اس کی ایک خاص وجہ ہے۔ آپ نے ابھی تک یہ نہیں پوچھا کہ مادام ہاناوانی اسپتال میں کیوں ہے؟'' میں سوالیہ نظروں سے انیق کا چہرہ تکنے لگا۔ وہ رازدارانہ لہجے میں بولا۔ ''یہ بات پھیلی ہوئی ہے کہ مادام ہاناوانی نے آپ کو اپنی آنکھوں کے جادو سے زیر کرنے کی کوشش کی......اور یہ ایسی سرتوڑ کوشش تھی جو اس نے کبھی شاید ہی کی ہو۔ وہ آپ کو زیر کرنے میں ناکام رہی۔ اسی ردِعمل میں اس کی اپنی ذہنی صحت متاثر ہوئی۔ اب پتا نہیں کہ یہ اطلاع غلط ہے یا صحیح لیکن کہا جا رہا ہے کہ مادام اپنی آنکھوں اور سر کے پچھلے حصے میں شدید قسم کا درد محسوس کرتی ہے اور ایسا واقعہ اس کے ساتھ پہلے کبھی نہیں ہوا۔ کچھ لوگ جو مادام کی ماورائی صلاحیتوں کو مانتے ہیں، یہ کہہ رہے ہیں کہ وہ اب زیادہ بوڑھی ہو گئی ہیں اور ان کی ''روحانی طاقت'' پہلے جیسی نہیں رہی۔''

مجھے وہ سارے مناظر پھر یاد آ گئے، جب ہاناوانی نے اپنی سیاہ عینک اتاری تھی اور میں ایک ناقابلِ بیان عذاب سے دوچار ہوا تھا۔ اپنے محسن ذکری کی ہدایت کے مطابق میں نے اپنی سانس روک لی تھی اور اپنے انگوٹھے کے زخم کو اپنی مٹھی میں لے کر بری طرح کچل ڈالا تھا۔ مجھے ٹھیک سے ادراک نہیں تھا کہ وہ معرکہ کتنی دیر جاری رہا لیکن یقیناً وہ ایک طویل دورانیہ تھا......وہی سات رنگ کا بہت بڑا بھنور جو مجھے بار بار اپنی طرف کھینچتا تھا اور میں اس کی زد سے نکلتا تھا۔

انیق نے کہا۔ ''وہ واقعہ معمولی نہیں تھا شاہ زیب بھائی! لوگوں نے آپ کی محبت میں اسے مزید بڑھا چڑھا دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ جیسا شخص ہی مادام اور اس کے ''عورت باز'' بیٹے کے سامنے خم ٹھونک سکتا ہے......اور ایجنسی کے سفید سوٗروں کو یہاں سے چلتا کر سکتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''وہ غلط سمجھ رہے ہیں۔ بے وقوفی کر رہے ہیں۔ میں کوئی فوجی ماہر یا جنگجو کمانڈر نہیں ہوں جو ان کی کمان کروں گا اور جو میری حالت ہے وہ بھی تم دیکھ رہے ہو بلکہ میں

تو یہ سمجھتا ہوں کہ میری وجہ سے ان لوگوں پر بہت بڑی مصیبت آنے والی ہے۔ میں نے رات کو ایک فیصلہ کیا ہے انیق ! اور فیصلہ یہی ہے کہ میری طبیعت ذرا بہتر ہوتی ہے تو ہم مرکوزا سے نکل جائیں گے۔''

''کیسے نکلیں گے؟''

''یہ مجھ پر چھوڑو...... میں کل رات تک تمہیں بتا دوں گا۔''

انیق نے عجیب لہجے میں کہا۔''یہ لوگ آپ کے ارادے سے بے خبر نہیں ہیں۔ان میں بے چینی پائی جا رہی ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ آپ کو یہاں سے جانے نہیں دیں گے جس طرح لوگ اپنے لیڈروں کی گاڑیوں کے سامنے لیٹ جاتے ہیں، یہ بھی لیٹ جائیں گے۔''

اچانک ایک مدھم شور نے ہمیں متوجہ کر لیا۔شدید نقاہت کے سبب میرے لیے تو اٹھنا ممکن نہیں تھا انیق کھڑکی تک گیا اور کھول کر باہر دیکھنے لگا۔شور میں اضافہ ہو رہا تھا۔نعرے بھی لگائے جا رہے تھے، زیادہ تر عورتوں ہی کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔انیق کچھ دیر دیکھتا رہا، پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔''اگر آپ یہاں آ سکتے ہیں تو آ کر دیکھیں، کیا تماشا ہے۔''

میں اٹھا اور انیق کے سہارے چل کر اس دو منزلہ مکان کی کھڑکی تک آ گیا۔منظر قابلِ توجہ تھا یہ ایک بڑا جلوس تھا مگر اس میں سب کی سب عورتیں ہی تھیں...... زیادہ تر جوان مقامی عورتیں۔ان کے ہاتھوں میں ملائی زبان کے مختلف کتبے تھے اور وہ نعرہ زنی کر رہی تھیں۔

انیق نے کہا۔''آپ جانتے ہیں یہ جلوس کس کے لیے ہے؟'' میں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔وہ ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔''ہماری ایک بڑی بہن ہے جس کا نام تاجور ہے یہ اسی کے لیے ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''یہ سینکڑوں عورتیں آپی تاجور سے مطالبہ کر رہی ہیں کہ وہ آپ کو یہاں سے جانے سے روکیں۔وہ یہ سمجھتی ہیں کہ آپ دونوں محبت کے اٹوٹ رشتے میں بندھے ہوئے ہیں بلکہ آپی تاجور کی انگلی میں جو RING ہے اسے بھی آپ سے ہی منسوب کیا جا رہا ہے۔ان عورتوں کا خیال ہے کہ جو بات آپ سے کوئی نہیں منوا سکتا وہ آپی تاجور منوا سکتی ہیں......اور یہی وجہ ہے کہ انہیں پاکستان سے یہاں پہنچایا گیا ہے۔''

میں اس کایا پلٹ پر ششدر تھا......

○......❖......○

عورتوں کی تعداد اور ان کا شور بڑھتا جا رہا تھا۔ان میں سے چند عورتیں اندر تاجور کے

پاس چلی گئی تھیں، باقیوں نے مکان کو گھیرا ہوا تھا اور نعروں کے ذریعے اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی تھیں۔ ان میں ہر عمر کی عورتیں شامل تھیں۔ کچھ نے اپنے بچے بھی اٹھا رکھے تھے۔ میں اور انیق کھڑکی میں سے یہ مناظر دیکھ رہے تھے۔

''یہ کیا تماشا ہے؟'' میں نے بیزاری سے کہا۔

انیق بولا۔ ''اس تماشے میں میرا اور آپ کا کوئی قصور نہیں۔ مقامی لوگوں میں یہ بات پھیل چکی ہے کہ رائے زل وغیرہ آپی تاجور کو اسی لیے یہاں جاماجی میں لے کر آئے تھے کہ وہ آپی تاجور کی اہمیت کو سمجھتے تھے، وہ جانتے تھے کہ ان کے ذریعے آپ کو ہر بات پر مجبور کیا جا سکتا ہے......اور اب یہی طریقہ یہ لوگ بھی استعمال کرنا چاہ رہے ہیں۔''

عورتوں کی آوازیں کبھی بلند اور کبھی پست ہو جاتی تھیں۔ ان میں زیادہ تعداد جزیرے کے مقامی باشندوں کی تھی، تاہم برونائی سے منتقل ہو کر یہاں آباد ہونے والے چہرے بھی کثیر تعداد میں نظر آ رہے تھے۔

اسی دوران میں ہم نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ بہت سی عورتیں تاجور کو گھیرے ہوئے ہماری طرف لا رہی تھیں۔ تاجور نے اپنی سرخی مائل اوڑھنی سے اپنا سر اور چہرے کا کچھ حصہ ڈھانپا ہوا تھا۔ وہ پریشان دکھائی دیتی تھی اور گاہے بگاہے احتجاجی انداز میں عورتوں سے کچھ کہہ بھی رہی تھی۔ لیکن وہ سب اسے پچکار پچکار کر اور اپنی بانہوں میں لے لے کر ہماری جانب بڑھتی آ رہی تھیں۔ ان کے انداز میں ایک جوش آمیز محبت تھی۔ یقینی بات تھی کہ ان کی ملائی زبان تاجور کی سمجھ میں نہیں آ رہی اور جو کچھ تاجور کہہ رہی ہے وہ ان کے پلے نہیں پڑ رہا۔ عورتیں اب صحن کے وسط میں پہنچ چکی تھیں۔

انیق نے آنکھوں کی پتلیاں اوپر چڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یا اللہ خیر! اس سیلاب کا رخ آپ کی طرف ہی لگتا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ سینکڑوں عورتیں اب آپ اور آپی کے درمیان صلح کرانے کے چکر میں ہیں۔''

''صلح؟'' میں نے مزید حیران ہو کر پوچھا۔

''کچھ لوگوں کا یہ خیال بھی ہے کہ آپ دونوں ایک دوسرے سے کچھ خفا ہیں۔ ڈی پیلس میں آپ دونوں کے درمیان جو جھڑپ ہوئی تھی اس کی نیوز بھی کسی طرح ''لیک'' ہو چکی ہے۔ یہاں آزاد میڈیا تقریباً ختم ہو گیا ہے، اس لیے کئی طرح کی افواہیں بھی بہت جلد پھیل جاتی ہیں۔''

پندرہ بیس سیکنڈ کے اندر جلوس میرے کمرے کے سامنے پہنچ گیا۔ شور سے کانوں پڑی

آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ پندرہ بیس عورتیں تاجور کو لے کر اندر آ گئیں۔ باقی دروازے کے سامنے، صحن میں اور صحن سے باہر کھڑی ہو گئیں۔ عورتوں نے مجھے بڑی محبت سے مخاطب کیا اور ملائی زبان میں پتا نہیں کیا کیا کہنے لگیں، ساتھ ساتھ وہ تاجور کی طرف بھی اشارے کر رہی تھیں۔ تاجور کی خوب صورت آنکھوں میں ہراس اور نمی تھی۔

عورتیں جو کچھ کہہ رہی تھیں ان میں سے بس چند الفاظ ہی میری سمجھ میں آ رہے تھے۔ مثلاً...... بہت اچھی لڑکی...... آپ بھی بہت اچھے...... قدرت...... بندھن...... محبت...... اچھا شگون وغیرہ۔

دو ادھیڑ عمر عورتوں نے مجھے کندھوں سے تھام کر لکڑی کی منقش چوکی پر بیٹھنے پر مجبور کیا۔ وہ بار بار میرے سر پر ہاتھ پھیر رہی تھیں پھر تاجور کو بھی چوکی پر بٹھا دیا گیا اور اس کے ماتھے کو بوسے دیئے گئے۔

انیق نے میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ ان کی کوئی رسم ہے جو کچھ یہ کہتی ہیں کرتے جائیں، یہی مناسب ہے۔''

لکڑی کی چوکی پر ہمارے درمیان ایک بلوری پیالے میں ڈینی کے بہت سے پھول رکھ دیئے گئے اور ہمارے اوپر گلابی رنگ کی ایک چادر ڈال دی گئی۔ میرے اور تاجور کے سر کو آگے کی طرف اس طرح جھکایا گیا کہ ہماری پیشانیاں آپس میں جڑ جائیں۔ تاجور بے بسی سے میری طرف دیکھ رہی تھی، مجھے بھی الجھن ہو رہی تھی۔ میں نے اپنا سر آگے جھکانے سے انکار کیا تو دو تین بوڑھی عورتوں نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے اور بے حد منت سے کچھ کہا۔ ان کا انداز ایسا تھا کہ ہم مزاحمت نہ کر سکے۔ میں نے اپنا سر آگے جھکایا، تاجور بھی جھکی اور ہماری پیشانیاں ایک دوسرے سے لگ گئیں۔

درمیانی عمر کی ایک خوش پوش مقامی عورت نے میرا بایاں ہاتھ تاجور کے دائیں ہاتھ میں تھما دیا اور تاجور کا بایاں ہاتھ میرے دائیں ہاتھ میں دے دیا۔ ہمیں چادر سے ڈھانپ دیا گیا۔ عورتوں نے ہمیں چاروں طرف سے گھیرا۔ وہ منقش چوکی کے اردگرد فرش پر بیٹھ گئیں اور مقامی زبان میں ہم آواز ہو کر کوئی قدیم گیت گانے لگیں۔ عجیب سحر انگیز سی آوازیں تھیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا مگر اتار چڑھاؤ میں جیسے محبت کا ایک آبشار بہہ رہا تھا۔ گانے والی عورتیں زیادہ تر جوان ہی تھیں۔

چادر کے اندر تاجور کے سانسوں کی مہک میرے نتھنوں سے ٹکرا رہی تھی۔ اس کی قربت کی وہی بھینی بھینی خوشبو نے کبھی مجھے چاند گڑھی میں اور ملنگی ڈیرے پر سرشار کیا تھا۔ میں اس

خوشبو کو زندگی کی آخری سانس تک نہیں بھول سکتا تھا۔ ایسا کیوں تھا؟ کیوں تھا ایسا؟ میں جو یورپ کی حسین ترین دوشیزاؤں کے سحر کا شکار نہیں ہوا تھا کیوں ایک نسبتاً کم خوب صورت دیہی لڑکی کی زلف کا ابدی اسیر ہو گیا تھا؟ یہ کیسا ناتا تھا؟ یہ کب قائم ہوا تھا؟ کیوں ایسے لگتا تھا کہ وہ میرے ہی جسم کا ایک نایاب حصہ ہے۔ جیسے کسی قدیم خزانے کے نقشے کا ایک گمشدہ ٹکڑا۔ یہ وہ سوال تھا جو میں خاموشی کی زبان میں ہزاروں ہی بار اپنے دل سے پوچھ چکا تھا مگر جواب کوئی نہیں تھا۔

مجھے لگا اس کی پیشانی پسینے سے تر ہو رہی ہے۔ اس نے ہولے سے میرا ہاتھ چھوڑ کر اپنی گود میں رکھ لیا۔ میں نے بھی اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ ہماری پیشانیاں بدستور اپنی جگہ پر رہیں۔ اس کی آنکھ سے ایک موتی گرا اور اس کی آغوش میں جذب ہو گیا۔

کچھ دیر بعد گیت ختم ہو گیا۔ ہم پر سے گلابی چادر اٹھا دی گئی۔ کچھ بوڑھی عورتوں نے میرا سر چوما اور کچھ نے تاجور کا۔ میرے ہاتھ میں گل داؤدی کی طرح کا ایک پھول دیا گیا جو میں نے تاجور کے ہاتھ میں تھمایا، تاجور کو جو پھول دیا گیا وہ اس نے میرے ہاتھ میں تھمایا، یہ رسم...... یا جو کچھ بھی یہ تھا اختتام پذیر ہوا اور عورتیں تاجور کو لے کر مکان کے صحن کی طرف اور پھر اس کے کمرے کی طرف چلی گئیں۔

کچھ ہی دیر بعد مرکوزا کا میئر (ناظم) باذان آدھمکا۔ وہ میرے جسم کے کچھ بگڑے ہوئے زخموں کے لیے ایک مقامی معالج کو لے کر آیا تھا۔ اس نے کچھ دوائیں کھانے کو اور کچھ لگانے کو دیں۔ میرے انگوٹھے کے زخم پر کئی ٹانکے لگے تھے مگر اندر سے زخم ابھی کچا تھا۔ مجھے دیکھنے کے بعد معالج چلا گیا تو باذان نے کہا۔ ''شاہ زیب! آپ کے حوالے سے لوگوں میں بہت جوش و خروش پایا جاتا ہے۔ مسجدوں اور دوسری عبادت گاہوں میں آپ کی صحت کی جلد بحالی کے لیے دعائیں کی جا رہی ہیں۔''

ان دعاؤں کے لیے آپ سب لوگوں کا بہت شکریہ باذان۔ لیکن اگر تم لوگ مجھ سے یہ توقع لگا رہے ہو کہ میں جنگ کی صورتِ حال میں کسی طرح تم لوگوں کی مدد کر سکوں گا تو یہ خام خیالی ہے۔ میں اس ''فیلڈ'' کا بندہ نہیں ہوں......''

''بات یہ نہیں ہے شاہ زیب صاحب۔'' وہ شستہ رواں انگلش میں بولا۔ ''دراصل آپ نے ایجنسی کے بے انتہا تشدد کے سامنے بے پناہ برداشت کا مظاہرہ کر کے اور ثابت قدم رہ کر لوگوں کے اندر ایک ایسا جذبہ پیدا کیا ہے جس کی مثال پہلے کبھی نہیں ملتی۔ بے شک لوگ محترم آدم کی بیٹی قسطینا سے بھی والہانہ پیار کرتے ہیں اور ان کے ایک اشارے پر بے شمار

لوگ جانیں دینے پر تیار ہو جاتے ہیں مگر جس قسم کے احساسات وہ آپ کے بارے میں رکھ رہے ہیں، وہ بالکل مختلف ہیں۔''

''اس میں میرا کیا قصور ہے؟'' میں نے روکھے لہجے میں کہا۔

وہ خجل ہوئے بغیر بولا۔''آپ نے رائے زل اور ایجنسی کی قید میں بہت کچھ سہا ہے شاہ زیب صاحب! لیکن شاید ابھی خود بھی آپ کو کچھ باتوں کا پتا نہیں۔ یہ بات بھی سننے میں آرہی ہے کہ مادام ہاناوانی اگر بیمار ہوئی ہے تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس نے آپ کے حوالے سے خود اپنے ہی طریقہ کار کی خلاف ورزی کی ہے۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں باذان!''

''یہ بات اکثر لوگ جانتے ہیں کہ مادام اپنے شکار کو ہپناٹائز کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ تین کوششیں کرتی ہے۔ ستر اسی فیصد لوگ تو اس کی پہلی کوشش میں ہی اس کے ''ٹرانس'' میں آجاتے ہیں۔ باقی بیس پچیس فیصد اس کی دوسری کوشش کی تاب نہیں لا پاتے، تیسری کوشش کی نوبت کم کم ہی آتی ہے۔ چند دن پہلے جب آپ کو اس عمل سے گزارنے کے لیے مادام کے پاس لے جایا گیا تو اس نے وقفے وقفے سے آپ پر تین کوششیں کیں اور آپ ان معدودے چند لوگوں میں شامل ہو گئے جنہوں نے اس کی تینوں کوششوں کو ناکام بنایا مگر مادام سے یہ ناکامی برداشت نہیں ہوئی اور اس نے اپنے اصول کو خود توڑا۔''

''تم کہنا چاہتے ہو کہ...... اس نے مزید کوشش کی؟''

باذان نے اثبات میں سر ہلایا۔''یہ بات ہمیں دو روز پہلے ہی معلوم ہوئی ہے کہ اس سے اپنی ناکامی ہضم نہیں ہوئی اور اس نے آپ کو چوتھی بار بھی ہپناٹائز کرنا چاہا۔''

''مگر مجھے تو اس حوالے سے کوئی خبر نہیں۔''

''مادام نے یہ کام اس وقت کیا جب ٹارچر سیل میں ناقابلِ برداشت حرارت سہنے کے بعد آپ چوتھی یا پانچویں دفعہ بے ہوش ہوئے تھے۔ مادام نے خیال کیا کہ اس صورتِ حال میں آپ کی قوتِ مدافعت بہت کمزور ہو چکی ہے۔ آپ کو خاص قسم کے دو انجکشن لگائے گئے اور کہا جاتا ہے کہ مادام نے آپ کو نیم غنودگی کے عالم میں ٹرانس میں لانے کی کوشش کی، مگر پھر ناکام ہوئی اور اس عمل کے دوران میں ہی اس کی اپنی طبیعت بگڑنا شروع ہو گئی۔ اس نے اپنی آنکھوں میں بھی شدید تکلیف کی شکایت کی اور اسے فوراً اسپتال روانہ کرنا پڑا، جہاں وہ اب تک موجود ہے۔''

''تم تک یہ باتیں کیسے پہنچیں؟''

''بہت باوثوق ذریعے سے شاہ زیب صاحب، اور مجھے ننانوے فیصد یقین ہے کہ حقیقت وہی ہے جو میں نے آپ کو بتائی ہے۔''

پتا نہیں کیوں، میرے دل کے اندر سے گواہی سی آنے لگی کہ یہ بندہ درست کہہ رہا ہے۔ میرے اپنے ذہن میں بھی کبھی کبھی ایک دھندلا خاکہ سا بنتا تھا۔ اس خاکے کا تعلق اسی منحوس ٹارچر سیل سے تھا جہاں میں نے زندگی کے بہترین شب و روز گزارے تھے۔ کسی وقت مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میں نے اس ٹارچر سیل میں نہایت گرم فرش پر لیٹے لیٹے مادام کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ نہایت چمکیلی اور پُرہول آنکھیں۔ وہ اپنے ہونٹوں کو عجیب انداز سے ہلا رہی تھی۔ اس وقت بھی شاید میں نے اپنے زخمی انگوٹھے کو کچلا تھا اور ایک ست رنگے بھنور سے دور رہنے کی کوشش کی تھی۔

بازان کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا، وہ بولا۔ ''مقامی لوگ آپ کو اس حوالے سے بھی بہت زیادہ اہمیت دے رہے ہیں کہ آپ نے مادام ہاناوانی کی آنکھوں والے جادو کو ناکام کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ آپ اور آپ کے ساتھیوں کا اس جزیرے پر آنا ایک خدائی مدد کی طرح ہے۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے یہ بات بار بار بتانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ یہاں کے لوگ کیا سمجھتے ہیں، یہ ان کا مسئلہ ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ میں اب یہاں سے جانا چاہتا ہوں۔ میرے یہاں رہنے سے تم سب لوگوں پر آفت آئے گی اور بہت جلد آئے گی۔''

''لیکن میرا خیال اس سے مختلف ہے شاہ زیب! لوگ بہت بڑی تعداد میں مرکوزا میں اور مرکوزا کے اردگرد موجود ہیں۔ رائے زل اور ایجنسی والے کوئی فوری ایکشن نہیں لیں گے۔ حالات ایسے ہیں کہ وہ اس وقت مزید بدامنی ''افورڈ'' نہیں کر سکتے۔'' اس نے مزید بھی کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر رک گیا۔ میرا قیافہ تھا کہ وہ مجھ سے قسطینا اور دیگر لوگوں کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا، میں فی الحال اس بارے میں کسی کو کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا۔ بازان کو بھی نہ بتاتا، بہرحال اس نے عقلمندی کی کہ اس حوالے سے کچھ پوچھ کر شرمندہ نہیں ہوا۔

O.....❖.....O

اگلے روز شام تک کوئی خاص واقعہ رُونما نہیں ہوا۔ دو ڈاکٹرز دن میں دو تین بار مجھے دیکھ رہے تھے اور ضروری طبی امداد فراہم کر رہے تھے۔ وہ بہار کی ایک خوشگوار شام تھی۔ کھڑکی میں سے آسمان کا کچھ حصہ دکھائی دیتا تھا۔ وہاں شفق کی سرخی تھی اور ایک دو ستارے اپنی جھلک دکھا رہے تھے جو ہوا اس گنجان آبادی کی بھول بھلیوں سے گزر کر اس کمرے تک پہنچ رہی تھی

اس میں گلابوں اور ڈینی کے پھولوں کی مہک تھی۔ میں آرام دہ بستر پر نیم دراز ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ شروع شروع میں مقامی میڈیا نے کچھ آزادانہ صحافت کی تھی مگر اب میڈیا بالکل پالتو دکھائی دے رہا تھا۔ جزیرے کے دونوں اہم چینلز مسلسل رائے زل اور اس کی والدہ کے قصیدے پڑھ رہے تھے۔ بغاوت کرنے والے ''مٹھی بھر'' عناصر کو سختی سے کچل دینے کی دھمکیاں دی جارہی تھیں۔ میرا ذہن بار بار شکیل داراب کی طرف جاتا تھا اور سینے کی جلن بڑھ جاتی تھی...... لیکن وہ کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ نہ میڈیا پر نہ سامنے۔ میرے لیے یہ انکشاف بھی بے حد اہم تھا کہ ہاناوانی نے ٹارچر سیل میں مجھے ایک بار پھر زیر کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں سوچوں میں گم تھا...... اسی دوران میں دروازے پر مدھم دستک سنائی دی۔ میرا دل یکبارگی دھڑک اٹھا۔ ''آجاؤ۔'' میں نے اردو اور انگلش دونوں زبانوں میں کہا۔

دروازہ کھلا اور تاجور ہوا کے تازہ جھونکے کی طرح اندر داخل ہوئی۔ وہ میری عیادت کے لیے آئی تھی لیکن اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ اور بھی بہت کچھ کہنا چاہتی ہے۔ باتیں کرتے کرتے وہ روہانسی سی ہوگئی، کہنے لگی۔ ''شاہ زیب! یہ لوگ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ یہ عورتیں میری جان کو آئی ہوئی ہیں۔ اپنی بات سمجھانے کے لیے کل ایک انڈین لڑکی کو اپنے ساتھ لے آئی تھیں۔ یہ ایسا کیوں سمجھ رہی ہیں کہ میں...... آپ سے سب کچھ منوا سکتی ہوں اور...... آپ میرے کہنے پر یہاں سے جانے کا ارادہ بدل سکتے ہیں، ان لوگوں کی خاطر لڑائی میں حصہ لے سکتے ہیں؟''

''یہ ان لوگوں کی اپنی سوچ ہے تاجور! اس پر میرا اختیار نہیں ہے۔ شاید یہ سمجھتی ہیں کہ میرے اور تمہارے درمیان کوئی قریبی رشتہ ہے۔''

وہ بے دھیانی میں اپنی انگلی کی انگوٹھی کو چھو کر بولی۔ ''میں نے انہیں یہاں تک بتا دیا ہے کہ آپ...... میرے منگیتر نہیں ہیں۔ میری شادی کہیں اور ہونے والی ہے۔ میں جلد از جلد واپس اپنے لوگوں میں جانا چاہتی ہوں۔''

''پھر...... انہوں نے تمہاری بات پر یقین کیا؟''

''نہیں۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''وہ سمجھتی ہیں کہ میں آپ سے ناراضگی کی وجہ سے ایسی باتیں کرتی ہوں۔ ورنہ ہم......'' وہ کہتے کہتے خاموش ہوگئی اس کی آنکھوں میں بے بسی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''ویسے، تمہارا اپنا کیا خیال ہے تاجور! مجھے ان لوگوں کی بات ماننی چاہیے یا نہیں؟''

"میں...... کیا بتاؤں لیکن جو کچھ میری سمجھ میں آ رہا ہے وہ تو یہی ہے کہ آپ اپنی جان سخت خطرے میں ڈال رہے ہیں۔ یہ ان لوگوں کی اپنی لڑائی ہے اور مدت سے چل رہی ہے۔ ہم اس آگ میں کیوں کودیں۔ آپ اپنے دوستوں کو اور مولوی فدا صاحب کی بیٹی کو لے کر یہاں سے نکل جائیں۔"

"ان حالات میں ان کا نکلنا بھی تو آسان نہیں ہے تاجور! اس جزیرے کے اور ارد گرد کے حالات ایسے نہیں ہیں کہ یہاں سے آسانی کے ساتھ فرار ہوا جا سکے...... اور ایک بات اور بھی ہے تاجور!" میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

اس نے میری جانب دیکھا۔ شام اب گہری ہوگئی تھی۔ تاجور کے عقب میں کھڑکی تھی اور اس میں سے چند ستارے جھانک رہے تھے۔ ہوا کے ایک آوارہ جھونکے نے بالوں کی لٹیں تاجور کے چہرے پر بکھیریں جنہیں اس نے چہرے سے ہٹا کر اپنے کانوں کے پیچھے اڑسا۔ میں نے کہا۔ "تاجور! یہ ظالموں اور مظلوموں کی لڑائی ہے اور مظلوموں میں نوے فیصد مسلمان ہیں۔"

"لیکن، آپ ان مسلمانوں کی جو مدد کر سکتے تھے وہ آپ نے کر دی ہے، بلکہ اپنی ہمت، طاقت سے زیادہ کی ہے۔ آپ نے ان کی کمانڈر قسطینا وغیرہ کو گرفتاری سے بچانے کے لیے خود کو موت کے منہ میں پہنچایا ہے، اب اگر آپ کو یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ ملتا ہے تو آپ کو ضرور فائدہ اٹھانا چاہیے۔"

"مگر میں اپنے ساتھیوں اور زینب کے بغیر یہاں سے کیسے نکل سکتا ہوں تاجور۔ اور فی الحال انہیں یہاں سے نکالنے کی کوئی تدبیر نظر نہیں آتی۔"

وہ بے قراری سے اپنی انگلیاں مروڑ رہی تھی۔ لٹیں پھر اس کی پیشانی پر ڈھلک آئی تھیں۔ ٹیوب لائٹ کی روشنی میں اس کی سفید اوڑھنی کے گہرے زرد پھول دمک رہے تھے۔ وہ میری طرف دیکھے بغیر بولی۔ "میں اس سلسلے میں آپ کو کیا مشورہ دے سکتی ہوں شاہ زیب! میں تو بس...... یہی کہہ سکتی ہوں کہ اللہ کا نام لے کر مجھے شکیل صاحب کے سپرد کر دیں۔ میں ان کی بیوی کی منت سماجت کروں گی کہ وہ مجھے پاکستان واپس بھجوا دیں اور اگر...... آپ کا خیال ہے کہ شکیل صاحب کے پاس جانا میرے لیے ٹھیک نہیں تو پھر...... مجھے کسی بھی طرح پاکستان بھجوا دیں جو میری قسمت میں لکھا ہو گا وہ مجھے مل جائے گا۔"

اس کی آنکھوں کے کٹوروں میں پھر پانی کی چمک تھی۔

میں نے اسے بغور دیکھنے کے بعد کہا۔ "تاجور! کب ہے تمہاری شادی؟"

وہ اس اچانک سوال پر لرز سی گئی، پھر سنبھل کر بولی۔ ''تاریخ تو اگلے ماہ کی ہے۔ آگے جو اللہ کو منظور۔'' اس کی پلکیں جھکی ہوئی تھیں اور چہرے پر ہلکی سی سرخی تھی۔

میں نے گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ''تاجور! تمہیں شاید ان حالات کی سنگینی کا اندازہ نہیں جن میں اس وقت میں اور تم بلکہ ہم سب گھرے ہوئے ہیں۔''

وہ سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھنے لگی۔

''تاجور! اگر میں یہ کہوں کہ تمہاری شادی نہیں ہوسکتی تو پھر؟''

''مم...... میں سمجھی نہیں۔ آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟''

''تمہارے ہونے والے شوہر کا نام سیف ہے نا؟ وہ کبڈی کا مشہور کھلاڑی بھی ہے۔''

تاجور کے چہرے پر بے پناہ تحیر اُمڈ آیا۔ ''آ...... آپ کو کیسے پتا؟'' وہ بولی۔

''تمہیں یہ جان کر مزید حیرانی ہوگی کہ میں نہ صرف اسے جانتا ہوں بلکہ وہ کچھ دن پہلے تک جزیرے میں یہاں میرے ساتھ بھی موجود تھا۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' وہ ہکلائی۔

''یہ ہوا ہے تاجور! اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوا ہے۔'' میرے لہجے میں دکھ تھا۔

میں نے ذرا توقف سے کہا۔ ''سیف کو لڑائی بھڑائی بہت پسند تھی نا...... اور اپنے اسی شوق کے لیے وہ ہمارے ساتھ یہاں تک آن پہنچا تھا۔''

''مگر کیسے؟ اور...... اب...... کہاں ہیں وہ؟'' تاجور کی آواز کپکپا رہی تھی۔

میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ اب آسمان کا وہ ٹکڑا ستاروں سے جھلملا رہا تھا۔ خوشگوار ہوا کے جھونکے بار بار کمرے میں گھس آتے تھے، مرکوزا کی گلیوں میں ایک سنسنی سی تیر رہی تھی اور اس سنسنی میں کبھی کبھی نعروں کی مدھم گونج بھی شامل ہو جاتی تھی۔ جب بھی کوئی ہیلی کاپٹر پرواز کرتا ہوا اس ''ایریا'' کے اوپر سے گزرتا تھا نعروں کی گونج میں اضافہ ہو جاتا تھا۔

میں نے بڑے محتاط لفظوں میں تاجور کو وہ رُوداد سنانا شروع کی جس کا تعلق اس کے منگیتر سیف عرف سیفی سے تھا اور جس کے نام کی انگوٹھی اب بھی اس کی انگلی میں چمک رہی تھی۔ میں نے یہ رُوداد سکھیرا گاؤں میں اپنی آمد سے شروع کی (مگر یہ نہیں بتایا کہ میں پاکستان چھوڑنے سے پہلے اس کی ایک جھلک دیکھنا چاہتا تھا اس لیے سکھیرا گاؤں پہنچا تھا) میں نے کہا کہ ایک اہم کام کے سلسلے میں مجھے اس علاقے میں جانا پڑا تھا۔ میں نے گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ ہونے والی اپنی اس لڑائی کا ذکر کیا جس میں سیف بھی شریک تھا۔ اس کے بعد سیف کا میرے پیچھے لیہ پہنچ جانا، اور اصرار کرنا کہ میں اسے لڑائی کے داؤ پیچ

سکھاؤں، اس کے بعد سیف کا ضد کر کے ہمارے ساتھ یہاں برونائی سے آگے جاماجی پہنچنا۔ میں نے تاجور کو بتایا کہ شروع میں مجھے ہرگز ہرگز یہ پتا نہیں تھا کہ سیف اس کا منگیتر ہے، اس کا پتا بعد میں چلا۔ میں نے تاجور کو بتایا کہ یہاں جاماجی پہنچ کر کس طرح کے غیر متوقع حالات پیش آئے اور وہ لڑائی جسے ہم گروہی مارا ماری سمجھ رہے تھے، کیسے ایک وسیع پیمانے کی جنگ کی صورت میں سامنے آئی، کس طرح حالات نے بتدریج ہمیں اپنے شکنجے میں جکڑا اور کیسے ریان فردوس کی کم ہمتی کے باعث اور آقا جان پر اس کے بے پناہ اعتماد کے باعث شکست ڈی پیلس کا مقدر بن گئی۔ ریان فردوس کی موت کے بعد ہمیں ایک قریبی ٹاپو پر پناہ لینا پڑی اور رائے زل نے امریکیوں کے ساتھ مل کر ہماری تلاش میں جگہ جگہ چھاننا شروع کیا اور پھر ہمیں ڈھونڈ نکالا۔

رُوداد کے بالکل آخری مرحلے میں پہنچ کر میں نے کہا۔ ''تاجور! زندگی کی کئی حقیقتیں بہت ہی کڑوی اور تکلیف دہ ہوتی ہیں لیکن انہیں قبول کیے بغیر چارہ نہیں ہوتا۔ تم یہ میرا زخم زخم جسم دیکھ رہی ہو اور تم نے میری زخمی حالت کی وہ ہزاروں تصویریں بھی دیکھی ہوں گی جو یہاں کے گلی کوچوں میں آویزاں ہیں۔ تمہیں اندازہ ہو رہا ہوگا کہ ٹاپو میں امریکن ایجنسی کے ہاتھوں پکڑے جانے کے بعد کیپٹن تبارک، سیف اور میرے ساتھ کس طرح کا سلوک ہوا۔ اس غیر انسانی تشدد کو لفظوں میں بیان کرنا شاید ممکن ہی نہیں۔ پکڑے جانے کے بعد میں نے ہر ہر پل یہی سوچا کہ کاش سیف نے میرے پیچھے پناہ گاہ سے نکلنے کی غلطی نہ کی ہوتی۔ ہم سے پوچھ گچھ شروع ہونے سے پہلے ہی مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ ہم پر کتنی بڑی آفت ٹوٹنے والی ہے اور پھر وہی کچھ ہوا جس کے بدترین اندیشے میرے دل میں موجود تھے۔ یہ وہ مقام تھا تاجور، جہاں انسان کو موت، راحت محسوس ہوتی ہے اور وہ زندگی سے چھٹکارے کے لیے گڑگڑا کر دعا مانگتا ہے۔ کیپٹن تبارک کی تدبیر تو کام کر گئی۔ بے پناہ تشدد سے گزرتے ہوئے اس نے ایک موقع پر امریکن جلاد کو اتنا بھڑکا دیا کہ اس نے اسے موقع پر ہی شوٹ کر ڈالا۔ اس نے الٹا لٹکے لٹکے اس کے منہ پر تھوک دیا تھا۔ لیکن...... سیف کے لیے...... ایسا کوئی چانس موجود نہیں تھا......'' میری آواز بھرا گئی۔

تاجور سکتے کے عالم میں سن رہی تھی۔ میں نے چند سیکنڈ خاموش رہ کر خود کو تھوڑا سا سنبھالا اور آخر وہ جانکاہ خبر تاجور کو سنا دی جس کے لیے میں اسے پچھلے ایک گھنٹے سے بتدریج تیار کر رہا تھا۔

میں نے تاجور کو بتا دیا کہ کس طرح امریکی لونگ کے سخت ترین تشدد کے دوران ٹلا

سیف اپنی جان کی بازی ہار گیا۔ میں نے اسے بتایا کہ ایک سخت چوٹ اس کے سینے پر لگی، اس نے خون کی ایک بڑی الٹی کی اور بے ہوشی کی حالت میں دم توڑ گیا۔ میں نے زہر والی بات تاجور سے چھپالی تھی، کیونکہ پتا نہیں تھا کہ یہ بات اس کی سمجھ میں آئے گی یا نہیں۔ کوئی اور جانتا ہو یا نہ...... لیکن میرا دل تو جانتا تھا کہ میں نے سیفی کو موت کے حوالے کرتے ہوئے کتنا بڑا صدمہ اپنے دل و دماغ پر جھیلا تھا۔ وہ لمحے مجھے بھلائے نہیں بھولتے تھے اور بعد کے واقعات نے اس امر کی تصدیق کی تھی کہ سیف کو اذیت سے نجات دلاتے وقت، جو اندیشے میرے ذہن میں تھے وہ سو فیصد درست تھے۔ اگر درست نہ ہوتے تو میں خود کو دو مرتبہ شدید ترین خطرے بلکہ موت کے منہ میں جھونکنے کی کوشش نہ کرتا۔

تاجور سکتہ زدہ سی تھی۔ کتنی ہی دیر تک اسے سیف کی موت کا یقین نہیں آیا اور جب آ گیا تو اس کا ملیح چہرہ رنج والم کے تاریک سایوں میں گم ہو گیا۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھوں سے لگاتار آنسو گر رہے ہیں پھر اس نے اپنا چہرہ گھٹنوں میں چھپایا اور ہچکیوں سے رونا شروع کر دیا۔ اس کی دلدوز آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ''یہ کیا ہو گیا ہے...... اس کی والدہ یہ سب کچھ کیسے برداشت کر پائے گی، وہ تو اس کا نام لے لے کر جیتی ہے۔ دن رات اس کی خیریت کی دعائیں مانگ رہی ہے۔ وہ تو مر جائے گی، آپ کہہ دیں یہ جھوٹ ہے، یہ جھوٹ ہے۔''

میں خاموش بیٹھا رہا۔ کہتا بھی تو کیا؟ وہ روتی رہی۔ اس کے دل کا غبار کچھ ہلکا ہوا تو میں نے کہا۔ ''تاجور! یہاں جو کچھ بھی ہوا ہے بالکل توقع کے خلاف ہے۔ ہم سب بھی اس وقت موت کے گھیرے میں ہیں۔ کبھی کبھی تو میں سوچتا ہوں کہ سیف کی جگہ میں ہوتا اور میری جان جلد چھوٹ گئی ہوتی۔''

وہ سسکی۔ ''وہ ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کے بعد ان کی زندگی اندھیر ہے۔ اس کی والدہ یہ صدمہ نہیں سہ پائیں گی۔ میں کتنی بدقسمت ثابت ہوئی ہوں ان کے لیے اچھا ہوتا میں بھی مر گئی ہوتی۔'' صدمے کی شدت میں وہ پتا نہیں کیا، کیا بولتی جارہی تھی۔

میں نے ملازمہ سے کہہ کر اس کے لیے پانی منگوایا اور اس سے تسلی تشفی کی باتیں کرنے لگا مگر صدمہ تازہ تھا، اس کے آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے، اس کی انگلی میں چمکیلے نگینے والی انگوٹھی حسرت ناک منظر پیش کر رہی تھی۔

وہ آنسوؤں اور ہچکیوں کے درمیان مجھ سے اس واقعے کی مزید تفصیلات پوچھنے لگی۔ کب ہوا یہ واقعہ؟ وہ کہاں دفن ہیں؟ آخری وقت میں انہوں نے کچھ کہا؟ ان کا ذاتی سامان کہاں ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

میں نے ان سوالات کے جواب اسے دیئے۔ رات کا کھانا ہمیں جیسے بھول ہی گیا تھا۔ رات گیارہ بجے کے لگ بھگ وہ باذان کی ملازمہ خاص کے ساتھ خاموشی سے اپنے کمرے میں واپس چلی گئی۔

میرا سارا جسم جیسے زخموں کی وجہ سے جل رہا تھا۔ بخار کی کیفیت بھی محسوس ہوتی تھی۔ میرے کچھ زخم اچھے ہونے میں نہیں آرہے تھے۔ کمر اور پہلو کی طرف دو تین جگہ میری جلی ہوئی ''اسکن'' کو کاٹ بھی دیا گیا تھا تاکہ اس کا زہر جسم میں سرایت نہ کرے۔ تاجور کے جانے کے بعد میں نے ڈاکٹر کو بلایا۔ وہ ساتھ والے کمرے میں بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے اس بات پر تھوڑی سی خفگی کا اظہار بھی کیا کہ میں نے وقت پر کھانا اور دوا کیوں نہیں لی اور اپنی پٹیاں کیوں نہیں بدلوائیں۔ میں اسے کیا بتاتا کہ کئی گھنٹوں سے میں کرب کے کس دورانیے سے گزر رہا تھا (دکھ درد کے ایسے ہی دورانیے ہوتے تھے جب میں بے ساختہ اپنے ہاتھ شراب کی طرف بڑھا دیا کرتا تھا مگر اب تو میں اس چیز کو بھی خود سے دور کر چکا تھا)

○......❖......○

ہمیں یہاں مرکوزا میں پانچ چھ دن گزر چکے تھے۔ ہر گھڑی یہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ ابھی شہر کے اس علاقے میں کوئی بڑا آپریشن ہو جائے گا جس میں بے تحاشا جانی نقصان ہوگا مگر ابھی تک تو باذان کی بات درست ہی ثابت ہو رہی تھی۔ قابض فوجیوں نے مرکوزا میں گھسنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ شاید وہ کسی بڑی تیاری میں مصروف تھے۔

انیق اور سجاول نے اپنے حلیے اور نام بدل رکھے تھے۔ صرف باذان کو ان کی اصلیت کا علم تھا۔ وہ دونوں آزادانہ مرکوزا کے اندر گھوم پھر لیتے تھے۔ اس وقت بھی سجاول پربت سنگھ کے روپ میں مرکوزا کی عمومی صورتِ حال کا جائزہ لینے نکلا ہوا تھا۔ میں بستر پر نیم دراز تھا اور انیق میرے کمرے میں تھا۔ وہ برے سے برے حالات میں بھی اپنی حسِ مزاح برقرار رکھتا تھا۔ اب بھی وہ فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا اور دیوار سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ وہ کافی دیر اسی پوزیشن میں رہا تو میں نے کہا۔ ''کیا ناٹک کر رہے ہو؟''

وہ ترنت بولا۔ ''میں ٹیلی پیتھی کے ذریعے چاند گڑھی میں پہلوان حشمت سے رابطے میں ہوں۔ وہ مجھے اپنا تازہ کلام سنا رہا ہے اور میں اسے یہاں کے تازہ حالات بتا رہا ہوں۔ تازہ بھی اور بے حد حیران کن بھی۔''

''کیا مطلب؟''

''دیکھیں جناب، یہ سب قربِ قیامت کی نشانیاں ہیں۔ یہاں شیر اور بکری ایک

گھاٹ میں پانی پی رہے ہیں۔ یعنی میں اور امریش پوری بہ امر مجبوری کندھے سے کندھا ملا کر چل رہے ہیں۔ کبھی ایسا سوچا نہ تھا۔''

میں نے بیزار لہجے میں کہا۔'' بکری زیادہ میں، میں کرے گی تو شیرا سے چیر پھاڑ بھی سکتا ہے۔ اپنے آپ کو کنٹرول میں رکھو۔''

''شیرا اپنے آپ کو کہاں تک کنٹرول میں رکھ سکتا ہے جناب۔ ایک نہ ایک دن تو میری برداشت نے جواب دینا ہی ہے۔''

''گویا شیر تم اپنے آپ کو کہہ رہے ہو؟''

''میں کہہ نہیں رہا جناب، میں ہوں۔ آپ نے مجھے ہمیشہ انڈر اسٹیمیٹ کیا ہے۔'' اس نے رونی صورت بنائی۔

میں نے کہا۔'' اچھا، یہ بکواس بند کرو اور پاس آ کر ایک کام کی بات سنو۔''

اس نے سر کھجایا اور بولا۔'' اچھا ایک منٹ جناب! میں پہلوان سے اجازت لے لوں۔'' اور دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔

ایسے موقعوں پر وہ مجھ سے سیدھی لات کھایا کرتا تھا مگر فی الوقت فاصلہ زیادہ تھا اور ویسے بھی میں ''بیڈ ریسٹ'' پر تھا۔

چند سیکنڈ بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور بولا۔'' جاتے جاتے پہلوان جی کیا پھڑکتا ہوا شعر سنا گئے ہیں۔

تیری جدائی کا غم ہم نے، مر مر کر اٹھایا سجناں
پھکی پے گئی چن تاریاں دی لو، توں اجے وی نہ آیا سجناں

''لو...... سمجھتے ہیں نا آپ...... روشنی...... اور پھکی کا مطلب مدھم......''

مجھے سچ مچ تاؤ آنے لگا۔ میں نے جوتی کی طرف ہاتھ بڑھایا تو وہ پھدک کر کھڑا ہو گیا۔ دراصل اسے پہلوان حشمت کے درجنوں شعر زبانی یاد تھے اور وہ موقع بے موقع انہیں استعمال کرتا رہتا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں اسے راہ راست پر لاتا اور وہ میرے قریب آ کر میری بات سنتا، دروازے پر دستک ہوئی...... اور باذان کے ملازم نے کہا۔'' کمپاؤنڈر ارکب آپ سے ملنا چاہتا ہے۔''

میں نے کہا۔'' لے آؤ۔''

چند لمحے بعد کمپاؤنڈر ارکب اندر داخل ہوا۔ وہ سفید کوٹ میں تھا۔ اس نے انیق کی طرف دیکھ کر سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا، پھر میرے کان میں چند سرگوشیاں کرنے کے بعد

واپس چلا گیا۔

''یہ کمپاؤنڈر صاحب کون ہیں؟'' انیق نے پوچھا۔

''کمپاؤنڈر تو کمپاؤنڈر ہی ہوتا ہے، اس کا شجرہ نسب تو مجھے معلوم نہیں۔''

''اس نے جس طرح میری موجودگی میں آپ کے کان میں سرگوشیاں کی ہیں میرے اندر زبردست ''جیلسی'' پیدا ہوئی ہے۔ میں نے کہا ہے نا جناب کہ قربِ قیامت کی نشانیاں ظاہر ہو رہی ہیں۔ اب آپ چھوٹے چھوٹے لوگوں کو بھی مجھ پر ترجیح دے رہے ہیں۔''

''یہ چھوٹا شخص ہم دونوں سے بہت بڑا ہے انیق!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔''یہ کیپٹن تبارک اور بن مشہد کی طرح اپنے مادر وطن کے لیے لڑ رہا ہے۔ جان ہتھیلی پر رکھے ہوئے ہے۔ تمہیں پتا ہے کہ میری زخمی حالت کی جو تصویر ٹارچر سیل سے نکلی اور اب جا ماجی کی ہر دیوار پر نظر آ رہی ہے، کس نے اتاری تھی اور کیسے باہر نکلی تھی؟ وہ اسی کمپاؤنڈر کا کارنامہ ہے۔''

انیق نے اپنے ہونٹ سکیڑ کر حیرت کا اظہار کیا۔

میں نے کہا۔''اور تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ صرف کمپاؤنڈر نہیں ہے۔''

''کیا مطلب جناب؟''

میں نے سرگوشی کے لہجے میں انیق کو بتایا۔''یہ عام سا نظر آنے والا شخص گرین فورس کا حاضر سروس کرنل ڈاکٹر ہے اور فورس کے لیے کئی کارنامے انجام دے چکا ہے۔''

''حیرت ہے۔ یہ شکل سے تو واقعی کمپاؤنڈر ہی دکھائی دیتا ہے۔''

''شکل سے تو تم بھی اُلو کے پٹھے نظر آتے ہو۔ مگر مجھے پتا ہے اور کچھ اور لوگ بھی جانتے ہیں کہ تم کیا شے ہو۔ لہٰذا شکلوں پر نہیں جایا کرتے۔ یہ انتہائی کوالیفائڈ شخص ہے۔ کاسمیٹک اور پلاسٹک سرجری ریذیڈنسی کا سفر طے کر چکا ہے...... کرنل احرار۔''

انیق واقعی متاثر نظر آنے لگا۔ پھر ہولے سے بولا۔''یہ محترم و معظم کمپاؤنڈر صاحب کیا سرگوشیاں فرما گئے ہیں آپ کے کان میں؟''

''ہم کل یہاں سے نکل رہے ہیں۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''کہاں سے نکل رہے ہیں؟''

''یہاں سے، اور کہاں سے؟ انٹیلی جنس رپورٹیں یہی بتا رہی ہیں کہ اگر ہم مزید یہاں رہے تو پھر مرکوزا پر ایک نہایت بے رحم آپریشن شروع ہو جائے گا۔''

''یعنی، ہم ڈر کر یہاں سے نکل جائیں گے؟''

''نہیں، ہم یہاں کے سینکڑوں بلکہ ہزاروں لوگوں کی جانیں بچانے کے لیے اس محفوظ ٹھکانے کو چھوڑ دیں گے۔''

''تو کہاں جائیں گے؟''

''اس کی فکر نہ کرو۔ انتظام ہو چکا ہے۔ کرنل احرار نے ہماری پناہ گاہ کا بندوبست کر لیا ہے۔ ہم دس پندرہ روز وہاں گزار کر اطمینان سے آئندہ کا لائحہ عمل سوچ سکتے ہیں۔''

انیق حیران تھا مگر میری بات کافی حد تک اس کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ ہم صاف محسوس کر رہے تھے کہ کشیدگی میں مسلسل اور تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ اس نو گوایریا کو رائے زل اور ایجنسی والے کسی صورت برداشت نہیں کر پا رہے تھے۔

انیق نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ''ہم کیسے نکلیں گے؟''

''سب انتظام یہ ''معمولی کمپاؤنڈر'' ہی کر رہا ہے۔ صبح چار بجے کا وقت مقرر ہوا ہے۔ یہ بہترین موقع ہوگا۔ مرکوزا کی بیشتر آبادی سو رہی ہوگی۔ کرنل احرار ایک ایمبولینس لے کر آئیں گے۔ تاجور مقامی لباس میں اور چادر پوش ہو کر ایمبولینس میں بیٹھے گی۔ میں ایسے مریض کا کردار ادا کروں گا جو شدید خطرے میں ہے اور جس کے چہرے پر آکسیجن ماسک اور پٹیاں ہیں۔''

''اور ہم دونوں؟''

''تم اور سجاول ایمبولینس کے پیچھے ایک دوسری گاڑی میں رہو گے اور مجھے یقین ہے کہ تم بھی بغیر کسی رکاوٹ کے ہمارے پیچھے پیچھے نکلتے چلے جاؤ گے۔''

''آپ نے آپی کو یہ سب بتا دیا ہے؟'' (وہ اب تاجور کو بڑی روانی سے آپی کہنے لگا تھا)

''نہیں، یہ ذمے داری تم پر ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

وہ سمجھ گیا کہ میں ایسا کیوں کہہ رہا ہوں؟ تاجور پچھلے چھ روز سے غم کے گھیرے میں تھی۔ سیف کی موت سے بھی زیادہ صدمہ اسے اس بات کا تھا کہ سیف کی ماں پر یہ سب کچھ سن کر کیا بیتے گی۔ وہ اس دن کے بعد مجھ سے بھی نہیں ملی تھی۔ میں بھی اس کے پاس جا کر اسے کسی طرح کے اضطراب میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں انیق کو اس کے پاس بھیج رہا تھا۔ میں نے انیق کو بھی بتا دیا تھا کہ سیف کے حوالے سے میرے اور تاجور کے درمیان تکلیف دہ گفتگو ہو چکی ہے۔ انیق کو یہ بھی معلوم تھا کہ بدترین حالات کا شکار ہونے کے بعد مجھے سیف کی زندگی کا خاتمہ اپنے ہاتھوں سے کرنا پڑا تھا۔

میرے کہنے پر انیق، تاجور کے پاس چلا گیا۔ اسی دوران میں سجاول واپس آ گیا۔ وہ چمکیلے تہبند اور کرتے میں تھا۔ کمر سے کرپان لٹک رہی تھی۔ اس نے بھی آ کر یہی بتایا کہ اگر ہم یہاں ٹکے رہتے ہیں تو لازماً گرے فورس اور ایجنسی کے گارڈز بھرپور کارروائی شروع کر دیں گے۔ اس نے بتایا کہ آج انتظامیہ کی طرف سے کچھ نوٹس بھی تقسیم ہوئے ہیں، جن میں کہا گیا ہے کہ آہنی گیٹ دو روز کے اندر ختم کر دیئے جائیں ورنہ انہیں سرکاری مشینری کے ذریعے توڑ دیا جائے گا۔ مطلوب لوگوں کو یہ پیشکش بھی کی جا رہی تھی کہ اگر وہ ہتھیار پھینک کر گرفتاری دے دیں تو ان سے رعایت کی جا سکتی ہے۔

○......❖......○

اور یہ رات کے چار بجے کا عمل تھا۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ مرکوزا کے در و دیوار اونگھ رہے تھے اور ان در و دیوار کو کہیں کہیں روشن کرنے والی روشنیاں بھی جیسے غنودگی میں تھیں۔ باذان کے اس مہمان خانے میں ایک پُراسرار سرگرمی تھی۔ تاجور مقامی لباس اور حجاب میں تھی۔ اس کی آنکھیں اور پیشانی کا تھوڑا سا حصہ ہی نظر آتا تھا۔ کرنل احرار نے میرے ماتھے اور ٹھوڑی وغیرہ کو سفید پٹیوں میں چھپا دیا تھا۔ میں بھی مقامی لباس میں تھا۔ ایمبولینس عقبی دروازے کے قریب کھڑی تھی۔ وہاں موجود تین گارڈز میں سے ایک تو کرنل صاحب کے ساتھ مل گیا تھا۔ باقی دو کو چائے میں بے ہوشی کی دوا دی گئی تھی۔ انیق اور سجاول کو ایک علیحدہ گاڑی میں جانا تھا۔ مقررہ وقت پر ہم بڑی خاموشی کے ساتھ عقبی دروازے کی طرف بڑھے۔ انیق نے مجھے سہارا دے رکھا تھا۔ سجاول ایک جانباز باڈی گارڈ کی طرح میری بائیں جانب چل رہا تھا۔ اس کا صندوق جیسا سینہ اور اس سینے میں دھڑکتا ہوا لوہے کا دل ہر خطرے کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھے۔ تاجور ہمارے پیچھے تھی اور اس کے پیچھے کرنل احرار آصفی۔ میرا پختہ ارادہ تھا کہ اگر کسی طرح باذان اور اس کے ساتھیوں کو خبر ہو بھی گئی تو ہم اب رکیں گے نہیں۔

ہم عقبی دروازہ کھول کر باہر نکلے۔ چند میٹر کے فاصلے پر ایمبولینس نظر آ رہی تھی۔ سڑک دور تک خالی تھی۔ اچانک سڑک کے آخری سرے پر مجھے کچھ لوگ نظر آئے۔ میرے ساتھ ساتھ انیق اور کرنل احرار بھی چونکے۔ اتنے میں ہمارے عین سامنے ایک گھر کا پھاٹک کھلا اور وہاں سے بھی دس پندرہ افراد نکل کر سڑک پر آ گئے۔

''یہ کیا ہے؟'' میں نے کرنل سے پوچھا۔

''ایسا ہونا تو نہیں چاہیے تھا۔'' کرنل متحیر تھا۔

اسی دوران میں گلی کی بائیں جانب بھی آٹھ دس افراد کی ایک ٹولی نظر آئی اور پھر تو

جیسے...... یکا یک سیلاب سا آ گیا۔ کئی گھروں اور دیگر عمارتوں کے دروازے کھلے۔ بغلی گلیوں میں بھی ہلچل محسوس ہوئی اور پھر لوگ جوق در جوق مین سڑک پر اکٹھا ہونے لگے۔ یہ رات کا آخری پہر تھا۔ ہم میں سے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ان خاموش در و دیوار کے پیچھے اتنی بڑی تعداد میں پُر جوش لوگ موجود ہوں گے۔

میں نے کرنل سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''آپ تو کہتے تھے، کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہے۔''

''میری...... سمجھ میں...... کچھ نہیں آ رہا۔ یہ تو مخبری والا معاملہ لگتا ہے۔''

یکے بعد دیگرے روشنیاں آن ہو رہی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے رات میں دن کا سماں محسوس ہونے لگا۔ بڑا ڈرامائی منظر تھا۔ میں ششدر تھا۔ لہریں لیتے ہجوم میں مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے سب شامل تھے۔ وہ بڑی حیران کن رازداری کے ساتھ سینکڑوں کی تعداد میں یہاں جمع ہوئے تھے اور ہمارے نکلنے کا انتظار کر رہے تھے۔

اتنے میں ناظم باذان نظر آیا۔ اس کے دو تین قریبی ساتھی بھی اس کے عقب میں تھے، اسے دیکھ کر میرے اندر عجیب سی جھنجلاہٹ پیدا ہو گئی۔ وہ جو کر رہا تھا، غلط تھا۔ تب میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ دس بارہ خوب صورت لڑکیاں، کیلے کا ایک بڑا پتا اٹھائے میری طرف بڑھ رہی تھیں۔ کیلے کا یہ پتا سبز کے بجائے سرخی مائل تھا۔ لڑکیوں کے چہرے پر معصومیت تھی۔ ان کی عمریں بمشکل چودہ پندرہ سال رہی ہوں گی یا شاید اس سے بھی کم۔

''یہ کیا ہے؟'' میں نے کرنل احرار آصفی سے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ یہ وہی نواص کی رسم ہے۔''

''نواص؟''

''کنواری لڑکیاں یا کمسن بچے اپنے خون سے کیلے کے پتے کو سرخ کرتے ہیں۔ جب خون سوکھ جاتا ہے تو اس پر اپنے نام لکھتے ہیں اور جب کسی بڑے شخص سے کوئی بات منوانا ہو یا مطالبہ کرنا ہو تو اسے یہ پتا پیش کرتے ہیں۔''

''مطلب یہ ہوا کہ مجھے جذباتی طور پر بلیک میل کیا جا رہا ہے؟''

اس سے پہلے کہ کرنل احرار جواب میں کچھ کہتا۔ ''لڑکیوں نے آگے بڑھ کر یہ پتا مجھے پیش کر دیا۔ پتے پر غالباً کسی پرندے کے پر کے ذریعے باریک لکھائی میں بے شمار نام لکھے ہوئے تھے۔ ایک لڑکی نے کسی بچی کی طرح آنکھیں پٹ پٹا کر میری طرف دیکھا اور معصوم، ملتجی لہجے میں بولی۔ ''آپ ہمیں اکیلا چھوڑ کر نہ جائیں۔''

میں نے لڑکیوں کو تو کوئی جواب نہیں دیا تاہم باذان کو آواز دے کر اپنے قریب بلایا۔

''یہ کیا تماشا ہے باذان؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''آپ یقین کریں، اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ پتا نہیں کہ کیسے یہ خبر پھیل گئی کہ آپ آج رات پچھلے پہر خاموشی کے ساتھ یہاں سے نکل جانا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد جو کچھ کیا، ان لوگوں نے خود ہی کیا ہے۔''

''اگر تمہاری بات سچ بھی مان لی جائے باذان! تو تم خود کو بے قصور قرار نہیں دے سکتے۔ تم اس صورتِ حال سے مجھ کو آگاہ کر سکتے تھے۔''

''میں نے کرنا چاہا تھا لیکن نائب ناظموں نے مجھے روک لیا۔'' اس نے دس پندرہ ادھیڑ عمر افراد کے ایک گروہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''باذان! تم ان لوگوں کو میرے راستے سے ہٹاؤ۔ میں نے یہاں سے جانا ہے اور ہر صورت جانا ہے۔'' میرا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

''آپ یقین کریں شاہ زیب، میں اس معاملے میں غیر جانب دار ہوں مگر فی الوقت یہ لوگ میری بات نہیں مانیں گے۔''

''اس کا کیا مطلب؟'' انیق نے تنک کر کہا۔ ''کیا ہم یہ سمجھیں کہ زلزلے کے بعد اب ہم...... تم لوگوں کے گھیرے میں ہیں؟''

''خدا نہ کرے ایسا ہو۔'' باذان جلدی سے بولا۔ ''لیکن ان لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ آپ ان کی اور ان کے بچوں کی زندگیاں بچا سکتے ہیں۔''

''ان کی زندگیاں بچانے کے لیے ہی تو ہم یہاں سے جانا چاہتے ہیں۔'' میں نے بھنا کر کہا۔ ''اگر ہم یہاں رہے تو اگلے ایک آدھ دن میں وہ لوگ یہاں چڑھ دوڑیں گے۔ تمہارے یہ گیٹ اور گنتی کی رائفلیں تمہاری حفاظت نہیں کر سکیں گی۔''

میں نے دیکھا ہجوم بڑھ رہا ہے۔ بہت سے افراد کے ہاتھوں میں چھوٹے بڑے کتبے تھے اور ان پر میری وہی ٹارچر سیل والی تصویر تھی۔ جسم پر صرف ایک انڈر ویئر...... بال منتشر، کھال جگہ جگہ سے جلی ہوئی، زخم اور آبلے، آنکھیں اندر دھنسی ہوئی۔ اس تصویر میں، میں نے سیل کی دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی اور چہرہ بے چارگی کا کامل نمونہ تھا۔

ہجوم میں سے ایک پچاس پچپن سالہ شخص آگے آیا۔ وہ شکل سے پڑھا لکھا لگتا تھا۔ اس مقامی شخص کی گود میں ڈیڑھ دو برس کا ایک بچہ تھا۔ پھولے پھولے گالوں والا یہ معصوم اپنی خوف زدہ آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ بڑی عمر کا شخص انگلش میں بولا۔ ''بیٹا! یہاں

کے لوگوں نے تم سے بہت سی امیدیں وابستہ کر لی ہیں اور اس میں ان کا کوئی قصور نہیں۔ کمانڈر افغانی شہید ہو چکے ہیں۔ ہر ہائی نس قسطینا اور کمانڈر فارس جیسے لوگ اب ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں۔ ایسے میں تم امید کے ایک روشن تارے کی طرح ہمارے سامنے آئے ہو۔ ہمارے دل...... گواہی دے رہے ہیں کہ تم...... ہمارے لیے بہت کچھ کر سکتے ہو۔"

میں نے کہا۔ "اور انکل جی! میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ میری اور میرے ساتھیوں کی وجہ سے آپ لوگوں کا بہت زیادہ نقصان ہونے والا ہے۔ فی الحال زیادہ جوش و خروش کا مظاہرہ ہم میں سے کسی کے لیے ٹھیک نہیں۔ ابھی مجھے یہاں سے جانے دیں اور اچھے وقت کا انتظار کریں...... اور مجھے لگتا ہے کہ وہ وقت بہت زیادہ دور بھی نہیں۔"

بڑی عمر کے شخص کی آنکھوں میں آنسو چمک گئے، بولا۔ "یہ دیکھو بیٹا! یہ جو میرے بازو پر ہے، میرا پوتا ہے...... اس سے ڈیڑھ سال بڑا اس کا ایک بھائی بھی تھا۔ وہ میرے دوسرے بازو پر ہوتا تھا۔ اب میرا یہ بازو خالی ہے۔ دو ماہ پہلے ہونے والی لڑائی میں امریکی گارڈز نے ہمارے گھروں پر کئی انچ موٹی کنکریٹ پھاڑنے والی گن سے حملہ کیا تھا جہاں کنکریٹ پھٹ جائے وہاں بچے کے نرم گوشت کا کیا بنتا ہے؟ اب اس کی ننھی سی قبر قبرستان میں ہے۔ میرا ایک بازو خالی ہو چکا ہے۔ کیا میرا دوسرا بازو بھی خالی ہو جائے گا؟" وہ سسکیوں سے رونے لگا۔

روتے روتے اس نے اپنے ننھے پوتے کے دونوں ہاتھ تھامے اور انہیں میرے سامنے جوڑ دیا۔ دادا کو روتے دیکھ کر بچے نے بھی رونا شروع کر دیا تھا۔ اس کے ہاتھ جڑے ہوئے تھے اور وہ رو رہا تھا۔

چند منٹ پہلے ہجوم کو دیکھتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ مجھے اس طرح کے جذباتی مناظر سے واسطہ پڑے گا۔ لہٰذا میں نے اپنا دل سخت کیا ہوا تھا۔ میں نے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس کے دادا سے کہا۔ "اس بچے کی حفاظت کے لیے اور ایسے بہت سے بچوں کی حفاظت کے لیے ہی ہم یہاں سے جا رہے ہیں، جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں شاید تم لوگ نہیں دیکھ رہے۔"

میرا اشارہ پا کر انیق مجھے سہارا دے کر آگے بڑھنے لگا۔ میرے تلوؤں کے زخم مجھے ابھی تک ٹھیک سے چلنے نہیں دے رہے تھے۔ جوتوں میں خون کی چپچپاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے آگے بڑھتے دیکھ کر لوگ میرے راستے میں آ گئے۔ مجھ پر جھلاہٹ سوار ہونے لگی۔ میں نے گرج کر کہا۔ "ہٹ جاؤ راستے سے۔ میں تمہارا قیدی نہیں ہوں۔"

ہجوم کچھ سہما ہوا سا تھا لیکن اپنی جگہ جما رہا۔ میں نے انیق سے کہا۔ "رکو مت، چلتے

جاؤ۔''

ہم آگے بڑھتے گئے۔ آٹومیٹک رائفل سجاول کے ہاتھ میں تھی اور چہرہ چٹان کی طرح سخت تھا۔ مادام ہاناوانی کے عارضی ''ٹرانس'' سے آزاد ہونے کے بعد وہ اب پھر پہلے جیسا سجاول ہی نظر آتا تھا۔ انیق نے مجھے سہارا دے رکھا تھا۔ تاجور اور کرنل ہمارے عقب میں آرہے تھے۔ کرنل کے لباس کے نیچے بھی پسٹل موجود تھا۔ میں نے تاجور کا چہرہ دیکھا۔ فقط آنکھیں نظر آرہی تھیں۔ ان آنکھوں میں دکھ، رنج اور پریشانی کی ملی جلی کیفیت تھی۔ شاید روتے ہوئے بچے کے منظر نے اسے بھی غم زدہ کیا تھا۔

''پیچھے ہٹو۔'' میں نے ایک بار پھر چلا کر کہا۔

لوگ کائی کی طرح پھٹنے لگے۔ جو پیچھے نہیں ہٹے انہیں سجاول نے رائفل کے کندے سے ٹھوکے دیئے۔ نعرہ زنی تھم گئی تھی۔ لوگوں کا فالتو جوش وخروش ٹھنڈا محسوس ہونے لگا۔ میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ آگے بڑھتا گیا۔ میرے مصمم ارادے نے لوگوں کو جیسے مفلوج کر دیا تھا۔ اچانک مجھے پھر رکنا پڑا۔ میرے سامنے ایک چادر پوش کھڑا تھا۔ ہموار سفید داڑھی، سر کے بالوں میں بھی سفیدی کا گہرا شیڈ، اس نے ایک چولا نما سفید لباس پہن رکھا تھا۔ کریم کلر کی چادر اس کے سر اور کندھوں پر تھی۔ اس کا اعتماد دیدنی تھا۔

''کون ہیں آپ؟'' انیق نے ملائی میں پوچھا۔

وہ دھیمی، ٹھہری ہوئی آواز میں بولا۔ ''تم مجھے نہیں جانتے لیکن تمہارا ساتھی شاہ زیب جانتا ہے۔ میں ذکری ہوں...... حاذق ذکری۔''

اب میرے چونکنے کی باری تھی۔ میں سناٹے کی کیفیت میں اپنے سامنے کھڑے شخص کو دیکھتا چلا گیا۔ نہایت سادگی، عاجزی اور متانت کا پیکر۔ لیکن اس کی سادگی اور عاجزی کے اندر ایک ایسا رعب بھی تھا جو یہاں موجود سینکڑوں لوگوں کی جمعیت میں بھی نہیں تھا۔ وہ مجھے اکیلا ہی روک رہا تھا اور روکنے میں کامیاب تھا۔

میں نے اس کی سوئی سوئی ہوئی سی آنکھوں میں دیکھا اور مجھے جیسے اپنا آپ خود سے دور جاتا محسوس ہوا۔ ''آپ ذکری ہیں؟'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

وہ ہولے سے مسکرایا اور اپنے سر کو اثبات میں حرکت دی۔

''آپ کو دیکھنے کی بہت خواہش تھی۔''

''مجھے بھی۔'' سفید ریش نے کہا اور اپنے ہاتھ میری طرف بڑھائے۔

میں نے اپنا بازو انیق کے کندھے پر سے اتارا اور بے ساختہ اس شخص کی طرف بڑھا۔

اس نے بڑی نرمی کے ساتھ مجھے گلے سے لگایا کہ میرے زخموں کو محسوس تک نہ ہوا۔ ایک عجیب سی خوشبو اور توانائی میرے ٹوٹے پھوٹے جسم میں سرایت کر گئی۔ ان لمحوں میں مجھے لگا کہ اگر اس شخص نے مجھ سے کہا کہ میں یہاں رک جاؤں تو میں کبھی انکار نہیں کر سکوں گا۔

لیکن اس نے نہیں کہا۔ مجھے گلے لگانے کے بعد اس نے انیق اور سجاول سے بھی ایک نرم معانقہ کیا۔ تاجور کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''شاہ زیب کیا ہم کہیں بیٹھ کر چند منٹ کے لیے کچھ گفتگو کر سکتے ہیں؟''

میں نے چھوٹے سے توقف کے بعد کہا۔ ''جیسا آپ کہتے ہیں۔''

انہوں نے اپنے پیچھے کھڑے ایک ادھیڑ عمر باریش شخص سے ملائمی میں کہا۔ ''اس بیٹی کو اپنی بیٹی کے پاس لے جاؤ۔ میں تھوڑی دیر میں تم سے دوبارہ رابطہ کرتا ہوں۔''

باریش شخص نے ادب سے سر جھکایا۔ تاجور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے سر کے اشارے سے اسے جانے کے لیے کہا۔ وہ اس شخص کے ساتھ دائیں جانب مڑ گئی۔ ''آؤ میرے ساتھ۔'' محترم ذکری نے کہا اور میرے کندھے کو سہلاتے ہوئے ایک دروازے کی طرف بڑھے۔ مجھے ان کے سرخ و سپید ہاتھ میں چھ انگلیاں نظر آ رہی تھیں۔

خاموش ہجوم میں اب پھر جوش و خروش کی ایک لہر سی نمودار ہو گئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ لوگوں کو بھی اس کایا پلٹ کا کچھ علم نہیں تھا۔ وہ ایک بار پھر نعرہ زنی کرنے لگے۔ مجھے اور محترم ذکری کو دیکھنے کے لیے ہماری طرف امڈنے لگے۔ باذان اور اس کے درجنوں مسلح اہلکاروں نے لوگوں کو ہماری طرف آنے سے روکا۔ محترم حاذق ذکری نے ہاتھ کے اشارے سے لوگوں کو ہدایت کی کہ وہ منتشر ہو جائیں۔ ان کے اس اشارے کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ ہجوم میں ٹھہراؤ نظر آنے لگا۔ ہم ایک منقش دروازے میں داخل ہو گئے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ محترم ذکری کے کسی خوش ذوق مرید کی رہائش گاہ ہے۔

○......❖......○

یہ عجیب جادوئی سا ماحول تھا۔ یہ مرکوزا کے متوسط درجے کے گھر کا ایک عام سا کمرا تھا مگر حاذق ذکری کی موجودگی نے اسے عام نہیں رہنے دیا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ان کے اندر سے ایک نظر نہ آنے والی روشنی پھوٹ رہی ہے اور ہر شے کو اپنے احاطے میں لے رہی ہے۔ کمرے میں صرف میں اور محترم ذکری موجود تھے۔ ہم لکڑی کے ایک چوکی نما تخت پر بیٹھے تھے۔ اس پر سفید رنگ کا خوش نما نمدہ بچھا ہوا تھا، بلکہ یہاں موجود استعمال کی اکثر اشیا مثلاً پردے، جانماز، تولیا، چادریں سفید یا کریم رنگ کی تھیں۔

میں اپنے چہرے کی فالتو پٹیاں اتار چکا تھا۔ پچھلے ایک گھنٹے میں میرے اور محترم ذکری کے درمیان جو گفتگو ہوئی تھی اس نے مجھے کافی ذہنی کچوکے لگائے تھے۔ میں خود کو اندر سے بدلا ہوا محسوس کرر ہا تھا۔ حیران کن طور پر وہ شستہ انگلش میں بات کر سکتے تھے۔ اب بھی وہ اپنے نرم لہجے میں کہہ رہے تھے۔

''میں ہمیشہ جاماجی کی سیاست سے دور رہا ہوں شاہ زیب! اور یہی وجہ ہے کہ ہر طبقے کے لوگ میری بات سنتے ہیں اور ہر ذات برادری میں ایسے لوگ موجود ہیں جو میری عزت کرتے ہیں۔ بہرحال ہر چیز کا ایک اختتام ہوتا ہے...... حالات کے ساتھ انسان کو بھی اپنے رویے تبدیل کرنا پڑتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ہم غیر جانبدار نہیں رہ سکتے...... اور یہی وجہ ہے کہ آج میں یہاں شہر کے اندر موجود ہوں۔''

''کہیں ایسا نہ ہو محترم...... کہ آپ کی جان کو خدانخواستہ خطرات لاحق ہو جائیں۔''

''خطرات کا سامنا کیے بغیر تو ہم کچھ بھی حاصل نہیں کر سکتے بیٹا! کیا تم خطرات کا سامنا نہیں کرر ہے ہو۔ اگر تم باہر سے آ کر، اور اس جزیرے سے کوئی تعلق نہ رکھتے ہوئے یہاں کے لوگوں کے لیے خود پر مصیبتیں جھیل رہے ہو تو...... میں تو پھر یہاں کا باشندہ ہوں۔''

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''آپ کی ہر بات پر بس ''ہاں'' کہنے کو دل چاہتا ہے جناب! لیکن اگر آپ اجازت دیں تو ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔''

''میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ تم ہر بات بے تکلف کہو۔''

''جناب! آپ نے فرمایا ہے کہ یہاں کے لوگوں نے مجھ سے بہت زیادہ توقعات وابستہ کر لی ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ میں ان کے لیے نجات دہندہ ثابت ہونے والا ہوں، لیکن حقیقت یہ ہے محترم کہ میں اپنے اندر ایسی کوئی خوبی نہیں پاتا۔ لیڈ کرنے کے لیے اور خاص طور پر باقاعدہ جنگ میں لیڈ کرنے کے لیے بہت صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں اس حوالے سے خود کو صفر پاتا ہوں۔ لوگوں کی توقعات دیکھتا ہوں تو مجھ پر بہت بوجھ پڑ جاتا ہے۔''

محترم حاذق ذکری نے اطمینان سے میری طرف دیکھا اور بولے۔ ''میں تمہارے سوال کے جواب میں دو باتیں کہنا چاہتا ہوں بیٹا جی! یہ قول یونہی نہیں بنا ہوا کہ آوازِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو۔ جب بہت سے لوگ کسی پر اپنی محبتیں نچھاور کرتے ہیں اور اسے رہنمائی کے قابل سمجھتے ہیں تو یہ ایک خدائی اشارہ ہوتا ہے کہ اس شخص کے اندر وہ صلاحیتیں موجود ہیں جن کی توقع کی جا رہی ہے۔ دوسری بات تم نے جنگ و جدل کے حوالے سے کی ہے...... تو

بیٹا جی! یہ کوئی ضروری نہیں کہ جنگ ہی ہو۔"

میں بری طرح چونکا۔ "میں سمجھا نہیں محترم! کیا آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ جنگ کے بغیر بھی فتح ہو سکتی ہے؟"

"نہیں، میں اور بات کہہ رہا ہوں۔ میری بہن ہانا وانی اور اس کے بیٹے رائے زل نے جاما جی کی جائز حکومت کو بزور بازو ختم کیا ہے۔ ان کی حیثیت قابضین کی ہے۔ اب ان قابضین کے خلاف عام لوگ اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ انہیں اٹھنے کے لیے ایک لیڈر کی ضرورت تھی۔ ایک ایسا باہمت شخص جوان کے دل کی گہرائی کو چھو سکے اور تم نے اپنی بے پناہ برداشت اور استقامت سے ان کے دلوں کو چھوا ہے...... اب وہ جمع ہو رہے ہیں۔ گھروں سے نکلنے کا حوصلہ پا رہے ہیں اور جب صورتِ حال ایسی ہو جائے تو کئی دفعہ خونریز لڑائیوں کے بغیر ہی کامیابیاں مل جاتی ہیں۔"

"آپ نے مجھے اظہارِ رائے کی اجازت دی ہے جناب! اس لیے بہت ادب سے گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ رائے زل اور اس کے امریکی گماشتے آسانی سے ہار نہیں مانیں گے۔ خاص طور سے ان امریکیوں کو جہاں تک میں جانتا ہوں، آسانی سے اپنا قبضہ نہیں چھوڑتے۔ آپ...... تاریخ میں جھانک کر دیکھ سکتے ہیں۔ ویت نام سے لے کر عراق تک بے شمار مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔"

"قربانیاں تو دینا پڑیں گی شاہ زیب! مگر ہو سکتا ہے کہ وسیع پیمانے پر وہ خونریزی نہ ہو جس کے خدشات ہم سب کے دلوں میں ہیں۔"

کمرے سے باہر نعروں کی گونج مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ ترانہ بھی سنائی دیتا تھا......

ہم جاتے اندھیرے تک لڑیں گے...... ہم سچے سویرے تک لڑیں گے۔

جوں جوں دن کا اجالا پھیل رہا تھا، ہجوم میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ محترم ذکری نے اپنی گھنی بھنوؤں کے نیچے اپنی سوئی سوئی آنکھوں کو حرکت دی، پھر بولے۔ "ان آوازوں کو سنو۔ ان میں ایک کاٹ ہے۔ ایک پکار اور تڑپ ہے۔ یہ پکار اور تڑپ برسوں سے ان لوگوں کے دلوں میں موجود تھی مگر آج اسے جو زبان ملی ہے اس کے پیچھے قربانیوں کی داستان ہے اور مجھے یہ بھی کہنے دو کہ اس کے پیچھے...... تم ہو اور تمہاری وہ تصویر ہے جو یہاں چپے چپے پر نظر آ رہی ہے۔ اس تصویر نے مزاحمت کے لفظ کو نئے معنی دیئے ہیں۔ یہ جدوجہد کی علامت بن گئی ہے۔ درست کہا جاتا ہے کہ قدرت بڑے بڑے انقلابات کے لیے بعض اوقات ایسے بہانے

بھی ڈھونڈ لیتی ہے جو بظاہر چھوٹے نظر آتے ہیں۔"

میں نے محترم ذکری کے نورانی چہرے کی جانب دیکھا۔ یہ وہ شخص تھا جسے یہاں کے لوگ بہت بڑا اپیشن گو قرار دیتے تھے اور آج یہ پیشین گو کہہ رہا تھا کہ یہاں کچھ ہونے والا ہے۔ وہ پریشان ضرور تھا مگر اس کی آنکھوں میں امید کی کرنیں بھی تھیں۔

سجاول اور انیق دوسرے کمرے میں موجود تھے۔ میرے اور محترم ذکری کے درمیان مسلسل بات ہو رہی تھی۔ مادام ہاناوانی کی طرح محترم ذکری نے مجھے کسی ماورائی طاقت کے ذریعے زیر کرنے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ اپنی دلیلوں سے قائل کرنا چاہ رہے تھے اور یہ دلیلیں میرے دل پر اثر کر رہی تھیں۔

قید و بند کے دوران میں بینش نامی لڑکی کے ذریعے، محترم ذکری نے جس طرح میری ہمت بندھائی تھی وہ میرے لیے یادگار تھی۔ میں نے اس پر محترم ذکری کا شکریہ ادا کیا۔ انہوں نے کہا۔ "شکریے کے لائق تم ہو جو بغیر کسی غرض کے یہاں کے لوگوں کے لیے صعوبتیں جھیل رہے ہو۔" ہماری گفتگو کے دوران میں ہی محترم ذکری کا ایک باریش ساتھی چھوٹی چھوٹی نفیس پیالیوں میں ہمارے لیے قہوہ لے کر آیا۔ ابھی وہ کمرے میں ہی تھا کہ باہر سے سنائی دینے والی نعروں کی آواز فلک شگاف ہوگئی۔

محترم حاذق ذکری نے سوالیہ نظروں سے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا۔ وہ بولا۔ "لگتا ہے حضرت کہ لوگ محترم شاہ زیب کو اپنے درمیان دیکھنا چاہتے ہیں۔"

حاذق ذکری نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں...... یہ کوئی اور معاملہ لگتا ہے، کہیں پولیس یا فوج کے لوگ تو اندر نہیں آ گئے۔"

اس سے پہلے کہ مخاطب شخص جواب میں کچھ کہتا، للکارے سنائی دیئے اور پھر گولی کی آواز کانوں میں پڑی۔ "یا اللہ خیر!" حاذق ذکری کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

ہم اٹھ کر ساتھ والے کمرے میں پہنچے۔ یہاں کی کھڑکی سے باہر جھانکا تو صورتِ حال تشویشناک نظر آئی۔ گرے فورس اور ایجنسی کے لوگ دندناتے ہوئے یہاں پہنچ گئے تھے۔ کافی زیادہ نفری تھی۔ کئی اہلکار اینٹی تک ٹرک نما گاڑیوں سے چھلانگیں لگا کر نیچے اتر رہے تھے۔ اہلکاروں نے بلٹ پروف جیکٹس پہن رکھی تھیں۔ ان کے ہیلمٹس کے آگے شیشے کی بڑی بڑی شیلڈز تھیں۔ بہت سوں کے ہاتھوں میں ڈھالیں بھی دکھائی دے رہی تھیں یہ لوگ، مظاہرین پر اندھا دھند لاٹھی چارج کر رہے تھے۔

ایک بار پھر کئی فائر ہوئے۔ بے شک یہ ہوائی فائرنگ تھی مگر کسی بھی وقت سیدھی

فائرنگ بھی کی جا سکتی تھی۔ ہجوم کائی کی طرح پھٹنے لگا۔ لوگ نعرے لگا رہے تھے اور بھاگ بھی رہے تھے۔ حملہ آوروں نے بڑی پلاننگ کے تحت آگے اور پیچھے سے حملہ کیا تھا۔ بھگدڑ میں کئی افراد پاؤں تلے روندے گئے۔ ہم سے صرف چالیس پچاس قدم کی دوری پر ایک جواں سال عورت اپنے ڈیڑھ دو سالہ بچے کے ساتھ اوندھے منہ سڑک پر گری۔ اس نے بچے کو بدستور سینے سے چمٹائے رکھا۔ گرے فورس کے سپاہیوں نے عورت پر بے دریغ لاٹھیاں برسانا شروع کیں۔ دو نوجوان گرے سپاہیوں پر جھپٹے اور عورت کو بچانے کی کوشش کی۔ سپاہیوں نے عورت کو تو چھوڑ دیا مگر نوجوانوں کو بری طرح پیٹنا اور گھسیٹنا شروع کر دیا۔

لوگ بغلی گلیوں میں بھاگ رہے تھے اور سپاہی ان کے تعاقب میں تھے پھر لاٹھی چارج کے علاوہ آنسو گیس بھی استعمال ہونے لگی۔ کچھ باہمت نوجوان اب بھی ٹولیوں کی شکل میں یہاں وہاں موجود تھے اور سپاہیوں پر زبردست پتھراؤ کر رہے تھے۔ پولیس ان کی طرف بھاگتی تھی تو وہ گلیوں میں غائب ہو جاتے تھے لیکن پھر فوراً ہی دوسری طرف سے نمودار ہو کر پتھراؤ کرنے لگتے تھے۔ میدانِ جنگ کا سا منظر تھا۔ جو مظاہرین گرفتار ہو رہے تھے انہیں بیدردی سے گرے فورس اور پولیس کی گاڑیوں میں پھینکا جا رہا تھا۔

میں نے حاذق ذکری سے کہا۔ ''ہم کیا کر سکتے ہیں جناب؟''

''ابھی تو کچھ کرنے کا موقع نہیں۔'' انہوں نے کہا۔ ان کی نگاہیں بھی دوسروں کی طرح سامنے میدان کا جائزہ لے رہی تھیں۔

آنسو گیس نے اب ہم پر بھی اثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ حاذق ذکری کے میزبان نے کہا۔ ''حضرت! آپ دونوں اندر تشریف لے چلیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ آپ کو بھی گرفتار کرنے کی کوشش کریں۔''

''نہیں، وہ اتنی جلدی ایسا قدم نہیں اٹھائیں گے۔'' حاذق ذکری نے پورے وثوق سے کہا۔

دوسرے شخص نے چند بھیگے ہوئے کپڑے تھام رکھے تھے۔ اس نے ایک کپڑا حاذق ذکری کو اور دوسرا مجھے دے دیا۔ آنسو گیس کے اثرات کم کرنے کے لیے ہم نے یہ کپڑے اپنے چہروں پر رکھ لیے۔

مجھ سے کچھ ہی فاصلے پر گرے سپاہی اور ایجنسی کے سفید فام گارڈز ایک چودہ پندرہ سالہ خوب صورت لڑکے کو گھسیٹتے ہوئے سرکاری ٹرک کی طرف لے جا رہے تھے۔ ایک عورت جو بچے کی والدہ تھی اس سے چمٹی ہوئی تھی اور اسے چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ

بھی بچے کے ساتھ ہی گھسٹتی چلی جارہی تھی۔ دو تین مظاہرین بھی لڑکے کو چھڑانے کی کوشش میں عورت کا ساتھ دے رہے تھے۔فورس کے اہلکاروں نے عورت کو اندھا دھند پیٹنا شروع کر دیا مگر وہ لڑکے سے چمٹی رہی۔ اس کا لباس کئی جگہ سے پھٹ چکا تھا اور وہ عریاں ہو رہی تھی۔ وہ کبھی چلاتی تھی کبھی اہلکاروں کی منتیں کرنے لگتی تھی۔ اہلکار زخمی لڑکے کو گھسیٹتے ہوئے ٹرک کے بالکل قریب پہنچ چکے تھے۔ اچانک میں نے سجاول کو دیکھا وہ بھاگتا ہوا ایک جانب سے نکلا اور ٹرک کی طرف بڑھا۔ اس کے پیچھے دس پندرہ مظاہرین کی ایک ٹولی تھی۔ یہ لوگ گرے سپاہیوں اور گارڈز پر ٹوٹ پڑے۔ زبردست مارا ماری کے دوران میں دو نوجوان...... لڑکے کو چھڑانے میں کامیاب ہوئے اور اسے بھگاتے ہوئے محفوظ مقام تک لے گئے۔ میں نے سجاول کو دیکھا، وہ بپھرا ہوا تھا۔ اس نے کسی پولیس اہلکار سے لاٹھی چھین لی تھی اور اندھا دھند چلا رہا تھا۔ تین چار مظاہرین بھی اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ ایک امریکن گارڈ جس کا ہیلمٹ گر گیا تھا، سجاول کی زوردار لاٹھی سر پر کھا کر کٹے ہوئے شہتیر کی طرح زمین پر گرا۔

''مارو ان حرامیوں کو۔'' سجاول کی گرج ہم تک پہنچی۔ اس نے اپنی کرپان نکال لی تھی۔

سجاول کی زبردست مزاحمت دیکھ کر چند سیکنڈ کے اندر درجنوں مظاہرین اس مقام پر اکٹھے ہو گئے، مجھے اب ان میں انیق بھی نظر آرہا تھا۔ اس نے سجاول کے کندھے سے کندھا ملا رکھا تھا۔ مخدوش صورتِ حال دیکھ کر سپاہی اور سفید فام گارڈز وہاں سے پسپا ہوئے اور اپنے ٹرکوں کے قریب پناہ لے لی۔

زبردست پتھراؤ اور شیلنگ کے دوران میں مظاہرین، لڑکے کی ماں اور دو زخمی مظاہرین کو بھی خطرے کی زد سے نکال لے گئے۔ سجاول اور انیق بھی اپنی چار دیواری کی طرف واپس آگئے۔ مظاہرین پھر جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ انہوں نے دانشمندی کا مظاہرہ کیا تھا اور اب اس مکان کے اردگرد جمع ہو رہے تھے جہاں میں اور حاذق ذکری وغیرہ موجود تھے۔ اس بات کا خدشہ بالکل درست تھا کہ ہم پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ دیکھا دیکھی مظاہرین کی اور کئی ٹولیاں بغلی گلیوں سے برآمد ہوئیں اور مکان کے حفاظتی حصار میں شامل ہو گئیں۔

میرے کہنے پر ایک ملازم سجاول اور انیق کو ہمارے پاس لے آیا۔ سجاول ابھی تک مشتعل نظر آرہا تھا۔ اس کی پگڑی کھل چکی تھی جو اس نے گلے میں ڈال رکھی تھی۔ کسی اہلکار کی لاٹھی روکتے ہوئے اس کے ایک ہاتھ پر چوٹ بھی آئی تھی۔

محترم ذکری نے تعریفی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ میں نے کہا۔ ''تم نے اچھا

کیا سجاول! اس سے لوگوں کا حوصلہ بڑھا اور انہوں نے لڑکے کو چھڑا لیا۔"

سجاول اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ "مجھے لگتا ہے، اب یہ لڑائی رکنے والی نہیں ہے۔ رائے زل کے پالتو ابھی تو لوگوں کو پکڑ کر واپس چلے گئے ہیں مگر جلد ہی دوبارہ آ جائیں گے۔"

"اندازاً کتنے لوگ گرفتار ہوئے ہوں گے؟" میں نے انیق سے پوچھا۔

وہ بولا۔ "دو بھرے ہوئے ٹرک اور ایک بھری ہوئی "قیدی گاڑی" تو میں نے خود دیکھی ہے۔ پکڑے جانے والوں میں عورتیں بھی شامل ہیں لیکن ایک خاص بات کا شاید آپ کو پتا نہ ہو۔ ناظم باذان صاحب بھی گرفتار ہوئے ہیں۔ ٹرک پر چڑھاتے ہوئے ان کے ساتھ بہت مار پیٹ بھی کی گئی ہے۔"

سجاول نے کہا۔ "اتنے لوگوں کے درمیان سے ان کے لیڈر کو اس طرح پکڑ کر لے جانا، بڑی دیدہ دلیری ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ یہاں کے بندوں میں جوش تو بہت زیادہ ہے مگر یہ جوش جھاگ کی طرح بیٹھ بھی جاتا ہے۔"

انیق بولا۔ "اصل میں لوگ لیڈر کے پیچھے لڑتے ہیں۔ ہر ہائی نس قسطینا کے بعد ان میں کوئی لیڈ کرنے والا نظر نہیں آ رہا۔"

میں دیکھ کر ٹھٹکا۔ سجاول کی کرپان کے دستے پر خون کے چھینٹے نظر آ رہے تھے۔ محترم ذکری نے بھی شاید یہ منظر دیکھ لیا تھا اور وہ چونکے ہوئے نظر آئے تھے۔

"کیا تم نے کرپان کسی کو ماری ہے؟" میں نے سجاول سے پوچھا۔

"کرپان مارنے کے لیے ہی تو ہوتی ہے۔" وہ بے پروائی سے بولا۔

"کسی کا پیٹ تو نہیں پھاڑ دیا؟" میں نے دریافت کیا۔

"جی تو پیٹ پھاڑنے کو ہی چاہ رہا تھا مگر پھر لحاظ کیا۔ ایک گورے کے پٹ (ران) پر ماری ہے۔"

میں نے کہا۔ "اس رائی کو بھی یہ لوگ پہاڑ بنائیں گے۔ گورے کا معاملہ ہے۔"

"پہاڑ تو اب بننا ہی بننا ہے جی۔" انیق نے کہا۔ "ویسے پٹ اور پیٹ میں فرق بھی تھوڑا ہی ہوتا ہے۔"

میں نے حاذق ذکری کو بتایا کہ میرے ساتھی نے کسی کو مارا نہیں ہے۔ صرف ایک امریکی کی ٹانگ زخمی کی ہے۔"

لاٹھی چارج اور شدید آنسو گیس کے بعد منتشر ہو جانے والا ہجوم اب پھر جمع ہو رہا تھا۔ سورج کی روپہلی کرنیں در و دیوار کو روشن کر رہی تھیں۔ سامنے میدان میں پتھراؤ میں استعمال

ہونے والے بے شمار پتھر اور اینٹوں کے ٹکڑے پڑے تھے۔ ان کے درمیان مظاہرین کی جوتیاں، اور ٹوپیاں وغیرہ بکھری ہوئی تھیں۔ کہیں کہیں جلے ہوئے ٹائر اور خون کے دھبے دکھائی دیتے تھے۔

حاذق ذکری کے ایک ساتھی نے آکر ملائی میں بتایا۔ ''حضرت! کم از کم دو سو افراد گرفتار ہوئے ہیں جن میں جناب باذان بھی شامل ہیں۔ لاٹھی چارج سے ان کے ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ اب تک کی اطلاع کے مطابق دو افراد جاں بحق ہوئے ہیں، زخمی ہونے والوں کی تعداد ساٹھ کے لگ بھگ ہے۔''

اسی دوران میں نعروں کی بلند گونج ایک بار پھر ہمارے کانوں تک پہنچنے لگی۔ یہ آوازیں کچھ اس طرح تھیں۔

محترم باذان کو رہا کرو

خون کا بدلہ خون

ماریں گے مر جائیں گے

ان نعروں اور للکاروں میں وقفے وقفے سے میرا نام بھی سنائی دے رہا تھا۔ حاذق ذکری نے میری طرف دیکھا اور دھیمے لہجے میں بولے۔ ''لوگ بکھرے ہوئے ہیں اور ان کے ذہن بھی منتشر ہیں۔ انہیں سنبھالا دیئے جانے کی ضرورت ہے۔''

میں حاذق ذکری کی بات کا مطلب سمجھ رہا تھا۔ وہ چاہ رہے تھے کہ میں لوگوں کے سامنے جاؤں اور انہیں حوصلہ دوں۔

پتا نہیں کیوں، تھوڑی ہی دیر کی ملاقات کے بعد میرے لیے یہ ممکن نہیں رہا تھا کہ میں حاذق ذکری کی کسی بات پر انکار کروں۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ انیق نے میرے منع کرنے کے باوجود مجھے سہارا دیا۔ میں آہستہ آہستہ چلتا کمرے سے باہر نکلا اور ایک چبوترہ نما جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ میرا جسم جیسے چور چور تھا۔ بہرحال آج کل میں اپنے کندھے کو بالکل درست محسوس کر رہا تھا۔ گزرے ہوئے شب و روز نے مجھے ٹمپریچر سیل کی ہولناک اذیت سے تو ضرور گزارا تھا مگر میرے کندھے کو آپریشن کے بعد اچھی ریکوری فراہم کر دی تھی۔ سامنے میدان اور اردگرد کی گلیوں میں لوگ بڑی تعداد میں دکھائی دے رہے تھے۔ جا بجا کے دو رنگے جھنڈے کے ساتھ ساتھ کچھ کتبے اور تصویریں بھی لہرائی جا رہی تھیں۔ ان تصویروں میں قسطینا کے علاوہ شہید کمانڈر افغانی کی تصویریں بھی لہرائی جا رہی تھیں۔ مگر جو تصویر بہت بڑی تعداد میں نظر آ رہی تھی وہ میری وہی ٹارچر سیل والی تصویر تھی۔

مجھے دیکھ کر ہجوم میں ہلچل نمودار ہوئی اور فلک شگاف نعرے لگنے لگے۔ میں کوئی سیاسی لیڈر نہیں تھا لیکن آج اپنی تمام تر نقاہت کے باوجود مجھے تقریر کرنا پڑ رہی تھی۔ آنسو گیس کے اثرات ابھی تک گلے کو متاثر کر رہے تھے۔

میڈیا کے تین چار نمائندے بھی موقع پر پہنچ گئے اور انہوں نے اپنے کیمرے آن کر لیے۔ ایک شخص پکار کر بولا۔ ''مائیک لاؤ...... جلدی۔''

فوری طور پر مائیک کا انتظام تو نہیں ہوا لیکن ایک طاقتور میگا فون میرے منہ کے سامنے کر دیا گیا۔ بولیے جناب! لوگ آپ کو سننا چاہتے ہیں۔'' ایک شخص نے بڑی ''عقیدت'' سے مجھے مخاطب کیا۔

میں بڑے تحمل سے بات کرنا چاہتا تھا اور چاہتا تھا کہ لوگوں کو نظم و ضبط کی ہدایت کروں لیکن پتا نہیں کیا ہوا، میں نے جب بولنا شروع کیا تو جذبات کا دھارا مجھے مختلف سمت میں بہا لے گیا۔ میرے اندر کی کڑھن اور تلخی نے میرے الفاظ کو آتشیں بنا دیا۔ میں نے کچھ فقرے ملائی میں، کچھ انگلش میں اور کچھ شاید اردو میں بھی بول دیئے۔ میری تقریر کچھ اس طرح سے تھی۔

''جو لوگ خود اپنی حالت نہ بدلنا چاہیں ان کی حالت کوئی نہیں بدل سکتا۔ تم لوگ گھروں سے نہیں نکلو گے، اپنی جان ہتھیلیوں پر نہیں رکھو گے تو کچھ نہیں ہو سکے گا۔ اگر تم لوگ تھوڑے تھوڑے کر کے مرنا چاہتے ہو اور مجھے بھی مروانا چاہتے ہو...... تو ٹھیک ہے۔ ایسے ہی سہی۔ ہم ابھی چل پڑتے ہیں اور اس پولیس اسٹیشن پر حملہ کر دیتے ہیں جہاں محترم باذان کو رکھا گیا ہے۔ میں نے یہاں آ کر بہت کچھ کھویا ہے جو باقی ہے میں وہ بھی گنوانے کے لیے تیار ہوں...... پوری طرح تیار ہوں۔ یہاں کھڑے ہو کر کان پھاڑنے والے نعرے مت لگاؤ۔ آؤ، چلو میرے ساتھ، میں وعدہ کرتا ہوں کہ جب ہم پر گولیوں کی بارش ہو گی تو میں ایک انچ پیچھے نہیں ہٹوں گا اور ان لوگوں میں شامل ہوں گا جو سب سے پہلے اپنی چھاتی سرخ کریں گے۔ چلو...... آؤ...... آ جاؤ۔''

ہجوم اپنی جگہ ساکت کھڑا رہا۔ سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ میری آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ تبارک اور سیف کی موت کے مناظر نگاہوں میں گھوم گئے۔ کئی لمحے اسی طرح خاموشی میں گزر گئے۔ سینکڑوں کا مجمع تھا لیکن کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ہجوم کے عقب میں فقط کچھ عورتوں کے نوحے تھے۔ یہ وہ عورتیں تھیں جن کے پیارے جاں بحق یا شدید زخمی ہوئے تھے۔

خاموشی طویل ہو گئی تو میں نے کہا۔ ''میری بات دھیان سے سنو۔ تمہارے شہر پر قبضہ کیا گیا ہے، تمہاری آزادی چھینی گئی ہے۔ انقلاب چاہتے ہو تو گھروں سے نکلو۔ خوف کی دیواریں گرا دو۔ ہر دروازہ کھل جائے، ہر گلی بھر جائے، جاماجی کی ہر سڑک پر انسانوں کا دریا بہتا نظر آئے۔ اپنے گریبان چاک کر دو، اپنے سینے گولیوں اور سنگینوں کے لیے کھول دو۔ اپنے سروں پر کفن باندھ لو، بس یہی ایک راستہ ہے آزادی کا۔ باقی سارے راستے ذلت، بے غیرتی اور غلامی کی طرف جاتے ہیں۔''

سکتہ زدہ سے ہجوم میں ایک لہر پیدا ہوئی۔ بے ساختہ سینکڑوں بازو فضا میں بلند ہوئے اور سینکڑوں لبوں نے حرکت کی۔ نعروں کی گونج سے درودیوار لرز گئے۔

میں نے کہا۔ ''میں ایک عام ایم اے فائٹر ہوں۔ کوئی سیاسی دانشور یا لیڈر نہیں ہوں لیکن میرا دل ایک گواہی دے رہا ہے اور وہ گواہی یہ ہے کہ جاماجی کی تقدیر کا فیصلہ اگلے ایک یا دو دن میں ہو جانا ہے۔ تخت یا پھر ہمیشہ کے لیے تختہ۔ کیا تم لوگ یہ چاہتے ہو کہ رائے زل اور اس کے غیر ملکی گماشتے یہاں سے نکل بھاگیں۔ تمہاری آزادی تمہیں واپس مل جائے؟''

سینکڑوں لوگوں نے بیک زبان کہا کہ وہ چاہتے ہیں۔ میں نے کہا۔ ''تو پھر ایک بات یاد رکھنا۔ قطرہ جب اکیلا ہوتا ہے تو ایک حقیر بوند کہلاتا ہے۔ لیکن جب وہ اکیلا نہیں رہتا تو پھر دریا اور سمندر کہلاتا ہے۔ اس کے رستے میں آنے والی ہر چیز خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتی ہے۔ مجھے بتاؤ...... کل شام تک اس جگہ چند قطرے ہوں گے یا ایک سمندر ہو گا؟''

میں نے یہ جملے ملائی زبان میں کہے تھے۔ بہت سی آوازوں نے پکار کر جواب دیا۔

''یہاں ایک سمندر ہو گا۔''

میں نے کہا۔ ''تو پھر منتشر ہو جاؤ۔ گلی گلی اور کوچے کوچے پھیل جاؤ۔ میری اور محترم حاذق ذکری کی طرف سے یہ پیغام چپے چپے پر اور بچے بچے تک پہنچا دو کہ کل یہاں جاماجی کی تقدیر کا فیصلہ ہو گا، خدا حافظ۔''

آخری الفاظ کہتے کہتے مجھے جیسے نقاہت کے سبب چکر سے آنے لگے تھے۔ انیق مجھے سہارا دیتا ہوا اندر لے گیا۔ باذان کے محافظوں نے دروازے کے سامنے پوزیشن لے لی۔ میرا دل بے حد شدت سے دھڑک رہا تھا۔ نسوں میں آگ سی لگی ہوئی تھی۔ محترم ذکری نے میری طرف قدرے حیرت سے دیکھا اور بولے۔ ''تم بہت اچھا بولے۔ کسی کو امید نہیں تھی کہ تم اس انداز میں بات کرو گے۔ میں تم سے کہہ رہا تھا نا کہ جب قدرت کسی پر غیر معمولی

ذمے داری ڈالتی ہے تو پھر اسے غیر معمولی توانائی بھی عطا کرتی ہے۔"

میرے اردگرد موجود سب لوگوں کے چہرے جوش سے تمتمائے ہوئے تھے۔ باہر نعروں کی گونج تھی۔ محترم ذکری نے کہا۔"شاہ زیب! تم نے ایک طرح سے ٹریگر دبا دیا ہے۔ گولی بیرل سے نکل چکی ہے۔ اب کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا۔"

میزبان بدرقہ بولے۔"میرے اندازے کے مطابق اگلے 18 گھنٹے اب بہت اہم ہیں۔ گرے فورس اور ایجنسی کی پوری کوشش ہوگی کہ لوگ یہاں بڑی تعداد میں جمع نہ ہونے پائیں۔ وہ ہر حربہ آزمائیں گے۔ چھاپے ماریں گے، مرکوزا کی طرف آنے والے راستوں پر رکاوٹیں کھڑی کریں گے اور وہ سب کچھ جو ایسے موقعوں پر ہوتا ہے۔"

محترم ذکری نے سفید داڑھی میں انگلیاں چلائیں اور کھوئے کھوئے لہجے میں بولے۔ "لیکن اگر ایک بار عوامی ردِعمل کا پہیہ حرکت میں آ گیا تو پھر اسے روکنا بہت مشکل ہوگا۔ انسانوں کا سیلاب ہو تو کہاں تک خون بہایا جاسکتا ہے، کہاں تک زندگیاں چھینی جاسکتی ہیں؟ اور مجھے لگتا ہے کہ وہ موقع آ گیا ہے جب جاما جی کے باشندے ایک سیلاب کی صورت اختیار کر سکتے ہیں۔ آدم کی شہادت سے لے کر کمال احمد کی موت تک بہت سے ظلم انہوں نے سہے ہیں اور ہر ظلم کا ردِعمل ان میں جمع ہوتا رہا ہے۔ تمہاری زخم زخم تصویر نے اس بکھرے ہوئے ردِعمل کو ایک مرکز فراہم کیا ہے۔"

ایک شخص نے اندر آ کر ادب سے محترم ذکری کو سلام کیا اور بولا۔"حضرت! ابھی ابھی خبر آئی ہے کہ ائیرپورٹ کے علاقے میں ایک بہت بڑے جلوس نے گرے فورس کی پوسٹ پر حملہ کیا ہے۔ گرے فورس کی فائرنگ سے دس افراد موقع پر جاں بحق ہوئے ہیں اور بہت سے زخمی ہیں۔"

محترم ذکری جیسے بے دم سے ہو کر نشست پر بیٹھ گئے۔ ان کے چہرے سے محسوس ہو رہا تھا کہ انہیں دس افراد کی نہیں اپنے دس بچوں کی موت کی خبر ملی ہے۔

دوسرے شخص نے کہا۔"بے شمار لوگوں نے میتوں کے ساتھ ڈی پیلس کو جانے والی سڑک پر احتجاج شروع کر دیا ہے۔ صورتِ حال کشیدہ ہے۔ اس کے علاوہ سٹی سینٹر کی طرف بھی ہنگامے کی اطلاع آئی ہے۔ گرے فورس کی چند فی میل اہلکار ایک خاتون کو گرفتار کرنے کے لیے ایک گھر میں گھسنا چاہ رہی تھیں، ان میں سے دو کو گولی مار کر شدید زخمی کر دیا گیا ہے۔ فورس کی کئی گاڑیوں کو آگ لگا دی گئی ہے۔"

ناظم باذان کے نائبین کی تعداد پندرہ کے قریب تھی۔ یہ سب بڑی عمر کے جہاندیدہ

افراد تھے۔ یہ جان چکے تھے کہ حالات تیزی سے بگڑ رہے ہیں اور ہوسکتا ہے کہ ناظم باذان کے بعد مجھے اور محترم ذکری کو بھی گرفتار کرنے کی کوشش کی جائے۔ ان نائبین کے حکم پر پاسبان بریگیڈ کے قریباً دوسو مسلح افراد نے ہماری قیام گاہ کو گھیرے میں لے لیا۔ اس حفاظتی حصار کے باہر ایک اور حصار تھا اور یہ مظاہرین کا تھا۔ ان کی تعداد بھی دو تین ہزار سے کم نہیں تھی۔

میری درخواست پر حاذق ذکری نے تاجور کو بھی اسی عمارت میں بلا لیا۔ میں نے اس سے علیحدہ کمرے میں ملاقات کی۔ تازہ ہنگامے کے بعد وہ مزید ڈری ہوئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ہم اس لڑائی میں بری طرح الجھتے چلے جارہے ہیں۔ وہ میری صحت کے حوالے سے بھی بے حد فکر مند تھی، بولی۔ ''آپ کا چہرہ بتا رہا ہے کہ آپ کو تیز بخار ہے۔ آپ کے زخم بھی ٹھیک نہیں ہو رہے۔ آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔''

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم بھی خود کو سنبھالے رکھو۔ تمہارا پریشان چہرہ دیکھتا ہوں تو خود کو بہت کمزور محسوس کرنے لگتا ہوں۔''

''آپ کا کیا خیال ہے، ہم کب تک یہاں سے نکل سکیں گے؟''

''مجھے ایسے لگتا ہے تاجور، اب یہ معاملہ کسی طرف لگنے والا ہے۔ لوگوں میں ایک لہر پیدا ہوئی ہے۔ وہ اپنے حق کے لیے کھڑے ہو رہے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ایک آدھ دن میں ہی کوئی نتیجہ نکل آئے۔''

وہ غم ناک لہجے میں بولی۔ ''کبھی تو دل چاہتا ہے کہ...... میں یہاں سے واپس ہی نہ جاؤں۔ اسی ہنگامے میں ہی کہیں ختم ہو جاؤں۔ میں اپنے پیدا کرنے والوں کے لیے بڑی بڑی مصیبتیں لا رہی ہوں...... اور اب تو...... میری وجہ سے ان پر بھی مصیبتیں آ رہی ہیں جن سے میرا ابھی تعلق بھی نہیں بنا۔''

''شاید تم سیف اور اس کے گھر والوں کی بات کر رہی ہو؟''

اس نے سر جھکا لیا اور دو آنسو اس کی آنکھوں سے لڑھک گئے۔ وہ سسکی۔ ''میں خیالوں میں دیکھتی ہوں تو مجھے اس کی ماں نظر آتی ہے جو اب بھی شاید مصلے پر بیٹھی ہو گی یا پھر اپنے بیٹے کی خیر خیریت کے لیے بچوں میں چاول بانٹ رہی ہو گی۔''

''خدا کے کاموں میں کسی کو دخل نہیں تاجور! لیکن ہم یہاں سے زندہ واپس چلے گئے تو اس ماں کے دکھوں کا مداوا کرنے کی پوری کوشش کریں گے۔''

وہ عجیب لہجے میں بولی۔ ''زندہ ہی رہنے کو تو دل نہیں چاہتا اب۔''

میں نے اس کا ہاتھ تھاما۔ ''تم خود ہی تو کہا کرتی تھیں کہ مایوسی کفر ہے۔''

اس نے میری طرف دیکھا۔ مجھے لگا کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے مگر پھر رک گئی۔ میرے دوسرے ہاتھ کو چھو کر بولی۔ ''آپ کا جسم آگ کی طرح تپ رہا ہے۔ آپ کی گردن کے زخم بھی اسی طرح بگڑے ہوئے ہیں۔''

میں نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ ''یہ بہار کا موسم ہے۔ شاید میرے زخموں پر بھی بہار آئی ہوئی ہے۔''

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا...... اور شاید میری بات کی گہرائی سمجھنے کے بعد میرے ہاتھوں کو چھوڑ دیا۔

رات تک میرا بخار جوں کا توں تھا۔ دو ڈاکٹرز وقفے وقفے سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے میری پسلیوں کے قریب سے کچھ اور متاثرہ جلد کاٹ دی تھی تاکہ وہ باقی جسم میں انفیکشن پیدا نہ کرے۔ مجھے زیادہ فکر اپنے پاؤں کی تھی۔ میں ان پر اپنے جسم کا پورا وزن ڈالنے میں ناکام ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر کھڑا رہنے کے بعد مجھے بیٹھنا پڑتا تھا۔ میرے پاؤں کے زخموں پر ڈاکٹروں نے بینڈیج نہیں کی تھی مگر میری پنڈلیاں اور دونوں کلائیاں بدستور پٹیوں میں جکڑی ہوئی تھیں۔ کلائیوں کی پٹیاں اسی سنگین واقعہ کی نشانی تھیں جب میں نے تاجور کو بدترین تشدد سے بچانے کے لیے اپنی شریانیں کاٹ لی تھیں۔

میں تاجور میں عجیب تبدیلی دیکھ رہا تھا۔ وہ مسلسل میری تیمارداری میں مصروف تھی۔ رات کو بخار تیز ہوا تو اس نے مجھے لیٹنے پر مجبور کر دیا اور میرے ماتھے پر ٹھنڈی پٹیاں رکھنے لگی۔ کبھی میرے پاؤں بھگوتی تھی، کبھی چہرے پر گیلا کپڑا پھیرتی تھی۔ نرس اس کی مدد کر رہی تھی۔ رات بارہ بجے کے لگ بھگ ان کوششوں سے میرا بخار کم ہو گیا۔

میرے استفسار پر انیق نے بتایا۔ ''شہر میں ہنگامے پھوٹے ہوئے ہیں۔ کئی جگہ مظاہرین اور گرے فورس میں جھڑپیں ہوئی ہیں۔ بپھرے ہوئے لوگ ٹولیوں کی شکل میں مرکوزا کی طرف آنا چاہتے ہیں مگر پورے مرکوزا کو گرے فورس اور ایجنسی کے گارڈز نے اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے...... سخت ترین چیکنگ کے بعد صرف مرکوزا کے رہائشیوں کو ہی اندر آنے دیا جا رہا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ کل یہاں لوگ جمع نہیں ہو سکیں گے؟''

''نہیں...... جمع تو ہوں گے مگر ان کی تعداد شاید دو ڈھائی ہزار سے زیادہ نہیں ہو گی۔''

''تو پھر......؟''

''لیکن ایک اچھی خبر یہ ہے کہ جن گروپوں کو مرکوزا کے علاقے میں آنے نہیں دیا جا رہا وہ واپس جانے کے بجائے وہیں مین سڑک اور اردگرد کی سڑکوں پر جمع ہو رہے ہیں۔''

''محترم ذکری کیا کہتے ہیں؟''

''وہ تو کچھ نہیں کہہ رہے، مگر ناظم باذان صاحب کے سارے نائب منصوبہ بندی میں مصروف ہیں۔ ان کا پروگرام ہے کہ اگر عام لوگوں کو مرکوزا میں نہ آنے دیا گیا اور یہاں زیادہ لوگ جمع نہ ہو سکے تو پھر یہاں موجود لوگ مرکوزا سے باہر نکلیں گے اور مین روڈ والے ہجوم میں شامل ہو جائیں گے۔ محترم ذکری یہاں مرکوزا میں جمع ہونے والے لوگوں کی قیادت کرنا چاہتے ہیں مگر نائبوں کی جماعت اس بارے میں بڑی سخت ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''وہ محترم ذکری اور آپ کو ہر قسم کے خطرے سے دور رکھنے پر متفق ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ محترم ذکری کل اس عمارت سے باہر قدم نکالیں...... اور آپ کی تو حالت ہی ایسی نہیں کہ باہر نکل سکیں۔''

مجھے اپنی جسمانی حالت کا اتنا دکھ نہیں تھا جتنا اپنی لاچاری کا رنج تھا۔ ایک اہم ترین موقعے پر میں خود کو بے بس محسوس کر رہا تھا۔

انیق نے کہا۔ ''ہمارا یہ اندازہ درست تھا کہ یہ لوگ رائی کا پہاڑ بنائیں گے۔ آقا جان کا ایک مکاری بھرا بیان بار بار ٹیلی کاسٹ کیا جا رہا ہے۔ اس میں وہ کہتا دکھائی دیتا ہے کہ مرکوزا میں ہماری امن پسندی کا جواب بدمعاشی اور ننگی جارحیت سے دیا گیا ہے۔ لاء انفورس کرنے والی ایجنسیوں کی طرف سے صرف لاٹھی چارج کیا گیا یا آنسو گیس استعمال ہوئی مگر مظاہرین میں مسلح افراد موجود تھے انہوں نے خنجروں اور کرپانوں سے حملے کر کے کئی اہلکاروں کو شدید زخمی کر دیا ہے۔ ہماری شرافت کو کمزوری سمجھا گیا ہے۔ اب ہم شرپسندوں کے ساتھ آہنی ہاتھوں سے نمٹیں گے۔''

''اس کا عملی مظاہرہ بھی ضرور کیا ہوگا اس خبیث نے؟''

''بالکل جناب، اس بیان کے فوراً بعد ہی مرکوزا کی ناکابندی کی گئی اور سینکڑوں مزید لوگ گرفتار ہوئے۔ مختلف واقعات میں کم و بیش چودہ افراد جاں بحق بھی ہوئے۔ پورے شہر سے آپ کی تار تار چرسیل والی تصویر اتار دی گئی ہے اور اس کو جمع کر کے نذر آتش کیا گیا ہے لیکن کہا جا رہا ہے کہ کچھ علاقوں میں پھر وہی تصویر دیواروں پر نظر آ رہی ہے۔''

''آقا جان کا بیان خطرناک ہے۔ لگتا ہے کہ وہ بہت سخت حکمتِ عملی اپنائے گا۔''

اچانک شہر میں کہیں دور فائرنگ کی آوازیں سنائی دیں۔ یہ پستول اور چھوٹی رائفلوں کے فائر تھے۔ پھر کسی ایم ایم جی کے تین چار برسٹ بھی چلے۔ اس کے فوراً بعد ہی ایمبولینسز کے الارم سنائی دینے لگے۔ یہ سب کچھ شہر میں موجود کشیدگی کی نشاندہی کرتا تھا۔

میرا ذہن بار بار اس ٹاپو کی طرف چلا جاتا تھا جو یہاں سے کئی میل دور کھلے سمندر میں تھا۔ اس ٹاپو میں زیرزمین خلا کے اندر ایک تاریک دریا بہتا تھا اور ایسی سنگلاخ چٹانیں تھیں جنہوں نے کبھی سورج کی روشنی نہ دیکھی تھی۔ اس اندھیری جگہ پر زینب، ابراہیم موجود تھے اور قسطینا بھی اپنے دیگر ساتھیوں سمیت۔ وہ سب لوگ رائے زل کو بے انتہا مطلوب تھے اور ان تک پہنچنے کے لیے وہ ہر حد تک جانے کو تیار تھا۔ پتا نہیں کہ اس وقت وہ لوگ کیا کر رہے تھے، کیا سوچ رہے تھے؟ میرا دل ابراہیم اور زینب کے لیے بے چین ہونے لگا۔ وہ نوخیز پھولوں جیسا معصوم جوڑا۔ مجھے کل انیق نے بتایا تھا کہ ابراہیم کی حالت کچھ زیادہ اچھی نہیں ہے۔ وہ آر یا پار کے مقولے پر عمل کر رہا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ یا تو اس زہر والی مجبوری کو ختم کر دے گا یا پھر خود ختم ہو جائے گا۔

انیق سے یہ سب کچھ سننے کے بعد میری تشویش بڑھ گئی تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے لگا تھا کہ ابراہیم کی حالت کے بارے میں انیق گھٹا کر بتا رہا ہے لیکن سوچنے کی بات یہ تھی کہ ہم ان حالات میں اس کے لیے کیا کر سکتے ہیں۔

O.....❖.....O

وقت آگے کو سرک رہا تھا۔ رات دھیرے دھیرے سویرے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ سویرا جو خون رنگ تھا اور جس کے اُجالے میں اَن گنت اندیشے زہریلے سانپوں کی طرح پھنکار رہے تھے۔ تاجور کئی گھنٹوں سے مسلسل میری دیکھ بھال میں مصروف تھی۔ کرنل احرار اندر داخل ہوا اس نے تاجور کو چھوٹی بہن کہہ کر مخاطب کیا اور اسے کچھ آرام دینے کے لیے زبردستی میرے پاس سے اٹھا دیا۔ اس نے میرے زخموں کو دیکھا اور مجھ سے تسلی تشفی کی باتیں کرنے لگا۔ میں نے کہا۔ ”کرنل تم نے کمپاؤنڈر ارکب کے روپ میں جو کچھ کیا وہ یادگار رہے گا۔ تمہاری اتاری ہوئی تصویر نے جاما جی کے لوگوں میں ایک نئی ترنگ پیدا کی ہے۔“

”لیکن مسٹر شاہ زیب! اس تصویر کا اصل کریڈٹ تو تم کو ہی جاتا ہے۔ میں تو صرف اتارنے والا ہوں۔“

”تم وہاں تک پہنچے کیسے کرنل؟“

کرنل احرار نے اپنی چھوٹی چھوٹی سیاہ داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”میں دراصل

ڈاکٹر ماریہ کے ساتھ اٹیچ تھا۔ ڈاکٹر ماریہ کو تو تم جانتے ہونا مسٹر شاہ؟''
''بہت اچھی طرح، وہی جو آج کل رائے زل کی ذاتی معالج ہے......اور حقیقت میں اس کی ذاتی KEEP ہے۔''
''ہاں وہی۔ ڈاکٹر ماریہ کو ٹارچر سیل میں تمہارے معائنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ میں اس کے ساتھ تھا۔ شاید ڈاکٹر ماریہ کو اس سیل میں بھیجنے کا مقصد یہ بھی ہو کہ وہ اپنی آنکھوں سے رائے زل کے مخالفوں کا انجام دیکھ سکے۔ اور یقیناً وہ منظر عبرتناک تھا۔ ہم دونوں ہی کانپ کر رہ گئے تھے۔ مسٹر شاہ! تم نیم بے ہوش تھے۔ تم نے ایک دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی اور کھسکتے ہوئے ایک جگہ ٹک گئے تھے۔ تمہارے آبلوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ تمہاری جلد نیم روسٹ تھی اور کئی جگہ سے لٹک رہی تھی...... پاؤں کا حال اتنا برا تھا کہ دیکھا نہیں جاتا تھا۔ تم غشی کی سی کیفیت میں ہولے ہولے کراہ رہے تھے اور پانی مانگ رہے تھے۔ اسی دوران میں ڈاکٹر ماریہ کے سیل فون پر کال آ گئی، وہ اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔ یہی وقت تھا جب میں نے صفائی کے ساتھ اپنے موبائل پر تمہاری تصویر لے لی۔''
''لیکن کرنل وہاں کلوز سرکٹ کیمرے بھی تھے۔''
''میں نے کیمروں کے زاویے پہلے ہی دیکھ لیے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ میری یہ مختصر کارروائی نوٹ نہیں کی جا سکے گی۔''
''اور اگر ہو جاتی؟'' میں نے کہا۔
''پھر وہی جو جاسوسی کی سزا ہوتی ہے۔ بے پناہ تشدد اور پھر موت۔'' وہ زیر لب مسکرایا۔
کرنل احرار آصفی بھی پاسبان بریگیڈ کے انہی خاص لوگوں میں سے تھا جو مادر وطن کے لیے اپنا سر ہتھیلی پر لیے پھرتے تھے۔ بے شک ان لوگوں کو ریان فردوس کی شکل میں ایک اچھا رہنما نہیں ملا تھا۔ بے شک آقا جان اور حلمی جیسے غداروں کی وجہ سے ان کو وقتی شکست ہوئی تھی مگر یہ لوگ ناامید نہیں تھے۔ میں نے کرنل سے ڈاکٹر ماریہ کے بارے میں پوچھا۔
وہ بولا۔ ''اپنے بچے اور قریبی عزیزوں کی خاطر وہ ہر دکھ جھیل رہی ہے۔ کہنے کو وہ رائے زل کی ذاتی معالج ہے مگر اس کی حیثیت ایک رکھیل کے سوا اور کچھ نہیں۔ ڈاکٹر ماریہ کو شراب سے ہمیشہ نفرت رہی ہے لیکن وہ ماریہ کو اسی رات اپنی خلوت میں بلاتا ہے جب اس نے شراب میں ڈبکی لگانا ہوتی ہے۔ ماریہ اور اس جیسی نہ جانے اور کتنی عورتیں ہیں جو اس ریچھ کے پنجوں میں جکڑی ہوئی ہیں۔ جنس اس کے لیے ایک من پسند کھیل کے سوا اور کچھ نہیں۔''
اسی اثنا میں کرنل احرار کے سیل فون کا بزر بج اٹھا۔ نائبین کی جماعت اسے مشورے

کے لیے بلا رہی تھی۔ وہ مجھ سے ''سوری'' کہتا ہوا باہر نکل گیا۔ وہ باہر نکل رہا تھا تو انیق اندر آ رہا تھا۔ سنگین صورتِ حال کے باوجود اس کا چہرہ ہشاش بشاش تھا۔ وہ مجھ سے تازہ ترین صورتِ حال کے حوالے سے بات کرنے لگا۔

میں نے کہا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے انیق، کل کچھ ہو سکے گا؟''

''آپ کا کیا خیال ہے؟''

میں نے کہا۔ ''کسی وقت تو لگتا ہے کہ شاید میری کل والی کال لوگوں پر اثر کرے گی اور وہ رکاوٹیں توڑ کر یہاں اس عمارت کے سامنے بہت بڑی تعداد میں جمع ہو جائیں گے، مگر کسی وقت صورتِ حال برعکس بھی لگتی ہے۔''

''ہم اسے ففٹی ففٹی کہہ سکتے ہیں شاہ زیب بھائی، چھوٹی چھوٹی ٹولیاں مختلف رکاوٹوں کو پار کر کے اب یہاں پہنچ رہی ہیں مگر صحیح صورتِ حال کا پتا تو صبح گیارہ بجے کے بعد ہی لگ سکے گا۔''

''میری ایک بات یاد رکھنی ہے انیق، تم نے اور سجاول نے کسی بھی صورت گرفتار نہیں ہونا۔ بے شک تم لوگوں نے حلیے بدل رکھے ہیں مگر ان لوگوں کو یہ جاننے میں بہت زیادہ دیر نہیں لگے گی کہ تم اصل میں کون ہو...... اور پھر تمہیں تشدد کی اسی چکی میں پیسا جائے گا جس میں سے میں معجزانہ طور پر بچ نکلا ہوں۔''

''آپ بے فکر رہیں جناب۔'' انیق نے بڑے جذبے کے ساتھ اپنی سرخ شرٹ اٹھا کر مجھے پیٹ کے ساتھ بندھی ہوئی دھماکا خیز بیلٹ دکھائی۔ اس بیلٹ کے ساتھ اوپر کی طرف کھینچی جانے والی ایک سیاہ ڈوری تھی۔ ڈوری کو کھینچتے ہی انیق ناپید ہو جاتا بس گوشت کے کچھ ناقابلِ شناخت ٹکڑے ہی دیواروں سے چپکے رہ جاتے۔ ایسی ہی ایک بیلٹ سجاول کے پیٹ سے بھی بندھی تھی۔

میں نے کہا۔ ''انیق! میں ٹمپریچر سیل کی جس ہولناک اذیت سے گزرا ہوں اس کے بعد تو میرا دل بھی چاہتا ہے کہ احتیاطاً ایک بیلٹ میں بھی باندھ لوں۔''

''ایسی بیلٹ آپ کو یہاں کہیں نہیں ملے گی شاہ زیب بھائی! اور ان شاء اللہ آپ کو ضرورت بھی نہیں۔ اس عمارت کے گرد رضا کاروں اور مظاہرین کے دو مضبوط حصار ہیں اور اب تو رضا کار دستے بھی اس حصار میں شامل ہو گئے ہیں۔ لوگوں نے تہیہ کر رکھا ہے کہ آپ پر اور محترم ذکری پر کوئی آنچ نہیں آنے دیں گے۔''

○......❖......○

اگلا دن بڑا تہلکہ خیز تھا اور بہت تجسس بھرا بھی۔ دیکھنا یہ تھا کہ لوگ رکاوٹیں عبور کر کے یہاں جمع ہوتے ہیں یا نہیں؟ دو پہر تک تین چار ہزار افراد تو وہاں جمع ہو گئے مگر پھر اس تعداد میں خاطر خواہ اضافہ نہیں ہو سکا۔ یہ صورتِ حال کسی حد تک مایوسی والی تھی۔

باذان کے سینئر نائب جاسم نے کہا۔ ''حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ مرکوزا کے گیٹوں سے باہر جمع ہونے والے لوگوں کی تعداد کافی زیادہ ہے۔ محتاط اندازے کے مطابق پندرہ بیس ہزار افراد ہیں اور مزید آ رہے ہیں۔''

''تو کیا فیصلہ ہوا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہم لوگ مرکوزا سے نکل کر ان کے ساتھ مل جائیں گے۔'' جاسم نے جواب دیا۔

''لیڈ کون کرے گا؟'' میں نے دریافت کیا۔

''لیڈ تو محترم ذکری ہی کرنا چاہتے تھے مگر ہم انہیں کسی ایسے خطرے میں نہیں ڈال سکتے۔ طے ہوا ہے کہ وہ مرکوزا کے گیٹس تک جلوس کے ساتھ جائیں گے اور پھر ہمیں دعاؤں کے ساتھ رخصت کر کے واپس آ جائیں گے۔ اس سے آگے کمانڈر افغانی شہید کی بیوہ محترمہ عارفہ جان جلوس کی قیادت کریں گی۔ لوگوں کی بہت بڑی تعداد ان کی آواز پر بھی لبیک کہتی ہے۔''

سہ پہر کے بعد ہماری قیام گاہ کے سامنے جمع ہونے والے چار پانچ ہزار افراد میں سے تقریباً نصف شہر کے مرکزی حصے کی طرف روانہ ہو گئے۔ باقی افراد نے ہماری قیام گاہ کو اپنے گھیرے میں لیے رکھا۔ ان میں بہت سے مسلح افراد بھی تھے اور کٹ مرنے کے لیے تیار نظر آتے تھے۔ پاسبان بریگیڈ کے سینکڑوں افراد بھی ہمارے حفاظتی حصار میں شامل تھے۔

سیل فونز کے ذریعے پل پل کی خبریں ہم تک پہنچ رہی تھیں۔ گیٹس تک پہنچنے کے بعد طے شدہ پروگرام کے مطابق محترم ذکری اور ان کے دو معمر ساتھیوں کو گارڈز کے ساتھ ایک گاڑی میں واپس بھیج دیا گیا اور یہ اچھا ہی ہوا کیونکہ ان کے واپس آنے کے تھوڑی ہی دیر بعد، مرکوزا سے باہر نکلتے وقت جلوس کو روک دیا گیا۔ یہاں مظاہرین اور رائے زل کی فورس میں زبردست جھڑپ ہوئی۔ کئی افراد شدید زخمی ہوئے مگر مظاہرین گیٹس کھول کر بڑے جلوس کے ساتھ مل گئے۔

اس ملاپ نے شہر کے طول و عرض میں زبردست جوش پیدا کیا۔ صرف ایک گھنٹے کے اندر اندر مظاہرین کی تعداد دگنی ہو گئی۔ لوگ جیسے دیوانہ وار گھروں سے نکل آئے اور اس کشادہ شاہراہ پر جمع ہو گئے جو ڈی پیلس کی طرف جاتی تھی۔

شام سے کچھ دیر پہلے جب مظاہرین نے ڈی پیلس کی طرف بڑھنا چاہا تو رائے زل کی فورس اور ایجنسی گارڈز نے انہیں فائنل وارننگ دے دی۔

انیق بھی اس عظیم الشان جلوس میں موجود تھا۔ وہ میرے لیے رپورٹر کے فرائض بھی انجام دے رہا تھا۔ اس نے بذریعہ سیل فون اطلاع دی۔ ''یہ فیصلہ کن مرحلہ ہے جناب! محترمہ عارفہ خاتون نے ملائی زبان میں ایک پُر جوش تقریر کی ہے اور اب لوگ آگے بڑھ رہے ہیں۔''

''کتنی تعداد ہو گی؟'' میں نے پوچھا۔

''بہت بڑی تعداد ہے جی۔ ہر طرف سر ہی سر نظر آتے ہیں۔ جلوس کے پچھلے حصے میں عورتیں اور بچے بھی موجود ہیں۔''

اسی دوران میں آنسو گیس کی شیلنگ اور ہوائی فائرنگ سنائی دینے لگی۔ انیق سے میرا رابطہ کٹ گیا۔ دس پندرہ منٹ بعد رابطہ دوبارہ قائم ہوا تو وہ بری طرح کھانس رہا تھا۔ اس کی آواز لرز رہی تھی۔ اس نے آقا جان کو ایک گالی دیتے ہوئے کہا۔ ''وہ خبیث خود موقع پر موجود ہے۔ جو کچھ ہوا ہے اس نے کیا ہے، اس نے کرایا ہے۔'' وہ پھر بری طرح کھانسنے اور ابکائیاں لینے لگا۔

چند سیکنڈ بعد اس کی آواز دوبارہ ابھری۔ اس کے اردگرد صرف رونے چلانے کی صدائیں سنائی دے رہی تھیں۔ ایمبولینسز اور فائر بگیڈز کے ہوٹر اودھم مچا رہے تھے۔ انیق نے لرزتی آواز میں کہا۔ ''یہ فائرنگ آقا جان نے خود کروائی ہے۔ بڑی بیدردی سے نہتے لوگوں پر گولیاں چلائی گئی ہیں۔ ہر طرف لاشیں اور زخمی دکھائی دے رہے ہیں۔''

''جلوس کا کیا بنا؟'' میں نے پوچھا۔

''جلوس تو تقریباً منتشر ہو چکا ہے جناب، بس چند سو لوگ رہ گئے ہیں۔ وہ بھی ٹولیوں کی شکل میں بکھرے ہوئے ہیں۔ بے شمار لوگ گرفتار ہوئے ہیں۔ وہ حرامی ٹھیک ہی کہتا تھا کہ میں آہنی ہاتھوں کے ساتھ نمٹوں گا۔''

ہم نے ٹی وی آن کیا۔ وہاں اب حکومت کی زبان ہی بولی جاتی تھی۔ فائرنگ اور ہلاکتوں کا ذکر الیکٹرانک میڈیا پر بھی ہو رہا تھا مگر اندازِ مختلف تھا۔ رپورٹر کہہ رہا تھا۔ ''زیادہ ہلاکتیں بھگدڑ کی وجہ سے ہوئی ہیں۔ محتاط اندازے کے مطابق ہلاک ہونے والوں کی تعداد 100 کے لگ بھگ ہے مگر ان میں سے گولیاں شاید آٹھ دس کو ہی لگی ہوں گی۔ باقی لوگ پاؤں تلے کچلے گئے ہیں۔''

نیوز کاسٹر نے پوچھا۔ ”جلوس کے شرکا کی تعداد کیا ہوگی؟“
رپورٹر بولا۔ ”کچھ لوگ اسے بہت بڑھا چڑھا کر بیان کررہے ہیں مگر غیر جانبداری سے بات کی جائے تو مرکوزا سے نکل کر یہاں آنے والوں کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ نہیں تھی۔ کوئی چار پانچ ہزار لوگ یہاں شاہراہ پر موجود ہوں گے لیکن اب چھوٹی چھوٹی چند ٹولیاں ہی دکھائی دے رہی ہیں۔“
نیوز کاسٹر بولا۔ ”کہا جارہا ہے کہ کمانڈر افغانی کی بیوہ عارفہ خاتون بھی زخمی ہوئی ہیں۔“
”نہیں...... یہ اطلاع درست نہیں۔ وہ آنسو گیس کی وجہ سے بے ہوش ہوگئی تھیں۔ ڈاکٹرز ان کی دیکھ بھال کررہے ہیں۔ شاید وہ اسی کو اپنی کامیابی سمجھ رہی ہیں کہ گرفتاری سے بچ گئی ہیں۔“
محترم ذکری کے میزبان بدرقہ نے دانت پیس کر کہا۔ ”یہ سب جھوٹ اور اندھیرے کی پیداوار ہیں، بکواس کررہے ہیں۔“ اور اس کے ساتھ ہی ٹی وی آف کردیا۔
میں نے انیق سے ایک بار پھر رابطہ کیا۔ اس کی آواز میں اب پھر تھوڑا سا جوش تھا، بولا۔ ”لوگ اب پھر جمع ہونا شروع ہوگئے ہیں۔ وہ ہلاکتوں پر بے حد مشتعل ہیں۔ کہا جارہا ہے کہ عارفہ بی بی کے سر پر گہرا زخم آیا ہے اور وہ اسپتال میں ابھی تک بے ہوش ہیں۔ ان کے بارے میں ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“
رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ میرا بخار پھر تیز تھا۔ زخم دہک رہے تھے۔ ہماری قیام گاہ کے اردگرد خاصی بڑی تعداد میں مسلح رضا کار اور مظاہرین موجود تھے۔ وہ گاہے بگاہے زبردست نعرہ زنی بھی کرتے تھے۔ دوسری طرف شہر کے مرکز سے جو اطلاعات آرہی تھیں ان کے مطابق ایک بار پھر مین روڈ پر جم غفیر تھا۔ لوگ ہلاکتوں پر شدید احتجاج کررہے تھے۔ ہلاکتوں کی تعداد دوسو کے قریب تھی۔ لوگ پختہ ارادہ کیے ہوئے تھے کہ وہ ڈی پیلس کی طرف مارچ کریں گے اور قاتلوں کے گریبان پکڑیں گے۔ کہا جارہا تھا کہ اب بہت سے مسلح رضا کار بھی اس اجتماع میں شامل ہوچکے ہیں اور خطرناک تصادم کا خطرہ ہے۔
رات قریباً بارہ بجے تک میں شدید اضطراب میں رہا۔ پھر میں نے ایک فیصلہ کرلیا۔ تاجور میرے سرہانے بیٹھی تھی اور میرے سر پر برف کی پٹیاں رکھ رہی تھی۔ اس کی قربت کبھی مجھے مہکا دیا کرتی تھی لیکن اس وقت میری ساری حسیات کند تھیں۔ ذہن میں صرف ایک ہی تصور تھا۔ ہزاروں لوگ غم و غصے سے بھرے ہوئے مگر انجام سے سہمے ہوئے...... پیچھے ہٹتے

تھے تو ہزیمت تھی، ذلت اور غلامی تھی۔ آگے بڑھتے تھے تو آقا جان اور اس کے حواریوں کی آگ اگلتی رائفلیں تھیں۔ یہ گوشت اور لوہے کا ٹکراؤ تھا۔

میں نے تاجور کا ہاتھ ہولے سے اپنی پیشانی سے ہٹایا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''کیا بات ہے شاہ زیب؟'' وہ ذرا چونک کر بولی۔

''ایک کام کرو۔ وہ سامنے الماری میں سے مجھے وہ اسپرے پکڑاؤ۔'' میں نے سن کرنے والے اسپرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''کیا زیادہ درد ہو رہا ہے پاؤں میں؟''

''سمجھو کچھ ایسا ہی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

وہ الماری میں سے سن کرنے والا NUMBING اسپرے اٹھا لائی۔ میں نے اپنے دونوں پاؤں پر اچھی طرح اسپرے کے کئی پف مارے اور پھر سائیڈ ٹیبل پر رکھا ہوا درد کش انجکشن سرنج میں بھر لیا۔ اسے میرے بازو پر لگا لوگی؟''

اس نے دونوں ہاتھ پیچھے ہٹائے۔ ''یہ مجھ سے نہیں ہوگا شاہ زیب۔'' وہ گھبرا کر بولی۔

''میں ڈاکٹر صاحب کو بلاتی ہوں۔''

''نہیں، وہ سارا دن میرے ساتھ ہی ہلکان ہوتے رہے ہیں۔ اب انہیں سونے دو۔ میں خود ہی لگا لیتا ہوں۔''

اس کے منع کرنے کے باوجود میں نے انجکشن اپنے بازو میں لگایا۔ سرنج کو واپس ٹیبل پر رکھتے ہوئے میں نے ہاتھ کو اس طرح حرکت دی کہ دودھ والا کپ میرے ٹراؤزر پر الٹ گیا۔ دودھ تو ٹھنڈا تھا مگر ٹراؤزر گیلا ہو گیا۔ میں نے تاجور سے کہا کہ میں ٹراؤزر بدل لوں...... سامنے ہی کمرے کے دروازے سے باہر باذان کے مسلح سیکیورٹی گارڈز پہرا دے رہے تھے۔ کسی وقت ان کی جھلک کھڑکی میں بھی دکھائی دے جاتی تھی۔ میں نے تاجور سے کہا۔ ''کسی گارڈ کو دو منٹ کے لیے اندر بلا لو۔''

وہ سمجھ گئی کہ میں ٹراؤزر بدلنے میں گارڈ کی مدد چاہتا ہوں۔ چند ہی سیکنڈ بعد مسلح گارڈ اندر اور تاجور کمرے سے باہر تھی۔ انجکشن اور اسپرے سے میری حالت عارضی طور پر کافی بہتر ہو گئی تھی مگر میں نے یہ بہتری ظاہر نہیں ہونے دی۔ جب خوش اخلاق گارڈ ٹراؤزر کی تبدیلی میں میری مدد کر رہا تھا میں نے اچانک اس کی گردن اپنے بازو کے شکنجے میں جکڑ لی۔ ''سوری ڈیئر۔'' میں نے کہا۔ اور اس کی توانا گردن کے مخصوص حصے پر دفعتاً دباؤ ڈال کر اسے انٹاغفیل کر دیا۔ وہ پوری طرح مسلح تھا۔ اس کے سینے سے چھوٹی نال کی رائفل آویزاں تھی۔ وہ بلٹ

پروف جیکٹ اور سیفٹی ہیلمٹ بھی پہنے ہوئے تھا۔ اس کے فل بوٹ نصف پنڈلیوں تک پہنچ رہے تھے۔ اسے کھینچ کر واش روم کی طرف لے جانے اور اس کا لباس پہننے میں مجھے پانچ منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ جیکٹ کے تسمے پشت پر تھے اس لیے وہ میں نے نہیں پہنی۔

تاجور کو آواز دی تو وہ ساتھ والے کمرے سے نکل آئی۔ مجھے دیکھ کر اس کا خوب صورت منہ کھلا رہ گیا۔ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

اسی دوران میں تاجور کی نگاہ واش روم کے ادھ کھلے دروازے سے نیم برہنہ گارڈ پر پڑ گئی۔ اس کے جسم پر فقط میرا انڑاوزر تھا۔ وہ مزید حیرت زدہ ہوئی۔

''یہ سب کیا ہے شاہ زیب؟'' وہ سرسراتی آواز میں بولی۔

''تاجور۔'' میں نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔ ''اگر میں آج یہاں سے نہ نکل سکا اور ان لوگوں کے درمیان نہ پہنچ سکا جو رائے زل کی فورس اور امریکی گارڈز کے سامنے کھڑے ہیں تو پھر سمجھو کہ اب تک کی ساری جدوجہد اور سب قربانیاں رائیگاں گئیں اور میں یہ ہونے نہیں دوں گا۔''

وہ لرزاں آواز میں بولی۔ ''شاہ زیب! آپ ہوش میں تو ہیں۔ آپ نے اپنی حالت دیکھی ہے؟ اور...... آپ کیا سمجھ رہے ہیں کہ جو لوگ آپ کی حفاظت کے لیے یہاں کھڑے ہیں، وہ آپ کو یہاں سے نکلنے دیں گے۔''

''میں ٹھیک ہوں تاجور...... اور گھبراؤ مت، یہ لوگ بھی مجھے نکلنے دیں گے۔ تم...... بس خود کو سنبھالو اور میری تھوڑی سی مدد کرو...... پلیز۔''

وہ بے حرکت کھڑی تھی۔ آنکھوں میں نمی تھی۔ ان لمحوں میں وہ اپنی لٹیں بھی پیشانی سے ہٹانا بھول گئی تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ میں نے کیا فیصلہ کیا ہے اور اس فیصلے کی خطرناکی بھی پوری طرح جان گئی تھی...... اس کے ساتھ ساتھ شاید وہ یہ بھی سمجھ گئی تھی کہ میں اب اس فیصلے سے پیچھے نہیں ہٹوں گا۔

گارڈ کو اندر آئے ہوئے اب دس منٹ کے قریب ہو چکے تھے۔ باہر سے دروازے پر مدھم دستک دی گئی۔

''کون؟'' میں نے بلند آواز میں پوچھا اور قریبی کھڑکی کا پردہ برابر کر دیا۔

''کسی مدد کی ضرورت تو نہیں جناب؟'' انگلش میں پوچھا گیا۔

''نہیں شکریہ...... بس ہم دو چار منٹ میں فارغ ہو جاتے ہیں۔''

''کوئی بات نہیں سر، ہم آپ کی سروس پر ہیں۔'' شائستہ لہجے میں جواب ملا۔

میں نے اشک بار تاجور کی طرف دیکھا اور ہولے سے کہا۔ ''تاجور! اگر تکلیف نہ ہو تو یہ جوتے پہننے میں میری مدد کر دو۔''

اس نے ایک طویل دکھ بھری سانس لی اور سر جھکا کر میرے قریب بیٹھ گئی۔ مجھے کمر جھکانے میں شدید تکلیف ہوتی تھی۔ میں اپنے ہاتھ جوتوں تک بمشکل پہنچا پا رہا تھا۔ تاجور نے جوتے چڑھانے اور تسمے باندھنے میں میری مدد کی پھر میں کھڑا ہو گیا اور بلٹ پروف جیکٹ میں اپنے بازو ڈال دیئے۔ وہ سمجھ گئی کہ اسے عقب سے جیکٹ کے اسٹریپس باندھنے ہیں۔

وہ لرزاں ہاتھوں سے یہ کام کرنے لگی۔ میں نے سیفٹی ہیلمٹ اپنے سر پر رکھ لیا۔ ان لمحوں میں مجھے یہی محسوس ہوا جیسے میں قدیم زمانے کا کوئی کردار ہوں۔ میدانِ جنگ میں جانے سے پہلے میری پیاری ہستی مجھے اپنے ہاتھوں سے تیار کر رہی ہے اور خاموشی کی زبان میں کہہ رہی ہے...... بہت بڑے خطرے کی طرف جا رہے ہو۔ جس طرح اس وقت اپنی پشت دکھا رہے ہو، اسی طرح اپنا مسکراتا ہوا چہرہ بھی دکھانا۔ میری ساری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں......

وہ عجیب لمحے تھے۔ کچھ پتا نہیں تھا کہ ہم ایک دوسرے کو دوبارہ دیکھ سکیں گے یا نہیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ آج کی اَن گنت ہلاکتوں کے بعد کل کا معرکہ زندگی اور موت کا معرکہ بن چکا ہے۔ وقفے وقفے سے شہر میں کسی نہ کسی جانب سے فائرنگ کی آواز بھی آ جاتی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ کشادہ سڑکوں پر فوجی گاڑیاں فراٹے بھر رہی ہیں اور فضا میں ہیلی کاپٹر نگرانی کی پروازیں کر رہے ہیں۔ کہا جا رہا تھا کہ کل آقا جان کے حکم پر جو قتلِ عام ہوا ہے اس میں ہلاکتوں کی تعداد تین سو سے تجاوز کر چکی ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ جاما جی کے اَن گنت گھروں میں صفِ ماتم بچھی ہوئی ہے...... اور بے شمار لوگوں کی آنکھوں میں خون کے آنسو ہیں۔ میں نے تصور ہی تصور میں نیم گنجے سر اور شیطانی آنکھوں والے آقا جان کو دیکھا اور اپنے دل میں کہا۔ ''میں آ رہا ہوں آقا جان۔''

تاجور میری پشت پر تھی اور بلٹ پروف جیکٹ کو درست کر رہی تھی۔ اس کی مدھم اشک بار آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ''اللہ نہ کرے آپ کو کچھ ہو گیا شاہ زیب! تو...... میں کہاں جاؤں گی؟''

''انیق اور سجاول تمہارے لیے بڑی سے بڑی مصیبت کا سامنا کر سکتے ہیں۔ مجھے پورا یقین ہے تاجور۔''

''لیکن...... وہ بھی تو...... وہیں ہیں، جہاں آپ جا رہے ہیں۔''

''تو پھر محترم ذکری ہیں۔ ان کے جاں نثار مرید ہیں۔ انہوں نے تمہیں اپنی پناہ میں لیا ہے، اور بیٹی کہا ہے۔''

وہ میرے عقب میں تھی۔ میرے کندھے پر اس کے ہاتھ کی گرفت بے ساختہ سخت ہو گئی۔ ''آپ نہ جائیں شاہ زیب۔'' اس نے بہت بوجھل آواز میں کہا۔ ''آپ اپنی حالت دیکھیں۔''

''مجھے کمزور نہ کرو تاجور! مجھے نیک دعا کے ساتھ رخصت کرو۔ اوپر والے نے چاہا تو ہم کامیاب ہوں گے۔''

وہ خاموش ہو گئی۔ سیفٹی جیکٹ کا ایک بکل بند نہیں ہو رہا تھا۔ تاجور نے اسے بمشکل بند کیا۔ گارڈ کے جوتے مجھے تھوڑے سے تنگ تھے اور مجھے جوتوں میں اپنے خون کی ''چپچپاہٹ'' محسوس ہونے لگی تھی۔ تاہم میں نے اس سلسلے میں اپنی زبان بند رکھی۔

''آپ سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔'' تاجور عجیب سے لہجے میں بولی۔ وہ ابھی تک میرے عقب میں کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میرے کندھوں پر تھے۔

میں نے اس کی طرف مڑنا چاہا تو اس نے کندھوں پر ہلکا سا دباؤ ڈال کر مجھے روک دیا۔

''نہیں شاہ زیب! آپ اپنا منہ ادھر ہی رکھیں۔''

''کیا مطلب تاجور؟''

''میں ایسے ہی بات کرنا چاہتی ہوں۔'' وہ معصوم انداز میں بولی۔

''کہو تاجور۔'' میں نے اپنی دھڑکنوں کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

''سجاول کے ڈیرے پر ہم ایک دوسرے سے دور ہو گئے...... آپ خود مجھے میرے گاؤں تک چھوڑنے گئے۔ سارے راستے آپ سوچتے رہے کہ شاید میں آپ سے کچھ کہوں گی لیکن میں نے کچھ نہ کہا۔ یہاں تک کہ گاؤں آ گیا۔ میں اتر کر چلی گئی۔ میں نے مڑ کر بھی نہ دیکھا...... مجھ میں اتنی ہمت ہی نہیں تھی کہ دیکھ سکتی...... میں نے آپ کو دکھ پہنچایا نا...... بہت تکلیف دی نا؟'' اس کی آواز لرز رہی تھی۔

میں کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن میرے گلے میں پھندا سا لگ گیا۔ میں خاموش کھڑا رہا۔ اس کے ہاتھ میرے کندھوں پر تھے اور اس کی ناک میری کمر کے بالائی حصے کو چھو رہی تھی۔

''مجھے معاف کر دیں شاہ زیب۔'' اس نے درد میں ڈوبی آواز میں کہا۔

میں نے خود کو بمشکل بولنے کے لیے تیار کیا۔ ''تم بھی مجھے معاف کر دو تاجور! میں نے بھی تو تمہیں دکھ پہنچایا نا۔ میں بھی تو خاموش ہی رہا نا......''

ہم ساکت کھڑے رہے۔ باہر للکارے تھے۔ مظاہرین کی کوئی ٹولی ہم آواز ہو کر جاماجی کا مقبول ترانہ پڑھ رہی تھی اور مدھم آوازیں ہم تک پہنچ رہی تھیں۔

جس دشمن نے ہمارے بچوں کی مسکراہٹ چھینی

جس دشمن نے ہم پر زندگی حرام کی

ہم اس سے لڑیں گے

آخری گولی تک اور آخری سر تک

ہم پیچھا کریں گے اس کا قبر تک......

میرے عقب میں تاجور نے اپنا سر میری گردن کے نچلے حصے سے ٹکا دیا پھر جیسے سسک کر بولی۔ ''میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا شاہ زیب، میں کیا کروں؟ میرے اندر جیسے فیصلہ کرنے کی ہمت ختم ہو گئی ہے۔ کسی وقت دل چاہتا ہے کہ......سب کچھ آپ پر چھوڑ دوں۔ آپ جیسا کہتے جائیں......ویسے کرتی جاؤں......'' وہ سچ مچ سسک پڑی۔

میں نے اپنا رخ اس کی طرف پھیرا......اور اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ اس نے اپنی بھیگی پلکوں کی چلمن گرالی۔ ناک سرخ ہو رہی تھی۔ جی چاہا سب اندیشے اور مصلحتیں بالائے طاق رکھ کر ایک بار اسے اپنے سینے سے لگالوں مگر جب میں نے ایسا سوچا میری نگاہوں کے سامنے فلیشز سے نمودار ہوئے۔ کچھ پُرہول جھلکیاں، یورپ کا خطرناک ترین گینگسٹر جان ڈیرک......اس کے سفاک کارندے جو ہر صبح پیاسے اٹھتے تھے اور ہر شام انسانی خون پی کر سکون پاتے تھے......وہ بھاگ رہے تھے......میری طرف آرہے تھے......ان کے پس منظر میں ایک لڑکے کی لاش سڑک پر پڑی تھی۔ اس کا پیٹ چاک اور انتڑیوں کا منظر برف کی تہہ پر، ہولناک نظارہ پیش کر رہا تھا۔

میں نے تاجور کے دونوں ہاتھوں کو اکٹھا کیا اور اپنے ہاتھوں کے پیالے میں تھام لیا۔ ''تاجور! میری بات کا یقین رکھو۔ تمہارے لیے سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ سب دکھ دور ہوں گے۔ آزمائش کی گھڑیاں اب زیادہ لمبی نہیں۔''

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ اشک بار لہجے میں بولی۔ ''آپ...... یہ کیوں کہہ رہے ہیں کہ تمہارے لیے سب ٹھیک ہو جائے گا؟ آپ کے لیے ٹھیک کیوں نہیں ہو گا۔''

میں نے اس کے ہاتھوں کو محبت سے دبایا۔ ''میرے لیے بھی ٹھیک ہو جائے گا۔ امید ہے کہ ہم یہاں سے سرخرو ہو کر نکلیں گے۔''

''آپ......رک نہیں سکتے؟'' اس نے عجیب التجا آمیز آواز میں کہا۔

''پلیز تاجور! مجھے ان آخری لمحوں میں کمزور نہ کرو۔''

اس نے آنسو پونچھ کر اثبات میں سر ہلایا۔

○......❖......○

میرے پاؤں بری طرح جل رہے تھے۔ میں نے ایک اور ہائی ڈوز دردکش انجکشن تیار کیا اور خود ہی بازو میں لگالیا۔

پھر میں بڑی تیزی کے ساتھ کمرے سے نکلا تھا۔ میں جانتا تھا مجھے کہاں جانا ہے۔ میں ایک سینئر گارڈ روحیل کی یونیفارم میں تھا اور وہ ایک ہیوی موٹر بائیک پر ڈیوٹی دیتا تھا۔ جب میں تیزی کے ساتھ باقی گارڈز کے درمیان سے گزرا تو وہ کچھ چونکے مگر میرا انداز اتنا عجلت کا تھا کہ کسی کو کوئی سوال پوچھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔

میں چار پانچ زینے اتر کر ایک دروازے تک پہنچا۔ باہر رضا کاروں اور مظاہرین کا جم غفیر تھا۔ رات کا تیسرا پہر ختم ہونے والا تھا مگر عمارت سے باہر جیسے دن کا سماں تھا۔ پھریرے لہرا رہے تھے اور پُرجوش تقریریں ہورہی تھیں۔ میں نیچے جانے والی سیڑھیوں پر پہنچا۔ یہ سیڑھیاں پارکنگ لاٹ میں اترتی تھیں۔ گارڈ روحیل کی پانچ ہارس پاور موٹر بائیک پہچاننے میں مجھے زیادہ دشواری نہیں ہوئی لیکن جب میں نے اسے چابی لگائی اور اسٹارٹ کرنا چاہا تو ناکامی ہوئی۔

مجھے پتا چلا کہ یہ موٹر بائیک اسی ٹائپ کی ہے جسے چابی کے علاوہ فنگر پرنٹس کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ حلمی کی ہلاکت کے موقع پر میں نے جلسہ گاہ میں جانے کے لیے ایک ایسی ہی بائیک پر سواری کی تھی۔ اس وقت بائیک والے کا کٹا ہوا انگوٹھا میری جیب میں تھا لیکن اب ایسا نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ میں موٹر بائیک کے ''فنگر پرنٹ سینسر'' کو مطمئن نہیں کرسکتا۔

میں موٹر بائیک سے اتر آیا۔ کچھ ہی فاصلے پر اس زمین دوز پارکنگ لاٹ میں مجھے کھلی چھت والی ایک پرائیویٹ کار کھڑی نظر آئی۔ یہ نیلے رنگ کی سیڈان تھی۔ ایک ادھیڑ عمر عورت اسے پارک کرنے کے بعد لاک کررہی تھی۔ میں نے اس سے چابی لے لی اور بڑے تحکم سے اسے بتایا کہ کسی شخص کے پیچھے جانے کے لیے یہ کار درکار ہے۔ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ میرا چہرہ ابھی تک ہیلمٹ میں چھپا تھا۔ معمر عورت گومگو کی کیفیت میں تھی تاہم میری یونیفارم دیکھ کر اس نے کسی طرح کی مزاحمت نہیں دکھائی۔ میں اس کی نیلی سیڈان لے کر تیزی سے باہر سڑک پر آیا اور مرکوزا کے بیرونی حصے کی طرف بڑھنے لگا۔ ذہن میں اس کے سوا اور کچھ

نہیں تھا کہ مجھے کسی بھی طرح اس مین شاہراہ پر پہنچنا ہے جہاں جاماجی کے لوگ احتجاج کر رہے ہیں۔

مرکوزا کا علاقہ شہر کے جنوبی حصے میں تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ میں دس پندرہ منٹ کے اندر شاہراہ پر پہنچ سکتا ہوں۔ مرکوزا کی اندرونی سڑکوں پر رش تھا۔ مظاہرین نے بینرز اور کتبے اٹھا رکھے تھے اور ہر طرف چکرا رہے تھے۔ میں یہ دیکھ کر چونکا کہ اس نیلی سیڈان کی ونڈ اسکرین پر بھی میری ٹارچر سیل والی تصویر کا اسٹیکر لگا تھا یعنی جس معمر عورت سے میں نے کار حاصل کی تھی، میں اس سے جھوٹ نہ بھی بولتا اور اپنا چہرہ دکھا دیتا تو وہ مجھے بخوشی کار دے دیتی۔

ایک جگہ گاڑی کو روکا گیا۔ مظاہرین نے وکٹری کے نشان بنائے۔ کچھ نے گاڑی کے اوپر جھک کر نعرے لگائے۔ ''جاماجی زندہ باد...... قسطینا زندہ باد...... ایسٹرن زندہ باد...... عارفہ بی بی زندہ باد۔''

اپنے نام کا پُرجوش نعرہ سن کر بڑا عجیب احساس ہوا۔ ''فتح ہماری ہوگی۔'' میں نے بھی وکٹری کا نشان بناتے ہوئے کہا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔ میرے ہیلمٹ اور نیم تاریکی کے سبب کسی نے مجھے پہچانا نہیں۔ شاید کسی کے خیال میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ میں جو شدید زخمی حالت میں ڈاکٹروں کی زیرنگرانی بستر پر پڑا ہوں، یہاں ایک سڑک پر گاڑی میں نظر آؤں گا۔

جلد ہی میں ایک ایسے گیٹ تک پہنچ گیا جو مرکوزا کے علاقے کو مین شہر سے جدا کرتا تھا، یہ گیٹ غالباً کل والے ہنگامے میں مسمار کیا جا چکا تھا مگر یہاں گرے فورس کا ناکا موجود تھا اور وہ احتیاط سے گاڑیوں کی چیکنگ کر رہے تھے۔ مجھ سے آگے دو گاڑیاں تھیں۔ میری دھڑکن میں اضافہ ہو گیا۔ میں جانتا تھا کہ میں یہاں رک گیا تو شاید یہیں پر میرے سفر کو فل اسٹاپ لگ جائے گا۔

جونہی گرے فوجی میری جانب آئے۔ میں نے کلچ چھوڑ کر ایکسلیریٹر کو فرش سے لگا دیا۔ گاڑی کمان سے نکلے تیر کی طرح بڑھی اور رکاوٹی بانس کو توڑتی ہوئی نکلتی چلی گئی۔

''ہالٹ...... بھاگو...... پکڑو۔'' کی ملی جلی آوازیں آئیں۔

پھر دو فائر ہوئے۔ میں نے خود کو حتی الامکان حد تک نیچے جھکا لیا تھا۔ گولیاں گاڑی کی باڈی میں لگیں۔ میں نے برق رفتاری سے سیڈان کو ایک بغلی سڑک پر موڑا۔ مجھے اپنے عقب میں ہیوی موٹر بائیکس کے ہوٹر سنائی دیئے۔ میں نے عقب نما آئینے میں دیکھا، کم از کم دو بائیکس میرے عقب میں تھیں۔ ایک پولیس کار بھی تیزی سے یوٹرن لے رہی تھی۔ ڈنمارک میں ٹیکساری گینگ کے غنڈوں سے مارا ماری کے دوران میں کئی مواقع ایسے آئے تھے جب

اس طرح کے خطرناک CHASE سے میرا واسطہ پڑا تھا۔ گاڑی کو بھگانا اور اڑانا مجھے اچھی طرح آتا تھا۔ لیکن یہاں مجھے یہ احتیاط بھی کرنا تھی کہ کوئی بے گناہ میری ٹکر سے جانی نقصان نہ اٹھائے۔ اگلے تین چار منٹ خاصے دھواں دھار تھے۔ رات کے پچھلے پہر جاماجی کی نیم سنسان سڑکوں پر یہ بڑا خطرناک ''چیز'' تھا۔ میں نے پولیس کی ایک پیٹرولنگ کار کو سائیڈ مار کر ''اوور برج'' سے نیچے گرا دیا اور اس نے آگ کے گولے کی شکل اختیار کی۔ ایک بائیک سوار کو بھی میرے قریب آنے پر اچھا خاصا ''سبق'' ملا۔

قریباً دس منٹ بعد اسپیشل ماڈل نیلی سیڈان اس شاہراہ پر پہنچ گئی جہاں جگہ جگہ ٹائر جل رہے تھے اور پتھروں اینٹوں کے سبب راستے بلاک تھے۔ میں ان جلتے ٹائروں اور بکھری ہوئی اینٹوں کے درمیان سے گاڑی بھگاتا چلا گیا اور مظاہرین کے درمیان پہنچ گیا۔

اب تعاقب کرنے والوں کے لیے مجھ تک پہنچنا ممکن نہیں تھا۔ چند ہی لمحوں میں بیسیوں مظاہرین نے مجھے گھیر لیا۔ یہ دراصل اس عظیم الشان جلوس کا عقبی حصہ تھا جو ڈی پیلس کی طرف مارچ کرنا چاہتا تھا۔ میں دروازہ کھول کر باہر نکلا۔

''کیا ہوا ہے آفیسر؟'' ایک شخص نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''مجھے عارفہ بی بی یا نائب جاسم صاحب تک پہنچاؤ۔ یہ ضروری ہے۔''

''لیکن آپ......؟'' وہ شخص الجھن میں نظر آرہا تھا اور وہی نہیں اردگرد موجود سارے افراد چونکے ہوئے تھے۔ میری گردن اور کلائیوں وغیرہ کے زخم دکھائی دے رہے تھے۔

میں نے ہیلمٹ اتار دیا۔ میری صورت دیکھ کر چند لمحوں کے لیے تو سناٹا چھا گیا پھر ایسے پُر جوش نعرے سنائی دیئے کہ قرب و جوار لرز گئے۔

دس پندرہ سیکنڈ کے اندر ہی سینکڑوں افراد یوں میری طرف کھنچے جیسے لوہ چون، مقناطیس کی طرف کھنچتا ہے۔ ہجوم میں سے لٹھ برداروں نے مجھے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ پھر راستہ بنا کر مجھے ایک بند جیپ میں سوار کر دیا۔ اس جیپ کے اوپر بھی میری اور قسطینا کی تصویر موجود تھی، بلکہ میری دو تصویریں نظر آرہی تھیں۔ وہی زخموں سے چُور اور بے بسی کی انتہا کو چھوتی ہوئی تصویر۔

میرا پورا جسم درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ مجھے پتا چل رہا تھا کہ میرے جوتوں میں میرے ہی زخموں سے رِسنے والا خون جمع ہو چکا ہے مگر پتا نہیں کیوں اب ذہن اتنی اذیت محسوس نہیں کر رہا تھا جتنی بند کمرے میں آرام دہ بستر پر کرتا رہا تھا۔

جیپ میں بیٹھا ہوا ایک باریش نوجوان سیل فون پر بلند پُر جوش آواز میں بول رہا تھا۔

''جی جناب...... جی جاسم صاحب...... میں حافظ بول رہا ہوں۔ ایک بہت بڑی خبر ہے جی...... جناب شاہ زیب صاحب، اس وقت ہمارے ساتھ موجود ہیں۔ ہم...... آپ کی طرف آنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

دوسری طرف سے جاسم کی آواز فون کے اسپیکر پر سنائی دی۔ ''کیا بکواس کر رہے ہو، شاہ زیب صاحب یہاں کیسے آسکتے ہیں؟ کون ہے یہ؟''

''آپ خود ان سے بات کریں۔'' حافظ نامی نوجوان نے سیل فون میری طرف بڑھایا اور خود جیپ کی کھڑکی سے سر باہر نکال کر مظاہرین پر چلانے لگا کہ وہ جیپ کو راستہ دیں۔

میں نے سیل فون پر کہا۔ ''ہیلو مسٹر جاسم! میں شاہ زیب بول رہا ہوں۔ میرا یہاں پہنچنا بہت ضروری تھا اور میں آرہا ہوں لیکن اس خبر کو ابھی عام نہ کیا جائے۔''

''او مائی گاڈ! یہ میں کیا سن رہا ہوں۔ آپ اس حالت میں یہاں؟ آپ نکلے کیسے؟'' اس کی آواز لرز رہی تھی۔

''یہ باتیں بعد میں ہوتی رہیں گی۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

○......❖......○

لوگ جیپ پر امڈے پڑ رہے تھے۔ میں اب چونکہ سیفٹی ہیلمٹ اتار چکا تھا اس لیے ہر نگاہ مجھے پہچان رہی تھی۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ جیپ کے اندر گھس آتے۔ سینکڑوں لوگوں کے درمیان جیپ رینگتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ ایم ایم اے کے فائٹر کی حیثیت سے بھی میں اپنے مداحوں میں گھرا کرتا تھا اور اپنے لیے لوگوں کا جوش و جذبہ دیکھتا تھا مگر آج جو کچھ میری نظریں دیکھ رہی تھیں وہ بیان سے باہر تھا۔ شاید ٹھیک ہی کہا جاتا ہے کہ لوگ اپنے رہنما سے عملی جدوجہد اور قربانی مانگتے ہیں اور جب وہ اس معیار پر پورا اترتا ہے تو پھر اپنا تن من اس پر نچھاور کرنے لگتے ہیں۔

چونکہ یہ جلوس کا عقبی اور درمیانی حصہ تھا لہٰذا اس میں بہت سی خواتین اور کہیں کہیں بچے بھی دکھائی دیتے تھے۔ سینکڑوں پرچموں اور کتبوں کے درمیان مجھے ایک دو جگہ کیلے کا ویسا ہی سرخ پتا بھی لہراتا نظر آیا جو کل مجھے کچھ بچیوں نے پیش کیا تھا اور مجھ سے رکنے کی درخواست کی تھی۔ میں نے ایک جواں سال ملائی عورت کو دیکھا، اس نے پانچ چھ سالہ بچے کو گود میں اٹھا رکھا تھا۔ اس بچے کی شرٹ پر میری زخمی تصویر پرنٹ تھی۔ اس شرٹ کو دیکھ کر میرے دل کے اندر ایک لہر سی اٹھی۔ میرے دل و دماغ نے گواہی دی کہ اب کچھ نہ کچھ ہوگا۔ بے شک میں اس قابل نہیں تھا، بے شک میں اس طرح کے حالات کو زیادہ اچھی طرح سے نہیں سمجھتا

تھا...... اور بلاشبہ میں ان لوگوں کی زبان تک پوری طرح نہیں جانتا تھا مگر ہمارے خون کا رنگ ایک تھا۔ ان لوگوں کی روح نے میری روح سے بات کی تھی اور ان کے دل و دماغ نے اپنی محبتیں میرے نام کی تھیں۔ مجھے اپنے اندر جہاں بے پناہ توانائی محسوس ہوئی وہاں اپنے کندھوں پر بے پناہ بوجھ بھی محسوس ہوا۔

پانچ منٹ کا سفر طے کرتے ہوئے شاید ایک گھنٹا ہی لگ گیا تھا۔ مجھے لگا کہ میں لوگوں کے درمیان سے نہیں جذبات کے ایک بپھرے ہوئے دریا کے درمیان سے گزر رہا ہوں۔ پھر مجھے انیق اور سجاول کی شکلیں بھی نظر آئیں۔ سجاول، سکھ پربت سنگھ کے روپ میں نمایاں نظر آرہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چمکیلے کوکوں والی ایک لٹھ تھی اور مجھے یقین تھا کہ اس کے لباس میں کوئی نہ کوئی آتشیں ہتھیار بھی ہوگا۔ وہ میرے قریب آیا اور دھیمی مگر بارعب آواز میں بولا۔

''شاہ زیب! تم نے یہاں آ کر کمال کر دیا ہے۔ میں نے کبھی کسی کو شاباش نہیں دی، پر دل کر رہا ہے کہ آج تمہیں شاباش دوں۔''

''شکریہ...... پر تم کہاں غائب تھے۔ کل بھی تم سارا دن نظر نہیں آئے؟''

''بس تمہارے آس پاس ہی تھا۔''

انیق نے مجھے آنکھ ماری اور سنجیدہ لہجے میں آہستہ سے بولا۔ ''دراصل سجاول بھائی ان لوگوں کی دیکھ بھال میں مصروف رہے ہیں جو کل والے ہنگامے میں زخمی ہوئے۔''

میں نے چونک کر دیکھا۔ سجاول کے عقب میں ایک خاتون نظر آرہی تھی۔ یہ وہی تھی جس نے کل اپنے بچے کو گرے فورس سے بچانے کی سرتوڑ کوشش کی تھی۔ اس کوشش میں سجاول نے بھی دیوانہ وار اس کا ساتھ دیا تھا اور وہ کامیاب رہی تھی۔ اس کا چودہ پندرہ سالہ بیٹا گرفتاری سے بچ گیا تھا۔

وہ عمر میں چونتیس پینتیس کے لگ بھگ ہوگی مگر جسمانی طور پر متناسب تھی۔ شکل و صورت بھی اچھی تھی۔ وہ اپنی عمر سے چھوٹی دکھائی دیتی تھی۔ اس کی کہنی پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں جاماجی کے دو پرچم تھے اور جوش سے اس کا رنگ گلابی دکھائی دے رہا تھا۔

انیق نے مجھے پھر آنکھ ماری اور بولا۔ ''یہ ہیں محترمہ خورسنہ۔ آزادی کی لڑائی لڑنے والوں میں ان کا بڑا کردار ہے۔ یہ سیاسی تنظیم 'ہوپ فل' کی سیکٹر انچارج بھی ہیں۔''

خاتون آگے آئی۔ اس کی پُراشتیاق نظریں میرے چہرے پر تھیں۔ اردو میں بولی۔ ''ہم آپ کے فین پہلے ہی تھے لیکن مسٹر پربت سنگھ کی زبانی آپ کی باتیں سن کر اور بھی فین

ہو گئے ہیں۔"

میں نے کہا۔"مسٹر پربت سنگھ میں بھی وہ ساری خوبیاں موجود ہیں جو کسی کو بھی ان کا فین بنا سکتی ہیں۔ یہ خطروں کے کھلاڑی ہیں...... جب ڈٹ جائیں تو لوہے کی دیوار بن جاتے ہیں۔"

"اس کا تجربہ تو کل مجھے ہو گیا ہے جناب! میرے بیٹے کو گرفتاری سے بچانے کے لیے انہوں نے جو کچھ کیا وہ میں کبھی بھول نہیں سکوں گی اور میرے خیال میں...... آج...... آپ نے بھی جو کچھ کیا ہے وہ بھلائے جانے کے قابل نہیں۔" اس نے اپنی گہری سیاہ آنکھیں میرے سراپے پر دوڑائیں اور ذرا توقف سے بولی۔"آپ اس حالت میں ہمارے درمیان آ گئے ہیں لوگوں کو یقین نہیں آ رہا۔ان کا حوصلہ کئی گنا بڑھ گیا ہے۔"

کسی نے ملائی میں فلک شگاف نعرہ بلند کیا۔اس کا مطلب تھا...... ماریں گے مر جائیں گے۔جواب میں یہی فقرہ سینکڑوں لوگوں نے بیک زبان ادا کیا تو قرب و جوار گونج گئے۔ ہجوم میں لہریں پیدا ہو رہی تھیں اور یہ لہریں ہم سے ٹکرا رہی تھیں۔ میں نے سینکڑوں پرچم لہراتے دیکھے۔ یہاں بھی لٹھ بردار محافظوں نے ہمیں چاروں طرف سے حفاظتی گھیرے میں لے لیا۔

تب مجھے قائم مقام ناظم جاسم کی صورت نظر آئی۔ وہ گول چہرے والا ایک صحت مند شخص تھا۔آتے ساتھ ہی وہ بے ساختہ میرے گلے لگ گیا۔ پھر اس نے میرے ہاتھوں کو بوسے دیئے اور ایک میگافون میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔"لوگ آپ کو سننے کے لیے بے تاب ہیں۔آپ ان سے کوئی بات کریں۔"

"ابھی اس کا وقت نہیں...... اور نہ ہی ابھی میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ میں وقت آنے پر ضرور بولوں گا مگر اس طرح میگافون پر نہیں۔ تمہیں انتظام کرنا ہو گا کہ میری آواز دور تک جائے۔"

شاید آپ ساؤنڈ سسٹم کی بات کر رہے ہیں...... یہاں پر یہ آسان تو نہیں ہو گا...... لیکن...... میں پوری کوشش کرتا ہوں۔"

ابھی ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ خورسنہ کے سیل فون پر کوئی کال آئی۔ اس نے اپنے اسکارف کو تھوڑا سا پیچھے ہٹایا اور ایک کان میں انگلی ٹھونس کر کال سننے میں مصروف ہو گئی۔تب میں نے اسے جوش کے عالم میں سجاول سے لپٹتے دیکھا۔اس کی بے باکی بڑی بے ساختہ تھی۔

"کیا ہوا خورسنہ؟" قائم مقام جاسم نے اس سے پوچھا۔

وہ بولی۔ ''مسٹر شاہ زیب کے یہاں پہنچنے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی ہے۔ بہت سے لوگ چھوٹی بڑی ٹولیوں کی شکل میں جلوس کی طرف بڑھ رہے ہیں اور ایک اس سے بھی اہم خبر ہے...... چھاؤنی میں ہلچل ہوئی ہے......اور گرین فورس کے کچھ یونٹ رکاوٹیں توڑ کر باہر آ گئے ہیں۔''

یہ دوسری خبر واقعی بہت اہم تھی۔ ڈی پیلس کے دفاع کے وقت ریان فردوس سے جو غلطیاں ہوئی تھیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ اس نے امن پسندی اور خیر سگالی کا مظاہرہ کرتے ہوئے گرین فورس کے زیادہ تر دستوں کو چھاؤنیوں میں بند کر دیا تھا۔ بعدازاں رائے زل اور ایجنسی نے انہیں جنگی قیدیوں کی حیثیت دے دی تھی۔ اب یہ لوگ بھی باہر نکل رہے تھے۔

اسی اثنا میں مجھے ایک بڑا ریلا اپنی طرف بڑھتا دکھائی دیا۔ قائم مقام ناظم محمد جاسم نے کہا۔ ''یہ عارفہ خاتون ہیں۔ آپ سے ملنے آ رہی ہیں۔''

چند ہی سیکنڈ بعد عارفہ خاتون میرے سامنے تھی۔ وہ ایک شہید کی بیوی تھی۔ اس نے سفید رنگ کا چغا نما لباس پہن رکھا تھا۔ عمر چالیس سے اوپر رہی ہوگی۔ وہ قدرے فربہ جسم کی ایک صحت مند خاتون تھی۔ اس کا نصف چہرہ نقاب میں تھا۔ بیسیوں پُرجوش نوجوان اس کے اردگرد تھے۔ ان نوجوانوں نے اپنی پیشانیوں پر نعرہ تکبیر کی پٹیاں باندھ رکھی تھیں اور دیکھا جاتا تو اب یہ واقعی ایک مذہبی جنگ بن گئی تھی۔ ایک طرف رائے زل تھا جو سرے سے خدا کو مانتا ہی نہیں تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ جنت دوزخ یہیں پر ہے بلکہ دوزخ بھی کیا صرف جنت ہی جنت ہے اور اس ''جنت'' سے لطف اندوز ہونے کے لیے وہ دن رات عیش و عشرت میں غوطہ زن ہو رہا تھا۔ رائے زل کے ساتھ اس کے امریکی دوست تھے۔ یہ پرلے درجے کے لالچی اور مکار لوگوں کا گروہ تھا۔ یہ لوگ نیوسٹی پر تو پہلے سے قابض تھے۔ اب انہوں نے مسلمان اکثریت والے علاقے جاماجی شہر پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ اس شیطانی اتحاد کے مقابلے کے لیے اب جو لوگ نکلے تھے ان میں نوے پچانوے فیصد مسلمان ہی تھے۔

ایک شہید کی بیوی کی حیثیت سے میں نے عارفہ خاتون کو تکریم دی اور اسے سلام کیا۔ اس نے بہت خلوص اور محبت سے جواب دیا، وہ بولی۔ ''ام نے آپ کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا۔ آج آپ کو دیکھ بھی لیا۔ اور ام کو لگ رہا ہے کہ ام نے جو کچھ سنا وہ درست ہی تھا۔''

''میں کسی قابل نہیں ہوں۔ یہ سب کچھ آپ لوگوں کا حسن نظر ہے۔''

''ایسی بات نہیں۔'' وہ بڑے یقین سے بولی۔ ''آپ نے امارے لیے بہت کچھ کیا ہے اور سب سے بڑا بات یہ کہ آپ نے ہاناوانی جیسی عورت کی نظروں کے جادو کو ناکام کیا ہے اور یہ کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ بلکہ اب تو یہاں تک کہا جارہا ہے کہ وہ عورت آپ کی وجہ سے اسپتال میں پڑا ہے۔ یہ ایک بڑا اچھا شگون ہے۔ لوگوں کے دلوں سے اس کا خوپ (خوف) دور ہوا ہے۔''

''یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ لوگ ایسا سمجھ رہے ہیں۔''

''یہ آپ کا نہیں امارا خوش قسمتی ہے کہ آپ یہاں موجود ہے۔ ام اس جلوس کا قیادت کر رہا تھا اور اپنے آپ سے شرمندہ بھی ہو رہا تھا کہ...... اصل لیڈر تو قسطینا بی بی ہے یا پھر آپ ہے۔ اب آپ یہاں آگیا ہے تو اب اس جلوس کا قیادت آپ کے سپرد ہے۔''

اسی دوران میں جنوب کی طرف سے بہت شور وغل سنائی دیا۔ کچھ دیر بعد معلوم ہوا کہ چھاؤنی سے نکل کر آنے والے فوجی دستے یہاں پہنچ گئے ہیں اور انہیں دیکھ کر جلوس کے شرکا خوشی کا اظہار کر رہے ہیں۔

میں کوئی سیاسی تجربہ نہیں رکھتا تھا اور احتجاجی سیاست کی تو الف ب بھی مجھے معلوم نہیں تھی، مگر میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ صورتِ حال میں یہ تبدیلی ہمارے لیے مثبت نہیں ہے۔ ہم پُرامن جدوجہد اور مسلح کوشش کو آپس میں مکس اَپ کرنے والے تھے۔ اس طرح سے یہ نہ تو پُرامن عوامی جدوجہد رہتی اور نہ عسکری کوشش ہوتی۔ میں نے قائم مقام جاسم سے کہا۔ ''یہ سب کیا ہو رہا ہے؟''

وہ ذرا جوش سے بولا۔ ''جو کچھ ہے آپ کے سامنے ہے۔''

''جو کچھ میرے سامنے ہے، وہ تمہارے سامنے شاید نہیں ہے۔ اگر تم لوگ مجھے لیڈر مان رہے ہو تو پھر یہ میرا حکم ہے کہ گرین فورس کے یہ دستے ہمارے جلوس میں شریک نہیں ہوں گے۔ ہم پُرامن...... اور مسلح جدوجہد کو ایک دوسرے میں گڈمڈ نہیں کریں گے۔ ان دستوں کو فوراً واپس جانا ہوگا۔''

جاسم پریشان نظر آنے لگا۔ اس نے اپنے مقامی طرز کے چولے کے دامن سے اپنے گول چہرے کا پسینہ پونچھا اور کہنے لگا۔ ''لیکن شاہ زیب صاحب! اب یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''

''اگر یہ نہیں ہوسکتا تو پھر کچھ بھی نہیں ہوسکتا۔'' میں نے کڑے لہجے میں کہا۔ ''ان لوگوں کو ابھی اور اسی وقت جلوس سے علیحدہ کرو، آدھے گھنٹے کے اندر اندر۔''

''مگر یہ کہاں جائیں گے؟''

''جہاں بھی جائیں مگر یہ جلوس میں نہیں ہوں گے۔ اگر ان کی ضرورت پڑی تو پھر ہم انہیں خود بلائیں گے۔ ابھی ان کا یہاں ہونا ہمارے ''کاز'' کے لیے بے حد خطرناک ہے۔''

چند منٹ کی بحث کے بعد عارفہ خاتون اور جاسم نے دیگر نائبین سے بھی صلاح مشورہ کیا۔ کمانڈر افغانی کی طرح عارفہ خاتون بھی ملائی زبان بڑی اچھی طرح جانتی تھی۔ آخر فیصلہ وہی ہوا جو میں چاہتا تھا۔ میری بات نائبین کی سمجھ میں بھی آ رہی تھی۔

جاسم میرے پاس آ کر بولا۔ ''یہاں قریب ہی ایک فٹ بال اسٹیڈیم ہے۔ چھاؤنی سے باہر آنے والے دستوں کو حکم دیا جا رہا ہے کہ وہ اسٹیڈیم کا کنٹرول سنبھال لیں اور تا حکم ثانی وہیں پر موجود رہیں۔''

''وہیں پر موجود رہیں...... اور ہر طرح کی لڑائی سے بھی ہاتھ روک کر رکھیں۔'' میں نے جاسم کا فقرہ مکمل کیا۔

''جی ہاں...... ایسا ہی ہوگا۔ یہ فیصلہ بھی کیا گیا ہے کہ اگر چھاؤنی سے گرین فورس کے مزید دستے نکلیں تو وہ بھی اسٹیڈیم میں ہی پہنچیں۔ اسٹیڈیم کے اندر یا اسٹیڈیم کے باہر۔''

''یہ ٹھیک ہے۔'' میں نے تائید کی۔

○......❖......○

اُفق پر صبح کی سفیدی نمودار ہونے لگی تھی۔ وہی روشنی جسے ''صبح صادق'' کہا جاتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ روشنی دن کے اجالے میں تبدیل ہوگئی۔ میں نے جیپ کی چھت پر کھڑے ہو کر دیکھا۔ جہاں تک نظر جاتی تھی انسانی سر نظر آ رہے تھے۔ ایک سمندر تھا جو صرف محاورتاً نہیں حقیقتاً ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ یہ وہی انسانی ردِعمل تھا جس کے ذکر سے تاریخ کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔ آج میں وہ ردِعمل اپنے سامنے اپنی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

انیق نے کہا۔ ''ڈی پیلس میں کھلبلی ہے شاہی بھائی! شاید کسی کو بھی توقع نہیں تھی کہ آج لوگ اتنی بڑی تعداد میں نکلیں گے۔ گرے فورس اور ایجنسی کی کھڑی کی ہوئی رکاوٹوں کے باوجود لوگ مسلسل پہنچ رہے ہیں، کئی کلومیٹر تک اردگرد کی سڑکیں بلاک ہو چکی ہیں۔ لوگ بے چین ہیں کہ آپ انہیں مارچ کا حکم کب دیں گے۔''

''ابھی تھوڑا مزید انتظار کرنا ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''آپ کی پنڈلیوں سے خون رِس رہا ہے جی۔ آپ کو زیادہ دیر کھڑا نہیں ہونا چاہیے۔''

''آج تو کھڑا ہونا ہی پڑے گا انیق! تم ڈاکٹر کو بلاؤ۔''

''وہ تو پچھلے ایک گھنٹے سے یہاں موجود ہے۔ آپ کی اجازت کا انتظار کر رہا ہے۔''

انیق نے جاسم سے کہا اور ملائیشین ڈاکٹر آن موجود ہوا۔ وہ دیکھتے ہی جان گیا کہ میری ٹانگوں کے زخم خون اُگل رہے ہیں اور میرے جوتوں میں خون جمع ہو چکا ہے۔

اس نے کہا۔ ''مسٹر شاہ زیب! آپ اپنے جوتے اتاریں۔''

''نہیں ڈاکٹر۔'' میں نے جواب دیا۔ ''یہ تشخیص کا وقت نہیں ہے۔ تم مجھے بس پین کلر انجکشن دو اور NUMBING اسپرے کر دو۔''

ملائیشین ڈاکٹر انکار میں سر ہلانے لگا۔ میری بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ ہم دونوں میں بحث شروع ہو جاتی، مجھے کرنل ڈاکٹر احرار آصفی کی شکل نظر آ گئی۔ اس نے میری مشکل آسان کی اور ملائیشین ڈاکٹر سے کہا کہ وہ وہی کرے جو میں کہہ رہا ہوں۔

مجھے انجکشن لگ گیا اور اسپرے ہو گیا تو ایک بار پھر جیسے جسم میں نئی جان پڑ گئی۔ نائب جاسم بڑے بھلے ساؤنڈ سسٹم کا انتظام کر چکا تھا۔ میں ساتھیوں کا سہارا لے کر جیپ کی چھت پر چلا گیا۔ میں کوئی مقرر نہیں تھا، نہ ہی میں نے اپنی تقریر کے لیے کوئی تیاری کی تھی، میں نے مائیک پکڑا اور جو کچھ میرے دل میں تھا بولنا شروع کر دیا۔ ایک عجیب سی کیفیت تھی، ایک انوکھا سا جذبہ تھا۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو تڑپ تڑپ کر مرتے دیکھا تھا۔ میں نے جاناں کی آخری ہچکیاں سنی تھیں، میں نے اَن گنت پھانسیوں کے مناظر ملاحظہ کیے تھے اور وہ سارا رنج والم ایک آتش کی صورت میرے لہجے میں وارد ہو گیا تھا۔ جو کچھ میرے دل میں تھا، میں بولتا چلا گیا۔

اپنی تقریر کے آخر میں، میں نے کہا۔ ''یہ صرف جاماجی کی کہانی نہیں، یہ ہر اس خطے کی کہانی ہے جہاں ظلم روا رکھا گیا ہے...... یہ کشمیر، فلسطین اور افغانستان جیسے ہر علاقے کی رُوداد ہے۔ اگر آج تمہارے قدم رک گئے تو پھر کبھی نہ اٹھ سکیں گے۔ اگر آج تم ڈر گئے تو تمہاری نسلوں کو ذلت کا عذاب جھیلنا پڑے گا۔ ایک رائے زل کے بعد دوسرا اور پھر تیسرا آئے گا......اور تم پر مسلط ہو جائے گا۔ غلامی کا یہ سفر کبھی ختم نہیں ہو گا۔

آج اپنے گریبان چاک کر دو، اپنے سینے کھول دو...... اپنی نظر سامنے رکھو، اپنے ہاتھوں کی زنجیر بناؤ اور آگے بڑھتے چلے جاؤ۔ میں تم سب سے آگے ہوں۔ ہماری طرف سے کوئی ایک شیشہ نہ ٹوٹے...... ہماری وجہ سے خون کا ایک قطرہ نہ بہے۔ آج ہم نے ایک اور طرح کی جنگ لڑنی ہے، آج ہم نے ایک اور طرح کا معرکہ سر کرنا ہے۔ یہ وہ لڑائی ہے جس میں ایک بھی گولی چلائے بغیر آتشیں ہتھیاروں کا مقابلہ کیا جاتا ہے، جس میں بارود کے سامنے سینوں کی دیوار کھڑی کی جاتی ہے۔ یہ وہ مزاحمت ہے جس میں ہزار ہا نہتے لوگ ایک قالب

میں ڈھل جاتے ہیں اور پکار کر کہتے ہیں...... دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے۔

تقریر ختم ہونے سے پہلے ہی ہجوم میں زبردست ہلچل نظر آنے لگی۔ اب مزید انتظار نقصان دہ تھا۔ میری ہدایت پر جیپ آگے بڑھی اور اس کے ساتھ ہی لوگ حرکت میں آ گئے۔ جیپ پر موجود بلند پرچم لوگوں کی رہنمائی کر رہا تھا۔ جلوس کے راستے میں پہلی رکاوٹ قریباً چار سو میٹر کی دوری پر تھی۔ پولیس اور مسلح رضا کار دستے ایک آہنی دیوار بنائے کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں ڈھالیں تھیں اور وہ سرتاپا آہن میں ڈوبے ہوئے تھے۔ میں نے دیکھا بیسیوں رائفلیں ہماری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

انیق میرے ساتھ ہی جیپ پر موجود تھا۔ اس نے ٹیلی اسکوپ کی مدد سے دیکھا اور بولا۔ ''رضا کار دستے غدار اعظم کی قیادت میں ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

''کمانڈر راوان...... جس نے عین موقعے پر دھوکا دیا تھا۔''

''ایجنسی کے لوگ بھی نظر آ رہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

انیق نے ٹیلی اسکوپ آنکھوں سے لگائے لگائے نفی میں سر ہلایا۔ ''کم از کم اس جگہ تو ایجنسی کا کوئی سفید یا کالا بندر نہیں ہے۔ شاید وہ سمجھتے ہیں کہ لوگ انہیں دیکھ کر زیادہ مشتعل ہوں گے۔''

مارچ شروع ہونے کے ایک منٹ بعد ہی آنسو گیس کی اندھا دھند شیلنگ شروع ہو گئی۔ میرے والی جیپ کے دائیں بائیں دو اور جیپیں تھیں۔ ایک پر عارفہ خاتون اور دوسری پر قائم مقام ناظم جاسم موجود تھا۔ میرے منع کرنے کے باوجود پاسبان بریگیڈ کے سادہ پوش جوان مجھے چاروں طرف سے ڈھانپے ہوئے تھے۔ وہ جیسے میرے اوپر گرے پڑ رہے تھے۔ ان میں سے کچھ نے بلٹ پروف جیکٹس بھی پہن رکھی تھیں۔

ابھی یہ عظیم الشان جلوس دفاعی لائن سے قریباً 100 میٹر دور ہی تھا کہ ''وارننگ شاٹس'' فائر کیے گئے...... اور اس کے فوراً بعد سیدھی فائرنگ شروع ہو گئی۔ چند لمحوں کے لیے بدنظمی اور بھگدڑ نظر آئی۔ جس لینڈ روور جیپ پر میں سوار تھا اسے بھی گولیاں لگیں۔ میں نے دو نوجوانوں کو زخمی ہو کر جیپ سے گرتے دیکھا۔ میری نظر شہید کی بیوی عارفہ خاتون پر پڑی وہ جیپ میں کھڑی ہو گئی تھی اور اس کا بالائی جسم سن روف کے خلا سے باہر نظر آ رہا تھا۔ وہ للکار رہی تھی اور شرکا کا حوصلہ بڑھا رہی تھی۔

بھگدڑ والی لمحاتی کیفیت ختم ہو گئی۔ ہجوم رکا، سنبھلا اور پلٹ پڑا۔ نعروں کی ہیبت ناک

گونج میں یہ ایک زبردست یلغار تھی۔ پولیس کے سینکڑوں اہلکار اور رضا کار دستے پہلے الٹے قدموں پیچھے ہٹے اور پھر منہ پھیر کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ ان کے پاس اس کے سوا اور کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔ یہ ایک انسانی سیلاب تھا جو ایک بلند لہر کی طرح ان کی طرف بڑھا تھا۔

وہاں موجود زیادہ تر سرکاری گاڑیاں تو پسپا ہو گئیں مگر چند ایک مظاہرین کے قبضے میں بھی آ گئیں۔ یہ زیادہ تر قیدیوں کو لے جانے والی بسیں تھیں۔ ٹھاٹھیں مارتا ہوا ہجوم ہر رکاوٹ توڑنے پر آمادہ تھا، جہاں تک نگاہ جاتی تھی دو رنگے پرچم اور کتبے لہرا رہے تھے۔ اگلی صفوں کے لوگ دیوانہ وار آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے، ہزاروں لوگ ان کے پیچھے تھے۔ قریباً 150 میٹر آگے بھی ایک دفاعی لائن قائم کی گئی تھی۔ آثار سے پتا چل رہا تھا کہ چار پانچ منٹ پہلے تک یہاں بھی پولیس اور نیم فوجی دستوں نے پوزیشنیں لے رکھی تھیں، مگر لوگوں کی غیر معمولی تعداد اور ان کا بے پناہ جوش و جذبہ دیکھ کر یہاں موجود سینکڑوں اہلکار دم دبا کر بھاگ نکلے تھے۔

ایک گاڑی پر پوری آواز کے ساتھ ترانہ گونج رہا تھا۔

ہم جاتے اندھیرے تک لڑیں گے

ہم سچے سویرے تک لڑیں گے

اور اگر ہم واپس نہ آ سکے

تو ہمارے بچوں سے کہنا، ہم سرخرو ہوئے

سجاول بھی اگلی صف میں تھا۔ اس صف میں کئی جوشیلی خواتین بھی موجود تھیں۔ انیق نے مجھے کہنی مارتے ہوئے کہا۔ ”وہ دیکھیں جی، آپ کا امریش پوری ہیرو کے کردار میں نظر آ رہا ہے۔“

میں نے دیکھا سجاول کے ساتھ اب خورسنہ بھی نظر آ رہی تھی۔ دونوں ہاتھوں میں پرچم اٹھائے وہ فلک شگاف نعرے لگا رہے تھے۔

انیق بولا۔ ”بڑی بہادر عورت ہے۔ ایسی عورتیں اپنے مردوں میں اتنا جذبہ پیدا کر دیتی ہیں کہ وہ شہادت سے ہمکنار ہو جاتے ہیں۔“

”اپنے مردوں سے تمہاری کیا مراد ہے۔ کیا تم سجاول کو خورسنہ کا مرد کہہ رہے ہو؟“

”یہی بات ہے جی...... پچھلے دو دنوں میں بہت کچھ بدلا ہے۔ کئی کام جو برسوں میں نہیں ہوتے بعض اوقات گھنٹوں اور پہروں میں ہو جاتے ہیں۔ سجاول اور خورسنہ میں گہری دوستی ہو گئی ہے اور محترمہ خورسنہ کی کالی سیاہ آنکھوں کو دیکھ کر مجھے تو یہی لگتا ہے کہ یہ صرف دوستی

نہیں ہے۔''

''اچھا تم زیادہ ماہر چشم نہ بنو۔ یہ وقت اس طرح کی باتوں کا نہیں ہے۔''

''آپ نے خود ہی بات چھیڑ دی ہے شاہی بھائی، ورنہ میں تو صرف سجاول بھائی کا دیدار کر رہا تھا۔ وہ جتنے جوش میں نظر آ رہے ہیں پتا نہیں پھر کبھی ان کا رخِ روشن دیکھنا نصیب ہو یا نہ ہو۔''

جاسم نے اپنی جیپ میں سے پکار کر مجھے مخاطب کیا اور بولا۔ ''دیکھیں جناب! بھگوڑے یہاں سے بھی بھاگ گئے ہیں۔''

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ یہ ڈی پیلس کو جانے والی شاہراہ کا ایک معروف چوراہا تھا (جب آقا جان نے مجھ سے یادگار تھپڑ کھانے کے بعد مجھے دوسری دفعہ اپنے ٹارچر سیل میں لے جانے کی کوشش کی تھی تو اسی چوراہے کے قریب میرے ساتھیوں نے مجھے چھڑایا تھا۔ انیق، کرخت سنگھ اور سیف وغیرہ عقابوں کی طرح جھپٹے تھے اور مسلح افراد کو مار بھگایا تھا) اب اس چوراہے پر ریت کی بے شمار بوریاں اور دیگر رکاوٹیں نظر آ رہی تھیں۔ خاردار تاروں کے طویل چھلے اور ''روڈ بلاکرز'' بتا رہے تھے کہ کچھ دیر پہلے تک یہاں بہت سے مسلح اہلکار و آفیسرز موجود تھے جو نازک صورتِ حال دیکھ کر پیچھے ہٹ گئے ہیں۔

آوازیں گونج رہی تھیں۔

ہم جاتے اندھیرے تک لڑیں گے
ہم سچے سویرے تک لڑیں گے

عارفہ خاتون پکار کر بولی۔ ''اب ام کو رکنا نہیں چاہیے۔ لوہا گرم ہے۔ ام کو آخری چوٹ لگا دینا چاہیے۔''

جاسم نے اثبات میں سر ہلایا۔ تاہم اس کے پاس کھڑا کرنل احرار آصفی بولا۔ ''یہ سب اتنا آسان نہیں ہوگا۔ ڈی پیلس کی حفاظت باقاعدہ فوج اور ایجنسی کر رہی ہے۔ جلد ہی وہ ہمیں روکیں گے۔''

عارفہ خاتون گرجی۔ ''ام سب مرنے کے لیے ہی تو آئے ہیں۔ وہ ماردیں ام کو...... ام تیار ہیں۔''

جاسم کا ایک نائب میرے پاس آیا۔ اور ہانپی ہوئی آواز میں بولا۔ ''جناب! ڈی پیلس سے دو کلو میٹر پہلے ہمیں روکنے کا پکا انتظام کیا گیا ہے۔ وہاں بہت بڑی تعداد میں ایجنسی کے گارڈز اور فوجی دستے موجود ہیں۔ ان کے پاس بھاری ہتھیار بھی ہیں۔ رائے زل کی طرف

سے انہیں ہر طرح کے اختیار دے دیئے گئے ہیں۔''

''یہاں سے یہ دستے کتنی دور ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''مشکل سے ایک کلومیٹر کا فاصلہ ہوگا۔ وہ جہاں سڑک تھوڑا سا موڑ کاٹ رہی ہے، قریباً وہی جگہ ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ ڈی پیلس یہاں سے ٹوٹل تین کلومیٹر دور ہے؟''

''جی جناب! مگر ان لوگوں نے تہیہ کر رکھا ہے کہ جلوس کو ڈی پیلس کے آس پاس بھی نہیں پہنچنے دیا جائے گا۔ ٹی وی پر بار بار اعلان کیے جا رہے ہیں۔ شہریوں سے کہا جا رہا ہے کہ وہ گھروں میں بند رہیں، جو شر پسند ڈی پیلس کی طرف مارچ کرنا چاہ رہے ہیں ان کے ساتھ نہایت آہنی ہاتھوں سے نمٹا جائے گا۔''

''جلوس کی صورتِ حال کیا ہے؟'' میں نے نائب سے پوچھا۔

''نعرہ زن جھتے مسلسل شامل ہو رہے ہیں جناب۔ جاماجی کی تاریخ نے ایسا عظیم الشان اجتماع کبھی نہیں دیکھا۔ پتا نہیں کہ سرکاری ٹی وی کن لوگوں کو گھروں میں بند رہنے کے لیے کہہ رہا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ گھروں میں کوئی رہا ہی نہیں ہے۔''

چند منٹ بعد نائبین سے مشورے کے بعد میں نے جلوس کو پھر مارچ کی ہدایت کی۔ ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر ہزاروں لوگ ایک فردِ واحد کی طرح حرکت میں آ گئے۔ خاردار تاروں کو کاٹ دیا گیا یا ان پر لکڑی کے بڑے بڑے تختے رکھ کر انہیں روند دیا گیا۔ چند منٹ بعد جلوس اس مقام پر پہنچ گیا جہاں ظلم کے پہرے دار سرتاپا آہن میں ڈوبے...... پرے باندھے کھڑے تھے۔ یہاں بکتر بند گاڑیوں کی قطاریں نظر آ رہی تھیں۔ ان پر M-16 ٹائپ کی مشین گنیں نصب تھیں۔ گرے فوجیوں نے سڑک پر ایک جگہ سرخ جھنڈیاں گاڑ رکھی تھیں۔ جھنڈیوں کی یہ قطار افقی رخ پر اس شاہراہ کے آر پار چلی گئی تھی۔

کرنل احرار نے تصدیق کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ ریڈ لائن کی نشاندہی ہے۔ ہم میں سے کوئی اس کو پار کرے گا تو اس پر فائر کھول دیا جائے گا۔ ان میں گرے فورس کے لوگ کم ہی ہیں۔ زیادہ تر ایجنسی کے امریکی ہیں۔ ٹاپ کلاس پروفیشنل...... حکم کے بندے...... ایک اشارے پر لاشیں بچھا دینے والے۔''

میں نے بکتر بند گاڑیوں کو گنا۔ تعداد پندرہ کے قریب تھی۔ ان کے عقب میں ریت کی بوریوں سے بہت سے مورچے بنائے گئے تھے۔ اردگرد کی عمارتوں کے پاس بھی مسلح فوجیوں نے پوزیشنیں لے رکھی تھیں۔ انتظام اس طرح کا تھا کہ چڑیا بھی پَر نہ مار سکے۔

اب یہ تخت یا تختے والا معاملہ تھا۔ فیصلہ کن مرحلہ تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ جاما جی کی بازیابی کے لیے لڑی جانے والی لڑائی آج اسی جگہ پر ختم ہو جانا تھی یا پھر کامیابی کی طرف بڑھنا تھی۔

کرنل احرار کے چہرے پر مجھے پہلی بار کچھ ہراس نظر آیا۔ وہ بولا۔ ''انسانوں کا یہ سمندر دیکھ کر ان لوگوں کی ٹانگیں ضرور کانپ رہی ہوں گی مگر یہ گولی چلانے سے باز نہیں آئیں گے۔ یہ قتلِ عام کی شکل ہو جائے گی۔''

عارفہ خاتون گرجی۔ ''کتنوں کو ماریں گے...... کتنوں کو چھلنی کریں گے۔ یہاں ہر گھر سے کمانڈر افغانی اور عبدالکریم نکلے ہیں۔ وہ لاکھوں میں ہیں اور مرنے کو تیار ہیں۔''

کرنل احرار آصفی نے کہا۔ ''لوگوں کی ناقابلِ یقین تعداد اور جوش میں تو کوئی کلام نہیں، مگر بات خونریزی کی ہے۔ اگر خدانخواستہ...... خدانخواستہ بھگدڑ مچ گئی یا ایسا ہی کچھ اور ہو گیا تو سینکڑوں لوگ اپنے ہی پاؤں تلے کچلے جائیں گے۔''

وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ اب یہ بالکل پگھلے ہوئے سیسے اور انسانی گوشت کا ٹکراؤ تھا...... سینوں اور گولیوں کا تصادم تھا۔ کچھ علاقوں کے ناظم بھی متذبذب نظر آتے تھے۔

جلوس...... عظیم الشان جلوس اور ایجنسی کی آہنی دیوار کے درمیان قریباً ساٹھ ستر قدموں کا فاصلہ رہا ہوگا۔ درجنوں سرخ جھنڈیاں موت اور زندگی کے درمیان ایک واضح لکیر بنا رہی تھیں۔ ان جھنڈیوں سے پندرہ بیس قدم آگے، ہیلمٹ اور سیاہ عینک پوش امریکی گارڈز اپنی انگلیاں جدید رائفلوں کے ٹریگرز پر رکھے پتھروں کی طرح ساکت بیٹھے تھے۔ دو تین گاڑیوں میں گرے فورس کے لوگ بھی نظر آ رہے تھے۔

دس پندرہ منٹ کے اندر دو طرح کی رائے سامنے آئیں۔ جلوس کے کچھ سرکردہ افراد کا خیال تھا کہ اندیشوں کو بالائے طاق رکھ کر آگے بڑھا جائے۔ کچھ لیڈر ایسے تھے جو فوری طور پر آگے بڑھنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کا مشورہ تھا کہ یہیں پر احتجاج جاری رکھا جائے۔ مین شاہراہ اور اردگرد کی سڑکیں بلاک کر دی جائیں۔ شام تک مظاہرین کی تعداد میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔ پھر کوئی فیصلہ کیا جائے۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ آخری فیصلے کا حق یہ لوگ مجھے دے رہے تھے اور یہی وہ گراں بوجھ تھا جس سے میں مسلسل بچنا چاہ رہا تھا۔ ابھی یہ کشمکش جاری ہی تھی کہ اچانک دو افراد میرے قریب آئے۔ وہ لمبے تڑنگے تھے اور ان کے جسموں پر مقامی لباس تھا۔ بہت سے رضاکاروں اور مظاہرین کی طرح انہوں نے بھی اپنے چہرے ڈھاٹوں میں چھپا رکھے تھے۔ بس ان کی آنکھیں ہی دکھائی دیتی تھیں۔ ان میں سے ایک

شخص کی نیلی آنکھیں دیکھ کر میں کچھ چونکا۔ اگلے ہی لمحے میرا شک درست ثابت ہو گیا۔ امریکی آفیسر پال کی مدھم آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ''ہیلو مسٹر شاہ زیب! کیسے ہو تم؟''

''اوہ گاڈ، تم یہاں؟'' میں واقعی حیرت زدہ تھا۔

''جب دوست مصیبت میں ہوتا ہے تو دوست کو وہاں پہنچنا ہی پڑتا ہے، اور میں آ گیا ہوں۔'' وہ اطمینان سے بولا اور مجھ سے گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔

میں نے دوسرے شخص کی طرف دیکھا، پال بولا۔ ''یہ بھی ایجنسی کے آفیسر ہیں مسٹر راجر نیومن...... الاسکا سے تعلق رکھتے ہیں۔ جلسے جلوسوں اور مشتعل ہجوم کی نفسیات کو بڑی اچھی طرح سمجھتے ہیں اور ایسی صورتِ حال کو سنبھالنے کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن یہاں یہ صورتِ حال کو سنبھالنے کے لیے نہیں آئے بلکہ ہماری مدد کرنے آئے ہیں۔''

اس دوسرے امریکی آفیسر نے بھی میرے ساتھ مصافحہ کیا۔ پال کی نیلی آنکھوں میں بلا کی چمک نظر آ رہی تھی۔ اس نے آنکھیں سکیڑ کر دور کھڑی ان پندرہ عدد بکتر بند گاڑیوں کی طرف دیکھا، جن پر مشین گنیں نصب تھیں اور جن میں حکم کے سفاک تابعدار موجود تھے۔

پال بولا۔ ''تمہاری ہمت کی داد دینا پڑتی ہے شاہ زیب! تم اس بری حالت میں یہاں موجود ہو، مجھے لگتا ہے کہ یہ فیصلہ کن مرحلہ ہے۔''

''بے شک۔'' میں نے کہا۔ ''یہ انسانی گوشت اور لوہے کا ٹکراؤ ہے۔ آئندہ چند منٹوں میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔''

پال نے مسکراتی نظروں سے میری طرف دیکھا اور میرے دونوں کندھے تھام کر عجیب لہجے میں بولا۔ ''آئندہ چند منٹوں میں کچھ نہیں ہو گا شاہ زیب! کم از کم وہ تو نہیں ہو گا جو تم سوچ رہے ہو۔''

''میں سمجھا نہیں پال؟''

''تمہیں دوست کہا تھا اور یہ دوستی مجھ سے کچھ مانگ رہی تھی۔ تم لونگ کے تشدد کی چکی میں پستے رہے اور میں بھی آگ میں جلتا رہا۔ میں نے خود سے عہد کر رکھا تھا کہ تمہیں تنہا نہیں چھوڑوں گا...... اور آج میں تمہارے پاس موجود ہوں۔ آج جب تم ڈی پیلس کے دروازوں پر دستک دو گے تو میں تمہارے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑا ہوں گا۔''

''لیکن پال، ڈی پیلس کے دروازوں پر تو ہم تب دستک دے پائیں گے جب یہاں سے آگے بڑھ سکیں گے۔ یہ مشین گنیں ہمیں آگے بڑھنے دیں گی؟''

''ہاں یہ بڑھنے دیں گی۔'' پال نے پھر عجیب لہجے میں کہا۔ ''ان میں سے کوئی گن فائر

نہیں کرے گی۔ سب خاموش رہیں گی۔ شاید کچھ سنگل فائر کیے جائیں۔ وہ بھی وارننگ شاٹس ہوں گے۔''

میں حیران تھا۔ میرے پاس کھڑے انیق کے چہرے پر بھی بے حد حیرت دکھائی دے رہی تھی۔ سجاول کچھ فاصلے پر تھا اس لیے اس تک ہماری آواز نہیں پہنچ رہی تھی۔ پہنچ بھی رہی ہوتی تو وہ انگلش نہ سمجھتا۔ جیپ میں میرے اور انیق کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ پال نے ڈرامائی لہجے میں بتایا۔ ''اس وقت بکتر بند گاڑیوں پر جو پلاٹون موجود ہے وہ ان ہی دو کمپنیوں میں سے ایک ہے جو میری ٹریننگ میں رہی ہیں۔ آج جس طرح جاماجی کے لوگ تم پر جان چھڑک رہے ہیں۔ 50 بندوں کی یہ پلاٹون بھی مجھ پر جان چھڑکتی ہے۔ لونگ جیسے آفیسرز کو اس بات کا پتا ہوتا تو آج یہ پلاٹون کبھی اس اہم ترین مقام پر موجود نہ ہوتی۔''

پال کی نیلی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی اور اس کا معنی خیز لہجہ مجھے بہت کچھ سمجھا رہا تھا۔ پال کا ساتھی راجر بولا۔ ''سامنے نظر آنے والی ایک دو بکتر بند گاڑیوں میں گرے فورس کے اہلکار بھی موجود ہیں مگران گاڑیوں میں بھی گن مین ہماری پلاٹون کے لوگ ہی ہیں۔''

میں نے سوالیہ نظروں سے پہلے انیق اور پھر پال کی طرف دیکھا۔ پال کی آنکھوں میں جوش آمیز نمی تھی۔ اس نے آہستگی سے میرے کندھے تھامے اور بولا۔ ''میں نے کہا تھا نا کہ بہت اچھے لوگوں میں بھی کمانڈر راوان جیسے برے موجود ہوتے ہیں...... اور بروں میں بھی ایسے لوگوں کو ڈھونڈا جا سکتا ہے جنہیں اچھا کہا جا سکے۔''

راجر نے کہا۔ ''ہمارے پاس وقت بہت کم ہے مسٹر شاہ زیب! میں بہت مختصر لفظوں میں آپ کو پوزیشن سمجھا دیتا ہوں، بلکہ میرا خیال ہے کہ آفیسر پال ہی آپ کو بتا دیتے ہیں۔''

پال نے کہا کہ یہ بات طے ہو چکی ہے کہ پندرہ گن مینوں میں سے کوئی ایک بھی فائر نہیں کھولے گا۔ تاہم پلاٹون کو اپنے حق میں ایک دو دلیلیں چاہئیں۔ ان میں اہم دلیل یہی ہو گی کہ اچانک سینکڑوں مظاہرین نے اندھا دھند چارج کیا اور بکتر بند گاڑیوں پر چڑھ دوڑے۔ کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع نہیں ملا۔ میری بات تم سمجھ رہے ہو نا؟'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ پال بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''جب مظاہرین چارج کریں گے تو بکتر بند گاڑیوں میں موجود گن مین ہوائی فائرنگ کریں گے اور سامنے کی طرف کچھ سنگل شاٹس بھی چلائیں گے لیکن کوئی زخمی نہیں ہو گا۔''

راجر بولا۔ ''پچھلے دس سال میں میں نے RIOT کنٹرولنگ کے سلسلے میں جو تجربہ حاصل کیا ہے، اس کا نچوڑ یہی ہے کہ ہجوم کی پہلی ایک یا دو صفیں ہجوم کو لیڈ کرتی ہیں۔ یہ ہراول

لوگ جو ایکشن دیتے ہیں باقی مجمع اس کو فالو کرتا ہے۔ ان ہی اگلی ایک دو صفوں میں لیڈر بھی ہوتے ہیں اور فعال ترین ورکر بھی۔ میں چاہتا ہوں کہ ان لوگوں کو یہاں جمع کیا جائے اور انہیں لائحہ عمل سے آگاہ کیا جائے۔''

انیق نے کہا۔ ''آپ کا مطلب ہے کہ انہیں اصل صورتِ حال سے آگاہ کر دیا جائے۔ یعنی بتا دیا جائے کہ فائرنگ نہیں ہو گی؟''

''نہیں۔'' پال نے کہا۔ ''اگر یہ اطلاع ہم اس طرح عام کریں گے تو پھر یہ راز...... راز نہیں رہے گا۔ ہاں ان ہراول لوگوں کو MOTIVATE کیا جائے۔ انہیں کہا جائے کہ وہ اشارہ ملتے ہی بکتر بند گاڑیوں کی طرف جھپٹ پڑیں۔ ڈیئر شاہ زیب جب تمہاری طرف سے یہ اعلان ہو گا کہ تم اور تمہارے قریبی ساتھی سب سے آگے چلیں گے تو ان لوگوں کے حوصلے پہاڑ بن جائیں گے۔''

''لیکن مجھے قائم مقام جاسم اور نائبوں کی جماعت کو تو ہر صورت اعتماد میں لینا پڑے گا۔'' میں نے کہا۔ ''ان کے علاوہ تین چار اسٹوڈنٹ لیڈر ہیں اور تنظیموں کے ہیڈ ہیں۔''

''خاص الخاص لوگوں کو بتانے میں کوئی حرج نہیں ہے، مگر انہیں پابند کیا جائے کہ وہ راز داری برتیں گے۔'' پال کورنی بولا۔

اسی دوران میں تین مزید ڈھاٹا پوش افراد بھی موقع پر پہنچ گئے۔ ان کی آنکھیں دیکھ کر ہی مجھے پتا چل گیا کہ وہ پال کے ساتھی ہیں۔ انہوں نے بھی بڑے اشتیاق سے مجھے دیکھا۔ جیسے دل ہی دل میں کہہ رہے ہوں کہ...... اچھا تم ہو وہ ایم ایم اے فائٹر جس کی ''زخمی تصویر'' یہاں چپے چپے پر نظر آ رہی ہے۔ ان تین امریکیوں میں سے ایک نے اپنا ڈھاٹا منہ سے ہٹایا اور پال سے بات کی۔ وہ شکل وصورت سے کوئی اسکیمو نظر آتا تھا۔ جو زبان وہ بول رہا تھا، انگلش سے کافی مختلف تھی، پال نے بھی اسی زبان میں اس شخص کے ساتھ چند فقروں کا تبادلہ کیا۔ میں پال سے اس گفتگو کے بارے میں جاننا چاہ رہا تھا کہ ایک شخص محافظوں کا گھیرا توڑتا ہوا مجھ تک آن پہنچا۔ آنسو گیس وغیرہ کے اثرات سے بچنے کے لیے اس نے بھی اپنا منہ سر ایک ڈھاٹا نما کپڑے میں چھپایا ہوا تھا۔ وہ قریب آیا اور اس نے کپڑا ہٹایا تو میں نے پہچان لیا۔ یہ وہی پچاس پچپن سالہ مقامی شخص تھا جس نے کل مجھ سے کہا تھا کہ اس کا ایک معصوم پوتا جنگ کا نوالہ بن چکا ہے اور دوسرا موت کے خطرے سے دوچار ہے۔ آج یہ دکھی دادا تمتمائے چہرے اور چاک گریبان کے ساتھ اس عظیم الشان جلوس میں موجود تھا اور اپنی آنے والی نسل کے لیے ہر قربانی پر آمادہ نظر آتا تھا۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر وہ صرف

میرے ہاتھ ہی چوم سکا۔ میرے حفاظتی حصار کے لوگ اسے مجھ سے کھینچتے ہوئے دور لے گئے۔

اگلے پندرہ بیس منٹ کے اندر قائم مقام جاسم اور اس کے نائبین نے نئی صورتِ حال کے مطابق عملی قدم اٹھا لیے۔ سرکردہ افراد کو اکٹھا کر کے ان کو نئی صورتِ حال سے آگاہ کیا گیا اور ان کی رائے میں ہم آہنگی پیدا کی گئی۔ گولی نہ چلنے والے انکشاف نے ہر شخص کو ایک خوشگوار حیرت میں مبتلا کیا تھا۔ سرکردہ افراد نے چار پانچ سو مظاہرین کے ہراول دستے کو ایک جگہ جمع کیا اور انہیں بتایا کہ کس طرح بکتر بند گاڑیوں کی طرف سرپرائز چارج کرنا ہے۔ انہیں یہ بھی سمجھایا گیا کہ اگر دوسری طرف سے ان پر سیدھی گولی نہیں چلتی تو وہ بھی ایجنسی کے گن مینوں کو جانی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ انہیں یہ بتا کر ان کی مزید حوصلہ افزائی بھی کر دی گئی کہ ایجنسی کے کچھ اہم افسران مظاہرین کے ساتھ آن ملے ہیں اور یہ لوگ اگلی صف میں موجود ہوں گے۔

پلاننگ مکمل ہو چکی تو آگے بڑھنے کا وقت آ گیا۔ سینوں میں دلوں کی دھڑکن تیز تر ہو چکی تھی۔ ہزاروں لوگ ایک ایسے پُرآشوب پانی کی طرح تھے جو کسی بھی وقت کنارے توڑ کر بہہ نکلنا چاہتا تھا۔ میری نگاہ سردار سجاول پر پڑی۔ وہ ایک پیدائشی جنگجو تھا۔ اسے وراثت میں فنِ حرب کی کچھ خاص صلاحیتیں ملی تھیں اور ان لمحوں میں وہ سرتاپا غیظ و غضب دکھائی دیتا تھا۔ میں نے خوش اندام و بلند ہمت خورسنہ کو دیکھا۔ وہ ایڑیاں اٹھا کر سجاول کی پگڑی کو ایک ڈھاٹے کی طرح اس کے چہرے اور سر پر لپیٹ رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے دونوں مدتوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔

○……❖……○

وہ ایک خوفناک یلغار تھی۔ سینکڑوں افراد یک بیک بکتر بند گاڑیوں کی طرف لپکے تھے۔ ان کے عقب میں ہزاروں افراد کا جلوس تھا۔ میں انیق اور سجاول ان لوگوں میں تھے جو سب سے آگے تھے۔ جاسم، عارفہ خاتون، پال کرونی، اس کے چاروں امریکی دوست بھی صف اول میں تھے۔ للکاروں کی گونج اور سینکڑوں پرچموں کی پھڑ پھڑاہٹ میں جلوس کی اگلی صف چند سیکنڈ میں سرخ جھنڈیوں تک پہنچ گئی۔ جونہی ہم نے سرخ جھنڈیاں کراس کیں، زبردست ہوائی فائرنگ شروع ہوگئی۔ پھر سیدھے فائر آنے لگے لیکن یہ فائر شاید ایک دو گاڑیوں سے ہی ہو رہے تھے۔ مظاہرین کی ٹانگوں کو نشانہ بنانے کی کوشش کی جارہی تھی۔ میں نے کئی افراد کو زخمی ہو کر جیپ کے اردگرد گرتے دیکھا، میری جیپ کے بونٹ پر کھڑے ایک بلوچی نوجوان کی چھاتی پر گولی لگی اور وہ پلٹ کر جیپ کے اندر آ گرا۔ وہ کلمہ طیبہ کا ورد کر رہا تھا۔ ایک اور شخص گردن میں گولی کھا کر زمین بوس ہوا۔

پال کرونی نے کہا تھا...... سیدھی گولی نہیں چلے گی، مگر وہ چل رہی تھی۔ یہ فائرنگ شدید نہیں تھی مگر ہو تو رہی تھی۔ سرخ جھنڈیوں کو کراس کرنے کے بعد پانچ چھ سیکنڈ کے اندر مظاہرین بکتر بند گاڑیوں تک پہنچ گئے۔ جن دو تین گاڑیوں سے فائر ہوئے تھے، ان میں موجود اہلکاروں کو گھسیٹ گھسیٹ کر باہر نکال لیا گیا اور بری طرح زدوکوب کیا جانے لگا۔ میری آنکھوں کے سامنے ایجنسی کے دو امریکن اہلکاروں کو چھرا گھونپ دیا گیا۔ تب ایک بار پھر فائرنگ کی آوازیں آئیں۔ کئی سفید فام گارڈز کو بپھرے ہوئے مظاہرین سڑک پر گھسیٹ رہے تھے۔ ان میں سے دو چار ایسے بھی تھے جو لاشوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ آناً فاناً چاروں طرف بپھرے ہوئے مظاہرین دکھائی دیئے۔ بکتر بند گاڑیاں، ریت کی بوریوں کے مورچے، روڈ بلاکرز، سب کچھ مظاہرین کے غیر معمولی ازدحام میں ڈوب گیا۔ اس سے چند لمحے پہلے جاسم پکار کر لٹھ بردار محافظوں کو حکم دے چکا تھا کہ جن بکتر بند گاڑیوں سے فائرنگ نہیں ہوئی

ان کے سواروں کو تحفظ دیا جائے۔ اس کی ہدایت پر خاطر خواہ عمل ہوا اور میں نے بیشتر بکتر بند گاڑیوں کے گرد محافظوں کو ہاتھوں کی زنجیر بنائے دیکھا۔ میری اور عارفہ خاتون کی جیپ کے گرد سماعت شکن نعرہ زنی ہو رہی تھی۔ لوگ آگے بڑھنے کے لیے بے تاب تھے۔

دس منٹ کے اندر اندر وہ سب کچھ ہو گیا تھا جو نہایت مشکل نظر آ رہا تھا۔ ڈی پیلس سے تقریباً دو کلو میٹر دور بولے جانے والے اس ہلے میں صرف چار پانچ مظاہرین کی جان جانے کی اطلاع تھی۔ مرنے والے امریکن گارڈز کی تعداد آٹھ کے لگ بھگ بتائی جا رہی تھی۔ کچھ زخمی ہوئے تھے۔ دیکھا جاتا تو یہ نقصان اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں تھا جس کا اندیشہ تھا۔ اب آخری مرحلہ باقی تھا اور یہ تھا ڈی پیلس پر چڑھائی کا۔

صف اول میں ہونے کی وجہ سے پال کورنی کے کندھے کے پاس زخم آیا تھا۔ گولی کندھے کے گوشت کو چیرتی ہوئی نکل گئی تھی۔ فرسٹ ایڈ لینے کے بعد وہ میرے پاس آیا۔ ساتھ میں اس کا وہ آفیسر دوست بھی تھا جو صورت سے اسکیمو دکھائی تھا۔ اس نے بلٹ پروف جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اس نے بتایا کہ ایک گولی سیدھی اس کے سینے پر لگی ہے۔ پال کھلی چھت والی جیپ کے اندر آ گیا۔ میرے اردگرد موجود نوجوان سمجھ گئے کہ میں اور پال اکیلے میں بات کرنا چاہتے ہیں۔ وہ جیپ سے اتر گئے۔ پال کے زخم کی حالت دریافت کرنے کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔ ''یہ کیا ہوا ہے پال؟ کن لوگوں نے فائرنگ کی ہے۔ تم تو گارنٹی دے رہے تھے کہ......'' میں نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

اس نے گہری نظروں سے میری طرف دیکھا اور میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''شاہ زیب! اگر اجازت ہو تو، تمہیں تھوڑا سا حیران کر سکتا ہوں؟''

''کس سلسلے میں؟''

''اسی فائرنگ کے سلسلے میں۔'' میری سوالیہ نظریں اس کے چہرے پر جم گئیں۔ وہ میری طرف جھکا اور مدھم آواز میں بولا۔ ''شاہ زیب! بکتر بند گاڑیوں میں موجود انفنٹری کی اس پلاٹون سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا...... ویری سوری...... میں نے غلط کہا تھا کہ ان لوگوں سے ہماری ''انڈر اسٹینڈنگ'' ہو چکی ہے۔''

میں خاموشی سے اس کی جانب دیکھتا رہا۔ درد کی لہریں پھر ٹانگوں کو جھنجوڑ رہی تھیں۔ پال نے بات جاری رکھی۔ ''میں چاہتا تھا شاہ زیب کہ لوگوں کی رائے تقسیم نہ ہو۔ اور مجھے یہ بھی پتا تھا کہ جب اتنا بڑا ہجوم بپھر کر ان بکتر بند گاڑیوں کی طرف جھپٹے گا تو ٹریگر دبانے والوں کی انگلیاں شل ہو جائیں گی۔ ان کی ''بے رحمی'' جواب دے جائے گی...... اور تم نے دیکھا

شاہ زیب! ایسا ہی ہوا......صرف دو تین گاڑیوں سے تھوڑی بہت گولیاں چلی ہیں......"
میں نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "اگر مجھے بھی اجازت ہو تو میں تمہیں تھوڑا سا حیران کروں؟"
"کیا مطلب؟" وہ چونکا۔
میں اس کی طرف جھکا اور سرگوشی میں بولا۔ "پال کورنی......میرے دوست...... مجھے بھی پتا تھا کہ تمہارے پاس کوئی گارنٹی نہیں ہے۔"
وہ ہکا بکا میری طرف دیکھنے لگا۔
"یہ کیسے ہو سکتا ہے شاہ زیب؟" پال کی آواز میں ارتعاش تھا۔
"یہ ہوا ہے پال، بکتر بند گاڑیوں کی طرف جھپٹنے سے پہلے مجھے اور میرے ساتھی انیق کو معلوم تھا کہ مشین گنوں کے منہ کھل سکتے ہیں، تم صرف طفلِ تسلی دے رہے ہو۔"
"مگر کیسے معلوم ہوا؟" پال کی نیلی آنکھوں میں تجسس آمیز حیرت کے سوا کچھ نہیں تھا۔
میں نے پال کے اس ساتھی کی طرف اشارہ کیا جس کا نام اس نے راجر بتایا تھا اور جو شکل وصورت سے کوئی اسکیمو دکھائی دیتا تھا۔ میں نے کہا۔ "چارج کرنے سے چند منٹ پہلے تم نے راجر سے کسی جناتی زبان میں تھوڑی سی بات کی تھی۔ وہ زبان یہاں کسی کو نہیں آتی تھی لیکن میرے پاس یہاں ایک ایسا جن ہے جو ہر طرح کی جناتی زبان کو سمجھ سکتا ہے۔ اس نے مجھے بتا دیا کہ تم دونوں میں کیا بات ہوئی ہے۔"
پال کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ میں نے جیپ سے کچھ فاصلے پر کھڑے انیق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "انیق نے مجھے بتا دیا تھا کہ تم راجر کو تسلی دے رہے ہو۔ اس سے کہہ رہے ہو کہ گولی چلی بھی تو زیادہ ہلاکتیں نہیں ہوں گی۔ جواب میں راجر نے کہا تھا کہ یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ کیا ہوتا ہے۔ راجر نے تمہیں یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ تم اس کی بلٹ پروف جیکٹ پہن لو۔ تم نے کہا تھا، جب سینکڑوں ہزاروں لوگ بلٹ پروف جیکٹ کے بغیر آگے بڑھیں گے تو تم بھی بڑھ سکتے ہو اور ویسے بھی بلٹ پروف زندگی کی ضمانت تو نہیں ہوتی۔"
پال خاموشی سے میری جانب دیکھتا رہا۔ میں نے کہا۔ "تم نے کہی تھی ناں یہ باتیں؟"
پال نے اثبات میں سر ہلایا اور گہری سانس لے کر بولا۔ "اور اسی لیے تم نے مجھے جیکٹ منگوا کر دی تھی۔"
"پھر بھی تمہارا کندھا تو زخمی ہو ہی گیا۔" میں نے کہا۔

"یہ کچھ بھی نہیں ہے میرے دوست! میں تمہاری مدد کے لیے ہر حد تک جانے کو تیار ہوں کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ تم حق پر ہو اور ان لوگوں کے کندھے سے کندھا ملا رہے ہو جو ظلم کے پنجے میں ہیں۔"

پندرہ بکتر بند گاڑیوں میں سے دس بارہ ضرور ایسی تھیں جن کے گن مینوں کو ہمت ہی نہیں ہو سکی تھی کہ وہ انسانوں کے سیلاب کو اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر اس پر مشین گن کا فائر کھول سکیں۔ ان بکتر بند گاڑیوں میں موجود زیادہ تر امریکیوں کی جان بچ گئی تھی اور قائم مقام جاسم کے حکم پر سر کردہ مظاہرین نے انہیں اپنے گھیرے میں لے لیا تھا مگر جن گاڑیوں سے فائر کھولا گیا تھا، ان کے سواروں کی ہجوم کے قہر سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔ آٹھ دس اہلکاروں کی ہلاکت یقینی تھی ابھی بہت سے شدید زخمی تھے۔ ایسے ہی ایک امریکی گارڈ کی لاش کو میں نے لوگوں کے پاؤں میں روندے جاتے دیکھا۔ ایک وہ امریکی تھا اور ایک یہ تھا جو میرے ساتھ جیپ میں بیٹھا تھا۔ دونوں کے کردار میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

جیپ پر سے ہمیں حدِ نگاہ تک انسانی سر اور لہراتے ہوئے پرچم نظر آتے تھے...... اس بیکراں ہجوم کو اب زیادہ دیر روکے رکھنا ممکن نہیں تھا۔ ہم نے باہمی مشورے کے بعد آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا۔ جونہی میری اور عارفہ خاتون کی جیپیں آگے بڑھیں، جاسم والی جیپ بھی حرکت میں آ گئی۔ ان جیپوں کو آگے بڑھتے دیکھ کر انسانی سروں کا بیکراں سمندر بھی متحرک ہو گیا۔

زمین جیسے دہل رہی تھی۔ آسمان محوِ حیرت تھا۔ کل کے قتلِ عام میں تین سو سے زیادہ افراد جاں بحق ہوئے تھے۔ یہی قتلِ عام تھا جس نے آج لوگوں کو دیوانہ وار گھروں سے باہر نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ قتلِ عام آقا جان نے بنفسِ نفیس کروایا تھا۔ ظالم اور جابر حکمران اسی طرح اپنی پھانسی کا پھندا اپنے ہاتھوں سے تیار کرتے ہیں۔ عوامی ردِعمل بس اتنا کرتا ہے کہ یہ پھندا ان کے گلے میں ڈال دیتا ہے۔

ڈی پیلس کی بلند و بالا دیواروں تک ہمارے راستے میں کوئی رکاوٹ نظر نہیں آئی۔ دو کلو میٹر کے اس نہایت پُر جوش سفر کے دوران میں ہی ہمیں ایک خوش کن اطلاع بھی ملی۔ یہ اطلاع جاسم نے ہم تک پہنچائی اس نے بتایا۔ "شہر کے مشرقی ساحل سے گرے فورس کے تین بریگیڈ ایک بڑے کانوائے کی صورت میں ڈی پیلس کی طرف آ رہے تھے۔ وہ اس نفری میں شامل ہونا چاہ رہے تھے جو ڈی پیلس کی حفاظت کر رہی ہے، مگر عظیم الشان انسانی ریلے کی خبروں نے انہیں ہراساں کر دیا ہے اور وہ وہیں سے واپس نیوسٹی کی طرف چلے گئے ہیں۔"

پال نے کہا۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ کل والے قتلِ عام نے رائے زل اور آقا جان کو بہت بڑا نقصان پہنچایا ہے جہاں عام لوگوں میں بے پناہ اشتعال پیدا ہوا ہے وہاں رائے زل کی فوج میں بھی کئی طرح کی چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ گرے فورس میں کئی لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ جس طرح عزت مآب ریان فردوس کی فیملی نے آقا جان پر اندھا بھروسا کر کے بہت نقصان اٹھایا اسی طرح عزت مآب رائے زل بھی اس شخص کو وسیع اختیارات دے کر غلطی کر رہے ہیں۔ کیونکہ یہ کسی کا خیر خواہ نہیں۔ بس اقتدار کا بھوکا ہے۔''

اب ہمیں ڈی پیلس کے بلند کلس اور برجیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ نیوسٹی کا بہت بڑا پرچم غاصبانہ قبضے کی علامت بن کر ایک برجی پر لہرا رہا تھا۔ فورس نے ڈی پیلس کے گرد مورچے بنا رکھے تھے اور خندقیں کھود رکھی تھیں۔ بکتر بند گاڑیوں کی قطاریں خاردار تاروں کے چھلے، ریت کی بوریاں، غرض دیوانوں کے راستے روکنے کا ہر سامان یہاں موجود تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ یہاں گریبانوں کے ڈھیر بھی لگیں گے۔

''اب کیا کرنا ہے جناب؟'' جاسم نے براہِ راست مجھ سے پوچھا۔

''تمہاری کیا رائے؟''

''لوگ آپ کے ایک اشارے کے منتظر ہیں۔ ہر رکاوٹ سے ٹکرا جائیں گے۔ لاکھوں کے اس مجمع میں ہزاروں ایسے ہیں جنھوں نے اپنے سر ہتھیلیوں پر رکھے ہوئے ہیں۔''

''یہاں اب کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ بہت بڑی خونریزی بھی ہو سکتی ہے۔'' میرے لہجے میں بجا طور پر تشویش کی لہر تھی۔

پال نے اپنی نیلی آنکھیں سکیڑ کر آسمان کی طرف دیکھا۔ سہ پہر کی دھوپ میں بہت بلندی پر ہیلی کاپٹرز کی موجودگی کا اندازہ ہوتا تھا۔ پال بولا۔ ''اب یہ آخری مرحلہ ہے اور یہاں پر امکان ففٹی ففٹی کا لگ رہا ہے۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو پال؟'' میں نے وضاحت چاہی۔

''یہاں بھی اگر ہجوم، رش کر کے ڈی پیلس کی طرف بڑھے تو بے پناہ نفسیاتی دباؤ کام کر سکتا ہے، فائر کھولنے والے ذہنی مفلوج ہو سکتے ہیں مگر اتنا ہی امکان اس بات کا بھی ہے کہ تخت یا تختہ کے مصداق، زمین اور فضا سے نہتے لوگوں پر موت کی بارش کر دی جائے۔ اگر ایسا ہوا تو بہت سی جانیں چلی جائیں گی۔''

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ دل و دماغ پر بے پناہ بوجھ تھا۔ یہ بوجھ اتنا شدید تھا کہ زخموں کی اذیت بھی پیچھے چلی گئی تھی۔ ایسے میں وہی نورانی چہرہ میرے تصور میں ابھرا جس

نے کل رات کے آخری پہر مجھے مرکوزا چھوڑنے سے روکا تھا اور مجھ سے کہا تھا کہ میں اپنے ہزاروں چاہنے والوں کو اس موقعے پر اکیلا نہ چھوڑوں۔ اس کٹھن ترین مرحلے میں میرا دھیان سیدھا محترم حاذق ذکری کی طرف گیا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ مجھے ان سے رہنمائی لینا چاہیے۔

میں دیکھ رہا تھا، قائم مقام ناظم جاسم کے پاس سیٹلائٹ فون موجود تھا۔ میں نے اسے اپنے پاس بلایا۔ چند ہی لمحے بعد میں محترم ذکری سے بات کر رہا تھا۔ وہ مرکوزا کے اسی گھر میں تھے جہاں تاجور بھی موجود تھی۔ محترم ذکری کے سینکڑوں جانباز اور پاسبان بریگیڈ کے لوگ اس جگہ کی حفاظت کر رہے تھے۔

محترم ذکری نے کہا۔ ''مجھے پہلے ہی شک تھا کہ تم اس چار دیواری میں نہیں رہ سکو گے اور نکل کر لوگوں کے درمیان پہنچ جاؤ گے۔''

''میں بہت شرمندہ ہوں کہ آپ کو آگاہ کیے بغیر نکل آیا۔ مجھے معاف کر دیجیے۔''

''جو ہو گیا سو ہو گیا...... اور شاید اچھا ہی ہوا۔ مجھے جو اطلاعات مل رہی ہیں ان کے مطابق تم لوگ ڈی پیلس کی دیواروں تک پہنچ چکے ہو۔ یہ بڑی کامیابی ہے مگر حالات یہ بھی بتا رہے ہیں کہ بہت زیادہ خونریزی بھی ہو سکتی ہے۔''

''میں اسی حوالے سے آپ کی رائے چاہ رہا ہوں جناب! میں تنہا اس ذمے داری کو نبھانے کے قابل نہیں ہوں۔ مجھے آپ کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔''

''تم غلط کہہ رہے ہو شاہ زیب! تم تنہا یہ ذمے داری اٹھانے کے قابل ہو اور تم نے اٹھا کر دکھائی بھی ہے...... باقی میں اپنی رائے ضرور دے سکتا ہوں۔ آخری فیصلہ تم نے خود ہی کرنا ہے...... اور میری رائے یہ ہے کہ ہمیں حتی الامکان خونریزی سے بچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہاناوانی اور اس کا بیٹا ان لاکھوں لوگوں کو دیکھ ہی چکے ہیں جنہوں نے پیلس کو گھیرا ہوا ہے۔ وہ لوگ نہتے ہونے کے باوجود اپنے ارادے میں چٹانوں کی طرح مضبوط ہیں۔ ہاناوانی، رائے زل اور ان کے گماشتے آقا جان کو...... صورتِ حال سمجھنے کا ایک موقع دیا جانا چاہیے۔ ان کو بتایا جانا چاہیے کہ سرنڈر کے سوا ان کے پاس اور کوئی راستہ نہیں ہے۔''

''جناب! کیا آپ چاہتے ہیں کہ ان کی طرف کوئی مذاکراتی ٹیم روانہ کی جائے؟''

''مجھے لگتا ہے کہ مناسب رہے گا مگر ہم ان مذاکرات کو ایک دو گھنٹے سے زیادہ طول نہیں دے سکتے۔ جاماجی کے لاکھوں شہری اس وقت سڑکوں پر ہیں۔''

''آپ بالکل بجا فرما رہے ہیں جناب۔''

''میں تمہاری حالت کی طرف سے بھی پریشان ہوں۔ ڈاکٹر بتا رہا تھا کہ تم اپنے آپ پر بہت ظلم کر رہے ہو۔ اتنے شدید بخار ایسی ''انفیکشن'' میں تم پر کسی بھی وقت بے ہوشی طاری ہو سکتی ہے۔''

''آپ کی دعائیں ساتھ ہیں تو مجھے کچھ نہیں ہوگا۔''

''یہ لڑکی کون ہے؟'' محترم ذکری نے اچانک موضوع بدلا۔ ''یہ تمہارے لیے مسلسل آنسو بہا رہی ہے اور دعائیں کر رہی ہے۔''

میں سمجھ گیا کہ وہ تاجور کا ذکر کر رہے ہیں۔ میں نے کہا۔ ''وہ میری ہم وطن ہے حضرت! مجھ پر بے حد بھروسا کرتی ہے اور میری وجہ سے ان حالات میں پھنسی ہوئی ہے۔''

''کہا جا رہا ہے شاہ زیب کہ وہ تمہاری منگیتر ہے اور کسی وجہ سے تم دونوں کے درمیان ناراضگی چل رہی ہے۔''

''مم...... منگیتر والی بات درست نہیں ہے حضرت!''

''اس کا مطلب ہے ناراضگی والی بات درست ہے...... نہیں شاہ زیب...... میں نے اس لڑکی کی آنکھوں میں سچے موتیوں کی پاک چمک دیکھی ہے۔ ایسی چمک مجھے بہت ہی کم آنکھوں میں دکھائی دی ہے۔ اگر کسی وجہ سے تم نے اس کا دل دکھایا ہے تو اس کی دلجوئی کرو۔ خاص طور سے ایسے نازک موقع پر تمہیں اس کی بہترین دعاؤں کی ضرورت ہے۔ ایسی دعائیں جن میں ناراضگی کا شائبہ تک نہ ہو۔''

''محترم کہاں ہے وہ؟''

''بہت فرمانبردار اور محبت کرنے والی لڑکی ہے۔ میرے منع کرنے کے باوجود ابھی یہاں بیٹھی میری ٹانگیں دبا رہی تھی۔ تم چند سیکنڈ ہولڈ کرو۔ میں اس سے تمہاری بات کراتا ہوں۔''

محترم حاذق ذکری کے قدموں کی چاپ ابھری اور پھر تھوڑی دیر بعد مجھے تاجور کی مدھم آواز سنائی دی۔ ''شاہ زیب! آپ کیسے ہیں؟ بہت خطرے والی خبریں مل رہی ہیں۔ میرا دل اب بھی اتنی زور سے دھڑک رہا ہے کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتی۔''

''محترم ذکری کہاں ہیں؟''

''وہ مجھے فون تھما کر باہر چلے گئے ہیں۔'' تاجور نے جواب دیا۔

''وہ کہہ رہے تھے کہ تم بہت افسردہ ہو...... رو رہی ہو؟''

''شاہ زیب اپنے دل پر میرا بس نہیں ہے۔ آپ مجھے بہت تسلی دے کر گئے ہیں۔

بھی پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے کہ کچھ ہو جائے گا...... برا ہو جائے گا۔‘‘
’’وہم کا کوئی علاج نہیں ہوتا تاجور! تم اپنے دل کو مضبوط کرو۔ محترم ذکری بالکل سادہ اور عام نظر آتے ہیں لیکن میرا دل کہتا ہے کہ یہ بہت بڑی شخصیت ہیں۔ تم ان کے آس پاس رہو۔ تمہیں سکون ملے گا۔‘‘
’’وہ تو میں خود بھی محسوس کرتی ہوں شاہ زیب! لیکن میرا دل چاہتا ہے کہ......‘‘ وہ فقرہ مکمل نہ کر سکی۔ اس کی آواز بھرا گئی۔
’’بولو تاجور! جو کہنا ہے کھل کر کہو۔‘‘ میں نے اسے حوصلہ دیا۔
’’میرا دل چاہتا ہے شاہ زیب! کہ ان حالات میں...... میں آپ کے ساتھ رہوں...... جو کچھ بھی اچھا یا برا ہونا ہے، ہم دونوں کے ساتھ ہو۔‘‘
’’پھر وہی مایوسی والی باتیں...... یہاں کچھ برا نہیں ہونے والا تاجور! ہم حق پر ہیں اور ہم جیتیں گے۔‘‘
’’کہتے ہیں کہ جلوس شاہی محل کے دروازوں تک پہنچ گیا ہے...... اب یہ لوگ ہیلی کاپٹروں سے بم پھینکیں گے......‘‘ تاجور کی آواز لرز رہی تھی۔
’’جب لوگ لاکھوں کی تعداد میں ہوتے ہیں تو ان کی اپنی ایک ہیبت ہوتی ہے۔ ان کو مارنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ تم بس دعا کرو۔‘‘
ایک ہیلی کاپٹر چنگھاڑتا ہوا ہمارے سروں کے اوپر سے گزر گیا۔ ہمارے اردگرد شور اتنا زیادہ تھا کہ میری آواز بمشکل تاجور تک پہنچ پا رہی تھی۔ تاجور نے بمشکل اپنی سسکی روکی اور مجھے خدا حافظ کہا۔
میں نے کہا۔ ’’نہیں اس طرح نہیں تاجور! مجھے پورے اطمینان کے ساتھ مسکرا کر خدا حافظ کہو۔ تمہارے اطمینان سے اور تمہارے مسکرانے سے مجھے بھی توانائی ملے گی۔‘‘
وہ کئی سیکنڈ تک خاموش رہی۔ شاید میرے الفاظ کی گہرائی پر غور کر رہی تھی۔ پھر اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ’’اچھا...... خدا حافظ......‘‘
’’ایسے نہیں تاجور، تم اب بھی مسکرائی نہیں ہو۔‘‘
’’میرے مسکرانے کا آپ کو کیسے پتا چلے گا؟‘‘ وہ سنبھلے ہوئے لہجے میں بولی۔ اب اس کی آواز بھرائی ہوئی نہیں تھی۔
’’مجھے پتا چل جائے گا۔‘‘
’’آپ بہت عجیب ہیں۔‘‘ اس نے ہارے ہوئے سے انداز میں کہا۔ ’’اچھا خدا حافظ!‘‘

اپنا خیال رکھیے گا۔''

''شکریہ۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

جاسم اور شہر کے دیگر عمائدین جیپ سے کچھ فاصلے پر کھڑے تھے۔ جیسے میری کال کے ختم ہونے کا انتظار کر رہے ہوں۔ جونہی بات ختم ہوئی، جاسم آگے آیا اور دیگر عمائدین کی ترجمانی کرتے ہوئے بولا۔ ''ہم آپ کے حکم کے منتظر ہیں شاہ زیب صاحب۔''

''دیگر لوگوں کی رائے کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''رائے تقسیم ہے جناب۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ ڈی پیلس والوں کو بری موت سے بچانے کے لیے انہیں سوچنے سمجھنے کے لیے چند گھنٹے کا وقت دینا چاہیے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ اب مہلت نہ دی جائے۔ لاکھوں لوگ یہاں موجود ہیں اور پوری طرح ''چارجڈ'' ہیں، جب یہ ڈی پیلس کی طرف بڑھیں گے تو کوئی ان کو روک نہیں سکے گا۔ بہرحال آخری فیصلہ، سب لوگ آپ کے ہاتھ میں دے رہے ہیں۔''

میں نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا۔ ''اگر ہم پہلے مذاکرات والا آپشن اختیار کرتے ہیں تو تمہارے خیال میں کون سے افراد مذاکرات میں حصہ لے سکتے ہیں؟''

جاسم شتابی سے بولا۔ ''اس کے لیے میں نے ایک چار رکنی ٹیم پہلے سے سوچ رکھی ہے جناب! ایک اعلیٰ افسر فوج کی نمائندگی کرے گا۔ دو افراد حکومت کے اور ایک شخص رضا کار تنظیموں کا نمائندہ ہوگا۔ تاہم میری رائے ہے کہ ایک پانچواں شخص بھی مذاکراتی ٹیم کا رکن ہو۔''

''وہ کون؟''

''ناظم باذان صاحب! وہ اس وقت رائے زل کی حراست میں ہیں۔ مذاکرات کی پہلی شرط ہی یہ رکھی جائے کہ مسٹر باذان کو مذاکرات میں حصہ لینے کے لیے رہا کیا جائے۔''

میں نے کہا۔ ''اس حوالے سے یہاں کافی تجربہ کار لوگ موجود ہیں جو کچھ بھی کرنا ہے آپ لوگ خود کریں مگر میری خواہش ہے کہ اس بات چیت کو تین چار گھنٹوں سے زیادہ وقت نہ دیا جائے۔''

''ہماری یہی کوشش ہوگی جناب! ہم آپ کو ساری صورتِ حال سے مسلسل باخبر بھی رکھیں گے۔''

میں نے پال کی طرف دیکھا، اس نے بھی تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

O......❖......O

میرے دونوں ڈاکٹرز نے ایک بار پھر معائنہ کیا۔ وہ بار بار یہی کہہ رہے تھے کہ مجھے ''ہاسپٹلائزڈ'' کیے جانے کی ضرورت ہے۔ میرے جو زخم ٹھیک ہو رہے تھے وہ بھی پھر سے بگڑنے لگے تھے۔ خصوصاً جہاں سے مردہ جلد کاٹی گئی تھی وہ جگہیں انفیکشن زدہ تھیں۔ بخار کی شدت بھی صرف دواؤں کی وجہ سے کم محسوس ہوتی تھی۔

شام کے سائے بڑی تیزی سے پھیلے اور پھر جاماجی کی لائٹس آن ہوگئیں۔ مذاکرات جاری تھے...... نو بجے کے بعد عوام نے اور خواص نے جیسے تیسے پیٹ پوجا کی۔ اسی دوران میں خبر ملی کہ رائے زل اور آقا جان نے ایجنسی سے مشورہ کرنے کے بعد باذان کی رہائی والی شرط مان لی ہے اور مسٹر باذان کو مذاکرات کے لیے جیل سے رہا کیا جا رہا ہے۔

اس بات کا صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ مذاکرات اتنی جلدی ختم نہیں ہوں گے، ہو سکتا تھا کہ ہمیں کل صبح تک انتظار کرنا پڑتا۔

رات دس بجے کے لگ بھگ دو بڑے کنٹینرز ہجوم میں سے راستہ بناتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ ان کنٹینرز کی چاروں طرف بلٹ پروف چادریں تھیں اور ان چادروں پر جاماجی کے جھنڈے پرنٹ تھے۔ اس کے علاوہ ان پر شہید کمانڈر افغانی، قسطینا اور میری تصویریں نمایاں دکھائی دیتی تھیں۔ (میری تصویر جہاں بھی دکھائی دیتی تھی یہ وہی زخمی حالت والی تصویر ہوتی تھی)

جاسم نے بتایا۔ ''عمائدین نے فیصلہ کیا ہے کہ ڈی پیلس کی طرف بڑھتے وقت آپ، مسٹر پال، عارفہ بی بی اور دیگر اہم افراد اس کنٹینر پر سوار ہوں گے۔ فی الوقت یہ کنٹینر آپ لوگوں کے آرام کے کام آئے گا۔ خاص طور سے آپ کو آرام کی ضرورت ہے شاہ زیب صاحب۔''

جاسم ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ مجھے دو چار گھنٹے آرام کی شدید ضرورت تھی۔ میں انیق کا سہارا لیتا ہوا اور تلوؤں کی تکلیف جھیلتا ہوا کنٹینر کے نچلے حصے میں چلا گیا۔ یہاں تین چار ''بنک بیڈز'' موجود تھے اس کے علاوہ ایک آرام دہ ڈبل بیڈ بھی دکھائی دے رہا تھا۔ درحقیقت ایک اچھے بیڈ روم کی بیشتر سہولتیں اس نچلے پورشن میں موجود تھیں۔

پال کے مجبور کرنے پر میں ڈبل بیڈ پر نیم دراز ہوگیا۔ زخم آگ کی طرح جل رہے تھے مگر میں اپنے تاثرات سے زیادہ ظاہر نہیں ہونے دے رہا تھا۔ حالات کا رخ دیکھ کر ٹی وی چینلز کے تیور بھی کچھ بدل رہے تھے۔ ایک چینل پر نیوز کاسٹر اپنے فیلڈ رپورٹر سے سوال جواب کر رہا تھا۔ نیوز کاسٹر کہہ رہا تھا۔ ''آپ کا کیا خیال ہے آگ صرف ان ہی ''پراپرٹیز'' کو

لگائی جارہی ہے جو آقا جان کی ملکیت ہیں؟''

''جی ہاں۔'' رپورٹر نے موبائل فون پر جواب دیا۔''ہماری اطلاعات کے مطابق یہ تقریباً ساری ''پراپرٹیز'' واڈا کمپنی کی ہیں اور سب جانتے ہیں کہ واڈا کمپنی میں آقا جان نے حال ہی میں باولن فیصد حصص خریدے ہیں......''

نیوز کاسٹر نے کہا۔''کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تشدد کی یہ لہر اس قتلِ عام کا نتیجہ ہے جو کل ''اسکوائر ون'' پر ہوا اور جس کے بارے میں کہا جارہا ہے کہ اس کا آرڈر محترم آقا جان کی طرف سے ہوا تھا۔''

''بالکل ایسا ہی لگ رہا ہے جی۔ آپ اسکرین پر دیکھ سکتے ہیں کہ جہاں جہاں آگ لگی ہوئی ہے وہاں واڈا کمپنی کے سائن بورڈز بھی دکھائی دے رہے ہیں۔ یہ کروڑوں ڈالر مالیت کی اشیا ہیں جو ہماری آنکھوں کے سامنے راکھ ہورہی ہیں۔''

ٹی وی کی آدھی اسکرین پر آتشزدگی کے مختلف مناظر دکھائے جارہے تھے۔ایک چھوٹی سی جھلکی آقا جان کی بھی نظر آئی۔اس کا نیم گنجا سر پسینے سے تر تھا اور وہ کسی نیوز رپورٹر پر بری طرح برس رہا تھا۔

نیوز کاسٹر نے ایک تجزیہ نگار کو لائن پر لے لیا اور اس سے پوچھنے لگا کہ آئندہ تین چار گھنٹوں میں حالات کیا رخ اختیار کرنے جارہے ہیں؟ یہ تجزیہ نگار سراسر رائے زل کی زبان بول رہا تھا۔اس کی بکواس سننا بیکار تھا۔انیق نے چینل بدل دیا۔

میری نگاہ کنٹینر کی کھڑکی سے باہر گئی۔کھڑکی کے بالکل پاس مجھے خورسنہ نظر آئی۔اس نے اپنے دونوں رخساروں پر جاماجی کا دورنگا جھنڈا پینٹ کرا رکھا تھا۔اب وہ اپنے تیرہ چودہ سالہ خوبرو بیٹے کے چہرے پر ''آزادی'' کے حروف پینٹ کررہی تھی۔آخری حرف پینٹ کرنے کے بعد وہ قریب کھڑے سجاول کی طرف متوجہ ہوئی۔وہ ابھی تک سکھ پربت سنگھ والے گیٹ اَپ میں تھا۔خورسنہ، سجاول کے چہرے پر بھی کچھ لکھنا چاہ رہی تھی مگر وہ ہاتھ کے اشارے سے منع کررہا تھا۔ہمیشہ کی طرح سجاول کا چہرہ گہری سنجیدگی میں لپٹا ہوا تھا۔اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں دیکھنے والا عموماً خوف زدہ ہوجاتا تھا مگر خورسنہ اور اس کا بیٹا، سجاول سے کافی بے تکلف دکھائی دیتے تھے۔

سجاول نے چہرے پر پینٹ کروانے سے مسلسل انکار کیا تو خورسنہ نے رنگ اور برش اپنے بیٹے کے ہاتھ میں تھمایا اور عقب میں جاکر سجاول کو اس طرح جکڑ لیا کہ سجاول کے بازو بھی خورسنہ کی گرفت میں آگئے۔''کرو انکل کو پینٹ۔'' وہ بولی۔

''مجھے ایسا مذاق چنگا نہیں لگتا۔'' سجاول نے پکا منہ بنا کر کہا۔

''لیکن مجھے تو بہت چنگا لگتا ہے۔'' خورسنہ نے سجاول کے ہی لہجے میں کہا۔

خورسنہ کی گرفت میں یقیناً اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ سجاول جیسے گرانڈیل کو بے بس کر سکی۔ اسے سجاول کی مہربانی ہی کہا جا سکتا تھا کہ وہ زبردستی نہیں کر رہا تھا پھر غالباً اس نے مدھم لہجے میں خورسنہ سے یہی کہا کہ وہ اسے چھوڑ دے۔ وہ تھوڑا بہت پینٹ کروالیتا ہے۔

خورسنہ نے اسے چھوڑ دیا مگر اس کے عقب میں اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑی رہی۔ خوش رُو لڑکے نے سجاول کے ایک رخسار پر ایک چھوٹا سا جھنڈا بنایا اور خوش ہو گیا۔ سنگین ترین حالات میں ان لوگوں کی یہ ہلکی پھلکی مصروفیت اس امر کی گواہ تھی کہ لوگوں کے حوصلے بلند ہیں اور وہ مستقبل قریب کے نقشے میں کامیابی کی جھلک دیکھ رہے ہیں۔

میں نے بہ زبان اردو، انیق سے پوچھا۔ ''کیا معاملہ ہے، لگتا ہے کہ دو دنوں میں ہی سجاول اور یہ خورسنہ کافی قریب آ گئے ہیں؟''

''نہیں جی۔ اتنی جلدی بھی نہیں ہوا یہ سب کچھ۔ یہ تانا بانا چند دن پیچھے تک گیا ہوا ہے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''آپ نے ابھی تک یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ میں اور امریش...... میرا مطلب ہے سجاول صاحب ٹاپو سے نکل کر یہاں تک کیسے پہنچے؟''

''میں نے پوچھا تھا لیکن تم نے کہا تھا کہ خود ہی بتائیں گے۔''

انیق نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر طویل سانس لی۔ کنٹینر کی کھڑکیوں سے باہر ہجوم کا ولولہ ایک مسلسل شور کی صورت میں ڈھلا ہوا تھا۔ لیکن کنٹینر کے اندر یہ شور پچاس ساٹھ فیصد کم تھا۔ انیق نے کہا۔ ''میں سمجھتا ہوں جناب کہ اگر خورسنہ صاحبہ نہ ہوتیں تو شاید آپ کو ہماری لاشوں کا سراغ بھی نہ ملتا۔ انہوں نے ہماری جان بچائی اور جاما جی تک پہنچنے میں ہماری بہت مدد بھی کی...... درحقیقت اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ہم نے ٹاپو والی پناہ گاہ سے نکل کر سخت غلطی کی تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ شاید ہم رات کی تاریکی اور بارش کا فائدہ اٹھا لیں گے اور کسی طرح ساحل پر پہنچ جائیں گے۔ ہمارے پاس ربڑ کی ایک چھوٹی سی کشتی تھی جس میں دستی پمپ سے ہوا بھری جاتی ہے......''

''تم شروع سے بتاؤ گے تو کچھ پتا چلے گا۔'' میں نے اسے ٹوکا۔

وہ بولا۔ ''پچھلے ہفتے جب ہم نے ٹی وی پر دیکھا کہ یہاں حالات خراب تر ہوتے

جارہے ہیں اور آپ کو ٹارچر سیل میں شدید ترین اذیت پہنچائی گئی ہے تو ہماری برداشت جواب دینے لگی۔ میں نے سجاول سے مشورہ کیا اور ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم ہر صورت باہر نکلیں گے۔ سب سے پہلے ہم نے یہ بارودی بیلٹس ڈھونڈیں اور عہد کیا کہ گرفتاری کی صورت میں ہم بلاتاخیر خود کو اڑا لیں گے۔ اس کے بعد ضروری سامان اور ربڑ بوٹ کے ساتھ ہم دہانے تک پہنچے اور پتھر سرکا کر باہر نکل آئے۔ باقی ساتھی ہماری اس کارروائی سے بالکل لاعلم تھے۔ اس رات تیز بارش بھی ہو رہی تھی اور ہمارا خیال تھا کہ شاید ہم نگرانوں کی نظروں سے بچ جائیں گے۔''

''بہت غلط خیال تھا۔'' میں نے کہا۔

''بجا کہہ رہے ہیں آپ، یوں لگتا ہے کہ ان خبیثوں نے وہاں چپے چپے پر رائفل بردار بٹھا رکھے ہیں۔ ہم بمشکل دس پندرہ قدم دور ہی گئے تھے کہ کسی نگران کو شک ہوا...... ''ہالٹ...... ہالٹ'' کی آوازیں آئیں اور سرچ لائٹس گردش کرنے لگیں۔ ہم اترائی کی طرف دوڑے اور کنارے کے قریب ایک ابھری ہوئی چٹان کے نیچے کیچڑ میں چھپ گئے۔ ہماری پلاننگ غلط ثابت ہو چکی تھی۔ ہمارا ارادہ تھا کہ ہم کسی سنسان کنارے پر ربڑ بوٹ میں ہوا بھریں گے اور چھوٹے چھوٹے چپوؤں کے ذریعے ٹاپو سے دور جانے کی کوشش کریں گے مگر اب ہر طرف سرچ لائٹس حرکت کر رہی تھیں۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ ہم ربڑ بوٹ پر یہاں سے نکل سکتے۔ چند ہی منٹ میں ہمیں اپنے اردگرد بھاری بوٹوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ پتا چل رہا تھا کہ گھیرا تنگ ہو رہا ہے۔ ہم دلدلی زمین پر چلتے اور رینگتے ہوئے سمندر کے ساتھ ساتھ قریباً ایک فرلانگ آگے نکل گئے۔ یہ جگہ قدرے پُرسکون نظر آتی تھی۔ ہم بوٹ میں ہوا بھرنے کا سوچ ہی رہے تھے جب ٹارچ کی روشنی ہم پر پڑی۔ کچھ پرچھائیاں درختوں سے نیچے کودیں۔ یہ تین امریکی گارڈز تھے جو ہم پر جھپٹے۔ اس دن آپ کے امریش پوری کا وہ ہنر میں نے دیکھا جس سے آپ ڈرایا کرتے ہیں۔ اس کے دو مکوں نے دو گارڈز کی کھوپڑیاں چٹخائیں جیسے ناریل پر ہتھوڑا مارا گیا ہو۔ تیسرا گارڈ پہلو کی طرف سے آیا اور اس نے سجاول پر شکاری چاقو سے حملہ کیا۔ میں نے اسے عقب سے دبوچ لیا اور ایک درخت سے دے مارا۔ میرے پستول کے دستے کی دو تین ضربوں نے اسے نیم مردہ کر دیا۔ ہم نے مرنے والوں کی برساتیاں پہن لیں۔ اردگرد ہلچل کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ نوے فیصد امکان یہی تھا کہ اب ہم بچ نہیں سکیں گے۔ ہم کہیں چھپنے کا ٹھکانا ڈھونڈ رہے تھے جب ایک نسوانی آواز آئی۔ یہ خورسنہ تھی۔ وہ ہمیں اپنی طرف بلا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی نال

کی رائفل تھی مگر انداز میں دشمنی نہیں تھی۔ ہم اس کے پاس پہنچے۔
وہ بولی۔ ''تم دونوں ہرہائی نس کے ساتھی ہو؟''
میں نے پوچھا۔ ''تم کون ہو؟''
اس نے کہا۔ ''جن سے بھاگ رہے ہو، میں تمہیں ان سے بچا سکتی ہوں۔ اگر اعتماد کر سکتے ہو تو آؤ میرے ساتھ۔''
وہ صاف ستھری اردو بول رہی تھی۔ انداز میں بھی ہمدردی تھی۔ میں اور سجاول اس کے پیچھے چل دیئے...... بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ دوڑ پڑے۔ ایک جگہ سامان ڈھونے والی کچھ کشتیاں اور لانچیں کھڑی تھیں۔ خورسنہ ہمیں گھنے درختوں کے درمیان سے گزار کر ایک لانچ تک لے آئی۔ اس پر سفید جھنڈا لہرا رہا تھا۔ لانچ کی اندرونی روشنی میں ہم نے پہلی بار خورسنہ کو دھیان سے دیکھا۔ وہ شکل سے بھلی لگی۔ متناسب جسم کی مالک تھی، لباس بارش میں بھیگا ہوا تھا۔ اس نے جو سفید لباس پہن رکھا تھا وہ نرسنگ یونیفارم سے ملتا جلتا تھا۔ ہم اندر گئے اور سیڑھیاں اتر کر لانچ کے پیندے میں چلے گے۔ بارش کا شور اور بادلوں کی گرج چمک یہاں معدوم ہو گئی......''
انیق کی رُوداد دلچسپ تھی مگر میرے زخموں میں لگی ہوئی آگ مجھے کسی پہلو چین نہیں لینے دے رہی تھی۔ خصوصاً جہاں پسلیوں پر سے اسکن کاٹی گئی تھی وہاں بہت تکلیف تھی۔ ویسے بھی اب پین کلر انجکشن ''ری پیٹ'' کیا جا سکتا تھا۔ میرے کہنے پر ڈاکٹر نے ایک انجکشن مزید دے دیا، یہ فوری ریلیف دیتا تھا۔ کچھ سکون ملا تو ڈاکر کے اصرار پر میں نے ایک اور انرجی بر کھا کر ایک برگر کے چند لقمے لیے۔ اس دوران میں انیق نے اپنی باقی رُوداد سنائی۔
وہ بولا۔ ''اس لانچ میں دواؤں کی بو تھی۔ یہ زیادہ تر مقامی طور پر تیار کی گئی دیسی ادویات تھیں۔ کچھ جڑی بوٹیاں خام شکل میں بھی یہاں موجود تھیں۔ سنگھاڑے کی شکل والا ایک مقامی پھل (جو ایک مرتبہ سیف بھی لایا تھا) تین چار بوریوں میں یہاں اسٹور کیا گیا تھا۔ کچھ دیگر خشک نباتات بھی اسی طرح یہاں ''اسٹورڈ'' تھیں۔ خورسنہ نے فرش کے چند چوبی تختے اپنی جگہ سے ہٹائے اور ہمیں ایک چھوٹے سے تاریک خلا میں گھسایا۔ یہ مستطیل جگہ بمشکل دس ضرب سات فٹ کی ہو گی۔ اس کی چھت چار فٹ سے بلند نہیں تھی۔ ہم اس میں بس جھک کر بیٹھ سکتے تھے۔ خورسنہ نے تختے دوبارہ جوڑ دیئے۔ پھر ہمیں آواز سے پتا چلا کہ اس نے ایک دو بوریوں کے منہ کھول دیئے ہیں اور ان میں موجود سنگھاڑے جیسا پھل فرش پر بکھر گیا ہے۔ خورسنہ اس لانچ میں اکیلی تھی مگر چند منٹ بعد کچھ اور لوگ بھی لانچ میں

داخل ہو گئے۔ آوازوں اور لب و لہجے سے پتا چلتا تھا کہ وہ خورسنہ کے ساتھی ہی ہیں۔ وہ لمحے ہمارے لیے شدید تناؤ والے تھے شاہ زیب بھائی۔"

انیق نے جھرجھری سی لی اور...... بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "اگر خورسنہ وہ نہیں تھی جو اس نے ظاہر کیا تھا...... تو پھر ہمیں کسی بھی وقت اپنی دھماکا خیز بیلٹس کی ڈوریاں کھینچنے کی ضرورت پیش آسکتی تھی۔ دس پندرہ منٹ کی شدید ٹینشن کے بعد ہمارے اندیشے زائل ہونا شروع ہو گئے۔ ہم دم سادھے اپنی جگہ بیٹھے رہے اور باہر سے آنے والی آوازیں اور آہٹیں سنتے رہے۔ شکاری چاقو کے حملے سے امریش...... میرا مطلب ہے سجاول کی کلائی اور ٹانگ پر کٹ آئے تھے۔ خورسنہ نے کہا تھا کہ وہ ایک دو گھنٹے بعد دوبارہ آئے گی لیکن ہمیں زیادہ دیر اس کا انتظار کرنا پڑا۔ آپ کو اندازہ ہے کہ کتنی دیر؟" انیق نے پوچھا۔

"پہیلیاں نہ بجھواؤ یار!" میں نے بے زاری سے کہا۔

"کہانی میں پہیلیاں نہ ہوں تو مزہ نہیں آتا۔ آپ نے کبھی ڈائجسٹ پڑھا ہے۔ یہ جو نامور رائٹر تھے، شوکت صدیقی، ایم اے راحت، محی الدین نواب اور علیم الحق حقی...... اللہ ان کو غریق رحمت کرے، یہ اسی طرح اپنے قارئین کو اپنی تحریروں کا دیوانہ بناتے تھے۔ دراصل کہانی ڈائجسٹ کی ہو، فلم کی یا......"

"اچھا اِدھر اُدھر کی نہ ہانکو، اپنے موضوع پر آؤ۔" میں نے اس کی بات کاٹی۔

اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "پہلوان حشمت ٹھیک ہی فرماتے ہیں، بندر کیا جانے ٹماٹر کا سواد...... ویسے جناب، یہ آج تک پتا نہیں چل سکا کہ ٹماٹر پھل ہے یا سبزی......؟"

میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ "تمہیں بھی پتا نہیں چلے گا کہ تھپڑ کس طرف سے آیا ہے اور کس طرح تمہارے دانت ٹوٹے ہیں۔"

میری بے زاری کو عروج پر دیکھ کر وہ جلدی سنجیدہ ہو گیا۔ رُوداد کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "خورسنہ صاحبہ نے ایک دو گھنٹے کا کہا تھا لیکن ہمیں پورے تیس گھنٹے وہاں محترمہ کا انتظار کرنا پڑا۔ اگلی رات کے تین چار بجے کا عمل تھا جب لکڑی کے فرش پر قدموں کی بہت مدھم آواز آئی۔ فرش پر بکھرے ہوئے "سنگھاڑے" سمیٹے گئے۔ تین تختے ہٹائے گئے اور خورسنہ خاموشی سے اندر آگئی۔ آج وہ مختلف لباس میں تھی۔ پاجامہ قمیص اور اسکارف میں وہ جاذب نظر دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے آتے ساتھ ہی تاخیر کے لیے معافی مانگی۔ وہ ہمارے لیے کھانا اور فرسٹ ایڈ کا سامان بھی لائی تھی۔ اس نے ٹارچ کی روشنی میں سجاول کی کلائی اور ٹانگ کے بالائی حصے کا زخم دیکھا۔ اس نے بتایا کہ اس کے پاس ایسے زخموں کے لیے

تیر بہدف دوا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ یہ لانچ دراصل طبی سامان اور کچھ مقامی طرز کی ادویات لے کر ہی اس ٹاپو پر آئی ہے۔ اس میں تین چار مقامی معالج بھی ہیں جنہیں "وی ڈوک" کہا جاتا ہے۔ یہ مقامی طریقے سے علاج کرتے ہیں۔ خورسنہ بطور نرس ان کے ساتھ یہاں موجود تھی۔ اس نے بتایا کہ ٹاپو کے اردگرد سمندری پانی میں مگرمچھ اور آبی سانپ وغیرہ موجود ہیں۔ ان کے کاٹنے سے کئی فوجی زخمی ہوئے ہیں۔ انہیں دیکھنے کے لیے ہی "وی ڈاکٹر یا وی ڈوک" یہاں آئے ہیں...... خورسنہ کے والدین پاکستانی تھے۔ وہ پہلے برونائی میں رہے، پھر یہاں آگئے تھے۔ خورسنہ جاماجی کی ہی جم پل ہے۔ اردو بالکل اردو دانوں کی طرح بولتی ہے جی۔ خورسنہ نے ٹارچ کی روشنی میں ایک جگہ سے سجاول کی شلوار کو چاک کیا اور ازخود سجاول کے زخم کا معائنہ کیا۔ اس نے اپنے طریقہ علاج کے مطابق ہلدی اور پپیتے کے محلول سے سجاول کے زخم کو صاف کیا اور مرہم لگا کر پٹی باندھ دی۔ اس نے پورے یقین سے کہا کہ تین چار دن کے اندر یہ زخم بغیر ٹانکوں کے ٹھیک ہو جائے گا۔ اس کی باتوں سے پتا چلا کہ اس کی ساری ہمدردیاں ان لوگوں کے ساتھ ہیں جو آزادی کی لڑائی لڑ رہے ہیں اور قسطینا کو اپنا لیڈر تصور کرتے ہیں۔ قسطینا ہی کے بارے میں سن گن لینے کے لیے خورسنہ بطور نرس مقامی معالجوں یعنی وی ڈاکٹرز کے ساتھ انیچ ہوئی تھی اور ٹاپو تک پہنچی تھی۔ وہ قسطینا کے بارے میں تو کچھ نہ جان پائی تھی مگر ہماری مدد کرنے میں کامیاب رہی تھی۔

"خورسنہ نے تم دونوں سے پوچھا نہیں کہ قسطینا کہاں ہے؟"

"اس نے پوچھا لیکن وہ بہت معاملہ فہم ہے۔ ہمارے رویے نے اسے سمجھا دیا کہ ہم نے اس سلسلے میں اپنے منہ پر بڑے پکے تالے لگائے ہوئے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ کل خورسنہ کے بیٹے کو مصیبت میں دیکھ کر سجاول نے جو غیر معمولی دلیری دکھائی اس کے پیچھے ٹاپو والی رُوداد بھی ہے۔"

انیق کی آنکھوں میں شرارت کی چمک ابھری۔ دائیں بائیں دیکھ کر بولا۔ "یہ آپ کا امریش پوری جتنا سنجیدہ نظر آتا ہے اندر سے اتنا ہی کھوچل ہے جناب...... مجھے تو شک پڑتا ہے کہ چاقو کے حملے میں اسے صرف کلائی پر ہی کٹ آیا تھا...... یہ ٹانگ والا کٹ اس نے بعد میں خورسنہ کو، اور اس کے نرسوں والے لباس کو دیکھ کر خود لگایا ہوگا اور مجھے لگتا ہے کہ وہ اپنے مقصد میں کافی کامیاب رہا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"خورسنہ اب تک دو تین بار تو اس کی ٹانگ کے بالائی حصے کا معائنہ کر چکی ہے۔ بالکل

ترکی دنبے جیسی ران ہے اس کی۔ اگر وہ سچ مچ دنبہ ہوتا تو میں نے سوتے میں اس کی ران تو ضرور کاٹ لینی تھی۔'' وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

''میرا خیال ہے کہ تم سجاول پر خورسنہ کو رجھانے کا الزام لگا رہے ہو۔ تمہاری ذہنیت اتنی گندی نہیں ہے...... صرف سجاول کے حوالے سے گندی ہو جاتی ہے اور اسی وجہ سے تمہاری موت بھی واقع ہوئی ہے۔''

رات کو میں بس تھوڑی دیر کے لیے ہی سو سکا۔ ذہن مسلسل اپنے اردگرد کی تہلکہ خیز صورتِ حال مین الجھا ہوا تھا۔ کل کا سورج نہ جانے کس رنگ میں طلوع ہونے والا تھا۔ سوچوں کا دھارا بار بار ٹاپو کے حالات کی طرف بھی جا رہا تھا۔ انیق کی گفتگو سے پتا چلا تھا کہ وہ لوگ ہمت نہیں ہارے اور کئی دن گزرنے کے باوجود مسلسل قسطینا وغیرہ کی تلاش جاری رکھے ہوئے ہیں۔ یہ بھی کہا جا رہا تھا کہ امریکا سے ایسے جدید آلات منگوائے جا رہے ہیں جو زیرزمین اشیا کا سراغ لگانے میں مدد دیتے ہیں۔

○......❖......○

اگلا دن شروع ہوتے ہی نعروں کی لگاتار گونج سے اطراف گونجنے لگیں۔ ہجوم میں کئی طرح کے ضمیمے اور اشتہار بھی گردش کر رہے تھے۔ ایسے ہی ایک اشتہار میں دو تین تصویریں تھیں۔ ان تصویروں میں کئی خوبرو لڑکیوں کو ڈانس کی تربیت پاتے دکھایا گیا تھا۔ تربیت دینے والا خواجہ سرا خیام دانش تھا۔ اس ہینڈ بل میں لکھا تھا کہ شریف گھرانوں کی ان لڑکیوں کو رائے زل کی تفریح طبع کے لیے تیار کیا جا رہا ہے۔ ناظم باذان کی رہائی کا اعلان رات کو ہی کر دیا گیا تھا مگر وہ عملی طور پر ابھی تک رہا نہیں ہوا تھا۔ اُس کے حوالے سے مسلسل ٹال مٹول سے کام لیا جا رہا تھا۔ میں نے قائم مقام جاسم سے اس بارے میں پوچھا تو اس نے کہا۔'' وہ لوگ بتا رہے ہیں کہ جیل کی انتظامیہ کو باقاعدہ تحریری حکم کا انتظار ہے۔ ابھی ایک آدھ گھنٹے میں محترم باذان ہمارے درمیان ہوں گے۔''

عارفہ خاتون نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔'' شاہ زیب! ام کو تو یہ شک پڑ رہا ہے کہ ان لوگوں نے ناظم صاحب پر تشدد کیا ہے...... اور ان کا حالت ایسا نہیں کہ ان کو امارے سامنے لایا جا سکے۔ لونگ کو تم سے زیادہ اور کون جانتا ہوگا...... یہ ایک بہت ظالم جانور کا نام ہے۔''

عارفہ خاتون کی بات میں وزن تھا۔ میں نے اس بارے میں پال سے بات کی تو اس کی نیلی آنکھوں میں بھی سوچ کی پرچھائیاں لہرانے لگیں وہ بولا۔'' شاہ زیب! جب لوگوں نے تمہیں اسپتال سے چھڑا کر مرکوزا میں پہنچایا تو لونگ کو ایسے ہی لگا جیسے سخت بھوک کے عالم

میں اس کے منہ سے شکار چھین لیا گیا ہو۔ وہ غصے سے دیوانہ ہو رہا ہے۔ کچھ بھی کر سکتا ہے۔''

''اس سلسلے میں تمہارا کیا مشورہ ہے پال؟'' میں نے پوچھا۔

''مائی ڈیئر شاہ زیب!'' ابھی پال نے اتنا ہی کہا تھا کہ کنٹینر کے سامنے والے حصے سے کرنل احرار کی چلاتی ہوئی آواز آئی۔ ''یہ دیکھیں...... ٹی وی پر کیا نیوز آ رہی ہے، مسٹر باذان کے بارے میں بتا رہے ہیں۔''

ہم سامنے والے پورشن کی طرف گئے۔ انیق نے مجھے سہارا دے رکھا تھا۔ ٹی وی اسکرین پر بریکنگ نیوز کی سلائیڈ چل رہی تھی۔ نیوز کاسٹر بلند آواز میں بول رہا تھا۔'' کہا جا رہا ہے کہ محترم باذان کو شدید ہارٹ اٹیک ہوا۔ اسپتال میں ڈاکٹرز نے ان کی جان بچانے کی بھرپور کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے...... ابھی تھوڑی دیر پہلے حکومتی ترجمان نے بھی اس بات کی تصدیق کر دی ہے کہ جب محترم باذان کو جیل سے باہر لایا جا رہا تھا انہیں سینے میں شدید تکلیف محسوس ہوئی۔ انہیں فوری طور پر ملٹری اسپتال لے جایا گیا مگر وہ جانبر نہ ہو سکے......''

''بکواس ہے...... یہ سب بکواس ہے۔'' عارفہ خاتون چلائی۔ ''ان حرامی سؤروں نے ناظم صیب کا جان لیا ہے۔ انہیں مار دیا ہے۔ یہ سب کا سب درندہ ہے...... جناور ہے...... ام ان کو نہیں مارے گا تو یہ ام کو مار دے گا۔''

جاسم نے روتے ہوئے کہا۔ ''انہیں کبھی کبھار ہائی بلڈ پریشر ہو جاتا تھا لیکن دل کی تکلیف نہیں تھی انہیں...... یہ سب جھوٹ کا پلندہ ہے۔ ایجنسی کے جلادوں کی نگرانی میں قتل کیا گیا ہے انہیں۔ ہم اس کا بدلہ لیں گے...... ہم ماریں گے یا مر جائیں گے۔''

کنٹینر کے اندر ہر چہرہ تمتما گیا تھا اور اکثر آنکھوں میں نمی نظر آ رہی تھی۔ نیوز کاسٹر کی آواز گونج رہی تھی۔ ''ان بگڑے ہوئے حالات میں محترم باذان کی موت ایک بہت بڑے دھماکے کی طرح ہے۔ اس کی تشریح مختلف طریقے سے کریں گے۔ صورتِ حال کوئی بھی رخ اختیار کر سکتی ہے۔ مزید تفصیلات کا انتظار ہے۔''

بریکنگ نیوز کی سلائیڈ دکھائی گئی اور اس کے ساتھ ہی نیوز کاسٹر نے مزید سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ ''ناظرین! ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ اسپتال کے باہر مظاہرین کی بڑی تعداد جمع ہو گئی ہے۔ وہ سخت مشتعل ہیں اور اسپتال کے اندر گھسنے کی کوشش کر رہے ہیں......''

باذان کی موت کی اطلاع جنگل کی آگ کی طرح ہر طرف پھیل گئی۔ یہ پتا بھی چلا کہ باذان کی موت آج واقع نہیں ہوئی...... لاش کل رات سے اسپتال کے سردخانے میں پڑی

ہے۔

ہجوم جو پہلے ہی بپھرا ہوا تھا اب سراپا آتش نظر آرہا تھا۔ پال نے اپنی آنکھیں سکیڑ کر کنٹینر کی کھڑکی سے باہر ہجوم کی بے پناہ بے چینی کا جائزہ لیا اور ٹھہری ہوئی آواز میں بولا۔

''مائی ڈیئر شاہ زیب! مجھے لگتا ہے کہ اب ہم تادیر ان لوگوں کو سنبھال نہیں سکیں گے۔ ان میں سے کچھ گروپ ہمارے کنٹرول میں نہیں رہیں گے اور ڈی پیلس کی طرف چارج کریں گے۔ بڑے پیمانے پر جانی نقصان ہوگا۔''

''تو پھر کیا کیا جائے؟''

''آخری فیصلہ تم نے ہی کرنا ہے ڈیئر، کیونکہ لوگ اس وقت جس کی بات سب سے زیادہ مان رہے ہیں وہ تم ہو۔ وہ تمہارے اشارے پر کٹ مرنے کو بھی تیار ہیں۔''

''لیکن انہیں کٹ مرنے دینا کہاں کی دانشمندی ہے۔ میرے ذہن میں ایک خیال آرہا ہے پال۔'' وہ سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھنے لگا۔ میں نے کہا۔''اگر ہم نے آگے ہی بڑھنا ہے تو پھر کیوں نا ان بکتر بند گاڑیوں سے کام لیا جائے جو کل کے ملبے میں ہمارے قبضے میں آئی ہیں۔ انہیں فوری طور پر آگے لایا جائے؟''

''لیکن وہ گاڑیاں جلوس کے عقبی حصے میں ہیں۔ یہ قریباً ڈھائی کلومیٹر کا فاصلہ ہے اور راستے میں تل دھرنے کو جگہ نہیں۔ ہجوم میں راستہ بنا کر گاڑیوں کو یہاں پہنچتے پہنچتے کافی وقت لگنا ہے اور یہ وقت ہمارے پاس نہیں۔''

میں کنٹینر کی کھڑکی کے شیشے میں سے دیکھ رہا تھا کہ نوجوانوں کی کئی مشتعل ٹولیاں دیوانہ وار نعرہ زنی کرتی ہوئی مورچوں کے قریب چلی گئی تھیں۔ یہ مظاہرین مورچا زن اہلکاروں پر زبردست پتھراؤ کر رہے تھے مورچا زن اور گاڑی بند اہلکاروں کی مہلک رائفلیں اس سنگ باری کے جواب میں خاموش تھیں لیکن انہیں زیادہ دیر خاموش نہیں رہنا تھا۔

مشین گنوں کے بالکل سامنے کھڑے ہو کر پتھراؤ کرنے والی مشتعل ٹولیوں میں میں نے خورسنہ کو بھی دیکھا۔ وہ ہر خطرے سے بے نیاز تھی مگر خطرہ تو موجود تھا۔ اگر گولی چلنا شروع ہوتی تو سب سے پہلے یہی مشتعل گروپ نشانہ بنتے۔ تب میری نگاہ دراز قد سجاول پر پڑی۔ وہ تیزی سے آگے گیا اور خورسنہ کو ''پتھراؤ کرنے والے افراد'' میں سے کھینچ کر واپس لے آیا۔ خورسنہ کا سرخ اسکارف اس کے سر پر سے اتر گیا تھا۔ اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ اس کا رخ مورچہ زن رائفل برداروں کی طرف تھا اور وہ سجاول کی گرفت سے نکل نکل جا رہی تھی۔

اس کے اور سجاول کے درمیان تکرار ہو رہی تھی تاہم آواز ہم تک نہیں پہنچ رہی تھی وہ

شاید رو بھی رہی تھی۔ یقیناً یہ باذان کی ناگہانی موت کا غم تھا۔ جب خطرناک زون کی طرف جانے کے لیے خورسنہ کی جدوجہد نے جنونی شکل اختیار کی تو سجاول نے اسے زور سے دھکا دیا۔ وہ لڑھکتی ہوئی ہمارے کنٹینر کے پہلو سے ٹکرائی اور پھر وہیں سڑک پر گر کر ہچکیاں لینے لگی۔ اس کا خوبرو بیٹا قریب ہی سکتہ زدہ کھڑا تھا۔ سجاول کچھ دیر تک خاموشی سے خورسنہ کی طرف دیکھتا رہا پھر آگے بڑھا اور کندھوں سے تھام کر اس کو اٹھا لیا۔ وہ بکھرے بالوں کے ساتھ مسلسل رو رہی تھی پھر وہ سجاول کے گلے سے لگ گئی۔ سجاول تسلی بخش انداز میں کچھ کہہ رہا تھا۔

پال اور اس کے اسکیمو اسٹائل ساتھی راجر نے بھی یہ سارا منظر دیکھا تھا۔ راجر بولا۔ ''یہ سردار سنگھ بہت دبنگ آدمی نظر آتا ہے۔ ایسا ہی ایک کریکٹر میں نے ہالی ووڈ کی انگلش مووی میں دیکھا۔ وہ ایک سکھ ڈکیت تھا......''

میں راجر کو کیسے بتاتا کہ اب وہ جس شخص کو دیکھ رہا ہے وہ بھی ایک بڑا ڈکیت ہی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہ سکھ نہیں۔

ابھی ہم بات ہی کر رہے تھے کہ سجاول لمبے لمبے ڈگ بھرتا، کنٹینر کی طرف آتا دکھائی دیا۔ چند ہی سیکنڈ بعد وہ ہمارے سامنے تھا۔ اس نے پال، راجر اور دیگر افراد کو خاطر میں لائے بغیر براہِ راست مجھے مخاطب کیا اور بھاری بھرکم آواز میں بولا۔ ''شاہ زیب! مجھے لگدا ہے کہ اب یہ لڑائی زیادہ دیر رکے گی نہیں۔ اب چھیتی وڈا پھڈا شروع ہو جانا ہے۔ اس موقع پر ایک گل ہم کو دماغ میں رکھنی چاہیے۔ بیگم نورل بھی محل کے اندر ہیں۔ یہ رائے زل اور اس کے گورے بدمعاش بیگم نورل کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔''

''یہ بات میرے ذہن میں بھی ہے......اور اس کا ایک حل بھی ذہن میں آ رہا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اگر وہ لوگ بیگم نورل کو یرغمال بناتے ہیں تو پھر ہم بھی ان کو انہی کے سکوں میں جواب دے سکتے ہیں۔ ہم...... مادام ہاناوانی کے بارے میں سوچ سکتے ہیں، وہ ابھی تک اسی اسپتال میں ہے جہاں مسٹر باذان کی لاش رکھی گئی ہے اور جہاں بڑی تعداد میں لوگ جمع ہو چکے ہیں۔''

''تم کیا کرنا چاہتے ہو؟'' سجاول نے اپنی مصنوعی ڈاڑھی کو درست کرتے ہوئے کہا۔

''میں کرنا چاہتا نہیں ہوں، میں کر رہا ہوں۔'' میں نے مستحکم لہجے میں کہا اور جاسم کو اپنے پاس بلا کر انگلش میں اسے ہدایت جاری کی۔ یہ بڑی اہم ہدایت تھی اور مجھے معلوم تھا کہ اس پر فوری عمل ہو سکے گا۔ وہ فٹ بال اسٹیڈیم، اسپتال سے زیادہ دور نہیں تھا، جہاں بیگم

نورل کی دشمن اول میڈم ہاناوانی موجود تھی۔ چند منٹ کے اندر سینکڑوں گرین فوجی اسٹیڈیم میں سے نکل کر اسپتال کو گھیرے میں لے سکتے تھے۔

میں نے جاسم سے کہا۔ ''فوری ایکشن کی ضرورت ہے جاسم۔ دس منٹ کے اندر ہمیں اطلاع مل جانی چاہیے کہ اسپتال پر گرین فورس کا قبضہ ہو چکا ہے۔''

''آپ بے فکر رہیں مسٹر شاہ زیب! اگر یہ آپ کا حکم ہے تو دس منٹ کے اندر اس پر عمل ہو گا۔''

اسی دوران میں کرنل احرار نے اطلاع دی کہ کل کے حملے میں جو بکتر بند گاڑیاں مشین گنوں سمیت ہمارے قبضے میں آئی ہیں ان کو ہجوم کے اندر سے گزار کر فرنٹ کی طرف لایا جا رہا ہے۔

جنگ اور مبارزت کا اپنا ایک بہاؤ ہوتا ہے۔ تصادم کی صورتِ حال ہمیشہ اپنے راستے اور اپنے اوقات خود منتخب کرتی ہے۔ شاید اسی غیر یقینی طرزِ عمل کو لڑائی کا چھڑ جانا کہتے ہیں۔ بھری ہوئی ٹولیاں اپنے قائدین کے منع کرنے کے باوجود مورچوں سے نزدیک تر ہو رہی تھیں۔ ایک طوفانی لہر تھی جو کنارے توڑ کر ہر چیز کو خس و خاشاک کی طرح بہا دینا چاہتی تھی۔ اسی دوران میں وہ خبر بھی آ گئی جس کا ہمیں انتظار تھا۔ تمتمائے چہرے والے جاسم نے ہمیں آ کر اطلاع دی۔ اس نے کہا۔ ''اسپتال کے باہر گرے اور گرین فوجیوں میں خونی جھڑپ ہوئی ہے۔ اسپتال کے باہر رائے زل کے سپاہیوں کی صرف ایک کمپنی تعینات تھی۔ اسٹیڈیم سے نکلنے والے سینکڑوں فوجیوں نے انہیں روند کر رکھ دیا ہے۔ میڈم ہاناوانی کو حفاظتی تحویل میں لے لیا گیا ہے۔''

''بکتر بند گاڑیاں کہاں تک پہنچی ہیں؟'' میں نے دریافت کیا۔

''ان کی رفتار سست ہے جناب! ہجوم میں سے راستہ بنانا بہت مشکل ہے لیکن وہ مسلسل آگے بڑھ رہی ہیں۔''

اس روز مجھے پہلی مرتبہ پتا چلا کہ عوامی بہاؤ کیا ہوتا ہے اور جب ایک بار یہ پہاڑی دریا کی طرح رفتار پکڑ لیتا ہے تو پھر اس کے راستے کو بدلنا یا اسے کناروں میں بند کرنا کتنا دشوار ہوتا ہے۔ اس روز مجھے پہلی مرتبہ آگاہی ہوئی کہ بپھرے ہوئے ہجوم لیڈروں کے کنٹرول سے باہر کیسے ہوتے ہیں۔ میرا حکم تو یہی تھا کہ ابھی آگے نہیں بڑھا جائے گا۔ عارفہ خاتون اور جاسم کنٹینر کی چھت پر موجود تھے اور میگا فونز کے ذریعے بار بار پکار رہے تھے کہ مورچوں کی طرف نہ بڑھا جائے مگر نوجوانوں کی مشتعل ٹولیوں نے جیسے اپنے کان بند کر لیے تھے۔ وہ پتھراؤ

کرتے کرتے مورچوں اور خندقوں کے نزدیک تر پہنچ رہے تھے۔

''بکتر بند گاڑیاں آ رہی ہیں۔ آپ لوگ چند منٹ انتظار کریں۔'' یہ جاسم کی آواز تھی جو بے پناہ شور میں ڈوب ڈوب کر ابھر رہی تھی ...... اور پھر وہ کچھ ہوا جس کا اندیشہ ہر دل کو ڈرا رہا تھا۔ ہجوم میں سے کچھ لوگوں نے مورچا بند اہلکاروں پر گولی چلا دی۔ گولی کا جواب گولی سے آیا اور یہ کوئی معمولی جواب نہیں تھا۔ کئی مشین گنوں نے اپنے منہ کھولے تھے اور موت کی سوغات تقسیم کی تھی۔

بالکل یہی لگا جیسے ایک بہت بڑے بارودی ڈھیر کو چنگاری دکھا دی گئی ہے اور زمین و آسمان کے قلابے میں قیامت بپا ہوگئی ہے۔ لوگ زخمی ہو ہو کر گرے پہلے سارا ہجوم دس پندرہ قدم پیچھے کی طرف گیا، پھر وہ رکا، سنبھلا اور دوبارہ مورچوں کی طرف جھپٹا۔ یہ جانباز اس مصرع کی زندہ تصویر تھے۔

دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے۔

اور بازوئے قاتل میں بہت زور تھا۔ انہوں نے کوئی رعایت نہیں کی۔ ایک بار پھر گولیوں کی باڑیں آئیں اور لاشیں ایک دوسرے کے اوپر گریں۔ اب ہمارا رکنا بھی بیکار تھا۔ ہمارا کنٹینر حرکت میں آیا اور یہی وقت تھا جب میری نگاہ ڈی پیلس کی فصیل نما دیوار پر پہنچی۔ میں نے ایک بوفر گن کے دیوہیکل بیرل کو حرکت کرتے دیکھا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ کنٹینر کو نشانہ بنایا جانے والا ہے۔ میں نے فوری طور پر کنٹینر چھوڑنے کا حکم دیا اور خود بھی انیق کے سہارے باہر آ گیا۔ بوفر گن کا شیل بنیادی طور پر تو طیارے کو گرانے کے لیے ہوتا ہے مگر اسے دیگر ٹارگٹس کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک منٹ میں تقریباً 120 راؤنڈ فائر ہوتے ہیں۔ یہ شیل سات آٹھ کلومیٹر تک بہ آسانی مار کر سکتا ہے، مگر اس وقت اسے صرف پانچ چھ سو فٹ کی دوری سے استعمال کیا جا رہا تھا۔ میرا اندازہ سو فیصد درست نکلا۔ چند سیکنڈ بعد ایک سماعت شکن دھماکا ہوا اور ہمارا کنٹینر آگ اور دھوئیں کے ایک بڑے گولے میں تبدیل ہو گیا۔ کنٹینر کے ارد گرد موجود درجنوں افراد اس فائرنگ کی زد میں آئے۔

دوسرا منظر اس سے زیادہ ہولناک تھا۔ عارفہ خاتون جوش کے عالم میں ابھی تک دوسرے کنٹینر پر موجود تھیں اور اسے کافی آگے لے گئی تھیں۔ اس کنٹینر پر ایم آر ایل سے حملہ کیا گیا۔ دو راکٹ کنٹینر کے سامنے والے حصے سے ٹکرائے۔ میں نے عارفہ خاتون کی سفید چادر کے ٹکڑے ہوا میں اڑتے دیکھے۔ یقینی بات تھی کہ عارفہ خاتون کے علاوہ درجنوں افراد اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ مشتعل ہجوم اب مورچوں تک پہنچ چکا تھا۔ میرا خیال ہے کہ

اس سے آگے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

جب مارے کاٹے گئے لوگ اپنے ہی پیاروں اور اپنے ہی ساتھیوں کی تڑپتی لاشوں کو پھلانگ کر قاتلوں کی کمین گاہوں تک پہنچ جاتے ہیں تو پھر جو کچھ ہوتا ہے وہ تاریخ کے ہزار ہا صفحات پر رقم ہے اور جب قاتلوں تک پہنچنے والے لاتعداد ہوں تو پھر وہاں لاشیں نہیں گرتیں، پرخچے اڑتے ہیں اور ٹکڑے ہوتے ہیں جو مناظر ہم نے دیکھے وہ دست بدست لڑائی کے تھے، مگر یہ لڑائی بیس تیس سیکنڈ سے زیادہ جاری نہیں رہ سکی۔ ہزاروں فٹ اونچی پھنکارتی لہروں اور ریت کی دیواروں کے درمیان لڑائی بھلا کتنی دیر جاری رہ سکتی ہے؟ وہاں ہم نے رائے زل کے فوجیوں اور ایجنسی کے گارڈز کو پھٹے پرانے کپڑوں کی طرح ہجوم میں اچھلتے اور پاؤں میں روندے جاتے دیکھا۔ ہاں ایسے ہی موقعے ہوتے ہیں جب کوئی خاص یونیفارم موت کا لباس بن جاتی ہے۔ اب لوگ جنونی انداز میں ڈی پیلس کے گیٹ کی طرف بڑھ رہے تھے۔

میں یہ دیکھ کر دنگ ہوا کہ ہم سے قریباً ڈیڑھ سو میٹر کی دوری پر ڈی پیلس کا مین گیٹ بند نہیں ہے۔ یہ وہی مضبوط ترین سلائیڈنگ گیٹ تھا جسے ریان فردوس نے ڈی پیلس کے دفاع کے لیے ہنگامی طور پر تعمیر کرایا تھا۔ کمانڈر افغانی نے اسی گیٹ کے سامنے اپنی جان دی تھی کیونکہ جب وہ واپس ڈی پیلس میں داخل ہونا چاہتا تھا گیٹ آٹومیٹک طور پر بند ہو گیا تھا۔ آج بھی اندیشہ یہی تھا کہ اس گیٹ کو پار کرنے کے لیے ہمیں سخت کوشش کرنا پڑے گی لیکن اس نہایت نازک موقع پر یہ گیٹ اچانک کھلا ہوا دکھائی دیا تھا۔ میں نے سینکڑوں پُرجوش افراد کو دیکھا جو اندھا دھند گیٹ کی طرف لپکے چلے جارہے تھے۔

''کہیں یہ کوئی چال نہ ہو؟'' میرے پاس کھڑے پال کورنی نے کہا۔

میں نے کہا۔ ''اگر چال ہے بھی تو اب ان لوگوں کو کوئی روک نہیں سکتا۔''

دیکھتے ہی دیکھتے یہ لوگ برستی گولیوں میں عظیم الشان گیٹ تک پہنچ گئے۔ اطراف میں موجود سینکڑوں گرے فوجیوں اور امریکن گارڈز کے ساتھ زوردار دوبدو لڑائی شروع ہو گئی جب ایسا گھمسان کا رَن پڑ جائے تو مشین گنیں اور مارٹرز، بوفرز وغیرہ کہاں استعمال ہو سکتی ہیں۔ ہاں چھوٹے ہتھیاروں کے فائر متواتر سنائی دے رہے تھے یا پھر آرمی ڈیگرز اور خنجروں وغیرہ کی چمک نظر آتی تھی۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ انیق میرے قریب موجود نہیں ہے۔ میں اسے دیکھ رہا تھا جب راجر نے اپنی ٹیلی اسکوپ میری طرف بڑھائی اور گیٹ کی داہنی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''مسٹر شاہ زیب! ادھر دیکھو، تمہارا دوست ہے وہاں۔ یقیناً بہادر آدمی ہے۔

میں نے ٹیلی اسکوپ آنکھوں سے لگا کر اسے فوکس کیا اور تھوڑا دائیں بائیں ہلایا۔ میرا جسم سنسنا اٹھا۔ مجھے وہاں سجاول کی جھلک نظر آئی۔ وہ گھمسان کی لڑائی کا حصہ تھا۔ اس کی پگڑی کھل چکی تھی۔ ڈاڑھی اتر چکی تھی۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ رائفل اس کے ہاتھ میں تھی مگر شاید خالی ہو چکی تھی۔ وہ اسے کسی برچھی کی طرح استعمال کر رہا تھا۔ رائفل کی سنگین، دوپہر کے سورج کی روشنی میں گاہے بگاہے بجلی کی طرح چمکتی تھی۔ وہ اس ٹولی میں سب سے آگے تھا جو گرے فوجیوں اور گارڈز کی صفیں چیر کر گیٹ میں داخل ہونا چاہتی تھی۔

اور پھر مجھے انیق بھی نظر آیا۔ اس نے سجاول کے کندھے سے کندھا ملا رکھا تھا۔ دست بدست لڑائی میں انیق بھی ایک نہایت خطرناک حریف تھا اور اس کا ثبوت ڈی پیلس کے گیٹ پر مل رہا تھا۔ اس نے میری نظروں کے عین سامنے ایک امریکی گارڈ کے پیٹ میں چھرا گھونپا اور پھر سر کی ٹکر سے اسے دور پھینک دیا۔ ''شاباش۔'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا اور یہ لفظ انیق اور سجاول دونوں کے لیے تھا۔

مجھے محسوس ہوا کہ میں زخمی اور لاچار ہونے کے باوجود زخمی اور لاچار نہیں ہوں۔ میں اس لڑائی میں حصہ لے رہا ہوں۔

میرے اردگرد سینکڑوں جانبازوں نے دہرا تہرا حفاظتی حصار قائم کر رکھا تھا۔ اسی دوران میں ہماری نظر بلیک ہاک گن شپ ہیلی کاپٹرز پر پڑی۔ سابقہ لڑائیوں میں ہم نے ان ہیلی کاپٹرز کو باقاعدہ بم گراتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ ہیلی کاپٹرز کی آمد پرتشویش تھی وہ نیچے پرواز کرتے ہوئے ڈی پیلس کے گیٹ کی طرف آئے مگر ان کو چلانے والے اندھے نہیں تھے۔ انہوں نے دیکھ لیا کہ نیچے، گھمسان کی دست بدست لڑائی ہو رہی ہے۔ یہاں فائرنگ کر کے یا بم پھینک کر وہ اپنے ہی چیٹی بھائیوں کے قاتل گردانے جاتے۔ درحقیقت وقت ان کے ہاتھ سے نکلتا چلا جا رہا تھا۔

دو تین منٹ بعد ہی ہم دیکھ رہے تھے کہ لہریں لیتا ہوا ایک انسانی سمندر ڈی پیلس کے اندر داخل ہو رہا ہے۔ ہر طرف ایک ہی نغمے کی گونج تھی۔

ہم نے جی جان سے جینا ہے
اور سینہ تان کے جینا ہے
ہم نے عزم کر لیا جنگ میں قدم دھر لیا......

بکتر بند گاڑیاں اب موقع پر پہنچ گئی تھیں۔ ان گاڑیوں پر جاماجی کے جھنڈے لہرا دیے تھے۔ مجھے ایک بکتر بند گاڑی میں سوار کر دیا گیا۔ پال، راجر اور کرنل احرار بھی اسی میں

سوار ہوئے۔ بے شمار لوگوں کے حصار میں اس گاڑی نے ڈی پیلس کے گیٹ کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ یہ بڑا ولولہ انگیز منظر تھا۔ سینکڑوں پرچم لہرا رہے تھے اور للکاروں سے ڈی پیلس کی دیواریں لرز رہی تھیں۔

ہاں...... یہ صرف ایک جاماجی کی کہانی نہیں تھی۔ یہ ہر اُس علاقے اور خطے کی کہانی تھی جہاں آزادی چھینی جاتی ہے اور جبر کو رواج دیا جاتا ہے۔

کچھ دن پہلے یہی ڈی پیلس تھا اور یہی گیٹ تھا جس میں سے رائے زل کی سواری بڑی بھاری بڑے فاتحانہ انداز میں اندر داخل ہوئی تھی۔ آج پانسا پلٹ چکا تھا۔ میری دلی خواہش تھی کہ ناجائز طور پر کسی کا خون نہ بہے۔ اسی دوران میں میرا ٹیلی فونک رابطہ محترم ح، ذ ق ذکری سے بھی ہو گیا۔ وہ بھی یہی چاہتے تھے کہ صرف ان لوگوں سے لڑا جائے جو اب بھی لڑنا چاہتے ہیں۔

میں نے فوری طور پر جاسم کو بلایا اور اسے سختی سے ہدایت کی کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔ جاسم کے ذریعے یہ ہدایات دو چار منٹ کے اندر سب ناظمین، کمانڈرز اور کرتا دھرتا افراد تک پہنچ گئیں۔

جب ہم ڈی پیلس کے مین گیٹ کے اندر داخل ہوئے تو میں نے دیکھا کہ ایک دیوہیکل پٹ پورا کھلا ہوا تھا مگر دوسرا تین چار فٹ کے قریب دیوار کے اندر نہیں گیا تھا۔ میں نے کرنل احرار سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”کرنل صاحب! مجھے لگتا ہے کہ گیٹ کے میکنزم میں کوئی خرابی ہے...... یا پھر پیدا کی گئی ہے۔“

”آپ کی دوسری بات درست ہے شاہ زیب صاحب! کسی نے عین موقع پر ہماری مدد کی ہے۔“

”کون ہو سکتا ہے؟“

”جو کوئی بھی ہو گا اپنی جان پر کھیلا ہو گا۔ یہاں بہت سخت سیکیورٹی تھی۔“

اسی اثنا میں جاسم سرخ چہرے اور ہانپتی سانسوں کے ساتھ بکتر بند کی کھڑکی میں نمودار ہوا۔ اس نے کہا۔ ”شاہ زیب صاحب! زیادہ تر لوگ ہتھیار ڈال رہے ہیں بس اکا دکا پاکٹس میں (کہیں کہیں) فائرنگ ہو رہی ہے۔ رائے زل اور آقا جان وغیرہ نے خود کو ڈی پیلس کی انیکسی میں بند کر لیا ہے۔ ریان فردوس مرحوم کے کئی قریبی عزیز یرغمال کے طور پر ان کے ساتھ ہیں اور ان میں...... بیگم نورل بھی ہیں۔“

”اس کا مطلب ہے کہ ہمارا اندیشہ درست تھا۔“ میں نے لمبی سانس لے کر کہا۔

''اور فیصلہ بھی درست تھا جو آپ نے کیا۔'' جاسم نے میری بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔'' آپ نے ہاناوانی کو اپنے حفاظتی حصار میں لے کر رائے زل کی اس خباثت کا توڑ کر دیا ہے۔''

پال نے پوچھا۔'' آفیسر لونگ کا کچھ پتا چلا؟''

جاسم بولا۔''سب لوگ جانتے ہیں کہ یہاں چپے چپے پر شاہ زیب صاب کی جو تصویر نظر آ رہی ہے...... وہ کیوں نظر آ رہی ہے۔ اس تصویر کو لونگ کی وحشت نے ہی وجود دیا ہے۔ لوگ ہر جگہ اس وحشی کو ڈھونڈ رہے ہیں۔''

''جاسم! ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ اسے زندہ گرفتار کیا جائے۔'' میں نے کہا۔

''ایسا ہی ہوگا جی۔'' وہ پُرعزم لہجے میں بولا۔

ہماری بکتر بند کے شیشے بلٹ پروف تھے۔ اس کے اوپر BMG ٹائپ کی طاقتور مشین گن ماؤنٹ کی گئی تھی۔ ایک بکتر بند ہمارے آگے اور ایک عقب میں تھی۔ یہ تینوں گاڑیاں ہجوم میں سے راستہ بناتی سُست روی سے انیکسی کی جانب بڑھ رہی تھیں۔ انیکسی جہاں جاماجی کا قابض حکمران اور ایک شیطان صفت عیار (آقا جان) موجود تھے۔ دور ہی سے پتا چل گیا کہ انیکسی کو چاروں طرف سے پاسبان بریگیڈ کے مسلح افراد نے گھیر رکھا ہے اور پوزیشنیں لی ہوئی ہیں۔ تینوں بکتر بند گاڑیاں انیکسی کے سامنے جا کر رک گئیں۔ گرین فورس کے ایک ون اسٹار آفیسر نے ہمیں ایک موبائل فون مہیا کر دیا۔ اس فون پر رائے زل آن لائن تھا۔ وہ اپنی کرخت آواز میں گرج رہا تھا۔''میں اکیلا نہیں جاؤں گا۔ بہت سوں کو ساتھ لے کر جاؤں گا اور ان میں یہ منحوس عورت بھی شامل ہوگی۔'' اس کا اشارہ یقیناً بیگم نسا نورل کی طرف تھا۔

میں نے کہا۔'' رائے زل! تم اس عورت کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے۔ اگر کرو گے تو پھر تمہاری والدہ محترمہ بھی زندہ دفن ہوں گی۔ ان کو بہت شوق ہے نا اپنی کھلی قبر میں راتیں گزارنے کا۔''

چند لمحے فون لائن پر سناٹا پھر رائے زل کی بدلی ہوئی آواز آئی۔''کون ہو تم؟ یہ کیا بک رہے ہو؟''

''میں تمہارا باپ شاہ زیب بول رہا ہوں اور تمہیں یہ سمجھانا چاہ رہا ہوں کہ تمہاری امی جان ہماری مہمان ہیں۔ بیگم نورل کے بارے میں کچھ بھی برا سوچنے سے پہلے اپنی ماں کی بری موت کے بارے میں بھی سوچ لینا۔''

''تم مادرِ محترم کی بات کر رہے ہو؟'' رائے زل کی آواز میرے کان میں گونجی۔

''جی...... اسی محترم کی بات ہو رہی ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ چبا کر کہا۔

چند لمحے تک مدھم کھسر پسر سنائی دی۔ یوں لگا جیسے رائے نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر کسی سے بات کی ہے۔ پھر اس کی سنگلاخ آواز دوبارہ ابھری۔ ''تم باسٹرڈ گھس بیٹھیے...... تم اپنی بکواس بند رکھو...... مادرِ محترم کو تمہاری ہوا بھی نہیں چھو سکتی...... اور اب تم وہ سنو جو میں کہہ رہا ہوں۔''

اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ابھی تک اس بات سے آگاہ نہیں کہ اسپتال پر گرین فورس کا مکمل کنٹرول ہو چکا ہے اور اس کی ماں ہاناوانی ہماری تحویل میں ہے۔

وہ بغیر کوئی بات سنے تند لہجے میں بولتا چلا گیا۔ ''میں تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو صرف دس منٹ دیتا ہوں۔ سیڑھیوں کی طرف سے اپنے حرامی ٹٹوؤں کو ہٹا دو۔ ورنہ ان کے جسم میں اتنے سوراخ ہوں گے کہ ڈی این اے کے بغیر لاشیں پہچانی نہیں جائیں گی...... اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں گھس بیٹھیے! بیگم نورل اس کی بہنوں، بھتیجوں، بھانجوں، بھانجیوں کی لاشوں کے لیے بھی ڈی این اے ٹیسٹ ضروری ہو جائے گا۔ گیٹ لاسٹ...... میں کہتا ہوں گیٹ لاسٹ۔''

اس نے قریب پڑی ہوئی کوئی چیز پٹخ کر توڑ ڈالی تھی۔ یہ آواز بھی فون پر گونجی۔

تب مجھے فون پر وہ آواز سنائی دی جو میرے لیے اس چار دیواری میں منحوس ترین تھی۔ یہ آقا جان کی آواز تھی۔ اس نے گفتگو ایک گالی سے شروع کی اور بولا ''انیکسی کی چھت پر جانا چاہتے ہیں ہم۔ اپنے بندوں کو وہاں سے ہٹا لو۔ ورنہ ہم اس گابھن گائے کا ماس کاٹ کاٹ کر باہر بھیجنا شروع کر دیں گے۔'' آقا جان کی آواز میں درندگی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ گابھن گائے کے الفاظ وہ یقیناً محترمہ بیگم نورل کے لیے استعمال کر رہا تھا۔

وہ چھت پر جانے کی بات کر رہا تھا۔ شاید ان کا خیال تھا کہ کوئی ہیلی کاپٹر انہیں وہاں سے اٹھا لے گا۔

میں نے جاسم سے کہا۔ ''ان حرام زادوں کو یقین نہیں آ رہا کہ ہاناوانی ہمارے پاس ہے۔ اسپتال میں رابطہ کرو اور اس حرافہ کی آواز اس کے بیٹے کو سناؤ۔''

جاسم نے فوراً موبائل پر اسپتال میں رابطہ کیا۔ وہاں گرین فورس کے کسی میجر سے جاسم کی بات ہوئی۔ میجر نے جاسم کو بتایا کہ ہاناوانی کو حفاظت اور رازداری کی غرض سے پہلی منزل کے ایک ساؤنڈ پروف سیٹنگ روم میں رکھا گیا ہے۔ وہ ابھی اس سے بات کرواتا ہے۔

جاسم بولا۔ ''ہم سے بات کروانے کی ضرورت نہیں میجر! میں تمہیں ایک فون نمبر دے رہا ہوں۔ یہ رائے زل یا اس کے پرسنل سیکرٹری کا ہے۔ تم ہاناوانی کی بات اس نمبر پر کرواؤ۔ لیکن دھیان رہے کہ ہاناوانی اپنی لوکیشن نہ بتانے پائے اور نہ ہی کوئی غیر ضروری بات کر سکے۔''

''او کے جناب ناظم۔'' میجر کی آواز فون کے اسپیکر پر سنائی دی۔

اسی اثنا میں ہم نے ایک تکلیف دہ منظر دیکھا۔ دس بارہ سالہ ایک بچی انیکسی کی ایک کھڑکی توڑتی ہوئی باہر آ گری۔ وہ خود نہیں آئی تھی، اسے پھینکا گیا تھا۔ اس کا سینہ خون سے رنگین تھا۔ ہمیں گولی کی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ بچی کو خنجر وغیرہ گھونپا گیا ہے۔

''او گاڈ!'' جاسم نے سر پکڑ لیا۔ ''یہ بیگم نورل کی لے پالک بیٹی ہے۔ بیگم جی کو بے حد پیار تھا اس سے......ویری ویری سیڈ۔''

لڑکی غالباً باہر گرنے سے پہلے ہی جاں بحق ہو چکی تھی۔ بس اس کے پاؤں میں تھوڑی بہت حرکت باقی تھی۔ اس کا خوب صورت فراک، تصویرِ حسرت بن کر ہوا میں پھڑ پھڑا رہا تھا۔

جاسم کے فون پر بیل ہوئی۔ دوسری طرف رائے زل ہی تھا۔ چھوٹی چھوٹی آنکھوں والا وہ بے رحم ریچھ جس کی آواز کثرت شراب نوشی سے مستقل طور پر بھرائی رہتی تھی۔ عورت بازی اس کی شناخت تھی اور ایجنسی کی یاری نے اسے سیاہ سفید کا مالک بنا رکھا تھا۔ وہ دہاڑا۔ ''یہ پہلا نمونہ ہے۔ سیڑھیوں پر تمہارا کوئی پالتو نظر نہیں آنا چاہیے ورنہ یہ بدذات عورت تڑپنا شروع کر دے گی۔'' اس کا اشارہ پھر بیگم نورل کی طرف ہی تھا۔

فون پر بیگم نورل کے رونے کی اور بولنے کی مدھم آواز بھی سنائی دے رہی تھی......ان کا یہ نوحہ یقیناً اس بچی کے لیے ہی تھا جو ٹوٹی ہوئی کھڑکی سے باہر، شیشے کی کرچیوں کے درمیان بے سدھ پڑی تھی۔

میں نے سجاول کا چہرہ دیکھا۔ اس کی آنکھیں جو ویسے ہی سرخ رہتی تھیں، بالکل انگاروں کی طرح دہک گئی تھیں۔ بیگم نورل نے اسے بھائی کہا تھا...... بے شک سجاول نے اسے بہن نہیں کہا تھا، مگر میں جانتا تھا، وہ دل سے اس کی عزت کرتا ہے۔

میں نے اردگرد نگاہ دوڑائی۔ ڈی پیلس کے وسیع سبزہ زاروں اور اس کی مختلف عمارتوں کے گرد ہزاروں افراد موجود تھے۔ خاص طور سے انیکسی کی وسیع عمارت کو لاتعداد مشتعل افراد

نے گھیرا ہوا تھا۔ ناظم باذان اور عارفہ خاتون کی موت نے انہیں سراپا آتش بنا رکھا تھا۔ وہ ایک اشارے پر اندر گھسنے اور قاتلوں کی تکا بوٹی کرنے کو تیار تھے۔ میں نے رائے زل سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''میں ایک بار پھر تمہیں وارننگ دیتا ہوں، تمہاری ماں مرنے سے پہلے تمہیں بدترین بددعاؤں سے نوازے گی۔ اگر ابراہیم کی ماں کے ساتھ کچھ ہوگا تو اس کا بدلہ تمہاری ماں کو چکانا ہوگا...... ابھی اور اسی وقت......''

یہی وقت تھا جب جاسم کے دوسرے سیل فون کی بیل ہوئی۔ اس نے کال ریسیو کی اور میں نے دیکھا کہ اس کا رنگ زرد ہو گیا ہے۔ اس نے اشارے سے مجھے کہا کہ میں فی الحال رائے زل سے گفتگو منقطع کر دوں۔

میں نے لائن کاٹ دی۔ جاسم دوسری طرف سے کی جانے والی بات بغور سن رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کی چمک محسوس ہوئی۔ بات ختم کر کے وہ بولا۔ ''اچھی خبر نہیں ہے شاہ زیب صاحب!''

''کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ ''رائے زل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ہاناوانی ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہو؟'' میں حیران رہ گیا۔

''جس کمرے میں اسے بند کیا گیا تھا، وہاں پانچ بندوں کی لاشیں پڑی ہیں، چھٹا غائب ہے اور ہاناوانی بھی۔'' وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد دوبارہ بولا۔ ''لگتا ہے کہ ہاناوانی نے کچھ کیا ہے...... ہم اس سے پہلے بھی دیکھ چکے ہیں...... وہ بے حد خطرناک اور عیار عورت ہے...... کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ گرین فورس کے آفیسر نے اپنے ساتھیوں کو خود ہلاک کیا ہے اور ہاناوانی کو وہاں سے نکال لے گیا ہے۔''

میرے تصور میں وہی دو چمکیلی آنکھیں گھوم گئیں جن کو ایک سیاہ شیشوں والی عینک ڈھانپے رکھتی تھی۔ ہاناوانی کی پہچان اس کی وہ پُراسرار صلاحیتیں تھیں جن کی بنا پر وہ اپنے دوستوں دشمنوں کو زیر کرتی تھی...... اور ڈاکٹر ماریہ نے مجھ سے کہا تھا (اور محترم ذکری نے بھی) کہ ہپناٹزم ایک مسلمہ سائنسی حقیقت ہے۔ جدید دور میں اس کے نئے رخ سامنے آ رہے ہیں...... یہ وہ جادو ہے جس کا تعلق براہِ راست انسان کے دل و دماغ سے ہے۔

تو کیا ہاناوانی کی آنکھوں کے جادو نے ایک بار پھر کام دکھایا تھا...... اور وہ ایسا کچھ کر گزری تھی، جس کی توقع ہم میں سے کسی نے نہیں کی تھی۔ بے پناہ حیرت کے ساتھ غم و غصے کی شدید لہر بھی میرے اندر سے اٹھی اور اس عورت کے لیے نفرت کا دریا سا سینے میں بہہ گیا۔

جاسم کے فون کی بیل ایک بار پھر کریہہ آواز میں پکارنے لگی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف حسبِ توقع رائے زل ہی تھا۔ اس کی آواز اسپیکر سے نکل کر بکتر بند کے اندر سنائی دے رہی تھی۔ ''کہاں مر گئے ہو...... سامنے آؤ...... تمہارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ حرام کے جنو، میں صرف دو منٹ بعد اس عورت کے گوشت کا ایک اور ٹکڑا کاٹنے والا ہوں......''

اب اس کی زبان کچھ کچھ سمجھ میں آ رہی تھی۔ گوشت کا ٹکڑا کاٹنے سے اس کی مراد کسی اور بچے یا نوجوان کو مارنا تھا۔ ویسے یہ بھی کوئی بڑی بات نہیں تھی کہ وقت پڑنے پر وہ سچ مچ بیگم نورل یا کسی اور یرغمالی کا گوشت کاٹنا شروع کر دیتا۔

''کیا چاہتے ہو تم؟'' میں نے سنبھلے ہوئے لہجے میں اس سے پوچھا۔

''تم بدذات، تو بات نہ ہی کرو تو اچھا ہے۔'' وہ پھنکارا۔ ''تمہاری آواز سن کر میرے دماغ میں چنگاریاں چھوٹ جاتی ہیں۔ کسی اور حرامی کو فون پکڑاؤ۔''

''تمہیں مجھ سے ہی بات کرنا پڑے گی رائے زل...... کیونکہ یہاں اور کوئی ایسا نہیں جو تم جیسے پلید جانور کی غلیظ آواز سننے کو تیار ہو۔ بولو کیا چاہتے ہو؟''

وہ دہاڑا۔ ''میں نے کہا ہے نا کہ تم ایک اجنبی گھس بیٹھیے ہو۔ میں تم پر اور تمہاری شکل پر ہزار بار لعنت بھیجتا ہوں...... میری بات کسی مقامی سے کرواؤ۔''

''مقامیوں نے ہی، تمہارے گلے میں پھندا ڈالنے کے لیے مجھے منتخب کیا ہے۔''

وہ مغلظات بکنے لگا۔ آخر میں بولا۔ ''تم جیسے خارش زدہ فائٹر میرے پیشاب کی دھار میں بہہ جاتے ہیں۔ تمہاری حیثیت میرے لیے گندی نالی کے کیڑے سے زیادہ نہیں ہے۔ دفعان ہو جاؤ یہاں سے ورنہ بہت شرمندگی والی موت مرو گے......'' اس کی آواز طیش کی شدت سے لرز رہی تھی۔

وہ مجھے اپنے مرتبے کا نہیں سمجھ رہا تھا مگر وہ جانتا نہیں تھا کہ مرتبہ اور معیار بدل چکے ہیں۔ وقت کی باگیں اس کے ہاتھوں سے نکلی جا رہی ہیں۔

میں نے پھر بولنا چاہا۔ ابھی میں نے ''سنو رائے زل......'' ہی کہا تھا کہ آٹو میٹک رائفل کی لرزہ خیز ''تڑ تڑ'' گونجی۔ گولیوں کی ایک بوچھاڑ آ کر ہماری بکتر بند سے ٹکرائی۔ بکتر بند کی چھوٹی چھوٹی کھڑکیوں کے شیشے بلٹ پروف تھے، مگر ایک کھڑکی تھوڑی سی کھلی ہوئی تھی برسٹ کی ایک گولی اندر گھسی اور انیق اور کرنل احرار کے سروں کو چھوتی ہوئی ''روف لائٹ'' سے ٹکرائی۔ لائٹ چکنا چور ہو گئی۔ اس کی کچھ کرچیاں میری گردن میں لگیں اور گردن پر خون

کی نمی کا احساس ہوا۔ انیق نے ''پاور ونڈو'' فوراً بند کر دی تھی۔ ہم سب نیچے جھک گئے۔ میرا دایاں ہاتھ اپنی گردن پر تھا اور ہاتھ پر بھی خون کی نمی محسوس ہو رہی تھی۔ بکتر بند کے اوپر لگی ہوئی مشین گن سے جوابی برسٹ چلایا گیا مگر یہ گن مین کی اضطراری حرکت تھی۔ اس کے سامنے کوئی نشانہ نہیں تھا۔ اس نے انیکسی کی سپاٹ دیوار پر گولیاں چلائی تھیں۔

فون کے اسپیکر پر بھرائی ہوئی آواز والا رائے زل جنونی انداز میں چلا رہا تھا۔ ''دفع ہو جاؤ یہاں سے...... چلے جاؤ میرے سامنے سے...... اس ہیجڑے ابراہیم کو لاؤ میرے سامنے...... یا اس حرام زادی قسطینا کو...... نہیں تو میں چھلنی کر دوں گا سب کو...... ایک کو نہیں بخشوں گا۔''

اس کے لہجے میں اب ایک جابر حکمران کی جگہ جنونی قاتل بول رہا تھا۔ اس کا پُر تکبر انداز گواہ تھا کہ وہ اپنے اردگرد موجود لوگوں کو چیونٹیوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔

اسی دوران میں کرنل احرار کے سیل فون پر کال کے سگنل آئے۔ اس نے کال ریسیو کی اور اسپیکر آن کر دیا۔ دوسری طرف رضا کار کمانڈر زمان بول رہا تھا۔ اس نے سخت گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''کرنل صاحب! کیا واقعی شاہ زیب صاحب کو گولی لگ گئی ہے؟''

''نہیں، نہیں۔'' کرنل جلدی سے بولا۔ ''وہ بالکل محفوظ ہیں۔ بکتر بند پر برسٹ چلایا گیا تھا۔ ایک اندرونی لائٹ ٹوٹنے سے ان کی گردن پر معمولی زخم آیا ہے۔''

''کیا...... آپ...... کچھ چھپا تو نہیں رہے؟'' کمانڈر کی آواز کانپ رہی تھی اور اس میں اب بھی اندیشے تھے۔

''نہیں، شاہ زیب صاحب بالکل ٹھیک ہیں۔''

''لیکن یہاں تو افواہ پھیل گئی ہے کہ...... خدانخواستہ...... ان کی زندگی کو...... نقصان پہنچ گیا ہے؟''

پس منظر میں فلک شگاف نعرے اور للکارے سنائی دے رہے تھے۔ میں نے مداخلت کی اور سیل فون پر جھک کر کہا۔ ''نہیں کمانڈر۔ Panic ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں بالکل خیریت سے ہوں۔ ہم اندر والوں سے بات کر رہے ہیں۔''

ابھی میرا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ ہم نے ایک سنسنی خیز منظر دیکھا۔ میں پھر وہی بات دہراؤں گا۔ اس دن مجھے پہلی بار پتا چلا کہ لوگوں کے بڑے بڑے مشتعل اجتماع کس طرح سرکش طوفانی ریلوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ انسانوں کا غیظ و غضب کس طرح بلند دیواروں کو ملیا میٹ کرتا ہے، اور اپنے راستے خود بنا لیتا ہے...... رائے زل جس شخص سے

بات کرنا بھی گوارا نہیں کر رہا تھا، وہ لاتعداد لوگوں کے لیے اہم ہو چکا تھا، اس کی زندگی کو نقصان پہنچنے کی خبر نے ہزاروں کے مجمع میں ایسی لہر پیدا کی جسے روکنا کسی کے بس میں نہیں تھا۔

اور واقعی وہ منظر ایک تند و تیز آبی لہر جیسا ہی تھا۔ انیکسی کی شمالی جانب کے لوگ انیکسی کی چار دیواری سے بمشکل پچاس میٹر دور تھے۔ ان میں پاسبان بریگیڈ کے مسلح جانباز اور ہتھیار بند رضا کار بھی تھے۔ یہ لوگ گولی کی رفتار سے انیکسی کی طرف بڑھے۔ یہ دس بیس نہیں تھے...... سو دو سو بھی نہیں تھی۔ یہ ہزاروں میں تھے مگر فرد واحد کی طرح حرکت کر رہے تھے...... اور یہ منظر دیکھنے لائق تھا۔

انیکسی کے اندر موجود افراد نے گولیاں چلائیں۔ یقیناً یہ بدحواسوں کی فائرنگ تھی اور ان بدحواسوں کو زیادہ وقت نہیں ملا۔ بمشکل آٹھ دس سیکنڈ۔ اَن گنت لوگ شیشے کی بڑی بڑی کھڑکیاں اور پلائی کے دروازے توڑ کر انیکسی میں گھس گئے۔ ہر طرف کہرام مچ گیا۔

اب ہماری اپنی جگہ رکنا پھر بے کار تھا۔ میری ہدایت پر ڈرائیور نے اس اسپیشل بکتر بند گاڑی کو تیزی سے آگے بڑھایا اور ہم بھی ایک بڑے چوبی دروازے کو توڑتے ہوئے انیکسی میں گھس گئے۔ میں نے بہت سے خوش پوش بچوں اور عورتوں کو دیکھا۔ وہ اندرونی حصے سے نکلے تھے اور چلاتے ہوئے مختلف اطراف میں راہِ فرار اختیار کر رہے تھے۔ میں انہیں شکلوں سے جانتا تھا۔ ان میں زیادہ کا تعلق شاہی فیملی ہی سے تھا۔ ان میں سے دو چار زخمی بھی تھے۔ میں اس میدانِ کارزار کو دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ آج سے چند ماہ پہلے جب میں چاند گڑھی میں تھا، میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ اس گاؤں کی خاموش فضا سے نکل کر ایک ایسی جگہ پہنچ جاؤں گا جہاں آگ اور خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے۔ میں ان مسافتوں کا راہی تو نہیں تھا۔ میں تو پاکستان پہنچا تھا انڈر ورلڈ کے کچھ دشمنوں سے اوجھل ہونے کے لیے...... اور اس کے ساتھ ساتھ ایک دلربا چہرے کی تلاش میں۔ یہ دونوں مقاصد تو بہت پیچھے رہ گئے تھے اور میں گھر گیا تھا ایک ''باقاعدہ جنگ'' کے شعلوں میں۔ شاید اسی کو حالات کی من مرضی اور رخشِ حیات کی سرکشی کہتے ہیں۔

○......❖......○

انیکسی کے مختلف حصوں سے فائرنگ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ پھر دستی بموں کے دھماکے بھی سنائی دیئے۔ ہر طرف دھوئیں اور بارود کی بو تھی۔ میری نگاہ سجاول اور انیق پر پڑی۔ ایک بار پھر دونوں اکٹھے نظر آ رہے تھے۔ سجاول کے سامنے ٹھہرنا کسی عام شخص کے بس کا روگ نہیں

تھا جو اس کا ایک طوفانی مکا کھالیتا تھا، دوسرے کی ''ڈیمانڈ'' نہیں کرتا تھا۔ انیق کے ہاتھ میں چھوٹی نال کی چینی رائفل تھی۔ میں نے اسے ایک ستون کی اوٹ میں دیکھا۔ وہ گاہے گاہے اوٹ سے نکل رہا تھا اور ایک چھوٹا برسٹ چلا کر پھر سے اوٹ میں ہو جاتا تھا۔ وہ ایک خطرناک جگہ پر تھا۔ میری دھڑکنیں زیروزبر ہونے لگیں۔

کرنل احرار بھی دلیرانہ انداز میں اس مار دھاڑ میں شریک ہو چکا تھا۔ تاہم جاسم میرے پاس بکتر بند کے اندر ہی تھا۔ وہ بولا۔ ''ادھر دیکھئے شاہ زیب صاحب! ایک غدار کا انجام۔''

میں نے مڑ کر دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ بالکل یقین نہیں آیا کہ میں حقیقت میں یہ منظر دیکھ رہا ہوں۔ یہ کسی ''ہارر'' فلم کا سین یا جاگتی آنکھوں کا خواب لگتا تھا۔ کمانڈر اوان کا سر ایک رائفل کی سنگین پر ٹنگا ہوا تھا اور درجنوں لوگ اس رائفل کے اردگرد دیوانہ وار ناچ رہے تھے، کسی رضا کار کے برچھے نے یہ سرتن سے جدا کر کے سنگین پر ٹانک دیا تھا۔ اس منظر کو دیکھنے کے بعد جاسم بھی باہر نکل گیا۔ اب میں بکتر بند میں اکیلا تھا۔

یکا یک میری نگاہ ہال کے آخری سرے پر ایک ایسے منظر پر پڑی جس نے مجھے سرتا پا جھنجوڑا۔ یہ بس ایک جھلک ہی تھی جو میں نے دیکھی۔ مگر یہ جھلک بھی سینہ چیرنے کے لیے کافی تھی۔ میں نے دیکھا دو تنومند افراد ایک عورت کو بالوں اور بازو سے گھسیٹتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف اوجھل ہو گئے۔ ان میں سے ایک یقیناً وہی فربہ اندام شیطان تھا جسے لوگ رائے زل کے نام سے جانتے تھے۔

شدید ترین افراتفری میں کسی کی نظر شاید ہی اس منظر پر پڑی ہو۔ میں نے پاور ونڈو کھولی اور سینے کی پوری طاقت سے پہلے جاسم اور پھر انیق کو پکارا مگر ان تک میری آواز نہیں پہنچی۔ اسی دوران میں عین اسی مقام پر دستی بم کا ایک دھماکا ہوا جہاں میں نے چند لمحے پہلے انیق کو دیکھا تھا۔ طاقتور دستی بم تھا۔ شعلے کے ساتھ دھواں پھیلا اور میں نے انسانی گوشت کا ایک لوتھڑا بکتر بند گاڑی کی ونڈ اسکرین سے چپکتے دیکھا۔ یہ کس کا لوتھڑا تھا...... مرد کا تھا عورت کا...... یا پھر...... اس سے آگے میں کچھ سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ اور میرے پاس کچھ سوچنے کا وقت بھی نہیں تھا۔ میں جان چکا تھا کہ رائے زل اور شاید آقا جان بھی بیگم نورل کو لے کر چھت پر پہنچ گئے ہیں۔ وہ بیگم نورل کو گن پوائنٹ پر رکھ کر یہاں سے راہِ فرار اختیار کر رہے تھے۔

اب یہ منٹوں کا نہیں شاید سیکنڈوں کا کھیل تھا۔ مجھ میں اتنی سکت ہرگز نہیں تھی کہ میں بکتر بند سے نکلتا...... برستی گولیوں میں اس طویل ہال کمرے کو پار کرتا اور سیڑھیوں تک پہنچ سکتا۔

یکا یک میری نگاہ دائیں جانب المونیم کے دو چھوٹے دروازوں کی طرف اٹھ گئی۔ میں ایک لمبے عرصے تک اس انیکسی کا مقیم رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ان دروازوں کے ساتھ ہی ایک لفٹ بھی موجود ہے۔

میں اپنی رہی سہی قوت جمع کر کے بکتر بند سے اترا اور جھک کر چلتا ہوا (اور خود کو گھسیٹتا ہوا) المونیم کے دروازوں تک پہنچ گیا۔ دو قدم آگے دائیں جانب لفٹ کا سلور کلر دروازہ موجود تھا۔ میں لفٹ میں گھس گیا اور ٹاپ کا بٹن دبا دیا۔ بکتر بند سے نکلتے ہوئے ایک M-16 رائفل میں نے اٹھالی تھی۔

لفٹ نے مجھے پانچ چھ سیکنڈ میں چوتھی منزل کی وسیع وعریض چھت پر پہنچا دیا۔ میں یہ دیکھ کر دنگ ہوا کہ یہاں ایک اوٹ میں چھوٹے سائز کا سرخ اور سیاہ آرمی ہیلی کاپٹر پہلے سے موجود تھا۔ دونوں تنومند افراد بیگم نورل کو بے دردی سے سر کے بالوں سے گھسیٹتے ہوئے ہیلی کاپٹر کی طرف لے جا رہے تھے۔ ان میں سے ایک وہی درندہ صفت رائے زل تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں مشین پسٹل تھا۔ دوسرا شخص رائے زل کا کوئی کزن ہی لگتا تھا، کیونکہ وہ بھی اسی کی طرح فربہ اندام اور مکروہ صورت تھا۔ اس کے ہاتھ میں کلاشنکوف تھی۔ تب میری نگاہ آقا جان اور اس کے دو امریکی گارڈز پر پڑی، وہ بھی رائے زل کے ساتھ ہی راہِ فرار اختیار کر رہے تھے۔

سب سے پہلے آقا جان کی منحوس نگاہ ہی مجھ پر پڑی تھی اس نے انگلی میری جانب سیدھی کی اور چلایا۔ اس کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی مگر اس کی بات کا مطلب واضح تھا۔

میں نے رائفل کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور ایک چوکور ستون کی آڑ لے کر رائے زل کو نشانے پر رکھ لیا۔ ''میں آ گیا ہوں رائے زل...... اور میں تجھے بھاگنے نہیں دوں گا۔'' میں نے پورے یقین سے اور پھیپھڑوں کی پوری طاقت سے کہا۔

میں نے رائے زل اور اس کے کزن کو بری طرح چونکتے ہوئے دیکھا۔ انہوں نے مجھے آقا جان کی طرح دیکھا نہیں تھا مگر میری آواز وہ ضرور سن رہے تھے اور شاید M-16 کی خوفناک نال بھی انہیں نظر آ رہی تھی۔ مجھے ایڈوانٹیج یہ تھا کہ میں آڑ میں تھا اور وہ لوگ کھلی جگہ پر۔ ہیلی کاپٹر کا پنکھا گھومنا شروع ہو گیا تھا۔ اس کی آواز بڑھتی جا رہی تھی اور اس کے اردگرد موجود لوگوں کے لباس پھڑ پھڑانے لگے تھے......

رائے زل نے اپنے مشین پسٹل کی نال بیگم نورل کی کنپٹی سے لگا دی اور دہاڑا۔ ''تم مجھے نہیں روک سکتے...... کوئی مجھے نہیں روک سکتا۔ اگر روکنا چاہتے ہو تو پھر اس کی کم از کم

قیمت اس بدذات بڈھی کی موت ہے...... اس کی موت ہے۔''

اس نے اتنے زور سے مشین پسٹل کا بیرل بیگم نورل کی کنپٹی میں گھسایا کہ وہ بے ساختہ چلا اٹھیں...... ان کی حالت بری تھی۔ چغہ کئی جگہ سے پھٹ چکا تھا۔ ہاتھوں اور چہرے پر گہری خراشیں تھیں۔ وہ ایک باپردہ خاتون تھیں۔ میں نے انہیں کبھی حجاب کے بغیر نہیں دیکھا تھا مگر آج ان کے چاندی کے تاروں والے بال پنکھے کی ہوا میں پھڑ پھڑا رہے تھے اور ان کا ایک بازو کندھے تک عریاں ہو رہا تھا۔

اب آقا جان اور اس کے دونوں گورے گارڈز نے بھی اسمارٹ ہیلی کاپٹر کی اوٹ میں جا کر اپنی رائفلیں میری طرف سیدھی کر لی تھیں۔ آقا جان کی چال میں اب بھی لنگڑاہٹ موجود تھی یہ لنگڑاہٹ اس چھلانگ کی نشانی تھی جو جلسہ گاہ میں میری فائرنگ کے وقت آقا جان نے جان بچانے کے لیے اسٹیج پر سے لگائی تھی۔

مجھے رائے زل کی آنکھوں میں جو جنون نظر آیا وہ گواہی دے رہا تھا کہ اگر وہ مرے گا تو بیگم نورل کی موت بھی ساتھ ہی واقع ہوگی۔ اس نے اپنی فربہ انگلی مشین پسٹل کی سیاہ لبلبی پر رکھی ہوئی تھی۔ ایک ہلکا سا دباؤ کئی مہلک گولیاں بیگم نورل کے سر میں اتار سکتا تھا۔

مقامی لیڈروں میں قسطینا کے بعد بیگم نورل ہی وہ واحد ہستی تھی جسے لوگ دل و جان سے چاہتے تھے اور جو جاماجی کا شیرازہ بکھرنے سے بچا سکتی تھیں۔ ان کی زندگی کی بہت زیادہ اہمیت تھی۔

اب میں اکیلا نہیں رہا تھا۔ میرے درجنوں ساتھی چھت پر پہنچ چکے تھے۔ ان میں مجھے سجاول، اور کرنل احرار بھی دکھائی دیئے۔ ہیلی کاپٹر کو دو طرف سے نشانے پر لے لیا گیا تھا۔ رائفلیں اور گنز تنی ہوئی تھیں اور نگاہوں میں بجلیاں کوندرہی تھیں۔ ٹارگٹ بھی سامنے تھا اور مجبوری بھی...... اور مجبوری کوئی معمولی نہیں تھی وہ بیگم نورل تھیں، ان کا زندہ رہنا ضروری تھا۔

رائے زل نے بیگم نورل کو گن پوائنٹ پر رکھا اور اپنے فربہ اندام کزن کو ہیلی کاپٹر میں گھسنے کا اشارہ کیا۔ وہ الٹے قدموں چلتا ہوا ہیلی کاپٹر کے اندر چلا گیا۔ اب رائے زل بھی بیگم نورل کو اپنے ساتھ کھینچتا ہوا الٹے قدموں ہیلی کاپٹر کی طرف بڑھنے لگا۔

بیگم نورل نے اپنے گلے کی پوری طاقت سے پکار کر کہا۔ ''میری پروانہ کرو...... تمہیں اللہ کا واسطہ ہے میری پروانہ کرو۔ مار دو اس کو...... یہ قاتل ہے عزت مآب کا...... یہ قاتل ہے کمال کا...... اور...... اور اس نے تڑپا تڑپا کر مارا ہے میرے بے شمار بچوں کو اور بھائیوں کو اسے جانے نہ دو......''

بیگم نورل کی آواز گلے میں گھٹ گئی...... کیونکہ رائے زل نے اپنی توانا کلائی کا بے رحم دباؤ بیگم نورل کی گردن پر بڑھا دیا تھا۔ سوتیلی ہی سہی لیکن وہ اس کی ماں تھیں اور کچھ بھی نہ ہوتیں تو بھی وہ ایک بزرگ خاتون تھیں...... رائے زل بڑی وحشت سے...... اور بے حد توہین آمیز انداز میں انہیں اپنے ساتھ گھسیٹ رہا تھا میری نگاہ جیسے اس کی فربہ انگلی پر جم کر رہ گئی تھی۔ وہ اس انگلی کو سیاہ ٹریگر پر ایک جنبش بھی دیتا تو موت کے شعلے آزاد ہو جاتے۔

رائے زل جنونی انداز میں ہنسا اور دہاڑا۔ ''اکیلا نہیں مروں گا۔ میں بتا دوں اکیلا نہیں مروں گا...... حرام زادو اس کی زندگی چاہتے ہو تو میرا راستہ چھوڑنا ہوگا۔''

وہ بیگم نورل کو کھینچتا ہوا ہیلی کاپٹر کے دروازے تک لے گیا۔ یہ خاص قسم کا کم وزن اسمارٹ ہیلی کاپٹر آئرش ساخت کا تھا۔ ایسے ہیلی کاپٹر مضبوط چھتوں پر آسانی سے لینڈ اور پرواز کر سکتے ہیں۔ اب بس سیکنڈوں کا کھیل تھا۔ آقا جان اور اس کے دونوں سفید فام گارڈز بھی ہیلی کاپٹر کے قریب سمٹ آئے تھے۔ وہ جان چکے تھے کہ وہ حاوی ہو چکے ہیں، جب تک بیگم نورل گن پوائنٹ پر ہے، ہم میں سے کوئی گولی نہیں چلا سکتا۔ نہ اب...... نہ ہیلی کاپٹر کے پرواز کرنے کے بعد۔

یہ واقعی بے بسی کے لمحے تھے۔ سجاول کی حالت دیکھنے کے قابل تھی۔ کمانڈر زمان اور کرنل احرار بھی دم بخود تھے۔ جاسم نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے سر کو ہولے سے نفی میں ہلایا...... اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

بیگم نورل کے بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔ وہ اب بھی پکار رہی تھیں۔ ''یہ قاتل ہے۔ اس کو جانے نہ دو...... اسے مار دو......''

درجنوں رائفلیں ''موت'' اگلنے کے لیے تیار تھیں مگر ان کے ٹریگرز دبانے کی ہمت کسی میں نہیں تھی۔ فتح کے اَبرِ کرم کے اندر سے شکست کی بجلی لشکارے مارنے لگی تھی۔ رائے زل کے چہرے پر جنون تھا اور ایک خباثت بھری مسکراہٹ تھی۔

یکایک میں نے کچھ محسوس کیا...... منظر میں کچھ تبدیلی آ رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ بیگم نورل نے اپنے دائیں ہاتھ کو حرکت دی ہے۔ ان کی شہادت کی انگلی سیدھی تھی۔ پھر جیسے فلم کے سلوموشن میں چیزیں آہستہ آہستہ حرکت کرتی ہیں...... میں نے دیکھا کہ وہ اپنی انگلی کو اوپر کی طرف اٹھا رہی ہیں...... انگلی اور مشین پسٹل کا فاصلہ کم ہوتا چلا گیا...... وہ سلوموشن نہیں تھا...... لیکن مجھے سلوموشن ہی کی طرح نظر آ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ کوئی کچھ سمجھتا...... یا کرتا...... بیگم نورل اپنی انگشت شہادت کو ٹریگر تک پہنچا چکی تھیں۔ میں نے ان کی انگلی کو رائے

زل کی فربہ انگلی کے اوپر دیکھا...... دوسرے لفظوں میں اب ٹریگر پر دو افراد کا کنٹرول تھا۔
ایک وہ جو ڈرانا چاہتا تھا اور ایک وہ جو ڈر کے بت کو توڑنا چاہتا تھا اور کامیاب اسی نے ہونا تھا
جو ڈر کے بت کو توڑنا چاہتا تھا اور وہ کامیاب ہوا۔ خوفناک آواز سے مشین پسٹل سے گولیاں
نکلیں۔ بیگم نورل کا سر بری طرح دائیں بائیں ہلا...... خون کی ایک پچکاری سی دوسری کنپٹی
سے نکلی۔ شوہر اور بیٹے کی قربانی کے بعد بیگم نورل نے اپنی جان کا نذرانہ بھی اپنے ہاتھوں سے
پیش کر دیا تھا۔ انہوں نے ہمارے اور رائے زل جیسے خطرناک شخص کے درمیان سے وہ
رکاوٹ ہٹا دی تھی جو اس کے لیے ایک نئی زندگی کی نوید بن سکتی تھی۔

ان ناقابلِ فراموش لمحوں میں رائے زل کی شکل دیکھنے لائق تھی۔ جیسے بل میں گھسنے
والے موذی جانور کو دم سے پکڑ کر کھلے میدان میں پھینک دیا گیا ہو۔ سکتے کے چند لمحے گزر
گئے تو رائے زل نے ایک چنگھاڑ کے ساتھ اپنا پسٹل سیدھا کیا لیکن وہ ہمیں جتنا نقصان پہنچا
سکتا تھا...... پہنچا چکا تھا...... اب اس کی باری تھی۔ میرے ہاتھوں میں موجود M-16 گن کا
سنگل شاٹ سیدھا اس کی شہ رگ میں لگا۔ درجنوں رائفلوں نے پلک جھپکتے میں رائے زل
اور اس کے ساتھیوں کو بھون کر رکھ دیا۔ فقط ایک شخص اپنی جان بچانے میں کامیاب ہوا اور وہ
آقا جان تھا۔ اس عیار نے ہمیشہ کی طرح پھرتی دکھائی تھی اور پرواز کرتے ہوئے ہیلی کاپٹر
کے اندر گھسنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

مگر ابھی ہیلی کاپٹر فضا میں دس بارہ فٹ سے زیادہ بلند نہیں ہوا تھا کہ میں نے ایک
عجیب منظر دیکھا۔ ایک پرچھائیں سی اڑ کر ہیلی کاپٹر کے ادھ کھلے دروازے میں داخل ہو گئی۔
ہم میں سے کوئی ٹھیک سے دیکھ بھی نہیں پایا۔ یہی لگا جیسے یہ کوئی رکھوالی کا کتا ہے لیکن وہ کتا
نہیں تھا۔ وہ ایک اور جانور تھا......

بعض اوقات، واقعات کے تسلسل میں کچھ کردار ایسے بھی ہوتے ہیں جو وقتی طور پر
نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں، لیکن وہ موجود رہتے ہیں...... اور کبھی کبھی حیران کن طور پر
پھر سے نمودار ہوتے ہیں۔ جو پرچھائیں، آقا جان کے پیچھے ہیلی کاپٹر کے اندر گھسی تھی وہ کسی
کتے یا دوسرے پالتو جانور کی نہیں تھی...... وہ لوسی کی تھی...... ازمیر طیب کی وہی پالتو بندریا......
جو لیہ کے پارا ہاؤس میں اور پھر یہاں ڈی پیلس میں ہر جگہ گھومتی پھرتی نظر آتی تھی۔
خانساماں ازمیر طیب کی موت کے بعد اسے میں نے کئی مرتبہ اداس بیٹھے دیکھا تھا...... سُست
اور بیزار...... لیکن آج وہ اچانک نمودار ہوئی تھی اور بجلی کی طرح کوندی تھی۔

وسیع چھت پر موجود گرین فوجیوں میں سے دو کے پاس راکٹ لانچر موجود تھے۔ انہوں

نے لانچر کندھوں پر رکھے اور ہیلی کاپٹر کو ''ہٹ'' کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ میں نے پکار کر انہیں منع کیا۔ میں دیکھ رہا تھا اور کرنل احرار وغیرہ بھی دیکھ رہے تھے کہ ہیلی کاپٹر بیس پچیس فٹ سے زیادہ بلند نہیں ہو سکا۔ وہ بری طرح چکرا رہا تھا۔ اس کے اندر جیسے کوئی کھلبلی مچی تھی پھر وہ ایک دم گھوم کر مزید نیچے آ گیا۔ اس کا دروازہ ابھی تک پوری طرح بند نہیں ہوا تھا۔ آقا جان اور لوسی ایک دوسرے سے گتھم گتھا چھت پر گرے۔ ہیلی کاپٹر نے دوبارہ اوپر اٹھنے کی کوشش کی......اور کامیاب ہوا۔

راکٹ لانچر والوں نے لانچر دوبارہ اپنے کندھوں پر رکھ لیے تھے۔ ان میں سے ایک نے پکار کر کرنل احرار سے پوچھا۔ ''سر! ہم ہٹ کریں؟''

کرنل احرار نے میری طرف دیکھا۔ میں نے انکار میں سر ہلایا۔ تب تک بات کرنل کی سمجھ میں بھی آ چکی تھی۔ اس نے اپنے ماتحت سے کہا۔ ''ٹھہرو ابھی۔''

میں نے دیکھا گرین فوجیوں نے آقا جان کو چھت کے کنکریٹ پر الٹا لٹایا ہوا تھا۔ اس کے چہرے اور گنجے سر پر بے شمار خونی خراشیں تھیں۔ شرٹ بھی پھٹ چکی تھی۔

''ہتھکڑی لگاؤ۔'' کرنل احرار نے پکار کر حکم دیا۔

اسے ہتھکڑی لگائی جانے لگی۔

ہیلی کاپٹر اب کچھ فاصلے پر جا چکا تھا مگر راکٹ اب بھی اسے آسانی سے نشانہ بنا سکتے تھے......کرنل احرار نے ایک بار پھر مشورہ طلب نظروں سے میری جانب دیکھا۔ اس مرتبہ میں نے کرنل کی توقع کے مطابق اثبات میں سر ہلایا۔

لانچر والے نے بڑے تربیت یافتہ انداز میں ایک گھٹنا فرش پر ٹیک کر اور ''ویو فائنڈر'' میں دیکھتے ہوئے نشانہ لے لیا۔ اس کے ایک ساتھی نے مخصوص انداز میں الٹی گنتی گنی اور پھر فائر کر دیا۔ ہیلی کاپٹر بمشکل 100 میٹر دور گیا تھا۔ راکٹ اس کے پچھلے حصے میں لگا۔ اس کی دم جھڑ کر گری۔ سپاہیوں نے نعرہ تکبیر بلند کیا۔ ہیلی کاپٹر چرخی کی طرح گھوما اور پھر دھماکے سے بلاسٹ ہو گیا۔ اس کا کچھ ملبا ساحل کی طرف گرا۔ کرنل احرار نے تعریفی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں جانتا تھا کہ اس نے تعریفی نظروں سے کیوں دیکھا ہے (بے شک وہ ایک تجربہ کار فوجی آفیسر تھا لیکن شدید تناؤ کے ان لمحات میں میرے ذہن نے اس کے ذہن سے تھوڑا سا بہتر کام کیا تھا اگر ہم شروع میں ہی ہیلی کاپٹر کو ہٹ کر دیتے تو ہو سکتا تھا کہ اس کا ملبا کھچا کھچ بھرے ہوئے ڈی پیلس کے اندر گرتا اور جانی نقصان ہوتا......)

ہم بیگم نورل کی لاش کی طرف بڑھے۔ سجاول آ گئے تھا۔ اس نے بڑے دکھی انداز میں

بیگم کی خونچکاں لاش کو اپنی پگڑی کے وسیع کپڑے سے ڈھانپ دیا۔ پھر وہ ایک طرف جھپٹا۔ اس نے ایک رضا کار کے ہاتھ سے کٹار نما وزنی برچھا چھینا اور رائے زل کی طرف گیا۔ شاہی لباس والے فربہ اندام رائے زل پر گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی تھی مگر اس نے بلٹ پروف پہن رکھی تھی۔ اس بلٹ پروف کے باوجود اسے تین چار گولیاں تو ضرور لگی تھیں۔ وہ ابھی سانس لے رہا تھا۔ مشتعل افراد نے اسے ٹانگوں سے گھسیٹتے ہوئے بیگم نورل کی لاش سے دور لے گئے تھے۔ سجاول لپکا۔ اس نے رائے زل کے سر کے ''خون آلود بال'' مٹھی میں جکڑے اور برچھے کے ایک ہی طوفانی وار سے اس کا سر، اس کے تن سے جدا کر دیا...... بالکل جدا...... یہ بڑا ڈرامائی منظر تھا۔ پھر ایک اور ڈرامائی منظر سامنے آیا۔ چند افراد نے رائے زل کے ''سر کٹے دھڑ'' پر سے شاہی چغہ پھاڑ دیا اور اس کے تھل تھل کرتے چربی دار سینے پر کچھ تلاش کرنے لگے۔ تب انہوں نے یکبارگی فلک شگاف نعرے بلند کیے۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا ان لوگوں نے رائے زل کے بدن پر کوئی نشانی دیکھ کر اس بات کی تصدیق کی تھی کہ اس بار واقعی اصلی رائے زل نشانہ بنا ہے۔

میرے سینے میں ایک اضطراب سا تھا۔ مجھے انیق نظر نہیں آ رہا تھا...... میں نے اسے بڑی خطرناک جگہ پر دیکھا تھا...... اور پھر اسی جگہ پر ہینڈ گرینیڈ کا سماعت شکن دھماکا ہوا تھا...... اور بکتر بند گاڑی سے ٹکرانے والا انسانی گوشت کا لوتھڑا۔ کہیں انیق......؟ میں اس سے آگے کچھ سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ تو میری رگ وجاں کے قریب ہو چکا تھا۔ جیسے میرے جسم کا حصہ بن چکا تھا...... کہاں تھا وہ؟

میں نے جاسم سے کہا کہ وہ نیچے جا کر انیق کو دیکھے۔ وہ فوراً اپنے دو محافظوں کے ساتھ سیڑھیوں کی طرف لپک گیا۔ میری دھڑکنیں زیروزبر ہو رہی تھیں۔ رائے زل کا پُرغرور سر لوگوں کے پاؤں میں تھا۔ اسی دوران میں مجھے کمانڈر زمان خان دکھائی دیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''تم نے انیق کو دیکھا ہے؟''

''افسوس انیق کے بارے میں کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔'' یہ انیق کی اپنی ہی آواز تھی۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ میرے پیچھے کھڑا تھا۔ اس کے لباس پر خون کے چھینٹے تھے مگر وہ ٹھیک تھا۔ ''بہت بڑے لعنتی ہو تم۔ میری جان نکال دی۔'' میں نے کہا۔

''جان تو میری بھی تقریباً نکل ہی گئی تھی، یہ دیکھیں۔'' اس نے اپنی پشت مجھے دکھائی۔ اس کی کمر پر ایک بڑا کٹ تھا اور خون بہہ رہا تھا۔ سفید شرٹ وہاں سے پھٹی ہوئی تھی۔ شاید دستی بم کے دھماکے کے وقت شیشے کا کوئی ٹکڑا وہاں لگا تھا وہ بولا۔ ''افسوس اس بات کا ہے

جناب کہ زخم پیٹھ پر آیا ہے۔ سینے پر زخم کا اپنا ہی مزہ ہوتا ہے۔ ویسے آپ گھبرایا نہ کریں۔ میں اتنی جلدی مرنے والا نہیں۔''

''اچھا زیادہ بک بک نہ کرو۔ خون بہہ رہا ہے فوراً ڈریسنگ کرواؤ۔''

اتنے میں ایک طرف سے خورسنہ نمودار ہوئی۔ اس کا سرخ و سپید چہرہ جوش کی آماجگاہ تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس نے بھی باقاعدہ لڑائی میں حصہ لیا ہے۔ اس نے فوراً انیق کے زخم پر روئی کا پھاہا رکھا اور اسے لے کر نیچے میڈیکل سینٹر کی طرف چلی گئی۔ چھت پر لوگوں کو ہجوم بڑھتا جارہا تھا......اور اس ہجوم میں ہی کہیں رائے زل کا کٹا ہوا سر بھی گم تھا۔

○ .....❖..... ○

انقلاب کو راستہ نہیں دیا جاتا تو پھر خونی انقلاب کو راستہ ملتا ہے۔ جاماجی میں بھی اس سے ملتا جلتا کام ہی ہوا تھا۔ اگلے ڈیڑھ دو گھنٹے میں جاماجی کے عوام نے درجنوں ایسے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جو قابضین سے تعلق رکھتے تھے۔ ایجنسی کے زیادہ تر اہلکار تو موقع تاک کر پہلے ہی نیوسٹی کی طرف بھاگ گئے تھے جو ہتھے چڑھ گئے انہیں مار دیا گیا یا ہاتھ پاؤں توڑ دیئے گئے۔ کئی سو امریکی گارڈز گرفتار ہوئے۔ مختلف جگہوں پر گرفتار ہونے والے گرے فوجیوں کی تعداد ہزاروں میں تھی تمام ہیلی کاپٹرز گرین فورس کے قبضے میں آچکے تھے۔

میں اب انیکسی کی عمارت کے ایک محفوظ حصے میں آرام کرسی پر نیم دراز تھا۔ ڈاکٹر میرے پاؤں کی نئی ڈریسنگ میں مصروف تھا۔ جاسم میرے پاس آیا اور بولا۔ ''شاہ زیب صاحب! ڈی پیلس پر جاماجی کا پرچم لہرا دیا گیا ہے۔ اب پیلس کی چار دیواری میں صورت حال پوری طرح کنٹرول میں ہے

میں نے کہا۔ ''ڈاکٹر ماریہ کا کچھ پتا چلا؟''

وہ بولا۔ ''ابھی تک تو نہیں جناب، لیکن ہم تلاش کر رہے ہیں۔ خواجہ سرا خیام دانش بھی گرفتار ہو چکا ہے۔ اس کی تحویل سے درجنوں ایسی لڑکیاں ملی ہیں جنہیں ڈی پیلس میں داد عیش دینے کے لیے جمع کیا گیا تھا۔ ہم ڈاکٹر ماریہ کے بارے میں خیام سے بھی پوچھ گچھ کر رہے ہیں۔'' پھر وہ ذرا رک کر بولا۔ ''دوسری بات یہ ہے جی کہ لوگوں کا پیمانہ صبر لبریز ہو رہا ہے۔''

''کس حوالے سے؟''

''وہ ہز ہائی نس ابراہیم اور سپریم کمانڈر قسطینا کو جلد از جلد آپ کے ساتھ دیکھنا چاہتے ''

''ٹاپو کی صورتِ حال کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''وہاں کم و بیش سات سو ایجنسی گارڈز اور گرے فوجی موجود ہیں ہماری جنگی کشتیوں نے ٹاپو کو مکمل طور پر گھیر لیا ہے۔ لاؤڈ اسپیکرز کے ذریعے ان لوگوں کو ہتھیار پھینکنے کے لیے کہا جا رہا ہے۔''
''ان کا ردِ عمل کیا ہے؟''
''یہ بات تو الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے ان کو معلوم ہو چکی ہے کہ جاماجی میں انہیں شکست فاش ہو گئی ہے۔ امید ہے کہ وہ بے وقوفی نہیں کریں گے اور جلد ہی ''سرنڈر'' کر دیں گے۔ انہیں کہا گیا ہے کہ انہیں جنگی قیدیوں کا اسٹیٹس دیا جائے گا اور ان کی زندگیاں محفوظ ہوں گی۔''
''لیکن اب اس میں زیادہ تاخیر نہیں ہونی چاہیے جاسم۔''
''ایسا ہی ہو گا جناب۔'' پھر جاسم میری طرف جھکا اور رازداری کے انداز میں بولا۔ ''اس بات کا امکان ہے جی کہ...... آپ کے دونوں ساتھیوں اور محترم باذان کو تشدد کے ذریعے مارنے والا امریکی افسر لونگ بھی ٹاپو پر ہی چھپا ہوا ہے۔''
''اسے کسی صورت بچ کر نہیں نکلنا چاہیے جاسم۔'' میں نے کہا۔
اس نے بڑے ادب سے میرے زخمی ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور اثبات میں سر ہلایا۔
بیگم نسا نورل کی لاش کو بڑے احترام سے ان کی قیام گاہ تک پہنچایا جا چکا تھا سینکڑوں ہزاروں لوگ وہاں موجود تھے اور اشک بار تھے۔ ہر طرف اس قربانی کا تذکرہ تھا جو بیگم نورل نے جاماجی کے بدترین دشمن کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لیے دی تھی۔
گرفتاری کے وقت آقا جان نے زبردست واویلا مچایا تھا۔ گرین فوجیوں اور رضاکاروں نے اسے ٹانگوں سے گھسیٹتے ہوئے بکتر بند میں پھینک دیا تھا۔
بندریا لوسی جو ہمیشہ کی طرح رنگ برنگے فراک میں تھی، معمولی زخمی ہوئی تھی۔ ڈی پیلس کے وٹرنری ڈاکٹر نے اس کو ٹریٹ منٹ دی تھی......اور عارضی طور پر پنجرے میں بند کیا تھا۔ شاید ٹھیک ہی کہا جاتا ہے، اچھے اور برے لوگ جانوروں کو بھی متاثر کرتے ہیں۔ برے لوگوں کی اندرونی کثافت بے زبان جانوروں کے اندر بھی ان کے لیے ناپسندیدگی اور نفرت پیدا کرتی ہے اور یہ ناپسندیدگی یا نفرت ان کے سینوں میں محفوظ ہو جاتی ہے۔ یقیناً لوسی نے بھی آقا جان کو ڈی پیلس کے طول و عرض میں ایک تند بگولے کی طرح چکراتے دیکھا تھا۔ نچلے درجے کے ملازم اس کے خوف سے سہمے رہتے تھے۔ وہ لوگوں کو تھپڑ مارتا تھا اور گالیاں

دیتا تھا۔ وہ ڈی پیلس کے اندر اور باہر ہونے والے ہر جور وستم میں حصے دار تھا...... ازمیر طیب کی موت میں بھی...... اور لوسی ازمیر طیب کے کندھوں پر جوان ہوئی تھی۔ اس نے ازمیر کی گود میں اٹکھیلیاں کی تھیں اور ازمیر نے اپنے ہاتھوں سے اسے محبت بھرے لقمے کھلائے تھے۔ کہنے والے کہہ سکتے تھے کہ لوسی نے جو کچھ کیا وہ ایک پالتو جانور کی اضطراری حرکت تھی...... اور اس کے پیچھے کسی طرح کی وفاداری یا محبت کو تلاش کرنا درست نہیں۔ مگر جنہوں نے ہیلی کاپٹر والے مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے وہ اس رائے سے اتفاق نہیں کر سکتے تھے۔ آقا جان ہیلی کاپٹر پر چڑھنے میں کامیاب ہو جاتا تو...... بچنا تو اس نے پھر بھی نہیں تھا لیکن اب اس کی موت آسانی سے واقع ہونے والی نہیں تھی۔

جاسم نے اپنا فون میری طرف بڑھایا۔ اس پر محترم ذکری کی کال آ رہی تھی۔ وہ میری آواز پہچانتے ہی گلوگیر آواز میں بولے۔ ''تمہیں بہت بہت مبارک ہو شاہ زیب! تمہاری قیادت میں آخر جاماجی کے عوام نے فتح پائی۔''

''یہ سب کچھ آپ کی رہنمائی سے ممکن ہو پایا ہے حضرت! اگر آپ نہ ہوتے تو شاید یہ سب کچھ نہ ہوتا۔''

''ایسی بات نہیں ہے۔ میرا یقین ہے کہ خلق خدا جس پر بھروسا کرتی ہے اس کے اندر کچھ نہ کچھ غیر معمولی ضرور ہوتا ہے۔ آج بہت دنوں بعد میں شہر کی جامع مسجد میں اذان کی صدا سن رہا ہوں۔ یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''آپ کو...... بیگم نورل کی شہادت کا علم تو ہو گیا ہو گا؟''

''اس نے عظیم قربانی دی ہے۔ اس کا کردار جاماجی کی تاریخ میں سنہری حرفوں میں لکھا جائے گا...... میں سمجھتا ہوں کہ اگر رائے زل اور آقا جان وغیرہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتے تو ایک بار پھر سنگین واقعات کا سلسلہ شروع ہو جانا تھا۔''

''لیکن حضرت! ہاناوانی کا ابھی تک کوئی سراغ نہیں مل سکا۔''

''اس کی کمر ٹوٹ چکی ہے شاہ زیب! اللہ نے چاہا تو وہ بھی جلد انجام کو پہنچے گی۔''

میں نے کہا۔ ''حضرت! ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے اطلاع ملی ہے کہ چھاؤنیوں میں بند کیے جانے والے تمام گرین فوجی باہر نکل آئے ہیں۔ انہوں نے پیش قدمی کرتے ہوئے وہ سارا سرحدی علاقہ خالی کرا لیا ہے جو رائے زل نے پچھلے کچھ عرصے میں قبضے میں لیا تھا۔ اب ہمارے بہت سے دستے نیوسٹی کے اندر ہیں اور پیش قدمی کرنا چاہتے ہیں۔''

محترم ذکری بولے۔ ''ہاں یہ بات مجھے ابھی جاسم سے معلوم ہوئی ہے لیکن میری

رائے ہے کہ ابھی نیوسٹی پر یلغار نہ کی جائے۔ ہاں ان کے کچھ سرحدی علاقے پر کنٹرول ضرور حاصل کرلیا جائے تاکہ ہمارا بارڈر محفوظ رہے۔''

''مجھے یہاں کی سیاست کا کچھ زیادہ علم نہیں ہے حضرت! آپ بڑے ہیں جس طرح مناسب سمجھیں فیصلہ کریں۔''

''میں سمجھتا ہوں شاہ زیب کہ اب قسطینا کا جلد سامنے آنا بھی ضروری ہے۔ اس نے اس جدوجہد میں بہت قربانیاں دی ہیں۔ وہ ان معاملوں کی بہت سوجھ بوجھ بھی رکھتی ہے۔ اس کو جلد از جلد ہمارے درمیان موجود ہونا چاہیے۔''

''آپ بے فکر رہیں جناب، اب یہ دنوں کی نہیں، گھنٹوں کی بات ہے، ٹاپو کا محاصرہ ہو چکا ہے۔''

''مجھے پوری امید ہے، تمہاری قیادت میں جیسے اب تک بہت اچھا ہوا ہے۔ آگے بھی ہوگا۔'' وہ عجیب لہجے میں بولے پھر انہوں نے کہا۔ ''لو تاجور سے بات کرو۔''

چند سیکنڈ بعد تاجور کی آواز ابھری۔ ''ہیلو شاہ زیب! آپ کیسے ہیں؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں تاجور۔'' میں نے کہا۔

وہ ذرا رک کر بولی۔ ''یہاں مکان کے باہر ہزاروں لوگ جمع ہیں۔ ان میں عورتیں اور بچے بھی ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں آپ کی تصویر ہے اور جاماجی کے جھنڈے ہیں۔ وہ خوشی سے ناچ رہے ہیں، نعرے لگا رہے ہیں۔''

''تمہاری دعا سے ہم فتح یاب ہوئے ہیں۔ رائے زل مارا گیا ہے۔ آقا جان گرفتار ہے۔ جلد ہی ابراہیم اور قسطینا وغیرہ بھی ہمارے درمیان ہوں گے۔''

''آپ...... واپس آجائیں...... میں اب بھی بہت فکرمند ہوں...... آپ......'' اس کی آواز بھرائی۔ وہ مزید کچھ نہ بول سکی۔

''ہیلو تاجور!'' میں نے دو تین بار کہا۔ مگر دوسری طرف خاموشی رہی۔ شاید وہ رو رہی تھی۔

''اوکے، تم حوصلہ رکھو...... میں جلد لوٹ رہا ہوں۔'' میں نے کہا اور خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔

میرا دھیان بار بار شکیل داراب کی طرف بھی جا رہا تھا۔ یہی شخص تاجور کو پاکستان سے یہاں لانے کا ذمے دار تھا۔ اس نے یہ سب کچھ آقا جان کی خاطر کیا تھا۔ اب آقا جان کی ناک میں نکیل پڑی تھی تو وہ کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ آثار بتا رہے تھے کہ وہ جاماجی میں

ہی نہیں ہے۔

میرا بخار پھر شدت اختیار کر رہا تھا۔ پسلیوں اور پنڈلیوں کے متاثرہ حصے جل رہے تھے۔

○......❖......○

اور یہ منظر تھا، سمندر کے درمیان اس ٹاپو کا۔ یہ مختصر سا خشکی کا ٹکڑا چاروں جانب سے جنگی کشتیوں اور آرمڈ لانچوں میں گھرا ہوا تھا۔ میں بھی ایک آرام دہ لانچ میں کرنل احرار کے ساتھ یہاں پہنچا تھا۔ سجاول بھی میرے ساتھ ہی آیا تھا۔ خورسنہ ایک دوسری لانچ میں تھی۔ انیق کو میں نے ڈاکٹر ماریہ کو کھوجن کی ذمے داری سونپی تھی اور وہ جاسم کے ساتھ جاماجی میں ہی تھا۔ ٹاپو کو دیکھ کر دل سے ایک آہ نکلی۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں میں نے کیپٹن تبارک اور کبڈی شاہ سیف کو کھویا تھا۔ ہاں...... پام کے انہی پیڑوں تلے ہمیں...... محاورتاً نہیں حقیقتاً...... زندگی اور موت کے درمیان لٹکا دیا گیا تھا اور یہی وہ جگہ تھی جہاں قسطینا اور میرے دیگر ساتھی، اب تک کسی غیبی مدد کے منتظر تھے...... آج یہ مدد پہنچ چکی تھی۔ لیکن کیا وہ اب تک محفوظ و مامون تھے۔ مجھے سب سے زیادہ فکر ابراہیم کی تھی۔ وہ اپنی ''زہریلی مجبوری'' سے لڑ رہا تھا اور اس معاملے کو شاید آر یا پار کرنا چاہتا تھا۔ اس نے زینب کو مکمل طور پر کھو کر پایا تھا۔ کیا اب پھر کھونے اور پانے کا مرحلہ درپیش تھا۔

لاؤڈ اسپیکرز پر بار بار مختلف اعلان ہو رہے تھے۔ ٹاپو پر کہیں حرکت نظر نہیں آ رہی تھی مگر یقینی بات تھی کہ یہاں سات سو سے زائد خطرناک مسلح افراد موجود ہیں۔ وہ مختلف مورچوں اور راوٹوں میں چھپے ہوئے تھے۔

میں نے کرنل احرار سے پوچھا۔ ''کرنل! آپ کا کیا خیال ہے، یہ لوگ ہتھیار ڈال دیں گے؟''

''اگر ان کی کمان کرنے والے بہت بڑے بے وقوف نہ ہوئے، تو ایسا ہی کریں گے ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔''

''لونگ کے بارے میں کیا خیال ہے؟ کیا وہ آخر وقت تک لڑنا نہیں چاہے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کی کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔ وہ جاماجی سے بھاگ کر یہاں کیوں آیا ہے؟ اور واقعی آیا بھی ہے یا نہیں؟''

''یہ بات تو یقیناً سوچنے کی ہے۔ اگر وہ جاماجی میں خود کو محفوظ نہیں رکھ سکتا تھا تو پھر اس

چھوٹے سے ٹاپو پر کیسے بچے گا۔''

ہماری گفتگو ابھی جاری ہی تھی کہ ہماری توقع کے مطابق نتائج سامنے آنا شروع ہو گئے۔ گرین فورس کے آفیسرز اور گرے فورس کے آفیسرز کے درمیان ایک طرح کی چھوٹی سی فلیگ میٹنگ ہوئی۔ اس میں ایجنسی کے دو افسر بھی شامل تھے۔ ٹاپو پر موجود افراد نے ہتھیار ڈال کر خود کو ہمارے حوالے کر دیا۔

وہ دو تین طویل قطاروں میں سامنے آئے اور اپنے اپنے ہتھیار ''اَن لوڈ'' کر کے اپنے سامنے زمین پر رکھ دیئے۔ ہتھیار پھینکنے والوں میں دو سو کے لگ بھگ امریکی ایجنسی کے گارڈز بھی تھے۔ ان لوگوں کے لیے چھ کے قریب بڑی کشتیاں کنارے پر لگائی جا چکی تھیں۔ جن قیدیوں کو خطرناک سمجھا جا رہا تھا ان کے ہاتھ پشت پر کیبل ٹائی کے ذریعے باندھ دیئے گئے۔ وہ قطاروں کی شکل میں کشتیوں پر سوار ہونے لگے۔

میں نے کرنل احرار کے ایک ماتحت کیپٹن سے پوچھا۔ ''لونگ کے بارے میں کیا خبر ہے؟''

وہ بولا۔' ابھی تک اس کا کوئی کھوج نہیں ملا۔ لیکن یہ کہا جا رہا ہے کہ وہ دو تین گھنٹے پہلے تک یہیں ٹاپو پر موجود تھا۔''

''تو کیا یہاں سے نکل گیا؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔'' کرنل احرار بولا۔ ''اتنے سخت گھیرے میں تو چڑیا بھی یہاں سے اڑے گی تو دیکھی جائے گی۔''

کیپٹن بولا۔ ''سر! ٹاپو کی دوسری طرف ایک R22 ہیلی کاپٹر کھڑا ہے۔ ہم نے اسے چیک کیا ہے۔ وہ اڑنے کے قابل نہیں ہے۔ غالباً اس کے اگنیشن میں کوئی خرابی ہے ہو سکتا ہے کہ ٹاپو کا محاصرہ ہونے سے پہلے مسٹر لونگ نے اس ہیلی کاپٹر کے ذریعے فرار ہونے کی کوشش کی ہو، اور ناکام ہو کر یہیں ٹاپو میں ہی کہیں روپوش ہو گیا ہو۔''

یہ بات دل کو لگ رہی تھی۔ لونگ کا اس ٹاپو پر آنا بے وجہ نہیں ہو سکتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ اس کی نظر اسی R22 ہیلی کاپٹر پر ہو اور وہ اس پر سوار ہو کر یہاں سے نکلنا چاہتا ہو۔

میں نے کیپٹن سے کہا کہ ایسے دو تین قیدیوں کو یہاں لایا جائے جنہوں نے لونگ کو یہاں ٹاپو پر دیکھا ہے۔

''یس سر!'' کیپٹن نے کہا اور مجھے اور کرنل کو مشترکہ سلیوٹ کرتا ہوا اپنی ایڑیوں پر گھوم گیا۔

مگر کیپٹن کے جانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ ایک ایسا واقعہ ہوا جس کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ لانچ کا ایک شیشہ ٹوٹا اور کوئی کود کر اندر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی نال کی واٹر پروف APS رائفل مجھے پہلی نظر میں دکھائی دے گئی۔ سمندری پانی میں بھیگا ہوا یہ گیم شیم شخص لونگ کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا اس نے ایک چنگھاڑ کے ساتھ فائر کھولا۔ میرے عقب میں کھڑے، گرین فورس کے دو جوانوں کو گولیاں لگیں اور وہ لانچ کے فرش کی طرف جھکتے دکھائی دیئے۔

یہی وقت تھا جب میری نگاہ لونگ کے انگارہ چہرے پر پڑی۔ اپنی طویل قامتی کے سبب وہ لانچ کی چھت کو چُھو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شعلے رقصاں تھے۔ اس نے گن کا رخ میری طرف کیا۔ مجھے اپنا آخری وقت اپنی آنکھوں کے سامنے دکھائی دیا۔ یہی وقت تھا، جب اپنی ایڑیوں پر گھوم جانے والے اسمارٹ کیپٹن نے لونگ پر چھلانگ لگائی۔ ابھی وہ لونگ کو چھو نہیں پایا تھا کہ لونگ کی چلائی ہوئی نصف درجن گولیاں اس کے جسم میں پیوست ہو گئیں۔ اس کے باوجود وہ لونگ کے اوپر گرا۔ لونگ لڑکھڑا کر چند قدم پیچھے گیا...... میرے پہلو میں کھڑے سجاول سیالکوٹی کے لیے یہ ایک دو سیکنڈ کا وقت کافی تھا۔

اس کے منہ سے بے ساختہ ایک ٹھیٹ پنجابی گالی نکلی تھی۔ اس نے خود کو نیچے تو اسی وقت جھکا لیا تھا جب پہلی گولی چلی تھی۔ اسی جھکی جھکی حالت میں وہ تیر کی طرح لونگ کی طرف گیا۔ اس نے لونگ کی گن کے بیرل کو اوپر اٹھایا اور لونگ کو اپنے ساتھ لیتا ہوا لانچ کے کچن ڈور سے ٹکرایا اور اسے توڑتا ہوا اندر جا گرا۔ تب تک میں بھی تکیے کے نیچے سے مشین پسٹل نکال چکا تھا مگر اب اسے استعمال نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ لونگ اور سجاول بری طرح گتھم گتھا تھے۔

ایک طرف پرائیویٹ امریکی ایجنسی کا نہایت تربیت یافتہ آفیسر تھا، جو وحشت میں ایک ''اعلیٰ مقام'' رکھتا تھا دوسری طرف ایک ڈکیت تھا، جس میں کچھ زبردست خوبیاں بھی تھیں اور جو پرانے وقتوں سے وراثت میں ملنے والا ایک ''قاتل ہنر'' رکھتا تھا۔ اگلے چالیس پچاس سیکنڈ ایک خوفناک کشمکش کے تھے۔ اس مختصر دورانیے میں لگژری لانچ کے کئی حصے کباڑ کی شکل اختیار کر گئے۔ لونگ کی واٹر پروف APS سے کم از کم چھ گولیاں مزید چلیں مگر یہ سب کی سب لانچ کی چھت میں ہی پیوست ہوئیں۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ گن پر سجاول کی آہنی گرفت موجود تھی۔ شاید یہ گرفت کا مقابلہ بھی تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے گن کا قبضہ حاصل کرنا چاہتے تھے اور سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے...... اب کوئی ایک درجن گرین

فوجی لانچ میں داخل ہو چکے تھے۔ انہوں نے لونگ کو نشانے پر لے لیا تھا مگر گولی وہ بھی نہیں چلا سکتے تھے۔

یکا یک اس زور آزمائی کا فیصلہ ہو گیا۔ لونگ نے ایک چنگھاڑ کے ساتھ گن کو پورے زور سے گھمایا اور اس کا بیرل سجاول کی پکڑ سے چھڑانے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ گن سجاول کی طرف سیدھی کرنا چاہ رہا تھا مگر سجاول کے جسم میں بھی بجلیاں کوندرہی تھیں۔ اس نے پنجوں پر اچھل کر ایک طوفانی ٹکر طویل قامت لونگ کے سینے پر رسید کی وہ گن سمیت کئی فٹ دور جا گرا۔

''ہالٹ...... ہالٹ۔'' کئی آوازیں گونجیں۔ کم و بیش ایک درجن آٹومیٹک رائفلیں لونگ کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ غالباً سیکنڈ کے دسویں حصے میں لونگ نے اپنا ذہن تبدیل کیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی گن کے 26 راؤنڈ والے میگزین میں ایک آدھ گولی ہی باقی ہو گی...... اور وہ ٹارچر تکنیک کا سپر اسٹار تھا۔ اسے پتا تھا کہ اس کی درندگی اسی کی طرف لوٹ کر آنے والی ہے۔ اس نے سجاول کو نشانہ بنانے کے بجائے گن کی نال اپنی کنپٹی پر رکھی اور ٹریگر دبا دیا۔

اور اس روز مجھے پتا چلا کہ خوشی غمی، تکلیف آرام، اچھی موت بری موت یہ سب کچھ قدرت کس طرح اپنے قبضے میں رکھتی ہے۔ لونگ نے آسان موت چاہی تھی مگر یہ اسے نہیں ملی، گن میں سے ٹھک کی آواز آ کر رہ گئی۔ اس کا میگزین خالی ہو چکا تھا۔ لونگ کی آنکھوں میں حیرت کی یلغار نظر آئی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے گن کو لٹھ کی طرح پکڑ لیا تھا۔ جونہی سجاول اس کے نزدیک گیا۔ اس نے گن کے وزنی دستے سے سجاول کے سر کو نشانہ بنانا چاہا، سجاول نے یہ مہلک وار نیچے جھک کر بچایا اور اس مرتبہ لونگ کے پیٹ پر لات رسید کی۔ وہ جیسے اڑتا ہوا ایک کھڑکی سے ٹکرایا اور اسے توڑ کر قلابازی کھاتا ہوا باہر پانی میں جا گرا۔

یہ سب کچھ اتنا آناً فاناً ہوا کہ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ ''اسے زندہ پکڑنا ہے۔'' میں نے پکار کر کہا۔

کرنل احرار اور مسلح فوجی لانچ کے مختصر ٹیرس پر پہنچے۔ میں بھی اپنے زخمی پاؤں پر بمشکل وزن ڈالتا ہوا، ٹوٹی ہوئی کھڑکی تک گیا۔ لونگ پانی میں تھا۔ اور اس نے لانچ کے ساتھ جھولتی ہوئی دو زنجیروں کو تھام رکھا تھا۔ ہمیں بس اس کا بالائی دھڑ ہی نظر آ رہا تھا۔ ''کوئی گولی نہیں چلائے گا۔'' کرنل احرار نے حکم دیا۔

''اسے باہر نکالو۔'' میں نے کہا۔

لونگ کے پھٹے ہوئے ہونٹوں سے خون کے قطرے گر رہے تھے اور سمندر کے پانی میں اوجھل ہو رہے تھے۔ خالی ہو جانے والی گن اس کے ہاتھ سے نکل چکی تھی۔

یکایک مجھے لونگ کے خونچکاں تھوبڑے پر اذیت کے آثار نظر آئے۔ اس کے ساتھ ہی یوں لگا کہ کوئی اسے نیچے کی طرف کھینچ رہا ہے۔ اس کے جسم کو ایک دھچکا سا لگا۔

''او گاڈ!'' کرنل احرار کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔ ''یہ ایلی گیٹر ہے۔ اس نے...... پکڑ لیا ہے۔''

کوئی اور ہوتا تو چلانے لگتا لیکن لونگ ایک سنگلاخ شخص تھا۔ اس کا چہرہ ضرور کرب کی آماجگاہ بن گیا، مگر اس نے کوئی صدا بلند نہیں کی۔ بلکہ یوں لگ رہا تھا کہ وہ خود کو مگرمچھ کے جبڑوں سے چھڑانے کی کوشش کر رہا ہے۔ بے شک وہ ''ملائیشین سمندر'' کا ایک خاکستری مگرمچھ ہی تھا۔ چند لمحوں کے لیے اس کے جسم کی مختصر جھلک بھی پانی میں دکھائی دے جاتی تھی۔

کرنل احرار کے ہاتھوں میں اب ایک ''بڑے کیلیبر'' کی رائفل نظر آ رہی تھی۔ اس نے میری جانب دیکھ کر لرزاں لہجے میں پوچھا۔ ''اس کو شوٹ کیا جائے؟'' اس کے سوال کا مطلب یہی تھا کہ کیا مگرمچھ کو نشانہ بنایا جائے؟

پتا نہیں کیوں اس وقت میرے اندر ایک عجیب سی بے حسی اور سنگدلی نمودار ہو گئی اور یہ کیفیت بے وجہ نہیں تھی۔ میں نے کیپٹن تبارک اور سیف کو لونگ کے تشدد سے تڑپ تڑپ کر جان دیتے دیکھا تھا۔ میں نے جاما جی کے عقوبت خانے میں قیدیوں کی لرزہ خیز آہ و بکا سنی تھی اور خود بھی ٹمپریچر سیل کی ناقابلِ بیان اذیت جھیلی تھی۔ میں نے کہا۔ ''نہیں کرنل! ابھی ہم دیکھتے ہیں کہ یہ اس جانور سے جیت پاتا ہے یا نہیں۔''

سجاول کے ہاتھ میں بھی اب ایک طاقتور شاٹ گن نظر آ رہی تھی مگر میرا مطمع نظر سمجھتے ہوئے اس نے بھی گن جھکا لی۔ سب دم بخود تھے۔ لونگ نے اپنے ہاتھوں کو گھما کر لانچ کی زنجیروں کو اپنی کلائیوں کے گرد بل دے لیے تھے اور پوری کوشش کر رہا تھا کہ مگرمچھ اسے پانی میں نہ کھینچ پائے۔ اس کی طویل ٹانگیں اور شاید اس کی ناف کا کچھ حصہ بھی مگرمچھ کے جبڑوں میں تھا۔ اس ... ارد گرد کے پانی میں سرخی کی آمیزش تھی۔

میں نے نہایت نفرت سے درندہ صفت لونگ کی طرف دیکھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا واپس لانچ کے اندرونی حصے میں چلا گیا۔ کیپٹن اور دیگر دو فوجیوں کی لاشیں وہاں سے اٹھائی جا چکی تھیں مگر ان کے جوان خون کے بڑے بڑے دھبے ابھی تک فرش پر موجود تھے۔ ایک

زخمی فوجی کی ٹانگ میں گولی لگی تھی اور اسے لانچ میں ہی فرسٹ ایڈ دی جا رہی تھی۔

''شکریہ سجاول۔'' میں نے کہا۔

''زیادہ جنٹلمین نہ بنو۔ یاری دوستی میں کوئی شکریہ نہیں ہوتا۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ اور شاٹ گن کو بے قراری سے اپنے ہاتھوں میں گھمانے لگا۔

اس کا اضطراب بتا رہا تھا کہ وہ لونگ کو جلد از جلد لاش کی صورت میں دیکھنا چاہتا ہے اور بے شمار اور لوگ بھی تھے جو اس کو لاش کی صورت دیکھنا چاہتے تھے۔ اردگرد کی جنگی کشتیوں پر اور ساحل پر بہت سے فوجی اور رضا کار جمع ہو چکے تھے۔ ہر نگاہ یقیناً پانی کی طرف ہی لگی ہوئی تھی۔

ہماری لانچ کو وقفے وقفے سے ہچکولے لگتے تھے۔ ان ہچکولوں کی وجہ عیاں تھی۔ یہ موذی آبی جانور اور موذی بری درندے کی خونی کشمکش کے ہچکولے تھے۔

چوکس گرین فوجی لانچ کا مکمل معائنہ کر رہے تھے انہیں اندیشہ تھا کہ کہیں لونگ کا کوئی ساتھی بھی موجود نہ ہو۔ لانچ کے فرش کو خون کے داغوں سے صاف کیا جا رہا تھا۔ شواہد بتا رہے تھے کہ کچھ دیر پہلے تک لونگ ٹاپو پر ہی تھا۔ وہ پانی میں غوطہ لگا کر لانچ تک پہنچا تھا وہ مجھے یرغمال بنانے یا پھر مارنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

کچھ دیر بعد کرنل احرار اندر آیا۔ ''ختم ہوا یا نہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔'' کرنل نے کہا۔ ''یہ غالباً زیادہ بڑا مگر مچھ نہیں ہے۔ یہ اسے داب کر بیٹھا ہوا ہے۔ چھوڑ نہیں رہا اور نہ ہی ابھی اسے نگلنے میں کامیاب ہو رہا ہے۔''

ایک تجربہ کار کوسٹل گارڈ نے کہا۔ ''کبھی کبھی مگر مچھ اس طرح کرتے ہیں سر! یہ شکار کو دبوچ لیتے ہیں اور بہت دیر تک اسی طرح پکڑے رکھتے ہیں۔ شاید انہیں خطرہ ہوتا ہے کہ وہ جبڑے کھولیں گے تو شکار نکل جائے گا۔''

ایک بار پھر لانچ بری طرح ہلنے لگی۔ اب لونگ کے کراہنے اور چلانے کی آوازیں بھی ہم تک پہنچنے لگی تھیں۔ اس کی برداشت جواب دیتی جا رہی تھی۔ اسے موذی جانور کے جبڑوں میں پھنسے اب پندرہ بیس منٹ سے زائد ہو چکے تھے۔ اذیت رساں...... اذیت کے ناقابلِ شکست شکنجے میں تھا۔ یہ بات تو طے تھی کہ لونگ سے کئی گنا طاقتور جانور اسے چھوڑے گا نہیں۔

''کیا اسے شوٹ کر دیا جائے؟'' کرنل احرار نے پوچھا۔

''کس کو؟'' میں نے دریافت کیا۔

''مگر مچھ کو یا لونگ کو...... جس کو آپ کہیں......''

میری آنکھوں میں نمی سی تیر گئی۔ میں اس سوال کا جواب سوچ ہی رہا تھا جب لانچ نے ایک بڑا ہچکولا کھایا۔ ملی جلی آوازیں بلند ہوئیں۔ ہوائی فائرنگ بھی سنائی دی۔ ہم نے ٹیرس پر جا کر دیکھا منظر عبرت ناک تھا۔ لونگ نے زنجیریں اب بھی نہیں چھوڑیں تھیں۔ مگر سینے سے نیچے اس کا دھڑ موجود نہیں تھا۔ اس کے پیٹ کے کچھ اندرونی اعضا پانی پر جھلک دکھا رہے تھے اور پانی سرخ تھا۔ وہ اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔

○......❖......○

اور یہ منظر تھا زیر زمین پناہ گاہ کا۔ آج کئی ہفتوں کے بعد میں ایک بار پھر اس تاریک دریا کا شور سن رہا تھا جو نہ جانے کہاں سے نکلتا تھا اور کن اتھاہ غاروں میں سما جاتا تھا یہ وہی قدرتی پناہ گاہ تھی جس کی تلاش میں سات سو سے زائد فوجی، کھوجی اور سراغ رساں کتے چپے چپے کی خاک چھانتے رہے تھے مگر اس پتھر تک نہیں پہنچ سکے تھے جسے سرکانے سے ان کے لیے ان کا سم سم کھل سکتا تھا۔ طویل سنگی سیڑھیاں اترنا میرے لیے خاصا دشوار تھا لیکن خوشی اور جوش کا یہ عالم تھا کہ میں ایک گرین لیفٹیننٹ کے سہارے سے اتر رہا تھا۔ ابھی ہم نصف سیڑھیاں ہی طے کر پائے تھے کہ ٹارچوں اور سرچ لائٹس کی روشنی میں مجھے دراز قد قسطینا کی جھلک نظر آئی۔ وہ حسبِ معمول پینٹ شرٹ میں تھی۔ کمر سے ہولسٹر جھول رہا تھا۔ اس کے عقب میں کمانڈر فارس جان تھا۔ قسطینا بھاگتی ہوئی آئی اور ''شاہ زائب'' کہہ کر میرے گلے لگ گئی۔

اپنے جذبات کے اظہار میں وہ کوئی جھجک نہیں رکھتی تھی اور نہ کسی کی پروا کرتی تھی۔ میں نے دوسرا ہاتھ کمانڈر فارس جان کی طرف بڑھایا۔ وہ بھی میرے گلے لگ گیا۔ گلوگیر آواز میں بولا۔ ''شاہ زیب صیب! آپ نے وہ کر دکھایا جس کا سپنا یہاں کا لوگ مدتوں سے دیکھ رہا تھا۔ ابھی تک ذہنوں کو یقین نہیں ہو رہا کہ یہ سب کچھ ہو چکا ہے۔''

قسطینا نے مجھ سے الگ ہو کر فوجی انداز میں مجھ سے مصافحہ کیا اور اشک بار لہجے میں بولی۔ ''ایسٹرن! آخر تم کامیاب ہو گئے۔''

''میں نہیں، ہم سب کامیاب ہوئے۔''

''تم بہت زخمی ہو۔ بہت زیادہ زخمی ہو۔ ہمیں یہاں تقریباً ساری خبریں ملتی رہی ہیں۔ پھوپھو نورل کی موت نے ہمیں بہت دکھ دیا ہے، مگر ان کی قربانی رائیگاں نہیں گئی۔ اس اسٹیٹ کے دو سب سے بڑے دشمن اسی بے مثل قربانی کی وجہ سے اپنے انجام کو پہنچے ہیں۔''

''بے شک آپ درست کہہ رہی ہیں۔'' میں نے کہا۔

اس کے چہرے پر سایہ سا لہرایا اور وہ ایک دم چپ سی ہوگئی۔ بولی۔ ''شاہ زائب! ابھی کئی کرنے والے کام باقی ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ تم بہت وقت پر پہنچے ہو بلکہ...... میں تو یہ کہوں گی کہ...... یہ سب کچھ ڈرامائی حد تک بروقت ہوا ہے۔''

میں نے سوالیہ نظروں سے کمانڈر فارس کی طرف دیکھا وہ بولا۔ ''ہاں برادر شاہ زیب! یہ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ اگر آج آپ لوگ یہاں نہ پہنچتا تو شاید...... ام مزید صبر نہ کرسکتا۔ ام سے یہ سب کچھ برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ شاید ام لوگ سارے خوپ (خوف) ایک طرپ رکھ کر باہر ہی نکل آتا۔''

''تم کیا کہنا چاہ رہے ہو فارس؟''

قسطینا نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''شاہ زائب......! ابراہیم کی حالت...... ٹھیک نہیں...... وہ بہت بری حالت میں ہے...... امید تو زیادہ نہیں لیکن شاید اگر وہ اسپتال پہنچ جائے تو......'' اس کی آواز بھرا گئی اور وہ فقرہ مکمل نہ کرسکی۔

میں جانتا تھا کہ وہ بہت باہمت لڑکی ہے اگر وہ اس طرح ناامید تھی تو یقیناً صورتِ حال سنگین تھی، میرے جسم میں ایک سرد لہر سی دوڑ گئی۔ یوں لگا جیسے دل و دماغ میں کئی دنوں سے پلنے والے اندیشے درست ثابت ہو رہے ہیں۔

''کیا ہوا اسے؟ کہاں ہے وہ؟'' میں نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

قسطینا نے پلکیں جھپک کر اپنے آنسو سنبھالنے کی کوشش کی اور رہائشی حصے کی طرف اشارہ کیا۔ ہم ابھی تک سیڑھیوں پر کھڑے تھے۔ تاریک دریا کا مدھم شور سنائی دے رہا تھا۔ میں نے دیکھا، دیواروں پر لمبے لمبے سائے تھے۔ بن مشہد اور سنبل وغیرہ بھی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ہماری طرف آرہے تھے۔ بن مشہد کافی کمزور دکھائی دیتا تھا۔ وہ طویل بخار میں مبتلا رہا تھا۔ سنبل ویسی کی ویسی تھی۔ بن مشہد نے بھی مجھ سے معانقہ کیا۔ میں نے سنبل کا کندھا تھپتھپایا۔

ہم سیڑھیاں اتر کر پتھروں کے اس قدرتی چیمبر میں پہنچے جہاں ابراہیم موجود تھا۔

میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ چیمبر میں پہنچنے سے پہلے ہی مجھے زینب کے رونے کی مدھم آواز آئی اور دل سینے میں سو ٹکڑے ہوگیا۔ سجاول کا سہارا لیتے ہوئے میں چیمبر میں داخل ہوا۔ نگاہیں جیسے ایک جگہ جم کر رہ گئیں۔ میں سرتاپا پتھرا گیا تھا۔ ٹیوب لائٹ کی روشنی میں میرے سامنے بستر پر ایک خالی کمبل پڑا تھا مگر کمبل خالی نہیں تھا، اس کے نیچے ابراہیم موجود تھا۔ ہڈیوں کا ایک ڈھانچا جو دکھائی تک نہیں دے رہا تھا۔ اس کی صورت؟ خدا کی

پناہ...... یہی لگتا تھا کہ کسی انسانی کھوپڑی پر سیاہی مائل ریگ زین منڈھا ہوا ہو اور اس ریگ زین پر سرخ دھبے ہوں۔ ابراہیم کی بے نور آنکھیں اندر دھنسی ہوئی تھیں اور دانت دکھائی دیتے تھے۔ اگر مجھے بتایا نہ جاتا تو میں کبھی نہ پہچان سکتا کہ یہ ابراہیم ہے۔ اس کی سانس کا زیر و بم بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔

زینب نے پلٹ کر میری طرف دیکھا پھر اٹھی اور دلدوز انداز میں ''بھائی'' کہہ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ گھونگھٹ کی اوٹ سے وہ نوحہ کناں انداز میں پکاری۔ ''بھائی! انہوں نے خود کو ختم کر لیا۔ انہوں نے کسی کی نہیں مانی...... کسی کی نہیں۔''

بن مشہد نے جلدی سے آگے بڑھ کر ہڈیوں کے ڈھانچے کی نبض ٹٹولی۔ اس کے سینے پر کان رکھ کر دھڑکن سننے کی کوشش کی۔ پھر دکھی لہجے میں بولا۔ ''وائٹل سائنز ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ اب تو شاید ہی ڈاکٹرز بھی کچھ کر سکیں۔''

میں نے دل کڑا کر کے ابراہیم کے ناقابلِ شناخت چہرے کو چھوا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ وہ ابھی زندہ ہے۔ میں نے اس کی پیشانی چومی۔ اس دوران میں قسطینا اسٹریچر منگوا چکی تھی اور چاق و چوبند فوجیوں کو اسٹینڈ بائی کر دیا تھا۔

میں نے سرنگ سے باہر کرنل احرار کو ہدایت کی کہ وہ ایک ہیلی کاپٹر فوراً منگوائے ایک مریض کی حالت بہت نازک ہے اور اسے فوراً جاماجی کے اسپتال پہنچانا ہے۔

ابراہیم کو اسٹریچر پر لٹا کر باہر لے جانے کی تیاری ہونے لگی۔ میں نے زینب کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس سے تسلی تشفی کی باتیں کیں۔ اسے ابھی تک اپنی ساس بیگم نورل کی موت کے بارے میں پتا نہیں تھا ورنہ اس کے دکھ میں اضافہ ہوتا۔

اسی دوران میں میری نگاہ اس زیرزمین تاریک دریا کی طرف اٹھ گئی۔ گیس لیمپس اور بجلی کی قمقموں میں اس کا ایک کنارہ نیم روشن دکھائی دیتا تھا۔ وسیع و عریض زیرزمین خلا کی چھت سے عجیب وضع کے حشرات لڑیوں کی صورت میں جھولتے تھے اور ان کے اندر سے قدرتی روشنی پھوٹتی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ کس طرح میں اس پانی کے کنارے، فارس جان کو خاموش بیٹھے دیکھا کرتا تھا۔ پھر میں اس کی ذاتی ڈائری تک پہنچا تھا جو ایک ناقابلِ فہم زبان میں لکھی گئی تھی۔ زبان شناس انیق نے اس ڈائری کو پڑھا تھا اور ہم پر فارس جان کے اس خاموش عشق کا انکشاف ہوا تھا جو وہ اپنی کمانڈر قسطینا سے رکھتا تھا۔ سارے واقعات ذہن میں تازہ ہو گئے۔ میں فارس اور قسطینا سے کئی باتیں پوچھنا چاہ رہا تھا مگر ابراہیم کی حالت نے کسی اور ''گفتگو'' کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی تھی۔

○......❖......○

قسطینا کی واپسی نے جاماجی میں جوش وخروش کی ایک نئی لہر دوڑا دی تھی جاماجی کے بیشتر باشندے تو پہلے ہی سڑکوں پر تھے اب ان کی تعداد میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ ہزاروں کی تعداد میں ڈی پیلس کے اندر اور باہر جمع تھے اور خواہش رکھتے تھے کہ ان کی سپریم کمانڈر ان سے خطاب کرے۔ وہ جانتے نہیں تھے کہ قسطینا اس وقت ڈی پیلس میں نہیں ملٹری اسپتال میں ہے۔ اس کی اور ہم سب کی تشویش عروج پر تھی۔ ہم چاہتے تھے کہ کسی بھی طرح ابراہیم زندگی کی طرف لوٹ سکے۔ میں جانتا تھا، ایک کزن کی حیثیت سے قسطینا...... ابراہیم سے بہت پیار کرتی ہے۔ وہ اسے ''چھوٹے بھائی'' کہہ کر بلاتی تھی اور ریان فردوس سے اختلافات رکھنے کے باوجود ابراہیم کی بات کو اہمیت دیتی تھی۔ اب بھی وہ مسلسل فون پر مصروف تھی۔ اس نے جزیرے پر موجود بہترین ڈاکٹروں کو ملٹری اسپتال میں جمع کر لیا تھا، ان میں دو غیر ملکی بھی تھے۔

اسی اثنا میں نیلی آنکھوں والا دراز قد پال اندر داخل ہوا۔ اس کے زخمی کندھے پر ابھی تک ڈریسنگ موجود تھی۔ ایک امریکی کو اپنے سامنے دیکھ کر قسطینا چونکی اور اس کے چہرے پر تردد نمودار ہوا۔ میں نے کہا۔ ''قسطینا! یہ پال کورنی ہیں۔ انہوں نے ہمارا بہت ساتھ دیا ہے۔ ہر جگہ انہوں نے ہمارے کندھے سے کندھا ملائے رکھا ہے۔ شاید آپ نے نیوز میں بھی ان کا تذکرہ سنا ہو۔''

پال کورنی نے مسکرا کر قسطینا سے مصافحہ کیا پھر بولا۔ ''یور ہائی نس! ہم دیکھ رہے ہیں کہ بچے (ابراہیم) کی حالت واقعی تشویشناک ہے مگر ہمیں نا امید نہیں ہونا چاہیے۔ نیویارک کے بہترین نیورو فزیشن ڈاکٹر بوشر وائٹ میرے دوستوں میں ہیں۔ میں نے انہیں پہلی دستیاب فلائٹ سے برونائی پہنچنے کے لیے کہا ہے۔''

''شکریہ۔'' قسطینا نے کہا۔ ''یہ نام تو شاید میں نے بھی سنا ہوا ہے۔''

اسی دوران میں پال کے سیل فون پر کال آ گئی۔ اندازہ ہوا کہ یہ اسی نامور ڈاکٹر کی کال ہے۔ ڈاکٹر چاہ رہا تھا کہ ابراہیم کی کچھ خاص رپورٹس نیٹ کے ذریعے اسے ارسال کر دی جائیں تاکہ وہ سفر کے دوران میں انہیں دیکھ سکے۔

پال، بات کرتا ہوا ڈاکٹرز روم کی طرف چلا گیا۔ قسطینا بے دم ہو کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ میں بھی بیٹھ گیا۔ کمرے کے دروازے پر اور کوریڈور میں درجنوں مسلح محافظ چوکس کھڑے تھے۔ میں نے کہا۔ ''قسطینا! آخر ابراہیم اس حالت تک کیسے پہنچا، آپ کے ہوتے ہوئے بھی

یہ سب کچھ ہو گیا؟''

''وہ کسی کی نہیں سنتا تھا شاہ زائب! NEUROTIC کی خاصی مقدار اس کے پاس موجود تھی...... اور وہ اس کو معمول کے مطابق استعمال کر سکتا تھا مگر وہ نہیں کرتا تھا۔ جب میں یا فارس اس پر زور دیتے تھے تو وہ ایک دم جھنجلا جاتا تھا۔ مجھے تو کسی وقت ڈر لگتا تھا کہ وہ خود کو کچھ کر ہی نہ لے۔''

''آپ لوگ اسے کسی طرح سلا کر یا بے ہوش کر کے NEUROTIC اس کے جسم میں داخل کر سکتے تھے۔''

''ہم نے اس بارے میں سوچا تھا مگر تب تک دیر ہو چکی تھی۔ وہ بہت کمزور ہو چکا تھا۔ اسے بے ہوش کرنے کی کوشش اس کی جان کے لیے خطرہ بن سکتی تھی۔'' چند لمحے خاموش رہ کر اس نے ایک آہ کھینچی اور بولی۔ ''اس کے دماغ میں بس ایک ہی بات سمائی ہوئی تھی...... مر جائے گا یا پھر اس زہر سے چھٹکارا حاصل کر لے گا میں نے اسے کئی بار سمجھایا کہ اگر وہ ایسا کرنا ہی چاہتا ہے تو پھر کم از کم اس جگہ تو نہ کرے۔ جب ہم یہاں سے نکل کر شہر پہنچ جائیں اور طبی سہولتیں موجود ہوں تو پھر یہ کوشش کر دیکھے مگر وہ کچھ مانتا ہی نہیں تھا۔''

''زینب کی ہر بات تو سنتا تھا وہ۔'' میں نے کہا۔

''نہیں۔'' قسطینا نے افسردگی سے نفی میں سر ہلایا۔ ''اب وہ اس کی بھی نہیں سنتا تھا بلکہ کئی دفعہ اس سے جھگڑ پڑا اور بے چاری کو گھنٹوں تک رونے پر مجبور کیا۔ حالانکہ وہ جو کچھ کر رہا تھا، اسی کے لیے کر رہا تھا...... اپنی حالت بگڑنے کے بعد اس نے دو چار بار تمہارا نام بھی لیا شاید تمہیں دیکھنا چاہتا تھا۔''

پھر قسطینا نے میرے سراپے پر نگاہ دوڑائی اور نم لہجے میں بولی۔ ''تم کیسے ہو شاہ زائب!''

''آپ کے سامنے ہوں...... آپ کو میرے کندھے کی بہت فکر رہتی تھی نا؟ اب کندھا بالکل درست ہے۔'' میں نے اسے بازو ہلا کر دکھایا۔

وہ بولی۔ ''کندھا تو درست ہے لیکن اور بہت کچھ درست نہیں ہے۔ تمہارے جسم کے جو حصے لباس سے باہر نظر آ رہے ہیں ان پر زخم ہیں۔ تمہارا چہرہ دیکھ کر ہی پتا چل جاتا ہے کہ تم اس وقت بھی شدید بخار میں پھنک رہے ہو۔''

میں نے گہری سانس لی۔ ''یہ باتیں زیادہ اہم نہیں ہیں قسطینا! اہم یہ ہے کہ ہم ایجنسی اور اس کے کٹھ پتلی رائے زل کو شکست فاش دے چکے ہیں...... اور اہم یہ ہے کہ آپ کے ڈی

پیلس پر پھر سے جاماجی کا پرچم لہرا رہا ہے اور یہ بھی اہم ہے کہ آپ پھر سے ہمارے درمیان ہیں۔ باقی رہے یہ زخم......تو اب ان کو بہت جلد ٹھیک ہو جانا ہے۔''

''میں کس منہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں شاہ زائب؟''

''اگر ضروری ہے، تو پھر اسی منہ سے کر دیں......اور اسی منہ سے اپنے لوگوں سے آپ کا ایک خطاب بھی بہت ضروری ہے۔ وہ آپ کو سننے کے لیے بے چین ہیں۔''

''مجھے تو لگتا ہے کہ مجھ سے زیادہ وہ تمہیں سننے کے لیے بے چین ہوں گے۔ تم یہاں کے لوگوں کے لیے بہت اہمیت اختیار کر چکے ہو شاہ زائب!......شاید مجھ سے بھی زیادہ......اور مجھے اس کی خوشی ہے۔''

''آپ کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا قسطینا! آپ نے جو طویل جدوجہد کی، میں نے تو بس اس کا آخری فقرہ لکھا ہے......اور شاید یہ آخری بھی نہیں ہے۔ ابھی اور کئی چھوٹے موٹے مسائل کا سامنا آپ کو کرنا پڑے گا......اور مجھے پوری امید ہے کہ اب آپ آسانی سے کر لیں گی۔ آپ کو فارس جان جیسے جاں نثار کمانڈروں کا بھرپور تعاون حاصل ہے۔'' میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پھر نگاہیں پھیر لیں۔

ہم اس ''آئی سی یو'' کے قریب ہی موجود تھے جہاں مقامی اور غیر ملکی ڈاکٹرز ابراہیم کی نبضیں بحال کرنے کی سرتوڑ کوشش کر رہے تھے۔ انہوں نے اگلے تین چار گھنٹے اہم ترین قرار دیئے تھے۔ جب کوئی ڈاکٹر شیشے کی دیوار کے سامنے سے گزرتا تھا، ہماری نگاہیں اس کے چہرے کا طواف کرنے لگتی تھیں۔ ہم اس کے تاثرات سے جاننے کی کوشش کرتے تھے کہ صورتِ حال کیا ہے؟

شدید تشویش سے دھیان ہٹانے کے لیے قسطینا نے جاماجی کی صورتِ حال کے بارے میں سوالات شروع کر دیئے۔ اس نے عارفہ خاتون، بیگم نورل اور پھر رائے زل کے آخری وقت کے بارے میں پوچھا۔ میں نے مختصراً جواب دیئے۔ جب میں نے محترم ذکری سے ملاقات اور ان کی بے مثل رہنمائی کا ذکر کیا تو قسطینا کی آنکھوں میں اطمینان کی جھلک نظر آنے لگی۔ اس نے اس حوالے سے بھی کئی سوال پوچھے۔ گفتگو کے ایک مرحلے میں ازمیر طیب کی پالتو لوسی کا ذکر بھی آیا۔ اس نے جو کچھ کیا، وہ سب کے لیے حیران کن اور بہت سنسنی خیز تھا۔ میں نے قسطینا کو بتایا کہ لوسی کی وحشت اب کم ہو چکی ہے۔ اسے پنجرے سے نکال دیا گیا ہے۔

لڑائی کے متعلق ایک سوال کا جواب، میری طرح قسطینا کے لیے بھی ایک پہیلی جیسا تھا۔ وہ کہنے لگی۔ ''شاہ زائب! جب تم لوگ ڈی پیلس کے سامنے پہنچ گئے......اور لوگوں نے ''آؤٹ آف کنٹرول'' ہو کر خاردار تاریں، چھلانگیں اور مورچوں پر قبضہ کر لیا تو ڈی پیلس کا مین گیٹ بند ہو جانا چاہیے تھا۔ وہ کیوں کھلا رہا؟''

''کہا جا رہا ہے کہ اس میں کوئی تکنیکی خرابی ہو گئی تھی مگر نوے فیصد امکان اسی بات کا ہے کہ یہ خرابی اتفاقاً نہیں تھی۔ پیدا کی گئی تھی۔''

''کوئی ہمارا اندر کا ہمدرد؟'' قسطینا نے پوچھا۔

''ممکن ہے......اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ موقع پر موجود آپریٹر نے ہی یہ کارنامہ انجام دیا ہو۔''

''لیکن میری اطلاع کے مطابق، اس مرکزی گیٹ پر کم از کم دو آپریٹر موجود ہوتے تھے جو آٹومیٹک سسٹم کو کنٹرول کرتے تھے۔ اکثر ایک سینئر انجینئر بھی اس کی معاونت کے لیے موجود ہوتا تھا۔ وہ جگہ سخت سیکیورٹی میں رہتی تھی۔''

''بہر حال جو کچھ بھی ہوا قسطینا! ایک غیبی مدد کی طرح تھا۔ مشتعل ہجوم نے اور رضا کار دستوں نے اس موقع سے پورا فائدہ اٹھایا اور ڈی پیلس میں گھس گئے۔''

''آقا جان اب کہاں ہے؟'' قسطینا نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''جیل میں...... اسے سخت سیکیورٹی میں رکھا گیا ہے۔ گرین فورس کے کچھ افسران بہت مشتعل تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ آقا جان کو ٹمپریچر سیل میں رکھا جائے......اور اسے اس اذیت کا تھوڑا سا مزہ چکھایا جائے جو اس نے مجھ پر روا رکھی۔ لیکن میں نے منع کر دیا ہے۔''

''تم پر کیا جانے والا ستم واقعی دل کو چیر ڈالتا ہے۔ تم بہت بڑے ایم ایم اے فائٹر ہو لیکن تم نے یہ لڑائی فائٹ کر کے نہیں اپنی غیر معمولی برداشت کا مظاہرہ کر کے جیتی ہے۔ ہم سنتے آ رہے تھے کہ انٹرنیٹ کے اس دور میں کچھ چیزیں اچانک ''وائرل'' ہو جاتی ہیں اور آناً فاناً ہزار ہا لوگ ان سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہمیں تمہاری ''ٹارچر سیل والی تصویر'' سے ملا ہے۔''

''بس جو کچھ ہوا خود بخود ہی ہوا۔ کہتے ہیں نا قسطینا کہ بندے کی اپنی پلاننگ ہوتی ہے اور قدرت کی اپنی پلاننگ۔''

اس نے ذرا چونک کر میری جانب دیکھا۔ پھر ہولے سے بولی۔ ''تم تو قدرت اور خدا کا ذکر کم کم ہی کیا کرتے ہو...... مجھے تم کچھ بدلے بدلے نظر آ رہے ہو۔''

میں نے گہری سانس لی۔ ''کہتے ہیں نا قسطینا کہ ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں۔ میں نے بھی ان گزرے ہوئے دنوں میں بہت کچھ دیکھا ہے اور محسوس کیا ہے۔''

''ہماری بات دوسری طرف نکل گئی۔ ہم آقا جان کا ذکر کر رہے تھے۔ اس کے بارے میں کیا سوچ ہے تمہاری؟'' (آقا جان کو قسطینا کبھی بڑے احترام سے انکل آقا کہا کرتی تھی)

میں نے کہا۔ ''جو آپ کی رائے ہوگی، وہی میری ہوگی۔ اتنا ضرور کہوں گا کہ اس شخص نے ایک بدترین غدار کا کردار ادا کیا ہے۔ اسے معاف نہیں کیا جانا چاہیے۔''

قسطینا حسبِ عادت اپنے کان کی لَو مسل رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں گہری سوچ جھلک رہی تھی۔

میں نے دیکھا ''آئی سی یو'' کی طرف سے پال کورنی ہماری طرف آ رہا تھا۔ اس کے قدموں میں ایک تشویش آمیز تیزی تھی۔ ہم اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔ پال نے نم آنکھوں کے ساتھ کہا۔ ''بچے کی حالت ٹھیک نہیں ہے، لیکن...... امید کی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر وائٹ نیویارک ائیرپورٹ سے روانہ ہو چکے ہیں۔ وہ اس وقت فضا میں ہیں۔ ہمیں دعا کرنی چاہیے۔'' اس کی آواز کچھ بھرا گئی۔ میرا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔

تو کیا ابراہیم جا رہا تھا؟ کیا زینب اور ابراہیم کرشماتی طور پر ملنے کے بعد پھر جدا ہو رہے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ کبھی کبھی حالات کی نہایت خوشگوار کروٹیں بھی نصیب کو بدل نہیں سکتیں۔ زینب کی قبر بن چکی تھی لیکن پھر کرشمہ ہوا تھا اور وہ زندہ سلامت ابراہیم کے سامنے آ گئی تھی لیکن اب حالات کی بدترین سنگینی پھر اس کرشمے کی چمک کو دھندلاتی چلی جا رہی تھی۔

پال نے کہا تھا کہ ابراہیم کے لیے دعا کریں۔ اس بے چارے کے لیے زینب سے زیادہ کس کی دعا قبول ہو سکتی تھی۔ وہ یتیم بے سہارا بچی جو دوسروں کے حکم پر اپنے شوہر کا ہاتھ پکڑ کر ہزاروں میل دور اس پردیس میں آ بسی تھی۔ میں نے اپنے پاؤں پر زور دیا اور بمشکل اٹھ کر چند قدم آگے گیا۔ ساتھ والے کیبن میں زینب موجود تھی۔ وہ شفاف فرش پر مصلیٰ بچھائے سجدے میں گری ہوئی تھی۔

O......❖......O

چند گھنٹے پہلے ڈاکٹر بوشر وائٹ یہاں پہنچ چکا تھا۔ وہ برونائی سے بذریعہ ہیلی کاپٹر یہاں آیا تھا اور آتے ساتھ ہی ڈاکٹروں کی اس ٹیم میں شامل ہو گیا تھا جو ابراہیم کو کومے کی سی کیفیت سے نکالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے مسیحا صفت ڈاکٹر وائٹ کی بس ایک جھلک دیکھی تھی۔ اس کی شخصیت میں کمال کا اعتماد تھا۔ خدا کی بخشی ہوئی عقل ہی تھی جس سے وہ

مُردوں میں جان ڈالتا تھا۔ تاہم بڑے سے بڑا مسیحا بھی یہی کہا کرتا ہے کہ موت کے سوا ہر بیماری کا علاج موجود ہے۔

رات گئے ایک اچھی خبر ملی اور وہ یہ تھی کہ NERVOUS رسپانس کر رہے ہیں اور ابراہیم کی نبض میں کچھ بہتری آئی ہے۔ بہرطور اس کی زندگی مسلسل خطرے میں تھی۔

رات تین بجے کے لگ بھگ میں ڈی پیلس واپس آگیا۔ میرے ڈاکٹرز کا شدید اصرار تھا کہ میں چند گھنٹوں کے لیے مکمل آرام کروں۔ میں ڈی پیلس کے مین گیٹ کے قریب پہنچا تو میری حفاظتی گاڑیوں کو رکنا پڑا۔ گیٹ پر رات کے اس پہر بھی لوگوں کا ایک بہت بڑا ہجوم تھا۔ میرے پوچھنے پر کرنل احرار نے بتایا۔ ''آقا جان اور اس کے دو قریبی ساتھی اپنے انجام کو پہنچ رہے ہیں۔''

کل سہ پہر ہی فوجی عدالت نے آقا جان کی قسمت کا فیصلہ کر ڈالا تھا...... اور سپریم کمانڈر کی حیثیت سے قسطینا نے اس فیصلے کی توثیق بھی کر دی تھی۔ جاماجی کے لاکھوں لوگ اپنے اس بدترین غدار کو جلد از جلد تختہ دار پر دیکھنا چاہتے تھے۔

گرین فوجیوں نے بمشکل راستہ بنایا اور ہماری گاڑیاں ڈی پیلس کے اندر چلی گئیں۔ میرا دل چاہا کہ میں اپنی آنکھوں سے اس شخص کو کیفر کردار تک پہنچتے دیکھوں۔ کرنل احرار، کمانڈر زمان اور جاسم وغیرہ بھی یہی چاہتے تھے۔ ہم ایک لفٹ کے ذریعے ڈی پیلس کی بیرونی فصیل پر پہنچے۔ جنگ ختم ہو چکی تھی مگر یہاں ابھی تک بڑے بڑے پلیٹ فارمز پر مارٹر گنز بوفر گنز اور ایم آر ایل وغیرہ نظر آ رہے تھے۔ ہم فصیل کے اوپر ایک نگران پوسٹ کی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

پھانسی کا وقت ہو چکا تھا۔ فضا میں ہیلی کاپٹرز چکرا رہے تھے اور دیگر حفاظتی انتظامات بھی مکمل تھے۔ چند منٹ بعد ہی آقا جان اور اس کے دونوں ساتھیوں کو عارضی پھانسی گھاٹ تک پہنچا دیا گیا۔ یہی وہ پھانسی گھاٹ تھا جہاں ہردلعزیز عبدالکریم اور اس جیسے سینکڑوں حریت پسندوں کو بے رحمی سے موت کے منہ میں دھکیلا گیا تھا...... آج آقا جان کی باری تھی...... بے شک یہ جاماجی کی کہانی نہیں تھی، یہ کشمیر، فلسطین، برما، افغانستان اور لیبیا جیسے ہر خطے کی کہانی تھی۔

ہم نے دیکھا کمانڈر فارس جان کی نگرانی میں آقا جان اور اس کے دونوں ساتھی نمودار ہوئے۔ آقا جان سیاہ لباس میں تھا۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے مگر وہ سخت مزاحمت کر رہا تھا۔ سپاہیوں کی گرفت سے نکل نکل جا رہا تھا۔ پھر عجیب منظر ہماری نگاہوں

کے سامنے آیا۔ وہ زمین پر لیٹ گیا۔ وہ اس موقع پر بھی گالیاں بک رہا تھا۔ ہم بلندی پر تھے اس کے باوجود اس کی آواز ہم تک پہنچ رہی تھی۔

سخت دھینگا مشتی کے عالم میں اس کا سیاہ ٹراؤزر نیچے کھسک کر گھٹنوں تک پہنچ گیا، جسے اہلکاروں نے بمشکل کھینچ کر اوپر کیا۔

یکا یک اس نے لہجہ بدلا اور منت سماجت میں مصروف ہو گیا۔ وہ سپریم کمانڈر قسطینا کا نام لے رہا تھا۔ ''قسطینا کو یہاں لاؤ۔ میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں...... بس ایک بار اس سے بات کرنا چاہتا ہوں......''

پھر وہ سپرنٹنڈنٹ جیل کی طرف مڑا اور اس سے کچھ کہنے لگا۔ شور کے سبب اس کی آواز ہم تک نہیں پہنچی۔ بس...... فون...... بھتیجی...... غلط فہمی، جیسے الفاظ ہی سمجھ میں آئے۔ سپرنٹنڈنٹ اپنا کام اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ کچھ دیر آقا جان کو پھانسی گھاٹ کی چوبی سیڑھیوں کی طرف جانے پر آمادہ کرتا رہا۔ وہ نہیں مانا تو اس کے اشارے پر اہلکاروں نے اسے ڈنڈا ڈولی کر کے اٹھایا اور چبوترے پر پہنچا دیا۔ یہاں اس کے دو ساتھی پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ آقا جان ایک بار پھر اشتعال میں آیا اور دائیں بائیں زور مارنے لگا۔ اتنے فاصلے سے مجھے نظر نہیں آرہا تھا مگر یقیناً اس کی ناک کا بل بہت موٹا ہو چکا تھا وہی منحوس بل جس کے نتیجے میں جاناں، زینب اور عبدالکریم جیسے لوگوں پر آفتوں کی یلغار ہوتی تھی۔ اس کے منہ پر سیاہ نقاب چڑھا کر پھندا اس کے گلے میں ڈال دیا گیا۔ پاؤں کے نیچے سے تختہ نکلنے تک وہ اہلکاروں کے ہاتھوں میں تڑپتا پھڑکتا رہا۔ تینوں جسم خلا میں جھولے تو ڈی پیلس کے در و دیوار پُرجوش نعروں سے گونج اٹھے پھر کسی قریبی مسجد سے فجر کی اذان کی آواز بلند ہونے لگی...... جاماجی کے سارے موسم بدل رہے تھے۔

○......❖......○

قسطینا، بن مشہد اور دیگر ساتھیوں کو ٹاپو کی زیرزمین پناہ گاہ سے باہر نکلے آج تیسرا روز تھا۔ غیر رسمی طور پر قسطینا کو جاماجی میں کلیدی فیصلوں کا اختیار دے دیا گیا تھا۔ وہ بڑی فہم و فراست سے صورتِ حال کو کنٹرول کر رہی تھی۔ عوام کے شدید اصرار پر اس نے ڈی پیلس کی بیرونی بالکونی سے لاکھوں کے مجمع سے خطاب بھی کیا تھا۔

محترم ذکری کے مشورے کے عین مطابق نیوشٹی پر یلغار نہیں کی گئی تھی اور صرف بارڈر کے کچھ علاقوں پر قبضہ کر کے فائر بندی کر دی گئی تھی۔ نہ جانے کیوں محترم حاذق ذکری کو یقین تھا کہ بہت جلد خونریزی کے بغیر نیوشٹی کے لوگ ڈی پیلس کو مرکز و محور مان لیں گے۔

ہاناوانی کے بارے میں یہی خبریں تھیں کہ وہ نیوسٹی میں ہے اور اس نے قسطینا کے حملے کی صورت میں نیوسٹی کا دفاع کرنے کا اعلان کیا ہے (یہ بات اب ثابت ہو چکی تھی کہ حملے کے روز وہ اسپتال کے ساؤنڈ پروف کمرے سے ایم گرین آفیسر کے تعاون سے فرار ہوئی تھی۔ کہا یہی جا رہا تھا کہ وہ آفیسر...... ہاناوانی میں موجود ہپناٹزم کی غیر معمولی صلاحیتوں کا شکار ہوا ہے۔ یہ بات مجھے کچھ عرصہ پہلے بتائی جاتی تو شاید میں نہ مانتا......لیکن اب تو میں اس حوالے سے ذاتی تجربے...... بلکہ تجربوں کا حامل تھا۔ سیاہ عینک کے پیچھے چھپی ہوئی خطرناک کشش...... وہ ست رنگا بھنور...... اور اس بھنور کے سامنے بے جان ہوتے ہوئے ہاتھ پاؤں، مجھے سب یاد تھا۔

کئی دنوں سے یہ سوال حل طلب تھا کہ حملے کے وقت ڈی پیلس کا مرکزی گیٹ کیسے خراب ہوا تھا۔ مار دھاڑ اور دستی بموں کے دھماکوں میں وہ سی سی ٹی وی کیمرے بھی برباد ہوئے تھے جو گیٹ کے اردگرد کے مناظر کو ریکارڈ کر رہے تھے جو ایک دو فوٹیج ملی تھیں وہ بیکار تھیں۔ ان میں صرف جنگی صورتِ حال ہی دکھائی دیتی تھی۔ یہ بات اب ثابت ہو چکی تھی کہ دیوہیکل گیٹ کے میکنزم کو جان بوجھ کر خراب کیا گیا تھا۔ یہ بھی کہا جا رہا تھا کہ موقع پر موجود ایک یا دو سی سی ٹی وی کیمروں میں سے فوٹیج نکال لی گئی ہے یا پھر ان میں میموری کارڈ ہی موجود نہیں۔

اسی طرح کا ایک اور سوال بھی تھا۔ وہ ڈاکٹر ماریہ اور اس کے بچے کے حوالے سے تھا۔ انیق اور جاسم کی کوشش کے باوجود ابھی تک ڈاکٹر کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ اب یہ تکلیف دہ سوچ ذہن میں آ رہی تھی کہ کیا وہ دونوں بھی ان بہت سے لوگوں میں شامل ہیں جو اس لڑائی میں لقمہ اجل بنے ہیں۔

ان دونوں سوالات کا جواب مجھے تقریباً ایک ساتھ ہی ملا۔ میں بیٹھا تھا کہ انیق سر کھجاتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس کے پاس ایک لیپ ٹاپ بھی تھا وہ بولا۔ ”لو جی، اپنی سراغ رسانی مکمل ہو گئی، ڈاکٹر ماریہ کا کھوج لگ گیا۔“

”سچ کہہ رہے ہو؟“ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”ایک سو ایک فیصد اور آپ کے لیے ایک اور بڑا انکشاف بھی ہے۔ ہم پچھلے تین روز سے اپنے اس محسن کو ڈھونڈ رہے ہیں جس نے ہمارے لیے ڈی پیلس کا دروازہ کھولا۔ آپ کو پتا ہے، وہ کون ہے؟“

”کون ہے؟“

''اس کو اس فوٹیج میں دیکھ سکتے ہیں جو میں ساتھ لایا ہوں۔ یہ اس لڑائی کی اہم ترین فوٹیج ہے اور یہ آپ کے اس خاکسار نے آج ہی حاصل کی ہے۔''

اس نے لیپ ٹاپ کے ''کی بورڈ'' کو استعمال کیا اور چند سیکنڈ بعد سی ٹی وی کی ایک فوٹیج اسکرین پر پلے ہونے لگی۔ یہ کافی صاف فوٹیج تھی۔ اسے دیکھتے ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ اسی خونی سہ پہر کی ہے جب ہم ڈی پیلس پر ہلا بول رہے تھے۔ اسکرین پر مین گیٹ کے کنٹرول روم کا منظر نظر آ رہا تھا۔ ایک کیمرے نے ایک جواں سال عورت کو عقب سے دکھایا جو سیکیورٹی اہلکاروں سے بات کر رہی تھی اور انہیں اپنا کارڈ دکھا رہی تھی۔ رائے زل کی فورس کے ان مسلح اہلکاروں نے اسے آگے جانے دیا۔

جب دوسرے کیمرے نے عورت کو دکھایا تو میں دنگ رہ گیا۔ وہ ڈاکٹر ماریہ تھی۔ وہ کنٹرول روم کے خاص حصے میں داخل ہوئی اور دروازہ اندر سے بولٹ کر دیا۔ جب اس نے دروازہ بولٹ کیا، گیٹ کو کنٹرول کرنے والے دو آپریٹرز نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ڈاکٹر ماریہ نے اپنے سفید کوٹ کے اندر سے ایک سائلنسر لگا بریٹا پسٹل نکالا۔ اس سے پہلے کہ آپریٹرز کچھ سمجھ پاتے، ڈاکٹر ماریہ نے تین فائر کیے اور دونوں گیٹ آپریٹرز اپنی کرسیوں سے لڑھک گئے...... کنٹرول پینل کے اوپر لگی دو اسکرینز پر گیٹ سے باہر کے دھندلے مناظر بھی دکھائی دے رہے تھے۔ یہ وہی تہلکہ خیز لمحات تھے جب کسی جانب سے گولی چلی تھی اور پھر سب کچھ کنٹرول سے باہر ہو گیا تھا۔ ہزاروں افراد مورچوں پر چڑھ دوڑے تھے۔ ہم نے فوٹیج میں دیکھا کہ کنٹرول پینل کے سامنے کھڑی ڈاکٹر ماریہ زخمی شیرنی کی طرح نظر آ رہی ہے۔ وہ کنٹرول پینل پر جھپٹی...... اور اسے دیکھنے لگی۔ جیسے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ گیٹ کے سسٹم کو کس طرح نقصان پہنچائے۔ پھر اس نے آہنی ٹانگوں والی ایک چھوٹی کرسی اٹھائی اور اسے دیوانہ وار کنٹرول پینل پر مارنا شروع کر دیا۔ پینل میں سے جو اسپارکس نکل رہے تھے وہ بھی فوٹیج میں صاف دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے کئی بار تار کھینچ کر توڑ ڈالے اور پھر سی ٹی وی کیمرے کے فریم سے نکل گئی۔

میں ششدر تھا۔ انیق نے کہا۔ ''دیکھا جائے تو ڈاکٹر ماریہ نے اپنے ہونے کا حق ادا کر دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سینکڑوں لوگوں کی جانیں اس کے اس دلیرانہ اقدام سے بچ گئی ہیں۔''

''بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن ڈاکٹر ماریہ اب خود کہاں ہے؟'' میرے لہجے میں ہلکی سی لرزش تھی۔

"آپ کے خیال میں اسے کہاں ہونا چاہیے؟"

"میرے خیال میں اسے زندہ ہونا چاہیے۔ اس کا ایک چھوٹا سا بچہ ہے۔"

"ڈاکٹر ماریہ زندہ ہے اور میری اطلاعات کے مطابق وہ کل رات تک جاماجی میں ہی تھی۔ اس نے کسی کو فون کیا تھا اور اس فون کے ذریعے ہم اسے ٹریس کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ایک دو گھنٹے میں وہ ہمارے سامنے ہو۔"

میں نے ایک بار پھر وہی فوٹیج دیکھی جس میں ماریہ آٹو میٹک گیٹ کے کنٹرول کو تباہ کرتی نظر آتی تھی۔ یہ سنسنی خیز مناظر تھے۔ ان میں ایک ایسی عورت کا ردِعمل نظر آتا تھا جسے ایک بااختیار شخص نے بلیک میل کر کے اپنے بیڈروم کی زینت بنایا تھا۔ اسے روندا تھا۔ اسے اَن گنت لوگوں کی نگاہوں میں ذلیل و رسوا کیا تھا...... اور مسلسل کیا تھا۔ ان مناظر میں اس عورت نے اپنا بدلہ لے لیا تھا اور نہ صرف بدلہ لیا تھا۔ بلکہ اپنے لاکھوں ہم وطنوں کے لیے پیش قدمی اور فتح کی راہ ہموار کی تھی۔

میں نے کہا۔ "انیق، تم نے ابھی ایک فون کی بات کی ہے۔ ڈاکٹر ماریہ نے کس کو کیا ہے فون؟"

"آپ نے ابھی تک یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ میں اس اہم فوٹیج تک کیسے پہنچا ہوں؟"

"تم کچھ بتاؤ تو پھر ہے ناں، تم تو ہر وقت لٹھ لے کر سسپنس کے پیچھے پڑے رہتے ہو۔"

"سسپنس ہی تو کہانی کی جان ہوتا ہے جی۔ آپ نے کبھی کرنل حمیدی فریدی، علی عمران اور میجر پرمود وغیرہ کو پڑھا ہے؟ نہیں پڑھا ناں، اسی لیے آپ کو سسپنس کا پتا نہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر ہمارے فلمساز گجر بادشاہ جیسی فلموں پر روپیہ برباد کرنے کے بجائے ان کرداروں پر کوئی ڈھنگ کی فلم بنا دیں تو کروڑوں میں کھیلیں۔"

میں نے کہا۔ "دیکھو، ابھی تم نے لات کا ذکر کیا تھا، اور لات تمہیں پڑنے والی ہے۔"

وہ جلدی سے پٹڑی پر آ گیا اور بولا۔ "ڈاکٹر ماریہ نے کل وہ فون اپنے ایک مریض کی بیوہ کو کیا ہے اور مریض کے وفات پانے پر اسے تسلی تشفی دی ہے۔"

"مریض کون تھا؟"

"ڈی پیلس کی نگرانی کا ڈپارٹمنٹ کا ایک چالیس سالہ ٹیکنیشن شکور آصفی وہ پرسوں شام ایک بارودی سرنگ کے پھٹنے سے مارا گیا تھا۔ یہی شخص تھا جس نے دوسی سی ٹی وی کیمروں سے ڈاکٹر ماریہ کی فوٹیج نکالی......"

انیق نے اس حوالے سے جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ یہ تھا...... معمولی حیثیت کا مالک شکور ہیپاٹائٹس سی کا پرانا مریض تھا۔ ڈاکٹر ماریہ نے طویل عرصے تک بلا معاوضہ اس کا علاج کر کے اسے اس بیماری سے چھٹکارہ دلایا تھا۔ اس بنا پر وہ ڈاکٹر ماریہ کا بے حد احسان مند تھا۔ پرسوں سہ پہر حملے کے وقت جب ڈاکٹر ماریہ کنٹرول روم میں گھسی اور اس نے دو افراد کو ہلاک کر کے گیٹ کا میکنزم جام کیا تو شکور نے دیکھ لیا۔ تب تک کچھ پتا نہیں تھا کہ اس لڑائی میں ایجنسی اور گرے فورس کو کامیابی ملنی ہے یا گرین فورس کو۔ اس خیال سے کہ ان سی سی ٹی وی کیمروں کی وجہ سے ڈاکٹر ماریہ پر کوئی مصیبت نہ آئے، شکور آصفی نے بڑی مہارت اور تیزی سے دونوں کیمروں کے ریکارڈنگ باکس کھولے، ان میں سے میموری کارڈز نکالے اور اپنے گھر لے گیا مگر ایک دو گھنٹے بعد اسی شام شکور کی زندگی کا سفر ختم ہو گیا۔ ڈی پیلس کے قریب بارودی سرنگ کے ایک دھماکے میں تین شہری جاں بحق ہوئے ان میں سے ایک ٹیکنیشن شکور بھی تھا۔ نیوز میں اس کی تصویر بھی آئی تھی۔ اسی دوران میں انیق ایک مقامی سراغ رساں کے ہمراہ گمشدہ میموری کارڈز کا کھوج لگاتا ہوا شکور کے گھر جا پہنچا...... جہاں صفِ ماتم بچھی ہوئی تھی شکور کی بیوہ بے چاری کو کچھ پتا نہیں تھا کہ گھر کی ایک الماری میں جو الیکٹرونکس کی اشیا پڑی ہیں وہ کس قدر اہم ہیں۔ انیق نے وہ ایس ڈی میموری کارڈز، آج صبح ہی شکور کی بیوہ سے حاصل کر لیے۔ شکور کی بیوہ نے انیق اور مقامی سراغ رساں کو بتایا تھا کہ اس کے لیے ڈاکٹر ماریہ کا تعزیتی فون بھی آیا ہے۔ اب انیق، مقامی سراغ رساں کے ساتھ مل کر اسی فون نمبر کو ٹریس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

یہی وقت تھا جب قسطینا کا پرسنل سیکرٹری اندر داخل ہوا اور مجھے سلیوٹ کرنے کے بعد بولا۔ ”جناب! ہر ہائی نس تشریف لا رہی ہیں۔“

میں نیم دراز تھا۔ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور سیکرٹری سے کہا کہ وہ آ جائیں۔

قریباً پانچ منٹ بعد قسطینا تیز قدموں سے اندر داخل ہوئی۔ یونیفارم ایک بار پھر اس کے جسم پر نظر آ رہی تھی۔ (یہ وہی فوجی یونیفارم تھی جسے ایک موقع پر قسطینا نے مایوسی کے عالم میں خنجر سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا) ”ہیلو شاہ زائب! تمہاری طبیعت کیسی ہے؟“ وہ اندر آتے ہوئے بولی۔

”میں اب بہتر محسوس کر رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔

وہ بیٹھ گئی۔ انیق اسے سلام کرتا ہوا باہر چلا گیا۔ وہ اسے جاتا دیکھتی رہی۔ پھر بولی۔ ”یہ تمہارا دوست بھی بہت انوکھی چیز ہے۔ دیکھو تو ایک عام سا بے وقوف لڑکا نظر آتا ہے۔ کوئی

سوچ بھی نہیں سکتا کہ وقت پڑنے پر یہ کتنا خاص الخاص اور اپنے دشمن کے لیے کتنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔''

''شاید ''چھپا رستم'' کا لفظ ایسے ہی لوگوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ میرے خیال میں آپ کو معلوم نہیں قسطینا! اس کی یادداشت فوٹو اسٹیٹ کی طرح ہے۔ آپ کو بتایا تھا ناں کہ یہ دنیا کی بہت سی زبانیں جانتا ہے، کوئی نئی زبان سیکھنا بھی اس کے لیے ہفتوں کی بات ہوتی ہے۔ اس کی یہی صلاحیت ہے جس کی وجہ سے ہمیں کمانڈر فارس جان کے دل کا حال بھی معلوم ہوا...... میرا مطلب ہے کہ ہم اس کی ڈائری پڑھ پائے۔''

قسطینا کے چہرے پر سرخی سی لہرا گئی۔ اس سرخی میں رومانیت کی ہلکی سی جھلک تھی۔ وہ جلدی سے سنجیدہ ہو گئی اور اپنے بوائے کٹ بالوں میں انگلیاں چلا کر بولی۔ ''اچھا، اس بارے میں پھر بات کریں گے۔ ابھی میں تمہیں ایک خاص اطلاع دینے کے لیے آئی ہوں۔''

''خیریت کی اطلاع ہے؟''

''ہاں، اس نے کہا اور اپنے موبائل فون پر آیا ہوا ایک طویل ٹیکسٹ میسج میرے سامنے کر دیا۔

یہ میسج ڈاکٹر ماریہ کی طرف سے تھا۔ اس نے قسطینا کو مخاطب کرتے ہوئے جو کچھ لکھا اس کا خلاصہ یہ تھا۔ ''پیاری قسطینا! یہاں میرے ساتھ جو کچھ ہو چکا ہے اس کے بعد میرا یہاں سے چلے جانا ہی بنتا ہے لیکن وقت رخصت مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ مجھے جاماجی کے لوگوں کی نظروں میں ذلیل و رسوا کرنے والا جنس زدہ خبیث (رائے زل) اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے۔ میں جانتی ہوں انیکسی کی چھت پر اس کے کٹے ہوئے سر کو فٹ بال کی طرح لڑھکایا گیا ہے۔ وہ اس سے بھی بڑی سزا کا مستحق تھا۔ اس نے ڈی پیلس میں اپنے چند روزہ قیام کے دوران میں جو شرمناک کھیل کھیلے ہیں بہت سی خواتین اس کی گواہ ہیں۔

میری پیاری دوست! میں اپنے بچے کو اپنی گود میں سمیٹ کر یہاں سے دور جا رہی ہوں۔ کسی ایسی جگہ جہاں اس کی ماں کے ساتھ ہونے والا سلوک ہمیشہ اس کی نظروں سے اوجھل رہے اور وہ ایک باوقار زندگی جی سکے۔ مجھے معاف کرنا۔ اب ہم کبھی نہیں ملیں گے...... لیکن ایک دوسرے کی یادیں تو ہم سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ آخر میں ایک بات اور...... مجھے تھوڑی سی خوشی بھی ہے کہ رائے زل اور ہاناوانی کی شکست میں تھوڑا سا کردار میں نے بھی ادا کیا ہے۔ تمہاری بڑی بڑی قربانیوں کے مقابلے میں یہ ایک چھوٹی سی کوشش تھی لیکن...... خدا نے اسے کامیاب کیا۔ حملے کے وقت میں اس کنٹرول روم میں چلی گئی جہاں سے پیلس کا مین

گیٹ کھلتا اور بند ہوتا تھا۔ جب گیٹ کھلا ہوا تھا میں نے اس کے کنٹرول سسٹم کو توڑ پھوڑ دیا۔

پیاری قسطینا! مجھے کبھی ڈھونڈنے کی کوشش نہ کرنا۔ تمہیں میسج کرنے کے بعد میں یہ سیل فون بھی سمندر میں پھینک رہی ہوں...... تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو فتح مبارک۔ آئندہ زندگی میں اللہ تمہیں بڑی کامیابیوں سے نوازے۔'' زندگی کی آخری سانس تک تمہاری دوست ماریہ۔''

میسج پڑھ کر میں قسطینا کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں دکھ کی پرچھائیاں تھیں۔ ہم ماریہ کے بارے میں گفتگو کرنے لگے۔ قسطینا بولی۔ ''یہ بھی ایک انکشاف ہے کہ مین گیٹ کے سسٹم کو جام کرنے والی ڈاکٹر ماریہ تھی۔ پتا نہیں وہ کس طرح اور کیسے اس جگہ گھسی؟''

''میں آپ کو بتا سکتا ہوں کہ وہ کس طرح اور کیسے گھسی۔'' قسطینا سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھنے لگی۔ میں نے کہا۔ ''میرے پاس ایک فوٹیج ہے جس میں سب کچھ نظر آتا ہے۔''

''فوٹیج...... کیسی فوٹیج؟''

''ان سی سی ٹی وی کیمروں کی فوٹیج جو کنٹرول روم میں تھے...... اور یہ فوٹیج اسی ''چھپے رستم'' نے حاصل کی ہے۔ آپ ابھی جس کا ذکر کر رہی تھیں۔''

میں نے فوٹیج دکھانے کے لیے لیپ ٹاپ آن کر دیا۔ قسطینا کی آنکھوں میں آہستہ آہستہ حیرت کی پرچھائیاں گہری ہونے لگیں۔

○......❖......○

رائے زل کی مسخ لاش ایک تابوت میں ڈال کر نیوسٹی کے سرحدی محافظوں کے حوالے کر دی گئی تھی۔ عارفہ خاتون اور ناظم باذان کی تدفین ہو چکی تھی۔ بیگم نورل کی میت ڈی پیلس میں رکھ دی گئی تھی۔ جاماجی کے ہزاروں لوگ اس کا دیدار کر چکے تھے۔ اگلے روز بیگم نورل کی آخری رسومات میں شرکت کرنے والوں کی تعداد ہزاروں میں نہیں لاکھوں میں تھی۔ قریبی ممالک سے بھی کئی اہم شخصیات نے اس میں شرکت کی۔ مقامی میڈیا کہہ رہا تھا کہ جاماجی کی تاریخ میں اتنا بڑا جنازہ کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ محترم حاذق ذکری نے خود یہ نماز جنازہ پڑھائی۔

بیگم نورل کی آخری رسومات میں، میں نے بھی شرکت کی مگر وہیل چیئر پر...... میرے پاؤں، پنڈلیوں اور ٹانگوں کے زخم، مجھے ابھی تک بہ آسانی چلنے کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔ کلائیوں اور پسلیوں کی جلد والے زخم اب بہتر تھے...... ابراہیم کا علاج بڑی تندہی سے

ہورہا تھا۔ اس کی حالت کے بارے میں ابھی تک کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی جاسکتی تھی۔ تاجور بھی ڈی پیلس میں تھی۔ وہ اس بات پر خوش تھی کہ ہم جنگ کی حالت سے نکل آئے ہیں مگر میری تسلی کے باوجود یہ بات اسے پریشان کرتی تھی کہ ہم جلد از جلد پاکستان روانہ کیوں نہیں ہوتے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ زینب کے پاس اسپتال گئی تھی جہاں ابراہیم زیر علاج تھا۔

آخری رسومات میں شرکت کے بعد میں تھکا تھکا سا کمرے میں بیٹھا تھا کہ شفیق آدھمکا۔ کسی حالت میں بھی اس کی خوش گفتاری پر منفی اثر نہیں پڑتا تھا بولا۔ ''اتنا شاندار جنازہ دیکھ کر تو میرا اپنا دل مرنے کو چاہ رہا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''تمہاری یہ خواہش جلد ہی پوری ہو جانی ہے۔ سجاول سے تمہارے تعلقات ٹھیک نہیں اور اس کا آخری نتیجہ بہرحال تمہاری رحلت کی شکل میں نکلنا ہے۔ ویسے...... حیرانی کی بات ہے...... لڑائی میں تم دونوں نے کندھے سے کندھا ملائے رکھا ہے؟''

''وہ مجبوری تھی جی، جس کی وجہ سے شیر اور بکری نے ایک گھاٹ پانی پیا ہے۔ دشمنی اسی جگہ پر ہے اور اس کا ثبوت میری کمر کا یہ زخم بھی ہے، جس کی وجہ سے میری ساری دلیری مشکوک ہوگئی ہے۔ بہت سے لوگ یہی سمجھتے ہوں گے کہ میں لڑائی میں کسی موقع پر بھاگا ہوں۔''

''سجاول سے اس کا کیا تعلق ہے؟''

''مجھے پورا شبہ ہے جی کہ یہ زخم دستی بم کے دھماکے میں نہیں آیا۔ موقع تاک کر آپ کے امریش پوری نے ہی اپنی کرپان وغیرہ ماری ہے۔ اس قسم کی عیاریاں وہ پہلے بھی کرتا رہا ہے اب دیکھیں کہ خورسنہ صاحبہ کو نرس کے لباس میں دیکھ کر اس نے اپنی ران بھی تو زخمی فرما ہی لی تھی نا۔''

''کبھی کبھی بالکل کوئی لڑاکی سوکن لگتے ہو۔ اگر بدگمانیوں کا مقابلہ ہو تو تم ضرور عالمی ٹائٹل جیت جاؤ۔''

''آپ کو تو کبھی یقین نہیں آئے گا۔ اب آپ دیکھ لیں اس کی کوئی عمر ہے عشق لڑانے کی؟ کل فل رگڑ کر شیو کی ہے اس نے اور مونچھیں بھی چھوٹی کی ہیں اور یہ سب کچھ خورسنہ کی فرمائش پر ہوا ہے۔ میں بھی اڑتے کوئے کے پَر گن لیتا ہوں۔ وہ کیا زبردست محاورہ کہا کرتے ہیں پہلوان حشمت صاحب، بوڑھی گھوڑی اور شہتیروں کو جھپے۔''

میں نے کہا۔ ”اتنی زیادہ عمر بھی نہیں اس کی اور طاقت بھی چھ بندوں جتنی ہے۔“
”ہاں اس بات سے تو میں بھی اتفاق کرتا ہوں۔“
”یعنی تم مانتے ہو کہ طاقت چھ بندوں جتنی ہے؟“
”اوہ...... آپ طاقت کہہ رہے ہیں؟...... میں سمجھا خباثت کہہ رہے ہیں۔“ پھر منہ بنا کر بولا۔ ”یہ سیالکوٹی بہت کھوچل ہے جناب! ایسے بندے بکری میں سے بھینس جتنا دودھ نکال لیتے ہیں۔ مجھے کوئی حیرت نہیں ہوگی اگر خورسنہ جیسی معقول خاتون اس نامعقول کے ساتھ پاکستان جانے کو بھی تیار ہو جائے۔“
ہم بہت دنوں بعد ہلکے پھلکے انداز میں بات کر رہے تھے...... کھڑکیوں سے باہر بہار کی ایک چمکیلی شام کے سائے طویل ہو رہے تھے۔ مگر قدرت کو شاید ابھی ہماری مسلسل مشکلات میں خوشی کا کوئی طویل دورانیہ منظور نہیں تھا۔ ہمیں باتیں کرتے ہوئے دو چار منٹ ہی گزر رہے تھے کہ بن مشہد دھواں دھواں چہرے کے ساتھ ہمارے پاس پہنچا۔ دھیان فوراً ابراہیم کی طرف گیا۔ ”کیا ہوا بن مشہد؟“ میں نے دل کڑا کر کے پوچھا۔
”چھوٹے صاحب...... ابراہیم...... کی حالت اچھی نہیں ہے۔ ڈاکٹر کہہ رہے ہیں کہ ان کے دل کی حرکت کسی بھی وقت بند ہو سکتی ہے۔“
مجھے لگا کہ میری رگوں میں خون جم رہا ہے...... تو کیا وہ برا وقت آ گیا تھا جس کے اندیشے ہمیں دن رات ڈرا رہے تھے...... کیا ابراہیم...... نیک دل، سادہ مزاج، نرم خو ابراہیم...... موت سے اپنی جنگ ہار رہا تھا؟
یہی وقت تھا جب میرے سیل فون کی گھنٹی بھی بجنے لگی۔ دوسری طرف تاجور تھی۔ وہ اشک بار آواز میں بولی۔ ”شاہ زیب! کہاں ہیں آپ...... کیا آپ اسپتال نہیں آ سکتے؟ مم...... مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے۔ ابراہیم کی حالت بہت خراب ہو گئی ہے۔ زینب نے رو رو کر برا حال کر لیا ہے۔ وہ آپ کو بلا رہی ہے۔ کہیں اس کو بھی کچھ ہو نہ جائے۔“
پھر ایک دم پس منظر میں رونے چلانے کی آوازیں سنائی دیں۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہ زینب کی آوازیں ہیں۔ مزید کچھ سننا میرے بس میں نہیں رہا۔ میں نے فون آف کر دیا۔

”کیا ہوا بھائی؟“ انیق نے پریشان لہجے میں پوچھا۔
”انیق! مجھے اسپتال لے چلو...... ابھی اسی وقت...... ابراہیم کی حالت ٹھیک نہیں۔“
”لل...... لیکن آپ تو......“

''چلو، جلدی کرو۔'' میں دہاڑ کر بولا۔

انیق نے وہیل چیئر کو انیکسی کے بیرونی دروازے کی طرف حرکت دی...... اسی دوران میں سیل فون پر پھر کال آئی...... اس مرتبہ قسطینا تھی مگر اب کال ریسیو کرتے ہوئے میرا دل لرز رہا تھا۔ میں کوئی کال سننا نہیں چاہتا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے پانی کی چادر سی تھی...... موت کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ وہ ایک پرچھائیں کی طرح آتی ہے...... اور آنسوؤں، آہوں، دعاؤں اور التجاؤں کے درمیان سے اپنے شکار کو اُچک کر لے جاتی ہے۔ کیا اب بھی وہ ایسا ہی کرنے والی تھی......

O......❖......O

انیق نے میری وہیل چیئر دھکیل کر پورچ میں کھڑی ایک اسٹیشن وین تک پہنچائی۔ ہم اسٹیشن وین پر سوار ہوئے اور تیزی سے ہسپتال کی طرف بڑھے۔ میری نگاہوں میں نوعمر ابراہیم کا چہرہ گھوم گیا تھا۔ کتنی حلیمی اور بردباری تھی، کیسا اجالا تھا، وہ ہر طرح سے ایک نیک روح والا لڑکا تھا اور اب ہڈیوں کا ناقابلِ شناخت ڈھانچا بن کر بسترِ مرگ پر پڑا تھا، وہ موت کے بے رحم شکنجوں میں تھا۔

ایک بار پھر میرے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس مرتبہ پھر تاجور ہی تھی۔ پتا نہیں کہ وہ کیا خبر سنانا چاہتی تھی۔ مجھ میں یہ خبر سننے کا حوصلہ نہیں تھا۔ میں نے کال ریجیکٹ کر دی۔ دس پندرہ منٹ میں ہم ہسپتال پہنچ گئے۔ ہم اس آئی سی یو تک پہنچے جہاں شیشے کی دیوار کے پار ابراہیم زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہا تھا۔ ابراہیم کے بیڈ کے گرد ''کرٹن'' کھڑا کر دیا گیا تھا۔ آئی سی یو سے باہر کئی افراد جمع تھے۔ ان میں شاہی خاندان کے افراد بھی تھے جن میں قسطینا نمایاں نظر آتی تھی۔ اس کے علاوہ کمانڈر فارس جان، بن مشہد، زمان خاں جیسے اہم لوگ بھی دکھائی دے رہے تھے۔ سب کے چہرے دھواں دھواں تھے۔

میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ زینب جیسے ہوش و حواس کھو کر آئی سی یو کے دروازے میں داخل ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ چلّا رہی تھی۔ ''مجھے چھوڑ دو۔ مجھے ان کے پاس جانے دو۔ خدا کے لیے، مجھے ان کے پاس جانے دو۔''

ہسپتال کا عملہ اسے روکنے کی کوشش کر رہا تھا پھر ایک لمبا تڑنگا ملائیشین ڈاکٹر آیا اور اسے جھڑکیاں دینے لگا۔ وہ انگلش بول رہا تھا۔ ''کون ہے یہ؟ کیا کہہ رہی ہے۔''

عملے میں ایک شخص نے کہا۔ ''ان کی بیوی ہے۔''

لمبا تڑنگا ڈاکٹر زینب سے مخاطب ہو کر انگلش میں گرجا۔ ''یہ کیا کر رہی ہو تم، ایسا کر کے

کس کو فائدہ پہنچا رہی ہو۔ ہم کسی کو اندر آنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔''
''پلیز ڈاکٹر...... پلیز۔'' زینب بلکی اور ڈاکٹر کی بغل میں سے نکل کر اندر جانا چاہا۔
ڈاکٹر نے اسے بازو سے تھام لیا۔ ''یہ کیا بیوقوفی ہے۔ یہ کیا طریقہ اختیار کر رہی ہو تم؟''
پھر وہ عملے سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''اس طرح نہیں چلے گا، اس کو باہر نکالو۔''
یہی وقت تھا جب میں نے محترم حاذق ذکری کو دیکھا۔ وہ لمبے چغے میں تھے اور سفید براق ڈاڑھی سینے پر لہرا رہی تھی۔ وہ لمبے تڑنگے ڈاکٹر کے پاس پہنچے اور زینب کا بازو اس کے ہاتھ سے چھڑایا۔ ''ڈاکٹر! یہ کیا کر رہے ہو تم، کس لہجے میں بات کر رہے ہو؟'' وہ رعب دار آواز میں بولے۔
ڈاکٹر نے حاذق ذکری کو دیکھا اور قدرے مرعوب ہوا۔ ذکری دوبارہ بولے۔ ''یہ کوئی عام لڑکی نہیں ہے۔ ابراہیم کی بیوی ہے اور ابراہیم ولی عہد ہے جاما جی کا۔''
''سوری جناب! لیکن ابراہیم صاحب کی حالت انتہائی نازک ہے، اس کے لیے...... آخری کوشش کی جا رہی ہے...... ان کے نزدیک کسی کی موجودگی ہرگز ٹھیک نہیں۔ آپ بس دعا کریں۔''
ذکری خاموش نگاہوں سے ڈاکٹر کی طرف اور دیگر عملے کی طرف دیکھتے رہے۔ ان کے اُجلے چہرے سے جیسے روشنی سی پھوٹتی محسوس ہوتی تھی۔ ایسی روشنی جس میں ایک وجدانی آگاہی تھی۔ انہوں نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ ''ڈاکٹر! مجھے ابراہیم کی حالت کے بارے میں جو کچھ بتایا گیا ہے، وہ تشویش ناک ہے۔ اگر خدانخواستہ...... وہ جا ہی رہا ہے تو پھر ہمیں اس کے لیے آخری حد تک جانا چاہیے۔''
''میں سمجھا نہیں جناب؟'' لمبے تڑنگے سینئر ڈاکٹر نے اُلجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔
''تم زینب کو اس کے پاس جانے دو۔ اس کے پاس بیٹھنے دو۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا وہاں موجود ہونا اتنا ہی ضروری ہو جتنا تمہارا موجود ہونا ضروری ہے۔''
''لیکن جناب......'' وہ کہتے کہتے چپ ہو گیا کیونکہ سامنے سے اس شعبے کا قابل ترین امریکی ڈاکٹر بوشر وائٹ آ رہا تھا۔ سفید لباس اور پُرکشش شخصیت کے ساتھ وہ سراپا مسیحا صفت دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے عقب میں ایک غیر ملکی اور دو تین مقامی ڈاکٹرز تھے۔ لمبے تڑنگے ملائیشین ڈاکٹر نے بوشر وائٹ کو ادب سے سلام کیا۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' بوشر وائٹ نے روتی سسکتی زینب کو دیکھ کر کہا۔
ملائیشین ڈاکٹر دھیمے لہجے میں اسے صورتِ حال سے آگاہ کرنے لگا۔ دو چار فقرے

محترم حاذق ذکری نے بھی بولے۔ میرا خیال تھا کہ ملائیشین ڈاکٹر کا مؤقف مانا جائے گا مگر یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ بوشر وائٹ نے محترم ذکری کی طرف دیکھ کر کچھ کہا، اثبات میں سر ہلایا اور زینب کو اپنے ساتھ لے کر آئی سی یو کے ایریا میں داخل ہو گیا۔ کچھ ہی دیر بعد زینب سبز رنگ کا ''تیمارداری ایپرن'' پہنے اس پردے کے پیچھے جا رہی تھی۔ جہاں ابراہیم موجود تھا۔

محترم ذکری نے ایک مقامی نیورو فزیشن سے سوال جواب کیے، اس نے کہا۔

''حضرت! صورتِ حال لحہ بہ لحہ خراب تر ہو رہی ہے۔ ہز ہائی نس ابراہیم کی مسلسل فاقہ کشی کی وجہ سے ان کی قوتِ مدافعت بالکل ختم ہو چکی ہے۔ نبضیں ڈوب گئی ہیں اور پورا جسمانی نظام جامد ہو چکا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ ان کا ذہن بھی بس پندرہ بیس فیصد تک کام کر رہا ہے۔''

''تمہارا تجربہ کیا کہتا ہے ڈاکٹر! کتنے فیصد امکان ہے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ میری طرف دیکھ کر مؤدب انداز میں بولا۔ ''جناب! یہ جو ہمارا ذہن ہے اپنی طرز کا انوکھا گورکھ دھندا ہے۔ جدید میڈیکل یہی وہ شعبہ ہے جس پر ہماری گرفت کمزور تر ہے۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا کہ طبی حوالے سے کس وقت کیا صورتِ حال پیش آ جائے۔ میرے خیال میں جناب بوشر وائٹ نے ہز ہائی نس کی بیوی کو اگر اس کے قریب جانے کی اجازت دی ہے تو کچھ سوچ کر ہی دی ہے۔ بعض اوقات ایسے مریضوں کا برین کسی جذباتی وابستگی کے سبب بھی رسپانس کرنا شروع کر دیتا ہے لیکن یہاں مسئلہ یہ ہے کہ......''

''ڈاکٹر پلیز۔'' ایک میل نرس کی آواز نے ڈاکٹر کو بات ادھوری چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ اسے اندر بلایا جا رہا تھا۔

میں نے دیکھا اب محترم ذکری کوریڈور کے ایک گوشے میں مصلا بچھائے بالکل خاموش بیٹھے تھے۔ ان کی آنکھیں بند تھیں۔ شاہی فیملی کے کئی افراد بے قراری سے اِدھر اُدھر ٹہل رہے تھے۔ قسطینا اپنی فوجی یونیفارم میں تھی اور اس کا چہرہ بالکل زرد نظر آ رہا تھا۔ میں جانتا تھا وہ ابراہیم سے بہت پیار کرتی ہے۔ وہ ایک ہی چار دیواری میں بہن بھائیوں کی طرح کھیل کر پروان چڑھے تھے۔ قسطینا کی آنکھوں میں بار بار نمی آتی تھی اور فارس جان اسے دلاسا دینے میں مصروف ہو جاتا تھا۔

میں نے انیق کو اشارہ کیا۔ وہ میری وہیل چیئر کو دھکیلتا ہوا انتظار گاہ کے وسیع لاؤنج میں لے گیا۔ یہاں درجنوں لوگ موجود تھے۔ مجھے دیکھ کر ان میں سے اکثر احتراماً کھڑے ہو گئے۔ ان کی آنکھوں میں میرے لیے ستائش، محبت اور ہمدردی کے تاثرات تھے اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی آنکھوں میں میری وہ دل فگار تصویر بھی نقش تھی جس نے ''وائرل'' ہو کر

یہاں ایک انقلابی لہر پیدا کی تھی۔ لوگ میرے قریب آنا چاہتے تھے مگر مسلح محافظوں نے مجھے اور انیق کو حصار میں لے لیا۔ یہاں ایک دیوار پر ایل سی ڈی نصب تھی۔ ہز ہائی نس ابراہیم کی تشویش ناک حالت کی خبر چل رہی تھی۔

مسجدوں اور دیگر عبادت گاہوں میں لوگ ابراہیم کی صحت یابی کے لیے دعا گو تھے۔ منتیں مانی جا رہی تھیں۔ خیرات تقسیم ہو رہی تھی۔ قسطینا کا ایک بیان ٹیلی کاسٹ ہو رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''ڈی پیلس کا اصل قانونی وارث ابراہیم ہے۔ خدانخواستہ اسے کچھ ہو گیا تو عزت مآب کے خانوادے کا آخری چراغ بھی گل ہو جائے گا۔ وہ ہمارے لیے عزت مآب اور بیگم نورل کی آخری نشانی ہے۔''

''ڈاکٹر صاحب باہر آ رہے ہیں۔'' انیق کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

میں نے مڑ کر دیکھا یہ وہی نیورو فزیشن تھا جو ہمیں تھوڑی دیر پہلے ابراہیم کی حالت خطرے میں بتا رہا تھا۔ وہ قریب آیا تو میں نے بیتابی سے پوچھا۔ ''کیا سچویشن ہے ڈاکٹر۔''

''ابھی کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ محترم ڈاکٹر بوشر کی ہدایت کے مطابق وہ لڑکی...... میرا مطلب ہے ہز ہائی نس ابراہیم کی بیوی ان کے پاس موجود ہے۔ اس نے اپنا سر ہز ہائی نس کے کندھے پر رکھا ہوا ہے۔ مدھم آواز میں کچھ بولتی جا رہی ہے۔ شاید پڑھتی بھی جا رہی ہے۔''

''ابراہیم کے جسم میں کوئی حرکت؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔'' ڈاکٹر کا لہجہ سپاٹ تھا۔

O......❖......O

طوفان آتے ہیں اور آ کر گزر جاتے ہیں، ریت اور مٹی پر زندگی کے سارے بام و در پر ان کے نشان رہ جاتے ہیں۔ یہاں بھی ایک طوفان آ کر گزر گیا تھا۔ یہ چار پانچ روز بعد کی بات ہے۔ میں صوفے پر بیٹھا تھا۔ پاؤں اپنے سامنے ایک تپائی پر رکھے ہوئے تھے۔ پاؤں کی حالت اب قدرے بہتر تھی۔ میں نے دیوار گیر کھڑکی سے پار دیکھا۔ ایک روش کے کنارے گلاب کے زرد پھول کھلے ہوئے تھے، ان کے ساتھ ساتھ نرگس، نیلوفر اور صد برگ کے چھوٹے بڑے غنچے بھی تھے۔ زینب عجیب کھوئے کھوئے سے انداز میں ان پھولوں میں گھوم رہی تھی۔ وہ ایک گلدستہ تیار کر رہی تھی۔ ہاں...... ایسا ہی ایک گلدستہ کبھی ابراہیم بھی روزانہ تیار کرواتا تھا اور ایک خادمہ کے ہاتھ زینب کو بھجوایا کرتا تھا۔ یہ اس کی محبت کا ایک

خاموش اور پاکیزہ اظہار ہوا کرتا تھا۔

گلدستہ تیار کر کے زینب کوریڈور میں آ گئی اوڑھنی اس کے سر پر تھی۔ قدم ہموار انداز میں اُٹھ رہے تھے۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ ہم ہسپتال کے اسپیشل روم میں داخل ہوئے۔ ابراہیم سفید بستر پر نیم دراز تھا۔ بے حد کمزور ابھی تک نا قابلِ شناخت لیکن زندہ۔ زینب نے ذرا جھک کر گلدستہ اس کے سرہانے رکھ دیا اور ایک جانب خاموش کھڑی ہو گئی۔

ہاں......طوفان آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔ کبھی کناروں کو اپنے ساتھ بہا کر لے جاتے ہیں اور کبھی کنارے اپنا وجود برقرار رکھنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ابراہیم بھی ایک جان لیوا اور نا قابلِ بیان کشمکش کے بعد زندگی کی طرف لوٹ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ پچھلے کئی ہفتوں بعد یہ پہلا موقع تھا کہ ابراہیم نے مجھے دیکھا اور پہچانا تھا۔ میں آہستگی سے اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے استخوانی ہاتھوں کو حرکت دی اور میرا ہاتھ تھام کر اپنے سینے پر رکھ لیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ سسکیاں لے رہا تھا۔

میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”ابراہیم! اللہ نے تمہیں نئی زندگی دی ہے۔ اس کے لیے جتنا بھی شکر کیا جائے، کم ہے۔“

میرے ہاتھ پر اس کی گرفت مزید سخت ہو گئی۔ زینب کی طرح وہ بھی مجھ پر بے پناہ اعتماد کرتا تھا۔ ان دونوں کو اپنے قریب میری موجودگی بے حد اطمینان بخش محسوس ہوتی تھی۔ ابراہیم کی نگاہ میری کلائیوں کے مندمل ہو جانے والے زخموں پر پڑی۔ وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ جیسے خاموشی کی زبان میں پوچھ رہا ہو۔ ”یہ آپ نے کیا حال بنا لیا ہے اپنا؟ کس کڑی مشکل سے گزرے ہیں آپ؟“

میں نے کہا۔ ”سب ٹھیک ہو چکا ہے ابراہیم۔ برا وقت گزر گیا ہے۔ وہ سویرا طلوع ہو گیا ہے جس کا انتظار یہاں بے شمار لوگوں کو تھا۔ جو تھوڑے بہت اندھیرے گوشے رہ گئے ہیں، وہ بھی بہت جلد روشن ہو جائیں گے۔ تمہارے والد، والدہ محترمہ اور تمہارے بھائی کی طرح ان بے شمار لوگوں کی قربانیاں ضائع نہیں گئیں جنہوں نے اس عظیم جدوجہد میں حصہ لیا ہے۔“

اس کی آنکھوں کے گوشوں سے تازہ آنسو بہہ نکلے۔ زینب نے ٹشو سے اس کے آنسو پونچھے، میں کچھ کہنا چاہ رہا تھا مگر پھر ڈاکٹر بوشر وائٹ کو دیکھ کر خاموش ہونا پڑا۔ وہ تین جونیئر ڈاکٹرز کے ساتھ ابھی کمرے میں داخل ہوا تھا۔ اس نے سب سے پہلے زینب کا سر تھپتھپایا اور ابراہیم سے مخاطب ہو کر انگلش میں بولا۔ ”کیسے ہو رائل بوائے؟“

ابراہیم نے سر کو اثبات میں حرکت دی۔

ڈاکٹر بوشر مسکرا کر بولا۔ ''کبھی کبھی جہاں میڈیکل ناکام ہو جاتی ہے، وہاں سے کوئی کرشمہ پھوٹ پڑتا ہے۔ یہاں بھی ایک کرشمہ ہوا ہے اور مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ یہ کرشمہ اس بچی کے حوالے سے ہوا ہے۔'' اس نے ایک بار پھر زینب کا سر تھپتھپایا۔

وہ گھونگھٹ میں تھی اور اپنے آپ میں سمٹی جا رہی تھی۔

ڈاکٹر بوشر دوبارہ گویا ہوا۔ ''شاید آپ میں سے کچھ لوگ اسے میرا کارنامہ سمجھتے ہوں، مگر سچ یہی ہے کہ اس کیس میں میرا کردار بیس پچیس فیصد سے زیادہ نہیں ہے۔ اخباروں میں میری تصویریں چھپی ہیں اور ٹی وی پر میری تعریفیں ہو رہی ہیں لیکن میں اپنے طور پر کچھ شرمندگی محسوس کر رہا ہوں، میں نے اس میں بہت کم محنت کی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''یہ آپ کی کسرِ نفسی ہے ڈاکٹر! ہم سب جانتے ہیں ''نیورولوجی'' میں آپ کا جو مقام ہے۔''

ڈاکٹر بوشر وائٹ نے جیسے پہلی بار دھیان سے میری طرف دیکھا۔ ''کیا آپ کرشموں پر یقین نہیں رکھتے؟'' پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر کہنے لگا۔ ''آپ کا زندہ بچ جانا بھی تو ایک کرشمہ ہے، مجھے آپ کے سارے حالات معلوم ہوئے ہیں اور اس ٹمپریچر سیل کا بھی معلوم ہوا ہے جہاں آپ کو زندہ ''گرل'' کرنے کی کوشش کی گئی۔ میں نے جہاں آپ کی وہ تصویریں دیکھی ہے جو یہاں چپے چپے پر نظر آتی ہے۔ آپ کی ثابت قدمی نے لوگوں میں ایک ایسا جذبہ پیدا کیا جس نے یہاں کی تاریخ بدل ڈالی۔''

''شکریہ...... لیکن میرے خیالات بھی آپ سے ملتے جلتے ہیں ڈاکٹر! میں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ اس ساری جدوجہد میں میرا کردار اتنا زیادہ نہیں جتنی تشہیر اس کو مل گئی ہے۔ یہاں کوئی بہادری نہیں دکھائی، کوئی کارنامہ سرانجام نہیں دیا، میں نے بس اپنی ہمت کے مطابق برداشت کا مظاہرہ کیا اور اس برداشت کو صلہ ملا۔ لوگوں میں تحریک پیدا ہوگئی۔''

ڈاکٹر بوشر بولا۔ ''کہا جاتا ہے کہ تم ایک بڑے فائٹر ہو۔ ہم نے پہلی بار دیکھا کہ ایک فائٹر نے کوئی لڑائی، لڑے بغیر جیتی ہے۔ اب آپ کے کیا ارادے ہیں؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

''یہ واپس جانا چاہ رہے ہیں۔'' یہ آواز میرے امریکن دوست پال کی تھی جو ابھی ابھی کمرے میں داخل ہوا تھا۔ وہ مجھ سے اور ڈاکٹر بوشر وائٹ سے مصافحہ کر کے بولا۔ ''لیکن مجھے لگتا ہے ڈاکٹر کہ یہاں کے لوگ ان کو واپس نہیں جانے دیں گے۔''

''کیا مطلب؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔ ڈاکٹر کے معاون ابراہیم کی تازہ رپورٹس وغیرہ چیک کرنے میں مصروف تھے۔

پال نے امریکن انداز میں کندھے اچکائے اور بولا۔ ''ان لوگوں نے مسٹر شاہ زیب کو ایک ہیرو کی حیثیت دے دی ہے۔ یہ ان کو اپنے درمیان دیکھنا چاہتے ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق ان کو یہاں بڑے سے بڑا عہدہ مل سکتا ہے اور ایسا مرتبہ بھی مل سکتا ہے جو کبھی اکبر دی گریٹ کے ٹیچر کو ملا تھا، کیا نام تھا اس مغل بادشاہ کے ٹیچر کا...... بیرم خان۔''

''شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اگر جزیرے کا نیا فرمانروا ابراہیم ہے تو پھر وہ نوعمر ہے۔ اسے کسی دبنگ استاد اور مشیر کی ضرورت ہے۔''

پال نے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ ہر ہائی نس قسطینا کی حیثیت یہاں سپہ سالار کی ہوگی...... کمانڈر فارس قسطینا کا دست راست ہوگا۔''

ڈاکٹر بولا۔ ''میں نے سنا ہے کہ...... وہ ایک دوسرے سے محبت بھی کرتے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ مستقبل میں ان کی شادی بھی ہو جائے۔''

''یہ عین ممکن ہے ڈاکٹر۔''

میں یہ باتیں سن سن کر حیران ہو رہا تھا۔ شاید ٹھیک ہی کہا جاتا ہے کہ امریکن جس خطے میں جاتے ہیں، وہاں کے حالات کو مقامی لوگوں سے بہتر جاننا شروع کر دیتے ہیں۔ وہ جو کہا جاتا ہے کہ نالج از پاور...... شاید ٹھیک ہی کہا جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ لوگ اس پاور کا درست استعمال کرتے ہیں اور کچھ نہیں۔ ایجنسی کے لالچی امریکنوں نے اس پاور کو یہاں انتشار پھیلانے اور قبضہ جمانے کے لیے استعمال کیا اور انہی جیسے ایک امریکن پال کورنی نے ہمارے کندھے سے کندھا ملایا اور ایک دوسرے امریکی نے پال کی کال پر ابراہیم کی مسیحائی کی۔

زینب دوسرے کمرے میں جا چکی تھی۔ ڈاکٹر بوشر اپنی پیشہ ورانہ مصروفیت کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس نے نہایت انہماک سے ابراہیم کی تازہ رپورٹس دیکھیں اور ان کا معائنہ کیا۔ وہ مطمئن نظر آ رہا تھا۔ میرے دو تین سوالوں کے جواب اس نے بڑی خندہ پیشانی سے دیئے اور بتایا کہ ابراہیم کا جسم دیرینہ زہر خورانی کا عادی ہو چکا تھا لیکن اس نے اپنے جسم کو اس علت سے نکالنے کے لیے فاقہ کشی کی ایسی کڑی سزا دی ہے کہ اب حالات بہت بہتر ہیں اور اندر کی کیمسٹری میں نہایت مثبت تبدیلیاں آ چکی ہیں۔

O......❖......O

خواجہ سرا خیام بھوں بھوں رو رہا تھا۔ اس کے فربہ جسم پر قیدیوں والا لباس تھا اور دونوں ہاتھ سامنے کی طرف ہتھکڑی میں جکڑے ہوئے تھے، ایک تنومند سپاہی نے ہتھکڑی کی زنجیر تھام رکھی تھی۔ خیام کو فوجی عدالت نے پھانسی کی سزا سنائی تھی اور وہ رحم کی اپیل کے ساتھ میرے سامنے موجود تھا۔ خیام پر سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ وہ شریف گھرانوں کی نوخیز اور خوش شکل لڑکیوں کو لالچ اور سخت دباؤ کے ذریعے ڈی پیلس تک پہنچاتا تھا۔ انہیں باقاعدہ ناچ گانے پر مجبور کرتا تھا اور پھر انہیں رائے زل کی ''خدمت'' میں پیش کیا جاتا تھا۔ ان میں سے کچھ کو رائے زل اپنے لیے پسند کرتا تھا اور باقی اس کے مصاحبوں کے حصے میں آتی تھیں۔

میرے سامنے روتے اور ہاتھ جوڑتے جوڑتے خیام مانش نے اچانک ایک حیران کن حرکت کی۔ وہ کسی چوپائے کی طرح اپنے گھٹنوں اور ہاتھوں پر ہو گیا۔ اس نے سر نیچے جھکایا اور میری ایک جوتی، جو پاس ہی پڑی تھی اپنے منہ میں دبا لی۔ پتا چلا کہ مقامی رواج کے مطابق یہ عاجزی اور منت سماجت کی حد تصور کی جاتی ہے۔

میں نے کہا۔ ''خیام! اب تجھے پھانسی کا پھندا اپنے سامنے نظر آ رہا ہے، ایسے وقت تو توبہ کا دروازہ بند ہو جاتا ہے...... مجھے سب یاد ہے...... تُو نے زینب کے ساتھ کیا سلوک کیا اور اس کے علاوہ بھی، پتا نہیں تُو معصوم لڑکیوں کے ساتھ کیا کیا کرتا رہا ہے، پتا نہیں ان میں سے دو چار تیرے ستم کی وجہ سے جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھی ہوں۔''

میری جوتی منہ میں دبائے دبائے اس نے شدومد سے انکار میں سر ہلایا اور ناقابل شناخت آواز میں پتا نہیں کیا کیا کہنے لگا۔ وہ بنگالی لہجے کی اردو بولتا تھا، اب تو جوتی بھی اس کے منہ میں تھی، اس کا کوئی لفظ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

میرے اشارے پر سپاہی نے جوتی اس کے منہ سے کھینچی۔ اس نے اپنا سر فرش پر ٹیک دیا، میں نے کہا۔ ''تجھے یاد ہو گا تُو میرے ٹمپریچر سیل میں آیا تھا اور میرے ساتھ بڑی ''محبت'' سے پیش آیا تھا۔''

میرے طنز پر وہ تڑپ اُٹھا۔ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ''اس وقت کو یاد کر کے ہام نے کئی بار اپنے شریر (سر پر) اپنے ہاتھوں سے جوتا مارا ہے...... آپ بھی مارو۔ ہام کو ننگا (ننگا) کر کے مارو۔''

وہ کسی پالتو جانور کی طرح میرے سامنے کروٹ کے بل لیٹ گیا۔ وہ زندگی کے لیے تڑپ رہا تھا۔ کل سویرے اسے چند دوسرے مجرموں کے ساتھ ڈی پیلس کے سامنے پھانسی

چڑھا دیا جانا تھا۔

ان سنگین لمحوں میں بھی میرے اندر ایک مسکراہٹ سی بکھر گئی۔ مجھے وہ وقت یاد آیا جب اس خبیث ہیجڑے نے ٹمپریچر سیل میں آ کر مجھے ٹارچر کیا تھا اور میں نے بے بس ہونے کے باوجود اسے جواب دیا تھا۔ اپنی دونوں بندھی ہوئی ٹانگیں میں نے اسے رسید کی تھیں اور لوٹ پوٹ کر دیا تھا۔ غالباً اس کے ایک دو مہرے بھی ہل گئے تھے وہ دردناک انداز میں چلا تا رہا تھا...... ہمارکی ہوڈی (ہڈی) توڑ ڈالی۔

میں دل ہی دل میں اس کی پھانسی کی سزا، قسطینا سے معاف کرانے کا ارادہ کر چکا تھا۔ میری سفارش پر یہ سزا عمر قید میں تبدیل ہونے والی تھی۔ بہر حال میں اس سے کچھ اگلوانا بھی چاہتا تھا۔ میرے سب سوالوں کے جواب خیام نے اس طرح دیئے تھے جیسے وہ کوئی روبوٹ ہو یا پھر ٹیپ ریکارڈ جو بٹن دبانے پر فرفر بولنا شروع کر دے۔ اس نے رائے زل اور اس کی ماں کی زندگی کے کئی خفیہ گوشوں سے نقاب اٹھایا۔ رائے زل کی خباثتوں کا ذکر کرتے ہوئے اس نے بتایا کہ اس کا جسم شروع سے ہی بہت موٹا اور بے ڈول تھا۔ وہ اپنی ہم نشیں عورتوں اور لڑکیوں کے سامنے تنہائی میں بھی بے لباس نہیں ہوتا تھا مگر پھر ایک دم اس کی ساری جھجک دور ہوگئی، بلکہ ایک طرح کی بے باکی و بے شرمی اس کے اندر آ گئی۔ اپنی نیوسٹی والی رہائش گاہ میں اس نے ایک بہت بڑا حمام تیار کروایا تھا۔ جس میں گرم پتھروں پر پانی ڈال کر بھاپ پیدا کی جاتی تھی اور اس بھاپ سے ''اسٹیم باتھ'' کا لطف اٹھایا جاتا تھا۔ اس لطف اندوزی کے دوران میں خوبرو لڑکیاں بھی اس کے ساتھ ہوتی تھیں اور وہ اپنے لیے لباس کا تکلف نہیں کرتا تھا۔ خیام نے رائے زل کی بداعمالیوں کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ ڈی پیلس میں بھی رائے زل، مرحوم ریان فردوس کے حمام کو ایسے ہی مشاغل کے لیے استعمال کرتا رہا ہے۔ ایسے مشاغل کے دوران میں کئی بار ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ کسی لڑکی کی طرف راغب ہوتا تھا اور دوسری لڑکیوں کی موجودگی کی پروا کیے بغیر اس کو اپنی قربت کا ''اعزاز بخشتا'' تھا۔ بقول خیام ایک دن رائے زل نے ڈاکٹر ماریہ کو بھی دوسری لڑکیوں کے سامنے اسی قسم کی ''صورتِ حال'' سے دوچار کیا تھا۔

اس جنس زدہ شخص کے واقعات بہت طویل تھے۔ خیام اپنی جان بچانے کے لیے ہر بات کھول کھول کر بیان کر رہا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ ایک موقع پر رائے زل نے اپنی ماں کے کہنے پر اپنے نہایت بے ڈول جسم کو اسمارٹ بنانے کے لیے ورزشیں شروع کی تھیں مگر اس کی خوش خوراکی اور شراب نوشی نے اس کی کوئی پیش نہ چلنے دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے خود کو

بالکل ہی مادر پدر آزاد چھوڑ دیا اور پھیلتا چلا گیا۔

میرے تصور میں وہ مناظر آ گئے، جب میری چلائی ہوئی گولی نے رائے زل کی عین شہ رگ کو نشانہ بنایا تھا پھر اس کا تڑپتا پھڑکتا چربیلا جسم، جسے سجاول کی کٹار نے ایک ہی وار میں سر سے محروم کر دیا تھا اور اس کا بہی خواہ آقا جان...... جسے بندر یا لوسی نے ہیلی کاپٹر سے کھینچ کر پختہ چھت پر پٹخا تھا اور دانتوں سے نوچ ڈالا تھا۔ وہ سارے تہلکہ خیز مناظر نگاہوں میں گھوم گئے۔

مجھے لگا کہ اگر خیام میرے سامنے کچھ دیر مزید ایسے ہی روتا بلکتا رہا تو اسے دل کا دورہ پڑ جائے گا یا برین ہیمرج ہو جائے گا۔ میں نے اسے صاف تو نہیں بتایا کہ میں اس کی پھانسی کو عمر قید میں تبدیل کروانے کا ارادہ کر چکا ہوں، بہرحال اتنا کہا کہ میں اس بارے میں سوچتا ہوں، اس کے لیے اتنی تسلی بھی ''برین ہیمرج'' جیسی ہی تھی۔ وہ جیسے بیہوش ہونے کے قریب تھا۔ اس کے منہ سے رالیں بہہ رہی تھیں۔ میرے اشارے پر سپاہی اسے کھینچتے ہوئے باہر لے گئے۔

اسی دوران میں انیق ٹہلتا ہوا اندر آ گیا۔ وہ حسب معمول اوٹ پٹانگ لباس میں تھا۔ قمیص سامنے سے پینٹ کے اندر اور پیچھے سے باہر تھی۔ میں پوچھتا تو وہ یقیناً یہی گھسا پٹا جواب دیا کہ قمیص سامنے سے اور پینٹ پیچھے سے پھٹی ہوئی ہے۔

میں اس وقت انیکسی کے ہی ایک کمرے میں موجود تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''کہاں سے تشریف لا رہے ہو؟''

وہ بولا۔ ''کچھ ضروری شاپنگ کرنے گیا تھا۔ پاکستان جانے سے پہلے جزیرے کی کچھ سوغاتیں تو ہمارے پاس ہونی چاہئیں۔''

''خیر اتنی جلدی بھی ہم نہیں جا رہے۔ ابھی آٹھ دس روز تو لگ ہی جائیں گے۔''

''یہ آپ اتنے ڈھیلے کیوں پڑے ہوئے ہیں؟ کہیں یہ تو نہیں سوچ رہے کہ کوئی اور پھڈا شروع ہو جائے اور ہم دوبارہ یہاں پھنس جائیں باجی تاجور سمیت۔'' اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔

میں نے گھور کر دیکھا تو وہ جلدی سے دوسری جانب دیکھنے لگا۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں دیر کر رہا ہوں تو اس کا ایک معقول جواز ہے۔ میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''سجاول، کہاں ہوگا؟''

وہ چمک کر بولا۔ ''امریش پوری کو اب بھول جائیں جی، وہ گوڈے گوڈے بلکہ گردن

گردن عشق میں دھنس گیا ہے، اس وقت بھی خورسنہ کے گھر میں ہوگا اور اس کے بیٹے کے ساتھ آنکھ مچولیاں کھیل رہا ہوگا۔ ایک نمبر کا بہروپیا ہے۔ اتنی تیزی سے اس نے خود کو بدلا ہے کہ حیرانی ہوتی ہے یا پھر یوں کہا جائے کہ عورت چیز ہی ایسی ہے جو بندے کو بدل دیتی ہے، میرا تو کسی وقت جی چاہتا ہے کہ ایک نیکی کروں۔ پوچھیں کون سی؟"

"نیکی اور پوچھ پوچھ۔"

وہ بولا۔ "سوچتا ہوں کہ اس نیک بی بی خورسنہ کو جا کر سب کچھ صاف صاف بتا دوں، کہہ دوں کہ وہ جس کو ہیرو سمجھ بیٹھی ہے وہ پرلے درجے کا ولن ہے۔ باقاعدہ ایک سند یافتہ ڈکیت ہے۔ بے شمار گھر لوٹ چکا ہے، اَن گنت لوگوں کو اغوا کر چکا ہے، درجنوں سہاگ اُجاڑ چکا ہے۔"

انیق کے لہجے میں سنجیدگی تھی، میں نے کہا۔ "فضول باتیں نہ کرو، کہیں سچ مچ کچھ بک نہ دینا۔"

"آپ اسے بکنا کہتے ہیں۔ ایک نہایت خوبصورت اور خوش اخلاق خاتون کو سجاول امریش پوری جیسے خطرناک شخص سے بچانا نیکی ہے، کیا آپ مجھے اس نیکی سے روکنا چاہتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "نیکی حلال ہے لیکن خودکشی حرام ہے اور تمہارا یہ اقدام ان شاء اللہ خودکشی کے برابر ہی ہوگا۔ سجاول نے پہلے ہی خود پر پتا نہیں کیسے ضبط کر رکھا ہے، وہ پاکستان روانہ ہونے سے پہلے ہی تمہیں مرحومین کی صف میں لا کھڑا کر دے گا۔"

وہ منہ بنا کر بولا۔ "آپ مانیں یا نہ مانیں لیکن میری اطلاعات یہ ہیں کہ امریش پوری، ہر طرح سے خورسنہ کے تیرِ نظر کا شکار ہے۔ وہ آج کل اس سے کہہ رہا ہے کہ وہ اس کے ساتھ پاکستان چلے لیکن وہ آمادہ نہیں ہے۔ وہ امریش پوری کو شاید پسند تو کرتی ہے لیکن اس کی طرح بے مقصد زندگی نہیں گزار رہی۔ وہ آزادی کی جدوجہد کرنے والی ایک سرگرم تنظیم کی رکن ہے اور یہاں اپنا کام جاری رکھنا چاہتی ہے۔"

"پھر کیا نتیجہ نکلے گا؟"

"امریش پوری اسے سبز باغ تو دکھا رہا ہے۔ اس کے بیٹے کو بھی اس نے ہاتھوں پر ڈالا ہوا ہے، دیکھیں کیا بنتا ہے۔"

"جو کچھ بھی ہے، تم اس کہانی میں کیدو بننے کی کوشش نہ کرو، کوئی انسان بھی سدا کے لیے برا نہیں ہوتا۔ کیا پتا کہ سجاول کل وہ نہ رہے جو آج ہے۔"

''یہ قیامت کی نشانیاں ہیں کہ آپ سجاول جیسے ڈاکو کو رانجھا کہہ رہے ہیں، ایسے موقع کے لیے اپنے حشمت پہلوان نے کیا خوب کہا ہوا ہے۔

رانجھے کے قول و فعل میں تھا تضاد بہت
حقیقت میں کیا اس نے ہیر کو برباد بہت
عمل کیا نہیں اور کرتا رہا گلاں ہی گلاں
دانے کے بغیر ڈالی کھیت میں کھاد بہت

اسی دوران میں میرے پاؤں کی مرہم پٹی کرنے والے ڈاکٹر صاحب آ گئے اور انیق کی چرب زبانی کو بریک لگ گئے۔

○......❖......○

اسی شام کا واقعہ ہے۔ مجھے سجاول والے کمرے سے بلند آواز میں بولنے کی صدا آئی۔ یہ سجاول ہی تھا اور سہ پہر کے وقت انیکسی میں لوٹا تھا۔ اس کے سر میں درد ہو رہا تھا اور مجھ سے اس کی ملاقات مختصر ہوئی تھی۔ اب پتا نہیں کہ وہ کس پر برس رہا تھا۔ میں نے اپنے پاؤں پر مناسب انداز میں وزن ڈالا اور باہر نکل کر دیکھا۔ سجاول والے کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک مقامی لڑکی ذرا گھبرائی ہوئی سی کمرے سے نکلی۔ وہ کسی طرف دیکھے بغیر سیدھی پورچ والے راستے کی طرف بڑھ گئی۔ جونہی وہ نظروں سے اوجھل ہوئی، مجھے سجاول کے کمرے سے ایک زوردار کڑاکا سنائی دیا۔ یوں لگا جیسے لکڑی کی کسی شے کے پرخچے اُڑ گئے ہیں۔

میں تیزی سے آگے گیا اور سجاول کے کمرے کا دروازہ کھولا۔ وہ کمرے میں نہیں تھا۔ واش روم میں پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ شاید تین چار سیکنڈ پہلے تک وہ کمرے میں ہی تھا۔ یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ کمرے کے قالین پر ساگوان کی ایک چھوٹی میز کے ٹکڑے پڑے تھے۔ اس کے ساتھ ہی تاج محل کا ایک ماڈل بھی تھا۔ یہ خوبصورت ماڈل قدرے چھوٹے سائز کا تھا اور چاندی کا بنا ہوا تھا مگر میز کی طرح اس کی حالت بھی بری تھی۔ وہ ایک طرف سے پچک گیا تھا۔ جیسے کسی ہتھوڑے سے اس پر ضرب لگائی گئی ہو مگر ہتھوڑا یہاں کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

میرے دل نے گواہی دی کہ سجاول نے اپنا طوفانی مکا استعمال کیا ہے، اور دونوں چیزوں کو چکنا چور کر دیا ہے۔ غالباً اس نے تاج محل کے ایک فٹ اونچے نقرئی ماڈل پر ضرب لگائی تھی اور ماڈل جس میز پر پڑا تھا، اس کا بھی بیڑا غرق ہو گیا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہ خوبصورت ماڈل شاید ابھی تھوڑی دیر پہلے خورسنہ کی طرف سے ہی سجاول کو بھیجا گیا ہے۔

اسی دوران میں سجاول بھی واش روم سے نکل آیا، اس کا سر اور کندھے وغیرہ پانی میں شرابور تھے۔ شاید اس نے اپنا طیش کم کرنے کے لیے خود کو شاور کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ اگر واقعی ایسا تھا تو پھر اس کی کوشش کامیاب رہی تھی۔ وہ اب کافی حد تک نارمل دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ ذرا حیران ہوا۔ ''تم یہاں؟'' اس نے کہا۔

''تمہارے کمرے کا کھڑاک سنا تو آ گیا۔''

''کچھ نہیں یار! ایسے ہی ذرا ''پھرکی'' گھوم گئی تھی۔ یہ زنانیاں بھی بس وکھری ٹائپ کی مخلوق ہوتی ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''وکھری ٹائپ کی نہ ہوتیں تو باوا آدم جنت سے کیوں نکلتے۔ لیکن یہ بات بھی ہے کہ اس دنیا میں زیادہ تر رنگ روغن اور رونق زنانیوں کی وجہ سے ہی ہے۔''

''چلو دفع کرو اس بات کو۔ مجھے بتاؤ ہماری واپسی کب ہو رہی ہے۔''

''بس چند دن اور۔ باناوانی کا دم خم تو نکل گیا ہے۔ اب وہ اپنے زخم چاٹ رہی ہے۔ لگتا یہی ہے کہ اب وہ کافی عرصے تک سر نہیں اٹھائے گی اور اگر اٹھائے گی تو قسطینا اور کمانڈر فارس جان مل کر اسے کچل دیں گے۔ قسطینا کی خواہش یہ ہے کہ ابراہیم ذرا مزید بہتر ہو جائے تو وہ اسے اپنے ہاتھوں سے عزت مآب کی گدی پر بٹھائے اور ہم بھی اس وقت موجود ہوں۔''

''یار! یہ ساری بیکار کی باتیں ہیں جو ہونے والا کام تھا وہ ہو چکا ہے، اب ہمیں یہاں سے نکلنا چاہیے۔''

میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''یہ اس تاج محل کے ماڈل کو کس جرم میں سزا دی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ تمہیں...... خورسنہ نے تحفہ بھیجا ہوگا۔''

اس نے بوتل کھول لی تھی۔ وہسکی کا ایک طویل کڑوا گھونٹ لیتے ہوئے بولا۔ ''چھوڑو یار اس کی بات۔ وہ بچے والی ہے اور ایسی زنانیوں کے لیے اپنے بچے سے بڑھ کر کوئی نہیں ہوتا۔ میں خوامخواہ اپنی مت مارنا نہیں چاہتا۔ پہلے ہی کوئی کم سیاپے نہیں ہیں۔''

کہنے کو تو وہ کہہ رہا تھا مگر اس کے لہجے کے اندر گہرائی میں کہیں کوئی کرب بھی چھپا ہوا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ پچھلے چوبیس گھنٹے میں سجاول اور خورسنہ کے درمیان کوئی ایسی بات ضرور ہوئی ہے جس کے سبب سجاول غم و غصے میں ہے۔

بڑی حیرت کی بات تھی۔ وہ اپنے کوٹلی والے ڈیرے پر اکثر کہا کرتا تھا، خوبصورت عورت، دل کو لگانے والی چیز نہیں، وہ بس استعمال کے لیے ہوتی ہے۔ ایک نہیں دوسری سہی، دوسری نہیں تیسری سہی۔ وہ تاجور کے حوالے سے مجھے بھی ایسے ہی مشورے سے نوازا کرتا

تھا۔ تب اس کا خیال تھا کہ ڈیرے کے اندر تاجور میرے قبضے میں ہے، میں اس کے ساتھ عیش کروں اور پھر اسے اس کے منگیتر ساتے وغیرہ کے حوالے کر دوں۔ آج وہی دبنگ سجاول اندر سے کچھ زخمی محسوس ہو رہا تھا بلکہ خاصا زخمی۔

وہ جھنجھلایا ہوا تھا۔ میں نے اسے زیادہ کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔ ویسے بھی شراب کی بُو اب مجھے بری لگنے لگی تھی۔ میں نے اس سے سنبل کی خیر خیریت دریافت کی اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

اگلے روز میں نے نہ صرف چہل قدمی کی بلکہ جسمانی توانائی بحال کرنے کے لیے ہلکی پھلکی ورزشیں بھی کیں۔ رات کا کھانا ہم سب نے اکٹھے کھایا۔ سجاول، سنبل، انیق، تاجور ہم سب موجود تھے۔ اگر کوئی نہیں تھا تو سیف عرف سیفی نہیں تھا۔ اس کی یاد نے ہم سب کو ملول کر دیا۔ اس کی باتیں، اس کے دلنشیں قہقہے میرے کانوں میں گونجنے لگے اور پھر اس کا آخری فقرہ ''استاد جی...... آپ مجھ سے...... ناراض تو نہیں......''

کھانے کے بعد میں کافی دیر افسردہ رہا۔ انیق میرا مزاج شناس بن چکا تھا۔ میری افسردگی یا پریشانی دیکھ کر وہ میرے اردگرد ہی موجود رہتا تھا اور میرا دھیان بٹانے کی کوشش کرتا تھا۔

کہنے لگا۔ ''شاہی بھائی! اگر آپ کو آپ کی کوئی کھوئی ہوئی قیمتی چیز واپس مل جائے تو آپ کو کیسا لگے گا۔''

میں نے ذرا چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

وہ جھٹ بولا۔ ''زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں باجی تاجور کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ یہ ایک بے جان چیز ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کو اس کے گم ہونے کا دکھ رہا ہو گا۔''

''کچھ بکو بھی۔'' میں نے کہا۔

اس نے اپنی بند مٹھی میرے سامنے کی اور پھر کھول دی۔ میں واقعی ششدر رہ گیا۔ یہ چنے کی دال کے دانے جتنا وہی جدید اور نایاب اسپائی کیمرا تھا جو لڑائی کے وقت ڈی پیلس سے نکلتے ہوئے یہیں رہ گیا تھا۔ اس وقت یہ کیمرا ڈاکٹر ماریہ کی رہائش گاہ پر لگا ہوا تھا۔ وہاں میں نے اسے خود نہیں لگایا تھا بلکہ یہ قسطینا کے آفس سے کچھ دیگر سامان کے ساتھ ڈاکٹر ماریہ کے گھر پہنچا تھا۔ (کیمرا جس کمرے میں تھا، زینب بھی وہیں رہائش پذیر تھی) جب ہم گھمسان کی لڑائی میں ڈی پیلس سے نکل گئے تو کیمرا یہیں رہ گیا۔ رائے زل کی شکست کے بعد ڈی پیلس میں واپس آ کر مجھے اس کیمرے کا خیال آیا تھا مگر اسے ڈھونڈنا بیکار تھا۔ مارٹر

گولوں سے وہ سارا گھر ہی تباہ ہو چکا تھا جہاں کبھی ماریہ رہائش پذیر تھی۔ اب یہ کیمرا عقابی نگاہ رکھنے والے انیق کے ہاتھ میں نظر آرہا تھا۔

اس نے مجھے یہ بتا کر حیران کیا کہ ڈی پیلس سے نکلتے وقت اس نے یہ کیمرا ڈیکوریشن پیس سے علیحدہ کر کے محفوظ کر لیا تھا۔ ٹاپو کی زیر زمین پناہ گاہ میں پہنچ کر وہ مجھے اس کیمرے کے حوالے سے سرپرائز دینا چاہتا تھا مگر پھر سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا۔ میں کیپٹن تبارک اور سیف پناہ گاہ سے نکلنے کے بعد پکڑے گئے اور یہ کیمرے والی بات وہیں رہ گئی۔

انیق نے کہا۔ ''کبھی کبھی قسمت میرا بہت ساتھ دیتی ہے۔ وہاں ٹاپو والی پناہ گاہ میں بھی ایسا ہی ہوا۔ مجھے وہاں ایک چھوٹے سے ڈکٹافون کی بیٹری مل گئی، اسی بیٹری میں تھوڑی سی تبدیلی کر کے میں نے آپ کے اس جادوئی کیمرے کو چالو کر لیا۔ اب یہ پھر آپ کے لیے آئینہ جہاں نما کا کام دے سکتا ہے۔''

میں نے ننھے سے کیمرے کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ ''مجھے حیرت ہو گی اگر یہ اب بھی کام کرے گا۔''

''ہاتھ کنگن کو ''آرسی کولا'' کی بوتل کیا...... میں نے ثبوت کے لیے اس سے ایک چھوٹی سی ویڈیو بھی بنالی ہے۔ دیکھ کر آپ کا دل خوش ہو جائے گا۔ آپ کے امریش پوری کی ہے۔''

''تیرا بیڑا اغرق۔ وہ سچ مچ تیری جان لے لے گا۔ کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کرنا۔''

''حرکت تو اب ہو چکی ہے جناب! لیکن ویڈیو ہے کمال کی۔ سمجھیں شیر کی کچھار میں گھس کر اس کا کچا چٹھا کھولا ہے۔ کل شام جب امریش پوری، سنبل کو دیکھنے گیا تھا، میں نے اس کے کمرے میں گھس کر یہ کیمرا بریکٹ فین کے ساتھ چپکا دیا۔ اب دیکھیے اس کی کارکردگی۔''

اس نے پھرتی سے اپنے سیل فون کو ویڈیو ریسیور کی ایپلی کیشن پر کیا اور کیمرے کو اس سے منسلک کر دیا۔ چند ہی سیکنڈ بعد واضح تصویر نمودار ہوئی، فریم میں سجاول نظر آیا جو کسی جنگلی بھینسے کی طرح پھیل کر بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ صندوق جیسا چوڑا چکلا سینہ بالوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ زیریں جسم پر صرف شلوار تھی۔ دروازے پر ہونے والی دستک نے اسے چونکایا۔ ''کون ہے؟'' اس کی بھاری آواز سنائی دی۔

جواب میں جو کچھ کہا گیا، وہ ریکارڈ نہیں ہوا۔ سجاول نے جلدی سے لمبا کرتہ پہنا وہسکی کی بوتل بیڈ کے نیچے گھسائی اور فریم سے نکل گیا۔ دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ پھر سجاول کے

ساتھ ایک عورت فریم میں داخل ہوئی۔ وہ ڈی پیلس کی کوئی ملازمہ ہی لگتی تھی۔ مگر عام ملازماؤں کے برعکس اس نے چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔ جب اس نے چہرہ کھولا تو میں ششدر رہ گیا۔ وہ سرو قامت جاذب نظر خورسنہ تھی۔ اس نے چادر اپنے کندھوں پر ڈال لی اور شکایتی نظروں سے سجاول کو دیکھنے لگی۔ ''کیا بات ہے تم مجھ سے ناراض ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''تم یہاں کیوں آئی ہو، یہ بالکل ٹھیک نہیں ہے۔''

''اور تم جو کر رہے ہو، وہ ٹھیک ہے؟ اگر میں تمہاری بات ماننے سے مجبور ہوں تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہمارے درمیان دوستی اور محبت کا رشتہ بھی ختم ہو گیا، کیا ہمارا تعلق اتنا ہی کمزور ہے کہ ایک دوسرے کے پاس رہنے سے ہی برقرار رہ سکتا ہے۔''

''یہ باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں خورسنہ! میں سیدھا سادہ بندہ ہوں یا تو تم میرے ساتھ ہو یا پھر نہیں ہو اور اگر نہیں ہو تو بھی کوئی بہت زیادہ ناراضی نہیں ہے، تھوڑی سی پریشانی ہے.....دس بیس دنوں میں وہ بھی ٹھیک ہو جائے گی۔''

وہ ایک ادا سے اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اب وہ بالکل کیمرے کے سامنے تھی۔ اس کی صراحی دار گردن، ہنسلی کی ابھری ہوئی ہڈیاں، چمکیلے رخسار، ریشمی بال، وہ لڑکی نہیں تھی مگر ایک دلکش اور بھرپور خاتون کی ساری خوبیاں اس میں نظر آتی تھیں۔ سجاول نے کہا تھا، بس تھوڑی سی پریشانی ہے۔ خورسنہ نے ذرا شوخی سے اس کی بات دہرائی۔ ''کیا واقعی تھوڑی سی پریشانی ہے؟''

''ہاں تھوڑی سی ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ تم یہاں سے ناراض جاؤ گے اور میرے دل پر اور میرے بیٹے کے دل پر ایک بوجھ چھوڑ جاؤ گے۔ وہ تم سے بہت پیار کرنے لگا ہے۔ اس نے کوئی ایسی کہانی پڑھی ہوئی ہے جس میں ہندوستان سے ایک نڈر ہیرو آتا ہے اور یہاں ایک جزیرے پر پھنسے ہوئے لوگوں کو ایسے خونی مگرمچھوں سے نجات دلاتا ہے جو پانی میں تو تیرتے ہی ہیں لیکن زمین پر بھی گھوڑے کی طرح دوڑتے ہیں۔'' وہ ہنس دی۔

''خورسنہ! میں نے تمہیں اپنی ساری کہانی سنا دی ہے۔ میں کوئی ہیرو شیرو نہیں ہوں۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ شاید تم نے میری بات نہ مان کر چنگا ہی کیا ہے۔ وہاں پاکستان جا کر تمہیں میرے بارے میں ایسی باتوں کا پتا چلنا تھا جو تمہیں اور ذیشان کو دکھ دیتیں۔''

(ذیشان خورسنہ کے خورد بیٹے کا نام تھا)

''مجھے تمہاری کسی بات سے دکھ نہیں پہنچ سکتا سجاول! اور نہ ہی یہ باتیں میرے لیے اہم

ہیں۔ اگر میں یہاں رہنا چاہتی ہوں تو اس کی کچھ اور وجوہات ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ ابھی جاماجی کی آزادی کا سفر مکمل نہیں ہوا۔ ابھی اور بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ ابھی ہم نے باناوانی کے طلسم کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنی ہے، ابھی......"

"ابھی تم کو بہت کچھ کرنا ہے۔" سجاول نے جل کر اس کی بات کاٹی۔ "مجھے پتا ہے تمہارا وقت بہت مہنگا ہے بلکہ جو وقت تم یہاں میرے پاس گزار رہی ہو، یہ بھی ضائع ہو رہا ہے۔ تمہیں یہاں آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔" وہ جھلائے ہوئے انداز میں کیمرے کے فریم سے نکل گیا۔

خورسنہ کچھ دیر عجیب نظروں سے اس کی جانب دیکھتی رہی پھر گردن کو ذرا خم دے کر بولی۔ "اور تم یہ بھی کہہ رہے ہو کہ ناراض نہیں ہو؟"

جواب میں سجاول نے کچھ کہا مگر اس کی ویڈیو آ رہی تھی نہ آڈیو واضح سنائی دے رہی تھی۔ خورسنہ نے ایک گہری سانس لی اور سجاول کی طرف بغور دیکھتے ہوئے آگے بڑھی۔ وہ سجاول کا ہاتھ تھام کر اسے صوفے تک لے آئی۔ اسے بٹھا کر بولی۔ "اگر میں تمہیں ایک آفر دوں تو مان لو گے؟"

وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

خورسنہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "سجاول! تم یہیں رہ جاؤ ہمارے پاس۔ ہم تینوں یہاں بہت خوش رہیں گے۔ بڑی خوشی اور بڑی آسائش کے ساتھ۔ میرے والد صاحب نے میرے لیے بہت کچھ چھوڑا ہے۔ ہم دونوں بھی محنت کریں گے، ایک بڑا خوشحال گھرانا بنائیں گے۔ تمہاری بہن کی تو شادی ہو جانی ہے۔ تم اپنی والدہ کو بھی یہاں بلا لو ہم مل کر ان کی اتنی سیوا کریں گے کہ ان کے سارے دکھ اور شکوے دور ہو جائیں گے۔"

سجاول بالکل خاموش بیٹھا تھا۔ ویڈیو اتنی اچھی نہیں تھی کہ سجاول کی آنکھوں میں جھانکا جا سکتا مگر محسوس ہو رہا تھا کہ وہ گمبھیر انداز میں سوچ رہا ہے۔ آخر اس کی پاٹ دار آواز اُبھری۔ "شاید میرا جواب تمہاری مرضی کے مطابق نہ ہو۔"

وہ اس کے ہاتھ کو تھامتے ہوئے بولی۔ "تم نے شاید کا لفظ استعمال کیا ہے اور یہ شاید میرے لیے امید کی کرن کی طرح ہے۔ میں تمہارے جواب کا انتظار کروں گی۔"

ویڈیو ختم ہو گئی۔ انیق نے کیمرا آف کیا اور میری طرف دیکھ کر بولا۔ "لو جی، دیکھ لیں ہیر رانجھے کے "لیول" کی اسٹوری ہے۔ ہیر تو پھر بھی چلو کچھ منہ متھے لگتی ہے مگر رانجھا تو لگتا ہے کہ بے موسم کا پھل ہے، کولڈ اسٹور سے نکلا ہوا اور کچھ نہیں تو بندہ اپنی عمر ہی دیکھ لے، اگر

اس کی جلدی شادی ہوگئی ہوتی تو اب تک جوان بچوں کا باپ ہوتا۔"

"اسے اتنا ایزی نہ لو، وہ اب بھی ایک ہاتھ سے تمہاری گردن مروڑ سکتا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ اب آپ میرا اور اس کا دنگل رکھ ہی لیں۔"

"دنگل رکھنے کی ضرورت نہیں۔ جس طرح کی تمہاری حرکتیں ہیں، ایک دن تمہارا دنگل ہو ہی جانا ہے اور اس دنگل کا نتیجہ تمہاری وفات یا جسمانی معذوری کی شکل میں نکلنا ہے۔ اپنی حالت پر رحم فرماؤ۔ اس طرح کی حرکت آئندہ نہ کرنا۔" میں نے اسپائی کیمرا اس سے جھپٹ لیا۔

خورسنہ اور سجاول والا معاملہ کچھ سنجیدگی اختیار کر چکا تھا۔ سجاول کے لیے یہاں اور پاکستان میں بھی لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں تھی لیکن یہ دل آنے کی بات تھی اور اس کا دل خورسنہ پر آ گیا تھا۔ آگ دونوں طرف سلگ رہی تھی، مگر شعلہ بنے گی یا نہیں، یہ معلوم نہیں تھا۔

○......❖......○

دن گزرتے جا رہے تھے، ہماری روانگی کا وقت نزدیک آ رہا تھا۔ میری جسمانی حالت اب کافی بہتر تھی، میں روزانہ تھوڑی سی جاگنگ بھی کر رہا تھا، کندھا اب یوں فٹ تھا جیسے کبھی اس میں کوئی نقص پڑا ہی نہیں تھا۔ قسطینا اور کمانڈر فارس بڑی اچھی طرح سیاسی اور فوجی صورتِ حال کو کنٹرول کر رہے تھے۔ فوجی دستوں اور رضاکار دستوں کی از سرِ نو تنظیم کی جا رہی تھی۔ بہت سے فوجی افسروں کو شجاعت کے تمغے ملے تھے اور ان کی ترقیاں ہوئی تھیں۔ بن مشہد کو میجر کا عہدہ مل گیا تھا۔ وہ تمغے ان دو افراد کے لیے بھی تھے جنھوں نے جاما جی سے چند میل کے فاصلے پر ایک ویران ٹاپو کے کنارے جان دی تھی۔ ان دونوں کی قبریں بھی وہیں پر تھیں...... ایک قبر پر کیپٹن تبارک اور دوسری پر محمد سیف کے نام کا کتبہ تھا۔ ساحلی ہوا میں جھومتے ہوئے بلند پام کے پیڑوں کے نیچے اس قبر میں وہ رنگ رنگیلا پنجابی گبرو سو رہا تھا جو سکھیرا گاؤں کی ٹھہری ہوئی زندگی سے اُٹھ کر یہاں پہنچا تھا اور چند نہایت پُر جوش دن گزارنے کے بعد موت کی آغوش میں چلا گیا تھا۔

میں اس کی قبر پر الوداعی نگاہ ڈالنے ٹاپو پر پہنچا تو تاجور بھی میرے ساتھ تھی۔ اس کو بس ایک ہی غم کھائے جا رہا تھا، سیف کی ماں اپنے لاڈلے بیٹے کی موت کی خبر کیونکر سن پائے گی، وہ سسکنے لگی۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے دلاسا دیا۔ حاذق ذکری بھی ہمارے ساتھ موجود تھے۔ وہ بڑی پُرکشش روحانی شخصیت کے مالک تھے۔ وہ اور ان کے چند قریبی ساتھی اکثر روزے سے رہتے تھے۔ آج بھی وہ روزے سے تھے۔ حاذق ذکری کا کہنا تھا کہ روزہ انسان

میں لطیف احساسات جگاتا ہے اور کثافت کو دور کرتا ہے، روزے دار کی بات میں ایک خاص قسم کا اثر پیدا ہو جاتا ہے اور سخت گیر لوگوں کا رویہ بھی لاشعوری طور پر روزہ دار کے ساتھ نرم ہونے لگتا ہے۔

اب بھی حاذق ذکری اپنے کئی مریدان کے ساتھ یہاں موجود تھے۔ انہوں نے فاتحہ پڑھی اور دعا کرائی۔ ابراہیم بھی ہمارے ساتھ یہاں آیا تھا۔ وہ ان دو افراد کو خراج تحسین پیش کرنا چاہتا تھا جنہوں نے اپنی جان دے دی مگر اپنے زیر زمین ساتھیوں کا سراغ نہیں دیا۔

ابراہیم کی حالت حیران کن تیزی سے بہتر ہو رہی تھی۔ گزرنے والا ہر دن اس میں زندگی اور توانائی کے آثار نمایاں کر رہا تھا۔ ڈاکٹر بوشر وائٹ تو جا چکے تھے مگر ان کا اسسٹنٹ ڈاکٹر ولسن یہاں موجود تھا اور ابراہیم کے علاج کی نگرانی کر رہا تھا۔

○......❖......○

آخر وہ دن آ گیا جب قسطینا نے بڑے چاؤ اور محبت کے ساتھ ابراہیم کو عزت مآب کی نشست پر بٹھایا اور ساری رسمیں ادا کیں۔ ڈی پیلس اس روز بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ تین سو کے قریب خاص مہمان اس خوبصورت تقریب میں موجود تھے۔ ان مہمانوں میں ہمارے خاص مددگار پال کورنی اور راجر بھی تھے۔ پال کورنی نے اپنے لونگ جیک جیسے بڑا ... ہم وطن سے ٹکر لی تھی اور آخری حد تک گیا تھا۔ یہ سب کچھ اس نے انسانیت کے نام سے کیا تھا۔

اس تقریب میں زینب اپنے دیدہ زیب لباس میں بے حد پیاری لگ رہی تھی۔ وہ سمٹی سمٹائی ہوئی، ابراہیم کے پہلو میں موجود تھی۔ آج سے ایک برس پہلے کون کہہ سکتا تھا کہ وہ اس مرتبے تک پہنچے گی۔ اس نے ''ماضی قریب'' میں بہت اذیتیں سہی تھیں لیکن آج صلہ پا رہی تھی۔ مگر یہ صلہ ابھی ادھورا تھا اور دراصل یہی ادھورا پن تھا جس نے مجھے ابھی تک جاما جی میں روکا ہوا تھا۔ میں ابراہیم اور زینب کو ایک دیکھنے کا خواہش مند تھا۔ شاندار تقریب کے اختتام پر جب مہمان رخصت ہو چکے تھے اور شب بسری کی تیاری ہو رہی تھی، میں نے ابراہیم سے اکیلے میں ملاقات کی۔ وہ عنابی رنگ کے شاہی چغے میں پیارا لگ رہا تھا۔ چہرہ دبلا نظر آتا تھا مگر اس پر صحت مندی کی چمک تھی۔ میں نے کہا۔ ''ابراہیم تمہاری ساری آزمائش ختم ہو چکی ہے۔ اب اپنے اندر اعتماد پیدا کرو اور زندگی کو نارمل کر لو۔''

وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگا۔ وہ میری بات سمجھ گیا تھا۔ میں اس سے ازدواجی

معاملے کی بات کر رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس کے اندر ابھی تک خوف موجود ہے۔ میں نے کہا۔ ”ڈیئر ابراہیم! تمہارے اندر سے سارے دلدر دور ہو گئے ہیں۔ تم نے خود کو کڑی آزمائش کی جس بھٹی میں تپایا ہے، اس نے تمہارے ہر میل کو دھو ڈالا ہے...... اب تمہیں علیحدہ ”بیڈروم“ میں سونے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

اس کے چہرے پر سایہ سا لہرایا۔ ”لیکن شاہ زیب بھائی میں ابھی......“

”پلیز ابراہیم۔“ میں نے اس کی بات کاٹی۔ ”اب خود کو بے جا خوف میں مبتلا نہ کرو۔ شاید تمہیں پتا نہیں، میں اگر اب تک یہاں موجود ہوں تو صرف اس وجہ سے کہ تمہیں اور زینب کو ایک دیکھنا چاہتا ہوں۔“

اس نے اپنے پتلے پتلے خشک لبوں پر زبان پھیری اور میری طرف دیکھے بغیر بولا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ ایک بار اپنے ٹیسٹ کرا لوں۔“

میں نے مسکراتے ہوئے سفید لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔ ”یہ کیا ہے؟“ اس نے حیرانی سے میری طرف دیکھا۔

”تمہاری تازہ ترین ٹیسٹ رپورٹس۔ جمعے کے روز تمہارا جو بلڈ سیمپل لیا گیا تھا، وہ انہی ٹیسٹوں کے حوالے سے تھا۔ میرے کہنے پر ڈاکٹر واٹسن نے تمہیں بتایا نہیں تھا کہ تم تناؤ میں نہ ہو گئے۔ تم سو فیصد او کے ہو جس زہر نے تمہاری زندگی میں زہر گھول رکھا تھا اب اس کا شائبہ تک تمہارے جسم میں موجود نہیں۔“

میں نے اسے ساری رپورٹس دکھائیں اور سمجھائیں۔ اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ آنکھوں میں نمی جاگ گئی تھی۔

پندرہ بیس منٹ بعد میں اسے آمادہ کر چکا تھا کہ...... آج کی رات جدائی کی نہیں، ملن کی ہوگی۔ وہ علیحدہ کمرے میں نہیں سوئے گا۔

میں نے اس کے لیے لباس منتخب کیا۔ اپنے ہاتھوں سے خوشبو لگائی۔ اس کی نوک پلک درست کی اور یہ سب کچھ کرتے ہوئے مجھے بے حد اچھا لگ رہا تھا۔ جیسے وہ میرا لاڈلا سا، چھوٹا بھائی ہو اور میں اسے حجلہ عروسی کے لیے روانہ کر رہا ہوں۔ وہ اپنے دھان پان جسم کے ساتھ، مجھ سے گلے ملا اور اشک بار آواز میں ہولے سے بولا۔ ”آپ کا شکریہ کہنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں۔“

”اور شکریہ کہنے کی ضرورت بھی نہیں۔“ میں نے اسے اپنے ساتھ بھینچتے ہوئے کہا۔

وہ میری زندگی کی ایک پرمسرت رات تھی۔ اگلی صبح میں نے ابراہیم کی پیشانی چومی اور

پھر جھکی جھکی آنکھوں والی، گڑیا سی زینب کے سر پر ہاتھ پھیرا...... مجھے لگا کہ میری بہت سی اذیتوں کا مداوا ہو گیا ہے۔ زینب جانتی تھی کہ ہماری یہاں سے روانگی کا دن قریب آ گیا ہے۔ وہ رونے لگی۔

میں نے کہا۔ ''زینب! اب تم یور ہائی نس ہو۔ اس طرح رونا مناسب نہیں۔''

قسطینا بھی قریب ہی موجود تھی۔ زینب کو اپنے ساتھ لگا کر بولی۔ ''شاہ زیب یہاں سے جا کر تمہیں دُکھ دے رہا ہے۔ اس کی سزا اسے میں دوں گی۔''

''کیا مطلب؟'' ابراہیم نے مسکرا کر پوچھا۔

''مطلب بھی اسی کو بتاؤں گی۔'' اس نے کہا۔

''کوئی اشارہ؟'' کمانڈر فارس جان نے کہا۔

''اشارے بازی تو زیادہ تر مرد ہی کرتے ہیں۔'' قسطینا ہلکے پھلکے انداز میں بولی۔ سب ہنسنے لگے۔

○......❖......○

اور یہ شام کا وقت تھا۔ جزیرے کی ایک خوش رنگ اور پُر بہار شام تھی۔ جنگ کے بادل چھٹ چکے تھے اور پام کے بلند درختوں کے اوپر گہرا نیلا آسمان جھلک دکھاتا تھا۔ ڈی پیلس کے مختلف حصوں کی مرمت کا کام تیزی سے جاری تھا۔ قسطینا نے مجھے اپنے نئے آفس کے اندر بلایا تھا۔ پتا نہیں، وہ کیا کہنا چاہتی تھی۔ میں ڈی پیلس کی مختلف راہداریوں سے گزر رہا تھا۔ ہمارا سامان تقریباً پیک ہو چکا تھا لیکن ہماری روانگی کی خبر کو عام نہیں ہونے دیا گیا تھا۔ پھر بھی ڈی پیلس میں اکثر لوگوں کو شک تھا کہ ہم یہاں سے روانہ ہونے والے ہیں۔ مجھے، انیق اور سجاول کو دیکھ کر ان کے چہروں پر افسردگی سی جھلکنے لگی تھی۔

میں نئے آفس سے ملحقہ ایک چھوٹے سے ہال میں پہنچا تو قسطینا کو مختلف لباس میں دیکھ کر حیران ہوا۔ اس نے ویسا ہی سفید لباس پہن رکھا تھا جیسے کراٹے کے کھلاڑی پہنتے ہیں۔ بوائے کٹ بال سلیقے سے پیشانی پر جمے ہوئے تھے۔ اسے دیکھ کر یہ کہنا مشکل تھا کہ یہ گرین فورس کی سپریم کمانڈر ہے۔ ''یہ کیا چکر ہے قسطینا؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور کھوئی ہوئی آواز میں بولی۔ ''مارشل آرٹ میرے بچپن اور لڑکپن کا اہم ترین مشغلہ تھا۔ تین چار سال پہلے جب تمہیں ٹی وی اسکرین پر یا نیٹ پر دیکھا کرتی تھی تو دل میں یہ خواہش جاگتی تھی کہ...... کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ کسی وقت میں تم جیسے چیمپئن سے ٹپس لوں یا اس کے ساتھ کھیلوں؟ یہ ایک سپنا تھا کہ میں تمہارے ساتھ پریکٹس

فائٹ کر رہی ہوں۔ تم میرا ہنر دیکھ کر حیران ہو رہے ہو۔ مجھے شاباش دے رہے ہو۔"
اس نے ایک گہری سانس لی اور بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "پھر ایک انہونی ہوئی۔ تم یہاں ہمارے پاس آئے۔ کئی ماہ یہاں رہے...... اور اب واپس جا رہے ہو۔ میرا خیال ہے کہ کچھ اور نہ سہی لیکن میری کم از کم یہ خواہش تو پوری ہونی چاہیے کہ ایک بار تم سے لڑ سکوں۔"
میں نے کہا۔ "جزیرے کی سپریم کمانڈر بڑی جذباتی باتیں کر رہی ہے۔"
"سپریم کمانڈر اپنی جگہ، مگر تمہارے فن کی پرستار اپنی جگہ۔ چند ہفتے تک میرا خیال تھا ایسٹرن! چونکہ تم ایک سپر فائٹر ہو، اس لیے جزیرے کی لڑائی میں بھرپور حصہ لو گے۔ کوئی بڑا کارنامہ انجام دو گے۔ تم نے بڑا کارنامہ تو انجام دیا...... بلکہ بہت بڑا...... لیکن لڑ کر نہیں، اپنی برداشت اور ثابت قدمی دکھا کر۔ یہاں کے لوگ تمہیں کبھی بھول نہیں سکیں گے۔ تمہاری زخمی تصویر یہاں کے در و دیوار پر تو موجود ہی ہے، لوگوں کے دلوں میں بھی چسپاں ہو چکی ہے۔"
اس نے میری کہنی کے پاس جلد کے اس حصے پر انگلیاں چلائیں جس کا رنگ جان لیوا تپش کے سبب سفیدی مائل ہو گیا تھا۔ اب یہ رنگ آہستہ آہستہ معمول پر آ رہا تھا۔ ایسے ہی کچھ نشان میری ٹانگوں اور کمر پر بھی موجود تھے۔ ایک جگہ نئی اسکن کا ٹکڑا بھی لگایا گیا تھا جو اب جسم کے ساتھ ہم رنگ ہوتا جا رہا تھا۔
وہ مسکرائی۔ "میں تمہیں لڑے بغیر یہاں سے نہیں جانے دوں گی۔ تم یوں سمجھو کہ میں تمہیں لڑ کر وداع کرنا چاہتی ہوں۔"
میں نے کہا۔ "یہ اچھی بات کہی کہ لڑ کر وداع کرنا چاہتی ہوں۔"
تب میں نے پہلی بار دھیان سے دیکھا کہ ہال کے دو گوشوں میں دو ویڈیو کیمرے بھی اسٹینڈز پر موجود تھے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ میں نے کہا۔ "قسطینا! کیا آپ سوچ بھی سکتی ہیں کہ میں آپ کو چوٹ لگاؤں گا؟"
اس نے عجیب انداز میں کہا۔ "چوٹ تو تم لگا ہی چکے ہو۔" پھر فوراً ہی کھلکھلا کر ہنس دی۔ چند سیکنڈ بعد سنجیدہ ہو کر بولی۔ "میں بھی جانتی ہوں کہ تمہارا وار نہیں سہہ سکتی اس لیے وار کرنے کا حق مجھے دے دو۔ تم صرف دفاع کرنا۔"
میں نے اس ساری صورتِ حال سے بچنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ وہ مُصر تھی۔ آخر اس نے دونوں کیمرے آن کر دیئے۔ ہم دونوں اس شرط کے ساتھ آمنے سامنے گئے کہ میں صرف دفاع کروں گا۔
وہ کوئی گئی گزری فائٹر نہیں تھی۔ میں ایک دفعہ پہلے بھی اسے بھگت چکا تھا۔ (اس وقت

میرا کندھا زخمی حالت میں تھا) آج بھی وہ زبردست اسپرٹ میں تھی۔ ”اگر میں تمہیں ایک دو چوٹیں لگانے میں بھی کامیاب ہوگئی تو سمجھوں گی کہ جیت گئی ہوں...... لیکن خبردار تم جان بوجھ کر چوٹ کھانے کی کوشش نہ کرنا۔“

”اوکے۔“ میں نے کہا۔

وہ مجھ پر پل پڑی۔ ایک اچھی فائٹر کی طرح وہ اپنے ہاتھ پاؤں کو مشینی انداز میں اور یکساں تواتر کے ساتھ حرکت دے سکتی تھی۔ اس کا چھریرا جسم، اسٹیل کی طرح سخت ہونے کے ساتھ ساتھ ربڑ کی طرح لچک دار بھی تھا۔ فائٹرز، پوائنٹ اسکور کرنے کے لیے چہرے اور سینے کو نشانہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں، وہ بھی کر رہی تھی۔

میرے لیے دفاع کرنا مشکل نہیں تھا۔ شاید وہ آٹھ دس گنا زیادہ مہارت کا مظاہرہ بھی کرتی تو مجھے زیر نہ کرسکتی لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ اگر میں زیادہ ”ایزی“ محسوس کروں گا تو وہ کوئی کراری ضرب لگا جائے گی۔ وہ پیچھے ہٹتی تھی، پینترا بدلتی تھی اور بار بار غضب ناک انداز میں حملہ آور ہوتی تھی۔ اس کی کوشش تھی کہ وہ مجھے کیمرے کے سامنے بائیں کونے میں گھیر لے۔ میں نے اس کا ارادہ پورا ہونے دیا۔ وہ بے حد جوش سے حملہ آور ہوئی۔ میں اپنے ہاتھوں اور کلائیوں سے اس کے وار روک رہا تھا لیکن کسی وقت میں جان بوجھ کر ”بلاکنگ“ نہیں کرتا تھا۔ اس کے پنچ یا اس کی کک کو اپنے چہرے کی طرف آنے دیتا تھا اور پھر جھکائی دے کر خود کو بچالیتا تھا۔ وہ ہانپ گئی، اس کا سینہ دھونکنی کی طرح چلنے لگا۔ رنگ لال گلابی ہوگیا۔

میں نے کہا۔ ”راؤنڈ ختم ہوگیا۔ تھوڑا سانس لیتے ہیں۔“

وہ شاید پہلے ہی ایسی آفر کی منتظر تھی۔ ہم گوشے میں رکھی دو کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ میں نے اسے بتایا کہ اس نے کہاں کہاں غلطی کی ہے اور وہ اپنی کن کن موومنٹس کو بہتر بنا سکتی ہے۔

وہ سنی اَن سنی کرتے ہوئے بولی۔ ”یہ بعد کی باتیں ہیں۔ فی الحال ہم دونوں صرف دو حریف ہیں۔“

”اوکے......“ میں نے کہا۔

چند لمبے سانس لے کر وہ پھر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ایک بار پھر اٹیک اور ڈیفنس کا کھیل شروع ہوگیا۔ اس کے بوائے کٹ بال اُچھل رہے تھے اور شفاف گردن کی نسیں پھڑک رہی تھیں۔ بہت کوشش کرنے کے باوجود وہ مجھے کوئی ایسی ضرب لگانے میں کامیاب نہیں ہوسکی جسے پوائنٹ اسکورنگ کہا جاسکے۔ آخر وہ تھک کر چور ہوگئی۔ میں نے اسے روک دیا اور کندھوں سے تھام کر زبردستی کرسی پر بٹھا دیا۔ جگ سے پانی لے کر اسے پلایا اور چند گھونٹ خود بھی لیے۔

جب میں گھونٹ لے کر گلاس تپائی پر رکھ رہا تھا، وہ اچانک ایک چنگھاڑ کے ساتھ مجھ پر حملہ آور ہوئی۔ میں کرسی سمیت پشت کے بل فرش پر گرا۔ سر پر چوٹ آئی۔ وہ مجھ پر چڑھ دوڑی۔ اس کے دو تین زوردار مکے میرے منہ پر لگے۔ وہ میرے سینے پر چڑھ بیٹھی۔ اور دونوں ہاتھوں سے مجھے مکے رسید کرنے لگی۔ میں نے دفاع کی تکنیک کے مطابق اپنے چہرے کو ''فور آرمز'' سے چھپالیا۔

''تم بہت برے ہو۔ میں تمہیں نہیں چھوڑوں گی۔'' وہ جذباتی انداز میں بول رہی تھی۔ آخر وہ ہانپ گئی اور میرے اوپر ہی گر گئی۔ اس کے دھڑکتے ہوئے عرق آلود بالائی جسم نے مجھے ڈھانپ رکھا تھا۔

چند سیکنڈ بعد اس کے رگ پٹھے ڈھیلے پڑتے محسوس ہوئے۔ میں نے اس کو بہ آہستگی خود سے جدا کیا...... اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بھی اُٹھ گئی اور ہانپی ہوئی سی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

''یہ تو سراسر فاؤل کیا ہے آپ نے۔'' میں نے بھی بیٹھتے ہوئے کہا۔

اس کی آنکھوں میں نمی سی تھی۔ عجیب نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی پھر وہ مسکرانے لگی۔ ''سوری، تم نے ویسے تو مجھے کوئی پوائنٹ لینے نہیں دینا تھا۔''

''آپ کی تسلی ہوگئی یا کچھ کسر باقی ہے۔''

''ایک بار پھر معذرت چاہتی ہوں ڈیئر ایسٹرن۔'' اس نے کہا اور آگے جھک کر میری ٹھوڑی کا معائنہ کیا۔ یہاں اس کے ایک پنچ نے خراش سی ڈال دی تھی۔

''نہیں...... ایسی کوئی چوٹ نہیں۔'' میں نے اسے تسلی دی۔

اس کی سانسیں اب درست ہو چکی تھیں۔ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''کیا تم چند دن مزید نہیں ٹھہر سکتے۔''

میں نے شریر انداز میں کہا۔ ''اگر تم اور فارس جان ''کوئی اہم'' فیصلہ کر لو تو ایک دو دن اور رکا جا سکتا ہے۔''

اس کے چہرے پر سرخ رنگ لہرایا بولی۔ ''اہم فیصلہ تو ہو جائے گا لیکن ایک دو دن میں نہیں۔ شاید ایک دو سال درکار ہوں گے۔''

''یہ تو زیادتی ہوگی فارس جان کے ساتھ۔'' میں نے سفارش کی۔

''چلو تمہارے کہنے پر جہاں اتنا کچھ مانا ہے، یہ بھی مان لیتے ہیں۔ دو سال میں دو تین ہفتے کم کر دیتے ہیں۔'' اس نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

اس کے سیل فون کا الارم بجنے لگا۔ اسے شاید کسی عسکری میٹنگ میں جانا تھا۔ وہ الارم

بند کرتے ہوئے بولی۔ ''یہاں کے لوگ تمہیں کبھی بھول نہیں سکیں گے۔ ایسٹرن اور ان لوگوں میں مَیں بھی شامل ہوں۔ میں امید رکھوں گی کہ تم دوبارہ Ring میں نظر آؤ گے۔''

''اور امید پر دنیا قائم ہے۔'' میں نے کہا۔

''اور یہ بھی امید رکھوں گی کہ کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں دوبارہ ملاقات ہوگی۔''

الوداعی کلمات کی ادائیگی کے بعد ہم اُٹھ کھڑے ہوئے۔ قسطینا نے دونوں کیمرے آف کر دیئے اور میرے قریب آ کر ایک دم آگے جھکی۔ میرے رخسار کا بوسہ لیا اور نم آنکھوں سے بولی۔ ''مائی آل گڈ وشنز۔''

○......❖......○

لونگ جیک کو اگر جاما جی کا قصائی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس کی اذیت رسانی کی کئی داستانیں یہاں موجود تھیں۔ اب یہ قصائی کسی مگرمچھ کا فضلہ بن کر سمندر میں بکھر چکا تھا۔ ایک اچھی بات یہ ہوئی تھی کہ تاجور کے سفری کاغذات لونگ کے آفس میں سے مل گئے تھے۔ ہم سب یعنی انیق، سجاول اور سٹیل وغیرہ بھی قانونی طریقے سے سفر کر کے یہاں پہنچے تھے۔ ہماری واپسی کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی...... آخر ہماری روانگی کا دن آن پہنچا۔ ہمیں ایک چارٹرڈ طیارے کے ذریعے بروناۓ دارالسلام اور وہاں سے لاہور پہنچنا تھا۔ جاما جی سے ہماری فلائٹ علی الصباح پانچ بجے تھی۔ سجاول اور خورسنہ کے معاملات طے نہیں پا سکے تھے۔ خورسنہ نے سجاول کو آفر کی تھی کہ وہ اس کے ساتھ یہیں رہ جائے...... مگر جس طرح خورسنہ پاکستان جانے والی بات نہیں مان سکی تھی اسی طرح سجاول بھی یہاں رہنے پر آمادہ نہیں ہو سکا تھا۔ وہ اوپر سے تو نارمل نظر آ رہا تھا۔ گاہے بگاہے مسکراتا بھی تھا لیکن میں جانتا تھا کہ وہ اندر سے اداس ہے۔ شاید اسے اب بھی امید تھی کہ خورسنہ اسے یوں اکیلا نہیں جانے دے گی۔ اس کی نگاہیں بار بار ڈی پیلس کے مین راستے کی طرف اُٹھ جاتی تھیں۔ جیسے اسے آس ہو کہ خورسنہ اور اس کا بچہ، اس کے ساتھ جانے کے لیے یہاں پہنچ جائیں گے اور قسطینا اپنے ذرائع استعمال کر کے آناً فاناً ان دونوں کی روانگی کا انتظام کر دے گی۔

ہونے کو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ جوں جوں ڈی پیلس سے روانگی کا وقت قریب آ رہا تھا، سجاول کی بے کلی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ انیق نے سرگوشی میں مجھ سے کہا۔ ''جی چاہتا ہے کہ میرے پاس کچھ پیسے آ جائیں تو امریش پوری پر فلم بنا دوں۔ اس کا نام ہو ''ڈاکو اور حسینہ...... مع ایک عدد بچہ۔''

آخر ہمارے پروٹوکول کی گاڑیاں پہنچ گئیں۔ ابراہیم اور زینب ہمیں الوداع کہنے کے

لیے موجود تھے۔ حاذق ذکری رات سے ہی ہمارے پاس تھے۔ ان کی سنہری گفتگو مسلسل ہمارے دل و دماغ کی آبیاری کر رہی تھی۔ وقتِ رخصت ابراہیم اور زینب نے وعدہ کیا کہ وہ بہت جلد ہم سے ملنے پاکستان آئیں گے۔

میں نے حاذق ذکری سے بھی پاکستان آنے کی درخواست کی۔ انہوں نے جواب میں ایک لفافہ میری طرف بڑھا دیا۔ دل پذیر لہجے میں بولے۔ ''سمجھو کہ یہ میرا خط ہے۔ اسے پاکستان جا کر اطمینان سے پڑھنا۔''

پال، راجر، بن مشہد، زمان اور دیگر مہربان بھی ہمیں الوداع کہنے کے لیے موجود تھے۔ ابراہیم اور زینب نے بھی ہمیں ڈی پیلس میں ہی سی آف کر دیا۔ قسطینا اور کمانڈر فارس جان کو ائیر پورٹ تک جانا تھا۔ ہم ڈی پیلس کے عملے کو خدا حافظ کہہ کر باہر نکلے تو دنگ رہ گئے۔ یہاں سڑک کی دونوں جانب بے شمار لوگ دکھائی دے رہے تھے۔ وہ سینکڑوں میں نہیں ہزاروں میں تھے لیکن بالکل خاموش اور پُرسکون، غالباً انہیں سختی سے ہدایت کی گئی تھی کہ وہ پہلے کی طرح ہمیں روکنے کی کوشش نہیں کریں گے اور خاموشی سے الوداع کہیں گے۔ یہ دیکھ کر میری آنکھیں نم ہو گئیں کہ اَن گنت لوگوں کے ہاتھوں میں میری ''زخمی تصویر'' تھی، ان میں چھوٹے چھوٹے بچے بھی تھے۔ وہ خوشی اور افسردگی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ ہماری طرف دیکھ رہے تھے، کہیں کہیں کچھ ٹولیاں مقامی زبان میں کوئی گیت بھی گا رہی تھیں اور کیلے کے ایسے پتے لہرا رہی تھیں جن پر سرخ رنگ تھا۔ یہ سارے کے سارے مناظر بے حد جذباتی تھے۔ ہم گاڑیوں کے ایک چھوٹے سے قافلے کے ساتھ ائیر پورٹ پہنچے۔ ائیر پورٹ پہنچ کر بھی سجاول کی نگاہیں اِدھر اُدھر بھٹکتی رہیں لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا جس کی وہ آس رکھتا تھا۔ خورسنہ کی جھلک کہیں دکھائی نہیں دی۔ انیق کو اس ساری صورتِ حال میں بڑا مزہ آ رہا تھا، خوشی جیسے اس سے چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ عجیب خدا واسطے کا بیر تھا ان دونوں میں۔ جب جہاز کی سیڑھی علیحدہ ہو گئی اور دروازہ بند ہونے کے بعد جہاز نے چلنا شروع کر دیا تو میرے پہلو میں بیٹھے انیق نے دونوں مٹھیاں بھینچ کر کہنیوں کو پیچھے کی طرف حرکت دی اور دبے دبے جوش سے بولا۔ ''یس۔'' اس کا مطلب یہی تھا کہ سجاول کی ''نامرادی'' پر مہر لگ گئی ہے۔

میں نے تاجور کی طرف دیکھا۔ وہ سنبل کے ساتھ بیٹھی تھی اور کھوئی کھوئی نظروں سے کھڑکی سے باہر جھانک رہی تھی۔ لٹیں پیشانی پر جھول رہی تھیں، جنہیں وہ بار بار بے خیالی میں پیشانی سے ہٹا کر کانوں کے پیچھے اُڑس رہی تھی۔ میں بھی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ جہاز سے نیچے جاما جی نظر آ رہا تھا۔ میں جب اس سرسبز جزیرے پر پہنچا تھا تو تصور بھی نہیں کر سکتا تھا

کہ مجھے جنگ وجدل کے ایسے لرزہ خیز مناظر سے گزرنا پڑے گا۔ یہاں کی خوشگوار یادیں تو کم ہی تھیں۔ زیادہ تر تلخ یادیں تھیں۔ اسی جزیرے کے ایک گوشے میں لانبے جسم اور ریشمی بالوں والی جاناں ابدی نیند سو رہی تھی جس نے کبھی لکھا تھا...... میں برف کے اندھیرے گھر میں تھی......اور پل پل ختم ہو رہی تھی میری زندگی......

جزیرے کے چاروں طرف گہرا نیلا سمندر تھا جس میں کشتیوں اور جہازوں کے سفید دھبے نظر آ رہے تھے......اور وہ چھوٹا سا ٹاپو بھی نظر آ رہا تھا، جہاں میں نے سیف عرف سیفی کو کھویا تھا۔ اسے یاد کر کے دل ہول جاتا تھا۔ ہم تینوں جس شکنجے میں پھنسے تھے، اس میں سے میرا زندہ بچنا کرشمے سے کم نہیں تھا لیکن کسی وقت میں سوچتا تھا کہ اچھا ہی ہوتا میں بھی ختم ہو جاتا، کم از کم میرے دل پر یہ بوجھ تو نہ ہوتا کہ میں نے سیفی کو اپنے ہاتھوں سے مارا ہے۔ میں نے کئی بار دل کڑا کر کے تاجور کو یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ سیفی کی موت کس طرح ہوئی، لیکن ہمت نہیں پڑی۔ یہ تکون کا رشتہ تھا اور ایسے رشتے بڑے سنگین ہوتے ہیں۔

انیق بھی میری ہی طرح نیچے جھانک رہا تھا۔ جاماجی کا ایک حصہ نیوسٹی کہلاتا تھا اور یہیں پر وہ خطرناک شاطر عورت موجود تھی جو اپنے اندر کچھ ایسی صلاحیتیں رکھتی تھی جو پیرا سائیکالوجی کے زمرے میں آتی تھیں۔ اطلاعات کے مطابق وہ خاصی بیمار تھی۔ اس جزیرے اور یہاں کے باسیوں کے لیے نیک شگون ہوتا اگر وہ کھلی قبر میں راتیں گزارنے کے بجائے مستقل طور پر بند قبر میں چلی جاتی۔

''دیکھیں جی، جاماجی پر نیا سورج طلوع ہو رہا ہے۔'' انیق نے افق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

سمندر سے نکل کر سرخ گولا آہستہ آہستہ بلند ہو رہا تھا اور پام کے درختوں کی چوٹیاں روشن ہو رہی تھیں۔ ہاں...... جاماجی پر نیا سورج طلوع ہو رہا تھا۔

○......❖......○

اس دلچسپ داستان کے بقیہ واقعات
چھٹے حصے میں ملاحظہ فرمائیں

جب ہم پاکستان روانہ ہوئے تو میرے ہم سفروں میں کرنل احرار بھی تھا، وہ ایک نہایت ذہین اور ملنسار شخص تھا۔ایک عام سی شکل وصورت کے اندر ایک نہایت قابل ڈاکٹر اور پلاسٹک سرجن چھپا ہوا تھا۔شاید کرنل کی عام شکل وصورت ہی تھی جس کی وجہ سے اس نے کمپاؤنڈر ارکب کا روپ دھار کر گرے فورس کے اندر رسائی حاصل کی اور میری تصویر حاصل کرنے کے علاوہ اور کئی اہم کام بھی انجام دیئے۔کرنل ابھی جاماجی کے جنگ زدہ ماحول سے کچھ دور رہنا چاہتا تھا۔اس کے علاوہ اس کے دل میں پاکستان دیکھنے کی اور یہاں کچھ ڈاکٹر دوستوں سے ملنے کی دیرینہ خواہش بھی تھی، لہٰذا وہ برونائی دارالسلام سے ہمارے ساتھ ہی پاکستان روانہ ہوا تھا۔

یہ مئی کی ایک خوشگوار رات تھی۔ ہمارا جہاز ایک لمبے سفر کے بعد آخر لاہور کی فضاؤں میں منڈلانے لگا۔ ہمارے نیچے حدِ نگاہ تک لاہور کی روشنیاں پھیلی ہوئی تھیں۔مینار پاکستان، بادشاہی مسجد، دریائے راوی کا پل، اندرون لاہور اور اردگرد کے علاقے صاف پہچانے جارہے تھے۔کرنل احرار نے کھڑکی سے نیچے دیکھتے ہوئے کہا۔"کیا خوب صورت شہر ہے جناب علامہ اقبال یہیں پیدا ہوئے تھے؟"

میں نے کہا۔"نہیں، لیکن ان کا مزار یہیں پر ہے۔وہ نیچے دیکھیں بادشاہی مسجد، اس کے ساتھ ہی وہ ایک روشنی شاعرِ پاکستان کے مزار کی ہے۔"

کرنل احرار لاہور کے نشیب وفراز میں کھو سے گئے۔انہوں نے ایک بار پھر کہا۔"دریا کے کنارے ایک دلفریب شہر۔"

میں نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی مگر میرا دھیان ان شب وروز کی طرف چلا گیا جو میں نے اس مشینی شہر میں گزارے تھے اور پھر گھبرا کر یہاں سے پرواز کرنے کا سوچا تھا مگر تب ہی تاجور اور چاند گڑھی ایک ساتھ میری زندگی میں آئے تھے اور مجھے پاکستان کے دیہی علاقے

میں اس خطے کا اصل حسن دیکھنے کو ملا تھا...... میں اسیر ہو کر رہ گیا تھا۔ اب بھی لاہور مجھے خوب صورت تو لگ رہا تھا مگر میرا دھیان ان لوگوں کی طرف جا رہا تھا جنھوں نے بڑے شہروں کی زندگی کو زہر آلود کر رکھا ہے۔ ان لوگوں میں شکیل داراب بھی تو تھا۔ وہ بھی تو لاہور کی انہی روشنیوں میں کہیں موجود تھا۔ میرے دل میں نفرت کی ایک لہر سی اٹھی۔ یہی شخص تھا جس نے تاجور کو ڈھونڈ کر جاما جی پہنچایا تھا اور اس کی آبرو اور زندگی ایک شدید ترین خطرے میں ڈالی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ ''کوئی بات نہیں شکیل داراب! میں آ گیا ہوں۔''

لاہور پہنچ کر ہمارے راستے وقتی طور پر جدا ہو گئے۔ سجاول کو تو سیدھا کوٹلی آزاد کشمیر پہنچنا تھا جہاں اس کی والدہ اور بہن وغیرہ شدت سے اس کی منتظر تھیں، سنبل کو بھی سجاول کے ساتھ ہی جانا تھا۔ کرنل ڈاکٹر احرار کو یہیں لاہور میں رہنا تھا۔ انیق بھی لاہور میں اپنے زیر زمین ٹھکانے پر پہنچ کر اپنے باس داؤد بھاؤ کے گھٹنے چھونا چاہتا تھا۔ داؤد بھاؤ اس کے بغیر بہت اداس تھا۔ ایک دن جاما جی میں فون پر میری مختصر بات داؤد بھاؤ سے ہوئی تھی۔ اس نے ہلکے پھلکے انداز میں مجھ سے شکوہ کیا تھا کہ میں نے کچے ذہن کے انیق کو ورغلا کر اغوا کر لیا ہے، میں نے کہا تھا۔ ''داؤد بھاؤ میں بھی تو تمہاری محبت کا اسیر ہوں۔ میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ تم نے مجھے اغوا کیا ہوا ہے۔ دوسرے لفظوں میں تم یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ میں اور انیق دونوں تمہارے دائرہ اثر میں ہیں اور اغوا شدہ ہیں۔''

وقتِ رخصت سنبل نے مڑ کر میری اور تاجور کی طرف دیکھا اور ہمیں مشترکہ طور پر سلاماں لیکم کہا۔ اس نے چند ہی ماہ میں کیا عروج اور کیسی پستی دیکھی تھی۔ وہ کھلنے اور بند ہونے والے مشینی گلاب میں بیٹھ کر ریان فردوس کی خدمت میں بطور تحفہ پیش ہوئی تھی اور عزیز ترین رکھیل کی حیثیت اختیار کر گئی تھی مگر پھر وہ وقت بھی آیا تھا جب ریان فردوس کی موت کے بعد اس کا سارا اثاثہ چھین کر اسے ایک کنیز کی حیثیت سے آریان نامی تھرڈ کلاس اہلکار کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ اب ابراہیم اور زینب نے اسے کچھ تحفے دیئے تھے اور ان تحفوں نے اس کے مردہ جسم میں پھر جان ڈالی ہوئی تھی۔

جب تک ہم ائیر پورٹ پر رہے مجھے خدشہ رہا کہ کہیں پولیس کی طرف سے سجاول، انیق یا مجھ پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش نہ کی جائے مگر یہ اندیشہ درست ثابت نہیں ہوا۔ (مجھ پر تو باقاعدہ دہشت گردی کا مقدمہ بھی موجود تھا)

داؤد بھاؤ کے علاوہ کسی کو ہمارے پاکستان پہنچنے کی اطلاع نہیں تھی۔ داؤد بھاؤ کی شکل دیکھے کافی عرصہ ہو گیا تھا۔ میں اس سے ملنا چاہتا تھا مگر فی الوقت تاجور میرے ساتھ تھی۔ داؤد

بھاؤ سے ملاقات میں نے پھر کسی وقت کے لیے اٹھا رکھی۔ میں اور تاجور ائیر پورٹ سے ٹیکسی میں بیٹھے اور بڑی خاموشی کے ساتھ شاہراہ قائداعظم کے ایک اچھے ہوٹل میں منتقل ہو گئے۔ تاجور بے حد مضطرب تھی، چادر میں لپٹی لپٹائی۔ پاکستان آنے کے بعد وہ مسلسل نقاب میں تھی۔ بس اس کی آنکھیں ہی دکھائی دیتی تھیں۔ وہ جلد از جلد اپنے گھر والوں کے پاس پہنچ جانا چاہتی تھی۔ ان کی خیریت سے آگاہ ہونا چاہتی تھی۔ اس کے علاوہ یہ غم بھی اس کی جان کھائے جا رہا تھا کہ سیف کے گھر والوں کو اس کے ''نہ ہونے'' کی دردناک اطلاع دینا ابھی باقی ہے۔ ابھی تو خود تاجور کے گھر والوں کو معلوم نہیں تھا کہ سیف اس دنیا میں موجود نہیں ہے۔ میں نے تاجور کو تسلی دی تھی کہ سیف کے گھر والوں کو اطلاع دینے والی نہایت گراں ذمے داری بھی میں پوری کروں گا۔

ہوٹل میں ہم نے ایک ہی کمرا شیئر کیا۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ تاجور جن حالات سے گزری تھی، اس کے اندر اضافی خوف بیٹھ گیا تھا۔ میں ایک پل بھی اس کی نگاہ سے اِدھر اُدھر ہوتا تھا تو اُس کا رنگ اُڑ جاتا تھا...... ساری رات سفر میں گزری تھی۔ ائیر پورٹ پر بھی کافی وقت لگا تھا۔ اب دن کے گیارہ بج چکے تھے۔ پروگرام کے مطابق ہم نے سب سے پہلے شکیل داراب کی بیوی سے رابطہ کیا۔ اس کی بیوی کا اصل نام تو اور تھا مگر اسے ''جے جی'' کہا جاتا تھا۔ بقول تاجور اس نے تاجور کو بہن کہا ہوا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ وہ صرف زبانی کلامی بہن ہے۔ بہرحال ضروری تھا کہ تاجور اس زبانی کلامی بہن سے ٹیلی فونک رابطہ کرتی۔ تاجور نے کانپتے ہاتھوں سے اس کا نمبر ملایا۔ بیل جاتی رہی مگر فون اٹینڈ نہیں ہوا۔ میں نے کہا۔ ''دوبارہ کوشش کرو تاجور۔''

اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور دوبارہ کال کی...... پھر تیسری مرتبہ...... اور چوتھی مرتبہ...... آخر کال اٹینڈ ہو گئی۔ دوسری طرف ''جے جی'' ہی تھی۔ اس کے بارے میں معلوم ہوا تھا کہ وہ دراصل شکیل داراب کی خاندانی بیوی ہے...... اور سیاست میں اس کی ہمرکاب بھی۔ تاجور نے فون کا اسپیکر آن کر رکھا تھا۔

جے جی نے یہ جان کر خوشی کا اظہار کیا کہ تاجور پاکستان پہنچ چکی ہے۔ اس نے کہا کہ جاما جی میں اس سے رابطہ کرنے کی کئی ناکام کوششیں کی گئی ہیں۔ رسمی گفتگو کے بعد تاجور نے گلوگیر آواز میں اس سے شکوہ کیا کہ جاما جی میں اس سے برا سلوک ہوا ہے اور یہ کہ وہاں پہنچ کر شکیل صاحب اور جے جی نے اسے تنہا چھوڑ دیا۔

جے جی نے کہا۔ ''تاجور! ہماری نیت اچھی تھی...... ہم نے اچھی نیت کے ساتھ ہی

تمہیں ڈھونڈا اور پھر جاما جی لے کر گئے۔ مقصد صرف یہ تھا کہ تم شاہ زیب کی جان بچا سکو۔ اسے آمادہ کرسکو کہ وہ آقا جان کے مطلوبہ لوگوں کا کھوج کھرا بتا دے اور خود کو تکلیف دہ موت سے بچائے۔ اس وقت یہ بات سو فیصد یقینی نظر آتی تھی کہ وہ لوگ شاہ زیب کی جان لے لیں گے۔ تمہیں شاہ زیب کے پاس پہنچا کر ہمیں تسلی ہو گئی تھی کہ سب کچھ خوش اسلوبی سے ہو جائے گا مگر ایک دم معاملہ اتنا بگڑ گیا کہ ہاتھ سے ہی نکل گیا۔ شاہ زیب اپنی جگہ اڑا رہا اور وہ لوگ تو تھے ہی پرلے درجے کے ہٹ دھرم۔ وہاں جو کچھ ہوا مجھے بے حد افسوس ہے۔ میں وہاں موجود نہیں تھی ورنہ شاید سب کچھ اس طرح نہ ہوتا۔''

''لیکن شکیل صاحب تو موجود تھے۔'' تاجور سسک کر بولی۔

''وہ موجود تھے لیکن جو ہوا آناً فاناً ہوا۔ لونگ جیک سے طے ہوا تھا کہ وہ تم پر کسی بھی طرح کی سختی نہیں کرے گا، تمہیں ہر طرح احترام دے گا مگر اس نے دھوکا دیا۔ جونہی شکیل صاحب کو پتا چلا کہ تمہیں شاہ زیب سے علیحدہ کر دیا گیا ہے اور شاہ زیب نے تمہیں ٹارچر سے بچانے کے لیے اپنی کلائیاں زخمی کر لی ہیں، شکیل صاحب فوراً ڈی پیلس پہنچے تھے مگر تب تک شاہ زیب بے ہوشی کی حالت میں اسپتال پہنچ چکا تھا اور تمہیں بھی اس کے پاس پہنچا دیا گیا تھا۔ اس کے بعد شکیل اور آقا جان میں سخت جھڑپ بھی ہوئی۔''

''لیکن جے جی بہن! کسی نے ہماری مدد تو پھر بھی نہ کی۔''

''تاجور! تب تک تمہیں مدد کی ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔ شاہ زیب کے پرستاروں نے اسے اسپتال سے نکال کر مرکوزا کے علاقے میں پہنچا دیا تھا۔ تم بھی ساتھ ہی تھیں۔ رائے زل کی فورس اور آقا جان کے لیے تو وہ نو گوایریا تھا۔ اس وقت ہم نے سکھ کی سانس لی تھی۔'' پھر وہ ذرا توقف سے بولی۔ ''شکیل صاحب مسلسل تم سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میرا خیال ہے کہ اگر دو چار دن مزید تمہاری واپسی نہ ہوتی تو وہ دوبارہ جاما جی جاتے۔''

شکیل داراب کی سیاست داں بیوی تاجور کے سوالوں کے جواب بڑی ہوشیاری سے دے رہی تھی مگر جو کچھ ان دونوں نے کیا تھا وہ ہمارے لیے ڈھکا چھپا نہیں تھا۔ میں نے اشارے سے تاجور سے کہا کہ وہ اب مطلب کی بات کرے۔

تاجور نے آنسو صاف کر کے جے جی سے کہا۔ ''اب میرے لیے اور ابا جی کے لیے شکیل صاحب کا کیا حکم ہے؟''

''کوئی حکم نہیں بھئی، تم اپنی مرضی کے مالک ہو۔ جو جگہ تمہیں اسلام آباد میں الاٹ کی گئی ہے، وہ اب ہمیشہ کے لیے تمہاری ہے۔ اگر چاہو تو کچھ دن مزید ادھر رہو، چاہو تو اپنے

گاؤں چلے جاؤ۔"

"میں گاؤں جانا چاہتی ہوں۔"

"تو ٹھیک ہے، شکیل صاحب تو اس وقت پاکستان سے باہر ہیں۔ میں ان کے سیکریٹری کو ہدایت کر دیتی ہوں۔ تم اسلام آباد آنا چاہو گی یا تمہارے گھر والے وہاں لاہور پہنچ جائیں۔"

"اگر وہی پہنچ جائیں تو اچھا ہے۔ مجھے لمبا چکر نہیں پڑے گا۔"

"ٹھیک ہے، میں انتظام کرواتی ہوں۔"

"لیکن یہ کام ذرا جلدی ہونا چاہیے جے جی...... میں اور شاہ زیب عارضی طور پر ایک ہی کمرے میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ شام تک وہ لوگ ہوٹل پہنچ جائیں گے تو ہم یہاں سے گاؤں روانہ ہو سکتے ہیں۔"

"اتنی جلدی تو شاید یہ ممکن نہ ہو۔ بہرحال میں کوشش کرتی ہوں۔ اگر نہ ہو سکا تو پھر کسی طرح رات گزار لینا۔"

"نہیں جے جی! یہ مناسب نہیں ہے۔"

"شاہ زیب تمہارے لیے کوئی اجنبی تو نہیں۔ اس سے پہلے تم اس کے ساتھ کافی عرصہ وہاں ملنگی کے ڈیرے پر رہ چکی ہو۔" جے جی کے لہجے میں طنز کی کاٹ بڑی واضح تھی۔

"وہ ایک مجبوری تھی جے جی مگر اب میں ایسا نہیں چاہوں گی۔"

"اچھا، میں کوشش کرتی ہوں۔" اس نے قدرے خشک لہجے میں کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔ وہ جانتی تھی کہ میں بھی تاجور کے پاس موجود ہوں مگر اس نے مجھ سے بات کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا اور شاید اچھا ہی کیا تھا۔ میرے منہ سے بے ساختہ کوئی ایسی بات نکل سکتی تھی جو اس کے تن بدن میں آگ لگا دیتی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ شکیل کے بارے میں بھی غلط بیانی کر رہی ہے۔ وہ بھی پاکستان میں ہی ہوگا۔ عین ممکن تھا کہ وہ اپنی بیوی جے جی کے پاس ہی بیٹھا ہو اور یہ ساری گفتگو سن رہا ہو۔ اس نے تاجور کے ساتھ بڑی "محبت" سے بڑی بے رحمی کا سلوک کیا تھا۔ اگر جاما جی میں اس روز میں اپنی شریانیں کاٹ کر خود کو موت کے حوالے نہ کر دیتا تو پتا نہیں تاجور کے ساتھ وہ دو نقاب پوش کیا کر گزرتے۔ انہوں نے لونگ جیک کے حکم پر اسے چھت سے لٹکایا ہوا تھا اور بے لباس کرنے کے قریب پہنچ چکے تھے۔ ان مناظر کو یاد کر کے ہی ایک جھرجھری سی میرے بدن میں پیدا ہو گئی۔ ایک بار پھر نفرت کی بلند لہر شکیل دار اب کے لیے اٹھی۔ اس نے آقا جان سے یاری نبھاتے ہوئے مجھے اور تاجور کو ایک بدترین آزمائش سے دوچار کر دیا تھا۔ ابھی اس کی بیوی نے جو بھی صفائی پیش کی، وہ سراسر جھوٹ

کے زمرے میں آتی تھی۔

میں صوفے پر بیٹھا تھا اور دوسری منزل کی کھڑکی سے نیچے ہوٹل کے سرسبز پارکنگ لاٹ کو دیکھ رہا تھا۔ تاجور مجھ سے کچھ فاصلے پر دوسرے صوفے پر بیٹھی تھی۔ اس نے ابھی ابھی ظہر کی نماز ادا کی تھی اور سفید دوپٹے نے اس کے دلکش چہرے کے گرد ہالہ سا بنا رکھا تھا۔ وہ جیسے بے خیالی میں سامنے دیوار پر لگی ایک خوب صورت پینٹنگ کو دیکھ رہی تھی۔ اس پینٹنگ میں ایک چھوٹے سے گھرانے کی تصویر کشی کی گئی تھی۔ دیہاتی طرز کا سجا سنورا کمرا تھا۔ شوہر دستر خوان کے سامنے آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا اور کھانا کھا رہا تھا۔ بیوی اسے محبت سے دیکھ رہی تھی۔ ایک ننھا بچہ باپ کی کمر پر لدا ہوا تھا، چار پانچ سال کی ایک بچی اسے باپ کی کمر سے اتارنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سب مسکرا رہے تھے۔

تاجور نے تصویر سے نگاہ ہٹائی اور گہری سانس لی۔ پھر میری طرف دیکھے بغیر کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔ ''شاہ زیب! آپ یہ سب کچھ چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ کیوں اتنے برے لوگوں کے ساتھ اتنی خطرے والی زندگی گزار رہے ہیں۔ کہیں، دور چلے جائیں آپ...... اپنی کوئی الگ دنیا بسا لیں۔ میرے دل کی آرزو ہے کہ آپ کسی کے ساتھ بھی رہیں لیکن خوش رہیں اور...... زندہ رہیں...... یہ لوگ نہیں چھوڑیں گے آپ کو۔ کچھ نہ کچھ ہو جائے گا آپ کے ساتھ۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔ آگے کچھ نہ بول سکی۔

میں نے کھوئی کھوئی نظروں سے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ باہر کی طرف کارنس پر ایک گملا رکھا تھا۔ گملے پر تازہ تازہ روغن کیا گیا تھا۔ ایک چیونٹا جو شاید خوراک کی تلاش میں نکلا تھا اس روغن سے چپک گیا تھا۔ پتا نہیں وہ کب سے چپکا ہوا تھا۔ اب اس کا صرف اگلا دھڑ حرکت کر سکتا تھا اگر اسے کھینچنے کی کوشش کی بھی جاتی تو وہ درمیان سے دو ٹکڑے ہو جاتا۔ اس نے اب جتنی دیر زندہ رہنا تھا اسی حالت میں رہنا تھا۔ میں نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''تاجور! تم اپنی جگہ درست کہہ رہی ہو مگر اپنے حالات صرف میں جانتا ہوں۔ میں اس دلدل سے نکلنا چاہوں بھی تو نہیں نکل سکتا۔ تم میرے لیے بس دعا کرو کہ......'' باقی فقرہ میں مکمل نہیں کر سکا۔ پورا فقرہ یہی تھا کہ...... میرے لیے بس دعا کرو کہ جب وقت آئے تو یہ زندگی آسانی سے میرا پیچھا چھوڑ دے۔

شاید وہ میرے بولے بغیر ہی میری بات سمجھ گئی تھی۔ اس کی بلوری آنکھوں میں نمی چمکی اور وہ اپنے آنسو چھپانے کے لیے جلدی سے واش روم کی طرف چلی گئی۔ میں دل میں درد لیے کر اس مسکراتی ہوئی فیملی کی پینٹنگ دیکھتا رہا۔ ایسے موقعوں پر میرے پردۂ تصور پر وہی

مناظر چلنے لگتے تھے جنہوں نے مجھے زندگی اور زندہ لوگوں کی دنیا سے دور کر رکھا تھا۔ میرے خنجر نے کسی کا پیٹ چاک کیا تھا، اس کی انتڑیاں تارکول کی سڑک پر بکھری تھیں، وہ کوئی اور نہیں تھا۔ یورپ کے سفاک ترین گینگسٹر جان ڈیرک کا لخت جگر تھا۔

تاجور کی محبت میرے سینے کی گہرائی میں ایک جاودانی آگ کی طرح سلگتی تھی مگر جب میں مستقبل قریب پر نگاہ دوڑاتا تھا تو مجھے ٹیکساری گینگ کے سفاک قاتلوں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ میرے بہت قریب پہنچ چکے ہیں یا پہنچنے والے ہیں اور میں جانتا تھا کہ جب وہ مجھے نشانہ بنائیں گے تو میرے اردگرد موجود لوگ بھی بچ نہیں سکیں گے۔ تاجور کو سہاگن بننا تھا بیوہ نہیں۔ میری محبت شدید تو تھی مگر خودغرض نہیں تھی۔ (اگر خودغرض ہوتی تو پھر سجاول کے ڈیرے پر وہ ہر طرح میری دسترس میں تھی) میں تاجور کو سہاگن دیکھنے کا خواہش مند تھا...... اور زندہ بھی۔

شام تک ہم اپنے اپنے خیالوں میں گم رہے۔ آنے والی گھڑیوں کے بارے میں سوچتے رہے۔ میں تاجور کے گھر والوں کا سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا مگر اس نے مجھے مجبور کر دیا تھا کہ میں ان کا سامنا کروں اور اپنی صفائی بھی پیش کروں۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی چاہتی تھی کہ میں زیادہ نہیں تو چند روز ضرور اس کے آس پاس موجود رہوں۔ اس کے ذہن میں انجانے وسوسے اور خدشات موجود تھے۔ پھر تیسری بات یہ تھی کہ میں نے اس سے یہ وعدہ کر رکھا تھا کہ سیف کی دل کی مریضہ والدہ کو سیف کے حوالے سے اطلاع دینا اور اس اطلاع کے بعد اسے غم کے شدید ترین ریلے سے سنبھال لینا بھی میری ذمے داری ہے۔

شام کے وقت تاجور کے ابا جان دین محمد صاحب نے فون پر تاجور کو اطلاع دی کہ وہ اسلام آباد سے بذریعہ جی ٹی روڈ لاہور کے لیے روانہ ہو چکے ہیں اور دس بجے تک ہوٹل پہنچ جائیں گے۔ انتظار کا یہ وقت کاٹنا مشکل تھا۔ میں تاجور کے چھوٹے بھائیوں راحیل اور اسفند کے لیے کچھ شاپنگ کرنا چاہتا تھا، اس کے علاوہ بھی مجھے ایک دو ضروری چیزیں لینا تھیں۔ میں نے تاجور سے کہا۔ ’’تاجور! تم دروازہ اندر سے بند کر لو۔ میں آؤں گا تو کھول دینا۔‘‘

اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ بے ساختہ میرا بازو تھام کر بولی۔ ’’نہیں، آپ مجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گے۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’چھوڑ کر تو جانا پڑے گا تاجور۔‘‘

میرے گمشدہ لہجے نے اسے چونکایا، بولی۔ ’’میں اب کی بات کر رہی ہوں شاہ زیب، میں اس کمرے میں اکیلے رہنا نہیں چاہتی۔‘‘ اس نے جھجک کر اپنے ہاتھ میرے بازو سے

پیچھے ہٹا لیے۔

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ گہری جھیل سی شفاف آنکھیں۔ کبھی یہ آنکھیں، اور یہ رخسار اور یہ ہونٹ مجھ سے بہت قریب تھے، بہت ہی زیادہ قریب۔ ملنگی ڈیرے کے وہ شب و روز جو ہم نے ایک چھت تلے اکٹھے گزارے تھے، ہمیشہ کے لیے میرے دل و دماغ پر نقش ہو چکے تھے۔ میں وہ رات کیسے بھول سکتا تھا جب ''تاریک بند خانے'' میں وہ میرے بالکل قریب موجود تھی، اچانک کہیں بالکل پاس سے پالتو چیتوں کی لرزہ خیز آواز سنائی دی تھی۔ تاجور خوف زدہ ہو کر میرے ساتھ آ لگی تھی۔ میری بانہوں میں سما گئی تھی اور پھر بعد کے دنوں میں اس ریشمی اندھیرے میں چھوٹے چھوٹے کئی خوش رنگ پھول کھلے تھے، کئی دلنواز لمحے چہکے تھے لیکن آج ان آنکھوں، ان رخساروں اور ان ہونٹوں سے میرا فاصلہ لامتناہی تھا۔ شاید پاٹا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ تاجور کی نگاہیں بھی جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہی تھیں......

ہاں ہمیں بھی وہ سب یاد ہے لیکن اب اس کی یاد سے دل دُکھنے کے سوا اور کیا حاصل؟

میں نے کہا۔ ''تاجور! میرا باہر جانا ضروری ہے۔ اگر تم اکیلی نہیں رہ سکتیں تو ساتھ آ جاؤ۔''

وہ باہر بھی نکلنا نہیں چاہتی تھی لیکن پھر اس نے جیسے ایک دم فیصلہ کیا اور اپنی چادر کی طرف بڑھی۔ اس نے خود کو سر تا پا چادر میں ڈھانپا۔ بس اس کی آنکھیں اور پیشانی ہی نقاب سے باہر تھی۔ ہم سیڑھیوں کے ذریعے نیچے آئے اور ہوٹل کے عقب میں واقع شاپنگ مال میں چلے گئے۔

شاپنگ مال سے واپس آ کر ایک بار پھر تاجور کے اہلِ خانہ کا انتظار شروع ہوا۔ تاجور کے والدین کو میری طرف سے کئی جذباتی دھچکے پہنچے تھے۔ ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ میں کئی ماہ گونگا بن کر ان کی ملازمت کرتا رہا اور ان کے گھر میں بھی آتا جاتا رہا تھا مگر جہاں میری وجہ سے انہیں صدمے پہنچے تھے وہاں کچھ چھوٹی موٹی راحتیں بھی ملی تھیں۔ میں نے ایک مرتبہ تاجور کو سجاول کے کارندوں سے بچایا تھا اور دوسری مرتبہ تاجور کے چھوٹے بھائی اسفند کو برستی گولیوں میں چاند گڑھی کے ایک کنویں سے نکالا تھا۔ ان صدموں اور ان راحتوں کی فہرست طویل تھی۔

آخر وہ گھڑی آئی جب تاجور کے ابا جی، اس کی والدہ اور دونوں چھوٹے بھائی میرے سامنے تھے۔ راحیل اور اسفند میری ٹانگوں سے لپٹ گئے۔ تاجور کی والدہ نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا تاہم دین محمد صاحب نے ہاتھ ملانے پر اکتفا کیا۔ وہ گم صم نظر آتے تھے لیکن ان کا

حلیہ کافی بدلا ہوا تھا۔ کچھ شہری رنگ ڈھنگ دکھائی دے رہا تھا۔ بوسکی رنگ کی اچکن کے نیچے انہوں نے سفید شلوار قمیص پہن رکھی تھی، پگڑی بھی نفیس تھی۔ راحیل اور اسفند بھی نیکر شرٹ میں نظر آرہے تھے۔ وہ سب تاجور کے گلے لگ کر ملے۔ وہ سسکنے لگی۔ ان کی ذاتی گفتگو میں مخل ہونے کے بجائے میں کمرے سے باہر نکل آیا۔

وہ رات ہم نے ہوٹل میں ہی گزاری۔ بہر حال اب فرق یہ تھا کہ چار بیڈ کا ایک اور کمرا لے لیا گیا تھا۔ تاجور اور اس کے اہلِ خانہ اس کمرے میں منتقل ہو گئے تھے۔ تاجور کے والد اور والدہ پہلے سے زیادہ غم زدہ نظر آرہے تھے۔ والدہ کی تو رو رو کر آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ وجہ ظاہر تھی تاجور نے انہیں سیف کی ناگہانی موت کے بارے میں بتایا تھا۔ (بہر حال میں نے تاجور کو تاکید کر رکھی تھی کہ ابھی فی الفور سیف کے اہلِ خانہ کو کچھ نہیں بتایا جائے)

O......❖......O

علی الصباح ہم بذریعہ اسٹیشن وین سکھیرا گاؤں کے لیے روانہ ہوئے۔ کرائے کی اس وین پر یہ ایک طویل اور بوجھل سفر تھا۔ میری موجودگی میں کوئی بھی زیادہ بات نہیں کر رہا تھا۔ صرف راحیل اور اسفند تھے جو کچھ بے تکلفی دکھا رہے تھے۔ ان کے لیے بے حد حیرانی کی بات تھی کہ ان کے گونگے انکل نے بولنا شروع کر دیا تھا۔ اس حوالے سے تاجور نے انہیں پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ چند ماہ پہلے "انکل کا آپریشن ہوا ہے جس کے بعد ان کی گویائی بحال ہو چکی ہے۔ دونوں بچے اس بات پر بھی حیران تھے کہ میں اتنا عرصہ اوجھل رہنے کے بعد پھر نمودار ہو گیا ہوں۔ وہ میرے سر کے چھوٹے چھوٹے بالوں پر بھی خصوصی دھیان دے رہے تھے۔

راحیل اور اسفند کو میری باتیں بڑی دلچسپ لگ رہی تھیں۔ میرا بولنا ان کے لیے بڑی انوکھی چیز تھا۔ اب مجھے مقامی لب و لہجے پر بھی کافی عبور حاصل ہو چکا تھا۔ سال ڈیڑھ سال پہلے میرے لہجے میں جو انگلش کا ٹچ پایا جاتا تھا وہ اب نہیں تھا۔ میں اپنی گفتگو میں پنجابی لفظ بھی آسانی سے استعمال کرتا تھا۔ مجھے کبھی کبھی پنجابی فقرہ بولنا اچھا لگتا تھا۔ شاید اس کی وجہ بھی کہیں تاجور سے ہی جڑی ہوئی تھی۔

گجرات سے ہوتے ہوئے ہم لالہ موسیٰ پہنچے۔ لالہ موسیٰ کے مضافات سے ہمارا رخ سکھیرا گاؤں کی طرف ہوا۔ (ہم اسی پیٹرول پمپ کے پاس سے گزرے جہاں سے ایک مرتبہ میں اور تاجور موٹر سائیکل پر سکھیرا روانہ ہوئے تھے۔) بالآخر ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ یہ شام کا وقت تھا۔ سورج نے مغربی افق کو سرخ کر رکھا تھا۔ درختوں پر چڑیوں اور دیگر

پرندوں کا شور تھا، کھیتوں کھلیانوں کی خوشبو نتھنوں میں گھس رہی تھی، ٹیوب ویل کی آواز کے پیش منظر میں مویشیوں کی گھنٹیاں کانوں میں جلترنگ بجا رہی تھیں۔ یہ درو دیوار میں نے پہلے بھی دیکھ رکھے تھے مگر تاجور سمیت کسی کو معلوم نہیں تھا کہ میں ایک بار چوری چھپے، صرف اسے دیکھنے کے لیے یہاں آچکا ہوں۔ باغ میں سہیلیوں کے جھرمٹ میں تاجور کا جھلملاتا چہرہ آج بھی ذہن پر نقش تھا۔ (یہ اور بات ہے کہ میرا یہاں آنا کسی کے لیے بہت برا شگون ثابت ہوا تھا۔ میری مراد سیف سے ہے)

ہم اس بلند چار دیواری کے قریب سے گزرے جہاں ایک احاطے میں سیف اور اس کے دوستوں سے میری جھڑپ ہوئی تھی۔ ساری تلخ و شیریں باتیں ذہن میں تازہ ہو گئیں۔ سکھیرا کافی بڑا گاؤں تھا اور اندازہ ہوتا تھا کہ گاؤں میں چودھری دین محمد کی کافی عزت بھی بن چکی ہے۔ ان کی اور اہلِ خانہ کی واپسی پر ہر کسی نے خوشی کا اظہار کیا۔ تاجور کے بارے میں یقیناً یہی سمجھا جا رہا تھا کہ وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ اسلام آباد میں تھی اور وہیں سے واپس گاؤں آئی ہے۔ مقامی لوگ اس لیے بھی دین محمد صاحب اور ان کے گھرانے کو خصوصی اہمیت دے رہے تھے کہ وہ لوگ ایک بااثر سیاسی شخصیت کے بلاوے پر اسلام آباد گئے تھے اور وہاں ڈھائی تین ماہ مہمان بنے تھے۔

مجھے سکھیرا میں کوئی نہیں جانتا تھا، سوائے ان چند لڑکوں کے جن سے میری مڈبھیڑ ہوئی تھی۔ ان میں سے بھی کوئی مجھے دکھائی نہیں دیا۔ میرے لیے دین محمد صاحب کے ڈیرے پر سونے کا انتظام کیا گیا تھا۔ چودھری دین محمد چاند گڑھی کی ہر چیز اور ہر ''تعلق'' کو چاند گڑھی میں ہی چھوڑ آئے تھے۔ ان کے ڈیرے کے سارے ملازم بھی نئے ہی تھے۔ کوئی مجھے جانتا نہیں تھا۔ ان کے نزدیک میں ایک عام شخص تھا اور دین محمد کی فیملی کے ساتھ اسلام آباد سے واپس گاؤں پہنچا تھا۔ میں نے ڈیرے پر موجود دو ملازموں کو اپنا نام شاہ زیب ہی بتایا۔ میرا خیال تھا کہ صبح ناشتے کے وقت گھر سے کوئی ملازم یا ملازمہ آئے گی اور مجھے گھر بلا لیا جائے گا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ایک تنومند ملازمہ آئی تو ضرور لیکن مجھے بلانے نہیں بلکہ ایک طشتری میں میرا کھانا لے کر۔ کھانا پُر تکلف تھا لیکن یوں ڈیرے پر کھانا بھیج کر دین محمد صاحب نے اپنی سرد مہری کا واضح اظہار کیا تھا۔

مجھے پتا تھا کہ تاجور کے علاوہ دونوں بچے راحیل اور اسفند بھی مجھے گھر میں دیکھنا چاہتے ہوں گے لیکن گھر کے سربراہ کی مرضی کے خلاف چلنا ان کے بس میں نہیں تھا۔ ناشتے کے بعد میں چہل قدمی کرتا ہوا گاؤں کے مرکزی حصے میں آگیا۔ چاند گڑھی جیسے سارے مناظر یہاں

بھی موجود تھے۔ کچے پکے گھر، دیواروں پر اُپلے، گھروں کے وسیع وعریض صحنوں میں کیکر، نیم اور بیری کے درخت۔ کچی گلیوں میں دوڑتے بھاگتے بچے۔ میں شلوار قمیص میں تھا۔ میرے سر کے بال جو ٹمپریچر میں چرمر ہونے کے بعد مونڈ دیئے گئے تھے اب پھر آدھ پون انچ لمبے ہو چکے تھے۔ گاؤں کے کئی لوگوں نے اور کچھ عورتوں لڑکیوں نے بھی مجھے توجہ سے دیکھا...... جیسے گاؤں میں وارد ہونے والے کسی بھی اجنبی کو دیکھا جاتا ہے۔

اچانک ایک جانب سے ایک نوجوان لڑکا تیزی سے آگے بڑھا۔ ''السلام علیکم'' اس نے کہا اور اپنے دونوں ہاتھ میری طرف مصافحے کے لیے بڑھائے۔

میں نے ذرا غور کیا اور اسے پہچان لیا۔ کڑھائی دار شلوار کرتے والا یہ لڑکا بھی ان میں شامل تھا جنہوں نے چند ماہ پہلے اسی گاؤں کے ایک بند احاطے میں مجھ سے مارا ماری کی کوشش کی تھی۔ انہیں ہرگز معلوم نہیں تھا کہ وہ ایک ''سخت حریف'' کے سامنے آگئے ہیں۔

''آپ شاہ زیب ہی ہیں ناں؟'' لڑکے نے بتیسی نکالتے ہوئے کہا۔

''تم نے ٹھیک پہچانا ہے بھائی۔''

''سیف بھی آیا ہے؟'' لڑکے نے اشتیاق سے پوچھا۔

''سیف؟'' میں نے کہا۔

''اس نے بتایا تھا کہ وہ آج کل آپ ہی کے ساتھ ہے۔ اس کا فون آیا تھا کچھ ہفتے پہلے۔ اس نے گھر میں تو یہی بتایا ہوا تھا کہ وہ بہاولپور میں ہے......لیکن مجھے پتا تھا کہ وہ آپ کے ساتھ پاکستان سے باہر ہے۔ وہ آپ کا مرید ہے جی......اور لگتا ہے کہ ہمیشہ رہے گا۔''

اپنی بات ختم کر کے وہ پھر سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ آنکھوں میں وہی سوال تھا کہ سیف میرے ساتھ آیا ہے یا نہیں؟

میں نے کہا۔ ''کہیں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔''

وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر کچھ فاصلے پر ٹیوب ویل کے نزدیک بچھی ایک چارپائی پر بیٹھ گیا۔ میں نے کہا۔ ''سیف تو ابھی نہیں آیا۔ وہ وہیں برونائی میں ہے۔ اسے ایک اچھی ملازمت ملی ہوئی ہے۔ ابھی چھٹی نہیں ملی، جونہی ملے گی آجائے گا۔''

''زبردست جی، لیکن کر کیا رہا ہے؟''

''وہاں ایک سکیورٹی ایجنسی کی جاب ہے۔ یونیفارم ملی ہوئی ہے۔ گن ہے، بڑا ٹھاٹ ہے اس کا۔ لیکن یہ بات ابھی اپنے تک ہی رکھنی ہیں۔''

''آپ فکر نہ کریں جی۔ نظر بندے کی ترقی کو کھا جاتی ہے۔ میرا نام صدیق ہے۔ ہم

دونوں ایک دوجے کے لنگوٹیے یار ہیں۔ اس کے بیرونِ ملک جانے والی بات بھی بس میرے اور اس کے بیچ میں ہی ہے۔ وہ کہتا تھا کہ وہاں سے ٹیلی فون بڑی مشکل سے ملتا ہے پھر بھی ایک دوبار اس نے مجھی کو فون کیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "سیف نے گھر والوں کے لیے کچھ چیزیں بھجوائی ہیں، ان کو دینی ہیں۔"

"آپ ٹھہرے کہاں ہوئے ہیں؟" صدیق نے پوچھا۔

"چودھری دین محمد صاحب کے گھر میں، بلکہ ان کے ڈیرے پر۔ یہ اسلام آباد سے گاؤں آرہے تھے، میں لاہور سے آرہا تھا۔ راستے میں ملاقات ہوئی اور میں ان کے ساتھ ہی یہاں پہنچ گیا۔

کچھ ہی دیر بعد میں نے ڈیرے سے وہ سامان اٹھایا جو سیف کے گھر والوں کے لیے لے کر آیا تھا اور صدیق کے ساتھ اس کے گھر کی طرف چل دیا۔ دل پر بھاری بوجھ تھا۔ میں سچ بولنا چاہتا تھا لیکن ابھی شاید اتنے "بڑے سچ" کے لیے موقع مناسب نہیں تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ سیف کے گھر میں اس کی والدہ اور والد کے علاوہ تین چھوٹی بہنیں ہیں، وہ ان بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا اور وہ اپنے بھائی کے سر پر سہرا سجانے کے لیے گن گن کر دن گزار رہی تھیں۔ ہم سیف کے دروازے پر پہنچے۔ یہ ایک درمیانے درجے کے زمیندار کا کشادہ اور پختہ گھر تھا۔ صدیق نے دروازے پر دستک دی۔ دوسری تیسری دستک پر ایک پندرہ سولہ سالہ لڑکی نے دروازہ کھولا اور ہمیں اپنے سامنے دیکھ کر جلدی سے گھونگھٹ نکال لیا۔

صدیق بولا۔ "شازیہ بہن، یہ بہاولپور سے آئے ہیں۔ سیف کے ساتھ ہی کام کرتے ہیں۔"

سیف کا نام سن کر لڑکی چونکی۔ اس نے گھونگھٹ کی اوٹ سے مجھے دیکھا اور سلام کرنے کے بعد تیزی سے اندر لپک گئی۔ کچھ دیر بعد پچاس پچپن سال کی ایک قدرے فربہ خاتون دروازے پر آئی۔ اس نے سر پر چادر لے رکھی تھی۔ چہرے پر اُجلا پن تھا۔ اس نے میرے سر پر پیار دیا۔ مجھے اور صدیق کو اندر صحن میں لے آئی۔ وسیع صحن میں ایک طرف ٹریکٹر کھڑا تھا۔ چند بکریاں بھی نظر آرہی تھیں۔ ہم برآمدے میں بچھی چارپائیوں پر آبیٹھے۔

بس اتنا سا چلنے سے ہی ادھیڑ عمر عورت کا سانس پھول گیا تھا وہ بولی۔ "پتر! تم سیف کے بیلی (یار) ہو؟"

میں نے کہا۔ "ہاں ماں جی، بہاولپور میں وہ میرے ساتھ ہی کام کرتا ہے۔ وہاں ایک بیلے میں جنگل کی کٹائی کا کام ہو رہا ہے۔ ہم تین دوستوں نے مل کر ٹھیکا لے رکھا ہے۔"

''پر وہ آتا کیوں نہیں ہے۔ اب تو کئی دنوں سے کوئی خط بھی نہیں آیا اس کا۔ ڈیڑھ مہینا ہو گیا ہے۔ بس ایک ٹیلی فون کیا تھا اس نے۔'' ادھیڑ عمر خاتون نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔

''ماں جی، وہاں فون کے سگنل بڑی مشکل سے ملتے ہیں۔ سگنل سمجھتی ہیں نا آپ؟''

آدھے گھونگھٹ کی اوٹ سے وہ شازیہ نامی لڑکی بولی۔ ''امی جی، بھائی بتا رہے ہیں کہ وہاں ٹیلی فون کی آواز نہیں آتی۔''

''پر اس نے تو کہا تھا کہ مہینے ڈیڑھ تک آ جاؤں گا۔'' عورت نے بے تابی سے کہا۔ میرا دل جیسے کٹ کر رہ گیا۔

میں نے کہا۔ ''میں کوشش کروں گا ماں جی کہ واپس جاتے ہی اسے آپ کے پاس بھیج دوں۔ یہ اس نے کچھ چیزیں بھیجی ہیں آپ سب کے لیے۔''

میں نے سامان لڑکی کو تھما دیا۔ وہ سامان لے کر دوسری چارپائی پر جا بیٹھی۔ اندر سے دو اور لڑکیاں بھی نکل کر اس کے اردگرد بیٹھ گئیں۔ ان میں سے ایک گھونگھٹ میں تھی اور دوسری جو تیرہ چودہ سال کی ہو گی گھونگھٹ کے بغیر تھی۔ وہ بڑے اشتیاق سے چیزیں دیکھنے لگیں چھوٹی لڑکی بھاگتی ہوئی ماں کے پاس آئی اور بولی۔ ''امی جی، یہ دیکھیں آپ کا سوٹ......اور یہ دیکھیں چادر۔ ہائے اللہ کتنی پیاری ہے۔''

اس نے چادر کھول کر ماں کو دکھائی، ماں نے دیکھا۔ اسے چوما اور سینے سے لگایا پھر وہ دیگر چیزیں دیکھنے لگی۔ اس کی سانس اب بھی تیزی سے آ جا رہی تھی۔ بڑی لڑکی ایک گلاس میں پانی اور دوا لے کر آئی۔ ماں نے دوا کھائی اور ایک بار پھر مجھ سے سیف کے بارے میں سوال جواب کرنے لگی۔

میں جانتا تھا کہ سیف کی والدہ شفقت بی بی کا بائی پاس ہو چکا ہے۔ انہیں اتنی خوفناک خبریوں ہی نہیں دی جا سکتی تھی......مگر زیادہ دیر چھپائی بھی نہیں جا سکتی تھی۔ میں نے ان تک یہ اطلاع پہنچانے کے لیے ایک پروگرام بنا رکھا تھا۔ میں ان کے پاس بیٹھا رہا، ان کی دلجوئی کی باتیں کرتا رہا۔ اسی دوران میں سیف کے والد بشیر صاحب بھی آ گئے۔ تاجور کے والد دین محمد کی طرح وہ بھی ایک درمیانے درجے کے زمیندار تھے۔ سیف کے حوالے سے وہ بھی کچھ الجھن میں نظر آتے تھے۔

وہ بولے۔ ''سخت غیر ذمے دار اور لاابالی لڑکا ہے۔ دو تین ہفتوں کا کہہ کر گیا تھا، اب دیکھو مہینے ہو گئے ہیں۔ ان دنوں تو اس کے ویاہ کی تیاری ہو رہی ہوتی تھی۔ لڑکی کے گھر والے علیحدہ پریشان ہیں۔ اب تو وہ اسلام آباد سے بھی آ گئے ہیں۔ انہوں نے زور ڈالنا ہے کہ جلد

سے جلد دن مقرر کیے جائیں۔''
میں نے چودھری بشیر کو بھی وہ ساری باتیں بتائیں جو والدہ شفقت کو بتائی تھیں۔ وہ بولے۔''تم کب واپس جا رہے ہو بہاولپور؟''
''آ...... ابھی تو ٹھیک سے پتا نہیں، چند دن تو لاہور میں رہوں گا چاچا جی۔''
''تم واپس جاؤ تو مجھے ساتھ لے جاؤ، وہ وہاں بیٹھ کر ناراضگیاں دکھا رہا ہے مجھ کو...... پتا نہیں پیو سے معافی منگوانا چاہتا ہے۔تو ٹھیک ہے مانگ لیتے ہیں معافی۔ دونوں میاں بیوی مانگ لیتے ہیں۔'' چودھری بشیر کی آواز بھرا گئی۔
''نہیں چاچا جی ایسی کوئی بات نہیں۔'' میں نے انہیں تسلی دی۔
''جب جواں پتر بیکار پھرتا ہو تو ماں پیو کا سمجھانا تو فرض بنتا ہے نا؟ بس ایک دو بار تھوڑا سمجھایا ہی ہے نا میں نے۔'' چودھری بشیر نے بوجھل آواز میں کہا۔
یہاں آ کر میرے دل کا بوجھ کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ میں نے سیف کے گھر والوں کو بتایا کہ ابھی ایک دو روز میں چودھری دین محمد کا مہمان ہوں مگر چودھری بشیر نے اصرار کیا کہ میں ان کے ہاں رہوں۔ انہوں نے اسی وقت اپنے گھر کی بیٹھک میرے لیے ٹھیک کرا دی اور سیف کے دوست صدیق سے کہا کہ وہ میرا سامان ڈیرے سے اٹھا کر گھر لے آئے۔
میں نے پہلے تو انکار کیا، پھر کہا کہ میں دین محمد صاحب کا شکریہ ادا کر آؤں، اور اس کے ساتھ ڈیرے سے سامان بھی لے آتا ہوں۔
میں صدیق کے ساتھ ڈیرے پر پہنچا تو وہاں پہلے ہی ناشتا لانے والی تنومند ملازمہ موجود تھی۔ وہ برتن لینے آئی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ پیغام دے رہی تھی کہ دین محمد صاحب مجھے گھر بلا رہے ہیں۔ انہوں نے کوئی بات کرنی ہے۔
میں دین محمد کی ملازمہ کے ساتھ ان کے گھر پہنچا۔ میں یہاں سکھیرا گاؤں میں پہلی بار دین محمد صاحب کا گھر دیکھ رہا تھا۔ ملازمہ نے مجھے باہر کھڑا کیا اور پھر بیٹھک کا دروازہ کھول کر اندر بلا لیا۔ بیٹھک اندر سے اچھی طرح سجی ہوئی تھی۔ صوفے، پردے اور دیہاتی انداز کی رنگین پایوں والی کرسیاں۔ میں ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ بیٹھک سے آگے کافی کشادہ صحن تھا اور گھر کے باقی کمرے صحن کی دوسری سمت تھے۔ صحن سے راحیل اور اسفند کی آوازیں آ رہی تھیں وہ شاید صحن میں ہی کرکٹ کھیل رہے تھے۔ میرا دل انہیں دیکھنے کو چاہتا تھا، خاص طور سے چھوٹے اسفند کو۔ اس کو بھی مجھ سے بہت انس تھا۔
کچھ دیر بعد بیٹھک کا اندرونی دروازہ کھلا اور دین محمد صاحب اندر آ گئے۔ میں نے اٹھ

کر مصافحہ کیا۔ انہوں نے بے دلی سے ہاتھ ملایا اور بوجھل لہجے میں بولے۔ ’’سیف کی موت ہم سب کے لیے بہت بڑا صدمہ ہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس کے گھر والوں تک یہ اطلاع کیسے پہنچائیں۔ اس کی ماں تو مر جائے گی۔‘‘

’’میں اس کی ماں سے مل کے آیا ہوں جی۔ ان کی حالت واقعی ایسی نہیں کہ انہیں اتنی بڑی خبر دی جائے۔ ہاں اگر آپ مناسب سمجھتے ہیں تو اس کے والد اور باقی گھر والوں کو مناسب طریقے سے بتایا جا سکتا ہے۔ یا ایسا کیا جائے کہ پہلے ان لوگوں کو ذہنی طور پر تیار کیا جائے، اس کی بیماری وغیرہ کی اطلاع دی جائے۔‘‘

دین محمد صاحب کے تاثرات سے ظاہر ہوا کہ وہ میری باتوں کو کوئی اہمیت نہیں دے رہے اس کے برعکس ان کی آنکھوں میں میرے لیے بیگانگی اور غصے کی جھلک تھی، بولے۔ ’’ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا کہ یہ سب کیا ہوا ہے اور کس طرح؟ میری بیٹی تو یہی بتا رہی ہے کہ یہ سب کچھ اتفاقیہ ہوا۔ سیف سے تمہاری ملاقات ہوئی اور وہ تمہارے پیچھے پہلے لیہ اور پھر برونائی چلا گیا۔ وہاں اس کی موت کیسے اور کس طرح ہوئی ہے یہ بھی ہمیں کچھ پتا نہیں۔‘‘

’’آپ میرے جسم پر یہ زخم دیکھ رہے ہیں۔ خدا گواہ ہے کہ میں بھی موت کے منہ میں جا کر واپس آیا ہوں۔ وہاں جو کچھ ہوا بہت ہولناک تھا۔ ہم نے سوچا بھی نہیں تھا۔‘‘

دین محمد بولے۔ ’’وہ تو خیر جوشیلا اور ناسمجھ تھا، تم تو نہیں تھے۔ دنیا دیکھی ہوئی ہے تم نے۔ بڑوں بڑوں کی عقل سے زیادہ عقل ہے تمہاری۔ جب تمہیں پتا چل گیا تھا کہ وہ میری بیٹی کا منگیتر ہے اور اس کے ویاہ کی تیاریاں ہو رہی ہیں، تو پھر تم نے کیوں اپنے ساتھ جانے دیا اسے؟ کیوں اسے ایک خطرناک ترین شہر میں لے کر گھس گئے؟‘‘

’’شاید آپ کو پتا نہ ہو، وہ یہاں بھی بہت خطرے میں تھا۔ لاہور کے ایک نامی گرامی بدمعاش کے ساتھ اس نے متھا لگایا ہوا تھا۔ یہاں بھی کسی وقت، کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ باقی ہوتا وہی ہے جو اللہ کی مرضی ہوتی ہے جہاں تک آپ کی دوسری بات کا جواب ہے، آپ یقین کریں مجھے اس بات کا پتا بہت بعد میں چلا کہ وہ آپ کا ہونے والا داماد ہے۔‘‘

وہ غصے سے بولے۔ ’’میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہاری باتوں پر یقین کیسے کروں...... تم نے ہمارے گھر میں اپنا اعتماد کھویا ہوا ہے......‘‘

میں نے ذرا توقف سے کہا۔ ’’میں اس بارے میں بہت شرمندہ ہوں چچا جان، میں یہاں حاضر ہی اس لیے......‘‘

’’چپ رہو۔‘‘ انہوں نے کرخت لہجے میں میری بات کاٹی۔ ’’مت کہو مجھے چاچا

شا چا...... تمہارے منہ سے یہ چنگا نہیں لگتا۔ تم نے پہلے دن سے جھوٹ بولا ہے اور...... اب تک بول رہے ہو، بار بار دھوکا دے رہے ہو۔''

''آپ، صرف دومنٹ کے لیے میری گزارش سن لیں۔'' میں نے عاجزی سے کہا۔

وہ گرجے۔ ''مجھے کچھ نہیں سننا تم سے، جو شخص میری بیٹی کو ورغلانے کے لیے گونگا بن کر میری ملازمت کرتا رہا، پیدائشی جھوٹوں کی طرح فریب دیتا رہا، وہ سب کچھ کر سکتا ہے...... وہ میرے داماد کو بھی مار سکتا ہے۔ اس کی جان بھی لے سکتا ہے۔'' دین محمد صاحب کی آواز بلند سے بلند ہوتی جا رہی تھی۔ چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

میں نے کہا۔ ''جناب! میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں اور اگر میں جھوٹا ثابت ہو جاؤں تو ہر سزا کے لیے بھی تیار ہوں اگر آپ......''

''تم اپنی بکواس بند ہی رکھو تو اچھا ہے۔'' دین محمد صاحب نے ایک بار پھر طیش میں میری بات کاٹی اور گرج کر بولے۔ ''تم ہمارے لیے ہمیشہ مصیبت اور نحوست ہی لائے ہو۔ تمہاری وجہ سے ہمیں چاندگڑھی چھوڑنا پڑا، اپنے باپ دادا کی قبروں سے دور ہونا پڑا لیکن تم نے ہمیں یہاں بھی چین نہیں لینے دیا۔ ہمارا جینا حرام کرنے کے لیے یہاں بھی آ پہنچے۔ جو کچھ سیف کے ساتھ ہوا ہے اور جو کچھ میری بچی کے ساتھ ہوا ہے اس کے ذمے دار صرف اور صرف تم ہو...... ہاں تم ہی ہو جس کی وجہ سے اتنے طاقتور لوگ میری بچی کے پیچھے پڑے ہیں۔ وہ ہمیں راتوں رات یہاں سے اٹھا کر اسلام آباد لے گئے۔ میری بچی کو پتا نہیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ ہمیں دن رات اس کے لیے تڑپایا اور اب اگر وہ واپس آئی ہے تو تم اب بھی اس کے ساتھ چمٹ کر یہاں پہنچ گئے ہو۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے...... تم میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔'' وہ غصے سے کانپ رہے تھے۔ میں پہلی مرتبہ انہیں اتنے طیش کی حالت میں دیکھ رہا تھا۔

وہ کھڑے ہو چکے تھے، میں بھی کھڑا ہو گیا۔ میری سمجھ میں اچھی طرح آ رہا تھا کہ اس موقع پر کچھ کہنا سننا فضول ہے۔ وہ گرجتے چلے گئے۔ ''ہماری حفاظت اللہ کرے گا۔ ہمیں کوئی ضرورت نہیں تمہاری حفاظت کی...... اور نہ میری بچی کو کوئی ضرورت ہے۔ جن عذابوں میں تم نے ہمیں ڈالا ہے ہم خود ہی ان کو جھل (جھیل) لیں گے۔ بس تم دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔'' انہوں نے باقاعدہ مجھے دھکا دیا۔

تب تک بیٹھک کے اندرونی دروازے پر دستک ہونا شروع ہو گئی تھی۔ اس دستک کی وجہ یقیناً دین محمد صاحب کی بلند آواز ہی تھی۔ میں نم آنکھوں کے ساتھ گھوما اور بیٹھک سے نکل

کر باہر گلی میں آ گیا۔

میرے سینے میں شعلے سے بھڑک رہے تھے۔ یہ شعلے شکیل داراب کے لیے تھے۔ یہ وہی تھا جس نے اپنے سارے ذرائع استعمال کر کے تاجور کو ڈھونڈا تھا اور پھر یہاں سے اٹھا کر اسے ہزاروں میل دور جاماجی میں جا پہنچایا تھا تاکہ اسے میرے خلاف استعمال کیا جا سکے۔ میری زبان کھلوانے کے لیے اسے ہر طرح کے تشدد کی چکی میں پیسہ جائے۔ ایک بار پھر میری نگاہوں میں وہ ہولناک منظر گھومنے لگا جب مجھے ایل سی ڈی کی اسکرین پر تاجور پر تشدد کے مناظر دکھائے گئے تھے۔ وہ چھت سے لٹکی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے گریبان کو گرہ دے رکھی تھی تاکہ برہنگی سے بچ سکے۔ نقاب پوشوں نے وہ گرہ کھول دی تھی...... اس سے آگے میں کچھ دیکھ نہیں پایا تھا......

اور اب اسی شکیل داراب کی بیوی خود کو بے قصور اور لاتعلق ظاہر کر رہی تھی۔ وہ یہ بھی بتا رہی تھی کہ شکیل داراب پاکستان میں نہیں ہے۔ میں جانتا تھا کہ وہ پاکستان میں ہے اور لاہور میں ہے۔ کل رات ہی داؤد بھاؤ سے فون پر میری بات ہوئی تھی۔ لاہور کا کون سا گوشہ تھا جو داؤد سے چھپا ہوا ہو۔ وہ لاہور کے اسرار و رموز اور اس کی گلی کوچوں کو اسی طرح جانتا تھا جس طرح جسم کا لہو، جسم کی شریانوں کو جانتا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ شکیل داراب الیکشن جیتنے کے بعد سے صرف ایک مرتبہ پاکستان سے باہر گیا ہے۔ آج کل اس نے لاہور میں پکا پکا ڈیرا لگایا ہوا ہے...... اور اپنے دو کٹھ پتلی افراد کو صوبائی وزیر بنوانے کے چکر میں ہے۔ داراب خاندان کی خصوصیت یہی تھی کہ یہ لوگ براہِ راست سیاست میں آئے بغیر سیاست کرتے تھے۔

میں ابھی سکھیرا گاؤں میں کچھ دن رہنا چاہتا تھا۔ تاجور کے والدین سے اپنی سابقہ غلطیوں کی معافی مانگنا چاہتا تھا، اس کے علاوہ ایک ایسا ماحول پیدا کرنا چاہتا تھا کہ سیف کے گھر والوں کو سیف کی موت کی اطلاع دی جا سکے مگر دین محمد صاحب سے ملنے کے بعد اور اپنے لیے ان کا غم و غصہ محسوس کرنے کے بعد میں نے فوراً گاؤں چھوڑنے اور لاہور پہنچنے کا فیصلہ کیا۔

○......❖......○

میری آنکھوں کے سامنے طیش کی سرخ چادر سی تنی ہوئی تھی۔ جب بندہ اپنے کسی دشمن سے ٹکر لینے کے لیے جاتا ہے تو اس کے پاس کوئی نہ کوئی ہتھیار ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی منصوبہ بھی ہوتا ہے اور جب دشمن بھی شکیل داراب جیسا طاقتور شخص ہو تو ہتھیار اور منصوبہ بندی مزید ضروری ہو جاتی ہے لیکن میرے پاس ان میں سے کوئی چیز نہیں تھی اور شاید مجھے ان

کی زیادہ ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں جانتا تھا کہ جب میں چاہوں گا، ہتھیار خودبخود میرے ہاتھ میں آجائے گا۔ آج بہت عرصے بعد میں خود کو پوری فارم میں محسوس کررہا تھا۔ مسافر بس تیزی کے ساتھ لاہور سے قریب تر ہوتی جارہی تھی۔ میرے سیل فون پر کال کا سگنل آیا مگر کالنگ نمبر نہیں آیا۔ یوں لگ رہا تھا کہ کوئی بیرون ملک سے کال کی کوشش کررہا ہو۔ ایسے ہی کال سگنل کل بھی دو تین دفعہ آئے تھے لیکن آج میں نے بٹن دبایا تو کال ریسیو ہوگئی۔ میں بھونچکا رہ گیا۔ یہ قسطینا کی آواز تھی۔ آواز کٹ کٹ کر آرہی تھی۔ ''ہیلو قسطینا، خیریت ہے؟'' میں نے پوچھا۔

جواب میں اس نے جو کچھ کہا، اس سے پتا چلا کہ وہ تو خیریت سے ہے لیکن اسے کچھ ایسی معلومات ملی ہیں جو میرے لیے ٹھیک نہیں ہیں۔ اس نے بتایا کہ دو دن پہلے تک یہاں جاما جی میں کچھ لوگ مجھے تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ وہ سفید فام ہیں اور خاصے خطرناک ہیں۔ اب پتا چلا ہے کہ وہ میرے پیچھے پاکستان پہنچ گئے ہیں۔ شاید قسطینا مزید تفصیل بتاتی مگر رابطہ منقطع ہوگیا۔ میرا دھیان فوراً ٹیکساری گینگ کی طرف گیا۔ ان کی آمد کسی بھی وقت متوقع تھی مگر یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ ویسے بھی اس وقت میرے ذہن میں صرف شکیل داراب کے نام کی آندھی چل رہی تھی۔ چوک یتیم خانے کے قریب بس سے اترتے ہی میں نے ایک ٹیکسی پکڑی اور گلبرگ کی طرف روانہ ہوگیا۔ شکیل داراب کی لاہور والی وسیع وعریض رہائش گاہ اسی علاقے میں تھی۔ مجھے بچانوے فیصد امید تھی کہ شکیل داراب اور اس کی مکار بیوی ''جے جی'' وہیں پر موجود ہیں۔ یقیناً وہاں پر سکیورٹی کے وسیع انتظامات بھی موجود تھے اور ہوسکتا تھا کہ شکیل داراب میری طرف سے کچھ الرٹ بھی ہو۔ مگر مجھے پتا تھا کہ جب میں آگے بڑھوں گا تو راستہ خودبخود نکلے گا۔ سب سے پہلا مرحلہ یہی تھا کہ کسی بھی حیلے بہانے سے شکیل داراب کے رُوبرو ہوا جائے، پھر کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ بااثر اور طاقتور ترین شخص کی کنپٹی پر بھی جب پستول یا رائفل کی نال آجائے تو اس کی شان وشوکت اور سکیورٹی دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔

میرے ذہن میں بس ایک آندھی سی تھی۔ سینے میں بس یہی آگ بھڑک رہی تھی کہ اس شخص نے میرے ساتھ کیے جانے والے ہر سمجھوتے کو بالائے طاق رکھا اور تاجور کے ''اغوا'' کی صورت میں مجھ پر کاری ترین وار کیا...... ہاں وہ ایک طرح کا اغوا ہی تو تھا۔

مجھے پتا تھا کہ شکیل داراب کی رہائش گاہ کے سامنے سکیورٹی والے مجھے روک لیں گے۔ میرے پاس شکیل کا پرائیویٹ سیل نمبر بھی موجود تھا۔ اس موقع پر وہ مجھے فائدہ دے سکتا تھا۔

ہتھیار کے نام پر میرے پاس فقط ایک تیز دھار چھری تھی جو میں نے یونہی ڈیرے سے اٹھا کر اپنے لباس کے نیچے رکھ لی تھی۔

ہماری ٹیکسی کار نے مزنگ چونگی سے ٹرن لیا اور جیل روڈ کی طرف مڑ گئی۔ ابھی ہم گلبرگ کے علاقے میں داخل نہیں ہوئے تھے کہ اچانک ایک ہنڈا اکارڈ کار نے ہمیں اوورٹیک کیا۔ ٹنڈڈ شیشے والی کھڑکی تھوڑی سی کھلی اور کسی نے ہاتھ کے اشارے سے ہمیں رکنے کا اشارہ کیا۔ میں چونک گیا۔ یہ کوئی اور نہیں لاہور کی زیرزمین دنیا کا بے تاج بادشاہ داؤد بھاؤ تھا۔

ٹیکسی ڈرائیور نے مڑ کر سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''گاڑی روک دو۔''

اس نے گاڑی کی رفتار آہستہ کی اور پھر اسے کنارے پر روک دیا۔ سفید رنگ کی ہنڈا اکارڈ بھی چند قدم آگے رک گئی۔ میں اس وقت داؤد بھاؤ کے ساتھ اس ملاقات پر ششدر تھا۔ کیا یہ ملاقات اتفاقیہ تھی یا پھر مجھے ٹریس کیا گیا تھا۔ تب ہنڈا اکارڈ کا ڈرائیونگ سیٹ والا دروازہ کھلا اور میں نے انیق کو دیکھا۔ وہ سرخ رنگ کی ہاف سلیو شرٹ اور جین میں ملبوس تھا پاؤں میں جوگرز تھے۔ خاصا اسمارٹ لگ رہا تھا۔ سیدھا میری طرف آیا اور بولا۔ ''چلیں جناب! آپ اغوا ہو چکے ہیں۔''

''کس خوشی میں؟''

''لاہور میں داخل ہونے کی خوشی میں۔'' اس نے ہلکے پھلکے انداز میں جواب دیا۔

''تم کیا کہہ رہے ہو؟''

وہ ہولے سے مسکرایا اور جیب سے کچھ روپے نکال کر ٹیکسی ڈرائیور کو تھما دیئے۔ غالباً یہ ضرورت سے کافی زیادہ تھے، ٹیکسی ڈرائیور متحیر رہ گیا پھر انیق مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''تشریف لائیں، باقی باتیں گاڑی میں ہوں گی۔''

میں باہر نکل آیا اور چند قدم دور اس ہنڈا اکارڈ کی پچھلی سیٹ پر جا بیٹھا جہاں داؤد بھاؤ بھی موجود تھا۔ داؤد بھاؤ کا چہرہ جوش سے تمتما رہا تھا۔ اس نے بیٹھے بیٹھے مجھ سے پُرجوش معانقہ کیا۔ انیق نے گاڑی کا دروازہ بند کر دیا تھا۔ وہ گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ انیق کے ساتھ اگلی سیٹ پر وہی شخص موجود تھا جسے ''جھارا'' کہا جاتا تھا۔ اپنے نام کے برعکس وہ ایک سوکھا سڑا شخص تھا لیکن اس کی سختی اور بے خوفی ہر شبہے سے بالاتر تھی۔ اس کی گود میں ''اے کے 57'' رائفل رکھی تھی جو یقیناً لوڈڈ تھی۔ اس نے ادب سے مجھے سلام کیا۔ اس

دوران میں انیق گاڑی آگے بڑھا چکا تھا۔
"پیچھے نظر رکھو۔" داؤد بھاؤ نے پاٹ دار آواز میں انیق کو حکم دیا۔
"یس باس۔" وہ مستعدی سے بولا۔
"ہم کہاں جا رہے ہیں داؤد بھاؤ؟" میں نے پوچھا۔
داؤد بھاؤ نے مجھے سرتاپا دیکھتے ہوئے کہا۔ "زیادہ دور نہیں۔ وہ سامنے ہی کرسٹل ہوٹل ہے۔ ادھر بیٹھتے ہیں، پھر اس نے میرا کندھا دبا کر کہا۔ "تمہارا پارا بہت چڑھا ہوا ہے۔ خود کو ریلیکسڈ کرو یار۔ زیادہ غصہ صحت کے لیے اچھا نہیں ہوتا۔"
میں جیسے لہو کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔ کچھ دیر خود کو پُرسکون کرنے کی کوشش کی، پھر کہا۔
"آپ کو میری آمد کا پتا کیسے چلا؟"
"یہ لاہور ہے چن جی، یہاں سے جو بھی نکلتا وڑتا ہے، داؤد بھاؤ کی نگاہ میں تو آتا ہی ہے۔" وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔
ہم ایک شاندار ہوٹل کے پورچ میں داخل ہو چکے تھے۔ اس وقت مجھے پتا چلا کہ داؤد بھاؤ کی گاڑی کے پیچھے ایک اور کار بھی ہے۔ اس میں بھی داؤد بھاؤ کے کارندے تھے اور یقیناً مسلح بھی رہے ہوں گے۔ ہم اتر کر اندر داخل ہو گئے۔ دربان نے شاید داؤد بھاؤ کو پہچان لیا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ بدلا اور اس نے جھک کر خصوصی سلام کیا۔ یہ شام کا وقت تھا۔ لاہور کی روشنیاں جگمگانے لگی تھیں۔ ہم ڈائننگ ہال میں داخل ہوئے۔ ابھی ڈنر کا ٹائم بہت دور تھا۔ ہال کی بیشتر میزیں خالی تھیں۔ انیق اور "جھارا پہلوان" تو داخلی دروازے کے پاس ہی ایک میز پر بیٹھ گئے۔ ان کا انداز پہرا دینے والا تھا۔ داؤد بھاؤ مجھے لے کر ایک نیم تاریک گوشے کی میز پر آ گیا۔ وہ پینٹ کوٹ میں تھا۔ کوٹ کے نیچے یقیناً بھرا ہوا پسٹل ہر وقت موجود رہتا تھا۔ اپنے چوڑے جبڑوں اور بھاری بھرکم آواز کے ساتھ وہ ہر لحاظ سے ایک دبنگ شخص دکھائی دیتا تھا۔ اتنے میں ہوٹل کا منیجر خود بھاگا ہوا ہماری میز پر پہنچ گیا اور رکوع کے بل جھک کر داؤد بھاؤ سے مصافحہ کیا۔ وہ ہر قسم کی خدمت کے لیے بالکل تیار نظر آتا تھا۔ داؤد بھاؤ نے اسے بس دو سوفٹ ڈرنکس بھجوانے کے لیے کہا اور کہا کہ ہم دونوں کچھ دیر تنہائی میں بیٹھنا چاہتے ہیں۔
داؤد نے رسمی انداز میں میرا حال احوال دریافت کیا۔ میرے ساتھی سیف کی موت پر دکھ کا اظہار کرنے کے بعد بولا۔ "تم کہاں جا رہے تھے۔ میرے آدمیوں نے بس اڈے پر ہی تمہیں دیکھ لیا تھا اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ تم بڑے تناؤ میں نظر آتے ہو پھر جب تم ٹیکسی میں

گلبرگ کی طرف روانہ ہوئے تو میں مزید چونک گیا۔ مجھے لگا کہ تم کو روکنا چاہیے۔“
”کیوں؟ آپ نے کیا سمجھا ہے؟“
اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے براہِ راست میری آنکھوں میں دیکھا۔ یہ ایک نہایت جہاندیدہ گینگسٹر کی جگر پاش نگاہیں تھیں۔ سگریٹ سلگا کر بولا۔ ”مجھے آج پتا چلا ہے کہ شدید غصے کے عالم میں تم جیسا بندہ بھی بے وقوفی کرسکتا ہے اور آج یہی بے وقوفی تمہیں کھینچ کر شاید شکیل داراب کی طرف لے جارہی ہے۔ اس نے تاجور کے حوالے سے جو کچھ تمہارے ساتھ کیا ہے، اس نے تمہارے دماغ میں کھولتا ہوا لاوا بھر دیا ہے اور میں اس کی لالی تمہاری آنکھوں میں دیکھ رہا ہوں۔“
”آپ نے ٹھیک اندازہ لگایا ہے داؤد بھاؤ...... لیکن میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ میں اب رکوں گا نہیں، آج اس کی آنکھوں میں آنکھیں ضرور ڈالوں گا۔“
”یہ بالکل بیکار کی بات کر رہے ہو...... بالکل بیکار۔ تم اس کے سوا اور کچھ نہیں کرو گے کہ خواہ مخواہ اسے ہوشیار کردو گے اور اپنے لیے کوئی بڑا سا گڑھا کھود لو گے۔ وہ آج کل جتنی سکیورٹی میں ہوتا ہے، تم اس کا بال بھی بیکا نہیں کرسکتے اور یہ بات بھی مت بھولو کہ وہ بادشاہ نہ سہی لیکن بادشاہ گر ہے۔ بڑے لمبے ہاتھ پاؤں ہیں اس خبیث کے۔ شاید یہ بات بھی تمہارے ذہن سے نکلی ہوئی ہے کہ تمہارے چچا اور چچا کا ”قیدی بیٹا“ کسی بھی وقت شکیل کا نشانہ بن سکتے ہیں۔ بلکہ چچا کا بیٹا ولید تو جیل میں ہے ہی شکیل کے رحم و کرم پر۔ شکیل سے کھل کر دشمنی کرو گے تو پچھتانا پڑے گا تمہیں۔ وہ کوئی لالہ نظام نہیں ہے جسے نیچا دکھا لو گے۔“
”تو آپ کا کیا خیال ہے۔ صبر کا گھونٹ بھر کر بیٹھ جاؤں۔ ایسے لوگوں کا منہ نہ توڑا جائے تو وہ ایک جگہ رکتے نہیں ہیں۔ کچھ دن بعد اس کا کوئی اس سے بھی بڑا کرتوت سامنے آجائے گا۔“
میرا خون میرے سر کی طرف یورش کررہا تھا۔ دماغ کی نسیں بے طرح دھڑک رہی تھیں۔ وہ سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ”میں تمہیں صبر کر کے بیٹھ جانے کا نہیں کہہ رہا۔ میں نے خود بھی ایسے ”صبر“ نہیں کیے ہیں۔ بہرحال ایک بات ہے۔ میں نے ان شکیل جیسے مال زادوں کو بڑے قریب سے دیکھا ہے۔ ان کی ساری حرام زدگیاں اچھی طرح جانتا ہوں۔ تمہیں شکیل کے وار کا سیدھا سیدھا جواب دینے کے بجائے پلاننگ سے کام لینا چاہیے اور جب یہ پلاننگ سے ہوگا میں بھی تمہارا پورا ساتھ دوں گا۔“
”آپ کس پلاننگ کی بات کر رہے ہیں۔ اگر اس کے ہاتھ لمبے ہیں تو پھر وہ دو چار ماہ

میں چھوٹے تو نہیں ہو جائیں گے۔ ایسے ہاتھوں کو کاٹنا ہی پڑتا ہے۔''

''کاٹیں گے چن جی، کاٹیں گے لیکن کلہاڑے سے نہیں، ایسی تیکھی تلوار سے جو چلے گی لیکن چمک تک نظر نہیں آئے گی اس کی۔ شکیل کے خلاف ایک پرانا معاملہ پھر سے اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ عورت کا چکر ہے تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔''

سوفٹ ڈرنکس آ گئے تھے۔ اس نے مجھے ٹھنڈا جوس پینے کا مشورہ دیا۔ وہ مجھے مسلسل سمجھا رہا تھا۔ وہ بڑا کائیاں گروہ باز تھا۔ پچھلے چالیس پینتالیس سال میں بہت سرد و گرم دیکھ رکھے تھے اس نے۔ اس نے مجھے بتایا کہ شکیل داراب اور داراب فیملی کے ایک مخالف سیاسی دھڑے نے ایک صحافی کی مدد سے شکیل کا ایک بڑا اسکینڈل پکے ثبوتوں کے ساتھ پکڑ لیا ہے۔''

''کچھ اشارہ دیں داؤد بھاؤ۔'' میں نے کہا۔

''اشارہ کیا دینا ہے، تمہیں بتا ہی دوں گا۔ بس تھوڑا سا انتظار کرو۔''

داؤد بھاؤ کی یہ بات بھی سمجھ میں آ رہی تھی کہ میرا چچا زاد ولید، پولیس پارٹی پر باقاعدہ حملہ کرنے کے جرم میں ابھی تک جیل میں تھا اور اس کی سلامتی کے سارے راستے شکیل داراب کے آفس میں سے ہو کر گزرتے تھے پھر چچا جان تھے جو پہلے ہی اپنے گھر کی بربادی کے بعد گوشہ نشین اور خاموشی کی زندگی گزار رہے تھے، میری کسی کارروائی سے ان کی مصیبتوں میں ایک دم اضافہ ہو سکتا تھا۔

داؤد بھاؤ سے میری یہ ملاقات قریباً دو گھنٹے جاری رہی۔ اس دوران میں انیق اور چھارا، ہال کے دروازے کے قریب مستعد اور چوکس بیٹھے رہے۔ داؤد کی آمد سے جیسے اس پورے ہوٹل میں سراسیمگی سی پھیلی ہوئی تھی۔

داؤد نے آخر میں مجھ سے کہا۔ ''میں ابھی اسلام آباد جا رہا ہوں۔ پرسوں واپسی ہو گی۔ تم اڈے پر آ جانا۔ تفصیل سے بات کریں گے۔ اب تم کہیں اور نہ جاؤ۔ یہیں اس ہوٹل میں رہو۔ اپنے اس مغوی (انیق) کو بھی اپنے ساتھ رکھ لو۔ میں تمہارے لیے فرسٹ فلور پر پورا سوئٹ بک کرا دیتا ہوں۔'' میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی اس نے چٹکی بجائی۔ اسسٹنٹ منیجر بھاگا بھاگا آیا۔ داؤد بھاؤ نے اسے فوراً ایک بہترین سوئٹ بک کرنے کی ہدایت کی۔ میں عذر کرنا چاہ رہا تھا مگر اس نے مجھے بولنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ کچھ ہی دیر بعد میں اور انیق ہوٹل کے شاید سب سے اچھی لوکیشن والے آرام دہ سوئٹ میں موجود تھے۔ دیوار گیر کھڑکیوں سے نیچے سوئمنگ پول کا شاندار منظر نظر آ رہا تھا۔ جل پریاں مختصر ترین لباسوں میں دعوتِ

نظارہ دیتی تھیں اور لگتا تھا کہ یہ خوش نمائی صرف دیکھنے کی حد تک نہیں ہے۔ ''حوصلہ زیادہ'' ہو تو آگے تک جایا جا سکتا ہے۔ یہ وہی یورپین اسٹائل تھا جو اب یہاں بھی سپر اسٹار ہوٹلوں میں دکھائی دیتا تھا۔

چالیس پینتالیس سالہ ایک سفید فام شخص تیس پینتیس سال کی ہم قوم خوبرو خاتون کو اپنے ساتھ لگائے، پول کے کنارے چہل قدمی کر رہا تھا۔ دونوں ہی واجبی ترین لباس میں تھے۔ انیق نے دونوں کو دیکھ کر ٹھنڈی سانس بھری اور بولا۔ ''آپ کے امریش پوری عرف پربت سنگ عرف سجاول سیالکوٹی کا خیال آ گیا۔ اس کے اندر کی خباثت نے اس کی بیڑیوں میں وٹے ڈال دیئے، ورنہ جاماجی کی وہ حسین خاتون ایسی سنگدل بھی نہیں تھی۔ اگر وہ اسے یوں بری طرح نہ دھتکارتی تو ہوسکتا ہے اس وقت وہ بھی اس خوش باش جوڑے کی طرح کہیں چہلیں کر رہا ہوتا...... آہ بے چارہ۔''

انیق نے اپنی آنکھوں میں باقاعدہ آنسو بھر لیے۔ پورا ڈرامے باز تھا۔ میں نے کہا۔ ''میں بڑی اچھی طرح جانتا ہوں، سجاول کے بارے میں کتنے دکھی ہو تم۔ تمہارے بس میں ہوتا تو جہاز میں ہی ناچنا شروع کر دیتے کہ خورسنہ اس کے ساتھ نہیں آئی۔''

''آپ مجھے کبھی نہیں سمجھیں گے۔ دراصل مجھے کوئی بھی نہیں سمجھتا۔ میرے دل میں محبت کا ایک سمندر بہہ رہا ہے جو قراقرم سے بھی بڑا ہے۔''

''اور قراقرم کسی سمندر کا نہیں پہاڑ کا نام ہے۔'' میں نے اس کی پسلیوں میں ٹانگ رسید کی۔ وہ تکلیف سے دہرا ہو گیا۔ سرخ چہرے کے ساتھ کراہا۔

''م...... مجھے لگتا ہے کہ آپ نے میرا ''لیور'' پھاڑ ڈالا ہے۔ اُف...... آہ......''

''یہاں جگر نہیں، دل ہوتا ہے۔''

''دل ہی تو نہیں ہے میرے پاس۔ اگر ہوتا تو اب تک کسی کو دے نہ چکا ہوتا۔ یہاں بائیں بغل کے نیچے جگر ہے میرا۔ تبھی تو کہتا ہوں کہ مجھے آج تک کوئی سمجھ نہیں سکا...... بھولی ہوئی ہوں داستاں گزرا ہوا خیال ہوں...... جس کو نہ تم سمجھ سکے۔''

○......❖......○

اچانک انیق کو بریک لگ گئے۔ نیچے کہیں سے یکے بعد دیگرے تین فائر سنائی دیئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی انیق کے فون پر سگنل آئے۔ اس نے کال ریسیو کی۔ یہ مختار جھارا تھا جو اپنے چند ساتھیوں سمیت ہمارے اردگرد ہی موجود تھا۔ وہ چلایا۔ ''انیق! گڑبڑ ہے۔ کچھ لوگ اندر گھس آئے ہیں۔ چہرے نقابوں میں چھپائے ہوئے ہیں۔''

اسی دوران میں ایک برسٹ چلا۔ میں اور انیق لپک کر سوئٹ کے اندرونی ٹیرس پر پہنچے۔ اس بالکونی نما جگہ پر کھڑے ہو کر ہم ہوٹل کا داخلی راستہ دیکھ سکتے تھے۔ یہ وہ راستہ تھا جو چھ منزلہ ہوٹل کے اندرونی باغیچے سے ہوٹل میں داخل ہوتا تھا۔ میں نے دیکھا نیچے افراتفری دکھائی دے رہی تھی۔ ایک باوردی دربان خون میں لت پت ایک فوارے کے قریب پڑا تھا۔ شاید یہ وہی ہو جس نے سرشام اس وقت ہمیں جھک کر خصوصی سلام کیا تھا جب میں اور داؤد بھاؤ اندر داخل ہوئے تھے۔ میں نے دو نقاب پوشوں کو دیکھا، وہ ایک کمرے کے اندر سے نکلے اور دوڑتے ہوئے ہوٹل کی عمارت میں داخل ہو گئے۔ یقیناً ان کے کچھ ساتھی پہلے ہی اندر آ چکے تھے۔ ان دونوں نقاب پوشوں نے سیاہ رنگ کے نہایت چست لباس پہن رکھے تھے۔ اس لباس کے نیچے نہایت پتلی پرت والی بلٹ پروف جیکٹس بھی یقیناً موجود تھیں۔ ان کے اسکائی نقاب بھی ڈارک گرے تھے اور لباس کی طرح سیاہ ہی دکھائی دیتے تھے۔ ان دونوں نقاب پوشوں کو دیکھتے ہی زمین و آسمان کا قلابہ میری نگاہوں میں گھوم گیا۔ مجھے لگا کہ میری رگوں میں خون کی گردش یکلخت ٹھہر گئی ہے اور میں بے جان ہو کر ہوا میں معلق ہو گیا ہوں۔ قسطینا کی ادھوری فون کال کی بازگشت کانوں میں گونجنے لگی۔

ہاں وہ آ گئے تھے، جن کی آمد کے بدترین اندیشے شام و سحر میرے ذہن کو جکڑے رکھتے تھے...... ہاں وہ آ گئے تھے...... جنہوں نے مجھ سے موت کا وعدہ کر رکھا تھا اور اس وعدے کو ایفا کرنے کے لیے شب و روز کوشاں تھے۔

یہ ٹیکساری گینگ تھا۔ یہ وہ بے رحم قاتل تھے جو صرف لڑنے مرنے کے لیے ہی پیدا ہوتے تھے اور جیتے تھے۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ یہ خون بہانے والی مشینیں تھیں......نہ ان کے ماں باپ تھے، نہ بہن بھائی، نہ بچے، انہیں بس اس حوالے سے انسان کہا جا سکتا تھا کہ وہ انسانوں کی طرح کھاتے پیتے تھے، سوتے جاگتے تھے اور عورتوں کے ساتھ تعلقات رکھتے تھے۔ یہ ٹیکساری گینگ کا وہ انوکھا ''وِنگ'' تھا جو انڈر ورلڈ میں دہشت و بربریت کی علامت تھا۔ اس کو یار لوگوں نے ڈیتھ اسکواڈ کا نام دے رکھا تھا۔ اس میں چند عورتیں بھی شامل تھیں۔ اس اسکواڈ کا ہر فرد دورِ حاضر کا ہلاکو تھا۔ اس ڈیتھ اسکواڈ کی تفصیل میں آگے جا کر بیان کروں گا۔ فی الحال تو یہی کہہ سکتا ہوں کہ میں یکا یک ایک مہلک طوفان کی زد میں آ گیا تھا اور چند لمحے کے سکتے کے بعد میری تمام حسیات بیدار ہو کر صرف ایک ہی بات پر فوکس کر رہی تھیں کہ مجھے اپنی اور انیق کی جان کس طرح بچانی ہے۔

مجھے ایک سو ایک فیصد یقین تھا کہ عمارت میں داخل ہونے کے بعد وہ لوگ میرے ہی

سوئٹ کی طرف لپک رہے ہوں گے۔

''یہ کون ہیں؟'' انیق نے پوچھا۔

''وہی جن کے بارے میں جاماجی سے اطلاع آئی تھی۔ ہمیں نکلنا ہوگا یہاں سے۔ تمہارے پاس کوئی ہتھیار ہے؟''

''جی جناب! ایک بریٹا پسٹل اور دو بھرے ہوئے فالتو میگزین۔'' انیق جوش سے بولا۔

میں نے کہا۔ ''ہمیں کھڑکی کی طرف سے نکلنا ہوگا۔'' میں اسے لے کر کھڑکی کی طرف بڑھا۔

وہ بولا۔ ''جناب! ایسا تو تب کرتے ہیں جب کمرے میں کوئی ''ناجائز لڑکی'' ہو، یہاں تو ہم دونوں شریف زادے ہیں۔''

میں نے اس کی سنی اَن سنی کی، وہ ابھی جانتا نہیں تھا کہ کتنی بڑی مصیبت میں پھنس چکا ہے۔ ہم نے شیشے کی دیوار گیر کھڑکی کا ایک شیشہ سلائیڈ کیا اور باہر کے چھ سات انچ چوڑے کارنس پر قدم جما کر بائیں جانب کھسکنے لگے۔ ابھی ہم آٹھ دس فٹ دور ہی گئے ہوں گے کہ عین ہمارے ''سوئٹ'' کی طرف سے زوردار کڑاکے کی آواز آئی جیسے دروازہ توڑنے کی کوشش کی گئی ہو پھر ایل ایم جی کا ایک طویل برسٹ چلا اور در و دیوار لرزہ خیز آواز سے گونج اٹھے۔

''وہ پہنچ گئے ہیں، چھلانگ لگاؤ۔'' میں نے انیق سے کہا۔

ہم تیرہ چودہ فٹ کی بلندی سے کودے۔ نیچے بھی بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ ہر ایک کو اپنی پڑی تھی۔ کسی نے ہمارے کودنے پر غور نہیں کیا۔ انیق کے گرنے سے ایک فربہ اندام خاتون کو دھکا لگا اور وہ چلا کر فوارے کے پانی میں جا گری۔ اس سے معذرت کرنے کا موقع نہیں تھا۔ ہم آگے پیچھے دوڑتے اور ایک چھوٹی دیوار پھلانگتے ہوئے ہوٹل کے کچن میں گھس گئے۔ یہاں کوکنگ کا کام زوروں پر تھا۔ اَن گنت پکوانوں کی خوشبوئیں چکرا رہی تھیں۔ ہم نے کئی برتن الٹائے اور کئی باورچیوں اور باورچنوں کو فرش بوس کیا۔ کچن کے عقبی دروازے سے نکل کر اور بیرونی چار دیواری پھاند کر ہم سڑک پر پہنچ گئے۔ سامنے ہی وہ نئے ماڈل کی اسٹیشن وین کھڑی تھی جس میں داؤد بھاؤ کے شوٹر موجود تھے۔ جھارا بھی ان میں ہی تھا اور اس نے ابھی دو منٹ پہلے ہمیں طوفان کی آمد کی اطلاع دی تھی۔ میں اور انیق فراٹے سے وین میں گھس گئے۔ یہی وقت تھا جب ہوٹل کے فرسٹ فلور کی کھڑکی سے کسی کی پکارتی ہوئی آواز سنائی دی

اور اس کے ساتھ ہی اسٹیشن وین پر مشین پسٹل کی گولی فائر کی گئی۔

''جھارے، نکلو یہاں سے۔'' میں نے چلا کر کہا۔

اس نے وین پہلے ہی اسٹارٹ کر کے گیئر میں ڈال رکھی تھی۔ وین کے پہیے چر چرائے اور وہ کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح آگے بڑھی۔ اب رات کے نو بج چکے تھے۔ یہ ویک اینڈ تھا۔ یہ وہی وقت ہوتا ہے جب لاہور جیسے شہروں کے لوگ آؤٹنگ اور ہوٹلنگ کے لیے گھروں سے نکلتے ہیں، سڑکوں پر رش ہو جاتا ہے۔

ہماری وین پہلے چوراہے تک ہی پہنچی تھی کہ عقب میں ایک تیز رفتار گاڑی کی روشنیاں نظر آئیں جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ شیورلیٹ جیپ تھی۔ تھوڑی سی دقت کے ساتھ ایسی جیپوں میں نو دس افراد بیٹھ سکتے تھے۔

''یہ انہی کی گاڑی ہے۔ وہ پیچھے آ رہے ہیں۔'' جھارا نے تصدیق کی۔

''رکنا نہیں، جدھر سے راستہ ملے نکلتے چلے جاؤ۔'' میں نے حکم دیا۔

میرے لباس میں اسی ایک تیز دھار چھری کے سوا اور کچھ نہیں تھا اور سابقہ پڑ گیا تھا ٹیکساری گینگ کے سفاک قاتلوں سے۔ ''انیق مجھے کوئی ہتھیار دو۔'' میں نے تیزی سے کہا۔

انیق نے ایک شوٹر کے ہاتھ سے سیون ایم ایم لے کر مجھے تھما دی۔ میں ابھی رائفل کا سیفٹی کیچ ہٹا رہا تھا کہ عقب میں آنے والی جیپ سے بے دریغ ایک برسٹ فائر کیا گیا۔ چند گولیاں وین کی باڈی میں لگیں۔ میں نے ایک آٹو رکشا کو دو پہیوں پر گھوم کر سڑک پر لڑھکتے دیکھا۔ شاید ہم پر چلائی جانے والی گولیوں میں سے ایک رکشا ڈرائیور کے حصے میں آ گئی تھی۔ رکشے کی رگڑ سے فضا میں چنگاریاں سی چھوٹتی محسوس ہوئیں۔

دوسرا برسٹ چلنے سے پہلے ہی انیق چلایا۔ ''لیٹ جاؤ۔''

اس برسٹ نے عقبی اسکرین کو چکنا چور کر دیا۔ ایک گولی یا شاید دو گولیاں ایک نشست کی ''بیک'' کو پھاڑ کر ایک شوٹر کے جسم کو چھید گئیں۔ میں نے سر اوپر اٹھایا اور ٹوٹی ہوئی اسکرین میں سے عقب میں آنے والی دیوہیکل جیپ پر دو چھوٹے برسٹ فائر کیے اور اس کے ساتھ ہی نیچے جھک گیا۔ ہوشیار جھارا ایسی لڑائیوں اور مارا ماریوں میں ماہر تھا، اس نے وین کو تیزی سے دائیں بائیں لہرایا اور جیپ سے چلنے والے چوتھے برسٹ کو تقریباً خالی کر دیا مگر اس سے دو نقصان ہوئے۔ اس نے جب وین کو دائیں بائیں لہرایا تو ایک موٹر سائیکل سوار اپنی خاتون ساتھی سمیت ہماری وین کے پہلو سے ٹکرایا اور موٹر سائیکل سڑک پر دو تین قلابازیاں کھا گئی۔ دوسرا نقصان یہ تھا کہ ڈیتھ اسکواڈ والوں کی بے دریغ فائرنگ نے ایک اور

شہری کو گھائل کر کے سڑک پر لٹا دیا تھا اور یہ گھائل ہونے والا کوئی اور نہیں ایک ٹریفک وارڈن تھا۔

میں اب پوری طرح چارج ہو چکا تھا اور ہر آفت کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھا لیکن یہ نہیں چاہتا تھا کہ میری اور ٹیکساری گینگ کے غیر ملکیوں کی اس لڑائی میں میرے بے گناہ ہم وطن مارے جائیں۔ میں نے جھارا سے کہا۔ ''ہم کہاں پر ہیں؟''

وہ بولا۔ ''کینال بیک روڈ پر جی۔''

''گاڑی کو گنجان علاقے سے باہر نکالو۔ یہ سڑک آگے کہاں جائے گی؟''

''جلو پارک کی طرف جی۔'' جھارا کے بجائے انیق نے جواب دیا۔ ''وہ بالکل کھلا علاقہ ہے۔''

''ٹھیک ہے، اسی طرف نکلو۔ سب اپنے ہتھیار تیار کر لو۔ یہ لوگ آسانی سے، ہمارا پیچھا نہیں چھوڑنے والے اور ذہن میں رہے، ان لوگوں نے بلٹ پروف جیکٹس پہن رکھی ہوں گی سر کو نشانہ بنانا ہے، یا ٹانگوں کو۔''

جونہی ہماری طاقتور اسٹیشن وین رش میں سے نکلی اور ایک چوراہا پار کر کے شاہراہ قائداعظم والے پل سے شمال کی طرف نکلی ایک دم اس کی رفتار تیز ہو گئی۔ یہاں سڑک کشادہ تھی۔ ٹریفک بھی کم تھا۔ میرا مقصد پورا ہو رہا تھا۔ اب غیر متعلق لوگوں کا نقصان ہونے کا اندیشہ زیادہ نہیں تھا۔ میرے سینے کے انگارے پوری طرح دہک گئے تھے۔ ان کی مدتوں پرانی رنگت لوٹ آئی تھی۔ وہی نیلگوں آنچ، وہی شعلوں کی ہلکی ہلکی پھنکار۔ میں نے دانت پیسے اور دل ہی دل میں کہا۔ ''آجاؤ...... آجاؤ، آج دیکھ لیتا ہوں تم کو۔ تم وہی موت کے ہرکارے ہو اور میں بھی وہی شاہ زیب ہوں۔''

ہم بڑی تیز رفتاری سے جلو موڑ کی طرف جا رہے تھے۔ مجھے تھوڑا تھوڑا پتا تھا کہ آگے جا کر یہ علاقہ بالکل سنسان ہو جاتا ہے۔

''میرے خیال میں پولیس بھی پیچھے آ رہی ہے۔'' انیق نے دور ایک ریوالونگ روشنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اس کا کہنا درست تھا...... جیپ کے عقب میں پولیس کی گاڑی موجود تھی۔ کم از کم ایک تو دکھائی دے رہی تھی۔

''یہ پولیس کس کی طرف سے ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میرے خیال میں تو یہ نیوٹرل ہے۔ اب تک راستے میں جو جو کچھ ہوا ہے، اس کی وجہ

سے یہ مامے ہمارے پیچھے لگے ہیں۔'' انیق نے جواب دیا۔

جو کچھ بھی تھا مجھے اس بات کا اطمینان تھا کہ اب جو بھی مارا ماری ہوگی کھلے میدان میں ہوگی۔ یہ بھی عین ممکن تھا کہ ذرا آگے جا کر ہمیں ان نقاب پوش قاتلوں سے پیچھا چھڑانے کا کوئی موقع ہی مل جاتا۔ ہمارا اور جیپ کا درمیانی فاصلہ اب 500 میٹر سے زائد تھا۔

''مارے گئے۔'' انیق کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

میں نے اس کی نگاہ کا تعاقب کیا اور چونک گیا۔ آگے پولیس ناکا نظر آ رہا تھا اور یہ کوئی عام ناکا بھی نہیں تھا۔ نہر کے کنارے دو پولیس موبائلز کو اس طرح آمنے سامنے کھڑا کیا گیا تھا کہ راستہ تقریباً مسدود ہو گیا تھا۔ دونوں گاڑیوں پر فلیشنگ روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ گاڑیوں سے کوئی پچاس قدم پہلے ہی پولیس کی نفری موجود تھی اور دور ہی سے ہمیں اسٹاپ والا سائن بورڈ دکھایا جا رہا تھا۔ ''لگتا ہے کہ وائرلیس پر پیغام چل چکا ہے۔'' جھارا نے کہا۔

''اب کیا کرنا ہے؟'' انیق نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

دائیں طرف نہر تھی۔ بائیں طرف نشیب کی کچی جگہ تھی اور کیاریاں وغیرہ تھیں۔ میں انیق کے سوال کا کیا جواب دیتا۔ مجھے اس علاقے کی کچھ پہچان نہیں تھی۔ مجھے خاموش دیکھ کر انیق، جھارا سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''وہ اگلے والے کھمبے سے گاڑی نیچے اتار دو۔''

جھارا نے انیق کی ہدایت پر عمل کیا۔ اسٹیشن وین دو تین فٹ اچھلی اور کچے پر دھکے کھاتی ہوئی ایک پختہ سڑک پر آ گئی۔ پانچ دس سیکنڈ بعد اندازہ ہوا کہ جیپ اور پولیس کی گاڑی بدستور ہمارے پیچھے ہیں...... بلکہ جیپ کا فاصلہ اب مزید کم ہو گیا تھا۔ جیپ کا دیوہیکل ہیولا جیسے کسی عفریت کی طرح ہمارے تعاقب میں لپکا چلا آ رہا تھا۔

''کون لوگ ہیں یہ؟'' جھارا نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے دبی آواز میں انیق سے پوچھا۔

''ابھی تو بس یہی سمجھو کہ ہماری جان کے دشمن ہیں۔ بعد میں پوسٹ مارٹم رپورٹ کے بعد پتا چلے گا کہ کس علاقے سے تعلق رکھتے ہیں۔'' وہ ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔

فاصلہ خاصا کم ہو چکا تھا۔ ایک بار پھر جدید ترین رائفلوں کے برسٹ ہم پر فائر ہوئے اسٹیشن وین کے دونوں پچھلے ٹائر فلیٹ ہو گئے......مگر وہ بھاگتی چلی جا رہی تھی۔ میں نے اور انیق نے جوابی فائرنگ کی۔ مجھے دکھ یہ تھا کہ اب ہم ایک بار پھر گنجان علاقے میں تھے اور جو کچھ ہوا تھا پولیس کی وجہ سے ہی ہوا تھا۔ اپنے پیٹی بھائی (وارڈن) کو گولی لگنے کے بعد غیر معمولی کارکردگی کا مظاہرہ کر رہے تھے اور وہ جانتے نہیں تھے کہ یہ کارکردگی کچھ لوگوں

بھاری بھی پڑ سکتی ہے۔ جیسا کہ مجھے بعد میں انیق سے معلوم ہوا یہ مغلپورہ کا علاقہ تھا۔ سڑک پر ٹریفک کا اژدھام تھا۔ آخر ہماری وین ٹریفک میں پھنس گئی۔ ہمارے عقب میں کچھ فاصلے پر دیوہیکل بلٹ پروف جیپ بھی رک گئی۔ میں نے آنکھیں سکیڑ کر دیکھا۔ جیپ کے اندر سے موت کے سیاہ پوش ہرکارے چھلانگیں لگا کر برآمد ہو رہے تھے...... یہ ٹیکساری گینگ کا بدنام زمانہ ڈیتھ اسکواڈ تھا اور مغلپورہ لاہور کی ایک سڑک پر موجود تھا۔ ان کا نشانہ میں تھا مگر میں جانتا تھا کہ وہ کسی دوسرے کی جان کی پروا کیے بغیر اندھا دھند مجھے ٹارگٹ کریں گے۔

میں نے جھارا سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''جھارا! میں اور انیق یہاں سے نکل رہے ہیں۔ تم بھی مختلف سمتوں میں بھاگ جاؤ اور خبردار فائر نہیں کرنا ان پر...... بس خود کو بچانے کی کوشش کرو۔''

میں نے انیق کو ساتھ لیا اور جست لگاتا ہوا وین سے باہر آ گیا۔ جھارا ابھی ڈرائیونگ سیٹ چھوڑ چکا تھا۔ پیچھے والی گاڑیوں کے ہارن مسلسل شور مچانے لگے۔ ہم رکی ہوئی ٹریفک کے درمیان سے راستہ بناتے، لوگوں سے ٹکراتے، گاڑیاں پھلانگتے مشرقی جانب دوڑے۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ سیاہ پوش ہمارے پیچھے ہیں اور پھر وہ گولیاں چلانے لگے۔ میرے عین سامنے ایک گدھا گاڑی کا گدھا اوندھے منہ گرا اور تڑپنے لگا۔ میں نے مڑ کر ایک برسٹ چلایا لیکن یہ ہوا میں تھا۔ میں پیچھے آنے والوں کو ٹارگٹ کیسے کر سکتا تھا۔ وہاں میرے اپنے لوگ بھی تھے۔ یکسر بے قصور اور لاتعلق۔ جب میں نے مڑ کر دیکھا، مجھے انیق کے علاوہ جھارا بھی نظر آیا۔ اور بات صرف جھارے کی نہیں تھی، وین میں موجود تقریباً تمام چھ سات افراد میرے پیچھے آ رہے تھے۔ ان میں سے کسی نے بھی میرا ساتھ چھوڑنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ مجھے ان میں لودھی بھی نظر آ رہا تھا۔ داؤد بھاؤ کے مارشل آرٹ کلب کا وہی دبنگ باکسر جس سے میرا ایک مرتبہ زوردار مقابلہ ہوا تھا۔

ہم ایک گنجان آبادی میں داخل ہو چکے تھے۔ یہاں تنگ گلیاں تھیں، بھرے پرے بازار تھے، میوزک سینٹر، چائے خانے، پان شاپس، ویڈیو گیمز، جنرل اسٹورز زندگی اپنے تمام تر روشن بہاؤ کے ساتھ رواں دواں تھی مگر ہماری اچانک آمد نے اس زندگی میں تلاطم برپا کر دیا تھا۔ ہمارے اردگرد ایک دم بھگدڑ سی مچ گئی۔ بے شمار دہشت زدہ نگاہیں ہماری طرف اٹھیں۔ ہمارے ہاتھوں میں موجود اسلحہ دیکھنے والوں کو مزید خوف زدہ کر رہا تھا اور وہ پھرتی سے ہمارا راستہ چھوڑ رہے تھے۔ یکایک اندھا دھند گولیاں چلنے لگیں۔ میں اور انیق دودھ دہی کی ایک دکان میں گھس گئے۔ ہم نے اپنے عقب میں آنے والوں پر جوابی فائرنگ کی۔

دھماکوں کے ساتھ ہر طرف چنگاریاں بکھرتی نظر آئیں۔ کئی عام افراد اس فائرنگ کی زد میں آ کر زمین بوس ہوئے۔ ایک گولی جھارا کے ایک ساتھی کی پیشانی پر لگی اور میں نے اس کو پہلو کے بل دودھ کے کڑاہے میں گرتے دیکھا۔ دودھ فروش کا ایک ملازم بھی زخمی ہو کر دکان کے فرش پر تڑپ رہا تھا۔ یہ وہی کچھ ہو رہا تھا جس سے میں بچنا چاہتا تھا۔

گولیاں موسلا دھار بارش کی طرح ہماری اس پناہ گاہ پر برسیں۔ مجھے اور انیق کو اتنا موقع ہی نہیں مل رہا تھا کہ کھل کر جوابی فائر کر سکیں۔ فائرنگ کی شدت اور رخ سے اندازہ ہو رہا تھا کہ قاتل حملہ آور ہم سے قریب تر ہو رہے ہیں۔

''یہاں ایک چھوٹا دروازہ ہے۔'' انیق نے چلا کر کہا اور عقب میں اشارہ کیا۔

ہم اس دروازے سے نکلے۔ ایسا کرتے ہوئے ہمیں تڑپتے ہوئے ملازم لڑکے کے خونچکاں جسم کو پھلانگنا پڑا...... اس منظر نے مجھے دکھ دیا۔ ہم ایک سڑک پر نکلے اور اسے پار کر کے دوسری طرف آ گئے۔ ہمارے چاروں جانب خوف زدہ آنکھیں اور ہراساں چہرے تھے۔ آس پاس ہونے والی فائرنگ نے راہ گیروں اور اہلِ علاقہ کو دہلا دیا تھا۔ ہم ایک بڑے آہنی گیٹ میں گھس گئے اور اسے اندر سے بولٹ کر دیا۔ یہ ایک پورچ نما جگہ تھی۔ سامنے ہی لکڑی کا دیدہ زیب منقش ''مین ڈور'' دکھائی دے رہا تھا۔ باہر ایک ملازم بھی کھڑا تھا۔ وہ ہکا بکا ہمیں دیکھ رہا تھا کہ ہم دروازہ دھکیل کر اندر گھس گئے۔ یہ ایک بڑا ہال تھا اور یہاں بہت سی روشنیاں چمک رہی تھیں۔ اسی اثنا میں جھارا، لودھی اور ان کے دو ساتھی بھی بھرا مار کر اندر گھس آئے۔ تب ہمیں پتا چلا کہ وہ بھی ہمارے پیچھے ہی آ رہے تھے۔ چوکیدار واویلا کرنے لگا۔ انیق نے اس منقش دروازے کو بھی اندر سے بولٹ کر دیا۔ دھیان سے دیکھا تو ہم ایک شادی ہال میں تھے۔ یہاں رنگ برنگے آنچل لہرا رہے تھے اور تیز روشنیاں تھیں لیکن یہاں شادی نہیں بلکہ کسی طرح کی شوٹنگ چل رہی تھی۔ جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ کوئی فلمی شوٹنگ ہے۔ ایک رقاصہ اشتعال انگیز لباس میں شاید چند سیکنڈ پہلے تک رقص کر رہی تھی۔ ہماری دخل درمعقولات نے یہاں موجود ہر مرد و زن کو بری طرح چونکا دیا۔

''کٹ اِٹ...... کٹ اِٹ۔'' ایک پاٹ دار آواز ابھری۔

اس کے ساتھ ہی دو ہٹے کٹے افراد ہماری طرف آئے۔ ''کیا بات ہے استاد! اندر کیوں گھسے ہو؟'' ایک بندے نے ہمارے اسلحے کو خاطر میں لائے بغیر کہا۔

انیق بولا۔ ''غلطی ہو گئی۔ ہم نے سمجھا تمہاری بہن کی شادی ہو رہی ہے مگر یہاں تو اور طرح کا بھنڈر خانہ چل رہا ہے۔''

''اوئے کون ہو تم؟'' دوسرے شخص نے پستول نکال لیا۔
دو گارڈز نے بھی رائفلوں کو حرکت دی مگر گارڈز کو دیکھ کر ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ مر کر بھی گولی چلانے یا پنگا لینے کی جرأت نہیں کریں گے۔ پستول والا بھی جیسے خود چاہ رہا تھا کہ اس سے پستول چھین لیا جائے...... اور اس کی عزت بچ جائے۔ انیق نے اس سے نہ صرف پستول چھینا بلکہ ایک زوردار دھکا بھی دیا۔ وہ چربیلا شخص اپنی گنبد نما توند سنبھالتا ہوا ایک پورٹ ایبل لائٹ پر گرا اور اسے چکنا چُور کر گیا۔ فلمی یونٹ میں کوئی قابلِ ذکر چہرہ نظر نہیں آرہا تھا۔ ایکٹرز بھی شاید دوسرے تیسرے درجے کے تھے۔ انہوں نے شکاریوں والے لباس پہن رکھے تھے اور ڈمی بندوقیں اٹھا رکھی تھیں۔ تین چار لڑکیاں تھیں جو چلاتی ہوئی ایک جانب بھاگ کھڑی ہوئیں۔ ڈائریکٹر اور کیمرا مین بھی الٹے قدموں پیچھے ہٹے اور اوجھل ہو گئے۔ صرف گارڈز اور چربیلا شخص جو پروڈیوسر بھی تھا، ابھی تک وہیں تھے، چربیلے شخص کا چہرہ سرخ نظر آنے لگا تھا۔ انیق نے اس کی توند میں رائفل کی نال چبھوئی اور اسے ''زچہ'' کا خطاب دیتے ہوئے کہا۔ ''بھاگ جاؤ یہاں سے ورنہ تمہارا حمل ضائع ہو جائے گا۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے موٹے شخص کے پاؤں کے قریب دو تین فائر کیے۔

خاصا نڈر شخص تھا مگر ہمارے تاثرات اسے سمجھا رہے تھے کہ معاملہ اس کی توقعات سے زیادہ سنگین ہے۔ وہ بڑبڑاتا ہوا پیچھے ہٹا اور بولا۔ ''اس کو کون اتارے گا؟''

میں نے اور انیق نے ایک ساتھ اوپر دیکھا۔ لوہے کے ایک بڑے پنجرے میں ایک حسینۂ دلنواز قید تھی۔ اس کے جسم پر لباس کے نام پر تو کوئی شے نہیں تھی، ہاں چند سبز پتے تھے جنہوں نے اسے مختصراً ڈھانپ رکھا تھا۔ پنجرہ چھت سے تین چار فٹ نیچے ایک مضبوط زنجیر سے لٹک رہا تھا۔

انیق بولا۔ ''یا اللہ خیر، یہ تو ٹاپ کی ہیروئن ہے۔''

''اور ٹاپ پر ہی لٹکی ہوئی ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ پکار رہی تھی۔ ''بچاؤ...... خدا کے لیے مدد کرو۔''

اب لوہے کے بیرونی گیٹ پر تابڑ توڑ فائرنگ ہو رہی تھی۔ وہ اسے توڑ کر اندر گھسنے ہی والے تھے۔ میں نے انیق اور موٹے پروڈیوسر کے ساتھ مل کر زنجیر کو ڈھیلا کیا۔ پنجرہ ایک چرخی پر گھوم کر نیچے فرش پر آ گیا لیکن جب انیق نے پنجرے کا دروازہ کھول کر لڑکی کو نکالنا چاہا تو پتا چلا کہ وہاں بھاری قفل لگا ہوا ہے۔

''چابی کہاں ہے؟'' انیق نے گرج کر پروڈیوسر سے پوچھا۔

''وہ تو کیمرا مین کے پاس تھی۔''

''تو پھر جاؤ تم بھی کیمرا مین کی گود میں جا کر بیٹھو۔ اس کو مرنے دو یہاں۔''

''کوئی کام سیدھا بھی ہوتا ہے تم لوگوں کا؟'' میں نے بھنا کر موٹے پروڈیوسر سے کہا اور رائفل کی نال تالے پر رکھ کر گولی چلائی۔ ڈھیٹ قسم کا تالا تھا۔ دو گولیوں کے باوجود سلامت رہا۔ ہر فائر پر ہیروئن دیوانہ وار چلا اٹھتی تھی۔ ایک ناقابلِ بیان خوف اور ہیجان تھا اس کے حسین چہرے پر۔

ہیروئن اور پنجرے کو اس کے حال پر چھوڑ کر ہم مختلف پوزیشنوں کی طرف بھاگے۔ یہی وقت تھا جب لکڑی کا منقش دروازہ دھماکے سے کھلا اور ڈیتھ اسکواڈ کے سفاک حیوان اندر داخل ہو گئے۔ وہ سرتاپا سیاہ پوش تھے۔ فربہ اندام پروڈیوسر اب بھاگنے کی فکر میں تھا مگر اس کام کے لیے اب دیر ہو چکی تھی۔ قریباً ایک درجن گولیاں اس کے سر کے پچھلے حصے اور پشت پر لگیں۔ وہ بھاگتا ہوا ایک آرٹی فیشل پودے پر گرا اور ساکت ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ پنجرے میں بند ہیروئن بھی بے ہوش ہو چکی تھی۔ وہ اب تک یقیناً مصنوعی لڑائیاں اور مار دھاڑ ہی دیکھتی رہی تھی...... آج اصلی معرکے کی پہلی جھلک نے ہی اس کا پتا پانی کر ڈالا تھا۔

میں نے اور لودھی نے ایک ساتھ ایک کمرے میں پوزیشن لی تھی۔ شادی ہال کا یہ کمرا شاید دلہن کے مزید بناؤ سنگھار کے لیے استعمال ہوتا ہوگا۔ گولیوں کی ایک بوچھاڑ آئی اور بناؤ سنگھار کی درجنوں اشیا ہوا میں اڑتی دکھائی دیں۔ دیوار گیر آئینہ چکنا چور ہو گیا۔ ہم نے جم کر جوابی فائرنگ کی۔ میرے پاس سیون ایم ایم تھی اور لودھی کے پاس 32 گولیوں والی جرمن آٹومیٹک۔ فالتو راؤنڈز والا چرمی بیگ بھی اس کے گلے سے جھول رہا تھا۔ ہماری تابڑتوڑ جوابی فائرنگ اور جوش و خروش نے تین چار منٹ کے لیے اسکواڈ کے نقاب پوش شوٹرز کو ٹھٹکا دیا۔ وہ ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھ سکے تھے۔ ان تین چار منٹ کے اندر ہی شادی ہال اور شوٹنگ کے ساز و سامان کا کباڑا ہو کر رہ گیا تھا۔ ہال کے در و دیوار جیسے چھلنی ہو گئے تھے۔

فائرنگ میں تھوڑا سا وقفہ آیا تو میں نے لودھی کی پیٹھ تھپکی۔ میں نے کہا۔ ''پتا نہیں تھا کہ اتنے عرصے بعد ملیں گے اور اس طرح ملیں گے۔''

وہ بولا۔ ''باکسنگ کے رنگ میں اب بھی میں آپ کو اپنا دشمن سمجھتا ہوں مگر یہ باکسنگ نہیں ہے۔ اس میں آپ کے لیے جان بھی قربان ہے۔''

پاس ہی شادی ہال کا آفس تھا۔ وہاں سے انیق کی للکارتی ہوئی آواز آئی۔ ''شاہ زیب بھائی! ایمونیشن کافی ہے۔ یہ لیں ایک بیگ آپ کی طرف آ رہا ہے۔''

کینوس کا ایک وزنی بیگ چکنے فرش پر پھسلتا ہوا عین ڈریسنگ روم کے دروازے پر آ گیا۔لودھی نے آگے بڑھ کر اسے اٹھایا مگر تب ہی دو فائر ہوئے اور ایک گولی لودھی کی چھوٹی انگلی کے بالائی حصے کو صاف اڑا گئی۔خون کی پچکاری سی نکلی۔ میں نے جلدی سے ایک رومال کس کر زخم پر باندھ دیا۔ رائفلوں سے نئے میگزین اٹیچ ہو گئے تھے۔ مجھے لگ رہا تھا کہ پھر سے اندھا دھند فائرنگ شروع ہونے والی ہے۔ میں نے پنجرے کی طرف نگاہ دوڑائی۔لڑکی (ہیروئن) بے حرکت پڑی تھی۔اب یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ صرف بے ہوش ہے یا اسے گولی چاٹ چکی ہے۔اس کا نیم عریاں گلابی جسم چمکیلے لوہے کے پنجرے میں آڑھا ترچھا بے سدھ پڑا تھا۔

لودھی کے سیل فون پر سگنل آئے۔اس نے کال ریسیو کی۔شور کے سبب اسے بلند آواز میں بولنا پڑ رہا تھا۔ فون سننے کے بعد اس نے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''شاہ زیب صاحب! ہمارے ساتھی کا فون ہے۔ وہ شادی ہال میں داخل نہیں ہو سکا۔اس کی پنڈلی میں گولی لگی ہے۔وہ کہہ رہا ہے کہ ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔''

''کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''ان کے کچھ اور ساتھی آ گئے ہیں۔ ایک بھری ہوئی بڑی جیپ ہے۔ سات آٹھ بندے تو ہوں گے۔ کچھ تو اسی طرح نقاب پوش ہیں اور کالے کپڑوں میں ہیں۔ دو تین مقامی لگتے ہیں مگر انہوں نے بھی منہ نقابوں میں چھپائے ہوئے ہیں سب کے پاس نئے ''ماڈلوں'' کا اسلحہ ہے......ان کے پیچھے ایک اور گاڑی بھی نظر آ رہی ہے۔''

فوراً ہی لودھی کی بات کی تصدیق بھی ہو گئی۔ شادی ہال سے باہر غالباً اندھا دھند فائرنگ کی گئی تھی پھر وہ لوگ شادی ہال میں داخل ہو گئے۔فون پر لودھی کے ساتھی کی کال آئی۔ ''آپ نکل سکتے ہیں تو نکل جائیں یہاں سے۔''

لودھی نے پکار کر پوچھا۔ ''پولیس کہاں ہے؟''

''پولیس ایسے موقعوں پر کہاں ہوتی ہے۔'' دوسری طرف سے کہا گیا، کچھ اور بھی کہا گیا مگر شدید فائرنگ کے شور میں سنائی نہیں دیا۔ یہ بڑا سخت حملہ تھا۔ میں نے لودھی سے کہا۔

''لائٹس کو ٹارگٹ کرو۔''

شاید اس کے ذہن میں بھی یہی بات تھی۔ اگلے پندرہ بیس سیکنڈ میں ہم نے تاک تاک کر ہال کی بچی کھچی روشنیوں اور قمقموں کو نشانہ بنایا۔آخری روشنی بجھتے ہی ہر طرف تاریکی پھیل گئی۔ میں نے پکار کر انیق کو مخاطب کیا۔ ''نکلو انیق! اوپر کی منزل پر پہنچو۔ سیڑھیاں ہماری

دائیں طرف ہیں۔''

میں نے یہ جملہ ملائی زبان میں کہا تھا تاکہ حملہ آوروں کی سمجھ میں نہ آسکے۔

ہم برستی گولیوں میں سیڑھیوں تک پہنچے اور باقی تین ساتھیوں کے ساتھ بالائی منزل پر اور پھر چھت پر آ گئے۔ یہاں چھتیں ساتھ ساتھ ملی ہوئی تھیں۔ درمیان میں فقط پانچ چھ فٹ کا فاصلہ تھا۔ جسے بہ آسانی پھلانگا جاسکتا تھا مگر اچانک مجھے کسی کمی کا احساس ہوا۔ میں نے مڑ کر دیکھا لودھی موجود نہیں تھا۔

''لودھی کہاں ہے؟'' میں نے چلا کر پوچھا۔

اس کا جواب کسی نے نہیں دیا مگر ہم سب کی سمجھ میں آ گیا۔ لودھی سیڑھیوں کے بالائی کنارے پر پڑا تھا۔ ایک برسٹ اس کی کھوپڑی توڑ کر نکل گیا تھا۔ اس کا مغز بکھرا ہوا تھا۔ اس کی جرمن رائفل اٹھا کر ہم پلٹے اور درمیانی خلا پھلانگ کر ساتھ والی چھت پر پہنچ گئے۔ یہ بھی کوئی دو منزلہ عمارت تھی۔ چھت سنسان تھی۔ ہم دس پندرہ قدم بھاگے اور تیسری چھت پر کود گئے جو آٹھ دس فٹ نیچی تھی۔ یہ گنجان علاقہ تھا۔ چھتوں سے چھتیں ملی ہوئی تھیں۔ کسی مارکیٹ کی چھت، کسی گھر کی چھت، رہائشی کوارٹرز کی چھتیں۔

جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ لوگ بھی اوپر پہنچ چکے ہیں اور فائرنگ کر رہے ہیں مگر یہ اندھی فائرنگ تھی۔ انہیں کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ ہم کس سمت فرار ہوئے ہیں بلکہ شاید ابھی وہ یہ بھی یقین سے نہیں کہہ سکتے تھے کہ ہم شادی ہال کی عمارت سے نکل چکے ہیں۔ یہ عمارتوں اور چھتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا۔ برساتیاں، منڈیریں، کبوتروں کی چھتریاں، مرغیوں کے ڈربے، الگنیوں پر لٹکے رہ جانے والے کپڑے، کہیں کہیں ٹی وی کے ایریل، ڈش انٹینا۔ دو چار چھتوں پر لوگ بھی نظر آئے۔ خواتین نے ہمیں دیکھ کر شور مچایا۔ ایک ٹھیٹ لاہوریے نے بدحواسی میں ہم پر ہاکی سے وار کرنے کی کوشش کی مگر انیق کی رائفل کا کندا کھا کر نیچے بالکونی میں جا گرا۔ ایک جگہ آکر ہمیں رکنا پڑا کیونکہ چھتوں کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔ ہم نے ایک بھری پری گلی میں چھلانگیں لگائیں۔ لوگ ہمیں دیکھ کر دہشت زدہ ہوئے اور مختلف اطراف میں دوڑے۔ میری بس ایک ہی خواہش تھی۔ ہم جلد از جلد ان غیر ملکی قاتلوں سے دور نکل جائیں۔ میں ہرگز ان کا سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا اور ایسے گنجان ترین علاقے میں تو بالکل بھی نہیں۔ یہ ویک اینڈ کی رات تھی، کھاتے پیتے مرد و زن، ہنستے کھیلتے بچے، خوشی خوشی گھروں کو جاتے ہوئے راہ گیر، چبوتروں اور تھڑوں پر اٹکھیلیاں کرتے نوجوان، یہ سب میرے اپنے تھے...... جیسے، میرے جسم کا حصہ تھے، میں ان کا خون بہتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ہم نے ایک

کیری ڈبے کو روکا۔ اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر سے ایک خان صاحب کو گھسیٹ کر نکالا۔ انہوں نے مزاحم ہونے کی کوشش کی تو انیق نے رائفل کے کندے سے ان کے سر پر جچی تلی ضرب لگائی۔ وہ سر پکڑ کر سڑک پر ڈھیر ہو گئے۔ انیق کے ایک ساتھی نے چند ہوائی فائر کیے۔ ہم کیری ڈبے پر سوار ہوئے اور تیزی سے بڑی سڑک کی طرف بڑھے۔ قریب کی ایک دو گلیوں میں پولیس موبائلز کے سائرن چنگھاڑ رہے تھے۔ غالباً ان پولیس موبائلز کی ساری کارکردگی صرف سائرنز کے چنگھاڑنے تک ہی محدود تھی۔

O......❖......O

اور یہ منظر تھا، داؤد بھاؤ کے زیر زمین ٹھکانے کا۔ آج کل یہ ٹھکانا زیر زمین (پوشیدہ) نہیں تھا۔ انتظامیہ اور چیدہ چیدہ لوگوں کو معلوم تھا کہ یہاں داؤد بھاؤ کی رہائش ہے اور اس کے قریبی ساتھی بھی یہاں آتے جاتے رہتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس رہائش گاہ کا ایک حصہ اب بھی ایسا تھا جہاں چڑیا پر نہیں مار سکتی تھی اور وہاں ایسے مفرور قیام پذیر تھے جن کی تلاش میں مختلف صوبوں کی پولیس ماری ماری پھرتی تھی (داؤد بھاؤ پر اب بھی کئی کیس چل رہے تھے اور وہ بڑی خوبی سے ان میں اپنا دفاع بھی کر رہا تھا۔ اگر کسی کیس میں گرفتاری یا ضمانت کینسل ہونے کا اندیشہ ہوتا تھا تو وہ کچھ دنوں کے لیے روپوش بھی ہو جاتا تھا۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں سے اس کی یہ آنکھ مچولی چلتی ہی رہتی تھی)

اس وقت بھی گراؤنڈ فلور پر اسنوکر کلب کی سرگرمیاں جاری تھیں اور بیسمنٹ میں ایک آرام دہ کمرے کے اندر میں اور انیق گم صم بیٹھے تھے۔ کل شام کے بعد جو کچھ ہوا تھا، اس نے داؤد بھاؤ کے گینگ کو تو افسردہ کیا ہی تھا میں بھی دکھ کے گہرے اندھیرے میں ڈوب گیا تھا۔ لودھی کے علاوہ گینگ کے تین مزید افراد جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے، دو زخمی ہوئے تھے۔ ایک کی پنڈلی اور دوسرے کی کمر میں گولی لگی تھی۔ سب سے روح فرسا بات یہ تھی کہ اس سارے تہلکہ خیز واقعے میں قریباً اٹھارہ عام شہری بھی جاں بحق ہوئے۔ ان میں ایک ٹریفک وارڈن اور ایک اے ایس آئی بھی شامل تھا۔ زخمی ہونے والوں کی تعداد پچاس کے قریب تھی۔

داؤد بھاؤ وہسکی کا ایک تلخ گھونٹ بھرتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی نوخیز داشتہ روبی نے اس کے سگریٹ کیس اور سیل فون وغیرہ اس کی نشست کے پاس ایک تپائی پر رکھ دیئے۔ داؤد بھاؤ نے اپنا گلاس بھی وہیں پر رکھا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''اچھا چھوڑو اب اس سوگ کو۔ اور سچی بات یہی ہے کہ میں تمہیں لودھی اور باقی تین بندوں کی

موت کا ذمے دار نہیں سمجھتا۔ جھارا نے گواہی دی ہے کہ تم نے حملے کے وقت باقی ساتھیوں سے کہا تھا کہ وہ دائیں بائیں ہو کر نکل جائیں۔ اب یہ ان کا اپنا فیصلہ تھا کہ وہ تمہارے اور انیق کے پیچھے گئے۔ اس کے بعد بھی جو کچھ ہوا اس میں تم بالکل بے بس تھے۔''

''مجھے ڈر تو تھا...... لیکن اتنے زیادہ نقصان کی توقع نہیں تھی۔ ساری گڑبڑ اس وقت ہوئی جب وارڈن کو گولی لگنے کے بعد ہمارا راستہ روکا گیا، اور ہمارا رخ گنجان آبادی کی طرف کر دیا گیا۔ آپ کے ساتھیوں کے علاوہ بھی اٹھارہ بے گناہ مارے گئے ہیں داؤد بھاؤ اور جو زخمی ہیں ان میں سے شاید دو چار مزید چل بسیں گے۔''

''اچھا بتاؤ یہ تھے کون لوگ؟ ٹیکساری گینگ کا تو تم نے کئی بار کہا اور میں نے بھی کئی بار سنا۔ مگر یہ نقاب پوش شوٹرز؟ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ میڈیا پر بھی سنسنی پھیلی ہوئی ہے۔ ایسی ایسی خبریں چل رہی ہیں کہ عقل کی واٹ لگ جاتی ہے۔ نقاب پوشوں کے ملتے جلتے چہرے، ایک جیسے قد کاٹھ، سب کی آنکھیں بھوری یا ہلکی بھوری، ایک ہی رنگ اور نسل؟ یہ تو کوئی ہالی ووڈ کی کہانی لگتی ہے۔''

''یہ ہالی ووڈ کی کہانیوں سے کم دلچسپ اور حیرت انگیز نہیں ہے۔'' میں نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا اور سوچ میں گم ہو گیا۔

داؤد بھاؤ نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ''شادی ہال کے اندر سے تو اپنی دو لاشیں وہ لوگ اٹھا کر لے گئے ہیں مگر شادی ہال سے باہر دودھ فروش کی دکان کے آس پاس سے جو تین لاشیں ملی ہیں وہ سب کو حیران کر رہی ہیں۔ اس طرح کے غیر ملکی ہمارے شہروں میں اس طرح دندنا سکتے ہیں، کبھی سوچا بھی نہ تھا......''

اچانک میرے ذہن میں ایک بات آئی۔ میں نے داؤد بھاؤ سے پوچھا۔ ''شادی ہال میں کسی ڈرامے یا فلم کی شوٹنگ ہو رہی تھی، بلکہ فلم ہی تھی۔ یونٹ والوں نے ایک لڑکی کو پنجرے میں بند کر کے رکھا ہوا تھا۔ اس کا کیا بنا؟''

''وہ ہماری چوٹی کی ہیروئنوں میں سے ایک تھی......''

''مر گئی؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''نہیں...... غائب ہو گئی۔ یہ بھی بڑی عجیب بات ہے۔ وہی حملہ آور اسے اٹھا کر لے گئے۔''

''اٹھا کر لے گئے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ وہ زندہ ہو گی۔'' میں نے تجزیہ کیا۔

''لیکن تمہیں اس بات پہ حیرانی نہیں ہوئی کہ ایسی جنگ و جدل والی حالت میں بھی وہ

لڑکی کی طرف متوجہ ہوئے اور اسے اٹھالیا؟''

''نہیں داؤد بھاؤ! مجھے حیرانی نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ ہے کہ میں ان انسان نما قاتل مشینوں کو بڑی اچھی طرح جانتا ہوں......''

''یہ ''قاتل مشینوں'' والے الفاظ تم نے پہلے بھی استعمال کیے ہیں۔'' داؤد نے مزید وہسکی اپنے گلاس میں انڈیلتے ہوئے کہا۔

''ہاں، داؤد بھاؤ! یہ قاتل مشینیں ہیں اور ہمارے شہر میں ہیں۔ اس صورتِ حال پر میرا سینہ اندر سے پھٹا جا رہا ہے۔''

''تم نے بتایا تھا کہ ان لوگوں کو ڈیتھ اسکواڈ کہا جاتا ہے؟''

''آپ یوں سمجھیں کہ یہ ٹیکساری گینگ کا سب سے خطرناک ''وِنگ'' ہے۔ ان لوگوں کو ایک بار جس نشانے پر ڈال دیا جاتا ہے، اس کا آخر تک پیچھا کرتے ہیں۔ عام طور پر کہا یہی جاتا ہے کہ ان ڈیتھ اسکواڈ کے ارکان کو نوعمری میں ہی اس کام کے لیے چن لیا جاتا ہے اور پھر سخت تربیت اور خاص قسم کے ماحول سے گزار کر صرف اور صرف مرنے مارنے والے جانور بنا دیا جاتا ہے مگر واقفِ حال لوگ جانتے ہیں کہ حقیقت اس سے بھی گہری اور حیران کن ہے۔''

داؤد بھاؤ سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں کی موت کا غم وہسکی میں ڈبونے کی کوشش کر رہا تھا۔ روبی دو تین منٹ تک اس کے کندھے دبانے کے بعد باہر جا چکی تھی۔ اس نہایت آرام دہ کمرے سے باہر وہی مصروفیات تھیں جو پہلے ہوا کرتی تھیں۔ کچھ لوگ ٹی وی پر ایم ایم اے کی فائٹنگ دیکھ رہے تھے کچھ تاش وغیرہ سے دل بہلا رہے تھے۔ کسی پاس کے ہال کمرے میں Ring کے اندر باکسنگ کا پریکٹس سیشن چل رہا تھا۔ ہاں آج لڑکیوں کے سریلے قہقہے نہیں گونج رہے تھے اور نہ ہی کوئی اور موج مستی تھی۔ وجہ وہی کل والے واقعات تھے۔

میں نے کوک کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ ''داؤد بھاؤ! آپ کو یہ عجیب تو لگے گا مگر حقیقت وہی ہے جو میں آپ کو بتانے والا ہوں۔ ڈیتھ اسکواڈ کے یہ سارے لوگ ایک ہی باپ کی اولاد ہیں۔ ان کی تعداد اس وقت بھی پچاس کے لگ بھگ ہے۔ یہ سارے تقریباً ہم عمر ہیں۔''

داؤد بھاؤ نے حیرانی سے میری طرف دیکھا اور اپنے گلاس کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''پی تو میں رہا ہوں اور نشہ تمہیں ہو رہا ہے۔ ایک ہی باپ کے پچاس بچے اور سارے ہم عمر؟''

''ہاں، یہاں ایسا ہی ہے۔ ان میں سے دس پندرہ ایسے ہوں گے جن کی ماں اور ہے۔ ورنہ باقیوں کی ماں بھی ایک ہی ہے۔''

''تم پہیلیاں بجھوا رہے ہو، اور وہ بھی نہ سمجھ میں آنے والی۔''

میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''یہ آج سے کوئی بیس بائیس سال پہلے کی بات ہے، جان ڈیرک کا باپ ڈیرک میکسیکو کی ایک جیل میں بند تھا، اسی جیل میں ''ایول'' نام کا ایک نہایت خطرناک قاتل اور ڈکیت بھی موجود تھا۔ سفاکی اور بے خوفی اس شخص میں دیوانگی کی حد تک موجود تھی۔ درجنوں قتل، آبروریزیاں، ڈکیتیاں اور دیگر لرز خیز جرائم اس کے کھاتے میں تھے۔ مارکٹائی کی اسپرٹ بھی اس شخص میں غیر معمولی بلکہ ناقابلِ یقین حد تک تھی۔ کئی کیس چل رہے تھے، یقینی بات تھی کہ وہ بجلی کی کرسی سے بچ نہیں سکے گا۔ اس موقع پر جان ڈیرک کے باپ ڈیرک کو ایک انوکھی بات سوجھی......''

داؤد بھاؤ نے مجھے روکتے ہوئے پوچھا۔ ''جان ڈیرک وہی، جو اس وقت ٹیکساری گینگ کا ہیڈ ہے؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''جان ڈیرک کا باپ زبردست منصوبہ ساز تھا۔ وہ ''ایول'' نامی اس نہایت خطرناک شخص سے بے حد متاثر تھا۔ اس نے جیل سپرنٹنڈنٹ کے ساتھ مل کر ایک پلان بنایا۔ اس نے سوچا کہ ایول کی سزائے موت سے پہلے کیوں نا اس کی ''نادر روزگار نسل'' کو محفوظ کیا جائے۔ آپ غور کرو داؤد بھاؤ کہ جو بندہ سیدھا سیدھا بجلی کی کرسی کی طرف جا رہا ہو، اس کو جیل کے اندر ہی دو من پسند عورتیں فراہم کر دی جائیں اور ہر طرح کی عشرت کا موقع دیا جائے تو اس کے تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔''

''یقیناً'' داؤد بھاؤ نے تائید کی۔

''ڈیرک اور سپرنٹنڈنٹ نے جیل کے اندر سے ہی دو نہایت خطرناک لیکن جوان قیدی عورتوں کو منتخب کیا اور انہیں ''ایول'' کے ساتھ تعلقات قائم کرنے پر آمادہ کر لیا۔ یہ دونوں عورتیں حاملہ ہو گئیں۔ میکسیکو کی اس جیل کے نسبتاً ڈھیلے ڈھالے نظام میں یہ کوئی بہت انوکھی بات نہیں تھی۔ ان میں سے ایک عورت نے بچہ اور دوسری نے بچی جنم دی۔ ماں باپ میں سے کسی نے بھی ان بچوں کی صورت نہیں دیکھی۔ ان بچوں کو جیل سے منسلک نگہداشت کے ایک ادارے کے سپرد کر دیا گیا۔ ڈیرک چاہتا تھا کہ کسی طرح بچہ اس کی تحویل میں آ جائے لیکن ایسا ممکن نہ ہو سکا۔ چند ماہ بعد ڈیرک اور سپرنٹنڈنٹ کے ذہنوں میں ایک اور منصوبہ

آیا......دراصل یہ پہلے منصوبے کی ہی ایک وسیع شکل تھی۔ انہوں نے ''ایول'' کی نسبت سے ٹیسٹ ٹیوب بی بی پیدا کرنے کا سوچا۔ ان دنوں کرائے کی ماں والی تکنیک بھی پریکٹس میں آ چکی تھی۔ کرائے کی ماں سمجھتے ہیں نا آپ؟''

داؤد بھاؤ نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''جس میں حمل مکمل کرنے کے لیے کسی صحت مند عورت کی کوکھ کرائے پر لی جاتی ہے۔''

''جی ہاں......ڈیرک نے جیل سپرنٹنڈنٹ کے ساتھ مل کر ٹھیک ٹھاک ڈالرز خرچ کیے اور اس کام کے لیے پچاسی عورتوں کا انتظام کیا...... جی ہاں قریباً اسی پچاسی عورتیں۔ کرائے کی ان ماؤں میں سے ستر عورتوں نے کامیابی کے ساتھ ٹیسٹ ٹیوب بچے پیدا کیے۔ یہ سب کے سب ''ایول'' کے بچے تھے۔ فرٹیلائزیشن کے لیے Eggs انہی دونوں عورتوں سے حاصل کیے گئے تھے جو جیل میں ایول کے ساتھ ہوتی تھیں۔ یہ سارا عمل ایک ''ایم او'' کے ذریعے جیل سے منسلک ایک اسپتال میں ہی انجام پایا۔''

داؤد بھاؤ حیرت میں گم یہ ساری باتیں سن رہا تھا۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''ان بچوں میں سے پینسٹھ میل اور صرف پانچ فی میل تھیں۔ مذکر مونث کی یہ تقسیم بھی پری پلاننگ کے تحت تھی۔ اس کے بعد منصوبے کا دوسرا مرحلہ شروع ہوا۔ اس دوران میں ڈیرک بھی ضمانت پر رہا ہو چکا تھا۔ یہ سارے ٹیسٹ ٹیوب بے بی اس کی تحویل میں تھے۔ شروع سے ہی ان بچوں کی گھٹی میں سفاکی، درندگی اور وحشت ڈال دی گئی۔ وہ ذرا بڑے ہوئے تو انہیں ایک بہت ہی خاص ماحول میں رکھا گیا۔ یہاں انہیں صرف مار دھاڑ، آتشیں اسلحہ کے استعمال اور مارشل آرٹ وغیرہ کی تربیت دی گئی۔ انہیں بتایا گیا کہ انسان کو صرف کھانے پینے، مخالف جنس کے ساتھ تعلقات رکھنے اور اپنے مقابل کا خون بہانے کے لیے ہی پیدا کیا گیا ہے اور یہی زندگی کی معراج ہے......''

''اچھا ایک منٹ۔'' داؤد بھاؤ نے مجھے روکتے ہوئے کہا۔ ''اس سپر بدمعاش ایول کا کیا بنا؟''

''اسے ایک سال بعد ہی بجلی کی کرسی پر بٹھا دیا گیا تھا۔ وہ اپنے انجام......لیکن اپنے 'جین' کی صورت میں بیسیوں اپنے جیسے انسان چھوڑ گیا......''

''اور وہ دونوں مائیں؟''

''ان میں سے جو زیادہ بچوں کی ماں تھی وہ چار پانچ سال مزید زندہ رہی...... پھر جیل کے اندر قیدیوں کے درمیان ہونے والی ایک لڑائی میں ماری گئی۔ اس نے کہیں سے ایک چاقو

حاصل کیا تھا اور اپنے ''جسم کے اندر'' ہی چھپا رکھا تھا۔ اس چاقو سے اس نے دو عورتوں کی جان لی اور خود بھی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ دوسری ماں کو سرطان ہو گیا تھا، اور وہ کسی اور جیل میں بھیج دی گئی تھی، اس کا کچھ پتا نہیں۔''

''ہاں تو تم ان بچوں کی ٹریننگ کا بتا رہے تھے؟'' داؤد بھاؤ نے کہا۔

''ان کو ایک وسیع چار دیواری کے اندر ہی تربیت کے مختلف مرحلے طے کروائے گئے جب وہ لڑکپن کی حد سے آگے نکلے...... تو انہیں خصوصی طور پر بنائی گئی ایسی فلمیں دکھائی جاتی تھیں جو سفاکی سے بھرپور ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ بھی کئی طریقوں سے ان کی برین واشنگ ہوتی تھی۔ ڈرائیونگ، سی ڈائیونگ، نشانہ بازی، کمپیوٹر کا استعمال، پولیس اِن کاؤنٹرز وغیرہ کی عملی ٹریننگ نے ان میں سے ہر ایک کو ایک نہایت عیار قاتل کا روپ دے دیا۔ یقیناً اس میں ان ''جینز'' کا بھی بہت عمل دخل تھا جو انہوں نے اپنے باپ ایول سے حاصل کیے تھے اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ وہ بندہ صرف ایول نہیں ''ایول جینئس'' تھا۔ اب یہ بہت سارے ایول جینئس، ڈیتھ اسکواڈ کے نام سے، انڈر ورلڈ میں جانے جاتے ہیں۔''

داؤد بھاؤ نے اپنا سر پکڑ لیا کچھ دیر گہری سوچ میں گم رہنے کے بعد بولا۔ ''ان لوگوں کو کمانڈ کون کرتا ہے...... جان ڈیرک؟''

''یہ آپ نے اچھا سوال کیا ہے۔ شروع میں میرا بھی یہی خیال تھا کہ شاید ان کو جان ڈیرک کا باپ یا خود جان ڈیرک کمانڈ کرتا ہے مگر ایسا نہیں ہے۔ جان ڈیرک کا بدبخت باپ تو کوئی چھ سال پہلے آنجہانی ہو چکا ہے۔ جان ڈیرک بھی ان موت کے ہرکاروں کو کنٹرول نہیں کرتا۔ ان کی کمان ان ہی میں سے ایک بندے کے ہاتھ میں ہے۔ یعنی ان کا ایک بھائی ہی ہے جو ان سے بھی زیادہ غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک ہے۔ وہ سب اس کے اشارے پر چلتے ہیں...... اور وہ خود جان ڈیرک سے ہدایات لیتا ہے۔ آپ یوں کہہ لیں کہ یہ سب ایک شیطان کی اولاد ہیں اور اس اولاد میں سے ہی ایک فرد ان کو گائیڈ کرتا ہے۔''

داؤد بھاؤ نے کہا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے کہ یہ سب کے سب پچاس پچپن شوٹر یہاں موجود ہیں؟''

''نہیں، میرے خیال میں تو ایسا نہیں ہو گا۔ جان ڈیرک کے ساتھ پندرہ بیس بندوں کی ٹولی یہاں پہنچی ہو گی۔ اور ان میں سے تین یہاں مارے گئے ہیں۔ یہ ہلاکتیں بھی خطرناک ہیں، وہ مزید خونخوار ہو جائیں گے۔'' کچھ دیر کمرے میں بوجھل خاموشی طاری رہی، پھر میں نے ہی اسے توڑا۔ ''یہ بے حد مکار بھیڑیے ہیں داؤد بھاؤ، جان ڈیرک سخت ضرورت

کے وقت ہی ان کو باہر نکالتا ہے اور اپنے شکار پر چھوڑتا ہے۔ شکار کی چیر پھاڑ کے بعد ان کو دوبارہ ان کے شیطانی ماحول میں بند کر دیا جاتا ہے۔"

ساتھ والے کمرے میں ٹی وی آن تھا، نیوز کاسٹر ہیجانی انداز میں بول رہا تھا۔ "یہ لوگ پاکستان میں کیسے داخل ہوئے؟ کس طرح یہاں پہنچے اور قتل و غارت کا بازار گرم کیا۔ بہت سے سوالات اٹھ رہے ہیں۔ تازہ ترین اطلاعات کے مطابق جاں بحق ہونے والوں کی تعداد بیس ہو چکی ہے......"

داؤد بھاؤ نے پُر سوچ لہجے میں پوچھا۔ "اور وہ ہیروئن جو کل رات غائب ہوئی ہے؟"

"وہ ان کی وحشت کا شکار ہو چکی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اسے راستے میں شیورلیٹ جیپ کے اندر ہی ریپ کر دیا گیا ہو۔ اگر وہ زندہ واپس مل گئی تو کرشمہ ہی ہوگا......"

کمرے کے ماحول میں سنسنی کی بلند و بالا لہریں اٹھتی محسوس ہو رہی تھیں۔

O......❖......O

داؤد بھاؤ نے کہا۔ "وہ ٹاپ کی ہیروئن ہے یار! اگر خدانخواستہ وہ ماری گئی تو بہت شور مچے گا یہاں۔"

"کچھ کہا نہیں جا سکتا داؤد بھاؤ...... آپ کو بتایا ہے نا کہ یہ مجسم شیطانوں کا ٹولا ہے۔ کچھ بھی کر سکتا ہے۔"

داؤد بھاؤ سوچ میں ڈوب گیا۔ پیشانی کے بال اڑ جانے کی وجہ سے اس کا ماتھا غیر معمولی طور پر چوڑا نظر آتا تھا۔ اس کے ماتھے پر تفکر کی شکنیں تھیں، وہ بولا۔ "میں چاہتا ہوں کہ کم از کم پندرہ بیس دن کے لیے تم یہاں روپوش رہو اور گراؤنڈ فلور پر جانے کی بھی ضرورت نہیں۔ شیطانی ٹولا زیادہ دیر یہاں نہیں ٹھہر سکے گا۔ مایوس ہوں گے تو پھر یہ لوگ واپس لوٹ جائیں گے۔"

میں نے اثبات میں سر ہلانا مناسب سمجھا۔ جہاں تک میرا ذاتی خیال تھا، میں اس طرح چوہے کی طرح دبک کر ہرگز نہیں رہنا چاہتا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ وہ لوگ بالکل بھی سکون سے نہیں بیٹھیں گے۔ مجھے باہر لانے کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتے تھے۔ کوئی بھی ایسا کام جس سے میں شدید اذیت میں مبتلا ہوتا۔

یہ اگلے روز شام کا ذکر ہے۔ داؤد بھاؤ کے منع کرنے کے باوجود میں گراؤنڈ فلور پر چلا گیا۔ عجیب سی گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ انیق بھی میرے ساتھ تھا۔ ہم ہال کے ایک نیم تاریک گوشے میں بیٹھ گئے۔ یہاں اسنوکر اور بلیئرڈ کی درجنوں میزیں تھیں اور کھیل جاری تھا۔ ہر

کوئی اپنے حال میں مست تھا۔ دو چار واقف حال لوگوں کے سوا کسی نے ہم پر خصوصی توجہ نہیں دی۔ بیس تیس فٹ کی دوری پر شیشے کی دیوار گیر کھڑکی تھی جس میں سے ایک بارونق سڑک کا منظر نظر آتا تھا۔ روشنیوں کا شہر آہستہ آہستہ روشن ہو رہا تھا۔ زندگی رواں دواں تھی۔ مرد وزن اور بچے اپنے اپنے راستوں پر گامزن تھے۔ گاڑیاں حرکت میں تھیں۔ کچھ برق رفتار کچھ دھیمی رفتار سے چلتی ہوئی، رنگین آنچل، مسکراہٹیں، پُرمسرت قہقہے، خریداریاں، گپ شپ کے انداز...... رنگ برنگ پھولوں کی جھلکیاں۔ یہ لاہور کی ایک زندگی سے بھرپور شام تھی مگر میں خود کو اس گہما گہمی اور اس زندگی سے بہت دور محسوس کر رہا تھا۔ یہ سب کچھ میرے لیے نہیں تھا۔ میرے شب و روز کچھ اور تھے، میں کسی اور راستے کا مسافر تھا۔ وہ یہاں وارد ہو چکے تھے، ایک بار مجھ سے ٹکرا چکے تھے...... اور ایک بار مجھ سے پھر ٹکرانا تھا۔ بار بار...... یہاں تک کہ ان کے بدلے کی آگ ٹھنڈی ہو جاتی۔

''کن سوچوں میں کھو گئے جناب! آپ تو دیوداس ہی بنتے جا رہے ہیں۔'' انیق کی آواز نے مجھے چونکایا۔

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''شاید، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' اس نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ ''دیوداس تو ہر وقت نشے میں ڈوبا رہتا تھا...... اور آپ تو بالکل باز آگئے ہیں۔ میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔'' اس نے ہوا میں ہاتھ گھمائے اور خیالی الفاظ کو پکڑ کر واپس منہ میں ڈال لیا۔

کچھ دیر خاموش رہ کر بولا۔ ''ویسے جناب! دیوداس کا تصور ذہن میں آتے ہی امریش پوری کا خیال آگیا ہے۔ بہت بری گزر رہی ہوگی بے چارے پر...... کیا پتا کہ گریبان پھاڑ کر ڈیرے کی ویران پہاڑیوں میں گھوم رہا ہو اور خورسنہ کو یاد کر کے گا رہا ہو...... کہاں ہو تم کو ڈھونڈ رہی ہیں، یہ بہاریں یہ سماں!''

''زیادہ مسخریاں نہ کرو۔ تم جانتے ہو، میں پریشان ہوں۔''

''آپ کی ''پریشانی'' تو سکھیرا گاؤں میں ہے اور آپ چاہیں تو حل بھی ہو سکتی ہے۔ خدانخواستہ خدانخواستہ آپ کو کسی نے امریش پوری کی طرح دھتکارا تو نہیں، پھٹکارا تو نہیں۔ مجھے تو وہ سین یاد آتا ہے جب سجاول عرف امریش پوری جہاز میں بیٹھنے سے پہلے مڑ مڑ کر پیچھے دیکھتا تھا...... اُف کتنا مایوس تھوبڑا تھا اس کا۔ جیسے...... ادھیڑ عمر بھینسے کو اس کی جوان مادہ نے عین بہار کے موسم میں ٹکریں مار کر بھگا دیا ہو۔'' انیق کی آنکھوں میں خوشی ناچنے لگی۔

ان دونوں کے درمیان نفرت اور اپنائیت کا عجیب ملا جلا سا تعلق تھا۔ میں نے کہا۔

''انیق! اگر تمہیں کوئی کام کی بات نہیں کرنی تو میں اٹھ جاؤں یہاں سے؟'' میں نے کرسی کے ہتھوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھنے والا انداز اپنایا تو وہ فوراً سنجیدہ ہو گیا۔

میری طرح وہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ حالات کتنے سنگین ہیں۔ داؤد بھاؤ کے ساتھ ساتھ میں نے انیق کو بھی بتا دیا تھا کہ یہ ''ڈیتھ اسکواڈ'' کس بلا کا نام ہے۔ اس کی پیدائش کیسے ہوئی؟ کیسے ٹیسٹ ٹیوبز کے ذریعے درجنوں بچوں کو کرائے کی ماؤں کے ذریعے پروان چڑھایا گیا...... اور پھر انہیں ان کے خطرناک ترین والد گرامی ''ایول'' کے مشابہ بنانے کی کوشش کی گئی۔

سننے میں یہ سب کچھ بڑا داستانی لگتا تھا مگر جدید دور میں جہاں زندگی کے ہر شعبے میں ناقابلِ یقین اختراعات ہوئی ہیں، جرم کی دنیا میں بھی بہت کچھ نیا ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے۔ یہ ڈیتھ اسکواڈ بھی اسی کی ایک زندہ مثال تھی۔

انیق نے کہا۔ ''مجھے تو یقین ہے شاہ زیب بھائی! یہاں آپ بالکل محفوظ ہیں۔ ان حرام زادوں کی گرد بھی آپ کو نہیں پا سکتی یا یوں کہہ لیں کہ وہ آپ کی گرد کو بھی نہیں پا سکتے۔''

''نہیں انیق، تم ان لوگوں کو پوری طرح جانتے نہیں ہو اس لیے یہ بات کہہ رہے ہو۔ ہم انہیں زیادہ دیر خود سے دور نہیں رکھ سکتے...... اور سچی بات یہ ہے انیق! کہ میں ان سے مزید چھپنا بھی نہیں چاہتا۔ میں یہ گوارا نہیں کروں گا کہ میں اس طرح بل میں گھس کر بیٹھا رہوں اور وہ یہاں میری تلاش میں دندناتے پھریں۔''

''تو پھر؟'' انیق نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''جو ہونا ہے، وہ تو ہونا ہی ہے۔ تو پھر کیوں نا جلدی ہو جائے۔ بجائے اس کے کہ وہ مجھے ڈھونڈیں، کیوں نا میں خود ہی ان کے سامنے آ جاؤں۔''

انیق نے گہری نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''آپ کہیں جذباتی تو نہیں ہو رہے؟''

''نہیں انیق...... میں سوچ سمجھ کر بات کر رہا ہوں۔ جب میں خود ان کے سامنے آ جاؤں گا تو بے خبری میں مارے جانے والا امکان ختم ہو جائے گا۔ میری بھی پوری تیاری ہو گی۔ اس کے علاوہ وقت اور مقام کا تعین بھی میرا ہو گا۔ یہ نہیں ہو گا کہ کسی گنجان جگہ پر وہ میدان سجا لیں اور پہلے کی طرح درجنوں شہریوں کو بھون ڈالیں۔''

انیق نے ایک طویل سانس لی اور کرسی پر بدن کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ وہ جان رہا تھا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ شکایتی لہجے میں بولا۔ ''یہ آپ بار بار ''میں اور میرا'' کے الفاظ کیوں استعمال فرما رہے ہیں۔ میں آپ کو اکیلے کچھ نہیں کرنے دوں گا۔ جو ہو گا، ہم دونوں کے ساتھ ہو گا، یا

پھر نہیں ہوگا۔"

"اب "تم" جذباتی ہونے کی کوشش کررہے ہو۔ خیر چھوڑو اس موضوع کو۔ فی الحال میں کچھ اور کہنا چاہ رہا ہوں۔ دل چاہتا ہے کہ کچھ بھی کرنے سے پہلے ایک بار چچا حفیظ اور ولید سے مل لوں۔ عرصہ ہوگیا ہے ان کی شکل دیکھے ہوئے۔"

"ولید تو جیل میں ہے نا؟" انیق نے پوچھا۔

"آخری اطلاعات تک تو جیل میں ہی تھا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ شکیل داراب کے پاس ہمیں اپنے کنٹرول میں رکھنے کے لیے ایک ہتھکنڈا موجود ہے۔"

"ہتھکنڈے تو کئی ہیں، اور ہمارے پاس بھی ہیں لیکن فی الحال تو شکیل داراب سے بڑی مصیبت گلے پڑ چکی ہے بلکہ بہت بڑی۔"

"یعنی ٹیکساری گینگ سے آپ کی پرانی دشمنی......اور گینگ کا یہ ڈیتھ اسکواڈ؟"

"بالکل۔ میں آنے والے دنوں کو خاصا تاریک دیکھ رہا ہوں۔"

انیق جیسے اندر سے تڑپ گیا، نہایت سنجیدگی سے بولا۔ "آپ مایوسی کی بات کریں گے تو میرا دل خون ہوجائے گا۔ آپ تو اس خاکسار کا آئیڈیل ہیں جناب۔"

"آئیڈیل اکثر مایوس ہی کرتے ہیں۔" میں نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"آپ مایوس کرنے والے آئیڈیل نہیں ہیں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔" وہ دل کی گہرائیوں سے بولا۔ اس کے اندھے یقین نے مجھ پر وہی بوجھ ڈالا جو جاماجی میں لوگوں کا یقین اور بھروسا ڈالتا تھا۔ جب قسطینا، ابراہیم، بیگم نورل اور کمانڈر فارس جان جیسے مجھ سے بہت پیار کرنے والے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ میں ہر مسئلے کا حل ہوں اور ہر طرح کے حالات کو شکست دے سکتا ہوں تو میرے کندھے ایک نادیدہ بوجھ سے جھک جاتے تھے......آج انیق کی صورت دیکھ کر کچھ ایسا ہی محسوس ہوا۔

○......❖......○

میں ایک بار پھر چچا حفیظ کے گاؤں مراد پور جارہا تھا۔ انیق بھی میرے ساتھ آنا چاہتا تھا مگر میں نے اسے منع کردیا۔ میں نے گول سندھی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ کئی دن تک شیو نہ کرنے کے سبب چھوٹی چھوٹی داڑھی بھی نظر آنے لگی تھی۔ آنکھوں پر ہلکے رنگ کے سن گلاسز تھے۔ کڑھائی دار شلوار کرتے میں حلیہ کافی بدلا ہوا نظر آتا تھا۔ میں داؤد بھاؤ کی فراہم کی ہوئی ایک سوزوکی سوئفٹ میں تھا۔ اس کے شیشے ٹنڈڈ تھے۔ لاہور سے مراد پور کا فاصلہ پندرہ

بیس میل سے زیادہ نہیں تھا۔ تاہم اس مختصر راستے سے گزرتے ہوئے میری کئی پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔ میں نے سڑک کا وہ حصہ دیکھا جہاں میرے ساتھ سر منڈواتے ہی اولے پڑنے والا معاملہ ہوا تھا۔ کوپن ہیگن سے لاہور اور لاہور سے اس علاقے میں پہنچتے ہی میں نے ایک روڈ ایکسیڈنٹ دیکھا تھا۔ خدمتِ خلق کے جذبے کے تحت ایک زخمی عارف کو اسپتال پہنچایا تھا اور پھر انسپکٹر قیصر نے مجھے ایک خطرناک چکر میں پھنسا کر چند ہی دنوں میں دہشت گرد بنا ڈالا تھا۔

میں مراد پور پہنچا۔ وہ جلا ہوا گھر دیکھا جہاں میری چچا زاد فائزہ اپنی شادی سے چند روز قبل ہی کفن پہننے پر مجبور ہو گئی تھی۔ اسی گھر میں فائزہ اور چچی آمنہ نے آگ کے بے رحم شعلوں میں زندگی کی بازی ہاری تھی...... اور پھر میرا چچا زاد ولید پولیس فائرنگ سے شدید زخمی ہونے کے بعد جیل جا پہنچا تھا۔

وہ مناظر آنکھوں کے سامنے آئے تو خون رگوں میں کھولنے لگا۔ انسپکٹر قیصر چودھری، لالہ وریام اور ان کے پشت پناہ شکیل داراب کے لیے نفرت کا دریا سا میرے سینے میں بہہ گیا۔ میرا جی چاہا کہ شکیل داراب میرے سامنے ہو اور میں اسے سیکڑوں لوگوں کے سامنے چاقو سے چیر ڈالوں، جیسے میں نے ٹیکساری گینگ کے ''ولی عہد'' کو چیرا تھا۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے

چچا حفیظ سے ملاقات ہوئی۔ تھوڑے ہی عرصے میں ان کے بہت سے مزید بال سفید ہو گئے تھے اور وہ اپنی عمر سے آٹھ دس سال بڑے دکھائی دینے لگے تھے۔ وہ مجھ سے لپٹ گئے اور دیر تک آنسو بہاتے رہے۔ ان کا گھرانہ اجڑ گیا تھا۔ وہ خود کو بالکل تنہا محسوس کرتے تھے۔ ان کا واحد سہارا جیل میں تھا۔ میرے اور چچا کے درمیان قریباً ڈیڑھ گھنٹہ بات چیت ہوئی۔ میں نے ان سے کہا۔ ''چچا! آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ میں آپ کو لینے آیا ہوں۔''

انہوں نے وہی جواب دیا جس کی ان سے توقع تھی۔ بولے۔ ''شاہ زیب پتر! یہاں ہمارے بزرگوں کی قبریں ہیں، میں ان سے دور جانا نہیں چاہتا۔ اب تو پتا نہیں کس گھڑی اللہ کا بلاوا آ جائے۔''

''نہیں چچا! عمر کے اس حصے میں آپ کو بہت آرام اور سکون کی ضرورت ہے اور یہ سکون آپ کو ملنا چاہیے۔ آپ کی زندگی پہلے بھی میری ہی دشمنی کی وجہ سے اُجڑی ہے اور اب بھی ایسے بہت سے خطرات موجود ہیں۔''

وہ اپنے بوڑھے ہاتھ میں میرا ہاتھ تھام کر بولے۔ ''ایسا مت کہو شاہ زیب! یہاں جو

کچھ ہوا، اس میں بھلا تمہارا کیا قصور تھا۔ تم تو ہم سے ملنے آئے تھے۔ جو کچھ کیا یہاں کے لوگوں نے کیا۔ ان بدکار پولیس والوں نے کیا جو بندے کو بندہ نہیں سمجھتے اور پالتو درندوں کی طرح اپنے مالک کے حکم پر کمزوروں کو چیرنے پھاڑنے میں لگ جاتے ہیں۔''

''ایسے لوگ اب بھی موجود ہیں چچا جان بلکہ ان سے بھی زیادہ برے اور وہ ہمارے آس پاس ہی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اب آپ کو کسی طرح کی گرم ہوا بھی نہ لگے۔''

میں لگا رہا اور میری کوشش کامیاب رہی۔ میں نے چچا کو عارضی طور پر مراد پور چھوڑنے اور اپنے ساتھ چلنے پر راضی کرلیا۔

○......❖......○

داؤد بھاؤ کے تعاون سے چند گھنٹوں کے اندر ہی لاہور کی ایک الگ تھلگ سوسائٹی میں ایک پُر سکون جگہ پر دس مرلے کا ایک گھر دستیاب ہوگیا۔ ایک دن کے اندر ہی یہاں ضرورتِ زندگی کی ہر شے فراہم کر دی گئی اور ایک نہایت قابلِ بھروسا، چاق و چوبند ملازم بھی جو ہر وقت چچا حفیظ کا خیال رکھ سکے۔

اس کے بعد میں اپنے چچا زاد ولید سے ملنے کے لیے کوٹ لکھپت جیل پہنچا۔ میرے اور شکیل داراب میں ہونے والے معاہدے کے بعد ولید کو جیل میں بی کلاس تو شروع میں ہی مل گئی تھی۔ داؤد بھاؤ کے اثر و رسوخ کی وجہ سے اسے دیگر سہولیات بھی ملتی رہتی تھیں۔ پھر بھی جیل تو جیل ہوتی ہے۔ ولید جلد باہر آنا چاہتا تھا، اپنی ماں اور بہن کے قاتلوں کو عبرت ناک انجام سے دوچار کرنا بھی اس کا اہم ترین مشن تھا اور وہ جتنا جذباتی اور غصے والا تھا...... میرے خیال میں فی الحال اس کا جیل میں رہنا ہی بہتر تھا۔

درحقیقت فائزہ اور چچی آمنہ کے قتل کا سب سے بڑا مجرم لالہ نظام تو اپنے کیے کی سزا پا چکا تھا۔ اسے میں نے ہی ہیوی لوڈر کے نیچے کچل کر جہنم واصل کیا تھا۔ اس ''المناک حادثے'' میں انسپکٹر قیصر چودھری بھی شدید زخمی ہوا تھا اور میری اطلاعات کے مطابق وہ اب تک صاحبِ فراش تھا۔ رہ گیا شکیل داراب تو وہ بھی میری ہٹ لسٹ پر تھا۔ ان دو افراد کو ہلاک کیے بغیر تو شاید مجھے موت بھی نہ آتی۔ اگر ٹیکساری گینگ یہاں لاہور میں وارد نہ ہوتا تو عین ممکن تھا کہ اب تک شکیل داراب سے میرے دو دو ہاتھ ہو چکے ہوتے۔

ولید سے ملنے اور اسے ضروری ہدایات دینے کے بعد میں نے خود کو کافی ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ اس روز میں نے ڈنمارک میں اپنے ایک پرانے دوست کے ذریعے اپنے والدین کی خیر خیریت بھی دریافت کی اور اسے ان کے بارے میں ضروری ہدایات دیں۔ میں انہیں ملنے

کی شدید خواہش رکھتا تھا مگر فی الحال خود ان سے رابطہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسی میں ان کی بھلائی تھی اور میری بھی۔

رات تک میں ذہنی طور پر اس کام کے لیے تیار ہو چکا تھا جس کا خاکہ پچھلے کئی دنوں سے میرے اندر ترتیب پا رہا تھا۔ میں ٹیکساری گینگ کے بدترین خوف کے سائے میں وقت گزارنا نہیں چاہتا تھا۔ جان ڈیرک نے ڈیتھ اسکواڈ کا شیطانی ٹولا مجھ پر اسی طرح چھوڑا تھا جیسے کسی جانور پر خونخوار شکاری کتوں کا غول چھوڑا جاتا ہے۔ انہوں نے لاہور میں مجھے پالیا تھا لیکن میں لاہور میں ان کا سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا......اور ان کے سامنے نکلنا چاہتا تھا۔

داؤد بھاؤ میرا رمز شناس ہوتا جا رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میں کیا چاہ رہا ہوں۔ میں اس سے کہتا تو وہ خطرناک گینگسٹرز بیسیوں کی تعداد میں میرے لیے مہیا کر دیتا مگر مجھے صرف دس بارہ نڈر شوٹرز درکار تھے۔ داؤد بھاؤ نے چند گھنٹوں کے اندر میرے مطلوبہ لوگ مہیا کر دیئے۔ ان میں خود جھارا بھی شامل تھا (یہی جھارا تھا، جس نے یہاں سے کوئی ڈیڑھ سو میل دور لالہ موسیٰ کے قریبی گاؤں سکھیرا میں سیف مرحوم سے بھی دشمنی بنا رکھی تھی، بہرحال، فی الوقت وہ میرا ساتھی تھا)

داؤد بھاؤ کے اسنوکر کلب کے زیریں تہ خانوں میں ناجائز اسلحے کی کمی نہیں تھی۔ ایک طرح سے یہ اسلحے کا گودام تھا۔ نیا اور پرانا اسلحہ تہ خانوں میں اوپر تک بھرا ہوا تھا۔ ان میں آٹومیٹک اور سیمی آٹومیٹک رائفلوں کے علاوہ ہینڈ گرینیڈ اور چھوٹے راکٹ لانچر تک موجود تھے۔ ایمونیشن کی پیٹیاں ایک علیحدہ تہ خانے میں بھری تھیں اور ان پر باقاعدہ لیبل لگے ہوئے تھے جو "کیلیبر" اور تعداد کی نشاندہی کرتے تھے۔ شام تک میرے درجن بھر ساتھی کیل کانٹے سے لیس ہو چکے تھے۔ وہ سب پُرجوش تھے......اور ان میں سب سے زیادہ پُرجوش مختار جھارا تھا۔ بظاہر اس سوکھے سڑے بندے کے اندر بے پناہ آگ چھپی ہوئی تھی۔ درحقیقت ان سب "قریباً ایک درجن بندوں" کا شمار داؤد بھاؤ کے مانے ہوئے شوٹرز میں ہوتا تھا۔ ان میں دو بندے سابقہ پولیس اہلکار تھے اور اپنی سروس کے دوران میں اِن کاؤنٹرز کے ماہر جانے جاتے تھے۔ دو شوٹرز کا تعلق انڈیا سے تھا۔ ان میں سے ایک کا نام واصف خاں تھا اور وہ عرصے سے انڈین پولیس اور بی ایس ایف کو مطلوب تھا۔ یہ سب لوگ داؤد بھاؤ کو اپنا بگ باس مانتے تھے۔

داؤد بھاؤ نے ان سب کو بتا دیا تھا کہ ان کا واسطہ کن لوگوں سے پڑنے والا ہے اور

انہیں کس طرح سے ہینڈل کرنا ہے۔ میرے اندر بھڑکی ہوئی آگ نے بھی ان شوٹرز کو اعتماد بخشا تھا۔ وہ جان گئے تھے کہ داؤد بھاؤ نے انہیں جس شخص کی کمان میں دیا ہے، وہ ایسی معرکہ آرائیوں اور ایسے میدانوں کا پرانا کھلاڑی ہے۔ مجھے افسوس صرف ایک بات کا تھا۔ انیق کہیں نظر نہیں آ رہا تھا اور نہ ہی اس سے رابطہ ہو سکا تھا۔

○......❖......○

شام چھ بجے کے بعد ہم لاہور کی سڑکوں پر نکل کھڑے ہوئے۔ میں اپنی سوزوکی سوئفٹ میں اکیلا ہی سوار تھا۔ میرے ساتھیوں کی گاڑیاں مجھ سے کچھ فاصلے پر تھیں اور مجھ پر مسلسل نظر رکھے ہوئے تھیں۔ سیل فون پر دونوں گاڑیوں سے میرا رابطہ تھا۔ وائرلیس ائیرفون میرے کان میں تھا اور میں اپنے ہاتھوں کو استعمال کیے بغیر اپنے شوٹرز کے علاوہ داؤد بھاؤ سے بھی رابطہ رکھے ہوئے تھا۔

''اس وقت کہاں ہو شاہی؟'' داؤد بھاؤ کی پاٹ دار آواز میرے کان میں گونجی۔

''میکلوڈ روڈ سے گزر رہا ہوں۔ یہاں سے دائیں ٹرن لوں گا تو شاید شاہراہ قائداعظم آ جائے گی۔''

''ہاں ایسا ہی ہے مگر لکشمی چوک کی طرف نہیں جانا، وہاں ٹریفک جام مل سکتا ہے۔ وہ ٹھیک نہیں ہوگا۔''

''لکشمی چوک وہی ہے ناں، جہاں بہت سے سینماز ہیں؟''

''بالکل، وہاں اس وقت شوز ٹوٹتے ہیں اور گھڑمس (ہجوم) ہو جاتا ہے۔ مجھے اس بے ڈھنگے پر غصہ آ رہا ہے۔ پتا نہیں کہ کہاں دفعان ہو گیا ہے۔ اس وقت اسے تمہارے ساتھ ہونا چاہیے تھا۔'' بے ڈھنگے کا لقب داؤد بھاؤ، انیق کے لیے استعمال کرتا تھا۔

''وہ بھاگنے والا تو نہیں ہے داؤد بھاؤ۔ مجھے فکر ہے کہ اس کے ساتھ کوئی مسئلہ نہ ہو گیا ہو۔''

''آخری بار کب ملا تھا تمہیں؟''

''جب میں مراد پور جا رہا تھا۔ میں نے کہا بھی کہ چلو میرے ساتھ مگر کنی کترا گیا۔ کہہ رہا تھا کہ ایک ضروری کام ہے۔''

''جب اسے کوئی بہانہ کرنا ہو تو ضروری کام فوراً اس پر نازل ہو جاتا ہے۔ آ کر تمہیں بتائے گا کہ اس کی ایک نانی لاہور میں رہتی ہے، وہ بیمار تھی اس کی تیمارداری کرنے گیا تھا۔ حالانکہ یہ نانی پہلے بھی کئی بار شدید بیمار ہو چکی ہے اور دو تین دفعہ مر بھی چکی ہے۔'' داؤد بھاؤ

کے لہجے میں جھنجلاہٹ تھی۔

میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''داؤد بھاؤ! شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے پہلے میں دیکھ لیا جاؤں تو بہتر ہے۔ ورنہ مشکل ہو جائے گی۔''

''یار! لاہور جاگتا ہوا شہر ہے۔ رات ڈیڑھ دو بجے تک بھی بعض علاقوں میں رونق رہتی ہے...... میرا تو یہی اندازہ ہے کہ آج تم لوگوں کی مڈبھیڑ ہو ہی جائے گی۔''

''اللہ کرے۔'' میں نے گاڑی کو شاہراہ قائداعظم کی طرف موڑتے ہوئے کہا۔

''جو بلٹ پروف جیکٹ میں نے تمہیں دی ہے، یہ میرے ذاتی استعمال کی ہے۔ بڑے کمال کی جیکٹ ہے۔ باڈی کو نیچے تک ڈھانپتی ہے۔ ایل ایم جی، ایم ایم جی اور کلاشنکوف وغیرہ کو آسانی سے جھیل لیتی ہے۔'' داؤد بھاؤ نے کہا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''سائز میں کھلی تو نہیں؟'' داؤد بھاؤ نے پوچھا۔

''نہیں، ٹھیک ہے۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔

درحقیقت جیکٹ میرے پاس تھی ہی نہیں۔ جو شوٹرز داؤد بھاؤ نے میرے ساتھ بھیجے تھے، ان میں سے ایک کی جیکٹ اتنی تنگ تھی کہ وہ استعمال نہیں کر سکا تھا۔ میں نے اپنی والی جیکٹ اسے پہنا دی تھی اور رازداری کا پابند بھی کر دیا تھا۔

داؤد بھاؤ کی کال ختم ہوئی تو پیچھے آتے ہوئے مختار جھارا سے رابطہ ہو گیا، وہ ذرا ہیجانی لہجے میں بولا۔ ''ماسٹر شاہ زیب! ایک اسٹیشن وین پیچھے آ رہی ہے۔ نیلا رنگ ہے۔ لاہور کا نمبر ہے۔ لگتا ہے کہ ان لوگوں نے آپ کو دیکھ لیا ہے۔''

میں نے عقب نما آئینے میں نگاہ دوڑائی۔ نیلی اسٹیشن وین کی جھلک دکھائی دی۔ وہ گاڑیوں میں سے راستہ بناتی نزدیک پہنچ رہی تھی۔ اگر یہ واقعی وہی تھے تو میں ایک بار بھری پری سڑک پر تھا...... یعنی ایک نامناسب جگہ پر۔

میں نے اپنی رفتار بڑھا دی۔ میرے رگ و پٹھے تن گئے۔ دھڑکن بڑھ گئی۔ میرے بظاہر عام سی نظر آنے والی گاڑی عام نہیں تھی۔ اس میں موجود جدید اسلحے نے اسے عام نہیں رہنے دیا تھا۔ ایک امریکن ایل ایم جی میری نشست کے نیچے موجود تھی اور ایک چھوٹی نال کی روسی رائفل نشست کے عقب میں کارپٹ کے نیچے اس طرح چھپائی گئی تھی کہ ایک کھٹکا دباتے ہی وہ میرے ہاتھوں میں پہنچ سکتی تھی۔ بائیں طرف والی نشست کے اندر ایمونیشن بھرا ہوا تھا۔ دونوں رائفلوں کے کم از کم چودہ بھرے ہوئے میگزین اس نشست کے اندرونی خلا

میں چھپائے گئے تھے۔ گولیوں کے دو علیحدہ ڈبے بھی گاڑی میں موجود تھے۔
میں نے گاڑی کی رفتار بڑھائی اور نہر کی طرف جانا شروع کر دیا۔ ابھی میں قریباً ایک کلو میٹر ہی آگے گیا تھا کہ نیلی اسٹیشن ویگن نے موڑ کاٹا اور فاطمہ جناح روڈ کی طرف مڑ گئی۔ جھارے کی آواز میرے کانوں میں گونجی۔ ''نہیں ماسٹر شاہ زیب! شک درست نہیں تھا، گاڑی دوسری طرف چلی گئی ہے۔''
''ہاں، میں نے دیکھ لیا ہے۔ پوری طرح الرٹ رہو۔ میں اب یوٹرن لے کر جیل روڈ کی طرف نکل رہا ہوں۔ وہاں کسی مصروف جگہ رکوں گا اور گاڑی کا بونٹ اٹھا کر پندرہ بیس منٹ گاڑی سے باہر ہی گزاروں گا۔''
''اوکے ماسٹر! ہم آپ کے آس پاس موجود ہیں۔'' مختار جھارے کی تیز تیکھی آواز آئی۔
''انیق کی طرف سے تو کوئی رابطہ نہیں ہوا؟''
''نہیں جی، میں خود بھی کئی بار کوشش کر چکا ہوں۔ وہ کسی مشکل میں نہ پڑ گیا ہو۔''
اگلے قریباً دو گھنٹے لاہور کی مختلف سڑکوں پر ہی گزرے میں نے کئی بارونق جگہوں پر گاڑی روکی بھی۔ مختلف بہانوں سے پیدل بھی گھوما پھرا لیکن وہ مقصد حاصل نہیں ہوا جس کے لیے میں یہ سب کچھ کر رہا تھا۔
داؤد بھاؤ نے مجھے لاہور کی دو تین ایسی جگہوں کا بتایا ہوا تھا جہاں عموماً جرائم پیشہ افراد کی آمدورفت ہوتی ہے۔ ان میں سے ایک تو لاہور کا معروف ریستوران تھا جہاں دیسی گھی میں پکا ہوا مٹن بڑے اہتمام سے سرو کیا جاتا تھا۔ ایک جوا خانہ تھا اور پھر بادشاہی مسجد کا ایک نواحی علاقہ تھا جہاں بڑے عالی شان چوباروں میں نہایت ''ہائی کلاس'' بدمعاشوں کی آمدورفت ہوتی تھی۔
معروف ریستوران کے اوپن ائیر پورشن میں ڈنر کے بعد میں ایک بار پھر اپنے غیر ملکی دشمنوں کو دعوتِ مبارزت دینے نکل کھڑا ہوا۔ کل تک میرا اور داؤد بھاؤ کا خیال بھی یہی تھا کہ وہ لاہور میں جگہ جگہ مجھے تلاش کرتے پھر رہے ہوں گے اور میں جونہی اپنی زیرِ زمین پناہ گاہ سے نکلوں گا، وہ مجھ پر جھپٹ پڑیں گے مگر آج صورتِ حال کا ایک اور نقشہ سامنے آ رہا تھا۔ ابھی تک کوئی ری ایکشن نہیں ہوا تھا۔
داؤد بھاؤ کی آواز میرے ہی فون میں گونجی۔ ''کہیں ایسا تو نہیں شاہی، کہ وہ لاہور سے جا چکے ہوں؟''

''نہیں داؤد بھاؤ! وہ اتنی جلدی تو جان چھوڑنے والے نہیں۔''
''یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ جان چکے ہوں کہ تم اکیلے نہیں ہو۔'' داؤد بھاؤ نے خیال ظاہر کیا۔
''نہیں بھاؤ! وہ کمینے ان باتوں کو خاطر میں لانے والے بھی نہیں۔'' میں نے گاڑی کو لاہور کی معروف شاہراہ ڈیوس روڈ کی طرف موڑتے ہوئے کہا۔ اب رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ ہوا میں ہلکی خنکی تھی۔ سڑکوں پر ٹریفک کم ہونا شروع ہو گیا تھا۔
میں ایک پولیس ناکے کے پاس سے گزرا۔ وہاں سے گزرتے ہی نگاہوں میں وہ مناظر تازہ ہو گئے جب چند روز پہلے ایک ایسے ہی بے ہودہ ناکے کی وجہ سے مجھے اپنا رخ سنسان علاقے سے گنجان علاقے مغل پورہ کی طرف کرنا پڑا تھا اور نتیجے میں بیس سے زائد بے گناہ شہری ڈیتھ اسکواڈ کی اندھی گولیوں کا نشانہ بن گئے تھے۔ رگوں میں ایک بار پھر خون کھول کر رہ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اغوا شدہ اداکارہ کا تصور بھی ذہن کو کچوکے لگانے لگا۔
گاڑی کا ریڈیو آن تھا۔ وقتاً فوقتاً نیوز بلیٹن بھی براڈکاسٹ ہوتا تھا۔ ایک ایسے ہی بلیٹن میں چند روز پہلے ہونے والے قتل عام کا ذکر بھی ہوا۔ خبروں میں ابھی تک اس خونی واقعے کی بازگشت موجود تھی، پولیس ترجمان کی طرف سے کہا جا رہا تھا۔ ''ہم ذمے داروں تک پہنچنے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ متعلقہ سفارت خانوں سے بھی رابطہ کیا گیا ہے۔ ساتھ ساتھ یہ کھوج لگانے کی کوشش بھی ہو رہی ہے کہ یہ غیر ملکی جن مقامی لوگوں پر حملہ آور ہوئے، وہ کون تھے۔ کچھ ایسی اطلاعات ملی ہیں کہ ان مقامی لوگوں کا تعلق زیر زمین سرگرم گروہوں سے ہے۔ اس حوالے سے ایک دو مقامی گینگسٹرز کے نام بھی سامنے آرہے ہیں۔ تفتیش کار اس معاملے کا کوئی پہلو بھی نظر انداز نہیں کر رہے۔''
نیوز کاسٹر نے کہا۔ ''ایک خبر یہ بھی ہے کہ غیر ملکی قاتل جس بندے کو نشانہ بنانا چاہتے تھے، یہ وہی شاہ زیب نامی شخص ہے جس پر کچھ عرصہ پہلے دہشت گردی کا ایک کیس بنا تھا اور جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ دراصل ایم ایم اے کا معروف کھلاڑی ایسٹرن ہے اور بدلے ہوئے بھیس میں یہاں موجود ہے۔''
یہ سب رسمی باتیں تھیں اور لگی بندھی اطلاعات تھیں۔ مجھے پتا تھا کہ ڈیتھ اسکواڈ کے لوگوں سے ٹکرانا، کم از کم مقامی پولیس کے بس کا روگ نہیں۔ قانون نافذ کرنے والے دیگر اداروں کی کارکردگی میرے علم میں نہیں تھی۔ ان غیر ملکی قاتلوں کا طریقہ کار بے حد مختلف تھا۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ وہ جنونی پیشہ ور تھے۔

اچانک میرے سیل فون پر کال کے سگنل آئے۔ میں چونک گیا، یہ انیق کا نمبر تھا جو مسلسل بند جا رہا تھا۔ میں نے فوراً کال ریسیو کی۔ ائیر فون کے ذریعے میرے کان میں انیق کی آواز گونجی۔ ''کہاں ہیں شاہ زیب بھائی؟''

''اپنا سر پیٹ رہا ہوں گاڑی میں بیٹھ کر اور تمہاری جان کو رو رہا ہوں۔ کہاں دفع ہو گئے ہو؟''

''آپ ہی کے لیے دفع ہوا تھا اور آپ ہی کے لیے واپس آیا ہوں۔ کچھ سن تو لیں مجھ ناہنجار کی۔''

''سناؤ۔'' میں نے گاڑی کو ایک راؤنڈ اباؤٹ پر موڑتے ہوئے کہا۔

''اچھا داؤد بھاؤ کہاں ہیں؟'' اس نے دبے لہجے میں پوچھا۔

''انہوں نے تمہارے وارنٹ نکالے ہوئے ہیں۔ بے نقط کی سنا رہے ہیں تم کو۔''

''مگر پاس تو نہیں ہیں ناں؟''

''نہیں، تم بکو۔''

''ان شاء اللہ ابھی آپ کو اپنے یہ الفاظ واپس لینے پڑیں گے۔ بڑی دھانسو اطلاع ہے آپ کے لیے۔ فلم مغل اعظم میں ایک ایسی ہی اطلاع ایک خادم نے جہانگیر کو دی تھی اور جہانگیر نے اس کا منہ موتیوں سے بھر دیا تھا۔ بعد میں سنسر بورڈ والوں نے یہ سین ہی نکلوا دیا......''

''اچھا ٹر ٹر بند کرو، کیا اطلاع ہے؟''

''آپ کے دشمنوں کا کھوج لگا لیا ہے میں نے۔ اس سے پہلے کہ وہ آپ کو ڈھونڈتے، میں نے انہیں ڈھونڈ لیا ہے۔ آپ فوراً پی سی ہوٹل پہنچیں۔ میں آپ سے ساری معلومات شیئر کرتا ہوں لیکن آپ بالکل اکیلے آئیں......اور بھاؤ جی کو تو بالکل پتا نہیں چلنا چاہیے۔''

میری دھڑکن تیز ہو گئی۔ ''دیکھو انیق! کوئی اونگی بونگی نہ مارنا۔ یہ بڑا سیریس معاملہ ہے۔''

''سیریس کیوں نہیں جی۔ ہمارے بیس شہری جاں بحق ہوئے ہیں۔ درجنوں زخمی ہیں۔ خون کی ہولی کھیلی گئی ہے۔''

''تم کہاں سے بات کر رہے ہو؟''

''زیادہ دور نہیں ہوں آپ سے۔ بس آپ دیر نہ کریں۔ فوراً پہنچ جائیں۔'' انیق کے لہجے میں ہیجانی کیفیت تھی۔

اب انیق کے لب و لہجے کو میں بڑی اچھی طرح سمجھنے لگا تھا۔ کبھی کبھی اس کے اندر سے ایک نہایت سنجیدہ انسان بولتا تھا۔ جیسے کہ اب بول رہا تھا۔ اب رات کے بارہ بج چکے تھے۔ میں نے مختار جھارا سے رابطہ کیا اور اس سے پوچھا کہ وہ کہاں ہے؟

وہ بولا۔ ''آپ کے پیچھے ہی آرہے ہیں ماسٹر۔''

''میرا خیال ہے کہ آج کی سڑک پیمائی اب ختم کر دیں۔ کافی ٹائم ہو گیا ہے۔ کل پھر کوشش کر لیں گے۔''

جھارے نے چند لمحے کے توقف کے بعد کہا۔ ''جیسے آپ کی مرضی ماسٹر۔''

''ٹھیک ہے۔ اب تم لوگ واپس چلے جاؤ۔ داؤد بھاؤ کو میں خود بتا دیتا ہوں۔''

جھارے سے بات کرنے کے بعد میں نے داؤد بھاؤ سے رابطہ کیا اور اسے بھی آگاہ کر دیا کہ اب ہم گھومنا پھرنا ختم کر رہے ہیں۔ میں تھوڑی دیر میں واپس کلب پہنچ جاتا ہوں۔''

میں اس وقت کینال بینک روڈ سے گزر رہا تھا۔ گاڑی کی رفتار پہلے تیز اور پھر آہستہ کرنے کے بعد میں نے تسلی کر لی کہ مختار جھارا اپنے شوٹرز سمیت واپس اسنوکر کلب پہنچ چکا ہے، تب میں نے سوزوکی سوئفٹ کا رخ پی سی ہوٹل کی طرف موڑ دیا۔

O.....❖.....O

قریباً بیس منٹ بعد میں اور انیق پی سی ہوٹل کے بخارا ہال میں ایک میز پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ انیق نے کہا۔ ''قدرت کبھی کبھی اپنے ہونے کے بڑے ٹھوس اور واضح ثبوت دیتی ہے۔ کسی بندے کے سر میں تین گولیاں لگیں اور چوتھی سینے پر، وہ پھر بھی زندہ رہے۔ کیسی بات ہے؟''

''کس فلم کی بات کر رہے ہو؟''

''حقیقت بیان کر رہا ہوں اور اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آرہا ہوں۔ ہائی وے پولیس کا ایک سارجنٹ فیروز خاں ہے۔ اچھی شہرت کا مالک نہیں۔ وہ اپنی ہیوی موٹر سائیکل پر تھا۔ کسی نے اس کا پیچھا کر کے اسے پانچ فائر مارے، جن میں سے چار اسے لگے۔ وہ لوگ اسے مردہ چھوڑ کر چلے گئے لیکن وہ اب تک زندہ ہے بلکہ اپنا بیان بھی قلمبند کرا چکا ہے۔''

''ڈیتھ اسکواڈ والے معاملے سے اس کا کیا تعلق؟''

''اسی سے تو تعلق ہے حضور والا۔ فیروز خاں ان افسروں میں شامل تھا جو راشی گردانے جاتے ہیں اور وہ واقعی رشوت خور بھی ہے، لیکن پرسوں رات اس نے جو کچھ کیا، وہ سننے کے لائق ہے اور قابلِ قدر ہے۔ اس نے ہمیں بتایا کہ چند دن پہلے لاہور کے معروف علاقے میں

قتل عام کرنے والے غیر ملکی ہمیں کہاں مل سکتے ہیں اور ان کے ارادے کس طرح کے ہیں۔''

''شروع سے بتاؤ گے تو کچھ پتا چلے گا۔''

جواب میں انیق نے مختصر الفاظ میں جو کچھ بتایا اس سے پتا چلا کہ پرسوں رات کو دریائے راوی کے پل کے قریب ایک ایسا ٹرک پکڑا گیا جس میں بظاہر تو بجری بھری ہوئی تھی مگر بجری کے نیچے بھاری مقدار میں اسلحہ اور بارودی سامان موجود تھا۔ اس ٹرک کو جن دو سارجنٹس نے چیک کیا، ان کے نام فیروز خاں اور شوکت واہلہ تھے۔ دونوں ہی مک مکا کے ماہر تھے۔ موقع پر شوکت واہلہ موجود تھا۔ اس نے اتنے خطرناک اور قیمتی سامان سے نظر پوشی کرنے کے لیے بھاری رشوت موقع پر ہی وصول کر لی۔ یہ ڈالرز کی شکل میں تھی۔ اسی دوران میں واہلہ کا ''کرپٹ'' ساتھی فیروز خاں بھی پہنچ گیا۔ ٹرک کے ساتھ ایک لگژری جیپ بھی تھی۔ مک مکا کرنے والے افراد اسی جیپ میں موجود تھے۔ جب جیپ اور ٹرک لاہور میں داخل ہونے کے لیے آگے بڑھے تو فیروز خاں پر انکشاف ہوا کہ انہیں ڈالرز کی شکل میں تقریباً 20 لاکھ روپے کی خطیر رقم دینے والوں میں دو غیر ملکی بھی ہیں، اس کا دھیان فوراً چند دن پہلے مغلپورہ کے علاقے میں ہونے والے خونی واقعے کی طرف چلا گیا جس میں بیس شہری جان سے گئے تھے۔ اس کو شک ہوا کہ کہیں ان لوگوں کا تعلق اسی گروہ سے نہ ہو۔ اس کے علاوہ فیروز خاں کو جس چیز نے سب سے زیادہ تکلیف دی، وہ ایک پرانے فقرے کی بازگشت تھی۔ امریکی زبان درازوں کی طرف سے کہا جانے والا یہ وہ فقرہ ہے جو بے شمار لوگوں کے دلوں میں زہریلے خنجر کی نوک سے کندہ ہو چکا ہے۔ افغان امریکا جنگ کے دوران میں اپنے مطلوبہ لوگوں کو تلاش کرتے ہوئے کسی بدبخت امریکی نے مقامی مسلمانوں اور قبائلیوں کے حوالے سے یہ کہا تھا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو پیسے کے لیے اپنی ماؤں تک کو بیچ دیتے ہیں۔ یہ فقرہ فیروز خاں کے دل دماغ پر آتشیں حروف میں نقش تھا۔ بے شک اس کا ضمیر نیم مردہ ہو چکا تھا۔ وہ اپنے ہم وطنوں کو بے دردی سے لوٹتا تھا لیکن جب اس کے ہاتھ میں ایک غیر ملکی کی دی ہوئی رشوت کے ڈالرز آئے تو اس کے اندر آگ بھڑک گئی۔ اس نے اپنے پارٹنر سارجنٹ شوکت واہلہ سے کہا کہ وہ لاہور میں اس ٹرک کی آمد کی اطلاع احکام بالا تک پہنچائے گا۔ ہاں کچھ لمحے ایسے ہی ''کایا پلٹ'' ہوتے ہیں۔

دونوں دوستوں میں اس معاملے پر شدید تکرار ہو گئی۔ اس تکرار کے دوران میں ہی فیروز خاں نے سفید جیپ اور بجری والے ٹرک کے پیچھے اپنی بائیک لگا دی۔ جلد ہی اس نے دونوں گاڑیوں کو لوئر مال روڈ پر جا لیا۔ سارجنٹ واہلہ بھی اپنی سرکاری موٹر بائیک پر مسلسل

اس کے ساتھ تھا اور اسے اس ''حرکت'' سے باز رکھنے کی کوشش کررہا تھا...... ساتھ ساتھ اسے ماں بہن کی گالیاں بھی دے رہا تھا۔ یہ رات کے دو بجے کا عمل تھا جب یہ لوگ سفید جیپ کا تعاقب کرتے اس نالے کے کنارے جارہے تھے جو شاہراہ قائداعظم کو جیل روڈ سے ملاتا ہے اور سنسان علاقے سے گزرتا ہے سارجنٹ واہلہ نے فیروز خاں کو اپنے 38 بور پستول سے شوٹ کر دیا۔ بعدازاں صرف دس فٹ کے فاصلے سے اس کے سر اور سینے میں مزید تین گولیاں اتار دیں۔ وہ اسے مردہ سمجھ کر بھاگ گیا لیکن یہاں ایک کرشمہ ہوا۔ سر میں تین گولیاں لگنے کے باوجود فیروز خاں زندہ رہا۔

انیق نے کہا۔ ''پرسوں رات ڈھائی بجے کے لگ بھگ میرے ایک پرانے ساتھی شاہد بٹ کا فون آیا۔ اس نے بتایا کہ اسے جیل روڈ کی بغلی سڑک پر نالے کے کنارے جھاڑ جھنکاڑ میں ایک زخمی پولیس والا شدید زخمی حالت میں ملا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ اسے کسی سرکاری اسپتال میں نہ لے جایا جائے کہ اس کی جان کو خطرہ ہے۔ میرے کہنے پر شاہد بٹ جو ایک سیاسی ورکر بھی ہے، مضروب سارجنٹ کو ایک پرائیویٹ کلینک میں لے گیا۔ اب سارجنٹ بے ہوش ہو چکا تھا۔ تب تک کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس معاملے کا تعلق آپ والے ڈیتھ اسکواڈ سے نکل آئے گا۔''

''کیا فیروز خاں نے کوئی بیان دیا ہے؟''

''بالکل دیا ہے جی...... اور میرے پاس ریکارڈ شدہ موجود ہے۔ یہ بیان میں نے کل ریکارڈ کیا تھا اور اس کے فوراً بعد مجھے امید پیدا ہوگئی تھی کہ میں آپ کو کوئی تہلکہ خیز خبر مہیا کر سکوں گا۔''

''اور وہ خبر کیا ہے؟''

''خبر یہ ہے کہ آپ کے پیچھے ڈنمارک سے یہاں پہنچنے والا وہ شیطانی ٹولا اس وقت اٹلی کے ایک سابق قونصلیٹ کی نجی رہائش گاہ پر موجود ہے، وہاں دو چار اور پرانے ڈپلومیٹس بھی موجود ہیں۔ دراصل کل دوپہر فیروز خاں کچھ دیر کے لیے ہوش میں آیا تھا اور اس نے ہمیں نہ صرف سفید لگژری جیپ کا نمبر بھی مہیا کر دیا تھا بلکہ اس مختصر علاقے کی نشاندہی بھی کر دی تھی جہاں وہ جیپ پائی جا سکتی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ پولیس کو ''انوالو'' کیے بغیر میں اور میرے ساتھی اس جیپ تک اور جیپ والوں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔''

انیق نے ایک نگاہ اپنی رسٹ واچ پر ڈالی اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''سابق قونصلیٹ جواب لاہور میں ایک کاروباری شخص کی حیثیت سے موجود ہے، اپنی بارہ کینال

کے شاندار گھر میں پایا جا رہا ہے۔ میری اطلاعات کے عین مطابق آج رات اس وسیع گھر میں کوئی تقریب بھی ہو رہی ہے۔''

''کیسی تقریب؟''

''غالب گمان یہی ہے کہ کوئی سالگرہ قسم کی تقریب۔ لاہور کی ایک مہنگی ترین بیکری سے ایک بڑا کیک بن کر اس چار دیواری میں گیا ہے یا جانے والا ہے۔ میں نے جو مخبر چھوڑ رکھے تھے، انہوں نے اپنی جان پر کھیل کر یہ معلومات اکٹھی کی ہیں جناب۔''

''بات تو تم واقعی بہت بڑی کر رہے ہو لیکن کیا تمہیں یقین ہے کہ اسلحے والا ٹرک اس کوٹھی میں گیا اور ڈیتھ اسکواڈ کے شوٹر بھی وہاں موجود ہیں۔''

''سو میں سے چورانویں پچانویں نمبر کم نہیں ہوتے جناب! اور مجھے پچانویں فیصد یقین ہے کہ وہ دس پندرہ غیر ملکی قاتل بھی اس وقت اسی چار دیواری میں موجود ہیں۔ اسلحے کی موجودگی کے بارے میں یقین کی شرح کچھ کم ہے مگر پھر بھی ستر پچھتر فیصد سے کم نہیں۔'' انیق کی آواز میں جوش تھا۔ اس نے عمارت کا نمبر 18-A بتایا۔

انیق کسی تقریب کی بات کر رہا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ اسی خاص تقریب کی وجہ سے آج ہمیں تلاش کرنے والے لوگ ''فیلڈ'' میں نہ ہوں...... یا دوسرے لفظوں میں چھٹی منا رہے ہوں۔ ورنہ جس طرح میں پچھلے چھ سات گھنٹوں سے مسلسل کھلے عام شہر میں گھوم رہا تھا کہیں نہ کہیں میرا ٹاکرا، میرا کھوج لگانے والوں سے ہو جانا چاہیے تھا۔

اسی دوران میں انیق کے فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف اس کا کوئی مخبر ہی تھا۔ مجھے کن اکھیوں سے دیکھتے ہوئے انیق نے کہا۔ ''کب ہوا یہ؟''

دوسری طرف کا جواب سننے کے بعد وہ بولا۔ ''دیکھو اس معاملے کا داؤد بھاؤ سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لیے ان کو کسی طرح کی خبر نہیں ہونی چاہیے...... او کے۔'' اس نے فون بند کر دیا۔ میری طرف ذرا اداسی سے دیکھ کر بولا۔ ''فیروز خاں نے دم توڑ دیا ہے لیکن مجھے لگتا ہے کہ جاتے جاتے وہ اپنے بہت سے گناہوں کا کفارہ ادا کر گیا ہے۔''

''اب کیا کرنا ہے انیق؟'' میں نے بھی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ آپ کو بتانا ہے۔''

''کیا ہمیں پولیس وغیرہ کو ''انوالو'' کرنا چاہیے؟''

''آپ اب پاکستان میں کوئی نئے نہیں ہیں۔ یہاں کی پولیس کا حال آپ نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے۔ پولیس کو اطلاع دینے سے تو بہتر ہے کہ پھر داؤد بھاؤ کو انفارم کر دیا

جائے اور ہاؤس نمبر اٹھارہ پر زوردار چڑھائی کردی جائے چالیس پچاس لوگوں کے ساتھ۔"

"لیکن بات تو پھر وہی مارا ماری اور خونریزی کی آجائے گی۔ جیسا کہ تم بتا رہے ہو، وہ ایک رہائشی علاقہ ہے پاس ہی ایک اولڈ ہاؤس بھی ہے۔"

"تو پھر کیا کہتے ہیں آپ...... اور میں آپ کو یہ بھی بتا دوں۔ زیادہ ٹائم نہیں ہے ہمارے پاس۔"

میری نگاہوں میں ایک بار پھر ان بیس بے گناہوں کی خونچکاں لاشیں آگئیں جنہیں ویک اینڈ کی ایک سہانی شام میں گولیوں سے بھون ڈالا گیا تھا اور پھر وہ خوبرو اداکارہ جو جرم بے گناہی میں بدترین صورتِ حال کا شکار ہو چکی تھی۔ معلوم نہیں کہ زندہ بھی تھی یا نہیں۔ اخبارات میں اور میڈیا پر اس کے بارے میں بہت شور تھا۔ اس شور کی وجہ سے اس سارے واقعے کی اہمیت کئی گنا بڑھ چکی تھی۔ میں نے وہیں پی سی ہوٹل کے ہال میں انیق کے سامنے بیٹھے بیٹھے براہِ راست ایکشن کا فیصلہ کیا اور اپنے پلان کو حتمی شکل دینے کی کوشش کرنے لگا۔

اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ میں نے جلدی سے پھر اپنی رسٹ واچ دیکھی۔ آج جون کی 10 تاریخ تھی...... ایک دھندسی تھی جو چھٹ گئی۔ مجھے یہ تاریخ اچھی طرح یاد تھی۔ یہ میرے اولین دشمن جان ڈیرک کی سالگرہ کا دن تھا اور مجھے معلوم تھا کہ یہ سالگرہ جان ڈیرک رات گئے چار بج کر پچیس منٹ پر مناتا تھا۔ یہی وہ شبھ گھڑی تھی جب یہ شخص اپنی تمام تر نحوست لے کر اس دنیا میں آیا تھا۔ اب مجھے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ ابھی کچھ دیر پہلے انیق نے جس خاص قسم کے کیک کا ذکر کیا ہے، وہ کس ٹائپ کا ہے اور اس میں کیا ہوگا۔

میں نے انیق کی طرف دیکھا، وہ بھی میری طرف دیکھ رہا تھا جیسے میرے ذہن کو ٹٹولنے کی کوشش کر رہا ہو، میں نے کہا۔"انیق ایک کام کرو جس انفارمر نے تمہیں سالگرہ کے کیک کے بارے میں اطلاع دی ہے، اس سے رابطہ کرو۔ اس سے پوچھو کہ وہ کیک ڈلیور ہو چکا ہے یا نہیں......"

"اس سے کیا ہوگا؟"

"جو کہہ رہا ہوں، وہ کرو...... جلدی۔" میں نے تحکم سے کہا تو انیق فوراً نمبر ملانے میں مصروف ہو گیا۔

میری ہدایت پر اُس نے اپنے مخبر سے بات کی اور اسے کیک کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے کہا۔

قریباً پانچ منٹ بعد اس شخص کی کال آ گئی۔ میرے کہنے پر انیق نے سیل فون کا اسپیکر آن کر دیا تا کہ میں بھی کچھ سن سکوں۔

اس شخص کا نام ماجد تھا اور وہ لب و لہجے سے چوکس نظر آتا تھا۔ معروف بیکری میں اس کا کوئی دوست کک تھا جس سے وہ معلومات حاصل کر رہا تھا۔ مخبر ماجد نے انیق کو بتایا۔ ''میں نے پتا کیا ہے بھائی، کیک بن چکا ہے لیکن ابھی گھر پر پہنچایا نہیں گیا۔ بس بیس تیس منٹ میں روانہ ہو جائے گا۔ اس کے لیے ڈیڈ لائن 3:30am ہے۔''

''کیا بہت بڑا کیک ہے؟'' انیق نے پوچھا۔

''بہت بڑا تو نہیں بھائی لیکن چھوٹا بھی نہیں۔ چھ فٹ ضرب ڈیڑھ دو فٹ سائز ہو گا۔''

''کیا کسی خاص ''شیپ'' میں ہے؟'' انیق نے دریافت کیا۔

''اس کا تو پتا نہیں چل سکا۔ عام ورکرز سے چھپا کر بنایا گیا ہے۔ شاید خریدار کی طرف سے ہدایت تھی۔''

میں نے سرگوشی میں انیق سے کہا۔ ''اس سے پوچھو کیک بھیجا کیسے جائے گا؟''

جب انیق نے یہی سوال اپنے انفارمر ماجد سے کیا تو اس نے بتایا کہ بیکری کی ائیر کنڈیشنڈ ڈلیوری وین خود لے کر جائے گی۔ جونہی کال ختم ہوئی، میں نے انیق سے کہا۔ ''اٹھو، ہمیں ابھی چلنا ہے۔''

''کہاں؟'' وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

''اس بیکری پر پہنچنا ہے۔ زیادہ دور تو نہیں ہے؟''

''نہیں، یہاں سے تو بمشکل دس منٹ کا راستہ ہے لیکن پلان کیا ہے؟''

میں نے اسے مختصر الفاظ میں پلان سے آگاہ کیا۔ خطرناک منصوبہ بندی تھی، اس کے باوجود انیق کی آنکھوں میں جوش نظر آیا۔ عام قد کاٹھ کے اس اول جلول سے لڑکے کو دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ اس کے اندر ایک نہایت قوی اور نڈر شخص چھپا بیٹھا ہے۔ وہ یوں ہی تو داؤد بھاؤ کی آنکھوں میں تارا بن کر نہیں چمکتا تھا۔ بلا کا ذہین، بے شمار زبانیں جاننے والا، ایک گینگسٹر کا دست راست ہونے کے باوجود وہ شراب، سگریٹ پان حتیٰ کہ عورت سے بھی کوسوں دور تھا۔ اپنے ارگرد اس کی موجودگی مجھے ہمیشہ توانائی بخشتی تھی۔

میں پارکنگ میں موجود اپنی سوزوکی کار تک پہنچا جیسا کہ میں نے بتایا ہے وہ اسلحے اور ایمونیشن کا گودام بنی ہوئی تھی۔ میں نے اس میں سے چھوٹی نال کی نہایت طاقتور آٹو میٹک روسی رائفل نکالی۔ ساتھ میں دو کولٹ پسٹل لیے...... ان میں سے ایک پر سائیلنسر چڑھا ہوا

تھا۔ایک دندانے دار خنجر میں نے اپنی پنڈلی سے منسلک کرلیا تھا۔

''یہ دیکھیں جی۔ یہ دو تین ''رک سیکس'' بھی پڑے ہوئے ہیں۔''انیق نے پچھلی نشست کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''بے شک ان کی ضرورت ہے۔'' میں نے ایک ''رک سیک'' اپنی جھولی میں رکھتے ہوئے کہا۔ یہ نیلے رنگ کا مضبوط کینوس کا بنا ہوا تھا۔

میں نے رک سیک میں اپنی رائفل اور کولٹ پسٹلز کے قریباً تین سو فالتو راؤنڈز اور اضافی میگزین رکھے۔اس کے علاوہ دو ہینڈ گرینیڈز بھی گھسا لیے۔

''چلو تم بھی راشن لے لو۔'' میں نے انیق سے کہا۔راشن سے میری مراد اسلحہ ہی تھا۔

انیق نے بھی ضروری چیزیں اپنے ''رک سیک'' میں بھر لیں۔ایک گارڈ ٹہلتا ہوا ہماری طرف آیا۔گاڑی کے اندر جھانکا اور مسکرا کر آگے بڑھ گیا۔اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ گاڑی کے اندر کس قسم کا سامان ہے اور کیا تیاری ہو رہی ہے۔اس سے پہلے اسی گاڑی میں لاہور کے اندر کئی پولیس ناکوں پر سے بھی ''ہنسی خوشی'' گزر گیا تھا۔قریباً پندرہ منٹ بعد ہم اس معروف بیکری کے سامنے کچھ فاصلے پر موجود تھے جہاں سے وہ خاص قسم کا کیک گلبرگ تین کے علاقے میں ہاؤس نمبر اٹھارہ میں ڈلیور ہونا تھا۔انیق کا مخبر ساتھی ماجد پہلے سے ہی بیکری کے اندر موجود تھا اور انیق سے اس کا ٹیلی فونک رابطہ تھا۔بیکری کا عظیم الشان کچن بیکری کے عقب میں موجود تھا اور وہیں پر ساری بیکنگ وغیرہ ہوتی تھی۔

ہم دونوں انیق کی کورے گاڑی پر یہاں پہنچے تھے،اسلحے والی سوزوکی سوئفٹ میں نے پی سی ہوٹل کی پارکنگ میں ہی کھڑی رہنے دی تھی۔ پروگرام کے مطابق اسے بعد میں داؤد بھاؤ کے کسی کارندے کو وہاں سے لے جانا تھا۔

ہم بیکری سے قریباً نصف کلومیٹر دور سڑک کے ایک نسبتاً سنسان حصے میں موجود تھے۔ اب رات کے قریباً دو بج چکے تھے۔ٹریفک ویسے بھی بہت کم ہو چکی تھی۔اسی دوران میں انیق کے فون پر کال آئی۔ یہ ماجد ہی تھا اس نے بتایا۔''انیق بھائی، کیک کی ڈلیوری روانہ ہو رہی ہے۔سفید رنگ کی وین ہے۔نمبر 1920 ہے۔بس نکل رہے ہیں وہ۔''

''کتنے بندے ہیں؟''

''دو......ایک ڈرائیور، دوسرا ڈلیوری مین۔''

''اوکے......ہم دیکھ لیتے ہیں۔'' انیق نے کہا اور کال ختم کردی۔

O......❖......O

ڈلیوری وین کو اسی سڑک پر آنا تھا۔ تین چار منٹ بعد اس کی جھلک دکھائی دی۔ تیز روڈ لائٹس میں اس کی ساخت اور اس کا رنگ صاف پہچانے جا رہے تھے۔ وہ قریب پہنچی تو انیق نے عین اس کے سامنے کھڑے ہو کر اس کا راستہ روک لیا۔ اس کا انداز بڑا مصیبت زدہ تھا۔ اس نے اپنا بایاں بازو اس طرح تھام رکھا تھا جیسے کوئی شدید چوٹ لگی ہو۔ جونہی وین کی رفتار کم ہوئی اور ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے پی کیپ والے شخص نے کھڑکی کا شیشہ نیچے اتارا، میں نے لپک کر دروازہ کھولا اور اندر گھس گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتا یا کر پاتا میرے ہاتھ کی نہایت جچی تلی ضرب اس کی کنپٹی پر لگی۔ یہ ضرب اسے آدھ پون گھنٹے کے لیے دنیا و مافیہا سے بے خبر کرنے کے لیے کافی تھی۔

دوسری طرف انیق بھی ڈرائیور کے ساتھ اس سے ملتا جلتا سلوک کر چکا تھا۔ اس نے پستول کے دستے سے دو کراری ضربیں ڈرائیور کے سر پر لگائی تھیں اور اسے لمبا لٹا دیا تھا۔ تب اس نے ڈرائیور کو دھکیل کر ایک سائیڈ پر کیا اور اسٹیئرنگ سنبھال کر وین کو آگے بڑھا دیا۔ یہ سارا عمل بمشکل سات آٹھ سیکنڈ کے اندر انجام پا گیا تھا۔ کچھ آگے جا کر ہم نے وین کو سڑک سے ہٹا کر ایک منی مارکیٹ کی پارکنگ میں کھڑا کر دیا۔ رات کے اس پہر مارکیٹ کی ساری پندرہ بیس دکانیں بند تھیں۔ ڈرائیور کے علاوہ ڈلیوری مین بھی بیکری کی مخصوص وردی میں تھا۔ سفید اپر، ہلکی براؤن پینٹ اور سفید پی کیپ۔ وین کا ڈرائیور مکمل سفید یونیفارم میں تھا۔ ہم نے ان دونوں کے جسموں پر صرف انڈر ویئر رہنے دیئے، باقی کپڑے اتار لیے۔ پہلے میں وین کے عقبی حصے میں گیا اور ڈلیوری مین والا لباس پہن کر سر پر پی کیپ سجا لی۔ لباس تھوڑا سا تنگ تھا مگر گزارا ہو گیا۔

وہ لمبوترا باکس ایئر کنڈیشنڈ وین میں موجود تھا جس میں اسپیشل کیک کی ''ہوم ڈلیوری'' کی جا رہی تھی۔ نفیس گتے کے باکس کی لمبائی قریباً سات فٹ اور چوڑائی دو فٹ ہو گی۔ میں نے اسے کھولنے کا سوچا مگر پھر دیکھا کہ اسے باقاعدہ اسٹیکر لگا کر سیل کیا گیا تھا اور مہر وغیرہ لگائی گئی تھی۔ میں بہت حد تک جانتا تھا کہ اس باکس میں کیا ہو گا اس لیے زیادہ تجسس پیدا نہیں ہوا۔

میرے بعد انیق نے ڈرائیور والا لباس پہنا اور واپس کیبن میں آ گیا۔ بیکری کے دونوں ملازمین کے پاس ان کے شناختی اور سروس کارڈز موجود تھے، وہ ہم نے نکال کر اپنی جیبوں میں رکھ لیے۔ ڈرائیور نے کسمسانا شروع کر دیا تھا۔ انیق نے اس کے منہ میں ٹشو پیپر کے کئی گولے گھسیڑ کر اوپر ٹیپ چپکا دی، اسی طرح اس کے ہاتھ پاؤں بھی پلاسٹک ٹیپ سے

جکڑ دیئے۔ دونوں افراد کو گارڈ نیا کی ایک اونچی باڑ کے پیچھے اوجھل کر کے ہم دوبارہ وین میں آ گئے۔

میں نے انیق سے کہا۔ ''اپنا راشن نشست کے نیچے گھسیڑ دو۔ داخل ہوتے وقت چیکنگ ضرور ہوگی۔'' راشن سے میری مراد اسلحہ ہی تھا۔

انیق نے اس ہدایت پر عمل کیا۔ میں نے بھی رائفل اور دونوں پسٹل عقبی نشست کے ایک خلا میں پہنچا دیئے۔ ایمونیشن والا رک سیک میں پہلے ہی محفوظ کر چکا تھا۔

دل کی دھڑکن بڑھنا شروع ہو گئی تھی۔ ہم نے پہلا مرحلہ کامیابی سے مکمل کر لیا تھا، اب دوسرا اور اہم ترین مرحلہ آ رہا تھا۔ ہم لاہور کی تقریباً خالی سڑکوں سے گزرتے ہوئے کچھ ہی دیر میں گلبرگ تین کے ہاؤس نمبر اٹھارہ کے سامنے پہنچ گئے۔ درختوں میں گھری ہوئی تقریباً آٹھ فٹ اونچی چار دیواری ہمارے سامنے تھی۔ ایک جہازی سائز کا گیٹ بھی دکھائی دے رہا تھا۔ ایک پولیس موبائل بہت دھیمی رفتار سے چلتی ہوئی ہمارے قریب سے گزر گئی۔ میرے اشارے پر انیق نے وین کا ہارن بجایا۔ کسی نے گیٹ کے ایک چوکور خلا سے باہر جھانکا اور پھر چھوٹا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ یہ ہاؤس نمبر اٹھارہ کا مسلح گارڈ تھا۔ شاید کوئی سابق فوجی۔ میں نے ڈلیوری مین کا نظر والا چشمہ لگا لیا۔

ڈرائیور کی یونیفارم انیق کو ذرا کھلی تھی مگر انیق نے اسے اس طرح اپنی بغلوں اور رانوں کے نیچے دبایا ہوا تھا کہ وہ جسم سے میچ کر گئی تھی۔ ہاں انیق کو وین سے نیچے اترنا پڑتا تو پھر یہ یونیفارم مشکوک ٹھہر سکتی تھی۔ چوکس گارڈ نے انیق سے سوال جواب کیے۔ اس کا سروس کارڈ دیکھا۔ وین کے کیبن پر طائرانہ نظر دوڑائی اور پھر اندر موجود گارڈز کو اشارہ کیا۔ انہوں نے جہازی سائز گیٹ ہمارے داخلے کے لیے کھول دیا۔

ایسی کشادہ عمارتوں میں عموماً اصل عمارت احاطے کے درمیان ہوتی ہے اور عمارت کے اردگرد اوپن ایریا چھوڑ دیا جاتا ہے مگر یہاں عمارت درمیان کے بجائے عقبی چار دیواری کے ساتھ تھی اور سامنے وسیع و عریض احاطہ تھا جسے کئی حصوں میں تقسیم کر کے اس میں گھاس کے قطعے بنائے گئے تھے۔ جگہ جگہ سایہ دار اور پھل دار درخت بھی دکھائی دیتے تھے۔ ''ڈرائیو وے'' خاصا طویل تھا۔ یہاں بھی اِکادُکا گارڈز نظر آ رہے تھے۔

''بڑا سناٹا ہے۔ کوئی مر تو نہیں گیا۔'' انیق نے کہا۔

''غور سے سنو۔ موسیقی کی ہلکی آواز آ رہی ہے۔''

انیق نے دھیان دیا اور اثبات میں سر ہلایا۔ یہ آواز عمارت کے کسی اندرونی حصے سے

بلند ہو رہی تھی۔

''میری پنڈلیوں میں میٹھا میٹھا درد ہو رہا ہے جی۔'' انیق نے کہا۔

''وہ کیوں؟''

''سنسنی اور تجسس کی وجہ سے۔ میرے لیے یہ خیال بڑا ''تھرلنگ'' ہے کہ ٹیکساری گینگ کا خطرناک ترین ٹولا اس وقت اس چار دیواری میں موجود ہے...... اب آپ یہ سوچ رہے ہوں گے کہ تجسس کی وجہ سے تو دل دھڑکتا ہے، میری پنڈلیوں میں درد کیوں ہو رہا ہے۔ دراصل خطرے کے وقت میری ساری حسیات سمٹ کر پنڈلیوں میں چلی جاتی ہیں۔ یہ بیماری میرے ننھیال کی طرف سے مجھ میں آئی ہے۔''

میں نے خشک لہجے میں کہا۔ ''تمہیں ''ننھیال'' یاد آ گیا ہے تو نانی بھی یاد آ جائے گی۔ بس ذرا چھری تلے سانس لو۔''

''آپ نے نانی کہا ہے تو مجھے کرمانی یاد آ گیا ہے۔ یہ پہلوان حشمت کے بڑے بھائی کا نام تھا۔ بچپن میں پہلوان سے بہت لڑتا تھا۔ پہلوان نے اس کے متعلق ایک بڑا مزیدار قطعہ کہا ہوا ہے۔

بات بات پر وہ مجھ کو جھاڑتا ہے
کبھی اپنے اور کبھی میرے کپڑے پھاڑتا ہے
وہ گوشت خور تو ہرگز نہیں ہے لیکن
لڑائی میں بڑے زور کی دندی واڈتا ہے

(میں نے جواب میں کڑی نظروں سے اسے گھورا تو اسے سنجیدہ ہونا پڑا)

یہ واقعی بڑے سنگین لمحات تھے۔ اگر جان ڈیرک کی سالگرہ کا کیک جا رہا تھا تو پھر اس بات کا بھی قوی امکان تھا کہ وہ خود بھی یہاں موجود ہو گا۔ یورپ کے چند خطرناک ترین گینگسٹرز میں سے ایک۔ جس کی رگوں میں خون کی جگہ زہر اور تیزاب دوڑتا تھا۔ وہ اور اس کا منحوس باپ ''ڈیتھ اسکواڈ'' کے خالق تھے۔ انہوں نے ایک ایسے شیطانی ٹولے کو وجود دیا تھا جو صرف مرنے اور مارنے کے لیے اس زمین پر دندناتا تھا۔

ہم طویل ڈرائیو وے سے گزر کر رہائشی عمارت کے کشادہ پورچ میں پہنچ گئے۔ یہاں کئی لگژری گاڑیاں موجود تھیں۔ ملازمین کی آمد و رفت بھی دکھائی دیتی تھی۔ موسیقی کی آواز قدرے نمایاں ہو گئی تھی۔ یہ بہت ہیجان خیز قسم کی موسیقی تھی جس میں ڈرم کی دھنا دھن سب سے بلند ہوتی ہے۔

میں اپنی سفید پی کیپ درست کرتا ہوا وین سے اتر آیا۔ چھوٹی چھوٹی داڑھی، نظر کی عینک اور پی کیپ وغیرہ نے میرا حلیہ کافی حد تک کیموفلاج کر رکھا تھا۔ کیک وصول کرنے کے لیے ایک صحت مند خانساماں اور چار پانچ ملازم پہلے سے یہاں موجود تھے۔ گارڈز بھی کچھ فاصلے پر کھڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

خوب صورت لمبی نیشن بورڈ پر رکھے گئے اس لمبوترے کیک کو کسی اسٹریچر ہی کی طرح وین سے اتارا گیا۔ ہیڈ خانساماں نے اس کا باکس چیک کیا۔ میں نے رسید پر وصولی کے دستخط لیے۔ اصل رسید خانساماں کے حوالے کر کے ڈپلی کیٹ اپنے پاس رکھ لی۔ ہمارے درمیان چند رسمی فقروں کا تبادلہ بھی ہوا پھر میں واپس وین میں آ بیٹھا۔ یہ بات غنیمت تھی کہ انیق کو ڈرائیونگ سیٹ چھوڑنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔

ہم واپس روانہ ہوئے اور ڈرائیو وے پر آ گئے۔ ابھی ہم مین گیٹ سے کافی دور تھے کہ ہماری گاڑی خراب ہوگئی۔ یہ ''خرابی'' ہماری پلاننگ کے مطابق ہوئی تھی۔ انیق نے ڈیش بورڈ کے نیچے دو تار اس طرح کھینچے تھے کہ اب انجن آسانی سے اسٹارٹ نہیں ہوسکتا تھا۔ جونہی گاڑی رکی اور اس کی ہیڈ لائٹس آف ہوئیں دو تین مسلح گارڈز درختوں کے پیچھے سے نکلے اور ہمارے پاس پہنچ گئے۔ ''کیا ہوا ہے؟'' ایک موچھیل نے چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

انیق سیلف پر سیلف مارتا چلا جا رہا تھا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے بولا۔ ''کرنٹ تو آ رہا ہے لگتا ہے کہ فیول لائن میں کوئی نقص ہے۔''

میں نے اس کی ہدایت پر پیچھے جا کر انجن کا کور اٹھایا اور مختلف تاروں اور کیبلز کو چیک کرنے لگا۔ انیق گاہے بگاہے سیلف بھی اپلائی کر رہا تھا۔ انجن ''اسٹارٹ'' ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ گارڈز نے دھکا لگا کر وین کو ڈرائیو وے کے ایک کنارے پر کر دیا۔ یہاں نیم تاریکی تھی اور یہ ہم دونوں کے لیے اچھی تھی۔

''مجھے لگتا ہے کہ فیول پمپ کا مسئلہ ہے۔'' انیق نے کہا۔

گارڈز کی نظر بچا کر اپنی یونیفارم کو سمیٹتا ہوا وہ وین کے عقبی حصے میں انجن کے سامنے بیٹھ گیا اور یونہی کل پرزوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔ ایک گارڈ ''تعاون'' کرتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ پر چلا گیا اور انیق کی ہدایت پر وقفے وقفے سے سیلف مارنے لگا۔

نقص ''ذرا لمبا'' نظر آ رہا تھا۔ موچھیل گارڈ ہمارے پاس ہی رہا اور باقی دو اپنی پوزیشنوں پر چلے گئے۔ ہم کسی ایسے ہی وقت کے انتظار میں تھے۔ میں ڈرائیونگ سیٹ کی طرف گیا۔ موچھیل گارڈ وین کے اسٹارٹ نہ ہونے پر بیزار نظر آ رہا تھا۔ شاید وہ مجھے کوئی جلی

کئی سنا تا لیکن اس سے پہلے ہی اسے رات میں کئی سورج دکھائی دے گئے ہوں گے۔ میرے کولٹ پسٹل کے دستے نے اس کی کنپٹی کے عین درمیانی حصے کو نشانہ بنایا مگر بندہ سخت جان تھا۔ گھٹنوں کے بل گرا ضرور مگر لڑھکا نہیں۔ میں نے ایم ایم اے کا ممنوعہ وار کیا اور اس کی گردن کو ایک مخصوص جھٹکا دے کر اسے بے جان کر ڈالا۔ اب یہ اس کی قسمت پر منحصر تھا کہ وہ ہوش میں آتا ہے یا نہیں۔

ہم دونوں نے اسے پھرتی کے ساتھ گھسیٹ کر وین کے عقبی حصے میں ڈال دیا اور لاک کر دیا۔ ''ٹھیک ہے انیق! میں جا رہا ہوں۔ تم یہاں رکنے کی کوشش کرو۔ اگر نہ رک سکو تو نکل جاؤ اور بلڈنگ کے پچھواڑے کی سڑک پر پہنچو۔''

''نہیں بھائی! میں رکوں گا...... ہم یہاں سے......''

''دیکھو انیق! جو کچھ طے ہوا ہے اس کے مطابق چلو۔'' میں نے سختی سے اس کی بات کاٹی۔

''تم کو وین کے پاس رہنا ہے اور اسے اسٹارٹ رکھنا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ واپسی کے وقت مجھے تمہارے کور کی ضرورت پڑے۔ تمہاری رائفل بالکل تیار ہونی چاہیے۔ فون بھی آن رکھو۔'' میرے لہجے نے اسے سمجھا دیا تھا کہ میں اس کی کوئی بات نہیں سنوں گا۔ اسے خدا حافظ کہتا ہوا میں اشوکا کے لمبے گھنے پودوں کے پیچھے چلا گیا۔ تاہم وین چھوڑنے سے پہلے میں نے نشستوں کے نیچے سے اپنے تینوں ہتھیار نکال لیے تھے اور رک سیک بھی کمر پر کس لیا تھا۔ یہ ایکشن کا وقت تھا اور میں خود کو اس کے لیے بالکل تیار پاتا تھا۔

عمارت کے احاطے میں روشنی کا معقول انتظام تھا لیکن احاطہ اتنا وسیع اور پھیلا ہوا تھا کہ کئی حصے اب بھی نیم تاریک یا تاریک تھے۔ میں ایسی ہی جگہوں سے فائدہ اٹھاتا ہوا رہائشی حصے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ کئی جگہ مجھے رکوع کی حالت میں اور کہیں کہیں رینگ کر آگے بڑھنا پڑا۔ ایک دو جگہ گارڈز سے مڈبھیڑ ہوتے ہوتے رہ گئی۔ چھوٹی نال کی روسی رائفل میرے ہاتھ میں تھی اور ایک سیکنڈ کے نوٹس پر آگ اُگل سکتی تھی۔ میں رہائشی عمارت کے پہلو میں پہنچ چکا تھا۔ ایک تنومند گارڈ گشت کرنے والے انداز میں ایک بغلی دروازے کے سامنے چکرا رہا تھا۔ میں گارڈنیا کی ایک اونچی باڑ کے عقب میں تھا۔ میں نے گارڈ کے گشت کا انداز دیکھا...... جونہی میری طرف اس کی پشت ہوئی، میں دروازے کی طرف لپکا۔ اگر دروازہ اندر سے لاک ہوتا تو، میرا گارڈ کی نگاہ میں آنا یقینی تھا۔ ایسی صورت میں مجھے رائفل کا منہ کھولنا پڑتا۔ تاہم خیریت گزری۔ میں نے لکڑی کے منقش دروازے کے سامنے پہنچ کر اس کے

ہینڈل پر ہاتھ رکھا اور اسے گھماتا ہوا اندر چلا گیا۔ دروازہ بھڑا تو سامنے سیڑھیاں نظر آئیں، اس کے ساتھ ہی ایک سی سی ٹی وی کیمرا بھی دکھائی دیا جو نیم دائرے میں حرکت کر رہا تھا جب میں اندر داخل ہوا تو خوش قسمتی سے اس کا رخ دوسری طرف تھا۔ میں نے خود کو ایک گول ستون کی اوٹ میں کیا اور جونہی کیمرے کا رخ سیڑھیوں کی مخالف سمت میں ہوا، میں لپک کر زینے چڑھ گیا۔

میوزک کا شور اب بہت بلند ہو چکا تھا۔ بدمست مرد و زن کی دور افتادہ آوازیں بھی کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ جیسے بھٹکی ہوئی بدروحیں تھیں جو عالم نشاط میں چلا رہی تھیں۔ میں سیڑھیوں کے بالائی سرے پر کھڑا تھا۔ ایک کوریڈور میں سے دو ویٹر نما افراد ہاتھوں میں طشتریاں لیے گزرے مگر مجھ پر ان کی نگاہ نہیں پڑی۔ شاید ٹھیک ہی کہتے ہیں جب راست اقدام اٹھائے جاتے ہیں اور نتائج کی پروا نہیں کی جاتی تو حالات بھی ساتھ دینا شروع کر دیتے ہیں۔

یہ عمارت بہت زیادہ پرانی نہیں تھی لیکن نئی بھی نہیں تھی۔ شاید 80 کی دہائی میں تعمیر ہوئی ہو۔ بڑی اعلیٰ درجے کی آرائش تھی۔ آبنوسی دروازے، منقش چھتیں اور قالین پوش راہداریاں، اکثر کمرے بند تھے۔ میں ایک دروازے کے پاس سے گزرا تو ٹھٹک گیا۔ اندر سے ایک نسوانی کراہ سنائی دی۔ میں گھوم کر کمرے کی سائیڈ پر پہنچا تو ایک ادھ کھلی کھڑکی دکھائی دی۔ اندر کی طرف گرل اور پردہ تھا۔ سرخ پردے میں جھری سی نظر آ رہی تھی۔ کمرے میں روشنی اور کوریڈور میں نیم تاریکی تھی۔ میں نے کھڑکی سے آنکھ لگائی اور پردے کی جھری سے دیکھا۔ ایک بیڈ پر مجھے کسی کے پاؤں نظر آئے۔ نہایت گورے چٹے زنانہ پاؤں۔ ایک پاؤں پر گہرا نیلگوں نشان بھی دکھائی دے رہا تھا اور اس سے بھی اہم بات یہ کہ پاؤں، ٹخنوں کے پاس سے ایک اسٹریپ میں جکڑے ہوئے تھے۔

''خدا کے لیے بس کرو۔ فار گاڈ سیک مجھے جانے دو۔'' ایک بار پھر کراہتی ہوئی سی آواز ابھری۔

میرا دماغ جھنجھنا اٹھا۔ میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ مغویہ اداکارہ کا کھوج اتنی جلدی لگ جائے گا۔ یقیناً یہ وہی تھی۔ نوے فیصد امکان تھا کہ یہ وہی ہے۔ چند سیکنڈ کے اندر ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ کراہ تو رہی ہے مگر کمرے میں اس کے سوا شاید اور کوئی نہیں۔

میں نے دروازے پر دباؤ ڈالا، وہ اندر سے بند تھا۔ ہینڈل سے پکڑ کر میں نے اسے ایک دو بار ہلایا تو کھٹکے کی مدھم آواز آئی اور وہ اچانک کھل گیا۔ دراصل اسے اوپر کی طرف

عمودی چٹخنی لگی ہوئی تھی۔ دروازے کو ہلانے سے چٹخنی خودبخود گر گئی تھی۔ میں رائفل سونتے اندر پہنچا تو سنسنی خیز منظر دکھائی دیا۔ بے شک یہ وہی فلمی ہیروئن تھی۔ جب چند روز پہلے میں نے اسے شادی ہال کی شوٹنگ میں دیکھا تھا تو وہ ایک جھلملاتا خوش رنگ ستارہ تھی لیکن آج ایک اجڑی پجڑی خستہ حال عورت دکھائی دیتی تھی۔ میک اَپ کی غیر موجودگی نے بھی اس کی ''ہیئت کذائی'' میں کردار ادا کیا تھا۔ اس کے جسم پر ایک ہلکے پھلکے سلیپنگ گاؤن کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ پنڈلیوں کے علاوہ اس کی کلائیاں بھی ان اسٹریپس میں جکڑی ہوئی تھیں جو بیڈ کے ساتھ ہی منسلک تھے۔

مجھے دیکھ کر اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اس نے اپنا کھلا ہوا منہ بند کر لیا۔ آنکھوں میں کئی سوال امڈ آئے۔

میں نے سب سے پہلے تو دروازے کو اندر سے لاک کیا پھر پردے کی اس جھری کو ختم کیا جہاں سے میں اندر جھانکنے میں کامیاب ہوا تھا۔ اس کے بعد میں اداکارہ کے بالکل قریب پنجوں کے بل بیٹھ گیا۔ اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ پوچھتا، واش روم میں پانی گرنے کی آواز آئی۔ ''کون ہے اندر؟'' میں نے اداکارہ سے سرگوشی میں پوچھا۔

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ روہانسی آواز میں بولی۔ ''مجھے نہیں پتا کون ہے...... یہاں بہت سارے سؤر ہیں۔ یہ مار ڈالیں گے مجھے......'' وہ سسکیوں سے رونے لگی۔

وہ موزوں جسم کی مالک تو تھی مگر اس کی عمر 35 سے کم نہیں تھی۔ اپنی موجودہ خستہ حالی کے سبب عمر سے چار پانچ سال بڑی دکھائی دیتی تھی۔ اس سے پسینے اور تیل کی بو آ رہی تھی۔ چہرے اور جسم کے کئی حصوں پر گہرے نیل اور خراشیں تھیں۔ بال جھاڑ جھنکاڑ نظر آتے تھے۔ اس حال میں اسے اس کے پرستار دیکھ لیتے تو شاید آئندہ اس کی فلمیں دیکھنے سے توبہ کر لیتے۔ میں نے تیزی سے کہا۔ ''میرے پاس وقت کم ہے۔ میں تمہیں یہاں سے نکال لوں گا مگر ابھی تھوڑا انتظار کرنا ہو گا۔''

''تت...... تم...... کون ہو؟ کسی...... بیکری سے...... آئے ہو؟''

''جو کوئی بھی ہوں، تمہارا ہمدرد ہوں۔''

''میں تمہیں منہ مانگا انعام دوں گی...... جو تم کہو گے۔'' اس کا انداز فلمی تھا۔

''او کے۔ لیکن ابھی تھوڑی دیر صبر کرنا ہو گا۔ کہو تو میں تمہاری یہ بندشیں کھول دیتا ہوں۔''

''ہاں کھول دو۔'' میرے ہاتھ سن ہو رہے ہیں۔'' وہ کراہی لیکن پھر ٹھٹک کر واش روم کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''لیکن اسے پتا چل جائے گا۔''

''اس کا علاج بھی کر لیتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

اداکارہ کی بری حالت دیکھ کر دماغ میں چنگاریاں سی چھوٹ رہی تھیں۔ عورت پر اس طرح کا تشدد کرنے والے اکثر ایک گناہ بے لذت کے سوا کچھ حاصل نہیں کر پاتے۔ صنف نازک کو پھول سے تشبیہ دی جاتی ہے اور پھول کی خوشبو لطف اندوز ہونے کے لیے ہوتی ہے۔ کوئی جانور اسے چبا جائے تو اسے ایک ناچیز لقمے کے سوا کیا ملتا ہے۔

میں نے پنڈلی سے بندھا ہوا خنجر نکال کر ہاتھ میں لیا تو اداکارہ کی بلوری آنکھوں میں حیرت کی یلغار ہوئی۔ میں اس کی طرف توجہ دیئے بغیر واش روم کی طرف بڑھا۔ انگلی کی پشت سے دروازے پر مدھم دستک دی۔ اندر جو کوئی بھی تھا یقیناً بری طرح بدکا ہوگا۔ اس بدحواسی میں اس نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا اور یہی لمحہ اس کے لیے قیامت بن گیا۔ یہ فربہ جسم والا ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ میرا گھونسا سیدھا اس کی موٹی ناک پر پڑا۔ وہ الٹ کر واش روم کے وسط میں جا گرا۔ میں نے پھرتی سے اندر گھس کر دروازہ بند کر لیا۔ وہ مادر زاد برہنہ گوشت کا ڈھیر، دہشت زدہ نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ شاور چل رہا تھا اور اس کے زیریں جسم پر ابھی تک صابن لگا ہوا تھا۔ اس نے چلانے کے لیے منہ کھولا لیکن اس سے پہلے ہی میں نے اس کے ہونٹ اپنی ہتھیلی سے ڈھانپ دیئے اور دوسرے ہاتھ سے اس کی شہ رگ کاٹ ڈالی۔ دندانے دار خنجر کی دھار بے مثال تھی۔

بالکل جانور کے ذبح ہونے والا منظر تھا۔ ایک سیکنڈ میں واش روم کے چکنے فرش پر خون کا ریلا بہہ گیا۔ اس کے بے ڈھنگے جسم کو نیلی ٹائیلوں کے فرش پر پھڑکتا چھوڑ کر میں باہر نکل آیا۔

''کیا ہوا اسے؟'' اداکارہ نے لرزاں سرگوشی میں پوچھا۔

''کچھ نہیں، بے ہوش ہوا ہے۔'' میں نے اسے مزید خوف زدہ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اندر فربہ شخص کی تڑپ ختم ہو چکی تھی اور اگر نہیں بھی ہوئی تھی تو کوئی آواز باہر نہیں آ رہی تھی۔

میں نے اداکارہ کی بندشیں کھول دیں۔ اس کا جسم بہ زبان حال پکار کر کہہ رہا تھا کہ اسے تختہ مشق بنایا گیا ہے اور بہت بری طرح بنایا گیا ہے۔ اس حال میں بھی اس کے گلے میں قیمتی موتیوں کا ایک ہار نظر آ رہا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا تھا، اغوا کے وقت وہ شوٹنگ میں مصروف تھی اور ایک ''جنگلی دوشیزہ'' کے روپ میں ایک پنجرے میں بند تھی۔ اس وقت تو ایسا ہار اس کے گلے میں نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ یقیناً اسے کسی نے یہیں پر اپنی من مرضیاں کرنے کے بعد عطا کیا تھا۔ اس حوالے سے میرے اور اس اروشا نامی اداکارہ کے درمیان دو چار فقروں کا

تبادلہ ہوا اور میرے خیال کی تصدیق ہوئی۔

میں نے اس سے کہا۔ ”میرے جاتے ہی اندر سے دروازہ بولٹ کرلو۔ ہوسکتا ہے کہ یہاں فائرنگ وغیرہ بھی ہو۔ خوف زدہ نہیں ہونا اور نہ کسی کے لیے دروازہ کھولنا۔ میں دروازے کے بالکل نچلے حصے پر تین چار بار ”ناک“ کروں گا۔ میری بات سمجھ رہی ہو؟“

اس کا رنگ بالکل ہلدی ہورہا تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر میں نے اسے بے طرح ڈانٹ دیا اور کہا کہ وہ وہی کرے جو میں کہہ رہا ہوں۔

اس کمرے میں واش روم کے مقتول کا لباس بھی ایک ہینگر میں جھول رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی مجھے پتا چل گیا کہ فربہ اندام شخص اس ہاؤس نمبر اٹھارہ کے مالک سابق قونصلیٹ کا کوئی مقامی دوست ہے اور ایک بڑے ہوٹل کا منیجر ہے۔

”مم...... مجھے چھوڑ کر نہ جانا۔“ اداکارہ نے فریاد کی۔

”تم بھی میری ہدایت پر عمل کرنا اور اسی بیڈ پر چپ چاپ لیٹی رہنا۔“

وہ اسی وقت لیٹ گئی۔ میں نے اس بات کی تسلی کہ پردے کے پیچھے کھڑکی پوری طرح بند ہے۔

کمرا چھوڑنے سے پہلے میں نے ایک بار پھر واش روم میں جھانکا۔ ادھیڑ عمر، سانولی رنگت والا سانڈ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ اندازہ ہورہا تھا کہ ڈیتھ اسکواڈ کے شیطانوں سے رہائی پانے کے بعد یہ اداکارہ یہاں موجود دیگر افراد کے تصرف میں آگئی تھی۔ اس مقتول ہوٹل منیجر کے لیے بھی یقیناً خوب صورت لڑکیوں کی کمی نہیں ہوگی مگر ایک معروف ہیروئن کی قربت کا مزہ چکھنے کے لیے وہ یہاں اس کمرے میں پایا جارہا تھا۔ میں نے واش روم کا دروازہ باہر سے لاک کر کے چابی اپنی پاکٹ میں ڈال لی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اداکارہ تجسس سے مجبور ہو کر واش روم میں جھانکے اور اپنی بے ہوشی کے اسباب پیدا کرلے۔

میں نے دروازہ کھول کر جھری میں سے باہر جھانکا۔ موسیقی کی دھنا دھن کچھ اور بڑھ چکی تھی۔ کوریڈور کا یہ حصہ خالی تھا۔ میں باہر نکل آیا۔

اس کمرے میں گھسنے اور باہر نکل آنے کا سارا عمل قریباً سات آٹھ منٹ میں مکمل ہوگیا تھا اور اب میں اس مرکزی حصے کی طرف جانا چاہتا تھا جہاں میرے خیال کے مطابق ٹیکساری گینگ کا روح رواں جان ڈیرک اپنے ڈیتھ اسکواڈ کے ساتھ موجود تھا۔ موسیقی ...... بلکہ بے ہنگم موسیقی کا شور اور بدمست آوازیں میری رہنمائی کررہی تھیں۔ مطلوبہ جگہ تک پہنچنے کے لیے مجھے جس دشواری اور کوفت کا سامنا کرنا پڑا، اس کی تفصیل کافی لمبی ہوجائے گی۔ وہ

بڑے سنسنی خیز لمحے تھے۔ میں اس بد بخت گروہ سے قریب تر ہوتا جارہا تھا جس کے ارکان انسانوں سے زیادہ حیوانوں سے قریب تر تھے۔ ایک شیطانی فیکٹری میں تیار کیے ہوئے گوشت پوست کے ایسے روبوٹ جو عیاری، مکاری اور درندگی میں لاثانی تھے۔ میری اوران کی جنگ پرانی تھی اور آج اس جنگ میں ایک نیا موڑ آیا تھا۔ میں ہر نتیجے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو چکا تھا۔ جس طرح میرے خنجر سے لہو ٹپک رہا تھا اسی طرح میرے دل سے بھی ٹپک رہا تھا۔ ان لوگوں نے لاہور کے بیس بے گناہ شہریوں کو گولیوں سے چھلنی کیا تھا اور ابھی مزید لوگ ان کے نشانے پر آسکتے تھے۔ وہ میرے گلی کوچوں میں گھسنے میں کامیاب ہو چکے تھے اور اب اس کامیابی کا خراج وصول کیے وہ یہاں سے جا نہیں سکتے تھے۔

قسمت میرا ساتھ دے رہی تھی۔ بالآخر میں ایک ایسی جگہ پر پہنچ گیا جہاں سے میں ''سب سے بڑے شیطان'' کی منحوس سالگرہ کی تقریب دیکھ سکتا تھا...... یہاں تک پہنچنے کے لیے میرے خنجر کی دھار نے دو اور افراد کے خون کا ذائقہ چکھا تھا اور میں نے بلاتردد یہ کام کیا تھا۔ یہ دونوں بھی بلڈنگ کے گارڈز میں سے تھے۔ ان دونوں کی لاشیں ایک اسٹور روم کی تاریکی میں بند ہو چکی تھیں۔

میں فرسٹ فلور کے ایک بالکل تاریک کمرے میں موجود تھا۔ یہ دراصل ایک پروجیکٹر روم تھا۔ جس طرح سینما ہالز کے عقب میں پروجیکٹر رومز ہوتے ہیں اور وہاں پلے ہونے والی فلم کا عکس سامنے اسکرین پر نظر آتا ہے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وڈیو پلے کرنے کے جدید طریقے آنے کے بعد یہ پروجیکشن روم کبھی کبھار ہی استعمال ہوتا ہے۔ یہاں دو قیمتی پروجیکٹرز موجود تھے اور دیگر لوازمات بھی تھے مگر ہر شے گرد آلود تھی۔ ایک دیوار میں وہ دو چوکور خلا تھے جہاں سے پروجیکٹر کی لائٹ اسکرین کی طرف جاتی ہے۔ میں نے ایک سوراخ کا کھٹکا ہٹا کر دیکھا اور چودہ طبق روشن ہو گئے۔ موسیقی اور شور کی آواز فلک شگاف ہو گئی۔ گراؤنڈ فلور پر ایک وسیع ہال کا منظر دکھائی دیا اور وہ اسکرین بھی دکھائی دی جس کا تعلق ان دو پروجیکٹرز سے تھا مگر وہ اسکرین فی الحال ایک جہازی سائز کے پردے میں چھپی ہوئی تھی اور کسی دیوار کا حصہ ہی محسوس ہوتی تھی۔

وسیع ہال کا منظر ششدر کرنے والا تھا۔ ڈیتھ اسکواڈ کے قریباً پندرہ زہریلے شیطان اور درجنوں دیگر مہمان یہاں موجود تھے۔ ڈیتھ اسکواڈ کے لوگ اپنے نہایت چست بلکہ بے ہودگی کی حد تک چست لباسوں اور منڈھے ہوئے سروں کی وجہ سے علیحدہ سے پہچانے جاتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کی بغل میں کوئی نہ کوئی خوش شکل لڑکی تھی۔ وہ شراب پانی کی

طرح بہار ہے تھے...... کچھ ایسے بھی تھے جو پینے کے ساتھ ساتھ اپنے اور اپنی پارٹنرز کے اوپر انڈیل رہے تھے۔ یہ تقریباً سب مقامی لڑکیاں تھیں...... غالباً اعلیٰ سوسائٹی کی کال گرلز۔ عین ممکن تھا کہ انہیں ان کی بے خبری میں یہاں لایا گیا ہو۔ یعنی یہ بتائے بغیر کہ وہ فی الوقت کہاں اور کن لوگوں کے درمیان ہیں۔

میرے ائیرفون پر کال کے سگنل آئے۔ دوسری طرف انیق ہی تھا۔ ''کہاں ہیں شاہ زیب بھائی؟''

''سمجھو ان جنگلی سوٌروں کی شہ رگ کے قریب ہوں اور تم کہاں ہو؟''

''مجھے یہ جگہ چھوڑنا پڑی ہے۔ بھانڈا پھوٹنے والا تھا، میں وین سمیت باہر آ گیا ہوں...... اور آپ کے حکم کے مطابق بلڈنگ کے پچھواڑے والی سڑک پر ہوں۔ مجھے یہاں سے بالائی منزل کی کچھ روشنیاں نظر آ رہی ہیں۔''

''نکلتے وقت گارڈز نے نوٹ نہیں کیا کہ وین میں ایک سواری کم ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''داؤد بھاؤ کا اور آپ کا شاگرد ہوں۔ چکما دے کر نکل آیا ہوں۔ ابھی تک تو خیریت ہے۔ آگے کا پتا نہیں۔ ویسے آپ کو جو کچھ بھی کرنا ہے جلدی کریں۔ میں نے وین کے پیچھے جا کر دیکھا ہے۔ میرا خیال ہے جس گارڈ کی گردن آپ نے مروڑی تھی، اس نے دنیا سے ہی منہ ''مروڑ'' لیا ہے۔''

''یہاں بھی ایک دو کی گردن پر چھری چلی ہے۔ بس تم پوری طرح الرٹ رہو۔ ایکشن کسی بھی وقت شروع ہوسکتا ہے۔'' میں نے ماؤتھ پیس میں سرگوشی کی۔

میں نے پروجیکٹر کے لیے بنائے گئے مختصر خلا کے کور کو پھر سرکایا۔ ہال کا منظر ہیجان خیز ہو چکا تھا۔ ایک ٹرالی کے ذریعے برتھ ڈے کا اسپیشل کیک مرکزی میز تک پہنچا دیا گیا تھا۔ میری نظریں جس خبیث اعظم کو ڈھونڈ رہی تھیں وہ کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اسی دوران میں ایک اسپیکر پر کسی کی مخمور آواز ابھری اور پورے ہال میں سنائی دی۔ میرے اندازے کے مطابق یہ ڈیتھ اسکواڈ کی ہی کسی آفت زادی کی آواز تھی۔ وہ انگلش میں بولی۔ ''ہم گریٹ باس کی غیر موجودگی میں ان کی برتھ ڈے کا کیک کاٹ رہے ہیں لیکن لگتا ایسے ہی ہے جیسے وہ ہمارے درمیان موجود ہیں۔''

''گریٹ باس...... گریٹ باس۔'' ڈیتھ اسکواڈ کے ارکان نے ایک ساتھ نعرہ بلند کیا اور ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر رقص کرنے لگے، ان کے لباس اتنے چست

تھے کہ جسم کا حصہ ہی معلوم ہوتے تھے۔
اسپیکر پر لڑکی کی آواز دوبارہ ابھری۔ ''باس اٹلی میں بہت مصروف ہیں لیکن وہ دو چار دن میں ہمارے درمیان ہوں گے۔ وہ اس ٹاسک کو بہت زیادہ اہمیت دے رہے ہیں...... بلکہ ہوسکتا ہے کہ وہ آج بھی ویڈیو لنک کے ذریعے ہلم سے بات کریں۔''
''ہُرے ہُرے کے نعرے بلند ہوئے......اور چست لباس والے شیطان زادوں نے کئی بے ہودہ حرکات کیں۔ ان کے انگ انگ سے جیسے شرارت مکاری اور سفاکی ٹپکتی تھی۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ کھانا ہو، عورت ہو، شراب ہو یا قتل و غارت، وہ ہر معاملے میں حدوں سے آگے نکلتے تھے۔
ان کی حرکات وسکنات دیکھ کر ان کی ساتھی عورتیں واضح طور پر بے چین اور ہراساں نظر آتی تھیں۔ ابھی ''اصل پارٹی'' شروع نہیں ہوئی تھی مگر ان میں سے کئی ایک ابھی سے کڑی ''دست درازی'' برداشت کر رہی تھیں۔ وہ جس نائیکا یا ایجنٹ کے ذریعے یہاں پہنچی ہوں گی، اس نے اپنی جیبوں میں تو بے تحاشا نوٹ ٹھونسے ہوں گے مگر ان ''سیکس ورکروں'' کو بے تحاشا خطرے کے حوالے کر دیا تھا۔ یہ خطرہ ان کے بدترین خدشات سے بھی زیادہ تھا۔
اسی دوران میں کیک کا ''کارڈ بورڈ'' والا بکس کھولا جا چکا تھا۔ یہ خوش رنگ کیک ایک خوبرو لڑکی کی شکل میں تھا۔ نیلی آنکھیں نیلم کی طرح دمک رہی تھیں، شب رنگ بال، سرخ و سپید جسم، جس پر لباس کا تکلف نہیں تھا، نئی تکنیک کے مطابق یہ کیک، چاول کے آٹے پر، پرنٹنگ کے ذریعے بڑی نفاست سے بنایا گیا تھا لڑکی کے خدوخال یوں واضح نظر آتے تھے جیسے وہ سچ مچ سامنے لیٹی ہو۔
میں اس لڑکی کو اچھی طرح جانتا تھا۔ یہ کبھی جان ڈیرک کی سویٹ ہارٹ تھی۔ اس کی رگِ جاں سے بھی قریب پھر اس نے ڈیرک کے ہی ایک نوجوان دست راست ترکی نژاد آذر سے تعلقات قائم کر لیے اور استنبول میں جا کر چھپ گئی۔ وہ تو استنبول تھا، ڈیرک ان دونوں کو زمین کی ساتویں تہ سے بھی ڈھونڈ نکالتا۔ اس نے ڈھونڈ لیا اور دونوں کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا لیکن سوزی نامی اس اطالوی لڑکی اور اس کے غم کو وہ کبھی بھی دل سے نکال نہ سکا۔ وہ ایسا ہی کینہ توز اور عداوت پسند تھا۔ اب بھی وہ اپنی ہر سالگرہ کے موقع پر اس لڑکی کے جسم سے اس کی بے وفائی کا انتقام لیتا تھا۔ ڈیرک کی زندگی ایسی کج روئیوں سے بھری ہوئی تھی۔
اسپیکر پر لڑکی کی آواز ابھری۔ ''گریٹ باس کی طرف سے وائٹ۔ ون سالگرہ کا کیک

کاٹے گا۔"

تالیاں سنائی دیں......اور منڈھے ہوئے سر والا لمبا تڑنگا شیطان زادہ آگے آیا۔ میں اسے بھی جانتا تھا۔ یہ گوشت پوست کا انہی خطرناک "روبوٹس" میں سے ایک تھا، تاہم ان کی قیادت بھی کرتا تھا۔ جیسے بھائیوں میں سے کوئی ایک بھائی زیادہ ذہین اور توانا ہوتا ہے۔ وائلڈ ون بھی آوٹ اسٹینڈنگ تھا۔ اس کے شانے غیر معمولی چوڑے اور آنکھوں میں مکاری کے کوندتے ہوئے لشکارے دوسروں سے زیادہ تھے۔

انسانی شکل کے کیک پر موم بتیاں روشن ہوئیں اور لمبا تڑنگا وائلڈ چھری بدست آگے بڑھا۔ موم بتیاں بجھانے کے بعد اس نے کیک کے درمیان میں کٹ لگایا اور اس کے ساتھ ہی ہال چلانے کی ایک دردناک آواز سے گونج اٹھا۔ یہ آواز کریم سے ڈھکے ہوئے کیک کے اندر سے آئی تھی۔ کیک کے اندر کوئی اسپیکر رکھا گیا تھا۔ اس اسپیکر کا کنٹرول قریب ہی کھڑے کسی شخص کے ہاتھ میں تھا۔ جونہی وائلڈ ون نامی شیطان زادے نے کیک پر چھری چلائی تھی، ریموٹ کنٹرول کے ذریعے "کیک" کو چلانے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ بالکل یہی لگا تھا جیسے لڑکی کے جسم پر کٹ لگایا گیا ہے اور اس نے درد سے بے قرار ہو کر آہ وفغاں بلند کی ہے۔

"ہیپی برتھ ڈے" کی آوازوں سے ہال گونج اٹھا۔

تب ایک اور شیطان زادہ آگے بڑھا۔ اس نے میز پر رکھی ہوئی پلیٹوں میں سے ایک پلیٹ اٹھائی اور لڑکی کی شکل والے کیک کے پہلو سے ایک ٹکڑا کاٹا۔

لڑکی کی شکل والا کیک ایک بار پھر دردناک انداز میں چلایا۔ بالکل یہی لگا جیسے لڑکی کے جسم سے گوشت کا ٹکڑا علیحدہ کیا گیا ہو۔

ڈیتھ اسکواڈ کے شیطان زادوں نے پُرمسرت آوازے بلند کیے۔ ان میں سے چند ایک نے جوش کے عالم میں اپنی ساتھی لڑکیوں کو اٹھایا اور ناچنے لگے۔

سب شیطان زادوں کے قد کاٹھ اور ان کی شکلیں قریباً ایک جیسی تھیں۔ مضبوط جسم، صفا چٹ کھوپڑیاں، اور آنکھوں میں ناچتی ہوئی کمینگی اور مکاری۔

ان میں سے ایک نے لڑکی کی ران میں سے ٹکڑا کاٹا۔ کیک ایک بار پھر کربناک آواز میں رونے چلانے لگا۔ اس کیک میں اسٹابری کا سیرپ بھرا جاتا تھا اور جب ٹکڑا کاٹا جاتا تھا، وہ سیرپ بھی جھلک دکھاتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ زخم میں سے خون رس رہا ہو۔ یہ عجیب تماشا تھا۔ میں نے اس کے بارے میں پہلے بھی سنا ہوا تھا لیکن دیکھ آج رہا تھا۔

ران سے ٹکڑا لینے والے شخص کو اس کے ایک ساتھی نے پکارا۔ "برادر! ایک میرے لیے

بھی۔ لیکن ذرا اوپر سے......اور مزے دار سا......"

اس شخص نے دوسری پلیٹ اٹھائی اور چھری سے لڑکی کے بالائی جسم کو نشانہ بنایا۔ نازک حصے کا ٹکڑا پلیٹ میں آیا تو "لڑکی نما کیک" نے دہائی مچا دی......اس کی بلند آہ و بکا سے در و دیوار گونج گئے۔

پُر مسرت شیطانی قہقہے بلند ہوئے۔ اپنی ساتھی لڑکیوں کے ساتھ شیطان زادوں کی حرکات و سکنات شدید ہوتی جا رہی تھیں۔ دوسری طرف سوزی کے رخسار کاٹے جا رہے تھے۔

اگلے دس پندرہ منٹ میں کیک کا بیشتر حصہ پلیٹوں میں پلیٹوں سے پیٹوں میں پہنچ گیا۔ کیک کے اندر چھپے ہوئے ٹیپ ریکارڈر کا تماشا بھی جاری رہا۔ جب جب چھری چلی، رونے پیٹنے کی لرزہ خیز آوازیں بلند ہوئیں۔

میں نے اپنی روسی رائفل کے ساتھ 38 گولی والا میگزین اٹیچ کر رکھا تھا اور انگلی لبلبی پر رکھی ہوئی تھی۔ میں خود کو ایک ایسے فٹ بالر کی طرح محسوس کر رہا تھا جو مخالف ٹیم کے سارے فل بیکس کو چکما دے کر گول کرنے کی بہتر پوزیشن میں پہنچ چکا ہو اور اب کسی بھی وقت بال کو کک لگا سکتا ہو۔

جان ڈیرک تو اپنی خوش قسمتی کے سبب یہاں موجود نہیں تھا۔ اب میرے نزدیک سب سے ہائی ویلیو ٹارگٹ اس شیطانی ٹولے کا انچارج وائلڈ ون تھا۔ میں پہلا فائر اسی کی کھوپڑی میں اتارنا چاہتا تھا مگر مسئلہ یہ تھا کہ وہ بھی دوسرے ساتھیوں کی طرح لڑکیوں میں الجھا ہوا تھا۔ میں کسی غیر متعلقہ کو نشانہ بنانا نہیں چاہتا تھا۔ میں اگر رائفل کو سنگل شاٹ پر سیٹ کرتا تو تین چار افراد سے زیادہ کو نشانہ نہ بنا سکتا......اگر برسٹ چلاتا تو کئی غیر متعلق بھی نشانہ بنتے۔

میں اسی شش و پنج میں تھا جب مشکل آسان ہوتی نظر آئی۔ کسی شخص نے اعلانیہ انداز میں کہا۔ "کھانا لگ گیا ہے۔ میز پر تشریف لے آئیں۔"

ایک بڑا ریشمی پردہ اپنی جگہ سے سرک گیا۔ اس کے عقب میں ایک طویل دیدہ زیب ڈائننگ ٹیبل نظر آئی جو انواع و اقسام کے کھانوں سے اَٹی ہوئی تھی۔ میں فاصلے سے بھی دیکھ سکتا تھا مینیو میں پاکستان کا قومی جانور مارخور سالم روسٹ کی شکل میں موجود تھا۔ اس کے علاوہ پرندوں کے گوشت اور سی فوڈ کی بھرمار تھی۔ جہاں تک میری معلومات تھیں، ڈیتھ اسکواڈ کے یہ خاص ہرکارے کچا قیمہ بھی بڑی رغبت سے کھاتے تھے......ان کے ہر مینیو میں خاص طریقے سے تیار کیے گئے کچے قیمے کی ڈشز بھی موجود ہوتی تھیں۔ ان کا آنجہانی باپ "ایول" بھی کچے قیمے سے خاص رغبت رکھتا تھا (اور شاید اسی وجہ سے اس میں حیوانی صفات بدرجۂ

اتم موجود تھیں)

جب ڈیتھ اسکواڈ کا دستہ کھانے کی میز کی طرف بڑھا تو خود بخود ہی ایک طرح کی ڈویژن ہوگئی۔ وہ پندرہ سولہ افراد ایک قطار میں بیٹھ رہے تھے۔ میرے جسم میں چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ آج ایک اچھا دن تھا...... یا یوں کہا جائے کہ ایک اچھی رات تھی۔ بہت سی باتیں میرے حق میں جا رہی تھیں۔ دل کی دھڑکن میری کنپٹیوں میں گونجنے لگی۔ میں سب سے پہلے وائلڈ ون کو ہلاکت سے سرفراز کرنا چاہتا تھا۔ میں نے رائفل کا رخ اس کی طرف کیا۔ اس خبیث نے ابھی تک ایک کال گرل کو اپنی آغوش میں لے رکھا تھا مگر اب زیادہ انتظار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بالفاظ دیگر اب گیند کو گول کی طرف روانہ کرنا ضروری تھا......اور کبھی کبھی گیہوں کے ساتھ گھن تو پستا ہی ہے۔ میں نے ٹریگر دبایا۔ گولیوں کی پہلی بوچھاڑ نے ابلیسی ٹولے کے لیڈر وائلڈ ون اور اس کے دائیں بائیں بیٹھے تین چار ساتھیوں کو چھلنی کر دیا۔

فائرنگ نے ایک سیکنڈ کے اندر ہال میں کہرام سا مچا دیا۔ میں نے بلاتوقف دوسرا برسٹ چلایا۔ کرسیاں الٹ کر اٹھنے والے کئی شتونگڑے، بھاگنے سے پہلے ہی شکار ہوئے اور اچھل اچھل کر گرے۔

میں جس تاریک کمرے میں بیٹھا تھا۔ دفعتاً وہ روشنی میں نہا گیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا، تین چار افراد جھپٹ کر آئے اور انہوں نے اپنی آٹومیٹک رائفلوں کے سرد بیرل میرے سر اور سینے سے لگا دیئے۔ یہ کایا پلٹ بمشکل دو تین سیکنڈ میں ہوگئی تھی۔ میں نے اپنی رائفل دیوار کے چوکور خلا میں گھسا رکھی تھی اس لیے اسے فوری طور پر موڑ بھی نہیں سکا۔

''خبردار......خبردار......''

''ہاتھ اوپر اٹھا دو......''

''نیچے لیٹ جاؤ......خبردار......گولی مار دیں گے۔''

کئی جنونی آوازیں بلند ہوئیں۔

میں نے رائفل چھوڑ کر ہاتھ اوپر اٹھا دیئے۔ ایک طوفانی ٹھوکر میرے منہ پر لگی۔ کوئی زہریلے ناگ کی طرح پھنکارا۔ ''اچھا......تو یہ تم ہو......'' اس کے ساتھ ہی گالیوں کی بوچھاڑ میرے کانوں میں پڑی۔

چند مزید مسلح افراد بھرا مار کر اندر گھس آئے۔ مجھے اوندھا لٹا کر میری گردن پر پاؤں رکھ دیا گیا۔ پروجیکٹر روم کے آٹھ انچ مربع کے خلا میں سے قیامت کا شور اندر آ رہا تھا۔ یہ شور وسیع ہال کمرے سے اٹھ رہا تھا جہاں کئی لاشیں گر چکی تھیں اور بہت سے زخمی ہو چکے تھے۔ مجھے

گن پوائنٹ پر رکھنے والے دو تین افراد اتنے مشتعل تھے کہ شاید مجھے اسی جگہ چھلنی کر ڈالتے لیکن ایک دو سینئر افراد نے انہیں بمشکل روکا...... اور غلط روکا کیونکہ چند سیکنڈ بعد ہی مجھے وہ موقع مل گیا جس کا میں متلاشی تھا۔

افراتفری میں میری تلاشی لے کر مجھے پانچ چھ رائفلوں کے نرغے میں ساتھ والے کمرے میں لے جایا جا رہا تھا۔ میرا ایک کولٹ پسٹل ابھی تک میری کمر پر تھا اور پنڈلی سے بندھا ہوا خنجر بھی چرمی غلاف کے اندر موجود تھا۔ ساتھ والے کمرے میں لے جا کر یقیناً ایک بار پھر میری مکمل تلاشی ہونا تھی اور مشکیں کس دی جانا تھیں، میں اس نوبت سے پہلے ہی کچھ کرنا چاہتا تھا اور...... میں نے کیا۔

میں برق کی رفتار سے نیچے بیٹھا تھا۔ میرے عقب میں آنے والے افراد میں سے دو کی انگلیاں بے ساختہ ٹریگرز پر دب گئیں۔ آگے جانے والا ایک شخص گھائل ہوا، میں نے تڑپ کر گھائل کو اپنی گرفت میں لیا اور پلٹ کر اپنے سامنے کر لیا۔ اب وہ میرے لیے ڈھال کی صورت تھا۔

کم از کم دو برسٹ اور چلے اور یہ میری "فربہ اندام ڈھال" نے سہے۔ ایک سیکنڈ میں اس کے جسم میں درجن بھر سوراخ ہو گئے۔ ایک گولی میرے بازو میں بھی لگی۔ میں اپنی ڈھال سمیت دو تین قدم پیچھے کی طرف گیا اور پشت کے بل ایک کھڑکی سے ٹکرایا۔ کھڑکی چکنا چور ہوئی اور میں اپنی ڈھال، یعنی فربہ اندام شخص سمیت ایک کمرے میں جا گرا۔

"مار دو جانے نہ پائے۔" ایک وحشی آواز گونجی۔ یقیناً یہ ٹیکساری گینگ کا کوئی انگلش اسپیکنگ شوٹر ہی تھا۔

اب مجھے تین چار فٹ اونچی دیوار کی آڑ میسر آ چکی تھی۔ سنسناتی گولیاں میرے سر کے اوپر سے گزریں۔ میری ڈھال یعنی فربہ اندام شخص وہی تھا جس نے چند سیکنڈ پہلے تلاشی کے دوران میں میری روسی رائفل مجھ سے جدا کی تھی۔ یہ رائفل اب تک اس کے کندھے سے جھول رہی تھی۔ میں نے رائفل اس کے کندھے سے اتاری اور فوراً جوابی برسٹ چلایا۔ یہ برسٹ بے حد ضروری تھا۔ ورنہ عین ممکن تھا کہ ٹیکساری گینگ کے شوٹر ٹوٹی ہوئی کھڑکی پھلانگ کر کمرے میں کود جاتے۔

میں نے رائفل کو چھوٹے برسٹ پر سیٹ کیا اور جوابی فائرنگ شروع کر دی۔ ہر طرف چنگاریاں بکھرنے لگیں۔ میرے ارد گرد کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے تھے اور شیشے کے ان ٹکڑوں پر گولیوں کے گرم خول بکھر رہے تھے۔ اب ڈیتھ اسکواڈ کے تین چار سفاک قاتل بھی

موقع پر پہنچ چکے تھے اور مجھ پر دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ ایک جنونی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

''یہ ایسٹر ہے۔ زندہ پکڑو اس باسٹرڈ کو۔''

''گیس پھینکو۔'' ایک دوسری آواز نے پکار کر کہا۔

میں جانتا تھا یہ لوگ ''اِن کاؤنٹرز'' میں مفلوج کرنے والی گیس کے شیل بھی استعمال کرتے ہیں۔ ضروری تھا کہ میں یہ جگہ چھوڑ دیتا۔ میں ایک بغلی دروازے سے نکلا اور ایک تنگ کوریڈور میں بھاگتا ہوا عمارت کے پہلو کی طرف بڑھا۔ بھاگتے بھاگتے ہی میں نے اپنے بازو کے زخم کا معائنہ کیا۔ گولی کلائی اور کہنی کے درمیان سے گوشت کو چھیدتی ہوئی گزر گئی تھی۔ زخم سنگین نہیں تھا۔

چست لباس والا ایک سر منڈا شیطان میرے سامنے آیا۔ اس کے ہاتھ میں نائن ایم ایم کا مشین پسٹل تھا۔ ''رک جاؤ۔'' وہ دھاڑا۔

میں نے اس پر فائر کیا۔ وہ فائر ہونے سے پہلے ہی ناقابلِ یقین پھرتی سے نیچے جھک چکا تھا۔ برسٹ کی چار گولیاں اسے چھوئے بغیر ہی گزر گئیں۔ وہ توپ کے گولے کی طرح مجھ سے ٹکرایا۔ وہ میری ناف پر فائر کر کے مجھے زخمی کرنا چاہتا تھا لیکن میں اسے زخمی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ لہٰذا میں نے سیدھا سر پر برسٹ چلایا۔ چار گولیوں نے اس کی کھوپڑی توڑ کر رکھ دی۔

اس دوران میں ایک دوسرا شیطان مجھ سے لپٹ چکا تھا۔ یہ وہ زندہ روبوٹس تھے جو صرف مرنے اور مارنے کے لیے ہی پروان چڑھائے گئے تھے۔ اس کا لباس وہسکی سے تربتر تھا اور اس چست گیلے لباس کے نیچے اس کا فولادی جسم تھا۔ اس نے میری رائفل پر اپنی آہنی گرفت قائم کی اور اپنی صفاچٹ سر کی شدید ضرب میری پیشانی پر لگائی۔ وہ جانتا تھا کہ اس تنگ کوریڈور میں اس کا پالا ایسٹرن سے پڑا ہے، اس کے باوجود وہ اپنی طاقت اور سفاکی آزمانا چاہتا تھا۔ اس نے خود کو غلط آزمائش میں ڈالا تھا۔ میری کہنی کی ضرب نے اس کی بائیں جانب کی کئی پسلیاں توڑ ڈالیں۔ وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح میرے قدموں میں گرا۔

میں اسے پھلانگتا ہوا، چھت کی سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔

''پکڑو، جانے نہ پائے۔'' سامنے سے للکارا بلند ہوا۔ اس کے ساتھ ہی میری ٹانگوں پر فائر ہوئے۔

یقیناً آج ایک خوش قسمت رات تھی میرے لیے۔ میں محفوظ رہا اور ایک سی سی ٹی وی کیمرے کو چکنا چور کرتا ہوا ایک اور کمرے میں گھس گیا۔ اندر داخل ہوتے ہی اندازہ ہو گیا کہ

یہ ڈیتھ اسکواڈ کے کسی شیطان زادے کے استعمال میں ہے۔ وہ شاید افراتفری میں تیار ہو کر تقریب میں جانے کے لیے نکلا تھا۔ حشیش اور الکحل کی ملی جلی بُو کمرے میں بسی ہوئی تھی۔ یہاں وہاں عریاں تصویروں والے پوسٹرز نظر آ رہے تھے۔ یہاں تک کہ بیڈ شیٹ پر بھی ایک عریاں ڈانسر پرنٹ تھی۔

میں اس کمرے میں مورچا بند ہو گیا اور کھڑکی میں سے جوابی فائرنگ کرنے لگا۔ ٹیکساری گینگ کے کسی بدمعاش کی للکارتی ہوئی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی، وہ اپنے کسی ساتھی سے مخاطب تھا۔ اسے گالی دے کر بولا "تم حرامی اس کو زندہ پکڑتے رہنا اور وہ تمہاری لاشیں بچھاتا جائے گا۔ مار دو......" اس سے آگے گالیوں کی بوچھاڑ تھی۔

میں نے رک سیک میں سے تین بھرے ہوئے میگزین نکالے۔ ایک رائفل سے اٹیچ کر لیا اور دو پاس رکھ لیے۔

فون کال کے سگنل آئے۔ میں نے کال ریسیو کی۔ ائیر پیس میں انیق کی ہیجانی آواز گونجی۔ "شاہ زیب بھائی! فائرنگ کی آوازیں آ رہی ہیں۔ آپ ٹھیک ہیں نا؟"

"ابھی تک تو بالکل ٹھیک ہوں۔"

"کیا میری ضرورت ہے؟"

"بالکل ہے، مگر وہیں پر جہاں تم ہو۔ وین کو اسٹارٹ رکھو اور ایسی پوزیشن پر رکھو کہ کسی بھی وقت یہاں سے نکلا جا سکے۔"

"دو گاڑیاں بلڈنگ سے نکلی ہیں جی اور بڑی تیزی سے بڑی سڑک کی طرف گئی ہیں۔ شاید زخمیوں کو طبی امداد کے لیے لے جایا جا رہا ہے۔"

"ابھی اور بھی نکلیں گی۔ او کے خدا حافظ۔" میں نے کہا اور کال منقطع کر دی۔

کافی عرصے بعد میں خود کو پوری فارم میں محسوس کر رہا تھا۔ مجھے اس بات کی تسلی تھی کہ میں ڈیتھ اسکواڈ کے سرخیل وائلڈ ون کو ہٹ کرنے میں کامیاب ہو چکا ہوں۔ کم از کم سات آٹھ مزید شیطان زادے بھی جہنم واصل ہو چکے تھے۔ میری اولین فائرنگ سے "جامِ ہلاکت" نوش کرنے والوں کی مجموعی تعداد پندرہ بیس سے کم نہیں تھی اور ایک طرح سے یہ چند دن پہلے مغلپورہ کے علاقے میں ہونے والی خونریزی کا اچھا انتقام تھا۔ اب ڈیتھ اسکواڈ کے ابلیس زادے اور ٹیکساری گینگ کے دیگر خونخوار شوٹر، آتشیں بگولوں کی صورت اختیار کر چکے تھے۔ میں ان کے گھیرے میں تھا مگر خبر نہیں کیوں میرے دل میں کہیں بھی خوف و ہراس کی کیفیت نہیں تھی۔ ایک تسلی سی تھی کہ میں اس گھیرے سے نکلنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ پوری

عمارت میں کہرام کا سماں تھا اور شوٹرز کی دھاڑیں گونج رہی تھیں۔ میرے گرد حصار تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے پتا تھا کہ کسی بھی وقت حواسوں کو شل کرنے والی گیس بھی استعمال ہو سکتی ہے۔

میں نے اپنے ''رک سیک'' میں ہاتھ گھمایا۔ دو دستی بم بھی میرے پاس موجود تھے اور انہیں استعمال کرنے کا اس سے بہتر موقع اور کوئی نہیں تھا۔ میں نے ایک بم استعمال کیا۔ بند جگہوں پر ایسے ہتھیار کا استعمال زبردست ''امپیکٹ'' پیدا کرتا ہے۔ در و دیوار تھرا گئے...... کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹنے کی آواز آئی۔ زبردست شعلے کے فوراً بعد دھواں پیدا ہوا۔ میں فائرنگ کرتا اور دوڑتا ہوا ایک خالی کوریڈور میں آ گیا۔ یکا یک مجھے اندازہ ہوا کہ میں اس کمرے سے زیادہ دور نہیں جہاں میں اس اروشا نامی اداکارہ کو چھوڑ آیا تھا۔ میں نے اپنا رخ پھیرا اور اس سمت میں بڑھا۔

دستی بم کے زوردار دھماکے نے کچھ دیر کے لیے میرے مقابل شوٹرز کو ٹھٹکا دیا تھا۔ دھواں بڑی تیزی سے پھیلا تھا اور انہیں کچھ اندازہ نہیں ہوا تھا کہ میں کس راہداری میں گھسا ہوں۔ میں نے اپنے عقب میں ایک سلائیڈنگ دروازے کو بند کر کے اس کے کنٹرول پر دو فائر مارے اور اسے ناکارہ کر دیا۔ چند ہی سیکنڈ بعد میں اس دروازے پر دستک دے رہا تھا جس میں اداکارہ موجود تھی۔ وہ جیسے پہلے ہی دروازے کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔

''کون؟'' اس نے لرزاں آواز میں تصدیق چاہی۔

''دروازہ کھولو۔'' میں نے سرسراتے لہجے میں کہا۔

اس نے دروازہ کھولا۔ میں نے کہا۔ ''اپنا برا بھلا سوچ لو۔ گولیاں چل رہی ہیں۔ رسک ہے۔''

''میں جانا چاہتی ہوں۔'' وہ مصمم ارادے سے بولی اور باہر نکل آئی۔

میں اس کا ہاتھ تھام کر عمارت کے عقبی حصے کی طرف دوڑا۔ میرے دوسرے ہاتھ میں چھوٹے بیرل والی طاقتور روسی رائفل تھی۔ میں نے انگلی ٹریگر پر رکھی ہوئی تھی اور بلاتردد شوٹ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

یہ مرنے یا مار دینے والی لڑائی تھی۔ وہ میرے ساتھ بھاگی آ رہی تھی۔ اس کا گاؤن گھٹنوں سے اوپر تک اٹھ رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ بلڈنگ کے عقب میں نکاسی کا راستہ موجود ہے۔ نکل جانے یا پکڑے جانے کا امکان ففٹی ففٹی تھا۔

''وہ جا رہے ہیں، پکڑو ان کو۔'' عقب سے للکارتی ہوئی آواز آئی۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ مسلح افراد کی ایک ٹولی ہمارے پیچھے لپک رہی تھی۔ میں اداکارہ

اروشا سمیت ایک لابی میں گھس گیا۔ دو ملازم جن کے چہرے پہلے ہی ہلدی ہو رہے تھے سکتہ زدہ نظروں سے ہمیں دیکھتے رہ گئے۔

ہم ایک اور کمرے میں پہنچے۔ میں بے طرح ٹھٹک گیا۔ یہاں مجھے اسلحے کا انبار نظر آیا۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ لکڑی کے ریکس تھے۔ ان میں ہر طرح کے ہتھیار اور پیٹی بند ایمونیشن رکھا تھا۔ یہ سارا اسلحہ ہی نہایت خطرناک تھا۔ مجھے بجری کا وہ ٹرک یاد آیا جو چند دن پہلے راوی کے پل سے گزرا تھا اور جس میں اسلحہ و گولا بارود چھپا تھا۔ بعد میں اس حوالے سے فیروز خاں نامی سارجنٹ کو اپنی جان کی قربانی دینا پڑی تھی۔

تو کیا یہ وہی اسلحہ تھا؟

سوال جتنی تیزی سے ذہن میں ابھرا تھا، جواب بھی اسی تیزی سے آیا۔ یقیناً یہ وہی تھا اور یہی وہ اسلحہ تھا جس کی وجہ سے ہمارے پیچھے آنے والی ٹولی ہم پر گولی نہیں چلا رہی تھی۔

غور کرنے یا سوچنے کی مہلت نہیں تھی۔ اس وقت تو واحد مقصد یہاں سے بچ کر نکلنا تھا۔ تعاقب میں آنے والے بالکل قریب آ چکے تھے۔ ہم اس اسلحہ گودام کے عقبی دروازے سے نکل گئے۔ ایک بار پھر قسمت نے ساتھ دیا۔ عقبی دروازے کو باہر سے لاک کیا جا سکتا تھا...... اور چابی ہضمی قفل میں موجود تھی۔ میں نے یہ مضبوط آبنوسی دروازہ لاک کر دیا۔

''آؤ اروشا'' میں اداکارہ کو ساتھ لے کر بھاگا۔

وہ چند قدم بھاگ کر رکی اور پلٹ گئی۔ اس کے گلے میں موجود اوریجنل موتیوں کا ہار ٹوٹ کر دروازے کے پاس ہی گر گیا تھا۔ وہ اسے اٹھانے کے لیے جھکی۔ یہی وقت تھا جب اندر موجود کسی شخص نے بدحواسی میں دروازے کا لاک توڑنے کے لیے گولی چلا دی۔ اسے بدحواسی کہنا شاید غلط ہے، یہ تو ایک سنگین ترین بلنڈر تھا۔ فائرنگ سے پیدا ہونے والی کسی چنگاری نے بارود کو جا پکڑا تھا۔ اس کا نتیجہ وہی نکلا جو نکلنا چاہیے تھا۔ دھماکا اتنا بڑا اور سماعت شکن تھا کہ یقیناً ہاؤس نمبر اٹھارہ کے اردگرد کا پورا علاقہ تھرا اٹھا ہوگا۔ مجھے صرف اتنا ہی یاد رہا کہ میری آنکھوں کے سامنے نہایت تیز چمک پیدا ہوئی اور میرے قدم جیسے فرش پر سے اٹھ گئے۔

O......❖......O

میرے حواس قدرے بحال ہوئے تو مجھے محسوس ہوا کہ میں کسی لوڈر نما گاڑی پر ہوں...... اور کسی نرم شے پر پڑا ہوں۔ ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ ایک سماعت شکن دھماکے نے مجھے اٹھا کر کہیں دور پھینک دیا ہے۔ دھماکے کے وقت میں باؤنڈری وال کے

بالکل قریب تھا۔ یہ عمارت کا وہ حصہ تھا جو باؤنڈری وال سے تقریباً ملا ہوا تھا۔ بلاسٹ کے زبردست پریشر نے مجھے اچھالا تھا...... میں نے غور کیا میری روسی رائفل بھی میرے ساتھ نہیں تھی۔

میرے کان جیسے بند ہو چکے تھے۔ کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ہاں یہ احساس ضرور ہوا کہ میں جس لوڈر نما گاڑی کی چھت پر پڑا ہوں وہ تیزی سے رواں ہے۔ سب سے پہلے میں نے اپنے جسم کو ٹٹولا۔ میری براؤن پتلون گھٹنوں کے نیچے سے سلامت نہیں تھی۔ پنڈلیوں پر بھی خون کی چپچپاہٹ محسوس ہوئی۔ ایک بوٹ بھی ندارد تھا اور تب یہ انکشاف ہوا کہ رک سیک بھی میری کمر پر موجود نہیں ہے۔

اداکارہ اروشا کہاں تھی؟ کیا وہ بھی دھماکے کی نذر ہو چکی تھی؟ مجھے یاد آیا وہ اپنا گرا ہوا ہار اٹھانے کے لیے پلٹی تھی۔ میں نے اسے روکا تھا......اور پھر آنکھوں کو خیرہ کرنے والی وہ چمک۔

دوسرا سوال جو ذہن میں ابھرا، وہ انیق کے حوالے سے تھا۔ وہ کہاں تھا؟

میں نے اپنے ''ہینڈ فری'' یعنی ہیڈ فون کو ٹٹولا۔ ہیڈ فون موجود نہیں تھا اور نہ ہی معروف بیکری کے مونوگرام والی وہ سفید کیپ تھی جس کے ساتھ میں نے ہیڈ فون کو اٹیچ کر رکھا تھا۔

مجھے ایمبولینسز کے سائرنگ سنائی دیئے اور پولیس موبائلز کے ہوٹر بھی۔ اس کا مطلب تھا کہ سماعت آہستہ آہستہ بحال ہو رہی ہے۔ میں نے آنکھیں سکیڑ کر دیکھا لوڈر کی سائیڈ پر گولڈن ٹینٹ سروس کے الفاظ لکھے تھے۔ میں قناتوں کے ایک ڈھیر کے اوپر پڑا تھا۔ پچھلے پہر کی تاریکی میں وہ لوڈر غالباً گلبرگ کی مین بلیوارڈ پر بھاگا جا رہا تھا۔ پھر وہ ایک مارکیٹ میں رک گیا۔ ڈرائیور اور پانڈی لوڈر میں سے اترے اور ہراساں لہجوں میں کسی سے باتیں کرنے لگے۔ ایک شخص جو غالباً ڈرائیور تھا، کانپتی آواز میں بولا۔ ''بہت وڈا دھماکا ہوا ہے جی......لگتا ہے پوری بلڈنگ اڑ گئی ہے۔ اللہ سوہنے نے بال بال بچایا ہے۔''

''تم کہاں تھے؟'' ایک بھاری آواز نے پوچھا۔

''چودھری رفاقت کے بنگلے نمبر چھبیس میں مہندی کا فنکشن تھا، وہاں سے سامان لینے گئے تھے۔ ابھی تھوڑا سا سامان باقی ہے، پر دھماکا ہوتے ہی بھاگ نکلے ہیں وہاں سے۔'' وہ ہانپتی آواز میں بولا۔

''دھماکا تو واقعی بہت بڑا ہوگا۔ یہاں تک آواز آئی ہے۔'' ایک اور آواز ابھری۔

''آگ لگ گئی ہے جی......شعلے اوپر تک جا رہے ہیں۔'' ڈرائیور بولا۔

پانڈی نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ''چودھری رفاقت صیب کے بنگلے کے سارے شیشے ٹوٹ گئے ہیں لگتا ہے کہ آلے دوالے کے گھروں میں بھی کافی نقصان ہوا ہو گا۔''

چند اور افراد بھی لوڈر کے گرد اکٹھے ہو گئے تھے۔ موضوع سخن وہی خوفناک بلاسٹ تھا جس نے ایک قریبی علاقے میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ بہت سے سوال جواب ہو رہے تھے۔ کیا یہ خودکش دھماکا ہے؟ خودکش دھماکا ہے تو اس طرح کے رہائشی علاقے میں کیوں ہوا ہے؟ کیا یہ گیس سلنڈرز کا دھماکا ہے جو اس عمارت میں اسٹور کیے گئے تھے؟ جتنے منہ اتنی باتیں تھیں اور میں قناعتوں کے ڈھیر پر پڑا سوچ رہا تھا کہ مجھے جلد از جلد یہاں سے نکلنے کا موقع مل جائے۔

پھر مجھے موقع مل گیا۔ کچھ اور لوگ بھی اکٹھے ہو گئے اور لوڈر سے پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر جا کر باتیں کرنے لگے جہاں لوڈر کھڑا تھا وہاں نیم تاریکی تھی۔ میں پھسل کر نیچے اترا......خوش قسمتی سے ایک آٹو رکشا پر نظر پڑی۔ وہ کچھ دور مارکیٹ کے ایک خالی برآمدے میں کھڑا تھا۔ ڈرائیور موجود تھا اور شاید اپنی نشست پر بیٹھے بیٹھے ہی سو گیا تھا۔

میں نے پچھلی نشست پر بیٹھنے کے بعد اسے جگایا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا۔ مچی مچی آنکھوں سے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ ''جی صیب جی۔'' اس نے ٹھیٹ پنجابی لہجے میں پوچھا۔

''اسٹیشن جانا ہے......بس اسٹیشن۔''

''اوہو، بس اڈے کہوناں جی۔ بادامی باغ کہ یتیم خانے؟''

''یتیم خانے۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔

چونکہ میں نے کرائے وغیرہ کی بات نہیں کی تھی لہٰذا اس نے بھی طے کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ رکشا اسٹارٹ کیا، اللہ کا نام لیا اور چل پڑا۔

راستے میں جب اس نے چند ایمبولینسز اور پھر ایک فائر بریگیڈ کی گاڑی دیکھی تو بولا۔

''یا اللہ خیر، لگتا ہے کوئی آگ شاگ لگی ہے سویرے سویرے۔''

''ہاں یہی لگ رہا ہے۔''

''بس جی شہروں میں تو قیامت ہی مچی رہتی ہے۔ ہم گاؤں میں رہنے والے لوگ پیٹ کی خاطر مجبوراً یہاں آتے ہیں۔ نہیں تو جو سکون پنڈ دیہاتوں میں ہے یہاں کہاں۔''

''ٹھیک کہتے ہو۔'' میں نے سامنے لگے ہوئے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔

ایک طرف سے بال چرمرہو گئے تھے......اور رخسار پر دھوئیں کی سیاہی کے علاوہ تھوڑا سا خون بھی رِسا ہوا تھا۔ شکر تھا کہ نیم تاریکی کی وجہ سے رکشا ڈرائیور نے میرے حلیے کا بغور

جائزہ نہیں لیا تھا۔

میں نے ٹانگوں کی حالت دیکھی۔ براؤن پتلون بس گھٹنوں تک ہی سلامت رہی تھی۔ پنڈلیوں سے خون رِس رہا تھا۔ سفید رنگ کا اُپر بھی ایک دو جگہ سے پھٹ چکا تھا اور وہاں جسم پر ہلکی جلن محسوس ہو رہی تھی۔ ایک جوتا بھی ندارد تھا۔ غنیمت تھا کہ ٹیکساری گینگ کے شوٹر کی گولی کلائی کے گوشت کو چھید کر گزری تھی۔ کوئی نس وغیرہ نہیں گئی تھی اور خون تقریباً بند ہو چکا تھا۔ میں نے پتلون کی ایک دھجی اس زخم پر باندھ لی۔ اتنے شدید دھماکے میں میرا بچنا اور ہوا میں اچھل کر لوڈر پر جا گرنا کسی کرشمے سے کم نہیں تھا۔ مجھے ایک فیصد بھی امید نہیں تھی کہ میرے ساتھ وہاں سے نکلنے کی کوشش کرنے والی اداکارہ اروشا زندہ بچی ہوگی۔ یقیناً ان آٹھ دس مسلح افراد کے پرخچے بھی فوراً ہی اُڑ گئے تھے جو اس وقت اسلحے کے اسٹور میں موجود تھے۔

مجھے سب سے پہلے اپنا حلیہ درست کرنے کی ضرورت تھی تاکہ میں کسی کے سامنے جانے کے قابل ہو سکوں۔ مجھے اس کا موقع جلد ہی مل گیا۔ رکشا ڈرائیور مزنگ چونگی سے سمن آباد کی طرف جانے کے لیے میانی صاحب کے قبرستان کے پاس سے گزر رہا تھا۔ سنسان سڑک تھی۔ اردگرد شہرِ خموشاں کی تاریکی میں کہیں کہیں کوئی روشنی ٹمٹماتی تھی۔ شاید پاس کی کسی مسجد سے فجر کی اذان بھی بلند ہو رہی تھی۔ میں رکشا ڈرائیور کے قد و قامت کا اندازہ لگا چکا تھا اور یہ بھی سوچ چکا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میں اسے زیادہ تکلیف پہنچانا نہیں چاہتا تھا مگر تکلیف پہنچائے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔

''ذرا رکو ایک منٹ۔'' میں نے اچانک کہا۔

اس کا پاؤں بے ساختہ بریک پیڈل پر دب گیا اور رکشا سڑک کے کنارے جنتر کی گھنی جھاڑیوں کے نیچے رک گیا۔

چند ہی سیکنڈ بعد رکشا ڈرائیور، ڈیش بورڈ پر اوندھا پڑا تھا۔ میں نے اس کی توانا گردن پر ایک نہایت محتاط اور جچی تلی ضرب لگائی تھی۔ رکشا کو ڈرائیور سمیت دھکیل کر جھاڑیوں کے اندر پہنچانے میں مجھے زیادہ دقت نہیں ہوئی۔ میں نے اپنے کپڑے اتارے اور ڈرائیور کی سفید شلوار قمیص پہن لی۔ وہ کھلے ہاتھ پاؤں کا شخص تھا۔ اس کے کپڑے مجھے تقریباً پورے ہی آ گئے۔ آستینیں کچھ چھوٹی تھیں، وہ میں نے اڑس لیں اور شلوار تھوڑی سی نیچے کھسکا لی۔

رکشا ڈرائیور کے جسم پر اب صرف ایک میلا سا انڈر ویئر تھا۔ اسے اسی حالت میں چھوڑنا میری مجبوری تھی۔ میں اسے اپنے والے کپڑے نہیں پہنا سکتا تھا۔ رکشے کے اندر سے ہی مجھے ایک نیلا شاپر مل گیا۔ بڑا شاپر تھا۔ میں نے اس میں بیکری ملازم والی کٹی پھٹی خون آلود

یونیفارم اور اپنی اکلوتا جوتا گھسیڑ لیا۔ جس جس جگہ میرے فنگر پرنٹس کا امکان تھا، وہ ساری جگہیں بھی صاف کر دیں۔

وہ قابلِ رحم حالت میں کچی زمین پر پہلو کے بل لیٹا تھا۔ آدھ پون گھنٹے سے پہلے اسے ہوش نہیں آنا تھا۔ اس کے گلے میں تعویذ تھا اور ایک بازو پر دیہاتی انداز کا ٹیٹو بھی بنا ہوا تھا۔ اس کی جیب سے شناختی کارڈ کے علاوہ ایک جواں سال عورت اور بچی کی تصویر بھی ملی تھی۔ کسی گاؤں کے کسی کچے گھر میں رہنے والے وہ لوگ جنھوں نے اپنے گھر کے سربراہ کو روزی روٹی کے لیے خود سے جدا کر کے خطرناک مشینی شہر کے حوالے کیا ہوا تھا۔ بے شک مجھے اپنے وطن کے یہ مشینی شہر بھی پیارے تھے مگر مجھے اپنے وطن کی اصل خوشبو تو یہاں کے کھیتوں کھلیانوں، باغوں، نہروں اور کچے گھروں سے ہی آتی تھی۔ میری جیب میں ہزار ہزار کے دس بارہ نوٹ اب بھی موجود تھے چار نوٹ رکھ کر میں نے باقی اس محمد رمضان نامی رکشا ڈرائیور کے نیکر نما انڈر ویئر میں اڑس دیئے۔ قریب ہی موجود سنگ مرمر کی دو قبروں کے پاس پانی کی ایک سبیل نظر آ رہی تھی، میں نے اپنا چہرہ دھویا، بال درست کیے۔ گیلے کپڑے سے اپنی خون آلود پنڈلیاں پونچھیں اور کسی سواری کی تلاش میں سڑک پر آ گیا۔

O......❖......O

اسٹیشن کے پاس ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں کمرا کرائے پر لینے میں مجھے کوئی خاص دشواری نہیں ہوئی۔ میرے پاس رکشا ڈرائیور محمد رمضان والا شناختی کارڈ موجود تھا بوقتِ ضرورت کام آ گیا۔

اب دن چڑھ آیا تھا۔ دکانیں کھلنا شروع ہو گئی تھیں۔ چائے اور حلوہ پوری وغیرہ کی خوشبو آ رہی تھی۔ کمرے کے ایک کونے میں برا بھلا ٹی وی بھی موجود تھا۔ میں نے ٹی وی آن کیا۔ فوراً ہی مجھے ایک نیوز چینل مل گیا اور وہ نیوز بھی جو میں دیکھنا چاہتا تھا۔ نیوز کاسٹر ہیجانی لہجے میں بول رہی تھی۔ ''یہ بہت بڑا واقعہ ہے جو لاہور میں ہوا ہے بلکہ ایسے علاقے میں جو نہایت محفوظ علاقوں میں شمار ہوتا ہے۔ محتاط اندازے کے مطابق ہلاکتوں کی تعداد تیس ہو چکی ہے لیکن کوئی بھی حتمی ''فگر'' بیان کرنا ممکن نہیں کیونکہ بیشتر لاشیں شدید آتش زدگی میں راکھ ہو چکی ہیں۔ زخمیوں کی تعداد پچاس سے کم نہیں ہے۔''

پھر نیوز کاسٹر نے اپنے فیلڈ رپورٹر کو لائن پر لیا۔ ''ہاں فواد! آپ موقع پر موجود ہیں۔ بتائیں اب کیا صورتِ حال ہے؟''

فیلڈ رپورٹر نے سیل فون کے ذریعے بتایا۔ ''پورے علاقے کو سکیورٹی فورسز نے اپنے

گھیرے میں لے لیا ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے اس عمارت میں اٹلی کے سابق قونصلیٹ کی رہائش تھی لیکن وہ خود آج کل یہاں موجود نہیں ہیں۔ یہاں ان کے کچھ غیر ملکی مہمان رہائش پذیر تھے۔ ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہے لیکن کچھ باوثوق ذرائع یہ انکشاف کر رہے ہیں کہ دھماکے میں مارے جانے والوں میں کچھ ایسے لوگ بھی شامل ہیں جنہوں نے چند دن پہلے لاہور ہی کے ایک علاقے میں اندھا دھند فائرنگ کر کے بیس سے زائد افراد کو ہلاک کر دیا تھا......اگر ہم غور کریں تو......"

نیوز کاسٹر نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔"فواد فائرنگ والے اس واقعے میں شاہ زیب نامی شخص کا نام بھی لیا گیا تھا۔ وہی جسے فارمر چمپئن بتایا جاتا ہے اور جس پر دہشت گردی کا ایک مقدمہ بھی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ اس آج والے واقعے میں بھی اس شخص کا کوئی کردار ہے۔ کیونکہ کچھ لوگ اس کے ڈانڈے شاہ زیب اور ان غیر ملکیوں کے درمیان موجود کسی پرانی دشمنی سے ملا رہے ہیں؟"

"جی ابھی اس بارے میں کوئی ٹھوس شہادت تو سامنے نہیں آئی لیکن ایسا لگتا ہے کہ ہاؤس نمبر اٹھارہ میں کل رات کوئی برتھ ڈے پارٹی ہو رہی تھی۔ اس پارٹی کے لیے جس معروف بیکری سے کیک بنوایا گیا اس میں بھی ایک پُراسرار واقعہ ہوا ہے۔ بتایا یہ جا رہا ہے کہ اس بیکری کے جو دو ملازم کیک کی ہوم ڈلیوری کے لیے وین پر "ہاؤس نمبر اٹھارہ" جا رہے تھے، راستے میں انہیں روکا گیا۔ ایک منی مارکیٹ کے قریب انہیں شدید زخمی کر کے گارڈینا کی ایک باڑ کے عقب میں ڈال دیا گیا اور ان کے کپڑے اتار لیے گئے۔"

"اس واقعے سے کیا اندازہ قائم کیا جا سکتا ہے؟" نیوز کاسٹر نے پوچھا۔

"یہ عین ممکن ہے کہ بیکری ملازمین کے روپ میں ہاؤس نمبر اٹھارہ میں گھسنے والے وہی لوگ ہوں جن کے ساتھ چند روز پہلے غیر ملکی گینگسٹرز کا خونی ٹاکرا ہوا تھا......یعنی شاہ زیب اور اس کے ساتھی......"

ابھی فیلڈ رپورٹر کی بات جاری ہی تھی کہ بریکنگ نیوز کے بڑے بڑے سرخ الفاظ اسکرین پر ابھرے اور نیوز کاسٹر نے ہیجانی لہجے میں کہا۔"ناظرین...... یہاں ہم آپ کو ایک نہایت اہم خبر دے رہے ہیں جس شبہے کا اظہار پچھلے دو ڈھائی گھنٹوں سے کیا جا رہا تھا، وہ بالآخر سچ ثابت ہو گیا ہے۔ اس بات کی تصدیق ہو رہی ہے کہ شاہ زیب المعروف ایسٹر، دھماکے کے وقت اسی ہاؤس نمبر اٹھارہ میں موجود تھا......اور وہ بھی جاں بحق ہونے والوں میں شامل ہے۔"

نیوز کاسٹر کی آواز ایک دم مزید بلند ہو گئی۔ ''یہ دیکھیں ناظرین...... یہ اسکرین پر آپ کو موقع واردات کی ایک جھلک نظر آ رہی ہے۔ یہ جو ''رک سیک'' فرش پر پڑا ہے، اس کا تعلق شاہ زیب سے ہے۔ ثابت ہوتا ہے کہ اداکارہ اروشا کی طرح شاہ زیب بھی دھماکے کے وقت عین اس جگہ پر موجود تھا۔ اس کا واضح مطلب یہی ہے کہ جاں بحق ہونے والے تیں پینتیس افراد میں یہ دونوں بھی شامل ہیں۔ جیسا کہ آپ کو پہلے بتایا جا چکا ہے بدقسمت اداکارہ اروشا کا ایک بازو اور جسم کے کچھ حصے ایک قریبی چھت سے دستیاب ہوئے ہیں۔ غالباً اسی طرح شاہ زیب کا یہ نیلا رک سیک اور سفید ٹوپی بھی دھماکے کی جگہ سے دس پندرہ میٹر دور پائی گئی ہیں۔''

نیوز کاسٹر مشینی رفتار سے بول رہی تھی اور واقعات کی مختلف کڑیاں جوڑتی چلی جا رہی تھی۔ اروشا کی موت کی تصدیق نے مجھے دلی صدمہ پہنچایا۔ شاید درست ہی کہتے ہیں کہ زیورات عورت کی اہم ترین کمزوریوں میں شامل ہوتے ہیں۔ بدترین حالات میں بھی یہ کمزوری سامنے آئی تھی۔ اروشا اپنی قیمتی مالا اٹھانے کے لیے واپس دروازے تک گئی تھی اور اجل کی لپیٹ میں آ گئی تھی۔

میں نے ایک اور چینل دیکھا۔ اس پر بھی یہ اہم نیوز موجود تھی۔ تبصرہ نگار کہہ رہا تھا...... واقعات کا تسلسل ظاہر کر رہا ہے کہ شاہ زیب اور اس کے ساتھیوں نے پہلے بیکری کی ڈلیوری وین کو ہائی جیک کیا پھر بیکری ملازمین کا روپ دھارا اور سابق قونصلیٹ کی رہائش گاہ میں گھس گئے۔ یہاں غیر ملکی ''گھس بیٹھیوں'' کے ساتھ ان کا دوبدو مقابلہ ہوا اور ایمونیشن کے اسٹور میں آگ لگنے کے سبب زبردست بلاسٹ ہو گیا۔

نیوز چینلز پر مختلف سوال اٹھائے جا رہے تھے۔

یہ غیر ملکی تربیت یافتہ افراد یہاں کیسے پہنچے ہیں؟

ایم ایم اے کے سابق چیمپئن شاہ زیب المعروف ایسٹرن سے ان لوگوں کی کیا دشمنی تھی؟

کیا شاہ زیب سے کوئی پرانا بدلہ چکانے کے لیے ہی وہ لوگ یہاں پہنچے تھے؟

کیا ان لوگوں سے چھپنے کے لیے ہی شاہ زیب یعنی ایسٹرن ایک بالکل مختلف روپ میں یہاں پاکستان میں موجود تھا؟

ایک چھوٹا چینل بیکری کی وہ وین دکھا رہا تھا جو دھماکے کی جگہ سے قریباً نصف کلومیٹر دور ایک ذیلی سڑک پر کھڑی ملی تھی اور جس کے اندر سے ایک مقامی گارڈ کی لاش بھی بازیاب

ہوئی تھی۔ نیوز کاسٹر نے ایک ماہر سکیورٹی ایجنٹ کو لائن پر لیا ہوا تھا۔ ایجنٹ اس سارے معاملے کے ڈرامائی پہلو پر اظہارِ خیال کر رہا تھا۔

وہ اپنا گنجا سر سہلا کر بولا۔ ''میں ایک بار پھر کہوں گا کہ یہ سب کچھ ڈرامیٹک ہے اور کسی ہالی ووڈ فلم کا حصہ دکھائی دیتا ہے۔ ایک ہی طرح کے لوگ...... ایک جیسے قد کاٹھ اور شکلیں بھی بہت زیادہ ملتی ہوئی۔ زیادہ لاشیں تو جل کر خاکستر ہو گئی ہیں۔ عمارت کے بڑے ہال سے جو دو لاشیں ملی ہیں، وہ بھی بالکل ایک جیسی ہیں۔ جیسے جڑواں بھائی ہوں۔ فقط آنکھوں کے رنگ اور پیشانی کی بناوٹ میں تھوڑا سا فرق نظر آتا ہے۔ بڑی بڑی جوائنٹ فیملیز میں اس طرح کی مثالیں نظر آتی ہیں کہ کزنز کی صورتیں ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں لیکن اتنی زیادہ تعداد میں لوگوں کا اس قدر مشابہ ہونا ایک معما ہے۔ ایک خیال یہ بھی پیدا ہو رہا ہے کہ کہیں ماضی میں کسی جرائم پیشہ تنظیم کی طرف سے کوئی ''ٹیسٹ ٹیوب بے بیز'' جیسا تجربہ تو نہیں کیا گیا......''

اینکر پرسن نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''قادر خاں صاحب! آپ کا کیا اندازہ ہے۔ اب باقی ماندہ لوگ کہاں غائب ہو گئے ہیں۔ بتایا جا رہا ہے کہ چند ملازمین کے سوا اب وہاں اور کوئی موجود نہیں۔ کئی لاشوں کے علاوہ زخمیوں کو بھی وہاں سے اٹھا لیا گیا ہے۔''

سکیورٹی ایجنٹ کا رابطہ منقطع ہو گیا تھا۔ اینکر پرسن ''ہیلو...... ہیلو'' کرنے لگا۔ میں نے ٹی وی آف کر دیا۔

سنسنی خیز خبریں تھیں اور سب سے سنسنی خیز خبر یہ تھی کہ میں دارِ فانی سے کوچ کر چکا تھا...... کم از کم فی الوقت تو میں مرحومین کی صف میں شامل تھا۔ یکا یک مجھے اپنے سیل فون کا خیال آیا۔ میرے ''انتقال'' کے بعد وہ اب تک خاموش کیوں تھا۔ سب سے پہلے تو انیق نے ہی مجھ سے عالم بالا کا حال احوال پوچھنا تھا۔ اس کے بعد داؤد بھاؤ تھا۔ مختار جھارا تھا اور کچھ دیگر ''لواحقین'' تھے جن کے پاس میرا یہ فون نمبر موجود تھا۔

میں نے اپنی جیبیں ٹٹولیں، فون تو موجود تھا مگر اس کی چارجنگ ختم ہو چکی تھی۔ میں نے بیرے سے ایک چارجر منگوا کر فون کو چارجنگ پر لگایا۔ ابھی دو چار منٹ ہی ہوئے تھے کہ پہلی کال آ گئی۔ مجھے یقین تھا کہ یہ انیق یا داؤد بھاؤ کی طرف سے ہو گی مگر غیر متوقع طور پر یہ سجاول سیالکوٹی کی طرف سے تھی۔

مجھے یقین تھا کہ وہ سب سے پہلے میرے ''انتقال پر ملال'' کی بات ہی کرے گا لیکن جب رابطہ ہوا تو چند سیکنڈ میں پتا چل گیا کہ وہ ابھی اس سنسنی خیز خبر سے آگاہ نہیں ہوا۔ وہ اپنے ہی کسی چکر میں تھا، بولا۔ ''کہاں ہو شاہ زیب؟''

''تم کہاں ہو جناب عالی؟''

''میں لاہور میں ہوں۔ ابھی ابھی جیپ پر لاہور پہنچا ہوں۔ موٹروے پر تمہارا فون نہیں مل رہا تھا۔''

''خیریت تو ہے؟''

''ہے بھی اور نہیں بھی۔ تمہیں آ کر بتاتا ہوں۔ تم بتاؤ کہاں آنا ہے مجھے؟''

میں نے کہا۔ ''خبروں کے مطابق تو تمہیں ''اگلے جہان'' میں آنا چاہیے...... ویسے میں یہاں اسٹیشن کے پاس ایک ہوٹل میں ہوں۔''

سجاول عجلت میں تھا۔ اس نے میرے فقرے کے پہلے حصے پر زیادہ غور نہیں کیا اور بولا۔ ''ہوٹل کا نام اور کمرا نمبر وغیرہ بتاؤ۔''

میں نے چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد اسے بتا دیا۔ اس کے فوراً بعد میرے ذہن میں ایک نیا خیال آیا اور میں نے اپنا فون پھر آف کر دیا۔ اس خیال کا ذکر میں آگے چل کر کرتا ہوں۔

وہ صرف آدھ پون گھنٹے میں پہنچ گیا۔ اس نے اپنے حلیے میں بس یہ تبدیلی کی تھی کہ اپنے اصل لباس شلوار قمیص کے بجائے پینٹ شرٹ میں تھا۔ داڑھی صاف تھی۔ مونچھ تو اس نے جاماجی میں ہی بہت چھوٹی کر دی تھی، اب کچھ اور بھی چھوٹی نظر آ رہی تھی۔ اس نے مڈل ایسٹ والے اسٹائل میں ایک ڈبی دار رومال چہرے کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ یقیناً اس کے قد کاٹھ کی وجہ سے لوگ اسے چونک کر دیکھتے تھے۔

وہ گلے ملا اور میرا حلیہ دیکھ کر کچھ ٹھٹکا بھی۔ میں رکشا ڈرائیور والی شلوار قمیص میں تھا۔ چھوٹتے ہی بولا۔ ''کیا شہر میں کوئی دھماکا ہو گیا ہے۔ سنا ہے کافی نقصان ہوا ہے۔ جگہ جگہ ناکے بھی لگے ہوئے ہیں۔''

''ہاں کافی نقصان ہو گیا ہے...... بلکہ...... ایک افسوسناک خبر تمہارے لیے بھی ہے۔ تمہارا یہ یار بھی ''مارا'' گیا ہے۔'' میں نے اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب؟'' وہ مزید چونکا۔

میں نے مختصر الفاظ میں اسے صورتِ حال بتانا مناسب سمجھی۔ وہ حیرت سے گنگ سنتا گیا۔ ٹیکساری گینگ کے خطرے کا علم تو اسے پہلے سے تھا لیکن یہ پتا نہیں تھا کہ یہاں پاکستان پہنچتے ہی یہ خطرہ پوری شدت سے مجھے آن دبوچے گا۔

اس نے کہا۔ ''تمہارا وہ نکو شہزادہ تو خیریت سے ہے ناں؟''

"خیریت سے ہی ہو گا لیکن ابھی اس سے میرا رابطہ نہیں ہوا۔"

"کیوں؟"

"فون کام نہیں کر رہا۔" میں نے اس سے جھوٹ بولا۔ دراصل میرے ذہن میں ایک اور خیال پنپ رہا تھا اور یہ بڑا سنسنی خیز تھا۔

میں نے موضوع بدلا اور سجاول سے پوچھا۔ "ہاں، تمہارا کیا مسئلہ ہے۔ کیوں اس طرح بھاگے پھر رہے ہو؟"

اس نے گہری سانس لی۔ اس کا صندوق جیسا سینہ کچھ اور بھی پھیل گیا۔ اس نے پتلون کی جیب سے ایک لفافہ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ اس کی شرٹ پتلون سے باہر تھی۔ لفافہ نکالتے ہوئے اس کی شرٹ تھوڑا سا اوپر اٹھی اور مجھے اس کے پیٹ کے ساتھ گولیوں والی بیلٹ نظر آئی۔ یقیناً اس نے پتلون کے عقب میں اپنا کولٹ پسٹل بھی اڑس رکھا تھا۔ بڑے ڈیل ڈول کی وجہ سے پینٹ شرٹ اس کے جسم پر زیادہ جچتی نہیں تھی مگر ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ مضحکہ خیز لگتا ہو۔

یہ ٹی سی ایس کا لفافہ تھا۔ اس پر اردو میں کوٹلی کے ایک گاؤں کا ایڈریس لکھا ہوا تھا۔ بھیجنے والے کا پتا لاہور کا تھا، نام احمد سلیم لکھا ہوا تھا۔

"یہ احمد سلیم کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اس کا کوئی ماموں زاد ہے۔ کراچی میں رہتا ہے اور کام کے لیے لاہور آتا رہتا ہے۔" سجاول نے اپنی پاٹ دار آواز میں کہا۔ "اس" سے سجاول کی مراد خورسنہ ہی تھی۔

"کیا کہتا ہے؟" میں نے خط کی تہیں کھولتے ہوئے پوچھا۔

"جاما جی میں وہ اور اس کا بچہ کسی مصیبت میں ہیں۔"

میں نے خط پڑھا۔ یہ زیادہ طویل نہیں تھا۔ احمد سلیم نامی اس شخص نے اس خط کے ذریعے خورسنہ کا حوالہ دیا تھا اور سجاول کو بتایا تھا کہ وہ جاما جی میں ایک بڑی مشکل کا شکار ہو گئی ہے۔ احمد سلیم نے خط کے آخر میں اپنا ایڈریس تحریر کیا تھا اور سجاول سے کہا تھا کہ اگر وہ لاہور آسکے تو وہ فوری طور پر اس سے کچھ شیئر کرنا چاہتا ہے۔ خط کی پشت پر خورسنہ کے اس ماموں زاد نے اپنا فون نمبر بھی لکھا تھا۔

خط کو دوبارہ دھیان سے پڑھنے کے بعد میں نے سجاول سے کہا۔ "کہیں یہ کوئی چال وغیرہ تو نہیں...... تم نے اس فون نمبر پر رابطہ کیا ہے؟"

"قریباً پندرہ بیس دفعہ۔ شروع میں ایک دو بار بیل گئی، پھر وہ بھی نہیں گئی۔"

"یہ کوٹلی کا ایڈریس خورسنہ یا اس کے ماموں زاد کے پاس کیسے ہو سکتا ہے۔ تم نے ہی دیا ہوگا؟"

"ہاں، میں نے ہی ایک مرتبہ خورسنہ کو دیا تھا۔"

"کچھ گڑبڑ لگ رہی ہے۔ اس ماموں زاد نے خط پر اپنا فون نمبر تو لکھا، لیکن پھر کال اٹینڈ نہیں کی...... اور...... اگر کوئی ایسی ہی خطرناک سچویشن تھی یا ارجنٹ بات تھی تو پھر یہ شخص تمہیں لاہور بلانے کے بجائے خود بھی کوٹلی آ سکتا تھا۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ خود بھی کسی مشکل میں پڑ گیا ہو؟"

میں نے ایک بار پھر لاہور کا ایڈریس پڑھا۔ یہ کوئی گھر یا فلیٹ وغیرہ نہیں تھا۔ ایک گیسٹ ہاؤس تھا ڈیفنس کے علاقے میں۔ روم نمبر بھی درج تھا۔ بعض لوگ جو اکثر کسی شہر میں جاتے رہتے ہیں، وہاں کسی ہوٹل یا گیسٹ ہاؤس میں مستقل بنیاد پر کمرا بک کرا لیتے ہیں۔ شاید یہ بھی کوئی ایسا ہی سلسلہ تھا۔

"اب کیا کرنا چاہیے؟" میں نے سجاول سے پوچھا۔

"جا کر دیکھنا تو پڑے گا۔" اس نے اپنی نہایت چوڑی اور کھردری ٹھوڑی کو سہلاتے ہوئے کہا۔

"میرا جانا ضروری ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہ جاؤ، میں اکیلا ہی چلا جاؤں گا۔" وہ ذرا تیکھے لہجے میں بولا پھر ذرا توقف سے کہنے لگا۔ "تم کسی چکر میں لگ رہے ہو...... دھماکے والا اتنا بڑا واقعہ ہو گیا ہے پر لگتا ہے کہ تم نے اپنا فون بند کیا ہوا ہے۔ انیق تک سے رابطہ نہیں کیا ہے......؟"

میرے ذہن میں جو خیال گھوم رہا تھا، وہ اب پختہ ہوتا جا رہا تھا۔ یہ بڑا عجیب خیال تھا اور اس کے نتائج دوررس ہو سکتے تھے۔ خوفناک دھماکے میں مجھے مردہ تصور کیا جا رہا تھا۔ کئی ٹھوس ثبوت بھی مہیا ہو گئے تھے۔ دھماکے کے بعد اتنی شدید آگ بھڑکی تھی کہ دو درجن کے قریب لاشیں خاک ہو گئی تھیں۔ شاید ڈی این اے ٹیسٹ بھی ساری لاشوں کی نشاندہی نہ کر سکتا۔ ٹیکساری گینگ ایک خوفناک بلا کا نام تھا اور ڈیتھ اسکواڈ اس بلا کا سب سے خوفناک ہتھیار تھا۔ یہ ہتھیار اپنی تمام تر ہلاکت خیزی کے ساتھ میری شہ رگ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میری زندگی ایک مہلک ترین نشانے پر تھی۔ کیا موجودہ صورتِ حال مجھے کچھ عرصے کے لیے...... یا پھر مستقل طور پر ٹیکساری گینگ کے گھیرے سے نکال سکتی تھی؟

"کس سوچ میں گم ہو گئے ہو۔ کوئی وڈی پریشانی ہے تو میں اکیلا چلا جاتا ہوں۔"

سجاول سیالکوٹی دبنگ انداز میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔
میں نے اسے پکڑ کر دوبارہ بٹھایا۔ اور اسے بتایا کہ میڈیا پر کیا خبریں چل رہی ہیں اور اس حوالے سے میں کیا چاہ رہا ہوں...... بات اس کی سمجھ میں آنے لگی۔ اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، جو کچھ تم کہہ رہے ہو...... وہ ہو تو سکتا ہے مگر سب سے بڑی شرط تو راز داری ہے۔''
میں نے کہا۔ ''سجاول! ابھی تک تمہارے سوا کسی کو یہ پتا نہیں کہ میں زندہ سلامت یہاں اس ہوٹل میں موجود ہوں۔''
''اگر ایسی بات ہے تو پھر جب تک تم کہو گے یہ بات ہم دونوں کے درمیان رہے گی۔'' وہ حلفیہ انداز میں بولا۔
''وعدہ؟''
''لو ہے توڑ وعدہ۔'' وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔
اس حوالے سے ہمارے درمیان تھوڑی سی گفتگو مزید ہوئی اور پھر ہم ڈیفنس جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

O......❖......O

سجاول چند سال پرانے ماڈل کی ٹویوٹا جیپ پر کوٹلی سے اکیلا ہی لاہور پہنچا تھا۔ جیپ کے شیشے ٹنٹڈ تھے۔ میرے باہر نکلنے میں تھوڑا بہت رسک تو تھا مگر سجاول جیسے یار کی خاطر یہ رسک لیا جا سکتا تھا۔ ہم گیسٹ ہاؤس کی وسیع پارکنگ میں پہنچے تو میں نے اپنے چرمی بٹوے میں سے وہ ننھا سا اسپائی کیمرا نکال لیا جو جاما جی میں بھی بے مثال ثابت ہوا تھا۔ سجاول کے گلے میں ایک تعویذ تھا اور یہ تقریباً کیمرے کا ہم رنگ ہی تھا۔ میں نے چنے کی دال کے دانے جتنا کیمرا سجاول کے تعویذ پر عین درمیان میں چپکا دیا۔ وہ تعویذ کا حصہ ہی معلوم ہونے لگا۔
''اس کی کیا ضرورت تھی؟'' وہ بولا۔
''میں یہاں گاڑی میں ہی رہوں گا۔ تم اندر جاؤ۔ کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو مجھے پتا چل جائے گا لیکن بھائی میرے! طیش میں نہ آنا۔ فی الوقت مارا ماری ہم بالکل افورڈ نہیں کر سکتے۔''
''زیادہ ہدایت اللہ خاں نہ بنو۔ مجھے پتا ہے کیا کرنا ہے اور کہاں تک رہنا ہے۔'' اس نے کمر کی طرف اڑسا ہوا اپنا لوڈڈ پستول نکالا اور اسے چیک کیا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں

میں عقابی چمک نمایاں ہوتی جا رہی تھی۔

میں نے اپنا سیل فون نکالا۔ اس کی ''سم'' علیحدہ کی اور پھر اسے آن کر کے اس ایپلی کیشن میں چلا گیا جو فون کی اسکرین کو اسپائی کیمرے کے ریسیور میں بدل دیتی تھی۔ تھوڑی سی کوشش سے مجھے کامیابی ہو گئی۔

سجاول کے باہر نکلنے کے بعد میں نے نشست کو اسٹریچ کیا اور نیم دراز ہو کر فون کی اسکرین پر نگاہ جما دی۔

سجاول مین دروازے سے گزر کر استقبالیہ کاؤنٹر تک پہنچ گیا۔ خوش شکل لڑکی نے پوچھا۔ ''میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟''

سجاول نے اپنا مدعا بیان کیا۔ لڑکی نے انٹرکام اٹھایا اور کسی سے بات کرنے کے بعد اوپر جاتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا۔ وہ سجاول کے ڈیل ڈول اور لب و لہجے سے مرعوب نظر آتی تھی اور ذرا ٹھٹکی ہوئی بھی۔ سجاول قالین پوش سیڑھیاں چڑھ کر فرسٹ فلور پر پہنچا اور پھر ایک کوریڈور سے گزر کر مطلوبہ کمرے تک پہنچ گیا۔ اب میرا تجسس بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ اگر واقعی وہاں خورسنہ کا ماموں زاد احمد سلیم موجود تھا تو اسے دیکھنا اور اس کی بات سننا میرے لیے اہم تھا۔

سجاول نے بزر بجایا۔ چند لمحے بعد اندر سے بولٹ گرنے کی مدھم آواز آئی لیکن دروازہ کھلا نہیں۔ سجاول نے چند سیکنڈ انتظار کیا اور پھر دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہو گیا۔ اسپائی کیمرے نے ایک پُرآسائش کمرے کا منظر دکھایا مگر سجاول کے سامنے کوئی دکھائی نہیں دیا۔ کیمرے کی موومنٹ سے اندازہ ہوا کہ سجاول دائیں بائیں دیکھ رہا ہے پھر اچانک محسوس ہوا کہ کوئی عقب سے سجاول سے لپٹ گیا ہے۔ مجھے اس لپٹنے والے کے صرف ہاتھ ہی ایک لمحے کے لیے دکھائی دیئے۔ مجھے لگا کہ یہ نسوانی ہاتھ ہیں۔

تب ایک آواز میرے کانوں سے ٹکرائی اور میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ یہ دلکش آواز خود خورسنہ کی تھی۔ ''السلام علیکم'' اس نے سجاول کی پشت سے چپکے چپکے کہا تھا۔ یقیناً سجاول بھی کچھ دیر کے لیے سکتہ زدہ رہ گیا تھا۔ تب اس نے خورسنہ کو گھما کر اپنے سامنے کر لیا۔ اسپائی کیمرے نے خورسنہ کو دکھایا۔ موسم کے لحاظ سے اس نے گلابی رنگ کی ہلکی پھلکی شرٹ پہن رکھی تھی۔ نیچے نیلی جین تھی۔ بال جوڑے کی صورت بندھے تھے۔ وہ ہمیشہ کی طرح چاق و چوبند اور جاذب نظر دکھائی دیتی تھی۔

سجاول کی بھاری آواز سیل فون کے اسپیکر پر ابھری۔ ''یہ...... تم نے کیا کیا؟ مجھے یقین

نہیں آرہا کہ...... تم یہاں ہو۔'' سجاول کی آواز میں لرزش تھی۔
''کیسا لگا سرپرائز؟'' وہ سجاول کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ اس کے گداز ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں نمی۔
''تم...... بہت عجیب ہو خورسنہ۔'' سجاول نے چند لمحے کے توقف کے بعد کہا۔
ایک دم اسکرین تاریک ہوگئی۔ یوں لگا جیسے کیمرے کو کسی نے ڈھانپ لیا ہو۔ میرے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ وہ سجاول کے گلے لگ گئی ہے۔
''میں نے تمہیں پریشان کیا ناں سجاول، بہت دکھ دیا ناں؟''
''ہوں۔'' سجاول نے مختصر جواب دیا۔
''شاید...... تم آخر وقت تک میرا انتظار کرتے رہے کہ میں آجاؤں گی۔''
''ہوں۔'' سجاول نے دوبارہ ہنکارا بھرا۔
''انتظار لمبا تھا لیکن بے کار تو نہیں گیا ناں؟''
سجاول خاموش رہا۔ وہ اس کے گلے لگے لگے بولی۔ ''جواب دو ناں''
''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔''
''میں بھی...... تمہیں یاد کرتی رہی ہوں...... ایک پل بھی...... ذہن سے نکال نہیں سکی۔'' وہ اٹک اٹک کر کہہ گئی۔
''وہ...... ذیشان کہاں ہے؟'' سجاول نے موضوع بدلا۔
اس موقع پہ دونوں ایک دوسرے سے علیحدہ ہوگئے۔ کیمرا ایک بار پھر خورسنہ کو دکھانے لگا۔ اس کا چہرہ جذبات سے سرخ ہورہا تھا۔ آنکھوں میں اشک مسکرا رہے تھے۔ خورسنہ نے کہا۔ ''ذیشان جاماجی میں ہی ہے۔ اپنے ایک ماموں کے پاس۔ بہت پیار ہے دونوں میں۔ وہ ان کے پاس ہفتوں رہ سکتا ہے۔ وہی احمد سلیم جن کے نام سے میں نے تمہیں خط بھیجا۔'' اس کے لہجے میں دبی دبی شوخی تھی۔
سجاول کے لہجے میں ذرا اداسی آگئی، اس کا مطلب ہے کہ تم...... عارضی طور پر آئی ہو؟''
وہ مسکرا کر بولی۔ ''آ تو گئی ہوں ناں، اب تم جیسا کہو گے، ویسا ہو جائے گا۔''
وہ شاید ایک بار پھر گلے لگ گئی تھی کیونکہ میرے سیل فون کی اسکرین تاریک ہوگئی تھی۔ بس سانسوں کی سرسراتی ہوئی آواز ابھر رہی تھی۔ میں نے سوچا اس موقع پر انیق ہوتا تو ضرور اپنا سر پیٹ لیتا۔

سجاول اور خورسنہ کے درمیان تھوڑی سی گفتگو مزید ہوئی۔ کیمرے کا اینگل بار بار بدل رہا تھا، کبھی خورسنہ کی صرف ٹانگیں نظر آتی تھیں، کبھی کندھا اور کبھی چہرہ۔ وہ جاماجی اور برونائی میں پروان چڑھی تھی۔ وہاں کی آب و ہوا نے اس کے اندر ایک خاص قسم کی دلکشی بھر دی تھی۔ وہ نوخیز شباب کی عمر سے تو گزر چکی تھی۔ تاہم کوئی بھی مرد پہلی نظر میں اس پر فدا ہوسکتا تھا۔ اور وہ فدا ہوئی تھی آزاد کشمیر کی پہاڑیوں میں اُگے ہوئے ایسے کڑوے خاردار درخت پر جس کے قریب سے گزرنے والا بھی لہولہان ہو جاتا تھا۔ واہ ری محبت تُو کیسے کیسے تماشے دکھاتی ہے۔

کچھ دیر بعد سجاول ذرا ہانپا ہوا سا ٹویوٹا جیپ میں واپس آ گیا۔ اس نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''اب بتاؤ کیا کرنا ہے؟''

میں نے مسکرا کر کہا۔ ''اب تو جو کچھ کرنا ہے، شیر نے ہی کرنا ہے۔ ویسے بڑی جرأت دکھائی ہے اس نے بھی۔ اتنی دور سے اکیلی چلی آئی......''

سجاول نے نشست سے ٹیک لگا کر ایک لمبی سانس لی۔ غالباً اسے سوچنے کے لیے سگریٹ اور وہسکی کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے جیپ کی نشست کے نیچے کسی خفیہ خانے میں ہاتھ گھمایا اور ایک ''ولایتی کوارٹر'' نکال کر تین چوتھائی غٹاغٹ چڑھا گیا پھر سگریٹ سلگا کر بولا۔ ''کوئی مشورہ دو اب۔''

''وہ کیا کہتی ہے؟''

''وہ تو کہتی ہے کہ کہیں بھی لے جاؤ۔ تم نے بھی سن ہی لیا ہوگا...... لیکن......''

''لیکن کیا؟''

''یہ تو پکی بات ہے کہ میں اسے اپنے ڈیرے پر نہیں لے جا سکتا اور نہ ہی یہ بتا سکتا ہوں کہ میں کیا کرتا ہوں۔''

''تو پھر؟''

''ابھی ایک دو دن سوچتا ہوں یہاں رہ کر۔''

''یہاں رہ کر؟ یعنی اس گیسٹ ہاؤس میں؟''

''ہاں۔'' سجاول نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اس نے یہ کمرا میرے ہی نام سے بک کروایا ہے بلکہ یہ دو کمرے ہیں۔ چھوٹی سی گیلری (بالکونی) بھی ہے۔''

''تمہارے نام سے کیسے کرا دیا؟ تمہارے نام کا شناختی کارڈ تھا اس کے پاس؟''

''نہیں، اس نے کہا سجاول احمد میرے شوہر کا نام ہے۔ وہ ایک دو دن میں پہنچ رہے ہیں...... اور کمرا بک کرا لیا۔''

''لگتا ہے کافی چوکس بھابی ملنے والی ہے ہمیں۔ لیکن اب تمہیں یہاں شناختی کارڈ دکھانا پڑے گا۔''

''یہ زیادہ مشکل کام نہیں۔ محمد سجاول...... سجاول احمد...... سجاول شاہ کے نام سے کئی شناختی کارڈ پڑے ہیں میرے پاس۔''

''لیکن تم زیادہ دن یہاں رہ تو نہیں سکو گے، نظر میں آنے کا خطرہ ہوگا۔''

''وہ تو اب بھی ہے۔'' سجاول نے دور کھڑی ایک پولیس موبائل پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

''اور یہی خطرہ میرے لیے بھی ہے یہاں۔ میرا خیال ہے کہ اب مجھے واپس اپنے ہوٹل پہنچ جانا چاہیے۔''

''ٹھیک ہے، میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں مگر ہمارا رابطہ ہر صورت رہنا چاہیے۔''

''پھر اس کے لیے ہمیں راستے میں چند منٹ کے لیے رکنا ہوگا۔ مجھے ایک نیا موبائل اور نئی سم چاہیے ہوگی۔''

''ٹھیک ہے۔'' سجاول نے کہا اور اپنے گلے کے تعویذ سے چپکا ہوا کیمرا اتار کر میرے حوالے کر دیا۔

میں نے شک بھری مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھا تو اس نے برا سا منہ بنایا اور جیپ اسٹارٹ کر دی۔ راستے میں ہماری گفتگو کا موضوع یہی دونوں سنسنی خیز واقعات رہے۔ پہلا واقعہ جودھا کے کے حوالے سے تھا اور جس نے شہر میں ہلچل مچا رکھی تھی اور دوسرا خورسنہ کی ڈرامائی آمد کا واقعہ۔ راستے میں ٹنٹڈ شیشوں والی جیپ کے اندر بیٹھے بیٹھے ہی ہم نے ایک موبائل سیٹ اور ایک سم بھی خرید لی۔ اس کی ادائیگی سجاول نے کی۔

O......❖......O

میں واپس ریلوے اسٹیشن کے قریبی ہوٹل میں پہنچ چکا تھا۔ سجاول واپس گیسٹ ہاؤس چلا گیا تھا۔ ایک گرم سہ پہر کے بعد شام کے سائے پھیلنا شروع ہو گئے تھے۔ الیکٹرانک میڈیا پر ابھی تک علی الصبح پیش آنے والے واقعے کی گونج تھی۔ ہلاکتوں کی تعداد بڑھ چکی تھی۔ جو خبر سب سے زیادہ دلچسپی اور حیرت سے سنی جا رہی تھی، وہ یہی تھی کہ غیر ملکی حملہ آوروں کی شکلیں غیر معمولی حد تک ایک دوسرے سے ملتی تھیں اور ان کے قد کاٹھ بھی تقریباً ایک جیسے تھے۔ سگے بھائی...... یا قریبی کزن...... یا پھر ایک ہی برادری کے لوگ؟ اس طرح کا واقعہ پہلے کبھی پیش نہیں آیا تھا۔

میں نے ٹی وی کی آواز تھوڑی سی اونچی کی۔ ایک نیوز چینل پر میری دلچسپی کی خبر چل رہی تھی۔ اینکر نے تجزیہ نگار سے پوچھا۔ ''اس واقعے میں شاہ زیب المعروف ایسٹرن اور اداکارہ اروشا کے جاں بحق ہونے کی تصدیق ہو چکی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے، شاہ زیب جس پر دہشت گردی کا مقدمہ بھی درج تھا، وہاں ہاؤس نمبر اٹھارہ میں کیوں موجود تھا؟''

تجزیہ نگار نے چائے کا کپ ہونٹوں سے لگانے کے بعد کہا۔ ''جہاں تک دہشت گردی کے مقدمے کا تعلق ہے اس کے درست یا غلط ہونے کے بارے میں فی الحال ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ انسپکٹر قیصر چودھری کے ذاتی عناد کا نتیجہ تھا۔ لیکن موجودہ واقعے میں شاہ زیب کا کردار مثبت رنگ میں سامنے آیا ہے۔ یہ صاف محسوس ہوتا ہے کہ وہ غیر ملکی گھس بیٹھیوں کی طرف سے بیس شہریوں کے قتلِ عام کا بدلہ چکانے کے لیے اٹھارہ نمبر گھر میں داخل ہوا اور وہ کافی حد تک کامیاب بھی رہا۔''

اینکر نے کہا۔ ''گرفتار ہونے والے کچھ عینی شاہدین کا کہنا ہے کہ دھماکے کے وقت شاہ زیب اور اروشا غیر ملکی شوٹرز کے نرغے سے نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ شاہ زیب اداکارہ اروشا کو بچانے کے لیے ہی گھر میں داخل ہوا ہو؟''

''ایسا کہنا قرین قیاس نہیں۔'' تجزیہ نگار نے نفی میں سر ہلایا۔''ہاں یہ ممکن ہے کہ مارا ماری کے دوران میں اس کی نظر اروشا پر پڑ گئی ہو اور اس نے اروشا کی مدد کرتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لے لیا ہو۔''

''داؤد بھاؤ کا نام بھی اس حوالے سے لیا جا رہا ہے۔ اس سارے واقعے میں داؤد بھاؤ کا کردار کیا ہو سکتا ہے؟''

''داؤد بھاؤ اور اس کے دو تین قریبی ساتھی ایک بار پھر منظر سے اوجھل ہیں مگر یہ شواہد تو بہر حال مل رہے ہیں کہ شاہ زیب اور داؤد بھاؤ میں لنک موجود تھا۔ اگر......''

میں نے ٹی وی آف کر دیا۔ میری ''موت'' کی خبر پختہ ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے کسی اور کی تو نہیں مگر اپنے والدین کی فکر تھی۔ عین ممکن تھا کہ یہ خبر ان کے کانوں تک رسائی حاصل کر چکی ہو یا کرنے والی ہو۔ میں کم از کم انہیں ضرور یہ بتا دینا چاہتا تھا کہ ان کا ناہنجار فرزند تادم اطلاع حیات ہے۔

میں نے اپنا پرانا نمبر تو بند کر دیا تھا۔ نئے نمبر کو ''ایکٹی ویٹ'' کرنے کے بعد میں نے قریباً آدھا گھنٹہ کوشش کی اور والد صاحب تک ایک ''وائس میسج'' پہنچانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس میسج میں، میں نے انہیں اطلاع دی کہ میں خیر خیریت سے ہوں...... اگر ان تک میرے بارے میں کوئی بری خبر پہنچے تو وہ جھوٹ ہو گی۔ ساتھ ہی میں نے والد صاحب کو تاکید کی کہ میری آئندہ سلامتی اس بات پر منحصر ہے کہ وہ میری موجودہ سلامتی کو مکمل راز رکھیں۔

فوراً ہی والد اور والدہ کی طرف سے ٹیکسٹ میسج موصول ہو گیا۔ اس میسج سے اندازہ ہوا کہ ابھی ان تک لاہور میں ہونے والے المناک واقعے کی خبر نہیں پہنچی تھی۔ وہ مجھ سے بات کرنا چاہ رہے تھے۔ میں جانتا تھا کہ اگر ایک بار یہ باتیں شروع ہوئیں تو پھر شاید کئی دن بھی ختم نہ ہو سکیں۔ میں نے دل پر پتھر رکھ کر انہیں ٹیکسٹ میسج بھیجا کہ فی الوقت میرے لیے بات کرنا کسی طور ممکن نہیں۔ میرے لیے دعا کرتے رہیں۔''

اس میسج کے بعد میں نے یہ نیا فون بھی آف کر دیا۔

مجھے پتا تھا کہ چچا حفیظ اور ولید وغیرہ کے لیے بھی یہ خبر بڑی دلدوز ثابت ہو گی۔ چچا حفیظ کے پاس میرا فون نمبر موجود تھا اور یقینی بات تھی کہ وہ اب تک درجنوں بار مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش کر چکے ہوں گے۔ اس حوالے سے ایک اور نام بھی میرے ذہن میں آ رہا تھا۔ یہ تاجور کا نام تھا۔ بے شک وہ ایک دور دراز گاؤں میں تھی مگر یہ عین ممکن تھا کہ یہ خبر اس تک بھی پہنچ جاتی۔ میں اس ردِعمل کے بارے میں سوچنے لگا جو اس خبر کے بعد اس پر ظاہر ہو

سکتا تھا۔

اچانک میرے ذہن میں ایک خیال ابھرا اور میں بری طرح چونک گیا۔ یوں لگا کہ ایک ہی لمحے میں دماغ کے اندر دس ہزار واٹ کا بلب روشن ہو گیا۔ اور اس کی روشنی نے حقیقت اور تصور کے ہر منظر کو بدل ڈالا ہے۔ میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ دل و دماغ میں کھلبلی سی مچ گئی تھی۔ نہایت بے قراری سے میں نے کمرے کے اندر ہی ایک چکر لگایا اور دوبارہ بیٹھ گیا۔ جو خیال پچھلے کئی گھنٹوں سے پنپ رہا تھا، وہ ایک نتیجے پر پہنچ گیا۔

میری زندگی کا سب سے بڑا روگ یہ ٹیکساری گینگ تھا اور میں ان کے لیے ''مر'' گیا تھا۔ اسّی نوے فیصد تو مر گیا تھا۔ میرے ''چیتھڑے'' اُڑے تھے اور میں درجنوں دوسرے لوگوں کے ساتھ راکھ ہو گیا تھا۔ تو کیا...... تو کیا؟ میرے لیے ایک نئی زندگی کا راستہ کھل سکتا تھا۔ ایسی زندگی جس کو ٹیکساری گینگ کا کینسر لاحق نہ ہو۔ کیا اس سلسلے میں ڈاکٹر احرار میرے کسی کام آسکتا تھا۔ کرنل ڈاکٹر احرار جو جاماجی سے میرے ساتھ ہی جہاز میں یہاں پہنچا تھا۔ وہ ایک مانا ہوا پلاسٹک سرجن تھا۔ وہ میرے چہرے کو تھوڑا بہت تو تبدیل کر ہی سکتا تھا۔ وہ کرشمہ کار تھا۔ میں نے جاماجی میں اس کے دو تین ماسٹر پیس دیکھے تھے۔ وہ ''سلی کون'' اور دیگر ٹشوز کی مدد سے حیرت انگیز نتائج پیدا کرتا تھا۔

میں اس حوالے سے سوچتا چلا گیا اور میرے اندر کچھ نئی راہیں کھلنے لگیں۔ ایک عجیب سی ترنگ تھی جو لہو سے اٹھ رہی تھی اور آہستہ آہستہ میرے رگ و پے میں پھیل رہی تھی۔

پورے چوبیس گھنٹے میں اس معاملے کے مختلف پہلوؤں پر سوچتا رہا اور غور کرتا رہا۔ گاہے بگاہے میں ٹی وی آن کر کے پرسوں والے واقعے کے بارے میں جاننے کی کوشش بھی کرتا تھا۔ کل سارا دن تو ہر چینل پر اسی خبر کا چرچا رہا تھا لیکن اب وقت گزرنے کے ساتھ دیگر خبریں حاوی ہو رہی تھیں۔ اس کے باوجود ہاؤس نمبر اٹھارہ کے واقعے کی بازگشت کہیں کہیں موجود تھی اور تبصرے بھی ہو رہے تھے۔

شام کے وقت میں نے ٹی وی آن کیا تو اسی قسم کی گفتگو ہو رہی تھی، اینکر نے کہا۔ ''اب یہ بات تقریباً ثابت ہو چکی ہے کہ ٹیکساری گینگ کے لوگ تھے اور یہ یورپ کے انڈر ورلڈ کے خطرناک ترین گینگس میں سے ایک ہے۔ شاہ زیب المعروف ایسٹرن کے ساتھ اس گینگ کی دشمنی بھی اب پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے۔ اب آپ کا کیا خیال ہے، کیا یہ لوگ واقعی مطمئن ہیں کہ شاہ زیب پرسوں رات والے واقعے میں ختم ہو چکا ہے اور اب انہیں مزید مہم جوئی کی ضرورت نہیں؟''

تبصرہ نگار نے کہا۔ ''اس کا دارومدار تو ڈی این اے ٹیسٹ کی رپورٹس پر ہونا تھا مگر مسئلہ یہ ہے کہ بیشتر لاشیں جل کر راکھ ہو چکی ہیں اگر کچھ باقیات مل بھی جاتی ہیں تو پھر انہیں میچ کرنے کے لیے سیمپل کی ضرورت ہوتی ہے، یہاں رکاوٹ یہ ہے کہ شاہ زیب کے ڈی این اے کا سیمپل موجود نہیں، اس کے والدین حیات ہیں لیکن ایک عرصے سے ان کا کچھ اتا پتا نہیں۔''

اینکر بولا۔ ''ہوسکتا ہے کہ شاہ زیب نے گینگ سے اپنی خطرناک دشمنی کی وجہ سے ہی انہیں کہیں چھپا رکھا ہو؟''

''آپ نے بالکل بجا کہا۔ یہی بات شاہ زیب کے چچا محمد حفیظ صاحب کے بارے میں کہی جاتی ہے۔ وہ چند روز پہلے تک مراد پور میں اپنی رہائش گاہ میں موجود تھے لیکن اب وہ بھی اوجھل ہیں۔ ایسے شواہد ملے ہیں کہ کچھ روز پہلے شاہ زیب مراد پور گیا اور اپنے چچا کو اپنے ساتھ لے گیا......''

''ممکن ہے کہ اس نے یہ احتیاط ٹیکساری گینگ کی یہاں آمد کے بعد کی ہو؟''

''یقیناً ایسا ہی ہے۔'' تبصرہ نگار نے تائید کی اور بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''شاہ زیب کا ایک چچازاد ولید آج کل کوٹ لکھپت جیل میں موجود ہے ممکن ہے کہ اس کے ذریعے ڈی این اے کا عمل آگے بڑھ سکے۔ تاہم اس سلسلے میں ماہرین ہی اصل بات بتا سکتے ہیں۔''

اینکر بولا۔ ''آپ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ شاہ زیب کی ہلاکت کا سو فیصد یقین ہونے تک گینگ کے لوگ واپس نہیں جائیں گے......؟''

''نہ صرف واپس نہیں جائیں گے بلکہ اس امر کا خدشہ بھی ہے کہ مزید لوگ آجائیں اور شاہ زیب کی ''موت'' کے حوالے سے اپنا ہر شک رفع کرنے کی کوشش کریں۔ ان لوگوں کی یہاں موجودگی بہت خطرناک ہے اور انتظامیہ کو اس حوالے سے بہت چوکس رہنے کی ضرورت ہے۔''

اینکر پرسن نے اپنے ہاتھوں میں بال پوائنٹ کو گھماتے ہوئے کہا۔ ''اب میں اس موضوع کے دوسرے اور زیادہ تحیر خیز پہلو کی طرف آتا ہوں۔ ایسی خبریں ہم تک پہنچ رہی ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ ٹیکساری گینگ کا یہ ڈیتھ اسکواڈ خاص الخاص اہمیت کا حامل ہے۔ ان لوگوں کے ہم شکل ہونے کے پیچھے ایک حیرت ناک کہانی ہے...... یہ وہی معاملہ ہے جس کا شبہ کل بھی ہمارے چینل پر معروف گائنا کالوجسٹ ڈاکٹر صدیقی نے کیا تھا۔ ٹیسٹ ٹیوب ''بے بیز'' اور کرائے کی کوکھ کا تصور اب......''

اس بور بحث سے بچنے کے لیے میں نے چینل بدل دیا۔ یہاں ایک خوبرو لڑکی چند بزرگ سیاست دانوں کے درمیان بیٹھی، بریک لینے کے لیے ہاتھ پاؤں چلا رہی تھی اور بزرگ اتنے گرم تھے کہ لگتا تھا، ابھی ایک دوسرے پر پل پڑیں گے۔

اسی دوران میں کمرے کے دروازے پر کسی نے دستک دی۔ میں کمرے سے بالکل نہیں نکل رہا تھا اور کھانا بھی کمرے میں ہی منگواتا تھا۔ میں نے اپنا پسٹل کمر کی طرف اپنے نیفے میں اڑسا اور دروازے کے سامنے پہنچ کر کہا۔ ''کون؟''

''میں ہوں۔ دروازہ کھولو۔'' سجاول کی بھاری بھرکم آواز ابھری۔

میں نے دروازہ کھولا، وہ اندر آ گیا۔ کافی سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''میں تمہیں فون کرنے ہی والا تھا، خیریت تو ہے ناں؟''

''خیریت ہی ہے۔'' وہ بیزاری سے بولا اور صوفے پر ڈھے گیا۔ اس کے وزن سے صوفے کی ''کراہیں'' نکل گئیں۔

''وہسکی ہوگی؟'' اس نے پوچھا۔

''توبہ توبہ کرو۔ تمہیں پتا ہے چھوڑ چکا ہوں۔''

اس نے شرٹ کی جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور ایک ہی کش میں ایک چوتھائی سگریٹ رگڑ گیا۔ ''تم کچھ پریشان لگ رہے ہو۔ حالانکہ تمہیں بہت خوش نظر آنا چاہیے تھا۔''

''خوشی گئی چولھے میں۔''

''کیا ہونے والی بھابی سے کوئی اَن بن ہوئی ہے؟''

وہ ذرا توقف سے بولا۔ ''ان زنانیوں کی کچھ سمجھ نہیں آتی۔ ان کے دل دماغ وکھرے، ان کی سوچیں وکھری، ان کا پیار محبت وکھرا......''

''پیار محبت وکھرا؟ کیا مطلب؟ پیار محبت تو ویسا ہی ہوتا ہے جیسا ہر جاندار میں اور ہر نر مادہ میں ہوتا ہے۔''

وہ میرے فقرے کی لطافت کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ''اب دیکھو اس کو، یہ وہاں سے کس لیے آئی ہے؟ سیر سپاٹے اور گھومنے پھرنے کے لیے تو نہیں آئی ہے نا؟''

''کیا کہنا چاہتے ہو سجاول؟''

''شاہ زیب! میں بالکل سیدھا صاف بندہ ہوں۔ مجھے یہ چاؤ چونچلے اور دل فریب نہیں آتے یا تو وہ میرے ساتھ ہے...... یا نہیں ہے۔ میں نے اسے ایک بالکل سیدھی آفر کی ہے۔ میں نے کہا ہے کہ ہم نکاح کر لیتے ہیں۔''

میں نے چند لمحے توقف کے بعد کہا۔ ”اور وہ کیا کہتی ہے؟“

”کہتی ہے کہ وہ اتنی جلدی اس کے لیے تیار نہیں ہے۔ میں نے کہا تو پھر یہاں آنے کا مقصد؟ وہ بولی کہ یہاں رہنا چاہتی ہے۔ میرے ساتھ گھومنا پھرنا چاہتی ہے۔ پاکستان کے پہاڑی علاقے دیکھنا چاہتی ہے...... پہاڑی علاقے۔“ وہ غصے سے بڑبڑایا اور سگریٹ کا خالی پیکٹ دیوار پر دے مارا۔

میں اب تک سجاول کو بہت اچھی طرح جان چکا تھا۔ وہ سونے کا دل رکھتا تھا مگر اس کا مزاج آہنی تھا۔ اس کا غصہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ مجھے جاماجی کا وہ سین بھی یاد تھا جب اس نے مایوسی کے عالم میں اپنے فولادی مکے کی ضرب سے تاج محل کا خوب صورت ماڈل توڑ پھوڑ دیا تھا اور ساتھ ہی وہ میز بھی جس پر ماڈل رکھا تھا۔ وہ ماڈل خورسنہ نے ہی اسے گفٹ کیا تھا۔

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”سجاول! شاید تم نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ عورت اور مرد کے پیار محبت میں فرق ہوتا ہے۔ مرد کی محبت میں جسم کے ملاپ کا عمل دخل زیادہ ہوتا ہے جبکہ عورت کی محبت میں سوچ اور خیال کو زیادہ جگہ ملتی ہے۔ وہ مرد سے دور رہ کر اس کو اپنی محبت کے گھیرے میں رکھنا چاہتی ہے جبکہ مرد اس کے قریب ہو کر محبت کو عملی شکل دینا چاہتا ہے......“

”یار! یہ پروفیسروں والی باتیں میرے ساتھ نہ کرو۔ یہ تو کوئی بات نہیں کہ کسی کے ساتھ رہنا بھی چاہو...... اور رہو بھی نہ۔ اس کو ستاؤ...... پریشان رکھو...... اور خود بھی پریشانی میں رہو۔ اٹھتے بیٹھتے ”ہوکے“ بھرتے رہو اور پھر اسی ”اکھ مچولی“ میں کوئی ایسا کام ہو جائے کہ کھوتا ہی کھوہ میں جا گرے۔“

میں نے کہا۔ ”سجاول! شاید اس معاملے میں، میں تم سے تھوڑا زیادہ جانتا ہوں۔ اگر خورسنہ تمہارے لیے تمہارے پیچھے یہاں آئی ہے تو یہ اس بات کا پکا ثبوت ہے کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے...... اور تمہاری ہر بات مان بھی سکتی ہے۔ بس تحمل رکھو اور اسے تھوڑا سا وقت دو۔ مجھے یقین ہے سب کچھ تمہاری مرضی کے مطابق ہو جائے گا۔“

”یار! وہ کوئی کالج کی کڑی نہیں ہے۔ چنگی بھلی سمجھ دار ہے۔“

”تم بھی کوئی کالج کے منڈے نہیں ہو۔ چنگے بھلے سمجھ دار ہو اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ تھوڑا صبر کرو۔ اگر کہتے ہو تو میں بھی اس سے تھوڑی بہت بات کرتا ہوں۔“

”تو کرو۔“

''پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے اس سے کیا کہا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ اپنے رہن سہن کے بارے میں...... یہ جو پنجاب کی آدھی پولیس تم اپنے پیچھے لگائے پھرتے ہو، اس کے بارے میں خورسنہ کو کچھ پتا ہے یا نہیں؟''

''یہ بات میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں۔ اس بارے میں، میں اسے کچھ نہیں بتا سکتا۔ ہاں، اتنا ضرور کروں گا کہ اسے اس سارے ماحول سے بالکل الگ رکھوں گا۔ اس کا سایہ بھی نہیں پڑنے دوں گا اس پر۔''

''تمہارے روزگار اور خاندان کے بارے میں اسے کیا پتا ہے؟''

''میں نے اسے جاما جی میں بتایا تھا کہ آزاد کشمیر میں کچھ زمینیں میں نے بیچی تھیں جن کی رقم میرے پاس ہے۔ آزاد کشمیر میں میری ''پرانی دشمنی'' چل رہی ہے جس کی وجہ سے میں وہاں سے نکل آیا ہوں اور اکیلا رہ رہا ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''وہ کتنے دن کے لیے آئی ہے؟''

''کوئی چھ ہفتے کے لیے۔ لیکن جو کچھ وہ چاہتی ہے، وہ میں نہیں کر سکتا۔ کیا میں اسے اپنے ساتھ لے کر انار کلی یا مال روڈ پر شاپنگیں کرا سکتا ہوں یا پھر مری اور نتھیا گلی میں چہل قدمیاں کر سکتا ہوں؟''

''ہاں یہ بات تو ہے۔ سجاول سیالکوٹی سے پالا پڑا ہے اس کا۔ مگر ایک بات کا خیال تم بھی کرو۔ وہ یہاں کی نہیں ہے۔ وہ برونائی اور جاما جی میں پلی بڑھی ہے، اس کا اپنا رہن سہن ہے۔ وہ خود کو تمہارے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرے گی اور شاید کر بھی رہی ہے مگر بات پھر وہیں پر آ جاتی ہے، جلدی نہ کرو۔ ایسے رشتے فولاد کی طرح پکے ہوتے ہیں اور دھاگوں کی طرح کچے بھی۔''

''چلو دیکھتے ہیں، دو چار دن میں کیا ہوتا ہے لیکن تم اگر اس سے بات کرو تو کسی طرح کا منت ترلا نہیں کرنا نہ اپنی طرف سے نہ میری طرف سے۔ میں نے سب کچھ اس کے سامنے رکھ دیا ہے۔ اب فیصلہ اسے ہی کرنا ہے۔''

''اب تمہارا کیا پروگرام ہے؟''

''میں نے خورسنہ کو بتا دیا ہے کہ دو تین روز تک آؤں گا۔''

''واپس ڈیرے پر جا رہے ہو؟''

''ہاں، تمہاری ہی ڈالی ہوئی مصیبت ہے۔ میری بھتیجی مانی کو تو اب یقین ہو گیا ہے کہ تم اب واپس نہیں آؤ گے۔ وہ تقریباً نارمل ہو گئی ہے مگر تمہارے نہ آنے سے ماں جی کے دل پر

گہرا اثر ہوا ہے۔ گرمیوں میں ویسے بھی ان کی طبیعت زیادہ خراب ہو جاتی ہے۔ لاہور سے ایک ڈاکٹر کو لے کر جا رہا ہوں ڈیرے پر۔"

میں جانتا تھا کہ باہر سے جن لوگوں کو سجاول سیالکوٹی اپنے ڈیرے پر لے جاتا ہے سفر کے آخری مراحل میں ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی جاتی ہے۔

میں نے کہا۔ "سجاول! اب تو تم میرے بارے میں سب کچھ جان ہی چکے ہو۔ میری وجہ سے مانی اور ماؤ جی کو جو مایوسی ہوئی ہے اس کے لیے میں تم سے اور ان دونوں سے بھی معافی مانگتا ہوں۔"

اس حوالے سے میرے اور سجاول کے درمیان مزید چند منٹ گفتگو ہوئی۔ پھر سجاول واپس چلا گیا۔ میں نے ایک بار پھر اسے تاکید کر دی تھی کہ میری "زندگی" اور اس ہوٹل میں میری موجودگی کے حوالے سے وہ اپنے ہونٹوں کو بالکل سی کر رکھے گا۔ وہ بھی اس معاملے کی غیر معمولی نزاکت کو سمجھ رہا تھا۔ اس نے مجھے پوری تسلی دی۔

سجاول کے جانے کے بعد بیرا تازہ اخبار لے آیا۔ میں نے اخبار پر نگاہ دوڑائی۔ ہاؤس اٹھارہ والا واقعہ کل کے اخباروں میں تو نہیں آسکا تھا مگر آج پوری تفصیل موجود تھی۔ وہ چیز بھی موجود تھی جس سے میں ڈرتا تھا۔ یعنی میری تصویر۔ مگر یہ تصویر ایسٹرن کنگ والے روپ میں تھی۔ لمبے جٹاؤں جیسے بال، لمبی داڑھی اور نہایت گھنی مونچھیں۔ مجھے اس تصویر سے کچھ زیادہ خطرہ نہیں تھا پھر بھی میں کمرے سے نہ نکلنے کو ترجیح دے رہا تھا۔

ہاؤس نمبر اٹھارہ کے ہولناک دھماکے کی خبروں کی نسبت سے ایک بیان شکیل داراب کا بھی چھپا تھا۔ اس نے میرا تذکرہ ایم ایم اے کے ایک بڑے چمپئن کی حیثیت سے کیا تھا اور میری بے وقت 'موت' پر افسوس کا اظہار بھی کیا تھا۔ اس نے کہا تھا بے شک شاہ زیب پر دہشت گردی کا ایک مقدمہ بنا...... مگر چونکہ یہ معاملہ عدالت میں ہے اس لیے وہ اس پر کوئی تبصرہ نہیں کرے گا۔

شکیل داراب نے یہ بھی کہا۔ "میں ذاتی حیثیت سے شاہ زیب کا بالکل فیئر ٹرائل چاہتا تھا اور اس کے چچا زاد ولید کو بھی قانونی معاونت فراہم کرنے کا حامی تھا۔ دیگر باتوں سے قطع نظر میں یہ سمجھتا ہوں کہ شاہ زیب نے غیر ملکی حملہ آوروں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور معروف فلم ٹی وی آرٹسٹ اروشا کو بھی جنونی قاتلوں سے بچانے کی اپنی سی کوشش کی۔ تاہم بہتر ہوتا کہ وہ اس سلسلے میں انتظامیہ کی مدد لیتا۔ چونکہ وہ پولیس کو مطلوب تھا لہٰذا وہ ایسا نہ کر سکا۔ اس نے دلیری سے لڑتے ہوئے جان دی ہے۔"

شکیل داراب دو چہرے والا شخص تھا اور اس کا یہ اخباری بیان اس امر کی تصدیق کرتا تھا۔اس نے میرے اور اپنے حوالے سے بہت سی باتیں چھپا رکھی تھیں۔

ہر گزرنے والی گھڑی کے ساتھ میرے ذہن میں یہ خیال پختہ ہوتا جا رہا تھا کہ اگر میں ''وفات'' پا چکا ہوں تو پھر مجھے ''مرحوم'' ہی رہنا چاہیے۔ کرنل ڈاکٹر احرار کا نام بھی میرے ذہن میں بار بار ایک روشن لکیر کی طرح چمک رہا تھا۔ یہ جدید دور تھا۔نئی تکنیکس کے تحت اب بہت کچھ حقیقی زندگی میں ممکن ہو چکا تھا۔

شام کو میں نے سوچا کہ خورسنہ سے ٹیلی فونک رابطہ کروں۔ وہ گیسٹ ہاؤس میں ہی مقیم تھی۔ پچھلے دو تین گھنٹے سے میں تذبذب میں تھا۔ جاماجی کے بہت سے دیگر لوگوں کی طرح میں اس کے لیے بھی ''ہیرو'' کی حیثیت رکھتا تھا۔ ایک ایسا سخت جان چمپئن جس نے امریکن ایجنسی کا ناقابلِ ٹارچر برداشت کر کے بھی اپنی زبان بند رکھی اور لوگوں کے نیم مردہ سینوں میں زندگی دوڑا دی۔ میں جانتا تھا کہ وہ میری بات دھیان سے سنے گی اور میں سجاول کے حوالے سے جو کچھ کہوں گا، وہ اسے اہمیت دے گی لیکن مسئلہ پھر وہی تھا۔ ابھی تک سجاول کے علاوہ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ میں ہاؤس نمبر اٹھارہ کے ہولناک بلاسٹ میں بچ گیا ہوں۔ سجاول تو باقاعدہ حلف اٹھا چکا تھا کہ اس نے یہ بات اپنے تک رکھی ہے مگر...... خورسنہ کے بارے میں کیا کہا جا سکتا تھا۔ بے شک وہ ایک دانا اور مضبوط خاتون تھی مگر بہت سے سوالات بھی موجود تھے......

بالآخر میں نے ارادہ ترک کر دیا اور مجھے یہی کرنا چاہیے تھا۔

اگلے روز صبح نیند سے جاگتے ہی تاجور کی صورت نگاہوں کے سامنے آ گئی۔ غالب گمان یہی تھا کہ وہ جلد یا بدیر میری 'موت' کی خبر سے آگاہ ہو جائے گی۔ اس کی کیفیت کا سوچ کر میرا دل کٹ سا گیا۔ میں جانتا تھا کہ اس کی تڑپ غیر معمولی ہو گی۔ دل چاہا ابھی پرانا نمبر آن کروں اور اسے بھی ویسا ہی ایک میسج بھیج دوں جیسا اپنے والدین کو بھیجا تھا لیکن یہ صرف خیال تھا۔ اس کو عملی جامہ پہنانا میرے لیے کسی صورت ممکن نہیں تھا۔

ٹی وی کھولا تو وہاں دو تین نیوز چینل پر ایک اور ہی طرح کی ہلچل نظر آئی۔ غیر متوقع طور پر یہ ہلچل میرے حوالے سے ہی تھی۔ ایک چینل نے ویڈیو لنک کے ذریعے جاماجی سے ایک جرنلسٹ کو آن لائن لیا ہوا تھا۔ گفتگو انگلش میں ہو رہی تھی۔

جرنلسٹ دل گرفتہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ''یہاں بہت سے لوگوں کو ابھی تک یقین نہیں ہے۔ وہ توقع کر رہے ہیں کہ شاید کوئی برعکس خبر آ جائے۔ آپ لوگ تصور نہیں کر سکتے کہ یہاں

اس جزیرے میں مسٹر شاہ زیب کی کیا حیثیت تھی۔ کل رات بھی بہت سے لوگ جاما جی کی سڑکوں پر نکل آئے اور اپنے غم زدہ جذبات کا اظہار کیا۔ کچھ زار و قطار رو رہے تھے۔"

اسٹوڈیو سے اینکر پرسن بولی۔" آپ نے ابھی ایک تصویر کا ذکر کیا ہے جو کچھ عرصہ پہلے ایک ٹارچر سیل سے لیک ہو کر خاص و عام میں مقبول ہوئی اور جس نے جزیرے میں ایک انقلابی فضا پیدا کی۔ کیا آپ وہ تصویر ہم سے شیئر کر سکتے ہیں؟"

اس شخص نے میری ٹمپریچر سیل والی تصویر کا ایک پوسٹر اٹھا کر اس پر محبت سے ہاتھ پھیرا اور پھر اسے کیمرے کے سامنے کر دیا۔

وہ نمناک آواز میں بولا۔" یہ چند ماہ پہلے عزت مآب ریان فردوس کے ساتھ یہاں پہنچے تھے۔ اگر ان کے بارے میں یہ کہا جائے کہ یہ آئے...... انہوں نے دیکھا اور چھا گئے تو غلط نہ ہوگا۔ یہ سوچ کر دل ہول جاتا ہے کہ یہ اب ہم میں نہیں رہے......"

سوجی سوجی آنکھوں والے ایک دوسرے ملائیشین نے پاکستانی اینکر سے پوچھا۔ " آپ کا کیا خیال ہے کہ ڈی این اے کی رپورٹ کب تک آجائے گی؟"

اینکر نے مصنوعی دل گرفتہ لہجے میں کہا۔"ہمیں جو اطلاعات مل رہی ہیں، ان کے مطابق مسٹر شاہ زیب کی 'موت' کی تصدیق ہو چکی ہے۔ ان کے لواحقین سے رابطہ کرنے کی بھرپور کوششیں جاری ہیں۔ ان کوششوں کا نتیجہ آنے کے بعد ہی "تجہیز و تکفین" کا مرحلہ آئے گا۔"

میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ میں یہاں اس درمیانے درجے کے ہوٹل میں بیٹھا دودھ پتی پی رہا تھا اور ادھر میری 'موت' کی تصدیق ہو چکی تھی۔ شاید کسی تابوت میں کچھ راکھ اور ناقابلِ شناخت ہڈیاں رکھ کر سرد خانے میں پہنچا دی گئی ہوں اور اوپر میرے نام کا اسٹیکر چسپاں کر دیا گیا ہو۔ پتا نہیں کتنے ڈی این اے اسی طرح سے انجام پا جاتے تھے۔ اب تو شاید میں خود بھی اعلان کرتا کہ میں بقیدِ حیات ہوں تو مجھ سے ٹھوس ثبوت مانگے جاتے۔ چلو اچھا ہے خس کم جہاں پاک...... میں نے دل ہی دل میں کہا۔

O......❖......O

اگلے قریباً دو دن بھی اسی غیر یقینی کیفیت میں گزرے۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے اچانک مجھے حاذق ذکری کا وہ خط یاد آیا جو جاما جی سے رخصت کے وقت انہوں نے مجھے دیا تھا اور دھیان سے پڑھنے کو کہا تھا۔ وہ خط ایک چھوٹی نوٹ بک اور چند رسیدوں سمیت سکھیرا گاؤں میں چودھری دین محمد کے ڈیرے پر ہی رہ گیا تھا۔ مجھے اس کا قلق ہوا۔ تاہم امید تھی کہ وہ محفوظ ہو

گا۔

میں اپنی آئندہ پلاننگ کو مسلسل ٹھوس شکل دے رہا تھا...... خورسنہ کا فون نمبر میرے پاس موجود تھا مگر اسے فون کرنا کسی طور ٹھیک نہیں تھا۔ میں سجاول کو فون کرتا رہا۔ اس کے سگنل ہی نہیں مل رہے تھے ایک دو بار بیل گئی لیکن فون اٹینڈ نہیں ہوا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سجاول اور خورسنہ کے معاملے کا اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔

یہ تیسرے روز شام کی بات ہے سجاول ایک بار پھر میرے کمرے میں وارد ہو گیا۔ اس کی شیو کچھ بڑھ گئی تھی۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ میں اس کا چہرہ دیکھ کر ہی جان گیا کہ وہ ابھی گیسٹ ہاؤس میں خورسنہ سے مل کر آیا ہے۔ شاید پھر کوئی بحث مباحثہ ہوا تھا۔ باہر لو چل رہی تھی۔ میں نے اسے ٹھنڈا پانی پلایا اور پنکھا تیز کر دیا۔ ''تمہارا بلڈ پریشر پھر ہائی لگ رہا ہے سجاول۔''

''کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اس سے تو بہتر تھا کہ وہ یہاں نہ ہی آتی۔ کم از کم پردہ تو رہتا، بھرم تو رہتا۔''

''اب کیا ہوا ہے؟''

''دیکھو شاہ زیب، میں بالکل اور طرح کا بندہ ہوں۔ لمبے روگ خود سے نہیں چمٹا سکتا۔ میں اس کے لیے بہت کچھ کھونے کو تیار ہوں مگر اسے بھی کچھ نہ کچھ تو کھونا ہی پڑے گا ورنہ......'' میں سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ فقرہ مکمل کرتے ہوئے بولا۔ ''ورنہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔''

عجیب مایوسی کے عالم میں اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے منہ سے الکحل کی باس آ رہی تھی۔ میں نے اس کے لیے شکنجبین منگوائی تا کہ اس کی طبیعت کچھ بحال ہو سکے۔ اس نے دو گھونٹ لے کر گلاس ایک طرف رکھ دیا اور آنکھیں پھر بند کر لیں۔ شاید وہ اونگھنے لگا تھا یوں لگا جیسے وہ اور خورسنہ پھر ایک دوسرے سے دور جا رہے ہیں۔ اچانک اس کے فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے چونک کر کال ریسیو کی۔ دوسری طرف خورسنہ ہی تھی۔ سجاول کے گندمی چہرے پر سرخی لہرا گئی۔ گہری سانس لے کر اس نے کال ریسیو کی اور بوجھل آواز میں بولا۔ ''ہیلو۔''

''ہیلو سجاول کہاں ہو؟''

''یہیں ایک دوست کے پاس۔'' سجاول نے کہا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر فون کا اسپیکر آن کر دیا۔

''تمہارے قریب کوئی ہے؟'' خورسنہ نے پوچھا۔سجاول نے اس کا جواب نفی میں دیا۔ دوسری طرف خاموشی طاری ہوگئی۔ایک گمبھیر سناٹا۔ایسا سناٹا جو کسی نہایت اہم بات سے پہلے سنائی دیتا ہے۔جو کسی طوفان......یا ہلچل کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔

''تو تمہاری یہی شرط ہے؟'' خورسنہ نے پوچھا۔

''شرط نہیں۔ایک درخواست تھی۔'' سجاول نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

''کوئی رعایت نہیں ہوسکتی؟'' خورسنہ نے دریافت کیا۔

وہ خاموش رہا۔

میں سمجھ گیا کہ یہ فیصلے کا لمحہ ہے۔خورسنہ حتمی بات کرنے والی ہے۔سجاول کو ہاں یا نہ کہنے والی ہے۔یہ بڑے تناؤ بھرے لمحے تھے۔

فون پر خاموشی تھی۔بس خورسنہ کی سانسوں کی مدھم آواز آرہی تھی۔سجاول بھی ہمہ تن گوش تھا۔آخر خورسنہ کی دھیمی آواز فون کے اسپیکر سے ابھری۔''اوکے سجاول! تمہاری خوشی میں میری خوشی ہے۔اگر تم یہی چاہتے ہو تو ٹھیک ہے، میں تمہیں......ناراض نہیں دیکھ سکتی۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے جیسے شرما کر فون بند کردیا......یا شاید گڑبڑا کر۔

سجاول کا چہرہ سرخ ہورہا تھا۔''سیالکوٹی، میدان مار لیا تم نے۔'' میں نے اسے کندھے سے پکڑ کر کہا اور کھینچ کر اسے اٹھنے پر مجبور کردیا۔ہم ایک دوسرے کے گلے ملے۔سجاول چٹانی چہرے کا مالک تھا۔اب بھی اس کا چہرہ تاثرات سے عاری تھا مگر اس کی آنکھوں میں جھانک کر اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے سینے کی گہرائی میں خوشی کی لہر ہے۔

○......❖......○

اس کے بعد جو کچھ ہوا، بڑی تیزی سے ہوا۔گھڑی کی سوئیوں کی رفتار جیسے ایک دم ہی تیز ہوگئی تھی۔جب ''میاں بیوی'' راضی تھے تو پھر راستے میں کوئی رکاوٹ ہی نہیں تھی۔خبروں سے خورسنہ پر بھی یہ جانکاہ انکشاف ہوگیا تھا کہ میں ایک حادثے میں ''چل بسا'' ہوں۔ سجاول نے نہایت طریقے اور رازداری کی کڑی شرط کے ساتھ خورسنہ کو بتادیا کہ یہ غلط خبر ہے اور میں زندہ سلامت لاہور میں موجود ہوں۔خورسنہ کے لیے یہ بڑی جاں فزا خبر تھی۔وہ فوراً مجھ سے ملنا چاہتی تھی مگر سجاول نے اسے بتایا کہ یہ ابھی ممکن نہیں ہے۔سجاول کے لیے یہ بالکل مشکل نہیں تھا کہ وہ نکاح کے لیے نکاح خواں اور چار گواہوں کا انتظام کرتا۔ایک وکیل اور دو وکیل کے تقرر کے گواہ خورسنہ کی طرف سے، جبکہ دو شادی کے گواہ۔

پلان یہی بنا کہ نکاح گیسٹ ہاؤس کے بجائے اسی ہوٹل میں کیا جائے جہاں میں ٹھہرا

ہوا ہوں اور نکاح کے بعد خورسنہ اور سجاول چند دن اسی ہوٹل میں گزاریں۔ اس غرض سے سجاول نے ہوٹل میں ایک کشادہ کمرا بک کرالیا تھا۔

نکاح سے صرف ایک دن پہلے گڑبڑ ہوگئی۔ ہوٹل کے منیجر نے سجاول کو ایک بیرے کے ذریعے اپنے کمرے میں بلوایا۔ میں بھی سجاول کے ساتھ ہی چلا گیا۔ یہ منیجر اس دومنزلہ ہوٹل میں بزنس پارٹنر بھی تھا۔ وہ پینتیس چالیس سال کا ایک خرانٹ سا شخص تھا۔ سرخ شرٹ کے نیچے سفید پینٹ پہنے اور اپنی فربہ توند کو بیلٹ میں کس کر میز کے عقب میں بیٹھا ہوا تھا، سامنے دو تین پرانے فون سیٹ، شان بڑھانے کے لیے رکھے ہوئے تھے۔ ہم میز کے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

منیجر کے رُوبرو ایک رجسٹر تھا۔ وہ سجاول کو سرتاپا دیکھتے ہوئے بولا۔ ''بھائی صاحب! بکنگ والا بتا رہا ہے کہ آپ نے میاں بیوی کے طور پر کمرا بک کرایا ہے؟''

''ہاں، کوئی اعتراض ہے؟'' سجاول نے پاٹ دار آواز میں کہا۔

سجاول کے انداز نے منیجر کے تیور کچھ اور بگاڑ دیئے۔ کہنے لگا۔ ''بیوی کہاں ہے آپ کی؟''

''وہ بھی آجائے گی۔ تمہیں پریشانی کیوں ہے؟''

''مجھے پریشانی اس لیے ہے جناب عالی کہ میں انگوٹھا نہیں چوستا یا فیڈر میں دودھ نہیں پیتا۔ بڑے پاپڑ بیلے ہوئے ہیں۔ ہم مشکوک لوگوں کو کمرا نہیں دیتے۔''

''کیا شک پڑ رہا ہے آپ کو؟'' میں نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

''مجھے لگتا ہے کہ آپ لوگ کسی چکر میں ہیں۔ آج کل ہوٹلوں میں نکاح نامہ بھی مانگا جارہا ہے یا پھر بیوی کے شناختی کارڈ پر خاوند کا نام ہو۔ کارڈ یا نکاح نامے کی کاپی ہے آپ کے پاس؟''

''اگر کاپی نہ ہو تو پھر؟'' سجاول کا موڈ بگڑ رہا تھا۔

''تو پھر میں سمجھوں گا کہ آپ لوگ کوئی ناجائز کام کر رہے ہو۔ کسی کے ماتھے پر کچھ نہیں لکھا ہوتا بھائی صاحب! ہوسکتا ہے کہ وہ عورت بھاگ کر آئی ہو۔''

میں نے دیکھا، سجاول کا پیمانہ صبر لبریز ہونے والا تھا۔ میں نے میز کے نیچے اس کا گھٹنا دبا کر اسے تحمل برتنے کا کہا اور منیجر سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ ''جناب کا نام؟''

''شہریار کہتے ہیں مجھے۔''

''تو شہریار بھائی! تم کافی سیانے بیانے لگتے ہو۔ ہر سیانے بندے کو پتا ہوتا ہے کہ

جب بالغ بندہ اور بندی راضی ہوں تو ان کے رشتے ناتے اور نکاح وغیرہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ یہاں بھی ایسا ہی ہے۔"

"یعنی نکاح ابھی ہوا نہیں ہے؟" شہریار تیکھے لہجے میں بولا۔

"اصل جوڑ تو آسمانوں پر ہوتا ہے، زبانی بول بھی کل تک پڑھے جائیں گے۔"

"زبردست...... زبردست۔" منیجر شہریار نے کہا۔ اس کے رخساروں کے نیچے موٹا گوشت تھا اور آنکھوں میں عیاری اور حرام خوری کی چمک بھی تھی۔

اس نے رجسٹر پر اپنا قلم چلا کر سجاول کی اور میری بکنگ کینسل کر دی۔ اس کے بعد سجاول کا دیا ہوا ایڈوانس بٹوے میں سے نکال کر میز پر دھرا اور بولا۔ "بڑا بڑا شکریہ...... اب تم لوگ جاسکتے ہو یہاں سے۔"

سجاول پھر بھڑکنے کے قریب تھا لیکن میں نے اسے سنبھال لیا۔ شہریار سے کہا۔ "یار، یہ کوئی غیر قانونی کام نہیں ہے، نہ ہی زبردستی ہے کسی سے...... بس کچھ مجبوریاں ہیں جن کی وجہ سے ہم یہاں ہوٹل میں ہیں اگر تم......"

"میرے پاس فالتو ٹائم نہیں ہے۔" اس نے بات کاٹی۔ "میں تم لوگوں کی بڑی عزت کر رہا ہوں، ورنہ ایسے معاملوں میں پولیس کو اطلاع دی جاتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "ذرا ایک منٹ علیحدہ ہو کر میری بات سن لو۔"

وہ بات سننے کو بھی تیار نہیں تھا مگر میں کسی نہ کسی طرح اسے بغلی کمرے میں لے گیا۔ یہ شاید اس کا ریٹائرنگ روم تھا۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے رام کرنے کی کوشش کی اور جب وہ ذرا نرم دکھائی دیا تو جیب سے ہزار ہزار کے بیس نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیئے۔ "یار! میری بات کا یقین کرنا۔ کوئی رسک نہیں ہے اس کام میں۔ پھر بھی ہمارے ساتھ تعاون کرنے کا "شکریہ" سمجھ کر رکھ لو۔"

نوٹ دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک آئی لیکن دوبارہ ہٹ دھرمی اور کمینگی عود کر آئی۔ وہ نفی میں سر ہلانے لگا۔ میں نے پانچ نوٹ مزید شامل کر کے زبردستی اس کی جیب میں ٹھونس دیئے۔

وہ لمبی سانس لے کر بولا۔ "کل ہوگا نکاح؟"

"امید یہی ہے۔"

"کمرے کب چھوڑو گے؟"

"زیادہ سے زیادہ پانچ چھ دن تک۔"

''نہیں، جمعرات تک خالی کرنے ہوں گے۔ میں اس سے زیادہ نہیں کر سکتا۔ میرا پارٹنر ایسے معاملات میں زیادہ سخت ہے۔''

''چلیں کوشش کرتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

دس منٹ بعد میں اور سجاول دوبارہ اپنے کمرے میں بیٹھے تھے۔ ''مجھے اس کمینے کی آنکھوں میں سوٗر کا بال نظر آتا ہے۔ کوئی گڑ بڑ نہ کر دے۔'' سجاول بولا۔

''ایسے لوگ بے ایمانی کا کام بڑی ایمانداری سے کرتے ہیں۔''

''پھر بھی ہمیں احتیاط کرنی چاہیے شاہی! میرا تو خیال تھا کہ یہ ہوٹل بدل لیتے۔''

''وہاں بھی تو یہی مسئلہ پیش آ سکتا ہے یار، ویسے میں نے ایک انتظام بھی کر دیا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''وہی جادو کا دانہ۔'' میں نے کہا اور اپنے سیل فون کو آن کر کے اس کے ''کی پیڈ'' سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔

چند ہی سیکنڈ کے بعد میرے فون کی اسکرین پر منیجر شہریار کے کمرے کا بے ڈھنگا منظر ابھرا۔ ٹیڑھے اینگل سے اس کی میز اور ایک صوفے کا آدھا حصہ دکھائی دے رہا تھا۔

''یہ کیمرا کب لگایا تم نے؟''

''جب وہ بک بک کر رہا تھا ہمارے ساتھ۔'' میں نے جواب دیا۔

اسپائی کیمرا تصویر تو ڈھنگ کی نہیں دے رہا تھا لیکن آوازیں، آہٹیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ کمرے میں کوئی لڑکی بھی موجود تھی، پھر لڑکی کی ٹانگیں اور منیجر صاحب کی ٹانگیں صوفے کے قریب دکھائی دیں۔ ٹانگوں کے اینگل سے پتا چلتا تھا کہ یہ لڑکی منیجر صاحب کی کوئی سہیلی ہے اور اس وقت باقاعدہ جناب کی آغوش میں بیٹھی ہے۔ اس نے شارٹ پہن رکھی تھی اور اس کی نصف پنڈلیاں بے لباس تھیں۔

شہریار کی آواز سنائی دی۔ ''باسٹرڈز۔ بڑے چالاک بن رہے ہیں۔ مجھے تو اس لمبے تڑنگے کا شناختی کارڈ بھی جعلی لگتا ہے۔''

''تو ''نادرا'' سے پتا کرا لو۔ وہاں تو تمہارا وہ افسر یار بھی ہے۔'' لڑکی کی کھنکتی ہوئی آواز آئی۔

''مجھے کیا ضرورت پڑی ہے۔ پولیس والے خود ہی بُرے کے گھر میں گھس جائیں گے۔''

''تو پولیس کو اطلاع دو گے؟''

''میرے خیال میں دینی چاہیے۔ مجھے یہ لمبا تڑنگا گڑبڑ لگ رہا ہے۔ لگتا ہے کہ اس کی صورت کہیں دیکھی ہوئی ہے۔ کوئی دبنگ قسم کی شے ہے یہ۔'' (یہ ذکر خیر سجاول کا تھا)

''اور دوسرا؟'' لڑکی نے پوچھا۔

''وہ بھی کوئی گھنی شے ہے۔ اس کا بازو بھی زخمی ہے۔ کیا پتا کوئی پھڈا شڈا کر کے آیا ہو۔ پر اس سے زیادہ مجھے اس تڑنگے کی فکر ہے۔ اس کے شناختی کارڈ پر نام محمد فاضل لکھا ہے۔ پر پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے کہ اس کا اصل نام کچھ اور ہے اور کسی اخبار میں...... یا کسی اور جگہ میں اس کی شکل بھی دیکھ چکا ہوں۔ بس کھوپڑی میں نہیں آ رہا۔''

لڑکی منیجر کی آغوش کو چھوڑ کر الماری کی طرف گئی اور اس کی ذرا سی جھلک نظر آئی۔ وہ تراشیدہ بالوں والی ایک پَر کٹی کبوتری تھی۔ کانوں میں چمکیلے جھمکے تھے۔ عین ممکن تھا کہ کوئی کال گرل ہو۔ ذرا فاصلے سے اس کی باریک آواز آئی۔ ''لیکن تم تو روپے بھی وصول کر چکے ہو ان سے۔''

''اوئے بھولی شہزادی! بیس پچیس ہزار کوئی شے نہیں۔ اس طرح کے لوگ جب پھنستے ہیں تو چار پانچ لاکھ بھی آرام سے ڈھیلے کر دیتے ہیں اور وجاہت رانا جیسا تھانے دار تو دگنے تگنے بھی نکلوا لیتا ہے۔''

''کوئی زبان بھی تو ہوتی ہے۔'' لڑکی نے شوخی سے کہا۔

''کسی خفیہ اطلاع پر چھاپا بھی تو پڑ سکتا ہے۔'' اس نے کمینگی بھرے لہجے میں جواب دیا۔

''تمہیں کیا ملے گا؟'' پَر کٹی کبوتری نے پوچھا۔

''کچھ نہ کچھ تو مل ہی جائے گا۔ شکار پھنسا کر دینا بھی تو کام رکھتا ہے۔''

''تو پھر سوچ کیا رہے ہو، لگاؤ فون۔''

''تو لاؤ فون۔'' شہریار کی پاٹ دار آواز آئی۔

میں نے اور سجاول نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور دونوں ہی سیڑھیاں اتر کر منیجر کے کمرے کی طرف لپکے۔ سجاول نے دھڑ دھڑ دروازہ بجایا۔

''کون ہے؟'' اندر سے کرخت آواز ابھری۔

''میں ہوں منیجر صاحب! ایک منٹ بات کرنا تھی۔'' میں سنبھلے لہجے میں بولا۔

چند سیکنڈ بعد دروازہ کھلا اور شہریار کی برہم صورت نظر آئی۔ ہم اندر چلے گئے۔ لڑکی کہیں نظر نہیں آئی۔ شہریار نے اسے عارضی طور پر بغلی کمرے میں بھیج دیا تھا۔ ہمیں اپنے کمرے

سے شہر یار کے دفتر تک پہنچنے میں دس سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ یقینی بات تھی کہ وہ ابھی فون والے ارادے پر عمل نہیں کر سکا تھا۔

میں نے دروازہ اندر سے بند کیا تو شہر یار کا منہ کھلا رہ گیا۔

''کیا بات ہے؟'' وہ ششدر ہو کر بولا۔

اس دوران میں سجاول بغلی دروازہ کھول کر اور لڑکی کو بالوں سے پکڑ کر کمرے میں لا چکا تھا۔ سجاول کے ہاتھ میں خوفناک نال والا ریوالور دیکھ کر لڑکی کی گھگھی بندھ گئی تھی۔ شہر یار بھی زرد نظر آ رہا تھا۔ یکا یک اس نے اپنی میز کی طرف ہاتھ بڑھایا جیسا کہ بعد میں پتا چلا وہ پستول نکالنا چاہتا تھا۔

سجاول نے لپک کر شہر یار کی کلائی تھام لی اور اسے بے دردی سے میز کے کنارے پر مارا۔ ہڈی ٹوٹنے کی آواز بڑی واضح تھی۔ لڑکی چلائی مگر آواز اتنی بلند نہیں تھی کہ باہر تک جا سکتی۔ شاید اس کا گلا خشک ہو چکا تھا اور آواز کو بلند ہونے کے لیے مناسب ''ماحول'' میسر نہیں آ سکا تھا۔

سجاول نے اپنا ریوالور اس کی گردن میں گھسیڑا اور پھنکارا۔ ''شور مچائے گی تو اسی جگہ فوت کر دوں گا۔''

کوئی ایسی بات تھی اس کے لہجے میں کہ لڑکی نے دہشت زدہ ہو کر اپنے ہونٹ بڑی مضبوطی سے بھینچ لیے۔ وہ دبلی پتلی تھی۔ یوں کانپنے لگی جیسے لرزے کا بخار چڑھا ہو۔

دوسری طرف چوڑے جبڑے والے منیجر شہر یار کو بھی ایسے سخت ردِ عمل کی توقع نہیں تھی۔ اس نے اپنی مضروب کلائی کو دوسرے ہاتھ میں تھام لیا تھا اور ایک کونے میں سمٹ گیا تھا، اس کی آنکھوں میں تکلیف آمیز خوف کا دریا بہنے لگا تھا۔

سجاول نے اس پر گندی گالیوں کی بوچھاڑ کی اور فون کا ریسیور اٹھا کر شہر یار کی طرف بڑھایا۔ ''لے کر فون اپنے ناجائز باپ کو۔ بتا اسے کہ شکار پھنسا لیا ہے میں نے لے پکڑ۔''

منیجر شہر یار کو اب سمجھ آ گئی تھی کہ اس کا پالا ایسے لوگوں سے پڑ گیا ہے جو اس سے کافی بھاری ہیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ سجاول نے ریسیور اس کے منہ پر مارا اور زہریلے انداز میں پچکار کر بولا۔ ''چل کر لے فون۔ اپنے پلپلے یار کو جو بتانا ہے وہ بتا بھی دے...... وعدہ کرتا ہوں تجھے کچھ نہیں کہوں گا۔ اور نہ روکوں گا۔ پر جن کو تو ابھی نئی سوزوکی گڈی کی خبر سنا رہا تھا ناں، انہیں آج رات تک قبرستان میں پہنچا دوں گا۔'' (ابھی تھوڑی دیر پہلے شہر یار نے فون پر چند فقرے اپنے بیوی بچے سے بھی بولے تھے اور انہیں نئی گاڑی

خریدنے کی خبر دی تھی)

شہریار دہشت زدہ اور ہکا بکا تھا۔ یقیناً اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس کمرے میں ہونے والی گفتگو ہم تک کیسے پہنچی ہے۔ وہ سجاول کی طرف دیکھ کر ہکلایا۔ ''مم...... مجھے لگتا ہے کہ میں نے...... تمہیں...... آ...... آپ کو کہیں دیکھا ہوا ہے۔''

''یہ ڈاکٹر صاحب ہیں۔'' میں نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ''جب تم جیسے ''مت ماہے'' بدمعاشوں کو طاقت اور پیسے کی بدہضمی ہوتی ہے تو ان کی ایک دو خوراکوں میں ہی ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر سجاول نام ہے ان کا۔ ڈاکٹر سجاول بی ایم پی پی۔ بی ایم پی پی کا مطلب ہے بندے مارو پیٹ پھاڑو۔'' میں نے منیجر کی توند کو انگلی سے زور کا ٹھوکا دیا۔

شہریار کی آنکھیں بے ساختہ پھیلتی چلی گئیں۔ اس کی چوڑی پیشانی پر سوچ کی لکیریں تھیں پھر یکا یک اس کا چہرہ اوپر تلے تین چار رنگ بدل گیا۔

وہ سجاول کی طرف انگلی اٹھا کر ہکلایا۔ ''سس...... سجاول نام ہے آپ کا۔ مجھے یاد آ گیا ہے...... یاد آ گیا ہے...... آ...... آپ کا تو بڑا نام ہے۔ آپ تو بادشاہ ہو جی۔ ہمارا آپ کا کیا جوڑ جی...... غلطی ہو گئی مجھ سے...... بڑی غلطی ہو گئی۔''

اس نے اپنی کلائی ضرور دوسرے ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی لیکن ان لمحوں میں وہ جیسے اپنی تکلیف بھی بھول گیا تھا۔

میرے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ وہ سجاول سیالکوٹی کو ایک خطرناک ڈکیت کی حیثیت سے جانتا تھا اور اب اسے پہچاننے کے بعد اسے اپنی سفید پتلون گیلی ہونے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ اپنے ''باس'' کی یہ حالت دیکھ کر لڑکی کی حالت اور بھی پتلی ہو گئی۔ وہ مسلسل روتی جا رہی تھی۔ سجاول نے اس کے ڈیانا کٹ بال چھوڑ دیئے اور وہ بے دم سی ہو کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس میں اب اتنا دم خم نہیں تھا کہ کسی بھی طرح کی مزاحمت کر سکتی۔

حیرت ہوئی کہ چند سیکنڈ بعد منیجر شہریار نے زمین پر بیٹھ کر باقاعدہ سجاول کے پاؤں پکڑ لیے۔ (ویسے اس کا ایک ہاتھ ٹوٹ کر جھول رہا تھا۔ وہ فقط ایک پاؤں ہی پکڑ سکا تھا)

''غلطی ہو گئی جی۔ میرے ماں باپ کی توبہ جو میں کسی کو اطلاع دوں۔ آپ جو کہیں گے، وہی ہو گا۔'' وہ گھگھیایا۔

''اور یہ تمہاری پر کٹی کبوتری؟'' میں نے لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ...... ایک لفظ بھی کسی سے بولے...... تو میں خود اسے جان سے مار دوں گا۔'' منیجر شہریار کی آواز لرز رہی تھی۔ لڑکی بھی شدومد سے نفی میں سر ہلانے لگی۔

ایک دو گھنٹے کے اندر کافی ''کایا کلپ'' ہوگئی۔ پہلے ہمارے پاس صرف دو کمرے تھے۔ منیجر شہریار کی ہدایت پر دو اور کمرے ہمارے سپرد کر دیئے گئے۔ شہریار نے کہا کہ چیک آؤٹ ٹائم کے بعد اوپر والا پورا پورشن ہمارے تصرف میں رہے گا اور ہم جس طرح چاہیں اسے استعمال کر سکتے ہیں۔ رشوت کے جو پچیس ہزار روپے اس نے مجھ سے وصول کیے تھے، وہ بھی ہاتھ جوڑ کر واپس کر دیئے۔

اس کی کلائی کی ایک ہڈی بچ گئی تھی۔ وہ صدر کے کسی ماہر پہلوان سے اپنا بازو بندھوا کر واپس آ گیا۔ ہوٹل میں یہی پتا چلا تھا کہ بڑے صاحب واش روم میں گر پڑے ہیں۔

اگلے روز منیجر شہریار کا اسسٹنٹ ایک بڑی سی گٹھڑی لے کر آیا۔ معلوم ہوا کہ اس گٹھڑی میں مسہری کا سامان ہے اور گلاب کی پتیاں وغیرہ ہیں۔ ایک کمرے کو باقاعدہ حجلۂ عروسی کی شکل دے دی گئی۔ یہ فرسٹ فلور کا سب سے کشادہ اور اچھا کمرا تھا، نکاح خواں اور گواہوں کا انتظام کل شام ہی ہو چکا تھا۔ شہریار نے بناؤ سنگھار والی دو لڑکیوں کو ایک پارلر سے منگوا رکھا تھا۔ یہ معاوضہ لے کر بناؤ سنگھار کرنے والی لڑکیاں تھیں۔ انہیں کچھ غرض نہیں تھی کہ کس کی شادی کس کے ساتھ کیوں ہو رہی ہے۔ اخراجات کے لیے مجھے بھی کیش کی ضرورت تھی۔ اس سے پہلے میں نے سجاول سے چالیس ہزار روپیہ ادھار لیا تھا۔ ماضی قریب میں، میں نے ایم ایم اے کی فائٹس میں کافی ڈالرز کما رکھے تھے، یہ رقم ڈنمارک میں میرے ایک قریبی راز دار دوست کے پاس تھی، میں بینک کے ذریعے تو منتقل نہیں کرا سکتا تھا، مجبوراً ہنڈی کے ذریعے معقول رقم منگوالی تھی......

شام سے تھوڑی دیر پہلے خورسنہ ایک بڑی چادر میں لپٹی لپٹائی اسٹیشن کے اس قریبی ہوٹل میں پہنچ گئی۔ عروسی جوڑے کے علاوہ تین چار مزید جوڑوں، جیولری اور جوتوں وغیرہ کا انتظام سجاول نے دو دن پہلے ہی کر لیا تھا۔ خورسنہ کی ضرورت کی بیشتر اشیاء عروسی کمرے میں موجود کر دی گئی تھیں۔ خورسنہ ایک بڑے اٹیچی کیس میں اپنا سامان بھی برونائی سے لے کر آئی ہوئی تھی۔ یہ سامان بھی ایک دن پہلے ہی ہوٹل میں پہنچ گیا تھا اور سیٹ کر دیا گیا تھا۔

منیجر شہریار بڑا جہاندیدہ اور موقع شناس بندہ لگتا تھا۔ وہ بڑی راز داری اور اپنائیت کے ساتھ سجاول کی ہر ضرورت پوری کر رہا تھا۔ میں اس سارے معاملے میں پیش پیش نہیں تھا۔ میرا زیادہ وقت کمرے میں بندرہ کر گزر رہا تھا۔

شام کو نکاح سے کوئی دو گھنٹے پہلے خورسنہ میرے کمرے میں آئی وہ بولی۔ ''میں خوش قسمت ہوں کہ اس بات سے آگاہ ہوں...... کہ آپ زندہ سلامت ہیں۔ ورنہ شاید اس وقت

میں بھی جاماجی کے بے شمار لوگوں کی طرح آپ کے غم میں آنسو بہا رہی ہوتی۔"

"مجھے امید ہے خورسنہ کہ یہ راز ہم تینوں کے درمیان ہی رہے گا۔ میرے بے حد قریبی لوگ جن میں انیق بھی شامل ہے، اس بھید سے بے خبر ہیں۔"

"آپ بے فکر رہیں۔ میں اس معاملے کی نزاکت اور سنگینی کو بہت اچھی طرح سمجھ رہی ہوں۔ مجھے سولی پر لٹکا دیا جائے تو بھی اس معاملے میں زبان نہیں کھولوں گی۔"

"بہت شکریہ خورسنہ۔"

"آپ کے ہم پر بہت احسان ہیں۔ آپ کے لیے تو جان بھی حاضر ہے۔" اس نے جیسے تہ دل سے کہا پھر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولی۔ "میں یہاں اس لیے نہیں آئی تھی کہ سجاول سے شادی کرلوں۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ سجاول جاماجی سے دکھی ہو کر واپس گیا ہے۔ میں اس سے ملنا چاہتی تھی۔ اسے بتانا چاہتی تھی کہ یہ دوری عارضی ہے۔ ہم آگے چل کر مل بھی سکتے ہیں لیکن یہاں آ کر سب کچھ ہی بدل گیا۔ میں نے دیکھا کہ سجاول میرے اندازوں سے کہیں زیادہ ڈسٹرب ہے۔ وہ اتنا بکھرا ہوا تھا کہ مجھے ڈر لگنے لگا......"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو خورسنہ! وہ تمہاری محبت میں بہت دور تک چلا گیا ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اتنا بدل سکتا ہے۔ جاماجی سے آنے کے بعد وہ اٹھتے بیٹھتے تمہیں اور ذیشان کو یاد کرتا رہا ہے۔ مجھے لگتا تھا کہ وہ ٹوٹ پھوٹ کر رہ جائے گا۔ تم نے جو فیصلہ کیا ہے خورسنہ! میں اس سے پوری طرح اتفاق کرتا ہوں۔"

اس کے چہرے پر ہلکی سی سرخی لہرائی۔ "یہ میرا نہیں سجاول کا فیصلہ ہے۔ میں نے تو بس اس کے فیصلے پر سر تسلیم خم کیا ہے۔"

"مجھے پورا یقین ہے، تم دونوں خوش رہو گے۔"

وہ ذرا توقف سے بولی۔ "آپ تو سجاول کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں، آپ مجھے بتائیں، مجھے اس سے ڈر کیوں لگتا ہے؟"

"کس طرح کا ڈر؟" میں نے پوچھا۔

"شاید...... مجھے خود بھی پتا نہیں، ہوسکتا ہے کہ یہ اس بات کا ڈر ہو کہ وہ بہت غصے والا ہے، بہت اکھڑ اور کڑوا ہے۔"

"مجھے یقین ہے کہ محبت ساری کڑواہٹیں ختم کر دیتی ہے۔ یہ تو تم بھی جان ہی چکی ہو گی کہ سجاول دوسروں سے بہت مختلف ہے۔ میں ماضی کے حوالے سے اس کی صفائیاں پیش کرنا نہیں چاہتا۔ میں صرف ماضی قریب اور حال کی بات کرنا چاہتا ہوں۔ خورسنہ! تمہاری

محبت ایک طوفان کی طرح اس کی زندگی میں آئی ہے اور اس نے اسے بنیادوں سے ہلا ڈالا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اس کی زندگی کی پرانی عمارت ڈھے گئی ہے اور اب ایک نئی تعمیر ہو رہی ہے۔"

"آپ اس کے غصے اور اکھڑپن کے بارے میں کیا کہیں گے؟" وہ بولی۔

"تم اس کے غصے پر نہ جاؤ خورسنہ، اس کا مزاج فولادی ہے، پر دل سونے کا ہے۔ اس کا تھوڑا بہت تجربہ تمہیں جاماجی میں بھی ہو گیا ہو گا۔ وہ سین تو میں نے بھی دیکھا تھا جب تمہیں اور چھوٹے ذیشان کو بپھرے ہوئے گرے فوجیوں اور ایجنسی والوں سے بچانے کے لیے وہ بے دریغ ان پر جھپٹ پڑا تھا۔"

"ہاں...... وہ سب کچھ تو میرے دل پر نقش ہے۔" اس نے ہولے سے کہا پھر چند لمحے خاموش رہنے کے بعد مسکرائی اور بولی۔ "ویسے اس کے غصے سے مجھے خود اپنے لیے اتنا ڈر نہیں آتا جتنا دوسروں کے لیے آتا ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ جو کوئی اس کی مرضی کے خلاف چلے گا، وہ اس پر جھپٹ پڑے گا اور مارنا شروع کر دے گا۔"

"میں نے کہا ہے ناں خورسنہ! وہ بڑی تیزی سے تبدیل ہوا ہے اور مزید ہو رہا ہے۔ میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ تمہاری اور ذیشان کی محبت اسے ایک بدلا ہوا شخص بنا دے گی۔ بس تمہیں تھوڑا سا وقت دینا ہے اسے۔"

وہ بولی۔ "میری ایک خواہش ہے شاہ زیب صاحب۔"

"ہاں کہو۔"

"کیا اس نکاح میں آپ میرے لیے سرپرست کا کردار ادا کر سکتے ہیں؟ اگر ایسا ہو جائے...... تو یہ میرے لیے بڑی خوش نصیبی کی بات ہو گی۔ اس نکاح میں میرا کوئی چھوٹا بڑا شریک نہیں ہے۔ آپ کے ہونے سے مجھے یوں لگے گا جیسے کوئی کمی نہیں رہی۔"

میں سمجھ رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے، میں نے کہا۔ "خورسنہ! مجھے اس میں کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا تھا مگر تم موجودہ صورتِ حال کو جانتی ہو۔ اگر میں نکاح نامے پر ولی یا سرپرست کی حیثیت سے نام دوں گا اور دستخط کروں گا تو یہ میرے تاحال زندہ ہونے کا ایک ثبوت بن جائے گا۔"

بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور اس کے چہرے پر مایوسی کا رنگ لہرا گیا۔

میں نے اسے تسلی دی۔ "خورسنہ! کاغذ پر لکھے ہوئے لفظ تو خانہ پری کی ضرورت کے

تحت ہوتے ہیں۔ اصل بات تو دل کی ہوتی ہے اور دل سے نکلے بولوں کی ہوتی ہے اور میں تمہاری بات کو دل سے قبول کرتا ہوں۔ نکاح کے فارم میں میرا نام نہ ہونے کے باوجود میں تمہاری طرف سے اس نکاح میں شریک ہوں گا۔"

"شکریہ شاہ زیب صاحب۔" اس نے کہا۔

اٹھنے سے پہلے اس نے ایک غیر متوقع حرکت کی۔ میرے کندھوں پر اجرک ٹائپ کی ایک چادر تھی۔ اس نے آگے جھک کر چادر کا پلو تھاما اور اسے بوسہ دیا۔

"ارے یہ کیا کرتی ہو؟" میں نے اسے ٹوکا۔

وہ آنکھوں میں ہلکی سی نمی لے کر واپس چلی گئی۔ اس نے جاماجی کے مقامی رواج کے مطابق عزت افزائی کے لیے میری چادر کو چوما تھا۔

یہ وہی باتیں تھیں جو میرے دل و دماغ پر بوجھ ڈالتی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ میں کتنے پانی میں ہوں۔ بے شک میں ایک فائٹر تھا مگر سیاست، جنگ اور جہاں بانی کا مجھے کیا تجربہ تھا۔ جاماجی میں جو کچھ ہوا، بس آپوں آپ ہی ہو گیا تھا۔ لوگوں کے اندر پہلے سے ایک زبردست ابال موجود تھا جسے غیظ و غضب کی صورت پھٹ پڑنے کے لیے کسی بہانے کی ضرورت تھی اور یہ بہانہ انہیں میری اور میرے ساتھیوں کی صورت میں مل گیا تھا۔

شام کو سجاول سیالکوٹی اور جاماجی کی خوش رنگ مہ جبیں خورسنہ کا نکاح بخیر و خوبی ہو گیا۔ میں حتی الامکان الگ تھلگ رہنا چاہتا تھا اس لیے عین نکاح کے وقت چند منٹوں کے لیے اپنے کمرے سے باہر نکلا اور وہ بھی سندھی ٹوپی، اجرک اور ہلکے رنگ کی کمانی دار عینک کے ساتھ۔

اس نکاح میں سجاول نے اپنی طرف سے بھی کسی کو شریک نہیں کیا تھا۔ یہاں تک کہ والدہ کو بھی نہیں۔ منیجر شہریار، جو شاید عام حالات میں ناک پر مکھی بھی نہیں بیٹھنے دیتا ہوگا، نکاح کے دوران میں سرگرم نظر آ رہا تھا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ جو ہونا ہے، وہ تو ہونا ہی ہے تو پھر کیوں نا وہ اس حوالے سے سجاول جیسے دبنگ کی خوشنودی حاصل کرے۔

میں نے اگلے روز سہ پہر سے کچھ دیر پہلے خورسنہ کو دیکھا۔ وہ پاکستانی دلہنوں کی طرح بہت زیادہ شرمالجا تو نہیں رہی تھی مگر اس نے لباس پاکستانی ہی پہن رکھا تھا۔ فیروزی رنگ کا کڑھائی دار شلوار کرتہ تھا اور مہندی، جیولری وغیرہ بھی دکھائی دے رہی تھی، ایک شوخی آمیز حیا نے اس کے دلکش چہرے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ مجبوری تھی، میں نے شادی کا تحفہ اسے کیش کی صورت میں دیا جسے اس نے نہایت خوش دلی سے قبول کیا۔ ہم نے بند کمرے میں ایک

پُرتکلف کھانا کھایا اور اِدھر اُدھر کی باتیں بھی کرتے رہے۔ اپنے بچے ذیشان کے ذکر پر وہ تھوڑی سی اداس ہوگئی تھی۔ خوشی کی ان گھڑیوں میں بھی وہ اس کی دوری محسوس کررہی تھی۔

میں نے سجاول سے کہا۔ ''بھابی کی بات ذیشان سے ہو نہیں سکتی؟''

''ہاں، میں کوشش کررہا ہوں۔ ذیشان وہاں اپنے ماموں کے پاس ہے۔ ماموں کا فون نمبر تو خورسنہ کے پاس موجود ہے، ہم رات کو بھی کوشش کرتے رہے ہیں لیکن رابطہ نہیں ہوا۔ امید ہے آج ہو جائے گا۔''

''تو پھر کرو ناں رابطہ...... دیکھو کتنا سا منہ نکل آیا ہے۔'' میں نے خورسنہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ ہولے سے مسکرائی۔ ''دراصل زور کی بھوک لگ رہی تھی۔ اب کھانا کھایا ہے تو منہ پر بھی رونق آجائے گی۔ وہ جاماجی میں ایک کہاوت ہے، اچھا کھانا، چہرے پر چمکتا ہے۔''

ٹی وی آن تھا۔ خبروں کے درمیان آنے والی ایک خبر نے ہمیں اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ نیوز کاسٹر نے اپنی روٹین کے مطابق ہیجان خیز لہجے میں کہا۔ ''ہم آپ کو یہاں ایک اہم خبر دے رہے ہیں۔ لاہور میں کالج روڈ پر نالے کے پاس سے ایک شخص کی تشدد زدہ لاش ملی ہے۔ مرنے والے پر کیا جانے والا تشدد لرزہ خیز ہے۔ اس کے زندہ جسم سے گوشت کے ٹکڑے کاٹے گئے ہیں...... اور شاید اس کے دونوں پاؤں بھی جیتے جی اس کے جسم سے علیحدہ کیے گئے ہیں۔ خدشہ ظاہر کیا جارہا ہے کہ اس ہولناک قتل کے پیچھے وہی غیر ملکی ہیں جنہوں نے اس سے پہلے بیس شہریوں کو گولیوں سے چھلنی کیا۔ ہم نے اپنے نمائندے سے رابطہ کیا ہے۔ ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ ان کے پاس اس حوالے سے کیا معلومات ہیں؟''

فیلڈ رپورٹر سے رابطہ ہوگیا۔ اس نے کہا۔ ''جی میں اس اسپتال کے باہر کھڑا ہوں جہاں مقتول کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے لائی گئی ہے۔ اس شخص کا نام تاری بتایا جارہا ہے اور یہ بھی کہا جارہا ہے کہ اس کا تعلق کسی نہ کسی طور داؤد بھاؤ کے گروپ سے رہا ہے۔''

اسٹوڈیو میں موجود نیوز کاسٹر نے کہا۔ ''اگر ایسا ہے تو پھر یہ سوچا جاسکتا ہے کہ لاہور میں موجود غیر ملکی گھس بیٹھوں نے ابھی تک شاہ زیب وغیرہ کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ عین ممکن ہے کہ اب وہ شاہ زیب کے قریبی ساتھیوں مثلاً انیق اور مختار وغیرہ کو تلاش کررہے ہوں۔''

''بالکل جی، یہ ممکن ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ابھی انہیں شاہ زیب کی طرف سے بھی پوری تسلی نہ ہوئی ہو۔ وہ اپنا یہ شک رفع کرنا چاہتے ہوں کہ کہیں شاہ زیب اس دھماکے میں

''سروائیو'' تو نہیں کر گیا۔''
''لیکن اب تو دھماکے میں مرنے والے بیشتر افراد کی ڈی این اے رپورٹ بھی آ چکی ہے، جن میں معروف اداکارہ اروشا اور شاہ زیب بھی شامل ہیں۔''
''جی کچھ حلقے ایسے بھی ہیں جو اس رپورٹ کو بہت زیادہ وزن نہیں دے رہے۔ دھماکا اور دھماکے کے بعد لگنے والی آگ اتنی شدید تھی کہ بہت کچھ راکھ کا ڈھیر بن گیا تھا۔ ایسے حالات میں شکوک کا اظہار تو ہمیشہ کیا ہی جاتا ہے۔''
نیوز کاسٹر نے کہا۔ ''یہ بھی خبر آئی ہے کہ ایک معروف مقامی ہوٹل میں بھی کل رات کچھ نامعلوم افراد داخل ہوئے اور انہوں نے اسسٹنٹ منیجر کے ساتھ سخت بدتمیزی کی اور اس سے شاہ زیب اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہیں؟''
''جی ہاں، صرف بدتمیزی ہی نہیں کی گئی بلکہ اسسٹنٹ منیجر کو زدوکوب بھی کیا گیا۔ یہ وہی ہوٹل ہے جہاں شاہ زیب اور انیق قیام پذیر تھے اور جہاں سے غیر ملکیوں نے انہیں پہلی بار ٹریس کیا تھا۔''
آدھی اسکرین پر ہاؤس نمبر 18 کا ویڈیو کلپ دکھایا جا رہا تھا۔ یہاں روڈ بلاکر لگے ہوئے تھے اور خاردار تار کے چھلوں سے عمارت کے گرد حصار قائم کیا گیا تھا۔ صبح ایک خبر میں بتایا جا چکا تھا کہ دھماکے کے بعد سے عمارت کا مالک سابق قونصلیٹ روپوش ہے۔ پولیس اسے تلاش کر رہی ہے اور اس کے لنکس ڈھونڈ رہی ہے۔
نیوز کاسٹر نے اپنا رخ کیمرے کی طرف کرتے ہوئے کہا۔ ''تو ناظرین! یہ ساری صورتِ حال مزید خطرات کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ واضح مطلب یہی ہے کہ ٹیکساری گینگ کے وہ عالمی شہرت یافتہ قاتل ابھی یہیں پر موجود ہیں۔ ابھی وہ اپنی ''خونی کارکردگی'' سے پوری طرح مطمئن نہیں۔ ہماری انتظامیہ کو پوری طرح چوکس رہنے کی ضرورت ہے۔''
نیوز ختم ہوئیں اور اشتہارات شروع ہو گئے۔ ہم تینوں کچھ دیر اس موضوع پر گفتگو کرتے رہے۔ سجاول اور خورسنہ کی رائے بھی یہی تھی کہ ابھی مجھے مکمل طور پر روپوش رہنا چاہیے اور کوئی چھوٹے سے چھوٹا رسک بھی نہیں لینا چاہیے۔ عین ممکن تھا کہ چند دن بعد وہ لوگ میری ''موت'' کی طرف سے مکمل طور پر مطمئن ہو جاتے۔
خورسنہ جلد از جلد اپنے ماموں زاد سے رابطہ کر کے اپنے بچے سے بات کرنا چاہتی تھی۔ وہ سیل فون کے ساتھ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں اور سجاول موجودہ صورتِ حال کے حوالے سے بات کرنے لگے۔ میں نے کہا۔ ''سجاول، مجھے انیق کی طرف سے فکر ہے، کہیں

وہ ان کے ہتھے نہ چڑھ جائے۔''

''وہ جتنا زمین کے اوپر ہے، اتنا ہی نیچے بھی ہے۔ آسانی سے ہاتھ نہیں آئے گا اور آ بھی گیا تو رونی صورت بنا کر اور پاؤں کو ہاتھ شاتھ لگا کر بچ جائے گا۔'' سجاول نے قدرے بیزاری سے کہا۔

''نہیں سجاول! میں چاہتا ہوں کہ تم فون پر اس سے رابطہ کرو۔''

''اور بتا دوں کہ تم یہاں خیر خیریت سے موجود ہو اور ابھی کڑاہی گوشت کھا کر فارغ ہوئے ہو۔''

''نہیں، یہ بات تو بس اب ہم تینوں کے درمیان ہی رہنی چاہیے۔ تم اس کی خیر خیریت پوچھو اور اسے ہوشیار کرو کہ ڈیتھ گینگ اسے ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔''

اس حوالے سے میرے اور سجاول کے درمیان کافی بحث ہوئی، آخر وہ فون کرنے پر رضامند ہو گیا۔ لیکن ہوٹل کے اندر سے فون کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ سیل فون کی لوکیشن ٹریس ہو سکتی تھی۔ ضرورت تھی کہ سجاول اپنی جیپ پر بیٹھ کر ہوٹل سے دور جائے اور بات کرے۔

سجاول کوئی ایک گھنٹے بعد واپس آیا۔ اس نے بتایا کہ انیق سے بات ہو گئی ہے۔

''کیا کہا اس نے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ تمہارا انکو بہت بڑا ڈرامے باز ہے۔ اس کو تو فلموں، ڈراموں میں بھرتی ہو جانا چاہیے۔ تمہارے لیے خود کو اتنا دکھی ظاہر کر رہا تھا جیسے تم نے اس کے پیٹ سے جنم لیا ہے۔ دوسروں کی طرح وہ بھی تمہیں روپے میں سے نوے پیسے تو ''فوت'' کر ہی چکا ہے۔''

''کہاں ہے وہ؟''

''اتنا بھولا نہیں ہے کہ بتا دیتا۔ بیٹھا ہو گا کہیں چھپ کر۔ ویسے مجھے لگتا ہے کہ لاہور میں ہی ہے۔''

''تاجور یا کسی اور سے رابطہ تو نہیں ہوا اس کا؟''

''وہ الٹا مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ تاجور کو اس واقعے کی خبر ہوئی ہے یا نہیں۔''

''تم نے کہا کہ گینگ والے اسے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں؟''

''ڈرایا تو بڑا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ نکو شہزادے، اگر تم ان کے ہاتھ آ گئے تو اگلی پچھلی کسر نکال دیں گے۔ بڑے وحشی لوگ ہیں، بندے کا قیمہ بنا دیتے ہیں اور پاؤں کی طرف سے شروع کرتے ہیں۔''

''خیر، وہ ڈرنے والا تو نہیں ہے سجاول! اس کا تجربہ تم بھی جاماجی میں کر چکے ہو اور اصل میں اس کی یہی دلیری مجھے ڈرا رہی ہے۔''

میں نے اسے چنگی طرح سمجھا دیا ہے یار! بے فکر رہو۔ اب اس نے اتنی بھی جان تلی پر نہیں رکھی ہوئی کہ سیدھا موت کے کھوہ میں چھال مار دے۔'' سجاول نے پھر بیزار لہجے میں کہا۔

''تم جب بھی اس کے بارے میں بولتے ہو، تمہارے منہ سے انگارے ہی نکلتے ہیں۔''

''اور وہ بھی میرے بارے میں اپنے منہ سے جو پھول جھاڑتا ہے، وہ میں چنگی طرح جانتا ہوں۔'' سجاول کے لہجے میں بدستور بیزاری تھی۔

میں نے موضوع بدل دیا۔ اسے نارمل ہونے میں کچھ دیر لگی۔ میں نے کہا۔ ''سجاول! موجودہ صورتِ حال میں تمہارا کیا مشورہ ہے؟ تم نے دیکھ ہی لیا ہے۔ وہ اب بھی لاہور میں ہیں اور ہر جگہ مجھے ڈھونڈ رہے ہیں۔ یہ بھی کوئی بڑی بات نہیں کہ وہ چاند گڑھی اور سکھیرا گاؤں بھی معلومات حاصل کریں۔''

''تمہارا مطلب ہے وہ خود وہاں پہنچ جائیں گے؟''

''نہیں، لیکن مقامی بدمعاشوں سے بھی تو ان کے رابطے ہیں۔ وہ ان کے ذریعے کھوج لگا سکتے ہیں اور اپنی تسلی کر سکتے ہیں۔''

''ایسے حالات میں تو چنگا یہی ہے کہ تم کچھ دیر کے لیے غائب ہی رہو۔ میرا مطلب ہے کہ دو چار مہینوں کے لیے دائیں بائیں ہو جاؤ۔ سب سے اچھا یہی ہے کہ ڈیرے پر چلے جاؤ۔ وہاں فیض محمد تمہارے رہنے سہنے کا سارا انتظام کر دے گا۔''

''میرے دل میں بار بار ایک خیال آ رہا ہے سجاول! کرنل احرار کا تو تمہیں پتا ہی ہے ناں جو جاماجی سے ہمارے ساتھ یہاں آئے تھے؟''

''ہاں، ہاں، سنا ہے بڑا قابل ڈاکٹر ہے۔''

''لیکن وہ عام ڈاکٹر نہیں ہے۔ بہت بڑا پلاسٹک سرجن ہے۔ جن لوگوں کے چہرے کسی حادثے میں بگڑ جاتے ہیں یا جل جاتے ہیں، وہ ان کی ایسی شاندار مرمت کرتا ہے کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے ہیں۔ میں نے وہاں ایک فوجی لڑکی کو دیکھا تھا۔ وہ لیفٹیننٹ تھی اور ایک جنگی مشق کے دوران میں اس کا چہرہ اور گردن بری طرح جھلس گئے تھے۔ اب اس کے چہرے کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ وہی لڑکی ہے اور ایسی کئی اور مثالیں بھی ہیں۔''

سجاول نے ذرا تعجب سے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''تو تم بھی اپنا چہرہ بدلنا چاہتے ہو؟''

''نہیں......لیکن چہرے پر کچھ ایسی چھوٹی موٹی تبدیلیاں تو ہو ہی سکتی ہیں جن کی وجہ سے مجھے آسانی سے پہچانا نہ جا سکے۔''

''یہ تو وہی فلموں والی بات لگتی ہے۔''

''لیکن اس دور میں یہ ناممکن نہیں رہا۔ یہ کام اتنی صفائی اور مہارت سے ہوتا ہے کہ مصنوعی تبدیلی کا شبہ تک نہیں ہوتا۔ شوبز اور دیگر شعبوں کے کئی مشہور لوگ ہیں جنہوں نے اپنے چہروں پر من پسند تبدیلیاں کروائی ہیں۔ کسی نے موٹی ناک کو پتلا کیا ہے۔ کسی نے اپنے ہونٹوں کو بدلا ہے۔ کہیں آنکھیں چھوٹی بڑی کروائی گئی ہیں اور یہاں شوق کا معاملہ تو نہیں ہے، یہ تو ایک بہت بڑی مجبوری ہے۔''

''تمہارا کیا مطلب ہے۔ تم اپنے چہرے کو بدل کر آؤ گے تو میں تمہیں پہچان نہیں سکوں گا؟ تمہارا قد کاٹھ تو وہی رہے گا......اور تمہاری آواز......تمہاری آنکھیں......؟''

''آنکھیں بھی بڑی حد تک بدل جاتی ہیں۔ جہاں تک آواز کی بات ہے، اس کو بدلا جا سکتا ہے بلکہ جدید سائنس میں تو یہ بھی ممکن ہو گیا ہے کہ آپ اگر کسی خاص بندے کی آواز میں بولنا چاہیں تو ایسا کر سکتے ہیں لیکن ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔''

سجاول نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے اور بولا۔ ''یار! سچی گل تو یہ ہے کہ یہ سب کچھ میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ تمہارا کیا مطلب ہے کہ تم اپنے چہرے کی مرمت کرا کے تاجور کے پاس جاؤ گے تو وہ یہ سمجھتی رہے گی کہ تم کوئی اور ہو؟''

''نہیں، جو لوگ آپ کو بہت قریب سے جانتے ہیں تو وہ ضرور شک میں پڑ جاتے ہیں، یا کم از کم الجھن میں آ جاتے ہیں لیکن جن سے آپ کی سرسری جان پہچان ہوتی ہے، وہ سو فیصد دھوکا کھا جاتے ہیں پھر اس میں یہ بات بھی ہوتی ہے کہ چہرے کی تبدیلی کس حد تک ہوئی ہے اور کتنی مہارت سے کی گئی ہے۔''

''کم از کم میں تو تمہیں اس بارے میں کوئی مشورہ نہیں دے سکتا۔ میں تو یہی کہوں گا کہ میرے پر چلے جاؤ اور......''

''دیکھو، میں بھی ابھی یقین سے کچھ نہیں کہہ رہا۔ کرنل احرار سے ملنے اور مکمل مشورہ کرنے کے بعد ہی کوئی رائے قائم کی جا سکتی ہے۔''

''تو پھر منہ سر لپیٹ کر نکل جاؤ......اور مل لو ڈاکٹر سے۔ لیکن تمہیں پتا ہے کہ وہ کہاں

ہیں؟"

"ان کا فون نمبر ہے میرے پاس۔"

"تو کرلو فون۔"

"نہیں فون میں نہیں کروں گا فون تم کرو......اور اپنے نمبر سے کرو۔"

صلاح مشورے کے بعد سجاول نے اپنے نمبر سے کال ملائی۔ کچھ دیر بیل جاتی رہی مگر رابطہ نہیں ہو سکا۔ شاید فون "سائیلنٹ" پر تھا یا ویسے ہی نامعلوم نمبر دیکھ کر کرنل صاحب نے کال ریسیو نہیں کی تھی۔ دو تین بار ٹرائی کرنے کے بعد ہم نے یہ کوشش وقتی طور پر ترک کر دی۔

میں نے سجاول سے پوچھا۔ "انیق سے اور کیا بات ہوئی؟"

"باتیں تو بہت سی کر رہا تھا، اب یاد بھی نہیں رہیں۔ یہ بھی بتا رہا تھا کہ منگل کے روز ڈی سی کے دفتر کی طرف سے لکڑی کا ایک تابوت ملا تھا اور بتایا گیا تھا کہ اس میں شاہ زیب کی میت ہے، یعنی وہی راکھ شاکھ۔ بعد میں اس تابوت کو مراد پور کے قبرستان میں ہی دفنا دیا گیا۔ تمہارے چاچے کے بیٹے ولید کو پیرول پر رہا کیا گیا تھا......وہ بھی سیدھا مراد پور پہنچ گیا تھا......اور ہاں تمہارا چاچا بھی تمہارے "جنازے" میں پہنچا تھا......"

"یعنی چچا حفیظ؟"

"ہاں، اس کو اخبار یا ٹی وی سے پتا چل گیا ہو گا۔ پر یہاں نکو شہزادے نے ایک عقلمندی کی۔ وہ تمہارے چاچے کو قبرستان سے ہی لے کر غائب ہو گیا۔ اب تمہارا چاچا اس کے پاس ہی ہے۔"

"یہ تو واقعی عقلمندی کی ہے۔" پریشانی کے شدید حملے کے بعد میں نے ذرا ریلیف محسوس کیا۔ تصور ہی تصور میں، میں نے وہ سارے مناظر دیکھے جن کا ذکر سجاول کر رہا تھا۔ بڑا عجیب محسوس ہوا۔ دل چاہا کہ میں یہ مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا۔ اپنی موجودگی میں اپنی غیر موجودگی کو دیکھنا اور اپنی زندگی میں اپنی "موت" کے اثرات اپنے پیاروں کے چہروں پر دیکھنا بڑا انوکھا تجربہ ہوتا ہو گا۔ مجھے یہ تجربہ کرنے کا کوئی شوق نہیں تھا مگر یہ ہو گیا تھا اور اب......میرا دل چاہ رہا تھا کہ اس کو طول دے دیا جائے۔ ٹیکساری گینگ کی وحشت سے بچنے کا یہ ایک منفرد راستہ نکلا تھا۔

سجاول اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا......اور اکتاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ "اچھا اپنے کمرے میں چلتا ہوں، ذرا نیند آ رہی ہے۔"

میں نے زیرِ لب مسکرا کر کہا۔ "نیند آ رہی ہے......کہ محبت آ رہی ہے۔"

''فی الحال تو نیند ہی آ رہی ہے۔'' وہ بدستور سنجیدہ رہا۔

''دن دیہاڑے نیند کیوں آ رہی ہے؟'' میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''مسکرانا تو اسے آتا ہی نہیں تھا، اس کی سنجیدگی کا کم ہونا ہی مسکرانا ہوتا تھا۔ ذرا کم سنجیدہ لہجے میں بولا۔'' نئی نئی دوہٹی ہے، پریشان ہو رہی ہو گی۔''

''اچھا یہ اپنا موبائل مجھے دے جاؤ۔'' میں نے کہا۔

اس نے موبائل مجھے تھما دیا اور لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر نکل گیا۔

کچھ دیر بعد میں نے دوبارہ کرنل ڈاکٹر احرار کے نمبر پر کال کی۔ بیل جاتی رہی۔ دوسری بار کوشش کی تو فون اٹھا لیا گیا۔ کرنل احرار کی بارعب آواز سنائی دی۔ ''ہیلو......کون؟''

''کرنل احرار؟'' میں نے بدلی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''یس کرنل احرار اسپیکنگ ......آپ کون؟'' انگلش میں پوچھا گیا۔

''میں......شاہ زیب کا دوست عباسی بول رہا ہوں، اکرام عباسی۔ مجھے شاہ زیب نے ہی آپ کا نمبر دیا تھا۔'' میں نے بھی انگلش میں کہا۔ کرنل احرار صرف ملائی اور انگلش ہی سمجھ سکتے تھے۔

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی، پھر بھرائی ہوئی آواز میں کہا گیا۔ ''اگر واقعی آپ ان کے دوست ہیں تو پھر یہ وقت آپ پر بھی بہت بھاری ہو گا۔ ابھی تک یقین نہیں آ رہا کہ یہ سب کچھ ہو چکا ہے۔'' پھر وہ جیسے ایک دم چونک کر بولے۔ ''میرا یہ نمبر آپ کو شاہ زیب نے دیا یا آپ کو ویسے ملا؟''

''شاہ زیب نے خود دیا۔ انہوں نے آپ کے لیے ایک اہم پیغام چھوڑا ہے جناب۔''

''کیسا پیغام؟'' کرنل احرار کی آواز بدستور بوجھل تھی۔

''یہ فون پر کرنے والی بات نہیں ہے جی۔ میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ آپ سے ملنا ضروری ہے۔''

دوسری طرف پھر خاموشی چھا گئی۔ آخر کرنل احرار کی آواز ابھری۔ ''میں کس طرح یقین کر لوں کہ تم واقعی شاہ زیب کے دوست ہو......میرا مطلب ہے کہ شاہ زیب کے اردگرد کے حالات بہت خطرناک رہے ہیں اور یہ حالات اس کے جانے کے بعد بھی موجود ہیں۔'' کرنل کے لہجے کے نیچے دکھ ہلکورے لے رہا تھا۔

مین نے اپنی گفتگو جاری رکھی اور چند منٹ میں کافی حد تک ان کی تسلی کر دی۔ میں نے ونائی سے لاہور آتے ہوئے جہاز میں ہونے والی وہ ساری گفتگو بھی بیان کر دی جو میرے

اور کرنل احرار کے درمیان ہوئی تھی۔ بالآخر کرنل نے دلیری کا ثبوت دیا اور مجھے اپنے ہوٹل اور کمرے کے نمبر سے آگاہ کر دیا۔

○......❖......○

قریباً دو گھنٹے بعد میں کرنل احرار سے ملنے کے لیے تیار تھا۔ دو دن کی شدید گرمی کے بعد آندھی آئی تھی اور لاہور کے آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ کبھی تیز اور کبھی ہلکی بارش بھی ہو رہی تھی۔ شام معمول سے زیادہ تاریک نظر آ رہی تھی۔ میرے ساتھ سجاول اور خورسنہ بھی جا رہے تھے۔ خورسنہ کو لے جانے کی وجہ یہ تھی کہ راستے میں چیکنگ وغیرہ سے بچا جا سکے۔ مزید احتیاط کے طور پر اپنا چہرہ چھپانے کے لیے میں نے زخموں پر لپیٹنے والی سفید پٹیاں منگوائی تھیں۔ خورسنہ نے یہ پٹیاں بڑے طریقے سے میرے چہرے پر لپیٹی تھیں۔ میری پیشانی، ایک آنکھ اور رخسار اس بینڈ یج میں چھپ گئے تھے۔ لگتا تھا کہ پیشانی اور باقی چہرے پر گہری چوٹیں لگی ہیں۔

بارش کے پیش نظر ایک چھتری بھی ساتھ لے لی گئی تھی۔ ہم تینوں سجاول والی جیپ میں سوار ہوئے۔ سجاول اور خورسنہ آگے بیٹھے۔ میں اجرک کی بکل مار کر پچھلی نشست میں دھنس گیا۔ بارش کی وجہ سے کوئی خاص پولیس ناکا بھی ہمارے راستے میں نہیں آیا۔

خورسنہ نے کہا۔ ”شاہ زیب صاحب، لگتا ہے کہ پولیس والے جان بوجھ کر آپ کے راستے سے ہٹ گئے ہیں۔“

”بھئی میں تو ”مردہ“ ہوں۔ مجھ سے کیا ڈریں گے۔ تمہارے شوہر نامدار سے خوف زدہ ہو گئے ہوں گے، خاصا دبنگ لگتا ہے۔“

وہ مسکرا کر بولی۔ ”یہ بات تو ٹھیک کہی۔ سجاول سے تو مجھے بھی ڈر آتا ہے۔ پتا نہیں کس وقت کس بات پر جناب کا پارا چڑھ جائے۔“

”اب یہ تمہاری حکمتِ عملی ہے کہ شیر کو گیدڑ کیسے بنانا ہے۔“ میں نے یہ فقرہ انگلش میں کہا تھا اس لیے سجاول کی سمجھ میں نہیں آیا۔ ہاں خورسنہ مسکرانے لگی۔ سجاول نے کڑی نظروں سے مجھے گھورا۔ میں نے کہا۔ ”یار! تمہاری تعریف ہی کر رہا ہوں۔“

وہ سگریٹ سلگا کر ایک ہاتھ سے ڈرائیونگ کرتے ہوئے بولا۔ ”میں ایسی انگریزی تعریفوں پر لعنت بھیجتا ہوں۔ جو بھی قصیدہ پڑھنا ہو اپنی زبان میں پڑھا کرو۔“

”وہ سامنے ناکا ہے شاید۔“ خورسنہ نے ٹھٹکی آواز میں کہا۔

میں نشست پر تقریباً نیم دراز ہو گیا۔ بہر حال ہم بخیریت گزر گئے۔ پولیس تو آپ سے

غائبانہ محبت فرما رہی ہے۔'' خورسنہ نے کہا۔
''مجھے پولیس سے زیادہ ڈر داؤد بھاؤ کے لوگوں کا ہے۔ وہ اس شہر کو ہزاروں آنکھوں کے ساتھ واچ کرتے رہتے ہیں۔''
انہی باتوں کے دوران میں ہم جل تھل سڑکوں سے گزرتے ہوئے شاہراہ قائداعظم کے مطلوبہ ہوٹل کی پارکنگ میں پہنچ گئے۔ کئی علاقے گہری تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے مگر ہوٹل کی چار دیواری میں جنریٹرز کی روشنی موجود تھی۔ پروگرام کے مطابق سجاول تو جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا رہا، میں اور خورسنہ چھتری لے کر باہر نکلے اور آہستہ رفتار سے چلتے ہوئے ہوٹل کی لابی میں پہنچ گئے۔ خورسنہ نے چھتری بند کر دی۔ وہ مجھے سہارا دیتے ہوئے ائی تھی۔ ظاہر یہی ہو رہا تھا کہ میں زخمی ہوں اور خورسنہ تیماردار کے طور پر میرے ساتھ ہے۔
میں نے صاف ستھری شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ جوتے بھی نئے اور چمکیلے تھے۔ قیمتی اجرک میرے شانوں پر تھی۔ ہم لفٹ کے ذریعے تیسری منزل پر پہنچے۔ خورسنہ مجھے کرنل احرار کے کمرے کے سامنے چھوڑ کر واپس چلی گئی۔ عروسی جوڑے میں وہ جگمگا رہی تھی اور دیکھنے والی نظر اس پر جم جاتی تھی۔
میں نے ڈور بیل پر انگلی رکھی۔ ٹائم ٹھیک سات بج کر چالیس منٹ تھا اور یہی وقت کرنل احرار سے میری ملاقات کا طے ہوا تھا۔
دروازہ خود کرنل احرار نے ہی کھولا۔ ''السلام علیکم'' میں نے بدلی ہوئی آواز میں کہا۔
میرے چہرے کی پٹیوں نے کرنل صاحب کو ذرا چونکایا۔ ''اکرام عباسی؟'' انہوں نے دریافت کیا۔
''جی۔'' میں نے کہا اور ان سے مصافحہ کرنے کے بعد اندر چلا گیا۔
کمرے میں زیادہ روشنی تھی۔ کرنل نے ذرا توجہ سے میری طرف دیکھا اور چونکے ہوئے نظر آئے۔ وہ براہِ راست میری آنکھوں...... بلکہ اکلوتی آنکھ میں دیکھ رہے تھے۔ الجھن زدہ لہجے میں بولے۔ ''تم...... زخمی ہو......؟''
''جی نہیں، خود کو چھپا رکھا ہے میں نے۔'' اس مرتبہ میں نے اپنی اصل آواز میں کہا تھا۔
وہ پھر بھی پہچان نہیں پائے۔ ہاں ان کے چہرے پر الجھن کا تاثر کچھ اور گہرا ہو گیا۔ کچھ ڈرے ہوئے بھی لگے۔
میں نے کہا۔ ''میں شرمندہ ہوں کرنل کہ آپ کو سرپرائز دینے پر مجبور ہوا بلکہ ایک پریشان کن سرپرائز۔'' میں نے چہرے کی پٹی کھولنی شروع کی۔

اچانک کرنل احرار کی ہلکی براؤن آنکھوں میں حیرت کا دریا امڈ آیا۔ وہ سرتاپا لرز گئے...... اور بے ساختہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئے۔ ”جی کرنل صاحب، یہ میں ہی ہوں شاہ زیب، اس برساتی رات میں چھپتا چھپاتا آپ کے پاس پہنچا ہوں۔“

”او مائی گاڈ...... او مائی گاڈ۔“ وہ مسلسل کہتے جارہے تھے۔ اب ان کی آنکھوں میں خوف آمیز حیرت کے ساتھ ساتھ خوشی کی چمک بھی نمودار ہونے لگی تھی۔

انہوں نے جلدی سے دروازے کے بولٹ کی طرف دیکھا، وہ اندر سے بند تھا۔ کھڑکیوں کے پردے بھی برابر تھے۔ اس بات کا اندازہ میں پہلے ہی لگا چکا تھا کہ یہاں کوئی بغلی کمرا موجود نہیں اور نہ کسی تیسرے شخص کی موجودگی کا امکان ہے۔

میں نے باقی ماندہ پٹی کھینچ کر اپنی پیشانی سے اتار دی۔ وہ لرزاں آواز میں بولے۔ ”اپنی نگاہوں پر بھروسا نہیں ہو رہا۔ یہ واقعی بڑا سرپرائز ہے، دل بند کردینے والا سرپرائز۔“ وہ آگے بڑھے، ہم گلے لگ گئے۔

باہر بارش مسلسل جاری تھی۔ ہم آمنے سامنے صوفوں پر بیٹھ گئے۔ لگژری کمرے کو دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہاں کچھ دیر پہلے تک ڈاکٹر صاحب کے دوست یا ہم پیشہ افراد موجود تھے۔ میڈیکل سے متعلق کچھ رسائل و جرائد شیشے کی خوب صورت میز پر بکھرے ہوئے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کو اور مجھے نارمل ہونے میں چار پانچ منٹ لگ گئے۔ ان کے لیے تو میں جیسے مر کر زندہ ہوا تھا۔ میں پہلے سے ارادہ کر کے آیا تھا کہ ڈاکٹر کرنل احرار سے موجودہ صورتِ حال کے بارے میں کچھ چھپاؤں گا نہیں۔ میرے اب تک کے تجزیے کے مطابق وہ ان لوگوں میں سے تھے جن پر ہر طرح کا بھروسا کیا جاسکتا ہے۔ ویسے وہ بھی جاماجی کے اَن گنت لوگوں کی طرح دلی طور پر میرے مداح تھے۔

میں نے چند باتیں چھوڑ کر سب کچھ ان کے گوش گزار کر دیا۔ پرانی دشمنی کی بنا پر ٹیکساری گینگ کا میرے پیچھے یہاں پہنچنا۔ قسطینا کا جاماجی سے مجھے اطلاع دینا کہ کچھ نہایت خطرناک لوگ میری تلاش میں ہیں۔ یہاں لاہور میں میری اور گینگ کی مڈبھیڑ ہونا، لاہور میں بیس بے گناہ شہریوں کا اندوہناک قتل اور پھر ہاؤس نمبر اٹھارہ کا خونی دھماکا......

کرنل احرار حیرت میں گم سنتے رہے۔ کہیں کہیں انہوں نے مجھ سے سوال بھی کیے...... میری گفتگو کے اختتام تک پہنچتے پہنچتے وہ میرے حوالے سے کافی کچھ جان چکے تھے۔ شاید یہ بھی کہ اگر مجھے ”مارا“ جا چکا ہے تو میں ”مرے رہنا“ ہی پسند کروں گا۔

میں نے کہا۔ ”کرنل صاحب! اب تک میرے سوا بس دو بندوں کو پتا ہے کہ میں زندہ

ہوں۔آپ تیسرے ہیں۔ مجھے پوری امید ہے کہ آپ میری مصیبت کو سمجھتے ہیں اور میرے اس راز کی حفاظت فرمائیں گے۔"

کرنل احرار کی آنکھوں کے گوشوں میں نمی آ گئی۔انہوں نے صدقِ دل سے مجھے یقین دلایا کہ جب تک میں چاہوں گا یہ بھید ان کے سینے میں دفن رہے گا۔

آخر ہماری گفتگو اس موڑ پر آ گئی جس کے لیے میں رسک لے کر یہاں کرنل احرار تک پہنچا تھا۔میں نے انہیں بتایا کہ اپنے جنونی دشمنوں کی خونخواری سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ میں ان کے لیے واقعی "مر" جاؤں اور ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاؤں۔"

وہ میری بات سمجھ رہے تھے۔وہ ان لوگوں میں سے تھے جو اپنے ہنر میں یکتائے روزگار ہوتے ہیں۔بولے۔"کیا تم اپنے خدوخال میں تبدیلی چاہتے ہو؟"

"مجھے ان کی نظروں سے مستقل طور پر بچنے کا کوئی اور طریقہ نظر نہیں آتا۔"

انہوں نے میرے چہرے کو غور سے دیکھا اور گہری سانس لے کر بولے، لیکن یہ کوئی اتنا سہل نہیں ہے۔اس میں ٹائم لگے گا اور دوسری بات یہ ہے کہ میں اپنے خاص ماحول اور اپنے کلینک میں ہی کام کرتا ہوں۔کئی اہم ٹیسٹ بھی ضروری ہوتے ہیں۔"

"میں ہر چیز کے لیے تیار ہوں۔" میں نے جلدی سے کہا۔"بس آپ کے ہنر اور آپ کی مہربان نظر کی ضرورت ہے۔آپ اخراجات کا تخمینہ لگا کر بتا دیں، میں انتظام کر لیتا ہوں۔"

انہوں نے گہری نظروں سے مجھے دیکھا۔"شاہ زیب! تمہارے بہت احسان ہیں ہم پر۔خرچ کا کوئی اتنا بڑا ایشو نہیں ہے لیکن اگر تمہیں میرے ساتھ واپس جاماجی جانا پڑا تو یہ تمہارے لیے مشکل ہوگا۔"

"ہاں کرنل، یہ تو مشکل ہوگا۔وہ لوگ ہر جگہ ڈھونڈتے پھر رہے ہیں......ابھی میری طرف سے پوری طرح مطمئن نہیں ہیں۔میرے ساتھیوں کی تلاش بھی جاری ہے۔"

"تو پھر کچھ عرصہ یہیں روپوش رہو اور جاماجی آنے کے لیے انتظار کر لو۔"

"کرنل......کیا یہیں پر کچھ نہیں ہو سکتا؟" میں نے کرنل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے درخواست اور گزارش والا لہجہ اختیار کیا۔

مجھے یوں لگا کہ میرے لہجے نے کرنل احرار پر اثر کیا ہے۔ان کی چوڑی پیشانی پر سوچ کی گہری لکیریں نمودار ہو گئیں۔

○......❖......○

تیسرے روز میں اور کرنل احرار بہت رازداری کے ساتھ کراچی پہنچ چکے تھے۔ یہاں کاسمیٹک اور پلاسٹک سرجری کا ایک بڑا اچھا یونٹ موجود تھا۔ وہاں ڈاکٹر احرار نے میرے کچھ ٹیسٹ کرائے اور پھر کاسمیٹک سرجری کا فیصلہ کیا۔

انہوں نے ایک موقع پر کہا۔"شاہ زیب! تین تین گھنٹے کے تقریباً تین دورانیے ہوں گے جن میں، میں اپنا کام مکمل کروں گا۔ اس کے بعد قریباً دو تین ہفتے تمہاری اسکن کو نارمل ہونے میں لگیں گے۔"

"کیا میرے جسم کے کسی حصے سے ٹشوز بھی لیے جائیں گے؟"

"نہیں شاہ زیب! ٹشوز لینے کو ہم آٹوگرافٹس کہتے ہیں۔ یہاں ہم دوسری تکنیک برت رہے ہیں۔ مصنوعی خلیوں کی کچھ پرتیں ہوتی ہیں جنہیں ہم خدوخال کی تبدیلی میں استعمال کرتے ہیں۔ ان میں "سیلیکون اور کاربن، ہائیڈروجن" کی آمیزش ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی کٹ لگائے بغیر چہرے کے کچھ حصوں سے چربی نکالی جاتی ہے، کچھ میں داخل کی جاتی ہے۔ چہرے کے کچھ رگ پٹھوں کو ٹریٹ کر کے گردن اور چہرے کی ساخت بدلی جاتی ہے۔"

"کرنل! اگر میں بعد میں اپنی نارمل صورت اختیار کرنا چاہوں؟"

"تو یہ بھی آسان ہے۔ بس چہرے کی اسکن کو نارمل ہونے میں کچھ وقت لگتا ہے اور بعض اوقات "ٹریٹ منٹ" بھی کرنا پڑتی ہے۔"

کرنل احرار نے بے حد توجہ اور دلجمعی کے ساتھ میری کاسمیٹک سرجری کی۔ ایک دو مرتبہ "لوکل انیستھسیا" بھی دیا گیا۔ انجکشنز اور "لیپوسکشن" کے طریقے سے رخساروں، ناک اور ٹھوڑی کی ساخت بدلی گئی۔ میں اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ ہوتا دیکھ رہا تھا اور حیران تھا۔ کبھی کبھی سوچتا تھا کہ اسامہ اور صدر صدام جیسے لوگ اپنے جانی دشمنوں سے بچنے کے لیے چہرے میں اس طرح کی تبدیلیاں کیوں نہ کرا پائے۔ بڑا عجیب احساس تھا شکل بدلنے کا۔ میرے اندازے کے مطابق یہ تیس فیصد سے زیادہ تبدیلی تھی۔ میں آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر دیر تک چہرے پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ کاسمیٹک سرجری کے فوراً بعد ہی میں ایک رہائشی اپارٹمنٹ میں شفٹ ہو گیا۔

ڈاکٹر کرنل احرار نے مجھے چند نفسیاتی لیکچرز بھی دیئے اور بتایا کہ شکل وشباہت میں تبدیلی آنے سے بندے کو اور اس کے اردگرد کے لوگوں کو کس طرح کے تناؤ اور الجھن کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ڈاکٹر احرار نے میرے سر اور داڑھی مونچھ کے بالوں کا رنگ بھی تبدیل کر دیا

تھا۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ رنگ کی اس تبدیلی نے مجھے ایک نئی شباہت دینے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔

ایک دن میں نے کہا۔ ''کرنل! مجھے رخساروں اور ٹھوڑی کے نیچے بے حسی اور بھاری پن کا احساس ہوتا ہے۔''

وہ بولے۔ ''یہ کچھ دن رہے گا۔ میں اسے ہینڈل کرنے کے طریقے تمہیں بتاؤں گا۔''

ابھی تک کوئی سائیڈ افیکٹ سامنے نہیں آیا تھا لیکن میں اس سلسلے میں پریشان تھا۔ کرنل احرار نے پیش بندی کے طور پر کچھ میڈیسنز بھی تجویز کر دیں۔

اس سارے عمل کے دوران میں ایک اور کام بھی ہو رہا تھا۔ میں وقاص احمد کے نئے نام سے اپنے کچھ شناختی کاغذات بھی بنوا رہا تھا۔ ''سب سے بڑا روپیہ'' والا محاورہ یہاں بھی صادق آ رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ لاہور اور کراچی جیسے بڑے شہروں میں روپے کے زور سے سب کچھ ممکن ہے۔ آخر وہ دن آیا جب کرنل احرار مجھ سے رخصت ہوئے۔ انہوں نے بغیر کسی معاوضے کے اپنا نہایت قیمتی وقت مجھے دیا تھا۔ اب وہ جلد از جلد جاماجی واپس پہنچنا چاہتے تھے۔ وقتِ رخصت انہوں نے گرم جوشی اور نم آنکھوں کے ساتھ مجھے گلے لگایا۔

چہرہ تو بڑی حد تک تبدیل ہو چکا تھا، اب میں اپنی چال ڈھال بدلنے کی کوشش بھی کرنے لگا۔ اس کے علاوہ آواز کی تبدیلی بھی ضروری تھی۔ میں نے فون کے وائس ریکارڈر میں بار بار آواز ریکارڈ کی اور اس کی خامیاں دور کیں۔

درحقیقت یہ سب کچھ بڑا دلچسپ اور سنسنی خیز تھا۔ ایک نئی شخصیت...... ایک نیا روپ۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ میں بالکل کوئی اور شخص لگ رہا تھا مگر تبدیلیاں بڑی مؤثر تھیں۔ میرا چہرہ ڈاکٹر کرنل احرار کے ہنر کا منہ بولتا ثبوت بن گیا تھا۔ جدید سائنس کس طرح زندگیوں کو بدل رہی ہے، یہ مجھ پر پہلی بار آشکار ہو رہا تھا۔ اس سارے عمل میں ڈاکٹر احرار کے اندازے کے مطابق قریباً آٹھ ہفتے لگ گئے۔ اس ساری کارروائی کے دوران میں تین چار بار میں اپنے نئے فون نمبر سے سجاول کے ساتھ رابطہ کر چکا تھا۔ سجاول نے وہی کیا تھا جو میں سوچ رہا تھا...... وہ قریباً دس روز تک خورسنہ کے ساتھ اسی ہوٹل میں رہا جہاں اس کا نکاح ہوا تھا پھر ایک روز اسے لے کر نہایت خاموشی سے لالہ موسیٰ کے قریب اپنے اسی یونس نامی دوست کے پاس چلا گیا تھا جس نے ایک دفعہ ''ہماری'' مدد بھی کی تھی۔ یہ ایک بالکل چھوٹی سی الگ تھلگ آبادی تھی۔ یونس کے دیہاتی پیٹرول پمپ سے قریباً دو کلومیٹر کے فاصلے پر ایک، سات آٹھ مرلے کا آرام دہ گھر تھا جہاں سجاول نہایت رازداری سے خورسنہ کے ساتھ رہ رہا تھا۔ میری

معلومات کے مطابق چند روز تک خورسنہ کا بیٹا ذیشان بھی اپنے ماموں کے ساتھ خورسنہ کے پاس پہنچنے والا تھا۔

اگر دیکھا جائے تو سجاول کی زندگی میں خوشنما خورسنہ ایک انقلاب کی طرح آئی تھی۔ وہ تو عورت کو بس ایک استعمال کی چیز سمجھتا تھا۔ اب سرتاپا ایک عورت کی محبت میں جکڑا گیا تھا۔ وہ کوئی نمازی پرہیزگار تو نہیں بنا تھا مگر فی الحال ڈاکو بھی نہیں رہا تھا۔ اس نے اپنے ڈیرے پر فیض محمد کو اپنا مستقل قائم مقام بنایا تھا اور خود بالکل الگ تھلگ ہو گیا تھا۔ میرے اور یونس کے سوا اس کے کسی ساتھی کو بھنک تک نہیں تھی کہ وہ کہاں ہے؟ آئندہ کیا ہونا ہے اس کا فیصلہ سجاول سیالکوٹی نے غالباً وقت پر چھوڑ دیا تھا۔

محبت ایسے ہی زندگیوں کو بدلا کرتی ہے۔ میرے اپنے حالات بھی تو کچھ مختلف نہیں تھے۔ جب سے مجھے محسوس ہوا تھا کہ ہاؤس نمبر اٹھارہ والے حادثے نے میرے لیے زندگی کا ایک نیا راستہ کھولا ہے، تاجور کا خیال ہر وقت دل و دماغ میں بسا رہتا تھا۔ ویسے تو وہ پہلے بھی کبھی دل و دماغ سے نکلی نہیں تھی مگر اب کچھ اور طرح کی کیفیت تھی۔ دل میں ایک ترنگ سی جاگی ہوئی تھی۔ کچھ عرصہ پہلے تک وہ مجھے کوئی بہت دور کی چیز نظر آتی تھی۔ جیسے آسمان پر چمکتا ہوا چاند جسے زمین کا باسی صرف دیکھ سکتا ہے مگر اب مجھے لگتا تھا کہ وہ چاند زمین پر آ گیا ہے یا پھر میں بیکراں بلندیوں پر پرواز کر رہا ہوں اور شاید...... شاید ہم دونوں کا ملاپ ہو سکتا ہے۔

سجاول سے فون پر میری آخری گفتگو پانچ چھ روز پہلے ہوئی تھی۔ میں نے اسے ایک کام کا کہا تھا۔ اب کراچی چھوڑنے سے پہلے میں ایک بار سجاول سے بات کرنا اور اپنے کام کا پوچھنا چاہتا تھا۔ ناشتے کے بعد میں نے سجاول کو کال کی۔ اس کی بھاری بھرکم بھرائی ہوئی آواز کان میں گونجی۔ ”ہاں بھئی شاہی، صبح سویرے گھنٹی کھڑکھڑا دی؟“

”اچھا تو تمہارے لیے اب یہ صبح سویرے ہو گیا ہے۔ خدا کے بندے! ساڑھے دس بجنے والے ہیں۔ خلقِ خدا اپنے اپنے کاروبار میں لگی ہوئی ہے۔“

”کس میں لگی ہوئی ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”کاروبار میں...... کاروبار میں۔“ میں جھلا کر بولا...... پھر ذرا توقف سے کہا۔ ”ویسے تو تم بھی کاروبار میں لگے ہو...... محبت کے کاروبار میں۔ اور یہ کاروبار عام طور پر نائٹ شفٹ میں ہوتا ہے۔ تمہارا سونا بنتا ہے بھئی...... بنتا ہے۔ ٹھیک ہے، میں شام کو فون کر لوں گا۔ خدا حافظ۔“

کھنکتی ہوئی نسوانی ہنسی کی مدھم آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی چوڑیوں کی جھنکار

ابھری۔ پھر چند فٹ کے فاصلے سے فون پر خورسنہ کی آواز آئی۔ ''نہیں...... نہیں، شاہ زیب صاحب! آپ بات کریں۔ یہ اب پوری طرح جاگ گئے ہیں۔''

قدموں کی چاپ ابھری۔ وہ شاید بستر سے اٹھ کر کمرے سے نکل گئی تھی۔

میرا دل اب تیزی سے دھڑکنا شروع ہوا تھا۔ ''میرے کام کا کیا بنا؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور ذرا مدھم آواز میں بولا۔ ''میں نے کل یونس کو سکھیرا بھیجا تھا۔ سن گن لی ہے اس نے۔''

''تاجور کا کچھ پتا چلا؟''

''ہاں، سنا ہے کہ وہ کچھ بیمار ہے۔ دو چار دن گجرات کے اسپتال میں بھی رہی ہے۔ لیکن اب گاؤں واپس آگئی ہے۔''

''کیا مسئلہ ہے؟''

''شاید ٹائیفائیڈ وغیرہ ہے مگر اصل بخار تو تمہارے والا ہی ہوگا۔ تمہارے ''مرنے'' والی خبر اس کے لیے بڑی ڈھاڈی رہی ہو گی۔''

''اس کے امی ابا اور گھر والے؟''

''وہ تو سب ٹھیک ہیں...... ہاں سیف کی ماں کی حالت ٹھیک نہیں۔ وہ پتر کے لیے بڑی پریشان ہے۔ ماں، پیو دونوں ابھی تک سیف کی موت کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ تاجور اور اس کے گھر والوں نے ابھی تک انہیں کچھ نہیں بتایا۔''

''اچھا کیا ہے۔ ماں بے چاری دل کی مریضہ ہے۔ بے موت مر جائے گی۔ اس کے بارے میں، میں نے کچھ سوچ رکھا ہے۔''

''کیا سوچ رکھا ہے؟''

''سکھیرا پہنچ لوں، پھر بتاؤں گا۔''

''تم سکھیرا آ رہے ہو؟''

''اب تو آنا بنتا ہی ہے یار! شاہ زیب تو ''مر مرا'' گیا۔ اب تو ایک نیا بندہ ہے۔ فی الحال اس سے کسی کی دشمنی ہے نہ وہ کسی کا دشمن ہے۔ سیدھا سادہ...... عام...... محنت کش...... اپنے کام سے کام رکھنے والا...... روزگار کی تلاش میں بھٹکتا ہوا سکھیرا پہنچے گا اور وہاں ٹکنے کی کوشش فرمائے گا۔''

چند لمحے خاموشی رہی پھر سجاول نے کہا۔ ''کیا واقعی تمہاری شکل اتنی بدل گئی ہے کہ تمہیں پہچانا نہ جا سکے؟''

''تجربہ کر کے دیکھیں گے مگر تمہاری شکاری نظر سے بچنا مشکل ہے اور......'' میں نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''اور کیا......؟''

''میرے خیال میں تو کوئی بھی ایسا شخص جو مجھے قریب سے جانتا ہو اور جس نے میرے ساتھ کچھ وقت گزارا ہو، مجھے دیکھ کر چکر میں تو ضرور پڑے گا۔ اس کے اندر کوئی نہ کوئی گھنٹی بجنا شروع ہو جائے گی۔ بہر حال دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔''

O......❖......O

میں اپنی نئی پہچان اور نئے شناختی کارڈ کے ساتھ کراچی سے لاہور پہنچ چکا تھا۔ میں نے بذریعہ ٹرین سفر کیا تھا اور اب براستہ سڑک مجھے لالہ موسیٰ کی طرف روانہ ہونا تھا۔ میرا حلیہ ایک نیم دیہاتی شخص والا تھا۔ سستی سی شلوار قمیص، سر پر ڈبی دار پرنا یعنی بڑا رومال۔ پاؤں میں پشاوری ٹائپ چپل۔ گلے میں تعویذ اور چھوٹی چھوٹی ہموار داڑھی پر گھنی مونچھیں۔ پیرا شوٹ کا ایک سستا سا تھیلا میرے کندھے پر تھا جس میں میری ضرورت کی چیزیں موجود تھیں۔ اس تھیلے کے دو پیندے تھے جن کے درمیان میں نے نقدی بھی بھری ہوئی تھی۔ لاہور پہنچتے ہی بہت سے سنسنی خیز مناظر ذہن میں تازہ ہو گئے۔ شیطان زادوں سے وہ گھمسان کا رَن جو لاہور میں ہی پڑا تھا، اور پھر اس سے بھی پہلے کے واقعات جب میں قسطینا اور ابراہیم وغیرہ کے ساتھ جاما.جی میں تھا۔ وہ سارا جنگ و جدل جاگتی آنکھوں کا خواب لگتا تھا۔ ان لوگوں سے میرا رابطہ اب بالکل منقطع تھا۔

لاہور اسٹیشن سے باہر نکل کر میں اس دو منزلہ ہوٹل کے سامنے سے گزرا جہاں میں نے اور سجاول نے چند سنسنی خیز دن گزارے تھے اور جہاں منیجر شہریار کی مہربانی سے سجاول کا نکاح بھی ہوا تھا۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا ورنہ میں ہوٹل کے اندر جا کر اور ملازمین کا سامنا کر کے یہ جاننے کی کوشش کرتا کہ مجھے پہچانا جاتا ہے یا نہیں۔ بہر حال آدھ پون گھنٹے بعد مجھے اس تجربے کا ایک موقع مل بھی گیا۔

یتیم خانہ چوک جانے کے لیے میں ایک وین میں سوار تھا۔ وین میں لوگ بھیڑ بکریوں کی طرح ٹھسے ہوئے تھے بلکہ باہر کے ملکوں میں بھیڑ بکریوں کو بھی اس سے کہیں زیادہ سہولت کے ساتھ لے جایا جاتا ہے۔ شروع شروع میں جب میں نے ڈنمارک سے یہاں لینڈ کیا تھا تو اس طرح کے مناظر دیکھ کر سخت تعجب ہوتا تھا لیکن اب یہ سب کچھ روٹین میں آ چکا تھا۔ میں خود کو اس ماحول کا حصہ ہی محسوس کرتا تھا اور میری بول چال اور اٹھنے بیٹھنے میں بھی مقامی رنگ

پختہ ہوگیا تھا۔ پنجابی کے کئی ٹھیٹ لفظ بھی اب میں روانی سے بولنے لگا تھا۔ میں گئے دنوں میں انیق کے ساتھ باقاعدہ پنجابی اور ''پنجابی لہجے کی اردو'' بولنے کی پریکٹس کرتا رہا تھا۔ اس زبان کی نسبت تاجور سے تھی۔ یہ مجھے کیوں پیاری نہ ہوتی۔

اچانک زور سے بریک لگے...... وین لہرائی اور ایک شاندار مرسیڈیز کار کو چھیلتی ہوئی نکل گئی۔

مرسیڈیز اور وین دونوں رک گئیں۔ وین کا ہانپا کانپا ڈرائیور بھی اپنی سواریوں سمیت باہر نکل آیا۔ مرسیڈیز میں سے پہلے ڈرائیور نکلا، پھر لمبا تڑنگا مالک بھی نکل آیا۔ مالک کو دیکھ کر میں چونک گیا۔ یہ وہی پاشا تھا جس نے سیاست زادے شکیل داراب کے لیے کبھی دلال کا کردار ادا کیا تھا۔ اس نے اپنی ''ٹیچر بیوی'' ناہید کو نوعمر شکیل داراب کی خواہشات کے ''احترام'' میں طلاق دے کر اس کے حوالے کر دیا تھا۔ بدلے میں پاشا کو من پسند رنگین زندگی ملی تھی۔

پاشا غصے میں تپا ہوا تھا۔ پہلے تو اس نے وین ڈرائیور کو مار مار کر لہولہان کر دیا پھر جب ایک ٹریفک کانسٹیبل نے نشاندہی کی کہ اس ایکسیڈنٹ میں زیادہ غلطی خود پاشا کی ہے تو پاشا کا پارا ساتویں آسمان کو چھو گیا۔ اس نے غریب کانسٹیبل کی وردی پھاڑ کر اسے نیم عریاں کر دیا اور اسی کی بیلٹ سے اسے روئی کی طرح دھنکنے لگا۔ اس کا ڈرائیور بھی بڑھ چڑھ کر اس کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔ یہ تو ایک ٹریفک کانسٹیبل تھا شاید ٹریفک سارجنٹ بھی ہوتا تو اس کا یہی حشر ہوتا۔ پاشا کوئی عام شہری نہیں تھا وہ شکیل داراب جیسے ''بادشاہ گر'' کے ''پے رول'' پر تھا۔

میں آگے بڑھا۔ میرے ساتھ دو تین اور جوشیلے نوجوان بھی سامنے آئے اور ہاتھ وغیرہ جوڑ کر نیم بے ہوش کانسٹیبل کو پاشا کے نرغے سے نکالا۔ اسی دوران میں میری نگاہ مرسیڈیز کے نیچے چلی گئی۔ کوئی چمک دار چیز پڑی تھی۔ یہ پاشا کی نہایت قیمتی رسٹ واچ تھی۔ میں نے جھک کر یہ واچ اٹھا لی۔ سب پاشا اور کانسٹیبل کی طرف متوجہ تھے یا اس نوجوان وین ڈرائیور کو دیکھ رہے تھے جو پاشا کے حکم پر سڑک کے کنارے مرغا بنا ہوا تھا۔ میں نے گھڑی جیب میں رکھ لی۔

ایک رعب دار سارجنٹ بھی موٹر سائیکل پر سوار موقع پر پہنچ گیا۔ حسبِ توقع اس نے پاشا کو سلیوٹ کے انداز میں سلام کیا۔ سارجنٹ کے آنے سے کم از کم اتنا ہوا کہ وین ڈرائیور اور کانسٹیبل کی گلو خلاصی ہوگئی اور ان کی معافی تلافی قبول کر لی گئی۔ ہنگامہ دیکھ کر کسی چینل کا نمائندہ اور دو اخباری رپورٹر بھی موقع پر پہنچ گئے تھے۔ پاشا کی گاڑی کا نقصان تو کافی ہوا تھا

لیکن اس نے کون سا اپنی جیب سے پورا کرنا تھا۔

اس سارے ہنگامے میں پاشا کی نظر کئی بار مجھ پر پڑی تھی۔ میں نے اسے مخاطب کر کے منت سماجت کے دوچار فقرے بھی بولے تھے۔ بہر حال وہ مجھے پہچاننے میں قطعی ناکام رہا تھا۔ یہ حوصلہ افزا شروعات تھی۔ جب چند منٹ بعد پاشا اپنی لگژری کار میں بیٹھ کر فاتحانہ انداز میں موقع سے روانہ ہونے لگا تو میں ادب سے گاڑی کی کھڑکی پر جھکا۔ پاشا نے دوسیکنڈ تذبذب میں رہنے کے بعد کھڑکی کا شیشہ نیچے سلائیڈ کیا اور سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

''یہ آپ کی امانت ہے جی۔ گاڑی کے نیچے پڑی تھی۔''

میں نے طلائی کام والی سنہری گھڑی اس کے سامنے کر دی۔

پاشا کی آنکھوں میں چمک ابھری۔ کثرت شراب نوشی اور شبانہ روز عیاشیوں نے اس کے چہرے پر چربی کی تہ چڑھا دی تھی اور اس کے تاثرات چربی کے اندر ہی کہیں گم ہو جاتے تھے، پھر بھی ایک اندازہ سا ہوا کہ وہ ہزاروں ڈالر کی شے واپس ملنے پر خوش ہوا ہے۔

اس نے گھڑی میرے ہاتھ سے لے لی اور ہزار روپے کا ایک نیلا نوٹ میری طرف بڑھا کر روانہ ہو گیا۔

رپورٹرز نے مجھے گھیر لیا۔ حسبِ عادت سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ ''کیا نام ہے تمہارا؟ کہاں سے آئے ہو؟''

وقاص نام ہے۔ گجرات کا رہنے والا ہوں۔ روٹی روزی ڈھونڈ رہا ہوں۔'' میں نے ایک عام شخص کے لب و لہجے میں کہا۔

''تمہیں پتا ہے، یہ کتنی قیمتی گھڑی تھی؟''

''جی زیادہ پتا تو نہیں...... لیکن سونا اور نگینے تو نظر آ ہی رہے تھے۔''

''کیا تمہارے دل میں نہیں آیا کہ اسے جیب میں ہی رکھو۔ یہاں کس کو پتا چلنا تھا؟'' ایک اخباری رپورٹر نے میری تصویر بنواتے ہوئے کہا۔

''اللہ کو جان دینی ہے جی۔ دنیا کا مال تو دنیا میں ہی پڑا رہ جاتا ہے۔''

اس طرح کی دوچار باتیں مزید ہوئیں۔ پھر دو اور ٹریفک سارجنٹ موقع پر پہنچ گئے اور ٹریفک بحال کرنے کے لیے لوگوں پر گرجنے برسنے لگے۔ مجمع منتشر ہو گیا۔ میں بھی چوک کراس کر کے دوسری طرف آ گیا اور اس بار ایک آٹو رکشا پر سوار ہو کر بس اڈے کی طرف روانہ ہوا۔ گرم ہوا لگنے کے سبب رخساروں پر ہلکی سی اکڑن پیدا ہو رہی تھی۔ کرنل احرار کی ہدایت کے مطابق میں انگلیوں سے ہولے ہولے رخساروں کو سہلانے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں

ریلیف محسوس ہوا۔ پاشا مجھے پہچان نہیں پایا تھا اور یہ بات بڑی حوصلہ افزا تھی، خصوصاً اس تناظر میں کہ پاشا سے بات کرتے ہوئے میں اپنی آواز تبدیل کرنا یکسر بھول گیا تھا۔ میں نے تہیہ کیا کہ اب یہ ''بھول'' دہراؤں گا نہیں۔

○......❖......○

میں نے بس سے بذریعہ جی ٹی روڈ سفر کیا اور ایک چلچلاتی ہوئی گرم سہ پہر میں اس موڑ پر پہنچ گیا جہاں سے مجھے کھٹارا دیہاتی بس یا وین میں سکھیرا گاؤں کی طرف جانا تھا۔ موسم کیسا بھی ہو، دل میں امنگ ترنگ ہو تو ہر منظر بھلا لگتا ہے۔ خستہ حال سڑک پر وین ہچکولے کھاتی ہوئی جا رہی تھی مگر اردگرد کی ہر شے سہانی تھی۔ سونا رنگے کھیت جن میں کہیں کہیں ہرے زمرد کے ٹکڑے جڑے تھے۔ آبی گزرگاہوں میں چمکتی ہوئی چاندی اور درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں سے دور دھوپ میں محنت کے موتی چمکاتے جفاکش کسان۔

اگست کی طویل سہ پہر اپنے تمام تر سحر کے ساتھ نشیب و فراز کو اپنے حصار میں لیے ہوئے تھی۔ گرم لیکن شفاف ہوا سنسناتی دھوپ میں بڑے ہموار انداز میں بہہ رہی تھی۔ ہاں دل کا موسم اچھا ہو تو سب اچھا لگتا ہے۔ ایک وقت تھا جب میں تاجور کو موٹر سائیکل پر بٹھا کر بڑے دکھی انداز میں ان کھیت کھلیانوں سے گزرا تھا۔ وہ جدائی کا موسم تھا، مگر اب آس کا موسم تھا۔ کچھ نئی امیدیں تھیں دل میں...... ایک نئی زندگی آواز دیتی محسوس ہوتی تھی۔

سجاول جس جگہ رہائش پذیر تھا، وہ راستے میں ہی پڑتی تھی مگر وہاں یونس بھی موجود تھا۔ میں سجاول سے اور خورسنہ سے ملے بغیر آگے بڑھ گیا۔ رات میں نے ایک کاشت کار کے ڈیرے پر گزاری اور صبح دہی پراٹھے کا ناشتا کر کے اور تانگے پر سوار ہو کر سکھیرا کی طرف روانہ ہو گیا۔ سکھیرا جہاں میری زندگی سانس لیتی تھی۔ جہاں اس کے قدم پڑتے تھے اور جہاں اس کا آنچل لہراتا تھا۔

میں ایک پردیسی کے طور پر گاؤں میں اترا۔ دوپہر ہونے والی تھی۔ سائے اچھے لگنے لگے تھے۔ مویشی اور پرندے ہانپنا شروع ہو گئے تھے۔ پروگرام کے مطابق میں سیدھا سیف کے والد چوہدری بشیر کے ڈیرے پر ہی گیا۔ بوڑھ کی گھنی چھاؤں تلے چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں اور چوہدری بشیر نڈھال سا گول تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ حقے کی نال اس کے منہ میں تھی۔ ایک ملازم اس کا سر دبا رہا تھا۔

''السلام علیکم چوہدری جی۔'' میں نے بدلی آواز میں کہا اور ہاتھ ماتھے پر لے جا کر سلام کیا۔

''ہاں بھئی۔ وعلیکم السلام۔ کیا بات ہے؟'' چوہدری بشیر تھکی تھکی آواز میں بولا۔

''کوئی کام شام مل جائے گا جی؟''

چوہدری بشیر نے مجھے سرتاپا گھورا۔ ''کیا کرتے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''ایف اے پاس ہوں جی۔ حساب کتاب کر لیتا ہوں۔ ویسے ہر کام کر سکتا ہوں۔''

''نہیں بھئی منشی کی لوڑ تو نہیں ہے ہمیں...... اور کیا کر لیتے ہو؟''

''ٹریکٹر کو بڑی اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ چلاتا بھی رہا ہوں۔''

''نہیں ٹریکٹر والا تو ہے۔'' چوہدری بشیر نے کہا۔ پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''عام گڈی بھی چلا لیتے ہو؟''

''ہاں جی۔'' میں نے شدومد سے سر ہلایا۔

''دو گڈیاں ہیں ہمارے پاس، ایک کار ہے ایک چھوٹا لوڈر...... لوڈر پر صبح سویرے سبزی یا پھل منڈی تک لے جانا ہوتا ہے۔ گڈیوں کی ڈرائیوری کر لو گے؟''

''کیوں نہیں جی۔ لائسنس بھی ہے میرے پاس۔ (وقاص کے نام کے ڈرائیونگ اور اسلحہ لائسنس اور کارڈ وغیرہ میں کراچی سے بنوا کر نکلا تھا۔ بے شک روپے کے زور پر ہر کام ممکن ہو جاتا ہے)

چوہدری بشیر نے اپنے ٹریکٹر ڈرائیور کو آواز دی۔ ''حاکم علی ذرا گڈی پر ٹرائی تو لے اس کی۔''

میں ادھیڑ عمر حاکم علی کے ساتھ ٹیوب ویل کی طرف آ گیا۔ یہاں مہران کار کھڑی تھی۔ کار دیکھ کر سیف کا چہرہ نگاہوں میں گھوم گیا۔ ہاں، یہی مہران کار تھی جس پر وہ سکھیرا گاؤں سے میرا پیچھا کرتا ہوا لیہ جا پہنچا تھا۔ وہ میرے فن کا پرستار تھا اور یہ پرستاری اسے موت کے منہ میں لے گئی تھی۔

میں نے تین چار منٹ مہران کار اور دو تین منٹ چھوٹا لوڈر چلایا اور حاکم علی کو مطمئن کر دیا۔ واپسی پر چوہدری بشیر سے بات چیت ہوئی۔ معمولی تنخواہ مل رہی تھی، میں اس پر بھی راضی تھا لیکن اصل مسئلہ ضمانتی وغیرہ کا تھا۔ شناختی کارڈ میرے پاس موجود تھا مگر اس پر گجرات کی تحصیل کا پتا درج تھا۔ چوہدری بشیر کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ میں گجرات چھوڑ کر یہاں نوکری کیوں ڈھونڈ رہا ہوں۔ میں نے اسے بھائیوں کی گھریلو ناچاقی کا بتا کر مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ اس دوران میں میری ایک غیر متوقع مدد بھی ہو گئی۔

چوہدری بشیر کے منشی ماسٹر منظور نے عینک کے اوپر سے مجھے بڑے غور سے دیکھا۔

بولا۔ ''تمہارا پورا نام وقاص احمد ہے ناں؟'' میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ ہاتھ میں پکڑے اخبار کو دیکھ کر بولا۔ ''کل تم لاہور میں تھے؟''

''آہو جی۔'' میں نے کہا۔ اس کے ساتھ ہی اگلی بات میری سمجھ میں آ گئی۔ منشی منظور احمد نے اخبار کا رخ چوہدری بشیر کی طرف کیا اور دھیمی آواز میں کچھ کہا۔ چوہدری بشیر نے اخبار دیکھا، پھر میری طرف دیکھا...... پھر اخبار کی طرف دیکھا۔

ماسٹر منظور بولا۔ ''تمہیں پتا ہے تمہاری تصویر چھپی ہے اخبار میں؟''

''میری تصویر؟'' میں نے انجان بن کر حیرت کا اظہار کیا۔

ماسٹر منظور نے اخبار میری طرف بڑھا دیا۔ پچھلے صفحے پر یہ وہی کل والے واقعے کی خبر تھی۔ میری تصویر کے ساتھ قیمتی گھڑی کا ذکر بھی تھا اور لہولہان وین ڈرائیور کا تذکرہ بھی۔ یہ سب کچھ تائید غیبی کی طرح تھا۔ مجھے لگا کہ میری ملازمت کا مسئلہ آسانی سے حل ہو گیا ہے۔ اگلے بیس تیس منٹ میں یہ بات ثابت ہو گئی۔ تنخواہ تو وہی رہی تھی لیکن مجھے عزت کے ساتھ دو ماہ کے لیے ملازم رکھ لیا گیا۔ اچھی کارکردگی پر میری نوکری پکی ہو سکتی تھی۔ اخبار والی خبر نے ڈیرے پر موجود سارے افراد کو متاثر کیا۔ میں نے چوہدری بشیر اور ماسٹر منظور وغیرہ کو اس واقعے کی تفصیل بھی بتائی۔ حالات کی کڑیاں ایسے ہی ایک دوسرے سے جڑتی ہیں اور کئی دفعہ اتفاقاً کوئی کڑی بڑی مفید ثابت ہو جاتی ہے۔

چوہدری بشیر سے میری پچھلی ملاقات بڑی مختصر سی رہی تھی اور اس کو کافی دن بھی گزر چکے تھے، پھر بھی یہ بات اہم تھی کہ وہ مجھے پہچاننے میں قطعی ناکام رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ سیف کی ماں اور اس کی بہنیں وغیرہ بھی مجھے پہچان نہیں پائیں گی۔

اچانک میری ساری حسیات سمٹ کر آنکھوں میں آ گئیں۔ یوں لگا کہ میں پتھرا گیا ہوں اور بس میری آنکھوں میں زندگی موجود ہے۔ میں نے تاجور کو دیکھا۔ وہ پچاس ساٹھ قدم کی دوری پر ایک تانگے میں بیٹھی تھی اور تانگا گاؤں میں داخل ہو رہا تھا۔ تانگے کی پچھلی نشست پر تاجور کے ساتھ اس کی والدہ اور شاید ملازمہ تھی۔ تاجور کا رنگ بالکل زرد تھا اور وہ بہت کمزور سی ہو چکی تھی۔ رنگ دار تانگا بڑا سجا سجایا تھا۔

تانگا تھوڑا آگے گیا تو اس کا ایک پہیہ کھڈے میں پھنس گیا۔ گھوڑا زور لگانے لگا۔ ہلنے لگے تو سواریاں نیچے اتر آئیں۔ اگلی نشست سے کوچوان کے علاوہ چوہدری دین محمد بھی اترے۔ تاجور کا جسم خزاں رسیدہ پتے کی طرح تھا۔ ملازمہ نے اسے سہارا دے رکھا تھا۔ پہیہ بری طرح پھنسا ہوا تھا۔ نکلنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ گھوڑا اور کوچوان دونوں زور لگا رہے

تھے۔

چوہدری بشیر بڑبڑائے۔ ''ایک تو یہ سڑک بنانے والے راستہ کھودتے ہیں اور پھر اپنی بے بے کی گود میں جا کر سو جاتے ہیں۔''

ماسٹر منظور نے کارندوں سے کہا۔ ''اوئے جاؤ، ذرا دھکا لگاؤ تانگے کو۔''

کارندے ہنستے ہوئے تانگے کی طرف لپک گئے۔ ماسٹر منظور نے چوہدری بشیر سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''دین محمد صاحب کی دھی زیادہ ہی بیمار لگتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب بھی کسی ڈاکٹر حکیم کو دکھا کر آ رہے ہیں۔''

چوہدری بشیر نے آہ بھری۔ ''ان دنوں تو وچاری کا ویاہ بھی ہو جانا تھا۔ پتا نہیں اللہ کو کیا منظور ہے۔ کچھ پتا ہی نہیں لگ رہا سیفی کا۔''

''دھی رانی کی بیماری کی وجہ بھی یہی لگتی ہے۔'' ماسٹر منظور نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

''یہ بالڑیاں تو بس پھولوں کی طرح ہوتی ہیں۔ ذرا تتی ہوا لگے تو مرجھا جاتی ہیں۔''

چوہدری بشیر تتی ہوا یعنی گرم ہوا کا ذکر کر رہا تھا لیکن اسے اس ہوا کی اصل گرمی کا اندازہ نہیں تھا۔ وہ مجھے ''کھو'' چکی تھی ہمیشہ کے لیے۔ اس کی دانست میں، میں مراد پور کے ایک قبرستان میں مٹی کے ڈھیر کے نیچے سو رہا تھا اور اس کی اس حالت کی وجہ یہی تھی۔

تانگا کھڈے میں سے نکل آیا۔ سواریاں دوبارہ سوار ہو گئیں۔ اس کی اوڑھنی چہرے کی طرف ڈھلکی ہوئی تھی۔ ایک گھونگھٹ سا بنا ہوا تھا۔ میں اسے پوری طرح نہ دیکھ سکا۔

چوہدری بشیر کا ڈیرا اور بھینسوں کا واڑا گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میرا بسیرا ڈیرے پر ہی تھا۔ یہاں ٹریکٹر ڈرائیور حاکم علی، چوکیدار وارث اور بھینسوں بکریوں کے رکھوالے ہاشم کے علاوہ تین چار کھیت مزدور بھی رہائش رکھتے تھے۔ ہاشم عرف ہاشو کی بیوی اور ایک مطلقہ بہن انوری بھی ڈیرے پر ہی ہوتی تھیں اور ڈیرے پر ہنڈی روٹی بھی کرتی تھیں۔ اس کام کا انہیں علیحدہ سے معاوضہ ملتا تھا۔

چار پانچ دن کے اندر ہی میں نے اپنے کام کو اچھی طرح سمجھ لیا اور ہاشو سے میری اچھی بے تکلفی بھی ہو گئی۔ ان چار پانچ دنوں میں مجھے دو دفعہ چھوٹے لوڈر پر سبزی لے کر قریبی قصبے کی منڈی تک جانا پڑا۔ یہاں چند بڑے ٹرک اور لوڈر موجود تھے جو سبزی اور پھل وغیرہ لے کر جی ٹی روڈ کے شہروں کی طرف جاتے تھے۔ میرا کام سمجھانے کے لیے ہاشو بھی دونوں دفعہ میرے ساتھ ہی گیا۔ ہاشو کی طلاق یافتہ بہن انوری دایہ کا کام بھی کرتی تھی۔ سکھیرا گاؤں کے اکثر گھروں میں اس کا آنا جانا تھا اور اس کے پاس بہت سی ''معلومات'' جمع رہتی تھیں

انوری سے یہ معلومات ہاشو کی بیوی اور ہاشو تک بھی پہنچتی تھیں۔

ایک روز میں اور ہاشو لوڈر سے سبزی اتار کر اور کھاد وغیرہ لے کر واپس سکھیرا آ رہے تھے۔ ہماری گفتگو بھی جاری تھی۔ میں نے ہاشو کو کریدتے ہوئے پوچھا۔ ''چوہدری صاحب کے بیٹے کا کیا چکر ہے۔ سنا ہے کہ وہ اسے ڈھونڈنے بہاولپور بھی گئے ہوئے تھے؟''

''ڈھونڈنے کیا گئے تھے بس خجل خراب ہونے گئے تھے۔ بڑا منع بھی کیا تھا سب نے لیکن آخر باپ ہے۔''

''کیا بیٹا ناراض ہو گیا تھا؟''

''کہتے تو سب یہی ہیں۔ کام شام نہیں کرتا تھا۔ کبڈی کھیلتا تھا۔ پیو کسی وقت ڈانٹ بھی دیتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ کسی ایسی ہی ڈانٹ کے بعد نکل گیا ہو۔ کچھ عرصہ پہلے اس کا کوئی دوست آیا تھا۔ اس کے گھر والوں سے ملا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ سیف بہاولپور میں ہے، وہاں کسی یار دوست کے ساتھ مل کر اس نے درختوں کی کٹائی کا ٹھیکا لیا ہوا ہے۔ جیسے ہی فارغ ہو جائے گا، آ جائے گا۔ پر وہ نہیں آیا۔ ماں رو رو کر مرنے والی ہو چکی ہے۔ پچھلے مہینے چوہدری بشیر صاحب اپنے ایک بھانجے کے ساتھ اسے ڈھونڈنے کے لیے بہاولپور گئے تھے۔ تھک ہار کر چھ سات دن پہلے واپس آئے ہیں۔''

''کیا کوئی اتنی ہی بڑی ناراضگی تھی؟''

''اللہ جانے...... ویسے کچھ لوگ ایک اور بات بھی کہتے ہیں۔ سچی ہے یا جھوٹی اس کا کچھ پتا نہیں۔'' ہاشو نے ذرا توقف کر کے سر پر بندھے ہوئے رومال سے اپنا پسینہ پونچھا اور بولا۔ ''یہ بات بھی اڑی ہوئی ہے کہ کچھ عرصہ پہلے یہاں سکھیرا گاؤں میں ایک جوان آیا تھا۔ پتا نہیں کون تھا؟ کس لیے آیا تھا؟ یہاں باغ کے پچھواڑے ایک احاطے میں پنڈ کے تین چار اتھرے منڈوں سے اس کی لڑائی ہو گئی۔ ان میں اپنے چوہدری صاحب کا پتر سیف، بھی تھا۔ اس جوان نے پنڈ کے ان سارے اتھرے منڈوں کو اکیلے ہی دن میں تارے دکھا دیئے۔ سیف خود بھی لڑائی مار کٹائی میں بڑا تیز ہے، وہ تو اس جوان کا ''مرید'' بن گیا۔ بعد میں وہ اس کے پیچھے ہی، گڈی لے کر پنڈ سے نکل گیا اور پھر واپس نہیں آیا۔''

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''تم کیا سمجھتے ہو کہ یہ بات صحیح ہے؟''

''میں نے کہا ہے نا کہ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں...... نہ ہی اس بات کا کوئی ثبوت ہے کہ پیو پتر یعنی چوہدری بشیر اور سیف میں کوئی وڈا جھگڑا ہوا تھا۔''

''پر یار! اگر کوئی بات نکلتی ہے تو اس کی وجہ تو ہوتی ہے ناں؟''

ہاشو ونڈ اسکرین کی دوسری جانب سڑک پر نظریں جمائے ہوئے بولا۔ ''پنڈ کے منڈوں سے اس جوان کی لڑائی تو واقعی ہوئی تھی اور اس کے وہی منڈے گواہ بھی ہیں، مگر باقی کی بات صرف ایک منڈے کو معلوم ہوسکتی تھی۔ اس کا نام صدیق ہے۔ وہ سیف کا لنگوٹیا یار سمجھا جاتا ہے...... پر اب پچھلے دوڈھائی مہینے سے وہ بھی غائب ہے۔''

میں نے لوڈر کو ایک گڑھے سے بچاتے ہوئے کہا۔ ''اس کا مطلب یہ ہے کہ چوہدری بشیر صاحب کے پتر اور دین محمد صاحب کی بیٹی کی شادی اب کھٹائی میں پڑگئی ہے؟''

''ہاں، یہ تو کھٹائی میں ہی ہے...... بلکہ......اب تو سیفی مل بھی گیا تو یہ شادی شاید نہیں ہو سکے گی۔''

''کیا مطلب ہاشو بھائی؟'' میں نے کہا۔

''چوہدری دین محمد صاحب اب بڑی اچی ہواؤں میں چلے گئے ہوئے ہیں۔ بڑے وڈے لوگوں سے ان کا تعلق بن رہا ہے...... بلکہ...... بن ہی گیا ہے۔ کئی مہینے اسلام آباد رہ کر بھی آئے ہیں۔ اب یہ بھی ان کی مہربانی ہے کہ سکھیرا تک پکی سڑک بن رہی ہے۔''

''کیا مطلب؟ یہ سڑک دین محمد صاحب بنوا رہے ہیں؟''

''نہیں بھئی! وہ وڈے لوگ بنوا رہے ہیں جن سے دین محمد صاحب کی فیملی کا تعلق بنا ہے۔'' ہاشو نے رازداری کے انداز میں کہا۔

''کوئی سیٹھ خاندان ہے؟ یا کوئی وڈا افسر وغیرہ؟''

''اوئے چن جی، اس سے بھی بہت زیادہ اچے لوگ ہیں۔ لاہور کے دارابیوں کا نام سنا ہے تم نے؟ عطاءاللہ داراب، شکیل داراب وغیرہ؟''

''ہاں، ہاں، کچھ تو سنا ہوا ہے، حکومت کے لوگ ہیں۔''

''حکومت کے نئیں ہیں لیکن حکومتیں ان لوگوں کی وجہ سے چلتی ہیں۔ سمجھو کہ یہ ان لوگوں میں سے ہیں جو پردے کے پیچھے رہ کر حکومتیں چلاتے ہیں اور گراتے ہیں.... ایویں...... چغلی والی بات ہو جاتی ہے مگر...... یہ بات تو اب قریباً سب کو پتا لگ چکی ہے کہ دارابیوں کی یہ وڈی وڈی کالی گڈیاں اور جیپیں چوہدری دین محمد کے گھر کیوں آتی ہیں۔''

''کیوں آتی ہیں؟''

''اوئے تُو بڑا کھوچل ہے وقاصے! ساری باتیں پوچھتا چلا جارہا ہے۔ وہ بھی مفت میں۔''

میں نے ڈبی سے ایک سگریٹ نکال کر ہاشو کی طرف بڑھائی۔ اس نے اسے خوش دلی

سے قبول کر لیا اور راز داری کے انداز میں بولا۔ ''خیر اب یہ بات کوئی راز بھی نہیں ہے۔ کہتے ہیں کہ وڈے داراب صاحب...... میرا مطلب ہے کہ عطا اللہ داراب صاحب کا چھوٹا بیٹا دین محمد کی دھی تاجور کو پسند کرنے لگا ہے۔ ان کی شادی کی گل بات چلنے والی ہے۔ بڑی اچی ہواؤں میں اڑنے والے ہیں دین محمد صاحب...... اب ذرا سوچو...... وہ نکھٹو سیفی کہیں سے آ بھی گیا تو اس کی دال کون گلنے دے گا۔''

میری دھڑکنیں زیر و زبر ہو رہی تھیں۔ تاہم میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''ہاں...... بات تو تمہاری ٹھیک ہے ہاشو بھائی...... لیکن یہ اتنے بڑے خاندان کے ساتھ چوہدری دین محمد کا ٹانکا جڑ کیسے گیا؟''

''اوپر والے کی باتیں اوپر والا ہی جانتا ہے۔ وہ سیانے کہتے ہیں ناں کہ جب اللہ دیتا ہے تو چھپر پھاڑ کے دیتا ہے۔''

سورج اب کافی اوپر آ گیا تھا۔ کھیتوں کھلیانوں میں لوگ اپنے کام میں لگ چکے تھے۔ اب ہم گاؤں میں داخل ہونے والے تھے اچانک میرا پاؤں بے ساختہ بریک پیڈل پر دب گیا۔ ہاشو ڈیش بورڈ سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ ''اوئے کیا ہوا؟'' وہ پکارا۔

میری نگاہ کھڑکی سے گزر کر دور ایک نیم پختہ راستے پر پڑ رہی تھی۔ گاؤں کی چند عورتیں لمبی لمبی چادریں اوڑھے پیدل جا رہی تھیں۔ مجھے ان میں تاجور کی جھلک بھی نظر آئی۔ وہ اب قدرے بہتر نظر آتی تھی کیونکہ بغیر سہارے کے چل رہی تھی۔ تاہم جسم نحیف اور رنگ زرد تھا۔ چڑھتے سورج کی دھوپ اس زردی کو اور بھی گہرا کر رہی تھی۔ بالکل اداس اور کھوئی کھوئی سی وہ خاموشی کے ساتھ دیگر عورتوں کے ہمراہ آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

''وہ سامنے شاہ سائیں کا مزار ہے۔ یہ عورتیں وہیں جا رہی ہیں۔'' ہاشو نے میرے سوال کرنے سے پہلے ہی جواب دیا۔

میں نے دیکھا، دور کچھ فاصلے پر درختوں کے جھنڈ میں شاہ سائیں کے مزار کا سفید اور نیلا گنبد دکھائی دے رہا تھا۔ جھنڈے وغیرہ بھی لگے ہوئے تھے۔

میں نے کہا۔ ''وہ سفید چادر والی لڑکی وہی تو نہیں جس کے بارے میں ہم ابھی بات کر رہے تھے۔ میرا مطلب ہے دین محمد صاحب کی بیٹی؟''

''ہاں یہ وہی ہے۔ تاجور نام ہے پر تمہیں کیسے اندازہ ہوا؟''

''ہاشو بھائی، اس دن وہ رنگین تانگا نہیں پھنس گیا تھا کھڈے میں، اس دن بات ہو رہی تھی ناں کہ دین محمد صاحب بیمار بیٹی کو کہیں دکھا کر آ رہے ہیں۔''

''ہاں، وہ اب بھی بیمار ہی لگتی ہے۔ اس کے ساتھ بائیں طرف جو دو لڑکیاں ہیں یہ اپنے چوہدری بشیر صاحب کی دھی رانیاں ہیں۔ اپنے بھائی کے لاپتا ہونے سے بہت پریشان ہیں یہ بھی۔''

میں نے دھیان سے دیکھا اور پہچان لیا۔ یہ چوہدری بشیر کی بیٹیاں ہی تھیں۔ میں اپنی اصل شکل کے ساتھ ان کے گھر میں جا کر ان سے مل چکا تھا۔

گرم ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ تاجور کی پیلے پھولوں والی چادر ایک لمحے کے لیے اس کے سر سے سرکی اور مجھے اس کا پورا چہرہ دیکھنے کا موقع ملا۔ وہی چہرہ جو میرے دل کا داغ تھا جو انمٹ روشنائی سے میرے سینے میں نقش ہو چکا تھا۔ خزاں کی ایک اپنی خوب صورتی ہوتی ہے اور ان لمحوں میں یہ خوب صورتی مجھے تاجور کے اردگرد نظر آئی۔

ان آٹھ دس عورتوں کے عقب میں کچھ فاصلے پر دو پولیس اہلکار بھی چل رہے تھے۔ ان کے کندھوں پر رائفلیں تھیں۔ ''یہ پولیس والے یہاں کیا کر رہے ہیں؟'' میں نے ہاشو سے پوچھا۔

''یہ گارڈ ہے۔ دین محمد صاحب کے گھر پر ہوتے ہیں۔''

''میں سمجھا نہیں؟''

وہ رازداری کے لہجے میں بولا۔ ''چن جی! اسلام آباد والے پھیرے کے بعد اب دین محمد صاحب اور ان کے گھر والے خاص الخاص لوگ ہو گئے ہیں۔ دو تین پولیس والے تو کیا پورا تھانہ ان کا پہرا دے سکتا ہے۔ دارابیوں کے ساتھ رشتے داری ہونے والی ہے ان کی۔''

میں نے دانت پیسے اور دل ہی دل میں کہا۔ ایسی تیسی دارابیوں کی اور ان کے ہوتے سوتوں کی۔ تاجور کی مرضی نہ ہوگی تو کوئی اس کی پرچھائی کو بھی نہ چھو سکے گا۔

یہ تیسرے روز کی بات ہے۔ شام کا وقت تھا۔ بہت حبس ہو رہا تھا۔ حاکم علی اور میں ایک ہی کمرے میں سوتے تھے۔ ہم کھانا کھا کر بیٹھے تھے اور گپ شپ کر رہے تھے۔ کل صبح چونکہ مجھے لوڈر لے کر منڈی نہیں جانا تھا لہٰذا ''ایزی'' محسوس کر رہا تھا۔ حاکم علی نے ابھی ابھی آم چوسا تھا اور اس کا گودا اس کی گھنی مونچھوں پر لگا ہوا تھا۔ کچی لسی کے تین چار بڑے گھونٹ لے کر بولا۔ ''ویسے اخبار والی خبر سے تیری بڑی نیک نامی ہوئی ہے پنڈ میں...... لیکن...... ایک بات سچی سچی بتا۔'' اس نے ذرا شرارتی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''کیا بتاؤں؟''

''کہیں ایسا تو نہیں کہ تجھے گھڑی اٹھاتے کسی نے دیکھ لیا ہو...... اور تُو نے سوچا ہو کہ

اگر تُو نے گھڑی واپس نہ کی تو پھر پکڑا جائے گا؟''

''حاکم بھائی! مجھ کو ایسے لگتا ہے کہ آپ مجھے نوکری ملنے سے خوش نہیں ہو۔ اگر ایسی بات ہے تو میں سویرے ہی بستر بوریا باندھ کر نکل جاتا ہوں۔''

''اوئیں وقاصے، میں تو مذاق کر رہا تھا تُو بھی چوہدری جی کے ٹریکٹر کی طرح ایک دم ہی بگڑ جاتا ہے۔'' حاکم علی بلند آواز میں ہنسا۔

اسی دوران میں دوسرے کمرے سے ہاشو نے اسے آواز دے دی اور وہ میرا کندھا تھپکتا ہوا باہر نکل گیا۔

میں اسی وقت کا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے پتا تھا اب حاکم ایک ڈیڑھ گھنٹے سے پہلے واپس نہیں آئے گا۔ میں نے لکڑی کے دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھائی اور ٹچ والا سیل فون نکال لیا (ایک ہلکا سا فون بھی میں نے عام استعمال کے لیے رکھا ہوا تھا) کچھ ہی دیر بعد میں سجاول سے بات کر رہا تھا۔ ''ہاں بھئی! کیسی گزر رہی ہے اپنی معشوق کے پنڈ میں؟'' سجاول نے چھوٹتے ہی سوال داغا۔

میں نے کہا۔ ''یار! تم سے پہلے بھی گزارش کی ہے اس کے بارے میں ایسے لفظ استعمال نہ کیا کرو۔ مجھے تکلیف ہوتی ہے۔''

''اچھا، چلو بتاؤ کیسی گزر رہی ہے بی بی تاجور صاحبہ کے پنڈ میں؟'' وہ بولا۔

''پہلے تم بتاؤ۔ تمہاری کیسی گزر رہی ہے خورسنہ کے ساتھ؟''

''بہت اچھی۔ بڑے تحمل والی ہے۔ میرے جیسے ڈنگے بندے کے ساتھ گزارا کر رہی ہے۔''

''ہاں اس بات پر تو اسے حسنِ کارکردگی کا ایوارڈ بھی دیا جا سکتا ہے۔'' میں نے تائید کی پھر ذرا توقف سے پوچھا۔ ''اور اس کا بلکہ...... تم دونوں کا بیٹا؟''

''ہاں...... ذیشان بھی پہنچ گیا ہے۔ اس کے آنے سے وہ اور بھی اچھی ہو گئی ہے بلکہ سج بھی گئی ہے۔ اب طرح لگتا ہے جیسے اب ہمارا گھر مکمل ہو گیا ہے۔ وہ یہ جان کر بھی بہت خوش ہوئی ہے کہ تم ہمارے آس پاس ہی موجود ہو۔''

''سجاول! سچی بات یہ ہے کہ وہ تم سے پیار کرتی ہے اور تم سے ڈرتی بھی ہے۔ ابھی تو نیا کام ہے اس لیے سب کچھ ٹھیک جا رہا ہے...... لیکن تمہیں اپنے حد سے بڑھے ہوئے غصے پر کنٹرول کرنا ہوگا۔ تم دونوں نے ایک دوسرے کے لیے بہت کچھ چھوڑا ہے، اب اپنے غصے کو بھی چھوڑ دو۔''

''اچھا گرو جی۔'' وہ بیزار لہجے میں بولا۔

میں نے کہا۔''گرو تم ہو۔طوفانی محبت کی......طوفانی ملاقاتیں کیں......اور تین چار ماہ میں چٹ منگنی اور پٹ بیاہ بھی کر لیا۔ہمیں دیکھو برسوں سے پیار کی راہ میں گھسیٹے مار رہے ہیں۔''

''اس میں بھی زیادہ قصور تمہارا ہی ہے۔میں چنگی طرح جانتا ہوں۔تم نے خود دور کیا ہے اسے اپنے آپ سے۔''

میں سجاول کے ساتھ سکھیرا گاؤں کے حالات کے بارے میں بات کرتا رہا۔میں نے اسے یہاں کی صورتِ حال سے آگاہ کیا اور سیف کے والدین کے بارے میں بھی بتایا۔آخر میں سجاول اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔''کسی بھی طرح کا کوئی مسئلہ ہو تو مجھے بتانا ہے۔مجھے تمہارے پاس پہنچنے میں آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں لگے گا۔''

ابھی سجاول سے فون پر میری بات ختم ہی ہوئی تھی کہ باہر کچھ شور سنائی دیا۔میں نے اپنا ڈبی دار رومال سر پر باندھا اور پشاوری چپل پہنتا ہوا باہر نکل آیا۔گاؤں کے پرائمری اسکول کی عمارت تھوڑے ہی فاصلے پر تھی۔میں نے دیکھا کہ تین چار بندے کسی نوجوان لڑکے سے الجھ رہے ہیں۔اسکول کے گیٹ کے پاس بلب روشن تھا۔اس کی روشنی میں، میں نے لڑکے کو غور سے دیکھا اور میری کھوپڑی میں دھماکا سا ہوا۔وہ انیق تھا۔اس نے پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی۔تین چار افراد اس سے لڑ رہے تھے اور گاہے بگاہے دھکے بھی دے رہے تھے۔میں نے ان دھکے دینے والوں کو پہچان لیا۔یہ دین محمد صاحب کے کارندے ہی تھے۔

''اوئے تیرا کام کیا ہے یہاں۔تجھے پہلے بھی کہا تھا کہ یہاں نہیں آنا۔'' ایک کارندے نے شعلہ بار لہجے میں کہا۔

''دیکھو تمیز سے بات کرو۔کوئی چور، ڈاکو نہیں ہوں میں۔''

''تیری تمیز کی تو......'' کارندے نے غلیظ گالی نکالی اور انیق کو الٹے ہاتھ کا تھپڑ مارنا چاہا۔

لیکن وہ بھی انیق تھا۔کرائے کے ایسے ٹٹو اس کا کیا بگاڑ سکتے تھے۔اس نے خود کو بچایا۔تین چار افراد نے اسے دبوچ لیا۔اسی دوران میں دور سے دو مسلح پولیس اہلکار بھی بھاگتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔یہ اسی گارڈ کے لوگ تھے جو دین محمد صاحب کے گھر پر مقرر کی گئی تھی۔پولیس والوں کو دیکھتے ہی کارندوں کا حوصلہ بڑھ گیا اور انہوں نے انیق کو زمین پر گرانا چاہا۔وہ تڑپ کر ان کی گرفت سے نکل گیا۔ایک پولیس اہلکار نے انیق کو رائفل کے کندے

سے ضرب لگانا چاہی۔ یہ ضرب اچٹ کر سر کے بجائے کندھے پر لگی۔ انیق نے پلک جھپکتے میں رائفل پر ہاتھ ڈالا اور اہلکار کے سینے پر ایسی لات رسید کی کہ وہ اچھلتا ہوا جوہڑ میں جا گرا۔

اب یہ پولیس مقابلہ بنتا جا رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ مجھے مداخلت کرنی چاہیے یا نہیں کہ ایک طرف سے چوہدری دین محمد صاحب لپکتے دکھائی دیئے۔ دوسرا پولیس اہلکار خطرناک انداز میں اپنی رائفل سیدھی کر رہا تھا۔ شاید وہ انیق کی ٹانگ وغیرہ پر فائر مار کر اسے زخمی کرنا چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا، انیق اسے یہ موقع مشکل سے ہی دے گا۔

چوہدری دین محمد جلدی سے اہلکار اور انیق کے درمیان آ گئے۔ انہوں نے اہلکار کو روک دیا۔ پھر وہ گرج کر انیق سے مخاطب ہوئے۔ ''اوئے کیوں تیری موت تجھے آوازیں مار رہی ہے۔ مرنا ہی ہے تو جا کسی ریل گڈی کے نیچے سر دے دے، تجھے کہا بھی تھا کہ پھر اپنی منحوس شکل نہ دکھانا۔''

انیق کی مدھم آواز میرے کانوں تک پہنچی۔ ''چوہدری جی! میں آپ سے کچھ لینے دینے نہیں آیا۔ دو باتیں ہی تو کرنا چاہتا ہوں آپ لوگوں سے۔ آپ کو کیا خطرہ ہے مجھ سے؟''

''کنجر کے بچے! خطرہ مجھے نہیں، تجھے ہے۔ ٹانگیں چیری جائیں گی تیری۔ لاش کسی کھیت میں پڑی ہو گی۔ کتے کھا رہے ہوں گے اسے۔ جس طرح وہ حرام موت مرا ہے اس سے زیادہ بری موت مرے گا تو، اس کے ساتھ ہی چوہدری دین محمد نے ایک زناٹے کا تھپڑ انیق کے گال پر مارا۔ پھر دوسرا...... پھر تیسرا۔

چوہدری دین محمد نے اس پر تھپڑوں کی بارش کر دی۔ ساتھ ساتھ وہ گرج رہے تھے۔

''دفع ہو جا...... دور ہو جا نظروں سے۔''

انیق اس طرح تھپڑ کھانے والا شخص نہیں تھا لیکن اس نے کھائے اور بغیر مزاحمت کے کھائے۔ اسے ''سعادت مندی'' کے سوا اور کیا کہا جا سکتا تھا۔ وہ تاجور کو باجی اور آپی کہتا تھا اور وہ تاجور کا باپ تھا۔ جو اہلکار انیق کی لات کھا کر جوہڑ میں گرا تھا وہ اب اچھل اچھل کر انیق کی طرف آ رہا تھا مگر چوہدری دین محمد کے اشارے پر ان کے کارندے، اہلکار کو سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یقینی بات تھی کہ چوہدری دین محمد اس بات کو زیادہ بڑھانا نہیں چاہتے کیونکہ یہ ان کی بیٹی کا معاملہ تھا۔

جھگڑے کی آوازیں سن کر حاکم علی، ہاشو، اس کی بہن انوری اور دیگر لوگ بھی باہر نکل آئے تھے۔ کچھ تو وہیں کھڑے رہے اور کچھ جھگڑے کی جگہ پر چلے گئے۔

میرے کانوں میں ابھی تک وہی الفاظ گونج رہے تھے جو تھوڑی دیر پہلے دین محمد صاحب نے ادا کیے تھے۔ انہوں نے انیق کو لتاڑتے ہوئے کہا تھا...... وہ حرام موت مرا ہے......اس سے زیادہ بری موت مرے گا تو......

ان الفاظ میں یقیناً میری طرف ہی اشارہ کیا گیا تھا۔ دین محمد صاحب اور ان کی پوری فیملی بڑی اچھی طرح جانتی تھی کہ انیق شروع دن سے میرا سنگی ساتھی رہا ہے۔ اب میری ''وفات'' کے بعد وہ یہاں سکھیرا گاؤں میں آجا رہا تھا۔ دین محمد صاحب جتنی نفرت مجھ سے کرنے لگے تھے، یقیناً اتنی ہی انیق کے حصے میں بھی آ گئی تھی۔

میں نے ہاشو سے پوچھا۔ ''کون ہے یہ لڑکا؟''

ہاشو بولا۔ ''ٹھیک سے تو مجھے بھی پتا نہیں۔ ایک دن پہلے بھی یہاں آیا تھا۔ دین محمد صاحب کی بیٹھک سے نکلتے دیکھا تھا میں نے۔ اس وقت بھی دین محمد صاحب کا منہ لال بوٹی ہو رہا تھا۔''

''مجھے تو لگتا ہے کہ یہ اسلام آباد سے ہی چوہدری دین کے پیچھے لگ کر آیا ہے۔'' ایک کارندے مجید نے خیال ظاہر کیا۔

''کسی کا کوئی مخبر شخبر نہ ہو۔'' ہاشو نے ڈکار لیتے ہوئے کہا۔ ''پچھلی دفعہ پرچون والے رمضان نے بتایا تھا کہ چوہدری دین سے ملنے سے پہلے یہ لڑکا اس کی دکان پر بھی گیا تھا اور سن گن لیتا رہا تھا۔ پوچھ رہا تھا کہ یہ سڑک کیوں بن رہی ہے۔ کون بنوا رہا ہے۔ دارابیوں کی گاڑیاں یہاں کس کے گھر آتی ہیں؟''

کارندے مجید نے کہا۔ ''ہوسکتا ہے کہ دارابیوں کی طرح کوئی اور وڈی پارٹی بھی ہو جس نے چوہدری دین کے گھر پر نظر رکھی ہوئی ہو۔'' لہجے میں شرارت تھی۔

ہاشو بولا۔ ''مجیدے، میں نے چپیڑ مارنی ہے تیرے منہ پر۔ چوہدری دین اب ہمارے پنڈ کا رہائشی ہے۔ اس کی عزت ہم سب کی عزت کے ساتھ سانجھی ہے۔''

مجیدا کٹ کر رہ گیا۔

جھگڑے پر اب قابو پالیا گیا تھا۔ دین محمد صاحب نے بڑی فراست سے معاملے کو سنبھالا تھا۔ دوسری طرف انیق کی بھی عقلمندی تھی کہ دین محمد صاحب کے تھپڑ کھا کر بھی وہ چپ رہا تھا۔ ورنہ وہ کسی کی سہنے والا کہاں تھا۔

میں جھگڑے والی جگہ پر جا کر انیق کے رُوبرو ہونا نہیں چاہتا تھا۔ بے شک چہرہ تیس پینتیس فیصد تک بدل چکا تھا مگر مجھے شک تھا کہ جو لوگ انیق کی طرح مجھے بہت نزدیک سے

جانتے ہیں وہ مجھے دیکھ کر چونک سکتے ہیں اور بعدازاں شبے کا شکار بھی ہو سکتے ہیں۔

میں کمرے میں واپس آ گیا۔ سوچنے لگا کہ انیق کے یہاں وارد ہونے کی اصل وجہ کیا ہوسکتی ہے۔ یہ عام سا نظر آنے والا لڑکا عام نہیں تھا۔ اس کے اندر ایک گھاگ اور ذہین وفطین شخص چھپا ہوا تھا۔ داؤد بھاؤ جیسا شخص اسے دست راست کی حیثیت دیتا تھا۔ اس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پی رکھا تھا...... درجنوں زبانیں پانی کی سی روانی کے ساتھ بولتا تھا اور اس کے علاوہ بھی اَن گنت صلاحیتیں تھیں جو گنوائی جاسکتی تھیں۔

یہ عین ممکن تھا کہ وہ ابھی تک میری ''موت'' کے حوالے سے مطمئن نہ ہوا ہو اور میرا کھوج لگاتا پھر رہا ہو۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ وہ یہاں تاجور سے مل کر اس کی دلجوئی کرنا چاہتا ہو۔ اس کے علاوہ یہاں بڑی بڑی گاڑیوں میں داراب فیملی کے لوگوں کی آمد بھی انیق کو چونکانے کا باعث ہوسکتی تھی۔

میں سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ میں انیق کو خود سے کتنی دیر تک دور رکھ سکوں گا اور یہ دور رکھنا کس حد تک مفید یا نقصان دہ ثابت ہوگا۔

کچھ دیر بعد حاکم علی واپس کمرے میں آیا تو میں نے اس سے پوچھا کہ کیا بنا؟

وہ بولا۔ ''پتا نہیں کون خردماغ منڈا ہے۔ خوامخواہ اوکھلی میں سر دے رہا ہے۔ پولیس والے تو اسے کسی صورت چھوڑنے کو تیار نہیں ہورہے تھے۔ چوہدری دین کی بات بھی نہیں مان رہے تھے۔ تھانے میں ٹیلی فون کررہے تھے۔ چوہدری دین نے مشکل سے معاملہ رفع دفع کیا ہے۔''

''چاہتا کیا ہے؟''

''کوئی اندر کا معاملہ ہی لگتا ہے۔'' حاکم علی رازداری سے بولا۔ ''نہیں تو ایسے کون زورا زوری کرسکتا ہے چوہدری دین محمد کے ساتھ۔ اب تو علاقے کے بڑے بڑے چوہدری اور زمیندار اس کے اَگے پچھے پھرتے ہیں۔ وڈے وڈے پھنے خاں افسر آ کر سلام کرتے ہیں چوہدری دین کو۔''

یہ اس سے تیسرے روز کی بات ہے۔ چوہدری بشیر نے مجھ سے کہا کہ مہران گاڑی کا تیل پانی چیک کرلوں، میں نے گھر والوں کو کہیں لے جانا ہے۔

میں نے فرمانبرداری سے اثبات میں سر ہلایا اور اپنے کام میں لگ گیا۔ کسی وقت میرے چہرے کے مرمت شدہ حصوں میں اکڑاؤ سا پیدا ہو جاتا تھا، تاہم گرمی میں صورتِ حال بہتر رہتی تھی۔ پسینہ وغیرہ بھی اسی طرح نکلتا تھا جس طرح چہرے اور جسم کے باقی

مساموں سے نکلتا تھا۔شروع شروع میں چہرے کے تبدیل شدہ حصوں کی اسکن کے رنگ میں معمولی سا فرق موجود تھا مگر اب غور کرنے سے بھی یہ فرق محسوس نہیں ہوتا تھا۔

دو روز پہلے بارش ہوئی تھی اور موسم خوشگوار تھا۔ میں گاڑی کو کپڑا مار کر فارغ ہوا ہی تھا کہ ادھیڑ عمر منشی منظور آتا دکھائی دیا۔ ''ہاں بھئی وقاص، گڈی ریڈی ہے؟'' اس نے پوچھا۔ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ بولا۔ ''چلو اسٹارٹ کرو۔''

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ وہ میرے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔ ہم گاڑی چلا کر چوہدری بشیر کے گھر کے دروازے کے بالکل سامنے لے گئے اور نیچے اتر گئے۔ دروازہ کھلا اور سیفی کی بیمار والدہ شفقت بی بی نمودار ہوئی۔ اس کی دو بیٹیوں نے اسے دائیں بائیں سے سہارا دے رکھا تھا، وہ بمشکل چل پا رہی تھیں۔ انہیں بمشکل گاڑی کی پچھلی نشست پر بٹھایا گیا۔ اتنی مشقت سے ہی ان کا سانس بری طرح پھول گیا تھا۔ میں نے اور منشی منظور نے انہیں سلام کیا۔ دونوں لڑکیاں بھی ماں کے ساتھ ہی بیٹھ گئیں اور ہم روانہ ہو گئے۔ شفقت بی بی کے سر پر وہی چادر تھی جو میں ڈھائی تین ماہ پہلے ان کے لیے لایا تھا۔ یہ چادر ان تحفوں میں شامل تھی جو میں ان کے لیے ''سیفی کی طرف سے'' لایا تھا۔

مجھے پتا چلا کہ ہمیں قریباً بیس کلومیٹر دور ایک شاہ پور نامی گاؤں جانا ہے۔ وہاں کوئی اللہ والا دم درود کرتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس کی دعا میں بہت اثر ہے۔ آنکھوں میں امید کے چراغ جلائے یہ دکھیاری ماں نہ جانے کہاں کہاں بھٹک رہی تھی، یہ جانے بغیر کہ وہ جس لخت جگر کی تلاش میں ہے، وہ اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔

میں نیم پختہ راستوں پر ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ منشی ماسٹر منظور نے سیف کی والدہ کو آپا جی کہہ کر مخاطب کیا اور بولا۔ ''یہ وہی ہے جی، جس کا ذکر میں نے آپ سے کیا تھا، وقاص نام ہے اس کا۔''

سیف کی والدہ بولیں۔ ''اچھا یہ ہے وہ جس کی تصویر اخبار میں بھی چھپی تھی۔'' اس کے ساتھ ہی انہوں نے پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر میرا کندھا تھپکا اور بولیں۔ ''شاباش پتر! ایمانداری سے زیادہ وڈی چیز اور کوئی نہیں۔ اللہ سوہنا دنیا اور آخرت دونوں میں اس کا صلہ دیتا ہے۔''

''شکریہ ماں جی۔'' میں نے عقب نما آئینے میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''محنت سے کام کر، اللہ نے چاہا تو یہاں بھی ترقی ملے گی تجھے۔''

''آپ کی دعا کی ضرورت ہے جی۔''

انہوں نے گہری سانس لی۔ ''دعاؤں میں واقعی بڑا اثر ہوتا ہے پتر۔ یہ کبھی بھی بے کار نہیں جاتیں۔ ان کا صلہ ایک صورت میں نہ ملے تو دوسری صورت میں مل جاتا ہے...... بس ہمیں دعا کرتے رہنا چاہیے۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔''

وہ مجھ سے میرے گھر بار اور شادی وغیرہ کے بارے میں پوچھنے لگیں۔ میں نے وہی کچھ بتایا جو اس سے پہلے چوہدری بشیر اور دیگر کو بتا چکا تھا۔ میں شادی شدہ تھا۔ دو چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ بوڑھے ماں باپ کا بوجھ بھی میرے سر پر تھا۔ بھائیوں میں ناچاقی اور جھگڑے کے سبب اپنے آبائی علاقے سے نکل آیا تھا اور مارا مارا پھر رہا تھا...... وغیرہ وغیرہ۔

ہم دوپہر کے وقت اس شاہ پور نامی گاؤں میں پہنچے۔ یہ اللہ والے بزرگ صرف جمعرات اور جمعے کو عقیدت مندوں کے مسائل سنتے تھے اور دعا کرتے تھے۔ ایک مسجد کے ساتھ ایک کشادہ حجرہ تھا۔ وہاں بہت سے لوگ جمع تھے۔ میں نے دیکھا کہ سیفی کی والدہ اور دونوں بہنوں نے اپنی جوتیاں گاڑی کے اندر ہی رہنے دیں اور ننگے پاؤں چلتی ہوئی حجرے کی طرف چلی گئیں۔

وہاں سادہ سے لنگر کا انتظام بھی تھا۔ دوپہر کا کھانا وہیں کھانے کے بعد ہم ظہر کے بعد وہاں سے واپس روانہ ہوئے۔ سیفی کی والدہ کا سانس بری طرح پھولا ہوا تھا اور چہرے کا رنگ نیلگوں ہو رہا تھا۔ وہ مسلسل آنسو بہا رہی تھیں۔ بڑی بیٹی شازیہ کی آواز گاہے بگاہے ابھرتی تھی۔ وہ انہیں پچکارتی تھی اور کہتی تھی۔ ''بس امی جی! ایسے کریں گی تو آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔ بس چپ ہو جائیں اب۔''

میں نے عقب نما آئینے میں دیکھا، اس نے ماں کا سر اپنے کندھے سے لگایا ہوا تھا اور اپنی ہلکی گلابی اوڑھنی سے بار بار ان کے آنسو پونچھ رہی تھی۔ وہ صاف رنگت اور متناسب جسم والی لڑکی تھی۔ میں اسے ایک بار پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ عمر سولہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اس نے آدھا گھونگھٹ نکالا ہوا تھا۔ خوب صورت ناک میں کوکا چمک رہا تھا۔ دوسری بہن سال دو سال چھوٹی ہوگی۔ اس کی شکل سیفی سے بہت ملتی تھی۔ جب بھی اس کے چہرے پر نگاہ جاتی، خوبرو پنجابی گبرو کا چہرہ نگاہوں میں گھوم جاتا۔ وہی جو جاماجی کے ایک قریبی ٹاپو پر ابدی نیند سو رہا تھا۔

ابھی ہم سکھیرا سے چھ سات کلومیٹر دور ہی تھے کہ ایک موٹر سائیکل نے ہمیں اوورٹیک کیا اور ہمارے آگے آگے چلنے لگی۔ اس پر دو لڑکے سوار تھے۔ دونوں شلوار قمیص میں تھے اور

مقامی لگتے تھے۔ وہ موٹر سائیکل کو کبھی ہماری گاڑی کی سائیڈ پر لے آتے اور اندر جھانکنے لگتے، کبھی آگے آگے چلنے لگتے۔ انداز سے شرارت عیاں تھی۔

ماسٹر منظور نے مجھے مخاطب کیا اور بگڑے تیوروں کے ساتھ کہا۔ ''وقاصے! گاڑی آگے نکالوان سے۔''

میں نے گاڑی آگے نکالنے کی کوشش کی مگر انہوں نے راستہ نہیں دیا۔ ''لوفر کہیں کے۔'' ماسٹر منظور بڑبڑایا۔

میں نے کچھ آگے جا کر موٹر سائیکل کو زبردستی اوورٹیک کرنے کی کوشش کی۔ وہ بھی ایک نمبر کے ڈھیٹ تھے بالکل راستہ نہیں دے رہے تھے۔ میں نے اوورٹیک تو کر لیا مگر موٹر سائیکل ذرا پھسلی اور گاڑی کی سائیڈ سے ٹکرانے کے بعد بری طرح ڈگمگائی۔ یقیناً گاڑی پر بھی اچھا خاصا ڈینٹ پڑ چکا تھا۔ ''کمینے...... الو کے پٹھے۔'' ماسٹر منظور نے دانت پیس کر کہا۔

ہم نے گاڑی روک لی۔ موٹر سائیکل بھی رک گئی۔ گاڑی کے دونوں دروازوں پر اچھی خاصی خراشیں آئی تھیں۔ موٹر سائیکل چلانے والے تنومند لڑکے کا رنگ سرخ انگارہ ہو رہا تھا۔ بلاتردد میرا گریبان پکڑ کر بولا۔ ''آنکھیں نہیں ہیں...... اندھے ہو؟''

ماسٹر منظور نے اس سے میرا گریبان چھڑاتے ہوئے کہا۔ ''اوے کم بختا، حیا کر...... ایک تو گڈی چھیل کر رکھ دی، اوپر سے بکواس کر رہے ہو۔''

لڑکے کا ساتھی جس کی گھنی مونچھیں تھیں اور شکل سے ہی جھگڑالو لگتا تھا، گرجا۔ ''زبان سنبھال کر بات کر ماسٹر! ایویں بےعزتی خراب نہ ہو جائے۔''

بات مزید بگڑی تو میں نے سوالیہ نظروں سے ماسٹر منظور کی طرف دیکھا۔ وہ غصے میں تھے لیکن تھر تھر کانپ رہے تھے۔ میرا گریبان پھر تنومند لڑکے کے ہاتھ میں تھا۔ ماسٹر منظور نے اسے بےغیرت کہا تو جواب میں اس نے بھی ماسٹر منظور کو یہی خطاب دیا۔ اب اسے سزا دینا ضروری ہو گیا تھا۔ میں نے اس کے منہ پر مکا جڑا اور وہ الٹ کر کھیت میں جا گرا۔

گاڑی کے اندر سے شفقت بی بی اور لڑکیاں چلائیں۔ دونوں لڑکے مجھ سے بھڑ گئے۔ میں نے انہیں محتاط انداز میں چوٹیں لگائیں لیکن وہ بپھرتے جا رہے تھے۔ ایک لڑکا لپک کر گیا اور اس نے موٹر سائیکل کی سائیڈ پر لٹکے بیگ میں سے آہنی مکا نکال کر ہاتھ پر چڑھا لیا۔ دوسرا اس سے بھی دو ہاتھ آگے نکلا۔ اس نے قمیص کے نیچے سے چاقو برآمد کر لیا۔ یہ وہی گھنی مونچھوں والا تھا جو موٹر سائیکل چلانے والے کے عقب میں بیٹھا تھا۔ ''چیر ڈالوں گا۔'' وہ دہاڑا اور چاقو سے میری ران کو نشانہ بنانا چاہا۔

میں نے اس کا وار بچایا اور بازو مروڑ کر چاقو اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ جس طرح چاقو میں نے اس سے چھینا تھا، اسے فوراً اندازہ ہو گیا کہ میں ان کے بس کا نہیں ہوں۔ وہ گالیاں بکتا ہوا جوار کے اونچے کھیت میں گھس گیا۔ وہ پسپا ہو رہا تھا مگر انداز ایسا ہی تھا جیسے کوئی آتشیں ہتھیار وغیرہ لینے کے لیے جا رہا ہو۔

جس نے ہاتھ پر آہنی مکا چڑھایا تھا، وہ تذبذب میں تھا کہ حملہ کرے یا نہیں، یہ وہی تھا جس نے چند سیکنڈ پہلے ماسٹر منظور کو گندی گالی دی تھی۔ میں نے چاقو ماسٹر منظور کی طرف پھینکا اور اس ہٹے کٹے کو روئی کی طرح دھنک دیا۔ چند سیکنڈ بعد حالت یہ تھی کہ اس کے ناک منہ سے خون چھوٹ رہا تھا اور وہ کھیت کی مٹی میں لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ اگر گاڑی میں بیٹھی ہوئی شازیہ بے ساختہ چلا کر مجھے روک نہ دیتی تو شاید میں اس کے چہرے کا بھرتا بنا دیتا۔

میں نے اپنا اٹھا ہوا ہاتھ روک لیا اور لڑکے کی پسلیوں میں ایک ٹھوکر مار کر اٹھ کھڑا ہوا۔ شفقت بی بی بھی دہائی دے رہی تھیں اور مجھے پیچھے ہٹنے کا کہہ رہی تھیں...... لیکن جس انداز میں لڑکی شازیہ بے ساختہ پکاری تھی اس نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں نے اس کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ہراس کے ساتھ ساتھ دکھ کی لہر نظر آئی۔ نہ جانے کیوں ان لمحوں میں میرے دل نے گواہی دی کہ شازیہ اور اس لڑکے کے درمیان کوئی تعلق موجود ہے۔

اس دوران میں ایک اور نوجوان لڑکا دکھائی دیا جو ایک پگڈنڈی پر بھاگتا ہوا ہماری طرف آ رہا تھا۔ وہ لڑنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ وہ ہانپا ہوا تھا اور رنگ زرد ہو رہا تھا۔ اس نے زخمی لڑکے کو اکبر کہہ کر مخاطب کیا اور بولا۔ ''کیا ہو گیا ہے، کیسے ہوا ہے جھگڑا؟''

میں نے کہا۔ ''یہ سوال جواب اس سے بعد میں کر لینا۔ پہلے اسے کسی ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ تاکہ اس کے بوتھے پر ٹانکے شانکے لگ سکیں۔''

اکبر نامی اس لڑکے کی ٹھوڑی کے نیچے گہرا زخم آیا تھا اور خون تیزی سے نکل رہا تھا۔ وہ اب بھی بڑی گرم نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''اب بھی دل میں کوئی حسرت ہے تو بعد میں نکال لینا۔ وقاص نام ہے میرا۔ بشیر صاحب کا ڈرائیور ہوں۔ یہ گاڑی کے اندر میری بہنیں بیٹھی ہیں۔ ان پر گندی نظر ڈالو گے تو یہ آنکھیں نکال کر ہتھیلی پر رکھ دوں گا۔''

وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا مگر اس کے ساتھی نے روکا۔ ''نہیں اکبرے! بعد میں دیکھ لیں گے۔ ابھی چل اسپتال۔''

اس نے اکبر کو سہارا دے کر اٹھایا۔ خون بند کرنے کے لیے ٹھوڑی کے نیچے ایک کپڑا باندھا۔ دونوں موٹر سائیکل پر سوار ہو کر نکل گئے۔ ہم نے بھی وہاں زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب

نہیں سمجھا۔ عین ممکن تھا کہ جو چاقو بردار دھمکیاں دیتا ہوا بھاگ گیا تھا وہ واقعی کمک لے کر پہنچ جاتا، یا پھر کوئی آتشیں ہتھیار لے آتا۔ اس کا چاقو ماسٹر منظور نے اپنے پاس محفوظ کر لیا تھا تا کہ اگر تھانے کچہری تک نوبت پہنچے تو اسے ثبوت کے طور پر پیش کیا جا سکے۔

شفقت بی بی اپنی پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ مسلسل آج کل کے لوفر لڑکوں کو کوسنے دے رہی تھیں اور میری شان میں قصیدہ پڑھ رہی تھیں، بولیں۔ ''آج ان کا بھائی یہاں ہوتا تو وہ بھی ایسے ہی غصہ کرتا جیسے تم نے کیا ہے۔ کسی نیک ماں کے پتر لگتے ہو۔'' انہوں نے عقب سے ہاتھ بڑھا کر میرا کندھا تھپکا اور دعائیں دیں۔

میں نے ماسٹر منظور سے کہا۔ ''منشی جی، یہ لڑکے تھے کون؟ کیا پہلے بھی کبھی ان پر نظر پڑی ہے؟''

''نہیں پہلی بار دیکھا ہے بدبختوں کو۔ پر یہ شاید مجھے جانتے ہوں۔ ان میں سے ایک مجھے ماسٹر کہہ رہا تھا۔''

''پتا نہیں کہاں کے تھے لعنتی۔ شاید وہاں لنگر خانے سے ہی پیچھے لگ گئے ہوں۔'' شفقت بی بی بڑبڑائیں۔

منشی جی اور شفقت بی بی دونوں ہی لڑکوں کے سلسلے میں لاعلمی کا اظہار کر رہے تھے مگر میں جان گیا تھا کہ کم از کم شازیہ تو انہیں جانتی ہے۔ اکبر نامی لڑکے کی درگت بنتے دیکھ کر وہ جس طرح اچانک بے ساختہ پکاری تھی، وہ لہجہ کسی دوسرے نے چاہے نوٹ نہ کیا ہو لیکن میں نے کیا تھا۔ وہ اب بھی بالکل چپ بیٹھی ہوئی تھی۔ آدھا گھونگھٹ اس کے چہرے پر لہرا رہا تھا۔

''تمہیں تو کوئی چوٹ نہیں لگی پتر؟'' شفقت بی بی نے ہمدردی سے پوچھا۔

''نہیں ماں جی، میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

گاؤں پہنچ کر میں نے گاڑی گھر کے دروازے کے عین سامنے روکی اور پچھلا دروازہ کھول کر کھڑا ہو گیا۔ حسبِ سابق دونوں لڑکیوں نے ماں کو سہارا دیا اور آہستہ آہستہ چلاتی ہوئی اندر لے گئیں۔ اس دوران میں دو سیکنڈ کے لیے میری نگاہ شازیہ کی نگاہ سے ملی۔ مجھے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے غصے اور نفرت کی لہر سی دکھائی دی۔

ڈیرے پر جا کر منشی ماسٹر منظور نے سارا ماجرا چوہدری بشیر کے گوش گزار کر دیا۔ چوہدری بشیر بھی پریشان ہو گئے لیکن صاف ظاہر تھا کہ وہ اس بات کو بڑھانا نہیں چاہتے تھے۔ اس میں ان کی بیٹیوں کا تذکرہ آ رہا تھا۔ وہ حقے کا ایک طویل کش لے کر بولے۔ ''پر وہ منڈے تھے

لون، آلے دوالے کے کسی پنڈ کے ہی ہوں گے ناں، حلیے کیسے تھے؟''
ماسٹر منظور نے کہا۔''شلواروں قمیصوں میں تھے، کھاتے پیتے گھر کے لگتے تھے۔ایک لڑکے کے گلے میں سونے کی موٹی زنجیر بھی تھی۔اب افسوس ہورہا ہے کہ ان کی موٹر سائیکل کا نمبر کیوں نوٹ نہ کیا ہم نے۔''
ہاشو بھی پاس ہی بیٹھا تھا۔ گلے میں سونے کی زنجیر کا سن کر وہ تھوڑا سا چونکا بولا۔ ''ماسٹر جی! آپ نے منڈے کا نام اکبر بتایا ہے ناں؟'' ماسٹر منظور نے اثبات میں جواب دیا۔ ہاشو نے کہا۔''گورا رنگ ہے۔ ذرا گھونگریالے بال ہیں تھوڑے سے لمبے؟''
''ہاں، بال لمبے ہی تھے۔'' میں نے تائید کی۔
''میں سمجھ گیا جی۔ یہ مہرا پور کے منڈے تھے۔ادھر کوئی میاں نثار ہے۔کافی وڈا باغ ہے اس کا۔اس کا ایک بھائی پھل فروٹ کی آڑھت بھی کرتا ہے۔ بندے تو یہ شریف ہی ہیں۔''
لڑکوں کی شناخت ہوگئی تو پھر گفتگو کا رخ دوسری طرف مڑ گیا کہ کیا رویہ اختیار کیا جائے؟ فیصلہ یہی ہوا کہ اگر گاڑی کا نقصان ہوا ہے تو ان لڑکوں کو بھی ٹھیک ٹھاک سزا مل گئی ہے۔اگر وہ لوگ چپ رہتے ہیں تو ہم بھی چپ رہیں اگر وہ بات آگے بڑھاتے ہیں تو پھر دیکھا جائے گا۔
چونکہ جھگڑا ایک ویران جگہ پر ہوا تھا اور دوسرے لوگوں کو اس کا پتا نہیں چلا تھا۔ مار کٹائی کا سارا معاملہ تین چار دوستوں تک ہی محدود رہا تھا اس لیے عین ممکن تھا کہ معاملہ یہیں پر ٹھپ ہو جاتا۔

○......❖......○

دو دن اسی طرح گزر گئے۔کسی طرح کی کوئی گڑبڑ نہ ہوئی۔مطلب یہی تھا کہ وہ لڑکے اس معاملے میں چپ سادھ گئے ہیں۔ یہ تیسرے دن کی بات ہے۔گاؤں میں کوئی شادی تھی۔دور کہیں ڈھولک بجنے کی مدھم آواز ابھر رہی تھی۔شام کے سائے گہرے ہوتے ہوتے اب تاریکی میں بدل چکے تھے۔لوڈشیڈنگ کے سبب بجلی بھی غائب تھی۔ ایسے میں گاؤں کی تاریکی اور بھی گہری محسوس ہوتی ہے۔بس گھروں کے اندر لیمپ اور لالٹینیں وغیرہ روشن ہوتی ہیں۔میرے سرہانے بھی لالٹین کی لَو تھرتھرا رہی تھی۔ میں کمرے کی دیوار سے ٹیک لگائے تاجور کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔شاید وہ بھی اس ڈھولک میں شریک ہو۔زرد جوڑا پہنے، ہونٹوں پر ہلکی لالی سجائے اپنے بالوں کو بار بار کانوں کے پیچھے اڑس رہی ہو۔وہ کیا سوچ رہی

ہوگی، اس کی شربتی آنکھوں میں کون سارنگ ہوگا؟ دل کی بے قراری بڑھنے لگی۔ میں کمرے سے نکل کر باہر کیکر کے درختوں کے نیچے آ گیا۔ میرے ہاتھ میں شیشم کی ایک چھوٹی لاٹھی تھی دیہات میں رات کے وقت آوارہ کتوں کو خود سے دور رکھنے کے لیے اس طرح کی احتیا کر لی جاتی ہے۔ خاص طور سے جو لوگ گاؤں میں اجنبی ہوتے ہیں، انہیں زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ گلیوں میں اِکا دُکا لوگ نظر آتے تھے۔ میری نگاہ ایک چھوٹے سے جلوس پر پڑی یہ زرق برق کپڑوں والی عورتوں اور لڑکیوں کا جلوس تھا۔ انہوں نے ہاتھوں میں تھالیاں ا چنگیریں اٹھائی ہوئی تھیں، ان کے اندر موم بتیاں روشن تھیں۔ غالباً یہ عورتیں مہندی لے لڑکی والوں کے گھر جا رہی تھیں۔

میں نے دل ہی دل میں خود سے پوچھا۔ ”کیا تاجور بھی ان میں موجود ہوگی؟“

میں چند قدم چل کر ایک کچا راستہ پار کر کے گاؤں کے گھروں کے کچھ اور نزدیک گیا۔ درختوں کی اوٹ میں کھڑا ہو کر لڑکیوں اور عورتوں کے دمکتے ہوئے چہرے دیکھنے کوشش کرنے لگا۔ وہ شاید ان میں موجود نہیں تھی۔ وہ تو گہرے غم کے گھیرے میں تھی۔ ایسی تقریبات میں کہاں شریک ہو سکتی تھی۔ میں اس جگمگاتے جلوس کو دیکھتا رہا جو اب گاؤں کے بیرونی راستے پر چلتا چلتا ایک گلی میں گم ہو رہا تھا۔ اچانک میں چونکا۔ دو لڑکیاں جلوس میں چ قدم پیچھے رہ گئی تھیں۔ ان میں سے ایک دہری ہو کر شاید اپنے سینڈل وغیرہ کا فیتہ درست کر رہی تھی۔ تب یکا یک وہ مڑی اور درختوں میں اوجھل ہوگئی۔

نہ جانے کیوں مجھے لگا کہ یہ کوئی اور نہیں سیفی کی بہن شازیہ ہے۔ میں بھی محتاط اند میں درختوں کی طرف گیا۔ لڑکی کا ہیولا اب ایک اونچے کھیت میں اوجھل ہو رہا تھا۔ میں تھوڑی دیر بعد احتیاط سے کھیت میں داخل ہو گیا۔ اونچی فصل کے درمیان آواز پیدا کیے بغ میں آگے بڑھتا رہا۔ یکا یک ایک مدھم آواز نے میرے قدم جکڑ لیے۔ میں وہاں کا تہاں کھ ہو گیا۔

آواز سو فیصد شازیہ ہی کی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”تمہیں کیا ضرورت پڑی تھی اس طر کی حرکت کرنے کی، تم نے جب بھی کہا ہے میں کسی نہ کسی طرح ملنے آ ہی گئی ہوں ناں.....“

مردانہ آواز ابھری۔ ”وہ تو بس ویسے ہی ذرا موڈ ہو گیا تھا تمہارے ساتھ ساتھ کا..... لیکن جو کچھ ہوا ہے، اس کنجر ڈرائیور کے لیے چنگا نہیں ہوا ہے۔ پورا بدلہ لوں گا سے، ہتھ پیر توڑ کر لولا نہ کر دوں تو اکبر نام نہیں۔“

”نہ نہ ایسا نہ کرنا اکبر..... تمہیں میری قسم..... بات بڑھ جائے گی۔ آخر میں بدنا

ری اور میرے گھر والوں کی ہی ہونی ہے ناں۔ سیف بھائی جان کے گم ہونے سے امی ابا پہلے ہی بڑے پریشان ہیں۔ مجھے تو ہر وقت امی کی طرف سے دھڑ کا لگا رہتا ہے۔''

''تُو فکر نہ کر شازی! بڑے طریقے سے ماروں گا اسے۔ ہم پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔ ب اس کی دو چار ہڈیاں توڑے بغیر مجھے چین نہیں آنا۔''

''ایسی باتیں نہ کیا کرو اکبر، ہماری مصیبتیں پہلے ہی کوئی کم نہیں ہیں۔ اوپر سے اتنی ںیں لگوالی ہیں تم نے۔ میرے دل کو کچھ ہو رہا ہے۔''

پھر شاید وہ اس کے گلے لگ گئی تھی۔ دس پندرہ سیکنڈ خاموشی رہی پھر شازیہ کی سسکتی لی سی آواز ابھری۔ ''یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے ناں، اللہ کرے میں ہی مر جاؤں۔''

''کتنی بار کہا ہے۔ ایسی باتیں نہ کیا کر۔ اگر تُو نہیں تو پھر میں بھی نہیں۔''

''لیکن تیرے بھائی جان کبھی نہیں مانیں گے اکبر! وہ ذات برادری سے باہر کبھی رشتہ ہیں جوڑیں گے۔''

فصل میں سرسراہٹ کی آواز آئی۔ شازیہ جیسے کانپ کر بولی۔ ''شاید کوئی آ رہا ہے اس ف...... اچھا...... میں چلتی ہوں۔''

میں اپنی جگہ دم سادھے بالکل ساکت کھڑا رہا۔ چومنے کی مدھم آواز آئی۔ وہ مجھ سے ا چھ فٹ کے فاصلے سے گزری اور پھر کھیت سے باہر نکل گئی۔ کچھ دیر بعد اندازہ ہوا کہ فصل ہا جو سرسراہٹ پیدا ہوئی وہ کسی آوارہ کتے کی وجہ سے تھی۔ میں اپنی جگہ دم بخود کھڑا رہا۔ ازیہ کے جانے کے بعد اکبر بھی اپنی جگہ سے حرکت میں آ گیا۔ مجھے پتا چلا کہ کھیتوں کے ہاں ایک تنگ پگڈنڈی پر اس کی موٹر سائیکل بھی کھڑی ہے۔ اس نے اپنا منہ سر ایک پڑے میں لپیٹا اور موٹر سائیکل کو اسٹارٹ کرنے کے لیے اس کے اوپر بیٹھ گیا۔

میں نے تیزی سے ایک فیصلہ کیا اور اس کے سامنے آ گیا۔ وہ بری طرح چونکا اور ں کی مدھم روشنی میں مجھے پہچاننے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا ہاتھ نیفے کی طرف بڑھایا۔ یقیناً وہاں کوئی ہتھیار وغیرہ موجود تھا۔

''کون ہے؟'' وہ بے دھڑک بولا۔

میں اس کے بالکل سامنے چلا گیا۔ اس نے آنکھیں سکیڑ کر مجھے دیکھا۔ میں نے کہا۔ ین دن پہلے کی ملاقات ہے۔ اتنی جلدی بھولی تو نہیں ہوگی۔''

اس نے لمبی سانس لی۔ ''اچھا تو یہ تم ہو۔ یہ تو چنگا ہی کیا کہ خود چل کر آ گئے ہو۔''

میں نے اطمینان سے کہا۔ ''دیکھو اگر تمہاری قمیص کے نیچے پستول وغیرہ ہے تو وہ مت

نکالنا۔ میں نہیں چاہتا کہ تم فائر مار کر مجھے زخمی یا ''اناللہ'' کرو اور قانون کے ہتھے چڑھ کر لمبے ٹائم کے لیے اندر ہو جاؤ۔ ہاں اگر اپنا دوسرا شوق پورا کرنا چاہو تو کوئی حرج نہیں۔''

''کیا بکواس کر رہے ہو؟'' وہ پھنکارا۔ اس کا ہاتھ بدستور قمیص کے نیچے ہی تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اسلحے کی موجودگی کے باوجود میرا اطمینان اسے خوف زدہ کر رہا ہے۔ میں اس کے نزدیک ایک معمولی ڈرائیور تھا اور اپنی اوقات سے بڑھ کر بات کر رہا تھا۔

''میں نے ابھی سب کچھ سن لیا ہے اکبرے! تُو میری دو چار ہڈیاں توڑنا چاہتا ہے ناں...... اور مجھے یہ سزا منظور ہے۔ لیکن اس سے زیادہ کی اجازت میں تمہیں نہیں دوں گا۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

میں نے ہاتھ میں پکڑا ہوا مضبوط لاٹھی نما ڈنڈا اسے تھما دیا اور کہا۔ ''لے بھئی، اپنا بدلہ لے لے تُو۔ میرا یقین رکھ۔ میں تجھے نہیں روکوں گا۔ نہ تجھ پر جوابی وار کروں گا، لے لے۔''

''تیرا ناٹک میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔'' وہ بدستور غصیلے لہجے میں بولا۔

''یہ ناٹک نہیں ہے۔ میں سچ مچ اس بات کے لیے تیار ہوں کہ تُو اپنا پرسوں والا بدلہ اتار لے۔''

وہ مجھے گھور کر دیکھتا رہا پھر اس نے لاٹھی نما ڈنڈا گھما کر دور پھینک دیا۔ تنک کر بولا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ تم چھپ کر ہماری باتیں سن رہے تھے؟''

''سن رہا تھا تو پتا چلا ہے ناں کہ تم مالک کی بیٹی سے محبت کرتے ہو اور اسی وجہ سے پرسوں والی بات پر افسوس بھی ہو رہا ہے۔ تمہیں کافی چوٹیں آئی ہیں۔''

''مطلب کی بات کرو۔'' وہ پھنکارا۔

''مطلب کی بات بھی کروں گا۔ پہلے تم سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔''

''کس بات کی معافی؟'' اس کا انداز بدستور تاؤ دلانے والا تھا۔ تاہم اب اس نے ہاتھ قمیص کے نیچے سے نکال لیا تھا۔

''اس بات کی معافی کہ تمہیں چوٹیں لگیں۔ اسپتال جانا پڑا۔'' میرے لہجے میں لجاجت تھی۔

وہ ابھی تک اکڑا کھڑا تھا۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اس کا غصہ کم کرنے کے لیے چند نرم فقرے بولے۔

وہ ذرا دھیما پڑا تو میں نے کہا۔ ''مجھے دشمن نہ سمجھو۔ میں نے بشیر صاحب کے گھر

نمک کھایا ہوا ہے۔ان کی بیٹیوں کو بہنوں کی طرح عزت دیتا ہوں۔ اگر شازیہ تمہیں چاہتی ہے اور تم بھی اسے پسند کرتے ہو تو پھر اس طرح چھپ چھپ کر ملنا کسی طور ٹھیک نہیں۔ میں تم دونوں کی مدد کر سکتا ہوں۔"

میرے آخری فقرے سے اس کی آنکھوں میں چمک سی نمودار ہوگئی۔

قریباً پندرہ بیس منٹ بعد میں اور اکبر گاؤں سے کچھ فاصلے پر درختوں کے نیچے گھاس کے ایک قطعے پر چادر بچھائے بیٹھے تھے۔قریب سے ہی پانی کا کھالا گزر رہا تھا۔ ہوا میں ہلکی سی خنکی تھی۔اب اکبر کافی بے تکلفی سے بات کر رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔"میں پھر کہتا ہوں، میرے دل میں کوئی چور نہیں اس لیے مجھے کوئی ڈر بھی نہیں۔لیکن شازیہ کے گھر والوں سے رشتے کی بات میں خود تو نہیں کر سکتا۔ یہ بات تو میرے بڑوں نے کرنی ہے۔ بھائی جان نے کرنی ہے یا پھر والدہ نے کرنی ہے اور بھائی جان برادری سے باہر کبھی تیار نہیں ہوں گے۔انہوں نے تو جیسے قسم کھائی ہوئی ہے والدہ کو بھی ان کی بات ماننا پڑتی ہے کیونکہ وہی سارا گھر چلاتے ہیں......"

"تو پھر اکبر! تم کیوں اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں ہوتے؟"

وہ ذرا اداسی سے بولا۔"میں نے تمہیں بتایا ہے ناں کہ قسمت ساتھ نہیں دے رہی۔ ایف اے والوں کو نوکری کہاں ملتی ہے، اپنا ہی کام کرنا پڑتا ہے۔سوڈا واٹر بنانے کا کام بڑی محنت اور ہمت سے شروع کیا تھا جگہ بنائی تھی، مشینیں لے کر آیا تھا...... ماں بے چاری نے کچھ زیور دیا تھا، وہ بھی لگا دیا مگر پچھلے سال جو سیلاب آیا اس نے سب برباد کر دیا۔ مشینیں بھی لوہے کے بھاؤ بیچنا پڑیں۔"

اکبر سے ڈیڑھ دو گھنٹے کی گفتگو میں، میں نے نتیجہ نکالا کہ لڑکا ذرا خودسر اور غصیلا ضرور ہے لیکن نیت کا برا نہیں۔ محنت کرنا چاہتا ہے شازیہ کو کچھ بن کر دکھانا چاہتا ہے لیکن فی الحال قسمت ساتھ نہیں دے رہی۔ بڑے بھائی کا بہت رعب ہے اور اس نے دبا کر رکھا ہوا ہے۔

میرے دل نے گواہی دی کہ اگر مناسب طریقے سے اس کی کوئی مالی مدد ہو سکے تو وہ چند مہینوں میں ہی کچھ کر کے دکھا سکتا ہے۔ میں نے اسے اشارہ دیا کہ میں ایک ایسے شخص کو جانتا ہوں جو باہمت نوجوانوں کے ساتھ تعاون کرتا ہے۔ کاروبار میں لگانے کے لیے انہیں بہت تھوڑے منافع پر سرمایہ فراہم کرتا ہے۔ میں نے کہا۔"اکبر! اگر تم کہو تو میں تمہارے لیے اس سے بات کر کے دیکھتا ہوں۔"

وہ دل گرفتہ انداز میں بولا۔"لیکن وقاص بھائی! میرے پاس گروی وغیرہ رکھنے کے

لیے کچھ نہیں ہے۔''
''اس کا بھی کوئی حل نکل آئے گا۔'' میں نے اسے تسلی دی۔

○......❖......○

اگلے روز میں نے صبح دس بجے کے قریب ایک عجیب تماشا دیکھا۔ میں فون پر سجاول اور خورسنہ سے بات کر رہا تھا۔ بات ختم کر کے کمرے سے نکلا تو کالے رنگ کی کئی بڑی بڑی گاڑیاں دندناتی ہوئی گاؤں میں داخل ہو رہی تھیں۔ ان کی آمد سے پہلے ہی راتوں رات راستہ ہموار اور درست کر دیا گیا تھا۔ مقامی پولیس کے باوردی اہلکار بھی یہاں وہاں چوکس کھڑے تھے۔ ان میں گارڈ کے لوگ بھی تھے۔

یہ گاڑیاں سیدھی چوہدری دین محمد صاحب کے گھر کے عین سامنے رکیں۔ یہاں چونے سے لائنیں وغیرہ ڈالی گئی تھیں۔ دو لگژری جیپوں میں سے قیمتی لباسوں والی کئی خواتین اتریں۔ ان میں سے کچھ کافی فربہ اندام بھی تھیں۔ دیگر گاڑیوں سے بھی لوگ اترے۔ چوہدری دین محمد اور گاؤں کے چوہدری عظمت رندھاوا نے بڑے تپاک سے مہمانوں کو خوش آمدید کہا۔ وہ ان کے راستے میں جیسے بچھے جا رہے تھے۔

''یہ دارابی ہیں۔'' ہاشو نے میرے پہلو میں کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''وہ جو شلوار قمیص اور کالی واسکٹ والا گورا چٹا لڑکا نظر آ رہا ہے، وہ شکیل داراب صاحب کا چھوٹا بھرا ہے، دیکھا ہے کیسی شان ہے اس کی۔ دارج نام ہے اس کا۔''

ہاشو ٹھیک کہہ رہا تھا۔ چھبیس ستائیس سال کا وہ نوجوان دراز قد تھا اور شکل میں شکیل داراب سے کافی ملتا تھا۔

میں نے کہا۔ ''ہاشو! یہ کس چکر میں آئے ہیں؟''

''چن جی، چکر کا تمہیں بتایا تو تھا۔ دین محمد صاحب کے ستارے بڑے اُچے جا رہے ہیں۔ جن کے گھر گورنمنٹ مہمان آ جائے ان کو پھر کس بات کی کمی ہوتی ہے۔''

چند ہی لمحوں میں مہمان دین محمد کی حویلی کے اندر چلے گئے۔ چار پانچ کالی گاڑیوں کے پاس بس ان کے ڈرائیور اور مسلح گارڈز وغیرہ کھڑے رہ گئے۔ میرا سینہ جیسے سلگنے لگا۔ شاید قسمت پھر اپنا چکر چلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اب تک میں تاجور سے اس لیے دور تھا کہ مجھے اپنے حالات سے پیچھا چھڑانے کا کوئی طریقہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ٹیکساری گینگ میری جان کو آیا ہوا تھا۔ اب میری زندگی نے ایک نئی اور حیران کن کروٹ لی تھی اور یہ کروٹ مجھے پھر تاجور کے گاؤں میں اور اس کی گلی میں لے آئی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ اب تاجور کے ساتھ ایک

نہایت دلکش زندگی میری دسترس میں آسکتی ہے۔ اب میں تاجور سے بات کرنا چاہتا تھا۔ اسے بتانا چاہتا تھا کہ میں زندہ ہوں...... میں یہاں ہوں۔ میں اپنے جسم اور اپنی روح میں کچھ نئے ارادے لے کر یہاں پہنچا تھا۔

میں بے قراری سے اِدھر اُدھر ٹہلتا رہا۔ میں نے ہاشو کی بہن انوری سے بھی اس بارے میں سن گن لینے کی کوشش کی۔

وہ بولی۔ ''یہ وڈے لوگوں کے وڈے معاملے ہیں۔ ہم غریبوں کو کیا پتا۔''

''مگر باجی انوری تمہیں تو آتی جاتی ہوا بھی گھروں کے اندر کی خبریں دے جاتی ہے۔''

میری تعریف نے اسے خوش کیا، بولی۔ ''لگتا ہے وہی چوہدری دین صاحب کی دھی رانی والا معاملہ ہے۔ یہ لوگ پنڈ کی سیر کے بہانے چوہدری دین کی دھی تاجور کو دیکھنے ہی آئے ہیں۔ رشتہ پکا کرنے سے پہلے سیانے لوگ ایسے ہی ایک دو پھیرے لگا کر اپنی تسلی کرتے ہیں۔''

غالباً انوری کی بات درست ہی تھی۔ یہ لوگ گاؤں کی سیر بھی کرنا چاہ رہے تھے۔ گاؤں کے باغ اور مزار کی طرف کسی مرد کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ خیر باغ کی سیر کو تو وہ لوگ نہیں گئے لیکن مزار دیکھنے چلے گئے۔ گاڑیوں کے اندر سے چڑھاوے کی بڑی بڑی طشتریاں اور چادریں وغیرہ نکالی گئیں۔ مزار کی قبر کو پھولوں کے عرق سے دھوئے جانے کا پروگرام بھی تھا۔ اس مقصد کے لیے پلاسٹک کے بڑے بڑے ''کینوں'' میں لاہور سے عرق بھر کر لایا گیا تھا۔

جب یہ سامان گاڑیوں سے اتارا جا رہا تھا میں اور ہاشو بھی قریب ہی کھڑے تھے، میں نے ہاشو کو اشارہ کیا اور لپک کر ایک وزنی کین اپنے کندھے پر رکھ لیا، ہاشو نے بھی ایک طشتری سر پر اٹھا کر اس رضا کارانہ خدمت میں حصہ لیا۔ یوں ہیلپرز کی حیثیت سے ہم مزار کے احاطے میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے اور ایک طرف مؤدب بیٹھ گئے۔ اس حصے کو ایک قنات کے ذریعے باقی احاطے سے علیحدہ کیا گیا تھا۔

کچھ دیر بعد مہمانانِ گرامی بھی پہنچ گئے۔ دارج داراب نے اپنے چوڑے شانوں پر سیاہ شال پھیلا رکھی تھی اور اس کی شان و شوکت دیکھنے کے قابل تھی۔ اس کے اردگرد فیملی کے دوسرے لوگ تھے۔ ایک سے بڑھ کر ایک خوب صورت اور بارعب۔ ان میں فربہ جسم کی ایک ادھیڑ عمر خاتون نمایاں نظر آتی تھی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ دارج کی والدہ تھی۔ اس کے جسم پر قیمتی زیورات تھے۔ ہمیں یہ سارا منظر مزار کی جالی میں سے نظر آ رہا تھا۔ وہ سب لوگ مزار کی دوسری جانب تھے۔ دین محمد صاحب اور گاؤں کے چوہدری عظمت رندھاوا

صاحب کی فیملی کی کچھ عورتیں بھی میزبانوں کی حیثیت سے اردگرد موجود تھیں۔
اور پھر دوطرفہ جالیوں سے گزر کر میری نگاہ تاجور پر پڑی۔ وہ ایک خاموش تصویر کی طرح دکھائی دیتی تھی۔ کریم کلر کی اوڑھنی میں اس کے چہرے کی دلکش سادگی نمایاں ہورہی تھی۔ اس کی حالت اب پہلے سے کافی بہتر دکھائی دیتی تھی، قبر کے تعویذ کو دھویا جاچکا تھا۔ پھر اس پر کئی قیمتی چادریں چڑھائی گئیں۔ میں نے دیکھا، اس دوران میں دارج کی والدہ گاہے بگاہے بڑی شفقت کے ساتھ تاجور سے بات بھی کرتی رہی...... تب ایک فقیر عورت نے صدا لگائی۔ ''بادشاہواں دیاں مراداں پوریا ہوں، اللہ سوہنا مبارک گھڑیاں دکھائے......''
ایک اور عمر رسیدہ فقیرنی بولی۔ ''رب کرم کرے...... بلاواں مصیبتاں دور کرے، ہر بھیڑی نظرتوں بچائے۔''
میں نے دیکھا دارج کی دبنگ والدہ نے اپنے چمکیلے پرس میں ہاتھ ڈالا اور پانچ پانچ سو کے کئی نوٹ نکالے۔ انہیں پہلو میں کھڑی دولڑکیوں کے سر پر وارا اور ایک دراز قد ملازم کے حوالے کر دیا۔ ان دولڑکیوں میں سے ایک تو دارج کی بہن لگتی تھی دوسری تاجور تھی۔ دراز قد ملازم نوٹ لے کر برآمدے میں چلا گیا۔ فقیرنیاں اور ان کے بچے اس پر ٹوٹ پڑے، اس نے نوٹ ہوا میں اچھال دیئے۔
دوسری طرف دارج کی والدہ نے تاجور کو اپنے ساتھ لگایا اور محبت سے اس کا سر چوما۔
عین اس وقت میری نگاہ دارج داراب پر پڑی، وہ کن انکھیوں سے تاجور کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بڑی فدا ہو جانے والی نگاہ تھی۔
میں نے دانت پیسے اور دل ہی دل میں کہا۔ ''تجھے تو دیکھ لوں گا بچو۔''
جب وہ لوگ دعا کر رہے تھے تب بھی میں نے آنکھیں جالی سے لگا رکھی تھیں اور تاجور کو دیکھ رہا تھا۔ شال کے ہالے میں اس کا چہرہ گلاب کے سفید پھول کی طرح تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ وہ نہ جانے کیا پڑھ رہی تھی؟ کیا سوچ رہی تھی؟ کیا ان لمحوں میں اس کے ذہن کے کسی گوشے میں، میں بھی موجود تھا۔ اگر موجود تھا تو اس نے میرے لیے دعا کی ہوگی؟ دعا کے دوران میں دارج داراب کی ترچھی نگاہیں تاجور کی طرف ہی رہیں۔
''میری طرف دیکھو تاجور! میں یہاں ہوں۔'' میں نے دل ہی دل میں کہا۔
''ہاں دیکھو تاجور...... میں یہاں ہوں۔ میں آگیا ہوں۔ تمہارا شاہ زیب۔ تمہارے لیے...... صرف تمہارے لیے۔ دیکھو میری طرف...... جالیوں کے پار دیکھو۔ میں مزار کی دوسری طرف کھڑا ہوں...... دیکھو تاجور......''

میں نے بہت دفعہ پڑھا تھا کہ ٹیلی پیتھی کے اثرات ہوتے ہیں۔ خیالات لہروں کی طرح سفر کرتے ہیں اور ایک ذہن سے دوسرے ذہن تک پہنچتے ہیں۔ میں اسی ٹیلی پیتھی کو آزمانے کی بچکانا کوشش کررہا تھا۔ تاجور نے اس وقت تک میری طرف نہیں دیکھا لیکن جب تھوڑی دیر بعد لنگر کھولنے کے بعد لاہور کے مہمان واپس دین محمد صاحب کے گھر کی طرف روانہ ہوئے تو مجھے یوں لگا کہ دور سے تاجور کی نظر مجھ پر پڑی ہے...... اور دو لمحوں کے لیے میرے چہرے پر ٹھہری ہے۔ یقیناً یہ میرا واہم ہی تھا۔ اس بدلی ہوئی شکل کے ساتھ اور اتنی دور سے وہ مجھے کہاں پہچان سکتی تھی۔

O......❖......O

سہ پہر کے وقت لاہور کے یہ وی آئی پی مہمان واپس روانہ ہوگئے۔ علاقے کے چوہدریوں اور زمینداروں نے بہت سی مقامی سوغات ان کے ساتھ روانہ کی تھیں۔ گاؤں کا اصل چوہدری تو عظمت رندھاوا تھا، مگر ان گھڑیوں میں اس کا رتبہ دین محمد صاحب سے کہیں کم دکھائی دے رہا تھا۔ شام کے وقت جب ہاشو کی بہن انوری روٹیاں پکانے کے لیے ڈیرے کا تندور گرم کررہی تھی، میں نے اس سے سن گن لی۔

اس نے کہا۔ ''لگتا ہے کہ اپنے دین محمد صاحب کی دھی رانی لاہور کی بیگموں کو پسند آگئی ہے۔''

''کیا مطلب؟ بات پکی ہوگئی ہے؟''

''پکی تو نہیں ہوئی پر کچی بھی نہیں رہی۔ وہ جو بڑی بیگم تھیں وہ بڑے پیار سے بولتی رہی ہیں دین محمد صاحب کی دھی کے ساتھ۔ جاتے جاتے اپنے ہاتھ کی ایک انگوٹھی اتار کر تاجور کی انگلی میں ڈال گئی ہیں۔ ایک طرح سے یہ اس بات کا اشارہ ہوتا ہے کہ اب بات آگے چلے گی اور پکی انگوٹھی بھی پہنائی جائے گی۔''

''وہ خوش تھی؟ میرا مطلب ہے جس کو انگوٹھی پہنائی گئی؟''

انوری نے تندور میں لکڑیاں جھونکتے جھونکتے مجھے گھورا۔ ''وے تُو ڈرائیور ہے، اپنی ڈرائیوری کر۔ تُو اتنی معلومات کیوں لے رہا ہے؟''

''مجھے پتا چلا ہے کہ تم جس لڑکی کی بات کررہی ہو، اس کا رشتہ اپنے مالک بشیر صاحب کے بیٹے سیف سے طے تھا؟''

''ہاں طے تو تھا؟'' انوری نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''پر اب مہینے ہوگئے ہیں کہ کچھ اتا پتا نہیں اس کا۔ کوئی کب تک جوان دھی کو گھر میں بٹھائے گا۔''

''پھر بھی دین محمد صاحب کو انتظار تو کرنا چاہیے۔ انہوں نے زبان دی ہوئی ہے۔''

''تم بات تو ٹھیک کر رہے ہو، پر یہ جو لاہور والے ہیں۔ یہ بہت ہی وڈے لوگ ہیں۔ ہماری سوچ سے بھی زیادہ وڈے ہیں اور وہ جو وڈی بیگم صاحبہ ہیں وہ تو کوئی مہارانی لگتی ہیں۔ اگر انہوں نے ارادہ کر ہی لیا تو پھر بھلا ان کے سامنے کس کی پیش چلنی ہے؟''

''تو اپنے بشیر صاحب چپ ہو کر بیٹھ جائیں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''کچھ پتا نہیں لیکن مالک بڑے دکھی نظر آ رہے ہیں۔ ابھی مسجد سے نماز پڑھ کر نکل رہے تھے۔ آنکھیں لال سرخ ہو رہی تھیں۔ مجھے لگتا ہے کہ روتے رہے ہیں۔''

''ان کو دین محمد صاحب سے کھل کر بات کرنی چاہیے۔ آخر انہوں نے زبان دی ہوئی ہے۔''

''مجھے شک پڑتا ہے کہ وہ بات کریں گے آج۔'' انوری نے تندور کے دھوئیں میں آنکھیں میچتے ہوئے جہاندیدہ لہجے میں کہا۔

کچھ دیر بعد میں نے بھی بشیر صاحب کو ڈیرے پر دیکھا۔ وہ بہت غم زدہ دکھائی دے رہے تھے۔ وہ پہلے ہاشو کو آوازیں دیتے رہے، وہ کہیں گیا ہوا تھا، پھر مجھ سے بولے۔ ''وقاصے، ذرا بیٹھک کی جھاڑ پونچھ کر دے، کسی نے آنا ہے۔''

''جی مالک۔'' میں نے ادب سے کہا۔

میرے ذہن نے اطلاعی گھنٹی بجائی کہ ممکن ہے آنے والے تاجور کے ابا جی دین محمد صاحب ہی ہوں۔

میں نے بیٹھک میں جا کر جھاڑ پونچھ کی اور صفائی کرتے ہوئے ایک اور کام بھی صفائی سے کر دیا۔ اپنا ننھا سا اسپائی کیمرا بھی وہاں رکھ دیا۔ ایک پڑچھتی پر کچھ آرائشی چیزیں پڑی تھیں۔ رنگ دار پتھروں والی ایک چھوٹی سی رنگین چاٹی پر میں نے وہ 4 ملی میٹر کا ریسیور چپکا دیا اور باہر آ گیا۔ یہ کیمرا میری زندگی میں بہت اہم ہو چکا تھا۔

اس شام تو کوئی مہمان آیا اور نہ کوئی میٹنگ ہوئی لیکن اگلے روز شام کے فوراً بعد اسی کمرے میں چوہدری دین محمد اور چوہدری بشیر اکٹھے ہوئے اور ان کے درمیان چونکا دینے والی بات چیت ہوئی۔ میں نے اپنے اسمارٹ فون کو اس کام کے لیے پہلے سے چارج اور تیار کر رکھا تھا۔ کمرے میں چونکہ ٹریکٹر ڈرائیور حاکم بھی لیٹا ہوا تھا اس لیے میں تاریکی میں کھڑے لوڈر میں چلا گیا اور فون پر دونوں کی گفتگو سننے لگا۔

کمرے میں روشنی بہت کم تھی اور کیمرے کا رخ بھی مناسب نہیں تھا۔ تصویر نہیں آ رہی

تھی مگر دونوں کی آوازیں صاف تھیں۔ چوہدری بشیر بڑے دکھی انداز میں کہہ رہا تھا۔ ”یہ امید نہیں تھی مجھے تم لوگوں سے...... اور تم سے تو بالکل بھی نہیں دین محمد۔ اللہ نہ کرے...... اللہ نہ کرے میرا پتر مرتو نہیں گیا، گم ہی ہے ناں، آج نہیں تو کل...... کل نہیں تو پرسوں اس نے آجانا ہے۔ تمہیں اس کی ماں پر بھی ترس نہیں آرہا جو پہلے ہی بستر سے لگی ہوئی ہے۔“

”میری پوری بات سنو بشیر۔“ دین محمد نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ”اور یہ بات سننے کے لیے تم کو اپنا دل بہت بڑا کرنا پڑے گا۔“

”میرا دل بڑا ہی ہے، تمہارا چھوٹا ہے جو وڈے لوگوں کو دیکھ کر بے ایمان ہو رہے ہو۔ اپنی زبان سے پھر رہے ہو......“

”محمد بشیر...... محمد بشیر...... تمہیں اصل بات کا پتا نہیں ہے۔ تمہیں نہیں پتا اصل بات کا۔“ دین محمد صاحب نے گلوگیر آواز میں کہا اور پھر چند لمحے بعد توقف سے بولے۔ ”ذرا دل بڑا کر کے سنو۔ میں تمہیں شروع سے ساری بات بتاتا ہوں۔ تمہارا سیف کبھی بھی بہاولپور نہیں گیا تھا بلکہ وہ پاکستان میں ہی نہیں تھا۔ وہ پہلے میانوالی سے آگے لیہ گیا تھا اور پھر وہاں سے ایک کمینے کے ساتھ برونائی چلا گیا تھا...... برونائی کا نام سنا ہوا ہے تم نے؟“

چوہدری بشیر، دین محمد صاحب کی سنی ان سنی کرتے ہوئے بولا۔ ”میرے دل کو کچھ ہو جائے گا دین محمد! مجھے بتاؤ میرے سیفی کے بارے میں تمہارے پاس کیا خبر ہے، کیا ہوا ہے میرے بچے کو۔“

دین محمد صاحب بہت بوجھل آواز میں بولے۔ ”کاش...... مجھے تم کو یہ خبر نہ سنانی پڑتی۔ میرا کلیجہ غم سے پھٹ رہا ہے محمد بشیر...... پر میں کیا کروں۔ میرے چپ رہنے سے سچ بدل تو نہیں جائے گا...... تیرا پتر...... تیرا پتر...... اب اس دنیا میں نہیں ہے محمد بشیر۔“

ایک دم کمرے میں دھاڑوں کی آوازیں گونجیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ چوہدری بشیر اکلوتے جوان بیٹے کے بارے میں اندوہناک خبر سن کر پچھاڑیں کھا رہا تھا اور دین محمد اسے شاید سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ چوہدری بشیر کی آواز بار بار میرے سیل فون کے اسپیکر پر ابھرتی تھی۔ ”نہیں یہ جھوٹ ہے۔ کسی نے تمہیں غلط بتایا ہے......“ یہ ہنگامہ بے حد دشواری سے سرد ہو پایا۔ لیکن اس دوران میں کسی اور کی آواز سنائی نہیں دی۔ شاید آواز دوسروں تک نہیں جا رہی تھی یا دونوں بزرگوں نے کسی دوسرے کو اس طرف آنے سے منع کر دیا تھا۔

”لو تھوڑا سا پانی پی لو۔“ دین محمد صاحب کی آواز ابھری۔

چوہدری بشیر نے شاید ایک آدھ گھونٹ ہی لیا ہوگا پھر وہ دل فگار آواز میں بولا۔ ''میں یہ کیسے مان لوں، اس کا دوست آیا تھا۔ بہاولپور سے اس کے تحفے لے کر......''

''وہی بد بخت تو اس ساری مصیبت کی جڑ تھا'' دین محمد صاحب نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''اسی کمینے کے پیچھے لگ کر سیفی لیہ پہنچا تھا اور پھر برونائی۔ مجھے پتا تھا محمد بشیر تمہیں میری بات پر آسانی سے یقین نہیں آئے گا۔ میں ایک گواہ بھی لے کر آیا ہوں اپنے ساتھ۔ لیکن میں ایک بار پھر کہوں گا۔ یہاں میرے اور تیرے درمیان جو گل بات ہو، وہ باہر نہ نکلے۔ نہیں تو دونوں گھروں کا بڑا نقصان ہو جائے گا۔''

چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں آئیں۔ دین محمد صاحب نے کسی کو پکارا تھا۔ تب اندازہ ہوا کہ جس کو پکارا گیا تھا، وہ آ گیا ہے اور اب بند کمرے میں چوہدری بشیر اور دین محمد صاحب کے علاوہ بھی کوئی موجود ہے۔ پھر فون کے اسپیکر کے ذریعے اس کی آواز مجھ تک پہنچی۔ میں نے پہچان لیا۔ یہ سیفی کا لنگوٹیا دوست صدیق تھا۔ (میں جب سیفی کی طرف سے تحفے لے کر سیفی کے گھر جانا چاہ رہا تھا تو صدیق سے میری ملاقات ہوئی تھی اور اس نے بڑی رازداری سے مجھے بتایا تھا کہ وہ جانتا ہے سیفی برونائی میں ہے) اب کافی دنوں سے صدیق سکھیرا میں موجود نہیں تھا، تاہم دین محمد صاحب نے گواہی کے لیے اسے کہیں سے ڈھونڈ نکالا تھا۔

صدیق کی گواہی کے بعد چوہدری بشیر کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا کہ دین محمد صاحب کی طرف سے دی جانے والی اندوہناک خبر پر یقین کر لے۔ چوہدری بشیر کی حالت بری ہو رہی تھی۔ صدیق کو پھر کمرے سے باہر بھیج دیا گیا تھا۔

کچھ دیر بعد دین محمد صاحب نے آہستہ آہستہ چوہدری بشیر کو تفصیل بتانا شروع کی۔ وہ نہایت گمبھیر لہجے میں بولے۔ ''وہ بدذات منڈا پتا نہیں کس طرح دھی رانی تاجور کے پیچھے پڑ گیا تھا پرلے درجے کا غنڈا تھا۔ ہماری بھیڑی قسمت کہ وہ ایک دن تاجور کے پیچھے یہاں پنڈ میں بھی پہنچ گیا...... یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی اور کام سے آیا ہو...... میں تم سے کچھ بھی چھپا نہیں رہا بشیر جو کچھ بھی مجھے پتا ہے، صاف صاف بتا رہا ہوں۔''

چند سیکنڈ کے توقف کے بعد دین محمد صاحب نے کہا۔ ''ہمارے پنڈ کے کچھ منڈوں کے ساتھ اس شاہ زیب نام کے منڈے کی لڑائی ہوئی وہ بڑا پکا پیٹھا بدمعاش تھا اور مرن مٹی چڑھی ہوئی تھی۔ اس اکیلے نے پنڈ کے منڈوں کو مارا۔ ان میں ہمارا سیفی بھی تھا۔ کچا ذہن وچارے کا۔ اس نے اسے کوئی بڑا استاد سمجھا اور اس کے پیچھے گڈی لے کر لیہ جا پہنچا۔''

چوہدری دین محمد صاحب نے ایک بار یہ رُوداد شروع کی تو چند باتوں کو حذف کر کے آخر تک سنا ڈالی۔ لیہ میں عزت مآب ریان فردوس کا عیاشی محل ...... لیہ سے ہمارا پاکستان سے باہر جانا اور تاجور کو برونائی پہنچانا تا کہ وہ مجھ کو اپنے ساتھیوں کا پتا بتانے پر آمادہ کرے۔ ایک ٹاپو پر سیفی کی موت اور علاقے میں ہونے والی خونی لڑائی۔ دین محمد صاحب نے رازداری کی شرط پر تقریباً ساری باتیں چوہدری بشیر کے گوش گزار کر دیں۔ یہ سب کچھ بتاتے ہوئے انہوں نے ایک دانا شخص کی طرح دو باتوں کا خاص خیال رکھا۔ ایک یہ کہ تاجور کو برونائی اور جاماجی پہنچانے والی حرکت کا الزام براہِ راست داراب فیملی پر نہ آئے اور دوسرا یہ کہ اس خبیث غنڈے سے (یعنی مجھ سے) تاجور کی مکمل بے رخی ثابت ہو۔

اس ساری گفتگو کے دوران میں گاہے بگاہے چوہدری بشیر کی آہ و بکا بھی سنائی دے جاتی تھی۔

○......❖......○

ہنڈی کے ذریعے میں نے جو خطیر رقم منگوائی تھی وہ میری دسترس میں تھی بلکہ اس میں سے کافی ساری میرے بیگ کے پیندے میں موجود تھی۔ میں اس میں سے ایک معقول اماؤنٹ شازیہ کے محبوب اکبر تک پہنچانا چاہتا تھا۔ اس کے لیے میں نے سجاول سے فون پر بات کر لی تھی اور اسے آمادہ کر لیا تھا کہ وہ اپنے پیٹرول پمپ والے دوست یونس کو فرضی فنانسر کی حیثیت سے اکبر کے گاؤں بھیجے گا اور یونس ایک عام سا اسٹامپ پیپر سائن کروا کے رقم اکبر کو دے دے گا۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد، میرے سینے پر سیفی کے حوالے سے جو بھاری بوجھ تھا، اس میں تھوڑی سی کمی واقع ہوگئی۔ سیف کے زندہ نہ ہونے والی اندوہناک خبر چوہدری بشیر نے ابھی خود تک ہی محدود رکھی ہوئی تھی اور اس کا ثبوت یہ تھا کہ ان کے گھر میں اب تک سب نارمل تھے۔ یقیناً شفقت بی بی کی نازک حالت چوہدری بشیر کو بھی ڈراتی تھی۔ بہرحال ایک نہ ایک دن تو انہیں سچائی کا سامنا کرنا ہی تھا۔

○......❖......○

وہ ایک بڑی خوشگوار رات تھی۔ ستمبر کا آغاز ہو رہا تھا۔ ہوا میں لطیف سی خنکی تھی۔ حبس اور پسینے سے جان چھوٹ چکی تھی۔ سرِشام مجھے انوری کی زبانی پتا چلا تھا کہ دین محمد صاحب کسی بزرگ کی فوتیدگی پر اچانک گوجرانوالہ چلے گئے ہیں۔ تاجور کی والدہ اور ایک عزیزہ بھی ساتھ ہی گئی تھیں۔ دین محمد صاحب کے حویلی نما مکان پر پولیس گارڈ کے تین اہلکار تھے۔ ان میں

سے بھی دو ایک موٹر سائیکل پر سوار دین محمد کے ساتھ چلے گئے تھے۔ میرے دل میں ایک ترنگ سی جاگی۔ پتا نہیں کیوں ان لمحوں میں، میں نے ایک عرصے بعد خود کو ایک کھلنڈرے نوجوان کی طرح آزاد اور پُرجوش محسوس کیا۔

میرا دل چاہا کہ تاجور کو دیکھوں۔ گاؤں کے اکثر لوگ ابھی چھتوں پر سوتے تھے۔ وہ بھی چھت پر ہی سوتی تھی۔ اس کے گھر کے عقب میں پہنچ کر چھت تک چلے جانا میرے لیے چنداں مشکل نہیں تھا۔ عجب عاشقانہ سا موڈ تھا۔ میں نے تصور میں دیکھا وہ تاروں کی چھاؤں میں اپنی رنگین چارپائی پر سیدھی لیٹی ہے۔ اس شہزادی کی طرح سوئی پڑی ہے جس کے کومل جسم میں سیکڑوں سوئیاں پیوست ہیں۔ میں ان سوئیوں کو اپنی پلکوں سے چن کر اسے زندہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ پھر اسے بتا رہا ہوں کہ وہ زندہ ہے اور میں بھی زندہ ہوں۔

ایک عجیب سا بہاؤ تھا جس میں بہہ کر میں اس کی گلی میں پہنچ گیا۔ رات کے گیارہ بجے کا عمل تھا۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ گارڈ مکمل طور پر الو کا پٹھا تھا۔ داخلی گیٹ کے قریب چارپائی ڈالے اونگھ رہا تھا۔ چوکیدار کو بھی ''نیم الو کا پٹھا'' کہا جا سکتا تھا کیونکہ وہ دور کسی گلی میں صدا لگا کر بتا رہا تھا کہ میں گاؤں کے اس حصے میں ہوں، دوسرے حصے میں اگر کسی نے کوئی کارروائی ڈالنی ہے تو اطمینان سے ڈال لے۔

میں نے آسانی سے بیرونی دیوار پھاندی اور پھر پلک جھپکتے میں اس چھت پر پہنچ گیا جہاں وہ موجود تھی اور میں جی بھر کر اسے دیکھ سکتا تھا۔ رنگین پایوں والی انواڑی چارپائی پر چھوٹا اسفند اس سے لپٹ کر سویا ہوا تھا۔ راحیل دوسری چارپائی پر تھا۔ دائیں طرف ایک عام چارپائی پر تنومند گھریلو ملازمہ خراٹے لے رہی تھی۔ میں محبت کی تصویر کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک وہ ہوا جو میں نے ہرگز سوچا نہیں تھا...... تاجور نے کروٹ لی اور میری طرف رخ کیا۔

میں تیزی سے پیچھے ہٹا اور لپک کر ایک برساتی نما کمرے میں چلا گیا۔ یہاں مکمل تاریکی تھی۔ مجھے یہی لگا کہ تاجور جاگ رہی ہے۔ میں بالکل ساکت کھڑا رہا اور ایک ادھ کھلی کھڑکی سے دیکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ یک دم اٹھ بیٹھی۔ ''کون ہے؟'' اس نے ہولے سے کہا جیسے اسے خود بھی یقین نہ ہو کہ کوئی یہاں موجود ہے۔

''کیا ہوا تاجور بی بی؟'' نوکرانی کے بڑبڑانے کی آواز آئی۔

''کچھ نہیں فردوس، شاید کوئی بلی تھی۔'' تاجور نے کہا اور دوبارہ لیٹ گئی۔

نیم تاریکی میں مجھے چھت اور وہاں بچھی ہوئی چارپائیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ تاجور والی چارپائی پر حرکت تھی۔ پتا چلتا تھا کہ وہ جاگ رہی ہے۔ شاید اس کا شک پوری طرح رفع

نہیں ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ دوبارہ اٹھی، بال سمیٹے اور چپل پہن کر برساتی کی طرف آئی۔ میں الرٹ ہو گیا۔ اس کی چوڑیوں کی چھن چھن بڑی واضح تھی۔ برساتی کے دروازے کے پاس پہنچ کر وہ رک گئی۔ اس نے واٹر کولر میں سے پانی نکال کر شیشے کے گلاس میں ڈالا اور وہیں پر ایک گھٹنا ٹیک کر ایک گھٹنا اٹھا کر پینے لگی۔

پانی پینے کے بعد واپس جاتے جاتے وہ پھر رک گئی۔ اس نے تذبذب کے انداز میں چند قدم اٹھائے اور برساتی میں جھانکا۔ یقیناً اس نے میرا ہیولا دیکھ لیا تھا۔ اب میرے لیے بے حرکت رہنا ناممکن تھا۔ میں نے جھپٹ کر اسے یوں دبوچا کہ اس کی کمر کے گرد اپنا بازو حمائل کیا اور برق رفتاری کے ساتھ اپنی ہتھیلی سے اس کا منہ ڈھانپ دیا۔

وہ چلائی ضرور مگر اس کی آواز گلے کے اندر ہی گونج کر رہ گئی۔ میری سخت گرفت نے اسے جکڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر زور مارا مگر فوراً ہی سمجھ گئی کہ جس نے اسے دبوچا ہے وہ اس کو شور مچانے یا خود کو چھڑانے کا موقع نہیں دے گا۔ میں نے بدلی ہوئی آواز میں تیز سرگوشی کی۔ ”میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔ میں قسم کھاتا ہوں، کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ لیکن اگر تم نے ہاتھ پاؤں چلائے تو پھر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“

اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن بول نہیں سکی۔

میں نے گرفت میں تھوڑی سی نرمی کی اور نسبتاً دوستانہ لہجے میں کہا۔ ”دیکھو، میں دشمن نہیں ہوں۔ تمہیں یا تمہارے بھائیوں کو میری طرف سے ذرا سا گزند بھی نہیں پہنچے گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ میں جس طرح خاموشی سے آیا ہوں اسی طرح واپس چلا جاؤں گا۔ تم بھی مجھ سے وعدہ کرو کہ اگر میں تمہارے منہ سے ہاتھ ہٹا لوں تو تم شور نہیں مچاؤ گی۔“

اس نے فوراً نفی میں سر ہلایا مگر وہ جس کیفیت میں تھی اس پر یقین کرنا مشکل تھا۔

میں نے پھر کہا۔ ”ڈرومت۔ مرد کی زبان ایک ہوتی ہے اور میں تمہیں زبان دے رہا ہوں۔ تمہیں یا تمہارے گھر والوں کو کچھ بھی کہے بغیر خاموشی سے واپس چلا جاؤں گا۔ اگر تم کہو گی تو کبھی واپس بھی نہیں آؤں گا لیکن اگر میں نے تمہارے منہ سے ہاتھ ہٹایا اور تم نے شور مچایا تو پھر اچھا نہیں ہو گا۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو ناں؟“

میں اس کے عقب میں تھا۔ وہ سر موڑ کر مجھے دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی مگر یہ ممکن نہیں تھا۔ اس کے کومل جسم میں لرزش تھی۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور اثبات میں سر ہلایا۔

اس مرتبہ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ہیجانی حالت میں جواب نہیں دے رہی۔ میں نے کہا۔ ”میں تم سے صرف ایک چیز لینا چاہتا ہوں اور وہ تمہیں دینا ہی پڑے گی...... اس کے بغیر میں

واپس نہیں جاؤں گا۔"

اس نے پھر مڑ کر میری جانب دیکھنے کی کوشش کی، میں بولا۔ "اب میں تمہارے منہ سے ہاتھ ہٹا رہا ہوں۔ اپنا وعدہ یاد رکھنا۔"

میں نے اس کے ہونٹوں اور نرم رخساروں پر سے اپنی گرفت ختم کر دی۔ اس کے جسم میں ہلچل پیدا ہوئی۔ اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ نیم تاریکی میں میرے خدوخال ایک پرچھائیں کی طرح ہی نظر آتے ہوں گے۔

"کون ہو تم؟" اس نے دہشت زدہ آواز میں متوقع سوال کیا۔

"کہا ہے نا کہ دشمن نہیں ہوں۔" میں نے اسے بدستور گرفت میں لیے لیے کہا۔ "میں شاہ زیب کا دوست ہوں۔ تم سے ایک بہت اہم بات کرنا چاہتا ہوں...... لیکن اس طرح نہیں اطمینان سے، تاکہ تم سن اور سمجھ سکو...... اور میں سمجھا سکوں۔ اس کے لیے مجھے تمہارے فون نمبر کی ضرورت ہے......"

اس نے تاریکی میں گردن موڑ کر اور آنکھیں سکیڑ کر مجھے دیکھا۔ "کک...... کون تم؟"

"کہا ہے نا کہ شاہ زیب کا قریبی دوست ہوں۔ جو بات تم سے کروں گا، وہ بڑی اہم ہوگی۔ وعدہ کرو کہ تم میری پوری بات سنے بغیر فون بند نہیں کرو گی۔"

"مم...... میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا، تم کیا کہہ رہے ہو؟" اس نے پھر خود کو چھڑانے کی کوشش کی۔

"میں نے صرف اس لیے تمہیں تھام رکھا ہے کہ تم گھبرائی ہوئی ہو۔ اس کمرے سے نکلنے کی کوشش کرو گی، یہ میرے اور تمہارے دونوں کے لیے نقصان دہ ہوگا۔ اگر تم کوئی حرکت نہ کرو تو میں تمہیں چھوڑ دیتا ہوں۔"

"چھوڑ دو مجھے۔" وہ عجب ہراس اور پریشانی کے عالم میں بولی۔

میں نے گرفت پہلے ڈھیلی کی پھر اسے چھوڑ دیا۔

اس نے پورا گھوم کر میری طرف دیکھا۔ اسی دوران میں چھت کی طرف سے تاجور کے چھوٹے بھائی اسفند کے ٹھنکنے کی آواز آئی۔ "باجی...... باجی۔"

وہ روہانسی ہو کر بولی۔ "میرا بھائی جاگ گیا ہے۔ ابھی فردوس بھی جاگ جائے گی۔ چلے جاؤ یہاں سے۔"

"تم مجھے فون نمبر دو، میں ایک سیکنڈ نہیں ٹھہروں گا لیکن دیکھو غلط نمبر نہ دینا۔"

وہ آمادہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ دوسری طرف میں بھی اٹل تھا۔ شدید تذبذب میں رہنے کے بعد اس نے سرگوشی کے لہجے میں اٹک اٹک کر نمبر بتا دیا۔

''میں کل رات نو بجے کے بعد کسی وقت کال کروں گا۔ تم فون آن رکھنا۔''

وہ خاموش رہی۔ باہر سے اسفند کی آواز پھر آئی۔ ''باجی۔'' وہ شاید اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

''آئی اسفند۔'' وہ گھبرا کر بولی پھر میری طرف مڑ کر سرگوشی میں کہا۔ ''خدا کے لیے اب تم جاؤ یہاں سے۔''

''تم بچے کو سلاؤ، میں جاتا ہوں۔''

وہ دوپٹہ سنبھال کر تیزی سے باہر نکل گئی۔ میں نے ادھ کھلی کھڑکی سے دیکھا، وہ اسفند کو لٹا کر اس کے ساتھ ہی لیٹ گئی۔ اس نے اسفند کا رخ اپنی طرف موڑ لیا تھا۔ میں چھت پر سے گزرتا تو وہ میری طرف دیکھ نہیں سکتا تھا۔ میں نے چھت پار کی اور منڈیر سے چھجے پر چلا آیا۔ پھر جس طرح آیا تھا اسی طرح عقبی دیوار پھاند کر باہر نکل گیا۔

جو کچھ ہوا، وہ میں ہرگز نہیں چاہتا تھا۔ میں تو صرف اسے دیکھنے کی ایک ہیجانی سی خواہش کے ساتھ وہاں چلا گیا تھا۔ میری ہتھیلی پر ابھی تک اس کے نرم ہونٹوں اور ریشمی رخساروں کا لمس موجود تھا۔ میں نے اسے اپنی گرفت میں لیا تھا...... یہ میری مجبوری تھی۔ اس کے حسین جسم کی ہر سہانی یاد میرے ذہن میں تازہ ہو گئی تھی۔ میں نے خاموشی کی زبان میں جیسے اپنے آپ سے کہا۔ ''شاہ زیب! تم یونہی تو اس کے دیوانے نہیں ہو۔ وہ لاکھوں میں ایک ہے، بے مثل ہے...... موجودہ حالات میں اگر تمہارے لیے کوئی گنجائش نکل رہی ہے تو پھر اسے پانے میں دیر نہ کرو۔ یہ نہ ہو کوئی اور دیوار تمہارے اور اس کے درمیان آ جائے۔''

اگلے روز رات نو بجے تک کا وقت میں نے بمشکل گزارا۔ حاکم علی سیالکوٹ گیا ہوا تھا۔ میں ڈیرے کے کمرے میں اکیلا تھا اور بہ آسانی تاجور سے بات کر سکتا تھا۔ ساڑھے نو بجے کے لگ بھگ میں نے اپنے ''بے نامی'' نمبر سے اسے کال کی بیل جاتی رہی مگر جواب نہیں آیا۔ یہی غنیمت تھا کہ فون آف نہیں تھا۔

تین چار بار بیل دینے کے بعد میں نے کوشش ترک کر دی۔ ساڑھے دس بجے کے لگ بھگ دوبارہ کال کی۔ اس مرتبہ جلد ہی کال ریسیو کر لی گئی۔

میں نے حسبِ سابق بدلی ہوئی بھاری آواز میں کہا۔ ''تاجور! میں بہت دیر سے کال کر رہا ہوں۔ تمہیں ڈسٹرب کرنے کے لیے معافی چاہتا ہوں مگر یہ ضروری ہے۔''

''پلیز، تم کو جو کہنا ہے، جلدی کہہ دو۔ میں زیادہ دیر بات نہیں کر سکتی۔'' وہ دبی آواز

میں بولی۔

اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ چھت پر نہیں ہے۔ مجھ سے بات کرنے کے لیے نیچے کسی کمرے میں چلی گئی ہے۔ مجھے پتا تھا کہ اس کے گھر والے آج واپس نہیں آئے۔ لہٰذا موقع تھا کہ ذرا تفصیل سے بات کی جا سکے۔ میں بڑے عجیب موڈ میں تھا۔ تاجور کو ستانے کو دل بھی چاہ رہا تھا۔ اسے پیار کرنے کو بھی اور یہ بتانے کو بھی کہ میں ابھی اس کی دنیا سے اور اس کی زندگی سے نکلا نہیں ہوں۔ لیکن یہ خبر اتنی بڑی تھی کہ اسے اس طرح نہیں دی جا سکتی تھی اور پھر اس میں اَن گنت خطرات بھی پوشیدہ تھے۔

میں نے کہا۔ ''تاجور! تمہیں وعدہ کرنا ہوگا کہ میری بات مکمل ہونے تک تم فون بند نہیں کرو گی اور نہ ہی برا مانو گی۔''

''پلیز، تمہیں جو کہنا ہے، جلدی کہو۔ میں نے بتایا ہے میں زیادہ بات نہیں کر سکتی...... اور یہ بھی بتا دوں کہ یہ پہلی اور آخری بار ہوگی۔''

''اس کا فیصلہ بعد میں کرنا۔ پہلے میری بات سنو'' میں نے ذرا تحکم سے کہا۔

''کہیں...... کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

''شاہ زیب میرا کزن اور دوست تھا۔ ہم ڈنمارک سے اکٹھے ہی آئے تھے۔ یہاں بھی میں ہر وقت اس کے آس پاس رہتا تھا لیکن اتفاق یہ ہے کہ دو چار بار کے علاوہ تم مجھے دیکھ نہیں سکی ہو اور جب دیکھا ہے تب بھی تمہیں علم نہیں تھا کہ میں اس کا دوست ہوں۔ میں اور شاہ زیب ایک دوسرے کو ایسے ہی جانتے تھے جیسے اپنے ہاتھ کی ہتھیلی کو جانتے ہیں۔ وہ اپنی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی مجھ سے چھپاتا نہیں تھا۔''

''آ...... آپ کا نام کیا ہے؟''

''وقاص...... وقاص احمد...... میں آج کل اسی گاؤں میں ہوں۔''

چند سیکنڈ خاموشی کے بعد وہ بولی۔ ''لیکن میں نے کبھی شاہ زیب سے یا ان کے کسی دوست سے آپ کا نام نہیں سنا۔''

''چلو تم نے کم از کم یہ تو نہیں کہا کہ کسی شاہ زیب کو جانتی ہی نہیں ہو۔ بہر حال...... ہماری کچھ مجبوریاں تھیں جن کے سبب ہم دوسروں کے سامنے ایک دوسرے سے ملتے نہیں تھے اور نہ یہ ظاہر ہونے دیتے تھے کہ ہمارے درمیان اتنا گہرا تعلق موجود ہے اگر تمہیں کسی طرح کا شک ہے تو میں ہر طرح سے اسے رفع کر سکتا ہوں۔''

''آپ مجھے صرف یہ بتائیں کہ اس طرح میرے گھر میں گھسنے اور مجھے فون کے لیے

مجبور کرنے سے آپ کا مقصد کیا ہے؟''

''میں سیدھی بات کرنے والا بندہ ہوں اس لیے جو کچھ میرے دل میں ہے صاف صاف کہوں گا۔ شاہ زیب اپنی ہر بات مجھ سے ''شیئر'' کرتا تھا۔ لاہور میں تم دونوں کی پہلی ملاقات سے لے کر دوسری ملاقات تک اور پھر آخری ملاقات تک ہر بات میں بھی اسی طرح جانتا ہوں جس طرح وہ جانتا تھا اور تم جانتی ہو۔ وہ تمہارے پیچھے چاند گڑھی کیسے گیا، چاند گڑھی میں تمہاری ملاقاتیں کس طرح ہوتی رہیں، پھر تم نے کس طرح شاہ زیب کے سامنے اپنی خواہش رکھی کہ وہ تمہاری سہیلی ریشمی کا کھوج لگائے۔ ملنگی ڈیرے کے سارے حالات مجھے معلوم ہیں۔ تمہارا ملنگی ڈیرے پر پہنچنا، پھر شاہ زیب کے ساتھ ہی پکڑا جانا، ملنگی ڈیرے میں تمہارا اور شاہ زیب کا ایک ہی کمرے میں رہنا...... وہاں پالتو چیتوں کی آوازیں اور ان آوازوں کے ''نتیجے''...... ایک ایک بات میرے علم میں ہے۔''

پالتو چیتوں کی آوازیں اور آوازوں کے نتیجے...... میں نے یہ الفاظ معنی خیز انداز میں کہے تھے اور یقیناً ان الفاظ نے تاجور کو سرتاپا ہلایا تھا۔ چند لمحے فون پر سناٹا رہا پھر وہ جیسے کراہی۔ ''کیا میں یہ سمجھوں کہ آپ مجھے کسی طرح بلیک میل کرنا چاہتے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''میرے پاس بہت کچھ ہے تاجور! اگر میں بلیک میل کرنا چاہوں تو اللہ کے سوا تمہیں مجھ سے کوئی نہیں بچا سکتا مگر میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں، میں تمہیں بلیک میل نہیں کروں گا...... اور نہ کبھی اس بارے میں سوچوں گا۔ بس شرط یہی ہے کہ جو کچھ میں کہوں اسے سن لو...... اور اس کے بارے میں ٹھنڈے دل سے سوچنا۔''

''آپ اپنی بات جلدی مکمل کریں۔'' وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

میں نے گہری سانس لی اور فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ''تاجور! شاہ زیب مجھے بہت پیارا تھا۔ وہ اپنے دل کا حال مجھ سے اس طرح بیان کرتا تھا کہ کبھی کبھی وہ مجھے اپنے ہی دل کا حال معلوم ہونے لگتا تھا۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ جیسے مجھے اس کے پیار سے پیار ہو گیا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ تم دونوں کی محبت کی باتیں سن سن کر میں تم دونوں کے عشق میں گرفتار ہو گیا تھا۔ میں شاہ زیب کے فون کا انتظار کرتا رہتا تھا کہ کب اس کا فون آئے اور وہ مجھ سے تمہاری باتیں کرے۔ تمہارے بارے میں بتائے۔ محبت کے سلسلے میں جب وہ کوئی پیش قدمی کرتا تھا تو مجھے لگتا جیسے اس نے نہیں، میں نے کی ہے...... اور جب کوئی محرومی اس کے حصے میں آتی تھی تو اس محرومی کی چوٹ شاہ زیب کی طرح میں بھی اپنے دل پر محسوس کرتا تھا۔''

تاجور کی پریشان کن آواز ابھری۔ ''مم...... مجھے ابھی تک سمجھ میں نہیں آیا کہ اب آپ نے کیا کہنے کے لیے مجھے فون کیا ہے؟''

میں نے ایک لمحہ توقف کے بعد کہا۔ ''بات بہت عجیب ہے تاجور لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں تمہاری محبت میں گرفتار ہوں۔ میں جانتا ہوں یہ بات سن کر تمہارے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بج گئی ہوں گی۔ مگر میں تمہاری ہی قسم کھا کر تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میری یہ محبت کبھی تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی اور نہ تمہاری عزت کو کسی خطرے میں ڈالے گی۔ بس مجھ پر اتنی مہربانی رکھنا کہ کبھی کبھار مجھ سے بات کر لیا کرنا۔''

وہ دکھی لہجے میں بولی۔ ''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ تم شاہ زیب کے کیسے دوست ہو کہ جو اس کے جانے کے بعد میرے لیے مشکلیں پیدا کر رہے ہو۔ ایک وہ انیق ہے جو بار بار یہاں آ کر ہمیں تکلیف دے رہا ہے۔ اب تم یہاں پہنچ گئے ہو اور اس کی دوستی کا دعویٰ کر رہے ہو۔''

''میں کسی اور کی نہیں صرف اپنی بات کرتا ہوں تاجور۔ مجھے تم سے محبت کے سوا کچھ درکار نہیں۔ اور یہ محبت بھی تم سے کچھ مانگے گی نہیں۔''

وہ آہ بھر کر بولی۔ ''شاید آپ جانتے نہیں ہو۔ یہاں کے حالات کیا ہیں۔ ان لوگوں کو بھنک بھی پڑ گئی تو وہ آپ کے ٹوٹے کر کے چیل کوؤں کو ڈال دیں گے یا پھر ساری عمر کے لیے جیل میں سڑنا پڑے گا۔''

''تم کن لوگوں کی بات کر رہی ہو؟'' میں نے انجان بن کر کہا۔

وہ چند سیکنڈ بعد بولی۔ ''جہاں میرے ماں باپ میرا رشتہ کر رہے ہیں اگر آپ نہیں جانتے ہو تو جان جاؤ۔ وہ داراب فیملی ہے۔ ان کے نوکر بھی بندے کو کیڑے مکوڑے کی طرح مار دیتے ہیں۔''

''اوہو تو تم اس دارج کھوتے سے ڈرا رہی ہو مجھ کو۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''تمہارے لیے وہ کچھ بھی ہو لیکن میرے لیے وہ کھوتا بلکہ کھوتے کا پتر ہے...... دولتیاں جھاڑنے والے ایسے بڑے جناور دیکھے ہیں میں نے اور شاہ زیب نے۔ جب ہم ایسے جناوروں کو لگام ڈال کر ان پر سواری کرتے ہیں تو دیکھنے والا تماشا ہوتا ہے۔''

''مجھے لگتا ہے کہ آپ نشے میں ہو یا پھر آپ کے ہوش ٹھکانے پر نہیں ہیں۔ آپ اگر واقعی اس گاؤں میں ہیں تو صبح ہونے تک یہاں سے نکل جائیں۔ آپ خود کو شاہ زیب کا دوست کہہ رہے ہیں اور میں ان کے دوست کو اس سے اچھا مشورہ نہیں دے سکتی اور ہو سکے

انیق سے بھی کہہ دیں۔ وہ اب آیا تو یہ لوگ مار ڈالیں گے اسے۔"

میں نے طویل سانس لے کر کہا۔ "مجھے پہلے ہی شک تھا کہ تم اور تمہارے گھر والے ان لاہوری پھنے خانوں سے ڈرے ہوئے ہو۔ خیر...... کوئی بات نہیں...... انیق کی باری بعد میں آئے گی۔ اب پہلے میں تو زور دیکھ لوں ان کمینے کن ٹٹوں کا۔" میرا لہجہ غصیلا تھا۔

یوں لگا کہ تاجور کو غلطی کا احساس ہوا ہے۔ وہ سوچ رہی ہے کہ اسے دارابیوں والی بات نہیں کہنا چاہیے تھی۔ وہ گھبرا کر بولی۔ "آپ اپنا تعلق شاہ زیب سے بتا رہے ہو تو پھر میری عزت کا تماشا نہ بناؤ۔ یہ بہت بڑا فساد ہو گا۔ آپ سوچ بھی نہیں سکتے ہو۔ میں آپ کو...... شاہ زیب کا واسطہ دیتی ہوں۔ آپ یہاں سے چلے جاؤ۔"

"یہ رشتے والی بات بتا کر تم نے میرے اندر آگ لگا دی ہے تاجور! یہ کیا سمجھتے ہیں کہ شاہ زیب نہیں ہے تو دین محمد صاحب کی بیٹی لوٹ کا مال ہے...... میں ان تخموں کو ان کی اوقات یاد دلا کر ہی رہوں گا۔"

میں نے فون بند کر دیا اور نیم دراز ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ میرے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ میں جانتا تھا کہ تاجور اس وقت شدید تناؤ میں ہو گی اور خود کو کوس رہی ہو گی کہ اس نے یہ دارابیوں والی بات مجھ سے کیوں کی۔

قریباً دس منٹ بعد میں نے اسے دوبارہ فون کیا تو اس نے فوراً اٹھا لیا۔ "ہیلو......" وہ رو دینے والے لہجے میں بولی۔

میں نے حسبِ سابق بدلی ہوئی آواز میں کہا۔ "تاجور! تم نے شاہ زیب کا جگرا دیکھا ہو گا۔ اس کے لنگوٹیے یار کا جگرا بھی اس سے کم نہیں ہے...... مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ یہ چٹا کھوتا دارج اور اس کی دبنگ بے بے اپنی طاقت دکھا کر تم لوگوں کو اس رشتے پر مجبور کر رہے ہیں۔ اب تم دیکھنا، میں انہیں روکتا کیسے ہوں۔"

"پلیز ایسی باتیں نہ کرو۔ میں پہلے ہی بہت بھگت چکی ہوں...... اب اور بھگتنے کی ہمت نہیں۔ میں تو مٹی کی ایک ڈھیری ہوں۔ اس ڈھیری کو میرے ماں باپ جس کے گھر میں ڈال دیں گے وہ اس کے گھر میں پڑی رہے گی۔ آپ نے شروع میں کہا تھا کہ آپ دشمن نہیں ہیں تو پھر پلیز دشمنوں والی باتیں نہ کریں۔"

وہ مجھے سمجھانے بجھانے میں لگ گئی۔ اپنی دانست میں وہ میرا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے بھی یہی تاثر دیا جیسے اس کی باتوں سے میرے اندر کے شعلوں پر پھوار پڑ رہی ہے...... اور اگر وہ مجھے اسی طرح سمجھائے بجھائے گی تو شاید دو چار ٹیلی فونک

ملاقاتوں میں، میں عقل کے ناخن لے لوں گا۔

میں نے تاجور کو بتا دیا کہ میں گاؤں کے چوہدری بشیر کے پاس بطور ڈرائیور ٹھہرا ہوا ہوں۔ مجھے دو ماہ کی عارضی ملازمت دی گئی ہے۔

اس نے ڈری ہوئی آواز میں کہا۔ ''چوہدری بشیر کا پتا آپ کو کس نے دیا تھا؟''

اس سوال کا جو جواب میں نے تاجور کو دیا، وہ بڑا مدلل تھا۔ اس جواب نے تاجور کو مکمل یقین دلا دیا کہ میں شاہ زیب کے انتہائی قریب رہا ہوں۔

میں نے کہا۔ ''چوہدری بشیر کے بارے میں مجھے شاہ زیب نے ہی بتایا تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ چوہدری کے بیٹے سیفی کے ساتھ جاماجی میں کیا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم بھی اس بارے میں سب کچھ جانتی ہو۔''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس اس کے سانسوں کی سرسراہٹ سنائی دیتی رہی۔ میں بولا۔ ''تاجور! دھماکے والے حادثے سے چند روز پہلے شاہ زیب نے مجھ سے کہا تھا کہ سیف کی موت کا اس کے ذہن پر بڑا بوجھ ہے۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر اسے کچھ ہو جائے تو میں سیف کے گھر والوں کی خیر خبر لوں اور اس کے لیے جو کچھ بھی ہو سکے کروں۔ میرے اس گاؤں میں آنے کا ایک مقصد تم ہو اور دوسرا چوہدری بشیر کا گھرانہ......''

وہ عجیب درد بھری آواز میں بولی۔ ''اس کا مطلب ہے کہ شاہ زیب کو پتا تھا...... اس کے ساتھ کچھ ہونے والا ہے۔''

''ہاں شاید ایسا ہی ہے۔'' میں نے لہجے میں درد بھر کر کہا۔ وہ شدید خطرات میں گھرا ہوا تھا، اسے کچھ پتا نہیں تھا کہ اگلے دن کا سورج دیکھے گا یا نہیں، جیسے کوئی مسافر سامان باندھ کر اسٹیشن پر بیٹھا ہو۔''

''لیکن اگر......'' اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن گلا رندھ گیا۔ وہ خاموش ہو گئی...... کتنی ہی دیر وہ کچھ بول نہ سکی۔

میں نے بات بدلنا مناسب سمجھا۔ دوبارہ چوہدری بشیر والے موضوع پر آتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یہ شک پڑتا ہے کہ چوہدری بشیر کو کسی طرح اپنے بیٹے کی موت کا پتا چل گیا ہے۔ وہ پچھلے کچھ دنوں سے بہت دکھی نظر آ رہا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں تاجور کہ تم نے یا تمہارے گھر والوں میں سے کسی نے چوہدری بشیر کو بتا دیا ہو؟''

''مجھے اس بارے میں کچھ پتا نہیں۔'' وہ روہانسی ہو کر بولی۔ پھر ایک دم ٹھٹک گئی۔ ''مجھے لگتا ہے کوئی سیڑھیوں سے نیچے آ رہا ہے...... اچھا میں فون بند کر رہی ہوں۔'' اس

نے فون بند کر دیا۔

اگلے روز صبح ناشتے کے بعد جب میں چوہدری بشیر کی ''مہران'' کو ٹیوب ویل کی حوضی کے پاس کھڑا کر کے دھو رہا تھا میری نگاہوں میں لاہور کے وہ خونی مناظر چل رہے تھے جب ٹیکساری گینگ کے ڈیتھ اسکواڈ نے لاہور کے گلی کوچوں میں تباہی مچائی تھی اور میں نے ان کو قرار واقعی جواب دیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ بلا فی الحال تو ٹل گئی ہے مگر اس کے دوبارہ ظاہر ہونے کے امکانات بھی موجود تھے۔ میں نہ سہی...... وہ ان لوگوں کو نشانہ بنا سکتے تھے جن سے میرا کوئی تعلق تھا...... انہی سوچوں کے دوران میں میری نگاہ چوہدری بشیر کے گھر پر پڑی۔ سیف کی بہنیں شاید کہیں گئی ہوئی تھیں۔ سیف کی والدہ بیرونی دروازہ کھولے چارپائی پر بیٹھی تھی خاموش، گم صم۔ اس کی نگاہیں کسی کا راستہ دیکھ رہی تھیں۔ دروازے سے گزر کر یہ نگاہیں کھیتوں کھلیانوں اور ان میں چلتی ہوئی پگڈنڈیوں پر بھٹک رہی تھیں۔ وہ جیسے کہہ رہی تھیں

آجا میرے لعل، کہاں ہے تُو۔ اپنی ماں کو کب تک تڑپائے گا۔ کب شکل دکھائے گا اسے، کیا اس کے مرنے پر ہی آئے گا؟...... آجا میرے سوہنے! تیری ماں رو رو کر اندھی ہونے والی ہے۔

میرا دل غم سے بھر گیا۔ ایک فقیر صدا لگاتا ہوا گلی سے گزرا۔ ''سب دا بھلا، سب دی خیر...... مراداں پوریاں...... اپنے بچے بچیاں دا صدقہ......''

میں نے دیکھا شفقت بی بی اپنے گھٹنوں پر بہت زور دے کر اٹھی۔ لڑکھڑاتی ہوئی سی دروازے پر آئی اور اپنی چادر کے پلو سے کچھ کھول کر فقیر کو تھما دیا۔ یقیناً کچھ مڑے تڑے روپے ہی ہوں گے۔

اسی دوران میں میری نگاہ چوہدری بشیر پر پڑی۔ وہ کمر پر ہاتھ رکھے آہستہ آہستہ گھر کی طرف آ رہا تھا۔ دو دنوں میں ہی پہلے سے کہیں زیادہ بوڑھا دکھائی دینے لگا تھا۔ اس نے غصے میں شفقت بی بی سے کچھ کہا۔ فاصلہ کافی زیادہ تھا۔ الفاظ مجھ تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ یقیناً یہ کہا ہوگا کہ وہ کیوں اس طرح دروازہ کھولے کھڑی ہے۔ اس نے دروازہ بند کر دیا۔

جو کیمرا میں نے ڈیرے کی بیٹھک میں چھپایا تھا وہ ابھی تک وہیں تھا۔ اسے اتارنے کا مناسب موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔ یہ موقع اچھا تھا۔ میں گاڑی کا گیلا کپڑا نچوڑ کر اسے دھوپ میں پھیلانے کے بہانے بیٹھک کے دروازے تک پہنچا۔ اسے دھکیلا لیکن مایوسی ہوئی۔ خلافِ معمول دروازہ لاک تھا۔ میں واپس آ گیا اور ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہوا کیونکہ اسی شام مجھے ایک بار پھر چوہدری بشیر کی گفتگو سننے اور اس کے تاثرات جاننے کا موقع مل گیا۔

شام کو منشی منظور چوہدری بشیر کے پاس ڈیرے والی بیٹھک میں تھا اور دروازہ بند تھا۔ میں نے اپنے سیل فون کی مطلوبہ ''اپلی کیشن'' میں جا کر اسکرین کو آڈیو ویڈیو ریسیور کی شکل دی۔ کچھ ہی دیر بعد کمرے میں ہونے والی گفتگو سنائی دینے لگی۔ تصویر پہلے کی طرح ندارد تھی۔

منشی منظور کہہ رہا تھا۔ ''آپ نے دھی رانیوں کو بھی کچھ نہیں بتایا؟''

''کیسے بتاؤں......؟'' چوہدری بشیر نے رندھی آواز میں کہا۔ ''ان کو بتاؤں گا تو ان کی ماں کو بھی پتا چلے گا۔ وہ نہیں بچے گی۔ میں نے کہا ہے ناں وہ نہیں بچے گی۔'' چوہدری بشیر باقاعدہ رونے لگا۔ منشی منظور اس کی ڈھارس بندھانے لگا۔

کچھ دیر بعد منشی منظور کی آواز آئی۔ ''کیا چوہدری دین محمد کو پکا یقین ہے کہ ایسا ہو چکا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ سیفی......''

''ہاں منظور! اب خود کو دھوکا دینے سے کوئی فائدہ نہیں۔ وہ نہیں رہا ہے۔ وہ چلا گیا ہے......ہمیں چھڈ گیا ہے ہمیشہ کے لیے......اور دیکھو......وہ......وہ جھلی کملی اس کی راہ تک رہی ہے۔ خیراتیں بانٹ رہی ہے......اس کی شکل دیکھتا ہوں تو دل پھٹ جاتا ہے میرا۔''

''اب یہ سب کچھ زیادہ دیر تو نہیں چھپایا جا سکتا ناں۔'' منشی منظور کی بھرائی ہوئی آواز ابھری۔ ''دل پر پتھر رکھ کر آپا جی کو بتانا ہی پڑے گا۔''

''وہ پہلے ہی مرنے والی ہو رہی ہے۔ کل بھی ادھی رات تک ہائے ہائے کرتی رہی تھی۔ چوہدری عظمت نے مالی پور میں ایک اللہ والے کا بتایا ہے۔ مشک اور زعفران سے تعویذ لکھ کر دیتا ہے۔ سویرے جانا ہے اس کی طرف......''

اسی دوران میں فون کی بیل سنائی دی۔ آواز سے اندازہ ہو گیا کہ یہ منشی منظور کے فون کی بیل ہے۔ بیل ہوتی رہی مگر منشی منظور نے کال ریسیو نہیں کی۔

''ٹھیکیدار افضل تھا؟'' چوہدری بشیر نے پوچھا۔

''ہاں جی، صبح سے تین بار فون کر چکا ہے۔''

''کیا کہہ رہا ہے؟'' چوہدری نے مری مری آواز میں دریافت کیا۔

''بس وہی بک بک کر رہا ہے۔ کہہ رہا ہے کہ اس مہینے کی پندرہ تاریخ تک کم از کم چھ لاکھ دے دو۔ نئیں تو بات تھانے کچہری تک جائے گی۔''

اس کے بعد چوہدری بشیر اور منشی ماسٹر منظور میں جو مختصر گفتگو ہوئی، اس سے میرا یہ یقین پختہ ہو گیا کہ چوہدری بشیر کی مالی حالت اچھی نہیں ہے۔ اس نے اپنا بھرم بنایا ہوا تھا۔ حقیقت

میں وہ اچھا خاصا مقروض تھا۔ چند برس پہلے زمین کے جھگڑے میں مقدمے بازی ہوئی تھی جس میں بشیر کا کافی سارا روپیہ غارت ہو گیا تھا۔ اب بھی اس کے تین چار کھیت گروی پڑے ہوئے تھے۔

اگلے روز میں نے اپنا جادوئی کیمرا اتار کر پھر محفوظ کر لیا۔ یہ کیمرا میرے لیے آئینہ جہاں نما کی حیثیت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ اس طرح کے ایک دو اور کیمرے ہوں تا کہ اگر کسی وقت یہ پکڑا بھی جائے یا ضائع ہو جائے تو متبادل میرے پاس موجود ہو۔

دوپہر کے وقت چوہدری بشیر میرے ساتھ گاڑی پر گجرات کے مضافاتی علاقے میں گیا۔ یہاں سے ہم کو اس ''اللہ والے'' کو لے کر سکھیرا آنا تھا جس نے شفقت بی بی کی طبیعت کی بحالی کے لیے وظیفہ اور تعویذ وغیرہ کرنا تھا۔ یہ شخص فی الحال اپنے مریدوں میں گھرا ہوا تھا۔ ہمیں اس کے گھر کے باہر گاڑی میں بیٹھ کر اس کا طویل انتظار کرنا پڑا۔ میں نے موقع دیکھ کر چوہدری بشیر سے بات کی۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''چوہدری جی، گستاخی معاف، کل مجھ سے ایک غلطی ہو گئی ہے۔''

''کیا مطلب؟'' چوہدری بشیر نے میری طرف دیکھ کر غمزدہ لہجے میں کہا۔

''کل جب آپ منشی صاحب کے ساتھ ڈیرے کی بیٹھک میں تھے، میں لوڈر کی چابی ڈھونڈتا ہوا بیٹھک کی طرف آیا تھا۔''

''تو پھر۔'' وہ ذرا چونک کر بولا۔

''میں بڑی معافی چاہتا ہوں جی...... آپ کے رونے کی...... ہلکی سی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ آپ...... اپنے بیٹے سیف کی بات کر رہے تھے...... مجھے بہت افسوس ہوا ہے جی...... بہت زیادہ افسوس۔''

چوہدری بشیر میری طرف دیکھتا رہا پھر سمجھ گیا کہ میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں۔ چند لمحے بعد وہ گمبھیر لہجے میں بولا۔ ''اگر تم نے سن ہی لیا ہے تو پھر یہ بات ابھی صرف اپنے تک رکھنی ہے۔ کسی کو بھنک بھی نہیں پڑنی چاہیے...... سن رہے ہو ناں؟''

میں نے شدومد سے اقرار میں سر ہلایا۔ چوہدری بشیر اس ذکر پر پھر آبدیدہ ہو گیا اور اس نے اپنی سفید پگڑی کا پلو اپنی آنکھوں پر رکھ لیا۔ گاڑی میں مہیب خاموشی طاری ہو گئی۔

کچھ دیر بعد میں نے ہمدردانہ آہنگ میں کہا۔ ''چوہدری جی! مجھے نہیں پتا سیف صاحب کی جان کیسے گئی اور کن حالات میں گئی لیکن اتنا تو پتا چل رہا ہے کہ یہ دکھ آپ کے لیے بہت ہی گہرا ہے...... اور اس وجہ سے اور بھی زیادہ گہرا ہو چکا ہے کہ آپ چوہدرانی جی کی بیماری کی

وجہ سے انہیں یہ خبر نہیں دے سکتے۔"

چوہدری خاموش رہا مگر تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ میری بات کی تائید کر رہا ہے میں نے کہا۔"چھوٹا منہ بڑی بات ہے لیکن اگر آپ برا نہ مانیں، تو میں آپ کو اس سلسلے میں ایک مشورہ دے سکتا ہوں۔"

چوہدری پھر اپنی بھیگی ہوئی سرخ آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے کہا۔ "مالک! بالکل اسی طرح کا ایک واقعہ میں پہلے بھی دیکھ چکا ہوں۔تب میں گجرات میں ایک کارخانے دار سلیم شیخ صاحب کی ڈرائیوری کر رہا تھا۔ ان کی والدہ بھی مالکن کی طرح بہت زیادہ بیمار تھیں۔سلیم صاحب کی بہن انگلینڈ میں ایک ایکسیڈنٹ میں فوت ہو گئی تھی۔ وہ بہن کی موت کی خبر ماں کو دینا چاہتے تھے۔ ڈاکٹروں سے مشورہ کر کے انہوں نے والدہ کو پہلے دل کے اسپتال میں داخل کرایا۔ ان کو سی سی یو میں رکھنے کے بعد انہیں بیٹی اور داماد کی موت کی خبر دی گئی۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر ان کو دل کا سخت دورہ پڑا۔ مگر سارا انتظام پہلے سے تھا۔ ڈاکٹرز نے ان کی جان بچالی۔"

چوہدری بشیر کے چہرے پر سوچ کے تاثرات ابھرے۔ مجھے لگا کہ میری بات اس کے دل کو لگ رہی ہے۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔"چوہدری جی! میں نے مالکن کی حالت دیکھی ہے۔ وہ واقعی یہ صدمہ برداشت نہیں کر سکیں گی۔ لیکن زیادہ دیر ان سے یہ بات چھپائی بھی نہیں جا سکتی۔ میری تو ادنیٰ سی رائے ہے کہ ہم انہیں لاہور لے جائیں اور وہی کام کریں جو سلیم شیخ صاحب نے کیا تھا۔"

"لاہور لے جانا کون سا سوکھا (آسان) کام ہے۔" وہ پژمردہ آواز میں بولا۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔"اگر آپ چاہیں تو میں اس سلسلے میں کچھ کر سکتا ہوں۔ میں نے دو سال پہلے ایک بڑے ڈاکٹر صاحب کی ڈرائیوری بھی کی ہے۔ بہت ہی اچھے بندے ہیں۔ دل کا ایک بڑا پرائیویٹ اسپتال چلا رہے ہیں۔ وہ ایک دو دن کے لیے مالکن کو داخل کر لیں گے۔ مجھے نہیں لگتا کہ خرچا بھی لیں گے۔"

چوہدری بشیر کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں ابھر رہی تھیں۔

○......❖......○

اور یہ منظر تھا لاہور کے ایک بہترین کارڈیک اسپتال کا۔ شفقت بی بی کو یہاں ایڈمٹ کرایا جا چکا تھا۔ چوہدری بشیر اور اس کی ایک بہن بھی یہاں موجود تھی۔ منشی منظور گاؤں میں

ہی تھا۔ میں ایم ایس ڈاکٹر عرفان ملک کے آفس میں بیٹھا تھا اور شفقت بی بی کے بارے میں ہی بات کر رہا تھا۔ میں نے ڈاکٹر کو ساری صورتِ حال بتا دی تھی اور خرچے کا حساب بھی لگوا لیا تھا۔ ابتدائی طور پر تین دن کا ایڈمیشن تھا۔ اگر مزید ضرورت پڑتی تو دورانیہ بڑھایا جا سکتا تھا۔ تین دن کا تخمینہ تین لاکھ روپے لگا تھا۔ میرے لیے یہ ہرگز بڑی رقم نہیں تھی۔ میں نے ایڈوانس پے منٹ جمع کرا دی۔

ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ ''یہ انتظام آپ کر رہے ہیں؟''

''میری اتنی حیثیت نہیں جناب! یہ علاقے کے ایک خدا ترس صاحب ہیں۔ نیکی کے کاموں میں خاموشی سے حصہ لیتے رہتے ہیں۔ اگر وہ خود آتے تو شاید چوہدری بشیر یہ پسند نہ ہوتا۔ انہوں نے رقم میرے حوالے کر دی۔ میں نے ایک گستاخی کی ہے۔ بشیر صاحب سے یہی کہا ہے کہ آپ سے میری علیک سلیک ہے اور میں چند سال پہلے آپ کی ڈرائیوری بھی کرتا رہا ہوں۔ آپ بڑی کرم نوازی فرماتے ہیں مجھ پر۔''

بات ڈاکٹر صاحب کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ انہوں نے زیادہ سوال جواب نہیں کیے۔ (مجھے یہ بھی خوشی ہوئی کہ ڈاکٹر ہونے کے باوجود ڈاکٹر صاحب کی نظر نے میری کاسمیٹک سرجری کو محسوس نہیں کیا اور میرے چہرے کے مصنوعی حصوں کو نہیں ٹٹولا)

اور پھر اسی سہ پہر اس ساری پلاننگ کا مشکل ترین مرحلہ آیا۔ اس کام کے لیے میرے ہی مشورے سے چوہدری بشیر نے ایک مولانا صاحب کو یہاں بلا لیا تھا۔ ان کا نام قدرت اللہ تھا۔ نہ جانے کیوں ان کی اجلی صورت دیکھ کر مجھے جاماجی کے حاذق ذکری صاحب کی یاد آ گئی۔ وہی جن کا ایک خط ابھی تک ''بن پڑھا'' میرے پاس پڑا تھا۔

عمر رسیدہ مولانا قدرت اللہ شفقت بی بی کے پاس پہنچے۔ چند منٹ ان سے اللہ اور اس کے دین کی باتیں کیں۔ مشیت ایزدی کے حوالے سے بتایا۔ ہم سی سی یو سے باہر تھے اور شیشے میں سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ فوری طبی امداد کے لیے سارے جدید انتظامات شفقت بی بی کے ارد گرد موجود تھے اور ڈاکٹرز بھی الرٹ تھے۔ خود پروفیسر ڈاکٹر عرفان ملک بھی اسپتال میں تھے۔ آخر مولانا اصل موضوع پر آئے اور انہوں نے شفقت بی بی کو محتاط لفظوں میں وہ خبر سنا دی جو ایک دکھی ماں کے سینے کو شق کر سکتی تھی۔ ایک ایسی ماں جس کا سب کچھ اس کا اکلوتا بیٹا ہی تھا۔

شفقت بی بی کا رنگ ہلدی ہو گیا اور منہ کھلا رہ گیا پھر وہ زور سے چلائیں۔ انہوں نے کچھ کہا اور دیوانہ وار بستر سے اٹھنے کی کوشش کی۔

یہی وقت تھا جب ہم اندر داخل ہو گئے۔ چوہدری بشیر لپک کر بڑھا اور اس نے شفقت بی بی کو اپنی بانہوں کے کلاوے میں لے لیا۔ وہ دلدوز انداز میں پکاریں۔ ''دیکھو سیفی۔ کے ابا! یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ ایسے کس طرح ہو سکتا ہے؟ یہ جھوٹ ہے...... یہ جھوٹ ہے۔''

''نہیں شفقت!'' چوہدری بشیر نے روتے ہوئے کہا۔ ''وہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اللہ کو یہی منظور تھا۔ ہمارا پتر اب نہیں ہے۔ وہ اللہ کی امانت تھا، اللہ نے اسے واپس لے لیا...... اللہ کی یہی منشا تھی۔''

وہ شوہر کے سینے پر دوہتڑ مارنے لگیں۔ ''نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ مجھے چھڈ کر نئیں جا سکتا۔ یہ جھوٹ ہے۔''

انہوں نے خود کو شوہر کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کی۔ وہ رو رہی تھیں۔ پکار رہی تھیں۔ اپنے سیفی کو آوازیں دے رہی تھیں۔ یہ اندوہناک مناظر تھے۔ دل خون ہو رہا تھا۔ یکا یک شفقت بی بی کے چہرے پر تکلیف کے شدید آثار نمودار ہوئے۔ انہوں نے جیسے اپنا کلیجہ تھام لیا۔ زرد رنگ اب نیلگوں ہونے لگا۔ چوہدری بشیر نے مجھے پکارا۔ ہم دونوں نے مل کر شفقت بی بی کو بستر پر لٹا دیا۔ ڈاکٹرز ان پر جھک گئے اور طبی امداد دینے لگے۔ انہیں آکسیجن چڑھا دی گئی۔ پہلے سے تیار شدہ ایک انجکشن فوری طور پر ''بازو پر لگے برانولا'' میں انجیکٹ کیا گیا۔ وہ تکلیف سے بے حال ہو رہی تھیں۔ مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھیں۔ ڈاکٹرز نے ان کے گرد پردہ تان دیا اور ہمیں باہر جانے کو کہا۔

وہ بڑے اضطراب کی گھڑیاں تھیں۔ چوہدری بشیر محمد بھی مسلسل رو رہا تھا۔ منتوں مرادوں سے ملنے والا اکلوتا بیٹا جدا ہو گیا تھا۔ میں نے چوہدری بشیر کی اجازت سے گاؤں میں منشی منظور کو فون کیا۔ وہاں سے بھی رونے اور بین کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ منشی منظور نے گلوگیر آواز میں بتایا کہ اس نے بھی بچیوں کو ان کے بھائی کی موت کی خبر سنا دی ہے۔

ڈاکٹرز نے شفقت بی بی کو ایسی ادویات دی تھیں جن کی وجہ سے وہ ہلکی غنودگی میں تھیں۔ رات دس گیارہ بجے تک ان کی طبیعت کچھ سنبھلی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں اور ایک بار پھر آہ و بکا کرنے لگیں۔

''میرے سیفی کو کیا ہوا۔ اس نے تو ابھی سہرا باندھنا تھا۔ وہ تو چنگا بھلا گیا تھا۔ کس نے مارا اسے، کس نے مارا؟''

میں چند فٹ کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ میں اسے کیسے بتاتا...... ماں جی! تمہارے پتر کو میں نے مارا۔ اپنے ہاتھوں سے مارا ہے۔ میرے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

شفقت بی بی نے گریہ وزاری کی حالت میں ایک بار پھر چوہدری بشیر کا شانہ تھام لیا۔ اسے جھنجھوڑتے ہوئے بولیں۔ ''میرے سیفی نے کیا قصور کیا تھا آپ کا؟ آپ نے اسے دھکا دے کر گھر سے نکالا۔ اسے دربدر کیا۔ اب میں کہاں ڈھونڈوں اسے؟''

چوہدری بشیر نے سسک کر کہا۔ ''اس کی جگہ میں مر جاتا، مجھے کیا پتا تھا اس نے یہ دن دکھانا ہے۔ اس کے قدموں میں اپنی پگ رکھ دیتا۔ اسے پنڈ سے باہر نہ جانے دیتا۔ پرچھانویں کی طرح اس کے ساتھ لگا رہتا۔'' شفقت بی بی پر پھر بے ہوشی سی طاری ہونے لگی۔

○......❖......○

چوتھے روز صبح دس گیارہ بجے تک شفقت بی بی کی حالت کچھ سنبھل گئی۔ ڈاکٹر عرفان ملک نے کہا کہ ہم چاہیں تو انہیں گھر لے جا سکتے ہیں۔ انہوں نے کچھ روٹین کی اور کچھ ہنگامی ادویات بھی لکھ دیں اور مناسب ہدایات دیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔ آپ لوگوں نے بہت اچھا فیصلہ کیا...... مکمل طبی امداد کے بغیر وہ اتنا تناؤ اور شدید دکھ ہرگز ہرگز برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔''

اسی روز شام سے پہلے ہم سکھیرا گاؤں واپس پہنچ گئے۔ طوفان آتے ہیں۔ کچھ کی شدت جلد ختم ہو جاتی ہے۔ کچھ کی شدت ختم ہونے میں دیر لگتی ہے۔ چوہدری بشیر کے گھر آنے والے طوفان کی شدت بھی آہستہ آہستہ ہی کم ہونا تھی۔ دوسرے روز چوہدری بشیر کے گھر میں پرسا دینے والوں کا ہجوم تھا۔ وسیع پیمانے پر قرآن خوانی کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔ گاؤں میں لوگوں کو بس یہی بتایا گیا تھا کہ سیف اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ برونائی چلا گیا تھا۔ وہاں وہ مسلمان رضا کاروں میں شامل ہو کر کچھ غیر مسلموں کے ساتھ لڑا اور شہید ہوا اور اگر دیکھا جاتا تو اس کی موت، شہادت سے کم تو نہیں تھی۔

چوہدری بشیر کے گھر اور ڈیرے پر آنے والے لوگوں کی دیکھ بھال اور کھانے کا انتظام کرنے والوں میں میں بھی شامل تھا۔ میں ایک دری گھر کے سامنے بچھا رہا تھا جب میں نے فقط چند فٹ کے فاصلے پر تاجور اور اس کی والدہ کو دیکھا۔ تاجور کا چہرا کپڑے کی طرح سفید تھا اور سوگواری اس کے ملیح چہرے پر ٹوٹ کر برس رہی تھی۔ وہ میرے بالکل قریب سے مجھ پر توجہ دیئے بغیر گزر گئی۔ اپنے چہرے کی تبدیلیوں پر میرا اعتماد کچھ اور بڑھ گیا۔ دوسری دری لینے کے لیے مجھے دوبارہ گھر کے صحن میں جانا تھا۔ میں نے اپنے سر پر ڈبی دار پرنا (بڑا رومال) درست کیا اور اندر چلا گیا۔ برآمدے میں خواتین کا ہجوم تھا۔ شازیہ، تاجور سے لپٹی ہوئی تھی

اور ہچکیوں سے رو رہی تھی۔

میں سر جھکائے ہوئے اسٹور میں چلا گیا اور دری لے کر باہر نکل آیا۔ گھر کے افراد اب مجھ سے بلاجھجک بات کر لیتے تھے۔ شازیہ تیزی سے میرے پاس آئی اور بولی۔ ''وقاص بھائی! امی کی طبیعت صبح پھر بگڑی ہوئی تھی۔ آپ نے بتایا تھا کہ سفید والی چھوٹی گولی روز بھی دی جا سکتی ہے۔ کیا آپ بڑے ڈاکٹر صاحب کو فون کر کے دوبارہ پوچھ سکتے ہیں؟''

''اچھا ٹھیک ہے میری بہن! میں کوشش کرتا ہوں۔'' میں نے سر جھکائے جھکائے جواب دیا۔

میری اچٹتی سی نگاہ خواتین کے ہجوم کی طرف گئی۔ مجھے یوں لگا کہ مجھے تاجور کی جھلک نظر آئی ہے۔ خواتین کے عقب سے شاید وہ میری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔

اسی رات فون پر میری بات اکبر سے ہوئی۔ اسے بھی چار پانچ دن پہلے سیف کی موت کی اطلاع مل چکی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ اطلاع شازیہ کے ذریعے ہی اس تک پہنچی ہو گی۔ ہم نے ایک دوسرے سے اظہارِ افسوس کیا۔ وہ افسردہ تھا۔ تاہم اپنے کاروبار کے حوالے سے تھوڑا پُرجوش بھی محسوس ہوتا تھا، بولا۔ ''وقاص بھائی! میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ یونس صاحب سے تمہاری ملاقات ہو چکی ہے۔'' (یونس سجاول کا وہی دوست تھا جسے ایک ''مہربان فنانسر'' کی حیثیت سے سجاول نے اکبر کی طرف بھیجا تھا) یونس نے اکبر کو رقم اپنے پاس سے فراہم کی تھی۔ بعد میں یونس نے یہ رقم مجھ سے لے لینی تھی۔

اکبر نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''اس بری دنیا میں بھی اچھے بندوں کی کمی نہیں ہے وقاص بھائی، یونس صاحب نے بس برائے نام لکھت پڑھت کے ساتھ پیسے دے دیئے ہیں۔ شرطیں بھی بڑی آسان ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ رحمت کا فرشتہ بن کر آئے ہیں وہ۔ آپ دیکھنا میں کتنی جلدی رزلٹ نکالتا ہوں اس کام میں۔''

میں نے اس کی حوصلہ افزائی کی اور ساتھ ہی یہ تنبیہ بھی کی کہ ابھی کچھ عرصے تک وہ شازیہ سے میل ملاقات کی کوشش نہ کرے۔ ویسے بھی وہ سب لوگ صدمے کی حالت میں ہیں اور اس صدمے سے نکلنے میں انہیں تھوڑا ٹائم لگے گا۔

''آپ بالکل بے فکر رہو وقاص بھائی! بس سمجھ لو کہ میں نے آپ کی انگلی پکڑ لی ہے۔ آپ جس طرف چلاؤ گے چل پڑوں گا۔''

''بس ذرا تحمل رکھنا ہو گا اور کام میں جان مارنی ہو گی۔ اللہ نے چاہا تو سب اچھا ہو جائے گا۔''

وہ ذرا رک کر بولا۔ ''ایک چھوٹی سی غلطی ہو گئی ہے۔ پتا نہیں کہ مجھے اسے بتانا چاہیے تھا یا نہیں۔''

''کس کی بات کر رہے ہو؟''

''شازیہ کی۔'' وہ دبے لہجے میں بولا۔ ''میں نے...... اس سے آپ کا ذکر کر دیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ آپ نے کس طرح سے میری مدد کی ہے۔''

میں سمجھ گیا کہ آج صبح شازیہ جس طرح جلدی سے میری طرف آئی تھی اور اپنائیت سے بات کی تھی، اس کے پیچھے یہ وجہ بھی ہے کہ وہ اکبر سے میرے نئے رویے کے بارے میں جان چکی ہے۔

میں نے کہا۔ ''نہ بتاتے تو اچھا تھا...... چلو اب جو بھی ہو گیا لیکن...... اسے اچھی طرح تاکید کر دو کہ اپنے تک ہی رکھے، ورنہ اس کے نتیجے میں نقصان تم دونوں کا ہی ہونا ہے۔''

''آپ اس بارے میں بے فکر رہیں۔'' وہ زور دے کر بولا۔

○......❖......○

مزید پندرہ بیس روز گزر گئے۔ شدید ترین صدمے بھی وقت کے ساتھ اپنا اثر کھونے لگتے ہیں۔ جتنا تعلق ہوتا ہے، گھاؤ کی اتنی ہی گہرائی ہوتی ہے۔ سب سے گہرا گھاؤ تو ممتا کے سینے پر ہی لگتا ہے۔ شفقت بی بی جان لیوا شاک سے تو بچ گئی تھیں مگر مسلسل عمیق دکھ کے گھیرے میں تھیں۔

میں اس بات کا کھوج لگا رہا تھا کہ جس قرضے نے چوہدری بشیر کی کمر توڑی ہوئی ہے، وہ کس نوعیت کا ہے اور چوہدری کو اس سے کیسے نجات دلائی جا سکتی ہے۔ میرے بوسیدہ سے بیگ کے دہرے پیندے میں اب بھی بڑے کرنسی نوٹوں کی شکل میں خاطر خواہ رقم موجود تھی اور میری خواہش تھی کہ وہ سیفی کے گھر والوں کے کام آ جائے۔

وہ ستمبر کی آخری تاریخوں کی ایک بڑی سہانی رات تھی۔ چوہدری بشیر کا کاماں ہاشو اپنی لاڈلی بیوی کے ساتھ ڈیرے کے کمرے میں تھا۔ کبھی کبھی دونوں کے ہنسنے کی آواز ابھرتی تھی اور ماحول کو رومان انگیز بناتی تھی۔ چودھویں کا چاند کھیتوں کھلیانوں، درختوں اور میدانوں کو دور تک روشن کر رہا تھا۔ تاجور بھی اسی فضا میں سانس لے رہی تھی اور یہی چاندنی اس کے گھر کے آنگن کو بھی روشن کر رہی تھی۔ میں لوڈر میں بیٹھا تھا۔ بڑی دھیمی آواز میں ریڈیو لگا رکھا تھا

اور ساتھ ساتھ تاجور سے فون پر رابطے کی کوشش کر رہا تھا۔ آخر رابطہ ہو گیا۔ وہ دکھی آواز میں بولی۔ ''آپ آگ سے کھیل رہے ہو، اس کا انجام اچھا نہیں ہو گا۔''

میں نے کہا۔ ''آگ سے نہیں کھیل رہا، میں خود آگ ہوں اور یہ آگ ان دارابیوں کو جلا کر راکھ کر دینا چاہتی ہے۔ شاہی کی آوازیں میرے کانوں میں گونجتی رہتی ہیں۔ وہ سب کچھ مجھے بتا گیا ہے۔ وہ سوّر کا پتر شکیل داراب ہی تھا جس نے یہاں سکھیرا گاؤں میں تمہارا کھوج لگایا اور تمہیں جاماجی پہنچا کر جان اور عزت کے شدید ترین خطرے سے دوچار کیا۔ اب اسی شکیل کا بھائی تم پر فریفتہ ہوا پھرتا ہے۔ میں نے سنا ہے چند ہفتوں میں تمہاری منگنی دھوم دھام سے دارج داراب کے ساتھ ہونے والی ہے؟''

''مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میں صرف اتنا کہتی ہوں کہ مجھ پر اور میرے گھر والوں پر رحم کریں۔ یہ بہت سخت لوگ ہیں۔ کسی وجہ سے بپھر گئے تو آپ کی جان تو جائے گی ہی ہم پر بھی کوئی آفت ٹوٹ سکتی ہے۔ ہم پہلے ہی بڑے ''مرے مکے'' ہیں اور صدمہ نہیں سہ سکتے۔''

''میری محبت بے لوث ہے تاجور۔ اس محبت نے نہ شاہ زیب کی زندگی میں تم سے کچھ مانگا نہ اب مانگے گی۔ تمہاری شادی کہیں اور ہو رہی ہوتی تو شاید میں چپ ہو کر کسی کونے میں بیٹھ جاتا...... لیکن...... ان دارابیوں کے سلسلے میں، میں چپ نہیں رہ سکتا۔ انہوں نے تمہیں لوٹ کا مال سمجھا ہے اور میں تمہیں لٹنے نہیں دوں گا۔''

''آپ کو اس طرح کی بات کرنے کا کوئی حق نہیں۔ یہ فیصلہ میرے ماں باپ کو کرنا ہے۔''

''اور وہ ان لٹیروں کے سامنے بچھے جا رہے ہیں۔ ان کی زبردستی پر اپنی رضامندی کا پردہ ڈال رہے ہیں۔ کیا انہیں پتا نہیں کہ ان دارابیوں میں بے شمار دوسری برائیوں کے علاوہ ایک برائی یہ بھی ہے کہ یہ ایک دو بیویوں پر بس نہیں کرتے۔ یہ عیاشی کے لیے بھی شادیاں کرتے ہیں۔ چھ نسلوں تک ان کے شجرے کو دیکھ لو۔ درجنوں میں بس دو چار ایسے ہوں گے جو اپنی شریکِ حیات پر سوکن نہ لائے ہوں گے۔ بہت ممکن ہے کہ تم دلہن سے ''سوکن'' بننے تک کا سفر بس پانچ چھ مہینے میں ہی طے کر لو۔''

''خدا کے لیے...... ایسی باتیں نہ کریں۔ ان سے کچھ حاصل نہیں۔''

''حاصل ہو بھی تو سکتا ہے تاجور بی بی...... ابھی بہت سی باتیں ایسی ہیں جو کلیئر نہیں۔''

''کیا مطلب...... کون سی باتیں؟'' وہ الجھے لہجے میں بولی۔

''مثلاً شاہ زیب کی موت۔''

''آ......آپ کیا کہنا چاہ رہے ہو؟'' وہ ہکلائی۔

''خبروں سے پتا چلتا ہے کہ شاہ زیب کی جان کے دشمن ابھی تک اس کی ٹوہ لگانے سے پیچھے نہیں ہٹے۔اس کا مطلب ہے کہ ان کے ذہنوں میں ابھی تک شک موجود ہے۔''

''لیکن......اب تو سب کچھ ثابت ہو چکا ہے۔ڈاکٹروں نے بھی کہہ دیا ہے......اب ایسی باتیں کرنے سے کیا فائدہ؟'' تاجور کی آواز کانپ رہی تھی۔

''ایسی اموات میں تھوڑی بہت آس تو باقی رہتی ہی ہے ناں۔شاید ایسا ہو گیا ہو...... شاید ایسا ہو گیا ہو۔''

وہ دل فگار لہجے میں بولی۔''آپ ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں......کیا آپ کو بھی کسی طرح کا شک ہے؟''

یوں لگتا تھا کہ وہ رو پڑے گی۔ بات کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے اسے ''لائٹ'' کرنے کے لیے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔''بھئی! فلموں، ڈراموں میں بھی تو اس طرح کی سچویشن آتی ہیں۔ پتا چلتا ہے کہ ہیرو مر گیا ہے۔ ہیروئن بعد میں ہیرو کے قریبی دوست سے شادی کر لیتی ہے لیکن پھر ایک دن ہیرو واپس آ جاتا ہے اور گڑمس مچ جاتا ہے۔''

''آپ اس طرح کی بات کیوں کر رہے ہو؟ یہ کوئی مذاق والا معاملہ ہے؟'' اس کی آواز اضطراب آمیز غصے کی وجہ سے کانپ رہی تھی۔

چند لمحے توقف کے بعد میں بولا۔''ویسے اگر غور کیا جائے تاجور بی بی تو یہ کوئی ایسی انہونی بھی نہیں ہے۔اس طرح کے واقعے ہوتے رہتے ہیں۔ہم دور کیوں جائیں۔ جاما جی میں بھی تو اس سے ملتا جلتا سلسلہ ہو گیا تھا۔زینب کو مردہ سمجھ لیا گیا تھا مگر ایک دن پتا چلا کہ وہ زندہ ہے۔ وہ نہ صرف زندہ نکلی بلکہ اس کی شادی اس کی مرضی کے عین مطابق ہز ہائی نس ابراہیم سے بھی ہو گئی۔شاید ٹھیک ہی کہا جاتا ہے کہ محبت میں طاقت ہو اور جنون ہو تو انہونیاں ہوتی ہیں اور دیواریں بھی رستہ دیتی ہیں......''

میں نے ایسا تاثر دیا جیسے اچانک کوئی آ گیا ہو۔ میں نے کہا۔''اچھا میں فون بند کر رہا ہوں۔دوبارہ بات کریں گے۔''

میں نے کال ڈس کنیکٹ کر دی۔

مجھے اندازہ تھا کہ تاجور شدید اضطراب میں مبتلا ہو گئی ہو گی اور ہو سکتا ہے کہ اب وہ خود کال کرے۔

بمشکل پندرہ بیس منٹ گزرے ہوں گے کہ اس کے نمبر سے کال آ گئی۔ دوسری کال پر میں نے فون اٹھایا۔ ''ہیلو...... میں تاجور بول رہی ہوں۔'' آواز سے اس کی ہیجانی کیفیت کا سراغ ملتا تھا۔

''ہاں تاجور، کہو۔''

''آپ ایسی الجھن کیوں ڈال رہے ہو۔ کیا آپ کو کوئی شک ہے شاہ زیب کے بارے میں۔ اگر شک ہے تو پھر اس کی کوئی وجہ بھی تو ہو گی؟''

''اوہ، تم بات کا بتنگڑ بنا رہی ہو تاجور! میں نے تو ایک رسمی سی بات کی تھی جو اور بھی کئی لوگوں کے ذہنوں میں موجود ہو گی۔ وہ میرا جگری یار تھا۔ میرے کانوں میں ابھی تک اس کی آوازیں گونجتی ہیں۔ ہر دستک پر اور فون کی ہر گھنٹی پر ایسے لگتا ہے کہ وہ آ گیا ہے۔''

''نہیں وقاص صاحب...... آپ...... کسی اور انداز میں بات کر رہے ہیں...... آ...... آپ...... ان کے ''جنازے'' میں گئے تھے۔ آپ نے ان کا چہرہ یا ان کی میت دیکھی تھی؟''

میں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ''ایسے واقعات میں 'چہرہ' کہاں ہوتا ہے تاجور بی بی اتنے بندے مرے شاید ایک آدھ کی شکل ہی پہچانی گئی ہو۔''

تاجور کی بھرائی آواز ابھری۔ آپ کہہ رہے ہو کہ ان کے دشمن ابھی بھی لاہور اور کراچی وغیرہ میں انہیں ڈھونڈ رہے ہیں۔ اس کا کیا مطلب ہے؟''

''یہ مطلب تو ان ڈھونڈنے والوں سے ہی پوچھا جا سکتا ہے۔''

اسی دوران میں کھٹ پٹ کی آوازیں آئیں۔ تاجور نے کہا۔ ''شاید کوئی آ رہا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ہاں میری طرف بھی کوئی آ رہا ہے۔ دوبارہ بات کریں گے۔'' میں سلسلہ منقطع کر دیا۔

تاجور کا بے پناہ اضطراب بتا رہا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر میں اس کی کال دوبارہ آ جائے گی۔ میں نے فون اپنے ہاتھ میں ہی رکھا۔ دل کہہ رہا تھا کہ کال آ رہی ہے۔ آ...... رہی ہے...... میں الٹی گنتی گننے لگا۔ تھرٹی نائن...... تھرٹی ایٹ...... تھرٹی سیون......''

ابھی گنتی ٹوئنٹی فور تک ہی پہنچی تھی کہ کال کے سگنل آ گئے۔ ''ہیلو وقاص بول رہے ہیں؟''

''ہاں بول رہا ہوں۔''

''ہیلو وقاص صاحب بول رہے ہیں؟'' اس نے دوبارہ پوچھا۔

''ہاں بھئی، کہہ تو رہا ہوں۔'' میں نے ذرا جھنجلاہٹ دکھائی۔

''در...... اصل...... آپ ذرا ناک میں بولتے ہیں ناں، اس لیے...... سمجھ نہیں آئی۔'' وہ گڑبڑا کر بولی۔

چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔ ''شروع میں آپ نے کیوں کہا ہے کہ بہت سی باتیں کلیئر نہیں ہیں؟ اس کا مطلب ہے آپ کو کچھ معلوم ہے۔'' اس کی آواز کی کپکپاہٹ نمایاں تھی۔

''اگر مجھے کچھ معلوم ہوگا بھی تو وہ ایک شک ہی گردانا جائے گا ناں۔''

''لل...... لیکن...... کیا معلوم ہے آپ کو؟'' وہ رو دینے کے قریب تھی۔

میں نے کہا۔ ''تاجور بی بی...... اس طرح کی بات میں ایسے فون پر شیئر نہیں کر سکتا۔ اگر کبھی دوبارہ تم سے ملنے کا موقع ملا تو بات کر لیں گے۔''

وہ تڑپ کر بولی۔ ''اگر یہ کوئی مذاق ہے تو...... خدا کے لیے اسے یہیں روک دیں اور اگر واقعی کوئی بات ہے تو پھر مجھے بتائیں۔''

''بات تو ہے...... لیکن کوئی بہت بڑی بھی نہیں۔'' میں نے گول مول جواب دیا۔

اگلے پانچ منٹ تک اسی موضوع پر گفتگو ہوئی۔ وہ چاہتی تھی کہ مجھے جو بتانا ہے فون پر بتا دوں مگر میں کہہ رہا تھا کہ یہ بات میں مل کر بتا سکتا ہوں۔ یہ گفتگو بے نتیجہ ختم ہوگئی لیکن اگلے روز صبح سویرے پھر تاجور کی کال آگئی۔ یوں لگتا تھا کہ اس نے رات کا زیادہ حصہ جاگ کر ہی گزارا ہے۔ وہ جیسے ہارے ہوئے لہجے میں بول رہی تھی۔ اس نے مجھے وہ طریقہ بتایا جس کے مطابق میری اور اس کی ایک اور ملاقات ہو سکتی تھی۔

اس نے بتایا کہ جس بزرگ کی فوتیدگی کے سلسلے میں گھر والے گوجرانوالہ گئے تھے اب ان کے چالیسویں کی رسم ہے۔ گھر والوں کو پرسوں صبح یا کل شام تک جانا ہے۔ اس دوران میں گھر کی ملازمہ فردوس گھر میں ہوگی یا پھر دین محمد صاحب کا ایک چچازاد بھائی ہوگا۔ تفصیل بتاتے ہوئے تاجور نے کہا کہ وہ فردوس کے ساتھ چھت پر ہی سو رہی ہے مگر رات کو ٹھنڈ کا بہانہ کر کے کمرے میں چلی جائے گی۔ فردوس رات کو کھانسی والی دوائی کھاتی ہے۔ وہ کہہ رہی تھی کہ وہ اسے کچھ زیادہ دوائی کھلا دے گی تاکہ وہ اطمینان سے سوئی رہے۔

میں نے جواباً تاجور سے وعدہ کیا کہ اسے چھونا تو درکنار میں اس کے قریب بھی نہیں پھٹکوں گا۔ (اس کے ذہن میں پہلے والا تجربہ موجود تھا۔ برساتی میں اس پر پوری طرح حاوی ہو جانے کے باوجود میں نے اسے کوئی گزند نہیں پہنچایا تھا)۔

مجھ سے ایک دو قسمیں لینے کے بعد اسے یقین ہو گیا کہ میں اس کے لیے کسی بھی طرح

کے خطرے کا باعث نہیں بنوں گا۔ پولیس اہلکاروں کی نظر سے بچنا بھی ضروری تھا، وہ بولی۔
"آپ خوامخواہ دیوار ناپنے کا خطرہ مول نہ لینا۔ پچھلی گلی میں گھر کا ایک چھوٹا دروازہ بھی ہے۔
جب فردوس سو جائے گی تو وہ میں اندر سے کھول دوں گی۔"
وہ ہر طرح کا رسک لے رہی تھی اور اس کے لیے مجبور تھی۔
گھر والے اگلے روز شام کو ہی چلے گئے۔ اس مرتبہ دونوں بچے بھی گئے تھے مگر پروگرام کے مطابق اگلے روز ہماری ملاقات نہ ہو سکی۔ عقبی گلی جہاں سے مجھے تاجور کے گھر میں جانا تھا، شامیانے لگ گئے۔ وہاں ذکر اذکار کی کوئی محفل تھی۔ بھاری آواز والے ایک مولانا رات گئے تک لاؤڈ اسپیکر پر تقریر کرتے رہے۔ ایسی باتیں کر رہے تھے جن کا اسلام سے دور کا تعلق بھی نہیں تھا۔ وہ سائنس اور ٹیکنالوجی کو سرے سے لغو قرار دے رہے تھے۔ ان کی باتیں سن کر نہ جانے کیوں میرا دھیان ایک بار پھر ٹیکساری گینگ کے خوفناک ہرکاروں کی طرف چلا گیا۔ میڈیکل سائنس بھی تو خدا کا بخشا ہوا علم ہی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ انسان اس کا استعمال کیسے کرتا ہے۔ ٹیکساری گینگ نے اس کا استعمال برے طریقے سے کیا۔ وہ ایک جیسے انسان، ایک جیسی شکلیں، ایک جیسی وحشی ذہانت۔ میں وہ سب کچھ یاد کر کے کانپ سا گیا۔
اگلے روز صورتِ حال سازگار تھی۔ رات دس بجے تاجور سے میرا ٹیلی فونک رابطہ ہوا۔ اس نے بتایا کہ اس نے فردوس کو ڈبل ڈوز دے دی ہے۔ وہ سوئی پڑی ہے۔ چاچا جی نیچے کمرے میں ہیں۔ اس نے عقبی دروازے کی کنڈی کھول دی ہے۔
میری دھڑکنیں بڑھ گئیں۔ میری اور تاجور کی یہ ملاقات بڑی انکشاف انگیز ثابت ہونے والی تھی۔ میں اب تاجور سے اپنی شناخت تا دیر نہیں چھپا سکتا تھا۔ دارابی فیملی بڑی تیزی سے تاجور کے گرد اپنا گھیرا تنگ کرتے جا رہی تھی۔ دارج داراب ایک عقاب کی طرح تھا اور سکھیرا اگاؤں کی اس رنگین چڑیا کو دبوچنے کے لیے مسلسل اڑانیں بھر رہا تھا۔
خنکی تھوڑی سی بڑھ چکی تھی۔ میں نے اپنا ڈبی دار صافہ سر پر لپیٹا۔ شلوار قمیص کے اوپر چادر کی بکل ماری۔ بیگ کے پیندے میں سے اپنا ریوالور نکال کر قمیص کے نیچے لگایا اور اپنی زندگی کی ایک اہم ترین رات کی تاریکی میں نکل کھڑا ہوا۔
دین محمد صاحب کے گھر میں داخل ہوتے وقت مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ پولیس کے دو اہلکار اہلِ خانہ کے ساتھ ہی گوجرانوالہ گئے تھے صرف ایک یہاں موجود تھا اور وہ سامنے کی طرف چارپائی پر ٹانگیں پسارے چوکیدار سے گپ شپ کر رہا تھا...... دوسری منزل کے کمرے میں مطلوبہ دروازہ مجھے بند ملا لیکن میری ہلکی سی دستک کے بعد کھل گیا۔ دروازہ

کھولنے والی تاجور تھی۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ لالٹین کی لَو نہ ہونے کے برابر تھی۔ مجھے اس کے تاثرات تو ٹھیک سے نظر نہیں آئے مگر اس کی حرکات سکنات سے عیاں تھا کہ وہ بری طرح سہمی ہوئی ہے۔ جب میں نے اندر سے کنڈی چڑھائی تو وہ مزید سہم گئی۔ اس نے دوپٹا بڑی مضبوطی سے اپنے سر اور چہرے کے گرد لپیٹا ہوا تھا۔ شاید میرے آنے سے پہلے نفل وغیرہ پڑھ رہی تھی۔

اس کا خوف دیکھ کر میں نے قمیص کے نیچے ہاتھ ڈالا اور ریوالور نکال کر زبردستی اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

''یہ بھرا ہوا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اگر میری طرف سے ذرا بھی خطرہ ہو تو بے دھڑک میری چھاتی پر فائر مار دینا۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا اور ریوالور جلدی سے تپائی پر رکھ دیا۔ میں نے اسے اٹھا کر دوبارہ اس کی گود میں رکھ دیا۔

''مجھ سے ڈرو گی تو پھر کیا کرو گی...... ہم تو کوئی بات ہی نہیں کر سکیں گے۔'' میں بدستور بدلی آواز میں بات کر رہا تھا۔

اس نے آنکھیں پوری کھول کر میری جانب دیکھا اور ہولے سے بولی۔ ''شاہ زیب، آپ کے کزن تھے؟''

''ہاں کزن بھی اور گہرا دوست بھی۔ تم کیوں پوچھ رہی ہو؟''

''آپ...... کی شکل...... کچھ کچھ ملتی ہے۔''

''اندھیرے میں کیا پتا چلے گا۔ لالٹین کی لَو کچھ اونچی کر لیں۔'' میں نے کہا۔

''نن...... نہیں...... روشنی ٹھیک نہیں۔ چانن نیچے تک جائے گا۔ چاچا جی جاگ سکتے ہیں۔''

نیچے سے کسی بوڑھے بندے کے کھانسنے کی آواز آئی اور ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ یہ دیہاتی خاموشی بڑی مکمل تھی۔ کسی گاڑی کی آواز نہیں تھی۔ کسی مشین کا شور نہیں تھا۔ کہیں کوئی ٹی وی بھی نہیں چل رہا تھا۔ بس کبھی کبھار کسی گلی میں کوئی آوارہ کتا اپنی موجودگی کا احساس دلا کر چپ ہو جاتا تھا۔

''آپ شاہ زیب کے حوالے سے کیا بات کرنا چاہ رہے تھے؟'' تاجور نے منمناتی آواز میں کہا۔

''یہی بات کہ شاید ابھی امید پوری طرح ختم نہیں ہوئی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس دھماکے

میں مرا نہ ہو۔ صحیح سالم رہا ہو یا پھر زخمی حالت میں کہیں موجود ہو۔ ایک دن اچانک سامنے آ جائے۔''

''کیا...... آپ کے اس شک کی کوئی وجہ ہے؟'' وہ اٹک اٹک کر اور نہایت ہراساں لہجے میں بول رہی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ اس کے ہراس کی ایک وجہ میں خود بھی ہوں۔ وہ میرے سلسلے میں شدید الجھن میں نظر آتی تھی۔ ڈاکٹر احرار نے یہی کہا تھا جب لوگ کاسمیٹک یا پلاسٹک سرجری کے بعد اپنی شباہت بدلتے ہیں تو انہیں جاننے والے انہیں دیکھ کر عجیب اضطراب کا شکار ہو جاتے ہیں۔

میں نے کرسی پر بیٹھ کر ٹیک لگالی تھی۔ تاجور چند فٹ دور چارپائی کے بالکل ایک سرے پر اکڑوں بیٹھی تھی، جیسے ابھی اٹھ کر باہر نکل جائے گی۔

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''تاجور بی بی! تم سے میرا لگاؤ اور میری محبت اپنی جگہ ہے لیکن فی الحال اگر میں دارابیوں کو تم سے دور رکھنا چاہ رہا ہوں تو اس کی وجہ صرف یہی ہے جو میں نے ابھی تمہیں بتائی ہے۔ کیا پتا، ابھی ہمارا شاہ زیب ہماری زندگیوں سے نکلا نہ ہو۔''

''مم...... میں نے بڑی مشکلوں سے خود کو کسی حد تک سنبھالا ہے وقاص صاحب۔ آپ مجھے پھر کانٹوں میں گھسیٹ رہے ہیں۔ خدا کے لیے ایسا نہ کریں۔ اگر واقعی...... کوئی بات...... آپ کے علم میں ہے...... تو بتائیں...... ورنہ پلیز اس بارے میں چپ رہیں۔''

میں نے اس کی سنی ان سنی کرتے ہوئے ٹھہرے ہوئے آہنگ میں کہا۔ ''تاجور، تم نے ایک دفعہ کہا تھا کہ پسرور میں تمہاری ایک چچازاد بہن ثمینہ تھی۔ چنے ابالتے ہوئے پریشر ککر پھٹ گیا تھا اور اس کے چہرے پر جلنے کے گہرے زخم آئے تھے۔ بعد میں اس کے بھائی اسے لاہور لے گئے تھے اور وہاں اس کی سرجری ہوئی تھی۔''

''ہاں...... لیکن...... یہ بات اس وقت آپ کیوں کر رہے ہیں؟'' (وہ یقیناً اس بات پر بھی حیران تھی کہ اس کی چھوٹی چھوٹی باتیں بھی مجھے معلوم ہیں)

''میں تمہیں یاد دلانا چاہتا ہوں کہ یہ دس پندرہ سال پہلے کی بات ہے، اب تو یہ ڈاکٹری اور بھی جدید ہو گئی ہے۔ بگڑے ہوئے چہروں کو بدلا جا سکتا ہے۔ قریبی جاننے والے بھی پہچاننے میں ناکام رہتے ہیں۔''

وہ بس میری جانب دیکھتی جا رہی تھی۔ جیسے سمجھ نہ پا رہی ہو کہ میری ان بے ربط باتوں کے جواب میں کیا کہے۔ میرا اپنا دل بھی بے طرح دھڑک رہا تھا مگر میں نے اپنے لہجے کا

ٹھہراؤ برقرار رکھا ہوا تھا۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا پتا تاجور! شاہ زیب بچ گیا ہو اور اس نے اپنے جانی دشمنوں سے بچنے کے لیے اپنے چہرے میں تبدیلیاں کروالی ہوں۔ وہ آس پاس ہی کہیں موجود ہو۔ اپنے پیاروں کے سامنے آنے کے لیے کسی مناسب موقع کی تلاش میں ہو۔ کوئی ایسا موقع جب ٹیکساری گینگ کے زہریلے سانپ اس کی طرف سے مایوس ہو کر واپس اپنے بلوں میں گھس جائیں......''

''میرے...... دل کو کچھ ہو جائے گا۔'' وہ ٹوٹی ہوئی آواز میں بولی۔ ''مجھے ڈر آ رہا ہے آپ سے...... آپ کون ہیں؟'' وہ لڑکھڑاتی ہوئی سی اٹھی اور اس نے لالٹین کی لو اونچی کر دی۔ اس کی آنکھیں خوف سے کھلی ہوئی تھیں۔ نگاہیں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ وہ سرتاپا لرزاں تھی۔ ان لمحوں میں کائنات کی گردش بھی جیسے تھم گئی۔ تاجور حرکت کرنا چاہتی تھی مگر حرکت نہیں کر سکتی تھی۔ بولنا چاہتی تھی مگر بول نہیں سکتی تھی۔ بس میرا چہرہ تھا اور اس کی نگاہیں تھیں۔

میں نے اسے کندھوں سے تھاما۔ ''شکلیں بدل جاتی ہیں تاجور...... لیکن انسان تو وہی رہتا ہے...... پہچان تو وہی رہتی ہے۔'' اس مرتبہ میں اپنی اصل آواز میں بولا تھا۔

تاجور نے ہیجانی انداز میں میرے ہاتھ اپنے کندھوں پر سے ہٹائے اور یوں لگا کہ اٹھ کر دروازے کی طرف بھاگنا چاہتی ہے۔ ایسی صورت میں شاید وہ چلا بھی اٹھتی، میں نے وہی کچھ کیا جو چند دن پہلے برساتی کی تاریکی میں کیا تھا۔ میں نے اسے اپنی گرفت میں جکڑ لیا۔ دائیں ہاتھ سے اس کے ہونٹ یوں ڈھانپے کہ وہ بند ہو کر رہ گئے۔ وہ گھبراہٹ میں چلائی اور ذرا مچلی بھی، مگر پھر بے جان سی ہو گئی۔ میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ ''تاجور...... یہ میں ہی ہوں...... میرے نقش کچھ بدلے ہوئے ہیں مگر میری آواز تو تم پہچان ہی رہی ہو...... پہچان رہی ہو ناں؟''

وہ بدستور سکتہ زدہ رہی۔ پورے جسم میں ایک نمایاں لرزش تھی۔ جیسے لرزے کا بخار چڑھ گیا ہو۔

''زندگی میں انہونیاں ہوتی ہیں تاجور...... اور یہ بھی ایک انہونی ہی ہے کہ میں اس حادثے میں بچ گیا ہوں۔ چند معمولی زخم آئے تھے۔ تم جانتی ہو ٹیکساری گینگ کے قاتل کتنے خطرناک ہیں۔ خود کو اور اپنے اردگرد کے لوگوں کو ان زہریلے ناگوں سے بچانے کے لیے ہی میں چھپا رہا۔ مستقل طور پر چھپے رہنے کے لیے جاماجی کے ڈاکٹر کرنل احرار نے میری مدد

کی ..... جدید زمانے میں جدید طرح کی مدد۔''

میں محسوس کررہا تھا کہ تاجور کی ہیجانی کیفیت ماند پڑ رہی ہے۔ وہ بالکل مزاحمت نہیں کررہی تھی۔ بس حیرت اور سنسناہٹ کی ایک لہر تھی جو اس کے سر سے لے کر پاؤں تک دوڑ رہی تھی۔

میں نے اس کے ہونٹوں سے ہاتھ ہٹالیا مگر جسم پر گرفت برقرار رکھی۔ ہونٹوں پر سے ہاتھ ہٹایا تو اس نے مڑکر دہشت زدہ نظروں سے میرا چہرہ دیکھا۔ لالٹین کی روشنی کمرے میں تھرتھرا رہی تھی اور شاید اسی طرح تاجور کا دل بھی۔ وہ گنگ سی ہوگئی تھی۔

میں نے بے ساختہ اس کے سر کے بالوں کو بوسہ دیا اور کہا۔ ''تاجور! تم جانتی ہی ہو، ڈاکٹر احرار ایک بہت بڑے ڈاکٹر ہیں۔ انہوں نے میرے چہرے میں کچھ تبدیلیاں کی ہیں۔ میری جلد، داڑھی اور سر کے بالوں کا رنگ بھی بدلا ہوا ہے۔''

میں نے ہاتھ بڑھا کر لالٹین کی لَو کچھ اور اونچی کردی۔ اس کی نگاہیں میرے چہرے پر تھیں اور چہرے پر یقین و بے یقینی کی عجیب سی کیفیت تھی۔ وہ کبھی اپنا سر نفی میں ہلانے لگتی۔ کبھی اپنا نچلا ہونٹ ہولے سے دانتوں تلے دباتی۔ اس کی حسین آنکھوں میں آنسو اُمڈنا شروع ہوگئے تھے۔ کرشمے، معجزے اسی دنیا میں ہی تو ہوتے ہیں اور پھر آنسو بڑی تیزی سے اُمڈے۔ اچانک اس نے گھوم کر اپنا چہرہ میرے سینے میں چھپالیا اور بازو میرے گرد حمائل کر دیئے۔ وہ پہلے سسکی پھر ہچکیوں سے رونے لگی۔ اس کے آنسو ایک آبشار کی طرح تھے جو میرے سینے کے بالوں کو بھگوتے چلے جارہے تھے۔ میں نے بھی اسے بانہوں میں بھرلیا۔ اپنے آپ پر جیسے اس کا بس نہیں چل رہا تھا۔ اس کی آواز بلند ہوتی جارہی تھی۔

''آہستہ تاجور..... آہستہ۔'' میں نے اسے بانہوں میں سمیٹا۔

کتنی ہی دیر بعد وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ ''مجھے یوں لگ رہا ہے..... یہ سب جھوٹ ہے..... یا پھر میں جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھ رہی ہوں۔ میں سمجھتی تھی ایسا نہیں ہوسکتا، صرف..... کہانیوں کی باتیں ہیں یہ۔ لیکن آپ زندہ ہیں..... آپ زندہ ہیں اور میں یقین نہیں کرپارہی۔''

یہ جذباتی اتار چڑھاؤ کے لمحے تھے۔ بے حد ہیجان تھا، سنسنی تھی اور حیرت آمیز والہانہ پن تھا۔ جب مدوجزر کا یہ شدید ترین دورانیہ گزر گیا، اور ہم نے دو تین بار ایک دوسرے سے علیحدہ ہوکر ایک دوسرے کو بھرپور نظروں سے دیکھ لیا..... تو تاجور کی ہیجانی کیفیت میں کمی واقع ہونے لگی۔ اس کے چہرے پر حیا اور گریز کی سرخی پھیلنے لگی۔ چہرہ آنسوؤں سے تربتر تھا اور وہ

مجھ سے چھوٹے چھوٹے سوال بڑی تیزی سے پوچھتی چلی جا رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ''تاجور! اتنا کچھ پوچھو گی تو میں کیا بتاؤں گا اور تمہاری سمجھ میں کیا آئے گا۔ ترتیب سے پوچھو، میں ترتیب سے بتاتا چلا جاتا ہوں۔''

''لیکن نہیں۔'' وہ ایک دم اٹھ بیٹھی۔ ''پہلے میں رب کا شکر ادا کر لوں۔''

میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے اپنی اوڑھنی کو اور مضبوطی سے اپنے سر اور چہرے کے گرد کسا، اپنی بکھری ہوئی لٹوں کو بھی اوڑھنی کے اندر گھسایا اور جائے نماز بچھا کر نماز پڑھنے لگی۔ یہ شکرانے کے نفل تھے۔ وہ سجدے کی حالت میں گئی تو دیر تک اشک بہاتی رہی۔

تب وہ آہستہ سے دروازہ کھول کر سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔ پہلے اوپر جا کر چھت پر ملازمہ فردوس کو دیکھا پھر دس پندرہ زینے اتر کر نیچے اپنے کسی چاچا کی سن گن لی پھر قدرے مطمئن انداز میں واپس کمرے میں آ گئی۔ اس مرتبہ اس نے خود ہی اندر سے کنڈی چڑھا دی تھی۔

میں نے کھڑکی کا پردہ تھوڑا سا سرکا کر باہر جھانکا۔ درمیانی راتوں کا چاند ٹھٹھرے ہوئے آسمان پر بدلیوں کے درمیان محوِ سفر تھا۔ میں نے پردہ پھر برابر کر دیا۔ میں تاجور کو کھل کر بتا دینا چاہتا تھا کہ میں اب ایک نیا شخص ہوں۔ میں ایک نئی زندگی اور ایک نئی پہچان کے ساتھ اس کے سامنے آیا ہوں...... اور اس انقلاب آفریں تبدیلی نے میرے لیے زیست کی کچھ نئی راہیں کھول دی ہیں۔ اب میں خود کو زنجیروں کے جکڑ بندوں سے آزاد محسوس کرتا ہوں۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ میں اس کی تمنا بھی کر سکتا ہوں۔ اگر وہ اس تمنا کو قابلِ قبول سمجھے تو ہم مستقبل میں مشترکہ زندگی کا حسین سپنا دیکھ سکتے ہیں لیکن یہ سب کچھ، اتنی جلدی، کہہ دینا آسان نہیں تھا۔ میں اس سے باتیں کرتا رہا اور آہستہ آہستہ اصل موضوع کے لیے راہ ہموار کرتا رہا۔

میرے پاس وہ چند فوٹوگرافس بھی محفوظ تھے جو ڈاکٹر احرار نے میری کاسمیٹک سرجری کے دوران میں اتارے تھے۔ ان تصویروں سے پتا چلتا تھا کہ کس طرح آہستہ آہستہ میری شکل میں چند دن کے اندر تبدیلی رونما ہوئی۔ میں نے اسے وہ تصویریں دکھائیں اور اس کی حیرت میں اضافہ ہوا۔ وہ مجھے ان عارضی تبدیلیوں کے بغیر دیکھنا چاہتی تھی مگر یہ بھی جانتی تھی کہ فوری طور پر ایسا ممکن نہیں۔ اس کے سوالوں کے جواب میں، میں نے اسے ٹیکساری گینگ سے اپنی ہولناک ٹکر کے بارے میں بتایا، انیق اور سجاول کے بارے میں بتایا۔ وہ یہ جان کر ششدر رہ گئی کہ سجاول اپنے ڈیرے کو چھوڑ چھاڑ کر ایک گاؤں میں چلا گیا ہے اور جاماجی کی حسینہ خورسنہ اس کے ساتھ ہے۔ دونوں شادی کر چکے ہیں۔

''مجھے یقین نہیں آ رہا۔ اتنی جلدی...... یہ سب کچھ؟''
''یقین تو مجھے بھی نہیں آ رہا تھا۔ کچھ لوگ خرگوش کی طرح چلتے ہیں اور کچھ میری طرح کچھوے کی رفتار سے۔'' میں نے معنی خیز لہجہ اختیار کیا۔
وہ بولی۔ ''اور سجاول کے درجنوں ساتھی؟ اور اس کی ماں اور بہن وغیرہ؟ وہ تو ایک پورے گروہ کے ساتھ تھا۔ اس کے علاوہ......''
''وہ سب کچھ چھوڑ دیا ہے اس نے۔'' میں نے تاجور کی بات کاٹی۔ ''اور اس کے ارادوں سے لگتا یہی ہے کہ وہ پرانی زندگی کی طرف واپس نہیں پلٹے گا کم از کم ارادہ تو اس کا یہی ہے...... آگے اللہ جانے۔''
وہ خاموش رہی...... وہ میری باتیں سن تو رہی تھی مگر اس کے اندر ایک بے چینی سی تھی۔ وہ اس ملاقات کو جلدی ختم کرنا چاہتی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ فردوس یا چچا میں سے کوئی جاگ نہ جائے۔
میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''کبھی کبھی تو اب میرا دل بھی چاہتا ہے کہ سجاول کی طرح کہیں دور کسی گوشے میں نکل جاؤں۔ اس بدلے ہوئے چہرے کے ساتھ۔ ایک نئی شناخت کے ساتھ۔''
اس نے چونک کر میری جانب دیکھا لیکن بولی کچھ نہیں۔ یہی بات وہ خود بھی مجھ سے کہا کرتی تھی۔ تو پتا نہیں کہ آج میری بات کا ردِعمل اس پر کیا ہوا تھا؟
اچانک وہ ٹھٹکی۔ مجھے بھی کہیں پاس ہی گاڑی رکنے کی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی ہارن بجایا گیا۔ ''ہائے میں مرگئی۔'' تاجور نے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر رکھے۔
''کیا ہوا؟''
''ابا جی واپس آ گئے ہیں۔ یہ ہماری ہی گاڑی ہے۔''
اسی دوران میں نچلی منزل پر کھٹ پٹ کی آوازیں آئیں۔ تاجور کے چاچا جاگ گئے تھے اور شاید مین دروازہ کھول رہے تھے۔
''یہ کیا ہو گیا؟'' تاجور دہشت زدہ ہو کر بولی۔ ''ان کو تو کل آنا تھا۔ ہائے ربا! اب کیا ہو گا۔'' پھر اس نے لالٹین بجھائی اور تیز سرگوشی کی۔ ''شاہ زیب! آپ چھت پر چلے جائیں۔ وہاں سے نکل جائیں۔''
''ٹھیک ہے، تم گھبراؤ نہیں، کچھ نہیں ہو گا۔''
میں نے کمرے کے دروازے کی طرف قدم بڑھایا ہی تھا کہ چھت سے فردوس کی آواز

آئی۔ وہ پکاری۔ ''تاجور بی بی! کہاں ہو تم......تاجور......''

''ہائے ربا، فردوس بھی جاگ گئی۔'' تاجور رو دینے والے انداز میں بولی۔ وہ تھر تھر کانپنے لگی تھی۔

چند ہی سیکنڈ بعد فردوس بھی کمرے کے دروازے پر تھی۔ اس نے دستک دی۔ ''تاجور......تم اندر ہو؟ دروازہ کھولو......تمہارے ابا جی آگئے ہیں۔''

میں نے تاجور کو خاموش رہنے کا کہا۔ عین ممکن تھا کہ فردوس دروازے کے سامنے سے ٹل کر نیچے چلی جاتی اور مجھے چھت کی طرف جانے اور گلی میں کود جانے کا موقع مل جاتا۔

فردوس بار بار دستک دینے لگی۔ تاجور بے دم سی ہوگئی اور چارپائی پر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے دونوں بازو اپنے سینے سے لگا رکھے تھے۔ ''یا اللہ خیر...... یا اللہ رحم کر۔'' وہ بار بار کہتی جا رہی تھی۔

نیچے برآمدے سے دین محمد صاحب کی آواز آئی۔ فردوس! کہاں ہو تم؟''

''آئی میاں جی۔'' فردوس نے جواب دیا۔

اندازہ ہوا کہ وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے جا رہی ہے۔ یہ امید کی کرن تھی لیکن ابھی وہ تین چار سیڑھیاں ہی اتری ہوگی کہ چھوٹے اسفند کی آواز آئی۔ ''ماسی جی، آپی کہاں ہے؟''

''وہ کمرے میں ہے۔ دروازہ کھڑکاؤ۔'' فردوس نے کہا اور خود نیچے چلی گئی۔

اب اسفند نے دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔ ''آپی......آپی ہم آگئے ہیں۔''

''اب کیا ہوگا شاہ زیب۔ مم...... میں نے تمہیں کتنا منع کیا تھا۔''

''حوصلہ رکھو، کچھ نہیں ہوگا۔ کوئی جرم نہیں کیا ہے تم نے...... یا میں نے۔''

اسی دوران میں دین محمد صاحب بھی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر آگئے اور دروازے کے سامنے پہنچ کر بولے۔ ''کیا بات ہے۔ دروازہ کیوں نہیں کھول رہی۔''

''بڑی پکی نیند ہے جی اس کی۔'' ملازمہ فردوس کی آواز ابھری۔

''لیکن یہ تو تمہارے ساتھ چھت پر سوئی ہوگی؟'' دین محمد صاحب نے پوچھا۔

''ہاں جی، ادھر ہی سوئی تھی پھر شاید ٹھنڈ لگی ہے۔ نیچے آگئی ہے۔''

ایک بار پھر دروازہ زور سے بجایا گیا۔ ''دروازہ کھولو تاجور۔'' دین محمد صاحب نے بلند آواز میں کہا۔

فردوس نے کہا۔ ''ہائے اللہ کیا ہو گیا ہے اس کو؟''

اسی دوران میں نیچے برآمدے کی طرف سے تاجور کی والدہ کی پکار سنائی دینے لگی۔

دروازہ نہ کھلنے سے وہ بھی یقیناً گھبرا گئی تھیں اور پوچھ رہی تھیں کہ کیا ہوا ہے۔ بیماری کے سبب وہ سیڑھیاں چڑھنے سے گریز کر رہی تھیں۔

دین محمد صاحب نے جھلا کر فردوس سے کہا۔ ''جاؤ دیکھو اس کو۔ کہیں اوپر ہی نہ آجائے۔'' وہ تاجور کی والدہ کی بات کر رہے تھے۔

فردوس پھر سیڑھیاں اتر کر نیچے چلی گئی۔ یہ مناسب موقع تھا۔ نکلنے کی کامیاب کوشش کی جا سکتی تھی۔ میں نے تاجور کے کان میں کہا۔ ''گھبراؤ نہیں۔ تم آرام سے دروازہ کھولو۔ دروازہ کھلے گا تو میں دروازے کے پیچھے آجاؤں گا اور پھر باہر نکل جاؤں گا۔''

تاجور کی حالت بری تھی مگر اس نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ جونہی پلائی ڈور کا اکلوتا پٹ کھلا مجھے اس کی اوٹ مل گئی۔ دین محمد صاحب کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ وہ گرجے۔ ''کوئی ہوش ہے تم کو۔ دروازہ کیوں نہیں کھول رہی تھیں؟''

''بب...... بس...... ابا جی...... پتا نہیں چلا۔'' وہ ہکلائی۔

دین محمد اور اسفند اندر آ گئے۔ یہ اچھا موقع تھا۔ میں بڑی صفائی سے دروازے کی اوٹ سے نکلا اور سیڑھیوں پر آ گیا۔ ایک قدم میں دو دو سیڑھیاں پھلانگتا ہوا میں برساتی کی طرف لپکا۔ بس آدھے سیکنڈ کا فرق رہ گیا۔ میں برساتی کے دروازے سے ایک قدم دور تھا کہ نیچے سے فربہ انداز فردوس کے چلانے کی آواز آئی۔ ''کون ہے...... کون ہے...... چور...... چور......''

جی چاہا، پلٹ کر ایسا گھونسا ماروں اس کے منہ پر کہ پٹ سے فرش پر جا گرے اور روزِ حشر تک آنکھ نہ کھولے...... مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ میں چھت سے گزرا...... اور پہلے کی طرح چھجے پر پہنچ کر بیرونی دیوار پر آ گیا۔ یہاں سے گلی میں کودنا آسان تھا۔

گلی میں خاموشی تھی۔ عقب میں دین محمد کے گھر میں بھی کسی طرح کا شور نہیں مچا تھا اور ایک طرح سے یہ اچھا ہی تھا۔ میرے لیے بھی اور اہلِ خانہ کے لیے بھی۔

○......❖......○

چوہدری بشیر کے ڈیرے پر پہنچ کر میں اپنے کمرے میں بند ہو گیا۔ یہ بڑا ''اَپ سیٹ'' ہوا تھا۔ مجھے تاجور کی فکر ہو رہی تھی۔ تاجور کی باتوں سے اندازہ ہوا تھا کہ گھر کے حالات پہلے ہی اچھے نہیں ہیں۔ دین محمد کا رویہ بہت بدل چکا تھا۔ وہ تاجور سے اکثر و بیشتر خفا رہتے تھے۔

اگلے روز میں نے ہاشو کی بہن انوری سے سن گن لینے کی کوشش کی مگر کسی خاص بات کا پتا نہیں چلا۔ مطلب یہی تھا کہ کل رات والا واقعہ صرف دین محمد کے گھر کے اندر تک ہی رہا ہے۔ فربہ اندام فردوس نے ایک دو بار چور چور کی آواز لگائی تھی لیکن یہ آواز بھی گھر سے باہر نہیں نکلی تھی۔

دوسرے روز رات دس گیارہ بجے میں نے فون پر تاجور سے رابطے کی کوشش کی مگر فون بند جا رہا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کی خیر خیریت کا پتا کیسے چلایا جائے۔ میں کسی طرح کا رسک بھی لینا نہیں چاہتا تھا۔ دو تین روز اسی گومگو میں گزر گئے۔ دین محمد صاحب کے حویلی نما گھر میں ایک سناٹا سا تھا...... کسی وقت لگتا تھا کہ یہ سناٹا مستقبل قریب میں کسی طوفان کا سبب بنے گا۔

انہی دنوں ایک بڑا اچھا اتفاق ہوا اور مجھے دین محمد صاحب کے گھر کے اندرونی حالات جاننے کا زبردست موقع مل گیا۔ بظاہر تو یہ ایک چھوٹا سا واقعہ تھا مگر اس کا نتیجہ میرے لیے غیر معمولی تھا۔ میں ابھی ابھی لوڈر پر سبزی منڈی کا پھیرا لگا کر واپس آیا تھا۔ صبح کے ساڑھے نو بجے تھے۔ اب رات تک میری کوئی ڈیوٹی نہیں تھی۔ میں آرام کر سکتا تھا۔ میں بستر پر نیم دراز، اپنے اسپائی کیمرے سے چھیڑ خانی کرنے لگا۔ اسے سیل فون کے ساتھ اٹیچ کر کے میں یونہی اس کی سابقہ ریکارڈنگ دیکھنے لگا۔ یہ وہ ریکارڈنگ تھی جو کیمرے نے چند روز پہلے چوہدری بشیر کی بیٹھک میں کی تھی اور جس میں چوہدری بشیر اور منشی منظور میں سیف کے بارے میں ہونے والی رقت آمیز گفتگو بھی شامل تھی۔ یہ ریکارڈنگ بس ایک ڈیڑھ گھنٹے کی تھی۔ باقی

پچاس ساٹھ گھنٹے میں کیمرا خالی کمرے کو ہی ایکسپوز کرتا رہا تھا۔ ریکارڈنگ چیک کرتے ہوئے ایک جگہ میں بری طرح چونک گیا۔ میں نے جلدی سے کیمرے کو اسٹاپ کیا اور اسے ریورس کر کے دوبارہ دیکھنے لگا۔ میں ششدر رہ گیا۔ خالی کمرے کے اندر ایک عورت داخل ہوئی تھی اور جھاڑ پونچھ کرنے لگی تھی۔ یہ بھرے بھرے جسم والی ایک جوان ملازمہ تھی۔

پھر ایک اور شخص کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے غالباً دروازے کو کنڈی چڑھا دی تھی کیونکہ کنڈی چڑھنے کی آواز ریکارڈ ہوئی تھی۔ وہ شخص کیمرے کے فریم میں آیا تو میں چونک گیا۔ وہ ہاشو تھا۔ وہی ہاشو جو اپنی بیوی سے بہت محبت کرتا تھا اور ہر وقت اس کی ٹہل سیوا میں لگا رہتا تھا۔ وہ بھوکے شیر کی طرح جواں سال عورت پر جھپٹا۔ دونوں بغل گیر ہو گئے اور پھر چارپائی پر گر گئے۔

''نہ کر ہاشو۔ چھڈ دے مینوں۔ کوئی آ جائے گا۔'' عورت کی آواز ابھری۔

''اوئے تیری ایسی کی تیسی۔ آج پورے ایک مہینے کے بعد تو پکڑائی دی ہے تُو نے۔'' وہ ہانپی ہوئی آواز میں بولا۔

کھینچا تانی میں عورت کی قمیص کے بٹن ٹوٹ گئے اور وہ نیم عریاں ہو گئی۔ عورت نے شوخی بھری ناراضگی کے ساتھ جھاڑ پونچھ والی ٹاکی اس کے منہ پر پھیر دی۔ وہ اور بھی پُر جوش ہو گیا۔ اچانک باہر کچھ فاصلے سے کسی کی مدھم آواز سنائی دی۔ ''ہاشو......اوئے ہاشو۔''

وہ دونوں جلدی سے علیحدہ ہو گئے۔ دونوں نے اپنے لباس درست کیے۔ ملازمہ نے اپنا چاک گریبان اوڑھنی میں چھپایا اور جھاڑ پونچھ میں لگ گئی۔ ہاشو باہر نکل گیا۔ عورت کا چہرہ پوری طرح کیمرے کے سامنے آیا تو میں نے پہچان لیا یہ دین محمد کے گھر کام کرنے والی ملازمہ فردوس تھی۔ اچھا لوّ سین تھا۔

اس لوّ سین سے فائدہ اٹھانے کا موقع مجھے دوسرے روز ہی مل گیا۔ انوری کے ذریعے مجھے پتا چل گیا کہ چوہدری بشیر کے ڈیرے کی صفائی ستھرائی کا کام فردوس کی ایک بہن نجمہ کرتی ہے۔ وہ چار پانچ دن کی چھٹی پر ہے اس لیے آج کل فردوس یہاں آ رہی ہے۔

وہ دوسرے روز آئی تو میں نے اسے گھیر لیا۔ کل والے واقعے کی ہوش رُبا تفصیل بتا کر اسے ہینڈل کرنے میں مجھے دس منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ جب میں نے سیل فون کی اسکرین پر اسے ہاشو والے سین کی جھلک دکھائی تو وہ سخت خوف زدہ ہو گئی۔ منت سماجت کرنے لگی اور سارا الزام ہاشو پر دھرنے لگی۔

میں نے کہا۔ ''وہ دیکھو، ہاشو کی زوجہ کھڑی ہماری ہی طرف دیکھ رہی ہے۔ یہاں بات

کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ تم کل کا کوئی ٹائم بتاؤ۔ آرام سے بات کریں گے۔"

وہ پہلے تو گریزاں رہی پھر مجبوراً مان گئی۔ پانی والے کھالے سے تھوڑا آگے تین چار ٹنڈ منڈ بیریاں تھیں۔ اس سے آگے تھوڑی سی تھوروالی زمین تھی اور سرکنڈے تھے۔ سرکنڈوں کی اوٹ میں کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر بات کی جاسکتی تھی اور اگر کوئی ادھر آجاتا تو پہلے سے اسے دیکھا جاسکتا تھا۔ میں نے فردوس کو پابند کر دیا کہ وہ اس معاملے کے بارے میں ہاشو سمیت کسی کو کچھ نہیں بتائے گی۔

دوسرے روز شام کے وقت وہ ہانپی ہوئی سی وہاں پہنچ گئی۔ وہ شادی شدہ تھی، دو بچے تھے۔ اس نے ہاتھ پاؤں جوڑے کہ میں اس کی اور ہاشو والی بات اپنے تک ہی رکھوں۔ اس کے لیے میں نے ایک شرط رکھی اور شرط یہ تھی کہ وہ دین محمد کے گھر کے حالات مجھے بتائے گی۔ میں نے اسے یہی باور کرایا کہ میں دین محمد کی بیٹی تاجور پر عاشق ہو گیا ہوں۔

فردوس نے دونوں ہاتھ کانوں کو لگائے اور خوف زدہ چہرے کے ساتھ بولی۔ "توبہ کرو ڈرائیور جی، کس چکر میں پڑ رہے ہو۔ تاجور، چوہدری جی کی دھی ہے۔ ویسے بھی اس کی بات تو لاہور کے بہت وڈے لوگوں میں چل رہی ہے۔ تھوڑے دنوں میں منگنی ہونے والی ہے۔ وہ بہت ہی ڈھاڈے لوگ ہیں۔"

"ڈھاڈا تو میں بھی بہت ہوں۔ میرا میٹر گھوم گیا تو آگا پیچھا نہیں دیکھوں گا۔ یہ موبائل فون سیدھا تیرے بندے کے سامنے جا کر رکھ دوں گا اور تُو خود ہی بتا رہی ہے کہ وہ تجھے تین طلاقیں دینے میں تین منٹ نہیں لگائے گا۔"

میرے بے رحم رویے نے فردوس کو بالکل سیدھا کر دیا۔ ویسے بھی وہ کوئی ایسی وفادار یا پرانی ملازمہ نہیں تھی۔ (جب دین محمد صاحب چاندگڑھی چھوڑ کر یہاں سکھیرا آئے تھے، تب اسے ملازم رکھا تھا) وہ اتنا ڈر گئی تھی کہ بہت جلد میرے ڈھب پر آگئی۔ اس کے پاس ایک سستا سا موبائل فون بھی موجود تھا۔ میں نے اس کا نمبر لے لیا۔

وہ جان چکی تھی کہ پانچ روز پہلے دین محمد کے گھر میں گھسنے والا اور پھر خطرہ دیکھ کر بھاگ جانے والا میں ہی تھا۔ وہ اس بات پر بے حد ششدر بھی تھی کہ مجھ جیسے معمولی ڈرائیور کے ساتھ تاجور کا چکر چل پڑا ہے۔

میں نے اس سے پوچھا۔ "وہاں سے میرے آنے کے بعد کیا ہوا؟"

اس نے ذرا دکھی لہجے میں انکشاف کیا۔ "تاجور بی بی کو اپنے ابا جی سے مار پڑی...... وہ غصے میں تھے۔ انہوں نے تاجور بی بی کو تھپڑ مارے۔ میں نے اور اس کی امی نے بڑی

مشکل سے انہیں روکا۔"

میرے سینے میں سرد لہر سی دوڑ گئی۔ یہ بڑی تکلیف دہ خبر تھی۔ میں نے فردوس سے پوچھا۔"اس کے بعد کیا ہوا؟"

"گھر میں بڑا سیاپا پڑا ہوا ہے۔ چوہدری جی بہت غصے میں ہیں۔ تاجور بی بی کو منحوس اور پتا نہیں کیا کچھ کہہ رہے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ تاجور کی وجہ سے بار بار ان کی عزت مٹی میں مل رہی ہے۔ انہوں نے حکم دیا ہے کہ تاجور گھر سے باہر قدم نہیں نکالے گی۔ اس کی امی اسے اپنے ساتھ کمرے میں سلا رہی ہیں۔"

"تاجور نے کیا کہا تھا کہ سیڑھیاں چڑھ کر کون بھاگا ہے؟"

"اس وچاری سے تو گل ہی نہیں کی جا رہی تھی۔ اس نے کہا کہ اسے کچھ پتا نہیں وہ تو ٹھنڈ کی وجہ سے نیچے کمرے میں آ گئی تھی۔ بس اسی بات پر چوہدری جی نے اسے مارنا شروع کر دیا تھا۔ اس کا ٹیلی فون بھی فرش پر مار کر توڑ دیا۔ ان کا خیال تھا کہ یہاں سے نکل کر بھاگنے والا وہی منڈا ہے جو دو تین دفعہ پہلے بھی تاجور بی بی کے پیچھے یہاں آیا ہے۔"

"کون منڈا؟"

"وہی جو کچھ دن پہلے پولیس والوں سے لڑا تھا اور پھر اسے چوہدری جی نے تھپڑ مارے تھے۔"

میں سمجھ گیا کہ فردوس، انیق کی بات کر رہی ہے۔ شاید چوہدری دین محمد کا خیال تھا کہ اب شاہ زیب کے "مرنے" کے بعد اس کا دوست اس کی بیٹی کے پیچھے پڑ گیا ہے۔ کبھی کبھی وہ اپنے غصے میں حق بجانب بھی لگتے تھے۔

فردوس نے میرے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ "تمہیں اللہ رسول کا واسطہ ہے۔ اس معاملے میں میرا نام کہیں نہ لینا۔ چوہدری جی کھڑے کھڑے میری گردن اتار دیں گے انہوں نے مجھے بڑی سختی سے منع کیا ہوا ہے کہ اپنی زبان بند رکھوں۔"

میں نے اس حوالے سے فردوس کو تسلی دی اور اس سے وعدہ لیا کہ جب میں فون کروں گا تو وہ سنے گی۔

کیمرا بڑا زبردست کام کر رہا تھا۔ اب تک میں خود اس سے کام لیتا رہا تھا لیکن یہ آخری کام کیمرے نے خود ہی کر دکھایا تھا۔ ہاشو اور فردوس کو کیپچر (capture) کر لیا تھا۔ رات کو ایک بار پھر شازیہ کے محبوب اکبر سے فون پر بات ہوئی۔ میری توقع کے عین مطابق اس نے بڑی پھرتی سے اپنے کام کو سنبھالا دیا تھا۔ مشینیں وغیرہ آ گئی تھیں۔ خالی بوتلیں اور سوڈا واٹر

میں استعمال ہونے والے کیمیکلز بھی اس نے خرید کر لیے تھے۔ حالانکہ سیزن نہیں تھا مگر توقع تھی کہ اس کا کام چل پڑے گا۔

میں نے چوہدری بشیر کے قرضے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا کام سجاول کے سپرد کیا تھا۔ قرض خواہ ٹھیکیدار افضل خان کی رہائش اسی قصبے کے پاس تھی جہاں سجاول آج کل نئی شادی شدہ زندگی کے خوشگوار دن گزار رہا تھا۔

سجاول نے فون پر مجھے بتایا۔ ''یونس نے ٹوہ لگالی ہے۔ قرض تو واقعی اس چوہدری بشیر نے لیا تھا مگر یہ چھ لاکھ روپیہ تھا۔ ٹھیکیدار نے سود پر سود لگا کر یہ رقم سولہ لاکھ تک پہنچا دی ہے۔''

''تو پھر؟''

''تم کہو تو وہ ہاتھ جوڑ کر سود معاف کر دے گا اور اللہ نے چاہا تو اصل زَر بھی۔''

''یعنی تم اس کو اپنی سجاول والی جھلکی دکھاؤ گے لیکن یہ مجھے منظور نہیں۔ تم جو بنے ہوئے ہو وہی بنے رہو بلکہ میں تو چاہتا ہوں کہ ہمیشہ یہی رہو۔''

''ایسی بات نہیں ہے...... یہیں بیٹھے بیٹھے فیض محمد کی ڈوری ہلا دوں گا...... یا اور بھی کئی ڈوریاں ہیں۔ آسانی سے سارا کام ہو جائے گا۔''

''نہیں یار! اب شرافت کی طرف آئے ہیں تو بہتر ہے جہاں تک بس چلے شریف ہی رہیں۔ یونس کے ذریعے ٹھیکیدار پر بس اتنا دباؤ ڈالو کہ وہ رقم پر معقول منافع لے لے۔''

''بشیر کو کیا بتاؤ گے، ادھار چکانے کے بارے میں؟''

''بتانے کی ضرورت ہی نہیں۔ بس اسے یہی پتا چلے گا کہ کسی مخیّر مالدار نے اس کی کسی پرانی نیکی کا بدلہ چکایا ہے اور خاموشی سے اس کا قرضہ ادا کر دیا ہے۔ مجھے کسی سے کوئی تمغہ تو نہیں لینا ہے۔''

''تمہاری معشوقہ...... سوری...... سوری...... تمہاری دوست والے معاملے کی کیا صورتِ حال ہے؟''

''ابھی تو پیچا پڑا ہوا ہے۔ اگلے دو تین ہفتے بڑے اہم ہیں۔''

''بس کہیں بھی ضرورت ہو...... مجھے آواز دے لینی ہے۔''

''بے فکر رہو۔'' میں نے کہا۔

پس منظر میں خورسنہ اور اس کے بچے کی چہکاریں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ دونوں ہنسنے کھیلنے میں مصروف تھے۔ شاید ایک دوسرے کو پکڑ رہے تھے۔ خورسنہ کی دور افتادہ آواز آئی۔

''شاہ زیب صاحب کو میرا سلام کہیں۔''

''وہ سلام کہہ رہی ہے۔'' سجاول بھاری آواز میں بولا۔

''میں بھی سلام کہہ رہا ہوں، بلکہ سلامتی کہہ رہا ہوں۔ اللہ اس معصومہ کو تمہاری ساری کرختگیوں اور چیرہ دستیوں سے محفوظ رکھے۔'' اس کے ساتھ ہی میں نے فون بند کر دیا۔

فردوس سے بات ہوئے آج تیسرا چوتھا دن تھا۔ میں نے اسے کال کرنے کا ارادہ کیا۔ رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ امید تو کم ہی تھی کہ وہ فون سنے گی۔ مگر حیرت ہوئی میری دوسری ہی بیل پر اس کی ڈری ہوئی آواز سنائی دے گئی۔ ''کک......کون؟''

''ڈرائیور وقاص بات کر رہا ہوں۔''

''کیا بات ہے؟'' وہ سرگوشی میں بولی

''بات تو تم نے بتانی ہے بلکہ باتیں بتانی ہیں۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''میں بڑی پریشان ہوں۔ ابھی تک جاگ رہی ہوں۔ یہاں گھر میں حالات بڑے خراب ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

وہ ذرا رک کر کہنے لگی۔ ''پرسوں چوہدری صاحب نئی گاڑی میں اپنے بھائی کے ساتھ لاہور گئے ہوئے تھے۔ انہوں نے آٹھ دس دن کے اندر تاجور کے نکاح کا پروگرام بنالیا ہے۔ خاموشی کے ساتھ پندرہ وی لوگ آئیں گے اور نکاح ہو جائے گا۔ رخصتی بعد میں پوری تیاریوں کے ساتھ ہو گی۔''

میرے سینے میں دل کے بھاگتے گھوڑے کو جیسے ایڑ لگ گئی اور وہ کچھ اور بھی سرپٹ ہو گیا۔ ''آٹھ دس دن کے اندر نکاح؟ تمہیں کوئی غلطی تو نہیں لگ رہی فردوس؟''

''نہیں ڈرائیور بھائی! سب کچھ ایسا ہی ہے جیسے میں بتا رہی ہوں۔ اب......تم بھول کر بھی اس طرف آنے کی کوشش نہ کرنا۔ اب یہاں تین چار گارڈ بھی آ گئے ہیں۔ بڑے خطرناک لوگ لگتے ہیں۔ چنگا یہی ہے کہ تم چوہدری بشیر کی نوکری چھوڑ دو اور نکل جاؤ یہاں سے۔''

''تا کہ تمہاری جان بھی چھوٹ جائے۔'' میں نے لقمہ دیا۔

''نہیں، نہیں۔ میں اپنے دل کی بات کر رہی ہوں۔ تم سے کوئی غلطی ہو گئی تو سچ کہہ رہی ہوں، جان چلی جائے گی تمہاری۔''

''جان دینے کے لیے ہی تو رکا ہوا ہوں یہاں۔'' میں نے کہا۔

''کسی ماں کے پتر ہو تم۔ روگ نہ لگا دینا اپنے پیدا کرنے والوں کو۔'' اس کے لہجے میں دکھ تھا۔

''اچھا، تم یہ ہمدردیاں چھوڑو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تاجور کی پوزیشن کیا ہے۔ کیا وہ راضی باضی ہے؟''

میرے سوال پر وہ چند لمحے کے لیے خاموش ہو گئی پھر ہولے سے کہنے لگی۔ ''کڑیوں کی اپنی مرضی کہاں ہوتی ہے۔ جہاں ماں پیو تور دیں چلی جاتی ہیں۔ اندر کی باتوں کا مجھے زیادہ پتا نہیں ہے۔ ویسے لگتا ہے کہ وہ زیادہ خوش نہیں ہے۔ اسے ڈر آتا ہے ان بہت وڈے لوگوں سے۔''

میں جانتا تھا کہ تاجور اس وقت شدید ترین کشمکش سے دوچار ہو گی۔ میں ایک بار پھر زندہ سلامت اس کے سامنے موجود تھا اور اس بار اس نے میری آنکھوں کے رنگ بھی دیکھ لیے تھے۔ وہی رنگ جن میں ایک محبت بھری آزاد اور حسین زندگی کا اشارہ موجود تھا۔

میں نے پوچھا۔ ''اس نے کبھی تم سے یا اپنی والدہ سے بات کی ہے؟''

''میں تو نوکرانی ہوں۔ میری اتنی حیثیت نہیں۔ پر مجھے لگتا ہے کہ وہ ماں کو اپنے دل کا حال بتاتی ہے۔ ماں دھی دونوں پریشان ہیں۔ بلکہ دونوں ماموں اور نانی وغیرہ بھی اس حق میں نہیں۔ ایک ماموں تو بات کرنے، لاہور سے یہاں آئے بھی تھے۔ پر گھر کے سربراہ تو چوہدری دین محمد ہیں۔ ان کے سامنے کسی کی پیش کہاں چل سکتی ہے۔ آج کل تو وہ ویسے بھی بڑے غصے والے ہو گئے ہیں۔''

''تم کہنا چاہتی ہو کہ تاجور کی طرح اس کی والدہ بھی ان وڈے لوگوں میں رشتے سے خوش نہیں ہیں؟''

''اندازہ تو یہی ہو رہا ہے مجھے۔ کل میں نے......'' وہ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔

میں نے اسے ٹوکا۔ ''دیکھو فردوس! تم نے وعدہ کر رکھا ہے کہ جو کچھ تمہیں پتا چلے گا، مجھے بتاؤ گی۔ میں تمہیں پورا یقین دلاتا ہوں کہ کوئی میرے ٹوٹے بھی کر دے تو کبھی تمہارا نام زبان پر نہیں لاؤں گا۔''

کچھ دیر تذبذب کے بعد وہ بولی۔ ''کل میں نے میاں جی اور تاجور کی امی کی کچھ باتیں سنی ہیں۔ میاں جی (دین محمد صاحب) بڑے غصے میں تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ اب تاجور کی شادی ہو گی تو یہیں دارابیوں کے گھر میں ہو گی۔ نہیں تو میں اس کے ٹوٹے کر کے نہر میں پھینک دوں گا۔ میں نے قسم کھالی ہے۔ اب کسی صورت اس رشتے سے پیچھے نہیں ہٹوں گا۔

بہت لاڈ دیکھ لیے ہیں اس بد بخت کے۔ بہت مٹی ڈلوالی ہے سر میں۔ تاجور کی امی نے کچھ کہنا چاہا لیکن ان کو بھی سخت جھڑکیں پڑیں۔"

"اس کا مطلب ہے فردوس کہ دین محمد صاحب من مانی پر تلے ہوئے ہیں۔"

"من مانی تو کر رہے ہیں لیکن وہ بھی کیا کریں۔ لاہور والے وڈے لوگوں کو انکار کرنا ان کے بس میں بھی نہیں ہے۔ ویسے بھی تاجور بی بی کی طرف سے کئی دکھ ملے ہیں میاں جی کو۔ اللہ کی مرضی ہے ورنہ وہ ایسی بھیڑی بھی نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔ "فردوس! اگر تم ایک بار کسی طرح میری ملاقات تاجور سے کرا دو تو میں تم سے ایک وعدہ کرتا ہوں۔ مردوں والا وعدہ...... وعدے سے پھر جاؤں تو کہنا کہ کسی ہیجڑے سے پالا پڑا تھا۔"

"تم کیا بات کر رہے ہو؟" فردوس کی آواز ابھری۔

"اگر تم تاجور سے میری ایک ملاقات کرا دو تو میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری اور ہاشو والی ویڈیو تمہارے سامنے صاف کر دوں گا۔ سچے دل سے صاف کر دوں گا۔"

"توبہ توبہ۔" وہ بولی۔ "آج کل بڑی سختی ہے تاجور بی بی پر۔ میاں جی تو مجھ کھلی کھلوتی کی جان نکال لیں گے، نہ بابا نہ۔"

میں نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہیں ہوئی۔ اس نے بتایا کہ تاجور بی بی کا گھر سے نکلنا بالکل بند ہے۔ آخر میں اسے صرف اتنا منا سکا کہ وہ اپنے فون کے ذریعے تاجور سے میری بات کرانے کی کوشش کرے گی۔

میں نے کہا۔ "اگر فون پر ہی بات کرانی ہے تو پھر ایک آدھ دن کے اندر ہی کراؤ۔"

وہ کچھ سوچ کر بولی۔ "تاجور بی بی! اب امی جی کے ساتھ ان کے کمرے میں سوتی لیکن کل ڈسکے سے اس کی خالہ اور خالہ کی ساس آ رہی ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ اگر وہ آ گئیں تاجور بی بی کو میرے کمرے میں سونا پڑے گا۔ اگر ایسی بات ہوئی تو میں اس کی مرضی پوچھوں گی۔ اگر اس کی مرضی ہوئی تو وہ تم سے بات کر لے گی۔"

"صرف مرضی نہیں پوچھنی۔ اسے راضی کرنا ہے۔ اسے بتانا کہ اگر اس نے بات نہیں کی تو ہو سکتا ہے کہ میں پہلے کی طرح دیوار کود کر اندر آ جاؤں بلکہ یہ بھی کہہ دینا کہ پھر بات سکتی ہے۔"

"لیکن پھر تم روز روز یہی بات کہو گے۔"

"نہیں، یہ بھی وعدہ ہے۔ میں پھر اسے مجبور نہیں کروں گا۔ کم از کم تمہیں تو نہیں کہوں

کہ اس سے بات کراؤ۔"

دوسرے روز رات کو ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ سرد ہوا سردیوں کی آمد کی خبر دے رہی تھی۔ گرم کپڑے نکل آئے تھے۔ رضائیوں نے بھی چارپائیوں پر جگہ بنالی تھی۔ رات دس بجے کے لگ بھگ فردوس کی کال آ گئی۔ حاکم علی میں ایک بری عادت تھی۔ وہ سوتے ہوئے خراٹے لیتا تھا مگر اس کی یہ بری عادت میرے لیے فائدہ مند ثابت ہو جاتی تھی۔ اس کے ہلکے خراٹے مسلسل اس امر کی نشاندہی کرتے رہتے تھے کہ وہ سو رہا ہے۔ اس وقت بھی یہی صورتِ حال تھی۔

میں نے کال ریسیو کی تو دوسری طرف سے فردوس کی آواز آئی۔ "تاجور بی بی سے بات کرلو۔"

"ٹھیک ہے لیکن تم باہر چلی جاؤ تو زیادہ اچھے طریقے سے بات ہو سکے گی۔"
"میں گرم چادر لے کر چھت پر جا رہی ہوں۔ تم کرو بات۔" فردوس نے کہا۔
پھر تاجور کی مترنم لیکن سہمی ہوئی سی آواز میرے کانوں میں گونجی۔ "ہیلو آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"
"مجھے بڑا دکھ ہے تاجور کہ اس دن میری وجہ سے تمہیں اتنی تکلیف اٹھانا پڑی۔ تمہارے ابا جی اتنے غصے میں آ گئے کہ انہوں نے تم پر ہاتھ اٹھایا۔"
"مجھے مار ہی ڈالتے تو اچھا تھا۔ میری جان تو چھوٹ جاتی اس روز روز کے مرنے سے۔" اس کی آواز میں دکھ بول رہا تھا۔
"تاجور! زندگی بار بار نہیں ملتی اور شادی کا فیصلہ زندگی بھر کا ہوتا ہے۔ میں میں چاہتا ہوں کہ تم یہ فیصلہ کسی مجبوری کے تحت نہ کرو۔" میں اب اپنی اصل آواز میں بول رہا تھا۔
"مجھے کوئی مجبوری نہیں۔" وہ عجیب انداز سے بولی۔ "میں اپنے پیدا کرنے والوں کو اور دکھ نہیں دے سکتی۔"
"پیدا کرنے والوں کو یا صرف پیدا کرنے والے کو؟ مجھے لگتا ہے کہ تمہارے ابا جی نے ضد پکڑی ہوئی ہے کہ وہ تمہیں ہر صورت اس دارابی کی ڈولی میں بٹھا کر چھوڑیں گے چاہے اس کا نتیجہ کچھ بھی نکلے۔"
"ان کا حق ہے مجھ پر۔ وہ میرے بارے میں ہر فیصلہ کر سکتے ہیں۔"
"کیا کسی اور کا تھوڑا سا بھی حق نہیں؟" میں نے دل فگار آواز میں پوچھا۔
دوسری طرف خاموشی رہی پھر تاجور نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔ "جب اس کا وقت

تھا شاہ زیب! آپ نے بس دور جانے والی باتیں ہی کیں۔ کئی مواقع ایسے آئے تھے جب کچھ نہ کچھ ہو سکتا تھا مگر اب ایک بار پھر وقت ہمارے خلاف ہے۔ شاید...... ملنا ہماری قسمت میں نہیں ہے اور قسمت کا لکھا بھلا کون بدل سکتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''قسمت کا لکھا میں بدل سکتا ہوں...... اور تاجور بدل سکتی ہے اور ہر وہ شخص بدل سکتا ہے جو سچے دل سے پیار کرتا ہے اور کوشش پر یقین رکھتا ہے۔''

''میں کیا کروں شاہ زیب! میں آپ کو کیسے بتاؤں، آپ کو زندہ سلامت دیکھ کر مجھے کتنی خوشی ہوئی ہے۔ سنا ہے کہ لوگ خوشی کی وجہ سے مر بھی جاتے ہیں۔ مجھے بھی یہی لگتا تھا کہ شاید میں مر جاؤں گی مگر اب جو حالات بن رہے ہیں، انہوں نے مجھے نچوڑ کر رکھ دیا ہے۔ ابا جی کسی صورت نہیں مانیں گے۔ وہ مجھے مار ڈالیں گے اور شاید خود اپنی جان بھی لے لیں گے مگر اپنے ارادے سے پیچھے نہیں ہٹیں گے۔''

''تو پھر کیا تم بھی اکثر مشرقی لڑکیوں کی طرح ایک جھوٹی زندگی جینا چاہتی ہو؟''

''جھوٹی زندگی بھی جب جینا شروع کر دی جائے تو پھر آہستہ آہستہ سچی ہو ہی جاتی ہے۔''

''تاجور! یہ تو بڑے کمزور درجے کی محبت کرنے والے کرتے ہیں۔ کیا ہماری محبت ایسی ہی کمزور تھی؟''

''آپ اس محبت کی گہرائی کو نہیں جانتے۔'' وہ بے ساختہ کہہ گئی۔

''تو پھر کیا تم میرا ہاتھ پکڑ کر، حالات کا سامنا کر سکتی ہو؟''

''اگر آپ یہی دیکھنا چاہتے ہیں کہ میں آپ کا حکم مان سکتی ہوں یا نہیں، تو پھر مجھے مرنے کا حکم دیں، میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں، میں کل کا سورج نہیں دیکھوں گی اور یہ کوئی زبانی بات نہیں۔ میں اپنے ہر لفظ کے ساتھ کھڑی ہوں۔''

''میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا تاجور، میں تمہیں زندہ دیکھنا چاہتا ہوں لیکن ان ''اونچی شان'' والے دارابیوں کی بہو بن کر بھی تم زندہ کہاں رہو گی۔ یہ بھی تو ایک مسلسل موت ہوگی اور میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ میں کوئی نہ کوئی راستہ نکالوں گا۔ کوئی ایسا راستہ جس سے تمہارے بڑوں کی عزت پر بھی کوئی حرف نہ آئے اور تم دارابیوں کی کسی عالی شان کوٹھی میں بھاری گہنوں اور کپڑوں میں دفن ہونے سے بھی بچ جاؤ۔''

''کیا کریں گے آپ...... کیا کر سکتے ہیں آپ؟''

میں نے ذرا توقف سے کہا۔ ''فرض کرو تاجور، یہ حرام زادہ دارج خود ہی کہیں دفع

جائے تو پھر؟"

"کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟"

"یہ خود ہی تمہاری جان چھوڑ دے۔ تمہیں سونے کے پنجرے میں بند کرنے کا ارادہ ترک کر دے؟"

وہ چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد بولی۔ "مجھے پتا ہے آپ اپنی جان ہتھیلی پر لیے پھرتے ہیں۔ خود کو خطرے میں ڈال کر آپ ایسا کچھ کر سکتے ہیں لیکن اس میں بھی بدنامی ہماری ہی ہونی ہے۔ ہو سکتا ہے...... کہ...... اس کا الزام بھی گھوم پھر کر مجھ پر ہی آ جائے۔"

"وہ کس طرح؟"

"آپ کو ہمارے گھر کے حالات کا کچھ علم نہیں۔ پرانی باتیں اباجی کے ذہن سے کسی صورت نہیں نکل رہیں۔ وہ انیق کے سلسلے میں بھی سخت پریشان ہیں۔ مجھے بتاتے ہوئے بھی شرم آتی ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ آپ کے بعد اب آپ کا دوست ان کی عزت مٹی میں ملانا چاہتا ہے، اگر آپ نے دارج کے ساتھ کچھ کیا تو......"

"تو کیا؟"

"اول تو یہ بہت ہی خطرناک کام ہوگا۔ اگر آپ کسی طرح کامیاب ہو بھی گئے تو کیا پتا اس کا الزام اباجی، انیق کو ہی دے ڈالیں اور اس طرح ساری بات پھر مجھ پر ہی آ جائے۔ پلیز شاہ زیب! میں اب اور بے عزتی نہیں سہہ سکتی...... نہ ہی اباجی کو کسی تکلیف میں دیکھ سکتی ہوں۔"

میں نے چند لمحے توقف کے بعد کہا۔ "ایک کام اور ہو سکتا ہے تاجور! کیوں نہ اباجی کو ہی سمجھانے کی کوشش کی جائے...... انہیں حوصلہ دیا جائے کہ وہ دارابیوں کو انکار کر دیں۔"

"انکار تو وہ تب کریں جب وہ انہیں برا سمجھیں...... وہ تو بس ان حالات کو برا سمجھ رہے ہیں جو میں نے ان کے لیے پیدا کیے ہیں۔"

"مگر تاجور! انہیں دارابیوں کا سیاہ سفید تو بتایا جا سکتا ہے ناں، انہیں سمجھایا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی اکلوتی بیٹی کو کن جابر لوگوں کے حوالے کر رہے ہیں۔"

"کون سمجھائے گا انہیں اور کیسے؟"

"میں سمجھاؤں گا۔"

"آپ...... آپ کس طرح سمجھا سکتے ہیں...... لوگوں کی نظر میں تو آپ......"

"مر چکا ہوں لیکن ضروری تو نہیں کہ میں خود ہی ان کے سامنے جا کر کھڑا ہو جاؤں۔

کسی ایسے شخص کو بھی ان کی طرف بھیجا جا سکتا ہے جو تمہاری امی اور تمہارے دیگر نھیالیوں کی طرح اس رشتے کے خلاف ہو۔ مثلاً تمہارے بڑے ماموں جو عالم دین ہیں اور لاہور کی ایک بڑی مسجد میں امامت بھی کرتے ہیں۔"

"آپ کو ان کے بارے میں کیسے پتا چلا؟"

"میں نے اپنے طور پر کچھ معلومات حاصل کی تھیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ وہ کچھ دن پہلے یہاں سکھیرا میں آئے تھے اور انہوں نے تمہارے ابا جی سے اس بارے میں بات کی تھی دارابیوں کے رہن سہن کے بارے میں بہت کچھ سمجھایا بجھایا تھا۔"

"لیکن اس کا فائدہ کیا ہوا۔ وہ اور بھڑک اٹھے۔ امی سے بھی بہت لڑے۔" پھر وہ ذرا رک کر بولی۔ "مگر آپ کو یہ ساری باتیں کیسے پتا چلتی ہیں؟"

"کہتے ہیں تاجور، جہاں چاہ ہوتی ہے وہاں راہ ہوتی ہے۔ بس مجھے بھی تمہارے بارے میں خبر مل ہی جاتی ہے۔"

اتنے میں تاجور اچانک کچھ گھبرا گئی۔ سرگوشی میں بولی۔ "ایک منٹ۔"

پھر شاید وہ آہٹ وغیرہ سننے کے لیے کمرے کے دروازے کی طرف چلی گئی تھی۔ چند سیکنڈ بعد اس کی آواز دوبارہ ابھری۔ "لگتا ہے کہ ابا جی جاگ گئے ہیں۔ نیچے برانڈے میں گھوم رہے ہیں۔ اوپر بھی آسکتے ہیں۔ اب میں بند کر رہی ہوں۔"

"تاجور پلیز...... میری بات ختم نہیں ہوئی۔ کم از کم ایک دفعہ تم نے پھر بات کرنی ہے مجھ سے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں اگر تم میرے ساتھ ہو تو میں کوئی نہ کوئی راستہ نکال لوں گا اور یہ ایسا راستہ ہوگا جس میں تمہاری عزت پر ذرا سا حرف بھی نہیں آئے گا۔"

"خدا حافظ۔" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں نے کچھ دیر بعد سجاول کو 'مسڈ کال' دی...... رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ وہ نیا نیا شادی شدہ ہوا تھا اس لیے براہِ راست فون کرنا مناسب نہیں سمجھا اگر وہ فرصت سے تھا تو رابطہ کر سکتا تھا۔ وہ فرصت سے ہی تھا۔ ایک منٹ بعد اس کی کال آ گئی۔ "ہاں شاہی، اتنی رات گئے پیٹ میں کیوں مروڑ اٹھ رہا ہے۔"

"ضروری مروڑ ہے۔ تمہیں تھوڑی سی تکلیف دینی ہے۔"

"شادی شدہ بندہ تو ویسے ہی تکلیف میں ہوتا ہے۔ تم کو اور کیا تکلیف دینی ہے؟"

"میں سنجیدہ ہوں یار، تم انیق سے رابطہ کرو، اور اسے ایک کام پر لگاؤ۔"

"کھل کر بات کرو۔"

''انیق بھی ان دارابیوں کے بہت خلاف ہے۔ میری ''موت'' کے بعد اور زیادہ ہو گیا ہے۔ وہ ہرگز نہیں چاہتا کہ تاجوران چنگیز خانوں کے شکنجے میں آئے۔''

''ہاں یہ بات تو ہے۔ فون پر اس نے یہ بات کھل کر کہی تھی۔ اسے جتنا دکھ تمہارے ''مرنے'' کا ہے، اتنا ہی اس بات کا بھی ہے کہ تمہارے بعد دارابیوں نے تاجور کو تر نوالہ سمجھا ہوا ہے۔''

''اور یہ حقیقت بھی ہے لیکن ہم اسے تر نوالہ نہیں بننے دیں گے بلکہ ان لوگوں کو اس کے قریب بھی نہیں پھٹکنے دیں گے۔ تم اپنی طرف سے انیق کی ایک ڈیوٹی لگاؤ۔ وہ دیواروں میں در بنانے والا کریکٹر ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ دو چار دن میں اس خبیث دارج دارابی کی ایک دو دکھتی رگیں ڈھونڈ لے گا۔ ہمیں اس کے خلاف ایک بھی تگڑا سا پوائنٹ مل گیا تو صورتِ حال بدل سکتی ہے۔''

سجاول میری بات سمجھ رہا تھا۔ ہمارے درمیان اس موضوع پر دس پندرہ منٹ بات ہوئی۔ میں نے سجاول سے یہ بھی کہا کہ جب انیق سے بات ہو تو اسے اپنی طرف سے خاص طور سے ہدایت کرنی ہے کہ وہ دوبارہ سکھیرا آنے سے اور کسی بھی طرح کی مہم جوئی کرنے سے باز رہے۔ سجاول کو کچھ ضروری مشورے دے کر اور پھر خورسنہ کی خیر خیریت دریافت کر کے میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

مجھے انیق کی تیز طراری اور معاملہ فہمی پر پورا بھروسا تھا (لیکن میں ابھی کسی طور بھی اس کے سامنے آنا نہیں چاہتا تھا) سجاول نے اپنے طور پر اس سے رابطہ کیا اور وہ اپنے کام میں لگ گیا۔

O......❖......O

ایک روز چوہدری بشیر کے آرڈر پر میں شفقت بی بی، ان کی بڑی بیٹی شازیہ اور سب سے چھوٹی ارم کو لے کر قریبی گاؤں مہراپور گیا۔ یہی گاؤں شفقت بی بی کا میکا بھی تھا۔ ان کا دل اپنی بچپن کی سہیلیوں اور دیگر لوگوں سے ملنے کو چاہ رہا تھا۔ سیف کی موت کا غم تو شفقت بی بی کی آنکھوں میں ایک بھاری چٹان کی طرح ٹھہرا ہوا تھا مگر ویسے ان کی طبیعت کچھ بہتر نظر آتی تھی۔ شازیہ نے بتایا کہ وہ کھا پی بھی رہی ہیں۔ راستے میں وہ بڑی اپنائیت کے ساتھ مجھے ''پتر'' کہہ کر باتیں کرتی رہیں۔ ''کسی چنگی ماں کی اولاد ہو تم...... ہمارے لیے اب تم ڈرائیور نہیں ہو۔ گھر کے جی بن گئے ہو۔ پتا نہیں، کیوں تمہیں دیکھتی ہوں تو سیف کی یاد آتی ہے۔''

میرے دل پر تیر سا لگا۔ میں نے دل میں سوچا۔ سیف کے قاتل کو دیکھ کر سیف کی یاد نہ آئے گی تو کیا ہوگا۔

شفقت بی بی نے کہا۔ ”پتر! کسی دن اپنے بال بچوں کو لا یہاں۔ ان سے بھی ملیں۔“

میں نے جواب دیا۔ ”ماں جی! آپ کو بتایا ہے ناں کہ بھائیوں میں جھگڑا ہے۔ میں گھر گیا تو پھر کوئی نہ کوئی مسئلہ کھڑا ہو جائے گا۔ ابھی دو چار مہینے دور رہ کر ہی گزارنا چاہتا ہوں۔“

وہ صلح صفائی اور پیار محبت پر زور دینے لگیں۔ پھر سیف کو یاد کرنے لگیں اور اس کی باتیں سنانے لگیں۔ ان کی آواز بوجھل ہونے لگی۔ شازیہ نے بڑی صفائی سے موضوع بدل دیا۔

گاڑی نیم پختہ راستوں پر دھول اڑاتی چلتی رہی۔ جلد ہی ہمیں مہرا پور گاؤں کے آثار نظر آنے لگے۔ یہی شازیہ کے محبوب اکبر کا گاؤں بھی تھا۔ گاؤں سے باہر ہی پکی سڑک کے کنارے وہ چھوٹا سا پختہ کارخانہ نظر آرہا تھا جہاں اکبر نے کولڈ ڈرنک بنانے کا کام شروع کیا تھا۔

میں نے عقب نما آئینے میں دیکھا۔ شازیہ اپنے اڑتے بالوں کو سنبھال رہی تھی اور تعریفی نظروں سے اس کارخانے کو بھی دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر آس امید کی روشنی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس سلسلے میں، میں نے اکبر کی مدد کی ہے۔ شفقت بی بی گاڑی کی کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے بولیں۔ ”یہ شاید کسی نے چھوٹی سی فیکٹری بنائی ہے۔“

”ہاں ماں جی، بوتلیں وغیرہ بنانے کا کارخانہ ہے۔ لگتا ہے کہ کسی پڑھے لکھے لڑکے نے کاشت کاری کرنے کے بجائے نئی لائن شروع کی ہے۔“ میں نے کہا۔

”چلو اللہ اسے کامیاب کرے۔ رب سوہنا ہر ماں کا کلیجہ ٹھنڈا رکھے۔ کسی کو اولاد کا دکھ اور پریشانی نہ دکھائے۔“ ان کی آواز پھر بھرانا شروع ہوگئی۔

شازیہ نے کہا۔ ”امی جی! تھوڑا سا جوس پی لیں۔“

وہ انہیں جوس پلانے لگی۔ ان کی حالت بہت اچھی نہیں تو بری بھی نہیں تھی۔ انہیں باتیں کرتے اور چلتے پھرتے دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی۔

گاؤں سے ہم سہ پہر کے وقت واپس سکھیرا روانہ ہو گئے۔ راستے میں شازیہ کی چھوٹی بہن کا فون آگیا۔ وہ گھر سے بول رہی تھی۔ دونوں بہنوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سے پتا چلا کہ چھوٹی بہن شازیہ کو کسی خوش خبری کا بتا رہی ہے اور یہ خوش خبری وہی تھی جس کا انتظام میں نے سجاول سے مل کر چند دن پہلے کیا تھا۔ خستہ حال چوہدری بشیر کا قرضہ بڑی خاموشی

سے ادا ہو گیا تھا۔ سجاول کے ساتھی یونس نے اسٹامپ پیپر پر اقرار نامہ وغیرہ لکھوا کر چوہدری بشیر کو ارسال کر دیا تھا۔ اب یہ اقرار نامہ ہی تھا جس نے اس گھر میں خوشی کی لہر دوڑائی تھی۔

شازیہ نے فون پر لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''لیکن...... کتنی عجیب بات ہے۔ ابا جی کو بھی پتا نہیں کہ ٹھیکیدار کو رقم واپس دینے والا کون ہے؟''

جواب میں چھوٹی بہن نازو کی باریک آواز فون کے اسپیکر سے نکل کر سنائی دی۔ ''لگتا ہے کہ ابا جی کا کوئی پرانا جاننے والا ہے۔ شاید ابا جی نے کبھی کوئی احسان کیا ہے اس پر جس کا اس نے بدلہ اتارا ہے۔ اصل بات تو ابا جی کو ہی پتا ہو گی۔''

شفقت بی بی نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''شازیہ! کیا بات کر رہی ہو۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا؟''

وہ ماں سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''امی جی! گھر جا کر بتاتی ہوں۔ اچھی خبر ہی ہے۔''

میں لاتعلق بیٹھا، ڈرائیو کرتا رہا۔ ہم گاؤں میں داخل ہونے والے تھے۔ شازیہ بدستور جذباتی لہجے میں چھوٹی بہن سے باتیں کر رہی تھی۔

اس گھرانے کو خوش دیکھ کر میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا تھا اور یہی میرا مقصد تھا۔ رات تک سب کچھ ٹھیک تھا مگر صبح شفقت بی بی کے بارے میں پتا چلا کہ وہ چل بسی ہیں۔

ہاشو کی بہن انوری نے مجھے جھنجھوڑ کر یہ خبر سنائی۔ میں کتنی ہی دیر سکتہ زدہ رہا۔ دنیا میں ہر آنے والے انسان کو ایک دن تو جانا ہی ہوتا ہے مگر کچھ موتیں دل و دماغ کو متاثر کرتی ہیں۔

''کیا ہوا ان کو؟'' میں نے انوری سے پوچھا۔

وہ اشکبار لہجے میں بولی۔ ''شازیہ نے صبح اٹھ کر ساتھ والے بستر پر دیکھا تو وہ نہیں تھیں۔ وہ اللہ بخشے سیف والے کمرے میں تھیں۔ سیف کی چیزیں صندوق سے نکال نکال کر اپنے پاس رکھی ہوئی تھیں۔ اس کی ایک چادر پر لیٹی تھیں اور گزر چکی تھیں۔''

''او گاڈ'' میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

گھر میں رونا دھونا مچا ہوا تھا۔ لوگ امڈے آ رہے تھے۔ حاکم علی نے رقت زدہ آواز میں کہا۔ ''بڑی نیک بی بی تھیں۔ بس پتر کا دکھ کھا گیا ان کو۔ اللہ ماں پتر دونوں کی بخشش کرے۔''

ہاشو نے کچھ مزید تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ''بچیوں نے انہیں سیف والے کمرے میں جانے سے منع کیا ہوا تھا، پر رات کو وہ پتا نہیں کیسے تالا کھول کر چلی گئیں۔ میں نے خود دیکھا ہے۔ پورے کمرے میں سیف صاحب کی چیزیں پڑی تھیں۔ ان کے کپڑے، ان کا ریڈیو،

گھڑی، ان کے کبڈی والے کپ...... اور پتا نہیں کیا کچھ۔ سیف کی کالی چادر کے اوپر ہی لیٹی ہوئی تھیں، قبلے کی طرف منہ کر کے، جیسے پتر سے ملنے جا رہی ہوں۔"

میرے سینے سے ہوک اٹھی اور سیف کا مسکراتا چہرہ ایک بار پھر نگاہوں میں گھوم گیا۔ وہ رنگ رنگیلا پنجابی گبرو جس کے انگ انگ میں زندگی لشکارے مارتی تھی...... وہ جوش اور جذباتیت کا شکار ہو کر ایک انہونی کے تعاقب میں چل نکلا اور آخر ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں سے واپس آنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ وہ دن قیامت صغریٰ کی مثال ہی تھا جب سمندر کے کنارے نیم بے ہوش سیف نے میری طرف دیکھا تھا اور کہا تھا......"آپ مجھ سے ناراض تو نہیں؟"

اس وقت میرا دل میرے سینے میں پھٹ کر سو ٹکڑے ہو گیا تھا۔ میں اسے کیسے بتاتا کہ میں ناراض نہیں ہوں...... لیکن ہم دونوں موت کے راہی بن چکے ہیں اور میں اسے بے پناہ اذیت سے چھٹکارا دلانے کے لیے زہر دینے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ اب وہ کبھی اپنے گھر کی طرف اور اپنی منتظر ماں کی طرف نہیں لوٹ سکے گا۔

میں نے یورپ میں جو ہنگامہ خیز زندگی گزاری تھی، اس میں درجنوں سنگین ترین مرحلے آئے تھے۔ کئی لوگوں نے مجھے مارنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ نتیجے میں کئی لوگوں کو میں نے بھی موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ ان سب کے چہرے اور نام بھی مجھے یاد نہیں تھے مگر سیف کی موت نے مجھے بنیادوں سے ہلایا تھا اور سینے پر اس کی جدائی کا گھاؤ بہت گہرا تھا۔

گلی میں شامیانے لگا دیئے گئے تھے۔ عورتیں ٹولیوں کی شکل میں آتی تھیں اور چوہدری بشیر کے گھر میں داخل ہو جاتی تھیں۔ مردوں میں سے زیادہ تر باہر بچھی دریوں پر بیٹھ جاتے تھے۔ کچھ چوہدری بشیر کے گلے لگ کر روتے تھے یا افسوس کا اظہار کرتے تھے۔ میں نے چند عورتوں میں لپٹی لپٹائی تاجور کو بھی دیکھا۔ سیاہ اوڑھنی کے نقاب میں سے فقط اس کی اشکبار آنکھیں ہی نظر آتی تھیں۔ اس کی نگاہ ایک لمحے کے لیے مجھ سے ملی پھر وہ عورتوں کے ہجوم میں گم ہو گئی۔

میں ان کا چہرہ دیکھنا چاہتا تھا۔ چوہدری بشیر سے پوچھا تو انکار نہیں ہوا۔ چند رشتہ دار لڑکے اندر گئے تو میں بھی چلا گیا۔ شفقت بی بی اپنے اجلے چہرے کے ساتھ مطمئن لیٹی تھیں۔ آنکھوں میں ہلکی سی درز تھی۔ جیسے مرتے مرتے بھی اپنے بچے کو دیکھنا چاہتی ہوں۔

میں سوچنے لگا...... ماں اور بچے کی محبت کیا ہوتی ہے۔ بچہ پچاس ساٹھ یا ستر برس کا بھی ہو جائے تو ماں کے لیے بچہ ہی ہوتا ہے۔ وہ اس کی چھوٹی سی تکلیف پر تڑپ جاتی ہے۔

یہ مائیں کیوں ہوتی ہیں ایسی؟ قدرت نے اتنا درد، اتنا گداز کیوں چھپایا ہوتا ہے ان کے سینوں میں؟ کیوں جوان اولاد کی موت کے بعد وہ خود بھی زندگی کو بوجھ سمجھنے لگتی ہیں۔

شام کو بہت سے دوسرے لوگوں کے ساتھ میں بھی شفقت بی بی کے جنازے میں شریک تھا۔ غیر ہونے کے باوجود میں نے ایک قریبی عزیز کی طرح ان کی چارپائی کو کندھا بھی دیا۔ وہ آسودہ خاک ہو گئیں۔ زندگی کے سارے جھنجھٹوں سے ان کی جان چھوٹ گئی۔

رات کو ڈیرے پر دیر تک ان کی باتیں ہوتی رہیں۔ ہاشو اس کی بیوی رخشندہ، انوری، حاکم علی سب موجود تھے۔

انوری نے سوگوار لہجے میں کہا۔ ''شازیہ بتا رہی تھی۔ پرسوں سے بڑی بے چین تھیں وہ۔ کہتی تھیں میں نے اپنے سیف کی ڈھیری (قبر) دیکھنی ہے۔ چوہدری جی نے اور لڑکیوں نے بڑی مشکل سے انہیں سمجھایا کہ اس کی قبر بہت دور ہے۔ ہم وہاں نہیں پہنچ سکتے۔''

رخشندہ بولی۔ ''ہاں یہی بات ایک دن مجھ سے بھی کہہ رہی تھیں۔ بڑبڑا رہی تھیں۔ میرے سیفی کو کہاں چھوڑ آئے ہیں، کیا پتا وہ ابھی زندہ ہی ہو۔ کہیں پھنسا ہوا ہو۔ مجھے اس کی قبر بھی تو نہیں دکھاتے۔ جب تک قبر نہ دیکھ لوں گی مجھے چین نہیں آئے گا۔''

انوری نے کہا۔ ''پرسوں سے کہہ رہی تھیں۔ وہ اکیلا ہے۔ وہ مجھے بلاتا ہے۔ آوازیں دیتا ہے، مجھے اس کے پاس جانا ہے۔ میں اسے اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔''

باتیں ہوتی رہیں لیکن میں اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا اور کمبل سر تک تان کر لیٹ گیا۔ عجیب سے دکھ آمیز پچھتاوے دل دماغ کو گھیر رہے تھے۔ میں نے کیوں زہر دیا اسے؟ کیوں تھوڑی دیر اور انتظار نہ کر لیا۔ شاید اس کے بچنے کی کوئی سبیل نکل آتی؟

مگر پھر دل کے اندر سے ہی آواز آئی کہ اس کا بچنا محال تھا۔ اس وقت جاما جی کا قصائی لونگ اور اس کے ماتحت وحشی ہو رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ کیپٹن تبارک کے بعد سیف بھی تشدد سے مر گیا تو کوئی بات نہیں۔ میں ابھی باقی تھا اور میں ان کے لیے ترپ کا پتا تھا۔ میں اگر ناقابلِ بیان تشدد کے باوجود زندہ رہا تو اس کی یہی وجہ تھی کہ میری شکل میں ان کے پاس آخری سراغ تھا۔ انہوں نے ٹمپریچر سیل میں مجھے زندگی اور موت کے درمیان تو لٹکائے رکھا مگر مارا نہیں۔

○......❖......○

تیسرے چوتھے روز کی بات ہے، سجاول کی دبے دبے جوش والی آواز میرے موبائل پر گونجی۔ ''اوئے شاہی، یہ کیا چیز پال رکھی ہے تُو نے۔ مجھے تو تیرا یہ نکو شہزادہ کسی جن کا بچہ لگتا

ہے......اور بچہ بھی ایسا جو حمل کے ساتویں مہینے میں ہی پیدا ہو جاتا ہے۔ قربان جاؤں اس کی پھرتیوں کے۔''

میں نے کہا۔ ''یہ نو مہینے والا حمل پتا نہیں جنوں میں ہوتا بھی ہے یا نہیں، خیر چھوڑو ان الٹی مثالوں کو۔ تم بات بتاؤ۔''

''اس نے ایک ہی ہفتے میں تمہارے کام کی ایک دو چیزیں ڈھونڈ لی ہیں......ایک ویڈیو ہے......دو تین کاغذ ہیں......دو چار تصویریں بھی ہیں شاید تمہارے کام آ جائیں۔''

''ویڈیو کیا ہے؟''

''میرا خیال ہے کہ تمہیں خود یہاں آنا پڑے گا۔ خورسنہ بھی تم سے ملنا چاہ رہی ہے۔ اس نے پاکستانی کھانا بنانا سیکھا ہے اور تمہیں اپنے ہاتھ سے پکا کر کھلانا چاہتی ہے۔''

''یہاں میری ڈیوٹی سخت ہے......لیکن چلو......کوئی وقت نکالتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

اسی روز میں نے چوہدری بشیر سے ایک روز کی چھٹی مانگی اور اس قصبے کی طرف روانہ ہو گیا جہاں ماضی قریب کا بے رحم ڈکیت ایک حسینہ کی زلفِ گرہ گیر کا شکار ہو کر ایک نئے روپ میں ایک نئے انداز کے شب و روز گزار رہا تھا۔ میرا اپنا بھی دل چاہ رہا تھا کہ ان دونوں سے ملوں اور دیکھوں کہ وہ مجھے کس حد تک پہچان پاتے ہیں۔ ہاشو کے پاس ایک موٹر سائیکل تھی جو اس کی ''پیاری بیوی'' کے بھائیوں نے اسے گفٹ کر رکھی تھی۔ ہاشو سے موٹر سائیکل ادھار لے کر میں سکھیرا سے روانہ ہوا اور قصبے میں پہنچ گیا۔ اس سفر میں مجھے آدھ گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔

میں شلوار قمیص میں تھا۔ گرد و غبار سے بچنے کے لیے سر پر ڈبے دار صافہ بھی باندھ رکھا تھا۔ ایک ہلکی سی شال، شانوں پر تھی۔ یہ صبح ساڑھے آٹھ نو بجے کا وقت تھا۔ سجاول کے بتائے ہوئے ایڈریس پر پہنچنے میں مجھے زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ میں مقررہ وقت سے قریباً ڈیڑھ گھنٹہ پہلے ہی سجاول کے دولت خانے پر پہنچ گیا تھا لیکن ابھی گھر کے اندر جانا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے گھر سے کچھ فاصلے پر موٹر سائیکل بڑے اسٹینڈ پر کھڑی کی اور اس پر بیٹھ گیا۔ یہ قصبے کی ایک بارونق جگہ تھی۔ دائیں طرف رہائشی مکانات تھے، بائیں جانب ایک بازار تھا۔ کہیں پاس ہی کسی چائے خانے سے ناشتے کی خوشبو آ رہی تھی۔

مجھے پتا تھا کہ ابھی کچھ دیر میں سجاول گھر سے باہر نکلے گا۔ وہ ناشتا بازار سے ہی لیتا تھا۔ مجھے موٹر سائیکل پر بیٹھے پندرہ بیس منٹ ہی ہوئے تھے کہ لحیم شحیم سجاول، پینٹ شرٹ اور سویٹر

میں ملبوس باہر نکلا۔ اس نے چپل پہن رکھی تھی۔ وہ میرے قریب سے گزر کر ایک حلوہ پوری والے کے پاس چلا گیا اور بھاری بھرکم ناشتا شاپر میں ڈلوایا۔ واپس گھر کی طرف آتے ہوئے وہ ذرا ٹھٹک کر ایک ریڑھی کے پاس رک گیا۔ ریڑھی پر پیاز اور لہسن وغیرہ کا ڈھیر تھا۔ ''آؤ پہلوان جی۔'' ریڑھی والے نے ہاتھ اٹھا کر سجاول کو سلام کیا۔

سجاول پیاز چھانٹ چھانٹ کر شاپر میں ڈالنے لگا۔ میرا دل مسکرانے کو چاہ رہا تھا۔ کل کا نامور مجرم اور خطرناک ڈکیت جس کی دہشت سے لوگوں کے پسینے چھوٹ جاتے تھے، آج گھر گرہستی کے لیے ایک ریڑھی سے پیاز اور لہسن خرید کر رہا تھا۔ پیاز اور لہسن تلوا کر سجاول نے اپنی جہازی سائز کی پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور سبزی فروش کو ادائیگی کی۔ نوٹ ذرا بڑا تھا۔ سبزی فروش نوٹ تڑوانے کے لیے پاس والے جنرل اسٹور کی طرف گیا۔ اب سجاول اکیلا ریڑھی کے پاس کھڑا تھا۔ میرا موڈ ذرا شرارتی ہو گیا۔ میں نے ریڑھی پر جا کر کہا۔ ''ہاں بھئی...... کیا بھاؤ دے رہے ہو یہ سڑے ہوئے پیاز؟''

سجاول نے ایک اچٹتی سی نظر مجھ پر ڈالی۔ چہرہ سرخ ہو گیا۔ ''ریڑھی والا اُدھر گیا ہے۔'' اس نے جنرل اسٹور کی طرف اشارہ کر کے بھنائی ہوئی آواز میں کہا۔

''اوہ پتا نہیں چلا...... ویسے شکل تو تمہاری بھی......'' میں کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

اس مرتبہ سجاول نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے قہرناک انداز میں مجھے دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے لگا کہ وہ اپنے طوفانی مکے سے میرے جبڑے کو چکنا چور کر دے گا لیکن پھر اس نے صبر کا بڑا سا گھونٹ بھرا۔ اس دوران میں ریڑھی والا بھی آ گیا تھا۔ ''لو پہلوان جی۔'' اس نے سجاول سیالکوٹی کو بقایا تھمایا۔

سجاول نے باقاعدہ اپنا غصہ زمین پر تھوکا اور دونوں شاپرز لے کر گھر کی طرف چل پڑا۔ ہاں یہ وہی سیالکوٹی تھا جو نگاہوں نگاہوں میں بندے کا خون پی جاتا تھا۔ ایک دلکش عورت کی محبت نے اور محبت کی گہرائی نے اسے کس قدر بدل ڈالا تھا۔ ریڑھی سے آٹھ دس قدم دور جا کر اس نے مڑ کر مجھے دیکھا...... وہ رک سا گیا تھا۔ میں دھیمے قدموں سے اس کی طرف بڑھا اور عین سامنے پہنچ کر بولا۔ ''جو مجھے اس طرح گھورتے ہیں، میں ان کے ڈیلے نکال لیا کرتا ہوں۔''

سجاول کے چہرے کا رنگ پہلے پھیکا ہوا...... پھر سرخ ہوا۔ وہ بڑی توجہ سے مجھے دیکھتا جا رہا تھا۔ تب اس کی آنکھوں میں ایک مختلف چمک نمودار ہونا شروع ہوئی۔ اس کے چہرے پر حیرت کی یلغار سی ہونے لگی۔ وہ مجھے پہچاننے کے عمل سے گزر رہا تھا۔ ہاں آنکھوں

کی ایک اپنی ساخت اور شناخت ہوتی ہے۔ وہ میری آنکھوں میں ہی دیکھ رہا تھا۔

پھر اس نے اپنے شاپرز ایک طرف چبوترے پر رکھ دیئے اور میری طرف اپنی انگلی اٹھائی۔ ''تم......تم......'' وہ لرزاں آواز میں اتنا ہی کہہ سکا۔

''ہاں...... میں شاہ زیب ہی ہوں سیالکوٹی صاحب۔'' میں نے اصل آواز میں کہا۔

ہم ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے۔ ''تم نے تو واقعی کھوپڑا گھما دیا۔'' وہ بولا۔

میں گھر میں خورسنہ کی بھی ایسی ہی آزمائش کرنا چاہتا تھا مگر وہ پہلے ہی جان گئی۔ جب میں اور سجاول بغل گیر ہوئے وہ تیس چالیس میٹر دور اپنے گھر کی ادھ کھلی کھڑکی سے ہمیں دیکھ چکی تھی۔

وہ بڑی گرمجوشی لیکن مؤدبانہ انداز میں مجھ سے ملی۔ اس نے حسبِ سابق میری چادر کے پلو کو بوسہ دیا اور دو قدم پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔

''ایسا نہ کیا کرو خورسنہ، مجھے شرمندگی ہوتی ہے۔'' میں نے کہا۔

''لیکن مجھے یہ اچھا لگتا ہے جی۔ آپ ہمارے لیے ہیرو ہو، آپ کی تصویر ہمارے شہر کی دیواروں پر ہی نہیں ہمارے دلوں پر بھی لگی ہے۔''

''اس کا بس چلے تو تمہارا کوئی بت وغیرہ بنا کر یہاں رکھ لے۔'' سجاول نے پاٹ دار آواز میں کہا۔

''دیکھو خورسنہ، تمہارے اصل ہیرو کو تکلیف ہوئی ہے۔''

اس نے پیار سے سجاول کی طرف دیکھا اور غیر ملکی لہجے کی اردو میں بولی۔ ''یہ میری زندگی اور میرے دل کے ہیرو ہیں۔ آپ ہمارے جاماجی کے ہیرو ہیں اور ان سپنوں کے ہیرو ہیں جو ہم جاماجی والے دیکھتے ہیں۔''

''تھینک یو۔'' میں نے کہا پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر پوچھا۔ ''ذیشان کہاں ہے؟''

''ابھی سو رہا ہے۔'' سجاول نے کہا۔ ''یہ خورسنہ اپنے ساتھ کافی سارا جاماجی بھی پاکستان لے آئی ہے۔ کئی چھوٹی رسمیں ہیں۔ یہ کہتی ہے کہ اگر مرد بدھ کے روز رات کو دیر تک جاگے اور صبح کو دیر تک سوئے تو اس کی یادداشت بہت اچھی ہو جاتی ہے۔''

وہ کھلکھلا کر ہنسی اور بولی۔ ''اور یہ سجاول میری بات نہیں مانتے، اس لیے ان کی یادداشت بالکل اچھی نہیں ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

''آج بدھ نہیں ہے۔ ذیشان ویسے ہی دیر تک سو رہا ہے۔''

اس مرتبہ خورسنہ کے ساتھ میں بھی ہنس دیا۔ میں نے اس طویل عرصے میں پہلی بار سجاول کے چہرے پر بھی غیر محسوس سی مسکان دیکھی۔

میری مہمان نوازی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی گئی۔ یہ سجاول کی بے پناہ محبت ہی تھی کہ اس تھوڑے سے عرصے میں خورسنہ بڑا اچھا مقامی پلاؤ اور قورما وغیرہ بنانا سیکھ گئی تھی۔ وہ پہلے سے کچھ اور بھی نکھر گئی تھی۔ جاما جی جزیرے کا ایک خوشنما پودا یہاں لالہ موسیٰ کی زمین پر لہلہا رہا تھا۔ خوبروذیشان سے بھی دلچسپ ملاقات رہی۔

میں یہاں جس مقصد کے لیے آیا تھا، وہ میری توقع کے عین مطابق پورا ہوا بلکہ شاید توقع سے تھوڑا بڑھ کر۔ بند کمرے میں سجاول نے مجھے وہ ثبوت دکھائے جو اسے انیق نے دارابی دارج کے خلاف مہیا کیے تھے۔ سب سے پہلے ایک اچھے موبائل فون پر بنائی جانے والی ایک ویڈیو تھی۔ یہ لاہور ہی کا کوئی فارم ہاؤس تھا۔ جہاں ناؤ نوش کی ایک نجی تقریب برپا تھی۔ پتا نہیں کہ انیق یہاں کیونکر اور کیسے داخل ہوا۔ ویڈیو کلپ میں گھریلو خواتین رقص کر رہی تھیں۔ مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین میں سے بھی کچھ ڈرنک فرما رہی تھیں۔ دارج صاف طور پر دھت نظر آتا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں گلاس دوسرے میں سگریٹ تھا۔ ساتھ ساتھ وہ اپنے بیش قیمت سیل فون سے چھیڑ خانی کر رہا تھا۔ تب نہایت بے ہودہ لباس میں ایک لڑکی جو غالباً کوئی ماڈل گرل تھی، اس کے پاس آ کر مسکرائی۔ وہ اٹھ کر اس کے ساتھ رقص کرنے لگا اور ساتھ ساتھ سیل فون پر کسی سے بات بھی کرنے لگا۔

یہ اس دارج دارابی کا اصل چہرہ تھا جو عوامی تقریبات میں شرافت کا پتلا نظر آتا تھا اور پیروں فقیروں کے مزارات پر حاضریاں دے کر اپنا شریفانہ تشخص ابھارتا تھا۔

انیق کے فراہم کردہ مواد میں چند تصویریں بھی تھیں اور یہ بھی دارج کی آزاد طبع اور رنگین مزاجی کو ظاہر کرتی تھیں۔ سب سے اہم چیز وہ چند کاغذات تھے جو انیق نے نہ جانے کیسے حاصل کیے تھے۔ ان میں تین چار میڈیکل رپورٹس تھیں اس کے علاوہ ایک پرانی ایف آئی آر کی کاپی تھی۔ ان کاغذات سے پتا چلتا تھا کہ تین ساڑھے تین سال قبل دارج نے اپنے گھر کی ہی دو جوان ملازماؤں سے ناجائز تعلقات رکھے تھے یہ دونوں آپس میں سگی بہنیں تھیں۔ یکے بعد دیگرے دونوں ہی حاملہ ہوئی تھیں اور پھر لاہور ہی کے ایک اسپتال میں ان کا ابارشن ہوا تھا۔ اس حوالے سے لڑکیوں کا دادا کسی طرح دارج کے خلاف ایف آئی آر درج کرانے میں کامیاب ہو گیا تھا مگر بعد میں اس سارے معاملے کو ہی دبا دیا گیا تھا۔

○.....❖.....○

میں سکھیرا میں اپنے ٹھکانے پر واپس آ چکا تھا۔ کچھ ایسی اطلاع بھی مل رہی تھی کہ دارج دارائی سے تاجور کا نکاح چند دن کے لیے ٹل گیا ہے۔ شاید اس کی وجہ شفقت بی بی کی فوتید گی بھی تھی۔ باہمت انیق کے ذریعے سجاول نے جو اہم مواد حاصل کیا تھا، وہ بھی اپنے ٹھکانے پر پہنچ چکا تھا۔ اس مواد کی مکمل نقل میرے پاس موجود تھی اور اصل مواد سجاول کے کارندے یونس کے ذریعے لاہور پہنچ گیا تھا۔ یہ مواد اب تاجور کے بڑے ماموں مولوی حبیب اللہ کے پاس تھا جو باقاعدہ ایک عالم دین اور پیش امام تھے۔

مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ مولوی جی پہلے ہی اس بات کے خلاف ہیں کہ تاجور کا رشتہ اتنے بڑے خاندان میں اور ایسے دبنگ لوگوں سے کیا جائے، ان کو یقین تھا کہ یہ بے جوڑ رشتہ مستقبل میں بے انتہا خرابیوں اور پریشانیوں کا سبب بنے گا۔ اب یہ مواد ملنے کے بعد ان کی اور ان کے ہمنواؤں کی آواز میں مزید طاقت آسکتی تھی۔

یہ تیسرے روز کی بات ہے۔ میں لوڈر پر سبزی منڈی سے واپس آیا تو ہاشو کی بہن انوری نے مجھے ایک بریکنگ نیوز سنائی۔ اس نے کہا۔ ''وقاص! کچھ پتا چلا تمہیں، رات کو چوہدری دین محمد کے گھر کیا ہوا؟''

''کیا ہوا؟''

''بڑا سخت جھگڑا ہوا۔ دین محمد اپنی دھی کا رشتہ لاہور کے وڈے لوگوں میں کر رہا ہے پر کڑی کے ماموں اور نانی وغیرہ اس کے سخت خلاف ہیں۔ تمہیں پتا ہی ہوگا شاید، تاجور کے وڈے ماما جی لاہور کی ایک وڈی مسجد میں پیش امام ہیں اور ایک مانے ہوئے عالم بھی ہیں۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

انوری بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''کل رات مولوی جی اور دو تین اور لوگ گاؤں آئے تھے۔ انہوں نے چوہدری دین محمد کو ایک بار پھر ان کے ارادوں سے باز رکھنے کی کوشش کی ہے مگر دین محمد اپنی بات پر اڑا ہوا ہے۔ لوہے کا بن گیا ہے۔ کہتا ہے کہ سارا پاکستان بھی خلاف ہو جائے مگر تاجور کا رشتہ وہیں پر ہوگا۔''

''تاجور کی ماں کس طرف کی بات کرتی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ بھی اس رشتے کے سخت خلاف ہے مگر اس وچاری کی پیش کہاں چلتی ہے۔ سنا ہے کل رات والے جھگڑے میں تو اسے دین محمد نے ایک دو چپیڑیں بھی ماری ہیں۔ اس کے بعد بات اور بڑھ گئی۔ مولوی صاحب نے کہا ہے کہ وہ خاندان کے سارے وڈوں کا اکٹھ کریں گے اور پھر بھی بات نہ بنی تو پنچایت بلائیں گے۔''

بات میری سمجھ میں آرہی تھی، جو ثبوت مولوی حبیب صاحب کے پاس پہنچے تھے یقیناً انہوں نے اپنا اثر دکھایا تھا۔

انوری بالکل ٹھیک کہہ رہی تھی۔ مجھے دوسرے ذریعوں سے بھی پتا چلا کہ مولوی جی واپس لاہور نہیں گئے۔ یہیں پر ٹھہرے ہوئے ہیں۔ اب وہ اس بات کو کسی کنارے پر ہی لگا کر جائیں گے۔ اگلے روز میں نے ان کی ایک جھلک بھی دیکھی۔ وہ مسجد سے باہر تشریف لا رہے تھے۔ جسم تھوڑا سا فربہ تھا مگر بلند قامت کی وجہ سے محسوس نہیں ہوتا تھا۔ ڈاڑھی میں زیادہ تر بال سفید تھے۔ وہ ساٹھ کے پیٹے میں تھے اور بارعب نظر آتے تھے۔

اسی روز رات کو چوہدری دین محمد کے گھر میں خاندان کے کئی لوگ اکٹھے ہوئے۔ (یہ بات اب ہرگز راز نہیں رہی تھی کہ چاند گڑھی کا چوہدری دین محمد خاموشی سے یہاں سکھیرا آکر آباد ہو گیا ہے اور دین محمد کو اب یہ راز کھلنے کی زیادہ پریشانی بھی نہیں تھی۔ دارابی خاندان اس کی ''بیک'' پر آچکا تھا۔ عالمگیر اور پیر ولایت جیسے چھوٹے دشمن اب اس کا کیا بگاڑ سکتے تھے) گھر میں ہونے والی بات چیت کا نتیجہ ایک بار پھر جھگڑے کی صورت میں ہی نکلا۔ میں نے ہاشو سے ٹوہ لی تو اس نے بتایا۔ ''چن جی! وہاں لمبا ہی بکھیڑا پڑا ہوا ہے۔ پتا چلا ہے کہ مولوی حبیب جی نے دین محمد صاحب کے ہونے والے داماد کے بارے میں کچھ خاص باتیں ''اکٹھ'' میں بتائی ہیں۔''

''کس طرح کی باتیں؟'' میں نے انجان بن کر پوچھا۔

''یار! وہی باتیں جو ان وڈے لوگوں کی ہوتی ہیں بلکہ یہ تو بہت ہی وڈے لوگ ہیں۔ ان کی باتیں بھی بہت وڈی ہیں۔ عیش عشرت، عیاشی اور تھڈے بازیاں، مجھے تو لگتا ہے کہ مولوی جی اپنے آپ کو کسی وڈی مصیبت میں ڈال لیں گے، ان کو اس طرح ان دارابیوں کے خلاف نہیں بولنا چاہیے۔''

''اب نتیجہ کیا نکلا ہے؟''

''ابھی تو گل بات چل رہی ہے۔ مولوی جی اور ان کے حمایتی جو بات کر رہے ہیں، وہ ہے تو سولہ آنے ٹھیک مگر ان کی ہاں میں ہاں ملانے کے لیے بھی جگرا چاہیے۔''

ہاشو جو...... مولوی جی کو خطرے والی بات کہہ رہا تھا، اس میں بہت وزن تھا اور اس کا ثبوت تیسرے چوتھے روز ہی مل گیا۔

ناکام کوششوں کے بعد مولوی حبیب صاحب اور ان کے گھر والے لاہور واپس جا چکے تھے۔ چوہدری دین محمد کے گھر میں عجیب سا سناٹا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ گھر نہ ہو کوئی جیل ہو۔

مقامی پولیس کے اہلکار اپنے ایس ایچ او سمیت گھر کے اردگرد چوکس کھڑے رہتے تھے۔ اضافی احتیاط کے طور پر پرائیویٹ گارڈز بھی موجود تھے۔ کسی کو تلاشی اور پوچھ گچھ کے بغیر اس گلی میں ہی جانے نہیں دیا جاتا تھا۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا۔ ابھی ابھی لوڈر پر بیس کلو میٹر کا فاصلہ طے کر کے آیا تھا۔ کبھی کبھی چہرے کے مرمت شدہ حصوں میں ہلکی سی اینٹھن محسوس ہوتی تھی۔ شاید اس کی وجہ بدلتا ہوا موسم تھا۔ میں ایسے میں کرنل احرار کی تجویز کردہ کریم یا لوشن چہرے پر اپلائی کرتا تھا، میں آج کل مسلسل آواز بدل کر بول رہا تھا۔ اس کی وجہ سے کسی وقت گلے میں ہلکی سی خراش بھی محسوس ہوتی تھی۔ اب بھی کچھ ایسی ہی کیفیت تھی۔ میں ان دونوں مسئلوں کا حل سوچ رہا تھا جب دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو ہاشو تیزی سے اندر آگیا۔ اس کے ہاتھ میں اخبار تھا۔ بولا۔ ''چن جی، تمہیں کہا تھا ناں کہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہوگی۔ یہ دیکھو، مولوی جی کی تصویر چھپی ہے اور ساتھ ہی یہ جھوٹم جھوٹ بھی لکھا ہوا ہے۔''

میں نے خبر پڑھی اور خون کھول گیا۔ خبر کچھ اس طرح تھی۔ ''معروف عالم اور نیو سوسائٹی مسجد کے پیش امام مولانا حبیب صاحب پر چندے کی رقوم میں خرد برد کے الزام نے پھر سر اٹھا لیا۔ مسجد کمیٹی کے ایک اہم رکن نے مولانا کے خلاف باقاعدہ ایف آئی آر درج کرا دی۔''

خبر کی تفصیل میں درج تھا...... یاد رہے کہ دو سال پہلے بھی اس طرح کی خبریں گردش کی تھی اور مولانا نے مسجد کی کمیٹی اور دیگر امور سے کنارہ کش ہونے کا اعلان کر دیا تھا مگر پھر کمیٹی کے مخالف ارکان کوئی بھی ثبوت فراہم کرنے میں ناکام رہے تھے اور مولانا کے عقیدت مندوں نے بصد اصرار انہیں دوبارہ فرائض کی انجام دہی پر مجبور کیا تھا۔

متن کے ایک حصے میں یہ بھی درج تھا کہ مولانا کی ضمانت قبل از گرفتاری ہو گئی ہے اور ان کے عقیدت مند نہایت غم و غصے میں ہیں۔

سینے میں چنگاریاں سی چھوٹنے لگیں۔ بااختیار اور طاقتور لوگوں کا یہی مکروہ چہرہ تھا جس نے وطن عزیز کے طول و عرض میں ہر جگہ مجھے اپنی جھلک دکھائی تھی۔ ہر کرپٹ شخص یہی کہتا دکھائی دیتا تھا، مجھے نہ چھیڑو...... میں تمہیں نہیں چھیڑوں گا۔ پتا نہیں کیوں میرا دل گواہی دینے لگا کہ مولوی جی کے ساتھ اس سے بھی برا سلوک ہونے والا ہے۔ انہوں نے ایک خونخوار درندے کی دم پر پاؤں رکھا تھا۔ وہ خاموش کیسے بیٹھ سکتا تھا۔ شاید مولوی جی سے غلطی ہی ہوئی تھی کہ انہوں نے بھانجی کی محبت میں اور حق سچ بات کہنے کی خواہش میں ایک بہت ہی طاقتور

شخص سے ٹکر لے لی تھی۔ میں نے سوچا کہ مجھے لاہور پہنچنا چاہیے۔ ان کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا اور وہ تاجور کے ماموں تھے۔

○......❖......○

یہ نیو سوسائٹی کی ایک کافی بڑی مسجد تھی اور بارونق علاقے میں تھی۔ مولوی حبیب اللہ قریباً پینتیس برس سے یہاں نہایت خوش اسلوبی اور وقار کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ یہاں پہنچ کر مجھے فوراً اندازہ ہو گیا کہ جب بااختیار لوگ اپنے نظر نہ آنے والے ہاتھوں کے ساتھ ڈوریاں ہلاتے ہیں تو حالات کس طرح بدلتے ہیں اور شریف ترین لوگ بھی کس طرح مجرم گردانے جاتے ہیں۔ چند ہی دنوں میں اس وسیع جامع مسجد کی کمیٹی اور اہلِ علاقہ دو دھڑوں میں بٹ گئے تھے۔ ایک دھڑا مولانا کو ہر صورت مشکلات میں مبتلا کرنا چاہتا تھا۔

پتا نہیں کیوں میرا دل چاہا کہ دو چار روز مولانا کے اردگرد ہی رہوں۔ میں نے بیوی کی بیماری کا عذر کر کے چوہدری بشیر سے تین چار دن کی رخصت لے لی تھی اور اپنی ایک دو ذمے داریاں ٹریکٹر ڈرائیور حاکم علی کو سونپ دی تھیں۔ (جس طرح وہ وقتِ رخصت مجھے سونپ جاتا تھا) مولوی جی کی رہائش گاہ مسجد کے ساتھ ہی واقع تھی۔ مجھے یہاں کے حالات کشیدہ نظر آتے تھے۔ مسجد کے سامنے ہی ایک بازار تھا۔ ایک اچھا اتفاق یہ ہوا کہ مجھے مسجد کے قریب ہی ایک چھوٹے سے ہوٹل میں کمرا کرائے پر مل گیا۔ یہ دوسری منزل کا کمرا تھا۔ ہوٹل کا مالک حاجی منیر بھی مولوی جی کے عقیدت مندوں میں شامل تھا۔ اس نے گفتگو کے دوران میں بتایا۔ ''لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ مولوی جی کے خلاف کہیں اوپر سے اشارے ہو رہے ہیں۔ ان کو ایک پرانے معاملے میں زبردستی گھسیٹنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔''

''سنا ہے کہ مولوی جی کی ضمانت بھی ہو چکی ہے۔''

''یہ کچی ضمانت ہے لیکن پکی بھی ہو تو بڑے لوگوں کے لیے کون سا کام مشکل ہوتا ہے۔ اب سنا ہے کہ ان کی کسی پرانی تقریر کا مسئلہ دوبارہ کھڑا کیا جا رہا ہے۔ اور ان پر ایک اور کیس کی تیاری ہو رہی ہے۔ اصل بات کا ہر ایک کو پتا ہے۔ داراب فیملی کا ایک اوباش امیرزادہ مولوی جی کے خاندان کی کسی لڑکی کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔''

یہ دوسری رات، دو ڈھائی بجے کا واقعہ ہے۔ میں ابھی تک جاگ رہا تھا۔ عجیب سی بے چینی تھی۔ رہ رہ کر تاجور اور اس کی مسکین صورت والدہ کا خیال آتا تھا۔ پتا نہیں کہ ان پر کیا گزر رہی ہوگی۔ اچانک میں نے مسجد کے سامنے سنسان سڑک پر پولیس کی ایک موبائل کو

رکتے دیکھا۔ انداز مشکوک سا تھا۔ کہیں آدھی رات کے بعد یہ لوگ مولوی جی کو گرفتار کرنے نہیں آ گئے تھے؟

ایسا ہو بھی سکتا تھا کیونکہ سارا دن تو مولوی جی کے پرستار اور عقیدت مند ان کے اردگرد رہتے تھے، رات کے اس پہر ان پر ہاتھ ڈالا جا سکتا تھا۔

میں کمرے کی کھڑکی میں سے صورتِ حال کا جائزہ لیتا رہا۔ کچھ دیر بعد میرا یہ اندازہ غلط ثابت ہو گیا۔ پولیس موبائل چلی گئی مگر پھر...... دس پندرہ منٹ کے بعد ہی ایک اسٹیشن ویگن خاموشی سے آئی اور تقریباً اسی جگہ کھڑی ہو گئی۔ میں یہ دیکھ کر چونکا کہ اس ویگن میں آگے سے پیچھے تک بندے ٹھسے ہوئے تھے پھر ویگن کے دروازے کھلے اور وہ جیسے افراد کو اگلنے لگی۔ ان سب افراد کے ہاتھوں میں مجھے ڈنڈے اور آہنی سلاخیں وغیرہ دکھائی دیں۔ یہ لوگ جیسے پہلے سے بنے ہوئے پلان کے تحت تیزی سے مولوی جی کی رہائش گاہ کی طرف لپکے۔ ان میں سے زیادہ تر نے اپنے چہرے پگڑیوں اور منڈاسوں وغیرہ میں چھپائے ہوئے تھے۔

میں نچلی منزل پر آیا اور سوئے پڑے حاجی منیر کو جھنجھوڑ کر جگایا۔ ''اٹھو...... اٹھو مولوی جی خطرے میں ہیں۔ کچھ لوگ ان کے گھر میں گھس رہے ہیں۔''

وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''تم دوسرے لوگوں کو جگاؤ اور پولیس کو فون کرو...... جلدی۔''

اس کے ساتھ ہی میں باہر کو دوڑا۔ میری لمبی قمیص کے نیچے بھرا ہوا ریوالور موجود تھا۔ میں نے تیزی سے سڑک پار کی اور مسجد کے پہلو میں مولوی جی کی رہائش پر پہنچا...... بلوائی بیرونی دروازہ توڑ کر اندر گھس چکے تھے۔ اب وہ ان سیڑھیوں پر کھڑے تھے جن کے آخر میں مولوی جی کے رہائشی پورشن کا آہنی دروازہ تھا۔ وہ للکار رہے تھے۔ ''دروازہ کھولو نہیں تو توڑ دیں گے...... باہر نکلو۔''

ایک شخص گرجا۔ ''اگر باہر نہیں نکلتا تو آگ لگا دو۔ اندر ہی جل جانے دو ان جہنمیوں کو۔''

''ہاں آگ لگا دو۔'' کئی آوازیں ابھریں۔ یقیناً وہ لوگ ہراساں کرنا چاہ رہے تھے۔ پھر دروازے پر زوردار ضربیں رسید کی جانے لگیں۔

اندر سے مولوی جی کے اہلِ خانہ کے چلانے اور رونے کی مدھم آوازیں آ رہی تھیں۔ میں لپک کر گیا اور بلوائیوں کی طرف منہ کر کے دروازے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ میں نے سب سے آگے والے افراد کو دھکے دیئے۔ ''دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ اگر کسی نے مولوی جی اور

ان کے گھر والوں کو ہاتھ بھی لگایا تو لاشیں گر جائیں گی۔''

میرے لب و لہجے نے چند لمحوں کے لیے مشتعل لوگوں کو ٹھٹکایا لیکن پھر وہ سنبھلے اور پھیلی ہوئی ڈاڑھی والا ایک لحیم شحیم شخص دھاڑا۔ ''اوئے پیچھے ہٹ جا......نہیں تو مارا جائے گا۔ آج ہم اس مکار کے ہاتھ پیر توڑے بغیر یہاں سے نہیں جائیں گے۔''

ایک دم دو افراد مجھ پر پل پڑے۔ وہ بے خبر تھے کہ ''مدِمقابل'' کو چوٹ لگانا ان کے بس کی بات نہیں ہے۔ میں نے لاٹھی کے ایک زوردار وار سے بچتے ہوئے حملہ آور کے سینے پر ٹانگ رسید کی اور وہ سیڑھیوں کی ریلنگ کے اوپر سے ہوتا ہوا فرش پر گرا، دوسرے نے میرا گریبان پکڑنا چاہا تھا، اس کے جبڑے پر طوفانی گھونسا پڑا اور وہ لڑکھڑا کر اپنے پیچھے کھڑے ساتھیوں پر گرا۔

''مارو اس چمچے کو۔'' کسی نے غضب ناک انداز میں ہدایت جاری کی۔

لوگ ہلا بول کر میری طرف آئے۔ ان کے ہاتھوں میں ڈنڈے تھے اور نوک دار آہنی سلاخیں تھیں۔ میں نے قمیص کے نیچے سے ریوالور نکالا اور تین ہوائی فائر کیے۔ دھماکوں سے قرب و جوار لرز گئے۔ سیڑھیوں پر چڑھے ہوئے افراد گھبرا کر پیچھے ہٹے اور ایک دوسرے کے اوپر گرے۔

''ہمت ہے تو بھاگو مت......آؤ آگے...... ہاتھ لگا کر دکھاؤ مولوی جی کو۔'' میں نے ایک اور فائر کرتے ہوئے کہا۔

اس اثنا میں بازار میں ہلچل مچ چکی تھی۔ اردگرد کی رہائشی عمارتوں میں سے لوگ نکل رہے تھے اور مولوی جی کے گھر کی طرف لپک رہے تھے۔ حملہ آور سمجھ گئے کہ رکنا اور مزاحمت جاری رکھنا خطرناک ہے۔ وہ اپنی اسٹیشن وین کی طرف جھپٹے اور بھرا مار کر اندر گھس گئے۔ یقیناً ان کے پاس بھی کم از کم ایک آتشیں ہتھیار تو موجود تھا کیونکہ اسٹیشن وین پر راہِ فرار اختیار کرتے ہوئے رائفل کی ایک گولی انہوں نے بھی چلائی۔ یہ بھی ہوائی فائر تھا۔

مولوی جی اور ان کے اہلِ خانہ یقیناً کھڑکیوں میں سے باہر کا منظر دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے اب اندر سے دروازہ کھول دیا۔ مولوی جی حیرت اور تعریف کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ میری طرف دیکھ رہے تھے۔ مولوی جی کے بہت سے حمایتی گھر سے باہر اور مسجد کے صحن میں جمع ہو گئے تھے۔ وہ غم و غصے میں دکھائی دیتے تھے۔ مولوی صاحب نے مجھ سے کہا۔

''تم کو، شاید دیکھا ہے کہیں۔''

''جی میں آپ کی محترمہ ہمشیرہ کے گاؤں سکھیرا میں ہی رہتا ہوں۔ یہاں لاہور ایک

کام سے آیا ہوا ہوں۔ کل آپ کے پیچھے نماز بھی پڑھی ہے میں نے۔ وہ سامنے ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں...... شور سن کر جاگ گیا اور یہاں پہنچ گیا۔''

مولوی جی نے میرا شانہ تھپکا اور دعا دی۔ ہم لوگ مسجد کے صحن میں آ گئے۔ اسی دوران میں پولیس کی ایک موبائل بھی وہاں پہنچ گئی۔ میرے اندازے کے مطابق یہ وہی گاڑی تھی جو اس وقوعے سے چند منٹ قبل مشکوک انداز میں یہاں کھڑی رہی تھی۔ بہت بڑے منہ والا ایک تندخو انسپکٹر گاڑی میں سے اترا اور واقعے کے بارے میں پوچھ گچھ کرنے لگا۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہوائی فائر کس نے کیے تھے؟''

''میں نے کیے تھے جی...... اور انہوں نے بھی گولی چلائی تھی۔''

''تمہارا ہتھیار کہاں ہے؟''

''میرے پاس ہے، لائسنسی ریوالور ہے۔''

''درشن تو کراؤ۔'' وہ اکھڑ لہجے میں بولا۔

جیسا کہ میں نے بتایا ہے، کراچی میں کاسمیٹک سرجری کے دوران میں، میں نے کچھ رقم خرچ کی تھی اور وقاص کے نام سے اپنے کئی شناختی کاغذات بنوا لیے تھے۔ جن میں شناختی کارڈ، ڈرائیونگ لائسنس، اسلحہ لائسنس اور ڈومیسائل وغیرہ شامل تھے۔ میں نے ریوالور اور لائسنس دونوں دکھا دیئے۔ پولیس والوں کے مخصوص انداز میں انسپکٹر اعتراض وغیرہ لگانا چاہ رہا تھا مگر میرا اعتماد اور وہاں موجود لوگوں کا غم و غصہ دیکھ کر کسی کمینگی سے باز رہا۔ اسی دوران میں میڈیا کی دو گاڑیاں بھی شور مچاتی موقع پر پہنچ گئیں۔ ان کیل کانٹے سے لیس گاڑیوں کے پہنچنے کا مطلب یہی تھا کہ اب پوری ''کوریج'' ہو گی۔ ایک لحاظ سے یہ میرے اور مولوی صاحب کے لیے اچھا ہی ہوا تھا۔

چوبیس گھنٹے کے اندر ہی میرے اور مولوی حبیب اللہ صاحب کے درمیان اپنائیت اور احترام کا ایک خوشگوار سا تعلق پیدا ہو گیا۔ مولوی جی کا ایک مرید جو مسجد کے قریب ہی رہتا تھا مجھے خستہ حال ہوٹل سے فارغ کرا کے اپنے گھر لے گیا اور خاطر داری کی۔ رات کو مولوی جی نے مجھ سے اپنے حجرے میں ملاقات کی۔ وہ مجھے ایک معمولی ڈرائیور سے کہیں زیادہ اہمیت دے رہے تھے۔ انہوں نے کہا۔ ''ماشاءاللہ بہت باہمت اور ہونہار جوان ہو۔ میرا دل کہتا ہے کہ تم بڑی ترقی کرو گے۔ رب کریم تمہیں اپنی حفاظت میں رکھے۔''

انہوں نے مجھے چوہدری دین محمد اور داراب فیملی والے معاملے کی کچھ تفصیل بھی بتائی۔ یہ باتیں تو اب ہر کس و ناکس کو معلوم تھیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔ ''مجھے ابھی ابھی پتا چلا ہے

کہ دین محمد اپنے گھر والوں کو لے کر لاہور آیا ہوا ہے۔ شاید کسی جاننے والے کے ہاں شادی ہے۔"

میں نے کہا۔ "کہیں ایسا تو نہیں مولانا! کہ دین محمد صاحب اس معاملے کی وجہ سے گھبرا گئے ہوں اور ویسے ہی کچھ دنوں کے لیے اِدھر اُدھر ہو گئے ہوں۔"

"نہیں، شادی والی بات ٹھیک ہی ہے۔ مجھے ایک دوسرے ذریعے سے بھی پتا چلا تھا۔"

میرے اور مولوی جی کے درمیان کافی دیر گفتگو ہوئی۔ انہوں نے ان اندیشوں کا اظہار بھی کیا جو مخالفین کی وجہ سے پیدا ہو رہے تھے۔ ان کی مسحور کن شخصیت نے مجھے متاثر کیا۔

مولوی جی نے دین محمد کی لاہور آمد کے بارے میں جو اندازہ قائم کیا تھا، وہ اسی رات غلط ثابت ہو گیا۔ میں نے فردوس کو فون کیا۔ پہلی کوشش ہی کامیاب ہوئی اور اس نے فون اٹھا لیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "کہاں ہو؟"

وہ حسبِ معمول ڈری ہوئی آواز میں بولی۔ "یہیں گاؤں میں۔ اپنے بچوں کے ساتھ۔"

"دین محمد صاحب اور بچے کہاں ہیں؟"

وہ کتنی ہی دیر خاموش رہی پھر دبی آواز میں کہنے لگی۔ "بڑی خاص خبر ہے لیکن اس میں میرا نام آیا تو میں مفت میں ماری جاؤں گی۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔"

میں سمجھ گیا کہ کوئی بہت اہم اطلاع ہے۔ میں نے اسے بمشکل آمادہ کیا۔ وہ بولی۔ "چوہدری جی اور بچے لاہور نہیں...... اسلام آباد گئے ہیں۔ اب تاجور بی بی کا صرف نکاح ہی نہیں ہو گا...... اسی وقت رخصتی بھی ہو جائے گی۔ بالکل چپ چپیتے...... کل نہیں تو پرسوں یہ سب ہو جانا ہے......" اس کی آواز لرز رہی تھی۔

اس کی بات سن کر میں سناٹے میں رہ گیا۔

میرے سینے میں عجیب ہلچل مچ گئی تھی۔ تاجور کا نکاح اور رخصتی...... اور وہ بھی بس ایک دو روز کے اندر؟ مجھے پہلے ہی اندیشہ تھا کہ یہ دارابی طاقت کے نشے میں کوئی نہ کوئی گل ضرور کھلائیں گے۔ انہوں نے تاجور کے والد دین محمد صاحب کو مکمل طور پر اپنے ہاتھ میں کر لیا تھا۔ رہی سہی کسر دین محمد صاحب کی اپنی ضد نے پوری کر دی تھی اور وہ اپنی بیٹی اور اپنے دیگر اہلِ خانہ کی مرضی کے بالکل خلاف، آناً فاناً اس رشتے کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دینا چاہتے تھے۔

تو کیا...... تاجور بالآخر ہمیشہ کے لیے مجھ سے دور ہو رہی تھی۔ محبت کا وہی انجام جو طے شدہ ہوتا ہے اور آخر کار محبت کرنے والوں کو دبوچ لیتا ہے؟

نہیں میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ میں اسے پانے کے لیے آخری حد تک جاؤں گا۔ بے شک وہ بہت کھل کر اظہار نہیں کرتی لیکن مجھے دل کی گہرائیوں سے چاہتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ میں اس کے اردگرد کی دیواریں ڈھادوں اور اسے ہمیشہ کے لیے اپنا بنالوں۔ اس سے پہلے اگر ہماری محبت کی کشتی کو کنارہ نہیں مل سکا تھا تو اس کی سب سے بڑی وجہ میں خود تھا۔ مجھے اپنے مستقبل کا کوئی بھروسا نہیں تھا۔ میں ہر وقت ان وحشی قدموں کی چاپ سنتا تھا جو میرے جسم کو روندنے اور پامال کرنے کے لیے میری طرف بڑھ رہے تھے لیکن اب ایک کرشمہ ہوا تھا۔ میں اپنے ماضی کی خونخوار پرچھائیوں سے دور ہو گیا تھا۔ میرے اور ان پرچھائیوں کے درمیان ایک دبیز پردہ آ گیا تھا۔ اب میں ایک نئے روپ میں ایک نئی زندگی جینے کی آس اپنے اندر پال سکتا تھا۔

''نہیں تاجور...... میں تمہیں اس طرح دارج دارابی کی بھینٹ نہیں چڑھنے دوں گا۔'' میں نے دل ہی دل میں کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

چند ہی منٹ بعد میں دوبارہ مولوی حبیب صاحب کے حجرے کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ ابھی رات کے دس ہی بجے تھے اور مجھے مسجد کے خادم کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ مولوی صاحب حجرے میں ہی ہیں اور نوافل وغیرہ پڑھ رہے ہیں۔

میری دوسری دستک پر مولوی صاحب نے اپنی دستار درست کرتے ہوئے دروازہ کھولا۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے طویل سانس لی، بولے۔ ''میں سمجھا پولیس والے مجھے اپنا مہمان بنانے کے لیے، لینے آ گئے ہیں۔'' ان کے لہجے میں ایک تشویش آمیز کیفیت تھی۔

میں نے کہا۔ ''مولانا، ہاتھ جوڑ کر آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ شاید میں نے آپ کی عبادت میں خلل ڈالا ہے۔''

وہ بولے۔ ''چلو اب خلل ڈال ہی دیا ہے تو اندر آ جاؤ۔ ویسے خیریت ہی ہے ناں؟''

''جی مولانا، خیریت ہی ہے۔ بس ایک سخت الجھن تھی اور یہ الجھن ہی مجھے اس طرح بے وقت اٹھا کر آپ کے پاس لے آئی۔ ایک بار پھر معافی کا خواستگار ہوں۔''

انہوں نے میرا کندھا تھپکا اور مجھے بیٹھنے کے لیے کہا۔ میں نرم چٹائی پر ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ انہوں نے ایک چھوٹے سے گاؤ تکیے کے ساتھ ٹیک لگا کر تسبیح اپنے ہاتھ میں تھام لی۔ وہ بغور میری طرف دیکھ رہے تھے، کہنے لگے۔ ''جب تم پر نظر ڈالتا ہوں تو یہی لگتا ہے کہ تم کسی سخت تکلیف میں مبتلا ہو۔ اپنا درد چھپاتے ہو لیکن وہ لہر مار کر تمہاری آنکھوں تک آتا ہے۔''

میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''مولانا! گستاخی معاف، میں اپنی ذاتی زندگی کے

بارے میں آپ سے کچھ رہنمائی لینا چاہتا ہوں۔"

"بولو...... بولو۔" انہوں نے حوصلہ بخش انداز میں کہا۔

"مولانا، یہ دارابیوں اور دین محمد صاحب والے حالات دیکھ کر میرے اپنے دکھ میں بہت اضافہ ہوا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے اپنے حالات بھی ان حالات سے بے حد ملتے جلتے ہیں۔"

"کھل کر بتاؤ۔" انہوں نے کہا۔ "جس طرح یہ کہا جاتا ہے کہ ڈاکٹر اور وکیل سے کچھ چھپانا نہیں چاہیے۔ شاید اسی طرح جب کسی سے کوئی شرعی مسئلہ پوچھا جائے تو اس کو مکمل بات بتانی چاہیے۔"

میں نے چند لمحے کے توقف کے بعد کہا۔ "میں ایک لڑکی سے محبت کرتا ہوں جی...... بالکل پاک اور کھری محبت...... اور یہ کوئی آج کی بات نہیں ہے۔ پانچ چھ برس گزر چکے ہیں، وہ بھی دل و جان سے مجھے چاہتی ہے۔ لیکن یہاں بھی وہی کچھ ہو رہا ہے جو دین محمد صاحب کی طرف ہو رہا ہے۔ لڑکی کا والد ایک امیر گھر میں اس کی شادی کرنا چاہ رہا ہے۔ حالانکہ جانتا بھی ہے کہ وہ اچھے لوگ نہیں۔ لڑکا سخت آوارہ ہے اور خر دماغ ہے۔ نشہ بھی کرتا ہے۔ کبھی کبھی تو یوں بھی لگتا ہے کہ لڑکی کا باپ اس غنڈہ صفت فیملی سے ڈرتا بھی ہے۔ آپ یوں سمجھیں کہ لڑکی کی والدہ کا رویہ بھی وہی ہے جو یہاں دین محمد صاحب کی بیوی صاحبہ کا ہے۔ وہ رشتے کے سخت خلاف ہیں اور سمجھتی ہیں کہ ان کا شوہر بچی کو جہنم میں دھکا دے رہا ہے لیکن شوہر کے خلاف چلنے کی اس میں ہمت نہیں ہے بلکہ گھر میں سے کوئی بھی اتنی مجال نہیں رکھتا۔"

مولانا حبیب اللہ نے تسبیح کو اپنی انگلیوں پر گردش دیتے دیتے ذرا توقف کیا اور بولے۔ "ابھی تم نے کہا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ لڑکی کا والد ان زور والے لوگوں سے ڈرتا بھی ہو، اس صورت میں تو وہ بھی قابلِ ترس ہوا۔ اس بات کی کوشش کی جانی چاہیے کہ اسے اس دباؤ سے نکالا جائے۔"

"میں نے بہت کوشش کی ہے جی...... اور اللہ کے فضل سے میں کر بھی سکتا ہوں، لیکن بات صرف دباؤ ہی کی نہیں ہے۔ لڑکی کے باپ میں ہٹ دھرمی بھی آ چکی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اب جو کچھ بھی ہو مگر وہ رشتہ وہاں کر کے چھوڑے گا۔ لڑکے کا کریکٹر کھلی کتاب کی طرح اس کے سامنے ہے مگر وہ اپنی بات منوانے پر تلا ہوا ہے۔"

"لڑکی بالغ ہے؟"

"بالکل جناب! چوبیس سال کے لگ بھگ عمر ہے۔ اپنی والدہ کی طرح پردہ دار اور

نماز، روزے کی پابند ہے۔ اس کی والدہ اور دیگر گھر والوں کا رو رو کر برا حال ہے۔“
مولوی جی نے گہری سانس لے کر تسبیح کو جیب میں ڈالا اور بولے۔ ”دیکھو میاں! بچوں پر ماں باپ کی اطاعت فرض ہے لیکن کبھی کبھی ماں باپ بھی آپس میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ کون حق پر ہے اور تقویٰ اور پرہیزگاری کس میں زیادہ ہے۔ یوں تو کئی معاملات میں والد کی اہمیت بڑھ جاتی ہے کیونکہ وہ گھر کا سربراہ بھی ہوتا ہے لیکن جب یہ دیکھا جائے کہ وہ صریحاً اللہ رسول کے احکامات کے خلاف جا رہا ہے تو پھر معاملات کو اور طرح سنبھالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔“
میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ”مولانا! میں مسجد کی حدود میں بیٹھا ہوں۔۔ بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں، جس جگہ اس لڑکی کا ناتا جوڑا جا رہا ہے، وہ لڑکا گردن تک آوارگی اور بے حیائی کی دلدل میں ڈوبا ہوا ہے اور لڑکی کے والد نے جانتے بوجھتے اپنی آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔“
مولوی حبیب اللہ بولے۔ ”اللہ تبارک تعالیٰ نے اسلام کو دینِ فطرت بنایا ہے۔ یہ زندگی کے ہر گوشے میں انسان کی رہنمائی کرتا ہے۔ طلاق سے زیادہ ناپسندیدہ عمل کیا ہو سکتا ہے مگر ہمارا دین کہتا ہے کہ اگر ایک عورت کسی عادی زانی، شرابی کے پلے بندھ گئی ہے اور اس شخص کی تبدیلی کے کوئی امکانات نہیں ہیں تو پھر اس کے گھر رہ کر مزید مخدوش مستقبل والے بچے پیدا کرنے کے بجائے بہتر ہے کہ وہ اس سے علیحدگی اختیار کر لے...... اور جو بات تم بتا رہے ہو، اس میں تو ابھی عقد والا معاملہ ہی موجود نہیں ہے، ایسی شکل میں خود کو گڑھے میں گرانے کے بجائے اپنے قدموں کو روک لینا ہی بہتر ہے۔ ایسی صورت میں خاندان کے بڑے بزرگوں کو اپنا ہمنوا بھی بنایا جا سکتا ہے۔“
”یہ سارے جتن کر کے دیکھے جا چکے ہیں جناب! بچاؤ کی کوئی صورت نہیں نکل رہی۔ آپ بتائیے ایسی شکل میں عاقل بالغ لڑکی کا اپنی والدہ اور دیگر بزرگوں کی خواہش کے مطابق نکاح کر لینا جائز ہے؟“
مولانا نے اس حوالے سے سیر حاصل گفتگو کی اور آخر میں کہا کہ اتفاق رائے کے لیے آخری حد تک جایا جائے اور اگر پھر بھی مثبت نتیجہ نہ نکل سکے اور لڑکی کی زندگی برباد ہونے کا خوف ہو تو اس کے لیے واضح احکامات موجود ہیں۔ اصل اہمیت تو بالغ و عاقل مرد عورت کی رضامندی کو حاصل ہے۔ ہم خیال بزرگوں کی معاونت سے وہ کوئی فیصلہ بھی کر سکتے ہیں۔“
میں نے کہا۔ ”مولانا! اگر وہ دونوں حالات کے سخت نرغے میں ہوں تو اس نرغے سے

نکلنے کا حق بھی ان کو حاصل ہے؟"

مولانا حبیب اللہ نے کچھ قواعد وضوابط سے مشروط کرنے کے بعد اس کا جواب بھی اثبات میں دیا۔

رات...... ایک سرد رات دھیرے دھیرے آگے کو سرک رہی تھی۔ حجرے کے بلب کی زرد روشنی میں، مولانا حبیب اللہ میرے ساتھ محوِ گفتگو تھے۔

اسی دوران میں ان کے فون کی مدھم بیل ہوئی۔ انہوں نے بسم اللہ پڑھ کر فون ریسیو کیا۔ دوسری طرف ان کا کوئی عزیز ہی تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا وہ ان کے چھوٹے بھائی صاحب تھے۔ انہوں نے مولانا کو اطلاع دی کہ دین محمد اور اس کے گھر والے شادی میں شریک نہیں ہوئے بلکہ سننے میں آیا ہے کہ وہ لاہور آئے ہی نہیں، بلکہ اسلام آباد چلے گئے ہیں۔

"استغفراللہ۔" مولانا نے غصے کے عالم میں کہا۔ "ایسی غلط بیانیاں...... ایسی حیلہ سازیاں، پتا نہیں یہ دین محمد کیا کرتا پھر رہا ہے۔ رب کریم اس کے گھر والوں کو اور ہم سب کو اس کی ہٹ دھرمی اور شر سے بچائے۔"

دوسری طرف سے مزید کچھ کہا گیا، جس کے جواب میں مولانا بولے۔ "کیا کہا جا سکتا ہے۔ جب اللہ بندے سے ناراض ہوتا ہے تو بندے کی عقل پر پتھر پڑ جاتے ہیں، تم ٹھیک کہہ رہے ہو، ہونے کو تو کچھ بھی ہوسکتا ہے۔"

جو اطلاع مولانا کو اب مل رہی تھی وہ مجھے دو گھنٹے پہلے ہی مل چکی تھی اور زیادہ تفصیل کے ساتھ ملی تھی۔ بہر حال میں نے اس سلسلے میں مولانا سے کوئی بات نہیں کی۔ مزید چند فقروں کے تبادلے کے بعد مولانا نے کال منقطع کر دی، ان کے سرخ وسپید چہرے پر گہری تشویش تھی مگر انہوں نے مجھ سے اس معاملے میں کوئی بات نہیں کی۔ میرے پوچھنے پر صرف اتنا بتایا۔ "دین محمد واقعی لاہور نہیں آیا۔ کہا جا رہا ہے کہ اسلام آباد چلا گیا ہے۔ پتا نہیں، کیا ارادے ہیں اس کے۔ بندہ بھاگتا تو اس وقت ہے جب اس کے پاس دلیلیں اور جواز ختم ہو جاتے ہیں۔ اللہ کریم خیر کرے، ہم سب پر رحم فرمائے۔"

وہ ایک دم خاموش سے ہو گئے تھے۔ جیسے کہیں کھو گئے ہوں۔ انہوں نے گاؤ تکیے سے ٹیک لگائی اور گمشدہ سی آواز میں بولے۔ "کبھی تو سوچتا ہوں کہ جس طرح تم اس لڑکی کے بارے میں سوچ رہے ہو اور اسے اس کے حالات سے نجات دلانا چاہتے ہو، کوئی دین محمد کی لڑکی کے بارے میں بھی سوچنے والا ہوتا۔ اسے اس عذاب سے نکال کر کہیں دور لے جاتا۔"

ان کے چہرے پر حزن آمیز تاسف تھا۔

میں نے محتاط انداز میں کہا۔ ''مولانا! میں نے سنا تھا کہ آپ کی محترمہ بھانجی (تاجور) کی منگنی وغیرہ بھی ہوئی تھی۔ شاید اسحاق نام تھا ان کے منگیتر کا۔''

انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں...... یہ تو پرانی بات ہے، اور وہ بھی کوئی اچھا بندہ نہیں تھا۔ بہت بری صحبت کا شکار ہو چکا تھا۔ اس کی شامت اعمال اسے لے ڈوبی۔ رب اس کی مغفرت کرے، اب وہ زندہ نہیں ہے۔''

میں نے دل میں سوچا...... مولانا! آپ نہیں جانتے، آپ جس شخص کے ہونے کی خواہش کر رہے ہیں، وہ ہے...... موجود ہے...... اور آپ کے سامنے ہے۔ وہ آپ کی بھانجی سے اتنی ہی محبت کرتا ہے جتنی کوئی کسی سے کر سکتا ہے۔ وہ اپنی جان دے کر بھی اس کی جان اور آبرو کی حفاظت کر سکتا ہے...... اور اس کے چہرے پر اطمینان بھری مسکراہٹ دیکھنے کے لیے وہ خود کو آگ اور برف کے سات سمندروں میں سے گزار سکتا ہے۔ وہ ہے...... اور وہ آپ کی آرزو کے مطابق اپنے ہونے کا ثبوت بھی دے گا۔ آپ کی پیاری بھانجی، آپ کی بہن اور آپ بے بس نہیں ہیں...... لیکن میں یہ سب کچھ اپنی زبان سے نہیں کہہ سکتا تھا۔

O......❖......O

اگلے روز صبح کے وقت میں نے فردوس کو دوبارہ فون کیا۔ اس مرتبہ چوتھی پانچویں کوشش میں کامیابی ہو سکی۔ فردوس نے ایک خوف زدہ سی سرگوشی میں کہا۔ ''کیا بات ہے وقاص بھائی! میں واش روم کے اندر سے بول رہی ہوں۔ یہاں بہت سخت خطرہ ہے...... مجھے اب اپنا فون بند کرنا پڑے گا۔''

''کہاں ہو تم؟'' میں نے سخت لہجے میں پوچھا۔

وہ کچھ دیر تذبذب میں رہنے کے بعد بولی۔ ''میں ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی گاؤں سے یہاں پہنچی ہوں۔''

''یہاں کہاں؟'' میں نے بھنا کر پوچھا۔

''اسلاماں...... باد۔'' وہ ہکلائی۔ ''پپ...... پرسوں نکاح ہے۔ کل رات مہندی کی چھوٹی سی رسم ہے۔ یہاں کئی کام ہیں، اسی لیے مجھے اور انوری کو سکھیرا سے یہاں لایا گیا ہے۔''

میرے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ فردوس کی باتوں سے پتا چل رہا تھا کہ وہ اسی جگہ پر ہے جہاں دین محمد صاحب اپنے گھر والوں کو لے کر پہنچے ہیں۔ میرے نقطۂ نظر سے یہ مثبت

خبر تھی۔ میں نے ایک توقف کے بعد فردوس سے کہا۔ ''فردوس! کیا تم کسی طرح تاجور سے میری بات کرا سکتی ہو؟''

''توبہ کریں جی توبہ...... کانوں کو ہاتھ لگاؤ وقاص بھائی! تاجور بی بی کی ہونے والی نندیں یہاں ہیں۔ اور وہ ایک دو نہیں پوری پانچ ہیں۔ اس کے علاوہ اس گھر کی نوکرانیاں ہیں۔ بڑی ہوشیار اور چالاک چلتر ہیں سب کی سب...... یہ لوگ تاجور بی بی کو دو منٹ کے لیے بھی اکیلا نہیں چھوڑ رہے...... اچھا باہر کھڑاک ہو رہا ہے۔ اب میں فون بند کر رہی ہوں......''

''نہیں فردوس۔'' میں نے سخت لہجے میں جلدی سے کہا۔ ''اگر تم نے فون بند کیا تو جو کچھ ہوگا تمہارے ساتھ وہ بہت برا ہوگا۔''

''پر میں کیا کروں؟ کسی کو پتا چل گیا کہ میں اس طرح یہاں چھپ کر مخبریاں کر رہی ہوں تو یہ لوگ میرے ٹوٹے کر دیں گے۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔'' وہ روہانسی ہو گئی۔ وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی لیکن میں نے کسی نہ کسی طرح اسے فون بند کرنے سے باز رکھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کس علاقے میں ہے اور تاجور اس وقت کس کمرے میں موجود ہے۔

فردوس ٹھیک مقام تو نہیں بتا سکی۔ تاہم اس نے کہا۔ ''یہ بڑے صاف ستھرے علاقے میں ایک، دو منزلہ کوٹھی ہے۔ یہاں بہت سے چوکیدار بھی ہیں نیلی وردیوں اور رائفلوں والے...... کئی وڈی وڈی گڈیاں سامنے ویہڑے میں کھڑی ہوئی ہیں۔ گھر زیادہ وڈا تو نہیں ہے پر بہت زیادہ سجا ہوا ہے۔ تاجور بی بی کا نکاح اسی گھر میں ہونا ہے اور اسی گھر سے وہ رخصت ہو کر اپنے سورے گھر (سسرال) جائیں گی۔''

''تاجور اس وقت کہاں ہے؟''

''ان کا کمرا اوپر والی منزل پر ہے...... سیڑھیوں کے بالکل ساتھ...... پر اس ویلے تو بی بی نیچے ہے۔ اپنے ہونے والی نندوں اور ان کی سہیلیوں کے ساتھ بیٹھی ہے۔ ان کی ہونے والی ساس صاحبہ بھی تھوڑی دیر کے لیے آئی ہوئی ہیں۔ وہ بڑی [illegible] والی زنانی ہیں۔ کوئی ان کے سامنے اُچی آواز میں گل نہیں کر سکتا۔''

فردوس بہت ڈری ہوئی تھی...... تاہم میں نے حکمتِ عملی کے ساتھ اس کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ اس جگہ کا محل وقوع جاننے کی کوشش کرے۔ میں نے اسے ہاشو کے ساتھ اس کی نازیبا ویڈیو کے حوالے سے ڈرایا بھی اور ساتھ ہی ساتھ اسے بڑے اعتماد کے ساتھ

تحفظ کا یقین بھی دلایا۔

فردوس سے بات ختم کرنے کے بعد میں ۔ نے فون پر سجاول سے رابطہ کیا اور اسے ساری صورتِ حال کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ وہ اپنی بھاری پاٹ دار آواز میں بولا۔ ''شاہی یہ سب تو ٹھیک ہے، لیکن مجھے یہ بتا کہ مجھے کرنا کیا ہے؟''

''تم آج کل پیار محبت والی فلم بنے ہوئے ہو۔ تمہیں پھر تھوڑا سا ایکشن کی طرف واپس لانا ہے۔ بلکہ بہت تھوڑا سا۔''

''زیادہ چلنے والی مشین کو بالکل روک دیا جائے اور وہ رکی ہی رہے تو اس کو زنگ شنگ لگ جاتا ہے۔ اسے تھوڑا بہت تو چلنا ہی چاہیے۔''

''پر ہماری بھابی کو بالکل پتا نہ لگے، ورنہ وہ جو تھوڑی بہت عزت مجھے دیتی ہے اس کا سوا ستیاناس ہو جائے گا۔''

''تھوڑی بہت تو نہیں، بہت زیادہ عزت دیتی ہے۔ بلکہ کبھی کبھی تو میں سڑنا شروع ہو جاتا ہوں۔ جاما جی میں قسطینا، ابراہیم اور اس لمبے فارس جان وغیرہ نے بھی تمہاری ''موت'' کا بڑا سوگ منایا ہے۔ ایک دو بار فون پر خورسنہ کی وہاں بات ہوئی ہے۔''

''بس ایک بات کا دھیان رکھنا سجاول۔ یہ سب کچھ ٹاپ سیکرٹ ہے۔ اگر میرے زندہ ہونے والا بھید کھل گیا تو پھر سمجھو کہ بیڑا ہی غرق ہو جانا ہے۔ ٹیکساری والا شیطانی ٹولا اب بھی آس پاس ہی ہے۔ مجھے اور میرے ارد گرد والوں کو کھوجتا پھر رہا ہے۔''

سجاول نے کہا۔ ''میں بھی ایک بار پھر کہتا ہوں کہ بے فکر رہو۔''

دو گھنٹے بعد میں نے فردوس کو دوبارہ فون کیا۔ اس مرتبہ بھی اس نے میری کال ایک واش روم میں بند ہو کر اور شاور وغیرہ کھول کر سنی۔ وہ صرف اتنا بتا سکی کہ اس جگہ کو چار نمبر چھوٹا سیکٹر کہتے ہیں اور مکان کے گیٹ پر 210 نمبر لکھا ہوا ہے۔ نیچے انگریزی میں بھی کچھ حرف لکھے ہیں۔

یہ معلومات مکمل تو نہیں تھیں لیکن ان سے کافی فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا۔ میں نے اسی وقت لالہ موسیٰ میں سجاول کو فون کیا اور اس سے کہا کہ وہ اپنے ساتھی یونس پمپ والے کو حرکت میں لائے۔ وقت کم تھا اور مجھے جو بھی ہاتھ پاؤں مارنے تھے ذرا جلدی مارنے تھے۔ میں نے آٹھ دس گھنٹے پہلے محترم مولانا حبیب سے جو گفتگو کی تھی وہ بڑی کار آمد تھی اور یہ گفتگو میرے سیل فون کے وائس ریکارڈر میں بھی محفوظ ہو چکی تھی۔

پروگرام کے مطابق سجاول وغیرہ ایک گھنٹے کے اندر اندر اسلام آباد روانہ ہو گئے۔

پھر کوئی چار بجے کے لگ بھگ میں بھی بذریعہ بس لاہور سے اسلام آباد کے لیے چل پڑا۔ میں اسی ڈرائیور وقاص والے حلیے میں تھا۔ شلوار قمیص اور آستینوں کے بغیر ایک جرسی۔ میں نے قمیص کے نیچے چمڑے کی پیٹی کے ذریعے ریوالور لگا رکھا تھا۔

میری ایک نئی شناخت تھی، نیا حلیہ تھا۔ میں آزادانہ راولپنڈی اور اسلام آباد کی سڑکوں پر گھوم پھر سکتا تھا۔ یہ ایک نیا اور تسلی بخش تجربہ تھا۔ میں نے ٹیکسی کے ذریعے سفر کیا اور فیض آباد سے تھوڑا آگے ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ میں سجاول اور اس کے ساتھی یونس سے ملاقات کی۔ یونس مجھے وقاص کی حیثیت سے ہی جانتا تھا۔ میرے اور سجاول کے درمیان طے ہو چکا تھا کہ یونس کے سامنے سجاول مجھے وقاص کے نام سے ہی بلائے گا۔ کلین شیو سجاول پینٹ شرٹ میں تھا۔ اس چوڑے لمبے بابو کو دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ ماضی قریب کا خونخوار ڈکیت سجاول سیالکوٹی ہے۔ (اس کے باوجود عام شخص اسے دیکھ کر یقیناً کچھ ہیبت محسوس کرتا ہوگا)

سجاول کے ساتھی یونس پمپ والا نے بڑی تیزی سے کام کیا تھا۔ یونس وہ بنگلا نما کوٹھی ڈھونڈنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ یہ ہائی سکیورٹی والا علاقہ تھا۔ تاہم سجاول اور یونس وغیرہ اس کا محل وقوع دیکھنے میں کامیاب رہے تھے۔ یونس کا ایک پوٹھوہاری دوست ایک ایسی الیکٹرک کمپنی میں ملازم تھا جو اس رہائشی علاقے میں سروس مہیا کرتی تھی۔ اپنے اس دوست کی مدد سے یونس نے دو عدد وردیاں حاصل کر لی تھیں۔ ان پر الیکٹرک کمپنی کے مونوگرام بنے ہوئے تھے۔

ہم ریسٹورنٹ میں چائے پی رہے تھے جب یونس کا ایک ساتھی اندر آیا اور اس نے بتایا کہ وہ گارڈ والی وردی لے آیا ہے اور دوسرا سامان بھی۔ (اس کا نام بعد میں شرافت معلوم ہوا)

ہم اس شخص کے ساتھ ریسٹورنٹ سے باہر آئے۔ سڑک کے کنارے سفید رنگ کی ہائی روف سوزوکی کھڑی تھی۔ اس پر بھی الیکٹرک کمپنی کا مونوگرام موجود تھا۔ ہم گاڑی کے اندر بیٹھ گئے۔ یونس نے مجھے یونیفارم دکھائی، بولا۔ ”وہاں علاقے میں جو گارڈ موجود ہیں ان کی وردی تقریباً ایسی ہی ہے۔ تھوڑا بہت فرق ہے بھی تو اندھیرے میں پتا نہیں چلے گا۔“

”اور اس ڈبے میں۔“ میں نے لکڑی کے ایک باکس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”وہی ڈائنا میٹ کے ڈنڈے (اسٹکس)۔“ اس نے جواب دیا۔

یو پی ایس کا ایک خالی ڈبا بھی یہ لوگ ساتھ لائے تھے۔ ڈائنامیٹ کی اسٹکس کو اسی خالی ڈبے میں رکھ کر موقع پر لے جایا جانا تھا مگر ڈائنامیٹ سے کسی کو نقصان پہنچانا مطلوب نہیں تھا۔ یہ صرف توجہ ہٹانے کا ایک حربہ تھا۔ یہ ڈائنامیٹ اسٹکس، یونس ہی اپنے ساتھ لالہ موسیٰ سے لایا تھا۔ یونس کا ایک بھائی بجری بنانے کا کام کرتا تھا اور دیسی ساخت کی یہ ڈائنامیٹ اسٹکس پتھروں میں چھوٹے موٹے بلاسٹ کرنے کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔

اسٹکس تعداد میں دس کے قریب تھیں۔ میں نے سجاول سے کہا۔ ''یہ زیادہ ہیں...... میرا خیال ہے کہ کچھ میں اپنے پاس رکھ لوں، ہوسکتا ہے کہ کام آ جائیں۔''

''جیسے تمہاری مرضی۔'' وہ بولا۔

وہیں بیٹھے بیٹھے ہم نے ڈائنامیٹ کی تین اسٹکس ایک مضبوط شاپر میں لپیٹیں اور ان کو آپس میں کنیکٹ کر کے ان کا فلیتہ اس طرح شاپر سے باہر نکال دیا کہ ماچس یا لائٹر سے اسے فوری آگ دکھائی جا سکے۔

اب پلاننگ کے مطابق ہماری تیاری پوری تھی۔ میں نے یونس سے کہا۔ ''کسی کو نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔ گولی تب ہی چلاؤ جب کوئی اور راستہ نہ ہو۔''

''ایسا ہی ہوگا۔'' یونس نے کہا۔

''سجاول بھائی، تم کہاں ہو گے؟''

''وہاں پاس ہی ایک پارک ہے...... میں ابھی تمہیں وہ بھی دکھا دیتا ہوں۔ میں اس گاڑی پر وہیں کھڑا رہوں گا۔''

''کوٹھی سے فاصلہ زیادہ تو نہیں ہے؟''

''بالکل نہیں، آدھے منٹ میں، میں کوٹھی کے دائیں طرف والے گیٹ تک پہنچ سکتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے تو پھر ہم ایک بار موقع کا معائنہ کرلیں۔''

یونس کے الیکٹریشن دوست نے سوزوکی ہائی روف کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور ہم چند ہی منٹ میں اسلام آباد کے ایریا میں داخل ہو گئے۔ ہمارے مطلوبہ سیکٹر میں واقعی سکیورٹی نظر آ رہی تھی۔ بہرحال ہماری گاڑی کو کہیں بھی رکاوٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ جلد ہی میں وہ شاندار بنگلا نما کوٹھی دیکھ رہا تھا جہاں تاجور موجود تھی اور اس کے گھر والے موجود تھے۔ 210 نمبر اس کوٹھی کو جانے والے راستے پر روڈ بلاک موجود تھے۔ اردگرد چند پولیس اہلکار بھی دکھائی دیتے تھے۔ گیٹ پر دو گارڈ نظر آ رہے تھے۔ وہ تقریباً ویسی ہی ہلکی نیلی وردیوں میں تھے، جیسی

ایک میرے پاس موجود تھی۔ کوٹھی کے باہر تین چار بڑی بڑی گاڑیاں کھڑی تھیں، ان میں سبز نمبر پلیٹ والی دو گاڑیاں بھی تھیں۔

کل تاجور کی مہندی کی رات تھی۔ کل یقیناً یہاں موجود گاڑیوں کی تعداد میں اضافہ ہو جانا تھا۔ عین ممکن تھا کہ کوٹھی پر تھوڑی بہت لائٹنگ بھی کی جاتی۔ بہر حال آج تو یہاں خاموشی ہی دکھائی اور سنائی دیتی تھی۔ یہ رات کے قریباً بارہ بجے کا عمل تھا۔ میرا خیال تھا کہ مجھے حرکت میں آنے سے پہلے قریباً دو گھنٹے مزید انتظار کرنا چاہیے۔ ہم واپس چلے گئے اور اسی ریسٹورنٹ میں جا بیٹھے جہاں رات کا کھانا کھایا تھا اور چائے پی تھی۔ اسلام آباد کی یہ خنک رات دھیرے دھیرے آگے کو سرک رہی تھی اور عمل کا وقت قریب آ رہا تھا۔

○......❖......○

سجاول نے پارک کے قریب گاڑی روک لی۔ یونس اور اس کا ساتھی الیکٹرک فرم کی یونیفارمز میں تھے۔ میں نے گارڈز والا ہلکا نیلا لباس پہن رکھا تھا۔ میرا ٹراؤزر چھ پاکٹس والا تھا۔ ایک بڑی جیب میں، میں نے اسٹکس والا شاپر اڑس رکھا تھا۔ ریوالور اب میری کمر سے بندھا ہوا تھا۔

''او کے یونس! تم کوٹھی کی پچھلی سڑک پر پہنچ جاؤ......اور میری کال کا انتظار کرو۔'' میں نے کہا۔

وہ اور اس کا دوست درختوں کے پیچھے اوجھل ہو گئے۔ میں نے تین چار منٹ بعد نیلی پی کیپ پیشانی پر جھکائی اور کوٹھی کی طرف بڑھا۔ انداز چہل قدمی والا ہی تھا۔ مجھے پورچ میں دین محمد صاحب کی نئی گاڑی بھی نظر آئی۔ دائیں طرف باؤنڈری وال کے ساتھ کھڑا ایک گارڈ متجسس نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر شاید وہ مجھے دھیان سے دیکھنے اور جانچنے کے لیے میری طرف بڑھا۔ مزید انتظار بے کار تھا۔ میں نے موبائل فون پہلے ہی ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔ میں نے بٹن دبا کر یونس کا نمبر ملایا اور کہا۔ ''بلاسٹ کرو۔''

قریباً تین چار سیکنڈ بعد کوٹھی کے بالکل قریب درختوں میں ایک زوردار دھماکا ہوا۔ تیز چمک کے ساتھ میں نے اشوکا کی سبز ٹہنیاں ہوا میں بلند ہوتے دیکھیں۔

کوٹھی کے سامنے کھڑے پولیس اہلکار اور گارڈز چند لمحے کے لیے پتھرا سے گئے۔ پھر وہ بے ساختہ دھماکے والی جگہ کی طرف لپکے۔ کوٹھی کے مختصر پورچ میں بھی زبردست ہلچل نظر آئی۔ مجھے اسی موقع کا انتظار تھا۔ میں گیٹ کے چھوٹے دروازے سے کوٹھی کے اندر گھسا اور اندرونی حصے کی طرف لپکا، کسی نے مجھ پر توجہ نہیں دی۔ میں بہ آسانی کوریڈور سے گزر کر گھر

کے کامن روم میں پہنچ گیا۔ یہاں مجھے ایک عمر رسیدہ خاتون اور ایک ملازمہ نظر آئی۔ دونوں شاید نیند سے ہڑبڑا کر اٹھی تھیں۔ وہ چلا رہی تھیں۔ ''کیا ہوا؟'' کیسے ہوا؟''

میں ان کے قریب سے گزرتا ہوا سیڑھیوں کی طرف لپکا۔ کسی اندرونی کمرے سے بھی ملی جلی مردانہ وزنانہ آوازیں سنائی دیں۔ دھماکے نے ہر کسی کو ہیجان میں مبتلا کر دیا تھا۔ دھیان یقیناً سب کا باہر کی طرف ہی تھا۔ لیکن میرا دھیان سیڑھیوں کے سرے پر واقع کمرے کی طرف تھا جہاں میرے اندازے کے مطابق اس وقت تاجور موجود تھی۔

سیڑھیاں طے کر کے میں پانچ چھ قدم آگے بڑھا۔ مجھے وہ دروازہ کھٹکھٹانے کی ضرورت ہی نہیں پڑی جہاں میرے قیافے کے مطابق تاجور کو ہونا چاہیے تھا۔ میرے سامنے پہنچتے ہی دروازہ ایک دم کھلا اور مجھے تاجور کی پریشان صورت نظر آئی۔ اس کے بال منتشر تھے اور دوپٹا ندارد تھا۔ ابھی وہ مجھے ٹھیک طرح سے دیکھ بھی نہیں پائی تھی کہ میں اسے دھکیلتا ہوا کمرے میں داخل ہو گیا۔ ''میں شاہ زیب ہوں۔'' میں نے تیزی سے کہا تھا۔

وہ چلانے کے لیے منہ کھول چکی تھی مگر چلانے کی حماقت اس نے نہیں کی۔ میں نے تیزی سے دروازہ بولٹ کر دیا۔ وہ جیسے پتھرا کر رہ گئی تھی۔ باہر سے شور بلند ہو رہا تھا اور دھما چوکڑی مچی ہوئی تھی۔ ''گھبراؤ نہیں تاجور، یہ میں ہوں۔'' میں نے پی کیپ بھی اتار کر بیڈ پر پھینک دی۔ نائٹ بلب کی روشنی میں بیڈ پر کوئی لیٹا تھا۔ میں نے دھیان سے دیکھا یہ تاجور کا بڑا بھائی راحیل تھا۔ وہ ابھی تک دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑا تھا۔ غالباً تاجور نے سہارے کے طور پر اسے اپنے ساتھ ہی لٹایا ہوا تھا۔

''آپ...... یہاں...... کس طرح...... اور...... اور یہ دھماکے کی آواز......؟'' وہ بری طرح ہکلائی۔ اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا اور آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔

''تمہیں سب کچھ بتاتا ہوں تاجور...... ذرا یہ باہر والا ہنگامہ ٹھنڈا پڑ لینے دو۔''

وہ رونے لگی۔ ''اچھا ہوتا میں چاند گڑھی میں ہی مر گئی ہوتی۔ نہ میں ہوتی نہ ہم سب پر یہ عذاب آتے۔ آپ کو کچھ پتا نہیں، آپ کیا کرتے پھر رہے ہیں۔ آپ کے ساتھ اوروں کی بھی جان جائے گی۔'' وہ تھر تھر کانپنا شروع ہو گئی تھی۔

قرب و جوار میں ابھی تک بھاگ دوڑ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ پھر چند فائر سنائی دیے۔ میرا قیافہ تھا کہ یہ فائر محافظوں یا پولیس اہلکاروں نے کیے ہیں اور یہ ہوائی فائر ہیں۔ دل سے دعا بھی نکلی کہ یہ ہوائی فائر ہی ہوں اور یونس پمپ والا اور اس کا ساتھی محفوظ رہے ہوں۔

''خدا کے لیے شاہ زیب! یہاں سے چلے جائیں۔ مجھ پر اور میرے گھر والوں پر رحم

کریں۔ میں ان کی زندگیاں خطرے میں نہیں ڈال سکتی......اگر آپ......"

میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ کوئی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آرہا ہے۔ عین ممکن تھا کہ یہ دین محمد صاحب ہی ہوں۔ میں نے تاجور کے کان میں تیز سرگوشی کی۔ "میں واش روم میں چلا جاتا ہوں، جو بھی آئے اس کی بات سن لو لیکن کوشش کرنا کہ آنے والا کمرے میں رک نہ جائے۔"

تاجور نے بوکھلائے ہوئے انداز میں اثبات میں سر ہلایا اور لرزاں ہاتھوں سے اوڑھنی اٹھا کر اپنا سر اور سینہ ڈھانپا۔ میں جلدی سے واش روم میں چلا گیا۔ تاہم اندر کی لائٹ آن نہیں کی اور دروازے میں تھوڑی سی جھری رکھی۔ تاجور نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا کیونکہ مسلسل دستک ہورہی تھی۔ اندر آنے والی فردوس تھی، اس کا چہرہ بھی فق ہورہا تھا۔ بولی۔

"تاجور بی بی! تم سوئی پڑی ہو باہر پتا ہے کیا ہوا ہے؟"

"کیا ہوا ہے؟"

"بڑی زور کا دھماکا ہوا ہے، کہہ تو یہی رہے ہیں کہ ایک گڈی کا گیس کا سلنڈر پاٹا ہے۔ اتنی زور کی آواز آئی ہے کہ اللہ مافی۔ گڈی کا بھی ستیاناس ہوگیا ہے۔"

"کس کی گاڑی تھی؟"

"پتا نہیں، پر اس کا پچھلا حصہ بالکل کباڑا ہوگیا ہے۔ شکر ہے کہ اس کے آسے پاسے کوئی تھا نہیں۔"

"ابھی گولیوں کی آواز بھی تو آئی ہے۔" تاجور نے دریافت کیا

"وہ تو پولیس والوں نے چلائی ہیں۔ میاں جی کہہ رہے تھے کہ انہوں نے گھبرا کر چلائی ہیں۔ ویسے خیر خیریت ہے۔"

فردوس جسے سلنڈر کا دھماکا کہہ رہی تھی۔ ظاہر تھا کہ وہ ڈائنامیٹ کا دھماکا تھا۔ اندازہ ہورہا تھا کہ یونس اور اس کے ساتھی نے دھماکا کسی گاڑی کے قریب کیا اور اس سے گاڑی کا سلنڈر بھی پھٹ گیا۔ دھماکے کے وقت مجھے بھی اس کی شدت توقع سے زیادہ محسوس ہوئی تھی۔

تاجور نے روہانسی آواز میں فردوس سے پوچھا۔ "اسپتال سے کوئی فون آیا ہے؟"

"نہیں، ابھی دو گھنٹے پہلے آپ کے سامنے ہی آیا تھا۔ بڑی بی بی جی بالکل ٹھیک ہیں، تم دیکھ لینا ایک دو دن میں چنگی بھلی ہو جائیں گی، تم فکر نہ کرو۔"

میں ذرا چونکا۔ مجھے لگا کہ یہ شاید تاجور کی والدہ کا ذکر ہورہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد فردوس

جب واپس چلی گئی تو تاجور نے دروازے کو اندر سے بولٹ کر دیا۔ اس نے قریب ہی ہونے والے ''سلنڈر دھماکے'' کی بات کی۔ اس کے گمان میں یہ بات بالکل نہیں آئی تھی کہ یہ سلنڈر دھماکا نہیں اور اس دھماکے اور میرے یہاں وارد ہونے میں گہرا تعلق ہے۔ میں نے تاجور سے پوچھا کہ ابھی ملازمہ کس کی بیماری کی بات کر رہی تھی؟ تاجور نے اشکبار لہجے میں مجھے بتایا کہ امی کو کل سے 103 بخار ہے۔ کچھ دیر کے لیے تو بے ہوش ہی ہو گئی تھیں۔ وہ اب بھی اسپتال میں ہیں۔

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے تاجور کو دیکھا۔ ''اور تاجور! اس کے باوجود کل تمہیں مہندی لگائی جائے گی۔ شاید ڈھولک بھی بجائی جائے گی...... اور پھر پرسوں تمہیں نکاح کے بعد رخصت کر دیا جائے گا۔''

وہ کچھ نہیں بولی۔ بس بیڈ کے کنارے پر سر جھکائے بیٹھی رہی۔ دو موتی اس کی آنکھوں سے جھڑے اور اس کی جھولی میں گم ہو گئے۔ اس کی صورت دیکھ کر صاف پتا چلتا تھا کہ وہ میرے یہاں آنے سے پہلے نہ صرف جاگ رہی تھی بلکہ رو بھی رہی تھی۔ اس کی ورم زدہ آنکھیں سرخ تھیں اور اب کوشش کے باوجود وہ اپنی آنکھوں کی حالت چھپانے میں کامیاب نہیں ہو پا رہی تھی۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تاجور! تمہارے ابا جان نے پورے خاندان سے جھوٹ بولا۔ تمہیں اور سارے گھر والوں کو خاموشی سے یہاں لے آئے اور کہا یہ کہ شادی پر لاہور جا رہا ہوں۔ اس کا کیا مطلب ہوا؟ ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے، کوئی اخلاقی جواز نہیں ہے کہ وہ تن تنہا دارابیوں میں تمہارا نکاح کر دیں۔ وہ اب صرف اور صرف اپنی ضد کا جھنڈا اونچا کر رہے ہیں۔''

''کچھ بھی ہے شاہ زیب! میں اب ان کو دکھ نہیں دے سکتی۔'' وہ کراہ کر بولی۔

''اور اس ماں کو دکھ دے سکتی ہو جس نے تمہیں اپنی کوکھ میں پالا...... اور جو اب تمہارے باپ کے سامنے بے بسی کی تصویر نظر آتی ہے۔ اپنے اس ماموں کو دکھ دے سکتی ہو جو تمہارے حق کے لیے ہر جگہ لڑا ہے اور دارابیوں کی دشمنی مول لے رہا ہے۔ اپنے ان سب خونی رشتوں کو بھی دکھی کر سکتی ہو جو ان دارابیوں کی خصلت جانتے ہیں اور تمہیں اس گڑھے میں گرنے سے بچانا چاہتے ہیں۔''

وہ سسک اٹھی۔ ''میں کیا کروں، میں بے بس ہو چکی ہوں۔ میں اپنے ان سب ہمدردوں سے بھی شرمندہ ہوں جو میرے لیے بولتے رہے ہیں لیکن کچھ کر نہیں سکے۔ مم......

میں نہیں چاہتی کہ میرے اپنے ہی خاندان والے میری وجہ سے آپس میں لڑنا شروع کر دیں...... اور پھر مجھ پر سب سے زیادہ حق تو میرے باپ کا ہے ناں؟ اگر وہ سمجھتے ہیں کہ وہ ٹھیک کر رہے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کر رہے ہوں گے۔''

''بلی کو دیکھ کر کبوتر کی طرح آنکھیں بند نہ کرو تاجور! تم دیکھ رہی ہو کہ یہ ایک قاتل گڑھا ہے۔ آنکھوں سے دیکھ کر اس میں گرو گی تو یہ خودکشی سے بڑا گناہ ہوگا اور میں تمہیں یہ نہیں کرنے دوں گا۔''

''ہم...... کچھ نہیں کر سکتے شاہ زیب...... بہت بڑا طوفان آ جائے گا۔ اب سب سہنا پڑے گا۔ کیونکہ...... اب کچھ نہیں ہو سکتا۔''

''ہو سکتا ہے۔'' میں نے اعتماد سے کہا۔ ''میں یہاں تک پہنچ ہی گیا ہوں ناں، بولو پہنچا ہوں یا نہیں؟''

وہ خاموش رہی۔ اس نے بالوں کی لٹوں کو کانوں کے پیچھے اڑسا اور ڈری نظروں سے سوئے ہوئے راحیل کو دیکھا۔ جیسے اسے اندیشہ ہو کہ وہ جاگ نہ جائے۔

میں نے خودسری سے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور کہا۔ ''میں تمہیں لینے آیا ہوں تاجور۔''

وہ سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔ اس کے دونوں ہاتھ جیسے بے ساختہ اس کی گود میں سمٹ گئے۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے شاہ زیب!'' وہ سہم کر بولی۔

میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''تاجور! اگر تم مجھ سے پیار کرتی ہو اور اپنے والد کی ضد کی وجہ سے ایک دلدل میں دھنسنے سے بچنا چاہتی ہو تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ مجھ پر یقین کرو۔ میں تم پر کوئی آنچ نہیں آنے دوں گا اور تمہیں جبر کے اس گھیرے سے نکال کر لے جاؤں گا۔ ہم کورٹ میرج کر لیں گے...... یا پھر نکاح...... جیسے بھی تم چاہو...... اور مجھے یقین ہے تاجور! تمہاری والدہ اور تمہارے خاندان کے زیادہ تر بزرگ اس بات پر خدا کا شکر ادا کریں گے کہ تم دارابیوں کے چنگل سے نکل گئی ہو۔''

''آپ...... نہ ہونے والی باتیں کر رہے ہیں شاہ زیب! وہ خدا کا شکر ادا کیسے کریں گے۔ میرے خاندان والے آپ کو جانتے نہیں، پہچانتے ہیں۔ سکھیرا میں تو لوگ یہی جانتے ہیں کہ آپ کا نام وقاص محمد ہے اور آپ چاچا بشیر کے ڈرائیور ہیں...... شادی شدہ ہیں۔''

''تاجور! اگر دنیا کو دیکھو گی تو پھر ہم اسی گورکھ دھندے میں پھنسے رہیں گے۔ میں جانتا

ہوں تم مجھے چاہتی ہو اور میں بھی تم پر جان نچھاور کرنے کے لیے تیار ہوں۔ کیا ایک نئی زندگی شروع کرنے کے لیے ہمارے لیے ایک دوسرے کی چاہت کافی نہیں ہے۔ صرف ایک دوسرے کی چاہت۔ خدا کا شکر ادا کرنے والی جو بات میں نے کی ہے، وہ اس حوالے سے کی ہے کہ تمہارے بہت سے بزرگ اس بات پر خوش ہوں گے کہ تم جہاں بھی ہو لیکن کم از کم اس طاقتور سیاسی خاندان کے عیاش امیر زادے سے تو بچ نکلی ہو۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے تاجور! کہ ان کی بیویوں کی حیثیت کنیزوں سے زیادہ نہیں ہوتی۔ تم دارج کے بھائی شکیل کو دیکھ لو۔ اس خانوادے کے دوسرے مردوں کو دیکھ لو۔ اگر دارج نے تمہیں کوئی سہانے سپنے دکھائے ہیں تو ان کے اثر سے نکل آؤ اور اگر اس نے نہیں دکھائے اس کے گھر والوں نے دکھائے ہیں تو بھی نکل آؤ۔ خوف اور مصلحت کے اس جال کو توڑ دو تاجور! میں تمہارے ساتھ ہوں، اور تمہیں اپنانے کے لیے بڑی سے بڑی مصیبت سے ٹکرانے کو تیار ہوں۔"

"شاہ زیب! میرے دل کو کچھ ہو جائے گا۔ خدا کے لیے آپ چپ ہو جائیں۔"

"ٹھیک ہے، میں چپ ہو جاتا ہوں لیکن کوئی اور تم سے کچھ کہنا چاہتا ہے......"

میں نے چھ پاکٹ والے ٹراؤزر کی ایک جیب سے اپنا سیل فون نکالا۔ اس میں محترم مولانا حبیب اللہ کی گفتگو ریکارڈ تھی۔ اسی گفتگو کے ایک حصے میں انہوں نے بڑی دردمندی اور حسرت سے کہا تھا کہ کاش...... کوئی تاجور کو شریکِ زندگی بنانے والا بھی ہوتا اور اس کی پُرخلوص محبت میں اتنی طاقت ہوتی کہ وہ اسے حالات کی اس غلیظ دلدل سے نکال کر لے جاتا۔

میں نے وائس ریکارڈر میں جا کر اسے پلے کر دیا۔ وہ اپنے ماموں کی اور میری باتیں سننے لگی۔ اس کے چہرے سے عیاں تھا کہ وہ سن تو رہی ہے مگر پریشانی غالب ہے۔ میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ "تاجور! یہاں اس کمرے میں اب کوئی نہیں آئے گا۔ اور آخر میں ہوگا بھی وہی جو تم چاہو گی۔ اگر تم کہو گی تو میں خاموشی سے اٹھ کر چلا جاؤں گا۔ اور شاید کبھی تمہیں اپنا منہ بھی نہیں دکھاؤں گا۔ لیکن اس وقت ذرا دھیان سے یہ باتیں سنو۔"

میں نے ریورس کر کے ٹریک کو دوبارہ پلے کیا۔ وہ سننے لگی۔ ساتھ ساتھ زرد رخساروں پر آنسو بھی رینگ رہے تھے۔ باہر سے بلند ہونے والی آوازیں اب مدھم پڑ گئی تھیں۔ تاہم گارڈز کی بلند آواز سے کسی وقت عمارت کے احاطے گونجتے تھے۔

پوری گفتگو سننے کے بعد تاجور نے سسک کر پوچھا۔ "ماموں جان اب کہاں ہیں؟"

"لاہور میں......"

''وہ ٹھیک تو ہیں ناں؟''

''مجھے لگتا ہے کہ تمہیں اردگرد کے حالات سے بے خبر رکھا جارہا ہے۔ ان داراہیوں کو بس یہ جلدی ہے کہ تم جلد از جلد دارج کے نکاح میں آجاؤ۔''

''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں شاہ زیب؟''

''جن لوگوں نے تمہاری اور دارج کی شادی کی مخالفت کی ہے، وہ سب پریشانی کا سامنا کرنے پر مجبور ہوں گے...... اور تمہارے بڑے ماموں چونکہ پیش پیش تھے اس لیے ان کی پریشانی کا تو آغاز بھی ہو چکا ہے۔ ان پر بنائے گئے ایک جھوٹے کیس کو پھر زندہ کر دیا گیا ہے اور وہ ضمانت قبل از گرفتاری کرانے پر مجبور ہوئے ہیں۔ بہر حال وہ دلیر شخص ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے ایسے نیک بندوں کی مدد بھی فرماتا ہے، وہ یقیناً اپنا دفاع کر لیں گے۔''

تاجور کا زرد چہرہ کچھ اور بھی زرد ہو گیا۔ اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری اور بولی۔

''میں ہی کیوں نہیں مر جاتی۔ سارے جھگڑے ختم ہو جائیں گے۔''

''جینا...... مرنے سے کہیں زیادہ مشکل ہوتا ہے تاجور...... لیکن قدرت اس مشکل کا صلہ بھی دیتی ہے اور اس کو دینا ہی پڑتا ہے...... کیونکہ وہ اپنے بنائے ہوئے اصولوں کی پابندی کرتی ہے۔ تم بھی قدم بڑھا کر دیکھو۔ رستہ بھی ملے گا اور منزل بھی۔''

''خدا کے لیے شاہ زیب! مجھے کسی ایسے امتحان میں نہ ڈالیں، میں جس کے قابل نہیں۔ آپ کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ آپ نے بہت برا کیا ہے، اپنے لیے بھی اور میرے لیے بھی......'' اس کی آنکھوں میں گہرے اندیشے تھے۔ یقیناً اب اسے یہ شبہ بھی ہو رہا تھا کہ دھماکے کی آواز اور میرے یہاں پہنچنے میں تعلق ہے۔

میں نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔ ''تاجور! میں نے یہاں آکر برا کیا ہے تو پھر میں چلا جاتا ہوں لیکن تم آخری بار سوچ لو۔ میں پھر مڑ کر نہیں آؤں گا۔ یہ سلسلہ اب ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ میں نے سب کچھ تمہارے سامنے رکھ دیا ہے۔ اب فیصلہ تم نے کرنا ہے۔ یا تو میرا ہاتھ تھام لو اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہیں کانٹا چبھنے کی تکلیف بھی نہیں ہوگی اور میں تمہیں یہاں سے نکال کر لے جاؤں گا یا پھر مجھے خدا حافظ کہہ دو۔ اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ کبھی تمہیں اپنی شکل نہیں دکھاؤں گا۔''

تاجور اسی طرح ساکت و جامد بیٹھی رہی۔ دونوں ہاتھ گود میں سمیٹے ہوئے...... انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے ہوئے۔ اس کے پورے بدن میں لرزش تھی۔

''میں تمہارے جواب کا انتظار کر رہا ہوں تاجور؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا اور مجھے یوں لگا جیسے ایک برچھی سی سینے میں گھس گئی ہو۔
میں نے ہمت کر کے کہا۔ ''تاجور! میں تمہاری آواز سننا چاہتا ہوں۔ تمہارا جواب ہاں میں ہے یا نہ میں؟''
وہ اب بھی خاموش تھی، میں جانتا تھا کہ وہ نہایت سنگین کشمکش اور تناؤ سے گزر رہی ہے لیکن میں بھی مجبور تھا۔ وقت بڑی تیزی سے سمٹ رہا تھا اور ہزاروں سال طویل کشمکش بھی ہو لیکن ایک وقت تو ایسا آہی جاتا ہے جب حتمی فیصلہ کرنا پڑتا ہے اور یہ وہی لمحے تھے۔ میرے اندر بھی عجیب سی کوفت اور تپش جاگ گئی تھی۔
کافی دیر بعد میں نے کہا۔ ''تو تم نہیں بولو گی تاجور! مجھے تمہاری خاموشی کو ہی انکار سمجھنا پڑے گا؟''
اس کا سر بدستور جھکا رہا۔ وہ لمحے کوہ ہمالیہ سے گراں تھے اور ان کا بوجھ دل اور سینے کے رگ پٹھوں کو روندتا ہوا گزر رہا تھا۔
نیند میں راحیل نے کروٹ لی اور نیند میں ہی اپنا ایک ہاتھ تاجور کی گود میں رکھ دیا۔ تاجور نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اپنی مٹھی میں دبا لیا۔ جیسے وہ اس ہاتھ کے ساتھ رہنا چاہتی ہے...... اور ان سارے رشتوں کے ساتھ رہنا چاہتی ہے جو اس ہاتھ ہی کی طرح اسے پیارے ہیں۔
میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اٹھنا بہت کٹھن تھا۔ لگتا تھا کہ اپنے جسم کو نہیں اپنی لاش کو اٹھا رہا ہوں۔ اس لمحے تاجور نے اپنی بھیگی پلکیں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ ان نگاہوں میں بے پناہ کرب تھا۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہی تھی...... ایسا مت کریں میرے ساتھ۔ میں ایک عورت ہوں۔ میں اس ندی جیسی ہوں جو اپنے دونوں کنارے کھونا نہیں چاہتی۔ مجھے اتنی کڑی آزمائش میں نہ ڈالیں۔
''کچھ بولو تاجور...... کچھ بولو...... کوئی ایک لفظ کہہ دو میرے حق میں۔ کوئی ایک جملہ جو میری پوری زندگی کو غارت ہونے سے بچا لے۔' میں نے خاموشی کی زبان میں کہا۔
اس نے کچھ نہیں کہا۔ میں گہری سانس لے کر واپس مڑا۔ ایک قدم اٹھایا اور دوسرا اٹھانے سے پہلے واپس مڑا۔ میں نے آگے بڑھ کر تاجور کے سر پر ہاتھ رکھا۔ زخمی آواز تھی۔ میں نے کہا۔ ''تاجور! مجھے تمہاری ہی قسم ہے۔ میں اس کمرے سے ہی نہیں تمہاری زندگی سے بھی نکل جاؤں گا۔''
میں چل پڑا...... دروازے تک پہنچنے سے پہلے مجھے رکنا پڑا۔ وہ گر گئی تھی۔ وہ لڑکھڑا کر

بستر پر گری تھی اور پھر وہاں سے پھسل کر قالین پر آ گئی تھی۔ اس کے گرنے سے پہلے میری سماعت تک اس کی آواز پہنچی تھی۔ اس نے کربناک آواز میں میرا نام لیا تھا۔

میں تیزی سے اس کے پاس آیا۔ دونوں گھٹنے موڑ کر دوزانو اس کے پاس بیٹھا۔ اس کا سر اپنی گود میں رکھا۔ ''تاجور! آنکھیں کھولو تاجور......'' میں نے کئی بار یہ الفاظ دہرائے۔

اس کے ہونٹ تھوڑے سے وا تھے۔ آنکھیں بند تھیں۔ ہاتھ پاؤں بالکل ٹھنڈے پڑ گئے تھے۔ میں نے اسے اٹھا کر صوفے پر لٹایا۔ اس کی ہتھیلیوں کی مالش کی۔ اسے ذرا سا جھنجھوڑا۔ اس کی نبض ٹھیک تھی۔ سانس بوجھل تھی مگر روانی سے آ رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ ایسی بے ہوشی صدمے یا شدید تناؤ کا نتیجہ ہوتی ہے۔ کچھ دیر بعد یہ نیم بے ہوشی یا پھر نیند میں بدل سکتی ہے۔ میں نے اس کا سر، چہرہ اور ہاتھ پاؤں ٹٹولے۔ وہ کسی سخت چوٹ سے محفوظ رہی تھی۔ ہاں سر کے پچھلے حصے میں معمولی چوٹ آئی تھی۔

میرے دل نے گواہی دی۔ شاہ زیب! یہ تاجور کا وہ جواب ہے جو وہ اپنی زبان سے نہیں دے سکی۔ یہ جواب اس کی 'حالت' نے دیا ہے۔ وہ تمہارا جانا نہیں سہہ سکی۔ میرے سینے میں سنسنی کی بلند لہریں اٹھ رہی تھیں۔ ایک ہیجان تھا جو سرتاپا پھیل گیا تھا۔ مجھے لگا میرے اندر اتنی توانائی پیدا ہو چکی ہے کہ میں بڑی سے بڑی مشکل سے ٹکرا کر تاجور کو اس مہلک گھیرے سے نکال سکتا ہوں۔

میں نے سجاول سے کال ملائی اور سرگوشیوں کے لہجے میں اس سے بات کی۔ ''کہاں ہوں سجاول؟''

''پارک کے سامنے والی سڑک پر۔ یونس وغیرہ بھی میرے پاس آ گئے ہیں۔ تمہارا کام ہوا؟''

''ہاں، میں اس وقت تاجور کے پاس ہی ہوں۔ اب ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔''

''اوئے خوش کیا ہے تم نے شاہی؟'' وہ ذرا جوش سے بولا۔ (وہ جوش و خروش اور خوشی کا اظہار کم ہی کرتا تھا)

میں نے کہا۔ ''اردگرد کیا پوزیشن ہے؟''

وہ بولا۔ ''دھماکے کے بعد کچھ افراتفری مچی تھی۔ پر اب سکون ہی ہے۔ ان اندھوں کو ابھی تک پتا نہیں چلا کہ گیس سلنڈر کے پھٹنے کی وجہ کیا ہے۔ ویسے اب پولیس کی ایک گاڑی آئی ہوئی ہے۔ کوٹھی کی پچھلی طرف کھڑی ہے۔ گاڑی کا معائنہ وغیرہ کر رہی ہے۔ مین گیٹ کی طرف اسی طرح دو تین گارڈ ٹہل رہے ہیں۔''

''چلو ٹھیک ہے۔ میں ابھی ان کا ٹھلنا بند کرتا ہوں۔ تم تیار رہو۔''

''کیا مطلب؟''

''تین اسٹکس میرے پاس ہیں۔ میں انہیں یہاں کسی مناسب جگہ پر پھاڑ رہا ہوں۔ جیسے ہی بلاسٹ ہو تم گاڑی چلا کر مین گیٹ کی طرف آؤ۔ بلکہ اپنی گاڑی کا رخ ابھی ٹھیک کر لو۔''

''ٹھیک ہے، ہم تیار ہیں۔'' سجاول نے پاٹ دار آواز میں کہا۔

میں نے احتیاطاً ہولسٹر میں سے ریوالور نکال لیا۔ بغیر آواز پیدا کیے دروازے کی کنڈی گرائی اور دائیں بائیں دیکھ کر باہر نکل آیا۔ میرے ٹراؤزر کی بڑی جیب میں وہ تینوں ڈائنامیٹ اسٹکس موجود تھیں جو یہاں ایک زوردار بلاسٹ پیدا کر کے میرے نکلنے کی راہ ہموار کر سکتی تھیں، تاہم میں یہاں کسی قسم کا جانی نقصان نہیں چاہتا تھا۔ یہاں تاجور کے علاوہ دین محمد صاحب اور ان کے دونوں بیٹے بھی موجود تھے۔ پھر ملازمائیں فردوس اور انوری بھی یہیں تھیں، اس کے علاوہ بھی بے گناہ لوگ تھے۔ میں نے اردگرد کا جائزہ لیا، پھر سیڑھیاں چڑھ کی چھت کی طرف بڑھا۔ ابھی میں چھت سے دور ہی تھا کہ سیڑھیوں کے موڑ پر ایک چھوٹا سا دروازہ نظر آیا، اس ادھ کھلے دروازے میں ایک بلب اسپارک کر رہا تھا۔ میں نے دیکھا یہ ''یو پی ایس'' کی جگہ تھی۔ ایک ہیوی ڈیوٹی یو پی ایس اور بجلی کے تار وغیرہ یہاں دکھائی دے رہے تھے۔ یہ مناسب جگہ تھی۔ یہاں بلاسٹ ہوتا تو کوٹھی میں لائٹ کا انتظام بھی درہم برہم ہو جاتا۔

میں نے اسٹکس نکالیں، یہ چھوٹے سائز کی تھیں پھر بھی میں نے تین کے بجائے دو اسٹکس استعمال کیں۔ ان کے مختصر سے فلیتے کو آگ دکھانے کے لیے لائٹر میں سجاول سے ہی لے آیا تھا۔ میں نے اسٹکس کو یو پی ایس کے باکس کے پاس ہی رکھا اور آگ دکھا کر پیچھے ہٹ آیا۔ اس کا جو نتیجہ نکلا وہ میری توقع اور خواہش کے عین مطابق تھا۔ میں آٹھ دس زینے اتر کر تاجور والے کمرے کے دروازے پر ہی پہنچا تھا کہ دھماکے سے در و دیوار لرز اٹھے اور اس کے ساتھ ہی گہری تاریکی پھیل گئی۔

کوٹھی کے مکینوں بلکہ اردگرد کے لوگوں کے لیے بھی یہ رات خاصی ''ناخوشگوار'' ثابت ہو رہی تھی۔ یہ دوسرا بلاسٹ تھا جس نے انہیں بستروں سے اچھلنے پر مجبور کر دیا ہوگا۔ پنسل ٹارچ میرے ہاتھ میں تھی۔ میں سیدھا اس جگہ پہنچا جہاں تاجور بے سدھ پڑی تھی۔ میں نے اسے ایک بڑی چادر میں لپیٹ کر کندھے پر ڈال لیا۔ ریشم کی طرح ہلکی اور پھولوں سے لدی

ہوئی ٹہنی کی طرح نازک۔

راحیل جو اتنی افراتفری کے باوجود اب تک سویا رہا تھا......اب ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھا۔ میں نے ٹارچ بجھا دی۔ ''کیا ہوا؟ کیا ہوا؟'' اس کی غنودہ آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ تب تک میں کمرے کے دروازے تک پہنچ چکا تھا۔

باہر ایک بار پھر دھما چوکڑی مچ گئی تھی۔ عورتیں باقاعدہ چلا رہی تھیں۔ دروازے دھڑا دھڑ بج رہے تھے۔ تاریکی نے مکینوں کو مزید بدحواس کر دیا تھا۔ سیڑھیوں میں بارود کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ غالباً یو پی ایس والے کیبنٹ میں تھوڑی سی آگ بھی لگ گئی تھی۔ میں تاجور کے ساتھ تیزی سے سیڑھیاں اترتا ہوا نیچے کوریڈور میں پہنچا۔ گاہے بگاہے میں ایک لمحے کے لیے پنسل ٹارچ بھی روشن کر لیتا تھا۔ میں نے گدرائے ہوئے جسم والی فردوس کی جھلک دیکھی۔ وہ سیڑھیاں چڑھنے کی کوشش میں گر گئی تھی۔ شاید اس کے سر پر چوٹ لگی تھی۔ وہ بیٹھی ہوئی تھی اور دونوں ہاتھوں سے سر تھام رکھا تھا۔ افراتفری کا ایسا عالم تھا کہ کسی نے میری طرف خصوصی توجہ نہیں دی۔ اگر کسی نے نیم تاریکی میں دیکھا بھی ہوگا تو یہی سمجھا ہوگا کہ ایک گارڈ کسی زخمی کو اٹھا کر خطرے والی جگہ سے دور لے جا رہا ہے۔

میں نے بائیں ہاتھ سے تاجور کو کندھے پر تھام رکھا تھا، دائیں ہاتھ میں ریوالور تھا اور کسی بھی خطرے کی صورت میں، میں اسے اپنے دفاع کے لیے استعمال کر سکتا تھا۔ فوراً ہی مجھے الیکٹرک فرم والی گاڑی کی ہیڈ لائٹس نظر آ گئیں۔ ڈرائیونگ سیٹ پر یونس خود بیٹھا تھا۔ گاڑی کا سلائیڈنگ ڈور کھول دیا گیا۔ میں نے پلک جھپکتے میں تاجور کو گاڑی کی لمبی نشست پر لٹا دیا۔ اس نے اب کسمسانا شروع کر دیا تھا، ہر کسی کی توجہ کوٹھی کی طرف تھی۔ شاید ہی کسی کو پتا چلا ہو کہ ایک سوزوکی ہائی روف یہاں رکی ہے اور اس میں کسی کو ڈالا گیا ہے۔

میں گاڑی کے اندر داخل ہوا اور سلائیڈنگ ڈور بند کر دیا۔ گاڑی تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ کہیں آگ کے آثار نہیں تھے۔ موقع پر جو تھوڑی سی آگ لگی تھی اسے یقیناً فوراً بجھا دیا گیا تھا۔ اس ساری کارروائی میں تھوڑا بہت مالی نقصان تو ہوا تھا لیکن کسی طرح کا جانی نقصان نہیں ہوا تھا اور یہ شکر کا مقام تھا۔

○......❖......○

رات گزر چکی تھی۔ دھیرے دھیرے صبح کا اجالا پھیل رہا تھا۔ کھڑکیوں سے باہر گیندے اور گلاب کے پھول اوس میں نہائے دکھائی دیتے تھے۔ وہ بھی آنسوؤں کی اوس میں نہائے کسی پھول جیسی ہی تھی۔ وہ ایک تکیے سے ٹیک لگائے آرام دہ بستر پر نیم دراز تھی۔ میں

نے اس کے سر کی چوٹ پر تھوڑی سی پائیوڈین لگا دی تھی۔ وہ سسک کر بولی۔ ''یہ سب کیا ہو گیا ہے شاہ زیب! وہاں میرے بارے میں کیا سوچا جا رہا ہو گا۔ اباجی کی کیا حالت ہو گی...... اور امی جان اور دوسرے......''

''اباجی کے سوا کسی کو کوئی پریشانی نہیں ہوئی ہو گی تاجور، بلکہ وہ خوش ہی ہوئے ہوں گے۔ دیکھنا وہ بہت جلد تمہاری ہمت کی داد دیں گے۔''

''للِ...... لیکن ان کو کیا پتا کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے، میں خود گئی ہوں...... یا کوئی مجھے زبردستی اپنے ساتھ لے گیا ہے...... یا پھر کچھ اور......''

''تم ان سب کو بتا دو کہ تم خود گئی ہو، کیونکہ تم جانتے بوجھتے اس اندھی کھائی میں گرنا نہیں چاہتی تھیں۔''

''مگر کیسے...... اور میری بات پر کون یقین کرے گا۔ وہاں جو کچھ آپ نے کیا ہے، وہ سب کے علم میں آچکا ہو گا۔ وہاں جو دو مرتبہ بارود کے دھماکے ہوئے...... وہ کس گنتی میں آئیں گے؟ ہر کوئی جان چکا ہو گا کہ وہ دھماکے صرف اس لیے تھے کہ چوکیداروں اور پولیس والوں کی توجہ ہٹائی جائے اور کوئی کوٹھی کے اندر داخل ہو سکے اور پھر باہر بھی نکل سکے۔''

''بھئی یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ دھماکوں والا چکر کوئی اور ہو...... اور تم نے بس اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھایا ہو۔ اس طرح کے حالات میں لوگ اس طرح کے فائدے اٹھاتے ہیں...... تم یہ سب کچھ اپنے اوپر کیوں لے رہی ہو؟ مجھے کسی نے اندر داخل ہوتے نہیں دیکھا، نہ ہی ہم دونوں کو باہر نکلتے دیکھا ہے۔ جب کوئی ثبوت نہیں ہے، گواہی نہیں ہے تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔''

اس نے ہاتھ کی پشت سے اپنے نازک رخسار سے آنسو پونچھے اور بولی۔ ''میں نے تو اپنی جوتی تک نہیں پہنی ہوئی تھی پھر کوئی اس بات پر یقین کیسے کر سکتا ہے کہ میں اپنی مرضی سے وہاں سے نکلی ہوں۔ پھر یہ بھی ممکن ہے کہ راحیل کو اس بات کا تھوڑا بہت شک ہو گیا ہو کہ کمرے میں میرے سوا کوئی اور بھی موجود ہے۔''

''اسے بالکل شک نہیں ہوا تاجور! اس وقت تک کوٹھی میں گہری تاریکی پھیل چکی تھی۔ باقی رہی تمہاری جوتی والی بات تو...... جب کوئی ہنگامی صورتِ حال میں موقع تاک کر بھاگتا ہے تو ضروری نہیں ہوتا کہ وہ جرابیں جوتی وغیرہ پہنے......''

''شاہ زیب! میرے سر پر تو دوپٹا بھی نہیں تھا۔''

''وہ چادر تو تھی جس میں، میں نے تمہیں لپیٹا تھا۔ اس نے دوپٹے کی کمی پوری کر دی۔''

وہ شکوک کا اظہار کر رہی تھی اور میں ہر شک کا جواب دلیل سے دے رہا تھا۔ دوپہر تک وہ کافی حد تک سنبھل گئی۔ اسے سکون بخش دوا کی آدھی گولی کھلا کر میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ ہم اس وقت یونس کے الیکٹریشن دوست شرافت علی کے گھر میں موجود تھے۔ اس کا یہ پانچ مرلہ مکان اسلام آباد اور راولپنڈی کے سنگم پر واقع تھا۔ شرافت علی کی بیوی اپنے بچوں سمیت اپنی والدہ کے گھر گئی ہوئی تھی۔ چھوٹے بھائی کو اس نے خود کسی کام سے لاہور روانہ کر دیا تھا۔ ہم دو چار دن بہ آسانی پوری رازداری کے ساتھ یہاں رہ سکتے تھے۔

سجاول نے چونکہ رات کا بیشتر حصہ جاگتے ہوئے ہی گزارا تھا لہٰذا اس وقت وہ سومن کا ریچھ ڈبل بیڈ پر لیٹا خراٹے لے رہا تھا۔ یونس اور شرافت ٹی وی کے سامنے موجود تھے۔ میں نے یونس سے پوچھا۔ ''کوئی نیوز آئی؟''

''نہیں...... اور یہ ہے حیرانی کی بات۔ لگتا ہے کہ میڈیا والوں کو وہاں تک جانے ہی نہیں دیا گیا۔''

شرافت علی بولا۔ ''بس اتنی خبر آئی ہے کہ کل رات چھوٹے سیکٹر نمبر چار میں رات کو دو بجے کے لگ بھگ زوردار ''کار سلنڈر'' دھماکا ہوا جس سے علاقے کے مکین خوف زدہ ہو کر گھروں سے باہر نکل آئے۔ کوئی جانی نقصان نہیں ہوا، تاہم گاڑی تباہ ہو گئی۔''

''دوسرے دھماکے کا ذکر نہیں آیا؟'' میں نے پوچھا۔

''کم از کم ہم نے تو کسی چینل پر نہیں سنا۔'' یونس پمپ والا نے جواب دیا۔

اندازہ ہو رہا تھا کہ داراب فیملی نے اپنے اثر رسوخ سے اور اپنے لمبے ہاتھوں کے ذریعے اس خبر کو دبا لیا ہے۔ تاجور کے غائب ہو جانے والی خبر کو بھی آؤٹ نہیں ہونے دیا گیا تھا مگر یہ بات تو طے تھی کہ اس کی تلاش پورے زور و شور سے ہو رہی ہو گی اور عین ممکن ہے کہ اب تک لاہور میں تاجور کے ماموؤں اور دیگر عزیزوں کے گھروں پر خفیہ چھاپے بھی مارے جا چکے ہوں۔

لالہ موسیٰ کے نواحی گاؤں میں خورسنہ اور اس کا بچہ گھر میں اکیلے تھے۔ شام کو میں نے سجاول کو زبردستی پنڈی واپس بھیج دیا، تاہم یونس میرے ساتھ ہی رہا۔ وہ مجھے وقاص کے نام سے جانتا تھا اور اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ کچھ عرصہ پہلے وہ تھوڑی دیر کے لیے مجھے کسی اور روپ میں دیکھ چکا ہے۔ اس کے سامنے میں آواز بدلنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتا تھا۔ میں نے تاجور کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ جب یونس یا شرافت میرے آس پاس ہوں تو مجھے میرے اصل نام سے نہیں پکارے۔ بہر حال ابھی تک ایسا موقع آیا ہی نہیں تھا کہ

تاجور نے اور میں نے ان دونوں کے سامنے بات کی ہو۔
رات کے وقت تاجور پھر بے چین ہونے لگی۔ وہ کچھ کھا پی بھی نہیں رہی تھی۔ میں نے اسے ہلکی سی ڈانٹ پلائی اور بمشکل چند لقمے کھلائے۔ وہ اپنی والدہ کی صحت کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین تھی۔ اس کے علاوہ چھوٹے بھائیوں راحیل اور اسفند کی یاد بھی اسے بری طرح ستا رہی تھی۔ میں اس سے تسلی تشفی کی باتیں کرتا رہا۔ میں نے اسے بتایا کہ اپنے والد کی ضد اور دارج دارابی کی ہوس کے جال سے نکل آنا اس کی بہت بڑی کامیابی ہے۔ میں نے ایک بار پھر اسے وہ آڈیو ریکارڈنگ سنائی جس میں محترم مولانا حبیب نے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔
پچھلی رات تو تاجور شدید ٹین شین میں تھی اس لیے اس نے یہ ریکارڈنگ زیادہ توجہ سے نہیں سنی تھی، تاہم اس مرتبہ اس نے دھیان سے اپنے بڑے ماموں کے خیالات سنے۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کا اضطراب کافی حد تک کم ہوا ہے۔ اس نے دلگیر آواز میں کہا۔ ''مجھے بڑے ماموں کی طرف سے بھی بہت پریشانی ہے، کہیں یہ نہ ہو کہ میرے اس طرح غائب ہو جانے کا الزام بھی بڑے ماموں پر آ جائے۔''
''اس بارے میں تم زیادہ فکر نہ کرو تاجور، تمہارے بڑے ماموں ایک باہمت شخص ہیں، ویسے بھی ان کے ارد گرد ان کے بہت سے بااثر عقیدت مند موجود ہیں۔ وہ ان کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہونے دیں گے۔''
''لیکن شاہ زیب! بڑے ماموں اور دوسرے خود کیا سوچیں گے میرے بارے میں! میرے ساتھ کیا ہوا ہے، میں کہاں گئی ہوں؟''
''تمہارے پاس بڑے ماموں کا نمبر ہو گا، میرے پاس بھی ہے، تم انہیں فون کرو بلکہ...... یہ بھی ٹھیک نہیں۔ تم انہیں اپنی ہینڈ رائٹنگ میں ایک خط لکھ دو اور بتا دو کہ ایک عاقل بالغ لڑکی کی حیثیت سے تم نے اپنی مرضی سے گھر چھوڑا ہے اور اب مکمل محفوظ جگہ پر ہو۔ فی الحال مجبوری ہے جس کی وجہ سے تم اپنا ٹھکانا نہیں بتا سکتی ہو۔''
تاجور خط لکھنے پر آمادہ تو ہو گئی لیکن وہ الجھن میں تھی، اس نے کہا۔ ''وہاں دو مرتبہ دھماکا ہوا میں اس کے بارے میں کیا لکھوں؟''
''تم اس سے خود کو بالکل لاتعلق ظاہر کرو۔ یہ بتاؤ کہ تم نے بس اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور وہاں سے نکل گئیں۔''
''شاہ زیب! یہ جھوٹ ہے۔ میں ماموں کو یہ جھوٹ کس طرح لکھوں اور یہ بھی

جھوٹ ہے کہ میں اکیلی وہاں سے نکلی ہوں۔''
''مگر تاجور، اس سارے خط میں جو اصل بات ہوگی وہ تو جھوٹ نہیں ہے، تم اس شکنجے سے نکلنا چاہتی تھیں اور تم نکل گئیں اور اب تم اپنی مرضی سے ایک بالکل محفوظ جگہ پر ہو۔ وقت آنے پر تم اپنا اتا پتا بھی بتا دو گی۔''
میں نے اسے قائل کر لیا تو اس نے اپنے بڑے ماموں کے نام دو صفحے کا ایک خط لکھ دیا۔ یونس ایک دن کے لیے لالہ موسیٰ جا رہا تھا۔ میں نے اسے لفافہ بند خط دے دیا اور ہدایت کی کہ وہ اس خط کو گجرات سے لاہور کے اس ایڈریس پر فوراً پوسٹ کر دے۔
ملازمہ فردوس کے سوا کسی کو معلوم نہیں تھا کہ بطور ڈرائیور وقاص میرا تاجور سے رابطہ رہا ہے اور میں اسے فون کرتا رہا ہوں۔ مجھے فردوس کی طرف سے تھوڑا سا اندیشہ تھا کہ کہیں کسی موقع پر وہ اپنی زبان نہ کھول دے۔ اگلے روز میں بذریعہ ٹیکسی پنڈی سے کچھ دور گوجر خاں میں پہنچا اور وہاں سے فردوس کو فون کیا۔ گوجر خاں آنے کا مقصد یہی تھا کہ میری لوکیشن وغیرہ ٹریس نہ ہو سکے۔ تیسری چوتھی کوشش پر فردوس سے رابطہ ہو گیا۔ وہ حسبِ معمول خوف زدہ تھی، میں نے عام سے لہجے میں پوچھا۔ ''کہاں ہو؟'' میں آواز بدل کر بول رہا تھا۔
''وہیں...... اسلاماں باد...... میں۔'' وہ ہکلائی۔
''اب بھی واش روم میں ہو؟''
''نن...... نہیں، چھت پر چڑھ کر بات کر رہی ہوں۔''
''ہاں پھر ہو گیا نکاح شکاح؟'' میں نے بدستور عام لہجے میں پوچھا۔
''نن...... نکاح...... نہیں ابھی نہیں ہوا۔ ایک دو دن آگے چلا گیا ہے۔'' وہ گول مول انداز میں بولی۔
میں سمجھ گیا کہ گھر کے ملازمین کو بھی سختی سے پابند کر دیا گیا ہے کہ وہ تاجور کی غیر موجودگی کے سلسلے میں اپنی زبان بند رکھیں گے۔ میں نے کہا۔ ''کیوں خیریت ہے، اس دارج خبیث سے تو ایک دن بھی صبر کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس بے چاری کی ماں اسپتال میں پڑی ہے اور وہ سہاگ رات منانے کے لیے دیوانہ ہوا پھرتا ہے۔''
''بب...... بس...... ان کی...... بیماری کی وجہ سے ہی لیٹ ہوا ہے۔'' فردوس نے پردہ داری کرتے ہوئے کہا۔ پھر ذرا توقف سے بولی۔ ''ویسے تم کہاں ہو وقاص بھائی؟''
''سکھیر امیں اور کہاں؟''
''پرسوں رات کہاں تھے؟'' اس کے لہجے میں ہلکا سا شک جھلک دکھا رہا تھا۔

''پرسوں بھی یہیں تھا...... لیکن تم کیوں پوچھ رہی ہو؟''

''کچھ...... نہیں......'' وہ ہکلائی پھر ذرا وقفہ دے کر کہنے لگی۔ ''جب تم نے پچھلی دفعہ بات کی تو ایسا لگتا تھا کہ...... تم...... یہ نکاح ہونے ہی نہیں دو گے۔''

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''کوئی بات نہیں۔ نکاح ہو بھی گیا تو وہ کون سا اڑ کر آسمانوں میں چلی جائے گی۔ رہے گی تو اسی زمین پر۔ یہاں سکھیرا ابھی آئے گی۔ کبھی نہ کبھی تو اپنا نشانہ بھی لگے گا اپنی شہزادی پر۔''

''وقاص! تم آگ سے کھیل رہے ہو۔''

''میں نے کہا ہے ناں کہ میں آگ سے نہیں کھیل رہا، میں خود آگ ہوں۔ اس دارج خبیث جیسی کوئی لکڑی میرا راستہ نہیں روک سکتی۔ روکے گی تو کوئلہ ہو جائے گی۔ بس تم ایک بات یاد رکھنا، تم نے میرے بارے میں اپنی زبان بالکل بند رکھنی ہے۔ اگر کسی وقت تم نے اس معاملے میں ایک لفظ بھی بولا تو پھر تمہاری اور تمہارے گھر بار کی خیر نہیں ہے۔''

وہ جیسے جھرجھری لے کر بولی۔ ''میں نے تم سے سو واری کہا ہے، میں کچھ نہیں بولوں گی، مر کر بھی نہیں بولوں گی۔''

فردوس سے بات ختم کرنے کے فوراً بعد میں پنڈی واپس روانہ ہو گیا۔ میں جانتا تھا میری غیر موجودگی میں تاجور کو اضافی پریشانی ہوگی۔

میں دوپہر دو بجے کے لگ بھگ واپس گھر پہنچا تو تاجور تکلیف میں تھی۔ اس کا رنگ زرد تھا اور وہ بری طرح کراہ رہی تھی۔ پرسوں رات جب وہ کمرے میں بے ہوش ہو کر گری تھی، اس کے سر اور کمر پر چوٹ آئی تھی۔ کمر کی چوٹ اس وقت تو زیادہ ظاہر نہیں ہوئی تھی مگر اب تکلیف دے رہی تھی۔ بائیں جانب والی پسلیوں میں گاہے بگاہے شدید ٹیس اٹھتی تھی۔ وہ پین کلر سے کام چلا رہی تھی مگر اب لگتا تھا کہ ڈاکٹر کو دکھانا پڑے گا۔ گرتے ہوئے، بیڈ کا کوئی حصہ اس کی پسلیوں سے ٹکرایا تھا اور وہاں گہرا نیل بھی دکھائی دیتا تھا۔ وہ بڑی ہمت والی تھی مگر اب اس سے برداشت نہیں ہو پا رہا تھا۔

مشکل یہ تھی کہ یہ سہ پہر ڈھائی تین بجے کا وقت تھا۔ اس وقت اکثر پرائیویٹ کلینکس میں ڈاکٹر موجود نہیں ہوتے۔ کسی بڑے اسپتال میں جانے کا سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ ہمارے میزبان شرافت علی نے پتا کیا اور چار بجے کے قریب ایک نزدیکی کلینک میں ڈاکٹر کی موجودگی کا علم ہوا۔ شرافت علی ایک ٹیکسی کار بھی لے آیا تھا۔ میں اس کار کے ذریعے کراہتی ہوئی تاجور کو کلینک لے گیا۔ ڈاکٹر نے معائنہ کیا، وہیں پر ایکسرے وغیرہ بھی ہوا۔

اس نے کہا۔ ''پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ پٹھے کی چوٹ ہے، آرام کرنے سے دو چار دن میں ٹھیک ہو جائے گی۔'' اس نے درد کش انجکشن بھی لگا دیا اور بیرونی استعمال کے لیے دوا بھی دی۔

تاجور کو کلینک میں ہی خاطر خواہ افاقہ ہو گیا۔ ہم اسی ٹیکسی کار میں واپس روانہ ہوئے۔ تاجور نے چہرے پر چادر کا نقاب کیا ہوا تھا۔ بس اس کی آنکھیں اور پیشانی کا کچھ حصہ ہی دکھائی دیتا تھا۔ وہ پچھلی نشست پر تھی، میں ڈرائیور کے ساتھ آگے تھا۔ گارڈ والی نیلی وردی سے میں نے کل ہی نجات حاصل کر لی تھی۔ اب میں شرافت علی کی فراہم کردہ ایک پینٹ شرٹ میں تھا۔ سر پر پی کیپ تھی جو میں نے پیشانی پر آگے تک جھکا رکھی تھی۔ میں جانتا تھا دارج داراب انگاروں پر لوٹ رہا ہوگا۔ اس کے ہرکارے ہر ممکنہ جگہ پر تاجور کو ڈھونڈ رہے ہوں گے۔ ہم بہ امر مجبوری گھر سے نکلے تھے ورنہ تاجور کے لیے اس گمنام گھر کی چار دیواری محفوظ ترین جگہ تھی۔

بعض اندیشے بڑی جلدی درست ثابت ہوتے ہیں۔ مجھے تاجور کے دیکھے جانے کا اندیشہ تھا اور اسے دیکھ لیا گیا...... لیکن ان لوگوں نے نہیں دیکھا جن کی طرف سے خطرہ تھا۔ اسے کسی اور نے دیکھا اور جس نے دیکھا وہ میرے یا تاجور کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ یقین نہیں آیا کہ وہ اس جگہ ہمارے آس پاس موجود ہے۔ وہ پہلوان حشمت راہی تھا۔ ہماری ٹیکسی ایک ٹریفک سگنل پر رکی ہوئی تھی۔ پہلوان ایک رکشا میں تھا اور رکشا ہماری ٹیکسی کے عین برابر میں تھا۔ وہیں سے پہلوان نے تاجور پر غور و خوض کیا تھا اور اسے پہچان لیا تھا۔ تاہم اسی دوران میں سگنل کھل گیا اور ٹریفک چل پڑا۔ اب حشمت راہی نے اپنا آدھا دھڑ رکشا سے باہر نکال لیا اور بہ آواز بلند پکارنے لگا۔ ''تاجور...... تاجور۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے ہاتھ لمبا کر کے ہماری ٹیکسی پر زوردار دستک بھی دی۔ تاجور کے منہ سے بے ساختہ ''ہائے اللہ'' نکلا اور وہ سہم کر رہ گئی۔ رکشا، ٹیکسی سے ذرا آگے نکل گیا۔ پہلوان نے ہیجانی انداز میں ہاتھ لہرایا اور ٹیکسی ڈرائیور سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''روکو...... گاڑی روکو۔''

ڈرائیور نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ پہلوان جس طرح رکشا سے باہر نکلا پڑ رہا تھا یوں لگتا تھا کہ وہ گر پڑے گا یا پھر رکشا کو ہی الٹا دے گا۔ میں نے ٹھنڈی سانس بھر کر ڈرائیور کی طرف دیکھا اور اثبات میں سر ہلایا۔ مطلب یہی تھا کہ وہ گاڑی روک دے۔

رکشا اور ٹیکسی دونوں سڑک کے کنارے ایک کھلی جگہ پر رک گئے۔ تاجور نقاب کی اوٹ

سے لرزاں آواز میں بولی۔ ''ہائے اللہ اب کیا ہوگا، یہ تو چاچا حشمت ہیں۔''

''اب بات تو کرنا ہی پڑے گی......لیکن میرے بارے میں کچھ نہیں بتانا۔''

تاجور نے ہاتھوں کی انگلیاں مروڑتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ پہلوان کسی قوی ہیکل مینڈک کی طرح پھدک کر رکشا سے باہر نکلا اور سیدھا ہماری طرف آیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کا منہ کچھ سوجا ہوا ہے۔ تاجور نے اپنی طرف والی کھڑکی کا شیشہ نیچے اتار دیا تھا۔ پہلوان نے آتے ساتھ ہی تاجور کے سر پر اپنا بھاری بھر کم ہاتھ پھیرا اور ہیجانی لہجے میں بولا۔

''مجھے اپنی نگاہوں پر یقین ناہیں آوت کہ تمہیں یہاں دیکھ رہا ہوں۔''

تاجور نے ایک بار پھر سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا اور میرا اشارہ سمجھ کر بولی۔

''چاچا جی! آپ گاڑی میں آجائیں، اس طرح باہر کھڑے ہو کر بات کرنا ٹھیک نہیں۔''

پہلوان حشمت نے کچھ کہنا چاہا، پھر ارادہ بدل کر بولا۔ ''ٹھیک ہے، میں اس رکشا والے کو فارغ کر لوں۔''

وہ اپنے بھاری جسم کو جھلاتا ہوا تیزی سے رکشا کی طرف گیا۔ اس میں سے اپنا ایک بیگ نکالا اور کرایہ ادا کر کے گاڑی کی پچھلی نشست پر تاجور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس نے ایک بار پھر تاجور کے سر پر پیار دیا۔ اس کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ اب اس پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دے گا لیکن تاجور نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کر دیا اور بولی۔ ''آپ میرے ساتھ چلیں پھر اطمینان سے بات کرتے ہیں۔''

تاجور کے رازدارانہ انداز کو دیکھ کر پہلوان نے اپنا مٹکا سا سر اثبات میں ہلایا پھر سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھنے لگا۔ تاجور نے کہا۔ ''انہوں نے میری بہت مدد کی ہے۔ میں ابھی گھر جا کر ان کے بارے میں آپ کو بتاتی ہوں۔''

''جانا کہاں ہے؟'' پہلوان نے پوچھا۔

''زیادہ دور نہیں۔'' تاجور نے کہا۔ میں نے ڈرائیور کو گاڑی آگے بڑھانے کی ہدایت کی۔

اپنے نقوش کی تبدیلی یعنی کاسمیٹک سرجری کے بعد اپنے کسی بھی شناسا سے ملنا ایک بہت انوکھا تجربہ ہوتا تھا۔ ایسے تجربے کی اصل کیفیت وہی بیان کر سکتا ہے جو اس میں سے گزرا ہو۔ آپ کسی کے سامنے ہوتے ہیں۔ وہ آپ کی اصل کو نہیں جان رہا ہوتا۔ آپ کے چہرے کو دیکھتا ہے، آپ کی آنکھوں میں کچھ ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہے، آپ کے حوالے سے ایک الجھن سی اس کے دل و دماغ میں جاگتی ہے۔ آپ کا اور اس دوسرے شخص کا تعلق

جتنا قریبی اور پرانا ہوتا ہے یہ الجھن اتنی ہی شدید ہوتی ہے۔

پہلوان حشمت نے بھی دو تین بار بڑے دھیان سے میری طرف دیکھا، کچھ کہنا بھی چاہا لیکن پھر تاجور کی ہدایت کے مطابق خاموش رہا۔ میرے ذہن میں ہلچل تھی۔ پہلوان کا ملنا ایک اتفاق ہی تھا مگر یہ اتفاق زیادہ مناسب موقع پر نہیں ہوا تھا۔ اگر ہم اسے پکارتا چھوڑ کر نکل جاتے تو یہ بھی کسی طور درست نہیں تھا۔ اسے ساتھ لے لینے میں ہی عافیت نظر آ رہی تھی۔

گھر میں پہنچتے ہی وہ بند ٹوٹ گیا جو پہلوان حشمت نے اپنی تیز رفتار گفتگو کے سامنے باندھ رکھا تھا۔ پہلوان نے چھوٹی چھوٹی داڑھی رکھ لی تھی اور وہ ٹھیک طرح بول بھی نہیں پا رہا تھا۔ گفتگو میں اس رکاوٹ کی وجہ اس کا سوجا ہوا منہ اور جبڑا تھا۔ پتا نہیں کہ یہ کس واقعے کا نتیجہ تھا۔

وہ تاجور پر سوالوں کی بارش کر رہا تھا تم یہاں کیسے؟ تم تو دین محمد کے ساتھ اسلام آباد گئی تھیں۔ سنا تھا تمہارا نکاح ہو رہا ہے۔ نکاح ہوا یا ناہیں۔ اور دین محمد صاحب کہاں ہیں؟ ہماری بہن کی حالت ٹھیک ہوئی یا ناہیں؟ میری سمجھ میں کچھ ناہیں آوت۔ تم نے شادی سے انکار تو ناہیں کر دیا؟“

تاجور نے نم آنکھوں کے ساتھ کہا۔ ”چاچا جی! آپ ایک ایک کر کے سوال پوچھیں گے تو شاید میں آپ کو جواب بھی دے سکوں۔“

”چلو جیسے تم ٹھیک سمجھت ہو مگر جواب تو دو۔“ پہلوان نے کہا۔

ساتھ والے کمرے کی کھڑکیاں کھلی تھیں، میں بند کرنے کے لیے آگے بڑھا۔ کھڑکیاں بند اور پردہ برابر کر کے واپس پلٹا تو پہلوان کے رونے کی آواز آئی۔ میں نے دروازے کی اوٹ سے دیکھا، وہ آنکھوں پر اپنا صافہ رکھے ہچکیوں سے رو رہا تھا۔ تاجور کی آنکھوں میں بھی نمی تھی۔ پہلوان کہہ رہا تھا۔ ”دیکھو، میری مت ہی ٹھکانے ناہیں رہی۔ کتنی اہم اور دکھ والی بات بھول گیا...... شاہ زیب کی موت کا جتنا دکھ ہوا شاید اپنے کسی خونی رشتے کا بھی ناہیں ہوتا۔ دو تین دن روتا ہی رہا۔ وہ یاروں کا یار تھا۔ سجاول سیالکوٹی کے ڈیرے پر اس نے جو کچھ میرے اور تمہارے لیے کیا وہ کوئی بھولنے والی بات ناہیں۔ اگر ہم دونوں وہاں سے صحیح سلامت نکلے تو یہ اس کی ہمت کی وجہ سے ہی تھا...... وہ...... وہ بہت چاہت تھا تم کو...... تمہارے لیے بہت کچھ کرنے کی خواہش رکھتا تھا۔ کاش تم دونوں کے ملنے کی کوئی سبیل نکل آتی۔“

یہ میری ”وفات حسرت آیات“ کا ذکر ہی ہو رہا تھا۔ اپنے ہوتے ہوئے اپنے نہ

ہونے کی باتیں سننا بھی عجیب تجربہ تھا۔ کسی وقت تو یوں لگتا تھا کہ میں ایک روح ہوں اور اپنے ''مرنے'' کے بعد اپنے لواحقین کے جذبات ملاحظہ کر رہا ہوں۔ پہلوان حشمت اور تاجور کے درمیان کچھ دیر میرے حوالے سے باتیں ہوئیں۔ پھر تاجور نے صفائی سے گفتگو اور سوالات کا رخ پہلوان کی طرف موڑ دیا۔ وہ بولی۔ ''چاچا جی، جس طرح آپ میرے بارے میں حیران ہیں، میں بھی بہت حیران ہوں۔ آپ یہاں کیسے؟ اور آپ کے منہ پر یہ چوٹ۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آپ سے یہاں راولپنڈی میں اس طرح ملاقات ہوگی۔''

پہلوان اب کافی حد تک خود کو سنبھال چکا تھا۔ اس نے صافے سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو وہی بات ہوئی کہ مرے تھے جن کے لیے وہ رہے وضو کرتے، بیٹا جی! یہ سارا معاملہ تمہارا ہی تو تھا۔ اب چاندگڑھی میں بھی ہر کسی کو معلوم ہو چکا ہے کہ دین محمد صاحب سب رشتے داروں کی مرضی' کے خلاف تمہاری شادی لاہور کے بہت امیر کبیر لوگوں میں کرنا چاھت ہیں۔ تمہارے بڑے ماموں مولوی حبیب صاحب نے اور تمہاری امی نے بھی اس رشتے کی سخت مخالفت کی۔ اس پر لاہور کے وہ بڑے لوگ تمہارے بڑے ماموں کے بھی سخت خلاف ہو گئے۔''

''بڑے ماموں خیریت سے تو ہیں ناں؟'' تاجور نے جیسے تڑپ کر کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ تم کو کچھ خبر ناہیں...... لیکن...... گھبراؤ ناہیں...... ویسے وہ خیریت سے ہی ہیں، مگر پچھلے دنوں کافی مشکل میں رہے ہیں۔ پولیس ان کو بالکل ناجائز طور پر گرفتار کرنا چاہ رہی تھی۔ ان کے عقیدت مندوں نے بہت بڑی تعداد میں جمع ہو کر پولیس کی یہ کوشش ناکام بنادی۔ چاندگڑھ سے بھی کئی لوگ یہ خبر سن کر لاہور پہنچے تھے۔ میں بھی ان میں شامل تھا۔ اچھا خاصا ہنگامہ ہوا۔ بعد میں بات بڑے پولیس افسروں تک اور میڈیا والوں تک پہنچ گئی۔ پولیس کو فی الحال تو مولوی صاب کی جان چھوڑنی پڑ گئی ہے۔ کل یہ اعلان بھی ہوا تھا کہ ان کے خلاف درج ہونے والا پرچہ خارج کر دیا جاوے گا۔''

میں دروازے کی اوٹ سے سب کچھ سن رہا تھا۔ تاجور نے اپنے ماموں جان کی خیر خیریت کے حوالے سے کچھ مزید سوالات پوچھے پھر پہلوان سے دریافت کیا کہ ان کے منہ پر یہ چوٹ کیسے لگی ہے۔ پہلوان نے کہا۔ ''بیٹا جی! تم کو تو معلوم ہی ہووے گا، ہم کے اپنے جھگڑے تو کم ہی ہووت ہیں، بس دوسروں کے جھگڑوں میں چوٹیں لگتی رہتی ہیں اور یہ چوٹ تو بڑی برکت والی ہے۔ ایسی دس چوٹیں میں مزید کھانے کو تیار ہوں۔''

تاجور کے استفسار پر پہلوان حشمت نے بتایا کہ پرسوں جب مولوی صاحب کو ان کے

گھر سے گرفتار کرنے کی کوشش کی گئی تو ان کے عقیدت مندوں اور پولیس میں باقاعدہ جھڑپ ہوئی۔ اس جھڑپ میں کسی ساتھی کی کہنی ان کے جبڑے پر لگ گئی۔ پھر پہلوان نے خود ہی کہا۔

''تاجور! تمہارا چاچا اتنا نرم نازک ناہیں ہے۔ اب بھی آج کل کے تین چار لونڈوں کو اکیلا ہی مار کر بھگا سکت ہوں۔ یہ دراصل ایک پرانی چوٹ تھی جو خوامخواہ تازہ ہوگئی۔''

پھر پہلوان حشمت نے تاجور کو وہی واقعہ سنایا جو کچھ عرصہ پہلے جاما جی میں مجھے بھی ٹیلی فون پر سنایا تھا۔ چاند گڑھی میں زمیندار کے دو بکروں کی لڑائی ہوئی تھی۔ ایک بکرے کا سینگ ٹوٹ گیا تھا۔ خدمت خلق کے جذبے سے سرشار ہو کر پہلوان بھاگا بھاگا وہاں پہنچا تھا اور بکرے کے سینگ کی مرہم پٹی کی کوشش کی تھی۔ جذبۂ خیر سگالی سے ناواقف بکرے نے ایک زوردار ٹکر پہلوان کو بھی رسید کر دی تھی اور جبڑے کا کڑا کا نکال دیا تھا۔

آخر میں پہلوان نے بتایا۔ ''بیٹا جی! میں نے گاؤں واپس جانے سے بہتر سمجھا کہ یہاں پنڈی آجاؤں۔ یہاں اپنی ایک پھوپی زاد رہتی ہے۔ سوچا دو چار روز اس کے گھر آرام کرلوں گا۔ یہاں پر ایک مشاعرے کا دعوت نامہ بھی آیا ہوا تھا۔ اگر جبڑے نے اجازت دی تو مشاعرہ بھی بھگتا لوں گا۔ میرے فرشتوں کو بھی خبر ناہیں تھی کہ پنڈی کی ایک سڑک پر میں تمہیں اس طرح ٹیکسی میں دیکھ لوں گا......''

پہلوان کا ذہن ایک بار پھر اپنے بے شمار سوالوں کی طرف منتقل ہو رہا تھا۔ میں موقع تاک کر اندر چلا گیا اور تاجور سے کہا۔ ''آپ کو اندر بلا رہے ہیں۔ ایک منٹ کے لیے بات سن لو۔''

تاجور بھی یقیناً کسی موقع کی ہی منتظر تھی۔ پہلوان سے مہلت لے کر باہر آگئی۔ ایک قریبی کمرے میں جا کر اس نے سرگوشی میں پوچھا۔ ''اب کیا کرنا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''پہلوان جی برے وقت پر ٹپکے ہیں۔ لیکن ان کو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ہم ان کو جانے دیتے تو پنڈی میں ہماری موجودگی کی بات نہ جانے کہاں تک پھیل جاتی۔''

''میں آپ کی بات سمجھ رہی ہوں۔ ویسے شاہ زیب...... پہلوان چاچا بھروسے کے بندے ہیں۔ امی جی ان کو بھائی کہتی ہیں اور ان سے دکھ سکھ بھی بانٹتی ہیں۔ یہ کبھی ہمارے گھر کی بات باہر نہیں کرتے۔ آپ بھی جانتے ہیں کہ عام لوگوں کے لیے بھی محبت اور ہمدردی ان میں بہت زیادہ ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے تاجور، مگر موجودہ حالات میں انہیں کیا بتاؤ گی؟''

''یہی تو پوچھ رہی ہوں۔''

میں نے تھوڑی دیر مراقبے میں رہنے کے بعد کہا۔''اس بات کا تو مجھے بھی پتا ہے کہ پہلوان حشمت پیٹ کا ہلکا نہیں ہے۔ یہ بات بھی ظاہر ہو رہی ہے کہ وہ تمہارے ماموں جان کے عقیدت مندوں میں سے ہے ورنہ چاند گڑھی سے پولیس کے ڈنڈے کھانے کے لیے لاہور کیوں پہنچتا۔ حق سچ کا ساتھ دینے والے لوگ ہی اس طرح بغیر کسی مفاد کے خود کو خطرے میں ڈالتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تم پہلوان حشمت کو بھی وہ سب کچھ بتا ڈالو جو مولانا حبیب اللہ کو اپنے خط میں لکھا ہے۔''

''یعنی میں شادی والے گھر سے بھاگ آئی ہوں؟''

''بالکل، تم کو جھجکنا نہیں چاہیے تاجور! تم نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے۔ تم پہلوان کو بھی بتادو کہ تمہیں اسلام آباد کے اس گھر سے بھاگنے کا ایک موقع ملا اور تم نے اس سے فائدہ اٹھایا۔''

''آپ کے بارے میں انہیں کیا بتاؤں؟ وہ ابھی تک آپ کو پہچاننے میں ناکام ہیں۔''

''فی الحال کچھ بھی کہہ دو کہ میں اور شرافت، شاہ زیب کے قریبی دوست ہیں، اور ہم نے تمہیں پناہ دی ہے۔ تم ہم پر پورا...... مکمل اعتماد کرتی ہو۔''

''آپ کے بارے میں پہلوان چاچا الجھن میں نظر آرہے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ آپ کی آواز پر بھی غور کر رہے ہوں۔ آپ کا کیا خیال ہے دو چار دن کے ساتھ میں وہ آپ کو پہچان نہیں لیں گے؟''

''چلو، اگر پہچان لیں گے تو پھر دیکھا جائے گا۔'' میں نے کہا اور تاجور کو کچھ ضروری ہدایات دے پہلوان حشمت کے پاس واپس بھیج دیا۔

دروازے کی اوٹ سے میں نے دیکھا۔ پہلوان حشمت ایک بار پھر صافے کی مدد سے آنسو پونچھ رہا تھا۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ میرے ذکر نے اسے افسردہ کیا ہے۔ جونہی تاجور اندر داخل ہوئی وہ سرتاپا سوال بن کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے تاجور سے پہلا سوال یہی کیا کہ وہ اسلام آباد سے یہاں کیسے پہنچی ہے اور اس کا نکاح ابھی ہوا ہے یا نہیں؟

تاجور نے ٹھہر ٹھہر کر اور مکمل رازداری کی شرط کے ساتھ، بڑے سلیقے سے پہلوان حشمت کو اس کے سارے سوالوں کے جواب دیئے۔ اس کی ساری بات سننے کے بعد پہلوان نے ایک بار پھر بڑے جذباتی انداز میں تاجور کے سر پر پیار دیا اور اشکبار لہجے میں کہا۔ ''بیٹا جی! تم نے کچھ برا نہیں کیا، تم کو یہی کرنا چاہیے تھا۔ میرا دل کہوت ہے کہ اگر مولوی جی

یہاں ہوتے تو وہ بھی اسی طرح تمہارے سر پر پیار دے کر یہی بات کہتے۔ اللہ اچھا کرے گا، سب اچھا ہو جائے گا۔"

پھر پہلوان نے تاجور سے میرے اور شرافت کے بارے میں پوچھا۔ تاجور نے میرا نام وقاص بتایا اور ہم دونوں کے حوالے سے وہی کچھ کہا جو میں نے اسے بتایا تھا۔ اس دوران میں پہلوان نے وہ بات بھی کہی جس کا ہمیں اندیشہ تھا۔ وہ بولا۔ "تاجور بیٹا! یہ جس کا نام تم وقاص بتا رہی ہو...... مجھے......اس کی شکل...... کچھ جانی پہچانی لگت ہے۔ جیسے کہیں......دیکھا ہوا ہے اس کو......"

پھر وہ ایک دم جیسے چونک کر بولا۔ "یہ شاہ زیب کا بس دوست ہی ہے، یا دور پاس کا رشتے دار بھی ہے؟"

"ہاں، یہ ان کی برادری کا ہے۔" تاجور نے مدھم آواز میں کہا۔

"شکل بھی کچھ کچھ ملت ہے۔" پہلوان نے الجھن آمیز لہجے میں جواب دیا۔

پہلوان حشمت موجودہ صورتِ حال کے حوالے سے بہت جذباتی ہو رہا تھا۔ وہ جلد از جلد جاننا چاہتا تھا کہ تاجور کا آئندہ لائحہ عمل کیا ہے، اس کی رائے تھی کہ وہ فوراً اپنے بڑے ماموں جان سے رابطہ کرے۔

تاجور نے اس حوالے سے سوچ بچار کے لیے ایک دو روز مانگے اور پہلوان حشمت کو قائل کر لیا کہ وہ نہ صرف راز داری برتے گا بلکہ راولپنڈی میں اپنا قیام یہیں اس گھر میں رکھے گا۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ تاجور پہلوان حشمت کو اپنے ایک "بڑے" کی حیثیت سے دیکھ رہی ہے اور اس کی آمد سے کچھ راحت بھی محسوس کر رہی ہے۔

یہاں پہنچنے سے پہلے پہلوان حشمت کو کچھ علم نہیں تھا کہ تاجور اپنے والدین سے علیحدہ ہو کر کہیں جا چکی ہے۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ داراب فیملی اور دین محمد وغیرہ نے تاجور کی گمشدگی کی خبر مکمل طور پر چھپالی ہے اور اسے تن دہی سے ڈھونڈ رہے ہیں۔

انجکشن اور دوا کے بعد تاجور اب بہتر محسوس کر رہی تھی۔ اس کی پسلیوں کی چوٹ کے لیے پہلوان حشمت نے اسے ایک تیر بہدف نسخہ بتایا۔ حالانکہ یہی نسخہ اس کے جبڑے کی چوٹ پر فیل ہو چکا تھا۔ پہلوان حشمت جب بولنے پر آتا تھا تو نان اسٹاپ بولتا تھا۔ بہر حال اس کے اخلاص اور انسان دوستی کے جذبے سے کسی کو انکار نہیں تھا۔ اگلے دو روز میں، میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ اس کی موجودگی میں تاجور خود کو نسبتاً ایزی محسوس کر رہی ہے اور پہلوان نے اس کا دھیان بھی پریشان کن سوچوں کی طرف سے ہٹا رکھا ہے۔ شروع میں تو

پہلوان حشمت نے کہا تھا کہ تاجور، مولانا حبیب اللہ سے رابطہ کرے مگر بعد میں اس پر زیادہ زور نہیں دیا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس وقت ہر طرف تاجور کو ڈھونڈا جا رہا ہوگا۔ دارج دار اب اسے دبوچ کر پنجرے میں ڈالنے کے لیے بے تاب ہوگا۔

اب بھی ساتھ والے کمرے میں تاجور اور پہلوان کے درمیان گفتگو ہو رہی تھی اور میں دروازے سے لگ کر کھڑا سن رہا تھا۔ تاجور نے پوچھا۔ ''چاچی اور بچے چاند گڑھی میں ہی ہیں؟''

''نہیں۔'' پہلوان نے ذرا افسردگی سے کہا۔ ''آج کل کافی برا وقت چل رہا ہے۔ تمہاری چاچی جھگڑ کر اپنی ماں کے گھر چلی گئی ہے۔ چاروں بچوں کو بھی لے گئی ہے۔ ڈھائی تین مہینے ہونے کو آئے ہیں نہ اس نے کوئی رابطہ کیا، نہ میں نے۔''

''آپ نے کیوں نہیں کیا؟''

''سوچتا ہوں کہ کچھ وقت وہ وہاں گزار ہی لے تو اچھا ہے۔ وہ کیا شعر ہے، کون سے میاں بیوی ہیں جن میں کھٹ پٹ نہیں ہوتی...... محبت سچی ہو تو دوری سے گھٹ نہیں ہوتی۔ کچھ خرچہ میں بھیج دیوت ہوں۔ کچھ اس کے ماں باپ کر لیوت ہیں۔''

''لگتا ہے کہ آج کل ہاتھ بھی تنگ ہے آپ کا؟''

''اصل بات یہی ہے بیٹا جی کہ اب ہڈی جوڑ کا کام بڑا مندا پڑ گیا ہے۔ دیہاتوں کے سیانے بیانے لوگ بھی ڈاکٹروں کے پاس بھاگت ہیں۔ ویسے بھی اب ڈانگ سوٹے کی لڑائیاں تو ہوتی ناہیں جن میں ہڈیاں ٹوٹتی تھیں۔ اب تو فائر مارا اور بندہ پار کر دیا۔ آج کل تو میں ہڈیاں جوڑنے کے بجائے شعر جوڑنے پر زیادہ توجہ دے رہا ہوں، کچھ نہ کچھ آمدن ہو جاوت ہے۔ یہاں راولپنڈی میں مجھے اکثر بلایا جاوت ہے مشاعروں میں۔''

تاجور نے کہا۔ ''تو پھر کیوں نہ آپ کچھ دن یہاں راولپنڈی میں ہی رہیں۔ مجھے آپ کی وجہ سے بڑا سہارا مل رہا ہے چاچا جی۔''

''وہ تو کوئی بات ناہیں، مگر چاند گڑھی میں لوگ پریشان ہوں گے کہ حشمت کہاں غائب ہو گیا۔ مولانا والے معاملے میں گیا تھا، کہیں پولیس کے ہتھے نہ چڑھ گیا ہو۔''

''آپ وہاں کسی کو فون کر دیں کہ آپ خیر خیریت سے ہیں اور کچھ دن یہاں راولپنڈی میں ہی رہیں گے۔''

پہلوان نیم رضامند ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ تاجور اس وقت مشکل میں ہے اور وہ دوسروں کی مشکلات رفع کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا تھا۔ یہ اس کی شخصیت کا بڑا خوب صورت

پہلو تھا۔

اس نے سرگوشی کے لہجے میں تاجور سے پوچھا کہ وہ میرے اور شرافت کے حوالے سے پوری طرح مطمئن ہے؟''

تاجور نے اپنے بالوں کی لٹوں کو کانوں کے پیچھے اڑستے ہوئے کہا۔''ہاں چاچا! یہ دونوں شاہ زیب کے سچے دوست ہیں۔ وہ شرافت تو مجھے بالکل بہن کی طرح سمجھتا ہے۔ یہ جو چادر میں نے اوڑھی ہوئی ہے یہ اسی نے میرے سر پر رکھی تھی۔''

''اور وہ دوسرا وقاص؟'' پہلوان نے ذرا الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔

''وہ بھی بڑے اچھے ہیں۔''

''پتا نہیں کیوں اسے دیکھ کر مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ شخص کچھ گھنا سا ہے۔ اس کی آواز بھی...... کچھ سنی سی لگتی ہے۔ رشتے میں یہ کیا تھا شاہ زیب کا؟''

''زیادہ قریب کا رشتہ تو نہیں، لیکن رشتہ ہے۔'' تاجور نے گول مول جواب دیا اور پھر گفتگو کا رخ پہلوان کے سوجے ہوئے جبڑے کی طرف موڑ دیا۔ اس نے پریشانی ظاہر کی کہ پہلوان کے جبڑے کی سوجن نہیں اتر رہی۔

پہلوان نے مخصوص انداز میں کہا۔''جس طرح عاملوں اور فقیروں کی دعائیں خود اپنے اوپر اثر نہیں کرتیں، اسی طرح شاید حکیموں اور پہلوانوں کے نسخے بھی خود پر بیکار جاتے ہیں۔ سوچ رہا ہوں کہ کل ٹائم نکال کر کسی ڈاکٹر کو ہی دکھا لوں۔ اس بارے میں میرا ایک بڑا مشہور قطعہ ہے۔

سب کی طرف سے سب کو سلام آنا چاہیے
حکیم ہو یا ڈاکٹر بس کام آنا چاہیے
علاج میں ہار جیت کا کوئی چکر نہیں ہوتا
علاج سے بس مریض کو آرام آنا چاہیے

میں نے بے شمار دنوں کے بعد تاجور کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی اداس مسکراہٹ دیکھی۔

مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ پہلوان کا یہاں موجود ہونا اور ہمارے ساتھ رہنا بڑا سودمند ثابت ہو گا۔ ہم زیادہ دن یہاں شرافت علی کے گھر میں نہیں رہ سکتے تھے۔ عین ممکن تھا کہ یونس ہمارے لیے کسی علیحدہ گھر کا انتظام کر دیتا۔ ایسی صورت میں بھی تاجور کو اکیلا چھوڑ کر کہیں جا نہیں سکتا تھا۔ پہلوان حشمت کی صورت میں اسے ایک ''بڑے'' کا تسلی بخش سہارا مل جاتا۔ اس کے علاوہ بھی پہلوان حشمت کئی طرح سے ہماری معاونت کر سکتا تھا۔

میں نے شام کے وقت تاجور سے اکیلے میں بات کی۔ وہ ابھی تک اسی لباس میں تھی جس میں اسلام آباد والے نیم سرکاری بنگلے میں ٹھہری ہوئی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ بازار جاؤں اور اس کے لیے کچھ کپڑے اور جوتے لے آؤں۔ (وہ ابھی شرافت کی بیوی کی چپل سے گزارا کر رہی تھی) میں نے کہا۔ ''تاجور! میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ پہلوان حشمت کو اپنے بارے میں بتا دیا جائے......''

''میں بھی یہی سوچ رہی ہوں...... وہ بار بار آپ کے بارے میں سوالات پوچھ رہے ہیں، جیسے کسی شک میں ہوں۔''

''لیکن ایک دم سب کچھ بتانا بھی مناسب نہیں۔ تم پہلے مرحلے میں ان کو آگاہ کرو کہ شاہ زیب کے بارے میں بھی آس موجود ہے۔ شرافت علی نے کچھ کھوج لگایا ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ لاہور گلبرگ والے بلاسٹ میں شاہ زیب کے بچ جانے کی امید ہے۔''

''ٹھیک ہے، جیسے آپ کہتے ہیں...... ویسے یہ چاچا حشمت کے لیے بہت بڑی خبر ہو گی۔''

''دوسرے مرحلے میں اسے یہاں میری موجودگی کے بارے میں بتا دو۔ پتا نہیں کہ کاسمیٹک سرجری وغیرہ کا اسے پتا ہے یا نہیں، لیکن وہ بات سمجھ جائے گا۔''

وہ بولی۔ ''میرے پاس تو آپ کی سرجری والی تصویریں بھی ہیں۔ اگر آپ کہتے ہیں تو وہ بھی دکھا دیتی ہوں۔ شاید بات پوری طرح اس کی سمجھ میں آجائے۔''

''وہ بھی دکھا دو۔ مگر اصل بات یہی ہے کہ پہلے اسے پوری طرح رازداری کا پابند کرنا ہے...... اور یہ سمجھانا ہے کہ فی الحال میرا روپوش رہنا ہی میری زندگی کا ضامن ہے۔''

میں نے تاجور کو اس حوالے سے تفصیلی ہدایات دے دیں۔

اس رات سونے سے پہلے میں نے حشمت راہی والے کمرے میں جھانکا۔ ٹیوب لائٹ میں اس کی آنکھیں اشکبار دکھائی دیتی تھیں۔ ایک دو آنسو اس کی چھوٹی چھوٹی کھچڑی داڑھی میں بھی چمک رہے تھے۔ میں نے پہلی بار اسے نماز پڑھتے دیکھا۔ میں جان گیا کہ تاجور نے پہلے مرحلے کی آگاہی پہلوان کو دے دی ہے۔ یعنی میرے زندہ ہونے کے حوالے سے اسے کچھ نہ کچھ بتا دیا ہے۔

سجاول کے ڈیرے پر قیام کے دوران میں میرے اور پہلوان کے درمیان کافی انسیت پیدا ہو گئی تھی اور بہت سے دیگر لوگوں کی طرح یقیناً پہلوان نے میری ''موت'' کا گہرا دکھ محسوس کیا تھا۔ یہ بات بھی حقیقت ہے کہ جب اپنے کسی قریبی کو بالکل کھو کر دوبارہ پایا جاتا

ہے تو دل و دماغ کی کیفیت عجیب ہوتی ہے۔ اس طرح کے ایک دو تجربے مجھے پہلے بھی ہوئے تھے۔ ایک تجربہ تو جاما جی میں ہی ہوا تھا۔ زینب کے زندہ ہونے کی نوید سن کر ابراہیم پر جو شادی مرگ طاری ہوئی تھی وہ میں کبھی بھول نہیں سکتا تھا۔ میرا اور پہلوان کا تعلق اتنا قریبی تو نہیں تھا...... پھر بھی تعلق تو تھا۔

اگلے روز دوسرا مرحلہ بھی طے ہو گیا۔ شام کا وقت تھا۔ سجاول کا فون آیا ہوا تھا (جاما جی میں بیگم نورل کی موت کا اس نے گہرا دکھ محسوس کیا تھا۔ جاما جی میں بیگم نورل نے اسے بھائی کا درجہ دیا تھا اور اس کی دی ہوئی انگوٹھی آج بھی سجاول کی انگلی میں چمکتی تھی۔ اس وقت بھی وہ بیگم نورل کی بات ہی کر رہا تھا۔ بیگم نورل نے اپنے سوتیلے بھائی رائے زل کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لیے بے مثال طریقے سے موت کو گلے لگایا تھا) ابھی میری اور سجاول کی بات جاری ہی تھی کہ اچانک ایسے لگا جیسے توپ کا گولا دروازے سے آ ٹکرایا ہے۔ یہ پہلوان حشمت تھا جو دروازے کی چولیں ہلاتا ہوا اندر داخل ہوا۔ کچھ دیر سکتے کی سی حالت میں کھڑا میری طرف دیکھتا رہا پھر ہیجانی انداز میں بولا۔ ''تم...... تم...... شاہ زیب ہو؟''

میں نے فون بند کیا اور اسے جیب میں رکھتے ہوئے ٹھنڈی سانس بھری۔ ''آپ کو کیا لگتا ہے پہلوان جی؟''

اس کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ آنکھوں سے آنسو اُمڈ پڑے۔ وہ بھاگ کر آیا اور مجھ سے لپٹ گیا۔ میں نے خود کو گرنے سے بمشکل بچایا۔ مجھے زور زور سے آگے پیچھے جھلانے کے بعد اس نے خود کو پیچھے ہٹایا۔ ایک بار پھر مجھے دھیان سے دیکھنے کے بعد اپنے جن جپھے میں لے لیا۔ ''مجھے یقین ناہیں آ رہا۔ لگت ہے کہ کوئی سپنا دیکھ رہا ہوں۔''

اس نے پھر پیچھے ہٹ کر میرا چہرہ دیکھا اور دوبارہ مجھے گلے لگایا۔ یہ عمل ایک بار مزید دہرانے کے بعد وہ بے دم سا ہو کر میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ ''مجھے پہلے دن سے ہی کچھ شک ہووت تھا۔ جب بھی تم کو دیکھت تھا۔ مجھے لگت تھا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ دال میں کچھ غلط ہے...... اگر آج بٹیا مجھے خود نہ بتاتی تو ہو سکت تھا کہ میں خود تمہارے بارے میں کچھ کھوجنے کی کوشش کرتا۔''

میں نے اسے بتایا کہ اپنے خدوخال میں یہ تبدیلی مجھے کس مجبوری کے تحت کرانا پڑی ہے اور فی الحال یہ میرے لیے کس قدر اہم ہے۔ میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ یہ عارضی ہے۔ بات کرتے کرتے پہلوان کی آنکھوں میں پھر آنسو آ گئے، کہنے لگا۔ ''میری سمجھ میں بالکل نہیں آوت تھا کہ تاجور بٹیا اس طرح اس چاردیواری میں دو غیر مردوں کے ساتھ کس طرح رہ رہی

ہے......اور یہ بات بھی سمجھ نا ہیں آ رہی تھی کہ وہ ان بڑے لوگوں کے چنگل سے کس طرح نکل پائی ہے لیکن اب سب کچھ سمجھ میں آ رہا ہے......سب کچھ آ رہا ہے۔''

میں نے پہلوان کو آگاہ کرتے ہوئے کہا۔''پہلوان جی! آپ نے بھی خبروں وغیرہ میں سن لیا ہوگا کہ کچھ غیر ملکی قاتل یہاں موجود ہیں۔ انہیں ابھی تک پوری طرح یقین نہیں آیا کہ میں ختم ہو چکا ہوں۔ مجھے شک ہے کہ وہ اب بھی میری ''موت'' کی تصدیق کر رہے ہوں گے۔ ہوسکتا ہے کہ ان کے مددگاروں نے چاند گڑھی اور سکھیرا وغیرہ پر بھی نگاہ رکھی ہوئی ہو۔ یہ راز اب آپ کے پاس ایک امانت ہے کہ میں ابھی راہی عدم نہیں ہوا ہوں۔''

پہلوان حشمت نے پوچھا۔''میرے علاوہ اور کس کس کو پتا ہے؟''

''صرف دو افراد۔ اور وہ بھی پورے بھروسے کے لوگ ہیں۔''

''ایک تو انیق ہووے گا۔''

''نہیں پہلوان جی، وہ بھی نہیں۔''

میرے جواب نے پہلوان کو حیران کیا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن پھر ارادہ بدل دیا۔ میری طرف دیکھ کر بولا۔''شام کا وقت ہے۔ اذان ہو رہی ہے۔ میں اوپر والے کو حاضر ناظر جان کر عہد کرت ہوں کہ کوئی میرے ٹکڑے بھی کر دیوے گا تو یہ بات میں اپنی زبان پر نہیں لاؤں گا۔'' اس کی آنکھوں میں اب بھی آنسو لشکارے مار رہے تھے۔

رات کو تاجور نے پہلوان حشمت کی پسندیدہ ڈش گڑ والے چاول بنائے جن میں سونف، بادام اور کشمش ڈالی گئی تھی۔ ساتھ میں چکن کڑاہی اور روغنی نان تھے جو شرافت علی بازار سے لایا تھا۔ شرافت کے ساتھ ہم بہت کم بات چیت کر رہے تھے۔ میں نے پہلوان کو یہ بھی سمجھا دیا تھا کہ اگر شرافت کے سامنے مجھے مخاطب کرنے کی ضرورت پڑے تو وہ مجھے وقاص کے نام سے ہی بلائے گا۔

وہ ایک سرد رات تھی۔ میں اور پہلوان حشمت کمبل اوڑھے ساتھ ساتھ بچھی چارپائیوں پر لیٹے تھے۔ پہلوان نے کہا۔''شاہ زیب! میں سمجھت ہوں کہ اوپر والے نے تمہیں ایک نئی زندگی دی ہے۔ اس نئی زندگی کا شکریہ ادا کرنے کا بہترین طریقہ میں تمہیں بتاؤں؟''

میں سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔

وہ میرا ہاتھ تھام کر بولا۔''تم تاجور سے شادی کرلو۔ میں بہت اچھی طرح جانت ہوں تم اس سے پیار کرت ہو......اور وہ بھی تم سے کرت ہے۔ سجاول سیالکوٹی کے ڈیرے پر میں نے سب کچھ دیکھ لیا تھا اور سمجھ لیا تھا، اگر اوپر والے نے تمہیں یہ موقع دیا ہے تو اس کو کھونا

ناہیں۔"

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "کیا وہ اس کے لیے تیار ہو جائے گی؟"

"کیوں ناہیں ہووے گی۔ جب وہ اپنی مہندی سے ایک رات پہلے تمہارے ساتھ چلی آئی ہے تو...... پھر باقی کیا رہ گیا ہے۔ اس نے بہت بڑا قدم اٹھایا ہے شاہ زیب! اور میں تمہیں تجربے کی بات بتاوت ہوں۔ کامیابی زندگی میں ایک بار بندے کا دروازہ ضرور کھڑکھڑاوت ہے۔ دروازہ کھل جاوے تو اندر آ جاوت ہے ورنہ واپس چلی جاوت ہے۔" وہ کیا شعر ہے۔

سچی محبت کرنے والوں کی مراد آخر بر آتی ہے
ملن کی رت ایک بار، دروازہ ضرور کھڑکاتی ہے

میں نے کہا۔ "پہلوان جی، آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ مگر ابھی تک تاجور نے نکاح کے حوالے سے میرے ساتھ کوئی اقرار نہیں کیا ہے۔ کسی وقت وہ مجھے سخت الجھن میں لگتی ہے۔"

"تو پھر تم وقت ضائع کیوں کرت ہو؟ دیکھو کسی بھی وقت یہ سنہری موقع تم دونوں کے ہاتھ سے نکل سکت ہے۔ تم آج ہی اس سے کھل کر بات کرو، بلکہ ابھی کرو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اگر میری ضرورت پڑی تو اس کو منانے میں تمہاری مدد کروں گا۔"

اس رات میرے اور تاجور کے درمیان ایک اہم گفتگو ہوئی۔ یہ راولپنڈی کی ایک خنک رات تھی۔ کمرے کا دروازہ بند تھا لیکن اسے بولٹ نہیں کیا گیا تھا۔ تاجور گم صم سی صوفے پر بیٹھی تھی۔ میں اس کے سامنے والے صوفے پر تھا۔ میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے، میں تمہاری بات تسلیم کرتا ہوں۔ ایک موقع تھا کہ میں نے اس سلسلے میں مسلسل خاموشی اختیار کی۔ کوئی پیش رفت نہیں کی۔ تم سے کوئی ٹھوس بات نہیں کی لیکن اس کی وجہ تم جانتی ہو اور تمہارا دل بھی اچھی طرح جانتا ہے۔ میں بڑے سخت دشمنوں کے گھیرے میں تھا۔ میرے خون کی پیاس نے ان کو دیوانہ کر رکھا تھا۔ مجھے بالکل امید نہیں تھی کہ میں ان سے بچ جاؤں گا۔ وہاں لاہور میں جو کچھ بھی ہوا ہے وہ بالکل اچانک اور حیران کن طور پر ہوا ہے۔ یوں لگا ہے کہ میری مسلسل تڑپ کے نتیجے میں قدرت نے میرے لیے اچانک ایک راستہ پیدا کیا ہے۔ مجھے ایک نئی شناخت ملی ہے تاجور! اور اسی شناخت کے بل بوتے پر آج میں خود کو اس قابل سمجھتا ہوں کہ اپنے اور تمہارے بارے میں کوئی بات کر سکوں۔"

وہ ایک توقف کے ساتھ بولی۔ "مجھے نہیں لگتا شاہ زیب کہ میں آپ کے قابل ہوں۔ میں...... خود میں ایسی کوئی خوبی نہیں پاتی جس کی وجہ سے میں آپ کے ساتھ زندگی گزارنے

کی خواہش کرسکوں۔"

"یہ خود سے نہیں، مجھ سے پوچھو کہ تم میں کوئی ایسی خوبی ہے یا نہیں تاجور! میں تمہاری ہی قسم کھا کر کہتا ہوں، اگر تم میرے سوال کا جواب ہاں میں دو گی تو میں خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھوں گا۔ آج مجھے کھلے الفاظ میں کہہ لینے دو تاجور! کہ میں تم سے پیار کرتا ہوں۔ شاید اسی دن سے اور اسی لمحے سے جب میں نے تمہیں پہلی بار لاہور میں شاہی قلعہ کے احاطے میں دیکھا تھا۔ تم کچھ لوفروں سے بچنے کے لیے میری جانب آئی تھیں۔ وہ بہت پرانی بات ہے تاجور لیکن میری نگاہوں کے سامنے آج بھی اسی طرح نئی اور تازہ ہے۔ پچھلے برسوں میں تمہارا وہ تصور اور منظر ہزاروں بار میری نگاہوں کے سامنے سے گزرا ہے۔"

وہ میری طرف دیکھے بغیر، عجیب لہجے میں بولی۔ "آپ کی پرواز بہت اونچی ہے شاہ زیب، میں زمین پر رینگنے والے ایک عام جاندار کی طرح ہوں۔ ایک سیدھی سادی پینڈو۔ نہ کوئی ایسی خوبی نہیں مجھ میں جس پر فخر کرسکوں۔ آپ......"

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "تاجور جب تم میری اونچی پرواز کی بات کرتی ہو تو میں اس میں چھپے ہوئے درد اور طنز کو سمجھتا ہوں۔ تم نے ملنگی ڈیرے پر میرا وہ روپ دیکھا جس نے تمہیں دلی طور پر مجھ سے بدظن کیا۔ ایک موقع پر ریشمی کے سامنے مجھے "پردے والی سرکار" کو اپنے ہاتھوں سے قتل کرنا پڑا۔ اس طرح کے واقعات نے تمہارے اندر ایک خوف پیدا کیا۔ مجھ سے لگاؤ رکھنے کے باوجود تم مجھ سے دور ہوگئیں۔ میں ایک ایسے غنڈے اور قاتل کے روپ میں تمہارے سامنے آیا جو دن رات خطروں میں گھرا رہتا ہے اور جس کے نزدیک اپنی اور دوسروں کی زندگی کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ میں نے کبھی انکار نہیں کیا تاجور۔۔۔ شاید...... میں واقعی ایسا ہی تھا۔ دنیا کی ساری برائیاں مجھ میں موجود تھیں لیکن...... اب میں نہیں ہوں تاجور، میں بدل چکا ہوں۔ تم نے مجھے بدل دیا ہے تاجور! مجھے یقین ہے جب تم ٹھنڈے دل سے سوچتی ہو گی تو تمہارا دل بھی گواہی دیتا ہوگا کہ میں شراب، عورت اور مار دھاڑ جیسی "بدعادتوں" سے بہت دور آ گیا ہوں۔ اب وہ شاہ زیب نہیں ہوں تاجور جسے تم نے پہلے چاند گڑھی اور پھر ملنگی ڈیرے پر دیکھا تھا۔ میری طرف دیکھو تاجور...... اور مجھے دیکھ کر بتاؤ، کیا میں وہ ہوں؟"

اس کی پلکیں بے ساختہ لرزیں لیکن اس نے نظر اٹھا کر میری طرف نہیں دیکھا۔ اس کی پیشانی پر حیا آمیز پسینے کی چمک تھی۔ یہ میری "اونچی پرواز" کا ذکر کر کے اس نے جو سوال اٹھایا تھا اس کا میں نے تسلی بخش جواب دیا تھا۔

مزید وضاحت کرتے ہوئے میں نے کہا۔ ''تاجور! آج میں اقرار کرتا ہوں کہ تمہارے بغیر میں ادھورا ہوں۔ خود کو مکمل کرنے کے لیے مجھے تمہارے سوا اور کچھ نہیں چاہیے۔ اگر تم کہو گی تو ہم سب کچھ چھوڑ کر کسی گمنام گوشے میں چلے جائیں گے۔ اپنی اس نئی شناخت سے میں تمہارے ساتھ ایک نئی زندگی شروع کر دوں گا۔ اگر ہمیشہ کے لیے نہیں تو ہم کم از کم اس وقت تک روپوش رہیں گے جب تک ہمارے اردگرد حالات تسلی بخش نہیں ہو جاتے۔''

رات آہستہ آہستہ آگے کو سرکتی رہی۔ میں نے آج اپنا دل کھول کر تاجور کے سامنے رکھ دیا تھا۔ وہ ساری محبت...... وہ ساری سچائی اور وہ ساری آرزوئیں جو اس کے حوالے سے میرے دل میں موجود تھیں میں نے اس پر آشکار کر دی تھیں۔

وہ پتھر کی طرح تھی لیکن پتھر نہیں تھی۔ اگر پتھر ہوتی تو پھر اس رات اسلام آباد کے اس عالیشان بنگلے کے کمرے میں چکرا کر فرش پر نہ گر جاتی۔ ہاں وہ پتھر نہیں تھی۔ وہ پتھر کی شکل کا موم تھی اور جب وہ پگھلنا شروع ہوئی تو پھر پگھلتی چلی گئی۔ اس نے کئی گلے شکوے بھی کیے۔ کئی اندیشوں کا اظہار بھی کیا۔ اپنے والدین اور اپنے بھائیوں سے دوری کا درد بھی اس کے حواس پر چھایا لیکن اس سب کے باوجود اس کا پگھلتا ہوا موم گواہی دے رہا تھا کہ وہ آج کی شب مجھے مایوس کر کے یہاں سے نہیں اٹھے گی۔

اور اس نے واقعی مایوس نہیں کیا۔ کچھ بھی تھا وہ ایک لڑکی تھی۔ اپنی زبان سے واضح اقرار تو نہیں کر سکتی تھی مگر جو کچھ اس نے کہا وہ میرے لیے کافی تھا۔ وہ بولی۔ ''میں بڑے ماموں جان کی باتیں ایک بار پھر سننا چاہتی ہوں۔ وہ باتیں سن کر مجھے بڑا حوصلہ ملتا ہے۔ کاش اس وقت وہ میرے پاس ہوتے۔ میری طرف سے جو فیصلہ کرنا ہوتا وہ خود کرتے۔''

''تم سمجھو تاجور، وہ اب بھی تمہارے ساتھ ہیں۔ اپنی اس ریکارڈ شدہ آواز کے ذریعے انہوں نے تم تک جو پیغام پہنچایا ہے، اس میں شک شبے کی کوئی گنجائش نہیں۔ مجھے ایک سو ایک فیصد یقین ہے تاجور، تم جب بھی ان سے ملو گی، وہ تمہیں اپنے بولے ہوئے ایک ایک لفظ کے ساتھ کھڑے نظر آئیں گے۔''

اس نے ایک گہری سانس لی۔ اس کی شفاف گردن پر سامنے کی طرف ایک چھوٹا سا خوشنما گڑھا پڑا۔ اس ملاقات میں اس نے پہلی بار پلکیں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر حیا آمیز سرخی تھی۔ وہی سرخی جو خاص موقعوں پر یلغار کر کے اس کے چہرے کی طرف آتی تھی۔ ''مجھے کچھ سوچنے دیں۔'' اس نے کہا اور جلدی سے اٹھ کر اندر چلی گئی۔

اس نے کہا تھا...... مجھے کچھ سوچنے دیں......لیکن میں جانتا تھا کہ وہ کافی کچھ سوچ چکی ہے۔اس کے چہرے پر پھیلنے والی حیا آمیز سرخی نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔

وہ اپنے کمرے میں چلی گئی تھی اور دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ پتا نہیں کیوں میرا دل مچلا کہ اسے دیکھنے کی کوشش کروں۔ میں نے کھڑکیاں دیکھیں وہ مکمل طور پر بند تھیں، میں نے موہوم امید کے سہارے ''کی ہول'' سے آنکھ لگائی۔ وہ مجھے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی نظر آئی لیکن وہ آئینے کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ اس نے اپنے بندھے ہوئے بال کھولے جو کسی حسین ریشمی رات کی طرح اس کے کشادہ شانوں پر بکھر گئے۔ وہ ان میں برش کرنے لگی۔ اس نے رخ تھوڑا سا پھیرا تو اس کا چہرہ بھی میری نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھی۔ ایک حیا آمیز مدھم مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر تھی۔ اس کے ذہن میں شاید انہی باتوں کی بازگشت تھی جو تھوڑی دیر پہلے میں نے اس سے کہی تھیں۔ جی چاہا اس منظر کو ہمیشہ کے لیے اپنی آنکھوں میں قید کر لوں۔

پھر اس نے عجیب دلربا انداز میں نفی میں سر ہلایا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے ایک نگاہ آئینے پر ڈالی اور بالوں کو جوڑے کی شکل میں باندھا۔ پورے مشرق کا حسن جیسے اس کے دراز قد پیکر میں سمٹ آیا تھا۔ اب وہ دروازے کی طرف آ سکتی تھی۔ میں جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔

پہلوان حشمت نے ٹھیک ہی کہا تھا...... ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ بہت بڑے لوگوں سے بہت بڑی ٹکر لی تھی ہم نے۔ کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا تھا۔ میں اس سلسلے میں سجاول سے مشورہ کرنا چاہتا تھا۔ اگر سجاول اور خورسنہ یہاں آ جاتے اور پہلوان حشمت بھی تاجور کے بزرگ کی حیثیت سے یہاں موجود ہوتا تو کسی مہربان نکاح خواں کا انتظام کر کے نکاح پڑھوایا جا سکتا تھا۔

میں سجاول کو فون کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اس کا فون آ گیا۔ وہ میری اور تاجور کی تازہ ترین صورتِ حال جاننے کے لیے صبح سے تین بار فون کر چکا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس نے اب بھی اسی حوالے سے فون کیا ہے مگر یہ ایک دوسری بات تھی۔ اس کے لہجے نے ہی مجھے سمجھا دیا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ وہ چھوٹتے ہی بولا۔ ''شاہی! مجھے لگتا ہے کہ تمہارا انکو شہزادہ مصیبت میں ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس کے کسی ساتھی منور کا فون آیا ہے، بڑا سیریس قسم کا فون تھا۔''

''کچھ بتاؤ بھی کیا ہوا ہے؟''

''مجھے لگ رہا ہے کہ تیرے ڈنمارک والے ''یاروں'' سے انیق کا پیچا پڑ گیا ہے۔ یا تو

اس نے خود ان کو جا ٹکر ماری ہے یا پھر انہوں نے اسے ڈھونڈ نکالا ہے۔ فون کے ساتھ ہی ٹرپل ٹو سے فائرنگ کی آوازیں بھی آئی ہیں۔ مجھے تو یہی اندازہ ہوا ہے کہ فون کرنے والا منور بھی مارا گیا ہے یا زخمی ہوا ہے۔"

"فون کیا تھا؟" میں نے دھڑکتے دل کو سنبھال کر پوچھا۔

جواب میں سجاول نے ہنگامی لب و لہجے میں جو کچھ بتایا اس سے پتا چلا کہ ابھی کوئی دس منٹ پہلے انیق کے موبائل فون سے اس کے دوست منور کی کال آئی۔ وہ بری طرح ہانپا ہوا تھا اور لگ رہا تھا کہ کسی سے بچنے کے لیے بھاگ رہا ہے۔ بھاگتے بھاگتے ہی اس نے بتایا کہ کچھ غیر ملکی نقاب پوش انیق کو پکڑ کر یہاں گوجرانوالہ والی نہر کے پاس لے آئے ہیں۔ نہر سے تھوڑے فاصلے پر نیلی اور سفید ٹائیلوں والی دو منزلہ کوٹھی ہے۔ ان کے ارادے بہت برے ہیں۔ ابھی منور نامی وہ لڑکا یہیں تک کہنے پایا تھا کہ تین فائر ہوئے۔ لڑکے کے کراہنے اور گرنے کی آواز آئی۔ ایسے لگا تھا کہ وہ پانی میں گرا ہے۔

میں نے سجاول سے پوچھا۔ "تمہارا اپنا کیا خیال ہے۔ اس میں کسی ڈرامے کا چانس کتنے فیصد ہے؟"

"فیصد کا تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا مگر جو کچھ سنا ہے وہ تو ٹھیک ہی لگ رہا ہے۔" سجاول کی آواز میں بھی پریشانی نمایاں تھی۔

"تو پھر...... تمہارا کیا مشورہ ہے؟"

"تمہارا تاجور کے پاس رہنا ضروری ہے۔ ویسے بھی پنڈی سے گوجرانوالہ کا فاصلہ چار گھنٹے سے کم کا نہیں ہے۔ میں یہاں سے ایک ڈیڑھ گھنٹے میں وہاں پہنچ سکتا ہوں۔ گوجرانوالہ میں اپنے ایک دو بندے بھی ہیں۔ میں دیکھ لیتا ہوں کہ کیا ہوا ہے۔"

"نہیں سجاول، یہ ٹیکساری گینگ ہے۔ تم نے بے شک بڑے بڑے بدمعاش دیکھے ہیں اور ان سے مارا ماری بھی کی ہے لیکن یہ بالکل اور ٹائپ کے لوگ ہیں۔ ان کو صرف میں ہی سمجھ سکتا ہوں، میرا وہاں پہنچنا ضروری ہوگا۔ تم ایسا کرو کہ داؤد بھاؤ کو فون کر کے اس سے صورتِ حال جاننے کی کوشش کرو اور مجھے بتاؤ۔"

"تمہارے کہنے سے پہلے ہی میں اس کے نمبر پر کوئی دس بار ٹرائی کر چکا ہوں۔ وہ رابطے میں نہیں ہے۔"

"اچھا کاغذ قلم لو اور یہ ایک دوسرا نمبر لکھو۔ یہ بھاؤ کے قریبی ساتھی مختار جھارے کا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس سے بات ہو جائے۔"

سجاول نے خورسنہ کو آواز دی اور اس نے میرا بتایا ہوا نمبر نوٹ کیا۔ میرے دل و دماغ میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ مجھے انیق کی طرف سے مسلسل اندیشے تھے۔ ٹیکساری گینگ کے شیطان اپنے دشمن کو تو کہاں معاف کرتے تھے وہ اس کے ہمنواؤں اور قریب والوں کو بھی عبرت کا نشان بنا دیتے تھے۔ لاہور میں ان سفاک قاتلوں کے ساتھ میرا جو خونی ٹکراؤ ہوا تھا اس میں انیق پیش پیش رہا تھا۔ اس کے علاوہ مختار جھارا اور لودھی وغیرہ نے بھی میرا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ لودھی تو خیر ان کا شکار بن چکا تھا مگر مجھے جھارے اور انیق کی مسلسل فکر تھی اور لگ یہی رہا تھا کہ آج یہ فکر حقیقت کا روپ دھار گئی ہے۔

وہ سارے حسین رومانی خیالات جو تھوڑی دیر پہلے میرے رگ و پے میں بے مثل شادمانی جگا رہے تھے، کہیں سینے کی گہرائی میں دبک گئے۔ میں بے قراری سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ قریباً دس منٹ بعد سجاول کا فون پھر آیا۔ اس نے کہا۔ ''مختار سے بھی رابطہ نہیں ہوا۔ پہلی کال پر دو دفعہ بیل گئی پھر فون بند کر دیا گیا۔ اب مسلسل بند ہی جا رہا ہے۔''

میں جانتا تھا کہ مختار جھارے کی حیثیت داؤد بھاؤ کے دست راست کی ہے۔ جس نمبر پر سجاول نے بات کی تھی وہ کبھی بھی بند نہیں ملتا تھا۔ اس کا بند ہونا بھی گڑبڑ اور خطرے کی نشاندہی کرتا تھا۔ میں نے حتمی لہجے میں کہا۔ ''سجاول! تم گوجرانوالہ پہنچو، اگر وہاں کوئی ساتھی ہیں تو ان کو بھی الرٹ کر دو، لیکن میرے پہنچنے سے پہلے تم نے کسی بھی طرح کی کوئی کارروائی نہیں کرنی۔''

''تم ان لوگوں کو ضرورت سے زیادہ ''ہوا'' بنا رہے ہو، یا پھر مجھ پر بھروسا نہیں۔''

''تم پر بھروسا ہے سجاول، اور ان کو ضرورت سے زیادہ ہوا بھی نہیں بنا رہا۔ بس تمہاری منت کر رہا ہوں۔ میرے آنے سے پہلے کچھ نہیں کرنا۔''

''تاجور کو کیا بتاؤ گے؟''

''اس کی فکر نہ کرو۔ شرافت علی اور پہلوان حشمت ہیں یہاں۔ بس میں روانہ ہو رہا ہوں یہاں سے۔ تم اپنا فون کھلا رکھنا۔''

''تم چار گھنٹے سے پہلے یہاں نہیں پہنچ سکو گے۔''

''میں موٹروے سے آ رہا ہوں۔ زیادہ دیر نہیں لگے گی۔''

''یار، تمہارے پہنچنے تک ہم اس کوٹھی کا کھوج لگانے کی کوشش تو کر سکتے ہیں ناں۔'' سجاول نے بگڑے لہجے میں کہا۔

مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ زیادہ ہی نہ بگڑ جائے۔ میں نے کہا۔ ''چلو کر لو کوشش لیکن اپنے

وعدے پر قائم رہنا۔ میرے پہنچنے سے پہلے کوئی کارروائی نہ کرنا۔''
''اچھا یار۔'' اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

○......❖......○

رات کا آخری پہر تھا جب میں گوجرانوالہ انٹرچینج سے گزر کر شہر میں داخل ہو گیا۔ اس وقت شہر کی سڑکوں پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ سجاول شہر سے دو تین کلومیٹر کے فاصلے پر لب سڑک ایک ریسٹورنٹ کے اوپن ایریا میں موجود تھا۔ اسے ڈھونڈنے میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ یہاں تک سفر کرنے کے لیے میں نے شرافت علی والی ہائی روف سوزوکی ہی استعمال کی تھی۔ گاڑی اچھی حالت میں تھی اور میں نے بہ آسانی 120 کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کر لیا تھا۔

جس وقت میں سجاول کے پاس پہنچا وہ سیل فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ اس کے سامنے میز پر چائے کے لوازمات رکھے تھے اور ایش ٹرے میں سگریٹ کے بہت سے ٹکڑے نظر آ رہے تھے۔ سجاول کے دو مقامی ساتھی بھی مؤدب انداز میں کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ ان کی شکلیں دیکھ کر ہی کہا جا سکتا تھا کہ وہ مرنے مارنے والے دبنگ افراد ہیں۔ میں نے اس سے پہلے انہیں نہیں دیکھا تھا، اگر دیکھا بھی ہوتا تو اس بدلی ہوئی شکل و شباہت کے ساتھ مجھے ان کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا (یعنی پہچانے جانے کا خطرہ نہیں تھا)

سجاول نے فون پر گفتگو ختم کی اور سگریٹ کا طویل کش لے کر بولا۔ ''دو بندے موٹر سائیکلوں پر گئے ہوئے ہیں۔ نہر کے ساتھ ساتھ ڈھونڈ رہے ہیں۔ ابھی نیلی سفید ٹائلوں والی کوٹھی کا کوئی کھوج نہیں ملا۔''

''اصل میں ہمیں ایریا کا بھی تو پتا نہیں۔ اس نے آبادی وغیرہ کا نام نہیں لیا تھا؟'' میں نے دریافت کیا۔

''میں نے بتایا ہے ناں شاہی، وہ بھاگتے بھاگتے بڑی افراتفری میں بات کر رہا تھا لیکن جب اس نے گوجرانوالہ والی نہر کہا ہے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ نہر کا وہ حصہ جو گوجرانوالہ شہر کے نزدیک سے گزرتا ہے۔''

''مختار جھارے یا گروپ کے کسی اور بندے سے تو رابطہ نہیں ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''سجاول نے اس کا جواب نفی میں دیا۔ میں نے کہا۔ ''داؤد بھاؤ اور اس کے ساتھی وقتاً فوقتاً روپوش ہو جاتے ہیں...... لگ رہا ہے کہ اس وقت بھی وہ ایسے ہی پیریڈ سے گزر رہے ہیں۔''

اسی دوران میں تازہ چائے اور لوازمات آ گئے۔ لب سڑک واقع اس ریستوران والے

سجاول سے کافی مرعوب نظر آتے تھے۔ آج کل وہ کلین شیوڈ ہو چکا تھا۔ لباس بھی سفاری سوٹ ٹائپ کا تھا۔ اس کے باوجود اپنے بھاری بھرکم جسم اور بارعب چہرے کے ساتھ وہ دیکھنے والے پر اپنی ہیبت بٹھا دیتا تھا۔

اچانک سجاول کے سیل فون پر پھر کال کے سگنل آئے۔ دوسری طرف اس کا مقامی ساتھی ہی تھا۔ اس نے ہیجانی انداز میں اطلاع دی کہ نہر سے کچھ فاصلے پر نیلی اور سفید ٹائلوں والی دومنزلہ کوٹھی کا کھوج لگ گیا ہے۔

میں نے فون سجاول کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔ میں نے سجاول کے کارندے سے پوچھا۔ ''تمہیں یقین ہے کہ یہ وہی کوٹھی ہے؟''

''بالکل جناب! جونشانیاں سردار نے بتائی ہیں ان کے مطابق تو یہ وہی ہے۔ نہر سے کوئی آدھا کلومیٹر ہٹ کر درختوں کے اندر ہے۔ سیمنٹ اور بجری کی چھوٹی سی سڑک ہے جو کوٹھی تک جاتی ہے۔''

''تم کوٹھی سے کتنی دور ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''فرلانگ سے جیادہ کا فاصلہ ہوگا جی۔''

''دیکھو......تھوڑا سا اور پیچھے ہٹ جاؤ۔ ہمارے پہنچنے سے پہلے کسی طرح کی کوئی حرکت نہیں کرنی ہے۔ یہ بڑے خطرناک لوگ ہیں، تمہارا ساتھی کہاں ہے؟''

''وہ بھی میرے نال ہی ہے جی۔ جرا پیشاب کرنے جھاڑیوں میں گیا ہے۔''

''اس کو بھی سمجھا دو۔ میں فون سردار کو دے رہا ہوں۔ اسے ٹھیک طرح سے موقع بتا دو۔''

میں نے فون دوبارہ سجاول کو تھما دیا۔ سجاول نے اپنے کارندے سے بات کی۔ کچھ ہی دیر بعد ہم اپنی پلاننگ کے مطابق دو گاڑیوں پر سوار ہو کر موقعے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یہ رات کے ساڑھے تین چار بجے کا وقت تھا۔ میں اور سجاول ایک کارندے کے ساتھ ٹویوٹا جیپ میں تھے۔ ڈرائیونگ کارندہ کررہا تھا۔ ایک ہنڈا اکارڈ گاڑی میں سجاول کے پانچ مسلح ساتھی ہمارے عقب میں آرہے تھے۔ سجاول کے تین چار ساتھی موقع پر بھی موجود تھے۔ ہماری گاڑی میں چھوٹی نال کی ایک کلاشنکوف اور اے کے 57 رائفل موجود تھی۔ فالتو راؤنڈ بھی کافی تعداد میں نشستوں کے نیچے خاص طریقے سے چھپائے گئے تھے۔ پلاننگ کے مطابق پہلے میں نے اور سجاول نے آگے جانا تھا۔ ضرورت پڑنے پر دیگر ساتھیوں کو بھی بلایا جا سکتا تھا۔ جو شخص ہماری گاڑی کی ڈرائیونگ کررہا تھا۔ وہ ایک سابق پولیس انسپکٹر تھا۔ سجاول

نے اسے ہدایت کر رکھی تھی کہ موقع پڑنے پر وہ فوراً مقامی پولیس کو بھی اس معاملے میں ''انوالو'' کر لے۔

ہم موقع پر پہنچے۔ درختوں میں گہری تاریکی تھی۔ نہر کی طرف سے آنے والی ہوا ٹھٹھری ہوئی تھی۔ سجاول کے اسلحہ بردار اور چادر پوش ساتھی درختوں میں موجود تھے۔ دور تقریباً نصف فرلانگ کی دوری پر وہ نیلی اور سفید ٹائلوں والی کوٹھی نظر آ رہی تھی۔ اس کی زیادہ تر کھڑکیاں تاریک تھیں۔ صرف گیٹ اور ایک دو کمروں میں روشنی دکھائی دیتی تھی۔ سجاول کے ساتھی انو نے بتایا کہ یہاں رکھوالی والے کتوں کی موجودگی ثابت نہیں ہوئی۔ موقع محل کا جائزہ لینے کے بعد اور ڈسکشن کے بعد طے ہوا کہ میں کوٹھی کے اندر گھسنے اور مین گیٹ کھولنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں نے یہ کوشش عقبی جانب سے کرنا تھی۔ ضرورت پڑنے پر سامنے کی طرف سجاول کے ساتھیوں نے ہوائی فائر کرنے تھے تاکہ اندر موجود لوگوں کی توجہ بٹ جائے۔

سجاول کے ساتھیوں میں سے انو نامی نوجوان کافی چاق چوبند نظر آتا تھا۔ میں نے اس کو اپنے ساتھ رکھنے کا فیصلہ کیا۔ سجاول کے پاس دو بلٹ پروف جیکٹس بھی موجود تھیں جو اس نے زبردستی مجھے اور انو کو پہنا دیں۔ سی سی ٹی وی کیمروں کے آثار تو نظر نہیں آتے تھے، تاہم بڑی احتیاط سے گھنے درختوں اور جھاڑیوں کے اندر چلتے ہم کوٹھی کی عقبی باؤنڈری کی طرف بڑھے۔ یہ الگ تھلگ کوٹھی کسی زمیندار یا مقامی کارخانے دار کی دکھائی دیتی تھی۔ ایک جگہ میں رک گیا۔ یہاں کسی چوڑے ٹائروں والی گاڑی کے گزرنے کے نشانات تھے۔ میں نے نیچے بیٹھ کر سیل فون کی ٹارچ کی روشنی میں جائزہ لیا۔ انو بھی دیکھ رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ''تمہاری موجودگی میں تو کوئی گاڑی یہاں سے نہیں گزری؟'' اس نے نفی میں جواب دیا۔ میں نے کہا۔ ''غور سے دیکھو، پتا چلتا ہے کہ اس بڑی جیپ کو یہاں سے گزرے زیادہ دیر نہیں ہوئی۔''

''یہ اندا جا آپ نے کیسے لگایا۔'' انو نے پوچھا۔

''اردگرد کی زمین پر اوس ہے۔ مٹی پر ٹائروں کے جو نشان ہیں وہ تازہ ہیں۔ یہاں اوس کا گیلا پن نہیں ہے۔ میرے اندازے کے مطابق یہ نو دس سیٹوں والی بڑی جیپ تھی۔ یہ اشارہ بھی مل رہا ہے کہ یہ یہاں سے نکل کر بڑی سڑک کی طرف گئی ہے۔''

''جرور ایسا ہوا ہوگا۔ نشان بھی تا جے ہی لگ رہے ہیں۔'' انو بولا۔

دیوار کے اوپر خاردار تاروں کی باڑ تھی مگر سجاول کے ساتھی انو کے پاس ایک بڑا بوریا موجود تھا۔ ایسے بوریے نوک دار سلاخوں اور خاردار تاروں پر ڈال کر ان کو آسانی سے پار کیا جا

سکتا ہے۔

میرے سینے میں شعلے سے لپک رہے تھے۔ انیق میرا وہ پیارا ساتھی تھا جس کی بے مثال محبت اور دلیری نے قدم قدم پر میرا ساتھ دیا تھا اور اب اگر وہ میرے بدترین دشمنوں کے چنگل میں تھا تو اس کی زندگی اور سلامتی کے لیے مجھے اپنی جان ہتھیلی پر رکھنا بالکل آسان محسوس ہوتا تھا۔ میرے دائیں ہاتھ میں چھوٹی نال کی کلاشنکوف تھی جسے باؤنڈری وال کے بالکل پاس پہنچ کر میں نے کندھے سے لٹکا لیا۔ میں نے مضبوط جسم والے انو کے کندھوں پر پاؤں رکھے اور وہ مجھے لے کر کھڑا ہو گیا۔ اب میں گیارہ بارہ فٹ اونچی چار دیواری کے اندر جھانک سکتا تھا۔ پلان کے مطابق اب یہ موقع تھا کہ میں فون پر مسڈ کال دے کر سجاول کو ہوائی فائر کرنے کا کہہ سکتا تھا مگر اچانک مجھے محسوس ہوا کہ ہمیں ہوائی فائرنگ والا خطرہ مول نہیں لینا چاہیے (ایسی صورت میں اردگرد موجود پولیس کی کوئی گشتی پارٹی بھی متوجہ ہو سکتی تھی) مجھے لگ رہا تھا کہ جیسے اس کوٹھی میں کچھ زیادہ مزاحمت موجود نہیں ہے۔ میری نگاہوں کے سامنے ایک بار پھر چوڑے ٹائروں کے وہی نشانات گھومے جو میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے دیکھے تھے۔

کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ ٹیکساری گینگ کے وہ شیطان صفت ہرکارے یہاں سے نکل چکے ہوں۔ میں نے خاص طریقے سے تہ کیا گیا بوریا خاردار تاروں پر ڈالا اور پھرتی سے اندر کود گیا (میرے کندھے کا کامیاب آپریشن جاما جی میں ہوا تھا اور اس آپریشن کے بعد سے میری پہلے والی فارم مکمل طور پر لوٹ آئی تھی) فرش پر پنجوں کے بل کودنے کے بعد میں نے چند سیکنڈ تک خود کو ساکت رکھا اور اردگرد سے ابھرنے والی آوازوں پر غور کیا۔ مکمل خاموشی تھی لیکن پھر دفعتاً میرے جسم میں ایک پھریری سی دوڑ گئی۔

کوٹھی کے کسی اندرونی حصے سے ایک دردناک آواز ابھری تھی۔ کوئی ذبح ہونے والے جانور کی طرح چلا رہا تھا۔ یہ مردانہ آواز بہت مدھم تھی لیکن سنائی دے رہی تھی۔ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے آواز پر کان لگا دیئے۔ دس پندرہ سیکنڈ بعد پکارنے والا پھر کربناک انداز میں پکارا۔

''بچاؤ......بچاؤ......کوئی ہے؟''

یہ سوچ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ کہیں یہ انیق کی آواز تو نہیں۔ میں نے پچیس گولی والی کلاشنکوف کندھے سے اتار کر اپنے ہاتھ میں لی اور باغیچے سے گزر کر کوٹھی کے پہلو کی طرف بڑھا۔ باغیچے سے گزرتے ہوئے مجھے بُو کا احساس ہوا۔ ''سیل فون ٹارچ'' کی روشنی میں، میں نے دیکھا۔ یہ ایک کتے کی بُو چھوڑتی ہوئی لاش تھی۔ اسے زمین میں دبایا گیا تھا مگر

شاید اس کا کچھ حصہ مٹی سے باہر رہ گیا تھا۔
اگلے دو تین منٹ میں، میں نے بڑی تیزی لیکن احتیاط سے کوٹھی کے پورچ اور برآمدوں کا جائزہ لیا۔ مجھے یقین ہونے لگا کہ کوٹھی میں زیادہ افراد موجود نہیں ہیں۔ پرانے ماڈل کی ایک پک اَپ کے سوا کوئی گاڑی بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ انٹرنس والا فینسی دروازہ لاک تھا۔ یہی وقت تھا جب کوئی پھر چلایا۔ وہ نزع کے عالم میں لگتا تھا۔ میں نے رائفل کے دستے سے ایک چھوٹا شیشہ توڑا اور دروازے کو اندر سے کھول دیا۔ شیشہ ٹوٹنے سے کافی آواز پیدا ہوئی تھی مگر ارد گرد کے کمروں میں کہیں حرکت کے آثار نظر نہیں آئے۔ یہ خاموشی کسی پلاننگ کا حصہ بھی ہو سکتی تھی مگر پچانوے فیصد امکان یہی تھا کہ گینگ کچھ دیر پہلے یہاں سے نکل چکا ہے۔ میں بھاگتا ہوا کوٹھی کے مین گیٹ پر آیا اور اسے اندر سے کھول دیا۔ میں نے ہونٹوں پر انگلیاں رکھ کر سیٹی بجائی اور ساتھ ہی ہاتھ لہرایا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ سجاول اور اس کے ساتھی کوٹھی کی طرف بڑھ سکتے ہیں۔
اسی دوران میں رائفل بدست انو بھی بھاگتا ہوا میرے پاس پہنچ گیا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''تم باقی لوگوں کو احاطے میں پوزیشن لینے کا کہو۔ میں اندر جا رہا ہوں۔''
''ٹھیک ہے جی۔ آپ جب تک کہیں گے، ہم یہاں پر ہی رکیں گے۔''
میں رائفل بدست اندر کی طرف لپکا۔ کسی اندرونی حصے سے ابھرنے والی دردناک آواز نے ایک بار پھر میری رہنمائی کی۔ میں کامن روم میں پہنچا اور پھر ایک کوریڈور سے گزرتا ہوا ایک ہال کمرے کے سامنے پہنچ گیا۔
''کہاں ہو تم؟ آواز دے کر بتاؤ۔'' میں نے بلند آواز میں کہا۔
''بچاؤ...... بچاؤ۔'' ایک بار پھر کربناک آواز ابھری۔
یہ جان کر تھوڑی سی تسلی ہوئی کہ یہ انیق کی آواز نہیں تھی۔ میں نے انگلی رائفل کی لبلبی پر رکھی ہوئی تھی۔ میرے ایک اشارے پر یہ روسی رائفل موت کی بارش کر سکتی تھی۔ ہال کمرے کا دروازہ مقفل تھا۔ میں نے ایک ادھ کھلی کھڑکی کی آہنی گرل میں سے اندر جھانکا اور اپنی جگہ سکتہ زدہ کھڑا رہ گیا۔ اپنی نگاہوں پر بھروسا نہیں ہوا لیکن بھروسا کرنے کے سوا چارہ نہیں تھا...... کیونکہ یہ سامنا تھا ٹیکساری گینگ جیسے وحشی ٹولے سے۔
میں نے چار نیم عریاں افراد کو دیکھا۔ وہ ڈنڈ پیلنے والی پوزیشن میں تھے۔ لکڑی کے جن تختوں پر انہوں نے یہ پوزیشن لے رکھی تھی۔ ان پر قریباً ایک فٹ اونچی تین نہایت نوکیلی آہنی سلاخیں لگی تھیں۔ ڈنڈ یعنی پش اَپ کی پوزیشن میں موجود چاروں افراد کے ہاتھ اور

پاؤں آہنی شکنجوں میں جکڑے ہوئے تھے۔نوکدار سلاخیں ان کی ناف پیٹ اور گردن کو چھوتی تھیں۔وہ جتنی دیر تک خود کو اپنے بازوؤں کے زور پر اوپر اٹھائے رکھتے یہ سلاخیں ان کے جسم سے دور رہتیں لیکن جب جب وہ تھک کر نیچے کی طرف آتے یہ تیکھی سلاخیں دھیرے دھیرے ان کے جسم میں اترتی چلی جاتیں۔میں نے اب تک بڑے بڑے خوفناک مناظر دیکھے تھے لیکن اس منظر نے سرتاپا جھنجھوڑ دیا۔دو افراد اپنے جسم کو اپنے بازوؤں پر نہیں سہار پائے تھے اور سلاخ نما نوکیلی میخیں دھیرے دھیرے ان کے جسم میں اتر گئی تھیں۔ایک ناف میں، ایک پیٹ میں اور ایک گردن میں۔وہ دونوں مر چکے تھے۔ان کا خون چوبی تختوں کے اردگرد پھیلا ہوا تھا۔خون کی حالت دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ ان دونوں کو مرے زیادہ دیر نہیں ہوئی۔

باقی دو افراد میں سے ایک انیق تھا اور دوسرا مختار جھارا جسے ہم مسلسل فون کال کرتے رہے تھے۔مختار جھارا کی ہمت بھی تقریباً جواب دے چکی تھی۔اس کا پورا جسم لرز رہا تھا۔انیق کی طرح جھارے کے جسم پر بھی صرف ایک پتلون تھی۔نیچے والی سلاخ نما میخ دھیرے دھیرے اس کی ناف میں اترتی جا رہی تھی۔درمیانی میخ نے بھی اس کے پیٹ میں گھسنا شروع کر دیا تھا۔دونوں زخموں میں سے خون نکل رہا تھا۔جھارے کا دبلا پتلا جسم پسینے سے تر تھا۔وہ اپنے بازوؤں کے زور پر خود کو اٹھائے رکھنے کی پوری کوشش کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ دلدوز انداز میں چلا رہا تھا۔

جھارے سے دو فٹ کے فاصلے پر انیق بھی ڈنٹر پیلنے والی پوزیشن میں تھا۔وہ اپنے کانپتے بازوؤں کو سیدھا رکھنے کی سرتوڑ کوشش کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ کراہ رہا تھا۔ابھی آہنی میخیں اس کے جسم سے دور تھیں لیکن کب تک؟ یہ ایک دو انچ کا فاصلہ کسی بھی وقت طے ہو سکتا تھا۔یہ سارے کا سارا منظر میں نے بس تین چار سیکنڈ کے اندر دیکھا۔انیق اور جھارے کے پاس بہت تھوڑا ٹائم تھا اور شاید جھارے کے پاس تو بالکل بھی نہیں تھا۔میں نے مقفل دروازے پر دو فائر کیے اور توڑتا ہوا اندر گھس گیا۔

فائرز کی آواز پوری کوٹھی میں گونجی تھی۔سجاول، انو اور ان کے دیگر ساتھی بھی لپکتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔''پکڑو ان کو۔'' میں نے پکار کر کہا۔

سجاول کے ساتھیوں نے فوراً انیق اور جھارا کو ان کی کمر سے تھام لیا اور ان کے جسموں کو قاتل میخوں سے دور رکھنے میں ان کی مدد کی۔ان کو چوبی تختوں پر سے فوراً ہٹایا نہیں جا سکتا تھا۔کیونکہ ان کی کلائیاں اور ٹخنے ''کلپس'' میں جکڑے ہوئے تھے۔جھارے کے منحنی لیکن مضبوط جسم سے خون کی دھاریں بہہ رہی تھیں اور میخوں کے سرے سرخ تھے۔یہ شیطانی گروہ

کی غیر انسانی کارروائی تھی جسے دیکھ کر دل کانپ گئے تھے۔ سجاول نے اپنی بھاری آواز میں مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''تم ان کے ہاتھ پاؤں کھولو، میں کوٹھی میں دیکھتا ہوں۔ کوئی حرم زادہ یہاں چھپا ہوا نہ ہو۔''

سجاول اپنے تین ساتھیوں کے ہمراہ تند بگولے کی طرح سیڑھیوں کی طرف چلا گیا۔ اے کے 57 رائفل اس کے ہاتھ میں تھی اور آنکھیں خون کی طرح سرخ دکھائی دیتی تھیں۔ میں نے انو وغیرہ کے ساتھ مل کر برق رفتاری سے جھارے اور انیق کے ہاتھ پاؤں آہنی کلپس سے آزاد کیے۔ جھارے کے جسم سے خون کا اخراج کافی زیادہ تھا۔ اسے فوری طبی امداد کی ضرورت تھی۔ اس کے زخموں پر پٹیاں رکھی گئیں اور سجاول کے دو تنومند ساتھی اسے اٹھا کر تیزی سے باہر کھڑی گاڑیوں کی طرف لے گئے۔ انیق کی حالت بھی نیم بے ہوشی والی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ بڑا سخت جان ہے۔ اس کی قوتِ برداشت اور ہمت میں بھی کوئی شک نہیں تھا لیکن وہ پچھلے ایک ڈیڑھ گھنٹے میں جس سخت ترین آزمائش سے گزرا تھا وہ گوشت پوست کے انسان کو ریزہ ریزہ کر سکتی تھی۔ انیق کا سارا جسم لرز رہا تھا اور پسینے میں تر تھا۔
میں نے سجاول کے ساتھیوں کو اشارہ کیا کہ وہ انیق کو سہارا دے کر دوسرے کمرے میں لے جائیں۔ دو افراد نے دونوں طرف سے اس کے بازو اپنے کندھوں پر رکھے اور اسے آہستہ آہستہ چلاتے ہوئے قریبی کمرے میں لے گئے۔ انیق مسلسل کراہ رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس کے ایک پاؤں اور سر پر بھی گہری چوٹ ہے۔ یہ چوٹیں غالباً دو تین گھنٹے پہلے کی تھیں۔ شاید اس وقت کی جب ڈیتھ اسکواڈ کے بھیڑیے انیق اور اس کے ساتھیوں کو اپنی گرفت میں لے رہے تھے۔

انیق بری طرح نڈھال اور نیم غشی کی حالت میں تھا اس کے باوجود میں اس کے سامنے جانا نہیں چاہ رہا تھا۔ میں نے انو سے کہا کہ وہ اس کی چوٹوں کو دیکھے اور اگر خون بہہ رہا ہے تو اسے روکے۔ اسی دوران میں سجاول کا ایک کارندہ سیڑھیوں سے اتر کر دوڑتا ہوا مجھ تک پہنچا۔ ''آپ کو سردار بلا رہے ہیں...... اوپر...... لاشیں ہیں۔'' اس نے ہانپی ہوئی آواز میں کہا۔

میں سیڑھیاں طے کر کے اوپر پہنچا۔ سامنے ایک کمرے میں تکلیف دہ منظر دکھائی دیا۔ (دو) لڑکیاں اور ایک جواں سال عورت تھی۔ تینوں نے اپنے گرد بیڈ شیٹس لپیٹ رکھی تھیں۔ ان کے چہرے اور ہاتھ پاؤں دیکھ کر ہی پتا چل جاتا تھا کہ انہیں بدترین تشدد کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ ان کے جسموں پر چوٹیں تھیں اور چوٹوں سے خون رِس رہا تھا۔ ان کی حالت گواہی دے

رہی تھی کہ وہ پچھلے ایک دو روز سے ڈیتھ اسکواڈ کی وحشت کا شکار ہیں۔ غنیمت بس یہی تھا کہ وہ زندہ بچ گئی تھیں۔ سجاول نے اس کمرے کے دروازے کے قفل کو توڑ کر ان تک رسائی حاصل کی تھی۔ ان کی چوتھی ساتھی بھی یہاں موجود تھی مگر وہ زیادہ بدقسمت ثابت ہوئی تھی۔ وہ اپنے جسم کے علاوہ اپنی جان بھی نہیں بچا سکی تھی۔ میں اسے دیکھ کر مزید افسردہ ہو گیا۔

''تم اسے پہچانتے ہو؟'' سجاول نے پوچھا۔

''ہاں، یہ داؤد بھاؤ کی رکھیل تھی۔ میں نے لاہور میں کئی بار اسے دیکھا ہے۔ روبی نام ہے اس کا۔''

روبی کی کمر میں بائیں طرف ایک خنجر دستے تک پیوست تھا۔ وہ اوندھی پڑی تھی اور اس کے اردگرد لوتھڑوں کی صورت میں جما ہوا خون بتا رہا تھا کہ اسے مرے ہوئے آٹھ دس گھنٹے تو ہو ہی چکے ہیں۔ شاید اسے مارنے کے بعد بطور ''نشانِ عبرت'' یہیں پڑا رہنے دیا گیا تھا۔ یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ بھاگنے کی کوشش میں مری ہے یا پھر مزاحمت کی وجہ سے۔ داؤد بھاؤ کی یہ نوعمر رکھیل بمشکل بیس برس کی ہوگی۔ وہ لاہور والے زمین دوز اڈے پر داؤد بھاؤ کے گرد تتلی کی طرح منڈلاتی تھی۔

''یہ باقی کی لڑکیاں بھی داؤد بھاؤ کے گروہ سے ہیں؟'' سجاول نے پوچھا۔

میں نے اثبات میں جواب دیا۔

''کہیں داؤد بھاؤ خود بھی تو نہیں ٹپک گیا؟'' سجاول نے خیال ظاہر کیا۔

''میرے خیال میں تو ایسا نہیں ہے۔ داؤد بھاؤ آسانی سے ہاتھ آنے والا بندہ نہیں۔ اس کے یہ ساتھی بھی لوہے کے چنے تھے مگر پتا نہیں کیسے گھیرے میں آ گئے۔''

''انیق کہاں ہے؟''

''نیچے کمرے میں، تم اسے دیکھو، بلکہ اگر ہو سکے تو اسے اپنے ساتھ ہی لے جاؤ۔ اسے مرہم پٹی اور تسلی تشفی کی ضرورت ہے...... ہم زیادہ دیر یہاں ٹھہر بھی نہیں سکتے۔ جو فائر ہم نے کیے ہیں ان کی آواز دور تک گئی ہوگی۔ کیا پتا کوئی پولیس پارٹی یہاں پہنچ جائے۔''

''لاشوں اور لڑکیوں کا کیا کرنا ہے؟'' سجاول نے پوچھا۔

''لڑکیوں کو کسی محفوظ ٹھکانے تک پہنچا دیتے ہیں۔ لاشیں یہیں پڑی رہیں۔'' پھر ایک دم مجھے یاد آیا کہ سجاول کے کارندے نے سیڑھیوں سے اترنے کے بعد مجھے جو اطلاع دی تھی اس میں لاشوں کا ذکر کیا تھا مگر مجھے ابھی تک فرسٹ فلور پر صرف روبی کی لاش ہی نظر آئی تھی۔

''کوئی اور بھی مرا ہے یہاں؟'' میں نے سجاول سے پوچھا۔

''ہاں، لگتا ہے چوکیدار ہے یہاں کا۔ سیڑھیوں کے ساتھ والے کمرے میں لاش پڑی ہے۔ اسے بھی بڑے بھیڑیے طریقے سے مارا گیا ہے۔ اس کے گلے کے گرد پھندا کسا گیا ہے۔ پر اتنا بھی نہیں کسا گیا کہ وہ فوراً مر جائے۔ لگتا ہے کہ وہ دو تین گھنٹے تڑپ تڑپ کر مرا ہے۔''

میں نے ساتھ والے کمرے میں جا کر صحت مند پٹھان چوکیدار کی لاش دیکھی۔ اس میں سے اب بُو اٹھنا شروع ہو گئی تھی۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ گردن میں نائیلون کی سرخ رسی کا پھندا تھا۔ یقیناً بے بس...... بدنصیب شخص دیر تک زندگی اور سانس کے لیے تڑپتا رہا تھا۔ اس کا منہ اور آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔

یہ درندگی یہ بے رحمی ٹیکساری گینگ اور ڈیتھ اسکواڈ کا خاصہ تھی۔ وہ بدترین اذیت رساں تھے۔ ڈیتھ اسکواڈ کے ان سب خبیثوں کے اندر ان کے جدِ امجد شیطان صفت ''ایول'' کی روح تھی۔ سونے پر سہاگا ان کی وہ تربیت تھی جو ٹیکساری گینگ کے بدنام زمانہ سرغنہ جان ڈیرک نے کی تھی۔ اس نے ان ''ٹیسٹ ٹیوب شیطانوں'' کو ایک خطرناک ترین ٹولا بنا دیا تھا۔ وہ مارنے سے نہیں ڈرتے تھے اور نہ مرنے سے۔ وہ دنوں میں برسوں کی لذتیں سمیٹ رہے تھے۔ ان کا جنون جب نشے میں ڈوب کر دو آتشہ ہوتا تھا تو وہ اس نہج پر پہنچ جاتے تھے جہاں زندگی اور موت ان کے لیے ہم معنی ہو جاتی تھی اور یہی سب سے تشویش ناک بات تھی۔

سجاول، انیق کو دیکھنے کے لیے نیچے گراؤنڈ فلور پر جا چکا تھا۔ سجاول کے ساتھی انو نے بتایا۔ ''لگتا ہے جی کہ کوٹھی کا مالک یہاں نہیں تھا۔ صرف چوکیدار تھا۔ اسے ان بدمعاشوں نے باندھ دیا اور کوٹھی پر قبجا (قبضہ) کر لیا۔ میرا تو اندازا ہے کہ یہ قبجا سات آٹھ روج سے تھا۔ شاید کل کسی وقت یہ لوگ ان لڑکیوں اور مردوں کو بھی پکڑ کر یہاں لے آئے۔''

''تم لوگوں نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے۔ یہاں کوئی چھپا ہوا تو نہیں ہے؟''

''نہیں جی، ایک ایک کونا دیکھ لیا ہے۔ چلے گئے ہیں حرامجادے۔ کوئی بڑی ہی گندی نسل کے انگریج ہیں یہ؟''

یہ جن شکنجوں میں انیق، مختار اور ان کے دو ساتھیوں کو کسا گیا تھا، پتا نہیں گینگ والوں نے کہاں سے حاصل کیے تھے۔ یہی لگ رہا تھا کہ یہ سات آٹھ روز والا قیافہ درست ہے۔ یہ ابلیسی ٹولا پچھلے قریباً ایک ہفتے سے یہاں موجود تھا۔ لکڑی کے یہ تختے ان کو یہیں اس کوٹھی سے مل گئے تھے۔ ان پر میخیں اور کلپس وغیرہ لگا کر انہیں اذیت رسانی کے آلے کی شکل دے دی

گئی تھی۔ایک طرح سے یہاں سے رخصت ہوتے وقت یہ شیطانی ٹولا، انیق اور اس کے تین ساتھیوں کو دردناک موت سے دوچار کر گیا تھا......یعنی سسکتے رہو اور مرتے رہو، ان میں سے دو تو واقعی موقع پر مر گئے تھے۔ مختار جھارے کی حالت بھی زیادہ اچھی نہیں تھی۔ یہ انیق کی غیر معمولی سخت جانی تھی کہ اس نے اپنے لرزتے بازوؤں پر اپنے جسم کا بوجھ اٹھائے رکھا تھا اور ہمارے پہنچنے تک میخ نما سلاخوں سے بچا رہا تھا۔

اس خالی کوٹھی میں جگہ جگہ سگریٹ کے ٹکڑے، شراب کی خالی بوتلیں اور تاش کے پتے وغیرہ بکھرے ہوئے تھے۔ میری معلومات کے مطابق ڈیتھ اسکواڈ کے یہ لوگ کچا گوشت بھی کھا جاتے تھے۔اس کا ثبوت ہمیں وہاں دیسی مرغیوں اور بطخوں کے بچے کھچے ٹکڑوں کی شکل میں ملا۔ کچے قیمے کی شکل میں بہت سا گوشت ریفریجریٹر میں بھی موجود تھا۔ یہ مرغیاں وغیرہ یقیناً اس کوٹھی سے ہی حاصل کی گئی تھیں۔

میرا جی چاہ رہا تھا کہ انیق سے بات کروں۔ اسے گلے سے لگاؤں، اسے اس نئی زندگی پر مبارک باد دوں مگر میں اس کے سامنے آنا نہیں چاہتا تھا۔ سجاول نے میری بات مان لی تھی۔ وہ انیق کو اپنے ساتھ لے جانے پر آمادہ تھا۔ بھاؤ گینگ کی تینوں لڑکیوں کو محفوظ مقام تک پہنچانے کی ذمے داری انو نے لے لی۔ان بے چاریوں کی حالت پر ترس آتا تھا۔ بے شک وہ کوئی گھریلو، شریف زادیاں نہیں تھیں۔ کئی طرح کے لوگوں سے ان کا سابقہ پڑ چکا تھا، پھر بھی ان کی آنکھوں میں وحشت ٹھہر سی گئی تھی۔ ذرا سی آواز پر بدک جاتی تھیں۔ مجھے ایک لڑکی کے بازو پر سگریٹ سے جلائے جانے کے داغ بھی نظر آئے۔ میں نے اسی سے پوچھا۔"ان لوگوں نے کہاں سے پکڑا تمہیں؟"

اس نے بولنے کی کوشش کی مگر بولا نہیں گیا۔ وہ ہچکیوں سے روتے ہوئے بس اتنا کہہ سکی۔"ہمیں یہاں سے لے جاؤ۔ وہ پھر آجائیں گے......پلیز دیر نہ کرو۔"

جواں سال عورت نے ہمت کر کے پوچھا۔"آپ......کون ہیں؟"

میں نے کہا۔"تم لوگوں کا ہمدرد اور مددگار ہوں، فی الحال اپنا نام نہیں بتا سکتا اور مجھ سے کچھ چھپانے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہارے اور داؤد بھاؤ کے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں، یہ بھی جانتا ہوں کہ داؤد بھاؤ آج کل روپوش ہے اور کس وجہ سے روپوش ہے......"

میری باتوں سے جواں سال عورت میں آمادگی پیدا ہوئی۔ دونوں لڑکیوں کی طرح وہ بھی اب برے بھلے لباس میں نظر آ رہی تھی۔ انو نے ان کے لیے شالیں بھی فراہم کر دی تھیں۔ وہ اپنے تراشیدہ بالوں کو اپنے زخمی ہاتھ سے آنکھوں سے پیچھے ہٹاتے ہوئے بولی۔

''داؤد بھاؤ نے پیر کے روز ہمیں بھی انڈر گراؤنڈ ہونے کی ہدایت کی تھی۔ مختار بھائی ہم کو لے کر شادمان کی ایک کوٹھی میں چلے گئے تھے۔ پرسوں رات کو انیق بھی وہیں آ گیا۔ ہمیں لگتا ہے کہ ہمارے اندر کی ہی ایک لڑکی نے مخبری کی ہے۔ چائے یا کھانے میں بے ہوشی کی دوا تھی۔ اسی بے ہوشی کی حالت میں ان لوگوں نے ہمیں وہاں سے اٹھایا۔ ہوش آیا تو ہم لاہور کے بجائے اس منحوس کوٹھی میں تھے۔''

''انیق اور مختار بھی ساتھ تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں...... انیق نے بڑی دلیری دکھائی...... مگر...... اس کا بھی بس نہیں چلا۔ اسے ان لوگوں نے بڑا مارا پھر اس کے ہاتھوں میں کڑیاں لگا دیں۔'' کل کے واقعات یاد کر کے اس کی آنکھوں میں پھیلا ہوا کاجل کچھ اور پھیل گیا۔ دوسری لڑکیاں بھی اشکبار ہو گئیں۔

''اس لڑکی روبی کو چاقو کس نے مارا؟''

''ان ہی سفید چمڑی والوں میں سے کوئی تھا۔ روبی نے بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ انہوں نے اسے پکڑ لیا۔ اس نے جان بچانی چاہی، روئی چلائی بھی۔ مگر انہوں نے اسے وہیں اسی وقت قتل کر دیا۔''

زیادہ سوال جواب کا وقت ہمارے پاس نہیں تھا۔ میں نے کوٹھی میں تیزی سے گھوم پھر کر کچھ شواہد اٹھائے اور کچھ مٹائے۔ بھاؤ گینگ کی تین لاشیں بھی یہاں موجود تھیں مگر انہیں یہاں سے لے جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ ہم نے لڑکیوں کو لے جانے پر اکتفا کیا۔ اسی دوران میں سجاول کو فون پر یہ بری خبر بھی ملی کہ مختار جھارا اسپتال نہیں پہنچ سکا۔ وہ راستے میں ہی دم توڑ گیا تھا۔ میں نے اس کی ناف والا زخم دیکھا تھا جو بہت سنگین تھا۔ غالباً اسی نے اس کی جان لی تھی۔

○......❖......○

صبح گیارہ بجے تک میں شرافت کی ہائی روف سوزوکی پر راولپنڈی واپس پہنچ چکا تھا۔ جاتے ہوئے میں پہلوان حشمت کو بتا کر گیا تھا کہ ایک ضروری کام سے لاہور جا رہا ہوں۔ اس نے تاجور کو بھی بتا دیا تھا مگر وہ میری غیر موجودگی سے بے حد پریشان تھی۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو ناراض نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس نے ناشتا بھی نہیں کیا ہے۔

''ایسا کیوں کرتے ہیں آپ؟'' وہ بھاری لہجے میں بولی۔

''بھئی، میں بتا کر گیا تھا۔ ضروری کام تھا، تم سو رہی تھیں۔''

''فون تو کر سکتے تھے ناں، اتنے برے برے خیال آ رہے تھے مجھے۔'' اس کی ناک سرخ ہو گئی، یہ اس بات کی علامت تھی کہ وہ اگلے چند سیکنڈ میں رو سکتی ہے۔

میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور دلاسا دیا۔ وہ اپنی لٹوں کو اپنے خوب صورت کانوں کے پیچھے اڑس کر بولی۔ ''کہیں...... آپ نے...... ان سے جھگڑا تو نہیں کیا؟''

میں سمجھ گیا۔ ''ان'' سے تاجور کی مراد دارابی اور دارج تھا۔

میں نے کہا۔ ''ان سے جھگڑے کی مجھے کیا ضرورت ہے۔ جب تم یہاں ہو...... اور میں یہاں ہوں تو پھر وہ سب جائیں جہنم میں۔ بس اتنی دعا ہے کہ وہ اوپر والا دین محمد صاحب کے دل میں ہمارے لیے کچھ نرمی پیدا کر دے۔''

وہ نڈھال سی میرے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔ کھوئی کھوئی آواز میں بولی۔ ''ایسا کیوں ہوتا ہے شاہ زیب؟ اتنی محبت کرنے والے لوگ اتنے سخت کیوں ہو جاتے ہیں۔ کیوں وہ ہماری فریاد نہیں سنتے۔ کیوں ہمارے دل کی بات نہیں سمجھتے؟'' اس کا اشارہ اپنے والد کی طرف تھا۔

''یہ تو اوپر والے کا نظام ہے تاجور...... محبت کی راہ میں مصیبتیں تو آنا ہی ہوتی ہیں، چاہے وہ کسی طرف سے آ جائیں۔ آخر کو تو وہ تمہارے والد ہیں۔ میرا دل کہتا ہے کہ ایک نہ ایک دن ان کا دل پسیج جائے گا۔''

کچھ دیر ہمارے درمیان بوجھل خاموشی طاری رہی۔ وہ جانتی تھی کہ اب میں کیا پوچھنے والا ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی پلکیں بے ساختہ جھک گئی تھیں۔ اس نے اپنی انگلیاں مروڑنا شروع کر دیں۔

میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ''تو پھر کیا سوچا ہے تم نے؟''

''کس بارے میں؟'' وہ انجان بن کر بولی۔

''کون سا دن مبارک رہے گا؟''

اس نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''ابھی تو یہ بھی پتا نہیں چل رہا کہ یہ کام بھی مبارک رہے گا یا نہیں۔''

''تو پھر میں کیا سمجھوں؟''

''جو مرضی سمجھ لیں۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ ایک چھوٹے سے گھونگھٹ نے اس نصف چہرہ چھپا لیا تھا۔

''تو کیا انکار سمجھ لوں۔''

''ہاں انکار ہی سمجھ لیں۔'' اس نے گھونگھٹ کی اوٹ سے ایک غیر محسوس مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھا اور جلدی سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی اور دروازہ بند کرلیا۔

چند سیکنڈ بعد میں اپنی جگہ سے اٹھا۔ دروازے کے پاس پہنچا۔ کان لگا کر اندر کی آہٹ لینے کی کوشش کی۔ وہ دروازے کے پاس ہی کھڑی تھی۔ میں نے کہا۔ ''یہ انکار ہے یا اقرار۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔ کوئی ٹھوس جواب ہونا چاہیے بھئی۔''

''میں چاچا حشمت کو بتادوں گی۔''

''ٹھیک ہے، میں ابھی بھیجتا ہوں چاچا حشمت کو۔''

درحقیقت وہ اپنا جواب تو اسی وقت دے چکی تھی جب اس عالی شان بنگلے میں، میں نے اس سے کہا تھا...... اگر تمہاری یہی مرضی ہے تو میں یہاں سے چلا جاتا ہوں...... اور وہ بڑی باہمت ہونے کے باوجود اپنے قدموں پر کھڑی نہیں رہ سکی تھی۔

میں نے پہلوان حشمت کو تاجور کی طرف بھیج دیا اور خود ٹی وی لاؤنج میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ شرافت علی نے ٹی وی لگا رکھا تھا۔ ایک کبڈی میچ دکھایا جارہا تھا۔ جیتنے والی ٹیم کا کپتان اپنے ساتھیوں کے کندھوں پر سوار تھا اور پُرجوش نعرے بلند کررہا تھا۔

میرا دھیان ایک بار پھر کبڈی شاہ سیف کی طرف چلا گیا۔ وہ رنگ رنگیلا پنجابی گبرو بھی تو اپنی کبڈی ٹیم کا کپتان تھا۔ اپنے حریفوں پر بجلی کی طرح جھپٹتا تھا اور ہوا کی طرح ان کی گرفت سے نکل جاتا تھا۔ وہ ہماری گرفت سے بھی نکل گیا تھا۔ ہم اسے روکنے کے لیے کچھ نہ کرسکے تھے۔ دکھیاری ماں اس کی راہ دیکھتے دیکھتے موت کی آغوش میں چلی گئی تھی۔ بوڑھا باپ اب کمر پر ہاتھ رکھ کر کراہتے ہوئے چلتا تھا اور چھوٹی بہنیں...... جن کی آنکھوں کا وہ تارا تھا...... ہمیشہ کے لیے اس کی تصویروں سے دل بہلانے پر مجبور ہوگئی تھیں۔ سیف کی ماں کا آخری وقت جیسے میرے ذہن پر نقش ہوکر رہ گیا تھا۔ اپنی آخری رات اس نے اپنے اکلوتے بیٹے کے کمرے میں گزاری تھی۔ اس کی تصویریں، اس کے استعمال کی اشیا، اس کے میڈل اور ٹرافیاں سب اس کے اردگرد تھے، اور وہ ان چیزوں پر سر رکھ کر ان پر ہاتھ پھیرتی ہوئی ابدی نیند سوگئی تھی۔

سیف کی موت گاہے بگاہے مختلف بہانوں سے میرے دل و دماغ کو جھنجھوڑتی رہتی تھی۔ اور یہ کیفیت میری ہی نہیں تھی۔ اس کے سب قریبی اس جواں مرگ کی جدائی کو شدت سے محسوس کرتے تھے۔ یہاں تک کہ تاجور بھی۔ اسے سیف سے بھی زیادہ اس کی والدہ کی

موت کا دکھ تھا۔ دو دن پہلے وہ اخبار میں ایک اشتہار دیکھ کر آبدیدہ ہوگئی تھی۔ یہ اشتہار ایک گمشدہ نوجوان کے بارے میں تھا۔ اشتہار کے مضمون میں لکھا تھا...... تمہاری ماں تمہارے غم میں بستر پر پڑی ہے۔ وہ اور صدمہ نہیں جھیل سکتی۔ جہاں اور جس حال میں ہو واپس آ جاؤ۔ تم سے کسی طرح کی باز پُرس نہیں کی جائے گی۔

تاجور نے مجھ سے مخاطب ہو کر جذباتی لہجے میں کہا تھا۔ ''ایسا کیوں ہوتا ہے، ماؤں کے نصیب میں ایسے دکھ کیوں لکھے جاتے ہیں۔''

میں کیا جواب دیتا۔ تاہم اس وقت میرے دل میں آیا تھا۔ کاش شفقت بی بی کے مرنے سے پہلے میں بھی کوئی ایسا اشتہار دے سکتا۔ سیف سے کہتا...... جہاں اور جس حال میں ہو واپس آ جاؤ۔ تمہاری ماں اور دکھ نہیں جھیل سکتی۔ اور وہ واقعی واپس آ جاتا۔ موت سے اپنی کلائی چھڑا لیتا۔ میرے گلے لگ کر کہتا...... دیکھو میں لوٹ آیا ہوں۔ میری ماں کی محبت نے مجھے مرنے نہیں دیا۔ میرا سینہ پھٹ گیا تھا۔ سانس رک گئی تھی۔ نبض بند ہوگئی تھی مگر زندگی کی رمق ابھی باقی تھی۔ ہاں میری ماں کی محبت نے مجھے مرنے نہیں دیا تھا۔

میں کافی دیر افسردہ بیٹھا رہا۔ پھر اس افسردگی کو پہلوان حشمت کے مسکراتے ہوئے چہرے نے ڈھانپ لیا۔ وہ میری طرف آ رہا تھا۔ زندگی کے سفر میں دکھ اور راحت کے لمحے اسی طرح ایک دوسرے کا پیچھا کرتے رہتے ہیں۔

پہلوان حشمت نے مبارک بادی انداز میں مجھے گلے سے لگایا اور بولا۔ ''تاجور تمہاری خوشی میں خوش ہے، وہ راضی ہے۔''

''اب کیا کرنا ہے؟'' میں نے پہلوان سے پوچھا۔

''سب سے پہلے تو میرا منہ میٹھا کرنا ہے۔ اور تم اچھی طرح جانت ہو، میرا منہ ایک کلو سے کم مٹھائی میں میٹھا ناہیں ہووے گا۔''

میں نے کہا۔ ''اور اگر آپ کو باقاعدہ مٹھائی کھلانا پڑے تو پھر؟ چھ سات کلو تو ضروری ہو گی۔''

''ناہیں، اب ایسی بھی بات ناہیں۔ چار پانچ کلو سے کام چل جاوت ہے۔ ابھی ابھی اس معاملے میں دو شعر وارد ہوئے ہیں مجھ پر۔ پڑھو۔'' اس نے سگریٹ کے پیکٹ پر لکھے شعر میری طرف بڑھائے۔

خوشی کے موکے کو ہم خوشی سے ہی مناتے ہیں
ہر ڈر دل سے نکالتے ہیں، پیتے ہیں اور کھاتے ہیں

محنت نہ کرنے سے بندے کو دل کے مسئلے ہوتے ہیں
رس غلے غلاب جامن کب بندے کو پھڑکاتے ہیں

میں بولا۔ ''پہلوان جی! یہ کیا بات ہے۔ آپ ویسے تو بڑی پکی اردو بولتے ہیں مگر شاعری میں پنجابی بھی گھسیڑ دیتے ہیں۔''

''بس پرانے وقت کی بات ہے۔ ایک دو شعروں میں تھوڑی سی پنجابی جوڑی تھی۔ وہ کسی نے بہت پسند کیے۔ بس، پھر اسی وقت سے یہ عادت پکی ہوگئی۔''

''جس نے شعر پسند کیے وہ کون تھا...... یا کون تھی؟''

پہلوان بولا۔ ''تم اتنے بھولے نہ بنو۔ اندر سے بہت کھوچل ہو تم۔ اچھی طرح جانت ہو کہ پیار کرنے کے بغیر کوئی شاعر بن ہی ناہیں سکتا۔ ہاں جی...... ہم نے بھی کبھی جوانی میں یہ جھک ماری تھی۔ لیکن اس خوشی کے موقع پر درد و غم کا ذکر چھیڑنا ٹھیک ناہیں۔ تم بتاؤ اب یہ شبھ کام کب ہونا ہے...... اور کیا انتظام کرنا ہے نکاح کا؟''

میں پہلوان کو سجاول اور اس کی شادی کے بارے میں تقریباً سب کچھ بتا چکا تھا۔ میں نے کہا۔ ''میرے خیال میں سجاول اور خورسنہ وغیرہ کا یہاں موجود ہونا ضروری ہے۔ لیکن اب پتا نہیں کہ وہاں اس بے چارے انیق کی کیا پوزیشن ہے۔ پہلے مجھے اس کی حالت کا پوچھنا ہو گا۔''

''تو فون کرو۔''

''یہی سوچ رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''چلو تمہاری طرف سے میں خود ہی مٹھائی لے آوت ہوں۔ پیسے بعد میں دے دینا۔''

پہلوان میرا مطمع نظر سمجھ کر باہر نکل گیا۔

میں نے اپنے نئے نمبر سے سجاول کو کال ملائی اور انیق کا احوال پوچھا۔

سجاول نے بتایا۔ ''سر پر بھی چوٹ لگی ہے مگر گٹے (ٹخنے) کی چوٹ کافی ڈھاڈی ہے۔ میں نے محلے کے ڈاکٹر کو بلایا تھا۔ اس نے بتایا ہے کہ چھوٹا موٹا فریکچر بھی ہو سکتا ہے۔ اسپتال میں چیک کرالیں۔ پر تم جانتے ہو اس کو اسپتال لے جانا ہم دونوں کے لیے خطرناک ہے۔ اب ڈاکٹر نے ٹیکے وغیرہ لگائے ہیں۔ درد میں کمی ہے اور سو رہا ہے۔''

''کچھ بتایا ہے اس نے کہ کیا ہوا؟''

''ہاں، تھوڑی دیر پہلے کہہ رہا تھا۔ میں ان کو چھوڑوں گا نہیں۔ کہیں بھی چلے جائیں، جا پکڑوں گا۔ انہوں نے روبی کو مار دیا...... فلاں فلاں کو بھی مار دیا۔ میں بدلہ لوں گا۔'' سجاول

نے ذرا توقف کر کے کہا۔ ''میرا خیال ہے روبی اس کڑی کا نام ہے جس کی لاش اوپر والی منزل سے ملی ہے۔''

میں نے اثبات میں جواب دیا۔

سجاول بولا۔ ''وہی بات صحیح ہے جو اس کٹے بالوں والی عورت نے بتائی تھی۔ تہمینہ نام کی کسی خاص کڑی نے مخبری کی اور یہ سارے شادمان کی کسی کوٹھی سے پکڑے گئے۔ بڑی زبردست پلاننگ تھی۔ انیق کو بہت دکھ ہے۔ وہ تاجور کے بارے میں بھی فکرمند ہے۔ بے ہوشی میں ہی بڑبڑا رہا تھا۔ کہہ رہا تھا، وہ اس تک بھی پہنچ سکتے ہیں...... سجاول بھائی تم اس کا دھیان کرو۔ میں نے کہا، تم گھبراؤ نہ۔ وہ دھیان میں ہی ہے، کچھ نہیں ہوگا اسے۔ پوچھ رہا تھا کہ میں وہاں موقع پر کیسے پہنچا ہوں؟''

''کیا بتایا تم نے؟''

''یہی کہ اس کے ساتھی منور نے فون کیا اور واردات والی جگہ بتائی۔ ہم چل پڑے۔''

میں نے سجاول سے پوچھا۔ ''منور کے بارے میں کوئی کھوج ملا؟''

''کھوج کیا ملنا تھا۔ وہ مر گیا ہے نہر میں ڈوب کر۔ دو چار گولیاں بھی لگی ہیں۔ میں نے تمہیں بتایا تھا ناں کہ جب اس کی کال آئی تو ساتھ ہی فائرنگ بھی سنائی دی تھی۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ٹیکساری گینگ والوں کو اس بات کا شک ہو گیا ہو کہ اس بندے نے مرنے سے پہلے کہیں اطلاع دے دی ہے اسی لیے وہ اس کوٹھی سے نکل گئے ہوں۔''

''میرے خیال میں تو ایسا نہیں ہے سجاول۔ اگر وہ اس بات پر کوٹھی سے نکلتے تو فوراً نکلتے۔ وہ تو دو تین گھنٹے بعد بھی وہیں رہے۔''

''ہاں، یہ بات تو ذہن میں آتی ہے۔''

میں نے سجاول کو اپنے اور تاجور کے بارے میں اطلاع دی۔ وہ خوش ہو گیا۔ اس نے مجھے مبارک باد دی اور بولا۔ ''پھر اب کیا پروگرام ہے؟''

میں نے کہا۔ ''تمہارا، خورسنہ اور ذیشان کا یہاں ہونا ضروری ہے۔ لیکن تم فوری طور پر انیق کو بھی نہیں چھوڑ سکتے۔ اسے بہتر ہونے میں تین چار روز تو لگ ہی جانے ہیں۔ مجھے بھی تھوڑی بہت تیاری کرنی ہے۔ تاجور کے کپڑے، جوتے وغیرہ بھی لینے ہیں، اور تھوڑی بہت جیولری بھی۔ میرے خیال میں تو جمعہ کا دن رکھا جا سکتا ہے۔''

''جیسے تمہاری مرضی۔ ویسے یہ کام جتنی جلدی ہو جائے اتنا ہی چنگا ہے۔ انیق کی دیکھ بھال کا بھی کوئی انتظام کیا ہی جا سکتا ہے۔''

''میں یہ بھی چاہتا ہوں سجاول کہ تاجور کی والدہ کی طرف سے کوئی خیر خیریت کی خبر مل جائے۔''

''میں نے تمہیں بتایا تو تھا کہ وہ اب بہتر ہیں۔''

''لیکن ہوسکتا ہے کہ وہ کل پرسوں تک اسپتال سے ڈسچارج ہو جائیں۔ یہ تاجور کے لیے بڑی اچھی خبر ہوگی اور ماحول کو بہتر بنائے گی۔''

''جیسے تمہاری مرضی۔'' سجاول نے کہا۔

خورسنہ بھی فون پر آئی اور اس نے اپنے مخصوص انداز میں مبارک باد دی۔ اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اس نے کہا۔''جاماجی میں یہ بات مشہور ہوگئی تھی کہ تاجور آپ کی گرل فرینڈ ہے۔ آپ دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں لیکن کسی وجہ سے ناراض ہیں۔ لوگ آپ دونوں کو ایک دیکھنا چاہتے تھے، جاماجی کی سیکڑوں خواتین نے آپ دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کے لیے رسمیں بھی ادا کی تھیں، آپ کو یاد ہے ناں؟''

''ہاں، میں کچھ بھی بھولا نہیں۔''

''آج ان سب لوگوں کی خواہش پوری ہونے کی امید پیدا ہوگئی ہے لیکن وہ بے خبر ہیں، بلکہ بہت ہی بے خبر ہیں۔ وہ اپنی دانست میں آپ کو ہمیشہ کے لیے کھو چکے ہیں۔'' اس کے لہجے میں اداسی آگئی۔

ہم نے تھوڑی دیر مزید بات کی۔ وہ بڑی ذہین تھی۔ فون پر ہونے والی گفتگو میں وہ مجھے وقاص کے نام سے مخاطب کر رہی تھی اور اس نے اپنی آواز بھی بہت دھیمی رکھی ہوئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ انیق اسی گھر میں ہے اور میرے ''حیات'' ہونے کی خبر انیق سے مکمل طور پر پوشیدہ ہے۔

شام تک گوجرانوالہ کے واقعے کی خبر پوری تفصیل سے میڈیا تک پہنچ چکی تھی۔ ایک بار پھر چینلز نے سنسنی پھیلا دی۔ ٹیکساری گینگ کے ذکر نے اس سنسنی میں خاطر خواہ اضافہ کیا۔ ایک نیوز کاسٹر ہیجانی انداز میں بول رہا تھا۔''ناظرین! یاد رہے کہ یہ تیسرا سنگین ترین وار ہے جو اس غیر ملکی گروہ نے کیا ہے۔ آخر کیسے پہنچے ہیں یہ لوگ یہاں؟ کیوں پہنچے؟ اب تک یہ قانون کی گرفت میں کیوں نہیں آئے۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ اس مرتبہ عام شہریوں کو نشانہ نہیں بنایا گیا۔ نشانہ بننے والے جرائم پیشہ گروہ کے لوگ ہی تھے، مگر انہیں جس اذیت ناک طریقے سے مارا گیا ہے وہ لرزہ خیز ہے۔''

پھر تفصیل بتائی جانے لگی کہ کس طرح ''پش اَپ'' کی پوزیشن میں جکڑے گئے افراد

کے جسم آہستہ آہستہ نوکیلی سلاخوں پر آئے اور یہ سلاخیں سرک سرک کر ان کے جسموں میں داخل ہوئیں......

اسی دوران میں دروازے پر بیل ہوئی، میں چونک گیا۔ سب کچھ ٹھیک جا رہا تھا، مگر اپنے اور تاجور کے نکاح کے حوالے سے عجیب سا وہم تھا دل میں۔ کہیں کچھ ہو نہ جائے.... کسی طرح یہ وقت خیریت سے گزر جائے۔

○......❖......○

دروازے پر دوبارہ بیل ہوئی۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ، دروازے پر پہنچ کر پوچھا۔ ''کون؟''

جواب میں شرافت کی آواز آئی اور میں نے اطمینان کا سانس لے کر دروازہ کھول دیا۔ شرافت اپنے سسرال سے ہو کر آیا تھا۔ اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''لو وقاص بھائی، آپ کا مسئلہ حل ہو گیا۔ اب آپ اطمینان سے دس پندرہ روز میرے گھر میں رہ سکتے ہیں۔''

''اپنی بیگم سے کیا کہا؟'' میں نے پوچھا۔

''یہی کہ دفتر کے کام سے مجھے دو ہفتے کے لیے راولپنڈی سے باہر جانا پڑ گیا ہے لہٰذا وہ اکیلی پڑی رہنے کے بجائے چند دن اور ماں باپ کے پاس گزار لے۔''

''تمہارے اور یونس کے تعاون کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس لفظ نہیں ہیں شرافت۔''

''یہ غیروں والی باتیں چھوڑو وقاص بھائی، یہ بتاؤ نکاح کس دن ہے؟''

''جمعے کے دن کا سوچ رہے ہیں۔ تھوڑی بہت تیاری کرنی ہے۔ ایک دو مہمانوں کو بھی آنا ہے۔''

شرافت بولا۔ ''میرے ذمے جو بھی کام ہو، مجھے بلا جھجک بتانا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''تم نے اپنا گھر دے دیا، اس سے بڑا کام اور کیا ہو گا۔ پھر بھی کوئی ضرورت ہوئی تو ضرور بتاؤں گا۔''

''ہاں'' کرنے کے بعد سے تاجور کچھ شرمائی ہوئی تھی۔ میرے سامنے آنے سے کترا رہی تھی (اس کی ''ہاں'' پہلوان حشمت کے ذریعے ہی مجھ تک پہنچی تھی) شام کے بعد میں نے اسے کچن میں گھیر لیا۔ وہ ہم تینوں کے لیے کھانا تیار کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے جلدی سے منہ پھیرا۔ ایسے موقعوں پر اس کا خون جیسے یلغار کر کے اس کے شفاف چہرے کی طرف آتا تھا اور اسے گلنار کر دیتا تھا۔ اب بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ چاولوں کو الٹ پلٹ کرنے میں

مصروف ہوگئی۔ میں نے اس کے عین پیچھے جا کر کہا۔ ''ہاں کے لیے شکریہ۔''

وہ ذرا توقف سے اور میری طرف رخ کیے بغیر بولی۔ ''آپ کا بھی شکریہ اگر آپ یہاں سے چلے جائیں۔''

''وہ کیوں بھئی؟''

''چاچا حشمت اور شرافت بھائی کیا سوچیں گے......؟''

''یہی سوچیں گے کہ ہونے والا شوہر اپنی ہونے والی بیوی سے مل رہا ہے۔ ایسا تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔''

''ایسا نہیں ہوتا ناں۔'' اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور ایک دم کچھ اداس نظر آئی۔ وہ چولہے کی آنچ دھیمی کرتے ہوئے بولی۔ ''میں اپنے گھر میں ہوتی اور آپ اپنے گھر میں......تو ہمارے درمیان فاصلہ ہوتا۔ یہی فاصلہ تو ایسے موقعوں کی خوبصورتی ہوتا ہے۔''

''چلو فاصلہ بڑھا لیتے ہیں۔'' میں نے کہا اور ایک ڈیڑھ فٹ پیچھے ہٹ گیا۔ ''اتنا کافی ہے یا اور بڑھا لوں؟'' میں نے پوچھا۔ وہ بے ساختہ مسکرا دی۔

اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ آنکھوں میں مسکراہٹ کی ہلکی سی چمک نمودار ہوگئی تھی۔ اتنے میں پہلوان حشمت کے کھنکھارنے کی آواز سنائی دی۔

''دیکھا ناں۔'' تاجور نے جلدی سے سر پر دوپٹا درست کیا اور پوری طرح چاولوں کی طرف متوجہ ہوگئی۔

پہلوان مصنوعی انداز میں کھانستے ہوئے اندر آ گیا۔ ''لگت ہے کہ بریانی پک رہی ہے، بڑی مزیدار خوشبو آوت ہے۔''

میں نے کہا۔ ''چاچا حشمت! یہ بریانی نہیں۔ اس کو بلیک پیپر کہتے ہیں۔ چائنیز کھانا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ چاند گڑھی سے نکلنے کے بعد ہماری بٹیا بھی ماڈرن ہوگئی ہے۔ ویسے ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ وہ کیا محاورہ ہے جیسا دیس ویسے فرشتے۔''

میں نے درستگی کی۔ ''جیسی روح ویسے فرشتے اور جیسا دیس ویسا بھیس۔''

''چلو بات تو سمجھ میں آ گئی ناں، ویسے میں تم سے ایک اور بات بھی کرنا چاہت ہوں، اگر نکاح میں......''

وہ بات کرتے کرتے چپ ہوگیا کیونکہ کہیں پاس ہی شرافت کی آہٹ سنائی دی تھی۔ شرافت کی موجودگی میں پہلوان اور تاجور مجھے وقاص کے نام سے مخاطب کرتے تھے...... بلکہ

ان کی کوشش ہوتی تھی کہ اس کے سامنے بات ہی نہ کی جائے۔
تھوڑی دیر بعد جب میں اور حشمت کمرے میں پہنچے تو حشمت نے مسرور لہجے میں کہا۔
''آج بہت عرصے بعد تاجور بٹیا کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھی ہے، کہیں نظر نہ لگ جاوے۔ بڑی اچھی لڑکی ہے۔ پورے چاند گڑھی کی آنکھ کا تارا تھی یہ...... اگر اس کی شادی چاند گڑھی میں ہو رہی ہوتی تو پورے گاؤں کے بڑے بوڑھوں کی دعائیں اس کے ساتھ ہوتیں۔''
''چلیں کوئی بات نہیں چاچا حشمت! آپ کی صورت میں پورے گاؤں کے بزرگوں کی نمائندگی موجود ہے۔''
''جمعے کا دن پکا ہے ناں؟'' پہلوان نے تصدیق چاہی۔
''ان شاء اللہ۔''
''اس کا مطلب ہے ابھی چھ دن باقی ہیں۔ اگر تم دونوں اجازت دو تو میں بس ایک چکر چاند گڑھی کا لگا آؤں۔ وہاں شکل دکھا آؤں، پھر پورے اطمینان کے ساتھ تمہارے نکاح کی تیاری کروں گا۔''
''جیسے آپ کی مرضی۔'' میں نے کہا۔
اگلے روز پہلوان چاند گڑھی کے لیے روانہ ہو گیا۔ جاتے وقت تاجور نے اسے خاص طور سے ہدایت کی کہ وہ چوہدری بشیر کے گھر جائے اور گھر والوں کی خیر خبر لائے۔ سیف کی بڑی بہن شازیہ اور تاجور میں گہری دوستی تھی۔ سیف کی ناگہانی موت کے بعد اس کے گھر والوں پر اور شازیہ پر جو کچھ گزری تھی، اس نے تاجور کو براہِ راست متاثر کیا تھا۔ سیف کی والدہ کی موت کا اندوہناک واقعہ تو تاجور کے ذہن سے نکلتا ہی نہیں تھا۔
پہلوان حشمت کے جانے کے بعد جب شرافت بھی دفتر گیا ہوا تھا، میں اور تاجور گھر میں اکیلے تھے، ہم دونوں نے وہ کمرا سلیکٹ کیا جو ہم دونوں کے مشترکہ استعمال میں آنا تھا۔ اس کی آرائش کے حوالے سے تاجور نے شرمائے ہوئے انداز میں ایک دو مشورے بھی دیئے پھر کنی کترا کر وہاں سے چلی گئی۔
رات تک سب کچھ ٹھیک تھا مگر اگلے روز مجھے وہ پھر کچھ بجھی بجھی سی لگی۔ میرا اندازہ یہی تھا کہ اپنے گھر والوں سے دوری کا دکھ رہ رہ کر اس پر حملہ آور ہو رہا ہے۔ باتیں کرتے کرتے وہ ایک دم کھو سی جاتی تھی۔ گھر میں ٹیلی ویژن موجود تھا مگر میرے کہنے پر شرافت نے اس کا کنکشن کاٹ دیا تھا اور تاجور کو یہی بتایا تھا کہ کیبل وغیرہ کا مسئلہ ہے۔ دراصل میں نہیں چاہتا تھا کہ باہر کی کوئی بھی پریشان کن خبر تاجور کی سماعت تک پہنچے۔ تین دن پہلے وہاں گوجرانوالہ

میں جو کچھ ہوا تھا، وہ بہت تہلکہ خیز تھا۔ ٹی وی اور اخبارات میں مسلسل اس حوالے سے خبریں آ رہی تھیں۔ ان میں مختار جھارا اور اس کے ساتھیوں کی اندوہناک موت کا ذکر بھی تھا اور انیق کے بچ نکلنے کی اطلاع بھی۔ ان آہنی میخوں اور شکنجوں کی تصاویر بھی میڈیا پر دکھائی جا رہی تھیں جن کے ذریعے بھاؤ گینگ کے افراد کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ یہ سارا واقعہ اسی رات ہوا تھا جس رات میں راولپنڈی سے غائب ہو کر لاہور پہنچا تھا اور تاجور صبح تک میرے لیے پریشان رہی تھی۔ اگر اس واقعے کی خبر اسے ہو جاتی تو وہ اس واقعے اور میرے اوجھل ہو جانے میں تعلق ڈھونڈ سکتی تھی جو مجھے کسی صورت قبول نہیں تھا۔ میں اسے بار بار یہی باور کرا رہا تھا کہ اپنی اس نئی شخصیت کے ساتھ میں ماضی سے اپنا ہر تعلق توڑ رہا ہوں۔

اسی شام سجاول کے ذریعے مجھے یہ خبر ملی کہ یونس پمپ والا اسلام آباد میں ہے اور اس نے یہ اچھی اطلاع دی ہے کہ تاجور کی والدہ اسپتال سے ڈسچارج ہو کر اسی بنگلے میں واپس آ گئی ہے جہاں دارج نے باقی گھر والوں کو رکھا ہوا ہے۔

میں نے یہ خبر تاجور کو بتا کر اس کا موڈ بحال کرنے کی کوشش کی اور واقعی اس کے چہرے پر سکون کی جھلک دکھائی دی۔ وہ بولی۔ ''میں نے بہت دکھ دیئے ہیں ان کو...... اور اب بھی دے رہی ہوں۔ جب انہیں بتایا جائے گا کہ میں گھر سے چلی گئی ہوں تو پتا نہیں، وہ اس خبر کو کیسے سہیں گی۔''

''تاجور! انہیں فوراً تو بتایا بھی نہیں جائے گا لیکن مجھے یقین ہے کہ جب بتایا جائے گا تو وہ دکھی ہونے کے بجائے سکھ کا سانس لیں گی کہ تم ان شکاریوں کے جال سے بچ نکلی ہو۔ تم دیکھ لینا تمہارے اس فیصلے کو تمہارے سارے سچے ہمدرد اچھی نظر سے ہی دیکھیں گے۔''

وہ اپنی والدہ کے بارے میں تفصیل سے جاننا چاہتی تھی۔ میں نے اسے وہی کچھ بتایا جو سجاول کی زبانی مجھ تک پہنچا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ اس کے باقی گھر والے بھی اسلام آباد کے اس بنگلے میں ہیں اور بالکل خیریت سے ہیں۔ میں نے اسے اس کے بڑے ماموں کی خیر سلامتی کی اطلاع بھی دی۔

رات کو جب میں اپنے کمرے میں لیٹا تھا اور نیم غنودگی کی کیفیت میں تھا، مجھے یوں لگا کہ ساتھ والے کمرے میں تاجور فون پر کسی سے باتیں کر رہی ہے۔ پہلے تو میں نے اسے اپنا وہم جانا مگر پھر اٹھ کر سن گن لینے کی کوشش کی۔ آواز بہت دھیمی تھی...... اور پھر بند ہو گئی۔ میں دوبارہ بستر پر آ گیا۔ کل شام بھی مجھے ہلکا سا شک ہوا تھا کہ جیسے وہ فون پر کسی سے بات کر رہی ہے۔ وہ اتنی ناسمجھ تو ہرگز نہیں تھی کہ اپنے عزیزوں میں سے کسی کو اپنی ''لوکیشن'' کے بارے

میں بتا دیتی۔ آجا کے یہی امکان تھا کہ اس نے ہمراز ملازمہ فردوس سے بات کرنے کی کوشش کی ہو اور اس سے اپنے بھائیوں اور والدہ وغیرہ کی خیریت دریافت کی ہو۔

مگر ایسا تھا تو بھی اسے مجھے بتانا چاہیے تھا۔ میں نے سوچا کہ شاید وہ کل تک مجھ سے اس بارے میں کوئی بات کرے۔ انہی خیالوں میں الجھا سلجھا میں سو گیا۔ صبح اٹھ کر فریش ہوا ہی تھا کہ ناشتے کی خوشبو نتھنوں سے ٹکرائی۔ وہ ٹرے لیے سامنے کھڑی تھی۔ ہلکے گرے رنگ کا سوٹ پہنے اور سرخ کناری والے گرے دوپٹے کے ساتھ ہمیشہ سے زیادہ دلکش دکھائی دے رہی تھی۔ تاہم اس دلکشی میں سنجیدگی اور دکھ کی آمیزش بھی موجود تھی۔

''بہت دیر تک سوتے ہیں آپ۔'' وہ شکوہ کناں لہجے میں بولی۔

''لیکن لگتا ہے کہ اب عادتیں تبدیل کرنے کا وقت آ گیا ہے۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

لہو نے ہمیشہ کی طرح اس کے شفاف چہرے کی طرف یلغار کی مگر میں نے یہ بات بھی نوٹ کی کہ اس ''یلغار'' میں پہلے والی شدت نہیں تھی۔

''مجھے لگتا ہے کہ تمہاری نیند بھی پوری نہیں ہوئی۔ کہیں جاگتی تو نہیں رہی ہو؟''

''نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' اس نے عام لہجے میں کہا پھر بات بدلنے کی غرض سے بولی۔ ''چاچا حشمت سے کوئی رابطہ ہوا آپ کا؟ میرا مطلب ہے چاچا بشیر کے گھر میں تو سب ٹھیک ہے ناں...... مجھے کسی وقت بڑا ڈر لگتا ہے چاچا بشیر کی طرف سے بھی لگتا ہے کہ بیٹے کی موت کا دکھ انہیں بھی کھا رہا ہے۔''

''نہیں تاجور، انہوں نے یہ دکھ سہہ لیا ہے۔ والدہ کی بات اور تھی۔ وہ پہلے ہی دل کی مریضہ تھیں۔ بجھتے ہوئے دیئے کی طرح تھیں......''

پھر میں نے تاجور کو بتایا کہ سیف کی والدہ کو بیٹے کی موت کی اطلاع دینے سے پہلے میں نے کتنی احتیاط سے کام لیا تھا...... اور کس طرح کوشش کی تھی کہ ان کو کم سے کم صدمہ پہنچے۔ تاجور کو بھی اس بارے میں سیف کی بہن شازیہ کی زبانی کافی باتیں معلوم ہو چکی تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ بطور ''ڈرائیور وقاص'' میں نے سیف کی والدہ کو پہلے لاہور کے ایک بہترین اسپتال میں ایڈمٹ کروایا تھا...... اور تب ان تک سیف والی خبر پہنچنے دی تھی۔

میں نے اس کے علاوہ بھی سیف کے گھر والوں کے لیے کچھ نہ کچھ کیا تھا۔ ان باتوں کی خبر تاجور کو نہیں تھی۔ میں نے اپنے منہ سے بتانا ضروری بھی نہیں سمجھا۔ اس گفتگو کے دوران میں، میں منتظر رہا کہ شاید تاجور مجھے رات والی ٹیلی فونک بات چیت کے بارے میں

کچھ بتائے لیکن وہ خاموش رہی۔ میری الجھن میں تھوڑا سا اضافہ ہو گیا۔

وہ شیشے کی طرح شفاف لڑکی تھی۔ اس کے اندر کے احساسات اس کے بلوری چہرے پر فوراً جھلک دکھاتے تھے، اور اس کی شکل گواہی دے رہی تھی کہ وہ اندر سے پریشان ہے، میں نے اس کا موڈ بحال کرنے کے لیے ایک بار پھر ہلکی پھلکی باتیں شروع کر دیں۔

میں نے کہا۔ ''اب زیادہ دن نہیں ہیں۔ تھوڑی بہت پلاننگ کر لو۔ میں نے گزارش کی تھی کہ ایک بار خورسنہ سے بھی بات کر لو۔ وہ نئی نئی شادی شدہ ہے۔ تمہیں تیاری کے حوالے سے قیمتی مشورے دے سکتی ہے۔''

شرمانے کے بجائے وہ سنجیدگی سے بولی۔ ''پرسوں میں نے آپ کے کہنے پر کال کی تو تھی۔ انہوں نے فون اٹھایا بھی مگر بات نہیں ہوئی۔ شاید میری آواز ان تک نہیں پہنچ رہی تھی یا پھر سگنلز کا کوئی مسئلہ تھا۔''

''چلو کوئی بات نہیں، میں سجاول کو فون کرتا ہوں۔ وہ خورسنہ سے تمہاری بات کرا دے گا۔''

وہ بس اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔

میں نے کہا۔ ''تاجور! مجھ سے ایک وعدہ کرو، کبھی بھی مجھ سے کوئی بات کہتے ہوئے دل میں کسی طرح کا کوئی اندیشہ نہ رکھنا۔ نہ اب...... نہ بعد میں۔ میں بھی تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اپنے دل کی ہر کیفیت تم سے کھل کر کہوں گا۔ بالکل ایسے جیسے میں کسی اور سے نہیں اپنی ذات سے کہہ رہا ہوں۔''

''آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں؟''

''یونہی دل میں بات آ گئی تھی۔'' میں نے کہا اور خاموش ہو گیا۔ دل چاہ رہا تھا کہ وہ کچھ کہے۔

اچانک وہ کھڑی ہو گئی۔ نتھنے سکیڑ کر کچھ سونگھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مجھے ماننا پڑا کہ اس کی حسِ شامہ تیز ہے۔ کچن سے سالن کے جلنے کی بالکل ہلکی سی بُو آئی تھی لیکن اسے پتا چل گیا تھا۔ ''اوہ...... کام خراب ہو گیا۔'' اس نے کہا اور بھاگ کر کچن کی طرف چلی گئی۔

اس بالکل عام سے گھر اور معمولی سے در و دیوار کو بھی اس کی موجودگی نے رنگوں سے بھر دیا تھا۔

O......❖......O

میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے یوں ہی سیل فون سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ فون پر موبائل

نیٹ آن تھا۔ میں مکس مارشل آرٹ سے متعلق سائٹس دیکھنے لگا۔ یہاں بھی ''میری موت'' کی خبر جگہ جگہ دردناک انداز میں موجود تھی۔ میں دیکھ کر حیران ہوا کہ مختلف سائٹس پر میری سیکڑوں تصاویر پوسٹ کی گئی تھیں اور تبصرے لکھے گئے تھے۔ مداحوں نے دلدوز فقروں کے ساتھ میری جدائی پر دکھ کا اظہار کیا تھا۔ میرے پرانے مقابلوں کی تصاویر اور چھوٹے چھوٹے ''کلپس'' بھی کئی جگہوں پر دکھائی دیتے تھے۔ وہ تصویر بھی جا بجا نظر آتی تھی جس کا تعلق جاماجی سے تھا اور جو اس جزیرے پر انقلاب کا سبب بنی تھی۔ ٹمپریچر سیل میں میری قوتِ برداشت کا وہ امتحان لوگوں کے دل و دماغ پر نقش تھا۔ ان ساری تصویروں تبصروں اور کلپس سے اس پیار کا اظہار ہوتا تھا جو ''ایم ایم اے'' کے شائقین مجھ سے کرتے تھے۔ ایسی چیزیں دیکھ کر مجھے رنج بھی ہوتا تھا کہ میں نے اپنے چاہنے والوں کے جذبات کو ایک جھوٹ سے مجروح کیا ہے۔

اچانک میرے ذہن میں ایک بار پھر داؤد بھاؤ کا خیال آیا۔ وہ نہ جانے کہاں چھپ گیا تھا۔ اس سے ایک بار بھی رابطہ نہیں ہو پایا تھا۔ اس کا نمبر ہر بار بند ہی ملتا تھا۔ سجاول درجنوں بار اس سے رابطے کی کوشش کر چکا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ میری پرانی ''سم'' میں شاید اس کا ایک اور نمبر بھی موجود ہو۔ یہ ''سم'' میں نے ایک ڈبیا میں ابھی تک محفوظ رکھی ہوئی تھی۔ کچھ دیر بعد میں کچن کی کچھ اشیا لینے کے لیے سوزوکی پر مین مارکیٹ گیا تو ایک جگہ گاڑی روک کر میں نے پرانی سم ایک فالتو موبائل فون میں ڈالی اور اس میں نمبرز دیکھے۔ داؤد بھاؤ کا اور مختار جھارا کا ایک ایک نمبر یہاں بھی مل گیا۔ مختار جھارا سے رابطہ تو اب اگلے جہان میں ہی ہو سکتا تھا، داؤد بھاؤ کے لیے کوشش کی جا سکتی تھی۔ میں نے کوشش کی اور مایوسی ہوئی۔ داؤد بھاؤ کا یہ نمبر بھی خاموش تھا۔ میں یہ دیکھ کر بھی چونکا کہ میرے پرانے نمبر پر میرے لیے ایک میسج بھی آیا ہوا تھا۔ یہ حیرانی کی بات تھی۔

اگر میں آج یہ سم آن نہ کرتا تو شاید یہ میسج بھی بے شمار دوسرے میسجز اور کالز کی طرح ہوا میں اُڑ جاتا۔ میں نے یہ ٹیکسٹ میسج پڑھا۔ یہ میرے ناروے کے ایک جگری دوست فخر لی طرف سے تھا۔

اس نے جذباتی انداز میں لکھا تھا۔ ''تمہارے اس نمبر پر درجنوں بلکہ شاید سیکڑوں ہی کال کر چکا ہوں۔ اور اس کی وجہ یہی ہے کہ کئی دوسرے لوگوں کی طرح میرے دل سے یہ شک جاتا نہیں ہے کہ شاید تم ابھی زندہ ہو اور دنیا کے کسی نہ کسی گوشے میں موجود ہو، سانس لے رہے ہو۔ کاش یہ انمول شک میرے ذہن اور دل سے نہ نکلے یہاں تک کہ تم مجھے

مل جاؤ۔ اگر میرے یہ الفاظ تم تک پہنچیں تو جان لو کہ ہمارے لیے ایک بڑی اچھی خبر موجود ہے۔ آخر اس بندے کا کھوج لگ گیا ہے جس کے ذریعے ہم جان ڈیرک اور اس کے گینگ کو ناکوں چنے چبوا سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تم سمجھ گئے ہو گے اور شاید تمہارے رونگٹے بھی کھڑے ہو گئے ہوں۔ ہاں میں وائٹس وائے کی بات کر رہا ہوں۔ وہ یہاں بنکاک میں موجود ہے۔ ایک جگہ ایک قیدی کی حیثیت سے پایا جا رہا ہے اور اس کی بیٹی بھی ساتھ ہے۔ میں نے ساری معلومات اکٹھی کی ہیں۔ ڈیتھ اسکواڈ کے پانچ چھ سرمنڈھے خبیث اس کی حفاظت پر مقرر ہیں۔ اگر ہم وائٹس وائے تک پہنچ جائیں تو اس ذلیل جان ڈیرک کی دنیا میں قیامت برپا ہو جائے۔ تم یہ بات بہت اچھی طرح جانتے ہو۔ اگر میرے یہ الفاظ تم تک پہنچ گئے ہیں تو فوراً جواب دو فوراً۔

تمہاری زندگی اور تمہارے ساتھ کا متمنی تمہارا دوست فخر زمان۔''

فخر کے اس میسج نے واقعی مجھے زیروزبر کر دیا۔ اگر یہ میسج مجھے چند ماہ یا سال ڈیڑھ سال پہلے ملا ہوتا تو میرے نزدیک اس کی بے پایاں اہمیت ہوتی، واقعی میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے اور میں ٹیکساری گینگ کو اس کے ہی ایک رکن کے ذریعے تباہ و برباد کرنے پر تیار ہو جاتا۔ لیکن اب یہ میسج میرے لیے بیکار تھا اور اس طرح کے سب میسجز، کالز اور رابطے بیکار تھے جو مجھے میرے ماضی کی طرف کھینچ سکتے تھے۔

میں نے ایک گہری سانس لے کر اس میسج کو ڈیلیٹ کیا اور پھر ماضی کی اس پُرخطر سم کو بھی فون سے نکال لیا۔

مین مارکیٹ میں ضروری خریداری کے بعد میں دوبارہ گھر پہنچا تو تاجور کچن میں تھی اور میرا انتظار کر رہی تھی۔

میں شام تک منتظر ہی رہا کہ شاید تاجور مجھ سے اپنی کسی الجھن کا ذکر کرے اور بتائے کہ کل اور منگل کے روز وہ فون پر کس سے گفتگو کر رہی تھی مگر اس حوالے سے ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ شام سے پہلے میں نے اسے دیکھا۔ وہ شاید نہا کر نکلی تھی۔ اپنے گیلے بال کھولے صحن کے اس حصے میں بیٹھی تھی جہاں ابھی تھوڑی سی دھوپ موجود تھی۔ کھوئے کھوئے انداز میں اپنے موبائل کو دیکھ رہی تھی۔ کسی مصور کی ایسی خوب صورت پینٹنگ کی طرح نظر آتی تھی جس کی طرف دل خود بخود کھنچتا چلا جاتا ہے۔ وہ ایسے سادہ مگر جاں گسل حسن کی مالک تھی کہ کسی بھی مضبوط سے مضبوط مرد کے لیے اسے دیکھ کر سہنا اور برداشت کرنا ایک مشکل امر تھا۔ میں نے کئی بار سوچا تھا، حسن کے ملکی اور بین الاقوامی مقابلے ہوتے ہیں لیکن وہ

صرف ان لڑکیوں میں ہوتے ہیں جو مقابلے کے لیے دستیاب ہوتی ہیں۔ گمنام شہروں کی گمنام گلیوں میں...... دور دراز بستیوں میں اور پہاڑوں کی اَن دیکھی آبادیوں میں نہ جانے کتنے ایسے چاند چھپے ہوتے ہیں جن کے سامنے عالمی حسیناؤں کے ستارے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔

تاجور کے حسن میں کچھ تھا۔ کچھ سب سے جدا...... سب سے علیحدہ...... یونہی تو ملک کی ''طاقتور داراب فیملی'' کا صاحب زادہ سو جان سے اس پر فدا نہیں ہوا تھا۔ ایسے بھونرے تو پھول پھول پر منڈلاتے ہیں...... وہ شادی کے بندھن کو کب قبول کرتے ہیں، لیکن تاجور کے سلسلے میں دارج یہ بندھن قبول کرنے کو بھی تیار تھا اور بات صرف دارج کی ہی نہیں تھی، اسے تو جو ایک بار دیکھتا تھا گرویدہ ہو جاتا تھا، پہلوان حشمت ٹھیک ہی کہا کرتا تھا، وہ چاند گڑھی کا چاند تھی۔ وہاں کے ہر باسی کی آنکھ کا تارا تھی۔ پھر میرا دھیان تاجور کے پہلے منگیتر اسحاق کی طرف چلا گیا۔ کیسا بدنصیب تھا وہ۔ چاند گڑھی کے گمنام گاؤں میں دھرتی کا یہ بے مثل چاند اس کے حصے میں آیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو اس کے قابل بنانے کی کوشش کرتا تو شاید یہ تحفہ اس کو مل ہی جاتا۔ لیکن وہ تو عالمگیر جیسے مشیروں کی وجہ سے اپنی ہی مردانہ اکڑفوں میں گھرا ہوا تھا۔ پستیوں میں گرتا چلا جا رہا تھا اور یہ سمجھ رہا تھا کہ تاجور تو گھڑے کی مچھلی ہے: وہ جب چاہے گا، ہاتھ ڈال کر دبوچ لے گا۔

میں سوچ رہا تھا اور کھڑکی میں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ڈوبتے سورج کی آخری کرنیں اس کے گیلے بالوں پر چمک رہی تھیں۔ جی چاہا کہ خاموشی سے جا کر اس کے پہلو میں جا بیٹھوں۔ اپنا چہرہ اس کے نم ریشمی بالوں پر رکھ دوں اور ان کی وہ ساری مہک اپنے اندر اتار لوں جو ایک مدت سے مجھ سے بچھڑی ہوئی تھی۔ وہ شام...... وہ زرد دھوپ اور وہ گم صم بیٹھی تاجور سب کچھ دیکھنے کے قابل تھا۔ میں کوئی شاعر یا مصور نہیں تھا ورنہ اس غم آمیز خوب صورتی کو دیکھ کر ضرور کوئی شاہکار تخلیق کر دیتا۔

اسی دوران میں دھوپ مکمل طور پر اوجھل ہو گئی۔ اس نے دونوں بازو اٹھا کر اپنے بال سمیٹے اور اندر چلی گئی۔

میں تاجور کی جاسوسی کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا مگر مجھے یہ اندیشہ بھی تھا کہ کہیں وہ اپنی شرم اور جھجک کے سبب کوئی ایسی پردہ داری نہ کرے جو ہم دونوں کے لیے نقصان دہ ثابت ہو جائے۔ شام کو جب تاجور کپڑے بدلنے کے لیے چند منٹ کے واسطے واش روم گئی تو میں نے اپنا ننھا پن ہول کیمرا کامن روم میں ایک وال کلاک کی نچلی سائیڈ پر چسپاں کر دیا۔ تین چار

ملی میٹر کے اس مہین کیمرے نے وال کلاک کے رنگ کے ساتھ یوں مناسبت پیدا کی کہ بالکل اوجھل ہو گیا۔ اس کیمرے کو لگانا اس لیے بھی ضروری تھا کہ کل سارا دن مجھے گھر سے باہر رہنا تھا۔ پہلوان حشمت بھی ابھی تک نہیں لوٹا تھا۔ ایسے میں تاجور گھر میں اکیلی تھی۔

اس روز رات کو ہی میں نے ان چیزوں کی لسٹ تیار کر لی جو اگلے چند روز میں ہمارے لیے ضروری تھیں۔ ایک گدا، کمبل، کچھ کپڑے، جوتوں کے دو تین جوڑے، تھوڑی سی جیولری، چوڑیاں، میک اَپ کا مختصر سامان، واش روم میں رکھی جانے والی اشیا اور اس قسم کی دیگر چیزیں۔

صبح دس بجے کے لگ بھگ میں راجا بازار جانے کے لیے گھر سے روانہ ہو گیا۔ شرافت کی ہائی روف سوزوکی میرے استعمال میں تھی۔ اپنی بدلی ہوئی شباہت کے ساتھ مجھے پولیس کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا، نہ ہی ٹیکساری گینگ اور دارابیوں کی طرف سے۔ پھر بھی میں باہر نکلتے وقت پی کیپ اور ہلکے کلر کے گلاسز استعمال کر رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی داڑھی نے بھی مجھے کافی حد تک کیموفلاج کر دیا تھا۔

میرے کیمرے کا رابطہ میرے سیل فون سے تھا۔ اگلے چار پانچ گھنٹے میں، میں نے گاہے بگاہے کیمرے کے ذریعے تاجور کی خیر خیریت جاننے کی کوشش کی۔ ایک بار وہ کیمرے کے فریم میں نظر بھی آئی۔ وہ سہ پہر کی چائے پی رہی تھی۔ کسی گہری سوچ میں گم دکھائی دیتی تھی۔ شام پانچ بجے کے لگ بھگ میں جیولری مارکیٹ پہنچا۔ میرے بس میں ہوتا تو اس موقع پر تاجور کو سر سے پاؤں تک سونے اور جواہرات سے ڈھانپ دیتا لیکن فی الوقت یہ دھوم دھام ممکن نہیں تھی۔ اس کام کو میں نے پھر کسی وقت کے لیے اٹھا رکھا۔ میں نے اس کے لیے جیولری کے چند ضروری آئٹم خریدے۔ (اور یہ سب میری وہی حلال کی کمائی تھی جو میں نے چند سال پہلے ایم ایم اے کے پروفیشنل کھلاڑی کی حیثیت سے جوڑی تھی) زیورات کی مارکیٹ یعنی صرافہ بازار سے نکل کر مجھے کچھ ریڈی میڈ کپڑے خریدنا تھے۔ تاجور کا ناپ بھی میرے پاس موجود تھا۔ گاڑی میں بیٹھتے وقت میں نے پھر سیل فون کے ذریعے کیمرا چیک کیا اور مجھے یوں لگا جیسے کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ میں ہکا بکا اسکرین کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ کامن روم میں ٹیوب لائٹ آن تھی اور اس روشنی میں مجھے وہاں انیق بیٹھا دکھائی دے رہا تھا۔

''اوہ گاڈ!'' میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔

میری نگاہیں اسکرین پر مرکوز رہیں۔ میں نے آڈیو کا والیم تھوڑا سا بڑھایا۔ مدھم

آوازیں میرے کانوں تک پہنچنے لگیں۔ انیق کا جو پہلا فقرہ میرے کانوں سے ٹکرایا، وہی دھماکا خیز تھا۔ وہ بولا۔ ”تاجور! شاہ زیب بھائی کی موت کا غم اپنی جگہ ہے...... ان کی ذات کے اتنے اچھے پہلو تھے کہ ہم گنتے جائیں اور وہ ختم ہونے میں نہ آئیں مگر شاید سچ ہی کہتے ہیں کہ کوئی انسان فرشتہ نہیں ہوتا جو انسان ہے، اس میں کہیں نہ کہیں خامی کوتاہی تو ہوتی ہے۔“

تاجور کا رخ کیمرے کی طرف تھا اور اس کا چہرہ زیادہ واضح دکھائی دیتا تھا۔ اس کی آنکھیں سُرخ تھیں اور چہرے پر رنج والم کی ایک ایسی کیفیت تھی جو اس سے پہلے میں نے کبھی نہ دیکھی تھی۔ وہ دل فگار لہجے میں بولی۔ ”مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا انیق، وہ ایسا کس طرح کر سکتے تھے...... کس طرح؟“

”یقین تو مجھے بھی نہیں آیا تھا، لیکن ہم حقیقت کو جھٹلا نہیں سکتے۔ بہر حال اب ان باتوں سے کوئی فائدہ تو نہیں ہے۔ نہ اب سیف دنیا میں ہے، نہ وہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی خطائیں معاف کرے اور ہماری بھی۔ شاید میں آپ کو یہ سب کچھ بتاتا ہی نہیں لیکن جب آپ سے فون پر رابطہ ہوا تو پھر باتوں سے بات نکل آئی۔ بلکہ...... اب مجھے اس کا افسوس بھی ہو رہا ہے۔“ انیق نے افسردہ لہجے میں کہا۔

مجھے انیق کے چہرے کی ایک سائیڈ نظر آ رہی تھی اور ایک کندھا، باقی جسم نظروں سے اوجھل تھا۔ اس کی گردن پر ابھی تک ایک بینڈ ایج موجود تھی۔ یہ ان چوٹوں کی نشانی تھی جو چند روز پہلے اسے گوجرانوالہ کے خونی واقعے میں آئی تھیں۔

اگلے چند منٹ میں مجھ پر یہ ناقابلِ یقین انکشاف ہوا کہ انیق اور تاجور میں پچھلے دو تین روز سے ٹیلی فونک رابطہ موجود تھا اور یہ بھی کہ انیق نے تاجور کے سامنے ایک نہایت خوفناک بات کہہ دی تھی۔ بے شک یہ بات جھوٹی نہیں تھی لیکن اتنی تلخ اور نقصان دہ تھی کہ میں نتیجے کا سوچ کر سرتاپا لرز گیا۔ انیق، تاجور کو اس امر سے آگاہ کر چکا تھا کہ سیف کو مارنے والا کوئی اور نہیں میں ہوں، میں نے اسے زہر دے کر ہلاک کیا تھا۔

کبھی کبھی زندگی میں ایسے لمحے بھی آتے ہیں، جب کانوں سے سن کر اور آنکھوں سے دیکھ کر بھی کسی بات پر یقین کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ میرے سامنے موبائل اسکرین پر انیق بیٹھا نظر آ رہا تھا جو میرا بہترین دوست اور ساتھی تھا۔ ہم نے ایک دوسرے کے کندھے سے کندھا ملا کر خطرناک ترین حالات کا سامنا کیا تھا اور کئی موقعوں پر ایک دوسرے کی ڈھال بھی بنے تھے۔ کسی وقت تو یوں لگتا تھا کہ میں انیق پر اتنا ہی اعتماد کر سکتا ہوں جتنا اپنی ذات پر...... ا

آج...... وہی انیق...... جو ہر وقت میرے لیے جان نچھاور کرنے کے لیے تیار رہتا تھا، میری ''موت'' کے بعد ایک بالکل نئے روپ میں نظر آ رہا تھا۔ وہ ایک نہایت نازک موقع پر تاجور کے سامنے ایک ایسا انکشاف کر رہا تھا جو تاجور کے سامنے میرے کردار کی دھجیاں بکھیر سکتا تھا۔ وہ کیوں کر رہا تھا ایسا؟ اور کیا واقعی اس نے ایسا کیا تھا یا یہ میرا 'تصور' تھا جو مجھے ایک بھیانک منظر دکھا رہا تھا۔

تاجور نے جیسے سسک کر کہا۔ ''کیا ان دونوں میں کوئی جھگڑا ہوا تھا انیق؟''

''نہیں جھگڑا تو نہیں تھا لیکن ایک دبی دبی سی رنجش تو ان دونوں میں پائی ہی جاتی تھی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہمارے جاماجی روانہ ہونے سے پہلے ہی شاہ زیب بھائی یہ جان گئے تھے کہ سکھیرا گاؤں میں جس نوجوان سے آپ کی شادی ہونے والی ہے، وہ سیف ہی ہے۔ انہوں نے سیف کے پاس آپ کی تصویر دیکھی تھی اور پھر ساری بات کھل گئی تھی۔ جب لیہ میں سیف نے اصرار کیا کہ وہ ہمارے ساتھ جاماجی جائے گا تو میں اس پر رضامند نہیں تھا۔ شاہ زیب بھائی بھی نہیں تھے، لیکن پھر بعد میں وہ راضی ہو گئے۔ شاہ زیب بھائی یوں تو دل کے بہت بڑے تھے، لیکن مجھے لگتا ہے تاجور کہ آپ کے حوالے سے شاید ان کا دل زیادہ بڑا نہیں تھا۔''

''تم...... کیا کہنا چاہتے ہو؟'' تاجور کی بھیگی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

''مجھے لگتا ہے کہ نہ چاہنے کے باوجود وہ سیف سے کچھ رقابت محسوس کرنے لگے تھے۔ انہوں نے سیف کے موبائل فون میں آپ کی بہت سی تصویریں دیکھیں، آپ دونوں کی گفتگو بھی سنی۔ ان ساری چیزوں نے ان کے دل پر اثر کیا تھا لیکن یہ اثر اس حد تک ہوگا یہ میں نے کبھی سوچا نہیں تھا جس طرح آپ کو یقین نہیں آ رہا، مجھے بھی بھروسا نہیں ہوا تھا کہ...... انہوں نے...... اپنے ہاتھوں سے سیف کو زہر دیا ہے۔'' پھر وہ ذرا توقف سے بولا۔ ''تاجور! آپ کو شاہ زیب بھائی نے اس بارے میں کیا بتایا تھا؟''

تاجور کی آواز جیسے کسی گہری کنوئیں میں سے آ رہی تھی۔ وہ ویسے بھی کیمرے سے تھوڑا سا دور تھی۔ آواز بمشکل میری سماعت تک پہنچ رہی تھی۔ وہ بولی۔ ''مجھے بھی وہی کچھ پتا ہے جو دوسروں کو۔ انہوں نے کہا تھا کہ ٹاپو پر پکڑے جانے کے بعد امریکی افسر نے ان پر تشدد کی انتہا کر دی تھی۔ سیف اس تشدد کی تاب نہ لایا۔ اسے خون کی الٹیاں ہوئیں اور وہ دم توڑ گیا...... لیکن انیق......'' تاجور کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

انیق سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ تاجور کی آنکھوں میں جیسے درد کا دریا

بہہ رہا تھا۔ وہ خشک لبوں پر زبان پھیر کر بولی۔ ''انیق...... میں کیا کروں؟ میرا دل ابھی بھی نہیں مان رہا۔ اس بات کا کیا ثبوت ہے......؟''

انیق نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔ ''ثبوت دیکھ کر کیا کریں گی...... ویسے ثبوت بھی ہے میرے پاس۔''

اس نے اپنا سیل فون نکالا۔ کچھ دیر اس کے ''کی پیڈ'' پر انگلیاں چلاتا رہا۔ تب فون کے وائس ریکارڈر میں سے ایک آواز نکل کر میرے کانوں تک پہنچی۔ میں ششدر رہ گیا۔ بے شک یہ میری ہی آواز تھی۔ لونگ کے ٹمپریچر سیل میں جب میں اپنی زندگی کی بدترین اذیت سہنے کے بعد اور ہڈیوں کا زخمی ڈھانچا بن کر واپس اپنے لوگوں میں پہنچا تھا تو جاما جی میں ناظم باذان کے گھر میں انیق سے میری گفتگو ہوئی تھی جس میں، میں نے اسے ٹاپو پر گزرنے والی قیامت کا احوال سنایا تھا۔ انیق نے باتوں کو محفوظ کرنے کی غرض سے ریکارڈ کر لیا تھا لیکن اب وہ اس گفتگو کا جو حصہ تاجور کو سنا رہا تھا، وہ سیاق و سباق سے ہٹ کر تھا۔ اس نے صرف وہی پورشن پلے کیا تھا جس میں، میں نے اسے بتایا تھا کہ میں نے ماڈل گرل جاناں کی انگوٹھی سے نکلنے والا زہر اپنی قمیص کی سلائی میں سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ میں نے یہی زہر کپ میں ڈال کر سیف کو نیم بے ہوشی کی حالت میں پلا دیا۔

میرے کان شائیں شائیں کر رہے تھے۔ یہ انیق کیا کر رہا تھا؟ یہ اس کا کیسا روپ میرے سامنے آیا تھا؟ میری ''زندگی'' میں وہ کیا تھا اور میری ''موت'' کے بعد یہ اس نے کس طرح کی ناقابلِ یقین حرکت کر ڈالی تھی۔ کیا اس کے پیچھے کوئی مقصد تھا؟

تاجور اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر بیٹھ گئی تھی۔ اب اس کا چہرہ کیمرے کے فریم میں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ شاید وہ کچھ بولی بھی تھی مگر آواز ریکارڈ نہیں ہوئی تھی۔ اچانک سیٹی کی مدھم آواز سنائی دی۔ یہ الیکٹرک کیتلی کی سیٹی تھی۔ تاجور نے شاید انیق کے لیے چائے بنائی تھی۔ وہ جلدی سے اٹھ کر کچن کی طرف چلی گئی۔ انیق چند سیکنڈ وہیں بیٹھا رہا۔ پھر ایک گہری سانس لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے لنگڑاتے ہوئے، آٹھ دس قدم کمرے میں ہی چہل قدمی کی اور مختلف چیزوں کا سرسری جائزہ لیا۔ میں اس کی تیز نگاہی کا قائل تھا۔ چند لمحوں کے لیے مجھے اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں وہ وال کلاک کے نچلے حصے سے چپکا ہوا ''منی کیمرا'' دیکھ ہی نہ لے۔ بہرحال خیریت گزری۔ وہ پہلے والی پوزیشن پر دوبارہ بیٹھ گیا اور اپنے سیل فون سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔ سیل فون کا رخ ایسا تھا کہ اس کی اسکرین کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ اچانک اسکرین پر کسی لڑکی کی تصویر نظر آئی۔ مجھے واضح دکھائی نہیں دیا لیکن میری چھٹی

حسن نے تائید کی کہ یہ تاجور کا ہی کوئی کیمرا شاٹ ہے۔

انیق محویت سے اسے دیکھنے لگا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے کوئی پرستار اپنی محبوب شخصیت کی دلکشی کو چپکے چپکے اپنی آنکھوں میں سمیٹتا ہے۔ اتنے میں قدموں کی چاپ ابھری اور انیق نے جیسے ٹھٹک کر تصویر کو اوجھل کر دیا۔ میں سناٹے کی سی کیفیت میں تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اتنی جلدی انیق کے بارے میں اور اس کے خیالات کے بارے میں کچھ بھی کہنا مشکل تھا لیکن جو کچھ میری نگاہوں کے سامنے آ رہا تھا، وہ ہلا دینے والا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ...... ہم تینوں کے مسلسل ساتھ کی وجہ سے انیق نے تاجور کے حوالے سے، کوئی نرم گوشہ رکھنا شروع کر دیا ہو۔ جب تک میں اس کے آس پاس موجود تھا اس نے یہ سب کچھ اپنے دل کی گہرائی میں چھپائے رکھا ہو، اور اب جبکہ میں اس کی نظروں میں ''دنیا میں نہیں رہا تھا'' اس نے تاجور سے اپنی وابستگی کو ظاہر کرنے کا فیصلہ کیا ہو۔ کچھ دن پہلے وہ سکھیرا میں بھی تاجور کے آس پاس منڈلاتا رہا تھا اور دارج داراب سے ٹکر لینے پر بھی آمادہ نظر آتا تھا۔ کیا وہ سب اسی وجہ سے تھا کہ وہ تاجور کے متعلق کسی اور انداز سے سوچنے لگا تھا؟

مجھے یہ سب کچھ اتنا عجیب محسوس ہوا کہ میں نے اپنے سر کو شدت سے نفی میں ہلایا اور ان خیالوں کو ذہن سے نکال باہر کیا۔ دل و دماغ یہ سب کچھ تسلیم ہی نہیں کر رہے تھے، لیکن دوسری طرف میں اس حقیقت سے بھی آگاہ تھا کہ زندگی انسان کو اپنے ایسے ایسے روپ دکھاتی ہے جن کے بارے میں اس نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوتا۔

انیق جلدی جلدی چائے پی رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ دارابیوں کے بارے میں گفتگو بھی کر رہا تھا۔ وہ تاجور کو سمجھا رہا تھا کہ اسے بے حد احتیاط کی ضرورت ہے اور اس نے دارج داراب کے چنگل سے نکل کر ایک بہت اہم اور قابلِ تعریف قدم اٹھایا ہے۔ وہ اسے ہر طرح سے اپنی مدد اور تعاون کا یقین بھی دلا رہا تھا۔ تاجور اس کی باتیں سن تو رہی تھی لیکن اس کا ذہن جیسے کہیں اور تھا۔ اسکرین پر تصویر بہت واضح نہیں تھی پھر بھی تاجور کا چہرہ دیکھ کر ہی میں بتا سکتا تھا کہ وہ شدید کرب میں مبتلا ہے اور یہ بھی چاہتی ہے کہ انیق اپنی چائے ختم کر کے جلد سے جلد یہاں سے اٹھ جائے۔

میرے ذہن میں جو کئی سوال اودھم مچا رہے تھے، ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ آخر انیق، سجاول کے گھر سے یہاں تاجور کے پاس کیسے اور کیونکر پہنچا؟ کیا اس کی ذہانت اور حاضر دماغی نے خود تاجور کا سراغ لگایا یا پھر تاجور کی طرف سے ہی کوئی غلطی ہوئی۔ اب یہ بات بھی اچھی طرح میری سمجھ میں آ رہی تھی کہ تین دن سے تاجور کیوں مسلسل گم صم ہے......

کسی بے نام اضطراب نے اسے ڈھانپا ہوا ہے؟

میں سوچنے لگا...... ایسا تو نہیں ہوا ہو گا کہ تاجور سے ٹیلی فونک رابطہ ہوتے ساتھ ہی انیق نے اسے سیف والی بات بتادی ہو۔ پہلے ان کے درمیان عام نوعیت کی گفتگو ہوئی ہو گی۔ پھر کیا وجہ تھی کہ تاجور نے مجھے اس ''رابطے'' کے متعلق بالکل بے خبر رکھا تھا؟ بہت سے سوال تھے اور اس کے ساتھ ساتھ دل گواہی دے رہا تھا کہ آخر ذہن میں پرورش پانے والے بے نام اندیشے درست ثابت ہو گئے ہیں...... میری اور تاجور کی زندگی ایک بار پھر تلاطم کا شکار ہونے والی ہے۔

اب کچھ بھی خریدنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن میں پھر بھی یونہی اِدھر اُدھر گھومتا رہا اور انیق کے بارے میں سوچتا رہا۔ میں نے ایک جگہ رک کر سجاول سیالکوٹی کو فون کیا، فوراً ہی اس کی پاٹ دار آواز میرے کان میں گونجی۔ ''بڑی لمبی عمر ہے تمہاری، میں بھی ابھی تمہیں ہی فون کرنے والا تھا۔''

''کس سلسلے میں؟'' میں نے پوچھا۔

''یار تمہارے نکاح کے سلسلے میں اور دوسری تیاریوں کے سلسلے میں۔ میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ خورسنہ اور تاجور کا رابطہ کراؤ۔ وہ ایک دوسرے کو اچھے مشورے دے سکتی ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''پرسوں تاجور نے رابطہ کیا تو تھا مگر بات نہیں ہو سکی۔ شاید نیٹ ورک میں خرابی تھی۔ خورسنہ کی آواز تاجور تک نہیں پہنچ رہی تھی۔''

''چلو کوئی بات نہیں، ابھی بات کرا دیتے ہیں۔ کہاں ہے تمہاری ہونے والی؟'' سجاول اپنے مخصوص انداز میں بولا۔

''میں ابھی گھر سے باہر ہوں، گھر جاؤں گا تو پھر دیکھ لیں گے۔''

''اور ہاں شاہی! وہ تمہارا انکو شہزادہ میرے منع کرنے کے باوجود یہاں سے نکل گیا ہے۔ ایک نمبر کا ڈھیٹ ہے۔ میں نے کہا بھی کہ ابھی تمہارا پاؤں پوری طرح ٹھیک نہیں ہوا لیکن نہیں مانا، کہہ رہا تھا کہ داؤد بھاؤ سے میرا رابطہ نہیں ہو رہا، ان سے ملنا بہت ضروری ہے۔ اب پتا نہیں کیا ارادے ہیں اس کے۔''

''کیا مطلب؟''

''اس کے ضدی پن سے تو تم بھی واقف ہو، کہیں ٹیکساری والوں کو ڈھونڈنے نہ نکل پڑا ہو۔ اپنے ساتھی مختار جھارا کی موت کا بھی بڑا دکھ ہے اسے۔''

سجاول غلط اندازہ لگا رہا تھا۔ انیق، ٹیکساری گینگ وغیرہ کے پیچھے نہیں تھا وہ تو سیدھا

یہاں راولپنڈی پہنچا تھا اور ایک اور ہی طرح کے معاملے میں الجھا ہوا تھا۔ بہرحال ابھی میں نے سجاول کو اس بارے میں کچھ بتانا مناسب نہیں سمجھا۔

گفتگو کے آخر میں سجاول نے مجھ سے کہا۔ ''کیا بات ہے تم کچھ بجھے بجھے سے لگ رہے ہو؟''

میں نے کہا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں۔'' اِدھر اُدھر کی بات کر کے میں نے اسے مطمئن کر دیا۔

میں جان بوجھ کر ذرا دیر سے گھر پہنچا۔ انیق تب تک جا چکا تھا۔ شرافت بھی واپس آ چکا تھا۔ میں نے خریدا ہوا سامان فی الوقت گاڑی میں ہی رہنے دیا۔ اندر پہنچا تو تاجور حسبِ توقع بہت گم صم دکھائی دے رہی تھی۔

''کیا بات ہے تاجور؟'' میں نے پوچھا۔

''سر میں درد ہے۔ دو گولیاں بھی کھائی ہیں لیکن ابھی طبیعت سنبھلی نہیں۔''

''ڈاکٹر کو دکھا لیتے ہیں۔''

''نہیں، شاید آرام کرنے سے ٹھیک ہو جاؤں گی۔ آپ کھانا کتنے بجے کھائیں گے؟''

''بالکل بھی بھوک نہیں ہے۔ تم آرام کرو، اگر ضرورت پڑی تو بتا دوں گا۔''

وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں جانتا تھا کہ اس کے دل پر کیا گزر رہی ہو گی۔ شاید اس وقت میں اس کے نزدیک دنیا کا خود غرض ترین انسان تھا جس نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے اپنے دل میں رقابت کو پروان چڑھایا اور موقع تاک کر اس بے گناہ کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا جو مستقبل میں اس کی خواہش کے راستے میں آ سکتا تھا پھر اس کی موت کے بارے میں سفید جھوٹ گھڑا کہ وہ غیر ملکیوں کے تشدد کا شکار ہوا۔

میرے ذہن میں بار بار یہ سوال اٹھ رہا تھا۔ کیا میں تاجور کے سامنے اپنی صفائی پیش کروں؟ اسے بتاؤں کہ مجھے سیف کے حوالے سے جھوٹ کیوں بولنا پڑا ہے۔ کیا وہ میری صفائی کو مانے گی۔ یا اس کا ذہن اس بات کو تسلیم کر لے گا کہ میں تو لیڈر ہونے کے باوجود امریکیوں کے تشدد سے بچ کر واپس پاکستان پہنچ گیا اور سیف میرا صرف ساتھی ہونے کی وجہ سے مار دیا گیا؟ پتا نہیں کیوں دل میں ایک عجیب سی مزاحمت پیدا ہو رہی تھی۔ وہ مجھ سے محبت کرتی تھی تو پھر اسے مجھ پر بھروسا بھی کرنا چاہیے تھا۔ پیار کرنے والے تو خاموشی کی زبان بھی سمجھتے ہیں اور ان کے دلوں کے درمیان ایک ایسی راہ ہوتی ہے جو ان کے درمیان کوئی فاصلہ کوئی پردہ رہنے ہی نہیں دیتی۔ میں وہ تھا جس نے پوری طرح دسترس رکھنے کے باوجود تاجور کو

میرا دل کہہ رہا تھا کہ انیق یہاں تاجور کے آس پاس ہی موجود ہے۔ وہ راولپنڈی میں ہی تھا اور کسی بھی وقت تاجور سے دوبارہ رابطہ کر سکتا تھا۔ میں خود بھی چاہتا تھا کہ وہ رابطہ کرے۔ تاجور کے کمرے میں میرا ''منی کیمرا'' نصب تھا اور مجھے ان دونوں کی گفتگو تک رسائی حاصل ہو سکتی تھی۔ اس رات میں گم صم سا اپنے کمرے میں لیٹا رہا۔ ساتھ والے کمرے میں تاجور تھی۔ ہم دونوں کے درمیان بس ایک دیوار تھی۔ دو دن پہلے تک یہ دیوار بالکل بے معنی اور عارضی چیز محسوس ہوتی تھی، لیکن اب یہ اپنے اصل وجود سے بیسیوں گنا موٹی اور اونچی ہو چکی تھی...... یوں لگتا تھا کہ اس نے اپنے اندر صدیوں کے فاصلے سمیٹ لیے ہیں۔ سوچتے سوچتے خیالوں کا دھارا اس ٹیکسٹ میسج کی طرف چلا گیا جو اس دن مجھے اپنے دوست فخر کی طرف سے موصول ہوا تھا۔ وہ ایک بڑا سنسنی خیز پیغام تھا لیکن میں اب اس جیسے سارے پیغاموں اور رابطوں سے خود کو بالکل الگ رکھنا چاہتا تھا۔ اب میرے مسائل، میری راحتیں اور میرے دکھ کچھ اور نوعیت کے تھے۔

میری توقع کے عین مطابق رات گیارہ بجے کے لگ بھگ تاجور اور انیق میں پھر فون پر بات ہوئی۔ مگر تاجور اتنے دھیمے لہجے میں بول رہی تھی کہ اس کا ایک لفظ بھی میرے لیے قابلِ سماعت نہیں ہو سکا۔ ویسے بھی یہ ایک مختصر گفتگو تھی...... مشکل سے دو تین منٹ کی۔ بہر حال مجھے ننانوے فیصد یقین تھا کہ فون پر دوسری طرف انیق ہی تھا۔ اگلے روز میں نے جان بوجھ کر پہلوان حشمت کو کچھ خریداری کرنے کے لیے صدر کے علاقے میں بھیج دیا۔ اس کی واپسی شام سے پہلے ممکن نہیں تھی۔ میں خود بھی گھر سے نکل گیا۔ میں نے تاجور کو بتایا کہ میں کرائے کا کوئی مناسب مکان ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یہ بس بہانہ ہی تھا۔ میرا مقصد یہی تھا کہ اگر انیق دوبارہ تاجور سے ملنا چاہتا ہے تو اس کے لیے موقع پیدا ہو سکے۔ میں انیق کے طریقہ کار کو اچھی طرح جانتا تھا، عین ممکن تھا کہ اس نے کسی طریقے سے اس گھر پر بھی نظر رکھی

ہوئی ہو اور اسے معلوم ہو کہ گھر سے کون گیا ہے اور کون موجود ہے۔ (ابھی تک مجھے انیق کی کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی)

میں نے لنچ قریباً ڈھائی بجے کے لگ بھگ ایک درمیانے درجے کے ریستوران میں کیا۔ میں پولیس کو مطلوب تھا، دارابیوں کو بھی اور ٹیکساری گینگ کو بھی۔ مگر اپنے بدلے ہوئے حلیے کے ساتھ میں شہر میں گھوم پھر رہا تھا۔ یہ ایک نیا تجربہ تھا میری زندگی کا۔ میں وقتاً فوقتاً اپنے سیل فون کی اسکرین بھی چیک کر رہا تھا۔ ابھی منی کیمرے والا کمرا خالی تھا۔ ابھی میں لنچ سے فارغ ہوا ہی تھا کہ کمرے کا ''خالی پن'' ختم ہو گیا...... پہلے کال بیل کی مدھم آواز سنائی دی تھی۔ پھر قریباً ایک منٹ بعد تاجور اور انیق آگے پیچھے کمرے میں داخل ہوئے۔ تاجور کچھ برہم نظر آ رہی تھی۔ اس کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ''انیق! میں نے تم سے کہا بھی تھا یہاں تمہارا آنا کسی طرح بھی ٹھیک نہیں۔ بعد میں ہم کہیں کسی اور جگہ بھی مل سکتے ہیں مگر فی الحال میری مشکلوں میں اضافہ نہ کرو۔''

وہ بولا۔ ''بس یہ ایک بار ہے، آئندہ نہیں آؤں گا۔ پھر جیسا آپ کہیں گی، ویسا کریں گے۔ لیکن اب پلیز اپنا موڈ ٹھیک رکھیں۔ یہ میں آپ کے لیے لایا ہوں پلیز انکار نہ کیجیے گا۔'' اس نے جھک کر کوئی چیز میز پر رکھ دی۔

اس وقت تو مجھے نظر نہیں آیا، بعد میں پتا چلا کہ یہ گلاب کے پھولوں کا دستہ تھا، وہ بولا۔ ''یہ آپ کی جرأت اور دلیری کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے ہے اور یقین کریں یہ میں آپ کو دل کی گہرائی سے دے رہا ہوں۔''

شاید تاجور نے بے دلی سے شکریہ کا لفظ کہا تھا لیکن مجھ تک بس اس کی منمناہٹ ہی پہنچ سکی۔

وہ دونوں بیٹھ گئے تھے۔ کیمرے کے سامنے ان کا اینگل پرسوں والا ہی تھا۔ انیق کا بس ایک کندھا اور چہرے کی دائیں سائیڈ دکھائی دیتی تھی۔ تاجور سامنے تھی اور اس کا چہرہ زیادہ واضح دکھائی دیتا تھا۔ انیق کی گفتگو ایک بار پھر میری ''موت'' کے حوالے سے ہی تھی۔ اس نے چند پُرملال فقرے ادا کیے۔ آخر میں بولا۔ ''آپ یقین کریں وہ آپ سے بہت محبت کرتے تھے۔ آپ کی خاطر ہر حد تک جانے کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔ شاید کسی وقت اپنے اصولوں سے بھی سمجھوتا کر گزرتے تھے۔ یہ سیف والا معاملہ بھی تو ایسے ہی ہوا۔''

''تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے انیق...... کہ وہ امریکیوں کے تشدد اور ان کی بے رحمی والی بات غلط تھی؟'' تاجور نے کھوئے کھوئے لہجے میں پوچھا۔

''پوری طرح تو غلط نہیں تھی۔ وہاں پریشان کن صورتِ حال کا خطرہ موجود تھا لیکن فوری طور پر تو...... خیر...... ان باتوں کو چھوڑیں تاجور...... ان سے کچھ حاصل نہیں...... آپ مجھے یہ بتائیں کہ اب آئندہ کے بارے میں آپ نے کیا سوچا ہے؟''

وہ لمبے توقف کے بعد بولی۔ ''ابھی سوچ رہی ہوں۔ ان لوگوں نے مجھے پناہ دی ہے۔ ہر طرح میری مدد کر رہے ہیں۔ فوری طور پر تو یہی جگہ محفوظ نظر آ رہی ہے۔''

''آپ کہہ رہی ہیں کہ یہ دونوں یعنی شرافت اور وقاص...... شاہ زیب بھائی کے دوست ہیں...... لیکن میں تو ان ناموں سے واقف نہیں ہوں۔ ابھی ساتھ والے کمرے میں، میں نے شرافت کی تصویر بھی دیکھی ہے، میرے لیے تو وہ اجنبی ہے۔''

وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''جس طرح تمہارے کئی دوستوں کا شاہ زیب کو پتا نہیں ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ تمہیں بھی ان کے کچھ دوستوں کا پتا نہ ہو۔''

اگلے آٹھ دس منٹ میں انیق نے تاجور سے جو گفتگو کی، وہ کم از کم میرے لیے بہت تکلیف دہ تھی۔ اس گفتگو میں واضح طور پر تاجور کی طرف جھکاؤ اور لگاوٹ کا عنصر نظر آتا تھا۔ وہ بڑے ٹھوس لہجے میں تاجور کو یہ بھی بتا رہا تھا کہ وہ اپنے آپ کو کسی بھی طرح کمزور اور بے بس محسوس نہ کرے۔ اگر شاہ زیب بھائی نہیں تو کیا ہوا وہ ان کی جگہ کھڑا ہو کر اس کی طرف آنے والی ہر مصیبت کا راستہ روکے گا۔ منی کیمرے کا آڈیو بہت حساس تھا اس کے باوجود کئی فقرے وضاحت سے مجھ تک نہیں پہنچ رہے تھے تاہم لب لباب سمجھ میں آ رہا تھا۔

پتا نہیں کہ تاجور اس کی گفتگو کے اینگل کو محسوس کر رہی تھی یا نہیں مگر وہ پریشان اور کسی حد تک بیزار ضرور دکھائی دیتی تھی۔ وہ بھی یہ چاہتی تھی کہ انیق اب جلد از جلد یہاں سے چلا جائے۔

یہ انیق کیا چیز تھا؟ شاید ٹھیک طرح سے آج تک میری سمجھ میں نہیں آسکا تھا۔ وہ عورت اور رومانس وغیرہ کے بارے میں بالکل اور طرح کا رویہ رکھتا تھا۔ اتنے عرصے کے ساتھ کے باوجود میں آج تک جان نہیں سکا تھا کہ کبھی صنف نازک سے اس کا کوئی تعلق رہا ہے یا نہیں۔ میری نگاہوں کے سامنے ماضی قریب اور ماضی بعید کے واقعات گھومنے لگے۔ مجھے کئی ایسے مناظر یاد آئے جب تاجور کے حوالے سے انیق کی تھوڑی بہت وابستگی کا اظہار ہوا تھا۔ یوں تو ایک موقع پر وہ تاجور کو آپی بھی کہتا رہا تھا لیکن ایسا کچھ ہی عرصے کے لیے ہوا تھا۔ مجھے یاد آنے لگا کہ ٹاپو پر پیش آنے والے واقعات کے بعد سے اس نے تاجور کو شاید اس لقب سے نہیں پکارا تھا۔

تاجور نے اس سے کہا تھا کہ وہ آئندہ لائحہ عمل کے بارے میں سوچنا چاہتی ہے۔ وہ جلد ہی وہاں سے چلا گیا۔ تاجور اسی کمرے میں چپ چاپ بیٹھی رہ گئی۔ رنج والم کی تصویر۔

میرے ذہن میں جو سب سے اہم سوال گردش کر رہا تھا، وہ یہی تھا کہ انیق اور تاجور کا رابطہ ہوا کس طرح سے؟ اس سوال کا جواب مجھے کچھ ہی دیر بعد مل گیا۔ سوزوکی ہائی روف میں بیٹھے بیٹھے میں اپنی تہلکہ خیز سوچوں سے برسرِ پیکار تھا کہ سجاول کا فون آ گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ انیق ابھی تک واپس لالہ موسیٰ نہیں آیا...... نہ ہی فون پر اس سے رابطہ ہو پا رہا ہے۔ کہنے لگا۔ ''شاہی! یہ عجیب وغریب شے پال رکھی ہے تم نے۔ میں تمہیں سچ کہتا ہوں، کسی وقت دھوکا دے گا، یہ جتنا زمین سے اوپر ہے اتنا ہی نیچے بھی ہے۔''

میں خاموش رہا لیکن سینے میں گھٹن سی ضرور محسوس ہوئی۔

سجاول بولا۔ ''لو تمہاری مریدنی بھی تم سے بات کرنا چاہ رہی ہے۔''

چند سیکنڈ بعد خورسنہ کی چہکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''جی شاہ زیب صاحب! کہاں چھپتے پھر رہے ہیں آپ......اور آپ کی ہونے والی بھی؟''

''نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں، ذرا مصروف تھا۔''

وہ بولی۔ ''مصروف تو یقیناً ہوں گے جناب...... دلہا والے بھی خود ہیں آپ اور دلہن والے بھی۔ دونوں طرف کا کام کرنا ہوگا۔ اور ہاں آپ کی ہونے والی مسز صاحبہ سے ابھی تک میری بات نہیں ہوئی۔ آج بھی دو تین بار کال کی انہوں نے فون ہی نہیں اٹھایا۔ کیا آپ کے ہاں دلہنیں اتنا زیادہ شرماتی ہیں؟ اگر اتنا زیادہ شرماتی ہیں تو پھر شادی کے بعد تو دلہا کا بہت برا حال ہوتا ہوگا۔''

میں نے اس کے مزاح کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ ''پہلے وہ تم کو فون کرتی رہی، تم نے نہیں اٹھایا۔ اب شاید اس کو پتا نہیں چل رہا۔''

''میں نے کب نہیں اٹھایا جی؟ بدھ کے روز شاید ایک بار ان کی کال آئی تھی، میں اس وقت نہا رہی تھی۔ بیل سن کر آپ کے دوست انیق نے کال ریسیو کی تھی مگر اتنے میں بند ہو گیا۔ بعد میں، میں نے ٹرائی کیا لیکن جواب نہیں آیا۔''

میرے سر میں جھماکا سا ہوا...... تاجور نے یہاں سے خورسنہ کو کال کی تھی...... خورسنہ کے بجائے یہ کال انیق نے سنی تھی جو زخمی ہونے کے بعد سے سجاول کے گھر میں موجود تھا...... تو کیا اس نے فون پر تاجور کی آواز پہچان لی تھی؟ یقیناً ایسا ہی تھا۔ اس جیسے ہوشیار...... بیدار مغز شخص کے لیے یہ مشکل نہیں تھا۔ پھر کیا ہوا تھا......؟ پھر وہ خاموش رہا تھا اور اس نے فون

بند کر دیا تھا۔

ایک ایک کر کے کڑیاں میرے ذہن میں جڑ رہی تھیں اور زنجیر مکمل ہو رہی تھی۔ انیق، ''بھاؤ گینگ'' کے چالاک ترین ارکان میں سے ایک تھا۔ اسے اور مختار جھارا کو داؤد بھاؤ کا دست راست کہا جاتا تھا بلکہ کئی طرح سے انیق کی حیثیت مختار جھارا سے بڑھ کر تھی۔ وہ پڑھا لکھا تھا۔ ہر فیلڈ کے لوگوں سے اس کے تعلقات تھے۔ ہر محکمے میں گھس جاتا تھا۔ دیواروں میں دَر بنانے کا فن اس میں یکتا تھا۔ مجھے یقین ہونے لگا کہ اس نے وہ جگہ پوائنٹ آؤٹ کرائی تھی جہاں سے تاجور نے کال کی تھی اور پھر وہ لالہ موسیٰ میں سجاول کی میزبانی کو خیر آباد کہہ کر یہاں راولپنڈی پہنچ گیا تھا۔

یہاں پہنچ کر اس نے ٹھیک ٹھیک ''نشانہ'' کیسے لگایا؟ مطلب یہ کہ عین شرافت فورمین کے گھر تک کیسے پہنچا؟ یہ بھی اہم سوال تھا لیکن انیق جیسے باتدبیر بندے سے کچھ ناممکن نہیں تھا۔ جب کسی سیل فون سے رابطہ ہو اور کال جاری ہو تو ٹھیک ٹھیک لوکیشن بھی معلوم کی جا سکتی ہے۔

خورسنہ کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا، وہ بولی۔ ''آپ بات کرتے کرتے کہاں کھو جاتے ہیں۔ کل سجاول بھی بتا رہے تھے کہ آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں، اگر کوئی مسئلہ ہے تو پلیز ہمیں بتائیں، آپ کے لیے ہماری جان بھی حاضر ہے۔''

''نہیں کوئی مسئلہ تو نہیں ہے۔ بس تاجور کی طبیعت کچھ خراب تھی۔ دوا وغیرہ لے رہی ہے۔ سر کا درد بتاتی ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ نکاح کی تقریب چند دن لیٹ کر لی جائے۔''

''نہ یہ غضب نہ کریں جناب! ہم تو ایک ایک پل گن کر گزار رہے ہیں اور پھر آپ کے اردگرد حالات بھی تو زیادہ اچھے نہیں ہیں، نیک کام جتنی جلدی ہو جائے، اتنا ہی اچھا ہے۔''

''چلو دیکھتے ہیں۔'' میں نے گول مول جواب دیا۔

وہ ذرا چہک کر بولی۔ ''آپ سُست پڑیں گے تو پھر ''فی میل'' تو ہوتی ہی سُست ہیں اور ''فی میل'' بھی پاکستان کی۔ آپ جناب! سجاول سے گائیڈ لائن کیوں نہیں لیتے۔ دیکھیں کتنی تیز رفتاری دکھائی ہے حضرت نے۔ میں یہاں صرف سیر و تفریح کے لیے آئی تھی مگر ایسے پیچھے پڑے کہ شادی کا جوڑا پہنا کے چھوڑا۔''

میں اسے کیسے بتاتا کہ تیز رفتاری تو گاڑی کے دونوں پہیوں سے ہوتی ہے، یہاں تو ایک پہیہ ساتھ ہی چھوڑ رہا تھا۔

میں گھر پہنچا تو تاجور کا وہی موڈ تھا جو ہونا چاہیے تھا، بالکل گم صم، آنکھیں ورم زدہ، چہرہ

اترا ہوا۔ اس نے وہی طبیعت کی ناسازی اور سر درد کا بہانہ بنایا۔ بہر حال گھر کے سارے کام وہ اسی طرح کر رہی تھی۔ اسے دیکھ کر یہی لگتا تھا کہ سطح آب پُرسکون ہے لیکن نیچے ایک طوفان ہے۔

میں نے کہا۔ ''یہاں کوئی آیا تھا تاجور؟''

''نہیں تو۔'' وہ ذرا چونک کر بولی۔ ''آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''یونہی خوشبو سی محسوس ہوئی تھی۔'' میں نے کہا۔

اس نے میرے فقرے کو نظر انداز کیا اور کوئی جواب نہیں دیا۔ یہ دراصل انہی سرخ گلابوں کی خوشبو تھی جو بقول انیق، وہ تاجور کو اس کی جرأت پر خراج پیش کرنے کے لیے لایا تھا۔ (اگلے روز یہ گلدستہ مجھے ڈسٹ بن میں کوڑے کے نیچے پڑا نظر آیا تھا)

پتا نہیں کیوں ایک بار پھر جی میں آئی کہ اپنا دل کھول کر تاجور کے سامنے رکھ دوں۔ اسے بتاؤں کہ مجھے سیف کے ساتھ وہ اَن چاہا سلوک کیوں اور کن حالات میں کرنا پڑا...... اور کیا وجہ تھی جس کے سبب مجھے دوسروں سے اس بارے میں جھوٹ بولنا پڑا...... لیکن یہاں سوال یہ تھا کہ کیا وہ میری دی ہوئی صفائی پر یقین کرے گی۔ اگر وہ نہ کرتی تو پھر میرے دل میں بھی گرہ پڑ جانی تھی اور یہ گرہ پڑ جاتی تو فاصلے کئی گنا بڑھ جاتے۔ میں سخت تذبذب میں تھا۔

درحقیقت میرے اور تاجور کے درمیان عجیب بے اعتمادی کی فضا پیدا ہوگئی تھی۔ شاید ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ ایک جھوٹ کو چھپانے کے لیے کئی جھوٹ بولنا پڑتے ہیں اور کبھی کبھی کئی جھوٹ بولنے کے بعد بھی شک کی دراڑیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ میں نے ابھی تک تاجور کو یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ انیق ٹیکساری والوں کے حملے میں زخمی ہوا ہے اور لالہ موسیٰ میں سجاول کے پاس قیام پذیر رہا ہے۔ میں نے سجاول اور خورسنہ سے بھی یہی کہا تھا کہ وہ بھی لالہ موسیٰ میں انیق کی موجودگی کے بارے میں تاجور کو کچھ نہ بتائیں۔ دوسری طرف صورتِ حال یہ ہوئی تھی کہ اتفاقاً انیق نے تاجور کا فون سن لیا تھا اور اس کا کھوج لگا کر یہاں راولپنڈی پہنچ گیا تھا۔ یقیناً اس نے تاجور کو بھی بتایا ہوگا کہ وہ لالہ موسیٰ میں سجاول کا مہمان رہا ہے۔ اگر وہ پچھلے چند روز سے سجاول کا مہمان تھا تو پھر یقیناً مجھے بھی اس بارے میں پتا تھا۔ تاجور کے ذہن میں پہلا سوال یہی پیدا ہونا تھا کہ میں نے اس سے انیق والی اطلاع کیوں چھپائی۔

رہی سہی کسر تاجور کی ذہانت نے پوری کر دی۔ دوپہر کو پہلوان حشمت اپنے زخمی جبڑے پر زیتون کے تیل کی مالش کرتا ہوا میرے کمرے میں آیا تو رازداری کے لہجے میں

بولا۔ ''مجھ کو لگت ہے تاجور بٹیا کو تمہارے بارے میں کسی طرح کا شک ہو گیا ہے شاید۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو چاچا حشمت؟'' میں نے دریافت کیا۔

''ابھی کچھ دیر پہلے بٹیا مجھ سے پوچھ رہی تھیں کہ جس رات شاہ زیب رات کو گھر میں نہیں تھے......اور صبح پہنچے تھے، وہ کون سا دن تھا۔''

''پھر؟'' میں ذرا چونک گیا۔

پہلوان بولا۔ ''میں سمجھ گیا کہ دال میں ضرور کچھ ''مسور'' کی دال ہے۔ مجھے پتا تھا لیکن میں نے گول مول جواب دیا۔ تاجور بٹیا کیلنڈر دیکھنے لگی اور انگلیوں پر حساب جوڑ کر بولی کہ وہ اتوار کی رات تھی۔ میں نے کہا بٹیا رانی تم کیا حساب جوڑت ہو؟ کہنے لگی کوئی خاص بات ناہیں۔''

پہلوان حشمت یقیناً ایک تشویش ناک اطلاع دے رہا تھا۔ ٹیکساری گینگ کے گوجرانوالہ والے حملے کی خبر میں نے تاجور تک نہیں پہنچنے دی تھی، گھر میں ٹی وی چلتا تھا اور نہ اخبار آتا تھا۔ مجھے یہی ڈر تھا کہ کہیں تاجور اس حملے میں اور میرے رات بھر غائب رہنے میں کوئی تعلق نہ ڈھونڈ لے لیکن اب اس تعلق کا افشا ہونے کا امکان پیدا ہو گیا تھا بلکہ شاید یہ افشا ہو ہی گیا تھا۔

اس کا مطلب یہی تھا کہ میں نے تاجور سے جو وعدہ کیا تھا کہ میں اپنے پُر ہنگام اور خطرناک ماضی کو خیر آباد کہہ رہا ہوں اور اپنے نئے روپ میں ایک نئی زندگی شروع کرنا چاہتا ہوں فقط ایک دھوکا تھا اور میں نے اس رات بھی سجاول کے ساتھ مل کر گوجرانوالہ میں ٹیکساری گینگ کے ساتھ ٹکر لی ہے اور انیق کو وہاں سے نکالا ہے۔

میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے فیصلہ کیا کہ میں تاجور سے کچھ بھی نہیں چھپاؤں گا......سب کچھ صاف صاف کہہ دوں گا۔ مجھے ایک جھوٹ چھپانے کے لیے کئی جھوٹ بولنا پڑ رہے تھے اور ہمارے درمیان بداعتمادی کی فضا تیزی سے پروان چڑھ رہی تھی۔ اگر وہ میری محبت پر یقین رکھتی تھی تو پھر اسے مجھ پر بھی یقین آجانا چاہیے تھا۔ کہتے ہیں کہ پیار کرنے والے دلوں کو ایک دوسرے سے راہ ہوتی ہے۔ اگر واقعی یہ راہ ہوتی ہے تو پھر اس کو نظر بھی آنا چاہیے تھا۔

اچھے ماحول میں بات کی جائے تو اس کے اثرات بھی اچھے ہوتے ہیں۔ میں اس اہم ترین گفتگو کے لیے اچھا ماحول چاہ رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شام کے وقت جب تاجور کچن میں کھانا تیار کر رہی تھی، میں بھی وہاں جا کر اس کا ہاتھ بٹانے لگا۔ وہ چونک گئی پھر میری طرف دیکھے بغیر افسردہ لہجے میں بولی۔ ''آپ جائیے، میں بنا لوں گی۔''

''کئی دن سے تم ہمیں پکا پکا کر کھلا رہی ہو، اگر آج میں تھوڑی سی مدد کر دوں گا تو کیا ہو جائے گا؟''

وہ خاموش رہی۔ میں سلاد بنانے میں مصروف ہو گیا۔ وہ شاید پہلوان حشمت کی فرمائش پر چکن کے شامی کباب بنا رہی تھی۔ اس نے اپنے ریشمی بالوں کا جوڑا کس کر باندھا ہوا تھا۔ اپنی ہلکی براؤن قمیص کی آستینیں اڑسی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے کام میں پوری طرح منہمک تھی۔ سلاد بنانے کے بعد میں نے چٹنی بنانے کے لیے پیاز اور پودینا وغیرہ گرائنڈ کیا۔ کبھی کبھی میں چور نظر سے اس کی طرف دیکھ بھی لیتا تھا۔ وہ کسی بھی حلیے میں ہوتی تھی، اس کی اندرونی دلکشی اس کے سراپا کے گرد ایک غیر مرئی ہالا سا بنائے رکھتی تھی۔ اس کی چوڑیوں کی کھنک نے اس کے بدن کی مہک کے ساتھ مل کر کچن کی بے رنگ فضا میں عجیب رنگ بھر دیئے۔

وہ اب شامی کباب، فرائی کرنے کی تیاری کر رہی تھی۔ میں نے کہا۔'' کتنے انڈے توڑوں؟''

''پانچ چھ۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

میں انڈے توڑ کر انہیں شیک کرنے لگا۔ ساتھ ساتھ میں سوچ رہا تھا، محبت انسان کو کیا سے کیا بنا دیتی ہے۔ وہ کیا کیا کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے، میں مارشل آرٹ کا چمپئن جو رِنگ میں اترتے ہی اپنے حریفوں کے ہوش اُڑا دیتا تھا، جو مار دھاڑ پر اُترتا تھا تو چھوٹے موٹے گینگسٹر چوہوں کی طرح اپنے بلوں میں گھس جاتے تھے، کچن میں کھڑا انڈے پھینٹ رہا تھا اور سلاد بنا رہا تھا...... اس کے ساتھ ساتھ سوچ رہا تھا کہ اسے اپنی زندگی کی اہم ترین ہستی سے کس طرح اور کیا بات کرنی ہے۔

ڈنر تقریباً تیار ہو چکا تھا۔ میں نے کہا۔'' تاجور! آج میرا دل چاہتا ہے کہ ہم اندر والے ٹیرس پر بیٹھ کر کھانا کھائیں، میں تم سے کچھ باتیں بھی کرنا چاہتا ہوں۔''

پہلوان حشمت لمبے لمبے ڈگ بھرتا اندر آ گیا۔'' دیکھو بھئی، میں یہاں تاجور بٹیا کے سرپرست کی حیثیت سے موجود ہوں۔ نکاح سے چند دن پہلے لڑکے لڑکی کا اس طرح ملنا اچھا ناہیں سمجھا جاتا، بلکہ پہلے وقتوں میں تو وہ ایک دوسرے کو دیکھتے بھی ناہیں تھے۔ بہرحال اگر تم مجھ سے باقاعدہ اجازت مانگو تو میں اس بارے میں سوچ سکت ہوں۔''

اگر پہلوان حشمت یہ سمجھتا تھا کہ اس کی اس ہلکی پھلکی بات پر تاجور کے چہرے پر مسکراہٹ آئے گی تو اس کی یہ توقع پوری نہیں ہوئی۔ تاجور نے سنجیدگی سے کہا۔'' چاچا جی!

آپ کبابوں کے ساتھ چاول لیں گے یا پراٹھا؟''

پہلوان بولا۔''تم مشکل میں ڈال دیتی ہو۔ گندم میں طاقت زیادہ ہووت ہے لیکن جبڑا ٹھیک ناہیں ہے اس لیے تھوڑے بہت چاول بھی کھالوں گا۔''

پہلوان حشمت کا کھانا اس کے کمرے میں لگا کر تاجور واپس کچن میں آگئی۔ اس کے آنے تک میں نے اپنا اور تاجور کا کھانا نکال لیا تھا۔ وہ خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہی۔ میں نے ٹرے اٹھائی اور کہا۔''آجاؤ، اوپر چلتے ہیں۔''

اس نے بالوں کی لٹوں کو پیشانی سے ہٹایا اور میرے پیچھے پیچھے سیڑھیوں کی طرف آگئی۔ ہم ٹیرس میں رکھی میز کے گرد جا بیٹھے، اس ٹیرس کا رخ اس گھر کے مختصر صحن کی طرف تھا۔ ایک بون بیل نے ٹیرس کے جنگلے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ کھانے کے دوران میں ماحول کی سنجیدگی کو کم کرنے کے لیے میں تاجور سے ہلکی پھلکی باتیں کرتا رہا۔ اس نے بدستور طبیعت کی خرابی کی آڑ لے رکھی تھی۔ وہ بار بار دونوں چھوٹے بھائیوں کی بات کر رہی تھی اور اپنی والدہ کی بھی۔

میں نے کہا۔''تاجور! شکر کا مقام ہے کہ خالہ جان اتنا بیمار ہونے کے باوجود اسپتال سے ڈسچارج ہوگئی ہیں اور اب پھر سے چل پھر رہی ہیں۔''

''لیکن ان کے دل پر پتا نہیں کیا بیت رہی ہوگی۔ ابا جی ان کو کبھی معاف نہیں کریں گے۔ وہ یہی کہیں گے کہ میرے اس طرح گھر سے نکل جانے میں ان کا ہاتھ ہے، ان کی تربیت کا قصور ہے۔''

''اس کی فکر نہ کرو تاجور، تمہارے خاندان اور عزیز واقارب میں سے شاید ہی کوئی ہوگا جو ان کی ہاں میں ہاں ملائے گا اور مجھے یقین ہے تاجور، تمہارے ماموں حبیب صاحب نے تو سجدۂ شکر ادا کیا ہوگا، تمہارا خط ملنے کے بعد۔''

''لیکن پتا نہیں کہ ان کو خط ملا بھی ہے یا نہیں؟''

''نہ ملنے کی کوئی وجہ نہیں تاجور! تم اس طرح کے وہم نہ کرو، آج تم سے ایک دو بہت اہم باتیں کرنا چاہتا ہوں بلکہ میں یوں کہوں گا کہ میں اپنا دل کھول کر تمہارے سامنے رکھ دینا چاہتا ہوں، اس کے بعد تم میرے بارے میں جو بھی رائے قائم کروگی، مجھے قبول ہوگی۔''

''ایسی خاص بات اب کیا رہ گئی ہے؟'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''ہیں کچھ باتیں......اور......تمہیں بھی پتا ہے کہ وہ ہیں۔''

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ تاجور کے بے لچک لہجے کی وجہ سے میں اپنے

اندر بے چینی سی محسوس کرنے لگا تھا۔ تاہم میں نے خود کو سنبھالے رکھا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''تاجور! پچھلے دو تین دن میں نے بڑی کشمکش میں گزارے ہیں، کبھی تو دل چاہتا تھا کہ تم سے کچھ بھی نہ کہوں، صرف اپنے جذبے اور اپنے سچ کی طاقت دیکھوں، یہ دیکھوں کہ کیا تم میرے اندر کی محبت اور سچائی کو میرے کہے بغیر محسوس کرتی ہو یا نہیں۔ لیکن پھر دل نے کہا...... کہ ان افسانوی باتوں پر نہ جاؤ۔ جو زبان سے کہنے والی بات ہے اسے کہہ دو، کہیں بعد میں زندگی بھر یہ پچھتاوا نہ رہے کہ تم نے کہہ دیا ہوتا......''

اس کی انگلیاں بے ساختہ اس کی چوڑیوں سے الجھ رہی تھیں۔ ٹیرس میں موتیے کی خوشبو تھی اور پوری رات کا چاند سفیدے کے ایک درخت کے عقب سے جھلک دکھا رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ دل سے نکلنے والی بات دل پر اثر کرے گی اور جب میں پورے جذب کے ساتھ بات کروں گا تو اس کے دل میں پڑنے والی گرہیں کھل جائیں گی۔

گفتگو کی شروعات اچھی تھی لیکن پھر ایک ایسی بات ہوئی جس نے ماحول کو بری طرح متاثر کیا اور مجھے یہ اہم ترین بات چیت ملتوی کرنا پڑی، سیڑھیوں پر پہلوان حشمت کے بھاری قدموں کی تھپ تھپ سنائی دی۔ وہ اوپر آیا تو اس کا سانس پھولا ہوا اور رنگت اڑی ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔ ''سکھیر اسے اچھی خبر نہیں ہے؟''

''کیا ہوا؟'' تاجور سہم کر بولی۔

''شازیہ کے والد چوہدری بشیر اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔''

میں دم بخود پہلوان حشمت کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ تاجور کا رنگ بھی بالکل زرد ہو گیا۔ اس کے ہونٹ بے ساختہ تھرائے لیکن وہ کچھ کہہ نہ سکی۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں پہلوان جی، کس نے بتایا آپ کو؟'' میں نے پوچھا۔

''ابھی ابھی سکھیرا سے فون آیا ہے۔'' پہلوان غمزدہ آہنگ میں بولا۔ ''بشیر کو ایک ہلکا اٹیک تو چند روز پہلے بھی ہوا تھا، آج دوسرا ہوا اور بایاں پہلو بالکل بے جان ہو گیا۔ اسپتال کے راستے میں ہی اس نے دم توڑ دیا۔''

تاجور سسکیوں سے رونے لگی۔ اس کا چہرہ کرب کی آماجگاہ تھا۔ پہلوان نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔ ''بیٹے سیف کی موت نے اس کی کمر توڑ دی تھی...... رہی سہی کسر بیوی کی جدائی نے پوری کر دی۔ وہ بھی اس کے پیچھے ہی پیچھے چلا گیا۔''

تاجور اٹھ کھڑی ہوئی اور روتی ہوئی نیچے چلی گئی۔ وہ پہلے ہی سہیلی شازیہ اور اس کے

اباجی کی خیریت کے بارے میں بڑی فکر مند تھی۔ آج اس کے اندیشے درست ثابت ہو گئے تھے۔ مجھے بھی اپنے دل پر گہری چوٹ محسوس ہوئی۔ کبھی کبھی ایک فرد کو پیش آنے والا واقعہ اس کے پورے گھرانے کی زندگی کو درہم برہم کر دیتا ہے۔ کاش وہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا اور اگر ہونا ہی تھا تو پھر میں اس میں یوں بری طرح ملوث نہ ہوتا، میں اوپر چھت پر چلا گیا۔ خنک ہوا میں دیر تک چھت پر ٹہلتا رہا اور اس صدمے کو خود میں جذب کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ حالات عجیب پینترے دکھا رہے تھے۔ کسی وقت لگتا تھا کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کسی وقت سب کچھ بکھرتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ تب میرا دھیان ایک بار پھر انیق اور اس کے رویے کی طرف چلا گیا۔ سینے میں دھواں سا بھرنے لگا۔ کیا انسان کے دنیا سے چلے جانے کے بعد اس کے اردگرد والے اسی طرح اپنے روپ بدل لیتے ہیں۔ حالات کا رخ یہی بتا رہا تھا کہ انیق کے دل کی گہرائی میں کہیں تاجور کے لیے پسندیدگی اور چاہت کا گوشہ موجود تھا...... اب چونکہ اس کے نزدیک میں اس ”دنیا میں نہیں“ تھا، لہٰذا اس نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے اور میری چاہت کو تاجور کے ذہن سے کھرچنے کے لیے ایک نہایت اوچھا ہتھکنڈا اوچھے طریقے سے استعمال کیا تھا۔

رات دس بجے کے قریب میں نے تاجور کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ پھر ادھ کھلی کھڑکی میں سے دیکھا، وہ نماز پڑھ رہی تھی۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ اس کو یوں غم زدہ دیکھ کر دل کا بوجھ کچھ اور بڑھ جاتا تھا۔ بہرحال میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ یوں ہی خاموش رہ کر ہار نہیں مانوں گا۔ حالات کا پوری طرح سامنا کروں گا اور اپنی طرف سے تاجور کا دل صاف کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھوں گا۔ جب کہتے ہیں کہ سچ کو آنچ نہیں تو پھر میرے پاس تو سچ ہی تھا۔

کچھ دیر بعد میں دوبارہ اس کے کمرے میں پہنچا۔ میں نے اسے بتایا کہ چاچا حشمت ہم سب کی نمائندگی کرتے ہوئے بشیر صاحب کی آخری رسوم میں شریک ہونے کے لیے سنکھیرا چلا گیا ہے۔

وہ سسکی۔ ”پتا نہیں شازیہ اور اس کی دونوں بہنوں کا کیا حال ہوگا، وہ تو اب بالکل بے آسرا رہ گئی ہیں۔“

میں اس سے تسلی تشفی کی باتیں کرتا رہا۔ وہ رو کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرتی رہی۔ جب وہ کچھ نارمل محسوس ہوئی تو میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ رات کو وہ دیر تک جاگتی رہی اس کے کمرے سے کھٹ پٹ کی آوازیں آتی رہیں۔ بہرحال وہ گفتگو سنائی نہیں دی جو وہ فون پر

بہت مدھم آواز میں کرتی تھی۔ شرافت کی گاڑی بدستور میرے استعمال میں تھی۔ (وہ اول درجے کا ''یار باش'' اور مہمان نواز شخص ثابت ہو رہا تھا) گاڑی کی اسٹارٹنگ میں کوئی مسئلہ آ رہا تھا۔ میں اسے چیک کرانے کے لیے ورکشاپ چلا گیا۔ واپسی پر مجھے مین مارکیٹ سے کچھ سودا سلف بھی لینا تھا۔ میں نے تاجور کو احتیاط سے دروازے بند رکھنے کا کہا اور خدا حافظ کہہ کر چلا گیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اب میں اسے اس گھر میں کبھی نہیں دیکھ سکوں گا۔ وہ مجھ سے بہت دور جا چکی ہوگی۔

○......❖......○

مجھے گاڑی ٹھیک کرانے میں ڈیڑھ دو گھنٹے لگ گئے۔ پھر میں مین مارکیٹ چلا گیا۔ بالوں کی کٹنگ کرائی اور وہیں بیٹھ کر کئی دن بعد اخبار بھی پڑھا۔ کچھ شاپنگ کر کے میں ڈھائی بجے کے لگ بھگ واپس روانہ ہوا۔ میرا اسمارٹ کیمرا ابھی تک گھر کے کامن روم میں وال کلاک کے ساتھ چسپاں تھا...... مگر کل شام سے اس کی چارجنگ ختم ہو چکی تھی اور اسے اتار کر ''اڈاپٹر'' کے ساتھ لگانے کی ضرورت تھی۔ ابھی میں گھر کے سامنے ہی پہنچا تھا کہ مجھے پہلوان حشمت کی پریشان صورت دکھائی دی، اس کے ہاتھ میں موبائل فون تھا...... وہ غالباً ابھی کچھ ہی دیر پہلے سکھیرا گاؤں سے واپس آیا تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی بولا۔ ''میں تم کو ہی فون کرنے لگا تھا۔ تاجور بٹیا کہاں ہے؟''

''کیوں؟ گھر میں نہیں ہے؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

وہ بولا۔ ''یہ باہر والا دروازہ لاک تھا۔ میرے پاس چابی ہے۔ میں کھول کر اندر چلا گیا۔ اندر کوئی نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ شاید تم دونوں کہیں گئے ہو۔''

میرے سینے میں جیسے کسی نے ایک زوردار گھونسا رسید کیا۔ میں تیزی سے گھر میں داخل ہوا، سیدھا تاجور والے کمرے میں پہنچا۔ میری چھٹی حِس گواہی دینے لگی کہ میرے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی اس نے کوئی بہت اہم فیصلہ کر لیا ہے اور یہاں سے چلی گئی ہے۔

اگلے چار پانچ منٹ میں اس بات کی تصدیق ہو گئی۔ وہ جا چکی تھی۔ اسی دوران میں شرافت علی بھی آ گیا۔ ہماری پریشان صورتیں دیکھ کر اسے بھی اندازہ ہو گیا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔

''کیا ہوا وقاص صاحب؟'' اس نے مجھ سے پوچھا۔

''تمہیں تاجور نے کوئی فون وغیرہ تو نہیں کیا؟'' میں نے الٹا اس سے استفسار کیا۔

''نہیں جی، کیا تاجور بہن گھر میں نہیں ہے؟''

میں نے نفی میں جواب دیا اور ایک بار پھر تاجور کے سیل فون پر کال کرنے کی کوشش

کرنے لگا۔ آپ کا مطلوبہ نمبر فی الحال بند ہے...... یہ مایوس کن فقرہ بار بار کانوں میں گونجتا رہا۔ میں اپنے کمرے میں پہنچا۔ الماری کھولی، میرے کپڑے کے دو تین جوڑے بڑی نفاست سے استری کر کے ہینگروں میں لٹکا دیئے گئے تھے۔ کمرا صاف ستھرا تھا اور ہر چیز سلیقے سے رکھی تھی۔ واش روم میں بھی تولیا، صابن وغیرہ ہر چیز اپنی جگہ پر موجود تھی۔ غالباً میرے جانے کے بعد وہ یہی کچھ کرتی رہی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ جہاں بھی گئی ہے، اپنی مرضی سے گئی ہے۔ لیکن کہاں گئی ہے؟ یہ سوال اہم ترین تھا اور نہایت تشویشناک بھی۔

ایک امکان یہ بھی تھا کہ میری غیر موجودگی میں انیق پھر یہاں آیا ہو اور وہ اس کے ساتھ چلی گئی ہو یا پھر وہ نہ آیا ہو مگر دونوں کے درمیان فون پر ہی کچھ طے ہو گیا ہو اور وہ یہاں سے روانہ ہو گئی ہو۔ دوسرا امکان زیادہ پریشان کن تھا اور وہ یہ تھا کہ کہیں وہ اپنے والد کے پاس واپس نہ چلی گئی ہو۔ سونے کے اس پنجرے میں بند ہونے کے لیے جہاں اسے ہمیشہ کے لیے پھڑ پھڑانا ہی تھا۔

پہلوان حشمت بے حد حیران تھا۔ اسے جیسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ تاجور اس طرح خاموشی کے ساتھ یہاں سے جا سکتی ہے۔ یہاں تو اس کے نکاح کی تیاری ہو رہی تھی۔ ایک ایک دن گنا جا رہا تھا۔ پہلوان کو اس چکر کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا جو کئی دن سے یہاں چل رہا تھا۔ انیق بڑی خاموشی سے دو دفعہ یہاں آ چکا تھا۔ اس بارے میں بھی پہلوان کو کچھ خبر نہیں تھی اور پھر وہ کاری ضرب جو انیق نے مجھ پر اور میرے کردار پر لگائی تھی، وہ بھی پہلوان حشمت سمیت کسی کے علم میں نہیں تھی، حتیٰ کہ میں نے ابھی تک سجاول کو بھی اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

شام تک اس بات کی امید رہی کہ شاید تاجور اچانک کہیں سے واپس آ جائے اور وہ تمام بدترین اندیشے غلط ثابت ہو جائیں جو مسلسل میرے دل و دماغ کو چھید رہے تھے مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ میرا فون مسلسل آن تھا اور میں وقفے وقفے سے تاجور کو کال بھی کر رہا تھا۔ اس نے اپنا فون بند کر چھوڑا تھا۔

راولپنڈی میں بھی داؤد بھاؤ کا ایک ٹھکانا موجود تھا۔ ایک مرتبہ انیق نے خود بھی اس کا ذکر کیا تھا اور اس کا حدود اربع بتایا تھا، تاہم ٹھیک ایڈریس مجھے معلوم نہیں تھا۔ میں نے داؤد بھاؤ سے رابطے کی کوشش شروع کر دی۔ چند دن پہلے کی طرح اب بھی ناکامی ہوئی۔ ٹیکساری گینگ والے واقعے سے پہلے ہی وہ اپنے کسی چکر میں زیرِ زمین تھا۔ انیق کی صورت رہ رہ کر میری نگاہوں میں گھوم رہی تھی اور ایک عجیب طرح کا طیش اس کے حوالے سے محسوس ہوتا

تھا۔ بہر حال یہ بات تو میں کسی صورت بھی سوچ نہیں سکتا تھا کہ تاجور نے انیق کے بارے میں کسی دوسرے انداز میں سوچا ہوگا۔ وہ اس کے لیے صرف اور صرف ایک بھائی بلکہ چھوٹے بھائی کی حیثیت رکھتا تھا۔

رات نو بجے کے لگ بھگ میں نے فردوس سے ٹیلی فونک رابطے کی تگ و دو شروع کر دی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے آج وہ سارے فون بند ہیں جن سے میں ''رابطہ کرنے'' ہونے کی کوشش کر رہا ہوں۔ فردوس کے فون پر پہلے تو بیل جاتی رہی پھر وہ بھی بند ہو گیا۔ میری جھلاہٹ عروج پر پہنچ گئی۔ بہر حال دس بجے کے لگ بھگ اچانک فردوس سے رابطہ ہو گیا۔ اس کی آواز سن کر ہی مجھے پتا چل گیا کہ وہ اسلام آباد والے نیم سرکاری بنگلے کے کسی واش روم سے بول رہی ہے۔ اس نے کوئی نل بھی کھول رکھا تھا۔ تاکہ پانی گرنے کی آواز میں اس کی آواز دب جائے۔

''کیا بات ہے بھرا وقاص؟'' وہ ڈری اور قدرے جھنجلائی ہوئی آواز میں بولی۔

''تم نے فون کیوں بند کر دیا تھا؟'' میں نے غصے سے کہا۔

''اس ویلے بات نہیں کر سکتی تھی۔ اب بھی بڑی مشکل سے موقع نکالا ہے۔''

''یہ مت سمجھنا کہ تم فون نہ سنو گی تو میں چپ کر کے بیٹھا رہوں گا، میں جا پہنچوں گا تمہارے پاس...... اور پھر جو کچھ ہوگا اس کی ذمے دار تم خود ہو گی۔''

وہ روہانسی آواز میں بولی۔ ''تم کو جو کہنا ہے جلدی کہو، مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے۔''

''تاجور کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہاں پر ہی ہے، اور کہاں جانا ہے اس نے۔'' وہ حسبِ سابق بولی۔ اس نے کبھی یہ بات تسلیم نہیں کی تھی کہ چند روز پہلے تاجور اچانک اسلام آباد کے اس نیم سرکاری بنگلے سے غائب ہو گئی تھی۔ وہ اب بھی اسی تناظر میں بات کر رہی تھی۔

میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''فردوس! تم بال بچوں والی ہو اور تم نے ایک بال بچے دار شخص سے ناجائز تعلق بنایا ہوا ہے۔ میرے پاس تمہارے اور ہاشو کے کرتوت کی تصویریں ہیں۔ میں تمہیں برباد کر ڈالوں گا اگر تم نے سچ نہ بولا تو۔''

وہ جیسے سرتاپا لرز کر بولی۔ ''میں نے کیا کہہ دیا ہے وقاص بھائی، جو تم پوچھ رہے ہو بتا تو رہی ہوں۔''

''تم نے پہلے بھی جھوٹ بولا تھا اور اب بھی اپنے مالکوں کی پردہ داریاں کر رہی ہو۔ پچھلی دفعہ میں نے تم کو فون کیا تھا تو تم نے کیا کہا تھا؟''

''کک......کیا کہا تھا؟''

''تم نے کہا تھا کہ تاجور بی بی وہاں بنگلے پر ہی ہے......اور اس کا نکاح ابھی اس لیے نہیں ہو سکا کہ اس کی والدہ اسپتال میں ہے حالانکہ اس وقت تاجور بنگلے پر موجود ہی نہیں تھی۔ وہ نکل چکی تھی وہاں سے اور سارے گھر والے اسے جگہ جگہ ڈھونڈتے پھر رہے تھے......ڈھونڈ رہے تھے یا نہیں؟'' میں نے کڑک دار لہجے میں پوچھا۔

وہ چپ رہی۔ بس اس کے ہانپتے ہوئے سانسوں کی آواز ہی آ رہی تھی۔ میں نے اسے تھوڑا سا مزید دھمکایا تو وہ روہانسی ہو گئی۔ منت کرنے لگی کہ میں اس کا پیچھا چھوڑ دوں، ورنہ یہ لوگ اس کی کھال اتروا کر اس میں توڑی (بھس) بھروا دیں گے۔

میں نے کہا۔ ''چھوڑوں گا پیچھا...... بلکہ انعام بھی اتنا دوں گا جو تم نے سوچا نہ ہو گا لیکن میں جب بھی فون کروں، میرا فون سننا ہو گا اور مجھے سب کچھ صاف صاف بتانا ہو گا۔ ورنہ وہ سب کچھ ہو گا جو میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں۔''

اس کے سسکنے کی آواز آتی رہی۔ میں نے کہا۔ ''بتاؤ اب......کہاں ہے تمہاری تاجور بی بی؟''

''وہ......آج ہی......واپس آئی ہے۔ شام سے تھوڑی دیر پہلے۔'' فردوس نے کہا اور میرے سینے میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔

آخر وہی ہوا تھا جس کا اندیشہ تھا۔ وہ انیق کے ساتھ نہیں گئی تھی۔ وہ واپس اپنے قید خانے میں چلی گئی تھی اور یہ بدترین صورتِ حال تھی۔ میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے فردوس سے پوچھا۔ ''کیا بتایا ہے اس نے؟ کہاں گئی تھی اور کہاں سے آئی ہے؟''

''ابھی تک کچھ پتا نہیں چلا۔ پر پورے بنگلے میں تھرتھلی سی مچی ہوئی ہے۔ تاجور بی بی کے سسرال والے بھی آئے ہوئے ہیں وڈی وڈی گاڑیوں میں۔ سب اندر والے لمبے کمرے میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ دروازے شروازے بھی بند ہیں۔''

''وہ اکیلی آئی تھی؟''

''آہو، وڈی چادر لی ہوئی تھی اور نقاب کیا ہوا تھا۔ ٹیکسی سے اتری تھی۔ گیٹ پر چوکیدار اسے دیکھ کر حیران رہ گئے پھر پورے بنگلے وچ بھاگ دوڑ مچ گئی۔''

اب سب کچھ واضح ہو چکا تھا۔ فی الوقت فردوس سے گفتگو کو طول دینا بھی مناسب نہیں تھا۔ میں نے اسے ہدایت کی کہ وہ اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھے اور موقع دیکھ کر مجھے یہاں کی صورتِ حال بتاتی رہے۔ میرا فون ہر وقت آن رہے گا۔

میرے دماغ میں کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں دو چار دن میں ہی عرش سے فرش پر آن گرا ہوں۔ اور یہ جو کچھ ہوا تھا اس کی بڑی وجہ انیق ہی تھا۔ میرا دوست میرا عزیز از جان ساتھی۔

میرا دل گواہی دینے لگا کہ اب جو کچھ ہوگا بڑی جلدی ہوگا۔ تاجور نے اپنے والد کے قدموں میں سر رکھ دیا ہوگا اور روتے ہوئے اپنی "غلطی" کی معافی مانگ لی ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا ہوگا کہ وہ ان کے ہر فیصلے کے سامنے اپنا سر تسلیم خم کرتی ہے۔ اور دارج شکاری تو پہلے ہی تیار تھا۔ شکار کو یوں بے دست و پا دیکھ کر اور رضا مند جان کر اس نے ایک دن کی دیر بھی نہیں کرنا تھی۔ تیاری تو پہلے سے موجود تھی اب راستے میں اور کیا رکاوٹ ہو سکتی تھی۔ ایک دم مجھے لگا کہ میں محبت کی اس لڑائی میں ہار رہا ہوں ...... اور یہ ہار غیروں کے سبب نہیں، اپنوں کی وجہ سے ہی میری جانب بڑھ رہی ہے۔

○......❖......○

میں نے رات گئے سجاول کو فون کیا۔ میں نے ابھی تک اسے یہاں انیق کی آمد اور اس کی سنگین مداخلت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا اور نہ اب بتانا چاہتا تھا۔ بے شک انیق سے ایک غلطی ہوئی تھی اور بہت بڑی ہوئی تھی لیکن اب بھی مجھے یہ گوارا نہیں تھا کہ اسے سجاول کی طرف سے کوئی بڑا نقصان پہنچ جائے۔ اس کے اور سجاول کے تعلقات پہلے بھی کچھ بہت اچھے نہیں تھے۔ اگر سجاول کے علم میں یہ سارا معاملہ آ جاتا تو کوئی بڑی بات نہیں تھی کہ وہ اسے شوٹ ہی کر ڈالتا۔

میری کال پر سجاول کے اس لالہ موسیٰ والے گھر میں بیل ہوئی۔ پانچویں چھٹی بیل پر اس نے فون اٹھا لیا۔ "کیا بات ہے، تمہیں اتنی رات گئے بھی چین نہیں ہے؟" سجاول نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ساتھ ہی خورسنہ کی دبی دبی ہنسی سنائی دی۔ یقیناً وہ اس کے پاس ہی موجود تھی۔

"کوئی بات نہیں، اگر ڈسٹرب ہو رہے ہو تو صبح بات کر لیں گے۔" میں نے کہا۔

اسی دوران میں خورسنہ نے غالباً سجاول کے ہاتھ سے فون جھپٹ لیا۔ شوخ آواز میں بولی۔ "ہم تو ڈسٹرب نہیں ہوئے لیکن آپ بہت ڈسٹرب لگ رہے ہیں۔ انتظار کے یہ دو چار دن کاٹنا کافی مشکل ہوتا ہے۔ میں نے آپ کے ان دوست صاحب (سجاول) کی حالت دیکھی تھی۔" اس کی کھنکتی ہنسی سنائی دی۔ وہ اپنے اور سجاول کے حوالے سے کافی بے تکلف گفتگو کرتی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ پاکستان سے باہر پلی بڑھی تھی۔

میں نے کہا۔" تمہارا کیا حال ہے خورسنہ؟"
"میں تو ٹھیک ہوں لیکن آپ کے یہ دوست ٹھیک نہیں ہیں۔ بالکل الو باٹے ہو گئے ہیں، رات رات بھر جاگنے والے۔" اس نے پھر ہنسی کا جلترنگ بجایا۔
خورسنہ سے ایک دو رسمی جملوں کا تبادلہ ہوا اور تب اس نے فون ایک بار پھر سجاول کو تھما دیا۔ میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔" ٹھیک ہے سجاول، ابھی تم آرام کرو کل بات کریں گے۔"
تب تک سجاول جان چکا تھا کہ میں کوئی عام نہیں خاص بات کہنا چاہتا ہوں۔ کھٹ پٹ کی آوازیں سنائی دیں جن سے اندازہ ہوا کہ سجاول بیڈ روم سے باہر نکل رہا ہے۔ چند سیکنڈ بعد وہ بولا۔ ہاں...... اب بتاؤ شاہی! میں دوسرے کمرے میں ہوں، کوئی خاص گل ہے؟"
میں نے ذرا توقف سے کہا۔" ہاں سجاول! گل تو خاص ہی ہے بلکہ کافی سے زیادہ خاص۔"
"اوئے کچھ بتاؤ بھی، تاجور تو ٹھیک ہے ناں؟"
"ہاں وہ ٹھیک ہے لیکن یہاں سے چلی گئی ہے۔ واپس اپنے باپ کے پاس...... اسی گھر میں جہاں سے ہم اسے نکال کر لائے تھے، اور...... مجھے لگتا ہے کہ اب وہ واپس نہیں آئے گی۔"
فون لائن پر چند لمحے سناٹا رہا پھر سجاول کی پریشان آواز سنائی دی۔" یہ تم کیا کہہ رہے ہو یار! یہ کیسے ہوسکتا ہے، کیا اس جھلی کو پتا نہیں کہ اس کے واپس جانے کا مطلب کیا ہے، وہ تو اس کا حشر نشر کر دیں گے، اس کا نکاح ہو رہا ہے تم سے۔ وہ اس طرح کی حرکت کیسے کر سکتی ہے؟"
"بس جو بھی ہے سجاول! یہ حرکت ہو گئی ہے۔ وہ چلی گئی ہے یہاں سے۔ اپنی مرضی سے گئی ہے اور نہ آنے کے لیے گئی ہے۔"
"یار! یہ کوئی گڈی گڈے کی کھیڈ ہے۔ کوئی مذاق ہے؟" سجاول کا لہجہ آتشیں ہو گیا۔ "تم نے کیوں جانے دیا اسے؟ کب گئی ہے وہ؟"
میں نے کہا۔" تمہیں بتایا تھا ناں، وہ دو تین دن سے بالکل گم صم تھی۔ سر درد کا بہانہ کر رہی تھی۔ پتا نہیں اس کے اندر کیا چل رہا تھا۔ بار بار والدہ اور چھوٹے بھائیوں کا ذکر بھی کرتی تھی۔ لگتا ہے کہ اس نے سوچ بچار کی اور اپنا فیصلہ بدل لیا۔" (میں نے انیق والی ساری بات کو گول رکھا)
سجاول کی بھنائی ہوئی مگر مدھم آواز سنائی دی۔" میں نے تمہیں جاماجی جانے سے پہلے

ہی کہہ دیا تھا ناں شاہی کہ تم بے وقوفی کر رہے ہو۔ وہاں کوٹلی والے ڈیرے پر یہ تمہارے پاس تھی۔ ہر طرح تمہارے بس میں تھی۔ تم جو کہتے وہ مان بھی سکتی تھی لیکن تم نے اسے واپس جانے دیا بلکہ خود اسے اس کے پیو کے پاس چھوڑ کر آئے ...... عورت ذات کا ڈنگا پن سامنے ضرور آتا ہے۔ اس کو جتنی ڈھیل دیتے جاؤ، لیتی چلی جاتی ہے۔ بندے کی مت مار کے رکھ دیتی ہے۔ اس کو تر سا تڑ فا کر خوش ہوتی ہے اور خوش ہوتے ہوتے کسی وقت سب کچھ برباد کر بیٹھتی ہے۔'' غصے کے عالم میں اس کے منہ میں جو بھی آ رہا تھا، بولتا چلا جا رہا تھا، تاہم آواز اتنی بلند نہیں تھی کہ دوسرے کمرے میں خورسنہ تک پہنچ جاتی۔

میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''سجاول! جو کچھ قسمت میں ہوتا ہے، وہ ہو کر رہتا ہے اگر وہ میری......''

''چھڈ یار'' اس نے جھلا کر میری بات کاٹی۔ ''اب قسمت کو لے کر بیٹھ جا...... قسمت بھی تو ہم خود ہی بناتے ہیں۔ اب میرے والے معاملے کو دیکھ لے۔ یہاں بھی عورت کا ڈنگا پن تھا کہ نہیں؟ میں اسے چاہتا تھا اور وہ بھی چاہتی تھی۔ میرے ساتھ زندگی گزارنے کے ارادے تھے۔ میرے پیچھے یہاں پاکستان آئی۔ پر صرف سیر سپاٹے کے لیے۔ شادی کے پروگرام بعد کے تھے۔ اگر میں اسے جانے دیتا تو یہ اس وقت جاما جی میں آنکھیں گیلی کر رہی ہوتی اور میں یہاں سوکھ رہا ہوتا۔''

''میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں سجاول! لیکن یہاں بات کچھ اور طرح ہے......''

''کوئی اور طرح نہیں۔'' اس نے پھر میری بات کاٹی۔ ''میں تو صاف صاف کہوں گا تجھے۔ اس موقع پر اگر تُو فلمی ہیرو بن کر بیٹھ گیا ناں تو سب کچھ نکل جائے گا تیرے ہاتھوں سے۔ اب اس کو جانے نہ دے۔ چیز وہی اپنی ہوتی ہے جسے بندہ آگے بڑھ کر اپنے ہاتھوں میں کر لیتا ہے۔ اگر تجھ سے ہمت نہیں ہو رہی تو مجھے بتا۔ میں کر لیتا ہوں سب کچھ۔ ایسی کی تیسی اس کنجر دارج کی اور اس کے ہوتوں سوتوں کی۔ مکھن کے بال کی طرح نکال کر اسے لے آؤں گا واپس تیرے پاس۔''

میں نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''سجاول! زبردستی نہیں کرنی ہے ہم نے...... جو کچھ بھی کریں گے، سوچ سمجھ کر کریں گے۔''

''لیکن زیادہ سوچنے کا ٹائم نہیں ہے تیرے پاس، اگر وہ واقعی اس بنگلے میں واپس پہنچ گئی ہے تو پھر سب کچھ بڑی چھیتی ہو جانا ہے۔''

میں نے سجاول سے کہا کہ ابھی میں فون رکھ رہا ہوں، وہ بھی آرام کر لے۔ صبح میں

دوبارہ کال کروں گا۔ وہ بہت سٹپٹایا ہوا تھا۔ میں اس کی دلی کیفیت سمجھ رہا تھا۔

وہ رات سخت بے قراری میں گزری۔ اگلے روز اتوار تھا۔ دوپہر کے بعد میں فردوس سے فون پر رابطہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ حسبِ معمول بنگلے کے کسی واش روم میں چھپ کر بات کر رہی تھی۔ ٹب یا بالٹی میں پانی گرنے کی مدھم آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ فردوس نے وہی کچھ کہا جس کی مجھے توقع تھی۔ اس نے بتایا۔ ''تاجور بی بی نے رو رو کر میاں جی سے معافی مانگی ہے اور انہوں نے اسے معاف کر دیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ وہ وہی کچھ کرے گی جو میاں جی کہیں گے۔'' میاں جی سے فردوس کی مراد تاجور کے ابا جی چوہدری دین محمد تھے۔

میں نے فردوس سے پوچھا۔ ''کئی دن گھر سے غائب رہنے کے بارے میں اس نے کیا بتایا ہے؟''

''یہی کہ وہ پریشان ہو کر لاہور میں اپنی سہیلی فرح کے پاس چلی گئی تھی اور اب وہیں سے واپس آئی ہے۔ اس کی سہیلی فرح بھی کل اس کے ساتھ ہی یہاں بنگلے میں آئی تھی۔''

یہ فرح، تاجور کی وہی دوست تھی جس سے شروع شروع میں لاہور میں میری ملاقات ہوئی تھی۔ (ایک طرح سے فرح نے ہی مجھے اور تاجور کو ایک راہ پر ڈالا تھا اور میں تاجور کو اس کے آوارہ منگیتر اسحاق سے بچانے کے لیے چاند گڑھی پہنچا تھا)

فردوس جو کچھ بتا رہی تھی، اس کا مطلب یہی تھا کہ مجھے چھوڑنے سے ایک دو دن پہلے ہی تاجور نے حتمی فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے فون پر اپنی اس سہیلی فرح سے بھی رابطہ کیا تھا اور اس کے ساتھ ہی بنگلے پر واپس لوٹی تھی۔

میں نے فردوس سے پوچھا۔ ''اب کیا پروگرام ہے ان لوگوں کا؟''

وہ دبی آواز میں بولی۔ ''کل سارا دن مشورے ہوتے رہے ہیں۔ اب بھی وڈی وڈی گاڑیوں میں لوگ آئے ہوئے ہیں۔ ان میں تاجور کی ہونے والی ساس بھی ہیں۔ میں نے بتایا تھا ناں کہ یہ بڑی رعب دار اور ڈھادی عورت ہیں، سنا ہے کہ......'' وہ بتاتے بتاتے چپ ہو گئی۔

میں نے اسے ڈانٹا کہ وہ اپنی زبان کو بریک نہ لگایا کرے۔ بات پوری کیا کرے۔

وہ ذرا ہکلا کر کہنے لگی۔ ''پتا چلا ہے کہ تاجور کی ہونے والی ساس کل بڑے غصے میں تھیں۔ ان کو شاید شک تھا کہ تاجور غلط کہہ رہی ہے۔ وہ لاہور میں اپنی سہیلی کے پاس نہیں تھی...... اگر تھی بھی تو کیوں تھی؟ اس نے گھر چھڈ کر جانے کی ہمت کیسے کی؟ انوری نے بتایا ہے کہ کل کوئی جھگڑا شگڑا بھی ہوا ہے۔''

''جھگڑا...... کس کے درمیان؟''

''خیر اس کو جھگڑا تو نہیں کہہ سکتے۔ تاجور کی ہونے والی ساس نے ہی غصہ دکھایا ہے۔ اس نے اپنے بیٹے کے ساتھ تاجور بی بی کا نکاح کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ میاں جی نے اس کا ترلا منت کر کے اسے کچھ ٹھنڈا کیا۔ بعد میں بند کمرے کے اندر ماں بیٹے میں بھی کچھ گرما گرمی ہوئی۔''

''کون ماں بیٹا؟'' میں نے پوچھا۔

''وہی تاجور کی ہونے والی ساس اور دارج صاحب...... پتا چلا ہے کہ دارج صاحب نے بھی ماں کو سمجھایا بجھایا اور ٹھنڈا کیا۔ دارج صاحب نے کہا کہ ٹھیک ہے کہ ایک غلطی ہوئی ہے لیکن اگر صبح کا بھولا شام ویلے گھر آ جائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔''

فردوس کی باتیں سن کر میرا سلگتا ہوا سینہ کچھ اور بھی سلگنے لگا۔ تاجور اپنے ہاتھوں سے ایک ایسا طوق گلے میں پہن رہی تھی جس سے اسے دکھ تکلیف اور توہین کے سوا اور کچھ نہیں ملنا تھا۔ دارج جس درگزر اور صبر و تحمل کا مظاہرہ کر رہا تھا، اس کے پیچھے یقیناً اس کی جلتی ہوئی خواہشات ہی تھیں۔ وہ بس ایک شکاری تھا اور کسی بھی طرح شکار کو اپنے دام میں لانا چاہتا تھا۔

فردوس کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا، وہ بولی۔ ''ہائے میں مر گئی۔ میاں جی مجھے آوازیں دے رہے ہیں۔ وہ پہلے ہی بڑے غصے میں ہیں۔ انہوں نے میری شامت لے آنی ہے۔''

''اچھا...... جانے سے پہلے ایک بات بتاؤ، کب ہونا ہے یہ نکاح والا کام؟''

''ابھی تو کچھ پتا نہیں ہے وقاص بھائی، کم از کم مجھے تو کچھ پتا نہیں۔ ویسے پہلے وہی مہندی والا کام ہوگا۔ میں نے اڑتی اڑتی سی گل سنی ہے۔ کل شاید مہندی ہوگی اور پرسوں نکاح اور رخصتی...... اچھا اب میں جاتی ہوں۔'' اس نے پھر گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' میں بولا۔ اس نے فوراً ہی فون بند کر دیا۔

میں بے قراری سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا۔ ہر چیز کی ٹائمنگ غلط ہو رہی تھی۔ چار روز پہلے رات کے کھانے کے بعد، ٹیرس میں بیٹھ کر میں نے تاجور سے تفصیلی اور حتمی گفتگو کرنا تھی، میں نے اپنا دل کھول کر اس کے سامنے رکھ دینا تھا اور ممکن تھا کہ میرے دل سے نکلنے والی آواز اس کے دل پر اثر بھی کر جاتی مگر پھر سیف کے والد چوہدری بشیر کے انتقال کا غم ناک واقعہ ہو گیا تھا اور اس واقعے نے تاجور کے احساسات سمیت جیسے سب کچھ

بدل کر رکھ دیا تھا۔

پہلوان حشمت برآمدے میں بے قراری سے ٹہل رہا تھا۔ ایک تو اسے بھی تاجور کے چلے جانے کی پریشانی تھی۔ دوسرے اسے بھوک بھی ستا رہی تھی۔ ڈھائی بج چکے تھے اور ابھی تک ہم میں سے کسی نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ ناشتے میں بھی پہلوان نے بس چند بسکٹ اور چائے لی تھی۔ اس سے پہلے یہاں تاجور نے ہی کچن سنبھال رکھا تھا۔ اب باقی گھر کی طرح کچن بھی بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔

میں نے پرس نکالا تا کہ پہلوان حشمت سے کہوں کہ وہ کسی قریبی ریسٹورنٹ سے کھانا لے آئے۔ میں نے پرس کھولا تو سب سے پہلے میری نگاہ ایک تازہ تازہ تہ کیے ہوئے سفید کاغذ پر پڑی۔ یہ لیٹر پیڈ کا کاغذ تھا۔ میں نے چونک کر کاغذ نکالا تحریر دیکھتے ہی میں پہچان گیا یہ تاجور کی تھی۔ میری دھڑکن ایک دم دگنی ہوگئی۔ خود کو نارمل رکھتے ہوئے میں نے پہلوان کو کچھ پیسے دیئے تا کہ وہ کھانا لے آئے۔ شرافت اور پہلوان باہر نکل گئے تو میں نے بند کمرے میں خط پڑھنا شروع کیا۔ یہ خط تاجور نے گھر چھوڑنے سے پہلے لکھا تھا۔ تحریر یوں تھی:

''شاہ زیب! یہ الفاظ لکھتے ہوئے میری آنکھیں آنسوؤں سے تر ہیں اور میں انہیں بار بار پونچھ رہی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ میں ایک بار پھر آپ کو دکھ دے رہی ہوں لیکن میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ میں نے اس بارے میں بہت سوچا ہے اور ہر بار ایک ہی جواب ذہن میں آیا ہے۔ مجھے اس رات اپنے ماں باپ اور گھر والوں کو اتنا بڑا دکھ دے کر اس گھر سے نکلنا نہیں چاہیے تھا۔ میں نے اس کی بہت دلیلیں سوچی ہیں لیکن کوئی ایک دلیل بھی ایسی نہیں جو میری اس حرکت کو جائز بنا سکے۔ میں اپنی خوشیوں کے لیے اپنے پیدا کرنے والوں کو اتنا بڑا دکھ نہیں دے سکتی۔ میں ابا جان کے قدموں میں اپنا سر رکھنے کے لیے جا رہی ہوں۔

میں جانتی ہوں شاہ زیب! آپ ڈرنے والے نہیں ہیں۔ آپ میرے لیے ہر بڑی سے بڑی دیوار کو گرانے کی کوشش کر سکتے ہیں اور اسے گرا بھی سکتے ہیں لیکن آپ ایسا نہ کرنا...... پلیز ایسا نہ کرنا۔ کیونکہ اس سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ میں آپ کے پاس نہیں لوٹوں گی۔ میں نے اپنی سب سے پیاری ہستی اپنی ماں کے سر کی قسم کھائی ہے۔ مجھے اب واپس نہیں آنا۔ اگر آپ زبردستی یا پھر کسی بھی حیلے سے مجھے اپنے پاس لے آئیں گے تو وہ میں نہیں میری لاش ہوگی۔ اور یہ لاش

آپ کے کسی کام کی نہیں ہوگی۔ زندگی میں پہلی اور آخری بار آپ سے ایک درخواست کررہی ہوں اور وہ یہی ہے کہ میرا خیال ہمیشہ کے لیے اپنے دماغ سے نکال دیں۔"

خط جس طرح بغیر کسی تمہید کے شروع ہوا تھا اسی طرح بغیر کسی رسمی جملے کے، روکھے پھیکے طریقے سے ختم ہوگیا۔ کہتے ہیں کہ بولے ہوئے الفاظ ہی نہیں، کاغذ پر لکھے ہوئے الفاظ بھی اپنے لکھنے والے کی ذہنی کیفیت کی عکاسی کرتے ہیں اور پتا نہیں کیوں یہ الفاظ دیکھ کر ہی پتا چلتا تھا کہ ان کے پیچھے حتمی ارادہ اور چٹان کی طرح مضبوط فیصلہ ہے۔ میں بے دم سا ہوکر کرسی پر بیٹھ گیا۔ یوں لگا جیسے تاجور نے کھڑے کھڑے میرے دونوں ہاتھ توڑ دیئے ہیں اور کسی تیز دھار کٹار سے میرے دونوں پاؤں قلم کردیئے ہیں۔ میرا یقین تھا کہ دنیا بھر کی دولت، طاقت اور جاہ وحشمت، ایک عورت کی دلی چاہ کو خریدنا چاہے تو نہیں خرید سکتی اور مجھے یہی لگ رہا تھا کہ آج میں اس چاہ سے محروم ہوگیا ہوں۔

اپنے اس خط میں تاجور نے کہیں بھی مجھ پر سیف کے حوالے سے کوئی الزام نہیں دھرا تھا۔ کہیں سیف کا نام نہیں آیا تھا لیکن میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اس خط میں شروع سے آخر تک بس سیف ہی کا ذکر ہے اور اس کی اندوہناک موت کی رُوداد ہے۔

سینہ جل اٹھا۔ آنکھوں میں ہلکی سی نمی محسوس ہوئی۔ دل نے جیسے پکار کر تاجور سے پوچھا۔ کیا اتنی کمزور تھی تمہاری محبت۔ ایک جھوٹ سے فریب کھا گئی۔ سچ کو نہ دیکھ سکی۔ میری آنکھوں کی گہرائی میں نہ جھانک سکی۔ پیار کرنے والے تو خاموشی کی زبان بھی سمجھتے ہیں۔ میں نے تو تمہیں بتایا......اور کئی بار بتایا کہ میری زندگی کا حاصل تمہاری محبت ہے اور میں اس محبت کو کبھی بھی جھوٹ کے چھینٹوں سے داغ دار نہیں کرسکتا۔

اسی دوران میں گھر کے بیرونی دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔ میں نے جاکر دروازہ کھولا۔ سجاول سیالکوٹی کسی تند بگولے کی طرح اندر داخل ہوا۔ وہ آج کل پینٹ شرٹ پہن رہا تھا اور کلین شیوڈ تھا پھر بھی اس کا دبنگ انداز اپنی جگہ تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہورہی تھیں۔ وہ میرے ساتھ سیدھا کمرے میں آیا اور دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ "وہ سؤر دارج ہمارے ہاتھوں سے تاجور کو چھین کر لے جائے، میں یہ نہیں ہونے دوں گا۔ میں آگ لگا دوں گا اس سارے شہر میں۔" اس کے اندر وہی پرانا سجاول سیالکوٹی بول رہا تھا جس نے کچھ عرصہ پہلے تک پورے پنجاب میں کھلبلی مچا رکھی تھی۔

میں نے کہا۔ "سجاول! یہ میرا ذاتی معاملہ ہے......"

"بکواس نہ کر۔ نہیں ہے یہ تیرا ذاتی معاملہ۔ اپنا منہ دیکھ...... اپنا رنگ دیکھ، لگ رہا ہے، مہینوں کا بیمار ہے۔ میں کسی کو تیرا خون چوسنے نہیں دوں گا۔ دارج کی آندریں (انتڑیاں) نکال دوں گا اور تاجور کو تیری جھولی میں لا کر ڈالوں گا۔ دیکھتا ہوں کون راستہ روکتا ہے سجاول کا۔"

"سب سے پہلے تو میں ہی روکوں گا۔" میں نے پھیکی ہنسی کے ساتھ کہا۔ "کہیں ایسا نہ ہو کہ تاجور کو میری جھولی میں ڈالتے ڈالتے تم خورسنہ سے ہی ہاتھ دھو بیٹھو۔ اس سے شادی کے وقت تم نے عہد کیا تھا کہ اپنی مار دھاڑ والی زندگی سے الگ ہو جاؤ گے۔"

"یہ شوقیہ مار دھاڑ نہیں ہے شاہی۔ تمہاری زندگی کا سوال ہے اور میں تمہارا دوست ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایک دوست کے طور پر میری عزت اور آن کو بھی للکارا گیا ہے۔"

"کسی نے نہیں للکارا سجاول، اگر کسی نے للکارا ہوتا تو ہم اس کی للکار کا جواب دیتے۔ یہاں تو وہی میرے سامنے آن کھڑی ہوئی ہے جس کے لیے لڑنا تھا، مرنا تھا اور جینا تھا۔ وہ اب نہیں آئے گی سجاول...... اور اسے زبردستی لانے کا کوئی فائدہ نہیں۔"

خط میز پر پڑا تھا۔ اس پر سجاول کی نظر پڑ گئی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کرتا، وہ خط اٹھا کر پڑھنے لگا۔ اس کے چوڑے ماتھے کی سلوٹیں بے ساختہ گہری ہونے لگیں۔ خط میری جھولی میں پھینک کر پکارا۔ "وہی عورت کا ڈنگا پن۔ تمہیں کہا تھا ناں کہ ان زنانیوں کی عقل ہی اور طرح کی ہوتی ہے۔ آنکھیں کہیں لگاتی ہیں شادیاں کہیں کرتی ہیں۔ ہزاروں میں کوئی دس بیس ہوں گی لگانے والی اور نبھانے والی۔"

سجاول طیش میں بولتا جا رہا تھا اور وہ اس بے حد کڑوی حقیقت سے واقف نہیں تھا کہ اگر تاجور نے یہ سب کچھ کیا ہے تو اس کے پیچھے وجہ کیا ہے۔ انیق کی یہاں آمد اور اس کی زہر افشانی کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا تھا اور میں اسے بتانا چاہتا بھی نہیں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ انیق کا خون کر ڈالے گا یا پھر انیق کی طرف سے کوئی نقصان اٹھا بیٹھے گا۔

میں نے بڑے تحمل کے ساتھ سجاول کو سمجھایا کہ میں اس کے جذبات کی بے حد قدر کرتا ہوں، لیکن یہ معاملہ کچھ اس طرح کا ہے کہ میں اس میں کسی بھی طرح طاقت کا استعمال کرنا نہیں چاہتا۔ وہ ٹھیک ہی کہتی ہے کہ طاقت کے استعمال سے اگر وہ میرے پاس آ بھی گئی تو اس کی حیثیت ایک لاش کے سوا کچھ نہیں ہو گی۔

میری بات سن کر سجاول نے نفی میں سر ہلایا اور پھنکارا۔ ''یہ سب قصے کہانیوں کی باتیں ہیں شاہی۔ عورت کی مرضی ہو یا نہ ہو لیکن وہ جس مرد کے پاس ہوتی ہے آہستہ آہستہ اسی کی ہو جاتی ہے اور جب بچے ہو جاتے ہیں تو پھر ساری اڑانیں بھول جاتی ہیں۔ بڑی بڑی تیکھی زنانیاں دیکھی ہیں میں نے، بندہ پاس جاتا تھا تو وہ اپنی جان لینے کی دھمکیاں دیتی تھیں لیکن پھر آہستہ آہستہ ہنسی خوشی ان ہی مردوں کے بچے پیدا کرنے لگیں۔''

''تمہاری بات اپنی جگہ ٹھیک ہے سجاول مگر زبردستی والا یہ قانون ہر جگہ ہر کسی پر لاگو نہیں ہوتا۔ ہر بندے کی سوچ اور اس کے معاملات الگ ہوتے ہیں۔ میں تم سے درخواست کرتا ہوں سجاول کہ اس معاملے کا سامنا مجھے اپنے طور پر کرنے دو۔''

''اپنے طور پر تم نے خاک کرنا ہے۔ یہاں بیٹھ کر انتظار کرتے رہو گے کہ کوئی انہونا کام ہو جائے۔ وہ دروازہ کھولے اور دوڑ کر تمہاری چھاتی سی چمٹ جائے۔ ایسا کچھ نہیں ہوگا دیکھ لینا۔''

''میں تم سے وعدہ کرتا ہوں سجاول! میں یہاں بیٹھ کر کسی انہونی کا انتظار نہیں کروں گا۔ میں اسے روکنے کی کوشش کروں گا لیکن یہ کوشش میں اپنے طور پر کروں گا اور اپنے طریقے سے۔'' میں نے سجاول کے دونوں ہاتھ تھام لیے اور التجائیہ لہجے میں کہا۔ ''میں تمہاری دوستی کی بہت قدر کرتا ہوں سجاول اور اسی دوستی کے ناتے میں تمہاری منت کرتا ہوں کہ اس معاملے میں نہ آؤ۔''

سجاول اپنی بڑی بڑی سرخ آنکھوں کے ساتھ چند سیکنڈ مجھے گھورتا رہا پھر اس نے اپنے ہاتھ پیچھے ہٹائے۔ اپنے سامنے پڑی ہوئی میز کو ہاتھ کی حرکت سے دور پھینکا اور طیش میں بڑبڑاتا ہوا تند بگولے کی طرح دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ میز پر پڑے ہوئے چائے کے کچھ برتن ٹوٹ گئے تھے اور کچھ الٹ پلٹ ہو گئے تھے۔

شکر کا مقام تھا کہ سجاول نے اپنا مکا استعمال کر کے میز کو چکنا چور نہیں کر ڈالا تھا۔ میرے ذہن سے ابھی تک وہ واقعہ محو نہیں ہوا تھا جب اپنے ڈیرے پر اسی طرح غصے میں آکر سجاول نے ایک نہایت مضبوط چوبی میز کے پرخچے اڑا دیئے تھے۔ اور اسی طرح ایک موقع پر اس نے جاماجی میں خورسنہ کے بھیجے ہوئے تاج محل کے ماڈل کا بھی یہی حشر کیا تھا۔

ڈیڑھ دو گھنٹے تک تنہائی میں خوب سوچ بچار کرنے کے بعد میں نے فردوس سے رابطہ کیا۔ اس مرتبہ وہ چھت پر واقع سرونٹ روم میں تھی۔ ''کیا پوزیشن ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''رات کو مہندی کی تیاری ہو رہی ہے۔ دارج صاحب کی والدہ مہندی کا بہت مہنگا جوڑا لے کر آئی ہیں۔ سب کی آنکھیں کھلی رہ گئی ہیں۔ سونے کے تاروں کا کام ہے اس پر...... کہتے ہیں کہ اٹھارہ وی لاکھ سے کم کا نہیں ہوگا۔''

کسی کمرے میں ڈھولک بجنے کی مدھم آواز میرے کانوں تک پہنچی اور سینے میں انگارے دہک اٹھے۔ ''تاجور کہاں ہے اس وقت؟'' میں نے پوچھا۔

''نیچے بڑے کمرے میں۔ کوئی بہت وڈا دکاندار راولپنڈی سے آیا ہوا ہے...... گھر والوں کو پسند کرانے کے لیے گہنے لایا ہے۔ لاہور سے آیا ہوا ایک اور وڈا سنیارا بیٹھک میں بیٹھا اپنی واری اڈیک رہا ہے۔ ویسے مجھ کو ایک بات سچی سچی بتاؤ وقاص بھائی، تاجور بی بی پچھلے ہفتے یہاں بنگلے سے نکل کر کہاں گئی تھی؟''

''تیری کھوپڑی میں شک دوڑ رہا ہے کہ شاید وہ میرے پاس آئی تھی۔ میرے پاس نہیں آئی تھی۔ اگر آئی ہوتی تو ''خالی'' نہ جان دیتا اس کو...... اور تُو ایویں اِدھر اُدھر کی باتیں نہ مار۔ میرے پاس فالتو ٹائم نہیں ہے۔ ابھی اسی وقت تجھے ایک کام کرنا ہے میرا۔''

''نہیں وقاصے نہیں۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''اپنے کانوں کو ہاتھ لگا۔ اب وہ بات نہیں کرسکتی تجھ سے۔ کرنا چاہے تو بھی نہیں کرسکتی۔ بس اب پچھا چھڈ دو اس کا۔ نہیں تو بہت بری طرح پچھتاؤ گے۔''

''پوری بات سنا کر۔'' میں نے اسے جھاڑا۔ ''مجھے پتا ہے وہ بات نہیں کرسکتی اور ابھی میں نے بات کرنی بھی نہیں۔ اپنے فون پر میسج پڑھ لیتی ہے ناں تُو؟''

''وہی جو خط والی تصویر کے ساتھ لکھا ہوا آتا ہے؟'' فردوس نے پوچھا۔

''ہاں وہی، میں تاجور کے لیے ایک میسج بھیج رہا ہوں۔ یہ تمہارے فون پر آئے گا۔ تم نے آج کسی بھی وقت شام سے پہلے یہ اسے دکھا دینا ہے اور دیکھ فردوس! یہ آخری کام ہے جو میں تجھ سے کہہ رہا ہوں۔ اس کے بعد کچھ نہیں کہوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے تجھ سے۔ لیکن آج یہ کام تجھے ہر صورت کرنا ہے۔ بول کرے گی؟''

''تم نے پہلے بھی مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اب کبھی مجھے تنگ نہیں کرو گے پر......''

''آج میرے کہے ہوئے کا اعتبار کر۔ سمجھ لے پتھر پر لکیر کھینچ رہا ہوں۔ تیری اور ہاشو کی وہ وڈیو بھی تیرے سامنے صاف کردوں گا۔''

فردوس کو پوری طرح آمادہ کرنے میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ اس کے بعد میں نے اردو ٹیکسٹ میں تاجور کے لیے ایک طویل میسج لکھا۔ ظاہر ہے یہ براہِ راست گفتگو نہیں

تھی، میں اس میں ڈھکے چھپے لفظوں میں ہی مدعا بیان کر سکتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ تاجور میری پوری بات سمجھے گی۔ یہ پیغام کچھ اس طرح تھا۔

''سوچتا ہوں، کہیں دل میں یہ حسرت ہی نہ رہے کہ میں نے تمہارے سامنے کھل کر اپنی صفائی پیش کیوں نہیں کی۔ جو حقیقت ہے وہ میں تمہارے سامنے کھول کر بیان کر دیتا ہوں، اب یہ تمہاری مرضی ہے کہ میری اس سو فیصد سچائی کو تسلیم کرتی ہو یا نہیں۔ میں جانتا ہوں یہاں پنڈی والے اس گھر میں ایک شخص میری غیر موجودگی میں دو بار تم سے ملنے آیا ہے۔ اس شخص نے پہلے کبھی کوئی اس طرح کا کام نہیں کیا اور ہم سب کو ہمیشہ اس سے بہت اچھی امید ہی رہی ہے۔ پتا نہیں کیا وجہ ہے کہ اس نے تمہارے سامنے میرے بارے میں اس طرح کی باتیں کیں، میں تفصیل میں نہیں جا سکتا صرف اتنا ہی کہوں گا کہ اس شخص نے مجھ پر جو الزام لگایا ہے، وہ سو فیصد غلط ہے۔ وہ شخص بھی اچھی طرح جانتا ہے کہ میں نے اس شخص کو زہر کیوں دیا تھا جب وہ زہر دیا گیا اس وقت ہم اپنے قاتلوں کے بدترین شکنجے میں تھے۔ ہمارے زندہ رہنے کی ایک فیصد امید بھی بہت بڑی خوش فہمی کہلائی جا سکتی تھی۔ اگر ہم میں سے کوئی ایک بھی غیر انسانی تشدد کی تاب نہ لا کر اپنی زبان کھول دیتا تو ہمارے ساتھ ساتھ ان سب ساتھیوں کو بدترین انجام سے دوچار ہونا پڑتا جو ڈرے سہمے زیر زمین موجود تھے۔ وہ اپنے لیے رو رو کر سلامتی کی دعائیں بھی مانگ رہے تھے، وہ اس بات سے مشروط تھیں کہ ہم اپنی زبان بند رکھیں اور پھر وہ اسٹیج آئی تھی جب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ زیر عتاب شخص اپنی چپ برقرار نہیں رکھ سکے گا۔ میں نے اس کی موت آسان کرنے کے لیے اور باقیوں کو بچانے کے لیے اپنے دل پر بہت بڑا پتھر رکھا تھا۔ کوئی اور جانے یا نہ جانے لیکن میں جانتا ہوں اور میرا خدا جانتا ہے کہ اس کی موت میں نے کس طرح جھیلی تھی۔ بے شک میں نے اس بارے میں تم سے جھوٹ بولا لیکن صرف اندیشے سے کہ کہیں تمہارے دل میں کوئی وسوسہ پیدا نہ ہو جائے۔ میں مانتا ہوں کہ میری یہ غلط بیانی میری غلطی تھی۔

''وہ شخص جو میری غیر موجودگی میں دو بار تمہارے پاس آیا اس نے تمہیں میری ریکارڈ شدہ آواز بھی سنائی تھی مگر اس نے اس ساری گفتگو کا صرف وہ حصہ تمہیں سنایا جس میں، میں زہر دینے والی بات کرتا سنائی دیتا ہوں۔ پتا نہیں کہ

اس شخص نے یہ سب کچھ کیوں کیا ہے، مجھے ہرگز ہرگز توقع نہیں تھی اور میرے خیال میں تمہیں بھی نہیں تھی کہ اس کا ایسا رویہ سامنے آئے گا۔

میں جانتا ہوں کہ میں جو صفائی دے رہا ہوں اس کے لیے شاید بہت دیر ہو چکی ہے لیکن یہ تسلی تو کم از کم ہے کہ میں نے اپنی آواز تم تک پہنچا دی ہے۔ اب جو فیصلہ کرنا ہے، تم کو کرنا ہے۔ اگر میری صفائی قبول کر کے مجھے آواز بھی دینی ہے تو تم کو دینی ہے، میری طرف سے میرے یہ آخری الفاظ ہیں، میری طرف سے اگر کچھ غلطیاں ہیں تو انہیں معاف کر دینا۔''

یہ الفاظ میں نے میسج کے ذریعے فردوس کو ارسال کر دیئے اور اس کو مل گئے۔ اپنی اس تحریر میں، میں نے پوری احتیاط برتی تھی اور کہیں بھی، اپنا یا تاجور کا اور سیف کا نام نہیں لکھا تھا۔

بمشکل آدھ گھنٹہ گزرا تھا کہ فردوس کا فون آ گیا۔ وہ حسبِ معمول اس مرتبہ واش روم میں تھی۔ اس کے سر سے جیسے بہت بڑا بوجھ اترا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ ''وقاص بھائی! اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر میں نے تمہارا یہ کام بھی کر دیا ہے۔ تمہارا وہ خط میں نے تاجور بی بی تک پہنچا دیا ہے۔''

''خط صرف پہنچا ہی ہے یا اس نے پڑھا بھی ہے؟''

''آہو جی، وہ اوپر چھت پر ہی آ گئی تھیں۔ اوپر سے نیچے تک سارا پڑھا ہے انہوں نے...... اور نہ صرف پڑھا ہے بلکہ ڈیلیٹ (ڈیلیٹ) بھی کر دیا ہے۔''

''خط پڑھنے کے بعد اس نے کچھ کہا؟''

''نہیں وقاص بھائی، کہا تو کچھ نہیں، بس جلدی سے نیچے چلی گئی تھیں۔''

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے فردوس، اب تم سکون میں آ جاؤ۔ لگتا ہے کہ اب تمہیں کبھی پریشان کرنے کی نوبت نہیں آئے گی۔ شاید ایک آدھ بار اور فون کروں گا اور پھر ختم۔'' اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ فردوس جو کچھ کہہ رہی ہے سچ کہہ رہی ہے۔ میری بات بالآخر تاجور تک پہنچ گئی ہے۔ اب میں کم از کم یہ تو کہہ سکتا ہوں کہ میں نے تاجور سے کچھ چھپایا نہیں۔ اب سب کچھ اس کے ہاتھ میں تھا۔ بے شک یہ بڑا نازک وقت تھا۔ گھڑی کی سوئیاں تیزی سے چل رہی تھیں اور وقت کی طنابیں کھنچی چلی جا رہی تھیں۔ اگر تاجور چاہتی تو اب بھی سب کچھ بدلا جا سکتا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ میں سب کچھ بدل سکتا ہوں۔

نوکروں کی فوج ظفر موج، یہ سکیورٹی گارڈز، یہ پولیس کے دستے...... میرا راستہ نہیں روک سکتے تھے لیکن اصل بات تو یہی تھی کہ اس کے دل میں سے آواز ابھرتی۔ اتنا بڑا اور ناقابلِ واپسی قدم اٹھانے سے پہلے وہ سوچتی کہ اسے مجھے چھوڑنا ہے یا نہیں۔ میرے لیے زندگی کے دروازے بند کرنے ہیں یا نہیں۔

سجاول مجھ سے بہت ناراض تھا۔ اتنا ناراض کہ مجھ سے بات کرنا بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ اس نے وہسکی کی آدھی بوتل بغیر کچھ ملائے اپنے اندر انڈیلی تھی اور ٹن ہو کر ساتھ والے کمرے میں لیٹ گیا تھا۔ وہ میری زندگی کی ایک مشکل ترین شام تھی۔ پہلوان حشمت بھی بے حد افسردہ تھا۔ میرے اور تاجور کے متوقع نکاح نے اسے بے حد سرشار کیا تھا۔ اس نے میرے لیے باقاعدہ سہرا بھی لکھ لیا تھا۔ اب اسے بھی معلوم ہو چکا تھا کہ تاجور یہاں سے اچانک کہاں گئی ہے اور اب اسلام آباد کے اس شاندار بنگلے میں کیا ہو رہا ہے۔

اس نے بھی مجھ سے یہی کہا تھا کہ ہمیں یہ ''زبردستی کا نکاح'' رکوانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ یہ زبردستی نکاح نہیں ہے۔ اب یہ رضامندی والا نکاح ہو چکا ہے۔

وہ بگڑ کر بولا۔ ''میں اچھی طرح جانت ہوں یہ کس طرح کی رضامندی ہے۔ بٹیا کو ضرور کسی نہ کسی طریقے سے مجبور کیا گیا ہے، دباؤ ڈالا گیا ہے۔''

ہمارے درمیان گفتگو کوئی ڈیڑھ گھنٹہ پہلے ہوئی تھی۔ شام کے بعد وہ پھر میرے پاس آ گیا۔ ''مجھ سے یہ سب کچھ برداشت ناہیں ہوتا شاہ زیب، میں فون کرنے لگا ہوں مولوی حبیب اللہ صاحب کو...... میں انہیں بتانے لگا ہوں کہ اسلام آباد میں کیا ہو رہا ہے۔''

''ٹھیک ہے بتادوان کو۔'' میں نے جھنجلا کر کہا۔ ''اور یہ بھی بتادو کہ میں ابھی ''مرا'' نہیں زندہ ہوں اور یہ بھی کہ تاجور جو کئی دن گھر سے غائب رہی ہے یہاں میرے پاس ہی ٹھہری ہوئی تھی۔''

''ناہیں، تمہارے بارے میں کچھ ناہیں بتاؤں گا۔ تم سے پکا عہد کر رکھا ہے اس بات کا۔ لیکن مجھے مولوی جی کو یہ تو بتانے دو کہ ان کی بھانجی کے ساتھ کتنا بڑا ظلم ہو رہا ہے۔''

''یہ سب کچھ ان سے چھپا ہوا نہیں ہے۔'' میں نے پھر پہلوان کی بات کاٹی۔ ''وہ بھی مجبور ہیں۔ کچھ نہیں کر سکتے۔ جب گاؤں میں چوہدری دین محمد کے سامنے کسی کی پیش نہیں چلی تو اسلام آباد میں کیسے چلے گی۔ اب جو کچھ ہو رہا ہے، اسے ہونے دو۔''

کہنے کو تو میں یہ کہہ رہا تھا لیکن آس تو ٹوٹی نہیں تھی۔ امید کی ایک پتلی سی ڈور اب بھی

بندھی ہوئی تھی۔ ابھی اس کے نکاح میں ...... اور اس کے غیر ہو جانے میں چوبیس گھنٹے بلکہ اس سے بھی زیادہ باقی تھے، کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ میری سب سے توانا امید کا تعلق سیل فون سے تھا۔ اس سیل فون پر کسی بھی وقت فردوس یا تاجور کی طرف سے کوئی ایسا پیغام آ سکتا تھا جو حالات کی اس قاتل برف میں کوئی دراڑ پیدا کر دیتا جس نے مجھے چاروں طرف سے منجمد کر رکھا تھا۔ شاید امیدیں ایسے ہی نقطہ انجماد سے سیکڑوں درجے نیچے کی مایوسی میں بھی زندہ رہتی ہیں۔

ہاں ...... وہ میری زندگی کی ایک مشکل ترین شام تھی ...... آخر وال کلاک کی سوئیاں دیکھ کر مجھے اس تلخ حقیقت کو تسلیم کرنا پڑا کہ اسلام آباد کے اس بنگلے میں روشنیوں رنگوں اور شوخ قہقہوں کے درمیان تاجور کی رسم حنا ادا ہو چکی ہے۔

مجھ سے رہا نہیں گیا۔ رات بارہ بجے کے قریب میں نے پھر فردوس کو فون کیا۔ وہ ابھی ابھی فنکشن سے فارغ ہو کر اپنے سرونٹ روم میں پہنچی تھی۔ انوری بھی اس کے ساتھ سوتی تھی لیکن آج وہ نہیں تھی۔ میں نے بدلی ہوئی (وقاص والی) آواز میں اس سے کہا۔ ''ہاں بن گئی تیری تاجور بی بی ...... شہزادی؟''

''ہاں۔'' وہ دبی آواز میں لحاف کے اندر منہ گھسا کر بول رہی تھی۔

''کیسی لگ رہی تھی؟''

''بالکل چن کا ٹوٹا۔ پر وقاص بھائی! اب تم اس کا خیال دل سے نکال دو۔ سچی کہتی ہوں کبھی کبھی مجھے تم پر ترس آتا ہے۔''

''جس کو ترس آنا چاہیے، اس کو نہیں آیا تو تمہارے ترس کا کیا فائدہ؟'' میں نے ڈرائیور وقاص کا لہجہ برقرار رکھا۔ پھر ذرا توقف سے پوچھا۔ ''سب کچھ خیر خیریت سے ہو گیا؟''

''ہاں ...... ہو گیا۔'' وہ ذرا اٹک کر بولی۔

مجھے ذرا شک ہوا۔ میں نے کچھ کریدا تو وہ بولی۔ ''بڑی کمزور ہو گئی ہیں تاجور بی بی۔ منہ اتنا سوہنا دیا ہے اللہ نے پر اس پر جیسے ہلدی کا رنگ پھرا ہوا تھا۔ ہال کمرے کی طرف آتے ہوئے چکر آ گیا تھا، تھوڑی دیر کے لیے بے ہوش سی ہو گئی تھیں لیکن پھر اللہ سوہنے نے کرم کیا۔''

مجھے وہ سین یاد آ گیا جب میں چند روز پہلے تاجور کو اسی بنگلے سے نکال کر لایا تھا۔ وہ تب بھی کچھ دیر کے لیے بے ہوش ہو گئی تھی۔ شاید یہ برداشت کی انتہا تھی۔ وہ نازک جان لڑکی حالات کے ساتھ ہی نہیں ...... اپنے احساسات کے ساتھ اور اپنے ساتھ بھی ایک جنگ لڑ رہی تھی۔

''اب کیسی ہے وہ؟'' میں نے پوچھا۔

''ایک بڑی وزیر جو لیڈی ڈاکٹر بھی ہے، اس نے بی بی کو دیکھا تھا۔ دوا وغیرہ دے دی ہے اب وہ ٹھیک ہیں۔ مجھے لگتا ہے، سو رہی ہیں۔''

بیک گراؤنڈ میں پولیس گاڑیوں کے مدھم سائرن بھی گاہے بگاہے سنائی دینے لگتے تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اس دفعہ مہندی کی اس رسم پر غیر معمولی حفاظتی انتظام کیے گئے تھے۔ (یہ بات عین ممکن تھی کہ چالاک ہوشیار دارابیوں نے ڈائنامائٹ والے دھماکوں اور تاجور کے گھر سے اوجھل ہونے میں کوئی ناتا ڈھونڈ لیا ہو اور ابھی صرف مصلحت کے تحت چپ ہوں)

''نکاح کل کتنے بجے ہونا ہے؟'' میں نے فردوس سے دریافت کیا۔

''ٹھیک ویلے کا تو پتا نہیں پر یہی کوئی رات نو دس بجے کا وقت ہوگا۔''

شاید میں کچھ اور بھی پوچھتا لیکن اسی دوران میں مجھے اندازہ ہوا کہ قریبی کمرے میں سجاول کسی سے مصروف گفتگو ہے۔ میں نے فردوس سے بات ختم کر کے فون جیب میں ڈالا اور اس کمرے کی طرف گیا جہاں سجاول ٹھہرا ہوا تھا۔ اب رات کا قریباً ایک بجنے والا تھا اور سجاول کی سرگوشی نما آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ کسی سے فون پر بات کر رہا تھا۔ میں نے دروازے سے کان لگایا۔ مدھم آواز مجھ تک پہنچنے لگی۔ سجاول پُرتپش لہجے میں کسی سے مخاطب تھا۔ ''باقی باتیں چھوڑو نادرے! کتنی دیر میں پہنچ جاؤ گے شکر پڑیاں تک؟''

جواب میں کچھ کہا گیا، جس کے ردِعمل کے طور پر سجاول نے ایک گندی گالی بکی اور پھنکارا۔ ''اپنی ماں کی گودی میں وڑ کر نہ بیٹھ ابھی نکل...... ابھی اسی وقت۔ اگر تُو اپنے بندوں کے ساتھ ایک گھنٹے میں شکر پڑیاں نہ ہوا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔''

دوسری طرف سے کوئی بات پوچھی گئی جس کے جواب میں سجاول اپنی بھاری بھرکم آواز میں بولا۔ ''باقر چھوٹا بھی بس پہنچنے والا ہوگا آدھے گھنٹے میں۔ کالی ٹویوٹا گڈی ہے ان کی، ہری نمبر پلیٹ والی۔''

میرے کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی۔ میں اس باقر کو بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ یہ سجاول کے خطرناک ترین بندوں میں سے ایک تھا اور جہاں اس کا نام آتا تھا، مطلب یہی ہوتا تھا کہ کوئی خاص کارروائی ہونے والی ہے۔ میرے دل نے گواہی دی کہ سجاول کی یہ خفیہ سرگرمی صرف اور صرف میرے حوالے سے ہے۔ اس نے کل کہا تھا کہ وہ ان دارابیوں کو اتنی آسانی سے میری محبت پر ڈاکا مارنے نہیں دے گا۔

میرے سینے میں ابال سا آیا اور میں کمرے کے دروازے کو دھکیلتا ہوا اندر چلا گیا۔

سجاول نے ذرا چونک کر میری طرف دیکھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں غیر معمولی طور پر سرخ تھیں۔ پورے کمرے میں الکحل کی بو پھیلی ہوئی تھی۔

''کیا بات ہے؟'' اس نے فون کے ''ماؤتھ ایریا'' پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''تم بتاؤ کیا بات ہے۔ یہ کس کام کی تیاری ہو رہی ہے؟''

''کسی کام کی تیاری نہیں ہو رہی۔'' وہ پھنکارا۔ ''تم جاؤ اپنے کمرے میں اور رضائی لے کر لیٹو۔''

''نہیں سجاول، میں نے پہلے بھی تم سے کہا تھا۔ میں یہ سب نہیں چاہتا۔ اگر میں یہ چاہتا...... تو تمہیں پتا ہے، میں اپنے طور پر بھی اس خطرے میں چھلانگ لگا سکتا تھا۔ میری بات کا برا نہ ماننا سجاول! مجھے تاجور کے سلسلے میں تمہاری کسی طرح کی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔''

''بکواس بند کرو۔ جاؤ اپنے کمرے میں۔ میں ان حرام زادوں کو اس طرح تم سے جیتنے نہیں دوں گا، جاؤ یہاں سے۔''

میں نے جھپٹ کر سیل فون اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور بند کر دیا۔ ''سجاول! یہ جو کچھ بھی ہے، اسے یہیں روک دو۔''

وہ چنگھاڑا۔ ''تم مجھے حکم دینے والے کون ہوتے ہو، میں اپنی مرضی کا آپ مالک ہوں، تم جاؤ اپنے کمرے میں ورنہ مجھ سے سن لو گے کچھ۔''

سجاول کی گرج برس سن کر پہلوان حشمت بھی گھبرایا ہوا سا وہاں آ گیا تھا۔ میں نے کہا۔ ''سجاول! میں پھر اپنے کمرے میں نہیں جاؤں گا۔ اس گھر سے ہی چلا جاؤں گا اور یہ قسم کھا کر جاؤں گا کہ تم کبھی میری شکل نہیں دیکھو گے۔ یہ دوستی آج اسی جگہ اسی گھر میں دفن ہو جائے گی اور اس کے علاوہ بھی جو کچھ ہو گا اس کے ذمے دار تم ہو گے۔''

میرے لہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ اس نے سجاول جیسے کرخت شخص کو بھی چونکا دیا۔ وہ ذرا سا ڈھیلا پڑتا دکھائی دیا۔

میرے سینے میں واقعی گاڑھا سیاہ دھواں بھرا ہوا تھا۔ سجاول کے جذبات اپنی جگہ لیکن وہ میرے دکھ سے بالکل میل نہیں کھاتے تھے۔ میں نے یہ لڑائی اس طرح جیتنا ہوتی تو کب کا جیت چکا ہوتا۔ اس طرح کی جیت میرے لیے ہار سے بھی بدتر تھی۔

سجاول چند سیکنڈ تک جلتی سرخ آنکھوں سے میری جانب دیکھتا رہا۔ اس کے گلے کی رگیں پھولی ہوئی تھیں اور آہنی چہرہ تمتما رہا تھا۔ آخر اس نے سیل فون میرے ہاتھ سے واپس

لیا۔ اسے دیوار پر پٹخ کر ریزہ ریزہ کیا اور ”جاؤ جہنم میں“ کہتا ہوا تند بگولے کی طرح باہر نکل گیا۔

پہلوان حشمت بھی اپنی جگہ جامد کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر کچھ اندازہ نہیں ہوا کہ سجاول کا یوں چلے جانا اسے اچھا لگا ہے یا نہیں۔

اگلا سارا دن ایک قیامت کا سا دورانیہ تھا۔ آس مر کر بھی نہیں مر رہی تھی۔ امید کی ایک پتلی سی ڈور اب بھی بندھی ہوئی تھی۔ پہلوان حشمت نے پھر اصرار کیا تھا کہ وہ لاہور میں مولانا حبیب اللہ کو تاجور کے حوالے سے اطلاع دیتا ہے لیکن میں نے اسے سختی سے منع کر دیا تھا اور کہا کہ ہمارے اطلاع دینے سے کچھ نہیں ہوگا۔ وہ بے خبر نہیں ہیں۔ اس کے باوجود مجھے شک تھا کہ پہلوان حشمت نے مولانا تک اتنی اطلاع تو پہنچا ہی دی ہوگی کہ آج تاجور کا نکاح ہے۔ سجاول رات کو ہی یہاں سے واپس روانہ ہو گیا تھا۔ یقیناً لالہ موسیٰ ہی گیا تھا۔

○.....❖.....○

شام تک کا وقت جیسے سولی پر ہی کٹا تھا۔ وہ عام شاموں جیسی ہی ایک خنک شام تھی لیکن میرے لیے عام نہیں تھی۔ سچ کہتے ہیں کہ ہر فرد کے لیے ہر وقت اور ہر منظر اپنے لیے ایک علیحدہ معنی رکھتا ہے۔ چاندنی رات کتنی بھی سہانی، دلکش اور خوشبودار ہو مگر جس شخص نے صبح چار پانچ بجے پھانسی پانا ہوتی ہے اس کے لیے وہ رات کسی اور ڈھنگ سے آتی ہے۔ آخر دس بجے کے لگ بھگ مجھ تک یہ خبر پہنچ گئی کہ وہاں اسلام آباد کے اس نیم سرکاری بنگلے میں سب کچھ بخیر و خوبی انجام پا گیا ہے۔

پہلوان حشمت نے ساتھ والے کمرے میں ٹی وی کی کاٹی ہوئی کیبل کو دوبارہ جوڑ لیا تھا اور ٹی وی آن کر رکھا تھا۔ ٹی وی کی ایک چھوٹی سی خبر میں یہ بتایا گیا بلکہ اپنے ناظرین پر انکشاف کیا گیا کہ معروف سیاسی خاندان کے چشم و چراغ اور شکیل داراب کے کزن دارج داراب آج شام رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے ہیں ان کی شادی نہایت سادگی سے ابھی کچھ دیر پہلے اسلام آباد کے سیکٹر نمبر چار کے بنگلے میں انجام پائی ہے۔ خاندانی ذرائع کے مطابق کچھ دن بعد شاندار طریقے سے ولیمے کی تقریب کا انعقاد کیا جائے گا۔“

خبر پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ پہلوان حشمت نے کھٹاک سے ٹی وی آف کر دیا۔

میں نے ایک طویل اور سلگتی ہوئی سانس لی۔ سیل فون سامنے ہی میز پر حسرت کی تصویر بنا پڑا تھا۔ میں نے اسے اٹھایا اور سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر آ گیا۔ مارگلہ کی پہاڑیوں کی طرف سے آنے والی ٹھنڈی ہوا نے میرا استقبال کیا۔ دور کچھ فاصلے پر اسلام آباد کی ہزاروں

روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ ان ہی روشنیوں میں سے کچھ بے رحم روشنیاں یقیناً اس عمارت کی بھی تھیں جہاں آج رات تاجور دلہن بنی تھی اور اس نے سرخ جوڑا پہنا تھا۔

میں نے اپنے سیل فون سے اپنے دوست فخر زمان کو کال کی۔ یہ طویل فاصلے کی کال لندن کے لیے تھی۔ تیسری چوتھی بیل پر فخر کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو۔''

میں خاموش رہا۔ اس نے دو تین بار ہیلو کہا پھر اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ ''آپ جناب کی تشریف میں کون سا کانٹا چبھ گیا ہے جو حضور والا نے اس وقت مجھے اپنا خاندانی ڈاکٹر جان کر میرے ''آرام'' کی جھیل میں ''خلل'' کا یہ پتھر مارا ہے؟'' وہ انگلش میں بولا تھا۔

میں نے گہری سانس لی اور ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔ ''ہیلو فخر! میرا خیال ہے تم میری آواز پہچان لو گے۔''

دوسری طرف چند لمحے گہرا سناٹا رہا پھر فخر کی ہیجانی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

''ہیلو......کون......ہیلو؟''

''میں شاہ زیب بول رہا ہوں فخر! اپنا جو شک تمہیں بہت پیارا تھا، وہ غلط نہیں تھا، میں ابھی زندہ ہوں......اسی دنیا میں سانس لے رہا ہوں۔''

فخر ایک نہایت مضبوط شخص کا نام تھا لیکن جو اطلاع اس کو مل رہی تھی، وہ اتنی تہلکہ خیز تھی کہ وہ اپنی بنیادوں تک ہل گیا۔ اس نے دو تین بار بوکھلائے ہوئے انداز میں ہیلو......ہیلو کہا پھر لرزاں آواز میں بولا۔ ''مجھے ابھی تک......یقین نہیں......آ رہا......کہیں میں جاگتی آنکھوں سے خواب تو نہیں دیکھ رہا......تت......تم شاہ زیب ہی ہو؟''

''ہاں یار، میں زندہ ہوں ابھی......لیکن جس طرح زندہ ہوں مزید زندہ رہنے کو کچھ زیادہ دل نہیں چاہتا۔ تمہارا میسج مجھے مل گیا تھا مگر اس وقت فوری جواب نہ دے سکا۔ جونہی اس قابل ہوا کہ تمہیں جواب دے سکوں، جواب دے رہا ہوں۔ بہت بڑی خبر دی ہے تم نے تھائی لینڈ والی۔ یقیناً ہم ٹیکساری گینگ کو تارے دکھا سکتے ہیں۔'' میرے لہجے میں اپنے آپ ہی ایک آگ سی بھڑکنے لگی تھی۔

فخر کا لہجہ بدستور ہیجانی تھا۔ وہ بولا۔ ''شاہ زیب! تم......شاید تصور بھی نہیں کر سکتے کہ میں اس وقت کیا محسوس کر رہا ہوں۔ اگر میں بتانا چاہوں تو میرے پاس وہ لفظ ہی نہیں ہیں کہ بتا سکوں۔ تم کہاں ہو یار، مجھے بتاؤ......میں ابھی......تمہارے پاس پہنچنا چاہتا ہوں۔ تمہیں اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں۔ تمہیں اپنے ہاتھوں سے چھونا چاہتا ہوں شاہی۔''

''میں اتنا پاس نہیں ہوں یار! لندن سے راولپنڈی کا فاصلہ کافی زیادہ ہے۔''

''راولپنڈی......یعنی پاکستان......لیکن کوئی فاصلہ نہیں...... بالکل بھی نہیں۔ میں ابھی پندرہ منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔ میرا مطلب ہے پندرہ منٹ میں تیار ہو رہا ہوں اور کوئی فلائٹ پکڑنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مجھے کون ساویزا لگوانا ہے۔آئی ایم ریڈی۔''

''اتنی جلدی کی ضرورت نہیں ہے فخر، حوصلے سے آؤ......اور اگر نہ بھی آؤ تو ہم فون پر تو رابطے میں ہی ہیں۔تم دو تین دن میں لندن سے ہی تھائی لینڈ پہنچ جاؤ، میں بھی پہنچ جاتا ہوں۔''

''نہیں شاہ زیب، اب تمہارے اس خاکسار سے صبر نہیں ہوگا۔ میں یہاں سے نکل رہا ہوں۔تم ابھی مجھے اپنا مکمل ایڈریس Send کرواور اگر......''

''دیکھو فخر، تم ہمیشہ کے جلد باز ہو، بہر حال سب سے پہلی بات تو میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں بہت سے لوگوں کے لیے ''مر'' چکا ہوں۔ لہٰذا میرے حیات ہونے کی خبر صرف اور صرف تم تک رہنی چاہیے۔''

''بے فکر رہو میرے جگر! میں جلد باز تو ہوں لیکن تم یہ بھی جانتے ہو کہ یہ سینہ ایک صندوق ہے۔اس میں جو بند ہو گیا سو ہو گیا۔''

میرے اور فخر کے درمیان دو چار منٹ مزید گفتگو ہوئی۔ میں اس سے تھائی لینڈ کے حوالے سے کچھ جاننا چاہتا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ واٹس وائے جیسے شخص کا مل جانا ہماری بہت بڑی خوش قسمتی اور خطرناک ٹیکساری گینگ کی بہت بڑی بد بختی تھی۔ اگر اس موقع کو اچھی طرح استعمال کیا جا سکتا تو ٹیکساری کی اور اس کے ڈیتھ اسکواڈ کی اینٹ سے اینٹ بج سکتی تھی۔ بہر حال فوری طور پر تو فخر سے اس بارے میں زیادہ بات نہیں ہو سکی۔ میرے حیات ہونے کی خبر نے اسے اتنا جذباتی کیا تھا کہ وہ ڈھنگ سے کوئی دوسری بات کر ہی نہیں پا رہا تھا۔

فون کرنے کے بعد میں چھت سے نیچے آ گیا۔ دل و دماغ میں کھلبلی سی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ کوئی گہرا تاریک گوشہ ہو جس میں منہ دے کر آنکھیں بند کر لوں اور بیس تیس گھنٹوں کے لیے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاؤں۔ اسی دوران میں لالہ موسیٰ سے کال آ گئی۔ یہ خورسنہ کی کال تھی۔ یقیناً اسے بھی سجاول کی زبانی سب کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ اس کی آواز دکھ کی شدت سے جیسے ٹوٹ رہی تھی۔ اس نے بھی ابھی تھوڑی دیر پہلے ٹی وی پر وہ مختصر خبر سنی تھی جس میں شکیل داراب کے کزن دارج داراب کی شادی انجام پانے کا تذکرہ تھا۔

خورسنہ نے کہا۔ ''کیا تاجور کی طبیعت خراب ہے شاہ زیب صاحب؟''

''کیا مطلب؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''اگر تاجور کی رخصتی ملتوی ہوئی ہے تو پھر طبیعت زیادہ خراب ہی ہوگی ناں۔''
''رخصتی......؟ کیا مطلب......رخصتی نہیں ہوئی؟''
''شاید آپ نے ٹی وی والی خبر نہیں سنی۔ اس خبر میں تو یہی بتایا گیا تھا۔''
خورسنہ کی اطلاع نے کچھ ٹھٹکا دیا۔ مجھے یاد آیا کہ جب ٹی وی پر خبر چل رہی تھی تو پہلوان نے پوری خبر سنے بغیر ہی ٹی وی بند کر دیا تھا۔
میں نے خورسنہ کو بتایا کہ مجھے اس بارے میں معلوم نہیں۔
وہ بولی۔ ''ٹی وی والی خبر میں، میں نے بس اتنا جملہ سنا تھا کہ رخصتی بعد میں ہوگی...... پھر مجھے یاد آیا کہ تاجور کی طبیعت بھی تو کچھ خراب تھی۔ میں نے اس کی رخصتی نہ ہونے کو اس کی طبیعت کی خرابی سے جوڑ دیا......''
خورسنہ سے بات جلدی ختم کر کے میں نے فردوس سے رابطے کی کوشش کی۔ اب آدھی رات گزر چکی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق فردوس اس وقت اسلام آباد والے بنگلے میں اپنے بالائی منزل والے سرونٹ روم میں سو رہی تھی۔ میں نے تین چار بار کال کی۔ آخر اس کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''کون؟''
''وقاص بول رہا ہوں۔'' میں نے بدلی ہوئی آواز میں ذرا ڈانٹ کر کہا۔
دوسری طرف خاموشی رہی۔ یوں لگا کہ وہ شاید جھلاہٹ سے فون بند کر دے گی مگر پھر وہ مری مری آواز میں بولی۔ ''ہاں کیا بات ہے؟''
''ہو گیا نکاح شکاح؟''
''ہاں ہو گیا ہے۔''
''رخصتی کب ہوگی؟'' میں نے پوچھا۔
''ٹھیک سے تو پتا نہیں، پر ہفتے کے دن ولیمے کا کہہ رہے ہیں، اس کا مطلب ہے کہ رخصتی تو پہلے ہی ہوگی ناں۔'' اس نے جماہی لے کر بیزاری سے کہا۔
''تاجور کی طبیعت اب کیسی ہے؟'' میں نے اندھیرے میں تیر چلایا۔
''دوپہر کے بعد سے تو ہوش میں ہے۔ ایک بڑی سیانی ڈاکٹر اس کو دیکھ رہی ہے۔ ابھی دو تین گھنٹے پہلے تک وہ بھی یہیں پر تھی۔''
میں نے فردوس کو ذرا کریدا تو خورسنہ والی بات بالکل درست ثابت ہو گئی۔ کل دوپہر تاجور کو پھر چکر آیا تھا اور وہ تھوڑی دیر کے لیے بے ہوش ہو گئی تھی۔ اس وقت ساتھ والے کمرے میں ڈھولک بجائی جا رہی تھی۔ تاجور کے گرنے کی آواز نے انوری کو چونکایا۔ اس نے

دیکھا تو تاجور پہلو کے بل صوفے پر پڑی تھی۔ اس کے گرنے سے کارنس پر رکھے ہوئے کچھ ڈیکوریشن پیس بھی ٹوٹ گئے تھے۔ بعدازاں وہ ہوش میں تو آ گئی مگر رنگ ہلدی کی طرح زرد رہا۔ فوری طور پر دو ڈاکٹرز کو بنگلے پر ہی بلایا گیا اور انہوں نے تاجور کو ٹریٹ منٹ دی۔ تب ہی یہ فیصلہ بھی ہوا کہ چونکہ نکاح کی تیاری مکمل ہے۔ اس لیے نکاح تو شام کے بعد ہو جائے گا مگر رخصتی دو چار روز ٹھہر کر ہو گی۔

فردوس سے بات کرنے کے بعد میں بستر پر نیم دراز ہو گیا۔ تاجور کی خرابی صحت نے فکر مند کیا تھا مگر اس کی رخصتی کا نہ ہونا مجھے ایک مثبت خبر کی طرح لگ رہا تھا۔ حالانکہ یہ بھی مثبت خبر کہاں تھی، وہ شادی شدہ تو ہو ہی چکی تھی۔ یہاں میں اپنے دل و دماغ کی کیفیت کو خود بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ دل دیوانے والی بات مجھ پر صادق آ رہی تھی۔ سچ بیان کروں تو وہ یہی ہے کہ اس وقت دل و دماغ میں لاشعوری طور پر یہ خواہش جاگ رہی تھی کہ تاجور فوراً صحت یاب نہ ہو، وہ جتنی دیر تک اس شکاری جانور کے جبڑوں کی زد سے بچ سکتی ہے، بچی رہے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت شاید پہلوان کی بھی تھی۔ اس کو بھی پتا چل گیا کہ تاجور کی رخصتی ابھی نہیں ہوئی ہے۔ میں نے اس کے زرد چہرے پر ہلکی سی سرخی دیکھی۔ کچھ دیر گم صم رہنے کے بعد بولا۔ ''کبھی جوانی کے دنوں میں دو شعر کہے تھے، آج وہ ایک دم یاد آئے ہیں۔

وہ مہماں ہیں ہمارے اور بیمار بھی ہیں کچھ روز سے
سو ہم یہ تمنا کرتے ہیں یارو، پورے زور سے
کتنا اچھا ہو کہ ہم کچھ دن ان کے ناز اٹھائیں
کتنا چنگا ہو کہ وہ ابھی چنگے نہ ہو پائیں

شاید اسی لیے کہتے ہیں کہ ڈوبتے کی آنکھ میں تنکے کا سہارا ہووت ہے۔ حالانکہ یہ سہارا غلط ہووت ہے...... بلکہ...... شاید یہ محاورہ بھی غلط ہو گیا ہے۔ ڈوبتے کی آنکھ میں تنکے کا......''
پہلوان حشمت گڑبڑا سا گیا اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا......

○......❖......○

اگلے روز رات چار بجے کے لگ بھگ فخر کسی طوفان کی طرح راولپنڈی کے اس گھر میں آ دھمکا جہاں میں ٹھہرا ہوا تھا۔ یہ ویک اینڈ تھا۔ شرافت اپنی بیوی سے ملنے گیا ہوا تھا۔ اسے کل شام کو آنا تھا۔ میں اور پہلوان گھر میں اکیلے تھے۔ فخر روشن چہرے والا ایک ہنس مکھ اور مضبوط نوجوان تھا۔ قد چھ فٹ سے بھی ایک آدھ انچ اوپر ہی ہو گا۔ چوڑی چھاتی، فولادی بازو، کبھی کبھی طنزیہ انداز میں بھی بات کرتا تھا۔ فخر کے سینے میں شیر کا دل تھا۔

اس کے آنے سے پہلے ہی میں نے اسے بتا دیا تھا کہ میں نے کچھ مجبوریوں کی وجہ سے کاسمیٹک سرجری کرائی ہے۔اس اطلاع کے باوجود وہ مجھے دیکھ کر دنگ رہ گیا اور مجھے پوری طرح پہچاننے میں اسے چند سیکنڈ لگے۔اس کے بعد وہ مجھ سے لپٹ گیا اور چٹاچٹ میرے رخساروں اور ماتھے کے کئی بوسے لیے۔اس کی سیاہ آنکھوں میں، میں نے شاید ہی کبھی نمی دیکھی ہو، لیکن آج میں دیکھ رہا تھا۔ پہلوان حشمت سے فخر کا غائبانہ تعارف موجود تھا۔وہ اس سے بھی بغلگیر ہوا اور حال احوال دریافت کیا۔

اب صبح ہونے والی تھی۔ پہلوان نے فخر کے آنے سے پہلے ہی ایک ہیوی قسم کا دیسی ناشتہ تیار کر لیا تھا۔فخر تھکا ہوا تھا۔ناشتے کے بعد اسے سو جانا چاہیے تھا مگر اس کے اندر تو جیسے ابال سے اٹھ رہے تھے۔ ہم نے بند کمرے کے اندر گفتگو شروع کی اور پھر یہ گفتگو طویل تر ہوتی چلی گئی۔ کہتے ہیں کہ تاش کے کھلاڑیوں کو وقت گزرنے کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ کچھ ایسا ہی ہمارے ساتھ ہوا۔تب ہوش آیا جب پہلوان نے مسمسی صورت بنا کر کمرے میں جھانکا اور بولا۔''اب تو شام کی چائے کا وقت بھی گزرتا جاوے ہے کچھ کھانا بھی ہے یا ناہیں؟''

فخر افسردہ لہجے میں بولا۔''یہاں کے حالات جان کر بھوک ہی مرگئی ہے پہلوان جی۔''

پہلوان نے اپنی طرف سے ماحول کو کچھ خوشگوار بنانے کی کوشش کی اور بولا۔''پیٹ کی مشین تو چلتی ہی رہوت ہے۔ کہتے ہیں کہ بھوک مر جاوے تو پھر بندہ بھی زندہ ناہیں رہتا۔ میرا خیال ہے کہ اب ٹائم زیادہ ہو گیا ہے۔ہم کو ''لنچائی'' کر لینی چاہیے۔''

''لنچائی؟ یہ کیا ہے؟''

''یہ ہم نے ایک لفظ بنایا ہوا ہے، جیسے برنچ ہوتا ہے۔اس طرح لنچ اور ٹی کو ملا کر لنچائی بھی تو ہو سکتا ہے۔'' پہلوان نے مسکرانے کی کوشش کی اور پھر زخمی جبڑے کی وجہ سے اس کوشش کو ادھورا چھوڑ دیا۔

فخر نے کہا۔''کیوں نا کہیں باہر چل کر کھالیں۔''

''ناہیں ناہیں۔کھانوں میں جس طرح کے تیل استعمال ہوتے ہیں۔'' پہلوان نے جھرجھری سی لی اور پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔''سب کچھ تیار ہے۔بس تم لوگوں کے فارغ ہونے کا انتظار کر رہا تھا میں۔''

''لیکن آپ نے خود تو کھا لینا تھا۔'' میں نے کہا۔

''بس مجھے اچھا ناہیں لگا۔''

''ٹھیک ہے پھر لے آئیں، میں بھی آپ کی مدد کرتا ہوں سرو کرنے میں۔''

''ناہیں ناہیں، تم لوگ بیٹھو۔ اتنے عرصے بعد ملے ہو۔'' پہلوان اپنے بھاری جسم کو جھلاتا ہوا کچن کی طرف چلا گیا۔ مجھے یقین تھا کہ اس نے بھی کھایا نہیں ہوگا لیکن چکھنے چکھنے میں ایک تہائی کھانا تو صاف کر ہی گیا ہوگا۔ دکھ میں اسے زیادہ بھوک لگتی تھی۔

فخر کا ہر دم شوخ نظر آنے والا چہرہ کچھ بجھا بجھا تھا۔ وہ میرے ان غیر ملکی دوستوں میں سے تھا جن سے میں وقتاً فوقتاً اپنے حالات شیئر کرتا رہتا تھا۔ فخر کو بھی جاماجی اور چاند گڑھی کے بہت سے حالات کا پتا تھا مگر پھر لاہور والے دھماکے کے بعد اس کے لیے بالکل بلیک آؤٹ ہوگیا تھا۔ فخر بھی مجھے ستر اسی فیصد تو ''مردہ'' سمجھ ہی چکا تھا۔ اسے اب یہاں آکر معلوم ہوا تھا کہ تاجور میرے بہت قریب آنے کے بعد ایک بار پھر دور چلی گئی ہے۔

اب بھی اس کے چہرے پر ایک دکھ آمیز سوچ تھی، بولا۔ ''یقین نہیں آرہا کہ انیق جیسا تمہارا قریبی دوست یہ کچھ کرسکتا ہے۔ تمہاری باتیں سن کر صاف پتا چلتا ہے کہ تاجور کے یہاں سے جانے کی بڑی وجہ یہی ہے کہ انیق نے اس کے کانوں میں سیف والی بات ڈالی ہے اور ایسے موقع پر ڈالی ہے جب سیف کی والدہ کے بعد اس کے والد بھی چل بسے تھے۔ یقیناً اس کا بہت زیادہ...... بہت زیادہ امپیکٹ ہوا ہے اس پر۔ اور شاید رہی سہی کسر اس دوسرے واقعے سے پوری ہوگئی۔''

دوسرے واقعے سے فخر کی مراد وہی گوجرانوالہ کے تصادم کا انکشاف تھا۔ اس تصادم کا انکشاف تاجور پر چند روز بعد ہوا تھا اور اسے پتا چلا تھا کہ میرے رات کو غائب رہنے کی وجہ یہ تھی کہ میں نے سجاول کے ساتھ مل کر ٹیکساری گینگ سے دو دو ہاتھ کرنے کی کوشش کی تھی اور اس سلسلے میں اپنے وعدے سے انحراف کیا تھا۔

''اب کیا ہوگا شاہ زیب؟'' فخر نے آزردہ لہجے میں پوچھا۔

''جو ہونا تھا، وہ تو ہو چکا۔''

''لیکن رخصتی تو اب بھی باقی ہے۔''

''مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا فخر۔ جب اس نے ''قبول ہے'' کہہ دیا تو پھر سب کچھ ختم ہوگیا۔ اسی وقت حالات جیت گئے اور ہماری محبت ہار گئی۔ ابھی جسمانی طور پر نہ سہی لیکن وہ دارج کی بیوی اور داراب خاندان کی بہو بن چکی ہے اور مکمل بیوی بننے میں بھی اب کون سی دیر ہے۔ شاید کل یا پھر پرسوں وہ رخصت بھی ہوجائے گی۔''

''اور تم اسی طرح منہ دیکھتے رہو گے؟''

''میں نے کہا ہے ناں فخر۔ اِٹ اِز آل اوور ناؤ۔ میرے لیے اب یہ سب کچھ بے معنی

ہے۔"

O......❖......O

اسی دوران میں میرے سیل فون پر کال کے سگنل آئے۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ ریسیو نہ کروں لیکن پھر ANSWER کا بٹن دبا دیا۔ دوسری طرف سے سب سے پہلے، خورسنہ ہی کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو شاہ زیب صاحب...... ہیلو۔" اس نے ہیجانی انداز میں کہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ بری طرح کھانسی۔

ابھی میں کچھ سمجھ بھی نہیں پایا تھا کہ اندھا دھند فائرنگ کی آوازیں آئیں یہ آٹو میٹک اور سیمی آٹو میٹک ہتھیاروں کی فائرنگ تھی۔

"خورسنہ، یہ کیا ہو رہا ہے، کہاں ہو تم؟"

"بچاؤ...... خدا کے لیے بچاؤ۔" خورسنہ کی چلاتی ہوئی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی اور میں سر تا پا لرز گیا۔

"کیا ہوا خورسنہ...... سجاول کہاں ہے، خورسنہ؟" میں پھر پکارا۔

میرے کانوں میں نوعمر ذیشان کے پکارنے اور چلانے کی آواز پڑی۔ پھر ایک برسٹ چلا۔ مجھے فون پر خورسنہ کی درد بھری کراہ صاف سنائی دی۔ پھر وہ شاید گر گئی تھی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ جہاں وہ گری ہے وہاں شعلے پھنکار رہے ہیں۔

یہ کیا ہو رہا تھا؟ اس ہنستے بستے گھر پر کیا قیامت ٹوٹی تھی۔ سجاول کہاں تھا؟ سجاول نے تو سب سے الگ تھلگ لالہ موسیٰ کی ایک گمنام نواحی آبادی میں ایک چھوٹی سی دنیا بسائی تھی۔ اسی کے گروہ کے اپنے ساتھیوں میں سے بھی کسی کو اس کے اس ٹھکانے کا کچھ پتا نہیں تھا۔ فقط ایک یونس پمپ والا تھا جو جانتا تھا کہ سجاول سیالکوٹی کہاں رہتا ہے۔

فائرنگ کی آوازیں اب رک گئی تھیں۔ بس وقفے وقفے سے کسی فائر کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ پھر ایک دم سیل فون خاموش ہو گیا۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ خورسنہ نے اپنے فون سے کال کی تھی۔ میں نے فوراً سجاول کا نمبر پریس کیا۔ فخر اور پہلوان ہکا بکا میرا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ فائرنگ اور خورسنہ کی دردناک آوازیں انہوں نے بھی سن لی تھیں، سجاول کا نمبر بند جا رہا تھا۔ میں نے جھلا کر دوسری اور پھر تیسری بار کال کی، نتیجہ صفر نکلا۔ میرا دل بے پناہ شدت سے دھڑک رہا تھا۔ جیسے پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ اچانک مجھے یونس پمپ والا کا خیال آیا۔ میں نے اس کا نمبر ملایا۔ وہ شاید کار میں سفر کر رہا تھا۔ ہلکا میوزک سنائی دے رہا تھا۔ کوئی پنجابی فلمی نغمہ تھا۔

''یونس! کہاں ہوتم؟'' میں نے تقریباً دہاڑ کر پوچھا۔ میں نے آواز بدل لی تھی۔

''کک کیا ہوا وقاص صاحب؟''

''مجھے بتاؤ کہاں ہوتم؟'' میں پھر گرجا۔

''میں لاہور پہنچا ہوں، ابھی ابھی راوی کا پل پار کیا ہے۔''

''سجاول کا کچھ پتا ہے، کہاں ہے وہ؟''

''انہوں نے ایک یا دو دن کے لیے کوٹلی جانا تھا۔ اپنی والدہ اور گھر والوں سے ملنے کے لیے۔ لیکن خیریت تو ہے، آپ کی آواز......''

''خیریت نہیں ہے۔ کوئی بہت بڑی گڑبڑ ہوگئی ہے سجاول کے گھر...... تم فوراً گاڑی موڑو واپس لالہ موسیٰ...... میں بھی آرہا ہوں۔ اگر لالہ موسیٰ میں یا اس آبادی میں کوئی باخبر بندہ ہے تو اس سے پوچھو کہ وہاں کن لوگوں نے فائرنگ کی ہے، کیا ہوا ہے وہاں۔ میرا فون آن ہے رابطے میں رہو۔'' اس کے ساتھ ہی میں نے فون بند کر دیا۔

صرف دس منٹ بعد ہم شرافت کی سوزوکی ہائی روف پر آندھی کی رفتار سے لالہ موسیٰ کی جانب رواں تھے۔ راولپنڈی سے لالہ موسیٰ کا فاصلہ 145 کلومیٹر کے لگ بھگ ہے۔ جی ٹی روڈ پر اچھی رفتار سے یہ سفر قریباً 2 گھنٹے میں طے کیا جا سکتا ہے۔ ڈرائیونگ فخر نے سنبھال لی تھی۔ پہلوان پچھلی نشست پر بیٹھا تھا۔ میں بار بار سجاول کے نمبر پر رابطہ کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اس کا نمبر مسلسل بند تھا۔ یونس پمپ والا سے گاہے بگاہے رابطہ ہو رہا تھا، وہ بھی تیزی سے لالہ موسیٰ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس سے صرف اتنی سن گن ملی کہ شاید خورسنہ اور سجاول میں کوئی معمولی نوعیت کا گھریلو جھگڑا ہوا تھا۔ عین ممکن تھا کہ سجاول کا فون بند ہونے کی وجہ یہی ہو کہ وہ ناراض موڈ میں گھر سے نکلا تھا۔ شاید اس کو ابھی تک پتا نہیں تھا کہ اس کے پیچھے اس کی چاردیواری میں کیا قیامت گزر چکی ہے۔

سجاول کے بے شمار دشمن تھے لیکن اس کے موجودہ ٹھکانے کی بھنک کسی کو نہیں تھی۔

رات کے نو بج چکے تھے جب ہم لالہ موسیٰ کی حدود میں داخل ہوئے۔ تب تک سجاول سے رابطہ نہیں ہو سکا تھا۔ تاہم یونس پمپ والا کو کسی ذریعے سے اتنا پتا چلا تھا کہ جس محلے میں سجاول اور خورسنہ کی رہائش تھی، وہاں ایک سنگین واقعہ ہوا ہے، کچھ لوگوں نے ایک گھر میں داخل ہو کر اندھا دھند فائرنگ کی ہے۔ ایک عورت کو گولیاں ماردی ہیں اور ایک بچے کو اغوا کر لیا ہے۔

جس عورت کا ذکر تھا، وہ یقیناً خورسنہ ہی ہو سکتی تھی۔ ہاں یہ واضح نہیں ہوا تھا کہ وہ زخمی

ہے یا مر گئی ہے۔ بچے کے ذکر پر دھیان صرف نوعمر خوبرو ذیشان کی طرف ہی جاتا تھا۔ میرا سینہ جیسے غم سے پھٹنے لگا۔

اچانک پہلوان حشمت کی دہاڑ نے ہمیں اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ وہ ایک دم پکارا تھا۔ ''وہ دیکھو......وہ دیکھو۔'' اس نے سامنے سے آنے والی ایک گاڑی کی طرف اشارہ کیا تھا۔

''کون تھا؟'' میں نے ہیجانی لہجے میں پوچھا۔

''انیق تھا، میں نے اچھی طرح دیکھا ہے......انیق ہی تھا۔ کالے شیشوں والی گاڑی تھی۔ بہت زیادہ اسپیڈ کے ساتھ گئی ہے وہ گاڑی......''

انیق کا نام سن کر میرے ذہن میں ایک دھماکا سا ہوا۔

○......❖......○

انیق کے حوالے سے میں مسلسل شک میں پڑتا جا رہا تھا۔ میری ''موت'' کے بعد وہ عجیب انداز سے سامنے آیا تھا۔ پہلوان حشمت چلتی گاڑی میں ابھی تک پیچھے مڑ مڑ کر دیکھ رہا تھا۔ اس نے جس گاڑی میں انیق کو دیکھا تھا، وہ سامنے سے آئی تھی اور فراٹے کے ساتھ گزر گئی تھی۔ پتا نہیں کہ اب تک وہ کتنی دور جا چکی ہوگی۔

میں نے پہلوان سے پوچھا۔ ''آپ کو یقین ہے کہ وہ انیق ہی تھا؟''

''ایک سو ایک فیصد۔ گاڑی وہی چلا رہا تھا۔ ساتھ میں بھی کوئی بیٹھا تھا۔ اس کی شکل میں نہیں دیکھ سکا ہوں۔ انیق بھی سیدھا سڑک کو دیکھ رہا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کی نظر ہم پر نہیں پڑ سکی۔''

ہم اس جگہ سے زیادہ دور نہیں تھے جہاں ڈھائی تین گھنٹے پہلے سجاول کے گھر پر بے رحمی سے فائرنگ کی گئی تھی، اور اب انیق بھی اردگرد موجود پایا گیا تھا۔ ذہن میں بے ساختہ یہ سوال ابھرتا تھا کہ وہ یہاں کیوں تھا؟

چند منٹ مزید گزرے اور پھر ہم اس متوسط درجے کی آبادی میں پہنچ گئے جہاں سجاول کی رہائش گاہ تھی۔ ہم نے دور ہی گاڑی کھڑی کر لی تھی۔ گلی میں اب بھی کچھ لوگ ٹولیوں کی شکل میں نظر آ رہے تھے۔ ایک پولیس موبائل بھی گھر کے عین سامنے موجود تھی۔ یونس پمپ والا ہم سے پہلے ہی موقع پر پہنچ چکا تھا۔ ہماری گاڑی کی جھلک دیکھ کر وہ ہمارے پاس آ گیا۔ میں نے گاڑی کی کھڑکی کا شیشہ کھولا اور اس سے پوچھا۔ ''کیا صورتِ حال ہے؟''

وہ بولا۔ ''شکر کا مقام ہے کہ بچہ اغوا ہونے سے بچ گیا ہے۔ وائرلیس پر فوراً پیغام چل گیا تھا۔ وہ لوگ جس گاڑی میں بچے کو لے کر جا رہے تھے، اسے پولیس ناکے پر روک لیا

گیا۔اغوا کار بچے کو گاڑی میں چھوڑ کر بھاگ گئے۔''

''اور سجاول کی بیوی؟'' میں نے پوچھا۔

''ان کی حالت خطرے میں ہے۔ پیٹ میں لگنے والی ایک گولی نے زیادہ نقصان کیا ہے۔ میں بھی اسپتال جارہا ہوں۔آپ کو آنا ہے تو میرے پیچھے پیچھے آجائیں۔''

''بچہ اب کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ پولیس کے پاس ہے۔ میں سجاول سے رابطے کی کوشش کررہا ہوں لیکن ان کا فون مسلسل بند جارہا ہے۔ سمجھ میں نہیں آرہا کہ ان سے کیسے رابطہ ہو۔''

یہ بات اچھی طرح میری سمجھ میں آرہی تھی کہ میرا یا میرے دوست فخر کا براہِ راست اس معاملے میں ''انوالو'' ہونا درست نہیں۔ میں نے یونس سے کہا کہ وہ اسپتال پہنچے اور سجاول کی زخمی بیوی کو طبی امداد کی فراہمی میں کسی طرح کی کوتاہی نہ ہونے دے۔ میں نے اسے بتایا کہ میں بھی یہاں لالہ موسیٰ میں ہوں اور اس کے ساتھ مسلسل رابطے میں رہوں گا۔

ہم موقع سے ہٹ کر لالہ موسیٰ میں پہنچ گئے اور ایک اچھے ہوٹل میں کمرا لے لیا۔ یونس وقتاً فوقتاً مجھے صورتِ حال سے آگاہ کررہا تھا۔گیارہ بجے کے قریب اس نے بتایا کہ سجاول کی بیگم خورسنہ آپریشن تھیٹر میں ہے اور اس کا آپریشن ہورہا ہے۔ یونس کے ساتھ جو لوگ یہاں پہنچے تھے، انہوں نے ہی خورسنہ کے لیے خون کا انتظام بھی کردیا تھا۔ایک گھنٹے بعد ہمیں یونس کی زبانی ہی پتا چلا کہ خورسنہ کا آپریشن ہوگیا ہے اور اس کی حالت اب بہتر ہے۔ جو دوسری اچھی خبر اس نے دی، وہ یہ تھی کہ سجاول سے بھی اس کا رابطہ ہوگیا ہے اور وہ اسپتال پہنچنے والے ہیں۔

میں نے یونس سے بات ختم کرنے کے بعد پھر سجاول سے رابطے کی کوشش کی۔ اس دفعہ رابطہ ہوگیا۔''ہیلو سجاول......ہیلو، کہاں پہنچے ہو تم؟''

''بس پہنچنے والا ہوں۔ یہ سب کیا ہوا ہے شاہی! کون ذمے دار ہے اس کا؟'' سجاول کی گمبھیر آواز میں شعلوں کی پھنکار تھی۔اس کا لہجہ دہلا دینے والا تھا۔

''ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا......ہیلو،......آواز آرہی ہے؟ ہیلو۔''

دوسری طرف سے سجاول نے کچھ کہا مگر آواز کٹ رہی تھی۔ وہ موٹروے پر تھا اور سگنل ٹھیک نہیں آرہے تھے۔ میں نے کال منقطع کرکے پھر رابطے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔

ہوٹل کے اس کمرے میں ٹی وی آن تھا۔مختلف نیوز چل رہی تھیں۔ نیوز چینلز کے پاس جب کوئی اہم خبر نہیں ہوتی تو پھر چھوٹی خبریں بھی نمایاں جگہ پاتی ہیں۔ یہاں لالہ موسیٰ کے

مضافات میں ہونے والی اندھا دھند فائرنگ کی خبر بھی نیوز بلیٹن میں موجود تھی۔ اس فائرنگ میں ایک راہ گیر جاں بحق بھی ہوا تھا۔ بچے ذیشان کے اغوا اور پھر اس کی بازیابی کو بھی خبر میں نمایاں جگہ دی گئی تھی۔ اس خبر کا اہم ترین جزو ایک سی سی ٹی وی فوٹیج تھی۔ یہ اس جگہ کی فوٹیج تھی جہاں اغوا کاروں کی ہنڈا گاڑی کو ایک اہم پولیس ناکے پر روکا گیا۔ گاڑی نے ریورس ہو کر نکلنے کی کوشش کی مگر درختوں میں گھس گئی۔ اس میں سے نکل کر بھاگنے والے تین افراد میں سے دو بالکل واضح نظر آئے۔ تاہم ان کے چہرے دکھائی نہیں دے رہے تھے کیونکہ کیمرا عقب میں تھا۔ ایک لڑکے نے سرخ جرسی کے نیچے سیاہ یا گہری نیلی پتلون پہن رکھی تھی، سر پر پی کیپ تھی۔ وہ کچھ لنگڑاتا ہوا بھاگا تھا۔ اس کا ڈیل ڈول اور انداز دیکھ کر میرا دماغ جیسے بھک سے اڑ گیا۔ میرے دل نے جیسے پکار کر کہا...... بے شک شکل نظر نہیں آ رہی، لیکن، یہ کوئی اور نہیں...... یہ انیق ہے۔

انیق کے ساتھ ایک طویل وقت گزرا تھا میرا۔ اس کی نشست و برخاست، چال ڈھال اور اس کا ہر ہر انداز میرے ذہن پر نقش تھا۔ یہ جھلک جو فوٹیج میں دکھائی دی تھی۔ بہت مختصر تھی اور پکچر کوالٹی بھی ویسی ہی تھی جیسی عموماً سی سی ٹی وی کیمروں کی ہوتی ہے اس کے باوجود میرے اندر جیسے ایک تہلکہ سا مچ گیا تھا۔ یہ کیا ہو رہا تھا؟ کیوں ہو رہا تھا؟ کیا انیق کی ذات کے سارے مثبت پہلو اور اس کی ساری اچھی خصوصیات میری ''زندگی'' تک ہی محدود تھیں۔ میری ''موت'' کے بعد وہ ایک نئے روپ میں سامنے آ گیا تھا؟

اسی دوران میں سجاول سیالکوٹی کا فون دوبارہ آ گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ خورسنہ کی حالت بہتر ہے اور ڈاکٹر جو کچھ دیر پہلے اسے جہلم یا لاہور منتقل کرنے کا سوچ رہے تھے اب مطمئن نظر آتے ہیں۔ بہر حال ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

میں نے سجاول سے پوچھا۔ ''ذیشان کہاں ہے؟''

وہ بولا۔ ''وہ بھی تھوڑی دیر میں میرے پاس پہنچ جائے گا۔ تمہیں فکر کرنے کی لوڑ نہیں۔ یہاں جہلم میں ایک تگڑا بندہ اپنا یار بیلی ہے۔ وہی سنبھال رہا ہے سب کچھ۔''

''تم نے خورسنہ کو اپنی بیوی بتایا ہے؟''

''بیوی کو بیوی نہیں بتاؤں گا تو کیا رکھیل بتاؤں گا؟''

''یعنی ساری بات کھول دی ہے کہ خورسنہ، سجاول سیالکوٹی کی بیوی ہے؟''

''سجاول سیالکوٹی کی نہیں...... سجاول احمد کی جو ایک پیٹرول پمپ میں حصے دار ہے اور لالہ موسیٰ میں رہتا ہے۔ خیر ان باتوں کو چھوڑو۔ مجھے بتاؤ میں کیا کروں۔ میرے اندر جیسے

آگ سی لگی ہوئی ہے۔ تمہاری سمجھ میں کچھ آتا ہے تو مجھے بتاؤ۔ کس مائی کے لال کو اتنی ہمت ہوئی ہے کہ میرے گھر پر ہلا بولے۔ وہ جو بھی ہے اس حرام زادے نے اپنی موت کو آواز دی ہے اور موت بھی ایسی کہ لوگ یاد کریں گے۔'' سجاول کی آواز میں شعلوں کی پھنکار تھی اور وہ سفاکی تھی جو بے رحم قاتلوں کے لب و لہجے کا خاصہ ہوتی ہے۔

میں اندر سے لرز گیا۔ میں اسے کیسے بتاتا کہ میرے ذہن میں کیا کھلبلی مچی ہوئی ہے۔ میں اس سارے معاملے میں انیق کی پرچھائیاں دیکھ رہا تھا۔ ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا مگر یہ سب کچھ واقعی اگر انیق نے کیا تھا یا وہ اس واقعے میں ملوث تھا تو پھر اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ مجھے اب ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ وقت آ گیا ہے جب مجھے انیق سے ملنا چاہیے...... اور جاننا چاہیے کہ وہ یہ سب کیوں کر رہا ہے۔ لیکن یہاں فوراً یہ سوال بھی ابھرتا تھا کہ کیا مجھے اپنی اصل شناخت کے ساتھ انیق کے سامنے آنا چاہیے؟

میری نگاہوں کے سامنے ایک بار پھر سی ٹی وی کی وہی ویڈیو گھومنے لگی جو ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے دیکھی تھی۔ میرا دل پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ گاڑی سے نکل کر جو افراد بھاگے تھے ان میں سے ایک انیق تھا۔ اس کی جسامت اس کا قد کاٹھ، اس کا بے ڈھنگا لباس اور پھر اس کی لنگڑاہٹ، یہ لنگڑاہٹ چند روز پہلے کے اسی واقعے کی نشانی تھی جب ٹیکساری گینگ کے لوگ انیق اور مختار جھارا کو اٹھا کر لے گئے تھے۔ مختار جھارا دیگر لوگوں کے ساتھ مارا گیا تھا اور میں اور سجاول انیق کو بچا کر لے آئے تھے۔ اگر میرے دل کی یہ پکار درست تھی تو پھر اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ میری ''موت'' کے بعد انیق بالکل بدل گیا ہے۔ اب اس کے اندر کا گینگسٹر اپنی من چاہی راہ پر چل نکلا ہے اور ہر وہ کام کر رہا ہے جو پہلے نہیں کر سکتا تھا۔ سجاول سے اس کے تعلقات کبھی بھی ٹھیک نہیں رہے تھے اور کبھی کبھی تو دشمنی کی حدوں کو چھونے لگتے تھے۔ اگر مستقبل قریب میں کہیں انیق اور سجاول کا تصادم ہوتا تو بہت خطرناک ہوتا۔

صبح تک سجاول کی طرف صورتِ حال کافی سنبھل گئی۔ خورسنہ کا بیٹا ذیشان واپس سجاول کے پاس پہنچ چکا تھا۔ خورسنہ اب ہوش میں تھی۔ دو گولیاں اس کے بازو اور ایک پیٹ میں لگی تھیں۔ یہ گولیاں آپریشن کے ذریعے نکالی جا چکی تھیں۔ سجاول کی اس مصیبت کی طرف سے میرا دھیان تھوڑا سا ہٹا تو ایک بار پھر اسی جانکاہ غم نے پوری شدت سے گھیر لیا جس کا تعلق تاجور اور اس کے حالات سے تھا۔ وہ جا رہی تھی بلکہ جا چکی تھی...... مجھ سے جدا ہو چکی تھی۔ اسلام آباد کے اس بنگلے میں اس نے زور آوروں کی اس محفل میں گواہوں کے سامنے ''قبول

ہے'' کہا تھا اور بے رحمی سے میری ''آس امید'' کو جبر کی لاکھوں ٹن وزنی چٹان کے نیچے کچل دیا تھا۔

صرف دو مختصر سے الفاظ ''قبول ہے'' اور ان دو الفاظ کے ساتھ ہی کیا کچھ ختم ہو جاتا ہے۔ ہفتے کے روز اس کا ولیمہ تھا اور رخصتی یقیناً ولیمے سے پہلے ہی ہونا تھی۔ فردوس نے یہی بات کہی تھی۔ ہفتے میں ابھی دو تین دن باقی تھے لیکن گھڑی کی سوئیاں تو چل رہی تھیں۔ مجھے تاجور سے جو کچھ کہنا تھا، وہ میں نے اپنے آخری پیغام میں کہہ دیا تھا۔ یہ پیغام ایک طویل ٹیکسٹ میسج کی صورت میں تھا۔ اردو میں لکھا ہوا یہ میسج فردوس کے ذریعے تاجور تک پہنچا تھا اور پھر اس کے بعد بھی وہی کچھ ہوا تھا جو ہونا تھا۔ ''قبول ہے'' کے الفاظ ادا کر دیئے گئے تھے۔

ہم سہ پہر تک لالہ موسیٰ کے اس ہوٹل میں ہی رکے۔ سجاول نے فون پر خورسنہ سے میری بات بھی کرائی۔ وہ رک رک کر بول رہی تھی مگر آواز میں دم ختم تھا۔ اپنی جان بچ جانے سے بھی زیادہ خوشی اسے اس بات کی تھی کہ اس کا بیٹا ذیشان ایک بہت بڑی مصیبت سے بچ گیا تھا۔

○......❖......○

رات نو بجے تک ہم واپس راولپنڈی پہنچ چکے تھے۔ انیق جو کچھ کرتا پھر رہا تھا، اس کے بارے میں داؤد بھاؤ سے بھی سن گن مل سکتی تھی مگر داؤد بھاؤ نے بھی اپنے سارے رابطے منقطع کر رکھے تھے۔ انیق کے بارے میں سوچتے ہوئے میرا دھیان پھر انہی واقعات کی طرف چلا جاتا تھا جنہوں نے مجھے میری زندگی کے سب سے بڑے صدمے سے دوچار کیا تھا۔ یہ انیق کی دروغ گوئی ہی تو تھی جو تاجور کو ایک دم مجھ سے ہزاروں لاکھوں میل کی دوری پر لے گئی تھی۔ انیق کے حوالے سے دو دن پہلے مجھ پر ایک اور انکشاف ہوا تھا اور اس نے میری پریشانی میں اضافہ کیا تھا۔ شروع کے دنوں میں جب انیق سے تعلق بنا تھا تو میں نے انیق کے ساتھ فرضی نام سے ایک اکاؤنٹ کھلوایا تھا۔ اس مشترکہ فارن کرنسی اکاؤنٹ میں میری ہی رقم تھی تاہم بوقت ضرورت اسے انیق بھی ڈرا کر سکتا تھا۔ پرسوں جب میں نے یہ اکاؤنٹ چیک کیا تو پتا چلا کہ انیق اس میں سے قریباً دس ہزار یورو نکلوا چکا ہے۔ یہ اس کی تکلیف دہ حرکات میں سے ایک اور حرکت تھی۔ تکلیف دہ اور ناقابلِ فہم۔ میرا دوست فخر بھی سجاول ہی کی طرح تاجور کی شادی پر ازحد دکھی تھا۔ میں نے اسے تاجور کے حوالے سے تقریباً سبھی کچھ بتا دیا تھا۔ وہ بار بار یہی کہہ رہا تھا۔ ''یار! تمہیں کم از کم ایک بار اس سے خود ملنا چاہیے تھا۔ یہ ساری باتیں اس کے سامنے کہنی چاہیے تھیں۔ کیا پتا اس فردوس نام کی ملازمہ نے تمہارا میسج تاجور تک پہنچایا

بھی یا نہیں۔''

میں نے کہا۔''فخری! دل کی گواہی بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے مجھے یقین ہے کہ میرے وہ سارے الفاظ تاجور تک پہنچ گئے تھے اور یہ بھی میرے دل کی گواہی ہے کہ وہ ان الفاظ کے اثر سے بہت دور جا چکی تھی۔ میں اس کے پاؤں پکڑ کر بھی یہ سب کچھ اس سے کہتا تو وہ منہ پھیر کر واپس چلی جاتی۔''

فخر بولا۔''کبھی کبھی لگتا ہے کہ شاید سجاول تم پر ٹھیک ہی غصہ کرتا ہے، وہ یہی کہتا ہے ناں کہ وہاں کوٹلی والے ڈیرے پر تاجور سو فیصد تمہارے پاس تھی۔ تمہاری ہر بات مان بھی سکتی تھی لیکن تم خود ڈھیلے پڑے رہے۔ تم نے اسے جانے دیا بلکہ خود اسے سکھیرا گاؤں میں چھوڑ کر آئے۔''

''اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ میں کیوں ڈھیلا پڑا تھا۔ کیا تم اس سے انکار کر سکتے ہو کہ ٹیکساری گینگ سے ہماری دشمنی کا مطلب جوانی کی موت کے سوا اور کچھ نہیں۔''

فخر نے ایک طویل سانس لی۔''اور تم پھر اسی دشمنی کو آواز دے رہے ہو۔''

''اس لیے کہ اب کھونے کو کچھ نہیں ہے۔'' میں نے سپاٹ آواز میں کہا۔

''تو پھر کب چلنا ہے بنکاک؟'' اس نے پوچھا۔

''شاید ابھی چل پڑتا...... لیکن پہلے ذرا اس انیق والے معاملے کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگ رہا ہے کہ سجاول اس کو یا وہ سجاول کو سخت نقصان پہنچا دے گا۔''

فخر نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں کے ساتھ دھیان سے میری طرف دیکھا اور بولا۔''کیا یہاں رکنے کی صرف یہی وجہ ہے یا اپنے زخموں پر اپنے ہاتھوں سے نمک چھڑکنا چاہتے ہو؟''

''کیا مطلب؟''

''کہیں ایسا تو نہیں کہ اس کو وداع کر کے یہاں سے جانا چاہتے ہو۔ اس کی رخصتی کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے ہو؟''

''بیکار کی باتیں مت کرو۔'' میں اٹھ کھڑا ہوا اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

ایک ایسی بے قراری تھی جس کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ کسی وقت تو یہی دل میں آتا تھا کہ جلد سے جلد فخر کے ساتھ بنکاک روانہ ہو جاؤں اور وہاں پہنچ کر خود کو ماضی کی زہرناک فضا میں یوں ڈبو لوں کہ ایک دو روز میں ہی سانس تھم جائے لیکن پھر انیق کے ناقابلِ فہم رویے کا خیال آتا تھا اور ساتھ ہی اس نقصان کا بھی جو انیق، سجاول کو یا سجاول انیق کو پہنچا سکتا تھا۔ شام کے بعد سجاول کی زبانی معلوم ہوا کہ خورسنہ کی حالت یوں تو بہتر ہے مگر

ڈاکٹر اسے احتیاطاً راولپنڈی منتقل کر رہے ہیں۔ چار پانچ گھنٹے تک وہ لوگ راولپنڈی پہنچ جائیں گے۔ میں نے سجاول کو تسلی دی اور کہا کہ ایک لحاظ سے یہ بہتر ہی ہے۔

رات کو صرف دو چار منٹ کے لیے چوہدری دین محمد کی ملازمہ فردوس سے بھی بات ہوئی، اس نے بتایا کہ تاجور کی طبیعت اب سنبھل گئی ہے اور جمعہ کے روز اس کی رخصتی پکی ہو گئی ہے۔ جب فردوس بات کر رہی تھی پس منظر میں ڈھولک اور شادی کے گیتوں کی مدھم آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ کسی وقت لڑکیوں کے پُرمسرت قہقہوں کی ہلکی سی گونج بھی ابھر کر معدوم ہو جاتی تھی۔ یہ سب کچھ میرے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیلنے کے لیے کافی تھا۔ تاجور کو اس ''انجام'' سے روکنے کے لیے میں پوری دنیا سے ٹکرا سکتا تھا مگر خود تاجور سے نہیں۔ اس کی محبت اور رضامندی وہ انمول موتی تھا جو میں ہفت اقلیم کی دولت دے کر بھی حاصل نہیں کر سکتا تھا اور میرا دل گواہی دیتا تھا کہ یہ موتی میرے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔

میرے پوچھنے پر فردوس نے بتایا۔ ''میاں جی نے تاجور کے بڑے ماموں اور دوسرے لوگوں کو منانے کی کوشش کی ہے، کچھ وڈے وڈے افسر بھی ساتھ گئے تھے پر وہ بڑے ماموں مولوی حبیب صیب کو منا نہیں سکے ہیں۔ ہاں برادری کے کچھ لوگ ضرور مان گئے ہیں اور شاید وہ شادی میں شامل بھی ہو جائیں۔''

''مولوی جی نے کیا کہا ہے؟''

''انہوں نے تاجور کے ابا جی سے گل ہی نہیں کی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ وہ اس کو گناہ سمجھتے ہیں اور گناہ میں شامل نہیں ہوں گے۔''

''ولیمہ کب ہوگا؟''

''ہفتے کو۔ بہت زیادہ تیاری ہو رہی ہے۔ بہت سارے مہمان ہوں گے۔ پر میاں جی نے اپنی طرف سے زیادہ لوگ نہیں بلائے۔ وہ نہیں چاہتے کہ بہت زیادہ پگڑیاں اور تہبند وہاں نظر آئیں۔ خاص خاص لوگ ہوں گے اور وہ شیروانیاں وغیرہ پہنیں گے۔''

میرا دل گواہی دیتا تھا کہ یہ بے جوڑ شادی ہے اور ہر لحاظ سے بے جوڑ ہے۔ یہ صرف حرص و ہوس کا کھیل تھا اور اسے بااثر و دولت مند شکاری کھیل رہا تھا۔ تاجور ایک خاص کشش رکھنے والی، الوہی حسن کی مالک تھی، دارج اس کے حجلہ عروسی میں داخل ہونے کے لیے اور اس کا گھونگھٹ اٹھانے کے لیے فی الحال ہر ناپسندیدہ بات برداشت کر رہا تھا۔ بہت جلد اس کا اصل روپ سامنے آ جانا تھا اور مجھے یقین تھا کہ یہ روپ چوہدری دین محمد اور اس کے ہمنواؤں کے چودہ طبق روشن کر دے گا۔

○......❖......○

وقت کی سوئیاں کسی کی خاطر اپنی رفتار بڑھاتی نہیں......اور نہ ہی گھٹاتی ہیں۔ اگلا دن بھی آ گیا۔ پتا نہیں کیوں اب دل چاہ رہا تھا کہ جو کچھ بھی ہونا ہے، جلد سے جلد ہو جائے۔ تاکہ کسی بھی انہونی کی ہلکی سے ہلکی امید بھی ذہن سے نکل جائے۔ رات کوئی ساڑھے دس بجے کا وقت تھا جب فون کی بیل ہوئی۔ میں نے چونک کر اسکرین کو دیکھا۔ یہ شرافت کی کال تھی، اس نے کہا۔ ''کوئی خبر سنی آپ نے؟''

''کیوں، کیا ہوا؟'' میں نے ٹھٹک کر پوچھا۔

''دارج داراب کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ اسے سخت چوٹیں آئی ہیں۔ سنا ہے کہ بے ہوشی کی حالت میں اسپتال لے کر گئے ہیں۔''

''کہاں سے پتا چلا تمہیں؟'' میں نے ششدر ہو کر پوچھا۔

''ابھی ٹی وی پر خبر آئی ہے۔ مری روڈ پر ایک تیز رفتار لوڈر سے ٹکر ہوئی ہے۔ گاڑی الٹ گئی ہے۔ دارج کا ایک گن مین بھی شدید زخمی ہوا ہے۔''

میرے اندر کھلبلی سی مچ گئی۔ جو بدترین دشمن ہوتے ہیں ان کا نقصان دل کو راحت دیتا ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ مجھے افسوس ہوا تو یہ غلط ہوگا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ذہن میں یہ سوال ایک بلند لہر کی طرح ابھرا کہ اگر یہ حادثہ واقعی ہو چکا ہے تو کیا صرف ایک اتفاق ہے؟

شرافت فون پر بتا رہا تھا۔ ''شہ زور لوڈر کا ڈرائیور موقع سے فرار ہو گیا ہے۔ پولیس اس کی تلاش میں ہے۔ چھتر پارک سے تھوڑا پہلے یہ ایک خطرناک موڑ تھا، ہلکی پھوار بھی تھی۔ دونوں گاڑیاں تیز رفتاری سے جا رہی تھیں۔''

''دارج کی حالت کے بارے میں کیا بتا رہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''کہا جا رہا ہے کہ محافظ کی حالت تو بہت نازک ہے مگر دارج داراب کی بھی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی ہے اور اسپتال پہنچنے تک وہ ہوش میں نہیں تھا۔''

میں نے سلسلہ منقطع کر کے ٹی وی لگانا چاہا مگر یہاں لائٹ گئی ہوئی تھی اور کیبل نہیں آ رہی تھی۔ میں بے قراری سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اچانک میرے دماغ میں روشنی کا ایک جھماکا ہوا......اس کے ساتھ ہی پورے جسم پر چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ کہیں اس حادثے میں کسی طرح سجاول سیالکوٹی کا عمل دخل تو نہیں تھا؟ اس نے کہا تھا کہ وہ یہ سب کچھ نہیں ہونے دے گا۔ وہ تاجور کو اس طرح دارج داراب کے شکنجے میں نہیں جانے دے گا۔ وہ ایک خطرناک شخص تھا۔ وہ سب کچھ کر سکتا تھا۔ اس سے اچھی اور بری سے بری توقع رکھی

جاسکتی تھی۔

میں نے دل کے سرپٹ گھوڑے کو سنبھالتے ہوئے فون اٹھایا اور سجاول کو کال ملائی۔ تیسری چوتھی بیل پر کال ریسیو کر لی گئی۔ ''ہیلو کون؟'' اس کی پاٹ دار آواز میرے کان میں گونجی۔

''شاہ زیب بول رہا ہوں، کہاں ہو تم؟''

''یہاں پنڈی کے اسپتال میں اور کہاں؟ ابھی ایک دو دن تو یہاں رکنا ہی پڑے گا۔ پیٹ والا زخم کچھ اچھا ہوگا تو چھٹی کی امید ہوگی۔''

''کوئی تازہ خبر سنی ہے تم نے؟ دارج کے بارے میں؟''

''کیوں کیا ہوا اسے؟'' وہ بھاری آواز میں بولا۔ شاید ایک دو پیگ لگا رکھے تھے۔

''مری روڈ پر ایکسیڈنٹ ہوا ہے اس کا۔ اسپتال میں ہے۔''

''زندہ ہے کہ مر گیا ہے سوّر کا تخم؟'' سجاول نے پوچھا۔

''ابھی تو زندہ ہے...... ویسے تم اسپتال کب پہنچے ہو؟''

''میں تو صبح سے ہی یہاں ہوں...... خورسنہ کے پاس۔ ایک منٹ کے لیے بھی اِدھر اُدھر نہیں ہوا۔ اسے تھوڑی دیر بعد درد ہونے لگتا ہے لیکن تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو...... اور یہ دارج والی خبر تو بڑی کراری سنائی ہے تم نے۔ کیسے ہوا ہے ایکسیڈنٹ؟'' وہ سپاٹ لہجے میں بول رہا تھا...... جیسے کوشش کر رہا ہو کہ میں اس کے لہجے سے اس کے جذبات کا تعین نہ کر سکوں۔

میں نے ایک دو جملوں کے بعد سلسلہ منقطع کر دیا اور فوراً سجاول کے دست راست یونس پمپ والا سے رابطہ کیا۔ ''ہیلو یونس کہاں ہو؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''یہاں راولپنڈی میں ہی ہوں۔''

''سجاول کہاں ہے؟''

''سجاول صاحب اسپتال میں ہی ہیں اپنی وائف کے پاس۔''

''میں دس بجے کے قریب گیا تو وہ وہاں نہیں تھا۔'' میں نے اندھیرے میں تیر چلایا۔

''ہاں اس وقت وہ کچھ دیر کے لیے کہیں گئے تھے۔ گھنٹے سوا گھنٹے میں واپس آ گئے تھے۔'' یونس کی آواز میں ارتعاش میں نے صاف محسوس کیا۔

جو ''وقت'' یونس پمپ والا بتا رہا تھا، یہ وہی تھا جب مری روڈ پر دارج داراب کی بی ایم ڈبلیو گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوا۔ سجاول کا یہ بیان بھی جھوٹا ثابت ہو رہا تھا کہ وہ ایک منٹ کے

لیے بھی اسپتال سے اِدھر اُدھر نہیں ہوا۔ میں سجاول کی رگ رگ سے واقف ہو چکا تھا۔ وہ پہاڑی ندی کی طرح اپنی مرضی کے رخ پر چلنے والا شخص تھا۔ اس کے اندر کسی قدیم قبیلے کا وہ جنگجو چھپا ہوا تھا جس کے اندر مار دینے کی خداداد صلاحیت موجود تھی اور اس کی ایک مثال سجاول کا وہ جان لیوا گھونسا تھا جو جنگ و جدل میں اپنے حریف کو دوسرا سانس نہیں لینے دیتا تھا۔

تو کیا یہاں بھی اس نے اپنی من مرضی کی تھی اور تاجور کی رخصتی کو رکوانے کے لیے ایک راستہ منتخب کیا تھا۔ اسی دوران میں بجلی آ گئی۔ میں نے ٹی وی آن کیا۔ تھوڑی سی کوشش سے میں ایک دو چینلز پر اپنی مطلوبہ خبر ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گیا۔

نیوز کاسٹر سنسنی خیز لہجے میں کہہ رہی تھی۔ ''جیسا کہ آپ جانتے ہوں گے صرف ایک روز بعد دارج داراب اپنی دلہن کو بڑی شان شوکت سے اپنے گھر لے جانے والے تھے، ہفتے کے روز ان کے ولیمے کی تقریب تھی۔ اس حادثے نے یہ سب کچھ درہم برہم کر دیا ہے۔ شکر کا مقام ہے کہ دارج صاحب کی جان بچ گئی ہے۔ ان کا ایک محافظ اب بھی شدید زخمی ہے۔''

پھر نیوز کاسٹر نے اپنے فیلڈ رپورٹر سے رابطہ کیا اور بولی۔ ''آپ کا اس حادثے کے بارے میں کیا خیال ہے؟ کیا یہ محض ایک حادثہ ہے یا اس کے پیچھے کوئی سازش بھی ہو سکتی ہے؟''

فیلڈ رپورٹر نے کہا۔ ''چند روز پہلے کے حالات دیکھے جائیں تو پتا چلتا ہے کہ دارج داراب صاحب کی شادی کے حوالے سے فیملی کے اندر اور باہر کچھ اختلافات پائے جاتے تھے۔ اس سلسلے میں معروف مذہبی شخصیت مولانا حبیب اللہ کا ذکر بھی کیا جاتا تھا۔ وہ اس شادی کے ناقدین اور مخالفین میں شامل تھے۔ بہر حال جہاں تک سازش کی بات ہے ابھی اس بارے میں کچھ بھی کہنا قبل از وقت ہو گا۔ میں اس وقت جائے حادثہ پر موجود ہوں۔ یہ دیکھیے ناظرین یہ وہ جگہ ہے جہاں سے لوڈر نے تیز رفتاری کے ساتھ جناب دارج صاحب کی گاڑی کو اوورٹیک کرنے کی کوشش کی اور......'' وہ مسلسل بولتا چلا جا رہا تھا۔ میں نے ٹی وی آف کر دیا۔

میرا دل بار بار یہی گواہی دے رہا تھا کہ دارج داراب کو زخمی کرنے والا یہ ''کارنامہ'' سجاول سیالکوٹی نے ہی انجام دیا ہے۔ لیکن اس سے کیا حاصل تھا؟ میرے خیال میں تو ایسا اقدام ایک بے وقوفی کے سوا اور کچھ نہیں تھا جو ہونا تھا، وہ ہو چکا تھا، وہ دارج کی دلہن بن چکی تھی۔ دارج کے زخمی ہو جانے سے ممکن تھا کہ عارضی طور پر تاجور کی رخصتی رک جاتی......مگر

کب تک؟ اطلاعات سے تو یہی لگتا تھا کہ وہ دو تین ہفتوں میں پھر اس قابل ہو جائے گا کہ اپنی منکوحہ کو اپنے گھر لے جا سکے اور اگر...... وہ اس حادثے میں مر بھی جاتا تو بھی تاجور نے جو جدائی میری جھولی میں ڈال دی تھی...... وہ تو ڈال دی تھی۔ اس نے اپنے فیصلہ کن اقدام سے اس حقیقت پر مہر تصدیق ثبت کر دی تھی کہ اب وہ میری نہیں ہے اور نہ ہونا چاہتی ہے۔

اسی دوران میں فخر میرے کمرے میں چلا آیا۔ وہ یورپ کی کڑاکے دار سردی سے یہاں پہنچا تھا لہٰذا یہاں کی سردی اسے زیادہ محسوس نہیں ہوتی تھی۔ وہ اس وقت بھی جین اور پتلی سی ٹی شرٹ میں ملبوس تھا۔ شرٹ میں سے اس کا کسرتی جسم چمکیلے فولاد کی طرح اپنی جھلک دکھاتا تھا اور میں جانتا تھا وہ فولاد ہے بھی۔ ایم ایم اے کی سخت فائٹس اور گلی کوچوں میں ہونے والی خونی لڑائیوں نے اسے سرتاپا ایک فائٹنگ مشین بنا دیا تھا۔

اس نے ایک گہری سانس لی اور پھیل کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ دارج داراب کے زخمی ہونے کی خبر اس تک بھی پہنچ چکی تھی اور سچی بات تھی کہ یہ خبر سن کر ہم میں سے کسی کو دکھ نہیں ہوا تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ دل کی گہرائی میں کہیں خوشی نے جھلک دکھائی ہو تو بے جا نہ ہوگا۔

فخر بولا۔ ''پھر کیا اندازہ لگایا ہے تم نے اس حادثے کے بارے میں؟'' میں خاموش رہا اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''کہیں، تمہارے سیالکوٹی دوست نے ہی تو حقِ دوستی ادا نہیں کیا؟''

یہی بات میرے دل میں بھی تھی لیکن میں خاموش رہا۔

میرے تاثرات دیکھ کر فخر کے لہجے میں مزید اعتماد آ گیا، کہنے لگا۔ ''یہ اسی کا کام ہے۔ کوئی ایرا غیرا داراب فیملی کو ایسی چوٹ نہیں لگا سکتا تھا۔''

فخر بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا۔ سجاول ایک بے حد دبنگ اور جارح شخص کا نام تھا اور جب اس کی جارحیت کا خیال ذہن میں آتا تھا تو فوراً یہ سوچ بھی حملہ آور ہوتی تھی کہ انیق اپنے کرتوت کی وجہ سے سجاول کی پکڑ میں آنے والا ہے۔ میں مذاق مذاق میں اس سے کہا کرتا تھا کہ اپنے رویے کی وجہ سے کسی دن اس نے سجاول کے ہاتھوں ضائع ہو جانا ہے لیکن اب واقعی ایسی صورتِ حال بن گئی تھی کہ انیق اپنی من مانی کی وجہ سے کوئی شدید نقصان اٹھا سکتا تھا اور سجاول کے ساتھ بھی کچھ بہت برا ہو سکتا تھا۔

مجھے لگا کہ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ میں انیق کو بتا دوں کہ میں زندہ ہوں مگر اس کا ردِعمل کیا ہوگا، یہ کچھ پتا نہیں تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ کچھ ایسے خطرناک لوگ ہوں جو اسے اپنے ہاتھوں میں کھیلا رہے ہوں مگر جو کچھ بھی تھا اب یہ رسک تو مجھے لینا ہی تھا۔ ویسے بھی اب تاجور

کی نسبت جو کچھ ہو چکا تھا، مجھے لگ رہا تھا کہ میں اپنے ماضی کی طرف لوٹ رہا ہوں اور جب ماضی کی طرف واپسی طے ہو گئی تھی تو پھر اپنی ''موت'' کا ڈھونگ رچائے رکھنے سے کوئی خاص فائدہ نہیں تھا۔ ساری سنہری سوچیں، یکے بعد دیگرے واپس تاریکی کے غار میں اترتی چلی جا رہی تھیں۔ وہ خوفناک دھماکا، میری موت کا شہرہ...... میرے چہرے کی تبدیلی...... میری نئی شخصیت...... کوئی دور دراز پُرسکون پہاڑی بستی...... اس بستی میں ایک چھوٹا سا گھر...... اور اس گھر کی حسین شام، پکوان کا دھواں دیتی ہوئی اور دھیرے دھیرے ایک محبت بھری رات کی طرف بڑھتی ہوئی شام...... اور ایسی لاتعداد راتیں جن میں تاجور کی بے مثل خوب صورتی کا گداز رچا بسا تھا...... ہاں وہ سب کچھ دھندلا گیا تھا۔ گہری تاریکیوں میں چل گیا تھا۔

میں جانتا تھا کہ انیق یہاں راولپنڈی میں ہی کہیں موجود ہے لیکن اس سے کیسے ملا جاتا۔ اس کا پرانا سیل نمبر تو کئی ہفتوں سے بند تھا۔ میرے پاس اس کا واحد سراغ داؤد بھاؤ ہی تھا۔ وہی بتا سکتا تھا کہ انیق کہاں ہے اور کیا کرتا پھر رہا ہے۔ میں نے ایک بار پھر داؤد بھاؤ کے دونوں نمبروں پر ''ٹرائی'' شروع کر دی۔ وہی ڈھاک کے تین پات والا معاملہ تھا...... میرا خیال چچا حفیظ کی طرف چلا گیا۔ میری آخری اطلاعات کے مطابق انیق چچا حفیظ کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اس وقت مجھے یہی لگا تھا کہ چچا محفوظ پناہ گاہ میں چلے گئے ہیں اور ٹیکساری کے متلاشی ہرکارے ان کو کوئی گزند نہیں پہنچا سکیں گے، مگر اب انیق کے نئے کردار نے چچا کی طرف سے بھی تشویش لاحق کر دی تھی۔

انیق کا کریکٹر پیچیدہ تر ہوتا جا رہا تھا۔ ایک دو بار میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا تھا کہ کہیں انیق ہی تو وہ شخص نہیں جس نے دارج داراب کی گاڑی کو ٹکر ماری ہو مگر پھر مجھے یہ خیال رَد کرنا پڑا تھا۔ پتا نہیں کیوں میری چھٹی حِس بار بار سجاول کی طرف ہی اشارہ کرتی تھی۔ بہرحال یقین سے اس بارے میں بھی کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

میں بے قراری سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ کھڑکیوں سے باہر راولپنڈی کی ایک خنک رات دھیرے دھیرے سرک رہی تھی اور مری کی طرف سے آنے والی ہواؤں نے درختوں کے پتوں کو ہلکورے دینے شروع کر دیئے تھے۔ سگریٹ نکالنے کے لیے میں نے الماری کھولی تو سامنے ہی تاجور نظر آ گئی۔ وہ خود نہیں اس کی تصویر۔ یہ تصویر میں نے چند روز پہلے ہی فریم کرائی تھی۔ ریشمی زلفوں کی دو لٹیں اس کے گل رنگ رخسار پر جھولتی ہوئی، سیاہ آنکھوں میں ایک سادہ حسن کی خیرہ کن چمک، ایک ایسی دلکشی جو چہرے کے کسی نقش میں ڈھونڈی نہیں جا سکتی تھی مگر ہر نقش میں موجود تھی۔ میں نے فریم اوندھا کر کے رکھ دیا۔ فریم کے پیچھے ہی الماری

کی وہ دراز تھی جس میں، میں نے وہ جیولری وغیرہ سنبھال رکھی تھی جو تاجور کے لیے لایا تھا۔ میں نے دراز کھولی۔ جیولری پر ایک سپاٹ نگاہ ڈالی پھر اسے ایک کپڑے میں لپیٹ کر اور سیاہ شاپر میں ڈال کر پہلوان حشمت کے حوالے کر دیا۔ وہ پوچھتا ہی رہ گیا کہ اس میں کیا ہے۔ میں نے کہا کہ وہ اسے کھول کر نہ دیکھے لیکن امانت کے طور پر اپنے پاس رکھ لے (میرا ارادہ یہی تھا کہ یہ میں پہلوان کو سونپ دوں گا تا کہ وہ اپنے مالی حالات درست کر سکے) محبت کے شجر کٹ جاتے ہیں مگر جڑیں دل کی زمین میں پیوست رہتی ہیں۔ ہماری سوچیں بھی ان جڑوں سے لپٹی رہتی ہیں۔ میں سوچتا تھا کہ شاید میرا یہ نیک کام تاجور کی خیر خیریت کے لیے سودمند ثابت ہو۔

O......❖......O

ایک گھنٹے بعد میں نے پھر داؤد بھاؤ کے نمبروں پر رابطے کی کوشش شروع کر دی۔ دفعتاً میری دھڑکن تیز ہوگئی۔ داؤد بھاؤ کے ایک نمبر پر بیل جانا شروع ہوگئی تھی۔ میں نے فون فوراً بند کر دیا۔ میں داؤد بھاؤ سے براہِ راست بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ داؤد کے لیے بھی میں ''مرحوم'' ہو چکا تھا (اور ابھی میں نے طے نہیں کیا تھا کہ میں نے اپنے حیات ہونے کا بھید کھولنا ہے یا نہیں) میں نے فوراً سجاول کو فون کیا اور اسے یہ اطلاع دی کہ داؤد بھاؤ کا ایک نمبر آن ہو چکا ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ داؤد بھاؤ سے رابطہ کرے اور اس سے پوچھے کہ انیق کہاں ہے؟

قریباً دس منٹ بعد سجاول کا فون آ گیا۔ اس نے کہا۔ ''داؤد بھاؤ کے نمبر پر بیل تو واقعی جارہی ہے مگر وہ فون اٹھا نہیں رہا۔''

میں نے اس سے کہا۔ ''ٹرائی جاری رکھو۔ انیق کا ملنا ضروری ہے۔''

''پر کیوں ضروری ہے؟ اس کے بغیر کون سا کام رکا ہوا ہے ہمارا؟''

میں اسے کیسے بتاتا کہ اس کے بغیر کام رکا تو نہیں ہوا، ہاں اس کی وجہ سے کام خراب ہو رہے ہیں اور اگر اس کی محبوب بیوی زخمی ہو کر اسپتال میں پڑی ہے تو اس کے پیچھے بھی انیق کے سائے ہی نظر آ رہے ہیں۔ میں اسے انیق کے حوالے سے خبردار بھی کرنا چاہ رہا تھا مگر سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسے کروں، کچھ بھی کرنے سے پہلے ایک بار انیق سے میرا ملنا ضروری ہو گیا تھا۔

''تم بول کیوں نہیں رہے، چپ کیوں ہو گئے ہو؟'' سجاول کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔

میں نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''سجاول! ہمارے اردگرد بہت کچھ عجیب ہو رہا ہے۔ تمہیں کیا لگتا ہے، لالہ موسیٰ میں تمہارے گھر پر حملہ کرنے والے اور ذیشان کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والے کون لوگ تھے؟''

''یہی سوچ سوچ کر تو میرا دماغ پھٹا جا رہا ہے۔ دشمن تو بہت سے ہیں میرے...... لیکن یہ جو کام ہوا ہے بالکل وکھری ٹائپ کا ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ کوئی گھر کا بھیدی ہے۔''

''اچھا ایسا کرتے ہیں سجاول، کہیں ملتے ہیں بلکہ ابھی ملتے ہیں۔''

''تو مل لو، یہیں اسپتال آ جاؤ۔ خورسنہ بھی تمہیں یاد کر رہی تھی۔''

''نہیں اسپتال نہیں، کہیں اور بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔ بالکل اکیلے میں۔''

سجاول نے ذرا توقف کر کے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ تمہارے دماغ میں کوئی خاص بات ہے۔''

''یہی سمجھ لو...... ذیشان کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ماں کے پاس ہی ہے۔ ایک منٹ کے لیے بھی اس سے دور نہیں ہو رہا۔''

''انہیں چھوڑ کر تھوڑی دیر کے لیے آ سکتے ہو؟''

''ہاں...... کیوں نہیں...... یہاں کمرے کے باہر پولیس گارڈ ہے۔ میں نے اپنے بندے بھی آس پاس لگائے ہوئے ہیں۔''

''چلو انہیں الرٹ رہنے کا کہو اور بڑی سڑک پر آ جاؤ۔ پہلے گول چکر کے ساتھ ہی آبپارہ ریسٹورنٹ ہے۔ اس کے ہال میں پہنچ رہا ہوں میں۔''

قریباً آدھ گھنٹے بعد میں اور سجاول اس فور اسٹار ریسٹورنٹ کے ڈائننگ ہال میں ایک نیم تاریک گوشے میں بیٹھے تھے۔ ہمارے سامنے گرین ٹی کے کپ دھرے تھے۔ یہ رات کے قریباً ساڑھے بارہ بجے کا وقت تھا۔ اگلے روز چھٹی تھی اس لیے ریسٹورنٹ میں گہما گہمی نظر آ رہی تھی۔ میں نے سجاول کی بڑی بڑی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اچھا...... باقی باتوں کو چھوڑو۔ مجھے ایک بات صاف صاف بتا دو اور اگر دوست ہو تو جھوٹ نہ بولنا۔''

''کون سی بات؟'' سجاول نے بے پروائی سے کہا۔

''ابھی ڈھائی تین گھنٹے پہلے مری روڈ پر جو ایکسیڈنٹ ہوا ہے، وہ کس نے کیا ہے؟'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر پوچھا۔

اس نے کپ ٹیبل پر واپس رکھا اور میری طرف دیکھ کر ٹھہرے لہجے میں بولا۔ ''تو تمہارا خیال ہے...... کہ وہ میں نے کیا ہے؟''

''خیال تھا، لیکن اب یقین ہونے لگا ہے۔ یہ حرکت تمہاری ہی ہے۔''

''خود ہی سوال کر کے خود ہی جواب دینا ہے تو پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟'' اس نے اطمینان سے گرین ٹرین کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔

''مطلب یہ ہے کہ یہ تم نے کیا ہے مگر کیوں؟ کیا ضرورت پڑی تھی اتنی ہمدردی جتانے کی۔ کیا حاصل ہوا ہے اس سے مجھے؟ کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں بلکہ......خود پر لعنت ملامت کرنے کو جی چاہنے لگا ہے۔ تمہارے نزدیک محبت کا مطلب کچھ اور ہوگا، میرے نزدیک اور ہے۔ مجھے زبردستی، چھینی ہوئی محبت نہیں چاہیے۔ میں سچ کہتا ہوں سجاول، مجھے شرمندہ کیا ہے تم نے۔''

''اچھا اپنی بک بک بند کرو۔ کوئی کام کی بات ہے تو بتاؤ۔'' وہ گرین ٹی کے آدھے کپ کو شربت کی طرح غٹاغٹ چڑھا گیا۔

اس سے ماتھا پھوڑنا بیکار تھا۔ میں واش روم جانے کے بہانے اس کے پاس سے اٹھ گیا۔ واش روم میں جا کر چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دیئے، لمبے سانس لے کر خود کو پُرسکون کرنے کی کوشش کی پھر رومال سے ہاتھ منہ پونچھتا ہوا واپس آ گیا۔ تب تک سجاول مزید گرین ٹی منگوا چکا تھا۔ جس طرح کا اس کا موڈ ہو رہا تھا شاید وہ ''کچھ اور'' پیتا مگر یہ ایک عوامی جگہ تھی اور یہاں اسے محتاط رہنا پڑ رہا تھا۔ جس طرح اس کے قوی ہیکل سراپا پر پینٹ شرٹ جچتی نہیں تھی، اسی طرح اس کے بالوں بھرے لمبے چوڑے ہاتھ میں گرین ٹی کا کپ بھی عجیب لگتا تھا۔

اس کے وسیع ماتھے پر سوچ کی پرچھائیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ چائے کی ایک طویل چسکی لے کر بولا۔ ''میرے بندے تین چار ''مشکوک'' پکڑ کر ڈیرے پر لے گئے ہیں۔ کافی مارا کٹی ہوئی ہے ان سے۔ ایک کی تو دو چار ہڈیاں بھی ٹوٹ گئی ہیں، پر ابھی تک کوئی پکا کھرا ہاتھ نہیں لگا۔''

میں سمجھ گیا کہ وہ اپنے گھر پر ہونے والے سنگدلانہ حملے کی بات کر رہا ہے۔ اس حملے کے شبہے میں اس کے کارندے کچھ لوگوں کی کم بختی لے آئے تھے...... یقیناً ان سے کچھ اگلوانے کی کوشش میں ان کی کھال ادھیڑ دی گئی ہوگی۔ میں سوچنے لگا کہ اگر سجاول کو بھنک بھی پڑ جائے کہ اس کے گھر پر ہونے والی فائرنگ میں انیق کا ہاتھ ہے تو اس کا غیظ و غضب کیا رنگ دکھائے، میں شدید تذبذب میں تھا۔ میں چاہتا تھا کہ سجاول کو انیق کی طرف سے خبردار رہنے کا مشورہ دوں، اور یہ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ مشورہ کس طرح دوں۔ اس کے بعد

سجاول اور انیق کا ٹکراؤ ہو جانا لازم تھا۔ میں نے ناراض لہجے میں اس سے پوچھا۔ ''آئندہ کے لیے تم نے کیا سوچا ہے۔ ظاہر ہے کہ اب تم اور خورسنہ لالہ موسیٰ کے اس گھر میں تو نہیں رہو گے؟''

''ہاں گھر کا انتظام کرلیا ہے یونس نے۔ اب لالہ موسیٰ شہر کے اندر ہے۔ میرے خیال میں ٹھیک جگہ ہے۔''

''کیا یہ اچھا نہیں تھا کہ کسی اور شہر میں چلے جاتے؟''

''جن حرام زادوں نے حملہ کیا ہے وہ بھی یہی سوچیں گے کہ ہم نے یہ علاقہ چھوڑ دیا ہے۔ اس لحاظ سے تو لالہ موسیٰ ہی زیادہ محفوظ ہے۔''

''بات میں وزن تو ہے مگر سجاول! مجھے لگتا ہے کہ خورسنہ اور ذیشان کے لیے تمہیں مزید احتیاط کی ضرورت ہے۔ اگر تمہارے کہنے کے مطابق واقعی یہ گھر کے کسی بھیدی کا کام ہے تو یہ بھیدی پھر بھی کام دکھا سکتا ہے۔ میری مانو تو کچھ عرصے کے لیے یہاں راولپنڈی ہی رک جاؤ، بڑا شہر ہے۔''

''اچھا دیکھ لیں گے یہ بھی، تم اپنی سناؤ۔ اب کیا ارادے ہیں۔ دیوداس ہی بنے رہنا ہے یا پھر کچھ حرکت شرکت بھی کرنی ہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ شادی کے نام پر وہ ایک اندھے کنویں میں گر رہی ہے اور تم چپ کر کے اسے دیکھ رہے ہو۔ کیا اسی کو محبت کہتے ہیں؟''

''سجاول! یار یہ بات نہ ہی چھیڑو تو اچھا ہے۔ تم نے جو کچھ کیا ہے، اس نے میرے زخموں پر نمک چھڑکنے کے سوا اور کچھ نہیں کیا۔ اب اپنی باتوں سے اور نمک نہ چھڑکو۔ اس ایکسیڈنٹ کے بعد تاجور اور اس کے گھر والوں پر کیا بیت رہی ہوگی۔ سوچتا ہوں تو......'' مجھے بولتے بولتے چپ ہونا پڑا۔ سجاول کے سیل فون پر کال کے سگنل آگئے تھے۔

''ہیلو کون؟'' سجاول اپنی مخصوص گھن گرج کے ساتھ بولا۔

دوسری طرف سے جو کچھ کہا گیا، اس نے سجاول کو قدرے پریشان کیا۔ وہ دھیمے لہجے میں بولا۔ ''اچھا، میں تھوڑی دیر میں نکل رہا ہوں...... بلکہ......ابھی نکل رہا ہوں۔ دس پندرہ منٹ میں پہنچتا ہوں۔''

فون بند کر کے اس نے بتایا کہ یونس کا فون تھا۔ ''اس نے کہا ہے کہ خورسنہ کو پھر درد ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر نے اس کے ایک دو ٹیسٹ لکھے ہیں جو ابھی کرانے ہیں۔''

''ٹھیک ہے، تو تم نکلو فوراً اگر کسی طرح میری مدد کی ضرورت ہو تو مجھے بتانا۔''

وہ اثبات میں سر ہلاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ میں وہیں بیٹھا رہا۔ ابھی گھر واپس جانے کو بھی

دل نہیں چاہ رہا تھا۔ دل و دماغ میں عجیب سی مایوسی اور اداسی بھری ہوئی تھی۔ ہال میں کسی غمگین نغمے کی دھن پلے ہو رہی تھی اور فضا میں عجیب سا حزن رچا ہوا تھا۔ میں نے سجاول کو عقب سے دیکھا، وہ ڈائننگ ہال سے نکل کر زیر زمین پارکنگ کی طرف جا رہا تھا اور تبھی اپنی میز پر بیٹھے بیٹھے میں بری طرح چونک گیا۔ یکلخت ہی میری رگوں میں خون کی گردش کئی گنا بڑھ گئی۔ میں نے انیق کو دیکھا، وہ ہال ہی کے کسی گوشے سے اٹھا تھا اور اب سجاول کے پیچھے باہر نکل رہا تھا۔ وہ میرے بالکل قریب سے ہو کر گزرا اس نے ایک ہلکی سی جیکٹ اور چست پتلون پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں مہنگے سے اسپورٹس شوز تھے۔ پتا نہیں کیوں اس کی قدرے پھولی ہوئی جیکٹ دیکھ کر مجھے کسی خطرے کا احساس ہوا۔ اس کا یوں سجاول کے پیچھے جانا بھی الارمنگ تھا (میرے پاس سے گزرتے ہوئے ایک اچٹتی سی نظر اس نے مجھ پر ڈالی تھی۔ ہال کے اس نیم روشن گوشے میں وہ مجھے پہچاننے میں سو فیصد ناکام رہا تھا)

یہ کیا کر رہا ہے؟ کیا کرنے والا ہے؟ میرے ذہن میں یہ چنگھاڑتا ہوا سوال ابھرا۔

میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور انیق کے پیچھے گیا۔ ہال سے باہر نکل کر میں نے دیکھا، سجاول کشادہ کوریڈور کے آخری سرے پر تھا اور انڈر گراؤنڈ پارکنگ میں داخل ہو رہا تھا۔ انیق سے اس کا فاصلہ بیس پچیس قدم تھا۔ میرے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ انیق نے ڈائننگ ہال میں سجاول پر نگاہ رکھی ہوئی تھی اور اس بات کا منتظر تھا کہ سجاول یہاں سے اٹھے۔ کیا وہ سجاول سے کوئی بات کرنا چاہتا تھا، یا پھر ارادے زیادہ خطرناک تھے؟ اس کی کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی اور اس سے کچھ بعید بھی نہیں تھا۔

ہم انڈر گراؤنڈ پارکنگ میں پہنچے، صرف سات آٹھ گاڑیاں یہاں کھڑی تھیں۔ بس ایک چوکیدار دکھائی دے رہا تھا۔ سجاول تیز قدموں سے چلتا ایک ننانوے ماڈل ٹویوٹا کار کی طرف بڑھا۔ انیق ایک ستون کے قریب رک چکا تھا اور یہی وقت تھا جب میں نے ایک لرزہ خیز منظر دیکھا۔ میرے بدترین خدشات ٹھوس حقیقت کا روپ دھار گئے تھے۔ انیق نے اپنی جیکٹ میں سے کچھ نکالا اور اپنے ہاتھ سجاول کی طرف سیدھے کیے۔ اگلے ہی لمحے پارکنگ لاٹ ایک لرزہ خیز دھماکے سے گونج اٹھا۔ میں نے چند آخری قدم بھاگ کر طے کیے اور اڑتا ہوا سا انیق پر جا پڑا۔ میں جانتا تھا کہ عام جسم رکھنے کے باوجود انیق کوئی معمولی حریف نہیں ہے۔ اس کا خاص ہتھیار اس کی غیر معمولی پھرتی تھی جو مدِمقابل کو حیران کر دیتی تھی۔ میں اور انیق اوپر نیچے گرے۔ بہت اچھا ہوا تھا کہ میں نے گرتے ہوئے ایک ہاتھ اس کے مشین پسٹل پر ڈال دیا تھا۔ اس نے بیدردی سے ٹریگر دبایا تھا لیکن بیرل کا رخ چونکہ میری طرف

سے ہٹ چکا تھا، اس لیے پسٹل سے نکلنے والی تین گولیاں چھت کی جہازی سائز کی گول لائٹ میں لگیں۔ اس سے غالباً شارٹ سرکٹ ہوا اور پارکنگ لاٹ تاریکی میں ڈوب گیا۔ صرف زینوں کی طرف سے آنے والی مدھم روشنی میں گاڑیوں کے خدوخال دکھائی دے رہے تھے۔

انیق نے دانت پیس کر گالی بکی اور پسٹل کے وزنی دستے سے میرے جبڑے کو نشانہ بنانا چاہا۔ میں اس قسم کے ردِعمل کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ میں نے نہ صرف خود کو بچایا بلکہ ایک کلاسیکل گھونسا اس کے منہ پر رسید کیا۔ اس نے بلا کی تیزی دکھائی اور پلٹ کر میرے نیچے سے نکل گیا۔ یہ جانے بغیر کہ میں کون ہوں، وہ ایک بار پھر مجھے پسٹل سے نشانہ بنانا چاہ رہا تھا۔ میری ٹانگ کی ضرب بہت جچی تلی تھی اور بہت شدید بھی۔ ٹریگر دبنے سے پہلے ہی پسٹل انیق کے ہاتھ سے نکل گیا اور کسی گاڑی کی باڈی سے ٹکرا کر نامعلوم سمت میں لڑھک گیا۔

میں اور انیق ایک بار پھر گتھم گتھا ہو گئے۔ چوکیدار کی پکارتی ہوئی آواز پارکنگ لاٹ میں گونج رہی تھی۔ ''پیچھے ہٹ جاؤ، ام گولی مار دے گا۔'' اس کی یہ وارننگ یقیناً انیق کے لیے ہی تھی۔ لیکن اس کی آواز ہی بتا رہی تھی کہ وہ گولی نہیں چلا سکتا۔ ویسے بھی میں اور انیق گتھم گتھا تھے۔ مجھے انیق کی ایک طوفانی ٹکر اپنی پسلیوں پر سہنا پڑی اور مجھے صحیح پتا چلا کہ وہ کس ''کیلیبر'' کا فائٹر ہے۔ اگر یہ ٹکر کسی عام شخص کو لگی ہوتی تو وہ ضرور فوراً خون تھوکنے لگتا۔ میں نے ایم ایم اے کی ایک مخصوص ضرب انیق کی کنپٹی پر لگائی۔ ضرب ٹھیک سے نہیں لگی پھر بھی وہ لڑکھڑا کر دیوار سے جا ٹکرایا۔ یہی وقت تھا جب سجاول بھی دھاڑتا ہوا موقع پر پہنچ گیا۔

زمین پر گرنے کے بعد انیق کی نگاہ پھر اپنے مشین پسٹل پر پڑ گئی تھی۔ وہ اٹھ کر اس کی طرف لپکا مگر تب تک سجاول اس کی راہ میں آ چکا تھا۔ مجھے شک ہوا کہ سجاول کا ایک بازو زخمی ہے۔ اس نے انیق کو دبوچا۔ وہ کسی چکنی مچھلی کی طرح اس کے ہاتھ سے پھسل گیا۔ یہی وقت تھا جب شارٹ سرکٹ کی وجہ سے کچھ مزید پٹاخے چھوٹے اور پارکنگ لاٹ مکمل تاریکی میں ڈوب گیا۔ میں نے انیق کے سائے کو کسی چھلاوے کی طرح گاڑیوں کے عقب میں اوجھل ہوتے دیکھا۔ عین اس وقت پولیس موبائلز کے تیز سائرن بالکل قریب سے سنائی دینے لگے۔ ''بھاگو پکڑو'' کی آوازیں بھی پارکنگ لاٹ کی طرف سے آ رہی تھیں۔

میں نے پکار کر کہا۔ ''سجاول! نکل جاؤ یہاں سے۔''

میں خود بھی ایک نیم تاریک راہداری کی طرف دوڑا۔ کچھ ہی دیر بعد میں تاریک بھول بھلیوں سے گزر کر باہر سڑک پر آ گیا۔ میں نے ایک سوزوکی ٹیکسی کو اشارہ کیا اور اس میں گھس کر ریسٹورنٹ سے دور ہوتا چلا گیا۔ ذہن میں کھلبلی سی مچ گئی تھی۔ ہر گزرنے والے دن نے

ساتھ انیق کا نیا روپ سامنے آتا تھا اور وہ پہلے روپ سے برا ہوتا تھا۔ تاریکی کا فائدہ اٹھا کر میں اور سجاول ہنگامے والی جگہ سے نکل آئے تھے اور انیق تو تھا ہی ایک چھلاوا وہ ہم سے بھی پہلے نکل بھاگا تھا، مگر آج جو کچھ اس نے کیا تھا، وہ کسی صورت قابلِ معافی نہیں تھا۔ اس نے سجاول کو گولیوں سے چھلنی کرنے کی کوشش کی تھی، اگر میں بروقت مداخلت نہ کرتا تو شاید اب تک خورسنہ بیوہ ہو چکی ہوتی اور میں اپنے ایک نہایت قیمتی دوست سے محروم ہو چکا ہوتا۔

یہ سب کچھ ہونے سے رہ گیا تھا لیکن جو کچھ ہوا تھا، وہ بھی کم برا نہیں تھا۔ میرے اندازے کے مطابق سجاول کا بازو زخمی ہوا تھا اور اس نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ اس پر فائرنگ کرنے والا کون ہے۔ اب ان دونوں کے تصادم کو کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ جونہی میں گھر پہنچا سجاول کا فون آ گیا۔ (وہ گاڑی سمیت ریسٹورنٹ میں سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا) حسبِ توقع اس کی آواز میں شعلوں کی پھنکار تھی۔ وہ چھوٹتے ہی بولا۔ ”دیکھ لیا...... دیکھ لیا ناں اس کا کارنامہ؟ میں ہمیشہ تم سے یہی کہتا تھا کہ یہ آستین کا سانپ ہے، بس موقع کی تلاش میں ہے۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں میری بیوی کو زخمی کر کے اسپتال میں ڈالنے والا اور میرے بچے کو اغوا کرنے والا بھی یہی سوٴر کا تخم ہے۔ وہ قیامت بھی اسی نے توڑی ہے۔“

”سجاول خود کو ٹھنڈا رکھو، جو بھی ہوگا سامنے آ جائے گا۔“

”اب اور کیا سامنے آنا ہے؟ اس نے مجھ پر گولی چلائی ہے۔ اگر تم اسے روک نہ لیتے تو اس وقت میری لاش مردہ خانے میں پڑی ہوتی۔ یہ حرامی کوئی گہرا کھیل کھیلنے میں لگا ہوا ہے۔ میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔ کل کا سورج ڈوبنے سے پہلے یہ ایک لاش کی صورت میں نظر آئے گا۔“

”سجاول سوچنے کی بات ہے کہ اگر یہ سب کچھ اس نے کیا ہے تو کیوں کیا ہے؟ تم اس کو مار ڈالو گے تو پھر اس کھیل کا پتا کیسے چلے گا جس کی تم بات کر رہے ہو؟“

”کھیل کا پتا بھی چلا لوں گا چند گھنٹوں میں۔“ سجاول کی آواز میں غضب ناک دہاڑ تھی۔

”یہ سب کچھ اتنی جلدی ہونے والا نہیں ہے سجاول، جو کچھ انیق نے کیا ہے اس کا مجھے بھی اتنا ہی دکھ ہے جتنا تمہیں۔ ہم اس کے لیے اسے معاف نہیں کریں گے لیکن پہلے پتا تو چلے کہ اس کا ایسا گندہ کردار کیوں سامنے آیا ہے؟“

”اس کا کردار ہمیشہ سے ایسا ہی تھا۔ بس تمہاری آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اپنے اس اکاوٴنٹ کو بھی دیکھو جو تم نے اس کے ساتھ مل کر کھلوایا ہوا تھا۔ مجھے تو لگتا ہے اس نے اس

پر بھی ہاتھ صاف کر دیا ہو گا۔“

میں خاموش رہا۔ خاموشی ہی مناسب تھی۔

سجاول نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”شاہی! مجھے پورا یقین ہے جمعرات کے روز جو کچھ میرے گھر پر ہوا ہے، وہ بھی اسی نے کیا ہے، یہی وہ گھر کا بھیدی ہے ہم جس کی بات کر رہے تھے۔ یہ مجھے میری بیوی بچے سمیت جان سے مار دینا چاہتا تھا، کسی وقت تو لگتا ہے کہ یہ کرائے کا قاتل بنا ہوا ہے۔ کوئی لمبی رقم پکڑی ہو گی اس نے۔“

سجاول طیش کے عالم میں بولتا چلا جا رہا تھا اور می[illegible] تین ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑ رہا تھا۔

میں نے سجاول سے کہا کہ وہ ایک بار پھر داؤد بھاؤ سے رابطے کی کوشش کرے صرف وہی بتا سکتا ہے کہ وہ خبیث کیا کرتا پھر رہا ہے۔“

سجاول طیش میں تھا۔ اس نے داؤد بھاؤ کی شان میں بھی دو تین قصیدے پڑھے اور بولا۔ ”کیا پتا دونوں استاد شاگرد ہی ایک لائن پر چل پڑے ہوں۔“

”نہیں سجاول! ہر ایک کے بارے میں بدگمان ہونا ٹھیک نہیں۔ داؤد بھاؤ کچھ اور ٹائپ کا بندہ ہے۔ تم اس سے رابطے کی ٹرائی کرو۔“

”یہ تمہارا انکو شہزادہ بھی تو اور ٹائپ کا ہی تھا۔ اب دیکھو کیسے کیسے رنگ دکھا رہا ہے۔“

سجاول کی آواز میں تکلیف کی جھلک بھی تھی اور میرے اندازے کے مطابق یہ اسی زخم کی تکلیف تھی جو اسے تھوڑی دیر پہلے پارکنگ لاٹ میں انیق کی گولی سے آیا تھا۔

میں نے اس حوالے سے پوچھا تو سجاول نے چند مغلظات بولنے کے بعد بتایا کہ بچ بچاؤ ہو گیا ہے۔ گولی کلائی کے گوشت کو ادھیڑتی ہوئی گزر گئی ہے۔ گفتگو کے آخر میں سجاول کسی حد تک آمادہ ہو گیا کہ وہ دوبارہ داؤد بھاؤ کو کال ملانے کی کوشش کرتا ہے۔

اس رات کا زیادہ تر حصہ بے قراری کے عالم میں ہی گزرا۔ انیق کی صورت رہ رہ کر نگاہوں میں گھومتی تھی۔ اس کا مجھ پر جھپٹنا، پھر سخت ضربیں لگانا اور میری ضربیں سہنا۔ مجھے یاد آیا کہ جب وہ میرے قریب تھا تو اس کے منہ سے الکحل کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ وہ تو پینے پلانے سے بہت دور تھا پھر اس طرف کیسے آ گیا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اب وہ صحیح معنوں میں ایک گینگسٹر بن گیا ہے۔ ہر لذت کو جائز و ناجائز طریقے سے حاصل کرنے والا ایک ایسا شخص جو اپنے مطلب تک پہنچنے کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ مجھے تاجور سے اس کی خفیہ ملاقاتیں یاد آئیں اور وہ الفاظ میرے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیلنے لگے جو اس نے تاجور

سے کہے تھے۔

سجاول کا فون اگلے روز دس بجے کے لگ بھگ آیا۔ اس نے یہ خبر سنائی کہ بالآخر داؤد بھاؤ سے اس کا رابطہ ہو گیا ہے۔ دراصل ایک بڑے کیس میں اپنی ضمانت منسوخ ہونے کے بعد سے داؤد روپوش تھا۔

''انیق کے بارے میں کچھ پتا چلا؟'' میں نے پوچھا۔

''کچھ بھی نہیں......'' سجاول نے انیق کو پھر ایک بھاری بھرکم گالی دی۔

''کیا مطلب؟''

''داؤد کہتا ہے کہ وہ بھی اسے ڈھونڈ رہا ہے۔ جب سے گوجرانوالہ کا واقعہ ہوا ہے، اس کا کچھ پتا نہیں ہے۔ گینگ کے کسی دوسرے بندے سے بھی اس نے کوئی کنکشن نہیں کیا۔''

''اس سے کیا نتیجہ نکالا جائے؟''

''ہو سکتا ہے کہ وہ کسی دوسرے گینگ میں وڑ گیا ہو......'' فقرے کے آخر میں سجاول نے پھر انیق کی ماں بہن ایک کی۔ اس کا طیش بجا تھا۔

○......❖......○

اگلے چار پانچ روز تک میں نے فخر کے ساتھ مل کر انیق کو ڈھونڈنے کی پوری کوشش کی، سجاول اور اس کے کوئی نصف درجن کارندے بھی اسی کام میں لگے ہوئے تھے مگر اس کا کوئی کھوج کھرا نہیں ملا۔

دوسری طرف دارج داراب کے بارے میں خبر تھی کہ اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے اور کمر کی ہڈی میں بھی چوٹ آئی ہے۔ اسلام آباد کے ایک بڑے اسپتال میں وی آئی پی کی حیثیت سے اس کا علاج ہو رہا تھا۔ تاجور کی رخصتی ایک بار پھر ملتوی ہو گئی تھی۔ ہاں یہ پتا چلا تھا کہ اپنے گھر والوں کے ساتھ سکھیرا گاؤں واپس روانہ ہونے سے پہلے وہ دو راتوں تک اسپتال میں دارج کی تیمارداری کرتی رہی ہے۔ تاہم اس خبر کی پوری طرح تصدیق نہیں ہو پائی تھی۔ ہاں یہ کنفرم تھا کہ وہ اسپتال پہنچی ہے۔

مجھے یہی لگتا تھا کہ رخصتی کا ہونا یا نہ ہونا اور اپنے شوہر سے تاجور کا ملنا یا نہ ملنا سب بے معنی باتیں ہیں۔ اصل بات یہی ہے کہ وہ اپنی راہیں مجھ سے جدا کر چکی ہے اور زندگی بھر کا دکھ میری جھولی میں ڈال چکی ہے۔ میں نے آخری بار فردوس کو فون کر دیا تھا اور اسے یہ یقین دلا دیا تھا کہ اب وہ کبھی میری وجہ سے پریشان نہیں ہو گی۔ اسے یقین نہیں آیا تھا لیکن حقیقت یہی تھی کہ میں اب اسے اس کی غلطی کی مزید سزا دینا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اس کی اور اہا

کی نازیبا ویڈیو واقعی اپنے ''پن ہول کیمرے'' سے صاف کر دی تھی۔

سجاول اب پوری طرح الرٹ تھا اور میں اچھی طرح جانتا تھا کہ انیق کتنا بھی ہوشیار چالاک سہی اور اس کے دل و دماغ میں کوئی بھی فتور سہی وہ سجاول جیسے دبنگ کو آسانی سے نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ جہاں تک چچا حفیظ کا تعلق تھا، ان کی طرف سے ایک بڑی اچھی خبر مجھے مل گئی تھی۔ یہ خبر سجاول کے ذریعے ملی تھی۔ چچا، لاہور میں میرے وکیل دوست عبداللہ کے پاس حفاظت سے تھے۔ پتا یہی چلا تھا کہ انیق نے ان کی طرف سے مجرمانہ غفلت برتی تھی۔ انہیں ان کی بیماری کی پروا کیے بغیر ایک کمرے میں بند کر کے کہیں دفع ہو گیا تھا۔ وہ بڑی مشکلوں سے وہاں سے نکل پائے تھے۔ میرا دل تو چاہتا تھا کہ چچا سے ٹیلی فونک رابطہ کروں مگر عملی طور پر میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ میرے ذہن میں ایک بار پھر وہی تہلکہ تھا جو تاجور کی واپسی اور اس کے نکاح کے بعد برپا ہوا تھا۔ اسی ہلچل کے نتیجے میں، میں نے فخر سے رابطہ کیا تھا اور وہ لندن سے یہاں آ گیا تھا۔ اس نے ٹیکساری گینگ کے حوالے سے جو کلیو حاصل کیا تھا وہ غیر معمولی حیثیت رکھتا تھا۔ واٹس وائے وہ شخص تھا جسے آج سے تین چار سال پہلے ہم دیوانوں کی طرح ڈھونڈتے رہے تھے۔ ٹیکساری گینگ کا بانی ڈیرک تھا۔ واٹس وائے اس کا باکمال دست راست تھا۔ ڈیرک کے بیٹے یعنی میرے موجودہ دشمن جان ڈیرک نے ہمیشہ واٹس وائے سے خار کھائی تھی۔ تاہم اپنی زندگی میں ڈیرک نے اپنے بیٹے اور اپنے دست راست میں کسی طرح کا تصادم نہیں ہونے دیا تھا۔ اس نے اپنے بیٹے جان ڈیرک کو سمجھا کر رکھا تھا کہ واٹس وائے ان کے کالے دھندوں کے لیے کتنا اہم اور ناگزیر ہے۔ بہرحال ڈیرک کی موت کے فوراً بعد واٹس وائے اور جان ڈیرک کے سنگین اختلافات کھل کر سامنے آ گئے تھے اور پھر ان کے درمیان ایک زوردار تصادم ہو گیا تھا۔ اس تصادم میں گینگ کے کچھ اہم لوگوں نے جان ڈیرک اور کچھ نے واٹس وائے کا ساتھ دیا تھا۔ اس تصادم کی تفصیل میں آگے چل کر بیان کروں گا۔ فی الحال میرے اور فخر کے ذہن نے ایک ہی بات پر فوکس کر رکھا تھا کہ ہم کسی طرح جلد از جلد واٹس وائے اور اس کی نوعمر بیٹی تک رسائی حاصل کریں۔ فخر کی مصدقہ اطلاعات یہی تھیں کہ واٹس اور اس کی بیٹی تھائی لینڈ کے شہر بنکاک میں غیر متوقع طور پر زندہ موجود ہیں اور جان ڈیرک کی تحویل میں ہیں۔

آخر وہ دھندآلودسی صبح آ گئی جب مجھے اور فخر کو پاکستان سے پرواز کر کے بنکاک پہنچنا تھا۔ سارے سفری کاغذات تیار تھے۔ میں اپنی وقاص والی شناخت کے ساتھ سفر کرنے والا تھا۔ اس نام کا پاسپورٹ بھی میں نے کراچی میں قیام کے دوران میں ہی تیار کروالیا تھا (یہ

وہی دن تھے جب میں کرنل ڈاکٹر احرار سے اپنے چہرے میں کچھ کاسمیٹک تبدیلیاں کروا رہا تھا)

ہم اپنا مختصر سامان پیک کر رہے تھے اور میں ایک بار پھر خود کو چند سال پہلے کے اسی دور میں محسوس کر رہا تھا جب میں ایم ایم اے کے ایک چمپئن سے مار دھاڑ کی دنیا میں داخل ہوا تھا اور یورپ کے گلی کوچوں میں خونی کھیل کھیلے تھے۔ میں نے فخری سے پوچھا۔ ''بنکاک میں ٹھہرنا کہاں ہے؟''

وہ بولا۔ ''ویسے تو وہاں ایک دو بہت قابلِ بھروسا بندے موجود ہیں لیکن میں نے درمیانے درجے کے ایک ہوٹل میں بکنگ کروائی ہے۔ ہم جتنا الگ تھلگ رہیں گے اتنا ہی ہمارے لیے بہتر ہوگا۔''

''پلاننگ کیا ہے؟ جاتے ساتھ ہی ایکشن لینا ہے یا پھر ''ریکی'' وغیرہ ہوگی؟''

''جانِ جگر! ہم نے خودکشی نہیں فرمانی، ذرا دیکھ بھال کر قدم اٹھانا ہوگا۔ وہ خطروں کا شہر ہے اور ہمارا واسطہ خطرناک ترین لوگوں سے ہے۔'' فخر نے نفرت سے ایک طرف تھوکا اور سرسراتے لہجے میں بولا۔ ''ٹیسٹ ٹیوب شیطان۔ ایک جیسی شکلوں والی وہ قاتل مشینیں۔ یقین کرو شاہ زیب! کسی وقت تو دل چاہتا ہے کہ یہ سارے ہم شکل جانور ایک جگہ اکھٹے ہوں اور میں اپنے اس پیکر ناتواں پر ہزار ہزار پونڈ کے چار پانچ بم باندھ کر ان کے درمیان گھس جاؤں اور بلاسٹ کرلوں اپنی ذات شریف کو۔''

وہ ڈیتھ اسکواڈ کی بات کر رہا تھا اور اس کے دلی جذبات کو سمجھنا میرے لیے کچھ مشکل نہیں تھا۔ فخر نے اب تک والش وائے کے بارے میں جو معلومات اکٹھی کی تھیں، ان کے مطابق یہی کنفرم ہوا تھا کہ والش وائے کو بنکاک کے ایک نواحی علاقے میں اس کی خوبرو بیٹی سمیت رکھا گیا ہے اور اس کی حفاظت ڈیتھ اسکواڈ کے لوگ کر رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ ڈیتھ اسکواڈ کے سرمنڈھے شیطانوں سے ایک بار پھر ہمارا سامنا ہونے والا ہے۔

''تم نے ایک دن والش وائے کی کسی تصویر کا ذکر کیا تھا؟'' میں نے کہا۔

''اوہ ہاں۔'' فخر چونک کر بولا اور اپنے سفری بیگ کو پھر سے کھولنے لگا۔ اس نے ایک اندرونی خانے میں رکھی ہوئی تین کارڈ سائز تصویریں نکالیں اور کہنے لگا۔ ''یہ زیادہ صاف تو نہیں ہیں لیکن والش کو تم پہچان لو گے۔''

میں نے تصویریں دیکھیں۔ وہ واقعی غیر واضح تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ بہت دور سے ''زوم'' کر کے اتاری گئی ہیں۔ یہ کسی قلعہ نما جگہ کا احاطہ تھا۔ اونچی دیواریں، چند برجیاں اور

مخروطی چھتیں دکھائی دیتی تھیں۔ دو تصویروں میں تو بس درختوں اور ایک دو ہیولوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ تاہم تیسری تصویر بہتر تھی۔ اونچی دیوار کے ساتھ ایک گراسی لان دکھائی دیتا تھا۔ نیم گنجے سر والا ایک درمیانی عمر کا شخص ایک نیٹ کے پاس کھڑا تھا۔ یہ بیڈمنٹن یا پھر والی بال کا نیٹ تھا۔ اس نے ٹریک سوٹ پہن رکھا تھا، اس کی دائیں سائیڈ نظر آرہی تھی۔ میری رگوں میں خون سنسنا اٹھا۔ دل نے پکار کر کہا کہ یہ والٹس وائے ہی ہے۔ وہی جس کو آج بھی ٹیکساری گینگ کے کچھ لوگ شدت سے یاد کرتے تھے اور اسے اپنا اصل باس سمجھتے تھے۔ وہ پہلے سے کچھ کمزور ہو چکا تھا لیکن ڈیل ڈول اب بھی رعب دار تھا۔ اس کے ساتھ سنہری بالوں والی دس گیارہ سال کی ایک بچی تھی جس نے گود میں ایک بلی اٹھا رکھی تھی۔ لڑکی نیکر اور ہلکی پھلکی شرٹ میں تھی۔ اس کی شکل تصویر میں زیادہ واضح نہیں تھی۔

''یہی بچی ہے؟'' میں نے فخر سے پوچھا۔

فخر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''جس وقت والٹس وائے منظر سے اوجھل ہوا تھا، اس بچی کی عمر شاید چھ سات سال ہوگی۔ اس کی ماں کے بارے میں تو یہی خیال ہے کہ اسے ڈیرک نے جان سے مار ڈالا تھا۔''

میں نے تصویر کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ اتاری کہاں سے گئی ہے؟''

''بس یہی سمجھو کہ ہمارا ایک ہونہار شوٹر اپنی جان پر کھیلا ہے۔''

''ہیلی کاپٹر کا کام لگ رہا ہے؟''

فخر نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے تصویریں اسے واپس دے دیں جن کو اس نے احتیاط سے سنبھال لیا۔

اگر یہ واقعی والٹس وائے تھا تو پھر یہ ایک بہت بڑی خبر تھی اور اس سے بھی بڑی اور عجیب خبر یہ تھی کہ وہ ابھی تک اپنی بیٹی سمیت زندہ تھا۔ اسے زندہ کیوں رکھا گیا تھا۔ اس کا زندہ رہنا کسی طور بھی جان ڈیرک اور اس کے گینگ کے مفاد میں نہیں تھا۔

○......❖......○

وہ بنکاک کی ایک جگمگاتی ہوئی شام تھی جب ہمارا بوئنگ طیارہ ائیرپورٹ پر اترا۔ تھائی لینڈ کا دارالحکومت بنکاک، روشنیوں رنگوں اور دلربا نازنینوں کا شہر۔ جہاں ہر موڑ پر قاتلان ہوش وخرد اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ مستعد نظر آتے ہیں۔ جہاں عشرت کدوں میں شب وروز جسموں کے سودے ہوتے ہیں۔ جواخانوں میں دنیا کے مانے ہوئے جواری اپنے جوہر دکھاتے ہیں اور کرۂ ارض کے گوشے گوشے سے ہر قوم کے سیلانی اپنی جیبوں میں ڈالر اور

یورو ٹھونس کر زندگی کا لطف اٹھانے کے لیے کھچے چلے آتے ہیں۔ اس شہر سے میری کئی یادیں وابستہ تھیں۔ یہاں کے ان بھکشوؤں اور بدؤھوں سے بھی میرا واسطہ پڑ چکا تھا جو یوں تو چوبیس گھنٹے امن و آشتی کا پرچار کرتے ہیں لیکن جب خونریزی پر آتے ہیں تو بڑوں بڑوں کو پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔

ہمارا قیام ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں تھا۔ میں اس ہوٹل میں ایک بار پہلے بھی ٹھہر چکا تھا۔ یہاں کی فضا بڑی مانوس سی تھی، ''سیکس ورکرز'' یہاں تتلیوں کی طرح منڈلاتی پھرتی تھیں اور ہر مسکراہٹ میں بس ایک ہی دعوت تھی۔ زندگی حسین ہے اور بس ''آج کی رات'' ہی ہے اس لیے آجاؤ۔

کانٹی نینٹل ڈنر کرنے کے بعد میں اور فخر نکل کھڑے ہوئے۔ ہماری منزل بنکاک کے مرکزی علاقے میں ایک مشہور کیسینو تھا جسے ''بلیک مون'' کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ فخر کو یہاں ایک وجے نامی انڈین سے ملنا تھا۔ وجے ٹیکساری گینگ کا ایک اہم رکن رہا تھا مگر جان ڈیرک کی طرف سے اس کی کچھ ایسی تذلیل ہوئی تھی کہ وہ اپنی وفاداریاں برقرار نہیں رکھ سکا تھا۔ درحقیقت یہی وجے نامی لڑکا تھا جس کی مدد سے فخر نے والٹس وائے کا سراغ حاصل کیا تھا۔ اب ہم بلیک مون میں اسی وجے سے ملنے جارہے تھے۔ وجے سے رات گیارہ بجے کا وقت طے تھا۔ جوا خانے میں اس کی موجودگی کنفرم کرنے کے لیے فخر اسے مسلسل کال کر رہا تھا لیکن رابطہ نہیں ہو پا رہا تھا۔

''کیا چکر ہے؟'' میں نے فخر سے پوچھا۔ ہم ایک ٹیکسی کار میں سفر کر رہے تھے۔

''کچھ زیادہ پی گیا ہوگا۔ آج کل گلاس استعمال نہیں کرتا بوتل سے منہ لگاتا ہے۔''

''پھر ٹرائی کرو۔'' میں نے کہا۔

فخر پھر رابطے کی کوشش کرنے لگا۔ ٹیکسی بنکاک کی جگمگاتی سڑکوں پر سے گزر رہی تھی۔ سیاحوں کی ٹولیاں دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ ہم فار ایسٹ میں نہیں یورپ میں گھوم رہے ہیں۔

اسی دوران میں ہم کیسینو کی شاندار سہ منزلہ عمارت کے سامنے پہنچ گئے۔ فخر نے کہا۔ ''ممکن ہے وہ اندر ہی ہو۔ ڈائننگ ہال میں بارہ نمبر میز اس کے لیے ہمیشہ ریزرو رہتی ہے۔ شاید وہیں بیٹھا ہو۔''

''تم کیوں نہیں جاؤ گے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہاں کوئی شناسا بھی موجود ہوسکتا ہے۔ تمہاری بات اور ہے، تمہیں تو شاید خود تمہارے والدین بھی نہ پہچان سکیں۔''

''او کے، تم اپنا فون ہاتھ میں رکھو۔ میں اندر جاتا ہوں۔''

میں ٹیکسی کار سے نکلا اور لمبے ڈگ بھرتا ہوا کیسینو کی طرف بڑھا۔ آج ایک مدت بعد میں خود کو پھر اسی خاص موڈ میں محسوس کر رہا تھا جو مجھے خطرات سے بے نیاز کرتا تھا اور میرے اندر کچھ ایسے انگارے بھرتا تھا جن کی تپش سے میرے قرب و جوار جھلسنے لگتے تھے، یہ میرا جانا پہچانا ماضی تھا۔

میں براؤن پینٹ اور سیاہ جیکٹ میں ملبوس تھا۔ میں کیسینو کے پُرشور ماحول میں داخل ہوا۔ دھواں، شراب، پُرمسرت قہقہے، آوازے، ہیجان خیز لباسوں میں چکراتی ہوئی لڑکیاں جو موسیقی کی تیز لہروں میں ڈوب ابھر رہی تھیں۔ فخر کی معلومات کے مطابق میں نے جلد ہی میز نمبر بارہ تلاش کر لی۔ میز خالی تھی مگر اس کے اردگرد کچھ لوگ جمع تھے۔ ان کے چہرے دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ کچھ عجیب سی سنسنی محسوس کر رہے ہیں۔ میں نے ذرا آگے جا کر دیکھا۔ میز پر ایک تھائی اور ایک دو انگلش اخبار پڑے تھے۔ یہ شام کے اخبارات تھے۔ ایک اخبار کی ہیڈ لائن اور تصویر دیکھ کر میں چونکا ہیڈ لائن کچھ اس طرح تھی۔ ''بدنام انڈین گینگسٹر وجے پرکاش آج سہ پہر اپنے بیڈروم میں مردہ حالت میں پایا گیا۔''

ذیلی سرخی اس طرح تھی۔ ''وجے کو بے دردی سے قتل کیا گیا ہے۔ لاش بری طرح مسخ ہے۔ یہ گینگ وار کا شاخسانہ لگتا ہے۔ بنکاک پولیس تیزی سے مصروف تفتیش ہے۔''

یہ بڑی اہم لیکن بڑی مایوس کن خبر تھی۔ اب یہ بات بھی سمجھ میں آ رہی تھی کہ دو گھنٹوں سے مسلسل کوشش کے باوجود فخر کا رابطہ اپنے اس انفارمر دوست سے کیوں نہیں ہو پایا۔ وہ بے چارہ عدم آباد سے فون کیسے سن سکتا تھا۔ میں نے واپس جانے کا سوچا۔ مجھے معلوم تھا کہ فخر کے لیے یہ اطلاع کافی حوصلہ شکن اور تشویشناک ثابت ہوگی۔ وہ شخص جو ٹیکساری گینگ کی اندرونی خبر فخر تک پہنچانے کا ذمے دار تھا، اس قدر بے دردی سے مار دیا گیا تھا۔ عین ممکن تھا کہ اسے قتل کیے جانے کی کوئی اور وجہ ہو مگر وہ ''ذریعہ'' تو ختم ہو گیا تھا جو واٹس وائے تک پہنچنے میں ہماری مدد کر سکتا تھا۔

میں واپس جانے کے لیے مڑا تو ایک منظر دیکھ کر ذرا چونکا۔ واپسی کا دروازہ کچھ عجیب طرز کا تھا۔ اس کی شکل مخروطی تھی اور اس میں سے ذرا جھک کر گزرنا پڑتا تھا۔ یہ دراصل ایک تھائی حسینہ کا مجسمہ تھا۔ اس کی نیم عریاں ٹانگوں کو دروازے کی شکل دی گئی تھی۔ وہ بڑے طمطراق سے سینہ تانے کھڑی تھی۔ ایک ٹانگ سیدھی تھی، دوسری کو تھوڑا سا خم دے رکھا تھا۔ وہ بڑے مغرورانہ انداز میں ہال کی طرف دیکھ رہی تھی اور جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہی تھی۔

اگر باہر جانا ہوتو میری ٹانگ کے نیچے سے نکل کر جاؤ۔ کیسینو سے باہر نکلنے والے بلاتر دد اس کی ٹانگ کے نیچے سے گزر رہے تھے۔

مجھے یہ سب کچھ عجیب اور توہین آمیز لگا۔ میں باہر نکلنے کے لیے اس دوسرے دروازے کی طرف بڑھا جو پاس ہی واقع تھا۔ وہاں سوجی سوجی آنکھوں والا ایک تنومند گارڈ کھڑا تھا۔ اس نے مجھے روکا اور مجسمے کی ٹانگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انگلش میں بولا۔ ''وہ دروازہ۔''

''اس دروازے سے کیوں نہیں؟'' میں نے بھی تنک کر پوچھا۔

''یہ وی آئی پیز کے لیے ہے، اُدھر جاؤ۔'' وہ غنڈوں کے انداز میں سرسراتے لہجے میں بولا۔

میں بھی تپا بیٹھا تھا۔ اسُ کے انداز نے مجھے اور بھڑکا دیا۔ میں اسے ایک ہاتھ سے دھکیلتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ ابھی میں نے دروازے کے ہینڈل کو گھمایا ہی تھا کہ وہ دھاڑا۔ ''او، سنا نہیں تم نے۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے مجھے کالر سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ میں نے بھنا کر الٹے ہاتھ کا تھپڑ اس کے منہ پر جڑا۔ وہ دو تین قدم پیچھے ہٹا اور پھر تیر کی طرح میری طرف آیا۔ دو افراد تیزی سے ہم دونوں کے درمیان آ گئے۔ وہ بھی اپنے حلیے سے گارڈ ہی دکھائی دیتے تھے۔ ان میں سے ایک سینئر تھا۔ اس نے میری طرف بڑھنے والے گارڈ کو بمشکل روکا اور تھائی زبان میں اس سے کچھ پوچھا۔ جونہی اس شخص نے جواب دیا، تینوں گارڈ بغیر کچھ کہے سنے مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ میرے اندر بھی بہت دنوں سے آگ جمع ہو رہی تھی۔ ایک دو چوٹیں کھا کر میں سنبھلا اور پھر...... ان کی شامت آ گئی۔ بہت دنوں بعد میرے اندر وہی بے رحمی نمودار ہوئی تھی جو مار کٹائی میں میرے حریفوں کو دہشت زدہ کر دیا کرتی تھی۔

ایک دم کیسینو میں ہلچل نظر آئی۔ کئی آوازے بلند ہوئے۔ اردگرد موجود لڑکیاں چلاتی ہوئی پیچھے ہٹ گئیں۔ ایک گارڈ کے سینے پر میری زوردار ٹھوکر لگی اور وہ دو تین کرسیاں الٹاتا ہوا حسینہ کے نو دس فٹ اونچے مجسمے کے قدموں میں جا گرا۔ جب اپنے ساتھیوں کی درگت بنتے دیکھی تو دو اور گارڈ اس لڑائی میں کود پڑے۔ ان میں سے ایک کو تو فوراً اپنی کلائی کی ہڈی کا کڑاکا سنائی دے گیا۔ دوسرا جو چاقو نکالنے کے چکر میں تھا میرے کندھے کے اوپر سے ہوتا ہوا ایک طویل میز پر گرا اور کئی پیمانے اور بوتلیں چکنا چُور کر گیا۔ ڈیڑھ دو منٹ کی اس تیز رفتار لڑائی میں کیسینو کے زخمی گارڈز میں سے کوئی ایک بھی مجھے قابلِ ذکر چوٹ نہیں لگا سکا۔

اچانک کئی رائفل بردار باوردی افراد میرے اور لڑنے والوں کے درمیان آ گئے۔ پہلے تو لگا کہ

شاید پولیس والے ہیں لیکن ایسا نہیں تھا۔ یہ اس جوا خانے کی ہی پرائیویٹ سکیورٹی تھی۔ مجھے کئی باوردی افراد نے اپنے حفاظتی حصار میں لے لیا۔ تب لاؤڈ اسپیکر پر ایک آواز میرے کانوں میں گونجی کسی نے تھائی زبان میں اور تحکمانہ لہجے میں کچھ کہا۔

مجھ پر حملہ آور ہونے والے افراد اپنی چوٹیں سہلاتے اور خون پونچھتے ہوئے پیچھے ہٹ گئے جس شخص کی کلائی ٹوٹی تھی، اس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ اس کی ناک سے بھی خون نکسیر کی طرح چھوٹ رہا تھا۔ میں نے غور کیا تو پتا چلا کہ جو شخص اسپیکر پر حکمیہ انداز میں بولا تھا، وہ بلندی پر واقع ایک گیلری میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس گیلری کے تین اطراف میں شیشہ تھا۔ وہ شخص وہاں سے سارے ہال پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ یقیناً اس نے میری اور گارڈز کی لڑائی بھی دیکھی تھی۔

باوردی افراد میں سے ایک نے مجھ سے تھائی میں کچھ کہا۔ جب میں سمجھ نہیں پایا تو وہ شکستہ انگلش میں بولا۔ ”باس، تم کو اوپر گیلری میں بلا رہے ہیں۔ تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔“

میں نے اکھڑپن سے کہا۔ ”وہ تمہارا باس ہوگا، میرا نہیں۔ اس سے کہو کہ نیچے آ کر بات کرلے۔“

گیلری میں بیٹھے ہوئے شخص تک میری آواز نہیں پہنچی تھی لیکن شاید اس نے میرے انداز سے ہی بھانپ لیا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ اس نے اپنے آدمیوں کو ہاتھ سے کچھ اشارہ کیا اور پھر میں نے اسے نشست سے اٹھتے ہوئے دیکھا۔ اس کے ساتھ کوئی دراز قد لڑکی تھی۔ جب وہ دونوں بارعب انداز میں شیشے کی بنی ہوئی سیڑھیوں پر پاؤں رکھتے نیچے آئے تو مجھے پتا چلا کہ منی اسکرٹ میں دراز قد لڑکی یقیناً وہی حسینہ ہے جس کا مجسمہ ہال کے خارجی دروازے پر نصب ہے۔ اس کے ساتھ چوڑے شانوں اور کسرتی جسم والا ایک تھائی تھا۔ اس کی عمر پچیس چھبیس سال رہی ہوگی۔ اس کا چہرہ دہکے ہوئے تنور کی طرح سرخ تھا۔ وہ میرے عین سامنے کھڑا ہوا اور انگلش میں بولا۔ ”لگتا ہے پاکستانی ہو۔ بہت گرمی ہے تمہارے اندر۔“

”تم نے تھوڑی سی دیکھی ہے۔ زیادہ ابھی تمہاری نظروں میں نہیں آئی۔“

اس نے مجھے سرتاپا دیکھ کر کہا۔ ”مکس مارشل آرٹ بھی کرتے ہو؟“

”بس کوشش کرتا ہوں۔“

”تو...... تھوڑی سی اور کوشش کرلو۔“

''کیا مطلب؟''

''مطلب بھی بتا دیتا ہوں۔'' اس نے کہا اور اپنی ساتھی حسینہ کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ وہ بھی مسکرائی اور ساتھ ہی بے باکی سے مجھے آنکھ ماری۔ وہ بڑی دبنگ قسم کی لڑکی تھی۔ مقامی خدوخال رکھنے کے باوجود اس میں کشش محسوس ہوتی تھی۔

نوجوان باس نے مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ ''اتنا اچھا لڑتے ہو، لگتا ہے کہ مقابلوں میں بھی حصہ لیتے ہو گے؟''

''میں یہاں تمہیں انٹرویو دینے کے لیے نہیں آیا ہوں۔ اور نہ ہی تم جیسے ڈرائنگ روم بدمعاشوں کو انٹرویو دینا مجھے پسند ہے۔ میرا وقت ضائع مت کرو۔'' میں نے کہا اور اسی دروازے کی طرف قدم بڑھائے جہاں سے گزرنے سے مجھے روکا گیا تھا۔

''ٹھہرو نوجوان۔'' باس نے تحکم سے کہا۔

میں رک گیا اور مڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگا، وہ بولا۔ ''اب بات بڑھ گئی ہے سویٹ ہارٹ! تمہیں نکلنا تو اسی دروازے سے پڑے گا۔''

''اور میں اس دروازے سے نہیں نکلوں گا۔''

وہ اطمینان سے بولا۔ ''تو پھر مجھے اپنے اس ہال کی کرسیوں میزوں اور کراکری کا نقصان قبول نہیں۔ ایک ایک میز پر ہزاروں ڈالرز کی تو صرف کراکری ہی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''ادھر لان میں آ جاؤ۔ وہاں ہم نے زور آزمائی کرنے والوں کے لیے باقاعدہ RING بنا رکھا ہے۔''

''یعنی لڑنا چاہتے ہو مجھ سے؟'' میں نے پوچھا۔

''تمہاری اتنی اوقات تو نہیں مگر ابھی تھوڑی دیر پہلے تم سے جو کارکردگی ''سرزد'' ہوئی ہے، اس کی سزا دینے کو دل چاہتا ہے۔''

میں اس شخص کی شکل اور لب و لہجے پر غور کر رہا تھا۔ مجھے شک ہو رہا تھا کہ میں نے اسے ایم ایم اے کے انٹرنیشنل مقابلوں میں کہیں دیکھا ہے۔ لگ رہا تھا کہ شاید اس کی کوئی اہم فائٹ بھی میری نظر سے گزری ہے۔

میں نے اس کا نام پوچھا تو وہ بولا۔ ''نام میں کیا رکھا ہے سویٹ ہارٹ! اصل چیز تو کام ہوتا ہے۔ میں نے تمہارا کام دیکھا ہے نام نہیں دیکھا، تم بھی میرا کام دیکھ لو اور اگر کام پسند آ جائے تو پھر میرے بتائے ہوئے دروازے میں سے نکل کر باہر چلے جانا۔''

''اگر جا سکو تو۔'' ہجوم میں سے کسی نے فقرہ کسا۔ (مطلب یہی تھا کہ شاید تم اس قابل ہی نہ رہو کہ اپنے پاؤں پر چل کر نکل سکو)

میرے اندر کا فائٹر بھی آج جاگا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ میرا ماضی بتدریج مجھ میں واپس لوٹ رہا ہے۔ رگ پٹھوں میں ایک برق سی چل رہی تھی۔

قریباً دس منٹ بعد میں نوجوان باس کے ساتھ باہر ایک خوب صورت لان میں تھا۔ یہاں ایک جدید رنگ کے اوپر گول شامیانہ تنا ہوا تھا۔ اردگرد بہت سی کرسیاں اور صوفے وغیرہ رکھے تھے۔ یہ پورا حصہ برقی قمقموں سے جگمگا رہا تھا تھائی لینڈ میں موسم زیادہ سرد نہیں تھا۔ بلکہ بنکاک میں دوپہر کے وقت گرمی ہو جاتی تھی۔ میں نے اس وقت بھی سفید قمیص اور براؤن پتلون پہن رکھی تھی۔ لباس کی مناسبت سے ٹائی بھی لگا رکھی تھی۔ وانگ نے میری ٹائی کو پکڑ کر ہلکا سا کھینچا۔ مطلب یہ تھا کہ میں اسے اتار دوں۔

میں نے نہ صرف ٹائی اتار دی بلکہ جیکٹ اور قمیص بھی اتار دی۔ وانگ نے بھی اپنے بالائی جسم کو کپڑوں سے آزاد کر دیا۔ اس کے ایک کندھے پر ڈریگن کا بڑا سا ٹیٹو تھا۔ ڈریگن نے اپنے بل کھاتے جسم میں ایک عریاں لڑکی کو کسا ہوا تھا مگر لڑکی کے چہرے پر تکلیف کے بجائے خوشی کے آثار نظر آتے تھے۔ وانگ کے جسم کو دیکھ کر ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ ایک سخت حریف ثابت ہو گا۔ اس کے ساتھ ہی یہ پتا بھی چل گیا کہ وہ ایم ایم اے کے ''رِنگ'' سے دور نہیں ہے اور مسلسل پریکٹس کرتا رہتا ہے۔ میرا منفی پوائنٹ یہ تھا کہ میں چیمپئن ہونے کے باوجود طویل عرصے سے رِنگ اور فائٹنگ سے دور تھا۔

اچانک میری نظر رِنگ کے فرش پر پڑی اور میں چونک گیا۔ رنگ کے فرش کو عجیب طریقے سے ڈیزائن کیا گیا تھا۔ پورے فرش پر ایم ایم اے کے جانے پہچانے فائٹرز کی تصویریں تھیں۔ یہ تیس کے قریب تصویریں تو ہوں گی۔ یہ کسی طرح کا ''ریگ زین'' تھا جو ''رِنگ'' کے فرش پر منڈھا ہوا تھا۔ تصویریں اسی پر پرنٹ تھیں۔

میں نے کہا۔ ''یہ کیا ہے؟''

وانگ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''یہ وہ سارے گھوڑے ہیں جن پر میں نے سواری کی ہے۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''ان سب کو ناکوں چنے چبوائے ہیں میں نے اور ہرایا ہے۔''

میں نے پھر تصویروں کو دھیان سے دیکھا۔ اپنی جیت کو یادگار بنانے کا یہ بڑا بھونڈا اور

توہین آمیز طریقہ تھا۔ وہ اس رنگ میں ان فائٹرز کو اپنے پاؤں تلے روندتا تھا اور خوشی محسوس کرتا تھا۔ ان میں سے کئی چہرے میرے جانے پہچانے تھے۔ اٹلی کا روسو، جاپان کا وائی کنگ، ہالینڈ کا جمی ٹف اور اسی طرح کے اور لوگ۔ اچانک میری حیرت کئی گنا بڑھ گئی۔ ایک طرف میری تصویر بھی موجود تھی۔

میں نے پوچھا۔ ''یہ کون ہے؟''

وانگ مسکرایا اور اس کی چھوٹی آنکھیں مزید چھوٹی ہو گئیں۔ ''ایسٹرن کنگ۔ نام سنا ہوگا تم نے۔ یورپی چمپئن بھی بنا تھا۔''

''یہ تو بہت جانا پہچانا بندہ ہے۔''

''بندہ ہے نہیں...... بندہ تھا۔ مر چکا ہے۔ ٹائیں ٹائیں فش۔ لگتا ہے تمہاری معلومات زیادہ وسیع نہیں ہیں۔''

''اسے بھی ہرایا تھا تم نے؟'' میں نے دریافت کیا۔

''تمہیں کوئی شک ہے؟''

میں نے گہری سانس لی۔ وہ شک کی بات کر رہا تھا اور مجھے پورا یقین تھا ہارنا تو دور کی بات ہے، میں اس تھائی لینڈر سے کبھی نہیں لڑا تھا۔ وہ بکواس کر رہا تھا۔

ویسے اب مجھے تھوڑا تھوڑا اس کا حدود اربع یاد آ رہا تھا۔ جرمنی میں ہونے والے ایک بڑے ایونٹ میں یہ شاید تھائی لینڈ کی ٹیم کا کپتان تھا۔

میں نے کہا۔ ''مسٹر وانگ میں نے ایسٹرن کنگ کے بڑے چھوٹے قریباً سارے ہی مقابلے دیکھے ہیں۔ ایک دو مقابلوں کے سوا وہ کبھی ہارا نہیں تھا اور تمہارے ساتھ تو اس کا کوئی مقابلہ مجھے یاد نہیں آ رہا۔''

''ہو سکتا ہے کہ یہ کوئی پرائیویٹ مقابلہ ہو۔'' وہ عیاری سے بولا۔

''ایسے مقابلوں کی بھی وڈیوز تو بنتی ہی ہیں اور میڈیا...... سوشل میڈیا پر بھی آتی ہیں۔''

اس نے اپنی ساتھی حسینہ کے سیاہ بالوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے کے بعد میری طرف توجہ دی اور قدرے سنجیدگی سے بولا۔ ''میں نے ایک مرتبہ اسے مقابلے کا چیلنج کیا تھا اور اس نے قبول نہیں کیا تھا۔ میں اسے اس کی ہار ہی سمجھتا ہوں۔''

''بہت خوب، کسی کو ہرانے کا یہ بڑا آسان طریقہ ہے...... اور اب تم خود کو فاتح سمجھ کر اس کی تصویر کو بھی دوسروں کے ساتھ پاؤں تلے روند رہے ہو؟''

''لیکن گھبراؤ مت۔ میں تمہاری تصویر یہاں نہیں لگاؤں گا۔ تمہاری یہ اوقات نہیں

ہے۔'' اس نے انگلیوں کے پٹاخے نکالتے ہوئے کہا۔اس کے ساتھ ہی وہ جمپ لگا کر رنگ میں داخل ہو گیا۔

میں نے بھی اپنی قمیص ایک طرف رکھی۔ٹائی پتلون کی جیب میں ڈالی اور جست بھر کر رنگ میں آ گیا۔وانگ نے جوتا پہن رکھا تھا مگر میں نے تسمے کھول کر اپنے بوٹ اتار دیئے اور کچھ نہیں تو یہ نامی گرامی فائٹرز کم از کم میرے جوتوں تلے تو نہ آتے۔اردگرد بہت سے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ جوا خانے کے دونوں ہال تقریباً خالی ہو گئے تھے۔کچھ لوگ کرسیوں اور صوفوں پر بیٹھ گئے تھے، کچھ کھڑے تھے اور بڑی مشتاق نگاہوں سے ''رنگ'' کی طرف دیکھ رہے تھے۔ان کی نظروں میں میرے لیے رحم کی جھلک تھی، جیسے وہ یقین کیے بیٹھے ہوں کہ اس تھائی لینڈر چمپئن نے میری ایک دو ہڈیاں توڑ دینی ہیں۔میں نے سوچا ان میں سے کئی ہوں گے جو مجھے ایسٹرن کی حیثیت سے بہت اچھی طرح جانتے ہوں گے، میرے پرستار ہوں گے لیکن وہ بے خبر تھے کہ میں آج رات ان کے درمیان موجود ہوں۔

اسی اثنا میں میرے موبائل پر کال کے سگنل آنے لگے۔ میں نے پینٹ کی جیب میں سے موبائل نکالا۔حسبِ توقع یہ میرے دوست فخر کی کال ہی تھی۔ وہ بولا۔''کیا بات ہے، اندر جا کر چپک ہی گئے ہو،کوئی لڑکی تو نہیں چمٹ گئی؟''

''لڑکی تو نہیں ایک لڑکا چمٹ گیا ہے۔اس سے تھوڑی سی گفتگو کر کے آتا ہوں۔'' میں نے ''گفتگو'' پر زور دیتے ہوئے کہا۔

وہ چونک گیا۔''کوئی مار کٹائی والا معاملہ تو نہیں۔ اگر ہے......تو اس خاکسار کو بے خبر نہ رکھنا۔''

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ خاکسار اپنی جگہ پر ہی رہے اور انتظار کرے۔ میں ابھی تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔''

''آپ جس کام کے لیے تشریف لے کر گئے تھے،اس کا کیا بنا؟'' اس کا اشارہ اپنے انفارمر وجے کی طرف تھا۔

میں نے تفصیل میں جانا مناسب نہیں سمجھا۔ میں نے کہا۔''وہ یہاں نہیں ہے۔ میں ابھی آ کر تمہیں بتاتا ہوں لیکن تم اندر نہیں آنا۔'' میں نے فون بند کر دیا۔

تھوڑی ہی دیر میں باقاعدہ مقابلے کا ماحول پیدا ہو گیا۔شائقین چاروں رف موجود تھے۔ان میں چند سفید فام بھی نظر آ رہے تھے۔ایک ہٹا کٹا امریکن ان میں نمایاں دکھائی دیتا تھا۔ وہ اپنی بغل میں بیٹھی ہوئی مقامی لڑکی سے جس طرح کی حرکات کر رہا تھا، وہ سکہ بند

امریکن ہی کرتے ہیں۔

ایک پروفیشنل ریفری بھی ''رنگ'' میں آچکا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے ہال میں جن گارڈز کی پھینٹی لگائی تھی، ان کے تعلقات شاید اس ریفری سے زیادہ اچھے نہیں تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ مجھے ستائشی نظروں سے دیکھ رہا تھا، مگر اس ستائش میں رحم کی جھلک بھی تھی۔ دوسروں کی طرح یقیناً اس کو بھی یقین تھا کہ میں نے حسینہ کی ٹانگوں کے نیچے سے نہ نکل کر بڑی غلطی کی ہے اور اب مجھے اس سے کہیں زیادہ توہین برداشت کرنا پڑے گی۔

مقابلہ شروع ہوا۔ میرا انداز درست تھا۔ وانگ ایک نہایت خطرناک فائٹر تھا لیکن میں پہلے منٹ میں ہی اس کی ایک اہم کمزوری سمجھ گیا۔ وہ اپنے بائیں پاؤں کا استعمال بہت کم کرتا تھا۔ اس کی وجہ کوئی پرانی چوٹ ہوسکتی تھی یا پھر کچھ فائٹر عادتاً بھی اپنی کسی ٹانگ یا بازو کو کم استعمال کرتے ہیں۔ اس کی اس کمزوری کو جانچنے کے بعد اس کے خلاف اپنا دفاع کرنا میرے لیے آسان ہوگیا۔ آؤٹ آف پریکٹس اور اپنی پوری فارم میں نہ ہونے کے باوجود میں نے اسے تگنی کا ناچ نچا دیا۔ میں زیادہ تر اپنا دفاع ہی کررہا تھا لیکن کبھی کبھی چوٹ بھی لگا جاتا تھا۔ وانگ کی حیرت بڑھتی جارہی تھی۔ اسے مجھ سے ایسی کارکردگی کی توقع ہرگز ہرگز نہیں تھی۔ جوں جوں اس کی حیرت بڑھ رہی تھی، اس کی جھلاہٹ میں بھی اضافہ ہورہا تھا۔

دوسرا راؤنڈ شروع ہوا تو اس کی جھلاہٹ شدید غصے میں بدلنے لگی۔ فائٹر جب شدید غصے میں ہوتا ہے تو اس پر دو طرح کے اثرات پڑتے ہیں۔ ایک اثر منفی ہوتا ہے اور دوسرے کو کسی حد تک مثبت کہا جاسکتا ہے۔ فائٹر کے لیے منفی اثر تو یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنا ڈیفنس فراموش کردیتا ہے اور اکثر فاؤل کھیلتا ہے۔ مثبت اثر یہ ہوسکتا ہے کہ اس کی ضرب میں اضافی توانائی آجاتی ہے۔ وانگ پر بھی منفی اور مثبت دونوں اثرات ظاہر ہو رہے تھے۔

اس کے ایک طوفانی مکے سے بچ کر میں نے اس کی پسلیوں میں اپنے بائیں پاؤں کی کک رسید کی۔ اس نے غیر معمولی پھرتی سے میری ٹانگ دبوچ لی اور ہم اوپر نیچے گرے۔ اس کے سپورٹرز نے قیامت خیز شور بلند کیا لیکن وانگ کے فاؤل کو نوٹ کرتے ہوئے دراز قد ریفری نے اسے اور مجھے جدا کردیا۔

''مار ڈالوں گا تجھے۔'' وانگ خوفناک لہجے میں بولا اور تند بگولے کی طرح میری جانب آیا۔ اب وہ بے طرح ہانپ رہا تھا۔

اس نے مجھے گراؤنڈ کرنے کے لیے پورا زور لگایا مگر میں نے اس کی کوشش کامیاب نہیں ہونے دی۔ اس ناکامی نے اس کی حیرت اور وحشت میں زبردست اضافہ کیا۔ شاید یہ

بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ ایک گمنام فائٹر اس طرح سے اور یوں مسلسل اس کی مزاحمت کرسکتا ہے۔ اس کا غرور اس کے سیکڑوں حمایتیوں کے سامنے لرزنا شروع ہو گیا تھا۔ وہ چنگھاڑ رہا تھا اور تڑپ تڑپ کر میری طرف آ رہا تھا۔ اچانک اس کا ایک تہلکہ خیز گھونسا میرے جبڑے پر لگا اور مجھے تارے نظر آ گئے۔ میں ڈگمگا کر رنگ کی جالی سے ٹکرایا۔ اور تب میں نے سوچا کہ مجھے اس کھیل کو مزید طول نہیں دینا چاہیے۔ وحشت میں لگائی ہوئی حریف کی کوئی ضرب مجھے غیر متوقع نقصان بھی پہنچا سکتی تھی۔ جونہی مجھے موقع ملا، میں نے اس کی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے بائیں پاؤں پر اپنے پاؤں کی جچی تلی چوٹ لگائی۔ وہ بری طرح لڑکھڑایا اور اپنے بائیں گھٹنے پر گرا۔ میں نے لپک کر اسے دبوچ لیا اور گھوم کر اس کی پشت پر آ گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ میں کیا کرنے والا ہوں۔ اس نے بڑی تیزی سے ہاتھ پاؤں چلائے مگر اب اس کے لیے دیر ہو چکی تھی۔ میں اسے ''نیک لاک'' لگانے میں کامیاب رہا۔ یہ ایم ایم اے کے چند خطرناک داؤ میں سے ایک ہوتا ہے اور اگر ''پرفیکشن'' کے ساتھ لگایا جائے تو حریف کے پاس ہار ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا۔ ''رنگ'' کے اردگرد ایک دم سناٹا چھا گیا تھا۔ وانگ کے پاس اس داؤ سے نکلنے کا چانس چار پانچ فیصد سے زیادہ نہیں تھا مگر وہ اپنا پورا زور لگا رہا تھا۔ میں اس کی گردن پر اپنی بائیں کہنی کا بوجھ ڈالتا گیا اور اس کا سر جھک گیا۔ یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ جس جگہ اس کا سر فرش سے لگا یہ تقریباً وہی جگہ تھی جہاں میری تصویر بھی تھی۔ میں نے اس کے چہرے کو فرش پر دو تین رگڑے دیئے۔ وہ اب بھی اندھا دھند مزاحمت کر رہا تھا۔

میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''گردن ٹوٹ گئی تو کسی کام کا نہیں رہے گا۔ ہار مان لے۔''

اس نے جواب میں گالی دی اور رندھی ہوئی ناقابل شناخت آواز میں کچھ کہا۔

میں نے دباؤ بڑھا دیا۔ اس کی حالت پتلی ہونے لگی۔ میں نے اس کی ساتھی دراز قد تھائی حسینہ کی طرف دیکھا۔ وہ ''رنگ'' کے بالکل قریب آن کھڑی ہوئی تھی، اس کا چہرہ ہلدی ہو رہا تھا۔ کئی دیگر تماشائی بھی اپنی نشستوں سے کھڑے ہو گئے تھے۔ ریفری گھٹنوں کے بل ہو گیا تھا اور ہماری چاروں جانب گھوم رہا تھا۔ آخر اس نے اچھی طرح سمجھ لیا کہ اس کا ''نوجوان باس'' اپنی ہٹ دھرمی کی وجہ سے ناقابلِ تلافی نقصان اٹھا بیٹھے گا۔

اس نے زوردار سیٹی بجائی اور اس کے ساتھ ہی پکارا۔ ''اسٹاپ اِٹ...... اسٹاپ اِٹ۔'' اس نے اپنے دونوں بازو میرے اور وانگ کے درمیان گھسا دیئے۔ اس کے ساتھ

ہی اس کے دو تین معاون بھی ''رنگ'' میں داخل ہو گئے اور انہوں نے مجھے اور وانگ کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا۔

وانگ اپنے گھٹنوں پر جھکا ہوا تھا اور مسلسل کھانستا جا رہا تھا۔ اس نے چند ابکائیاں بھی لیں۔ ریفری نے میرا ہاتھ کھڑا کر کے مقابلہ ختم ہونے کا اعلان کر دیا۔ تقریباً تمام کے تمام تماشائی ورطۂ حیرت میں تھے۔ میں رنگ سے نیچے اترا۔ اپنی شرٹ اٹھا کر پہنی۔ اسے پینٹ کے اندر کیا۔ جیب سے ٹائی نکال کر دوبارہ باندھی اور بوٹ بھی پہن لیے۔ مزے کی بات یہ تھی کہ اس گھمسان کی لڑائی میں میرے سینے پر چند خراشوں کے سوا کوئی چوٹ نہیں آئی تھی۔ سب دم بخود مجھے دیکھتے رہے۔ چند افراد نے بے دلی سے تالیاں بھی بجائیں۔ میں اطمینان سے رنگ کی طرف مڑا۔ ایک نظر بدحال وانگ پر ڈالی۔ وہ اب بھی خون آلود چہرے اور جلتی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں لان سے ہال کمرے کی طرف واپس مڑا۔ یکا یک عقب سے بھاگتے قدموں کی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی فائر ہوا۔ میں تیزی سے پلٹا۔ میں نے ایک ہٹے کٹے تھائی کو زخمی ٹانگ کے ساتھ گھاس پر گرتے دیکھا۔ تب میری نگاہ اسی تنومند امریکن پر پڑی جو کچھ دیر پہلے تک ایک لڑکی کو بغل میں لیے لگژری صوفے پر براجمان تھا۔ اب اس کے ہاتھ میں پستول نظر آ رہا تھا۔ یقیناً اسی نے سانولے رنگ کے تھائی کو فائر کر کے زخمی کیا تھا۔

امریکن نے زخمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''چاقو لے لو اس باسٹرڈ سے۔''

اب مجھے صورتِ حال کی سنگینی کا احساس ہو چکا تھا۔ سانولے رنگ کے تھائی شخص نے مجھ پر عقب سے چاقو کا وار کرنے کی نیت کی تھی۔ وہ میری طرف لپکا تھا مگر امریکن نے اس کا ارادہ بھانپ کر پھرتی دکھائی تھی۔ اس کی پنڈلی پر گولی ماری تھی اور اسے گرا دیا تھا۔ یقینی بات تھی کہ زخمی ہونے والا شخص وانگ کا کوئی قریبی ساتھی ہی تھا اور اس کی شکست پر دل برداشتہ ہوا تھا۔

پینٹ کوٹ والے اس بھاری بھرکم امریکن نے رات کے وقت بھی گہرے رنگ کے گلاسز لگا رکھے تھے۔ وہ ٹھہرے قدموں سے چلتا ہوا میری طرف آیا اور میرا کندھا تھپکا۔

''شاباش پاکستانی۔'' وہ بارعب آواز میں بولا۔

''تمہارا بھی شکریہ۔'' میں نے کہا۔

''تم نے واقعی سب کو حیران کر دیا۔ پہلے اندر ہال میں اور اب یہاں رنگ میں۔ زبردست۔ وانگ کوئی معمولی فائٹر نہیں۔ اس وقت تھائی چیمپئن ہے اور کچھ پتا نہیں کہ ایک

ماہ تک ایشین چیمپئن بھی بن جائے۔ تم نے بڑا اَپ سیٹ کیا ہے۔''

''لیکن یہ اَپ سیٹ کچھ لوگوں کو ہضم نہیں ہو سکا۔''

''ان کی ایسی کی تیسی۔ تم فکر نہ کرو۔ اگر تم پسند کرو تو میں تم سے پھر ملنا چاہتا ہوں۔ یہ لو میرا کارڈ۔ اگر ہو سکے تو کل ہی مل لو۔ اگر تم چاہو تو میرے گارڈز تمہیں تمہارے ٹھکانے تک چھوڑ آتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''تمہارا نام؟''

''مجھے روڈلف کہتے ہیں، اور تمہیں؟''

''وقاص۔'' میں نے جواب دیا اور کہا۔ ''جہاں تک گارڈز کی بات ہے یہ کسی کی حفاظت نہیں کر سکتے۔ ابھی کچھ دیر پہلے تم نے ہال میں دیکھا ہوگا، وہ اپنی حفاظت بھی نہیں کر سکے۔''

روڈلف کے چہرے پر ہلکی سی سرخی نظر آئی، تاہم وہ تحمل سے بولا۔ ''مجھے تمہارا یہ انداز پسند آیا۔ میرا خیال ہے کہ ہم ایک دوسرے کے لیے کچھ کر سکتے ہیں۔''

اس امریکن کو دیکھ کر میرے ذہن میں فوراً جاما جی میں ملنے والے مہربان امریکی پال کا خیال آیا۔ اس نے اپنے ہی ہم قوم لٹیروں کے خلاف بڑی دلیری سے ہماری مدد کی تھی اور جنگ کے کئی مشکل مرحلوں میں بے دریغ ہمارا ساتھ دیا تھا۔ شاید یہ روڈلف بھی اسی مزاج کا امریکی تھا۔ تاہم میری یہ سوچ غلط تھی۔ (اگلے ہی روز روڈلف کا ایک بالکل ہی مختلف روپ سامنے آ گیا) بہرحال میں روڈلف سے رخصت ہو کر اس بلیک مون نامی وسیع و عریض کیسینو سے باہر نکل آیا۔

پارکنگ میں فخر زمان ابھی تک میرے انتظار میں سوکھ رہا تھا۔ جونہی میں گاڑی میں داخل ہوا وہ شکوہ کناں ہو گیا۔ ''کہاں چلے گئے تھے یار۔ دل میں سیکڑوں طرح کے وسوسے آ رہے تھے۔ اگر تم پانچ منٹ اور نہ آتے تو میں تمہارے مشورے کو لات مار کر اندر آ رہا تھا۔ کیا مسئلہ ہو گیا تھا؟''

''مسئلہ تو بہت بڑا ہے۔ تمہارا وہ مخبر جس پر تمہارا سارا دارومدار تھا، اب تمہاری مدد نہیں کر سکے گا۔''

''مدد نہیں کر سکے گا؟ کیوں؟''

''مردے مدد نہیں کر سکتے۔ وہ قتل ہو چکا ہے۔ شاید ابھی تم تک خبر نہیں پہنچی۔''

فخر ہکا بکا رہ گیا۔ میں نے اسے تفصیل بتائی...... اور پھر وہ سب کچھ بھی بتا دیا جو بعد میں

ہوا تھا۔ حسینہ کی ٹانگوں والا مخروطی دروازہ، میری مزاحمت، پھر لڑائی اور آخر میں بھاری تن و توش والے امریکی کی مداخلت۔ وہ حیرت میں گم سنتا رہا۔ شاید اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنے مختصر وقت میں یہ سب کچھ ہو چکا ہے۔

اس نے کہا۔ ''فائر کی مدھم سی آواز تو میں نے بھی سنی تھی مگر یہ نہیں سوچا تھا کہ یہ فائر کسی نے تمہیں بچانے کے لیے کیا ہوگا۔ ویری اسٹرینج...... اور اس سے بھی زیادہ حیرت اس بات پر ہے کہ وجے کمار اب زندہ نہیں۔''

یہ بات واقعی تشویشناک تھی، جس سراغ پر سارا دارومدار تھا، وہی ختم ہو گیا تھا۔ یہ وجے ہی تھا جو فخر کو اور مجھے والٹس وائے کے ٹھکانے کا بتا سکتا تھا اور ہمیں وہاں تک پہنچنے میں بھی مدد دے سکتا تھا۔ اس کا یوں مارے جانا بے شمار اندیشوں کو وجود دے رہا تھا۔

○......❖......○

ہم نے شام کا ایک اخبار خریدا اور وجے کے قتل کی مکمل خبر تفصیل سے پڑھی۔ اس خبر میں سب سے چونکا دینے والی چیز طریقہ قتل تھا۔ بڑے بہیمانہ انداز سے مارا گیا تھا اسے۔ چہرہ مسخ کر دیا گیا تھا۔ جسم چیر پھاڑ دیا گیا تھا اور جسم کے کئی اندرونی اعضا غائب تھے۔ دھیان سید ھا ڈیتھ اسکواڈ کے بدنام زمانہ زندہ روبوٹس کی طرف جاتا تھا۔ وہ درندے جو ظلم و ستم میں اپنی مثال آپ تھے۔ عورت ان کے لیے ایک کھلونے کی طرح تھی۔ وہ لوگوں کو بغیر کسی وجہ کے تفریحاً بھی قتل کر سکتے تھے۔ وہ کچا گوشت کھاتے تھے اور شراب میں خون ملا کر غٹا غٹ چڑھا جاتے تھے، ان کے انوکھے طرزِ زندگی اور ان کی بداعمالیوں پر کتاب لکھی جا سکتی تھی۔

اب میرے اور فخر کے لیے ضروری تھا کہ والٹس وائے اور اس کو اپنے نرغے میں رکھنے والے ان ہم شکل شیطانوں تک پہنچنے کے لیے کوئی اور راستہ اختیار کریں۔ ہم واپس اپنے ہوٹل پہنچ گئے۔ میں نے رات کا زیادہ تر حصہ جاگتے ہوئے ہی گزارا۔ کوئی یاد آتا تھا اور دل کی رگیں ٹوٹنے لگتی تھیں...... پھر انیق کی صورت نگاہوں میں گھومتی تھی، اور اس کی دوستی کا لاشہ حالات کے چوراہے پر بے گوروکفن پڑا دکھائی دیتا تھا۔ اس نے میرے اکاؤنٹ سے کم و بیش نو لاکھ پاکستانی روپیہ اڑایا تھا اور اکاؤنٹ خالی کر دیا تھا۔ یہ ایک بڑی رقم تھی مگر اس نے روپے پیسے کے معاملے میں بھی اپنی دوستی کی بہت کم قیمت لگائی تھی۔ وہ کہتا تو میں بہت کچھ اس پر قربان کر سکتا تھا۔

اگلے روز حسبِ توقع امریکن روڈلف کا فون آ گیا۔ وہ مجھ سے ملنا چاہ رہا تھا۔ میں اس کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ میں نے کہا۔ ''کہاں پہنچنا ہے؟''

وہ بولا۔ ”تم ابھی بلیک مون آجاؤ۔ وہاں پارکنگ سے باہر ہی سرخ رنگ کی ایک اسٹیشن وین موجود ہوگی۔ میرا مقامی اسسٹنٹ موگا سے تمہیں میرے پاس لے آئے گا۔ کسی طرح کا اندیشہ دل میں نہ لاؤ۔“

”اندیشوں سے میرا دور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔ تم فکر مت کرو۔“

”دل والے ہو، میں ایسے لوگوں کی قدر کرتا ہوں۔“

پروگرام کے مطابق فخر کو میرے ساتھ رابطے میں رہنا تھا اور میرے آس پاس بھی رہنا تھا مگر میرے ساتھ نہیں جانا تھا۔ ہم دونوں میں سے کسی کو توقع نہیں تھی کہ میں وہیں جا رہا ہوں، جہاں وجے زندہ ہونے کی صورت میں مجھے لے کر جاتا۔ یعنی بنکاک کے مضافات میں وہی خفیہ مقام جہاں ٹیکساری گینگ کے سرغنہ نے اپنے اہم ترین قیدی والٹس وائے کو اس کی بچی سمیت رکھا ہوا تھا۔

سرخ وین میں، میں نے قریباً دس میل کا فاصلہ طے کیا۔ پھر ہم سیاہی مائل درختوں سے گھرے ہوئے ایک فارم نما علاقے میں پہنچے اور تب مجھے سرخ مخروطی چھتوں والے اس قلعے کی جھلک نظر آئی جو میں فخر کے پاس موجود تصویروں میں دیکھ چکا تھا۔ میں بھونچکا رہ گیا۔ میں نے اپنے میزبان موگا سے سے پوچھا۔ ”کیا مسٹر روڈلف سے یہیں پر ملاقات ہوگی؟“

”امید تو ہے کہ ہوگی۔“ وہ عجیب انداز سے مسکرایا۔

میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ مطلب یہی تھا کہ جہاں مجھے اور فخر کو بہت جتن کر کے پہنچنا تھا وہاں میں خود ہی لے جایا جا رہا تھا۔ کبھی کبھی ایسے بھی دیواروں میں در بنتے ہیں، اونچی فصیلیں اور بلند چٹانیں راستہ دیتی ہیں۔ یہ بہت خاموش اور سنسان جگہ تھی۔ پتھر کی اونچی اونچی دیواریں، پام کے بلند درخت جن کے عقب سے پوری رات کا چاند جھلک دکھا رہا تھا۔ لکڑی کے موٹے موٹے محرابی دروازے تھے جن کے عقب سے زرد روشنی جھانکتی تھی۔ کچھ افراد بڑی خاموشی سے یہاں وہاں حرکت کرتے دکھائی دیئے...... ایک آٹومیٹک دروازے سے گزر کر ہم ایک سجے سجائے کمرے میں داخل ہوئے۔ یہاں تنومند روڈلف منہ میں سگار دبائے ایک لیپ ٹاپ سے چھیڑ چھاڑ میں مصروف تھا۔ اس کی پیشانی پر سے بال اڑے ہوئے تھے اور وہاں تفکر کی گہری پرچھائیاں تھیں۔ اس نے میرے سلام کا سر کے اشارے سے جواب دیا اور مجھے بیٹھنے کا کہہ کر پھر سے لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہوگیا۔

کچھ دیر لیپ ٹاپ بند کر کے اس نے گہری سانس بھری اور میری طرف متوجہ ہو کر بولا۔ ”ہمارے لیے کام کرنا پسند کرو گے؟“

''کس طرح کا کام؟''

''سمجھو کہ ریکوری منیجر۔ لوگوں سے اپنی رقمیں وغیرہ وصولنی ہوتی ہیں ہمیں۔ کچھ دھڑلے دار بندوں کی ضرورت ہوتی ہے۔''

''یعنی بدمعاشی کرانا چاہتے ہو مجھ سے؟''

''نہیں، بدمعاشوں سے نمٹنا چاہتا ہوں۔''

''کام کیا ہے تم لوگوں کا؟''

''وہی امپورٹ ایکسپورٹ، لیکن تم کام سے زیادہ دام پر توجہ دو۔ دو کے ساتھ چار صفر جوڑو۔ یہ ڈالرز ماہانہ ملیں گے اور باقی ساری عیش وعشرت بھی۔''

''مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

''فی الحال تو کھانا پینا اور آرام کرنا ہوگا۔ موقع آنے پر تمہیں کوئی ٹاسک بھی دے دیا جائے گا۔''

انکار کا کوئی پروگرام ہی نہیں تھا۔ اس قلعہ نما عمارت میں داخل ہوتے ہی میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر والٹس وائے جیسا نایاب ہیرا یہاں موجود ہے تو پھر مجھے یہاں سے خالی ہاتھ واپس نہیں جانا۔

آدھ پون گھنٹے کے اندر سب کچھ طے ہوگیا۔ میں نے روڈلف کو اپنے بارے میں وہی کچھ بتایا جو وہ سننا چاہتا تھا۔ میرا آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ اگر کوئی آگے تھا تو وہ زندگی کی رنگینیاں تھیں اور اگر کوئی پیچھے تھا تو وہ قانون تھا۔ پاکستانی پولیس اور انٹرپول کے لوگ میرے لیے مڈل ایسٹ میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے تھے اور میں یہاں تھائی لینڈ میں چکن تھائی اور مٹن تھائی سمیت ہر طرح کی تھائی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

○......❖......○

روڈلف مطمئن ہوگیا اور مجھے یہ ''جاب'' مل گئی۔ موگا سے نے مجھے میرا اپارٹمنٹ دکھایا۔ میں نے یورپ کے بہترین عشرت کدے دیکھ رکھے تھے اور یہ بھی کچھ ایسی ہی جگہ تھی۔ تفریح اور عیش وعشرت کا ہر سامان یہاں موجود تھا۔ کچھ ہی دیر بعد ایک پری پیکر بھی نمودار ہوگئی۔ اس اپارٹمنٹ میں موجود استعمال کی دیگر اشیا کی طرح وہ بھی جیسے ایک استعمال کی شے ہی تھی، مگر وہ عام نہیں تھی۔ نہایت دلکش خدوخال کی مالک وہ ایک انگلش لڑکی تھی۔ ہلکے سنہری بال، نیلی آنکھیں اور جسم کسی نایاب نگینے کی طرح دمکتا ہوا۔ اس نے جو مختصر سا مہین لباس پہن رکھا تھا وہ جسم کو چھپانے کے لیے نہیں تھا بلکہ یہ بتانے کے لیے تھا کہ بدن سرکش

طوفانی لہروں کی طرح ہو تو کپڑا اسے چھپانے میں کس طرح ناکام رہتا ہے۔

اس کی مسکراہٹ قابلِ دید تھی۔ وہ بولی۔ ''کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتائیں؟''

میں نے کہا۔ ''فی الحال ایک لائٹر، ڈن ہل سگریٹ کا ایک پیکٹ اور تنہائی۔''

اس نے سر تسلیم خم کیا اور سنہری بالوں کو انداز سے لہراتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ یہاں باقاعدہ ایک بار روم موجود تھا۔ وہ سگریٹ اور لائٹر وغیرہ لے آئی اور دست بستہ کھڑی ہوگئی۔ میں نے کہا۔ ''میں نے تین چیزیں مانگی تھیں اور ان میں تنہائی بھی شامل تھی۔''

''او کے۔'' اس نے ادا سے کہا اور بیڈ کے ساتھ ایک سبز بٹن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''جب کسی چیز کی ضرورت ہو تو اسے پریس کر دیجیے گا۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

اس کے جانے کے بعد میں بیڈ پر نیم دراز ہوگیا۔ دل و دماغ میں انگارے سلگ رہے تھے۔ جس چہرے کو بھلانا چاہتا تھا وہی بار بار آنکھوں کے سامنے آتا تھا، جس آواز کو فراموش کرنا چاہتا تھا، وہی مسلسل کانوں میں گونجتی تھی، وہ چلی گئی تھی، پرائی ہوگئی تھی مگر پھر بھی اپنی جگہ موجود تھی۔ جیسے کوئی لہلہاتا ہوا تناور درخت ہو جسے کاٹ دیا جائے مگر اس کی جڑیں زمین میں دور تک پیوست رہیں، دل کی زمین پر اس کے پیار کی جڑیں بھی تو لامتناہی گہرائی تک گئی ہوئی تھیں وہ کہاں ہوگی؟ کیا کر رہی ہوگی؟ اس کے بارے میں مجھے پتا چلا تھا کہ اپنے شوہر دارج کے ایکسیڈنٹ کے بعد وہ اسپتال گئی اور ایک دو راتوں تک مسلسل اس کی تیمارداری کی تھی۔ اب وہ والدین کے ساتھ واپس سکھیرا گاؤں چلی گئی تھی لیکن کیا کہا جا سکتا تھا کہ کب وہ شوہر پرستی کی روایات نبھاتے ہوئے واپس اسلام آباد پہنچ جاتی اور اس کی خدمت گزاری شروع کر دیتی۔

میں اسے بھولنا چاہتا تھا۔ ایک مرتبہ پہلے بھی جب وہ سجاول کے ڈیرے سے واپس اپنے والدین کے پاس چلی گئی تھی، میں نے اسے بھولنے کی ایک بھرپور کوشش کی تھی اور کسی حد تک کامیاب بھی رہا تھا۔ میں نے خود کو الکحل اور جاناں کی زُلفوں کے سائے میں گم کر دیا تھا۔ خود فراموشی کی ایک عجیب سی کیفیت خود پر طاری کر لی تھی۔ کیا اب پھر میں کچھ ایسا ہی کروں۔ میرا دھیان آپوں آپ ساتھ والے کمرے میں موجود انگریز حسینہ کی طرف چلا گیا اور ان چمکتی بوتلوں کی طرف چلا گیا جن میں بہترین شرابیں بھری ہوئی تھیں۔ میرا ماضی لوٹ رہا تھا تو پھر یہ سب چیزیں اس ماضی کا حصہ ہی تھیں۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میری بچت اسی صورت میں ہے کہ میں اپنے ماضی میں غرق ہو جاؤں۔

کچھ ہی دیر بعد میرا ہاتھ بے ساختہ اس سبز بٹن کی طرف بڑھ گیا جس کا ''ذکرِ خیر'' انگلش لڑکی نے کیا تھا۔

بٹن کا دبنا تھا کہ وہ وارد ہوگئی۔ اس کے دانت سچے موتیوں کی طرح چمکے، بولی۔ ''مجھے پتا تھا کہ مجھے بلایا جائے گا۔ میری ممی کہا کرتی تھیں کہ ایشیائی مردوں کو سفید فام لڑکیاں بہت مشتعل کرتی ہیں۔''

''تمہارا نام؟''

''میڈونا، لیکن گلوکارہ میڈونا کی طرح پلاسٹک یا کاسمیٹک سرجری سے اپنی عمر کم نہیں کی ہے۔ میں واقعی چوبیس سال کی ہوں۔''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ کہیں اسے میرے چہرے کی کاسمیٹک تبدیلیوں کے بارے میں شک تو نہیں ہو گیا تھا لیکن اس کے تاثرات کو غور سے دیکھنے کے بعد اطمینان ہوا۔ وہ عمومی انداز میں بات کر رہی تھی۔

''کہاں سے آئی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

وہ شوخی سے بولی۔ ''فی الحال تو ساتھ والے کمرے سے آئی ہوں...... لیکن ویسے میرا تعلق اسکاٹ لینڈ سے ہے۔'' وہ اٹھلا کر میرے پہلو میں آن بیٹھی۔ اس کا مہین مختصر لباس اس کے جسم سے سرکتا چلا جا رہا تھا۔ وہ جیسے مجھے یہ بتانے پر تلی ہوئی تھی کہ وہ واقعی چوبیس سال کی ہے اور مجھے پوری طرح مشتعل کرنے میں کامیاب ہو چکی ہے۔

O......❖......O

انسان خطا کا پتلا ہے۔ خطا انسان کے اندر اس کے خون کے ساتھ ہی دوڑتی رہتی ہے۔ اس خطا سے بچنے کا واحد ذریعہ بھی انسان کے اندر کی توانائی ہی ہوتی ہے۔ جاماجی کا بزرگ حاذق ذکری کہتا تھا انسان کے اندر کی یہ توانائی یا تو خدا اور معاشرے کے خوف سے آتی ہے یا پھر محبت سے۔ اور محبت کی ایک طاقتور ترین قسم وہ الوہی جذبہ ہے جو خدا نے آدم اور حوا کے درمیان پیدا کیا۔ میرے اندر بھی یہی محبت تھی جس نے توانائی بن کر مجھے شراب عورت اور جوا سمیت ہر قسم کے عیبوں سے دور کر دیا تھا، لیکن آج یہ نیم مردہ محبت بے یار و مددگار حالات کے چوراہے پر پڑی تھی...... خطا توانا ہو رہی تھی، مزاحمت کمزور پڑنے لگی۔ لیکن پھر ایک دم جیسے وہ اپنے دونوں بازو پھیلا کر میرے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ ہاں یہ تاجور ہی تھی۔ اس کی تصوراتی آواز میرے کانوں میں گونجی۔ ''نہیں، میں آپ کو دوبارہ تاریکی کے اس گڑھے میں نہیں گرنے دوں گی۔''

''تم کس بل بوتے پر یہ بات کر رہی ہو؟'' میں نے خاموشی کی زبان میں اس سے پوچھا۔ ''تم نے مجھے بے یارومددگار چھوڑ دیا۔ اب جو میری قسمت میں لکھا ہے، وہ مجھے مل جائے گا۔ اب ہٹ جاؤ میرے راستے سے۔ مجھے زندگی کا زہر پینے دو اور مرنے دو۔ تم جا کر اپنے شوہر کے سرہانے بیٹھو۔ اس کی پیشانی دباؤ۔ اپنے قرب سے اس میں تندرستی کی روح پھونکو، تاکہ وہ تمہیں حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکے اور تم پوری پوری سہاگن بن سکو۔''

وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ اپنے دونوں بازو پھیلائے میرا راستہ روکے کھڑی رہی۔ جیسے کہہ رہی ہو...... مجھے مار دو پھر آگے چلے جانا، بڑا ابھرپور تصور تھا۔

میڈونا بڑی بے باک لڑکی تھی۔ وہ خود ہی بوتل اور گلاس لے آئی تھی اور اٹھلا کر مجھ سے ہم آغوش ہو گئی تھی۔ میرے گال پر بوسہ دے کر بولی۔ ''اِدھر اُدھر کیا دیکھ رہے ہیں جناب، میں یقین دلاتی ہوں یہاں کوئی خفیہ ویڈیو یا آڈیو آلہ نہیں ہے۔''

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اس بند کمرے میں کوئی دیکھنے سننے والا نہیں تھا۔ ہم دونوں اکیلے تھے...... لیکن وہ ہمارے درمیان موجود تھی۔ میڈونا کو نظر نہیں آ رہی تھی لیکن مجھے آ رہی تھی۔ وہ اسی طرح دونوں بازو پھیلائے کھڑی تھی۔

میں نے ایک گہری سانس لی اور میڈونا کو اس کے سارے لوازمات سمیت کمرے سے باہر نکال دیا۔

شاید آس امید کے بغیر بھی محبت زندہ رہتی ہے۔
شاید انہونیوں کی تمنا آخری دم تک مٹتی نہیں۔
شاید محبت واقعی ایسا دریا ہے کہ بارش کے روٹھ جانے کے باوجود پانی کم نہیں ہوتا۔

بنکاک کے ان بلند و بالا پام پیڑوں کے درمیان واقع اس قلعہ نما عمارت میں دوروزہ قیام کے دوران میں مجھے کافی کچھ معلوم ہو گیا۔ میں جس حصے میں موجود تھا، وہ اس عمارت کا بیرونی پورشن تھا۔ اندرونی حصے میں سخت حفاظتی انتظامات تھے اور یہ حصہ ڈیتھ اسکواڈ کے خطرناک ترین گماشتوں کی نگرانی میں تھا۔ قلعے کے عام گارڈز اور ملازمین کو اس دوسرے حصے کی طرف جانے کی بالکل اجازت نہیں تھی۔ اس حصے کو سات آٹھ فٹ اونچے آہنی جنگلے اور خاردار تاروں کے چھلوں نے گھیر رکھا تھا۔ اندر آنے جانے والے افراد کو سخت چیکنگ کے بعد گزرنے دیا جاتا تھا اور یہی وہ جگہ تھی جہاں ٹیکساری گینگ کا اہم ترین اور سینئر ترین رکن وانس وائے زندہ سلامت پایا جاتا تھا۔ مجھے اس تک پہنچنا تھا۔

میرے پاس واحد راستہ یہی تھا کہ میں کسی ایسے شخص کو ڈھونڈوں جو اس عمارت کے

اندرونی حصے میں آتا جاتا ہو، پھر اس پر غلبہ حاصل کر کے اس سے معلومات حاصل کروں۔
ایک دم ذہن میں خیال آیا کہ شاید یہ میڈونا نامی لڑکی بھی اہم معلومات دے سکے۔ میں نے پرسوں رات اسے بھگا دیا تھا مگر آج رات میں نے اسے اپنے کمرے میں بیٹھنے دیا اور اس سے باتیں کرتا رہا۔ وہ اس جگہ پر قریباً تین سال سے موجود تھی۔ یہاں اس کا ایک بوائے فرینڈ بھی تھا۔ انکشاف ہوا کہ وہ انڈین ہے اور وہ بھی انہی لوگوں کے لیے کام کرتا ہے جن کے لیے میڈونا کرتی ہے۔ میڈونا کے بقول یہ عمارت کسی بہت مال دار امریکی کی ملکیت تھی اور یہاں بظاہر امپورٹ ایکسپورٹ کا کام ہی ہوتا تھا۔ میں نے میڈونا سے پوچھا۔ ''تمہارے انڈین بوائے فرینڈ کو پتا ہے کہ تم اس طرح دوسروں کے بیڈرومز کی زینت بھی بنتی ہو؟''

وہ پھر دلکش انداز میں مسکرائی۔ ''یہاں سب کچھ چلتا ہے مسٹر وقاص! ویسے بھی وہ میرا بوائے فرینڈ ہے، میں اس کی گرل فرینڈ نہیں ہوں، آپ اسے یک طرفہ ٹریفک بھی کہہ سکتے ہیں۔''

مجھے میڈونا کے ایک رخسار پر چوٹ کا ہلکا سا نشان بھی دکھائی دیا۔ ایسا ایک کچھ دن پرانا نشان اس کی دائیں کلائی پر بھی تھا۔ میں نے اس بارے میں پوچھا تو وہ بولی۔ ''میرا بوائے فرینڈ بہت جلد غصے میں آجاتا ہے لیکن میں چونکہ اس سے محبت کرتی ہوں اس لیے کبھی کبھی اس کا سخت رویہ بھی برداشت کر لیتی ہوں۔ سنڈے کے روز اس نے مجھے ٹانگ ماردی تھی۔ میں کمرے کے دروازے سے ٹکرائی اور یہاں کلائی پر چوٹ آگئی۔'' وہ ہر بات بے تکلفی سے کر جانے والی سکہ بند مغربی لڑکی تھی۔ اسے اس بات کی بھی خوشی تھی کہ میں اس کی طرح روانی سے انگلش بول سکتا ہوں۔ اس کا رضی نامی انڈین بوائے فرینڈ زیادہ روانی سے نہیں بول سکتا تھا۔ وہ اس بات پر بھی حیران تھی کہ میں نے تھائی لینڈ کے مانے ہوئے چیمپئن وانگ کو رنگ میں بری طرح رگیدا ہے۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ''کبھی تمہیں آہنی جنگلے کے پار والا حصہ دیکھنے کا اتفاق ہوا؟''
اس نے نفی میں سر ہلایا اور اس کے نرم سنہری بالوں نے اس کے رخساروں پر بکھر کر خوب صورت منظر پیش کیا۔ وہ بولی۔ ''وہاں باس روڈلف کے علاوہ بس وہی خاص افراد جاتے ہیں جن کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔''
نہ جانے کیوں مجھے لگا کہ وہ اس بارے میں جھوٹ بول رہی ہے۔ وہ مجھے بس اتنا ہی بتا رہی تھی جتنے کی اسے اجازت دی گئی تھی۔

''ٹیکساری گینگ کا نام سنا ہے تم نے؟''

وہ حیرت سے بولی۔''یہ کیا ہوتا ہے؟''

وہ پھر بکواس کر رہی تھی اور جھوٹ بول رہی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں اسے گالی دی اور کہا۔''ٹیکساری گینگ وہ ہوتا ہے جس کی تم چاکری کر رہی ہو اور اپنی خوب صورتی سے جس کے ممبروں کا دل بہلا رہی ہو۔''

اگلے دو روز بھی میں نے اپنی آنکھیں اور کان پوری طرح کھلے رکھے۔ یہاں کا ماحول نہایت پُراسرار تھا اور سب سے زیادہ آہنی جنگلے اور خاردار تاروں کے اندر کا ماحول۔ وہاں سرخ رنگ کی مخروطی چھتیں تھیں۔ ناریل اور تاڑ کے بلند درخت تھے اور شاذ ونادر ہی کوئی حرکت دکھائی دیتی تھی۔ میں جانتا تھا کہ اس عمارت سے باہر کہیں فخر زمان موجود ہوگا اور بے چینی سے میری کال کا انتظار کر رہا ہوگا مگر میں اس سے رابطے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ مجھے محسوس ہوتا کہ اس چار دیواری میں کہیں چیونٹی بھی رینگتی ہے تو خبر رکھنے والوں کو خبر ہو جاتی ہے۔ میں نے جگہ جگہ سی سی ٹی وی کیمرے بھی دیکھے تھے مگر زیادہ تر کیمرے آہنی جنگلے کے اوپر اور آس پاس لگے تھے۔ ایسے زیادہ تر کیمروں کا رخ اندرونی حصے کی طرف ہی تھا۔

O.......❖.......O

اس قلعہ نما عمارت میں وہ میری چوتھی یا پانچویں شب تھی جب مجھے وہ موقع مل گیا جس کا میں انتظار کر رہا تھا۔ میں آہنی جنگلے سے قریباً تیس میٹر کی دوری پر کیلے کے تین چار پھیلے ہوئے درختوں کے درمیان کھڑا تھا۔ میں اچھی طرح دیکھ چکا تھا کہ یہ جگہ کسی طرف سے بھی سی سی ٹی وی کی زد میں نہیں ہے۔ میری گھڑی پر رات کے دس بج کر پندرہ منٹ ہوئے تھے۔ میں نے نوٹ کیا کہ یہ وہی وقت ہوتا ہے جب اندرونی حصے سے تین پہیوں والی ایک اسٹائلش گاڑی نکلتی ہے اور کیلے کے ان درختوں کے قریب ایک دروازے کے سامنے پارک ہو جاتی ہے۔ میری اب تک کی معلومات کے مطابق یہ سفید وین نما گاڑی اشیائے خورونوش اور کچن کا سامان وغیرہ لے کر اندرونی حصے میں جاتی تھی۔ ایک دفعہ اسے ایک نیگرو چلا رہا تھا، ایک دفعہ کوئی اور شخص۔ میں آج پوری فارم میں تھا اور تہیہ کیے ہوئے تھا کہ آج شب کچھ کر گزرنا ہے۔

مقررہ وقت سے تھوڑی دیر بعد تین پہیوں والی یہ ڈلیوری وین جنگلے کے سکیورٹی چیک پر نظر آئی۔ پھر اس کی ہیڈ لائٹ دھیرے دھیرے میرے قریب آتی چلی گئی۔ اب میں ایکشن میں آنے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ میرا ارادہ یہی تھا کہ وین چلانے والے کو وین کے اندر

ہی دبوچوں گا اور اسے اندرونی حالات کے بارے میں اگلنے پر مجبور کردوں گا۔ اس وین کی چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں تھیں اور انہیں بھی شٹرز کے ذریعے بند کیا جا سکتا تھا۔ عقبی اسکرین ایسی گاڑیوں میں ہوتی ہی نہیں۔

گاڑی بے آواز چلتی ہوئی درختوں کے قریب پہنچ گئی۔ یہ بیٹری سے چلنے والی الیکٹرک گاڑی تھی۔ میں پَر تول چکا تھا۔ جونہی گاڑی رکی اور اس کا انجن بند ہوا، میں جھپٹنے کے لیے تیار ہو گیا۔ مجھ سے گاڑی کا فاصلہ دس فٹ کے قریب تھا۔ اس کی ایک کھڑکی کا شیشہ کھلا ہوا تھا۔ کوئی شخص ٹوٹی پھوٹی انگلش میں فون پر کسی عورت سے بات کر رہا تھا۔ ''کہا ہے ناں کہ آج نہیں آ سکتا۔ اب چونچ بند کروا اپنی۔''

دوسری طرف سے کچھ کہا گیا جس پر وہ پھنکار کر بولا۔ ''زیادہ آگ لگی ہے تو جا چلی جا کسی اور کے پاس بلکہ بہتر ہے کوئی فائر بریگیڈ والا ہی ڈھونڈ لے۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے فون بند کر دیا۔ وہ انگلش بول رہا تھا مگر لہجہ اردو اسپیکنگ محسوس ہوتا تھا۔

اب وہ دروازہ کھول کر باہر نکلنے ہی والا تھا۔ میں اپنی جگہ سے نکلا اور لپک کر گاڑی میں داخل ہو گیا۔ نیم تاریکی میں مجھے بس اتنا نظر آیا کہ وہ نوجوان تھا اور اس نے پی کیپ پہن رکھی تھی، میرا بھرپور گھونسا اس کی ٹھوڑی پر لگا اور کیپ اچھل کر دور جا گری۔ اس کی کمر سے باقاعدہ ہولسٹر بندھا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنا ہاتھ ہولسٹر تک پہنچاتا، میں نے پھل کاٹنے والی ایک نوک دار چھری اس کی شہ رگ پر رکھ دی۔ ''خبردار مار ڈالوں گا۔'' میں نے سرسراتے لہجے میں کہا۔

اس نے میری چھری والی کلائی پکڑ لی تھی۔ یکایک اس نے تڑپ کر خود کو میری اور چھری کی زد سے نکالنا چاہا، وہ پھرتیلا تھا لیکن ''ایک بار اور بھی پیدا ہو جاتا'' تو ایسا نہ کر سکتا۔ میں نے اس کے منہ پر کہنی کی ضرب لگائی اور اسے نڈھال کر دیا۔ اس کا شاندار بریٹا پسٹل اب اس کے ہولسٹر سے نکل کر میرے ہاتھ میں آ چکا تھا۔

یہی وقت تھا جب میں نے اسے دھیان سے دیکھا۔ اور میرے چودہ طبق روشن ہو گئے...... میں نے اپنی آنکھیں سکیڑیں اور دوبارہ اسے غور سے دیکھا۔ ہاں گورے رنگ کا یہ نہایت خوبرو نوجوان میرے لیے اجنبی نہیں تھا...... یہ رضوان ٹی تھا۔ وہی رضوان جو ملنگی ڈیرے پر ہمارا ساتھی رہا تھا اور کٹھن حالات کا مقابلہ کرتا رہا تھا۔ ملنگی ڈیرے کی زمین دوز بھول بھلیوں میں ''ارم'' نام کی سائیکو ڈاکٹر نے اس پر اپنا تسلط جما رکھا تھا۔ رضوان اپنی تمام تر مردانہ وجاہت کے ساتھ اس کا کھلونا بنا ہوا تھا۔ ملنگی ڈیرے کی بلند دیواروں کے اندر ایک

ڈری سہمی زندگی گزار رہا تھا۔

ہم نے اسے وہاں سے نکالا تھا، اسے اپنی آزادی اور اپنے حق کے لیے لڑنا سکھایا تھا۔ آخر سائیکلو ڈاکٹر ارم کے جبر سے رضوان کی جان ہمیشہ کے لیے چھوٹ گئی تھی۔ رضوان سے میری آخری ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب میں نے ارم کے قتل کے بعد اسے لیہ کے پارا ہاؤس سے بحفاظت نکالا تھا اور لاہور روانہ کیا تھا۔

اور اب وہ لیہ اور پاکستان سے ہزاروں میل دور یہاں اس ڈلیوری وین میں میرے سامنے ''سیٹ'' پر نیم دراز تھا۔ اس کی پی کیپ اچھل کر دور گر چکی تھی اور اس کے سرخ ہونٹوں سے خون رِس رہا تھا۔ میں نے بریٹا پسٹل کی نال اس کے سر سے لگا دی اور کرخت آواز میں سرگوشی کی۔ ''حرکت کرو گے تو جان سے جاؤ گے۔ یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔''

میرے لہجے کی حرارت اور آہنگ نے اسے جوں کا توں لیٹے رہنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے چند سیکنڈ کے لیے وین کی اندرونی لائٹ آن کی، ہاں وہ رضوان ہی تھا۔ پہلے سے ذرا موٹا ہو گیا تھا اور شیو بڑھی ہوئی تھی۔ اس نے چھوٹی چھوٹی مونچھیں بھی رکھ لی تھیں۔ میں اسے پہچان چکا تھا لیکن میرے چہرے کی کاسمیٹک تبدیلیوں کی وجہ سے وہ مجھے پہچاننے میں قطعی ناکام تھا۔ شاید وہ سوچ ہی نہیں سکتا تھا کہ اس جگہ اس طرح میری اور اس کی ملاقات ہو سکتی ہے۔

میں نے بائیں ہاتھ سے اچھی طرح اس کی تلاشی لی۔ ہولسٹر کے سوا کوئی خطرناک چیز اس کے پاس موجود نہیں تھی۔ میں نے خالی ہولسٹر بھی پچھلی نشست پر پھینک دیا اور اسے سیدھا ہو کر بیٹھنے کا حکم دیا۔ وہ بدستور ڈرائیونگ سیٹ پر ہی تھا۔ میں نے وین کی چابی اگنیشن میں سے نکال لی اور جیب میں ڈال لی۔ چابی نکالنے سے پہلے میں نے چاروں کھڑکیوں کے شٹر گرا دیئے تھے۔ اب یہ وین ایک چھوٹے سے محفوظ کمرے کی طرح تھی۔

''تم جانتے ہو کہ تم کیا کر رہے ہو۔ باس روڈلف تمہاری گردن توڑ دے گا۔'' رضوان دانت پیس کر بولا۔ اس کی بات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ یہاں ''نئے ملازم کی حیثیت سے میری موجودگی'' کے بارے میں جانتا ہے۔

میں نے کہا۔ ''میری گردن کی فکر نہ کرو۔ بس یہ فکر کرو کہ تم سے کوئی بے ساختہ چالاکی سرزد نہ ہو جائے۔ اس کا نتیجہ تمہارے حق میں بہت برا نکلے گا اور ابھی نکلے گا۔''

وہ بس سکتہ زدہ سا مجھے تکتا رہ گیا۔ میں نے ایک بار پھر چند سیکنڈ کے لیے وین کی اندرونی لائٹ آن کی۔ وہ اشیائے خورونوش کی ترسیل کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ اس کے

عقب میں خانے سے بنے ہوئے تھے۔ سبزیوں اور پھلوں کے علاوہ گوشت کی ہلکی سی بُو بھی آرہی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ ڈیتھ اسکواڈ کے ہم شکل گنجے شیطان کچا گوشت بھی بڑے شوق سے کھاتے ہیں اور۔ کچے گوشت سے ان بدبختوں کی رغبت صرف کھانے کی حد تک ہی نہیں تھی وہ اس کا ''دوسرا استعمال'' بھی کثرت سے کرتے تھے، ان کے اردگرد ہر وقت خوش بدن لڑکیوں کی ضرورت رہتی تھی۔

پھر میرا دھیان معروف اداکارا روشا کی طرف چلا گیا۔ لاہور میں اسے ان ہی ہم شکل جانوروں نے اغوا کیا تھا۔ اس کی بدحالی میں نے گلبرگ کی اس کوٹھی نمبر 16 میں دیکھی تھی۔ شاید وہ دھماکے میں ہلاک نہ ہوتی تو بھی ان جانوروں کے ستم سے بچ نہ پاتی۔ آہ کچھ لوگ جنس کو کس قدر گھناؤنا اور کراہت آمیز بنا دیتے ہیں۔

''ہاں سپلائی دے آئے ہو کھانے کی؟'' میں نے رضوان سے پوچھا۔

''دے آیا ہوں لیکن......''

''بس اتنی بات کا جواب دو جتنی پوچھ رہا ہوں۔'' میں نے انگلی اٹھا کر اسے روکا۔ ''سمجھو کہ یہ وین آج کی رات تمہارے لیے حوالات بن گئی ہے۔ جب تک میرے سارے سوالوں کے جواب نہیں دے لوگے، یہاں سے نکل نہیں سکو گے نہ کسی کو آگ لگا سکو گے، نہ کسی کی بجھا سکو گے۔ بائی دی وے، ابھی جس سے گفتگو فرما رہے تھے وہ محبوبہ تھی تمہاری؟''

''ہاں......لیکن......''

''پھر وہی لیکن، جتنا پوچھ رہا ہوں اتنا ہی بتاؤ۔'' میں نے اسے ڈانٹا۔ میں اپنی اصل آواز میں ہی بول رہا تھا لیکن رضوان کا ذہن میری آواز اور لب و لہجے کی طرف منتقل نہیں ہوا تھا۔ اس کے سان گمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ میں پاکستان سے ہزاروں میل دور یہاں اس کے سامنے پایا جاؤں گا۔ میرا ذہن گھڑ دوڑ کا میدان بنا ہوا تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں خود کو رضوان پر آشکار کر دوں یا نہیں...... وہ یہاں موجود تھا اور میرے لیے بے حد کارآمد ثابت ہونے والا تھا۔ ویسے بھی جب میں اپنے ماضی کی طرف لوٹ ہی رہا تھا تو پھر اپنا یہ روپ چھپائے رکھنے سے کیا فائدہ تھا۔

رضوان کا شمار میں اپنے قابلِ بھروسا ساتھیوں میں کرسکتا تھا۔ وہ یہاں کیوں اور کیسے موجود ہے؟ یہ سوال ضرور جواب طلب تھا مگر مجھے یقین تھا کہ جب میں اپنا آپ رضوان پر کھول دوں گا تو ان سوالوں کے ساتھ ساتھ بہت سے دیگر سوالوں کے جواب بھی مل جائیں

گئے۔

اور پھر میں نے ایسا ہی کیا۔ اگلا قریباً آدھ گھنٹہ اس وین کے اندر بہت تہلکہ خیز تھا۔ میں نے پستول رضوان ٹی کے سر سے ہٹا لیا اور اسے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ وہ حیرت سے گنگ سنتا رہا اور بیچ بیچ میں سوالات بھی کرتا رہا۔ باتوں کے دوران میں اسے ایک دم کرنٹ سا لگا۔ تڑپ کر بولا۔ ''ایک گڑبڑ ہوگئی ہے جی۔''

''کیا ہوا؟''

''مجھے پورے گیارہ بجے باس روڈلف کو رپورٹ کرنا تھی۔ اب ساڑھے گیارہ ہونے والے ہیں۔ یہاں ٹائم کا بہت خیال رکھا جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ابھی کوئی مجھے دیکھنے کے لیے یہاں پہنچ جائے۔'' اس نے دو لمحے توقف کیا، پھر بولا۔ ''آپ فوراً اپنے اپارٹمنٹ میں پہنچ جائیں۔ میں بھی نکل جاتا ہوں۔ کل کسی وقت آپ سے فون پر رابطہ کروں گا۔ آپ مجھے اپنا نمبر دے دیں۔''

میں نے اسے نمبر لکھوایا اور یاد دہانی کرائی کہ وہ مجھے وقاص کے نام سے ہی پکارے گا۔ رضوان کو اس کا بریٹا پسٹل واپس کر کے میں احتیاط کے ساتھ اس تین پہیوں والی گاڑی سے نکلا اور اپنے کمرے میں واپس پہنچ گیا۔

انسان کوشش کرتا ہے، قدرت راستے کھولتی ہے۔ رضوان کا اس جگہ مل جانا بھی ایک تائید غیبی کی طرح ہی تھا۔ ابھی مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ یہاں بنکاک میں کیسے اور کیونکر پہنچا ہے۔ اس نے صرف اتنا بتایا تھا کہ وہ بہت بدل چکا ہے، ڈاکٹر ارم کی موت کے بعد چھوٹا گرو وغیرہ اس کی تلاش میں تھے۔ ڈر ڈر کر مرنے کے بجائے اس نے حالات کا سامنا کرنا مناسب سمجھا اور ملنگی ڈیرے کے تین خطرناک ''ملنگوں'' سے اس کی زوردار ٹکر ہوئی۔ بعدازاں وہ یہاں بنکاک چلا آیا۔

رات کو جب میں بستر پر دراز ہوا تو سنہری بالوں اور نیلی آنکھوں والی میڈونا ایک بار پھر مستعد خدمت گار کی طرح میرے سر پر آن کھڑی ہوئی۔ ''کوئی چیز درکار ہو تو مجھے بتائیں۔'' وہ اپنے کلیوں جیسے دانت چمکا کر بولی۔

میں نے کہا۔ ''نہیں، تم جاسکتی ہو۔''

وہ سر جھکا کر کسی ایسی ماڈل کی طرح گھومی جو ریمپ پر اپنے جسم کو ہر زاویے سے دکھانا چاہتی ہے۔ ''لائٹ آف کر جاؤں؟'' اس نے رک کر پوچھا۔

''کر جاؤ۔'' میں نے کہا، پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''جب تم لوگوں کے بیڈ رومز میں

جا کر ان سے پوچھتی ہو کہ کوئی چیز تو درکار نہیں...... تو تمہارا بوائے فرینڈ کیا محسوس کرتا ہو گا؟''

اس نے کہا۔ ''میں نے بتایا ہے ناں کہ وہ میرا بوائے فرینڈ ہے، میں اس کی گرل فرینڈ نہیں ہوں۔ بہت ''رف'' ہے لیکن مجھے پھر بھی اچھا لگتا ہے۔''

ایک دم میرے دماغ میں پھلجڑی سی چھوٹی۔ ابھی کچھ دیر پہلے باہر وین میں رضوان بھی تو کسی لڑکی سے بڑے آتشیں لہجے میں بات کر رہا تھا۔ کہیں وہ یہی انگلش لڑکی تو نہیں تھی؟ میں نے میڈونا سے پوچھا۔ ''کیا نام بتایا تھا تم نے اپنے انڈین بوائے فرینڈ کا؟''

''رضی...... ویسے پورا نام تو کافی مشکل ہے۔'' اس نے اپنی چھوٹی سی انگلش ناک چڑھا کر کہا۔

میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ وہ جسے انڈین کہہ رہی تھی، وہ پاکستانی تھا اور رضوان تھا۔ وہ مردانہ وجاہت کا نمونہ تھا۔ اگر میڈونا اس پر فدا ہوئی تھی تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ میڈونا، سوئچ بورڈ کے پاس کھڑی کچھ دیر میرے بولنے کا انتظار کرتی رہی پھر لائٹ آف کر کے چلی گئی۔

مجھے میڈونا کے جسم کی چوٹیں یاد آئیں۔ اس نے بتایا تھا کہ اس کا محبوب ذرا سخت مزاج ہے۔ کسی وقت اس سے مار پیٹ بھی کر گزرتا ہے، تو کیا رضی یعنی رضوان اب ایسا ہو گیا تھا۔ اس میں بہت سی تبدیلیاں آئی تھیں۔ وہ خاموش طبع نہیں رہا تھا، سہما ہوا نہیں رہا تھا۔ اس کی چال ڈھال میں ایک اعتماد اور طمطراق آ گیا تھا۔ تو کیا ان تبدیلیوں میں ایک تبدیلی یہ بھی شامل تھی کہ وہ عورت ذات کے حوالے سے کچھ کرخت ہو گیا تھا۔

شاید یہ تبدیلی اس رویے کا ردِ عمل تھی جو ڈاکٹر ارم نے اس سے روا رکھا تھا۔ اس نے خوبرو رضوان کے ساتھ ایک زرخرید غلام کا سا سلوک کیا تھا۔ وہ اسے اپنے اشاروں پر نچاتی تھی اور اس کے جسم پر اپنی دیوانی محبت کی کرخت نشانیاں چھوڑتی تھی۔ وہ مناظر بھی میرے ذہن سے محو نہیں ہوئے تھے جب ڈاکٹر ارم نے رضوان کو اس کی بہن کے حوالے سے بے بس کر کے واپس اپنے پاس آنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ اس کے گلے میں رسّی ڈال کر اس سے جانوروں کا سا سلوک کرتی رہی تھی۔ شاید اسی طرح میں رات کو سونے سے پہلے دیر تک رضوان کے بارے میں سوچتا رہا اور ان حالات کے بارے میں سوچتا رہا جو رضوان سے ملاقات کے بعد یہاں پیش آ سکتے تھے۔ وہ یہاں کا بھیدی تھا۔ وہ بہت معاون ثابت ہو سکتا تھا۔

اگلے روز فون پر میری اور رضوان کی مختصر بات ہوئی۔ پھر اس نے باس روڈلف سے

مجھ سے ملنے کی اجازت لے لی۔ یہ اجازت اس نے اس حوالے سے لی کہ وہ میرا ہم وطن اور ہم زبان ہے..... لہٰذا ہم دونوں میں اچھی ''کوآرڈی نیشن'' پیدا ہوسکتی ہے۔

شام کی چائے کے وقت ہم دونوں کمرے میں تھے اور رازداری کے ساتھ گفتگو کررہے تھے۔ کھڑکیوں سے باہر اس وسیع قلعہ نما عمارت کے نشیب وفراز دکھائی دے رہے تھے۔ دور تک پھیلے ہوئے سبزہ زار، پتھریلی دیواریں، خاموش کھڑے پام اور ان کے درمیان سنسناتی ہوئی اسراریت، یہ جگہ رنگوں اور روشنیوں سے بھرے ہوئے بنکاک سے بس چند میل کے فاصلے پر تھی مگر کسی جزیرے کا حصہ معلوم ہوتی تھی۔

رضوان نے مجھے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا تھا، وہ میرے اندازوں کے عین مطابق ہی تھا۔ ملتان میں ملنگی ڈیرے کے زہریلے ''ملنگوں'' سے ایک زبردست مڈبھیڑ کے بعد رضوان کراچی چلا گیا تھا مگر چھوٹا گرو اور اس کے چیلے وہاں بھی اس کی بُو سونگھ رہے تھے۔ وہ ''پردے والی سرکار'' کے قتل میں رضوان کو بھی حصے دار سمجھتے تھے۔ یہیں پر رضوان کی ملاقات اس غیر ملکی گینگسٹر موگا سے ہوئی تھی اور وہ اس کے ساتھ بنکاک چلا آیا۔ موگا سے اور باس روڈلف کے ساتھ کام کرتے ہوئے اسے چار پانچ ماہ ہوئے تھے جب اسے پتا چلا کہ وہ انڈر ورلڈ کے ایک خطرناک گروہ ٹیکساری گینگ کا حصہ بن چکا ہے۔ یا یوں کہہ لیں کہ گینگ سے وابستہ مقامی لوگوں کے لیے کام کررہا ہے۔ یہ اس کے لیے ایک بڑا انکشاف تھا لیکن جو کچھ بھی تھا اب وہ پیچھے نہیں ہٹ سکتا تھا۔

میں نے بھی اپنی رُوداد کی چیدہ چیدہ باتیں رضوان کے گوش گزار کردیں اور اسے مختصراً بتادیا کہ کیا حالات تھے جن کی وجہ سے مجھے مردہ تصور کرلیا گیا اور کیا وجوہات تھیں جن کی بنا پر میں نے اپنا بھیس بدلا۔ میں نے اسے دیگر ساتھیوں انیق، سجاول، پہلوان حشمت اور تاجور وغیرہ کے بارے میں بھی ضروری باتیں بتائیں۔ تاہم انیق اور تاجور کے حوالے سے کسی منفی بات کا ذکر نہیں کیا۔

گفتگو طویل ہوتی جارہی تھی۔ میں نے رضوان سے کہا۔ ''اب مجھے بتاؤ کہ جنگلے اور خاردار تاروں کے اس پار کیا ہے؟''

وہ دھیمے لہجے میں بولا۔ ''مجھے صرف اتنا پتا ہے جی کہ..... کوئی بہت خاص بندہ وہاں سخت حفاظت میں رکھا گیا ہے۔ یوں تو اس کی ہر ضرورت اور سہولت کا خیال رکھا جاتا ہے مگر اسے ایک خاص جگہ سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں۔ وہ کبھی بیمار بھی ہوتا ہے تو یہیں پر اس کے لیے ایک گورے ڈاکٹر کو بلالیا جاتا ہے۔''

''وہ اکیلا ہے یا ساتھ کوئی اور بھی ہے؟''

''ایک لڑکی اس کے ساتھ ہے۔ کہا یہی جاتا ہے کہ وہ اس کی بیٹی ہے۔ اس کی عمر دس گیارہ سال کے قریب ہے۔ کبھی کبھار جب میں کھانے کی سپلائی لے کر اندر جاتا ہوں تو دیواروں کے پیچھے سے لڑکی کی چہکار یا اس شخص کی بھاری آواز سنائی دے جاتی ہے۔ ہم اس شخص کو یہاں بڑا آدمی کہتے ہیں۔ پچھلے سارے عرصے میں بس دو چار بار ہی ایسا ہوا ہوگا جب مجھے بڑے آدمی یا اس کی بچی کی جھلک نظر آئی ہو۔''

''اندر کوئی گارڈز وغیرہ بھی ہوتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''اصل میں جی میری وین کچن کے دروازے تک ہی جاتی ہے اور وہاں سے واپس آجاتی ہے۔ اس آنے جانے میں مجھے بس اتنا معلوم ہوا ہے کہ صفاچٹ سروں والے پانچ چھ بندے ہیں جو ہر وقت بڑے آدمی اور اس کی بچی کی نگرانی کرتے ہیں۔ کچھ عجیب شیطانی قسم کی شکلیں ہیں ان کی۔ دیکھ کر جھرجھری سی آجاتی ہے۔ کسی وقت تو لگتا ہے کہ ان کے چہروں کے نقش بھی ایک جیسے ہیں۔ میں نے کئی بار موگا سے بھی پوچھا ہے کہ یہ کون لوگ ہیں۔ مگر وہ کھل کر نہیں بتاتا۔ شاید اسے بھی ٹھیک سے پتا نہیں۔ کہتا ہے کہ یہ گینگ کے اسپیشل یونٹ کے لوگ ہیں۔ ان کے قریب جانا بھی خطرناک ہے۔''

''خطرناک سے کیا مراد ہے؟''

رضوان الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ ''وضاحت تو وہ بھی ٹھیک طرح سے نہیں کرسکا یا شاید کرنا ہی نہیں چاہتا تھا مگر ان ہم شکل بندوں کی عادتیں اور حرکتیں عام لوگوں سے مختلف ہیں۔ آنکھوں میں عیاری اور شرافت ناچتی رہتی ہے۔ شراب پانی کی طرح پیتے ہیں بلکہ پانی تو شاید پیتے ہی نہیں ہیں۔ ان کے اردگرد ہر وقت خوش شکل عورتیں موجود رہتی ہیں۔ یہ کچا گوشت اور قیمہ وغیرہ کھا جاتے ہیں۔ کسی وقت شوقیہ بھی آپس میں جھگڑتے ہیں اور تفریحاً ایک دوسرے کو خوناں خون کر دیتے ہیں۔ یہ بلا کے نشانے باز بھی ہیں۔''

پھر رضوان نے ایک واقعہ سنایا کہ کس طرح ایک اتوار کو جب وہ سپلائی دینے جنگلے کے پار گیا تو اس نے دیکھا کہ اندر ایک گراسی لان میں وہ منڈھے ہوئے سروں والے شیطان ایک خانساماں کے سر پر سیب رکھ کر پستول سے نشانہ بازی کر رہے تھے اور خوف کے سبب خانساماں کے کپڑے گیلے ہو جانے پر خوشی سے چلا رہے تھے۔

میں نے رضوان کو بتایا۔ ''یہ اسپیشل یونٹ والی بات بالکل درست ہے۔ یہ لوگ ٹیکساری گینگ کے بدنام زمانہ ڈیتھ اسکواڈ کا حصہ ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے، آپ ان کو پہلے سے جانتے ہیں؟''

''ان کو اور ٹیکساری گینگ کو جتنا میں جانتا ہوں، کم ہی لوگ جانتے ہوں گے۔ یہی لوگ تھے رضوان، جنہوں نے مجھے ایم اے کے ایک کھلاڑی سے مجرم اور قاتل بننے پر مجبور کر دیا اور شاید یہی لوگ ہیں جن کی وجہ سے میں اب بھی اپنی اصل شناخت کو چھپا کر پھر رہا ہوں۔ میری اور ان کی دشمنی بہت پرانی ہے لیکن مجھے لگتا ہے کہ اب وہ وقت آ گیا ہے جب اس دشمنی کو منطقی انجام تک پہنچایا جا سکتا ہے۔''

''وہ کس طرح شاہ زیب صاحب؟''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس شخص کو رہا کرا کے جسے تم بڑا آدمی یعنی بگ مین کہتے ہو اور جسے ان لوگوں نے یہاں قید کر رکھا ہے۔''

''گستاخی معاف، اس کے رہا ہونے سے کیا ہو گا؟''

''یہ تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ سب سے پہلے ہمیں یہ سوچنا ہے رضوان کہ ہم ''بڑے آدمی'' اور اس کی بچی کو کس طرح یہاں سے صحیح سلامت نکال سکتے ہیں۔''

وہ گہری سوچ میں گم ہو گیا۔ اس کی فراخ پیشانی پر الجھن کی پرچھائیاں تھیں، پھر جیسے ایک دم اسے کوئی خیال آیا۔ موضوع بدل کر بولا۔ ''آپ کی ذاتی زندگی کے بارے میں کوئی بات کر سکتا ہوں؟''

''کرو۔'' میں نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔

''ہماری بہن تاجور اب کہاں ہیں۔ میرا مطلب ہے آپ دونوں کا تعلق ملنگی ڈیرے پر ہی بہت واضح ہو گیا تھا۔ میں اکثر سوچتا رہا ہوں کہ آپ دونوں ایک ہوئے یا نہیں اور اگر نہیں ہوئے تو کب ہوں گے؟''

میں نے اصل بات چھپاتے ہوئے کہا۔ ''شاید وہ سب کچھ اتنا سنجیدہ نہیں تھا جتنا تم سمجھ رہے ہو، وہ ایک...... ہلکا پھلکا تعلق تھا۔''

وہ گہری نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ ''مجھے اس طرح آپ سے سوال جواب کرنے کا کوئی حق نہیں...... لیکن...... گستاخی معاف، مجھے لگتا ہے کہ آپ اس حوالے سے کچھ چھپا رہے ہیں۔''

''چلو، اس بارے میں پھر بات کریں گے۔''

''ویسے تاجور بہن ٹھیک تو ہیں ناں؟'' میں نے اثبات میں جواب دیا اور اسے بتایا کہ وہ لالہ موسیٰ کے قریب کسی گاؤں میں ہے۔

وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔ ''ان کے چہرے کی خاص روشنی اور مسکراہٹ مجھے آج بھی یاد ہے۔ کوئی ایسی بات ہے ان میں جو انہیں دوسروں سے بہت...... بہت جدا کرتی ہے۔ شاید آپ کو پتا نہ ہو کہ جب آپ اور وہ ملنگی ڈیرے پر تھے تو وہاں ایک انگریز صحافی بھی تھا مائیکل نام کا۔ اس نے جھوٹ موٹ ''پردے والی سرکار'' کے ہاتھ پر بیعت کی ہوئی تھی۔ دراصل وہ وہاں ملنگی ڈیرے کے روز وشب جاننے کے لیے ٹھہرا ہوا تھا۔ بعد میں اس نے ملنگی ڈیرے کے اندرونی حالات کے بارے میں ایک طویل مضمون لکھا تھا اور بتایا تھا کہ وہاں کیا گیا گھپلے ہوتے تھے اور کس طرح جھاڑ پھونک کے نام پر مریضوں کو ایلو پیتھک دوائیں دے کر ان سے پیسہ بٹورا جاتا تھا۔

ملنگی ڈیرے کے دیگر حالات لکھتے ہوئے اور وہاں کے مناظر بیان کرتے ہوئے اس نے ایک جگہ تاجور بہن کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے...... ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ جنگلوں میں بہت سے پرندے ایسے ہوتے ہیں جن کی بے مثال چہکار سننے والا کوئی نہیں ہوتا اور ویرانوں میں بہت سے پھول ایسے مہکتے ہیں جن کی خوب صورتی کی داد دینے والا کوئی نہیں آتا۔

پاکستان کے ایک دیہی علاقے سے تعلق رکھنے والی ایک دوشیزہ تاجور کی مثال بھی ایسی ہی تھی، وہ ایک سادہ اور جادوئی حسن کی مالک تھی۔ ایک ایسی خوب صورتی جو بے وجہ دل کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے اور انمٹ اثر چھوڑتی ہے۔ مجھے نہیں پتا کہ وہ ملنگی ڈیرے پر کیسے اور کیونکر پہنچی اور نہ ہی میں نے جاننے کی کوشش کی مگر آتے جاتے جب بھی میری نظر اس کے پاکیزہ روشن چہرے پر پڑی میری دل میں اس کی بے مثال خوب صورتی کے لیے ایک احترام جاگا...... اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہوا کہ دنیا میں حسن کو ناپنے کے جو پیمانے اور طریقے رائج ہیں وہ کتنے بھونڈے اور ناقابلِ بھروسا ہیں۔''

میں خاموشی سے رضوان کی طرف دیکھتا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ جواب میں اس سے کیا کہوں۔

وہ بولا۔ ''انگلش اخبار کا وہ تراشہ میں نے ابھی تک سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ موقع ملا تو آپ کو دکھاؤں گا اور برا نہ مانئے گا شاہ زیب...... سوری وقاص صاحب، میں نے تصور میں آپ دونوں کو اکثر ایک جوڑی کی صورت میں دیکھا ہے۔ میری دلی دعا ہے کہ ایک دن میرا یہ تصور حقیقت کا روپ دھار جائے۔''

دل میں ٹیس سی اٹھی۔ میں اس ''بے خبر'' کو کیسے بتاتا کہ اب یہ ساری بے معنی باتیں

ہیں۔ پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا ہے۔

رضوان کے جانے کے بعد میں نے لائٹ آف کی اور بستر پر دراز ہو کر سوچتا رہا، وہ سادہ سے چہرے والی شاید واقعی جادوئی حسن کی مالک تھی۔ اسی لیے تو اسے قدم قدم پر اپنے دیوانوں سے واسطہ پڑا تھا۔ یہاں تک کہ میرا انیق جیسا دوست بھی ایک موقع پر ہوش وحواس سے بیگانہ ہو گیا تھا اور پھر وہ سب کچھ ہو گیا تھا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ تاجور سے دھیان ہٹانے کے لیے میں خود کو اتنا مصروف کر لینا چاہتا تھا کہ تن بدن کا ہوش نہ رہے۔

پھر خود بخود ہی اس کے اسباب پیدا ہو گئے۔ مجھے یہاں بھرتی کرنے والوں نے مجھے ایک ٹاسک سونپ دیا اور وہ یہ تھا کہ میں یہاں کے کچھ تھائی شوٹرز کو کک باکسنگ میں ٹرینڈ کروں۔ ایک اونچی چھت والے وسیع وعریض ہال میں قریباً دو درجن چھٹے ہوئے بدمعاش میرے حوالے کر دیئے گئے اور میں انہیں مار دھاڑ کے گُر سکھانے لگا۔ مجھے معلوم ہوا کہ اس سے پہلے یہ کام وہی وجے نامی شخص کرتا تھا جس نے فخر کے لیے مخبری کرنا تھی مگر پھر اپنے کمرے میں سفاکانہ طریقے سے قتل کر دیا گیا۔

گاہے بگاہے رضوان سے بھی ملاقات ہو رہی تھی۔ وہ واقعی سرتاپا بدل چکا تھا۔ اس کے اندر خوف کی جگہ ایک ایسی بےخوفی نے لے لی تھی جو واقعی متاثر کرتی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ کس قدر خطرناک لوگوں کے لیے کام کر رہا ہے۔ اس کے باوجود میرا مطمع نظر سمجھتے ہوئے وہ واٹس وائے تک پہنچنے کے لیے کمربستہ ہو گیا۔

O......❖......O

اس دلچسپ داستان کے بقیہ واقعات
ساتویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں

یہ اس قلعہ نما عمارت میں میری ساتویں آٹھویں رات کا واقعہ ہے۔ ہم دونوں اپنے محفوظ میٹنگ روم یعنی میرے کمرے میں موجود تھے۔ میں نے کہا۔ ''یار! جب سے یہاں آیا ہوں فخر سے رابطہ نہیں ہوسکا۔ وہ میرے لیے بہت پریشان ہوگا۔''

''لیکن میں نے آپ کو بتایا ہے ناں کہ یہاں سے فون کرنے میں رسک ہے۔ ابھی آپ کو باہر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ آپ مجھے اس کا نمبر دیں میں کسی بہانے یہاں سے باہر نکلوں گا اور اس سے رابطہ کرلوں گا۔''

میں نے رضوان کو فخر کا نمبر دے دیا۔ جی تو یہ بھی چاہتا تھا کہ سجاول سے رابطہ کروں اور اس سے پاکستان کے حالات پوچھوں۔ یہ جاننے کی کوشش کروں کہ دارج داراب اور اس کی نئی نویلی دلہن کس حال میں ہیں لیکن یہ سب دل کو خون کرنے والی باتیں ہی تو تھیں اور میں اب ان باتوں کے حصار سے نکلنا چاہتا تھا۔

رضوان نے کہا۔ ''کل دوپہر میں کچن میں سپلائی دینے کے لیے گیا تو ہیڈ بٹلر سے بات کرنے اندر چلا گیا۔ وہاں ایک کھڑکی میں سے اندر والی عمارت کی جھلک نظر آرہی تھی۔ میں نے بڑے آدمی کی ایک جھلک دیکھی۔ وہ اونچے جنگلے والے لان میں آرام کرسی پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ اس کی بیٹی ایک روش پر اسکیٹ چلا رہی تھی اور ساتھ ساتھ کچھ کھا رہی تھی۔ شکل سے ہی پتا چل جاتا ہے کہ وہ اس کی بیٹی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے اور فخر کو ابھی تک یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ اپنے اس بدترین دشمن کو جان ڈیرک جیسے کمینے نے اب تک زندہ کیوں رکھا ہوا ہے۔ ہمارا تو خیال تھا کہ اسے پہلی فرصت میں دردناک طریقے سے مار کر اس کی لاش کے ٹکڑے کسی گٹر میں بہا دیئے جائیں گے۔''

''ہوسکتا ہے کہ اس شخص سے گینگ کو کوئی غرض ہو۔ میں نے ایک دفعہ میڈونا سے یہ بھی سنا تھا کہ گینگ کا چیف جان ڈیرک ہٹ کا بہت پکا اور دیوانگی کی حد تک ضدی ہے۔ ایک بار

جو بات اس کے دماغ میں سما جائے وہ نکلتی نہیں۔ ممکن ہے کہ وہ اپنے اس بدترین دشمن کو زندہ رکھ کر اذیت دے رہا ہو۔''

''کس طرح کی اذیت؟ آثار سے تو یہی پتا چلتا ہے کہ وہ یہاں اس پُرسکون جگہ پر نارمل زندگی گزار رہا ہے۔ قید کی صعوبت تو ہے مگر اور کچھ خاص نہیں۔'' ایک دم میرے ذہن میں ایک نیا خیال آیا۔ میں نے رضوان سے کہا۔ ''تمہاری باتوں سے مجھے اندازہ ہوا ہے کہ یہ میڈونا کافی کچھ جانتی ہے لیکن چکنے گھڑے کی طرح ہے، بتاتی کچھ نہیں۔ وہ تم پر لٹو بھی ہے۔ اگر تم اس پر اپنا ہاتھ ذرا ہولا رکھو، میرا مطلب ہے تھوڑی سی محبت برتو تو وہ کافی کچھ اُگل سکتی ہے۔''

وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ''آپ کے کہنے سے پہلے ہی میں اس کی کوشش کر رہا ہوں۔''

''اس سے سخت رویہ کیوں رکھتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''بس جناب! کسی وقت اس سے چڑ سی ہو جاتی ہے۔ جس طرح بلی زبردستی ٹانگوں میں گھستی چلی جاتی ہے اور ٹھوکر کھا کر بھی باز نہیں آتی، کچھ یہی حال اس لڑکی کا ہے۔''

''لیکن کافی خوب صورت انگریزنی ہے۔ کہیں کسی اور کا بدلہ تو نہیں لے رہے ہو اس سے؟''

اس نے پھیکی ہنسی کے ساتھ نفی میں سر ہلایا۔ لیکن اس کے تاثرات یہی بتاتے تھے کہ اس کے دل کی گہرائی میں ابھی تک اپنے ماضی کی بے بسی، اذیت اور توہین کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔

میں نے اس حوالے سے اسے سمجھانے بجھانے کی کوشش کی اور اس کا نتیجہ جلد ہی نکل آیا۔ صرف 72 گھنٹے بعد رضوان سے میری جو ملاقات ہوئی، وہ خاصی معلومات افزا تھی۔ پہلی خبر تو اس نے یہی دی کہ اس نے فخر سے رابطہ کر لیا ہے اور میری جانب سے اسے پوری تسلی دے دی ہے۔ دوسری بات اس نے یہ بتائی کہ کل رات میڈونا نے اس سے کھل کر باتیں کی ہیں۔ وہ بولا۔ ''دراصل جناب! یہ میڈونا اس جگہ کی سب سے پرانی خدمت گار ہے۔ یہ یہاں کے تقریباً ہر بیڈ روم کو رونق بخش چکی ہے۔ اس کے سینے میں بہت سے راز دفن ہیں۔ مجھے پہلے بھی اس بات کا اندازہ تھا مگر پرسوں آپ کے کہنے پر میں نے اس بارے میں خاص توجہ دی۔ کل اور پرسوں میڈونا سے میری طویل گفتگو ہوئی ہے اور اس نے اپنی معلومات کے مطابق ایک بڑا انکشاف کیا ہے۔''

''کس بارے میں؟'' میں نے پوچھا۔

''واٹس وائے اور اس کی بیٹی کے بارے میں۔ مجھے ابھی تک یقین نہیں آرہا لیکن جو کچھ وہ بتا رہی ہے، پورے اعتماد سے بتا رہی ہے اور جب ہم ٹیکساری کے چیف جان ڈیرک کے خطرناک کردار کے بارے میں سوچتے ہیں تو پھر یہ انکشاف زیادہ حیران کن بھی نہیں لگتا۔''

اس نے چند لمحے توقف کر کے الفاظ کا انتخاب کیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''میڈونا کے مطابق جان ڈیرک اپنی دشمنی میں دیوانگی کی حد تک چلا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس نے ایک پرانا بدلہ چکانے کے لیے واٹس وائے کو زندہ رکھا ہوا ہے۔ اس بدلے کا تعلق واٹس کے علاوہ اس کی بیٹی سے بھی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

رضوان نے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ ''آپ کو پتا ہی ہے یہ گینگسٹر جب آپس میں لڑتے ہیں تو جانوروں کی طرح ہو جاتے ہیں، ہر حد تک چلے جاتے ہیں۔ ایسے ہی ایک موقع پر کبھی واٹس وائے کے بھائی نے ایک گھناؤنا جرم کیا۔ اس نے جان ڈیرک کی جوان بیٹی کی عزت خراب کر دی اور یہ مکروہ کام جان ڈیرک کے سامنے کیا۔ بعدازاں جان ڈیرک اِس گھیرے سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا لیکن اس نے خود سے عہد کیا کہ وہ واٹس وائے سے بدلہ لے گا اور اسی طریقے سے لے گا۔ وہ اس کی جوان بیٹی کو اس کے سامنے برباد کرے گا۔ اب دیکھیں جناب! انسان دشمنی کے اندھے گڑھوں میں گرتا ہے تو کتنی دور تک چلا جاتا ہے۔ آپ سوچ سکتے ہیں کہ چیف جان ڈیرک نے واٹس وائے کو اب تک زندہ کیوں رکھا ہوا ہے؟''

میں سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''جب واٹس وائے کو جان ڈیرک نے زیر کر لیا اور اپنے بس میں کر لیا تو اس کو بے پناہ اذیت سے گزارا۔ اس کی بیوی کو مار ڈالا۔ بھائی کے علاوہ اس کے دو قریبی دوستوں کو قتل کر دیا مگر اس کا انتقام پورا نہیں ہوا۔ واٹس وائے کی کوئی جوان بیٹی نہیں تھی۔ اس کی بیٹی ڈیزی کی عمر صرف چھ سات سال تھی۔ اپنی قسم پوری کرنے کے لیے جان ڈیرک کے لیے ضروری تھا کہ وہ چند سال انتظار کرتا تاکہ واٹس کی بیٹی جوان ہوتی اور وہ اسے اس کی آنکھوں کے سامنے بے آبرو کر کے اپنے انتقام کی آگ ٹھنڈی کرتا۔ واٹس وائے کے اب تک زندہ رہنے کی اصل وجہ یہی ہے جناب۔''

میں سناٹے کے عالم میں سن رہا تھا۔ اگر یہ سب کچھ درست تھا تو اس کا مطلب یہی تھا

کہ اگر جان ڈیرک کا بدترین دشمن والٹس وائے اب تک زندہ تھا تو اس کی وجہ انتقام کا غیر معمولی جذبہ ہی تھا۔ والٹس وائے کو مارنے سے پہلے جان ڈیرک اسے بھی اس اذیت سے گزارنا چاہتا تھا جس سے وہ خود گزرا تھا۔ وہ اس کی بیٹی کے بالغ ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔

میں نے رضوان سے پوچھا۔ ''میڈونا کیا کہتی ہے۔ کیا والٹس وائے کو اس صورتِ حال کا علم ہے؟''

''یقیناً ہوگا اور نہیں بھی ہوگا تو شک ضرور ہوگا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ دو تین بار، بیٹی سمیت یہاں سے فرار ہونے کی ناکام کوشش کر چکا ہے۔ ایک بار اس نے خودکشی کی کوشش بھی کی تھی۔ اس موقع پر اس کی بیٹی نے رو رو کر اپنی حالت خراب کر لی۔ اس کے بعد خودکشی کی کوشش والا تو کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ اب فرار کی کوشش بھی اس کے لیے ممکن نہیں کیونکہ ٹیکساری گینگ کے یہ خطرناک ترین گنجے گارڈز اس پر ہر وقت اپنی عقابی نظر رکھتے ہیں۔''

میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اب تک اپنے زندہ رہنے کی وجہ کچھ اور سمجھ رہا ہو۔''

''بالکل، یہ بھی ہوسکتا ہے۔ آپ خود ہی کہہ رہے تھے کہ ان گینگسٹرز کے ان گنت چکر ہوتے ہیں۔ مختلف طریقوں سے ایک دوسرے کو بلیک میل کیا جاتا ہے...... لیکن میرا خیال ہے...... اصل بات وہی ہے شاہ زیب صاحب! جو میڈونا نے کل رات مجھے بتائی ہے۔''

O......❖......O

پروگرام کے مطابق میں اور رضوان کارروائی کے لیے بالکل تیار تھے۔ رات ساڑھے آٹھ اور نو کے درمیان رضوان کو ناشتے اور بیکری کا دیگر سامان لے کر آہنی جنگلے کی دوسری جانب ممنوعہ علاقے میں داخل ہونا تھا۔ گیٹ پر ڈیلیوری وین کو پوری طرح چیک کیا جاتا تھا، مگر ایک بات ہمارے حق میں جا رہی تھی۔ گاڑی کو نیچے سے چیک کرنے والا VEHICLE METAL DETECTOR پچھلے تین چار روز سے خراب تھا۔ اس صورتِ حال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے رضوان نے مشورہ دیا تھا کہ میں وین کے پیندے سے چپک کر اندر چلا جاؤں۔ یہ بھی ایک حسبِ حال بات تھی کہ تین پہیوں والی اس الیکٹرانک وین کی اونچائی زمین سے کچھ زیادہ تھی۔ اس کے نیچے گھس کر ''سکیورٹی گیٹ'' پار کرنے کا آئیڈیا قابلِ عمل تھا۔ کل رات میں اکیلا ہی کیلے کے اس جھنڈ کے پاس پہنچا تھا اور وین کے نیچے جا کر ٹھیک سے ریہرسل کر لی تھی۔ اب ساری تیاری مکمل تھی۔ رضوان نے مجھے اپنا شاندار بریٹا پسٹل بمع دو عدد فالتو میگزین فراہم کر دیا تھا۔ ایک دندانے دار لمبا چاقو بھی میرے لباس میں موجود تھا

اور میرا سب سے اہم ہتھیار تو ہر وقت میرے پاس ہی رہتا تھا، میرا ایم ایم اے کا ہنر۔

میں نے کہا۔ ”رضوان ایک بات تو ذہن سے نکل گئی اور وہ کافی اہم بات ہے۔“ وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے کہا۔ ”سکیورٹی گیٹ تک اور پھر آگے کچن تک قریباً ڈیڑھ سو میٹر کا فاصلہ تو ہے ہی۔ اگر اس راستے میں کہیں کوئی اسپیڈ بریکر ہوا تو میری ریڑھ کی ہڈی کے دو تین ٹکڑے ضرور ہو جائیں گے۔“

وہ مسکرایا۔ ”جناب، یہ خدشہ شام کو میرے ذہن میں بھی آیا تھا۔ میں پوری تسلی کر آیا ہوں۔ کم از کم یہاں سے کچن تک تو کوئی بریکر نہیں ہے۔“

پلان فائنل ہو چکا تھا اور یہ بڑا خطرناک تھا۔ خاص طور سے میرے لیے۔ رضوان کو وین میں نقص ڈال کر کچن کے قریب ہی موجود رہنا تھا جبکہ مجھے ایک چار دیواری پار کر کے اندرونی حصے میں گھسنا تھا۔ ایک حرکت کرتا ہوا سی ٹی وی کیمرا یہاں موجود تھا۔ رضوان نے اس کی حرکت کی ٹائمنگ دیکھ لی تھی۔ کیمرا اپنا نیم دائرہ قریباً پانچ سیکنڈ میں مکمل کرتا تھا، مجھے اسی پانچ یا چھ سیکنڈ کے اندر دیوار سے کود کر اندر پہنچنا تھا۔

رات نیم گرم اور تاریک تھی۔ سینے میں پُر جوش دھڑکن کا شور تھا۔ میں عرصے بعد خود کو پوری فارم میں محسوس کر رہا تھا۔ مرنے مارنے والا وہی آتشیں موڈ تھا جو مجھے یورپ میں خطرناک گینگسٹرز کے سامنے لا کھڑا کرتا تھا۔ ہاں یہی میرا ماضی تھا۔ کسی نے بڑی سنگ دلی سے مجھے اس ماضی کی طرف دھکیل دیا تھا، اور خود اپنا رخ اپنے سماج کی طرف اور اپنی نئی زندگی کی طرف پھیر لیا تھا۔ اب مجھے انگاروں پر چلنا تھا اور جب انگاروں پر ہی چلنا تھا تو پھر میں آہستہ کیوں چلتا۔ اب میں دوڑنا چاہتا تھا۔ آر یا پار۔

مقررہ وقت پر میں کیلے کے درختوں کی طرف چلا گیا اور خود کو الیکٹرک وین کے نیچے ایڈجسٹ کر لیا۔ کچھ ہی دیر بعد وین کو ہچکولا لگا۔ رضوان ڈرائیونگ سیٹ سنبھال چکا تھا۔ بالکل ہلکی سی آواز کے ساتھ وین اسٹارٹ ہوئی اور سکیورٹی گیٹ کی طرف روانہ ہو گئی۔ مشکل ترین لمحات قریب آ رہے تھے۔

وین گیٹ پر رکی اور مسلح گارڈز اس کا جائزہ لینے لگے۔ اس کے دروازے کھولے گئے۔ آگے پیچھے سے دیکھا گیا۔ اندرونی لائٹس جلائی گئیں اور BOXES وغیرہ کھول کر دیکھے گئے۔ ”آج جلدی آ گئے ہو؟“ ایک گارڈ کی بھاری بھرکم آواز میرے کانوں تک پہنچی۔

رضوان نے بے تکلف لہجے میں کہا۔ ”ڈیئر، تمہاری گھڑی خراب ہے۔ میں پورے تین منٹ لیٹ ہوں۔ وین اسٹارٹ نہیں ہو رہی تھی۔“

دوسرے گارڈ نے رضوان کی بات کی تائید کی اور اس کے ساتھ ہی گیٹ کھول کر اسے جانے کی اجازت دی۔ پہلا مرحلہ طے ہو گیا تھا اور اگلا زیادہ مشکل تھا۔ وین چالیس پچاس میٹر چلنے کے بعد ایک نیم روشن جگہ پر رکی۔ وین کے رکتے ہی میں پیندے سے علیحدہ ہوا اور خود کو تیزی سے رول کرتا ہوا گارڈینا کی ایک، پانچ چھ فٹ اونچی باڑ کے عقب میں چلا گیا۔ میری نظر بلندی پر موجود حرکت کرتے ہوئے کیمرے پر تھی۔ جونہی اس کیمرے کا رخ دوسری جانب ہوتا، مجھے اپنی جگہ سے اٹھنا تھا اور قریباً آٹھ فٹ اونچی ایک دیوار پار کرنا تھی۔ ہاں یہی دیوار تھی جس کی دوسری جانب ڈیتھ اسکواڈ کے ہم شکل شیطان پائے جاتے تھے۔ میں اس دیوار کو دیکھ رہا تھا اور جانتا نہیں تھا کہ اس کے پار جا کر میں ایک ایسا دلخراش منظر دیکھنے والا ہوں جو تا دیر میرے ذہن سے محو نہیں ہو سکے گا۔

○......❖......○

میں مسلسل کیمرے کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کی ''مومنٹ'' پر غور کر رہا تھا۔ جونہی کیمرے نے دیوار کی طرف سے رخ پھیرا، میں گارڈینا کے پیچھے سے اٹھا اور لپک کر اس آٹھ فٹ اونچی دیوار کی طرف گیا۔ پلک جھپکتے میں دیوار کے پار تھا۔ میں دیوار سے کود کر جس جگہ پنجوں کے بل گرا وہ پختہ زمین نہیں ایک لمبی کیاری تھی۔ گل عباسی کے پودوں نے مجھے ڈھانپ لیا۔ میں نے احتیاطاً بریٹا پسٹل اپنے ہاتھ میں کر لیا تھا اور انگلی لبلبی پر دھری تھی۔

مجھے اپنے سامنے ایک کشادہ لان نظر آیا۔ گھاس کو خوب صورتی سے تراشا گیا تھا۔ چاروں طرف ایک باغیچہ تھا جس میں پھل دار اور پھول دار پودے تھے۔ کہیں کہیں گارڈن لائٹس کی مدھم روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ گھاس کاٹنے والی ایک چھوٹی سی جدید، جیپ نما مشین اس وسیع لان کے بیچوں بیچ کھڑی تھی۔ میری نگاہ سب سے پہلے جس منظر پر پڑی وہ انہی ہم شکل شیطانوں کے ہیولے تھے۔ وہ حسبِ معمول تیز رنگ کے نہایت چست لباسوں میں تھے۔ جیسے جسموں پر کپڑے کے بجائے رنگ کیا گیا ہو۔ فقط ان کے بازو کندھوں تک ننگے تھے۔ ان کے منڈھے ہوئے سر گارڈن لائٹس کی دھیمی روشنی میں دمک رہے تھے۔ یہاں ان کی تعداد چار تھی۔ تین تو گھاس کاٹنے والی مشین کے پاس کھڑے تھے ایک باؤنڈری وال کے ساتھ ساتھ باغیچے میں بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔

''پکڑو جانے نہ پائے۔'' ایک شتونگڑا کریہہ آواز میں چلایا۔

دوسرے نے پکار کر کہا۔ ''بس دو منٹ باقی ہیں تمہارے پاس۔''

باغیچے میں بھاگ دوڑ کرنے والے کی رفتار کچھ اور تیز ہو گئی۔ وہ کسی شکاری جانور کی سی

پھرتی کے ساتھ کسی چیز کو پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا اور پھر مجھے وہ چیز بھی نظر آ گئی۔ وہ ہرن کا ایک خوب صورت بچہ تھا۔ چند روز پہلے میرے دوست فخر نے مجھے واٹس وائے اور اس کی دس گیارہ سالہ بچی کی جو تصویریں دکھائی تھیں، ان میں سے ایک تصویر میں ہرن کا یہ بچہ بھی لڑکی کے ساتھ دکھائی دے رہا تھا۔ ڈیتھ اسکواڈ کا سر منڈا شیطان برق رفتاری سے ہرن کو دبوچنے کی کوشش میں تھا۔ ہرن بھی بلا کا پھرتیلا۔ وہ نوخیز بھی تھا۔ چوکڑیاں بھرتا ہوا ایک طرف کے درختوں سے نکلتا تھا اور دوسری طرف کے پودوں میں اوجھل ہو جاتا۔ غالباً یہ کسی قسم کا کھیل تھا جو یہ شیطان زادے آپس میں کھیل رہے تھے۔ دفعتاً ہرن نے برق رفتاری سے بھاگتے بھاگتے تیزی سے اپنا رخ بدلا اور پھسل گیا۔ اس کے پیچھے طوفان کی طرح آتا ہوا شخص جست لگا کر اس کے اوپر جا پڑا۔ بالکل جیسے کوئی جانور اپنے شکار پر چھلانگ لگاتا ہے۔ میں سمجھا کہ یہ کھیل یہیں تک ہے مگر اگلا منظر دل خراش تھا۔ سر منڈھے شیطان زادے نے بالکل کسی درندے کی ہی طرح مچلتے ہوئے ہرن کی شہ رگ پر اپنا منہ رکھا اور اسے دانتوں سے بھنبھوڑ دیا۔ گارڈن لائٹ کی مدھم روشنی میں مجھے ہرن کی گردن سے خون کا فوارہ پھوٹتا نظر آیا۔ وہ بری طرح مچلا پھڑکا مگر لمبے تڑنگے خبیث کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ اس نے باقاعدہ کسی شیر ہی کی طرح ہرن کی شہ رگ سے منہ پیوست رکھا۔ یقیناً وہ اس کا خون پی رہا تھا۔

گراس کٹر مشین کے پاس کھڑے تینوں ارکان نے اپنے ساتھی کی کامیابی پر خوشی کا اظہار کیا۔ خون پیتا ہوا شخص پکار کر بولا۔ ”آ جاؤ میرے شیرو۔“

وہ تینوں بھی شیطانی انداز میں چنگھاڑتے ہوئے، نیم جان جانور پر جھپٹے اور چوپایوں کا انداز اختیار کیا پھر وہ بھی باقاعدہ دانتوں سے اس کا گوشت نوچنے لگے۔ میں جانتا تھا کہ وہ کچا گوشت کھاتے ہیں لیکن اس طرح بھی کھاتے ہیں، مجھے علم نہ تھا۔ تب میری نگاہ مور پنکھ کے پودوں کے پاس ایک اور شے پر پڑی میں نے وہاں ایک السیشن کتے کی ہڈیاں دیکھیں، اس کا سر اس کے پنجر کے ساتھ ہی تھا اور اردگرد خون کے لوتھڑے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ یہ منظر میں اس سے پہلے نہیں دیکھ پایا تھا۔ بدن میں پھریری سی دوڑ گئی۔ یہ ڈیتھ اسکواڈ کے ان ہرکاروں کی وحشت کی نشانیاں تھیں۔ جب بھی ان سے واسطہ پڑتا تھا، ان کی کوئی نہ کوئی ”اضافی خوبی“ سامنے آتی تھی۔

چاروں افراد جو یہاں موجود تھے، ہرن کا کچا گوشت کھانے میں مصروف تھے۔ میں ان سے پندرہ بیس میٹر کی دوری پر تھا، پھر بھی مجھے ان کے خون میں لتھڑے ہوئے چہرے صاف نظر آ رہے تھے۔ وہ اس ساری صورتِ حال کو انجوائے کر رہے تھے اور مست تھے۔ میں

لیے یہ اچھا موقع تھا کہ میں اندر عمارت کی طرف جانے کی کوشش کروں۔

موقع دیکھ کر میں نے اپنی جگہ چھوڑی اور باغیچے کے پودوں کی اوٹ میں جھک کر بھاگتا ہوا اندرونی عمارت کی طرف بڑھا...... میں اچھی طرح دیکھ چکا تھا کہ سی سی ٹی وی کیمرے صرف باہر کے آہنی جنگلے اور اندرونی دیوار پر ہی نصب تھے۔ اندر کی عمارت میں کہیں کسی کیمرے کے آثار دکھائی نہیں دیتے تھے۔ میں نے ایک دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا اور اسے دھکیلتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ وہاں اے سی کی خوشگوار ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ کسی اندرونی کمرے سے موسیقی کی تیز دھنا دھن ابھر رہی تھی۔ کہیں پاس سے ہی باتیں کرنے کی ہلکی سی آواز بھی سنائی دی۔ میں تھوڑا آگے گیا۔ دو افراد مصروفِ گفتگو تھے۔ ان کی آوازیں سن کر ہی مجھے پتا چل گیا کہ وہ ڈیتھ اسکواڈ کے ''حرامزادے'' ہیں۔ کسی وقت تو مجھے یوں لگتا تھا کہ ایول نامی اس ابلیس کے تخم سے جنم لینے والے ان سارے اشخاص کی شکلیں ہی نہیں آوازیں بھی ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں۔ ان میں سے ایک کو شاید نیند آ رہی تھی اور دوسرا ایل سی ڈی پر کوئی لچر فلم دیکھنے میں مصروف تھا۔ پہلا بولا۔ ''تمہارے منہ پر پیشاب کے چھینٹے، جاؤ اب دفع بھی ہو جاؤ۔''

دوسرا بولا۔ ''تمہاری اس ماں کا ہنی مون تو دیکھ لوں، پھر جاتا ہوں۔''

پہلے نے شاید اسے دھکا دیا تھا۔ وہ لڑکھڑا کر کسی چیز سے ٹکرایا اور اس کے ٹوٹنے کی صدا آئی۔ ایک لمحے کے لیے تو لگا کہ شاید وہ گتھم گتھا ہو جائیں گے لیکن پھر معاملہ ٹل گیا۔ ان میں سے ایک بلند آواز میں ہنستا ہوا اس دروازے کی طرف بڑھا جس کے عقب میں، میں چھپا ہوا تھا۔ وہ ایک بڑے سیب کو کچر کچر کھاتا ہوا آ رہا تھا۔ شاید اگر وہ میرے پاس سے گزر جاتا تو اس کی زندگی آگے چلتی رہتی مگر وہ گزرا نہیں، دروازے سے نکلتے نکلتے رک گیا۔ غالباً اس کے سونگھنے کی حس بڑی تیز تھی اور اسے اپنے آس پاس کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔ میں نے سانس روک لی۔ وہ پلٹا اور اس نے دروازے کے پیچھے جھانکا۔ وہاں میں کھڑا تھا اور میرے ہاتھ میں خطرناک نوک والا دندانے دار چاقو تھا۔ ''کون ہو؟'' اس کے منہ سے بے ساختہ گمبھیر آواز بلند ہوئی۔

میں نے اسے جواب دیا اور یہ جواب اس چاقو کی شکل میں تھا جو دستے تک اس کے سینے میں گھس گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کریہہ آواز میں چلاتا، میں نے اس کا منہ بڑی مضبوطی کے ساتھ اپنی ہتھیلی سے ڈھانپ لیا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ چاقو دل میں ترازو ہو جانے کے باوجود وہ بری طرح مچلا اور مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش کی۔ اس نے تڑپ

کرا پنا گھٹنا میری ناف میں رسید کرنا چاہا۔ میں نے اس کے گھٹنے کو اپنے گھٹنے سے ہی روکا اور چاقو کھینچ کر دوسرا وار اس کی گردن پر کیا۔ خون کا فوارہ چھوٹا اور وہ ڈگمگا کر زمین بوس ہو گیا۔ میں نے تب تک اس کے منہ سے ہاتھ نہیں ہٹایا جب تک اس کی آنکھیں پتھرا نہیں گئیں اور سیب اس کے ہاتھ سے لڑھک نہیں گیا۔

کسی قریبی کمرے سے اس کا ساتھی پکار کر پوچھ رہا تھا۔ ''کیا ہوا چارلی، یہ آواز کیسی تھی؟''

تب قدموں کی چاپ ابھری، وہ میری طرف آ رہا تھا۔ میں ایک بار پھر دروازے کی اوٹ میں چلا گیا۔ چست لباس اور منڈھے ہوئے سر والا لمبا تڑنگا شیطان اندر داخل ہوا۔ سامنے ہی لاش پڑی تھی۔ اس کا ردِعمل حیرت انگیز طور پر برق رفتار تھا۔ وہ واپس پلٹا، مجھے لگا کہ کوئی ہتھیار لینے لپکا ہے۔ میں نے چند قدم بھاگ کر اسے عقب سے جالیا۔ وہ اوندھے منہ میرے نیچے قالین پر گرا۔ میں نے سب سے پہلے اس کا منہ بند کیا، پھر چاقو کا بھرپور وار اس کی کمر پر دونوں کندھوں کے درمیان کیا۔ میں دوسرا وار بھی کرنا چاہتا تھا مگر دندانے دار چاقو اس کی پسلیوں میں کہیں بری طرح پھنس گیا۔ اس ''ٹیسٹ ٹیوب خبیث'' کے جسم میں حیوانی طاقت تھی۔ اس لیے زور لگا کر پلٹا اور خود کو میرے نیچے سے نکالنا چاہا۔ مگر میں اسے دوبارہ اسی آسن پر لے آیا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اس نے اپنا دایاں ہاتھ لمبا کیا ہوا ہے اور اسے پورے زور سے کسی چیز تک پہنچانے کی کوشش کر رہا ہے، لیکن وہ چیز کوئی ہتھیار نہیں تھی...... وہ ایک وارڈ روب کے نچلے کنارے پر لگا ہوا ایک چھوٹا سا سفید بٹن تھا۔

میرے دل نے پکار کر گواہی دی کہ یہ ''الارمنگ بٹن'' ہے۔ اس کے دبتے ہی پوری عمارت میں خطرے کے سائرن بج اٹھیں گے۔ مجھے الارمنگ سسٹم کے بارے میں رضوان ٹی پہلے ہی بتا چکا تھا۔ الارمز کے بٹن اور خبیث کی انگلی کے درمیان پانچ چھ انچ کا فاصلہ تھا۔ یہ فاصلہ ختم ہو جاتا تو پھر کچھ بھی میرے بس میں نہ رہتا۔ چاقو نے تو حریف کے جسم سے باہر آنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ میں نے چاقو چھوڑ کر خبیث کی وہ کلائی تھام لی جس کی انگلی سفید بٹن کی طرف بڑھ رہی تھی۔ یہ چند انچ کے فاصلے کی کشمکش تھی اور بڑی شدید تھی۔ فاصلہ مزید کم ہو گیا چار انچ...... تین انچ...... دو انچ...... میں نے اپنی پوری توانائی صرف کی اور حریف کو پلٹ دیا۔ اب وہ اوپر اور میں نیچے تھا لیکن اس کی پشت بدستور میری طرف تھی اور میں نے ہتھیلی کی مدد سے پوری مضبوطی کے ساتھ اس کا منہ ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کی پشت سے بہنے والا گرم خون میرے سینے اور پیٹ کو بھگو رہا تھا۔ میرا دایاں ہاتھ اب آزاد تھا۔ اس کو

پتا ہی نہیں چلا کہ میں نے کب اس کی گردن کا کڑا کا نکال دیا۔ یہ ایم ایم اے کا ہنر تھا۔
اس شخص کو وہیں لہولہان چھوڑ کر میں اس کمرے کی طرف بڑھا جہاں سے موسیقی کی تیز آواز ابھر رہی تھی۔ میں نے بے دھڑک ہو کر دروازہ کھولا۔ اندر ایک لڑکی محوِ رقص تھی اور دروازہ کھلتے ہی موسیقی کی آواز سماعت شکن ہو گئی تھی۔ لڑکی کا رخ دوسری طرف تھا میں نے دروازہ بند کر دیا۔ میں دیکھتے ہی جان گیا یہ کوئی عام لڑکی نہیں تھی۔ یہ بھی ڈیتھ اسکواڈ کی ایک خطرناک شیطان زادی تھی۔ نہایت چست لباس۔ بوائے کٹ بال اور فولادی جسم۔ وہ میری طرف دیکھے بغیر بلند آواز میں بولی۔ ''کھا آئے ہو کتے اور بلی کا گوشت؟''
موسیقی کے سبب آواز بمشکل میرے کانوں تک پہنچ سکی۔
میں کوئی جواب دیئے بغیر عین اس کی پشت پر چلا گیا اور اپنے دونوں ہاتھ اس کے عُریاں کندھوں پر رکھ دیئے۔ وہ بدستور ہولے ہولے تھرک رہی تھی۔ موسیقی کی دھنا دھن کے اندر بلند آواز سے پکاری۔ ''آج تمہارے منہ سے السیشن کتے کی بُو آئے گی۔ اس لیے اچھا تو یہی ہے کہ چپ کر کے سو جاؤ۔''
فقرہ مکمل کرتے کرتے اسے کسی انوکھے پن کا احساس ہو گیا۔ اس نے جیسے تڑپ کر اپنا رخ پھیرا اور میری جانب دیکھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ کوئی عام لڑکی نہیں ہے اور نہ ہی عام سلوک کی مستحق ہے۔ میں نے اس کے جبڑے پر ایک طوفانی مکا رسید کیا۔ یہ نشانے پر لگتا تو اسے بے ہوش کرنے کے لیے کافی تھا۔ تاہم وہ غیر معمولی پھرتی سے نیچے جھکی اور میرا یہ راؤنڈ پنچ بھرپور ضرب نہیں لگا سکا۔ اس نے چلا کر اپنی ٹانگ گھمائی جو میری چھاتی پر لگی۔ ٹانگ کی دوسری ضرب کا میں نے نہ صرف دفاع کیا، بلکہ ٹانگ تھام لی اور اس کی دوسری ٹانگ کو اڑنگا لگا کر اسے نیچے گرا دیا۔ اس نے میری ٹانگوں کے درمیان ہاتھ ڈالنا چاہا مگر منہ کی کھائی، میرے گھٹنے کی ضرب اس کی ناک پر لگی تھی۔ اس ضرب نے اس غیر معمولی ''فی میل فائٹر'' کا دم خم ختم کر دیا۔ وہ ہیجانی انداز میں پکاری۔ ''مدد...... مدد...... کوئی ہے۔''
اس کی آواز کان پھاڑ موسیقی میں دب کر رہ گئی۔ شاید وہ دوگنا آواز سے بھی چلاتی تو اپنی آواز باہر نہ پہنچا سکتی۔ اس نے اپنے نکیلے ناخنوں سے میرا منہ نوچنے کی کوشش کی۔ اُپنے نیسٹ ٹیوب بھائیوں کی طرح وہ بھی عیاری اور سفاکی میں اپنی مثال آپ تھی۔ میں اس سے پہلے ڈنمارک میں بھی اس جیسی ایک آفت زادی سے دو دو ہاتھ کر چکا تھا۔ ایک عجیب سے طیش نے میرے دماغ میں چنگاریاں بکھیر دیں۔ مین نے اس کی صنف کی پروا کیے بغیر ایک دھواں دھار ہاتھ اس کے جبڑے پر رسید کیا۔ اس مرتبہ وہ اپنا دفاع نہ کر سکی اور نیم بے ہوش

ہوگئی۔ اس کا جبڑا ٹوٹ چکا تھا۔ اس کے قریب ہی نائیلون کی وہ رسی پڑی تھی جو ورزش کے طور پر پھاندی جاتی ہے۔ میں نے پھرتی سے اس کے ہاتھ اور پاؤں باندھ دیئے۔ ایک ریشمی اسکارف میں نے اس کے گلے میں کس دیا، لیکن نہ تو اتنی زور سے کسا کہ اس کا سانس رک جائے اور وہ زندگی سے نجات پا جائے اور نہ ہی اتنا ڈھیلا رکھا کہ وہ بچ جائے۔

یہ اسی ڈیتھ اسکواڈ کے سفاکانہ طریقوں میں سے ایک طریقہ تھا۔ یہ لوگوں کو اذیت دے کر قتل کرتے تھے (ابھی چند روز پہلے ہی تو وہ پاکستان کے شہر گوجرانوالہ میں اس طریق سے ایک کوٹھی کے نوکر پیشہ شخص کی جان لے چکے تھے۔ وہ آزادانہ سانس کے لیے کئی گھنٹے تڑپ کر مر گیا تھا)

آفت زادی نے اب کسمسانا شروع کر دیا تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر ایک واش روم میں پھینکا اور دروازہ باہر سے لاک کر کے موسیقی کی آواز کچھ اور بلند کر دی۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ اب میں والٹس وائے اور اس کی بیٹی سے زیادہ دور نہیں ہوں مگر ان کی صحیح لوکیشن کے بارے میں، میں بس اندازہ ہی لگا سکتا تھا۔ میں نے دائیں بائیں نظر گھمائی اور مجھے ایک الماری کے اندر جھولتا ہوا چابیوں کا ایک گچھا نظر آ گیا۔ یہ بڑی اسٹائلش اور چمکتی دمکتی چابیاں تھیں۔ میں دس پندرہ قدم آگے گیا۔ اسٹیل کا ایک سلائیڈنگ دروازہ دکھائی دیا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہی وہ راستہ ہے جو مجھے والٹس وائے اور اس کی بیٹی کی طرف لے جائے گا۔ میں نے مختلف چابیوں کو دروازے کے ہضمی لاک میں آزمانا شروع کر دیا۔ ایک چابی لگ گئی مگر دروازہ پھر بھی کھلا نہیں۔ کسی مائیک سے آواز آنا شروع ہوگئی۔ ''پلیز، اپنی شناخت کرائیں...... پلیز اپنی شناخت کرائیں۔''

تب میں نے دیکھا کہ ایک سائیڈ پر چھوٹا سا ''اسکینر'' نظر آ رہا تھا۔ یہ میرے فنگر پرنٹس مانگ رہا تھا، میں ٹپٹا کر رہ گیا۔ دروازہ بند رکھنے کا پکا انتظام کیا گیا تھا۔ مجھے وہ مناظر یاد آ گئے جب میں نے جاما جی میں ایک گرے فورس کے اہلکار کا انگوٹھا کاٹا تھا اور اس کی مدد سے ''سینسر'' کو دھوکا دے کر حلمی کے خاص باڈی گارڈ تک رسائی حاصل کی تھی لیکن یہاں میں نہیں جانتا تھا کہ اس سینسر کو کس کے فنگر پرنٹس درکار ہیں۔

موسیقی کی دھنا دھن نے یہاں بھی قیامت برپا کر رکھی تھی۔ میں نے اپنے پسٹل کا دستے جھلا کر سینسر پر رسید کیا۔ دوسری تیسری ضرب نے اس ''سینسر'' کو چکنا چور کر دیا لیکن اگر میرا خیال تھا کہ اس طرح دروازہ کھلنے کی راہ نکل آئے گی تو یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ اس کے بجائے یہ ہوا کہ یکا یک عمارت میں بہت سے الارم بج اٹھے اور ایک طویل راہداری میں اور

کمروں میں سرخ روشنی کے جھماکے ہونے لگے۔ میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ اب کسی طرح کی احتیاط بے کار تھی۔ میں نے دو قدم پیچھے ہٹ کر سلائیڈنگ ڈور کے کنٹرول پینل پر اوپر تلے کئی فائر کیے۔ اس بار نتیجہ حسبِ منشا نکلا۔ دروازہ کھل گیا۔ میں اندھا دھند اندر داخل ہوا۔

میں جانتا تھا میرے پاس وقت کم ہے۔ میں بلند آواز میں والٹس وائے کو اس کے مختصر نام سے پکارنے لگا۔ ''والٹس کہاں ہو، والٹس میں تمہاری مدد کے لیے آیا ہوں، والٹس میرے سامنے آؤ۔''

میں راہداریوں میں بھاگ رہا تھا۔ دروازوں کو دھکیل رہا تھا اور آوازیں دے رہا تھا۔ دوسری طرف پوری عمارت میں الارمز اور بھاگتے دوڑتے قدموں کی آوازوں نے کہرام مچا دیا تھا۔

اچانک ایک لمبا تڑنگا شخص میرے سامنے آ گیا۔ راہداری نیم تاریک تھی۔ سامنے آنے والے شخص کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی ٹارچ تھی۔ اس نے روشن دائرہ میرے چہرے کی طرف کیا اور ٹھٹکی ہوئی آواز میں بولا۔ ''کون ہو؟''

آواز نے تصدیق کر دی کہ یہی ماضی قریب کا خطرناک ترین گینگسٹر اور یورپی ڈان، والٹس وائے ہے۔

میں نے بلاتوقف کہا۔ ''مسٹر واٹ! مجھے اور فخر زماں کو جس شخص نے تمہارے پاس بھیجا ہے، اس کا نام ایسٹرن کنگ ہے اور مجھے یقین ہے تم اسے اچھی طرح جانتے ہو۔''

والٹس وائے چند لمحے سکتے کی سی کیفیت میں رہا پھر اس کی ہیبت ناک آواز راہداری میں گونجی۔ ''میں اس بات پر کیسے یقین کر لوں؟''

''ویسے تو میرے پاس اس کے کئی ثبوت ہیں لیکن فی الوقت ڈیتھ اسکواڈ والوں کی دو تین لاشیں میری بات کی گواہی دیں گی۔ وہ آس پاس ہی پڑی ہیں۔''

''تت...... تم...... کیسے نکال سکتے ہو ہمیں یہاں سے؟''

''پورا انتظام ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ تمہیں معلوم ہوگا ایسٹرن کسی کام میں کچے ہاتھ نہیں ڈالتا...... بچی کہاں ہے؟''

ابھی میرا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ لڑکی کی گھبرائی ہوئی آواز آئی۔ ''پاپا! کہاں ہو، کیا ہوا؟''

اور پھر وہ سامنے آ گئی۔ وہ ہلکی سی شرٹ اور نیکر میں تھی۔ سنہری بال شانوں پر بکھرے

تھے۔اس کی عمر دس گیارہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔راہداری کا منظر دیکھ کر وہ ہکا بکا رہ گئی۔

بھاگتے قدموں کی آوازیں اب اس سلائیڈنگ ڈور کے نزدیک پہنچ چکی تھیں جسے میں نے فائرنگ کر کے کھولا بلکہ توڑا تھا۔"ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے مسٹر واٹ! ہمیں دوسرے دروازے سے نکلنا ہوگا۔"

واٹس وائے ایک نہایت جہاندیدہ شخص کا نام تھا۔یقیناً اس کی چھٹی حس بھی کام کر رہی تھی۔اس نے تیزی سے فیصلہ کیا اور اپنی بچی کا بازو پکڑ کر میرے ساتھ عقبی دروازے کی طرف دوڑا۔عمارت کا مکمل حدود اربع مجھے رضوان کے ذریعے معلوم ہو چکا تھا۔ہم جس طرف جا رہے تھے،ادھر بھی ایک چوبی دروازہ تھا اور دروازے سے آگے اسٹیل کا سلائیڈنگ ڈور تھا۔دونوں دروازوں کے درمیان سات آٹھ فٹ جگہ تھی اور اس جگہ پر بھی ایک مسلح گارڈ کی موجودگی یقینی تھی۔میں نے اپنے پسٹل سے نیا میگزین اٹیچ کر لیا تھا اور انگلی ٹریگر پر دھر لی تھی۔چوبی دروازہ کھولنے یا توڑنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔الارمز اور بھاگ دوڑ کی آوازوں نے چوبی دروازے کی دوسری جانب موجود گارڈ کو الرٹ کر دیا تھا۔اس کی بدقسمتی کہ ہمارے پہنچنے تک اس نے دروازہ کھولا اور راہداری میں جھانکا۔ٹارچ کی روشنی میں اس کا صفاچٹ سر چمکا اور تصدیق ہوگئی کہ یہاں بھی ڈیتھ اسکواڈ کا عیار قاتل موجود ہے۔اسے کوئی موقع دینا شدید خطرے کو دعوت دینا تھا۔میں نے بلاتردد اس کی پیشانی پر گولی ماری۔وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح فرش پر آیا۔واٹ کی بچی ڈیزی بے ساختہ چلا اٹھی۔واٹ نے لپک کر زخمی کو فرش پر گرنے سے روک لیا اور وہ زخمی بھی کہاں تھا۔اعشاریہ 38 کی گولی نے اس کا بھیجہ پھاڑ ڈالا تھا،اس کا شمار مُردوں میں ہو چکا تھا۔خون تیزی سے اس کے تھوبڑے کو رنگین کر رہا تھا۔چابیوں کا ایک گچھا اس کی کمر سے بندھا ہوا تھا۔واٹس وائے نے پھرتی سے یہ گچھا نکالا اور ایک لمبی چابی دروازے کے قفل میں گھمائی۔میں اس دوران میں نیم مردہ شیطان کو گھسیٹ کر دروازے کے "سینسر" کے پاس لے گیا اور اس کی ہتھیلی وہاں پر رکھ دی۔

دروازہ کھل گیا۔

واٹس وائے کی تیزی بھی قابلِ ذکر تھی۔اس نے پلک جھپکتے میں نہ صرف گارڈ کی آٹومیٹک رائفل اس کے کندھے سے اتار لی تھی بلکہ ان لوگوں کی طرف ایک برسٹ بھی جھونک دیا جو دیوانہ وار ہماری طرف لپک رہے تھے۔اس برسٹ نے بلاشبہ ہمیں بہت فائدہ دیا۔ہمیں یہ موقع مل گیا کہ ہم سلائیڈنگ دروازے سے گزر کر باہر نکل آئے بلکہ دروازے کو بند کرنے والا کھٹکا بھی دبا دیا۔

''دائیں طرف بھاگو'' واٹ وائے چلایا۔ وہ اب پوری فارم میں نظر آرہا تھا۔
ہم ایک چھوٹی سی راہداری سے گزرے۔ وہاں بھی سرخ روشنی کے جھماکے ہو رہے تھے۔ ایک تھائی گارڈ نے ایک اوٹ سے نکل کر مجھ پر فائر کرنا چاہا مگر میں ٹریگر دبانے میں سبقت لے گیا اور وہ بھی جان لیوا طور پر زخمی ہو گیا۔ تاہم وقت بہت کم تھا، ہم اس کی رائفل حاصل نہ کر سکے۔ ایک بغلی دروازہ کھول کر ہم قلعہ نما عمارت کے عقبی احاطے میں آ گئے۔ بچی کا بازو واٹس وائے کے ہاتھ میں تھا۔ وہ جوگر ٹائپ جوتے پہنے ہوئے تھی اور تیز رفتاری سے باپ کے ساتھ بھاگ رہی تھی۔ واٹس وائے کے رخ سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ تیس چالیس میٹر دور ایک برآمدہ نما جگہ تک پہنچنا چاہتا ہے لیکن اس میں شدید رسک تھا۔ وہاں تک کھلا احاطہ تھا۔ ہم وہاں پہنچنے سے پہلے ہی نشانہ بن سکتے تھے اور نہ بھی بنتے تو ہمیں اس جگہ گھیرے میں تو ضرور لیا جا سکتا تھا۔ میں نے واٹس وائے کا بازو پکڑا اور اسے درختوں کی طرف کھینچا۔
''ادھر کہاں......ادھر کھائی ہے۔'' واٹس وائے نے دہاڑ کر کہا۔
''مگر ادھر ہی جانا پڑے گا......ادھر ہمارے ساتھی ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ (ظاہر ہے کہ جھوٹ ہی بولا تھا۔ یہاں میرا واحد ساتھی رضوان تھا)
ہم بھاگتے ہوئے دوسری طرف گئے۔ یہ دراصل ایک چھوٹا سا اسپورٹس کمپلیکس تھا جس میں دو تین درمیانے سائز کے ہال کمرے تھے۔ یہ کمپلیکس اس قلعہ نما عمارت کی باؤنڈری وال کے بالکل ساتھ واقع تھا اور دوسری طرف کوئی ایک ہزار فٹ گہری قدرتی کھائی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اگر ہم اسپورٹس کمپلیکس کے اندر پہنچ جائیں تو یہاں سے بچ نکلنے کا امکان پیدا ہو جائے گا۔
''یہ رائفل مجھے دے دو اور یہ لو میرا پسٹل۔'' میں نے واٹس وائے کے ساتھ ہتھیاروں کا تبادلہ کیا۔ یہ تبادلہ بھاگتے بھاگتے ہی ہوا تھا۔
ہم مشکل سے کمپلیکس تک پہنچے تھے کہ فائرنگ کی تڑتڑ گونجی اور تاریکی میں ہمارے اردگرد چنگاریاں بکھر گئیں۔ واٹس وائے بچی کو لے کر عمارت میں گھس گیا اور میں نے ایک دیوار کی آڑ لے کر جوابی فائرنگ شروع کر دی۔ ہر طرف شعلے سے لپکنے لگے۔ اس ٹرپل ٹو رائفل کے دو فالتو میگزین بھی مجھے دستیاب ہو گئے تھے۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ اگر میں احتیاط سے جوابی فائر کروں تو آدھ پون گھنٹے تک ڈیتھ اسکواڈ کے ہرکاروں کو خود سے اور واٹس وائے سے دور رکھ سکتا ہوں۔

ڈیڑھ دو منٹ بعد مجھے اپنے عین عقب سے والٹس وائے کی گونج دار آواز سنائی دی۔

''تم نے کیا بکواس کی تھی۔ یہاں کدھر ہیں تمہارے ساتھی؟''

میں نے رائفل سے ایک چھوٹا سا برسٹ چلاتے ہوئے کہا۔''وہ بھی آس پاس ہیں لیکن اصل ہمت تو ہم کو ہی دکھانی پڑے گی۔ میری انفارمیشن کے مطابق یہاں اسپورٹس کمپلیکس میں پیراشوٹ جمپنگ کا سامان موجود ہے۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' وہ انگلش میں پھنکارا۔

''یہاں پیراشوٹ کے ذریعے کھائی میں جمپ لگائے جاتے رہے ہیں۔ میری اطلاع کے مطابق یہاں اب بھی دو چار پیراشوٹ موجود ہوں گے۔''

وہ دانت پیس کر بولا۔'تمہارے ہوش تو ٹھکانے پر ہیں۔ اس اندھیری رات میں ہم اس اندھی کھائی میں چھلانگ لگائیں گے؟''

''چھلانگ نہیں لگائیں گے تو چھلنی ہو جائیں گے۔ چھلانگ لگانے میں پھر بھی کافی چانس ہے اور میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم چانس لینے کا حوصلہ رکھتے ہو۔''

''بک بک بند کرو۔ میرے ساتھ میری بچی ہے۔ اس نے کبھی دس فٹ سے چھلانگ نہیں لگائی۔''

''آزادی، قیمت مانگتی ہے والٹس وائے۔ اور تمہارا دوست ایسٹرن کنگ کہتا تھا کہ تمہیں آزادی کی قدر و قیمت معلوم ہے۔ کیونکہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ یہاں تمہارے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔''

اچانک ایک برسٹ آیا اور ہم جس دیوار کے پیچھے کھڑے تھے وہ لرزہ براندام ہو گئی۔ مخالف طرف سے ہونے والی فائرنگ شدید اور خطرناک ہوتی جا رہی تھی۔ میگا فون پر کسی طرح کا اعلان بھی کیا جا رہا تھا جس کی ہمیں سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ کیونکہ فائرنگ کا شور کان پھاڑ دینے والا تھا۔ والٹس وائے کی بیٹی سکڑی سمٹی ایک اندرونی دروازے کی اوٹ میں بیٹھی تھی۔ اس کے گلے میں ہیڈ فون جھول رہا تھا۔ میں نے والٹس وائے سے کہا۔''آپ بہت سینئر بندے ہو۔ میں آپ کو ہدایت تو جاری نہیں کر سکتا لیکن اتنا کہہ سکتا ہوں کہ آپ یہاں میری جگہ بیٹھ کر کاؤنٹر فائر کرو، میں اندر پیراشوٹ ڈھونڈتا ہوں۔''

والٹس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی میں نے 222 رمنگٹن رائفل اس کے ہاتھوں میں تھما دی اور خود لڑکی کے سر پر تسلی آمیز تھپکی دے کر اندرونی کمروں کی طرف گیا۔ یہاں بیڈمنٹن اور ٹیبل ٹینس وغیرہ کی جگہیں دکھائی دے رہی تھیں۔ میں نے تیزی سے ہاتھ پاؤں چلائے

اور ایک اسٹور روم کی گرد آلود الماری سے پیراشوٹس ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ تعداد میں کل چار تھے لیکن دو کی حالت خاصی پتلی تھی۔ میں نے ان دو میں سے ایک نسبتاً بہتر لے لیا۔ یہ تینوں پیراشوٹس لے کر میں لڑکی ڈیزی کے پاس آیا۔ اسے لے کر میں پختہ سیڑھیاں چڑھا اور اس وسیع قلعہ نما عمارت کی فصیل پر آ گیا۔ بے شک یہ باؤنڈری وال کسی قدیم فصیل کی طرح ہی تھی۔ یہاں چھوٹی چھوٹی برجیاں بنی ہوئی تھیں۔ جونہی ہم فصیل پر پہنچے، تیز ہوا محسوس ہوئی۔ لڑکی کے سنہری بال اڑنے لگے۔ میں نے اسے پیراشوٹ پہنانے کی کوشش کی تو وہ ترش لہجے میں بولی۔ ''مجھ سے یہ نہیں ہوگا۔ میں یہ نہیں پہنوں گی۔''

میں نے کسی طرح بہلا پھسلا کر پیراشوٹ کا ''ہارنس'' اس کی ٹانگوں پر چڑھا دیا اور اس کی دبلی پتلی کمر کے گرد بیلٹ کس دی۔ وہ مسلسل انکار کر رہی تھی۔ اب میرے پاس دو پیراشوٹ تھے۔ ان میں سے ایک خطرناک حد تک بوسیدہ تھا۔ بہرحال یہ بوسیدہ میں نے اپنے لیے رکھا اور اسے پہن لیا۔ اس دوران میں والٹس وائے نیچے اپنے ''مورچے'' میں ڈٹا رہا اور جم کر فائرنگ کا جواب دیتا رہا۔ میرے اندازے کے مطابق اب اس کے پاس پندرہ بیس راؤنڈ سے زیادہ نہیں تھے۔

میں نے لڑکی کو وہیں کھڑا رہنے کے لیے کہا اور جھک کر بھاگتا ہوا والٹس وائے کے پاس پہنچا۔ میں نے اس سے رائفل لے لی اور پیراشوٹ کی پیکنگ اس کی طرف بڑھائی۔

''اسے پہن لو مسٹر والٹس...... ڈیزی بھی پہن چکی ہے۔''

وہ کوئی اعتراض کرنا چاہتا تھا لیکن یہ بھی جانتا تھا کہ یہ اعتراض کا موقع نہیں۔ اس نے پیراشوٹ میرے ہاتھ سے لے لیا۔ میں نے اس کی جگہ سنبھال لی۔

سنگل شاٹ پر سیٹ تھی۔ میں ڈیتھ اسکواڈ والوں کو خود سے دور رکھنے کے لیے جوابی فائر کرنے لگا۔ وقفے وقفے سے میں بریٹا پسٹل بھی استعمال کر رہا تھا، اور یہ تاثر دے رہا تھا کہ یہاں دو افراد مزاحمت کر رہے ہیں۔ بریٹا پسٹل کے وافر راؤنڈ میرے پاس موجود تھے۔

والٹس، پیراشوٹ کے ساتھ مصروف تھا۔ اس کا انداز دیکھ کر ہی پتا چل جاتا تھا کہ وہ پیراشوٹ جمپنگ کے بارے میں کافی کچھ جانتا ہے۔ ''مسٹر والٹس! جلدی کرو۔ یہ سؤر کے بچے ہمیں زیادہ وقت نہیں دیں گے۔ قریب آ رہے ہیں۔''

چند ہی سیکنڈ بعد گولیاں ہمارے سروں کے اوپر سے گزرنے لگیں۔ میگافون پکار رہا تھا۔ ''ہتھیار پھینک کر خود کو ہمارے حوالے کر دو، ورنہ اسی جگہ مارے جاؤ گے۔'' یہ وارننگ انگلش کے علاوہ تھائی زبان میں بھی دی جا رہی تھی۔

واٹس پیراشوٹ پہن چکا تھا۔ میں نے کہا۔ ''مسٹر واٹس، تم ڈیزی کے پاس دیوار پر چلے جاؤ......اور چھلانگ لگا دو، میں ان کو یہاں روکتا ہوں۔ موقع ملتے ہی میں بھی چھلانگ لگاؤں گا۔''

''پسٹل مجھے دے دو۔'' واٹس نے بھنائے ہوئے لہجے میں کہا۔

میں نے پسٹل کے بجائے رائفل اس کی طرف اچھال دی۔ اس میں اب تین چار راؤنڈ ہی باقی رہ گئے تھے۔

واٹس الٹے قدموں سیڑھیوں کی طرف گیا اور پھر فصیل نما دیوار پر پہنچ گیا۔ اب وہ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا۔

بے شک میں بریٹا پسٹل کے ساتھ تابڑ توڑ فائر کر رہا تھا مگر جانتا تھا کہ میں اس ایک ہتھیار کے ساتھ ڈیتھ اسکواڈ کے ان بدنام زمانہ قاتلوں کو زیادہ دیر خود سے دور نہیں رکھ سکوں گا۔ وہ دیوانگی کی حد تک بے خوف تھے۔ دوسروں کی اور اپنی زندگی کی ان کے نزدیک کچھ زیادہ اہمیت نہیں تھی۔ وہ وحشیانہ انداز میں چلا رہے تھے اور قریب تر آتے جا رہے تھے۔ اب موقع تھا کہ میں اپنی جگہ چھوڑ کر دیوار تک پہنچوں اور پھر میں نے ایسا ہی کیا۔ پسٹل سے لگاتار کئی راؤنڈ چلانے کے بعد میں سیڑھیوں کی طرف بھاگا۔ اپنے پیچھے میں نے دو دروازے لاک کر دیئے تھے۔ جونہی میں تین فٹ چوڑی دیوار پر پہنچا مجھے چلانے کی آواز آئی۔ ''نہیں پاپا نہیں، میں کہہ چکی ہوں، میں یہ نہیں کر سکوں گی۔'' یہ ڈیزی تھی۔

''ہمت کرو ڈیزی۔'' واٹس گمبھیر آہنگ میں بولا۔ ''ورنہ موقع ہاتھ سے نکل جائے گا۔''
وہ دونوں تاریک کھائی کے بالکل کنارے پر کھڑے تھے۔

ہمت بڑھانے کے لیے واٹس نے بیٹی کا سر چوما اور اسے پھر چھلانگ کی ترغیب دی۔

ڈیزی نے جھک کر تاریک کھائی کی طرف دیکھا اور جھرجھری لے کر پیچھے ہٹ گئی۔ وہ پھر چلانے لگی۔ ''مجھ سے نہیں ہوگا۔''

میرا پارا چڑھ رہا تھا۔ میں نے اس کے پاس جا کر کہا۔ ''یہ ان چونچلوں کا وقت نہیں۔ چھلانگ لگاؤ۔ ورنہ وہ بھیڑیوں کی طرح پھاڑ ڈالیں گے ہم سب کو۔''

اس نے مجھے دھکا دیا۔ میں نے جھپٹ کر اسے اٹھایا اور اس سے پہلے کہ واٹس کچھ کرتا، میں نے ڈیزی کو دیوار سے نیچے پھینک دیا۔ اس نے جو سریلی اور دردناک آواز نکالی، وہ بہت طویل تھی۔

واٹس چند ساعتوں کے لیے سکتہ زدہ کھڑا رہا، پھر وہ مجھ پر جھپٹا۔ اس نے پستول کا دستہ

گھما کر میرے چہرے پر مارنا چاہا، یہ ضرب لگ جاتی تو ضرور میرے چہرے کا بھرتا بن جاتا۔ اس ادھیڑ عمری میں بھی واٹس میں مجھے غیر معمولی پھرتی اور توانائی نظر آئی تھی۔ اس کا اچٹتا ہوا وار میرے کندھے پر لگا تھا۔ پیچھے ہٹنے کی کوشش میں، میں دیوار سے ٹکرایا۔ واٹس نے مجھے امریکن گینگسٹروں والی گالی دی۔ ایک لمحے کے لیے لگا کہ وہ پھر مجھ پر جھپٹے گا لیکن پھر اس نے ارادہ بدلا اور پلٹ کر بیٹی کے پیچھے تاریکی میں چھلانگ لگا دی۔

اب سیڑھیوں پر بھاگتے قدموں کی صدا آ رہی تھی۔ وہ زہری قاتل کسی بھی لمحے دیوار کے اوپر پہنچ سکتے تھے۔ میرے پاس بھی چھلانگ لگانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں نے ایک ساعت کے لیے اپنے سامنے پھیلے ہوئے تاریک خلا کو دیکھا۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ یہ خلا کتنا وسیع اور کتنا گہرا ہے۔ نہ ہی یہ معلوم تھا کہ اس کی تہ میں کیا ہوگا...... اور اگر میں صحیح سلامت اتر بھی گیا تو کس چیز پر لینڈ کروں گا، بس مجھے چھلانگ لگانا تھی اور میں نے لگا دی۔ میرے جسم اور پگھلے ہوئے سیسے کے ملاپ میں بس ایک دو سیکنڈ کا فرق ہی رہ گیا ہوگا۔

جن لوگوں نے کبھی زیادہ بلندی سے چھلانگ لگائی ہو وہ جانتے ہیں کہ ہوا کی کاٹ کیا ہوتی ہے اور وہ کس طرح ہمارے جسم کو کرکٹ کے بال کی طرح ''سوئنگ'' کرتی ہے۔ فری فال کے دوران میں ہوا کی یہی کاٹ کبھی کبھی ''جمپر'' کو اَن چاہی سمت میں موڑ دیتی ہے۔ یہاں بھی یہی کچھ ہو رہا تھا اور اضافی مشکل، گہری تاریکی تھی۔

آخر چند سیکنڈ کی فری فال کے بعد میرا پیراشوٹ کھلا اور ایک طویل ہچکولے کے بعد میرے گرنے کی رفتار کم ہوگئی۔ اوپر چند سو فٹ کی بلندی سے فائرنگ بھی ہوئی مگر یہ فائرنگ ایک اضطراری عمل کی طرح تھی اور بغیر کسی نشانے کے کی گئی تھی، لہٰذا مجھے کسی طرح کا نقصان نہیں پہنچا سکی۔ میں نے دیکھا میری بائیں جانب تاریکی کے سمندر میں بنکاک کی روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں۔ میں جانتا تھا میرے نیچے واٹس وائے اور ڈیزی کے پیراشوٹ ہوں گے۔ وہ لینڈ کر چکے ہوں گے یا کرنے والے ہوں گے۔ بہرحال وہ مجھے نظر نہیں آ رہے تھے۔

دفعتاً میرے پیراشوٹ کو ایک اور زوردار ہچکولا لگا اور میرے گرنے کی رفتار پھر بڑھ گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ میں گھومنے بھی لگا۔ آخر وہ ہوا تھا جس کا اندیشہ تھا۔ میرے بوسیدہ پیراشوٹ نے کوئی کام دکھایا تھا۔ تاریکی میں مجھے فقط اتنا ہی نظر آیا کہ پیراشوٹ کا سفید کپڑا ایک جانب سے مسلسل پھڑ پھڑا رہا تھا۔ شاید اس کی لائنز آپس میں الجھی تھیں جس کی وجہ سے کنوپی کی ایک سائیڈ پر دباؤ بڑھا تھا اور کپڑا پھٹ گیا تھا۔ اس پیراشوٹ میں ایمرجنسی کنوپی بھی موجود نہیں تھی۔ اب جو کچھ ہونا تھا، اس مین کنوپی کے ساتھ ہی ہونا تھا۔

میری رفتار خاصی تیز ہو چکی تھی۔ اس کے علاوہ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ میں کب گروں گا اور کس چیز سے ٹکراؤں گا۔ نیچے صرف چار پانچ مدھم روشنیاں تھیں جن سے تھوڑا بہت اندازہ ہی لگایا جا سکتا تھا یوں لگتا تھا کہ پیراشوٹ صرف بیس تیس فیصد کام کر رہا ہے۔ یہ بے حد خطرناک تھا۔ جان بچ بھی جاتی تو ہڈیاں تو ٹوٹ ہی جانا تھیں۔ دل بے طرح دھڑ کنے لگا۔ پھر مجھ پر یہ تسلی بخش انکشاف ہوا کہ میں کسی درخت کی شاخوں سے ٹکرانے کے بعد پانی میں گرا ہوں۔ میں نے ہیلمٹ تک نہیں پہن رکھا تھا۔ شاخیں ٹکرانے سے سر پر کچھ چوٹ آئی تھی اور کمر پر بھی جلن کا شدید احساس ہوا تھا۔

○......❖......○

میں نے اردگرد دیکھا۔ میں ایک تالاب نما بارشی جھیل میں گرا تھا۔ کنارہ زیادہ دور نہیں تھا۔ میں نے سب سے پہلے اپنا بریٹا پسٹل کنارے پر پھینکا تاکہ وہ بھیگنے سے محفوظ رہے۔ پھر تیزی کے ساتھ خستہ حال پیراشوٹ کو اپنے جسم سے جدا کیا اور تیرتا ہوا کنارے کے پام پیڑوں کی طرف بڑھا۔ یہی وقت تھا جب میری نگاہ کچھ فاصلے پر ڈیزی کے پیراشوٹ پر پڑی۔ وہ شاید چند سیکنڈ پہلے ہی اتری تھی اب اس کا پیراشوٹ گھنے درختوں میں الجھا ہوا تھا۔ سو ڈیڑھ سو فٹ اوپر والس وائے والے پیراشوٹ کے آثار بھی نظر آئے۔ وہ بھی بس لینڈ کرنے ہی والا تھا۔ حالانکہ اس نے مجھ سے چند سیکنڈ پہلے چھلانگ لگائی تھی لیکن میں چونکہ آخری مرحلے میں تیزی سے نیچے آیا تھا لہٰذا پہلے اتر گیا تھا۔

میں بھاگتا ہوا ڈیزی کے پاس پہنچا، یہ جان کر دھچکا لگا کہ وہ بے ہوش ہے۔ یہ خوف کی وجہ سے تھا لیکن ایک خدشہ یہ بھی تھا کہ کہیں چھلانگ لگانے کے بعد اسے کوئی گولی نہ لگ گئی ہو۔ میں نے تیزی کے ساتھ اسے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ وہ کسی بھی زخم سے محفوظ تھی۔ اسی دوران میں والس بھی ہانپا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ اس نے بھی دیکھ لیا تھا کہ ڈیزی بے ہوش ہے۔

وہ لرزاں آواز میں بولا۔ ”یہ ٹھیک تو ہے، کوئی فائر تو نہیں لگا؟“

”نہیں، خدا کا شکر ہے صرف ڈر سے بے ہوش ہوئی ہے۔“ میں نے پیراشوٹ کی بیلٹ کھولتے ہوئے کہا۔

”ہم زیادہ دیر یہاں نہیں رک سکتے۔ وہ حرام زادے کسی بھی وقت پہنچ جائیں گے۔“ والس نے اوپر تاریک بلندی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

بلند پام پیڑوں اور ایک سپاٹ دیوار کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ ایک سطح مرتفع جیسی جگہ تھی۔ زمین کے ایک بڑے قدرتی کٹاؤ نے اس قلعہ نما قدیم عمارت کے عقب میں گہری

کھائی کو وجود دے دیا تھا۔ اب یہ کھائی ہمارے لیے فرار کا ذریعہ بنی تھی۔

ڈیزی کو پیراشوٹ سے جدا کرنا کافی دشوار ہو رہا تھا۔ بہر حال ہم کسی نہ کسی طور یہ کام کر گزرے۔ ڈیزی کی بے ہوشی نے والٹس کے اوسان خطا کر رکھے تھے۔ وہ اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے دینے لگا اور اسے جھنجھوڑنے لگا۔ ''آنکھیں کھولو ڈیزی، پلیز آنکھیں کھولو۔'' وہ بار بار پکار رہا تھا۔

میں نے والٹس کو پیچھے ہٹا کر ڈیزی کو کندھے پر ڈالا اور ہم درختوں سے نکلنے کے لیے تیزی سے آگے بڑھے۔ والٹس کسی وجہ سے لنگڑا بھی رہا تھا۔ دو تین منٹ کے اندر ہی ہمیں سڑک کے آثار نظر آ گئے۔ ہمارے پاس زیادہ سوچ بچار کا وقت نہیں تھا۔ روڈلف اور اس کے ہرکارے کسی بھی وقت چکر کاٹ کر ہم تک پہنچ سکتے تھے۔ والٹس کو جو رائفل میں نے دی تھی وہ تو وہیں اوپر فصیل پر رہ گئی تھی مگر بریٹا پسٹل میرے پاس موجود تھا اور اس میں گولیاں بھی تھیں۔ جونہی سڑک پر کسی گاڑی کی روشنیاں دکھائی دیں، میں ڈیزی سمیت اس کے عین سامنے کھڑا ہو گیا۔ ڈرائیور کو بریک لگانا پڑے۔ یہ ایک چھوٹی سی کار تھی اور خستہ حال بھی دکھائی دیتی تھی۔ اس سے پہلے کہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا شخص کچھ سمجھ پاتا، ایک جانب کے درختوں سے والٹس جھپٹ کر نکلا۔ اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور تھائی ڈرائیور کو کھینچ کر باہر نکال لیا۔ وہ قریباً پانچ ساڑھے پانچ فٹ کا شخص تھا گرانڈیل والٹس کے سامنے بونا ہی لگا۔ والٹس کے ایک ہی طوفانی مکے نے اسے ادھ موا کر کے سڑک کے کنارے نیم تاریکی میں پھینک دیا۔

میں نے ڈیزی کو گاڑی کی پچھلی نشست پر لٹایا اور ڈرائیونگ سنبھال لی۔ والٹس میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ یہی وقت تھا جب بلندی پر واقع قلعہ نما عمارت کے اوپر ایک ہیلی کاپٹر پھڑپھڑاتا محسوس ہوا۔ ہماری تلاش شروع ہو چکی تھی اور یقیناً یہ تلاش صرف فضا تک محدود نہیں رہنا تھی۔ عنقریب اس پورے علاقے کی سڑکوں پر روڈلف کے ہرکاروں نے بھاگ دوڑ کرنا تھی۔ میں نے تیزی سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ گاڑی کافی بری حالت میں تھی۔ میں ایکسلریٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھاتا جا رہا تھا مگر وہ اپنی مرضی سے رفتار پکڑتی تھی اور کبھی نہیں پکڑتی تھی۔ اسی دوران میں دور عقب میں پولیس کار کا سائرن سنائی دینے لگا۔ مطلب یہی تھا کہ جس تھائی کو گھونسا مار کر والٹس نے سڑک پر پھینک دیا تھا، اسے دیکھ لیا گیا ہے۔

میں جانتا تھا کہ فخر میرے آس پاس ہی کہیں موجود ہے۔ اس کے پاس رینٹ کی کار موجود تھی۔ میرا سیل فون تو بھیگ کر ناکارہ ہو گیا تھا۔ تاہم گاڑی کے ڈیش بورڈ میں سے ایک

سیل فون برآمد ہوا اور وہ کام کر گیا۔ جونہی فخر سے رابطہ ہوا میں نے پوچھا۔ ''کہاں ہو تم؟''
وہ بولا۔ ''ایف چوک کے پاس، لیکن تم تو خیریت سے ہو۔ ابھی اوپر عمارت کی طرف سے فائرنگ کی بہت زیادہ آواز آئی ہے۔ ایک کاپٹر بھی اُڑ کر گیا ہے۔''
''یہ سارا ''پروٹوکول'' ہمارے لیے ہی تھا۔ ہم اس وقت ایک منحوس عمر رسیدہ گاڑی میں ہیں جو ہمیں مروا کر چھوڑے گی۔ ہم بنکاک روڈ کے پہلے چوراہے کی طرف جا رہے ہیں۔ تم کسی طرح وہاں پہنچو فوراً...... گاڑی کا رنگ سبز ہے اور یہ فوکسی ہے۔''
''او کے، آ رہا ہوں۔'' فخر نے کہا۔
والش بیٹی کے لیے بے حد پریشان تھا اور بار بار مڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگتا تھا۔ وہ بولا۔ ''ہمیں سب سے پہلے کسی ڈاکٹر کے پاس پہنچنا ہوگا۔ یہ بالکل بے ہوش ہے۔''
میں نے بھی مڑ کر پچھلی نشست کی طرف دیکھا۔ وہ بمشکل گیارہ بارہ سال کی ہو گی۔ چست نیکر پہنے ہوئے تھی۔ جسم دبلا پتلا تھا لیکن نقوش اچھے تھے۔ وہ بلوغت کی پہلی سیڑھی کی طرف قدم بڑھا رہی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ شاید ابھی تھوڑی دیر بعد خود ہی ہوش میں آ جائے۔ میں نے والش کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ''اس طرح کسی ڈاکٹر کے پاس جانا ٹھیک نہیں ہوگا، میرا خیال ہے کہ ہمیں انتظار کر لینا چاہیے۔''
''چپ رہو۔'' وہ کرخت لہجے میں بولا۔ ''میرے لیے اس سے اہم کچھ نہیں، پہلے ہم کو اسپتال جانا ہوگا۔''
میں نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ اسی دوران میں ڈیزی نے کسمسانا شروع کر دیا۔ وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں بڑبڑائی۔ ''میں مر جاؤں گی۔ مجھے بچالو...... مجھے بچالو۔''
وہ بچانے کی التجا کر رہی تھی اور اسے معلوم نہیں تھا کہ فی الحال تو وہ بچائی جا چکی ہے۔ وہ دشمنی اور انتقام کے اس جال سے نکل آئی ہے جو اس کے باپ کی وجہ سے اسے اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ یہ لوہے کا جال تھا اور مستقبل قریب میں وہ اس کے جسم کو یوں جکڑنے والا تھا کہ اس کو زخم زخم ہو جانا تھا۔
یہی وقت تھا جب فخر نے مجھے فون کر کے بتایا کہ وہ بنکاک روڈ کے پہلے چوراہے پر پہنچ گیا ہے۔ (اپنی کچھوا گاڑی، کے ساتھ ہم بھی چوراہے کے پاس ہی تھے) میں نے اطمینان کی طویل سانس لی۔

○......❖......○

ہم فخر کی گاڑی میں سوار ہو کر اسی ہوٹل میں پہنچ چکے تھے جہاں پہلے دن سے ہمارا قیام

تھا۔ یہ بنکاک کے ایک گنجان علاقے میں متوسط درجے کا گمنام ہوٹل تھا اور ہم یہاں خود کو بہت محفوظ محسوس کرر ہے تھے۔ میں نے اور فخر نے اپنا مشترکہ کمرا واٹس وائے اور اس کی بیٹی کے لیے خالی کر دیا۔

واٹس وائے کی بازیابی اور آزادی کی خبر اتنی بڑی تھی کہ انڈر ورلڈ میں ایک تہلکہ مچنے والا تھا۔ بہت سے لوگ تو اسے مُردہ تصور کر چکے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اب جان ڈیرک ہی ٹیکساری گینگ کا واحد کرتا دھرتا ہے۔ اب یقینی بات تھی کہ ٹیکساری گینگ کے اندر بھی زبردست ٹوٹ پھوٹ مچنے والی ہے۔ گینگ کے بے شمار لوگ ایسے تھے جن کے دلوں میں اب بھی اپنے اولین باس کی وفاداری موجود تھی۔

میں نے ہوٹل کی لابی میں فخر سے کہا۔ ''میں اب واٹس کے سامنے زیادہ نہیں آنا چاہتا۔ ابھی تک تو افراتفری کا عالم تھا اور اس نے میری شکل شباہت پر زیادہ توجہ نہیں دی مگر اب وہ غور کرے گا۔''

''یعنی تم اس پر اپنی اصل شناخت نہیں ظاہر کرنا چاہتے؟''

''بہتر تو یہی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ پھر ذرا توقف سے کہا۔ ''اب تم ہی اس سے رابطہ رکھو۔ میرے بارے میں کہنا کہ میں اب بنکاک میں نہیں ہوں۔''

''تم کہاں جاؤ گے؟''

''بنکاک میں ہی رہوں گا یار! آس پاس کے دوسرے ہوٹل میں چلا جاتا ہوں۔''

''تمہاری اصلیت یعنی ایسٹرن کنگ کے بارے میں کیا بتانا ہے واٹس کو؟''

''وہی جو دوسروں کو معلوم ہے۔ چند ہفتے پہلے میں پاکستان میں ہونے والے ایک حادثے میں ''جاں بحق'' ہو چکا ہوں۔''

''یار! وہ بڑا خطرناک شخص ہے۔ ایسے لوگ جھوٹ بڑی جلدی پکڑ لیتے ہیں۔ وہ اس سارے معاملے کو ہی کوئی سازش قرار نہ دے دے۔''

''بڑی بیکار بات کرر ہے ہو فخری، ہم نے اسے ایک ایسے چنگل سے نکالا ہے کہ وہ ساری عمر ہمارا احسان مند رہے گا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ وہ مستقبل قریب میں ہمیں کسی بڑے انعام واکرام سے نوازنے کی کوشش بھی فرمائے۔ بلکہ اب میں تو ویسے ہی سائیڈ پر ہو رہا ہوں۔ اب اس کی ہر مہربانی تمہارے حصے میں ہی آئے گی۔''

''اور اگر اس پر کوئی آفت ٹوٹی تو اس میں سے بھی مجھے ہی حصہ ملے گا۔ تمہارا کیا خیال ہے جان ڈیرک اور روڈلف وغیرہ اتنی آسانی سے باپ بیٹی کا پیچھا چھوڑ دیں گے؟''

''لیکن اب وہ بھی اکیلا تو نہیں ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ ابھی ایک دو گھنٹے کے اندر اندر وہ گینگ میں اپنے ہمنواؤں سے رابطے کر رہا ہو گا۔ ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں کا پہلا ٹکراؤ یہاں بنکاک میں ہی ہو جائے۔''

میں نے صبح نو دس بجے کے لگ بھگ ایک قریبی علاقے پارک لین میں ایک ہوٹل میں کمرا بک کرا لیا۔ فخر بدستور اسی ہوٹل کے ایک کمرے میں ٹھہرا رہا جہاں ٹیکساری کا عالمی شہرت یافتہ ڈان اپنی بیٹی کے ساتھ موجود تھا۔

○......❖......○

وہ بنکاک کی ایک رنگا رنگ شام تھی۔ روشنیاں جگمگا اٹھی تھیں۔ تفریح گاہیں، نائٹ کلب، کیسینوز اور قحبہ خانے بارونق ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اپنے اپنے کاموں سے واپس آنے والے لوگ اب اپنے ٹھکانوں پر پہنچ چکے تھے اور نائٹ لائف کا آغاز ہو رہا تھا...... ہاں یہ اس شہرِ عشرت میں ایک معمول کی شام تھی مگر اس کے اندر کچھ جدا بھی تھا۔

شام چھ بجے کے قریب مجھے فخر کا پہلا فون آیا تھا اور اس نے بتایا تھا کہ والٹس وائے نے چار پانچ برس کی مکمل خاموشی اور لاچاری کے بعد اپنا پہلا سیل فون حاصل کر لیا ہے اور اس کے ذریعے گینگ کے کچھ لوگوں تک یہ خبر پہنچا دی ہے کہ وہ زندہ ہے اور یہاں بنکاک میں موجود ہے۔

آٹھ بجے کے لگ بھگ فخر کا دوسرا فون آیا۔ اس نے کہا۔ ''وہی ہو رہا ہے پیارے! جو ہم سوچ رہے تھے، تہلکہ مچ گیا ہے بلکہ شاید تہلکے مچ گئے ہیں جس عام سے ہوٹل میں ہم ٹھہرے ہوئے ہیں، یہ اس وقت بنکاک کا اہم ترین ہوٹل بن گیا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''تین چار اعلیٰ پائے کے ڈان تو اس وقت بھی یہاں ہوٹل میں موجود ہیں۔ فون بج رہے ہیں، رابطے ہو رہے ہیں۔ ڈنمارک اور لندن تک گھنٹیاں کھڑک چکی ہیں۔ ہوٹل کے پارکنگ لاٹ میں کئی بڑی بڑی گاڑیاں نظر آ رہی ہیں۔ ابھی تک میڈیا کو کچھ خبر نہیں ہے۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ یہاں ہجوم ہو جائے۔'' فخر کی آواز میں جوش تھا۔

''ٹیکساری کے لوگ بھی نظر آئے ہیں یا نہیں؟''

''زیادہ تر ٹیکساری کے ہی ہیں اور مجھے یہ بھی لگ رہا ہے کہ ابھی تھوڑی دیر میں والٹس اپنی بیٹی سمیت یہاں سے کہیں اور منتقل ہو رہا ہے...... یہ دیکھو...... یہ میں ہوٹل کی کھڑکی میں سے دیکھ رہا ہوں۔ یہ کسی سکیورٹی ایجنسی کے دو ڈھائی درجن مسلح گارڈز ہیں جو یہاں پہنچ گئے

ہیں۔لگتا ہے کہ یہ گارڈز لاو. ں.ور ڈیزی کو اپنی حفاظت میں یہاں سے لے کر جائیں گے۔"

"تم بھی ساتھ جاؤ گے؟" میں نے پوچھا۔

"قیاس تو یہی ہے۔ابھی تک تو مجھے یہاں وی وی آئی پی والا پروٹوکول ہی مل رہا ہے...... واٹس صاحب تم سے کافی متاثر نظر آتے ہیں برادرم! اور تمہارے طفیل مجھ پر بھی صدقے واری جارہے ہیں۔"

"چلو تمہارے لیے اچھا ہی ہے۔"

"بلکہ بہت اچھا ہے۔" وہ فوراً بولا۔"یہ لڑکی تو چھوٹی ہے اگر اس کی کوئی بڑی ہمشیرہ ہوتی تو روشن امکان تھا کہ واٹس وائے مجھے اپنی دامادی کا شرف عطا کر دیتا۔مجھ سے کہہ رہا تھا...... میں تم دونوں سے بہت متاثر ہوا ہوں۔خاص طور سے تمہارے دوست واکس سے۔"

"واکس؟" یہ کون ذات شریف ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یار! تم ہو واکس۔ میں نے اسے تمہارا نام وقاص بتایا تھا،اس نے واکس بنا دیا...... اور ہاں......اس کو تمہاری اس پیراشوٹ والی بات کا بھی پتا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"آج صبح مجھ سے کہہ رہا تھا۔تمہارا وہ ساتھی نر بندہ ہے۔خطرے مول لینا جانتا ہے۔ اس نے بڑی ہمت دکھائی ہے ہمیں وہاں سے نکالنے میں۔اس نے بروقت فیصلہ کیا اور ڈیزی کو اٹھا کر پھینک دیا۔ورنہ دو چار سیکنڈ اور گزر جاتے تو وہ لوگ ہمیں بھون ڈالتے......اور اس کے علاوہ بھی واکس نے ایک احسان کیا ہے ہم پر۔دو اچھے پیراشوٹ ہمیں دے کر خود پرانا پیراشوٹ رکھا۔ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں جلد از جلد۔" فخر نے آخری فقرے میں واٹس وائے کی آواز کی ہو بہو نقل اتاری۔

"اسے بتا دیا میری موت کے بارے میں؟" (یعنی ایسٹرن کنگ کی موت کے بارے میں)

"ہاں، کافی افسردہ ہوا ہے لیکن اس بات پر خوش بھی ہے کہ ایسٹرن کی وجہ سے اسے اور اس کی بیٹی کو آزادی ملی اور واکس اور مجھ جیسے دو عدد نر ساتھی بھی ملے۔لگتا ہے کہ وہ مستقبل قریب میں ہمیں اپنے گینگ میں کسی اہم رتبے پر فائز کرنے کی نیک تمنا رکھتا ہے۔"

"لعنت ہو اس کی تمنا پر اور اس پر بھی۔ ہمارا کام بس اس کو آزاد کرانا تھا اور شکر ہے کہ ہم اس میں کامیاب رہے ہیں۔اب یہ جائے جہنم میں اور اس کے ہوتے سوتے بھی۔"

"لیکن یار اس چھوٹی بچی کو تو بد دعا نہ دو۔وہ بے گناہ ہے۔اندیشے لاحق ہیں کہ کہیں وہ

بھی ان بدمعاشوں کے ٹاکرے میں جان نہ گنوا بیٹھے۔ مجھے یہاں آثار و حالات اور دیگر مضمرات کچھ اچھے نہیں لگ رہے۔'' وہ گاڑھی اردو بول رہا تھا۔

فخر سے بات ختم کرنے کے بعد میں نے پاکستان میں فون کرنے کی ٹھانی۔ میں خورسنہ کی صحت کی طرف سے بھی فکرمند تھا۔ میرا موبائل فون پانی میں گرنے کے بعد بیکار ہو گیا تھا۔ نیا موبائل مجھے ایک قریبی مارکیٹ سے دستیاب ہو گیا تھا اور میں نے اس کو چالو بھی کر لیا تھا۔ چوتھی پانچویں کوشش میں، میں سجاول سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ سب سے پہلے میں نے خورسنہ کی خیریت دریافت کی۔ اس نے بتایا کہ وہ ابھی تک اسپتال میں ہے لیکن بتدریج بہتر ہو رہی ہے۔ پھر اس نے مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ میں اچانک پاکستان سے کیوں غائب ہو گیا ہوں اور اب وہاں تھائی لینڈ میں کیا کرتا پھر رہا ہوں۔ وہ بہت غصے میں لگتا تھا۔ اس نے پھنکارتے ہوئے کہا۔ ''کسی وقت تو دل چاہتا ہے کہ جان تلی پر رکھ کر وڑ جاؤں اس حرام زادے دارج کے تاج محل میں اور سیدھی گولیاں ماروں اس کے سر میں اور ساتھ ہی تمہاری اس بے وفا تاجور کے سر میں بھی۔''

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''سجاول! اگر تمہیں ایسی باتیں کرنی ہیں تو میں فون بند کر رہا ہوں۔''

''تو پھر کیسی باتیں کروں۔ میرا دل خون ہو رہا ہے۔ یہ سب کچھ دیکھا نہیں جاتا مجھ سے۔ تم تو آنکھیں بند کر کے نکل گئے ہو یہاں سے۔ پر میں یہیں پاکستان میں ہوں۔ مجھ تک ساری خبریں پہنچ رہی ہیں۔ وہ کمینے کا تخم بستر پر پڑا ہے پھر بھی اس کو چین نہیں۔ اس نے تاجور کی رخصتی مانگ لی ہے۔ اس کی وہ موٹو ماں دن رات اسلام آباد سے سکھیرا کے چکر لگا رہی ہے۔ کہتی ہے کہ میرے پتر کو ضرورت ہے کہ اس کی بیوی اس کی دیکھ بھال کے لیے اس کے پاس ہو۔ خبیث ماں کا خبیث بچہ......'' سجاول نے دانت پیس کر کہا اور گالی دینے سے بمشکل خود کو روکا۔

میں کچھ دیر خاموش رہا پھر موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''سجاول! مجھے دو باتوں کی زیادہ فکر تھی۔ ایک تو خورسنہ کی اور دوسری انیق کی۔ انیق کے ساتھ تمہاری کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی؟''

''اب گڑبڑ نہیں ہوگی۔ سیدھا قتل ہوگا۔ اس کا یا پھر میرا۔ وہ چوہے کی اولاد چھپا ہوا ہے لیکن زیادہ دیر چھپا نہیں رہنے دوں گا۔ زمین کی ساتویں تہ سے ڈھونڈ نکالوں گا اسے۔''

میں نے دل ہی دل میں شکر کیا کہ ابھی تک وہ آمنے سامنے نہیں آئے...... میں اس حوالے سے کچھ اور کہنا چاہتا تھا مگر سجاول ایک بار پھر تاجور والے موضوع پر آ گیا۔ اس نے

کہا۔’’مولوی حبیب اللہ جی دار بندہ ہے۔اب بھی ڈٹا ہوا ہے۔سنا ہے کہ اس نے ایک بار پھر برادری کے لوگوں کو اکٹھا کیا ہے۔کچھ عالم لوگ بھی بلائے ہیں۔اس نے کہا ہے کہ ایک بھلی مانس گھریلو لڑکی کو’’نکاح‘‘ کے نام پر آیب مانے ہوئے عادی بدکردار کے حوالے کر دینا کسی طور بھی جائز نہیں۔اس کے خلاف آواز اٹھانا عین نیکی کا کام ہے۔اس نے تاجور کی ماں کی بات بھی کی اور کہا کہ اولاد کے لیے جو فیصلے کیے جاتے ہیں ان میں ماں کا حق بھی اتنا ہی ہوتا ہے جتنا باپ کا......‘‘

وہ اس سلسلے میں مزید بات کرنا چاہتا تھا مگر میں نے اس انداز سے فون بند کر دیا جیسے بات کرتے کرتے سلسلہ منقطع ہو گیا ہو۔

ایک عجیب سی بے چینی پھیل جاتی تھی سینے میں، جب میں تاجور کا ذکر سنتا تھا۔

رات کے دس بج چکے تھے جب تیسری بار فخر کا فون آیا۔اس نے بتایا۔’’ہم ہوٹل سے منتقل ہو گئے ہیں۔یہ جنوبی بنکاک میں ایک فارم ہاؤس ہے۔اردگرد اونچی چاردیواری ہے۔تھائی لینڈ میں موجود والٹس کے کئی ہمنوا یہاں پہنچ چکے ہیں اور کچھ ابھی آ رہے ہیں۔‘‘

’’ڈیزی کہاں ہے؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’بچی کے بارے میں ایک اچھی خبر ہے۔میرا خیال ہے کہ اس کے حوالے سے والٹس کو یہی کرنا چاہیے تھا۔اس نے اسے پہلی دستیاب فلائٹ سے کہیں روانہ کر دیا ہے۔اب مجھے ٹھیک سے پتا نہیں کہ اسے کہاں بھیجا گیا ہے۔‘‘

’’ٹھیک ہے، مجھے حالات سے باخبر رکھو۔لگتا ہے کہ کسی طرح کی گڑبڑ کرنے والے ہیں یہ لوگ۔‘‘

’’بجا ارشاد فرمایا تم نے۔تاہم ممکن ہے اور’’قرین القیاس‘‘ ہے کہ گڑبڑ ان کی طرف سے نہ ہو، دوسری طرف سے ہو۔روڈلف اور جان ڈیرک اس بات پر سر پیٹ رہے ہوں گے کہ ان کا بدترین دشمن ان کی قید سے نکل بھاگا ہے۔‘‘

یہی وقت تھا جب مجھے فون پر کسی آٹومیٹک رائفل کے فائر سنائی دیئے۔’’یہ کیا ہے؟‘‘ میں نے فخر سے پوچھا۔

’’شاید یہ لوگ ٹیسٹ فائر کر رہے ہیں۔‘‘

اسی دوران میں ایک اور طویل برسٹ چلا اور پھر دو تین رائفلوں سے گولیاں چلنے لگیں۔

’’کہیں کام شروع تو نہیں ہو گیا؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’کچھ کہا نہیں جا سکتا۔‘‘ فخر کی آواز میں ارتعاش تھا۔

چند چھناکوں کی آوازیں آئیں جیسے دو چار بڑے شیشے ٹوٹے ہوں۔ فخر تیزی سے بولا۔ ''اچھا، میں دوبارہ فون کروں گا۔'' اس نے فون بند کر دیا۔

میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ جو کچھ ہم چاہ رہے تھے، اس کا آغاز توقع سے بھی جلدی ہو گیا ہے۔

میں تھوڑی دیر تک فخر کے فون کا انتظار کرتا رہا پھر میں نے ٹی وی آن کیا۔ ایک نیوز چینل دیکھا تو وہاں نیوز کاسٹر ہیجان خیز انداز میں بول رہا تھا۔ وہ انگلش میں کہہ رہا تھا۔ ''ابھی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ پورے علاقے میں فائرنگ ہو رہی ہے۔ کچھ راہ گیر نشانہ بن گئے ہیں۔ ایک بس کو بھی آگ لگ گئی ہے۔ لگ یہی رہا ہے کہ نجی فارم ہاؤس میں جو دو مسلح گروہ آپس میں ٹکرائے تھے، ان کی لڑائی پورے علاقے میں پھیل گئی ہے۔''

پھر نیوز کاسٹر نے اپنے فیلڈ رپورٹر سے رابطہ کیا۔ ''آپ اس وقت کہاں ہیں مسٹر واٹرنگ؟''

رپورٹر نے تقریباً چلاتے ہوئے کہا۔ ''آپ فائرنگ کی آوازیں سن رہے ہوں گے۔ وہ دیکھیں وہ میرے پیچھے گاڑی سے دھواں نکل رہا ہے۔ یہ ایک ٹویوٹا کار ہے۔ اس پر اتنی شدید فائرنگ کی گئی ہے کہ اس میں بیٹھے ہوئے تینوں غیر ملکی اندر ہی ہلاک ہو گئے ہیں۔ اس کے بعد پیچھے سے ان کے ساتھی آئے ہیں اور انہوں نے فائرنگ کرنے والوں کو اس سامنے والے پلازا میں گھیر لیا ہے...... یہ دیکھیں ناظرین! آپ کو آوازیں بھی آ رہی ہوں گی۔ اندھا دھند گولیاں چل رہی ہیں۔''

نیوز کاسٹر اپنے فیلڈ رپورٹر کا نام لے کر پکارا۔ ''آپ اپنی جان خطرے میں مت ڈالیں، آپ یہاں سے ہٹ جائیں...... یہاں صورتِ حال بڑی مخدوش نظر آ رہی ہے۔''

میں نے ایک اور چینل ٹیون کیا۔ اس نیوز چینل پر بھی سنسنی خیز خبر چل رہی تھی۔ بنکاک کے وسط میں ایک بڑے نائٹ کلب کی دوسری منزل پر آگ لگی ہوئی تھی اور مسلسل فائرنگ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ایمبولینس گاڑیوں اور فائر بریگیڈ والوں کے سائرن گونج رہے تھے اور اس گونج میں سے رپورٹر کی آواز ڈوب ڈوب کر ابھر رہی تھی۔ وہ تھائی زبان میں کچھ کہہ رہا تھا...... اور اس کا کیمرا مین نائٹ کلب کے علاوہ ایک قریبی گفٹ شاپ میں لگی ہوئی آگ کو بھی دکھا رہا تھا۔

میں نے پہلے والے چینل پر شفٹ کیا۔ وہاں اب دو تھائی نوجوانوں کو دکھایا جا رہا تھا۔ وہ لبِ سڑک پڑے تھے۔ ان میں سے ایک گولی لگنے سے مر چکا تھا۔ دوسرا زندہ تھا مگر ابھی

تک کسی کو ہمت نہیں ہوئی تھی کہ قریب جا کر اس کی مدد کر سکے۔ فائرنگ اور دھماکوں کی آوازیں یہاں بھی آ رہی تھیں۔ رپورٹر پکار رہا تھا۔ ”یہ دونوں راہ گیر ہیں اور دوطرفہ فائرنگ کی زد میں آئے ہیں۔ خبروں سے پتا چل رہا ہے کہ متحارب گروہوں کے درمیان ہونے والی یہ لڑائی بنکاک کے کئی علاقوں میں پھیل گئی ہے۔ یہ دو بڑے گینگ ہیں یا شاید ایک ہی بڑے گینگ کے دو گروپ ہیں۔ ان میں سے کچھ ملکی و غیر ملکی شوٹر ٹولیوں کی صورت میں ہیوی بائیکس پر گھوم رہے ہیں اور اپنے مخالفوں کو ٹارگٹ کر رہے ہیں۔ پولیس ابھی تک اس تصادم کو روکنے میں ناکام ہے۔“

مجھے رضوان کی فکر لاحق ہو رہی تھی۔ میں نے اسے فون کیا۔ دوسری تیسری کوشش کامیاب ہو گئی۔ رضوان کی ہانپتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”میں بالکل ٹھیک ہوں شاہ زیب صاحب! میں اور میڈونا وہاں سے نکل آئے ہیں۔ وہاں حالات بہت خراب ہو گئے تھے۔ لگتا ہے کہ ان لوگوں کی آپسی لڑائی شروع ہو گئی ہے۔“

”میڈونا کو کیوں لے آئے ہو۔ کیا یہ قابلِ بھروسا ہے؟“ میں نے مدھم آواز میں پوچھا۔

”قابل بھروسا کا تو پتا نہیں جی...... مگر فی الوقت اسے بھی جان کا اتنا ہی خطرہ محسوس ہو رہا ہے جتنا مجھے۔“

میں نے رضوان کو ہدایت کی کہ کم از کم چوبیس گھنٹے کے لیے تو وہ کہیں چھپ چھپا کر بیٹھ جائے۔ اس نے میری بات کی تائید کی۔

ایک نیوز چینل پر بار بار ایک ویڈیو کلپ چل رہا تھا۔ کسی کیسینو میں ہونے والی مار دھاڑ کا ذکر آ رہا تھا۔ میں یہ دیکھ کر چونکا یہ وہی کیسینو ”بلیک مون“ تھا جہاں ایک دراز قد حسینہ کا مجسمہ ایستادہ تھا اور لوگوں کو اس کی ٹانگوں کے نیچے سے نکل کر باہر جانا پڑتا تھا مگر اب وہ ہال کمرا اور وہ مجسمہ تباہی کا نمونہ پیش کر رہے تھے۔ ٹیکساری گینگ کے مقامی شوٹرز میں یہاں خوفناک تصادم ہوا تھا...... اور یہ پہلا موقع تھا کہ دستی بم بھی استعمال ہوئے تھے۔ لاکھوں کی کراکری اور کروڑوں کا فرنیچر کباڑ کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ جوئے کی مشینیں تہس نہس تھیں۔ حسینہ کا نو دس فٹ اونچا مجسمہ اوندھا پڑا تھا اور دونوں ٹانگیں علیحدہ تھیں۔ ہال میں کئی جگہیں ایسی تھیں جہاں سے ابھی تک دھواں اٹھتا دکھائی دیتا تھا۔ میں نے ایک عمیق سانس لے کر ٹی وی آف کر دیا۔ دور شہر کے کسی حصے سے لائٹ مشین گن کی ”ریٹ ٹیٹ“ سنائی دی اور ایمبولینس گاڑیوں کے سائرن گونجنے لگے۔ بنکاک کی یہ رنگین جگمگاتی رات،

ایک سنگین رات بن چکی تھی اور یہ سب کچھ واٹس وائے کے تہلکہ خیز فرار کے بعد ہوا تھا۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ آج رات جو کچھ یہاں بنکاک میں ہوا ہے، وہ کئی دیگر انٹرنیشنل شہرت والے شہروں میں بھی ہوگا۔ آج کی رات ٹیکساری گینگ کی بربادی کی شروعات ہوگئی تھی۔ میں اور فخر ایک مدت سے ٹیکساری گینگ کے خلاف جس بریک تھرو کو ڈھونڈ رہے تھے، وہ آج ہمیں مل گیا تھا۔

○……❖……○

یہ آس کیسی چیز ہوتی ہے، ٹوٹ کر بھی نہیں ٹوٹتی۔ مرتے دم تک انسان کے اندر انہونیوں کی امید باقی رہتی ہے۔ شاید یوں ہو جائے…… شاید یوں ہو جائے۔ تاجور پرائی ہو چکی تھی مگر وہ ابھی تک ماں باپ کے گھر میں ہی تھی۔ وہ اپنے شوہر کے پاس نہیں پہنچی تھی۔ مولوی حبیب اللہ جیسے لوگ ابھی تک اس کی رخصتی کی مزاحمت کر رہے تھے۔ ذہن میں یہ خیال ابھرتا تھا شاید کوئی ایسی بات ہو جائے جو وہ بے گناہ سزا کے اندھے کنویں میں گرنے سے بچ جائے۔ وہ میری نہیں بنی نہ سہی لیکن اس کی پوری زندگی تو غارت نہ ہو۔

مجھے جو دوسری فکر لاحق تھی، وہ انیق اور سجاول کے حوالے سے تھی۔ وہ دو مختلف مزاجوں کے بندے تھے۔ بے شک وہ جاماجی میں اکٹھے رہے تھے لیکن ان کے درمیان کبھی نہیں بنی تھی۔ اب تو انیق کی وجہ سے حالات بہت سنگین رخ اختیار کر چکے تھے۔ ان حالات کی وجہ سے وہ کسی بھی وقت ایک دوسرے کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا سکتے تھے۔ سجاول نے تو ٹھیک سے بتایا کچھ نہیں تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں کسی دوسرے کو فون کر کے اس بارے میں معلومات حاصل کروں۔ گھوم پھر کے دھیان پہلوان حشمت کی طرف ہی جا رہا تھا۔ بنکاک سے کال کافی مہنگی پڑ رہی تھی مگر رابطہ ضروری تھا۔ اگلے روز شام کو میں نے ٹرائی کی اور دوسری کوشش میں پہلوان کی بھرائی ہوئی سی آواز سنائی دے گئی۔

''تم کہاں چلے گئے ہو شاہ زیب! یہاں حالات اچھے ناہیں ہیں۔ کہاں سے بات کر رہے ہو تم؟''

''پاکستان سے باہر ہوں…… لیکن حالات کیوں اچھے نہیں ہیں؟'' میرا دھیان ایک بار پھر آپوں آپ سجاول اور انیق کی طرف چلا گیا۔

وہ بولا۔ ''میرا دل خون کے آنسو بہاوت ہے۔ کل رات…… وہ چلی گئی ہے۔ ہمیشہ کے لیے پرائی ہوگئی ہے۔''

میرے سینے میں سرد لہر دوڑ گئی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ تاجور کی بات کر رہا ہے۔ آخر ہونی ہو

کر رہی تھی۔ فون پر خاموشی تھی۔ اس خاموشی کو توڑنے کے لیے پہلوان دکھی آواز میں بولا۔
''مولانا حبیب کی ساری کوششیں بھی بے کار ہی گئیں۔ طاقت وروں کے سامنے کسی کا زور کب چلت ہے، کل تاجور رخصت ہو کر اپنے شوہر کے گھر چلی گئی ہے۔''
''شوہر کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''تین چار دن پہلے تلک تو اسپتال میں تھا خبیث...... اب اپنے گھر میں ہے۔''
پہلوان نے ٹھنڈی سانس لی، پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''مجھے سب سے زیادہ غصہ تاجور کے والد دین محمد پر آوے ہے۔ اس کو تو جیسے تعویذ گھول کر پلا دیئے ہیں دارابیوں نے۔ آخر میں اس نے مولانا کو یہاں تک کہہ ڈالا تھا کہ اگر وہ مخالفت سے پیچھے نہ ہٹے تو دارج کے ایکسیڈنٹ والا کیس بھی ان پر اور ان کے دو قریبی مریدوں پر بنے گا۔''
میں نے اپنے اندر کی ٹوٹ پھوٹ کو بمشکل سنبھالنے کے بعد کہا۔ ''مولوی جی کو کوئی انگلی بھی نہیں لگا سکتا۔ چاچا حشمت آپ ان کی طرف سے باخبر رہیں۔ کوئی ایسی ویسی بات ہو تو مجھے فوراً بتائیں۔ ویسے اب وہ کہاں ہیں؟''
تاجور کی رخصتی کے بعد سکھیرا سے واپس لاہور چلے گئے ہیں۔ وہاں بھی پولیس ان کو جا بے جا تنگ کرت ہے۔'' پہلوان کی آواز میں رنج تھا۔
''آپ بے فکر رہیں۔ ان کو کچھ نہیں ہوگا۔'' میں نے کہا۔
پہلوان سے بات ختم کر کے میں بستر پر دراز ہو گیا۔ سینے میں دل کے اندر جیسے ایک بہت بڑا چرکا لگ گیا تھا اور مسلسل خون رِس رہا تھا۔ کبھی کبھی ایک پچھتاوا سا بھی دل و دماغ کو گھیرتا تھا۔ میں دل ہی دل میں خود سے سوال کرتا تھا۔ ''شاہ زیب! کہیں ایسا تو نہیں کہ تم نے تاجور کو روکنے کے لیے...... اسے حاصل کرنے کے لیے پوری کوشش نہ کی ہو۔ نادانستہ طور پر تم سے کوتاہی ہو گئی ہو، غفلت ہو گئی ہو۔''
اس کا جواب اثبات میں نہیں تھا۔ کم از کم میرے نزدیک تو اثبات میں نہیں تھا۔ اس کے جدا ہونے کی اور بھی کئی وجوہات ہوں گی لیکن جو وجہ فوری طور پر اس کے فیصلہ کن اقدام کا سبب بنی تھی۔ وہ انیق کا جھوٹ ہی تھا۔ انیق نے سیف مرحوم کے حوالے سے وہ زہریلی باتیں تاجور کے کانوں تک پہنچائیں جنہوں نے اسے اندر سے توڑ پھوڑ دیا۔ اس منظر کی یاد روح فرسا تھی جب میں نے انیق اور تاجور کی باتیں سنی تھیں۔ اس واقعے کے بعد میرا دل چاہا تھا کہ میں تاجور کے سامنے کوئی صفائی پیش نہ کروں لیکن پھر میں یہ بھی کر گزرا تھا۔ اپنے خط (طویل ٹیکسٹ میسج) میں، میں نے سیف کی موت کے حوالے سے ہر بات کھول کر تاجور کے

سامنے بیان کر دی تھی۔ اس کے باوجود وہی کچھ ہوا تھا جو ہونا تھا۔ لہٰذا یہ کہنا درست نہیں تھا کہ شاید میں نے اسے روکنے کی بھرپور کوشش نہیں کی۔ کانٹوں کا بستر کیا ہوتا ہے اور انگاروں پر لوٹنا کسے کہتے ہیں، یہ کچھ انہی کو معلوم ہوتا ہے جن پر ایسی بے مہر راتیں آتی ہیں۔ ماضی کا ایک ایک منظر نگاہوں کے سامنے گھومتا رہا۔ ایک ایک بات سماعت کو گھائل کرتی رہی۔ اس کا پہلی بار ملنا۔ لاہور میں میرے ساتھ دو دن تک گھومنا پھرنا، پھر اچانک غائب ہو جانا، ایک ہی فون نمبر پر میرا ہزاروں بار فون کرنا...... جدائی کے وہ جاں گسل تین سال جب میں نے ہر ہر پل اس کا انتظار کیا اور دل میں یہ امید زندہ رکھی کہ ہم کم از کم ایک بار تو مزید ملیں گے...... اور پھر اس امید کا پورا ہونا۔ فرح کے ساتھ میرا تاجور کو دیکھنا...... پھر چاند گڑھی کی چاندنی راتیں اور سنہری صبحیں، جن کے ہر ہر پل میں ہریالی کی خوشبو اور محبت کی سرگوشیاں رچی بسی تھیں۔ پھر ملنگی ڈیرے کے طلسمی روز و شب جن میں وہ ہر گھڑی میرے ساتھ تھی۔ میں نے اسے قریب سے دیکھا تھا اور میرا یہ یقین پختہ ہوا تھا کہ اس کے نقوش میں کوئی ایسی بات ہے جس کے سبب وہ شاید دنیا کی دلکش ترین عورتوں میں شمار ہو سکتی ہے۔ ملنگی ڈیرے کے بعد سجاول کا ٹھکانا اور اس کے بعد جاماجی کا پُرفسوں جزیرہ...... ہاں کہاں کہاں اس کی یادیں نقش نہیں تھیں اور آج ان ساری مشترکہ یادوں کی قبر پر میں تنہا کھڑا تھا...... اس قبر کا وہ کتبہ پڑھ رہا تھا جس پر دائمی جدائی درج تھی۔ شاید اسی لیے تاجور نے اپنی عزیز سہیلی ریشمی کے سامنے یہ شعر پڑھا تھا۔

درد جگر تے سخت سزاواں عشق دیاں
اوکھے پینڈے لمیاں راہواں عشق دیاں

○......❖......○

اس رات بنکاک میں جو ہنگامے ہوئے تھے، ان میں کم و بیش بیس افراد جان سے گئے تھے۔ زخمی ہونے والوں کی تعداد سو کے قریب تھی، مالی نقصان اس کے علاوہ تھا۔ ہلاک ہونے والوں میں دس کے لگ بھگ راہ گیر تھے جبکہ دس افراد کا تعلق جرائم کی دنیا سے تھا۔ اب یہ بات کسی کے لیے راز نہیں رہی تھی کہ یہ تصادم بدنام زمانہ ٹیکساری گینگ کے دو گروپس میں ہوا تھا...... اور بات صرف یہیں تک نہیں رہی۔ اب اس واقعے کو تین دن گزر گئے تھے اور کوپن ہیگن اور برمنگھم سے بھی ایسی ہی خونی جھڑپوں کی اطلاعات آئی تھیں۔

میرا دل واپس پاکستان جانے کو نہیں چاہ رہا تھا مگر پتا نہیں کیوں سجاول اور انیق کے حوالے سے میرے ذہن میں مسلسل برے برے خیالات جنم لے رہے تھے۔ کبھی دل چاہتا

تھا پاکستان چلا جاؤں، کبھی چاہتا تھا کہ اس سرزمین کی طرف سے اپنا رخ بالکل موڑ لوں۔ دو تین روز اسی شش و پنج میں گزر گئے، بالآخر میں نے پاکستان کے بجائے یورپ جانے کا فیصلہ کیا، اپنی بدلی ہوئی شکل اور کوائف کے ساتھ میں آزادانہ پھر یورپ میں داخل ہو سکتا تھا، اپنے والدین سے مل سکتا تھا اور اپنے چچا حفیظ کے لیے بھی کوئی مستقل پناہ گاہ ڈھونڈ سکتا تھا۔ فخر بھی یہی چاہتا تھا کہ میں اب کچھ دیر کے لیے پاکستان سے دور چلا جاؤں۔ وہ مجھے ہر صورت اپنے ساتھ واپس انگلینڈ لے جانے کا خواہاں تھا۔ اس کی دلی تمنا تھی کہ ہم وہاں رہ کر ٹیکساری گینگ کی بربادی کا تماشا دیکھیں اور حتیٰ المقدور اس بربادی میں اپنا حصہ بھی ڈالیں۔

رضوان کو جب یہ پتا چلا کہ میں یورپ جانے کا ارادہ رکھتا ہوں تو وہ بھی بضد ہو گیا کہ میرے اور فخر کے ساتھ جائے گا لیکن میں نے اس کے لیے پاکستان میں ایک اہم کام سوچ رکھا تھا۔ یہ ایک بڑی اہم ذمے داری تھی اور مجھے پتا تھا کہ رضوان یہ نبھا سکتا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ وہ پاکستان میں رہے اور مولانا حبیب اللہ کی حفاظت کی ذمے داری اٹھائے۔ ویسے تو میں نے پہلوان حشمت کو بھی مولانا کے بارے میں باخبر رہنے کا کہہ رکھا تھا مگر پہلوان حشمت ایک حد تک ہی یہ بوجھ اٹھا سکتا تھا۔ مجھے یہ ڈر تھا کہ دارابیوں کی طرف سے مولانا کو کسی اوچھے ہتھکنڈے کا شکار بنایا جائے گا۔ میں نے پوری بات رضوان کو سمجھا دی...... اور اسے یہ بھی بتا دیا کہ وہ مسجد کے ایک خدمت گار کی حیثیت سے مولانا کے آس پاس رہے گا اور اگر کسی طرح کا کوئی بھی اندیشہ ہو تو فوراً سجاول کو اس سے آگاہ کرے گا۔

میں نے تھائی لینڈ سے ہی مولانا حبیب اللہ کو ایک طویل فون کال بھی کر دی جس میں ان سے گزارش کی کہ وہ میرے قریبی اور بااعتماد دوست رضوان کو اپنی خدمت میں قبول کریں۔

جب میں لاہور میں تھا تو میں نے مولانا کو ایک نہایت مشکل صورتِ حال سے نکالا تھا۔ وہ میری صلاحیت کے معترف تھے۔ وہ سمجھ گئے کہ میرا ساتھی بھی ان کے لیے ضرور سودمند ثابت ہوگا۔ یوں تو وہ اللہ پر توکل کرنے والے بندے تھے مگر میرے پُرزور اصرار پر انہوں نے رضوان کے سلسلے میں میری بات مان لی اور بس اتنا کہا۔ ”وقاص! موت کا ایک دن مقرر ہے، ہمیں اس پر یقین رکھنا چاہیے۔“

دوسری طرف میں نے سجاول کو بھی فون کر دیا کہ وہ میری غیر موجودگی میں مولانا حبیب اللہ سے کسی طرح کی زیادتی نہیں ہونے دے گا۔ اپنی قانونی مدد تو وہ خود بھی کر سکتے تھے لیکن اگر کوئی اوچھا ہتھکنڈا ان کے خلاف استعمال ہوتا تو پھر اس کا ترکی بہ ترکی جواب

دیئے جانے کی ضرورت تھی۔

رضوان پہلے سے بہت زیادہ تبدیل ہو چکا تھا۔اس میں جرأت اور بے خوفی کے ساتھ جہاندیدگی بھی آگئی تھی۔وہ یہ بات بخوبی سمجھ رہا تھا کہ میں فی الحال اپنی شناخت چھپائے رکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے امید تھی کہ کم از کم رضوان کی وجہ سے تو میرے ''حیات'' ہونے کا راز فاش نہیں ہوگا۔ میں ایک عجیب طرح کا اعتماد اس پر محسوس کرنے لگا تھا۔ میں نے اسے پوری طرح سمجھا دیا تھا کہ میں مولانا حبیب اللہ سے وقاص کے نام کے ساتھ ہی ملا ہوں اور سکھیرا گاؤں میں میری حیثیت سیف کے والد کے ڈرائیور کی تھی۔

○……❖……○

زندگی تبدیلیوں اور غیر متوقع حالات کا نام ہے جو کچھ سوچا ہوتا ہے، وہ نہیں ہوتا اور جو وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا، وہ ہم پر وارد ہو جاتا ہے۔ میں فخر کے ساتھ تھائی لینڈ سے ڈنمارک کے لیے پرواز کر گیا۔ تھائی لینڈ سے یورپ کے لیے پرواز کریں تو مشرق سے مغرب کی طرف جانا پڑتا ہے۔ انہی فضاؤں سے گزرنا پڑتا ہے جن کا تعلق ہماری سرزمین سے بھی ہے۔ امارات ایئرلائن کے بوئنگ طیارے میں پرواز کرتے ہوئے میں نے نیچے دیکھا تو دل سے ایک ہوک سی اٹھی۔ یہیں کہیں کوئی خطہ تھا، کوئی جگہ تھی جہاں میرا بہت کچھ موجود تھا۔

ڈنمارک کے شب و روز کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا، وہ بہت ہیجان خیز دن تھے۔ ہمارے اردگرد ٹیکساری گینگ کے حوالے سے بہت کچھ ہو رہا تھا اور ہمیں مسلسل خبریں بھی مل رہی تھیں۔ حالات اسی رخ پر جا رہے تھے جو ہم نے سوچا تھا۔ اسی دورانیے میں، میں نے کچھ وقت نکالا اور آسٹریا کے اس دور دراز قصبے ''واسٹو'' میں گیا جہاں میرے والدین بالکل الگ تھلگ لیکن محفوظ زندگی گزار رہے تھے۔ وہ مجھے دیکھنے کے لیے ترس رہے تھے لیکن مجھے دیکھ کر بھی پوری طرح نہ دیکھ سکے۔ میں کاسمیٹک سرجری کی آڑ میں تھا۔ بے شک میرا چہرہ تیس پینتیس فیصد سے زیادہ تبدیل نہیں ہوا تھا مگر تبدیلی تو تھی۔ ماں باپ اپنی اولاد کی مجبوریاں بہت جلد سمجھ لیتے ہیں اور تسلیم بھی کر لیتے ہیں۔ انہوں نے میری مجبوری تسلیم کر لی اور میری بدلی ہوئی صورت کے ساتھ ہی مجھے سینے سے لگا کر اپنے کلیجے ٹھنڈے کیے۔

اسی دوران میں میری کوشش سے چچا حفیظ کے سفری کاغذات بھی تیاری کے مراحل سے گزر رہے تھے۔ اب امید تھی کہ وہ بھی بہت جلد یہاں اپنے بھائی اور بھابی کے پاس پہنچ جائیں گے۔ اس کے علاوہ اب مجھے کسی کی فکر نہیں تھی۔ میرا اور تھا بھی کون؟ ماں کی نگاہ اپنی

اولاد کے اندر بہت دور تک دیکھتی ہے۔ میں نے آج تک اپنی والدہ سے تاجور کا ذکر نہیں کیا تھا لیکن وہ میرے بتائے بغیر جانتی تھیں کہ پاکستان میں کوئی لڑکی ہے جو میرے دل کی گہرائیوں میں بسی ہوئی ہے۔ والدہ نے مجھ سے بہت پوچھا لیکن میں نے انہیں ایک وقتی تعلق کا کہہ کر ٹال دیا۔ والدہ نے فخر کو گھیرا اور اس کو ہر طریقے سے کریدنے کی کوشش کی مگر وہ بھی میری ہدایت کے خلاف نہیں جا سکتا تھا۔ ایک دن وہ بولا۔ ''یار! پہلے صرف تم پر ترس آتا تھا اب خالہ جان پر بھی آتا ہے پتا ہے پرسوں مجھ سے کیا کہہ رہی تھیں؟''

''کیا کہہ رہی تھیں؟''

''وہ رو رہی تھیں۔ مجھ سے درخواست کر رہی تھیں کہ میں کسی طرح ایک بار ان کو اس لڑکی سے ملوا دوں، اور کچھ نہیں تو فون پر ہی بات کروا دوں، وہ مجھ سے ملے گی تو میں اس کے پاؤں پکڑ لوں گی، میں شاہ زیب کو آباد دیکھنا چاہتی ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''اسی لیے تو تجھ سے کہتا ہوں کہ جلد سے جلد یہاں سے نکلنا ہوگا۔''

اور پھر تیسرے ہی روز میں اور فخری آسٹریا کے اس واسٹو نامی پُر فضا قصبے سے واپس آ گئے۔

ایک بار پھر کوپن ہیگن ہمارا مسکن تھا۔ کوپن ہیگن میں دس بارہ روز گزارنے کے بعد ہمیں ایمسٹرڈیم جانا پڑا۔ وہی شہر آشوب جہاں زندگی اپنے ہر رنگ میں پوری تابانی کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ بظاہر اس شائستہ اور ایڈوانس شہر کی تہ میں بھی انڈر ورلڈ کا وسیع تانا بانا پھیلا ہوا ہے۔ یہاں ٹیکساری گینگ واضح طور پر دو گروہوں میں بٹ چکا تھا بلکہ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ اس کے تین گروہ بن چکے ہیں۔ ایک گروہ کو جان ڈیرک لیڈ کر رہا تھا اور دوسرا گروہ جو نسبتاً زیادہ بڑا اور مضبوط تھا، والٹس وائے کو اپنا لیڈر مان رہا تھا۔ ان کے نزدیک والٹس وائے ہی گینگ کی سربراہی کا اصل حق دار تھا۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ جان ڈیرک نے اپنے باپ کی نافرمانی کرتے ہوئے والٹس وائے کو منظر سے ہٹایا اور ایک عرصے تک اسے قید و بند کی تکلیفوں سے دوچار رکھا۔ بے شک ایسے بے رحم جرائم پیشہ افراد کی زندگی سے اخلاقیات کا دور دور تک کوئی تعلق نہیں ہوتا پھر بھی ٹیکساری گینگ کے اکثر ارکان کا خیال تھا کہ جان ڈیرک نے والٹس وائے کی بچی کے بارے میں جو ارادے باندھ رکھے تھے، وہ بے حد غلط تھے۔ وہ اپنی ضد پوری کرنا چاہتا تھا اور بہت بری نیت سے اس کے بالغ ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔

ایمسٹرڈیم میں بھی آئے دن دونوں گروپوں میں جھڑپیں ہو رہی تھیں۔ ایک دوسرے کو

قتل کیا جا رہا تھا۔ گینگسٹرز کو اغوا کیا جا رہا تھا۔ آبروریزی کے واقعات ہو رہے تھے۔ ٹیکساری گینگ کا پورا ڈھانچا لرزہ براندام تھا اور ڈیتھ اسکواڈ کے ہم شکل شیطان بھی اسی ڈھانچے کا حصہ تھے۔

ایک روز میں سٹی سینٹر کے ایک بڑے پب میں بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ فخر کا فون آیا۔ اس کی آواز میں چہکار تھی۔ بولا۔ ''ٹیکساری کی واٹ لگ گئی ہے۔ برادرم! ہمارے نقطۂ نظر سے ایک بہت بڑی خوش بری ہے۔''

''جان ڈیرک کی لاش کسی گٹر سے ملی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہی حالات برقرار رہے تو وہ بھی مل جائے گی۔ فی الحال یہ جان لو کہ ڈیتھ اسکواڈ بھی دوحصوں میں بٹ گیا ہے۔ کم وبیش پچیس عدد شیطان زادے اپنی تمام تر حرامزدگی اور نحوست کے ساتھ والٹس والے سے جا ملے ہیں۔ انہوں نے جہاں اپنے بدمعاش باپ کے ''ڈی این اے'' سے اور بہت سی خباثتیں لی ہیں وہاں یقیناً غداری بھی شامل ہے۔''

○......❖......○

وہ بڑے سنسنی خیز دن تھے۔ دوتین مرتبہ ڈیتھ اسکواڈ کے شیطانوں سے ہماری مڈبھیڑ بھی ہوئی۔ ان میں سے ایک مڈبھیڑ بڑی تہلکہ خیز تھی۔ آپس کی ایک خوفناک جھڑپ کے بعد ڈیتھ اسکواڈ کے پانچ ہم شکل ''جانور'' لارلم کے قریب ایک جنگل میں جا چھپے تھے۔ ان میں سے دو زخمی بھی تھے۔ میں نے اور فخر نے انہیں جا گھیرا۔ وہ عیاری میں اپنی مثال آپ تھے۔ ہم نے ایک زبردست مقابلے کے بعد ان پانچوں کو جہنم واصل کر دیا۔ وہ اتنے خطرناک تھے کہ گھنے جنگل میں خالی ہاتھ بھیڑیے اور جنگلی کتے جیسے جانوروں کا شکار کر کے ان کا گوشت کھاتے رہے تھے اپنے ساتھ موجود ایمونیشن انہوں نے مخالف گروپ سے مقابلے کے لیے رکھ چھوڑا تھا۔

ان دنوں مجھ پر عجیب سی بے حسی طاری تھی۔ زندگی اور موت میں جیسے کوئی خاص فرق محسوس نہیں ہوتا تھا۔ کسی وقت تو جی چاہتا تھا کہ اپنی زندگی سے چھٹکارا حاصل کرلوں۔ مگر یہ چھٹکارا خودکشی کی صورت میں نہ ہو بلکہ زیرزمین مجرموں کے خطرناک ترین ٹھکانوں میں گھس جاؤں۔ زمین پر سے ان کا جتنا بوجھ بھی کم کر سکتا ہوں کر دوں اور پھر خود بھی کسی جوابی کارروائی کا شکار ہو کر قیدِ حیات سے رہائی پالوں، لیکن سیانے شاید ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ موت کا تعاقب کرو تو وہ آگے لگ کر بھاگتی ہے اور آنکھ مچولی کھیلتی ہے۔ ان دنوں یہی آنکھ مچولی جاری تھی اور کبھی کبھی اس کھیل کے دوران میں ایک بجلی سی بھی چمکتی تھی۔ ایک بے مثل چہرے

اور ایک مسکراہٹ کی بجلی...... اس قیام کے دوران میں ایک مرتبہ ڈاکٹر کرنل احرار سے بھی ملاقات ہوئی۔ میری ٹھوڑی کے اردگرد جلد میں تھوڑی سی سرخی پیدا ہو گئی تھی۔ یہ کاسمیٹک سرجری کا ہی ایک عمومی ری ایکشن تھا۔کرنل احرار نے میری اس شکایت کو بخوبی دور کر دیا۔

اسی طرح قریباً پانچ ماہ گزر گئے۔ میں نے فخر کو منع کر رکھا تھا کہ وہ پاکستان سے آنے والی کوئی خبر مجھ تک نہیں پہنچائے گا۔ میں نے اپنا سیل نمبر بھی ایک بار پھر تبدیل کر لیا تھا مگر ہونی ہو کر رہتی ہے۔ایک دن ایک ایسی اطلاع مجھ تک پہنچی کہ میں بری طرح تھرا گیا......اور مجھے ایک بار پھر نہ چاہنے کے باوجود پاکستان کا رخ کرنا پڑا۔ میں اور فخر مکس مارشل آرٹ کے مقابلے دیکھنے کے لیے ایمسٹرڈیم کے ایک بڑے کلب میں پہنچے تھے۔مزے کی بات یہ تھی کہ یہ چیلنج مقابلے ان چند کھلاڑیوں کی یاد میں منعقد ہو رہے تھے جو پچھلے پانچ چھ برسوں میں مقابلوں کے دوران میں یا ویسے ہی راہی ملک عدم ہوئے تھے۔ میں بھی ان میں ''شامل'' تھا۔''مرحومین'' کی بڑی بڑی تصویروں میں میری تصویر بھی نمایاں جگہ پر نظر آ رہی تھی۔اپنی اس تصویر سے صرف پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر میں خود بھی اپنے دوست فخر کے ساتھ موجود تھا۔

مقابلوں کے دوران میں ریفریشمنٹ کے لیے ایک گھنٹے کا وقفہ تھا۔ میں اور فخر ایک فوڈ سینٹر میں جا بیٹھے۔فخر مجھے کچھ افسردہ نظر آ رہا تھا۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کی افسردگی کی وجہ سیل فون سے جڑی ہوئی ہے۔شاید اسے کوئی تازہ کال یا میسج آیا تھا۔

میرے استفسار پر وہ گہری سانس لے کر بولا۔''تم نے مجھے پابند کر رکھا ہے کہ میں پاکستان سے ملنے والی کوئی اطلاع تم تک نہ پہنچاؤں لیکن میں نے تم سے کہا تھا کہ کوئی بہت ضروری اطلاع ہوئی تو میں خود کو باز نہیں رکھ سکوں گا۔''

میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے گہری سانس لی۔''اچھا اب بول ہی پڑے ہو تو پھر بک دو۔''

وہ بولا۔''میں مولانا حبیب اللہ کی طرف سے پریشان ہوں۔تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ انہیں دارابیوں کی طرف سے خطرہ ہے۔''

''کیا کوئی بات ہوئی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اگر ہو بھی جائے تو پھر ہمارا ردِعمل کیا ہوگا؟''

''صاف بات کرو۔'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

''تم نے رضوان کو مولوی صاحب کے آس پاس رہنے کا کہا تھا۔ بے شک وہ باہمت

لڑکا ہے مگر تمہارا کیا خیال ہے وہ مولوی جی کو درپیش خطروں کا مقابلہ کر سکتا ہے؟''
''خطروں کا مقابلہ اکیلے اس کو نہیں کرنا۔ اس نے سجاول سیالکوٹی کو اطلاع پہنچانی ہے اور میرے خیال میں سجاول کسی معمولی بندے کا نام نہیں۔''
''لیکن جناب عالی! یہ غیر معمولی بندہ اگر دستیاب ہو تو پھر ہے ناں، وہ تو موجود ہی نہیں ہے۔ اپنی دشمنیاں چکانے کے چکر میں پڑا ہوا ہے۔''
''فخری! پہیلیاں نہ بجھواؤ۔ اصل بات بتاؤ۔ مولوی صاحب کے ساتھ کچھ ہوا ہے؟''
''ہاں، وہ سخت زخمی ہوئے ہیں۔ وہ اپنے ایک عقیدت مند کی گاڑی میں لاہور سے باہر جا رہے تھے۔ ایک سڑک پر ایک مشتعل گروہ نے ان کا راستہ روکا۔ پہلے ان کی گاڑی پر شدید پتھراؤ کیا اور شیشے توڑ دیئے۔ پھر ان پر حملہ کر دیا۔ ان کو ''چندہ خور'' اور چور جیسے القابات دیئے گئے۔ مولوی حبیب اللہ کی حفاظت کرتے ہوئے ان کے ایک مرید نے جان دے دی اور کئی ایک زخمی ہوئے۔ پولیس کی آمد پر حملہ آور بھاگ گئے۔ مولوی صاحب کے ایک بازو اور پسلیوں پر شدید چوٹیں آئی ہیں۔''
''اوہ گاڈ!'' میں نے سر پکڑ لیا۔ ''پاکستان سے روانہ ہوتے وقت مجھے اسی طرح کا اندیشہ تھا۔ دارج داراب جیسے لوگ انتقام کو بھولتے نہیں اور خود پس منظر میں رہ کر بدلہ لینے کے ان کے پاس اَن گنت طریقے ہوتے ہیں۔''
فخر بولا۔ ''بات یہیں پر بس نہیں ہوئی ہے۔ جب مولانا کو اسپتال پہنچایا گیا تو وہاں بھی کچھ لوگوں نے اسپتال سے باہر ہنگامہ کیا، ہوائی فائرنگ کی اور حملہ آور ہونے کی کوشش کی۔''
''یہ سب کچھ تمہیں رضوان نے بتایا؟'' میں نے پوچھا۔
''ہاں، اس نے کہا ہے کہ سجاول صاحب سے رابطہ نہیں ہو رہا۔ دو روز سے ان کا فون مسلسل بند جا رہا ہے۔''
''تم کہہ رہے تھے کہ سجاول اپنی دشمنیاں چکانے میں لگا ہوا ہے؟''
''ہاں اس کو تم دوسری بری خبر کہہ سکتے ہو شاہی! وہی ہو رہا ہے جس کا تمہیں اندیشہ تھا۔ وہاں سانپ اور نیولے کا کھیل جاری ہے۔ انیق اور سجاول میں ٹاکرا ہوا ہے۔ سجاول کو کھوج ملا تھا کہ انیق کوہاٹ اور ٹل سے آگے قبائلی علاقے میں کہیں موجود ہے۔ وہ اس کے پیچھے وہاں پہنچا ہوا ہے۔''
واقعی، میرے لیے یہ دونوں خبریں تشویش ناک تھیں۔ خاص طور سے مولانا حبیب اللہ والے واقعے نے میرے دل پر گہرا اثر کیا۔ بے شک دارابیوں جیسے لوگ معاف کرنا نہیں

جانتے۔ انہوں نے وہ سب کچھ کیا تھا جو کر سکتے تھے مگر اب بھی ان کا انتقام باقی تھا۔ یقینی بات تھی کہ مولانا حبیب اللہ کے خلاف جو مہم چلائی جا رہی ہے، اس کے پیچھے کہیں نہ کہیں دارج داراب یا اس کے باپ کا ہاتھ موجود ہوگا۔ انہوں نے اس واقعے کی خوب مذمت بھی کی ہوگی۔ مجرموں کو جلد پکڑنے اور کیفر کردار تک پہنچانے کے دعوے بھی کیے ہوں گے مگر خود کو پکڑنا آسان تو نہیں ہوتا۔ اپنے آپ کو کون ہتھکڑیاں لگاتا ہے۔ خانہ پُری کے لیے کسی بے گناہ کی گردن ماردی جاتی ہے یا اسے سلاخوں کے پیچھے زندہ درگور کر دیا جاتا ہے۔

اس رات میں نے فیصلہ کرلیا کہ پاکستان جاؤں گا اور دیکھوں گا کہ مولانا حبیب اللہ صاحب کے ساتھ یہ ظلم کس نے کیا ہے۔ یہ سب کچھ ایک آگ کی طرح تھا۔ میں اس آگ سے دور رہنا چاہتا تھا مگر آگ مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ میری نگاہوں کے سامنے مولانا کی نورانی صورت گھوم رہی تھی اور اس جدوجہد کا نقشہ تھا جو انہوں نے اپنی بھانجی کو دارابیوں کے چنگل سے بچانے کے لیے کی تھی۔ یقیناً ان کو اسی کی سزا مل رہی تھی۔

○......❖......○

میں اور فخر زماں اب ایک بار پھر پاکستان میں تھے۔ (میں اب وقاص کے نام سے ہی سفر کرتا تھا اور یہ نام میری شناخت بنتا جا رہا تھا) میں جانتا تھا، یہ لاہور ہے۔ یہ ایک طرح سے داؤد بھاؤ کے گلی کوچے بھی تھے۔ یہاں ہر چپے چپے پر اس کے گماشتے موجود رہتے تھے اور اپنی عقابی نگاہوں سے لوگوں کی آمدورفت پر نگاہ رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ دارابیوں کا شہر بھی تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ائیرپورٹ کے اندر اور باہر ان کے کئی ہرکارے موجود ہوں گے، اس کے علاوہ پولیس تھی جسے بدستور میری تلاش تھی مگر میں اپنے ان سارے چاہنے والوں کی نظروں میں آئے بغیر آزادانہ لاہور میں وارد ہو گیا تھا۔ ہم مال روڈ کے ایک معروف ہوٹل میں ٹھہرے۔ اسی شام میں مولانا حبیب کی خبر گیری کے لیے ان کے گھر جا پہنچا۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے مولانا حبیب کی رہائش گاہ مسجد کے بالکل ساتھ ہی واقع تھی۔ جب ان پر پہلی بار مشتعل لوگوں سے حملہ کرایا گیا تھا تو میں اتفاقاً یہاں موجود تھا اور میں نے خود کو ان کے سامنے ڈھال بنایا تھا۔ اس واقعے نے مجھے بحیثیت وقاص، مولانا کی نظروں میں ایک اہم مقام دے دیا تھا۔

میں شام کے بعد مولانا کی رہائش گاہ پر پہنچا تو وہاں مزاج پُرسی کے لیے آنے والوں کا ہجوم تھا۔ ظاہر ہے کہ سب تو اندر نہیں جا سکتے تھے۔ مولانا کے برادرِ نسبتی میزبانی کر رہے تھے۔ بہرحال تھوڑے سے انتظار کے بعد مجھے اندر جانے کی اجازت مل گئی۔ ایک کشادہ کمرے میں

مولانا بستر پر نیم دراز تھے۔ ان کا ایک بازو پلاستر میں جکڑا ہوا تھا۔ پسلیوں پر بھی بینڈیج نظر آرہی تھی مگر ان کے چہرے پر ہمیشہ نظر آنے والا اطمینان اور آنکھوں سے چھلکنے والی آسودگی اپنی جگہ موجود تھی۔

میں نے ان کا حال احوال دریافت کیا۔ انہوں نے ''شکر ہے یا اللہ'' سے بات شروع کی اور ''شکر ہے یا اللہ'' پر ختم کی۔ پھر پوچھنے لگے۔ ''اتنی دیر کہاں رہے ہو وقاص، بڑے دنوں بعد شکل دکھائی ہے؟''

''بس لاہور میں نہیں تھا جناب! ورنہ ضرور حاضر ہوتا رہتا۔ آپ ہی تو فرماتے ہیں کہ جہاں کا دانہ پانی ہوتا ہے وہاں بندہ ضرور پہنچ جاتا ہے۔''

اسی دوران میں دروازہ کھلا اور مجھے رضوان ٹی کی شکل نظر آئی۔ اس نے چھوٹی چھوٹی داڑھی رکھ لی تھی جو اس کے وجیہہ چہرے پر خوب جچتی تھی۔ وہ ٹرے میں ایک گلاس کے اندر ہلدی ملا دودھ لے کر آیا تھا۔ مجھے دیکھ کر بولا۔ ''سلام وقاص بھائی۔''

میں نے سلام کا جواب دیا۔ وقاص نے دودھ مولانا کے پاس سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور مؤدب کھڑا ہوگیا۔

مولانا نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور مجھ سے مخاطب ہوکر بولے۔ ''اس بندے کو بھیج کر تم نے میرے ساتھ بڑی بھلائی کی ہے۔ چوبیس گھنٹے کا مستعد خدمت گار دے دیا ہے مجھے۔ میں ہزار بار کہتا ہوں اللہ کے بندے اپنی نیند پوری کیا کر، مگر مجال ہے جو اس پر اثر ہو۔''

''آپ شرمندہ کر رہے ہیں جی۔'' رضوان نے کہا۔ ''آپ کو تو مجھ جیسے سیکڑوں عقیدت مند مل جائیں گے لیکن مجھے آپ جیسا محترم کہاں ملے گا۔''

مولانا کی دوا کا وقت بھی ہوگیا تھا۔ رضوان نے انہیں دوا کھانے میں مدد دی اور پھر اجازت لے کر باہر چلا گیا۔

دیکھا جاتا تو مولانا پر اوپر تلے دو دفعہ قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔ ایک مرتبہ سڑک پر اور چند گھنٹے بعد اسپتال میں، لیکن وہ بالکل مطمئن نظر آتے تھے۔ میں نے پورے یقین سے کہا۔ ''مولانا! آپ مانیں یا نہ مانیں مگر اس کے پیچھے انہی لوگوں کا ہاتھ ہے جن کی مخالفت آپ نے رشتے کے سلسلے میں کی تھی۔''

''نہیں وقاص، ہمیں بغیر ٹھوس ثبوت کے کسی پر الزام نہیں دھرنا چاہیے۔ یہ بہتان کے زمرے میں آتا ہے اور اللہ رب العزت نے اس کی سخت سزا رکھی ہے۔''

''ایسے لوگ ثبوت کہاں چھوڑتے ہیں حضرت! یہی تو ان کا ہنر ہوتا ہے۔''

''پولیس تفتیش کر رہی ہے ناں، ایک دو بڑے اچھے افسر ہیں۔ مجھے امید ہے وہ فرض شناسی سے کام کریں گے۔''

''گستاخی معاف، یہ کبھی بھی نہیں ہوگا۔ زیادہ ہوا تو کسی مرغے کو پھانس کر اس پر دفعہ 302 لگا دی جائے گی...... اصل ذمے دار اپنے سائے کو بھی نہیں چھونے دیں گے۔''

''اچھا چھوڑو ان باتوں کو۔'' انہوں نے ٹوپی سر سے اتار کر اپنے کھچڑی بالوں میں انگلیاں چلائیں اور بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔ ''تم نے پچھلی دفعہ اس لڑکی کا ذکر کیا تھا جس سے عقد کرنا چاہتے تھے۔ اس کا کیا بنا؟''

میرے دل پر گھونسا سا لگا۔ میں مولانا کو کیا بتاتا کہ وہ آپ کی وہی بھانجی تو ہے جو اس وقت اسلام آباد کے کسی ''اونچی دیواروں والے محل'' میں نوبیاہتا کے روپ میں موجود ہے۔ میں نے چند لمحے کے توقف کے بعد کہا۔ ''آپ ٹھیک ہی کہتے تھے حضرت! ایک مرضی انسان کی ہوتی ہے اور ایک رب کی...... اور ہوتا وہی ہے جو رب چاہتا ہے۔ وہ لڑکی بھی اپنے والد کی من مانیوں کے سامنے بند نہیں باندھ سکی۔ اس کی شادی ہوگئی ہے...... آپ میرے لیے صبر اور حوصلے کی دعا کیجیے۔''

مولوی حبیب صاحب کے چہرے پر افسردگی کی جھلک دکھائی دی۔ انہوں نے اس سلسلے میں کچھ مزید تفصیل پوچھی...... پھر بولے۔ ''وقاص بیٹا! ایک جنت دوزخ اگلی زندگی میں ہے اور ایک جنت دوزخ اس دنیا میں بھی موجود ہے۔ ہم اپنے اعمال کے سبب اس جنت دوزخ کا مزہ بھی چکھتے ہیں۔ صبر کرنے والے اور اللہ کی رضا کے ساتھ اپنی رضا کو ملا لینے والے اس دنیا میں بھی صلہ پاتے ہیں اور ان کی زندگی میں جنت کی ہوائیں داخل ہوتی ہیں۔ دیر ہو سکتی ہے مگر اندھیر نہیں۔ بندے کو اس کے رنج و غم اور تکلیفوں کا صلہ یہاں اس دنیا میں بھی ضرور ملتا ہے۔ میں اللہ پاک سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اس محرومی کے بدلے کوئی ایسی عطا تمہیں کرے جو تمہارے دکھوں کا مداوا کر دے۔ کوئی ایسا تمہاری زندگی میں آئے جو تمہارے رنج و غم کو پائیدار خوشی میں بدل دے۔''

میرے دل پر چوٹ لگ رہی تھی۔ میں ان کے سامنے کیسے وضاحت کرتا کہ میں ایک عشق کا اسیر ہوں اور ایسے لوگوں کے لیے تو ان کا غم ہی راحت بن جائے تو بن جائے ورنہ وہ غم سے جان نہیں چھڑا سکتے۔ بہر حال مولانا کی باتوں نے میرے بہت سے جلتے زخموں پر ٹھنڈک بھرا مرہم رکھا اور مجھے کچھ سکون محسوس ہوا۔

میں نے مولانا کو بتایا کہ اب میں لاہور آ گیا ہوں اور ان سے ملاقات کا شرف حاصل کرتا رہوں گا۔ میں مولانا سے تو نہیں کہہ سکتا تھا مگر مجھے شدید اندیشہ تھا کہ مولانا کے مخالفین انہیں کسی نہ کسی طریقے سے پھر نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے۔

اگلے روز ہوٹل میں رضوان بھی آیا۔ اس کی دوست میڈونا واپس یورپ جا چکی تھی تاہم فون پر اس سے رابطہ کرتی رہتی تھی (اور ممکن تھا کہ اس سے جھاڑیں بھی سنتی رہتی ہو) رضوان نے مجھے اور فخر کو یہاں کے حالات سے مکمل آگاہی دی۔ سجاول کے بارے میں اسے بس اتنا ہی پتا تھا کہ تین چار روز سے اس کا فون بند ہے۔ اطلاعات کے مطابق لالہ موسیٰ کے ایک بازار میں سجاول نے کسی بندے سے سخت مار پیٹ کی تھی اور اس کے بعد اسے لئیق کا کچھ کھوج ملا تھا۔ وہ اس کھوج کے سلسلے میں ہی کرم ایجنسی کی طرف گیا تھا۔

میرے پاس خورسنہ کا نمبر موجود تھا مگر یہ نمبر بھی بند جا رہا تھا۔ اب اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ سجاول کے قریبی ساتھی ''یونس پمپ والا'' سے رابطہ کیا جائے۔ یونس پمپ والا، مجھے وقاص کی حیثیت سے ہی جانتا تھا۔ یونس سے رابطہ ہو گیا مگر اس سے بھی بس اتنی ہی بات معلوم ہو سکی کہ بازار میں سجاول نے کسی بندے کو پکڑا تھا اور مکا مار کر اس کے ناک کی ہڈی کا چورا کر ڈالا تھا۔ اس کے بعد وہ کسی کو ڈھونڈنے پشاور کی طرف نکل گیا تھا۔ یونس پمپ والا نے بتایا۔ ''بھابی خورسنہ اب تندرست ہیں اور اپنے بچے کے ساتھ لالہ موسیٰ شہر میں ہی موجود ہیں۔''

میں یونس سے یہ تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ خورسنہ سے میری بات کرائے، بہرحال یونس سے بات کر کے خورسنہ اور بچے کی خیریت کے حوالے سے تسلی ہو گئی۔

رضوان عجیب لہجے میں بولا۔ ''شاہ زیب بھائی، مولانا صاحب اپنی بھانجی صاحبہ کی طرف سے بہت فکرمند رہتے ہیں۔'' میں نے چونک کر رضوان سے وجہ پوچھی تو وہ بولا۔ ''شاید وہ اپنے گھر میں سکھی نہیں ہیں۔ پچھلے دنوں کسی صحافی نے اندر خانے کی خبر دی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ بیماری کی وجہ سے دارج داراب صاحب بہت چڑچڑے ہو چکے ہیں۔ ان کی ازدواجی زندگی بھی متاثر ہوئی ہے بلکہ اس صحافی نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ دارج صاحب اپنی بیوی پر ہاتھ اٹھاتے ہیں۔''

رضوان کی بات سن کر میرے اندر جیسے بھک سے ایک شعلہ بھڑک اٹھا۔ وہ میری محبت تھی، میرا عشق تھی، اس کو پہنچنے والی ذرا سی تکلیف مجھے بے قرار کر دیتی تھی۔ کوئی اس کے چہرے کی طرف گستاخ نظر اٹھاتا تھا تو بھی مجھ سے برداشت نہیں ہوتا تھا۔ کہاں یہ کہ اس کو

منکوحہ بنا کر اپنے قبضے میں کرنے والا شخص اس پر تشدد کرتا۔

میں نے تفصیل پوچھی تو رضوان نے وہی بات بتائی جو مجھے اس سے پہلے بھی معلوم ہو چکی تھی۔

اس نے کہا۔"میں نے آپ سے مائیکل نامی صحافی کے مضمون کا ذکر کیا تھا ناں...... اسے پاکستان سے باہر بھی کافی شہرت ملی ہے۔ صحافی نے ملنگی ڈیرے پر اپنے کیمرے کو زوم کر کے تاجور صاحبہ کی دو تین تصویریں بھی اتاری تھیں......اور ساتھ ہی یہ لکھا تھا کہ حسن کے مقابلوں میں شریک ہونے والی خوب صورتی اور دیہات میں خودرَو پھولوں کی طرح پرورش پانے والی خوب صورتی میں کیا فرق ہوتا ہے۔ پچھلے دنوں یہی مضمون انگلینڈ کے ایک میگزین میں بھی شائع ہوا۔ داراب فیملی میں سے کسی کی نظر اس مضمون پر پڑ گئی۔ بس اسی کا بتنگڑ بنایا گیا۔ بہن تاجور صاحبہ کے شوہر نے اس کا غصہ اتارا اور الزام لگایا کہ تاجور صاحبہ نے خود یہ تصویریں اتروائی ہیں اور یہ کوئی اکیلی بات نہیں ہے۔ ایسی کئی چھوٹی موٹی باتیں ہیں جن کی وجہ سے وہ شخص اپنے گھریلو معاملات میں بہت تلخ رہتا ہے۔"

میرے سینے میں انگارے سے دہکنے لگے۔ وہی کچھ ہو رہا تھا جس کی دارج جیسے اوباش سے توقع تھی۔ وہ تاجور سے محبت کا دعوے دار تھا اور یہ "محبت" چار پانچ ماہ میں ہی اپنی اصلیت دکھانے لگی تھی۔ ابھی تو وہ بدبخت پوری طرح صحت مند نہیں ہوا تھا ورنہ نہ جانے اس کا کیا حشر کرتا۔

میں کمرا بند کر کے دیر تک چپ چاپ لیٹا رہا۔ خاموشی کی زبان میں تاجور سے یہ سوال کرتا رہا کہ اس نے مجھے اور خود کو اتنی بڑی سزا کیوں دی؟ کیوں جان بوجھ کر خود کو ایک جانور کے حوالے کر دیا؟ کیا اسے وہ نظر نہیں آ رہا تھا جو اس کے والد کے علاوہ باقی اور سب کو نظر آ رہا تھا۔ اسے کیوں نظر نہیں آ رہا تھا؟ کیا یہ وہی خود اذیتی تھی جس کے لیے کبھی کبھی مشرقی عورت کو موردِ الزام بھی ٹھہرایا جاتا ہے۔

اسی روز رات کو میں نے وہ خبر بھی پڑھی جو ایک پاکستانی صحافی کی چھان بین کا نتیجہ تھی۔ اس نے بڑے یقین سے یہ بات کہی تھی کہ چند ماہ پہلے دارج داراب کی بڑی دھوم دھام سے ہونے والی شادی اب تلخ حالات کو جنم دے رہی ہے۔ اس نے نوبیاہتا جوڑے کے قریبی ذرائع سے بتایا تھا کہ بیماری کے سبب دارج داراب صاحب چڑچڑے ہو گئے ہیں......ان کا زیادہ تر وقت گھر میں ہی گزرتا ہے۔ انہوں نے اپنا آفس بھی گھر میں منتقل کر لیا ہے۔ ان کی بیوی جس کا تعلق درمیانے درجے کے ایک زمیندار گھرانے سے تھا۔ اپنی

آنکھوں میں نہ جانے کیا کیا سپنے سجا کر اسلام آباد کے ایک ایکڑ پر پھیلے محل نما گھر میں داخل ہوئی تھی لیکن اب ''اسٹیٹس کو'' کی اصل تلخیاں اس کے سامنے آ رہی ہیں۔ باوثوق ذرائع کے مطابق کچھ دن پہلے ازدواجی جھگڑے کے نتیجے میں مسز تاجور دارج اپنے گاؤں سکھیرا چلی گئی تھیں لیکن عید کے موقع پر دارج داراب صاحب نے اپنے رویے پر نظر ثانی کی اور صلح کر لی مگر یہ سب کچھ عارضی تھا۔ اب پھر وہی سب کچھ ہو رہا ہے جو پہلے تھا......

خبر کے متن میں آگے جا کر ایک جگہ لکھا تھا۔ ''دارج داراب صاحب کے ایک نہایت قریبی ذریعے سے یہ معلوم ہوا ہے کہ شام کے بعد دارج صاحب اکثر ہوش میں نہیں ہوتے۔ پچھلے دنوں مسز دارج کے بارے میں یہ خبر آئی تھی کہ وہ اپنے گھر کے ''ڈور اسٹیپس'' پر پھسل گئی تھیں، غلط تھی، ان کی اس چوٹ کی وجہ بھی کچھ اور تھی......''

مجھ سے یہ ساری خبر نہیں پڑھی گئی اور میں نے اخبار رول کر کے ایک طرف پھینک دیا۔

وہ تکلیف دہ...... آتشیں راتوں میں سے ایک اور رات تھی۔

○......❖......○

دوسرے روز میں پھر مولانا حبیب اللہ کی تیمارداری کے لیے پہنچا۔ ہم نے رینٹ اے کار سے ایک سفید رنگ کی ہنڈا اسٹی حاصل کر لی تھی اور اس پر آمد و رفت کر رہے تھے۔ میں اسی پر مولانا کی رہائش گاہ پر آیا۔ وہ مجھ پر خصوصی نوازش کرتے تھے اور مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑتا تھا۔ اس روز ہلکی بوندا باندی کی وجہ سے ویسے بھی رش نہیں تھا۔ آٹھ بجے کے لگ بھگ رضوان مجھے لے کر اندر چلا گیا۔

ڈاکٹر ابھی ابھی مولانا کو دیکھ کر گیا تھا۔ وہ قدرے بہتر نظر آ رہے تھے۔ تسبیح ان کے دائیں ہاتھ میں گردش کر رہی تھی۔ وہ خوش دلی کے ساتھ مجھ سے ملے اور بیٹھنے کے لیے کہا۔

انہوں نے میرے لیے قہوہ منگوایا اور رضوان کے حوالے سے ایک بار میرا شکریہ ادا کیا۔ میں نے کہا۔ ''مولانا! آپ کیوں شرمندہ کر رہے ہیں۔ میں تو خود کو ملامت کرتا ہوں کہ جس وقت آپ کو میری ضرورت تھی، میں آپ کے ارد گرد موجود کیوں نہیں تھا، کتنا اچھا ہوتا کہ آپ کا دفاع کرتے ہوئے جو شخص جان سے گیا ہے، وہ میں ہوتا...... یا کم از کم میں ان میں شامل ہوتا جو اس موقع پر زخمی ہوئے ہیں۔''

مولانا نے مجھے منع کیا کہ اپنے لیے اور دوسروں کے لیے خدا سے خیر مانگنی چاہیے، اس طرح کی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔

دو چار ملاقاتی اور بھی باہر بیٹھے تھے۔ مولانا نے رضوان سے کہا کہ ان کا شکریہ ادا کر

کے ان سے معذرت کر لی جائے۔ وہ کل کسی وقت آ جائیں۔

مولانا نے مجھ سے کہا کہ میں اب کھانا کھا کر ہی جاؤں۔ وہ مجھ سے میرے حالات پوچھنے لگے کہ میں پچھلے چند ماہ کہاں رہا ہوں......

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی ایک مسلح گارڈ اجازت لے کر اندر آیا۔ (یہ گارڈز مولانا کے عقیدت مندوں نے ہی یہاں متعین کر رکھے تھے) گارڈ نے جھک کر مولانا کے کان میں کچھ کہا اور اپنا سیل فون مولانا کے کان سے لگایا۔ مولانا نے دوسری طرف سے آنے والی آواز سنی اور مجھے ان کے چہرے پر تغیر کے آثار نظر آئے۔ ''ٹھیک ہے۔'' انہوں نے کہا۔ گارڈ نے فون مولانا کے کان سے ہٹا لیا اور سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔

مولانا چند سیکنڈ تک تذبذب میں رہے، پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولے۔ ''بیٹا وقاص! ایک ضروری مہمان آئے ہیں۔ اگر تم مناسب سمجھو تو ذرا دیر کے لیے ساتھ والے کمرے میں چلے جاؤ، ابھی قہوہ آتا ہے وہ پیو...... پھر ہم کھانا کھاتے ہیں۔''

''نہیں جناب! آپ تکلف کر رہے ہیں۔ میں ابھی چلا جاتا ہوں، کل پھر حاضر ہو جاؤں گا، آپ اطمینان سے......''

''نہیں، نہیں...... ایسے نہیں، تم سے کچھ باتیں بھی کرنی ہیں۔''

انہوں نے رضوان سے کہا، وہ مجھے ساتھ لے کر اندرونی دروازے میں داخل ہوا اور ایک قریبی کمرے میں لے آیا۔ یہاں قالین پر گاؤ تکیے رکھے تھے۔ الماریوں میں دینی کتب نظر آ رہی تھیں۔ میں بیٹھ گیا۔ چند منٹ بعد رضوان خوشبودار قہوہ اور مصری کی ڈلیاں لے آیا۔ میں نے پوچھا۔ ''کون آیا ہے؟''

وہ بولا۔ ''کوئی پردہ دار عورت ہے، برقع میں ہے۔ ویسے نوجوان ہی لگتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مولانا کی کوئی عزیزہ ہو یا پھر عقیدت مند۔''

''عزیزہ ہوتی تو پھر زنانے میں چلی جاتی۔'' میں نے کہا۔

رضوان باہر چلا گیا اور میں قہوہ کی چسکیاں لینے لگا۔ یہ عربی طرز کا ذرا کڑوا لیکن خوشبودار قہوہ تھا۔ مولانا کے کمرے کی طرف سے باتوں کی مدھم بھنبھناہٹ سی سنائی دیتی تھی۔ اچانک میرے دماغ میں روشنی کا ایک تیز جھماکا سا ہوا۔ نہ جانے کیوں مجھے لگا کہ اس وقت جو مولانا کے کمرے میں موجود ہے، وہ کوئی خاص الخاص مہمان ہے۔

میرے پورے بدن میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ یہ تھی تو غیر مناسب اور معیوب بات لیکن میرا تجسس اتنا زیادہ تھا کہ میں اٹھنے پر مجبور ہو گیا۔ قالین پر ننگے پاؤں چلتا میں ساتھ

والے کمرے سے گزرا اور پھر اس دروازے کے عین سامنے پہنچ گیا جو مولانا کے اس کمرے میں کھلتا تھا۔ دائیں بائیں کوئی موجود نہیں تھا۔ میں نے دروازے سے کان لگائے۔ میرا دل پناہ شدت سے دھڑکنے لگا۔ وہ آواز میرے کانوں میں پہنچی جس کو میں ہزاروں میں پہچان سکتا تھا۔ ایک زمانہ گزر چکا تھا کہ اس آواز کے ساتھ میرے دل کی دھڑکنیں بندھی ہوئی تھیں، یہ تاجور تھی۔

وہ دکھی آواز میں کہہ رہی تھی۔ ''میں نے کہا ہے ناں ماموں جان! میں خود کو یہاں آنے سے روک نہیں سکی۔ میں آپ کو دیکھنا چاہتی تھی۔ آپ کا حال پوچھنا چاہتی تھی۔ میرے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہ تھا۔''

''مگر یہ غلط ہے تاجور، اگر دارج کو پتا چل جائے تو کتنا برا ہو۔''

''انہیں پتا نہیں چلے گا ماموں جان! وہ بہت مصروف ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کے دوست کی شادی ہے۔ وہ رات گئے تک یاروں دوستوں میں گھرے رہیں گے۔ اپنے طریقے سے تفریح وغیرہ کرتے رہیں گے۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے تاجور کے لہجے میں ہلکی سی اداسی محسوس ہوئی۔ غالباً تفریح سے اس کی مراد وہی پینے پلانے کا شغل تھا۔

مولانا حبیب کی آواز میرے کانوں تک پہنچی وہ ذرا حیرت سے بولے۔ ''لیکن تم تو کہہ رہی تھیں کہ وہ بستر پر ہوتا ہے یا وہیل چیئر پر؟''

''ہاں جی، یہاں بھی وہیل چیئر پر ہی ہیں مگر دوستوں میں گھر کر ان کا موڈ بدل جاتا ہے۔''

''تمہاری ساس بھی ساتھ آئی ہیں؟''

''نہیں وہ ابھی اسلام آباد میں ہی ہیں۔ کل برات سے پہلے پہنچیں گی۔''

کمرے میں کچھ دیر خاموشی رہی پھر مولانا کی ذرا بھرائی ہوئی آواز ابھری۔ ''جو ہونا تھا، وہ ہو گیا بیٹی، لیکن اب جو کچھ بھی ہے وہ تمہارا شوہر ہے۔ تمہارا گھر بن گیا ہے اب اس گھر کو ٹوٹنے سے بچانے کی زیادہ ذمے داری بھی تم پر ہی آتی ہے میں جانتا ہوں تم ہمارے خاندان کی سمجھ دار ترین بچی ہو، تم آہستہ آہستہ ان حالات کو اپنے حق میں کر سکتی ہو۔ پانی کا قطرہ پتھر پر گرتا رہے تو اس میں سوراخ کر دیتا ہے، انسانی رویہ تو پانی کے قطرے سے کہیں زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔''

''مم...... میں پوری کوشش کر رہی ہوں ماموں جان...... لیکن...... کچھ لوگ شاید پتھر سے بھی زیادہ سخت ہوتے ہیں۔ کسی وقت تو شاید......'' وہ بولتے بولتے چپ ہو گئی، شاید اس

کا گلا رندھ گیا تھا۔

پچ پچ کی آواز آئی۔ مولانا اسے پچکار رہے تھے اور تسلی دے رہے تھے پھر تاجور کی اشکبار آواز ابھری۔ ''میں بہت کمزور ہوں ماموں! میرے لیے بہت زیادہ دعا کریں...... بہت زیادہ۔''

''سب ٹھیک ہو جائے گا میری بچی...... بس تم گھبرانا نہیں۔ بندہ جب خدا کی مرضی کو اپنی مرضی سمجھ لیتا ہے تو پھر اس کو سکون کی دولت عطا ہوتی ہے...... اور وہ اپنے حالات کو سدھارنے کے لیے جو کوششیں کرتا ہے، وہ کامیاب ہوتی ہیں۔''

''وہ...... میرا خیال تو رکھتے ہیں مگر غصے میں کچھ بھی ان کے بس میں نہیں رہتا۔ روز بروز چڑچڑے بھی ہوتے جا رہے ہیں۔''

''چڑچڑے پن کی ایک وجہ شاید اس کی بیماری بھی ہے۔''

''لیکن ماموں جان! وہ اپنی بیماری کی وجہ بھی مجھ کو ہی سمجھتے ہیں۔'' تاجور کی روہانسی آواز ابھری۔ ''ان کا خیال ہے کہ میں اور ان کی بیماری ایک ساتھ ان کی زندگی میں آئے ہیں۔''

اچانک میں بری طرح چونکا۔ مجھے اپنے قریب ہی قدموں کی آہٹ سنائی دی تھی۔ میں نے خود کو دروازے سے پیچھے ہٹایا اور مڑ کر دیکھا۔ آنے والا مجھے دیکھ چکا تھا لیکن وہ کوئی اور نہیں رضوان تھا۔

میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کی ہدایت کی۔ وہ الٹے قدموں واپس چلا گیا۔ میں نے ایک بار پھر دروازے سے کان لگایا۔ تاجور اب بھرائی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی۔ ''دیکھیں ماموں! میں بھی کتنی بے وقوف ہوں۔ آپ کا حال پوچھنے آئی ہوں اور اپنی باتیں لے کر بیٹھ گئی ہوں۔ یقین کریں ماموں! جس دن مجھے آپ کے زخمی ہونے کی خبر ملی، مجھے ایسے لگا کہ مجھے کچھ ہو جائے گا۔ سارا دن روتی رہی، کوئی دکھ بانٹنے والا بھی تو نہیں تھا۔ نہ ہی یہ پتا چل رہا تھا کہ آپ کی حالت اب کیسی ہے۔ پھر میری منت سماجت پر دارج نے یہاں لاہور فون کیا اور پتا چلا کہ آپ ہوش میں آ گئے ہیں۔''

''اللہ نے بڑا کرم کیا ہے...... اور اللہ آئندہ بھی کرے گا۔ وہ اپنے بندوں کے امتحان ضرور لیتا ہے مگر ان امتحانوں میں بھی انہیں تنہا نہیں چھوڑتا۔''

تاجور نے دکھی آواز میں کہا۔ ''ماموں جان! آپ کچھ دنوں کے لیے کہیں چلے کیوں نہیں جاتے۔ مجھے لگتا ہے کہ آپ لاہور میں رہیں گے تو آپ کو...... کوئی نہ کوئی پریشانی ہوتی

رہے گی......''

ماموں بھانجی میں باتیں جاری تھیں۔ پتا نہیں کیوں میں تاجور کو دیکھنا چاہتا تھا، میں نے کی ہول میں جھانکنے کی کوشش کی، کھڑکی کی طرف بھی گیا لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ آوازوں سے پتا چلتا تھا کہ ماموں کی مزاج پُرسی کے بعد تاجور اب جانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ مولانا حبیب اس سے پوچھ رہے تھے۔''آئی کس طرح ہو؟''

''ٹیکسی کار پر...... وہ باہر ہی کھڑی ہے۔ اسی پر واپس چلی جاؤں گی۔''

''لیکن...... مجھے یہ سب کچھ مناسب نہیں لگا تاجور...... آئندہ تم ایسا نہیں کرنا، ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے ماموں جان۔ بس ایک دفعہ کی معافی دے دیں۔''

وہ اب جس طرح باتیں کر رہی تھی، اندازہ ہو رہا تھا کہ دو چار منٹ میں یہاں سے نکل جائے گی۔ میرے سینے میں ایک لہر سی پیدا ہوئی۔ میں تیزی سے اٹھا اور رضوان کو لے کر باہر سڑک پر آ گیا۔ اسٹریٹ لائٹ کی تیز روشنی میں مجھے سامنے ہی ٹیکسی کے طور پر چلنے والی ٹویوٹا گاڑی نظر آ گئی۔ نشست پر ڈرائیور بیٹھا تھا جس نے سرخ رنگ کی پی کیپ پہن رکھی تھی۔ میں نے جو کچھ سوچا تھا، وہ بس دو تین منٹ کے اندر ہی ہو گیا۔ رضوان، ڈرائیور کو اس سفید ہنڈا سٹی میں لے آیا تھا جس پر میں یہاں مولانا کے پاس پہنچا تھا۔ اب ڈرائیور بے ہوش تھا اور امید یہی تھی کہ وہ ایک گھنٹے سے پہلے اپنے حواس میں واپس نہیں آئے گا......اور اگر آ بھی جاتا تو رضوان ٹی اسے سنبھالنے کے لیے یہاں موجود تھا۔ ڈرائیور کی جیب سے گاڑی کی چابی وغیرہ نکالنے کے بعد اور اس کی دھاری دار قمیص اتارنے کے بعد، رضوان نے اسے پچھلی نشست پر نیم دراز کر کے اس پر گاڑی کا غلاف ڈال دیا تھا۔ ڈرائیور کی گردن پر زوردار چوٹ لگا کر اسے بے ہوش کرنا مجھے اچھا تو نہیں لگا تھا مگر مجبوری تھی۔ اس کی اس چوٹ اور اس کے وقت کے زیاں کا ازالہ اس کی توقع سے کہیں بڑھ کر کیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ اس شخص کی وجہ سے مجھے جو موقع ملا تھا وہ بہت قدر و قیمت رکھتا تھا۔

ڈرائیور کی دھاری دار شرٹ میں نے اپنی شرٹ کے اوپر سے ہی پہن لی۔ اس کی ٹوپی سر پر رکھ کر میں ٹیکسی کار کی ڈرائیونگ نشست پر بیٹھ گیا۔ اپنا زاویہ ایسا رکھا کہ اسٹریٹ لائٹ کی روشنی براہِ راست چہرے پر نہ پڑے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ سیاہ برقع میں لپٹی لپٹائی مولانا کی رہائش گاہ سے نکلی۔ نقاب میں سے بس اس کی آنکھیں ہی دکھائی دیتی تھیں۔ وہ تیزی سے دروازہ کھول کر ٹیکسی کار کی پچھلی نشست پر آ بیٹھی اور بولی۔''چلو ڈرائیور۔''

میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور روانہ ہو گیا۔ اب رات کے قریباً ساڑھے نو کا وقت تھا۔ لاہور کی سڑکوں پر رش تھا۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ مجھے کس طرف جانا ہے، بس اندازے سے ہی گلبرگ کی سمت جا رہا تھا۔ گاڑی نہر کے کنارے دوڑ رہی تھی، ہاں وہی جگہ جہاں ہم پہلے پہلے ملے تھے۔ وہی خاموشی سے بہتا پانی، وہی پاپولر کے دراز درخت وہی مدھر ہوا...... لیکن اس نہر کے پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا تھا۔ نہ وہ تاجور رہی تھی...... نہ وہ میں رہا تھا۔

میں نے گاڑی ایک ہوٹل کی پارکنگ میں روکی تو وہ بری طرح چونک گئی۔ ''یہاں کیوں رکے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے اس کی طرف رخ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''یہ میں ہوں تاجور...... لیکن گھبرانا نہیں میں صرف دو منٹ بات کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ جیسے سکتہ زدہ سی اپنی جگہ بیٹھی رہ گئی۔ بالکل صمٌ بکمٌ...... چند لمحے کے لیے تو مجھے ایسا لگا کہ وہ ابھی دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھے گی اور اسے کھول کر گاڑی سے نکل جائے گی۔ مڑ کر میری طرف دیکھے گی بھی نہیں، لیکن پھر شاید اس نے خود کو سنبھالا تھا اور اس عمل سے باز رہی تھی۔ (ویسے میں نے احتیاطاً پچھلے دروازوں کے چائلڈ لاک لگا دیئے تھے)

میں نے ٹھہری آواز میں کہا۔ ''تاجور! میں اپنی حد اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں تمہارے وقت میں سے چند منٹ سے زیادہ نہیں لوں گا پھر تمہیں چھوڑ آؤں گا جہاں تم چاہتی ہو۔''

خاموشی کے ایک وقفے کے بعد وہ کپکپاتی آواز میں بولی۔ ''اس گاڑی...... کا ڈرائیور کہاں ہے؟''

''وہ بالکل خیریت سے ہے، تمہیں تمہاری منزل پر چھوڑ آؤں گا تو گاڑی اس کو واپس مل جائے گی اور پورا کرایہ بھی۔ تم اس بارے میں فکر نہ کرو۔''

''ایسا کیوں کیا آپ نے؟'' تاجور کی آواز میں دکھ، غصہ، حیرت، مایوسی، سب ہی کچھ شامل تھا۔

''تم سے صرف یہ پوچھنے کے لیے...... کہ مجھے کس غلطی کی اتنی بڑی سزا دی ہے تم نے؟''

یہ فقرہ بالکل بے ساختہ ہی میری زبان سے نکلا تھا اور اس میں اتنا درد شامل ہو گیا تھا کہ خود مجھے بھی تعجب ہوا۔

اس نے نقاب کے اوپر سے میری طرف دیکھا اور پھر پلکیں جھکا کر بولی۔ ''ان باتوں

سے اب کوئی فائدہ نہیں شاہ زیب...... میں نے پہلے بھی آپ سے معافی مانگی تھی، اب پھر مانگتی ہوں۔ میرے بس میں کچھ نہیں رہا تھا۔''

''تمہیں وہ ''خط'' مل گیا تھا جو میں نے فردوس کے ذریعے بھیجا تھا؟''

وہ ایک گمبھیر توقف کے بعد بولی۔ ''ہاں...... لیکن...... تب......'' وہ کہتے کہتے خاموش ہوگئی۔ شاید کہنا چاہتی تھی کہ تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔

''تاجور! تم نے سیف کے بارے میں میری صفائی تسلیم کی یا نہیں؟'' میرے سوال کے جواب میں وہ چپ رہی۔ میں نے ٹوٹے لہجے میں کہا۔ ''تاجور! اگر میری صفائی نہیں مانو گی تو میں زندگی کی آخری سانس تک خود کو لعنت ملامت کرتا رہوں گا۔ تمہاری جدائی کے بعد یہ دوسری بڑی تکلیف ہوگی جو مجھے ملے گی۔''

اس کی بھرائی ہوئی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ''انیق نے ایسا جھوٹ کیوں بولا۔ وہ ایسا نہیں تھا۔ کبھی بھی نہیں تھا۔''

''تاجور! اس نے صرف یہ ایک جھوٹ ہی نہیں بولا ہے، اس نے اور بھی بہت کچھ ایسا کیا ہے جس کی توقع ہم ہرگز نہیں کر سکتے تھے۔ وہ بہت بدل گیا ہے۔ میں تمہیں کیا کیا بتاؤں تاجور۔''

کچھ دیر کار میں مہیب سناٹا طاری رہا۔ پھر وہ عجیب لہجے میں گویا ہوئی۔ ''شاہ زیب! میں ایک بار پھر ہاتھ جوڑ کر آپ سے معافی مانگتی ہوں۔ اس کے علاوہ آپ سے ایک منت بھی کرنی ہے۔ اب ہم...... ایک دوسرے سے بہت دور ہی رہیں تو ہمارے لیے اچھا ہے...... پلیز میری یہ بات مان لیں۔ لوگ مر بھی تو جاتے ہیں۔ آپ سمجھ لیں کہ میں اب نہیں ہوں۔'' اس کا گلا رندھ گیا۔

اس نے نقاب ذرا سا نیچے کھسکایا اور چھوٹی انگلی سے اپنی آنکھوں کے نچلے کنارے صاف کیے۔ میری نگاہ اس کے چہرے پر پڑی۔ ایک ایسے چاند کا منظر تھا جس کا نصف حصہ بدلی میں چھپا ہوا تھا۔ خوب صورت چہرے تو بہت سے ہوتے ہیں لیکن...... کوئی ایسی بات تھی...... ہاں کوئی ایسی بات تھی اس کے نقوش میں جو طلسماتی اثر رکھتی تھی اور اسے سب سے جدا کرتی تھی۔ میں نے جلدی سے نگاہیں پھیر لیں۔ اس نے اپنی طلائی رسٹ واچ کی طرف دیکھا اور بے چینی سے پہلو بدلا...... باہر ہونے والی بوندا باندی اب رک چکی تھی۔

میں نے کہا۔ ''تاجور! کسی وقت مجھے شک ہوتا ہے کہ جو لوگ مولانا کو نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں، ان کی ڈوریاں پیچھے کہیں داراب فیملی کے ہاتھ میں ہیں۔''

وہ جیسے کانپ گئی۔ ''نہیں، ایسا مت سوچیں شاہ زیب! اور..... دارج کے بارے میں تو بالکل بھی نہیں۔ وہ دل کے بہت اچھے ہیں۔ تھوڑے سے سخت لگتے ہیں مگر اندر سے اتنے ہی نرم ہیں۔ بہت ہمدرد..... بہت خیال رکھنے والے۔''

''تمہارا بھی خیال رکھتے ہیں؟'' میں نے دفعتاً پوچھا۔

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا، پھر پلکیں گرا کر بولی۔ ''بہت زیادہ..... مم..... میں تھوڑی دیر کے لیے بھی کہیں چلی جاؤں تو بہت پریشان ہو جاتے ہیں..... اب بھی بڑی مشکل سے ان سے اجازت لے کر آئی ہوں۔''

''وہ خود کیوں نہیں آیا تمہارے ساتھ؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''اللہ ان کو صحت دے۔ فی الوقت تو وہیل چیئر پر ہیں۔ آنا جانا ان کے لیے مشکل ہے۔'' اس نے بات گول کی۔ اس کے لہجے سے یوں ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ دل و جان سے شوہر پر فدا ہے۔

حقیقت میں نے قریباً ایک گھنٹہ پہلے جان لی تھی اور اس سے پہلے بھی میں کافی کچھ جان چکا تھا۔ وہ دارج کے ساتھ جتنی خوش تھی وہ میرے لیے راز نہیں رہا تھا۔

اچانک اس کے سیل فون پر کال کے سگنل آئے۔ اس نے اپنے بیش قیمت شولڈر بیگ میں سے آئی فون نکالا اور اسکرین چیک کی۔ اس نے کال تو ریسیو نہیں کی لیکن ایک دم بے قرار نظر آئی۔ کال کا میوزک ختم ہوا تو وہ بولی۔ ''وہ کال کر رہے ہیں، مجھے جلد جانا ہوگا، ان کی دوا کا وقت بھی ہو رہا ہے۔''

اس کے لہجے کے نیچے چھپی ہوئی تشویش اور بے قراری مجھے صاف محسوس ہو رہی تھی اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتی، میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور اس کی بتائی ہوئی سمت میں چل پڑا۔ کار میں ایک گمبھیر اور دلدوز خاموشی طاری ہوگئی۔ وہی کیفیت جب الفاظ تو بے شمار ہوتے ہیں لیکن زبان گنگ ہو کر رہ جاتی ہے۔

ڈرائیونگ کرتے ہوئے میں نے ایک بار پھر تاجور سے کہا کہ مجھے دارابیوں کی طرف سے اندیشہ ہے۔ وہ مولانا کو نقصان پہنچانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔

میں نے تاجور سے کہا کہ مجھے اس سے جو کچھ کہنا تھا وہ کہہ چکا ہوں۔ اب میں اور کچھ نہیں کہوں گا۔ وہ یہ سمجھ لے کہ میں نے آج سے اپنے ہونٹ سی لیے ہیں لیکن اگر کبھی کسی بھی حوالے سے اسے میری مدد کی ضرورت پڑے تو وہ مجھے آواز دے سکتی ہے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ میں مولانا حبیب صاحب کے حوالے سے خاموش تماشائی بنا نہیں رہ سکتا۔ میں فی الحال

ان کے آس پاس موجود رہوں گا۔ وہ خاموشی سے سنتی رہی۔ اس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ وہ کسی اور کیفیت میں تھی۔ میں نے گردن کو ذرا لمبا کر کے عقب نما آئینے میں دیکھا۔ مجھے لگا کہ نقاب کے نیچے وہ اپنے ہونٹوں کو مسلسل حرکت دے رہی ہے۔ وہ خوف کی حالت میں تھی اور یقیناً کچھ پڑھ رہی تھی۔

یہ خوف دارج کے علاوہ کس کا ہوسکتا تھا۔ میرا دل چاہا کہ وہ میرے سامنے ہو۔ میں اس کا گریبان پکڑلوں اور اس وقت تک نہ چھوڑوں جب تک اس کا سارا غرور، ساری سفاکی اور بیدردی اس کے ناک منہ اور جسم کے دیگر راستوں سے بہہ نہ جائے۔

تاجور کی ہدایت کے مطابق میں نے اسے ڈیفنس کے ایک نہایت پوش علاقے کے اندرونی چوراہے پر اتار دیا۔ یہاں چاروں طرف چار چار کنال کی شاندار کوٹھیاں نظر آتی تھیں ...... اترنے سے پہلے اس نے فقط اتنا کہا۔ ''چاچا بشیر اور چاچی شفقت کے بچے اب بالکل بے آسرا ہیں۔ ہوسکے تو ان کا خیال رکھیے گا۔'' (وہ سیف کی بہنوں کا ذکر کررہی تھی)

پھر وہ مجھے ''اللہ حافظ'' کہہ کر چلی گئی۔ خاموشی کے ساتھ ...... بغیر کوئی الوداعی کلمہ کہے، بغیر مڑ کر دیکھے ہوئے ...... ایسے کسی کو خاموشی کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھنا کتنا جاں گسل ہوتا ہے۔ خاص طور سے اس وقت، جب جانے والا آپ کی زندگی کا حاصل ہو۔

میرا دل چاہا کہ میں ٹیکسی کار آگے بڑھا کر اس شادی والے گھر کے سامنے چلا جاؤں جہاں دارج ٹھہرا ہوا تھا۔ شاید ابھی کچھ دیر میں سہمی ہوئی تاجور کو میری مدد کی ضرورت پڑ جائے۔ لیکن پھر مجھے خود ہی اپنا یہ خیال بیکار اور بچکانا لگا۔ مدد تو اس کی ہوسکتی ہے جس کو مدد درکار ہو۔ میں نے ایک گہری سانس بھر کر یوٹرن لیا اور واپس مولانا کی رہائش گاہ کی طرف رخ کرلیا۔ میں جانتا تھا کہ ڈرائیور ہوش میں آچکا ہوگا یا آنے والا ہوگا۔ ہوش میں آنے کے بعد اسے گاڑی کے اندر سنبھالنے میں رضوان کو کافی دشواری پیش آسکتی تھی۔ مولانا کی تشویش بھی یقینی تھی کہ میں انہیں بتائے بغیر ہی وہاں سے نکل آیا تھا۔

○......❖......○

مجھے انیق اور سجاول کی طرف سے بہت زیادہ فکر لاحق تھی۔ آخری اطلاعات کے مطابق سجاول کو انیق کا کوئی سراغ ملا تھا اور وہ اس کے پیچھے ٹل سے آگے قبائلی علاقے کی طرف گیا تھا۔ میں مسلسل سجاول سے رابطے کی کوشش کررہا تھا مگر ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہورہا تھا۔ یونس پمپ والا کی کوششیں بھی ناکام تھیں۔ ذہن میں وسوسے سر اٹھا رہے تھے۔ انیق ایک نہایت عیار اور موقع شناس شخص کا نام تھا۔ ایک طرح سے اس کی تیزی طراری اور پھرتی

کا مقابلہ سجاول کے تجربے، بے خوفی اور طاقت سے تھا۔ کسی کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ انیق اپنا پرانا فون نمبر ترک کر چکا تھا۔ اس کے نئے رابطے کے بارے میں مجھے کچھ علم نہیں تھا۔ آجا کے اب داؤد بھاؤ ہی رہ جاتا تھا جو انیق کے موجودہ رویے اور حالات کے بارے میں کچھ بتا سکتا تھا۔

تیسرے روز کی بات ہے، میں نے فخر سے کہا۔ ''یار! مجھے لگتا ہے کہ ہمیں داؤد بھاؤ سے ملنا چاہیے۔''

''تو مل لو۔'' وہ بولا۔

''لیکن اس کے لیے تو میں ''وفات'' پا چکا ہوں، اب یہ کام تم کو کرنا ہوگا۔''

''وہ کس طرح؟''

''میرے قریبی دوست کی حیثیت سے اس سے ملو۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں کسی موقع پر اس سے تمہارا غائبانہ تعارف بھی کرا چکا ہوں۔ وہ تمہیں پہچان لے گا۔ تھوڑی دیر تک میری ''موت'' کے حوالے سے دکھ درد کا اظہار کرے گا، تم بھی کرنا۔ پھر اس سے انیق کے بارے میں سن گن لینا...... کہ وہ کہاں ہے اور کیا کرتا پھر رہا ہے؟''

''میں داؤد بھاؤ کو کیا بتاؤں گا کہ اس تک کیسے پہنچا ہوں...... اور کیا پتا کہ وہ اپنی سکیورٹی کے پیشِ نظر مجھ سے ملنے سے ہی انکار کر فرما دے۔''

''میں اپنے ہاتھ سے تمہیں اس کا ایڈریس اور فون نمبر لکھ کر دے دیتا ہوں اور اس پر کوئی ایسی تاریخ ڈال دیتا ہوں جب میں ''زندہ'' تھا۔ وہ میری تحریر اچھی طرح پہچانتا ہے۔''

میں نے اس سلسلے میں فخر کو کچھ ضروری ہدایات دیں اور اسے داؤد بھاؤ کی طرف روانہ کر دیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں نے لاہور کی ایک معروف سکیورٹی ایجنسی سے رابطہ کیا...... اور اس ایجنسی سے دو ایسے چوکس گارڈز حاصل کیے جو سادہ کپڑوں میں مولانا حبیب کے آس پاس رہ کر ان کی حفاظتی نگرانی کر سکتے تھے۔

فخر اپنے کام پر لگ چکا تھا۔ داؤد بھاؤ سے اس کی ملاقات اسنوکر کلب والے ٹھکانے پر ہو چکی تھی۔ میں بے تابی سے اس کی ''رپورٹ'' کا انتظار کر رہا تھا۔ یہ ''رپورٹ'' مجھے دوسرے روز شام کے بعد مل گئی۔ فخر ہوٹل پہنچا۔ اس نے سب سے پہلے تو داؤد بھاؤ کا قصیدہ بیان کیا بولا۔ ''یار شاہ زیب! کبھی کبھی تم بڑے سفاک ہو جاتے ہو۔ داؤد بھاؤ جیسا دبنگ دوست تمہیں لاہور شہر کے بیچوں بیچ ملا ہوا ہے اور بجائے اس کے کہ تم اس سے فائدہ اٹھاتے...... اس کے لیے مرحوم بن گئے ہو۔ وہ تمہارے لیے بہت دکھی تھا۔''

''اس کے دکھ کا شکریہ...... مگر ابھی تو مجھے وہی کرنا ہے جو میرے لیے بہتر ہے۔ اسے میرے ''مرحوم'' ہونے کے حوالے سے کسی طرح کا شک تو نہیں ہے؟''

''شک تو شاید کئی ایک کو ہے مگر تمہاری ''موت'' کا ڈراما کافی تگڑا تھا۔ اس میں شبے کی گنجائش کم کم ہی ہے۔''

''کیا کہتا ہے داؤد بھاؤ؟''

''وہ دکھی اور پریشان نظر آتا تھا۔ ایک وجہ تو یقیناً تمہاری والی ہے۔ دوسری وجہ اس کے ایک اور قریبی ساتھی مختار جھارا کی موت ہے...... اور تیسری وجہ انیق ہے۔ وہ بھی انیق کے حوالے سے بہت زیادہ مایوس اور کافی حد تک غصے میں ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اسے زمانے کی ہوا کچھ زیادہ ہی لگ گئی ہے۔ اسے شک ہے کہ ایک بڑے جرائم پیشہ گروہ سے اس کا تعلق بن گیا ہے لیکن وہ بڑے ''مردمار'' قسم کے لوگ ہیں۔ بندے کو ٹشو پیپر کی طرح استعمال کر کے پھینک دیتے ہیں۔''

''تم نے انیق اور سجاول کی لڑائی کا ذکر بھی کیا؟''

''بالکل کیا، لیکن داؤد بھی اس کی اصل وجہ بتانے سے قاصر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ گوجرانوالا کے واقعے کے بعد اس خبیث (انیق) سے اس کا کوئی رابطہ ہی نہیں ہو سکا ہے۔ وہ بالکل ایک باغی جیسا کردار ادا کر رہا ہے۔ بہت غلط لوگوں کے ہتھے چڑھا ہوا ہے۔ نقصان اٹھائے گا۔ انیق کی بات کرتے ہوئے داؤد بھاؤ کا چہرہ تمتما جاتا تھا۔ وہ نیٹ وہسکی بھی غٹاغٹ چڑھا رہا تھا۔''

''داؤد کی پریشانی اور مایوسی کی ایک وجہ اس کی محبوبہ بھی ہو سکتی ہے۔ اس کی ''روبی نام کی یہ رکھیل'' گوجرانوالہ والے واقعے میں ماری گئی تھی۔'' میں نے فخر کو بتایا۔

''ہاں اس نے تھوڑا سا ذکر اس لڑکی کا بھی کیا تھا۔ اسے بھی معلوم ہے کہ اس لڑکی اور مختار جھارا کے علاوہ ''تمہارے'' قاتل بھی ایک ہی ہیں...... یعنی ٹیکساری گینگ والے۔ میں نے اسے گینگ کے حوالے سے اچھی خبر سنا کر تھوڑا سا مطمئن کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''میں نے اسے بتایا ہے کہ ایک پرانے گینگسٹر کے رہا ہونے کی وجہ سے ٹیکساری گینگ دو بلکہ تین گروہوں میں بٹ گیا ہے اور اب یہ لوگ بڑے خوفناک طریقے سے خود ہی ایک دوسرے کی بینڈ بجا رہے ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ داؤد بھاؤ سے ملاقات ہونے کے باوجود تمہارا یہ سارا ایڈونچر

ٹائیں ٹائیں فش رہا ہے۔ انیق کے سلسلے میں کوئی پیش رفت نہیں ہوسکی۔''
''تم کہہ سکتے ہو مگر ایک چھوٹی سی بات کا پتا چلا ہے۔ میں نے انیق کا بیک گراؤنڈ جاننے کی کوشش میں تھوڑا سا رستہ نکالا ہے۔ پتا چلا ہے کہ پیچھے سے وہ کراچی کا نہیں بلکہ رحیم یار خاں کے قریب ایک گوٹھ موراناں کا رہنے والا ہے۔''
''یہ کس نے بتایا؟''
''داؤد بھاؤ نے ہی۔ دراصل وہ بھی سخت پریشان ہے کہ انیق ہاتھ کیوں نہیں آرہا۔ اس کے بندوں نے پچھلے ڈیڑھ دو ماہ میں بھاگ دوڑ کی اور پتا چلا کہ انیق کی اصل بنیاد کراچی کی نہیں بلکہ رحیم یار خاں کی کسی گوٹھ موراناں کی ہے۔ یہ لوگ گوٹھ موراناں تک پہنچے مگر اس ساری کوشش کا نتیجہ ابھی تک تو صفر ہی ہے۔ گوٹھ موراناں تو مل گیا ہے وہاں انیق نام کے ایک کے بجائے دو بندے بھی مل گئے ہیں مگر ان میں اصلی انیق نہیں ہے۔''
''اس کا مطلب ہے کہ گوٹھ موراناں والا یہ کھوج غلط تھا۔''
''ابھی تک تو یہی لگ رہا ہے۔ ویسے میں نے داؤد بھاؤ کی باتوں سے اندازہ لگایا ہے کہ اس کے بندے اس گوٹھ موراناں کے آس پاس کے علاقے میں بھی انیق یا اس کے کسی رشتے دار کو ڈھونڈ رہے ہیں۔''
''تو کیوں ناں ہم بھی کوشش کریں......''
''ہاں...... وہ کیا شعر ہے کہ کیا ضروری ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب۔ آؤ ناں ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی۔'' فخر نے فٹ ادبی رنگ اختیار کیا۔
میں نے کہا۔ ''مگر میرا خیال ہے کہ اس کام کے لیے میں اکیلا ہی جاؤں تو ٹھیک ہے۔ تم داؤد بھاؤ اور اس کے آدمیوں کی نظر میں آچکے ہو۔ رحیم یار خاں کے اس علاقے میں گئے تو ان کے ''ریڈار'' پر آجاؤ گے۔''
''تو یہ بندۂ ناچیز یہاں بیٹھ کر ہیر پڑھے گا؟''
''ہیر پڑھ سکتے ہو اور چاہو تو شام کے وقت انارکلی اور لبرٹی وغیرہ میں ہیریں دیکھ بھی سکتے ہو، مگر......''
''پاکستان اور یورپ کا فرق ملحوظ خاطر رکھنا۔'' فخر نے جلدی سے میرا فقرہ مکمل کیا اور برا سا منہ بنا کر بولا۔ ''یہ نصیحت نامہ میں پہلے بھی کئی بار سن چکا ہوں مگر یہ بات تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ ''رسک'' لیے بغیر کچھ بھی حاصل وصول نہیں ہوتا۔ اگر ہوتا تو پھر تم بڑے بڑے رسک کیوں لیتے؟''

''کیا مطلب؟''

فخر نے ایک بار پھر اس بوسیدہ پیراشوٹ کا ذکر چھیڑ دیا جو والٹس وائے کے فرار کے وقت میں نے اپنے لیے منتخب کیا تھا۔ فخر کے نزدیک یہ میری بہت بڑی غلطی تھی۔ میں نے بمشکل اس ذکر سے پیچھا چھڑایا۔

○......❖......○

لاہور سے رحیم یار خاں تک کا سفر کافی طویل ہے۔ میں نے اس میں فضائی سفر کا سہارا لیا اور رحیم یار خاں پہنچ گیا۔ وہاں سے ایک پرائیویٹ مہران کار رینٹ پر لے کر گوٹھ موراناں تک پہنچنا کافی دشوار عمل ثابت ہوا مگر میں کسی نہ کسی طرح اس علاقے میں پہنچ گیا۔ ان علاقوں میں درجۂ حرارت بھی کچھ بڑھا ہوا تھا گرمی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے یہی ظاہر کیا کہ بہاولپور کا رہائشی ہوں اور فارم بنانے کے لیے یہاں کوئی مناسب زرعی رقبہ تلاش کر رہا ہوں۔

میں نے موراناں نامی اس بڑے گاؤں میں قریباً چوبیں گھنٹے گزارے۔ وہاں کے مکھیا، ہیڈ ماسٹر اور دو چار زمینداروں سے بھی ملاقات ہوئی۔ میں نے اپنا یہ شک بھی رفع کیا کہ کہیں یہ لوگ یہاں انیق کی موجودگی کو چھپانے کی کوشش تو نہیں کر رہے۔ یہاں رہنے والا ایک انیق، درمیانی عمر کا کریانہ فروش تھا۔ اس سے بھی گپ شپ رہی۔ زرعی رقبے اور اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں لیکن اصل مقصد یہی تھا کہ مجھے انیق کا کوئی کھوج کھرا ملے۔ انیق کے بارے میں جاننے کے لیے تجسس بڑھتا جا رہا تھا مگر اس تجسس کو انجام تک پہنچانے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔

عین ممکن تھا کہ موراناں نامی اس گوٹھ میں یا اس کے آس پاس داؤد بھاؤ کا کوئی کارندہ بھی موجود ہو مگر مجھے کوئی ایسی شکل نظر نہیں آئی۔

دوسرے روز سہ پہر کے وقت میں نے اس زمیندار سے اجازت لی جس نے مجھے اپنے ڈیرے پر مہمان ٹھہرایا ہوا تھا۔ میں سفید مہران کار پر سوار موراناں سے نکل رہا تھا جب ایک جگہ ایک چیز دیکھ کر ٹھٹکا۔ یہ کیکر کے درختوں اور جنتر کی جھاڑیوں کے درمیان لگا ہوا لوہے کا ایک پرانا سا بورڈ تھا جس پر موراناں لکھا ہوا تھا ..... مگر موراناں کے آگے بھی کچھ لکھا تھا، جو بورڈ کے زنگ آلود ہونے کی وجہ سے مٹ چکا تھا۔ میں نے گاڑی روک کر ذرا دھیان سے دیکھا..... یہ لفظ ''خاص'' تھا جو امتدادِ زمانہ سے مٹ چکا تھا۔ یعنی موراناں کا پورا نام ''موراناں خاص'' تھا۔

مجھے یہ نکتہ اہم محسوس ہوا۔ پاس سے ہی دو اونٹنیاں گزر رہی تھیں جن کے آگے آگے

سندھی طرز کی ٹوپی والا ایک ادھیڑ عمر شخص مہار پکڑے چل رہا تھا۔ میں نے اسے روکا اور علیک سلیک کے بعد پوچھا۔ ''بھائی صاحب! آپ کا یہ گاؤں موراناں ہے یا موراناں خاص؟''

وہ بولا۔ ''اس کو موراناں ہی کہتے ہیں، لیکن آپ کیوں پوچھ رہے ہو؟''

میں نے کہا۔ ''یہ دیکھیں اس پرانے بورڈ پر کسی نے موراناں کے بجائے موراناں خاص لکھا ہوا ہے۔ کہیں اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ کوئی اور موراناں بھی موجود ہے؟''

وہ اپنی نیم سفید مونچھوں کو سہلا کر بولا۔ ''اس کا تو پتا نہیں...... پر یہ بورڈ کئی سال پہلے وڈے پوسٹ ماسٹر صاحب نے لگوایا تھا۔ اب تو وہ بھی مرکھپ چکے ہیں۔''

میرے ذہن میں شک کا جو بیج بویا گیا تھا، وہ مجھے واپس گاؤں میں لے گیا، میں نے ایک رات مزید زمیندار کے ڈیرے پر گزاری، نئے پوسٹ ماسٹر اور چند دیگر افراد سے بھی ملا کہ کوئی اور گوٹھ بھی موجود ہوسکتی ہے۔ گئے وقت میں اگر پرانے پوسٹ ماسٹر صاحب نے ایسا بورڈ لگوایا تھا تو اس کے پیچھے کوئی وجہ تھی۔ عین ممکن تھا کہ ان کے علم میں کوئی ایسی بات آئی ہو مگر علاقے کے لوگوں نے اسے پذیرائی نہ دی ہو۔

اگلے روز میں نے فخر کو بھی رحیم یار خاں بلالیا۔ ہم نے ایک اور مہران کار رینٹ پر حاصل کر لی اور خاموشی سے تلاش میں لگ گئے۔

کہتے ہیں کہ ڈھونڈنے والے کو خدا بھی ملتا ہے۔ پانچ چھ روز کی مسلسل تگ ودو کے بعد ایک روز اچانک فخر کو انیق کا کھوج مل گیا۔ رحیم یار خان سے قریباً 60 کلومیٹر دور تحصیل صادق آباد کے علاقے میں ہمیں موراناں کلاں کے نام سے ایک اور بستی ملی۔ یہ بڑی خوش آئند کامیابی تھی۔

○......❖......○

میں نے اپنی گاڑی رحیم یار خاں میں ہی چھوڑ دی۔ بس اور تانگے کے طویل سفر کے ذریعے اس موراناں نامی گاؤں جا پہنچا۔ فخر اپنی گاڑی پر یہاں پہلے سے ہی موجود تھا۔ ہمارے پاس بہانہ وہی زرعی رقبے کی تلاش والا تھا اور یہ کافی کارگر بہانہ تھا۔ موراناں میں پہنچنے کے صرف ایک گھنٹے بعد ہی ہمیں پتا چل گیا کہ لاہور کے نامی گرامی گینگسٹر داؤد بھاؤ کے چہیتے دست راست انیق کا تعلق اسی گاؤں سے ہے۔ یہ بڑا سنسنی خیز انکشاف تھا۔ ایک طرح سے جو کام داؤد بھاؤ کے کارندے کوشش بسیار کے باوجود نہیں کر سکے تھے وہ ہم نے کر لیا تھا۔

مقامی پٹواری اشرف خاں اپنے پٹوار خانے میں چٹائی پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ ہم بھی ایسے ہی بیٹھے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''ہاں جی چنگا منڈا ہے۔ پہلے دو تین سال تو گوٹھ سے قریباً غائب ہی رہا ہے۔ اب جب سے پکی سڑک بنی ہے مہینے دو مہینے بعد گوٹھ کا چکر لگا لیتا ہے۔ سنا ہے پنجاب میں کسی کے ساتھ مل کر مرغی خانے کا کام کرتا ہے۔ اس کی پھوپی بھی بڑی چنگی زنانی ہے۔ اپنی اولاد کی طرح سمجھتی ہے اسے...... پر تم لوگ کیسے جانتے ہو انیقے کو؟''

''بس، لاہور میں ہی ایک دفعہ جان پہچان ہوئی تھی۔ اس نے گوٹھ کا نام بھی بتایا تھا۔ کہا تھا کہ اگر کبھی ادھر آنا ہو تو مجھ سے ضرور ملنا۔''

''پر اب تو مجھے لگتا ہے کہ پچھلے دو تین ہفتے سے وہ گوٹھ میں نہیں ہے، پھر بھی میں پتا کرا دیتا ہوں۔'' اس نے کسی بچے کو آواز دی۔ تیرہ چودہ سالہ بچہ اسکول کی نیلی شلوار قمیص میں دوڑتا ہوا آیا۔ پٹواری اشرف نے کہا۔ ''جا اوئے مزمل! انیقے کے گھر جا اور اس کی پھوپی سے پوچھ کہ وہ گوٹھ آیا ہوا ہے یا نہیں۔''

لڑکے نے اثبات میں سر ہلایا، مگر اس سے پہلے کہ وہ تیزی سے نکل جاتا، میں نے اسے روکا۔ میں نے اشرف خاں سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''چلو ہم بھی چلے جاتے ہیں، اس کا گھر بھی دیکھ لیں گے۔ باہر ہی کھڑے ہو کر اس کی پھوپو سے بات بھی کر لیں گے۔''

اس سے پہلے کہ اشرف خاں کوئی اور تجویز پیش کرتا، میں اور فخر چٹائی پر سے اٹھ کھڑے ہوئے، ہم لڑکے کے ساتھ موراناں کی گلیوں سے گزرے، کافی وسیع گاؤں تھا، ہائی اسکول، ڈاک خانہ اور مویشیوں کا اسپتال وغیرہ یہاں موجود تھا۔ زیادہ تر مکان اینٹوں کے بنے ہوئے تھے۔ ہم نیم پختہ گلیوں سے گزرتے ہوئے انیق کے گھر کی طرف جا رہے تھے، گزرے ڈیڑھ دو سال میں، میں نے کئی دفعہ انیق سے اس کے آبائی علاقے اور عزیزوں وغیرہ کے بارے میں پوچھا تھا۔ اس نے ہمیشہ گول مول بات ہی کی تھی اور صرف اتنا بتایا تھا کہ وہ کراچی کا رہنے والا ہے اور اس کے والدین فوت ہو چکے ہیں۔ آج ایک عرصے بعد مجھے پتا چلنے والا تھا کہ اس کی اصل کیا ہے۔ وہ شخص جو نوجوانی میں ہی ایک خطرناک گینگسٹر کا روپ دھار کر انڈر ورلڈ میں پہچان پیدا کر چکا ہے، حقیقت میں کیا ہے۔

دیہاتی لڑکے کی رہنمائی میں ہم بالآخر ایک پختہ مکان کے سامنے پہنچے۔ یہ دو منزلہ مکان اچھی حالت میں تھا۔ مکان کے ساتھ ہی تین چار دکانیں تھیں اور ان کے اوپر بھی رہائشی جگہ تھی۔ دروازے پر کوئی نیم پلیٹ وغیرہ نہیں تھی۔ لڑکے نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ لاٹھی کی ٹھک ٹھک سنائی دی اور اسی پچاسی سال کے ایک مدقوق سے باریش بزرگ نے دروازہ کھولا۔

''باباجی! یہ لوگ شہر سے ملنے آئے ہیں۔'' لڑکے نے بزرگ سے ہمارا مختصر تعارف کرایا اور اُڑن چھو ہو گیا۔

بزرگ نے مچی مچی آنکھوں سے بغور ہمیں دیکھا۔ اسی دوران میں اندر سے ایک نسوانی آواز ابھری۔ ''کون ہے تایا جی؟''

اس کے ساتھ ہی قدموں کی چاپ بھی سنائی دی۔ چند لمحے بعد قریباً پچاس سال عمر کی ایک چادر پوش خاتون دکھائی دی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہی انیق کی پھوپی ہے۔ ''جی بیٹا جی! کس سے ملنا ہے؟'' خاتون نے ہم دونوں کو سرتاپا دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے اپنا مختصر تعارف کرایا اور خاتون کو بتایا کہ ہم انیق سے ملنے آئے تھے۔ انیق کا نمبر مسلسل بند جا رہا ہے ورنہ اسے بتا دیتے۔

عورت نے ایک دو سوال پوچھے جن کا میں نے بڑا مناسب جواب دیا۔ عورت بااخلاق لگتی تھی۔ اسے یہ مناسب نہیں لگا کہ ہمیں یوں دروازے سے ہی لوٹا دے۔ اس نے ہمارے لیے بیٹھک کا دروازہ کھلوا دیا۔ ہم اندر چلے گئے۔ یہ بیٹھک دیہاتی انداز میں لیکن سلیقے سے سجائی گئی تھی۔ ایک طرف ایک بڑی سی فریم شدہ تصویر تھی۔ یہ یقیناً انیق کے والد مرحوم کی تھی۔ چند اور تصویریں بھی ایک کارنس پر آویزاں تھیں۔ ان میں سے ایک تصویر میں چودہ پندرہ سالہ انیق شاید بقرعید کے موقع پر ایک سجے سجائے دنبے کی رسّی پکڑے کھڑا تھا۔ ہمارے رسمی انکار کے باوجود انیق کی نیک صورت پھپو ہمارے لیے چائے پانی کا انتظام کرنے چلی گئیں۔ یہ دیہاتی مہمان نوازی کی ایک اچھی مثال تھی۔ عمر رسیدہ بزرگ ہمارے پاس ہی بیٹھے رہے اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ وہ انیق اور اس کی پھپو کے کوئی دور کے رشتے دار تھے اور ان کے ساتھ رہتے تھے۔

میری نگاہ بیٹھک کی ادھ کھلی کھڑکی سے گزر کر ایک طویل برآمدے میں گئی۔ یہاں بہت سی کرسیاں اور صوفے وغیرہ رکھے تھے۔ مجھے آٹھ دس خواتین بھی نظر آئیں۔ وہ سب کھاتے پیتے گھرانوں کی چودھرانیاں لگتی تھیں۔ کچھ نے چادریں لے رکھی تھیں اور کچھ یونہی بے تکلفی سے ننگے سر بیٹھی تھیں لیکن وہ سب کی سب مؤدب نظر آتی تھیں۔ ایک دو کے ہاتھ میں تسبیح بھی نظر آئی۔

بزرگ نے اٹھ کر ادھ کھلی کھڑکی بند کر دی اور وضاحت کرتے ہوئے بولے۔ ''یہ بی بی صاحبہ کی محفل ہے۔ ایک دن چھوڑ کر شام کے وقت ہوتی ہے۔''

''بی بی صاحبہ کون ہیں؟'' فخر نے پوچھا۔

بزرگ نے جو کچھ بتایا، اس سے پتا چلا کہ یہ انیق کی پھپو کی کوئی پرانی دوست ہیں۔ بہت ''اللہ والی'' ہیں۔ لوگوں کو ان سے بڑا فیض پہنچتا ہے۔ آج کل انیق کی پھپو سے ملنے یہاں آئی ہوئی ہیں۔

اسی دوران میں انیق کی پھپو بھی آگئیں۔ وہ چائے، بسکٹ اور نمکو وغیرہ لائی تھیں۔ کافی خوش گفتار بھی تھیں۔ کہنے لگیں۔ ''انیقے سے اپنے بچوں سے بڑھ کر پیار ہے مجھے۔ جب اس کے ماں باپ نہ رہے تو پھر مجھے لگا کہ میں ہی اس کی ماں ہوں۔ وہ بھی سگے پتروں کی طرح خیال رکھتا ہے میرا۔ اب تو خیر آتا جاتا رہتا ہے، پر جب مرغی خانے کا کام نیا نیا شروع کیا تھا، مہینوں تک اسے آنے کا ٹائم نہیں ملتا تھا، تب بھی ہماری پوری خبر رکھتا تھا اور کسی طرح کی کوئی کسر نہیں لگنے دیتا تھا۔''

''بالکل جی، بڑا پیار ہے اسے آپ لوگوں سے۔ ہم سے بھی اکثر اس نے آپ کا ذکر کیا ہے۔'' میں نے اندھیرے میں تیر چھوڑا۔

''اللہ اسے لمبی حیاتی دے۔ بڑے دکھ دیکھے ہیں وچارے نے۔ اور اس آخری دکھ نے تو ہم سب کو نچوڑ کر ہی رکھ دیا تھا۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی اثبات میں سر ہلانا مناسب سمجھا۔ خاتون کی آنکھوں میں نمی چمکنے لگی تھی۔ انہوں نے اوڑھنی کے پلو سے آنکھوں کے کنارے صاف کرتے ہوئے بات بدلی اور کہنے لگیں۔ ''پچھلے چار پانچ دن سے ہمارے ساتھ بھی اس کی کوئی بات نہیں ہوئی۔ کئی دفعہ جب کام زیادہ ہوتا ہے تو پھر فون بند کر دیتا ہے۔ ہمیشہ سے یہی عادت ہے اس کی۔''

''جی بالکل ایسا ہی ہے۔'' میں نے کہا۔

میں اس سادہ لوح خاتون کو کیسے بتاتا کہ اس کا پیارا بھتیجا مرغی خانے کے کاروبار میں مصروف نہیں، وہ مرغیاں ذبح کرنے کے کام میں مصروف ہے۔ اور یہ مرغیاں وہ انسان ہیں جو اس کے ہتھے چڑھتے ہیں یا جن کی وہ سپاری پکڑتا ہے۔ وہ اس کا دکھیارا انیقا نہیں ہے وہ وسطی پنجاب کا ایک خطرناک گینگسٹر ہے اور آج کل تو اپنی آئی پر آیا ہوا ہے۔ بیس منٹ کی گفتگو میں ہی ادھیڑ عمر خاتون ہمیں اپنوں کی طرح لگنے لگی تھیں۔ وہ بھی بڑی اپنائیت سے باتیں کر رہی تھیں۔ ہم نے انہیں بھی یہی بتایا کہ ہم بہاولپور سے کوئی زرعی رقبہ ڈھونڈتے ہوئے یہاں آئے ہیں۔

خاتون نے ہمیں پیشکش کی کہ اگر ہم رات رہنا چاہتے ہیں تو ساتھ والی دکانوں کے

اوپر ایک رہائشی پورشن خالی پڑا ہے۔ چارپائیاں اور بستر بھی ہیں۔ ہم رہ سکتے ہیں۔
اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں۔ رسمی انکار کے بعد ہم نے ایک رات کے لیے یہ آفر قبول کر لی۔ فخر نے خاتون سے پوچھا۔ ''یہ دکانیں آپ کی ہیں؟''
وہ بولیں۔ ''میرا کچھ نہیں پتر! میں تو ایک، ڈھائی مرلے کے گھر سے اٹھ کر یہاں آئی تھی۔ یہ سب کچھ میرے بچے انیقے کا ہی ہے۔ اس نے میرے اور میری بچی کے لیے بڑا پکا انتظام کر رکھا ہے۔ ان دکانوں اور اوپر والے کوارٹروں کے کرائے سے ہمارا گھر بڑی چنگی طرح چلتا ہے بلکہ رب سوہنے کے فضل سے کچھ بچت بھی ہو جاتی ہے۔''
اسی دوران میں دروازے کے پیچھے سے کسی نوجوان لڑکی نے آواز دی۔ ''امی جی! آ جائیں۔''
خاتون ٹھنک کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ہم سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''تم لوگ بیٹھو، تایا جی کے ساتھ گل بات کرو۔''
میں نے کہا۔ ''نہیں خالہ جی، اب ہم بھی ذرا گاؤں کا راؤنڈ لگاتے ہیں۔ پٹواری صاحب نے ایک دو زمین کے ٹکڑوں کا بتایا ہے، وہ دیکھ آتے ہیں۔''
وہ بولیں۔ ''تایا جی کو بھی ساتھ لے جائیں۔ یہ آپ کو چنگے مشورے دے سکتے ہیں۔''
''یہ تو اچھی بات ہے۔'' میں نے کہا۔
برآمدے کی طرف سے آنے والی آوازوں سے پتا چلتا تھا کہ وہاں گہما گہمی کچھ بڑھ گئی ہے۔ کسی عورت کے رونے کی آواز بھی آ رہی تھی، شاید وہ کوئی مریضہ تھی جو علاج کے لیے یہاں لائی گئی تھی۔
ہم بزرگ کے ساتھ اٹھ کر باہر آ گئے اور اپنی گاڑی کی طرف چل دیئے۔ دور کھجور کے درختوں اور لہلہاتے کھیتوں کے پیچھے دن بھر کا تھکا ہوا سورج افق کی طرف جھکتا چلا جا رہا تھا۔ مجھے اندیشہ صرف ایک ہی تھا، اگر انیق کی پھپھو کا ٹیلی فونک رابطہ کہیں انیق سے ہو جاتا تو ہمارا بھانڈا پھوٹ سکتا تھا، تاہم اس کا امکان پندرہ بیس فیصد سے زیادہ نہیں تھا۔
زمینیں دیکھنے کا تو بہانہ ہی تھا۔ ہم شام کے طویل ہوتے سایوں میں گاؤں کے مضافات کی سیر کرتے رہے اور محترم بزرگ سے تبادلۂ خیال ہوتا رہا۔ اس گفتگو سے ہمیں کافی اہم باتیں معلوم ہوئیں۔ انیق کے والدین اس کے بچپن میں ہی ایک سیلابی ریلے کا شکار ہو گئے تھے۔ انہوں نے ترکے میں ایک مکان اور اس کے پیچھے ایک کافی بڑا احاطہ چھوڑا تھا۔ انیق کی پھپھو رضیہ ایک قریبی گاؤں میں بیاہی ہوئی تھیں۔ ان کا خاوند فوت ہو چکا تھا اور

دو بچیاں تھیں۔ وہ تیرہ چودہ سالہ انیق کی دیکھ بھال کے لیے اس کے پاس آ گئیں اور اپنی بچیوں سمیت یہی رہنے لگیں۔ سچی محبت دل پر اثر کرتی ہے۔ پھپھو کی محبت نے بھی انیق پر اثر کیا، وہ ان کو سگی ماں کا درجہ دینے لگا۔ پھپھو کی بڑی بیٹی سدرہ اسے بچپن سے اچھی لگتی تھی۔ خاندان کے بڑوں کے مشورے سے دونوں کی منگنی ہو گئی۔ وہ بڑے اچھے دن تھے لیکن پھر ایک حادثے نے سب کچھ تہس نہس کر دیا۔ انیق اپنی منگیتر سدرہ اور اس کی چھوٹی بہن فاطمہ کے ساتھ ایک قریبی گاؤں میں لگنے والے میلے سے واپس آ رہا تھا کہ سڑک پار کرتے ہوئے ان کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ ایک موڑ پر ایک انتہائی تیز رفتار کار ان پر چڑھ دوڑی۔ انیق اور فاطمہ کو تو فقط چوٹیں آئیں مگر خوبرو سدرہ وہیں سڑک پر اپنی جان ہار گئی۔ میلے پر جانے کے لیے اس نے چمکیلے کپڑے پہن رکھے تھے اور ہاتھوں پر مہندی لگا رکھی تھی، یہ سب کچھ خون میں لت پت ہو گیا۔

جس گاڑی سے سدرہ ٹکرائی تھی، اسے علاقے کا ایک بارسوخ شخص چلا رہا تھا۔ وہ ایک ایم این اے کا برادرِ نسبتی تھا اور جس وقت ایکسیڈنٹ ہوا، وہ نشے میں چُور تھا۔ گاڑی بھی اَن رجسٹرڈ تھی مگر وہی ہوا جو ایسے معاملوں میں ہوتا ہے۔ کوئی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ وہ دو گھنٹے کے لیے بھی تھانے میں نہیں رہا۔

اس واقعے نے انیق کو توڑ کر رکھ دیا۔ اس نے قصوروار کو سزا دلانے کے لیے اپنے طور پر بھاگ دوڑ کی۔ گاؤں کے کچھ معتبر لوگوں نے بھی اس کا ساتھ دیا لیکن کچھ نہیں بنا۔ الٹا انہیں ڈرایا دھمکایا جانے لگا۔ آخر یہ معاملہ سرد خانے میں چلا گیا۔ کچھ لوگ غم کا شکار ہوتے ہیں تو دنیا سے کٹ کر رہ جاتے ہیں۔ نوجوان انیق کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ اپنی محبوب منگیتر کی جدائی نے جیسے اسے ہر چیز سے بیزار کر دیا تھا۔ وہ عام لوگوں سے جھگڑے کرنے لگا۔ مار پیٹ شروع کر دی۔ سگریٹ نوشی کی عادت اپنا لی لیکن ان حالات میں بھی وہ اپنی غم گسار پھپھو اور ان کی چھوٹی بیٹی کا بہت خیال رکھتا تھا۔ انہی دنوں اس کے دماغ میں یہ خیال سمایا کہ اپنے مکان کے پیچھے واقع ڈیڑھ دو کنال کا احاطہ بیچ دے۔ یہ احاطہ بیچ کر اس نے چند دکانیں بنائیں۔ دکانوں کے پیچھے اور اوپر چار پانچ رہائشی پورشن بنائے۔ یوں اس نے اپنی پھپھو کے لیے ان کے اخراجات کا مستقل انتظام کر دیا۔ اس کے بعد وہ جنوبی پنجاب سے وسطی پنجاب چلا گیا اور پھر لاہور میں کہیں ''مرغبانی'' شروع کر دی۔

گاڑی میں ڈرائیو کر رہا تھا۔ بزرگوار میرے پہلو میں بیٹھے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا۔ ''اس بندے کا کیا بنا تھا جس کی گاڑی سے انیق کی منگیتر ٹکرائی تھی؟''

وہ بولے۔ ''پتر جی! اللہ بڑا کارساز ہے۔ اس کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔ شاید انیق نے تمہیں بتایا نہیں۔ ایم این اے کا وہ رشتے دار پکا شرابی تھا۔ ایک ڈیڑھ سال بعد ہی اس کے دماغ کی نس پھٹ گئی۔ اس کو فالج ہو گیا۔ فالج کے بعد پندرہ وی دن کے اندر ہی وہ مر گیا۔''

اردگرد کی زمینوں کا جائزہ لے کر ہم شام پڑے موراناں گاؤں واپس آ گئے۔ دکانوں کے اوپر ایک صاف ستھرے کشادہ کمرے میں ہمارے لیے دو چار پائیوں پر بستر بچھا دیئے گئے تھے۔ میرا ذہن مسلسل انیق کے حالات میں الجھا ہوا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے سہ پہر کے وقت انیق کی پھپو رضیہ نے اس آخری دکھ کا ذکر کیا تھا جس نے ان سب کو نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ یہ دکھ یقیناً وہی ایکسیڈنٹ تھا جس نے انیق کی پھپو سے اس کی بیٹی اور انیق سے اس کی منگیتر چھینی تھی۔

''یہ اسٹوری تو ساری دکھی کرنے والی ہے برادر۔'' فخر نے اپنے مخصوص انداز میں کہا اور ایک شعر بھی پڑھا۔

میں نے کہا۔ ''لیکن کچھ لوگ اپنے دکھ میں سے ''کچھ بہت اچھا'' نکال کر دکھا دیتے ہیں لیکن کچھ ایسا نہیں کر سکتے۔ انیق بھی دوسری طرح کے لوگوں میں شامل ہو گیا۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے سدرہ کے مجرم سے انتقام لینے کے لیے ہی یہ راستہ اختیار کیا ہو۔ اس کا مجرم تو شراب نوشی کا شکار ہو کر اپنی موت آپ مر گیا مگر انیق جس راستے پر چل پڑا تھا، وہ اسے آگے لے گیا۔''

''بلکہ بہت آگے لے گیا۔ بعید از قیاس اور خارج از امکان حالات تک۔'' فخر نے ہنکارا بھرا۔

میں نے کہا۔ ''خاص طور سے وہ اب جو کچھ کر رہا ہے یہ تو سراسر بے وفائی، عیاری اور عیاشی کے زمرے میں آتا ہے۔ ماضی کا کوئی بھی دکھ یا واقعہ اس کے موجودہ کردار کا جواز نہیں بن سکتا۔ اس نے ایک جھوٹ کے ذریعے تاجور کو ورغلانے کی کوشش کی۔ مجھے کئی طرح سے نقصان پہنچایا، سجاول کو بیوی بچے سمیت خون میں نہلانے کی منصوبہ بندی کی۔ اس کے علاوہ بھی پتا نہیں کہ کیا کچھ کیا ہوگا۔''

اچانک میرے سیل فون کا میوزک بج اٹھا۔ میں اسکرین دیکھ کر چونکا۔ یہ یونس پمپ والا کی کال تھی۔ میں نے کال ریسیو کی وہ بولا۔ ''آپ کہاں ہو وقاص بھائی؟'' اس کی آواز میں ہیجانی کیفیت تھی۔

''کیوں کیا ہوا؟ خیریت تو ہے؟''
''خیریت نہیں ہے وقاص بھائی! ایک بہت بڑی گڑبڑ ہوئی ہے۔ آزاد کشمیر کی طرف...... وہ خبیث انیق یونہی قبائلی علاقے کی طرف نہیں نکلا۔''
''کھل کر بات کرو۔'' میں نے اپنی دھڑکنوں کو سنبھالتے ہوئے کہا۔
''سجاول صاحب کی خالہ اور بھتیجی کوٹلی والے ڈیرے سے نکل کر کسی شادی والے گھر گئی تھیں۔ انیق اور اس کے ساتھیوں نے سجاول صاحب کی بھتیجی کو گاڑی میں سے گھسیٹا اور اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کی۔ گن مین اور ڈرائیور نے مزاحمت کی۔ دونوں طرف سے گولیاں چلیں۔ انیق اور اس کے ساتھیوں کی چلائی ہوئی گولیوں میں سے ایک سجاول صاحب کی خالہ کو جا لگی۔ وہ طبی امداد پہنچنے سے پہلے ہی دم توڑ گئیں۔''
میں سناٹے میں رہ گیا۔ گزرنے والا ہر دن انیق کے حوالے سے کوئی بری سے بری خبر لے کر ہی آتا تھا۔ وہ سب حدوں کو پار کر رہا تھا۔ یونس نے بتایا کہ جب سجاول کی بھتیجی کو اغوا کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی، اس کے کپڑے پھٹ گئے اور وہ سڑک پر ہی قریباً برہنہ ہو گئی۔ میری نگاہوں کے سامنے اس تیز طرار خوبرو لڑکی کا سراپا گھوم گیا۔ وہ میرے لیے اجنبی نہیں تھی۔ میں کوٹلی والے ڈیرے پر دوسروں کے علاوہ اسے بھی اچھی طرح بھگت چکا تھا۔
''یہ تو بہت برا ہوا یونس، لگتا ہے کہ اب اس انیقے اور سجاول میں سے کوئی ایک ضرور مرے گا۔''
''بالکل یہی لگتا ہے۔'' یونس نے تائید کی۔ ''جو خبر مجھے ملی ہے، اس کے مطابق تونسہ شہر کے قریب ایک قبائلی ملک کے ڈیرے پر دونوں میں ٹاکرا بھی ہوا ہے، گولیاں چلی ہیں اور کہتے ہیں کہ ایک بندہ بھی مرا ہے......'' یونس مجھے اس واقعے کی تفصیل بتانے لگا۔ میرا دماغ جیسے گھڑ دوڑ کا میدان بنا ہوا تھا جو کچھ ہو رہا تھا، نہیں ہونا چاہیے تھا۔ بالکل نہیں۔ کسی وقت مجھے انیق سے زیادہ سجاول کی فکر لاحق ہو جاتی تھی۔ یونس کو بھی سجاول اور انیق کی درست لوکیشن کا ابھی تک کوئی پتا نہیں تھا، وہ کوشش میں لگا ہوا تھا۔
اگلے روز صبح سویرے ہمیں بہترین دیہاتی ناشتا دیا گیا۔ ناشتے کے بعد میں اور فخر ایک بار پھر گاڑی پر سوار بے مقصد اِدھر اُدھر گھومنے لگے۔ ہم مقامی لوگوں پر اپنا یہ تاثر برقرار رکھنا چاہتے تھے کہ فارم ہاؤس کے لیے زمین دیکھ رہے ہیں۔ ہماری گاڑی سرسبز لہلہاتے کھیتوں کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ اس کے یاد آنے کے ہزار بہانے تھے۔ جتنا بھولنا چاہتا تھا، اتنا ہی وہ ذہن پر مسلط ہوتی تھی۔ کبھی کبھی تو لگتا تھا کہ شاید اس کے گاؤں چاند گڑھی کو بھی اس کے

نام سے نسبت تھی۔ وہ ایک بے مثل...... بے داغ چاندنی تھی اور اس کا گاؤں ''چاند گڑھی'' تھا۔ ہاں......اس کے یاد آنے کے ہزار بہانے تھے۔ صبح سویرے، اوس سے بھیگے سرسبز کھیتوں کے درمیان گھومتے ہوئے بھی وہی یاد آئی۔ وہ ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیوں پر کھڑی تھی، وہ سنہری گندم کے خوشوں میں مسکرا رہی تھی، وہ ٹیوب ویل کے چمکیلے پانیوں میں اپنی جھلک دکھا رہی تھی۔ میں کس کس منظر سے اپنی آنکھیں بند کرتا......کس کس آواز کو اپنی سماعت تک پہنچنے سے روکتا۔

میں نے یونس پمپ والا سے بھی مسلسل ٹیلی فونک رابطہ رکھا ہوا تھا اور اسے کہا ہوا تھا کہ جونہی سجاول یا انیق کے بارے میں کوئی خبر ملے، وہ مجھے آگاہ کرے۔

دوپہر کو انیق کی پھپھو کے تایا، اصرار کر کے ہمیں پھر گھر لے گئے۔ وہ چاہتے تھے کہ واپس جانے سے پہلے وہ ہمیں گھر میں کھانا کھلائیں۔ ہم بیٹھک میں بیٹھ گئے اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ برآمدے کی طرف سے آج بھی خواتین کے بولنے چالنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ محترم بزرگ آج پہلی بار کچھ افسردہ نظر آئے۔ ان کی افسردگی کا تعلق اپنے نواسے انیق عرف انیقے کے حوالے سے تھا۔ گفتگو کے دوران میں انہوں نے کہا۔ ''پترو! تم دونوں اس کے یار بیلی ہو، کیا کسی ویلے وہ تم کو بدلا بدلا سا نہیں لگتا؟'

''بدلنے سے آپ کا کیا مطلب ہے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ اپنی سفید داڑھی کھجا کر بولے۔ ''اکھڑا اکھڑا سا۔ پریشان سا۔ بات کوئی اور کر رہا ہوتا ہے، دھیان کہیں اور ہوتا ہے۔ کسی وقت سوچتا ہوں شاید کاروبار میں کوئی بڑا نقصان ہو رہا ہے جس کی وجہ سے گھبرایا ہوا ہے۔''

میں بزرگوار کو کیا بتاتا کہ کس طرح کے کاروبار کر رہا ہے وہ...... اور کس طرح کے نقصان ہو رہے ہیں اسے۔ میں نے بات بناتے ہوئے کہا۔ ''دراصل مجھے اس سے ملے ڈیڑھ دو مہینے ہو گئے ہیں، اب تازہ صورتِ حال کیا ہے، مجھے اس کا پتا نہیں۔''

وہ التجائیہ لہجے میں بولے۔ ''تم لوگ مجھے دل کے چنگے لگتے ہو۔ وہ تمہارا دوست بھی ہے۔ اس سے ضرور ملو اور اس کی پریشانی جاننے کی کوشش کرو۔ ہو سکتا ہے کہ وہ تمہیں ہی کچھ بتا دے۔ کسی وقت...... کسی وقت......'' وہ بات ادھوری چھوڑ کر خاموش ہو گئے۔

چند لمحے توقف کے بعد بولے۔ ''کسی وقت تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے اس پر کسی نے تعویذ ڈال دیئے ہیں۔ بالکل گم صم سا ہو گیا ہے۔ نہ جاگا ہوا، نہ سویا ہوا۔ کبھی کبھی تو مجھے ترس بھی آتا ہے اس پر۔ میں رضیہ (انیق کی پھپھو) سے بات کرتا ہوں۔ وہ بھی نہیں سنتی۔ پتا نہیں دونوں پر ہی تعویذ ہو گئے ہیں۔'' محترم بوڑھے نے مایوسی سے سر ہلایا۔

برآمدے میں سے ابھرنے والی آوازیں اب بڑھ گئی تھیں۔ لگتا تھا کہ آج شام کے بجائے دوپہر کو ہی محفل ہورہی ہے۔ میں نے بزرگوار سے پوچھا تو انہوں نے اس کی تصدیق کی۔ بولے۔ ''بی بی صاحبہ اس بار ڈھائی تین مہینے کے وقفے سے آئی ہیں اس لیے ان سے ملنے والے بہت زیادہ ہیں، رش کم کرنے کے لیے وہ منگل اور جمعرات کو دوپہر کے وقت بھی دم وغیرہ کرتی ہیں۔ بہت اللہ والی ہیں۔ میں نے تو انیقے کو بھی دم کرایا تھا۔ ایک تعویذ بھی لکھوایا ہوا ہے پر وہ ناشکرا، ناقدرا، کہیں میرے ہتھے چڑھے تو تب ہے ناں، پتا نہیں کہیں بھاگا پھر رہا ہے۔ اب تو کئی دن سے فون بھی بند کیا ہوا ہے بے شرم نے۔''

اسی دوران میں اندر سے کسی لڑکی نے آواز دی۔ ''نانا جی...... نانا جی...... ذرا بات سن جائیں۔'' محترم بزرگ گھٹنوں پر زور دے کر اٹھے اور ''ابھی آیا'' کہتے ہوئے باہر چلے گئے۔

برآمدے سے ابھرنے والی آوازوں سے پتا چلتا تھا کہ کم وبیش دو درجن خواتین تو وہاں موجود ہوں گی۔ اگربتیوں کی مدھم خوشبو بھی ہم تک پہنچ رہی تھی لیکن یہ عام اگربتیاں نہیں تھیں۔ بڑی منفرد اور ''سنسنی خیز'' قسم کی خوشبو تھی۔

فخر نے آنکھوں سے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ وہاں آج بھی ایک چھوٹی سی جھری موجود تھی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر اٹھ کر جھری سے آنکھ لگائی۔ تھوڑی سی کوشش کے ساتھ مجھے رنگین پایوں والی وہ شاندار کرسی نظر آگئی جو ذرا بلندی پر رکھی تھی۔ اس کرسی پر ایک چادر پوش، گرانڈیل عورت براجمان تھی۔ اس نے سیاہ شیشوں والی عینک پہن رکھی تھی۔ میں نے اسے دیکھا اور مجھے یوں لگا کہ کائنات کی گردش تھم گئی ہے اور میں بھی اپنی جگہ پتھرا گیا ہوں۔ اپنی نگاہوں پر بھروسا نہیں ہوا لیکن سامنے نظر آنے والی حقیقت کو جھٹلانا ممکن نہیں تھا۔

میرے سامنے کرسی پر جزیرہ جاماجی کی خطرناک ترین عورت ''مادام ہاناوانی'' براجمان تھی۔ وہی ہاناوانی جسے ہم نے قسطینا اور فارس جان کے ساتھ مل کر شکست فاش دی تھی اور ایک نہایت کاری زخم لگایا تھا...... اس کے بدکار بیٹے رائے زل کو جہنم واصل کیا تھا۔ جاماجی کے اس زہریلے حاکم کا سر سجاول نے اپنے ہاتھوں سے کاٹا تھا۔

ہاں، یہ وہی تھی...... اور یہ یہاں پہنچ گئی تھی۔ ذہن اس بات کو قبول نہیں کررہا تھا کہ وہ جاماجی سے ہزاروں میل دور یہاں رحیم یار خاں کے اس گمنام گاؤں موراناں میں موجود ہے...... اور اس دیہی مکان کے ایک برآمدے میں، ایک گول شیشوں والی رنگین کرسی پر براجمان ہے۔ دفعتاً میرے ذہن میں بجلی کا ایک کوندا سا لپکا۔ میرے پورے جسم میں برقی لہریں دوڑ گئیں اور اعضا تڑخ گئے۔ میرا خیال سیدھا انیق کی طرف گیا...... یہ انیق کا گھر

تھا...... اور آنکھوں کے ذریعے مسحور کرنے والے فن، کی یہ بدنام ترین ''ماہرہ'' یہاں اس گھر میں موجود تھی، میرا دل بے ساختہ پکار اٹھا...... انیق سخت خطرے میں ہے......

○......❖......○

خدا کی پناہ، یہ کیسا انکشاف تھا۔ آنکھوں کے سامنے سے جیسے ایک پردہ سا ہٹ گیا تھا اور ایک ایسا منظر نگاہوں کے سامنے آرہا تھا جو نہایت تشویش ناک تھا۔ کیا انیق جو کچھ کر رہا تھا، اس کے پیچھے اس عورت ہاناوانی کا ہاتھ تھا؟ ہپناٹزم ایک مانی ہوئی سائنسی حقیقت ہے، یہ جن پریوں کی کہانی نہیں ہے۔ یہ ایگزسسٹ کرتی ہے۔ نگاہ کی طاقت سے ذہن کو تابع کیا جاتا ہے اور سوچوں کو من چاہی سمت میں موڑا جاتا ہے۔ جاما جی میں اس طاقت کا مظاہرہ دیکھنے سے پہلے میں بھی اس پر پوری طرح یقین نہیں رکھتا تھا مگر اب صورتِ حال مختلف تھی۔ وہ ست رنگا بھنور آج بھی میری نگاہوں کے سامنے تھا جس سے بچنے کے لیے میں نے اپنے زخمی انگوٹھے کو نہایت بے دردی سے کچل ڈالا تھا۔

ہاں پیرا سائیکالوجی کی یہ حقیقت زندہ سلامت میرے سامنے موجود تھی اور اس کا نام ہاناوانی تھا تو کیا اس نے انیق کے دل و دماغ کو مفلوج کر رکھا ہے اور اس سے اپنی منشا کے کام کرا رہی ہے۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ انیق کی وہ ساری تکلیف دہ کارروائیاں نگاہوں کے سامنے آئیں جنہوں نے ہم سب کو متحیر کر رکھا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ انیق ''شکاری'' نہیں ''شکار'' ہے۔ وہ ستم گر نہیں بلکہ اس پر ستم کیا گیا ہے۔

انیق کے رشتے دار بزرگ کی آواز کی بازگشت میری کانوں سے ٹکرائی۔ ایک دن پہلے انہوں نے کہا تھا۔ ''کبھی کبھی تو مجھے انیقے پر ترس آتا ہے۔ بہت پریشان رہتا ہے۔ کسی وقت تو لگتا ہے کہ اس پر کسی نے کچھ کر دیا ہے۔''

''یار! ادھر چپک ہی گئے ہو۔'' فخر کی سرگوشی نے مجھے چونکایا۔

میں نے کھڑکی کی جھری سے آنکھ ہٹائی اور واپس آ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ ''کیا ہوا برادر؟'' فخر میرا چہرہ دیکھ کر چونک گیا۔

''وہ...... جو کچھ ہم نے سوچا بھی نہیں تھا۔'' میں نے بمشکل خود کو سنبھال کر کہا۔ ''انیق وہ نہیں ہے فخر...... جو نظر آرہا ہے۔ وہ کسی شکنجے میں ہے۔ اسے...... استعمال کیا جارہا ہے۔''

''کیسی باتیں کر رہے ہو؟'' وہ حیرت سے بولا۔

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا، باباجی واپس آ گئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی پڑیا تھی۔ اس پڑیا کو انہوں نے کھولا تو اس میں ایک قیمتی یاقوت تھا۔ بزرگ نے بتایا

کہ یہ بی بی صاحبہ نے کسی چوہدرائن کو دیا ہے۔اس کو سونے کی انگوٹھی میں لگوانا ہے۔

وہ "بی بی صاحبہ" کے بارے میں بتانے لگے کہ وہ واقعی بہت پہنچی ہوئی ہیں......صرف عورتوں کا علاج دم اور وظیفے وغیرہ سے کرتی ہیں۔منہ سے کچھ بولتی نہیں مگر ان کے عمل میں اللہ نے بہت شفا رکھی ہوئی ہے۔

میرے لیے اب زیادہ دیر یہاں بیٹھنا ممکن نہیں تھا۔میرے ذہن میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔دماغ میں صرف اور صرف انیق کا چہرہ تھا۔اسے بڑے خطرناک طریقے سے استعمال کیا جارہا تھا۔ان لوگوں کے نزدیک میں تو "مر" چکا تھا ورنہ ہوسکتا تھا کہ اس کے ذریعے پہلے مجھے ہی بے دردی سے مروایا جاتا۔اب ان لوگوں کا سب سے بڑا دشمن سجاول تھا......اور سجاول مسلسل انیق کی زد میں تھا لیکن کیا واقعی وہ انیق کی زد میں تھا؟اس کا جواب نفی میں تھا۔ وہ جاماجی کی بدنام ترین ساحرہ ہاناوانی کی زد میں تھا۔

باہر جب ہم گاڑی میں بیٹھے تو فخر نے قدرے ہراساں لہجے میں پوچھا۔"کیا ہوا ہے یار! کچھ مجھے بھی بتاؤ۔"

میں نے کہا۔"فخر! میں ابھی وہ دیکھ کر آیا ہوں جس کا میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔وہ دشمنی جو جاماجی سے شروع ہوئی تھی،ابھی ختم نہیں ہوئی۔میں نے تمہیں رائے زل کی ماں کا بتایا تھا نا؟"

"کون؟وہی جو کھلی قبر میں رات گزارتی ہے۔کیا نام بتایا تھا تم نے اس کا ماذووارا؟"

"ہاں......اسے ہاناوانی بھی کہتے ہیں۔وہ اس وقت یہاں انیق کے گھر میں موجود ہے مجھے یقین ہے فخر......انیق جو کچھ کررہا ہے......ہاں،جو کچھ بھی کررہا ہے وہ اس ہاناوانی کی وجہ سے کررہا ہے۔وہ ہمارے تصور سے زیادہ خطرناک......ناقابل فہم عورت ہے۔"

"وہ عورت اور یہاں؟"فخر کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔"تمہیں غلطی تو نہیں لگی؟"

"کاش غلطی ہی لگی ہوتی مگر یہ ہو چکا ہے فخر......اور میرا دل کہہ رہا ہے کہ وہاں خیبر ایجنسی میں سجاول اور انیق کے ساتھ......یا دونوں میں سے کسی ایک کے ساتھ بہت برا ہونے والا ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے......انیق حواس میں نہیں ہے،اور جو کچھ کررہا ہے اسی عورت کے زیراثر کررہا ہے؟"

"ایک سو ایک فیصد ایسا ہے......بظاہر یہ باتیں عجیب لگتی ہیں مگر میں جاماجی میں اپنی ان گناہ گار آنکھوں سے یہ سب کچھ ہوتے دیکھ چکا ہوں۔میں نے ایک مرتبہ سجاول کو بھی

ایسے ہی ''ٹرانس'' میں دیکھا تھا۔ وہ جیسے کسی تیز نشے کے مستقل اثر میں تھا۔ کچھ عرصے کے لیے بالکل بیگانہ ہو گیا تھا۔ یہ تنویم کی ایک خاص قسم ہوتی ہے۔''

''اوہ خدا!'' فخر نے سر پکڑ لیا۔ ''یہ اکیسویں صدی ہے...... اور کیا ہم ایک بار پھر جادو اور طلسم کی طرف لوٹ رہے ہیں؟''

''اب ان باتوں کو چھوڑو فخر...... ہمیں جلد از جلد انیق اور سجاول تک پہنچنا ہوگا۔ وہ اس وقت نہایت مہلک صورتِ حال میں ہیں۔ سجاول کا پارا ساتویں آسمان کو چھو رہا ہے۔ اس کی والدہ کی بہن کو قتل کر دیا ہے انیق نے، اس کی بھتیجی کے ساتھ سرِ عام دست درازی ہوئی ہے۔ سجاول اب اسے معاف نہیں کرے گا۔''

وہ بولا۔ ''چلو ڈرائیونگ میں سنبھالتا ہوں، تم فون پر رابطے کرو۔ شاید کہیں سے کوئی سرا ہاتھ آ جائے۔''

فخر ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا۔ گاڑی تیزی سے مضافاتی علاقے کی پختہ و نیم پختہ سڑکوں پر بھاگنے لگی۔ شام کے سائے طویل ہو رہے تھے اور ہم اس مین سڑک کی طرف بڑھ رہے تھے جو آگے جا کر ہمیں جی ٹی روڈ سے جوڑ سکتی تھی۔

میں نے ایک بار پھر یونس پمپ والا کو فون ملانے کا ارادہ کیا، تاہم اس کی کال آ گئی۔ وہ ہانپی ہوئی آواز میں بولا۔ ''وقاص بھائی! ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔ نہیں تو ان دونوں میں سے کسی ایک کا خون ہو جائے گا۔ انیق کا کھوج کہیں کوہاٹ کے آس پاس ملا ہے۔ سجاول صاحب وہاں پہنچ گئے ہیں۔ کوئی مقامی ملک زرق خاں بھی ان کے ساتھ ہے۔''

''تم تک یہ خبر کیسے پہنچی ہے؟''

''خیبر ایجنسی میں اپنا ایک بندہ ہے، وہی اطلاع دے رہا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ تین بڑی جیپوں پر سجاول صاحب اور ملک زرق خاں کے مسلح بندے ''باغ'' کے پاس کی پہاڑیوں کی طرف گئے ہیں۔ وہاں پر فون کے سگنل نہیں ملتے۔ میں نے بڑا سر مارا ہے مگر سجاول صاحب سے رابطہ نہیں ہوا۔''

''ٹھیک ہے، تم اطلاع دینے والے بندے سے رابطہ رکھو۔ ہم جلد از جلد ان تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے جی جیسے آپ کہتے ہیں۔'' وہ بولا۔

مین نے اس سے پوچھا۔ ''تمہاری بات سے پتا چلتا ہے کہ سجاول کافی بندے لے کر انیق کے پیچھے گیا ہے۔ کیا انیق کے ساتھ بھی بندے ہیں؟'

''جہاں تک میرا اندازہ ہے ''باغ'' میں تو اس کے ساتھ دو تین بندے تھے۔ اب کا پتا نہیں ہے۔'' (باغ، وہاں ایک قصبے کا نام تھا)

فون بند کر کے میں نے فخر سے کہا۔ ''میرا دل کہہ رہا ہے کہ انیق کو مدد کی ضرورت ہے۔ وہ سجاول کے بے پناہ طیش کا شکار ہو سکتا ہے۔''

O......❖......O

رات کے نو بجے تھے جب ہمارے جہاز نے لاہور کے علامہ اقبال ایئرپورٹ پر لینڈ کیا۔ رضوان نے ہمارے لیے گاڑی کا انتظام پہلے ہی کر رکھا تھا۔ یہ اچھی حالت کی ایک بلینو کار تھی۔ ایئرپورٹ سے ہم ہوٹل پہنچے۔ یہاں میرے بریٹا پسٹل کے علاوہ ایک عدد سیون ایم ایم رائفل بھی موجود تھی۔ ہم نے یہ چیزیں ایک کمبل میں لپیٹ کر گاڑی تک پہنچائیں اور پھر وہاں سے نکل آئے۔ رضوان میری ہدایت پر لاہور میں مولانا کے پاس رہا۔ موٹر وے پر پہنچتے ہی ہم قریباً 120 کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے راولپنڈی کی طرف روانہ ہو گئے۔

راستے میں وقتاً فوقتاً یونس سے بھی رابطہ ہو رہا تھا۔ وہ پنڈی بھٹیاں انٹرچینج پر موجود تھا اور ہمارا انتظار کر رہا تھا (میں نے فخر کو یاددہانی کرا دی تھی کہ وہ یونس کی موجودگی میں مجھے وقاص کے نام سے ہی بلائے گا) ہم نے انٹرچینج سے یونس کو پک کیا اور تیز رفتاری سے سفر جاری رکھا۔ کچھ دیر بعد یونس نے دوبارہ اپنے ''اطلاع کنندہ'' سے رابطہ کیا۔ ''ہیلو آصف خان کیا حالات ہیں؟''

موبائل اسپیکر سے آواز ابھری۔ ''خو، حالات بڑا گڑبڑی والا ہے۔ ام کو تو لگتا ہے کہ اب اس لڑکے کا لاش ہی آئے گا۔ سجاول صیب اور اس کا ساتھی بہت غصے میں گیا ہے۔ ام کو نہیں لگتا کہ وہ اس کو زندہ چوڑے گا۔''

''کیا تم کسی طرح اس لڑائی کو روک نہیں سکتے خان؟ میرا مطلب ہے کسی طرح سجاول صاحب یا ازرق صاحب سے رابطہ ہو جائے۔''

''یہی تو بڑا مصیبت ہے۔ وہاں سگنل کیا، سگنل کا بچہ بھی نہیں ملتا۔ بارڈر کے پاس کا پہاڑی علاقہ ہے۔''

میں نے فون یونس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔ ''آصف خان! یہ ایک بے گناہ بندے کی زندگی موت کا سوال ہے۔ کیا تم کسی طرح خود اس جگہ نہیں پہنچ سکتے؟''

''برادر! یہاں شام سے بہت بارش لگا ہوا ہے۔ امارے پاس موٹر سائیکل کے سوا کوئی سواری نہیں ہے اور اگر سواری ہوتا بھی تو شاید ہم نہ جا سکتا۔ وہ کافی بڑا علاقہ ہے۔ ام کو کچھ پتا

نہیں کہ وہ کس طرف کو گیا ہے۔''

''تم کوشش تو کر سکتے ہو، کسی کو ساتھ لے لو۔ جتنا بھی خرچا آئے گا ہم دینے کو تیار ہیں بلکہ تمہاری مدد کرنے والے کو انعام اکرام بھی دیں گے۔''

''آپ کیسی باتیں کر رہا ہے۔ ام کو انعام شنام کا لالچ نہیں ہے اور نہ امارے کسی ساتھی کو ہے۔ اگر ام کچھ کر سکتا تو تمہارے کہنے کے بغیر ہی کر دیتا۔''

''سوری......سوری......'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''بہت پریشان ہوں۔ تمہیں برا لگا ہے تو معافی چاہتا ہوں۔''

اس کے ساتھ ہی میں نے فون یونس کو تھما دیا اور اشارے سے کہا کہ وہ اپنے اس دوست کو آمادہ کرے۔ یونس نے فون لے لیا اور اپنی سی کوشش کرنے لگا، مگر دوسری طرف سے جو کہا جا رہا تھا اس سے صاف پتا چلتا تھا کہ جو کچھ ہم چاہ رہے ہیں، وہ ہو نہیں سکے گا۔ فون کے اسپیکر میں سے گاہے بگاہے بادلوں کی گھن گرج بھی سنائی دے جاتی تھی۔

آخر یونس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ ڈرائیونگ فخر کر رہا تھا۔ اسپیڈو میٹر کی سوئی 120 کلو میٹر کے قریب تھی۔ میں نے کہا۔ ''اسپیڈ تھوڑی سی بڑھا لو فخر۔''

''چالان نہ ہو جائے۔''

''ہونے دو۔'' میں نے کہا۔

فخر نے اسپیڈ قریباً دس کلو میٹر فی گھنٹہ مزید بڑھا دی۔

یونس بغور میرا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ وہ چالیس کے پیٹے میں تھا لیکن اچھی کاٹھی تھی اور تیز طرار بھی تھا۔ وہ سجاول کے ان دوستوں میں سے تھا جو براہِ راست کسی جرم میں شریک نہیں تھے مگر تھے دبنگ لوگ۔ اس نے اپنی بڑھی ہوئی شیو کو کھجا کر ہولے سے کہا۔ ''وقاص بھائی! چھوٹا منہ بڑی بات کر رہا ہوں۔ اس منڈے نے سجاول صاحب کو بڑا دکھ پہنچایا ہے۔ پہلے ان کے بیوی بچے کو مارنے کی کوشش کی......پھر سجاول صاحب پر حملہ کیا، پھر ان کی بہن کی عزت خراب کی اور ان کی خالہ کی جان لی......لیکن آپ اسے بے گناہ کہہ رہے ہیں؟''

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''وہ بے گناہ ہے، اسی لیے کہہ رہا ہوں۔ کچھ باتوں کا تمہیں پتا نہیں......اور سجاول کو بھی نہیں......''

''آپ کا مطلب ہے کہ یہ سب کچھ اس منڈے نے نہیں کیا؟''

''اس سے کرایا گیا ہے۔ مجبور کر کے کرایا گیا ہے۔ بہرحال یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔ بعد میں سمجھ میں آ جائے گا سب کچھ۔ ابھی ہمیں کسی بھی طرح وہاں پہنچنا ہے اور ان کے

درمیان بیچ بچاؤ کرانا ہے۔''
''مگر بھائی جی، وہ جو قتل ہوگیا ہے اس کا کیا ہوگا؟'' وہ شاید بحث کے موڈ میں تھا۔
میں نے اسے گھورا۔ ''میں نے تم سے کہا ہے ناں یونس، یہ وقت ان باتوں کا نہیں۔ بعد میں تمہیں بتاؤں گا سب کچھ۔''
ہمارے قریب سے ایک بڑی لگژری جیپ گزری۔ اس کی پچھلی اسکرین پر دارج داراب کے باپ کا ایک رنگین پوسٹر چسپاں تھا۔ جس میں اس شخص کو قوم اور ملک کا سچا خیر خواہ اور ہمدرد بتایا گیا تھا۔ ایسے پوسٹر اور بینرز پتا نہیں کہاں کہاں لگے تھے لیکن جو پوسٹر میرے دل پر لگ چکا تھا اس کی سیاہی کبھی ماند پڑنے والی نہیں تھی۔ اس شہ زور فیملی کے ایک شہ زور فرزند نے میری تاجور کو مجھ سے جدا کیا تھا...... اور میں جانتا تھا کہ وہاں اس کی زندگی ایک کنیز کی زندگی سے بھی بدتر رخ اختیار کرنے والی ہے۔
میں نے خیالات کی اس اچانک ابھرنے والی لہر کو بمشکل اپنے ذہن سے دور کیا۔ گاڑی برق رفتاری سے رواں تھی۔ ابھی ہم راولپنڈی سے آگے نکلے ہی تھے کہ بارش کا آغاز ہوگیا۔ مسلسل بارش میں ہم جس وقت فتح جنگ پہنچے، رات کے تین بج چکے تھے۔ ہم نان اسٹاپ سفر کر رہے تھے۔ میں تھوڑے تھوڑے وقفے سے کسی موہوم امید کے سہارے سجاول کے نمبر پر بھی رابطے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہاں سے بس ایک ہی منحوس جواب تھا...... ''آپ کے مطلوبہ نمبر سے رابطہ ممکن نہیں۔''
میرے پردہ تصور پر بار بار انیق کا چہرہ چمکتا تھا...... اور وہ سارے مناظر نگاہوں میں گھوم جاتے تھے جو اب تک مجھے بے پناہ حیرت اور دکھ میں مبتلا کرتے رہے تھے۔ تب میرا دل بار بار مجھ سے یہی سوال کرتا تھا کیا ہمارا انیق ایسا ہوسکتا ہے؟
وہ جو مجھ پر جان قربان کرتا تھا جس نے کئی بار اپنی جان پر کھیل کر میری جان بچائی تھی۔ وہ جو مجھے اور تاجور کو ایک دیکھنے کے لیے تڑپا کرتا تھا، اس نے یہ سب کیوں کیا تھا؟ بندہ اپنی بے پناہ مصروفیات میں کئی باتوں کو بھول جاتا ہے مگر وہ باتیں اس کی زندگی سے نکلی نہیں ہوتیں۔ ہم بھی چند ماہ پہلے جاماجی سے آنے کے بعد، وہ باب بند کر بیٹھے تھے لیکن وہ بند نہیں ہوا تھا۔ وہ دشمنی ہنوز دھک رہی تھی اور اس کا قرض چکانے کے لیے جزیرہ جاماجی کی بدذات عورت یہاں پہنچ چکی تھی۔ وہ نئے دور کی جدید ساحرہ تھی۔ وہ اپنی آنکھوں میں شاید ہپناٹزم سے بھی آگے کی کوئی صلاحیت رکھتی تھی۔ وہ لوگوں کے دل و دماغ کو اپنے شکنجے میں جکڑ تی تھی اور قریباً دیوانہ بنا کر رکھ دیتی تھی۔

وہ دیوانگی ہی تو تھی جو اب تک انیق سے سرزد ہوتی رہی تھی۔ وہ مسلسل اس کے ''ٹرانس'' میں تھا۔ اس کا میرے متعلق جھوٹ بولنا، بند کمرے میں تاجور کو میرے خلاف بھڑکانا، تاجور پر غلط نگاہیں ڈالنا، سجاول کے بیوی بچے پر قاتلانہ حملہ...... اور اس کی بیوی کو شدید زخمی کر کے مہینوں کے لیے بستر پر ڈال دینا...... ہوٹل کے پارکنگ لاٹ میں سجاول کو گولیوں سے چھلنی کرنے کی کوشش اور اب سجاول کی قریبی عزیزہ کا قتل...... لیکن یہ سب کچھ انیق نے اپنی مرضی سے نہیں کیا تھا۔ وہ ایک کل پرزے کی طرح حرکت کر رہا تھا۔

فخر کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔ یونس کی وجہ سے اس نے مجھے وقاص کے نام سے مخاطب کیا اور بولا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے۔ یہ عورت سجیشن کے علاوہ میڈیکیشن کا استعمال بھی کرتی ہے۔ سنا ہے کہ آج کل اکثر ہپناٹسٹ اپنے معمول کو دوائیں وغیرہ بھی کھلاتے ہیں۔''

''مجھے اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں فخر، میں بس اتنا جانتا ہوں کہ یہ عورت اس جزیرے کی ایک انوکھی مخلوق ہے۔ اس کے بارے میں اَن گنت کہانیاں مشہور ہیں اور یہ خبیث اپنی ساری شیطانیت کے ساتھ یہاں موجود ہے۔ انیق کے رشتے دار بزرگ کی باتوں سے پتا چلتا ہے کہ وہ یہاں آتی جاتی رہتی ہے۔ پچھلے پانچ چھ مہینوں میں شاید تیسری یا چوتھی دفعہ یہاں آئی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ اس نے انیق کو مسلسل اپنے اثر میں رکھا ہوا ہے۔''

فخر نے کہا۔ ''باباجی بتا رہے تھے کہ اس مرتبہ وہ ڈھائی تین مہینے بعد یہاں آئی ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ ڈھائی تین مہینے وہ انیق سے دور تھی۔ تو کیا اس دوران بھی انیق اس کی زد میں تھا؟''

''ہمیں ابھی کچھ پتا نہیں فخر، کیا پتا وہ انیق کو اپنے ساتھ ہی لے گئی ہو اور وہ اس کے ساتھ ہی رہا ہو۔ ویسے جہاں تک میری معلومات ہیں ایسے ماہر عامل فاصلے پر رہ کر بھی اپنے معمول کو اپنے ٹرانس میں رکھ سکتے ہیں۔''

فخر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہاں ایک جرمن ہپناٹسٹ کے بارے میں خبر پڑھی تھی میں نے۔ وہ فون کے ذریعے اپنے معمول کو ''سجیشن'' دیتا تھا اور معمول اس پر عمل کرتا تھا...... لیکن یار! ایک بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔ اگر یہ ایسی ہی دبنگ اور خطرناک عورت ہے تو اس نے وہاں اس دور دراز گاؤں میں جا کر انیق کو کیوں آلہ کار بنایا، وہ خود بھی تو سجاول اور انیق کو من چاہا نقصان پہنچا سکتی تھی۔''

''تمہارا سوال اپنی جگہ درست ہے مگر کچھ لوگ ایسے بھی تو ہوتے ہیں جن کو، اپنے ایک

دشمن کو دوسرے دشمن کے ذریعے مروا کر ہی زیادہ تسکین ملتی ہے۔ بہرحال ابھی تو یہ سارے مفروضے ہی ہیں۔''

ہماری باتیں، یونس حیرانی سے سن رہا تھا۔ کچھ اس کی سمجھ میں آرہی تھیں، کچھ نہیں۔ میرا دھیان بار بار خورسنہ اور اس کے بچے کی طرف بھی جا رہا تھا۔ ہم نہایت ناقابلِ بھروسا حالات سے گزر رہے تھے اور سجاول تو آتشیں بگولے کی طرح انیق کے پیچھے نکل گیا تھا۔ میں نے یونس سے پوچھا۔ ''سجاول صاحب کی بیگم اور بچے کی حفاظت کا کوئی انتظام ہے؟''

''ہاں جی، میں نے اپنے دو چوکس بندوں کو چوبیس گھنٹے سجاول صاحب کے گھر کی حفاظت پر لگایا ہوا ہے، آپ بے فکر رہیں۔''

پنڈی سے کوہاٹ جانے والی سڑک کو فتح جنگ روڈ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ بہت اچھا راستہ تو نہیں تھا، تاہم اگر ہم اچھی رفتار سے چلتے رہتے تو ہمیں ڈیڑھ دو گھنٹے میں کوہاٹ پہنچا سکتا تھا۔ جوں جوں ہم پنڈی کوہاٹ روڈ پر آگے بڑھتے رہے، بارش کی شدت بڑھتی رہی۔ فخر اور یونس کو تو شاید تھوڑی بہت بھوک محسوس ہو رہی ہو لیکن میری بھوک، خالی پیٹ ہونے کے باوجود مری ہوئی تھی۔ میں جلد سے جلد کوہاٹ پہنچنا چاہتا تھا۔

کچھ آگے جا کر میں نے محسوس کیا کہ مسلسل ڈرائیونگ نے فخر کو کچھ تھکا دیا ہے۔ میں نے لبِ سڑک ایک بس اڈے پر گاڑی رکوائی۔ پیٹرول لیا...... کچھ جوسز اور بسکٹس وغیرہ پکڑے اور ڈرائیونگ سیٹ خود سنبھال لی۔ میرے خیال میں، میں نے زندگی کی جو مشکل ترین ڈرائیوز کی ہیں، وہ ان میں سے ایک تھی۔ ہمارا پہلا ٹارگٹ تو باغ پہنچنا تھا۔ اس کے بعد یونس کے انفارمر آصف خان کو ساتھ لے کر اس پہاڑی ایریا میں جانا تھا جہاں انیق اور سجاول موجود تھے۔

ہم نے پنڈی کوہاٹ روڈ پر 60 کلومیٹر کا فاصلہ قریباً 45 منٹ میں طے کیا اور موسم اور راستے کو دیکھا جاتا تو یہ بڑی اچھی رفتار تھی۔ اچانک مجھے گاڑی کی رفتار آہستہ کرنا پڑی۔

''کیا ہوا؟'' اونگھتے ہوئے یونس نے پوچھا۔

''لگتا ہے ٹریفک جام ہے۔''

گاڑیوں اور ٹرکوں کی ایک قطار کے پیچھے ہمیں رکنا پڑا۔ فخر تیزی سے نیچے اترا۔ یونس بھی اس کے ساتھ گیا۔ انہوں نے آگے جا کر دیکھا۔ ایک دو بندوں سے بات کی پھر واپس آ گئے۔ یونس پمپ والا ہانپی ہوئی آواز میں بولا۔ ''گڑبڑ ہو گئی جی۔ آگے ایک بڑا لوڈر سڑک کے درمیان پلٹی ہو گیا ہے۔ کوئی دو فرلانگ کی لائن لگی ہوئی ہے۔''

میں نے بے ساختہ ماتھے پر ہاتھ مارا۔ ”اب کیا ہوگا؟“ میں نے پوچھا۔
یونس بولا۔ ”وقاص بھائی، لیٹ نہ کریں جلدی سے واپس موڑیں۔“
میں نے گاڑی کو واپس موڑ لیا۔ ایک دو اور گاڑیاں بھی واپس مڑ رہی تھیں۔
”اب کیا کرنا ہے؟“ میں نے پریشان لہجے میں پوچھا۔
یونس پمپ والا پنجاب اور پختونخواہ میں کافی سفر کر چکا تھا۔ ان راستوں کا شناور تھا، بولا۔ ”پشاور روڈ والا چکر تو بہت زیادہ لمبا ہے۔ پندرہ بیس میل پیچھے ایک اور چھوٹی سڑک بھی نکلتی ہے مگر ایک دو پٹھان ڈرائیوروں نے بتایا تھا کہ اس کا بہت برا حال ہے۔ ایک دو پلیاں بھی ٹوٹی ہوئی ہیں۔“
”کوئی رستہ نکالو یار، کسی پرانے ٹرک ڈرائیور کو فون وغیرہ لگاؤ۔“
اس نے سگریٹ سلگا کر مٹھی میں دبایا اور ایک لمبا کش کھینچ کر بولا۔ ”فون لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میری اپنی عمر بھی ان رستوں پر ہی گزری ہے۔ یہاں سے کوئی چار میل پیچھے ایک پرانی سڑک ہے۔ سات آٹھ میل کا راستہ ہے۔ اگر ہم وہاں سے نکل جائیں تو نہ صرف اس 'جام ٹریفک' سے جان چھوٹ جائے گی بلکہ سفر بھی کم از کم بیس بائیس میل کم ہو جائے گا۔“
”تمہارا مطلب ہے کہ شارٹ کٹ ہے؟“ فخر نے پوچھا۔
”بالکل شارٹ کٹ ہے مگر اس سڑک کا کوئی تین میل کا ٹوٹا امراجوں کی پراپرٹی سے گزرتا ہے۔ انہوں نے کوئی جھگڑا کھڑا کیا ہوا ہے...... اور وہاں پھاٹک لگا رکھے ہیں۔ جب موڈ زیادہ خراب ہوتا ہے تو پھاٹک بند کر دیتے ہیں۔“
”یہ زندگی موت کا سوال ہے یار، ہم ان کا منت ترلا کر لیں گے۔“ میں نے کہا۔
”ویسے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آج کل پھاٹک بند نہ ہوں۔“ یونس نے امید دلائی۔
”یہ امراجے ہیں کون؟“
”علاقے کے ملکوں کی کوئی برادری ہے۔ کہتے ہیں کہ مشہور ڈاکو چراغ بالی جب قانون سے چھپتا پھر رہا تھا تو کچھ عرصے اس علاقے میں بھی رہا تھا۔ کافی ڈاھڈے لوگ ہیں۔“
”چلو دیکھا جائے گا۔“ میں نے کہا اور گیئر لگا کر گاڑی آگے بڑھا دی۔
تین چار میل پیچھے جا کر ہم ایک تاریک سنسان سڑک پر مڑے۔ دونوں طرف ٹیلے اور پہاڑیاں تھیں۔ تنگ سڑک ان کے درمیان سے بل کھاتی گزرتی تھی۔ بارش کچھ ہلکی ہوگئی تھی مگر بدستور برس رہی تھی۔ ”گن وغیرہ تیار کر لیں؟“ فخر نے بوجھل خاموشی کو توڑنے کے لیے

ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

"بالکل کرلو۔" میں نے بھی رسمی انداز میں جواب دیا۔

اس وقت ہمیں ہرگز اس بات کا یقین نہیں تھا کہ دس پندرہ منٹ بعد میں واقعی ان ہتھیاروں کی ضرورت پیش آجائے گی۔ اس سڑک پر ہم دوڈھائی کلومیٹر ہی آگے گئے تھے کہ وہ پھاٹک نظر آگیا جس کا "ذکر خیر" یونس نے کیا تھا۔ پھاٹک بند تھا۔ موٹی سی زنجیر میں بھاری قفل لگا ہوا تھا۔ قریب ہی ایک بڑا سا سائبان تھا جس کی تین جانب پتھروں کی آٹھ نو فٹ اونچی دیوار تھی۔ سائبان کے اندر الاؤ روشن تھا اور رائفل بردار افراد نظر آرہے تھے۔ گاڑی دیکھ کر دو مسلح افراد لپکتے ہوئے ہماری طرف آئے۔ انہوں نے سروں پر چھتریاں تان رکھی تھیں۔ میں نے گاڑی کی کھڑکی کا شیشہ تھوڑا سا اتار لیا۔ ایک ہٹے کٹے شخص نے پہلے تو پشتو زبان میں کچھ کہا۔ پھر یہ جان کر کہ ہم پشتو نہیں سمجھ پارہے، ٹوٹی پھوٹی اردو میں بولا۔ "کون ہو تم......اور یہاں کیا کرتے پھر رہے ہو؟"

یونس باہر نکل کر بولا۔ "یار! مین سڑک پر ایکسیڈنٹ ہوا ہے، ٹریفک رکی ہوئی ہے، ہمیں سخت ایمرجنسی ہے، ہمیں کوہاٹ پہنچنا ہے۔"

ہٹے کٹے شخص نے شرارتی انداز میں گاڑی کے اندر جھانکا اور بولا۔ "یہاں تو مجھ کو کوئی عورت نظر نہیں آتا جس کو بچہ ہونے والا ہو بلکہ سرے سے کوئی عورت نظر ہی نہیں آتا۔"

میں بھی بارش کی پروا کیے بغیر گاڑی سے اتر آیا۔ میں نے کہا۔ "میرے بھائی! یہ کسی کی زندگی موت کا سوال ہے۔ اگر ہم بروقت "باغ" نہ پہنچ سکے تو ایک بالکل بے گناہ شخص مارا جائے گا۔ ہم آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولیں گے۔ ہمیں یہاں سے نکل جانے دیں۔"

"بڑا ملک صیب ہمارا چمڑی اتروا کر اس میں گائے کا گوبر بھر دے گا۔ اس نے بالکل پابندی لگایا ہوا ہے۔" وہ روکھے پن سے بولا۔ ساتھ ساتھ وہ ہم سب کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔

اگلے تین چار منٹ میں ہم نے ان لوگوں کی ہر طرح منت سماجت کی لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ چار پانچ مزید بندے بھی سائبان کے نیچے سے نکل کر ہمارے اردگرد کھڑے ہو گئے تھے۔ آخر پھاٹک کی دوسری جانب سیاہ شلوار قمیص اور پگڑی والا ایک گرانڈیل شخص نظر آیا۔ اس نے بھی اپنے سر پر چھتری تان رکھی تھی۔ ہاتھ میں ٹارچ تھی۔ اس نے پشتو زبان میں اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کچھ کہا۔ غالباً اس نے یہی کہا تھا کہ اگر یہ نہیں مان رہے تو پھر کھول دو گیٹ......

تالا کھول کر گیٹ کے پٹ وا کر دیئے گئے۔ ہم نے گرانڈیل شخص کا شکریہ ادا کرتے ہوئے گاڑی آگے بڑھائی...... اس نے بھی مسکرا کر جواب دیا مگر گاڑی پانچ چھ گز ہی آگے گئی ہو گی کہ ہمیں ایک اور چھوٹا پھاٹک نظر آ گیا۔ میں نے پھر بریک لگا دیئے۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو بڑا گیٹ بھی بند ہو چکا تھا۔

گرانڈیل شخص مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا آگے آیا اور بولا۔ ''ام نے تو تم سے بہت کہا تھا کہ واپس چلے جاؤ، اب تم نہیں مانے تو تمہاری مرضی لیکن آگے جانے سے پہلے تم کو تلاشی ملاشی تو دینا ہو گا۔ دومنٹ کے لیے باہر آ جاؤ۔''

فخر نے میری طرف اور میں نے فخر کی طرف دیکھا۔ ہمیں اندازہ ہو گیا تھا کہ بلا ٹلی نہیں ہے۔ رائفلوں والے چھ سات افراد ہمارے گرد جمع ہو چکے تھے۔ میں اور فخر باہر آ گئے۔ مجبوراً یونس کو بھی آنا پڑا۔ وہ موجودہ صورتِ حال میں کچھ گھبرا سا گیا تھا۔

گرانڈیل شخص نے پشتو میں اپنے ایک ساتھی سے کچھ کہا۔ وہ آگے بڑھا اور ہماری تلاشی شروع کر دی۔ پہلے فخر کی جیب سے دو تین ہزار کی نقدی اور موبائل فون نکالا گیا پھر یونس کو نقدی، گھڑی اور موبائل فون سے محروم کیا گیا۔ اب شک شبہے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ عین ممکن تھا کہ یہ لوگ ہمیں گاڑی سے بھی محروم کرنے کی کوشش کرتے۔ جونہی تلاشی لینے والے نے میری پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا میں نے سر کی زوردار ٹکر عین اس کی طوطے جیسی ناک پر رسید کی۔ وہ گرانڈیل شخص کے پاؤں پر جا کر گرا۔ ایک دم کئی رائفلیں ہماری طرف سیدھی ہو گئیں لیکن کوئی فائر نہیں ہوا...... اس کی وجہ غالباً یہی تھی کہ گرانڈیل شخص نے کسی کو بھی فائر کرنے سے روک دیا تھا...... وہ لمبے ڈگ بھرتا ہوا عین میرے سامنے آیا اور دانت پیس کر بولا۔ ''اوئے بدبختا! یہ کیا کر دیا تم نے؟ اپنا موت کو خود آواز دے کر اپنے پاس بلا لیا۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے ایک بھرپور طمانچہ میرے چہرے پر رسید کرنا چاہا۔ میں نے اطمینان سے اس کا یہ ''وار'' خالی دیا اور اس کا گریبان اپنی مٹھی میں جکڑ لیا۔

ایک بار پھر رائفلیں میری طرف سیدھی ہوئیں اور کرخت آوازیں بھی ابھریں مگر گرانڈیل شخص نے اب بھی فائر سے روک دیا۔ اندازہ ہوا کہ وہ لوگ یہاں پر فائر ''افورڈ'' نہیں کر رہے۔ فائرنگ سے انہیں کوئی اندیشہ لاحق ہو سکتا تھا۔

گرانڈیل شخص کا پارا اب ساتویں آسمان کو چھو رہا تھا۔ اس نے گالی دی اور منہ سے جھاگ اڑاتے ہوئے بولا۔ ''خوانہی ہاتھوں سے تم ابھی میرے پاؤں کو پکڑے گا۔''

اس کے ساتھ ہی وہ مجھ پر پل پڑا۔ اس کے ساتھی، فخر اور یونس پر جھپٹ پڑے

فائرنگ پر بات چلی جاتی تو اور معاملہ تھا۔ دوبدولڑائی میں یہ قبائلی غنڈے میرا اور فخر کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ ہاں یونس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اس پر دو قد آور قبائلی حملہ آور ہوئے تھے اور رائفل کے دستوں سے اسے کوٹ رہے تھے۔ میں نے اپنے ایک مدِمقابل کی چھاتی پر ٹانگ رسید کر کے اسے آٹھ دس فٹ گہری کھائی میں پھینکا اور یونس کی مدد کو لپکا۔

ایک ڈیڑھ منٹ کے مختصر وقفے میں ہی حملہ آوروں کو اندازہ ہو گیا کہ وہ غلط جگہ متھا لگا بیٹھے ہیں اور خالی ہاتھ وہ ہم سے نمٹ نہیں سکیں گے۔ اب وہ کسی بھی وقت ہتھیار استعمال کر سکتے تھے۔ میں نے جست لگا کر گرانڈیل قبائلی کو عقب سے دبوچ لیا اس کے ہولسٹر میں 38 بور کا وزنی ریوالور موجود تھا۔ میں نے ریوالور ہولسٹر میں سے کھینچ کر اس کی کنپٹی سے لگا دیا۔

''خبردار! کھوپڑی توڑ دوں گا اس کی...... پیچھے ہٹ جاؤ۔'' میں نے چلا کر کہا۔

رائفل ابھی تک گرانڈیل شخص کے ہاتھ میں تھی مگر اس کی گردن پر اتنا شدید دباؤ تھا کہ وہ میری مرضی کے بغیر رائفل بھی استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ چند سیکنڈ پہلے تک وہ فخر سے گتھم گتھا تھا۔ فخر نے آگے بڑھ کر رائفل گرانڈیل شخص کے ہاتھوں سے جھپٹ لی اور چند قدم پیچھے پلٹ کر اس کا رخ مسلح قبائلیوں کی طرف کر دیا۔ ان سب کے تیور خطرناک تھے۔ ان میں سے کسی نے ابھی تک میری ہدایت پر عمل نہیں کیا تھا۔ شاید ان کو یقین تھا کہ ان کا طاقتور سرغنہ کوئی پلٹی شلٹی مار کر میری گرفت سے نکل جائے گا لیکن ایسے NECK LOCKS بڑے بڑے پروفیشنل فائٹرز کو بھی بے بس کر دیتے ہیں۔ اپنی وارننگ کو مزید مؤثر بنانے کے لیے میں نے ایک فائر سرغنہ (سرخیل) کی پنڈلی پر کیا اور ریوالور پھر اس کی کنپٹی سے لگا دیا۔ گرانڈیل سرغنہ درد سے کراہ اٹھا تھا۔ ''دوسری گولی اس کے بھیجے میں جائے گی۔'' میں نے گرج کر کہا۔

بجلی زور سے چمکی اور اس نے میری گرج کا ساتھ دیا۔ بیشتر چھتریاں اُڑ چکی تھیں۔ بارش کی بوچھاڑیں اب براہِ راست ہمیں اور حملہ آوروں کو بھگو رہی تھیں۔ چند افراد پیچھے ہٹ گئے لیکن رائفلیں انہوں نے اب بھی نیچے نہیں کیں۔ میں نے بے دریغ دوسرا فائر گرانڈیل کی دُمی ٹانگ پر کیا اور ریوالور دوبارہ اس کے کھوپڑے سے ''چپک'' کر دیا۔ اس مرتبہ وہ تڑپ اٹھا تھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے ساتھیوں کو پیچھے ہٹ جانے کا کہا۔

اس کے ساتھی بھی سمجھ گئے تھے کہ ''باس'' مصیبت میں ہے...... یعنی اونٹ پہاڑ کے نیچے آ گیا ہے۔ انہوں نے پسپائی کا انداز اختیار کیا اور چند قدم پیچھے ہٹ گئے، ان کی رائفلوں

کے ''بیرلز'' کا رخ بھی زمین کی طرف ہو گیا تھا۔ میری گرفت میں پھنسا ہوا شخص اب بلند آواز میں کراہ رہا تھا۔ یقیناً اس کی گھیر دار شلوار گھٹنے سے نیچے خون سے تر ہو چکی تھی۔ ''رائفلیں نیچے پھینک دو اور ہاتھ اٹھاؤ۔'' میں نے اس کے ساتھیوں کو ہدایت کی۔

تھوڑی سی پس و پیش کے بعد انہوں نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ اس دوران میں فخر بھی گاڑی میں سے سیون ایم ایم نکال چکا تھا۔ اس نے ہاتھ نہ اٹھانے والے دو افراد کے پاؤں کے پاس فائر بھی دے مارے۔ یہ لوگ اب جان چکے تھے کہ غلطی سے انہوں نے عام شہریوں کے بجائے اپنے سے کہیں زیادہ تگڑے لوگوں پر ہاتھ ڈال دیا ہے اور اگر اب بھی انہوں نے خرد ماغی کا مظاہرہ کیا تو ''باس'' کی لاش سب سے پہلے گرے گی۔

میں گرانڈیل باس کو گھسیٹتا ہوا گاڑی کے پاس لے گیا۔ اس کی ایک ٹانگ تقریباً ناکارہ تھی اور زمین پر گھسٹتی ہوئی آرہی تھی۔

فخر نے ایک شخص کو حکم دیا کہ وہ چھینے ہوئے موبائل اور نقدی وغیرہ واپس ہماری گاڑی میں رکھے۔ برساتی پہنے ہوئے اس شخص نے فوراً سے پہلے اس ہدایت پر عمل کیا۔ ہماری اشیاء گاڑی کی پچھلی نشست پر رکھ دی گئیں۔ یہ لوگ پوری طرح دب گئے تھے۔ اگر ہم اس وقت ان کی گھڑیاں، نقدی اور موبائل وغیرہ لینا چاہتے تو بھی لے سکتے تھے تاہم اس شغل میلے کا وقت ہمارے پاس نہیں تھا۔ میں نے لحیم شحیم سرغنہ کو گھما کر گاڑی کی پچھلی نشست پر پھینکا۔ فخر نے اس کی لمبی ٹانگیں سمیٹ کر گاڑی کے اندر کیں اور دروازہ بند کر دیا۔ پھر اس کی رائفل بھی اٹھا کر گاڑی میں رکھ لی۔

میں نے اس کے دم بخود ساتھیوں کی طرف دیکھا اور وارننگ دی۔ ''اگر مزید کوئی حرامزدگی نہیں کرو گے تو تمہارے اس باپ کو آگے جا کر چھوڑ دیں گے۔ چلو کھولو اس پھاٹک کو۔''

ایک بندہ جس کے گھٹنے پر کاری چوٹ لگی تھی لنگڑاتا ہوا پھاٹک کی طرف گیا۔ لرزتے ہاتھوں کے ساتھ اس نے کھٹکا ہٹایا اور پھاٹک کھول کر مؤدب کھڑا ہو گیا۔ میں نے گاڑی آگے بڑھائی اور برق رفتاری سے اسے اونچے نیچے سیاہ ٹیلوں کے درمیان بھگاتا چلا گیا۔ جگہ کم تھی لہٰذا گرانڈیل سرغنہ گٹھڑی سا بن گیا تھا۔ وہ کراہنے اور بڑبڑانے کے سوا اور کچھ نہیں کر پا رہا تھا۔ یونس نے احتیاط کے طور پر اس کا ریوالور اس کی پسلیوں سے لگا رکھا تھا۔ آج کی رات یقیناً اس مغرور شخص اور اس کے متکبر ٹولے کے لیے بھیانک ثابت ہوئی تھی۔ وہ شخص پشتو تو بول رہا تھا لیکن شاید اصل نسل کا پٹھان نہیں تھا۔ اس کا رنگ خاصا سانولا تھا، نقوش بھی

عام پٹھانوں سے کافی مختلف تھے۔

فخر نے اس کا ''چوڑا ہاتھی جیسا کان'' مروڑتے ہوئے کہا۔'' لگتا ہے کہ آپ نے لوٹ مار کرنے کی یہ ڈگری کسی بڑی گندی سی یونیورسٹی سے لی ہوئی ہے۔ اسی لیے تو آٹھ دس ساتھیوں کے باوجود آپ ایک چھوٹی سی ''اسائنمنٹ'' بھی ٹھیک سے کر نہیں پائے...... اگر آپ کے اندر مادۂ عقل کی بالکل قلیل سی مقدار بھی موجود ہے تو آئندہ کے لیے راہ زنی سے توبہ فرمالیں۔''

وہ پتا نہیں فخر کی گاڑھی اردو پوری طرح سمجھا یا نہیں لیکن بڑبڑانے والے انداز میں بولا۔'' تم لوگوں نے یہ اچھا نہیں کیا۔ تم ان امراجوں کو جانتا نہیں ہے، یہ تمہارا جینا حرام کر دے گا۔''

''ایسی کی تیسی تیرے ان امراجوں کی۔'' یونس نے ایک کلاسیکل گالی سے اپنے اس فقرے کو مزین کیا۔ دھینگا مشتی میں یونس کی ناک کا پکوڑا بنا ہوا تھا اور اس کی آنکھوں سے مسلسل پانی بہہ رہا تھا۔

فخر میرے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھا تھا۔ اس نے مڑ کر سرغنہ کو مخاطب کیا اور بولا۔ '' آپ کے ان خادموں کے پاس وقت کم ہے، ورنہ ابھی آپ کے امراجوں سے شرفِ ملاقات حاصل کر کے جاتے، آپ جناب کو یہ دیکھ کر بڑی مسرت حاصل ہوتی کہ آپ کی طرح ہم ان کی اکڑ خانی کا بھی اخراج براستہ ناک کرتے...... اور عین ممکن تھا کہ ان کو آپ کے سامنے ایک قطار میں مرغا بھی بنا دیتے۔ چلو کوئی بات نہیں محترم...... یار زندہ صحبت باقی۔''

امراجوں کی پراپرٹی سے نکلنے کے بعد اور ایک محفوظ فاصلے پر جا کر ہم نے زخمی سرغنہ کو جھاڑ جھنکاڑ میں پھینک دیا، تاہم اس کی رائفل اور کچھ دیگر اشیا ہمارے پاس ہی رہیں۔ امید یہی تھی کہ کچھ دیر میں اس کے ساتھی اس کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں پہنچ جائیں گے۔ فی الحال ہمیں اپنے پیچھے دور دور تک کوئی روشنی نظر نہیں آ رہی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد ہماری گاڑی یہ ہنگامہ خیز شارٹ کٹ لگانے کے بعد ایک بار پھر مین روڈ پر تھی۔ مار کٹائی میں تھوڑا سا وقت ضرور ضائع ہوا تھا پھر بھی ہمیں دو بڑے فائدے ہوئے تھے۔ ایک تو ہم ایک لمبے چوڑے ''ٹریفک جام'' سے بچ گئے تھے، دوسرے ہم نے اپنے وقت میں سے کم از کم آدھا گھنٹہ بچا لیا تھا۔

O......❖......O

اب دن کی روشنی پھیل چکی تھی۔کوہ و دمن روشن ہورہے تھے لیکن یہ ملگجی سی روشنی تھی۔ بے آب وگیا پہاڑیاں بارش میں بھیگی ہوئی تھیں اور بادلوں کے سیاہ ٹکڑے اب بھی چوٹیوں پر جھکے ہوئے تھے۔ بارش اب ایک ہلکی لیکن مسلسل پھوار کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ پہاڑی راستوں پر ایسے موسم میں تیز رفتاری سے ڈرائیونگ نہیں کی جاسکتی مگر میں یہ رسک بھی لے رہا تھا۔ایک دوجگہ لینڈ سلائیڈنگ کے آثار بھی نظر آئے۔

فخر سیل فون تھامے میرے پہلو میں بیٹھا تھا اور وقتاً فوقتاً سجاول اور آصف خان کے نمبر پر ٹرائی کررہا تھا۔ اچانک آصف خان سے رابطہ ہوا۔ اس نے خود فخر کے نمبر پر کال کی تھی۔

''کیا خبر ہے خان بھائی؟'' فخر نے پوچھا۔ لہجے میں بے تابی تھی۔

''ایک لحاظ سے تو اچھا خبر ہی ہے۔آپ ام کو بتائیں کہ کہاں پہنچے ہیں۔''

میں نے فون فخر کے ہاتھ سے لے لیا اور آصف خان کو بتایا۔''سائن بورڈز کے مطابق ہم باغ سے پچیس میل دور ہیں لیکن تمہارے پاس خبر کیا ہے؟''

وہ انکشاف انگیز انداز میں بولا۔''برادر! اس جگہ کا پتا چل گیا ہے جہاں پائرنگ فائرنگ) ہورہا ہے۔شہر سے پانچ چھ میل کا دوری ہے صرپ۔''

''کس کے درمیان فائرنگ ہورہی ہے؟'' میں نے بے تاب ہوکر پوچھا۔

''اسی لڑکے اور سجاول صاحب کے درمیان۔ زرق خاں صاحب بھی وہیں پر موجود ہے۔''

''اس لڑکے کے ساتھ اور کون ہے؟''

''اب تک کی خبروں کے مطابق اس کے ساتھ تین بندہ اور تھا۔ ایک تو پہلے ہی زخمی حالت میں پکڑا گیا۔ باقی دو میں سے ایک اور مارا گیا ہے۔خو، اب تو یہی لگتا ہے کہ اس کے ساتھ شاید ایک بندہ ہے...... یا شاید وہ بھی نہیں ہے۔''

''آصف خان! کیا سجاول سے اب بھی رابطہ نہیں ہوسکتا؟''

''برادر! ام نے آپ کو بتایا ہے ناں کہ سگنل کا بچہ بھی وہاں نہیں پہنچتا۔ آدھا گھنٹہ پہلے صرف چار پانچ سیکنڈ کے لیے سجاول صیب کے نمبر پر گھنٹی گیا تھا۔اس وقت شاید وہ کسی اونچی جگہ پر ہوگا، اس کا بس ''ہیلو'' ہی سنائی دیا پھر لائن کٹ گیا۔''

میں نے کہا۔''آصف خان کوشش جاری رکھو، اگر رابطہ ہو جائے تو اس کو کہو تمہارے ایک دوست شاہ زیب کی طرف سے تمہارے لیے پیغام ہے۔اس لڑکے انیق کی بے گناہی کا پتا چلا ہے، اس کی جان نہیں جانی چاہیے۔''

آصف خان نے میری بات کا جواب اثبات میں دیا۔ میں نے کہا۔ ''آصف خان لگتا ہے کہ ہم آدھے گھنٹے میں تم تک پہنچ جائیں گے۔ تم یونس سے بات کرو اور وہ جگہ طے کرو جہاں تم سے ہم کو ملنا ہے۔ ہمارے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت بالکل نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے برادر۔'' وہ ہمدردانہ لہجے میں بولا۔

میں نے فون یونس کو تھما دیا۔ وہ یہاں کے پہاڑی راستوں اور سڑکوں وغیرہ سے واقف تھا، اس نے آصف سے بات کی اور اسے آبادی سے باہر ہی ایک ایسی سڑک پر بلا لیا جہاں سے ہم شہر میں جانے کے بجائے سیدھا پہاڑیوں کی طرف نکل سکتے تھے۔

○......❖......○

ایک بار پھر بادل گھر کر آ گئے تھے اور دن میں ہی رات کا سماں نظر آنے لگا تھا۔ ہمارا معاون آصف خان نہایت ذہین اور جہاندیدہ شخص لگتا تھا۔ ایک ہمدرد دوست اور اچھے معاون کی ساری خصوصیات اس میں دکھائی دیتی تھیں۔ وہ میرے ساتھ ایک پرانی لیکن نہایت طاقتور بریڈفورڈ جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا اور مشاقی سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ اس کے نچلے ہونٹ میں دبی ہوئی نسوار اس کی چوکسی اور توانائی میں شاید اضافہ ہی کر رہی تھی۔ ہم نے اپنی بلینو کار وہیں پر چھوڑ دی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''آصف، لوکیشن کا پتا کیسے چلا ہے تمہیں؟''

وہ بولا۔ ''اسے اوپر والے کا مہربانی ہی سمجھیں۔ وہاں ہونے والی پائرنگ میں ملک زرق کا ایک کارندہ شدید زخمی حالت میں یہاں شہر لایا گیا تھا۔ وہیں سے پتا چلا ہے کہ سجاول صیب اور ملک زرق خاں کس جگہ پر ہے۔''

پتھروں سے بنے ہوئے سخت ناہموار راستے پر ہم نے قریباً پانچ کلومیٹر سفر کیا۔ اس سے آگے کا راستہ بالکل ناپید ہو گیا یوں لگتا تھا کہ اب پیدل ہی چلنا پڑے گا مگر آصف خان کسی نہ کسی طرح جیپ کو آگے بڑھاتا رہا۔ بارش پھر تیز ہو گئی، ہمارے لباس غتربود ہو چکے تھے تاہم ہم نے اپنے ہتھیار اور ایمونیشن وغیرہ پلاسٹک کی شیٹ میں لپیٹ رکھے تھے۔

''پائر (فائر) کا آواز آ رہا ہے۔'' آصف خان نے چونک کر کہا۔

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ دور کہیں پہاڑیوں کے اندر چند فائر سنائی دیئے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ ہم منزل کے قریب ہیں۔

جیپ بری طرح ڈگمگا رہی تھی۔ کسی وقت تو لگتا تھا کہ الٹ ہی جائے گی۔ میں نے ایک بار پھر سجاول کے نمبر پر ٹرائی کیا۔ سینے میں دل اچھل کر رہ گیا۔ سجاول کے نمبر پر بیل

جا رہی تھی۔ پانچ چھ بار بیل ہوئی مگر فون اٹینڈ نہیں ہوا۔ میں نے دوبارہ کال کی اور پھر تیسری دفعہ بھی۔ تیسری مرتبہ کال ریسیو کی گئی۔ ''ہیلو سجاول...... ہیلو یہ میں بول رہا ہوں۔ انیق کو کچھ نہیں ہونا چاہیے...... میں تمہارے پاس آ رہا ہوں۔ تمہیں سب بتاتا ہوں......''

میں نے اپنی آواز سجاول کی سماعت تک پہنچانے کے لیے ایک سیکنڈ بھی ضائع نہیں کیا۔ ''ہیلو...... ہیلو......'' سجاول کی بھاری پاٹ دار آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ آواز ٹوٹ ٹوٹ کر آ رہی تھی۔

میں نے پھر اپنی بات دہرائی۔ اسی دوران میں سلسلہ منقطع ہو گیا۔ میں نے کہا۔

''آصف، راستہ اب کچھ بہتر ہے۔ رفتار بڑھاؤ۔''

آصف نے رفتار بڑھا دی۔ چند منٹ بعد ہمیں نشیب میں ان جیپوں کی جھلک نظر آ گئی جن پر سجاول اور ملک زرق خاں یہاں پہنچے تھے۔ اِکا دُکا افراد بھی حرکت کرتے دکھائی دیے، تاہم فائرنگ کی آواز اب معدوم تھی۔

چار پانچ منٹ بعد ہم موقع پر موجود تھے۔ یہاں کا منظر بڑا سنسنی خیز تھا۔ ایک طرف چٹائی پر زرق خاں کے دو بندوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ دو تین بندے زخمی حالت میں تھے۔ ان کو گولیاں لگی تھیں۔ تاہم ان کی حالت خطرے والی نہیں تھی۔ پچاس ساٹھ میٹر کے فاصلے پر دو ٹیلوں کے درمیان سے دھواں سا اٹھ رہا تھا۔

سجاول کے کندھے سے رائفل جھول رہی تھی اور چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا اور بے حد حیران نظر آیا، میں لپک کر اس کی طرف گیا۔ ''سجاول! یہ بہت برا ہوا ہے، یہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ مجھے تمہارے نقصان کا افسوس ہے اور انیق کے نقصان کا بھی، انیق کہاں ہے؟''

''ابھی پتا چل جاتا ہے۔'' وہ زہریلے لہجے میں بولا اور اس کی نگاہ بے ساختہ اس دھوئیں کی طرف چلی گئی جو ٹیلوں کے درمیان سے اٹھ رہا تھا۔

''یار پہیلیاں نہ بجھواؤ، مجھے بتاؤ۔ وہ ٹھیک تو ہے ناں؟ کہاں ہے وہ؟'

سجاول نے جلتی نظروں سے مجھے دیکھا اور ٹیلوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''وہاں چھپا ہوا ہے کنجر کا تخم۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے نفرت سے ایک طرف تھوکا۔

میں نے تیزی سے دھوئیں کی طرف بڑھنا چاہا لیکن سجاول نے مجھے کالر سے پکڑ کر روک لیا۔ ''ذرا چھری کے تلے سانس لو۔ کہیں تمہیں بھی نہ پھڑکا دے۔ بڑے بھانبڑ مچے ہوئے ہیں اس کے اندر۔''

میں نے سجاول کی گرفت سے اپنا کالر چھڑایا اور دھوئیں کی طرف بڑھا۔ سجاول کا پرانا ساتھی باقر بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر روک لیا۔ ہولے سے بولا۔ ''ادھر جانے سے کوئی فائدہ نہیں...... وہ شاید مر چکا ہے۔ ہم بس دھواں چھوڑ کر تسلی کر رہے ہیں۔''

زمین آسمان، جیسے میری نگاہوں کے سامنے گھوم گئے۔ ''کیا بکواس کر رہے ہو؟'' میں نے گھما کر ایک طمانچہ باقر کے منہ پر مارا اور اس کھوہ کی طرف بھاگا جس کے دہانے سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ ساتھ ساتھ میں پکارنے لگا۔ ''انیق! یہ میں ہوں۔ گولی نہ چلانا...... انیق......انیق۔''

بات میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ انیق نے کھوہ کے اندر سے سجاول اور زرق کا مقابلہ کیا ہے۔ اب یا تو وہ شدید زخمی ہو چکا تھا یا پھر اس کا ایمونیشن ختم ہو گیا تھا۔ اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آ رہا تھا۔ یہ دو درجن سے زائد لوگ اس کی مزاحمت سے اتنا ڈرے ہوئے تھے کہ کھوہ کے اندر نہیں گھس رہے تھے۔ انہوں نے دھواں چھوڑا تھا تا کہ اگر وہ زندہ ہے تو خود ہی باہر نکل آئے۔

میرے ایک ہاتھ میں رائفل اور دوسرے میں بڑے سائز کی ٹارچ تھی۔ بارش کی بوچھاڑ میں، میں جھک کر بھاگتا ہوا کھوہ کے دہانے پر پہنچا اور پھر سانس بند کر کے اندر گھس گیا۔ یہاں وہاں گولیوں کے خول چمک رہے تھے۔ یہ کھوہ زیادہ بڑی نہیں تھی۔ مجھے کسی چیز سے ٹھوکر لگی اور میں گرتے گرتے بچا۔ میں نے پلٹ کر ٹارچ کی روشنی اس رکاوٹ پر پھینکی اور میرا دل جیسے سینے میں دھڑکنا بھول گیا۔

میرے سامنے انیق تھا۔ ہاں وہ انیق ہی تھا۔ اس نے ہمیشہ کی طرح بے ڈھنگی سی پتلون شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے جسم پر کم وبیش دس گولیاں لگی ہوئی تھیں۔ دونوں ٹانگیں تو پوری طرح خون میں لتھڑی ہوئی تھیں۔ میں نے جو سانس سینے میں روک رکھی تھی، وہ مزید رکی نہ رہ سکی۔ ''انیق......انیق......'' میں نے اسے شانوں سے پکڑ کر بری طرح جھنجھوڑا۔

وہ بے حرکت تھا۔ میں نے اس کا ماتھا چوما اور اسے بازوؤں میں اٹھا کر باہر کی طرف بڑھا۔ دھواں میرے سینے میں بھی داخل ہو گیا تھا اور میں بری طرح کھانس رہا تھا۔ اپنی رائفل اور ٹارچ میں نے وہیں کھوہ میں پڑی رہنے دی تھی۔ کھوہ سے آٹھ دس قدم آگے آ کر میں نے اسے ایک ہموار پتھر پر لٹایا۔ اس کے گلے پر ہاتھ رکھ کر اس کی نبض ڈھونڈی، اس کے سینے سے کان لگایا۔ وہ ابھی زندہ تھا لیکن دھڑکن کسی بہت گہرے کنویں میں ٹمٹماتے ہوئے

ستارے کی طرح تھی، کسی بھی وقت اوجھل ہو سکتی تھی۔

انیق کو دیکھ کر سجاول سیالکوٹی طوفان کی طرح اس کی طرف بڑھا، اس کے ہاتھوں میں سیاہ رنگ کی ''اے کے 47'' رائفل بڑی خوفناک دکھائی دے رہی تھی۔ رائفل کا رخ سیدھا انیق کی طرف تھا۔ لگتا تھا کہ وہ کسی بھی لمحے ٹریگر دبا دے گا۔ بجلی چمکی اور بادلوں کی جگہ سجاول دہاڑا۔ ''پیچھے ہٹ جاؤ۔ میں نے زندہ نہیں چھوڑنا اسے۔''

میں سجاول کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ''مرے کو کیا مارو گے۔ وہ مر چکا ہے۔ شاید ہی کوئی سانس باقی ہو۔''

''ایک سانس بھی نہیں، ایک سانس بھی نہیں چھوڑوں گا۔'' اس نے دائیں جانب ہو کر بے ہوش انیق کا نشانہ لینا چاہا۔ میں نے آگے بڑھ کر ''اے کے 47'' کی سیاہ نال تھام لی۔

''میں یہ نہیں ہونے دوں گا سجاول، چاہے کچھ بھی ہو جائے۔''

وہ میرے اس لہجے کو پہچانتا تھا۔ جانتا تھا کہ میں جو بات کہہ رہا ہوں وہ اٹل ہے۔ وہ ذرا ڈھیلا پڑا۔ تاہم اس کی آنکھیں اب بھی خون کی طرح سرخ تھیں۔ وہ سیدھا میری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ یہ بڑے نازک لمحے تھے۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا پھر گورا چٹا ملک زرق خاں آگے بڑھا۔ اس نے سجاول کے کان میں کچھ کہا۔ یقیناً یہی کہا ہو گا کہ، مرے کو مارنے سے کیا حاصل۔ وہ تقریباً مر چکا ہے۔

سجاول نے ایک بار پھر خونی نظروں سے انیق کی طرف دیکھا اور اس کے بے حرکت جسم کی طرف تھوک کر چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔

زرق خاں اور دیگر افراد کی رائے یقیناً ٹھیک ہی تھی۔ انیق میں زندگی کی رمق نہ ہونے کے برابر تھی، لیکن میں کوشش کرنا چاہتا تھا۔ میں ''موت'' سے پہلے اسے مردہ تصور نہیں کر سکتا تھا۔ ہم نے انیق کو ایک لینڈ روور جیپ میں ڈالا، زرق خاں کے دو شدید زخمیوں کو بھی جیپ میں سوار کر لیا گیا۔ حتی الامکان رفتار سے ہم شہر کی طرف بڑھے۔ وہ جیپ کی ایک طویل سیٹ پر بے حرکت لیٹا تھا۔ اس کی نیلی جین میں جگہ جگہ گولیوں کے سوراخ تھے۔ اس کی ٹانگوں اور سینے سے رِسنے والا خون قطروں کی صورت جیپ کے فرش پر ٹپک رہا تھا۔ اس کا سر میری گود میں تھا...... اور ہچکولوں سے مسلسل دائیں بائیں ہل رہا تھا۔

جیپ میں فخر کے علاوہ یونس بھی سوار تھا۔ ڈرائیونگ زرق خاں کا ہی ایک بندہ کر رہا تھا۔

''انیق...... آنکھیں کھولو۔'' میں نے اس کے گال تھپتھپائے اور ہولے سے پکارا۔

لیکن وہ آنکھیں کھولنے کی منزل سے بہت دور تھا۔ یہی غنیمت تھا کہ اس کی سانس کی ڈورابھی ٹوٹی نہیں تھی۔

فخر نے ڈرائیونگ کرنے والے شخص کو مخاطب کیا اور ذرا کڑے لہجے میں پوچھا۔

''خان! کیسے ہوا ہے یہ سب کچھ؟''

وہ بولا۔ ''ام کو کچھ زیادہ پتا نہیں ہے صیب جی، ام تو ملک زرق صیب کا ملازم ہے۔ وہ جیسا کہتا ہے ام کو کرنا ہوتا ہے۔ ویسے بھی امارا کام گاڑی چلانے کا ہے۔''

''پھر بھی تم یہاں موجود تھے۔ تمہیں پتا تو ہوگا کہ یہاں تک نوبت کیسے پہنچی ہے؟''

وہ کچھ دیر تذبذب میں رہنے کے بعد بولا۔ ''ام کو صرپ اتنا پتا ہے کہ اس زخمی لڑکے کے ساتھ دو بندے اور بھی تھے۔ ان میں سے ایک تو اسی کھوہ کے اندر مارا گیا ہے جہاں سے آپ نے اس لڑکے کو نکالا ہے۔ دوسرے کا ٹھیک پتا نہیں، لیکن لگتا ہے کہ وہ بھی بچا نہیں ہو گا۔''

''پر یہ سب کچھ ہوا کیوں؟'' فخر نے چیخ کر پوچھا۔ ''اور تم لوگوں کو شرم بھی نہیں آئی۔ دو یا تین بندوں کے لیے پورا جتھا لے کر یہاں آ گئے؟''

ڈرائیور نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ ''یہ بات تو آپ اپنے دوست (سجاول) سے پوچھیں یا پھر ملک زرق خاں سے پوچھیں۔ ام کو صرف اتنا پتا ہے کہ ان کو کل شام ان ٹیلوں میں گھیرا گیا تھا۔ ان کو بے شمار مرتبہ کہا گیا کہ یہ ہتھیار پھینک کر باہر نکل آئیں مگر ان میں سے کسی ایک نے بھی اس بات پر کان نہیں دھرا...... بلکہ رات نو بجے کے قریب ایک دم پائر کھول دیا۔ اس پر مجبوراً زرق خان کے بندوں نے بھی اندھا دھند پائرنگ کر دی۔ بڑا زوردار مقابلہ ہوا۔ اندر والا دونوں بندہ زخمی ہوا۔ جن میں سے ایک کچھ دیر میں ہی مر گیا، دوسرے کو سول اسپتال بھیج دیا گیا۔ سچا بات تو یہ ہے کہ دونوں طرپ کا کاپی (کافی) نقصان ہوا ہے۔ یہ لڑکا اس طرح جم کر لڑے گا کسی کو اندازہ نہیں تھا۔'' ڈرائیور کا اشارہ انیق کی طرف تھا۔

میرے سینے سے آہ سی نکلی۔ میں نے انیق کے سر کے نم بالوں میں انگلیاں چلائیں۔ بڑے پیارے بال تھے اس کے لیکن اس نے کبھی انہیں سنوارا نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اپنا حلیہ جان بوجھ کر بگاڑے رکھتا ہے۔ شاید اس کے اس رویے کا تعلق اس کے ماضی سے بھی ہو۔ اس نے کسی کو ٹوٹ کر چاہا تھا اور پھر ایک ''روڈ ایکسیڈنٹ'' میں اسے کھو دیا تھا۔ اس کا غم اور اس کی بے کسی اسے دھیرے دھیرے ایک ان چاہی سمت میں لے گئے تھے۔ وہ گینگسٹر کے روپ میں ڈھل گیا تھا۔ اس نے جو کچھ کیا تھا، یقیناً اس کے لیے کوئی صفائی یا دلیل پیش

نہیں کی جاسکتی۔ اس نے برا کیا تھا مگر ایسا ہوتا ہے، بے شمار لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے، اپنے غم و غصے کو ہر کوئی مثبت توانائی میں بدل کر ڈاکٹر، انجینئر یا عظیم فن کار تو نہیں بنتا، بہت سے مجرم بھی بن جاتے ہیں۔ وہ بھی مجرم بنا تھا، لیکن اس کے اندر کی انسانیت پوری طرح مری نہیں تھی۔

اس کا سر میری گود میں تھا اور مجھے ماضی کے وہ سارے مناظر یاد آ رہے تھے کہ جب جب وہ میرے ساتھ تھا۔ میرے کندھے سے کندھا ملائے کھڑا تھا۔ چاند گڑھی کے خونی واقعات، ملنگی ڈیرے کا جان لیوا معرکہ، پارا ہاؤس کے خطرناک شب و روز اور جاما جی کے تہلکہ خیز جنگی حالات۔ اس نے کہاں کہاں میرا ساتھ نہیں دیا تھا، کہاں کہاں اپنے سینے کو میرے لیے ڈھال نہیں بنایا تھا۔

میں نے ایک بار پھر اس کی کیچڑ آلود پیشانی چومی۔ ”نہیں میرے نکو شہزادے، میں اس طرح تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔“ میں نے دل ہی دل میں کہا اور ڈرائیور کو ہدایت کی کہ وہ فی الحال باتیں کرنا چھوڑے اور گاڑی تیز چلائے۔ یہ دن کے بارہ بجے کا وقت تھا، ہلکی بارش جاری تھی۔

○.....❖.....○

کہتے ہیں کہ مشکل تنہا نہیں آتی، کئی دفعہ مشکلات کا ایک سلسلہ بندے کو گھیر لیتا ہے۔ ہم طوفانی رفتار سے انیق کو ”باغ“ کے ایک مقامی اسپتال لے گئے۔ اس کے خون کا اخراج بند کیا گیا اور آکسیجن لگائی گئی۔ اس کی حالت ہرگز ایسی نہیں تھی کہ اسے اس چھوٹے سے اسپتال میں رکھا جاتا۔ کم از کم اسے کوہاٹ یا پشاور تک پہنچایا جانا بہت ضروری تھا مگر پتا چلا کہ شدید بارش کی وجہ سے مین روڈ پر دو جگہ لینڈ سلائیڈنگ ہوئی ہے اور راستہ صاف ہونے میں آٹھ سے دس گھنٹے لگ جائیں گے۔

”اتنا وقت تو یہ نہیں گزار سکے گا۔“ فخر نے بڑے دکھ سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”میں نے ڈاکٹر سے بات کی ہے۔ سرجری تو یہاں بھی ہو سکتی ہے۔ سینے میں لگنے والی دو گولیاں نکال لی جائیں تو کچھ امید ہو سکتی ہے۔“ میں نے کہا۔

”تو پھر دیر نہ کی جائے۔“ فخر نے کہا۔ ”ڈیوٹی ڈاکٹر بتا رہا تھا کہ خون لگنے کے باوجود ’بی پی‘ تیزی سے گر رہا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ باڈی کے اندر بھی بلیڈنگ ہو رہی ہے۔“

سجاول اور ملک زرق خاں کا تو کوئی پتا نہیں تھا۔ شاید وہ کسی دوسرے اسپتال میں اپنے زخمیوں کو سنبھالنے میں لگے ہوئے تھے۔ ہاں آصف خان اور یونس بدستور ہمارے ساتھ

تھے۔ آصف خان نے نہ صرف خود انیق کے لیے خون دیا تھا بلکہ وہ چھ سات صحت مند نوجوان بھی اس کام کے لیے لے آیا تھا۔

ہماری اجازت ملنے کے بعد دو مقامی سرجنز نے انیق کا ہنگامی آپریشن شروع کر دیا۔ انہوں نے بتا دیا تھا کہ مریض کے بچنے کی امید بہت کم ہے۔ پتا نہیں کیوں میرے پردۂ تصور پر جاماجی والے مناظر گھومنے لگے۔ جواں سال ابراہیم بھی تو اسی طرح جاں بلب ہوا تھا۔ اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں رہی تھی۔ (ڈاکٹرز نے جواب دے دیا تھا اور بتایا تھا کہ اپنے اندر کے زہر کو فاقہ کشی سے ختم کرتے کرتے وہ خود ختم ہو گیا ہے) مگر اس کو چاہنے والوں کی دعائیں اور محبتیں موت کے منہ سے واپس لے آئی تھیں۔

ایک آواز نے مجھے چونکایا۔ ایک میل نرس نے مجھے انیق کے لباس میں سے ملنے والی کچھ اشیا تھمائیں۔ اس کا سیل فون، شناختی کارڈ، تھوڑی سی نقدی، اور ایک چھوٹا سا پلاسٹک پاؤچ جس میں چند میڈیسن تھیں۔

میں نے ان دواؤں کو غور سے دیکھا اور حیران ہوا۔ میری معلومات کے مطابق ان میں سے دو ٹیبلیٹس تو SEDATIVE تھیں اور ٹھیک ٹھاک نشہ آور تھیں۔ مجھے اس بزرگ کی بات یاد آئی جو رشتے میں انیق کا نانا بھی کہلاتا تھا۔ بزرگ نے کہا تھا۔ ''انیقے کی کچھ سمجھ نہیں آتی۔ ہر وقت سویا سویا سا لگتا تھا۔ بات کچھ اور کر رہا ہوتا ہے، دھیان کہیں اور ہوتا ہے۔'' تو کیا یہ سب کچھ ایسی ہی مضر صحت دواؤں کی وجہ سے تھا۔ وہ کیوں کھا رہا تھا یہ دوائیں...... اسے تو ایسی کوئی عادت نہیں تھی۔ کیا وہ یہ سب کچھ بھی مجبوری کے عالم میں کر رہا تھا۔ دوسرے لفظوں میں یہ ''سیلف میڈیکیشن'' بھی اس سے کرائی جا رہی تھی۔

میں نے اس کے سیل فون کو چیک کیا۔ جو نمبر وہ استعمال کر رہا تھا، وہ نیا تھا۔ میں نے فون کی ''کال لاگ'' میں جا کر دیکھا۔ ایک نمبر ایسا تھا جس پر بے شمار دفعہ کال کی گئی تھی اور اس نمبر سے بہت دفعہ انیق کو کال آئی بھی تھی۔ کال ریکارڈ میں بھی یہ نمبر اَن گنت مرتبہ موجود تھا۔ دیکھا جاتا تو کئی ماہ سے یہ انیق کے فیورٹ نمبروں میں سے تھا۔

انیق کے موبائل میں بیلنس موجود تھا۔ میں نے اس نمبر پر 'ٹرائی' کی۔ ایک مرتبہ تو کال اٹینڈ نہیں ہوئی مگر دوسری کوشش کامیاب رہی۔ ایک بھرائی ہوئی بھاری آواز کانوں سے ٹکرائی۔ بظاہر مردانہ محسوس ہونے والی اس آواز پر غور کیا جاتا تو پتا چلتا تھا کہ یہ زنانہ ہے۔ میرے سینے میں دل اچھل کر رہ گیا۔ یہ آواز میرے لیے نئی نہیں تھی۔ اس سے میرا واسطہ پڑ چکا تھا۔ یہ جاماجی کی اسی ساحرہ کی آواز تھی جو اپنی آنکھوں اور اپنے لہجے کے ذریعے دل و دماغ کو

مفلوج کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

اس نے غالباً شکستہ انگلش میں کچھ کہا تھا جو میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے اپنی آواز سے انیق کی آواز کی نقل کرنے کی کوشش کی اور ''ہیلو'' کہا۔ یقیناً میری یہ کوشش کامیاب ثابت نہیں ہوئی۔

''کون؟'' دوسری طرف سے ذرا چونکی ہوئی آواز میں پوچھا گیا۔ اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔ میں اپنے پورے جسم میں سنسناہٹ محسوس کر رہا تھا۔

''کون تھا؟'' فخر نے مجھ سے پوچھا۔

''جاماجی کی وہی بد بخت...... مادام ہاناوانی...... یہ دیکھو اس ''کال ریکارڈ'' سے پتا چلتا ہے کہ یہ مسلسل انیق کے ساتھ رابطے میں رہتی تھی۔ اس نے انیق پر پوری طرح کنٹرول کر رکھا تھا۔''

''تمہارا مطلب ہے ہپناٹزم؟''

''ہاں...... اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ خاص لوگوں میں پائی جانے والی یہ صلاحیت ایک جیتی جاگتی حقیقت ہے فخر۔ یہ دیکھو...... یہ ہیں وہ دوائیں جو انیق مسلسل استعمال کر رہا تھا۔ اس طرح کی دوائیں تو ویسے ہی دل و دماغ کو ماؤف کر دیتی ہیں پھر جب ان میں کسی ماہر ہپناٹسٹ کی سجیشن بھی شامل ہو جائے تو کیا نہیں ہوسکتا۔'' میں بات کر رہا تھا اور میرا سینہ جل رہا تھا۔

فخر بولا۔ ''یہ بات تو میں نے بھی کہیں سنی تھی یا شاید ہالی ووڈ کی کسی فلم میں دکھایا گیا تھا کہ ہپناٹزم کے کچھ ماہر ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے ''معمول'' سے دور رہ کر صرف اپنی آواز اور اپنے لہجے کے اتار چڑھاؤ سے ہی اسے ٹرانس میں لے لیتے ہیں۔ ''معمول'' ان کی ہدایات پر عمل شروع کر دیتا ہے۔''

''یہ بھی کچھ ایسی ہی صورتِ حال ہے۔'' میں نے کہا۔

آپریشن شروع ہو چکا تھا۔ اسٹاف اور ڈاکٹرز آپریشن تھیٹر میں آ جا رہے تھے۔ ہمارے دل کی دھڑکنیں جیسے ان کے قدموں کی چاپوں سے بندھی ہوئی تھیں۔ فخر بھی بے چینی سے میرے اردگرد ٹہل رہا تھا۔ ''اگر یہ سب کچھ کسی باہر کے ملک میں ہوا ہوتا تو اب تک مریض کو ''پک'' کرنے کے لیے ہیلی کاپٹر یہاں پہنچ چکا ہوتا۔''

میرا دھیان شکیل داراب کی طرف چلا گیا۔ وہ لمبے ہاتھوں والا ایک بارسوخ شخص تھا اگر وہ چاہتا تو ہیلی کاپٹر کا انتظام بھی ہوسکتا تھا مگر اسے فون کون کرتا۔

بادل زور سے گرجے اور بارش کی بوچھاڑیں کچھ اور تیز ہو گئیں۔ فخر بولا۔ ''اگر ہیلی کاپٹر مہیا ہو بھی جائے تو اس طرح کے موسم میں شاید یہاں اتر ہی نہ سکے۔''

تیز ہوا سے اس چھوٹے سے اسپتال کے کھڑکیاں دروازے تھرا رہے تھے اور اندر شاید انیق کی زندگی کی لَو بھی تھرا رہی تھی۔

انیق کا فون خاموش تھا۔ مادام ہاناوانی نے یا کسی اور نے اس نمبر پر دوبارہ رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ یہ بات یقینی تھی کہ مادام ہاناوانی چونک گئی ہے اور اسے کسی شدید گڑبڑ کا احساس ہو چکا ہے۔ اس کا ردِعمل کیا ہوگا، اس بارے میں ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

میں انیق کے موبائل کی مختلف ایپلی کیشنز دیکھتا رہا۔ میوزک میں اچھی قسم کی غزلیں اور نغمے موجود تھے۔ اچھی فلمی شاعری سے انیق کو ہمیشہ لگاؤ رہا تھا۔ شاید اس ذوق کا تعلق بھی کہیں اس کی بچپن کی محبت سے ہی ہو۔ وہ لڑکی جو اس سے چھین لی گئی تھی لیکن تاجور کی طرح اس کے ہاتھوں پر سہاگ کی نہیں، خون کی مہندی لگی تھی۔ اوپر والے نے محبت تو بنائی لیکن اس سے بھی پہلے شاید جدائی بنا دی۔ محبت کی قسمت میں چند گھڑیوں کی مسرت لکھ کر طویل انتظار، آس اور نہ پوری ہونے والی امیدیں درج کر دی گئیں۔

میں نے ایک ''سونگ'' پر ٹچ کیا۔ معروف گلوکارہ فریدہ خانم کی مدھر آواز فون کے اسپیکر سے ابھرنے لگی۔ ''وہ عشق جو ہم سے روٹھ گیا، اب اس کا حال سنائیں کیا......''

بے ہوش کرنے والے عملے کا ایک فرد تیزی سے تھیٹر میں سے نکلا اور یونس کے کسی سوال کا جواب دیے بغیر ''فارمیسی'' کی طرف لپک گیا۔

میں اٹھ کر بے قراری سے ٹہلنے لگا۔ انیق کا سیل فون میرے ہاتھ میں تھا۔ اس پر بھی خون کے دھبے تھے جو تھوڑی دیر پہلے میں نے کاٹن سے صاف کر دیے تھے۔ فون میں پیغامات کے خانے میں ایک جگہ کچھ ڈرافٹس نظر آئے۔ ان میں سے ایک نسبتاً طویل ڈرافٹ کافی اہم تھا۔ اس کی تحریر کچھ اس طرح تھی۔ انگلش کی یہ تحریر انیق کی طرف سے تھی۔

''یہ کیسا رنگ دار گول چکر ہے؟ یہ کیسی دھند ہے جس میں، میں گھرا رہتا ہوں؟ یہ رنگ برنگی دھند میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتی؟ میں اس میں دھنسا ہوا ہوں، کبھی کبھی یہ بس چند منٹ کے لیے چھٹتی ہے جیسے اب...... میں کچھ کہنا چاہتا ہوں، چلانا چاہتا ہوں۔ لیکن کوئی میرا گلا دبا دیتا ہے۔ میری آواز سینے سے باہر نہیں نکل پاتی۔

ایسا کیوں ہے، میں کس اَن دیکھی گرفت میں ہوں......بس اب وہ کال آجائے گی جس کے بعد میں کئی دن کے لیے ہوش سے بیگانہ ہو جاؤں گا۔ میں کیوں وہ کال سننے پر مجبور

ہو جاتا ہوں، شاید وہ آ رہی ہے...... وہ آواز آ رہی ہے......کون میری مدد کرے گا؟ کون میری مدد کر سکتا ہے؟''

ایک اور ڈرافٹ (تحریر) میں اسی طرح کے کچھ اور الفاظ لکھے تھے لیکن وہ بے جوڑ اور ناقابلِ فہم تھے...... میں کہاں جا رہا ہوں۔ کیوں جا رہا ہوں۔ یہ میری زندگی ہے یا کسی اور کی؟ کون جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھتا ہے......کون ہے جس کے قدم زمین میں دھنسے ہوئے ہیں...... وہ میں ہوں تو پھر بھاگتا کیوں نہیں ہوں...... بھاگ جاؤں تو کتنا اچھا ہو...... میری دوا کی گولیاں...... رنگ برنگی دھند...... رنگ دار گولیاں...... یہ سارے رنگ کہاں سے آتے ہیں......

انیق کے لکھے ہوئے بہت سے لفظوں کے ہجے غلط تھے۔ کچھ حرف الٹے لکھے تھے (حالانکہ وہ انگلش ہی نہیں، بہت سی دیگر زبانیں بہت اچھی طرح جانتا تھا) لگتا تھا کہ یہ ٹیکسٹ کمپوز کرتے وقت بھی انیق اپنے مکمل حواس میں نہیں تھا۔

ایک دو اور چھوٹے چھوٹے ڈرافٹس بھی اسی نوعیت کے ملے۔ ان سب تحریروں سے ایک ناقابلِ بیان بے چارگی اور اذیت ٹپکتی محسوس ہوتی تھی۔ تو کیا یہی بے چارگی و اذیت تھی جس سے وہ مسلسل لڑ رہا تھا۔ اپنی منشا کے خلاف کچھ ایسے کام کر رہا تھا جو اسے اندرونی طور پر بے حد کرب میں مبتلا رکھتے تھے۔ ہم اسے دشمن سمجھتے رہے اور وہ دشمنوں کے گھیرے میں تھا۔ یہ بہت بڑا ستم توڑا گیا تھا ہم پر...... اور اسے توڑنے والی وہی کریہہ عورت تھی۔ اس نے اپنی شکست اور اپنے بدقماش بیٹے رائے زل کی موت کا سنگین بدلہ لیا تھا ہم سے۔ ہم نے اپنے ہی ہاتھوں سے اس جاں نثار ساتھی کو موت کے دہانے پر پہنچا دیا تھا جو کسی طور بھی اس سزا کے لائق نہیں تھا۔ اچھا تھا کہ اس وقت سجاول اور ملک زرق وغیرہ میرے سامنے نہیں تھے، ورنہ پتا نہیں کہ میرا ردِعمل کیا ہوتا۔

اسی دوران میں انیق کے فون پر کال کا میوزک ابھرا۔ اسکرین پر نظر آنے والا نمبر وہ نہیں تھا جس پر کچھ دیر پہلے ہاناوانی سے بات ہوئی تھی۔ میں نے دوسری طرف سے بولنے والے کا انتظار کیا۔ ''ہیلو۔'' ایک بھرائی ہوئی مردانہ آواز ابھری۔

میں نے پہچان لیا۔ یہ وہی بزرگوار تھے جن سے انیق کے آبائی گھر میں ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے چند لمحے سوچا پھر نارمل لہجے میں کہا۔ ''ہیلو بابا جی! میں انیق کا دوست وقاص بول رہا ہوں۔''

چند سیکنڈ بعد بزرگوار نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ''اچھا اچھا پتر! میں نے پہچان لیا لیکن

ایقا کہاں ہے؟ فون کر کر کے برا حال ہو گیا ہے ہمارا۔''

''وہ...... یہیں ہے باباجی! بس اس کی طبیعت...... تھوڑی سی خراب ہے، دو تین دن سے بخار چل رہا ہے، اب بھی دوا کھا کر سویا ہوا ہے۔ ویسے پریشانی کی بات نہیں۔''

''پریشانی کی بات تو ہے پتر! ایسا بے وقوف کھوتا ہے کہ خیر خبر تک نہیں دیتا۔ پچھلے تین چار دن میں کوئی سو واری فون کیا ہو گا اس کو...... اس کی پھوپی تو مرن والی ہو گئی ہوئی ہے۔ اب بھی مزار پر دعا مانگنے گئی ہے۔ اس کو جگاؤ ذرا...... ایک منٹ بات کر لے مجھ سے۔''

''باباجی! ابھی سویا ہے، ڈاکٹر نے منع کیا ہے بار بار جگانے سے۔ جونہی طبیعت بہتر ہوتی ہے، میں اس سے کہتا ہوں کہ آپ کو فون کرے۔''

''تم...... اس وقت ہو کہاں؟'' انہوں نے بے تابی سے پوچھا۔

مجھے جھوٹ بولنا پڑا۔ ''لاہور میں ہی ہوں...... اس کے مرغی خانے پر۔'' پھر اس سے پہلے کہ بزرگوار کچھ اور کہتے میں نے جلدی سے پوچھا۔ ''وہ آپ کی مہمان...... بی بی صاحبہ کہاں ہیں؟''

''ادھر ہی تھیں، ابھی تھوڑی دیر پہلے، ڈرائیور کے ساتھ اپنی گڈی پر کہیں گئی ہیں۔ کچھ دیر میں آ جائیں گی۔ پر...... تم انیقے سے بات کب کراؤ گے۔ ہم بہت پریشان ہیں اس کے لیے......''

''کہا ہے ناں باباجی! ابھی جاگتا ہے تو کرا دیتا ہوں۔''

''اس سے بات کراؤ، اور اسے سمجھاؤ بھی۔ تم یار بیلی ہو اس کے...... اس سے کہو، اب بے پروائیاں چھوڑ دے۔ بہت ہو چکی ہے...... ہر بات کی کوئی حد ہوتی ہے۔''

میں نے بزرگوار سے تسلی کے چند بول کہے اور فون بند کر دیا۔

یہی وقت تھا جب سبز کپڑوں میں ملبوس نوجوان سرجن دھیمے قدموں سے، آپریشن تھیٹر سے باہر نکلا۔ میں اور فخر لپک کر اس کے پاس گئے۔ ''کیا پوزیشن ہے سرجن؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

وہ میری طرف دیکھے بغیر بولا۔ ''سوری جی، ہم اس کو بچا نہیں سکے۔''

میں سکتہ زدہ اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ دماغ ماؤف سا ہو گیا۔ اس کی آواز جیسے اسپتال میں اور اسپتال سے باہر دور دور تک گونج رہی تھی۔ ''سوری جی، ہم اسے بچا نہیں سکے...... سوری جی! ہم اسے بچا نہیں سکے۔''

میرا دل چاہا، میں نوجوان سرجن کو شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالوں۔ اس سے کہوں

کہ...... وہ ختم کرے یہ مذاق...... اپنے الفاظ واپس لے...... اور کہے کہ نہیں وہ ابھی زندہ ہے......اس کے بچنے کی امید ہے......

لیکن سرجن جا چکا تھا...... اور حقیقت یہ تھی کہ انیق بھی جا چکا تھا۔ میرا انکو شہزادہ...... میری سانس کے ساتھ سانس لینے والا اور میرے پسینے پر اپنا خون چھڑکنے والا، اب نہیں رہا تھا۔ اس کی باتوں کی پھلجھڑیاں، اس کی مسکراہٹیں، اس کے گیت سب کچھ اس کے ساتھ ہی فنا کے گھاٹ اتر گیا تھا۔ میں اکثر مذاق میں اس سے کہا کرتا تھا کہ وہ جس طرح کی باتیں کرتا ہے، ایک دن سجاول نے اسے جان سے مار دینا ہے...... اور اس نے مار دیا تھا...... لیکن...... اس میں سجاول کا بھی کیا قصور تھا، اس میں کسی کا قصور نہیں تھا، اگر قصور تھا تو اس بدذات عورت کا جو اپنے خونی بیٹے کی موت کا بدلہ لینے کے لیے ہزاروں میل کا فاصلہ پاٹ کر یہاں پہنچی تھی اور انیق کو اپنے قبضے میں کیا تھا۔ وہ ایک خطرناک عاملہ تھی اور اس کی پُراسرار صلاحیتوں نے وہ کر دکھایا تھا جو ہمارے گمان میں بھی نہیں تھا۔

ایک اسٹریچر آپریشن تھیٹر سے باہر لایا گیا۔ اس پر انیق لیٹا تھا۔ اس کا چہرہ سفید چادر سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ اس چادر پر بھی اس کے جوان خون کے دھبے موجود تھے۔ میرے سینے میں ایک نیلی آگ روشن تھی۔ میں نے خود کو بمشکل سنبھال کر اس کے چہرے سے چادر ہٹائی، وہ سو رہا تھا۔ اپنے سارے داغ سینے میں چھپائے، اس دنیا سے کچھ خاص لیے بغیر، اس چھوٹی سی عمر میں ہی اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہی مائل حلقے تھے۔ ہمیشہ سرخ نظر آنے والے ہونٹ بھی سانولائے ہوئے تھے۔ بالکل ہلدی جیسے چہرے پر یہ سانولاہٹ اور بھی نمایاں محسوس ہوتی تھی۔ یہ سب کچھ یقیناً ان نشہ آور دواؤں کی وجہ تھا جو وہ آج کل مسلسل استعمال کر رہا تھا۔ وہ مجھ سے اتنا بے تکلف ہو چکا تھا کہ کسی وقت شرارت سے بھی باز نہیں آتا تھا۔ ایسے وقت میں، میں اسے ڈانٹتا تھا یا ایک آدھ ٹانگ رسید دیا کرتا تھا۔ وہ سخت چوٹ لگنے کا ڈراما کرتا تھا اور لڑھکتا ہوا دور جا گرتا تھا۔ کاش وہ اس وقت بھی کوئی ڈراما ہی کر رہا ہوتا۔

اچانک انیق کے سیل فون پر پھر کال کے سگنل آئے۔ میں نے کال ریسیو کی دوسری طرف اس کی پھپھو تھی۔ وہ جذباتی لہجے میں بولی۔ ''کون بول رہا ہے...... انیقے کا دوست؟''

''جی ہاں۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔

''وہ جاگا یا نہیں، اگر نہیں جاگا تو اسے جگاؤ۔ مجھے اس سے بات کرنی ہے۔ بس ایک بار اپنی آواز سنا دے...... پھر سو جائے۔ پتا نہیں کیوں اتنا بے حس ہو جاتا ہے یہ شہر جا کر۔

ہی نہیں آتی اسے...... دو دو ہفتے فون کا جواب نہیں دیتا۔‘‘

میں نے چند لمحے کے توقف کے بعد کہا۔’’خالہ جی...... اس کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔‘‘ میرا لہجہ بجھا ہوا تھا۔ آنکھوں میں نمی تھی۔

’’ہائے میں مر گئی کیا ہوا اسے...... تم تو...... کہہ رہے تھے کہ...... صرف بخار ہے۔‘‘ پریشان عورت ہکلا کر رہ گئی۔ وہ انیق کی ماں نہیں تھی مگر ممتا کی ساری جھلکیاں اس میں پائی جاتی تھیں۔

’’بخار نہیں ہے...... اس کو...... سخت چوٹیں لگی ہیں۔ آپ دعا کریں۔ حالت ٹھیک نہیں ہے۔‘‘ میں نے دل کڑا کر کے کہا۔

عورت نے فون پر ہی رونا شروع کر دیا۔ وہ ہیجانی لہجے میں پتا نہیں کیا کیا پوچھ رہی تھی۔ میں نے ... ’’اللہ کے کاموں میں کسی کو دخل نہیں ہے...... میں دوبارہ فون کرتا ہوں......‘‘

انیق کے چہرے سے چادر ابھی تک ہٹی ہوئی تھی۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوا کہ میں مزید اس کا چہرہ دیکھ سکوں۔ میں نے چادر اس کے سر تک کھینچ دی۔

فخر نے مجھے گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔’’یار! ہمیں خود کو سنبھالنا چاہیے، اگر وہ عورت یہاں پاکستان میں موجود ہے تو پھر کچھ بھی کر سکتی ہے، عین ممکن ہے کہ وہ اکیلی نہ ہو، اس کے کئی گماشتے بھی اس کے ساتھ ہو سکتے ہیں۔ ابھی جب تم نے فون پر بابا جی سے پوچھا تھا کہ وہ کہاں ہے تو کیا پتا چلا تھا؟‘‘

’’وہ گاڑی پر بیٹھ کر گوٹھ سے نکلی ہے۔‘‘

’’جب تم نے انیق کے فون سے اس حرام زادی کو کال کی تھی تو تم آواز بدل کر بولے تھے لیکن اسے پتا چل گیا ہو گا کہ یہ انیق نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ اس نے خطرے کو سونگھ لیا ہو۔ اگر وہ فون کی لوکیشن وغیرہ تلاش کروا سکتی ہے تو پھر وہ یہاں بھی پہنچ سکتی ہے۔‘‘

’’اللہ کرے وہ پہنچ جائے۔ مجھے اس کو ڈھونڈنا نہ پڑے۔‘‘ میرے لہجے میں بھڑکتی ہوئی آگ نے فخر کو بھی چونکا دیا۔

بانا وانی کا چوڑا چکلا دبنگ چہرہ میری نگاہوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ وہ میرے سامنے ہوتی تو یقیناً ہم دونوں میں سے کوئی ایک ہی زندہ رہتا۔ اس نے جس لڑائی کو ہوا دی تھی، وہ اب رکنے والی نہیں تھی۔

○......❖......○

انیق کی موت ایک ایسا صدمہ تھا جو ایک پہاڑ جیسے وزن کے ساتھ میرے سینے کو روندتا اور کچلتا چلا گیا تھا۔ گوٹھ موراناں کلاں میں اس کی تدفین کے مناظر ایسے تھے کہ دل خون ہو کر آنکھوں کے راستے بہہ جانا چاہتا تھا مگر میں نے یہ خونی آنسو بہنے نہیں دیئے، سنبھالے رکھے، میں انہیں ضائع کر کے اس آتشیں توانائی کو ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا جو مجھے ہاناوانی جیسی خطرناک عورت سے ٹکرانے کے لیے درکار تھی۔

انیق کے جنازے کے مناظر میرے سامنے جیسے ایک دھند میں چھپے ہوئے تھے۔ میں ایک عجیب سی غنودگی کے گھیرے میں چل رہا تھا۔ اس کے جنازے میں پورے گوٹھ کے لوگ امڈ آئے تھے۔ بے شمار عام چہرے تھے لیکن ان میں کچھ خاص چہرے بھی تھے۔ ان میں سے کچھ چہروں کو میں پہچانتا تھا اور کچھ کو شاید نہیں۔ جن کو میں پہچانتا تھا، ان میں سے ایک چہرہ داؤد بھاؤ کا بھی تھا۔ داؤد بھاؤ کے کچھ قریبی ساتھی بھی اس جنازے میں شریک تھے، رعب دار چہرے والا داؤد بھاؤ، سر پر رومال باندھے، سوجی ہوئی آنکھوں کے ساتھ سر جھکائے جنازے کے ساتھ چل رہا تھا۔ ایک دوبار اس کی اچٹتی سی نظر مجھ پر پڑی لیکن وہ مجھے پہچاننے سے قاصر رہا۔ پہلوان حشمت بھی چاندگڑھی سے طویل فاصلہ طے کر کے یہاں گوٹھ پہنچا تھا، چاندگڑھی کے کچھ اور افراد بھی تھے جن کو انیق نے وہاں اپنے قیام کے دوران میں اپنا گرویدہ بنایا تھا۔ ان میں چاندگڑھی کی مسجد کے نئے امام صاحب بھی شامل تھے۔ (پہلے امام صاحب مولوی فدا یعنی زینب کے والد تو عرصہ ہوا مقامی دشمنیوں کی زد میں آکر اپنی زندگی ہار چکے تھے) رضوان ٹی بھی جنازے میں شامل ہونے کے لیے لاہور سے یہاں پہنچا تھا۔ انیق کے ساتھ اس کا تعلق زیادہ طویل تو نہیں رہا تھا مگر وہ اس کا گرویدہ تھا۔ میرے اندازے کے مطابق خفیہ پولیس کے کچھ لوگ بھی اس ہجوم میں موجود تھے اور چہروں کو تاک رہے تھے۔ ایک اہم چہرہ سجاول کا بھی ہو سکتا تھا مگر یہ چہرہ کہیں دکھائی نہیں دیا۔ میرا خیال تھا کہ شاید وہ یہاں آئے لیکن وہ نہیں آیا۔

میں نے لحد میں انیق کی صورت دیکھی اور پتا نہیں کیوں میرے دل سے آواز آئی کہ اس خوبرو نوجوان نے اپنے بہت سے گناہوں کا کفارہ شاید اس زندگی میں ہی ادا کر دیا ہے۔ وہ اتنی ہی زندگی کے ساتھ دنیا میں آیا تھا۔ درحقیقت ہم نے اسے بچانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ گوٹھ موراناں سے طویل فاصلہ طے کر کے خیبر ایجنسی پہنچے تھے، مگر گھڑی کی سوئیاں ہم سے جیت گئی تھیں۔ ممکن تھا کہ ہمیں پہاڑی راستے میں کچھ رکاوٹیں نہ ملتیں اور ہم آدھ گھنٹہ پہلے موقع پر پہنچ جاتے تو انیق کی زندگی بچ جاتی۔ ہونے والا کام ہو گیا تھا اور اب ان باتوں کو

سوچنے سے کچھ حاصل نہیں تھا۔

اسے منوں مٹی کے نیچے دفن کر دیا گیا اور ہم اس کے گھر کی طرف واپس چل دیئے۔ اچانک ایک ہاتھ میرے کندھے پر آیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا اور سکتہ زدہ رہ گیا۔ میرے عقب میں داؤد بھاؤ کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب ہیجانی سی کیفیت تھی۔ آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے، اس کی آہنی انگلیوں کی گرفت میرے کندھے پر، بے ساختہ، سخت تر ہوتی جا رہی تھی۔

وہ عجیب لہجے میں بولا۔ ''ساری دنیا کو دھوکا دے سکتے ہو پر مجھے نہیں...... یہ داؤد کی نظریں ہیں...... سمجھے ہو یہ داؤد کی نظریں ہیں۔''

میں ششدر کھڑا تھا۔ چہرے کی ساخت تبدیل ہونے کے بعد میں اپنے درجنوں شناساؤں سے ملا تھا۔ ان میں سے کچھ بہت قریبی بھی تھے مگر مجھے پہچان نہیں سکے تھے لیکن اس شخص نے...... اس عقابی نگاہوں والے شخص نے میرے بدلے ہوئے خدوخال میں سے، اور میری آواز میں سے مجھے ڈھونڈ لیا تھا۔

اب کچھ کہنا سننا فضول تھا۔ میں نے خود کو نارمل کیا۔

داؤد بھاؤ نے میری کلائی مضبوطی سے پکڑی اور بولا۔ ''دو منٹ کے لیے میرے ساتھ آؤ۔'' اس کی آواز جذبات کے بوجھ سے لرز رہی تھی۔

ہم دوسرے لوگوں سے علیحدہ ہو کر ایک سلور رنگ کی اسٹیشن وین کے پیچھے جا کھڑے ہوئے۔ داؤد بھاؤ اور اس کے تین چار ساتھی اسی وین پر یہاں پہنچے تھے۔ وین کے عقب میں جا کر داؤد بھاؤ نے آنسوؤں سے لبریز آنکھوں کے ساتھ مجھے دیکھا اور پھر بانہوں میں لے لیا۔ ہم دونوں بغلگیر ہو گئے۔ وہ گلوگیر آواز میں بولا۔ ''دنیا کچھ اور کہتی تھی، پر میرا دل ہمیشہ یہی کہتا رہا کہ تم اتنی جلدی ہمیں چھوڑ نہیں سکے...... میرا دل یہی کہتا رہا۔''

''سوری داؤد بھاؤ...... بہت معافی چاہتا ہوں۔ آپ کو صدمہ پہنچایا...... دکھ دیا...... لیکن یہ مجبوری تھی میری...... اور اب بھی یہی مجبوری ہے۔''

''میں سب جانتا ہوں...... سب سمجھتا ہوں...... آج کا دن میری زندگی کا انوکھا دن ہے شاہی! آج ہی مجھے اپنی زندگی کی ایک بدترین خبر ملی...... مجھے پتا چلا کہ انیق مر گیا ہے اور آج ہی یہ سب سے بڑی خوش خبری ملی کہ تم زندہ ہو۔'' اس نے مجھے بانہوں میں بھینچ لیا۔ میرا دل بھی بھر آیا تھا لیکن میں نے خود کو سنبھالے رکھا۔ ہاں، یہ آنسو ہی تو سرمایہ تھے۔ یہ مجھے ضائع نہیں کرنا تھے۔ کم از کم ہانا وانی کی موت تک تو نہیں۔

تھوڑی دیر بعد میں اور داؤد بھاؤ اس لگژری اسٹیشن وین کے اندر تھے۔ یہ جزوی طور پر بلٹ پروف گاڑی تھی۔ داؤد بھاؤ نے سر پر بندھا ہوا رومال اتار کر ایک طرف رکھا اور ڈبڈبائی آنکھوں سے مجھے سرتاپا دیکھ کر بولا۔ ”تمہاری شکل...... خاص طور سے ناک اور آنکھوں کے اردگرد کا حصہ بہت تبدیل ہوا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ تمہارے جاماجی کے دوست کرنل ڈاکٹر احرار کا کارنامہ ہے۔ وہ بہت بڑا پلاسٹک سرجن ہے۔“

”لیکن یہ پلاسٹک سرجری نہیں، کاسمیٹک سرجری ہے داؤد بھاؤ، میں جب چاہوں گا اپنی اصل صورت بحال کرسکوں گا۔“

حیرت اور سنسنی کے شدید حملے کے بعد داؤد بھاؤ اب سنبھلنا شروع ہو گیا تھا۔ انیق کی موت کا غم سانجھا تھا لیکن ہم نے اس پر زیادہ بات نہیں کی۔ شاید یہ بات کرتے ہوئے ہم دونوں کو ہی تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ ہم کچھ دیر تک ان حالات کا تذکرہ کرتے رہے جن میں مجھے اپنی ”موت“ کا تاثر دینا پڑا۔ اس کے بعد بھی جو واقعات ہوئے وہ ہم نے ایک دوسرے سے شیئر کیے۔ بالآخر داؤد بھاؤ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ”مجھے یقین ہے، تم نے جو کچھ بھی کیا ہے، ان ٹیکساریوں کی وجہ سے کیا ہے۔ مجھے وہ دن یاد ہیں جب وہ لاہور میں اور آس پاس کے علاقوں میں جنونیوں کی طرح تمہیں ڈھونڈ رہے تھے۔“

”انہوں نے جو کچھ کیا داؤد بھاؤ، اس نے میرے دل پر گہرا اثر چھوڑا ہے۔ آپ کی دوست روبی، مختار جھارا اور دوسرے ساتھیوں کی دردناک موت کو میں کیسے بھول سکتا ہوں۔ انہیں آہنی سلاخوں میں پرویا گیا اور مجھے لگتا ہے کہ میرا دل بھی ان ہی سلاخوں میں پرویا گیا۔ پھر لاہور شہر میں انہوں نے جو بے گناہ شہری مارے ان کا دکھ بھی میرے سینے میں ایک جلتے داغ کی طرح ہے...... مگر ہم نے ان سے حساب چکا دیا ہے بھاؤ...... کافی حد تک چکا دیا ہے اور اگر کوئی کسر رہ گئی ہے تو وہ بھی، اللہ نے چاہا تو جلد پوری ہو جائے گی۔“

داؤد بھاؤ نے کہا۔ ”ہاں...... تمہارے دوست نے مجھے اس بارے میں بتایا ہے۔ کیا نام ہے اس کا؟“

”فخر۔“ میں نے لقمہ دیا۔ ”ابھی جنازے میں بھی اس سے آپ کی ملاقات ہوئی ہے۔“

”ہاں، میں نے یہاں آتے ہی اسے پہچان لیا تھا۔ تمہیں پہچاننے میں ایک ڈیڑھ گھنٹہ لگا...... مگر ناکامی نہیں ہوئی۔“

”میں آپ کی تیز نگاہی کا ہمیشہ سے قائل رہا ہوں بھاؤ۔“

بھاؤ نے سگار سلگاتے ہوئے کہا۔ ''فخر نے مجھے بتایا ہے کہ ٹیکساری گینگ کا پرانا باس واٹسن وائے زندہ تھا اور اسے اس کی بچی کے ساتھ بنکاک میں بند رکھا گیا تھا۔''

''جی ہاں، اسے ہم دونوں نے ہی جان ڈیرک کے چنگل سے نکالا ہے...... یہ ایک بہت مشکل ٹاسک تھا لیکن ہم کسی طرح کر گزرے۔ اب باقی کا کام واٹسن وائے خود ہی کر رہا ہے۔ ٹیکساری گینگ دو دھڑوں میں بٹ چکا ہے اور دونوں دھڑے پوری قوت کے ساتھ ایک دوسرے کے سامنے ہیں۔''

''ہاں، کچھ واقعات کا پتا مجھے بھی چلا ہے...... ان کے لوگ جنگلی جانوروں کی طرح ایک دوسرے کو بھنبھوڑ رہے ہیں۔''

''زیادہ اطمینان کی بات یہ ہے بھاؤ کہ ڈیتھ اسکواڈ کے خونی باسٹرڈز بھی ایک دوسرے کی جان لے رہے ہیں۔''

''وہ گندے جانور تو سارے کے سارے تلف ہی ہو جائیں تو اچھا ہے۔ وہ کڈنیپ، مرڈر اور ریپ کرنے والی مشینیں ہیں۔ لاہور میں انہوں نے بے چاری فلمی اداکارہ اروشا کے ساتھ جو کچھ کیا، وہ بھلائے جانے کے قابل نہیں۔''

''بہت تھوڑی تعداد رہ گئی ہے ان کی...... جو بچ گئے ہیں وہ بھی ایک دوسرے سے چھپتے پھر رہے ہیں۔'' میں نے بھاؤ کو بتایا۔

کچھ دیر اسٹیشن وین میں خاموشی طاری رہی۔ ٹنٹڈ شیشوں والی کھڑکیوں میں سے چالیس پچاس قدم کے فاصلے پر انیق کا سوگوار گھر نظر آ رہا تھا۔ وہی در و دیوار جہاں اس نے آنکھ کھولی تھی اور پھر اس کی مختصر زندگی کا آغاز ہوا تھا۔ میں نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔

''داؤد بھاؤ! ٹیکساری گینگ تو اپنی موت آپ مر رہا ہے...... اور جو تھوڑا بہت رہ گیا ہے، وہ بھی مرے گا...... اب اصل خطرہ یہ ناگن کی آنکھوں والی ڈائن ہے جو جاماجی جزیرے سے یہاں پہنچی ہے۔''

''تم کس کی بات کر رہے ہو؟'' وہ حیرت زدہ ہو کر بولا۔

''انیق کی قاتلہ کی؟''

''لیکن...... انیق کی دشمنی تو سجاول سے چل رہی تھی۔ انیق کو اسی ڈکیت سجاول اور اس کے ساتھی ملک زرق خاں نے مارا ہے۔'' بھاؤ کی آواز میں دکھ کی لہر ابھری۔

''آپ یہ بھی تو سوچیں، کیوں مارا ہے؟'' میں نے کہا۔

''اس لیے کہ اس خبیث نے انیق کے ساتھ دشمنی بنا رکھی تھی، اس کے خون کا پیاسا

ہو رہا تھا۔" داؤد بھاؤ کی آنکھوں میں لہو اتر آیا۔

"تالی ایک ہاتھ سے تو نہیں بجتی بھاؤ۔ اگر ان دونوں میں دشمنی شروع ہوئی تو اس میں انیق کا بھی دوش تھا بلکہ اگر ہم دیکھیں تو زیادہ بوجھ انیق پر ہی آتا ہے۔ لالہ موسیٰ میں سجاول کی بیوی بچے کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس کی سن گن آپ کو مل چکی ہوگی اور اب یہ کوٹلی والا معاملہ۔ اس میں تو ایک جان بھی چلی گئی...... لیکن بات یہ نہیں ہے کہ دونوں میں سے زیادہ قصور کس کا تھا، بات تو یہ ہے کہ دشمنی شروع ہی کیوں ہوئی؟ شاید آپ کو یہ بات عجیب لگے لیکن حقیقت یہ ہے بھاؤ کہ اس خطرناک کھیل کی شروعات میں دونوں کا قصور نہیں تھا...... ایک ذرہ بھی قصور نہیں تھا، انیق نے جو کچھ بھی کیا، وہ اس دشمنی کی وجہ بنا اور انیق نے بھی جو کچھ کیا، اس نے خود نہیں کیا، اس سے کرایا گیا۔"

"کس نے کرایا؟ میرے اور تمہارے علاوہ وہ کس کی بات مانتا تھا۔ میرے اور تمہارے سوا اور کون تھا اس کا پشت پناہ؟" غم و غصے کی شدت سے داؤد بھاؤ کی آواز بھرا گئی۔

میں نے چند لمحے توقف کے بعد کہا۔ "داؤد بھاؤ...... یہاں کچھ باتیں بہت عجیب ہیں، آپ انہیں مان نہیں پائیں گے۔ مجھے بھی شروع شروع میں یہ سب کچھ ماننے میں بہت مشکل پیش آئی لیکن حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ جاما جی جزیرے میں بہت کچھ انوکھا ہوتا رہا اور یہ انوکھا پن اب ہمارے ساتھ یہاں بھی پہنچ گیا ہے۔"

"تم پہیلیاں نہ بجھواؤ۔" داؤد بھاؤ نے جھنجلا کر کہا...... پھر چونک کر بولا۔ "ابھی تم کسی عورت کی بات کر رہے تھے۔ کون جاما جی سے یہاں پہنچی ہے؟"

"وہی جس کے بارے میں، میں نے آپ کو، ایک دو مرتبہ فون پر بھی بتایا تھا، اس وقت بھی آپ کو میری بات پر پوری طرح یقین نہیں آیا تھا۔"

"تم شاید رائے زل کی ماں کی بات کر رہے ہو، جو عمل وغیرہ کرتی ہے۔"

"جی ہاں، اسی کی بات کر رہا ہوں۔ وہ بہت خاص قسم کی ہپناٹسٹ ہے۔ ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ وہ اچھے بھلے بندے کے اندر گھس کر اس کی ساری سوچیں اپنے ہاتھوں میں کر لیتی ہے۔ اس بات کا ثبوت بھی ہے کہ وہ اپنے معمول کے ذہن کو کمزور کرنے کے لیے اس پر خاص قسم کی نشہ آور ادویات کا استعمال بھی کرتی ہے۔ ہمارے انیق کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوتا رہا ہے داؤد بھاؤ! آپ نے ابھی جنازے سے پہلے اس کا چہرہ دیکھا ہوگا۔ آپ کو اس کے چہرے پر منشیات کے آثار نظر نہیں آئے؟ حالانکہ ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں، وہ کبھی نشہ آور چیزوں کے قریب تک نہیں گیا۔"

''تم کہنا چاہتے ہو کہ رائے زل کی ماں یہاں ہے اور اس نے انیق پر کوئی عمل وغیرہ کیا تھا؟''

''عمل کیا ہی نہیں تھا داؤد بھاؤ...... وہ مسلسل یہاں موجود رہی ہے۔ اس نے انیق کو پوری طرح اپنے قبضے میں کر رکھا تھا، اگر آپ......''

''میں نہیں مانتا ان باتوں کو۔'' داؤد بھاؤ نے ہاتھ لہرا کر میری بات کاٹی۔ ''کوئی اور مجھے طوطا مینا کی ایسی کہانی سناتا تو میں اس کا گریبان پکڑ لیتا...... لیکن شاہی! تم میرے دل کے بہت قریب ہو۔ تمہارے لیے میری ساری سوچیں اور میرے فیصلے بدل جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب تم سے ملاقات ہوئی اور تم نے انیق کو مجھ سے مانگا تو میں انکار نہ کر سکا۔ حالانکہ سب جانتے ہیں، کہ انیق حقیقتاً میرے دائیں ہاتھ کی طرح تھا۔'' اس کی آواز بوجھل ہو گئی۔ اس نے چند لمحے توقف کیا اور بولا۔ ''خیر چھوڑو ان باتوں کو، لیکن اب مجھے ایسے لگ رہا ہے کہ تم انیق اور سجاول کی اس لڑائی میں، ذمے داری انیق پر ڈال رہے ہو، اور مجھے یہ سمجھا رہے ہو کہ وہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھا۔ حالانکہ ہوش و حواس میں تو تمہارا وہ ڈکیت یار سجاولا نہیں تھا۔ اگر انیق نے کبھی اس کی طرف اینٹ پھینکی ہے تو اس نے اس کا جواب پتھر سے دیا ہے پھر اس ڈکیت نے اس اکیلے بچے کو گھیر کر مارا ہے۔ اس کام کے لیے اس نے اپنے یار قبائلی سردار اور اس کے درجنوں گن مینوں کو بھی ساتھ ملایا، بتاؤ ملایا یا نہیں؟''

میں دیکھ رہا تھا کہ انیق کی موت کا صدمہ ابھی تازہ ہے اور داؤد بھاؤ، سجاول وغیرہ کے خلاف غم و غصے سے بھرا ہوا ہے۔ میں نے فی الحال اس سلسلے میں طویل بحث مناسب نہیں سمجھی اور بتدریج گفتگو کا رخ دیگر موضوعات کی طرف موڑ دیا۔

یہ تدبیر کارگر رہی اور داؤد کے بگڑے ہوئے موڈ میں تھوڑی سی بہتری آ گئی۔ اس نے سجاول والے موضوع کو کچھ دیر کے لیے التوا میں ڈالا اور مجھ سے ٹیکساری گینگ کی موجودہ ذلت و خواری کے حوالے سے کچھ سوالات پوچھے۔ وہ بھی جیسے دانستہ اپنی توجہ انیق والے موضوع سے ہٹانا چاہتا تھا۔ اسی دوران میں بھاؤ کے ایک کارندے نے آ کر بتایا کہ مقامی تھانے کا ایس ایچ او آیا ہوا ہے اور گھر والوں سے سوال جواب کر رہا ہے۔ ایس ایچ او جیسے لوگوں سے نمٹنا داؤد بھاؤ کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ وہ اس سے بات کرنے کے لیے باہر آ گیا...... میری اور بھاؤ کی دوسری نشست سہ پہر کے بعد اسی اسٹیشن وین میں ہوئی۔ کچھ دیر انیق کی بات ہوتی رہی۔ تب داؤد بھاؤ جیسے چونک کر بولا۔ ''شاہی، آخر وہی ہوا ناں۔ تاجور تمہارے ہاتھ سے نکل گئی۔ وہ طاقتور سیاسی خاندان اسے لے اڑا...... اور تم منہ دیکھتے رہ

گئے ......اور تم ہی کیا ہم سب منہ دیکھتے رہ گئے۔ جس دن اس کی شادی کی خبر ملی، مجھے لگا جیسے سینے پر کسی نے فائر دے مارا ہے...... ایک بار تو جی میں آئی کہ کچھ کر گزروں لیکن پھر سوچا کہ اس سے فائدہ کیا ہے۔ جب تم ہی دنیا میں ”نہیں“ ہو تو پھر جو ہوتا ہے، ہوتا رہے۔“

میں خاموش رہا۔ میں اسے کیا بتاتا کہ اگر تاجور میرے ہاتھ سے نکلی ہے اور ہم دونوں جدا ہوئے ہیں تو اس کے پیچھے بھی انیق اور اس کی مجبوریاں ہیں۔ وہی تھا جس نے نکاح سے صرف ایک دو دن پہلے تاجور کو ایک اذیت ناک انکشاف کے ذریعے اشکوں میں ڈبویا اور وہ ایک ایسے فیصلے پر پہنچ گئی جس نے مجھے ہی نہیں، اسے بھی دکھ کی دیوار میں چن دیا۔

داؤد بھاؤ نے نئے سگار کا کونا توڑتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں معلوم تھا کہ اس کی شادی ہو رہی ہے؟“

”ہاں داؤد بھاؤ معلوم تھا اور یہ بھی معلوم تھا کہ جو کچھ ہو رہا، ہے اس کی مرضی سے ہو رہا ہے۔ اس کے بعد تو پھر زبردستی ہی رہ جاتی تھی اور آپ کو معلوم ہے کہ اگر اسے اس کی مرضی کے بغیر حاصل کرنا ہوتا تو پھر اس سے پہلے بھی بہت موقع تھے میرے پاس۔“

”تم کہہ رہے ہو کہ سب کچھ اس کی مرضی سے ہوا ہے لیکن اس کی مرضی کیوں ہوتی، میں نے تو یہاں تک سنا ہے کہ دارج کے ساتھ شادی سے صرف دو دن پہلے، اپنی مہندی کے موقع پر وہ کہیں نکل گئی تھی......“

داؤد بھاؤ بولتے بولتے ایک دم رک گیا۔ اس نے جیسے چونک کر میری طرف دیکھا اور گہرا کش لے کر بولا۔ ”ایک بات سچ بتانا۔ کیا تاجور کو پتا تھا کہ تم زندہ ہو، مطلب ہے کہ دھماکے سے بچ گئے ہو؟“

”ہاں، اسے پتا تھا۔“

”تو پھر تو یہ بھی ہو سکتا ہے شاہی کہ...... وہ اپنی مہندی کے موقع پر گھر سے غائب ہی اس لیے ہوئی تھی کہ وہ تم تک پہنچنا چاہتی تھی...... اور یہ بھی ممکن ہے کہ تم ہی...... اس کو لے کر گئے ہو۔“ وہ اپنی بڑی بڑی جہاندیدہ آنکھوں سے میری آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ اس کی ذہانت فطانت کے بارے میں مجھے کوئی شک نہیں تھا اور اب اس کا ثبوت بھی مل رہا تھا۔ وہ کڑی سے کڑی جوڑ کر درست صورتِ حال تک پہنچ گیا تھا۔

میں نے لمبی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ”اب ان باتوں سے کچھ حاصل نہیں داؤد بھاؤ، جو ہونا تھا، ہو چکا ہے۔“

”ٹھیک ہے، ہو چکا ہے مگر مجھ سے جھوٹ تو نہ بولو شاہی، مجھے سچ بتاؤ۔ شادی سے پہلے

تاجور تمہارے پاس تھی؟ وہ کتنے دن رہی تمہارے پاس......اور پھر واپس کیوں گئی۔ سنا ہے کہ اس نے واپس جا کر اپنے باپ سے اور اپنے ہونے والے سسرال سے رو رو کر معافی بھی مانگی تھی۔ ایسا کیا ہوا تھا جو اس نے یوں ہتھیار ڈالے؟"

میں نے نشست پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کو بتا دوں گا داؤد بھاؤ۔ سب کچھ بتا دوں گا۔ اس وقت انیق کی موت کے صدمے نے گھیر رکھا ہے۔ کچھ بھی کہنے سننے کو دل نہیں چاہ رہا۔"

"ٹھیک ہے مگر مجھے صرف اتنا بتا دو کہ...... وہ شادی سے پہلے چند دن تمہارے پاس رہی تھی یا نہیں؟" وہ زور دے کر بولا۔

"آپ کہہ سکتے ہیں کہ وہ رہی ہے لیکن خدانخواستہ اس کے رہنے میں کسی طرح کا بھی کچھ غلط نہیں تھا۔ آپ مجھے جانتے ہیں...... اگر......"

"تمہیں صفائیاں دینے کی ضرورت نہیں شاہی۔" وہ میری بات کاٹ کر بولا۔ "میں تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں۔"

"اب اس چیپٹر کو کلوز ہی رکھا جائے تو بہتر ہے بھاؤ۔" میں نے افسردگی سے کہا۔

وہ نشست سے ٹیک لگا کر کہنے لگا۔ "میرے خیال میں شاہی! یہ چیپٹر ابھی پوری طرح کلوز نہیں ہے۔ میری سی آئی ڈی بتا رہی ہے کہ تاجور اپنے سسرال میں سکھی نہیں ہے۔ اس کے ساتھ وہی کچھ ہو رہا ہے جس کی توقع تھی۔ وہ سؤر کا بچہ دارج اپنی پاور کے نشے میں اس کمزور کے ساتھ وہی سلوک کر رہا ہے جو آقا اور کنیز والا ہوتا ہے۔ ریڑھ کی ہڈی تڑوا کر بستر پر پڑا ہوا ہے پھر بھی خبیث کو چین نہیں ہے۔ سنا ہے کہ اس کا نچلا دھڑ بالکل ناکارہ ہو گیا ہے۔ حاجتیں وغیرہ بھی اسے "آرٹی فیشل" طریقے سے پوری کرائی جاتی ہیں۔"

"یہ بات مجھے آپ ہی سے معلوم ہو رہی ہے...... میرا تو خیال تھا کہ شاید اس کی طبیعت اتنی خراب نہیں ہے۔"

"یہ اندر خانے کی باتیں ہیں شاہی۔ یہ لوگ پبلک کے سامنے اپنا بھرم رکھنے کے لیے بڑے بڑے پاپڑ بیلتے ہیں۔ ان کا ہر کام ان کے ایجنڈے کے مطابق ہوتا ہے۔ پچھلے دنوں وی آنا کا کوئی بہت بڑا سرجن پہنچا ہے اسلام آباد...... اس نے بڑے داراب صاحب کو یقین دلایا ہے کہ وہ دو تین ماہ میں بغیر کسی بڑے آپریشن کے اس کے بیٹے کو بحال کر دے گا۔ بحال کرنا تو اوپر والے کا کام ہے، کرتا ہے کہ نہیں کرتا۔ یہ "میڈیکل شعبے" کے انٹرنیشنل لٹیرے تو بس مال کھائیں گے کروڑوں کے حساب سے۔"

داوٗد بھاوٗ کی باتوں سے مجھے حیرت کا شدید دھچکا لگا۔ ان باتوں سے یہ نتیجہ اخذ ہو رہا تھا کہ دارج صرف بیمار نہیں، بہت زیادہ بیمار ہے۔ ریڑھ کی چوٹ کی وجہ سے وہ عضوِ معطل بن کر رہ گیا ہے۔ تاجور ایک بیوی کی حیثیت سے نہ صرف دن رات اس کی خدمت میں مصروف ہے بلکہ اس کے سخت سلوک کا شکار بھی ہو رہی ہے۔

''کیا سوچنے لگ گئے ہو؟'' داوٗد کی گرج دار آواز نے مجھے چونکایا۔

میری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر وہ بولا۔ ''شاہی! تمہارے زندہ سلامت ہونے کی خوشی میں جانتا ہوں یا میرا دل جانتا ہے۔ یہ میری زندگی کی ایک انوکھی خوشی ہے مگر یہ خوشی تب ہی مکمل ہوگی جب میں انیق کے قتل کے ذمے داروں کو ان کے انجام تک پہنچا لوں گا۔ تمہیں اچھا لگے یا برا، لیکن میں خیالوں پر نہیں جاؤں گا، سالڈ بات کروں گا، میرے نزدیک تو اس قتل کا ذمے دار وہ سیالکوٹیا (سجاول) ہی ہے۔ اچھا ہے کہ وہ یہاں میرے آس پاس موجود نہیں۔ ورنہ آج کا سورج اس کی موت کے ساتھ ڈوبنا تھا۔''

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا، لگژری اسٹیشن وین کی خاموش ایئر کنڈیشنڈ فضا میں داوٗد بھاوٗ کے قیمتی سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اپنے نیم گنجے سر پر ہاتھ پھیرنے کے بعد وہ کسی سے بات کرنے میں مصروف ہو گیا، اسپیکر کی آواز نہ ہونے کے برابر تھی۔ دوسری طرف سے بولنے والے کی آواز مطلق میرے کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ داوٗد بھاوٗ بھی اسے ہوں ہاں میں جواب دے رہا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے یہ شک ہوا کہ یہاں جو گفتگو ہو رہی ہے وہ کسی طور سجاول اور اس کے قریبی ساتھیوں زرق خاں وغیرہ کے بارے میں ہی ہے۔

بات کرتے ہوئے داوٗد بھاوٗ اپنی لگژری وین سے باہر نکل گیا۔ وہ ایک مانا ہوا گینگسٹر تھا اور درجنوں مقدمات میں پولیس کو مطلوب بھی، لیکن وہاں موجود ایک پولیس افسر نے اسے 'ادب' سے سلام کیا۔ وہ بات کرتا ہوا دوسری جانب نکل گیا۔ میں فخر اور یونس پمپ والا کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظر دوڑانے لگا مگر وہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ جنازے کے بعد سے وہ غائب تھے۔ پہلوان حشمت بھی جس طرح خاموشی سے آیا اسی طرح واپس چلا گیا تھا۔ اس نے عقلمندی کا ثبوت دیتے ہوئے، دوسروں کے سامنے مجھ سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔

لواحقین اور دور سے آنے والے عزیزوں کے لیے کھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ میں نے انیق کی پھپھو کی ایک جھلک بھی دیکھی۔ اس عورت نے اس یتیم بچے کو ماں بن کر پالا تھا اور اب وہ ایک سگی ماں ہی کی طرح سوگوار دکھائی دیتی تھی۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی اور رنگ

ہلدی تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ ایک قریبی گوٹھ میں کوئی بڑا وڈیرا، داؤد بھاؤ کے جاننے والوں میں شامل ہے، داؤد بھاؤ اور اس کے قریبی ساتھی رات اسی وڈیرے کی حویلی میں بسر کریں گے اور کل واپس لاہور روانہ ہوں گے۔ میں بھی کل ہی یہاں سے روانہ ہونا چاہتا تھا۔ ہماری توقعات کے عین مطابق مادام ہاناوانی اس گوٹھ سے اُڑن چھو ہو چکی تھی۔ اس کے بارے میں انیق کے گھر والوں کو کچھ پتا نہیں تھا۔

رات نو بجے تک فخر سے کوئی رابطہ نہیں ہوا تو مجھے اس کی فکر لاحق ہوئی۔ وہ گاڑی بھی لے گیا تھا۔ میں نے ایک بار پھر سیل فون پر اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی اور اس مرتبہ رابطہ ہو گیا۔ ''ہیلو فخر، یار کہاں غائب ہو گئے ہو بغیر بتائے؟''

''بس آ رہا ہوں گوٹھ۔ تمہارے لیے ایک اہم خبر ہے۔ دس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔''

دس پندرہ منٹ بعد وہ میرے ساتھ گوٹھ کی ایک اندھیری گلی میں کار کے اندر بیٹھا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور سنسنی خیز لہجے میں بولا۔ ''اظہارِ تشکر فرمانا چاہیے تمہیں۔ پچھلے تین چار گھنٹے میں اس خاکسار نے ایک بڑی لڑائی کو سر سے ٹالا ہے۔ یہاں پانی پت سے چھوٹا معرکہ نہیں ہونا تھا میرے فہم و ادراک کے مطابق۔''

''کس کی لڑائی کس کے ساتھ؟'' میں نے استفسار کیا۔

''سجاول سیالکوٹی کی لڑائی، تمہارے داؤد بھاؤ کے ساتھ۔ اس وقت تک دونوں میں سے ایک کی لاش تو یقیناً کپڑے سے ڈھکی پڑی ہوئی تھی۔''

''یار! صاف بات کرو، کہاں گئے تھے تم اور یونس؟''

''سجاول کو روکنے۔ وہ کالی آندھی کی طرح یہاں گوٹھ موراناں آ رہا تھا اور یہاں یہ داؤد بھاؤ پہلے ہی اس کا ٹیٹوا دبانے کے لیے پوری طرح تیار اور کمر بستہ تھا۔''

''سجاول! وہ کیوں آ رہا تھا یہاں؟ جنازہ تو ہو چکا تھا۔''

''وہ شاید جنازہ پڑھنے نہیں ایک اور جنازہ نکالنے آ رہا تھا۔ اس بدبخت ہاناوانی کو جہنم واصل کرنے کے لیے تشریف لا رہا تھا۔ اس کو سب پتا چل چکا ہے شاہ، وہ جان چکا ہے کہ یہاں گوٹھ میں کیا گھناؤنا کھیل کھیلا گیا ہے۔ اس نے اس ساری صورتِ حال پر یقین بھی کیا ہے اور اس کی وجہ شاید وہی ہے جو تم نے بتائی تھی۔ تم نے بتایا تھا کہ جاما جی میں سجاول خود بھی ایک موقع پر اس عورت کے عملیات کا شکار ہوا تھا......''

میں فخر کی باتیں سن رہا تھا اور سناٹے میں تھا۔ صورتِ حال بڑی تیزی سے تبدیل ہو رہی تھی اور سمجھ میں بھی آ رہی تھی۔ میں نے فخر سے پوچھا۔ ''اگر تمہاری بات درست ہے تو

پھر سجاول کو یہاں ہاناوانی کی موجودگی کے بارے میں کس نے بتایا؟''

''یہ کام یونس نے کیا ہے، جب انیق ''باغ'' کے اسپتال میں تھا اور زندگی موت کی لڑائی لڑ رہا تھا تو میں اور تم ہاناوانی کے موضوع پر کھل کر بات کر رہے تھے، اس حوالے سے راستے میں بھی ہماری گفتگو ہوتی رہی تھی۔ کافی باتیں یونس کے کانوں تک پہنچ چکی تھیں۔ اس نے اپنے پشت پناہ سجاول کو ان سے آگاہ کیا اور وہ ہاناوانی کا سامنا کرنے کے لیے گوٹھ موراناں کی طرف جھپٹ پڑا۔ اس نے پچھلے سولہ گھنٹے مسلسل سفر کیا اور اپنے چار ساتھیوں کے ہمراہ ''بھوگلا'' تک پہنچ گیا۔ جب مجھے یونس کی زبانی اس بات کا پتا چلا، تم داؤد بھاؤ کے ساتھ اس کی اسٹیشن وین میں محوِ گفتگو تھے۔ میں سمجھ گیا کہ اگر سجاول اور داؤد بھاؤ کے درمیان خونریز تصادم سے بچنا ہے تو سجاول کو یہاں پہنچنے سے پہلے ہی روک لینا چاہیے۔ میں نے یونس کو ساتھ لیا اور چل پڑا۔''

''اب کہاں ہے سجاول؟''

''یہاں سے قریباً دس کلومیٹر دور...... بھوگلا کے ایک ہوٹل میں۔ میں جس طرح اس کو روکنے میں کامیاب ہوا ہوں کچھ میں ہی جانتا ہوں۔ وہ بہت جذباتی ہو رہا ہے شاہی، اسے احساس ہو گیا ہے کہ جاماجی والی دشمنی یہاں تک آن پہنچی ہے۔ اس دشمنی کی وجہ سے اس کتنا بڑا ناقابلِ تلافی نقصان ہو گیا ہے لیکن ایک بات بتا دوں، وہ طیش سے تقریباً دیوانہ ہو رہا ہے۔ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اس کا دل تو شاید یہی چاہتا ہے کہ تمہارا سامنا کرنے سے پہلے ہاناوانی کا قصہ تمام کر دے تاکہ تھوڑی بہت سرخروئی اسے مل جائے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے کہ مجھے اس سے ملنا چاہیے؟'' میں نے فخر سے رائے طلب کی۔

''ضرور ملنا چاہیے۔ تم سے مل کر ہی وہ کچھ سنبھل سکے گا۔ حالانکہ میں اسے دس بار بتا چکا ہوں کہ ہاناوانی اب گوٹھ میں نہیں ہے مگر اس کی نظریں گوٹھ کی طرف ہی ہیں۔ اگر وہ آج رات اس طرف نکل آیا تو داؤد بھاؤ سے اس کا تصادم ہو کر رہے گا۔''

''ٹھیک ہے۔ میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں فخر۔'' میں اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

O......❖......O

قریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد میں اور فخر اس درمیانے درجے کے ہوٹل میں موجود تھے جہاں صوبے کا خطرناک ترین ڈکیت سجاول اپنی تمام تر گمبھیرتا کے ساتھ موجود تھا۔ ہوٹل کا منیجر کچھ سہما سہما سا نظر آتا تھا۔ سجاول کا دبنگ کارندہ باقر اور دو مزید ساتھی بھی اپنی لمبی قمیصوں کے نیچے اسلحہ سجائے آس پاس موجود تھے۔ میں اور فخر سیڑھیاں چڑھ کر اس ڈبل روم میں پہنچے جہاں سجاول ٹھہرا ہوا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی مجھے چونکنا پڑا۔ ایک کمرے کا تقریباً سارا فرنیچر برباد ہو چکا تھا۔ فریم شدہ تصویریں چکنا چور تھیں۔ ایک دیوار پر کئی جگہ سے پلاستر تک اکھڑا نظر آیا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہ وحشیانہ توڑ پھوڑ سجاول نے ہی مچائی ہے۔

میں ساتھ والے کمرے میں گیا۔ اس نے تیز ترین وہسکی کی بوتل سامنے رکھی ہوئی تھی۔ اس میں بس چند گھونٹ الکحل ہی بچا تھا۔ سجاول کی بڑی بڑی آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ تھیں۔ ایک ہاتھ لہولہان ہو رہا تھا۔ یہ وہی ہاتھ تھا جس کا طوفانی مکا پتھر میں بھی دراڑیں ڈال دیتا تھا۔ ساتھ والے کمرے میں جو بربادی نظر آئی تھی یقیناً اسی غیر معمولی گھونسے کی کرشمہ کاری تھی۔ شدید غم و غصے اور ڈپریشن کی شدت میں اس نے اپنے اردگرد نظر آنے والی ہر شے کو توڑ پھوڑ ڈالا تھا۔ ہوٹل کے عملے میں جو خوف و ہراس پایا جاتا تھا۔ اس کی وجہ بھی یقیناً یہی تھی۔

میں نے آج تک سجاول کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھے تھے لیکن آج مجھے یہ نظر آئے۔ میری اپنی آنکھیں بھی نم تھیں۔ ہم دونوں نے اپنا ایک قریبی دوست اور ساتھی کھویا تھا۔ المیہ یہ تھا کہ اسے کسی اور نے نہیں، ہم نے ہی مار ڈالا تھا۔ ہم اس کی ساری اذیتوں، مجبوریوں اور لاچاریوں سے بے خبر رہے تھے۔ پتا نہیں کیوں ہمارا دھیان اس طرف گیا ہی نہیں تھا۔ ہم بھول گئے تھے کہ ہم جاماجی میں ایک خطرناک دشمنی چھوڑ کر آئے ہیں اور وہ دشمنی ہمارا تعاقب کر کے یہاں پہنچ سکتی ہے۔

کچھ دیر تک کمرے میں ایک گمبھیر اور بوجھل خاموشی طاری رہی۔ وہ میری طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ ''سجاول!'' میں نے اسے پکارا۔

وہ اٹھا اور میری طرف پشت کر کے کھڑا ہو گیا۔ جیسے اپنا چہرہ مجھے دکھانا نہ چاہتا ہو۔ اس کے زخمی ہاتھ سے اب بھی تھوڑا بہت خون رِس رہا تھا۔

''سجاول۔'' میں نے اسے دوبارہ بلایا۔

وہ اسی طرح بے حرکت کھڑا رہا۔ اس نے جبڑے بھینچ رکھے تھے۔ میں نے اس کے چوڑے شانے پر ہاتھ رکھا اور اسے کھینچ کر اپنی طرف کیا۔ ''جو ہونا تھا، وہ ہو چکا سجاول، اب ہوش میں آ جاؤ......''

''شاہی! میں جب تک اس سورنی کو مار نہیں لوں گا، مجھ پر آرام حرام ہے۔'' وہ شعلہ بار آنکھوں کے ساتھ آتشیں لہجے میں بولا۔ ایک خوفناک ٹھہراؤ تھا اس کی آواز میں۔

''وہ ہماری سانجھی دشمن ہے سجاول! ہم اس سے انیق کی موت کا یادگار بدلہ لیں گے لیکن تم جوش میں آ کر کوئی غلطی نہ کرنا۔ تمہیں پتا ہے وہ کتنی خطرناک عورت ہے۔ ہم اس سے پہلے بھی اسے بھگت چکے ہیں۔ تمہیں یاد ہی ہو گا کہ اس نے جاماجی میں کس طرح تمہیں ہمارے خلاف لا کھڑا کیا تھا۔''

سجاول کی آنکھوں میں مسلسل انگارے دہک رہے تھے۔ اس کا چہرہ چٹان کی طرح سخت تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ اس نے خود پر بڑی دشواری سے ضبط کر رکھا ہے۔ یہ واقعی فخر کا کمال تھا کہ اس نے سجاول کو گوٹھ تک پہنچنے نہیں دیا تھا اور یہاں روک لیا تھا۔

میں اور فخر قریباً ایک گھنٹہ مزید سجاول کے پاس رکے۔ میرے سمجھانے بجھانے پر وہ کسی حد تک نارمل دکھائی دینے لگا۔ بہر حال انیق کی موت کا دکھ اس کی آنکھوں میں کسی جوت کی طرح روشن تھا۔

اس نے آخر میں بوتل سے منہ لگا کر چند تلخ بدبودار گھونٹ گلے سے نیچے اتارے اور اپنے بالوں بھرے ہاتھ سے اپنے ہونٹ پونچھ کر بولا۔ ''اس نے کوٹلی میں جو کچھ کیا، اس نے میرے ہوش مجھ سے چھین لیے۔ میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ اسے مار دوں یا خود مر جاؤں، اگر جو کچھ آج مجھے پتا چلا ہے، پرسوں چل جاتا، یا کل بھی چل جاتا تو شاید یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ کل صبح آٹھ نو بجے تک بھی وہ زندہ تھا اگر اس وقت بھی تمہاری کال مجھے مل جاتی تو ہم اپنے ہاتھ روک لیتے۔''

سجاول کی آنکھوں میں گہرا تاسف تھا اور اس تاسف میں یقیناً اپنی قریبی عزیزہ کی

موت کا دکھ بھی تھا۔

میں نے ایک بار پھر سجاول کو دماغ ٹھنڈا رکھنے کا مشورہ دیا اور ساتھ ہی یہ یقین بھی دلایا کہ ہم ایک آدھ دن میں ہی ہاناوانی کی گردن تک ضرور جا پہنچیں گے۔ اگر وہ واپس جاما.جی فرار نہیں ہوگئی تو پھر یہیں پر اس کا "مقبرہ" بنے گا۔

سجاول میری باتوں پر خاموش تھا۔ ایک طرح اس صورتِ حال کو سجاول کی نیم رضامندی کہا جا سکتا تھا لیکن میں اس کی آتش مزاجی سے بھی بخوبی آگاہ تھا۔ ساتھ والے کمرے میں جو فرنیچر چکنا چُور پڑا تھا، وہ اس آتش مزاجی کا ایک چھوٹا سا ثبوت تھا۔

سجاول نے عندیہ دیا کہ وہ آج رات اس ہوٹل میں قیام کرے گا اور کل کسی وقت کوٹلی والے ڈیرے پر واپس چلا جائے گا۔ بہرحال مجھے اسے بارے میں بھی شک تھا۔ سجاول سے رخصت ہوتے وقت میں نے ایک احتیاط کی۔ میرا پن ہل اسمارٹ کیمرا اس سے پہلے بھی کئی بار میرے زبردست کام آچکا تھا۔ نیم مدہوش سجاول کی نگاہ بچا کر میں نے کیمرا جیب سے نکال کر ہاتھ میں کر لیا تھا جونہی مجھے موقع ملا، میں نے یہ ننھا سا ڈیوائس ایک کارنس ٹیبل پر چپکا دیا۔

سجاول سے رخصت ہو کر میں اور فخر واپس روانہ ہوئے۔ یونس پمپ والا بھی نیچے ہوٹل کی لابی میں موجود تھا۔ اس کی موجودگی میں فخر بہت احتیاط کرتا تھا اور مجھے وقاص کے نام سے ہی بلاتا تھا۔ گاڑی میں بیٹھتے وقت میں نے یونس کو سمجھایا۔ "تمہارے سجاول صاحب، اس وقت پوری طرح ہوش میں نہیں ہیں۔ کسی وقت بھی ابال آگیا تو یہاں سے نکل کھڑے ہوں گے اور یہ خطرناک ہوگا۔"

"میں آپ کی بات پوری طرح سمجھ رہا ہوں وقاص بھائی، اگر مجھے کوئی ایسی بات ہوتی نظر آئی تو میں آپ کو بتاؤں گا۔ ویسے وہ جتنی چڑھا چکے ہیں میرا خیال ہے کہ کچھ دیر میں سو جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے تم چوکس رہو، میرا گوٹھ واپس جانا ضروری ہے، ورنہ ہوسکتا تھا کہ میں اِدھر ہی رک جاتا۔"

○......❖......○

جس وقت ہم ہوٹل کی مختصر پارکنگ سے نکلے رات کے بارہ بج چکے تھے۔ ناشتے کے بعد سے ہم دونوں نے کچھ بھی کھایا پیا نہیں تھا۔ بھوک ہی مری ہوئی تھی۔ بہرحال جسم کو توانائی کے لیے ایندھن کی ضرورت تو ہوتی ہے۔ نقاہت سی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک قدرے بارونق

سڑک پر ایک درمیانے درجے کا سندھی ہوٹل نظر آیا اور ہم وہاں رک گئے۔ ہلکا پھلکا کھانا کھایا اور چائے پی، اس دوران میں بھی انیق کی دردناک جدائی کی ہی باتیں ہوتی رہیں۔ چھوٹی چھوٹی یادیں تھیں چھوٹے چھوٹے واقعات تھے، جو اس کے غم کو بڑھاوا دے رہے تھے۔ وہ ایک مسلسل عذاب میں مبتلا رہا اور ہم اس کی تکلیف سے بے خبر رہے۔ پتا نہیں کیوں...... ہم میں سے کسی ایک کا ذہن بھی اس طرف جا ہی نہیں سکا۔ جاما جی کی دشمنی والا حوالہ جیسے ہمارے ذہنوں سے محو ہی ہو گیا تھا۔

انیق نے میرے ساتھ جو آخری تصویر بنوائی تھی، وہ جاما جی ہی کی تھی۔ بلند پام پیڑوں کے نیچے وہ شرارت کے موڈ میں کھڑا تھا، اس نے دھوپ کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ میں نے اس کی گردن اپنی بغل میں لے رکھی تھی۔

کچھ دیر تک میں اور فخر یہ تصویریں دیکھتے رہے پھر میں نے یونہی اپنے پن ہول کیمرے کو کونیکٹ کیا۔ میں کیمرے کا رزلٹ دیکھنا چاہ رہا تھا۔ رزلٹ بہت خراب تھا۔ اسکرین پر لہریں دکھائی دے رہی تھیں۔ کیمرے کا زاویہ بھی کچھ زیادہ اچھا نہیں تھا۔ مجھے سجاول کا بس ایک کندھا ہی دکھائی دے رہا تھا۔ مگر باقی جو کچھ مجھے نظر آیا، وہ اوسان خطا کرنے کے لیے کافی تھا۔ مجھے یوں لگا کہ سجاول والے کمرے میں کوئی شدید قسم کی گڑبڑ ہے۔ مجھے ایک شخص فرش پر اوندھا پڑا دکھائی دیا۔ یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ سجاول کا ساتھی ہے یا کوئی اور......

کوئی شخص کڑک کر بولا مگر آواز ٹوٹ کر آ رہی تھی۔ الفاظ بالکل سمجھ میں نہیں آئے۔ اس کے ساتھ ہی یوں بھی لگا کہ کوئی خاتون بھی کمرے میں موجود ہے کیونکہ ایک زنانہ چادر کی جھلک دکھائی دی تھی۔

''کیا ہوا؟'' فخر نے میرے تاثرات دیکھے اور چونک کر کہا۔

''کوئی گڑبڑ ہے۔ میں نے سجاول کے کمرے میں منی کیمرا چھوڑا تھا۔'' میں نے نگاہیں اسکرین پر مرکوز رکھے رکھے جواب دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

فخر بھی اٹھ گیا اور اسکرین کو دیکھنے لگا۔ میں نے کہا۔ ''یہاں سگنل کمزور ہیں کچھ بھی ٹھیک سے پتا نہیں چل رہا۔''

فون کے اسپیکر پر آڈیو سنائی دی۔ کسی نے انگلش میں گرج کر کہا۔ ''ایسا نہیں ہو سکتا......'' اس کے ساتھ ہی سگنل کمزور ہو گئے اور آڈیو کے بجائے شائیں شائیں سنائی دینے لگی۔

میں اور فخر تقریباً بھاگتے ہوئے ہوٹل سے نکلے۔ نکلنے سے پہلے فخر نے ایک بڑا کرنسی نوٹ میز پر چھوڑ دیا تھا۔ ہم مہران کار میں بیٹھے اور واپس اس ہوٹل کی طرف بڑھے جہاں ایک گھنٹہ پہلے سجاول کو چھوڑ کر آئے تھے۔ سڑک پر رش کم تھا، فخر برق رفتاری سے کار چلانے لگا۔ ہم ایک راؤنڈ اباؤٹ سے مڑے تو موبائل کے ''وڈیو ریسیور'' کے سگنل ایک دم کلیئر ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی میرے سر سے پاؤں تک سنسنی کی تیز لہریں دوڑ گئیں۔ میرے سامنے سجاول والے کمرے میں ایک سنگل صوفے پر ہاناوانی موجود تھی۔ اپنے پورے طمطراق اور شان وشوکت کے ساتھ۔ اس کے بھاری بھرکم جڑاؤ زیورات ٹیوب لائٹ میں چمک رہے تھے۔ اس کی ایک کلائی کے گرد لپٹی ہوئی منکوں کی تسبیح بھی نمایاں دکھائی دے رہی تھی۔ حسبِ دستور اس نے رات کے وقت بھی گہرے سیاہ شیشوں والی عینک لگا رکھی تھی۔

''ہاناوانی۔'' میں نے سرسراتے لہجے میں کہا۔

فخر بھی چونک کر میرے سیل فون کی اسکرین کو دیکھنے لگا۔ کمرے کا منظر تہلکہ خیز تھا۔ ہاناوانی کے کم از کم چار مسلح ساتھی ہوٹل کے اس کمرے میں موجود تھے۔ ان میں سے تین اپنے ملائیشین خدوخال کی وجہ سے صاف پہچانے جا رہے تھے۔ کمرے میں سجاول کے ایک ساتھی کی لاش صاف دکھائی دے رہی تھی۔ ایک اور غیر متحرک جسم کی ٹانگ بھی کیمرے کے فریم میں دکھائی دیتی تھی۔ کمرے کے اندر ٹوٹ پھوٹ کے آثار تھے۔

فخر نے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ سجاول کو کرسی سے باندھ دیا گیا ہے۔''

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ سجاول کو جکڑنے والی بندشیں دکھائی دے رہی تھیں...... سجاول کے منہ میں کوئی کپڑا ٹھونس کر اوپر سے ٹیپ چسپاں کر دی گئی تھی۔ وہ شراب کے نشے میں پہلے ہی مدہوش تھا۔ غالباً اس پر غلبہ پانے میں ہاناوانی اور اس کے ساتھیوں کو بہت زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

''فرش پر کافی خون نظر آ رہا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں فائرنگ وغیرہ نہیں ہوئی۔ شاید تیز دھار آلہ استعمال کیا گیا ہے۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' فخر لرزاں آواز میں بولا۔ ''اگر فائرنگ ہوتی تو پورے ہوٹل کا عملہ اور گیسٹ یہاں جمع ہو جاتے۔''

''کچھ کہہ رہی ہے یہ عورت۔'' میں نے کہا اور آواز کا حجم بڑھانے کی کوشش کی۔ آواز سنائی دینے لگی۔ اور یہ اسی منحوس ہاناوانی کی آواز تھی۔ انیق کی قاتلہ کی آواز تھی۔ ہم اسے ڈھونڈنا چاہتے تھے، سجاول بھی اسے ڈھونڈنا چاہتا تھا، اور وہ خود سجاول کے پاس پہنچ گئی تھی۔

معلوم نہیں کہ کیسے اور کیونکر......؟ یقیناً وہ لمبے ہاتھوں والی ایک انوکھی اور خطرناک عورت تھی۔ وہ سجاول سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''میری چھاتی میں آگ بھڑک رہی ہے آگ...... جب تک تم لوگ زندہ ہو، مجھے کسی پل چین نہیں آئے گا۔'' اس نے یہ الفاظ ملائیشین زبان میں ادا کیے تھے۔ یقیناً سجاول کے پلے کچھ نہیں پڑا تھا۔ ہاں ایک عرصہ جاماجی میں قیام کے بعد مجھے مقامی زبان کی ''شدبد'' ہوگئی تھی۔

سیاہ چشمہ ابھی تک ہاناوانی کی آنکھوں پر تھا۔ وہ یوں پھیل کر صوفے پر براجمان تھی جیسے کسی اجلاس کی صدارت کر رہی ہو۔ سجاول کی کرسی کو شاید اس نے ٹانگ رسید کی تھی۔ سجاول کا رخ تھوڑا سا تبدیل ہو گیا تھا اور اب اس کے چہرے کی ایک سائیڈ بھی کیمرے کے فریم میں نظر آ رہی تھی۔

سجاول کی پیشانی پر تازہ چوٹ کا گہرا نشان تھا اور خون رِس کر اس کی چوڑی ٹھوڑی تک آ رہا تھا۔ سفید شلوار اور قمیص کے گھیرے پر بھی خون کے آثار تھے۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں جن میں ہمیشہ ایک عقابی چمک رہتی تھی، بے ساختہ بند ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ صرف وہسکی کا تیز نشہ نہیں ہے، سجاول کو یہاں کچھ اور بھی ''کھلایا پلایا'' جا چکا ہے۔ یا عین ممکن تھا کہ کوئی انجکشن لگا دیا گیا ہو۔ وہ بالکل نڈھال اور مجہول نظر آ رہا تھا۔ بس غنودگی بھری آنکھوں اور ڈگمگاتے سر کے ساتھ ہاناوانی کی طرف دیکھتا چلا جا رہا تھا۔

وہ کچھ بڑبڑائی پھر فون کے اسپیکر کے ذریعے اس کا ایک اور فقرہ میرے کانوں تک پہنچا۔ وہ جنونی انداز میں بول رہی تھی۔ ''میں نے قسم کھائی تھی...... ہاں قسم کھائی تھی میں نے، میں تم میں سے کسی کو نہیں ماروں گی ہاتھ تک نہیں لگاؤں گی، تم خود ہی ایک دوسرے کو مارو گے۔ اس حرامی انیق نے تمہاری بھگوڑی بیوی کو مارنے کی ناکام کوشش کی لیکن تمہاری کوشش ناکام نہیں رہی۔ تم نے اس حرامی کو مار دیا۔ اب تم اس کے گرو کو مارو گے...... اس، بھینسے کے منہ والے داؤد بھاؤ کو مارو گے...... پھر تم اپنی بیوی کا خون کرو گے، اس کے بچے کا گلا کاٹو گے...... اگر تمہاری کارکردگی اچھی رہی تو...... اور مجھے یقین ہے کہ اچھی رہے گی...... میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گی، تم اس ناگن قسطینا کے بیڈروم میں گھسو گے، اسے خوار کر کے مارو گے، اس خارش زدہ سانپ فارس جان کے ٹکڑے کرو گے۔ تم کرو گے سب کچھ کرو گے۔'' وہ بول رہی تھی اور اس کے منہ سے جیسے طیش سے جھاگ بہہ رہے تھے۔

''یہ کیا کہہ رہی ہے؟'' فخر نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے پوچھا۔

میں نے اسے مختصراً بتایا۔ ہماری کار اب اس درمیانے درجے کے ہوٹل کے قریب پہنچ

چکی تھی جہاں سجاول ٹھہرا ہوا تھا۔ ہم صرف ڈیڑھ گھنٹے بعد دوبارہ یہاں آئے تھے اور اس دوران میں بہت کچھ یہاں بدل چکا تھا۔

میں نے فخر سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ ہوٹل کے آس پاس بھی ہاناوانی کے لوگ موجود ہوں گے۔ تم گاڑی یہیں روک لو۔''

فخر نے میرے مشورے پر عمل کیا۔ ہم ہوٹل سے قریباً 100 میٹر کے فاصلے پر ایک پیٹرول پمپ کے سامنے رک گئے۔ ہوٹل کے سامنے دو لگژری جیپیں پُراسرار انداز میں موجود تھیں۔ ایک پر اسلام آباد کا نمبر دکھائی دیتا تھا۔ میرا منی کیمرا آگاہ کر رہا تھا کہ کمرے میں منظر مزید سنسنی خیز ہو گیا ہے۔ ہاناوانی نے غالباً اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا اور کمرے میں سے فالتو افراد باہر نکل گئے۔ اب وہاں ہاناوانی تھی اور ایک تنومند ملائیشین مؤدب انداز میں کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چمکیلا خنجر دکھائی دے رہا تھا۔ دیوار پر لرزتے ہوئے ایک سائے سے پتا چلتا تھا کہ ایک اور بندہ بھی موجود ہے لیکن وہ دکھائی نہیں دیتا تھا پھر شاید اسی بندے نے کمرے کی لائٹ آف کر دی اور کوئی دوسری پورٹ ایبل لائٹ آن کر دی۔ اس لائٹ سے مختلف رنگوں کی روشنیاں نکل کر پورے کمرے میں چکرانے لگیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک عجیب سحر انگیز سا ماحول طاری ہو گیا تھا۔

میں نے دیکھا کہ جزیرہ جاماجی کی اس انوکھی ساحرہ نے سیاہ شیشوں والی عینک اتار کر میز پر رکھ دی ہے۔ اس کا چہرہ دمک رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی وہ سارے بیش قیمت طلائی گہنے بھی جو اس کے فربہ جسم پر جگہ جگہ دکھائی دیتے تھے۔ اس مرتبہ مجھے اس کی گود میں کوئی جانور بھی نظر آیا۔ اس سے پہلے میری نظر اس پر نہیں پڑ سکی تھی۔ میں ششدر رہ گیا۔ یہ ایک بندریا تھی۔ تصویر واضح نہیں تھی لیکن میرا دل گواہی دینے لگا کہ یہ وہی بندریا لوسی ہے جس نے جاماجی میں حقِ نمک ادا کیا تھا اور اپنے مالک (خانساماں) کی موت کا بدلہ لیتے ہوئے، آقا جان کو بوقتِ فرار ہیلی کاپٹر میں سے کھینچ کر چھت پر لا پھینکا تھا۔ ہاناوانی اب سحر کار نظروں سے سجاول کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی غیر مرئی طاقتیں بیان سے باہر تھیں۔ صوبے کا یہ خطرناک ڈکیت جس کے رعب سے ایک خلقت کانپتی تھی، اس وقت قطعی بے بس دکھائی دے رہا تھا۔ شراب تو اس نے پہلے ہی اندھا دھند پی رکھی تھی، اب کچھ خاص قسم کی نشہ آور دواؤں نے اس کے دل و دماغ کو بالکل ماؤف کر دیا تھا۔ ہاناوانی اس پر اپنی طلسمی آنکھوں سے کارگر وار کرنے کے لیے بالکل تیار نظر آتی تھی۔

میں نے فون بند کرتے ہوئے فخر سے کہا۔ ''ہمیں اس عورت کو روکنا ہوگا'' اس کے

ساتھ ہی میں نے نشست کے نیچے سے بھرا ہوا بریٹا پسٹل نکال لیا۔
فخر نے اپنے پاؤں کے قریب رکھی ہوئی چھوٹی نال کی سیون ایم ایم اٹھالی۔ ''میرا خیال ہے میں چادر کی بکل مار لیتا ہوں۔'' اس نے کہا۔
''ہاں ٹھیک رہے گا۔ ہم عام انداز میں درمیانی رفتار سے چلتے ہوئے اندر داخل ہوں گے۔ استقبالیہ کاؤنٹر پر موجود افراد ہمیں پہلے بھی دیکھ چکے ہیں، وہ ہمارے اوپر جانے پر کوئی اعتراض نہیں کریں گے۔''
''ہمیں...... کرنا کیا ہے؟'' فخر نے جوشیلے لہجے میں کہا۔ میں جانتا تھا کہ اس کے سینے میں انسان کے بجائے ایک شیر کا دل دھڑکنا شروع ہو گیا ہے۔ وہ بلاشبہ خطروں کا کھلاڑی تھا۔
میں نے کہا۔ ''یہ لوگ ہمارا کوئی لحاظ نہیں کریں گے۔ ہمیں بھی نہیں کرنا۔ سیدھا فائر کریں گے...... اگر موقع ملا تو اُڑا دیں گے اس کو بھی۔''
''کس کو؟''
''اسی حرام زادی کو۔ قاتلہ ہے یہ ہمارے انیق کی۔'' میرے لہجے میں نیلی آگ بھڑک رہی تھی۔ فخر نے سر ہلا کر میرے خیال کی تائید کی۔
ہم نے اپنے ہتھیار چیک کیے اور مہران کار سے باہر نکل کر درمیانی رفتار سے ہوٹل کے داخلی راستے کی طرف بڑھے۔ ایک لگژری جیپ کے قریب سے گزرے تو اس کے اندر کچھ افراد کی موجودگی کا اندازہ ہوا۔ مگر رنگ دار شیشوں کی وجہ سے کچھ بھی واضح دکھائی نہیں دیا۔ استقبالیہ کاؤنٹر کے سامنے سے گزر کر ہم اوپر جانے والی قالین پوش سیڑھیوں تک پہنچے۔ سیڑھیاں طے کر کے جب ہم فرسٹ فلور کی پہلی راہداری کے سامنے آئے تو خطرے کا احساس شدید ہو گیا۔ یہی راہداری تھی جس میں آگے جا کر سجاول والا ڈبل روم تھا۔ راہداری کے وسط میں دو ہٹے کٹے افراد کھڑے تھے۔ یہ پینٹ کوٹ میں تھے اور ان میں سے ایک مقامی لگتا تھا۔ ان لوگوں کو فخر کی چادر کی بکل نے شک میں مبتلا کیا تھا۔ ''جی بھائی صاحب، کہاں جانا ہے آپ کو؟'' مقامی شخص نے ہمیں روکتے ہوئے کہا۔
''28 نمبر کمرے میں۔'' میں نے یونہی اٹکل سے جواب دیا۔
چادر میں سے رائفل کی نال کا ابھار اس شخص کو شاید دکھائی دے گیا تھا۔ اس نے ابھار کو چھو کر دیکھا اور ایک دم دو تین قدم پیچھے ہٹ گیا۔ انداز سے صاف عیاں تھا کہ وہ کوٹ کے نیچے سے ہتھیار نکالنا چاہ رہا ہے۔ اب انتظار فضول تھا۔ اس سے پہلے کہ ان دونوں میں سے

کوئی آتشیں ہتھیار یا تیز دھار آلہ نکال سکتا، میں نے پسٹل کا فائر کیا جو سیدھا مقامی شخص کے سینے میں لگا اور وہ لڑکھڑا کر ایک بڑے گل دان پر گرا۔

یہ پہلا فائر ایک زوردار ہنگامے کا نقطۂ آغاز ثابت ہوا۔ کوریڈور کے آخری سرے سے ایک رائفل بردار ملائیشین بھاگا ہوا آیا۔ فخر نے بھی چادر اتار پھینکی تھی اور لوڈڈ رائفل اپنے ہاتھ میں کر لی تھی۔ فخر کی چلائی ہوئی گولیاں رائفل بردار کی ٹانگوں میں لگیں اور وہ لڑھکتا ہوا ہم سے دس پندرہ فٹ کی دوری پر آن گرا۔

میں اور فخر بروقت ایک دیوار کی اوٹ میں ہو گئے۔ ایک طویل برسٹ نے ہمارے اردگرد کی کئی اشیا کو تنکوں کی طرح ہوا میں اُڑا دیا۔ ہوٹل کے در و دیوار میں جیسے کہرام سا مچ گیا تھا۔ چلانے کی مردانہ و زنانہ آوازیں ہر سمت گونج رہی تھیں۔ ''بچو شاہ زیب۔'' فخر نے پکار کر کہا۔

میں نے دیکھا بائیں پہلو کی طرف سے موٹی ناک اور سوجی سوجی آنکھوں والا ایک شخص ہاتھ میں برچھی نما آلہ لیے مجھ پر جھپٹ رہا تھا۔ میں نے بروقت خود کو جھکا کر اپنے ہاتھوں کو حرکت دی۔ وہ جتنی تیزی سے آیا تھا، اتنی ہی تیزی سے میرے سر کے اوپر سے ہوتا ہوا ایک دیوار گیر کھڑکی سے ٹکرایا اور اس کا شیشہ توڑتا ہوا نیچے کہیں گلی میں جا گرا۔

ہمیں ایک محفوظ اوٹ میسر آ گئی تھی۔ ہر طرف پگھلا ہوا سیسہ پرواز کر رہا تھا۔ شیشے ٹوٹ رہے تھے، دیواریں لرز رہی تھیں۔ پھر ایک برسٹ ہمارے عقب میں موجود بجلی کی ''ڈی پی'' میں جا لگا۔ فرسٹ فلور پر تاریکی چھا گئی۔

''فخر کسی طرح اس ڈائن ہاناوانی تک پہنچنا ہے۔'' میں نے جھک کر فائر کرتے ہوئے کہا۔ ہم اندازے سے اس کمرے کی طرف بڑھے جہاں وہ موجود ہو سکتی تھی۔

دو عورتوں کی چلاتی ہوئی پرچھائیاں ہمارے پاس سے گزریں، سیڑھیوں پر پہنچ کر وہ دونوں گر پڑیں اور لڑھکتی ہوئی نیچے گئیں۔ ان کے عقب میں آنے والے ایک نوجوان کے ہاتھ میں ٹارچ تھی۔ وہ جھک کر دوڑتا ہوا سیڑھیوں کی طرف جا رہا تھا، میں نے اس کے ہاتھ سے ٹارچ چھینی اور اس کی روشنی میں ایک دیوار کی اوٹ لیتا ہوا سجاول والے کمرے کی جانب بڑھا۔ فخر میرے عقب میں تھا اور مجھے کور دے رہا تھا۔ میں ٹارچ کی روشنی مختلف کمروں کے دروازوں پر ڈال رہا تھا۔ ان دروازوں پر کمروں کے نمبرز لکھے ہوئے تھے۔ بالآخر ہم سجاول والے 'ڈبل روم' کے سامنے پہنچ گئے۔ دروازہ کھلا تھا۔ پہلے میں نے ٹارچ کی روشنی کمرے میں پھینکی پھر اندر گھس گیا۔

''تم دروازے پر رہو فخر۔'' میں نے پکار کر کہا۔

''تم بےفکر رہو۔'' وہ بھی جوشیلے لہجے میں پکارا۔

کمروں میں کم از کم تین لاشیں موجود تھیں۔ ایک لاش پہلے کمرے میں تھی۔ باقی دو اس کمرے میں جہاں سجاول کو باندھا گیا تھا۔ سجاول کرسی سمیت اوندھا پڑا تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ وہ محفوظ دکھائی دیتا تھا۔ سر سے بہتا ہوا خون اس کی پہلی چوٹ کا ہی تھا۔

باہر سے فخر نے پوچھا۔ ''کہاں ہے حرام زادی؟''

''یہاں نظر نہیں آ رہی......''

ابھی میرا فقرہ مکمل ہوا ہی تھا کہ تاریکی سے ایک پرچھائیں سی مجھ پر جھپٹی۔ مجھے دبوچنے کی یہ بڑی کمزور سی کوشش تھی۔ میں نے خود کو بچایا۔ جھپٹنے والا اوندھے منہ فرش پر گرا۔ یہ وہی ملائیشین تھا جسے تھوڑی دیر پہلے میں نے اپنے پن ہول کیمرے کے ذریعے دیکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں خم دار خنجر تھا۔ میں نے اس کے خنجر والے ہاتھ کی کلائی پر پاؤں رکھا اور سخت ٹھوکر اس کے چوڑے تھوبڑے پر رسید کی۔ اس کے دو تین دانت ضرور اس کے گلے میں چلے گئے ہوں گے۔

اسی دوران میں لائٹ پھر آن ہو گئی۔ ملائیشین کو دیکھ کر میرے سینے میں بھڑکتے ہوئے شعلے اور بلند ہو گئے۔ ہاں یہی لوگ تھے جنہوں نے جاماجی سے یہاں پہنچ کر ہمارے انیق کو ہم سے جدا کیا تھا۔ مجھ پر جنون کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ میں نے ٹھوکروں اور گھونسوں سے اسے روئی کی طرح دھنک دیا۔

''چھوڑ دو شاہ زیب، اسے جان سے نہیں مارنا۔'' فخر چلایا اور مجھے اس شخص سے دور ہٹایا۔

ہوٹل کے عملے کے دو تین افراد جن میں ایک مسلح گارڈ بھی شامل تھا، اندر گھس آئے تھے۔ انہوں نے زور لگا کر سجاول والی کرسی سیدھی کی۔ پارکنگ کی طرف سے اندھا دھند فائرنگ کی آوزیں آئیں، کئی برسٹ چلے۔

فخر چلایا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ وہ لوگ فرار ہو رہے ہیں۔''

''انہیں روکنا ہوگا۔'' میں نے کہا۔

ہم سجاول کو وہیں چھوڑ کر سیڑھیوں کی طرف لپکے۔ سیڑھیوں پر سجاول کا زخمی ساتھی باقر ملا۔ ''سردار سجاول کہاں ہیں؟'' اس نے ہراساں لہجے میں پوچھا۔

''وہ اوپر ہے۔اس کے پاس پہنچو۔'' فخر نے جواب دیا۔

جب تک ہم پارکنگ میں پہنچے، وہاں موجود دونوں لگژری جیپیں منظر سے اوجھل ہو چکی تھیں۔ہم دونوں اندھا دھند بھاگتے ہوئے اپنی مہران کار تک آئے لیکن اس میں بیٹھنے سے پہلے ہی ہمیں پتا چل گیا کہ اس کے دونوں اگلے ٹائر برسٹ کر دیئے گئے ہیں۔

ہم ان تین چار گاڑیوں کی طرف لپکے جو ہوٹل کے سامنے کھڑی تھیں۔ان میں سے ایک ٹویوٹا کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک شخص موجود تھا۔فخر نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور کھینچ کر اس شخص کو باہر نکال لیا۔وہ پہلے ہی فائرنگ سے ازحد ڈرا ہوا تھا۔کچھ بولنا چاہ رہا تھا مگر اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔مجھے اس کی گاڑی کی ڈکی کے پاس گولیوں کے دو تین سوراخ نظر آئے۔تب میں نے اس کے ٹائروں پر نگاہ دوڑائی۔اس گاڑی کا ایک ٹائر بھی مکمل طور پر بیکار ہو چکا تھا۔

''کوئی فائدہ نہیں فخر۔'' میں نے ٹائر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

فخر، جو گاڑی میں گھسنا چاہ رہا تھا، رک گیا۔ٹائر دیکھ کر اس نے دانت پیسے اور ''ڈرٹی باسٹرڈز'' کہہ کر رہ گیا۔

اب پتا چل رہا تھا کہ پارکنگ کی طرف، چند سیکنڈ پہلے جو اندھا دھند برسٹ چلائے گئے تھے، ان کا مقصد ان تین چار گاڑیوں کو بے کار کرنا ہی تھا۔اب تعاقب کا خیال عبث تھا۔

''نکل گئی موٹی سورنی۔'' فخر نے زمین پر تھوک کر کہا۔

ہم دوبارہ ہوٹل میں گھسے۔یہاں مسلسل ہاہاکار مچی ہوئی تھی۔بے تحاشا فائرنگ کے سبب کئی افراد زخمی بھی ہوئے تھے۔ہم سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئے۔سجاول کو ایک دوسرے کمرے میں منتقل کیا جا چکا تھا اور اس کے سر سے بہنے والا خون بند کرنے کی کوشش ہو رہی تھی۔ہم سجاول والے ڈبل روم میں پہنچے۔یہاں ایک ڈاکٹر، ملائیشین کو طبی امداد یا یوں کہہ لیں کہ فرسٹ ایڈ دینے میں مصروف تھا۔انکشاف ہوا کہ میری مار پیٹ کے دوران میں ہی اس شخص نے اپنے گلے پر خنجر چلا لیا تھا۔اس کی حالت خطرے میں تھی لیکن اسے بچانے کی کوشش کی جا سکتی تھی۔

میں نے فخر سے کہا۔''میں یہاں سجاول اور یونس وغیرہ کو دیکھتا ہوں۔تم اس ملائیشین کے ساتھ اسپتال جاؤ، یہ ہمارے لیے بہت اہم ہے۔''

فخر نے اپنی رائفل میرے سپرد کی اور میرے والا بریٹا پسٹل اپنی قمیص کے نیچے لگا لیا۔

زخمی ملائیشین کو فوراً ڈنڈا ڈولی کر کے سیڑھیوں کی طرف لے جایا گیا۔یہاں تین لاشیں پڑی

تھیں۔ دو سجاول کے ساتھیوں کی تھیں جن کو تیز دھار آلے سے قتل کیا گیا تھا۔ تیسری ہانا وانی کے ساتھی کی تھی جسے کاؤنٹر فائرنگ میں چار گولیاں لگی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر میں پولیس یہاں پہنچ جائے گی اور ان دونوں کمروں کے چپے چپے کی تلاشی لی جائے گی۔ بہتر تھا کہ میں اپنا جادوئی کیمرا یہاں سے ہٹا لیتا۔ کیمرے کو کارنس ٹیبل سے علیحدہ کر کے میں نے محفوظ کرنا چاہا تو پتا چلا کہ وہ اپنی جگہ پر موجود نہیں ہے۔ میں نے تیزی سے اردگرد نگاہ دوڑائی۔ مہین سا کیمرا لکڑی کے ایک ٹکڑے سمیت قالین پر پڑا تھا۔ دراصل شدید فائرنگ کے دوران میں اس کارنس ٹیبل کے کچھ پرخچے قالین پر گرے تھے کیمرا بھی انہی میں تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔

باقر مجھے اچھی طرح پہچانتا تھا مگر میرے بدلے ہوئے حلیے کے ساتھ پہچاننے سے قاصر تھا۔ اس سے بات کرتے ہوئے میں ویسے بھی آواز میں تھوڑی سی ''بیس'' بنا لیتا تھا۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ''یونس کہاں ہے؟''

وہ پریشان آہنگ میں بولا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ وہ لوگ اسے ساتھ لے گئے ہیں۔ مجھے بھی گن پوائنٹ پر ایک جیپ میں بٹھا لیا گیا تھا، جب یہ لوگ بھاگ رہے تھے تو مجھے جیپ سے نکلنے کا موقع مل گیا۔''

''یہ لوگ سجاول تک پہنچے کیسے؟'' میں نے جھلا کر کہا۔ ''تم پانچ چھ بندے تھے یہاں، تم انہیں روک نہیں سکے؟''

''وہ لوگ بڑی پلاننگ کے ساتھ آئے ہیں۔ وہ سامنے والی سڑک پر ایک موٹر رکشا الٹ گیا۔ اس میں سواریاں تھیں۔ وہ زخمی ہو گئیں۔ ایک دو منٹ کے لیے سب کی توجہ اس طرف چلی گئی۔ اسی دوران میں یہ لوگ اندر گھس گئے۔ لگتا ہے کہ اس رکشا کو بھی جان بوجھ کر ٹکر ماری گئی تھی۔''

''تم بھی تماشا دیکھنے والوں میں شامل تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''بس، ایک آدھ منٹ کی غلطی مجھ سے بھی ہوئی۔ میری جگہ شاید کوئی بھی ہوتا، اس سے غلطی ہو جاتی۔'' باقر نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ اس نے اپنی کنپٹی کے خون اگلتے زخم پر ایک کپڑا رکھ کر دبایا ہوا تھا۔

میں نے پوچھا۔ ''تمہیں کیسے پکڑا انہوں نے؟''

''میں ان بڑی بڑی جیپوں کو دیکھ کر ان کی طرف گیا تو کسی نے پیچھے سے آ کر میرے سر پر چوٹ لگائی۔ میں گر گیا۔ دو بندوں نے مجھے گھسیٹ کر جیپ میں ڈال لیا۔ وہاں یونس

پہلے سے پچھلی سیٹ پر پڑا ہوا تھا۔ انہوں نے اس کے سر پر پستول رکھا ہوا تھا اور اس کے منہ پر سلور کلر کی ٹیپ لگائی جا رہی تھی۔''

''کتنے بندے تھے جیپ میں؟''

''مجھے تو تین ہی نظر آئے۔ ان میں سے ایک پاکستانی تھا، باقی دو، باہر کے لگتے تھے، کوئی دوسری زبان بول رہے تھے۔''

سجاول کے جو دو ساتھی کمرے کے اندر مارے گئے تھے انہیں بے دردی سے کٹار نما تیز دھار آلوں سے نشانہ بنایا گیا تھا۔ ان کے لہو نے قالین پر بڑے بڑے داغ ڈال دیئے تھے۔

میں نے ساتھ والے کمرے میں جا کر سجاول کی صورتِ حال دیکھی۔ وہ بستر پر چت لیٹا تھا۔ اس کی سرخ آنکھیں نیم وا تھیں اور ان میں بہت گہری غنودگی تھی۔ موقع پر موجود ایک ڈاکٹر نے بتایا۔''ان کو بہت تیز ٹرینکولائزر دیا گیا ہے۔ ان کا بی پی بھی گرا ہوا ہے۔''

''کیا اسپتال لے جانے کی ضرورت ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''شاید نہیں لیکن آپ زخم کی مرہم پٹی ابھی کرا لیں۔''

میں نے وہیں کھڑے کھڑے فخر کو فون کیا۔ پہلی ہی بیل پر اس نے کال ریسیو کی۔

''کہاں ہو فخر؟'' میں نے پوچھا۔

''ہم اسپتال پہنچ گئے ہیں۔ ڈاکٹرز، زخمی کو دیکھ رہے ہیں۔ شاید اس کے لیے خون وغیرہ کی ضرورت پڑے۔''

''اس کی جان بچنی چاہیے فخری، جو بھی ہو سکے کرو۔'' میں نے زور دے کر کہا۔

رات کافی بیت چکی تھی۔ اس کے باوجود میں نے داؤد بھاؤ کو فون کیا تو اس نے کال ریسیو کر لی۔''ہیلو کون؟'' اس کی اونگھتی ہوئی سی آواز سنائی دی۔

''شاہ زیب بول رہا ہوں بھاؤ، آپ سے کہا تھا ناں کہ انیق کی طرح سجاول کی زندگی کو بھی خطرہ ہے۔ جب یہ ہاناوانی یہاں ہے تو کسی کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔''

''کیوں کیا ہوا؟'' بھاؤ نے چونک کر پوچھا۔

''سجاول سیالکوٹی پر حملہ ہوا ہے۔ اس کے دو بندے مارے گئے ہیں۔ دو تین زخمی ہوئے ہیں۔ ایک کو اغوا کر کے لے گئے ہیں ہاناوانی کے لوگ۔''

''کیا کہہ رہے ہو؟ کہاں سے بات کر رہے ہو تم؟''

''ایک قریبی قصبے سے۔ مجھے اطلاع ملی تھی کہ سجاول طیش سے بھرا ہوا ہے اور ہاناوانی سے دو دو ہاتھ کرنے گوٹھ موراناں کی طرف آ رہا ہے لیکن مجھے خطرہ تھا کہ کہیں آپ میں اور

اس میں ٹکر نہ ہو جائے۔ میں نے اسے اس قصبے ''بھوگلا'' میں ہی رکوا دیا لیکن یہ بدبخت ہاناوانی پتا نہیں کیسے وہاں جا پہنچی۔ کافی مارا ماری ہوئی ہے یہاں کے ہوٹل میں۔ سجاول بھی زخمی ہے۔''

''تم نے ہاناوانی کو خود دیکھا ہے وہاں؟'' بھاؤ نے تفتیشی انداز میں پوچھا۔

''جی ہاں، خود دیکھا ہے......اور فرار ہوتے بھی دیکھا ہے۔ اب آپ کو اس لیے فون کیا ہے کہ آپ اپنی ڈوریاں ہلائیں۔ اس کو اور اس کے خونی ساتھیوں کو پکڑنا ہے۔ وہ دو جیپوں پر سوار ہو کر یہاں سے نکلے ہیں۔ پولیس کی کارکردگی کا آپ سے بڑھ کر اور کسے پتا ہو گا۔ آپ اپنے طور پر ان لوگوں کو ٹریس کرنے کی کوشش کریں۔''

اسی دوران میں ہوٹل سے باہر پولیس موبائلز کے کرخت سائرن گونجنے لگے میں نے کہا۔ ''بھاؤ! میرا خیال ہے کہ پولیس پہنچ گئی ہے، مجھے تھوڑی دیر کے لیے دائیں بائیں ہونا پڑے گا۔'' اس کے بعد میں نے بھاؤ کو جلدی جلدی دونوں جیپوں کے رنگ اور ماڈل وغیرہ بتا کر فون بند کر دیا۔

میں نے نیم بے ہوش سجاول پر ایک نگاہ ڈالی، پھر میں اور فخر اس ہوٹل سے کھسک گئے۔ (فخر کو بھی پولیس سے مڈبھیڑ کا اندیشہ تھا اس لیے وہ زخمی ملائیشین کو کوالیفائڈ ڈاکٹرز کے سپرد کر کے واپس آ گیا تھا) یہ تو یقینی بات تھی کہ اب ہاناوانی واپس گوٹھ موراناں کا رخ نہیں کرے گی لیکن ابھی داؤد بھاؤ وہیں موجود تھا اور یہ بات اب یقینی ہو چکی تھی کہ ہاناوانی ہر اس شخص کو مارنا چاہتی ہے جس کا کسی طرح بھی میرے اور سجاول کے ساتھ تعلق رہا ہے۔ اس نے قسم کھا رکھی تھی کہ وہ کسی کو بھی ہاتھ لگائے بغیر ان سب کی جان لے گی۔ وہ انیق کو مار چکی تھی اور یونس کو اپنے ساتھ لے جا چکی تھی۔ ابھی پتا نہیں کہ کون کون اس کی ہٹ لسٹ پر تھا۔ اس حساب سے تو فخر، پہلوان حشمت، رضوان ٹی اور تاجور کو بھی خطرات لاحق ہو سکتے تھے اور ان کے علاوہ بھی کئی لوگ اس گھیرے میں آ سکتے تھے۔

○......❖......○
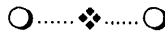
ہماری مہران کار تو اب چلنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ ہم نے منہ مانگے کرائے پر ایک ٹیکسی والے سے بات کی اور اسے گوٹھ موراناں جانے پر راضی کر لیا۔ اب رات کے قریباً چار بج چکے تھے۔ اس مضافاتی علاقے کی چھوٹی سڑکیں بالکل خالی تھیں۔ بس کسی وقت کوئی موٹر بائیک یا ٹریکٹر ٹرالی دکھائی دے جاتی تھی۔ سجاول ابھی تو ہوش میں نہیں تھا لیکن وہاں موجود باقر سارے معاملات سنبھال سکتا تھا۔ سجاول نے بھی جلد ہوش میں آ جانا تھا اور پھر

''ہیوی ویٹ بااثر لوگوں'' سے اپنے تعلقات کی بنا پر وہ اس سارے بکھیڑے سے خود کو مکھن کے بال کی طرح نکال سکتا تھا۔ فی الوقت ہم یہی سوچ رہے تھے کہ ہاناوانی یوں آناً فاناً سجاول اور یونس وغیرہ تک کیسے پہنچ گئی؟ وہ غیر معمولی صلاحیتوں والی ہپناٹسٹ ضرور تھی مگر کوئی غیب دان نہیں تھی، اور نہ ہی مجھے ایسی باتوں پر بھروسا تھا، اندازہ یہی ہورہا تھا کہ جب سجاول تند بگولے کی طرح اس علاقے میں داخل ہوا تو ہاناوانی کے ساتھیوں میں سے ہی کسی نے اسے یا اس کی گاڑی کو پہچانا اور اسے ٹریس کرلیا۔ اسی سوچ بچار کے دوران میں میرا دھیان اپنے منی کیمرے کی طرف چلا گیا۔ وہ لکڑی کے ٹکڑے سمیت میری جیب میں تھا۔ میں نے اسے نکال کر دیکھا۔ اس کا چھوٹا سا لینس دھندلایا ہوا تھا۔ اندازہ ہورہا تھا کہ کیمرا بھی DAMAGE ہوا ہے۔ میں نے اسے اپنے موبائل کے ساتھ کونیکٹ کرکے چیک کیا تو یہ اندیشہ درست نکلا۔ وہ کام نہیں کررہا تھا۔ مجھے مایوسی ہوئی۔ اس جدید ترین کیمرے کی ریپئرنگ آسان کام نہیں تھا۔

ہم جس وقت گوٹھ موراناں کے قریب پہنچے دن کا اجالا پھیل چکا تھا۔ کھیت کھلیان اور درخت پودے سب جیسے صبح کی آمد کو محسوس کررہے تھے، پتوں پر شبنم چمک رہی تھی اور راستوں کی مٹی بھی نم تھی۔ دور ہی سے گوٹھ موراناں کی مسجد کا مینار اور چند اونچے گھر دکھائی دے رہے تھے۔

اچانک فخر نے ٹھٹک کر ایک طرف اشارہ کیا۔ ''وہ دیکھو۔''

میں نے اس کی نظر کا تعاقب کیا اور چونک گیا۔ وہ قوی ہیکل داؤد بھاؤ تھا۔ سر پر رومال باندھے وہ گوٹھ کے قبرستان میں سے باہر نکل رہا تھا۔ یقیناً انیق کی قبر سے ہوکر آرہا تھا۔ اس کے عقب میں اس کا مسلح شوٹر چل رہا تھا لیکن یقینی طور پر یہ اکیلا شوٹر یہاں نہیں تھا۔ آس پاس دو چار اور مسلح افراد بھی موجود تھے اور ایسے لوگ ہمہ وقت بھاؤ کے اردگرد موجود رہتے تھے۔

عجیب منظر تھا۔ ایک بدنام زمانہ گینگسٹر، ایک خطرناک جرائم پیشہ، جو ہر وقت جان لینے اور جان دینے کے لیے تیار رہتا تھا جس کے ایک اشارے پر اس کے خونخوار ساتھی انسانی جسموں کو گولیوں سے چھلنی کردیتے تھے...... سر جھکائے، سر پر رومال باندھے، دل گرفتہ حالت میں قبرستان سے باہر آرہا تھا۔

میں اور فخر ٹیکسی سے اتر آئے۔ ڈرائیور کو کرایہ دے کر ہم بھاؤ کے پاس پہنچ گئے۔ کچھ ہی دیر بعد میں اور بھاؤ اسی لگژری اسٹیشن وین میں بیٹھے تھے جہاں کل میرے اور بھاؤ کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ فخر کو میں نے انیق کے گھر بھیج دیا تھا۔

بھاؤ کی آنکھیں ورم زدہ تھیں اور چہرے پر دکھ کی گہری پرچھائیاں لہرا رہی تھیں۔ انیق کے دکھ کو ہم دونوں نے ایک ہی شدت سے محسوس کیا تھا لیکن انیق کی ناگہانی موت کے حوالے سے ہم دونوں کے خیالات مختلف تھے۔

بھاؤ نے عجیب لہجے میں کہا۔ ''شاہ زیب! میں نے زندگی میں بہت کم قسم کھائی ہے، لیکن آج کھائی ہے کہ میں انیق کی موت کے ذمے داروں کو بری موت ماروں گا۔''

''میرے ارادے آپ سے مختلف نہیں ہیں۔''

''لیکن ہمارے مجرم شاید مختلف ہیں۔'' داؤد بھاؤ نے روکھے پن سے کہا۔ اس کا لہجہ میرے سینے پر جیسے زوردار گھونسے کی طرح لگا۔

میں نے داؤد کے بالوں بھرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''بھاؤ! ہمارا مجرم ایک ہی ہے اور میں ثابت کروں گا کہ وہ کون ہے۔''

''تمہارے نزدیک وہ رائے زل کی ماں ہاناوانی ہے جو اچھے بھلے بندے کو اپنے جادو سے دیوانہ کر دیتی ہے اور اس نے ہمارے انیق کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا۔'' داؤد کے لہجے میں طنز کی کاٹ تھی۔

''بدقسمتی سے ایسا ہوا ہے داؤد بھاؤ۔''

داؤد بھاؤ نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ پر سے ہٹایا اور اپنی دکھ سے بھری آنکھیں میرے چہرے پر جما کر بولا۔ ''شاہ زیب! سچ کہتا ہوں تمہارے زندہ ہونے کی جو خوشی مجھے ہوئی ہے، وہ میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا لیکن یہ خوشی بری طرح گہنائی ہوئی ہے۔ اسے انیق کی موت نے گہنایا ہے۔ میری بات کا برا نہ ماننا، جب تم ہاناوانی کی بات کرتے ہو تو مجھے لگتا ہے جیسے بے وقوف بنا رہے ہو، ہپناٹزم، مسمریزم، ٹیلی پیتھی وغیرہ کے بارے میں، میں بھی ضروری انفارمیشن رکھتا ہوں، آج کل ہمارے ملک میں اور باہر کے ملکوں میں ہپناٹزم کی پریکٹس کس طرح ہو رہی ہے اور اسے کس طرح علاج معالجے میں استعمال کیا جا رہا ہے، اس کے بارے میں بھی مجھے پتا ہے، لیکن جو بات تم کر رہے ہو یہ تو خالص فلمی اور داستانی انداز کی ہے...... اس حرام زادی کھوسٹ نے اپنی آنکھوں کے زور پر انیق کو اپنا تابع کیا اور وہ ہفتوں اور مہینوں کے لیے اپنے دوستوں اور اپنے پیاروں کے خون کا پیاسا ہو گیا۔ یہ باتیں سمجھ میں آنے والی نہیں ہیں۔''

''یہ باتیں میری سمجھ میں بھی نہیں آ رہی تھیں داؤد بھاؤ...... جاما جی میں کافی عرصے تک میں اسے زبانی جمع خرچ سمجھتا رہا، یہاں تک کہ ایک موقع پر اس انوکھی عورت سے میری ایک

"تکلیف دہ ملاقات ہوگئی۔ یہ عام عورت نہیں ہے داؤد بھاؤ۔ نہ عام HYPNOTIST ہے۔ اگر آپ پوری تفصیل تک جائیں گے تو آپ کو پتا چلے گا کہ یہ کس طرح براہِ راست اور فون کے ذریعے مستقل طور پر انیق سے چمٹی ہوئی تھی...... آپ نے......"

"میری بات سنو شاہ زیب۔" داؤد نے میری بات کاٹ کر کہا۔ "جو بات میری سمجھ میں نہیں آرہی تم اسے زبردستی میرے دماغ میں ٹھونس نہیں سکتے اور میرے خیال میں یہ بات بے شمار لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔"

"بھاؤ! آپ مجھے تھوڑا سا وقت دیں، میں آپ کو......"

"پلیز شٹ اَپ۔" بھاؤ نے پھر تیوری چڑھا کر میری بات کاٹی۔ "تم اس طرح کی باتیں کر کے صرف اپنی ذہنی کمزوری کا اظہار کر رہے ہو، جو کچھ ہوا ہے وہ بالکل کلیئر ہے، یہ بات جاماجی میں ہی اوپن ہوگئی تھی کہ انیق اور اس ڈکیت میں چپقلش چل رہی ہے اور روز بروز بڑھ رہی ہے۔ وہاں اس شخص نے انیق کو جان سے مارنے کی کوشش بھی کی، اور یہ بات اس وقت کسی اور نے نہیں تم نے ہی مجھے بتائی تھی۔ ہمارا انیق اسی دشمنی کی بھینٹ چڑھا ہے۔"

"آپ ایک بات سوچیں بھاؤ، اگر انیق نارمل تھا تو پھر وہ آپ سے بھی دور کیوں ہوگیا تھا۔ کیوں اس نے عرصے تک آپ سے بھی رابطہ نہیں کیا......"

"یہ...... یہ اس کی پرانی عادت تھی۔ جب کسی سے اس کی ذاتی رنجش چل پڑتی تھی تو پھر ہم کو اس میں "انوالو" نہیں کرتا تھا۔ اپنا معاملہ خود نمٹانے کی کوشش کرتا تھا۔"

"میرے پاس مکمل ثبوت ہیں بھاؤ۔ اور ایک ثبوت تو بالکل تازہ ہے۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے اس عورت نے سجاول پر ہلا بولا ہے۔ اس نے اسے باقاعدہ بے بس کر کے اپنے ٹرانس میں لینے کی کوشش کی ہے۔ وہ سجاول کی بیوی کو اور آپ کو بھی سجاول کے ذریعے جانی نقصان پہنچانا چاہتی تھی۔ میرے پاس اس سارے منظر کی ویڈیو ریکارڈنگ موجود ہے۔"

"کہاں ہے ریکارڈنگ؟" بھاؤ ہر طرح کی بحث پر آمادہ نظر آتا تھا۔

میں نے کہا۔ "میرے پاس چھوٹا اسپائی کیمرا ہے، اس میں وہ مناظر محفوظ ہیں مگر ابھی کیمرے میں کچھ فالٹ آرہا ہے۔ آپ یقین رکھو داؤد بھاؤ میں آپ کو سب کچھ دکھا دوں گا بلکہ آپ کو انیق کے بارے میں بھی کچھ چیزیں دکھاؤں گا۔ آپ حیران رہ جائیں گے۔ آپ کو ماننا پڑے گا کہ وہ یہ سب کچھ اپنی مرضی سے نہیں کر رہا تھا۔"

"اچھا، جب تم کوئی ثبوت دو گے تو پھر دیکھیں گے۔" داؤد بھاؤ نے بیزاری سے ہاتھ

لہرا کر کہا۔ وہ اب یہاں سے اٹھنا چاہ رہا تھا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''بھاؤ! میری صرف ایک بات مان لیں۔ کسی کے خلاف کچھ بھی کرنے سے پہلے مجھے صرف...... صرف پانچ چھ دن کی مہلت دیں۔ اگر میں آپ کو مطمئن کرنے میں کامیاب نہ ہوا تو آپ اپنی مرضی کرنے میں آزاد ہوں گے۔''

وہ گہری نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اپنے نوجوان ''دست راست'' کی موت کا غم کسی جوت کی طرح روشن تھا۔ مجھے لگا کہ وہ کوئی بہت سخت بات کہنے جا رہا ہے لیکن پھر اس نے خود کو سنبھالا اور یہ بات کہی نہیں۔ شاید میرے ''مر کر پھر زندہ ہونے'' کی جو تہلکہ خیز خبر اسے ملی تھی اس نے اس کے پتھریلے دل میں میرے لیے کچھ نرمی پیدا کر رکھی تھی۔

اسی دوران میں داؤد بھاؤ کے بیش قیمت سیل فون پر ایک کال آ گئی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے کی جانے والی بات سنتا رہا اور ''ہوں، ہاں'' میں جواب دیتا رہا۔ آخر میں بولا۔ ''ٹھیک ہے لیکن...... ابھی تم واپس آ جاؤ...... بعد میں بات کریں گے۔''

میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ مبہم گفتگو کسی نہ کسی طور سجاول اور زرق خاں وغیرہ کے حوالے سے ہی تھی۔ میں نے موضوع بدلنے کے لیے داؤد بھاؤ سے پوچھا کہ کیا اس نے ہاناوانی کو ٹریس کرنے کے لیے کچھ کیا ہے۔ اس نے میرے سوال کا جواب ڈھیلے ڈھالے انداز میں دیا اور کہا کہ اس نے دو بندوں کی ڈیوٹی اس کام پر لگائی ہے۔ اس کے مقامی زمیندار دوست کا ایک بندہ بھی تلاش میں شریک ہے۔

میرے اور داؤد بھاؤ کے درمیان اس لگژری وین میں ہونے والی نشست بوجھل انداز میں ختم ہوئی اور میں انیق کے گھر چلا گیا۔ ابھی جوان موت کا غم تازہ تھا۔ در و دیوار سوگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ گاہے بگاہے اندر سے خواتین کی سسکیاں بھی سنائی دیتی تھیں۔ دوسرے لوگوں کی طرح میں اور فخر بھی اہلِ خانہ کے پاس بیٹھے رہے اور انہیں اس غم میں اپنی شرکت کا احساس دلاتے رہے۔ انیق کی پھپو کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ انہوں نے سسکتے ہوئے کہا۔ ''مجھے پتا ہے، میرے انیق پر کسی نے کچھ کر دیا ہوا تھا۔ وہ اپنے ہوش حواس میں ہی نہیں لگتا تھا۔ کسی نے بڑا سخت عمل کیا ہوا تھا اس پر۔ بی بی صاحب بھی یہی کہتی تھیں کہ اسے بہت زیادہ علاج کی ضرورت ہے مگر وہ کسی کی سنتا ہی کب تھا......''

میں اس سادہ لوح عورت کو کیسے بتاتا کہ وہ جس سے انیق کا ''علاج'' کرانا چاہتی تھی وہی تو اس کی سب سے بڑی دشمن تھی۔ وہ ایک خونخوار ڈائن تھی جو اپنے سینے میں انتقام کی

ٹلے سمیٹے، ہزاروں میل کا فاصلہ سمیٹ کر یہاں پہنچی تھی...... اور اب بھی یہیں کہیں تھی۔

اہلِ خانہ انیق کی چھوٹی چھوٹی یادیں تازہ کر کے آنسو بہا رہے تھے۔ ہم نے اس خوبرو ''ی کی فریم شدہ تصویر بھی دیکھی جو کبھی انیق کی منگیتر تھی اور جس کو پیش آنے والے ایک حادثے نے انیق کی زندگی کا رخ بدلا تھا۔ میں اس گھر میں اور ان لوگوں کے درمیان رہنا چاہتا تھا لیکن میرے پاس وقت نہیں تھا۔ ہانا وانی ایک قاتل آسیب کی طرح ان فضاؤں میں منڈلا رہی تھی۔

اسی دوران میں میرے سیل فون پر کال کے سگنل آئے۔ یہ رضوان ٹی تھا۔ میں نے رضوان کو مولانا حبیب اللہ کے آس پاس رکھا ہوا تھا تاکہ وہ ان کی صحت و سلامتی کی طرف سے پوری طرح باخبر رہے۔ وہ جنازے میں شرکت کے بعد لاہور واپس چلا گیا تھا۔ رضوان کی اس بے وقت کال پر مجھے تشویش ہوئی۔ کہیں مولانا حبیب اللہ کا کوئی مسئلہ تو نہیں تھا۔ کال ریسیو کرتا ہوا میں باہر نکل گیا۔ ''مولوی جی تو خیریت سے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''جی شاہ زیب بھائی۔ وہ خیریت سے ہیں مگر ایک اور تکلیف دہ خبر ہے...... تاجور صاحبہ کے والد دین محمد صاحب کے بارے میں۔''

''کیوں کیا ہوا؟''

''وہ بہت زیادہ پریشان ہو رہے ہیں اپنے داماد کے ہاتھوں......''

رضوان سے بات کرتا ہوا میں کھلی جگہ پر نکل آیا تھا۔ یہاں دور تک کھیت تھے اور کھیتوں کے سلسلے تھے۔ رضوان نے کہا۔ ''جیسا کہ آپ کو بھی پتا ہے تاجور اور ان کے میاں کے تعلقات اچھے نہیں ہیں۔ پہلے بھی ایک دو بار تاجور صاحبہ اپنے میکے جا چکی ہیں اور کچھ دن وہاں گزار کر آئی ہیں۔ اب بھی قریباً دو ہفتے سے وہ سکھیرا گاؤں میں تھیں...... کل رات دارج اب انہیں لینے کے لیے سکھیرا پہنچا اور زبردستی اپنے ساتھ لے گیا۔ یہ بات میڈیا تک پہنچی اور یہاں تک کہا گیا ہے کہ دارج کے آدمیوں نے دین محمد صاحب کو دھکے بھی مارے ہیں۔''

''لیکن وہ تو بستر پر پڑا ہوا ہے۔'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''بستر پر تو ہے مگر جہاں جانا ہوتا ہے وہاں پہنچ بھی جاتا ہے۔ ایسا انتظام ہے کہ اس کی ویل چیئر اس کی ہائی روف جیپ کے اندر ہی چلی جاتی ہے لیکن کل رات وہ جیپ کے اندر ہی رہا۔ اس کی بڑی بہن اور دو ملازمائیں دین محمد صاحب کے گھر گئیں۔ بڑی بہن پہلے نرمی سے تاجور صاحبہ کو سمجھانے کی کوشش کرتی رہی لیکن جب بات نہیں بنی تو دارج طیش میں

آ گیا۔ اس کے کارندے اسے وہیل چیئر سمیت دین محمد صاحب کے گھر کے اندر لے گئے۔ دارج نے تاجور صاحبہ کی کلائی پکڑ لی اور انہیں اپنے کارندوں کی مدد سے کھینچتا ہوا گاڑی میں لے آیا۔ اس موقع پر اس نے اور اس کے کارندوں نے دین محمد صاحب کو دھکے بھی دیئے۔ دارج نے کہا کہ وہ اپنی منکوحہ بیوی کو لے کر جا رہا ہے اور لے جا سکتا ہے۔''

میرے سینے میں پھر ایک انگارہ سا دہکنے لگا۔ یہ دین محمد صاحب ہی تھے جنہوں نے اس رشتے کے خلاف اٹھنے والی ہر آواز کو دبایا تھا اور اپنی ضد پوری کر کے رہے تھے۔ اب چند ماہ میں ہی نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ وہ اپنی بچی سمیت دارج داراب کے جبر اور قہر کا شکار ہو رہے تھے۔ ایک طاقتور شخص کی طرف سے تاجور کو اس کی سادگی، کمزوری اور شاید خوب صورتی کی سزا دی جا رہی تھی۔

میں تاجور اور اس کے حالات کی طرف سے اپنا منہ موڑ لینا چاہتا تھا مگر حالات بار بار مجھے اپنی طرف کھینچتے تھے۔ میرے دل نے جیسے پکار کر مجھ سے ایک سوال کیا۔ ''شاہ زیب اگر تمہاری زندگی کی سب سے محبوب ہستی کے ساتھ زبردستی ہو رہی ہے۔ اسے ذہنی اور جسمانی اذیت سے گزارا جا رہا ہے تو کیا تم پھر بھی ایک خاموش تماشائی بنے بیٹھے رہو گے؟''

مجھے اپنے ماتھے پر پسینے کی نمی محسوس ہوئی۔ میں نے گہری سانس لیتے ہوئے اپنے آپ کو بہ زبانِ خاموشی سمجھایا۔ ''جس کے ساتھ زبردستی ہو رہی ہے، وہ خاموش ہے اور اس کو زبردستی سمجھتی ہی نہیں ہے تو پھر تمہاری ہر کوشش مداخلتِ بے جا ہی کہلائے گی۔ شاید یہ بھی کہا جائے کہ تاجور کے حالات اور اس کا گھر خراب کرنے میں تمہارا بھی عمل دخل ہے۔ لہٰذا جو کچھ ہو رہا ہے، اسے ہونے دو۔ بس اس کے لیے دعا کرو اور اس کی سلامتی چاہو۔''

دل نے کہا۔ ''لیکن وہ کمزور لوگ ہیں۔ دین محمد اور ان کی بیوی اگر چاہیں بھی تو تاجور کو اس شکاری کے پنجوں سے نہیں چھڑا سکتے۔ کیا ایک عام شخص کی حیثیت سے بھی تم ان لوگوں کی مدد نہیں کر سکتے۔''

رضوان کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔ ''آپ کہاں گم ہو گئے جناب؟''

''اچھا رضوان! اس بارے میں پھر بات کریں گے۔ تم بس مولوی جی کا خیال رکھو۔'' میں نے کہا اور گفتگو ختم کر دی بلکہ فون بھی آف کر دیا۔

پتا نہیں کیوں میرا دل چاہتا تھا کہ تاجور کی ازدواجی زندگی اور اس کے دیگر حالات کے بارے میں کوئی خبر بھی میرے کانوں تک نہ پہنچے۔ سینے میں آگ سے دہکنے لگی تھی۔ میں نے صبح کی تازہ دیہاتی ہوا میں چند لمبی سانسیں لیں اور اپنا دھیان بٹانے کے لیے ایک پگڈنڈی

چلنا شروع کر دیا۔

ہاناوانی کا چہرہ اپنی تمام تر خباثت کے ساتھ پردۂ تصور پر نمودار ہو گیا۔ یوں لگا کہ وہ ابھی کسی جانب سے نمودار ہو گی اور اپنی تمام تر ہلاکت خیزی کے ساتھ میرے سامنے کھڑی ہو جائے گی۔

ایک درخت کے نیچے دو دیہاتی بچے کھیلتے دکھائی دیئے۔ ان کی عمریں چھ سات سال کے لگ بھگ ہوں گی۔ انہوں نے اسکول کی یونیفارمز پہن رکھی تھیں اور کراٹے کے انداز میں ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر شرما گئے اور خاموش کھڑے ہو گئے۔ میں نے انجان بن کر پوچھا۔ ''یہ کیا کھیل رہے تھے؟''

ایک بچہ بولا۔ ''اس کو جوڈو کراٹے کہتے ہیں۔ آپ کو نہیں آتی؟''

''ہاں...... مجھے بھی تھوڑی آتی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

ایک بچے کی شکل دیکھ کر پتا نہیں کیوں مجھے خورسنہ کا بچہ ذیشان یاد آ گیا۔ بالکل اسی کی طرح گول مٹول تھا یہ بھی۔ اور پھر ایک دم میرے ذہن میں آندھی سی چل گئی۔ خورسنہ کے بچے کا خیال آتے ہی یہ بات بھی ذہن میں آئی کہ خورسنہ اور اس کا بچہ لالہ موسیٰ کے کسی گھر میں ہیں۔ اس گھر کو سجاول نے اپنے خاص بندوں کی خفیہ نگرانی میں رکھا ہوا تھا لیکن اب ایک ایسا شخص ہاناوانی کے قبضے میں جا چکا تھا جو ساری سکیورٹی کے باوجود سجاول کے گھر میں بہ آسانی داخل ہو سکتا تھا اور وہ تھا یونس...... یونس پمپ والا...... ایک دم میرے ذہن میں خطرے کی کئی گھنٹیاں بج اٹھیں۔ لالہ موسیٰ کے اس نامعلوم مکان میں خورسنہ اور اس کا بچہ شدید خطرے میں تھے۔

O......❖......O

میرے پاس سجاول کے قریبی ساتھی باقر چھوٹے کا نمبر موجود تھا۔ میں نے تھوڑی سی کوشش کی اور اس سے رابطہ ہو گیا۔ ''سجاول کا اب کیا حال ہے؟''

وہ بولا۔ ''ہم سردار کو صبح سویرے ہی یہاں صادق آباد لے آئے تھے۔ اسپتال میں ان کا دوا دارو ہوا ہے۔ ڈرپ بھی لگائی گئی ہے۔ اب طبیعت چنگی ہے۔ سوئے ہوئے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ ہم دو تین گھنٹے میں یہاں سے فارغ ہو جائیں گے اور واپس لالہ موسیٰ جانے کا سوچ سکیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے، سوچ لینا...... مگر ابھی فوراً ایک کام کرو۔ وہاں لالہ موسیٰ میں سجاول نے جن خاص بندوں کو اپنے گھر کی نگرانی پر لگایا ہوا ہے، ان کا انچارج کون ہے؟''

''خود فیض چاچا ہے، کیوں کیا کہنا ہے؟''

''ابھی، اسی وقت فیض چاچا کو فون لگاؤ اور اسے بتاؤ کہ یونس کے ساتھ کیا ہوا ہے......''

''وہ میں نے بتادیا تھا رات کو ہی۔'' وہ میری بات کاٹ کر بولا۔

''پوری بات سنو۔'' میں نے خشک لہجے میں کہا۔ ''فیض کو بتاؤ کہ یونس کچھ غلط لوگوں کی گرفت میں چلا گیا ہے۔ وہ کسی بھی وقت اس کے ہوش حواس خراب کر سکتے ہیں۔ اس کو نشہ آور دوائیں کھلا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ تم نے خود بھی دیکھا ہے کہ انہوں نے سردار سجاول کے ساتھ کیا کیا ہے، دیکھا ہے یا نہیں؟''

''ہاں دیکھا تو ہے۔'' وہ ذرا بھرائی آواز میں بولا۔ شاید اس نے دو تین پیگ لگا رکھے تھے۔

''تم ابھی فیض کو بتاؤ کہ اگر یونس، سردار کے گھر کی طرف آئے یا آس پاس دکھائی دے تو اسے روکنا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے حواس میں نہ ہو۔ وہ سردار کے بیوی بچے کے لیے خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں ابھی فون کرتا ہوں۔''

''فون کرو اور پھر مجھے اسی نمبر پر بتاؤ کہ وہ کیا کہتا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' باقر نے کہا۔

میں فوراً انیق کے گھر واپس آیا۔ اس کے لیے گوٹھ کی عورتیں اور رشتے دار خواتین قرآن خوانی میں مصروف تھیں۔ ان میں وہ پیاری سی گوری چٹی لڑکی بھی تھی جو اس کی منگیتر کی بہن تھی...... اور جسے اب وہ اپنی چھوٹی بہن سمجھتا تھا۔ اس گھر کے در و دیوار میں کئی حسرت ناک منظر بکھرے ہوئے تھے۔ ایک طرف وہ سرخ موٹر سائیکل کھڑی تھی جسے وہ گوٹھ میں قیام کے دوران میں استعمال کرتا تھا۔ ایک الماری کے اوپر اس کا ہیلمٹ دھرا تھا۔ سامنے صحن کی دیوار کے ساتھ ساتھ وہ خوشنما پھول دار پودے تھے جن کو وہ اپنے ہاتھ سے پانی دیتا تھا اور تراشتا خراشتا تھا۔ کیا پتا ان پودوں کے ساتھ اس کی کچھ خاص یادیں وابستہ ہوں۔ ان پودوں کی تعداد تین تھی اور وہ چھوٹے چھوٹے درختوں کی شکل اختیار کر چکے تھے۔

ان سارے مناظر سے نگاہ چرا کر اور انیق کے اہلِ خانہ کو پُرسہ دے کر میں اور فخر گوٹھ سے نکل آئے۔ داؤد بھاؤ کی اسپیشل اسٹیشن وین اب موجود نہیں تھی۔ وہ ہم سے پہلے ہی گوٹھ سے واپس روانہ ہو چکا تھا۔ اب میں اور فخر بھی لاہور اور پھر لاہور سے آگے لالہ موسیٰ پہنچنا چاہتے تھے۔ یہ بات اب صاف تھی کہ اگر ہاناوانی، ابھی تک پاکستان میں ہے تو پھر اس کا رخ

بھی یقیناً وسطی پنجاب کی طرف ہوگا۔ وہ سارے افراد جو اس کا ٹارگٹ ہو سکتے تھے، اسی علاقے میں تھے۔

گوٹھ سے بہاولپور اور پھر وہاں سے لاہور تک براستہ سڑک ایک طویل سفر تھا، تاہم جو گاڑی ہمارے لیے مقامی زمیندار نے مہیا کی تھی، وہ ایک اچھی حالت کی 2008ء ماڈل ٹویوٹا تھی اور ہم مناسب رفتار سے سفر کرتے تو قریباً چودہ گھنٹے میں لاہور پہنچ سکتے تھے۔ لاہور سے آگے لالہ موسیٰ جانے کی ضرورت پیش آتی تو بھی دو تین گھنٹے میں بہ آسانی پہنچا جا سکتا تھا۔

راستے میں، میں نے باقر کو ایک بار پھر فون کیا، اس نے بتایا۔ ''سردار ہوش میں آ گئے ہیں۔ مقامی پولیس والوں نے ہمیں گھیرا ہوا تھا۔ گرفتاری کی بات بھی ہو رہی تھی پر اب سردار صاحب کے ایک بہت بڑے افسر دوست کا فون جہلم سے آ گیا ہے۔ وہ شاید خود بھی یہاں پہنچ رہے ہیں، لگتا ہے کہ معاملہ ٹھیک ہو جائے گا۔''

''جس فون کا میں نے کہا تھا، اس کا کیا بنا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں تمہیں فون کر کے بتانے ہی والا تھا۔ میں نے چاچے فیض کو فون کر کے ساری بات سمجھا دی ہے، وہ ہوشیار ہو گیا ہے۔''

''سوال جواب تو نہیں کر رہا تھا؟''

''پریشان تو تھا، پر میں نے کہا ہے کہ ابھی جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کے مطابق چلو لالہ موسیٰ آ کر تمہیں سب کچھ بتائیں گے۔''

''ٹھیک ہے فیض کا نمبر مجھے بھی بھیج دو۔ میں اس سے رابطہ رکھوں گا۔''

باقر سے بات کرنے کے بعد مجھے کچھ تسلی ہوگئی۔ اب میرا سارا دھیان لاہور اور لالہ موسیٰ کی طرف تھا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ وہاں کچھ خطرناک ہلچل ہونے والی ہے۔

○......❖......○

رات کو ہم نے ملتان کے ایک متوسط درجے کے ہوٹل میں قیام کیا اور صبح سویرے پھر نکل کھڑے ہوئے۔ باقر نے مجھے ابھی تک فیض محمد کا سیل نمبر نہیں بھیجا تھا۔ میں نے اسے دوبارہ بھی یاد دہانی کرائی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ سجاول نے اسے منع کر رکھا ہے۔ (باقر کے نزدیک تو میں ایک آؤٹ سائیڈر ہی تھا۔ یعنی سکھیرا گاؤں کے ایک زمیندار کا ڈرائیور) سجاول کے بارے میں پتا چلا کہ اسے عارضی طور پر حراست میں لے لیا گیا ہے۔ وہ جس اسپتال میں تھا وہیں پر پولیس کی نفری تعینات کر دی گئی تھی۔ بھوگلا قصبے کے ہوٹل سے ملنے

والی لاشوں کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دیا گیا تھا۔ نامعلوم حملہ آوروں کے لیے بھی رسمی چھاپے مارے جا رہے تھے۔

سہ پہر دو بجے کے قریب ہم ملتان روڈ پر سفر کرتے ہوئے لاہور کے نواح میں پہنچ چکے تھے۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں قریب ہی میرا آبائی گاؤں مراد پور تھا جہاں سے میری اس درد بھری کہانی کی شروعات ہوئی تھی۔ میں اپنی من موہنی چچا زاد بہن فائزہ کی شادی میں شرکت کے لیے ڈنمارک سے یہاں پہنچا تھا اور پھر اسے اپنی چچی سمیت کفن میں لپیٹ کر قبر میں اتارنا پڑ گیا تھا (خیر یہ تو چند روز بعد کا واقعہ تھا اس سے پہلے ہی ایک زخمی کو اسپتال پہنچانے کی پاداش میں، میں پولیس گردی کا شکار ہوا تھا) پتا نہیں کیوں یونہی دل چاہا اور میں نے گاڑی ملتان روڈ سے اتار کر آبائی گاؤں کی طرف موڑ دی۔

''کہاں جا رہے ہو؟'' فخر نے چونک کر پوچھا۔

''تمہیں اپنا گاؤں دکھاؤں، چند منٹ کے لیے؟'' میں نے کہا۔

اس نے میرے چہرے کے کھوئے کھوئے تاثرات پر ایک نگاہ ڈالی اور خاموش ہو گیا۔

چار پانچ منٹ بعد ہی ہم اس ذیلی سڑک کے اسی موڑ سے گزرے جہاں کسی نامعلوم کار سوار نے عارف کی موٹر بائیک کو ٹکر مار کر نشیب میں گرایا تھا اور اسے تڑپتا چھوڑ کر فرار ہو گیا تھا۔

وہ سارے پرانے مناظر نگاہوں میں گھوم گئے۔ خستہ حال مقامی اسپتال۔ مقامی تھانہ جس میں برگد کے درخت کے نیچے مویشی بندھے ہوئے تھے اور پھر بے مہار پولیس اہلکاروں کے ناقابلِ فراموش رویے، رشوت ستانی، بے حسی اور پھر عام لوگوں کی بد نظمی، کم علمی اور دیگر قباحتیں، لیکن جو کچھ بھی تھا، یہ میرا وطن تھا اور میں نے اسے دل و جان سے قبول کیا تھا...... میں آج بھی کر رہا تھا۔ تاہم سینے میں کچھ زخم ایسے تھے جو انمٹ ہو چکے تھے۔

''یار، یہ تو کافی بڑا گاؤں ہے بلکہ اسے قصبہ کہنا چاہیے۔'' فخر نے کہا۔

''قصبہ بھی کیا...... ہو سکتا ہے کسی وقت ''لاہور'' ہی اس کو ہڑپ کر لے۔ یہ شہر ہی بن جائے۔ دیکھ نہیں رہے کس طرح کھیتوں کھلیانوں کو رہائشی کالونیوں کی شکل دی جا رہی ہے۔ یہ جو سامنے دو سڑکیں نظر آ رہی ہیں، ان کے درمیان ہماری آبائی حویلی تھی۔ اب اس کا نام و نشان نہیں ہے۔ بس یہی چاہتے تھے یہاں کے بڑے لوگ۔''

سامنے ہی مراد پور کا قبرستان نظر آیا۔ پتا نہیں کیوں میرا دل چاہا کہ ''اپنی قبر'' ہی دیکھ لوں۔ دھماکے میں ''مرنے'' کے بعد یہیں تو ''دفنایا'' گیا تھا شاہ زیب کو۔ میں نے گاڑی قبرستان کے دروازے کے قریب روک لی۔

''آؤ تمہیں اپنی ''قبر'' دکھاؤں۔'' میں نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

فخر نے چونک کر میری جانب دیکھا، پھر ایک گہری سانس لے کر میرے ساتھ گاڑی سے باہر نکل آیا۔ یہ کافی بڑا اور پرانا قبرستان تھا۔ اس بات کا پورا پورا خدشہ موجود تھا کہ جلد یا بدیر اس قبرستان کو بھی کسی سڑک یا کالونی کے کسی بلاک کے نیچے دفنانے کی کوشش کی جائے گی۔ اگر اب تک یہ بچا ہوا تھا تو شاید اس کی وجہ یہی تھی کہ اس کے گرد چار دیواری موجود تھی اور ابھی وہ لوگ بھی قرب و جوار میں موجود تھے جن کے پیاروں کی قبریں یہاں پائی جاتی تھیں۔

جنتر اور کیکر کے درختوں کے نیچے سے گزرتے ہوئے اور قبروں کے کتبے پڑھتے ہوئے ہم ایک کتبے کے سامنے پہنچ کر رک گئے۔ کتبے پر میرا نام لکھا تھا...... شاہ زیب عمر 26 سال...... تاریخ وفات وغیرہ وغیرہ۔ دوسری قبروں کی طرح ''میری اس قبر'' پر بھی گلاب کی چند سوکھی پتیاں موجود تھیں، تاہم آثار سے پتا چلتا تھا کہ یہاں کوئی کم کم ہی آتا ہے۔ اردگرد خشک پتے بکھرے ہوئے تھے اور کتبے پر بھی گرد تھی۔

''اپنی ہی قبر پر کھڑے ہونا اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھانا کیسا لگتا ہے، یہ آج ہی پتا چلا۔'' میں نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''ہاں، بہت کم لوگوں کو ایسا تجربہ ہوا ہوگا۔'' فخر بھی زیرلب بولا۔

اچانک میں چونکا۔ مجھے یاد آیا کہ میری چچازاد فائزہ اور چچی آمنہ کی قبریں بھی تو اسی قبرستان میں ہیں۔ تین چار برس پہلے انہیں لحد میں اتارنے والوں میں، میں بھی شامل تھا۔ معمولی سی کوشش کے بعد مجھے ان کی قبریں بھی مل گئیں۔ ماں، بیٹی ایک دوسری کے پہلو میں خاموش لیٹی تھیں۔ وہ دردناک مناظر نگاہوں میں گھومے جب آگ نے انہیں زندہ جلا دیا تھا اور پھر اس کے بدلے لالہ نظام اور اس کے ساتھیوں کو اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے تھے۔ لالہ نظام کے جسم کا قیمہ میں نے ہی کیا تھا، اسے ایک بھاری لوڈر کے نیچے کچلا تھا۔

''جی صاحب جی...... کوئی خدمت؟'' ایک آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔

ہمارے سامنے قبرستان کا عمر رسیدہ رکھوالا کھڑا تھا۔ اس نے ایک بنیان اور دھوتی پہن رکھی تھی۔ سر اور داڑھی کے بال سفید تھے۔ میں نے کہا۔ ''چاچا! ان دونوں قبروں کی صفائی کر دو۔''

وہ شتابی سے گیا اور پانی کی بالٹی اور جھاڑو وغیرہ لے آیا۔ دو منٹ میں اس نے صفائی ستھرائی کر کے قبروں پر پانی چھڑک دیا۔ بولا۔ ''آپ دونوں عزیز ہیں حفیظ صاحب کے؟''

وہ میرے چچا کا نام لے رہا تھا۔

میں نے اثبات میں جواب دیا اور مختصراً بتایا کہ ملتان روڈ سے گزر رہے تھے، قبریں دیکھنے کا خیال آ گیا، وہ بولا۔ ''حفیظ بھائی کہاں ہیں، ان کا نیا گھر بھی خالی پڑا ہے، کئی مہینوں سے ان کا پتا نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''پتا تو ہمیں بھی نہیں۔ بس اتنی خبر ملی تھی کہ شاید بھائی کے پاس کہیں باہر کے ملک چلے گئے ہیں۔''

قبریں صاف ستھری نظر آنے لگی تھیں۔ ہم نے فاتحہ پڑھی اور پھر اس تیسری قبر کی طرف آ گئے جس پر میرے نام کا کتبہ تھا۔ یقیناً کچھ راکھ اور ناقابلِ شناخت ہڈیوں کو میری ''باقیات'' قرار دے کر اس قبر میں دفن کر دیا گیا تھا۔ گورکن نے اس قبر کی بھی صفائی کر دی اور پانی وغیرہ چھڑک دیا بولا۔ ''حفیظ صاحب پر اوپر نیچے بڑے سخت صدمے آئے ہیں۔ پہلا دھچکا بیوی اور بیٹی کی موت کا لگا، پھر بیٹا جیل چلا گیا اور پھر یہ جوان بھتیجا اللہ پیارا ہو گیا۔''

فخر بولا۔ ''اس قبر پر کبھی کوئی آتا ہے یا نہیں؟''

گورکن نے کہا۔ ''حفیظ صاحب دو چار دفعہ یہاں آئے۔ بارش میں لیپائی وغیرہ بھی کروائی تھی تینوں قبروں کی۔ اب تو وہ بھی نہیں ہیں۔'' پھر وہ ذرا چونک کر بولا۔ ''ہاں شروع شروع میں ایک لڑکا آیا کرتا تھا۔ دیر تک گم صم بیٹھا رہتا تھا، روتا رہتا تھا، کہتا تھا یہ میرے بڑے بھائی کی قبر ہے، بلکہ بھائیوں سے بھی کہیں زیادہ پیارے کی قبر۔ لاہور سے آتا تھا...... ایک دو دفعہ تو رات بھر یہاں رہا۔''

''نام کیا تھا؟'' فخر نے پوچھا۔

''نام تو میں نے کبھی نہیں پوچھا۔ درمیانہ قد تھا، اکیس بائیس سال عمر ہو گی۔ اچھی شکل صورت تھی......''

میں نے کہا۔ ''گھونگریالے بال تو نہیں تھے...... گردن پر بائیں طرف کٹ کا پرانا نشان تھا؟''

''جی جی...... وہی ...... کوئی رشتے دار تھا آپ کا؟''

میرے سینے میں درد کی تیز ٹیس اٹھی۔ گورکن، انیق کی بات کر رہا تھا۔ انیق جو میری قبر پر آ کر روتا رہا تھا لیکن اب وہ خود قبر میں تھا۔ گلبرگ کے دھماکے والے واقعے کو اب سات آٹھ ماہ گزر چکے تھے۔ انیق کا یہاں آنا یقیناً ان دنوں کی بات تھی جب وہ ابھی ہانا وانی کے ہتھے نہیں چڑھا تھا...... اور اس نے اپنی طلسمی آنکھوں کے زور سے اور خاص منشیات کی مدد

سے اسے ہوش وخرد سے بیگانہ نہیں کیا تھا.......وہ میری ''ابدی جدائی'' پر تڑپا تھا اور اب میں اس کی ابدی جدائی پر تڑپ رہا تھا۔

ہاناوانی کا چہرہ پچھلے تین چار روز سے مسلسل میرے دماغ میں گھوم رہا تھا۔ میرے سینے میں بے رحم کچوکے لگا رہا تھا۔ فخر نے جھک کر ''میری قبر'' کی مٹی کو چھوا اور سرگوشی میں بولا۔ ''ایک بات نوٹ کی تم نے؟ یہ قبر زیادہ پرانی نہیں لگ رہی۔ لگتا ہے کہ چار چھ ہفتے پہلے ہی بنی ہو۔''

یہ بات میں نے بھی محسوس کی تھی۔ قبر کی مٹی کچھ نرم تھی اور ساخت ایسی نہیں تھی جیسی آٹھ ماہ پرانی قبر کی ہونی چاہیے۔ گورکن کا نام اللہ دتا تھا، وہ بغور ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''اللہ دتا! یہ مٹی کچھ بھربھری اور نرم لگ رہی ہے اور اس کتبے کو بھی دیکھ کر لگتا ہے جیسے چند ہفتے پہلے لگایا گیا ہے؟''

اس نے ایک گہری سانس لی اور چند لمحے ہچکچانے کے بعد بولا۔ ''میرا بھی یہی خیال تھا کہ آپ کو اس واقعے کا پتا نہیں جو یہاں دو ڈھائی مہینے پہلے ہوا ہے۔''

''کون سا واقعہ؟'' فخر نے استفسار کیا۔

گورکن نے پاس ہی ایک کمرے کے باہر بچھی ہوئی چارپائی کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے کہنے پر ہم چارپائی پر آن بیٹھے، وہ ایک خستہ حال موڑھے پر بیٹھ گیا اور بولا۔ ''یہاں بڑا عجیب معاملہ ہوا ہے۔ میں چوبیس گھنٹے یہاں موجود رہتا ہوں۔ قبروں کی جتنی بھی رکھوالی ہو سکتی ہے، کرتا ہوں۔ اس دن میں بس ایک دو گھنٹے کے لیے ایک رشتے دار کی طرف گیا تھا۔ رات کا کھانا کھاتے ہی میں واپس پلٹ پڑا۔ قبرستان کے باہر دو بڑی گاڑیاں کھڑی نظر آئیں۔ پھر ایک دم بہت سی گولیاں چلیں۔ میں ڈر کر واپس گاؤں کی طرف بھاگا۔ گاؤں میں بھی فائرنگ کی آواز سنی گئی تھی۔ وہاں سے بھی لوگ باہر نکل آئے۔ ہم سات آٹھ بندے مل کر قبرستان کی طرف آئے۔ اس وقت کچھ لوگ قبرستان میں سے نکل رہے تھے۔ ان میں کئی ایک کے پاس اسلحہ بھی تھا۔ وہ تیزی سے گاڑیوں میں بیٹھے اور نکل گئے۔ ہم میں سے کسی کی بھی اتنی ہمت نہیں ہوئی کہ انہیں روک سکے۔ وہ بڑے خطرناک لوگ دکھائی دیتے تھے۔ ان کے جانے کے بعد ہم قبرستان میں آئے۔ یہاں باقی تو سب ٹھیک ٹھاک تھا مگر حفیظ صاحب کے بھتیجے شاہ زیب کی قبر کھلی پڑی تھی۔''

''کھلی پڑی تھی؟'' فخر نے تعجب سے پوچھا۔

''ہاں جی...... بات تو افسوس کی ہے لیکن ہوا ایسے ہی ہے۔ ان لوگوں نے قبر کھود کر کفن

اور جو کچھ اس میں تھا لکڑی کے تابوت میں سے باہر نکالا اور اس پر پیٹرول چھڑک کر آگ لگا دی۔ اِدھر اُدھر سے کچرا اور کوڑا اکٹھا کر کے کھلی قبر میں پھینک دیا گیا۔ سرہانے پر سنگِ مرمر کا بڑا اچھا کتبہ لگا ہوا تھا۔ اس پر اتنی فائرنگ کی گئی کہ وہ ٹوٹ پھوٹ کر رہ گیا۔ یہ جو کتبہ اب قبر پر لگا ہوا ہے وہ ایڈووکیٹ عبداللہ نے دوبارہ لگوایا ہے، جو مرنے والے کا دوست ہے۔ شاید آپ بھی جانتے ہوں، عبداللہ کو؟''

میں بس اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

فخر نے گورکن اللہ دتا سے پوچھا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے یہ کن لوگوں کا کام تھا؟''

''کوئی ڈھاڈے دشمن ہی ہو سکتے ہیں۔ ایسا کام کرنے کے لیے پتھر کا کلیجہ چاہیے ہوتا ہے۔ ہم نے کفن کے ٹکڑے اور ادھ جلی ہڈیوں کو پھر جمع کیا۔ مشکل سے آدھا کلو وزن ہوگا۔ ہم نے ان چیزوں کو پھر دفنا دیا۔ سارے مراد پور کو اس واقعے کا بڑا دکھ ہوا۔ ایڈووکیٹ عبداللہ نے اپنے طور پر کوشش بھی کی مگر یہ ذلیل حرکت کرنے والوں کا کچھ پتا نہیں چلا۔''

میں نے پوچھا۔ ''جو لوگ گاڑیوں میں بیٹھ کر فرار ہوئے وہ کس طرح کے تھے، کس طرح کے کپڑے پہن رکھے تھے؟''

''کپڑے تو عام شہریوں والے ہی تھے..... ہاں ایک خاص بات یاد آئی۔ ان میں ایک ہٹی کٹی عورت بھی تھی۔ میں نے اسے کافی دور سے دیکھا لیکن لگتا تھا کہ اس نے کالے شیشوں والی عینک پہن رکھی ہے۔ بس ایک جھلک ہی نظر آئی اس کی۔ پھر وہ چھ گز لمبی جیپ کے اندر بیٹھ گئی۔''

میرے سینے میں جیسے ایک زوردار گھونسا لگا۔ شک درست ثابت ہو گیا تھا۔ میں نے کن انکھیوں سے فخر کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بھی غم و غصے کی لہر نمودار ہو گئی تھی۔ ہاناوانی نے ان سب لوگوں کو مارنے کی قسم کھا رکھی تھی جو کسی بھی طرح اس کے بیٹے کے قتل میں شریک رہے تھے۔ ان میں سرِفہرست یقیناً میرا نام ہی رہا ہوگا لیکن میں چونکہ اس کے انتقام سے پہلے ہی ''مارا'' جا چکا تھا لہٰذا اس نے اپنے سینے کی آگ کو ''میری قبر کی بے حرمتی'' سے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ واقعہ اس جنونی کیفیت کا غماز تھا جو اس وقت جاماجی کی اس خطرناک عورت میں پائی جا رہی تھی۔

گورکن نے ہمیں وہ کتبہ بھی دکھایا جو گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا تھا۔ میرے نام کا وہ ٹوٹا پھوٹا پتھر ایک گوشے میں جنتر کی جھاڑی کے نیچے پڑا تھا۔ اس پر ہیوی آٹومیٹک رائفل سے گولیاں برسائی گئی تھیں۔ چچا حفیظ تو یہاں موجود نہیں تھے اور میرے دوست عبداللہ کی

خوش قسمتی تھی کہ وہ ان لوگوں کے ہتھے نہیں چڑھا ورنہ یقینی بات تھی کہ وہ بھی زندہ نہ بچتا۔
ہمارے پاس وقت کم تھا۔ ہم زیادہ دیر قبرستان میں ٹھہر نہیں سکے۔ گورکن اللہ دتا کو قبروں کی نگہداشت کی ہدایت کر کے اور اس کی جیب میں کچھ معقول رقم ڈال کر ہم وہاں سے روانہ ہو گئے۔ گاڑی ایک بار پھر تارکول کی سڑک پر دوڑنے لگی۔
فخر نے کہا۔ ''ہاناوانی یوں تو عملیات کی بڑی ماہر بنتی ہے۔ اس کے عقیدت مند پتا نہیں اسے ''معرفت'' کے کس درجے پر فائز کرتے ہوں گے مگر وہ ایک ایسی قبر پر غصہ اتارتی رہی جو تمہاری تھی ہی نہیں۔''
''ہاں، اس کی یہ بے خبری قابلِ توجہ ہے...... لیکن...... دوسری طرف دیکھا جائے تو وہ غیب دانی کا دعویٰ نہیں کرتی۔ یا کم از کم ہمیں تو کسی ایسے دعوے کا علم نہیں۔ اس کا سارا تکبر اور ظالمانہ رویہ اس کے ''ہپناٹزم'' کے حوالے سے ہے اور اپنی یہ غیر معمولی صلاحیت تو اس نے ہر جگہ ثابت کی ہے۔''
اسی دوران میں میرے سیل فون پر کال آ گئی۔ یہ سجاول کا ساتھی باقر چھوٹا ہی تھا۔ ''کیا بات ہے باقر؟'' میں نے پوچھا۔
وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''یار! ایک کام خراب ہو گیا ہے مجھ سے۔ رات کو میں کچھ نشے میں تھا۔ میں لالہ موسیٰ میں فیض چاچے کو وہ فون نہیں کر سکا جس کا تم نے کہا تھا۔''
میں سٹپٹا گیا۔ ''اس کا مطلب ہے تم نے جھوٹ بولا۔ بہت بڑی بے وقوفی کی ہے تم نے...... نہ فون کیا اور نہ مجھے فیض کا نمبر دیا۔ اگر وہاں کچھ ہو گیا تو پھر؟''
چند لمحے کے توقف کے بعد وہ کانپتی ہوئی سی آواز میں بولا۔ ''یار وقاص! یہی تو مسئلہ ہے...... وہاں...... گڑبڑ ہو گئی ہے۔''
''کیا بکواس کر رہے ہو؟'' میں چلا اٹھا۔
''ابھی پندرہ بیس منٹ پہلے مجھے پتا چلا ہے......'' وہ ہکلایا۔
''کیا پتا چلا ہے؟''
''یونس وہاں آیا تھا۔ وہ سردار کی بیوی اور بچے کو اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھا کر کہیں لے گیا ہے۔''
میں گالی کم ہی دیتا تھا لیکن اس وقت باقر کے لیے دو چار گالیاں بے ساختہ میرے منہ سے نکل گئیں۔ میں نے گاڑی ایک سائیڈ پر روک دی۔
میری گالیاں سن کر اس نے بھی غصہ دکھایا بولا۔ ''وقاصے! منہ سنبھال کر بات کرو۔ غلطی

بندے بشر سے ہی ہوتی ہے، مجھ سے بھی ہوگئی ہے......اگر......''

''یہ چھوٹی غلطی ہے جو تُو نے کی ہے۔ سردار کو تباہ کر دیا ہے تُو نے۔ اگر یونس واقعی اس کے بیوی بچے کو لے گیا ہے تو اب وہ زندہ نہیں بچیں گے۔''

''دیکھ وقاصے! بات کا بتنگڑ نہ بنا۔ ابھی تو یہ بھی پتا نہیں ہے کہ یونس سردار کے گھر کیوں گیا اور اس کے بیوی بچے کو کس لیے وہاں سے لے کر گیا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ ان کو حفاظت کے لیے ہی کہیں لے گیا ہو۔''

''تُو میرے سامنے ہوتا تو تیرے منہ پر ضرور ایک جوتا مارتا۔'' میں نے تلملا کر کہا۔

''اوئے تجھ سے کہہ رہا ہوں منہ سنبھال کر بات کر...... جو ہونا تھا ہو گیا ہے۔ اب یہ سوچ کہ اس کو ٹھیک کیسے کرنا ہے...... اور...... ایک بات میں تجھے صاف صاف بتا دوں وقاصے! اس بات کا پتا اگر سردار کو چلا تو پھر میرے ساتھ تو جو ہوگا وہ ہوگا لیکن تیرے میرے درمیان بہت برا ہو جائے گا۔ تُو مجھے ٹھیک سے جانتا نہیں ہے۔ میں قبر تک بندے کا پیچھا کرتا ہوں۔''

وہ سردار سے خوف زدہ تھا اور اب مجھے دھمکانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن جب میں نے اس پر مزید لعنتیں ارسال کیں تو وہ نرم پڑ گیا اور پھر منت سماجت پر اتر آیا۔ یقیناً اس کا دل بھی گواہی دے رہا تھا کہ وہاں لالہ موسیٰ میں کوئی غیر معمولی قسم کی گڑبڑ ہو چکی ہے۔ کوئی ایسی گڑبڑ جو اس کی سمجھ سے باہر تھی لیکن تھی ضرور۔

میں نے جھلا کر فون بند کر دیا اور گاڑی پوری رفتار سے لاہور کی طرف بڑھا دی۔ لاہور سے آگے ہم موٹر وے یا جی ٹی روڈ کا راستہ اختیار کر کے دو ڈھائی گھنٹے میں لالہ موسیٰ پہنچ سکتے تھے۔ کئی دفعہ انسان کے بدترین اندیشے اس کی سوچ کے عین مطابق حقیقت کا روپ دھار لیتے ہیں، لگتا تھا کہ یہاں بھی یہی کچھ ہوا ہے، یونس اس خطرناک عورت کے انوکھے اثر میں آ چکا ہے اور لالہ موسیٰ کے اس گھر میں سے خورسنہ اور اس کے بچے کو لے کر نکل گیا ہے۔ کیا وہ انہیں مار دے گا؟ کیا وہ خورسنہ پر مجرمانہ حملے کی کوشش کرے گا؟ کیا ہانا وانی ان دونوں کو یرغمال بنا لے گی اور ان کے ذریعے کوئی مطالبہ منوانے کی کوشش کرے گی؟ اس طرح کے کئی سوالات ذہن میں چنگھاڑ رہے تھے۔

○......❖......○

شام کے سات بجے تھے جب ہم لالہ موسیٰ میں داخل ہوئے۔ باقر چھوٹا مجھے اس جگہ کا پتا بتا چکا تھا جہاں سجاول نے خورسنہ اور اس کے بچے ذیشان کو رکھا ہوا تھا۔ اس نے فیض کو بھی

بتادیا تھا کہ ہم اس کے پاس آرہے ہیں۔فیض محمد کو میرا نام باقر نے وہی بتایا تھا جو اسے معلوم تھا۔یعنی وقاص......اور یہ بھی بتادیا تھا کہ سردار سجاول مجھ پر اعتماد رکھتا ہے۔

ہم لالہ موسیٰ کے گنجان علاقے میں داخل ہوئے۔ بڑے پوسٹ آفس کے قریب ایک چائے خانے میں ہماری اور فیض محمد کی ملاقات ہوئی۔ میں فیض محمد کو اس وقت سے جانتا تھا جب ہم کوٹلی والے ڈیرے پر قیام پذیر تھے۔اس قیام کے دوران میں فیض محمد سے میری اچھی دوستی ہوگئی تھی۔ یقیناً وہ اب بھی مجھے یاد کرتا ہوگا......لیکن فی الوقت وہ بے خبر تھا کہ میں ایک نئی شباہت کے ساتھ اس کے سامنے موجود ہوں۔فیض محمد کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں اور وہ سخت الجھا ہوا تھا۔ بولا۔''میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا کہ باقر اتنا پریشان کیوں ہے۔وہ کہہ رہا ہے کہ یونس کے ارادے اچھے نہیں ہیں۔ میرے لیے اس پر یقین کرنا بڑا مشکل ہورہا ہے۔سردار تو یونس پر جتنا اعتماد کرتے ہیں شاید مجھ پر بھی نہ کرتے ہوں۔''

''بات وفاداری یا دغابازی کی نہیں ہے فیض محمد......مجبوری کی ہے۔یونس کو شاید مجبور کر دیا گیا ہے، خیر یہ بات لمبی ہوجائے گی۔تم ہمیں یہ بتاؤ کہ وہ کب یہاں پہنچا اور ان دونوں کو کیسے لے کر گیا؟''ان دونوں سے میری مراد خورسنہ اور ذیشان تھی۔

فیض نے اپنی کھچڑی داڑھی کھجائی اور بولا''وہ صبح آٹھ بجے کے قریب اسی سفید سوزوکی میں آیا تھا جس میں دو تین بار پہلے بھی آچکا ہے۔ہم سے کوئی بات کیے بغیر وہ اندر چلا گیا۔ پندرہ بیس منٹ بعد سردار کی بی بی صاحبہ اور بچہ باہر نکلے۔ وہ بڑے آرام سے باتیں کرتے ہوئے آرہے تھے۔ یونس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئے۔ بچہ آگے بیٹھا، بی بی صاحبہ پیچھے بیٹھیں۔ میں نے یونس سے پوچھا کہ سکیورٹی کی لوڑ تو نہیں، وہ بولا کہ نہیں ایسی کوئی لوڑ نہیں، ہم ابھی واپس آجاتے ہیں۔''

فخر نے پوچھا۔''فیض چاچا......تمہیں یونس کی بات چیت میں کوئی فرق محسوس ہوا؟''

''نہیں، فرق تو کوئی نہیں لگا......ہاں......ذرا نشے میں لگتا تھا......اور یہ کوئی ایسی نئی بات تو نہیں تھی۔ میں جانتا ہوں کہ وہ اکثر صبح کے وقت بھی دو تین پیگ لگالیتا ہے۔''

میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔''دیکھو فیض چاچا، تم نے بتایا ہے کہ وہ نو بجے کے قریب بی بی اور بچے کو لے کر یہاں سے نکلا، اب ایک گھنٹے بعد رات کے نو بج جائیں گے وہ ابھی تک واپس نہیں آئے۔''

''پریشانی تو بہت زیادہ ہے۔ پر اگر کوئی گڑبڑ ہوئی ہے تو اس میں ہمارا تو ذرہ بھر قصور نہیں ہے۔سردار نے یونس کو یہاں آنے جانے کی پوری اجازت دے رکھی تھی بلکہ شاید تم

لوگوں کو بھی پتا ہو کہ سردار کے بیوی بچے کے لیے اس گھر کا انتظام اور اس کی سکیورٹی کا بندوبست بھی یونس نے ہی کیا ہوا تھا......'' صورتِ حال کی سنگینی کو بھانپتے ہوئے فیض محمد کی آواز میں ہلکی سی لرزش آگئی تھی۔

چائے خانے میں ٹی وی آن تھا، ایک معروف نیوز چینل لگا ہوا تھا۔ اچانک ایک خبر نے ہمیں اپنی طرف متوجہ کیا اور پوری طرح جکڑ لیا۔ نیوز کاسٹر جو خبر پڑھ رہی تھی وہ قریبی شہر نما قصبے کھاریاں کے حوالے سے تھی۔ خبر کے مطابق کھاریاں کے قریب جی ٹی روڈ سے قریباً آدھ کلومیٹر کے فاصلے پر جھاڑیوں سے ایک جواں سال عورت اور بچے کی لاش ملی تھی۔ دونوں کو نہایت پاس سے فائرنگ کر کے گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا تھا۔ نامعلوم قاتل کسی بڑی جیپ پر سوار آئے تھے اور لاشیں پھینک کر فرار ہو گئے تھے۔ نیوز کاسٹر نے کہا۔ ''اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خونی واقعہ آج دوپہر کے وقت پیش آیا ہے۔ ابتدائی اندازے کے مطابق یہ دونوں لاشیں ماں اور بچے کی ہیں......''

خبر سن کر پورے جسم میں سنسنی اور درد کی لہریں دوڑ گئیں۔ دھیان سیدھا خورسنہ اور اس کے خوبرو بچے کی طرف ہی گیا۔ تو کیا جاماجی کی دلکش خورسنہ بھی اس سفاک دشمنی کی بھینٹ چڑھ چکی تھی...... وہ جو اپنے دل میں محبت کی جوت جلائے ہوئے تھی...... ہزاروں میل کا فاصلہ طے کر کے سجاول سے ملنے یہاں پہنچی تھی اور پھر اسی کی ہو کر رہ گئی تھی۔ کیا اس سچی کھری محبت کی سزا اسے پہلے زخمی کر کے اور اب جان سے مار کر دی گئی تھی۔

فیض محمد اور فخر کے چہرے بھی دھواں ہو رہے تھے۔ ہم فوراً وہاں سے اٹھے اور گاڑی میں بیٹھ کر کھاریاں کی جانب روانہ ہو گئے۔ ٹی وی سے نشر ہونے والی نیوز میں اس اسپتال کا بھی بتایا گیا تھا جہاں لاشیں رکھی گئی تھیں۔ فیض محمد ہماری رہنمائی کر رہا تھا۔ بیس پچیس منٹ بعد ہم اس اسپتال کے سامنے موجود تھے۔ لاشوں کا پوسٹ مارٹم ہو چکا تھا اور اب وہ شناخت کے لیے مردہ خانے میں رکھی تھیں۔

مردہ خانے میں جا کر اپنے کسی پیارے کو ڈھونڈنا، اس کے چہرے سے چادر سرکانا کتنا دشوار ہوتا ہے، یہ کچھ وہی جانتے ہیں جن کو ایسے کٹھن وقت سے گزرنا پڑتا ہے۔ ہم نے بھی مردہ خانے میں جا کر لاشیں دیکھیں۔ خدا ہر کسی کی نگاہ کو ایسے مناظر سے محفوظ رکھے۔ گولیوں کی باڑ نے بچے کے چہرے کے ایک حصے کے پرخچے اڑا دیئے تھے۔ پھر بھی وہ پہچانا جا رہا تھا۔ وہ ذیشان نہیں تھا، عورت بھی خاکستری بالوں والی ایک مقامی عورت تھی، دونوں کسی وراثتی جھگڑے کی بھینٹ چڑھے تھے۔ ہماری غیر معمولی تشویش میں تھوڑی سی کمی واقع ہوئی،

لیکن مجموعی طور پر صورتِ حال اب بھی نہایت مخدوش تھی۔ خورسنہ اور ذیشان کی طرف سے کوئی بھی بری خبر آسکتی تھی۔

پھر میرا دھیان سجاول، رضوان اور تاجور کی طرف چلا گیا۔ کسی نہ کسی طور وہ بھی انیق ہی کی طرح میرے ساتھیوں میں شامل تھے...... اس کے علاوہ کچھ اور لوگ تھے جو پاکستان میں نہیں تھے۔ جیسے قسطینا، کمانڈر فارس جان اور زینب ابراہیم وغیرہ۔ قسطینا کا نام تو میں نے ہاناوانی کی زبانی خود اپنے کانوں سے سنا تھا۔ اگر سجاول نے اپنے ہاتھوں سے رائے زل کا سر کاٹا تھا تو قسطینا وہ دلیر لڑکی تھی جس نے نیوسٹی کے اندر گھس کر رائے زل کی شکست کی بنیاد رکھی تھی۔ ہاناوانی اسے کیسے بھول سکتی تھی۔

ہم لالہ موسیٰ واپس آ گئے۔ میں نے فیض محمد کو تو سجاول اور خورسنہ کی رہائش گاہ پر واپس بھیج دیا اور خود فخر کے ساتھ ایک مقامی ہوٹل میں چلا گیا۔ ہوٹل کی پارکنگ میں گاڑی کے اندر بیٹھ کر میں نے سب سے پہلے رضوان ٹی کو فون کیا اور اس سے کہا کہ اس کے لیے خطرات موجود ہیں، وہ چوکس رہے۔ میں نے اسے یونس کے حوالے سے بھی الرٹ کیا۔ اس کے بعد میں نے سجاول کو کال ملائی۔ سجاول اپنے تین ساتھیوں سمیت مقامی پولیس کی کسٹڈی میں تھا۔ اب ایک بااثر شخصیت کی وجہ سے سجاول کو رحیم یار خان کے تھانے سے رہائی مل چکی تھی اور وہ طوفان کی رفتار سے لالہ موسیٰ کی طرف آ رہا تھا۔ اسے بھی وہی خدشات لاحق تھے جو ہمیں تھے۔ یعنی یونس کیوں لالہ موسیٰ پہنچا تھا اور خورسنہ اور اس کے بچے کو اپنے ساتھ کیوں لے گیا تھا؟ سجاول سے میری آخری ملاقات بھوگلا کے ہوٹل میں ہی ہوئی تھی۔ اس وقت وہ ہاناوانی کے خلاف غم و غصے سے بھرا ہوا تھا۔ اب اس غم و غصے میں غیر معمولی اضافہ ہو چکا تھا۔ وجہ عیاں تھی۔ ہاناوانی نے حملہ کر کے نہ صرف اس کے ساتھیوں کی جان لی تھی بلکہ یونس کو اغوا بھی کیا تھا...... اب وہی یونس تھا جو پُراسرار طور پر لالہ موسیٰ میں سجاول کی خفیہ رہائش گاہ پر پہنچا تھا اور وہاں سے خورسنہ اور بچے کو لے اُڑا تھا۔

وہ فون پر دھاڑا۔ ''شاہ زیب! یہ کیا ہو رہا ہے ہمارے ساتھ۔ ابھی انیق کی موت کا غم ہی چین نہیں لینے دے رہا، اب اگر خورسنہ یا ذیشان کے ساتھ کچھ ہو گیا تو میں زندہ جلا دوں گا اس عورت کو اور اس کے اگلے پچھلوں کو...... میں نسلیں ختم کر دوں گا ان کی۔''

میں نے کہا۔ ''ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا سجاول، کیا پتا، یونس نے جو کچھ کیا ہے، اس کے پیچھے کوئی اور وجہ ہو۔''

''یہ تو دل کو تسلی دینے والی باتیں ہیں۔'' وہ مہیب لہجے میں بولا۔ ''وہ خورسنہ اور بچے کو نو

''گھر واپس جارہا ہوں۔''

''کہاں گئے تھے؟''

''ایک بندے سے ملنے نکلا ہوا تھا۔''

آوازوں سے پتا چلتا تھا کہ وہ لالہ موسیٰ کی کسی بارونق سڑک سے گزر رہا ہے اور گاڑی میں سوار ہے۔

''کوئی نئی خبر؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، ابھی کوئی نہیں۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولا اور فون بند کر دیا۔

فون بند ہوا ہی تھا کہ باقر کی کال آ گئی۔ وہ اس وقت جہلم شہر میں تھا اور اپنے سردار سجاول کی ہدایات کے مطابق خورسنہ اور یونس وغیرہ کی تلاش میں لگا ہوا تھا۔ وہ صبح سے دو بار مجھے فون کر چکا تھا۔ وہ اندر سے بے حد ڈرا ہوا تھا۔ اب بھی اس کی گفتگو کا موضوع وہی تھا۔ چھوٹتے ہی بولا۔ ''وقاصے بھائی! میں تیرا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔ یہ میری زندگی و موت کا سوال ہے۔ اگر سردار کو بھنک بھی پڑ گئی کہ تم نے مجھے یونس کے بارے میں خبردار کیا تھا، لیکن میں نے......''

''یار! تم نے پھر وہی فلم چلا دی ہے۔'' میں نے بیزار ہو کر اس کی بات کاٹی۔ ''تمہیں کہا ہے ناں، میں کچھ نہیں کہوں گا......اب اسٹامپ پیپر لکھنے سے تو میں رہا۔'' میں نے فون بند کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد پھر اس کا فون آ گیا۔ اس بار اس نے ذرا ٹھہرے ہوئے لہجے میں بات کی اور مجھے بتایا کہ اسے ایک چھوٹا سا کھوج ملا ہے۔ اس کے اور یونس کے ایک مشترکہ دوست سے رابطہ ہوا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ اس نے یونس کو دیکھا ہے۔

''کہاں؟'' میں نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

''لالہ موسیٰ کی طرح یہاں جہلم میں بھی یونس کا ایک پیٹرول پمپ ہے۔ کل وہ اپنی سفید رنگ کی گاڑی میں پیٹرول پمپ سے نکل رہا تھا جس دوست نے اسے دیکھا وہ بس میں سوار تھا اس لیے رک نہیں سکا۔ اب میں اسی دوست سے ملنے جا رہا ہوں۔''

''ٹھیک ہے باقر! مجھے جلدی اس کے بارے میں بتاؤ بلکہ اگر کہو تو میں ابھی تمہارے پاس پہنچ جاتا ہوں۔''

''میں پہلے اس بندے سے مل لوں، پھر تمہیں فون کرتا ہوں۔''

''باقرے! جو غلطی تم کر چکے ہو، اس کا کفارہ اسی طرح ہوگا کہ اب کچھ کر کے دکھاؤ۔''

میں نے اس کو تحریک دی۔

ٹھیک ایک گھنٹے بعد باقر کی طرف سے اطلاع آ گئی۔ لیکن یہ اطلاع باقر کی طرف سے نہیں، کسی اور کی طرف سے تھی، اور اس میں باقر کی موت کی اطلاع دی گئی تھی۔ کچھ ہی دیر پہلے اس کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا تھا۔ یہ اطلاع فیض محمد کے ذریعے ہی مجھ تک پہنچی۔ فیض محمد کی باتوں سے پتا چلا کہ باقر اپنے اور یونس کے مشترکہ دوست کے ساتھ شاید یونس تک پہنچ گیا تھا مگر یونس نے اسے مار ڈالا ہے اور اس کے دوست کا ''ریپ'' کر دیا ہے۔ یہ دوست دراصل ایک لڑکی تھی۔ باقر نے مجھ سے ڈھکے چھپے انداز میں بات کی تھی۔ باقر اس نرگس نامی لڑکی کے ساتھ یونس تک پہنچا تھا۔ یونس نے اس کے سینے پر پے در پے خنجر کے کئی وار کیے تھے اور موقع پر ہی ختم کر دیا تھا۔ اس نے نرگس کو ریپ کیا تھا اور ادھ موا چھوڑ کر غائب ہو گیا تھا۔

یہ خبر اپنے ساتھ شدید حیرت اور سنسنی لے کر آئی تھی۔ باقر نے فقط ایک گھنٹہ پہلے مجھ سے بات کی تھی۔ وہ اپنی غلطی کے سبب سردار سجاول سے ڈرا ہوا تھا لیکن اسے پتا نہیں تھا کہ موت کسی اور شکل میں اس کے بالکل قریب پہنچ چکی ہے۔ اسپتال میں نیم بے ہوش لڑکی نے جو بیان دیا تھا اس کے بعد اس امر میں شبہے کی گوئی گنجائش نہیں رہ گئی تھی کہ یونس پمپ والا اب اسی خوفناک ''ٹرانس'' میں ہے جس میں اس سے پہلے انیق تھا۔ مخصوص دواؤں اور غیر معمولی تحیجشن کے زیر اثر وہ ہاناوانی کے خطرناک ہرکارے کا روپ دھار چکا تھا۔

میں نے فیض محمد سے پوچھا۔ ''لڑکی نے اور کیا کہا ہے؟''

فیض بولا۔ ''اس نے بتایا ہے کہ یونس بالکل دیوانہ لگ رہا تھا۔ اس نے زیادتی کی اور پھر اسے دھکا دے کر تیسری منزل کی کھڑکی سے نیچے پھینک دیا...... بے چاری کو بہت سخت چوٹیں آئی تھیں۔

میں نے صدمے کی کیفیت میں فیض محمد کی یہ بات سنی...... یہ کیا وحشت تھی جو انسان نہیں رہنے دیتی تھی۔

گہری سانس لے کر میں نے موضوع بدلا۔ ''سجاول اب کہاں ہے؟''

''سردار ابھی تھوڑی دیر پہلے پھر گاڑی پر کہیں نکلا ہے، ویسے میرا خیال ہے کہ ابھی تک اسے باقر والی خبر نہیں ملی ہے۔''

''اسے ابھی یہ خبر دینا بھی نہیں، وہ پہلے ہی بہت ڈسٹرب ہے۔ میں آدھے گھنٹے میں خود وہاں پہنچ رہا ہوں۔''

باقر کا سفاکانہ قتل اور لڑکی کا ''ریپ'' بڑے تشویش ناک واقعات تھے۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ خورسنہ اور اس کے بچے کے ساتھ بھی برے سے برا ہوسکتا ہے۔ حالات نہایت تیزی سے بگڑ رہے تھے۔ وہ عورت ایک آفت کی طرح یہاں آئی تھی اور نہایت سنگین وار کررہی تھی۔ اس کی وحشت اور نفرت کا اندازہ اس بات سے ہوتا تھا کہ اس نے میری ''قبر'' کے کتبے تک کے پرخچے اُڑا دیئے تھے۔ اگر میرا چچا زاد ولید یا چچا حفیظ اس کے ہتھے چڑھ جاتے تو نہ جانے ان کا کیا حشر ہوتا۔

میرا دھیان ایک بار پھر رضوان، پہلوان حشمت اور تاجور وغیرہ کی طرف جانے لگا۔ ہاناوانی میرے اور تاجور کے ''گہرے تعلق'' کو اچھی طرح جانتی تھی۔ میرے حوالے سے اس کی بے پایاں نفرت تاجور پر بھی حملہ آور ہوسکتی تھی۔ بہرحال تاجور کے حوالے سے مجھے کچھ تسلی بھی تھی۔ وہ اسلام آباد کے ایک ہائی سکیورٹی علاقے میں اونچی دیواروں والے ایک محل نما گھر میں تھی۔ وہاں تک رسائی آسان نہیں تھی۔

میں فخر کے ساتھ سجاول کی رہائش گاہ تک پہنچا تو رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ سجاول ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ میں نے اس سے ٹیلی فونک رابطہ کیا۔ بیل جاتی رہی مگر کال اٹینڈ نہیں ہوئی۔ اس کے بعد سجاول کا فون ہی بند ہوگیا۔ وہ پتا نہیں، کیا کرتا پھر رہا تھا۔ فخر نے کہا۔ ''شاہ زیب! تمہاری بات میں وزن ہے، اب مجھے بھی یہی لگ رہا ہے کہ سجاول کوئی بات چھپا رہا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ خورسنہ اور ذیشان کو اغوا کرنے والوں نے سجاول سے کوئی رابطہ کیا ہو۔''

''بالکل ہوسکتا ہے۔ ممکن ہے کہ اسے باور کرایا گیا ہو کہ وہ کسی دوسرے کو اس معاملے میں ''انوالو'' نہیں کرے گا۔ ورنہ خورسنہ اور بچے سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں وہ ظاہر نہیں کرتا مگر خورسنہ سے بہت محبت کرتا ہے۔ اس کی جان اور عزت کے لیے چھوٹے سے چھوٹا خطرہ مول نہیں لے گا۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ...... وہ خود کو ہاناوانی کے حوالے کرنے کے بارے میں سوچ سکتا ہے؟''

''یقیناً سوچ سکتا ہے یا پھر تن تنہا کوئی ایسی کارروائی کرسکتا ہے جو اسے اور خورسنہ کو شدید خطرے میں ڈال دے۔''

''تو پھر کیا کرنا چاہیے؟''

''فی الحال تو اس سے رابطہ ہونا چاہیے یا اسے یہاں واپس آنا چاہیے۔''

''کہیں ایسا تو نہیں شاہ زیب کہ اسے باقر کی موت کی خبر مل گئی ہو اور مزید ڈسٹرب ہو گیا ہو۔ ایسی حالت میں اس سے کوئی بڑی غلطی ہو سکتی ہے۔''

میں نے ذرا توقف سے کہا۔ ''وہ ایک بڑے ڈکیت گینگ کا سردار ہے فخری! دنیا کا بہت سرد گرم دیکھا ہوا ہے اس نے...... کسی فاش حماقت کی توقع تو اس سے نہیں کی جا سکتی مگر اس کا شدید غصہ ضرور ایک تشویش ناک بات ہے۔''

ہم رات آخری پہر تک سجاول کے فون یا اس کی آمد کا انتظار کرتے رہے مگر یہ دونوں کام نہیں ہو سکے۔ سجاول کے حوالے سے اب ہماری پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔

○......❖......○

سجاول کے جس فون کا انتظار تھا، وہ اگلے روز صبح دس بجے کے لگ بھگ آیا اور میرے ہی نمبر پر آیا۔ پتا نہیں کہ وہ کہاں سے بول رہا تھا اس نے بڑی عجلت میں اور فیصلہ کن لہجے میں مجھ سے بس ایک بات کہی۔ وہ بولا۔ ''شاہ زیب! میں بالکل خیریت سے ہوں لیکن فی الحال بار بار تم سے رابطہ نہیں کر سکتا۔ میں اس مسئلے کو اپنے طور پر حل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، اور لگتا ہے کہ میں کر لوں گا۔''

''خورسنہ اور بچے کا کچھ پتا چلا؟''

''سمجھو کہ چل گیا ہے۔ وہ اب تک خیریت سے ہیں لیکن میں اس بارے میں تمہیں زیادہ بتا نہیں سکتا۔ تم لوگ تسلی سے رہو۔ فی الحال مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ہوئی تو بتا دوں گا۔'' اس کے لہجے کی تہ میں پریشانی اور عجلت صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔

میں نے کہا۔ ''سجاول، ایک طرف مجھے دوست بھی کہتے ہو اور دوسری طرف......''

''دیکھو شاہی، یہ ان باتوں کا وقت نہیں۔'' سجاول نے تیزی سے میری بات کاٹی۔

''میں اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ اس وقت میرے بیوی بچے کے لیے کیا زیادہ بہتر ہے۔ اب ہو سکتا ہے کہ ایک دو دن کے لیے تمہیں میرا یہ نمبر بند ملے۔ میرے پاس زیادہ ٹائم نہیں اس لیے پھر بات کریں گے۔'' اس کے ساتھ ہی سجاول نے کال ختم کر دی۔

میں اور فخر، سجاول کی اس ہنگامی کال پر غور کرنے لگے۔ وہ اپنی طرز کا انوکھا بندہ تھا۔ اس کو اس کی مرضی کے خلاف کسی کام پر آمادہ کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ وہ ایک پیدائشی جنگجو تھا۔ کسی قدیم لڑاکا قبیلے کا خون اس کی رگوں میں دوڑتا تھا اور اس خون کی یورش اب اسے نہ جانے کس سمت بہا کر لے جا رہی تھی۔

فخر نے کہا۔ ''کہیں ایسا تو نہیں کہ سجاول نے خود کو ہاناوانی کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر

لیا ہو؟"

"اس اسٹیج پر کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ اگر ایسا ہو گیا تو پھر وہ ضرور اسے اپنے ٹرانس میں جکڑے گی اور خطرناک طریقے سے استعمال کرے گی۔ عین ممکن ہے کہ وہ سجاول کو قسطینا، فارس اور زینب ابراہیم وغیرہ کے خلاف استعمال کرنے کا ارادہ رکھتی ہو۔ وہ ایک جنونی عورت ہے۔ جاماجی میں سجاول نے اس کے بیٹے کا گلا اپنے ہاتھوں سے کاٹا تھا۔ اب یہ اس عورت کے لیے بڑی خوشی کی بات ہوگی کہ سجاول اپنے ہاتھوں سے اپنے ساتھیوں کی جان لے، لیکن...... ابھی ہم یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ عین ممکن ہے کہ سجاول کے ذہن میں کوئی پلان ہو، وہ جس پر اکیلے عمل کرنا چاہ رہا ہو۔"

فخر نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "چلو، اتنی تسلی تو ہوئی کہ خورسنہ اور بچہ ابھی تک کسی نقصان سے محفوظ ہیں۔"

"یونس کے بارے میں میری تشویش بڑھ گئی ہے۔" میں نے کہا۔ "سوچنے والی بات ہے کہ اگر انیق جیسا مضبوط نوجوان، ہاناوانی کے جال میں اس بری طرح جکڑا جا سکتا ہے تو یونس کا کیا حال ہوگا۔ وہ تو اس سے کوئی بھی کام لے سکتی ہے۔ مجھے زیادہ خطرہ، ڈاکٹر کرنل احرار، رضوان، پہلوان حشمت اور تاجور وغیرہ کی طرف سے ہے۔ ہاناوانی انہیں میرے قریبی ساتھیوں کی حیثیت سے جانتی ہے۔ ان سب کو اس خطرے کا احساس ہونا چاہیے۔"

"یہ احساس ہمارے سوا اور کون دلائے گا؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ سب سے پہلے میں نے پہلوان حشمت راہی سے رابطہ کیا۔ وہ ابھی تک راولپنڈی میں قیام پذیر تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ فوراً سے پہلے میرے پاس لالہ موسیٰ پہنچ جائے۔ میں نے اسے یونس کے بارے میں بھی خبردار کیا۔ اس کے بعد میں نے طویل فاصلے کی اوورسیز کال کی اور جاماجی میں قسطینا یا ابراہیم سے رابطہ کرنا چاہا۔ تاہم یہ کوشش کامیاب نہیں ہو سکی۔ میں نے کرنل احرار سے رابطہ کیا۔ وہ اس وقت انڈیا میں تھے۔ میں نے انہیں مختصر الفاظ میں ساری صورتِ حال بتائی اور محتاط رہنے کا کہا۔ میں نے ان سے یہ درخواست بھی کی کہ وہ اپنے طور پر جاماجی میں قسطینا اور ابراہیم وغیرہ سے رابطہ کریں اور انہیں بتائیں کہ ہاناوانی اپنے بدقماش بیٹے رائے زل کے انتقام کے لیے کمربستہ ہے اور جنونی ہو رہی ہے۔

میری ہدایت کے مطابق پہلوان حشمت شام تک لالہ موسیٰ کے اس ہوٹل میں پہنچ گیا جہاں ہم ٹھہرے ہوئے تھے۔ انیق کی موت کا غم اس کے ہمیشہ مسکراتے چہرے کو مستقل طور پر

ڈھانپے ہوئے تھا۔ وہ اس پوٹلی کو اپنے ساتھ ساتھ لیے پھر رہا تھا جس میں تاجور کے زیورات تھے۔ پہلوان کو بھی یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ یہ وہی جیولری ہے جو میں نے تاجور کے لیے خریدی تھی۔ اس نے صاف لفظوں میں مجھ سے کہہ دیا تھا کہ وہ ان زیورات کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔ یہ تاجور بیٹی کے ہیں۔ وہی ان کو پہنے گی، چاہے کسی بھی شکل میں پہنے۔ اس نے انہیں بیچنے سے بھی انکار کر دیا تھا۔

اسی رات دس بجے کے لگ بھگ مجھے رضوان کا ایک فون آیا اور اس نے مجھے بری طرح چونکا دیا۔ یوں لگا کہ ہمارا ہر بدترین خدشہ حقیقت کا روپ دھار رہا ہے۔ رضوان نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔ ''شاہ زیب بھائی! مجھے لگتا ہے کہ یونس یہاں آس پاس موجود ہے۔''

''کیا کہہ رہے ہو؟'' میں نے ڈانٹنے والے انداز میں کہا۔

وہ بولا۔ ''مسجد میں عشا کی نماز کے بعد آج مولانا حبیب اللہ کا درس تھا۔ کافی لوگ آئے ہوئے تھے۔ مسجد کے سامنے سڑک پر دونوں طرف کافی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ میں نے مسجد کی اوپری منزل سے جہلم کی نمبر پلیٹ والی ایک گاڑی دیکھی۔ میں ایک دفعہ پہلے بھی یونس کو اس گاڑی میں دیکھ چکا ہوں۔ میرا چونکنا لازمی تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ گاڑی کے قریب ہی مجھے یونس بھی نظر آیا۔ فاصلہ کافی تھا۔ سڑک پر زیادہ روشنی بھی نہیں تھی مگر مجھے نوے فیصد یقین تھا کہ وہ یونس ہی ہے، میں مسجد کی چھت پر گیا۔ وہاں سے اپنا پستول لیا اور سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا۔ تب تک وہ گاڑی ریورس ہو کر بڑی سڑک کی طرف نکل گئی۔''

''گاڑی کا نمبر کچھ یاد ہے تمہیں؟''

''جہلم کا نمبر تھا۔ پہلے دو ہندسے تین اور سات تھے......''

میرے جسم میں کرنٹ سا دوڑ گیا۔ یہ وہی 86 ماڈل ٹویوٹا تھی جو لالہ موسیٰ کے قریب یونس کے پیٹرول پمپ پر کھڑی رہتی تھی۔ یعنی اب اس نے سفید سوزوکی چھوڑ دی تھی۔

میں نے کہا۔ ''رضوان! ایک دم چوکس ہو جاؤ۔ یہ وہی تھا۔ یہ اسی کی گاڑی تھی وہ بے حد خطرناک ہے۔ وہ قریباً چوبیس گھنٹے پہلے یہاں جہلم میں باقر چھوٹے کو بے دردی سے قتل کر چکا ہے اور اس کی دوست لڑکی کو خراب کر کے، تیسری منزل سے دھکا دے چکا ہے۔ وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ انیق کی طرح وہ بھی اپنے ہوش حواس میں نہیں ہے۔''

باقر کی موت کی خبر سن کر رضوان کو دھچکا لگا۔ تاہم وہ باہمت لہجے میں بولا۔ ''آپ بے فکر رہیں جی۔ میں اپنی حفاظت کر لوں گا لیکن...... مجھے یہ پتا نہیں کہ اگر یونس سے آنا سامنا

ہو گیا تو مجھے کس حد تک جانا ہے۔ میرا مطلب ہے اگر فائر وغیرہ کی نوبت آ گئی تو؟''

''اگر کوئی زیادہ بری سچویشن ہو جائے تو اس کی ٹانگوں پر گولی مار سکتے ہو۔ یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ انیق کی طرح وہ بھی شکاری نہیں، شکار ہے۔ ویسے مجھے امید ہے کہ تم چوکس رہو گے تو یہاں تک شاید نوبت نہ پہنچے۔ خود کو مسجد کے اندر ہی رکھو اور اردگرد کے افراد سے باخبر رہو۔''

میں نے رضوان کو کچھ ضروری ہدایات دیں اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ ہم ابھی لالہ موسیٰ سے روانہ ہو کر اس کے پاس لاہور پہنچ رہے ہیں۔

○......❖......○

ہم صبح چھ بجے کے قریب لاہور میں تھے۔ گوٹھ موراناں کے زمیندار نے جو کار ہمیں استعمال کے لیے دی تھی، وہ ابھی ہمارے پاس ہی تھی، وہ دریا دل بندہ تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ہم جب تک چاہیں گاڑی استعمال کر سکتے ہیں۔ فخر اور پہلوان حشمت بھی میرے ساتھ ہی لاہور آئے تھے۔ پہلوان حشمت کی حیثیت مولانا حبیب کے مرید کی سی تھی۔ وہ دارابیوں کی خصلت کو جانتا تھا، اس لیے مولانا کی خیریت کے حوالے سے ہر وقت فکرمند رہتا تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ مولانا کی حفاظت کے لیے ایک لمحے میں اپنی جان ہتھیلی پر رکھ سکتا ہے۔

مولانا حبیب اللہ صبح کی نماز اور دیگر اعمال کے بعد کچھ دیر کے لیے سو جاتے تھے۔ وہ اس وقت بھی آرام فرما رہے تھے۔ ہم نے رضوان سے دس پندرہ منٹ کی ملاقات کی اور پھر مسجد کے قریب ہی واقع بازار کے ایک ہوٹل میں چلے گئے۔ اس چھوٹے سے ہوٹل میں، میں ایک دفعہ پہلے بھی قیام کر چکا تھا۔ دوسری منزل سے مسجد کے سامنے چوراہا اور مسجد کے برآمدے وغیرہ دکھائی دیتے تھے۔ ہم نے تین بیڈ کا ایک ہی کمرا لے لیا۔

پہلوان حشمت اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ ''اگر وہ ایک بار یہاں آیا ہے تو دوبارہ بھی آوے گا اور زیادہ چانس اس بات کا ہے کہ رات کو آوے گا۔ شروع رات میں مجھے ویسے بھی آج کل کم نیند آوت ہے۔ اگر تم کہو تو میں یہاں گیلری میں بیٹھ کر مسجد کے دروازے پر نظر رکھ لوں گا۔''

''لیکن اگر ہم یونس کو پکڑ بھی لیں تو وہ ہمیں ہاناوانی تک پہنچا سکے گا؟'' فخر نے سوال اٹھایا۔

میں نے کہا۔ ''تم جمع خاطر رکھو۔ اول تو اسے پکڑنا اتنا آسان نہیں ہو گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ہمارے ہاتھ آنے کے بجائے خود ہی اپنی جان لینا بہتر سمجھے، لیکن اگر وہ ہماری

گرفت میں آ گیا تو کم از کم یہ تو ہو گا کہ فوری طور پر رضوان کے لیے خطرہ ٹل جائے گا۔ دوسرے یہ بھی ممکن ہے کہ وہ دو چار دن میں ہمارے لیے فائدہ مند ثابت ہو جائے۔''

''کیا مطلب؟'' پہلوان نے پوچھا۔

''جو دوائیں اس پر استعمال کی گئی ہوں گی، ان کا اثر کمزور پڑ جائے گا پھر ہاناوانی کی انجیکشن بھی جب ''ری نیو'' نہیں ہو گی تو وہ ٹرانس سے باہر نکلنا شروع ہو جائے گا۔ یوں اس کی اپنی جان بھی بچ جائے گی اور ہو سکتا ہے کہ وہ ہمیں ہاناوانی کا کوئی سراغ بھی دے سکے۔''

ہوٹل میں رہتے ہوئے، رات تک ہم نے بھی مسجد اور اس کے اردگرد کڑی نظر رکھی۔ کوئی مشکوک شخص یا گاڑی وغیرہ نوٹ نہیں ہوئی۔ سجاول کی اطلاع کے مطابق اس کا فون مسلسل بند جا رہا تھا۔ بس ایک بار فیض محمد سے رابطہ ہوا، اس نے بھی یہی اطلاع دی کہ سردار کا ابھی کچھ پتا نہیں، اس کا کہنا ہے کہ جب ضرورت ہو گی وہ خود ہی ساتھیوں سے رابطہ کرے گا۔ فیض محمد اپنے ساتھی باقر کی موت پر ملول تھا۔ اس نے ایک اور بری خبر دی اور وہ یہ کہ جس گجراتی لڑکی کو یونس نے تیسری منزل سے دھکا دیا تھا، وہ اسپتال میں دم توڑ گئی ہے۔

ہاناوانی ایک ناگن کی طرح لوگوں کو ڈس رہی تھی اور انہی بستیوں، انہی گلی کوچوں میں کہیں موجود تھی۔ اس کے ہاتھ بہت لمبے تھے مگر اس نے خود سے عہد کر رکھا تھا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے اپنے دشمنوں کی جان نہیں لے گی، وہ ہمارے ہی ذریعے ہمیں مارنا چاہتی تھی۔

اس رات کوئی خاص واقعہ نہیں ہوا۔ سوائے اس کے کہ مولانا حبیب اللہ سے میری مختصر ملاقات ہوئی۔ انہوں نے میرے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا اور میرے سکونِ قلب کے لیے دعا کی۔ انہوں نے مجھے یہ مشورہ بھی دیا کہ ہجر و فراق میں رہنے کے بجائے میں کوئی اچھی، نیک لڑکی دیکھ کر نکاح کر لوں، انہیں کیا معلوم تھا کہ جس نے مجھے ہجر و فراق میں مبتلا کیا ہے، وہ ان کا اپنا خون ہے، ان کی بھانجی ہے۔ غیب کا علم اللہ کے سوا اور کس کو ہے۔ بزرگ و عالی مقام مولانا حبیب اللہ کو بھی نہیں تھا۔

یہ اگلی رات کا واقعہ ہے۔ یہ نو ساڑھے نو کا وقت تھا۔ پہلوان حشمت اپنی کوئی دوا لینے کے لیے قریبی میڈیکل اسٹور پر گیا تھا۔ وہ ہانپتا کانپتا ہوا واپس آیا۔ اس نے بتایا کہ اس نے ابھی یونس والی گاڑی مسجد کی عقبی سڑک پر دیکھی ہے۔ لگتا ہے کہ وہ آس پاس موجود ہے۔

''آپ کو یقین ہے کہ یہ وہی گاڑی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''ایک سو ایک فیصد۔ کلیجی رنگ کی یہ کار میں نے خود بھی دیکھی ہوئی ہے۔ اب تو میں نے نمبر بھی پڑھا ہے۔ میں ٹھیک سے شکل نہیں دیکھ سکا ہوں لیکن میں جانتا ہوں یہ یونس ہی

تھا۔ وہ گول چکر سے ہو کر مارکیٹ کی طرف نکل گیا ہے۔"

پہلوان کی اطلاع کو نظر انداز کرنا کسی طور ممکن نہیں تھا۔ میں فوراً ہوٹل سے نکلا اور مسجد میں رضوان کے پاس پہنچ گیا۔ آنے سے پہلے میں نے فخر اور پہلوان سے کہہ دیا تھا کہ وہ ہوٹل میں ہی رہیں لیکن بالکونی سے اردگرد پر پوری نظر رکھیں۔

میں مسجد کے صحن سے گزر کر اس پورشن میں پہنچا جہاں مولانا کا حجرہ تھا اور حجرے کے ساتھ وہ دو تین کمرے تھے جن میں دینی کتابیں رکھی تھیں اور کوئی خاص مہمان آجاتا تو اس کی رہائش کا انتظام بھی تھا۔ ابھی کچھ لوگ مولانا سے ملاقات کر کے گئے تھے۔ رضوان ایک خادم کی حیثیت سے مصروف تھا۔ چائے کے برتن وغیرہ حجرے سے لے کر نکل رہا تھا، مجھے دیکھ کر ٹھٹکا۔ "کیا ہوا شاہ زیب صاحب! خیریت تو ہے؟"

"ہے بھی اور نہیں بھی۔ مولانا کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ڈی جی خاں سے کچھ مہمان آئے ہوئے تھے، ان کے ساتھ پاس والی مسجد میں گئے ہیں لیکن...... آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں۔"

"برتن رکھ کر آؤ، پھر بتاتا ہوں۔"

وہ دو منٹ میں واپس آگیا۔ میں اور وہ ایک برآمدے میں ستون کے ساتھ بیٹھ گئے۔ ابھی اِکا دُکا نمازی مسجد کے صحن میں دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے کہا۔ "رضوان مجھے لگتا ہے کہ تم اتنی احتیاط نہیں کر رہے، جتنی کرنی چاہیے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تم موٹر بائیک پر کہیں سے آئے ہو۔"

"ان مہمانوں کے لیے چائے کا سامان لینے گیا تھا۔"

"پستول کہاں ہے تمہارا؟"

اس نے نیفے کے اوپر سے اپنی قمیص کو چھوا اور بتایا کہ پستول اس کے پاس ہے۔

میں نے کہا۔ "یونس تمہارے آس پاس ہے۔ وہ کسی بھی وقت تمہارے سامنے آسکتا ہے۔ کسی نمازی کے بھیس میں منہ سر لپیٹ کر اندر داخل ہو سکتا ہے یا پھر اردگرد کی کسی سڑک پر تمہیں نشانہ بنا سکتا ہے۔"

"میں بھی اب تر نوالہ نہیں ہوں جناب۔" وہ اپنی چھوٹی چھوٹی ہموار داڑھی پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ "بلکہ میں تو چاہتا ہوں کہ وہ کہیں نظر آئے اور ہم اسے پکڑ سکیں۔"

"لیکن ہم اس کو ایزی نہیں لے سکتے رضوان۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ اکیلا ہو۔ اس کے اردگرد دہاناوانی کے کارندے بھی موجود ہو سکتے ہیں۔ ہمیں ہر قدم احتیاط سے اٹھانا ہوگا

پوری طرح الرٹ ہو جاؤ، آج کی رات اہم ہے۔''

ہم تھوڑی دیر تک اس حوالے سے گفتگو کرتے رہے۔ اچانک رضوان ایک طرف دیکھ کر چونکا۔ کوئی بغلی دروازے سے اندر آیا تھا اور مسجد کے رہائشی حصے کی طرف بڑھا تھا۔ رضوان کے چہرے کا رنگ بدلا اور پھر میرا بھی بدل گیا۔ یہ ایک برقع پوش لڑکی تھی جس کا گہرا براؤن شولڈر بیگ اس کے سیاہ برقع کا ہم رنگ ہی محسوس ہوتا تھا۔ میرا دل پکار کر بولا کہ یہ کوئی اور نہیں تاجور ہے۔ میرے پورے جسم میں سنسنی کی لہریں دوڑ گئیں۔ تاجور اسی طرح ایک دفعہ پہلے بھی نہایت خاموشی سے یہاں آئی تھی اور اپنے ماموں مولانا حبیب سے ملاقات کر چکی تھی۔ (اس وقت برقع کا رنگ اور اس کی تراش مختلف تھی)

میرے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں یہاں رضوان سے گفتگو کرتے ہوئے اسے یوں اپنے سامنے دیکھ لوں گا۔ وہ تو اسلام آباد میں اپنے سسرال میں تھی (دارج داراب چند دن پہلے اسے زبردستی میکے سے اپنے ساتھ لے گیا تھا) میں نے سوالیہ نظروں سے رضوان کی طرف دیکھا، وہ بھی حیرت کے شدید ریلے میں تھا۔ سرسراتی آواز میں بولا۔ ''یہ تاجور صاحبہ ہی لگتی ہیں۔''

مجھے رضوان کی تصدیق کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ سرتاپا برقع میں تھی مگر اس کے شانوں کی بناوٹ...... اس کی قامت اس کی چال سب کچھ گواہی دے رہا تھا کہ وہ تاجور ہی ہے۔ اس کے ساتھ میرا کچھ ایسا ناتا تھا کہ ہزاروں کے ہجوم میں اس کے سراپا کی ایک جھلک دیکھ کر میں اسے پہچان سکتا تھا کہ یہ تاجور ہے۔

رضوان نے سرگوشی کی۔ ''مجھے لگتا ہے جی، کہ یہ آج پھر مولانا سے ملنے آئی ہیں۔''

''ٹھیک ہے...... تم انہیں بٹھاؤ اور بتاؤ کہ مولانا ابھی تھوڑی دیر میں آجاتے ہیں۔''

رضوان، حجرے کی جانب چلا گیا۔ میں وہیں برآمدے میں بیٹھا اپنی سرپٹ دھڑکنوں کو سنبھالنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ ایک خطرناک وقت میں ایک خطرناک جگہ پر آگئی تھی۔ یہ بات اب ظاہر تھی کہ ہاناوانی کچھ لوگوں کو بے دردی سے قتل کرنے کا پلان بنا چکی ہے...... اور یہ عین ممکن تھا کہ اس کی ہٹ لسٹ میں تاجور بھی شامل ہو۔ میری بے چینی ایک دم عروج پر پہنچ گئی۔ اس سے پہلے میں تاجور کے بارے میں بہت زیادہ فکرمند نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ دارج داراب کی اونچی چار دیواری میں محفوظ ہے۔ اس کے اردگرد ہر وقت مسلح محافظ ہوتے ہیں لیکن آج وہ جس طرح اچانک یہاں نظر آئی تھی، میرے سارے اندیشے توانا ہو کر سانپوں کی طرح پھنکارنے لگے تھے۔

چند منٹ بعد رضوان نے واپس آ کر بتایا کہ وہ تاجور کو مولانا کے کمرے میں بٹھا آیا ہے۔"وہ کیا کہہ رہی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"پوچھ رہی تھیں کہ مولانا کتنی دیر میں آ جائیں گے۔ میں نے کہا، زیادہ دور تو نہیں گئے۔ کچھ مہمان تھے ان کو دوسری مسجد میں چھوڑنے گئے ہیں، آدھ پون گھنٹے تک آ جائیں گے۔ کہہ رہی تھیں کہ میں مولانا کو فون کر کے پوچھ لوں۔ میں نے انہیں بتایا ہے کہ مولانا فون یہیں پر بھول گئے ہیں۔"

تاجور، رضوان کو اچھی طرح جانتی تھی، وہ بھی تاجور کو جانتا پہچانتا تھا لیکن وہ جس طرح برقع میں لپٹی لپٹائی یہاں آئی تھی۔ اگر میں نے اسے پچھلی دفعہ بتایا نہ ہوتا کہ یہ تاجور ہے تو اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہو پاتی۔

مسجد میں اب بھی اِکا دُکا لوگ آ جا رہے تھے۔ مین دروازے کے سامنے دو تین بھکارنیں بھی موجود تھیں۔ میں نے رضوان سے کہا کہ وہ درمیان والا دروازہ بند کر دے۔ یہ درمیان والا دروازہ ایک جنگلے کی صورت میں تھا اور مسجد کو رہائشی پورشن اور حجرے سے علیحدہ کرتا تھا۔ رضوان نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ میرے ذہن میں آندھی سی چل رہی تھی۔ میں اٹھا اور رضوان کے ساتھ سیدھا، مولانا کے حجرے پر پہنچ گیا۔ رضوان باہر ہی کھڑا رہا، میں دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ وہ سکڑی سمٹی ہوئی سی قالین پر بیٹھی تھی اور دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ میں ننگے پاؤں چلتا اس کے سامنے پہنچا۔ نقاب میں سے فقط اس کی آنکھیں ہی نظر آتی تھیں۔ وہی دلنشیں آنکھیں جن کی دلکشی سیدھی دل میں اترتی تھی اور جسم و جاں کو جکڑ لیتی تھی لیکن فی الوقت ان آنکھوں میں صرف ہراس نظر آ رہا تھا۔ یہ ہراس اس لیے تھا کہ میں ایک بار پھر بالکل غیر متوقع طور پر اس کے سامنے موجود تھا۔ اس نے بے ساختہ اپنے نقاب کو تھوڑا سا مزید اوپر چڑھایا اور کچھ مزید سمٹ گئی۔

میں نے بغیر کسی تمہید کے کہا۔"تم سات پردوں میں بھی چھپو تاجور لیکن میری نگاہوں سے چھپ نہیں سکتی ہو۔ تم جانتی نہیں ہو کہ تم بغیر کسی سکیورٹی کے یہاں آ کر کتنی بڑی بے وقوفی کر رہی ہو۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس ڈبڈبائی آنکھوں سے میری جانب دیکھتی رہی۔

"یہاں بہت خطرہ ہے۔ چلو اٹھو...... آؤ میرے ساتھ میں تمہیں بتاتا ہوں۔" میں نے کہا۔

وہ اپنی جگہ ساکت بیٹھی رہی۔ پتا نہیں کہ میرے اندر اتنی جرأت کہاں سے آئی کہ میں

نے اسے کلائی سے پکڑا اور اٹھا کر ساتھ والے کمرے میں لے آیا۔ یہ وہی کمرا تھا جس میں دیوار گیر الماریوں کے اندر کتابیں چنی ہوئی تھیں۔ یہاں ایک دفعہ پہلے بھی میری اور تاجور کی ملاقات ہو چکی تھی۔

میں نے اسے صاف ستھری چٹائی پر بیٹھنے کے لیے کہا اور خود بھی اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ میرا چھونا اسے بہت ناگوار گزرا تھا مگر وہ منہ سے کچھ بولی نہیں تھی جو ہاتھ میں نے پکڑا تھا وہ اس نے اپنے سیاہ برقع کے اندر چھپا لیا تھا جیسے اس ہاتھ کو اور اس کلائی کو مجھ سے بہت دور کر دینا چاہتی ہو۔

میں نے کہا۔ ''دیکھو تم برقع کا اسٹائل اور رنگ وغیرہ بدل کر آئی ہو لیکن اس کے باوجود تمہیں پہچاننا مشکل ثابت نہیں ہوا۔ تم جانتی نہیں ہو کہ تمہارے اردگرد حالات کتنے خراب ہیں اور یقیناً مولانا کو بھی اس کی خبر نہیں ہے...... تمہیں انیق کے بارے میں پتا چلا ہے یا نہیں؟''

اس کا سر بے ساختہ جھک گیا اور آنکھوں سے دو موتی جھڑ کر برقع میں جذب ہو گئے۔

وہ اشکبار آواز میں بولی۔ ''مجھے اتنا پتا چلا ہے کہ وہ قبائلی علاقے میں تھا، وہاں سجاول اور اس کے درمیان لڑائی ہوئی......''

''کیوں لڑائی ہوئی؟ یہ پتا نہیں؟''

''ان میں جھگڑا چل رہا تھا۔ انیق نے شاید سجاول کی کسی رشتے دار کو مار دیا تھا......''

''نہ صرف رشتے دار کو مار دیا تھا بلکہ اس کی بھتیجی کو سرعام رسوا کرنے کی کوشش کی تھی اور یہ سب وہی سلسلہ ہے تاجور جو میں تمہیں پہلے بھی تفصیل سے بتا چکا ہوں۔ انیق اپنے حواس میں نہیں تھا۔ وہ جو کچھ کر رہا تھا کسی اور کے کہنے پر کر رہا تھا۔ وہ ہر وقت تیز نشیلی دواؤں کے اثر میں بھی ہوتا تھا۔ اس نے راولپنڈی میں میرے بارے میں بھی تم سے جو کچھ کہا وہ اسی اثر میں کہا۔ اس بدبخت عورت کی وجہ سے سیف کے بارے میں تم سے جھوٹ بولا، مجھے اس کا قاتل بنایا، اور تمہیں مجھ سے دور کیا۔ اب تو سب کچھ تمہاری سمجھ میں آ جانا چاہیے۔''

وہ سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی پھر بہت دھیمی آواز میں بولی۔ ''جو کچھ ہونا تھا، وہ ہو چکا۔ اب ان باتوں سے کوئی فائدہ نہیں۔ پلیز...... آپ بھول جائیں ان باتوں کو۔''

''ہم ان باتوں کو بھول جائیں گے لیکن یہ ہمیں نہیں بھولیں گی۔ اب یہاں اس مسجد کی صورتِ حال ہی دیکھ لو۔ یہ خطرناک کیوں ہو رہی ہے؟ اس لیے کہ پہلے جو حالت انیق کی تھی وہ اب سجاول کے ایک ساتھی کی ہے۔ یہ وہی یونس ہے...... یونس پمپ والا جس نے لالہ موسیٰ میں مجھے موٹر سائیکل دی تھی اور میں نے تمہیں تمہارے والد تک پہنچایا تھا۔ اب سجاول کا

وہ سب سے قریبی ساتھی اس کا دشمن بنا ہوا ہے۔ وہ خورسنہ اور اس کے بچے کو اغوا کر چکا ہے۔ سجاول کے ساتھیوں کو قتل کر رہا ہے...... میرے اندازے کے مطابق کئی لوگ اس کی ''ہٹ لسٹ'' پر ہیں۔ وہ یہاں مسجد کے آس پاس رضوان ٹی کی تاک میں گھوم رہا ہے...... کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا ہے...... بلکہ...... کسی وقت مجھے تمہاری طرف سے بھی خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔''

وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگی۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس کے ایک پاؤں پر سے برقع سرک گیا تھا۔ مہندی لگے سفید پاؤں میں چاندی کی پازیب نظر آ رہی تھی جس میں چھوٹے چھوٹے نہایت قیمتی نیلم لگے ہوئے تھے۔ پازیب کی خاص بات یہ تھی کہ اس کے ساتھ سجاوٹ کے طور پر دو ڈھائی انچ لمبی ایک نقرئی زنجیر بھی تھی۔ کہنے کو تو یہ آرائشی زنجیر پازیب کی ڈیزائننگ کا حصہ تھی، لیکن درحقیقت یہ علامت تھی اس غلامی اور محکومیت کی جو دارج جیسے لوگ کمزور عورت پر روا رکھتے ہیں۔ میں نے ملازمہ فردوس کی زبانی سنا تھا کہ دارج کی والدہ نے اپنی بہو (تاجور) کو قیمتی گہنوں سے لاد دیا ہے۔ شاید عمرانیات کے کچھ ماہر ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ ان بھاری بھرکم گہنوں کے ڈانڈے تاریخ کے اس دور سے جا ملتے ہیں جب عورتوں کو اپنے بس میں رکھنے کے لیے ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنائی جاتی تھیں۔

وہ مجھ سے نظریں چرا کر بولی۔ ''میں تو باہر نکلتی ہی نہیں ہوں۔ یہ ایک اتفاق ہے کہ لاہور آئی ہوئی تھی اس لیے چند منٹ کے لیے ماموں جان سے ملنے چلی آئی۔''

''لاہور کس سلسلے میں آئی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''ان کا علاج ہو رہا ہے۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔ ''ان'' سے تاجور کی مراد دارج داراب ہی تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتی، وہی ہوا جس کا اندیشہ ہم پچھلے 48 گھنٹے سے محسوس کر رہے تھے۔ مسجد کے عین سامنے چوراہے کی طرف سے اوپر تلے تین فائر سنائی دیئے۔ پھر مسجد کے گیٹ کی طرف سے بھی پمپ ایکشن کی آواز آئی۔ یہ فائر یقیناً گارڈ نے کیا تھا۔ میں نے قمیص کے نیچے سے اپنا بریٹا پسٹل نکال لیا...... لیکن میری سمجھ میں نہیں آیا کہ باہر جاؤں یہیں تاجور کے پاس رہوں۔ وہ بے طرح خوف زدہ ہو گئی تھی اور دونوں ہاتھ سینے پر رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

اسی اثنا میں مجھے چھت کی طرف سے رضوان کی مدھم آواز سنائی دی۔ وہ کسی کو للکار رہا تھا۔ پھر اوپر تلے چار پانچ گولیاں چلیں۔ اب اس میں شبہے کی گنجائش نہیں تھی کہ آس پاس

منڈلاتے یونس نے بالآخر رضوان کو نشانہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ مجھے اتنی تسلی ضرور تھی کہ فخر اور پہلوان حشمت بھی چوکس ہیں اور وہ رضوان کو تنہا نہیں چھوڑیں گے۔

فائرنگ ایک دم تھم گئی اور پھر سڑک کی طرف سے لوگوں اور راہ گیروں کا شور سنائی دینے لگا۔ میں رضوان کی طرف سے فکر مند تھا۔ یہ فکرمندی جلد ہی ختم ہو گئی۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے رضوان کی آواز پہچان کر دروازہ کھولا۔ اس کے چہرے پر ہیجانی کیفیت تھی۔ ہانپی آواز میں بولا۔ ''یہ یونس تھا...... مارا گیا ہے اس کا ایک ساتھی...... خود بھاگ گیا ہے۔''

''مرا کون ہے؟ اور مر ہی گیا ہے یا زخمی ہے؟''

''مر گیا ہے جی۔ بیکری کے سامنے لاش پڑی ہے۔ شکل سے میں نہیں جانتا۔ کوئی کرائے کا ٹٹو ہی لگتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اسے فخر صاحب نے ہوٹل کی بالکونی سے فائر مارا ہے، اور ٹھیک مارا ہے، نہیں تو اس نے نقصان کرنا تھا، مشین پسٹل تھا اس کے پاس۔''

باہر سے کوئی رضوان کو آوازیں دے رہا تھا۔ ''ابھی آتا ہوں۔'' اس نے کہا اور باہر کی طرف لپک گیا۔

میں نے سکڑی سمٹی تاجور کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''ٹھیک کہا تھا ناں میں نے۔ یہاں خطرہ ہی خطرہ تھا۔ تم نے غلطی کی یہاں آکر...... اب دیکھنا دو چار منٹ میں پولیس یہاں پہنچ جائے گی۔ مسجد کو بھی گھیر لیں گے وہ لوگ۔ پھر تمہارا یہ برقع تمہاری شناخت نہیں چھپا سکے گا۔''

وہ خوف زدہ ہو کر بولی۔ ''مجھے کسی طرح یہاں سے نکال دیں۔''

میں نے چند لمحے سوچا۔ پھر اپنا پستول دوبارہ قمیص کے نیچے لگایا اور بغلی دروازے سے گزار کر تاجور کو ساتھ والے کمرے میں لے آیا۔

یہاں ایک تنگ سی راہداری تھی جس کا اختتام مسجد سے باہر ایک بغلی گلی میں ہوتا تھا، یہ ایک چھوٹا سا بازار تھا۔ لوگوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ ٹولیوں کی شکل میں کھڑے خوف زدہ نظروں سے چوراہے کی جانب دیکھ رہے تھے۔ کسی نے ہم دونوں کی طرف خصوصی توجہ نہیں دی۔ ہم تیس چالیس قدم چل کر اس ہوٹل کی طرف گئے جہاں ہم ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہ گاڑی جو ہمارے زیر استعمال تھی، باہر ہی کھڑی تھی۔ اس کی چابی میری جیب میں تھی۔ گاڑی کھول کر اس کے اندر بیٹھنے میں ہمیں چند سیکنڈ ہی لگے۔ یہی وقت تھا جب پولیس موبائلز کے سائرن سنائی دینے لگے۔ میں نے دیکھا گاڑی سے پندرہ بیس قدم کی دوری پر پہلوان حشمت موجود تھا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا اور یوں لگتا تھا کہ وہ ابھی شور

مچاتا ہوا گاڑی کی طرف لپکے گا، لیکن پھر نیم تاریکی کے باوجود اس نے مجھے پہچان لیا اور اسے اطمینان ہو گیا کہ گاڑی چوری نہیں ہو رہی۔ تاہم اس کے چہرے پر شدید حیرت بدستور موجود رہی۔ یقیناً یہ حیرت برقع پوش تاجور کے حوالے سے تھی۔ میں نے گاڑی کو نوے کے زاویے پر موڑا اور تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا بڑی سڑک پر آ گیا۔

''ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' وہ لرزاں آواز میں بولی۔

''فی الحال تو یہاں سے دور جا رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''پلیز مجھے جلدی سے گھر پہنچا دیں۔ میں زیادہ دیر باہر نہیں رہ سکتی۔ اسپتال سے کسی بھی وقت خالہ جان کا فون آ سکتا ہے۔'' خالہ جان سے اس کی مراد اپنی ساس ہی تھی شاید وہ اپنے بیٹے کے پاس اسپتال میں تھی۔

تاجور سے چند باتیں کرنے کے لیے یہ موقع غنیمت تھا۔ میں نے ڈیڑھ دو کلومیٹر دور آ کر گاڑی ایک مارکیٹ کی نیم روشن پارکنگ میں گاڑیوں کے درمیان روک دی۔ وہ جیسے پہلے ہی جانتی تھی کہ میں راستے میں کہیں گاڑی روک دوں گا، اس لیے خاموش بیٹھی رہی۔ یہ وسیع وعریض پارکنگ کافی پُرسکون تھی۔ پارکنگ والا ہمیں ٹوکن تھما کر واپس چلا گیا۔ اس نے بے قراری سے اپنی بیش قیمت رسٹ واچ پر ایک نگاہ ڈالی اور بولی۔ ''دس بج گئے ہیں۔ بہت دیر ہو جائے گی، پلیز مجھے چھوڑ آئیں۔''

میں نے کہا۔ ''اپنے ماموں جان کے پاس بھی تو تم نے آدھ پون گھنٹہ بیٹھنا ہی تھا۔''

وہ کچھ بولی نہیں بس کسمسا کر رہ گئی۔ ہمارے درمیان کچھ دیر، مسجد کے سامنے پیش آنے والے واقعے کے بارے میں بات ہوئی پھر میں نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔ ''تاجور! میں نے سنا ہے کہ دارج تمہیں زبردستی میکے سے اپنے گھر لے گیا تھا۔ وہ دین محمد صاحب سے بھی سخت بدتمیزی کر رہا ہے۔''

''ایسی کوئی بات نہیں شاہ زیب! میں خوش ہوں۔ چھوٹی موٹی باتیں تو گھروں میں ہوتی رہتی ہیں اور انہوں نے کوئی زبردستی نہیں کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ اگر میں نہیں جانا چاہتی تو بتا دوں......اور......''

''اور تم گنگ سی ہو گئی ہو گی۔ تمہیں اتنی ہمت ہی نہیں ہوئی ہو گی کہ تم انکار کر سکو۔ تم سرتاپا اس شخص کے خوف میں جکڑی جا چکی ہو۔''

''میں آپ کو کیسے بتاؤں۔ ایسا کچھ نہیں ہے شاہ زیب۔'' وہ زور دے کر بولی ''اور دیکھیں پچھلی دفعہ آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ کبھی اس معاملے میں مجھ سے بات نہیں

کریں گے۔کبھی میری راہ میں نہیں آئیں گے۔''

''اب بھی میں تمہاری راہ میں نہیں آیا ہوں۔تم خود آئی ہو ایک ایسی راہ پر جہاں تمہیں نہیں آنا چاہیے تھا۔اب سوچو اگر میں وہاں پر نہ ہوتا اور تمہیں نکال کر یہاں نہ لے آتا تو شدید امکان تھا کہ تم اس وقت پولیس کی تحویل میں ہوتیں۔یقیناً تمہارا یہ برقع بھی کسی کام نہ آتا۔پولیس کو پتا چلتا کہ داراب خاندان کی نو بیاہتا بہو یوں بھیس بدل کر اپنے ماموں سے ملنے آئی ہے،تو یہ خبر کہاں تک پہنچتی اور میڈیا اسے کس طرح اچھالتا۔''

''مم...... میں بہت شرمندہ ہوں۔مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ میں نے ایسا کیوں کیا۔پلیز،اب آپ بھی مجھے اس غلطی کی سزا نہ دیں۔مجھے جلد از جلد گھر چھوڑ آئیں۔وہ اسپتال میں ہیں۔کسی بھی وقت پی ٹی سی ایل پر مجھے فون کر سکتے ہیں۔''

''اسلام آباد چھوڑ کر وہ یہاں لاہور کے اسپتال میں کیوں آ گیا ہے؟''

''مجھے اس بارے میں کچھ زیادہ پتا نہیں ہے۔ان کے علاج کے لیے باہر کے ملک سے ہڈیوں کا کوئی بڑا ڈاکٹر آیا ہوا ہے۔اس کے کہنے پر انہیں لاہور کے ایک پرائیویٹ کلینک میں لایا گیا ہے۔یہ کلینک پاکستان اور آسٹریا کے ڈاکٹر مل کر چلاتے ہیں۔''

''کیا کہتے ہیں ڈاکٹر؟''

''بڑے ڈاکٹر صاحب نے پرسوں بہت امید دلائی ہے۔وہ کہتے ہیں کہ ایک دو دن میں ان کی ریڑھ کی ہڈی کا ایک چھوٹا سا آپریشن کیا جائے گا۔ہو سکتا ہے کہ بڑے آپریشن کی ضرورت نہ پڑے اور وہ ٹھیک ہو جائیں۔''

میں نے کہا۔''ابھی وہ ٹھیک نہیں اور اس نے تمہارا یہ حال کر رکھا ہے۔سوچو جب وہ ٹھیک ہو جائے گا تو کیا سلوک کرے گا تمہارے ساتھ۔اس کا تکبر تمہیں ایک چیونٹی کی طرح روند کر رکھ دے گا اور یہی کچھ تمہارے گھر والوں کے ساتھ ہو گا۔اس سے تو بہتر ہے کہ وہ اسی طرح بستر پر لیٹا رہے۔''

''ایسا مت کہیں،جو کچھ بھی ہے۔اب وہ میرے شوہر ہیں۔میرا جینا مرنا ان کے ساتھ ہے۔''

''جینے کی بات تو نہ کرو،مرنے کی کرو۔وہ مار ڈالے گا تمہیں۔تمہیں تازہ ہوا کی ایک ایک سانس کو ترسا دے گا۔''

''وہ......وہ مجھ سے پیار کرتے ہیں۔میرے بغیر چند گھنٹے بھی نہیں گزارتے۔بس...... ان کا مزاج اور طرح کا ہے۔''

''یہ وہی پیار ہے جو ہم قربان کرنے والے بکرے سے کرتے ہیں۔اس کے نازنخرے بھی اٹھا لیتے ہیں مگر ساتھ ساتھ چھری بھی تیز ہورہی ہوتی ہے اور جو پیار وہ تم سے کرتا ہے اس کی ایک نشانی تمہاری یہ کپکپی اور تمہارا یہ پسینہ بھی ہے۔تم بار بار گھڑی دیکھ رہی ہو اور خوف زدہ ہو کہ اگر اسے تمہاری جسارت کا پتا چل گیا تو کیا ہوگا۔کس طرح کی قیامت ٹوٹے گی تم پر...... واہ بہت خوب...... بڑا انوکھا قسم کا رومانس ہے۔''

وہ کچھ دیر خاموش رہی، پھر بھرائی آواز میں بولی۔''شاہ زیب! آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں......اور میرا خیال ذہن سے نکال دیں۔اگر آپ سوچ رہے ہیں کہ میں کسی وقت دوبارہ اپنی مرضی سے آپ کی طرف پلٹ سکتی ہوں......تو ایسا نہیں ہوگا۔خدانخواستہ وہ ساری عمر بھی بستر پر رہتے ہیں تو میں ان سے دور نہیں جاؤں گی۔''

''کیا شوہر پرستی ہے......کیا وفاداری ہے......کیا محبت ہے......لیکن محبت تو آنکھوں میں نظر آیا کرتی ہے تاجور بی بی۔تمہاری آنکھوں میں مجھے دہشت اور خوف کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ایسی ڈری ہوئی عورت کا انتظار میں کیوں کروں گا؟ میں اس عورت کو نہیں جانتا جس لڑکی کو میں جانتا تھا وہ کوئی اور تھی۔میں اس سے پیار کرتا ہوں اور زندگی کی آخری سانس تک کرتا رہوں گا۔''

میں نے گاڑی تیزی سے آگے بڑھا دی۔دھچکا لگنے سے وہ ساری جیولری جھنجھنا اٹھی جو اس کی کلائیوں اور گلے وغیرہ میں موجود تھی مگر برقع کی وجہ سے مجھے نظر نہیں آرہی تھی۔وہ بس عجیب دکھی نظروں سے میری طرف دیکھ کر رہ گئی۔ایک لمحے کے لیے لگا کہ کچھ کہنا چاہتی ہے مگر پھر اس نے رخ پھیر لیا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ایک ایمبولینس ہمیں اوورٹیک کرتے ہوئے گزر گئی۔کیا پتا تھا کہ اس میں اسی شخص کی لاش ہو جو تھوڑی دیر قبل مسجد کے سامنے چوراہے میں مارا گیا تھا۔مسجد میں پیش آنے والے واقعات میری نگاہوں میں گھومنے لگے، یقیناً تاجور کی آنکھوں میں بھی گھوم رہے ہوں گے۔وہ خاموش تھی مگر اس کے جسم کا انگ انگ یہ کہہ رہا تھا کہ وہ جلد از جلد گھر پہنچنا چاہتی ہے۔

اسی دوران میں تاجور کے فون پر کال کے سگنل آئے۔اس نے اسکرین دیکھی اور پھر کچھ دیر شدید تذبذب میں رہنے کے بعد کال ریسیو کرلی۔دوسری طرف سے جو بھاری بھرکم آواز سنائی دی، میں نے اسے مدھم ہونے کے باوجود پہچان لیا، اور اس کے ساتھ ہی جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔یہ دارج کی آواز تھی۔دارج داراب جس میں ایک خودسر رئیس زادے کی تمام تر خصوصیات موجود تھیں، اس نے تاجور سے پوچھا تھا۔''کہاں ہو؟''

''مم...... میں یہیں پر ہوں۔ آپ...... کہاں ہیں؟''

''میں گھر پہنچ چکا ہوں...... لیکن تم مجھے یہاں کہیں نظر نہیں آ رہی ہو۔ مجھے لگتا ہے کہ تم کسی سڑک پر ہو۔''

''میں...... دراصل...... مجھے بہت درد ہو رہا تھا دانت میں...... آپ کی امی تو آپ کے پاس اسپتال گئی ہوئی تھیں۔ میں نے انہیں پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا اور ڈاکٹر کو دکھانے خود ہی یہاں سامنے مارکیٹ میں چلی آئی۔'' تاجور کی آواز بری طرح کانپ رہی تھی۔

''تمہارے ہوش تو ٹھکانے پر ہیں۔ اکیلی چلی آئیں۔ کسی کو بتایا تک نہیں۔'' دارج دہاڑا۔

''مم...... میں نے کہا ہے ناں کہ میں نے کسی کو پریشان کرنا ٹھیک نہیں سمجھا۔ میں برقع پہن کر نکلی ہوں۔ کسی کو پتا نہیں چلا۔''

وہ چلایا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ تم واقعی اپنے ہوش میں نہیں ہو، یہ طریقہ ہے گھر سے نکلنے کا۔ رات کا ٹائم ہے اور منہ اٹھا کر نکل گئی ہو...... اور وہ بھی اکیلی؟...... مر گئے تھے نوکر اور باقی سارے لوگ؟ کہاں ہو اس وقت تم؟''

''میں ٹیکسی میں ہوں...... بس پہنچ رہی ہوں دس منٹ میں۔''

وہ دانت پیس کر بولا۔ ''پہنچو...... پہنچو...... پوچھتا ہوں تم سے۔'' اس کے ساتھ ہی فون بند ہو گیا۔

تاجور نے برقع کے پلو سے چہرے سے پسینہ پونچھا اور حواس باختہ لہجے میں بولی۔ ''یہ اچھا نہیں ہوا۔ وہ گھر آ گئے ہیں۔ ان کی امی بھی آ گئی ہیں۔ شاید عارضی طور پر چھٹی مل گئی ہے انہیں۔ میں نے غلطی کی نکل کر......'' خوف کی شدت سے اس کی آواز ٹوٹ رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ''تم نے کوئی غلط کام نہیں کیا ہے۔ وہ تمہارا شوہر ہے اور تمہارے بقول تم سے محبت بھی کرتا ہے تو پھر اسے تم پر بھروسا ہونا چاہیے۔''

''وہ بھروسا کرتے ہیں مگر......'' وہ گڑبڑا کر خاموش ہو گئی۔

وہ اپنی حالت کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی مگر اس کوشش میں پوری طرح کامیاب نہیں تھی۔ اس کے چہرے کا بس تھوڑا سا حصہ ہی نظر آ رہا تھا اور اس پر پسینے کی نمی تھی، اس کے سینے کا زیر و بم بھی اس کی بے کلی کی چغلی کھا رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہی ہو گی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس کے منہ سے بے ساختہ ایک جھوٹ نکل گیا تھا اس نے کہا تھا کہ وہ ڈاکٹر کو دانت دکھانے قریبی مارکیٹ میں آئی ہے۔ اگر دارج تفتیش پر اتر آتا تو چند منٹ میں

یہ جھوٹ آشکار ہوسکتا تھا۔
تین چار منٹ کی کوشش کے بعد اس نے خود کو قدرے سنبھالا اور دھیمی آواز میں مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''آپ میرے لیے پریشان نہ ہوں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' اپنی آواز کا کھوکھلا پن شاید خود اسے بھی محسوس ہوا ہوگا۔
اس کے بعد اس نے اور کچھ نہیں کہا، سوائے اس کے کہ ایک دو بار مجھے یہ بتایا کہ مجھے کس طرف مڑنا ہے۔ ہم نیو مسلم ٹاؤن کے علاقے میں تھے۔ ایک جگہ اس نے مجھے گاڑی روکنے کا کہا۔ ''کون سی کوٹھی ہے؟'' میں نے گاڑی روکتے ہوئے پوچھا۔
''ساتھ والی لین میں...... لیکن میں یہیں اترنا چاہتی ہوں۔ ایک منٹ کا راستہ ہے مم...... میں پیدل جاتی ہوں۔''
وہ اتر گئی، اس کی پریشانی اس بات سے عیاں تھی کہ وہ اپنا موبائل وہیں نشست پر چھوڑ گئی۔ چند قدم آگے گئی تھی کہ میں نے اسے آواز دی۔ ''تمہارا موبائل۔''
وہ جیسے لڑکھڑا کر واپس پلٹی اور میرے ہاتھ سے موبائل لے کر پھر آگے بڑھ گئی۔
یہ وہ آن بان والی، طرح دار تاجور تھی جو چاند گڑھی کی گلیوں میں ایک روشن لکیر کی طرح چمکتی تھی اور جدھر سے گزرتی تھی، لوگوں کی نگاہوں سے پیار اور اپنائیت سمیٹتی چلی جاتی تھی۔ وہ چوہدری دین محمد کی وہ ہر دلعزیز لختِ جگر تھی جس کو قدرت نے خاص قسم کی دلکشی اور ذہانت سے مالا مال کیا تھا۔ آج وہ ایک ''زبردست'' کے پنجۂ ستم میں تھی اور جیسے ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئی تھی۔
اس نے ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھ سے کہا تھا کہ وہ جس طرح کی زندگی بھی جی رہی ہے یہ اس کی اپنی زندگی ہے، میں اس میں مداخلت نہ کروں...... یہ بات کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں التجا کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔
میں نے گہری سانس لی۔ وہ اب نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور یوٹرن لے کر واپس چل دیا لیکن میں اسے اس حالت میں چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔ میں شاہ زیب تھا، اور میں نے زندگی میں یہی سیکھا تھا کہ کسی کو مصیبت میں دیکھ کر اسے تنہا نہیں چھوڑنا جو کچھ میں دیکھ رہا تھا، اس نے میرے سینے کو شق کر ڈالا ہوا تھا۔ میرے دل و دماغ میں ایک زلزلہ برپا تھا۔ یوٹرن لے کر میں نے گاڑی کو ایک درمیانی لین پر روکا اور اتر کر پیدل اس سمت بڑھا جدھر تاجور گئی تھی۔
چند ہی سیکنڈ بعد مجھے سڑک کے درمیان ایک بیریئر نظر آیا...... اور پھر وہ عظیم الشان

کوٹھی بھی نظر آ گئی جس میں تاجور داخل ہو رہی تھی۔ ایک سکیورٹی گارڈ مؤدب انداز میں اس کے عقب میں تھا۔

میں آگے نہیں جا سکتا تھا اور واپس جانے کو بھی ہرگز دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اسی دوران میں مجھے ایک کورے کار عظیم الشان کوٹھی کے مین گیٹ سے باہر نکلتی نظر آئی۔ بانس کا بیریئر ہٹایا گیا اور چھوٹی سی گاڑی دھیمی رفتار سے چلتی میری طرف بڑھنے لگی۔ میں نے دور ہی سے دیکھ لیا۔ اس میں صرف ایک شخص موجود تھا۔ میں تھوڑا سا پیچھے ہٹ کر ''موڑ'' کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ گاڑی قریب پہنچی تو میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکا۔ گاڑی میں تیس پینتیس سال کا ایک جواں سال شخص موجود تھا۔ وہ کلین شیوڈ تھا اور پینٹ قمیص پہن رکھی تھی۔ گاڑی کی اسکرین پر مبشر اسپتال کا اسٹیکر لگا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس شخص کا تعلق کسی طور میڈیکل کے پروفیشن سے ہے۔

اس نے کھڑکی کا شیشہ تھوڑا سا نیچے اتارا اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اپنی 2008ء ماڈل کار کی طرف اشارہ کیا اور پریشان صورت بنا کر کہا۔ ''میری گاڑی خراب ہو گئی ہے، اگر آپ مجھے کسی آٹو ورکشاپ تک پہنچا دیں تو میں مکینک کی مدد حاصل کر لوں گا۔''

وہ چند لمحے تذبذب میں رہا پھر خرابی قسمت کی بنا پر اس نے میرے لیے دروازہ کھول دیا۔ میں شکریہ ادا کر کے اس کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ میں نے کہا۔ ''جو بھی قریبی ورکشاپ ہے بس مجھے وہاں ڈراپ کر دیجیے۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور ایک بار پھر مجھ پر اچٹتی سی نظر ڈالی۔ ''یہاں کس کے ہاں آئے ہیں آپ؟'' اس نے پوچھا۔

''رحیم بیگ صاحب، ساتھ والے بلاک میں رہتے ہیں۔'' میں نے یونہی اندھیرے میں تیر چھوڑا۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ پوچھتا میں نے کہا۔ ''اور آپ؟''

''میں یہاں ملازم ہوں، داراب ہاؤس میں۔''

''آپ تو مجھے ڈاکٹر لگے تھے۔''

وہ ہولے سے مسکرایا۔ ''نہیں، ڈاکٹر تو نہیں...... لیکن کام ڈاکٹر سے ملتا جلتا ہی ہے۔ داراب ہاؤس میں ایک مریض ہیں، ان کے لیے ''میڈیکل اٹینڈنٹ'' کے طور پر کام کرتا ہوں۔''

مجھے مزید کریدنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں ایک لمحے میں سمجھ گیا کہ وہ جس مریض کی

بات کررہا ہے، وہ یقیناً دارج ہی ہے۔ اس کا نصف زیریں حصہ بیکار تھا اور اسے اپنی ضروریات کے لیے ہر وقت ایک مددگار کی ضرورت رہتی تھی۔

میرے ذہن میں خیالات تیزی سے پنپ رہے تھے۔ میں نے پوچھا۔ ''کہاں جارہے ہیں آپ؟''

اسے میری دخل درمعقولات اچھی نہیں لگ رہی تھی تو شاید بری بھی نہیں لگ رہی تھی، بولا۔ ''میرے والد سیڑھیوں سے پھسل گئے ہیں۔ اسپتال میں ہیں۔ انہیں دیکھنے جارہا ہوں۔ اللہ کرے انہیں زیادہ چوٹیں نہ آئی ہوں۔''

میں نے بریٹا پسٹل نکالا اور اس شخص کی پسلیوں سے لگا دیا۔ اس نے چونک کر پستول کی طرف دیکھا پھر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس کی توجہ سڑک کی طرف سے مکمل طور پر ہٹ گئی تھی، گاڑی لہرا گئی۔ میں نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ کو سہارا دیا ورنہ وہ فٹ پاتھ پر چڑھ جاتی۔

''گھبراؤ نہیں......نقصان نہیں پہنچاؤں گا لیکن اگر شور مچاؤ گے تو فائر کرنے میں بھی دیر نہیں کروں گا۔''

میرے لب و لہجے نے اسے سکتہ زدہ کردیا۔ مجھے کچھ فاصلے پر ایک چلڈرن پارک کا جنگلا نظر آرہا تھا۔ اسٹریٹ لائٹ میں پارک کے سامنے کھلی جگہ بھی دکھائی دیتی تھی میں نے کہا۔ ''گاڑی وہاں روک دو۔''

اس نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ اس کے جسم میں نمودار ہونے والی کپکپی میں صاف محسوس کررہا تھا۔ وحشت زدہ آواز میں بولا۔ ''میرے پاس صرف دو ڈھائی ہزار روپیہ اور موبائل ہے تم چاہو تو لے سکتے ہو۔''

''اور گاڑی بھی تو تمہاری ہوگی۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔

''یہ اسپتال کی ہے...... لے جانا چاہو تو لے جاسکتے ہو......مگر......'' وہ کہتے کہتے خاموش ہوگیا۔

''مگر کیا؟ یہ بھی بتادو۔''

وہ میری طرف دیکھ کر گویا ہوا۔ ''داراب فیملی کا نوکر ہوں۔ تمہیں پتا ہوگا یہ معمولی لوگ نہیں ہیں۔ تمہیں نقصان اٹھانا پڑے گا۔ اگر نقدی اور موبائل لے جانا ہے تو لے جاؤ، میں کسی سے ذکر نہیں کروں گا۔''

میں نے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں، یہ چیزیں اپنے پاس ہی رکھو اور گاڑی بھی

رکھو، لیکن جو کچھ میں پوچھوں گا تمہیں بتانا پڑے گا اور جو کچھ کہوں گا وہ ماننا پڑے گا، ورنہ یہ دارابی شرابی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور اگر کچھ بگاڑ بھی لیا تو تمہیں اس سے کیا فائدہ؟ تم تو اس سے پہلے ہی قبر میں اتر چکے ہو گے۔'' میں نے پستول اس کی بائیں پسلیوں میں چبھویا۔

اس نے اردگرد دیکھا۔ اب رات کے قریباً گیارہ بج چکے تھے۔ لوگ اپنی وسیع کوٹھیوں میں بند تھے۔ چلڈرن پارک بھی تقریباً خالی ہی نظر آ رہا تھا۔ رات زیادہ نہیں ہوئی تھی لہٰذا گارڈز وغیرہ ایزی موڈ میں تھے۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور بولا۔ ''تم چاہتے کیا ہو مجھ سے؟''

''سوال مت پوچھو، صرف جواب دو۔'' میں نے خطرناک لہجہ اختیار کیا۔ ''شادی شدہ ہو؟''

''ہاں، دو چھوٹے بچے ہیں۔''

''تمہارا والد کس اسپتال میں ہے؟''

''داراب فیملی کا ہی ایک ٹرسٹی اسپتال ہے، جیل روڈ کے قریب۔''

''اگر تمہارے والد کو زیادہ چوٹیں آ گئی ہوں اور تم اس کی تیمارداری کی وجہ سے واپس ڈیوٹی پر نہ آ سکو......تو پھر کیا ہو گا؟''

''مم...... مجھے لگتا ہے کہ ایسا ہی ہے۔ انہیں کافی چوٹیں آئی ہیں۔ میرا ایک پھوپی زاد بھائی زید ہے۔ وہ بھی میڈیکل اٹینڈنٹ ہے۔ آج کل شیخوپورہ میں ہے۔ مجھے اس کو بلانا پڑے گا، چند دن کے لیے۔''

میں نے ذرا توقف کر کے پوچھا۔ ''تمہارے اس بھائی کو داراب فیملی کے لوگ جانتے ہیں؟''

''نہیں...... اس سے پہلے کبھی کوئی ایسا اتفاق نہیں ہوا ہے لل...... لیکن تم یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''پھر سوال۔ تمہیں کہا ہے ناں باسٹرڈ! تمہیں صرف جواب دینے ہوں گے۔'' میں نے پستول کا بیرل پھر اس کی پسلیوں میں چبھویا اور دوسرے ہاتھ سے اس کے سر کے بالوں کو جکڑ لیا۔ اسے مزید دباؤ میں لانے کے لیے یہ گرم مزاجی ضروری تھی۔

وہ اب باقاعدہ لرز رہا تھا لیکن ساتھ ساتھ اس میں جھلاہٹ آمیز طیش بھی نمودار ہو رہا تھا، وہ بولا۔ ''دیکھو...... تم مجھ سے بدمعاشی کی زبان میں بات کر رہے ہو لیکن ایک بات دماغ میں رکھو، تم سے بڑے بڑے بدمعاش بھی اس شہر میں موجود ہیں۔ اگر تم مجھے اجازت دو تو میں ایک

بندے سے تمہاری صرف سلام دعا کرا دیتا ہوں۔ اس کے بعد بھی اگر تم مجھ سے زبردستی کرنا چاہو گے تو پھر کر لینا......"

"اوہو......تو اب دھمکیاں بھی دو گے...... چلو ٹھیک ہے......کون سا رانی خاں کا سالا ہے، جو تمہارے کہنے پر مجھ کو شرف ملاقات بخشے گا۔" میں نے زہریلے لہجے میں پوچھا۔

"تمہارے ہی "قبیلے" کا ہے......تم جانتے ہو گے اس کو......داؤد بھاؤ۔"

مجھے واقعی شاک لگا۔ بہرحال میں نے تاثرات سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ میں نے پوچھا۔ "کسی نقلی داؤد بھاؤ سے تو یارانہ نہیں لگا بیٹھے ہو۔ اتنے جوگے مجھے لگتے نہیں ہو تم۔"

"میں نے پورے چار سال تک داؤد بھاؤ کے بیمار والد کی دیکھ بھال کی ہے۔ مم...... میری بہت قدر کرتے ہیں وہ۔"

صورتِ حال دلچسپ ہو رہی تھی۔ میں نے نشست سے ٹیک لگائی اور پستول کا دباؤ اس کی پسلیوں پر تھوڑا سا کم کر دیا۔ "اگر تم نے داؤد بھاؤ کا نام لے ہی لیا ہے تو پھر ذرا ثبوت بھی فراہم کر دو، لیکن کوئی اور بات نہیں کرو گے ان سے......صرف اور صرف سلام دعا کراؤ گے اور یاد رکھنا میں داؤد صاحب کی آواز پہچانتا ہوں۔"

اس کی شدید گھبراہٹ میں اب کمی واقع ہونا شروع ہو گئی تھی۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے اپنا سیل فون نکالا اور ایک نمبر تلاش کر کے اسے پریس کیا۔ بیل جاتی رہی لیکن کال اٹینڈ نہیں ہوئی۔ اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور پھر کوشش کی۔ اس مرتبہ چار پانچ سیکنڈ بعد کال اٹینڈ ہو گئی۔ داؤد بھاؤ کی بھاری بھرکم آواز گاڑی کے مختصر خلا میں گونجی۔

"ہیلو۔"

میں سعید بول رہا ہوں داؤد بھاؤ۔" وہ جلدی سے بولا۔

"ہاں سعید! خیریت تو ہے، اس وقت فون کر رہے ہو؟"

"جی، بالکل خیریت ہے۔ تکلیف دینے پر معافی چاہتا ہوں۔ دراصل میرا ایک دوست کو آپ کی آواز سننے کا بڑا شوقین تھا۔ ہو سکے تو دو سیکنڈ اس سے بات کر لیں۔"

اس نے فون میری طرف بڑھایا۔ "سلام داؤد بھاؤ۔" میں نے کہا۔

"وعلیکم السلام...... کیا نام ہے بھئی تمہارا اور سعید سے کیسے دوستی ہے؟" داؤد بھاؤ نے خانہ پُری کے لیے کہا۔

"نام تو آپ میرا اچھی طرح جانتے ہیں، اور سعید سے دوستی نہیں دشمنی ہے۔ اس وقت میں نے اپنا بریٹا پسٹل اس کی پسلیوں سے لگایا ہوا ہے، کیا سمجھے آپ؟"

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے سعید کا چہرہ تاریک ہوگیا۔شاید اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ گفتگو ایسا رخ اختیار کرے گی اور میں شہر لاہور کے ایسے خطرناک و دبنگ شخص سے اس طرح بات کروں گا۔

دوسری طرف داؤد بھی حیران تھا لیکن اس کی ذہانت و فطانت بھی شاید کام دکھا رہی تھی۔میں چونکہ اپنی اصل آواز میں بول رہا تھا اس لیے وہ چونک گیا تھا۔شاید بریٹا پسٹل کے حوالے نے بھی اسے کچھ چونکایا ہو۔''کون بات کر رہا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے گاڑی کی چابی نکال کر سعید کو دھمکانے والے انداز میں دیکھا اور گاڑی سے نکل آیا، تاہم پستول بدستور میرے ہاتھ میں رہا اور رخ بھی سعید کی جانب ہی تھا۔گاڑی کے شیشے بند تھے۔میں نے باہر کھڑے ہوکر دھیمی آواز میں کہا۔''داؤد بھاؤ، مجھے لگ رہا ہے آپ نے آواز پہچان لی ہے۔''

''شاہ زیب ہو تم؟'' بھاؤ سرسراتی آواز میں بولے۔

''آپ کے اس بہی خواہ سعید سے بس اتفاقیہ ملاقات ہوگئی ہے لیکن اس ملاقات سے مجھے بہت فائدہ ہوسکتا ہے۔''

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا شاہی! مجھے تفصیل سے بتاؤ کہ یہ سعید کھو کھر کہاں ملا ہے تمہیں......اور اب کیا معاملہ ہے؟''

میں نے بھاؤ کو الف سے ے تک سب کچھ بتا دیا اور کہا کہ تاجور کی مشکلیں بڑھتی جارہی ہیں، میں اس کے گھر میں داخل ہونا چاہ رہا ہوں۔یہ سعید اس سلسلے میں میری مدد کرسکتا ہے۔میں نے داؤد بھاؤ کو یہ بھی بتایا کہ سعید کا والد اسپتال میں ہے اور وہ اپنے کسی پھوپی زاد کو اپنی جگہ داراب ہاؤس میں بھیجنے والا ہے۔

اب سب کچھ داؤد بھاؤ کے پلے پڑ گیا تھا۔میں نے داؤد بھاؤ سے درخواست کی کہ وہ سعید کو میری مدد پر آمادہ کرے اور اسے یقین دلائے کہ اس سلسلے میں ہم اس پر کوئی آنچ نہیں آنے دیں گے۔اس حوالے سے اس سے بھاری بھرکم انعام کی بات بھی کر دی جائے۔

داؤد بھاؤ نے مجھ سے چند سوال پوچھے، اس کے بعد فون سعید کو دینے کے لیے کہا۔ (میں نے داؤد بھاؤ سے کہہ دیا تھا کہ وہ سعید کو میرا نام وقاص ہی بتائیں)

داؤد بھاؤ نے قریباً پندرہ منٹ تک سعید سے بات کی۔اس دوران میں، میں گاڑی سے باہر ہی ٹہلتا رہا۔علاقے کے دو گارڈز اِدھر اُدھر گھومتے رہے اور ہمیں شک کی نظروں سے دیکھتے رہے مگر کسی نے قریب آنے کی زحمت نہیں کی۔داؤد بھاؤ سے بات ختم کرنے کے بعد

سعید نے فون مجھے تھما دیا۔ داؤد بھاؤ بولے۔ ''میں نے اسے ''ایگری'' کرلیا ہے مگر اس کو اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا بھی تو خطرہ ہے۔ اس کی سائیڈ محفوظ کرنے کے لیے ہم یہ کریں گے کہ جب اس کا پھوپی زاد اس کی جگہ ڈیوٹی دینے کے لیے داراب ہاؤس پہنچنے کے لیے روانہ ہوگا تو اس کے ''کڈنیپ'' کا ڈراما کردیں گے۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ کسی وقت پول کھل بھی جائے تو سعید پر الزام نہ آسکے۔''

''ہاں، سعید کے بھائی کا نام چاند کھوکھر ہے۔ سعید اسے اعتماد میں لے لے گا۔ چاند کھوکھر ہمارے پاس رہے گا تم اس کی جگہ داراب ہاؤس پہنچ جانا۔ سعید تم سے فون پر رابطہ بھی رکھے گا۔ یہ رابطہ تم دونوں ٹیکسٹ میسج کے ذریعے کرلینا۔ اسپتالوں میں ویسے بھی وائس کال کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ ہاں ایک پرابلم ہوسکتا ہے۔ داراب ہاؤس میں جانے کے لیے چاند کھوکھر کا شناختی کارڈ دیکھا جاسکتا ہے۔ اس کی تصویر تمہارے لیے مسئلہ نہ کرے؟''

''اتنا رسک تو پھر لینا ہی پڑے گا بھاؤ۔'' میں نے کہا۔

ہم نے وہیں کھڑے کھڑے ضروری جزئیات طے کیں اور پھر داؤد بھاؤ نے اس سعید نامی میڈیکل اٹینڈنٹ سے چند جملوں کے تبادلے کے بعد کال ختم کردی۔

سعید پریشان تو نظر آتا تھا لیکن یہ بھی اندازہ ہورہا تھا کہ داؤد بھاؤ نے اس کے اہم خدشات دور کردیئے ہیں اور اب وہ آمادہ ہے۔ اس کی اس آمادگی میں شاید بھاری انعام اکرام کے وعدے نے بھی کردار ادا کیا ہو۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا بڑی تیزی سے ہوا۔ شیخوپورہ سے نکل کر لاہور آنے والا چاند کھوکھر داراب ہاؤس میں جانے کے بجائے سیدھا داؤد بھاؤ کے زیرزمین ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ واقعی اغوا ہوگیا ہے۔ داؤد بھاؤ کے ٹھکانے پر میں نے چاند سے اس کے بارے میں پورا بائیوڈیٹا معلوم کرلیا اور ذہن نشین بھی کرلیا۔ اس کی ڈیوٹی کے بارے میں بھی اہم نکات میں نے اپنے حافظے میں بٹھا لیے۔ اس کا قد کاٹھ مجھ سے ملتا جلتا ہی تھا۔ تصویر بھی بہت زیادہ مختلف نہیں تھی۔ کام چل سکتا تھا۔ ایک فرق یہ تھا کہ وہ کلین شیوڈ تھا اور میری فی الوقت چھوٹی چھوٹی مونچھیں تھیں۔ مونچھوں سے نجات حاصل کرنے میں مجھے دو منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ چاند کا لباس پہن کر اور اس کے شناختی کاغذات جیب میں ڈالنے کے بعد میں داراب ہاؤس میں گھسنے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ میرے پاس وہی سعید کھوکھر والی کورنے کار تھی۔

○......❖......○

اب میں داراب ہاؤس کے اندر تھا۔ داراب ہاؤس میں داخلے کے وقت میرے لیے سب سے اہم خطرہ ٹل گیا تھا۔ یعنی سروس کارڈ پر موجود تصویر اور میرے چہرے میں فرق محسوس نہیں کیا جا سکا تھا۔ یہ دوپہر بارہ بجے کا وقت تھا۔ جونہی میں داراب ہاؤس کے وسیع پورچ میں رکا، دو ملازم مجھے ریسیو کرنے کے لیے موجود تھے۔ وہ مجھے سیدھا دارج کے کمرے میں لے گئے۔ یہ کمرا اپنی مثال آپ تھا۔ آرائش و آسائش کی ہر چیز یہاں موجود تھی۔ اٹلی کا بنا ہوا بیش قیمت بیڈ، امپورٹڈ فرنیچر، ایرانی قالین اور بیش قیمت پردے۔ دارج نے دن کے وقت بھی سلیپنگ گاؤن پہن رکھا تھا۔ وہ بستر پر نیم دراز تھا۔ اس کے قریب ہی بلوری تپائی پر گرین ٹی کا کپ رکھا تھا اور کچھ دوائیں بھی نظر آ رہی تھیں۔ مجھے یوں لگا جیسے میری آمد سے تھوڑی دیر پہلے تاجور بھی یہاں موجود رہی ہوگی۔

دارج کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا مگر ٹانگیں اور پاؤں کمزور اور زرد دکھائی دیتے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ اس کا بالائی دھڑ اپنی ساری آب و تاب کے ساتھ زندہ ہے اور نچلا دھڑ بیماری جھیل رہا ہے...... بنجر پڑا ہے۔

مجھے دیکھ کر وہ پھنکارا۔ ''کہاں مر گئے تھے، تمہیں بتایا نہیں تھا سعید نے کہ دس بجے تک یہاں پہنچنا ہے؟''

''سوری سر! میں نے بڑی کوشش کی مگر ہڑتال کی وجہ سے راستے بلاک تھے۔ میں معافی چاہتا ہوں۔''

ایک لمحے کے لیے یوں محسوس ہوا کہ وہ یہ معافی قبول نہیں کرے گا اور مجھ پر برس پڑے گا لیکن پھر اس نے خود پر ضبط کیا اور سرخ چہرے کے ساتھ بولا۔ ''چلو، جلدی کرو، مجھے چینج کی ضرورت ہے...... اور مساج بھی کرنا ہے۔''

''اوکے سر۔'' میں نے مستعدی سے کہا اور اپنے کام میں لگ گیا۔

یہ کافی ناخوشگوار کام تھا لیکن میں ذہنی طور پر پہلے ہی تیار تھا۔ دارج ٹوائلٹ نہیں جا سکتا تھا اس کو ''ڈائپر'' استعمال کرائے جا رہے تھے۔ دن میں کم از کم تین بار تو یہ ڈائپرز تبدیل کرنے ہوتے تھے۔ میں نے کمرے کو اندر سے بولٹ کیا۔ دارج کا گندا ڈائپر اتار کر مخصوص ڈسٹ بن میں پھینکا۔ کاٹن کو ایک محلول میں ڈپ کر کے اس کے جسم کو صاف کیا اور نیا ڈائپر لگا دیا۔ ایک دو جگہ مجھ سے تھوڑی سی غلطی بھی ہوئی اور دارج کی ڈانٹ میرے کانوں سے ٹکرائی مگر میں پوری توجہ کے ساتھ اپنے کام میں لگا رہا۔ ڈائپر لگانے کے بعد میں نے اسے کروٹ کے بل ہونے میں مدد دی اور پھر اس کی کمر کی مالش شروع کر دی۔ ایسی مالش ان لوگوں کے

لیے ضروری ہوتی ہے جو بیماری کی وجہ سے بہت زیادہ بیٹھتے ہیں یا لیٹے رہتے ہیں۔ دارج کا بالائی جسم چربی دار تھا اور بیماری کے باوجود اس بالائی جسم میں خون کی فراوانی اور آرام آسائش کی چمک دمک محسوس ہوتی تھی۔

خود سے بیٹھ جانا بھی دارج کے لیے کوئی ایسا آسان کام نہیں تھا۔ اس کے لیے ایک اور ملازم کی ضرورت پڑتی تھی۔ مالش کے بعد میں نے اسے بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگوائی۔ وہ بیماری کے باوجود سگریٹ پھونکنے میں مصروف ہو گیا۔ سامنے بڑے سائز کی ایل سی ڈی پر کوئی سیاسی ٹاک شو ہو رہا تھا مگر آواز بند تھی۔ نیچے پٹی چل رہی تھی۔ اس پٹی میں دو تین فقرے کی ایک نیوز سجاول کے حوالے سے بھی گزری...... چند دن پہلے رحیم یار خان میں سجاول اور اس کے ساتھیوں پر جو پُراسرار حملہ ہوا تھا یہ نیوز اس کے بارے میں تھی۔ کسی نامعلوم عورت اور اس کے ساتھیوں کا ذکر تھا جنہوں نے سجاول کے دو بندوں کو قتل کیا اور سجاول کو ''اغوا'' کرنے کی کوشش کی۔

دارج نے بھی یہ خبر دیکھی۔ لمبے بالوں والا ایک شخص ہر وقت سائے کی طرح دارج کے ساتھ رہتا تھا۔ اب بھی وہ نیم دراز دارج کے سرہانے کھڑا تھا۔ دارج نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''آدم خان! یہ سجاول وہی ڈکیت ہے ناں، سیالکوٹ کے علاقے کا؟''

''جی سر، یہ وہی ہے۔'' آدم خان نامی اس گرانڈیل شخص نے ادب سے جواب دیا۔

دارج منہ میں کچھ بڑبڑایا اور پھر چینل بدل دیا۔ پتا نہیں کہ وہ سجاول کو کتنا جانتا تھا اور کب سے جانتا تھا لیکن یہ بات اسے ہرگز معلوم نہیں تھی کہ اگر آج وہ آدھے بے جان دھڑ کے ساتھ بستر پر پڑا ہے تو اسی سیالکوٹی کی وجہ سے ہے۔ یہ سجاول ہی تھا جس نے چند ماہ پہلے تاجور کا نکاح رکوانے کی کوشش کی تھی۔ وہ اس کوشش میں کامیاب تو نہیں ہوا تھا مگر دارج کو بستر پر ضرور لے آیا تھا۔ اس نے دارج کی گاڑی کو ٹکر ماری تھی اور اس کی ریڑھ کو ایک یادگار سلامی دے ڈالی تھی۔

دارج کی سگریٹ نوشی کا دھواں بیڈ روم میں بکھر رہا تھا لیکن اسے مطلق پروا نہیں تھی۔ دارج کی دائیں جانب سائیڈ ٹیبل پر سرخ رنگ کا ایک بٹن تھا۔ مجھے سعید کھوکھر نے بتایا تھا کہ یہ بٹن صرف اٹینڈنٹ کے لیے مخصوص ہے۔ دوسرے ملازمین کے لیے ایک سفید بٹن تھا۔ دارج نے بٹن دبایا۔ لاہور کے کسی بہترین پارلر کی پری پیکر ملازمہ اندر داخل ہوئی اور بڑے ادب اور سنجیدگی کے ساتھ دارج کی شیو کرنے میں مصروف ہو گئی۔ دارج نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے بتایا کہ فی الحال میں جا سکتا ہوں۔ میں دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ میرے

لیے جو کمرا مخصوص تھا وہ دارج کے عظیم الشان بیڈ روم کے بالکل ساتھ واقع تھا۔ یہ ایک چھوٹے سائز کا مگر پُر آسائش روم تھا۔ یہاں فون اور انٹرنیٹ کی سہولت تھی۔ ایک الماری میں کچھ ادویات وغیرہ بھی دکھائی دیتی تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں وقتاً فوقتاً کوئی سینئر ڈاکٹر بھی آ کر بیٹھتا ہوگا۔ میں نے نیٹ آن کیا اور یہ دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کرنے لگا کہ یہاں میری ڈیوٹی کی باریکیاں کیا ہیں۔

میری ڈیوٹی چوبیس گھنٹے کی تھی لیکن رات دس بجے سے صبح سات بجے تک ایزی ٹائم تھا۔ اس وقت میں اپنے اسسٹنٹ کو ذمے داری سونپ کر آرام کر سکتا تھا، تاہم ضرورت کے وقت مجھے طلب بھی کیا جا سکتا تھا۔ میری ڈیوٹی فزیو کی بھی تھی۔

مجھے دو اسسٹنٹ مہیا کیے گئے تھے۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا ایک سینئر ڈاکٹر دن کے وقت اور ایک رات کو یہاں داراب ہاؤس میں موجود رہتا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ ''آرتھوپیڈک اسپتال'' میں دارج کے کچھ ٹیسٹ ہوئے ہیں جن کی رپورٹ ایک ہفتے بعد آنی ہے اس لیے اسے عارضی طور پر رہائش گاہ پر بھیج دیا گیا ہے۔

میں تو داراب ہاؤس میں داخل ہو گیا تھا مگر میرے زیرِ استعمال ٹویوٹا گاڑی ابھی تک وہیں کھڑی تھی جہاں میں نے سعید کھوکھر سے لفٹ مانگی تھی اور پھر اسے اپنے ڈھب پر کیا تھا۔ وہ گاڑی مشکوک ٹھہر کر کوئی مشکل پیدا کر سکتی تھی۔ میں نے فخر کو فون کیا لیکن رابطہ نہیں ہو سکا۔ میں نے پہلوان حشمت سے کال ملائی۔ پہلوان اور فخر ابھی تک وہیں مسجد کے سامنے والے چھوٹے سے ہوٹل میں قیام پذیر تھے۔

میں نے پہلوان کو فون کیا۔ اس کی ہانپتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''شاہ زیب! تمہاری کچھ سمجھ ناہیں آوت ہے۔ ایک دم کہاں غائب ہو گئے تھے، اور وہ برقع والی لڑکی کون تھی؟''

''کیوں کیا ہوا، لڑکی کا کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''یار! اس لڑکی کی وجہ سے تو بڑا پھڈا ہو گیا ہے۔ مجھے کچھ شک پڑ گیا تھا، پتا نہیں کیوں پڑ گیا لیکن بس پڑ گیا۔''

''کیسا شک؟''

''اس وقت مجھے ایسا لگا کہ شاید وہ برقع والی لڑکی تمہیں زبردستی اپنے ساتھ لے جاوت ہے۔ میں نے سمجھا کہ ہو سکت ہے برقع میں لڑکی کے بجائے کوئی بندہ ہو اور اس نے پستول وغیرہ پکڑ رکھا ہو۔ وہ کہوت ہیں ناں کہ آنکھ اوجھل پتا نہیں کیا کیا اوجھل۔ اسی چکر میں آج دوپہر ہم سے ایک غلطی بھی ہو گئی...... بلکہ اسے غلطا کہنا چاہیے۔ میں نے مسجد کے پیچھے والے

بازار میں ایک برقع پوش لڑکی کو دیکھا۔ میں اس کی طرف گیا اور بے ساختہ ہی اس کا ٹیٹوا پکڑ لیا۔ اس نے وہ شور مچایا کہ اللہ کی پناہ۔ اصل میں برقع کا رنگ اور لڑکی کا قد کاٹھ سب کچھ تمہارے والی لڑکی سے ملتا تھا۔"

"پھر آپ کی تو پٹائی ہوگئی ہوگی؟"

"خیر ایسا بھی ناہیں۔ پٹائی الٹا اسی لڑکی کی ہوئی۔ وہ چور نکلی۔ اس کے برقع سے تین جوڑے جوتوں کے نکل آئے جو اس نے سامنے مسجد سے اٹھائے تھے۔ ہم نے سوچا کہ یہ تو ہمارے اسی مشہور شعر والی بات ہوگئی۔ ہم نے یونہی اپنی آستین کو جھاڑا تھا...... آستین میں سے سانپ گر پڑا جو بہت بھارا تھا۔ بھارا پنجابی میں وزنی کو کہوت ہیں۔ میری بات تمہاری سمجھ میں آوت ہے ناں؟"

پہلوان حسبِ عادت بڑی تیز رفتاری سے بولتا چلا جا رہا تھا پھر ایک دم اس کی گفتگو کو بریک لگی، وہ بولا۔ "لیکن تم بتاؤ بھئی! کہاں غائب ہو۔ تمہارا فون بھی متواتر بند جا رہا تھا۔ فخر تمہیں کال کر کر کے ہلکان ہو گیا ہے۔"

"لیکن اب تو خود اس کا فون بند ہے۔"

"یہی تو ہلکان کا مطلب ہووت ہے۔ تمہیں فون کر کر کے شاید اس کی بیٹری اللہ بیلی ہو گئی ہے۔ ٹھہرو میں اس سے تمہاری بات کراوت ہوں۔"

چند ہی لمحے بعد فخر کی آواز فون پر سنائی دے گئی۔ وہ بھی فائرنگ والے واقعے کے بعد سے میری گمشدگی پر پریشان تھا۔ فائرنگ میں جو بندہ ہلاک ہوا، اسے فخر کی گولی ہی لگی تھی مگر کسی کے علم میں یہ بات ہرگز نہیں آئی تھی کہ تابڑ توڑ فائرنگ کے دوران میں جو گولی اس بندے کو لگی، وہ سامنے والے ہوٹل کی بالکونی سے چلائی گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ پہلوان حشمت اور فخر ابھی تک اطمینان سے اسی ہوٹل میں موجود تھے۔

میں نے مختصر الفاظ میں فخر کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا...... اور اسے بتایا کہ میں داراب ہاؤس میں موجود ہوں۔ اس کے بعد میں نے اسے گاڑی کے بارے میں بتایا اور تاکید کی کہ وہ احتیاط کے ساتھ گاڑی کو اس جگہ سے ہٹا لے۔ اسے کچھ ضروری ہدایات دینے کے بعد میں نے کال ختم کر دی۔

○......❖......○

داراب ہاؤس کی چاردیواری میں مجھے ابھی تک تاجور نظر نہیں آئی تھی لیکن وہ اردگرد ہی کہیں موجود تھی۔ ڈری سہمی ہوئی اسی فضا میں کہیں سانس لے رہی تھی۔ اس گھر میں مجھے پہلا

دھچکا اسی وقت لگ گیا اور یہ کافی سخت تھا...... رات ساڑھے نو کے لگ بھگ میرے کمرے میں بزر گونجا اور سرخ بلب نے اسپارکنگ کی۔ میں ٹی وی آف کر کے تیزی سے دارج کے کمرے کی طرف بڑھا۔ حسبِ ضابطہ دو بار ''ناک'' کر کے میں اندر داخل ہو گیا۔ یہ دیکھ کر جسم پر چیونٹیاں سی رینگ گئیں کہ تاجور کمرے میں موجود تھی۔ اس نے لمبے سلکی بال ڈھیلے ڈھالے جُوڑے کی صورت باندھے ہوئے تھے۔ جڑاؤ طلائی زیورات اس کے سراپا پر کثرت سے جھلملاتے تھے مگر اس وقت صرف چوڑیاں اور جھمکے ہی جھلک رہے تھے۔ وہ گھبرائے ہوئے انداز میں دارج پر جھکی ہوئی تھی...... اور ٹشو پیپر کے ساتھ اس کے گھٹنے پر سے کچھ صاف کر رہی تھی۔ دارج کا چہرہ غصے سے انگارا ہو رہا تھا لیکن وہ کچھ بول نہیں رہا تھا۔ قریب ہی شیشے کی تپائی پر ایک پلیٹ میں دودھ کا نصف گلاس رکھا ہوا تھا۔ کچھ دودھ پلیٹ میں بھی چھلکا ہوا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ دارج کو دودھ کا گلاس دیتے ہوئے، تاجور سے کچھ دودھ چھلک گیا ہے اور دارج کے کپڑوں پر گرا ہے۔

''آپ جائیں۔'' دارج ڈری سہمی تاجور سے مخاطب ہو کر بولا۔

وہ اثبات میں سر ہلا کر مڑی اور یہی وقت تھا کہ جب اُس کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ اس کے چہرے پر زلزلے کی سی کیفیت نمودار ہوئی۔ ایک لمحے کے لیے وہ جیسے لڑکھڑا سی گئی تھی۔ غنیمت تھا کہ اس کا رخ دارج کی طرف نہیں تھا ورنہ وہ ضرور بری طرح چونک جاتا۔ تاجور کے ہاتھ بےساختہ اٹھے اور اس نے اپنے سر کو آنچل سے ڈھک لیا۔

''یہ مجھے دے دیں بیگم صاحبہ۔'' میں نے ٹشو پیپرز اس کے ہاتھ سے لے لیے۔

وہ میرے قریب سے اپنے جسم کو چراتی ہوئی باہر نکل گئی۔ میں نے ٹشو پیپرز ائر ٹائٹ ڈسٹ بن میں پھینکے۔ دارج کی رعب دار آواز میرے کانوں میں گونجی۔ ''میرا ٹراؤزر تبدیل کرو۔''

وہ سلیپنگ سوٹ میں تھا۔ میں نے اس کا ٹراؤزر تبدیل کیا۔ ظاہر ہے کہ میں ایسے کاموں کا تجربہ نہیں رکھتا تھا، تاہم میں نے پوری کوشش کی اور دارج کو شکایت کا موقع نہیں دیا۔ اس کو سکون بخش گولی کی ضرورت تھی۔ میں نے پانی کے ساتھ اسے گولی فراہم کر دی اور پھر اس کے حکم پر باہر آ گیا۔ میں جانتا تھا کہ مجھے یہاں داراب ہاؤس کے اندر دیکھ کر تاجور کے سینے میں طوفان برپا ہو گیا ہو گا۔ وہ تو قریباً 24 گھنٹے پہلے مجھے داراب ہاؤس کی اونچی دیواروں سے باہر ایک سڑک پر خدا حافظ کہہ چکی تھی۔ اس کے گمان میں بھی نہیں ہو گا کہ میں یہاں دارج داراب کے اتنا قریب پایا جاؤں گا۔

میں اپنے مخصوص کمرے میں واپس آ گیا اور ایک بار پھر ٹی وی آن کر کے بیٹھ گیا۔ خبروں میں ایک چھوٹی سی خبر مسجد کے سامنے ہونے والی فائرنگ کے حوالے سے بھی تھی۔ وہاں مارے جانے والے حملہ آور کا پوسٹ مارٹم وغیرہ ہو چکا تھا۔ کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ یہ حملہ دراصل کس پر کیا گیا تھا۔ سب یہی سمجھ رہے تھے کہ شاید پہلے کی طرح مولانا حبیب اللہ کو نشانہ بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ صرف ہم جانتے تھے کہ یہ کوشش مولانا حبیب پر نہیں ان کے خدمت گار رضوان ٹی پر تھی۔

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ دارج داراب کے بیڈ روم کی جانب سے لڑائی جھگڑے کی مدھم آوازیں سنائی دینے لگیں۔ یہ دراصل دارج کی ہی آواز تھی جو گرج برس رہا تھا۔ ایسی ہی آواز مجھے ڈیڑھ دو گھنٹے پہلے بھی سنائی دی تھی۔ بڑے گھروں میں جب صاحب اور بیگم میں ٹین شین ہوتی ہے تو اس کا علم قریبی گھریلو ملازموں کو بھی ہو جاتا ہے۔ یہاں موجود ملازمین کے تاثرات مجھے مسلسل یہ بتا رہے تھے کہ صاحب جی اپنی بیگم سے جھگڑ رہے ہیں...... یہ رات کے قریباً بارہ بجے کا عمل تھا۔ میں سلیپر پہن کر خاموشی سے باہر آیا اور بیڈ روم کے عظیم الشان ساگوانی دروازے تک پہنچا۔ اندر سے ابھرنے والی دارج کی دھاڑیں اب نمایاں ہو گئی تھیں۔ کچھ الفاظ سمجھ میں نہیں آ رہے تھے مگر کچھ آ بھی رہے تھے۔ وہ تاجور کو لتاڑ رہا تھا۔ اس کی جنونی آواز بیڈ روم میں گونجی۔ ''بکواس کرتی ہو تم۔ اگر تمہیں میری عزت کا اتنا پاس ہوتا تو اس مولوی ماموں سے ملنے کیوں جاتیں جس نے ہر جگہ ہمارے رشتے کی مخالفت کی...... مجھ میں اور میرے خاندان میں ہر طرح کے کیڑے نکالے۔ وہ مولوی نہیں مکار ڈرامے باز ہے۔ چندے کی رقمیں ڈکارنے والا نوسرباز ہے۔ وہ تو اس قابل ہے کہ اسے اسی علاقے کے تھانے میں الٹا لٹکایا جائے......'' دارج کی آواز سے انگارے برس رہے تھے۔

تاجور کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ اپنے پیارے ماموں کی اتنی سخت توہین پر بھی وہ یکسر خاموش تھی۔

''اب منہ میں گنگنیاں کیوں ڈالی ہوئی ہیں۔ بولتی کیوں نہیں ہو؟'' اس کی زہریلی آواز کمرے میں گونجی۔

اس مرتبہ بھی تاجور کی آواز سنائی نہیں دی۔ یا شاید وہ اتنی دھیمی آواز میں بولی تھی کہ آواز مجھ تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ میں حیران تھا، ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے جب میں دارج کے کمرے میں تھا دارج نے ہمارے سامنے تاجور کو ''آپ'' کہہ کر بلایا تھا اور اسے کمرے سے باہر جانے کو کہا تھا۔ اب وہ اسی تاجور سے تُو تڑاں کر رہا تھا اور انتہائی بدتمیزی سے بات کر رہا تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد صورتِ حال مزید بگڑ گئی۔ شاید وہ تاجور کے خاموش رہنے پر مزید بھڑک گیا تھا۔ اس کا لہجہ سخت سے سخت اور بلند سے بلند ہوتا جارہا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ ابھی تاجور کو پیٹنا شروع کر دے گا۔

میں نے شائستگی سے دو بار دروازے پر دستک دی۔ تیسری چوتھی دستک پر ساگوانی دروازے میں حرکت پیدا ہوئی۔ اسے کھولنے والا خود دارج داراب ہی تھا۔ وہ اپنی جدید الیکٹرانک وہیل چیئر پر بیٹھا تھا۔ اس کا چوڑا چکلا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کا پارا مزید چڑھ گیا۔ ''کیا بات ہے؟'' وہ پھنکارا۔

میں نے حیرت کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے بلایا تھا سر، ابھی بزر بجا ہے۔''

''کیا بکواس ہے؟ کس نے بجایا ہے بزر؟ کسی نے نہیں بجایا۔''

''لیکن...... معافی چاہتا ہوں...... بزر بجا ہے سر...... یا پھر...... شاید سرکٹ میں کوئی خرابی ہے۔ ویری سوری سر...... آپ ذرا بٹن کو دیکھ لیجیے گا۔ میں بزر کو چیک کرتا ہوں۔''

دارج نے مجھے خشمگیں نظروں سے دیکھ کر دروازہ دھماکے سے بند کر دیا۔ میں واپس نہیں گیا۔ دروازے کے آس پاس ہی منڈلاتا رہا۔ اندر سے دارج کی آواز تو اب بھی آرہی تھی مگر صورتِ حال قدرے بہتر محسوس ہوتی تھی۔ شاید میری مداخلت سے دارج کے غیظ و غضب کا ٹیمپو ٹوٹ گیا تھا۔ کچھ دیر بعد خاموشی ہوگئی اور میں اپنے کمرے میں واپس آگیا۔

رات کا زیادہ تر حصہ میں نے جاگتے ہوئے ہی گزارا۔ یہ تو مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ اپنے پُرشکوہ سسرال میں تاجور کے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہو رہا۔ مگر آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل والی بات بھی شاملِ حال تھی۔ اب میں سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ اور کانوں سے سن رہا تھا۔ سینے میں ایک کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ وہ ایک خوشنما چڑیا جیسی تھی لیکن ظالم عقاب کی گرفت میں تھی۔ اس عقاب کی اپنی ٹانگیں بھی ایک بیماری کے جال میں جکڑی ہوئی تھیں، اس کے باوجود وہ چڑیا پر ستم ڈھا رہا تھا۔

پھر خیالات کا دھارا سجاول اور اس کے حالات کی طرف مڑ گیا۔ سجاول اور اس کے بیوی بچے کا خیال ہر لحظہ میرے دماغ میں چمٹا ہوا تھا۔ میں کئی بار کوشش کر چکا تھا مگر سجاول کی وارننگ کے مطابق اس کا فون مسلسل بند جا رہا تھا۔ میں نے فیض سے رابطہ کیا۔ اس سے بھی یہی معلوم ہوا کہ سردار کا ابھی تک کچھ پتا نہیں ہے۔ خورسنہ اور بچے کی تلاش اب تک بے سود ہی ثابت ہوئی تھی۔ ہاں یونس پمپ والا ابھی تک حرکت میں تھا۔ باقر کے قتل اور اس کی فرینڈ

کے ریپ کے بعد اسے لاہور کے ایک گنجان علاقے میں دیکھا گیا تھا مگر اس پر ہاتھ نہیں ڈالا جاسکا تھا۔

مجھے قسطینا، فارس اور زینب وغیرہ کی طرف سے بھی مسلسل فکر لاحق تھی۔ ہاناوانی ایک خونخوار اور جنونی عورت کے روپ میں سامنے آئی تھی۔ وہ ہر اس شخص کو اذیت ناک موت دینے کا ارادہ رکھتی تھی جو کسی بھی طور اس کے بیٹے رائے زل کے قتل میں ملوث تھا۔ قسطینا وغیرہ کو جان سے مارنے کا ارادہ اس نے میرے سامنے ظاہر کیا تھا اور میں نے اس کے الفاظ اپنے کانوں سے سنے تھے۔ میرے اسپائی کیمرے کی وہ ویڈیو ضائع ہو چکی تھی...... کیمرا ابھی تک بحال نہیں ہوا تھا، تاہم فارغ وقت میں، میں نے خود ہی اس کے ساتھ تھوڑی بہت کوشش کی تھی۔ اس کوشش کا اتنا نتیجہ تو ضرور نکلا تھا کہ کیمرا ''آڈیو'' ریکارڈ کرنے کے قابل ہو گیا تھا۔

قسطینا، زینب اور ابراہیم وغیرہ سے میں خود رابطہ نہیں کرسکتا تھا (ان کے لیے میں اس دارفانی سے ''کوچ'' کر چکا تھا اور میں چاہتا تھا کہ اب میرا یہ ''اسٹیٹس'' برقرار ہی رہے) میں نے قسطینا سے رابطہ کرنے اور اسے خطرے سے آگاہ کرنے کی ذمے داری فخر کو سونپ رکھی تھی۔ اس کی طرف سے ابھی تک کوئی اطلاع نہیں تھی۔ میں نے اسے بھی فون کیا۔ اس نے فوراً ہی کال ریسیو کرلی۔ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ ''تمہاری عمر یقیناً ایک ہزار سال سے زیادہ ہوگی۔ یہ خاکسار تمہیں فون کرنے ہی والا تھا۔''

''خیریت ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ سوال تو مجھے کرنا چاہیے، تم ایک خطرناک جگہ پر گھسے بیٹھے ہو۔ تمہاری خیریت کو نیک مطلوب ''چاہنا'' عین حسبِ حال ہے۔''

''ابھی تو خیریت سے ہوں۔ تم بتاؤ، جاما جی میں کوئی رابطہ ہوا؟''

''یہی اچھی خبر سنانے کے لیے تو میں بے کل تھا لیکن اس کے ساتھ ایک تھوڑی سی بری خبر بھی ہے۔ رواج کے مطابق تو مجھے تم سے استفسار کرنا چاہیے کہ پہلے اچھی خبر سناؤں یا بری، لیکن اس سے وقت کا زیاں ہوگا...... اچھی خبر یہ ہے کہ ابھی آدھ گھنٹہ پہلے جاما جی میں قسطینا صاحبہ سے میرا رابطہ ہو گیا ہے۔ تمہارے دوست کی حیثیت سے میں نے قسطینا صاحبہ کو ہاناوانی والے خطرے سے آگاہ کر دیا ہے اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ وہ بدبخت یہاں پاکستان میں انیق کی جان سے کھیل چکی ہے۔''

''دوسری خبر کیا ہے؟'' میں نے بے تاب ہو کر پوچھا۔ ''زینب اور ابراہیم تو خیریت

سے ہیں؟''

''ہاں وہ خیریت سے ہیں...... لیکن قسطینا صاحبہ کی زبانی پتا چلا ہے کہ ہاناوانی نے وہاں بھی ایک سخت وار کیا ہے...... اپنے محترم بھائی حاذق ذکری کی جان لے لی ہے۔ محترم بزرگ حاذق ذکری کی لاش جاماجی شہر سے باہر ایک پہاڑی کھوہ سے ملی ہے۔ ان کا پیٹ چاک کر کے انہیں کئی گھنٹے تک تڑپنے کے لیے چھوڑ دیا گیا اور انہوں نے اسی حالت میں دم توڑ دیا۔''

میں نے نہایت دکھ کے عالم میں یہ خبر سنی اور سر پکڑ لیا۔

فخر بولا۔ ''مزید دکھ کی بات یہ ہے کہ جناب حاذق ذکری کو کسی اور نے نہیں آپ لوگوں کے ہی ایک قریبی ساتھی باذان احمد نے قتل کیا ہے۔ قسطینا صاحبہ کا کہنا ہے کہ یقیناً وہ بھی اسی انوکھے ٹرانس میں تھا جو ہاناوانی کی نسبت سے مشہور ہے۔''

میں نے طویل سرد آہ بھری۔ اگر یہ سب کچھ اسی طرح ہوا تھا تو پھر یہ بہت بڑے غم کی بات تھی۔ میری نگاہوں کے سامنے محترم حاذق ذکری کا نورانی چہرہ گھوم گیا اور ان کی اس طلسماتی گفتگو کی بازگشت بھی سنائی دی جو سننے والے کے دل و دماغ میں آگہی کی نئی راہیں کھولتی تھی۔ مجھے ان سے اپنی آخری ملاقات یاد آئی۔ یہ ملاقات جاماجی میں ہوئی تھی۔ وقتِ رخصت انہوں نے مجھے ایک سربمہر خط دیا تھا اور کہا تھا کہ میں پاکستان جا کر اسے ضرور پڑھوں۔ اب اسے میری غفلت کہا جائے یا بے تحاشا مصروفیت کہ میں وہ خط پڑھ ہی نہیں سکا تھا۔ وہ شاید ابھی تک سکھیرا گاؤں میں چوہدری دین محمد کے ڈیرے پر کسی طاقِ نسیاں میں رکھا تھا یا شاید گم ہی ہو چکا تھا۔ محترم حاذق ذکری کے لیے میرا دل درد سے بھر گیا۔ وہ بہت بڑے پیش گو بھی تھے لیکن وہ اپنی موت کو نہ دیکھ سکے یا پھر شاید ان کی بہن ہاناوانی کی شیطانی قوت ان کی روحانی توانائی سے زیادہ زور آور ثابت ہوئی تھی......؟ پھر مجھے باذان کا خیال آیا۔ جاماجی میں ہمارے تہلکہ خیز قیام کے دوران میں باذان نے دل و جان سے ہمارا ساتھ دیا تھا۔ کئی مواقع ایسے آئے تھے جب اس نے ہماری خاطر سنگین ترین خطرات مول لیے تھے۔ اب وہی عزیز ساتھی باذان، محترم ذکری کا قاتل ٹھہرا تھا۔ مجھے وہ مناظر اب بھی اچھی طرح یاد تھے جب جاماجی کے ہزارہا لوگ دیوانہ وار ڈی پیلس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ مقامی لوگوں کا جوش و جذبہ بڑھانے میں باذان احمد نے جو کردار ادا کیا، یادگار تھا۔

فخر کی آواز نے مجھے میرے خیال سے چونکایا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''جاماجی اور نیوسٹی میں ہاناوانی کے حوالے سے سخت ہراس پایا جاتا ہے۔ کئی سچی جھوٹی کہانیاں مشہور ہوگئی ہیں۔ کچھ

لوگ کہتے ہیں کہ چاند کے بغیر راتوں میں نیوسٹی کے سارے قبرستانوں کی ساری قبریں کھل جاتی ہیں۔ان میں سے مردے باہر نکلتے ہیں۔ ہاناوانی ان سے خطاب کرتی ہے اور وہ سب، جنگ میں مرنے والوں کے لیے انتقام،انتقام کے آوازے بلند کرتے ہیں۔''

''اس طرح کے حالات میں اس طرح کی بے سروپا باتیں اور مبالغہ آرائیاں تو گردش میں آہی جاتی ہیں لیکن مجھے ایک بات حقیقت لگتی ہے......اور وہ یہ کہ ہاناوانی نے کوئی بڑی قسم کھا رکھی ہے۔وہ رائے زل کی موت کا سبب بننے والے کسی شخص کو اپنے ہاتھ سے نہیں مارے گی۔وہ انہیں اپنے ہی لوگوں کے ہاتھوں سے مروانا چاہتی ہے۔''

''یہ تم نے درست کہا ہے۔قسطینا صاحبہ نے بھی یہی بات کہی ہے۔انہوں نے بتایا ہے کہ ہاناوانی نے اپنی کھلی قبر میں بیٹھ کر کئی دنوں تک کوئی چلہ کاٹا ہے پھر اسی قبر میں بیٹھ کر کسی فدائی لڑکی کے خون سے غسل کیا ہے اور اپنے درجنوں قریبی ساتھیوں کے سامنے یہ قسم کھائی ہے کہ رائے زل کے قاتل اپنی موت کا سامان خود کریں گے......اور عبرت کا نشان بنیں گے۔''

''زینب یا ابراہیم سے کوئی رابطہ ہوا؟''

''نہیں شاہ زیب! لیکن قسطینا صاحبہ نے یقین دلایا ہے کہ وہ میرے سارے خدشات ان دونوں تک بھی پہنچائیں گی اور ان کی سکیورٹی کے اضافی انتظامات کیے جائیں گے۔وہ دونوں بالکل خیریت سے ہیں لیکن تمہاری ''موت'' کے حوالے سے دکھی ہیں۔اس حوالے سے قسطینا صاحبہ بھی بہت غم زدہ تھیں۔دیر تک اس بارے میں بات کرتی رہیں......اور ان حالات کے بارے میں پوچھتی رہیں جن میں ٹیکساری گینگ پاکستان پہنچا اور تمہاری ''موت'' کا سبب بنا۔لگتا ہے کہ وہ بہت عقیدت رکھتی تھیں تم سے۔وہ تمہاری ''قبر شریف'' پر بھی آنے کا ارادہ رکھتی تھیں مگر میں نے انہیں یہاں کا واقعہ سنایا اور بتایا کہ اس قبر کے اردگرد بھی ہاناوانی کسی آسیب کی طرح منڈلا رہی ہے۔فی الحال وہ اپنے ارادے کو ملتوی رکھیں۔''

''تاجور کا ذکر ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، تاجور کا ذکر بھی ہوا۔وہ اس بات پر خوش ہیں کہ اس کی شادی ایک اعلیٰ وارفع خاندان میں ہوگئی ہے لیکن انہیں یہ پتا نہیں کہ اس شادی کے نتائج کیا نکل رہے ہیں...... انہیں انیق کی موت کی خبر بھی مل چکی تھی مگر ٹھیک سے پتا نہیں تھا کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا ہے۔وہ انیق کے لیے بہت دکھ محسوس کر رہی تھیں۔جب میں نے انہیں وضاحت سے بتایا کہ انیق کی موت کیسے اور کن حالات میں ہوئی تو ان کے دکھ اور پریشانی میں اضافہ ہوا۔انہوں نے کہا

کہ اگر ہاناوانی وہاں پہنچ چکی ہے تو پھر ہر اس شخص کو ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے جس کا تعلق کسی بھی صورت میں شاہ زیب اور سجاول سے رہا ہے......ان میں تاجور بھی شامل ہے۔“

میں نے فخر سے کہا کہ وہ قسطینا سے مسلسل رابطہ رکھے اور وہاں کے حالات سے خصوصاً زینب اور ابراہیم کے حالات سے باخبر رہنے کی کوشش کرے۔ زینب وہ یتیم لڑکی تھی جس کے سر پر میں نے ہاتھ رکھا تھا اور جس کی حفاظت کی قسم کھائی تھی۔ میں اس کی طرف سے ہر وقت باخبر رہنا چاہتا تھا۔ فخر سے بات ختم ہوئی تو انیق کی یاد ایک بار پھر دل و دماغ پر شدت سے حملہ آور ہوگئی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی باتیں یاد آنے لگیں۔ اور پھر اس کی وہ بے لوث محبت جو وہ مجھ سے رکھتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ”میری موت“ کا صدمہ اس کے لیے ایک کوہِ گراں کی طرح تھا مجھے گورکن اللہ دتا کی بات پھر یاد آئی اور سینے میں دکھ کی لہر اٹھی۔ اس کی بات سے ثابت ہوا تھا کہ وہ ”میری قبر“ پر آتا تھا اور دیر تک بیٹھا رہتا تھا۔ اس کی یادوں میں کھویا کھویا میں سو گیا۔

○......❖......○

اگلے روز مجھے موقع مل گیا۔ میں صبح آٹھ بجے کے لگ بھگ دارج داراب کا ڈائپر وغیرہ بدلنے کے لیے اس کے کمرے میں گیا تو وہ بیڈ سے ٹیک لگائے انگلش اخبار پڑھنے میں مصروف تھا۔ اس کا کمرا خوشبوؤں سے بھرا ہوا تھا اور سامنے دیوار پر ایک بہت بڑی ایل سی ڈی پر کوئی کیٹ واک دکھائی جا رہی تھی۔ دارج کا ڈائپر بدلنے کے دوران میں ہی میں نے اپنا منی کیمرا ایک نہایت محفوظ جگہ پر چپکا دیا۔ اس کیمرے کا رزلٹ مجھے رات گیارہ بجے کے قریب ملنا شروع ہوگیا۔ میاں بیوی میں جو شدید تلخی تھی، وہ آج بھی رنگ دکھا رہی تھی۔ دارج داراب اور تاجور بیڈروم میں اکیلے تھے۔ وہ کسی چڑچڑے وکیل کی طرح تاجور پر جرح کرتا چلا جا رہا تھا۔

میرا کیمرا مجھے صرف آڈیو دے رہا تھا تاہم یہ خاصی واضح تھی۔ دارج نے جلتے لہجے میں کہا۔ ”میں پھر وہی بات کہوں گا۔ جو کچھ تم بتا رہی ہو، وہ کسی صورت ماننے کے لائق نہیں۔ شاہ زیب ایک مدت سے تمہارا عاشق تھا۔ تمہارے پیچھے لگ کر لاہور سے چاند گڑھی اور چاند گڑھی سے وہاں ملنگی ڈیرے پہنچا۔ وہاں تم دونوں کئی راتوں تک ایک ہی جگہ ایک کمرے میں سوتے رہے۔ سوتے رہے یا نہیں؟“

”لیکن دارج...... میں آپ کو کتنی بار بتا چکی ہوں......“

”بکواس مت کرو۔ جتنا پوچھ رہا ہوں، اتنا ہی جواب دو۔ تم ایک کمرے میں اکٹھے

سوتے رہے یا نہیں؟'' وہ گرجا۔
''ہاں۔'' وہ سسک کر بولی۔
''ایک کمرا، بند دروازہ......اندھیرا۔ عاشق اور محبوب کا ساتھ۔ نہ کوئی چھوٹا بڑا روکنے ٹوکنے والا۔ اب بتاؤ میں کیسے مان لوں کہ اس، اللہ کے نیک پرہیزگار بندے نے تمہیں معاف کر دیا ہوگا اور کوئی جسمانی تعلق نہیں بنایا ہوگا تجھ سے۔''
''میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں دارج۔ آپ مجھے کہیں بھی لے جا کر کسی بھی طرح کا حلف لے لیں، ایسا کچھ نہیں ہوا جو آپ سمجھ رہے ہیں۔''
''بہت خوب۔'' وہ زہریلے لہجے میں بولا۔ ''تمہارے ان حلف ناموں پر قربان ہونے کو دل چاہتا ہے۔ وہ ایک انٹرنیشنل غنڈا تھا۔ اس کی راتیں نائٹ کلبوں اور یورپ کے بدنام ترین PUBS میں گزرتی تھیں۔ خوب صورت عورتیں اس کی کمزوری تھیں۔ جو بھی اس کے قریب آئی، اس نے آکٹوپس کی طرح اسے جکڑ لیا ہوگا......بس صرف ایک تم تھیں...... ہاں صرف تم تھیں جس کو اس نے اپنی بہن بنا کے رکھا۔ تمہارے ساتھ بس دور دور سے محبت کی۔ یہی بات ہے ناں؟ بتاؤ یہی بات ہے ناں؟''
میرے موبائل کے ریسیور پر تاجور کی سسکی سنائی دی۔ غالباً دارج نے اس کے بال مٹھی میں جکڑ لیے تھے۔ وہ کراہتے ہوئے بولی۔ ''میں آپ سے جھوٹ نہیں بول رہی۔ میں نے آپ کو بتایا ہے جو غلطی بھی ہوئی، وہ بتائی ہے۔ بس ایک دو راتیں ایسی آئیں جب......''
''جب تم پالتو چیتوں کی آوازوں سے ڈر گئیں اور اس کی بانہوں میں گھس گئیں؟'' اس نے زہرناک انداز میں تاجور کا فقرہ مکمل کیا اور اس کے بالوں کو شدت سے کھینچا۔ وہ سسک کر بولی۔
''پلیز میرے بال چھوڑ دیں، مجھے درد ہو رہا ہے۔''
''تو پھر جو ہوا سچ سچ بتاؤ ایک ایک لفظ بتاؤ مجھے۔'' دارج نے دانت پیسے۔
''مم...... میں نے آپ کے سامنے کتنی بڑی قسم کھائی ہے وہاں کچھ نہیں ہوا ملنگی ڈیرے پر۔''
''ملنگی ڈیرے پر نہیں ہوا ہوگا تو پھر اس ڈکیت سجاول سیالکوٹی کے اڈے پر ہوا ہوگا۔ وہاں بھی تو تم اس عورت باز کے ساتھ اکیلی تھیں۔ پوری طرح اس کے قبضے میں تھیں۔ کیا وہاں تمہارے حسن نے اور تمہارے اس قاتل جسم نے اس پر بجلیاں نہیں گرائی ہوں گی۔ کوئی لڑکی ایک رات اپنے عاشق کے ساتھ گھر سے باہر رہ آئے تو اس پر یقین نہیں کیا جاتا۔ تم تو

کئی ہفتے وہاں اس کے بس میں رہی ہو۔ وہ تمہیں اس وقت تمہارے گھر چھوڑ کر آیا جب اس نے تمہیں پوری طرح روند لیا۔ اپنی ہر حسرت پوری کر لی، بولو ایسا ہوا کہ نہیں؟''

اس نے ایک بار پھر کسی طرح تاجور کو تکلیف دی۔ وہ کراہ اٹھی۔ وہ پھنکارا۔ ''مجھے تمہاری ہائے وائے نہیں چاہیے۔ مجھے میری بات کا جواب دو۔''

''میں سچ کہتی ہوں دارج! خدا کے لیے میری بات کا یقین کریں۔ وہ بالکل اور طرح کا تھا...... آ...... آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ ایک دو بار خود مجھے بھی ڈر لگا تھا کہ کچھ ہو نہ جائے...... لیکن ایسا نہیں ہوا۔ تب تک اس نے شراب پینا بھی چھوڑ دی تھی۔ وہ قریب ہو کر بھی مجھ سے دور ہوتا تھا۔ ایک فاصلہ رکھتا تھا میرے اور اپنے درمیان...... میں سچ کہتی ہوں۔ آپ میری بات پر کیوں یقین نہیں کرتے۔''

''کوئی نہیں کرے گا...... جس طرح تیرا یہ حسن لشکارے مارتا ہے اور جس طرح تیری یہ کمینی ادائیں ہوش اُڑاتی ہیں، پتھر کا مرد بھی ہو تو موم کی طرح پگھلنا شروع ہو جائے اور وہ بدمعاش تو تھا ہی سرتاپا آگ۔ پورے تین مہینے ہو گئے ہیں مجھے تم سے یہ باتیں پوچھتے ہوئے...... تین سال بھی گزر جائیں گے تو تیری جان نہیں چھوٹے گی۔ چھوٹے گی اسی صورت میں جب سچ بولے گی۔''

چند لمحے خاموشی رہی، بس تاجور کی سہمی ہوئی گہری سانسیں سنائی دیتی رہیں تب وہ پھر جنونی انداز میں بولا۔ ''چل بتا، پہلی بار تیرا جسمانی تعلق کب بنا شاہ زیب سے۔ چاند گڑھی میں، ملنگی ڈیرے میں یا سجاول کے اڈے پر؟ چل آج تجھے یہ رعایت دیتا ہوں۔ ایک واقعے کے بارے میں بھی بتا دے گی تو باقی کے بارے میں کچھ نہیں پوچھوں گا۔''

وہ سہمے ہوئے انداز میں منمنائی۔ آڈیو ریسیور میں کچھ سنائی نہیں دیا۔ پھر شاید اس بدبخت نے اسے کسی چیز سے ضربیں لگائیں۔ چٹاخ چٹاخ کی آواز صاف سنائی دی، وہ رونے لگی۔ میرا جسم ایک بپھرے ہوئے طوفان کی زد میں تھا۔ وہ، جس کو کانٹا چبھنے کی تکلیف بھی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی تھی۔ وہ اسے مار رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے جی میں آئی کہ دروازہ توڑ کر اندر داخل ہو جاؤں۔ اگر میں ایسا کرتا تو یقیناً اگلے چند سیکنڈ میں دارج کی خونچکاں لاش اس کے بستر پر پڑی نظر آتی۔ میں شاید اس منحوس کو دیکھ کر خود کو سنبھال نہ سکتا اور اس کو موقع پر ہی مار ڈالتا۔ لیکن اس کے بعد کیا ہوتا؟ سب سے اہم سوال تو تاجور کا ہی تھا۔ وہ ابھی تک شاید سیف کے سلسلے میں بھی مجھے پوری طرح معاف نہیں کر سکی تھی، کیا وہ اپنے شوہر کے لیے مجھے معاف کر دیتی؟ میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ وقتی طور پر تاجور کی جان چھڑانے کا

خیال ذہن میں آیا۔

میں نے بیڈروم کے دروازے پر دو بار مخصوص دستک دی۔ اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ لیکن تاجور پر دارج کا گرجنا برسنا ختم ہو گیا۔ میں نے دوبارہ ''ناک'' کیا۔ اس مرتبہ وہ اندر سے چنگھاڑا۔ ''کون ہے؟''

''جی سر! آپ نے مجھے بلایا تھا۔'' میں نے دروازے سے منہ لگا کر ذرا بلند آواز میں کہا۔

وہ ایک موٹی گالی دے کر چلایا۔ ''کس نے بلایا ہے تجھ کو، کب بلایا ہے؟''

چند سیکنڈ بعد دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور ادھ کھلے دروازے سے مجھے دارج کی شکل نظر آئی۔ اس نے گرے رنگ کا ریشمی سلیپنگ گاؤن پہن رکھا تھا، وہ اپنی جدید الیکٹرانک وہیل چیئر پر تھا۔ اس کی آنکھوں سے وحشت ہویدا تھی۔ ''کس نے بلایا ہے تمہیں۔ کیوں آئے ہو؟'' وہ دہاڑا۔ اگر وہ کھڑا ہو سکتا تو یقیناً اٹھ کر میرا گریبان پکڑ لیتا۔

''مم...... معافی چاہتا ہوں سر! آپ نے بزر بجایا ہے۔''

''کس نے بزر بجایا ہے...... کس حرام زادے نے بجایا ہے۔ اور تم......'' اس نے پھر ایک تگڑی گالی بکی اور طیش کے عالم میں اپنا سلیپر اتار کر مجھے مارا۔ وہ میرے کندھے سے ٹکراتا ہوا، کوریڈور میں جا گرا۔

''آدم خاں...... آدم خاں۔'' وہ گرجا۔ وہ اپنے اسی ''باڈی گارڈ کم مشیر'' کو بلا رہا تھا جو ہمہ وقت سائے کی طرح اس کے ساتھ رہتا تھا۔ لیکن رات کے اس پہر شاید وہ بھی قریب موجود نہیں تھا۔

وہ غضب ناک انداز میں بولا۔ ''اٹھا کر لاؤ اسے...... اٹھا کر لاؤ۔'' اس کا اشارہ اپنے سلیپر کی طرف تھا۔

میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور راہداری میں سے سلیپر لا کر اس کے پاؤں کے پاس وہیل چیئر کی ''فٹ پلیٹ'' پر رکھا۔ اس نے میرے سر کے بال مٹھی میں جکڑ لیے اور زور زور سے آگے پیچھے جھلایا۔ تب دھکا دے کر دور ہٹا دیا۔ بیماری کے باوجود اس کے بالائی جسم میں کسی بھینسے کی سی طاقت تھی۔

اسی اثنا میں چراغ کا جن آدم خان بھی آن حاضر ہوا۔ دارج اسے دیکھ کر گرجا۔ ''وہ کہاں مر گیا ہے سعید کھوکھر؟ اپنی جگہ یہ کس چغد کو بھیج دیا ہے اس نے...... اس کو ابھی جوتے مار کر نکال دو یہاں سے۔''

میں نے کہا۔ ''سر! ہاتھ جوڑ کر معافی چاہتا ہوں۔ میرا قصور نہیں دراصل کال سسٹم میں کوئی فالٹ ہے۔ شاید ''شارٹ سرکٹ'' سے بزر خود بخود بج اٹھتا ہے، یا ارتھ کا کوئی مسئلہ ہے۔'' میں نے مدد طلب نظروں سے آدم خاں کی طرف دیکھا۔

وہ ٹھہرے لہجے میں بولا۔ ''میرے سرکار! میرا خیال ہے کہ لائن میں کوئی گڑ بڑ ہے۔ پہلے بھی ایک دو دفعہ ایسا ہوا ہے لیکن اس میں بھی اس بے وقوف کا قصور ہے۔ اسے ٹھیک کرانا چاہیے تھا اسے۔''

''سوری سر! میں نے کل الیکٹریشن کو بلانے کی کوشش کی تھی مگر رابطہ نہیں ہوا۔'' میں نے مصلحت آمیز جھوٹ بولا۔

اس سے پہلے کہ دارج پھر گرجتا، آدم خاں جلدی سے بولا۔ ''سرکار! میں ابھی بلاتا ہوں الیکٹریشن کو۔ پانچ منٹ میں ''بیل'' درست کراتا ہوں۔'' آدم خاں میری مدد پر آمادہ نظر آتا تھا۔

میری حمایت پر آدم خاں کو بھی ایک دو سخت باتیں سننا پڑیں مگر دارج کا غصہ کسی حد تک کم ضرور ہو گیا۔

ادھ کھلے دروازے میں سے نائٹ بلب کی مدھم نیلگوں روشنی کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا، مگر تاجور اسی مدھم روشنی میں کہیں موجود تھی۔ وہ سب کچھ دیکھ رہی تھی، سب جان رہی تھی، میں ایک ادنیٰ ملازم کی طرح اس کے شوہر کی خدمت کرتا تھا، اس کا مساج کرتا تھا، اس کے گندے ڈائپر بدلتا تھا اور اس کی گالیاں، جھڑکیاں بھی سن رہا تھا۔ یہ سب میں کیوں کر رہا تھا، کوئی اور جانتا ہو یا نہ جانتا ہو، وہ تو جانتی تھی۔

میں دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ اس سے پہلے کہ الیکٹریشن آ دھمکتا میں نے بزر کے ''کونیکٹر'' سے چھیڑ چھاڑ کی اور اسے واقعی گڑبڑ کر دیا۔

رات کافی گزر چکی تھی اس کے باوجود الیکٹریشن بھی حاضر ہو گیا اور اپنی چیکنگ وغیرہ کرنے لگا۔ اس ساری صورتِ حال سے یہ فائدہ تو ضرور ہو گیا تھا کہ دارج کے غیظ و غضب کا ٹیمپو ٹوٹ گیا تھا اور اب اس کے بیڈروم کی طرف سے کسی طرح کی کوئی پریشان کن آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

یہ بے حد تکلیف دہ رات دن تھے۔ خورسنہ اور اس کے بچے کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا کہ ان پر کیا بیتی ہے۔ میرا دھیان بار بار حاذق ذکری کی موت کی طرف بھی چلا جاتا تھا۔ ابھی انیق کی جدائی والا صدمہ ہی کم نہیں ہوا تھا کہ یہ دوسری دلدوز خبر سننے کو مل گئی تھی۔

اگلے روز صبح سویرے مجھے غسل کرنے میں دارج کی مدد کرنا تھی۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں اس کے کمرے سے باہر نکل رہا تھا کہ تاجور سے آمنا سامنا ہو گیا۔ ملازمہ کے بجائے وہ خود ناشتے کی ٹرالی دھکیلتی ہوئی اندر لا رہی تھی۔ بس دو لمحوں کے لیے اس کی نگاہیں میری نگاہوں سے ملیں۔ ان دو لمحوں میں ہی اس کی نگاہوں نے خاموشی کی زبان میں کئی شکوے مجھ سے کر ڈالے۔

آپ کیوں موجود ہیں یہاں؟

کیوں میری اذیتوں میں اضافہ کر رہے ہیں؟

کیوں اپنے آپ کو مصیبت میں ڈال رہے ہیں اور اپنی توہین کروا رہے ہیں؟

اس سب سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں، آپ کو نہ مجھے۔ ہاں کچھ بہت برا ضرور ہو سکتا ہے۔ وہ آگے بڑھ گئی اور میں اپنے کمرے کی طرف آ گیا۔ ایک آرتھوپیڈک ڈاکٹر بھی آیا ہوا تھا اور ناشتے کے بعد دارج کا عمومی معائنہ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ وہ میری طرف غور سے دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ کہنے لگا۔ ''پتا نہیں کیوں، تمہیں دیکھ کر لگتا ہے کہ پہلے بھی کہیں دیکھا ہوا ہے۔ خاص طور سے تمہاری آنکھیں اور تمہاری ٹھوڑی وغیرہ۔''

''شکلوں سے شکلیں ملتی ہیں جی۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔ (ویسے کسی وقت مجھے لگتا تھا کہ دارج بھی مجھے الجھن زدہ نظروں سے دیکھتا ہے۔ جیسے میری صورت کے حوالے سے اپنی یادداشت کو کریدتا ہو)

آرتھوپیڈک ڈاکٹر مجھ سے سعید کھوکھر کے والد کا حال احوال پوچھنے لگا۔ وہ میری کارکردگی سے زیادہ مطمئن نہیں تھا اور چاہتا تھا کہ سعید جلد از جلد اپنی ڈیوٹی پر واپس آ جائے۔ ڈاکٹر نے یہ بھی بتایا کہ دارج صاحب کے ٹھیک ہونے کے چانس کافی روشن ہیں۔ وہ بولا۔ ''دارج صاحب کے اندر ٹھیک ہونے کی شدید خواہش ہے، اور ارادے کی پختگی پائی جاتی ہے...... اور جب مریض میں یہ چیزیں موجود ہوں تو اس کی صحت یابی کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔''

میں نے اپنے آپ میں سوچا...... ایسے شخص کی صحت یابی کی خواہش کیسے کی جا سکتی ہے؟ اس کی مکمل صحت یابی سے نہ جانے کتنے لوگوں کی تکلیف اور مصیبت منسلک تھی...... اور تاجوران میں سرِفہرست تھی۔ میں زیادہ دیر ڈاکٹر کے پاس نہیں ٹھہرا۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ کہیں میری ڈیوٹی کے حوالے سے ٹیکنیکل باتیں نہ شروع کر دے۔

میرا منی کیمرا 'زخمی' تھا اور ٹھیک کام نہیں کر رہا تھا۔ پھر بھی آواز کی حد تک تو وہ اب بھی

میرا پورا ساتھ دے رہا تھا۔ وہ بدستور دارج کے عظیم الشان بیڈروم میں ایک مستعد جاسوس کی طرح موجود تھا۔ اس سہ پہر میں نے ایک اور تکلیف دہ منظر دیکھا۔ میرا گزر داراب ہاؤس کے استقبالیہ کمرے کی طرف سے ہوا تو میں نے وہاں چوہدری دین محمد اور ان کی بیوی یعنی تاجور کی والدہ کو بیٹھے پایا۔ ساتھ میں تاجور کا چھوٹا بھائی اسفند بھی تھا۔ میرا چہرہ تبدیل تھا مگر وقاص کی حیثیت سے تو وہ مجھے پہچان ہی سکتے تھے۔ شکر کا مقام تھا کہ وہ مجھے دیکھ نہیں پائے تھے۔ میں ایک چوکور ستون کی اوٹ میں ہو گیا۔ وہ استقبالیہ کمرے میں یوں بیٹھے تھے جیسے دو سائل کسی اعلیٰ افسر کے دفتر کے سامنے بیٹھے اپنی باریابی کا انتظار کر رہے ہوں (چوہدری دین محمد کے ساتھ ان کا پرانا ملازم خدابخش بھی ایک طرف سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اب سکھیرا میں دین محمد صاحب کی نقل مکانی کوئی راز نہیں رہی تھی۔ لہٰذا چاند گڑھی والے ایک دو ملازم بھی ان کے پاس آ گئے تھے)

یقیناً دونوں میاں بیوی اپنی بیٹی سے ملنے آئے تھے۔ گاؤں سے اس کے لیے کچھ سوغاتیں اور پھل وغیرہ لائے ہوں گے لیکن انہیں شاید ذلیل کرنے کے لیے یہاں بٹھا دیا گیا تھا۔ کس قدر افسوس کا مقام تھا۔ وہ دارج کے ساس سسر تھے۔ تاجور ان کے جگر کا ٹکڑا تھی اور انہوں نے اسے پوس پال کر دارج کے حوالے کیا تھا۔ اب وہ اپنے جگر کے اس ٹکڑے سے ملنے کے لیے یوں انتظار گاہ میں بیٹھے سوکھ رہے تھے۔ مجھے چوہدری دین محمد پر غصہ آیا اور ان کے لیے دکھ بھی محسوس ہوا۔ یہی دین محمد صاحب تھے جو اپنی بات پر اڑ گئے تھے اور برادری کی مخالفت مول لے کر بھی اپنی مرضی کر کے رہے تھے۔ اب اس مرضی میں خوف کتنا تھا اور مرضی کتنی تھی، یہ تو وہی بتا سکتے تھے۔

میں نے دیکھا کہ پانچ دس منٹ بعد وہ دونوں، اسفند سمیت تین ہٹے کٹے گارڈز کی نگرانی میں اندرونی حصے کی طرف چلے گئے۔ ان کے ساتھ آنے والا ملازم خدابخش وہیں بیٹھا رہ گیا تھا۔ اسے وہیں پر کولڈ ڈرنک تھما دیا گیا تھا۔ وہ جو اٹیچی کیس اور ٹوکری وغیرہ اٹھا کر لایا تھا وہ اب داراب ہاؤس کے گارڈز نے اٹھالی تھیں۔

دین محمد ان کی بیوی اور اسفند بمشکل آدھ گھنٹہ ہی اندر رہے ہوں گے۔ یقیناً ان کی یہ مختصر ملاقات تاجور کے ساتھ ہی تھی۔ ان کا داماد دارج اس وقت وہاں موجود ہی نہیں تھا۔ وہ اپنے کزن شکیل داراب کے ساتھ گھر کے دوسرے حصے میں تھا۔ شاید کوئی سیاسی میٹنگ وغیرہ ہو رہی ہو۔

○......❖......○

رات کو ایک بار پھر میرے زخمی لیکن ''ہونہار'' کیمرے نے مجھے حالات کی ایک مختصر سی تصویر دکھائی۔ یہ تصویر صرف آواز کی صورت میں تھی۔ آج تاجور کے شوہر نامدار کا مزاج قدرے بہتر محسوس ہوتا تھا۔ وہ بیماری کے باوجود سگریٹ نوشی سے مکمل پرہیز نہیں کرتا تھا۔ اس وقت بھی اس کی سگریٹ نوشی کی بات ہو رہی تھی۔ تاجور نے سہمی آواز میں کہا۔ ''آج پھر آپ زیادہ سگریٹ پی رہے ہیں۔''

''ہاں واقعی مجھے سگریٹ نہیں پینا چاہیے...... زہر پی لینا چاہیے۔'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

کچھ دیر گمبھیر خاموشی طاری رہی پھر اس کی آواز دوبارہ ابھری۔ ''جن شوہروں کو ایسی بیویاں مل جاتی ہیں، ان کا ''زہر پینا'' ہی بنتا ہے۔''

وہ روہانسی ہو کر بولی۔ ''میں اب تھک گئی ہوں۔ میں سمجھ گئی ہوں کہ میں آپ کو اپنی بے گناہی کا یقین نہیں دلا سکتی...... دیکھیں میں نے آپ کے کتنے سوالوں کے جواب دیئے ہیں، آپ میرے صرف ایک سوال کا جواب ہی دے دیں۔ اگر آپ میرے بارے میں ایسے خیال رکھتے تھے تو پھر...... مجھے کیوں لائے اس گھر میں؟ کیوں اتنا زور دے کر اپنایا مجھ کو؟''

''اندھا ہو گیا تھا میں۔ دیوانہ ہو گیا تھا۔ میری حرام زادی عقل نے کام کرنا بند کر دیا تھا۔'' وہ پھنکارا پھر توقف کر کے بولا۔ ''اس وقت مجھے بس ہلکا سا شک تھا...... کہ شاید کوئی چھوٹا موٹا افیئر چلا تھا تمہارا...... لیکن اب تو تمہاری ''عشق معشوقیوں'' کے دفتر کھل گئے ہیں میرے سامنے۔ وہ سرکاری سانڈ تو عیش عشرت کر کے ''قبر'' میں جا سویا اور مجھے چھوڑ گیا آگ میں جلنے کے لیے۔'' اس نے کوئی چیز پھینک کر توڑ دی۔ چھناکے کی آواز سنائی دی اور خاموشی چھا گئی۔

میرا خون کھول رہا تھا۔ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، ایک بھونڈی بکواس کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ یہ بات ماننے والی ہرگز نہیں تھی کہ شادی سے پہلے اسے تاجور کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا۔ وہ سارے نہیں تو کافی حالات جانتا تھا لیکن تاجور کی دلکشی اور خوب صورتی کی چکاچوند نے اسے جنونی کر رکھا تھا۔ وہ صرف اور صرف اسے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر وہ اپنی دبنگ ماں کے سامنے بھی ڈٹ گیا تھا اور اس نے کہا تھا کہ وہ جیسی بھی ہے وہ اسے اپنانا چاہتا ہے...... میں نے کان اپنے موبائل سے لگا رکھا تھا...... بیڈ روم کے حالات خراب ہو رہے تھے۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ ایک بار پھر جا کر دروازے پر دستک دوں اور دارج سے کہوں کہ بزر بجا ہے۔ یقیناً اس کا پارا ساتویں آسمان سے ٹکرا جاتا...... مگر تاجور کی مصیبت ٹلنے کا امکان

تو پیدا ہو جاتا۔

مجھے ایک بار پھر تاجور کی درد آمیز سسکی سنائی دی۔ غالباً دارج نے پھر اس کے بال اپنی مٹھی میں جکڑ لیے تھے۔ وہ بڑے ٹھہرے لہجے میں بولا۔ ''اچھا...... میرے پچھلے ہفتے والے سوال کا جواب تو عنایت فرما دو...... اتنے بڑے انگلش رسالے کی اتنی بڑی ایڈیٹر تم تک پہنچی کیسے؟''

''مجھے کچھ معلوم نہیں دارج۔'' وہ کراہی۔ ''وہ لوگ خود ہمارے گھر آئے تھے، میں خود تو ان کے پاس نہیں گئی تھی...... مجھے صرف اتنا پتا ہے کہ انہوں نے میرے بارے میں کہیں کچھ پڑھا تھا۔''

''میسنی مت بنو...... سب پتا ہے تمہیں۔ یہ بھی پتا ہے کہ کیا پڑھا تھا...... اور کہاں پڑھا تھا۔ بس بتانا نہیں چاہتی ہو۔''

''اگر پتا ہے تو پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''تمہارے منہ سے سننا چاہتا ہوں۔'' وہ نفرت سے پھنکارا۔

''پلیز، میرے بال چھوڑ دیں۔ درد ہو رہا ہے۔''

''تو پھر بتاؤ۔''

کچھ دیر خاموشی طاری رہی۔ شاید تاجور اپنے آنسو پونچھ رہی تھی اور خود کو کمپوز کر رہی تھی۔

میں حیران تھا، میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کس رسالے اور ایڈیٹر کی بات ہو رہی ہے۔ ابھی تک میں نے اس طرح کا کوئی ذکر نہیں سنا تھا۔

چند سیکنڈ بعد تاجور کی آواز موبائل کے اسپیکر پر ابھری۔ ''آپ جانتے ہیں جب میں ملنگی ڈیرے پر تھی، وہاں کسی مائیکل نام کے انگریز نے مجھے دیکھا تھا۔ مجھے بتائے بغیر میری تصویریں اتاری تھیں اور کہیں پر چھاپی بھی تھیں۔ انہی تصویروں کو دیکھ کر اس انگریزی رسالے کی ''مالکن'' پاکستان آئی اور پھر ہمارے گاؤں سکھیرا تک پہنچی تھی۔''

''وہ لوگ کیا چاہتے تھے؟''

''وہ کسی اشتہار میں میری تصویر دینا چاہتے تھے...... جس میں، میں بہت سے بچوں کے ساتھ کسی خاص اسپتال کے سامنے کھڑی ہوں، یہ بچوں کی خون کی بیماری، کے بارے میں کوئی اشتہار تھا۔ مجھے اس بارے میں زیادہ پتا نہیں۔ ان لوگوں نے اباجی اور چھوٹے ماموں سے ہی زیادہ بات کی تھی۔''

''اور اس کے لیے وہ تمہیں اور تمہاری فیملی کو انگلینڈ لے جانا چاہتے تھے۔ ڈھیر سارے پاؤنڈوں کی پیشکش بھی کر رہے تھے۔ تم ان کے ساتھ انگلینڈ کیوں نہیں گئیں؟''

''مم...... مجھے یہ سب کچھ ٹھیک نہیں لگا تھا...... اور میرے بڑے بھی ایسا نہیں چاہتے تھے۔''

''بکواس بند کرو۔ ہمیشہ کی طرح جھوٹ بول رہی ہو۔ اصل بات چھپا رہی ہو...... اصل بات یہ ہے کہ تمہاری ''عاشقی'' تمہارے اندر پھڑ پھڑا رہی تھی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب شکیل اور اس کی بیگم تمہیں اپنے ساتھ جاماجی لے جانے کا پروگرام بنا رہے تھے...... تاکہ تم وہاں جا کر اپنے خبیث عاشق کی جان بچا سکو...... اسے راضی کر سکو کہ وہ اپنی ضد چھوڑ دے اور اپنے مفرور ساتھیوں کے بارے میں بتا کر تشدد اور ہلاکت سے بچ جائے، میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں ناں؟''

دوسری طرف خاموشی رہی، تاجور نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دارج بات آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''اب تم یہ فرماؤ گی کہ تم شکیل اور اس کی بیگم کو انکار نہیں کر سکتی تھیں۔ اس لیے میگزین ایڈیٹر کی بات ماننے کے بجائے شکیل اور اس کی بیگم کے ساتھ برونائی اور پھر جاماجی جا پہنچیں...... جہاں اپنے اس حسن پرست عاشق شاہ زیب کو بچاتے بچاتے تمہاری اپنی عزت لٹنے کے قوی امکان پیدا ہو گئے۔ یہی کہو گی ناں؟''

وہ منمنائی۔ ''یہ سچ ہے دارج! شکیل صاحب اور ان کی بیگم مجھے جلد از جلد جاماجی پہنچانا چاہتے تھے......''

''یہ بھی سفید جھوٹ ہے...... بکواس ہے۔'' وہ اتنی زور سے دھاڑا کہ اس کی آواز کی دھیمی سی گونج مجھے بیڈ روم سے براہِ راست بھی سنائی دی۔ اسپیکر پر اس کی زہر آلود آواز ابھری۔ ''شکیل بھائی نے مجھے سب کچھ بتایا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جاماجی میں شاہ زیب کے حالات سن کر تمہاری حالت بری ہو گئی تھی۔ شکیل بھائی سے زیادہ تم خود جاماجی جانے کے لیے بے تاب ہو گئی تھیں...... اپنے عاشق کی مصیبت کے بارے میں جان کر تمہارا دل چاہتا تھا کہ تمہارے پنکھ لگ جائیں اور تم اُڑ کر اس کے پاس پہنچ جاؤ۔ دو تین روز بعد جب یہ ایڈیٹر والا معاملہ سامنے آیا تو شکیل بھائی نے خود تم سے اور تمہارے گھر والوں سے کہا تھا کہ یہ ایک بڑی پیشکش ہے، وہ لوگ اپنے میگزین کے لیے بس چند تصویریں اتارنا چاہتے ہیں۔ اگر جاماجی کا پروگرام چار دن لیٹ ہو بھی جائے تو کوئی بات نہیں...... لیکن...... تمہارے اندر کی تڑپ تمہیں اُڑا کر سیدھا اپنے عاشق کی گود میں لے گئی۔ واہ...... کیا کیا قربانیاں دی ہیں تم نے اس حرصی،

عورت باز کے لیے...... وٹ اے ریلیشن ...... وٹ اے ریلیشن۔'' وہ جنونی انداز میں گرجا، اس نے شاید ایک بار پھر تاجور کے بال مٹھی میں جکڑے تھے اور اسے مارنے کی کوشش کی تھی۔

ایک زوردار کھٹکا سنائی دیا، جیسے کوئی بھاری چیز فرش پر گری ہو۔ مجھے یہ شک بھی ہوا کہ شاید تاجور چلائی ہے۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ میرے کمرے میں موجود بزر بج اٹھا اور سرخ روشنی اسپارک کرنے لگی۔ میں تیزی سے نکلا اور لپکتا ہوا دارج کے بیڈ روم تک پہنچا۔ دستک دینے کی نوبت نہیں آئی۔ میرے پہنچنے سے پہلے ہی دروازہ کھل گیا۔ تاجور کی ہراساں صورت دکھائی دی۔ اس کے حسین بال، اس وقت کسی پرندے کے گھونسلے کا سا منظر پیش کررہے تھے۔ اس نے کمرے کی طرف اشارہ کیا اور پکار کر بولی۔ ''وہ گر گئے ہیں۔''

میں اندر نائٹ بلب کی نیلگوں روشنی میں پہنچا۔ دارج اوندھے منہ قالین پر گرا ہوا تھا۔ وہیل چیئر بھی اس پر الٹی ہوئی تھی۔ وہ سیدھا ہونے کی ناکام کوشش کررہا تھا۔ وہیل چیئر کا کوئی بٹن دب گیا تھا اور اس کے پہیے مسلسل الٹ سمت میں حرکت کررہے تھے۔ میں نے پہیے روک کر چیئر کو سیدھا کیا پھر تاجور کے ساتھ مل کر دارج کو بمشکل اٹھایا۔ اس کے منہ سے خون رِس رہا تھا۔ اس کی کمزور ٹانگیں توری کی طرح لٹک رہی تھیں مگر بالائی جسم بھاری تھا۔ اسے بستر پر نیم دراز کرنے میں کافی دشواری پیش آئی۔ اسی دوران میں چراغ کا جن آدم خاں بھی ادھ کھلے دروازے پر ''ناک'' کرکے اندر آگیا۔

''کیا ہوا میرے سرکار؟'' وہ سکہ بند غلاموں کے انداز میں بولا۔

دارج نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بتایا کہ بچ بچاؤ ہوگیا ہے پھر اس نے ہم دونوں کو باہر چلے جانے کے لیے کہا۔ تاجور اس کے قریب ہی بیٹھ گئی تھی اور پریشانی کے عالم میں اپنے پلو سے اس کے ہونٹوں سے رِسنے والا خون پونچھ رہی تھی۔

''ڈاکٹر کی ضرورت تو نہیں سرکار؟'' آدم خاں نے پوچھا۔

''نہیں۔'' وہ خشک لہجے میں بولا اور ایک بار پھر ہاتھ کے اشارے سے ہمیں باہر جانے کے لیے کہا۔

ہم باہر نکل آئے، دروازہ پھر سے لاک ہوگیا...... چند منٹ بعد میں پھر اپنے کمرے میں تھا۔ میں نے موبائل پر منی کیمرے کی ''اپلی کیشن'' آن کی۔ اب کمرے میں سے جو آوازیں آرہی تھیں وہ بہت دھیمی تھیں۔ گرنے اور چوٹ کھانے کے بعد، غالباً دارج کا آتشیں غیظ وغضب عارضی طور پر ٹھنڈا ہوگیا تھا۔ تاجور ایک خدمت گار کی طرح اس کے اردگرد موجود تھی۔

کچھ دیر پہلے میں نے اپنے منی کیمرے کے ذریعے جو گفتگو سنی تھی وہ دماغ میں ہلچل مچا رہی تھی۔ قریباً ایک سال بعد آج مجھ پر یہ انکشاف ہوا تھا کہ جب تاجور مجھے امریکی قسائی لونگ کے چنگل سے نکالنے کے لیے جاماجی پہنچی تھی تو اس میں اس کی اپنی مرضی اور شدید خواہش بھی شامل تھی۔ ایک سیدھی سادی، عام دیہاتی لڑکی ہونے کے باوجود اس نے غیر مانوس لوگوں کے ساتھ غیر ملک کا سفر کیا تھا اور خود کو شدید ترین خطرات میں ڈالا تھا...... ہاں وہ کرتی تھی پیار...... پیار کے بغیر اس طرح کی ہمتیں انسان کے اندر پیدا ہو ہی نہیں سکتیں، میرا دل درد سے بھر گیا۔

○......❖......○

میرا سینہ جل رہا تھا۔ یہاں جو کچھ تاجور کے ساتھ ہو رہا تھا، وہ ہرگز ہرگز اس کے لائق نہیں تھی۔ وہ تو چاند گڑھی کی ست رنگی فضاؤں کا ایک خوش رنگ پھول تھی اور اسے ایک تاریک حبس زدہ چار دیواری میں مرجھانے اور پتی پتی ہونے کے لیے بند کر دیا گیا تھا۔

تاجور کو مارنے کی کوشش میں دارج اپنی وہیل چیئر سے گرا تھا۔ اس کی ناک سوج کر کپا ہوگئی تھی اور اس تبدیلی نے اس کی شکل کو کچھ اور بھی منحوس کر ڈالا تھا۔ وہ چھوٹی چھوٹی آنکھوں والا ایک خونخوار بھیڑیا ہی دکھائی دیتا تھا۔ اس کی دبنگ والدہ اس واقعے کے بعد مسلسل اس کے اردگرد موجود تھی اور یقیناً اس نے اپنی بہو تاجور کی شامت لا رکھی ہوگی۔ تاجور کا یہ قصور کم نہیں تھا کہ اسے تھپڑ مارنے یا اس کے بال کھینچنے کی کوشش میں اس کا اپاہج بیٹا کرسی سے گرا ہے۔ اس نے کیوں نا اس طریقے سے بال کھچوائے یا تھپڑ کھایا کہ دارج کرسی پر رہتا اور فرش پر نہ گرتا۔

اس رات کو دس بجے کے لگ بھگ پھر میرے موبائل کے ریسیور پر دارج کی چیخ چیخ سنائی دی۔ لگتا تھا کہ بال کی کھال اتارنا اس کی عادت ہے۔ اس خبیث نے بحث کا سلسلہ وہیں سے جوڑ دیا تھا، جہاں کل اس کے گرنے سے ٹوٹا تھا۔ اس نے پھر ملنگی ڈیرے والی کتھا چھیڑ دی تھی اور تاجور سے کہہ رہا تھا کہ وہاں اس شخص مائیکل نے اس کی جو تصویریں اتاری تھیں، وہ بے شمار لوگوں تک پہنچی ہیں۔ ان تصویروں اور اس مضمون کی وجہ سے ان لوگوں نے لاکھوں پاؤنڈ کمائے ہیں۔ اب مزید لوگ بھی پاؤنڈ اور ڈالر کمانے کے لیے میری سوہنی بیوی کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ میرے لیے اور داراب فیملی کے لیے یہ کتنی بڑی 'عزت' کی بات ہے۔

اس کے جسم کے بہت سے اعضا حرکت نہیں کرتے تھے، شاید وہ یہ کسر اپنی زبان کو

مسلسل حرکت دے کر پوری کر رہا تھا۔

اگلے روز دارج کی ناک کی ہڈی میں شدید درد شروع ہو گیا اور اسے فوراً اسپتال جانا پڑا۔ اس کی والدہ اور خود شکیل داراب بھی اس کے ساتھ اسپتال گئے۔ تاجور گھر پر ہی تھی۔ اس روز تاجور سے بات کرنے کا مجھے ایک زبردست موقع مل گیا۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا کہ دروازے پر مدھم دستک ہوئی۔

''آجاؤ۔'' میں نے کہا۔

میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اندر آنے والی خود تاجور ہو گی۔ وہ ذرا لنگڑاتی ہوئی سی آئی اور بولی۔ ''کوئی اچھی آئنٹ مینٹ ہو گی یہاں؟''

''کیوں، کیا ہوا؟'' میں نے اس کے پاؤں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اس کے پاؤں کی ایک انگلی نیلی ہو رہی تھی مگر کوئی کٹ وغیرہ نہیں تھا۔ ایسی چوٹ بغیر کسی ٹریٹ مینٹ کے بھی ٹھیک ہو جاتی ہے مگر شاید اس نے یہاں کمرے میں آنے کے لیے بہانہ بنایا تھا۔

میں نے جلدی سے ڈریسنگ کا سامان نکالا، وہ بولی۔ ''نہیں، بس تھوڑی سی آئنٹ مینٹ دے دیں، میں خود ہی لگا لیتی ہوں۔''

شاید وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ میں علاج کے لیے بھی اس کے جسم کو چھوؤں۔ میں نے آئنٹ مینٹ، روئی اور میڈیکل ٹیپ وغیرہ اسے دے دی۔ وہ اپنے پاؤں کو دوسری کرسی پر رکھ کر خود ہی انگلی کی ڈریسنگ کرنے لگی۔ شاید یہ چوٹ بھی کسی زبردستی کا نتیجہ ہی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس بار شوہر کے بجائے شوہر کی ماں نے اسے یہ تکلیف پہنچائی ہو لیکن پوچھنا بے کار تھا۔ اس نے کہاں بتانا تھا۔ ایک مرتبہ پہلے بھی وہ اسی طرح ''سیڑھیوں'' سے گری تھی۔ اس ''گرنے'' پر میڈیا پر تبصرے بھی چل گئے تھے۔

میری نظر اس کے چہرے پر پڑی اور میں چونک گیا۔ بظاہر تو وہ اپنی انگلی کی طرف متوجہ تھی لیکن شدید جذباتی کیفیت میں تھی۔ آنکھوں کے کٹوروں میں وہی آنسو تھے جن سے میری جان پہچان بہت پرانی ہو چکی تھی۔ وہ میری طرف دیکھے بغیر بولی۔ ''پلیز شاہ زیب! اگر آپ کے دل میں میرے لیے تھوڑی بہت بھی جگہ ہے تو میں ہاتھ جوڑ کر آپ کی منت کرتی ہوں، آپ یہاں سے چلے جائیں۔ میری مشکلوں کو اور نہ بڑھائیں۔ ورنہ میرے پاس مرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہے گا۔''

میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''تم زندہ ہی کہاں ہو جو مرو گی۔ تم صرف زندہ نظر آتی

ہو۔ کچھ رحم کرو اپنے آپ پر...... کچھ رحم کرو...... اپنے گھر والوں کی حالت پر...... دیکھو، ان کی ذلت کو محسوس کرو۔ اپنے چھوٹے بھائیوں کی بے چارگی پر نظر ڈالو۔ ان کے ساتھ یہ جو کچھ ہو رہا ہے، تمہاری وجہ سے ہو رہا ہے اور جو تمہارے ساتھ ہو رہا ہے وہ بھی سنہری حرفوں سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ کیوں لعنت نہیں بھیج دیتی ہو ایسی زندگی پر۔ کیوں ایک تھپڑ نہیں مارتی ہو اس کمینے کے منہ پر جس نے تمہیں زرخرید لونڈیوں سے بھی بری حالت میں پہنچایا ہوا ہے؟ لوگوں کے سامنے وہ حرام زادہ تمہیں آپ...... اور آیئے کہہ کر بلاتا ہے اور تنہائی میں تمہیں ایسی گندی گالیوں سے نوازتا ہے جن کو سن کر شیطان بھی شرمانے لگے......"

"ایسا کچھ نہیں ہے۔ آپ کیوں غلط اندازے لگاتے پھر رہے ہیں۔ آپ کو...... آپ کو کوئی حق نہیں ایسی باتیں کرنے کا۔"

میں اسے کیسے بتاتا، میں غلط اندازے نہیں لگا رہا۔ میں اپنے کانوں سے وہ مغلظات سن رہا ہوں جو اس کے بیڈروم میں گونجتے ہیں۔ میں ان دونوں کی خلوت کا ایک ایک لفظ سن رہا ہوں...... میں یہ سب نہیں کہہ سکا لیکن میں نے اتنا ضرور کہا کہ وہ بے حس ہوتی جا رہی ہے اور ایک روز یہ بے حسی اسے پستی کی انتہا میں گرا دے گی۔ وہ ایک ایسا پتھر ہو گی جو اپنے شوہر اور اپنے سسرالیوں کی ٹھوکروں سے گھر کی چار دیواری میں لڑھکتا پھرے گا اور کوئی اسے اٹھا کر ایک طرف رکھنے کی زحمت بھی نہیں کرے گا۔

تین چار منٹ کے اندر ہمارے درمیان دھیمی آواز میں نہایت تند و تیز گفتگو ہوئی۔ وہ سرتاپا ایک شوہر پرست بیوی نظر آ رہی تھی۔ جب میں نے کہا۔ "طلاق لے لو اس حرام زادے سے۔" اس کا رنگ ہلدی ہو گیا۔ وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی، اس کے پورے جسم پر ہلکی سی لرزش تھی۔ میری طرف دیکھے بغیر ذرا لنگڑاتی ہوئی دروازے کی طرف گئی، پھر رکی، مڑ کر میری طرف دیکھا اور بولی۔

"اگر آپ...... کل تک یہاں سے چلے نہیں گئے تو میرا مرا ہوا منہ دیکھیں گے۔"

اس نے یہ فقرہ ادا کرتے ہوئے ایک ایک لفظ پر زور دیا تھا اور یہ ایسا لہجہ تھا جس کا ارتعاش میرے جسم سے گزر کر میری ہڈیوں کے گودے تک میں چلا گیا۔ مجھے ایسے لگا جیسے وہ آج مجھ سے ہر بندھن توڑ گئی ہے...... ہر معمولی سے معمولی تعلق کو بھی ختم کر گئی ہے اور اگر میں نے اس کی بات نہ مانی تو واقعی یہاں اس چار دیواری میں کچھ بہت برا ہو جائے گا۔ میرے سینے میں آتش تھی اور وہ آنسو بن کر میری آنکھوں میں آنا چاہتی تھی لیکن میں نے اسے آنکھوں تک نہیں آنے دیا...... انیق کی موت پر بھی میں کہاں رویا تھا۔ یہ آنسو ہی تو

توانائی تھے۔ یہ پارا بن کر میرے جسم میں پھیل رہے تھے۔ مجھے زندگی اور موت سے بے پروا کر رہے تھے۔ اس گھڑی میں نے فیصلہ کرلیا کہ میں مزید اس چار دیواری میں نہیں رہوں گا۔

دو ڈھائی گھنٹے بعد دارج اسپتال سے واپس آ گیا۔ اس کی ناک کے ایکسرے وغیرہ ہوئے تھے اور ریڑھ کی ہڈی کا بھی عمومی معائنہ ہوا تھا۔ اس کا آپریشن اب ایک ہفتہ آگے چلا گیا تھا۔ دارج کے آنے کے بعد میں اس کا لباس تبدیل کروانے اس کے بیڈ روم میں گیا۔ اس کی دبنگ والدہ بھی وہیں پر موجود تھی۔ وہ فون پر کسی ہیوی ویٹ سیاست داں سے تند و تیز باتیں کر رہی تھی۔ اس کی اور دارج کی نظر بچا کر میں نے اپنا زخمی کیمرا اس کی جگہ سے اتار لیا۔

شام تک میں داراب ہاؤس سے نکل آیا۔ نکلنے سے پہلے ہی میں نے داؤد بھاؤ کو فون کر دیا تھا اور سعید کھوکھر کو بھی۔ میں نے سعید کھوکھر سے کہہ دیا تھا کہ وہ اب اپنی ڈیوٹی پر واپس آسکتا ہے۔ اس کے باپ کی حالت بہتر تھی اور وہ خود بھی چاہتا تھا کہ بھانڈا پھوٹنے سے پہلے پہلے داراب ہاؤس میں پھر سے اپنی ڈیوٹی سنبھال لے۔

○......❖......○

بعد از شام آٹھ بجے کے لگ بھگ میں اسی چھوٹے سے ہوٹل میں موجود تھا جہاں پہلوان حشمت اور فخر ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہ دونوں بے قرار تھے کہ میں انہیں داراب ہاؤس میں گزارے ہوئے چار پانچ دنوں کی رُوداد سناؤں۔ میں نے مختصراً دونوں کو آگاہ کیا، بہر حال تنہائی میں فخر کو ذرا تفصیل سے بھی بتا دیا۔ فخر بھی داراب ہاؤس میں تاجور کی حالتِ زار کا سن کر ملول ہوا۔ فخر کا زیادہ عرصہ یورپ میں ہی گزرا تھا۔ تاجور جس مشرقیت اور شوہر پرستی کا مظاہرہ کر رہی تھی وہ اس کے لیے کافی حیران کن تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایک لڑکی اتنا کچھ سہنے کے بعد بھی اپنے شوہر کی مٹھی چاپی کرتی ہے اور اس کے آگے پیچھے پھرتی ہے۔

پہلوان حشمت اپنی جگہ بہت پریشان تھا۔ فخر کی زبانی اسے معلوم ہو گیا تھا کہ ہانا وانی کے غنڈوں نے غیظ و غضب کے عالم میں ''میری قبر'' کو بھی نہیں بخشا۔ اسے دو ماہ پہلے ادھیڑ ڈالا تھا اور کتبے کو گولیوں سے چھلنی کر دیا تھا۔

فخر ہوٹل سے نیچے اتر کر سگریٹ وغیرہ لینے بازار گیا ہوا تھا۔ پہلوان حشمت نے دروازے کو اندر سے بولٹ کیا اور بڑے تفکر سے بولا۔ ''شاہ زیب! مجھے تمہاری طرف سے بہت فکر لاحق ہو گئی ہے...... وہ ٹیکساری گینگ والی دشمنی ہی کم نا ہیں تھی اب یہ بدذات عورت

بھی تمہارے پیش پڑ گئی ہے۔ میں تو کہوت ہوں کہ تم کچھ دن کے لیے کہیں غائب ہی ہو جاؤ۔''

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''چاچا حشمت میں غائب ہی تو ہوں۔ اپنے دشمنوں کے سامنے سے بھی گزر جاتا ہوں اور وہ مجھے پہچان نہیں سکتے۔''

''لیکن یہ بدذات زنانی اور طرح کی ہے۔ سب کہوت ہیں کہ یہ کالا علم وغیرہ بھی جانت ہے۔ کیا پتا کہ تمہاری بدلی ہوئی شکل کے ساتھ بھی یہ تمہیں پہچان لے اور نہ بھی پہچانے تو رضوان اور فخر وغیرہ تو اس کے نشانے پر ہی ہیں۔ تم سب کو سیلف ڈیفنڈ (سیلف ڈیفنس) سیکھنے کی بہت ضرورت ہے اور میرے خیال میں ہماری دیسی کشتی سے زیادہ ''سیلف ڈیفنڈ'' کوئی بھی ناہیں سکھاتا۔''

''تو پھر؟'' میں نے پوچھا۔

''وہاں سردار سجاول کے ڈیرے پر میں نے تمہاری اچھی بھلی ٹریننگ شروع کر دی تھی اور تمہیں کافی داؤ پیچ آ بھی گئے تھے مگر پھر تم نے سارا کھیل ہی بگاڑ دیا۔ وہ کیا کہوت ہیں کہ نہ رہا بانس، نہ رادھا ناچی۔ تم تاجور کو اور مجھے لے کر نکل آئے سجاول کے ڈیرے سے...... میں تو کہوت ہوں تھوڑا بہت سیکھ لو مجھ سے۔ یاد کرو گے اور زندگی میں تمہارے کام آوے گا۔ یہ جوڈو شوڈو اور باکسنگ کچھ ناہیں ہیں پہلوانی کے سامنے۔''

میرا موڈ کچھ اور طرح کا تھا مگر پہلوان پر بھوت سوار تھا کہ مجھے آج ہی ''سیلف ڈیفنڈ'' میں طاق کر کے رہے گا بلکہ وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ فخر اور رضوان بھی اس کی بے پایاں صلاحیتوں سے فائدہ اٹھا کر خود کو کسی قابل کر لیں۔ وہ علامہ اقبال کے معروف شعر کی ٹانگ توڑتے ہوئے بولا۔

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں
راہ کس کو دکھائیں، کسی میں اتنی عقل ہی نہیں

وہ مجھے دیسی کشتی کے مزید داؤ پیچ سکھانے پر پوری طرح کمربستہ ہو گیا۔ یہ تین بیڈ کا بڑا کمرا تھا۔ ایک طرف کافی جگہ خالی تھی۔ شدید جذبۂ ہمدردی کے تحت اس نے مجھے مختلف طرح کی ''پکڑیں'' اور دھوبی پٹکے اور پٹھیاں وغیرہ سکھانا شروع کر دیں۔ میں سعادت مندی سے سیکھتا رہا...... اور اس کی تعریف بھی کرتا رہا۔ وہ ماضی قریب کے یورپی چمپئن کو بالکل ابتدائی چیزیں سکھا رہا تھا جیسے یونیورسٹی کے طالب علم کو بڑی اور چھوٹی اے بی سی لکھنا سکھائی جائے۔ ہانپی ہوئی آواز میں بولا۔ ''شاہ زیب سچ کہوت ہوں تم میں ٹائیلٹ

(ٹیلنٹ) بہت ہے، بس تھوڑی سی محنت کی ضرورت ہے۔ وہ کہتے ہیں ناں کہ...... ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی خونریز ہے ساقی...... تم نے سجاول جیسے بندے کو نیچا دکھایا تھا تو...... کوئی بات تو ہے ناں تم میں۔''

اسی دوران میں فخر بھی آ گیا۔ فخر مکس مارشل آرٹ کے ان فائٹرز میں سے تھا جنہوں نے Ring کے اندر اور باہر بڑے بڑے سورماؤں کو ناکوں چنے چبوائے تھے، تاہم پہلوان نے فوراً سے پہلے اسے بھی اپنے ''احاطۂ شاگردی'' میں لے لیا۔ میں نے آنکھ کے اشارے سے فخر کو سمجھایا کہ پہلوان جو کر رہا ہے اسے کرنے دو۔ پہلوان کی یہی پُر خلوص معصومیت ہی تو اس کی شخصیت کا خاصہ تھی۔ وہ اپنی عقل سمجھ کے مطابق ہر وقت ہر کسی کے کام آنے کے لیے تیار ہوتا تھا۔

ہماری ''ٹریننگ'' کے دوران میں ایک موقع پر پہلوان نے مجھے اور فخر کو ایک ساتھ اڑنگا لگایا اور نیچے گرنے کو کہا۔ ہم نے عمل کیا۔ پہلوان نے میرا بازو مروڑ کر مجھے الٹا کیا اور اپنا بھاری بھرکم پاؤں میری کمر پر رکھ کر بولا۔ ''اگر تمہارے مخالف کے ہاتھ میں پستول بھی ہوگا تو پکے ہوئے آم کی طرح نیچے گر جاوے گا۔ پاؤں کا پریشر ذرا سا اور بڑھاؤ گے تو بچہ جی کا کندھا بھی اکھڑ جاوے گا ان شاء اللہ۔''

اس نے جب پاؤں کا دباؤ بڑھا کر دکھانا چاہا تو اس کے اپنے گوڈے کا کڑاکا نکل گیا۔ اس نے مجھے چھوڑ دیا پھر ہم دونوں کو اٹھنے کا کہا...... اب اس نے پریکٹیکل کے بجائے تھیوری پر اکتفا بہتر سمجھا۔ ہمیں زبانی کلامی مختلف داؤ سمجھانے لگا۔ اس دھما چوکڑی میں پہلوان کے زخمی جبڑے کو بھی تھوڑی سی دب سہنا پڑی تھی۔ اس سے ٹھیک سے بولا نہیں جا رہا تھا اس لیے تھیوری کا پیریڈ بھی جلد ہی ختم ہو گیا۔

رات کو میں دیر تک تاجور کے اور اپنے حالات کے بارے میں سوچتا رہا۔ ایک عجیب سی دلدل تھی جو مجھے اپنے اندر غرقاب نہیں کرتی تھی اور رہائی بھی نہیں دیتی تھی۔ سوچ کی لہروں پر سفر کرتے کرتے میرا دھیان ایک بار پھر سیف اور اس کے گھر والوں کی طرف چلا گیا۔ سیف کی موت کے بعد اس کی ماں اور پھر اس کا باپ دونوں یہ صدمہ نہیں سہہ سکے تھے اور چل بسے تھے اور سیف کا صدمہ ہی تھا جسے شاید میرا اور تاجور کا پیار بھی نہیں سہہ سکا تھا...... اور چل بسا تھا۔ وہ مجھے بالکل کنارے پر آ کر چھوڑ گئی تھی۔ میرا خیال تاجور کے ان جملوں کی طرف چلا گیا جو چند ہفتے پہلے ایک ملاقات میں اس نے مجھ سے کہے تھے (اس وقت ہم دونوں ایک چھینی ہوئی ٹیکسی پر سوار تاجور کی قیام گاہ کی طرف جا رہے تھے) تاجور

نے کہا تھا...... شاہ زیب! میری ایک بات ضرور مانیے گا۔ سیف کی یتیم بہنوں کو تنہا نہ چھوڑیے گا۔ آپ ان کا خیال رکھیں گے تو شاید اوپر والا میرے اور آپ کے دکھ بھی کم کر دے۔

مجھے افسوس ہوا کہ تاجور سے وعدے کے باوجود میں ابھی تک سیف کی تینوں بے آسرا بہنوں کی پوری خبر گیری نہیں کر سکا تھا۔ میں نے اسی وقت پہلوان حشمت کو اپنے پاس بلایا۔ میں نے ایک معقول رقم پہلوان کے سپرد کی اور اس سے درخواست کی کہ وہ سکھیرا گاؤں کا ایک چکر لگا آئے۔

''اس رقم کا کیا کرنا ہے؟'' پہلوان نے اپنے مخصوص انداز میں پوچھا۔

''سیف کی بہنوں کا ہم پر حق ہے۔ ہمیں ان کا خیال رکھنا ہوگا۔ سنا ہے کہ ان کے ایک چچا آکر ان کے پاس رہنے لگے ہیں، آپ یہ رقم ان کے حوالے کریں اور ان کے گھریلو حالات کی پوری خبر لے کر آئیں۔''

پہلوان نے فوری رضامندی ظاہر کر دی۔ ویسے بھی پہلوان یہاں کے موجودہ حالات سے سخت ڈسٹرب تھا۔ اس کے ذہن میں یہ وہم بیٹھ گیا تھا کہ ہاناوانی کے لوگ اچانک پھر حملہ کریں گے اور رضوان ٹی کے ساتھ ساتھ مولانا حبیب کو بھی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوگا۔ (حالانکہ ہاناوانی والے معاملے سے مولانا حبیب کا کوئی تعلق نہیں تھا)

میری درخواست پر پہلوان حشمت اسی سہ پہر سکھیرا جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس کی روانگی کے وقت میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ میں نے پہلوان سے حاذق ذکری مرحوم کے اس خط کا ذکر کیا جو میری غفلت کے سبب ابھی تک میری نظر سے اوجھل تھا اور سکھیرا میں چوہدری دین محمد کے ڈیرے کے ایک کمرے میں پڑا تھا۔ میں نے پہلوان سے کہا کہ وہ ڈیرے پر جا کر اس خط کو ڈھونڈے، اگر مل جائے تو لے آئے......

پہلوان چلا گیا۔ مجھے خط کے سلسلے میں زیادہ امید نہیں تھی۔ تاہم اگلے روز سہ پہر کو جب پہلوان واپس آیا تو اس کے پاس وہ کئی ماہ پرانا خط موجود تھا جو جاما جی میں جناب حاذق ذکری نے مجھے دیا تھا۔ وہ وہیں ڈیرے کی ایک الماری میں گرد آلود اخباروں کے نیچے پڑا تھا۔ اسے کھولا تک نہیں گیا تھا۔ سیف کی بہنوں کے حوالے سے میں نے پہلوان کو جو ہدایات دی تھیں، اس نے ان پر پورا عمل کیا تھا۔

رات کو جب فخر سو گیا اور پہلوان کے خراٹے بھی کمرے میں گونجنے لگے تو میں نے موبائل فون کی ٹارچ آن کی اور خط کھول کر پڑھنے لگا۔ یہ خط اردو میں لکھا گیا تھا۔ شاید

جناب حاذق ذکری نے اپنے کسی اردودان مرید سے لکھوایا تھا۔ باریک لکھائی تھی۔ تفصیل سے لکھا گیا یہ خط تین صفحات پر مشتمل تھا۔ اس خط کا لب لباب کچھ یوں تھا۔

''شاہ زیب! مجھے پوری امید ہے کہ تم خیر خیریت سے اپنے وطن اور اپنے لوگوں کے درمیان پہنچ جاؤ گے۔ یہاں جاماجی کے لوگوں کے لیے تم نے جو کچھ کیا ہے، اسے یہاں کے باشندے کبھی بھلا نہیں سکیں گے۔ تم ان کی تاریخ کا حصہ بن گئے ہو۔ اپنی برداشت اور حوصلے سے تم نے اہلِ جاماجی میں ایک ایسی روح پھونکی ہے جس نے انہیں کھلے آسمان پر لمبی پروازوں کا حوصلہ دیا ہے۔ شاباش...... میرے بچے۔''

اس تمہید کے بعد جناب حاذق ذکر نے لکھا تھا۔

''شاہ زیب! یہاں کے لوگ مجھے بہت بڑا پیش گو کہتے ہیں لیکن حقیقت یہی ہے کہ مجھے بھی اپنے اگلے سانس کا پتا نہیں کہ آئے گا یا نہیں۔ یہ ساری پیش گوئی درحقیقت قیافہ شناسی ہے۔ گہری سوچ، تجربہ، مشاہدہ اور مراقبہ بہت سے لوگوں کو پیش گوئی کے درجے پر پہنچا دیتا ہے۔ میں بھی شاید انہی میں سے ایک ہوں۔ کسی وقت مجھے الہام اور القا کا شبہ ہوتا ہے......اور اکثر یہ الہام اور القا درست ثابت ہو جاتا ہے۔ تمہارے بارے میں جو القا مجھے ہو رہے ہیں، میں ان کے بارے میں تمہیں مختصراً بتا دیتا ہوں...... مجھے لگتا ہے کہ ہاناوانی تمہاری جرأتوں کو اتنی آسانی سے معاف نہیں کرے گی۔ وہ میری بہن ہے، میں اس کی خصلتوں کو بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم یہاں سے چلے جاؤ گے تو وہ دن رات انگاروں پر لوٹے گی۔ شاید تمہیں حیرانی ہو لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ تمہارا پیچھا کرے گی۔ ممکن ہے کہ وہ تمہارے کسی ساتھی کو قبضے میں کرے اور اس کو اپنے انتقام کے لیے استعمال کرے۔ اس حوالے سے انیق یا سجاول کو شدید خطرہ لاحق ہوگا۔ اگر ان دونوں میں سے کسی کے رویے میں تمہیں اچانک کوئی اہم تبدیلی نظر آئے تو یہ شدید خطرے کی گھنٹی ہوگی۔ عین ممکن ہے کہ اس کا تعلق ہاناوانی کی دشمنی سے ہو۔

''مجھے لگتا ہے کہ یورپ میں تم نے جو ایک بڑی دشمنی پال رکھی ہے وہ بھی عنقریب تمہارا تعاقب کر سکتی ہے۔ وہ گینگسٹرز تمہیں ڈھونڈتے ہوئے تم تک پہنچ سکتے ہیں۔ تمہیں ان کی طرف سے بڑی احتیاط کی ضرورت ہوگی۔ یہ لوگ تمہارے وطن میں پہنچ کر عام افراد کو بھی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ میرے خیال میں تو تمہارے

اور تمہارے قریبی ساتھیوں کے لیے بہتر یہی ہے کہ یہاں سے جانے کے بعد کم از کم تین چار ماہ کے لیے بالکل روپوش ہو جاؤ۔ اس اثنا میں تم اپنے اور تاجور کے بارے میں بھی کچھ نہ کچھ ضرور سوچ لو۔ تاجور کا ذکر آیا ہے تو میں چند سطور اس کے بارے میں بھی لکھنا چاہوں گا۔ شاہ زیب بیٹا جہاں تک میں اس لڑکی کو سمجھ سکا ہوں وہ تم سے بے انتہا پیار کرتی ہے۔ یہ پیار سطحی نہیں ہے اس میں اتھاہ گہرائی اور ٹھہراؤ ہے۔ اس پیار کی شدت سے زیادہ مجھے اس کی گہرائی اور اس کے ٹھہراؤ نے متاثر کیا۔ یہ عشق ہے اور مجھے لگتا ہے کہ اس کی جڑیں اس خوبرو لڑکی کے اندر بہت آگے تک جا چکی ہیں۔ یہ کبھی تم کو بتائے گی نہیں مگر تمہارے بغیر اگر اسے زندہ رہنا پڑا تو ایک مسلسل عذاب سے کم نہیں ہوگا۔ میرا مشورہ ہے کہ تم اسے جلد سے جلد اپنا لو۔ کہیں یہ نہ ہو کہ کوئی دیوار تمہارے درمیان آ جائے۔ اگر خدانخواستہ ایسا ہو گیا اور اس لڑکی کی زندگی کسی اور کی زندگی سے منتھی ہو گئی تو پھر واپسی قریباً ناممکن ہو جائے گی۔

"شاہ زیب! جب تم لڑائی کے محاذ پر تھے تو یہ لڑکی میرے پاس تھی۔ ان دنوں میں نے اس کی حالتِ زار کو دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ وہ راتوں کا زیادہ تر حصہ جاگ کر گزارتی رہی ہے، روتی رہی ہے اور تمہاری سلامتی کی دعائیں کرتی رہی ہے۔ ایک دن میں نے اس سے کہا کہ صدقہ آفتوں سے بچاتا ہے اور اگر کسی کو آفتوں سے بچانے کے لیے وہ شخص صدقہ دے جو اس کا شریکِ زندگی بھی بننا چاہتا ہے تو اثرات غیر معمولی ہو جاتے ہیں۔ اس دن تاجور نے اپنی طلائی بالیاں اور چوڑیاں تک اتار کر ایک حاجت مند بیوہ کو دے دی تھیں اور یہیں پر بس نہیں، اس نے تمہاری سلامتی کی خاطر خدا ترسی کا ایک اور بڑا کام بھی کیا۔ شاید میں تمہیں نہ ہی بتاتا (کیونکہ اس نے منع کیا تھا) مگر میرا دل چاہتا ہے کہ میں اپنی بات کا وزن بڑھانے کے لیے یہ بات بھی تمہیں بتا ہی دوں...... تاجور نے انہی دنوں کھڑے کھڑے ایک خطیر رقم تمہاری خاطر میری جھولی میں ڈال دی تاکہ میں اسے جاماجی کی لڑائی کے زخمی بچوں اور پناہ گزینوں کی امداد اور بحالی پر خرچ کر سکوں۔ جانتے ہو کہ کتنی رقم تھی...... یہ قریباً ڈیڑھ لاکھ برطانوی پاؤنڈ تھے جو تمہارے ملک کی کرنسی کے مطابق تقریباً ایک کروڑ اسّی لاکھ روپے بنتے ہیں۔ تمہارے ذہن میں یہ سوال آئے گا کہ یہ رقم کہاں سے آئی۔ اس رقم کے پیچھے ایک چھوٹی سی کہانی ہے اور شاید تم بھی اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ جانتے ہو۔

''پاکستان میں جب تم اور تاجور کسی ''ملنگی'' نامی جگہ پر قید تھے تو مائیکل نام کے ایک شخص نے تاجور کی کچھ تصاویر اتاری تھیں اور پھر اپنی کتاب میں تفصیل سے تاجور کا ذکر بھی کیا تھا۔ یہ تصویریں اس کتاب کے ذریعے بے شمار لوگوں تک پہنچیں اور ان کو پسند کیا گیا۔ مائیکل کے لیے یہ تصویریں مالی فائدے کا باعث بھی بنیں۔ تم یورپ میں رہے ہو، ان لوگوں کو اچھی طرح جانتے ہو۔ خامیوں کے ساتھ ساتھ ان میں کچھ زبردست خوبیاں بھی ہوتی ہیں۔ حق دار تک اس کا حق پہنچانے کی پوری کوشش کرتے ہیں، بلکہ کئی بار اسے ڈھونڈ کر اس تک اس کی کاوش کا معاوضہ پہنچاتے ہیں۔ شاید تمہیں یہ جان کر حیرانی ہو کہ پچھلے دنوں مائیکل بھی تاجور کو ڈھونڈتا ہوا ہمارے جنگ زدہ جاما جی آن پہنچا تھا۔ ایک روز وہ میری رہائش گاہ تک آ گیا اور تاجور اسے اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ دل و جان سے تاجور کا پرستار ہے۔ اس نے زبان سے کچھ نہیں کہ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ کروڑ پتی شخص تاجور کو اپنانا بھی اپنی ایک بہت بڑی خوش نصیبی سمجھتا لیکن تاجور نے بس پردے کی اوٹ سے اس سے دو چار جملے ہی بولے۔ وہ اپنے ساتھ ڈیڑھ لاکھ پاؤنڈ کا چیک لایا تھا، اس کا کہنا تھا کہ یہ اس رقم میں سے ہے جو اسے تصویروں اور آرٹیکل کی اشاعت سے حاصل ہوئی ہے۔ اور یہ تاجور کا حق ہے۔ تاجور نے یہ رقم لینے سے صاف انکار کیا۔ اس کو وہم تھا کہ شاید یہ مائیکل نامی بندہ اس کے بارے میں کسی اور انداز سے سوچتا ہے۔ اور کسی اور ارادے سے یہاں آیا ہے (تمہیں معلوم ہی ہو گا مائیکل نے اپنی کتاب میں تاجور کی خوب صورتی کا ذکر بڑے خاص انداز میں کیا ہے) بہر حال میں نے تاجور کو سمجھایا کہ وہ مائیکل کی نیت پر ہرگز ہرگز شک نہ کرے۔ بعد ازاں میرے سمجھانے پر تاجور نے یہ رقم لے لی لیکن دو دن بعد جب اسے یہ خبر ملی کہ ڈی پیلس کے عین سامنے گرین اور گرے فورسز کے درمیان فیصلہ کن معرکہ ہونے والا ہے اور تم اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اگلی صفوں میں ہو تو اس نے مجھ سے کہا...... کہ وہ یہ ساری رقم تمہاری جان کے صدقے میں خیرات کرنا چاہتی ہے...... اور ابھی اسی وقت کرنا چاہتی ہے۔

یہ رقم مجھے سونپتے وقت تاجور بیٹی نے مجھ سے درخواست بھی کی تھی کہ میں یہاں مائیکل کی آمد اور اس رقم کے بارے میں تمہیں کچھ نہیں بتاؤں گا۔''

میں نے حاذق ذکری کا لکھا ہوا یہ طویل خط آخر تک پڑھا اور مجھ پر کئی انکشافات ہوئے۔ میرا یہ پچھتاوا کئی گنا بڑھ گیا کہ میں اس خط کو بروقت کھول کر کیوں نہ پڑھ سکا۔ اپنی اس تحریر میں حاذق ذکری نے کئی حیران کن اشارے دیئے تھے۔ مثلاً ایک جگہ انہوں نے لکھا تھا، تاجور اپنی ہمت کے مطابق پوری کوشش کرے گی کہ اس کی زندگی کسی اور شخص سے وابستہ نہ ہو لیکن اس کے قریبی عزیزوں میں سے کوئی ایک اس کی راہ میں سخت رکاوٹ بنے گا۔ ممکن ہے کہ وہ اس رکاوٹ کو بھی عبور کر لے۔ اگر اس نے ایسا کیا تو تم اسے اپنے نکاح میں لانے میں تاخیر نہ کرنا......

گزرے دنوں کے مناظر میری نگاہوں میں گھومنے لگے اور سینے میں درد کی بلند لہریں پیدا ہوئیں۔ شاید اس موقع پر واقعی غیر ضروری تاخیر ہوئی تھی۔ نکاح کا انتظام ہونے میں تو ایک دن سے زیادہ نہیں لگتا اور ہم نے کئی دن گزار دیئے تھے......اور پھر اسی دوران میں انیق اور تاجور کا رابطہ ہو گیا تھا۔

نہ چاہنے کے باوجود میں یہ سوچنے پر مجبور ہو رہا تھا کہ اگر میں یہ خط بروقت کھول کر پڑھ لیتا تو آج حالات کی تصویر کچھ اور ہوتی۔ شاید انیق بھی زندہ ہوتا۔ شاید خورسنہ اور اس کا بچہ بھی اپنے گھر میں ہنسی خوشی موجود ہوتے...... شاید حاذق ذکری بھی حیات ہوتے اور شاید......ابھی تاجور بھی مجھ سے جدا نہ ہوئی ہوتی۔ وہ جو ایک روز اپنا سب کچھ سونپنے کے لیے میرے ساتھ راولپنڈی چلی آئی تھی، میری زندگی کا حصہ بن چکی ہوتی۔ بہار کی اس دلنشیں رات میں، میں لاہور کے اس ہوٹل میں ہونے کے بجائے، تاجور کے ساتھ کسی دوسرے ملک میں......شاید...... کسی چھوٹے سے خوب صورت گھر میں ہوتا، اس کی خوشبودار بانہیں میرے گلے میں ہوتیں...... میں اس کی پیشانی پر جھولتی لٹوں کو اپنی انگلی سے پیچھے ہٹاتا اور اپنے ہونٹوں کو اس کے بے مثل چہرے کے قریب تر کر دیتا۔

ایک طویل سرد آہ بھر کر میں نے دیوار سے ٹیک لگائی اور حاذق ذکری مرحوم کے خط کو پھر سے پڑھنا شروع کیا۔ بے شک خط کی ہر سطر میں میرے لیے ایک پچھتاوا تھا......لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ شاید تقدیر میں لکھا اٹل ہوتا ہے اور ہونی ہو کر رہتی ہے۔ ہم آئندہ حالات کے بارے میں جان بھی جائیں تو بھی اپنے مقدر سے بھاگ نہیں سکتے۔

حاذق ذکری صاحب نے تاجور کے بارے میں جس واقعے کا ذکر کیا، وہ بھی میرے لیے کسی بڑے انکشاف سے کم نہیں تھا۔ تاجور نے آج تک مجھے اس بات کی بھنک بھی نہیں

پڑنے دی تھی کہ مائیکل نامی وہ شخص اور اس کے ساتھی اسے تلاش کرتے ہوئے جاماجی جا پہنچے تھے اور مائیکل نے اسے ایک خطیر رقم دی تھی۔ پتا نہیں، ایسی کتنی ہی باتیں اس نے اپنے سینے میں چھپا رکھی تھیں...... اور ان سارے پنہاں رازوں کے ساتھ وہ اب مجھ سے جدا ہو چکی تھی۔

حاذق ذکری کے خط کے الفاظ ایک بار پھر میری نگاہوں میں گھومنے لگے...... وہ تم سے بے انتہا پیار کرتی ہے لیکن اگر خدانخواستہ اس کی زندگی کسی اور کی زندگی سے نتھی ہو گئی تو پھر واپسی تقریباً ناممکن ہو جائے گی...... اور تاجور کی زندگی نتھی ہو چکی تھی...... اور نتھی بھی ایک ایسے شخص کے ساتھ ہوئی تھی جو انسان کہلانے کا حق دار ہی نہیں تھا۔

میں رات دیر تک جاگتا رہا۔ سینے میں ایک عجیب سی بے کلی تھی۔ میں سوچتا تھا کہ پتا نہیں اس بلند و بالا چار دیواری کے اندر تاجور کے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہوگا۔ وہ مسلسل ایک جنونی شخص کے قبضے میں تھی۔ اس کی شخصیت بری طرح ٹوٹ پھوٹ رہی تھی۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ میں اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ ایسے موقعوں پر اکثر انیق میرے آس پاس ہوتا تھا۔ وہ عقب سے میرے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیتا اور میری ڈھارس بندھانا شروع کر دیتا، لیکن اب تو وہ بھی منوں مٹی کے نیچے تھا۔ کئی بار میں بڑی حیرت کے عالم میں بہ زبان خاموشی اپنے آپ سے یہ سوال پوچھتا تھا۔ ''کیا انیق واقعی مر چکا ہے؟'' میرا دوسرا قریبی ساتھی سجاول تھا۔ وہ بھی نہایت مخدوش حالات کا شکار تھا۔ میں نے کئی بار اسے فون کیا لیکن حسبِ سابق فون بند جا رہا تھا۔ پھر میں نے فیض سے رابطے کی کوشش کی۔ اس کی بھرائی ہوئی آواز ابھری۔ ''ہیلو، کون؟''

''وقاص بول رہا ہوں چاچا فیض۔''

میرے سوال سے پہلے ہی وہ بول اٹھا۔ ''سردار کا ابھی تک کوئی پتا نہیں۔ نہ کوئی فون، نہ کوئی اطلاع۔ انہوں نے تلاش سے بھی منع کر دیا تھا۔ اب تو بس انتظار ہی ہو سکتا ہے...... اور تم کہاں ہو؟''

''لاہور میں...... اور یونس کے بارے میں کوئی خبر؟''

''نہیں۔'' فیض نے ذرا ڈرے ہوئے لہجے میں کہا اور پھر توقف کر کے بولا۔ ''اس کے بارے میں تو کوئی خبر نہ ہی ملے تو چنگا ہے۔ لگتا ہے کہ اس کے ہوش حواس بالکل ختم ہو چکے ہیں۔ کہتے ہیں کہ کالے علم کی مار بہت بری ہوتی ہے۔ وہ کسی ایسے ہی علم کے اثر میں ہے۔ سنا ہے کہ پچھلے بدھ کو اس نے مسجد کے پاس تمہارے کسی دوست کو مارنے کی کوشش بھی کی ہے۔''

''ہاں......لیکن بچت ہوگئی ہے۔''

''پر ادھر لالہ موسیٰ میں تو بچت نہ ہوئی۔ باقر کو اس نے جتنی بے دردی سے قتل کیا اور اس کی دوست کڑی کو جس طرح تیسری منزل سے دھکا دے کر مارا، اس نے سب کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ سب ڈرے ہوئے ہیں۔ سامنے آکر لڑنے والے دشمن کا مقابلہ تو بہادری سے ہوسکتا ہے پر جو نظر نہ آئے اور سائے کی طرح آلے دوالے بھی رہے اس کا خوف ہڈیوں میں بیٹھ جاتا ہے۔''

فیض کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ سجاول کا تقریباً سارا گروہ ہراس کی سی کیفیت میں ہے۔ وہ یونس پمپ والا کی موجودہ حالت اور اس کی دیوانگی کو عملیات کا نتیجہ قرار دے رہے تھے اور اس کا تعلق ہوائی چیزوں سے جوڑتے تھے۔ بے شک یہ سب کے سب سکہ بند ڈکیت تھے مگر ان کی اکثریت کا تعلق دیہاتی علاقوں سے تھا۔ ان میں پڑھا لکھا بھی شاید ہی کوئی ہو گا۔ ایسے ذہنوں میں توہمات بڑی جلدی جگہ بناتے ہیں اور...... بڑی تیزی سے پھلتے پھولتے ہیں۔

○......❖......○

یہ رات کا تیسرا پہر تھا۔ ہوٹل کے نیچے بازار اب مکمل طور پر خاموش تھا۔ بازار کی دوسری طرف مولانا حبیب اللہ والی مسجد کے نیم روشن مینار بھی اونگھتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ خالی چوراہے سے کبھی کبھار کسی گاڑی کے گزرنے کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔

''کیا بات ہے شاہ زیب! جاگ رہے ہو؟'' فخر کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔ وہ بھی آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ بیٹھا تھا۔

میں گہری سانس لے کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ ''فخری! ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا ورنہ سجاول اور اس کے بیوی بچے کے ساتھ کچھ بہت برا ہو جائے گا۔ آج پورے آٹھ دن ہو گئے ہیں۔ ان کا کچھ پتا نہیں۔''

فخر نے بستر سے اٹھ کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''کل میں سوچ رہا تھا کیوں نا اس سلسلے میں تم داؤد بھاؤ سے مدد لو۔ اس کا پورا ایک نیٹ ورک ہے۔''

''لیکن مسئلہ تو وہی ہے جو تمہیں بتایا تھا۔ داؤد کا دل سجاول کی طرف سے ابھی تک صاف نہیں ہے۔ وہ انیق کی موت کا ذمے دار اسی کو سمجھ رہا ہے۔ وہ سجاول کی تلاش کے سلسلے میں کبھی بھی مخلص نہیں ہوگا۔''

''تو پھر؟''

''مجھے زیادہ فکر خورسنہ اوراس کے بچے کی ہے۔ان دونوں کو یونس لے کر گیا تھا اور جس طرح کی ذہنی حالت ہے اس کی، ہم دیکھ ہی چکے ہیں۔''

میں اور فخر دیر تک سوچتے رہے کہ خورسنہ اور سجاول کو ڈھونڈنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔اسی دوران میں میرے سیل فون کی بیل ہوئی۔ میں نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے فیض محمد کی ہانپتی ہوئی آواز سنائی دی۔''ہیلو وقاص! بی بی اور بچہ واپس آ گئے ہیں......وہ خود ہی واپس آ گئے ہیں۔ بالکل خیر خیریت سے ہیں۔''

میں سناٹے میں رہ گیا۔''کس کی بات کررہے ہو؟ سجاول کی بیگم کی؟''

''ہاں، ہاں ...... بیگم جی کی......اور بچے کی...... یہ لو...... یہ تم خود بھی بات کرلو۔''

چند لمحے کی خاموشی کے بعد فون پر سانسوں کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ میں نے لرزاں آواز میں پوچھا۔''ہیلو......کون......خورسنہ؟''

''ہاں۔'' دوسری طرف سے مختصراً جواب ملا۔

''مجھے یقین نہیں آرہا۔ یہ سب کیسے ہوا ہے؟''

''میں تھوڑی دیر بعد فون کرتی ہوں۔'' خورسنہ نے کہا، یقیناً وہ فیض وغیرہ کے سامنے مجھ سے آزادانہ بات نہیں کرسکتی تھی۔فون بند ہوگیا۔

میری طرح فخر بھی حیران تھا۔ ہم نے دو تین منٹ سخت بے قراری میں گزارے۔ آخر میرے نمبر پر کال کے سگنل آئے۔ خورسنہ اب یقیناً کسی بند کمرے میں موجود تھی۔''ہیلو کون؟''

''میں خورسنہ بول رہی ہوں شاہ زیب صاحب۔'' وہ بھرائی آواز میں بولی۔

''تم خیریت سے تو ہو......اور ذیشان؟''

''ہاں جی، ہم بالکل خیریت سے ہیں۔ ابھی کوئی آدھ گھنٹہ پہلے یہاں لالہ موسیٰ اپنے گھر پر پہنچے ہیں۔''

''سجاول کہاں ہے؟''

''وہ ہمارے ساتھ نہیں ہیں۔'' خورسنہ کی آواز زیادہ بھرا گئی۔''وہ وہیں پر ہیں، ان لوگوں کے پاس۔ مم...... میرا خیال ہے کہ ہمیں فون پر زیادہ بات نہیں کرنی چاہیے۔ آ...... آپ کسی طرح یہاں آسکتے ہیں؟'' میرے لیے اس کے لہجے میں ہمیشہ کی طرح احترام تھا۔

میں نے کہا۔''کیوں نہیں...... میں ابھی روانہ ہوتا ہوں۔ دو ڈھائی گھنٹے میں تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا لیکن سجاول خیریت سے تو ہے نا؟''

''میں کچھ کہہ نہیں سکتی......آپ......بس جلد سے جلد یہاں آجائیں۔''

''اوکے......ذیشان کہاں ہے؟''

''وہ میرے ساتھ ہی ہے۔ خیریت سے ہے وہ بھی۔''

''ٹھیک ہے، تم لوگ پوری طرح چوکس رہو، ہم آرہے ہیں۔ میں فیض کو بھی فون کردیتا ہوں کہ گھر کے اردگرد کڑی نگرانی رکھے۔''

خورسنہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شاید آنسو پینے کی کوشش کررہی تھی۔ میں نے کال منقطع کی پھر فیض کو کال ملائی اوراس سے پوچھا کہ بیگم اور بچہ کیسے پہنچے ہیں یہاں؟

فیض نے بتایا۔''ایک ٹیکسی پر۔ ٹیکسی پر جہلم کا نمبر تھا۔ ڈرائیور چھوڑ کر فوراً چلا گیا۔ بہرحال میں نے ٹیکسی کا نمبر نوٹ کروالیا ہے۔''

''بیگم نے کچھ بتایا ہے سردار سجاول کے بارے میں؟''

''ابھی تک تو کچھ بھی نہیں۔ بس بچے کے ساتھ کمرے میں چلی گئی ہے اور دروازہ اندر سے بند کرلیا ہے۔''

''دیکھو چاچا فیض! بیگم اور بچے کی حفاظت کی سخت ضرورت ہے۔ تم اپنے بندوں کے ساتھ، آس پاس رہو۔ آنکھیں اور کان کھلے رکھنے پڑیں گے۔''

''تم کو بتانے کی لوڑ نہیں۔ ہم پوری طرح چوکنے ہیں۔''فیض محمد نے کہا۔

پہلوان بھی اب جاگ چکا تھا اور اس ساری صورتِ حال پر ششدر تھا۔ فیض سے بات ختم کرنے کے بعد میں نے فخر سے کہا۔''فخر! جانا تو ہم دونوں کو چاہیے لیکن یہاں بھی کسی کا موجود رہنا ضروری ہے۔ رضوان ان لوگوں کے نشانے پر آچکا ہے اور اس کے ساتھ کسی بھی وقت کچھ ہوسکتا ہے۔''

پہلوان بولا۔''لیکن میرے خیال میں اگر آپ دونوں جانا چاہت ہو تو چلے جاؤ۔ میں یہاں ہوں ناں۔''

کہنے کو تو پہلوان یہ بات کہہ رہا تھا لیکن حقیقت یہی تھی کہ وہ کافی تناؤ میں تھا۔ وہ ڈرپوک نہیں تھا مگر اس ناقابلِ فہم اور کسی حد تک پُراسرار صورتِ حال نے اسے اضافی طور پر پریشان کررکھا تھا۔ وہ ضرورت سے زیادہ چوکنا ہوگیا تھا۔ شکر تھا کہ اس کے پاس کوئی آتشیں ہتھیار نہیں تھا۔ ورنہ ممکن تھا کہ وہ اب تک صرف شبے کی بنا پر کسی کو فائر مار چکا ہوتا۔

فیصلہ ہوا کہ فخر اور پہلوان ابھی یہیں ہوٹل میں رہیں گے۔ میں اکیلا لالہ موسیٰ جاؤں گا۔ تاہم اگر ضرورت پڑی تو میں انہیں بلالوں گا۔

O......❖......O

رات کا وقت تھا، سڑکوں پر ٹریفک زیادہ نہیں تھا۔ میں خاصی تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتا ہوا قریباً تین گھنٹے میں لالہ موسیٰ اس گھر تک پہنچ گیا جہاں خورسنہ اپنے بچے کے ساتھ موجود تھی۔ یہ ایک گنجان آبادی تھی۔ جونہی میری گاڑی رکی، ایک جانب نیم تاریکی سے ایک سایہ نمودار ہوا اور میرے پاس پہنچ گیا۔ یہ چاچا فیض ہی تھا۔ اس کے نزدیک میری شناخت، سردار سجاول کے ایک نئے ساتھی کی تھی۔

میں نے گاڑی کی کھڑکی کا شیشہ نیچے اتارا۔ ''ہاں بھئی وقاص! پہنچ گئے ہو؟'' وہ اپنی نیم سفید مونچھوں کو تاؤ دے کر بولا۔

''ہاں...... بیگم اور بچہ اندر ہی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

فیض نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے گاڑی سے اتر کر خورسنہ کے نمبر پر کال کی اور اسے کہا کہ وہ دروازہ کھولے۔

تھوڑی ہی دیر بعد گھر کے ایک کمرے میں خورسنہ اور میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ ڈرا سہا ذیشان بھی ایک طرف موجود تھا۔ اس کے قریب پلیٹ رکھی تھی اور اردگرد چاول بکھرے ہوئے تھے۔ لگتا تھا کہ کچھ دیر پہلے تک خورسنہ اسے چاول کھلانے کی ناکام کوشش کرتی رہی ہے۔ خورسنہ کی اپنی حالت بھی ناگفتہ بہ تھی اس کے اٹھنے بیٹھنے کے انداز سے مجھے شک گزرا کہ اسے کچھ چوٹیں بھی آئی ہوئی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد خورسنہ نے ''اونگھتے ہوئے ذیشان'' کو ساتھ والے کمرے میں لٹا دیا اور دھیمی آواز میں مجھ سے باتیں کرنے لگی۔ میں نے اس سے پہلا سوال سجاول کے حوالے سے ہی پوچھا۔ ''سجاول کہاں ہے خورسنہ؟''

''وہ وہیں پر ہیں جہاں سے میں آئی ہوں۔'' اس نے انکشاف کیا۔ یہ ایک طرح سے میرے خدشات کی تصدیق بھی تھی۔

''لیکن کہاں پر؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ میرا چہرہ دیکھیں شاہ زیب صاحب! یہاں آنکھوں کے پاس آپ کو سرخ نشان نظر نہیں آ رہے۔''

میں نے غور سے دیکھا۔ اس کی سفید گلابی ملائم جلد پر ہلکے نشان تھے۔ یہاں ہوئے اس کی آنکھوں پر کس کر پٹی باندھی گئی تھی اور یہ اسی کا نشان تھا۔

وہ بولی۔ ''ذیشان کی آنکھوں پر بھی پٹی تھی۔ حالانکہ اس بے چارے کو راستے کا کیا چلنا تھا۔ میرے خیال میں ہم نے اونچی چھت والی کسی گاڑی میں قریباً ڈیڑھ گھنٹہ تیز رفتاری سے سفر کیا ہے۔ پھر ایک جگہ کسی نہر کے کنارے والی سڑک پر ہماری آنکھوں سے پٹی اتاری

گئی اور ہمیں ایک ٹیکسی میں دھکیل دیا گیا۔ وہ ٹیکسی ہمیں یہاں لے آئی۔''

''اس کا مطلب یہ ہے خورسنہ! کہ تمہیں اور ذیشان کو اس شرط پر چھوڑا گیا کہ سجاول نے خود کو ان لوگوں کے حوالے کر دیا۔''

خورسنہ نے اثبات میں سر ہلایا اور اس کی خوب صورت آنکھوں سے دو آنسو ڈھلک کر اس کی گود میں گر گئے۔ وہ اپنی عمر سے چھوٹی نظر آتی تھی اور اس کے بھرے بھرے جسم میں نظر کو جذب کرنے والی موزونیت تھی۔ سجاول کی بیوی کی حیثیت سے وہ ہم سب کے لیے قابلِ احترام تھی۔

''تمہیں یہاں سے لے کر کون گیا؟''

''وہی یونس۔ سجاول اس پر پورا بھروسا کرتے تھے۔ اسی طرح میں بھی کرتی تھی۔ اس روز وہ بڑی تیزی سے آیا۔ اس نے مجھ سے کہا...... بی بی جی! یہاں بہت خطرہ ہے۔ سردار نے کہا ہے کہ آپ کو اور بچے کو فوراً یہاں سے نکال لیا جائے۔ میں نے اس سے کہا کہ میں سجاول کو فون کر لوں لیکن سجاول کا فون پچھلے کئی گھنٹے سے بند جا رہا تھا۔ تب بھی بند ہی تھا۔ میں ذیشان کو لے کر فوراً اس کی سفید سوزوکی کار میں جا بیٹھی...... ہم آبادی سے باہر نکلے تو دو اور بندے گاڑی میں سوار ہو گئے۔ میں نے یونس سے پوچھا کہ یہ کون ہیں۔ اس نے بس گول مول سا جواب دیا۔''

میں نے پوچھا۔''تم نے یونس کے رویے میں کوئی تبدیلی نوٹ نہیں کی؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔''شاہ زیب صاحب! وہ کبھی کبھار نشے میں ہوتا تھا لیکن اس روز کچھ زیادہ ہی نشے میں لگ رہا تھا، آواز بھی بھاری تھی۔ کسی وقت یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی اور شخص بول رہا ہو، لیکن تب میرے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ ہاناوانی جیسی خطرناک عورت کے ہتھے چڑھ چکا ہے...... اور اس کے ہوش حواس ٹھکانے پر نہیں ہیں۔''

''اس کے بعد کیا ہوا؟''

''مجھے کچھ پتا نہیں، ذیشان کے ساتھ بیٹھا ہوا بندہ ایک دم ہی، چلتی گاڑی میں مجھ پر جھپٹا تھا۔ میری ناک میں کسی کیمیکل کی تیز بُو گھسی۔ مجھے ذیشان کے چلانے کی آواز آئی۔ میں نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا، اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔ دوبارہ آنکھ کھولی تو خود کو ایک بند کمرے میں پایا۔ ذیشان بھی میرے ساتھ ہی سویا تھا۔ میں بہت روئی چلائی مگر کسی نے میری آواز نہیں سنی پھر شام کو ہاناوانی سے ملاقات ہو گئی۔''

خورسنہ بات کرتے کرتے چپ ہو گئی۔ یوں لگا جیسے ہاناوانی سے ملاقات کا تصور ہی

اس کے لیے روح فرسا ہو۔ اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے منڈلا گئے۔ کچھ دیر چپ رہ کر وہ بولی۔ ''جاماجی میں، میں نے اس منحوس عورت کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ ایک دو مرتبہ ٹی وی کے علاوہ بھی اسے دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا لیکن دور دور سے۔ اس دن پہلی بار اسے اتنے قریب سے دیکھا۔ یوں لگا جیسے کسی عورت کو نہیں ایک ہیبت ناک اور بدبودار مادہ جانور کو دیکھ رہی ہوں۔ وہ بہت بری ہے شاہ زیب صاحب، ہماری سوچوں سے بڑھ کر خطرناک ہے۔''

''اس نے تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں پہنچائی؟''

''تکلیف بھی پہنچائی ہے لیکن جسمانی تکلیف سے زیادہ ذہنی تکلیف۔ کئی دن گزر گئے ہیں لیکن میرا سراب بھی پھوڑے کی طرح دُکھتا ہے اور آنکھوں کی پتلیوں میں اینٹھن محسوس ہوتی ہے۔'' اس نے اپنا ماتھا تھام لیا۔

میرے استفسار پر خورسنہ نے جو کچھ بتایا، اس سے پتا چلا کہ ہاناوانی نے اسے جسمانی اور ذہنی تشدد کا نشانہ بنایا۔ خورسنہ نے اپنے کندھے پر قمیص ہٹا کر چھڑی کی ضرب کا سرخی مائل نشان دکھایا۔ ایسے ہی نشان اس کی ساری پشت پر موجود تھے۔ ہاناوانی نے اسے نیم برہنہ کر کے دو روز تک سخت تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔ اس نے یہ مار پیٹ خود اپنے ہاتھوں سے کی تھی۔ شاید اس نے یوں اپنے دل کی بھڑاس نکالی تھی۔ یقیناً اسے اس بات کا بہت قلق رہا ہوگا کہ جاماجی کی خوبرو خورسنہ نے جاماجی کو چھوڑ کر ایک پردیسی سے دل لگایا، اور پردیسی بھی وہ جس نے اس کے بیٹے رائے زل کا سر اپنے ہاتھوں سے کاٹا...... یعنی سجاول۔ جسمانی تکلیف پہنچانے کے علاوہ ہاناوانی نے خورسنہ کو ذہنی طور پر بھی زبردست طریقے سے رگیدا تھا۔ اس نے اسے اپنے بدنام زمانہ ٹرانس میں لیا تھا اور پتا نہیں کہ اس کے اندر سے کیا کیا کھوجتی رہی تھی۔ اس کا اہم ترین ٹارگٹ یقیناً یہی رہا ہوگا کہ خورسنہ سے ان لوگوں کے بارے میں معلومات حاصل کرے جو اس کی ہٹ لسٹ پر ہیں۔ یعنی اس کے شیطان فرزند کے قاتلین۔ خورسنہ نے بتایا کہ اسے کچھ معلوم نہیں کہ وہ کتنے دن یا کتنے گھنٹے اس کے ٹرانس میں رہی ہے...... لیکن جب وہ اپنے حواس میں واپس آئی تو اسے صاف پتا چلا کہ وہ کسی نادیدہ شکنجے میں تھی۔ اس پر نشہ آور دواؤں کا اثر بھی تھا، اس کے علاوہ اس کے سر اور اس کی دونوں آنکھوں میں شدید قسم کی چبھن تھی۔

ایک دم ایک خیال میرے ذہن میں آیا اور مجھے لگا کہ میرے سینے میں سنسنی کی ایک تیز لہر دوڑ گئی ہے۔ ایک خدشہ تھا جس نے مجھے سرتاپا ہلا دیا۔ خورسنہ ان چند افراد میں سے

تھی جو جانتے تھے کہ میں ابھی ''بقید حیات'' ہوں۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ ہاناوانی کے ٹرانس میں آنے کے بعد جہاں خورسنہ نے اور بہت کچھ اگلا ہو وہاں میرے بارے میں بھی بتا دیا ہو؟

میں نے کہا۔''خورسنہ! کہیں ایسا تو نہیں کہ ہاناوانی کے ٹرانس اور نشہ آور دواؤں کے زیر اثر تم نے اسے میرے بارے میں بھی کچھ بتا دیا ہو؟''

خورسنہ کی آنکھوں میں خوف کے سائے ابھرے۔ وہ لرز کر بولی۔''شاہ زیب صاحب! مم...... میں...... اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی...... لیکن......'' وہ کہتے کہتے خاموش ہوگئی۔

''لیکن کیا؟ بات ادھوری کیوں چھوڑ دی؟''

اس نے الجھے ہوئے انداز میں کہا۔''جب میں پورے ہوش میں تھی اس وقت بھی ہاناوانی سے کئی باتیں ہوئیں...... لیکن تب اس نے آپ کے بارے میں مجھ سے کوئی بات نہیں کی، نہ ہی کوئی سوال پوچھا۔''

''چلو...... یہ تو ایک اچھی علامت ہے۔ باقی، اگر کوئی بات ہوگئی ہے تو اس کا بھی پتا چل جائے گا۔''

خورسنہ کے چہرے پر تشویش کے سائے تھے اور وہ گہری سوچ میں ڈوب گئی تھی۔ میں نے اصل موضوع پر واپس آتے ہوئے کہا۔''سجاول وہاں کیسے پہنچا اور تمہاری اس سے ملاقات کب ہوئی؟''

وہ گہرے دکھ سے بولی۔''شاہ زیب صاحب! مجھے سجاول نے بتایا کچھ نہیں لیکن مجھے اچھی طرح پتا چل گیا ہے کہ...... سجاول نے ہاناوانی کی کوئی شرط مانی ہے اور وہ شرط شاید یہی ہوگی کہ ہاناوانی مجھے اور ذیشان کو چھوڑ دے گی اور سجاول خود کو اس کے حوالے کر دیں گے۔''

خورسنہ کی آنکھوں میں نمی تھی۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ اپنے محبوب شوہر کے لیے از حد پریشان ہے۔ ابھی ان کی شادی کو چند ماہ ہی تو ہوئے تھے اور اس میں سے بھی زیادہ وقت خورسنہ نے خوف کے سائے میں ہی گزارا تھا۔ وہ ہر وقت سجاول کی خیریت کے حوالے سے تشویش میں مبتلا رہی تھی...... اور پھر وہ خود ایک سانحے کا شکار ہوئی تھی۔ اسے تین گولیاں لگی تھیں اور اس کے بچے کو اغوا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ وہ قریباً تین ماہ تک بستر پر رہنے کے بعد حال ہی میں رُوبصحت ہوئی تھی اور اب یہ افتاد اس پر آن پڑی تھی۔

میں نے اس سے پوچھا کہ سجاول سے اس کی ملاقات کب ہوئی۔ جواب میں اس نے آنسو پونچھتے ہوئے بتایا۔ ”یہ کل رات کی بات ہے۔ میں اور ذیشان سو رہے تھے۔ کمرے کو باہر سے تالا لگا دیا جاتا تھا۔ تالا کھلنے کی آواز آئی اور پھر میں نے سجاول کو اپنے سامنے دیکھا۔ میں ششدر رہ گئی...... اور ان سے لپٹ گئی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ وہ کہاں تھے؟ اور کیسے یہاں تک آئے ہیں؟ انہوں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا...... ان کا مطلب تھا کہ میں آہستہ بولوں کہیں ذیشان جاگ نہ جائے۔ ہم وہاں بیٹھ کر دھیمی آواز میں باتیں کرتے رہے۔ آپ کو پتا ہی ہے کہ وہ کتنے بے پروا ہیں، لیکن کل میں نے پہلی بار انہیں پریشان دیکھا۔ انہوں نے کہا کہ ہاناوانی ایک بڑی مشکل عورت ہے...... لیکن اس سے بات چیت چل رہی ہے، ہوسکتا ہے کہ ایک دو دن میں یہاں سے ہماری رہائی کا کوئی راستہ نکل آئے۔ اس وقت مجھے بالکل شبہ نہیں ہوا کہ وہ کسی شرط کے تحت یہاں پہنچے ہیں۔ انہوں نے مجھ پر یہی ظاہر کیا کہ انہوں نے کوشش کر کے ہم دونوں کو ڈھونڈا ہے لیکن بعد میں انہوں نے جو باتیں کیں، ان سے مجھے ہلکا سا شک ضرور گزرا تھا......“

”کس طرح کی باتیں؟“ میں نے پوچھا۔

”یہی کہ ہاناوانی یہاں پہنچ گئی ہے۔ وہ بڑی زہریلی عورت ہے اور ان سب لوگوں کو ڈسنا چاہتی ہے جنہوں نے اس کے شیطان بیٹے کو مارنے میں حصہ لیا ہے۔ سجاول نے مجھ سے آپ کا ذکر بھی کیا اور کہا کہ موجودہ صورتِ حال میں آپ کوئی بہتر راستہ نکال سکتے ہیں بلکہ اگر میں چاہوں تو آپ کچھ عرصے کے لیے مجھے اور ذیشان کو پاکستان سے باہر بھی بھجوا سکتے ہیں...... میں نے کہا، سجاول! آپ ایسی بات سوچیں بھی نہ۔ اب میرا جینا مرنا آپ کے ساتھ ہے۔ ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ میری کمر کی چوٹوں کے بارے میں جان کر ان کی آنکھوں میں خون اتر آیا...... وہ بے قراری سے کمرے کے اندر ہی ٹہلنے لگے۔ میں نے انہیں بڑی مشکل سے نارمل کیا۔ وہ ذیشان سے بہت محبت رکھتے ہیں مگر کبھی اس کا اظہار نہیں کیا۔ کل رات پہلی بار انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ماتھا چوما۔“

خورسنہ کی آواز پھر بھرا گئی۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔ ”رات کے آخری حصے میں مجھے تھوڑی دیر کے لیے اونگھ آ گئی۔ آنکھ کھول کر دیکھا تو وہ بیڈ کے دوسرے سرے پر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے اور میری ہی طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے کہا۔ ایسے کیا دیکھ رہے ہیں۔ انہوں نے بے پروا نظر آنے کی کوشش کی اور بولے۔ بھئی آنکھیں دیکھنے کے لیے ہی تو ہوتی ہیں۔ اس وقت مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ کل میں اکیلی یہاں سے

جاؤں گی...... سجاول میرے ساتھ نہیں ہوں گے۔“

خورسنہ نے دکھی انداز میں سر جھکا لیا۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”گھبراؤ نہیں خورسنہ! بہت جلد سجاول ہمارے ساتھ ہوگا۔“

میں نے خورسنہ سے مختلف سوالات پوچھے...... اسے اور ذیشان کو کیسے وہاں سے روانہ کیا گیا۔ گاڑی کس قسم کی تھی۔ کیا انہوں نے کچے راستے پر بھی سفر کیا؟ کیا وہ کسی ٹول پلازا وغیرہ سے بھی گزرے؟ اردگرد سے آنے والی آوازیں کس طرح کی تھیں۔ کیا ہیوی ٹریفک کی آواز بھی سنائی دیتی تھی؟ وغیرہ وغیرہ۔

میں اگلے روز شام تک وہیں خورسنہ اور ذیشان کے پاس رہا اور سجاول کے حوالے سے کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرتا رہا۔ چاچا فیض سے بھی دو تین اہم میٹنگز ہوئیں۔ مجھے پوری تسلی ہوگئی کہ اب چاچا فیض اور اس کے مسلح ساتھی پوری طرح چوکس ہیں اور خورسنہ پر کوئی آنچ نہیں آنے دیں گے۔ سجاول کی تلاش کے سلسلے میں میرے ذہن میں ایک موہوم سا خاکہ بن رہا تھا۔

○......❖......○

رات دس بجے تک میں جی ٹی روڈ کے ذریعے واپس لاہور پہنچ چکا تھا۔ راستے میں فون پر مجھے اپنے ایک غیر ملکی دوست کی زبانی یہ خبر ملی کہ کوپن ہیگن میں، ٹیکساری گینگ کے دونوں گروپوں میں ایک بڑا تصادم ہوا ہے جس میں دو اہم ممبران سمیت آٹھ دس افراد جان سے گئے ہیں۔ واٹس وائے کے بندوں سے جان بچانے کے لیے جان ڈیرک کو ایک جوا خانے کی تیسری منزل سے چھلانگ لگانا پڑی اور اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔ اس قسم کی خبریں مجھے ملتی رہتی تھیں اور ان سے پتا چلتا تھا کہ اس عظیم الشان گینگ کی بینڈ کس طرح بج رہی ہے۔ بہر حال میں ہوٹل میں فخر اور پہلوان حشمت کے پاس پہنچا تو رضوان ٹی کو بھی وہیں پایا۔ وہ سب سونے کی تیاری کررہے تھے۔

''کیوں بھئی خیریت ہے رضوان! مسجد چھوڑ کر یہاں چلے آئے؟''

''یہ نہیں آیا، میں زبردستی لایا ہوں۔'' فخر نے جواب دیا۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب ذرا پریشان کن ہے۔'' فخر نے رضوان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ رضوان بھی الجھا ہوا اور گم صم دکھائی دے رہا تھا۔ فخر نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''اندازہ ہو رہا ہے کہ یہاں مسجد کے اردگرد کچھ لوگ موجود ہیں۔ کچھ پُراسرار سے معاملات چل رہے ہیں۔ میں نے بہتر سمجھا کہ رضوان یہاں ہمارے پاس رہے۔''

''کن معاملات کی بات کررہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

فخر اور پہلوان نے ایک ساتھ رضوان کی طرف دیکھا۔ جیسے کہہ رہے ہوں کہ وہ خود ہی بتائے۔ رضوان نے اپنی چھوٹی چھوٹی خوب صورت داڑھی میں انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔

''شاہ زیب صاحب! وہ آس پاس موجود ہیں۔ پرسوں رات میرے کمرے کا وہ دروازہ دیر تک بجتا رہا جو مسجد کے صحن کی طرف کھلتا ہے۔ میں نے تکیے کے نیچے سے پستول نکالا اور

دروازہ کھول کر دیکھا لیکن کوئی نہیں تھا۔ بس مجھے ایک پر چھانواں سا نظر آیا، وہ اوپر سے کچی زمین پر گرا اور پھر یوں اچھلا جیسے ربڑ کی گیند اچھلتی ہے۔ مجھے تو یہی لگا کہ وہ اوپر درخت کی شاخوں میں کہیں گم ہو گیا ہے۔ بہر حال میں نے اسے وہم ہی سمجھا اور خود کو تسلی دی لیکن کل رات پھر یہی کچھ ہوا ہے۔ چھت پر کسی کے چلنے کی آواز آتی رہی لیکن یہ انسانی قدموں کی آواز نہیں تھی۔ میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں، کوئی جانور بھی نہیں لگتا تھا۔ پھر شیشہ ٹوٹنے کی آواز آئی۔ میں ایک بار پھر پستول لے کر موقع پر پہنچا۔ میرے کوارٹر میں چھوٹا سا کچن ہے اس کی کھڑکی کا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا۔ میں نے ٹوٹے شیشے سے باہر جھانکا۔ مسجد کے صحن کے ساتھ ساتھ گارڈینیا کی جو باڑ ہے وہاں مجھے دو نقطے چمکتے نظر آئے۔ یہ کسی کی آنکھیں تھیں۔ میں نے پکار کر پوچھا کہ کون ہے؟ ایک دم آنکھیں نظر آنا بند ہو گئیں لیکن پھر ایک دم یہی آنکھیں ایک درخت پر نظر آئیں۔ جیسے وہ کوئی چھلاوا ہو۔ جو ابھی یہاں تھا ابھی تیس چالیس فٹ دور چلا گیا۔ یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ درخت پر نظر آنے والی آنکھیں کسی دوسری چیز کی ہوں۔ اگلے روز صبح کو میں نے ٹوٹی ہوئی کھڑکی کے آس پاس کچی زمین پر نشان وغیرہ ڈھونڈنے کی کوشش کی پر کچھ حاصل نہیں ہوا۔''

پہلوان نے رضوان کے اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر وہ کوئی ہوائی چیز تھی تو پھر اس کے پاؤں کہاں ہوویں گے۔ مجھے تو لگت ہے کہ یہ چیزیں مولانا حبیب صاحب کے پیچھے پڑی ہوئی ہیں۔ مولانا کیونکہ مسجد کے اندر ہوت ہیں اس لیے وہ چیزیں مسجد کے آس پاس ٹامک ٹوئیاں مار رہی ہیں۔''

فخر نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ ''پہلوان جی کا خیال ہے کہ یہ ''ہوائی اشیا'' دارج یا اس کی فیملی کے کسی فرد نے پال رکھی ہیں...... اور ان چیزوں کو اپنے دشمنوں کا دھڑن تختہ کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔''

پہلوان نے گھور کر فخر کو دیکھا۔ جیسے اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ فخر نے یہ بات سنجیدگی سے کہی ہے یا مذاق سے۔ اگر پہلوان کو غصہ آ جاتا تو یقیناً اگلے آدھ پون گھنٹے تک ہوائی اور زمینی چیزوں کے حوالے سے زبردست قسم کی بحث ہوتی اور ہمیں پہلوان کے کئی دھواں دھار آہنگ والے ذاتی شعر بھی سننا پڑتے۔ میں نے بروقت مداخلت کر کے موضوع بدلا اور فخر کو ایک بڑی مصیبت سے بچایا۔

یہ تین بیڈ والا کمرا تھا۔ ایک بیڈ تو بمشکل پہلوان کو ہی سہولت فراہم کرتا تھا۔ دو بیڈز کو جوڑ کر ہم تینوں نے شیئر کر لیا۔ میں نے فخر وغیرہ کو مختصراً آگاہ کیا کہ وہاں لالہ موسیٰ میں خورسنہ

سے کیا بات چیت ہوئی ہے۔ میری طرح فخر، رضوان اور پہلوان کو بھی سجاول کی طرف سے شدید تشویش محسوس ہوئی۔ رات کوئی ڈیڑھ دو بجے کا عمل تھا جب پہلوان حشمت ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا یا شاید وہ ابھی تک سویا ہی نہیں تھا۔ اس نے کمرے کی لائٹ آن کرنا چاہی مگر بجلی گئی ہوئی تھی۔

''کیا ہوا چاچا حشمت؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے دروازے کے پاس کچھ کھسر پھسر سی لگت ہے۔''

فخر نے بیزاری سے جماہی لیتے ہوئے کہا۔ ''پسر تو میں نے نہیں سنی لیکن شاید تھوڑی سی کھسر ہوئی ہوگی۔''

پہلوان نے اس کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے کمرے کا دروازہ تھوڑا سا کھول کر باہر جھانکا۔ کوریڈور میں بھی نیم تاریکی تھی، کچھ دکھائی نہیں دیا۔ پہلوان نے اِدھر اُدھر جھانک کر دروازہ پھر بند کر دیا...... اور ایک کھڑکی کے کھٹکے وغیرہ بھی اچھی طرح چیک کیے...... ہم دوبارہ سونے کے لیے لیٹ گئے۔

فخر نے میرے کان میں غنودگی بھرے لہجے میں کہا۔ ''مجھے تو لگتا ہے کہ پہلوان جی نے ہوائی چیزوں کو یہاں بلا کر ہی چھوڑنا ہے۔''

یہ وہ لمحے تھے جب میں نے کمرے میں ایک بہت ہلکی سی بے نام سے بو محسوس کی لیکن میں بھی نیم غنودگی میں تھا اس لیے اسے کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ جلد ہی میں پھر سے سو گیا۔ یقیناً فخر اور رضوان بھی سو گئے۔ پہلوان کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا۔ قریباً پندرہ بیس منٹ بعد میں ایک سماعت شکن شور کے ساتھ جاگا۔ اندھیرے کمرے میں کوئی تھا...... اور رضوان سے چمٹا ہوا تھا۔ تب مجھے رضوان کی دردناک کراہ سنائی دی۔

پھر شاید رضوان نے اپنے مدِمقابل کو کوئی ضرب لگائی تھی۔ ایک پرچھائیں سی رضوان سے جدا ہو کر ٹی وی سے ٹکرائی اور اسے چکنا چور کر گئی۔ اندھیرے کے سبب یہ بھی پتا نہیں چل سکا کہ ٹی وی سے ٹکرانے اور اسے گرانے والا خود حملہ آور تھا یا رضوان تھا۔ میں نے تکیے کے نیچے سے اپنا بریٹا پسٹل نکالا...... اور پھر سوئچ بورڈ کی طرف جھپٹا مارا۔ لائٹ ابھی تک نہیں آئی تھی۔ اسی دوران میں ایک کرسی ٹوٹنے کی واضح آواز سنائی دی...... اور اس کے ساتھ ہی پہلوان حشمت کی للکار بھی ابھری۔ اس نے کسی چیز سے حملہ آور کو طوفانی ضرب لگائی تھی۔ اس سے پہلے کہ ہم میں سے کوئی ٹھیک سے سمجھ پاتا، کمرے کی بائیں جانب والی کھڑکی کا شیشہ دھماکے سے ٹوٹا اور پرچھائیں اوجھل ہوگئی۔ مجھے بس اس کے زردی مائل لباس کی ہلکی سی

جھلک ہی دکھائی دی۔

''رضوان تم ٹھیک ہو؟'' فخر کی پکارتی ہوئی آواز کمرے میں گونجی۔

رضوان کا جواب سنے بغیر میں پستول بدست کمرے سے نکل آیا اور اس سمت بڑھا جدھر پرچھائیں اوجھل ہوئی تھی۔ سیڑھیوں کی طرف سے پنجابی چوکیدار کی بلند آواز آئی۔ ''اوئے کون ہے؟''

اس کے ساتھ ہی اس کی کربناک دھاڑ سنائی دی۔ شاید اس پر حملہ کیا گیا تھا۔ کچھ لوگوں نے اپنے موبائل وغیرہ کی ٹارچیں روشن کر لی تھیں، ان میں، میں بھی شامل تھا۔ چوکیدار کے چلانے کی آواز سیڑھیوں کے نچلے سرے سے آئی تھی۔ میں بھاگتا ہوا وہاں پہنچا تو ایک خوفناک منظر نظر آیا۔ فربہ اندام چوکیدار کا نرخرہ ادھڑا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ کسی نے آناً فاناً اس کی گردن پر ایک تیز دھار چھری چلا دی ہے۔ خون اس کی گردن میں سے ہلکوروں کے ساتھ ابل رہا تھا اور فرش کی ٹائلوں پر پھیل رہا تھا۔ کسی نے بوکھلا کر اس کے زخم پر ایک کپڑا رکھ کر دبایا لیکن خون کا یہ اخراج ایسا نہیں تھا جو یوں رک سکتا۔

میں نے کپڑا ہٹا کر ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ یہ عجیب سا زخم تھا۔ گردن پر ایک نہیں دو تین کٹ تھے لیکن ایک کٹ اتنا گہرا تھا جس نے بدقسمت شخص کی شہ رگ جزوی طور پر کاٹ ڈالی تھی۔ اب شور ہوٹل کے عقبی حصے کی طرف سے اٹھ رہا تھا۔ زخمی پر فقط ایک نگاہ ڈالنے کے بعد میں شور کی جانب لپکا۔ یہی وقت تھا، جب لائٹ آ گئی۔ ہوٹل میں روشنی ہوئی۔ میں چھوٹے سائز کے ڈائننگ ہال سے گزر کر عقبی سیڑھیوں کی طرف آیا۔ یہاں سات آٹھ افراد جمع ہو چکے تھے۔ ایک ملازم لوہے کے ایک چھوٹے دروازے کی طرف اشارے کر رہا تھا اور واویلا مچا رہا تھا۔ یہ ہوٹل کا ایک ویٹر ہی تھا۔ وہ ایک بار پھر دروازے کی طرف انگلی اٹھا کر بولا۔ ''وہ ادھر ہی گھسا ہے، اندھیرا تھا، پھر بھی مجھے صاف پتا چلا ہے، وہ اندر ہی ہو گا۔'' اس کے لہجے میں یقین تھا۔

اب دروازے کے سامنے دس پندرہ افراد جمع ہو چکے تھے۔ اکثر چہروں پر ہراس تھا۔ سیڑھیوں کی طرف سے بھی بلند آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ زخمی ہونے والے پنجابی چوکیدار کو اسپتال پہنچانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

ویٹر جس دروازے کی طرف اشارہ کر رہا تھا، وہ ایک تہ خانے میں کھلتا تھا۔ ایک تنگ سا زینہ نیچے اترتا دکھائی دے رہا تھا۔ نیچے مکمل خاموشی تھی۔ کسی نے کہا۔ ''پولیس کو اطلاع دو۔''

ایک دوسرا شخص بولا۔ ''وہ اکیلا بندہ ہے۔ ہمت کر کے اندر گھسو، پکڑ لو اسے۔''
پہلے نے کہا۔ ''تو تم گھسو اندر۔ ہم تمہارے پیچھے ہیں۔''
دوسرا شخص جو ایک لمبا چوڑا پنجابی گبرو تھا، دروازے کے قریب گیا مگر ایک عمر رسیدہ شخص نے اسے کندھے سے تھام کر روک لیا۔ ''بے وقوفی نہیں کرنی چاہیے۔ اگر کوئی ہتھیار ہے تو پھر جاؤ اندر۔''
بریٹا پسٹل ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا اور میرے پاس اس کا باقاعدہ لائسنس بھی تھا۔ میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ''میرے پاس ہے ہتھیار۔ میں دیکھتا ہوں۔''
کئی افراد ایک ساتھ بولنے لگے۔ ان کی باتوں کا مفہوم یہ تھا کہ اندر گھسنے کے بجائے حملہ آور کو پہلے باہر آنے کی وارننگ دی جائے۔
اس مشورے پر عمل ہوا۔ گھونگریالے بالوں والے گوجر نما پنجابی گبرو نے دروازے کو لات مار کر کھولا اور للکار کر بولا۔ ''تم جو بھی ہو، باہر آ جاؤ۔ ورنہ اندر ہی مارے جاؤ گے۔ یہاں پھنس تو گئے ہو پر نکل نہیں سکتے ہو تم۔''
اس وارننگ کو دو تین بار مختلف الفاظ میں دہرایا گیا مگر نتیجہ کوئی نہیں نکلا۔ اندر تقریباً خاموشی رہی۔ اب پہلوان حشمت اور فخر وغیرہ بھی موقع پر پہنچ چکے تھے۔ میں نے اپنے پسٹل کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور لوہے کے دروازے سے گزر کر اندر چلا گیا۔ تہ خانے میں ہلکی روشنی موجود تھی۔ تنگ زینوں پر احتیاط سے قدم رکھتا میں نیچے پہنچ گیا۔ یہ تہ خانہ قریباً تیس فٹ ضرب بیس فٹ کا ہوگا۔ اس کے دو پورشن تھے۔ تہ خانہ سیلن زدہ تھا اور اس کی مجموعی حالت زیادہ اچھی نہیں تھی۔ یہاں ہوٹل کا کاٹھ کباڑ پڑا ہوا تھا۔ چند دیگچے، ٹوٹی ہوئی تین چار کرسیاں، ایک جہازی سائز کے ریفریجریٹر کا ڈھانچا، دو تین بے کار گیس سلنڈر وغیرہ۔
میں نے دروازے کی آڑ لے کر بڑی احتیاط سے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ میں نے انگلی پسٹل کے ٹریگر پر رکھی ہوئی تھی۔ مجھے بظاہر کہیں بھی کسی متنفس کے آثار دکھائی نہیں دیئے...... لیکن ویٹر نے جس یقین کے ساتھ واویلا مچایا تھا اسے کچھ نہ کچھ تو دکھائی دیا ہی تھا۔
میرے بعد فخر اور گرانڈیل پنجابی گبرو بھی احتیاط سے قدم رکھتے نیچے اتر آئے۔ اس کے بعد چار پانچ مزید افراد نے حوصلہ کیا اور سیڑھیوں پر آ گئے۔ ان میں سے ایک شخص کے ہاتھ میں پمپ ایکشن رائفل بھی دکھائی دے رہی تھی جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ اس ہوٹل کے مالک کا بیٹا تھا۔
اگلے پانچ منٹ میں تہ خانے کے سارے کونے کھدرے دیکھ لیے گئے۔ وہاں کچھ نہیں

ملا لیکن یہ بات تو تقریباً کنفرم تھی کہ حملہ آور ابھی اس ہوٹل کے اندر ہی کہیں ہے۔ سب لوگ تہ خانے سے نکل کر ہوٹل کی دونوں منزلوں پر پھیل گئے۔ کچھ چھت پر چڑھ گئے۔ میں، فخر اور پہلوان واپس اپنے کمرے میں آ گئے۔ فخر نے اپنے دائیں ہاتھ سے اپنی بائیں کلائی کو تھام رکھا تھا۔ ''کیا ہوا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''چوٹ لگی ہے لیکن زیادہ نہیں ہے۔'' فخر نے اپنی کلائی کا بڑا سا نیل دکھاتے ہوئے کہا۔

''اور رضوان؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ بھی ٹھیک ہے۔ اسے پسلیوں پر چوٹ آئی ہے۔ خون بھی نکل رہا تھا۔ اسے زخمی چوکیدار کے ساتھ ہی اسپتال لے گئے ہیں۔ ویسے وہ خیریت سے ہے۔ میں نے اس کا زخم دیکھا ہے۔''

''کس چیز کا زخم تھا؟''

''کوئی تیز دھار آلہ ہوسکتا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اسے کوئی شیشہ لگ گیا ہو۔ وہ ٹوٹے ہوئے ٹی وی پر گرا تھا۔''

''لیکن میرا خیال کچھ اور ہے۔''

''کیا مطلب؟'' فخر نے پوچھا۔

''ابھی بتاتا ہوں تمہیں۔''

ہمارے کمرے کے سامنے بھی کئی افراد جمع تھے...... وہ سب ٹوٹی ہوئی کھڑکی اور چکنا چور ہو جانے والے ٹی وی سیٹ کو ہراس آمیز تجسس کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ ایک بستر پر خون کے کچھ دھبے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ یہ یقیناً رضوان کے زخم سے ٹپکنے والا خون تھا۔ ہوٹل کے مالک کا ''رائفل بدست بیٹا'' بھی وہاں پہنچ گیا۔ وہ بڑا تیز طرار بن رہا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں گاؤدی پن صاف جھلک دکھاتا تھا۔ وہ کچھ ڈرا ہوا بھی تھا اور ڈر کی وجہ بھی عیاں تھی۔ دراصل جب یہ واقعہ ہوا ہوٹل میں دو چار ایمرجنسی لائٹوں کے علاوہ مکمل تاریکی تھی۔ کوئی بھی حملہ آور کو دیکھ نہیں پایا تھا۔ یہاں تک کہ ہم بھی نہیں جن کے کمرے میں وہ گھسا تھا۔ تہ خانے کے قریب بیرے کو بھی بس ایک پرچھائیں سی دکھائی دی تھی۔ اب یہ پرچھائیں کسی چیز کی بھی ہوسکتی تھی۔

ہوٹل مالک کے بیٹے نے ہم سے سوال جواب شروع کر دیئے کہ ہماری کسی سے دشمنی وغیرہ تو نہیں ہے...... اور کیا وجہ ہے کہ حملہ آور سب سے پہلے ہمارے کمرے میں گھسا۔

پہلوان اس سوال پر طیش میں آ گیا اور اس سے پہلے کہ وہ نوجوان سے جھگڑ پڑتا، میں نے اور فخر نے معاملہ سنبھال لیا۔

ہوٹل کی چھت پر اور اردگرد کی چھتوں پر ابھی تک تلاش جاری تھی۔ میں نے کمرے کا دروازہ بند کرنے کے بعد فخر سے کہا۔ ''ان لوگوں کو کچھ نہیں ملے گا، کیونکہ حملہ کرنے والا آس پاس کہیں نہیں ہے۔''

''کیا مطلب؟'' فخر نے ذرا چونک کر اور حیران ہو کر کہا۔

''وہ وہیں نیچے اس تہ خانے میں موجود ہے۔'' میں نے انکشاف کیا۔

فخر اور پہلوان کے چہرے ایک ساتھ حیرت کی آماجگاہ بن گئے۔ ''یہ تم کیا کہوت ہو شاہ زیب!'' پہلوان لرزاں آواز میں بولا۔ ''وہاں تو کچھ بھی نظر ناہیں آیا۔''

''اس نے نظر آنا بھی نہیں تھا، کیونکہ وہ انسان نہیں ہے۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔

پہلوان حشمت کا چہرہ تاریک ہو گیا اور آنکھوں کے ڈیلے بے ساختہ باہر کو ابل پڑے۔ فخر بھی تعجب سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ ''یہ کیا مذاق کر رہے ہو؟'' اس نے کہا۔

''مذاق نہیں ہے فخری! وہ اس لیے نظر نہیں آیا کہ وہ انسان نہیں ہے۔ وہ ایک مختصر سی جگہ پر بھی چھپ سکتا ہے۔ وہ ایک جانور ہے۔''

''جانور؟'' فخر کی متحیر نگاہیں میرے چہرے پر جمی تھیں۔

میں دھیان سے اس بستر کو دیکھ رہا تھا جہاں ایک دو جگہوں پر خون کے دھبے تھے۔ یقیناً یہ رضوان کے زخم سے نکلنے والا خون ہی تھا۔ میں نے چادر پر سے کچھ خاکستری بال اٹھائے اور انہیں روشنی کی طرف کر کے توجہ سے دیکھا۔ یقیناً یہ انسانی بال نہیں تھے۔ فخر اور پہلوان حشمت بھی ان بالوں کو بغور دیکھ رہے تھے۔

''یہ کس کے بال ہیں؟'' فخر نے پوچھا۔

''میں پچاس ساٹھ فیصد تو جان گیا ہوں لیکن ابھی کنفرم ہونا باقی ہے۔''

''یار پہیلیاں کیوں بجھوا رہے ہو، میرے تو رونگٹے کھڑے ہو گئے ہیں۔'' فخر نے کہا۔

پہلوان حشمت منہ میں کچھ پڑھ رہا تھا۔ اس کی صورت دیدنی تھی۔ میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ تہ خانے میں جو چیز چھپی ہوئی ہے...... وہ ایک بندریا ہے۔ ایک بندریا جو خونخوار ہو چکی ہے۔''

''یہ تم کیا کہوت ہو؟ کہیں تم پر بھی تو کسی چیز کا سایہ ناہیں ہو گیا۔'' پہلوان حشمت نے ہراساں آواز میں خیال ظاہر کیا۔

میں نے فخر سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''چاچا حشمت کو تو معلوم نہیں، لیکن تم تو اس وقت میرے ساتھ تھے جب ہم نے صادق آباد میں ہاناوانی کے درشن کیے تھے۔ وہ اس وقت سجاول کو اپنے قبضے میں کرنے کی کوشش کر رہی تھی......''

ایک دم جیسے فخر کو یاد آ گیا۔ وہ بولا۔ ''ہاں......اس وقت ہمیں ہاناوانی کی گود میں ایک بندریا نظر آئی تھی......''

''یہ وہی ہے فخر! مجھے ساٹھ فیصد سے زیادہ یقین ہے کہ یہ وہی بندریا ہے۔ یہ بال دیکھو، یہ کسی اور جانور کے نہیں ہو سکتے۔''

فخر کے چہرے پر بھی اب ہیجان نظر آ رہا تھا۔ وہ ایک توقف کے بعد بولا۔ ''اگر تمہیں پتا لگ گیا تھا کہ وہ تہ خانے میں ہے تو پھر اسے مارنے یا پکڑنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟''

''اس کی وجہ ہے۔ میں یہ کوشش سب کے سامنے کرنا نہیں چاہتا تھا۔''

''لیکن اگر وہ واقعی وہاں ہے تو پھر وہاں سے نکل بھی سکتی ہے۔ مزید نقصان پہنچا سکتی ہے۔'' فخر نے کہا۔

''نہیں نکلے گی۔ مالک کے بیٹے نے تہ خانے کو باہر سے لاک لگا دیا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر میں ہم پھر تہ خانے میں اتریں گے۔ ذرا یہ ہلچل ختم ہو جائے۔'' بات اب فخر کی سمجھ میں آ رہی تھی۔

O......❖......O

دس پندرہ منٹ بعد رضوان سے ہمارا رابطہ ہو گیا۔ وہ ایک قریبی اسپتال میں تھا۔ اس نے فون پر بتایا کہ اس کے زخم کی بینڈ تیج ہو گئی ہے۔ اسے کچھ ٹانکے بھی لگائے گئے تھے۔ اس نے کہا۔ ''میں آدھے گھنٹے تک واپس آ جاؤں گا۔''

اپنے اوپر ہونے والے حملے کے بارے میں اس نے وہی کچھ بتایا جس کا مجھے اندازہ تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ کوئی تیز پنجوں والا جانور تھا، وہ اسے کتا یا بڑے سائز کا بلا سمجھا تھا۔ تاہم حملے کے دوران میں جو مدھم سی آوازیں اس کے کانوں تک پہنچی تھیں وہ کتے یا بلے کی نہیں تھیں۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ یہاں پہنچے اسے سب پتا چل جائے گا۔ وہ اس بات پر بھی سخت الجھن میں تھا کہ حملہ آور جو کوئی بھی تھا، بند کمرے میں کیسے پہنچ گیا۔ میں نے اسے بتایا۔ ''تمہیں یاد ہے سب سے پہلے چاچا حشمت کو کھٹ پٹ کی آواز آئی تھی۔ انہوں نے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر جھانکا تھا۔ جھانکا تھا یا نہیں؟'' رضوان نے میری بات کی تائید کی۔ میں نے کہا۔ ''حملہ کرنے والے نے اندھیرے سے فائدہ اٹھایا اور اس وقت کمرے میں کھسک

آیا۔ بعد میں ہم نے دروازہ اندر سے پھر لاک کر لیا۔‘‘ اس حوالے سے کافی حد تک رضوان کی تسلی ہو گئی۔

رضوان نے کہا۔ ’’میرے ساتھ جس زخمی چوکیدار کو یہاں لایا گیا تھا، وہ مسلسل بے ہوش ہے لیکن ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اب اس کی حالت خطرے سے باہر ہے۔‘‘

رضوان کی طرف سے تسلی ہونے کے بعد ہم نے اپنی توجہ اصل کام پر مرکوز کی۔ مالک کے بیٹے نے تہ خانے کے دروازے کو باہر سے تالا لگایا تھا اور چابی میرے سامنے ہوٹل کے ہیڈ ویٹر کو دی تھی۔ یہ ہیڈ ویٹر طوطے جیسی ناک والا ایک دبلا پتلا گنجا شخص تھا۔ ہم نے اسے اپنے کمرے میں بلا لیا۔ ہوٹل کے دیگر عملے کی طرح وہ بھی خوف زدہ نظر آتا تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ ہوٹل میں اور ہوٹل کے باہر حملہ آور کی تلاش ناکام رہی ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ وہ کوئی پھرتیلا بچہ تھا جو آناً فاناً دو بندوں کو زخمی کر کے غائب ہو گیا ہے۔ گہرے اندھیرے میں بس اس کی پرچھائیں ہی دکھائی دی۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ’’پولیس کو اطلاع دی گئی ہے؟‘‘

اس نے رازداری کے انداز میں کہا۔ ’’نہیں ابھی تک نہیں۔ یہ مالکوں کا کام ہے، پتا نہیں کہ وہ دیتے بھی ہیں یا نہیں۔‘‘

میں نے اندازہ لگایا کہ شاید ہوٹل والوں کے اپنے کوئی ایشوز ہیں جن کی وجہ سے وہ پولیس کو اطلاع دینے سے کترا رہے ہیں۔ تھوڑی سی کوشش سے میں نے منظور نامی اس ہیڈ ویٹر کو اپنے اعتماد میں لے لیا۔ ویسے بھی وہ لالچی بندہ تھا۔ ایسے لوگوں کو شیشے میں اتارنا زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔

میں نے منظور سے پوچھا۔ ’’تہ خانے کی چابی تمہارے پاس ہے؟‘‘

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ’’آہو جی۔ میرا کمرا تہ خانے کے دروازے کے ساتھ ہی ہے۔ میں اب تک وہیں پر تھا۔ شروع میں، میں نے ہی رولا ڈالا تھا کہ کوئی تہ خانے کی طرف آیا ہے۔ ویسے مجھے تو اب بھی شک ہے کہ کوئی اندر گھسا تھا۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’منظور! ہمیں بھی لگتا ہے کہ تمہارا شک درست ہے۔‘‘

منظور نے اپنی گول گول آنکھوں کو نیم دائرے کی شکل میں گھمایا اور مزید حیران نظر آنے لگا۔ فخر نے اس سے پوچھا۔ ’’دروازہ لاک ہونے کے بعد تمہیں اندر سے کوئی آواز وغیرہ تو سنائی نہیں دی؟‘‘

وہ جلدی سے بولا۔ ’’ہاں ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے آواز کا شک بھی ہوا ہے۔‘‘

میں نے منظور کو مختصر الفاظ میں سمجھایا کہ ہم کیا چاہ رہے ہیں۔ وہ اثبات میں سر ہلاتا رہا اور ڈرے ڈرے انداز میں ہماری طرف دیکھتا رہا۔

بجلی ایک بار پھر جا چکی تھی۔ نچلے درجے کے اس ہوٹل میں مختلف جگہوں پر پورٹی ایبل لائٹس اور گیس لیمپ تھوڑی بہت روشنی دے رہے تھے۔ ہوٹل میں مقیم زیادہ تر لوگ دوبارہ اپنے کمروں میں جا چکے تھے۔ عملے کے بیشتر لوگ جاگ رہے تھے۔ وہ ہوٹل کے بیرونی دروازے کے پاس دو تین ٹولیوں میں کھڑے لاحاصل تبصروں میں مصروف تھے۔ میں اور فخر...... منظور کی رہنمائی میں بڑی خاموشی کے ساتھ تہ خانے کے آہنی دروازے تک پہنچ گئے تھے۔ منظور نے مجھے ایک بھاری کمبل فراہم کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک بڑی ٹارچ تھی جو فخر کے پاس تھی۔ ایک چھوٹی ٹارچ میں نے بھی اپنے پسٹل سمیت قمیص کے نیچے اڑس رکھی تھی۔ دستانوں کا ایک جوڑا بھی میرے پاس موجود تھا۔ یہ رات کے قریباً تین بجے کا عمل تھا۔ ہمارے کمرے پر ہونے والے حملے کو...... اور اس کے نتیجے میں مچنے والی بھاگ دوڑ کو اب تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ گزر چکا تھا۔ پتا نہیں کیوں میرا دل بار بار یہ گواہی دے رہا تھا کہ تہ خانے کی تاریکی میں وہ لوسی نامی بندریا موجود ہے جو ہم نے چند روز پہلے ہاناوانی کی گود میں دیکھی تھی...... میرے کہنے پر منظور نے بڑی آہستگی سے ہضمی قفل میں چابی گھمائی اور خوف زدہ انداز میں پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ میں اور فخر آگے پیچھے تہ خانے کی سیڑھیوں پر پہنچے۔ منظور نے دروازہ بند کیا اور ہم نے اسے اندر سے بولٹ کر دیا۔ میرے پاس بھاری بھرکم کمبل تھا۔ اپنا پستول میں نے فخر کو تھما دیا۔ بڑی ٹارچ بھی اس کے پاس تھی۔ اس نے سیڑھیاں اترتے ہوئے ٹارچ کا روشن دائرہ اسی جہازی سائز کے ریفریجریٹر پر ڈالا جو ایک بیکار ڈھانچے کی صورت دیوار کے ساتھ کھڑا تھا۔ ریفریجریٹر اور دیوار کے درمیان بمشکل چھ سات انچ کا فاصلہ ہو گا۔

فخر نے سرگوشی کی۔ ''یہ تو بڑی تھوڑی سی جگہ ہے۔''

''لیکن وہ جو کوئی بھی ہے یہیں پر ہے۔ میں نے اس خلا میں اس کی چمکتی آنکھیں دیکھی ہیں۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ اب وہ کہیں اور چھپ گئی ہو...... یا چھپ گیا ہو۔ تم بالکل چوکس رہو۔ اگر گولی چلانے کی ضرورت پڑے تو بالکل دریغ نہ کرنا۔''

''بے فکر رہو۔ سیدھا ماتھے پر ماروں گا۔'' فخر نے سرگوشی میں جواب دیا۔

تہ خانے میں مکمل سناٹا تھا۔ لگتا تھا کہ یہاں کوئی ذی روح ہے ہی نہیں۔ ہم بڑی احتیاط سے چلتے ریفریجریٹر کے چھ سات فٹ اونچے ڈھانچے کے قریب پہنچے...... پروگرام یہی تھا کہ

فخر ریفریجریٹر کے عقبی خلا میں ایک جانب سے روشنی پھینکے گا اور آہٹ پیدا کرے گا۔ جانور دوسری طرف سے نکلنے کی کوشش کرے گا اور میں اس پر کمبل پھینک کر اسے زندہ پکڑنے کی کوشش کروں گا مگر جو کچھ ہوا وہ غیر متوقع تھا۔ ابھی ہم ریفریجریٹر کے قریب پہنچے ہی تھے کہ کھڑ کھڑاہٹ ہوئی، اس کے ساتھ ہی وہ تیز غصیلی آواز ابھری جو ''بندر جاتی'' سے مخصوص ہوتی ہے۔ ایک پرچھائیں برق رفتاری سے مجھ پر جھپٹی۔ شکر کا مقام تھا کہ کمبل میرے ہاتھوں میں تھا اور میں نے اسے تقریباً کھولا ہوا تھا۔ میں نے اپنے دفاع کے لیے کمبل کو اپنے سامنے کیا۔ پرچھائیں کمبل سے ٹکرائی اور زوردار دھچکے کے سبب میں پشت کے بل گری۔ یہی وقت تھا جب فخر کی ٹارچ کا روشن دائرہ حملہ آور جانور پر پڑا۔ بے شک وہ بندریا لوسی تھی۔ جاما جی میں بھی وہ ہمیشہ لباس میں نظر آیا کرتی تھی۔ اس وقت بھی اس کے جسم پر کوئی فراک نما پیراہن تھا۔ میں نے تیزی سے اسے اپنے کمبل کے لپیٹے میں لینا چاہا۔ مگر پھر وہ بری طرح مچلی اس نے اپنے بالائی دھڑ کو آزاد کرا کے اپنے دانت میرے کندھے میں گاڑ دیئے۔ اس کا انداز وحشیانہ تھا۔ اگر ان لمحوں میں، میں اس کے نچلے دھڑ کو چھوڑ دیتا تو وہ یقیناً اپنے پنجوں سے مجھے ادھیڑ ڈالتی۔ وہ ایک درمیانے سائز کی بندریا تھی لیکن اس وقت اس کے جسم میں کسی خون آشام شکاری جانور کی سی طاقت محسوس ہوتی تھی۔ میرے کندھے سے درد کی ایک ٹیس اٹھی۔ ان ساعتوں میں فخر نے بروقت ردِعمل دیا۔ میرا بریٹا پسٹل اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے پسٹل کے دستے کی دو کراری ضربیں لوسی کی کھوپڑی پر لگائیں۔ پہلی ضرب پر تو وہ تڑپی لیکن دوسری ضرب پر ادھ موئی سی ہو کر میرے کندھے سے علیحدہ ہو گئی۔ فخر نے احتیاطاً ایک اور ضرب اسے رسید کی۔ وہ کسی چھپکلی کی طرح تہ خانے کے گرد آلود فرش پر گر گئی۔

''تم ٹھیک ہو؟'' فخر نے بے تابی سے پوچھا اور ٹارچ کی روشنی میرے کندھے پر ڈالی۔ اسے خطرہ محسوس ہوا تھا کہ شاید اس بپھرے جانور نے میری گردن میں دانت گاڑے ہیں۔

قمیص پر خون کا چھوٹا سا داغ نمودار ہو گیا تھا۔ تاہم زخم گہرا نہیں تھا۔ ہم نے پھرتی کے ساتھ لوسی کو کمبل میں لپیٹا اور سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔ سیڑھیاں چڑھ کر میں نے دروازے سے کان لگائے۔ تہ خانے میں تھوڑی بہت آوازیں پیدا ہوئی تھیں لیکن یہ باہر تک نہیں پہنچی تھیں اور دروازے کی دوسری جانب خاموشی تھی...... لوسی کو فخر نے اٹھا رکھا تھا۔ میں نے بغیر آواز پیدا کیے دروازہ تھوڑا سا کھولا۔ حسبِ توقع منظور وہاں موجود تھا۔

''سب ٹھیک ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''آہو جی، سب ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا تب اس کی نگاہ فخر کے کندھے پر رکھے کمبل پر پڑی۔ یوں لگتا تھا کہ اس نے کسی بچے کو کمبل میں لپیٹ کر اٹھا رکھا ہے۔ منظور کی گول آنکھوں میں حیرت کی یلغار نظر آئی۔ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ بجلی ابھی تک غائب تھی۔ لوسی سمیت اپنے کمرے تک پہنچنے میں ہمیں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔

ہمارے پہنچنے تک پہلوان حشمت نے مالک کے بیٹے سے کہہ کر اپنا کمرا تبدیل کرا لیا تھا۔ پہلے کمرے کی کھڑکی ٹوٹ چکی تھی اور ٹی وی کے علاوہ فرنیچر بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوا تھا۔ یہ دوسرا کمرا بھی تقریباً پہلے جیسا ہی تھا۔ اس میں بھی تین بیڈ تھے تاہم کھڑکی میں لوہے کی گرل تھی۔ ہمارا مختصر سامان بھی اس دوسرے کمرے میں شفٹ ہو چکا تھا۔

ہم نے کمرا اندر سے بند کیا اور پردے برابر کر دیئے۔ منظور واپس نیچے جا چکا تھا۔ میں نے اس کی جیب میں ہزار ہزار کے پانچ نوٹ ڈالے تھے اور اسے مکمل رازداری کا پابند کیا تھا۔

ٹیوب لائٹ کی دودھیا روشنی میں ہم نے کمبل کو کھولا اور لوسی کا معائنہ کیا۔ فخر نے اسے جو دوسری چوٹ لگائی تھی اس کے سبب اس کی کنپٹی سے تھوڑا سا خون بھی رِسا تھا۔ اس کے دانت یوں نکلے ہوئے تھے جیسے وہ ہنس رہی ہے لیکن وہ بے ہوش تھی۔ اس نے ایک زرد پھولدار فراک اور سرخ نیکر پہن رکھی تھی۔ نیکر کے عقبی سوراخ میں سے اس کی لمبی دم باہر نکلی ہوئی تھی۔ لگ بھگ چالیس پاؤنڈ کی وہ ایک خوب صورت بندریا تھا۔ جاما جی کی لڑائی کے آخری راؤنڈ میں اس نے زبردست کارکردگی دکھائی تھی اور اپنے مالک خانساماں ازمیر طیب کے قاتل کو کیفر کردار تک پہنچانے میں ایک حیران کن کردار ادا کیا تھا لیکن اب وہ خود کسی کے چنگل میں تھی۔ یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ انسانوں کی طرح جانور بھی ہپناٹزم سے پوری طرح متاثر ہوتے ہیں۔ یقیناً وہ ''تحپیشن'' کے زیر اثر تھی اور ایک خونخوار جانور کا روپ دھار چکی تھی۔

پہلوان نے ڈرے ڈرے لہجے میں کہا۔ ''میں تو کہوت ہوں کہ اس کو دو چار چوٹیں اور لگاؤ، اور اس کی کھوپڑی توڑ کر کہیں پھینک دو اسے۔''

میں نے کہا۔ ''پہلوان جی! اگر کھوپڑی توڑنی ہوتی تو پھر اسے پکڑنے کا خطرہ کیوں مول لیا۔ یہ جانور ہمارے بہت کام آنے والا ہے۔''

''وہ کیسے؟''

''ابھی چند گھنٹوں میں پتا چل جائے گا آپ کو۔''

میں نے فخر کی طرف دیکھا۔ وہ جانتا تھا کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔ اسی دوران میں پہلوان کی نگاہ میرے کندھے سے رِسنے والے خون پر پڑی۔ وہ ایک دم زیادہ پریشان نظر آنے لگا۔ میں نے اسے بتایا کہ یہاں اسی بندریا نے دانت آزمائے ہیں۔ وہ جلدی سے نیچے گیا اور پسی ہوئی سرخ مرچیں لے آیا، بولا۔ ''جانور کے کاٹے کا فوراً علاج ہونا چاہیے سرخ مرچیں جراثیموں کو مارت ہیں۔''

فخر نے ابھی تک اپنی مضروب کلائی دبا رکھی تھی وہ بولا۔ ''پہلوان جی! آپ کو پہلے میری مرہم پٹی کرنی چاہیے...... کیونکہ یہ چوٹ بھی آپ کی لگائی ہوئی ہے۔''

پہلوان جواب دینے کے بجائے تھوڑا سا خجل نظر آیا۔ معلوم ہوا کہ دو گھنٹے پہلے جب لوسی پُراسرار طور پر ہمارے کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے رضوان پر حملہ کیا تو دھینگا مشتی کا سماں بن گیا۔ عالم گھبراہٹ میں پہلوان جی نے ٹوٹی ہوئی میز کا پایہ اس طرح گھمایا کہ وہ بندریا کے بجائے فخر کی کلائی پر لگا اور اس کی ہڈی ٹوٹنے میں بس اُنیس بیس کی کسر رہ گئی۔

میں نے سوالیہ نظروں سے فخر کو دیکھا تو وہ کراہنے کی اداکاری کرتے ہوئے بولا۔ ''مجھے تو لگتا ہے کہ اس چوٹ کے لگنے میں مجھ خاکسار کا ہی قصور ہے، نہ میں ہوائی چیزوں کے بارے میں پہلوان جی سے بحث کرتا، نہ ان کی طبع میں غصے کی پیداوار ہوتی اور نہ مجھے یہ سزا ملتی۔''

پہلوان نے بھنا کر کہا۔ ''الٹا چور لنکا ڈھائے۔ میں نے تم دونوں کو بچانے کی کوشش کی اور تم مجھ پر الزام دھرت ہو کہ میں نے جان بوجھ کر مارا یہ تو وہی بات ہوئی ناں

جو تیر ان کی طرف آیا، ہم نے سینے پر کھایا
جب ہم مر گئے تو انہوں نے بھنگڑا پایا۔''

شاید یہ بحث طول پکڑتی لیکن اسی دوران میں رضوان بھی اسپتال سے فارغ ہو کر ہوٹل پہنچ گیا۔ اس کی پسلیوں کو ڈھانپنے والے گوشت پر بارہ ٹانکے لگے تھے مگر وہ حوصلے میں تھا۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں حیرانی منجمد تھی۔ یہ حیرانی صرف رضوان کو ہی نہیں اس کے زخم کو ٹریٹ کرنے والے ڈاکٹرز کو بھی تھی۔ انہوں نے واضح طور پر بتایا تھا کہ یہ کسی جانور کی وحشت کا نتیجہ ہے لیکن جانور کیا تھا، اس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکا تھا، چوکیدار اور رضوان کے جسم سے چند بال اٹھا کر لیبارٹری ٹیسٹ کے لیے بھیج دیئے گئے تھے۔

بندریا لوسی کمبل کے اوپر بستر پر پڑی تھی۔ اسے دیکھ دیکھ کر پہلوان حشمت کا بلڈ پریشر

مسلسل لو ہو رہا تھا۔ اسی تناؤ کو ختم کرنے کے لیے اس نے جائے نماز بچھائی اور نوافل پڑھنا شروع کر دیئے۔ جب وہ رکوع میں گیا تو اسے بتایا گیا کہ اس نے مغرب کے بجائے مشرق کی طرف رخ کر رکھا ہے۔ نتیجے میں اس نے سلام پھیرا اور اپنا قبلہ درست کیا۔

جو کچھ ہم نے سوچ رکھا تھا، وہ دوپہر تک عملی شکل میں سامنے آ گیا۔ میری درخواست پر داؤد بھاؤ نے دو گھنٹے کے اندر اس ''VHF ریڈیو ٹرانسمیٹر'' کا انتظام کر دیا جو جنگلی جانوروں کی لوکیشن معلوم کرنے کے لیے ان کے جسم کے اندر لگایا جاتا ہے۔ اس کے لیے ایک بالکل چھوٹی سی سرجری کی ضرورت ہوتی ہے۔ فخر شکاریات کا خاصا تجربہ رکھتا تھا اور ریڈیو ٹرانسمیٹر وغیرہ لگانے کا تجربہ بھی رکھتا تھا۔ ہم نے لوسی کی مشکیں اچھی طرح کس رکھی تھیں اور اس کی آواز دبانے کے لیے اس کے منہ پر چوڑی ٹیپ بھی چڑھا رکھی تھی۔ ریڈیو ٹرانسمیٹر آ گیا تو فخر نے لوسی کو جسم سن کرنے والا انجکشن دیا۔ رضوان ٹی بھی ایک عرصہ تک ڈاکٹر ارم کا اسسٹنٹ رہا تھا اور سرجری کی سوجھ بوجھ رکھتا تھا۔ ان دونوں نے مل کر ٹرانسمیٹر لوسی کی گردن کے نیچے لگا کر اسٹچنگ کر دی۔ لوسی کے بال خاصے بڑے تھے۔ اسٹچنگ تقریباً چھپ کر رہ گئی۔ اب خصوصی توجہ کے بغیر اسے دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ (جانور کے کاٹے کا انجکشن میں صبح سویرے ہی لگوا چکا تھا۔ اور ڈریسنگ بھی کروالی تھی)

پروگرام کے مطابق ہم نے شام تک لوسی کو اپنے کمرے کے اندر ہی رکھا۔ اس کی آنکھیں اورنج کلر کی تھیں۔ میں نے پہلے بھی اس کی آنکھیں اور اس کا چہرہ دیکھا تھا لیکن اب یہ اس کی آنکھیں نہیں لگتی تھیں اور نہ یہ اس کا چہرہ لگتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سے جیسے کوئی اور جھانکتا تھا۔ کسی اور کے خونی ارادے تھے جو اس کی آنکھوں میں لشکارے مارتے تھے۔ اس کے ہاتھ پاؤں بڑی اچھی طرح بندھے ہوئے تھے مگر وہ پھر بھی گاہے بگاہے بے پناہ زور مارتی تھی اور یوں لگتا تھا کہ اپنی بندشیں توڑ ڈالے گی۔

رات کا اندھیرا پھیلتے ہی ہم نے لوسی کو اچھی طرح کینوس کے ایک بیگ میں بند کیا اور نیچے گاڑی میں لے آئے۔ ٹرانسمیٹر کے سگنل وصول کرنے والا انٹینا بھی ہمارے پاس موجود تھا اور بالکل درست کام کر رہا تھا۔ رات نو بجے کے لگ بھگ ہم لاہور کے شمالی علاقے میں پہنچے اور منٹو پارک کے قریب ایک خالی سڑک پر لوسی کو آزاد کر دیا۔ اسے آزاد کرنے سے پہلے میں نے اپنا پسٹل بالکل تیار حالت میں کر لیا تھا، کیونکہ اس بات کا اندیشہ موجود تھا کہ وہ پلٹ کر حملہ کر دے۔ کہنے کو تو وہ ایک درمیانے سائز کی مادہ بندر تھی لیکن اپنی خاص کیفیت کے زیر اثر اس میں کسی درندے جیسی طاقت محسوس ہوتی تھی۔ مجھے وہ لمحے یاد تھے جب اس نے

الماری کے خلا کے عقب سے نکل کر مجھ پر جست لگائی تھی۔ وزنی کمبل میرے سامنے تھا جس نے مجھے اس کے پنجوں سے محفوظ رکھا تھا۔ اس کے باوجود میں دھکے کے سبب دور تک لڑھک گیا تھا۔

بہرطور اس موقع پر خیریت ہی گزری۔ جونہی ہم نے لوسی کی مشکیں کھول کر اسے آزاد کیا۔ اس نے اپنے چمکیلے دانت نکالے، مڑ کر ہماری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت تھی۔ پھر وہ تیزی سے مخالف سمت میں بھاگی اور ایک موٹر سائیکل سوار کے سامنے سے گزرتی ہوئی درختوں میں گم ہوگئی۔

''اگر اس کے گلے میں ریڈیو ٹرانسمیٹر نہ ہوتو ہم اس کی گرد کو بھی نہ پا سکیں۔'' فخر نے خیال ظاہر کیا۔

میں نے کہا۔ ''اب بھی ہمیں زیادہ دیر نہیں کرنی چاہیے۔ ہمارے ٹرانسمیٹر کی رینج دس کلومیٹر سے زیادہ نہیں ہے۔''

فخر نے سگنل ریسیور آن کیا اور ہم نے لوسی کا تعاقب شروع کر دیا۔ ایک اسپارک کرتا ہوا نقطہ مسلسل لوسی کی لوکیشن کی نشاندہی کر رہا تھا۔ یہ نقطہ مسلسل لاہور کے مضافاتی علاقے کی طرف جا رہا تھا۔ گاڑی میں ڈرائیو کر رہا تھا۔ فخر نے ''ایریل'' ایک ہاتھ میں تھام کر گاڑی کی کھڑکی سے باہر نکال رکھا تھا اور اس کی نگاہیں اسپارک کرتے ہوئے نقطے پر تھیں۔

جلد ہی ہم شہر کے گنجان علاقے سے نکل کر راوی کے پل پر پہنچے اور پھر پار نکل گئے۔ یہ جی ٹی روڈ تھی۔ یہاں ہمیں سگنل کا پیچھا کرنے میں تھوڑی سی دشواری پیش آئی کیونکہ سگنلز سے اندازہ ہوتا تھا کہ لوسی مین روڈ چھوڑ کر کسی ذیلی راستے پر مڑ گئی ہے۔ اس کے لیے ضروری نہیں تھا کہ وہ کسی سڑک پر ہی سفر کرتی۔ وہ جھاڑیوں اور گھنے درختوں سے گزر کر بھی اپنی منزل تک پہنچ سکتی تھی۔ یہ خیال ہمارے لیے بے حد سنسنی خیز تھا کہ ہم ایک اہم سراغ کی طرف جا رہے ہیں۔ اس بات کی امید اسّی نوّے فیصد تک تھی کہ لوسی اسی مقام کی طرف جا رہی ہوگی جہاں ہانا وانی موجود تھی۔

قریباً پندرہ منٹ کے مزید سفر کے بعد اسپارک کرتا ہوا نقطہ ایک جگہ ٹھہر گیا۔ لوسی اب کہیں رک گئی تھی اور یہ ہمارے حق میں بہتر ہی ہوا تھا۔ کیونکہ چھوٹی سڑکوں اور گھنے درختوں والے اس علاقے میں پہنچ کر ہمیں خدشہ محسوس ہونے لگا تھا کہ کہیں لوسی کے ساتھ ہمارا فاصلہ بڑھ نہ جائے اور ہم اسے کھو نہ دیں۔

ہم چار پانچ کلومیٹر مزید آگے گئے پھر رک گئے۔ ہمارے اندازے کے مطابق اب

لوسی سے ہمارا فاصلہ دو کلومیٹر سے زیادہ نہیں تھا۔
''کیا پروگرام ہے؟'' فخر نے مجھ سے پوچھا۔
پچھلی نشست سے پہلوان حشمت نے جواب دیا۔ ''تم لوگ جانت ہو کہ میں ڈرپوک ناہیں ہوں۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ اس وقت مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ اس باندری کو تم لوگ عام باندری نہ سمجھو۔ مجھے تو لگت ہے کہ اس پر ہوائی چیزوں کا قبضہ ہے۔ ایک عام باندر یا باندری میں اتنی طاقت ہو ہی ناہیں سکت ہے۔ تم لوگوں نے دیکھا جب ہم اس کو باندھ رہے تھے تو اس نے کس طرح ہاتھ مار کر پکی لکڑی کی کرسی کے ٹکڑے کر دیئے تھے۔''
''تو ٹھیک ہے پہلوان جی۔ ہوائی چیزوں کو نکالنے کے لیے دو چار روحانی عاملوں کو یا کڑک قسم کے جنات کو بلا لیتے ہیں۔'' فخر نے کہا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''حضرت ''جن پیر'' یعنی داؤد بھاؤ کے بارے میں جناب کا کیا خیال ہے۔ ان کے پاس بھی تو تگڑے قسم کے جنات موجود ہیں۔ ایک گاڑی میں پانچ چھ تو آ ہی جائیں گے۔ کافی ہوں گے ہمارے لیے۔''
وہ ذرا مزاحیہ انداز میں بات کر رہا تھا۔ جنات سے اس کی مراد داؤد بھاؤ کے خطرناک کارندے ہی تھے۔ وہ یہاں پہنچ جاتے تو ہم زیادہ اعتماد سے آگے بڑھ سکتے تھے۔ عین ممکن تھا کہ ہانا وانی کسی عمارت میں ہوتی اور ہمیں اس جگہ کو گھیرنا پڑتا۔
میں نے فخر کی بات سے اتفاق کیا۔ داؤد بھاؤ کو کال ملائی اور ساری سچویشن سے آگاہ کیا۔ اس ڈرامائی سچویشن نے اسے بھی متحرک کر دیا۔ میں نے اس سے صرف پانچ چھ بندوں کی ڈیمانڈ کی تھی لیکن اس نے کہا کہ وہ دو گاڑیاں بھیج رہا ہے اور اگر ضرورت پڑی تو وہ خود بھی وہاں پہنچ جائے گا۔''
فخر بولا۔ ''لگتا ہے کہ محترم داؤد بھاؤ صاحب کو اب تھوڑا تھوڑا یقین ہونے لگا ہے کہ اینق کی موت میں سجاول سے کہیں زیادہ اسی خطرناک زنانی کا ہاتھ ہے۔''
''محسوس تو یہی ہو رہا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن سجاول کو بھی وہ اتنی آسانی سے معاف نہیں کرے گا۔''
پہلوان حشمت نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ''معاف کرنے یا نہ کرنے کا سوال تو تب پیدا ہووے گا جب سجاول اس شکنجے سے زندہ سلامت نکل آوے گا۔ سچ کہوت ہوں مجھے تو حالات زیادہ اچھے ناہیں لگ رہے۔''
''اگر حالات اچھے نہیں لگ رہے تھے تو آپ کو ہمارے ساتھ آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔''

فخر نے کہا۔

وہ بولا۔ ''الٹے بانس کوتوال کو۔ ایک تو تمہارا ساتھ دے رہا ہوں۔ اوپر سے تم مذاق کرت ہو۔''

میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر فخر کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ پہلوان کو واقعی غصہ آ رہا تھا اور بات حقیقت تھی کہ پہلوان خود کو خطرے میں ڈال کر بھی دوسروں کی مدد کے لیے کمربستہ رہتا تھا۔

پہلوان نے سجاول کے حوالے سے بات کی تھی اور اس حوالے سے ایک بات میرے ذہن میں بھی مسلسل کچوکے لگا رہی تھی۔ خورسنہ کی طرح سجاول بھی ان لوگوں میں سے تھا جو میرے زندہ ہونے کے بارے میں جانتے تھے۔ اگر وہ انوکھی عورت اپنے بے مثل ٹرانس کے ذریعے سجاول پر حاوی ہو جاتی تو وہ نہ جانے کیا کچھ اس کے سامنے اگل دیتا۔

فخر نے گاڑی کی نشست سے ٹیک لگائی اور گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''سجاول بھائی کس دن نکلا تھا بیوی اور بچے کی تلاش میں؟''

''پندرہ تاریخ کو۔'' میں نے کہا۔

وہ انگلیوں پر حساب جوڑ کر بولا۔ ''مطلب ہے کہ آٹھ دن ہو چکے ہیں۔ یہ کافی سے زیادہ ٹائم ہے۔''

''تمہارا خیال ہے کہ سجاول اب تک مکمل طور پر ہاناوانی کے قبضے میں جا چکا ہوگا؟''

''بالکل ممکن ہے...... بلکہ...... یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے کسی مشن پر بھی روانہ کیا جا چکا ہو۔ ہم نے یہ بات خود اپنے کانوں سے سنی تھی کہ ہاناوانی کی پلاننگ بڑی دور کی ہے۔ وہ ابراہیم اور قسطینا وغیرہ کو اسی سجاول کے ذریعے مروانا چاہتی ہے جس نے ان کے کہنے پر رائے زل کا سر کاٹا تھا۔''

''خیر ہم قسطینا وغیرہ کو الرٹ تو کر ہی چکے ہیں۔ وہ ہاناوانی کے لیے تر نوالہ نہیں بنیں گے۔''

ہماری یہ گفتگو گاڑی کے اندر ہی ہو رہی تھی۔ ہم نے گاڑی کی ہیڈ لائٹس وغیرہ بند کر دی تھیں اور اسے درختوں کے ایک جھنڈ میں یوں کھڑا کر رکھا تھا کہ کسی کی نگاہ آسانی سے اس پر نہ پڑ سکے۔ ہمیں داؤد بھاؤ کی طرف سے بھیجی جانے والی کمک کا انتظار تھا۔ ٹرانسمیٹر کے ریسیور پر نظر آنے والا نقطہ ایک ہی جگہ پر اسپارک کر رہا تھا۔

O......❖......O

بیس پچیس منٹ بعد داؤد بھاؤ کے تجربہ کار شوٹر موقع پر پہنچ گئے۔ وہ دو گاڑیوں پر سوار تھے۔ ان میں سے اکثر نے سیاہ لباس پہن رکھے تھے۔ اب ہم گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس آن کیے بغیر پارکنگ لائٹس کی مدھم روشنی میں آگے بڑھے۔ جلد ہی ہمیں ایک فیکٹری اور فیکٹری کے قریب ہی بنی ہوئی ایک خوب صورت کوٹھی نظر آئی۔ سگنل بتا رہے تھے کہ لوسی مینار پاکستان کے قریب سے آزاد ہونے کے بعد اسی چار دیواری کے اندر پہنچی ہے۔ یہ کوٹھی درختوں میں گھری ہوئی تھی۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ فیکٹری کی جانب چند روشنیاں دکھائی دیتی تھیں۔ کوٹھی میں بھی اِکا دُکا بیرونی لائٹس آن تھیں۔ کسی وقت رکھوالی کے کسی کتے کی آواز آتی اور پھر خاموشی چھا جاتی۔ ایسی خاموشیاں، طوفان کا پیش خیمہ ہوتی ہیں۔

ہم نے گاڑیوں کے انجن بند کیے اور نیچے اتر آئے۔ پتا نہیں کیوں یہاں پہنچ کر میرا دل گواہی دینے لگا تھا کہ انیق اور باقر کو قتل کرنے والی، جاما جی کی شیطان صفت ساحرہ اسی چار دیواری میں موجود ہے۔ داؤد کے ساتھی پوری طرح مسلح تھے۔ داؤد نے معاملہ فہمی کا ثبوت دیتے ہوئے ہمارے لیے تین بلٹ پروف جیکٹس بھی بھیجی تھیں۔ اس کے تین چار اہم کارندوں نے بھی بلٹ پروف جیکٹس پہن رکھی تھیں۔ میں نے ان کارندوں کے انچارج عاشق جٹ سے کہا۔ ''میں اور فخر اندر جائیں گے۔ تم لوگ کوٹھی کے چاروں طرف پھیل جاؤ۔ کوئی بھاگنے کی کوشش کرے تو پہلے اس کی ٹانگوں پر گولی مار کر گرانے کی کوشش کرو۔''

''آپ دونوں کا اندر جانا خطرناک تو نہیں؟ میرا مطلب ہے کہ ایک دو بندے اور ساتھ ہو جائیں۔'' عاشق بولا۔

میں نے سوالیہ نظروں سے فخر کی طرف دیکھا۔ اس نے سر ہلا کر تائید کی۔ مشورے کے بعد عاشق اور ٹونی باکسر نامی دو بندے ہمارے ساتھ آگے جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ انہوں نے جیکٹس پہن رکھی تھیں۔ چھوٹی نال کی جدید امریکن رائفلیں ان کے پاس تھیں۔ انہوں نے اپنی شرٹس کے نیچے کمر کی طرف بھرے ہوئے پسٹل بھی لگا رکھے تھے۔ احتیاطاً ہم نے بھی جیکٹس پہن لیں۔ گو پہلوان حشمت کو پیچھے ہی رہنا تھا پھر بھی فخر نے ایک جیکٹ کھینچ تان کر اسے بھی پہنا دی۔ میرے پاس لمبے پھل کا ایک تیز دھار چھرا بھی تھا...... اور میں جانتا تھا کہ اس کی ضرورت پڑنے والی ہے۔

ہم چاروں احتیاط سے چلتے مین گیٹ کی طرف بڑھے۔ رکھوالی والے دیوہیکل کتے کے شور میں دفعتاً اضافہ ہو گیا جو کچھ ہوا وہ اتنا اچانک تھا کہ ہماری پلاننگ آغاز میں ہی درہم برہم ہو گئی۔

تاریکی کے سبب ہمیں وہ سرچ لائٹس نظر نہیں آئی تھیں جو باؤنڈری وال کے بالکل قریب درختوں پر نصب تھیں۔ یکا یک ہم چاروں تیز روشنی میں نہا گئے۔

ایک گرج دار آواز ابھری۔ ''خبردار، وہیں رک جاؤ ورنہ مارے جاؤ گے۔''

میں نے ایک لحظہ ضائع کیے بغیر اپنی سیون ایم ایم رائفل سے دو سرچ لائٹس کو نشانہ بنایا۔ دھماکوں سے دو شعلے چمکے اور دو لائٹس تاریک ہو گئیں۔ تیسری لائٹ کو داؤد کے کارندے ٹونی باکسر نے نشانہ بنایا۔ اس کا پہلا فائر خطا گیا لیکن دوسرے نے سرچ لائٹ کا شیشہ چکنا چور کر دیا مگر اس سے پہلے ہی میں نے ٹونی کو زخمی ہو کر پختہ سڑک پر گرتے دیکھا۔

ہمارا کام ایک دم مشکل ہو گیا تھا لیکن اسے آسان بھی اس عمارت کے ایک پہریدار نے ہی کیا۔ تابڑ توڑ فائرنگ سے بدحواس ہو کر گیٹ کیپر نے گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھول دیا۔ اس نے جونہی باہر جھانکا، میں تیر کی طرح اس کی طرف لپکا۔ فخر میرے عقب میں تھا۔ گیٹ کیپر کے پیٹ میں چھرا گھونپ کر میں نے اسے فائر کرنے سے روک دیا اور اس کی رائفل چھینتا ہوا عمارت کے احاطے میں گھس گیا۔ یہ قریباً دو کینال کی کوٹھی تھی۔ پورچ میں کھڑی ایک دیوہیکل جیپ کو دیکھ کر یقین ہو گیا کہ ہاناوانی یہیں موجود ہو گی۔ بھوگلا کے ہوٹل میں کئی افراد کی جان لینے کے بعد جب ہاناوانی اور اس کے ساتھی فرار ہوئے تھے تو وہ دو جیپوں پر سوار تھے۔ ان میں سے ایک یہی تھی۔

میں، فخر اور عاشق گارڈینیا کی قد آدم باڑ کے پیچھے پیچھے بھاگتے اندرونی حصے کی طرف بڑھے۔ ایکا ایکی چھت سے بھی فائرنگ ہونے لگی۔ ایک گولی سیدھی عاشق کے سینے میں لگی تھی لیکن وہ جیکٹ کی وجہ سے محفوظ رہا۔

''ہمیں کسی چیز کی اوٹ لینی چاہیے۔'' فخر نے کہا۔

''نہیں، وہ بلندی پر ہیں فخر...... بھاگتے جاؤ۔''

ہم جھک کر بھاگتے ہوئے برآمدے تک پہنچ گئے اور یہاں ستونوں کی آڑ لے لی۔ عقب سے ہم پر کوئی فائر نہیں ہو رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ گیٹ کے آس پاس اگر ایک دو مزید بندے موجود تھے تو انہیں، ہمارے باہر موجود ساتھیوں نے سنبھال لیا ہے۔

یکا یک کوئی ایک گوشے سے نکل کر چیل کی طرح مجھ پر جھپٹا۔ میں بروقت نیچے جھکا اور وہ دیوار سے ٹکرایا۔ اس کے ہاتھ میں پسٹل تھا۔ یہ ایک ملائیشین تھا۔ میں نے اس کی کمر پر لات رسید کی اور وہ دور تک لڑکھڑاتا چلا گیا۔ اس کی بدقسمتی کہ اس کے کسی ساتھی نے بدحواسی میں اس پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ بوچھاڑ کے بعد ٹھک ٹھک کی وہ مخصوص آواز آئی جو بتاتی

ہے کہ آٹومیٹک رائفل کا میگزین خالی ہو چکا ہے۔ میں اور فخر ایک ساتھ لپکے اور ایک دیوار کے پیچھے چھپے اس ہٹے کٹے ملائیشین کو چھاپ لیا۔ وہ نشے میں تھا، گالیاں بک رہا تھا اور ملائی میں واویلا کر رہا تھا۔

ہم نے اس کے دونوں بازو موڑ کر اس کی پشت سے لگائے اور اسے ڈھال کی طرح استعمال کرتے ہوئے عمارت کے ڈرائنگ روم کی طرف بڑھے۔ ہم نے اپنی انگلیاں ٹریگرز پر بالکل تیار حالت میں رکھی ہوئی تھیں۔ عاشق عقب سے ہمیں کور دے رہا تھا۔ ہم اسی طرح دس پندرہ قدم آگے آ گئے۔ کوئی مزاحمت نہیں ہوئی۔

فخر بولا۔ ''خاکسار کو ایسا لگ رہا ہے کہ ہم جتنی مزاحمت کی یہاں توقع کر رہے ہیں، اتنی ہے نہیں۔''

''کبھی کبھی خاکسار کے اندازے غلط بھی تو ہوتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''لیکن اس دفعہ نہیں۔'' پھر اس نے اپنے قبضے میں آئے ہوئے ملائیشین کو جھنجھوڑ کر پوچھا۔ ''اور کتنے بندے ہیں یہاں۔'' فخر انگریزی میں بولا تھا۔

''نو...... نو...... اونلی ون فی میل سرونٹ۔'' ہٹا کٹا ملائیشین کراہتے ہوئے بولا۔ وہ تھوڑا بہت زور بھی مار رہا تھا اور شاید اس کے ساتھ ساتھ حیران بھی ہو رہا تھا کہ وہ اتنا گرانڈیل ہونے کے باوجود خود کو فخر سے چھڑا کیوں نہیں پا رہا۔ وہ بے خبر تھا کہ یہ ایم ایم اے کے ایک منجھے ہوئے فائٹر کا ''ڈبل آرم لاک'' ہے۔ اس کو اس کا باپ اور دیگر رشتے دار مل کر بھی نہیں توڑ سکتے تھے۔

جس اکلوتی ملازمہ کا ابھی ہٹے کٹے ملائیشین نے ذکر کیا تھا، وہ بھی چند سیکنڈ بعد ہانپی کانپی ہوئی ہمارے سامنے آ گئی۔ فخر چوکس انداز میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ یقیناً لوسی کو تلاش کر رہا تھا لیکن وہ ابھی تک دکھائی نہیں دی تھی۔ ملازمہ نے اپنا نام جمیلہ بتایا۔ وہ فائرنگ کی آوازیں سننے کے بعد تھر تھر کانپ رہی تھی اب ہٹے کٹے ملائیشین کو فخر کے شکنجے میں بے حال دیکھ کر اس کی رہی سہی ہمت بھی ختم ہو گئی۔ وہ ہاتھ جوڑنے لگی اور دہائی دینے لگی کہ وہ صرف ایک ملازمہ ہے۔ حکم کی بندی ہے۔

فخر نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ ''اے حکم کی بندی! مالکن کہاں ہے تمہاری؟''

''مالکن...... نئی مالکن......؟ عینک والی؟'' ملازمہ نے استفسار کیا۔

''ہاں وہی۔''

''وہ کچھ دیر پہلے تک وہاں اپنے کمرے میں تھیں...... پر اب نہیں ہیں۔ مم...... مجھے لگتا

ہے کہ وہ...... گولیوں کی آوازیں سن کر...... کہیں نکل گئی ہیں۔''

''اس کا کمرا دکھاؤ۔'' میں نے گرج کر کہا۔

وہ ہمیں ایک کوریڈور میں سے گزار کر ایک کشادہ بیڈروم میں لے آئی۔ کمرے کو دیکھ کر پتا چل جاتا تھا کہ کوئی بڑی افراتفری میں یہاں سے نکلا ہے۔ کمرے میں موجود کئی ایسی اشیا ہم نے پہچان لیں جن کا تعلق یقیناً ہاناوانی سے تھا۔ وہ عموماً گہنوں سے لدی رہتی تھی۔ اس کی ایک بیش قیمت طلائی مالا ہمیں سامنے بستر پر ہی پڑی نظر آ گئی۔ ایک ادھ کھلی الماری میں سے ایک سیاہی مائل لبادہ جھانک رہا تھا۔ یہ بھی ہاناوانی کے مخصوص پہناووں میں سے ایک تھا۔

میں نے کہا۔''فخر، وہ زیادہ دور نہیں گئی ہوگی اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس عمارت میں ہی کہیں چھپی ہوئی ہو۔ ہمیں اسے ڈھونڈنا چاہیے۔''

عاشق جٹ نے اپنے ساتھیوں کو آوازیں دیں اور انہیں کہا کہ وہ پوری طرح چوکس رہیں اور کسی کو یہاں سے نکلنے نہ دیں اس کے علاوہ اس نے اپنے چار پانچ ساتھیوں کو اندر بھی بلا لیا تاکہ وہ ہاناوانی اور لوسی کی تلاش میں ہماری مدد کریں۔ یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ اب ہمارے ریسیور پر ریڈیو ٹرانسمیٹر کے سگنل نہیں آ رہے تھے۔ رکھوالی کا دیوہیکل کتا مسلسل شور مچا رہا تھا۔ پھر میں نے ایک سنسنی خیز منظر دیکھا۔ کتے نے اپنی زنجیر تڑالی تھی اور وحشت کے عالم میں سیدھا ہماری جانب آ رہا تھا۔ اس موقع پر عاشق نے اپنی حاضر دماغی اور نشانہ بازی کا پکا ثبوت فراہم کیا۔ اس کی سیون ایم ایم رائفل نے یکے بعد دیگرے دو سنگل فائر کیے اور چھوٹے گدھے جیسی جسامت والا کتا ہم سے فقط چند فٹ کی دوری پر گر کر تڑپنے لگا۔ وہ بہت کریہہ آواز میں چلا رہا تھا۔

''پتا نہیں کہ یہ بھی کسی ٹرانس میں ہی ہو۔'' فخر نے خیال ظاہر کیا۔

''ہو سکتا ہے۔'' میں نے کہا۔''میں نے کبھی کسی کتے کو اتنی رفتار سے اور اتنے خوفناک انداز میں حملہ آور ہوتے نہیں دیکھا۔''

''اور یہ دیکھو جی، یہ ٹھیک ٹھاک زنجیر بھی توڑی ہے اس نے۔'' عاشق جٹ نے کتے کی خون آلود زنجیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

مزید وقت ضائع کیے بغیر ہم عمارت میں پھیل گئے اور بڑے محتاط انداز میں تلاش شروع کر دی۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ عمارت سے ملحقہ فیکٹری میں کیمیکلز وغیرہ تیار ہوتے ہیں۔ اس رہائشی عمارت کے ایک پورشن میں بھی مختلف کیمیائی اشیا اسٹور کی گئی تھیں۔ میرا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ اس بات کا قوی امکان تھا کہ یہیں اس عمارت میں کہیں سجاول سے بھی

ملاقات ہو جائے گی۔ لیکن سجاول کس حال میں ہو گا، اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

میں نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا تو میں اور فخر بری طرح چونک گئے۔ ہماری رائفلیں جیسے خود بخود ہی جھک گئی تھیں۔ سامنے بستر پر یونس پمپ والا کی لاش پڑی تھی۔ گولی اس کی گردن پر سامنے کی طرف ماری گئی تھی اور اس کی کھوپڑی توڑ کر پیچھے سے نکل گئی تھی۔ وہ الٹا سیدھا پڑا تھا۔ بستر پر خون کے سیاہی مائل داغوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اسے مرے ہوئے چودہ پندرہ گھنٹے تو ہو ہی چکے ہیں۔ اسی بستر پر ہمیں کچھ ٹوٹی ہوئی چوڑیاں اور ایک آویزے کا بالائی حصہ بھی دکھائی دیا۔ یوں لگتا تھا کہ یونس نے جس طرح باقر کی دوست لڑکی کو نشانہ بنایا، اسی طرح وہ یہاں بھی کسی عورت سے زیادتی کی کوشش کر رہا تھا۔ کیا پتا اسی عورت کا داؤ چل گیا ہو اور اس نے لاچار ہو کر باقر کے ہتھیار سے ہی اسے نشانہ بنا ڈالا ہو۔

یونس پمپ والا کے جسم پر ایک چادر تھی، میں نے یہ چادر اس کے سر تک کھینچ دی۔ اب سجاول کے حوالے سے میری پریشانی مزید بڑھ چکی تھی۔ اگر ہانا وانی اسے اپنے ساتھ ہی نہیں لے گئی تھی تو پھر ممکن تھا کہ وہ یہاں موجود ہوتا اور بری حالت میں ہوتا۔ عاشق جٹ کے ساتھیوں نے پوری عمارت کی لائٹس آن کر دی تھیں اور بڑے ماہرانہ انداز میں مختلف کمروں کی تلاشی لے رہے تھے۔ عاشق کا ایک ساتھی تیزی سے ہمارے پاس پہنچا اور بولا۔ ''سر جی! ایک عورت ملی ہے۔ اس کو رسیوں سے باندھا ہوا ہے۔ بہت واویلا کر رہی ہے۔ لگتا ہے کہ اسے زبردستی یہاں لایا گیا ہے۔ بار بار یونس کا نام بھی لے رہی ہے اور اسے بددعائیں دے رہی ہے۔''

ہم اس شخص کے ساتھ عمارت کے عقبی حصے کے ایک چھوٹے کمرے میں پہنچے۔ ایک عورت کے ہاتھ پاؤں نائیلون کی رسی سے بندھے تھے اور وہ ایک چٹائی پر پڑی تھی۔ عورت کی عمر چالیس سے اوپر تھی لیکن وہ اپنی اچھی صحت اور متوازن جسم کی وجہ سے پینتیس سے زیادہ نہیں بلکہ کم ہی لگتی تھی۔ وہ شکل کی بھی اچھی تھی۔ اس کی پھول دار قمیص کندھوں سے پھٹی ہوئی تھی اور زیر جامہ کی جھلک نظر آتی تھی۔

''بی بی! کون ہو تم؟'' میں نے ذرا سخت لہجے میں اس سے پوچھا۔

ہمارے تیور اور ہمارے ہاتھوں میں رائفلیں دیکھ کر وہ خوف زدہ ہو چکی تھی۔ تاہم اس نے میرے سوال کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ اس نے اپنا رونا دھونا جاری رکھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ہیجانی انداز میں پتا نہیں کیا کچھ بول رہی تھی۔ اسی دوران میں عاشق جٹ

ملازمہ جمیلہ کو کھینچ کر ہمارے پاس لے آیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''یہ عورت کون ہے؟''

جمیلہ روتے ہوئے بولی۔ ''مجھے بس اتنا پتا ہے کہ یہ اس کی بھابی ہے۔''

''کس کی بھابی ہے؟'' میں نے وضاحت چاہی۔

''وہی...... جس کو گولی ماری ہے اس نے...... وہ مر گیا ہے، اس کی لاش یہاں ہی کسی کمرے میں پڑی ہو گی لیکن مجھے پتا نہیں۔ یونس نام ہے اس کا۔''

میں سناٹے میں رہ گیا۔ یہ ملازمہ جمیلہ اہم انکشاف کر رہی تھی۔ میں اور فخر اس ملازمہ کو لے کر کامن روم میں آ گئے۔ اسے صوفے پر بٹھایا اور پانی وغیرہ پلایا۔ اس دوران میں عمارت کے طول و عرض میں ہاناوانی اور سجاول وغیرہ کی تلاش جاری تھی۔ میں نے عورت سے کہا کہ وہ ہمیں یونس اور اس عورت کے بارے میں تفصیل سے بتائے۔

جمیلہ نامی اس عورت نے اپنے ہاتھ مستقل طور پر ہمارے سامنے جوڑ رکھے تھے، وہ بولی۔ ''مجھے بس اتنا پتا ہے کہ یونس اس عورت کو تین دن پہلے یہاں لے کر آیا تھا۔ اس عورت نے ہی مجھے بتایا تھا کہ وہ اس کی بڑی بھابی ہے اور وہ اس کی بڑی عزت کرتا ہے لیکن پھر...... اسی یونس نے کل رات اپنی اس بھابی......'' جمیلہ مزید کچھ نہ کہہ سکی اور آنکھوں پر دوپٹا رکھ کر سسکنے لگی۔

جو کچھ وہ کہنا چاہ رہی تھی، وہ اس کے کہنے سے پہلے ہی کافی حد تک ہماری سمجھ میں آ چکا تھا۔ لگتا تھا کہ یہ ہاناوانی کی شیطانیت کی ایک اور زندہ مثال ہے جو ہمارے سامنے آئی ہے۔ وہ جن کو اپنا دشمن سمجھ رہی تھی، ان کو ایک دوسرے سے مروانے کی قسم اٹھائے بیٹھی تھی۔ آج اس نے سجاول کے نہایت قریبی ساتھی یونس کو اس کی اپنی ہی ایک عزیزہ کے ذریعے مروا دیا تھا۔ ظاہر یہی ہو رہا تھا کہ یونس نے انوکھے ٹرانس کی حالت میں جس طرح باقر کا مرڈر کیا تھا اسی طرح وہ اپنی محترم بھابی کو پکڑ کر یہاں لایا تھا اور پھر اس کو زیادتی کا نشانہ بنانا چاہا تھا۔ وہ عورت یہ سب کچھ جھیل نہیں سکی تھی۔ یہ جانے بغیر کے اس کا دیور جو کچھ کر رہا ہے، کسی اور کی خواہش کے زیر اثر کر رہا ہے...... اس نے اسے شوٹ کر ڈالا تھا...... اور اب وہ نیم دیوانگی کی حالت میں مسلسل پتا نہیں کیا کیا بولتی جا رہی تھی۔ عین ممکن تھا کہ یونس کو مارنے کے بعد اس نے خودکشی کی کوشش کی ہو اور اسے روکنے کے لیے اس کی مشکیں کس کے اسے یہاں چٹائی پر ڈال دیا گیا ہو (بعدازاں ہمارا یہ اندازہ بھی بالکل درست ثابت ہوا۔ وہ یونس سے بہت پیار کرتی تھی۔ اپنی اولاد کا سا درجہ دیتی تھی۔ وہ یہ خوفناک صدمہ جھیل نہیں سکی تھی۔ اس نے یونس کے ریوالور سے ہی یونس کو گولی ماری اور پھر اسی سے اپنی جان لینے کی کوشش بھی کی)

عاشق جٹ رائفل بدست اندر داخل ہوا۔ اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''کوٹھی کا چپا چپا دیکھ لیا ہے جی۔ کسی بندے یا جناور کا کھوج نہیں ملا۔ بس پچھلے کمروں کی چھت پر ایک کھڈے (ڈربے) کے اندر دس پندرہ کبوتر اور دوسرے کھڈے کے اندر پندرہ وی چھوٹے طوطے ہیں۔ گولیاں چلنے کی وجہ سے ڈرے ہوئے ہیں اور شور مچاتے جا رہے ہیں۔''

ہم پلٹے اور کوریڈور سے گزر کر عمارت کے سامنے والے حصے میں آ گئے۔ گرانڈیل کتے کی خون آلود لاش کے پاس سے گزر کر سامنے والے صحن میں آئے۔ میں اور فخر ایک بار پھر اچھی طرح عمارت کا جائزہ لینا چاہتے تھے۔ اگر باہر موجود افراد نے کسی کو فرار ہوتے نہیں دیکھا تھا تو اس بات کا امکان موجود تھا کہ ہاناوانی یہیں کہیں روپوش ہو۔ کسی تہ خانے کی موجودگی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پہلوان حشمت بھی اب اندر آ چکا تھا۔ وہ بھی ہمارے ساتھ اس تلاش میں شریک ہو گیا۔ چھت پر پرندے مسلسل شور مچا رہے تھے۔ ایک دم میرے ذہن میں ایک نئی بات آئی۔ پرندوں کا یہ شور معمول سے ذرا ہٹ کر تھا۔

میں نے کہا۔ ''فخر! پرندے کچھ زیادہ ہی شور نہیں مچا رہے؟''

''لگ تو ایسے ہی رہا ہے۔'' اس نے کہا پھر ذرا چونک کر بولا۔ ''کہیں ان کو کوئی جانور تو نظر نہیں آ رہا؟ بلی وغیرہ؟''

''بلی ہو سکتی ہے......اور کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے لوسی؟'' فخر حیرت سے بولا۔

''ناممکن تو نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

رائفلیں ہمارے ہاتھوں میں تھیں۔ ہم سیڑھیاں طے کر کے تیزی سے چھت پر پہنچے یہاں کئی تاریک اور نیم تاریک گوشے موجود تھے۔ تیس چالیس سیکنڈ کے اندر ہم نے پوری چھت دیکھ لی۔ ہمیں کچھ دکھائی نہیں دیا لیکن پرندوں کا غیر معمولی شور جاری تھا۔

عاشق آگے بڑھا۔ اس نے ٹارچ کی روشنی ڈربے کے اندر پھینکی۔ یہ رنگ دار پَروں والے دو درجن سے زائد چھوٹے طوطے تھے جو اب بھی بری طرح پھڑ پھڑا رہے تھے۔ شاید ڈربے کے اندر کوئی چیز چھپی ہوئی تھی۔ عاشق نے آہنی ڈربے کا جالی دار دروازہ تھوڑا سا کھولا تا کہ جان سکے کہ ان معصوم پرندوں کو کیا چیز وحشت زدہ کر رہی ہے۔ اس کے بعد جو منظر ہم نے دیکھا وہ ناقابل یقین تھا۔ وہ ''معصوم پرندے'' برق رفتاری سے عاشق پر جھپٹے۔ جیسے وہ خوشنما طوطے نہ ہوں کسی تاریک غار سے نکلنے والی خون آشام چمگادڑیں ہوں۔ مجھے یہی لگا جیسے پہلے ہلے میں ہی، انہوں نے عاشق کی آنکھیں زخمی کر ڈالی ہیں۔ عاشق بدحواسی میں

پشت کے بل گرا پھر اٹھ کر بھاگا۔ خوشنما پرندے، شہد کی مشتعل مکھیوں کی طرح اس سے چمٹ گئے تھے۔ یقیناً وہ اپنی تیز خم دار چونچوں سے اس کا گوشت نوچ رہے تھے۔ عاشق کے ہاتھ سے رائفل چھوٹ گئی تھی وہ بری طرح چلا رہا تھا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے ان پرندوں کو خود سے جدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے رائفل سیدھی کی لیکن ٹریگر دبانا ممکن نہیں تھا۔ عاشق پہلے بھاگتا ہوا سیڑھیوں کی طرف گیا۔ پھر بدحواسی میں برساتی کی جانب لپکا۔ طوطے اس سے چمٹے ہوئے تھے۔ ہم جیسے سکتہ زدہ ہو کر رہ گئے تھے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ کچھ ہو گیا جو ہم نے سوچا نہ تھا۔ عاشق چھت کی ڈھائی تین فٹ اونچی منڈیر سے ٹکرایا اور الٹ کر نیچے پختہ فرش پر گرا۔ اس کی پکار...... جو اس کی آخری پکار تھی، بڑی دلدوز تھی۔

ہمارا سکتہ ٹوٹا۔ مجھ پر انکشاف ہوا کہ ہم ایک نہایت انوکھی اور خوفناک صورتِ حال کا شکار ہو چکے ہیں۔ ہم سیڑھیوں کی طرف لپکے تیزی سے نیچے آئے اور خود کو کمروں میں بند کر لیا جس کمرے میں ہم بند ہوئے اس میں فخر اور پہلوان کے علاوہ داؤد بھاؤ کے دو ساتھی بھی تھے۔ تین چار دیگر افراد ایک ساتھ والے کمرے میں بند ہو گئے تھے۔ پہلوان کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ وہ کراہ کر بولا۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے ہمارے ساتھ؟''

فخر اور دیگر افراد بھی حیرت سے گنگ تھے۔ مجھے زندگی میں پہلی بار فخر کی آنکھوں میں ہراس کی کیفیت دکھائی دی۔ وہ سرسراتی آواز میں بولا۔ ''کیا یہ سب بھی ہاناوانی کی وجہ سے ہے؟'' اس نے یہ فقرہ انگلش میں بولا تھا تا کہ پہلوان اور باقی دونوں بندے سمجھ نہ پائیں۔

''یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا مگر ہم جس طرح کی صورتِ حال کا شکار ہیں، کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔''

''یعنی...... یہ...... پرندے بھی ٹرانس میں؟''

''اگر لوسی ٹرانس میں آ سکتی ہے تو یہ کیوں نہیں......؟''

ابھی میرا فقرہ مکمل بھی نہیں ہوا تھا کہ رنگین پَروں والے وہ خوب صورت طوطے عمارت کے اندر پھڑ پھڑانے لگے۔ ان کی باریک آوازوں میں ایک ہیجان تھا۔ وہ دیواروں اور دروازوں سے ٹکرا رہے تھے۔ چکرا رہے تھے، گھوم رہے تھے۔

''اب کیا ہووے گا؟'' پہلوان کی آواز خوف سے ٹوٹنے لگی۔

''آپ گھبرائیں نہیں۔ کھڑکیوں پر جالیاں ہیں۔'' میں نے تسلی دی۔

''میرا خیال ہے کہ ہمیں باہر والوں کو اطلاع دینی چاہیے کہ وہ خود کو گاڑیوں میں بند کر

لیں۔“ فخر نے کہا۔

”میں فون کرتا ہوں جی۔“ داؤد بھاؤ کا ایک کوتاہ قد کارندہ بولا۔

اس نے فوراً فون کر کے اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ یہاں کیا صورتِ حال پیش آئی ہے...... عاشق کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا اس نے ہم سب کو دہشت زدہ کر دیا تھا۔ وہ کافی بلندی سے نیچے گرا تھا۔ اس کے بچنے کے امکانات کم تھے۔ دانشور درست ہی کہتے ہیں، جو دشمن سامنے آ کر قابلِ فہم وار کرتا ہے اس کا خوف کم ہوتا ہے لیکن نادیدہ دشمن کے ”ناقابلِ فہم وار“ بے حد پریشان کن اور خطرناک ہوتے ہیں۔ پہلوان اور داؤد بھاؤ کے دونوں ساتھیوں کے چہرے خوف اور حیرت کی تصویر تھے، داؤد بھاؤ کے دونوں ساتھیوں کو ساری صورتِ حال کا علم نہیں تھا لیکن اتنی بات تو وہ بھی جانتے تھے کہ وہ یہاں کسی ایسی بندریا کی تلاش میں آئے ہیں جو دیوانے پن کا شکار ہے اور خونخوار ہو رہی ہے۔ اب انہوں نے معصوم نازک پرندوں کو بھی جان لیوا عفریتوں کے روپ میں دیکھ لیا تھا۔ پہلوان کی طرح وہ دونوں بھی اسے ہوائی چیزوں اور آسیب کا کرشمہ سمجھ رہے تھے...... اور اب جلد سے جلد یہاں سے نکلنا چاہتے تھے لیکن نکلنا کہاں آسان تھا؟

عمارت کے عقبی کمروں کی طرف سے مسلسل کسی عورت کے رونے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

”کون ہو سکتی ہے یہ؟“ فخر نے کہا۔

”ملازمہ جمیلہ، یا پھر وہی جو خود کو یونس کی بھابی بتاتی ہے۔“

”آواز نوجوان لڑکی کی نہیں لگتی۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ وہی، یونس کی بھابی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”ان آوازوں سے پتا چلتا ہے کہ وہ صرف خوف کی وجہ سے چلا رہی ہے۔ اگر وہ پرندوں کی زد میں آئی ہوتی تو پھر اس کی پکار کچھ اور طرح کی ہوتی۔“

اسی دوران میں دو تین چھناکے ہوئے اور شیشے ٹوٹنے کی آوازیں آئیں۔ یہ آوازیں اس دوسرے کمرے کی طرف سے آئی تھیں جہاں داؤد بھاؤ کے باقی تین چار ساتھیوں نے خود کو بند کیا تھا۔

داؤد بھاؤ کے کوتاہ قد کارندے نے اپنے ان ساتھیوں سے فون پر رابطہ کیا۔ انہوں نے بتایا کہ وہاں بھی کھڑکیوں میں جالیاں ہیں۔ شیشے ٹوٹنے کے باوجود وہ محفوظ ہیں۔ ہاں شروع میں ایک طوطا کسی طرح اندر گھس آیا تھا اسے انہوں نے مار ڈالا ہے۔

ابھی بات ہو ہی رہی تھی کہ ہمارے کمرے کی ایک کھڑکی کا شیشہ بھی ٹوٹا، تین چار خوش

رنگ طوطے، دیوانگی کے عالم میں جالی سے ٹکرانے لگے۔

"اب کیا کرنا ہے؟" فخر نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"ابھی تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ انتظار ہی کیا جا سکتا ہے۔"

"اگر یہ پرندے واقعی کسی ٹرانس میں ہیں تو ٹرانس کی شدت آہستہ آہستہ کم بھی تو ہو سکتی ہے۔" فخر نے خیال ظاہر کیا۔

"لیکن یہ کام اتنی جلدی نہیں ہو گا۔ ہم نے انیق اور یونس وغیرہ کو دیکھا ہی ہے۔ ہاناوانی سے دور ہو کر بھی وہ مسلسل اس کے اثر میں رہے ہیں۔"

"لیکن شاہ زیب، وہاں تو ٹیلی فونک رابطہ بھی اثر کرتا تھا۔"

"پھر بھی ان پرندوں کا جلد ہی نارمل حالت میں آ جانا آسان نہیں لگتا۔ یہ کسی عام ہپناٹسٹ کا عام ٹرانس نہیں ہے۔ اس میں بہت کچھ جدا ہے۔" ہم دونوں انگلش میں بات کر رہے تھے۔ پہلوان کو شاید اِکا دُکا الفاظ سمجھ میں آ رہے ہوں مگر داؤد کے دونوں ساتھی ہونقوں کی طرح ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔

فخر نے سراسیمگی کے عالم میں گہری سانس لی اور بولا۔ "اس کا مطلب ہے کہ انسانوں کی طرح جانور بھی ماہر ہپناٹسٹ کی سجیشن قبول کرتے ہیں......؟"

"بالکل ایسا ہے۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ آج سے تیس چالیس سال پہلے بھی کچھ ہپناٹسٹ اتنی صلاحیت رکھتے تھے کہ اپنے ہاتھوں کے لمس اور اپنی آواز کے ذریعے مختلف خطرناک جانوروں کو مفلوج کر دیتے تھے۔ اسے Tonic immobility کہا جاتا تھا۔ اور اب تو یہ شعبہ بہت آگے جا چکا ہے۔"

ہمارا دھیان بار بار عاشق کی طرف بھی جا رہا تھا۔ چھت سے گرنے کے بعد اس کے ساتھ کیا ہوا تھا، ابھی کچھ پتا نہیں تھا...... پہلوان نے خشک لبوں پر زبان پھیری اور آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "ابھی تک یقین ناہیں آ رہا کہ پاس والے کمرے میں جیتا جاگتا یونس ایک لاش کی شکل میں پڑا ہے۔"

پہلوان ٹھیک کہہ رہا تھا۔ یونس کی موت بھی ہمارے لیے ایک شدید دھچکے سے کم نہیں تھی۔ وہ سجاول کا دوست اور جاں نثار ساتھی تھا۔ وہ سجاول کے ڈکیت گینگ سے بالکل علیحدہ تھا۔ اس کے ذریعہ روزگار کے طور پر اس کے پیٹرول پمپس کا حوالہ دیا جاتا تھا۔ وہ ہاناوانی کے ہتھے چڑھا تھا اور چند ہی دن میں اس سے کیا کچھ سرزد ہو گیا تھا پھر انیق ہی کی طرح اسے بھی ایک حسرت ناک موت کو گلے لگانا پڑ گیا تھا۔ ہاناوانی نے اسے ذلت کے گڑھے میں گرا

کر موت سے ہمکنار کیا تھا۔

O......❖......O

ہم قریباً تین گھنٹے تک اسی جگہ پر بند رہے اور صورتِ حال کے بہتر ہونے کا انتظار کرتے رہے۔ پرندے ابھی تک عمارت میں موجود تھے اور یہاں وہاں چکرا رہے تھے۔ بے شک تین چار گھنٹے پہلے اس عمارت میں فائرنگ ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود ابھی تک کوئی آؤٹ سائیڈر اس عمارت کی طرف متوجہ نہیں ہوا تھا اور ان میں مقامی پولیس بھی شامل تھی۔ ایک لحاظ سے یہ اچھا ہی تھا۔ اگر کوئی صورتِ حال جاننے کے لیے اس طرف آنکلتا تو عین ممکن تھا کہ یہ خونی پرندے اسے بھی خون میں نہلا دیتے۔ داؤد کے باقی ساتھی ابھی تک باہر موجود تھے اور دو گاڑیوں میں بند تھے۔ مشتعل پرندوں کی جھلک انہوں نے بھی دیکھی تھی لیکن وہ ابھی تک ان کے براہِ راست حملے سے محفوظ تھے۔ داؤد کا کارندہ ٹونی باکسر گولی لگنے سے زخمی ہوا تھا اور اسے مرہم پٹی کے لیے بھیج دیا گیا تھا۔

اب رات کے قریباً گیارہ بجے کا عمل تھا۔ فیکٹری میں اور اس کے اردگرد بھی مکمل خاموشی تھی۔ فخر نے گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ''لگتا ہے کہ اب آوازیں نہیں آرہیں۔'' اس کا اشارہ طوطوں کی آوازوں کی طرف تھا۔

مجھے بھی یہی محسوس ہو رہا تھا کہ پرندے شاید کسی ایک جگہ جمع ہو گئے ہیں یا پھر یہاں سے نکل گئے ہیں مگر باہر نکل کر دیکھنے میں خطرات تھے۔ یہ ایک ایسا دشمن تھا جس پر گولی وغیرہ بھی تقریباً بے اثر ہی تھی۔ داؤد بھاؤ کے کوتاہ قد ساتھی بنارس نے اپنے باہر موجود ساتھیوں سے فون پر رابطہ کیا۔ وہ لوگ اب اپنی بند گاڑیوں سے نکل آئے تھے۔ انہوں نے بھی یہی کہا کہ پرندوں کے آثار اب نظر نہیں آرہے۔ ہم نے دس پندرہ منٹ مزید انتظار کیا۔ پھر میں اور فخر اس بند کمرے سے نکل آئے۔ ہم نے محتاط طریقے سے مختلف کمروں میں جھانکا۔ پرندے اب یقیناً یہاں نہیں تھے۔ ظاہر ہے پرندوں میں اتنی صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ گھات لگا کر کہیں بیٹھ جائیں اور اچانک حملہ کریں۔

مطمئن ہونے کے بعد ہم نے باقی افراد کو بھی گرین سگنل دیا اور وہ اپنی پناہ گاہوں سے باہر نکل آئے۔ سب سے پہلے ہم چھت سے گر کر زخمی ہونے والے تنومند عاشق جٹ کے پاس پہنچے۔ وہ مر چکا تھا۔ اس کی حالت سے ظاہر تھا کہ بلندی سے گر کر اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ اس کے چہرے اور جسم پر طوطوں کی چونچوں کے بہت سے خونی نشان تھے۔ یہاں سے گوشت نوچ کر نکال لیا گیا تھا۔ ہم نے عاشق کی لاش کو اٹھا کر ایک چارپائی پر رکھا

اوراس پر چادر ڈال دی۔

ہم دوسرے کمرے میں یونس کی لاش کے پاس پہنچے۔اس کا بھی برا حال تھا۔ پرندوں نے عالم وحشت میں اس کے مردہ جسم کو بھی نوچا تھا۔اس کی ناک ناپید تھی اور چہرہ پہچانا نہیں جارہا تھا۔ہم نے اس پر بھی چادر ڈال دی۔

تھوڑے ہی فاصلے پر گرانڈیل کتے کی لاش بھی موجود تھی۔تاہم یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ طوطوں نے اس کے مردہ جسم کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔وہ اسی طرح اپنے خون کے جمے ہوئے تالاب میں بے حرکت پڑا تھا۔عاشق جٹ نے اپنی سیون ایم ایم سے جو دو عدد فائر کیے تھے ان میں سے ایک نے کتے کی کھوپڑی توڑ ڈالی ہوئی تھی۔

''یونس کی بھابی؟'' فخر نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

وہ عمارت کے عقبی حصے میں تھی۔اب اس کی کوئی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔

کوتاہ قامت بنارس نے کہا۔''اور وہ ملازمہ جمیلہ بھی کہیں دکھائی نہیں دے رہی۔''

ہم مختلف کمروں اور راہداریوں میں جھانکتے ہوئے عقبی حصے میں پہنچے تو یونس کی خوبرو بھابی اور جمیلہ دونوں ہی نظر آگئیں۔طوطوں نے جمیلہ کو بھی زخمی کیا تھا مگر وہ اپنی جان بچانے میں کامیاب ہوگئی تھی۔اس کے ایک کندھے اور بازو پر چھوٹے چھوٹے کوئی ایک درجن زخم تھے۔دونوں عورتیں ڈری سہمی ایک کونے میں سمٹی بیٹھی تھیں۔وہ جیسے آہ و بکا کر کر کے اب نڈھال ہو چکی تھیں۔اس کمرے کی دیوار گیر کھڑکی کے شیشے بھی جگہ جگہ سے ٹوٹے ہوئے تھے۔اگر یہاں بھی جالی نہ ہوتی تو یہ دونوں عورتیں اذیت ناک موت کا شکار ہو چکی ہوتیں۔

ہمارے پہنچنے پر جمیلہ نے اندر سے دروازہ کھولا اور ہم نے ان دونوں کی خبر گیری کی۔

یونس کی بھابی کی ذہنی حالت دگرگوں تھی۔وہ ایک بار پھر ماتم کناں ہوگئی۔اس کے کچھ الفاظ سمجھ میں آتے تھے اور کچھ نہیں۔اسے جیسے ابھی تک یقین نہیں تھا کہ یونس نے اس کے ساتھ بدترین سلوک کرنے کی کوشش کی ہے......اوراس نے اپنے ہاتھ سے اسے گولی ماردی ہے۔

اسی اثنا میں پہلوان حشمت ہانپا ہوا اندر آیا۔اس کا چہرہ خوف اور دہشت کی تصویر تھا۔اس نے کہا۔''چھت کی طرف سے اب بھی پھڑ پھڑانے کی آوازیں آرہی ہیں۔لگتا ہے پرندے ابھی یہیں پر ہیں۔''

داؤد کے ایک کارندے نے بھی وحشت زدہ انداز میں اس بات کی تصدیق کی۔یہ بے حد الارمنگ صورتِ حال تھی لیکن سوچنے کی بات تھی کہ اگر خدانخواستہ یہ اطلاع درست ہے تو پھر ابھی تک ہم محفوظ کیوں ہیں۔پرندوں کے چھت سے یہاں پہنچنے میں کون سی رکاوٹ تھی۔

اچانک میرے ذہن میں ان کبوتروں کا خیال آیا جو طوطوں کے پاس ہی ایک دوسرے ڈربے میں بند تھے۔

فخر سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بھی زندگی میں پہلی بار تھوڑا سا ہراس دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''فخر! میرا خیال ہے کہ پھڑ پھڑانے کی جو آوازیں آ رہی ہیں وہ طوطوں کی نہیں ہیں۔''

ہم تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر پہنچے۔ میرا اندازہ سو فیصد درست ثابت ہوا۔ یہ کبوتر ہی تھے مگر ان کی حالت ناگفتہ تھی۔ وہ بھی اب جنون کی سی کیفیت میں تھے۔ دیوانہ وار ڈربے کی جالیوں سے ٹکرا رہے تھے۔ جیسے کوئی جنگلی بلا ان کے ڈربے میں گھس گیا ہو اور وہ اس سے جان بچانا چاہ رہے ہوں۔ فرق صرف یہ تھا کہ ان کی ''تڑپ پھڑک'' میں خوف کے بجائے زبردست قسم کی جارحیت تھی۔ پتا نہیں وہ کب سے ڈربا توڑنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ ان کی چونچیں زخمی تھیں اور کئی ایک کے پَر جھڑ چکے تھے۔

فخر نے کہا۔ ''یہ دیکھو شاہ زیب!'' اس نے ٹارچ کی روشنی ڈربے کے ایک حصے پر پھینکی۔ وہاں سے چھوٹے سوراخوں والی جالی ڈھیلی ہو کر اکھڑنا شروع ہو گئی تھی۔ داؤد بھاؤ کے کارندے دہشت زدہ نظروں سے ان پرندوں کو دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے کچھ زینے اتر کر نیچے چلے گئے۔ پہلوان حشمت ویسے ہی اوپر نہیں آیا تھا۔ فخر بولا۔ ''میرے خیال میں تو ان کو مار دینا چاہیے۔ یہ طوطوں سے زیادہ خطرناک ثابت ہوں گے۔''

''لیکن کیسے ماریں؟''

''یہاں نیچے کیمیکلز میں، میں نے مائع ''گبریلیک ایسڈ'' دیکھی ہے۔ کافی زہریلی دوا ہے اس کا اسپرے چند سیکنڈ میں ان کو ختم کر دے گا۔''

''تو پھر لے آؤ۔'' میں نے خوب صورت کبوتروں کی حالت دیکھتے ہوئے کہا۔

فخر نیچے سے اسپرے اور ماسک وغیرہ لے آیا۔ ہم سب نیچے آ گئے اور فخر نے تھوڑی دیر اوپر رہ کر بدقسمت پرندوں کو ان کی اذیت سے نجات دلا دی۔

یہ بڑی تشویشناک صورتِ حال تھی۔ داؤد بھاؤ کے کارندے اب اپنے ساتھی عاشق جٹ کی لاش لے کر جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتے تھے۔ تاہم وہ از خود ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ اسی دوران میں میرے نمبر پر داؤد بھاؤ کا فون آ گیا۔ وہ یہاں کی صورتِ حال سے کافی حد تک باخبر تھا اور بہت حیران بھی۔ اس نے اپنی پاٹ دار آواز میں کہا۔ ''شاہ زیب! یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ میری تو عقل خبط ہو گئی ہے۔ کوئی بھی ان باتوں پر یقین نہیں کرے گا۔''

''لیکن یہ سب کچھ ہو رہا ہے داؤد بھاؤ۔ میں نے آپ کو بتایا تھا ناں کہ ان تجربوں سے گزرنے سے پہلے مجھے بھی یقین نہیں تھا لیکن جو کچھ بھی ہو رہا ہے ہماری نگاہوں کے سامنے ہے۔ یہ بہت خطرناک عورت ہے۔ یہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ یہاں سے فرار ہو چکی ہے جو مادہ بندر اس کے ساتھ تھی، اس کے سگنل آنا بھی بند ہو گئے ہیں۔ اب یا تو وہ ٹرانسمیٹر کی پہنچ سے باہر نکل گئی ہے یا ہو سکتا ہے کہ انہیں ٹرانسمیٹر کا پتا چل گیا ہو اور اسے بیکار کر دیا گیا ہو۔ مجھے عاشق کی موت کا بے حد دکھ ہے داؤد بھاؤ، لیکن اگر ہم مزید بڑے نقصانات سے بچنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس منحوس عورت کو ڈھونڈنا پڑے گا۔''

داؤد بھاؤ نے ذرا توقف سے کہا۔ ''ٹھیک ہے، میں وہاں تمہارے پاس پہنچ رہا ہوں، پھر بات کرتے ہیں۔''

داؤد بھاؤ کے لب و لہجے سے لگتا تھا کہ انیق کی موت کے حوالے سے اس نے سجاول کے خلاف جو رائے بنا رکھی تھی اب اس میں کمزوری آ رہی ہے۔ وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہو رہا ہے کہ ہمارے اردگرد بہت کچھ ایسا ہو رہا ہے جو معمول سے بہت ہٹ کر اور پُراسرار ہے۔

میں نے ایک بار پھر عاشق کی موت پر داؤد بھاؤ سے دکھ کا اظہار کیا اور اس کو جلد از جلد یہاں پہنچنے کا کہا۔

اس دوران میں فخر ڈری سہمی جمیلہ سے پوچھ گچھ کرتا رہا تھا اور اس کے زخمی بازو کی مرہم پٹی بھی کر دی تھی۔ جمیلہ نے بتایا تھا کہ فیکٹری دو ہفتے کے لیے بند ہے۔ فیکٹری کے مالک میاں کرامت علی صاحب اپنی فیملی کے ساتھ گلگت اسکردو وغیرہ کی طرف گئے ہوئے ہیں۔ ان کا چھوٹا بھائی حاجی مراد جو صوم صلوٰۃ کا بہت پابند ہے یہیں کوٹھی پر تھا، لیکن پچھلے بدھ کو اچانک نہ جانے اسے کیا ہوا۔ اس نے شلوار قمیص اتار کر پینٹ قمیص پہن لی۔ ٹوپی اتار پھینکی، اگلی صبح جب جمیلہ نے اسے دیکھا تو ششدر رہ گئی۔ وہ جس نے کبھی گانے بجانے کو اپنے کانوں تک نہیں پہنچنے دیا تھا، آڈیو سسٹم پر میوزک لگا کر سن رہا تھا اور تھرک بھی رہا تھا۔ رات کو جمیلہ نے اسے شراب پیتے اور ایک لڑکی سے چہلیں کرتے دیکھا تو اسے اپنی نگاہوں پر یقین نہیں آیا۔ اس سے اگلے روز وہ لڑکی سمیت گھر سے غائب تھا۔ ابھی تک اس کی واپسی نہیں ہوئی تھی اور نہ وہ کہیں نظر آیا تھا۔

جمیلہ یہاں کے حالات سے بے حد دہشت زدہ تھی۔ وہ یہاں پر خورسنہ اور اس کے بچے کی آمد سے بھی آگاہ تھی، اس نے گلوگیر آواز میں بتایا۔ ''عینک والی، نے اس عورت اور بچے کو ڈرائنگ روم کے ساتھ والے کمرے میں بند کر رکھا تھا۔ وہ عورت کو اس کے بچے کے

سامنے ننگا کر کے اپنے ہاتھوں سے مارتی تھی اور پتانہیں کیا کچھ پوچھتی تھی۔''

''پھر کہاں گئے وہ ماں بچہ؟'' میں نے انجان بن کر پوچھا۔

''تین دن پہلے عینک والی نے انہیں چھوڑ دیا جی۔ یا پھر شاید کہیں بھیج دیا۔ مجھے ٹھیک سے پتانہیں جی۔''

''عورت اور بچے کے بعد کوئی اور بھی یہاں آیا؟'' میں نے پوچھا۔

''آہو جی، اونچے لمبے قد والا ایک بندہ یہاں آیا تھا۔ مجھے شک ہے کہ وہ مار کھانے والی بی بی کا خاوند تھا۔ بڑا زور والا بندہ لگتا تھا وہ بھی۔ پر وہ پہلے دن کے بعد مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔ کیا پتا...... کہ...... اس کو بھی عینک والی نے مار ہی دیا ہو۔'' جمیلہ سسک پڑی۔ ''وہ عورت نہیں، مجھے تو کوئی جن بھوت لگتی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ چھوٹے مالک (حاجی مراد) پر بھی اس نے کوئی ڈھاڈا قسم کا جادو ٹونا ہی کیا ہے۔ اللہ ماف کرے...... کہاں جی وہ پنج وقتے نمازی اور کہاں راتوں رات......'' وہ اس سے آگے کچھ نہ بول سکی۔ اس کا گلا رُندھ گیا۔

''تم نے اس لمبے چوڑے بندے کو آخری دفعہ کہاں دیکھا تھا؟'' فخر نے پوچھا۔

وہ اپنے منتشر ذہن کو یکسو کرتے ہوئے بولی۔ ''کوٹھی کے سجے پاسے (دائیں جانب) جو دو تین کمرے ہیں وہ مہمانوں شمانوں کے لیے ہیں۔ وہ عینک والی اور اس کے فوجی (گارڈز) اس بندے کو لے کر اسی پاسے (طرف) جا رہے تھے۔ پھر میں نے نہیں دیکھا۔''

میں نے کہا۔ ''تمہیں بھی عینک والی نے مارا پیٹا؟''

''نہیں جی، بس ایک دفعہ پولی سی سوٹی ماری تھی میری لت پر...... لیکن اس کے ایک فوجی نے میرے سر سے بندوق لگا کر مجھے بہت دھمکیاں دی تھیں۔ اس نے کہا تھا کہ میں نے کوئی چوں بھی کی تو میری اور میرے بچوں کی لاشوں کا بھی پتانہیں چلے گا۔ یہ بڑے خطرناک لوگ ہیں جی۔ اور یہ...... عینک والی...... تو مجھے بندہ بشر لگتی ہی نہیں ہے۔ یہ کوئی اور چیز ہے جی۔'' جمیلہ کی آواز لڑکھڑانے لگی اور چہرے پر ہلدی سی پھر گئی۔

وہ ڈری سہمی نگاہوں سے اردگرد دیکھنے لگی۔ جیسے اسے اب بھی اندیشہ ہو کہ وہ کسی طرف سے دیوار توڑ کر یا زمین پھاڑ کر نکل آئے گی۔

پہلوان حشمت کے ماتھے پر پسینہ تھا۔ وہ جیسے کھینچ کھینچ کر سانس لے رہا تھا۔ میں یہی سمجھا کہ ماحول کے تناؤ کی وجہ سے ایسا ہو رہا ہے۔ بے شک پہلوان ڈرا ہوا بھی تھا لیکن یہ سانس کی تنگی والی بات کچھ اور نکلی۔ میں نے جب پوچھا کہ پہلوان چاچا خیریت تو ہے......؟

تو وہ بولا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ ویسے تو شاید میں بچ جاؤں لیکن تمہاری یہ بلٹ پروف جیکٹ مجھے ضرور مار دے گی۔“

میں یہ دیکھ کر سٹپٹایا کہ پہلوان نے ابھی تک وہ نہایت تنگ جیکٹ پہن رکھی تھی۔

”آپ نے اسے اتار دینا تھا۔ اب تو کوئی ایسا خطرہ نہیں۔“ فخر نے کہا۔

”ایک دو بار اتارنے کی کوشش کی لیکن لگتا ہے کہ یہ میری جان لے کر ہی جائے گی۔“ پہلوان نے ہانپی آواز میں کہا۔

میں نے فخر کے ساتھ مل کر پہلوان کی جیکٹ اتارنے کی کوشش کی مگر اس کے ”بکل“ بری طرح پھنسے ہوئے تھے۔ فخر نے انگلش میں کہا۔ ”بلٹ پروف جیکٹ جان بچانے کے کام آتی ہے لیکن یہاں لگتا ہے کہ اس کا مصرف الٹا ہو جائے گا۔“

پہلوان نے بھنا کر کہا۔ ”دیکھو، میرے سامنے اس طرح انگریزی مت مارا کرو۔ مجھے لگتا ہے کہ تم مجھے غیر بلکہ دشمن سمجھتے ہو۔“

”سوری پہلوان جی...... ویری سوری۔“ فخر نے کہا۔

پہلوان نے آنکھیں دکھائیں۔ ”اوئے، پھر وہی انگریزی۔“

اسی دوران میں ہم جیکٹ کے ”بکل“ کھولنے میں کامیاب ہو گئے اور پہلوان کی جان میں جان آئی۔

داؤد بھاؤ کا کوتاہ قد کارندہ بنارس برآمدے میں موجود تھا۔ رائفل اس کے ہاتھوں میں تھی۔ عاشق جٹ کی موت نے ہم سب کو دکھی کیا تھا مگر بنارس کچھ زیادہ ہی سوگوار تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ وہ اور اس کے ایک ساتھی بار بار آسمان کی طرف دیکھنے لگتے تھے جیسے انہیں اندیشہ ہو کہ اس چاندنی رات میں اچانک ہی کسی طرف سے جنونی پرندوں کی ٹولی نمودار ہو گی اور دوبارہ حملہ آور ہو جائے گی۔ اچانک میرے ذہن میں رضوان ٹی کا خیال آیا اور میرے جسم پر چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ پرندے یہاں سے اوجھل ہو چکے تھے۔ وہ کہاں گئے تھے؟ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ وہ ہاناوانی کے کسی اور ٹارگٹ پر حملہ آور ہو جائیں۔ ہاناوانی کو رضوان کی لوکیشن بھی اچھی طرح معلوم تھی۔ رضوان چونکہ زخمی تھا اس لیے ہم اسے ہوٹل میں ہی چھوڑ آئے تھے۔ وہ دوا کھا کر سویا ہوا تھا اسی لیے کئی گھنٹے گزرنے کے باوجود ابھی تک اس سے ہمارا رابطہ نہیں ہوا تھا۔ میں نے فوراً اس کا نمبر ملایا۔ تیسری چوتھی کال پر اس کی غنودگی بھری آواز میرے موبائل پر ابھری۔ ”جی شاہ زیب بھائی۔“

میں نے کہا۔ ”یہاں حالات بڑے خراب ہو گئے ہیں رضوان۔“

''کیا ہوا جناب؟''

میں نے مختصر الفاظ میں اسے یہاں پیش آنے والے واقعات سے آگاہ کیا۔ اس کی بے پناہ حیرت میں مزید اضافہ ہوا۔ وہ کراہتے ہوئے بولا۔ ''یہ باتیں بہت سے لوگوں کو ہضم نہیں ہوں گی، ہمارا مذاق اُڑایا جائے گا۔''

''جو کچھ بھی ہے، ہم تو دیکھ رہے ہیں ناں، ہمیں بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ تم پوری طرح چوکس ہو جاؤ۔''

رضوان کو فون کرنے کے بعد میں نے سجاول کے قریبی ساتھی چاچے فیض کو فون کیا اور اسے بھی لوسی اور پرندوں والے واقعات سے مختصراً آگاہ کیا۔ وہ ان واقعات کا تعلق ہوائی چیزوں سے جوڑنے لگا۔ میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا تھا اور نہ ہی اسے مزید خوف زدہ کرنا چاہتا تھا۔ میرا مقصد یہی تھا کہ وہ الرٹ ہو جائے اور وہ ہو گیا تھا۔ تاجور کے حوالے سے بھی میرے ذہن میں اندیشے امنڈنا شروع ہو گئے۔ میں نے قسم کھالی تھی کہ اب اس سے ملنا تو دور کی بات ہے، اس سے رابطہ بھی نہیں رکھوں گا مگر اب پھر مجھے لگ رہا تھا کہ اسے کسی طرح خطرات سے آگاہ کرنے کی ضرورت ہے۔ بے شک دارج کے لاہور والے گھر میں وہ سخت سکیورٹی میں تھی لیکن ہمیں جس طرح کے خطرات لاحق ہو گئے تھے ان میں عام قسم کی سکیورٹی اور حفاظتی تدابیر ناکام تھیں۔ میں نے فوری طور پر یہ کیا کہ دارج کے میڈیکل اٹینڈنٹ سعید کھوکھر سے کال ملائی اور وقاص کی حیثیت سے بات کر کے اسے بتایا کہ ہمارے اردگرد کس طرح کے واقعات پیش آ رہے ہیں۔ وہ بھی یقین کرنے کو تیار نہیں تھا مگر اتنا ضرور ہوا کہ وہ کچھ خوف زدہ ہو گیا۔

میں نے اس سے کہا۔ ''سعید! میری یہ اطلاع محترمہ بیگم صاحبہ تک پہنچا دو اور انہیں بتاؤ کہ انہیں بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔'' بیگم صاحبہ سے میری مراد تاجور تھی۔

وہ بولا۔ ''بیگم صاحبہ ان باتوں پر یقین کر لیں گی؟''

''ان کو کرنا پڑے گا، ورنہ ان کا نقصان ہو سکتا ہے۔ ویسے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ مادہ بندر والا یا پرندوں والا واقعہ کل کے اخباروں میں بھی رپورٹ ہو جائے۔''

سعید سے بات کر کے تھوڑی سی تسلی تو ہوئی تاہم تاجور کا چہرہ مسلسل نگاہوں میں گھوم رہا تھا۔ مرحوم حاذق ذکری نے تاجور کے حوالے سے جو کچھ اپنے خط میں لکھا تھا وہ جیسے دل و دماغ پر نقش ہو کر رہ گیا تھا۔ انہوں نے لکھا تھا...... شاہ زیب بیٹا! جہاں تک میں اس لڑکی کو سمجھ سکا ہوں یہ تم سے بے انتہا پیار کرتی ہے...... یہ عشق ہے اور مجھے لگتا ہے کہ اس کی جڑیں

اس خوبرولڑکی کے اندر بہت گہرائی تک جاچکی ہیں۔ یہ کبھی تمہیں بتائے گی نہیں مگر تمہارے بغیر اگر اسے زندہ رہنا پڑا تو ایک مسلسل عذاب سے کم نہیں ہوگا۔ میرا مشورہ ہے کہ تم اسے جلد سے جلد اپنالو۔ اگر خدانخواستہ اس لڑکی کی زندگی کسی اور کی زندگی سے منتھی ہوگئی تو پھر واپسی تقریباً ناممکن ہوجائے گی۔

ہاں یہی کچھ لکھا تھا حاذق ذکری صاحب نے...... اور اب اس کی زندگی ایک بیمار لاغر لیکن نہایت کرخت شخص سے منتھی ہوچکی تھی۔ میں نے اس خبیث کی تنہائیوں میں جھانک کر دیکھا تھا۔ وہ دہری شخصیت کا مالک تھا۔ دوسروں کے سامنے تو تاجور کو احترام سے آپ...... آیئے...... اور سنیئے جیسے الفاظ سے پکارتا تھا مگر خلوت میں اس کی مٹی پلید کر کے رکھ دیتا تھا۔ وہ فی الحال ازدواجی تعلق کے لائق نہیں تھا اور شاید اس بات کا رنج وغم بھی اس کے رویے کو بدترین بنا رہا تھا۔

فخر کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔ ''شاہ زیب! ابھی جمیلہ نے مہمان خانے کا ذکر کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اسے بھی دیکھ لینا چاہیے۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

پہلوان حشمت ایک بار پھر واش روم میں چلا گیا تھا۔ پانی گرنے کی آواز آرہی تھی۔ شاید وضو کررہا تھا۔ وہ نماز روزے کا ایسا پابند نہیں تھا لیکن لگتا تھا کہ اب ہوجائے گا۔

ہم نے جمیلہ کو ساتھ لیا اور رہائشی حصے سے نکل کر مہمان خانے کی طرف بڑھے۔ کبوتروں کو تلف کرنے کے لیے فخر نے جو کیمیکل استعمال کیا تھا اس کی ہلکی سی بو پنچے تک آرہی تھی۔ چاندنی اس سنسان کوٹھی کے در و دیوار کو آسیب زدہ لک (LOOK) دے رہی تھی۔ ہم مہمان خانے والے پورشن میں داخل ہوئے۔ ''رائفل بدست بنارس'' بھی ہمارے ساتھ تھا۔ ہم خود بھی پوری طرح الرٹ تھے۔ (حالانکہ داؤد کے کارندے اس مہمان خانے کا ایک سرسری جائزہ پہلے لے چکے تھے اور انہیں یہاں کچھ نہیں ملا تھا) مہمان خانے میں جھاڑ پونچھ نہیں کی گئی تھی اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ یہ جگہ دو تین ماہ سے بالکل استعمال نہیں ہوئی۔ چلتے ہوئے ایک جگہ اچانک مجھے اپنے قدموں کی چاپ بدلی ہوئی محسوس ہوئی، میں رک گیا۔

''کیا ہوا؟'' فخر نے چونک کر پوچھا۔

میں نے قالین پر تین چار دفعہ پاؤں مارا۔ گو بہت معمولی سا فرق تھا لیکن آواز میں فرق موجود تھا۔

''یہاں کچھ ہے؟'' میں نے ڈری سہمی جمیلہ سے پوچھا۔

''نہیں صیب جی...... مجھے کچھ پتا نہیں۔'' وہ سہمی آواز میں بولی۔ اس نے اپنے ہاتھ مستقل طور پر جوڑ رکھے تھے۔

میں نے بنارس کو اشارہ کیا۔ اس نے کمرے کے اس حصے سے قالین اٹھایا۔ ہم نے غور سے دیکھا اور بے طرح چونک گئے۔ فرش کی ٹائیلوں میں تقریباً تین فٹ ضرب چھ فٹ کا ایک ٹکڑا مختلف نظر آتا تھا۔ یہ کسی تہ خانے کا داخلی راستہ تھا۔

فخر نے ٹھونک بجا کر دیکھا۔ خلا کو ڈھانپنے والا یہ جدید ''کور'' ٹس سے مس نہیں ہوا۔

''لگتا ہے کہ یہ الیکٹرک پاور سے حرکت کرتا ہے۔'' فخر بولا۔

ہم نے کمرے میں موجود بجلی کے تقریباً سارے ہی بٹن آزما کر دیکھے۔ کچھ حاصل نہیں ہوا۔ خفیہ بٹنوں کی تلاش بھی کی گئی لیکن ناکامی ہوئی۔ ایک ریموٹ کنٹرول ایک الماری کی اندرونی دراز سے برآمد ہوا۔ میں نے یونہی آزمائشی طور پر اس کے مختلف بٹن دبائے۔ اس پر ایک سرخ لائٹ اسپارک کرنے لگی۔

اچانک فرش کا وہ حصہ بغیر آواز پیدا کیے اپنی جگہ سے سلائیڈ کر گیا۔ اس سلائیڈنگ کے ساتھ ہی ایک لائٹ بھی خود بخود آن ہوگئی۔ ہمیں زینے دکھائی دیئے۔ اندر بالکل خاموشی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس جگہ کو گودام کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے دیواروں کے ساتھ بہت سے کارٹن پڑے دکھائی دے رہے تھے۔ دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ جگہ خالی ہے۔ پھر بھی احتیاط لازم تھی۔

بنارس بولا۔ ''میں آگے جاتا ہوں سر جی۔''

''نہیں۔ پہلے ہی بہت نقصان ہو گیا ہے تم لوگوں کا۔'' میں نے اسے منع کیا۔

میں اور فخر آگے پیچھے زینوں پر اترے۔ (میں نے اپنی بلٹ پروف اتاری ہوئی تھی لیکن اسے دوبارہ پہننا پڑا) ہمارے ہاتھوں میں سیون ایم ایم رائفلیں بالکل تیار حالت میں تھیں۔ یہ کافی بڑا بیسمنٹ تھا۔ اس میں کوریڈورز اور چھوٹے بڑے کمرے تھے۔ چونکہ اس سے گودام کا کام بھی لیا جاتا تھا اس لیے یہاں ''وینٹی لیشن'' کا بھی مناسب انتظام موجود تھا۔ تاہم یہ انتظام اس طرح سے کیا گیا تھا کہ باہر سے بیسمنٹ کی موجودگی کا بالکل پتا نہیں چلتا تھا۔

''کوئی ہے؟'' میں نے آواز لگائی۔

جواب میں جو آواز سنائی دی، اس نے ہمیں ہلا دیا۔ ''کون؟ یہ کون ہے؟'' یہ سجاول کی آواز تھی۔ ہم دیوانہ وار آواز کی طرف لپکے۔

سیڑھیوں سے بس پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر وہ ایک کمرے میں موجود تھا۔ اس کی ایک ٹانگ ایک لمبی زنجیر سے باندھ کر ایک بھاری بھرکم ڈبل بیڈ سے منسلک کردی گئی تھی۔ ہم نے اسے جس حالت میں دیکھا، اس نے ہمیں سرتاپا لرزا دیا۔ اس کے چوڑے چکلے جسم اور چہرے پر زخموں کے کئی گہرے نشانات نظر آرہے تھے لیکن سب سے تکلیف دہ منظر سجاول کی آنکھوں کا تھا...... اس کی آنکھوں کی جگہ دو گھاؤ تھے۔ شاید ایک گھاؤ میں تھوڑی بہت انفیکشن بھی تھی، اس پر کوئی سفید مرہم لگایا گیا تھا۔

میں تڑپ کر آگے بڑھا اور سجاول کے دونوں کندھے تھام لیے۔ ''سجاول! یہ کیا ہوا سجاول؟''

مجھے لگا کہ سجاول نے میری آواز سنی ہی نہیں اور اگر سنی ہے تو نہ ہونے کے برابر۔ اس نے اپنی بھاری بھرکم ہاتھوں سے مجھے ٹٹولا۔ ''شاہ زیب۔'' اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ ایک دلدوز کراہ نکلی۔

''اوہ گاڈ! یہ کیا ہوا تمہارے ساتھ۔'' میں اپنے جذبات سے مغلوب ہوگیا۔ میرا گلا رندھ گیا۔ میری نگاہیں سجاول کی آنکھوں کے بے نور حلقوں پر تھیں۔

فخر نے کمرے کی لائٹس آن کردیں۔ وہ سجاول جس کے رعب سے ایک خلقت کانپتی تھی، لاچاری کی تصویر بنا ہمارے سامنے تھا۔ یقیناً اسے بے رحمی سے تشدد کا نشانہ بھی بنایا گیا تھا۔

فخر نے گلوگیر آواز میں سرگوشی کی۔ ''شاہ زیب! مجھے لگ رہا ہے کہ سجاول صاحب سن بھی نہیں پا رہے۔''

غالباً فخر ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ سجاول تہ خانے کی سیڑھیوں سے فقط پندرہ بیس قدم کی دوری پر اس کمرے میں موجود تھا۔ جب ہم تہ خانے کے داخلی راستے کے فرش کو ٹھونک بجا رہے تھے اور اسے کھول رہے تھے۔ سجاول کو اس کی آواز آجانا چاہیے تھی، مگر اس کی طرف سے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا تھا، یہاں تک کہ ہم نے اس کے بالکل پاس پہنچ کر آواز لگائی تھی۔

میں نے منہ اس کے ایک کان سے لگایا۔ سجاول! میں شاہ زیب ہوں، میری آواز سن رہے ہوناں؟'' میں نے بلند آواز سے کہا۔

وہ زخمی آواز میں بولا۔ ''ہاں...... تھوڑی...... بہت تھوڑی۔''

''سجاول، کیا ہوا تمہارے کانوں کو اور تمہاری آنکھوں کو؟'' میں کربناک انداز میں

چلایا۔
وہ نفی میں سر ہلانے لگا۔ ''کچھ نہیں...... کچھ نہیں...... یہ ایسا ہی ہونا تھا۔''
''یہ ہاناوانی ہے ناں، میں اس کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ وہ موت کو ترس ترس کر مرے گی۔'' اپنے لہجے کی بے پناہ تپش خود مجھے بھی محسوس ہو رہی تھی۔
سجاول نے ٹٹول کر میرے دونوں کندھے تھام لیے۔ انہیں ہولے سے دبایا پھر بولا۔
''اور کون آیا ہے تمہارے ساتھ؟''
''فخر زماں ہے، پہلوان حشمت ہے اور داؤد بھاؤ کے بندے ہیں۔''
''کس کے بندے ہیں؟''
''داؤد بھاؤ کے۔'' میں نے سجاول کے دائیں کان سے منہ لگا کر زور سے کہا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ بس اسی کان سے وہ تھوڑا بہت سن سکتا ہے۔
''ہاناوانی کہاں ہے؟'' سجاول نے ٹھہری آواز میں پوچھا۔
''یہاں سے بھاگ گئی ہے حرامزادی، لیکن زیادہ دیر نہیں بھاگنے دوں گا۔ اس نے بہت سے قرضے چڑھا دیئے ہیں ہمارے اوپر۔ اب اس مال زادی کو حساب دینا پڑے گا۔'' میں نے نہایت جذباتی اور حتمی لہجے میں کہا۔
''خورسنہ اور ذیشان؟'' سجاول نے پوچھا۔
''وہ بالکل خیریت سے ہیں سجاول لیکن...... لیکن یہ کیا ہوا ہے تمہارے ساتھ؟ تمہاری آنکھیں...... مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا کہ میں یہ سب کچھ دیکھ رہا ہوں۔''
سجاول نے جیسے کراہ کر دیوار سے اپنی پشت ٹکائی اور افسردہ لہجے میں بولا۔ ''وہ بہت بری اور کمینی عورت ہے...... لیکن...... میری آنکھوں...... اور میرے کانوں کے ساتھ اس نے کچھ نہیں کیا۔''
''تو کس نے کیا ہے؟'' میں نے سجاول کے کان سے منہ لگا کر بلند آواز میں پوچھا۔
''تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔''
ایک دم میرے سر میں تیز جھماکا سا ہوا۔ میں ششدر نظروں سے سجاول کی طرف دیکھتا چلا گیا۔ پھر کئی لمحے بعد میں نے سرسراتی آواز میں کہا۔ ''سجاول! سچ بتانا...... کہیں تم نے...... خود ہی تو......؟''
میرا فقرہ ادھورا تھا لیکن سجاول کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ ایک کربناک توقف کے بعد اس نے ہولے سے اثبات میں سر ہلایا۔

جو کچھ سجاول بتا رہا تھا، وہ میں نے سمجھ لیا تھا اور شاید فخر نے بھی۔ اور یہ اتنا تکلیف دہ تھا کہ پل بھر میں میرے جسم کے ہر مسام نے پسینہ اگل دیا...... یہ ناقابلِ یقین بات تھی لیکن ہو چکی تھی۔ سجاول نے خود کو ہاناوانی کے انوکھے، خطرناک ٹرانس سے بچانے کے لیے اپنی بصارت اور سماعت قربان کر دی تھی۔ اس کے ''کانوں'' کے بارے میں تو ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن اپنی ''آنکھوں'' سے وہ یقیناً محروم ہو چکا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ زہریلی عورت اس کی آنکھوں اور کانوں کے راستے ہی اس کے اندر گھسے گی، اور اس نے یہ دونوں راستے مسدود کر ڈالے تھے۔

اگلے آٹھ، دس منٹ میں سجاول نے غم ناک لب و لہجے میں جو کچھ بتایا اس سے معلوم ہوا کہ اس نے ہاناوانی کے جبر کا شکار ہونے اور اس کے اشاروں پر ناچنے کے بجائے دو روز پہلے وہی کچھ کیا جو اس جیسے بہادر شخص کو کرنا چاہیے تھا۔ اس نے ایک غیور اور محبت کرنے والے شوہر کی طرح خورسنہ اور اس کے بچے کو تو ہاناوانی کے پنجے سے آزاد کرا لیا تھا۔ اب وہ جانتا تھا کہ ہاناوانی اپنی نگاہوں کے طلسم کے ذریعے اسے کس طرح بے دست و پا کرنے والی ہے...... اور کس طرح اس کی شیطانی صلاحیتوں کے سامنے اس کی برداشت جواب دینے والی ہے۔ اس نے گودام میں موجود ایک تیز ایسڈ اپنی آنکھوں میں ٹپکا لیا تھا، اس نے سخت اذیت جھیلی لیکن اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔ اس کی آنکھیں ضائع ہو گئیں۔ اس سے اگلے روز اسے یہ خیال گزرا کہ کہیں صرف آواز کے ذریعے ہی ہاناوانی اسے اپنے قبضے میں نہ کر لے۔ ایک پاس کی الماری میں وہ ''سلیکون'' کی ایک بڑی ٹیوب بھی دیکھ چکا تھا۔ اس نے نتائج سے بے پروا ہو کر خاصی مقدار میں ''سلیکون'' اپنے دونوں کانوں میں ٹپکا لیا جو اندر تک چلا گیا اور اسے باہر کی آوازیں آنا تقریباً بند ہو گئیں۔

اس صورتِ حال پر ہاناوانی طیش اور بوکھلاہٹ میں ناچ کر رہ گئی تھی۔ وہ خورسنہ اور ذیشان پر بھی دوبارہ چڑھائی نہیں کر سکتی تھی کیونکہ وہ اب لالہ موسیٰ میں سخت حفاظتی انتظام میں تھے۔ یہ وہ دردناک حالات تھے جن میں سجاول یہاں لاہور کی اس مضافاتی کوٹھی میں ''کالا شاہ کاکو'' کے قریب موجود تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے سجاول نے یہاں ہاناوانی کے چنگل میں پھنسنے کے فوراً بعد ہی اپنی آنکھوں اور اپنی سماعت کی قربانی دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مجھے خورسنہ کی باتیں یاد آئیں۔ اس نے تین دن پہلے مجھے بتایا تھا کہ اسے اور بچے کو یہاں سے نکالتے وقت سجاول اسے پہلی بار جذباتی دکھائی دیا تھا۔ اس نے ذیشان کے ماتھے کو چوما اور پھر رات کو جب وہ اتفاقاً جاگی تو اس نے سجاول کو ایک ٹک اپنی طرف دیکھتے پایا۔ اس موقع پر

میاں بیوی میں جو مکالمہ ہوا، وہ بھی خورسنہ نے بتایا تھا۔ خورسنہ نے کہا تھا۔ ''سجاول! ایسے کیا دیکھ رہے ہیں میری طرف؟''

سجاول نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا تھا۔ ''بھئی! آنکھیں دیکھنے کے لیے ہی تو ہوتی ہیں۔''

ہاں آنکھیں دیکھنے کے لیے ہی تو ہوتی ہیں اور دبنگ سجاول نے ان سے جتنا دیکھنا تھا، وہ دیکھ چکا تھا۔ وہ ایک پیدائشی جنگجو اور نڈر تھا...... اور آج اس نے ایک شوہر اور ایک باپ کی حیثیت سے بھی اپنی بے خوفی اور اپنی ''کمٹ منٹ'' کو ثابت کیا تھا۔

میری آنکھوں میں انگارے سے بھر گئے۔ ''ہاناوانی...... ہاناوانی......'' میرے سینے میں ایک شور برپا تھا۔

ہاناوانی کی آواز فضاؤں میں گونجتی محسوس ہوتی تھی۔ وہ جیسے کہہ رہی تھی...... میں آ گئی ہوں۔ تم سب میرے دشمن ہو...... اور تم مجھے روک نہیں سکتے ہو۔ میں تمہیں چن چن کر ماروں گی......

○......❖......○

''یونس کا کچھ پتا چلا ہے؟'' سجاول نے مجھ سے پوچھا۔

میں اسے کیسے بتاتا کہ ساتھ والے کمرے میں اس کی لاش پڑی ہے، جسے خونخوار طوطوں نے مسخ کر ڈالا ہے۔ فی الحال میں نے اس بارے میں لاعلمی ظاہر کرنا مناسب سمجھا۔

''ہاناوانی کہاں ہے؟'' سجاول نے دریافت کیا۔

''نوے پچانوے فیصد امکان یہی ہے کہ وہ یہاں سے فرار ہو چکی ہے۔ بہر حال ہم اسے اس عمارت کے آس پاس ڈھونڈ رہے ہیں۔'' میں نے بلند آواز میں جواب دیا۔

اس دوران میں فخر نے ایک چابی ڈھونڈ کر وہ زنجیر سجاول کی ٹانگ سے علیحدہ کر دی جس نے اسے بھاری بھرکم بیڈ کے ساتھ منسلک کر رکھا تھا۔ سجاول کی آنکھوں کو نظر بھر کے دیکھنا بھی مشکل تھا۔ ان میں سے اب بھی خون کا رساؤ محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے علاوہ انفیکشن بھی ظاہر ہو رہا تھا۔ اسے فوری طور پر طبی امداد کی ضرورت تھی۔

اسی دوران میں داؤد بھاؤ بھی لاہور سے پچیس تیس کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے موقع پر پہنچ گیا۔ اس نے بھی سجاول کی حالت دیکھی اور ششدر رہ گیا۔ سجاول سن بھی نہیں پا رہا تھا۔ داؤد بھاؤ نے مجھ سے اس بارے میں پوچھا تو میں نے اسے بتایا۔ ''یہاں جو کچھ بھی ہو رہا ہے بھاؤ! انوکھا ہو رہا ہے۔ سجاول نے اپنے کانوں میں ''سیلیکون'' انڈیل کر انہیں بند کر دیا

ہے۔ سجاول اس بدذات عورت کے شکنجے سے بچنا چاہتا تھا اور اس کے لیے اس نے ہر وہ کام کیا ہے جو کر سکتا تھا۔''

داؤد بھاؤ کے چہرے پر تاسف کے تاثرات تھے۔ اس سے پہلے میں نے اس سے جب بھی کہا تھا کہ انیق کی موت میں سجاول بے قصور ہے تو داؤد نے میری بات پر یقین نہیں کیا تھا۔ میرے بار بار کہنے کے باوجود اس کے ذہن میں شک رہا تھا لیکن آج جو کچھ وہ دیکھ رہا تھا، اس نے یقیناً اسے اپنے خیالات بدلنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''عاشق کہاں ہے؟'' داؤد بھاؤ نے غم زدہ لہجے میں پوچھا۔

''وہ ختم ہو گیا تھا بھاؤ...... چھت سے گرتے ہی ختم ہو گیا تھا۔ اس کی لاش بھی ساتھ والے کمرے میں پڑی ہے۔''

داؤد ابھی تک پرندوں اور لوسی والی باتوں پر پوری طرح یقین نہیں کر پا رہا تھا۔ بہر حال وہ اس حوالے سے کسی طرح کی بحث بھی نہیں کر رہا تھا۔

اس نے سجاول کی آنکھوں کو دھیان سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اسے فوری طور پر میڈیکل ایڈ کی ضرورت ہے۔ اس طرح کا انفیکشن، دماغ کا بھی ستیاناس کر دیتا ہے۔ اس کے علاوہ پتا نہیں کہ اس کے کانوں کی کیا صورتِ حال ہے۔ اگر کیمیکل نے کان کے پردے اور اندرونی حصے کو نقصان پہنچا دیا ہے تو پھر اس کی سننے کی صلاحیت بھی ختم ہو سکتی ہے۔''

ہم نے تیزی سے مشورہ کیا۔ کسی سرکاری اسپتال سے تو رجوع نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ایک دو بڑے پرائیویٹ کلینکس کے مالکان داؤد بھاؤ کے ''عقیدت مندوں'' میں شامل تھے۔ سجاول کو فوراً جیل روڈ لاہور کے ایک بڑے کلینک میں شفٹ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ داؤد بھاؤ خود اس گاڑی کے ساتھ روانہ ہوا جس میں سجاول کو لے جایا جا رہا تھا۔ داؤد کے کارندے عاشق جٹ کی لاش بھی اسی جہازی سائز کی جیپ میں موجود تھی۔ روانہ ہوتے وقت سجاول نے کراہتی ہوئی سی آواز میں مجھ سے کہا۔ ''شاہ زیب! خورسنہ اور ذیشان کا دھیان رکھنا۔''

میں نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ ''سجاول! جو ہونا تھا، وہ ہو گیا لیکن اب کسی کی ہوا بھی ان کو چھو نہیں سکتی۔ اس بارے میں بالکل بے فکر ہو جاؤ۔''

''یونس کا بھی پتا کرو۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ سخت مصیبت میں ہو گا۔''

میں نے اس موقع پر اسے یہ بتانا مناسب نہیں سمجھا کہ وہ ساری مصیبتوں سے آزاد ہو چکا ہے۔ میں نے بس اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

سجاول روانہ ہو گیا تو ہم یونس پمپ والا کی لاش اور اس کی زخمی بھابی کی طرف متوجہ

ہوئے۔اس کی بھابی کا نام پروین تھا۔جس کمرے میں یونس نے ٹرانس کی حالت میں پروین پر مجرمانہ حملے کی کوشش کی تھی، اس میں سی سی ٹی وی کیمرا موجود تھا۔فخر نے اس کی فوٹیج ٹریس کر لی تھی۔ یہ فوری طور پر ضائع کر دینے والی چیز تھی۔اس فوٹیج میں یونس اپنی موت سے چند منٹ قبل وحشیانہ انداز میں اپنی بھابی پر حملہ آور نظر آتا تھا۔ وہی عورت جو اس کے لیے قابلِ صد احترام تھی اور جس کی وہ دل سے عزت کرتا تھا، اس کی ہوس ناک گرفت میں تھی۔ وہ اس کے کپڑے پھاڑ رہا تھا، اس کا جسم نوچ رہا تھا۔

اس کے بعد بھی جو کچھ ہوا، وہ سب کچھ سی سی ٹی وی میں ریکارڈ ہو گیا تھا اور یونس کے آخری لمحات کی دردناک تصویر کشی کر رہا تھا۔

پروین نامی اس عورت کی ذہنی کیفیت اب بھی ٹھیک نہیں تھی۔ وہ وقفے وقفے سے جنونی انداز میں واویلا کرنے لگتی تھی۔ میں نے اسے سمجھانے بجھانے کی کوشش کی وہ ذرا نارمل ہوئی تو میں نے اس سے کہا۔"بی بی! تم اپنے آپ کو سنبھالو۔ ورنہ لمبا چوڑا کیس بن جائے گا تم پر...... جو ہونا تھا، وہ ہو گیا ہے، اب اس پر واویلا کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔"

"وہ ایسا نہیں تھا...... وہ ایسا نہیں تھا...... اس پر کسی نے کچھ کر دیا ہو گا۔ ہائے میرا یونس...... ہائے میرا چھوٹا ویر...... میں نے اسے اپنے ہاتھوں سے مار دیا۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ اس پر بڑا سخت قسم کا جادو ٹونہ تھا...... اس بارے میں تمہیں بعد میں بتائیں گے۔ فی الحال تم اس بارے میں اپنی زبان بالکل بند رکھو۔ ہمیں دوسروں کو یہی بتانا ہے کہ یونس کو ان لوگوں نے مارا ہے جنہوں نے اسے اغوا کیا تھا۔"

"اس کو کس نے اغوا کیا تھا...... یہ کیسے ہو سکتا ہے...... وہ تو خود مجھے گھر سے لے کر آیا تھا۔ کہتا تھا...... بھابی! تم کو ایک پلاٹ دکھانا ہے...... بچوں کے کام آئے گا...... وہ تو......"

"دیکھو بی بی! زیادہ سوال جواب نہ کرو، نہیں تو تمہاری پریشانی بڑھے گی۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

پھر میں نے اسے بتایا کہ اس نے اپنے گھر والوں کو اپنی چوٹوں وغیرہ کے بارے میں کیسے مطمئن کرنا ہے اور یونس کی موت کے حوالے سے کیا رویہ اختیار کرنا ہے۔ وہ اب کچھ کچھ میری بات سمجھنے لگی تھی (اس کا شوہر پاکستان سے باہر تھا) وہ کافی سیانی عورت لگتی تھی۔

داؤد کے کارندے دیوہیکل کتے کی لاش کو بھی ٹھکانے لگا چکے تھے اور فرش وغیرہ کو دھو کر صاف کر دیا تھا۔ پہلوان کی حالت ابھی تک دگرگوں تھی۔ وہ گاہے بگاہے خوف زدہ نظروں سے آسمان کی طرف دیکھنے لگتا تھا۔ جیسے اسے ڈر ہو کہ یہاں سے پرواز کر جانے والے جنونی

طوطے ابھی کسی جانب سے نمودار ہوں گے اور ہم پر حملہ آور ہو جائیں گے۔ بندریا لوسی والے حملے کے بعد یہ دوسرا لرزہ خیز منظر تھا جو پچھلے چوبیس گھنٹوں میں ہم نے دیکھا تھا۔ ہم نے وہاں اپنی موجودگی کے تقریباً تمام نشانات مٹا دیئے اور پروین کو اس کے گھر کی طرف روانہ کر کے ہوٹل واپس آ گئے۔ ٹرانسمیٹر کا ریسیور ہمارے پاس موجود تھا لیکن اس پر لوسی کے سگنل بالکل دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

O......❖......O

رضوان بڑی بے چینی سے ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ اب صبح کے تقریباً چھ بج چکے تھے۔ وہ زخمی ہونے کے باوجود بالکل چوکس تھا۔ پستول بالکل تیار حالت میں اس نے اپنی قمیص کے نیچے لگا رکھا تھا۔ وہ ہم سے وہ واقعات سننے کے لیے بے تاب تھا جو وہاں ''کالا شاہ کاکو'' کی اس الگ تھلگ عمارت میں پیش آئے تھے۔ پرندوں کے اچانک حملے سے لے کر سجاول کی حالت زار تک میں نے سب کچھ اس کے گوش گزار کر دیا۔ یہ جان کر وہ بھی سخت ملول ہوا کہ سجاول کی آنکھیں ضائع ہو چکی ہیں اور اسے مخدوش حالت میں اسپتال پہنچایا گیا ہے۔ یونس پمپ والا کی موت بھی رضوان کے لیے غم ناک ثابت ہوئی۔

رضوان نے مجھے کل شام کا اخبار دکھایا۔ اس میں بھی بندریا لوسی والی خبر موجود تھی۔ رپورٹر نے ہوٹل کا نام لکھتے ہوئے بتایا تھا کہ رات کو اس ہوٹل پر ایک انوکھا واقعہ ہوا ہے۔ ایک پالتو مادہ بندر نے ہوٹل میں گھس کر وہاں موجود لوگوں پر حملہ کر دیا...... اس مادہ بندر نے باقاعدہ لباس پہن رکھا تھا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کی حیثیت ایک پالتو بندریا کی تھی۔ وہ بندریا بہت جارحیت پر اتری ہوئی تھی۔ اس نے ہوٹل کے چوکیدار پر حملہ کر کے اسے شدید زخمی کیا، جبکہ ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ایک دو مہمانوں کو بھی زخم آئے ہیں...... علاقے کے مکین اس پُراسرار واقعے پر خوف زدہ نظر آتے ہیں۔

رضوان نے کہا۔ ''ایک دو ٹی وی چینلز پر بھی اس واقعے کی مختصر خبر چلی ہے۔ عشاء کے بعد مسجد سے مولانا حبیب صاحب کا فون بھی آیا تھا، مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ میں کہاں غائب ہو گیا ہوں۔ میں نے بہانہ بنایا ہے کہ ایک ضروری کام کے سلسلے میں اچانک شیخوپورہ آنا پڑ گیا ہے۔ وہ بھی کچھ چونکے ہوئے ہیں۔''

''کس بات پر؟''

''ہوٹل میں بندریا کے گھسنے والی خبر ان تک بھی پہنچ چکی ہے۔ انہیں یہ بھی پتا ہے کہ دو دن پہلے رات کو مسجد کے رہائشی پورشن میں بھی کسی کے گھسنے اور شیشہ وغیرہ ٹوٹنے کا واقعہ ہوا

ہے۔ اس ہوٹل اور مسجد میں مشکل سے ستر اسّی میٹر کا فاصلہ ہوگا۔ مولانا کو اندیشہ ہے کہ کہیں مسجد اور ہوٹل والے واقعے میں ''لنک'' تو نہیں ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اندیشہ تو ان کا بالکل درست ہے اور میرے خیال میں تمہاری طرح مولانا کو بھی محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔''

رضوان بولا۔ ''میرا تو خیال ہے کہ یہاں چھپ کر بیٹھنے کے بجائے مجھے مسجد ہی چلا جانا چاہیے۔ مولانا صاحب کی حفاظت بھی ہو جائے گی...... اور اپنی طرف سے تو میں چوکس ہو ہی چکا ہوں۔''

داؤد بھاؤ کا کوتاہ قد کارندہ بنارس مجھے کافی کام کا بندہ لگا تھا۔ میں نے اس وقت داؤد بھاؤ کو فون کیا اور اسے کہا کہ وہ بنارس کو میرے پاس ہوٹل میں بھیجے، میں چاہتا تھا کہ بنارس یہاں مسجد کے آس پاس رضوان کی معاونت کرے۔ داؤد بھاؤ نے کہا کہ آدھے گھنٹے میں بنارس ایک اور بندے سمیت میرے پاس پہنچ جائے گا۔ میں نے داؤد سے پوچھا۔ ''سجاول کی کیا پوزیشن ہے؟''

''پوزیشن کچھ زیادہ اچھی نہیں ہے۔ اس کی آنکھیں تو ضائع ہو ہی چکی ہیں۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ آنکھیں ایک خطرناک ایسڈ کی وجہ سے ضائع ہوئی ہیں۔ اس کو انفیکشن ہو چکا ہے۔ یہ انفیکشن اس کے برین کو متاثر کر سکتا ہے۔ اگر ایسا ہو گیا تو اس کا بچنا محال ہو جائے گا۔'' داؤد بھاؤ کے لہجے میں گہرا تاسف تھا۔

''اور اس کے کان؟''

''ہاں کانوں کے سلسلے میں ای۔ این۔ ٹی اسپیشلسٹ نے امید دلائی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ کم از کم ایک کان تو مکمل بحال ہو جائے گا۔''

میں نے کہا۔ ''کیا اس وقت سجاول سے بات کر سکتا ہوں۔''

''اس کو آپریشن تھیٹر لے جانے کی تیاری ہو رہی ہے۔ بہر حال میں کوشش کرتا ہوں۔'' داؤد بھاؤ نے کہا۔

قریباً دو منٹ بعد سجاول کی بھاری بھرکم لیکن نقاہت بھری آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ''ہیلو شاہ زیب! کیا بات ہے؟''

''سجاول! مجھے پتا ہے تم اس مصیبت کا مقابلہ بڑے حوصلے سے کرو گے۔ تم بھی جانتے ہو کہ اس لاہور شہر میں داؤد بھاؤ کی کتنی چلتی ہے۔ اللہ نے چاہا تو ہم تمہارے لیے بہترین علاج مہیا کریں گے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

وہ افسردہ لہجے میں بولا۔ ''لیکن ابھی تو سب غلط ہی ہو رہا ہے ناں، تم نے یونس کے بارے میں مجھے اندھیرے میں رکھا۔ وہ وہاں مارا گیا ہے ناں؟''

میں ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا پھر بات کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری اپنی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں تمہیں بعد میں بتانا چاہتا تھا۔ اس کی موت کا صدمہ مجھے بھی کم نہیں ہے سجاول...... اور ہم ان موتوں کو بھولیں گے نہیں۔ بہت جلد اس سارے ظلم کا حساب اس حرام زادی کو دینا پڑے گا۔''

''شاہ زیب! سامنے آنے والے دشمن سے تو دلیری کے ساتھ مقابلہ کیا جا سکتا ہے مگر وہ ایک گہرے اندھیرے میں چھپی ہوئی زنانی ہے۔ ابھی تک تو اس نے ثابت کیا ہے کہ وہ ہم پر حاوی ہے۔ اب تک وہ کتنی جانیں لے چکی ہے۔ اس نے حاذق ذکری صاحب کو مارا، انیق کو مارا، مانی کی خالہ کو مارا، باقر اور یونس کو مارا۔ اور مجھے بھی لاچار کر کے بستر پر پھینک دیا۔ ابھی نہ جانے اسے کیا کچھ کرنا ہے۔''

مجھے پہلی بار سجاول جیسے دبنگ بندے کا لہجہ افسردہ اور شکست خوردہ محسوس ہوا۔ اس کی مایوسی اور لاچاری کو محسوس کر کے میرا دل جیسے کٹ کر رہ گیا۔

''سجاول، یار یہ کیسے لہجے میں بات کر رہے ہو تم؟ حوصلہ پکڑو یار، ابھی یہ لڑائی ختم نہیں ہوئی ہے۔''

''پر میرے لیے تو ختم ہو ہی چکی ہے۔ میں خود کو آدھا مرا ہوا محسوس کر رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ میں نے اس کے پتر (رائے زل) کا گلا کاٹ کر جو زخم اسے لگایا تھا، اس کا بدلہ اس نے لے لیا ہے...... اور شاید ابھی اور بھی لے گی۔ میرا دھیان بار بار خورسنہ اور اس کے بچے کی طرف جا رہا ہے۔ تم جانتے ہو کہ خورسنہ نے میرے لیے کتنی تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ مجھ سے ویاہ کر کے اس کو خوشی تھوڑی ملی اور دکھ زیادہ...... اور ابھی شاید اور بھی ملنے ہیں۔ تم اس کا خیال رکھنا شاہ زیب۔''

میرا دل بھر آیا۔ میں نے بوجھل آواز میں کہا۔ ''اگر تم میرے سامنے ہوتے تو ضرور میرے اور تمہارے درمیان سخت قسم کی لڑائی ہو جاتی۔ تمہیں شرم نہیں آتی ایسی بات کرتے ہوئے؟ یہ تمہاری نہیں، میری لڑائی تھی۔ اس لڑائی میں، میں نے تمہیں گھسیٹا۔ اب تم یہ کیسے سوچ سکتے ہو کہ میں ایسے موقع پر خورسنہ اور ذیشان کو تنہا چھوڑ دوں گا۔ یاد رکھو سجاول! میری زندگی میں تو کوئی ان کو کانٹا چبھنے کی تکلیف بھی نہیں دے سکتا اور اگر مر گیا تو بھی ان شاء اللہ ایسا انتظام کر جاؤں گا کہ کوئی ان پر میلی نظر نہ ڈال سکے گا۔ سچی بات یہ ہے سجاول کہ ایسی

مایوسی کی باتیں مجھے سردار سجاول سیالکوٹی کی طرف سے سنائی دیتی اچھی نہیں لگ رہیں...... مجھے بھروسا نہیں ہورہا کہ یہ سب کچھ تم کہہ رہے ہو، ابھی سب کچھ ختم نہیں ہوا ہے سجاول...... ابھی بہت کچھ باقی ہے...... اور تم بھی باقی ہو، تمہاری صحت بھی باقی ہے۔''

شاید میں اور بھی کچھ کہتا لیکن اسی دوران میں میڈیکل اسٹاف کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ وہ غالباً سجاول کو آپریشن تھیٹر میں لے جانے کے لیے پہنچ گئے تھے۔ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

○......❖......○

دوپہر سے پہلے ہی رضوان ہوٹل سے واپس مسجد میں چلا گیا۔ زخمی ہونے کے باوجود وہ حوصلے میں تھا اور کسی حد تک پُر جوش بھی۔ گٹھے ہوئے جسم والا کوتاہ قامت بنارس بھی ایک اور تجربہ کار شوٹر سمیت رضوان کی مدد کو پہنچ چکا تھا۔

پہلوان کا مورال اتنا اچھا نہیں تھا اور نہ ہی اس کی حالت اچھی تھی۔ کئی دیگر لوگوں کی طرح اس کے دل و دماغ میں بھی یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے، سب ماورائی ہے اور اس میں خطرناک قسم کے جادو اور ہوائی چیزوں کا عمل دخل ہے۔ جادوٹونے کی حد تک تو ہم بھی پہلوان کے ہم خیال تھے لیکن یہ جادوٹونا کسی جنتر منتر یا تعویذ گنڈے کی شکل میں نہیں تھا...... یہ ایک تسلیم شدہ سائنس تھی۔ یہ پیرا سائیکالوجی کا وہ شعبہ تھا جو کھوجنے والی نگاہوں کے سامنے حیرت کے نئے جہاں کھول رہا تھا۔ یہ ہپناسز کی صلاحیت تھی جو ایک انوکھی عورت کے اندر پہنچ کر ایک غیر معمولی صورت اختیار کر گئی تھی۔

پہلوان ایک کاغذ پر کچھ لکھ کر کمرے کی الماری پر چپکانے میں مصروف تھا۔ میں نے قریب جا کر پڑھا تو پتا چلا کہ یہ اشتہار ''ہوائی چیزوں'' کے لیے ہے۔ پہلوان نے لکھا تھا (اور اس میں حسبِ معمول املاء کی غلطیاں بھی شامل تھیں) اس تحریر کے ذریعے ساری ہوائی چیزوں کو اطلاع دی جاوت ہے کہ وہ ہمارے آس پاس سے چلی جاویں ورنہ اپنے نقصان کی خود ذمے ہووین گی۔ ہم سب پیر صاحب شاناں والے کے ''پیروقار'' ہیں۔ اگر تمہارا ٹاقرا (ٹاکرا) پیر شاناں والے کے مریدوں سے بھی ہو گیا تو وہ تمہارا دھڑن طختہ کر دیویں گے...... پیر شاناں والے کا ایک حکیر وادنیٰ مرید۔'' اس کے نیچے کچھ ناقابلِ فہم الفاظ لکھے تھے۔

میں نے کہا۔ ''یہ کیا معاملہ ہے پہلوان جی؟''

پہلوان نے رازداری کے لہجے میں کہا۔ ''کل یہاں کے ایک پہنچے ہوئے بزرگ

پیر شاناں والے سے میری تفصیل سے بات ہوئی ہے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ یہ آتشی مخلوق ہے اور عراق کے شہر تہران سے یہاں آئی ہے۔ اگر اس کا علاج نہ ہوا تو بڑا نقصان پہنچا سکتی ہے۔''

میں نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''پہلوان جی! پہلی بات تو یہ کہ تہران ....عراق میں نہیں ایران میں ہے اور دوسری بات یہ کہ اگر یہ آتشی مخلوق واقعی ایران سے آئی ہے تو پھر آپ کی اردو کیسے سمجھے گی۔ یہ خط فارسی میں ہونا چاہیے تھا۔''

''تم خوامخواہ کی میم میخ نہ نکالو۔ اس آتشی مخلوق میں بھی ترجمہ کرنے والے ہوتے ہوویں گے۔''

پہلوان سے بحث طول پکڑ سکتی تھی مگر اسی دوران میں فخر نے پہلوان کو بلا لیا۔ وہ دونوں سجاول کی خبر گیری کے لیے جانا چاہتے تھے۔

O......❖......O

میں بالکونی میں بیٹھ گیا اور ہوٹل سے نیچے گزرتی سڑک کو بے خیالی میں گھورنے لگا۔ دھیان بار بار تاجور اور اس کی سلامتی کی طرف جا رہا تھا۔ جب سے مجھے یہ پتا چلا تھا کہ وہ مجھے بچانے کے لیے اپنی مرضی اور خواہش سے جاماجی گئی تھی اور مشکل ترین حالات کا سامنا کیا تھا تو اس کے حوالے سے میری حیرانیوں میں اضافہ ہوا تھا۔ مجھے کبھی کبھی لگتا تھا کہ میں آج تک اسے ٹھیک سے سمجھ ہی نہیں سکا ہوں یا شاید وہ اپنے آپ میں ایک گورکھ دھندا تھی، سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔

اچانک میں نے ایک شخص کو سیڑھیاں چڑھ کر ہوٹل کی لابی میں داخل ہوتے دیکھا۔ وہ سیدھا میری طرف ہی آ رہا تھا۔ وہ گرانڈیل آدم خاں تھا۔ دارج داراب کا وہی لمبے بالوں والا ملازم جو ہر وقت سائے کی طرح اس کے ساتھ رہتا تھا اور اس کی جی حضوری میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا تھا۔ آدم خاں کے پیچھے ہی پیچھے ایک اور شخص بھی چلا آ رہا تھا۔

''السلام علیکم۔'' اس نے قریب آتے ہی بھاری بھرکم آواز میں کہا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

''وعلیکم السلام۔'' میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''آدم خاں تم یہاں کیسے؟''

''بس آپ کو اس ہوٹل میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ سوچا آپ سے مل ہی لیں۔''

دوسرے شخص نے بھی مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ آدم خاں نے اس شخص کا تعارف کراتے ہوئے مجھے بتایا۔ ''یہ میرا دوست ہے، ڈاکٹر تو نہیں ہے لیکن ڈاکٹری تقریباً ساری ہی

جانتا ہے۔ آپ کی ہر بیماری کو دو منٹ میں ٹھیک کر دے گا۔'' پھر اس نے میری طرف اشارہ کیا اور اپنے اس دوست سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''اور یہ ہیں چاند کھوکھر صاحب...... پچھلے دنوں جب سعید کھوکھر صاحب کے والد سیڑھیوں سے گر کر زخمی ہو گئے تھے تو دارج صاحب کی دیکھ بھال انہوں نے ہی کی تھی۔ معذور مریضوں کی تیمارداری کا بڑا تجربہ ہے ان کو۔''

''شکریہ۔'' میں نے کہا۔ وہ دونوں میرے سامنے کرسیوں پر بیٹھ چکے تھے۔ پتا نہیں کیوں ان دونوں کے انداز سے مجھے کسی گڑبڑ کا احساس ہو رہا تھا۔

میں نے رسمی انداز میں پوچھا۔ ''اب دارج صاحب کا کیا حال ہے؟''

''اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ وہ ٹھیک ہیں۔ اللہ نے ان کو ایک بڑے خطرے سے بچایا ہے۔''

''کس طرح کا خطرہ؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''بڑے لوگوں کے کئی سجن دشمن ہوتے ہیں۔ بس اسی طرح کا ایک خطرہ تھا۔'' اس نے جیسے بات گول کرتے ہوئے کہا۔

سہ پہر کے سائے طویل ہو رہے تھے۔ چھوٹے درجے کے اس ہوٹل میں لوگوں کی آمدورفت جاری تھی۔ کھانوں کی خوشبو سے ہی پتا چل جاتا تھا کہ ہوٹل کی طرح کھانوں کا معیار بھی بس گزارے لائق ہی ہے۔

آدم خاں کے ساتھ آنے والا شخص پینٹ شرٹ میں ملبوس تھا۔ اس کی فرنچ کٹ داڑھی تھی۔ وہ درمیانے جسم کا ایک جواں سال تھا۔ اس نے ابھی تک گفتگو میں حصہ نہیں لیا تھا۔ میں نے آدم خاں سے کہا۔ ''تم نے اپنے اس دوست کا تعارف کرا دیا لیکن اسم شریف تو بتایا ہی نہیں؟''

آدم خاں نے دائیں بائیں دیکھا اور پھر اطمینان سے بولا۔ ''اس کا نام بھی چاند کھوکھر ہے۔''

میرا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ اس مرتبہ میں نے دھیان سے پینٹ شرٹ والے کو دیکھا۔ اس نے بڑے سکون سے اپنی فرنچ کٹ داڑھی اتار کر سامنے میز پر رکھ دی اور پی کیپ بھی اتار دی۔ وہ چاند کھوکھر ہی تھا (جب میں چاند کھوکھر کا روپ دھار کر داراب ہاؤس میں گھسا تھا میں نے باقاعدہ چاند کھوکھر سے ملاقات کی تھی اور اس سے ضروری معلومات حاصل کی تھیں)

میرا ہاتھ بے ساختہ اپنی قمیص کے نیچے لگے بریٹا پسٹل کی طرف رینگ گیا لیکن اس

سے پہلے کہ وہ پسٹل تک پہنچتا ایک اور منظر نے مجھے بری طرح ٹھٹکا دیا۔ ایک باوردی پولیس انسپکٹر دو سادہ پوش پولیس اہلکاروں کے ساتھ بالکونی کی طرف آرہا تھا۔ سادہ پوش اہلکاروں کا انداز بڑا جارحانہ تھا۔ ان کے ہاتھوں میں پکڑی آٹومیٹک رائفلوں کا رخ سیدھا میری جانب تھا۔

''خبردار!'' انسپکٹر بھی اپنا سرکاری پستول نکالتے ہوئے گرجا۔ ''اپنی جگہ سے حرکت نہ کرنا۔ تم گھیرے میں ہو۔''

اور تب مجھے صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ ہوا۔ نہ صرف ہوٹل کی چھت پر باوردی اور سادہ پوش اہلکار نظر آرہے تھے بلکہ نیچے سڑک پر بھی پولیس والے آدھمکے تھے۔ یہ سب کچھ نہایت خاموشی اور سرعت سے کیا گیا تھا۔ یہی وقت تھا۔ جب انسپکٹر نے مجھے وارننگ دی کہ میں اپنا ہاتھ اپنے پستول سے دور رکھوں ورنہ اسی جگہ شوٹ کر دیا جاؤں گا۔

انسپکٹر مجھ سے فقط سات آٹھ فٹ کی دوری تک پہنچ چکا تھا اور اس کے سرکاری ریوالور کا فاصلہ مجھ سے تین چار فٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ میرے دماغ میں آندھی سی چل رہی تھی۔ یہ سب کیا ہوا تھا؟ کیسے ہوا تھا؟ لگتا یہی تھا کہ دارج داراب یا اس کے وفادار خادم آدم خاں کی ملاقات اس اصلی چاند کھوکھر سے ہوگئی تھی اور نتیجے میں مجھ پر چھاپا مار دیا گیا تھا مگر تب یکا یک مجھے شک پڑا کہ بات اس سے بھی کچھ زیادہ ہے۔ میں نے نیچے کھڑے پولیس اہلکاروں میں ایک جانا پہچانا منحوس چہرہ دیکھا۔ میری نظر دھوکا نہیں کھا رہی تھی۔ یہ وہی انسپکٹر قیصر چوہدری تھا جس نے میرے پاکستان میں داخل ہوتے ہی مجھے اپنی پولیس گردی کا شکار کیا تھا اور نتیجے میں میری اس طویل رُوداد کا آغاز ہوا تھا...... میں نے دور ہی سے دیکھ لیا۔ اب اس کے جسم پر ڈی ایس پی کی وردی نظر آرہی تھی۔

میرے سامنے کھڑے پولیس انسپکٹر نے تحکمانہ لہجے میں مجھے اپنے ہاتھ اوپر اٹھانے کے لیے کہا۔ آٹومیٹک رائفلوں کے بیرل میرے سر سے قریب تر پہنچ چکے تھے۔

میں نے ہاتھ اٹھانے میں ذرا پس و پیش کی تو انسپکٹر زہریلے لہجے میں بولا۔ ''کوئی چالاکی نہ دکھانا شاہ زیب! ورنہ اسی جگہ...... اسی وقت مارے جاؤ گے۔''

یہ دوسرا بڑا بم تھا جو دو منٹ کے اندر اندر میرے سر پر پھٹا تھا۔ انسپکٹر نے میرا نام لے کر مجھے پکارا تھا۔ اس نے مجھے شاہ زیب کہا تھا۔ میرے پورے جسم میں نہایت تیز سنسناہٹ دوڑ گئی۔ مطلب یہ تھا کہ راز فاش ہو چکا تھا۔

انسپکٹر نے بڑی احتیاط سے آگے بڑھ کر میری قمیص کے نیچے سے بریٹا پسٹل نکال لیا

اور چند قدم پیچھے ہٹ کر رائفل برداروں کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ ''میرا خیال ہے شاہ زیب صاحب، کہ اب تمہیں شرافت سے ہتھکڑی لگوا لینی چاہیے۔'' انسپکٹر نے کہا اور اس کی آواز مجھے کہیں بہت دور سے آتی محسوس ہوئی۔

میرا دھیان سید عابد بخت ہانا وانی کی طرف گیا اور اس کے ساتھ ساتھ خورسنہ کی طرف بھی۔ مجھے پہلے ہی اس بات کا اندیشہ تھا کہ ہانا وانی کے ٹرانس میں آخر خورسنہ نے اسے میرے حوالے سے کچھ بتا نہ دیا ہو...... اور اب لگ رہا تھا کہ یہ اندیشہ بالکل درست تھا۔ میرا بھید کئی مہینوں کے بعد بالآخر کھل گیا تھا۔ آٹومیٹک رائفلیں میرے سر سے آن لگی تھیں۔ مزاحمت کا مطلب خودکشی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ہوٹل میں اور ہوٹل کے اردگرد موجود افراد، چہروں پر حیرت اور خوف لیے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔

O......❖......O

یہ ایک بکتر بند قسم کی گاڑی تھی۔ مجھے لاہور شہر کی مختلف سڑکوں سے گزار کر کسی عمارت میں پہنچایا گیا۔ گاڑی میں کرخت صورتوں والے چار مسلح پولیس اہلکار موجود تھے اور جیسے خاموشی کی زبان میں مجھ سے کہہ رہے تھے...... ''بڑی لمبی چھلانگیں لگائی ہیں تم نے...... لیکن ایک دن تو تمہیں پکڑے جانا ہی تھا اور آج پکڑے گئے ہو۔''

قیصر چوہدری...... بلکہ ڈی ایس پی قیصر چوہدری ابھی تک میرے سامنے نہیں آیا تھا لیکن یقینی بات تھی کہ ابھی کچھ دیر میں اپنے اس دیرینہ دشمن سے بھی ملاقات ہونے والی ہے۔

بند گاڑی کسی پورچ نما مقام پر رک چکی تھی لیکن ابھی اس کے دروازے نہیں کھولے گئے تھے۔ بے شک میرے ہاتھ الٹی ہتھکڑی میں جکڑے ہوئے تھے لیکن گاڑی میں موجود مسلح اہلکار مجھے یوں گھور رہے تھے جیسے ابھی میں کوئی جادو دکھاؤں گا اور اپنے کھلے ہاتھوں کے ساتھ ان پر پل پڑوں گا۔ آخر گاڑی کے دروازے کھلے اور مجھے مسلح اہلکاروں کی معیت میں ایک کشادہ کمرے کے اندر پہنچا دیا گیا۔

یہاں موٹی توندوں اور نیم گنجے سروں والے کئی پولیس افسر موجود تھے۔ کچھ باوردی اور کچھ سادہ لباس میں تھے۔ ان میں سے میری نگاہ سب سے پہلے قیصر چوہدری پر ہی پڑی۔ اس کی ناک ایک رخسار اور پیشانی پر پرانی چوٹوں کے گہرے نشان تھے۔ اس کا ایک کندھا بھی خاصا جھکا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اس کی یہ ساری ظاہر اور پوشیدہ چوٹیں میری ہی دی ہوئی تھیں۔ عرصہ پہلے جب میں نے درندہ صفت لالہ نظام کو ہیوی ''ڈمپر'' کے نیچے کچلا تھا تو اس وقت قیصر چوہدری بھی لالے کی کار میں ہی سوار تھا۔

''جی آیاں نوں...... ست بسم اللہ...... نیا جیون مبارک ہو شاہ زیب صاحب۔'' قیصر چوہدری نے زہر خند لہجے میں کہا اور مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

میں بیٹھ گیا اور سوالیہ نظروں سے ان لوگوں کے چہرے دیکھنے لگا۔ ایک سادہ لباس والا آفیسر بولا۔ ''لگتا ہے اس وقت تم یہی سوچ رہے ہو کہ تمہارا بھانڈا پھوٹا کس طرح ہے؟ اپنے بوتھے (چہرے) کی مرمت کرنے میں تو تم نے طوائفوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ ایسا سرخی پاؤڈر لگایا ہے کہ تمہارا اماں پیو بھی تمہیں نہ پہچان سکے۔''

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا، اس مکمل گنجے آفیسر کے موبائل فون پر کال آ گئی۔ وہ سننے لگا اور گاہے بگاہے اپنا مٹکے سا سر ہلانے لگا۔ ''آلے دوالے اچھی طرح دیکھ لیا ہے؟...... ٹھیک ہے...... اب وہ ادھر نہیں آئیں گے...... پر خفیہ نگرانی کرتے رہو...... اوکے۔''

میں سمجھ گیا کہ یہ گفتگو اسی بارے میں ہے جس بارے میں، میں بھی مسلسل پریشان ہوں۔ ہوٹل پر چھاپا پڑنے سے قریباً ایک گھنٹہ پہلے پہلوان حشمت اور فخر ہوٹل سے چلے گئے تھے۔ وہ گرفتاری سے بچ گئے تھے مگر اس کا قوی امکان موجود تھا کہ واپسی پر انہیں گرفتار کر لیا جاتا لیکن اب گنجے آفیسر کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس سلسلے میں فخر کی غیر معمولی ہوشیاری اور چوکسی کام آئی ہے اور وہ خطرہ بھانپ کر پہلوان سمیت کہیں اوجھل ہو گیا ہے۔

میرے پاس موجود دیگر اشیا کی طرح میرا موبائل فون بھی پولیس کے قبضے میں جا چکا تھا۔ قیصر چوہدری نے شعلہ بار نظروں سے مجھے گھورا اور پھر ایک اہلکار سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''شاہ زیب صاحب ہتھ چالاکی بہت زیادہ کرتے ہیں۔ بہتر ہے کہ ان کو ذرا کرسی کے ساتھ باندھ دو۔''

نائیلون کی سرخ رسی نے مجھے جکڑ لیا۔ قیصر چوہدری نے میرا موبائل نکالتے ہوئے کہا۔ ''اس پر بات کرو اپنے دونوں یاروں سے، ان کو بتاؤ کہ تم نکل بھاگے ہو، ان بیکار کے پھوسڑ پولیس والوں سے...... شاہدرہ میں بارہ دری کے پاس پہنچ گئے ہو، وہ دونوں وہاں آ جائیں......''

''اور میں یہ فون نہ کروں تو؟'' میں نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔

جواب میں قیصر چوہدری نے گھما کر میرے منہ پر ٹانگ رسید کی۔ میں کرسی سمیت الٹ کر دور جا گرا۔ میرا نچلا ہونٹ پھٹ گیا اور خون میری سفید قمیص کے گریبان کو رنگین کرنے لگا۔ اہلکاروں نے میری کرسی اٹھا کر سیدھی کی۔ قیصر چوہدری خونی لہجے میں بولا۔

''اگر بات نہیں مانو گے شاہ زیب صاحب، تو تمہارے جسم کے ایک ایک حصے کو علیحدہ علیحدہ مرنا پڑے گا۔ تمہاری ساری مارشل آرٹ اکٹھی ہو کر گھس جائے گی جہاں سے نکلی تھی......''

اس نے میرے بال مٹھی میں جکڑ لیے لیکن اس سے پہلے کہ وہ مزید اپنا غصہ اتارتا ایک موٹے تازے اہلکار نے آکر افسران کو سلیوٹ کیا اور بولا۔ ''بڑے صاحب اور ان کے ساتھی تشریف لے آئے ہیں۔''

قیصر چوہدری نے میرے سر کو زور سے آگے پیچھے ہلانے کے بعد میرے بال چھوڑ دیئے اور اہلکار سے بولا۔ ''اس کی قمیص اتار دو اور اس کا منہ بھی صاف کرو۔''

میری خون آلود قمیص کے بٹن کھول کر اسے جسم سے علیحدہ کر دیا گیا اور اسی قمیص سے میرے خون آلود ہونٹ اور ٹھوڑی کو اچھی طرح صاف کر دیا گیا۔ ایک اہلکار کہیں سے کسی ساتھی کی قمیص لے آیا لیکن اسے پہنایا جانا مشکل تھا کیونکہ خون آلود قمیص تو پھاڑ کر اتار لی گئی تھی مگر دوسری قمیص، رسی کی بندشیں کھولے بغیر پہنائی نہیں جا سکتی تھی۔

جلدی سے دو لکڑی کرسیاں لا کر کمرے میں رکھ دی گئیں۔ قیصر چوہدری اور دو دیگر افسران کے علاوہ باقی سب لوگ باہر چلے گئے۔ کچھ دیر بعد کوریڈور کی طرف ایڑیوں کی ٹھک ٹھک سنائی دی۔ جو دو افراد کمرے میں داخل ہوئے، انہیں دیکھ کر میں ایک بار پھر دنگ رہ گیا۔ وہ دونوں ہی کسی تعارف کے محتاج نہیں تھے اور ان میں سے ایک تو ملک کا جانا پہچانا ''سیاست زادہ'' تھا۔ یہ اس فیملی کا چشم و چراغ تھا، جو براہِ راست تو حکومت کم کم ہی کرتی تھی لیکن اصل میں حکومت انہی کی ہوتی تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جو حکومتیں بنانے اور توڑنے پر قادر تھے۔ یہ بادشاہ نہیں بادشاہ گر تھے۔ یہ خوب صورت بارعب شخصیت کا مالک شکیل داراب تھا۔ تاجور کا جنونی شوہر دارج اسی شکیل کا فرسٹ کزن تھا۔ شکیل کے ساتھ جو دوسرا شخص اندر داخل ہوا وہ کھڑ کھڑ کرتی سفید شلوار قمیص والا ایک دبنگ شخص تھا۔ مجھے اسے پہچاننے میں تھوڑی سی دشواری تو ہوئی لیکن ناکامی نہیں ہوئی۔ یہ لالہ نظام کا سگا بھائی لالہ وریام تھا۔ یہ لوگ بڑی تمکنت سے میرے سامنے براجمان ہو گئے۔

شکیل داراب کی خوب صورت آنکھوں میں میرے لیے نفرت اور زہریلے تمسخر کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ہاں یہی وہ شخص تھا جس کے اَن گنت جرائم کی فہرست میں ایک جرم یہ بھی شامل تھا کہ اس نے اپنی ہی ایک ٹیچر کو غلط نگاہ سے دیکھا...... اس سے محبت کا دعوے دار ہوا اور پھر نوعمری میں ہی اپنے اثر و رسوخ کے ذریعے اپنی اس ٹیچر کو طلاق دلوا کر اپنی دسترس میں کر لیا۔ اسی شکیل داراب نے تاجور کو اس نیت سے جاماجی پہنچایا تھا کہ وہ مجھ سے مل کر مجھے

زبان کھولنے پر مجبور کرے گی اور پھر وہیں پر رائے زل جیسے کسی ہوس کار کی داشتہ بن کر رہ جائے۔ ہاں اس شخص نے قدم قدم پر مجھے زخم دیئے تھے اور آج ایک بار پھر وہ خطرناک ارادوں کے ساتھ میرے رُوبرو بیٹھا تھا۔ اس کمرے میں سے اب قیصر چوہدری کے سوا باقی سب باہر جا چکے تھے۔

شکیل داراب نے کہا۔ ''لالہ وریام کو ہمیشہ یہ شک رہا ہے کہ ان کے بھائی صاحب کو جو حادثہ پیش آیا، اس کے پیچھے تم ہی تھے۔ کیا تم اپنے منہ سے اس کا اقرار کرنا پسند کرو گے؟''

''میرے اقرار کرنے یا نہ کرنے سے کیا ہوگا؟'' میں نے بھی اطمینان سے جواب دیا۔

''بات تو تمہاری ٹھیک ہی ہے۔ مرنا تو تم نے ہر صورت ہے اور دردناک موت ہی مرنا ہے لیکن چلو تم سے ایک سودا کر لیتے ہیں۔ اگر تم اقرار کر لو گے تو تمہاری سزا صرف تم تک ہی محدود رکھیں گے۔ تمہارا چچازاد ولید یہاں جیل میں ہے، ہم اس کی جان بخشی کر دیں گے...... اور تمہارے سنگی ساتھیوں پر بھی ہاتھ ہولا رکھیں گے۔''

''اس شاندار رحم دلی کے لیے بہت شکریہ۔ لیکن جو کام میں نے کیا ہی نہیں، اس کا اقرار کیسے کرلوں؟''

''بڑے خاص قسم کے چکنے گھڑے ہو تم۔ لیکن گھڑا کتنا بھی چکنا ہو، موٹا ریگ مال تو اسے کھدیڑ ہی دیتا ہے...... اور میرا خیال ہے کہ تم پر بڑا سخت قسم کا ریگ مال لگنے والا ہے......''

''مجھے تم سے یہی امید تھی۔'' میں نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔

شکیل اپنی لگژری نشست پر پہلو بدل کر بولا۔ ''ویسے تمہارے ذہن میں یہ سوال نہیں آیا کہ تمہاری اس کاسمیٹک سرجری کے باوجود ہم نے تمہیں پہچان کیسے لیا؟''

''مجھے لگتا ہے کہ میرے پہچانے جانے میں تمہاری عقل مندی سے زیادہ کسی کی مخبری کا عمل دخل ہے۔ ایک بلا تھی جو جاما جی سے میرے پیچھے لگی تھی، وہ یہاں بھی پہنچی ہوئی ہے۔''

''ٹھیک نشانہ لگایا ہے تم نے۔'' شکیل بولا۔ ''میں اس بلا کو اچھی طرح جانتا ہوں لیکن تم خود بھی تو ایک بڑی بلا ہو، پھر وہ بلا تم پر حاوی کیسے ہوگئی؟''

''ایک طرف تم کہہ رہے ہو کہ تم اسے اچھی طرح جانتے ہو، دوسری طرف سوال بھی پوچھ رہے ہو...... وہ عام عورت نہیں ہے اور نہ ہی وہ کسی کی دوست ہے۔ کیا پتا کل وہ کس کی دشمن ہو جائے، کیا پتا کل تم خود اپنے ہاتھوں سے اپنے اباجی کا ٹینٹوا دبا کر انہیں فوت کر ڈالو، یا پھر اپنی بیوی کو ننگا کر کے بازار میں نچوانا شروع کر دو۔''

''بکواس بند کرو۔'' شکیل دھاڑا اور اس کا گورا چہرہ سرخ انگارہ ہو گیا۔

قیصر چوہدری نے اٹھ کر مجھے پیٹنا شروع کر دیا۔ دس پندرہ سیکنڈ بعد شکیل داراب نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکا اور خود کو پُرسکون کرنے کے لیے قیمتی سگریٹ سلگایا میں اب بھی اطمینان سے بیٹھا تھا اور میرا یہی اطمینان ان لوگوں کو مزید مشتعل کر رہا تھا۔ میرے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ دیکھ کر ڈی ایس پی قیصر کا پارا ایک بار پھر چڑھ گیا۔ وہ کسی شیش ناگ کی طرح پھنکار کر اپنی کرسی سے اٹھا، لیکن شکیل نے اسے دوبارہ روک لیا۔

لالہ وریام نے اپنی مٹھی میں دبے ہوئے سگریٹ سے ایک طویل کش لیا اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''اچھا...... مجھے ایک بات بتاؤ لالے دی جان! جب وہ زنانی تمہاری اصلیت جان ہی چکی تھی تو پھر اس نے تمہاری مخبری کرنے کے بجائے خود ہی تمہارا قیمہ شیمہ کیوں نہ کر دیا؟''

شکیل نے کہا۔ ''اس کا جواب تمہیں میں دیتا ہوں لالہ! مخبری اس زنانی نے نہیں کی کسی اور نے کی ہے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا ناں کہ یہ بہت وکھری قسم کی زنانی ہے۔ میں جادو ٹونے پر یقین نہیں رکھتا لیکن وہ ایک خاص قسم کا جادو ٹونا ہے جس کو سائنس بھی مانتی ہے۔ اس عورت ہاناوانی کی آنکھوں میں جادو ہے لالہ وریام! یہ قیصر چوہدری جس بندے کو سو چھتر مار کر بھی بولنے پر مجبور نہیں کر سکتا، وہ اپنی آنکھوں کے ذریعے اسے چند منٹ میں اپنے ڈھب پر لا سکتی ہے۔ اسی طرح اس نے سجاول کی غیر ملکی بیوی کو بولنے پر مجبور کیا۔ اس نے نیم بے ہوشی کی حالت میں اپنے اندر کی ہر بات اگل دی۔ ان ہی باتوں میں یہ بات بھی شامل تھی کہ شاہ زیب ابھی مرا نہیں، بس اس نے اپنی شکل بدلی ہوئی ہے۔ اس نے یہ بھی بتا دیا کہ وہ وقاص کے نام سے ہمارے ارد گرد موجود ہے لیکن اس سے پہلے کہ ہاناوانی خود شاہ زیب تک پہنچتی، ہم شاہ زیب تک پہنچ گئے۔''

''پر وہ کس طرح شکیل صاحب؟'' لالہ وریام نے اپنی لمبی سیاہ مونچھوں کو بل دے کر پوچھا۔

''ہاناوانی کے بندوں میں زیادہ تر تو ملائیشین ہیں پر کچھ کرائے کے مقامی ٹٹو بھی ہیں۔ ان میں سے ایک مقامی ملازمہ اس وقت ہاناوانی کے آس پاس موجود تھی جب وہ سجاول کی بیوی سے اس کے اندر کی باتیں اگلوا رہی تھی۔ یہ شاہ زیب والی بات ملازمہ کے کانوں میں بھی پڑ گئی۔ اتفاقاً یہ ملازمہ کچھ عرصہ پہلے پولیس کی ٹاؤٹ بھی رہی ہے۔ اس نے یہ اہم خبر قیصر چوہدری تک پہنچا دی...... پچھلے چوبیس گھنٹوں سے اس خبر نے پورے پولیس ڈپارٹمنٹ

میں ترتھلی ڈالی ہوئی تھی۔''

لالہ وریام بولا۔ ''عورت کی شکل ہی نظر نہ آرہی ہو تو اس کے ساتھ کچھ بھی کرنے کا کیا سواد ہے۔''

''کیا مطلب؟'' شکیل نے پوچھا۔

''مطلب یہ کہ اس ''ہیرے موتی'' نے اپنی شکل ہی بدلی ہوئی ہے، اس کو مارنے کا مزہ تو تب ہے ناں جب یہ اپنی اصلی شکل میں ہو۔'' وریام کا اشارہ میری طرف تھا۔

''تو یہ کون سا مشکل کام ہے لالہ جی۔ کوئی بھی کاسمیٹک سرجن اسے دس بیس گھنٹوں میں اس کی اصل شکل میں واپس لاسکتا ہے۔''

''تو پھر ٹھیک ہے شکیل صاحب پہلے اس کی اصلی بوتھی کے درشن کراؤ، پھر باقی کا کام ہو گا۔''

باقی کا کام...... لالے وریام نے اس لہجے میں کہا تھا کہ میں بے ساختہ چونک گیا۔ شکیل کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ کھیل گئی، وہ بولا۔ ''معاف کرنا شاہ زیب! لیکن لالے وریام اور قیصر وغیرہ نے تمہارے بارے میں کچھ نیا سوچا ہے لیکن ابھی یہ پوری طرح فائنل نہیں ہوا۔ ایک دو دن میں بات صاف ہو جائے گی۔ تب تک تم چھری کے نیچے سانس لے سکتے ہو۔''

''میری سمجھ میں تمہاری بک بک بالکل نہیں آرہی ہے۔'' میں نے بیزاری سے کہا۔

قیصر چوہدری ایک بار پھر مشتعل ہوا اور مجھ پر گالیوں کی بوچھاڑ کی۔ وہ میری طرف آنا چاہتا تھا لیکن شکیل بولا۔ ''یار! اتنے بے صبرے کیوں ہو رہے ہو۔ میرے سامنے اس کی درگت بناؤ گے تو اسے شرم آئے نہ آئے مجھے ضرور آئے گی۔ کبھی ہم بھی یہ بھی تھے آشنا...... اسے یاد ہو کہ نہ یاد ہو......''

کچھ دیر تک مجھ سے سوال جواب کرنے کے بعد شکیل جانے کے لیے تیار نظر آیا، تاہم اٹھنے سے پہلے بولا۔ ''شاہ زیب خان بہادر صاحب! ہم سوچ رہے ہیں کہ جس طرح ہانا دانی نے قسم کھا رکھی تھی کہ تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو اپنے ہاتھوں سے نہیں مارے گی بلکہ تم لوگ خود ہی ایک دوسرے کو مارو گے...... ہمارا بھی دل یہی چاہتا ہے کہ تمہارے خون سے اپنے ہاتھ گندے نہ کریں۔ یہ کام کسی اور کے لیے چھوڑ دیں۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں مرتے ہوئے دیکھ کر بھی ہمیں وہی خوشی ہوگی جو خود مار کر ہوتی...... کیا خیال ہے لالہ جی؟'' شکیل داراب نے خوب صورت چمکیلی مسکراہٹ کے ساتھ لالہ وریام کی طرف دیکھا۔

لالہ وریام بولا۔ ”یہ سب کچھ میں نے آپ پر چھوڑ دیا ہوا ہے میرے سرکار! بس اب اس کو چھیتی سے مرنا چاہیے۔“

”چھیتی اور جلدی کا کام تو شیطان کا ہوتا ہے لالہ...... اور میں ہرگز نہیں چاہتا کہ اس کو مارنے میں شیطان اپنی ٹانگ اڑائے۔ ذرا آرام آرام سے چلتے ہیں۔ بس یہ گارنٹی تم لوگوں کو دیتا ہوں کہ یہ مرضرور جائے گا اور اس بار بالکل اصلی مرے گا۔“

وہ تینوں کھڑے ہو گئے۔ شکیل نے قیصر سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”اس کو کھلاؤ پلاؤ۔ تھوڑی سی صحت بنا دو اس کی لیکن اس کی طرف سے بہت ہوشیار بھی رہو۔ تمہیں پتا ہی ہے یہ شاہ زیب ہی نہیں ایسٹرن بھی ہے۔“

قیصر چوہدری نے شدومد سے اثبات میں سر ہلایا۔ شکیل داراب اور لالہ وریام جانے کے لیے مڑے لیکن قدم اٹھانے سے پہلے شکیل داراب میرے قریب آیا اور جھک کر میرے کان میں ہولے سے بولا۔ ”ویسے تم اب مر بھی جاؤ تو کیا فرق پڑتا ہے، تمہاری امنگ ترنگ تو ختم ہو ہی چکی ہے۔“

پھر میری آنکھوں میں دیکھتا ہوا وہ باہر چلا گیا۔ اس کی بات دل پر ایک شدید گھونسے کی طرح لگی تھی۔ میں جانتا تھا کہ اس کا اشارہ کس طرف ہے۔ وہ تاجور کی بات کر رہا تھا۔ تاجور جو اس کے کزن دارج کی منکوحہ بن چکی تھی۔

قیصر چوہدری ایک بار پھر مجھے مجبور کرنے لگا کہ میں اپنے موبائل فون سے فخر اور پہلوان حشمت کو فون کروں اور ان کو اپنے پاس بلاؤں، میں یہ بات کسی صورت نہیں مان سکتا تھا۔ وہ ایک بار پھر گالی گلوچ اور مار پیٹ پر اتر آیا...... تاہم اسی دوران میں اس کے موبائل فون پر اطلاع آئی کہ میرا ایک ساتھی پکڑا گیا ہے۔

میرے لیے یہ ایک مایوس کن خبر تھی۔ پتا نہیں کہ کون پکڑا گیا تھا، فخر یا پہلوان حشمت؟ بہر حال جب پکڑا جانے والا میرے سامنے لایا گیا تو میرے دونوں اندازے غلط ثابت ہوئے۔ یہ رضوان ٹی تھا۔ اس کے چہرے پر چوٹوں کے نشان اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ گرفت میں آنے سے پہلے اس نے اچھی خاصی مزاحمت کی ہے۔ اس کا ایک پہلو تو لوسی والے حملے میں پہلے ہی زخمی ہو چکا تھا۔ رضوان کے ہاتھ بھی الٹی ہتھکڑی میں جکڑے ہوئے تھے، تاہم اسے میری طرح کرسی سے باندھنے کی زحمت نہیں کی گئی۔

○......❖......○

جس عمارت میں مجھے اور رضوان کو رکھا گیا تھا، یہ پولیس کا کوئی خفیہ ٹارچر سیل لگتا تھا۔

تاہم یہ کافی کشادہ تھا۔ یہاں رکھوالی کے کتوں کی موجودگی بھی ظاہر ہوتی تھی۔ یہ خطرناک کتوں کی پوری ایک ٹولی تھی جو عمارت کے کسی حصے میں مسلسل شور مچاتی رہتی تھی۔ آج ہمیں یہاں دوسرا روز تھا۔ ہمارے کمرے میں فقط ایک دروازہ اور ایک کھڑکی تھی۔ دروازہ لوہے کا تھا، کھڑکی میں مضبوط آہنی گرل تھی، جسے ہماری مہمان نوازی کے لیے مزید مضبوط کر دیا گیا تھا اور کھانا اندر پہنچانے کے لیے ایک چھوٹا سا رخنہ بھی بنا دیا گیا تھا۔ یہ دونوں کام غالباً کل ہی کیے گئے تھے۔ کھڑکی کے سامنے پولیس کا ایک سادہ پوش آٹومیٹک رائفل تانے چوکس کھڑا رہتا تھا۔ ہم دونوں کی ہتھکڑیاں کھول دی گئی تھیں تاہم ان کا کھلنا یا نہ کھلنا ایک برابر ہی تھا کیونکہ یہ کمرا ہمارے لیے ایک مضبوط کال کوٹھڑی جیسا تھا۔

کمرے کی کھڑکی سے ایک لابی سی دکھائی دیتی تھی۔ اس لابی میں ایک ٹی وی موجود تھا لیکن ہمیں بس اس کی آواز ہی سنائی دیتی تھی۔ ٹی وی پر میرے بارے میں بھی تہلکہ خیز نیوز موجود تھی۔ اب بھی ایک نیوز کاسٹر اپنے فیلڈ رپورٹر سے سوال جواب کر رہا تھا۔

فیلڈ رپورٹر کی آواز ابھری۔ ''جی، میں اس وقت اسی ہوٹل کے سامنے کھڑا ہوں جہاں سے کل مشہور و معروف شاہ زیب عرف ایسٹرن کو گرفتار کیا گیا ہے۔ یہ بے حد ڈرامائی صورتِ حال ہے۔ کچھ لوگ ابھی تک اس پر یقین نہیں کر پا رہے۔ شاہ زیب چند ماہ پہلے گلبرگ میں ہونے والے دھماکے میں ''مر گیا'' تھا۔ ڈی این اے ٹیسٹ میں اس کی تصدیق بھی ظاہر کی گئی تھی۔ شاہ زیب کی ''تدفین'' مراد پور کے قبرستان میں بہت سے لوگوں کی موجودگی میں ہوئی تھی۔ اس کی ''موت'' کی خبر کو یورپ وغیرہ میں بھی بڑی تشہیر ملی تھی، لیکن اب وہی شاہ زیب اس مقامی ہوٹل سے گرفتار ہوا ہے۔''

نیوز کاسٹر نے پوچھا۔ ''شاہ زیب کی گرفتاری کا سہرا ڈی ایس پی قیصر چوہدری کے سر باندھا جا رہا ہے۔ کیا پولیس ذرائع نے کچھ بتایا ہے کہ یہ گرفتاری کس طرح عمل میں آئی؟''

''نہیں جی، ابھی تک پولیس ڈیپارٹمنٹ اور دیگر متعلقہ افراد نے اس حوالے سے مکمل خاموشی اختیار کر رکھی ہے لیکن کہا یہی جا رہا ہے کہ یہ گرفتاری کسی زبردست مخبری کے ذریعے عمل میں آسکی ہے۔''

نیوز کاسٹر بولا۔ ''کیا اس موقع پر ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ جو شخص پکڑا گیا ہے، وہ واقعی شاہ زیب عرف ایسٹرن ہے؟''

''جی ہاں، اس بارے میں تب تک شبہات موجود رہیں گے جب تک اسے میڈیا کے سامنے نہیں لایا جاتا۔ کچھ لوگوں کی طرف سے یہ بات بھی کہی جا رہی ہے کہ شاہ زیب نے

اپنے چہرے میں کچھ تبدیلیاں کروا رکھی ہیں جس کی وجہ سے اسے پہچانا جانا آسان نہیں ہے۔ بہرحال کل شام کے بعد سامنے والی مسجد سے جو ایک گرفتاری ہوئی ہے وہ بھی اس بات کو یقینی بناتی ہے کہ پکڑا جانے والا شاہ زیب عرف ایسٹرن ہی ہے۔ یہ گرفتاری رضوان ٹی نامی نوجوان کی ہے اور واقف حال لوگ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ رضوان ماضی میں شاہ زیب کے قریبی ساتھیوں میں سے رہا ہے۔''

نیوز کاسٹر نے سوال کیا۔ ''ہوٹل کی انتظامیہ اور دیگر لوگ کیا کہتے ہیں؟ شاہ زیب کی گرفتاری کس طرح عمل میں آئی۔ کیا اس نے مزاحمت کی...... یا آسانی سے خود کو حوالے کر دیا؟''

فیلڈ رپورٹر بولا۔ ''ہوٹل کا مالک اور ملازمین بہت ڈرے ہوئے ہیں۔ اس حوالے سے کوئی بھی بات کرنے سے گریز کر رہے ہیں۔ ایک ملازم کا یہ کہنا ہے کہ ہوٹل میں اور اس کے اردگرد پچھلے کچھ روز سے عجیب واقعات پیش آ رہے تھے۔ ہوٹل کے اندر مادہ بندر کے گھسنے اور حملہ کرنے کا واقعہ تو میڈیا پر بھی رپورٹ ہو چکا ہے۔ اس سے پہلے قریبی مسجد کے اندر بھی رہائشی پورشن میں کچھ گڑبڑ ہوئی اور شیشے وغیرہ ٹوٹے۔ پھر سامنے والے بازار میں اندھا دھند فائرنگ ہوئی اور ایک شخص جان سے چلا گیا۔ بہرحال اس ہوٹل میں کسی کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ شاہ زیب جیسا مشہور و معروف شخص جو کئی مقدمات میں مطلوب بھی ہے، یہاں اس جگہ زندہ سلامت پایا جا رہا ہے۔ جہاں تک آپ کا یہ سوال ہے کہ گرفتاری کے وقت پولیس اور ملزم میں کسی طرح کی کھینچا تانی یا ایگریشن نظر آئی تو اس کا جواب شاید نفی میں ہے۔ پولیس نے اپنے ڈی ایس پی کی قیادت میں بڑی رازداری اور ہوشیاری سے ملزم کے گرد گھیرا ڈالا اور اسے کسی طرح کی مزاحمت کا موقع نہیں دیا......''

فیلڈ رپورٹر شاید کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا لیکن اسٹوڈیو میں موجود نیوز کاسٹر نے ''شکریہ عرفان خان'' کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ پھر فوراً ہی اس کی آواز ابھری۔ ''ناظرین! ہمیں ابھی ابھی دارالاسلام، برونائی سے ہمارے خصوصی نمائندے باسط احمد نے جوائن کیا ہے...... جی باسط احمد! برونائی اور جاماجی وغیرہ سے مسٹر شاہ زیب کا گہرا تعلق رہا ہے۔ وہاں اس خبر کو کس طرح سنا گیا ہے؟''

نمائندے نے کہا۔ ''آپ بجا کہتے ہیں، قریبی جزیرے جاماجی کے لوگوں میں شاہ زیب المعروف ایسٹرن کے لیے ایک پُرجوش اپنائیت پائی جاتی ہے۔ وہاں کے لوگ مسٹر شاہ زیب کو ہیرو کا درجہ دیتے ہیں۔ جب چند ماہ پہلے مسٹر شاہ زیب کی ''موت'' کی خبر یہاں پہنچی

تھی تو سیکڑوں لوگ غم زدہ ہو کر جاماجی کی سڑکوں پر نکل آئے تھے۔ اس دکھ کو بڑی شدت سے محسوس کیا گیا تھا۔ اب اس تازہ خبر کو ایک نہایت حیرت آمیز مسرت کے ساتھ سنا گیا ہے اور اگر آپ سچ پوچھیں تو بات صرف جاماجی ہی کی نہیں مکس مارشل آرٹ کے چمپئن کی حیثیت سے لوگ یورپ میں بھی شاہ زیب کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ اس خبر سے ایم ایم اے کے حلقوں میں ایک سنسنی پھیل گئی ہے۔ بہت سے لوگ جلد از جلد اس خبر کی مکمل تصدیق چاہتے ہیں۔''

نیوز کاسٹر نے کہا۔'' کچھ اس طرح کی خبریں آئی ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ وہاں کے لوگوں میں کسی طرح کی تشویش بھی پائی جا رہی ہے......؟''

'' آپ نے درست کہا ہے۔ اس تشویش کی دو وجوہ ہیں۔ ایک تو یہ اطلاع کہ مسٹر شاہ زیب کو مقامی پولیس نے گرفتار کر لیا ہے۔ اس تشویش کی دوسری وجہ زیادہ سنگین ہے۔ یہ بات اب ثابت ہو چکی ہے کہ جاماجی کے اہم ترین سیاسی خانوادے کی سربراہ میڈم ہاناوانی اس وقت پاکستان میں ہے۔ وہ اپنے بیٹے کے قتل کا انتقام لینے کے لیے اندھی ہو رہی ہے۔ مسٹر شاہ زیب سے بڑھ کر اس کا دشمن کون ہو سکتا ہے۔ وہ کسی بھی وقت مسٹر شاہ زیب کو نقصان پہنچا سکتی ہے...... جاماجی میں لوگوں کا خیال ہے کہ مقامی حکومت کو مسٹر شاہ زیب اور ان کے قریبی ساتھیوں کی حفاظت کا پورا انتظام کرنا چاہیے۔ اس حوالے سے آج صبح جاماجی کے نوجوان فرمانروا محمد ابراہیم نے ایک بیان بھی دیا ہے۔''

یہ گفتگو ختم ہوتے ہی اشتہار چلنا شروع ہو گئے۔ پھر کسی پولیس اہلکار نے ٹی وی بند کر دیا۔ رضوان سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ یقیناً اس کے ذہن میں بھی بہت سے سوال اُدھم مچا رہے تھے۔

وہ اپنے زخمی رخسار کو سہلاتے ہوئے بولا۔'' یقیناً ہاناوانی بھی آپ کی تلاش میں ہو گی۔ کیا وہ یہاں تک پہنچ سکتی ہے؟''

'' وہ کہاں تک نہیں پہنچ سکتی؟ تم نے دیکھا ہی ہے کہ وہ اس اکیسویں صدی میں بھی کیسے کیسے طلسم دکھا رہی ہے۔ جانوروں تک کو استعمال میں لا رہی ہے۔''

'' وہ جو پرندوں والی بات آپ نے بتائی ہے وہ بھی کل شام کے ایک اخبار میں چھپی ہے اور کہا گیا ہے کہ لاہور میں ایک ایسے شخص کی تدفین ہوئی ہے جس پر چھوٹے طوطوں نے جھنڈ کی صورت میں حملہ کیا اور اسے مار ڈالا۔ بہرحال ابھی تک اس خبر کو اتنی پذیرائی نہیں ملی لیکن مسئلہ یہ ہے جناب! کہ اس طرح تو ہاناوانی کسی بھی جگہ کسی کو بھی نقصان پہنچا سکتی ہے۔''

''یہ تو ہے...... اور مجھے سب سے زیادہ اندیشہ تاجور کی طرف سے ہے۔ اسے اور اس کے گھر والوں کو ابھی تک صورتِ حال کی اصل سنگینی کا احساس نہیں۔''

''اب یہ لوگ کیا کرنا چاہتے ہیں ہمارے ساتھ؟'' رضوان نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔ اس کے تاثرات سے لگتا تھا کہ وہ ہر قسم کی صورتِ حال کے لیے تیار ہے۔

میں رضوان کو کیا جواب دیتا۔ ابھی میں خود بھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ میرے دیرینہ دشمن آناً فاناً میرے گرد اکٹھے ہو گئے تھے۔ ان میں قیصر چوہدری کے علاوہ لالہ وریام اور شکیل داراب بھی شامل تھا۔ میرے کانوں میں رہ رہ کر شکیل کے الفاظ گونج رہے تھے۔ اس نے کہا تھا ہاناوانی کی طرح ہمارا بھی دل چاہتا ہے کہ تمہارے خون سے اپنے ہاتھ گندے نہ کریں۔ یہ کام کسی اور پر چھوڑ دیں۔''

اس بات سے اس کا کیا مطلب تھا؟ اس کے ذہن میں کیا کوئی اور خوفناک خیال پل رہا تھا؟ یا پھر اس نے مجھے صرف الجھن میں ہی ڈالا تھا۔ میرے پردہ تصور پر اپنے جاما جی کے دوستوں کی تصویریں ابھریں۔ یقیناً وہ خوش بھی تھے اور پریشان بھی۔ ابراہیم، زینب، قسطینا، فارس جان، ڈاکٹر ماریہ اور بہت سے دیگر افراد۔ یقینی بات تھی کہ بہت سے وسوسوں کے باوجود، میرے حیات ہونے کی خبر نے ان کو شاد کیا تھا۔ میں تصور کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا کہ ان کی آنکھوں میں مسرت کے آنسو ہیں۔

رضوان کی آواز نے مجھے ایک بار پھر خیالوں سے چونکایا۔ وہ بولا۔ ''آپ کا کیا خیال ہے، ہاناوانی اب کیا کر سکتی ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں ہو گا کہ وہ پولیس کے کسی اعلیٰ افسر کو اپنے شکنجے میں جکڑ لے اور وہ افسر خود یہاں پہنچ کر ہمیں یہاں سے نکالے......''

''میں نے کہا ہے نا کہ وہ سب کچھ کر سکتی ہے۔ اس کے پاس بے شمار آپشنز ہیں۔ وہ ہم تک پہنچنے کے لیے پولیس ڈیپارٹمنٹ یا انتظامیہ کے کسی بھی بندے کو استعمال کر سکتی ہے، لیکن لگتا ایسے ہی ہے کہ ابھی وہ فوری طور پر حرکت میں نہیں آئے گی۔ وہ ہم سے بچ کر فیکٹری والی کوٹھی سے فرار ہوئی ہے۔ ویسے بھی پاکستان میں اس کے پاس وہ افرادی قوت تو نہیں ہے جو جاما جی میں تھی۔ زیادہ سے زیادہ دس پندرہ کارندے ہوں گے۔''

''فخر صاحب اور پہلوان حشمت کے بارے میں آپ کی سوچ کیا کہتی ہے؟''

''مجھے فخر کی طرف سے اندیشہ ہے کہ وہ ہمیں چھڑانے کی کوشش کرے گا...... یا کم از کم اس بارے میں سوچ بچار تو ضرور کر رہا ہو گا لیکن اسے یہ راستہ اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ اس وقت ہم پولیس کے زبردست سکیورٹی حصار میں ہیں۔''

''لیکن جناب! یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ اس سلسلے میں فخر صاحب کو داؤد بھاؤ کا تعاون بھی حاصل ہو جائے۔''

''داؤد بھاؤ اتنا معصوم نہیں ہے۔ اسے پتا ہے، فی الحال ہم لوہے کے جال میں پہنچ چکے ہیں۔''

رضوان کچھ دیر تک خاموش رہا۔ اس کے خوبرو چہرے پر تفکر کی پرچھائیاں تھیں مگر آنکھوں میں حوصلے کی چمک بھی لشکارا مارتی تھی۔ کہنے لگا۔ ''میں نے سن رکھا ہے کہ یہ ڈی ایس پی قیصر لوگوں کو ''پولیس مقابلے'' میں بھی مار دیتا ہے۔ کہیں ہمارے بارے میں بھی تو اس کے ایسے ہی ''نیک ارادے'' نہیں؟''

''شروع میں مجھے بھی یہی لگا تھا مگر ایک دو باتیں اس نے ایسی کہی ہیں جن سے اشارہ ملتا ہے کہ یہ لوگ کچھ اور سوچ رہے ہیں۔''

اسی دوران میں دروازے کے قریب قدموں کی چاپ سنائی دی پھر چند افراد ہمارے کمرے کی گرل دار کھڑکی کے سامنے نظر آئے۔ ان میں سانولے چہرے والا سخت گیر قیصر چوہدری بھی شامل تھا۔ وہ اس وقت سادہ شلوار قمیص میں تھا۔ اس کے ساتھ پینٹ شرٹ میں ملبوس نیم سفید بالوں والا ایک نفیس سا شخص بھی تھا جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ ایک معروف کاسمیٹک سرجن تھا۔ اس کا نام ظفر جمالی تھا۔ سرجن نے مجھے کھڑکی کے نزدیک آنے کے لیے کہا...... اور پھر دھیان سے میرے چہرے کا معائنہ کرنے لگا (تاہم اس معائنے کے دوران میں اس نے کھڑکی سے ایک محفوظ فاصلہ رکھا ہوا تھا اور یہی محفوظ فاصلہ دوسرے افراد نے بھی رکھا ہوا تھا۔ جیسے میں ایک خون آشام جانور ہوں اور پنجرے میں سے اپنا پنجہ باہر نکال کر حملہ آور ہوسکتا ہوں۔

سرجن جمالی نے پوچھا۔ ''یہ کاسمیٹک سرجری کب ہوئی اور کس نے کی ہے؟''

میں نے کہا۔ ''سات آٹھ مہینے پہلے ہوئی ہے اور تمہارے ایک باپ نے کی ہے۔''

سرجن کا چہرہ زرد اور قیصر چوہدری کا سرخ ہو گیا۔ قیصر چوہدری نے ایک بار پھر مغلظات بکیں اور مجھے دھمکایا کہ وہ میرا ایسا حشر کرے گا کہ میری لاش بھی شرماتی پھرے گی۔

میں نے بھی جواباً بڑے اطمینان سے قیصر چوہدری کی ماں بہن ایک کی۔ میں اس کو طیش دلا رہا تھا کہ شاید وہ جذبات میں آجائے اور ہمارے کمرے میں کودنے کی کوشش کرے۔ بہرحال وہ اتنا کچا نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد حالات ذرا پُرسکون ہوئے تو سرجن جمالی نے مجھ سے میری کاسمیٹک سرجری کے بارے میں کچھ مزید سوالات پوچھے پھر ٹھہرے ہوئے

لہجے میں مجھ سے کہا۔ ’’مسٹر شاہ زیب! کیا تم اس سرجری کو ریورس کرنا چاہتے ہو؟‘‘
میں نے کہا۔ ’’ڈاکٹر! تم نے سن ہی لیا ہے۔ یہ لوگ اب ہمیں مار کر ہی یہاں سے نکالیں گے تو پھر جب لاش ہی بننا ہے تو شکل اصلی ہو یا نقلی، کیا فرق پڑتا ہے؟ موت کے فرشتے کو تو کاسمیٹک سرجری دھوکا نہیں دے سکتی۔‘‘
’’پھر بھی اگر تم چاہو تو تمہارے چہرے کی یہ تبدیلیاں ختم کی جا سکتی ہیں۔‘‘ سرجن نے جواب طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔
ویسے میں اب خود بھی اس روپ کو برقرار رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کا کچھ فائدہ بھی نہیں تھا۔ چند منٹ کی گفتگو کے بعد میں نے رضامندی ظاہر کر دی۔ طے یہ ہوا کہ سرجن جمالی اور اس کا اسسٹنٹ وغیرہ تب اس کمرے میں داخل ہوں گے جب میں اور رضوان اپنے ہاتھ الٹی ہتھکڑیوں میں جکڑوا لیں گے۔
ظاہر ہے کہ اس کے سوا کوئی آپشن ہی نہیں تھا۔ ہتھکڑیاں ان لوگوں کے پاس موجود تھیں، پہلے میں کھڑکی کے پاس آیا اور رخ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے الٹی ہتھکڑی لگا دی گئی۔ اس کے بعد یہی عمل رضوان کے ساتھ کیا گیا۔ چوکس رائفل بردار اب بھی ہمارے سامنے موجود تھے۔
— ہتھکڑیاں لگنے کے باوجود جب دیر تک سرجن صاحب اندر نہیں آئے تو الجھن ہونے لگی۔ میں نے ایک موٹے تازے باوردی اے ایس آئی سے پوچھا۔ ’’اب کیا مسئلہ ہے؟‘‘
وہ چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد بولا۔ ’’ڈاکٹر صاحب اب بھی اندر آنے سے ڈر رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ بندے بہت خطرناک ہیں۔ انہیں بیڑی بھی پہنائی جائے۔‘‘
’’تو سوچ کیا رہے ہو، پہنا دو وہ بھی بلکہ تین چار بڑی رائفلیں، راکٹ لانچر اور توپیں بھی منگوا لو۔ جب ہم بھاگنے لگیں تو چلا دینا۔‘‘
اے ایس آئی نے میرا پیغام ڈی ایس پی قیصر تک پہنچایا۔ کچھ دیر بعد میرے اور رضوان کے پاؤں دو بیڑیوں میں جکڑ دیئے گئے۔
تب سرجن صاحب اندر آئے۔ دو میڈیکل باکس ان کے پاس تھے۔ الیکٹرک لیمپ کی تیز روشنی میں انہوں نے میرے چہرے کا تفصیلی معائنہ کیا۔ آخر میں فرمایا۔ ’’REVERSION کا طریقہ کار تھوڑا سا لمبا ہوتا ہے اور اس کے لیے اضافی مہارت بھی چاہیے ہوتی ہے۔ بہرطور میں کوشش کرتا ہوں، تمہارے چہرے کی تین چوتھائی تبدیلیاں تو شاید اگلے 48 گھنٹے میں ختم ہو جائیں، جو تھوڑی بہت رہ جائیں گی، انہیں پھر دیکھ لیا جائے

گا۔"

"اگر میں زندہ رہا تو۔" میں نے سرجن کا فقرہ مکمل کیا۔
قیصر چوہدری نے آتشیں نظروں سے مجھے گھورا کہ میں فی الحال اپنی زبان بند رکھوں۔
تھوڑی سی ٹریٹمنٹ کے بعد سرجن نے میرے چہرے کے مختلف حصوں پر ENZYME کے انجکشن لگائے اور بتایا کہ ان جگہوں سے وہ چربی تحلیل ہو جائے گی جو میری اسکن کے نیچے داخل کی گئی تھی......اس نے کچھ مزید باتیں بھی بتائیں۔
سرجن کے جانے کے بعد مجھے اور رضوان کو ایک بار پھر مقفل کر دیا گیا اور مقفل کرنے کے بعد ہمارے ہاتھوں اور پاؤں کی بندشیں کھول دی گئیں۔ یہ کام کھڑکی کی گرل کے راستے کیا گیا۔

○......❖......○

اس نہایت محفوظ لاک اَپ میں یہ ہمارا چوتھا روز تھا۔ باہر لابی نما جگہ پر سے ٹی وی ہٹا لیا گیا تھا لہٰذا اب ہمیں باہر کی صورتِ حال کا کچھ علم نہیں تھا لیکن اس بات کا قوی امکان تھا کہ میرے زندہ ہونے کی خبر کو کافی تشہیر ملی ہوگی۔ سرجن جمالی نے اس لاک اَپ میں ایک وزٹ مزید کیا تھا۔ وہ پولیس کا خاص الخاص بندہ تھا اسی لیے یہاں لایا گیا تھا۔ اس نے میرے چہرے کو کچھ اور ٹریٹ کیا تھا...... بہرحال چہرے کی مکمل بحالی ابھی نہیں ہوئی تھی۔ ایک رات مجھے اور رضوان کو کچھ نامانوس آوازیں آئی تھیں۔ مجھے اور رضوان کو یہ آوازیں کسی جانور کی ہی لگی تھیں، اور یہ سنسنی خیز شک بھی ہوا تھا کہ شاید یہ لوسی کی آوازیں ہیں۔ تاہم اس کی تصدیق نہیں ہو پائی تھی کیونکہ پھر یہ آوازیں رکھوالی کے کتوں کے بے پناہ شور میں دب گئی تھیں۔
پہلے روز کے بعد شکیل داراب اور لالہ وریام کی شکل دوبارہ نظر نہیں آئی تھی، تاہم ڈی ایس پی قیصر چوہدری وقتاً فوقتاً اپنا منحوس تھوبڑا دکھا رہا تھا۔
پھر ایک روز وہ ہوا جس کی ہمیں ہرگز ہرگز توقع نہیں تھی۔ کہتے ہیں کہ دشمن کا دشمن بھی دوست ہوتا ہے۔ ہمارے دشمنوں شکیل داراب وغیرہ نے بھی ہمارے ایک اور بڑے دشمن کو ہمارے سامنے لا کھڑا کیا۔
یہ شام کا وقت تھا۔ میں رضوان کے پہلو کے زخم کی ڈریسنگ بدل رہا تھا۔ درست علاج نہ ہونے سے پسلیوں کے اس زخم میں انفیکشن ہو گیا تھا اور رضوان بخار بھی محسوس کر رہا تھا۔ یہ وہی زخم تھا جو لوسی نے جنون کی حالت میں اپنے تیز پنجوں سے بنایا تھا۔ اچانک کمرے کے آہنی دروازے کے قریب آہٹیں سنائی دیں۔ پھر قیصر چوہدری کھڑکی میں نمودار ہوا۔

''تمہارے کچھ دوست تم سے ملنے آئے ہیں لیکن پہلے تمہیں ہتھکڑی لگوانا پڑے گی۔'' اس نے کہا۔

''کون ہیں؟'' میں نے دریافت کیا۔

''یہ تو سرپرائز ہے تمہارے لیے۔ بولو، ملنا چاہتے ہو یا واپس بھیج دوں؟''

میں نے کہا۔ ''معاملہ صرف ملاقات کا ہی نہیں لگتا ہے۔ ملاقات تو اس کھڑکی کے راستے بھی ہو سکتی تھی۔ بہر حال، تم ہتھکڑی لگانا چاہتے ہو تو لگا لو۔''

دو منٹ بعد میرے اور رضوان کے ہاتھ الٹی ہتھکڑی میں جکڑے جا چکے تھے۔ مسلح پولیس اہلکار اندر آ گئے۔ رائفلوں کے نرغے میں ہمیں ایک بڑے ہال نما کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ یہاں چاروں طرف ایک گیلری تھی جس میں چند صوفے بھی رکھے گئے تھے۔ یہاں دو طویل میزیں بھی دکھائی دے رہی تھیں، بظاہر یہ کھانے کی میزیں ہی لگتی تھیں۔ مجھے اور رضوان کو اسٹیل کی دو کرسیوں کے ساتھ باندھ دیا گیا۔ اس موقع پر رضوان نے کچھ مزاحمت کرنا چاہی لیکن میں نے منع کیا۔ حقیقت یہی تھی کہ فی الحال تو ہم مکمل طور پر ان لوگوں کے رحم و کرم پر تھے۔ ایسے میں اپنی توانائیاں ضائع کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

تب ہال نما کمرے کا دروازہ کھلا اور چند افراد اندر داخل ہوئے۔ انہیں دیکھ کر ہم دنگ رہ گئے۔ یہ چست لباس اور گنجے سروں والے ٹیکساری گینگ کے وہی شیطان تھے جن سے ایک دنیا پناہ مانگتی تھی۔ یہ بدنام زمانہ مجرم ایول کے جرثومے سے پیدا ہونے والے وہی ہم شکل جانور تھے۔ شراب نوشی، آبروریزی اور خون آشامی جن کی گھٹی میں بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ خون پیتے تھے، کچا گوشت کھاتے تھے اور جب مستی میں آتے تھے تو جانوروں کو ذبح کرنے کے بجائے انہیں وحشت میں زندہ ہی بھنبھوڑ ڈالتے تھے، ان کی یہ خصلت بھیڑیوں سے ملتی تھی۔

میں نے دیکھا رضوان کا چہرہ زرد ہو گیا ہے۔ وہ گنجے شیطان تعداد میں دس کے قریب تھے۔ ان کی آنکھوں میں میرے لیے غیظ و غضب اور نفرت کی بجلی لشکارے مار رہی تھی۔ ہاں میں نے انہیں تباہ کر کے رکھ دیا تھا۔ فخر کے ساتھ مل کر میں نے ان کی کمر توڑ ڈالی تھی لیکن وہ جاں بلب ضرور تھے، مکمل طور پر ختم نہیں ہوئے تھے...... اور آج رات میں بے دست و پا ان کے سامنے موجود تھا...... بلکہ ان کے سامنے پھینک دیا گیا تھا۔

میں نے اوپر گیلری کی طرف دیکھا، وہاں قیصر چوہدری کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ تھی۔

میرے کانوں میں شکیل داراب کے الفاظ گونجنے لگے۔ اس نے کہا تھا کہ وہ خود سے میرے گندے خون میں ہاتھ رنگنا نہیں چاہتا...... اب اس کی بات اور بات کی سنگینی پوری طرح میری سمجھ میں آ رہی تھی۔

تب گیلری میں ایک اور جانی پہچانی شکل نظر آئی اور میری رگوں میں خون کھول کر رہ گیا۔ یہ بچے کھچے ٹیکساری گینگ کا سربراہ جان ڈیرک تھا۔ وہ وہیل چیئر پر تھا، اس کا ایک کارندہ چیئر دھکیلتا ہوا گیلری میں داخل ہوا تھا۔ گیلری میں سے ہی جان ڈیرک مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''نئی زندگی مبارک ہو شاہ زیب...... بہت خوشی ہوئی ہے تم سے مل کر۔'' جان ڈیرک کی آواز میں نقاہت تھی، اس کے باوجود لہجے میں شدید قسم کی زہرناکی بھی جھلک رہی تھی۔ وہ کافی کمزور نظر آتا تھا۔

میں نے کہا۔ ''جان! خوشی تو مجھے بھی بہت ہوتی اگر تم ایک بہادر دشمن کی طرح کھلے میدان میں میرے سامنے آتے۔''

وہ بولا۔ ''اب تم کس منہ سے یہ بات کہہ رہے ہو، تم نے ہم پر چھپ کر وار کیا ہے۔ ایک گندی سازش کی ہے۔ اس خارش زدہ سؤر والٹس وائے کو آزاد کرا کے گینگ میں گروپنگ کرائی ہے۔ اب تو جو کیا ہے، وہ بھگتنا پڑے گا۔''

''تم بکواس کر رہے ہو جان ڈیرک، اس کو سازش نہیں پلاننگ کہتے ہیں۔ تم نے بھی ایسی سیکڑوں منصوبہ بندیاں کی ہیں۔ یہ سب کچھ تو گینگ وار میں چلتا ہی ہے۔''

''تو پھر یہ بھی چلتا ہے جو تمہارے ساتھ ہونے جا رہا ہے۔'' وہ اپنی ٹوٹی ہوئی ٹانگ کو سہلا کر بولا۔ ''تم نے ٹیکساری کمپنی کے حصے بخرے کیے ہیں، اب تمہارے بھی حصے بخرے ہوں گے۔ مجھے امید ہے کہ تمہارے جسم کے ہر ہر حصے کو علیحدہ علیحدہ موت ملے گی۔'' ساتھ ہی اس نے انگلش کی غلیظ گالی بکی۔

رضوان دہاڑا۔ ''حرام زادے! دھمکیاں مت دے، تُو نے جو کرنا ہے کر گزر۔ ہم تجھ سے رحم کی بھیک نہیں مانگیں گے۔ ہاں اگر تُو قریب آیا تو تیرے اس منحوس منہ پر تھوکیں گے ضرور۔''

جان ڈیرک نے گیلری میں بیٹھے بیٹھے، ایک شیطان زادے کو اشارہ کیا۔ وہ عقب سے آیا اور اس نے اپنا ایک فٹ لمبا تیز دھار چھرا رضوان کے جسم میں گھونپ دیا۔ یہ چھرا رضوان کی کہنی سے اوپر دائیں بازو میں لگا اور آر پار ہو گیا۔ خون کا فوارہ ابل پڑا۔ ایک شیطان زادے نے فوراً شراب کا ایک خالی جام آگے کیا۔ ابلتا ہوا خون اس میں گرنے لگا۔ جام ایک

تنہائی بھر گیا تو خون کا رساؤ کم ہو گیا۔ رضوان کراہ رہا تھا لیکن اس نے اپنی آواز بلند نہیں ہونے دی تھی۔

جان ڈیرک کے اشارے پر شیطان زادہ مسکرایا اور دو گھونٹ میں یہ خون اندر انڈیل لیا۔ گیلری میں سے ڈیرک نے پوچھا۔ ''لڑکا تو ہینڈسم ہے۔ کیسا ذائقہ ہے اس کا؟''

گنجے نے بلند آواز میں ہنس کر کہا۔ ''مزیدار......اور گرم بھی۔''

''ہاں گرم تو ہونا ہی تھا لیکن کوئی بات نہیں، ساری گرمی نکل جائے گی۔'' ڈیرک نے جواب دیا۔

''ایک جام اور؟'' گنجے نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔ خون آلود چھرا ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔

''نہیں ابھی کچھ صبر کرو۔'' ڈیرک نے اسے منع کیا پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''ہو سکتا ہے اس کے کچھ اور دوست بھی ہمیں میزبانی کا شرف بخش دیں۔ ذرا بہتر ماحول بن جائے گا۔''

میرے جسم میں چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ جان ڈیرک کی بات کا مطلب یہی تھا کہ یہ لوگ ابھی فخر اور پہلوان کی تلاش سے مایوس نہیں ہوئے تھے۔

ہمیں جن کرسیوں پر باندھا گیا تھا، وہ آرام دہ کاؤچ کی کرسیوں کی طرح کافی لگژری ٹائپ تھیں۔ انہیں اسٹریچ کر کے نیم دراز بھی ہوا جا سکتا تھا۔ ان کرسیوں کے ساتھ ہمیں باندھنے کے لیے رسی وغیرہ استعمال نہیں کی گئی تھی بلکہ چمڑے کی بیلٹس تھیں جن پر موٹے بکل لگے ہوئے تھے۔

کچھ دیر گیلری میں بیٹھنے کے بعد اور ہم پر طنز کے تیر چلانے کے بعد جان ڈیرک واپس چلا گیا۔ قیصر چوہدری بھی ساتھ ہی گیا۔ رضوان کے زخمی بازو سے ابھی تک خون رِس رہا تھا۔ ڈیتھ اسکواڈ کے صفا چٹ چہروں والے ہم شکل شیطان اب باہر جا چکے تھے۔ صرف ایک وہاں موجود تھا۔ اس نے سرخ رنگ کا چست لباس اپنے جسم پر یوں منڈھا ہوا تھا کہ وہ جسم کو چھپانے کے بجائے بے حجابی سے نمایاں کر رہا تھا۔ اس کی نگاہوں میں جیسے شعلے سے لپکتے محسوس ہوتے تھے۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ''تمہارا انچارج ٹام کہاں ہے؟''

وہ مشینی انداز میں بولا۔ ''وہ مارا گیا۔ اس کے بعد جو انچارج بنا، وہ بھی، آپسی لڑائی کی بھینٹ چڑھ گیا۔ ہمارا بہت کچھ ختم ہو گیا۔ اب تم کو بھی ختم ہونا ہے۔ کیونکہ تمہاری بدبختی نے تمہیں یہاں گھیر لیا ہے۔''

وہ گفتگو کے دوران میں بھی شراب پی رہا تھا۔ یہ لوگ شراب، پانی کی طرح چڑھاتے تھے۔ وہ عجیب نظروں سے رضوان کو گھورنے لگا۔ پھر اس کے قریب چلا آیا۔ اس کے سلکی بالوں میں انگلی چلا کر بولا۔ ''خوب صورت ہو، تمہارے گھر کی عورتیں بھی خوب صورت ہوں گی۔''
رضوان نے اس کے منہ پر تھوک دیا۔ وہ بالکل بدمزہ نہیں ہوا بلکہ اس نے تھوک کو صاف کرنے کی کوشش بھی نہیں کی پھر وہ مجھ پر جھک کر بولا۔ ''کوئی ہے تو بتاؤ۔ تیرہ چودہ سال سے لے کر چالیس پینتالیس تک بھی چلے گی۔'' رضوان نے پھر اس پر تھوک دیا۔
اس مرتبہ تھوک اس کے منہ کے بجائے اس کی پشت پر گرا۔ اس نے بڑی نرمی کے ساتھ اسے رضوان کے زخمی بازو کی آستین کے ساتھ پونچھ دیا۔ پھر اچانک رضوان کے زخمی بازو کو اتنی بے دردی سے دبایا کہ وہ چلا اٹھا۔ شیطان زادے نے بازو کے زخم کے اندر انگلی گھسائی اور اسے مچھلی کی طرح تڑپنے پر مجبور کر دیا۔
''کیا کرتے ہو رِیگی؟'' ایک آواز نے اسے مزید بے رحمی سے روک دیا۔
یہ آواز ایک لڑکی کی تھی۔ اس نے بھی سرخ رنگ کا نہایت چست لباس پہن رکھا تھا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ گینگ کے اس ڈیتھ اسکواڈ میں فی میلز بھی موجود ہیں۔ یہ درحقیقت ان شیطان زادوں کی بہنیں ہی تھیں جو ''ٹیسٹ ٹیوب'' طریقہ کار کے ذریعے تولد ہوئی تھیں، اپنی خوفناک خصلتوں میں یہ شیطان زادوں سے کم نہیں تھیں۔ انہی کی طرح سخت جان، بے رحم اور عیار...... یہ بھی ہر وقت نشے میں مدہوش رہتی تھیں۔ مارنے اور مرنے کے لیے ہر وقت تیار۔ ایک موقع پر ہم نے ان کو شتونگڑیوں کا نام دیا تھا لیکن ان کی بے پناہ کارکردگی کے سامنے یہ نام شاید چھوٹا تھا۔ یہ تو بلائیں تھیں اور ان کے اندر عفریتوں کی روح تھی۔
اندر آنے والی کو میں نے پہچان لیا۔ اس کو ریڈکیٹ کہا جاتا تھا۔ یہ فی میل ونگ کی انچارج تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ اب ان فی میلز میں سے بھی بس دو چار ہی زندہ بچی ہوں گی۔ کیونکہ اب تک ہمیں بس یہی ایک نظر آئی تھی اور اس کے چہرے پر بھی چند ماہ پرانے زخم کا گہرا نشان دکھائی دے رہا تھا۔ وہ میرے اردگرد گھومی اور مجھ پر طنز و تشنیع کے چند تیر چلائے۔ اس کے لب و لہجے میں میرے لیے نفرت اور زہر کے سوا اور کچھ نہیں تھا پھر وہ رضوان کے زخم کی طرف متوجہ ہوئی۔ ریگی نام کے اس شیطان زادے کو ڈانٹ کر بولی۔ ''اس کا زیادہ خون بہہ گیا تو یہ بے ہوش ہو جائے گا۔ چلو ڈریسنگ کرواؤ اس کی۔''
ریگی اپنی ٹانگوں کو کھجاتا اور ڈولتا ہوا باہر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد ایک کمپاؤنڈر نما شخص اندر داخل ہوا اور رضوان کے خونچکاں زخم کی ڈریسنگ کرنے میں مصروف ہو گیا۔ یہ پولیس کا کوئی

اپنا آدمی تھا۔ میں اس بات پر تھوڑا سا حیران تھا کہ یہ نہایت خطرناک شیطان زادی جو صرف زخم ادھیڑنا اور خون بہانا جانتی ہے، زخم کی ڈریسنگ کرنے کا کہہ رہی ہے، بہرطور چند گھنٹے بعد میری اس ''حیرانی'' کا جواب مل گیا۔

ریڈکیٹ نامی یہ شیطان زادی ہمارے اردگرد چکرا رہی تھی۔ کسی وقت وہ جدید قسم کے سیل فون پر مدھم آواز میں کسی سے باتیں بھی کرنے لگتی تھی۔ شاید جان ڈیرک سے ہدایات لے رہی ہو۔ میں اس ''آفت'' کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ ماردھاڑ اور گن شوٹنگ میں یہ اپنی مثال آپ تھی۔ ایک موقع پر اس اکیلی نے کوپن ہیگن کی ساری پولیس کو تگنی کا ناچ نچا دیا تھا۔ دو اہلکاروں کو ہلاک اور پانچ کو شدید زخمی کر کے ایک مغوی ''سائنٹسٹ'' سمیت بھاگ نکلی تھی۔ ایسے ہی کئی کارنامے اس کے کھاتے میں موجود تھے۔ اسے یونہی ڈیتھ اسکواڈ کے فی میل ونگ کا انچارج نہیں بنایا گیا تھا لیکن اب وہ فی میل ونگ رہا تھا اور نہ وہ چارج...... مجھے اچھی طرح پتا چل رہا تھا کہ ڈیتھ اسکواڈ کے یہ جو آٹھ دس شیطان زندہ بچے ہیں، یہ ان کی کمان کر رہی ہے۔

میرے ساتھ جب بھی اس کی نگاہ ٹکرائی، مجھے اس میں بجلیاں کوندتی ہی نظر آئیں۔ یہ نگاہ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہی تھی ......ایسٹرن کنگ تم نے اپنی چال بازی سے ہمیں برباد کیا...... ہمارے ٹھکانے اجاڑ دیئے، ہمارے جانبازوں کو ایک دوسرے سے لڑا کر زمین کے اندر اتار دیا۔ ہماری ساکھ مٹی میں ملا ڈالی۔ اب جو کچھ ہو گیا، اس کو بدلا تو نہیں جا سکتا لیکن تم سے ایک یادگار انتقام تو لیا جا سکتا ہے اور یہ ہم لیں گے۔ تم دیکھنا ہم تمہیں کیسی اذیت والی موت دیتے ہیں۔

رات کے کھانے کے لیے صرف ہمارے ''ہاتھ'' کھول دیئے گئے تاکہ ہم وہیں بیٹھے بیٹھے کھانا کھا سکیں۔ بعدازاں ان جدید کرسیوں کو اس طرح اسٹریچ کر دیا گیا کہ انہوں نے تقریباً بیڈ کی شکل اختیار کر لی۔ اب ہم ان کرسیوں پر بندھے ہوئے آرام کر سکتے تھے۔ ذہن میں خیالات کا ہجوم تھا۔ کیا ہونے والا ہے؟ شکیل داراب نے بڑی عیاری سے ہمیں زخم خوردہ ٹیکساری گینگ کے حوالے کر دیا تھا۔ اب ڈیتھ اسکواڈ کے یہ شیطان صفت ہرکارے ہمیں اسی جگہ مار کر ناپید کر سکتے تھے۔ کوئی قیامت تک ہماری لاشوں کا سراغ نہ پا سکتا۔ پولیس کے لیے یہ نہایت آسان تھا کہ میں اور میرا ساتھی حراست سے فرار ہو گئے ہیں۔ ایسے ڈرامے کے لیے ایک آدھ پولیس اہلکار کو زخمی کرنا یا مار دینا بھی شکیل اور ڈی ایس پی قیصر چوہدری کے لیے چنداں مشکل نہیں تھا۔

رات کسی وقت مجھے اونگھ آ گئی۔ کسی آواز کے سبب میں ہڑ بڑا کر اٹھا تھا۔ اس ہال کمرے میں اندھیرا تھا۔ بس آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے سے ہی اشیا کے ہیولے نظر آتے تھے۔نسوانی آواز پھر ابھری۔ ''اوسویٹ بوائے۔کم آن......کم آن۔''

یہ فی میل وِنگ کی خونخوار انچارج ریڈ کیٹ کی آواز تھی۔ وہ کرسی سے بندھے ہوئے نیم دراز رضوان پر سوار تھی۔ وحشت کے عالم میں اس نے رضوان کی قمیص پھاڑ ڈالی تھی اور اس کے سر کے بال اپنی مٹھی میں جکڑے ہوئے تھے۔ الکحل کے نشے میں دھت، وہ اپنے سرکش جسم کے ساتھ رضوان کو انگیخت کرنے کی کوششوں میں مصروف تھی۔ اس کی دست درازی حد سے بڑھی تو رضوان نے اس کے منہ پر بھی تھوک دیا۔ جواب میں اسے وحشی لڑکی کے کئی طمانچے کھانے پڑے۔ وہ رضوان کو پیٹنے لگی۔ مجھے معلوم تھا، وہ کتنی سخت جان فائٹر ہے۔ اس کی ضرب میں بجلی کوندتی تھی۔ رضوان پہلے ہی زخمی تھا۔ اس تشدد نے اسے کراہنے اور پھر چلانے پر مجبور کر دیا۔

اس کا باپ بدنام زمانہ ''ایول'' تھا۔ یہ اس کی ٹیسٹ ٹیوب اولاد تھی۔ میں نے اس کو اس کے باپ کے نام کی گالی دی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ برہم ہو کر میری طرف متوجہ ہو جائے......مگر وہ تو کسی خون آشام جونک کی طرح رضوان سے چمٹی ہوئی تھی۔ وہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔ ان لمحوں میں مجھے رضوان کی جان خطرے میں نظر آئی لیکن پھر ایک بلند آواز نے ریڈ کیٹ نام کی اس بلا کو ٹھٹکا دیا۔

یہ کسی اور کی نہیں جان ڈیرک کی آواز تھی۔ یہ آواز گیلری کی طرف سے آئی تھی۔ گیلری میں اب روشنی نظر آ رہی تھی۔ اس روشنی میں جان ڈیرک کی وہیل چیئر کا اسٹیل چمکتا دکھائی دیا۔ پھر جان ڈیرک کا کمزور چہرہ بھی نظر آیا۔ اس نے کرخت آواز میں ریڈ کیٹ کو ڈانٹا۔ ''یہ کیا کر رہی ہو......سنبھالو خود کو...... پیچھے ہٹو...... پیچھے ہٹو۔''

ہانپی ہوئی لال پیلی ریڈ کیٹ نے مڑ کر گیلری کی جانب دیکھا۔ چند لمحوں کے لیے تو یوں محسوس ہوا کہ وہ ڈیرک کی بات ماننے سے بھی انکار کر دے گی لیکن پھر اس نے عجیب سی آواز میں ہنکارا بھرا اور رضوان کے سینے پر سے اتر آئی۔ اترتے ہوئے اس نے اپنے ناخنوں سے رضون کے سینے پر ایسا کھرونچا ڈالا تھا کہ وہ درد سے چلا اٹھا۔

جان ڈیرک نے اس شیطان زادی کو کچھ مزید ڈانٹ ڈپٹ کی اور ہال کمرے سے واپس بھیج دیا۔ وہ فی میل وِنگ کی نامی گرامی کمانڈر تھی۔ اگر کسی اور نے اس کو یوں ڈانٹا ہوتا تو شاید وہ اس کو دن میں تارے دکھا دیتی......لیکن جان ڈیرک جو کچھ بھی تھا بچے کھچے گینگ کا

سربراہ تھا۔

○......❖......○

اگلے روز صبح کے وقت ہمیں تھوڑی دیر کے لیے ان جدید طرز کی کرسیوں سے کھولا گیا۔ ہمارے ہاتھ بدستور الٹی ہتھکڑیوں میں جکڑے رہے۔ ناشتا وغیرہ کرانے کے بعد ہمیں دوبارہ انہی کرسیوں سے باندھ دیا گیا۔ دوپہر سے تھوڑی دیر قبل شیطان زادے ریگی نے مکروہ انداز میں ہنستے ہوئے ہمیں یہ خبر سنائی کہ ہمارا ایک اور ساتھی یہاں مہمان بننے والا ہے۔ میرا دل بے طرح دھڑک اٹھا۔ عین ممکن تھا کہ یہ فخر یا پہلوان میں سے کوئی ایک ہو لیکن یہ اس کے سوا بھی کوئی ہوسکتا تھا اور پھر قریباً آدھے گھنٹے بعد جس بندے کو لاکر تیسری کرسی پر باندھا گیا، اسے دیکھ کر میں ششدر ہوا۔ یہ میرا چچا زاد ولید تھا۔ وہی ولید جو قیصر چوہدری پر جھوٹے قاتلانہ حملے کی پاداش میں جیل لایا گیا تھا اور پچھلے کئی سال سے جیل میں ہی سڑ رہا تھا۔ اس سے میری آخری ملاقات کوئی ایک سال پہلے ہوئی تھی۔ وہ تب بھی کمزور تھا لیکن اب اور بھی کمزور نظر آرہا تھا۔ اس نے چھوٹی چھوٹی داڑھی رکھ لی تھی۔

مجھے دیکھ کر اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ مجھے پہچاننے میں اسے دشواری نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ میری اصلی شکل ENZYMES کے استعمال کے بعد ستر اسّی فیصد بحال ہو چکی تھی۔ صرف چہرے کے مختلف حصوں پر سرخی موجود تھی۔ ”السلام علیکم شاہ زیب بھائی۔“

”وعلیکم السلام۔ تمہیں جیل سے لائے ہیں؟“

”ہاں بھائی...... اور مجھے لگ رہا ہے کہ یہاں حالات جیل سے کہیں زیادہ سنگین اور خطرناک ہیں۔“

”یہ دنیا تو جگہ ہی خطروں کی ہے ولید۔“ میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔

وہ نم آنکھوں کے ساتھ بولا۔ ”ہم تو آپ کو کھو چکے تھے۔ مراد پور کے قبرستان میں ”دفنا“ چکے تھے آپ کو...... کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ آپ کو پھر زندہ سلامت دیکھیں گے۔ آپ کو نئی زندگی مبارک ہو۔“ (میرے زندہ ہونے کی خبر اسے ٹی وی کے ذریعے ملی تھی)

میں نے مسکرا کر کہا۔ ”ابھی تو مجھے مرا ہوا ہی سمجھو تو بہتر ہے۔ ہاں اگر کسی طرح یہاں سے بچ گئے تو پھر مبارک دے لینا۔“

وہ گم صم سا ہو گیا اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔ ”کیا یہ...... پولیس والوں کی ہی کوئی بلڈنگ ہے؟“

”لگ تو یہی رہا ہے ولید...... لیکن پولیس والوں نے ہمیں اپنے پاس نہیں رکھا بلکہ کسی

اور کے حوالے کر دیا ہے اور ان لوگوں سے بھی خیر کی کوئی توقع نہیں۔''

''زیادہ سے زیادہ مار ہی دیں گے ناں...... اب کوئی ڈر نہیں رہا مرنے کا...... اپنی شادی سے ذرا پہلے بہن جل مری...... ماں جی کو جلا کر کوئلہ بنا دیا گیا۔ گھر اجڑ گیا۔ زندگی تباہ ہو گئی۔ اب جی کر کرنا بھی کیا ہے؟'' وہ آزردہ لہجے میں بولا۔

میرے ذہن میں قیصر چوہدری کے وہ الفاظ گونج رہے تھے جو اس نے کل ادا کیے تھے۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں فخر اور پہلوان حشمت سے فون پر رابطہ کروں اور انہیں بتاؤں کہ میں پولیس کی حراست سے فرار ہو کر دریائے راوی کی بارہ دری میں پہنچ گیا ہوں۔ اگر میں یہ کر گزروں تو میرے چچازاد ولید اور باقی قریبیوں پر ہاتھ ہولا رکھا جائے گا۔ میں نے یہ بات نہیں مانی تھی اور شاید اسی کا نتیجہ تھا کہ ولید کو جیل سے نکال کر اس مقتل میں پہنچا دیا گیا تھا۔ شکیل داراب جیسے ''بادشاہ گر'' کے لیے کیا ممکن نہیں تھا۔

ولید جانتا تھا کہ اس کے والد، یعنی میرے چچا حفیظ، ان خطرات کے بھنور سے نکل کر بیرون ملک پہنچ گئے ہیں لیکن اسے یہ پتا نہیں تھا کہ یہ کام بھی میری کوشش سے ہی ہوا ہے۔ وہ مجھ سے بہت سے سوال جواب کرنا چاہتا تھا لیکن یہاں اس ہال میں یہ سب کچھ ممکن نہیں تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ہماری ساری باتیں سنی جا رہی ہوں۔

○......❖......○

اور یہ رات کا وقت تھا۔ ہم تینوں کو کرسیوں سے کھول کر طویل میزوں پر باندھ دیا گیا تھا۔ باندھنے کے لیے اسٹریپس استعمال کی گئی تھیں اور یہ اتنی مہارت سے باندھی گئی تھیں کہ ہم بمشکل اپنے جسم کے کسی حصے کو حرکت دے سکتے تھے۔ ہمارے جسموں پر بس ایک ایک نیکر نما جامہ تھا۔ صرف رضوان کے جسم پر ایک اضافی قمیص موجود تھی شاید یہ اس کے زخمی جسم کو ڈھانپنے کے لیے رہنے دی گئی تھی۔ ہمارے اردگرد جو کچھ ہو رہا تھا اور جس طرح کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں، ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ آج یہاں کچھ انوکھا ہونے والا ہے۔ شاید اس ڈرامے کا ڈراپ سین جو دو تین دن سے جاری ہے۔ وہی بے ہنگم موسیقی ہال میں گونج رہی تھی جو ہم ایک دو مرتبہ پہلے بھی سن چکے تھے۔ ڈیتھ اسکواڈ کے وحشی ارکان کی طرح اس موسیقی میں بھی ہیجان اور وحشت کی لہریں تھیں۔ ڈرم کی دھا دھم کے درمیان ایسی کریہہ انسانی آوازیں بلند ہوتی تھیں جیسے کسی کو نیزوں میں پرو دیا جا رہا ہو۔

ایک چوڑی میز پر میں اور رضوان ساتھ ساتھ بندھے ہوئے تھے جبکہ دوسری میز پر ولید کو جکڑا گیا تھا۔ رضوان نے میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ''اوپر گیلری میں

لوگ آ گئے ہیں۔"

میں نے بمشکل گردن گھما کر دیکھا۔ بارعب شکیل داراب اور چوہدری ٹائپ لالہ وریام آرام دہ صوفوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان کے عقب میں ڈی ایس پی قیصر کی جھلک بھی دکھائی دی، وہ سادہ لباس میں تھا۔ چار پانچ اور افراد بھی تھے۔

"لگتا ہے کہ تماشا شروع ہونے والا ہے۔" رضوان نے طویل سانس بھر کر کہا۔ شاید وہ کچھ اور بھی کہتا مگر اس کی آواز بے ہنگم شور میں دب گئی۔ دس بارہ شیطان زادے اچھلتے کودتے اور رقص کرتے ہال کمرے میں داخل ہو گئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں شراب ہلکورے لے رہی تھی لیکن اس شراب کے پیمانے غیر معمولی طور پر بڑے تھے۔ شاید آدھی بوتل ایک پیمانے میں ہی سما سکتی تھی۔ تین چار ایسے بھی تھے جن کے ہاتھوں میں شراب کے علاوہ چمکیلے تیز دھار خنجر بھی تھے۔

میں جانتا تھا کہ یہ لوگ انسانی خون رغبت سے پیتے ہیں اور بعض اوقات اسے اپنی شراب میں شامل کر لیتے ہیں۔

"میرا خیال ہے کہ موم بتیاں آ رہی ہیں۔" رضوان نے سرگوشی کی۔

میں نے دیکھا، جان ڈیرک کے دو ملازم طشتریوں میں روشن بہت سی شمعیں لے کر اندر داخل ہو رہے تھے۔

ایک دم میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور میری نگاہوں کے سامنے کچھ عرصہ پہلے دیکھا ہوا ایک منظر گھوم گیا۔ گلبرگ والی جس کوٹھی میں دھماکا ہوا تھا اور بہت سے دیگر لوگوں کی طرح میں نے بھی "وفات" پائی تھی، وہاں دھماکے سے پہلے ایک جشن بھی ہوا تھا۔ ہم نے ان ہی ابلیس زادوں کو ایک بہت بڑا کیک کاٹتے اور پُر لطف قہقہے بلند کرتے دیکھا تھا۔ وہ کیک ایک جواں عورت کی شکل میں تھا۔ وہ عورت کے جسم کے مختلف حصوں کو چھری سے کاٹتے تھے، کیک کے اندر لگے ہوئے کسی اسپیکر میں سے رونے چلانے کی بلند آوازیں سنائی دیتی تھیں اور شیطان زادے مخمور ہو کر رقص کرتے تھے، نعرے لگاتے تھے۔

ایک دم میرے جسم کے ہر مسام سے پسینہ بہہ نکلا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ آج یہاں بھی کوئی ایسا ہی سنگین تماشا ہونے والا ہے۔

یقیناً رضوان نے وہ منظر نہیں دیکھا تھا اس لیے وہ مسلسل الجھن میں تھا۔ کہنے لگا۔ "کہیں یہ ان کے باس کی سالگرہ تو نہیں ہے؟"

میں نے کہا۔ "سالگرہ کسی کی بھی ہو...... لیکن...... کیک شاید ہم ہی ہیں۔"

میرے لہجے کی گمبھیرتا کو محسوس کر کے رضوان نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔
''آپ کا مطلب ہے کہ...... براوقت بالکل قریب آ گیا ہے؟''
''براوقت تو بنکاک سے ہی ہمارے آس پاس رہا ہے۔''
وہ خاموش ہو گیا۔ میں بھی خاموش ہو گیا۔ کہنے کو کچھ سوجھ ہی نہیں رہا تھا۔ امید کی کوئی کرن دکھائی دے رہی ہوتی تو شاید اس کے بارے میں بات بھی کرتے۔ جان ڈیرک سے بھی کوئی بات کرنا بیکار لگ رہا تھا۔ محسوس ہوتا تھا کہ وہ اب اس ڈرامے کا ڈراپ سین کرنے پر پوری طرح تلا ہوا ہے۔
پھر بھی رضوان کے کہنے پر میں نے اسے بلند آواز سے مخاطب کیا۔ موسیقی کی سماعت شکن آواز تھوڑی دیر کے لیے بند کر دی گئی۔ ''کیا کہنا چاہتے ہو ایسٹرن کنگ اپنے اس خادم سے۔'' ڈیرک کے لہجے میں زہر تھا۔
''کیا کوئی بارگیننگ ہو سکتی ہے؟'' میں نے صاف سیدھی بات کی۔
وہ زہرناک انداز میں ہنسا اور بولا۔ ''کیوں مسٹر شکیل داراب! اس شخص سے کوئی بارگیننگ ہو سکتی ہے؟''
شکیل بولا۔ ''میرے خیال میں ایسے وقت پر بارگیننگ نہیں ہوتی بلکہ آخری خواہش پوچھی جاتی ہے...... لیکن مجھے لگتا ہے کہ اب کم از کم ایسٹرن کی تو کوئی خواہش ہے ہی نہیں۔ یہ بس ویسے ہی بیکار میں زندہ رہنا چاہتا ہے۔''
میرے سینے میں پھر ایک گھونسا سا لگا۔ شکیل کا اشارہ تاجور والے معاملے کی طرف تھا۔ وہ ان کے خاندان کی ''بہو'' بن چکی تھی ورنہ اس موقع پر پتا نہیں کہ وہ اس کے حوالے سے کیا کیا بکواس کرتا۔
میرے اور جان ڈیرک کے درمیان دو تین منٹ مزید گفتگو ہوئی۔ میں اس خطرناک ترین موقع کو کسی بھی طرح ٹالنا چاہتا تھا۔ میں نے شکیل اور ڈیرک کو یہ اشارہ بھی دے دیا کہ میں اپنے دونوں مفرور ساتھیوں کے بارے میں بھی ان کے ساتھ کچھ تعاون کر سکتا ہوں (حالانکہ یہ صرف ایک اشارہ ہی تھا) میں جانتا تھا کہ یہ لوگ ٹس سے مس نہیں ہوں گے...... اور وہ نہیں ہوئے۔ وہ اس رات کو انتقام کی ایک یادگار رات بنانے کے لیے پوری طرح تلے ہوئے تھے۔ میں کئی مرتبہ ان کے جان لیوا شکنجے میں آتے آتے بچ گیا تھا...... میں جانتا تھا کہ قیصر، لالہ وریام اور شکیل کو میرے زندہ بچ جانے کا بہت قلق ہے...... اور آج انہوں نے مجھے میرے ان بدترین دشمنوں کے حوالے کر دیا تھا جو سفاکی میں اپنی مثال آپ تھے۔

رضوان کے ارد گرد میز پر شمعیں روشن کر دی گئی تھیں۔ پھر اس کے جسم پر کچھ ایسے رنگ انڈیلے گئے جن کی وجہ سے وہ واقعی ایک خوش رنگ کیک کے مانند دکھائی دینے لگا۔ وہ ہراساں نظروں سے کبھی میری طرف دیکھتا تھا اور کبھی سرخ لباس والے ابلیس زادوں کی طرف۔ ان کی شعلہ بار نگاہوں میں وحشت ہی وحشت تھی۔ رضوان کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے لیکن میں کافی حد تک جانتا تھا۔ میری بے چینی عروج پر پہنچ گئی۔ میں مسلسل ان چرمی پٹیوں سے زور آزمائی کر رہا تھا جنھوں نے مجھے سرتاپا جکڑا ہوا تھا مگر انہیں توڑنا شاید کسی کے بس میں بھی نہیں تھا۔

موسیقی کا شور فلک شگاف ہو چکا تھا۔ سرخ لباسوں والے انسان نما حیوان مختلف نعرے بھی بلند کر رہے تھے جو کم از کم میرے لیے تو ناقابلِ فہم ہی تھے۔

پتا نہیں کیوں ان لمحوں میں مجھے رضوان پر بے پناہ ترس آیا۔ ہم نے سب سے پہلے اسے ملنگی ڈیرے کے پُراسرار تہ خانوں میں دیکھا تھا جہاں وہ سائیکو ڈاکٹر ارم کی چیرہ دستیوں کا شکار تھا۔ وہ وہاں سے نکلا تو ڈاکٹر ارم نے اسے اس کی شادی شدہ بہن کے ذریعے بلیک میل کرنا شروع کیا اور واپس اپنے پاس آنے پر مجبور کر دیا۔ تب رضوان کے اندر بغاوت اور مزاحمت کے جراثیم پیدا ہوئے اور تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق وہ بدلتا چلا گیا۔ اب وہ ایک حوصلہ مند اور پُرعزم نوجوان کے روپ میں ڈھل چکا تھا۔ وہ ایک نئے ڈھب سے زندگی گزارنے کا خواہش مند تھا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ سپنے تھے...... لیکن...... انسان کے منصوبوں اور قدرت کے ارادوں میں مطابقت اکثر کم کم ہی ہوتی ہے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ موت کے دہانے پر ہے...... اور شاید انتقام کی اس تاریخی رات میں وہ ہم سے پہلے زندگی کی سرحد پار کرنے والا ہے۔ اس نے بجھی بجھی سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھا۔ جیسے پوچھ رہا ہو...... کیا یہ واقعی آخری لمحے ہیں۔ اس کے چہرے کے تاثرات میں اب بھی کہیں آس امید کی کرنیں موجود تھیں۔ جیسے اسے اب بھی یقین ہو کہ میں بہت کچھ کر سکتا ہوں...... میں اس طرح اسے مرنے نہیں دوں گا۔

میں اسے حوصلہ دینا چاہتا تھا لیکن کیسے دیتا۔ مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ تیز دھار خنجروں والے شیطان اس کے سر پر پہنچ چکے تھے۔ پھر ایک نے اس کی بائیں کلائی اس بری طرح کاٹی کہ خنجر کی دھار ہڈی سے ٹکرا گئی۔ تازہ جوان خون اُبلا لیکن فرش پر گرنے سے پہلے ہی اسے ایک پیمانے میں جمع کیا جانے لگا۔ ایک پیمانہ بھر گیا تو دوسرا آگے کر دیا گیا۔ میں نے کن انکھیوں سے دیکھا رضوان کے چہرے پر کرب تھا اور اس کا رنگ زرد ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے

خون کا رساؤ کچھ کم ہوا تو کلائی کو ایک رومال سے باندھ دیا گیا۔
''دشمن کا خون...... پیاس بجھانے کے لیے۔'' ایک شیطان زادے نے نعرہ لگایا۔
''ہاں، دشمن کا خون...... پیاس بجھانے کے لیے۔'' باقیوں نے بیک زبان اس نعرے کو دہرایا۔
دونوں پیمانوں کا خون سارے پیمانوں میں شامل کر دیا گیا۔ شیطان زادوں کے ہاتھوں میں پکڑی زرد وہسکی کا رنگ اب سرخی مائل ہو چکا تھا۔
ایک بار پھر نعرہ بلند ہوا۔ ''دشمن کا خون...... نشے کو دوآتشہ کرنے کے لیے۔''
ڈیتھ اسکواڈ کے ارکان نے اس دوسرے نعرے کا جواب بھی کورس کی شکل میں دیا اور پھر خون آمیز شراب اپنے گلے میں انڈیلنے لگے۔ انہوں نے سیکنڈوں میں جام خالی کر دیئے۔ وہ چلتی پھرتی سفاکیت تھے...... وہ مجسم برائی تھے۔ عیاری، قتل و غارت، آبرو ریزی، بے رحمی ان کے خون میں شامل تھی اور جان ڈیرک جیسے عالمی بدمعاش نے ان کی یہ ''صلاحیتیں'' بڑی محنت سے پروان چڑھائی تھیں۔ ان میں سے کچھ تو اتنے ہم شکل تھے کہ ان کو علیحدہ سے پہچاننا بھی دشوار تھا۔
تب مجھے کتوں کا شور سنائی دیا...... اور پھر ایک نیا منظر آنکھوں کے سامنے آیا۔ ایک کافی بڑا آہنی پنجرہ دکھائی دیا۔ اس کے نیچے پہیے تھے۔ چند افراد اس پنجرے کو دھکیلتے ہوئے اندر لائے تھے۔ پنجرے میں دیوہیکل کتے بند تھے۔ میں نے ان کو گنا، وہ تعداد میں پانچ تھے۔
میرے چچا زاد ولید کو کتوں اور گھوڑوں کے بارے میں کافی معلومات تھیں۔ وہ ڈری ڈری سرگوشی میں بولا۔ ''یہ ڈیئر ہاؤنڈ ہیں۔ شکار کے لیے بھی استعمال ہوتے ہیں۔ بڑی اسپیڈ ہوتی ہے ان کی۔''
''مجھے لگتا ہے کہ یہ بہت بھوکے بھی ہیں......'' میں نے جوابی سرگوشی کی۔
''یہ بھوکے نہ بھی ہوں تب بھی دو جانور، گدھے جتنے بڑے چوپائے کو گرا لیتے ہیں اور منٹوں میں چیر پھاڑ دیتے ہیں۔''
ہم اس کوٹھی میں کتوں کی آوازیں تو مسلسل سنتے رہے تھے لیکن یہ ہرگز پتا نہیں تھا کہ یہ اتنی خطرناک نسل کے جانور ہوں گے۔
اچانک ایک شیطان زادہ آگے بڑھا، یہ وہی بھوری آنکھوں والا ریگی تھا۔ اس نے کسی ماہر قصاب کی طرح رضوان کی قمیص سامنے سے خنجر کی مدد سے چاک کر دی۔ (رات والی دست درازی میں یہ قمیص پہلے ہی کافی حد تک چاک ہو چکی تھی) رضوان کا کسرتی لیکن زخمی

جسم لائٹس میں دمک اٹھا۔ رضوان نے اگلے لمحے میں جو پکار بلند کی وہ بڑی دردناک تھی۔ ریگی نے کسی چابک دست قصاب ہی کی طرح رضوان کے ایک بازو سے گوشت کا پارچہ الگ کر دیا تھا۔ اگر عام زبان میں بیان کیا جائے تو یہ رضوان کے بازو کی مچھلی کا گوشت تھا۔

رضوان بری طرح تڑپا لیکن چرمی پٹیوں نے اسے بے طرح جکڑ رکھا تھا۔ ریگی نے خون آلود انسانی گوشت کا یہ پارچہ ہوا میں لہرایا اور پھر بے پروائی سے کتوں والے پنجرے میں پھینک دیا۔ دو دیوہیکل کتے اس پر جھپٹے۔ ان میں سے ایک نے پلک جھپکتے میں گوشت کا یہ ٹکڑا نگل لیا۔

ریگی نے گوشت کا دوسرا ٹکڑا رضوان کی بائیں ٹانگ سے اتارا۔ بے حد ضبط رکھنے کے باوجود رضوان بری طرح چلایا۔ شیطان زادوں نے پُر لطف قہقہے بلند کیے۔ یہ سب کچھ دھواں دھار موسیقی میں گڈمڈ ہو رہا تھا۔ یہ بعینہٖ وہی مناظر تھے جو کچھ عرصہ پہلے میں نے گلبرگ کی ایک عمارت میں دیکھے تھے، وہاں انسانی شکل کا ایک کیک تھا اور یہاں واقعی ایک انسان تھا۔ یہ دوسرا ٹکڑا بھی ڈیئر ہاؤنڈز کے سامنے پھینک دیا گیا جو ایک لحظے میں ان کے خوفناک جبڑوں میں اوجھل ہو گیا۔

خون کے ضائع ہونے سے رضوان پہلے ہی نیم جان تھا، اب بالکل ہی زرد رو ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اس کی اذیت دیکھنا میرے بس سے باہر ہو رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر پوری جسمانی طاقت اپنے بازوؤں میں جمع کی اور خود کو چرمی پٹیوں سے نجات دلانا چاہی۔ مگر نتیجہ وہی رہا جو پہلے تھا۔ ولید نے ہراساں نظروں سے میری طرف دیکھا۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں پوچھ رہا تھا۔ ”کیا اس کے بعد ہماری باری ہے؟“

بدقسمتی کی انتہا تھی کہ ولید کے اس سوال کا جواب اثبات میں تھا۔

چند سیکنڈ کے لیے موسیقی تھمی اور گیلری میں سے جان ڈیرک کی منحوس آواز ابھری۔ اس نے امریکن لہجے کی انگلش میں کہا۔ ”میں ایک بار پھر اپنے الفاظ دہراتا ہوں...... تم نے ٹیکساری کمپنی کے حصے بخرے کیے ہیں۔ اب تمہارے بھی حصے بخرے ہوں گے۔ مجھے امید ہے کہ تمہارے جسم کے ہر ہر حصے کو علیحدہ علیحدہ موت ملے گی۔“

”ٹھیک ہے۔ تمہاری دشمنی مجھ سے ہے لیکن ان دونوں کا اس لڑائی میں کبھی کوئی کردار نہیں رہا...... یہ ولید کئی سال سے جیل میں پڑا ہوا ہے...... اور یہ رضوان کبھی تمہارے کسی نقصان میں شامل نہیں رہا۔“

شکیل داراب نے بلند آواز میں کہا۔ ”ایک مرتبہ تم نے خود ہی کہا تھا شاہ زیب! کہ

گیہوں کے ساتھ گھن بھی پستا ہے۔ آج گھن پس رہا ہے تو رو کیوں رہے ہو؟''

''دیکھو شکیل! ہر ظلم کا ایک ردِ عمل ہوتا ہے۔ ان دونوں کو بے جواز مارو گے تو تمہیں کسی نہ کسی صورت میں بھگتنا پڑے گا۔ ان کو چھوڑ دو۔''

''اب تو یہ سب کچھ جان ڈیرک صاحب کے ہاتھوں میں ہے۔ ہم تو صرف مہمانوں کی حیثیت سے یہاں بیٹھے ہیں۔ اگر تمہیں ہمارے سامنے اس طرح مرتے ہوئے شرم آتی ہے تو ہم چلے جاتے ہیں...... کیوں لالہ وریام؟'' شکیل داراب نے مسکراتی نظروں سے وریام کی طرف دیکھا۔

اس نے اپنی بڑی بڑی مونچھوں کو بل دے کر زیرلب کوئی گالی بکی۔

اس سے پیشتر کہ میں کچھ اور کہتا، ایک دم موسیقی کی آواز پھر کان پھاڑنے لگی۔ یقیناً یہ جان ڈیرک کے اشارے پر ہی ہوا تھا۔ مطلب یہی تھا کہ میری اپیل رد کی جا چکی ہے۔ لاچاری سی لاچاری تھی۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ کبھی کبھی انسان کا حوصلہ، ہمت، دلیری اور سخت جانی سب کچھ بے معنی ہو جاتا ہے۔ حالات اسے اسیر کر کے ناچیز بنا دیتے ہیں۔ جاماجی والے قید و بند کے بعد یہ دوسرا موقع تھا کہ میں بے بسی کے نرغے میں تھا اور مجھے کوئی راہ نہیں سوجھ رہی تھی۔

اب یہی لگ رہا تھا کہ اگلے تین چار منٹ میں رضوان کے جسم کا بیشتر گوشت اس کے جسم سے علیحدہ ہو چکا ہوگا اور وہ دم توڑ چکا ہوگا۔ موسیقی کی دھما دھم مزید وحشت ناک ہو گئی تھی، در و دیوار لرزتے محسوس ہوتے تھے۔ بلکہ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ہمارے اردگرد روشن درجنوں شمعوں کے شعلے بھی تھرتھرا رہے ہیں، رضوان کی کراہیں اور آہیں سینہ چھلنی کر رہی تھیں۔ اس کا چہرہ لٹھے کی طرح سفید تھا اور آنکھیں بے پناہ نقاہت کے سبب بند ہو چکی تھیں۔ تب سفاک ریگی اپنے خود آلود خنجر کے ساتھ ایک بار پھر رضوان کی طرف بڑھا۔ دیوہیکل کتے پنجرے کے اندر بے قراری سے اپنی دُموں کو گردش دے رہے تھے۔

یہ بے کسی کی انتہا تھی اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی انتہا ایک دھماکے سے ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے۔ بہت گہرے جان لیوا حبس میں بجلی کڑکتی ہے اور آسمان سے چھاجوں پانی برسنا شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں بھی یہی کچھ ہوا۔ ایک ایسی ہی بجلی کڑکی۔ مجھے اپنی نگاہوں پر بھروسا نہیں ہوا۔ شاید کسی کو بھی نہیں ہوا ہوگا۔ کچھ دیر کے لیے سب سکتہ زدہ رہ گئے تھے۔ آٹومیٹک رائفل کا ایک برسٹ چلا۔ ہال کمرے کا ایک دروازہ دھماکے سے کھلا اور میں نے قسطینا کو دیکھا۔ جان ہتھیلی پر رکھنے والی وہی نڈر قسطینا جس کو ایک روز میں جاماجی میں چھوڑ آیا تھا۔ ہاں وہی جنگجو جس نے خطرناک ترین حالات میں اپنے لوگوں کی کمان کی تھی اور اپنے

دشمن کو شکستِ فاش دی تھی۔ وہ طوفان کی طرح اندر داخل ہوئی۔ اس کے عقب میں کمانڈر فارس جان، ناوان اور ان کے جانباز لپکتے ہوئے آرہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں جدید آٹومیٹک رائفلیں تھیں۔

میرے دل نے پکار کر کہا۔''میرے اپنے آگئے ہیں۔ میرے غم خوار آگئے ہیں، اب میں اکیلا نہیں رہا۔''

وہ کب آئے؟ کیسے آئے...... کیسے یہاں تک پہنچے؟ یہ سب کچھ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ اب سوچنا صرف یہ تھا کہ موت کو جُل کیسے دینا ہے۔ پانسہ کیسے پلٹنا ہے۔ چاروں طرف شعلے لپک رہے تھے اور رائفلوں کی سماعت شکن تڑتڑ تھی۔ قسطینا گیلری کی جانب فائرنگ کرتی ہوئی الٹے قدموں میری طرف آئی۔ اس کے دو ساتھی شوٹر بھی دائیں بائیں تھے۔ میں نے دیکھا قومی ہیکل لالہ وریام نے سینے پر گولی کھائی اور گیلری سے سر کے بل نیچے فرش پر گرا۔

''ان کو نکالو یہاں سے۔''قسطینا چلائی۔ اس کا اشارہ ہماری میزوں کی طرف تھا۔

اور تب مجھے پتا چلا کہ ہماری میزوں کے نیچے بھی پہیے موجود ہیں۔ قسطینا اور اس کے ساتھیوں نے ہمیں اوٹ میں لیا اور دونوں طویل میزوں کو اسٹریچرز کی طرح دھکیلتے ہوئے ہال کمرے سے باہر پہنچا دیا۔

اسی دوران میں ایک گولی قسطینا کے سینے پر عین دل کے مقام پر لگی۔ گولی کے دھچکے سے میں نے اسے لڑکھڑاتے دیکھا تاہم اگلے ہی ساعت میں وہ سنبھل گئی اور جوابی فائر کیے۔ تب مجھے پتا چلا کہ اس نے بلٹ پروف جیکٹ پہن رکھی ہے۔

''قسطینا، ذرا سنبھل کے۔'' میں پکارا۔

ابھی میرا فقرہ مکمل بھی نہیں ہوا تھا کہ ایک اور برسٹ آیا۔ اس برسٹ نے میری دائیں جانب کھڑے، قسطینا کے ساتھی کا سر پاش پاش کر دیا۔

شیطان زادے پوری وحشت میں تھے۔ وہ نہ صرف اندھا دھند فائرنگ کر رہے تھے۔ بلکہ چیلوں کی طرح قسطینا اور فارس جان کے ساتھیوں پر جھپٹ بھی رہے تھے۔ زندگی کی طرح موت بھی ان کے لیے شاید ایک تماشے کی طرح تھی۔ ایک شیطان زادے نے ایک چنگھاڑ کے ساتھ دراز قد فارس جان پر جست لگائی لیکن راستے میں ہی ناوان کی چلائی ہوئی گولیوں کا شکار ہوا۔

''قسطینا مجھے کھولو۔'' میں نے پکار کر کہا۔

قسطینا نے اپنی پینٹ کی بیلٹ سے اڑسا ہوا آرمی ڈیگر نکالا......اور اس کی تیز دھار

چند سیکنڈ میں میری چرمی اسٹریپس کاٹ ڈالیں۔

''تم پیچھے چلے جاؤ شاہ زائب۔'' وہ سرخ چہرے کے ساتھ بولی۔

میں نے جواب دینے کے بجائے اس کے ہاتھ سے خنجر جھپٹ لیا اور اس کے مرنے والے ساتھی کی ٹرپل ٹو رائفل اٹھالی۔

دونوں طرف سے پوزیشنیں لے کر اندھا دھند فائرنگ کی جارہی تھی۔ میں نے سب سے پہلے رضوان کے اسٹریپس (چرمی پٹیاں) کاٹ کر اسے میز سے علیحدہ کیا۔ وہ خونچکاں اور نیم بے ہوش تھا۔ فارس جان نے اسے کندھے پر اٹھایا اور تیزی سے پیچھے لے گیا۔ اس دوران میں ناوان نے ولید کے اسٹریپس کاٹ ڈالے تھے۔ ''اس کو بھی پیچھے لے جاؤ۔'' قسطینا نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔

تب میں نے پہلی بار نوٹ کیا کہ قسطینا کے ساتھیوں میں داؤد بھاؤ کے چند اہم شوٹر بھی شامل تھے۔ ان میں سے کچھ نے اپنے چہرے نقابوں میں چھپا رکھے تھے۔ داؤد بھاؤ کے کوتاہ قد ساتھی بنارس کو میں نے اس کے قد کاٹھ اور آواز کی وجہ سے ہی پہچانا۔ اس نے بھی اپنا چہرہ ایک بڑے رومال میں چھپا رکھا تھا۔ اندر گھسنے والوں کی تعداد پندرہ بیس سے کم نہیں تھی۔

قسطینا اور اس کے ساتھیوں کا حملہ اتنا شدید اور اچانک تھا کہ ڈیتھ اسکواڈ والے انتہائی چوکس اور خونریزی میں تاک ہونے کے باوجود اپنا بھرپور دفاع نہ کر سکے۔ قسطینا اور اس کے بپھرے ہوئے ساتھی دیوانہ وار آگے بڑھے تھے اور مناسب ترین جگہوں پر پوزیشین لے لی تھیں۔ ایک کھڑکی میں سے مجھے ہال کمرے کا منظر نظر آرہا تھا۔ وہاں کم و بیش چار سرخ پوشوں کی لاشیں پڑی تھیں...... یہاں ایک لاش دبنگ مونچھوں والے لالہ وریام کی بھی تھی۔ اس کے اردگرد گولیوں کے بہت سے خول اور شیشے بکھرے ہوئے تھے۔

میں نے ایک ستون کی اوٹ میں کھڑی قسطینا کو مخاطب کیا اور پکار کر کہا۔ ''ہم زیادہ دیر یہاں نہیں رک سکتے۔ ان کو کمک مل جائے گی۔''

اس سے پہلے کہ قسطینا جواب میں کچھ کہتی، ایک اوٹ سے انچارج ''ریڈ کیٹ'' نمودار ہوئی اور بلا کی رفتار سے قسطینا پر جھپٹی۔ اس نے قسطینا کو عقب سے دبوچا اور گھما کر فرش پر دے مارا لیکن وہ بھی قسطینا تھی۔ جاما جی کی گرین فورس کی کمانڈر...... جونہی وہ اوندھے منہ فرش پر گری، اس نے اپنی رائفل کے دستے سے ''کیٹ'' کے سر پر ضرب لگائی اور تڑپ کر اس کے نیچے سے نکل گئی۔

یہی وقت تھا جب میں نے قیصر چوہدری کو دیکھا۔ اس نے اپنا ایک زخمی بازو دوسرے

ہاتھ سے تھام رکھا تھا اور بھاگنے کی کوشش میں تھا۔ میں اس کے پیچھے لپکا اور پندرہ بیس قدم دور اسے جا لیا۔ اس کے منہ سے شراب کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ اس نے گالی بکی اور خود کو چھڑانے کی دیوانہ وار کوشش کی۔ میں نے عین اس کے چہرے پر اپنے سر کی ٹکر رسید کی۔ وہ کئی قدم دور جا گرا۔ کوتاہ قد بنارس اور اس کے ایک تناور ساتھی نے قیصر چوہدری کو دبوچ لیا۔ پنجرے میں بند کتوں کا شور فلک شگاف تھا۔ ان میں ایک دو کو یقیناً گولی چاٹ چکی تھی۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ قسطینا اور کیٹ برسر پیکار تھیں لیکن پھر ایک آواز بلند ہوئی۔ میں ٹھیک سے پہچان نہیں سکا مگر گمان غالب یہی تھا کہ یہ جان ڈیرک کی آواز ہے۔ یکا یک کیٹ نے بے پناہ زور لگا کر خود کو قسطینا سے چھڑایا اور اندھا دھند کوریڈور کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی۔ ریکارڈڈ میوزک اب بھی پورے زور شور سے گونج رہا تھا۔ قسطینا، آگے بڑھنا چاہتی تھی مگر میں نے اسے بازو سے پکڑ کر روک لیا، اس کے کان کے قریب منہ کیا اور چلا کر کہا۔ ''قسطینا! وہ پیچھے ہٹ رہے ہیں، لیکن ہم بھی یہاں رک نہیں سکتے۔ ہمیں فوراً نکلنا ہے، تم لوگ کس پر ہو؟''

''ہماری گاڑیاں باہر کھڑی ہیں۔'' وہ بھی زور سے بولی۔

''تو پھر نکلو۔''

قسطینا نے فارس جان کو آواز دی۔ فارس جان نے قیصر چوہدری کی گردن اپنے مضبوط بازو میں جکڑی ہوئی تھی اور رائفل اس کے سر سے لگا رکھی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ کسی بھی لمحے اسے شوٹ کر ڈالے گا۔ ''نہیں فارس! اسے ساتھ لے کر جانا ہے۔ اسے گھسیٹ لاؤ ادھر۔'' میں نے کہا۔

ہال کمرے کی گیلری کی طرف سے اِکا دُکا فائر اب بھی ہو رہے تھے۔ ہم برق رفتاری سے پورچ کی جانب آئے۔ نیم بے ہوش رضوان کو ناوان نے اپنے کندھے پر اٹھا رکھا تھا۔ رضوان کے نیم عریاں جسم پر ابھی تک کیک کے رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ قیصر چوہدری کسی نیم جان نیولے کی طرح فارس جان کے ساتھ گھسٹتا چلا آ رہا تھا۔ اس کی گردن فارس کے آہنی بازو کے شکنجے میں تھی۔

پورچ کے قریب دو بڑی جیپیں اور ایک کار موجود تھی۔ ان گاڑیوں کے قریب بھی قسطینا اور داؤد بھاؤ کے تین چار مسلح ساتھی موجود تھے اور اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں بھی تھوڑی بہت فائرنگ ہوئی ہے۔ یقینی بات تھی کہ ان گاڑیوں کی نمبر پلیٹیں جعلی ہیں۔ غالب امکان یہی تھا کہ یہ گاڑیاں داؤد بھاؤ کی فراہم کردہ ہوں گی۔ ہم آناً فاناً ان گاڑیوں میں گھسے...... اور بڑی

سرعت کے ساتھ سڑک کی طرف بڑھے۔ قیصر چوہدری، یرغمالی کے طور پر ہمارے ساتھ تھا اور مجھے یقین تھا کہ اگر راستے میں ہمیں روکنے کی کوشش کی گئی تو شکیل داراب کا یہ انتہائی چہیتا افسر ہمارے لیے بہت کارآمد ثابت ہوگا۔

یہ رات کے قریباً بارہ بجے کا عمل تھا۔ لاہور میں ہلکی بوندا باندی تھی اور سڑکیں تقریباً سنسان نظر آ رہی تھیں۔ مجھے پہلی بار پتا چل رہا تھا کہ ہم لاہور کے مضافاتی علاقے کی ایک ذیلی سڑک پر ہیں جس لینڈ کروزر جیپ میں، میں سوار تھا اس میں قسطینا کے علاوہ فارس بھی تھا۔ زخمی قیصر چوہدری بے ہوشی کی ایکٹنگ کر رہا تھا مگر فارس نے رائفل بدستور اس کے سر سے لگا رکھی تھی اور ایک لمحے کے لیے بھی اس کی طرف سے غافل نہیں تھا۔

میں نے قسطینا سے پوچھا۔ ''ہمیں کہاں جانا ہے؟''

قسطینا نے کوتاہ قد بنارس کی طرف دیکھا، وہ بولا۔ ''نہر کے ساتھ ساتھ جائیں گے تاج پورہ کی طرف ایک کوٹھی ہے۔''

اب یہ بات ثابت ہوگئی کہ قسطینا اور فارس وغیرہ کو یہ تمام تر سہولتیں داؤد بھاؤ نے ہی فراہم کی ہیں۔

میں نے بنارس سے پوچھا۔ ''یہ گاڑیاں بھی بھاؤ نے دی ہیں؟''

وہ بولا۔ ''ایک گاڑی میڈم کی ہے۔ دو بھاؤ نے دی ہیں۔''

اس سے پہلے کہ میں قسطینا سے کچھ مزید پوچھتا، گاڑی ڈرائیو کرنے والا بنارس کا ساتھی بنارس سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''استاد جی، آگے کوئی ناکا نظر آ رہا ہے۔''

بنارس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا۔ ''رکنا کسی صورت نہیں۔'' پھر میں نے فارس جان سے مخاطب ہو کر انگلش میں کہا۔ ''فارس، یہ حرامی ڈی ایس پی ان لوگوں میں سے ہے جو اس محکمے کے نام پر دھبا ہیں۔ اس کو ڈھال کے طور پر استعمال کرنا ہے ہم نے۔ اگر ضرورت پڑے تو دو چار اور گولیاں مار دینی ہیں اس کی توند میں۔''

قسطینا کے اشارے پر ڈرائیور نے جیپ کی رفتار بڑھا دی۔ عقب میں آنے والی دونوں گاڑیوں کی رفتار بھی بڑھ گئی۔ ہیڈ لائٹس میں اس ناکے پر پولیس کی موبائل دکھائی دے رہی تھی۔ دو چار مسلح پولیس اہلکار بھی نظر آ رہے تھے۔ میں نے اپنی انگلی ٹرپل ٹو رائفل کی لبلبی پر رکھ لی...... مگر اس ناکے پر خیریت گزری۔ جہازی سائز کی لگژری گاڑیاں دیکھ کر اہلکاروں کو ہمت نہیں ہوئی کہ ہمیں روک سکیں۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ ابھی پولیس کے وائرلیس سسٹم پر کسی طرح کا ہنگامی پیغام نہیں چلا ہے۔

بارش کچھ تیز ہوگئی تھی۔ خوش قسمتی سے اگلے آدھ گھنٹے میں ہمیں کہیں بھی روکا نہیں گیا لیکن اس دوران میں ایک اور ایسا واقعہ ہوگیا جس کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ قیصر چوہدری، کمانڈر فارس جان کی گرفت میں تھا۔ اس کے بازو میں گولی لگی تھی مگر وہ ظاہر یوں کر رہا تھا جیسے شدید زخمی ہے اور کسی بھی وقت بے ہوش ہوسکتا ہے۔ اس کا ایک بازو نیچے لٹک رہا تھا۔ نہ جانے وہ بازو اس نے کب دروازے کے اندرونی ہینڈل تک پہنچا دیا۔ دفعتاً اس نے بڑی سرعت سے حرکت کی، جیپ کا دروازہ اچانک کھلا اور قیصر چوہدری نے چلتی جیپ سے نیچے چھلانگ لگا دی۔ فارس جان نے اسے دبوچے رکھنے کی کوشش کی مگر اس کی قمیص پھٹ گئی اور وہ سڑک پر گرا۔ فارس کی انگلی بے ساختہ رائفل کے ٹریگر پر دب گئی۔ دھماکے سے شعلہ نکلا اور یہ سنگل شاٹ قیصر چوہدری کے زیریں جسم میں کہیں لگا۔ جیپ کی رفتار سو کلومیٹر سے زیادہ ہی تھی۔ قیصر چوہدری کے جسم نے کئی لڑھکنیاں کھائیں اور تاریکی میں اوجھل ہوگیا۔ اس اثنا میں ہماری تینوں گاڑیاں پچاس ساٹھ میٹر آگے نکل چکی تھیں۔ رکتے رکتے وہ کچھ اور آگے نکل گئیں۔ یہ سب کچھ تین چار سیکنڈ میں ہوا۔

''اوہ گاڈ، یہ کیا ہوا شاہ زائب۔'' قسطینا نے کہا۔

''مجھے تو لگتا ہے کہ مر گیا ہوگا باسٹرڈ۔'' فارس جان اپنی پشتو نما انگلش میں بولا۔

''اس کو اٹھانا ہے؟'' قسطینا نے پوچھا۔

میں نے عقب میں دیکھا۔ سیدھی کشادہ سڑک پر دور گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس نظر آ رہی تھیں۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ یہ عام گاڑیاں ہیں یا کوئی ہمارے پیچھے آ رہا ہے۔ ویسے بھی اب ہم منزل کے قریب تھے۔ میں نے جیپ کے ڈرائیور سے کہا۔ ''گاڑی چلاؤ۔''

وہ جیسے پہلے ہی تیار تھا۔ اس نے کلچ چھوڑا۔ گاڑی کے پہیے چرچرائے اور وہ ایک دھچکے سے آگے بڑھی۔ باقی دونوں گاڑیاں بھی ہمارے پیچھے چل پڑیں...... اور پھر رفتار پکڑتی چلی گئیں۔

O......❖......O

یہ بھی واہگہ بارڈر کی طرف ایک کشادہ عمارت تھی۔ اس کی پیشانی پر راوی فارم ہاؤس کا بڑا سا بورڈ لگا ہوا تھا۔ عمارت کے عقب میں ایک وسیع رقبہ تھا جس پر پھلواریاں تھیں۔ مچھلیوں کے چھوٹے بڑے تالاب تھے اور مرغی خانے کے آثار بھی نظر آتے تھے۔ تاہم یہ سب کچھ کافی فاصلے پر تھا۔ یہ عمارت باہر کے برعکس اندر سے نہایت آراستہ و پیراستہ تھی۔ تینوں گاڑیاں زمین دوز گیراجوں کے اندر بند ہو گئیں۔ ہمارے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی داؤد بھاؤ نے یہاں ایک قابل ڈاکٹر کا انتظام کر دیا تھا۔ اس طرح کے لوگ داؤد بھاؤ کے لیے نہایت قابلِ بھروسا ہوتے تھے۔ وہ اپنی جان تو دے سکتے تھے مگر بھاؤ سے بے وفائی نہیں کر سکتے تھے۔ اس عمارت کے ایک کمرے میں تقریباً اسپتال جیسی سہولتیں ہی موجود تھیں۔ رضوان کو فوری طبی امداد کی ضرورت تھی۔ اس کا بہت سا خون ضائع ہو چکا تھا اور وہ غشی کی حالت میں تھا۔ قسطینا اور فارس کے ساتھ آئے ہوئے افراد میں سے ایک کا خون رضوان کو میچ کر گیا۔ بنارس کا خون گروپ بھی وہی تھا۔ رضوان کو فوری طبی امداد فراہم کی جانے لگی۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد ڈاکٹر نے نوید سنائی کہ اس کا بی پی اوپر آ گیا ہے اور اب اسے کوئی فوری خطرہ نہیں ہے...... اسی دوران میں مجھے اور ولید کو ہمارے ناپ کے لباس بھی مہیا کیے جا چکے تھے۔

روشن کمرے میں، میں نے پہلی بار قسطینا کو دھیان سے دیکھا۔ وہ اسی طرح شاداب اور چوکس نظر آتی تھی۔ پینٹ شرٹ کے ساتھ بوائے کٹ بال...... یقیناً وہ ان عورتوں میں سے تھی، شادی کے بعد جن کی دلکشی میں کمی واقع نہیں ہوتی۔ دراز قد فارس جان کے پہلو میں کھڑی وہ اس کا صحیح ''میچ'' لگتی تھی۔

اس کی آنکھوں میں نمی چمکی۔ اس نے بے باکی کے ساتھ مجھے اپنی بانہوں میں لے لیا۔

''ہم تمہیں کھو چکے تھے شاہ زائب! تمہیں نئی زندگی مبارک ہو۔'' وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولی۔

''اس نئی زندگی کو پھر نئی زندگی بھی تم نے ہی دی ہے۔ ورنہ شاید اب تک ہمارے جسموں کے ٹکڑے ان ڈیئر ہاؤنڈز کے معدوں میں پہنچ چکے ہوتے۔'' میں نے کہا۔

فارس جان بھی نم نظروں سے میری جانب دیکھ رہا تھا۔ میں نے ایک ہاتھ اس کی طرف بڑھایا اور قسطینا کے ساتھ ساتھ اسے بھی گلے سے لگا لیا۔ ''ابھی تک یقین نہیں آ رہا فارس کہ تم لوگ یہاں موجود ہو۔ تمہارا آنا اور ایسے نازک وقت پر آنا کسی کرشمے سے کم نہیں ہے۔''

میں نے دونوں کی کمر تھپتھپائی اور پوچھا۔ ''کیا ابراہیم اور زینب بھی آئے ہیں؟''

قسطینا نے مجھ سے علیحدہ ہوتے ہوئے اپنے آنسو پونچھے اور بولی۔ ''ابراہیم تو نہیں، لیکن زینب آئی ہے۔ تمہارے زندہ ہونے کی اطلاع کے بعد وہ دیوانی سی ہو رہی ہے۔ امید ہے کہ ایک دو دن میں وہ تم سے مل سکے گی۔''

قسطینا اور فارس دونوں دھیان سے میرا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ ناک اور ٹھوڑی کے قریب تھوڑی سی ''کاسمیٹک فلنگ'' باقی تھی۔ باقی چہرہ نارمل ہو چکا تھا۔

پھر ایکا ایکی قسطینا کے چہرے پر غم کے گہرے سائے لہرا گئے۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''یہ انیق کے ساتھ کیا ہو گیا ہے شاہ زائب! یہ کوئی عمر تھی مرنے کی...... اور پھر جس طرح کے حالات اس کے ساتھ ہوئے، وہ اور بھی دکھ دینے والے ہیں...... کاش...... تم لوگ وقت پر سمجھ سکتے کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔''

فارس جان نے کہا۔ ''اور اب تو ام کو سجاول صیب کے بارے میں بھی داؤد بھاؤ سے کافی برا خبر ملا ہے۔''

''ہاں فارس! تم جانتے ہی ہو، وہ بدذات کیا قسم اٹھائے بیٹھی ہے۔ وہ ایک ایک کر کے ہمیں اپنے ہی پیاروں سے مروانا چاہتی ہے۔ سجاول نے اس کے شکنجے سے بچنے کے لیے اپنی آنکھوں کی قربانی دی ہے۔ اس سے پہلے سجاول کے دو قریبی ساتھی بھی اس کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔''

اسی دوران میں قسطینا کے نمبر پر داؤد بھاؤ کی کال آ گئی۔ قسطینا صرف انگلش سمجھ سکتی تھی اور داؤد بھاؤ اتنی انگلش تو بول ہی سکتا تھا کہ قسطینا اور فارس جان کو اپنا مافی الضمیر سمجھا سکتا...... انیق اسے پڑھا لکھا گینگسٹر کہا کرتا تھا۔

قسطینا نے مختصر الفاظ میں داؤد بھاؤ کو اب تک کی تہلکہ خیز صورتِ حال سے آگاہ کیا پھر سیل فون میری طرف بڑھا دیا۔

داؤد کی پاٹ دار آواز ابھری۔ ''مبارک ہو۔ تمہارا وہاں سے بچ نکلنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ پورے شہر کی پولیس میں کھلبلی مچی ہوئی ہے۔ ہر جگہ تمہیں ڈھونڈا جا رہا ہے۔ قسطینا اور اس کے ساتھیوں کی انٹری نے بھی انتظامیہ کو ششدر کر رکھا ہے۔ بے شک یہ جان پر کھیلنے والے لوگ ہیں۔''

''بھاؤ! اس میں آپ کی کوششیں بھی تو شامل ہیں۔''

داؤد بھاؤ میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ''تمہارے لیے ایک اور اہم خبر ہے۔ قیصر چوہدری کا کام تمام ہو گیا ہے۔ مارا گیا ہے وہ۔'' بھاؤ کے لہجے میں اطمینان کی جھلک تھی۔ یہ ایک چونکا دینے والی اطلاع تھی۔

''اس نے زخمی حالت میں خود کو تیز رفتار جیپ میں سے باہر گرایا تھا۔'' میں نے داؤد بھاؤ کو آگاہ کیا۔

''مجھے اس بارے میں ابھی تفصیل معلوم نہیں ہوئی لیکن کچھ دیر پہلے یہ پتا چلا ہے کہ اسپتال میں ڈاکٹروں نے اس کی موت کی تصدیق کر دی ہے۔''

''اب کیا ارادے ہیں بھاؤ! آپ کو بے حد محتاط رہنا ہوگا۔ قیصر کی موت کو یہ لوگ ایزی نہیں لیں گے۔''

''مجھے پتا ہے کہ مجھے کب روپوش ہونا ہے اور کب سامنے آنا ہے، تم بے فکر رہو۔ یہ جگہ تم سب کے لیے بے حد محفوظ ہے۔ جب تک خود کوئی غلطی نہیں کرو گے، تم تک پہنچا نہیں جا سکے گا۔ میری رائے ہے کہ ابھی پانچ چھ روز کے لیے بالکل دم سادھ لو۔ شکیل داراب نے اب ہاتھ پاؤں تو مارنے ہیں۔''

''بھاؤ! سجاول کا کیا حال ہے؟''

''پرائیویٹ کلینک میں اس کا بہترین علاج ہو رہا ہے۔ اس کی آنکھیں تو واپس نہیں آ سکتیں لیکن ان کا انفیکشن اب ختم ہو گیا ہے۔ اس کا ایک کان بھی سننے کے قابل ہو گیا ہے۔ دوسرے کی ٹریٹ منٹ جاری ہے۔''

''فخر اور پہلوان حشمت کا کچھ پتا چلا؟'' میں نے دریافت کیا۔

''میرے بندے ان کی تلاش میں ہیں، جیسے ہی کوئی کھوج ملا میں تمہیں انفارم کروں گا۔''

مجھے کچھ ضروری ہدایات دینے کے بعد اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

میرے اور داؤد بھاؤ کے درمیان چونکہ ساری گفتگو اردو میں ہوئی تھی اس لیے قسطینا اور

ناوان سمجھ نہیں پائے تھے۔ (ناوان ایک اوان نامی باغی کا بھائی تھا لیکن ابراہیم اور قسطینا کا زبردست وفادار تھا۔ اس نے جاما جی کی جنگ میں بھرپور حصہ لیا تھا)۔ میں نے انہیں مختصراً اس گفتگو کے بارے میں بتایا۔ قسطینا نے کہا۔ ''شاہ زائب! تم نے داؤد بھاؤ سے ہاناوانی کے بارے میں کچھ پوچھا؟''

''نہیں، یہ میرے ذہن سے نکل گیا۔ دوبارہ فون کروں؟'' میں نے کہا۔

''نہیں، ابھی رہنے دو۔ مجھے پتا ہے وہ اسی شہر میں کہیں ہے۔ ہم زیادہ دیر اس سے دور نہیں رہ سکتے اور نہ وہ رہے گی۔ وہ دیوانی ہو رہی ہے شاہ زائب! ہمیں بھی دیوانوں کی طرح اس سے ٹکرانا ہوگا۔''

اس سے پہلے کہ میں قسطینا اور فارس جان سے ان کی یہاں حیران کن آمد کے بارے میں تفصیلات معلوم کرتا، بھاؤ کے ساتھی بنارس کی آواز آئی۔ وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا تھا، سر جی، دیکھیں، یہ ٹی وی پر کیا خبر آ رہی ہے۔''

ساتھ والے کمرے میں ٹی وی آن تھا۔ میں قسطینا اور ولید وغیرہ وہاں پہنچے تو خبر واقعی توجہ طلب تھی۔ نیوز کاسٹر قیصر چوہدری کی موت کی سنسنی خیز خبر دے رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''پولیس ترجمان بھی ابھی اس سلسلے میں کھل کر بات نہیں کر رہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ شاہ زیب عرف ایسٹرن اب پولیس کی حراست میں نہیں ہے۔ پہلے یہ خیال ظاہر کیا جا رہا تھا کہ شاید وہ پولیس مقابلے میں ہلاک کیا جا چکا ہے مگر اب ایک دوسری رائے بھی سامنے آ رہی ہے...... اور وہ یہ ہے کہ شاہ زیب کو پولیس کی حراست سے نکالنے کے لیے رائے ونڈ روڈ کی ایک عمارت پر باقاعدہ ہلا بولا گیا ہے۔ ہلا بولنے والوں میں بھاؤ گینگ کے علاوہ شاہ زیب کے کچھ غیر ملکی دوست بھی شامل ہیں اور یہاں کافی جانی نقصان بھی ہوا ہے۔''

تب نیوز کاسٹر نے اپنے فیلڈ رپورٹر سے رابطہ کیا۔ فیلڈ رپورٹر نے ہانپی سانسوں کے ساتھ گہری تاریکی میں نیم روشن عمارت کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔ ''ناظرین! یہ ہے وہ بلڈنگ جہاں مبینہ طور پر ایک زبردست پولیس مقابلہ ہوا ہے۔ آس پاس کے لوگوں کا کہنا ہے کہ رات ساڑھے گیارہ بجے کے لگ بھگ اس عمارت کی جانب سے تابڑ توڑ فائرنگ کی آوازیں قریباً آدھ گھنٹے تک سنائی دیتی رہی ہیں۔''

نیوز کاسٹر نے پوچھا۔ ''ڈی ایس پی قیصر چوہدری صاحب کے بارے میں کیا پتا چلا ہے؟ کیا وہ اسی عمارت میں زخمی ہوئے تھے؟''

''جی پولیس ذرائع ابھی اس بارے میں کوئی بات نہیں کر رہے۔ میڈیا کو بھی عمارت

تک رسائی نہیں دی جارہی لیکن غالب امکان یہی ہے کہ قیصر چوہدری اسی عمارت میں فائرنگ کے سخت تبادلے کے دوران میں زخمی ہوئے اور پھر حملہ آور ان کو اپنے ساتھ لے گئے۔ راستے میں قیصر چوہدری نے چلتی گاڑی سے کود کر بچ نکلنے کی کوشش کی نتیجے میں وہ شدید زخمی ہو گئے۔''

''کیا...... قیصر چوہدری نے وہیں سڑک کے کنارے دم توڑا یا پھر انہیں اسپتال پہنچایا گیا؟''

''نہیں جی...... بدقسمتی کی بات ہے کہ وہ شدید زخمی ہو کر وہیں سڑک کے کنارے قریباً آدھے گھنٹہ تڑپتے رہے۔ تیز رفتار گاڑیاں ان کے پاس سے گزرتی رہیں لیکن کسی نے رک کر ایک جاں بلب انسان کی مدد کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بعدازاں جب پولیس موقع پر پہنچی تو قیصر چوہدری اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کر چکے تھے۔ اطلاعات کے مطابق ان کے جسم پر گولیوں کے دو زخم بھی ہیں لیکن یقینی بات ہے کہ اگر وہ بروقت اسپتال پہنچ جاتے تو ان کی جان بچائی جاسکتی تھی۔''

نیوز ریڈر نے کہا۔ ''کچھ ایسی خبریں بھی سننے میں آرہی ہیں کہ اس اندوہناک واقعے میں مشہور سماجی شخصیت لالہ وریام بھی اپنی جان کی بازی ہار گئے ہیں؟''

''جی ہاں، ایسی خبریں بھی مل رہی ہیں لیکن ابھی یہ تصدیق نہیں ہوسکی۔ بہت سے سوال ذہنوں میں ابھر رہے ہیں۔ جیسے ایک یہ سوال کہ اگر شاہ زیب ایسا ہی خطرناک مجرم تھا تو اسے شہر کے کسی محفوظ تھانے میں رکھنے کے بجائے شہر سے باہر اس الگ تھلگ بلڈنگ میں کیوں لے جایا گیا۔ پھر وہ کون غیر ملکی تھے جنہوں نے داؤد گینگ کے ساتھ مل کر شاہ زیب کو چھڑایا...... اور کیا یہ بات بھی سچ ہے کہ اس عمارت میں پہلے سے بھی کچھ غیر ملکی موجود تھے؟''

نیوز کاسٹر نے ناظرین کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''جوں جوں خبریں آرہی ہیں، اس معاملے کے کچھ نئے پہلو بھی سامنے آرہے ہیں۔ کچھ لوگ اس واقعے میں ٹیکساری گینگ کے ملوث ہونے کا شبہ بھی ظاہر کررہے ہیں۔ بہرحال ہم آپ کو اس سلسلے میں مکمل طور پر آگاہ رکھیں گے......''

نیوز ختم ہوگئی اور دوسری نیوز ٹیلی کاسٹ ہونے لگیں لیکن میرا ذہن وہیں قیصر چوہدری والی نیوز میں اٹکا ہوا تھا۔ نیوز کاسٹر کے الفاظ کانوں میں گونج رہے تھے...... وہ سڑک کے کنارے آدھا گھنٹہ تڑپتے رہے، تیز رفتار گاڑیاں ان کے پاس سے گزرتی رہیں۔

میں نے ایک طویل سرد آہ بھری، کبھی سڑک کے کنارے ایک اور شخص بھی تو تڑپا تھا۔

تیز رفتار گاڑیاں اس کے پاس سے بھی تو گزرتی رہی تھیں۔ پھر پردیس سے اپنے وطن آنے والے ایک شخص نے سڑک کے کنارے سے اس زخمی کو اٹھایا تھا اور اسپتال پہنچا کر اس کی جان بچائی تھی۔ اس نیکی کا صلہ اسے کیا ملا تھا؟ ہاں، اس نیکی کا صلہ مجھے کیا ملا تھا؟ وہ میں ہی تو تھا جسے اس جرم بے گناہی میں تھانے میں بند کر دیا گیا تھا اور وہ پولیس افسر قیصر چوہدری ہی تو تھا جس نے مجھے بند کیا تھا، سخت توہین اور گالی گلوچ کا نشانہ بنایا تھا...... معاشرے ایسے ہی بنتے ہیں، روایات ایسے ہی پروان چڑھتی ہیں۔ انسان کے اعمال اکثر لوٹ کر اس کی طرف آتے ہیں۔ جو کچھ برسوں پہلے زخمی عارف کے ساتھ ہوتے ہوتے رہ گیا تھا، وہ آج رات اس خودسر پولیس افسر قیصر چوہدری کے ساتھ ہو گیا تھا۔

○......❖......○

داؤد بھاؤ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ یہ عمارت ہمارے لیے ایک محفوظ پناہ گاہ تھی۔ دور دور تک کسی خطرے کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ اس فارم ہاؤس میں جو چار پانچ ملازم موجود تھے، وہ درحقیقت داؤد بھاؤ کے خاص الخاص آدمی تھے۔ دیکھنے میں سیدھے سادے مزدور مگر اصل میں گھاگ گینگسٹرز۔

عمارت سے باہر کئی ایکڑ تک ایک قدرتی ماحول تھا۔ یہاں چار دیواری کے ساتھ ساتھ بانس اور پاپولر کے بے شمار پودے لگے ہوئے تھے۔ احاطے کے بیچوں بیچ پھولوں کے تختے تھے جن میں گلاب، موتیا، نرگس، گیندا اور گل لالہ کثرت سے دکھائی دیتے تھے۔ بھینسوں اور بکریوں کے لیے علیحدہ باڑے تھے اور ایسا انتظام کیا گیا تھا کہ کسی طرح کی بو رہائشی عمارت کی جانب نہیں آتی تھی۔

رات کی بارش کے بعد موسم بہت نکھرا ہوا تھا۔ ایک چمکیلے دن کی پہلی کرنیں کھڑکیوں، دروازوں پر دستک دے رہی تھیں۔ قسطینا اور فارس میرے ساتھ گفتگو میں مصروف تھے، کسی وقت ناوان بھی ایک دو جملے بول دیتا تھا۔ قسطینا کہہ رہی تھی۔ ”ہاناوانی نے رائے زل کے انتقام کے لیے جو قسم کھائی تھی، اس کا تو پہلے ہی بہت چرچا تھا لیکن جب محترم حاذق ذکری کو شہید کیا گیا تو لوگوں کو پورا یقین آ گیا......“

”جناب حاذق ذکری والے واقعے نے ہمیں بھی بہت صدمہ پہنچایا۔ ایک شاک کی سی کیفیت تھی۔“ میں نے افسردہ لہجے میں کہا۔

”بے شک یہ دردناک واقعہ تھا۔ محترم حاذق ذکری کا ایک نہایت قریبی مرید، ہاناوانی کے ٹرانس کا شکار ہوا۔ محترم کے پیٹ میں گہرے گھاؤ لگا کر انہیں ایک تنہا جگہ تڑپنے کے لیے

چھوڑ دیا گیا۔'' قسطینا نے اس واقعے کو یاد کر کے جھرجھری سی لی پھر ذرا توقف کر کے بولی۔
''ہمارے دو اہم کمانڈر بھی اسی طرح ہاناوانی کے انتقام کا شکار ہو چکے ہیں۔ ان غم ناک حالات میں جب ہمیں تمہارے زندہ ہونے کی خبر ملی تو یہ شادیٔ مرگ والی کیفیت تھی۔ یقین کرو شاہ زائب، پورے جاماجی میں اس کی خوشی منائی گئی......''
''لیکن اس کے پوراً (فوراً) بعد ہی دکھ اور پریشانی کا جھونکا بھی آ گیا۔'' فارس جان نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہاں پاکستان سے یہ اطلاع جاماجی میں پہنچا کہ وہ کمینی عورت اب یہاں پاکستان میں ہے، ام سمجھ گیا کہ وہ یہاں کیوں ہے۔''
میں نے کہا۔ ''لیکن ہاناوانی کے یہاں ہونے کی اطلاع تو میں نے پہلے ہی جاماجی پہنچا دی تھی۔''
''لیکن اس کا تصدیق بعد میں ہوا محترم برادر۔'' فارس اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔
اگلے آدھ پون گھنٹے میں قسطینا اور فارس نے اپنی یہاں آمد کے بارے میں جو کچھ بتایا اس کا لبِ لباب یہ تھا...... قسطینا، فارس جان اور ناوان، زینب سمیت چھ روز پہلے جاماجی سے برونائی اور پھر پاکستان پہنچے۔ ابراہیم بھی آنا چاہتا تھا لیکن جاماجی کا فرمانروا ہونے کی وجہ سے اس پر ذمے داریاں تھیں۔ قسطینا وغیرہ کے ساتھ گرین فورس کے دس دلیر جوان بھی یہاں پہنچے تھے۔ قسطینا اور فارس نے یہاں اپنی آمد بالکل خفیہ رکھی تھی۔ ان کا قیام لاہور ہی کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں تھا۔ زینب بھی اپنی ذاتی خادمہ کے ساتھ وہیں ہوٹل میں تھی۔
میں نے قسطینا سے پوچھا۔ ''داؤد بھاؤ کے ساتھ آپ کا رابطہ کیسے ہوا؟''
''یہ رابطہ ہم نے جاماجی سے روانہ ہوتے وقت ہی کر لیا تھا مگر ایسا ہو نہ سکا۔ یہ رابطہ یہاں پاکستان آنے کے بعد اس وقت ہوا جب پولیس تمہیں اور رضوان کو اٹھا کر لے جا چکی تھی۔ ہم جانتے تھے کہ اگر ہم اس شہر میں کوئی کارروائی کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے داؤد بھاؤ کا لاجسٹک تعاون ضروری ہوگا۔''
فارس جان نے لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''برادر شاہ زیب! آپ دیکھیں کیسا الٹ پلٹ ہوا ہے۔ ام جب پاکستان کے لیے روانہ ہوئے تھے تو امارا خیال تھا کہ آپ کو اصل خطرہ ہاناوانی کی طرپ سے ہے لیکن یہاں آ کر پتا چلا کہ ادھر کا پولیس آپ کا جانی دشمن بنا ہوا ہے......اور آپ اس کے قبضے میں ہے۔''
''پولیس کے قبضے میں بھی ہم ہاناوانی کی وجہ سے ہی گئے ہیں فارس۔'' میں نے کہا۔
''دراصل یہ ہاناوانی ہی ہے جس نے خورسنہ کو اپنے ٹرانس میں...... لے کر میرے زندہ ہونے کا

سراغ لگایا...... یہ سراغ ایک مخبر عورت کی وجہ سے پولیس تک بھی پہنچ گیا اور مجھے بالکل غیر متوقع طور پر ہوٹل سے پکڑ لیا گیا۔''

''لیکن یہ ٹیکساری والے بیچ میں کیسے کود ے؟'' قسطینا نے اپنے بوائے کٹ بالوں کو پیشانی سے ہٹاتے ہوئے اپنے مخصوص فوجی لہجے میں پوچھا۔

''ٹیکساری والوں کی جان تو نکل چکی ہے یور ہائی نس! بس یہ چند بچے کھچے افراد ہی ہیں۔ان میں سے بھی کل کئی مارے گئے ہیں۔ان کو ملوث کرنے کا سہرا شکیل داراب اور اس کے پلیپے دوستوں کے سر ہے،ان کا خیال تھا کہ ڈیتھ اسکواڈ کے لوگ ہمیں زیادہ اذیت ناک موت دے سکیں گے۔''

میں نے ذرا توقف کر کے قسطینا سے پوچھا۔''لیکن یور ہائی نس! آپ لوگ ہم تک پہنچے کیسے؟''

''اس کا زیادہ کریڈٹ تو داؤد بھاؤ کو ہی جاتا ہے شاہ زائب! وہ گینگسٹر تو ہے لیکن گریٹ بھی ہے۔شاید اسے گریٹ گینگسٹر کہنا بھی غلط نہ ہوگا۔یہ شہر اس کے ہاتھ کی ہتھیلی کی طرح ہے۔اس کی نظر میں پانچ ایسے ٹھکانے تھے جہاں تمہارا دشمن ڈی ایس پی (قیصر چوہدری) تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو رکھ سکتا تھا۔ان میں سے دو تو تھانے تھے اور تین پرائیویٹ جگہیں تھیں۔داؤد بھاؤ نے ان پانچوں جگہوں کی ''ریکی'' کروائی اور آخر مطلوبہ جگہ ڈھونڈ لی۔''

فارس جان بولا۔''امارا خیال تھا کہ داؤد بھاؤ صیب خود بھی امارے اس آپریشن میں شریک ہوگا......لیکن لگتا ہے کہ وہ پیچھے رہ کر کام کرنے والا آدمی ہے۔''

''ایسا ہی ہے۔'' میں نے کہا۔''وہ بے حد نڈر آدمی ہے لیکن ہمیشہ پیچھے رہ کر اپنے مہروں کو حرکت دیتا ہے۔اس کے کام کا یہی طریقہ ہے۔''

اسی دوران میں قسطینا نے ہوٹل میں زینب سے ٹیلی فونک رابطہ قائم کیا اور پھر فون مجھے تھما دیا۔دوسری طرف وہی نازک آواز والی چھوئی موئی سی زینب تھی۔آج میں ایک عرصے بعد اس کی آواز سن رہا تھا۔اس نے صرف ''بھائی جان'' کہا اور پھر سسکیوں کے ساتھ روتی چلی گئی۔وہ کوشش کے باوجود کچھ بول نہیں پا رہی تھی، میں نے کہا۔''یہ خوشی کا موقع ہے زینب! اور تم رو رہی ہو۔''

وہ بمشکل بولی۔''مجھے یقین نہیں آرہا کہ آپ کو کھو کر دوبارہ پایا ہے۔اب دل کانپ رہا ہے......کہ......آپ پر پھر کوئی......مصیبت نہ آجائے۔''

''مجھے کچھ نہیں ہوگا ان شاء اللہ......آپ بے فکر رہیں یور ہائی نس۔'' میں نے اسے چھیڑنے والے انداز میں کہا۔

وہ پھر سسکیاں بھرنے لگی۔ میں نے پوچھا۔''اور ہمارے دولہا میاں کیسے ہیں؟''

''وہ بالکل ٹھیک ہیں......اور آپ سے ملنے کے لیے بہت بے قرار بھی۔ ہم کب آپ کو دیکھ سکیں گے۔ میرے لیے تو ایک ایک منٹ کاٹنا مشکل ہو رہا ہے۔''

''بہت جلد مجھے دیکھ سکو گی......اور صرف مجھے ہی نہیں، سب کو دیکھو گی۔ اپنے گاؤں کو......اپنے عزیزوں کو......سہیلیوں کو۔ بہت جلد سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

زینب کو تسلی تشفی دے کر ہم رضوان کی خبر گیری کے لیے گئے۔ رہائش گاہ کا یہ کمرا بالکل کسی جدید اسپتال کا کمرا لگتا تھا۔ ڈاکٹر نے بتایا۔''زخموں کی بینڈ یج کی جا چکی ہے۔ بلڈ پریشر نارمل ہے۔ ابھی ٹرنکولائزرز دے رکھی ہیں، اس لیے سو رہے ہیں۔''

''اور جہاں سے گوشت نکالا گیا ہے؟'' قسطینا نے انگلش میں پوچھا۔

''وہاں گہرے گھاؤ ہیں۔ ممکن ہے کہ ان دو جگہوں پر بعد میں پلاسٹک سرجری والی تکنیک اپنانا پڑے۔''

رضوان کی تسلی بخش حالت دیکھ کر ہمیں کچھ اطمینان محسوس ہوا۔ اب بس فخر اور پہلوان حشمت کی طرف سے کچھ فکر تھی۔ میں اور قسطینا ایک روش پر ٹہلتے ہوئے بانس کے طویل درختوں کی طرف چلے گئے۔ قسطینا نے تاجور کا ذکر چھیڑ دیا۔ وہ دل گیر لہجے میں بولی۔''شاہ زائب! جب یہ بات کنفرم ہوگئی کہ تم دنیا میں نہیں رہے ہو تو اس نے ایک مشرقی لڑکی کی طرح اپنے آنسو پونچھے اور کسی اور کی ہوگئی۔ اب جب اسے پتا چلا ہوگا کہ تم حیات ہو تو اس پر کیا گزری ہوگی؟''

میں قسطینا کو کیسے بتاتا کہ وہ میری ''زندگی'' میں ہی کسی اور کی ہوگئی تھی۔ اپنی شادی سے پہلے ہی وہ جان گئی تھی کہ میں زندہ ہوں۔

''چپ کیوں ہوگئے ہو؟ تم بھی بہت دکھی ہوناں؟'' وہ افسردگی سے بولی۔

''اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔'' میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

''کبھی ملاقات ہوئی اس سے؟'' قسطینا نے ایک رازدار دوست کی طرح مجھ سے پوچھا۔

''ہاں ایک دفعہ ہوئی......وہ اپنی دنیا میں مگن ہو چکی ہے قسطینا۔'' میں نے مختصر جواب

دیا۔

''وہ تم سے...... بہت محبت کرتی تھی...... بہت زیادہ۔'' قسطینا نے بھرائی آواز میں کہا پھر ذرا توقف کر کے بولی۔ ''جاماجی میں یہ بات مشہور ہے کہ جب تم لڑائی کے میدان میں تھے تو تاجور نے تمہاری خیر، سلامتی کے لیے ایک بہت بڑی رقم ''ڈونیشن'' میں دی تھی...... بہت خطیر رقم......''

''ہاں یہ بات مرحوم حاذق ذکری نے مجھے اپنے ایک خط میں بتائی تھی۔''

وہ بولی۔ ''یہ وہی رقم تھی جو ایک کتاب کی رائلٹی کے حصے میں سے اسے ملی تھی اور ایک کروڑ اسّی لاکھ کوئی معمولی اماؤنٹ نہیں ہوتی، ایک عام بندہ اپنی پوری زندگی سنوار سکتا ہے لیکن اس نے کھڑے کھڑے یہ رقم حاذق ذکری صاحب کے سپرد کر دی۔''

''چلو اچھا ہوا۔ اس نیکی کا صلہ اسے ملا...... اور اب وہ ایک ارب پتی کی بیوی ہے۔''

''تم شاید، اس پر طنز کر رہے ہو لیکن یہ حقیقت ہے شاہ زائب کہ تاجور کی ڈونیٹ کی ہوئی اس رقم سے جنگ کے بے شمار زخمیوں خاص طور سے بچوں کا علاج ہوا اور ان کو نئی زندگی ملی۔ بہرحال جو بات میں تم سے شیئر کرنا چاہ رہی ہوں، وہ یہ ہے کہ تاجور کے حوالے سے کبھی کوئی بدگمانی ذہن میں نہ لانا۔ اسے اپنی نیک دعاؤں میں یاد رکھو۔ وہ بہت...... بہت مختلف لڑکی ہے۔''

میں نے موضوع بدلا اور قسطینا سے جاماجی کے حالات دریافت کرنے لگا...... اور وہ بتانے لگی کہ وہاں نوجوان ابراہیم نے کس خوبی سے اپنے والد ریان فردوس کی کمی پوری کی ہے اور جنگ زدہ جزیرے کو بحال کر رہا ہے۔

یکایک ولید کی بلند آواز نے ہمیں چونکایا۔ ''شاہ زیب بھائی ادھر آؤ...... دیکھو...... یہ کیا خبر آ رہی ہے۔''

میں نے مڑ کر دیکھا۔ فارس جان، ناوان، بنارس وغیرہ کے چہروں پر بھی ہیجانی کیفیت تھی۔ ہم مڑے اور تیزی سے کامن روم کی ایل سی ڈی کے سامنے پہنچے۔ یہاں ایک اور سنسنی خیز خبر چل رہی تھی۔ اس خبر کا تعلق دارج داراب سے تھا۔ بتایا جا رہا تھا کہ دارج صاحب جو علاج کی غرض سے یہاں لاہور میں مقیم ہیں ایک حادثے سے بال بال بچے ہیں۔ یہ عجیب حادثہ ہے۔ بظاہر اس پر یقین کرنا مشکل ہے مگر شواہد بتا رہے ہیں کہ ایسا کچھ ہو چکا ہے۔ مبینہ طور پر رات کو پرندوں کے ایک جھنڈ نے دارج صاحب کی رہائش گاہ پر حملہ کیا۔ رکھوالی کے ایک کتے کو مار ڈالا، کھڑکیوں کے شیشے توڑ دیئے اور دارج صاحب کے

بیڈ روم تک گھسنے کی کوشش کی مگر وہاں چونکہ جالیاں لگی ہوئی تھیں اس لیے یہ کوشش ناکام رہی۔ تاہم کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ پرندے نہیں چمگادڑیں تھیں...... کیونکہ اس قسم کے واقعات چمگادڑوں وغیرہ سے منسوب کیے جاتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں یہ ایک انوکھا اور عجیب واقعہ ہے۔

اس کے بعد دارج کی رہائش گاہ کی ایک فوٹیج دکھائی جانے لگی۔ پالتو کتے کی لاش نظر آئی۔ کھڑکیوں کے ٹوٹے ہوئے شیشے اور کہیں کہیں کھرونچوں کے نشان بھی نظر آئے۔

نیوز کاسٹر نے ایک ایکسپرٹ کو آن لائن لیا۔ وہ کہنے لگا۔ ''یہ سب کچھ روٹین سے ہٹ کر ہے۔ بالفرض یہ چمگادڑیں بھی ہوں تو اس طرح کا جارحانہ رویہ وہ شہری آبادیوں میں اختیار نہیں کرتیں، لیکن شواہد بتا رہے ہیں کہ یہ جو جاندار بھی ہیں ایک جنونی کیفیت کا شکار ہیں۔ چند روز پہلے بھی لاہور کے مضافات میں اس طرح کا ایک واقعہ رپورٹ ہو چکا ہے۔ اس میں کہا گیا تھا کہ خوش رنگ طوطوں کے جھنڈ نے کچھ افراد پر حملے کیے اور انہیں نقصان پہنچایا......''

اسی دوران میں دارج کی رہائش گاہ کی ایک تازہ فوٹیج اسکرین پر دکھائی جانے لگی۔ اس میں کوٹھی کا ایک ملازم ہاتھوں میں دو مردہ چمگادڑیں لیے کھڑا تھا۔ ان میں سے ایک چمگادڑ فائر سے ہلاک ہوئی تھی اور دوسری کو غالباً ہلاک ہونے والے کتے نے اپنے دفاع میں مارا تھا۔ نیوز کاسٹر نے جوشیلے لہجے میں کہا۔ ''جی ناظرین! ابھی جو بات ہم کہہ رہے تھے، اس کا ایک واضح ثبوت سامنے آ گیا ہے۔ پرندوں والی جو بات کی جا رہی تھی وہ کم از کم موجودہ واقعے میں تو غلط ثابت ہوئی ہے۔ یہاں ان خونی چمگادڑوں نے حملہ کیا ہے۔ آپ ذرا ان کا سائز ملاحظہ فرمائیں۔''

ایکسپرٹ نے کہا۔ ''آپ نے بجا کہا۔ ان کا شمار بڑی چمگادڑوں میں کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے اکثر باغات میں یہ پائی جاتی ہیں لیکن میں ایک بار پھر کہوں گا کہ ان کا اس طرح جھنڈ کی صورت میں شہری آبادی میں حملہ آور ہونا بالکل...... جی ہاں بالکل غیر معمولی بات ہے۔'' ایکسپرٹ کے لہجے سے حیرت ٹپکی پڑ رہی تھی۔

نیوز ختم ہوئی تو ہم دوسرے کمرے میں چلے آئے۔ قسطینا نے کہا۔ ''یہ شہر اور یہاں کے لوگ ہاناوانی کو نہیں جانتے اس لیے وہ ششدر ہیں لیکن ہمارے لیے اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ وہ بدباطن عورت اس سے بھی بڑے عجوبے وجود میں لا سکتی ہے۔ میں پورے

یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ یہ حملہ تاجور پر تھا اور ہاناوانی کی طرف سے تھا۔''

بات ختم کر کے قسطینا سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھنے لگی۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

قسطینا بپھرے لہجے میں بولی۔ ''ہمیں حرکت میں آنا ہوگا شاہ زائب! وہ ہاناوانی کے نشانے پر آگئی ہے۔ ہم نے کچھ نہ کیا تو اس کو خدانخواستہ کوئی بڑا نقصان اٹھانا پڑ جائے گا۔''

''تو پھر ہم کیا کر سکتے ہیں؟''

''تم کیوں کچھ نہیں کر سکتے؟'' قسطینا نے الٹا مجھ سے سوال کیا۔

میں اسے کیسے بتاتا کہ میں اب دارج کی رہائش گاہ پر نہ جانے کی قسم کھا چکا ہوں اور تاجور کو بھی یقین دلا چکا ہوں کہ میں اپنا ''برا'' چہرہ اس کو نہیں دکھاؤں گا۔

مجھے خاموش دیکھ کر قسطینا نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے پہلوؤں پر رکھے اور بولی۔ ''اگر تم نہیں جانا چاہتے شاہ زائب تو نہ جاؤ، میں جاؤں گی۔ میں خود ملوں گی اس سے۔ اسے بتاؤں گی کہ اس کے اردگرد کیا کچھ منڈلا رہا ہے۔''

''اس کا شوہر بہت کرخت مزاج ہے قسطینا! وہ آپ کی اس جسارت کے بدلے میں تاجور کی زندگی اور مشکل کر دے گا۔''

قسطینا کی آنکھوں میں حیرت نظر آئی۔ ''شاہ زائب! تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ...... تاجور اپنے گھر میں...... خوش نہیں ہے؟''

مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میں ایسی غلطی کم ہی کرتا تھا لیکن پتا نہیں کیوں بے دھیانی میں بے ساختہ یہ بات میرے منہ سے نکل گئی تھی۔

میں نے بات کو سنبھالنے کی کوشش کی اور قسطینا کو بتایا کہ بیماری کی وجہ سے وہ چڑچڑا ہو گیا ہے۔ اس لیے کبھی کبھی ہائپر ہو جاتا ہے۔

قسطینا گہری نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی پھر عزم سے بولی۔ ''کچھ بھی ہے شاہ زائب! اگر تم اسے خطرے سے آگاہ نہیں کرو گے تو میں کروں گی۔ مجھے ایسی خاموشی منظور نہیں جس سے تاجور جیسی لڑکی کی زندگی کو خطرہ لاحق ہو جائے۔''

میں چپ رہا لیکن دل ہی دل میں قسطینا کے فیصلے کو سراہ رہا تھا۔

اسی دوران میں اس ڈاکٹر کی شکل نظر آئی جو رضوان کا علاج کر رہا تھا۔ اس نے آ کر مجھ سے کہا۔ ''شاہ زیب صاحب! مریض آپ کو یاد کر رہا ہے۔ وہ اب پوری طرح ہوش میں ہے۔''

میں رضوان کے کمرے میں پہنچا تو وہ دبیز تکیے سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔ اس کا چہرہ اب بھی ہلدی کی طرح زرد تھا مگر آنکھوں میں حوصلے کی چمک تھی۔ اس نے نحیف آواز میں کہا۔ ''شاہ زیب بھائی! آپ نے فخر یا پہلوان سے فون پر رابطے کی کوشش کی ہے؟''

''ان دونوں کے نمبر مسلسل خاموش ہیں رضوان۔ ان دونوں کی طرف سے بھی ابھی تک کوئی رابطہ نہیں ہوسکا۔ میرا اور تمہارا موبائل پولیس نے قبضے میں لے لیا تھا۔''

وہ بولا۔ ''میرے پاس پہلوان جی کا ایک اور نمبر ہے، آپ اس پر کوشش کر کے دیکھیں۔'' رضوان نے مجھے نمبر دیا۔

میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ کوشش کی۔ بیل جانا شروع ہوگئی اور پھر تھوڑی دیر بعد پہلوان کی ڈری ڈری آواز آئی۔ ''کون بولت ہے؟''

میں نے اندازہ لگایا کہ پہلوان کسی کھلی جگہ پر ہے۔ پرندے چہچہا رہے تھے۔ کوّوں کی کائیں کائیں بھی سنائی دیتی تھی۔ کہیں دور کوئی ٹریکٹر چل رہا تھا۔ ایسا کوئی خطرہ نہیں تھا کہ پہلوان پولیس کی حراست میں ہو۔

میں نے کہا۔ ''میں شاہ زیب بول رہا ہوں۔''

پہلوان جیسے چلا اٹھا۔ ''تم ٹھیک تو ہوناں، پولیس نے تم پر تشدد تو ناہیں کیا اور رضوان بھی تمہارے ساتھ ہی ہے ناں؟''

''بالکل میرے ساتھ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اور آپ کس جنگل میں ہو؟''

''جنگل میں؟''

''ہاں جب لوگ پولیس سے بھاگ کر مفرور ہوتے ہیں تو پہاڑ میں یا جنگل میں ہی تو چھپتے ہیں۔ یہ پوٹھوہار کا سارا علاقہ قدرت نے آپ اور فخر جیسے مفروروں کے لیے ہی تو بنا رکھا ہے۔''

میرے لب و لہجے سے پہلوان کو یقین ہوگیا کہ ہم بالکل خیریت سے ہیں، وہ جوش سے بولا۔ ''تم کو خدا کا واسطہ ہے شاہ زیب! اپنی خیریت کی اطلاع ذرا جلدی سے اس فخر کو بھی دو۔ ورنہ مجھ کو پکا یقین ہے کہ شام تک اس نے پولیس کے کسی بڑے افسر کو اغوا کر لینا ہے اور اس کے بدلے تمہاری رہائی کا...... وہ...... کر دینا ہے۔''

''مطالبہ۔'' میں نے پہلوان کے لیے درست لفظ ڈھونڈا۔

''بالکل مطالبہ، اور شاید تم جانت ناہیں ہو، میں 23 مارچ کو پیدا ہوا تھا۔ مجھ کو پاکستان

سے اور پاکستان کے قانون سے بہت زیادہ محبت ہے، اور پولیس مقابلے کا تو میں نے کبھی سوچا بھی ناہیں۔ اگر مجھ جیسے قانون پسند کو پوٹھوہار کی پہاڑیوں میں چھپنا پڑے تو بڑی شرم کی بات ہے۔''

میں نے کہا۔ ''پہلوان جی! فی الحال چھپنا تو ہم کو پڑے گا ہی لیکن اس کے لیے ایک بڑی مناسب سی جگہ میسر آ گئی ہے۔ فخر کہاں ہے، اس سے بات کرائیں۔''

فخر بھی کہیں آس پاس ہی موجود تھا۔ وہ فون پر آ گیا۔ اس نے بتایا کہ یہ شیخوپورہ سے آگے ایک گاؤں ہے۔ یہاں پہلوان جی کا ہی ایک شاگرد ہے جس کے گھر میں وہ موجود ہیں۔ پہلوان کی طرح فخر تک بھی ابھی یہ خبر نہیں پہنچی تھی کہ ہم پولیس کی کسٹڈی سے نکل چکے ہیں۔ میں نے اسے اس بارے میں بتایا لیکن فون پر ساری تہلکہ خیز تفصیل تو نہیں بتائی جا سکتی تھی۔ فخر یہاں کے راستوں اور جگہوں سے زیادہ واقف نہیں تھا۔ میں نے پہلوان کو سمجھایا کہ ہم کہاں ہیں اور ان دونوں کو کس طرح یہاں پہنچنا ہے۔ میں نے اسے پولیس سے محتاط رہنے کی ہدایت بھی کی لیکن پہلوان پولیس سے زیادہ ان پُراسرار واقعات سے خوف زدہ تھا جو ہمارے اردگرد پیش آ رہے تھے۔ اس نے فون پر ہی مجھے ایک دو وظیفے بھی بتا دیئے...... اور یہ بھی بتایا کہ ہوائی چیزیں کن کن شکلوں میں ظاہر ہو سکتی ہیں، وہ بولا۔ ''یہ ہوائی چیزیں ہمارے آس پاس موجود کسی بھی بندے کا روپ دھار سکت ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''یہ تو بڑی خطرناک چیز ہے۔ اب مجھے کیا پتا کہ میں جس سے فون پر بات کر رہا ہوں، وہ پہلوان حشمت ہے یا کوئی ہوائی چیز؟''

''تم مذاق کرت ہو۔ مذاق کرنے والوں کو یہ چیزیں کبھی معاف ناہیں کرتیں...... میں آ کر تمہیں سب کچھ سمجھاوت ہوں۔''

پہلوان سے بات ختم کر کے میں ایک بار پھر ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہاں خون آشام چمگادڑوں کا ذکر پھر ہو رہا تھا۔ ایک نیوز پرسن کا خیال تھا کہ قریب ہی باغِ جناح میں شہد کی مکھیوں اور چمگادڑوں کی بہتات ہو گئی ہے اور یہ چمگادڑیں وہیں سے اُڑ کر حملہ آور ہوئی ہیں۔ باقی سب افواہیں ہیں۔

میں نے جب اس خبر کا انگلش ترجمہ کر کے قسطینا کو بتایا تو وہ بولی۔ ''لوگ یہاں اس معاملے کو اتنی سنجیدگی سے نہیں لے رہے، جتنی سنجیدگی سے انہیں لینا چاہیے۔''

فارس جان مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ ''ام کو لوگوں کو یقین دلانا پڑے گا کہ یہاں بہت کچھ انوکھا ہو رہا ہے...... مزید بھی ہو سکتا ہے...... اور اس کے پیچھے ایک ایسا عورت کا ہاتھ

ہے جو ہپناٹزم کا ماہر ہے بلکہ اس فیلڈ میں کچھ زیادہ ہی آگے نکلا ہوا ہے۔ وہ انسانوں اور جانوروں کے ذہنوں کو ناقابلِ یقین طریقے سے کنٹرول کرسکتا ہے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے فارس جان؟ یہ چمگادڑیں کسی ٹرانس میں تھیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ایک سو ایک پی صد۔ میں نے وہاں جاما جی میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، یہ ہاناوانی جس کھلی قبر میں راتیں گزارتا تھا وہاں قبرستان کے درختوں پر دن کے وقت بے شمار چمگادڑیں الٹا لٹکا نظر آتا تھا خو یہ بات مشہور تھا کہ یہ چمگادڑیں بھی ہاناوانی کے معمولوں میں شامل ہے۔ اس کے علاوہ قبریں کھودنے والے بجو...... سانپ...... نیولے اور پتا نہیں کیا کیا الا بلا وہ اپنے گرد جمع کر لیتا تھا۔ یہ عورت خوف کا علامت تھا شاہ زیب بھائی......اور اب بھی خوف کا علامت ہے۔ خوام کو جلد از جلد اس کا سدِباب کرنا ہوگا ورنہ یہ اپنا مشن پورا کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔''

میں نے کھڑکیوں سے باہر دیکھا۔ یہ دوپہر کا وقت تھا۔ صاف نیلا آسمان خوب روشن تھا۔ بس کہیں کہیں کسی پرندے کے آثار نظر آتے تھے۔ بہت عرصے بعد میں نے آسمان کو اتنے غور سے دیکھا تھا اور میں نے محسوس کیا کہ ''اس دیکھنے میں'' ایک طرح کی تشویش بھی شامل تھی۔

O......❖......O

یہ ایک پُرسکون بارڈر ایریا تھا۔ پہلوان حشمت بھی فخر کو لے کر یہاں پہنچ چکا تھا۔ فخر اور پہلوان حشمت میری بدلی ہوئی صورت کو دیکھ کر ازحد حیران ہوئے تھے۔ خاص طور سے پہلوان کو تو بالکل ہی یقین نہیں آرہا تھا کہ میں اپنی اصل شکل صورت میں واپس آچکا ہوں۔ وہ ہوائی چیزوں سے اتنا ڈرا ہوا تھا کہ ہر بات میں خوف اور اسرار کا پہلو ڈھونڈ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''کچھ سمجھ میں نہیں آوت کہ کون اپنا ہے اور کون بیگانہ۔ کبھی کبھی تو اپنے اوپر بھی شک ہونے لگت ہے کہ میں بھی حشمت ہوں یا نہیں۔ عجب الجھن ہے۔

کرے کوئی بھرے کوئی
مجرم کوئی ڈرے کوئی
چور چالاکو ہوتا ہے
پلس ہتھے چڑھے کوئی

فخر نے کہا۔ ''آپ پہلوان حشمت ہی ہو جی۔ ورنہ اتنا اچھا شعر آپ کیسے بولتے۔ آپ کا ہر شعر اور محاورہ انگوٹھی میں نگینے کی طرح فٹ بیٹھتا ہے۔''

''تم لوگوں کو مذاق سوجھت ہے۔ سچ کہتے ہیں کہ عقل بڑی کہ گائے۔ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ عقل ہو تو فکر ہی فکر اور عقل ناہیں تو موج ہی موج۔ میں حیران ہوں کہ اتنے سنگین حالات میں بھی تم لوگ ہنس بول رہے ہو؟''

''زندگی اسی کا نام ہے پہلوان جی...... یہ دکھوں اور پریشانیوں کے اندر سے اپنے راستے ڈھونڈتی ہے۔'' میں نے کہا۔

''لیکن یہ صرف دکھوں اور پریشانیوں کا معاملہ ناہیں ہے۔ یہاں کالا علم چل رہا ہے بلکہ شاید اس سے بھی آگے کی کوئی چیز ہے۔ میں تو اب یہی کہوت ہوں پیر شاناں والے، سے رابطہ کرنا چاہیے۔ وہ بدارواح اور آسیب وغیرہ کے سلسلے میں بڑے کامل سمجھے جاوت ہیں۔ تم لوگوں کی عقل کام کیوں ناہیں کررہی۔ ایک بندریا قاتل جانور کا روپ دھار لیوت ہے۔ خوب صورت پالتو طوطے انسانوں پر ٹوٹ پڑت ہیں۔ چمگادڑیں ایک بارونق علاقے میں حملہ کرت ہیں اور لوگوں کو جان کے لالے پڑ جاوت ہیں۔'' پہلوان کی تقریر ایک بار شروع ہوئی تو پھر لمبی ہوتی چلی گئی۔

درحقیقت اس ساری صورتِ حال کو لوگ دو مختلف طریقوں سے دیکھ رہے تھے۔ کچھ لوگ تو اسے سراسر جادو ٹونے اور بھوت پریت سے جوڑ رہے تھے۔ ان میں پہلوان حشمت اور فیض محمد جیسے بہت سے لوگ شامل تھے۔ سجاول کے قریباً تمام ساتھی اسے ایک آسیبی عمل ہی سمجھ رہے تھے اور خوف کے عالم میں منظر سے غائب نظر آتے تھے۔ دوسرے وہ لوگ تھے جو اسے سراسر اہمیت ہی نہیں دے رہے تھے۔ وہ اس سارے معاملے کو نارمل گردان رہے تھے۔ ان میں زیادہ تر پڑھے لکھے لوگ تھے۔ میڈیا بھی اس ساری صورتِ حال میں ''لاجک'' اور وجہ ڈھونڈ رہا تھا۔

ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے فارم ہاؤس کا ایک ملازم کہیں سے انگلش کا تازہ اخبار ڈھونڈ کر لایا تھا (انگلش کا اخبار قسطینا کے لیے منگوایا گیا تھا) اس اخبار میں ایک خبر دارج داراب کے حوالے سے بھی تھی۔ اخباری نمائندے نے دارج سے اس غیر معمولی واقعے کے بارے میں پوچھا تھا جس میں چمگادڑوں نے اس کی قیام گاہ پر حملہ کیا تھا اور کھڑکیوں وغیرہ کو شدید نقصان پہنچانے کے علاوہ ایک پالتو کتے کو بھی ہلاک کر دیا تھا۔

اس خبر کے ساتھ دارج کی تصویر بھی شائع ہوئی تھی جس میں وہ ٹانگوں پر کمبل رکھے وہیل چیئر پر بیٹھا تھا۔ اس نے اپنے جواب میں سخت برہمی کا اظہار کیا تھا اور کہا تھا...... یہ سب کیا بکواس ہے۔ جس کے منہ میں جو آتا ہے، وہ بول رہا ہے۔ یہ اکیسویں صدی ہے۔ قبل از

تاریخ کا زمانہ نہیں ہے۔ اس سائنسی دور میں ایسی بے سروپا باتیں کرنے اور سننے والے پرلے درجے کے احمق ہی ہو سکتے ہیں۔ یہ صرف ایک ناخوشگوار واقعہ تھا اور معمول سے ہٹ کر تھا اس لیے اسے اتنی تشہیر مل گئی ہے۔ ایسے واقعات اس سے پہلے بھی ہو چکے ہیں۔ ابھی پچھلے برس خوشاب کے علاقے میں کسی جگہ اسی طرح چمگادڑوں نے حملہ کیا تھا اور کچھ لوگوں کو شدید زخمی کر دیا تھا۔ اس قسم کے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ بعض اوقات پرندے اور جانور کسی خاص کیفیت میں ہوتے ہیں اور مختلف ردِعمل ظاہر کرتے ہیں۔ میرے خیال میں تو وہ مادہ بندر والا واقعہ بھی اسی قسم کا ہے۔

اخباری نمائندے نے جب دارج سے ہاناوانی کی پُراسرار شخصیت اور اس کی یہاں موجودگی کے بارے میں پوچھا تو وہ پھر غصے میں آیا۔ اس نے کہا۔ ”یہ بالکل بے سروپا باتیں ہیں۔ کم از کم میں تو ان کو نہیں مان سکتا۔ میڈیا کو بھی اس سلسلے میں بہت مرچ مسالا نہیں لگانا چاہیے۔“

نمائندے نے کہا۔ ”مگر جناب! آپ کے محترم کزن شکیل داراب صاحب اس سلسلے میں بیان دے چکے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ کسی حد تک ہاناوانی کو جانتے ہیں۔ وہ واقعی ایک مختلف عورت ہے اور اس کے پاس کچھ خاص صلاحیتیں ہیں۔“

اس موقع پر دارج نے نمائندے کو شٹ اَپ کال دے کر خاموش کرا دیا...... اور کہا کہ وہ ان باتوں کو اہمیت نہیں دیتا اور نہ اس سلسلے میں کوئی بحث کرنا چاہتا ہے۔

اسی صفحے پر نیچے ایک کالم کے باکس میں ایک اور چھوٹی سی خبر موجود تھی۔ جانوروں کے ایک ماہر ڈاکٹر نے کہا تھا کہ دارج داراب صاحب کی قیام گاہ سے جو دو مردہ چمگادڑیں ملی ہیں، ان کا تفصیلی معائنہ کیا گیا ہے۔ بظاہر ان میں دیوانے پن کی کوئی علامت نظر نہیں آتی۔ مجموعی طور پر بھی وہ بالکل نارمل ہیں لیکن یہ بات معمول سے ہٹ کر ہے کہ انہوں نے ایک جھنڈ کی صورت میں ایک رہائشی علاقے میں کسی پر حملہ کیا۔

قسطینا بھی یہ خبر تفصیل سے پڑھ چکی تھی، وہ بولی۔ ”شاہ زائب! تمہارے پاس تاجور کا فون نمبر تو یقیناً ہوگا۔ تم کسی بھی طرح اس سے رابطہ کرو اور اسے سمجھاؤ کہ اس کے لیے کتنا بڑا خطرہ موجود ہے۔“

”میرے پاس اس کا فون نمبر نہیں قسطینا... اور اگر ہوتا بھی تو شاید میں اس کو کال نہ کرتا۔“

”کیا کالج کے لڑکوں جیسی باتیں کر رہے ہو شاہ زائب! تم سمجھتے کیوں نہیں۔ تاجور اور

اس کا خاوند اپنی بے پروائی کی وجہ سے بہت نقصان اٹھا سکتے ہیں...... ان کو تو اب کچھ دن تک گھر میں بالکل بند رہنا چاہیے اور اردگرد سکیورٹی ہونی چاہیے۔ اگر تاجور کا فون نمبر نہیں ہے تو اس کے خاوند سے بات کر دیا پھر مجھے بتاؤ، میں بات کرتی ہوں اس سے۔ وہ تو انگلش سمجھ لیتا ہوگا۔"

"وہ سمجھ لیتا ہے انگلش بلکہ اب تو تاجور کو بھی انگلش سکھائی جا رہی ہے مگر بات پھر وہیں پر آجاتی ہے قسطینا۔ ہمارا مشورہ کوئی نہیں سنے گا اور وہ خبیث دارج تو بالکل نہیں...... ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے ایک اور بات کا پتا چلا ہے۔"

قسطینا سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

میں نے اسے بتایا۔ "داؤد بھاؤ کا فون آیا تھا، اس نے اطلاع دی ہے کہ چند دن پہلے دارج کی ریڑھ کی ہڈی کا ایک چھوٹا سا آپریشن ہو چکا ہے...... اور اب وہ واپس اسلام آباد جا رہا ہے اور خاص بات یہ ہے کہ موٹروے کے ذریعے جا رہا ہے۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟" قسطینا نے حیران ہو کر کہا۔

"تفصیل داؤد بھاؤ کو بھی معلوم نہیں۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ ساری حقیقت معلوم کرے۔"

"تو پوچھو ناں مسٹر داؤد کو فون کر کے۔" قسطینا نے بے چین لہجے میں کہا۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ دن کے دو بج چکے تھے۔ اس وقت داؤد بھاؤ کو فون کیا جا سکتا تھا۔ میں نے اس کا خاص نمبر ملایا۔ فوراً ہی کال ریسیو ہوگئی اور بھاؤ کی پاٹ دار آواز آئی۔

"ہیلو شاہی! میں تمہیں فون کرنے ہی والا تھا۔ دارج کل صبح آٹھ بجے لاہور سے روانہ ہوگا۔ تین چار گاڑیوں کا قافلہ ہوگا۔ سکیورٹی کے لوگ بھی ہوں گے۔"

"لیکن اس کی جان کیوں شکنجے میں آئی ہوئی ہے۔ کیا ضرورت پڑی ہے اس کو بائی روڈ جانے کی؟"

"وہ موٹروے پر سفر کرتے ہوئے کلر کہار کے آس پاس کہیں رکنا چاہتا ہے۔ وہاں کوئی معدنی چشمہ ہے جس کا پانی سردیوں میں بھی گرم ہی ہوتا ہے۔ فالج کے مریض وہاں جاتے ہیں اور اپنے پاؤں وغیرہ ڈبو کر وہاں بیٹھتے ہیں......"

"یہ سب کچھ آپ کو کیسے پتا چلا ہے؟" میں نے بھاؤ سے پوچھا۔

"وہی تمہارا پرانا یار سعید کھوکھر...... دارج کا میڈیکل اٹینڈنٹ۔ وہ بھی ساتھ ہی ہو گا۔"

اب ساری بات میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''داؤد بھاؤ! یہ کھوتے کا بچہ دارج بڑی غلطی کر رہا ہے۔ قسطینا اور فارس کا خیال بھی یہی ہے کہ اس وقت اسے اور تاجور کو شدید خطرہ ہے۔ ان لوگوں کو چند دن کے لیے بالکل روپوش ہونا چاہیے۔''

''اب میں اس سلسلے میں کیا کہوں۔ سچی بات یہ ہے کہ مجھے خود بھی اس سچویشن کی سمجھ نہیں آ رہی۔ اس ہپناٹزم، مسمریزم اور ٹیلی پیتھی پر زیادہ یقین نہیں ہے مجھے۔ لیکن جو کچھ تم لوگ کہہ رہے ہو اس کو بھی ایک دم جھٹلایا تو نہیں جا سکتا۔''

میں نے بھاؤ سے سجاول کا حال دریافت کیا اور کچھ مزید ڈسکشن کے بعد کال ختم کر دی۔ یہ ساری گفتگو قسطینا کی سمجھ میں نہیں آئی تھی وہ بس خاموش بیٹھی اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے میری طرف دیکھتی رہی تھی۔ میں نے اسے بھاؤ سے اپنی گفتگو کے بارے میں بتایا تو وہ زیادہ بے چین نظر آنے لگی۔ کچھ دیر گہری سوچ میں گم رہنے کے بعد بولی۔ ''شاہ زائب! یہ دارج اپنے لیے اور تاجور کے لیے بہت بڑا خطرہ مول لے رہا ہے۔ ہمیں اس کو روکنا چاہیے۔''

''ہم کیسے روک سکتے ہیں۔ یہ تو پھر سیدھا سیدھا ٹکراؤ ہوگا۔''

''تو پھر ہمیں اتنا تو کرنا چاہیے کہ تاجور کو تنہا نہ چھوڑیں۔''

''قسطینا! آپ کا مطلب ہے کہ ہم لاہور سے اسلام آباد تک ان لوگوں کے ساتھ رہیں؟''

''بالکل...... میں یہی کہنا چاہ رہی ہوں بلکہ ہمیں اسلام آباد پہنچ کر بھی ان کے آس پاس ہی رہنا چاہیے۔ ہاناوانی کی خصلت کو جتنا میں جانتی ہوں شاید کوئی اور نہ جانتا ہو۔ وہ اپنے ٹارگٹ کا پیچھا قبر تک کرتی ہے...... اور اسے قبر تک پہنچانے میں تاخیر کو گناہ سمجھتی ہے۔ وہ بہت جلد دوبارہ وار کرے گی۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ وہ تاجور کو ٹارگٹ بنا چکی ہے؟''

''اس میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں شاہ زائب!...... وہ جانتی ہے کہ تاجور کہاں ہے...... وہ اس کے ہر پل کی خبر رکھ رہی ہوگی اور مجھے یقین ہے کہ تمہارے زندہ رہنے کی خبر بھی اس تک ضرور پہنچ چکی ہوگی۔ وہ تمہارا کھوج لگانے کی بھی پوری کوشش کر رہی ہوگی۔''

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''وہ میرا کھوج لگا سکے گی یا نہیں، لیکن میں اس کا کھوج ضرور لگا لوں گا۔''

○...❖...○

یہ ایک چمکیلی صبح تھی۔ نو بجے کا وقت تھا۔ ہم لاہور سے اسلام آباد جانے والی موٹر وے M2 پر سفر کر رہے تھے۔ یہ داؤد بھاؤ کی ہی فراہم کردہ ایک اسٹیشن وین تھی۔ اس میں میرے اور فخر کے علاوہ قسطینا، فارس جان اور قسطینا کے دو عدد جنگجو گارڈز شامل تھے۔ ایک لینڈ کروزر جیپ ہمارے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ اس میں بھی قسطینا کے گارڈز تھے۔ ناوان اور کوتاہ قد بنارس بھی اس میں سوار تھے۔ رضوان کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ ہمارے ساتھ سفر کر سکتا، لہٰذا اسے وہیں راوی فارم میں دو ڈاکٹرز کی زیر نگرانی رہنے دیا گیا تھا۔ پہلوان جی اس کے پاس تھے۔

دارج داراب اور اس کا پروٹوکول قافلہ ہم سے آگے تھا۔ درمیانی فاصلہ کم و بیش سو میٹر کا تھا۔ اس خیال سے کہ قافلے والوں کو شک نہ گزرے، کبھی ہم اپنی لگژری اسٹیشن وین کو پیچھے لے جاتے تھے اور لینڈ کروزر آگے آ جاتی تھی، کبھی لینڈ کروزر پیچھے چلی جاتی تھی۔

کلر کہار انٹر چینج سے ہم نے موٹر وے چھوڑ دی۔ چند میل کا مزید فاصلہ طے کر کے گاڑیاں شمال کی جانب ایک بغلی سڑک پر مڑ گئیں۔ اب تعاقب جاری رکھنا ایک مشکل کام تھا۔ دارج کے قافلے کی پچھلی گاڑی کے سواروں کو ہماری اسٹیشن وین یا جیپ پر شک ہو سکتا تھا۔ ہم نے اپنی اسٹیشن وین کی رفتار بہت دھیمی کر دی اور فاصلہ بڑھا دیا۔ ہمیں یہ خطرہ ہرگز نہیں تھا کہ دارج اور اس کے قافلے کی گاڑیاں ہماری نظروں سے اوجھل ہو جائیں گی۔ وہ اوجھل ہو بھی جاتیں تو ہمیں معلوم تھا کہ ان کو کس رخ پر جانا ہے۔ معدنی چشمے والے مقام کا پتا ہمیں تھا اور اس کی لوکیشن نقشے پر بھی ہم نے ٹریس کر رکھی تھی۔

مگر چشمے تک پہنچنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ جو کچھ ہوا، وہ اتنا اچانک تھا کہ کچھ دیر کے لیے ہم سب سکتہ زدہ رہ گئے۔

''اوہ مائی گاڈ...... اوہ مائی گاڈ'' قسطینا سراسیمگی کے عالم میں پکاری۔ ''میں نے کہا تھا ناں...... کہا تھا ناں میں نے۔''

فخر نے بھی سرسراتی آواز میں کہا۔ ''یقین نہیں آ رہا۔ شاکنگ، ویری شاکنگ۔''

میں حیرت زدہ نظروں سے نیلگوں آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اچانک ایک طرف سے پرندوں کا ایک بڑا جھنڈ نمودار ہوا تھا یہ وہی درجنوں طوطے تھے جن کی ہلاکت خیزی ہم اس سے پہلے ''کالا شاہ کاکو'' کے قریب دیکھ چکے تھے۔ وہ کسی گائیڈڈ میزائل کی طرح اس بغیر چھت کی گاڑی پر جھپٹے جو دارج کے قافلے میں سب سے آگے جا رہی تھی۔ اس گاڑی میں دارج کے نصف درجن مسلح گارڈز موجود تھے۔ پرندوں کا حملہ اتنا اچانک تھا کہ گاڑی ڈرائیور کے کنٹرول میں نہیں رہ سکی۔ وہ بری طرح دائیں بائیں لہرائی اور پھر ایک تنگ پل کے جنگلے

سے جاٹکرائی۔ پیچھے آنے والی جیپ بھی سنبھلتے سنبھلتے خوفناک آواز سے ڈبل کیبن پک اَپ سے ٹکرا گئی۔

اس کے عقب میں وہ جہازی سائز کی لگژری جیپ تھی جس میں دارج اپنی وہیل چیئر سمیت سوار ہو جاتا تھا۔ جیپ کے ڈرائیور نے خود کو تصادم سے بچایا اور رکنے کے بجائے گاڑی کو تیزی سے پل پر چڑھا دیا۔ وہ سیدھا نکلتا چلا گیا۔ ایک اور پروٹوکول گاڑی اس کے عقب میں تھی۔ وہ بھی سیدھی نکلی۔ ہم بھی ان کے پیچھے گئے۔ پرندوں کا جھنڈ پوری وحشت سے ان کا پیچھا کر رہا تھا۔ یہ سب کچھ اتنا ناگہانی اور تحیر خیز تھا کہ نگاہوں پر بھروسا نہیں ہو پا رہا تھا۔ پھر ہم نے دیکھا کہ دارج کی جیپ کے عقب میں چلنے والی حفاظتی گاڑی میں سے ایک آٹومیٹک رائفل باہر جھانکنے لگی۔ یہ رائفل گاڑی کی کھڑکی کھول کر باہر نکالی گئی تھی۔ مقصد یقیناً یہی تھا کہ اوپر منڈلاتے ہوئے مشتعل پرندوں کو نشانہ بنایا جائے۔

''یہ غلطی کر رہے ہیں۔'' قسطینا نے ہراساں لہجے میں کہا۔''ان کو کھڑکی نہیں کھولنی چاہیے۔''

ابھی قسطینا کا فقرہ بمشکل مکمل ہی ہوا تھا کہ آٹومیٹک رائفل کی خوفناک تڑتڑ گونجی۔ چلتی گاڑی میں سے پرندوں کو نشانہ بنایا گیا تھا۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے شہد کی مکھیوں پر فائرنگ کی جائے۔ ممکن ہے کہ ایک دو پرندے نشانہ بھی بنے ہوں لیکن مجموعی طور پر کوئی فرق نہیں پڑا۔ جھنڈ اسی رفتار سے دارج والی جیپ کا پیچھا کرتا رہا لیکن فائرنگ کا ایک نقصان ہوا اور یہ وہی نقصان تھا جس کا اندیشہ ابھی قسطینا نے ظاہر کیا تھا۔ تین چار پرندے دفعتاً کھلی کھڑکی کے اندر گھس گئے۔ سکیورٹی کی یہ گاڑی بری طرح لہرانے لگی۔

''یہ بڑا گڑبڑ ہو گیا ہے۔'' فارس جان بڑبڑایا۔

اس وقت گاڑیوں کی رفتار اسّی نوے کلومیٹر فی گھنٹہ سے کم نہیں تھی اور یہ کم چوڑائی والی ایک ذیلی سڑک تھی۔ یکا یک لہراتی ہوئی گاڑی بالکل آؤٹ آف کنٹرول ہوئی اور گھوم کر ایک تناور درخت سے جاٹکرائی۔ یہ بڑا زوردار تصادم تھا۔ گاڑی نے دو تین پلٹیاں کھائیں اور پھر دھماکے سے آگ پکڑ لی۔ میں نے دارج کے دو باوردی گارڈز کو دیکھا وہ شعلوں میں لپٹے، خودرَو جھاڑیوں میں گرے تھے۔ گاڑی کا ایک پہیہ گاڑی سے جدا ہو کر برق رفتاری سے لمبی گھاس میں اوجھل ہو رہا تھا۔

ہماری وین فخر چلا رہا تھا۔ اس کا پاؤں جیسے بے ساختہ ایکسلریٹر سے اٹھ گیا۔''نہیں فخر، گاڑی نہیں روکنی۔'' میں نے پکار کر کہا۔

اس نے پھر گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ اب صورتِ حال یہ تھی کہ دارج والی جیپ حتی الامکان رفتار سے اس شکستہ سڑک پر اُڑی جارہی تھی اور طوطوں کا جھنڈ ان کے تعاقب میں تھا۔ وہ دیوانہ وار جیپ سے ٹکرا رہے تھے، پیچھے ہٹ رہے تھے پھر ٹکرا رہے تھے۔ جیپ کو دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ ڈرائیور بدحواس ہو چکا ہے اور اب وہ بھی گاڑی کر کہیں دے مارے گا اور یہی وہ گاڑی تھی جس میں دارج اور اس کی دبنگ والدہ کے علاوہ تاجور بھی سوار تھی۔ یہ پرندے اسی کو نشانہ بنانا چاہ رہے تھے۔ مجھے لگا کہ میری پیشانی پر پسینہ آ گیا ہے۔ ایسی صورتِ حال سے شاید میرے کسی ہم سفر کو واسطہ نہیں پڑا تھا۔ ان پرندوں پر گولیوں کی بوچھاڑ بھی کر دی جاتی تو کوئی خاص فائدہ ہونے والا نہیں تھا...... الٹا نقصان یہ ہو سکتا تھا کہ جیپ کا ٹائر برسٹ ہو جاتا یا اس کے سواروں میں سے کسی کو نقصان پہنچ جاتا۔ کچھ دیر لہرانے کے بعد دارج کی جیپ اب کچھ سنبھلی ہوئی نظر آئی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ پرندوں کی تعداد چند دن پہلے پیش آنے والے واقعے سے کافی زیادہ ہے۔

فخر نے کہا۔ ''لگتا ہے کہ ڈرائیور نے اب خود کو سنبھال لیا ہے۔''

''لیکن اس طرح کہاں تک جائیں گے۔'' میں نے کہا۔ ''یہ پرندے شہد کی مکھیوں سے زیادہ خطرناک لگ رہے ہیں۔''

قسطینا نے دعائیہ انداز میں کہا۔ ''اللہ کرے یہ لوگ کھڑکی کھولنے کی غلطی نہ کریں۔ ورنہ یہ نوچ کھائیں گے ان کو۔''

دارج والی جیپ اب ایک اور سڑک پر مڑ گئی تھی۔ یہ بالکل ویران جگہ تھی۔ چھوٹے چھوٹے ٹیلے بھی نظر آ رہے تھے۔ شکستہ سڑک کی وجہ سے گاڑیاں بری طرح اچھل رہی تھیں۔ ہماری دوسری گاڑی جو ایک لینڈ کروزر تھی اب عقب میں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ ناوان اور بنارس بھی اس میں سوار تھے۔ پتا نہیں وہ کیوں پیچھے رہ گئی تھی۔

ہم اب پل سے سات آٹھ کلومیٹر آگے آ چکے تھے لیکن جنونی پرندے مسلسل تعاقب میں تھے۔ ویران شکستہ سڑک کے کنارے نانک چندی اینٹوں کی ایک پرانی عمارت نظر آئی۔ اس کے احاطے میں ایک ٹوٹا پھوٹا مندر بھی دکھائی دے رہا تھا۔ دارج کے ڈرائیور نے شاید کسی کی ہدایت پر ہی گاڑی عمارت کے پھاٹک سے ٹکرائی اور اسے توڑتا ہوا اندر گھس گیا۔ ہم بھی اس کے پیچھے ہی گئے۔ عمارت کا احاطہ وسیع تھا۔ ڈرائیور جیپ کو سیدھا ڈیوڑھی سے گزار کر اندرونی حصے کی طرف لے گیا اور برآمدے کے ایک ستون سے ٹکراتا ہوا کسی کمرے کے دروازے کے سامنے رک گیا۔

یہ سب کچھ یقیناً پریشانی اور بدحواسی کے عالم میں ہی ہوا تھا۔ یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ ان خون آشام پرندوں سے کیسے چھٹکارا پایا جائے۔ غالباً ان لوگوں کا خیال تھا کہ یہاں کسی بند کمرے میں گھسنے کا موقع مل جائے گا یا اور کسی طرح کی مدد میسر آجائے گی۔

پھاٹک سے ٹکرانے کے بعد کوئی مسئلہ ہوا تھا اور جیپ کے بونٹ کی طرف سے ہلکا دھواں اٹھنا شروع ہوگیا تھا۔ پرندے بدستور جیپ پر جھپٹ رہے تھے۔ جیپ کے شیشے ''ٹنٹڈ'' تھے لہٰذا اندر کے حالات کا کچھ علم نہیں تھا، نہ ہی اندر کی آوازیں باہر سنائی دے رہی تھیں۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ پرندے ابھی تک ہماری طرف متوجہ نہیں ہوئے تھے۔ ہم ان کے لیے جیسے یہاں موجود ہی نہیں تھے۔

''دھواں بڑھتا جارہا ہے۔'' فخر نے کہا۔

''آگ بھی لگ سکتی ہے۔'' قسطینا نے پریشان لہجے میں تائید کی۔

میرے اندر تہلکہ سا مچا ہوا تھا۔ گاڑی کے اندر وہ ہستی تھی جو میری رگوں میں خوں کی طرح دوڑتی تھی اور دل میں دھڑکن کی طرح بستی تھی۔ اگر اسے کچھ ہوجاتا تو؟ باہر خون آشام پرندے تھے جو دارج اور تاجور وغیرہ کو باہر نہیں آنے دے رہے تھے۔ اندر آگ کا خطرہ تھا۔

دھواں اور بڑھ گیا تھا۔ بونٹ تھوڑا اوپر اٹھ چکا تھا اور اس میں سے سیاہ مرغولے نکل رہے تھے۔ ''ہمیں کچھ کرنا ہوگا۔'' میں نے نشست کے نیچے سے ٹرپل ٹو رائفل نکالتے ہوئے کہا۔

''یہ بہت خطرناک ہے۔'' قسطینا چلا اٹھی اور اس نے میرا بازو مضبوطی سے تھام لیا۔

خوشنما طوطے عفریتوں کا روپ دھار چکے تھے۔ وہ نہ صرف جیپ پر جھپٹ رہے تھے بلکہ باریک تیز آوازیں بھی نکال رہے تھے۔ میں نے ان چھوٹے طوطوں کی دلکش آواز کئی بار سنی ہوئی تھی لیکن اس وقت ان آوازوں میں دلکشی نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ یہ آوازیں بہت بدلی ہوئی تھیں۔ ان میں ایک طرح کا جارحانہ پن تھا۔ لگتا تھا کہ یہ ان کی آوازیں ہی نہیں ہیں۔

''میرا خیال ہے کہ پرندے دھوئیں سے گھبرا رہے ہیں۔'' فخر نے ونڈ اسکرین سے باہر بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ درست کہہ رہا تھا۔ تیزی سے نکلنے اور پھیلنے والے گاڑھے دھوئیں نے پرندوں کو ان کے ٹارگٹ سے دور ہٹا دیا تھا مگر وہ چکرا اسی عمارت کے اردگرد رہے تھے۔ ''یہ ایک اچھا موقع

ہے۔'' میں نے کہا اور تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔
قسطینا بھی کہاں رکنے والی تھی۔ وہ تیزی۔ سے میرے پیچھے آئی۔ اس کے ہاتھ میں مشین پسٹل تھا۔ فارس جان نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ ہم دارج داراب کی جیپ کی طرف لپکے۔ گاڑھے سیاہ دھوئیں سے بچنے کے لیے ہم نے اپنے سانس سینوں میں روک لیے تھے۔ میں نے جیپ کے اگلے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ وہ کھل گیا۔ مجھے اندرونی روشنی میں سب سے پہلے دارج کی دہشت زدہ شکل نظر آئی۔ وہ اپنی وہیل چیئر پر تھا۔ یہی وہ شخص تھا جس نے صرف ایک دن قبل خونی پرندوں اور چمگادڑوں سے متعلق ساری اطلاعات کو لغو اور بکواس قرار دیا تھا اور اس حوالے سے کسی بھی طرح کے اسرار کو رد کیا تھا۔ آج اس کے چہرے پر حیرت کی یلغار تھی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے تاجور کی ہراساں صورت نظر آئی۔ وہ میری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔

''باہر نکلو..... جلدی کرو۔'' یہ دارج کی دبنگ والدہ کی آواز تھی جو ایک درمیانی نشست سے بولی تھی پھر وہ بے طرح کھانسنے لگی۔ دروازہ کھلنے سے دھواں گاڑی میں داخل ہونا شروع ہو گیا تھا۔ جیپ کے دروازے کے ساتھ ہی ایک آہنی سلائیڈ کا انتظام کیا گیا تھا۔ دارج کی وہیل چیئر اس پر رینگ کر باہر آ گئی۔ دارج کی خوف زدہ نظریں اوپر اٹھی ہوئی تھیں اور وہ چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ یقیناً پرندوں کی دہشت اس پر بھی پوری طرح سوار ہو چکی تھی۔ تاجور بھی بری طرح کھانستی ہوئی باہر آئی۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے باہر نکالا۔ قسطینا نے اسے اپنی بانہوں کے گھیرے میں لے لیا۔

سعید کھوکھر نے چلا کر تنومند گارڈ آدم خاں سے کہا۔ ''سر کو کرسی پر سے اٹھا لو۔''
اس نے درست مشورہ دیا تھا۔ آگے سیڑھیاں تھیں۔ ہم دارج کو تیزی سے اندر نہیں لے جا سکتے تھے۔ گرانڈیل آدم خان نے کوشش کر کے فربہ اندام دارج کو اپنے بازوؤں میں اٹھا لیا۔ قسطینا نے تاجور کو پوری طرح اپنے کلاوے میں لے لیا تھا۔ وہ اسے لے کر اندر کی طرف لپکی۔ پرندے جیسے تڑپ تڑپ کر اس کی طرف آ رہے تھے لیکن دھوئیں نے انہیں تاجور تک پہنچنے سے روک لیا تھا۔ میں نے ٹرپل ٹو رائفل کو بیرل کی طرف سے پکڑ کر چاروں طرف گھمایا اور پرندوں کو قریب آنے سے روکا۔ ہم سب تیزی سے اندر داخل ہوئے لیکن یہ دیکھ کر ششدر رہ گئے کہ اس بڑے ہال کمرے کی چھت سرے سے موجود ہی نہیں تھی۔ اوپر نیلا آسمان نظر آ رہا تھا۔

''وہ دروازہ ہے۔'' میں نے ایک طرف اشارہ کیا۔

ہم اس دوسرے دروازے کی طرف لپکے۔ میں نے ٹانگ رسید کر کے اسے کھولا۔ آگے تاریک سیڑھیاں نیچے جا رہی تھیں۔ فوری طور پر ہمارے پیش نظر اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا کہ کسی بند کمرے میں گھس جائیں۔ ہم سب بری طرح کھانستے ہوئے سیڑھیوں پر اترے اور اپنے عقب میں دروازہ دھماکے سے بند کر دیا۔ ایک طوطا اندر گھسنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ نامانوس آواز کے ساتھ تاجور اور قسطینا پر جھپٹا۔ فارس جان نے اسے خالی ہاتھوں سے دبوچ لیا۔ اس چھوٹے سے پرندے میں اضافی طاقت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بری طرح مچل رہا تھا۔ اس نے فارس کی انگلیوں پر شدت سے کاٹا۔ نتیجے میں فارس نے اسے گھما کر دیوار سے دے مارا۔ وہ بے سدھ ہو کر نیچے گر گیا۔ تین مزید زینے اتر کر ہم ایک تاریک ہال کمرے میں پہنچے۔ ہمارے سیل فونز کی ٹارچیں روشن ہو گئیں۔ اس جگہ کا منظر چونکا دینے والا تھا۔ یہاں پتھر کی تین چار بوسیدہ مورتیاں موجود تھیں۔ ان میں سے دو مورتیوں پر جیسے برش اور رنگ کی مدد سے بڑے بڑے سیاہ کراس لگا دیئے گئے تھے۔ ان مورتیوں کے ہونٹوں پر ٹیپ چڑھا کر انہیں اچھی طرح بند کر دیا گیا تھا۔ ایک دیوار پر ہندی میں کچھ لکھا گیا تھا اور اس تحریر پر بھی بڑے بڑے سیاہ کراس لگائے گئے تھے۔ پیتل کی ایک بہت بڑی گھنٹی اس ہال کمرے کی چھت سے جھول رہی تھی۔ یہاں دو بغلی دروازے بھی نظر آ رہے تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ اس تہ خانے میں اور کمرے بھی ہیں۔ دارج کی دبنگ والدہ کا بلڈ پریشر بھی ایک دم شدت اختیار کر گیا تھا۔ وہ کھینچ کھینچ کر سانس لے رہی تھی۔ میڈیکل اٹینڈنٹ سعید کھوکھر اسے فوراً ساتھ والے کمرے میں لے گیا اور ایک بستر پر لٹا دیا۔ وہاں سے مٹی کے تیل سے روشن ہونے والے دو لیمپ بھی مل گئے۔ اس نے ایک لیمپ باہر اور دوسرا کمرے میں روشن کر دیا۔

ایک چھوٹے کمرے میں پرانی طرز کا کچھ فرنیچر بھی دکھائی دیا۔ یہ اتنا صاف نہیں تھا لیکن زیادہ گرد آلود بھی نہیں تھا۔ اس فرنیچر اور دیگر چیزوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ کبھی کبھی یہاں کوئی آتا رہتا ہے...... یا پھر یہ تھا کہ تہ خانہ چاروں طرف سے بند ہونے کی وجہ سے گرد و غبار یہاں کم ہی پہنچتا تھا۔ گرانڈیل آدم خان نے دارج داراب کو ایک قدیم طرز کے صوفے پر بٹھا دیا اور اسے ایک بڑے تکیے کے ساتھ سہارا بھی دیا۔

دارج اب بھی بری طرح کھانستا جا رہا تھا۔ دھواں شاید اس کے پھیپھڑوں میں بھر گیا تھا۔ تاجور کی اپنی آنکھوں سے بھی پانی بہہ رہا تھا۔ تاہم وہ دارج کے قریب بیٹھ گئی اور اس کا گریبان کھول کر اس کے سینے پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ دارج کی سانس میں قدرے بہتری آئی لیکن اس کی جھلاہٹ بدستور موجود تھی۔ اس نے تاجور کا ہاتھ جھٹک دیا اور پانی مانگا۔

آدم خاں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ یہاں پانی کہاں ہوسکتا تھا۔ تاجور نے جلدی سے اپنے شولڈر بیگ میں ہاتھ ڈالا اور پانی کی چھوٹی بوتل اور ڈسپوزیبل گلاس نکال لیا۔ پانی کے چند گھونٹ لے کر دارج کی حالت قدرے بہتر ہوئی۔ تہ خانے کے بیرونی دروازے کی طرف سے ابھی تک پرندوں کا شور سنائی دے رہا تھا۔ وہ جنونی انداز میں دروازے سے ٹکرا رہے تھے۔

میں نے دیکھا کہ دارج کی نگاہیں مجھ پر جمی ہوئی ہیں۔ اس کی آنکھوں میں جیسے خون اترا ہوا تھا۔ وہ میری طرف انگلی اٹھا کر زہریلے لہجے میں بولا۔ ''میں جانتا ہوں۔ یہ سب کچھ تمہارا کیا دھرا ہے...... یہ تمہاری سازش ہے۔ تم پرلے درجے کے جھوٹے دغاباز ہو۔ اپنے مرنے کا ڈراما کر کے لوگوں کو اور قانون کو دھوکا دیتے رہے ہو۔ ہماری جڑیں کاٹتے رہے ہو۔ تم غداروں سے ملے ہوئے ہو۔'' اس نے فرطِ غضب میں مجھ پر گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔

''زبان سنبھال کر بات کرو دارج، ورنہ گالیاں دینا مجھے بھی آتا ہے اور یہ تمہارا دولت خانہ نہیں ہے جہاں تمہارے پالتو تمہارے اردگرد ہوتے ہیں۔''

وہ اور بھڑک اٹھا۔ اس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا۔ دہاڑ کر بولا۔ ''میں تمہاری آنکھیں نکلوا کر تمہارے ہاتھ پر رکھ دوں گا۔ تمہارے گندے دماغ میں جو کیڑے چل رہے ہیں، وہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم...... تم...... ایک شادی شدہ عورت کے پیچھے پڑے ہوئے ہو۔ ایک بے حیا، بے غیرت کی طرح اس کا گھر برباد کرنے پر تلے ہوئے ہو۔ بھیس بدل بدل کر اس سے ملنے کی کوشش کرتے ہو، اس کے گھر میں گھستے ہو، ہر جگہ اس کا پیچھا کرتے ہو۔ تمہیں تو چوراہے میں لٹا کر جوتے مارنے چاہئیں۔ اسی جگہ سنگسار کر دینا چاہیے تمہیں۔'' اس نے ایک بار پھر مجھ پر گالیوں کی بوچھاڑ کی۔ اس کے گلے کی رگیں پھول گئی تھیں اور چہرہ سرخ ہوتا جا رہا تھا۔

تاجور روہانسی آواز میں منمنائی۔ ''پلیز دارج! آپ کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔''

اس نے تاجور کو سر کے بالوں سے پکڑ کر آگے پیچھے جھلایا اور پھر دھکا دے کر دور ہٹا دیا۔ وہ جیسے اپنے حواس میں ہی نہیں تھا۔ گرجا۔ ''تم جاؤ دوسرے کمرے میں۔ ہٹ جاؤ اس شیطان کے سامنے سے۔''

تاجور بے چارگی کی تصویر نظر آئی۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ ابھی ایک مصیبت پوری طرح ٹلی بھی نہیں تھی کہ یہ دوسری کھڑی ہوگئی تھی۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی دروازے کی طرف گئی۔

اس موقع پر قسطینا سے برداشت نہیں ہوا۔ اس نے دارج سے مخاطب ہو کر انگلش میں

کہا۔ ''مسٹر دارج! خواتین سے بات کرنے کا ڈھنگ سیکھو۔ یہ کیا طریقہ ہے، سب کے سامنے بیوی کی بے عزتی کر رہے ہو۔''

''شٹ اَپ...... یو شٹ اَپ...... تمہارے بارے میں بھی اچھی طرح جانتا ہوں میں...... اسی حرامی شاہ زیب کی رکھیل بنی رہی ہے تُو بھی...... اب اس کے ساتھ شادی کھیلتی پھر رہی ہے......''

قسطینا کا چہرہ انگارے کی طرح دہک اٹھا۔ ''شٹ اَپ یو باسٹرڈ...... شٹ اَپ۔'' وہ چنگھاڑی اور بے ساختہ چند قدم اٹھا کر دارج کی طرف گئی۔

آدم خاں راستے میں آ گیا۔ اپنی نہایت بھاری بھرکم آواز میں بولا۔ ''بس میم صاحب بس...... زیادہ ناپنے کی کوشش نہیں کرنی۔'' اس کا لہجہ خطرناک تھا۔

فارس جان جلدی سے آگے بڑھا لیکن میں نے اسے روک لیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس نازک موقع پر بات بڑھ جائے۔ قسطینا کے دو جنگجو محافظ جو ہمارے ساتھ ہی اندر آ گئے تھے، قسطینا کے حکم پر ایک طرف خاموش بیٹھے تھے۔ باہر ابھی تک پرندوں کا شور تھا اور یقیناً باہر کھڑی دارج کی گاڑی سے بھی دھوئیں کے مرغولے نکل رہے تھے۔ وہ کسی بھی وقت آگ پکڑ سکتی تھی۔

قسطینا نے آدم خاں کو دھکا دے کر پیچھے ہٹایا تو وہ سرسراتی آواز میں بولا۔ ''عورت ذات پر ہاتھ نہیں اٹھاتا، ورنہ ابھی اسی جگہ تجھے ننگی لاش کی شکل دے دیتا۔''

''اوئے حرام کے تخم، اِدھر آ، میں تیری انتڑیاں نکال کر تیرے ہاتھ میں دوں۔'' فارس نے آدم کو للکارا اور پھر اس کی طرف بڑھنے کی کوشش کی۔ میں نے دوبارہ اسے روک لیا۔

بلند آوازیں سن کر دارج کی ہٹی کٹی والدہ بھی ساتھ والے کمرے سے نکل آئی اور دہائی دینا شروع کر دی۔ اس کے آنے پر آدم خاں، غضب ناک انداز میں قسطینا اور فارس کو گھورتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ دارج مسلسل اول فول بول رہا تھا۔ اس کی والدہ اپنی حالت بھول کر اسے سنبھالنے اور ''کول ڈاؤن'' کرنے میں لگ گئی۔ میں نے بھی فی الحال دارج کے سامنے سے ہٹ جانا بہتر سمجھا...... میں قسطینا اور فارس کو لے کر تہ خانے کی نیم تاریک سیڑھیوں کی طرف آ گیا۔ یہاں کا منظر ابھی تک ناقابلِ یقین اور نہایت ''الارمنگ'' تھا۔ سیڑھیوں کے نچلے سرے پر موجود دروازے کے نیچے قریباً ایک انچ کی درز موجود تھی۔ اس درز میں کوئی ایک درجن طوطوں نے اپنی چونچیں گھسا رکھی تھیں۔ وہ اندر گھسنے کے لیے پھڑ پھڑا رہے تھے اور دروازے سے ٹکرا رہے تھے۔

میں نے کہا۔ ''فارس ایک بات نوٹ کی تم نے؟ اب دھواں نہیں ہے۔''
''ہاں آپ ٹھیک کہتا ہے۔'' وہ بولا۔ ''اگر دھواں ہوتا تو اب بھی اس درز کے نیچے سے اندر آرہا ہوتا۔''
''لیکن، تھوڑی بہت بُو تو موجود ہے۔'' قسطینا نے کہا۔
''یہ اسی دھوئیں کی ہے جو شروع میں اندر آیا تھا۔'' میں نے کہا۔
''اس کا مطلب ہے کہ دارج کی گاڑی، آگ پکڑنے سے بچ گئی ہے۔'' فارس جان نے خیال ظاہر کیا۔
''ہاں، ان جدید گاڑیوں میں ایسے سسٹم ہوتے ہیں جو ایسے حادثوں کی شکل میں، اندرونی حصوں کو محفوظ رکھتے ہیں۔'' قسطینا نے کہا۔
''یہ سب کچھ کسی ہارر فلم جیسا لگ رہا ہے۔ اپنے حواس پر یقین نہیں ہو پارہا۔'' فارس جان بولا۔ وہ قسطینا کی موجودگی میں انگلش میں ہی بات کرتا تھا۔
میرا دھیان پھر بنارس اور ناوان والی گاڑی کی طرف چلا گیا۔ میں اور قسطینا تقریباً ایک ساتھ بول اٹھے۔ ''وہ دوسری گاڑی پتا نہیں کہاں رہ گئی؟''
فارس جان بولا۔ ''ممکن ہے کہ وہ سیدھا آگے نکل گئے ہوں اور مڑے نہ ہوں۔''
''نہیں فارس۔'' قسطینا نے نفی میں سر ہلایا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ میں نے پل والے ایکسیڈنٹ کے بعد انہیں نہیں دیکھا۔''
''پھر تو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ پل پر دارج کے گارڈز نے گاڑی پر فائرنگ کی ہو۔ اس کا ٹائر وغیرہ برسٹ کر دیا ہو۔'' میں نے خیال ظاہر کیا۔
قسطینا نے اپنے دونوں ہاتھوں کے انگوٹھے اپنی پینٹ کی بیلٹ میں پھنسائے اور پُرتفکر لہجے میں بولی۔ ''یہاں سے کیسے نکلیں گے۔ یہ پرندے تو ہمیں گھیر کر بیٹھ گئے ہیں۔''
''مجھے بھی لگ رہا ہے کہ ان کے جانے کے لیے لمبا انتظار کرنا پڑے گا۔'' میں نے کہا۔
تہ خانے کے بغلی کمرے سے ایک بار پھر دارج کے گرجنے برسنے کی مدھم آوازیں آنے لگیں۔ پتا نہیں کہ اب وہ کس کے لتّے لے رہا تھا۔
فارس جان کی آنکھوں میں اب تک خون کی سرخی موجود تھی۔ دارج نے جو گندی زبان قسطینا کے بارے میں استعمال کی تھی، اس نے یقیناً اس کا خون کھولا دیا تھا۔ وہ سنگین لہجے میں بولا۔ ''اگر یہ حرام زادہ اپنی گندی بکواس سے باز نہیں آیا تو میں ضرور اس کا قاتل قرار پاؤں گا۔ جو شخص اپنی بیوی کے بارے میں اس طرح کا رویہ رکھ سکتا ہے، دوسری خواتین کے ضمن

میں اس سے خیر کی کیا امید ہو سکتی ہے۔"

"نہیں فارس، آپ اس سلسلے میں کوئی جھگڑا مول نہیں لیں گے۔ ہم پہلے ہی کئی خطروں میں گھرے ہوئے ہیں۔" قسطینا نے اس کا بازو تھامتے ہوئے پُر زور لہجے میں کہا۔

فخر بھی اس گفتگو میں شریک ہونے کے لیے سیڑھیوں کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے میرے خیال کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "یہ دارج داراب ایک اہم شخصیت ہے۔ اس کی اچانک گمشدگی پورے علاقے کی پولیس کو حرکت میں لے آئے گی۔ ہم امید کر سکتے ہیں کہ جلد ہی کچھ لوگ دارج کو تلاش کرتے ہوئے یہاں پہنچ جائیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اب تک فون وغیرہ بھی کر چکا ہو۔"

"نہیں، فون اس تہ خانے میں کام نہیں کر رہے۔" میں نے فخر کو اطلاع دی۔

"ہاں میرا بھی نہیں کر رہا۔" فارس جان نے کہا۔

"پھر بھی میرا اندازہ ہے کہ دارج کو ڈھونڈنا اس کے محافظوں کے لیے بہت زیادہ دشوار ثابت نہیں ہوگا۔ جس پل کے پاس گاڑیاں آپس میں ٹکرائی ہیں اور الٹی ہیں وہ یہاں سے آٹھ نو کلو میٹر ہوگا۔ ہمیں اس پل کے آس پاس ضرور تلاش کیا جائے گا...... پھر تلاش کا دائرہ وسیع کر دیا جائے گا۔"

میں نے ایک بار پھر اپنے سیل فون پر بنارس اور داؤد بھاؤ سے رابطہ کرنا چاہا، یہ دونوں کوششیں ہی ناکام ہوئیں۔ یہاں سگنلز نہ ہونے کے برابر تھے۔

دروازے سے باہر جنونی طوطوں کا ہجوم تھا۔ ان کی آوازیں اصل آوازوں سے بہت مختلف تھیں...... اور یقیناً یہ اسی خوفناک ٹرانس کی وجہ سے تھا جس نے انہیں اپنے حصار میں جکڑا ہوا تھا۔ فارس جان نے اپنے موبائل فون کی ٹارچ کی روشنی فرش پر پھینکی، وہاں وہ مردہ طوطا نظر آیا جسے اس نے تاجور پر حملہ کرنے سے روکا تھا اور دیوار سے پٹک دیا تھا۔

ہم نے وہ طوطا اٹھا کر دیکھا۔ مردہ حالت میں بھی اس کی آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں اور ان میں ایک عجیب سی سرخی محسوس ہوتی تھی۔ یکا یک میں چونک گیا۔ آہنی دروازے کی دوسری جانب طوطوں کے شور کے علاوہ ایک اور آواز بھی سنائی دی۔ میں نے ٹھٹکی نظروں سے دیکھا، دروازے کی نچلی درز میں طوطوں کی چونچوں کے علاوہ ایک اور شے بھی نظر آ رہی تھی۔ یہ تیز نکیلے ناخن تھے اور یہ ناخن جیسے بے ساختہ، حرکت کر رہے تھے اور فرش کو کھرچنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ یہ کسی بڑے جانور کے ناخن تھے پھر میرے بدن میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔ یہ لوسی کے ناخن تھے...... ہاں یہ اسی کے تھے۔ طوطوں کے شور کے درمیان جو نامانوس سی خرخر

سنائی دے رہی تھی، وہ بھی لوسی ہی کی تھی۔
فخر نے ہراساں نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''لگتا ہے کہ وہ بھی یہاں پہنچ گئی ہے۔''
''کس کی بات کرر ہے ہیں؟'' فارس جان نے مجھ سے پوچھا۔
''وہی مادہ بندر لوسی...... یہ دیکھو...... یہ اسی کا پنجہ ہے۔''
اب فارس اور قسطینا وغیرہ نے بھی یہ ناخن دیکھ لیے تھے۔ ''اوہ گاڈ'' قسطینا کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا اور وہ زیادہ بے چین نظر آنے لگی۔
میں نے دروازے کے نٹ بولٹ اور قبضوں وغیرہ پر روشنی ڈالی اور ان کے مضبوط ہونے کا اطمینان کیا۔ تب ہم سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گئے۔ اپاہج دارج کو اس کی دبنگ والدہ نے کچھ ''شانت'' کیا تھا اور اسے اپنے ساتھ دائیں جانب والے کمرے میں لے گئی تھی۔ تاجور بھی یقیناً وہیں تھی۔ ہم نے تہ خانے کے ہال کا تفصیلی جائزہ لیا۔ یہاں موجود جن مورتیوں پر کراس کے سیاہ نشان لگائے گئے تھے، وہ عریاں مناظر پیش کر رہی تھیں۔ ایک مورتی میں ایک چوڑے چکلے نیم عریاں راکھشس کی آغوش میں ایک عریاں عورت موجود تھی۔ اسی طرح کی ایک دوسری مورتی میں ایک پہلوان نما شخص جس کا بالائی دھڑ شیر کا تھا ایک جواں سال عورت کو اپنے پنجوں میں دبوچے بیٹھا تھا۔ رقاصہ عورت کی ساڑی اس کے جسم سے ڈھلکی ہوئی تھی اور اتنی صفائی سے بنائی گئی تھی کہ پتھر کی ہونے کے باوجود اس کی ہر ہر سلوٹ دکھائی دے رہی تھی۔ اس مورتی پر بھی کراس کا سیاہ نشان لگا ہوا تھا۔
اس ہال کمرے میں صرف دو مورتیاں تھیں جن پر نشان نہیں لگائے گئے تھے اور یہ رام کرشن کی مورتیاں تھیں۔ ان کے گلے میں شاید کئی ماہ پرانے پھولوں کے ہار تھے جواب سوکھ سوکھ کر جھڑ رہے تھے۔
''یہ سب کیا ہے؟'' قسطینا نے حیران ہو کر پوچھا۔
''دیکھنے میں تو مندر لگتا ہے لیکن یہ مندر ہے نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔
''کیا مطلب؟'' قسطینا نے پوچھا۔
میں نے ایک دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ دیکھیں، یہاں کیا لکھا ہوا ہے...... راکھشس دوارا۔ مطلب شیطان کا مسکن......''
''وہ دیکھیں...... وہاں بھی مورتیاں ہیں...... چھوٹے سائز کی۔'' فخر نے اوپر ایک بڑے طاق کی طرف اشارہ کیا۔

ہال کمرے کی چھت سے تھوڑا نیچے لکڑی کے دو مستطیل طاق موجود تھے۔ یہ قریباً ایک فٹ ضرب ڈھائی فٹ کے ہوں گے۔ ان میں بھی وہی شخص نظر آتا تھا جس کا اوپر کا دھڑ دھاری دار ٹائیگر کا اور نچلا کسی شہ زور پہلوان کا تھا۔ ایک منظر میں وہ اپنے دونوں ہاتھوں میں دو چمک دار کٹاریں تھامے کھڑا تھا، اس کی آنکھوں میں شعلے رقصاں تھے۔ دوسرے منظر میں وہ ایک اونچے سنگھاسن پر بیٹھا تھا۔ اس کے پاؤں تلے ایک جوان عورت تھی۔ جیسے وہ عورت نہ ہو کوئی ہرن یا بارہ سنگھا ہو جس کو شکار کر کے شکاری نے اس کے ساتھ تصویر بنوائی ہو۔ ان ساری مورتیوں پر بھی چھوٹے چھوٹے سیاہ کراس لگے ہوئے تھے۔

○……❖……○

اجاڑ علاقے کے اس ویران ''مندر'' کے تہ خانے میں ہمیں ایک رات گزر چکی تھی۔ حیرت کی بات تھی کہ ابھی تک کوئی ہماری مدد کو نہیں پہنچ سکا تھا اور حیرت کی دوسری بات یہ تھی کہ خونخوار پرندے اور مادہ بندر لوسی ابھی تک تہ خانے سے اوپر جانے والی سیڑھیوں پر موجود تھے۔ اگر ہمارے اور ان کے درمیان تہ خانے کا اندرونی دروازہ نہ ہوتا تو پتا نہیں اب تک کیا کچھ ہو چکا ہوتا۔

بظاہر یہی لگ رہا تھا کہ ''ہماری تلاش میں نکلنے والے'' اس ایریا میں ابھی تک آئے ہی نہیں۔ کیونکہ وہ آئے ہوتے تو انہیں دور سے ہی اس شکستہ مندر کا کھلا ہوا پھاٹک نظر آ جاتا اور شاید ہماری دونوں گاڑیاں بھی دکھائی دے جاتیں۔ یعنی ایک دارج داراب والی جہازی جیپ اور دوسری ہماری اسٹیشن وین، لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ ہوا سے یا کسی اور وجہ سے پھاٹک بند ہو گیا ہو اور احاطے کا سارا منظر اوجھل ہو گیا ہو۔ ایسی صورت میں بھی یہ سوال تو ذہن میں ضرور پیدا ہوتا تھا کہ ہمیں تلاش کرنے والے ابھی تک اس مندر کے احاطے میں کیوں نہیں جھانک سکے۔ یہاں اس تہ خانے میں موجود قریباً ہر شخص کے پاس موبائل فون موجود تھا لیکن سگنل نہ ہونے کی وجہ سے یہ سب فونز بیکار تھے۔

خوش قسمتی سے دارج کا میڈیکل ہیلپر اپنا وہ بڑا شولڈر بیگ ساتھ لانے میں کامیاب ہو گیا تھا جس میں دارج کی دوائیں اور ڈائپرز اور دیگر لوازمات شامل تھے۔ دارج کی والدہ مسز یاسمین داراب کے بیگ میں کچھ بسکٹس اور چاکلیٹس وغیرہ موجود تھیں جن سے دارج وغیرہ نے بھی اپنا کام چلایا۔ باقیوں کے لیے اس تہ خانے میں کھانے کے لیے بھنے ہوئے چنوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ یہ ڈیڑھ دو کلو چنے پلاسٹک کے بند پیکٹوں میں ایک الماری کے اندر ملے تھے اور کھانے کے قابل تھے۔ یہیں سے ہی ہمیں پانی کی تین چار سربمہر بوتلیں بھی

مل گئیں۔ تہ خانے میں ہال کمرے سمیت کل چار کمرے تھے۔ ان میں دو بوسیدہ واش رومز بھی تھے۔ بہرحال ان کے زنگ آلود نلکوں میں سے تھوڑا بہت پانی آتا تھا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ گاہے بگاہے دو تین افراد یہاں آتے ہیں اور شاید ایک دو روز قیام بھی کرتے ہیں، لیکن اب فرش اور دیگر اشیا پر پڑی ہوئی گرد دیکھ کر تو یہی پتا چلتا تھا کہ شاید پانچ چھ ہفتوں سے کوئی اس تہ خانے میں نہیں اترا۔

یہ صبح کے آٹھ بجے کا وقت تھا۔ اچانک دارج کی گھن گرج نے ہم سب کو پھر چونکا دیا۔ اس بار وہ براہِ راست تاجور کے لتے لے رہا تھا۔ بند دروازے کے پیچھے سے اس کی کرخت آواز ابھری اور ہال کمرے تک سنائی دی۔ ''بند کرو یہ بکواس...... تمہاری عقل تو ٹھکانے پر نہیں ہے، میری ٹھکانے پر رہنے دو۔ میں سب جانتا ہوں۔ اتنا چوچا نہیں ہوں۔ یہ سب تمہاری وجہ سے ہو رہا ہے...... تمہارے پیچھے پڑے ہوئے ہیں یہ لوگ۔ اور خاص طور سے وہ حرامی شاہی۔ یہ سب ڈرامے تم تک پہنچنے کے لیے ہو رہے ہیں۔''

جواب میں تاجور نے دھیمی آواز میں کچھ کہا ہوگا جو ہمارے کانوں تک نہیں پہنچ سکا۔ حسبِ توقع دارج اور بھڑک اٹھا...... بلند آواز میں چنگھاڑا۔ ''ہونے دو میری بے عزتی جو ہوتی ہے...... اب اس میں کسر ہی کیا رہ گئی ہے۔ ساری دنیا کے سامنے ننگا ہو رہا ہوں میں...... ٹھیک ہے ہوتا ہوں تو ہونے دو۔ جب تک برداشت ہے، برداشت کروں گا۔ جب نہیں ہوگا تو گولی مار دوں گا تجھے اور خود کو بھی...... سنا گولی مار دوں گا۔'' وہ اتنے زور سے بولا کہ اسے کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔

چند سیکنڈ بعد حالت قدرے سنبھلی تو اسی گھن گرج کے ساتھ بولا۔ ''اور یہ جو باتیں ہو رہی ہیں ناں کالے علم کی اور سفید علم کی، میں نہیں مانتا ان کو...... یہ سارا ڈھونگ ہے ان سوٗروں کا۔ یہ ان کی سدھائی ہوئی بندریا ہے...... اور پرندوں کو بھی سدھا لیتے ہیں اس طرح کے لوگ۔ یہ سب ڈھونگی ہیں اور سب سے بڑا ڈھونگی وہ شاہی ہے۔ کبھی چاند گڑھی میں ٹریکٹر ڈرائیور بنتا ہے، کبھی سکھیرا میں کار ڈرائیور بنتا ہے...... اور تو اور ہمارے گھر میں گھسا ہے وہ باسٹرڈ چاند کھوکھر بن کر، گھسا ہے یا نہیں......؟''

جواب میں شاید تاجور نے پھر عاجزی سے کچھ کہا تھا۔ جواب میں طمانچے کی زوردار آواز باہر تک آئی۔ پھر وہ پھنکارا۔ ''آگے سے جواب دیتی ہے۔ تیری یہ مجال...... تیری یہ مجال۔'' موقع محل دیکھے بغیر وہ خبیث اپنی منکوحہ بیوی سے ناروا سلوک کر رہا تھا۔

قسطینا بپھر کر اپنی جگہ سے اٹھی اور دروازے کی طرف بڑھی۔ اس نے دروازے کو دھکا

دیا اور وہ کھل گیا۔ بڑا تکلیف دہ منظر تھا۔ صوفے پر بیٹھے بیٹھے دارج نے تاجور کی گردن اپنے بازو کے شکنجے میں جکڑی ہوئی تھی اور دوسرے ہاتھ سے اس کے بال پکڑے ہوئے تھے۔ تاجور کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ سرخ چہرے کے ساتھ کھینچ کھینچ کر سانس لے رہی تھی۔

ہم آناً فاناً دروازے کے سامنے نظر آئے تو دارج نے تاجور کو چھوڑ دیا۔ وہ بری طرح کھانستی ہوئی صوفے پر ایک طرف سمٹ گئی۔ دارج، قسطینا کو دیکھ کر گرجا۔ ''تمہارے ہوش تو ٹھکانے پر ہیں؟ اس طرح کیوں گھسی ہو، ہمارے کمرے میں؟''

''یہ تمہارے گھر کا بیڈ روم نہیں ہے۔'' قسطینا بھی ترکی بہ ترکی بولی۔ ''یہاں ہم سب اکٹھے پھنسے ہوئے ہیں اور تم سے بڑا بے وقوف، بے شرم اور کون ہوگا۔ سب کی موجودگی میں اپنی بیوی کے ساتھ اس طرح کا سلوک کر رہے ہو؟''

دارج نے اپنا مکا زور سے صوفے کے چوبی ہتھے پر مارا اور گرجا۔ ''چلے جاؤ تم لوگ یہاں سے۔ یہ ہم میاں بیوی کا ذاتی معاملہ ہے۔'' اس کے بالائی جسم میں جیسے زلزلہ برپا تھا۔ زیریں جسم مردہ ہونے کے باوجود اس کا بالائی جسم نہ صرف پوری طرح صحت مند بلکہ پُرزور بھی تھا۔

اس سے پہلے کہ قسطینا اسے کوئی کرارا سا جواب دیتی، ایک طرف سے لمبا تڑنگا آدم خاں تند بگولے کی طرح برآمد ہوا اور سیدھا قسطینا کی طرف آیا۔ اس کے لمبے بال چوڑے چکلے چہرے پر جھول رہے تھے۔ ''سر کے کمرے سے نکل جاؤ میڈم ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔'' اس نے قسطینا کو باقاعدہ باہر کی طرف دھکیلا۔

قسطینا جو کل سے بھری ہوئی تھی، مزید برداشت نہ کر پائی، اس نے ایک تھپڑ گھما کر آدم خاں کے چہرے پر دے مارا۔

یکایک کمرے میں بھونچال سا آ گیا۔ آدم خاں نے قسطینا پر جھپٹنا چاہا مگر قسطینا نے اس کے پیٹ میں ٹانگ رسید کر کے اسے دور ہٹا دیا، آدم خاں کا پارا آسمان کو چھو گیا۔ یہی وقت تھا جب فارس جان تڑپ کر قسطینا اور آدم خاں کے درمیان آیا۔ آدم خاں نے ایک بھاری بھرکم گالی بک کر فارس جان کا گریبان دبوچا، دوسرا ہاتھ اس نے زوردار گھونسا رسید کرنے کے لیے ہی اٹھایا تھا مگر اسے بوقت قسطینا نے دبوچ لیا۔

وہ چلائی۔ ''پیچھے ہٹ جائیں فارس۔ میں اس کی مردانگی نکالتی ہوں۔ میں نمٹوں گی اس باسٹرڈ سے...... ابھی نمٹوں گی......'' قسطینا کا چہرہ لال بھبھوکا تھا اور آنکھوں میں شعلے ناچ رہے تھے۔

میں بھی آگے بڑھتے بڑھتے رک گیا۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ اب قسطینا اپنی سی کر کے رہے گی۔ اس آدم خاں کی اکڑ خانی سب کو کھٹک رہی تھی۔ یقیناً اسے اپنے پھیلے ہوئے جسم اور اپنے مسلز پر بہت ناز تھا۔ اگر وہ ایک لڑکی سے شکست کھا جاتا تو اس کے لیے ڈوب مرنے کا مقام تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ قسطینا اسے زیر کر سکتی ہے۔

ہال کمرے کے اندرونی دروازے کے سامنے آناً فاناً آدم خاں اور قسطینا میں رَن پڑ گیا۔ فارس جان نے ایک بار پھر آگے بڑھنا چاہا مگر میں نے اسے روک دیا۔ ''میرا خیال ہے وہ کر لے گی۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

قسطینا کے دو زوردار ہاتھ کھانے کے بعد آدم خاں نے فراموش کر دیا تھا کہ وہ ایک ''غیور مرد'' ہے...... اور عورت ذات پر ہاتھ اٹھانا اپنی توہین سمجھتا ہے۔ پندرہ بیس سیکنڈ کے اندر ہی وہ جان گیا تھا کہ وہ کوئی عام لڑکی نہیں ہے۔ اگر وہ ذرا بھی ڈھیلا پڑا تو وہ اس کی ساری اکڑ خانی ناک منہ کے رستے نکال باہر کرے گی۔ وہ گالیاں بک رہا تھا اور جھپٹ جھپٹ کر قسطینا کی طرف آ رہا تھا۔ قسطینا نے اس کے کئی وار بڑی صفائی سے بچائے اور جواب میں اسے جچی تلی ضربات رسید کیں۔ اس کے اندر کی جنگجو لڑکی پوری طرح بیدار تھی اور یہ کوئی عام لڑکی نہیں تھی، یہ جاماجی کی آرمڈ فورس کی جواں سال کمانڈر تھی۔ ایک موقع پر گرانڈیل آدم خاں کے ہاتھوں میں قسطینا کے بال آ گئے مگر یہ بوائے کٹ بال تھے۔ وہ ان پر زیادہ دیر اپنی گرفت قائم نہ رکھ سکا۔ قسطینا نے اسے طوفانی انداز میں دھکیل کر ایک پتھریلی مورتی سے جا ٹکرایا...... آدم خاں کی پشت پر شدید چوٹ لگی۔ قسطینا کے بال اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئے۔ قسطینا نے ایک خطرناک کک اس کی چھاتی پر پسلیوں کے درمیان رسید کی۔ وہ ایک واش روم کے دروازے سے ٹکرایا...... اور اس کی چولیں ہلا ڈالیں۔ واش روم کے اندر سے دارج کی دبنگ والدہ اپنے کپڑے سنبھالتی اور دہائی دیتی ہوئی باہر نکلی۔ وہ انگارہ چہرے کے ساتھ چلانے لگی۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیا قیامت مچائی ہوئی ہے۔ میں ایک ایک کو جیل میں سڑا دوں گی۔ حشر کرا دوں گی تم سب کا......''

اس نے لپک کر قسطینا کو آدم خاں سے پیچھے ہٹانے کی کوشش کی۔ قسطینا نے اسے بھی دھکا دے کر دور ہٹایا اور گرانڈیل آدم خاں کو اڑنگا لگا کر فرش پر پٹخ دیا۔ آدم خان کی ناک واضح طور پر بائیں جانب مڑ چکی تھی۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ اس کی ناک کی ہڈی ٹوٹ چکی ہے۔ اس کے ہونٹ اور چوڑی ٹھوڑی خون سے رنگین ہو چکے تھے۔ اس کی آنکھوں میں حیرت لشکارے مار رہی تھی، اسے جیسے یقین نہیں ہو پا رہا تھا کہ وہ جس عورت ذات پر ہاتھ

اٹھانا اپنی توہین سمجھتا ہے، وہ مار مار کر اس کا بھرکس نکال رہی ہے۔

اندر صوفے پر دارج اچھل رہا تھا اور دہاڑ رہا تھا۔ ''مہنگا پڑے گا۔ بہت مہنگا پڑے گا تم لوگوں کو۔ تم داراب فیملی سے ٹکر لے رہے ہو۔ کمینو موت کی بھیک مانگتے پھرو گے۔''

اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ اُڑ کر قسطینا پر جا پڑتا اور اسے اپنے سب سے وفادار غلام کی ہڈیوں کا سرمہ بنانے سے روک دیتا۔

قسطینا نے واقعی اس کا جسمانی ریمانڈ لے لیا تھا۔ وہ اتنے تواتر سے اس پر مکے اور ٹھوکریں برسا رہی تھی کہ قوی ہیکل آدم خاں کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اپنے جسم کے کون سے حصے کو بچائے اور کون سے حصے کو قسطینا کی مہلک ضربات کے لیے کھلا چھوڑ دے۔ اس کی بائیں کلائی ٹوٹ چکی تھی۔ ایک پاؤں کا پنجہ بھی بے طرح زخمی تھا۔ وہ اوندھے منہ واش روم کے اندر گرا۔ اس کا چہرہ بدبودار پاٹ سے بس چند انچ کے فاصلے پر تھا۔ ہانپتی ہوئی قسطینا نے اس کی گردن کے پچھلے حصے پر پاؤں رکھ دیا۔ وہ پھنکاری۔ ''جان سے مار دوں گی تجھے۔''

اس کی انگلش آدم خاں کی سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ بس خون تھوک کر رہ گیا۔ بہرحال اس کا انداز اب بھی خطرناک تھا۔ موقع ملتے ہی وہ کوئی اوچھی حرکت کر سکتا تھا۔ اس کے پاس کوئی آتشیں ہتھیار نہیں تھا ورنہ شاید وہ اب تک قسطینا کو شوٹ کر چکا ہوتا۔ میں نے فخر سے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ اس ارنے بھینسے کے ہاتھ پاؤں باندھ دینے چاہئیں، کہیں یہ پھر مشکل پیدا نہ کرے۔''

فخر نے میری تائید کی۔ سن کی ایک رسّی مل گئی۔ آدم خاں کی دونوں ٹانگیں باندھ دی گئیں اور ایک ہاتھ بھی پشت کی طرف موڑ کر اسی رسّی سے جکڑ دیا گیا۔ دوسرے ہاتھ کی کلائی ویسے ہی ٹوٹ چکی تھی۔ دارج اور اس کی والدہ مسلسل واویلا کر رہے تھے۔ دارج میری طرف دیکھ رہا تھا اور خطرناک نتائج کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ وہ اپنی ہر مصیبت اور ذلت کا ذمے دار مجھے ہی سمجھ رہا تھا۔ طیش کے ساتھ ساتھ دارج کی آنکھوں میں ایک طرح کی حیرت بھی جھلک دکھا رہی تھی۔ غالباً اسے ابھی تک یقین نہیں آرہا تھا کہ اس کے فولادی باڈی گارڈ اور بے مثال جاں نثار آدم خاں کو ایک لڑکی نے چکنا چُور کر ڈالا ہے۔

قسطینا کا چہرہ غصے سے سرخ تھا۔ وہ دارج کے عین سامنے پہنچی اور اس کی جانب انگلی اٹھا کر بولی۔ ''دیکھو مسٹر دارج! میں ایک بار پھر تمہیں بتا رہی ہوں، یہ تمہارا گھر نہیں ہے اور نہ یہ تمہارا بیڈروم ہے۔ یہاں اپنے آپ کو کنٹرول میں رکھو ورنہ سب کے لیے مشکل ہوگی اور سب سے زیادہ تمہارے لیے ہوگی۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے صوفے پر پڑا ہوا دارج کا

ن اٹھا کر قبضے میں لے لیا۔
دارج نے غصے کے عالم میں کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن اس کی والدہ یا سمین بیگم نے
ں کے کندھے تھام کر اسے روک دیا۔ ''تمہیں میری قسم دارج، چپ رہو..... اس وقت چپ
ہو۔ ہم سب اس وقت مصیبت میں ہیں۔''
''یہ مصیبت بھی ان کی لائی ہوئی ہے۔'' دارج پھنکارا۔ ''یہ سب ڈرامے ہو رہے
یں۔ یہ پالتو پرندے ہیں ان کے...... ان کو کسی طرح ٹرینڈ کیا ہوا ہے...... ہم احمق اُلو کے
پٹھے نہیں ہیں جو ان کی باتوں میں آئیں گے۔''
''اچھا جو بھی ہے دارج، پلیز اب چپ رہو۔'' اس کی دبنگ ماں نے باقاعدہ اس کے
سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ پھر اس نے اپنی بہو تاجور کو تحکمانہ انداز میں اشارہ کیا۔ اس نے آگے
ڑھ کر کمرے اور ہال کا درمیانی دروازہ بند کر دیا۔
یہی وقت تھا جب فخر کی پکارتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''شاہ زیب! یہ دیکھو اس کمرے
یں یہ ایک روشن دان بھی ہے۔''
میں اور قسطینا وغیرہ اس دوسرے کمرے میں پہنچے۔ چھت کے بالکل پاس ایک مستطیل
روشن دان تھا۔ تہ خانوں میں عموماً ایسے روشن دان رکھے جاتے ہیں۔ یہ زیادہ تر باہر کے صحن یا
برآمدے وغیرہ کے لیول پر ہوتے ہیں تاکہ روشنی اور ہوا کی آمدورفت ہو سکے۔ یہ بھی ایک
یسا ہی روزن تھا۔ اس میں زنگ آلود گول سلاخیں تھیں اور باہر کی طرف جالی لگی ہوئی تھی۔
روشن دان میں جو سب سے پریشان کن منظر دکھائی دیا، وہ خونخوار لوسی کا تھا۔ وہ روشن دان
سے لگی خاموش بیٹھی تھی اور اپنی سرخ آنکھوں کے ساتھ ہمیں دیکھ رہی تھی۔ کسی وقت وہ اپنے
سفید دانتوں کی نمائش کرتی تھی اور اپنے پنجے کو روزن کی جالی پر رگڑتی تھی۔ دیگر افراد بھی یہ
منظر دیکھنے کے لیے کمرے میں آ گئے۔
''یہ کیسے پہنچی یہاں؟'' فخر نے حیرت سے کہا۔
''کیا مطلب؟''
''یعنی ہم لاہور سے کافی دور آ چکے ہیں اور یہ آخری مرتبہ لاہور میں دیکھی گئی تھی۔''
''یہ طوطے بھی تو یہاں پہنچ گئے ہیں۔'' میں نے کہا۔
''یہ تو چلو اُڑ کر آ گئے...... لیکن یہ کیسے آئی؟''
''اس نے بھی کوئی حل نکال لیا ہوگا۔ یہ ایک طاقتور ٹرانس میں ہے...... اپنے ٹارگٹ
تک پہنچنے کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہے۔''

''مثلاً کیا؟'' فخر نے پوچھا۔

''مثلاً یہ کہ...... کسی مسافر بس کی چھت پر چڑھ گئی ہو یا اس طرح کا کوئی اور ذریعہ خیر یہ غیر اہم باتیں ہیں۔ اصل سوال یہ ہے کہ کیا یہ ہاناوانی اور اس کے ساتھیوں کو ہماری اس پناہ گاہ تک پہنچا سکتی ہے؟''

قسطینا کسی بہت گہری سوچ میں نظر آتی تھی، وہ بولی۔ ''جہاں تک میں سمجھتی ہوں اور جانتی ہوں...... ہاناوانی کے ٹرانس میں آنے والے جانور بس اتنا ہی کام کر سکتے ہیں جتنی ان کو سجیشن دی جاتی ہے۔ ان جانوروں کی سجیشن ہمیں ٹارگٹ کرنا ہے۔ انہوں نے ہمیں دیکھا ہے اور ہمارے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ اب ہم جب تک ان کی نالج میں رہیں گے، یہ ہمارا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ یہ اسی وقت ہاناوانی کے پاس واپس جائیں گے جب اپنے ٹارگٹ کو ختم کر دیں گے یا پھر وہ ان کی نظروں سے اوجھل ہو جائے گا۔''

اسی دوران میں ایک بار پھر دارج کے بلند آواز میں بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ اس مرتبہ پتا نہیں وہ کس پر برس رہا تھا۔ غالباً سعید کھوکھر کی کم بختی آئی ہوئی تھی۔ دو منٹ بعد تاجور اپنی روانی میں کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک شاپر تھا جسے وہ ڈسٹ بن (پلاسٹک کے ایک ڈبے) میں پھینکنے آئی تھی۔ ہم نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ جونہی لوسی کی نظر تاجور پر پڑی، وہ جو اب تک خاموش بیٹھی تھی، ایک دم بھڑک اٹھی۔ اس نے چلانا شروع کیا اور دیوانہ وار روزن پر حملہ آور ہوئی۔ وہ جیسے ہر رکاوٹ توڑ کر اندر گھس آنا چاہتی تھی۔ وہ روزن کی آہنی جالی کو اپنے دانتوں اور پنجوں سے ادھیڑنا چاہ رہی تھی۔ وہ آہنی سلاخوں کی وجہ سے خود تو اندر نہیں گھس سکتی تھی لیکن اگر وہ جالی کو نقصان پہنچا دیتی تو خون آشام طوطوں کو راہ مل سکتی تھی۔ چند سیکنڈ میں دو چار طوطے بھی جالی سے ٹکرانا شروع ہو گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کی تعداد بڑھ گئی۔

ان مناظر کو دیکھ کر تاجور کا رنگ ہلدی ہو گیا۔ وہ شاپر ڈسٹ بن میں پھینک کر جلدی سے باہر چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی لوسی کی جارحیت ماند پڑ گئی۔ پرندے بھی کچھ دیر جالی کے اردگرد پھڑ پھڑاتے رہے پھر تہ خانے کے زیریں دروازے کی طرف چلے گئے۔

''اوہ گاڈ۔'' قسطینا نے طویل سانس لی پھر دھیمی آواز میں مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''اس کا مطلب ہے فی الوقت تاجور ہی ان کا ٹارگٹ ہے۔ ابھی ان پرندوں اور لوسی کو تمہارے یا ہمارے حوالے سے کوئی سجیشن نہیں دی گئی ہے۔''

''ایسا ہی لگ رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

قسطینا نے کچھ توقف کیا پھر پُرسوچ لہجے میں بولی۔ ''اس کا مطلب ہے کہ اگر ہم یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں تو ہم پر حملہ نہیں ہوگا۔''

''اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا قسطینا! ویسے آپ نے دیکھا ہی تھا جب آپ تاجور کو اپنی اوٹ میں لے کر سیڑھیاں اتری تھیں، یہ طوطا اندر آنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔'' میں نے ڈسٹ بن میں پڑے مردہ طوطے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ میری بات سمجھ کر بولی۔ ''ہاں اس طوطے نے مجھ پر بھی حملہ کیا تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ تاجور میری آڑ میں تھی۔ ہو سکتا ہے کہ جب تاجور ہمارے ساتھ نہ ہو، ہم یہاں سے نکل سکیں۔'' اپنی بات مکمل کر کے قسطینا سوالیہ نظروں سے اپنے شوہر فارس جان کی طرف دیکھنے لگی۔

وہ خاموش رہا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ تردید کر رہا ہے نہ تائید۔

فخر نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ''دوپہر کے بارہ بج چکے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ ہمیں یہاں بند ہوئے چوبیس گھنٹے ہو چکے ہیں۔ حیرانی کی بات ہے کہ ان چوبیس گھنٹوں میں کوئی ہم تک نہیں پہنچ سکا۔''

ایک جانب لوہے کی ایک پرانی سیڑھی رکھی تھی۔ میں یہ چھوٹی سی سیڑھی دیوار سے لگا کر روزن تک پہنچا۔ باہر کا منظر دکھائی دیا۔ لوسی چند فٹ کے فاصلے پر خاموش بیٹھی تھی لیکن دیکھ روزن کی طرف ہی رہی تھی۔ دو تین پرندے بھی روزن کے اردگرد چکرا رہے تھے۔ اس شکستہ مندر کی چھوٹی سی ڈیوڑھی دکھائی دیتی تھی یا پھر احاطے کا کچھ حصہ۔ مجھے اپنی اسٹیشن وین کے عقبی پہیے اور دو کھڑکیاں بھی دکھائی دے رہی تھیں جس پھاٹک سے ٹکرا کر ہم اندر آئے تھے، وہ ہوا کی وجہ سے یا پھر خود ہی بند ہو چکا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر آس پاس سے کوئی گزرے گا بھی تو اسے احاطے میں کھڑی دو گاڑیاں نظر نہیں آئیں گی۔

''کچھ دکھائی دیا؟'' فخر نے نیچے سے پوچھا۔

''ہاں...... پھاٹک بند ہو چکا ہے۔ لگتا ہے کہ کل رات بارش بھی ہوئی ہے...... کئی جگہ پانی کھڑا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ دونوں گاڑیوں کے ٹائروں کے نشان بھی مٹ گئے ہوں گے۔'' فخر نے کہا۔

''لگ تو یہی رہا ہے...... مگر یہ بالکل کوئی جنگل تو نہیں ہے۔ پُل کے اردگرد اگر پندرہ سولہ کلومیٹر قطر کے ایریا میں بھی ہمیں ڈھونڈا جائے تو کسی کو اس احاطے تک پہنچنا چاہیے۔''

اچانک میرے ذہن میں آیا کہ میں اس روزن کے پاس سے اپنا موبائل فون ٹرائی کروں۔ وہیں سیڑھی پر کھڑے کھڑے میں نے بار بار داؤد بھاؤ کے خاص نمبر پر ٹرائی کیا مگر جواب وہی آیا۔ ''فی الحال آپ کے مطلوبہ نمبر سے رابطہ ممکن نہیں۔ کچھ دیر بعد کوشش کیجیے۔''

میں نے موبائل کی اسکرین دیکھی، سگنل کی انڈیکیشن کی صرف ایک لائن کسی وقت ایک سیکنڈ کے لیے ابھرتی تھی اور غائب ہو جاتی تھی۔

ایک دم لوسی اپنی جگہ سے اٹھی اور دو قدم چل کر روزن کے کچھ اور قریب آ گئی۔ وہ جیسے اپنی جبلت کے تحت مجھے پہچاننے اور سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ تاہم یوں لگتا تھا کہ ٹرانس اتنا پاورفل ہے کہ اس نے ایک خاص مقصد کے سوا سب کچھ اس کے ذہن سے محو کر رکھا ہے۔

لوسی ہمیشہ کی طرح ایک پھول دار فراک اور نیلی نیکر میں تھی۔ اس نیکر کے ایک سوراخ سے اس کی طویل دم باہر نکلی ہوئی تھی۔ کچھ دن پہلے اس کی گردن پر ایک کٹ لگا کر ہم نے ایک ٹرانسمیٹر اس کے جسم میں رکھا تھا۔ بعدازاں وہ ٹرانسمیٹر ہاناوانی کے لوگوں نے نکال لیا تھا۔ اب گردن پر ایک چھوٹے سے زخم کے آثار تھے لیکن وہ بھی کافی حد تک اس کے گولڈن بالوں میں چھپ گئے تھے۔

میں نے سوچا کسی وقت لوسی کی حیثیت ایک خوشنما پالتو جانور کی تھی۔ جاما جی میں خانساماں ازمیر طیب اسے کندھوں پر اٹھائے پھرتا تھا۔ اس کی اٹکھیلیاں ازمیر کے علاوہ دوسرے دیکھنے والوں کو بھی نہال کر دیتی تھیں اور پھر یہی وفادار لوسی تھی جو اپنی جان کی پروا کیے بغیر ہیلی کاپٹر پر جست لگا گئی تھی اور ازمیر طیب کے قاتل آقا جان کو ہیلی کاپٹر سے کھینچ کر چھت پر لا پھینکا تھا۔ آقا جان کے فرار کی کوشش لوسی کی وجہ سے ہی ناکام ہوئی اور وہ اپنے انجام کو پہنچا۔ اپنے اسی جرم کی سزا میں یہ باوفا لوسی اب ہاناوانی کے مہلک شکنجے میں تھی اور ہمارے خون کی پیاسی ہو رہی تھی۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے قسطینا نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ لوسی کو شوٹ کر دیا جائے مگر مجھے ہمت نہیں ہوئی تھی کہ میں اس تجویز کی حمایت کروں۔ میں نے ٹال مٹول سے کام لیا تھا۔ اب بھی بھرا ہوا بریٹا پسٹل میری شرٹ کے نیچے موجود تھا مگر ابھی میں لوسی کو کچھ اور وقت دینا چاہتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ کسی طرح اس منحوس شکنجے سے نکل آتی جس نے اسے جکڑ رکھا تھا۔

میں سیڑھی سے نیچے اترا تو فارس جان باہر کا منظر دیکھنے کے لیے اوپر چڑھ گیا۔ اس کے بعد قسطینا اپنی باری کی منتظر تھی۔

ہال کمرے کے گوشے سے کراہنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یہ آدم خاں تھا۔ چوٹیں اب

ٹھنڈی ہو کر اسے اذیت میں مبتلا کر رہی تھیں۔ اس کی ناک خوفناک انداز میں بائیں طرف مڑ چکی تھی اور کلائی، ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح جھول رہی تھی۔ ''میڈیکل اٹینڈنٹ'' سعید کھوکھر نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر میڈم کی اجازت ہو تو اس...... آدم خاں کو میڈیکل ایڈ دے دوں؟'' میڈم سے اس کی مراد قسطینا ہی تھی۔

میں نے کہا۔ ''بالکل طبی امداد دو لیکن یہاں کوئی بھی کسی طرح کی کوئی چالاکی نہ دکھائے، ورنہ کام بگڑ جائے گا۔''

میں نے یہ الفاظ بلند آواز میں کہے تھے تاکہ دارج اور اس کی والدہ یاسمین بیگم تک بھی پہنچ جائیں۔

آدم خاں کی گن تو باہر جیپ میں ہی رہ گئی تھی، کیونکہ کل اسے افراتفری میں دارج کو گود میں اٹھا کر تہ خانے میں لانا پڑا تھا۔ باقی دارج یا یاسمین بیگم کے پاس کسی طرح کا آتشیں ہتھیار نہیں تھا۔ ان چاروں کے سیل فونز کچھ دیر پہلے ہی قسطینا نے اپنی تحویل میں لے لیے تھے۔

O......❖......O

یہ اس پرانے مندر میں ہماری دوسری رات تھی بلکہ شاید اسے مندر کہنا بھی درست نہیں تھا۔ یہ تو راکھشس دوارا تھا۔ یہ راکھشس دوارا کیوں تھا؟ کچھ مورتیوں پر سیاہ کراس کیوں لگے ہوئے تھے؟ یہاں گاہے بگاہے کون آتا تھا، اس بارے میں کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔

مضروب آدم خاں کی حالت بری تھی تاہم اس نے خود کو سنبھالا ہوا تھا۔ دوسری طرف یاسمین بیگم نے بھی ہاتھ پاؤں جوڑ کر اپنے شعلہ صفت فرزند دارج کو کسی حد تک سنبھال رکھا تھا۔ میرا دھیان بار بار یونس پمپ والا کی موت کی طرف چلا جاتا تھا۔ اس نے ہاناوانی کے آسیبی جبر کا شکار ہو کر ایک ایسی عزیزہ پر مجرمانہ حملہ کیا تھا جس کی وہ دل و جان سے عزت کرتا تھا۔ اب پتا نہیں کہ وہ پروین نامی خاتون کس حال میں تھی...... پھر میری سوچ کا دھارا خورسنہ اور اس کے بچے کی طرف مڑ گیا۔ سجاول کے بعد ان دونوں کو بھی شدید خطرات لاحق تھے۔ بہر حال مجھے فیض محمد سے امید تھی کہ وہ ان کی حفاظت کا حق ادا کرے گا۔ یہ رات کے دس بجے کا عمل تھا، ہم نے خشک چنوں سے پیٹ پوجا کی تھی اور کفایت شعاری کے ساتھ تھوڑا تھوڑا پانی پی کر ان چنوں کو گلے سے نیچے اتارا تھا۔ رات کے سناٹے میں بس کسی وقت آوارہ کتوں کی صدا سنائی دیتی تھی اور پھر خاموشی چھا جاتی تھی۔ ہم بہت کان لگا کر سنتے رہے تھے کہ کہیں کسی ٹریکٹر، انجن یا گاڑی وغیرہ کی آواز سنائی دے لیکن مایوسی ہوئی تھی۔

ہم نے دونوں لیمپس کی لو بہت کم کر رکھی تھی تا کہ تیل کی بچت ہو سکے۔ اس کم روشنی میں ہال کمرے کا منظر زیادہ پُر اسرار دکھائی دے رہا تھا۔ مورتیوں کے طویل سائے اور پیتل کے بہت بڑے گھنٹے کا سایہ جو آہستہ آہستہ جھولتا بھی تھا۔ فخر ساتھ والے کمرے میں لوہے کی سیڑھی پر چڑھا ہوا تھا اور اپنے موبائل فون کے ذریعے کال کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پچھلے چھتیس گھنٹوں میں ہم ایسی درجنوں کوششیں کر چکے تھے مگر کامیابی کوئی نہیں ہوئی تھی۔ ہماری نارسائی بھی وہیں رہی تھیں اور ہمارے گرد موت کا حصار بھی وہی رہا تھا۔

اب بھی فخر ناکام ہو کر روزن سے لگی سیڑھی سے اتر آیا۔ وہ میرے اور قسطینا کے قریب آن کھڑا ہوا۔ قسطینا نے اپنے ہاتھوں میں پکڑا ہوا لیمپ تھوڑا سا اونچا کیا اور ایک قد آدم مورتی کو دھیان سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''شاہ زائب! تم نے بھی نوٹ کیا ہو گا صرف ان مورتیوں پر نشان لگے ہیں جو بے ہودہ ہیں اور ان میں سے زیادہ مورتیوں میں یہی مجسمہ نظر آتا ہے جس کا اوپر کا دھڑ ٹائیگر کا ہے۔ مطلب یہ کہ یہی راکھشس ہے۔''

''مگر سوال یہ ہے کہ پھر ان مورتیوں کو اس جگہ سے نکال کیوں نہیں دیا گیا...... ہو سکتا ہے کہ ان مورتیوں کی وجہ سے ہی آس پاس کے لوگوں میں ہراس پیدا ہو گیا ہو اور وہ اس طرف آنے سے کتراتے ہوں۔ ورنہ یہ علاقہ اتنا بھی غیر آباد نہیں ہے۔''

قسطینا نے بڑے دھیان سے سیاہ نشانات کو دیکھا اور بولی۔ ''مجھے لگتا ہے کہ یہ نشانات خون سے لگائے گئے ہیں جو بعد میں خشک ہو کر سیاہی مائل ہو گیا ہے۔''

میڈیکل ہیلپر سعید کھوکھر بھی قریب آ گیا۔ اُس کے پاس ایک چھوٹی ٹارچ بھی تھی اس نے نشانات کو دھیان سے دیکھنے کے بعد قسطینا کے خیال کی تصدیق کی۔

ابھی ہم بات ہی کر رہے تھے کہ ایک زوردار آواز نے ہم سب کو اچھلنے پر مجبور کر دیا۔ ہم کو یہی لگا کہ تہ خانے کی چھت شیشے کی ہے اور چھناکے سے ٹوٹ کر ہم پر آن گری ہے لیکن یہ آواز گھنگروؤں کی تھی اور اتنی بلند تھی کہ کانوں کے پردے پھٹتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی کسی عورت کے رونے اور چلانے کی آوازیں آئیں۔ جیسے وہ کسی پیارے کی لاش پر بَین کر رہی ہو۔

تاجور اور اس کی دبنگ ساس یاسمین بیگم دہشت کے عالم میں پکارتی ہوئی کمرے سے نکل آئیں۔ سعید کھوکھر ''ہلدی چہرے'' کے ساتھ ان کے عقب میں تھا۔ ہم سب چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ یہ ہولناک آوازیں دیواروں اور فرش کے اندر سے پھوٹ رہی ہیں۔

پھر ایک اور کام ہوا۔ دودھیا روشنی کے جھماکے ہونے لگے۔ یہ جھماکے تہ خانے کے اندر نہیں باہر ہو رہے تھے۔ دروازے کی نچلی درز اور روشن دان کی طرف سے ان جھماکوں کا پتا چل رہا تھا۔

''یہ سب کیا ہے؟'' قسطینا نے حیران نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''جو کچھ ہے آپ کے سامنے ہی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

دودھیا روشنی کے جھماکوں کا عکس ہال کمرے کی مورتیوں پر بھی پڑ رہا تھا۔ یہ عکس ماحول کو اور بھی سنسنی خیز بنانے لگا۔ مجھ جیسا حقیقت پسند شخص کسی غیر منطقی اور ماورائی صورتِ حال کو تو ہرگز نہیں مان سکتا تھا۔ اس کے پیچھے کوئی انسانی ذہن ہی کارفرما تھا۔

میں نے قسطینا اور فارس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔'' لگتا ہے کہ کوئی اس جگہ کو جان بوجھ کر آسیب زدہ بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ یہ آوازیں...... ٹیپ ریکارڈر وغیرہ کی ہیں؟'' قسطینا نے پوچھا۔

''عین ممکن ہے۔ ہو سکتا ہے کہ...... ان کو پاورفل اسپیکرز کے ذریعے اتنی زیادہ فریکوئنسی دی گئی ہو۔''

''لیکن اسپیکرز کہاں ہیں؟'' فخر نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

گھنگھروؤں کی زوردار جھنکار اور عورتوں کی نوحہ گری جاری تھی۔ دودھیا جھماکے اس ساری سچویشن کو مزید ہیجان خیز بنا رہے تھے۔

یاسمین بیگم اور سعید کھوکھر کا خاص طور پر برا حال تھا۔ سعید تو لگتا تھا کہ بے ہوش ہو کر گر جائے گا۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔'' یہ آرٹی فیشل آوازیں ہیں۔ کچھ لوگ ڈراما کر رہے ہیں...... اور کچھ نہیں ہے یہاں۔''

فخر نے سیڑھی روشن دان کے پاس سے اٹھائی اور روشن دان کی دائیں جانب لگا کر اوپر چڑھ گیا۔ یہاں لکڑی کا ایک باکس سا تھا، جیسے فالتو اشیا رکھنے کے لیے چھوٹی سی الماری بنائی گئی ہو۔ میں نے سعید سے ٹارچ لے کر اس باکس پر ڈالی۔ چند سیکنڈ کے اندر فخر نے اس مقفل باکس کا دروازہ توڑ کر اسے کھول لیا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ آوازوں کا ماخذ یہی ہے۔ یہ اندازہ درست نکلا۔ اندر ایک جہازی سائز کا ''ایمپلی فائر'' موجود تھا۔

''اس کے تار کھینچ دو۔'' میں نے کہا۔

فخر نے تار کھینچ دیے۔ ایمپلی فائر خاموش ہو گیا لیکن آوازیں بدستور بلند ہوتی رہیں۔

فارس جان بولا۔ "لگتا ہے کہ یہ دوسرا ایمپلی فائر ہے جو تہ خانے سے باہر انسٹال کیا گیا ہے۔"
وہ درست کہہ رہا تھا اب آوازیں تہ خانے کے باہر سے آرہی تھیں۔ یہ اتنی بلند تھیں کہ رات کے اس سناٹے میں شاید دو تین کلومیٹر تک سنی جاتی ہوں۔ اچانک یہ آوازیں بند ہوگئیں اور اس کے ساتھ ہی روشنی کے جھماکے بھی ختم ہو گئے۔ ایک بار پھر چاروں طرف پہلے جیسا گمبھیر سناٹا چھا گیا۔ اس سناٹے میں بس آوارہ کتوں کا دور افتادہ شور تھا یا پھر ہمارے محاصر پرندوں کی پھڑ پھڑاہٹ سنائی دیتی تھی۔

اندر کمرے میں دارج گرج برس رہا تھا۔ وہ وہی بات دہرا رہا تھا۔ "یہ سب ناٹک ہے۔ ڈرامے بازی ہے۔ یہ حرام زادے ہم کو چغد سمجھ رہے ہیں، ہم بھی اسی دنیا میں رہتے ہیں۔ کہیں جنگلوں سے نہیں "نکلے ہیں....." وہ مغلظات بکنے لگا۔ اس کی والدہ اسے چپ کرانے کی کوشش کرنے لگی۔ دارج کے زیادہ تر غصے کا رخ میری طرف ہی تھا۔ وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ یہ سب میرا ہی بچھایا ہوا جال ہے اور میں یہ سب کچھ داراببوں سے اپنی پرانی دشمنی چکانے کے لیے اور تاجور تک پہنچنے کے لیے کر رہا ہوں۔ بیماری نے اس کے حواس خراب کر دیئے تھے اور وہ بس ایک ہی رخ پر سوچتا جا رہا تھا۔

بہرحال ایمپلی فائر برآمد ہونے کے بعد یہاں موجود ہر فرد کو یقین ہو گیا تھا کہ اچانک جو آوازیں بلند ہوئی ہیں اور جو جھماکے ہوئے ہیں، وہ سراسر کوئی پلاننگ ہے۔ شاید کچھ لوگ کسی خاص مقصد کے لیے علاقے کے مکینوں کو اس شکستہ عمارت سے دور رکھنا چاہتے ہیں۔ ایک مرتبہ انیق نے ہی مجھے بتایا تھا کہ اس قسم کی صورتِ حال اکثر دیہاتی علاقوں میں پیش آتی ہے۔ جرائم پیشہ لوگ کسی قبرستان، کسی عمارت یا درختوں کے جھنڈ کو آسیب زدگی کا رنگ دے دیتے ہیں اور اپنے مذموم مقاصد کے لیے راہ ہموار کرتے ہیں۔ سادہ لوح لوگ ان کے جھانسے میں آجاتے ہیں۔

اگر یہاں بھی کوئی ایسی ہی سچویشن تھی تو سوچنے کی بات یہ تھی کہ وہ کون لوگ ہیں جو اس جگہ کو استعمال کر رہے ہیں۔ ایک الماری سے شراب کی دو خالی بوتلیں اور ماچس کی ڈبیا ملی تھیں۔ روغنی نان کے کچھ سوکھے ہوئے ٹکڑے، ایک ٹوٹی ہوئی زنانہ چپل، ایک کمبل، اس طرح کی کچھ اور اشیا بھی یہاں موجود تھیں۔

رات کا باقی حصہ نسبتاً پُرسکون گزرا۔ تاریک خاموشی میں بس کسی وقت لوسی کی غصیلی آواز ابھرتی تھی اور پتا چلتا تھا کہ وہ دروازے پر اپنے پنجوں کو رگڑ رہی ہے یا پھر روزن کی جالی پر اپنے ناخن آزما رہی ہے۔ کسی وقت جنونی پرندوں کی پھڑ پھڑاہٹ بھی سنائی دے جاتی

تھی۔قسطینا کے دونوں محافظ پہرا دینے والے انداز میں دروازے کے پاس موجود تھے۔

دو ڈھائی بجے کے لگ بھگ مجھے نیند آ گئی۔ میں وہیں فخر کے پاس ہال کمرے میں ایک چٹائی پر لیٹ گیا۔ فارس جان اور قسطینا ساتھ والے چھوٹے کمرے میں لیٹے ہوئے تھے۔ قسطینا اپنے ساتھی ناوان کی طرف سے سخت پریشان تھی۔ابھی تک باہر کی کوئی خبر ہم تک نہیں پہنچ سکی تھی۔اب دو تین موبائلز کی چارجنگ بھی ختم ہو چکی تھی۔

یہ رات کا پچھلا پہر تھا جب کسی نے میرے پاؤں کا انگوٹھا ہلا کر مجھے جگایا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھا۔ لیمپ کی روشنی نہ ہونے کے برابر تھی۔ پھر بھی مجھے تاجور کے دلکش چہرے پر جھولتی ہوئی دو لٹیں نظر آ ہی گئیں۔ میں نے اردگرد دیکھا۔سب سو رہے تھے۔کمرے میں سے دارج کی فربہ اندام والدہ کے خراٹوں کی مدھم آواز سنائی دے رہی تھی۔ یقیناً دارج بھی سو رہا تھا۔ زخمی آدم بھی مدھم خراٹے لے رہا تھا اور اس کے خراٹوں کی آواز سے پتا چلتا تھا کہ وہ تکلیف میں ہے۔

میں اٹھ کھڑا ہوا۔''کیا بات ہے تاجور؟'' میں نے سرگوشی کی۔

''میں بات کرنا چاہتی ہوں۔'' وہ بھی بہت مدھم آواز میں بولی اور مڑ کر تہ خانے کے اس تاریک گوشے کی طرف چل دی جو سیڑھیوں کے نیچے واقع تھا۔ میں بھی ننگے پاؤں اس کے پیچھے گیا۔ساتھ ساتھ میں محتاط نظروں سے دائیں بائیں بھی دیکھ رہا تھا۔وہ سیڑھیوں کے نیچے پہنچ کر مڑی اور دلدوز آواز میں بولی۔''شاہ زیب! پلیز مجھ پر رحم کریں۔آپ جانتے نہیں کہ دارج کتنی زیادہ ٹینشن میں ہیں۔''

''میں نے کیا کیا ہے تاجور؟''

''لیکن قسطینا نے تو کیا ہے۔آدم کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اس پر دارج کو بے حد غصہ ہے۔ وہ بہت زیادہ تلخ ہو گئے ہیں۔ مسلسل بول رہے ہیں اور گالیاں دے رہے ہیں۔'' وہ سسک پڑی۔

وہ کہہ نہیں رہی تھی مگر اس کی گفتگو کا مطلب یہی تھا کہ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے، اس کا سارا غصہ خود اس پر نکلے گا۔ وہ بہت زیادہ ڈری ہوئی تھی۔

''تم کیا چاہتی ہو تاجور؟''

''قسطینا اور آپ ایسی کوئی بات نہ کریں جس سے دارج کا غصہ بڑھ جائے پلیز، آپ کسی طرح قسطینا سے کہیں کہ وہ...... دارج سے معافی مانگ لے۔کل وہ بہت زیادہ سخت بولی ہے دارج سے۔ پلیز آپ قسطینا سے کہیں۔'' تاجور نے میرے سامنے باقاعدہ ہاتھ جوڑ

دیئے۔

میں اس کا چہرہ دیکھ کر لرز گیا۔ دنیا جہان کا خوف سمٹ آیا تھا اس کی آنکھوں میں۔ یوں لگتا تھا کہ دارج کا خوف ایک عفریت کی طرح اس کے دل و دماغ پر سوار ہو چکا ہے۔ وہ کیوں ہو گئی تھی ایسی؟ میں نے بے حد کرب کے ساتھ سوچا۔

اس نے ایسے انداز میں التجا کی تھی کہ میں گنگ سا ہو کر رہ گیا۔ میں بس اتنا کہہ سکا۔ ''اچھا...... میں...... کوشش کروں گا۔''

وہ جانے کے لیے مڑنا چاہتی تھی۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ''تاجور! دارج نے اپنی من مانی کی ہے۔ وہ بغیر کسی احتیاطی تدبیر کے لاہور سے موٹروے پر چل پڑا...... اور پھر وہی ہوا جس کا خطرہ تھا۔ یہ کوئی جادوٹونا یا کالا علم یا اس طرح کی کوئی اور چیز نہیں ہے۔ یہ ہپناسز ہے، جسے عام زبان میں ہپناٹزم کہتے ہیں۔ ایک خاص عورت کے دماغ میں پہنچ کر یہ ہپناٹزم بہت خطرناک صورت اختیار کر گیا ہے۔ تمہیں معلوم ہی ہے۔ یہ خاص عورت ہاناوانی ہے اور اس وقت...... ہم سب کے لیے زبردست خطرہ ہے۔''

اس نے اپنا نچلا ہونٹ ہولے سے دانتوں میں دبایا۔ اپنی لٹوں کو پیشانی سے پیچھے ہٹایا اور میری طرف دیکھے بغیر بولی۔ ''کل سعید اور فارس جان بات کر رہے تھے۔ میرے کان میں بھی کچھ لفظ پڑ گئے۔ وہ میری بات کر رہے تھے...... اور کہہ رہے تھے کہ سب سے زیادہ خطرہ تُو ہے۔ اور یہ...... پرندے...... میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔''

مجھے فارس اور سعید پر غصہ آیا۔ ان کو بات کرتے ہوئے احتیاط سے کام لینا چاہیے تھا۔ میں نے کہا۔ ''اگر انہوں نے ایسا کہا ہے تو بالکل بیکار کی بات کی ہے۔ مت ماری گئی ہے ان کی۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔ مجھ سے، قسطینا سے اور فارس سے زیادہ ہاناوانی کا دشمن اور کون ہو سکتا ہے۔ ہمیں چھوڑ کر وہ تمہارے پیچھے کیوں پڑے گی۔''

''لیکن...... کل...... جب میں شاپر لے کر ڈسٹ بن کی طرف گئی تھی......'' یکایک تاجور کو اپنی بات ادھوری چھوڑنا پڑی۔

کمرے کے اندر سے دارج کی بھاری بھرکم کھانسی سنائی دی تھی۔ پھر وہ بھرائی ہوئی آواز میں کچھ بولنے لگا۔ شاید سعید کھوکھر کو بلا رہا تھا۔

تاجور نے لرز کر کہا۔ ''اچھا، میں چلتی ہوں...... اور پلیز، جو کچھ میں نے کہا ہے، وہ یاد رکھیے گا۔''

وہ چلی گئی۔ میں اسے کیسے بتاتا۔ وہ اپنے بے مثل ہونٹوں سے جو لفظ بھی ادا کرتی ہے،

وہ میرے حافظے پر نقش ہو جاتا ہے۔ میں چاہوں بھی تو اس کے لفظوں اور اس کی کہی ہوئی باتوں کو بھول نہیں سکتا۔

تاجور کمرے میں جا چکی تھی، دروازہ بند ہو گیا۔ سعید کھوکھرا اپنی ڈیوٹی سے بالکل بے خبر سو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد بند دروازے کے پیچھے سے دارج کے گرجنے برسنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ساری باتیں تو سمجھ میں نہیں آرہی تھیں لیکن اس طرح کے الفاظ میرے کانوں تک ضرور پہنچ رہے تھے......بکواس بند کرو...... اس کو نیچے رکھو......وہ لے کر آؤ، اُلو کی پٹھی...... جو میں کہہ رہا ہوں، وہ کرو......

میرا خون کھولنے لگا لیکن میں بے بس تھا۔ جب وہ اسے دل و جان سے شوہر سمجھتی ہے اور اس کے خلاف کچھ بھی سننے کی روادار نہیں تھی تو میں کیا کر سکتا تھا......کوئی بھی کیا کر سکتا تھا؟ چند روز پہلے جب ہم لاہور میں تھے، میں نے یہ اُڑتی اُڑتی بات بھی سنی تھی کہ تاجور شاید ''امید'' سے ہے......اور لاہور آنے کے بعد دارج کی حالت میں کافی بہتری آئی ہے لیکن اس امر کی تصدیق ابھی تک نہیں ہو سکی تھی۔ آدم خاں اسے جس طرح گود میں اٹھا کر یہاں تہ خانے میں لایا تھا، اس سے تو بہتری کا تاثر نہیں ملتا تھا۔ بہرطور اس موقع پر یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

''چلو جلدی کرو۔'' اندر سے دارج کی دہاڑ ابھری۔

چند سیکنڈ بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور تاجور بوکھلائی ہوئی باہر نکلی۔ لیمپ کے پاس سے اس نے جھاڑ پونچھ والا ایک کپڑا اٹھایا اور جلدی سے اندر چلی گئی۔ شاید اندر دارج نے کوئی برتن وغیرہ الٹ دیا تھا۔

میں لیٹ گیا مگر سینے میں دھواں سا بھرا ہوا تھا۔ میں نے کہیں سنا تھا کہ کبھی کبھی انسان اپنے حالات کا بدلہ اپنے آپ سے لینے لگتا ہے۔ خود کو سزا دیتا ہے......اور اس میں راحت محسوس کرتا ہے۔ شاید تاجور بھی ایسا ہی کر رہی تھی۔ والد نے غلامی کا جو طوق، دارج کی صورت، اس کے گلے میں ڈال دیا تھا، وہ اسے اٹھائے پھر رہی تھی۔ اس طوق کے علاوہ بھی کچھ وزنی زنجیریں اس نے خود پہن لی تھیں۔ زخمی ہو رہی تھی، ذلت سہہ رہی تھی مگر چلتی جا رہی تھی۔ کل سہ پہر جب سعید کھوکھر، دارج کا ڈائپر بدلنے اور منہ ہاتھ صاف کرنے کے بعد کمرے سے باہر نکلا تھا تو ایک سیکنڈ کے لیے میری نگاہ کمرے کے اندر گئی تھی۔ میں دیکھ کر......اور دل مسوس کر رہ گیا تھا کہ دارج پاؤں لٹکائے، چوڑا ہو کر صوفے پر بیٹھا ہوا تھا اور تاجور فرش پر بیٹھی اس کے پاؤں دھو رہی تھی۔

ایکا ایکی مجھے اپنے خیالوں سے چونکنا پڑا۔ چھوٹے سے وقفے کے بعد ایک بار پھر بند کمرے میں سے دارج کے مسلسل بولنے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ میں دروازے کے بالکل نزدیک چلا گیا اور سننے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ قسطینا کو ہی لتاڑ رہا تھا۔ ''اس نے آدم کو مارا ہے۔ میری نظروں کے سامنے مارا ہے۔ میں اس کو بخشوں گا نہیں۔ سرِعام اس کی مٹی پلید کرواؤں گا۔ اس کی نسلیں یاد رکھیں گی۔'' وہ غصے سے جیسے پھٹا پڑ رہا تھا۔

تب ایک بار پھر وہ تاجور کے درپے ہو گیا۔ وہ نسبتاً دھیمی لیکن کرخت آواز میں تاجور کو لعنت ملامت کر رہا تھا۔ بہت دھیمی آواز بمشکل میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ ''تو جو کچھ بھی کہتی رہ لیکن اس خبیث نے تجھے دل سے نہیں نکالا۔ تُو اب بھی اس کی معشوقہ ہے۔ وہ تیرے لیے ہی بھیس بدل کر ہماری کوٹھی میں گھسا تھا اور تُو جانتی تھی سب کچھ...... جانتی تھی ناں؟'' وہ پھنکارا۔

وہ سہمی آواز میں بولی۔ ''میں نے آپ کو بتایا ہے کہ میں جانتی تھی لیکن اس کا آنا مجھے بھی اتنا ہی برا لگا جتنا آپ کو لگا ہوگا۔''

''پھر وہی بکواس کر رہی ہے۔'' وہ دانت پیس کر بولا۔ ''تیرا فرض بنتا تھا کہ پہلے دن مجھے بتاتی...... پہلے دن...... پہلی گھڑی۔''

''میں ڈرتی تھی دارج...... آپ کے غصے سے ڈر لگتا تھا۔ میں سچ کہتی ہوں، اگر وہ ایک دو دن مزید وہاں سے نہ جاتا تو میں آپ کو سب کچھ بتا دیتی۔''

''یہ صفائیاں میرا دکھ دور نہیں کر سکتیں۔ اگر تُو نے پہلے روز مجھے بتایا ہوتا تو اس باسٹرڈ کی لاش کے ٹکڑے کر کے گٹر میں ڈال دیئے ہوتے ہم نے۔ اب ہمارے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے اس لیے ہو رہا ہے کہ تیری وجہ سے وہ زندہ ہے۔ ہمارے آس پاس تماشے لگا رہا ہے۔''

جواب میں تاجور نے منمنا کر کچھ کہا جو سنائی نہیں دیا۔ تاہم اس کے جواب میں دارج پھر پوری شدت سے بھڑک اٹھا۔ وہ اس پر بے طرح گرجنے برسنے لگا۔ اس کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔ پھر اس نے شاید حسبِ عادت تاجور کے بال مٹھی میں لے لیے تھے یا اس کی گردن بازو کے شکنجے میں جکڑ لی تھی۔ اس کی ہلکی کراہیں میرے کانوں تک پہنچیں جی چاہا کہ دروازہ توڑ کر اندر گھس جاؤں اور اسی جگہ اس منحوس شخص کو شوٹ کر دوں، لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ وہ تاجور کا شوہر تھا اور وہ اس کو اپنا شوہر مانتی تھی۔ شاید وہ بھی اسی ''زریں قول'' پر کاربند تھی جس میں بڑے بوڑھے رخصتی کے وقت بیٹیوں سے کہتے ہیں کہ اب جس گھر میں تمہاری ڈولی جا رہی ہے، وہاں سے تمہارا جنازہ ہی نکلنا چاہیے اور اکثر جنازہ نکلنے میں زیادہ

دیر نہیں لگتی۔ جسمانی جنازہ نہ نکلے لیکن خوشیوں کا جنازہ تو نکل ہی جاتا ہے۔

میرے سینے میں گھٹن بڑھنے لگی۔ دارج کی ماں ہال کمرے میں ہی ایک چوبی تخت پر گدا بچھا کر سوئی ہوئی تھی۔ میں نے اسے جھنجھوڑا تو اس کے خراٹے تھم گئے۔ پھر اس نے اپنے چربی دار جسم کو ہلکورا دیا اور جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ''کون ہے؟ کیا ہوا؟'' اس نے اپنا بڑا سا منہ کھول کر کہا۔

میں نے دارج کے کمرے کے بند دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ کیسی آوازیں ہیں؟'' میں نے انجان بن کر کہا۔

دارج کی والدہ یاسمین بیگم چند سیکنڈ تک سنتی رہی، پھر بڑبڑاتی ہوئی اور اپنے جسم کو جھلاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ دروازے تک پہنچی اور دھیمی آواز میں دروازہ کھٹکھٹایا۔

''دارج......دارج......تاجور......دروازہ کھولو۔''

اندر صورتِ حال جوں کی توں رہی۔ دارج مسلسل گرج رہا تھا۔ یاسمین بیگم نے ذرا گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''دارج نہ کرو...... چھوڑ دو اسے...... یہ ٹھیک نہیں...... دروازہ کھولنے دو اسے۔''

شاید دارج کی مشتعل کھوپڑی میں بھی یہ بات آ گئی۔ کچھ دیر بعد دروازے پر کھٹ پٹ ہوئی اور تاجور نے دروازہ کھول دیا۔ مجھے اس کی پنک قمیص کی ایک جھلک ہی نظر آئی۔ یاسمین بیگم اندر چلی گئی۔ دروازہ دوبارہ بند ہو گیا لیکن میں پھر صبح تک سو نہیں سکا۔

○......❖......○

ہم زیادہ دیر یہاں بندرہ کر مزید خطروں کو دعوت نہیں دے سکتے تھے۔ صبح سویرے پہلے میں نے اور قسطینا نے مشورہ کیا تھا، پھر باقیوں کو بھی اس مشورے میں شریک کر لیا تھا۔ فیصلہ یہی ہوا تھا کہ ہم یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں۔ بے شک پرندوں کا محاصرہ موجود تھا اور لوسی بھی اردگرد منڈلا رہی تھی مگر ایک بات کافی حد تک کھل کر سامنے آ گئی تھی۔ فی الوقت پرندوں اور لوسی کا ٹارگٹ تاجور ہی تھی۔ وہ تاجور کی جھلک دیکھ کر زیادہ مشتعل ہو جاتے تھے اور بے چینی ظاہر کرتے تھے۔ ایسی صورت میں یہ عین ممکن تھا کہ اگر تاجور باقی لوگوں کے ساتھ یہیں رہتی اور ہم میں سے دو تین افراد مسلح ہو کر باہر نکلتے تو اپنی اسٹیشن ویگن تک پہنچ جاتے۔ اس کے بعد آگے کا سوچا جا سکتا تھا۔

ایک بار پھر یہی سوال ہم سب کے ذہنوں میں ابھرتا تھا کہ ہمیں اب تک ڈھونڈا کیوں نہیں جا سکا تھا۔ اگر پہلوان حشمت ہمارے ساتھ یہاں ہوتا تو وہ اس صورتِ حال پر یقیناً

یہی کہتا کہ یہ سب کالے جادو اور آسیب کا چکر ہے۔ یہ مندر باہر سے کسی کو نظر ہی نا ہیں آتا ہووے گا۔

بلکہ میرا تو خیال تھا کہ پہلوان حشمت نے کل رات کو ہی اپنی جان، جانِ آفریں کے سپرد کر دینا تھی جس طرح اچانک قیامت کا شور بلند ہوا تھا اور دودھیا جھماکوں نے قرب و جوار کو روشن کیا تھا۔ پہلوان کی حرکتِ قلب کا بند ہونا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ مشورے کے دوران میں، میں نے کہا۔ ''یقینی بات ہے کہ ہماری تلاش میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی جا رہی ہو گی۔ انسپکٹر قیصر چوہدری کی موت کا واقعہ ہی چھوٹا نہیں تھا، اب خیر سے دارج اور اس کی والدہ اوجھل ہو گئی ہیں۔''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' قسطینا نے پوچھا۔

''ہمیں رات ہونے کا انتظار کر لینا چاہیے۔ داؤد بھاؤ بھی ہماری مدد رات کے اندھیرے میں ہی کر سکتا ہے۔''

''لیکن اس سے پہلے تو یہ مسئلہ ہے کہ مسٹر داؤد سے رابطہ ہو۔''

''وہ تو ہو جائے گا قسطینا، تہ خانے سے نکلتے ہی ہمارے موبائل فون کام کرنا شروع کر دیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ داؤد بھاؤ اپنے مقامی کارندوں کو حرکت میں لے آئے گا اور وہ کسی بھیس میں ہم تک پہنچنے کی کوشش کریں گے۔''

یکایک سعید کے چلانے کی آواز آئی۔ وہ ہمیں پکار رہا تھا۔ ہم میٹنگ ادھوری چھوڑ کر اس کی طرف لپکے۔ وہ روشن دان کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ لوسی وہاں موجود تھی۔ شاید اب اسے ٹرانس کے علاوہ بھوک بھی بے قرار کر رہی تھی۔ وہ جارحانہ آوازیں نکال رہی تھی اور پنجوں سے آہنی جالی کو بری طرح کھرچ رہی تھی۔

''یہ دیکھیں...... یہ کیا کیا ہے اس نے؟'' سعید ہراساں لہجے میں بولا۔ ساتھ ہی اس نے اپنی ٹارچ کی روشنی روزن پر پھینکی۔

لوسی کی پے در پے ضربوں سے روزن کی بیرونی جالی ایک جگہ سے ادھڑنا شروع ہو گئی تھی۔ ''اوہ گاڈ! یہ تو بہت خطرناک ہے۔ پرندے یہاں سے اندر آ جائیں گے۔'' قسطینا بولی۔

''بالکل......'' فارس جان نے کہا۔ ''تھوڑی سی جگہ بھی بن گئی تو وہ اندر گھسنا شروع ہو جائیں گے۔''

فخر نے لوہے کی زنگ آلود سیڑھی کو روزن کی طرف کیا اور اس کی ضربات سے لوسی کو ڈرانے کی کوشش کی مگر وہ ڈرنے کے بجائے مزید مشتعل ہو گئی۔ وہ زیادہ شدت کے ساتھ

جالی سے کھینچا تانی کرنے لگی۔ کچھ طوطے بھی نامانوس آوازیں نکالتے ہوئے اس کے اردگرد چکرا رہے تھے۔

میں نے ایک بار پھر لوسی کی طرف دیکھا۔ پھول دار فراک، نیلی نیکر...... وہ کبھی ایک چنچل بچے کی طرح نظر آیا کرتی تھی۔ ازمیر طیب کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پر کھاتی تھی۔ اس کی گود میں بیٹھ کر گاڑی کا اسٹیئرنگ گھماتی تھی۔ اس کے اشارے پر پارک میں قلابازیاں لگاتی تھی اور رقص کرتی تھی۔ وہ دشمن نہیں تھی مگر دشمن بن چکی تھی۔ میں سیڑھی کی طرف گیا۔ میں نے بریٹا پسٹل سے تین گولیاں لوسی کے جسم میں اتار دیں۔ ایک گولی عین اس کی چنچل آنکھوں کے درمیان لگی...... اور اس نے اس کی موت آسان کر دی۔ وہ لڑھک کر پیچھے گئی اور اینٹھ کر ساکت ہو گئی۔ فائرنگ کی پُرشور آواز نے طوطوں کو تتر بتر کر دیا اور وہ بلندی پر جا کر ہوا میں چکرانے لگے۔ ''معاف کرنا لوسی...... اس کے سوا چارہ نہیں تھا۔'' میں نے دل ہی دل میں کہا اور بریٹا پسٹل پھر اپنی شرٹ کے نیچے لگا لیا۔

سب ہی کچھ دیر کے لیے گم صم ہو گئے تھے۔ فخر نے سیڑھی پر چڑھ کر جالی کو دیکھا۔ ابھی تک تو اتنا راستہ نہیں بنا تھا کہ کوئی پرندہ اندر آ سکتا لیکن اگر تھوڑی دیر مزید گزر جاتی تو ٹھیک ٹھاک راستہ بن جانا تھا۔

فخر نے روزن کے باہر پڑی لوسی کی طرف دیکھا۔ پھولدار فراک خون سے سرخ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ آہ بھر کر بولا۔ ''ہاناوانی کا ایک اور شکار۔''

قسطینا کا چہرہ بھی سرخ ہو رہا تھا۔ وہ مستحکم لہجے میں بولی۔ ''وہ ایک ایک کو نشانہ بنا رہی ہے۔ ہم اسے مزید وقت نہیں دے سکتے۔ اندھیرا ہوتے ہی ہمیں ہر صورت یہاں سے نکلنا ہو گا۔''

O......❖......O

شام کے سائے لمبے ہوتے جا رہے تھے۔ ایک پُرخطر رات سر پر تھی۔ ہمارے پاس صرف دو موبائل فونز ایسے تھے جن میں کچھ چارجنگ ابھی باقی تھی۔ اور باہر نکلنے کے بعد ان کے ذریعے کسی سے رابطہ کیا جا سکتا تھا۔ بند کمرے سے بگاہے بگاہے دارج کی کرخت آواز ابھرتی تھی۔ وہ جیسے ہر کسی پر بھرا بیٹھا تھا اور خاص طور سے تاجور پر۔ ابھی کچھ دیر پہلے اس نے سعید کھوکھر کو بھی بے نقط سنا ڈالی تھیں۔

تاجور کمرے سے نکلی تو ایک لمحے کے لیے اس کی نظریں میری نظروں سے ملیں...... اس کی آنکھیں مسلسل رونے سے سوجی ہوئی تھیں۔ اس نے جیسے خاموشی کی زبان میں مجھے

رات والی بات یاد دلائی۔

میں اٹھ کر ہال کمرے میں ٹہلنے لگا۔ میں قسطینا کے مزاج کو اچھی طرح سمجھتا تھا، یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ دارج جیسے شخص سے معافی مانگتی یا معذرت کرتی۔ وہ تو اس بدتہذیب کو غائبانہ صلواتیں سنا رہی تھی، اور حیران تھی کہ تاجور اس جنگلی کے ساتھ کیسے نبھا رہی ہے۔ دوسری طرف یہ بھی حقیقت تھی کہ آتش مزاج دارج کا پارا ڈاؤن کیے جانے کی فوری ضرورت تھی۔ وہ تاجور کے لیے سانس لینا مشکل کر رہا تھا۔

میرے دل سے آواز آئی۔ ''شاہ زیب! تم پیار نہیں عشق کرتے ہو تاجور سے اور عشق میں اپنی کوئی ہستی تو رہتی ہی نہیں ہے اور پھر جب ہستی ہی نہیں تو اونچ نیچ اور اَنا کا کیا مطلب، یہ وقت ٹالنے کے لیے تم خود دارج سے معذرت کیوں نہیں کر لیتے؟''

میں نے کافی دیر اس بارے میں سوچا، پھر فیصلے پر پہنچ گیا۔ شام کے سات بجے تھے۔ دارج کی والدہ بلڈ پریشر کی دوا کھا کر سو رہی تھی۔ سعید ابھی ابھی دارج کے کپڑے تبدیل کروا کے باہر نکلا تھا۔ میں نے دروازے پر ''ناک'' کی اور پھر اسے تھوڑا سا کھول دیا۔ سامنے ہی دارج کی پائنتی کی طرف تاجور نظر آئی۔ وہ اس کے پاؤں کے ناخن تراش رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

میں نے کہا۔ ''ایکسکیوزمی، اگر زحمت نہ ہو تو آپ ذرا باہر آ جائیں۔ میں دارج صاحب سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔''

دارج نے مجھے گھورا پھر غصے سے بولا۔ ''مجھے کوئی بات نہیں کرنی تم سے۔ تم بہروپیے ہو۔ تم نے ہماری زندگی کو عذاب بنا رکھا ہے۔ چلے جاؤ یہاں سے۔ میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔''

میں نے کہا۔ ''لیکن جو بات میں کرنا چاہ رہا ہوں، وہ بہت اہم ہے اس میں ہم سب کا فائدہ ہے دارج صاحب۔''

''یہ آج دارج صاحب کیوں کہنے لگے تم۔ اسی طرح بلاؤ جس طرح پہلے بلاتے رہے ہو۔ تمہاری ''توتڑاں'' میں بھولا نہیں ہوں۔''

''اسی حوالے سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا اور پھر دوبارہ تاجور کی طرف دیکھ کر گزارش کی کہ وہ ذرا دیر کے لیے باہر آ جائے۔

تاجور نے سوالیہ نظروں سے دارج کی طرف دیکھا۔ اس نے ذرا توقف کے بعد اشارے سے کہا کہ وہ باہر چلی جائے۔

تاجور کے جانے کے بعد میں دارج کے بستر کے سامنے سنگل صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کے کمرے میں دواؤں کی بوتھی اور اس کی ٹانگیں جو بالائی جسم کے مقابلے میں کافی دبلی نظر آتی تھیں کمبل میں لپٹی تھیں۔ وہ نیم دراز تھا۔

میں نے کہا۔ ''دارج! میری بات تحمل سے سن لینا، بعد میں جو جی میں آئے کہہ لینا۔''

وہ بس مجھے گھورتا رہا۔ اس کی گھنی مونچھوں کے بالوں میں جیسے ایک ارتعاش سا تھا۔ میں بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''پہلی بات تو یہ کہ...... ایک غلط فہمی اپنے دل سے نکال دو...... بالکل نکال دو...... اس مادہ بندر اور طوطوں وغیرہ کے یہاں موجود ہونے میں میرا یا میرے کسی ساتھی کا کوئی کردار نہیں ہے۔ ہم تو خود اس مصیبت سے چھپتے پھرتے ہیں۔ میرا سب سے قریبی ساتھی انیق مارا جا چکا ہے۔ کالا شاہ کاکو کے علاقے میں ان پرندوں نے ہمارا پیچھا کیا۔ اس سے پہلے لاہور کے ہوٹل میں، یہ مادہ بندر لوسی ہم پر حملہ آور ہوئی، ہم زخمی ہوئے اور اب تم نے بھی دیکھ لیا ہوگا، ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے لوسی کو اپنے ہاتھوں سے گولی ماری ہے۔ اس کے باوجود اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ ان جانوروں کو ہم نے ''ٹرینڈ'' کیا ہوا ہے تو وہ سراسر غلطی پر ہے۔''

''تم زیادہ تقریر مت کرو۔ بتاؤ کہنا کیا چاہتے ہو؟''

''میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس وقت ایک اتفاق نے ہم سب کو ایک ہی کشتی کا سوار بنا دیا ہے...... اور یہ کشتی مشکل میں ہے۔ اگر ہم ایک دوسرے سے جھگڑیں گے تو یہ مشکل اور بھی بڑھ جائے گی۔''

''میں کسی حرامزادے سے نہیں جھگڑ رہا۔ یہ تمہاری وہی غیر ملکی سورنی ہے جس نے آدم سے جھگڑا مول لیا، اس کو زخمی کیا اور وہ اب کسی غنڈی کی طرح سینہ تان کر یہاں دندناتی پھر رہی ہے۔ میں اس کی یہ اکڑی ہوئی گردن توڑ کر نہ رکھ دوں تو میرا نام بدل دینا۔''

میں نے تحمل سے کہا۔ ''میں یہی بات تم سے کرنے آیا ہوں۔ اس واقعے کا مجھے بھی بہت افسوس ہے اور خود قسطینا کو بھی۔ شاید تمہیں پتا ہی ہوگا کہ وہ جاما جی کی آرمڈ فورسز کی کمانڈر ہے۔ اپنے لوگوں میں اس کا ایک مقام اور دبدبہ ہے۔ جب آدم خاں نے اس کو دھکا دیا تو وہ برداشت نہ کر سکی۔ اب اسے بھی پچھتاوا ہے لیکن جو کچھ بھی ہے اس کی حیثیت یہاں شاہی مہمان کی سی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اسے مزید شرمندہ ہونا پڑے۔ اس کی طرف سے میں تم سے معافی مانگتا ہوں اور یہ وعدہ بھی کرتا ہوں کہ دوبارہ اس طرح کا واقعہ نہیں ہوگا۔''

''دوبارہ اب کیا ہونا ہے۔'' وہ پھنکارا۔ ''آدم کے ہاتھ پاؤں توڑ کر تو پھینک دیا ہے تم

لوگوں نے۔"

"جو کچھ بھی ہوا ہے، میں اس کے لیے پھر تم سے سوری بولتا ہوں۔ جہاں تک آدم کی بات ہے تم سعید کھوکھر سے پوچھ سکتے ہو۔ اسے فوری طبی امداد دی گئی ہے۔ ہر طرح اس کا خیال رکھا جارہا ہے۔ ہاتھ پاؤں صرف اس لیے باندھے گئے ہیں کہ کہیں وہ غصے میں کسی پر جھپٹ نہ پڑے، اگر وہ......"

"یہ طوطا مینا کی کہانی مجھ کو نہ سناؤ۔" وہ ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "میں اس ذلیل کے سلوک کو کبھی بھول نہیں سکتا۔ وہ خود آ کر میرے پاؤں کو ہاتھ لگائے تو بھی بھول نہیں سکتا...... لیکن اس موقع پر میں بات کو بڑھانا نہیں چاہتا...... اس سفید سورنی سے کہو ہمارے موبائل فون ہمیں واپس کرے...... اور بہتر ہے کہ ہماری نظروں سے بھی دور رہے۔"

"ٹھیک ہے میں موبائل واپس لا دیتا ہوں...... اس کے علاوہ ایک بار پھر کہتا ہوں کہ کم از کم یہ غلط فہمی اپنے ذہن سے نکال دو کہ یہاں جو سچویشن بنی ہوئی ہے، اس میں میرا یا میرے ساتھیوں کا کوئی کردار ہے۔"

"تمہارا کردار کیا ہے اور کہاں کہاں ہے اس بارے میں مجھ سے میری زبان نہ ہی کھلواؤ تو اچھا ہے۔ تم نے کھلی جنگ کی ہے میرے ساتھ۔ جب تک تم ہمارے اردگرد رہو گے، یہ جنگ جاری رہے گی بلکہ اور بھڑکتی جائے گی۔ بہرحال اس کا فیصلہ تو باہر جا کر ہونا ہے۔"

میں نے دارج کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس بارے میں بھی جمع خاطر رکھو۔ میں تمہاری زندگی میں کسی بھی طرح کی مداخلت نہیں کرنا چاہتا۔ ہوسکتا ہے کہ یہاں سے نکلنے کے بعد تم اور تمہارے اہلِ خانہ کبھی میری شکل بھی نہ دیکھیں لیکن ایک بات تم سے ضرور کہنا چاہتا ہوں...... جاماجی کی بدنام ترین عورت ہاناوانی یہاں پاکستان میں موجود ہے۔ اس کی ایک "ہٹ لسٹ" ہے۔ اور اس ہٹ لسٹ سے تمہیں اور تمہاری مسز کو بھی اسی طرح خطرہ ہے جس طرح مجھے اور میرے ساتھیوں کو ہے۔ تمہیں ہر طرح سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔"

"اس ہمدردی اور زبردست خیر خواہی کا بہت بہت شکریہ۔" دارج نے معنی خیز، زہرناک لہجے میں کہا اور اپنا بازو موڑ کر آنکھوں پر رکھ لیا۔ اس کا مطلب تھا کہ اب میں یہاں سے جاسکتا ہوں۔

"او کے۔" میں نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

باہر آکر میں نے قسطینا سے وہ تینوں موبائل فون لیے جو کل اس نے طیش کی حالت میں اپنے قبضے میں لیے تھے۔ ان میں دارج کا موبائل فون بھی تھا۔ اس کی قیمت دو ڈھائی لاکھ سے کم تو نہیں ہو گی۔ ان میں دارج کی والدہ اور تاجور کے موبائل فونز بھی تھے۔ میں نے یہ تینوں موبائل فونز سعید کے ہاتھ دارج کو بھجوا دیئے۔ ظاہر ہے کہ اس تہ خانے میں یہ موبائل فونز بھی ہمارے موبائلز کی طرح بیکار تھے۔

قسطینا سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کیا بات ہوئی اس سے؟''

''کچھ زیادہ نہیں قسطینا، اس بندے کی ذہنی صحت ٹھیک نہیں ہے۔ کسی وقت بالکل دیوانوں جیسی باتیں کرتا ہے۔ اس کا زیادہ تر غصہ تاجور پر ہی اترتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کم از کم جب تک ہم یہاں ہیں کوئی بدمزگی نہ ہو۔''

میں نے مختصراً قسطینا کو بتایا کہ دارج سے کیا باتیں ہوئی ہیں۔ بس اس میں سے معافی والی بات حذف کر دی۔

قسطینا گمبھیر لہجے میں بولی۔ ''شاہ زائب! میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تاجور یہاں اتنے بڑے عذاب میں مبتلا ہے۔ یہ شخص، شوہر تو کیا انسان کہلانے کے قابل بھی نہیں ہے۔ یہ بے چاری کس طرح پھنس گئی اس کے چنگل میں؟''

''بس جو ہونا تھا، وہ ہو گیا۔ ہمارے ہاں یہ مقولہ ہے کہ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں، اس رشتے میں زیادہ کردار تاجور کے والد چوہدری دین محمد نے ہی ادا کیا ہے۔ وہ ایک طرح سے ضد میں آ گئے تھے اور اس ضد کی ایک وجہ مستقبل کا خوف بھی ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اتنے طاقتور خانوادے کے لوگوں نے تاجور کا رشتہ مانگا تھا۔ دارج کی والدہ، رشتے داروں کی پوری پلٹن کے ساتھ بڑی بڑی گاڑیوں میں سکھیرا گاؤں کے مسلسل پھیرے لگاتی رہی۔''

قسطینا افسردہ انداز میں بولی۔ ''شاہ زائب! کیا اس وقت تمہارے ذہن میں نہیں آیا کہ تمہارے مرنے کی خبر ہر جگہ پھیل گئی ہے...... اور تاجور بھی یہی سمجھتی ہو گی کہ خدانخواستہ اب تم دنیا میں نہیں رہے ہو۔ کیا تم کو تاجور کی یہ غلط فہمی دور نہیں کرنی چاہیے تھی؟''

''بس حالات ہی ایسے تھے...... کہ میں تاجور تک نہ پہنچ سکا۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

میں نے یہ بات قسطینا سے پھر چھپا لی کہ تاجور کو میرے زندہ ہونے کا پتا چل چکا تھا، اس کے باوجود وہ سیف کی موت کے حوالے سے شبہے کا شکار ہوئی اور مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔ درحقیقت میں نے یہ بات آج تک کسی کو بھی نہیں بتائی تھی...... اور نہ کبھی بتانا چاہتا تھا۔

قسطینا نے کہا۔ ''یہ شخص تو اس بے چاری کی زندگی جہنم بنا ڈالے گا۔ دیکھو، ابھی بد بخت بستر پر پڑا ہوا ہے، اگر ٹھیک ہو گیا تو کیا طوفان نہیں اٹھائے گا۔ شاہ زائب! ہمیں...... مدد کرنی چاہیے تاجور کی...... اسے اس بندے سے نجات دلانی چاہیے۔''

''مدد اس کی کی جاتی ہے قسطینا جو خود کو مصیبت میں سمجھتا ہو۔ وہ تو خود کو مصیبت میں سمجھتی ہی نہیں۔ دل و جان سے اس کو اپنا مجازی خدا مان کر بیٹھی ہوئی ہے۔ اس کے خلاف چھوٹی سی بات بھی سننا پسند نہیں کرتی۔''

قسطینا نے آہ بھری۔ ''عورتوں کا یہی رویہ ہے جو اکثر انہیں مردوں کے پاؤں کی جوتی بنا دیتا ہے۔ وہ اپنی زندگی برباد کرتی ہیں اور ان بچوں کی بھی جو اس مرد کے ذریعے ان کی کوکھ سے پیدا ہوتے ہیں۔ سچی بات یہ ہے شاہ زائب! مجھ سے تو یہ سچویشن بالکل برداشت نہیں ہو رہی۔ تم کو برا لگے یا اچھا، لیکن میں تاجور کو سمجھانے کی کوشش ضرور کروں گی۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ کوئی بچے کی زنجیر بھی نہیں ہے۔ ابھی وہ بہت کچھ سوچ سکتی ہے۔''

میں نے قسطینا کو یہ نہیں بتایا کہ تاجور کے ''امید'' سے ہونے کے بارے میں بھی کچھ کہا جا رہا ہے۔ (ابھی اس بارے میں مجھے خود بھی حتمی طور پر کچھ پتا نہیں تھا)

اب اس شکستہ عمارت سے باہر نکلنے کا مرحلہ تھا۔ پرندے جوں کے توں وہاں موجود تھے۔ یہ شک بھی مسلسل موجود تھا کہ اس مرتبہ ان کی تعداد زیادہ ہے۔ قسطینا کے مزاج میں مہم جوئی بدرجہ اتم موجود تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ اور فارس جان بھی میرے ساتھ باہر نکلیں۔ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''قسطینا! میرے خیال میں یہاں آپ کی ضرورت زیادہ ہے۔ آپ کی موجودگی میں تاجور کو بہت حوصلہ رہتا ہے۔''

''لیکن میں سمجھتی ہوں کہ تم ہمیشہ کی طرح خطرناک کام اپنے ذمے لینا چاہ رہے ہو۔''

''اس لیے لینا چاہ رہا ہوں کہ میں اور فخر یہاں کے ماحول اور لوگوں کو آپ سے بہتر سمجھتے ہیں۔ تاہم ضرورت پڑی تو ہم آپ کو باہر بلانے میں دیر نہیں کریں گے۔''

''تم کیا سمجھتے ہو شاہ زائب! اگر تاجور تمہارے ساتھ نہیں ہو گی تو یہ ہپناٹائزڈ طوطے تم پر حملہ نہیں کریں گے؟''

''یہ تو نہیں کہا جا سکتا لیکن مجھے لگتا ہے کہ یہ اتنے مشتعل نہیں ہوں گے جتنے تاجور کو دیکھنے کے بعد ہوتے ہیں۔''

اچانک مجھے خاموش ہونا پڑا۔ قسطینا اور فارس وغیرہ بھی چونک گئے تھے۔ ہمیں ایک آواز سنائی دی تھی، جو اس سے پہلے ابھی تک ہم نے یہاں نہیں سنی تھی۔ یہ آواز درمیانی

کمرے کے پاس سیڑھیوں کے قریب سے آئی تھی۔ اس نیم تاریک حصے میں لوہے کا ایک کھڑکی نما دروازہ تھا۔ کئی دیگر اشیا کی طرح اسے بھی زنگ لگا ہوا تھا۔ ہم نے ایک دوبارا سے کھولنے کی کوشش کی تھی لیکن یوں محسوس ہوا تھا کہ وہ جام ہے پھر اس کے سامنے ایک چٹائی بچھا کر زخمی آدم خان کو ڈال دیا گیا تھا اور اس کھڑکی نما دروازے کی طرف سے توجہ ہٹ گئی تھی۔ اب یہ مدھم سی آواز اسی دروازے کے عقب سے ابھری تھی مگر یہ آواز دروازے کے پاس سے نہیں آئی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ دروازے کے پیچھے کافی دور سے آئی ہے۔

''یہ کیا چکر ہے؟'' فارس جان نے سرسراتی آواز میں کہا۔

''یہ تو لگ رہا ہے کہ یہاں کوئی راستہ ہے۔'' میں نے بھی دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

ہم آدم خاں کو پھلانگ کر دروازے کے پاس پہنچے اور اس سے کان لگائے...... آواز یقیناً اسی دروازے کے عقب سے آ رہی تھی اور کافی دور سے آ رہی تھی۔ یہ کھٹ پٹ کی صدا تھی۔

''ایسا لگتا ہے، کوئی اس طرف آ رہا ہے۔ یا شاید ایک سے زیادہ لوگ ہیں......'' میں نے خیال ظاہر کیا۔

پندرہ بیس سیکنڈ میں آہٹیں زیادہ واضح ہو گئیں۔ آواز گونجتی ہوئی محسوس ہوتی تھی جیسے کوئی طویل راہداری یا سرنگ ہو۔ ایک دم میرے ذہن میں ایک نیا خیال آیا میں نے قسطینا اور فارس سے کہا۔ ''میرا خیال ہے، ہمیں یہاں سے ہٹ جانا چاہیے جو آ رہا ہے، اسے آنے دینا چاہیے۔''

فخر نے بھی میرے اس خیال کی تائید کی۔ ہم تہ خانے کے عقبی کمرے کی طرف بڑھے یہی وہ کمرا تھا جو دارج نے سنبھالا ہوا تھا دارج کی والدہ یاسمین بیگم دروازے میں کھڑی متجسس نظروں سے ہماری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔ ''کیا ہوا؟'' اس نے حیرت آمیز خوف کے ساتھ پوچھا۔

''لگتا ہے کہ کچھ لوگ اس دروازے کی طرف آ رہے ہیں۔'' میں نے مختصر جواب دیا اور سعید کھوکھر کو اشارہ کیا کہ وہ آدم خاں کو اس کی جگہ سے اٹھائے۔ آدم خاں درد کش گولیاں کھا کر غنودگی کی حالت میں سیڑھیوں کے نیچے ہی پڑا تھا۔ ہم نے پہلے آدم خاں کو اٹھایا پھر دونوں طرف سے سہارا دے کر چلایا اور دارج والے کمرے میں لے آئے...... آدم خاں کے پاؤں کا پنجہ بری طرح زخمی تھا۔

اس دوران میں قسطینا اور فارس جان نے تیزی سے ہاتھ چلائے اور تہ خانے کے اندر

سے ایسی وہ تمام اشیا ہٹالیں جو ہماری یہاں موجودگی کی طرف اشارہ کرسکتی تھیں۔آدم خان کو دارج والے کمرے میں لٹانے کے بعد میں نے اور فخر نے بھی قسطینا وغیرہ کا ساتھ دیا......اور تہ خانے میں اپنی موجودگی کے نمایاں شواہد ختم کر دیئے۔

دارج کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ وہ اس بات پر سیخ پا تھا کہ ہم نے اس کی اجازت کے بغیر زخمی آدم خاں کو اس کے کمرے کے فرش پر لٹا دیا ہے اور مختلف اشیا سمیٹ کر کمرے میں لے آئے ہیں۔

وہ تڑخ کر بولا۔"کیا قیامت ٹوٹ پڑی ہے تم لوگوں پر...... جو حرامزادہ آرہا ہے یہاں اسے آنے دو......"

میں نے اسے سمجھایا کہ ہم کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ پہلے ہمیں دیکھنا ہوگا کہ کون آرہا ہے۔اور کیا وہ ایک ہے، یا ایک سے زیادہ ہیں۔ میں نے دروازہ اندر سے لاک کر دیا اور وہاں موجود لیمپ بھی بجھا دیا۔ کمرے میں تاریکی پھیل گئی۔ سرنگ نما راستے سے ابھرنے والی آہٹیں اب کھڑکی نما آہنی دروازے کے بالکل قریب پہنچ چکی تھیں۔ ہم سب نے دم سادھ لیے۔ پوری توجہ آوازوں کی طرف تھی۔ ڈری سہمی ہوئی تاجور اپنی ساس کے پہلو میں کھڑی تھی۔ چند لمحوں بعد یوں محسوس ہوا کہ آہٹیں معدوم ہوگئی ہیں۔

قسطینا سرگوشی میں بولی۔"ہوسکتا ہے کہ وہ کسی اور طرف چلا گیا ہو۔"

ابھی اس کا فقرہ مکمل ہوا ہی تھا کہ قفل میں چابی گھومنے کی مدھم آواز سنائی دی اور پھر ایک چرچراہٹ کے ساتھ آہنی دروازہ کھل گیا۔ اس کے ساتھ ہی احساس ہوا کہ ہمارے کمرے سے باہر روشنی موجود ہے۔ میں نے کی ہول سے آنکھ لگائی۔ نگاہ سیدھی اسی کھڑکی نما دروازے پر پڑی جو ہماری کوشش کے باوجود ٹس سے مس نہیں ہوا تھا۔ اب قفل کھلنے کے بعد وہ بہ آسانی کھل گیا تھا۔ مجھے کمرے میں ایک عجیب سا ہیولا نظر آیا۔ یہ جس شخص کا ہیولا تھا اس کا قد چھ فٹ کے لگ بھگ تھا اس کے ہاتھ میں ایک پورٹ ایبل لائٹ تھی۔ روشنی کا زاویہ تھوڑا سا تبدیل ہوا تو مجھے اس شخص کا حلیہ بھی دکھائی دیا۔ اس کے گھونگریالے لیکن بوسیدہ بال شانوں تک پہنچ رہے تھے۔ ناک اونچی اور لمبی تھی۔ نیم گرم موسم کے باوجود اس نے بھاری کوٹ پہن رکھا تھا...... نیچے سیاہ رنگ کی گرد آلود پینٹ تھی۔ استخوانی، لمبوترے چہرے والے اس شخص کی عمر تیس کے لگ بھگ نظر آتی تھی۔

اس نے پورٹ ایبل لائٹ کو چاروں طرف گھما کر جائزہ لیا، پھر لائٹ کو ایک طرف رکھ دیا اور ذرا پھیل کر کرشن کی مورتی کے پاس بوسیدہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ اب اس کا چہرہ زیادہ

وضاحت سے میرے سامنے آیا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں نشے کی دھندسی بھری تھی۔ وہ اپنے حلیے سے بے پروا ایک سنکی سا شخص دکھائی دیا۔

قسطینا نے میرے کان میں سرگوشی کی اور اس کے سانس کی گرم ہوا میرے چہرے سے ٹکرائی۔ ''کون ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''آپ بھی دیکھ لیں۔''

قسطینا نے اپنے گھٹنے فرش پر ٹکا کر آنکھ کی ہول سے لگائی۔ باہر بیٹھے شخص نے جو پورٹ ایبل لائٹ ہال کمرے میں رکھی تھی اس کی کچھ روشنی ہمارے کمرے کے دروازے کی نچلی درز سے جھلک دکھا رہی تھی۔ ''کیا کر رہا ہے؟'' میں نے قسطینا سے پوچھا۔

''کاغذ پر رکھ کر کچھ سونگھ رہا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ ہیروئن ہے...... یا اس جیسا کوئی نشہ۔''

''کوئی اسلحہ وغیرہ تو نظر نہیں آ رہا؟'' فارس نے پوچھا۔

''بھاری کوٹ پہنا ہوا ہے، کچھ کہا نہیں جا سکتا۔'' قسطینا نے جوابی سرگوشی کی۔ پھر ذرا توقف سے بولی۔ ''ویسے مجھے لگتا ہے کہ کوئی اور بھی یہاں آئے گا۔ یہ اپنی گھڑی دیکھ رہا ہے۔''

مجھے بھی یہی اندیشہ تھا کہ یہ اکیلا نہیں ہوگا۔ شاید یہاں مزید آمد بھی ہوگی۔ قسطینا نے چابی کے سوراخ سے آنکھ ہٹائی تو فخر نے لگا لی۔ ہماری ذرا سی آہٹ بھی اس شخص کو ہماری طرف متوجہ کر سکتی تھی اور فی الحال یہ ہرگز ہمارے حق میں نہیں تھا کہ وہ ہماری طرف متوجہ ہو جاتا۔ یوں لگتا تھا کہ نشے کی وجہ سے اس شخص کی حسیات کند ہیں۔ ورنہ ہماری موجودگی کی دو تین چھوٹی نشانیاں اب بھی اس کے آس پاس موجود تھیں۔

''وہ کھڑا ہو رہا ہے۔'' فخر نے مدھم سرگوشی کی۔

چند لمحے بعد اندازہ ہوا کہ اس نے ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھولا ہے اور اندر گیا ہے۔ پانچ دس سیکنڈ مزید گزرے، پھر ساتھ والے باتھ روم میں پانی گرنے اور کلیاں وغیرہ کرنے کی آوازیں آئیں پھر وہ باہر آ گیا۔ یہ نازک موقع تھا وہ ہمارے والے کمرے کی طرف بھی آ سکتا تھا...... اور اس کمرے کا دروازہ ہم نے اندر سے لاک کر رکھا تھا۔

پھر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ اس نے اپنی ترنگ میں کچھ گنگناتے ہوئے ہمارے والے کمرے کا دروازہ کھولنا چاہا۔ دو تین بار زور سے ہینڈل گھما کر دروازے کو دھکا دیا۔ وہ نہیں کھلا۔ اس نے دروازے کو ٹانگ ماری اور بڑبڑاتا ہوا ہال کمرے کی طرف چلا گیا۔ اس نے اس بات پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی کہ دروازہ کیوں نہیں کھلا۔ شاید اس نے سمجھا ہو کہ دروازہ

جام ہے۔ اب اس کی آواز ہال کمرے کی طرف سے آرہی تھی۔ مختلف اشیا کو الٹ پلٹ رہا تھا۔

فخر نے سرگوشی کی۔ ''میرا تو خیال ہے کہ اس کو ابھی چھاپ لیا جائے، پھر پوچھا جائے کہ اور کون یہاں تشریف لانے والا ہے۔''

''لیکن اس میں خطرہ ہے کہ آنے والا یا آنے والے بدک جائیں۔'' قسطینا نے مستحکم لہجے میں رائے دی۔

''لیکن، یہ آیا کہاں سے ہے؟ کیا کوئی سرنگ اس مندر تک آتی ہے؟'' فارس جان نے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کوئی سرگوشی کرتا۔ سعید کو اچانک کھانسی آگئی۔ اس نے منہ پر ہاتھ رکھ کر آواز دبانے کی کوشش کی تھی، پھر بھی اچھی خاصی آواز ہمارے کانوں تک پہنچی تھی۔

''سعید واش روم میں چلے جاؤ۔'' میں نے اسے دھکیلا۔

وہ منہ دبائے دبائے واش روم میں چلا گیا اور دروازہ بند کرلیا۔ فارس جان نے کی ہول سے آنکھ لگا رکھی تھی۔ قسطینا نے پوچھا۔ ''کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی؟''

''لگتا ہے کہ بچ بچاؤ ہو گیا ہے، آواز باہر نہیں گئی۔'' وہ اپنے سانسوں میں بولا۔

یہی وقت تھا جب ہمیں ایک بار پھر کھڑکی نما دروازے کی طرف سے مدھم آہٹیں سنائی دینے لگیں۔ وہی گونجتی ہوئی سی آہٹیں جیسے کوئی کسی سرنگ میں چلتا ہوا آرہا ہو۔ قریباً ایک منٹ بعد یہ چاپ جیسی آوازیں نمایاں ہوگئیں اور آہنی دروازہ کھلا رہنے دیا تھا۔

میں نے کی ہول سے آنکھ لگائی۔ اندر آنے والی ایک جواں سال عورت تھی جس نے خود کو خانہ بدوشوں جیسی ایک بوسیدہ چادر میں چھپایا ہوا تھا۔ گھونگھٹ میں سے اس کا چہرہ واضح طور پر دکھائی نہیں دیا۔ اس کی جوتی بھی عام سی تھی۔ اندر آتے ہی جواں سال عورت نے آہنی چادر کا دروازہ اندر سے بولٹ کر دیا۔ پھر اس نے اپنی بوسیدہ، طویل چادر اتار کر ایک طرف رکھ دی۔ وہ صرف چادر اور جوتی کی حد تک ہی خانہ بدوش تھی۔ اس نے بڑا امیرانہ لباس پہن رکھا تھا۔ اس کی شکل بھی ہرگز خانہ بدوشوں جیسی نہیں تھی۔ ستواں ناک، بھرے بھرے گلابی رخسار، گداز ہونٹوں پر ہلکے رنگ کی لپ اسٹک، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اور ریشمی بالوں کے نیچے جھمکے چمکتے ہوئے۔

لمبے گھونگریالے بالوں والا بے تابی سے آگے بڑھا اور اس نے جواں سال لڑکی کو اپنی

بانہوں میں لے لیا۔ ''یہاں تو پریم کہانی شروع ہو گئی ہے۔'' میں نے فخر سے کہا جس نے اپنا سر میرے سر سے جوڑ رکھا تھا۔

''اتنی دیر کر دی؟'' خبطی نظر آنے والے شخص نے شکوہ کناں لہجے میں امیرانہ خدوخال والی لڑکی سے کہا۔

''کسی دن اتنی دیر ہو جانی ہے کہ پھر تمہیں میری لاش ملنے کی خبر ہی ملے گی۔'' لڑکی عجیب افسردہ لہجے میں بولی۔ گھونگرالے بالوں والے کے لیے اس کے اندر کوئی گرمجوشی نظر نہیں آتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کسی مجبوری کے تحت اس سے ملنے آئی ہے۔ وہ اس خبطی شخص کو انور کہہ کر بلا رہی تھی اور وہ اسے مدھو بالا کہہ رہا تھا۔ فدویانہ لہجے میں بولا۔ ''جب تم لاش بننے کی بات کرتی ہو تو مجھے لگتا ہے کہ میں خود لاش بن گیا ہوں۔ تمہارے بغیر جی نہیں سکتا ہوں میں۔''

اس نے مدھو بالا کو کھینچ کر سینے سے لگا لیا اور اپنے پیار کا عملی مظاہرہ کرنے لگا...... کچھ دیر بعد لڑکی نے خود کو بمشکل اس کی بانہوں سے نکالا اور ایک مورتی کے چبوترے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''میرا گھر سے نکلنا روز بروز دشوار ہو رہا ہے۔ جس دن ملکو جی کو پتا چل گیا کہ میں تم سے ملنے آتی ہوں وہ اسی وقت اور اسی جگہ میرے ٹوٹے کر دیں گے۔''

''کبھی پتا نہیں چلے گا میری جان۔'' وہ مدھو بالا کے ہاتھ اور گھٹنے چومتے ہوئے بولا۔ ''دیکھو کیسا انتظام کیا ہے۔ کوئی پھڑک بھی نہیں سکتا اس طرف۔ دن کے وقت بھی لوگ یہاں سے فاصلہ رکھ کر گزرتے ہیں۔ رات کی تو بات ہی اور ہے۔''

''لیکن مجھے گھر سے نکلتے اور سرنگ میں جاتے وقت تو کوئی دیکھ ہی سکتا ہے۔''

''کوئی نہیں دیکھے گا میری جند جان۔ اگر کوئی دیکھے گا بھی تو یہی سمجھے گا کہ کوئی چنگڑی جھاڑیوں کی طرف جا رہی ہے، باقی رہا ملکو جی...... تو وہ تو اپنی پہلی بیوی کے ساتھ لپٹ کر سویا رہتا ہے...... بلکہ اب بھی سویا ہوگا۔''

مدھو بالا نے کہا۔ ''نہیں ایسی بات نہیں انو! وہ بیمار ہے اس لیے ملکو جی اس کے پاس سوتے ہیں۔''

انو یعنی انور نے ذرا پیچھے ہٹ کر غور سے مدھو بالا کا سرخ و سپید چہرہ دیکھا اور بولا۔

''کیا بات ہے مدھو! تمہاری سوچ ملکو کے بارے میں کچھ کچھ بدلتی جا رہی ہے۔''

''کچھ کچھ نہیں...... کافی زیادہ...... مجھے لگتا ہے کہ میں اپنے شوہر سے بہت زیادتی کر رہی ہوں۔ ہم بہت دور نکل گئے ہیں انو، اب ہمیں واپس آنا پڑے گا۔''

''سیدھی طرح کیوں نہیں کہتی ہو کہ مر جاؤ انو! میں تو کہتا ہوں کہ کہہ دو۔ اور پھر دیکھو کہ انو ایسا کرتا ہے یا نہیں؟'' اس نے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک گراری دار چاقو نکالا اور اسے مدھو کے ہاتھ میں زبردستی تھمانے کی کوشش کی۔ ''واپسی کی باتیں کرنے سے بہتر ہے کہ مجھے اس سے ماردو۔ ابھی اسی وقت ماردو۔''

جب مدھو نامی اس لڑکی نے چاقو نہیں تھاما تو اس نے جوش اور وحشت کے عالم میں وہی چاقو اپنی کلائی میں اتارلیا۔ چاقو اندر تک دھنس گیا اور اس کی نوک دوسری طرف سے نظر آنے لگی۔ لڑکی چلا کر رہ گئی۔ زخمی کلائی سے خون کے قطرے گر رہے تھے لیکن جب انو نے چاقو کلائی میں سے کھینچا تو خون کی دھاری سی بہہ نکلی۔ لڑکی نے جلدی سے الماری کے اندر سے ایک کپڑا نکالا، اسے پٹی کی صورت میں پھاڑا اور انو کی زخمی کلائی پر باندھ دیا۔ انو کے چہرے پر تکلیف کے کوئی آثار نہیں تھے۔ غالباً نشے نے اس کی برداشت میں غیر معمولی اضافہ کر رکھا تھا۔ لڑکی اب ڈری سی گئی تھی۔ اس لیے جذباتی انداز میں جب انو نے اسے دوبارہ بانہوں میں لیا تو وہ زیادہ مزاحمت نہیں کرسکی۔ اس کی خوب صورت کلائیوں میں بھاری طلائی چوڑیاں دمک رہی تھیں۔ گلے میں بھی سونے کی وزنی چین تھی جس میں دل کی شکل کا لاکٹ پرویا گیا تھا۔

کچھ ہی دیر میں ہال کمرے کا منظر نہایت رومان انگیز ہوگیا۔ میں نے دیکھا کہ مدھو نامی اس لڑکی نے پہلے اپنے جھمکے اتارے، پھر اپنے بال قیمتی کلپ سے آزاد کیے پھر خود کو بے لباس کرنے میں مصروف ہوگئی۔ جیسے وہ جانتی ہو کہ یہ ناخوشگوار فریضہ اسے انجام دینا ہی دینا ہے۔ وہ اپنے چہرے کو نارمل رکھنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن دھیان سے دیکھنے پر اس کا اندرونی اضطراب اس کی آنکھوں میں جھلک دکھاتا تھا۔

ابھی وہ اپنے بالائی لباس سے ہی مصروف تھی۔ میں نے کی ہول سے آنکھ ہٹائی اور فخر سے مخاطب ہوکر سرگوشی کی۔ ''میرا خیال ہے کہ اب ہمیں مداخلت کرنی چاہیے۔''

فارس اور فخر نے کی ہول سے کچھ نہیں دیکھا تھا لیکن آوازوں سے ہی انہیں اندر کے ''سنسنی خیز'' ماحول کا اندازہ ہوگیا تھا۔ اندر والے ہرگز نہیں جانتے تھے کہ ان سے فقط چند فٹ کے فاصلے پر بند کمرے میں کئی افراد موجود ہیں اور ان کی ہر حرکت دیکھ اور سن رہے ہیں۔

میں نے اپنا بریٹا پسٹل نکالا اور تیزی سے دروازہ کھول کر باہر آگیا۔ مدھو نامی وہ لڑکی خوف زدہ انداز میں چلائی۔ اس نے لپک کر خانہ بدوشوں والی وہ بوسیدہ چادر پکڑی جو ابھی

تھوڑی دیر پہلے اتاری تھی اور اپنا بالائی جسم ڈھانپ لیا۔

اسی اثنا میں انو نامی اس شخص نے اپنا ہاتھ کوٹ کی اندرونی جیب کی طرف بڑھایا۔ یقیناً وہی چاقو نکالنا چاہتا تھا جس سے اس نے اپنی کلائی زخمی کی تھی۔ ''خبردار۔'' میں نے بلند آواز سے کہا۔ ''گولی ماردوں گا۔''

وہ ٹھٹک کر رک گیا اور ہاتھ نیچے لٹکا دیا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں حیرت اور ہراس کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اس کے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ یوں اچانک اس کی رنگین تنہائی درہم برہم ہوگی۔ بند کمرے کا دروازہ کھلے گا اور چار پانچ افراد اس کے سامنے آن کھڑے ہوں گے۔''

''کون ہو تم؟'' وہ بمشکل بول پایا۔

''اصل بھوت۔'' فخر نے کہا۔ ''ہم یہ دیکھنے آئے ہیں کہ ایک ناہنجار، نقلی بھوت نے کس طرح ایک اچھے بھلے مندر کو ''بھوت بنگلا'' بنا رکھا ہے۔''

''تت.....تم یہاں گھسے کیسے ہو؟''

''اصلی بھوتوں کو کہیں گھسنے کے لیے رستے کی ضرورت نہیں ہوتی۔'' فخر نے اطمینان سے جواب دیا اور پھر اس سے کہا کہ وہ چند قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو اور اپنا کوٹ اتار کر فرش پر ڈال دے۔

مدھو نامی وہ لڑکی تھرتھر کانپ رہی تھی۔ یقیناً اس کی سمجھ میں بھی کچھ نہیں آرہا تھا کہ یہاں ''چور کو مور'' کس طرح پڑ گئے ہیں۔ اس کی طرف ہماری توجہ کم تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اسے یہ غلط فہمی ہوئی کہ وہ یہاں سے فرار ہوسکتی ہے۔ وہ کھڑکی نما دروازے کے پاس ہی موجود تھی۔ اچانک اس نے دروازہ کھولا اور بھاگنے کی کوشش کی۔ میں نے لپک کر اسے اپنے ایک بازو میں جکڑ لیا۔ اس نے ہاتھ گھمایا اور میں نے اس کے ناخنوں سے اپنا چہرہ بمشکل بچایا۔ انو کو یہ موقع مناسب محسوس ہوا اور اس نے تڑپ کر قسطینا کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں وہی کھلا ہوا چاقو تھا۔ اس نے قسطینا کو یرغمال بنانے کی کوشش کی تھی۔ اس کا اقدام تو درست تھا لیکن انتخاب غلط تھا۔ اس جیسے پانچ چھ بھی مل کر آجاتے تو شاید قسطینا پر ہاتھ نہ ڈال سکتے۔ جونہی وہ قسطینا کے عقب میں پہنچا، زمین اس کے پاؤں کے نیچے سے نکل گئی۔ قسطینا نے اسے گھما کر دیوار سے دے مارا تھا۔ چاقو اس کے ہاتھ سے نکل گیا اور وہ اوندھے منہ ایک مورتی کے قدموں میں گرا۔ فارس جان نے اس کی گردن پر پاؤں رکھ دیا۔ دوسری طرف لڑکی بھی میری گرفت میں پوری طرح بے بس تھی۔

قریباً دس منٹ بعد انو دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ فارس جان نے پشت پر باندھ دیئے تھے۔ ویسے یہ احتیاطاً ہی تھا، اس کا دم خم تو پہلے دو منٹ میں ہی رخصت ہو گیا تھا۔ وہ جو اس مندر کی خاموش گہرائی میں کچھ بہت ''جذبات انگیز'' گھڑیاں گزارنے والا تھا، اب زرد چہرے اور سکڑے ہوئے جسم کے ساتھ چپ چاپ بیٹھا تھا۔ اس کی تلاشی میں جو ذاتی اشیا برآمد ہوئی تھیں، ان میں ایک سستا سا موبائل فون بھی تھا لیکن یہ سستا موبائل فون ہمارے لیے بے حد اہم تھا (ہمارے اپنے موبائل فونز کی تمام چارجنگ اب ختم ہو چکی تھی) انو کے اس موبائل فون کے ذریعے ہم باہر نکلنے کے بعد اپنے ساتھیوں سے رابطہ کر سکتے تھے۔ لڑکی مدھو کے بارے میں ہمارا خیال یہ تھا کہ وہ شاید ہندو ہے لیکن وہ بھی مسلمان ہی تھی۔ اس کا اصل نام مدیحہ تھا جو بگڑ کر مدو بنا اور پھر انور کی ''عشق بازی'' نے اسے مدھو بالا بنا دیا۔ اب یہ مدو یا مدھو بالا بھی قسطینا کی نگرانی میں ڈری سہمی بیٹھی تھی اور اٹک اٹک کر ہمارے سوالوں کے جواب دے رہی تھی۔

جس راستے سے مدھو اندر آئی تھی، وہ بھی ہم نے دیکھ لیا تھا اور حیرت کا شکار ہوئے تھے۔ ہمارے قیافے کے عین مطابق یہ ایک قدیم سرنگ تھی اور اس کی لمبائی کم و بیش ایک فرلانگ تھی۔ یہ حیران کن لمبائی تھی، تاہم کشادگی کے لحاظ سے سرنگ متاثر کن نہیں تھی۔ یہ بمشکل پانچ فٹ قطر کی ہو گی اور اس میں جھک کر چلنا پڑتا تھا۔

میں نے مدھو سے پوچھا۔ ''سرنگ کا داخلی دروازہ کس جگہ پر ہے؟''

وہ ہاتھوں کی حنائی انگلیاں مروڑتے ہوئے بولی۔ ''وہ بھی ایک چھوٹا سا کھنڈر ہے۔ کہتے ہیں کہ پچھلے وقتوں میں وہاں کوئی شمشان گھاٹ تھا۔ وہاں چھوٹی اینٹوں کی بنی ہوئی ایک کال کوٹھڑی ہے۔ وہیں پر اس کا دروازہ ہے۔''

''تو جب تم اپنے گھر سے نکل کر اس کال کوٹھڑی میں گھستی ہو تو کوئی دیکھتا نہیں؟''

''نہیں۔'' اس نے مختصر جواب دیا اور خاموش ہو گئی۔ پھر چند سیکنڈ بعد بات کو مکمل کرتے ہوئے بولی۔ ''اس نے وہاں بھی کچھ کیا ہوا ہے۔ کال کوٹھڑی کے پاس سے رات کو آوازیں آتی ہیں اور روشنی چمکتی ہے۔ ڈر کے مارے وہاں بھی کوئی نہیں آتا۔''

یہ پوری بات اب ہماری سمجھ میں آرہی تھی جس طرح یہاں اس مندر سے خوفناک آوازیں بلند ہوتی تھیں، وہاں شمشان گھاٹ کی کسی کوٹھڑی سے بھی آوازیں آتی تھیں اور روشنی کے جھماکے ہوتے تھے۔ دونوں جگہوں کے درمیان یہ قریباً ایک فرلانگ لمبی سرنگ تھی۔

''یہ ملکو جی کون ہے؟ تمہارے شوہر کا نام تو نہیں؟'' فخر نے پوچھا۔

ذرا تذبذب کے بعد مدھو نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''پچھلے سال ہماری شادی ہوئی تھی۔''

''شادی شدہ ہونے کے باوجود تم اپنے اس پرانے شناسا سے ملنے آتی ہو؟'' فارس جان نے کڑے لہجے میں پوچھا۔

وہ ایک بار پھر آنسو بہانے لگی اور ہم سے التجا کرنے لگی کہ ہم اسے یہاں سے جانے دیں۔ اس کے گھر والوں کو پتا چل گیا تو اس کے لیے قیامت آجائے گی۔

فارس جان نے نشئی انور عرف انو کے کولہے پر ٹھوکر رسید کی اور کہا۔ ''اوئے خدائی خوار! تم کیوں مجبور کرتا تھا اس لڑکی کو اس طرح سے۔ تمہارا اپنا بھی تو کوئی ماں بہن ہوگا؟''

انو نے اپنے چہرے پر جھولتے ہوئے بالوں کے عقب سے فارس جان کو گھورا اور عجیب لہجے میں بولا۔ ''میں اس کو مجبور نہیں کرتا۔ میری محبت اس کو مجبور کرتی ہے۔ یہ جانتی ہے کہ میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہوں گا۔''

''اموشنل بلیک میلنگ۔'' فخر نے میری طرف دیکھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔

سنکی مزاج انو نے ایک بار پھر واویلا شروع کر دیا۔ خود کو زخمی کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ فارس جان نے تین چار دوہتڑ اس کے سر پر رسید کیے اور چیخ کر کہا۔ ''تم ذرا چھری تلے سانس لو۔ ام تھوڑی دیر میں تمہیں پوت (فوت) ہونے کا بڑا آسان موقع پراہم کرے گا پھر دیکھے گا کہ تم اس موقع سے پائدہ اٹھاتا ہے یا نہیں۔''

فارس جان کے غصیلے انداز نے انو کو کچھ ٹھنڈا کر دیا۔ کچھ دیر بعد وہ ہمارے سوالوں کے جواب بھی دینے لگا۔ اس سے اور امیرانہ خدوخال والی مدیحہ عرف مدھو سے جو کچھ معلوم ہوا اس کا خلاصہ یوں ہے۔

انور عرف انو ایک الیکٹریشن تھا۔ آج سے تین چار سال پہلے وہ اچھا بھلا خوبرو جوان تھا۔ مدیحہ ایک مقامی زمیندار کی بیٹی تھی۔ قصبے میں شادی بیاہ کے موقعوں پر انو ہی لائٹنگ وغیرہ کا انتظام کرتا تھا۔ مدیحہ کی ایک سہیلی کی شادی کے موقع پر انو حویلی میں لائٹنگ کرنے کے لیے آیا۔ وہیں پر مدیحہ عرف مدھو سے اس کی نگاہ لڑ گئی۔ وہ کھاتے پیتے گھرانے کی تھی، انو قصبے میں ایک معمولی دکان چلاتا تھا مگر قانون کی طرح شاید جوانی بھی اندھی ہوتی ہے۔ وہ جب اپنے راستے چنتی ہے تو ساری مصلحتیں بالائے طاق رکھ دیتی ہے۔

انو اور مدھو کے سلسلے میں بھی یہی کچھ ہوا۔ تمام رکاوٹوں اور پابندیوں کے باوجود ان کا تعلق آگے بڑھتا رہا۔ موقع ملنے پر وہ ایک دوسرے سے ملتے بھی رہے اور عہد و پیماں کرتے

رہے۔ لیکن آخر وہی ہوا جو ایسے موقعوں پر اکثر ہو جاتا ہے۔ سماج دیوار بنا، انو کوشش کے باوجود اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہو سکا اور وہ ترقی نہ کر سکا جو کرنا چاہتا تھا۔ مدھو کی شادی قریبی قصبے کی ایک ہم پلہ فیملی میں ہو گئی، اور دونوں پریمی دکھ کے آتشیں آنسو بہا کر رہ گئے۔

بات یہیں تک رہ جاتی تو ٹھیک تھی، مگر انو نے شادی کے بعد بھی مدھو کی تمنا کو خیر باد نہیں کہا۔ اس نے خود کو ہیروئن اور راکٹس کے نشے میں ڈبو دیا اور مجنوں بن کر گلیوں میں پھرنے لگا۔ دوسری طرف مدھو کو بھی اپنی ازدواجی زندگی میں وہ توجہ اور راحت نہ مل سکی جس کی وہ آرزو رکھتی تھی۔ اس پر اور اس کے گھر والوں پر یہ انکشاف ہوا کہ مدھو کا خاوند ملکو پہلے سے شادی شدہ تھا اور اس کی ایک بیوی موجود تھی۔ یہ وہ حالات تھے جن میں انو اور مدھو کے تعلق کے بجھے ہوئے چراغ میں پھر سے روشنی پیدا ہونا شروع ہو گئی۔ مدھو سے انو کی بربادی دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ اس نے ایک موقع نکالا اور انو سے مل کر اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ان کی اس ملاقات نے اس کہانی کا دوسرا باب شروع کر دیا۔ ان کے درمیان پھر سے، کبھی کبھی موبائل فون پر رابطہ ہونے لگا۔ اس کے بعد دو تین خفیہ ملاقاتیں بھی ہوئیں۔ انو کی نیم دیوانگی اور غیر معمولی جذباتیت مدھو کو اپنے ساتھ بہا کر لے گئی۔ مدھو کے نہ چاہنے کے باوجود انور عرف انو سے اس کا ناجائز تعلق پیدا ہو گیا۔

انو چاہتا تھا کہ مدھو سے مستقل طور پر اپنی رنگین ملاقاتیں جاری رکھنے کے لیے اسے ایک نہایت محفوظ ٹھکانا میسر آ جائے۔ وہ ایک ماسٹر الیکٹریشن تھا۔ وہ اس شکستہ مندر اور یہاں موجود سرنگ سے بھی اچھی طرح آگاہ تھا۔ سرنگ کے دوسرے سرے سے قصبے اور مدھو کے سسرالی گھر کا فاصلہ دو سو میٹر سے زیادہ نہیں تھا۔ انو کو یہ بھی معلوم تھا کہ اس کے علاقے کے لوگ کتنے توہم پرست ہیں۔ اس نے ایک پلان بنایا اور اس مندر کے تین چار گوشوں میں بڑی پاور کے ''ایمپلی فائرز'' نصب کر دیئے۔ اس کے علاوہ کچھ ایسی لائٹس بھی یہاں بڑی صفائی سے چھپا دیں جن کے دودھیا جھماکے دور سے دیکھے جا سکتے تھے۔ اس سسٹم کو دو پاور فل بیٹریوں کے ساتھ منسلک کر دیا اور ایک ٹائمر بھی لگا دیا، جو ہر چوتھے پانچویں روز اس سسٹم کو آن کرتا تھا...... اس کے نتیجے میں آوازیں اور روشنی پیدا ہوتی تھی۔ یہی کچھ چھوٹے پیمانے پر شمشان گھاٹ والی کال کوٹھڑی میں بھی نصب تھا۔

علاقے کے لوگ واقعی اپنی توہم پرستی اور سادہ لوحی میں حد سے گزرے ہوئے تھے۔ وہ ان دونوں جگہوں کو پہلے ہی شک کی نظروں سے دیکھتے تھے، اب بالکل ہی آسیب زدہ سمجھ چکے تھے...... یہاں تک کہ اس خوف زدگی کا شکار مقامی پولیس اہلکار بھی تھے...... شروع میں ہم یہ

سمجھے تھے کہ شاید کسی جرائم پیشہ گروہ نے اس مندر کو آسیب زدہ بنا رکھا ہے لیکن یہ ایک رومانی کہانی کے تانے بانے نکلے تھے۔

قسطینا بے حد ہمدردی کی نگاہوں سے مدھو کو دیکھ رہی تھی۔ تاجور کی بھی کچھ ایسی ہی کیفیت تھی۔ وہ بھی کافی حد تک جان چکی تھی کہ اگر ہماری مداخلت نہ ہوتی تو یہاں کس طرح کی ''واہیاتی'' وجود میں آنا تھی۔ قسطینا نے مجھ سے کہا کہ میں اس لڑکی سے موجودہ صورتِ حال کے بارے میں پوچھوں۔ اس میں کس حد تک اس کی مرضی شامل ہے۔

میں جانتا تھا کہ مدیحہ عرف مدھو اس سنکی انو کے سامنے ٹھیک سے کوئی جواب بھی نہیں دے سکے گی۔ میں اسے ساتھ والے کمرے میں لے گیا۔ قسطینا بھی ساتھ ہی آئی۔ میں نے مدھو سے پوچھا۔ ''تم کسی اچھے گھرانے سے لگتی ہو۔ کیوں اس خبطی کے پیچھے اپنی ازدواجی زندگی برباد کر رہی ہو۔ یہ محبت نہیں ہوس ہے اور اس ہوس کاری میں تم اس شخص کا ساتھ دے رہی ہو۔''

''میں نہیں دے رہی ساتھ...... میں نہیں دے رہی۔'' وہ روتے ہوئے بولی۔ ''شروع میں مجھ سے...... غلطی ضرور ہوئی ہے...... میں مانتی ہوں اپنی غلطی...... لیکن اب حالات بدل گئے ہیں۔ میں سمجھ گئی ہوں کہ...... میرا شوہر...... برا نہیں تھا...... اس کی کچھ...... مجبوریاں تھیں...... دوسری طرف...... یہ بھی سمجھ گئی ہوں کہ...... یہ اسی طرح مجھے اپنے مرنے کی دھمکیاں دیتا رہے گا...... اور...... اور مجھے خراب کرتا رہے گا۔''

''کیا دھمکیاں دیتا ہے یہ؟''

''یہی کہ اگر میں نے اس سے ملنا چھوڑ دیا تو وہ میرے گھر کے سامنے خود کو آگ لگا کر مر جائے گا۔ اور ساری دنیا کو بتائے گا کہ کیوں مر رہا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ابھی تم نے بتایا ہے کہ تمہارا شوہر اتنا برا نہیں تھا، جتنا تم اسے سمجھتی رہی ہو۔ اس کا کیا مطلب ہے؟''

اس نے جواب میں جو کچھ بتایا اس سے پتا چلا کہ کچھ باتیں آہستہ آہستہ کھلی ہیں۔ اس کے شوہر (ملکوجی) کی پہلی بیوی شادی کے وقت بھی بیمار تھی۔ خاندانی دباؤ کی وجہ سے اس کے شوہر کو یہ شادی کرنا پڑی تھی۔ تب خیال تھا کہ شاید اس کی حالت بہتر ہو جائے گی مگر شادی کے بعد وہ مزید بیمار ہوگئی۔ اس نے زیادہ وقت لاہور کے ایک اسپتال میں ہی گزارا اور ملکو ایک شوہر کی حیثیت سے تین سال تک اس کی تیمارداری کرتا رہا۔ اب اپنی بوڑھی اور قریب المرگ والدہ کی شدید خواہش پر ملکو احمد نے یہ دوسری شادی کی تھی۔

قسطینا نے میرے ذریعے مدھو سے یہ سوال کیا کہ یہ انو کیا شروع سے نشے باز تھا یا اب اس لت کا شکار ہوا ہے؟

مدھو بولی۔ ''جس طرح آہستہ آہستہ میرے شوہر کا رویہ مجھ سے اچھا ہوتا گیا ہے اور مجھے ان کی مجبوریوں کا بھی پتا چلتا گیا ہے...... اسی طرح آہستہ آہستہ انو کا رویہ مجھ سے خراب ہوتا گیا ہے اور مجھے یہ بھی پتا چلتا گیا ہے کہ یہ بری طرح نشوں میں ڈوبا ہوا ہے۔ یہ پاؤڈر کے علاوہ نشے کے راکٹ بھی کھاتا ہے...... مم...... میں...... مجبور ہو کے اس کے پاس آتی ہوں۔ اب مجھے...... اس سے ڈر لگنے لگا ہے۔'' وہ سسک اٹھی۔

''گھبراؤ نہیں۔ ہم تمہارا یہ ڈر ختم کر دیں گے۔'' میں نے اسے تسلی دی پھر میری نگاہ ہال کمرے کی ان مورتیوں پر پڑی جن پر کراس کے سیاہ نشان لگائے گئے تھے۔

میں نے اس بارے میں مدھو سے پوچھا تو وہ بولی۔ ''یہ بھی اسی چالباز کے ڈرامے ہیں۔ جب مندر سے عورتوں کے رونے اور بَین کرنے کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں تو ایک روز یہ ایک سادھو کو لے کر یہاں آیا۔ قصبے کے کچھ لوگ بھی ساتھ تھے۔ سادھو نے کچھ مورتیوں پر کالے نشان لگا دیئے۔ سادھو کا خیال تھا کہ شاید یہ آوازیں ان مورتیوں کی وجہ سے آتی ہیں۔ سادھو نے کہا کہ اب یہ رام دوارا نہیں راکھشس دوارا بن چکا ہے۔ عام لوگوں کو یہاں سے دور رہنا چاہیے۔ یہی چاہتا تھا انو بھی۔'' مدھو نے سر جھکا کر کہا اور اس کی آنکھوں سے دو موٹے آنسو ڈھلک کر اس کی جھولی میں آن گرے۔

ہم نے باہمی مشورہ کیا۔ یہ جگہ چھوڑنے سے پہلے ہم اس پھنسی ہوئی شادی شدہ لڑکی کی مصیبت آسان کرنا چاہتے تھے۔ ایک طریقہ تو یہ تھا کہ آدم خاں کی طرح اس انو کو بھی اپنے ساتھ ہی لے جائیں اور پھر اس کے بارے میں اطمینان سے سوچا جائے۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی تھی کہ اسے بری طرح خوف زدہ کر کے یہ باور کرا دیا جائے کہ اگر اب اس نے مدیحہ کی زندگی میں کسی طرح کی مداخلت کی تو اس کا حشر ہم خراب کر دیں گے۔ آخری صورت...... یقیناً آخری ہی تھی کہ اسے گولی مار کر ٹھنڈا کر دیا جاتا۔

بہرطور ان تینوں صورتوں کی نوبت نہیں آئی اور وہ ہوا جس کا ہم نے سوچا بھی نہیں تھا۔ تیس بتیس سالہ انو ہماری توقع سے زیادہ غصیلا اور پھرتیلا نکلا۔ جونہی اس نے ہمارا دھیان بٹا ہوا دیکھا، وہ تڑپ کر اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس کے راستے میں سعید کھوکھر تھا۔ اس نے اپنے سر کی طوفانی ضرب سعید کے چہرے پر لگائی اور ادھ کھلے دروازے سے نکل کر سرنگ میں داخل ہو گیا۔

''رک جاؤ......رک جاؤ......'' میں اور فخر ایک ساتھ چلائے اور اس کے پیچھے لپکے۔
ہمیں جھک کر بھاگنا پڑ رہا تھا، وہ بھی جھک کر بھاگ رہا تھا۔ وہ ہمیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کے ہاتھ ابھی تک پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ رک جاؤ......نہیں تو گولی مار دیں گے۔'' میں نے اسے آخری وارننگ دی اور پسٹل نکال لیا۔
گونجتی آوازوں سے پتا چل رہا تھا کہ وہ مسلسل بھاگ رہا ہے۔ اس کا مدھم سا ہیولا بھی دکھائی دے رہا تھا۔ وہ دوسرے دروازے تک پہنچ جاتا تو پھر اسے ڈھونڈنا مشکل تھا۔ میں نے پسٹل سیدھا کیا اور بھاگتے بھاگتے اندازے سے اس کی ٹانگوں کو نشانہ بنایا۔ میں نے اوپر تلے تین فائر کیے۔ اس کے گرنے کی آواز آئی اور کربناک صدا سنائی دی۔ ہم جھک کر دوڑتے ہوئے اس کے پاس پہنچے۔ ٹارچ کی روشنی میں سرنگ کے اندر ہی چند زینے نظر آئے۔ ان زینوں سے آگے سرنگ آٹھ دس فٹ مزید گہرائی میں چلی گئی تھی۔ بھاگتے بھاگتے انو ان زینوں سے لڑھکا تھا......فخر نے ٹارچ کی روشنی اس کے چہرے پر ڈالی۔ اس کا سر اور پیشانی بری طرح زخمی تھے۔ لمبے بال بھی خون میں بھیگے ہوئے تھے۔ ایک لمحے میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کا مغز اس کی کھوپڑی سے باہر آ گیا ہے۔ وہ مر چکا تھا۔ ہاتھ بندھے ہونے کی وجہ سے وہ گرتے وقت اپنا چہرہ نہیں بچا سکا تھا اور چوٹ غیر معمولی شدت اختیار کر گئی تھی۔
سرنگ میں گونجتی ہوئی آوازوں سے پتا چلتا تھا کہ فارس اور قسطینا وغیرہ بھی ہمارے پیچھے آ رہے ہیں۔
''کمال ہے شاہ زیب! تم سے ایسی توقع نہیں تھی۔'' فخر نے ٹارچ کا روشن دائرہ انو کے جسم پر سرکاتے ہوئے کہا۔
''کیا مطلب؟''
''تم نے تین فائر کیے اور ایک بھی محترم انور صاحب کو نہیں لگا۔''
وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ نیم تاریکی میں چلائی ہوئی گولیوں میں سے کسی نے بھی انو کے جسم کو نہیں چھوا تھا۔ وہ گرنے اور سر پر چوٹ لگنے کی وجہ سے مرا تھا۔
میں نے کہا۔ ''چلو یہ بھی ٹھیک ہی ہوا۔ اس کی لاش کا بندوبست نہیں کرنا پڑے گا۔ یہی سمجھا جائے گا کہ یہ جانتے بوجھتے اس خطرناک جگہ میں گھسا اور بھوتوں کی مجلسِ عاملہ نے اسے موت کی سزا سنا دی۔''
وہ بولا۔ ''میرے ساتھ رہنے کا یہ فائدہ ہوا ہے کہ تمہاری حسِ ظرافت خطرناک موقعوں

پر بھی پھڑک اٹھتی ہے۔"

میں نے کہا۔" یہ تمہاری وجہ سے نہیں، یہ پہلوان حشمت کی صحبت کا نتیجہ ہے۔ اس کے دو غلے محاوروں اور گلابی اردو والے شعروں نے کافی افاقہ دیا ہے میری سنجیدگی کو۔"

اسی دوران میں قسطینا اور سعید کھوکھر بھی وہاں پہنچ گئے۔ فارس جان نے اچھا کیا تھا کہ وہاں مندر کے ہال کمرے میں دارج، تاجور اور آدم خاں وغیرہ کے پاس ہی رہا تھا۔ ٹارچ کی روشنی میں سعید کا چہرہ زخمی نظر آیا۔ دانتوں سے بھی خون رِس رہا تھا۔ یہ اس ٹکر کا نتیجہ تھا جو انو نے بھاگتے وقت سعید کے چہرے پر رسید کی تھی۔ انو کی بے حرکت لاش نے سب کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ میں نے قسطینا سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔" اس لڑکی کو انو کے مرنے کی خبر نہیں ملنی چاہیے۔ بہت ڈر جائے گی۔ فی الحال اسے یہی بتاتے ہیں کہ وہ بچ کر بھاگ گیا ہے۔ اسے تسلی دے کر واپس بھیج دیتے ہیں۔"

"لیکن وہ یہیں سے تو گزر کر جائے گی۔" قسطینا نے کہا۔" اس کی لاش کو دائیں بائیں کر دیا جائے۔"

ہم نے لاش کو اٹھا کر ایک سائیڈ پر کر دیا اور اوپر کچھ خشک جھاڑ جھنکاڑ ڈال دیے۔ ویسے بھی اسے اندھیرے سے گزر کر جانا تھا، وہ لاش نہیں دیکھ سکتی تھی۔ ہم نے سعید کھوکھر کو بھی یہ بات اچھی طرح سمجھا دی کہ مدھو نامی اس لڑکی کو انو کی اس ناگہانی موت سے بے خبر رکھنا ہے۔

○......❖......○

یہ رات کے قریباً دو بجے کا عمل تھا، مدھو سرنگ کے راستے کال کوٹھری میں پہنچ گئی تھی اور وہاں سے واپس اپنی حویلی میں چلی گئی تھی۔ انور اور مدھو کی یہ کہانی جتنی تیزی سے ہمارے سامنے آئی تھی اتنی ہی تیزی سے اپنا سفر ختم کر کے اپنے اختتام کو پہنچ گئی تھی، میں دل میں دعا کر رہا تھا کہ یہ واقعی اپنے اختتام کو پہنچ گئی ہو اور مدھو اس کے" آفٹر شاکس" سے محفوظ رہے۔ امید یہی تھی کہ اگر وہ خود اپنی زبان نہیں کھولے گی تو اس کی پردہ داری برقرار رہے گی۔ مندر میں مدھو کی آمد کے جو چھوٹے موٹے آثار نظر آئے، وہ میں نے ختم کر دیئے تھے...... فخر نے انو کی لاش اٹھا کر مندر کے ہال کمرے میں اس طرح ڈال دی کہ اس کا سر ایک مورتی کے قدموں میں رکھ دیا۔ یہ وہی مورتی تھی جس میں ایک ہوس کار نے ایک دوشیزہ کو اپنے پنجوں میں جکڑ رکھا تھا۔ اس کا بالائی دھڑ ٹائیگر کا اور نچلا انسان کا تھا۔ اس کے جسم پر سیاہ کراس تھا اور منہ پر ٹیپ چڑھی ہوئی تھی۔

اب ہم یہاں سے نکلنے کے لیے تیار تھے۔ امید یہی تھی کہ شکستہ مندر سے باہر مسلسل ہمارا پہرا دینے والے خونی پرندے اس بدلی ہوئی صورتِ حال سے بے خبر رہیں گے اور ہم شمشان گھاٹ کی جانب سے راہ فرار اختیار کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ پھر بھی اندیشے ہم سب کے ذہنوں میں موجود تھے۔ انور اور مدھو سے سوال جواب کرتے ہوئے ہم نے ان سے باہر کے حالات کے بارے میں بھی پوچھ گچھ کی تھی۔ ان کے جوابات سے اس بات کی تصدیق ہوتی تھی کہ علاقے میں پولیس کی نقل و حرکت بہت بڑھی ہوئی ہے۔ کچھ ایسے لوگوں کو ڈھونڈا جا رہا ہے جو ایک وین اور ایک بڑی جیپ میں یہاں آئے تھے اور اب مل نہیں رہے۔ مقامی پولیس نے اس سلسلے میں کچھ مشکوک لوگوں کو گرفتار بھی کر رکھا تھا۔ ہمیں باہر نکلنے کی پلاننگ کرتے ہوئے دیکھا تو دارج کی والدہ نے کہا۔ ”سب سے اہم مسئلہ تو یہ ہے کہ گھاٹ کی طرف ہمارے پاس کوئی سواری نہیں ہے۔ تم سب کو پتا ہے کہ دارج چل نہیں سکتا۔ آدم خاں بھی زخمی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”آپ ذرا حوصلہ رکھو۔ ہمارا ایسا کوئی پروگرام نہیں کہ سرنگ سے نکل کر بھاگ کھڑے ہوں گے۔ ہم سب باہر نہیں نکل رہے۔ پہلے ہم میں سے دو بندے باہر نکلیں گے، انو والے موبائل فون کے ذریعے داؤد بھاؤ وغیرہ سے رابطے کی کوشش کریں گے رابطہ ہو جانے پر باقی کا طریقہ کار طے کیا جائے گا۔“

”اور پہلے باہر کون نکلے گا؟“ دارج نے ہمیشہ کی طرح بگڑے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”یہ تمہارے نہیں، ہمارے سوچنے کی بات ہے اور بے فکر رہو کہ ہم تمہیں یا تمہارے آدم خاں کو کسی طرح کی چالاکی کا کوئی موقع دیں گے۔“ فارس جان نے اسے بہ زبان انگلش کڑے لہجے میں جواب دیا۔

دارج کا رنگ سرخ اور اس کے پہلو میں کھڑی تاجور کا زرد ہو گیا لیکن اس سے پہلے کہ دارج پھر گرجنا برسنا شروع کر دیتا۔ میں نے اسے سنبھال لیا۔ اس کا بالائی دھڑ غصے کی وجہ سے بے ساختہ بل کھاتا جا رہا تھا۔ یہ وہ شخص تھا جس کے ایک اشارے پر درجنوں خادم پیشہ حرکت میں آ جاتے تھے۔ آج وہ یہاں سے ہلنے کے لیے بھی ہماری مدد کا محتاج تھا۔

قسطینا بھی میرے اور فخر کے ساتھ باہر جانا چاہتی تھی۔ میں نے سمجھانے والے انداز میں اس سے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ آپ کو بہت جلد یہاں ایڈونچر کے بہت سے مواقع ملنے والے ہیں۔ فی الحال ہم دونوں کو جانے دیجیے۔ آپ یہاں رک کر اس آدم خاں پر نظر رکھیے۔“

اس نے اپنے بوائے کٹ بالوں میں انگلیاں چلا کر انہیں پیشانی سے پیچھے ہٹایا اور ''اوکے'' کہہ کر ایک طرف بیٹھ گئی۔ اس کے دونوں محافظ بس اسی کی زبان سمجھتے تھے اور ہمہ وقت اس کے اشارے کے منتظر رہتے تھے۔

فارس اور سعید ہمارے ساتھ چل پڑے۔ ان کو سرنگ سے باہر نہیں نکلنا تھا، اس کے دہانے یعنی داخلی دروازے کے قریب کھڑے ہو کر ہماری طرف سے کسی بھی اطلاع کا انتظار کرنا تھا۔ ہم ٹارچ کی روشنی کا سہارا لے کر اس تنگ سرنگ میں آگے بڑھنے لگے۔ یہ نانک چندی اینٹوں سے بنائی گئی تھی۔ بے شک یہ قدیم سرنگ تھی مگر سیوریج کے کسی بڑے پائپ کی طرح دکھائی دیتی تھی۔ کہیں کہیں جالے لگے ہوئے تھے اور اینٹیں اکھڑی ہوئی تھیں۔ ہم اس جگہ سے آگے بڑھ گئے جہاں انور عرف انو گر کر راہی عدم ہوا تھا۔ کم و بیش ایک فرلانگ کا فاصلہ طے کر کے ہم نے دس بارہ زینے طے کیے اور شمشان گھاٹ والے دروازے کے سامنے پہنچ گئے۔ میں نے اپنا پستول ہاتھ میں لے لیا تھا۔ فخر بھی چھوٹی نال والی آٹومیٹک گن کے ساتھ پوری طرح الرٹ تھا۔ ہم نے کال کوٹھری والا دروازہ کھولا اور باہر نکل آئے۔ آج کئی روز بعد کھلی ہوا میں سانس لینے کا موقع ملا تھا۔ تاریک آسمان پر ستاروں کے جھرمٹ تھے اور ان کی مدھم روشنی میں اس بالکل مختصر سے کھنڈر کے خدوخال نظر آتے تھے۔ یہ ساری جگہ لمبی جنگلی گھاس اور جھاڑیوں میں چھپی ہوئی تھی۔ میں اور فخر مسلسل آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ہمیں جو سب سے پہلا خطرہ درپیش تھا، وہ یہی تھا کہ مندر کی طرف موجود جنونی پرندے پرواز کرتے ہوئے اس کھنڈر کی طرف آ جائیں اور ہم پر جھپٹ پڑیں۔

ہم تین چار منٹ تک پوری طرح الرٹ رہے۔ ہمارے کسی اندیشے نے حقیقت کا روپ نہیں دھارا۔ ''وہ دیکھو شاہ زیب۔'' فخر نے ایک جانب اشارہ کیا۔

کچھ گھنی جھاڑیوں کے اندر سے چند روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ یہ اسی قصبے کے مکانات تھے، جہاں سے چل کر مدھو، اپنے پرانے عاشق انو سے ملنے آتی تھی اس کھنڈر سے قصبے کا فاصلہ ڈیڑھ دو سو میٹر سے زیادہ نہیں تھا۔

میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ انو والا موبائل آن کیا۔ اسکرین پر سگنلز نمودار ہو گئے۔ یہ بہت خوش آئند تھا۔ سب سے پہلے میں نے داؤد بھاؤ کا پرائیویٹ نمبر ڈائل کیا..... بیل جانا شروع ہو گئی۔ یہ ہمارے لیے بڑے اہم لمحات تھے۔ بیل جاتی رہی لیکن کال ریسیو نہیں ہو سکی۔ داؤد بھاؤ رات دیر تک جاگتا تھا لیکن اب ڈھائی بج چکے تھے۔ یوں لگ رہا تھا کہ وہ فون کو ''سائیلنٹ'' پر کر کے سو گیا ہے۔ ''دوبارہ ٹرائی کرو'' فخر نے بے چینی سے کہا۔ میری

طرح اس کی نگاہیں بھی مسلسل قرب و جوار کا جائزہ لے رہی تھیں۔

میں نے دوبارہ ٹرائی کیا......اور پھر تیسری اور چوتھی بار بھی کال ریسیو نہیں ہو سکی۔ داؤد بھاؤ کے کارندوں میں سے صرف بنارس کا نمبر مجھے زبانی یاد تھا۔ ''کیا خیال ہے فخر، بنارس کے نمبر پر کوشش کریں؟'' میں نے مشورہ طلب کیا۔

فخر نے میری بات کی تائید کی۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ بنارس کا نمبر ڈائل کیا۔ بیل جانا شروع ہوئی اور پھر کوتاہ قد بنارس کی بوجھل آواز کانوں سے ٹکرائی۔ ''ہیلو کون؟''

شکر کا مقام تھا کہ وہ زندہ تھا اور ہماری کال بھی ریسیو کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''بنارس! میں شاہ زیب بول رہا ہوں......تمہارے پاس کوئی اور تو موجود نہیں؟''

''اوہ گاڈ......اوہ گاڈ...... یہ آپ ہیں؟'' بنارس کی آواز لرز اٹھی۔ اس میں خوشی کی جھلک تھی۔ بظاہر تو ہم اپنے ساتھیوں سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے لیکن ہمیں معلوم نہیں تھا کہ بنارس کو کال کر کے ہم نے کتنی بڑی غلطی کی ہے۔ اس غلطی کا نتیجہ بے حد سنگینی کے ساتھ ہمارے سامنے آنے والا تھا۔

○......❖......○

بنارس نے کپکپاتی آواز میں کہا۔ ''یہ آپ کس نمبر سے بات کر رہے ہیں؟''

''بس ہے کسی کا نمبر۔ تم یہ بتاؤ کہ کہاں ہو؟ اور تمہارے آس پاس کون ہے؟''

''اس وقت بالکل اکیلا ہوں جی۔ سو رہا تھا، آپ کی بیل آنے پر اٹھا ہوں۔ ہم سب اتنے پریشان ہیں آپ کے لیے کہ بتا نہیں سکتا۔ داؤد بھاؤ نے تین چار گاڑیاں مسلسل آپ کی تلاش مین لگا رکھی ہیں جس پُل کے پاس گاڑیوں کو حادثہ پیش آیا تھا، اس کے آس پاس بھی ڈھونڈا جا رہا ہے آپ کو۔''

''لیکن حادثے کے بعد تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟''

''ہم بھی بال بال بچے ہیں جی، ہماری گاڑی کا ٹائر برسٹ ہو گیا تھا۔ شکر ہے کہ الٹنے سے بچ گئی۔ آپ کے مہمان ناوان صاحب کے بازو پر کچھ چوٹ آئی تھی لیکن اب وہ ٹھیک ہیں......''

میں نے کہا۔ ''بنارس! تفصیل سے بات بعد میں کریں گے۔ تم اس وقت کہاں ہو؟''

''میں دو ساتھیوں کے ساتھ یہاں کلر کہار میں ہوں۔ بھاؤ جی بھی آپ کی تلاش کے لیے یہیں ٹھہرے ہوئے ہیں۔''

''گڈ، یہ اچھی بات ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ بھاؤ اپنا فون بند کر کے سو چکے ہیں۔ تم فوری

طور پر ان کے پاس پہنچو یا کسی بھی طریقے سے ان سے رابطہ کرو۔ ہم کلر کہار سے زیادہ دور نہیں ہیں۔"

پھر میں نے مختصر الفاظ میں بنارس کو آگاہ کیا کہ ہم کہاں موجود ہیں اور دیگر صورتِ حال کیا ہے۔ اس نے میری بات حیرت آمیز خاموشی کے ساتھ سنی۔ آخر میں وہ لرزتی ہوئی سی آواز میں بولا۔ "شاہ زیب صاحب! جو کچھ مجھے معلوم ہے، اس کے مطابق اس پورے علاقے میں پولیس آپ کو ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔ دارج اور ان کے گھر والوں کی گمشدگی نے پورے محکمے میں...... بلکہ ہر جگہ تڑتھلی مچائی ہوئی ہے۔ میری ناچیز رائے تو یہی ہے کہ آپ جہاں ہیں وہیں رہیں۔ ہمارے پہنچنے تک بالکل اِدھر اُدھر نہ ہوں۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ جلد سے جلد بھاؤ جی سے آپ کا رابطہ ہو جائے۔"

"ٹھیک ہے، میں انتظار کر رہا ہوں۔ تم جلدی کرو۔ اس فون کی چارجنگ بھی زیادہ نہیں ہے۔"

بنارس سے بات ختم کرنے کے بعد میں نے فخر سے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ ہمیں کوٹھری کے اندر چلے جانا چاہیے۔ سگنلز تو کوٹھری میں بھی آتے ہیں۔"

"میں بھی یہی کہنے والا تھا۔" فخر بولا۔ پھر انگلی سے، دور اس قصبے کی روشنیوں کی طرف اشارہ کیا جو رات کے اس سناٹے میں اونگھتا ہوا محسوس ہوتا تھا، کہنے لگا۔ "ابھی مجھے وہاں ایک نیلی روشنی نظر آئی ہے۔ کیا پتا وہ پولیس کی کسی گاڑی کی ہی ہو۔"

میں نے دھیان سے ٹمٹماتی ہوئی زرد روشنیوں کی طرف دیکھا۔ کوئی نیلی روشنی تو دکھائی نہیں دی، تاہم اس اونچی حویلی کا ہیولا ضرور نظر آیا جہاں امیرانہ خدوخال والی گوری چٹی مدیحہ عرف مدھو رہتی تھی۔ وہ رات کے اندھیرے میں وہاں سے چل کر آتی تھی اور اس سرنگ سے گزر کر اپنے عاشق انو تک پہنچتی تھی۔ انو جس کا 'عشق' اب سراسر 'جسم کی بھوک' میں بدل چکا تھا۔ اب وہ انو مکافات کا شکار ہو کر مندر کے تہ خانے میں سر پھٹی لاش کی صورت میں پڑا تھا۔

میں اور فخر شمشان گھاٹ کی کوٹھری کے اندر آ گئے۔ تاہم ہم نے موٹی لکڑی کا قدیم دروازہ کھلا رہنے دیا۔ سردی ابھی شروع نہیں ہوئی تھی لیکن ہوا میں ایک گیلی سی ٹھنڈک موجود تھی۔ دو دن پہلے ہونے والی بارش کی وجہ سے آسمان صاف تھا اور ستارے بے حد روشن نظر آ رہے تھے۔ فخر نے کہا۔ "تمہارا کیا خیال ہے شاہ زیب! داؤد بھاؤ کس طرح مدد کرے گا؟ ظاہر ہے کہ وہ سیدھا تو یہاں نہیں پہنچے گا۔ وہ بھی جانتا ہے کہ علاقے میں پولیس پھیلی ہوئی ہے۔"

''ممکن ہے کہ اس کے بندے کسی بھیس میں یہاں پہنچیں۔ اس کے پاس ہر طرح کے کارندے اور بہروپیے موجود ہیں۔ داؤد بھاؤ سے میری جو پہلی ملاقات ہوئی تھی، اس میں وہ اور اس کے ساتھی پولیس والوں کے روپ میں تھے۔ داؤد بھاؤ خود تو شاذ و نادر ہی کسی کارروائی پر نکلتا ہے۔ تب شاید قدرت کی مرضی تھی کہ ہماری ملاقات ہو اس لیے وہ خود بھی ایک مشن پر نکلا ہوا تھا۔''

''ہاں، تم نے مجھے اس ملاقات کے بارے میں بتایا تھا۔ ان دنوں ولید کی گرفتاری کے بعد تم پولیس سے چھپتے پھر رہے تھے...... ویسے تمہاری یہ بات بھی صحیح ہے کہ داؤد کے پاس ہر قسم کے بہروپیے موجود ہیں۔ چند دن پہلے وہاں راوی فارم میں ہم نے جو مالی اور مزدور وغیرہ دیکھے تھے، وہ بھی مالی اور مزدور تو نہیں تھے۔''

''ان میں سے کسی نے بھی آٹھ دس سے کم قتل نہیں کیے ہوں گے۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔

''تاجور اور اس کے جہنمی شوہر صاحب کے بارے میں کیا پروگرام ہے۔ انہیں ساتھ لے جانا ہے یا یہیں چھوڑنا ہے؟''

''ویسے تو یہیں بھی چھوڑا جا سکتا ہے۔ پولیس کو بس ایک کال کر دی جائے کہ داراب فیملی کا جنونی سپوت دارج اپنی مسز اور والدہ کے ساتھ مندر کے تہ خانے میں پایا جاتا ہے۔ پولیس کے اعلیٰ افسر پورے پروٹوکول کے ساتھ یہاں پہنچیں گے اور ان لوگوں کو لے جائیں گے...... مگر مسئلہ پھر وہی ہے کہ کہیں پولیس والے بے احتیاطی نہ کریں...... لوسی ماری گئی ہے مگر پرندے تو ابھی وہیں منڈلا رہے ہیں۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ پولیس والے جب مندر کا دروازہ کھلوائیں گے تو پرندے تاجور پر حملہ آور ہونے کی کوشش کریں گے؟''

''اب تک تو ہم نے یہی دیکھا ہے کہ تاجور کی جھلک دیکھ کر وہ بری طرح پھڑ کنے لگتے ہیں۔ اس کا حل یہی ہے کہ ہم دارج اور اس کی فیملی کو اپنے ساتھ ہی یہاں سے نکالیں...... یا پھر دوسرا آپشن یہ ہے کہ پولیس کو پوری طرح انفارم کیا جائے، انہیں بتایا جائے کہ وہ اپنے وی آئی پی (دارج) کو مندر کی طرف سے نہیں بلکہ اس شمشان گھاٹ کی طرف سے نکالیں...... اور نکالنے کے دوران میں پوری طرح چوکس رہیں۔''

پندرہ بیس منٹ مزید گزر گئے۔ ہمارا انتظار طویل ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے تین مرتبہ خود بھی داؤد بھاؤ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔ بنارس کا نمبر بھی مصروف جا رہا

تھا۔اس موبائل کی چارجنگ بھی کم رہ گئی تھی اس لیے میں احتیاط سے استعمال کر رہا تھا۔ مجھے پتا تھا کہ سرنگ کے دوسرے سرے پر مندر کے تہ خانے میں قسطینا وغیرہ پریشان ہو رہے ہوں گے۔ یقیناً دارج کا پارہ بھی انتظار کی کوفت کے سبب چڑھنے والا ہوگا۔ میں نے فخر سے کہا کہ میں یہیں ٹھہرتا ہوں، وہ تہ خانے کا ایک چکر لگا آئے۔اس سے پہلے کہ فخر جواب میں کچھ کہتا، انو مرحوم کے سیل فون پر کال کے سگنل آ گئے۔ یہ کال بنارس کے نمبر سے ہی آ رہی تھی۔ میں نے کال ریسیو کی، دوسری طرف سے بنارس کی آواز آئی۔ ''شاہ زیب صاحب، ہم پہنچ رہے ہیں۔ہمیں مندر نظر آ گیا ہے......اب شمشان کے کھنڈر کی طرف آ رہے ہیں۔''

''کتنے لوگ ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''پانچ بندے ہیں، تین بڑی گاڑیوں میں۔آپ بالکل تیار رہیں۔''

''کوئی......رکاوٹ تو نہیں آئی؟''

''شکر ہے......ابھی تک تو نہیں آئی۔'' اس نے کہا۔ ایسے لگتا تھا کہ ایک گاڑی وہ خود ہی ڈرائیو کر رہا ہے۔

میں نے سلسلہ منقطع کیا۔ ہم فوراً سرنگ میں داخل ہوئے اور تہ خانے کی طرف بڑھے۔ بنارس نے خود رابطہ کیا تھا، اس کا مطلب تھا کہ داؤد بھاؤ خود ساتھ نہیں ہے۔ وہ ''فیلڈ'' کا بندہ نہیں تھا۔ عموماً بند کمرے میں بیٹھ کر ہی احکامات جاری کرتا تھا۔ اس کارروائی کے سلسلے میں یقیناً اس نے بنارس کو انچارج بنایا تھا۔ بنارس کوئی عام کارندہ نہیں تھا۔اس میں صلاحیتیں موجود تھیں۔ غالباً انیق کے بعد وہ داؤد بھاؤ کے دو تین اہم ترین ''ورکرز'' میں سے تھا۔ وہ جتنا زمین کے اوپر تھا، اتنا اندر بھی تھا۔

ہم تاریک سرنگ میں جھک کر دوڑ رہے تھے۔فخر نے کہا۔ ''یہ تو خوش قسمتی ہی ہے کہ بنارس اور اس کے ساتھیوں کا ٹاکرا ابھی تک پولیس وغیرہ سے نہیں ہوا۔''

''اللہ کرے یہ خوش قسمتی اگلے ایک ڈیڑھ گھنٹے میں ہمارے ساتھ رہے۔'' میں نے جواب دیا۔

تہ خانے میں پہنچنے اور وہاں سے دارج وغیرہ کو واپس شمشان گھاٹ تک لانے میں ہمیں پندرہ منٹ لگ گئے۔ قسطینا کے دونوں تنومند محافظوں نے آہنی سیڑھی کی مدد سے ایک اسٹریچر سا بنا لیا تھا۔ اس اسٹریچر کے ذریعے دارج کو سرنگ سے گزارنے میں کافی آسانی رہی۔ آدم خاں کا پاؤں زخمی تھا، تاہم فخر اور فارس کے سہارے وہ بھی جیسے تیسے سرنگ سے گزر کر شمشان کے کھنڈر تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ سب سے پہلے میں ہی باہر نکلا۔ میرے

پاس موجود فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ یقیناً یہ بنارس ہی تھا۔ باہر نکل کر میں نے ادھر اُدھر نظر دوڑائی۔ تینوں گاڑیوں کے ہیولے بیس پچیس میٹر دور دکھائی دے گئے، بنارس وغیرہ نے گاڑیوں کی روشنیاں بجھا رکھی تھیں۔

''ہم آ گئے ہیں۔'' میں نے بنارس کی کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں جی، میں نے آپ کو دیکھ لیا ہے۔'' بنارس کی آواز آئی اور پھر گاڑیوں کے اندر سے تین چار افراد برآمد ہو گئے۔

سب سے پہلے بنارس ہی میرے پاس پہنچا۔ اس کے عقب میں داؤد بھاؤ کا ایک اور اہم کارندہ فاروق تھا۔ دونوں کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ بنارس گرم جوشی سے گلے ملا۔ اس نے ہانپی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ سامنے قصبے کی طرف ہم نے ایک دو نیلی بتیاں دیکھی ہیں۔ یہ پولیس بھی ہو سکتی ہے۔''

میں نے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''پولیس کے علاوہ بھی ہمیں خطرہ ہے۔ پرندے ہم سے زیادہ دور نہیں ہیں۔''

تہ خانے سے نکلنے والے ہم کل گیارہ افراد تھے۔ (قسطینا کے دونوں محافظ بھی اس میں شامل تھے) بڑی تیزی کے ساتھ ہم ان تینوں گاڑیوں میں منتقل ہو گئے۔ ان میں سے ایک ٹویوٹا کی ڈبل کیبن پک اَپ تھی اور دو جہازی سائز کی لگژری جیپیں تھیں۔ جس گاڑی میں دارج، تاجور اور میں گھسے، قسطینا بھی اسی میں تھی۔ فارس اور فخر کو دوسری گاڑی میں جگہ ملی تھی۔

گاڑی کے اندر تاریکی تھی۔ مجھے کچھ عجیب سا احساس ہوا۔ شاید یہ چھٹی حس کا اشارہ تھا۔ مجھے لگا جیسے جیپ کے عقبی حصے میں پہلے سے کوئی چھپا بیٹھا تھا۔ میں مڑ کر دیکھنا ہی چاہ رہا تھا جب مجھے اپنے بائیں پہلو میں تیز چبھن محسوس ہوئی۔ بے شک یہ آٹومیٹک رائفل کا بیرل تھا۔ میں نے بائیں جانب دیکھا۔ بنارس کی آنکھوں میں شعلے نظر آ رہے تھے اور موٹے سیاہ ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ تھی۔ وہ ہیجانی انداز میں بولا۔ ''اپنے ہاتھوں کو حرکت مت دینا شاہ زیب صاحب! چھ سات گولیاں اکٹھی آپ کے پیٹ میں اتر جائیں گی۔''

یہی وقت تھا جب قسطینا نے بھی تیزی سے پلٹ کر دیکھا۔ اس کے عقب میں بنارس کا ساتھی فاروق موجود تھا اور اس نے اپنا مشین پسٹل دونوں ہاتھوں سے تھام کر قسطینا کے سر سے لگا دیا تھا۔ اس کی شکل دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ زبردست تناؤ کا شکار ہے اور قسطینا کی ذرا سی حرکت پر ٹریگر دبا دے گا۔ ''خبردار میڈم! تم نے بھی کوئی حرکت نہیں کرنی۔'' وہ بھی سنسنی خیز لہجے میں بولا۔

میرا بریٹا پسٹل میری شرٹ کے نیچے تھا لیکن کمر کی طرف تھا۔ میں وہاں تک ہاتھ پہنچانے کی کوشش کرتا تو بنارس اس سے بہت پہلے ٹریگر دبا چکا ہوتا۔

اسی اثنا میں میری چھٹی حس کا اشارہ بھی درست ثابت ہو گیا۔ جیپ کے عقبی حصے میں نشستوں کے پیچھے ایک نہیں دو مسلح افراد موجود تھے...... میں یہ جان کر دنگ رہ گیا کہ یہ ٹیکساری گینگ کے وہی بدنام زمانہ شیطان زادے تھے جن سے لوگ پناہ مانگتے تھے۔ ان میں سے ایک کا خوشی سے بھرپور، مکروہ قہقہہ میرے کانوں سے ٹکرایا۔ ''تم کیا سمجھتے تھے ایسٹرن! اتنی آسانی سے ہم سے پیچھا چھڑا لو گے؟''

میں نے آواز سے پہچان لیا۔ یہ گینگ کے ان بچے کھچے خبیثوں کا انچارج ریگی تھا......

میرا دماغ چکرا کر رہ گیا۔ یہ سب کیا ہوا تھا؟ اور کیسے؟

میں نے ایک بار پھر مڑ کر کوتاہ قد بنارس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بیگانگی اور دشمنی کے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دیا۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے بنارس! داؤد بھاؤ تمہارا باریک قیمہ بنوا دے گا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ بعد کی باتیں ہیں۔ فی الحال آپ جناب اپنے ہاتھوں کو اپنے گھٹنوں پر رکھو۔ میں گھوڑا دبانے میں ایک سیکنڈ کی دیر بھی نہیں کروں گا۔''

اسی دوران میں ڈیتھ اسکواڈ کے انچارج ریگی نے عقبی سیٹ پر آ کر اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور میری شرٹ کے نیچے سے پسٹل کھینچ لیا۔ دوسری طرف فاروق اور اس کے ایک ساتھی نے قسطینا کو بھی بڑی تیزی اور احتیاط سے نہتا کر دیا تھا۔ دارج، تاجور اور اس کی تنومند ساس بڑی حیرت سے یہ مناظر دیکھ رہے تھے۔ دارج نے بھی ٹیکساری گینگ کے قاتل شتونگڑوں کو جیپ میں دیکھ لیا تھا اور غالباً وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ اپنے لوگوں میں ہی ہے۔ اس نے اپنے اکھڑ لہجے میں بنارس سے پوچھا۔ ''کس نے بھیجا ہے تم لوگوں کو یہاں؟''

بنارس ادب سے بولا۔ ''سر! آپ بالکل پریشان نہ ہوں، ہم آپ کی مدد کے لیے ہی تو آئے ہیں۔ یہ سب کچھ جناب شکیل صاحب کے آرڈر پر ہوا ہے۔ وہ ابھی آپ سے فون پر بات کرتے ہیں۔''

میرے دل نے گواہی دی کہ یہ بدبخت بنارس جسے ہم بھاؤ کا خاص بندہ سمجھتے تھے، اندر سے شکیل داراب اور اس کے ہمنواؤں سے مل چکا ہے۔

اب یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ میں آ رہی تھی کہ علاقے میں پولیس کی موجودگی اور سرچ آپریشن کے باوجود یہ تینوں گاڑیاں شمشان گھاٹ تک کیسے پہنچ گئیں۔ ان میں سے

دو گاڑیاں تو داراب فیملی کی ہی تھیں۔ انہیں یہاں آنے سے کون روک سکتا تھا۔ کوئی پولیس آفیسر کتنا بھی فرض شناس ہوتا، ان گاڑیوں کے راستے میں رکاوٹ نہیں ڈال سکتا تھا۔

اب یہ تینوں گاڑیاں ہمیں لے کر تیز رفتاری سے ناہموار راستے پر رواں تھیں۔ اب تینوں گاڑیوں نے ہیڈ لائٹس آن کر لی تھیں...... گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس دیکھنے کے بعد پتا چلا کہ گاڑیوں کی کل تعداد اب چار ہوگئی ہے۔ عین ممکن تھا کہ کوئی پولیس موبائل بھی ان میں شامل ہوگئی ہو۔ نشستوں کی پوزیشن کچھ ایسی تھی کہ میں اور قسطینا تقریباً آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ میرے علاوہ بنارس اور قسطینا کی نگاہ بھی بار بار جیپ کی کھڑکیوں سے باہر بلندی کی طرف جاتی تھی۔ یقیناً ان کے ذہنوں میں بھی خونی طوطوں والا اندیشہ موجود تھا۔ طوطے گو مندر کی جانب تھے لیکن ہماری گاڑیوں سے بہت زیادہ دور بھی نہیں تھے۔ جب ہم پانچ چھ کلو میٹر دور نکل آئے تو طوطوں کی طرف سے کسی طرح کی جارحیت کا اندیشہ تقریباً ختم ہوگیا۔ ان کو ہمارے پیچھے پڑے قریباً چار دن ہو چکے تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ باناوانی نے تنویمی عمل کے دوران میں ان پرندوں کو جو ''تحیشن'' دی ہو اس کا اثر وقت گزرنے کے ساتھ کم ہو گیا ہو...... یا پھر زائل ہونے کے قریب ہو۔ بہرحال جو کچھ بھی تھا، تاجور کی موجودگی کے باوجود پرندے ہمارے پیچھے نہیں آئے تھے۔

''ہمیں کہاں لے جا رہے ہو؟'' میں نے گمبھیر آواز میں بنارس سے پوچھا۔

''یہ تو باس ہی بتا سکتے ہیں۔''

''اور باس کون ہے؟''

''عزت مآب جناب شکیل صاحب۔'' بنارس نے اطمینان سے جواب دیا۔ وہ بے حد الرٹ بیٹھا تھا، اس نے اپنی انگلی کو آٹومیٹک سیون ایم ایم کے ٹریگر پر بالکل چوکس رکھا ہوا تھا۔

''میری بات کراؤ اس سے۔'' میں نے سرسراتے لہجے میں کہا۔

''باتیں تو ہوں گی اور بہت زیادہ ہوں گی، آپ پریشان نہ ہوں۔''

''بکواس بند کر۔ یہاں چلتی گاڑی میں خون خرابا ہو جائے گا......''

میرا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی عقبی نشست سے گنجا شیطان ریگی پھنکارا۔ ''خاموش بیٹھے رہو، نہیں تو یہیں پر چیر پھاڑ ڈالیں گے۔'' اس کی آواز میں ایسی درندگی تھی کہ ایک مرتبہ تو سینے میں چنگاریاں سی چھوٹ گئیں۔

پھر میری نگاہ قسطینا کے چہرے پر پڑی۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں مجھ سے کہہ رہی تھی، ابھی ذرا تحمل رکھواور ہمیں واقعی تحمل رکھنا چاہیے تھا اگراس جیپ کے اندر ہی کوئی گڑبڑ ہو جاتی تو تاجور، دارج اوراس کی والدہ سمیت ہم میں سے کسی کا بھی نقصان ہوسکتا تھا۔

باقی دونوں گاڑیاں ہم سے آگے جا رہی تھیں۔ ان میں فخر اور فارس جان سمیت ہمارے باقی ساتھی تھے۔ دارج کا بے دام کا غلام آدم خاں بھی ان میں سے کسی ایک گاڑی میں تھا۔ یقینی بات تھی کہ ان دونوں گاڑیوں میں موجود ہمارے ساتھیوں کو بھی ہماری ہی طرح دفعتاً بے بس کر دیا گیا تھا۔ یہ سب کچھ پوری پلاننگ کے ساتھ ہوا تھا، اور بڑی تیز رفتاری سے ہوا تھا۔ اب اس امر میں شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ بنارس ایک کالی بھیڑ ثابت ہوا ہے۔ اس کو میرا فون کر دینا ہی اس ساری کایا پلٹ کا سبب بنا تھا۔ اگراس موقع پر داؤد بھاؤ کا فون مل جاتا تو شاید یہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا۔

میرا اندازہ تھا کہ ہم ایک بار پھر موٹروے کی طرف جا رہے ہیں۔ کھڑکیوں سے باہر گہری تاریکی تھی اور درختوں کے ہیولے پیچھے کی طرف بھاگتے محسوس ہوتے تھے، ٹیکساری گینگ کے دونوں شیطان بڑے خوشگوار موڈ میں تھے۔ وہ گاہے بگاہے مجھے اور قسطینا کو انگلش میں مخاطب کرتے تھے اور انگلش کا ایک لچر گانا گنگنانا شروع کر دیتے تھے۔ کسی وقت وہ دونوں آپس میں ہی ایک دوسرے کی ماں بہن ایک کرتے اور پھراس بے ہودہ گوئی پر کھل کر ہنستے۔ ہمارے بارے میں ان کے ارادے بہت خطرناک لگتے تھے۔ ظاہر ہے کہ لاہور کے نواح میں جو آخری چوٹ انہیں لگی تھی، وہ خاصی شدید تھی۔ ان کے بندے مرے تھے، ان کے ہمنوا قیصر چوہدری اور لالہ وریام جان سے گئے تھے۔ ان کا باس جان ڈیرک بھی بمشکل جان بچا کر نکلا تھا۔ ایک بار پھر وہ لرزہ خیز مناظر میری نگاہوں کے سامنے گھوم گئے جب ان سرمنڈھے وحشیوں نے رضوان ٹی کے جسم پر رنگ پھینک کر اسے کیک جیسی شکل دی تھی اور پھراس کے گوشت کے ٹکڑے اس کے زندہ جسم سے علیحدہ کیے تھے۔ میرے لیے وہ بے بسی کی انتہا تھی۔

تب میں نے ان بے رحم لمحوں کو کس طرح جھیلا تھا، یہ میں جانتا تھا یا میرا خدا۔ میں کرب کی شدت میں بہت گرجا برسا تھا، میں نے ان لمحوں میں گینگ کے چھرا بردار شیطانوں کو مشتعل کرنے اور اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش بھی کی تھی، مگر سب رائیگاں گیا تھا۔ وہ رضوان کا گوشت کاٹنے پر تلے ہوئے تھے...... اب پتا نہیں کہ رضوان کس حالت میں تھا۔ ہم اسے قابلِ رحم حالت میں راوی فارم پر پہلوان حشمت اور ولید کی زیرنگرانی چھوڑ آئے تھے۔

اچانک مجھے اپنے خیالوں سے چونکنا پڑا۔ ہچکولے کھاتی جیپ کی ایک کھڑکی کے ساتھ کوئی وزنی چیز ٹکرائی تھی۔ پھر ایسی ہی ایک دوسری آواز جیپ کی ونڈ اسکرین کی طرف سے آئی۔

''اوہ مائی گاڈ...... یہ کیا ہو رہا ہے۔'' ڈرائیور کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

یہی وقت تھا جب دارج کے پہلو میں بیٹھی تاجور بری طرح چلائی۔ اس کی ساس یاسمین بیگم بھی خود کو چلانے سے نہ روک سکی۔ ہم نے کھڑکیوں سے باہر دیکھا۔ کچھ اُڑتی ہوئی سیاہ پرچھائیاں جیپ پر حملہ آور تھیں۔ یہ خوفناک چمگادڑوں کا ایک بڑا ''غول'' تھا۔ یوں لگتا تھا کہ انہوں نے چلتی ہوئی جیپ پر چاروں طرف سے حملہ کر دیا ہے۔ پتا نہیں کہ یہ کس وقت اور کہاں سے نمودار ہوئی تھیں۔ اب یہ دیوانہ وار شیشوں سے ٹکرا رہی تھیں۔

میرے پہلو میں بیٹھے ہوئے بنارس کی توجہ بس ایک لحظے کے لیے میری طرف سے ہٹی تھی۔ یہ ایک لحظہ میرے لیے بہت کافی تھا۔ میں نے تڑپ کر رائفل کی مہلک نال اپنی پسلیوں سے ہٹا دی، میں جانتا تھا کہ کوتاہ قد بنارس ضرور ٹریگر دبا دے گا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے بیرل کا رخ اس کے ساتھی فاروق کی طرف رکھا تھا۔ بنارس بدبخت نے وہی کیا جس کی اس سے توقع تھی۔ اس نے ٹریگر دبایا اور کم و بیش پانچ گولیاں اس کے ساتھی فاروق کے سینے میں گھس گئیں۔ ایک یا دو گولیاں جیپ کی ونڈ اسکرین میں سوراخ کرتی گزر گئی تھیں۔

میں نے اسے دوسری بار ٹریگر دبانے کا موقع نہیں دیا۔ رائفل ابھی تک اسی کے ہاتھ میں تھی۔ میں نے رائفل کی نال کی نہایت تگڑی ضرب اس کی پیشانی پر لگائی۔ رائفل بنارس کے ہاتھوں سے نکل گئی جس شخص نے قسطینا کے سر سے اپنا مشین پسٹل لگا رکھا تھا، وہ فاروق ہی تھا۔ اس کو گولیاں لگتے ہی قسطینا آزاد ہو گئی تھی۔ اس آزادی کا قسطینا نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اس نے ایک جست لگائی اور عقبی نشستوں پر بیٹھے ہوئے ایک شیطان زادے پر جا پڑی۔ اس کا حملہ بڑا بروقت تھا۔ مدِمقابل نے رائفل کا ٹریگر دبایا اور کوئی نصف درجن گولیاں جیپ کی چھت پھاڑ کر نکل گئیں۔ اس کے فوراً بعد شیطان زادہ نہایت کریہہ آواز میں چلایا تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا قسطینا نے اسے چھاپتے ہی اس کا تیز دھار ڈیگر اس کی بیلٹ میں سے نکال لیا تھا، اب یہی دس انچ لمبا ڈیگر، دستے تک شیطان زادے کے سینے میں گھس گیا تھا۔

ٹیکساری گینگ کے دوسرے رکن نے فائر کرنے میں ایک سیکنڈ کی تاخیر کی تھی۔ شاید وہ اس لیے ہچکچایا تھا کہ مجھ پر ہونے والا فائر سامنے بیٹھے دارج اور اس کی فیملی کو لگ سکتا تھا۔ اس کی یہی لمحاتی ہچکچاہٹ ہماری زندگی کی ضمانت بن گئی۔ میں نے بنارس والی رائفل ایک ہاتھ

سے گھمائی اور شیطان زادے ریگی کے سر سے لگا دی۔ دوسرے ہاتھ سے میں نے اس کی رائفل کا بیرل جکڑ کر نیچے جھکا دیا۔ ایک فائر ریگی نے بھی کیا لیکن یہ گولی کہیں دبیز نشستوں کے فوم میں دفن ہوگئی۔

''خبردار'' میں نے گرج کر کہا۔ ''کھوپڑی ٹوٹ جائے گی۔''

ریگی نے میری آنکھوں میں موجود اپنی موت کی تحریر پڑھ لی۔ وہ ذرا سا ڈھیلا پڑا۔ قسطینا نے رائفل کے آہنی دستے سے ایک طوفانی چوٹ اس کی صفا چٹ کھوپڑی پر لگائی اور پھر رائفل گھما کر بیرل اس کی کنپٹی سے لگا دیا۔ ''شاہ زائب، تم ڈرائیور کو دیکھو۔'' وہ انگلش میں پکار کر بولی۔

ڈرائیور شدید بدحواسی کے عالم میں تھا۔ یوں لگتا تھا کہ گاڑی الٹا دے گا۔ اس کی بدحواسی جیپ کی اندرونی صورتِ حال کی وجہ سے بھی تھی اور باہر کے ہولناک مناظر کے سبب بھی۔ وزنی چمگادڑیں پتھروں کی طرح جیپ سے ٹکرا رہی تھیں اور اسے لرزا رہی تھیں۔ کسی وقت وہ اتنی زیادہ ہو جاتی تھیں کہ ونڈ اسکرین کے پار دیکھنا مشکل ہو جاتا تھا۔ زخمی بنارس کی گردن میرے بائیں بازو کے شکنجے میں یوں جکڑی ہوئی تھی کہ شاید نبض کے سوا اس کے جسم کی کوئی چیز حرکت نہیں کر پا رہی تھی۔ دائیں ہاتھ سے میں نے رائفل کا رخ ڈرائیور کی طرف کیا اور کرخت لہجے میں کہا۔ ''ہوش کرو، اپنی اس ماں کو سیدھا رکھو ورنہ یہ اُلٹ جائے گی۔ سب مارے جائیں گے۔''

ڈرائیور نے ہراساں انداز میں سر ہلایا اور پوری توجہ سامنے سڑک پر مبذول کر دی۔

قسطینا نے ابلیس صفت ریگی کو مسلسل اپنے نشانے پر رکھا ہوا تھا۔ ریگی کے ساتھی اور فاروق کا خون جیپ کے فرش پر پھیلنے کے بعد ہمارے قدموں تک پہنچ رہا تھا۔ بنارس کا ماتھا بری طرح پھٹ گیا تھا۔ ماتھے سے بہنے والا خون اس کی آنکھوں میں بھر رہا تھا اور وہ نیم بے ہوش نظر آنے لگا تھا۔ گاڑی ناہموار راستے پر اچھل رہی تھی اور دارج کی والدہ کا چربی دار جسم بھی بری طرح تھل تھل کر رہا تھا۔ وہ گاہے بگاہے ہیجانی انداز میں چلانے لگتی تھی……

''یہ کیا ہو رہا ہے ہمارے ساتھ…… یا خدا ہم پر رحم کر۔''

○……❖……○

میں نے دارج کی طرف دیکھا، وہ بھی سکتہ زدہ بیٹھا تھا۔ تاجور نے اس کا بازو مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ میں نے پکار کر کہا۔ ''اب کیا خیال ہے دارج صاحب! طوطوں کے بعد اب

یہ چمگادڑیں بھی میں نے ہی یہاں بلائی ہیں ناں؟ یہ سب میرا رچایا ہوا ڈراما ہی ہے ناں؟''

وہ کچھ نہیں بولا۔'' اس کی آنکھوں میں دنیا جہان کی حیرت سمٹی ہوئی تھی۔ کسی وقت اس کا سر اچھل کر جیپ کی چھت سے جا ٹکراتا تھا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ ہم نیم پختہ سڑک سے بھی محروم ہو گئے ہیں۔ اس میں ڈرائیور کا کوئی قصور نہیں تھا۔ ان خونی چمگادڑوں کا حملہ اتنا شدید تھا کہ سب کچھ درہم برہم ہو گیا تھا۔ ہمارے ساتھ چلنے والی گاڑیاں بھی کہیں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ جس کے جدھر سینگ سمائے ہیں ادھر نکل گیا ہے۔

میں نے ڈرائیور کو مخاطب کیا اور پکار کر کہا۔'' یہ ہیڈ لائٹس کیوں بجھا دی ہیں؟''

'' یہ ٹوٹ گئی ہیں۔ صرف پارکنگ لائٹس جل رہی ہیں۔''

'' تم جا کدھر رہے ہو؟''

'' مم...... مجھے کچھ پتا نہیں، یہ تو......''

وہ فقرہ مکمل نہ کر سکا۔ ونڈ اسکرین کی طرف سے کھٹکے کی زوردار آواز آئی پھر '' بڑی برائلر مرغی'' سے بھی بڑی ایک سیاہ چمگادڑ شیشہ توڑتی ہوئی اندر آ گئی۔ وہ سیدھی تاجور اور یاسمین بیگم کے درمیان گری تھی۔ دونوں عورتیں بے طرح چلائیں۔ ایک لمحے کے لیے قسطینا بھی ٹھٹکی مگر پھر اس کے اندر کی جنگجو عورت بیدار ہوئی۔ اس کی گود میں ابھی تک وہ تیز دھار ڈیگر موجود تھا جس سے اس نے شیطان زادے کو جنم واصل کیا تھا۔ اسی ڈیگر سے اس نے مشتعل چمگادڑ پر وار کیا۔ چمگادڑ جو چند لمحے کے لیے ایک گیند کی طرح نظر آئی تھی ایک دم اپنے لمبے پَر کھول کر بری طرح پھڑپھڑائی۔ جیپ میں کہرام سا مچ گیا تھا۔

اس موقع پر سعید کھوکھر نے حاضر دماغی کا مظاہرہ کیا اور ونڈ اسکرین کے اس سوراخ کو ایک کشن سے بند کر دیا جہاں سے چمگادڑ کو راہ ملی تھی۔ اس نے کشن کو بڑی مضبوطی سے باہر کی طرف دھکیل کر رکھا۔ تاجور نے بھی آگے بڑھ کر سعید کھوکھر کی مدد کی۔

ریگی کو لگا کہ شاید یہ کچھ کر دکھانے کا موقع ہے مگر میں اس کی طرف سے ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہیں ہوا تھا۔ قسطینا کی رائفل ریگی کی طرف سے ہٹی تو میں نے رائفل کا رخ اس کی کھوپڑی کی طرف کر دیا تھا۔ وہ جیسے تلملا کر رہ گیا۔ اسی دوران میں قسطینا نے چمگادڑ کو جان لیوا طور پر زخمی کر دیا۔ وہ اب ہمارے قدموں میں جان کنی کے عالم میں پھڑپھڑا رہی تھی۔ گاڑی بری طرح لہرانے لگی تھی۔ میں ڈرائیور کو مخاطب کر کے ایک بار پھر زور سے بولا اور اسے حواس قائم رکھنے کا کہا۔

اس دوران میں ڈرائیور کو دوبارہ اونچے نیچے ٹیلوں کے درمیان ایک نیم پختہ راستہ مل

گیا۔ جونہی گاڑی اس راستے پر پہنچی اس کی رفتار کچھ تیز ہوگئی۔ رفتار تیز ہوئی تو چمگادڑوں کی یلغار کچھ ماند پڑنے لگی...... مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ انہوں نے پیچھا چھوڑ دیا تھا۔ وہ گائیڈڈ میزائل کی طرح ہمارا پیچھا کر رہی تھیں۔ کچھ اب بھی جیپ کی کھڑکیوں اور دروازوں سے ٹکرا رہی تھیں۔

''باقی گاڑیاں کہاں گئی ہیں؟'' دارج کی ماں نے روہانسی آواز میں پوچھا۔

''جہنم میں۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔

قسطینا نے اپنے پاؤں میں پڑی مردہ چمگادڑ کو ٹٹولا اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''یہ اسکرین کیسے ٹوٹی ہے شاہ زائب؟''

''مجھے لگتا ہے کہ گولی لگنے سے سوراخ ہوا اور پھر اس چمگادڑ کے ٹکرانے سے سوراخ بڑا ہوگیا۔ اب یہ خطرہ ہے کہ کہیں اسکرین میں مزید کشادہ راستہ نہ بن جائے۔''

قسطینا درمیانی نشست پھلانگ کر اگلی نشست پر پہنچ گئی۔ اس نے اصرار کر کے تاجور کو پیچھے ہٹایا اور خود اس کی جگہ بیٹھ کر چرمی کشن کو تھام لیا۔ سعید نے بھی کشن کو بائیں جانب سے پکڑ کر باہر کی طرف دھکیل رکھا تھا۔ لگتا تھا کہ اب کم از کم اس شگاف سے تو فوری طور خطرہ موجود نہیں ہے۔

میں نے انو والے سیل فون پر فخر سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ ''ڈیڈ'' ہو چکا تھا۔ میرے کہنے پر تاجور نے بنارس کی جیب سے اس کا سیل فون نکالا۔ میں نے اسے فخر کا نمبر بتایا جو اس نے تیزی سے پریس کیا اور ساتھ ہی فون کا اسپیکر آن کر دیا۔ کال کے سگنل جانا شروع ہوگئے۔ چند سیکنڈ بعد اسپیکر پر ایک شور ابھرا اور فخر کی ہانپی ہوئی آواز آئی۔ ''کون؟''

''شاہ زیب بول رہا ہوں۔'' میں نے بلند آواز سے کہا۔ ''کہاں ہو تم لوگ؟''

''کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔'' وہ بھی بلند آواز میں بولا۔ ''ڈبل کیبن ایک درخت سے ٹکرا کر بارش کے پانی میں گرگئی ہے۔ ہم بھی کچے پر اترے ہوئے ہیں۔ یہ خانہ خراب چمگادڑیں ہمارے ساتھ ساتھ آرہی ہیں۔ ہم نے ان پر کچھ فائر بھی کیے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''فائرنگ کی آواز ہمیں تو نہیں آئی۔ اس کا مطلب ہے تم لوگ فاصلے پر ہو۔''

''ایسا ہی لگ رہا ہے۔ تمہارا رخ کس طرف ہے؟''

''رخ کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اندازہ ہوتا ہے کہ شمال کی طرف جا رہے ہیں۔ فارس جان کہاں ہے؟''

''وہ آگے والی گاڑی میں ہے۔اس گاڑی پر بھی آٹھ دس چمگادڑیں جھپٹ رہی ہیں۔ مجھے اس کا ڈرائیور بھی بہت ڈرا ہوا لگ رہا ہے۔قسطینا اور تاجور تمہارے ساتھ ہی ہیں ناں؟''

''ہاں، دونوں ساتھ ہیں۔قسطینا بھی خیریت سے ہے......''

اسی دوران میں سلسلہ منقطع ہو گیا۔ میں نے دو بار ہیلو ہیلو کہا پھر تاجور کی طرف دیکھا۔ اس نے میرا اشارہ سمجھتے ہوئے فون بند کر کے اپنی گود میں رکھ لیا۔

اب ہماری دونوں جانب ٹیلے تھے۔ نیم پختہ راستہ دس پندرہ منٹ پہلے پھر ناپید ہو گیا تھا۔ میں جانتا تھا ہیڈ لائٹس نہ ہونے کی وجہ سے ڈرائیور کو سخت دشواری پیش آ رہی ہے۔ رہی سہی کسر اس کے غیر معمولی خوف نے پوری کر رکھی تھی۔ اچانک ہماری جیپ کو ایک شدید جھٹکا لگا۔ یوں محسوس ہوا جیسے وہ منہ کے بل کسی کھائی میں گر رہی ہے۔ وہ گری تو نہیں مگر کسی چیز سے ٹکرا کر رک گئی۔ ہم سب بری طرح اچھل کر رہ گئے۔ بنارس کے ساتھی کی لاش اچھل کر یاسمین بیگم کے گھٹنوں پر گری اور وہ بے طرح چلانے لگی۔

ان خطرناک لمحوں میں بھی میں نے شیطان زادے ریگی کی طرف سے اپنی توجہ نہیں ہٹائی تھی اور نہ رائفل کا رخ اس کی طرف سے ہٹنے دیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ڈیتھ اسکواڈ کے اس عیار ترین شوٹر کو پانسا پلٹنے کے لیے صرف ایک سیکنڈ درکار ہے...... گاڑی کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا اس کی ایک وجہ ہیڈ لائٹس کا نہ ہونا بھی تھا۔ گاڑی کے دونوں اگلے پہیے ایک کھڈے میں گئے تھے اور بری طرح گھوم رہے تھے۔ ڈرائیور نے بار بار ریورس گیئر لگا کر گاڑی کو نکالنا چاہا لیکن زبردست ہچکولوں کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوا۔ گاڑی کے پیندے میں سے کچھ آوازیں بھی بلند ہو رہی تھیں جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ شاید نیچے کچھ ٹوٹ پھوٹ بھی ہوئی ہے۔ یہ ''فور وہیل ڈرائیو'' جدید جیپ تھی مگر ان لمحوں میں بالکل بے بس دکھائی دے رہی تھی۔

میں نے ڈرائیور کو مخاطب کر کے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''تم سے یہی امید تھی۔''

''مجھے تو لگتا ہے گاڑی اور زیادہ پھنستی جا رہی ہے۔'' قسطینا نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔

وہ درست کہہ رہی تھی۔ گاڑی کا جھکاؤ سامنے کی طرف اور زیادہ ہو گیا تھا۔ گاڑی چونکہ رک چکی تھی اس لیے پیچھے رہ جانے والی چمگادڑیں بھی پہنچ گئی تھیں اور انہوں نے چاروں طرف سے گاڑی کا گھیراؤ کر لیا تھا۔ سعید کھوکھر اور قسطینا نے فوم کے کشن کی مدد سے ونڈ اسکرین کے سوراخ کو پوری طرح بند کر رکھا تھا اور اپنے ہاتھ بڑی مضبوطی سے کشن پر دبا رکھے تھے۔

دارج کی والدہ یاسمین بیگم نے دہشت زدہ آواز میں کہا۔ ”اگر ان کو اندر آنے کی راہ مل گئی تو یہ مار ڈالیں گی ہم سب کو۔“

میں نے کہا۔ ”لیکن ہم تو بچ جائیں گے ناں، آپ کے بیٹے کے مطابق تو یہ ہماری ہی پالی ہوئی ہیں۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”خدا کے لیے کچھ کرو تم لوگ۔ یہ آپس میں لڑنے کا وقت نہیں ہے۔“ یاسمین بیگم نے رو دینے والے لہجے میں دہائی دی۔

”فی الحال تو یہی ہو سکتا ہے میڈم جی، کہ ہم ان کو اندر نہ آنے دیں۔“ سعید کھوکھر نے مؤدب لہجے میں کہا۔

”تت...... تم لوگ شکیل کو فون کرو۔ اسے اپنی لوکیشن بتاؤ۔“ یاسمین مجھ سے مخاطب ہوئی۔

”اب، عقل سے اتنے بھی پیدل نہیں ہیں ہم۔“ میں نے جواب دیا۔ ”وہ شہزادہ ہمارے لیے ان چمگادڑوں سے زیادہ خوفناک ثابت ہوگا۔ وہ گینگ کے ان شیطانوں کے ذریعے ہمارے زندہ جسموں سے گوشت نوچ نوچ کر ہمیں ڈھانچے بنانے کا ارادہ رکھتا ہے۔“ اس کے ساتھ ہی شکیل داراب کے لیے ایک گالی بے ساختہ میرے منہ سے نکلی۔

دارج داراب کا چہرہ سرخ ہو گیا تاہم موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے وہ بولا کچھ نہیں۔ سچ ہی کہتے ہیں کہ موت کا خوف بڑے بڑوں کی بولتی بند کر دیتا ہے۔ یوں لگتا تھا کہ سیاہی مائل پھڑ پھڑاتی اور مچلتی ہوئی چمگادڑیں پوری جیپ کو ڈھانپ چکی ہیں۔

”گاڑی کے اندر کی لائٹ آن کر دو۔“ میں نے پکار کر کہا۔

ڈرائیور نے اس پر عمل کیا۔ امید کی جا سکتی تھی کہ شاید اندرونی روشنی کی وجہ سے ان کی بصارت پر اثر پڑے اور ان کے حملے کی شدت کم ہو جائے۔ مگر لائٹ آن ہونے کے بعد بھی کوئی خاص بہتری ہمیں نظر نہیں آئی۔ مدھم روشنی کی وجہ سے اب ہمیں ان عفریوں کی شبیہیں واضح نظر آنا شروع ہو گئی تھیں۔ سب سے نمایاں چیز ان کے کان اور ان کی سیاہ چمک دار آنکھیں تھیں جن میں مہلک دیوانگی جھلک دکھاتی تھی۔ ”یہ...... آواز...... کیسی ہے؟“ سعید نے ہراساں لہجے میں پوچھا۔

”ان ہی کی ہے۔“ میں نے کہا۔ میرا اشارہ چمگادڑوں کی طرف تھا۔

یہ ایک کٹ کٹاتی ہوئی سی آواز تھی۔ درجنوں چمگادڑوں کی یہ مشترکہ آواز ایک شور بن گئی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ٹین کی کسی چھت پر ژالہ باری ہو رہی ہے۔ تاجور اور یاسمین

بیگم نے خوف کے سبب اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ گاڑی کی اندرونی روشنی میں تاجور کا چہرہ برف کی طرح سفید دکھائی دیتا تھا۔ چہرے پر جھولنے والی لٹیں کسی خزاں رسیدہ درخت کی ٹوٹی ہوئی شاخوں کی طرح تھیں۔ ڈرائیور گاہے بگاہے گاڑی کا ہارن بجاتا تھا اور انجن کو ریس دیتا تھا۔ شاید اس کا یہ خیال ہو کہ اس شور سے چمگادڑوں کی یلغار کی شدت کم ہو جائے گی مگر یہ کوشش بھی بے سود ہی تھی۔ گاڑی کو نکالنے کی کوشش اب ڈرائیور نے ترک کر دی تھی مگر انجن اسٹارٹ تھا اور اے سی بھی چل رہا تھا۔ ایسے لگتا تھا کہ ایک دم دھماکوں سے کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ جائیں گے اور بیسیوں خونخوار چمگادڑیں ہمیں نوچنے کے لیے اندر گھس آئیں گی۔

''فائر کرنے سے کوئی فائدہ ہوگا؟'' قسطینا نے پریشان لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

''میرے خیال میں نہیں۔''

''لیکن کوئی ایک کھڑکی تھوڑی سے کھول کر رائفل کی نال تو باہر نکالی ہی جا سکتی ہے۔'' قسطینا نے دلیل دی۔

اس کی بات میں وزن تھا۔ ممکن تھا کہ رائفل کی صرف نال، کھڑکی سے باہر نکالی جاتی اور فائرنگ کی جاتی تو ان خون آشام عفریتوں میں کچھ کھلبلی پیدا ہوتی۔

میں نے تو اپنی رائفل کا رخ مسلسل رنگی کی طرف رکھا ہوا تھا اور ایک لحظے کے لیے بھی اس سے غافل نہیں تھا، ہاں قسطینا اپنی رائفل استعمال کر سکتی تھی۔ قسطینا کی ہدایت پر فربہ اندام ڈرائیور نے اپنی نشست چھوڑی اور کشن کو تھام کر رکھنے میں سعید کی مدد کرنے لگا۔ یوں قسطینا کو موقع مل گیا کہ وہ اپنی رائفل استعمال کر سکے۔ اس نے اپنی جانب والی کھڑکی کا شیشہ بڑی احتیاط سے ڈیڑھ انچ کے لگ بھگ نیچے اتارا اور رائفل کی نال اس میں گھسا دی۔ قریباً نصف درجن چمگادڑوں کے کریہہ جبڑے اور دانت کھڑکی کے خلا میں چمکنے لگے۔ یہ ایک روح فرسا منظر تھا۔ وہ اندر گھسنے کے لیے زور لگا رہی تھیں۔ ان کے بڑے بڑے پنکھ پُرشور آواز کے ساتھ جیپ کی باڈی سے ٹکرا رہے تھے۔ قسطینا نے پہلے تین چار سنگل شاٹ فائر کیے پھر رائفل کو چھوٹے برسٹ پر سیٹ کر کے تین برسٹ چلائے۔ ''ریٹ ٹیٹ'' کی لرزہ خیز آوازوں سے قرب وجوار گونج گئے۔

اس ساری کارروائی کا اثر اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوا کہ چند چمگادڑیں مضروب ہو کر گریں اور باقیوں میں تھوڑی سی ہلچل نظر آئی۔ لیکن یہ عارضی ہلچل تھی، فائرنگ رکنے کے ساتھ ہی وہ پھر پوری قوت اور دیوانگی سے گاڑی پر جھپٹنے لگیں۔ ہم نے کھڑکی کا شیشہ دوبارہ چڑھا دیا۔ مزید ایمونیشن ضائع کرنا غلطی تھی۔

یہ سلسلہ دس پندرہ منٹ مزید جاری رہا۔ پھر یوں لگا جیسے ان موذی پرندوں کے جھپٹنے میں وہ شدت نہیں رہی۔ یہ بات دوسروں نے بھی محسوس کی۔

''کیا یہ تھک رہی ہیں؟'' قسطینا نے پُرامید لہجے میں پوچھا۔

''ہوسکتا ہے...... لیکن ایک اور بات بھی ہے۔'' میں نے کھڑکیوں سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''رات ختم ہورہی ہے۔ ہلکا اجالا محسوس ہورہا ہے۔''

کھڑکیوں سے باہر ٹیلوں اور جھاڑیوں کے ہیولے اب کچھ نمایاں ہونے لگے تھے۔ نسیم سحری میں لمبی جنگلی گھاس اور درختوں کی شاخیں ہل رہی تھیں۔ کچھ ہی دیر بعد ایک ملگجا سا اجالا قرب و جوار میں دکھائی دینے لگا۔ مشتعل چمگادڑیں اب اس سیاہ جیپ کے اردگرد چکرا رہی تھیں مگر جھپٹ نہیں رہی تھیں۔ روشنی ان کو اندھا کر دیتی ہے، شاید یہاں بھی یہ عمل کارفرما تھا۔

جوں جوں روشنی بڑھتی گئی ہماری جیپ کے اردگرد خطرہ کم ہوتا گیا۔ چمگادڑوں کے غضب کے علاوہ ان کی تعداد میں بھی خاطر خواہ کمی واقع ہوئی تھی۔ وہ منظر سے اوجھل ہورہی تھیں لیکن اس سے پہلے کہ یہ سنگین خطرہ پوری طرح ہمارے سروں سے ٹلتا، ایک اور خطرہ ہمارے سروں پر پہنچ گیا۔

قسطینا کا رخ عقبی اسکرین کی طرف تھا۔ سب سے پہلے اسی نے نشیب میں دیکھا اور پکار اٹھی۔ ''شاہ زائب! کوئی آرہا ہے ہماری طرف۔''

میں نے ریگی کی طرف سے پوری طرح چوکس رہتے ہوئے قسطینا کی بتائی ہوئی سمت میں دیکھا۔ وہ درست کہہ رہی تھی۔ دور نشیب کے ٹیلوں میں دو گاڑیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ ان میں سے ایک تو ڈبل کیبن ہائی لیکس تھی، دوسری عام ٹویوٹا کار تھی۔ ان کے رخ سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ سیدھی ہماری ہی طرف آرہی ہیں۔ ان میں سرخ لباس والوں کی ہلکی سی جھلک بھی دکھائی دیتی تھی۔

میں نے ریگی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''لگتا ہے کہ تمہارے مزید حرامی بھائی یہاں پہنچ رہے ہیں۔''

قسطینا نے تاسف سے کہا۔ ''شاید ہم نے جو فائرنگ کی اسی نے ان کو ہماری طرف متوجہ کیا۔ (اس فائرنگ کا مشورہ قسطینا کا ہی تھا)

میں نے قسطینا کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''ابھی یہ ہم سے کافی دور ہیں۔ آٹھ دس منٹ تو لگ ہی جانے ہیں ان کو۔ مجھے لگتا ہے کہ ہم یہاں سے نکلنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔''

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ ہم ریگی اور بنارس کو شوٹ کر کے یہاں سے نکل سکتے تھے۔ تاجور، دارج، اس کی والدہ اور سعید وغیرہ کو یہیں جیپ میں چھوڑا جا سکتا تھا۔ قسطینا نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ ''لیکن شاہ زائب، نکل کر جائیں گے کہاں؟ ہمارے پاس کوئی سواری نہیں...... شاید یہاں کوئی چھپنے کی جگہ بھی نہ ملے......''

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی دونوں گاڑیاں مزید قریب آ گئیں۔ وہ خاصی تیز رفتاری سے بڑھ رہی تھیں۔ تب میری نگاہ کچھ فاصلے پر خودرَو درختوں کے ایک جھنڈ میں گئی۔ یہاں ایک قدرتی کھوہ کا دہانہ سا نظر آ رہا تھا۔ فاصلے سے اندازہ لگانا مشکل تھا کہ یہ کتنی بڑی یا کتنی چھوٹی ہوگی۔ تاہم یہ اندازہ تو ہو رہا تھا کہ ہم اس میں سما کر مورچا زَن ہو سکتے ہیں۔

میرے اور قسطینا کے درمیان مشورہ ہوا اور ہم نے فوری طور پر اس چوہے دان (جیپ) سے باہر نکلنے کا فیصلہ کیا۔ چمگادڑیں اب منظر سے غائب ہو چکی تھیں۔ مجھے سب سے زیادہ خطرہ شیطان زادے ریگی کی طرف سے ہی تھا۔ میں نے رائفل اس کے سر کی جانب کر کے بے دریغ گولی چلائی اور اس کی شفاچٹ کھوپڑی میں سوراخ کر دیا۔ دھماکے کے سبب تاجور اور یاسمین بیگم بری طرح چلا اٹھی تھیں۔ ریگی آسان موت کا تحفہ لے کر مردہ چھپکلی کی طرح پہلو کے بل نشست پر گرا اور ساکت ہو گیا، گولی اس کی منحوس کھوپڑی توڑ کر عقب سے نکل گئی تھی اور چھت میں پیوست ہوئی تھی۔ مرتے وقت اس کی آنکھوں میں حیرانی تھی شاید اسے بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہو جائے گا۔

بنارس نیم بے ہوشی جیسی کیفیت میں تھا مگر پھر بھی اس کے منہ سے بے ساختہ ڈری ڈری آوازیں نکلنے لگیں۔ اسے لگ رہا تھا کہ شاید ریگی کے بعد اس کی باری ہے۔ میں فی الحال اسے زندہ رکھنے کے حق میں تھا۔ سب سے پہلے میں نے اسی کو گود میں اٹھایا اور کھوہ تک پہنچایا۔ اپنی کوتاہ قامتی کے سبب وہ میری گود میں سمٹ کر رہ گیا تھا۔ کھوہ اتنی بھی تنگ نہیں تھی جتنا ہم سمجھ رہے تھے۔ بنارس کے بعد دارج دار اب کی باری تھی۔ تنومند ڈرائیور اور سعید کھوکھر نے میرے حکم پر اسے جیپ سے باہر نکالا۔ میں نے بھی ان دونوں کی مدد کی اور مفلوج دارج کو کھوہ میں پہنچا دیا۔ قسطینا رائفل تان کر دارج، اس کی والدہ اور بنارس کے سر پر کھڑی رہی۔ میں نے جس طرح ریگی کو دفعتاً شوٹ کر دیا تھا، اس نے بنارس، دارج، اس کی والدہ اور ڈرائیور وغیرہ پر زبردست اثر ڈالا تھا اور وہ کسی طرح کی چوں چرا نہیں کر رہے تھے۔ میں نے سعید اور ڈرائیور کے ساتھ مل کر کچھ ضروری اشیا اور ایمونیشن کے بیگ تیزی کے ساتھ کھوہ میں منتقل کر دیئے۔ مسلح افراد سے بھری ہوئی گاڑیاں اب کافی قریب آ گئی تھیں۔ ان کے

انجنوں کی آواز صاف ہمارے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔

''میرا خیال ہے کہ یہ ہمارے لیے ایک اچھا مورچا ثابت ہوگی۔'' قسطینا نے کھوہ کی بلندی دیکھتے ہوئے کہا۔

ہم نے بڑی تیزی کے ساتھ ایک بڑا پتھر مل کر سرکایا اور اسے دہانے کے عین سامنے رکھ دیا، پھر ایک اور چھوٹا پتھر میں نے قسطینا اور سعید کے ساتھ مل کر اٹھایا اور پہلے پتھر کے اوپر دھر دیا۔ یہ کھوہ کے دہانے پر ایک آڑ سے بن گئی۔

''میرے خیال میں وہ پہنچ گئے ہیں۔'' قسطینا نے کہا۔

ان کی دونوں گاڑیاں ہمیں کھوہ کے دہانے سے صرف ستر اسّی میٹر کی دوری پر نظر آ رہی تھیں۔ وہ سرمئی ٹیلوں کے عقب میں تھے، ان میں سے زیادہ تر سرخ لباسوں والے کلین شیوڈ شیطان زادے ہی تھے۔ ان کی صفا چٹ کھوپڑیاں صبح کی روپہلی روشنی میں دمک رہی تھیں۔

''ان کی تعداد ہمارے تخمینے سے کچھ زیادہ ہی ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہاں، ایک درجن سے کم تو نہیں ہیں۔'' قسطینا نے کہا۔

''اور ان میں ایک فی میل بھی ہے۔ شاید وہی ریڈ کیٹ جس نے لاہور والے واقعے میں آپ سے مارا ماری کی تھی۔''

''یہ اب کرنا کیا چاہ رہے ہیں...... شاید گھیرا ڈال رہے ہیں۔'' قسطینا بولی۔

''یہ نشیب میں ہیں۔ ہم ذرا بلندی پر ہیں۔ یہ آسانی سے ہم تک پہنچ نہیں سکیں گے۔ اس دوران میں اگر داؤد بھاؤ سے رابطہ ہو جائے تو ہمیں بھی کمک مل سکتی ہے۔''

''لیکن یہاں ہمارا مقابلہ شکیل داراب سے ہے۔ شاہ زائب! اور تم خود ہی بتاتے ہو کہ اس کے ہاتھ بہت زیادہ لمبے ہیں۔''

''ہاں...... سیاسی طور پر اس کے ہاتھ لمبے ہیں لیکن وہ سیاہ و سفید کا مالک تو نہیں ہے۔ یہاں میڈیا ہے، اپوزیشن ہے۔ اگر وہ غیر قانونی طور پر پولیس کو یا کسی ایجنسی کو استعمال کرے گا تو جواب میں ردِ عمل ظاہر ہوگا۔''

ہمارا اندازہ بالکل درست تھا۔ دونوں گاڑیوں سے اترنے والے قریباً ڈیڑھ درجن افراد نے ہماری پناہ گاہ کو تین اطراف سے گھیرنا شروع کر دیا تھا۔ عقب میں ایک گہری کھائی تھی جس میں اتر کر اوپر آنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ میرے ہاتھ میں رائفل تھی اور میں نے نیم جان بنارس کے ساتھ ساتھ سعید کھوکھر کو بھی اپنی نگاہ میں رکھا ہوا تھا۔ کچھ بھی تھا، سعید کھوکھر دارج فیملی کا ملازم تھا، اس پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا تھا۔

قسطینا بولی۔ ”اب تو دن چڑھ آیا ہے۔ اب اپنے داؤد بھاؤ کو فون کر کے دیکھو۔“
”اس کا دن ابھی نہیں چڑھا۔ وہ ایک گینگسٹر ہے قسطینا اور ایسے لوگوں کے لیے تو ابھی آدھی رات ہوتی ہے۔“
”کیا مسٹر سجاول کے ساتھی فیض محمد سے مدد لی جا سکتی ہے؟“ قسطینا نے دوسرا سوال کیا۔
”ہاں، موقع پڑنے پر اسے ٹرائی کیا جا سکتا ہے مگر ان لوگوں کو لالہ موسیٰ یا پھر کوٹلی سے یہاں پہنچتے ہوئے کافی وقت لگ جائے گا۔ دوسری طرف خورسنہ اور اس کے بچے کی حفاظت کے لیے بھی فیض محمد کی سخت ضرورت ہے۔ ہانا دانی کسی بھی وقت ان پر وار کر سکتی ہے۔“
قسطینا اپنے شوہر فارس جان کے حوالے سے بھی پریشان نظر آ رہی تھی۔ میں نے اس کی پریشانی بھانپتے ہوئے کہا۔ ”کیا آپ فارس کو فون کرنا چاہتی ہیں؟“
”چلو...... ایک کال کر کے دیکھ لیتے ہیں۔“ اپنے دل کی بات وہ ہونٹوں پر لے آئی۔
میں نے بنارس والا فون سیٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔ چارجنگ کم تھی، بچت کے لیے میں نے اسے آف کر رکھا تھا۔ اس نے وجہ پوچھی۔ میں نے کہا۔ ”چارجنگ اس کی بھی زیادہ نہیں ہے۔“
وہ فون آن کرتے کرتے رک گئی۔ ”نہیں...... پھر کال کرنا مناسب نہیں۔ ہم کو مشکل وقت کے لیے بیٹری بچانی چاہیے۔“
قسطینا کے ہاتھوں میں اس وقت قریباً چار فٹ لمبی ایم جی تھری تھی۔ یہ زبردست گن اس اسلحے میں سے تھی جو جیپ کی نشستوں کے نیچے موجود تھا۔ گن کے پانچ سو کے قریب راؤنڈ بھی ایک بڑے کینوس بیگ میں موجود تھے۔ اس کے علاوہ تین چار بھرے ہوئے میگزین بھی تھے۔ یہ گن یہاں ہمارے دفاع میں زبردست کردار ادا کر سکتی تھی۔ اس کے علاوہ ایک ٹرپل ٹو بھی ہمیں ملی تھی۔
قسطینا ایک ماہر فوجی آفیسر کی طرح کھوہ کے دہانے پر چوکس بیٹھ گئی۔ اس نے ”ایم جی تھری“ کو تیزی کے ساتھ جس طرح ”اِن آرڈر“ کیا تھا۔ وہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ اس گن کے ہر کل پرزے سے واقف ہے۔ یکا یک خوفناک تڑتڑاہٹ سے قرب و جوار گونج اٹھے۔ یہ ایک ایل ایم جی کا برسٹ تھا۔ لگتا تھا کہ ڈیتھ اسکواڈ کے لوگوں کی طرف سے یہ ایک وارننگ برسٹ چلایا گیا ہے۔ یعنی بتایا گیا ہے کہ ہم اِدھر اُدھر بھاگنے کی کوشش نہ کریں کیونکہ ہم نشانے پر ہیں۔

قسطینا نے بھی فوری طور پر بلا جھجک اس برسٹ کا جواب دیا۔ اس نے پانچ چھ راؤنڈز کا ایک برسٹ چلا کر ڈیتھ اسکواڈ کے شیطانوں کو بتایا کہ ان کی اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کا سامان یہاں موجود ہے۔ قریباً 1200 میٹر تک مار کرنے والی ایم جی تھری کی گھن گرج زبردست تھی۔

دونوں طرف خاموشی چھا گئی۔ یوں محسوس ہوا کہ گھیرا ڈالنے والے اپنی پوزیشنیں درست کرنے میں مصروف ہیں۔

تاجور کی روہانسی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ وہ مجھ سے ہی مخاطب تھی۔ دارج کی طرف اشارہ کر کے بولی۔ ''ان کو یہاں سے ہٹانا چاہیے۔ ان کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔''

میں نے دیکھا مفلوج دارج سنگلاخ زمین پر اکڑوں بیٹھا تھا اور کھوہ کی دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ وہ جس جگہ بیٹھا تھا وہاں کوئی بھی بھٹکی ہوئی گولی اس کا مزاج پوچھ سکتی تھی۔ میں نے سعید کھوکھر کو ساتھ لیا۔ اس کے پاس ٹارچ موجود تھی۔ ہم نے کھوہ کا جائزہ لیا۔ وہ پیچھے جا کر کچھ کشادہ اور اونچی بھی ہو گئی تھی۔ تاہم اس کی گہرائی بیس بائیس فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ جھاڑ جھنکاڑ موجود تھا۔ کسی بلی وغیرہ کے کھائے ہوئے پرندے کے پَر بھی دو تین جگہ بکھرے تھے۔ اس پوری جگہ میں مٹی اور پتھر کی مخصوص باس محسوس ہوتی تھی۔

میں نے ایک ہموار جگہ دیکھی اور سعید سے کہا کہ وہ اس جگہ کو صاف کر لے تاکہ دارج کو یہاں لٹایا جا سکے۔

اچانک سعید میرے بالکل قریب چلا آیا۔ اس کا چہرہ میرے کان سے صرف چند انچ کے فاصلے پر تھا۔ سرگوشی کے لہجے میں بولا۔ ''شاہ زیب صاحب! میں نے دارج فیملی کی ملازمت ضرور کی ہے، ان کا غلام نہیں ہوں۔ آپ مجھ پر پورا بھروسا کر سکتے ہیں اگر آپ داؤد بھاؤ کے دوست ہیں تو پھر مجھے بھی اپنا دوست ہی سمجھیں۔''

''دارج داراب صاحب سے بغاوت فرما رہے ہو؟'' میں نے ہلکے پھلکے انداز میں پوچھا۔

''بغاوت کیوں جی؟ اپنی ڈیوٹی پوری طرح انجام دوں گا۔ لیکن دارج یا ان کی والدہ کے کہنے پر کوئی ایسا کام نہیں کروں گا جس سے آپ کو یا قسطینا صاحبہ کو کوئی نقصان پہنچے۔''

اچانک قسطینا کی بلند آواز آئی۔ ''شاہ زائب...... شاہ زائب۔''

میں اپنی رائفل سونت کر دہانے کی طرف لپکا۔ جیپ کا تنومند ڈرائیور موقع تاک کر کھوہ سے بھاگ نکلا تھا۔ اس کی نیلی جین اور سفید شرٹ کھوہ کے دہانے سے قریباً پچاس ساٹھ فٹ

دور دکھائی دے رہی تھی۔ ''رک جاؤ۔'' میں نے گرج کر کہا۔

وہ سنی اَن سنی کرتا ہوا ٹیلوں کے پیچھے اوجھل ہو گیا۔ وہ ان لوگوں کی طرف بھاگ رہا تھا، جنہوں نے ہمارا محاصرہ کیا ہوا تھا۔

''نکل گیا ہے؟'' قسطینا نے افسردہ لہجے میں پوچھا۔

''نہیں...... ابھی دوبارہ نظر آئے گا۔'' میں نے کہا۔

میری نگاہیں دو ٹیلوں کے درمیان جمی ہوئی تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ محاصرہ کرنے والوں کے پاس پہنچنے سے پہلے وہ ان ٹیلوں کے درمیان نظر آئے گا اور پھر یہی ہوا۔ اس کا تھل تھل کرتا ہوا چربی دار جسم مجھے گن کی ٹیلی اسکوپ میں صاف نظر آیا۔ میں نے ایک وارننگ شاٹ اس کی ٹانگوں کے پاس چلایا کہ شاید وہ رک جائے۔ لیکن جب وہ نہیں رکا تو میں نے نشانہ لے کر سیدھی اس کے سر میں گولی ماری۔ وہ اوندھے منہ گرا اور لڑھکتا ہوا ایک درخت سے جا ٹکرایا۔ اس کی سفید شرٹ درخت کے تنے کے ساتھ یوں نظر آ رہی تھی جیسے تنے کے نچلے حصے پر سفید رنگ کیا گیا ہو۔

قسطینا، سعید اور تاجور نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ تاجور کا چہرہ ہراس اور ابتلا کی مکمل تصویر تھا۔ وہ پچھلے ایک گھنٹے میں اپنی نگاہوں کے سامنے چار افراد کو قتل ہوتے دیکھ چکی تھی۔ سعید بھی گم صم کھڑا تھا۔ میں اسے ساتھ لے کر واپس کھوہ کے پچھلے حصے میں چلا گیا تاکہ دارج کو پیچھے لانے کے لیے جگہ صاف کی جا سکے۔ سعید بولا۔ ''آپ نے ٹھیک ہی کیا۔ وہ ان لوگوں کے پاس پہنچ جاتا تو یہاں کی ساری سچویشن اور اسلحے وغیرہ کی تفصیل ان کو بتا دیتا۔''

میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''تم نے کہا ہے کہ میں تم پر اعتماد کروں، کیا میں واقعی ایسا کر سکتا ہوں؟''

''میں...... ہر قسم کھانے کو تیار ہوں۔''

''ٹھیک ہے، مجھے اس طرح آزمائش میں نہ ڈالنا جس طرح اس ڈرائیور نے ڈالا ہے۔''

''ایسا نہیں ہوگا۔'' وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ اس کی آواز لرز رہی تھی۔ سعید جگہ صاف کرنے میں مصروف ہو گیا تاکہ دارج کو وہاں بٹھایا یا لٹایا جا سکے۔ میں کھوہ کا باریک بینی سے جائزہ لینے لگا۔ کھوہ کے آخری حصے میں ایک چھوٹا سا رخنہ تھا جہاں سے ہوا اندر آ رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے بجری نما پتھروں کے درمیان سے پانی رس رس کر ایک دو فٹ قطر کے گڑھے

میں جمع ہو رہا تھا۔ اسے چشمہ تو نہیں کہا جا سکتا تھا، یہ پانی کا رساؤ سا تھا۔ ایسے علاقوں میں اسی طرح پانی کی چھوٹی چھوٹی گزرگاہیں ہوتی ہیں۔

سعید نے کہا۔ ''میرے اندازے کے مطابق ہم وادی سون کے علاقے میں ہیں اور کافی آگے ہیں۔ یہاں ایسے ٹیلے اور غار وغیرہ بہت ملتے ہیں......''

بات کرتے کرتے وہ اچانک چونک گیا۔ ہیجانی لہجے میں بولا۔ ''دیکھیں جی وہ بنارس کیا کر رہا ہے؟''

میں نے مڑ کر دیکھا اور پھر زخمی بنارس کی طرف لپکا۔ بنارس کے ہاتھ میں موبائل فون تھا جو اس نے آگے بڑھ کر دارج داراب کو تھما دیا تھا۔ (یہ بنارس والا فون ہی تھا اور یہ ہمارے پاس، باہر سے مدد طلب کرنے کا واحد ذریعہ تھا) دارج کے دائیں ہاتھ میں تین چار کلو وزنی ایک پتھر تھا۔ جونہی موبائل دارج کے ہاتھ میں آیا اس نے اندھا دھند اس پر پتھر سے ضرب لگائی۔ میرے پہنچتے پہنچتے اس نے ایک ضرب اور لگا دی اور موبائل کو چکنا چور کر دیا۔

دارج کی موٹی کلائی میرے ہاتھ میں تھی۔ جی چاہا کہ ایک زناٹے کا تھپڑ اس کے گال پر جڑ دوں، لیکن پھر خود پر ضبط کیا۔ تاجور کی ڈری سہمی صورت نگاہوں کے سامنے آ گئی۔ میں جانتا تھا، دارج پر جو بھی سختی ہو گی وہ اس کا بدلہ براہِ راست یا بالواسطہ تاجور سے لے گا۔

''تم اپنے لیے مصیبتیں پیدا کر رہے ہو دارج۔'' میں پھنکارا۔

اس نے غصیلے انداز میں اپنی کلائی میرے ہاتھ سے چھڑائی اور بولا۔ ''لڑائی میں سب کچھ چلتا ہے اور لڑائی کر رہے ہو ہمارے ساتھ۔''

میں نے کہا۔ ''تم ابھی تک صرف میرا تحمل اور میری برداشت دیکھ رہے ہو۔ دشمنی دیکھنی پڑی تو بہت پچھتاؤ گے۔''

''دھمکیاں مت دو۔ جو سانپ تم نے نکالنا ہے ابھی نکال لو۔'' وہ کڑک لہجے میں بولا۔

ایک بار پھر میرا دل چاہا کہ اس کا گریبان دبوچ لوں اور ایک ایسی چوٹ لگاؤں اس کے تھوبڑے پر کہ ایک انمٹ نشانِ بن جائے۔ مگر پھر میری نگاہ عقب میں کھڑی تاجور کے زرد چہرے پر پڑی، اس کی آنکھیں نم تھیں اور وہ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہی تھی۔ ''پلیز شاہ زیب! مجھ پر ترس کھائیں...... کچھ بھی ایسا مت کریں جو اس کو طیش دلا دے۔''

میں ایک دم منہ پھیر کر قسطینا کی طرف چلا گیا۔ موبائل فون کے ضائع ہو جانے کا قسطینا کو بھی دکھ تھا۔ ہم اس اکلوتے فون کی چارجنگ بچا بچا کر رکھ رہے تھے کہ اس سے کام لے سکیں۔ اب چارجنگ کے ساتھ ساتھ فون بھی ختم ہو گیا تھا۔ اس میں قسطینا کا قصور نہیں تھا۔

اس کے لیے تو ضروری تھا کہ وہ اپنی تمام تر توجہ سامنے ڈیتھ اسکواڈ کے عیار ترین شوٹرز کی طرف رکھتی۔ اس موقع سے دارج نے فائدہ اٹھایا تھا۔ اس نے بنارس کو اشارہ کیا تھا اور اس نے یہ فون، گولیوں والے تھیلے کے قریب سے اٹھا کر دارج تک پہنچا دیا تھا۔

میں نے دو تین تگڑی ٹھوکریں بنارس کی کمر پر رسید کیں۔ وہ وہیں لیٹا لیٹا بلبلا اٹھا۔ اس کا سر بری طرح زخمی تھا پھر بھی وہ مزاحمت پر تلا ہوا تھا۔ کبھی بے ہوشی اور نیم بے ہوشی کا ڈراما کرتا تھا۔ کبھی اپنے چھوٹے چھوٹے بازوؤں کو حرکت دے کر اپنے ہاتھوں کو اپنے سینے پر رکھتا تھا اور یوں ظاہر کرتا تھا جیسے اسے دل کا دورہ پڑنے والا ہے۔

اچانک مخالف طرف سے پھر فائرنگ شروع ہو گئی۔ جدید آٹومیٹک رائفلوں سے کی جانے والی یہ فائرنگ اس مرتبہ کافی شدید تھی لیکن اس مرتبہ بھی یہی لگا کہ ڈیتھ اسکواڈ کے ماہر نشانہ باز ہمیں مارنے کے لیے نہیں بلکہ ڈرانے کے لیے فائرنگ کر رہے ہیں۔ گولیاں بارش کی طرح برسیں لیکن یہ بارش کھوہ کے اردگرد ہی ہوئی۔

قسطینا نے میرے ساتھ مل کر اس فائرنگ کا مناسب جواب دیا۔ ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ ''لگتا ہے کہ یہ لوگ ہمیں اپنی فائر پاور بتا رہے ہیں۔'' قسطینا نے اپنی شاندار گن سے نیا میگزین اٹیچ کرتے ہوئے کہا۔ اس گن کے ساتھ گولیوں والی بیلٹ بھی چلتی تھی۔

وہ جانتے ہیں قسطینا کہ دارج اور اس کی فیملی ہمارے پاس ہے۔ وہ سیدھا فائر کرنے سے پہلے سو بار سوچیں گے۔''

''لیکن ڈیتھ اسکواڈ کے یہ ہم شکل شیطان تو سوچنے سمجھنے کو خرافات سمجھتے ہیں۔'' قسطینا نے نقطہ اٹھایا۔

''وہ ٹھیک ہے لیکن فی الوقت وہ اکیلے نہیں، شکیل داراب کے خاص لوگ بھی ان کے ساتھ ہیں...... اور عین ممکن ہے کہ کچھ دیر میں شکیل داراب کی خود بھی یہاں تشریف آوری ہو۔''

''اس کا مطلب ہے، جب تک دارج اور اس کی ماں وغیرہ ہمارے پاس ہیں، ہمارا پلڑا بھاری ہے۔''

''آپ کہہ سکتی ہیں۔'' میں نے ہنکارا بھرا۔

وہ پُرسوچ لہجے میں بولی۔ ''مگر شاہ زائب! دوسری طرف بھی تو یہی طریقہ کار اختیار ہو سکتا ہے۔ میرا مطلب ہے، اگر فارس، فخر، ناوان وغیرہ ان کے قبضے میں ہیں تو وہ ان کو سامنے لا کر ہم سے سودے بازی کر سکتے ہیں۔''

میں نے پتھر کی اوٹ میں بیٹھ کر اپنی اسنیپر گن کو ری لوڈ کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے نہیں لگتا قسطینا کہ فارس اور فخر ان کے ہتھے چڑھے ہیں۔ وہ دونوں آسانی سے ہار ماننے والے نہیں ہیں اور خاص طور سے فخر۔ میرے ساتھ یورپ میں اس کا بہت لمبا عرصہ گزرا ہے۔ وہ ایسے خطروں سے نمٹنا بہت اچھی طرح جانتا ہے۔ ویسے بھی اگر وہ دونوں ان لوگوں کے قبضے میں ہوتے...... تو اب تک یہ انہیں ہمارے سامنے لے آئے ہوتے۔''

''اللہ تمہاری زبان مبارک کرے۔'' قسطینا نے میری گن پکڑ کر اپنی آنکھ اس کی ٹیلی اسکوپ سے لگائی اور سامنے ٹیلوں کا جائزہ لیا۔

''کیا نظر آرہا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''زیادہ تو ڈیتھ اسکواڈ کے لوگ ہی ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق بس تین چار مقامی بندے ہیں۔ ان میں بڑی توند والا ایک بندہ کوئی پولیس آفیسر ہی لگتا ہے مگر اس نے شلوار قمیص پہن رکھی ہے۔''

میں نے قسطینا سے گن واپس لے کر ٹیلی اسکوپ کے ذریعے دیکھا۔ مجھے فربہ اندام شخص نظر آیا۔ یہ یقیناً سادہ لباس میں کوئی پولیس افسر ہی تھا۔ ہوسکتا ہے کہ قیصر چوہدری کا کوئی ''کولیگ'' ہی ہو۔ اس کے قریب ڈیتھ اسکواڈ کے فی میل ونگ کی انچارج ریڈ کیٹ کھڑی تھی۔ چست لباس، تنا ہوا جسم، صفاچٹ کھوپڑی، ٹیلے کی اوٹ سے اس کا صرف بالائی دھڑ ہی نظر آتا تھا۔ وہ موٹی توند والے آفیسر سے کسی بات پر بحث کر رہی تھی۔ پھر میں نے دیکھا کہ اس نے برہمی دکھاتے ہوئے آفیسر کے ہاتھ سے سیل فون چھین لیا۔ دونوں ٹیلوں کے عقب میں اوجھل ہوگئے۔ اس نیم گنجے سر والے پولیس آفیسر کو میں ایک سے زائد مرتبہ شکیل داراب کے ساتھ دیکھ چکا تھا۔ اس سلسلے میں میری نظر یقیناً دھوکا نہیں کھا رہی تھی۔

پتا نہیں کہ یہ کیا معاملہ تھا اور آفیسر کے ساتھ ریڈ کیٹ کی بحث کس سلسلے میں تھی۔ شام کے فوراً بعد ہمارا گھیراؤ کرنے والوں سے ہمارا پہلا رابطہ ہوا۔ یہ رابطہ ڈیتھ اسکواڈ کی شیطان زادی ریڈ کیٹ نے خود کیا۔ میں نے ٹیلی اسکوپ میں دیکھا، دو مسلح شتونگڑے اس کے ہمراہ تھے اور وہ تینوں ایک ٹیلے کی اوٹ میں کھڑے تھے۔ جھٹ پٹے کا فائدہ اٹھا کر یہ لوگ کھوہ سے کافی قریب چلے آئے تھے، اس سے ان کی بے خوفی کا اندازہ بھی ہوتا تھا۔ ریڈ کیٹ نے براہِ راست مجھے مخاطب کیا اور پکار کر بولی۔ ''ایسٹرن! تم پوری طرح گھر چکے ہو، بہتر یہی ہے کہ شرافت سے خود کو ہمارے حوالے کردو۔''

میں نے طیش کے عالم میں پکار کر کہا۔ ''تمہیں حرام زادی کہنے میں مجھے کوئی عار نہیں،

کیونکہ تم ایول کی ناجائز اور مشینی اولاد ہو۔ میں تم سے بات کرنا اپنی توہین سمجھتا ہوں۔ تم اپنے اس باسٹرڈ باس جان ڈیرک کو بلاؤ۔"

"وہ ابھی یہاں نہیں ہیں لیکن اگر تم بری موت مرنے کا پکا ارادہ کر لو گے تو تماشا دیکھنے کے لیے وہ بھی یہاں آجائیں گے...... فی الحال میں تم کو یہی مشورہ دیتی ہوں کہ ہتھیار باہر پھینکو اور ہاتھ سر سے اونچے کر کے باہر تشریف لے آؤ۔" اس کے لہجے میں آگ تھی اور زہر تھا۔

"ہتھیار پھینکنے کا مشورہ تمہارے لیے ہے۔ اگر چڑھائی کرو گے تو سب سے پہلے جان ڈیرک کے چہیتے دوستوں کی جانیں جائیں گی۔"

"کن کی بات کرتے ہو؟"

"دارج اور اس کی ماں کی۔ سب سے پہلے ان کو گولی لگے گی۔"

"ایسا کرو گے تو اس کا جواب ہمارے پاس ہے۔ تمہارے دونوں ساتھیوں کے سر کاٹ کر اس سامنے والی جیپ کی چھت پر رکھ دیں گے۔"

میں ایک لمحے کے لیے سناٹے میں رہا لیکن پھر فوراً ہی میری چھٹی حس نے کہا کہ یہ حرافہ جھوٹ بول رہی ہے اگر فخر اور فارس ان لوگوں کے پاس ہوتے تو یہ اب تک انہیں سامنے لا چکے ہوتے، بلکہ یہ بھی بڑی بات نہیں تھی کہ ان میں سے کسی کا سر کاٹ کر گاڑی کی چھت پر رکھ بھی چکے ہوتے۔

میں نے کہا۔ "تمہاری بکواس سننے کے لیے میرے پاس وقت نہیں۔ تم سارے باسٹرڈ بہن بھائی اچھی طرح جانتے ہو کہ میں جو کہتا ہوں، اس پر عمل کرتا ہوں۔ اگر ہمیں یہاں سے نکلنے کا محفوظ راستہ نہیں دو گے تو دارج کی پوری فیملی اور اس کے دونوں بندے بھی جائیں گے۔"

مجھے شک تھا کہ ڈیتھ اسکواڈ کے شیطانوں کے علاوہ شکیل کا کوئی خاص بندہ بھی ٹیلے کے پیچھے موجود ہے اور یہ گفتگو سن رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ شکیل داراب اپنے اس خبیث چچازاد دارج اور چچی وغیرہ کے لیے کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اس بات کا بھی امکان موجود تھا کہ وہ کچھ دیر میں بنفس نفیس بھی یہاں پہنچ جاتا۔

ایک دو منٹ مزید یہ گفتگو جاری رہی پھر ریڈ کیٹ اپنے ساتھیوں کے ساتھ واپس اپنی گاڑیوں کے قریب چلی گئی۔ وہ ایک بار پھر یہی بڑ مار کر گئی تھی کہ ہمارے دونوں ساتھی (فارس اور فخر) ان کے پاس ہیں اور وہ کچھ ہی دیر میں انہیں ہمارے سامنے لے آئے گی۔

قسطینا ایک بار پھر تھوڑی سی متفکر نظر آئی۔ میں نے کہا۔ ''قسطینا! ان ٹیسٹ ٹیوب قاتلوں کو جتنا میں جانتا ہوں، آپ نہیں جانتیں۔ اگر فارس اور فخر ان کے پاس ہوتے تو اب تک ہم واقعی سخت مشکل میں آچکے ہوتے...... یہ صبر کرنے والے لوگ نہیں ہیں۔ اپنی ماؤں (کرائے کی ماؤں) کے پیٹوں میں پتا نہیں کیسے ٹکے رہے ہیں۔ اب بھی یہ صرف ہمیں انڈر پریشر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ یہ فارس اور فخر کو ڈھونڈ رہے ہوں اور ان کو امید ہو کہ وہ انہیں پکڑ سکیں گے۔''

کھوہ میں روشنی کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ ہمارے پاس ایک بڑی ٹارچ تھی اور اس کی بیٹری ہم بچا کر رکھنا چاہتے تھے لیکن روشنی بھی ضروری تھی۔ چھوٹی ٹارچ دارج کے قریب روشن کر دی گئی۔ اس کے لیے ایک عارضی سا بستر بنا دیا گیا تھا جس پر وہ نیم دراز تھا۔ سعید کھوکھر اور تاجور اس کے اردگرد موجود تھے اور اس کے احکامات کی تعمیل کر رہے تھے۔ اس کا حال وہی تھا کہ رسّی جل گئی لیکن بل نہ گیا۔ لاہور میں ہاناوانی کے سلسلے میں ہماری وارننگز کو مسلسل نظر انداز کر کے وہ اس حال کو پہنچا تھا لیکن اس کی اکڑفوں اور پھوں پھاں برقرار تھی۔ تاجور کو بھی گاہے بگاہے اس کے سخت فقروں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اس وقت زیادہ کم بختی سعید کھوکھر کی آئی ہوئی تھی۔ حالانکہ اس نے چوکسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دارج کی ضروریات اور ادویات والا بڑا بیگ جیپ میں سے نکال لیا تھا، مگر ایک دو دوائیں رہ گئی تھیں جس کی وجہ سے وہ سیخ پا تھا۔ روشنی کے لیے ہم نے دہانے کے پاس تھوڑی سی آگ بھی روشن کر لی تھی۔

مندر میں جن بھنے ہوئے چنوں اور پانی پر ہم گزارہ کرتے رہے تھے، وہ تو مندر میں ہی رہ گئے۔ اب ہم سات افراد کے لیے پیٹ پوجا کے لیے کچھ نہیں تھا۔ دو بوتلوں میں بس تین چار لیٹر پانی تھا۔ ان میں سے ڈیڑھ لیٹر کی ایک بوتل تو فقط دارج کے لیے مخصوص کر دی گئی تھی۔ سعید کھوکھر میرے پاس آیا اور سرگوشی کے انداز میں بولا۔ ''دارج صاحب کی ایک نہایت ضروری میڈیسن جیپ میں رہ گئی ہے۔ اگر وہ یہاں نہ آسکی تو بہت مشکل ہو جائے گی۔ ان کی کمر کے پٹھوں میں پین شروع ہو جائے گا اور اگر یہ بڑھ گیا تو یہ آسمان سر پر اٹھا لیں گے۔''

''تو پھر جاؤ اور لے آؤ۔ یا اس کی ماں کو بھیجو۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

سعید بغلیں جھانک کر رہ گیا۔ وہ جانتا تھا، ایسا ممکن نہیں۔ جس سیاہ ٹویوٹا جیپ پر ہم یہاں تک آئے تھے، وہ کھوہ سے کم و بیش پچیس تیس میٹر کے فاصلے پر کھڑی تھی، وہاں تک

جانے کا مطلب خود کو شدید خطرے میں ڈالنا تھا۔ وہ جگہ واضح طور پر ڈیتھ اسکواڈ کی فائرنگ کی زد میں تھی اور رات میں کسی حد تک چاندنی بھی تھی۔ کوئی کھوہ سے نکل کر جیپ کی طرف جاتا تو ڈیتھ اسکواڈ کی نظر میں آسکتا تھا۔

قریباً ایک گھنٹہ مزید گزرا، پھر وہی کچھ ہونے لگا جس کا خدشہ سعید نے ظاہر کیا تھا۔ دارج کا ''پین'' بڑھ گیا اور اس نے واویلا شروع کر دیا۔ معاملہ صرف سعید کی ڈانٹ ڈپٹ تک رہتا تو بھی گوارا تھا...... لیکن اب وہ تاجور کے درپے بھی ہو گیا تھا۔ اس کی غصیلی آواز ہماری سماعتوں تک پہنچ رہی تھی۔ ''وہ اندھا ہو گیا تھا تو تم بھی اندھی ہو گئی تھیں۔ تمہیں پتا نہیں تھا کہ تمہارے خصم کو ضرورت ہے میڈیسن کی۔ مگر تمہارے تو ہوش ٹھکانے پر نہیں ہوتے...... ان کو ٹھکانے پر لانا پڑے گا......''

تاجور کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا یا شاید وہ اتنی آہستہ بولی تھی کہ آواز ہم تک نہیں پہنچی تھی۔

چند سیکنڈ بعد دارج کی والدہ یاسمین بیگم کی کرخت آواز ابھری۔ ''اب ادھر کھڑی منہ کیا دیکھ رہی ہے، جا...... گلاس میں تھوڑا سا پانی لے کر آ۔''

اس صورتِ حال کے سبب قسطینا کا پارا چڑھ رہا تھا۔ اس نے پُرتپش نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

بنارس نے ایک بار پھر کراہنا شروع کر دیا۔ اس کے سر پر خاصا بڑا زخم تھا۔ اس کے باوجود خبیث ہمیں ڈنک مارنے سے باز نہیں رہا تھا۔ اس نے اپنا موبائل دارج تک پہنچایا اور دارج نے اسے چکنا چُور کر دیا تھا۔ یوں ہم اپنے کسی بھی مددگار کے ساتھ رابطہ کرنے سے محروم ہو گئے تھے۔ اس بات کا اندیشہ بھی تھا کہ داؤ دبھاؤ کا یہ بے وفا ساتھی کوئی اور کام نہ دکھا جائے۔ لہٰذا شام سے پہلے ہی میں نے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ ڈالے تھے۔ اب وہ کسی نیم جان مرغی کی طرح کھوہ کے فرش پر پڑا تھا۔ (ہم نے اس سے ناوان کے بارے میں بھی پوچھا تھا اور اس نے بتایا تھا کہ وہ کلر کہار میں ہے اور خیریت سے ہے)

میں نے قسطینا سے کہا۔ ''آپ تھک گئی ہوں گی، کچھ دیر کے لیے لیٹ جائیں۔ اس گن کو میں سنبھالتا ہوں۔''

اس نے رسٹ واچ دیکھتے ہوئے کہا۔ ''نہیں شاہ زائب! سخت ترین ٹریننگ سے گزری ہوں، اتنی جلدی تھکنے والی نہیں۔ میں آدھی رات تک آسانی سے یہاں بیٹھ سکتی ہوں۔ تم تھوڑی دیر سو جاؤ۔ پھر چاہو تو یہاں آ جانا۔''

''نہیں......ابھی نیند تو مجھے بھی نہیں آ رہی۔ ویسے بھی ایک سے دو بھلے ہوتے ہیں۔''
میں نے لمبے بیرل والی اسنیپر گن کو گود میں رکھتے ہوئے کہا۔

اسی دوران میں دارج پھر تاجور پر گرجنے لگا۔ معاملہ پھر انہی دو دواؤں کا تھا جو جیپ میں رہ گئی تھیں۔ دارج کی زہریلی آواز ابھری۔ ''بکواس مت کرو۔ تمہارے ہاتھ میں دیکھا تھا میں نے وہ لال پیکٹ۔ تم نے وہاں سیٹ پر رکھ دیا ہوگا۔ پھر منہ اٹھا کر یہاں چلی آئی...... اور کوئی بات نہیں، بس تمہاری طبیعت درست ہونے والی ہے۔'' اس نے آخر میں پھر گالی بکی اور کراہنے لگا۔

ذرا دیر بعد یاسمین بیگم کی دبی دبی لیکن غصیلی آواز سنائی دی۔ ''اب کھڑی یہاں تماشا کیا دیکھ رہی ہے۔ جا بیگ میں سے زیتون کا تیل نکال۔''

میں نے کھوہ کے آخری سرے پر تاجور کا ہیولا دیکھا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی سی اس گوشے کی طرف بڑھی جہاں دارج کی ضروریات والا بیگ رکھا تھا۔

دارج کی ہائے ہائے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کی تکلیف واقعی بڑھ چکی ہے۔ تاجور کی بے بسی پر ترس آ رہا تھا اور دل پر چوٹ بھی پڑ رہی تھی۔ وہ کیوں خود اذیتی کے گرداب میں دھنسی چلی جا رہی تھی۔ میں نے گہری سانس لیتے ہوئے قسطینا سے کہا۔ ''لگتا ہے کہ سعید نے ٹھیک تجزیہ کیا ہے، جوں جوں اس کی تکلیف بڑھتی جائے گی، یہ ہائپر ہوتا جائے گا۔''

''تو ہونے دو ہائپر کمینے کو۔''

''مگر شامت تو پھر تاجور ہی کی آنی ہے...... میں سوچ رہا ہوں کہ اسے میڈیسن لا ہی دی جائے۔''

''خطرہ ہوگا اس میں۔ ابھی چاند بھی کافی اوپر ہے۔ دیکھ لیے جانے کا شدید خطرہ ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔ مجھے کچھ ہو گیا تو آپ سنبھال لیں گی سب کچھ...... جاماجی میں پوری فوج کو سنبھال لیتی ہیں آپ۔'' میں نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

''مر کر تاجور کو اکیلا چھوڑ دینا چاہتے ہو؟''

''وہ اب بھی میرے ساتھ کہاں ہے؟''

''لیکن مستقبل میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔''

''سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن شاید وہ نہیں ہو سکتا جو آپ سوچ رہی ہیں۔ اس کے راستے جدا ہیں۔ وہ اب ماں بننے والی ہے۔''

وہ کچھ دیر سوچ میں گم رہی پھر الجھے لہجے میں بولی۔ ''مجھے نہیں لگتا کہ ایسا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''یہی ماں بننے والی بات۔''

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا، دارج کے کراہنے کی بلند آواز آئی۔ یوں لگا جیسے اس کے جسم پر کسی نے دہکا ہوا انگارہ رکھ دیا ہو۔ وہ سعید کھوکھر پر بری طرح برسنے لگا۔ غالباً سعید اور تاجور وغیرہ مل کر دارج کا پہلو بدلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے قسطینا سے کہا۔ ''مجھے جانا پڑے گا۔'' اس کے ساتھ ہی میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

میں نے سعید کھوکھر کو اپنے پاس بلایا۔ اس سے پوچھا کہ میڈیسن والی ڈبیا جیپ میں کس جگہ ہو سکتی ہے۔ اگر اس کے علاوہ بھی وہ کوئی چیز جیپ کے اندر سے منگوانا چاہتا ہے تو بتا دے۔ اس سے بات کرنے کے بعد میں نے اسے واپس دارج کے پاس بھیج دیا۔ اپنی اسنیپر گن قسطینا کے پاس رکھی اور ایک چھوٹی نال کی روسی رائفل لوڈ کر کے جیپ کی طرف جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ قسطینا نے جب مجھے جانے کے لیے تیار دیکھا تو اصرار کرنے لگی کہ اس کی بلٹ پروف جیکٹ میں پہن لوں۔ میں نے اس کی بات نہیں مانی۔ میرے پاس ایک معقول دلیل یہ بھی تھی کہ اس کے سائز کی جیکٹ مجھے پوری نہیں آئے گی۔ جیکٹ کے سبب ویسے بھی مجھے اپنی موومنٹس میں بہت دشواری محسوس ہوتی تھی۔ بہر حال میں نے کسی نہ کسی طور اسے ٹال دیا...... ہمارے اندازے کے مطابق جیپ کے دروازے لاک نہیں تھے پھر بھی میں نے احتیاطاً قسطینا سے جیپ کی چابی لے لی۔ (یہ چابی قسطینا نے اگنیشن میں سے نکالی تھی) پوری تیاری کے بعد میں دہانے کے قریب کھڑا ہو گیا۔ میری نگاہ بار بار آسمان کی طرف اٹھ رہی تھی۔

''کیا دیکھ رہے ہو۔ پرندوں کی طرف سے خطرہ ہے؟'' قسطینا نے پوچھا۔

''نہیں چاند کی طرف سے ہے۔'' میں نے مغرب کی طرف جھکتے ہوئے چاند کو دیکھ کر کہا۔

''ہاں، یہ تو ہے۔'' وہ بولی۔

میری نگاہ ایک بڑی بدلی کی طرف تھی جو آہستہ آہستہ چاند کی جانب بڑھ رہی تھی۔ یہ چاند کو ڈھانپ لیتی تو میرے دیکھے جانے کا خطرہ بہت کم ہو جاتا۔ قسطینا میرا نقطہ نظر سمجھ گئی۔ بولی۔ ''لگتا ہے تم نے چھاپا مار ٹریننگ بھی لی ہوئی ہے۔ ایسی ٹپس اور طریقے گوریلا لڑائی کی تربیت میں سکھائے جاتے ہیں۔''

''سب سے بڑی تربیت عملی میدان کی ہوتی ہے قسطینا اور یہ میدان بہت بھگتا ہوا ہے میں نے۔''

وہ خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہی۔ بدلی نے چاند کی روشنی کو ڈھانپ لیا تو حدِ نگاہ کافی کم ہوگئی۔ میں چند قدم جھک کر چلا اور پھر پیٹ کے بل لیٹ گیا۔ پتھریلی زمین پر کرالنگ کرتا ہوا میں دھیرے دھیرے جیپ کی طرف بڑھنے لگا۔ یہاں کوئی خاص آڑ موجود نہیں تھی۔ اگر مخالف سمت سے فائر آتا تو میرے بچنے کے امکانات بہت کم تھے۔ وہ تیس میٹر کے لگ بھگ فاصلہ تھا مگر مجھے تیس کلومیٹر کی طرح لگا۔ مجھے پتا تھا کہ اگر مجھ پر فائر ہوا تو پہلا پگھلا ہوا سیسا میرے جسم میں اترے گا، دھماکے کی آواز بعد میں آئے گی۔

بالآخر یہ نہایت خطرناک فاصلہ طے ہوا اور میں جیپ تک پہنچ گیا۔ اس کا بونٹ اور اگلا بمپر بری طرح پچکا ہوا تھا۔ جیپ کے اگلے دونوں پہیے گڑھے میں تھے اور وہ لگ بھگ پینتالیس کا زاویہ بنا رہی تھی۔ جیپ کی اوٹ میں پہنچ کر مجھے قدرے تحفظ کا احساس ہوا۔ میں نے خود کو گھٹنوں کے بل اٹھایا اور اگلے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا۔ دروازے کو ہولے سے اپنی طرف کھینچا لیکن مایوسی ہوئی۔ توقع کے برعکس دروازہ لاک تھا۔ شاید اس کے سکیورٹی سسٹم نے اسے خود بخود لاک کر دیا تھا۔ میں نے پچھلا دروازہ چیک کیا، وہ بھی ''سینٹرلاکنگ'' کے سبب بند تھا۔ میں نے احتیاط سے اپنی پینٹ کی اگلی جیب میں ہاتھ گھسایا اور جیپ کی چابی نکال لی۔ اس امر کا اندیشہ بھی موجود تھا کہ میں دروازے کھولتا تو گاڑی کے ''اشارے'' جلنا بجھنا شروع ہو جاتے یا کوئی اور انڈیکیشن سامنے آجاتی۔ بہرحال یہ رسک تو اب لینے ہی تھا۔ میں نے پہلے ریموٹ کے ذریعے دروازے کھولنے کی کوشش کی مگر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا۔ یہ تعجب خیز تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ''ریموٹ'' ڈیڈ ہو گیا ہے۔ مجبوراً میں نے تالے میں چابی گھسائی اور اس کے ذریعے دروازے کو کھولنا چاہا...... مگر یہ طریقہ بھی ناکام ہوا۔ مجھ پر انکشاف ہوا کہ گاڑی کے اگلے حصے کو نقصان پہنچنے کے سبب اس کے الیکٹرانک سسٹم میں کوئی نقص پیدا ہو گیا ہے جس کی وجہ سے ریموٹ کام کر رہا ہے اور نہ چابی کے ذریعے دروازے کھل رہے ہیں۔

یہ بڑی مایوس کن صورتِ حال تھی۔ میں کافی خطرہ مول لے کر یہاں جیپ تک پہنچا تھا اور یہ سب کچھ بے سود رہا تھا۔ اب ایک ہی طریقہ رہ جاتا تھا کہ ونڈ اسکرین والے سوراخ کو بڑا کر کے وہاں سے اندر گھسنے کی کوشش کی جاتی۔ یہ وہی سوراخ تھا جس سے ایک چمگادڑ اندر گھسی تھی اور اس نے تہلکہ مچایا تھا۔ میں نے ایک بڑے پتھر کے ذریعے اسکرین پر پے در

پے ضربیں لگائیں اور اس میں کافی بڑا شگاف ڈالنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس عمل کے دوران میں ہر گھڑی یہی دھڑکا لگا تھا کہ کہیں گاڑی کا الارم آن نہ ہو جائے یا پھر پتھر سے لگنے والی ضربوں کی آواز مخالفین تک نہ پہنچ جائے۔ جونہی مناسب گنجائش پیدا ہوئی میں بونٹ پر چڑھ کر گاڑی کے اندر رینگ گیا۔ نشستوں پر ہر طرف شیشے کی کرچیاں بکھری تھیں۔ شیطان زادے ریگی اور اس کے ساتھی کی لاشیں اسی طرح پچھلی سیٹوں پر اوندھی سیدھی پڑی تھیں جیسے ہم چھوڑ کر گئے تھے۔ اگلی نشست پر بنارس کے ساتھی کی لاش تھی۔ ایک پورا برسٹ اس کے چہرے اور چھاتی پر لگا ہوا تھا۔ اس کا خون لوتھڑوں کی صورت میں جیپ کے فرش پر جما ہوا تھا...... اور ان ہی لوتھڑوں میں ایک مردہ چمگادڑ بھی لتھڑی پڑی تھی۔ میں نے بڑی احتیاط سے ٹارچ جلائی اور درمیانی نشستوں پر پڑی وہ سرخ ڈبیا ڈھونڈ لی جس میں دارج کی میڈیسنز موجود تھیں۔ یہاں سے میں نے چند اور چیزیں بھی لے لیں...... پانی کی ایک چھوٹی بوتل، موٹے ریگ زین کی ایک رول کی ہوئی چٹائی، لائٹر اور اس طرح کی ایک دو اور اشیا۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ میں جس طرح رینگ کر اندر آیا تھا اسی طرح باہر نکل گیا۔ گاڑی کے بائیں جانب والے دونوں ٹائر فائرنگ کے سبب برسٹ ہو چکے تھے۔ مستقبل قریب میں اس کو استعمال میں لائے جانے کی کوئی امید نہیں تھی۔

بڑی احتیاط سے کرالنگ کرتا ہوا میں واپس کھوہ کی طرف بڑھا۔ اب مجھے زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی۔ بدلی چند منٹ تک چاند کا چہرہ ڈھانپنے کے بعد آگے نکل رہی تھی۔ چاندنی بتدریج نمایاں ہو رہی تھی۔ پھر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ دھماکے کے ساتھ دو فائر ہوئے اور گولیاں سنسناتی ہوئی میرے سر پر سے گزر گئیں۔ یقیناً انہیں شک ہو چکا تھا۔ مجھے لگا کہ میں کرالنگ کرتا رہا تو "ہٹ" ہو جاؤں گا۔ کھوہ کا دہانہ دس بارہ میٹر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میں نے رسک لیا اور اٹھ کر دوڑتا ہوا کھوہ کے اندر چلا گیا۔ نشیب کی طرف سے آٹومیٹک کا ایک پورا برسٹ آیا لیکن یہ فائرنگ صرف پتھروں پر ہی چنگاریاں چھوڑ سکی۔ چوکس قسطینا نے بڑی چابکدستی سے ایک جوابی برسٹ چلایا پھر پکار کر مجھ سے پوچھا۔ "تم ٹھیک تو ہو شاہ زائب؟"

"ہاں میں ٹھیک ہوں۔" میں نے بیٹھ کر خود کو دیوار کے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

تاجور اور اس کی والدہ بھی بہت فکر مند نظر آئیں۔ اب تک وہ سب جان چکے تھے کہ میں جیپ کی طرف گیا ہوں۔ یقیناً انہوں نے ان ضربوں کی آوازیں بھی سنی ہوں گی جو میں نے اسکرین توڑنے کے لیے لگائی تھیں۔

"میڈیسن مل گئی؟" یاسمین بیگم نے ہانپی ہوئی سی آواز میں پوچھا۔

میں نے ڈبیا اس کی طرف بڑھا دی۔ وہ شکریے کا لفظ ادا کیے بغیر تیزی سے اپنے بیٹے کی طرف گئی جو فرشی بستر پر بری طرح بل کھا رہا تھا۔ ڈری سہمی تاجور اس کی چربیلی کمر پر غالباً زیتون کی مالش کر رہی تھی۔ مطلوبہ میڈیسن دیکھ کر تاجور نے ایک ممنونیت بھری نگاہ مجھ پر ڈالی۔ یہ نگاہ جیسے آنکھوں کے راستے میرے پورے جسم میں سرائیت کر گئی اور میری ساری کلفت دور کر دی۔

ویرانہ مسلسل فائرنگ سے گونجنے لگا تھا، دونوں طرف سے سنگل شاٹ فائر کیے جا رہے تھے پھر چھوٹے چھوٹے برسٹ بھی فائر ہونے لگے۔ اسنیپر گن ایک طرف رکھ کر میں نے بھی ایک سیون ایم ایم اٹھالی اور قسطینا کے ساتھ اوٹ میں بیٹھ کر فائرنگ کا جواب دینے لگا۔

''قسطینا آپ نے ایک بات نوٹ کی؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں...... فائر اب بائیں طرف سے آ رہا ہے اور قریب سے آ رہا ہے۔'' وہ میری طرف دیکھے بغیر بولی۔

''اس کا مطلب ہے، وہ اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر ہم پر چڑھائی کرنا چاہ رہے ہیں۔''

''یہ اتنا آسان نہیں ہوگا ان کے لیے۔'' وہ دانت پیس کر بولی اور مزید تن کر بیٹھ گئی۔

چند گولیاں ہمارے سروں کے اوپر سے گزر کر کھوہ کی چھت میں پیوست ہوئیں اور کچھ بجری نما پتھر اور ریت وغیرہ ہمارے اوپر گری۔ چاند اب مغربی ٹیلوں کے عقب میں اوجھل ہونے والا تھا مگر تھوڑی بہت چاندنی ابھی باقی تھی۔ مجھے قریباً ساٹھ ستر قدم دور ایک سرخ لباس کی جھلک سی نظر آئی۔ یقیناً یہ ڈیتھ اسکواڈ کا ہی ایک چھلاوا تھا جو جست لگا کر ایک چٹان سے دوسری چٹان کے عقب میں گیا تھا۔

''یہ لوگ آگے آ رہے ہیں۔'' میں نے قسطینا کو خبردار کیا۔

''میں دیکھ رہی ہوں۔'' اس نے کہا۔ اس کے ساتھ ہی ایک برسٹ چلایا ایک پرچھائیں سی ٹیلے سے لڑھک کر نیچے گئی۔ یقیناً یہ وہی چھلاوا تھا جس کی جھلک چند سیکنڈ پہلے میں نے دیکھی تھی۔ اس کے پیچھے آنے والے دوسرے شیطان زادے پر میں نے گولی چلائی، وہ بھی پتھروں کے پیچھے اوجھل ہو گیا۔ مجھے لگا کہ وہ زخمی ہوا ہے۔

ہماری اس کارروائی کے بعد فائرنگ کی شدت کم ہو گئی اور پھر اس کے بعد ایک دم خاموشی چھا گئی۔ مین نے کہا۔ ''قسطینا، ان لوگوں نے کہا تھا کہ وہ فخر اور فارس کو ہمارے سامنے لائیں گے لیکن اس کے بجائے انہوں نے ہم پر ہلا بولا ہے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ خالی خولی دھمکی تھی۔''

"ہاں، اب تو یہ ثابت ہو گیا ہے۔ اندازہ یہی ہوتا ہے کہ چمگادڑوں کا خطرناک انداز دیکھ کر سب تتر بتر ہوئے۔ ایسے میں شاید فارس اور تمہارے دوست کو بھی بچ نکلنے کا موقع مل گیا۔"

چمگادڑوں کے ذکر نے میرے ذہن میں پھر کئی اندیشے جگا دیئے۔ ان خونی چمگادڑوں نے ہمارا پیچھا اس وقت چھوڑا تھا جب دن کی روشنی پھیل گئی تھی...... لیکن اب تو پھر رات تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ دوبارہ نمودار ہو سکتی ہیں۔ یہ بہت تشویش ناک صورتِ حال تھی۔ میں نے اس کا ذکر قسطینا سے کیا...... اور کہا۔ "پہلے ہم بند گاڑی میں تھے اس لیے بچ گئے۔ اب یہ کھلے دہانے والی کھوہ ہے۔ اگر دوبارہ وہی صورتِ حال پیدا ہوئی تو ہم اپنا دفاع کیسے کریں گے؟"

قسطینا کے چہرے پر بھی تشویش کے سائے نظر آنے لگے۔ کھوہ کا یہ دہانہ قریباً چھ فٹ بلند تھا مگر بیضوی شکل میں تھا۔ اس کی چوڑائی چار ساڑھے چار فٹ کے لگ بھگ تھی۔ اونچائی کی طرف سے کچھ حصہ تو دو تین بڑے پتھروں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ باقی کھلی جگہ پر کوئی چیز تانی جا سکتی تھی۔

"دارج کے نیچے ڈبل پلائی کا بڑا کمبل موجود ہے۔" قسطینا نے تجویز پیش کی۔

"لیکن امپورٹڈ گدوں پر سونے والا وہ شہزادہ ننگی زمین پر کیسے لیٹ سکے گا۔ اس کے حواس پہلے ہی ٹھکانے پر نہیں ہیں، مزید واویلا شروع کر دے گا۔"

تب میرا دھیان ریگ زین کے اس "میٹ" کی طرف گیا جو تباہ حال جیپ سے نکلا تھا۔ اس کی لمبائی چوڑائی ایسی تھی کہ اسے پرندوں یا چمگادڑوں کے متوقع حملے سے بچنے کے لیے استعمال کیا جا سکتا تھا۔ سعید کھوکھر کے پاس ایک میڈیکل باکس موجود تھا۔ اس میں کچھ چھوٹی قینچیاں، دو تین نشتر اور ہکس وغیرہ موجود تھے۔ اگلے دس پندرہ منٹ میں، میں نے سعید کے ساتھ مل کر کوشش کی اور ریگ زین وفوم کے اس مضبوط "میٹ" کو کھوہ کی چھت سے یوں لٹکا دیا کہ بوقت ضرورت اسے نیچے سے تھام کر ہم اپنا بچاؤ کر سکتے تھے۔ میٹ کو چھت سے لٹکانے کے لیے میں نے قینچیوں وغیرہ کو میخوں کی طرح استعمال کیا تھا، تاجور، قسطینا اور سعید نے میری اس "کاریگری" کو تعریفی نظروں سے دیکھا تھا۔

دارج کی حالت میڈیسن کے بعد تھوڑی دیر کے لیے سنبھل گئی لیکن تب دوبارہ اس نے ہائے وائے شروع کر دی۔ وہ کھوہ کے عقبی حصے میں فرشی بستر پر لیٹا تھا۔ تاجور سائے کی طرح اس کے اردگرد موجود تھی...... اور گاہے بگاہے اس کی ڈانٹ بھی سن رہی تھی۔ دارج غالباً ان مردوں

میں سے تھا جو عورت کے حصول سے پہلے اس کے پاؤں چھونے کو بھی تیار رہتے ہیں لیکن وہی عورت جب انہیں حاصل ہو جاتی ہے، اسے اپنے پاؤں کی جوتی کا درجہ دے دیتے ہیں۔

دھیرے دھیرے دارج کا واویلا زیادہ ہوتا چلا گیا۔ سعید کھوکھر نے مجھ سے کہا۔ ''جس وقت جیپ کھڈے میں گئی، ان کی کمر کو شدید دھچکا لگا ہے۔ میرے خیال میں اب ان کو مکمل میڈیکل ٹریٹ منٹ کی ضرورت ہے۔ ورنہ ان کا حال زیادہ خراب ہو جائے گا۔''

''ہونے دو۔'' قسطینا نے سپاٹ لہجے میں لیکن دھیمی آواز میں کہا۔ ''اس طرح کے بندے کو تو اسی طرح تڑپتے رہنا چاہیے۔ شاید اسے دوسروں کی تکلیف کا کچھ احساس ہو۔ جو کچھ یہ اپنی منکوحہ بیوی کے ساتھ کر رہا ہے، اس کو تو باقاعدہ جوتے مارنے چاہئیں۔''

دارج کی دبنگ والدہ دور بیٹھی ہمیں گھور رہی تھی۔ اسے سنائی تو کچھ نہیں دے رہا تھا لیکن اسے یہ اندازہ ضرور ہو رہا تھا کہ ہم اسی کے فرزند ارجمند کے بارے میں بات کر رہے ہیں، دارج کی تکلیف بڑھنے کے بعد وہ ایک بار پھر بہت پریشان نظر آنے لگی تھی۔ میں نے دیکھا تاجور کھوہ کے ایک گوشے میں چادر بچھائے نماز پڑھنے میں مشغول تھی۔ اس نے دوپٹے کو اس طرح سر پر باندھا ہوا تھا کہ فقط دو تہائی چہرہ ہی نظر آتا تھا...... میں نے دل ہی دل میں سوچا...... وہ کس کے لیے دعا کر رہی ہوگی...... یقیناً اپنے شوہر کے لیے...... اور پھر اپنے گھر والوں کے لیے، اپنے والدین کے لیے اپنے چھوٹے بھائیوں اسفند اور راحیل کے لیے...... میرے ذہن میں خیال آیا...... کیا کبھی اس کی دعاؤں میں میرا نام بھی آتا ہے؟ کیا کبھی وہ میرے بارے میں بھی سوچتی ہے؟ کیا اسے اب کچھ بھی...... کچھ بھی یاد نہیں۔ وہ مجھ سے بس چند قدم کی دوری پر تھی لیکن درمیان میں ہزاروں میل کا فاصلہ تھا۔

رات کو ہمارے اور گھیراؤ کرنے والوں کے درمیان دو دفعہ مزید فائرنگ ہوئی۔ دونوں دفعہ ہم نے انہیں اچھی طرح باور کرا دیا کہ ہم انہیں آسانی سے اپنے قریب نہیں آنے دیں گے۔ کچھ دیر کے لیے میں سو گیا تھا اور کچھ دیر کے لیے قسطینا نے آنکھ لگا لی تھی۔ رات کو خونی چمگادڑوں کی طرف سے ایک کھٹکا سا تو رہا تھا مگر اس حوالے سے خیریت گزری تھی۔ اب سپیدۂ سحر نمودار ہونے والا تھا۔ دارج کے بارے میں جو کچھ سعید کھوکھر نے کہا تھا وہ درست ثابت ہو رہا تھا۔ اس کا اب برا حال تھا۔ پین کلر بھی اس پر کچھ زیادہ اثر نہیں کر رہی تھی۔ اس کی والدہ اپنے جسم کو جھلاتی ہوئی میرے پاس آئی اور بولی۔ ''مجھ سے یہ سب کچھ برداشت نہیں ہوتا۔ وہ بہت تکلیف میں ہے...... مم...... میں کسی بھی طرح اسے لے کر یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔''

''زبردست۔'' میں نے کہا۔ ''آپ اپنی فیملی کو لے کر یہاں سے چلی جائیں......اور آپ کا بھتیجا شکیل داراب اسی کھوہ کو ہمارا مقبرہ بنا ڈالے؟''

''تو پھر کیا چاہتے ہو تم؟'' وہ روہانسی ہو کر بولی۔

''یہاں سے نکلنے کا محفوظ راستہ۔ اگر واقعی ہمارے دونوں ساتھی ان لوگوں کے پاس ہیں تو انہیں ہمارے حوالے کر دیا جائے۔'' میرا اشارہ فارس اور فخر کی طرف تھا۔ (ویسے مجھے بہت کم امید تھی کہ وہ دونوں ان کے پاس ہوں گے)

''ٹھیک ہے......تم......میری بات کراؤ شکیل سے۔ وہ کوئی نہ کوئی راستہ نکال لے گا۔''

''راستہ کیا نکالے گا؟ یہ سب کچھ اسی کا کیا دھرا تو ہے۔ دوسری بات یہ کہ آپ اس سے بات کیسے فرمائیں گی۔ جو ایک سیل فون یہاں کارآمد تھا وہ تو آپ کے فرزند نے خود اپنے ہاتھوں سے توڑ دیا ہے۔''

وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر گم صم رہی۔ پھر میری طرف دیکھ کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''تم مجھے جانے دو ان کی طرف۔ میں خود جا کر ان سے بات کرتی ہوں۔ یہ لوگ تمہیں یہاں سے جانے دیں گے۔ کوئی فائرنگ نہیں ہوگی تم پر۔ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں۔''

''مجھے نہیں لگتا کہ آپ ایسا کر سکیں گی۔ اگر کر لیں تو میں بھی یقین دلاتا ہوں کہ آپ کو اور آپ کی فیملی کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔''

اب ہلکا اجالا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ اونچے نیچے ٹیلے اور گھاٹیاں دور تک دکھائی دے رہی تھیں۔ یاسمین بیگم یہاں سے جانے کے لیے تیار نظر آنے لگی۔ میں نے کہا۔ ''آپ ایک بار پھر اچھی طرح سوچ لو۔ یہ نہ ہو کہ کوئی اور مصیبت کھڑی ہو جائے۔ یہ سرخ کپڑوں والے بڑے خطرناک گروہ کے لوگ ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ...... یہ شکیل سے آپ کا رابطہ ہی نہ ہونے دیں۔ ان سے کچھ بھی بعید نہیں ہے۔''

''تم فکر نہ کرو......میں ہینڈل کر لوں گی۔'' وہ رعب سے بولی۔

میں نے کہا۔ ''اگر ارادہ کر ہی لیا ہے تو پھر تھوڑی دیر صبر کریں۔ روشنی اچھی طرح پھیل جانے دیں۔ یہ نہ ہو کہ کسی غلط فہمی کی وجہ سے وہ آپ پر بھی گولی چلا دیں۔''

یاسمین بیگم نے میری یہ بات مان لی......اور یہ بھی کہا کہ وہ ایک دو ''سیل فون'' ساتھ لے کر آئے گی تاکہ ہم شکیل وغیرہ سے براہِ راست بھی بات کر سکیں۔

سورج طلوع ہونے والا تھا جب یاسمین بیگم نے شال لپیٹی اور کراہتے ہوئے دارج کو پرتشویش نظروں سے دیکھ کر کھوہ سے نکل کھڑی ہوئی۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔ ساتھ ساتھ

وہ اپنی سفید شال کے پلو کو ایک ہاتھ سے لہرا بھی رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں وہ کافی آگے نکل گئی۔

قسطینا بولی۔ ''جہاں تک میں سمجھ سکی ہوں، یہ ٹیکساری گینگ والے تو کسی وعدے، معاہدے کی پاسداری کر ہی نہیں سکتے۔ ان پر بھروسا کرنا بے وقوفی ہوگی۔''

میں نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ ''مجھے نہیں لگتا کہ اتنی جلدی یہ لوگ کوئی شرط مان لیں گے لیکن اگر ایسا کچھ ہوا بھی تو ہم اپنی سائیڈ محفوظ رکھیں گے۔ دارج یا پھر یاسمین بیگم میں سے کوئی ایک ہمارے ساتھ رہے گا اور ہم اسے تب چھوڑیں گے جب خود کو بالکل محفوظ محسوس کریں گے۔''

قسطینا نے پتھریلی دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ ''تم یہ کیوں کہہ رہے ہو کہ کسی طرح کی شرائط طے ہونا مشکل ہے؟''

''اس لیے کہ میں ان ابلیس زادوں کو ضرورت سے زیادہ جانتا ہوں۔ شکاری جانوروں کی طرح ان کی نظر بس اپنے ٹارگٹ پر ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کسی موقع پر وہ شکیل داراب کی بات ماننے سے بھی انکار کردیں۔ کل میں نے اس اختلاف کی ایک چھوٹی سی جھلک دیکھی بھی ہے۔ ٹیلی اسکوپ میں وہ باسٹرڈ ریڈکیٹ نظر آئی تھی۔ شکیل کے کارندے سے سیل فون چھین رہی تھی......''

اسی دوران میں دارج کی آہ و بکا نے ہمیں اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ وہ زخمی بھینسے جیسی آوازیں نکال رہا تھا۔ سعید غالباً پیشاب وغیرہ کے لیے کھوہ سے باہر نکلا ہوا تھا۔ اکیلی تاجور دارج کے سرہانے موجود تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ دارج تکلیف کے سبب کروٹ بدلنا چاہ رہا ہے۔ تنہا تاجور کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ زور لگا کر بھاری بھرکم دارج کو کروٹ کے بل کر سکتی۔ وہ بے بس دکھائی دے رہی تھی۔ میں اس کی مدد کے لیے گیا۔ میں نے دارج کو ہاتھ لگایا تو اس نے اپنے جسم کو سمیٹا۔ جیسے میرا چھونا بھی اسے گوارا نہ ہو۔ لیکن اس کی مجبوری اس کے تکبر اور نخوت کی دیوار کو ڈھا رہی تھی۔ میں نے تاجور کے ساتھ مل کر اس کی کروٹ بدلی۔

وہ ابکائیاں سی لے رہا تھا۔ مجھے لگا کہ وہ قے کرنے لگا ہے۔ میں نے جلدی سے ایک تہ شدہ کپڑا اس کے منہ کے سامنے کردیا۔ اس نے واقعی قے کی جس کا زیادہ تر مواد تہ شدہ کپڑے میں سما گیا۔ کچھ کمبل پر گرا۔ میں نے اسی کپڑے سے پہلے کمبل کو پونچھا پھر اپنے رومال سے دارج کا منہ صاف کردیا۔

''آپ رہنے دیں...... میں کرلیتی ہوں۔'' تاجور روہانسی آواز میں کہتی رہ گئی۔

میں نے کپڑا لپیٹا اور کھوہ سے باہر ایک نشیب میں پھینک دیا۔ کھوہ کی بائیں جانب چند چٹانوں کی آڑ موجود تھی اور وہاں فائر آنے کا کوئی خطرہ موجود نہیں تھا۔ سعید بھی انہی چٹانوں

کی اوٹ سے پلاسٹک کی خالی بوتل لیے ہوئے برآمد ہوا۔ میں نے اسے بتایا کہ وہ جلدی پہنچے دارج کو اس کی ضرورت ہے۔

چٹانوں کے پیچھے دس پندرہ قدم جھک کر چلنے کے بعد میں کھوہ کے عقب میں آ گیا...... میں نے کل شام کو بھی اس جگہ کا معائنہ کیا تھا۔ یہاں سے کھوہ کی طرف آنا ناممکن تھا۔ یہ مٹیالے رنگ کی ایک سیدھی سپاٹ دیوار تھی جس نے گہری کھائی کا ایک کنارہ بنا رکھا تھا۔ دور دور تک ٹیلے اور چٹانیں تھیں۔ سعید کھوکھر، خوشاب کا رہنے والا تھا اور اس نے کل مجھے بتایا تھا کہ یہ سارا وادیٔ سون کا علاقہ ہے۔ کٹی پھٹی زمین...... گھاٹیاں، غار، جھرنے، نالے...... یہ سب کچھ یہاں دور تک دکھائی دیتا تھا۔ سورج کی روپہلی کرنوں نے ہر منظر کو ایک اجلی سی دلکشی دی تھی۔ مجھے یہاں جنگلی انجیر اور بیر وغیرہ کے درخت نظر آئے...... اور کہیں کہیں پہاڑی گزرگاہوں میں پھولدار جھاڑیاں دکھائی دیں۔ کوئی اور موقع ہوتا تو شاید میں اس وسیع و عریض منظر سے لطف اندوز ہوتا لیکن اس وقت تو ہم بے رحم قاتلوں کے گھیرے میں تھے اور فضا میں بارود اور خون کی بو محسوس ہوتی تھی۔

اچانک میری نگاہ آسمان کی طرف اٹھی اور میں بری طرح چونک گیا۔ دور فاصلے پر پرندوں کا ایک جھنڈ دکھائی دیا جو بڑی تیزی سے ہماری پناہ گاہ کی طرف آ رہا تھا۔ میری دھڑکنیں سرپٹ ہو گئیں۔ میں واپس مڑا اور چٹانوں کی آڑ لیتا ہوا کھوہ میں داخل ہو گیا۔

''کیا ہوا شاہ زائب؟'' قسطینا نے ہراساں لہجے میں پوچھا۔

میں نے جواب نہیں دیا۔ میری نگاہ بدستور کھوہ کے دہانے سے گزر کر بلندی کا جائزہ لے رہی تھی۔

قسطینا کی نگاہ نے میری نگاہ کا تعاقب کیا۔ پھر اس نے بھی پرندوں کا تیز رفتار جھنڈ دیکھ لیا۔ ''اوہ گاڈ یہ کیا ہے شاہ زائب! مجھے تو طوطے لگ رہے ہیں۔''

''شاید۔'' میں نے کہا اور ریگ زین کی چٹائی کو چق کی طرح نیچے گرا کر کھوہ کا دہانہ ڈھانپ دیا۔

سعید بھی دارج کو چھوڑ کر میری مدد کو لپکا اور ہم نے ریگ زین کی اس مضبوط چٹائی کو نیچے سے تھام لیا۔ چٹائی کی درز سے میں نے دیکھا...... یقیناً یہ طوطوں ہی کی کوئی قسم تھی لیکن یہ سائز میں قدرے بڑے نظر آ رہے تھے۔ مجھے محسوس ہوا کہ ان کے انداز میں جارحیت نہیں ہے۔ وہ کھوہ کے قریب پہنچے اور پھر ہمارے سروں کے اوپر سے پرواز کرتے ہوئے آگے نکل گئے۔

میرے سینے سے ایک طویل سانس خارج ہوئی۔ ''کیا ہوا؟'' قسطینا نے پریشان کن

آواز میں پوچھا۔

''نو نیوز اِز گڈ نیوز۔'' میں نے جواب دیا اور چٹائی کو پھر سے اوپر چڑھا دیا۔ دن کی روشنی کھوہ کے اندر آنے لگی۔

قسطینا مطمئن نظر آئی۔ تاجور، دارج اور سعید کے چہروں کے اڑے ہوئے رنگ بھی واپس پلٹ آئے۔ کچھ دیر کھوہ میں ایک بامعنی خاموشی طاری رہی۔ میں نے کہا۔ ''سچ کہتے ہیں کہ سانپ کا ڈسا ہوا رسی سے بھی ڈرتا ہے۔''

''اور ڈرنا چاہیے بھی۔'' قسطینا نے لقمہ دیا۔

میں نے کھوہ سے سر باہر نکال کر دیکھا۔ ان آزاد پرندوں کا جھنڈ پرواز کرتا ہوا بہت دور نکل چکا تھا۔ میں واپس قسطینا کے قریب آن بیٹھا۔ وہ ایک فوجی کی سی استقامت کے ساتھ اس مورچے پر ڈٹی بیٹھی تھی۔ میں نے اسے مجبور کیا کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے کمر سیدھی کر لے...... وہ گن کے سامنے سے ہٹ گئی مگر لیٹی نہیں اور مجھ سے کچھ فاصلے پر کھردری دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ فارس کے بارے میں ابھی تک ہمیں کچھ پتا نہیں تھا اور وہ اس کے لیے پریشان تھی جو دوسری چیز اسے پریشان کر رہی تھی، وہ دارج داراب کی مسلسل ڈانٹ ڈپٹ تھی جو وہ تاجور اور سعید سے جاری رکھے ہوئے تھا۔

وہ بولی۔ ''شاہ زائب! اگر یہ سوّر اس زخمی حالت میں بھی ایسا رویہ اپنائے ہوئے ہے تو صحت مندی میں کیسا ہوتا ہوگا۔ تاجور کس طرح برداشت کر رہی ہے اسے؟''

''مجھے تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ اپنے حالات کا بدلہ خود اپنے آپ سے لے رہی ہے۔ جانتے بوجھتے خود کو اذیت دے رہی ہے۔''

''اور تمہیں بھی۔'' وہ مجھے کن انکھیوں سے دیکھ کر بولی۔

''میری اذیت تب تک ہے جب تک یہ سب کچھ میرے سامنے ہے۔ ایک بار یہاں سے نکل جائیں پھر اس کی اپنی دنیا میری اپنی۔''

''یعنی تاجور کو اس کے حال پر چھوڑ کر چلے جاؤ گے؟''

''ہم صرف اس لیے تاجور اور دارج کے پیچھے آئے تھے کہ دارج کو ان خطرات کا ادراک نہیں تھا جو اس کے اور تاجور کے اردگرد منڈلا رہے تھے۔ اب پچھلے چار پانچ روز میں جو کچھ اس شخص پر بیتی ہے، اس کے چودہ طبق روشن ہو چکے ہوں گے۔''

''چلو مان لیتے ہیں کہ اب تاجور کی جان کو پہلے جتنا خطرہ نہیں ہوگا مگر یہ نیم دیوانہ شخص جس طرح اس بے چاری کی روح کو چھید رہا ہے، یہ زندوں میں کہاں شمار ہوگی۔''

''یہ بلا اس نے خود اپنے گلے ڈالی تھی قسطینا......اور اب بھی شاید وہ اسی میں خوش ہے۔''

قسطینا عجیب لہجے میں بولی۔''اگر میں یہ کہوں کہ وہ خوش نہیں ہے اور وہ اب بھی تم سے اتنی ہی محبت کرتی ہے جتنی پہلے کرتی تھی......یا شاید اس سے بھی زیادہ تو پھر؟''

''آپ اپنے حساب سے اور اپنے ماحول کے حساب سے سوچ رہی ہیں قسطینا اور آپ غلطی پر ہیں۔''

''اگر میں ثابت کردوں کہ میں غلطی پر نہیں ہوں تو پھر......؟''

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا، غنودگی کی حالت میں زمین پر پڑے کوتاہ قد بنارس نے کراہنا شروع کر دیا۔ وہ پانی مانگ رہا تھا۔ وہ بدترین دشمن ثابت ہوا تھا مگر زخمی تھا اور ہمارے رحم و کرم پر تھا۔ میں نے اٹھ کر اسے پانی پلایا اور اس کے سر کی پٹی درست کی جو خون سے بھیگ چکی تھی۔

قسطینا نے رسٹ واچ دیکھتے ہوئے کہا۔''دارج کی والدہ کو گئے اب دو گھنٹے پورے ہو گئے ہیں۔ ابھی تک کوئی رسپانس سامنے نہیں آیا۔''

میں نے کہا۔''مجھے رسپانس کی زیادہ جلدی نہیں لیکن اللہ کرے یہ رسپانس جب بھی آئے، اچھا ہو۔''

''تمہارا کیا خیال ہے اگر یاسمین بیگم کال کرے گی تو شکیل داراب یہاں پہنچ جائے گا۔ جس طرح کے سنگین حالات ہیں، اسے پہنچنا تو چاہیے لیکن وہ بھی داؤد بھاؤ کی طرح پیچھے رہ کر کام کرنے والا بندہ ہے۔''

O......❖......O

اس دلچسپ داستان کے بقیہ واقعات
آٹھویں (آخری) حصے میں ملاحظہ فرمائیں

قسطینا نے پتھر کی اوٹ سے دور نیچے نشیب میں دیکھا۔ بڑے بڑے چٹان نما پتھروں کے عقب میں ڈیتھ اسکواڈ کے لوگوں کی کم وبیش آٹھ پوزیشنیں تھیں۔ شکیل کے کارندے بھی ان میں شامل رہے ہوں گے۔ وہ جن گاڑیوں پر یہاں پہنچے تھے، وہ بھی اوٹ کے طور پر استعمال ہو رہی تھیں۔ کافی زیادہ فاصلے کے باوجود گاڑیون کی ساخت اور ان کے ماڈل وغیرہ پہچانے جا رہے تھے۔

قسطینا بولی۔ ''میرا خیال ہے کہ اگر ان لوگوں نے اب تک ہم پر زیادہ سخت حملہ نہیں کیا تو اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ دارج ہمارے ساتھ ہے۔ اگر یہ باسٹرڈ نہ ہوتا تو یہ تین اطراف سے ہم پر ٹوٹ پڑتے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں اور دوسری اہم وجہ یہ ہے کہ یہ نشیب میں ہیں۔ انہیں پتا ہے کہ پتھروں کی اوٹ سے نکلیں گے تو نشانے پر آجائیں گے۔ ممکن ہے کہ یہ آج اندھیرا پھیلنے کے بعد کوئی کارروائی کریں۔''

قسطینا بولی۔ ''لیکن ایک اسٹریٹجی یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یہ ہمیں محصور رکھیں ...... اور یہ سوچیں کہ ہم بھوک پیاس سے مجبور ہو کر باہر نکل آئیں گے۔''

ہوا کے دوش پر تیر کر کسی کتے کی مدھم آواز مجھ تک پہنچی۔ میں بری طرح ٹھٹک گیا۔ یہ عام کتے کی آواز نہیں تھی۔ یہ وہی خوفناک ڈیئر ہاؤنڈ تھا جن کا ایک پورا غول ہم نے رائے ونڈ کے قریب ایک کوٹھی میں دیکھا تھا۔ رضوان کا گوشت کاٹ کاٹ کر انہی ڈیئر ہاؤنڈز کے سامنے پھینکا گیا تھا۔ وہ منظر یاد کر کے اب بھی دل کانپ جاتا تھا۔

قسطینا نے بھی آواز سن لی تھی۔ وہ بولی۔ ''لگتا ہے کہ لاہور کی کوٹھی میں پنجرے کے اندر نظر آنے والے وہی ہاؤنڈز یہاں بھی پہنچ گئے ہیں۔ یہ بڑی تیز رفتاری سے حملہ کرتے ہیں۔ ہمیں مزید چوکس رہنا ہوگا۔''

میں نے ٹیلی اسکوپ کی مدد سے دیکھا۔ ایک پتھر کی اوٹ سے مجھے ایک قدآور ہاؤنڈ کا منہ اور گردن کا کچھ حصہ دکھائی دیا۔ اس نے اپنے کان کھڑے کر رکھے تھے اور بے حد بے تاب نظر آتا تھا۔ بہر حال مجھے زیادہ پریشانی نہیں تھی۔ جب تک دارج یہاں موجود تھا، ہم پر کوئی سخت ہلا نہیں بولا جا سکتا تھا۔ اس بات کی کافی امید تھی کہ بیگم یاسمین رو پیٹ کر اپنے فرزند کو بچانے کے لیے کوئی درمیانی راستہ تلاش کر لے گی...... شرط بس اتنی ہی تھی کہ ریڈ کیٹ اور ڈیتھ اسکواڈ کے دیگر ارکان کوئی رکاوٹ نہ ڈالیں۔

یہ سنسان علاقہ تھا۔ چاروں طرف ایک پُراسراری خاموشی تھی۔ کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ ہمیں گھیرا ڈالنے والے اب کیا سوچ رہے ہیں۔ یاسمین بیگم کے وہاں پہنچنے کا کوئی ردِ عمل ابھی تک تو سامنے نہیں آیا تھا۔

قسطینا نے آنکھیں سکیڑ کر غور سے سامنے دیکھا اور انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

''شاہ زائب! وہ ان لوگوں کی سفید ٹویوٹا جیپ کی چھت پر کیا چیز نظر آ رہی ہے؟''

میں نے بھی دیکھا۔ یہی لگا کہ چھت پر کوئی فٹ بال سا دھرا ہے۔ تب میں نے اسنیپر گن کی ٹیلی اسکوپ سے آنکھ لگائی اور اپنی نگاہ کو اس چیز پر مرکوز کیا میری ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ اپنی آنکھوں سے دیکھے ہوئے منظر پر بھروسا نہیں ہوا۔ ٹویوٹا جیپ کی چھت پر دارج کی والدہ یاسمین بیگم کا کٹا ہوا سر دھرا تھا...... میں پہچاننے میں غلطی نہیں کر رہا تھا، یہ اسی کا سر تھا۔ منہ کھلا ہوا، تراشیدہ بال منتشر اور رخسار پر خون کے داغ۔ خون کی چند لکیریں گاڑی کی چھت پر بھی دکھائی دے رہی تھیں۔

قسطینا نے میرے تاثرات بھانپ لیے۔ ٹھٹکے لہجے میں بولی۔ ''کیا ہوا شاہ زائب؟''

اس کے ساتھ ہی اس نے میرے ہاتھ سے اسنیپر گن جھپٹ لی۔ گن کی ٹیلی اسکوپ سے آنکھ لگا کر اس نے بھی وہی دلخراش منظر دیکھا جو میں نے دیکھا تھا۔ وہ بھی سکتہ زدہ رہ گئی۔ کتنی ہی دیر ہم گم صم بیٹھے رہے۔

میں نے کہا۔ ''قسطینا اس کا مطلب صرف ایک ہی ہے۔ یہاں شکیل داراب کا کوئی بندہ موجود نہیں۔ اگر کچھ بندے تھے بھی تو انہیں ان سرخ پوش درندوں نے ذبح کر ڈالا ہے۔ میں نے آپ سے کہا تھا ناں کہ یہ خون آشام بھیڑیے ہیں اور بھیڑیا کسی کا دوست یا ساتھی نہیں ہوتا۔''

قسطینا نے کہا۔ ''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہم اس وقت ٹیکساری گینگ کے ڈیتھ اسکواڈ کے گھیرے میں ہیں اور انہیں اس بات کی کوئی پروا نہیں کہ دارج یا اس کی فیملی ہماری تحویل

میں ہے۔''

''میرا اندازہ ہے قسطینا کہ ان لوگوں میں جھگڑا بھی اسی بات پر ہوا ہوگا۔ شکیل داراب کے ساتھیوں نے کہا ہوگا کہ دارج اور اس کی فیملی کے ہوتے ہوئے ہماری پناہ گاہ پر اندھا دھند ہلا نہیں بولنا چاہیے لیکن ڈیتھ اسکواڈ والوں نے یہ بات نہیں مانی ہوگی۔''

''تم نے بتایا تھا کہ ان کی انچارج ریڈ کیٹ، شکیل داراب کے کارندے سے جھگڑ رہی تھی اور اس نے اس سے موبائل چھین لیا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ شکیل کا کارندہ شکیل سے ہدایات لینا چاہ رہا ہو۔''

''سو فیصد یہی بات ہے۔ ان آفت زادوں نے شکیل کے کارندوں کو کسی سے رابطہ ہی نہیں کرنے دیا۔ ان کو بے بس کر کے باندھ دیا ہے یا پھر ویسے ہی مار ڈالا ہے۔''

صورتِ حال ایک دم سنگین تر ہوگئی تھی۔ یاسمین بیگم جو دو ڈھائی گھنٹے پہلے یہاں جیتی جاگتی حالت میں موجود تھی، تحکمانہ انداز میں باتیں کررہی تھی اور بیٹے کی حالت پر سیخ پا تھی، اب زندگی کی قید سے آزاد ہوچکی تھی۔ اس کا کٹا ہوا سر ٹویوٹا کی چھت پر کسی ٹرافی کی طرح دھرا تھا۔ یہ ایک طرح سے ڈیتھ اسکواڈ کی جانب سے ہمیں خطرناک ترین سگنل بھی تھا۔ انہوں نے ہمیں بتا دیا تھا کہ دارج کی ماں کی طرح دارج کی بھی ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں اور جیسے ہی ان کا داؤ چلے گا، وہ ہم تک پہنچ کر ہمیں چیر پھاڑ دیں گے۔

اب ہمیں اس سوال کا جواب بھی بڑی اچھی طرح مل گیا تھا کہ اپنے فرسٹ کزن دارج کو بچانے کے لیے شکیل داراب بنفس نفیس یہاں کیوں نہیں پہنچا...... اور ہمیں اپنے اردگرد پولیس یا کسی سکیورٹی ایجنسی کی گاڑیاں وغیرہ کیوں دکھائی نہیں دیں۔ ان سنسان ٹیلوں سے باہر کسی کو پتا ہی نہیں تھا کہ دارج اور اس کی فیملی کہاں ہے اور یہاں ڈیتھ اسکواڈ کے جنونی قاتل کیا کھیل کھیل رہے ہیں۔ یاسمین بیگم کے انجام پر افسوس ہونے لگا۔ میں نے اسے خبردار کیا تھا...... اور جانے سے منع بھی کیا تھا لیکن جو اس کی قسمت میں لکھا تھا، اسے مل گیا تھا۔

میں اچھی طرح جانتا تھا کہ ڈیتھ اسکواڈ کا اصل ٹارگٹ میں ہی ہوں لیکن خونریزی اور انتقام کے حوالے سے ڈیتھ اسکواڈ والے کسی قانون قاعدے کے پابند نہیں تھے۔ بالفرض میں ایثار کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود کو ان کے حوالے کر بھی دیتا تو اس بات کی بالکل امید نہیں تھی کہ وہ یہاں کھوہ میں موجود باقی افراد کو چھوڑ دیں گے۔ ان کے کسی بھی قول پر یقین کرنا حماقتِ عظیم تھی۔

قسطینا نے نفرت سے دارج کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''اب شاید اس خبیث کو اندازہ ہو کہ بنارس والا موبائل فون توڑ کر اس نے کتنا بڑا ''بلینڈر'' کیا ہے۔''

''ایسے لوگوں کو پھر بھی کوئی سبق نہیں ملتا۔'' میں نے مایوسی سے کہا۔

وہ درد سے مسلسل کراہ رہا تھا پھر میں نے سعید کھوکھر کو اپنی جانب آتے دیکھا، ہمارے پاس آ کر وہ بولا۔ ''صاحب پوچھ رہے ہیں کہ ان کی والدہ کی طرف سے کوئی اطلاع آئی ہے؟''

''ہاں آئی ہے۔ وہ خیر خیریت سے ہیں۔'' میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''وہ پوچھتے ہیں کہ وہ اب تک آئی کیوں نہیں؟''

''آ جائیں گی، تم کوشش کرو کہ یہ کسی طرح سو جائے۔ سکون بخش دوا کی زیادہ ڈوز دو اور ساتھ میں درد کش کی بھی ٹرپل ڈوز دے دو۔''

سعید نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا اور دارج کی طرف چلا گیا۔ میری نگاہ تاجور کی نگاہ سے ٹکرائی۔ اس کی نگاہ میں ممنونیت تھی۔ میں نے کل رات جس طرح خود کو خطرے میں ڈال کر دارج کی میڈیسن گاڑی سے نکال کر یہاں پہنچائی تھی، اس نے اسے بہت متاثر کیا تھا۔

اچانک قسطینا نے ٹیلوں میں کچھ فاصلے پر کوئی چیز دیکھی اور ایک دم چوکس ہو گئی۔ گن کے کنٹرول پر اس کی گرفت مضبوط ہوئی اور اس نے انگلی ٹریگر پر رکھ دی۔

''کیا ہوا؟'' میں نے اسنیپر گن کا سیفٹی کیچ ہٹاتے ہوئے پوچھا۔

''کوئی ہے وہاں، میں نے حرکت دیکھی ہے۔''

''کوئی جانور تو نہیں؟''

''جانور کپڑے نہیں پہنتے۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔ اس کی ساری توجہ سو ڈیڑھ سو فٹ دور ایک ابھرے ہوئے پتھر کی طرف تھی۔ میں نے بھی وہاں ایک متحرک جسم دیکھا۔ میں نے اسے نشانے پر رکھ لیا۔ ٹیلی اسکوپ میں مزید واضح منظر دکھائی دیا...... کسی کا کریم کلر لباس دکھائی دیا۔ یوں لگا کہ اس پر خون کے دھبے بھی ہیں۔

''کوئی زخمی لگ رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ ہم دونوں کے نشانے پر تھا۔ سیکنڈ کے چوتھے حصے میں ہم اس پر گولیوں کی بارش کر سکتے تھے۔ پھر میں نے دیکھا کہ وہ شخص کسی چوپائے کی طرح ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل چلا اور ایک ڈھلوان پر اترنے کی کوشش کی۔ دس پندرہ فٹ چل کر وہ لڑھک گیا اور پلٹیاں کھاتا ہوا مزید نیچے چلا آیا۔ ایک دو منٹ تک وہ وہیں بے حرکت پڑا رہا، تب پھر چوپائے کی طرح چلتا

ہوا اور کبھی کرالنگ کرتا ہوا آگے آنے لگا۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ لڑھک کر کسی حد تک نشیب میں چلا گیا تھا۔ یہاں جھاڑ جھنکاڑ بھی زیادہ تھی۔ یوں وہ ڈیتھ اسکواڈ کے سرخ پوشوں کی نظروں سے بچا ہوا تھا۔

''کون ہوسکتا ہے؟'' قسطینا نے پوچھا۔

''اس کا چہرہ بری طرح خون اور مٹی میں لتھڑا ہوا ہے۔ پہچانا نہیں جا رہا۔ ہوسکتا ہے کہ شکیل کے بندوں میں سے کوئی ہو۔''

ہم سے ساٹھ ستر فٹ کی دوری پر وہ ایک بار پھر ڈھلوان سے لڑھک کر کسی چیز سے ٹکرایا اور ساکت ہوگیا۔ شاید اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ وہ بہت ابتر حالت میں تھا۔ سفید قمیص اور کریم کلر کی پتلون مٹی اور خون میں لتھڑی ہوئی تھی۔ اس کی عمر تیس سال سے زائد ہی لگتی تھی۔ وہ ننگے پاؤں تھا۔ مجھے لگا کہ وہ نیم بے ہوش ہوگیا ہے۔ میں نے قسطینا سے کہا۔

''میں اس کی طرف جاتا ہوں، یہ نہ ہو کہ یہ ختم ہی ہو جائے۔''

''بہت احتیاط سے جانا ہوگا۔ کہیں یہ ان لوگوں کی کوئی چال نہ ہو۔'' قسطینا نے جواب دیا۔

''چال لگتی تو نہیں، میرا اندازہ ہے کہ اس کی دونوں ٹانگوں میں گولیاں لگی ہوئی ہیں۔ ایک گولی یا دو شاید پیٹ میں بھی لگی ہوئی ہیں۔''

کھوہ کے گوشے سے دارج نے پکار کر پوچھا۔ ''کون آیا ہے؟''

''تمہاری والدہ نہیں ہے کوئی اور ہے۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں جواب یا۔

''وہ بھائی شکیل کا آدمی ہوگا، بلاؤ اسے۔'' دارج نے کراہتے ہوئے تحکمانہ انداز میں کہا۔

''وہ بلائے جانے کے قابل نہیں ہے۔ مجھے خود ہی اس کے پاس جانا پڑے گا۔'' میں نے جواب دیا۔

وہ پتا نہیں کیا کیا بڑبڑاتا رہا۔ اس مرتبہ قسطینا نے میری ایک نہیں چلنے دی۔ مجھے زبردستی اپنے والی جیکٹ پہنائی۔ وہ مجھے تنگ تھی لیکن کسی نہ کسی طرح اسے ایڈجسٹ کرلیا۔ یہ دوپہر قریباً ایک بجے کا وقت تھا۔ کل رات کی نسبت دن کی روشنی میں خطرہ زیادہ تھا۔ بہرحال میں کھوہ سے باہر نکلا۔ کسی وقت ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل چلتا اور کسی وقت کرالنگ کرتا اس مضروب شخص تک پہنچ گیا۔ وہ دو تین فٹ گہرے گڑھے میں پڑا تھا اور غشی کی سی حالت میں تھا۔ میں بوتل میں تھوڑا سا پانی لے کر گیا تھا۔ میں نے رومال گیلا کر کے اس کے چہرے پر

پھیرا۔ خون اور گرد وغبار کے اندر سے اس کے نقوش نظر آئے تو میں چونکنے پر مجبور ہو گیا۔ میں شکیل کے اس ساتھی کو جانتا تھا۔ اس بندے کے ساتھ آغاز میں ہی میرا ٹاکرا ہو گیا تھا اور ٹھیک ٹھاک ہوا تھا۔ یہ درمیانی عمر اور پست اخلاق کا مالک پاشا تھا۔ یہی وہ بندہ تھا جس نے شراب نوشی اور عیش کوشی کے عوض اپنی ''ٹیچر بیوی'' ناہید کو شکیل داراب کے حوالے کر دیا تھا۔ اب اس بندے کی حیثیت شکیل داراب کے مستقل پالتو کی سی تھی۔ اس نے خون آلود پلکیں اٹھا کر خالی خالی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے پانی کی بوتل اس کے منہ سے لگائی...... اور گیلے رومال سے اس کے چہرے کو ہوا دی۔ چند گھونٹ پی کر اس کے حواس کچھ بحال ہوئے۔ ''تت......تم......شاہ زیب ہو ناں؟'' اس نے میری طرف انگلی اٹھائی اور نہایت کمزور آواز میں کہا۔

''اور تم پاشا ہو۔ میں نے پہچان لیا ہے۔ اب ہمت کرو۔ زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ چند میٹر کی بات ہے۔ تم محفوظ ہو جاؤ گے۔ اسی طرح لیٹے لیٹے میرے ساتھ آگے کو رینگتے چلے جاؤ۔''

''مجھ میں اب ہمت نہیں ہے۔ مجھے لگتا ہے میری ٹانگوں سے جان نکل چکی ہے۔''

''میں تمہیں سہارا دوں گا۔'' میں نے اس کی فربہ اور پلپلی کمر کے گرد اپنا بازو لپیٹتے ہوئے کہا۔

اس کے جسم کا بہت سا خون ضائع ہو چکا تھا۔ رنگ ہلدی کی طرح تھا۔ ہم رینگتے ہوئے آگے بڑھے۔ وہ چند میٹر کا فاصلہ بہت طویل محسوس ہوا۔ ہر گھڑی یہی دھڑکا تھا کہ ابھی ایک تڑتڑاہٹ گونجے گی اور ہم چھلنی ہو کر یہیں پڑے رہ جائیں گے۔ قسطینا جوابی فائرنگ کے لیے پوری طرح تیار تھی۔ بہر طور خیریت گزری اور ہم کھوہ میں داخل ہو کر پتھروں کی اوٹ میں پہنچ گئے۔

''یہ شکیل کا قریبی ساتھی پاشا ہے۔'' میں نے قسطینا کو اطلاع دی۔

''کیا پوزیشن ہے؟''

''دونوں ٹانگوں میں گولی لگی ہے۔ بہت خون ضائع ہو گیا ہے۔ ایک گولی پیٹ میں لگی ہے اور دوسری کندھے کا گوشت چیر کر نکل گئی ہے۔'' میں نے قسطینا سے انگلش میں بات کی تھی۔ میرا خیال تھا کہ پاشا انگلش سے نابلد ہے لیکن ایسا نہیں تھا۔

پاشا نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''بائیں ٹانگ والی گولی آر پار ہو گئی ہے مگر دائیں ٹانگ والی اندر ہی ہے۔''

میں نے سعید کھوکھر کے ساتھ مل کر سب سے پہلے پاشا کے جسم سے خون کا اخراج روکا۔ اپنے حصے کا کچھ پانی تو میں بنارس کو پلا چکا تھا، باقی پاشا کو پلا دیا۔ دارج کے سامان میں دودھ کے دو تین چھوٹے پیکٹ بھی موجود تھے۔ اس دودھ کے چند گھونٹ پینے کے بعد پاشا کی حالت قدرے بہتر محسوس ہونے لگی، لیکن میں جانتا تھا کہ یہ عارضی بہتری ہے اور سعید کا خیال بھی یہی تھا۔ پاشا کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ چکا تھا۔ اسے اس وقت اسپتال میں ہونا چاہیے تھا۔ وہ کچھ بولنے کے قابل ہوا تو میں نے پوچھا۔ ''یہ سب کیا ہے پاشا؟ کیسے زخمی ہوئے ہو؟''

پاشا کی آنکھوں میں خوف اور دہشت نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ اٹک اٹک کر بولا۔ ''وہ بہت ظالم ہیں...... شاید انسان ہی نہیں ہیں۔ انسانوں کے روپ میں چیر نے پھاڑنے والے جانور ہیں۔''

''کن کی بات کر رہے ہو؟'' میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

''وہی...... گنجے سروں والے...... جن کے ساتھ ہم یہاں پہنچے تھے۔ شکیل صاحب کا خیال تھا...... اور ہمارا بھی تھا کہ...... یہ ہمارے دوست ہیں لیکن...... یہ برے سے برے دشمنوں سے بھی برے ہیں۔ انہوں نے...... مار ڈالا ہے...... سب کو۔''

''کن کو؟''

''سب کو۔ بنارس کے علاوہ ہم کل آٹھ بندے تھے جو ان کے ساتھ وہاں مندر میں پہنچے تھے...... بعد میں ہم...... تم لوگوں کے پیچھے یہاں پہنچے...... ہم تم لوگوں پر فائر کھولنا نہیں چاہتے تھے۔ ہمیں پتا تھا کہ دارج صاحب اور ان کے گھر والے...... یہاں تم لوگوں کے ساتھ ہیں۔ ہم شکیل صاحب کو بھی...... یہاں بلانا چاہتے تھے مگر یہ سفید سؤر نہیں مانے...... انہوں نے ہم سے جھگڑا کیا...... ہمارے موبائل چھین لیے...... پھر...... پھر ایک دم ہم پر گولیاں چلا دیں...... انہوں نے ایک طرح سے ہم آٹھوں کو ہی مار ڈالا تھا۔ وہ مینہ کی طرح ہم پر گولیاں برسا رہے تھے۔ پورا کمرا خون سے بھر گیا تھا۔ میں لاشوں کے نیچے آ گیا...... اور شاید...... اسی وجہ سے...... اب تک سانس لے رہا ہوں۔''

''یہ کل کتنے لوگ ہیں وہاں؟'' میں نے پاشا سے پوچھا۔

''ایک درجن سے کم تو نہیں ہیں...... زیادہ ہی ہوں گے...... پتا نہیں کہ تم لوگ ان کے بارے میں ٹھیک سے جانتے ہو یا نہیں۔ یہ عام انسانوں کی طرح نہیں ہیں۔ یہ...... بغیر کسی وجہ کے، شوق سے بھی...... بندے کو مار دیتے ہیں......'' کرب کے عالم میں اس نے آنکھیں

بند کرلیں۔

دو گھونٹ پانی پینے کے بعد اس کے ہونٹ ذرا تر ہوئے تو اس نے ہمیں بتایا کہ کس طرح مندر کی طرف جاتے ہوئے ان شرابی جانوروں نے ایک گدھا سوار راہ گیر کو بغیر کسی وجہ کے گولیاں ماردی تھیں۔ سوار اور اس کا گدھا موقع پر ہی گر کر تڑپنے لگے تھے۔ پاشا بغور قسطینا کی طرف بھی دیکھ رہا تھا۔ مجھ سے پوچھنے لگا۔ ''کیا یہی وہ فوجی کمانڈر ہیں جو برونائی سے آئی ہیں؟''

میں نے وضاحت کی کہ یہ برونائی سے نہیں ایک قریبی جزیرے جاما جی سے آئی ہیں۔

پاشا نے بتایا کہ ان سرخ لباسوں والے شیطانوں کی انچارج لڑکی ہے، وہ تمہاری اس فوجی ساتھی کے خلاف طیش سے بھری ہوئی ہے۔ بدلہ لینے کی باتیں کررہی تھی، کہہ رہی تھی کہ اس فوجی کی وجہ سے ایسٹرن اور اس کے ساتھی ان کے قبضے سے نکلے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ پاشا لاہور والے واقعے کی بات کررہا ہے۔ پھر مجھے دارج کی دبنگ والدہ کا خیال آیا۔

میں نے پاشا سے پوچھا۔ ''کیا یاسمین بیگم تمہاری موجودگی میں وہاں پہنچی تھیں؟''

اس کے چہرے کا کرب کچھ اور بڑھ گیا۔ ''تم دارج صاحب کی والدہ کی بات کررہے ہو؟'' میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ لرزاں آواز میں رک رک کر بولا۔ ''اس وقت...... میں ساتھیوں کی لاشوں کے نیچے پڑا تھا۔ مجھے بس ان کی آواز ہی سنائی دے رہی تھی...... وہ...... وہ ان کے کپڑے پھاڑ رہے تھے، ان کے بال کھینچ رہے تھے پھر وہ...... جان بچانے کے لیے بھاگیں...... اور اسی کمرے میں آگئیں جہاں میں...... سانس روکے پڑا تھا۔ وہ بری حالت میں تھیں...... وہ بلند آواز میں ہنستے اور چلاتے ہوئے ان کے پیچھے آئے اور کھینچ کر لے گئے۔ ادھ کھلے دروازے میں سے مجھے...... سب کچھ...... نظر آیا۔''

وہ سانس لینے کے لیے رکا۔ اس کا چہرہ خوف سے سفید ہورہا تھا۔ میں نے اسے مزید دو گھونٹ پانی پلایا...... اس پانی میں سعید نے فوری انرجی کا کوئی سیرپ بھی ملایا تھا۔ ایک دو منٹ بعد پاشا نے سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ ''میڈم نے ایک بار پھر خود کو چھڑا لیا اور واپس بھاگنا چاہا...... مگر...... بھاری جسم کی وجہ سے وہ ایک ڈھلوان پر گر گئیں۔ ان کا سر کسی پتھر سے ٹکرایا...... مجھے لگتا ہے کہ وہ...... اسی وقت ختم ہوگئی تھیں۔ ان وحشی جانوروں نے ان کا گلا کاٹا اور ان کا خون ایک فلاسک میں جمع کیا...... جسے بعد میں وہ وہسکی میں ملا کر پیتے رہے۔ وہ انسانوں کے روپ میں بلائیں ہیں۔ وہ کچھ بھی کرسکتی ہیں، ان کے قد کاٹھ...... ان کے چہرے...... ان کی خصلتیں، سب کچھ ایک جیسا ہے......'' پاشا دھیمی آواز میں بول رہا تھا

اور ساتھ ساتھ نظر اٹھا کر دور لیٹے دارج کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا۔ یقیناً ہماری طرح وہ بھی یہی چاہتا ہوگا کہ دارج کی ماں کا دردناک انجام دارج کے علم میں نہ آئے۔

چند سیکنڈ بعد وہ سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''ان درندوں نے میڈم کا گوشت کاٹ کاٹ کر اپنے ہاؤنڈ کتوں کے آگے پھینکا۔ میں نے یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔''

اسی اثنا میں دور کہیں ہیلی کاپٹر کی آواز سنائی دینے لگی۔ میری طرح پاشا اور قسطینا نے بھی چونک کر یہ آواز سنی۔ ہم نے اَبر آلود آسمان پر نگاہیں دوڑائیں مگر ہیلی کاپٹر نظر نہیں آیا۔

''شاید یہ ہمیں ہی ڈھونڈ رہا ہو۔'' پاشا نے کراہتے ہوئے کہا۔

میں بولا۔ ''تم نے ڈھونڈنے کی بات کی ہے تو ذہن میں سوال آ رہا ہے کہ اتنا بڑا واقعہ ہو چکا ہے۔ دارج داراب اپنی فیملی سمیت غائب ہے۔ پولیس اور دیگر لوگ اب تک اس جگہ کو کیوں نہیں ڈھونڈ سکے؟''

''ان کو بڑی حد تک دھوکے میں رکھا گیا ہے۔'' پاشا نے کہا۔

''کیا مطلب؟''

''ہماری ہی زبانی ان کو کہلوایا گیا ہے کہ ہم بڑے برساتی نالے کے دوسرے طرف والے علاقے میں ہیں۔ یہ لفظ مجھ سے ہی کہلوائے گئے تھے۔ انہوں نے میرے سر سے رائفل لگائی ہوئی تھی اور میری گردن پر ایک فٹ لمبا چھرا رکھا ہوا تھا۔ جب ایس ایس پی صاحب کا فون آیا تو ان سرخ کپڑوں والوں نے مجھے مجبور کیا کہ...... میں پولیس کو غلط اطلاع دوں۔'' پاشا نے ذرا توقف کیا اور اپنی سانس درست کرتے ہوئے بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ پولیس اور دوسرے لوگ ہماری تلاش کے لیے سارا زور نالے کی دوسری طرف والے علاقے میں لگا رہے ہیں۔ وہ جگہ یہاں سے دس پندرہ کلومیٹر مشرق کی طرف ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ظاہر ہے کہ تم نے ایس ایس پی صاحب سے اردو یا پنجابی میں بات کی ہوگی۔ اس غیر ملکی گینگ کے لوگ اردو، پنجابی کہاں سمجھتے ہیں۔ تم ایس ایس پی کو درست جگہ بتا سکتے تھے۔''

''آ...... آپ ٹھیک کہتے ہو لیکن اس وقت عقل نے اتنا کام ہی نہیں کیا۔''

ہیلی کاپٹر کی آواز ایک بار پھر سنائی دی مگر اب وہ مزید دور سے آ رہی تھی۔ میں نے بغور پاشا کی حالت دیکھی۔ اگر اس کے پیٹ کی سرجری نہ ہوتی تو اگلے پانچ چھ گھنٹوں تک اس کا زندہ رہنا محال نظر آتا تھا۔ وہ عادی نشے باز اور عیش پرست تھا۔ اس کا جسم کھوکھلا ہو چکا تھا اور

آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے بہت نمایاں نظر آتے تھے۔ میں اس بات پر متحیر تھا کہ وہ اب تک زندہ کیسے ہے۔

میرے اور قسطینا کے استفسار پر اس نے بتایا کہ انسپکٹر قیصر چوہدری اور لالہ وریام کی موت نے پولیس ڈیپارٹمنٹ میں زبردست کھلبلی مچائی تھی۔ پھر اس کے بعد یہ دارج اور اس کی فیملی کی گمشدگی کا واقعہ ہو گیا۔ اس نے پوری انتظامیہ کی چولیں ہلا کر رکھ دی ہیں۔ بڑے بڑے افسروں کی دوڑیں لگی ہوئی ہیں اور بے شمار مشکوک افراد پکڑے گئے ہیں۔

قسطینا نے اس سے پوچھا۔ ''اب پرندوں اور چمگادڑوں وغیرہ کے حملوں کے بارے میں عام لوگوں کا کیا خیال ہے؟''

پاشا بولا۔ ''یہ خبر میڈیا کے ذریعے بہت زیادہ پھیلی ہے کہ کلر کہار کے قریب نمکین پانی کے کسی چشمے کی طرف جاتے ہوئے دارج صاحب کے قافلے پر پرندوں کا حملہ ہوا ہے...... اور گاڑیوں کے الٹنے کی وجہ سے کئی بندوں کی ہلاکت ہوئی ہے۔ اب لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ یہ کوئی عام پرندے یا جانور نہیں ہیں۔ ان کو خاص طریقے سے سدھایا گیا ہے، یا پھر یہ جادوٹونے والی بات ہے۔ لوگوں میں خاص طور سے کم پڑھے لکھے لوگوں میں بہت ڈر پایا جاتا ہے۔''

کھوہ کے عقبی حصے میں موجود دارج کا درد تو کچھ کم تھا (کیونکہ سعید نے اسے ٹرپل ڈوز دے دی تھی) تاہم وہ پہلے سے زیادہ بے چین نظر آتا تھا۔ وہ پاشا کو دیکھ چکا تھا اور شاید پہچان بھی چکا تھا۔ وہ اس سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔ پہلے تو وہ اسے پکارتا رہا پھر گرجنا برسنا شروع کر دیا۔ مجھے اور قسطینا کو پھر اندیشہ پیدا ہوا کہ وہ کہیں تاجور کے درپے نہ ہو جائے۔ جیسے پانی جلدی سے نشیب کی طرف آجاتا ہے، وہ ہر طرف اور ہر طرح کا غصہ تاجور پر نکالنا شروع کر جاتا تھا۔

میں نے دارج کے پاس جا کر کہا۔ ''وہ بہت زیادہ زخمی ہے۔ تمہارے پاس کیسے آسکتا ہے۔''

''کیا بکتا ہے وہ...... کیسے پہنچا ہے یہاں...... اور...... والدہ کے بارے میں کیا بتاتا ہے؟''

میں نے جھوٹ بولا۔ ''والدہ کے بارے میں اسے کچھ پتا نہیں۔ خود بڑی مشکل سے بچ کر یہاں تک آیا ہے۔ تم دیکھ ہی رہے ہو اس کی دونوں ٹانگوں میں گولیاں لگی ہوئی ہیں پیٹ میں بھی۔''

''موبائل فون نہیں ہے اس کے پاس؟''

''موبائل فون گینگ والوں نے پہلے چھینا تھا...... اور صرف پاشا کا ہی نہیں، سب کے چھین لیے تھے۔''

پھر میں نے مختصر الفاظ میں وہ سب کچھ دارج کے گوش گزار کیا جو وہاں پیش آچکا تھا۔ بس یہ بات چھپائی کہ اس کی دبنگ والدہ کا کٹا ہوا سر سامنے ایک گاڑی کی چھت پر رکھا ہے۔ دارج کا بالائی وجود، غصے اور خوف آمیز حیرت کے سبب لرزنے لگا تھا۔

تاجور کسی خدمت گار کی طرح دارج کے سرہانے گم صم کھڑی تھی۔ دارج کی موجودگی میں اسے کچھ کہنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی تھی۔ دارج اب سمجھ گیا تھا کہ یہاں سے ان کا بچ نکلنا آسان نہیں ہوگا۔ شکیل داراب نے جن لوگوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کیا تھا، وہ کسی کے دوست نہیں تھے۔ وہ بس خون آشام تھے اور انہوں نے اس کھوہ کا محاصرہ کرلیا تھا۔ دارج نے ذرا حسرت سے اس بیکار موبائل فون کو دیکھا جسے اس نے کل اپنے ہاتھوں سے ٹکڑے کیا تھا۔

○......❖......○

ابھی سورج غروب ہونے میں دیر تھی لیکن اندھیرا محسوس ہونے لگا تھا۔ یہ ستمبر کی ایک ابر آلود سہ پہر تھی اور تیز ہوا بھی چلنا شروع ہوگئی تھی۔ ایک بار پھر ہیلی کاپٹر کی مدھم آواز ہوا کے دوش پر تیر کر ہم تک پہنچی۔ قسطینا نے پکار کر کہا۔ ''شاہ زائب! یہ دیکھو...... وہ لوگ کیا کررہے ہیں؟''

میں تیزی سے دہانے کے پاس پہنچا۔ قسطینا نے انگلی سے فاصلے پر اشارہ کیا۔ ڈیتھ اسکواڈ کے لوگ اپنی تینوں گاڑیوں کو حرکت میں لے آئے تھے۔ ''کیا...... وہ...... ہماری طرف آرہے ہیں؟'' سعید کھوکھر نے ہکلا کر پوچھا۔

''نہیں، میرا خیال ہے وہ ان گاڑیوں کو کہیں چھپا رہے ہیں۔ ہیلی کاپٹر کی نظر سے بچانا چاہتے ہیں۔'' قسطینا نے وثوق سے کہا۔

اس کا اندازہ درست تھا۔ وہ لوگ گاڑیوں کو گھنی جھاڑیوں کے نیچے لے گئے تھے۔ ایک گاڑی ایک چٹان کے سائبان تلے کھڑی کردی گئی تھی۔ ٹیلی اسکوپ مجھے سب کچھ صاف دکھا رہی تھی۔

''لیکن ہمارے والی جیپ تو وہیں گڑھے میں پھنسی ہوئی ہے۔'' قسطینا نے کہا۔ ''شاید وہ اوپر سے دکھائی دے جائے۔''

ابھی قسطینا کا فقرہ مکمل بھی نہیں ہوا تھا کہ ہمیں اپنی پھنسی ہوئی جیپ کے قریب حرکت

نظر آئی۔ شیطان زادوں میں سے کوئی ایک جیپ کے عقب میں موجود تھا۔ وہ ہمیں دکھائی
نہیں دے رہا تھا لیکن وہ جو ''جھاڑ جھنکاڑ'' جیپ کے اوپر پھینک رہا تھا وہ ہمیں نظر آ رہا تھا۔
اس نے کئی بڑی بڑی ٹہنیاں کاٹ کر جیپ کے اوپر پھینک دیں اور اسے تقریباً کیموفلاج کر
دیا۔

اسی دوران میں، میں اپنی اسنیپر گن کے ذریعے اسے مسلسل نشانے پر لینے کی کوشش
کرتا رہا۔ بالآخر میں اس کی ٹانگ کو نشانہ بنانے میں کامیاب ہوا۔ اس دور مار گن کی گولی نے
یقیناً اس شیطان زادے کی ایک پنڈلی چکنا چور کر دی تھی۔ میں نے اسے زمین پر گرتے اور
پھر واپس اپنی پوزیشنوں کی طرف جاتے دیکھا۔

قریباً یہی وقت تھا جب تیز ہوا کے ساتھ گرج چمک شروع ہوئی اور وادی سون کے اس
سنسان علاقے میں موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔

ہیلی کاپٹر کی آواز ایک بار پھر سنائی دی۔ اس مرتبہ یہ آواز نسبتاً قریب سے آئی تھی مگر
ہیلی کاپٹر دکھائی پھر بھی نہیں دے رہا تھا۔ قسطینا نے کہا۔ ''شاہ زائب! میرا خیال ہے کہ ہمیں
اس ہیلی کاپٹر کو متوجہ کرنے کے لیے کچھ فائر کرنے چاہئیں۔''

میں نے قسطینا کی تائید کی۔ بے شک شکیل داراب کے لوگ بھی ہمارے لیے اتنے ہی
خطرناک تھے جتنے کہ ڈیتھ اسکواڈ کے یہ قاتل مگر شکیل داراب کے حوالے سے ہمیں ایک
''ایڈوانٹیج'' حاصل تھا۔ وہ دارج کی موجودگی میں ہم پر حملہ نہیں کر سکتا تھا۔

قسطینا نے طاقتور ایم جی تھری کا رخ آسمان کی طرف کیا اور عمودی رخ پر تین برسٹ
چلائے۔ یہ طاقتور گن تھی اور اس کی خاصی آواز تھی مگر اس طوفان بادوباراں میں پتا نہیں ک
اس کی آواز کہاں تک گئی...... اور ہیلی کاپٹر والے اسے نوٹ کر پائے یا نہیں۔ موسم تیزی سے
خراب ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے بعد ہمیں دوبارہ ہیلی کاپٹر کی آواز سنائی نہیں دی۔ یقیناً مو
کے تیور دیکھ کر وہ اپنے ٹھکانے کی طرف چلا گیا تھا۔

شدید زخمی پاشا کو میں نے سہارا دے کر اٹھایا۔ سعید نے اس کے عقب میں ایک کمبل
تہ کر کے رکھا اور ہم نے اسے نیم دراز کر دیا۔ وہ دہانے سے باہر موسلا دھار برستی بارش کو دی
رہا۔ شاید اسے بھی یہی لگ رہا تھا کہ وہ اپنی زندگی کی آخری بارش دیکھ رہا ہے۔ وہ مکمل طور
ایک بھٹکا ہوا شخص تھا لیکن اس وقت موت کے گھیرے میں تھا۔ رک رک کر بولا۔ ''م
اندازہ ہے کہ شام کے بعد...... اندھیرا ہوتے ہی...... یہ لوگ یہاں ہلا بول دیں گے۔ ا
کے پاس سات آٹھ جدید رائفلیں ہیں۔ اس کے علاوہ پستول ہیں۔ ان کی سرغنہ لڑکی ہ

اس کے پاس قریباً ایک فٹ لمبا تیز دھار چھرا بھی ہے، جس کے ایک طرف دندانے ہیں۔ وہ ان میں سب سے زیادہ خطرناک ہے۔''

پھر وہ رک کر مزید دھیمے لہجے میں بولا۔ ''میں نے کل رات آخری پہر ان خبیثوں کی باتیں سنی تھیں۔ وہ ایک دوسرے کو بہت گندے لطیفے سنا رہے تھے اور ماں بہن کی گالیاں دے رہے تھے۔ ان کی باتوں میں دارج صاحب کی وائف کا ذکر بھی خاص طور سے آیا۔ وہ بڑے لوفر انداز میں ان کی خوب صورتی کے بارے میں باتیں کر رہے تھے، کسی انگلش رسالے میں چھپی ہوئی تصویر ان کے پاس تھی، یہ دارج صاحب کی وائف کی تصویر تھی......'' وہ مزید بھی کچھ کہنا چاہتا تھا مگر پھر چپ رہا۔

میرا یہ اندازہ بالکل درست ثابت ہو رہا تھا کہ اگر میں خود کو ان کے حوالے کر بھی دوں تو اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ وہ باقیوں کو پھر بھی معاف نہیں کریں گے۔ ان کا واحد علاج ان کی موت تھی۔ جیسے موذی جانوروں کو بے جھجک تلف کر دیا جاتا ہے۔

یقینی بات تھی کہ پاشا کے جسم کے اندر بھی بلیڈنگ ہو رہی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس کا بجھا سا چہرہ مزید بجھ رہا تھا۔ رنگ زرد ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اس نے دھندلائی ہوئی سی نظروں سے ساری کھوہ کا جائزہ لیا اور بولا۔ ''تمہارے ساتھ تمہارا ساتھی فخر بھی تو تھا، اس کے علاوہ ایک لمبے قد کا پٹھان تھا؟'' وہ فارس جان کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔

پاشا کے اس سوال نے اس بات کی تصدیق کر دی کہ شیطان زادی نے فخر اور فارس کے حوالے سے جھوٹ بولا تھا۔ وہ دونوں ان کے قبضے میں نہیں تھے۔ میں نے پاشا کو بتایا کہ چمگادڑوں کے حملے کے وقت سب تتر بتر ہو گئے تھے اس لیے شاید وہ بھی کسی طرف نکل گئے ہیں۔

بارش موسلا دھار تھی اور مسلسل ہو رہی تھی۔ اب شام بھی ہو چکی تھی اس لیے اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ قسطینا اور میں دونوں جانتے تھے کہ اب ہمیں زیادہ چوکس رہنے کی ضرورت ہے۔ وہ خون آشام بلائیں جن کے نزدیک اپنی زندگی اور موت کی بھی کچھ زیادہ اہمیت نہیں تھی، کسی بھی وقت ہم پر جھپٹ سکتی تھیں۔

میں نے قسطینا کو کچھ دیر کے لیے ایم جی تھری کے سامنے سے ہٹا دیا اور یہ ڈیوٹی خود سنبھال لی۔ بھوک نے اب نقاہت کی شکل اختیار کر لی تھی۔ پیٹ میں جیسے بل سے پڑے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے تاجور نے دارج کی نظر بچا کر قسطینا کو بسکٹس کی پیشکش کی تھی۔ یہ وہی بسکٹس تھے جو دارج کے ذاتی سامان میں موجود تھے۔ قسطینا نے یہ پیشکش قبول نہیں کی

تھی۔ وہ جانتی تھی یہ بہت تھوڑی مقدار میں ہیں اور دارج کے علاوہ زخمی پاشا اور بنارس کو بھی ان کی ضرورت پڑسکتی ہے۔

میں نے کھوہ کی دیوار سے ٹیک لگالی۔ ایم جی تھری اسٹینڈ پر تھی۔ میں نے شہادت کی انگلی گن کے ٹریگر پر رکھی ہوئی تھی اور ریڈ الرٹ تھا۔ بارش ٹیلوں، گھاٹیوں اور ڈھلوانوں پر تواتر سے برس رہی تھی۔ اس کا شور ایک عجیب سی گونج پیدا کر رہا تھا۔ میرا دھیان اپنے ہمدم سجاول سیالکوٹی کی طرف چلا گیا۔ اسے بھی پہاڑی علاقے کی موسلا دھار بارشیں بہت پسند تھیں۔ کیا وہ اب کبھی ایسی بارش نہیں دیکھ سکے گا۔ اب کبھی اپنی خورسنہ کو نہیں دیکھ سکے گا؟ وہی خورسنہ جس سے اس نے کبھی کھل کر اظہارِ محبت نہیں کیا تھا لیکن جسے وہ دل و جان سے چاہتا تھا۔ اسے اور اس کے بچے کو بچانے کے لیے اس نے بڑی قربانی دی تھی۔ اگر ہم بروقت نہ پہنچ جاتے تو شاید وہ اپنی جان بھی ہار چکا ہوتا۔ اب بھی وہ پتا نہیں کس حال میں تھا؟ اس جی دار ساتھی کی یاد نے میرا دل درد سے بھر دیا۔ اس کے ساتھ ہی ہاناوانی کا مکروہ چہرہ نگاہوں میں گھومنے لگا۔ میں جلد از جلد اس بدذات عورت کا سامنا کرنا چاہتا تھا لیکن درمیان میں یہ شیطان صفت گینگسٹر ٹپک پڑے تھے۔ ان کی کمر ٹوٹ چکی تھی لیکن وہ ابھی مکمل طور پر مرے نہیں تھے اور حالات کی ستم ظریفی نے وادیٔ سون کے ان ویران ٹیلوں میں ہمیں ان کے حصار میں دے دیا تھا۔

پھر میری سوچ زخمی رضوان اور پہلوان حشمت وغیرہ کی طرف چلی گئی۔ مجھے یقین تھا کہ داؤد بھاؤ کے راوی فارم میں وہ بالکل محفوظ ہوں گے اور رضوان کا علاج بھی ٹھیک سے ہو رہا ہوگا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ داؤد بھاؤ نے سجاول کو بھی راوی فارم میں ہی پہنچا دیا ہو۔ مجھے امید تھی کہ ولید اور پہلوان حشمت بہت اچھی طرح ان کی دیکھ بھال کر رہے ہوں گے۔ پہلوان حشمت ایک نہایت انسان دوست اور بے لوث شخص تھا۔ اپنی جان خطرے میں ڈال کر بھی دوسروں کے کام آنا اس کی خو تھی۔ مجھے یاد آیا کہ اس نے کس طرح ابھی تک تاجور کا زیور سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ یہ وہی زیور تھا جو میں نے نکاح سے پہلے تاجور کے لیے بنوایا تھا، پھر سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا۔ تاجور کسی اور کی بن گئی اور میں نے وہ زیور غلطی سے پہلوان حشمت کے حوالے کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اس سے اپنے معاشی حالات کچھ بہتر کر لے گا مگر وہ اب بھی پتا نہیں کس امید کے سہارے ان زیورات کو سنبھالے بیٹھا تھا۔ لاہور میں قیام کے دوران میں ایک دن میں نے اس سے کہا تھا۔ ''پہلوان جی، آپ وہ زیور مجھے واپس دے دیں۔''

وہ ترنت بولا تھا۔ ''جب ایک دفعہ تحفہ دے دیوت ہیں تو پھر واپس ناہیں لیتے۔ سیانے بھی یہی کہوت ہیں کہ نیکی کر اور دریا میں جا کر اپنے منہ میاں مٹھو نہ بن۔''

''آپ تحفے کی بات کر رہے ہو لیکن آپ نے یہ تحفہ لیا ہی کب ہے۔ اس کو پوٹلی بنا کر رکھا ہوا ہے۔''

''یہ اب میری مرضی ہے کہ میں اسے کیسے استعمال کرتا ہوں۔''

''میں جانتا ہوں، آپ ایک ایسی امید پال رہے ہیں جس کا پورا ہونا ممکن نہیں......اور شاید اب میں بھی نہیں چاہتا کہ ایسا ہو۔ براہِ مہربانی آپ ان گہنوں کو بیچ کریا تو استعمال کریں یا پھر مجھے واپس کر دیں۔''

''تا کہ تم انہیں کسی گندے نالے میں پھینک دو۔ اس سے بہتر ہے کہ یہ میرے پاس ہی پڑے رہیں۔'' پھر اس نے ایک شعر پڑھا تھا جس نے سارا ماحول ہی بدل دیا تھا۔

میں پہلوان کی باتوں کو یاد کر رہا تھا اور قسطینا پاشا کے پاس بیٹھی اس کے پیٹ کے زخم سے رِسنے والا خون بند کر رہی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ پاشا سے باتیں بھی کر رہی تھی۔ پاشا ٹوٹی پھوٹی انگلش میں اس کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''وہ بدروحوں کی طرح ہیں۔ کسی وقت تو لگتا ہے کہ وہ بدروحیں ہی ہیں۔ عام لوگوں کی شکلیں ایک دوسرے سے اتنی ملتی جلتی کیسے ہو سکتی ہیں۔''

قسطینا نے کہا۔ ''تم اس لڑکی کا بتا رہے تھے جسے یہ لوگ راستے سے پکڑ کر لائے تھے۔''

''وہ لڑکی نہیں تھی، اٹھائیس تیس سال کی جوان عورت تھی۔ اپنے خاوند کے ساتھ سڑک کے کنارے کھڑی تھی...... اس وقت ہم آپ لوگوں کو گھیر نے مندر کی طرف جا رہے تھے۔ بنارس نے گاڑی روک کر مندر کا راستہ پوچھا تھا۔ ان لال کپڑوں والے شیطانوں نے لڑکی کو اٹھا کر گاڑی میں ڈال لیا......اور راستہ بتانے والے کے پیٹ میں چھرا مار کر اس بے چارے کی انتڑیاں باہر نکال دیں۔''

''وہ لڑکی اب کہاں ہے؟''

''ان کے پاس ہی ہو گی۔ اس کا جو حال ہوا ہو گا، وہ بتانے کی ضرورت ہی نہیں۔'' پاشا نے نحیف آواز میں کراہتے ہوئے کہا۔ یوں لگتا تھا کہ اب اس پر غشی طاری ہو رہی ہے۔

بادل زور سے گرجا اور بارش تیز ہو گئی۔ چند سیکنڈ بعد ایک بار پھر بجلی چمکی اور کھوہ کے سامنے تاریک نشیب و فراز اور ٹیلے دور تک روشن ہو گئے۔ ان ٹیلوں میں ہی کہیں ایک گاڑی کی چھت پر یاسمین بیگم کا کٹا ہوا سر بھی دھرا تھا۔ یا عین ممکن تھا کہ گاڑیوں کی جگہ تبدیل کرتے

وقت وہ سر نیچے لڑھک گیا ہو اور ڈیئر ہاؤنڈز اپنے نکیلے دانتوں سے اس کے بھی چیتھڑے اڑا چکے ہوں۔ یہ سارا تصور ہی بے حد لرزہ خیز تھا۔

''کوئی آ رہا ہے۔'' یکا یک قسطینا نے چونکی ہوئی آواز میں کہا۔

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ چمکتی بجلی میں، میں نے بھی کسی متحرک چیز کو دیکھا تھا۔ وہ برق رفتاری سے ہماری طرف بڑھ رہی تھی۔ میں نے گن کے دستے پر گرفت مضبوط کی۔ اسے ہماری خوش قسمتی ہی کہنا چاہیے کہ بجلی ایک بار پھر زور سے چمکی۔ ہمارے سامنے کوہ و دمن دور تک روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گئے۔ میں نے دو ڈیئر ہاؤنڈز کو دیکھا جو خوفناک انداز میں ہماری طرف جھپٹ رہے تھے۔ ان کے چھریرے بدن، پتلی گردنیں اور لمبی تھوتھنیاں، سب کچھ واضح دکھائی دیا۔ ہماری کھوہ سے ان کا فاصلہ تیس چالیس میٹر سے زیادہ نہیں تھا...... ہاں میں اسے اپنی بڑی خوش قسمتی ہی کہوں گا۔ اگر آسمانی بجلی کے سبب میں انہیں دیکھ نہ سکتا تو ان کی خونی یورش کا پتا اس وقت چلتا جب وہ ہمارے سروں پر پہنچ چکے ہوتے اور اس وقت شاید ایم جی تھری جیسی گن بھی ان کا کچھ نہ بگاڑ سکتی۔

''فائر کرو شاہ زائب۔'' قسطینا چلائی۔

میں نے اندھیرے میں اندازے سے ہی نشانہ لے کر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ ''بیلٹ پر لگی گن'' کی گھن گرج سے قرب و جوار لرز گئے۔ میرے دل نے گواہی دی کہ کم از کم وہ دونوں کتے تو ضرور نشانہ بن گئے ہیں۔

لیکن وہ دو نہیں تھے۔ ایک تیسری پرچھائیں مجھے کھوہ سے صرف دس بارہ قدم کی دوری پر نظر آئی۔ میں نے ایک بار پھر ٹریگر کا دباؤ بڑھایا۔ خونخوار جانور نشانہ بنا اور لڑھکتا ہوا دہانے کے عین سامنے گرا۔ یہی وقت تھا جب چوتھا کتا بلائے ناگہانی کی طرح کھوہ میں داخل ہوا اور قسطینا پر جھپٹا۔ یہ سب کچھ اتنا غیر متوقع تھا کہ قسطینا پشت کے بل زخمی بنارس کے قریب گری۔ میری والی اسنیپر گن اس کے ہاتھوں میں تھی لیکن اس کے پاس گن استعمال کرنے کی مہلت ہی نہیں تھی۔ گرتے وقت گن اس کی گرفت سے نکل گئی۔ میں نے اسے بپھرے ہوئے کتے کے ساتھ برسرِ پیکار دیکھا۔

میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ یہی وقت تھا جب سامنے سے اندھا دھند فائرنگ شروع ہو گئی۔ یہ فائرنگ کافی قریب سے کی جا رہی تھی۔ میں نے ایم جی تھری کے ساتھ بھرپور جواب دیا۔ کھوہ کے اندر نہتی قسطینا اور ڈیئر ہاؤنڈ کے درمیان گھمسان کا رَن پڑا ہوا تھا۔ یہی وقت تھا جب میں نے تاجور کو کسی چیل کی طرح ڈیئر ہاؤنڈ پر جھپٹتے دیکھا۔ اس کے ہاتھوں میں

وہی میری والی اسنیپر گن تھی جو اس نے اس کے لمبے بیرل کی طرف سے پکڑ رکھی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے کتے کی کھوپڑی پر ایک طوفانی ضرب لگائی...... پھر دوسری۔ کتے نے قسطینا کو چھوڑا اور پلٹ کر تاجور کی طرف آیا۔ اس کے دھکے سے تاجور گن سمیت دور جا گری۔ قسطینا نے وہ فوجی ڈیگر نکال لیا تھا جس سے اس نے جنون زدہ چمگادڑ کو تہ تیغ کیا تھا۔ وہ جست لگا کر عقب سے ڈیئر ہاؤنڈ پر جا پڑی۔ کتے کے حیوانی شور نے کھوہ میں تہلکہ سا مچا دیا۔

سامنے سے گولیوں کی بوچھاڑ آ رہی تھی۔ ہر طرف چنگاریاں چھوٹ رہی تھیں۔ صاف پتا چلتا تھا کہ ڈیتھ اسکواڈ والوں نے چالبازی دکھائی ہے۔ پہلے ڈیئر ہاؤنڈز کو ہم پر چھوڑا گیا ہے اور جب ہم ان سے برسرِ پیکار تھے تو اسکواڈ کے بدنام زمانہ شوٹر ہمارے سروں پر پہنچ گئے لیکن یہاں بھی کامیابی ان کے لیے سہل نہیں تھی۔ ان کا مقابلہ ایسٹرن کنگ سے تھا اور بے مثال ایم جی تھری گن سے تھا۔ ایم جی تھری کا یہ نیا ماڈل نہایت شاندار تھا۔

میں نے ڈٹ کر جوابی حملہ کیا۔ مخالف سمت سے چلائی جانے والی گولیاں اب کھوہ کے اندر تک آ رہی تھیں۔ پاشا کے لیے خطرہ تھا، اس سے پہلے کہ اس کے لیے کچھ کیا جا سکتا، کلاشنکوف کا ایک برسٹ اس کے سینے اور گردن کو چھلنی کر گیا۔

''ہمت سے شاہ زائب! میں آگئی ہوں۔'' قسطینا کی پُرجوش آواز مجھے اپنے بالکل قریب سنائی دی۔

وہ ڈیئر ہاؤنڈ کا خاتمہ کرنے کے بعد میرے قریب آن بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں آٹومیٹک 8 ایم ایم رائفل تھی۔ ہم نے جم کر فائرنگ شروع کی۔ تابڑ توڑ برستی بارش اور دھاڑتے بادلوں میں یہ ایک زوردار معرکہ تھا۔ سعید کھوکھر لڑائی بھڑائی والا آدمی نہیں تھا، شاید اسے ٹھیک سے رائفل تھامنا بھی نہیں آتی تھی۔ کھوہ کا سب سے محفوظ حصہ عقبی گوشہ تھا جہاں دارج اور تاجور موجود تھے، وہ بھی ان کے پاس سکڑا سمٹا کھڑا تھا۔

حملہ آوروں میں سے کوئی ایک شیطان زادہ کھوہ کے بالکل پاس پہنچ چکا تھا۔ وہ کسی پتھر کی اوٹ میں تھا اور بڑی کارگر فائرنگ کر رہا تھا۔ وہ مجھے مخاطب کر کے دھاڑا۔ ''تجھے چھوڑیں گے نہیں ایسٹرن۔ جو کچھ تُو نے ہمارے ساتھ کیا، اس سے ہزار گنا برا تیرے ساتھ کریں گے۔ تجھے ایک دردناک کہانی بنا دیں گے......''

وہ پتھر کی اوٹ سے نکل کر کھوہ کی طرف آنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا مگر قسطینا نے اسے پوری طرح ٹارگٹ کیا ہوا تھا اور ایک لحظہ کی مہلت بھی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے اپنی

ساری توجہ بائیں جانب مبذول کر رکھی تھی جہاں میرے اندازے کے مطابق شیطان زادوں کی کم ازکم پانچ پوزیشنیں موجود تھیں۔ ریڈ کیٹ بھی یقیناً اسی طرف تھی۔

یہ اندھا دھند فائرنگ کم وبیش پانچ منٹ جاری رہی۔ ہم نے ڈیتھ اسکواڈ والوں کی آگے بڑھنے کی ہر کوشش ناکام بنا دی۔ کچھ دیر بعد اندازہ ہوا کہ وہ پسپا ہو رہے ہیں۔ وہ فائرنگ تو اب بھی کر رہے تھے مگر اب ہم تک پہنچنے والی گولیوں کا زاویہ اتنا خطرناک نہیں رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد فائرنگ تھم گئی۔ بارش کی شدت میں بھی تھوڑی سی کمی واقع ہوگئی تھی مگر بجلی اسی طرح چمک رہی تھی اور بادل دہاڑ رہے تھے۔ ایک ڈیئر ہاؤنڈ کی لاش کھوہ کے عین سامنے پڑی تھی۔ اس کا خون بارش کے پانی کے ساتھ مل مل کر نشیب کی طرف جارہا تھا۔ دوسرا ڈیئر ہاؤنڈ کھوہ کے وسط میں ادھ بجھے انگاروں کے قریب پڑا تھا۔ قسطینا نے اس کی پسلیوں اور پیٹ میں کم ازکم پانچ جگہ فوجی خنجر گھونپا تھا۔ تاجور نے کتے کے سر پر اسنیپر گن کے دستے سے جو ضربیں لگائی تھیں۔ ان میں سے ایک نے اس کی آنکھ کو گہرا زخم دیا تھا۔ شاید یہی زخم تھا جس نے اسے قسطینا پر سے توجہ ہٹانے پر مجبور کیا تھا۔

قسطینا ایم جی تھری کے سامنے آن بیٹھی۔ میں نے آگے بڑھ کر سب سے پہلے پاشا کو دیکھا۔ وہ نیم جان تو پہلے ہی تھا، اب ہر تکلیف سے آزاد ہو گیا تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر کھوہ کی دیوار کے ساتھ لٹا دیا اور اوپر ایک کپڑا ڈال دیا۔ کھوہ میں جگہ جگہ خون تھا اور گولیوں کے خول بکھرے تھے۔

سعید نے میرے قریب آتے ہوئے کہا۔ ”بیگم صاحبہ کے کندھے پر بھی کافی چوٹ آئی ہے، خون نکل رہا ہے۔“ بیگم صاحبہ سے اس کی مراد تاجور تھی۔

میں نے دیکھا وہ دارج کے پاس کھڑی تھی اور اپنے کندھے پر ایک کپڑا رکھ کر دبایا ہوا تھا۔

سعید نے کہا۔ ”جب کتا ان پر جھپٹا تو یہ پیچھے کی طرف گری تھیں، اس وقت کسی پتھر کی چونچ ان کو لگی ہے۔“

”زخم زیادہ تو نہیں؟“

”نہیں...... لیکن تھوڑا گہرا ہے۔ خون نکل رہا ہے۔“

سامنے سے اِکا دُکا فائر اب بھی آرہے تھے جن کا جواب قسطینا بڑی مستعدی سے دے رہی تھی۔ دارج نے ایک بار پھر بڑھتے ہوئے درد کی وجہ سے واویلا شروع کر دیا۔ اس مرتبہ سعید کی شامت آئی۔ اس نے سعید کے اہلِ خانہ سے نازیبا رشتے جوڑے...... اسے سخت برا

بھلا کہا کہ وہ اس کا درد کم کرنے کے لیے کچھ کر نہیں پا رہا۔
سعید لرزتا کانپتا اس کے پاس پہنچ گیا۔ پہلے اسے عین اپنی ناف میں دارج کی ایک زوردار کہنی کھانا پڑی، پھر دارج کی پھینکی ہوئی ایک پلیٹ اچٹتی ہوئی سی اس کے سر پر لگی۔ تب وہ اپنے میڈیکل باکس کی طرف متوجہ ہو گیا اور کوئی دوا یا آئنٹمنٹ ڈھونڈنے لگا۔ وہ کل شام سے قریباً مسلسل اس کی تیمارداری میں لگا ہوا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ تھک کر ہلکان ہو چکا ہے، اس کے علاوہ وہ اردگرد کی صورتِ حال کے سبب بے حد دہشت زدہ بھی تھا، اس کے باوجود وہ ''کروٹ کے بل لیٹے دارج'' کی پشت کے مساج میں مصروف ہو گیا۔ اس کی سانولی پیشانی پسینے سے تر تھی۔
پھر میری نگاہ تاجور کے کندھے پر پڑی۔ کندھے کی پچھلی جانب گردن کے قریب چوٹ آئی تھی اور خون رِس رہا تھا۔ اس کی ہلکی سبز قمیص اس جگہ سے سرخ دکھائی دینے لگی تھی۔ کیونکہ وہ پشت کے بل گری تھی اور چوٹ کندھے کی عقبی سمت میں تھی اس لیے اسے خود بھی ٹھیک سے اندازہ نہیں تھا کہ خون کا رساؤ زیادہ ہے۔ میں اس کے پاس گیا اور کہا۔ ''مسز دارج! آپ کو کافی چوٹ آئی ہے۔ خون نکل رہا ہے۔''
میں نے میڈیکل باکس کھولا۔ طبی امداد کا کافی سامان اس میں موجود تھا۔ میں نے پائیوڈین، کاٹن اور میڈیکل ٹیپ وغیرہ نکالی۔ تاجور ہچکچا رہی تھی مگر یہ بات وہ بھی جان چکی تھی کہ اس کے زخم سے بہنے والا خون قمیص کو نم کر رہا ہے۔ جہاں پر چوٹ لگی تھی وہاں سے قمیص پھٹ بھی گئی تھی۔ میں نے قمیص کا یہ شگاف تھوڑا سا مزید کھلا کیا۔ اس کے لمبے ریشمی بالوں نے کندھے اور گردن کو عقب سے ڈھانپ رکھا تھا۔ ''اپنے بالوں کو ذرا سمیٹیں۔'' میں نے کہا۔
اس نے دونوں ہاتھ پیچھے کی طرف موڑ کر بالوں کو گردن سے ہٹایا۔ میری قربت نے اس کے جسم میں ہلکی سی لرزش پیدا کر دی تھی۔ مجبوری تھی ورنہ میں اس کو چھونے سے اجتناب ہی کرتا۔
دارج تکلیف میں تھا، اس کے باوجود اسے میرا یوں تاجور کے قریب آنا برداشت نہیں ہوا۔ اس نے گردن موڑی اور بھنا کر سعید کھوکھر سے مخاطب ہوا۔ ''یہاں بیٹھے منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ جاؤ ان کی ڈریسنگ کرو۔'' اس کا اشارہ تاجور کی طرف ہی تھا۔
سعید جو دارج کی کمر کا مساج کر رہا تھا۔ لڑکھڑاتا ہوا سا اٹھا اور میرے ہاتھوں سے ڈریسنگ کا سامان لے لیا۔ میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''تاجور! آپ نے جرأت کا مظاہرہ کیا۔ قسطینا آپ کا شکریہ ادا کرتی ہیں۔''

میرے الفاظ دارج کے کانوں تک نہیں پہنچے۔ اسے یہی لگا ہوگا کہ میں سعید کھوکھر سے کچھ کہہ رہا ہوں۔ اس کے باوجود وہ مجھے مسلسل گھور رہا تھا۔ اس کی نگاہوں میں جیسے رقابت اور نفرت کی بجلی کوندر ہی تھی۔ میں واپس قسطینا کے پاس پہنچ گیا۔ کھوہ کے وسط میں پڑی کتے کی لاش نے ماحول مکدر کررکھا تھا۔ میں نے اس لاش کو گھسیٹ کر کھوہ سے باہر پھینکا۔ دوسرے کتے کی لحیم شحیم لاش کو بھی دہانے کے سامنے سے ہٹا دیا۔ خشک لکڑیوں سے ہم نے جو آگ جلائی تھی اس کی مدھم روشنی میں کھوہ کے فرش پر جا بجا خون کے نشانات نظر آرہے تھے۔ میں نے ان پر بجری نما کنکر اور ریت وغیرہ پھینک کر انہیں جزوی طور پر چھپا دیا...... فائرنگ اب رک چکی تھی مگر ہم پوری طرح چوکس تھے۔

○.....❖.....○

جو بارش کل شام کو شروع ہوئی تھی، اس نے پھر رکنے کا نام نہیں لیا۔ وہ ساری رات برستی رہی، اب دن کا اجالا پھیلنا شروع ہوگیا تھا لیکن کبھی ہلکی اور کبھی تیز بارش اب بھی ہورہی تھی۔ پیاس کا مسئلہ تو اب حل ہو چکا تھا مگر بھوک نے ہمارا دم آنکھوں میں کیا ہوا تھا۔ داؤد بھاؤ کا غدار ساتھی بنارس، جس کی وجہ سے ہم سب اس گھیرے میں پھنسے تھے اب مکمل طور پر بے ہوش ہو چکا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اگر آج رات تک اسے تسلی بخش طبی امداد نہ ملی تو وہ جانبر نہیں ہو سکے گا۔ اس کا زندہ رہنا ضروری تھا تاکہ پتا چلتا کہ بھاؤ کے گینگ میں اور کون کون سی کالی بھیڑ موجود ہے۔

دفعتاً ایک بلند آواز نے ہم سب کو چونکا دیا۔ یہ آواز ہماری اس جیپ کے قریب سے آئی تھی جو منہ کے بل ایک گڑھے میں دھنسی ہوئی تھی اور جس پر ایک شیطان زادے نے بہت سا جھاڑ جھنکاڑ پھینک دیا تھا تاکہ جیپ کو فضا میں سے نہ دیکھا جا سکے۔ میں نے پہچان لیا۔ یہ آواز بدنام زمانہ ریڈ کیٹ کی تھی۔ اپنے ٹیسٹ ٹیوب بھائیوں کی طرح وہ بھی نشے میں دھت محسوس ہوتی تھی۔ وہ پکار کر بولی۔ ''او باسٹرڈ لومڑی، اس طرح اپنے بل میں گھس کر کیوں بیٹھی ہوئی ہے۔ ہمت ہے تو باہر نکل میرے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال میں تجھے بتاؤں اسکواڈ والوں سے ٹکر کیسے لی جاتی ہے۔''

اس نے یقیناً قسطینا کو ہی مخاطب کیا تھا۔ اس سے پہلے پاشا نے بھی کل ہمیں بتایا تھا کہ وہ قسطینا کے خلاف طیش سے بھری ہوئی ہے اور زخمی ناگن کی طرح بل کھا رہی ہے۔ آج شاید وہ مزید برداشت نہیں کر سکی تھی۔ محاصرے کی طوالت نے اسے سیخ پا کیا ہوا تھا اور وہ ہمارے قریب آکر قسطینا کو للکارنا شروع ہوگئی تھی۔

رم جھم برستی بارش میں اس کی کرخت آواز ایک بار پھر ٹیلوں میں گونجی۔ ''کسی چوہے کی اولاد! باہر نکل۔ کھلے میدان میں مجھ سے دو دو ہاتھ کر۔ میں وعدہ کرتی ہوں ہماری طرف سے تجھ پر کوئی گولی نہیں چلے گی۔ ایک فائر بھی نہیں ہوگا۔ اور یہ بھی وعدہ کرتی ہوں اگر تُو نے مجھے مار لیا تو میرے لوگ تمہارا گھیرا چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ جان بخشی کر دیں گے تم لوگوں کی......''

میں جانتا تھا کہ ڈیتھ اسکواڈ کے لوگ ان میں سے نہیں جن کے وعدوں کا اعتبار کیا جا سکے۔ یہی بات جب میں نے قسطینا سے کہی تو وہ بولی۔ ''لیکن شاہ زائب! ان کو یہ بھی تو پتا ہے کہ اگر وہ مجھ پر فائر کریں گے تو یہ حرام زادی ریڈ کیٹ بھی جوابی فائرنگ سے بچ نہیں سکے گی.....''

''کیا مطلب؟ آپ اس کے سامنے جانا چاہتی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

وہ کھوئی کھوئی سی آواز میں بولی۔ ''تمہاری کیا رائے ہے؟''

میں نے کہا۔ ''میری رائے تو یہ ہے کہ آپ آرام سے یہاں بیٹھیں۔ یہ یورپ کا عیار ترین ٹولا ہے۔ ان کی کسی بات پر کبھی بھی اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔''

''بات اعتبار کی نہیں شاہ زائب!'' قسطینا نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ''یہ کھلا میدان ہے۔ اگر یہ وعدے پر قائم نہیں رہیں گے تو ہم کیوں رہیں گے پھر دونوں طرف سے گولی چلے گی۔ یہ بات یہ لوگ بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔''

اسی دوران میں ٹیلوں کے عقب سے ریڈ کیٹ کی للکار پھر گونجی۔ ''او چوہے کی اولاد! اب بل میں گھسی کیوں بیٹھی ہے۔ اگر اپنے باپ کی اولاد ہے تو باہر نکل۔ میں خالی ہاتھ ہوں اور انتظار کر رہی ہوں تیرا۔''

میں نے پکار کر کہا۔ ''قیامت کی نشانیاں ہیں۔ باپ کی اولاد کا طعنہ کون دے رہا ہے، جو خود پولٹری فارم کے چوزوں کی طرح مشین کی پیداوار ہے۔ باقی تُو کہہ رہی ہے کہ تو نہتی ہے، ہمیں کیا پتا کہ ہے یا نہیں۔''

چند لمحے خاموشی رہی پھر واقعی ریڈ کیٹ نے دلیری کا مظاہرہ کیا۔ وہ ٹیلے کی اوٹ سے نکل آئی۔ اس کا سرخ لباس اس کے جسم سے چپکا ہوا تھا۔ بارش میں بھیگنے کی وجہ سے وہ جسم کا حصہ ہی نظر آنے لگا تھا اور یوں لگتا تھا کہ اس نے جسم پر سرخ پینٹ کیا ہوا ہے۔ اس نے دونوں ہاتھ کھڑے کیے۔ اس کے بائیں ہاتھ میں چھوٹی نال والی روسی رائفل تھی۔ اس نے طیش کے عالم میں یہ رائفل پاس ہی ایک گہری کھائی میں پھینک دی...... تب اس نے اپنی کمر

میں لگے ہولسٹر میں سے سیاہ پسٹل نکالا اور اسے بھی کھائی میں پھینک دیا۔ یقیناً یہ دونوں ہتھیار کھائی کے گھنے جھاڑ جھنکاڑ میں گم ہو کر رہ گئے تھے۔

میں نے اسنیپر گن کی ٹیلی اسکوپ سے دھیان کے ساتھ دیکھا۔ اب اس کے پاس کوئی ہتھیار نظر نہیں آ رہا تھا لیکن یقین کے ساتھ پھر بھی کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اسی دوران میں قسطینا اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ کھوہ سے باہر تھی۔ اس نے اپنی کمر سے بندھا ہوا ریوالور، چمڑے کے ہولسٹر سمیت اتار کر پتھریلی زمین پر ڈال دیا۔

تب اچانک میری نظر ریڈ کیٹ کی ایک پنڈلی کے عقبی حصے کی طرف گئی۔ وہاں ایک ابھار تھا جو ٹیلی اسکوپ میں سے صاف نظر آ رہا تھا۔ یقیناً یہ وہی دندانے دار خنجر تھا جس کا ذکر پاشا نے بھی کیا تھا۔ میں نے کہا۔ ''ٹھہریں قسطینا! ابھی آپ آگے نہ جائیں۔'' وہ ٹھٹک کر میری طرف دیکھنے لگی۔

میں نے ریڈ کیٹ کو مخاطب کر کے بلند آواز میں کہا۔ ''تم شروع میں ہی جھوٹی ثابت ہو رہی ہو۔ تمہاری پنڈلی سے خنجر بندھا ہوا ہے۔''

''تو پھر کیا ہے؟'' وہ چلا کر بولی۔ ''اپنی اس سابقہ گرل فرینڈ سے کہو کہ وہ بھی لے آئے خنجر...... بلکہ اگر چاہتی ہے تو کوئی تلوار شلوار بھی لے آئے۔''

قسطینا نے جس آرمی ڈیگر سے ڈیئر ہاؤنڈ کو کاری زخم لگائے تھے، وہ سامنے ہی ایک پتھر پر رکھا تھا۔ ریڈ کیٹ کی بات سن کر قسطینا مڑی اور وہ تیز دھار ڈیگر غلاف میں ڈال کر اپنی جراب میں اڑس لیا۔

''قسطینا...... ایک بار پھر سوچ لیں......'' میرا فقرہ ادھورا ہی رہ گیا کیونکہ قسطینا جست لگاتی ہوئی باہر نکل چکی تھی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور یہ وہی سرخی تھی جو ایک فطری جنگجو کے چہرے پر بہ وقتِ مبارزت نظر آتی ہے۔ تاجور اور سعید کھوکھر کھوہ کے وسط میں کھڑے تھے اور سراسیمگی کے عالم میں یہ صورتِ حال دیکھ رہے تھے...... بارش ہلکی تھی لیکن مسلسل برس رہی تھی۔ میں نے ایم جی تھری کے سامنے پوزیشن سنبھال لی اور پوری طرح الرٹ ہو کر بیٹھ گیا۔

جو جگہ ریڈ کیٹ اور قسطینا کے درمیان لڑائی کا میدان بننے والی تھی، وہ کھوہ کے دہانے سے کم و بیش پینتیس میٹر دور تھی۔ ٹیلوں اور کٹی پھٹی زمین کے درمیان یہ ایک نسبتاً ہموار قطعۂ اراضی تھا...... جگہ پتھریلی تھی اور جھاڑ جھنکاڑ بھی موجود تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں آمنے سامنے تھیں۔ ایک یورپ کے خطرناک ترین گینگ کے خطرناک ترین ونگ کی ہیڈ تھی۔ ایک درجن پولیس والوں سمیت کئی قتل اس کے کھاتے میں تھے۔ بڑے بڑے اسٹریٹ فائٹر اس

کی خونخواری اور عیاری سے پناہ مانگتے تھے۔ دوسری جانب جاماجی کی آرمڈ فورسز کی چیف قسطینا تھی۔ اعلیٰ تربیت یافتہ، فن حرب کی ماہر...... اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جوش اور جذبے سے بھری ہوئی۔

دونوں ایک دوسرے کے سامنے پہنچیں۔ ابھی قسطینا شاید پوری طرح سنبھلی بھی نہیں تھی کہ ریڈ کیٹ ایک چنگھاڑ کے ساتھ اس پر جا پڑی۔ قسطینا کو اس سے شاید اتنی جلدی کی توقع نہیں تھی۔ وہ پوری طرح اپنا دفاع نہیں کر سکی۔ اس کا دھکا لگنے سے دور جا گری مگر اتنا ضرور ہوا کہ وہ اس کے نیچے نہیں آئی۔ اس سے پہلے کہ ریڈ کیٹ دوبارہ جست لگا کر اسے چھاپ لیتی، وہ تڑپ کر کھڑی ہوگئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے اور داؤ لگا کر گرانے کی کوشش کرنے لگیں۔ یہ ایک زوردار مقابلہ تھا، دونوں میں سے کوئی بھی ہار ماننے کو تیار نہیں تھی۔ یکا یک قسطینا کا داؤ چل گیا اور اس نے اسے اپنے سر کے اوپر سے گزار کر سنگلاخ زمین پر پھینک دیا۔ ریڈ کیٹ پشت کے بل گری تھی اور اس نے یقیناً سخت چوٹ کھائی تھی مگر اس کی عیاری قابل دید تھی۔ گرتے ساتھ ہی اس نے ڈھلوان پر نیچے کی طرف کئی پلٹیاں کھائیں اور قسطینا کی زد سے دور نکل گئی۔

دونوں ایک مرتبہ پھر ایک دوسری کے سامنے آئیں۔ شاید دونوں کو ہی اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو کر کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتیں۔ کیونکہ دونوں میں سے کوئی بھی اتنی ہلکی نہیں تھی کہ اسے گرا کر اسے دبوچا جا سکتا اور کوئی فرشی داؤ یا لاک لگایا جا سکتا۔ دونوں نے ایک دوجے پر ٹھوکروں اور مکوں کی بارش کی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ ابھی تک دونوں میں سے کسی نے بھی خنجر نہیں نکالا۔ معاً قسطینا کے بوائے کٹ بال ریڈ کیٹ کی مٹھی میں آگئے۔ اس نے ہیجانی انداز میں چلاتے ہوئے قسطینا کے سر کو یوں پیچھے کی طرف موڑ دیا کہ اس کی گردن ٹوٹنے کا اندیشہ پیدا ہوگیا ردِعمل کے طور پر قسطینا نے بھی اپنا دایاں ہاتھ چلایا، لیکن اس کی حریف کے سر پر تو کوئی بال ہی نہیں تھا۔ اپنے ٹیسٹ ٹیوب بھائیوں کی طرح اس کی کھوپڑی بھی صفا چٹ تھی۔ بھنا کر قسطینا نے اس کے پہلو میں کہنی کی سخت ضرب لگائی اور پھر الٹے پاؤں پیچھے ہٹ کر اسے ایک بڑے پتھر سے ٹکرا دیا۔ قسطینا کے بال ریڈ کیٹ کی گرفت سے نکل گئے اور تب ایم ایم اے کے اسٹائل میں قسطینا نے گھوم کر ایک ٹھوکر ریڈ کیٹ کے تھوبڑے پر رسید کی۔ مارشل آرٹ کی اصطلاح میں اسے راؤنڈ کک کہتے ہیں اور یہ اکثر بڑی کارگر ثابت ہوتی ہے۔ ریڈ کیٹ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو یہ طوفانی ضرب کھا کر اٹھ نہ سکتا۔ لیکن وہ نہ صرف اٹھی بلکہ اس کے ہاتھ میں چمکیلا دندانے دار خنجر بھی نظر آنے لگا۔

اب یقیناً قسطینا کو بھی حق حاصل تھا کہ وہ فوجی ڈیگر نکال لیتی۔ وہ بھی تیزی سے اپنی پنڈلی کی طرف جھکی......اور تب......مجھ پر انکشاف ہوا کہ مارا ماری کے دوران میں تیز دھار ڈیگر اس کی جراب کے اندر سے نکل چکا ہے۔ یہ قسطینا کے لیے ایک زبردست دھچکا تھا۔ ریڈ کیٹ کسی خونی بلا کی طرح قسطینا پر جھپٹی۔ اس کا ہَمکیلا خنجر ایک روشن لکیر سی بناتا ہوا قسطینا کی گردن کے پاس سے گزرا۔ وہ بمشکل خود کو بچا سکی تھی۔ ریڈ کیٹ دیوانہ وار قسطینا پر خنجر کے وار کرنے لگی۔ ہر بار بس یہی محسوس ہوا کہ خنجر کی نوک قسطینا کے جسم کو چیر ڈالے گی۔ ساتھ ساتھ وہ چنگھاڑ رہی تھی۔ ''چھوڑوں گی نہیں......مار ڈالوں گی کسی سؤر کی اولاد......میں تیری بوٹیاں اُڑا دوں گی۔''

قسطینا کسی بھی وقت جان سے جا سکتی تھی۔ ایک لحظے کے لیے میرے دل میں آیا کہ مداخلت کروں۔ اگر میں احتیاط سے فائر کرتا تو قسطینا کو نقصان پہنچائے بغیر ریڈ کیٹ کو نشانہ بنا سکتا تھا مگر یہ لڑائی کے اصول کے خلاف تھا۔ میں یہ اصول توڑتا تو پھر دوسری طرف سے بھی توڑا جا سکتا تھا۔ یقینی بات تھی کہ شیطان زادے اپنی جدید رائفلوں سمیت، لڑائی والی جگہ کے آس پاس موجود ہیں۔ ریڈ کیٹ نشانہ بنتی تو وہ قسطینا پر گولی چلانے میں ایک سیکنڈ کی تاخیر نہ کرتے۔

قسطینا کے جسم پر کئی چرکے لگ چکے تھے اور وہ بہت مشکل میں تھی......مگر ایک فوجی کمانڈر کی استقامت اور آخری گولی تک لڑنے کا جذبہ اسے گرنے نہیں دے رہا تھا......میں نے دیکھا تاجور بھی سکتے کے سے عالم میں یہ دلدوز منظر دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ برف کی طرح سفید تھا اور ہونٹ، بے ساختہ دعائیہ انداز میں ہلتے جا رہے تھے......! پھر شاید اس کی دعا قبول ہوئی تھی۔ عین اس وقت جب ریڈ کیٹ، قسطینا پر تقریباً غالب آ چکی تھی، اس کا خنجر والا ہاتھ قسطینا کی گرفت میں آ گیا۔ قسطینا بھی سمجھ گئی تھی کہ یہ اُس کے لیے اپنی زندگی بچانے کا آخری موقع ہے، وہ پوری جان کے ساتھ اس کی کلائی سے چمٹ گئی......ریڈ کیٹ نے بے پناہ زور مارا اور یہی وقت تھا جب اس کی کلائی کی بڑی ہڈی ٹوٹ گئی۔ وہ اتنے بھیانک انداز میں چلائی تھی کہ اس کی وجہ ہڈی ٹوٹنے کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ دندانے دار خنجر اس کے ہاتھ سے گر کر جھاڑ جھنکاڑ میں گم ہو گیا۔ قسطینا نے اپنے بوٹ کی زوردار ٹھوکر اس کی پسلیوں میں لگا کر اسے دور پھینک دیا۔ پھر وہ دیوانی سی ہو کر اس شیطان زادی پر پل پڑی۔ شیطان زادی کا لباس پھٹ چکا تھا اور بالائی جسم تقریباً عریاں تھا مگر اسے اس عریانی کی کیا پروا ہو سکتی تھی۔ وہ بدستور چنگھاڑ رہی تھی اور قسطینا کی مزاحمت کر رہی تھی۔ یہ صبح قریباً سات

بجے کا وقت تھا۔ کبھی کبھی بجلی کی روشن لکیر آسمان پر تڑپتی تھی اور پھر بادل گرجتے تھے۔ بارش کی ہلکی پھوار میں قرب و جوار کا منظر دور تک دکھائی دے رہا تھا۔ دونوں ماسٹر فائٹرز تھیں اور دونوں خالی ہاتھ ایک دوسرے سے برسرِ پیکار تھیں۔ (ان لمحوں میں مجھے اپنی اور سجاول کی یادگار لڑائی یاد آ گئی۔ وہ بھی کوٹلی کے ڈیرے پر ایسے ہی گرجتے برستے موسم میں ہوئی تھی)

قسطینا کو اب ریڈ کیٹ پر اَپر ہینڈ مل چکا تھا۔ وجہ یہی تھی کہ کیٹ کا ایک بازو کام نہیں کر رہا تھا۔ وہ اس کمی کو ٹانگیں چلا کر پورا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اپنے بھائیوں کی طرح وہ بھی شراب، پانی کی طرح پیتی تھی۔ اس نشے نے شاید اس کے جسم میں عارضی طور پر اضافی توانائی پیدا کر رکھی تھی۔ اپنی ٹوٹی ہڈی کے باوجود وہ چنگھاڑ رہی تھی اور پلٹ پلٹ کر قسطینا پر حملہ آور ہو رہی تھی۔ قسطینا کو بھی دندانے دار خنجر کے کئی کٹ لگے تھے اور اس کا لباس خون آلود تھا۔

دفعتاً مجھے محسوس ہوا کہ ریڈ کیٹ مارا ماری کے دوران میں ایک خاص سمت میں بڑھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ یہ زمین میں دبا ہوا کئی ٹن کا ایک سیاہی مائل پتھر تھا۔ بظاہر یوں لگتا تھا کہ وہ راہِ فرار اختیار کر رہی ہے لیکن فرار ہونا ان ٹیسٹ ٹیوب شیطانوں کی خصلت میں نہیں تھا۔ یکا یک میرے دماغ میں ایک جھماکا سا ہوا۔ کہیں قسطینا کی اس عیار حریف نے یہاں کچھ چھپا تو نہیں رکھا تھا۔ اگلے چار پانچ سیکنڈ میں میرا یہ اندیشہ بالکل درست ثابت ہو گیا۔ وہ جست لگا کر سیاہ پتھر کے پہلو میں گری۔ اس کی ایک ٹانگ ابھی تک قسطینا کی گرفت میں تھی۔ اس نے اپنا بایاں ہاتھ آگے بڑھایا۔

''قسطینا۔'' میں پکارا۔

لیکن اس کے لیے دیر ہو چکی تھی۔ کیٹ نے گھاس کے اندر چھپایا ہوا کولٹ پسٹل نکال لیا۔ یہ سراسر عیاری اور دھوکے بازی تھی۔ اس نے پسٹل قسطینا کی طرف سیدھا کیا...... اب سیکنڈ کے دسویں حصے کا انتظار بھی حماقت تھا۔ میں نے ایم جی تھری کا ٹریگر دبایا۔ یہ ایک سیکنڈ میں قریباً 18 راؤنڈ فائر کرتی تھی۔ گولیوں کی بوچھاڑ نے ریڈ کیٹ کی کھوپڑی اور گردن چکنا چور کر دی۔ دو سیکنڈ کے لیے جیسے قرب و جوار پر سکتہ سا طاری رہا، پھر دوسری طرف سے بھی فائرنگ شروع ہو گئی۔ قسطینا نے اس دوران میں بڑی حاضر دماغی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے خود کو ڈھلوان پر لڑھکا دیا اور پلٹیاں کھاتی ہوئی ایک چٹان کی اوٹ میں پہنچ گئی۔ میں نے پوری گنجائش کے مطابق اسے کور فائر دیا۔ وہ جھک کر دس پندرہ قدم بھاگی اور کھوہ کے اندر گھسنے میں کامیاب ہو گئی۔

اپنی انچارج کی موت ملاحظہ کرنے کے بعد ڈیتھ اسکواڈ کا ابلیسی ٹولا دیوانہ سا ہو گیا۔ انہوں نے دو اطراف سے کھوہ پر زوردار حملہ کر دیا۔ میں نے جوابی فائرنگ کرتے ہوئے، قسطینا سے بلند آواز میں پوچھا کہ وہ ٹھیک تو ہے؟

''ہاں میں ٹھیک ہوں...... لیکن یہ لوگ بہت قریب آ چکے ہیں شاہ زائب! ان کو روکنا پڑے گا۔''

وہ اپنے زخموں کی پروا کیے بغیر لپک کر میرے پاس پہنچ گئی اور ایم جی تھری کا کنٹرول مجھ سے لے لیا۔ مجھے بھی یہ بات تسلیم تھی کہ وہ اس گن کو مجھ سے بہتر استعمال کر سکتی ہے۔ میں نے آٹھ ایم ایم کی آٹومیٹک سنبھال لی اور ڈٹ کر قسطینا کا ساتھ دینے لگا۔ یہ بڑا دھواں دھار معرکہ تھا۔ گولیاں مینہ کی طرح برس رہی تھیں۔ ابلیس زادے چنگھاڑ رہے تھے اور پوزیشنیں بدلتے ہوئے کھوہ سے قریب تر آ رہے تھے۔

میں نے پہلی بار قسطینا کے چہرے پر پریشانی و ہراس کی پرچھائیاں دیکھیں۔ اس نے چلا کر سعید کھوکھر کو مخاطب کیا۔ ''مجھے ایمونیشن باکس چاہیے...... جلدی کرو۔''

سعید کھوکھر ایک کونے میں سمٹا ہوا تھا، لیکن یہ بات وہ بھی جان چکا تھا کہ یہ نازک ترین مرحلہ ہے، اسے تھوڑی بہت ہمت کرنا پڑے گی۔ اس نے گولیوں والی پیٹی پکڑی اور اسے گھسیٹتا ہوا قسطینا کے پہلو میں لے آیا۔

قسطینا نے ایک ہاتھ سے چابکدستی کے ساتھ پیٹی کو کھولا اور ایک ہی ہاتھ سے گولیوں والی بیلٹ گن کے چیمبر سے منسلک کر لی۔ اس دوران میں، میں کم از کم دو شیطان زادوں کو ہٹ کر چکا تھا۔ ایک کی لاش ہمیں صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے باوجود وہ آگے آتے چلے جا رہے تھے۔ ان کی بے خوفی یقیناً غیر معمولی تھی۔

قسطینا اتنی شدید فائرنگ کر رہی تھی کہ دو تین منٹ میں ہی گولیوں والی باکس نما پیٹی ایک چوتھائی رہ گئی۔ ہر طرف گولیوں کے گرم خول بکھر رہے تھے۔ مخالف سمت سے آنے والی گولیاں اب کھوہ کے وسط تک پہنچ رہی تھیں۔ ہماری ضرورت کے سامان میں سے کئی اشیا غارت ہو چکی تھیں۔

''دوسری پیٹی لاؤں؟'' سعید کھوکھر نے بلند آواز میں پوچھا۔

''ہاں، جلدی۔'' قسطینا نے اپنی ساری توجہ سامنے مرکز رکھتے ہوئے کہا۔

سعید جھک کر چلتا ہوا عقبی حصے میں گیا۔ اس کے پہنچنے سے پہلے ہی تاجور پیٹی گھسیٹ کر کھوہ کے وسط تک لا چکی تھی۔ وہاں سے سعید نے اسے گھسیٹا اور قسطینا کی طرف آیا۔ دو

گولیاں سعید کی پشت میں لگیں اور سینے کی طرف سے شگاف کرتی ہوئی نکل گئیں۔ وہ پیٹی کے اوپر ہی بے جان ہو کر گر گیا۔ تاجور کا رنگ بالکل سفید ہو رہا تھا مگر اس نے یہ خوفناک منظر دیکھنے کے باوجود ہمت کی اور ایمونیشن کی پیٹی کی طرف بڑھی۔

''نہیں تاجور، آگے نہیں آنا۔'' میں نے بلند آواز میں اسے وارننگ دی۔

وہ ٹھٹک گئی اور اس کا ٹھٹکنا درست تھا۔ کھوہ کا وہ حصہ مکمل طور پر گولیوں کی زد میں آچکا تھا۔

دوسری طرف قسطینا کے پاس فقط پچیس تیس راؤنڈ رہ گئے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ بھی گن کے چیمبر میں چلے گئے۔

شیطان زادوں کے للکارے اب دہانے کے بالکل پاس سنائی دے رہے تھے۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کروں...... دفعتاً دو خبیث، وحشی جانوروں کی طرح اندر گھس آئے۔ ان میں سے ایک نے اپنی رائفل قسطینا کے سر کی طرف پوائنٹ کی لیکن اس سے پہلے کہ وہ قسطینا کو شوٹ کرتا، میں نے ٹریگر دبا دیا۔ وہ جیسے اُڑ کر کئی فٹ پیچھے گرا۔ اس کے ساتھی کی رائفل شاید خالی ہو چکی تھی۔ اس نے اسے بیرل کی طرف سے پکڑ رکھا تھا۔ اگر میں جھکنے میں ایک لمحے کی تاخیر کرتا تو طوفانی ضرب ناقابلِ تلافی نقصان پہنچاتی۔ میں اس شخص سے گتھم گتھا ہو گیا۔ اسی دوران میں، میں نے دیکھا کہ قسطینا، تیسرے حملہ آور سے گتھم گتھا تھی۔ اس نے اس کی رائفل کا بیرل دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اوپر اٹھا رکھا تھا۔ ایک طویل برسٹ چلا اور کھوہ کی چھت سے بہت سا پتھریلا ملبا اکھڑ کر نیچے گرا۔ جو شخص مجھ سے گتھم گتھا تھا، اس کے جسم میں وہی حیوانی قوت تھی جو ڈیتھ اسکواڈ کے شیطان زادوں کا خاصہ تھی۔ یہ شخص پلک جھپکتے میں دو تین افراد کا بھرتہ بنا سکتا تھا لیکن اب وہ جانتا تھا کہ اس کا مقابلہ ایسٹرن سے ہے۔ اس احساس نے اس کی توانائیوں کو جیسے آدھا کر ڈالا تھا۔ بے پناہ جوش میں ہونے کے باوجود وہ اندر سے ڈرا ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے جسم کے نازک ترین حصے کا دفاع نہیں کر سکا۔ میرے گھٹنے کی ضرب اس کے سینے کی سامنے والی ہڈی کے نیچے لگی اور وہ کراہ کر پشت کے بل گرا...... میری رائفل کا بیرل ابھی تک اس کے ہاتھوں میں تھا، وہ اس کا رخ اپنے سینے کی طرف سے ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ سینے پر لگنے والی چوٹ کی وجہ سے اس کی ناک سے خون جاری ہو گیا تھا۔ ایک لاش اور دو حملہ آور تو میرے سامنے تھے مگر میں اس چوتھے کو نہ دیکھ سکا جو ایک دندانے دار خنجر کے ساتھ میرے عقب سے آیا تھا۔ آہٹ پر میں نے ایک ساعت کے لیے پلٹ کر دیکھا تو وہ مجھ پر وار کرنے کے لیے خنجر سونت چکا تھا مگر پھر مجھے تاجور کے

لباس کی جھلک نظر آئی، وہ اس پر جھپٹی تھی۔ اسی دوران میں قسطینا نے اپنے ریوالور سے اس شیطان زادے کو شوٹ کر دیا جس نے ابھی تک میری رائفل کا بیرل جکڑ رکھا تھا۔

میں نے مڑ کر دیکھا اور حیران رہ گیا۔ تاجور نے چند گھنٹوں کے اندر دوسری مرتبہ زبردست جرأت دکھائی تھی۔ وہ ڈیتھ اسکواڈ کے سرخ پوش درندے کے اوپر گری ہوئی تھی اس نے لمبے پھل کا تیز دھار چاقو دونوں ہاتھوں سے تھام رکھا تھا اور پے در پے اس کے سینے اور گردن پر وار کر رہی تھی۔ اس پل وہ مجھے پنجاب کی صحت مند دوشیزہ نظر آئی جو وقت پڑنے پر اپنے کھائے ہوئے دودھ مکھن کا حق ادا کرتی ہے اور دشمن کے سامنے دیوار بن جاتی ہے۔

درحقیقت تاجور نے عقب سے آ کر اس شیطان زادے پر جو پہلا وار کیا تھا، اسی نے اس کی کچھ انتڑیاں نکال دی تھیں۔ اس کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکتے ہوئے میں نے بھی ایک گولی اس کے سینے میں اتار دی۔

''تاجور! پیچھے ہٹ جاؤ۔ یہ مر گیا ہے۔'' میں نے کہا اور اسے کھینچ کر اس سے دور ہٹایا۔

تاجور نے چاقو پھینک دیا اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ اس کا سارا بدن تھر تھر کانپ رہا تھا۔ سرخ چہرہ ایک بار پھر لٹھے کی طرح سفید ہونا شروع ہو گیا تھا۔ میں نے اسے اپنے ساتھ لگا کر پچکارا اور ساتھ ہی قسطینا کو اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھی اور تاجور کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔ دارج اپنے فرشی بستر سے اٹھ کر بیٹھ گیا تھا اور شور مچا رہا تھا۔ کیونکہ وہ کافی فاصلے پر تھا لہٰذا اس کا شور سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس زوردار ٹاکرے میں میرے ہاتھوں کا انگوٹھا پھر زخمی ہو گیا تھا۔ ناخن کے قریب سے تھوڑی سی جلد پھٹ گئی تھی اور خون نکل رہا تھا۔ یہ انگوٹھا جاما جی کی جنگ و جدل میں زخمی ہوا تھا اور اس میں سے اب بھی کبھی کبھی ٹیس اٹھتی تھی۔ بہر حال اب زیادہ چوٹ آئی تھی یوں محسوس ہوتا تھا کہ جوڑ کے پیچھے والی ہڈی کو بھی نقصان پہنچا ہے۔

بہر حال میں پلٹ کر تیزی سے بڑی گن کے سامنے آن بیٹھا۔ دہانے سے باہر اب مزاحمت کے آثار دکھائی نہیں دیتے تھے۔ پھر بھی میں نے انگلی ٹریگر پر رکھ لی اور پوری طرح چوکس ہو گیا۔ قسطینا نے تاجور کو اپنے ساتھ لگا رکھا تھا اور اسے تھپک رہی تھی۔ تاجور حیران نظروں سے کبھی شیطان زادے کی لاش کو دیکھتی تھی اور کبھی اس خون آلود چاقو کو جو اس نے ابھی زمین پر پھینکا تھا۔ اسے جیسے خود پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا کہ اس نے یہ سب کچھ کیا ہے۔

میرے ایک مدِمقابل کو قسطینا نے ریوالور سے شوٹ کیا تھا۔ وہ کھوہ کے فرش پر اوندھا پڑا تھا۔ تاہم اس کے جسم میں حرکت موجود تھی۔ ''یہ ابھی زندہ ہے قسطینا۔'' میں نے انگلی سے اشارہ کیا۔

قسطینا نے بے دریغ ریوالور کی دو گولیاں مزید اس کے سر میں اتار دیں۔ پھر وہ سعید کھوکھر کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ پہلو کے بل پڑا تھا۔ ابھی سانس لے رہا تھا مگر جتنا خون اس کے جسم سے نکل چکا تھا، اس کا بچنا محال تھا۔ قسطینا نے اسے سیدھا کیا اور اس کے زخموں کو دیکھنے لگی۔ زندگی بھر دوسروں کی مرہم پٹی کرنے والے نے خود ایسے کاری زخم کھائے تھے کہ اس کی مرہم پٹی ممکن نہیں تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کی نبض مکمل طور پر تھم گئی، وہ ختم ہو گیا۔ پاشا کی طرح اس کی لاش کو بھی ایک کپڑے سے ڈھانپ دیا گیا۔

میں نے پکار کر کہا۔ ''آپ خود بھی زخمی ہیں قسطینا! اپنے زخموں کا خون بند کریں۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ تاجور اس کے لیے جلدی سے میڈیکل باکس اٹھا لائی۔ کیٹ سے خونریز لڑائی کے دوران میں قسطینا کو دندانے دار خنجر کے کئی چرکے لگے تھے۔ ان میں دو چار پیٹ اور کندھوں پر بھی تھے۔ مجھے افسوس ہونے لگا کہ اگر اس نے بلٹ پروف جیکٹ پہن رکھی ہوتی تو وہ ان زخموں سے بچ جاتی (کل دن کے وقت قسطینا نے یہ جیکٹ زبردستی مجھے پہنادی تھی)

میں نے اسنیپر گن پر سے ٹیلی اسکوپ اتاری اور اس سے آنکھ لگا کر ٹیلوں کا دور تک جائزہ لیا۔ بارش اب تھم گئی تھی اور اجالا سا محسوس ہو رہا تھا۔ مجھے اپنے اردگرد دور تک کوئی حرکت نظر نہیں آئی۔

میں نے آٹھ ایم ایم رائفل پکڑی اور باہر نکلنے کا ارادہ کیا۔ قسطینا پکاری۔ ''نہیں شاہ زائب۔ یہ خطرناک ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ کسی نے آس پاس گھات لگا رکھی ہو۔''

''آپ بےفکر رہیں، میں احتیاط کروں گا۔'' میں نے کہا اور باہر نکل آیا۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ خطرناک ترین وقت گزر چکا ہے۔

ٹیلوں کی آڑ لیتا ہوا اور پھونک پھونک کر قدم رکھتا میں آگے بڑھا۔ میری انگلی بے ساختہ رائفل کے ٹریگر پر آ گئی تھی اور یہ اچھا ہی تھا۔ بیس پچیس قدم دور آ کر جونہی مجھے ایک جگہ سرخ لباس کی حرکت نظر آئی، میں نے بلاتامل گولی چلا دی۔ یہ بھی حملہ آوروں میں سے ہی ایک تھا۔ یہ پہلے سے زخمی تھا۔ لڑائی میں زخمیوں کو مارنے کے بجائے قید کیا جاتا ہے لیکن یہ ایسے زخمی تھے جن کو تلف کر دینا ہی بہتر حل تھا۔ اس شخص کے سینے میں ایک گولی پہلے سے موجود تھی، دو میں نے اتار دی تھیں۔ اب وہ بے جان تھا۔ میں نے اس کا مشین پسٹل اٹھا کر اپنی کمر میں اڑس لیا۔

کھوہ کے دہانے کی طرف سے قسطینا کی بلند آواز تھی۔ ''شاہ زائب! ادھر دائیں طرف

بھی کچھ ہے۔"

میں نے قسطینا کی بتائی ہوئی سمت میں دھیان سے دیکھا۔ یہاں بھی جھاڑ جھنکاڑ کے پیچھے سرخ لباس کی جھلک نظر آئی۔ "یہ لاش نہیں ہے شاہ زائب! اس میں حرکت ہے۔" قسطینا نے مزید اطلاع دی۔

میں نے ایک سنگل فائر اس سرخ لباس سے ڈیڑھ دو فٹ کے فاصلے پر کیا۔ لباس اپنی جگہ پر موجود رہا۔ اس کا مطلب تھا کہ یا تو یہ لاش ہے یا پھر شدید زخمی ہے۔ رائفل سونت کر میں قدم قدم اس کی طرف بڑھا۔ یہ ڈیتھ اسکواڈ کا ایک سرخ پوش زخمی ہی تھا مگر اس کے جسم پر کہیں گولی وغیرہ نہیں لگی تھی۔ اس کے منہ اور جسم سے الکحل کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ غالباً لڑائی سے پہلے اس نے اتنی زیادہ پی لی تھی کہ اپنے حواس قائم نہیں رکھ سکا تھا۔ وہ بلندی سے لڑھک کر زخمی ہوا تھا۔ اس کی صفاچٹ کھوپڑی خون سے رنگین تھی۔ اس کے دونوں بازوؤں پر عریاں لڑکیوں کے ٹیٹو بنے ہوئے تھے۔ میں نے اپنی پینٹ کی بیلٹ اتار کر سب سے پہلے اس کے ہاتھ اس کی پشت پر باندھے، پھر اسے بمشکل اپنے کندھے پر اٹھایا اس کی رائفل وغیرہ کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے اسے کھوہ میں لے آیا۔ اس نے ہولے ہولے کراہنا شروع کر دیا تھا۔ جیسے کوئی سویا ہوا عفریت آہستہ آہستہ بیدار ہو رہا ہو۔

تاجور دور کھڑی خوف زدہ نظروں سے اس کو دیکھ رہی تھی۔ دارج ہراساں لہجے میں بولا۔ "اس کو یہاں کیوں لے آئے ہو؟ شوٹ کر دو اس کو فوراً۔"

قسطینا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "مسٹر دارج! یہ تو تم لوگوں کے ساتھی ہیں۔ ان کے خلاف اتنا غصہ کیوں کر رہے ہو؟"

"تم بکواس بند کرو۔" وہ گرجا۔ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "والدہ کا کچھ پتا چلا ہے؟"

"نہیں ابھی نہیں، لیکن حالات اچھے نہیں لگ رہے۔ اندزہ ہوتا ہے کہ ڈیتھ اسکواڈ والوں نے شکیل کے سارے ساتھیوں کو مار ڈالا ہے۔ مرنے سے پہلے پاشا نے بھی یہی بات بتائی تھی۔"

دارج دھاڑا۔ "پاشا نے والدہ کے بارے میں بھی کچھ نہ کچھ بتایا ہوگا۔ تم مجھ سے چھپا رہے ہو۔ مجھے بتاؤ کہ...... وہ زندہ ہیں یا نہیں......؟"

"مجھے لگتا ہے کہ ان کے بارے میں کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں سب سامنے آ جائے گا۔"

اسی دوران میں تاجور پکار کر بولی۔ "اس کو دیکھیں...... وہ ہل رہا ہے۔" تاجور کا اشارہ

زخمی سرخ پوش کی طرف تھا۔

''گھبرائیں نہیں۔اس کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔'' میں نے اسے تسلی دی۔

اسی دوران میں دارج نے اپنے طور پر کروٹ لینے کی ناکام کوشش کی اور بری طرح کراہنے لگا۔ تاجور لپک کر اس کے پاس پہنچ گئی۔ مین نے سرخ پوش کی تلاشی لی۔ اس کے پاس سے ایک خنجر کے سوا اور کچھ نہیں ملا۔ مجھے سیل فون کی تلاش تھی اور وہ اس زندہ سرخ پوش کے علاوہ مردہ سرخ پوشوں کے پاس بھی نہیں تھا۔ بس دو کے پاس سے واکی ٹاکی برآمد ہوئے تھے۔

میں نے قسطینا سے مخاطب ہو کر کہا۔''ہمیں ایک بات ذہن میں رکھنی چاہیے۔ ہاناوانی والا خطرہ بدستور ہمارے اردگرد موجود ہے۔ ہاناوانی کے حملے کے حوالے سے یہ کھوہ ہمارے لیے کسی بھی طرح محفوظ نہیں ہے۔''

''تو پھر کیا کرنا چاہیے؟'' قسطینا نے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ میں آگے جاؤں۔ لگ تو یہی رہا ہے کہ یہ ابلیسی ٹولا ختم ہو گیا ہے۔ ان کی گاڑیاں اور دیگر سامان وہیں پر موجود ہے۔ میں کم از کم ایک گاڑی کو یہاں کھوہ کے دہانے کے پاس لے آتا ہوں۔ ہم اس میں بیٹھنے کے بعد کم از کم ہاناوانی سے تو محفوظ ہو جائیں گے۔''

''تمہارا مطلب پرندوں کے متوقع حملے سے ہے؟''

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ گن کے سامنے چوکس بیٹھی تھی۔ نگاہیں بدستور سامنے لگی ہوئی تھیں۔ پُرسوچ لہجے میں بولی۔''ابھی تھوڑی دیر ٹھہر جاؤ شاہ زائب! ہمیں جلد بازی نہیں کرنی چاہیے۔ ان کی مکاری تو ہم سب دیکھ ہی چکے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی ان گاڑیوں کے پاس گھات لگائے بیٹھا ہو۔''

میں نے کہا۔''قسطینا! اس رسک سے زیادہ رسک پرندوں والا ہے۔''

ہمارے درمیان تھوڑی سی بحث ہوئی پھر اس نے مجھے آمادہ کر لیا کہ ہم ابھی ایک آدھ گھنٹہ انتظار کریں۔

کھوہ کی اندرونی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ کتوں کی لاشوں کو تو میں کھوہ سے ہٹا چکا تھا مگر جان ڈیرک کے ان پالتو ''بھیڑیوں'' کی لاشیں کھوہ کے اندر ہی تھیں۔ ہمارے پاس کوئی ایسا کپڑا بھی نہیں تھا کہ انہیں ڈھانپا جا سکے۔ میں نے لاشوں کو ایک جگہ اکٹھا کیا۔ بارش اب تھم چکی تھی اور کسی وقت سورج بھی اپنی جھلک دکھاتا تھا۔ یہ صبح قریباً نو بجے کا وقت تھا۔ میں نے

کھوہ کے باہر سے کچھ جھاڑ جھنکاڑ اکٹھا کیا اور ان گینگسٹرز کی لاشوں پر ڈال دیا..... کوتاہ قد بنارس کی پیشانی کے زخم میں انفیکشن ہو چکا تھا۔ وہ غشی کی سی حالت میں تھا اور اس کا جسم بخار میں پھنک رہا تھا۔ میں نے اسے بھی ایک طرف نرم بچھونے پر ڈال دیا۔

تاجور مسلسل دارج کے سرہانے موجود تھی اور وہ ابھی تک پوری طرح نارمل نہیں ہوئی تھی۔ شاید اسے خود بھی اس بات کا یقین نہیں تھا کہ وہ ایک گینگسٹر کا پیٹ پھاڑ کر اسے جہنم واصل کر چکی ہے۔ اس کے چہرے پر ابھی تک زرد پرچھائیاں رقص کر رہی تھیں۔ میری اور اس کی نگاہ ملی تو میری آنکھوں میں احسان مندی سمٹ آئی۔ اس نے اپنی ہمت اور طاقت سے بڑھ کر کوشش کی تھی اور میری جان بچائی تھی۔ وہ منظر ابھی تک میری نگاہوں کے سامنے تھا، جب وہ ایک خوف آمیز طیش کے عالم میں تھی اور دونوں ہاتھوں میں چاقو پکڑے اندھا دھند شیطان زادے کو زخمی کر رہی تھی۔ بے شک بعدازاں میری چلائی ہوئی گولی نے شیطان زادے کا کام تمام کیا تھا، لیکن زیادہ کام تو وہ کر چکی تھی۔

بادل ایک بار پھر کچھ گہرے ہونے لگے لیکن بارش تھمی ہوئی تھی۔ قسطینا ٹیلی اسکوپ سے ٹیلوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس کے جسم کے مختلف حصوں پر میڈیکل ٹیپ چپکی ہوئی تھی۔ کندھے پر آنے والا ایک زخم زیادہ گہرا تھا اور وہاں اسے باقاعدہ ڈریسنگ کرنا پڑی تھی۔

دفعتاً تاجور کے چلانے کی آواز نے ہمیں متوجہ کر لیا۔ وہ دارج کے بستر سے چند فٹ دور وہ کھوہ کی دیوار سے لگی کھڑی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ ڈھانپ رکھا تھا۔ دارج بھی شور مچا رہا تھا لیکن اس کی بات پوری طرح سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ چت لیٹا اپنی ٹانگوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا اور ٹھٹک گیا۔ دارج کی مفلوج ٹانگوں پر خاکستری رنگ کا ایک نہایت بدنما چھپکلا بیٹھا تھا۔ وہ سائز میں کسی گرگٹ سے چھوٹا نہیں تھا۔ یقیناً وہ کھوہ ہی کی کسی درز سے نکل آیا تھا۔ دارج اپنی ٹانگوں کو حرکت دینے سے قاصر تھا اس لیے واویلا مچا رہا تھا۔ ''تماشا کیا دیکھ رہی ہو۔'' وہ چلایا۔

خوف کی پہلی لہر سے سنبھلنے کے بعد تاجور آگے بڑھی۔ اس نے زمین سے چپل اٹھائی اور اس کی ضرب سے چھپکلے کو دور پھینک دیا۔ وہ جارحانہ انداز میں میری طرف آیا لیکن پھر مڑ کر ایک تاریک درز میں گھس گیا۔

بھاگنے سے پہلے چھپکلے نے دارج کے پاؤں پر کاٹا تھا اور وہاں سے خون رِس رہا تھا۔ مرے کو مارے شاہ مدار والی بات ہوئی تھی۔ وہ پہلے ہی کمر کی تکلیف سے عاجز ہو رہا تھا۔ بہرحال پاؤں کے زخم کی اسے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ اس کا نچلا دھڑ تقریباً ہر احساس سے

عاری تھا۔ خاص طور سے گھٹنوں تک تو اسے کاٹ بھی دیا جاتا تو کچھ پتا نہ چلتا۔

اپنا خون دیکھ کر وہ بھڑک گیا اور ہماری پروا کیے بغیر تاجور کو صلواتیں سنانے لگا پھر زہریلے لہجے میں بولا۔ ''تب تو ڈر نہیں آیا تجھے جب چاقو لے کر جا پڑی تھی اس مشٹنڈے پر۔ تب اتنی ہمت کہاں سے آ گئی تھی۔ تجھ میں؟'' دارج کے لہجے میں جو معنی خیزی تھی، وہ میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔

وہ ڈھکے چھپے لفظوں میں تاجور کو میرے ساتھ پرانے تعلق کا طعنہ دے رہا تھا۔ اسے بتا رہا تھا کہ اس نے اپنی جان صرف اس لیے خطرے میں ڈالی کہ وہ مجھے مرتا یا زخمی ہوتا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اب وہ صرف ایک چھپکلے سے ڈر کر دور ہٹ گئی ہے۔

تاجور ہمیشہ کی طرح گم صم کھڑی تھی۔ پھر وہ میڈیکل باکس کی طرف بڑھی اور وہاں سے روئی وغیرہ نکالی تاکہ دارج کے پاؤں کے انگوٹھے سے رِسنے والا خون روک سکے۔ وہ قریب آئی تو دارج پھنکارا۔ ''رہنے دو یہ چونچلے...... بہنے دو خون۔ دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔'' اس کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے وہ تاجور کے سینے پر ٹانگ مار کر اسے دور پھینک دینا چاہتا ہو مگر ٹانگ مارنے کے قابل وہ کہاں تھا۔ اس نے بڑے حاکمانہ انداز میں مجھے اپنے قریب بلایا اور ایک بار پھر باہر کی صورتِ حال کے بارے میں دریافت کرنے لگا۔ وہ جلد سے جلد اس کھوہ سے نکل جانا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اپنی والدہ کے بارے میں بھی حقیقت جاننے کا خواہاں تھا۔

میں نے اس سے کہا۔ ''میں دس پندرہ منٹ تک باہر جا رہا ہوں۔ آنے کے بعد ہی تمہیں حتمی طور پر کچھ بتا سکوں گا۔''

اس کے چہرے سے لگتا تھا کہ اس نے خود کو ذہنی طور پر کسی بھی بری خبر کے لیے تیار کر لیا ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو اپنے بزرگوں کی جدائی کا غیر معمولی صدمہ محسوس کرتے ہیں۔ ہاں اس کی آنکھوں میں تفکر ضرور لہرا رہا تھا۔ وہ مجھ سے یہ بھی جاننا چاہ رہا تھا کہ باہر موجود سارے سرخ پوش مارے گئے ہیں یا ابھی کوئی باقی ہے۔

میں نے کہا۔ ''دارج صاحب! میں کوئی غیب دان نہیں ہوں، نہ ہی کوئی ''جادو'' وغیرہ جانتا ہوں۔ ویسے بھی تم ''ان چیزوں'' کو مانتے ہی کب ہو۔ میں باہر جاؤں گا تو حقیقت کا پتا چلے گا۔''

وہ سمجھ گیا کہ میرا اشارہ خونی طوطوں اور چمگادڑوں کی طرف ہے۔ بہرحال وہ اس سلسلے میں کچھ بولا نہیں۔ جو کچھ پرسوں رات اس نے دیکھا تھا، اس کے بعد وہ کچھ بولنے کے قابل

ہی نہیں تھا۔

قریباً دس منٹ بعد میں باہر نکلنے کے لیے تیار تھا۔ بلٹ پروف جیکٹ ابھی تک میرے ہی جسم پر تھی۔ رائفل کے علاوہ ایک دندانے دار چھرا بھی میں نے بیلٹ میں اڑس لیا۔ بارش بدستور تھمی ہوئی تھی مگر بادل گرج رہے تھے۔ میں نے قسطینا کو کوتاہ قامت بنارس کی طرف سے ہوشیار رہنے کا کہا۔ کسی وقت مجھے شبہ ہوتا تھا کہ وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں ہے لیکن خود کو بدستور بے ہوش ظاہر کر رہا ہے۔

میں ٹیلوں اور بڑے بڑے پتھروں کے عقب میں بڑی احتیاط سے چلتا ہوا ان تین گاڑیوں کی طرف بڑھا جنہیں شیطان زادوں نے ہیلی کاپٹر والوں کی نظر سے بچانے کے لیے گھنی جھاڑیوں میں چھپا دیا تھا۔ راستے میں مجھے مختلف جگہوں پر مزید تین سرخ پوشوں کی لاشیں نظر آئیں۔ انہوں نے ریڈ کیٹ کی موت کے بعد کھوہ پر جنونی انداز میں شدید حملہ کیا تھا۔ قسمت اچھی تھی کہ ہمارے پاس ایم جی تھری تھی اور اسے چلانے کے لیے قسطینا جیسی ماہر بھی تھی۔ کہیں رینگتا ہوا، کہیں ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل چلتا ہوا اور کہیں جھک کر چلتا ہوا، میں بالآخر گاڑیوں کے قریب پہنچ گیا۔

یہاں کے مناظر تکلیف دہ تھے۔ سب سے پہلے میری نگاہ یاسمین بیگم کے سر پر ہی پڑی۔ یہ کٹا ہوا سر ایک چھوٹے سے پتھریلے گڑھے میں پڑا تھا۔ خون اور گرد و غبار میں اٹا ہوا یاسمین بیگم کی آنکھوں میں دہشت آمیز حیرت منجمد نظر آ رہی تھی۔ چند مکھیاں اس پر منڈلا رہی تھیں۔ تب میں اس کمرے میں پہنچا جہاں بقول پاشا، ابلیسی ٹولے نے شکیل کے ساتھیوں اور ملازموں کا قتل عام کیا تھا۔ یہ سب کچھ تقریباً ویسا ہی تھا جیسا پاشا نے بتایا تھا۔ یہاں پتھروں کا بنا ہوا ایک چھوٹا سا کمرا تھا۔ شاید کسی وقت سیاحوں یا پھر کسی شکاری نے اسے اپنا مسکن بنایا تھا۔ اب اس کمرے میں سات آٹھ لاشیں اوپر تلے پڑی تھیں۔ خون فرش پر جم کر سیاہی مائل ہو چکا تھا اور لاشوں سے بدبو اٹھنا شروع ہو گئی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق ہر لاش پر گولیوں کے اوسطاً چھ سات سوراخ موجود تھے۔ پاس ہی ایک کھوہ نما جگہ بھی تھی۔ یہاں سگریٹ کے بے شمار ٹکڑوں اور شراب کی خالی بوتلوں کے قریب ایک دیہاتی لڑکی پڑی تھی۔ اس کے منہ میں کوئی کپڑا ٹھونس کر اوپر سے اسی کی اوڑھنی باندھ دی گئی تھی۔ لڑکی کے ہاتھ پاؤں بندھے تھے۔ یقیناً یہ وہی راہ گیر لڑکی تھی جسے ان شیطان زادوں نے راستے سے اٹھایا تھا...... پاشا نے بتایا تھا کہ اس کے ساتھی مرد سے مندر کا پتا پوچھنے کے بعد اسے خنجر گھونپ دیا گیا تھا۔ اب وہ بے چاری لڑکی بھی بے سدھ پڑی تھی۔ وہ مر چکی تھی۔ میرے

اندازے کے مطابق اس کی موت دم گھٹنے سے واقع ہوئی تھی۔ کسی کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا جائے اور کسی وجہ سے اس کی ناک سے بھی اس کی سانس کو روانی نہ ملے تو اس کی موت یقینی ہو جاتی ہے۔

بدنصیب لڑکی کے جسم پر اس کی اوڑھنی ڈالتا ہوا میں آگے بڑھ گیا۔ اردگرد کوئی متنفس دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میرا یہ خیال درست نکلا تھا کہ اس شیطانی ٹولے کے پاس فقط چار ہی ڈیئر ہاؤنڈز تھے جو کھوہ کے اندر مارے جا چکے تھے۔

مختصر سے کمرے میں لاشوں کا جو ڈھیر پڑا تھا، وہاں سے مجھے دو پستول ملے ان پر بھی خون کے چھینٹے موجود تھے۔ ان میں سے ایک پستول پاشا کا تھا اور اس پر ایک اسٹیکر لگا ہوا تھا۔ میں نے اسی اسٹیکر کی وجہ سے اسے پہچانا۔ مجھے اسلحے کے بجائے سیل فونز کی تلاش تھی اور وہ مجھے کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ تھوڑی سی تلاش کے بعد یہ سارے سیل فونز مجھے ایک شاپر میں مل گئے جو ڈبل کیبن گاڑی کے اندر رکھا تھا۔ ڈیتھ اسکواڈ والوں نے یہ سارے فون، شکیل کے ساتھیوں سے لے کر آف کر دیئے تھے اور اس گاڑی میں رکھ دیئے تھے۔ ان کے اپنے پاس جدید قسم کی واکی ٹاکیز اور ہیڈ فونز تھے۔

میں نے ڈبل کیبن کی چابی ایک نشست پر پڑی دیکھ لی۔ میں نے گاڑی کو اسٹارٹ کیا اور وہ ہوگئی۔ جو تھوڑا بہت اسلحہ مجھے نظر آیا، وہ بھی میں نے گاڑی میں رکھ لیا۔ اس کے علاوہ کچھ کھانے پینے کی اشیا تھیں۔ یہ جگہ چھوڑنے سے پہلے میری نگاہ ایک بار پھر یاسمین بیگم کے کٹے ہوئے سر اور اس کی باقیات پر پڑی۔ بھوکے ڈیئر ہاؤنڈز نے بیگم کے جسم کے ٹکڑے کر ڈالے تھے۔ بارش اب تھمی ہوئی تھی عین ممکن تھا کہ کچھ دیر میں چیل کوّے یہاں آن موجود ہوتے اور ان باقیات کو نوچنے کھسوٹنے لگتے۔ میں گاڑی سے باہر نکلا۔ لوہے کے ایک راڈ کی مدد سے ان باقیات کو اس گڑھے میں پھینکا جہاں کٹا ہوا سر پہلے سے موجود تھا۔ پھر بہت سے کنکر اور پتھر وغیرہ اس گڑھے میں بھر دیئے۔ دوبارہ گاڑی میں سوار ہونے کے بعد میں نے اسے اس کھوہ کی طرف بڑھا دیا جہاں قسطینا، تاجور اور دارج وغیرہ میرا انتظار کر رہے تھے۔

گاڑی ہچکولے کھاتی آہستہ آہستہ کھوہ کی طرف بڑھنے لگی۔ میں اردگرد سے پوری طرح ہوشیار تھا۔ اس کے علاوہ میری نگاہ بار بار آسمان کی طرف بھی اٹھ جاتی تھی۔ آسمان پر بھی فی الحال کوئی خطرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ تاہم میں جانتا تھا کہ ہاناوانی زیادہ دیر خاموش نہیں رہے گی۔

میں کھوہ سے پندرہ بیس میٹر کی دوری پر پہنچ گیا۔ گاڑی اس سے آگے نہیں جا سکتی تھی۔ قسطینا بالکل الرٹ پوزیشن میں گن کے سامنے بیٹھی تھی۔ مجھے گاڑی سے اترتے دیکھ کر اس

کے چہرے پر اطمینان کے آثار نظر آئے۔

میں نے کہا۔ ''سب ٹھیک ہے قسطینا! اب ہم کچھ ریلیکس ہو سکتے ہیں۔''

''سیل فون ملا؟'' اس نے پوچھا۔

''ایک نہیں...... آٹھ دس ملے۔'' میں نے شاپر اس کی طرف بڑھایا۔

وہ ایک ایک کر کے انہیں آن کرنے لگی۔ کم از کم چار ایسے تھے جن میں چارجنگ موجود تھی اور وہ آن ہو گئے۔ ''کیا صورتِ حال ہے وہاں کی؟'' قسطینا نے سرگوشی کے لہجے میں پوچھا۔

''پاشا ٹھیک کہتا تھا۔ یاسمین بیگم سمیت سب ختم ہو چکے ہیں۔ وہ لڑکی بھی جسے یہ پکڑ کر لائے تھے۔''

قسطینا نے ہونٹ سکیڑے۔ اسی دوران میں دارج کی گرج سنائی دی۔ ''کیا خبر لائے ہو وہاں سے، ادھر آؤ...... بتاؤ مجھے۔''

میں نے اس کے پاس پہنچتے ہوئے کہا۔ ''اچھی خبر نہیں ہے۔ بیگم صاحبہ...... بچ نہیں سکیں...... انہوں نے کسی کو بھی نہیں چھوڑا۔ سب کو مار دیا ہے۔''

دارج کی آنکھوں میں سرخی دکھائی دینے لگی۔ وہ کچھ دیر چپ رہا پھر پھنکارا۔ ''کس نے جان لی ہے ان کی...... کون ذمے دار ہے؟''

میں نے کہا۔ ''اگر تم سچ پوچھتے ہو دارج! تو اس کا ذمے دار تمہارا کزن شکیل ہی ہے۔ اسی نے ان خطرناک ترین گینگسٹروں سے گٹھ جوڑ کیا...... اور اس بات کو بھلا دیا کہ یہ ٹیسٹ ٹیوب شیطان اپنی ذات کے سوا کسی کے وفادار نہیں۔ تمہاری والدہ نے بھی غلطی کی۔ تمہارے سامنے میں نے انہیں کئی دفعہ کہا کہ وہ وہاں جانے کا رسک نہ لیں اور اگر......''

''بکواس بند کرو۔'' وہ میری بات کاٹ کر دہاڑا۔ ''اس فساد کی اصل جڑ تو تم ہی ہو۔ تم خود کو میری ماں کی موت کی ذمے داری سے علیحدہ نہیں کر سکتے...... نہیں کر سکتے۔''

اس نے فرسٹریشن کے عالم میں شیشے کی ایک بوتل مجھ پر پھینکی جو میرے کندھے کے اوپر سے ہوتی ہوئی نیم بے ہوش بنارس کی کھوپڑی سے ٹکرائی اور ٹوٹ گئی۔ بنارس نے بری طرح کراہنا شروع کر دیا تھا۔

اسی دوران میں آن ہونے والے فونز میں سے دو پر ایک ساتھ کال کے سگنل آنے لگے۔ میں لپک کر قسطینا کے پاس پہنچا۔ آن ہونے والا ایک فون پاشا کا تھا اور اس پر جو کال آ رہی تھی وہ کسی اور کی نہیں علاقے کے طاقتور ترین سیاست دان شکیل داراب کی تھی۔ پتا نہیں

کہ وہ اب تک کتنی دفعہ ان نمبرز پر ٹرائی کر چکا تھا۔

''کیا خیال ہے، بات کرنی ہے؟'' قسطینا نے میری طرف دیکھا۔

کچھ دیر سوچ کر میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''بہتر ہے کہ ہم ان فونز کو ابھی بند ہی رکھیں۔ یہ لوگ لوکیشن ٹریس کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ صرف ایک فون آن رکھتے ہیں اور داؤد بھاؤ کو ٹرائی کرتے ہیں۔''

ہم نے آن ہونے والے فون پھر سے آف کر دیئے۔ میں نے ایک فون پر داؤد بھاؤ کا خاص نمبر پریس کیا۔ ابھی آدھی بیل ہی گئی تھی کہ کال ریسیو ہو گئی۔ ''کون؟'' داؤد بھاؤ کی پاٹ دار آواز میرے کان میں گونجی۔

میں نے کہا۔ ''اگر آپ کے اردگرد کوئی اور نہیں ہے تو آپ پھر مجھ سے بات کریں، میں شاہ زیب بول رہا ہوں۔''

دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ اس کا مطلب تھا کہ بھاؤ کے آس پاس کوئی موجود ہے۔ قدموں کی آہٹ ابھری۔ پھر دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی۔ تب بھاؤ کی ہیجانی آواز سنائی دی۔ ''شاہ زیب...... شاہ زیب، کہاں چلے گئے تھے تم؟ پورا پنجاب کھنگال مارا ہے ہم نے۔ یہ کس نمبر سے بات کر رہے ہو؟ کہاں ہو تم؟''

''کہیں آپ کا نمبر چیک پر نہ ہو؟''

''نہیں...... یہ عام نمبر نہیں ہے۔ بے فکر رہو اور جلدی بتاؤ تم خیریت سے تو ہو؟''

''آپ کہہ سکتے ہیں کہ خیریت سے ہوں، لیکن یہ خیریت زیادہ دیر تک نظر نہیں آتی۔ وہ بانا وانی ہمارے اردگرد منڈلا رہی ہے۔ آپ کو جلد از جلد ہم تک پہنچنا ہوگا۔''

''لیکن اس وقت کہاں ہو تم؟''

''پہلے آپ بتائیں آپ کہاں ہیں اور ایک بار پھر کنفرم کریں کہ آپ اکیلے ہیں۔''

''میں آج ہی کلر کہار سے چکوال آیا ہوں۔ یہاں ایک ہوٹل میں ہوں اور تم بار بار میرے اکیلے ہونے پر زور کیوں دے رہے ہو؟''

''آپ کے قریبی ساتھیوں میں ایک دو کالی بھیڑیں ضرور موجود ہیں۔ ان میں سے چھوٹے قد کی ایک بھیڑ اس وقت زخمی حالت میں میرے سامنے پڑی ہے۔ ہمارے ساتھ یہاں جو کچھ ہوا ہے اسی شخص کی وجہ سے ہوا ہے۔''

''کون ہے یہ؟'' بھاؤ نے پوچھا۔

''بنارس...... یہ شکیل داراب سے وفاداریاں نبھا رہا ہے۔''

بھاؤ کو میری بات پر یقین نہیں آیا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید مجھے کوئی بڑی غلط فہمی ہوئی ہے لیکن جب میں نے کچھ تفصیل بتائی تو وہ ششدر رہ گیا۔ اسے یقین نہیں آیا۔ اس کا خیال تھا کہ انیق اور جھارا کے بعد بنارس اس کے وفادار ترین ساتھیوں میں سے ہے۔

میں نے کہا۔ ''بھاؤ! آپ سے بڑھ کر کون جانتا ہوگا کہ پیسے میں بہت زیادہ طاقت ہوتی ہے...... اور اللہ کے ''فضل'' سے شکیل داراب کے پاس یہ طاقت بے شمار ہے۔''

میں نے مختصر لفظوں میں بھاؤ کو بتایا کہ کس طرح ہم نے بنارس کو اپنی مدد کے لیے فون کیا اور کس طرح وہ ٹیکساری گینگ کے جنونی قاتلوں کو لے کر ہمارے پاس پہنچ گیا۔ میں نے بھاؤ کو بتایا کہ ہم اس وقت کہاں اور کس حال میں ہیں۔

وہ بولا۔ ''میری اطلاع کے مطابق تو تمہاری تلاش کے لیے پولیس نے سارا زور برساتی نالے کے مشرق والے ایریا کی طرف لگا رکھا ہے۔''

''پولیس کو اس غلط فہمی میں بھی ٹیکساری والوں نے ہی ڈالا تھا۔ انہوں نے شکیل کے قریبی ساتھی پاشا کو گن پوائنٹ پر رکھ کر اس سے شکیل کو فون کرایا تھا۔ پاشا اب ختم ہو چکا ہے۔ شکیل کے باقی سارے ساتھی بھی ٹیکساری ڈیتھ اسکواڈ نے مار ڈالے ہیں۔''

بھاؤ نے یہ سب کچھ حیرت کے عالم میں سنا۔ میں نے اسے اپنی موجودہ لوکیشن کے بارے میں کچھ نشانیاں بتائیں۔ بھاؤ نے کہا۔ ''اس علاقے کا ایک پرانا رہائشی میرے ساتھ ہے۔ اکثر شکار کھیلنے کے لیے سکیسر کے علاقے میں جاتا رہتا ہے۔ ہم اسے ساتھ لے لیتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ہم ڈیڑھ دو گھنٹے میں تم تک پہنچ جائیں گے۔''

''بھاؤ مجھے بس ہیلی کاپٹر کی طرف سے ڈر ہے۔ موسم اب ٹھیک ہے۔ اگر ہیلی کاپٹر نے علاقے پر دوبارہ پرواز شروع کر دی تو شکیل کے لوگ آپ سے پہلے ہم تک پہنچ سکتے ہیں۔''

''مگر شاہ زیب! تم اپنے طور پر وہاں سے نکلنے کی کوشش نہ کرنا۔ یہاں چپے چپے پر تمہاری تلاش ہو رہی ہے۔ تم جہاں ہو وہاں زیادہ محفوظ ہو۔ ویسے بھی جب تک وہ حرامی دارج تمہارے قبضے میں ہے شکیل کے لوگ کوئی غلط قدم نہیں اٹھائیں گے۔ ہم بس دس پندرہ منٹ میں یہاں سے نکل رہے ہیں۔''

تھوڑی سی مزید ڈسکشن کے بعد میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔ میں نے داؤد بھاؤ کو بتا دیا تھا کہ میں فون آف کر رہا ہوں۔ ٹھیک ایک گھنٹے بعد دوبارہ آن کروں گا (جیسا کہ میں نے بتایا ہے مجھے اندیشہ تھا کہ ''آن فون'' کی وجہ سے کہیں ہماری لوکیشن ٹریس نہ کی جائے)

وہ ایک گھنٹہ کاٹنا خاصا دشوار تھا میری اور قسطینا کی نگاہ بار بار آسمان کی طرف اٹھ جاتی

تھی۔ ہمارے لیے جو دو شدید خطرے تھے ان کا تعلق فضا سے ہی تھا۔ پہلا خطرہ ہیلی کاپٹر کا اور دوسرا ہاناوانی کے ہپناٹائزڈ پرندوں کا۔

جیسے تیسے یہ ایک گھنٹہ طے ہوا میں نے فون آن کر کے داؤد بھاؤ کے خاص نمبر پر رابطہ کیا۔ داؤد بھاؤ نے فوراً ہی کال ریسیو کی۔ اس نے کہا۔ ''شاہ زیب! آگے جانے کے سارے راستے بند ہیں۔ بہت سخت سکیورٹی ہے۔ تھوڑا سا ٹائم لگ جائے گا لیکن تم پریشان نہیں ہونا۔ شام ہونے تک میں کوئی نہ کوئی حل ڈھونڈ لوں گا۔''

میں نے کہا۔ ''بھاؤ، اگر زیادہ مشکل ہے تو پھر زیادہ رسک نہ لیں۔ ہم یہاں سے نکل پڑتے ہیں۔ ہماری گن دارج کے سر پر ہوگی تو کوئی ہمیں ٹچ نہیں کرے گا پھر دیکھ لیں گے جو بھی ہوگا۔''

''لیکن ایسی صورت میں یہ لوگ تمہارا اور قسطینا کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ گھیرا ڈال کر بیٹھ جائیں گے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ باسٹرڈ شکیل داراب اپنے اس کزن دارج کی بھی پروا نہ کرے۔ ان سیاسی خاندانوں کے اندر اپنی دشمنیاں بھی تو چل رہی ہوتی ہیں۔ سگے بیٹے اپنے باپ کی لاش پر پاؤں رکھ کر خود کو اونچا کرنے کا سوچ رہے ہوتے ہیں۔''

''آپ کے خیال میں کتنا انتظار کرنا ہوگا ہمیں؟''

''یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا مگر میں بھی جانتا ہوں کہ اس وقت ایک ایک پل قیمتی ہے۔'' پھر وہ ذرا توقف سے بولا۔ ''عین ممکن ہے کہ میرے جو بندے تمہاری طرف آئیں، وہ پولیس کی گاڑی میں ہوں اور وردی بھی پولیس ہی کی ہو۔''

داؤد بھاؤ کافی جلدی میں محسوس ہوتا تھا۔ مجھے تھوڑی سی مزید تسلی دے کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

جب سے یہ ہاناوانی والی آفت سامنے آئی تھی، میرے اندر ایک عجیب بے یقینی سی پیدا ہوگئی تھی۔ اگر میں یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ قریبی ساتھیوں پر بھی اعتماد کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ کیا پتا، کون کس وقت ہاناوانی کے ہتھے چڑھ جاتا۔ داؤد بھاؤ کسی معمولی شخص کا نام نہیں تھا اور نہ ہی اس پر ہاتھ ڈالنا کوئی آسان کام تھا لیکن ہمارے اردگرد اتنی انہونیاں ہو رہی تھیں کہ کچھ بھی بعید از قیاس نہیں تھا۔ میں ڈبل کیبن میں جو سامان اپنے ساتھ لایا تھا اس میں چند ٹن پیک جوس اور بسکٹس کے دو تین پیکٹ بھی تھے۔ یہ چیزیں ہمارے بالکل خالی معدوں کے لیے ناکافی تھیں۔ پھر بھی ان سے ہمیں کچھ سہارا ملا۔

دارج مسلسل تکلیف میں تھا۔ اب تو اس کی تیمارداری کے لیے سعید کھوکھر بھی اس کے

اردگرد موجود نہیں تھا۔ دارج کا سارا غصہ اب تاجور پر ہی نکل رہا تھا۔ تاجور کے اپنے کندھے پر بھی ٹھیک ٹھاک چوٹ آئی تھی۔ اس کے باوجود وہ اس کی دیکھ بھال میں لگی ہوئی تھی۔

وہ کروٹ بدلنا چاہ رہا تھا۔ تاجور اکیلی تو یہ کام نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے بے بسی سے میری طرف دیکھا۔ قسطینا نے گن کے سامنے پوزیشن لی ہوئی تھی اور وہ وہاں سے اٹھنا نہیں چاہتی تھی۔ مجھے ہی تاجور کی مدد کے لیے جانا پڑا۔ میں نے دارج کے تاثرات دیکھے۔ اس سے پہلے اسے گوارا نہیں تھا کہ میں اس کے جسم کو ہاتھ لگاؤں لیکن اب تکلیف اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہو رہی تھی۔ سچ کہتے ہیں کہ جب جان پر بنتی ہے تو آدرش دھرے رہ جاتے ہیں۔

''اجازت ہے؟'' میں نے دارج کے جسم کو ہاتھ لگانے سے پہلے پوچھا۔

وہ بس کراہ کر رہ گیا۔ میں نے اور تاجور نے اس کی کروٹ بدلنے کی کوشش کی تو اس کی تکلیف اور بڑھ گئی۔ وہ بلند آواز میں ہائے وائے کرنے لگا۔ ''نہیں رہنے دو۔'' وہ پکارا۔

ہم نے اسے چھوڑ دیا۔ اس نے خونی نظروں سے مجھے دیکھا، جیسے اس کی ساری تکلیفوں کا ذمے دار صرف اور صرف میں ہی ہوں۔

''کروٹ نہ بدلیں، ذرا ٹیک لگا کر بیٹھ جائیں۔'' تاجور نے کہا۔

میں نے پہلی بار دیکھا کہ تاجور نے کوئی بات کی اور جواب میں اسے جھاڑ نہیں سننا پڑی۔ اس نے مکروہ سا چہرہ بنایا اور بس اثبات میں سر ہلا دیا۔

تاجور نے اس کے سر کے نیچے سے کشن نکال کر کھوہ کی دیوار سے ٹکایا پھر ہم دونوں اس کے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے اور اسے اوپر کی طرف کھسکنے میں اس کی مدد کی۔ ہم دونوں کے سر آپس میں جڑ گئے۔ تاجور کے خدوخال اتنے قریب تھے کہ میں انہیں دیکھے بغیر نہ رہ سکا۔ ہاں...... یہی آنکھیں، یہی رخسار اور یہی ہونٹ کبھی کتنا قریب تھے مجھ سے۔ اس کی سانس کی جانی پہچانی مہک دو سیکنڈ کے لیے میرے نتھنوں سے ٹکرائی اور مجھ پر کئی حسین یادوں کے دریچے وا کر گئی۔

تاجور جیسے گڑبڑا کر دارج کے سر کے نیچے کشن درست کرنے لگی۔ غنیمت تھا کہ اس موقع پر دارج کی آنکھیں بند تھیں، ورنہ وہ میری اس لمحاتی کیفیت کو دیکھ کر شاید خود پر ضبط نہ رکھ سکتا اور منہ سے انگارے نکالنا شروع کر دیتا۔

اچانک ہیلی کاپٹر کی مدھم پھڑ پھڑاہٹ نے ہمارے اندیشے پھر جوان کر دیئے۔ یہ پھڑ پھڑاہٹ کافی فاصلے سے ابھری تھی مگر قریب آتی جا رہی تھی۔ میں فوراً قسطینا کے پاس پہنچا

اور ٹیلی اسکوپ سے آنکھ لگائی۔ سورج بادلوں کے پیچھے تھا۔ تاہم اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ مغرب کی طرف جھکا ہوا ہے۔ غالباً تاریکی پھیلنے سے پہلے ہیلی کاپٹر والے ایک آخری کوشش کرنا چاہتے تھے۔ میں نے کہا۔ ''قسطینا! رخ ہماری طرف ہی ہے۔''

''اگر دیکھے گئے تو پھر؟'' قسطینا نے پوچھا۔

''پھر بھی فوری طور پر تو کچھ نہیں ہوگا۔ یہاں کوئی ایسی جگہ تو نظر نہیں آتی جہاں یہ چاپر لینڈ کر سکے...... لیکن اگر ایسا ہی ہوگیا تو پھر ہمیں دارج کا سہارا لینا پڑے گا۔'' میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''تمہارا مطلب ہے کہ دارج کے سر پر رائفل رکھنا پڑے گی؟''

''شاید ایسا ہی کرنا پڑے۔'' میں نے کہا۔

قسطینا نے میری طرف دیکھا اور معنی خیز لہجے میں بولی۔ ''اگر ایسا ہوا تو مجھے یقین ہے کہ تاجور تم سے ناراض نہیں ہوگی بلکہ ہوسکتا ہے کہ وہ دل میں تھوڑی بہت خوشی بھی محسوس کرے۔''

''نہیں قسطینا! آپ غلط اندازہ لگا رہی ہیں۔ ہمارے خطے کی عورتیں شوہر سے وفاداری میں دوسروں سے ہمیشہ دو ہاتھ آگے رہی ہیں اور جاننے والے اس خوبی کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔''

''تم اس کو خوبی کہہ رہے ہو تو بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن شوہر کو بھی تو شوہر ہونا چاہیے ناں۔ یہ شخص تو ایک غصیلا جانور ہے۔ یقین کرو میرے اختیار میں ہو تو ابھی پتھر پکڑوں اور اس کا منہ توڑ دوں۔''

''پلیز آہستہ بولیں۔ اس نے سن لیا تو اپنی حالت کی پروا کیے بغیر بھڑکنا اور پھدکنا شروع کر دے گا۔''

ہیلی کاپٹر کی آواز قریب آ رہی تھی۔ ابھی تک یہی لگ رہا تھا کہ وہ اس کھوہ کے اوپر سے گزرے گا لیکن پھر اس نے اپنا رخ تبدیل کیا اور ایک دائرہ سا بناتا ہوا شمال کی طرف چلا گیا۔ ہمارے تنے ہوئے رگ پٹھوں نے قدرے سکون محسوس کیا۔

میں نے ایک بار پھر موبائل آن کر لیا۔ ابھی میں بھاؤ کو فون کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ کال کا میوزک ابھرا۔ میں نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف داؤد بھاؤ کا ایک اہم کارندہ وارث لودھی بول رہا تھا۔ یہ بھی گینگ کے خطرناک ترین شوٹرز میں سے ایک تھا۔ میں نے اس کی آواز پہچان لی، وہ بولا۔ ''السلام علیکم۔ ہم آپ کے قریب پہنچ گئے ہیں جی۔ نالا پار کر لیا

ہے۔ وہ دو پہاڑیاں بھی نظر آ گئی ہیں جن کا آپ نے بتایا تھا۔''

''بھاؤ کہاں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ ساتھ نہیں ہیں مگر سارا آپریشن ان کی نگرانی میں ہو رہا ہے۔ آپ بے فکر رہیں۔ ہم پولیس کی ٹویوٹا جیپ میں آ رہے ہیں۔ شاید ابھی دو چار منٹ میں آپ کو یہ نیلی جیپ نظر آ جائے گی۔ آپ بالکل تیار رہیں۔ ہم فوراً یہاں سے نکلیں گے۔''

مختصر گفتگو کے بعد میں نے فون بند کیا اور اسنیپر گن کی ٹیلی اسکوپ سے آنکھ لگائی۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد دور نشیب میں رینگتی ہوئی نیلی جیپ نظر آ گئی۔ چھت پر ایمرجنسی لائٹ بھی دکھائی دے رہی تھی۔

''وہ آ رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''کہیں پھر کوئی ڈاج نہ ہو جائے۔'' قسطینا نے خدشہ ظاہر کیا۔

''نہیں، اس مرتبہ دھوکا نہیں کھائیں گے۔''

میں نے بھاؤ کا نمبر ملایا۔ اس نے بھی تصدیق کی کہ وارث لودھی ایک ایس ایس پی کو گاڑی سمیت اغوا کر چکا ہے اور ایک گائیڈ کے ساتھ ہمارے پاس پہنچ رہا ہے۔''

ایس ایس پی کا اغوا کوئی معمولی اطلاع نہیں تھی۔ تاہم بھاؤ جیسے گینگسٹر کے لیے یہ کوئی بہت دشوار کام بھی نہیں تھا۔ میں نے قسطینا سے کہا۔ ''آپ اپنی گن کے سامنے بالکل چوکس رہیں۔ جب تک پوری طرح تسلی نہ ہو جائے آپ وارث لودھی اور اس کے ساتھی کو نشانے پر رکھیں۔''

''او کے۔'' اس نے چستی سے اثبات میں سر ہلایا۔

خوراک کی کمی اور شدید تھکن کے باوجود وہ بالکل چوکس تھی۔ یقیناً یہ اس کی سخت فوجی ٹریننگ کے باعث تھا۔

ہم سے قریباً سو میٹر کے فاصلے پر پہنچ کر پولیس کی جیپ رک گئی۔ یقیناً وہ لوگ ہماری پھنسی ہوئی جیپ اور بائیں طرف کھڑی ڈبل کیبن کو دیکھ چکے تھے۔ وہ تذبذب میں تھے کہ کس طرف جائیں۔ میں کھوہ سے باہر نکلا اور ایک کپڑا لہرا کر جیپ سواروں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ فوراً ایک شخص جیپ سے باہر آیا اور اس نے بھی میری طرف دیکھ کر دونوں ہاتھ لہرائے۔ میں نے ڈیل ڈول سے پہچان لیا۔ یہ وارث لودھی ہی تھا۔ اس نے سفید دھاریوں والی سیاہ شرٹ اور خاکی پتلون پہن رکھی تھی۔ تھوڑی سی نکلی ہوئی توند اور نیم گنجا سر اس کی اہم نشانیاں تھیں۔

جیپ ایک بار پھر آگے بڑھی اور ہچکولے کھاتی، ڈگمگاتی، ڈبل کیبن کے پاس پہنچ کر رک گئی۔ ڈرائیونگ نشست پر ایک باوردی پولیس والا موجود تھا۔ وہ باہر نکلا تو یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ وہی ایس ایس پی تھا۔ یعنی وہ اپنی سرکاری جیپ خود ڈرائیو کر کے یہاں تک لایا تھا۔ ایک تیسرا شخص اس بڑے سائز کی جیپ کے پچھلے دروازے سے باہر نکلا۔ شلوار قمیص والا یہ دبلا پتلا شخص یقیناً وہی مقامی شکاری تھا جسے بھاؤ نے رہنمائی کے لیے لودھی کے ساتھ بھیجا تھا۔

قسطینا بولی۔ ''اگر ایس ایس پی کو اغوا کیا گیا ہے تو پھر اسے گن پوائنٹ پر ہونا چاہیے تھا مگر یہ تو آزاد کھڑا ہے۔''

''ہاں، یہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔''

''کہیں یہاں بھی تو ہاناوانی کا کوئی داؤ نہیں چل گیا۔ میرا مطلب ہے داؤد بھاؤ تو ٹھیک ہے ناں۔'' وہ ہلکے پھلکے لہجے میں بولی۔

''میرے خیال میں وہ ٹھیک ہے قسطینا، وہ اتنی آسانی سے کسی کے ہتھے چڑھنے والا شخص نہیں۔''

''ایک دفعہ پھر اس سے رابطہ کر کے پوچھو کہ ایس ایس پی واقعی اغوا ہے یا لودھی کی مدد کر رہا ہے؟''

میں نے ہاتھ کے اشارے سے لودھی وغیرہ کو کہا کہ وہ ابھی اپنی جگہ پر رکیں۔ اس دوران میں، میں نے بھاؤ سے رابطہ کر لیا۔ میں نے ایس ایس پی والا سوال بھاؤ سے کیا تو وہ بولا۔ ''کہیں اس شبہے میں تو نہیں پڑ گئے کہ ہم پر بھی ہاناوانی کا جادو چل گیا ہے؟''

اس نے میرے دل کی بات پکڑی تھی۔ میں نے کہا۔ ''جو کچھ ہمارے آس پاس ہو رہا ہے بھاؤ، اس نے دماغ کا فالودہ بنا دیا ہے۔ ہر جگہ، ہر سین فریب دکھائی دیتا ہے۔''

''لیکن یہاں سب ٹھیک ٹھاک ہے۔ شاہ زیب۔'' بھاؤ نے مستحکم لہجے میں کہا۔ پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''دوسری بات تم نے یہ پوچھی ہے کہ ایس ایس پی اغوا ہوا یا تعاون کر رہا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ تعاون کر رہا ہے لیکن یہ تعاون بے وجہ نہیں ہے۔ ایس ایس پی کا بیٹا اس وقت میرے پاس ہے۔ میرے سامنے ہی صوفے پر بیٹھا آنسو بہا رہا ہے۔ شاید تمہیں اس کی تھوڑی بہت آواز بھی آ رہی ہو۔''

میں نے غور کیا تو کسی کے فریاد کناں آواز میں بولنے اور رونے کی مدھم آواز سنائی دی۔ کسی وقت یوں بھی لگتا تھا کہ بولنے والا جارحانہ انداز اختیار کر رہا ہے اور دھمکا رہا ہے۔

بھاؤ معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''چھ بہنوں کا اکلوتا بھائی ہے اور سب سے آخر میں پیدا ہوا ہے۔

اندازہ لگا لو کتنا لاڈلا ہوگا۔ کالج جا رہا تھا مگر ہم مہمان نوازی کے لیے پکڑ کر یہاں لے آئے ہیں۔ کچھ بھی نہیں کہیں گے اسے۔ جب تم لوگ محفوظ ٹھکانے پر پہنچ جاؤ گے تو یہ بھی صحیح سلامت اپنے گھر پہنچ جائے گا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی، کیا سمجھے؟''

میں سناٹے میں رہ گیا۔ بھاؤ نے ہمیں یہاں سے بہ حفاظت نکالنے کے لیے ایک بڑا قدم اٹھایا تھا۔ ایسا قدم بھاؤ جیسا شخص ہی اٹھا سکتا تھا۔ ایسا شخص جس نے انتظامیہ کے اندر اپنی انتظامیہ بنا رکھی تھی۔ وہ تیس سال سے اپنی جان ہتھیلی پر لیے پھر رہا تھا اور جو شخص اپنی جان ہتھیلی پر رکھتا ہے اس کو دوسروں کی جان پر اختیار حاصل ہونے لگتا ہے۔

سب کچھ اسی طرح ہوا جس طرح داؤد بھاؤ نے کہا تھا۔ یہ لوگ ایک اسٹریچر بھی ساتھ لے کر آئے تھے۔ اس اسٹریچر کے ذریعے پہلے دارج داراب کو اور پھر بنارس کو جیپ کی عقبی نشستوں پر لٹایا گیا۔ شیطان زادے کو ہم نے بری طرح رسیوں میں جکڑ رکھا تھا۔ میں نے اسے کسی گٹھڑی کی طرح اٹھا کر جیپ کے عقبی خلا میں پھینک دیا۔ اس کے منہ مین کپڑا ٹھونسا گیا تھا۔ پھر بھی وہ گالیاں بکنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ وہ جب بھی تاجور کی طرف دیکھتا تھا اس کی آنکھوں میں ایک مکروہ چمک نظر آنے لگتی تھی۔ پھر تاجور، قسطینا اور میں بھی جیپ میں سوار ہو گئے۔ سعید اور پاشا کی لاش سمیت باقی لاشوں کو فی الحال وہیں پڑا رہنے دیا گیا۔ درمیانی عمر کے ایس ایس پی کا چہرہ پریشانیوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ وہ اس ''ان چاہی کارروائی'' کو جلد از جلد مکمل کرنے کا خواہاں تھا۔ یہاں کے مناظر دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئی تھیں۔

بھاؤ کو پتا تھا کہ ہم تقریباً 72 گھنٹوں سے بھوکے پیاسے ہیں۔ جیپ میں ہاٹ پاٹس کے اندر سینڈوچز اور فلاسک میں چائے وغیرہ موجود تھی۔ ایک باسکٹ میں پھل تھے۔ لودھی نے سرگوشی میں مجھے بتایا۔ ''ہمیں یہاں سے موٹر وے پر پہنچنا ہے اور پھر سیدھا لاہور...... کہیں رکنا نہیں ہے۔''

''جانا کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہیں راوی فارم، جہاں آپ کے باقی ساتھی ہیں۔ بھاؤ جی نے بتایا ہے کہ آپ کے دوست سجاول صاحب کو بھی راوی فارم پہنچا دیا گیا ہے۔''

''ایس ایس پی سمیت راوی فارم کیسے جائیں گے؟'' میں نے استفسار کیا۔

''اسے راستے میں ہی کہیں مار کر پھینک دیں گے۔'' وہ بولا۔

''کیا مطلب؟''

وہ مسکرایا۔ ''سوری جی، مذاق کر رہا ہوں۔ لاہور میں ہی بند روڈ پر ایک جگہ مقرر ہے۔ وہاں ہم اس جیپ کو اور اس پولیس افسر کو چھوڑ دیں گے اگر آپ نے دارج اور ان کی بیگم کو وہاں چھوڑنا ہو تو انہیں بھی چھوڑ دیں۔ ہم ایک دوسری اسٹیشن وین کے ذریعے راوی فارم پہنچیں گے۔ بعد میں پوری تسلی ہونے کے بعد مہمان کو رخصت کر دیں گے۔ میرا مطلب ہے کہ ایس ایس پی کے بیٹے کی ''باعزت رہائی'' ہو جائے گی۔''

بھاؤ نے ایک مکمل پلان بنایا تھا......اور کافی تیزی سے بنایا تھا۔ اپنی فیلڈ میں بھاؤ کی ذہانت اور تجربہ کاری ہر شبہے سے بالاتر تھی۔

کچھ ہی دیر بعد ہماری جیپ ڈگمگاتی، ہچکولے کھاتی کھوہ سے روانہ ہو رہی تھی۔ اب شام کے سائے گہری تاریکی میں بدلنے لگے تھے، تاہم جیپ کی ہیڈ لائٹس آن نہیں کی گئی تھیں۔ ڈرائیونگ خود ایس ایس پی کر رہا تھا۔ اس کا نام تنویر احمد خاں تھا۔ عینک لگا رکھی تھی اور عام پولیس افسروں کے برعکس پڑھا لکھا اور کچھ دھیما نظر آتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں گہری پریشانی مسلسل ہلکورے لے رہی تھی۔ وہ مجھے مفرور کی حیثیت سے اچھی طرح پہچان چکا تھا لیکن ہمارے درمیان اب تک بس دو چار جملوں کا تبادلہ ہی ہوا تھا۔

فارس جان کے حوالے سے قسطینا کی فکرمندی ایک فطری چیز تھی۔ اس نے سرگوشی میں سے کہا کہ میں لودھی سے فارس اور ناوان کے بارے میں معلوم کروں۔ میں نے بھی دھیمی رگوشی کا انداز اختیار کر کے یہ سوال لودھی سے پوچھا۔ اس نے کہا۔ ''مجھے اس بارے میں کچھ زیادہ پتا نہیں...... اور نہ ہی شاید بھاؤ جی کو ہے لیکن یہ تو طے ہے کہ وہ دونوں ان ٹیکساری والوں سے بچ نکلے ہیں۔''

''مگر اس وقت چمگادڑیں ان کے پیچھے تھیں۔''

''خدانخواستہ ان کو کوئی حادثہ پیش آتا تو اب تک ان کی گاڑی کا سراغ لگ چکا ہوتا۔ دو ہیلی کاپٹر علاقے پر کئی دفعہ پرواز کر چکے ہیں۔''

میں کہہ سکتا تھا کہ ہم بھی تو ہیلی کاپٹر سے بچے رہے ہیں، لیکن خاموشی اختیار کی۔ قسطینا سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے اسے اپنے اور لودھی کے درمیان ہونے والی گفتگو کا ترجمہ انگلش میں بتایا۔

قریباً ایک گھنٹے بعد ہماری جیپ ایک نیم پختہ راستے پر پہنچ گئی۔ یہاں آتے ہی آفیسر تنویر خاں نے لودھی سے مشورہ کیا اور جیپ کی ہیڈ لائٹس آن کر دیں۔ اس کے علاوہ اس نے چھت پر لگی ہوئی ریوالونگ لائٹ بھی روشن کر دی۔

روانگی سے پہلے میری ہدایت پر تاجور نے دارج کو پین کلر کی ٹرپل ڈوز دے دی تھی اور اب وہ نشست پر نیم بے ہوشی کی سی کیفیت میں پڑا تھا۔ کوتاہ قد بنارس کی بھی کچھ ایسی ہی کیفیت تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ جیپ میں سوار کرنے کے بعد میں نے اس کے ہاتھ ایک بار پھر پشت کی طرف باندھ دیئے تھے۔ ہم سب کے ذہنوں میں ابھی تک پرندوں اور چمگادڑوں والا بھیانک اندیشہ بھی موجود تھا۔ خاص طور پر تاجور ہراساں تھی۔ وہ بار بار کھڑکی میں سے اوپر ابر آلود آسمان کی طرف دیکھنے لگتی تھی۔

''اوپر کیا دیکھ رہی ہے منہ اٹھا اٹھا کر۔ نیچے دیکھ میری طرف۔'' دارج دانت پیس کر تاجور سے مخاطب ہوا۔

وہ گڑبڑا کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ جیپ کے جھٹکوں کی وجہ سے دارج کی ایک ٹانگ پھسل کر نشست سے نیچے اتر گئی تھی۔ وہ اس قابل نہیں تھا کہ ٹانگ کو دوبارہ نشست پر لا سکے۔ تاجور نے اس کے پاؤں کو سہارا دیا اور ٹانگ کو دوبارہ نشست پر رکھا۔

وہ طیش کے عالم میں منہ ہی منہ میں پتا نہیں کیا بڑبڑانے لگا۔ غالباً اس نے تاجور سے ایک بار پھر اس کے کندھے کی چوٹ کے بارے میں نہیں پوچھا تھا۔ اسے بس اپنی ہی پڑی ہوئی تھی۔ اسے تکلیف دے کر اور تکلیف میں دیکھ کر شاید وہ سکون محسوس کرتا تھا...... اور یہ بھی کہا جا سکتا تھا کہ وہ تکلیف سہہ کر سکون محسوس کرتی ہے۔

وہ واقعہ یقیناً میرے لیے بھی تعجب خیز تھا۔ تاجور جیسی لڑکی نے مجھے بچانے کے لیے چاقو اٹھایا تھا اور اسے کئی مرتبہ گینگسٹر کے جسم میں گھونپا بھی تھا۔ غالباً یہی واقعہ تھا جس کے بعد سے دارج کا رویہ تاجور سے مزید درشت ہو گیا تھا۔ اسے وہ سب کچھ یقیناً زہر لگا تھا اور وہ اپنی زبان سے اس کا اظہار بھی کر چکا تھا۔

موٹروے پر پہنچتے ہی اس سرکاری جیپ کی رفتار 120 کلومیٹر کا ہندسہ چھونے لگی۔ ایس ایس پی تنویر گاہے بگاہے جیپ کا ہوٹر بھی آن کر دیتا تھا۔ موٹروے تک پہنچنے سے پہلے ہمیں کلر کہار تک راستے میں جگہ جگہ پولیس کے ناکے ملے تھے۔ مشکوک گاڑیوں کو روک کر تلاشی بھی لی جا رہی تھی۔ اگر ہم سرکاری جیپ میں نہ ہوتے اور پولیس آفیسر خود گاڑی ڈرائیو نہ کر رہا ہوتا تو ہم کبھی بھی اس طرح سفر نہیں کر سکتے تھے۔ اب موٹروے پر سفر کرتے ہوئے بھی ہمیں ہر طرح تحفظ کا احساس ہو رہا تھا۔ کئی جگہوں پر پولیس اہلکاروں نے ایس ایس پی کو سلیوٹ بھی کیا۔ اب کچھ پتا نہیں تھا کہ اپنے اس ہنگامی سفر کے لیے تنویر احمد خاں کو بعد میں کیا جواز پیش کرنا تھا۔ اندازہ یہی تھا کہ اسے محکمے کو ساری حقیقتِ حال بتانا پڑے گی۔ ظاہر ہے

کہ دارج داراب ہمارے ساتھ موجود تھا اور وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اگر وہ زندہ رہتا اور لگتا یہی تھا کہ زندہ رہ گیا تو پھر تنویر احمد خاں کا بھید تو کھلنا ہی تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ ایک لاچار باپ کی حیثیت سے آنسو بہاتا اور ''جذبہ پدری'' کا حوالہ دے کر اعلیٰ حکام کو رحم کھانے پر آمادہ کر لیتا۔

ہم رات ایک بجے کے لگ بھگ بخیریت لاہور پہنچ گئے۔ تاجور جانتی تھی کہ اب اسے ہم سے جدا ہونا پڑے گا۔ جوں جوں گاڑی بدلنے کا وقت قریب آ رہا تھا میں اس کے شفاف چہرے پر ایک ناقابلِ فہم کیفیت دیکھ رہا تھا۔ یہ اداسی، تکلیف اور پریشانی کی کوئی ملی جلی حالت تھی۔ آخر گاڑی بند روڈ پر واقع اس مقررہ مقام پر پہنچ گئی جہاں ایک پرائیویٹ فرم کی ڈلیوری وین ہمارے لیے تیار کھڑی تھی۔ اب پتا نہیں کہ یہ ڈلیوری وین تھی یا نہیں لیکن ہم نے اسی میں سوار ہو کر راوی فارم پہنچنا تھا۔

بلند چاردیواری والے ایک ویران احاطے کے اندر ہم نے اپنا سامان اور اسلحہ وین کے اندر منتقل کر لیا۔ اس کے بعد بنارس کو وین میں پہنچایا گیا۔ آخر میں، میں نے گٹھڑی بنے شیطان زادے کو اٹھایا اور وین کی دو نشستوں کے درمیان ٹھونس دیا۔

قسطینا جیپ سے باہر کھڑی تھی اور تاجور سے بات کر رہی تھی۔ دونوں اس طرح کھڑی تھیں کہ جیپ کے اندر لیٹا دارج داراب ان کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ میرے ساتھ رہنے کے بعد قسطینا کو اردو کے چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ آ گئے تھے۔ وہ تاجور کے دونوں ہاتھ تھام کر بولی۔

''تاجور! توم بہت اچھا...... دل کرتا ہام پھر ملیں ...... اگر تم ...... اگر توم......'' وہ اٹک کر رہ گئی۔ کچھ مزید کہنا چاہتی تھی لیکن الفاظ نے ساتھ نہیں دیا۔

اس نے پینٹ کی جیب سے ایک چھوٹی سے پرچی نکالی اور تاجور کی مٹھی میں تھما دی۔

''ہیئر از مائی فون نمبر۔ توم پرامس کرو...... اگر ہام توم کو فون کرتا، تو توم ریسیو کرتا، پلیز پرامس ...... پلیز......''

قسطینا کے لہجے میں ایسی التجا اور اپنائیت تھی کہ تاجور کو اثبات میں سر ہلاتے ہی بنی۔

''نو نو...... ناٹ ان دس وے...... پرامس، پٹنگ یور ہینڈ آن مائی ہیڈ پلیز۔'' اس نے تاجور کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سر پر رکھ لیا۔

تاجور چند لمحے کے لیے شدید ہچکچاہٹ میں نظر آئی پھر اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے۔''

قسطینا نے تاجور کو گلے لگایا لیکن بہت آہستگی سے۔ اسے معلوم تھا کہ اس کا کندھا زخمی

ہے اور قسطینا کو خود بھی چوٹیں لگی ہوئی تھیں۔ تاجور نے میری طرف دیکھا اور جیسے نگاہوں ہی نگاہوں میں خدا حافظ کہا پھر وہ تیزی سے مڑی اور جیپ میں لیٹے ہوئے اس شخص کی طرف چلی گئی جو کہنے کو تو اس کا مجازی خدا تھا...... مگر حقیقت میں انسان کے درجے کو بھی نہیں پہنچتا تھا۔ وہ شادی سے پہلے ہزار جان سے تاجور کی دلکشی پر فدا تھا لیکن اب اپنی ہر ناکامی، ہر تکلیف اور ہزیمت کا منبع تاجور کو سمجھتا تھا۔

نیلے رنگ کی سرکاری جیپ تاجور، دارج اور ایس ایس پی تنویر خاں سمیت وہیں کھڑی رہی۔ بھاؤ گینگ کے دو مسلح کارندے اس جیپ کے پاس موجود رہے۔ ہم بند اسٹیشن وین میں اس ویران احاطے سے روانہ ہو کر راوی فارم کی طرف رواں ہو گئے۔ لودھی اور اس کا شکاری ساتھی بھی ہمارے ساتھ ہی وین میں موجود تھے۔ قسطینا آخر تک مڑ مڑ کر اس جیپ کو دیکھتی رہی جس میں تاجور موجود تھی۔

○......❖......○

اب ہم راوی فارم میں تھے۔ بارڈر ایریا میں واقع یہ فارم ہاؤس ہر طرح سے ایک محفوظ پناہ گاہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے باہر سے فارم ہاؤس کی عمارت جیسی بھی تھی لیکن اندر یہاں آرائش و آرام کی ہر چیز میسر تھی۔ وسیع رقبے کو ایک چار دیواری سے محفوظ کیا گیا تھا اور اس چار دیواری میں بھیڑ بکریوں اور بھینسوں کے باڑے تھے۔ بانس اور پاپولر کے درختوں کے درمیان پھولوں کے وسیع تختے تھے۔ یہ پھول اور یہ درخت باڑوں اور پولٹری فارم کی بو باس کو رہائشی حصے کی طرف آنے سے روکتے تھے۔ ستمبر کی آخری تاریخوں کی یہ ایک خنک اور خوشگوار شب تھی۔ رات کے ڈھائی بجنے والے تھے۔ ہم سب سے پہلے سجاول سے ملنا چاہتے تھے لیکن علم نہیں تھا کہ وہ جاگ رہا ہے یا نہیں؟ لودھی نے فوراً پتا کرایا۔ معلوم ہوا کہ وہ شام سے ہی ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے سو گیا تھا مگر بارہ بجے پھر جاگ گیا۔ سجاول، فارم ہاؤس کے اس چھوٹے سے پورشن میں تھا جسے بھاؤ بوقتِ ضرورت اسپتال کی شکل دے دیتا تھا۔ یہاں ایک قابل ڈاکٹر، ایک کمپاؤنڈر اور ایک نرس ہمہ وقت موجود رہتے تھے۔ لودھی نے ہمیں بتایا کہ اب پچھلے دو روز سے سجاول صاحب کی حالت کافی بہتر ہے۔

ہم ایک کشادہ کمرے میں داخل ہوئے۔ یہاں اے سی کی ہلکی سی ٹھنڈک تھی۔ سجاول بیڈ پر نیم دراز تھا اور ایک چھوٹے ٹیپ ریکارڈ پر پنجابی کی کوئی کافی سن رہا تھا۔ اس کی آنکھوں پر رنگ دار چشمہ تھا۔ ماضی کا یہ دبنگ شخص جس نے بڑے بڑے پھنے خانوں کے سر جھکائے تھے اور اپنی ایک نگاہ غلط انداز سے فرعون صفت لوگوں کا پتا پانی کیا تھا، آج ایک عضو معطل کی

طرح ہری چادر والے اس بیڈ پر لیٹا تھا۔ وہ پہلے سے کافی کمزور بھی ہو چکا تھا، تاہم اس کے چہرے کا رعب داب اب بھی مکمل طور پر اوجھل نہیں ہوا تھا۔

ہمارے قدموں کی آہٹ نے اسے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ ''کون؟'' اس نے ٹھٹکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

میں بے آواز چلتا اس کے بالکل پاس پہنچ گیا اور پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے چہرے پر رکھا۔

''شاہ زیب......تم...... مجھے پہلے ہی لگ رہا تھا کہ تم آ گئے ہو۔'' وہ پُر جوش لہجے میں بولا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

میں نے اسے بیٹھے بیٹھے گلے سے لگایا۔ اُسے جذباتی مناظر کچھ زیادہ پسند نہیں تھے پھر بھی وہ دس پندرہ سیکنڈ تک میرے گلے سے لگا رہا۔ تب خود کو جدا کرتے ہوئے بولا۔ ''اور کون کون ہے تمہارے ساتھ؟''

''فی الحال تو صرف قسطینا ہے۔ امید ہے، باقی بھی پہنچ جائیں گے۔''

قسطینا نے آگے بڑھ کر سجاول کے دونوں ہاتھ تھامے۔ انگلش اور اردو کو باہم ملا کر اس کی خیر خیریت دریافت کی۔

قسطینا سے ملنے کے بعد سجاول نے ذرا سخت لہجے میں مجھے مخاطب کیا اور بولا۔ ''تم نے مجھے بالکل ہی اپاہج سمجھ لیا ہے۔ ٹیکساریوں کے ساتھ اتنی بڑی ٹکر لے کر آ رہے ہو، مجھے بتایا تک نہیں۔ چلو، میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا تھا لیکن کوئی مشورہ تو دے سکتا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''تمہیں کس نے بتایا ہے کہ ہم ٹیکساریوں سے ٹکر لے کر آ رہے ہیں؟''

''تمہارے داؤد بھاؤ نے۔ اس نے فون پر بتایا ہے کہ کلر کہار سے آگے تمہارے اور گینگ والوں کے درمیان زور کا ٹاکرا ہوا ہے۔ انہوں نے کئی دن سے تمہیں گھیرا ڈالا ہوا تھا۔ کل ایک سخت لڑائی کے بعد تم نے وہ گھیرا توڑا ہے اور فون پر رابطہ کر کے اس سارے معاملے کے بارے میں بتایا ہے۔''

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے سجاول کہ داؤد بھاؤ نے تمہیں پوری بات نہیں بتائی۔ ہم ٹیکساری گینگ سے ٹکر لینے کے لیے نہیں گئے تھے۔''

''تو پھر لمبی ڈرائیو کرنے کے لیے نکلے ہوئے تھے؟'' سجاول نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''نہیں یار، خوامخواہ بدگمان ہونے کی کوشش کر رہے ہو۔ ہم یہاں سے گئے تھے تاجور کے لیے اور دارج صاحب کے لیے۔''

''کیا مطلب؟''

میں نے اس کے لمبے چوڑے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا (وہی ہاتھ جس کا مکا، فنا کرنے کی طاقت رکھتا تھا) میں نے کہا۔ ''سجاول! تم جانتے ہو، دارج ایک بڑے ضدی اور گھمنڈی شخص کا نام ہے۔ وہ کسی کی بھی سنتا سناتا نہیں ہے۔ ہمیں پتا تھا کہ ہاناوانی اس وقت تاجور کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ اور تاجور کو چار دیواری کے اندر بند رہنا چاہیے۔ لیکن دارج اسے لے کر چل پڑا تھا کسی نمکین پانی کے چشمے کی طرف۔ یہ لوگ بائی روڈ کلر کہار جا رہے تھے۔ ہمیں اس کے سوا کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ ان کے پیچھے رہ کر اس کی حفاظت کریں اور میں سمجھتا ہوں کہ ہم نے جو کیا، ہمیں وہی کرنا چاہیے تھا۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو۔ ہاناوانی نے کوئی حرکت کی ہے؟''

''اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ تم تک پوری خبریں نہیں پہنچی ہیں یا شاید تمہاری بیماری کی وجہ سے تمہیں ان خبروں سے دور رکھا گیا ہے۔''

پھر میں نے مختصر الفاظ میں سجاول کو بتایا کہ کلر کہار کے راستے میں کس طرح اچانک جنون زدہ طوطوں نے گاڑیوں کے قافلے پر خوفناک حملہ کیا اور وہاں کیا تباہی ہوئی۔ بعدازاں مندر کے کھنڈر میں پیش آنے والے حیران کن واقعات کا مختصر تذکرہ بھی میں نے سجاول کے سامنے کیا۔ (کھوہ کے حالات تو وہ جان ہی چکا تھا) وہ سخت تعجب کے عالم میں سنتا رہا...... اور سر دُھنتا رہا۔

اس کی آنکھوں کی انفیکشن ختم ہو چکی تھی...... مگر آنکھیں بھی تو ختم ہو چکی تھیں۔ بہر حال اس کی سماعت ٹھیک کام کر رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ بس ایک کان سے تھوڑا سا کم سنائی دیتا ہے۔

''خورسنہ اور بچہ خیریت سے ہیں؟'' میں نے سجاول سے پوچھا۔

''ہاں، فیض محمد سے فون پر رابطہ ہوتا رہتا ہے۔ اس کے مطابق وہ بالکل خیریت سے ہیں۔''

''لالہ موسیٰ کے اسی گھر میں ہیں؟''

''ہاں، وہ جگہ ان کے لیے بہت ٹھیک ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اگر تم چاہتے ہو تو میں بھاؤ سے بات کرتا ہوں۔ خورسنہ اور بچے کو بھی یہاں فارم میں لے آتے ہیں۔''

''اس بارے میں، میں نے بھی سوچا تھا شاہ زیب مگر یہ خطرناک ہوگا۔ وہ جگہ ہاناوانی

کی نظر میں آ چکی ہے۔ اگر ہم خورسنہ کو وہاں سے نکال کر یہاں لانے کی کوشش کریں گے تو یہ جگہ بھی ہاناوانی کی نگاہ میں آجائے گی اور ایسا بالکل نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے یہ بات خورسنہ کو بھی سمجھا دی ہے۔ وہ پہلے کچھ دن تو روتی رہی ہے مگر اب اس نے خود کو سنبھال لیا ہے۔''

اسی دوران میں نسوانی قدموں کی تیز چاپ سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا اور ٹھٹک گیا۔ مجھے زینب نظر آئی۔ چاند گڑھی کے پیش امام مولوی فدا کی لختِ جگر...... وہ قیمتی لباس میں تھی۔ کندھوں پر ایرانی شال لیے وہ تیزی سے میری طرف آ رہی تھی۔ قسطینا بھی اس کے ساتھ تھی۔ آتے ساتھ ہی وہ میرے گلے لگ گئی۔ اس کے دل کی گہرائیوں سے جیسے بے ساختہ آواز نکلی۔ ''بھائی جان۔''

میں نے اس کا سر چوما۔ پھر اس کی آنکھوں میں چمکنے والے آنسو پونچھے۔ اسے پچکارتے ہوئے کہا۔ ''اب تم زینب نہیں ہو...... یور ہائی نس ہو۔ جاما جی کی خاتونِ اول۔ اور یہ جو خواتین اول ہوتی ہیں، اس طرح شوں شوں کر کے روتی نہیں ہیں۔''

وہ مزید سسکنے لگی اور دوبارہ میرے گلے لگ گئی۔

سجاول سے اجازت لے کر ہم باہر نکل آئے اور کوریڈور سے گزر کر ایک دوسرے کمرے میں آ گئے۔ ڈھائی تین سال پہلے کی وہ دھان پان سی زرد رُو لڑکی اب بھرے بھرے جسم کی ایک دلکش اور باوقار نوبیاہتا دکھائی دے رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ''لگتا ہے کہ ابراہیم نے تمہیں بہت اچھے طریقے سے رکھا ہوا ہے۔''

وہ ذرا شرما گئی لیکن پھر فوراً ہی اس کے کتابی چہرے پر غم کی لکیر سی کھنچ گئی۔ اس نے انیق کی ناگہانی موت کا ذکر کیا اور اپنے غم کا اظہار کیا۔ انیق کے بعد حاذق ذکری کی دردناک موت کا تذکرہ ہوا، پھر گفتگو کا رخ سجاول کی طرف ہو گیا وہ بولی۔ ''جاما جی کے لوگ آپ کے بعد جس شخص کا زیادہ ذکر کرتے ہیں وہ سجاول صاحب ہیں۔ رائے زل کا سر کاٹنے والا واقعہ لوگوں کے دلوں میں اتر چکا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''زینب! بے شک وہ ایک کارنامہ تھا لیکن اس کی سزا بھی تو سجاول کو بھگتنا پڑی ہے اور ابھی اس ہاناوانی نے پتا نہیں اور کیا طوفان اٹھانا ہے۔''

وہ گم صم سی ہو گئی۔ تب میری طرف دیکھ کر بولی۔ ''سجاول صاحب کو اس حال میں دیکھ کر بہت دکھ ہوا ہے۔ کیا اب وہ کبھی نہیں دیکھ سکیں گے؟''

''زینب اس بارے میں تو ڈاکٹر ہی بہتر بتا سکتے ہیں۔ بہرحال امید پر دنیا قائم ہے۔''

''ان کی بیوی خورسنہ، ان کے لیے اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر جاما جی سے یہاں چلی

آئی۔ اس بے چاری پر پتا نہیں کیا بیت رہی ہوگی۔ میں نے کل سجاول صاحب سے کہا تھا کہ وہ خورسنہ اور بچے ذیشان کو یہاں منگوالیں مگر وہ نہیں مانے۔''

''ہاں زینب، وہ سمجھتا ہے کہ خورسنہ کو یہاں لے کر آنے میں خطرہ ہے۔''

وہ بولی۔ ''مجھے تو یہ بھی لگتا ہے بھائی جان...... کہ سجاول اپنی یہ بے بسی والی حالت خورسنہ کو دکھانا ہی نہیں چاہتے۔''

''ممکن ہے اس کے ذہن میں یہ بات بھی ہو۔'' میں نے تائید کی۔

وہ کچھ دیر معصومانہ انداز میں اپنی بیش قیمت انگوٹھیوں کو انگلیوں میں گھماتی رہی۔ جیسے ان سے کھیل رہی ہو۔ تب اس کے چہرے پر تاسف کی نئی لہر ابھری۔ ''اور...... آپی تاجور...... ان کی شش...... شادی ہوگئی۔'' وہ عجیب دل گرفتہ لہجے میں بولی۔

قسطینا نے میرے تاثرات دیکھ کر فوراً موضوع بدلا اور زینب کو کندھوں سے تھام کر کہا۔ ''مجھے پتا ہے تم دونوں کے پاس کرنے کی بہت سی باتیں ہیں لیکن زینب! اس وقت شاہ زائب بھی تھکے ماندے ہیں۔ کل آرام سے گفتگو کرنا۔ میں بھی تمہیں بہت کچھ بتاؤں گی۔''

○......❖......○

فارم ہاؤس میں دور تک سنہری دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ یہ ستمبر کی آخری تاریخوں کا ایک خوشگوار دن تھا۔ ہم دوپہر بارہ بجے کے قریب سو کر اٹھے تھے۔ سب سے پہلے رضوان ٹی کی خیر خیریت دریافت کی تھی اور اب ایک اچھا برنچ کرنے کے بعد ہم باغیچے میں بیٹھے تھے۔ چچا زاد ولید اور پہلوان حشمت سے بھی ملاقات ہو چکی تھی۔ کئی سال جیل میں گزارنے کے بعد ولید کو کھلی ہواؤں میں سانس لینا نصیب ہو رہا تھا۔ چند روز میں ہی اس کی صحت بحال ہونا شروع ہوگئی تھی۔ بہرحال پہلوان حشمت کچھ کمزور دکھائی دیا تھا۔ اس کی کمر پر چوٹ بھی آئی ہوئی تھی۔ پتا چلا کہ وہ سیڑھیوں سے گرا ہے۔ اب بھی وہ کمرے میں لیٹا ہوا تھا۔

کھانے اور تھوڑی سے گپ شپ کے بعد میں پہلوان کے پاس پہنچا۔ اس نے کمرے سے باہر ایک پرچی چسپاں کر رکھی تھی۔ یہ دراصل کاغذ پر لکھا ہوا تعویذ تھا۔ ولید نے بتایا تھا کہ ایسی کئی پرچیاں پہلوان نے فارم ہاؤس میں مختلف جگہوں پر چسپاں کی ہوئی ہیں۔ ان پرچیوں کے ذریعے بدارواح کو خبردار کیا گیا تھا کہ وہ بہرصورت اپنی خیریت کو مقدم جانیں۔ اور اس فارم ہاؤس کے آس پاس منڈلانے کی کوشش نہ کریں۔ کیونکہ یہ ساری جگہ پیر شاناں والے کے سایۂ عاطفت میں ہے اور خلاف ورزی کرنے والی کوئی بھی شرارتی روح اپنے نقصان کی خود ذمے دار ہوگی وغیرہ وغیرہ۔

پشت کی چوٹ کے باعث پہلوان کروٹ کے بل لیٹا تھا۔ میں نے کہا۔''جناب! یہ سیڑھیوں سے گرنے والا سانحہ ہوا کس طرح؟''

وہ کراہ کر بولا۔''کیا اب میں تمہیں دوبارہ گر کر دکھاؤں؟''

''نہیں چاچا حشمت زبانی ہی بتا دیں۔''

وہ کچھ دیر تک برے برے منہ بناتا رہا پھر بولا۔''تم شاید مذاق سمجھو لیکن حقیقت ہے کہ ہوائی چیزیں بڑی میسنی ہووت ہیں۔ اگر عامل زبردست ہو اور ان ہوائی چیزوں کو شرارت کرنے کا موقع ناہیں ملتا ہو تو وہ وسوسوں کی بکل مار کر ہمارے دماغوں کے اندر گھس جاوت ہیں۔ میں بھی ایک وسوسے میں پڑ گیا اور چوٹ لگوا بیٹھا۔''

''سنا ہے کہ زینب کسی نوکرانی کو آوازیں دے رہی تھی۔ آپ نے سمجھا کہ وہ مدد کے لیے بلا رہی ہے۔ آپ جلدی میں سیڑھیاں اترتے ہوئے گر گئے؟''

''ہاں، میں چھت پر تھا۔ زینب نے نوکرانی جمالو کو آواز دی اور اونچی آواز میں جمالو...... جمالو کہا۔ مجھ کو ایسا لگا کہ وہ بچالو...... بچالو کہہ رہی ہے۔ ساتھ ہی دماغ میں یہ بات گھس گئی کہ شاید ان بدبخت طوطوں نے حملہ کر دیا ہے۔ میں تیزی سے سیڑھیاں اترا اور پھسل گیا...... اف...... ہائے۔'' پہلوان نے ہلنے کی کوشش کی اور اپنی دمچی کی ہڈی پر ہاتھ رکھا۔

میں نے کہا۔'' لگتا ہے کہ آپ کو نیچے والی ہڈی پر چوٹ آئی ہے۔ یہاں تو شاید آپ کو ایک دفعہ پہلے بھی ضرب آئی تھی۔''

پہلوان نے آزردہ انداز میں اثبات میں سر ہلایا۔

میں نے کہا۔'' آپ تو سیانے بیانے بندے ہیں جی۔ آپ کو جمالو...... اور بچالو میں فرق کا پتا ہی نہیں چلا؟''

''اسی کو تو وسوسہ کہوت ہیں۔ یہ تخم وسوسہ ایسا ہی ہووت ہے۔ دماغ میں شاید پہلے سے ڈر تھا اس لیے دھیان سیدھا، طوطوں اور باندری وغیرہ کی طرف چلا گیا۔ وہ معصوم بچی (زینب) دو دن پہلے ہی یہاں پہنچی تھی۔ میں نے سمجھا کہ آتے ساتھ ہی مصیبت میں پھنس گئی ہے...... اُف...... آہ......'' وہ پھر کراہا۔

میں بمشکل اپنی مسکراہٹ کو چہرے پر پہنچنے سے روک رہا تھا۔ پہلوان ہمیشہ قافیہ اور ردیف وغیرہ کی بات کرتا تھا۔ اب یہ جمالو...... اور بچالو ایک قافیہ ہی تھا جس کی وجہ سے پہلوان اس مصیبت میں پھنسا تھا۔ میں نے سنجیدہ صورت بنا کر پوچھا۔''اب کیا کر رہے ہیں، اس چوٹ کا؟''

''وہ کیا کہوت ہیں کہ چراغ تلے ادرک کا سواد۔ علاج کرنے والے کو اپنا علاج کم ہی فائدہ دیوت ہے پھر بھی کچھ نہ کچھ فائدہ تو ہوا ہے۔ مالش ہو رہی ہے دو ٹائم۔''

''خود کر رہے ہیں مالش؟'' میں نے پوچھا۔

''یار! کیسی الوؤں جیسی بات کرت ہو۔ جہاں چوٹ لگی ہے وہاں میں خود مالش کیسے کر سکت ہوں۔ کسی سے کروا رہا ہوں۔''

اسی دوران میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ فارم ہاؤس کا ہی ایک دبلا پتلا ملازم دیواریں ٹٹولتا ہوا اندر داخل ہوا۔ پہلوان بولا۔ ''لو بڑی لمبی عمر ہے اس کی۔ آ گیا ہے مالش کرنے والا۔''

میں نے دھیان سے دیکھا۔ آنے والا نابینا تھا۔ اس نے سلام کیا اور پھر اس الماری کی طرف بڑھا جہاں پہلوان نے اپنی چار پانچ خودساختہ تیل اور مرہم وغیرہ شیشے کی بوتلوں میں رکھے ہوئے تھے۔

میں نے سرگوشی میں کہا۔ ''پہلوان جی...... لیکن یہ تو نابینا ہے؟''

پہلوان نے خشک لہجے میں جواب دیا۔ ''تو تم کیا چاہت ہو کہ جہاں چوٹ لگی ہے وہاں کسی آنکھوں والے سے مالش کراؤں۔ اچھے بھلے سیانے ہو کر آج کیسی باتیں کر رہے ہو شاہ زیب۔ آخر پردہ اور ستر پوشی بھی کوئی چیز ہووت ہے۔''

میں اٹھ کر کھڑا ہوا۔ وہ بولا۔ ''تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد دوبارہ چکر لگا سکت ہو؟''

میں نے کہا۔ ''اب آ گیا ہوں۔ آپ جب کہیں گے سر کے بل آؤں گا اور آپ زیادہ فکر نہ کریں۔ اس فارم ہاؤس میں آپ پرندوں وغیرہ سے بالکل محفوظ ہیں اور جس باندری کی آپ بات کر رہے ہیں، وہ ماری جا چکی ہے۔''

پہلوان جی نے حیرانی ظاہر کی۔ ''یعنی وہ...... لوسی؟''

''جی ہاں، لمبی بات ہے۔ آپ مالش وغیرہ کرائیں پھر آپ کو تفصیل سے بتاؤں گا۔''

''یا اللہ شکر ہے...... یہ وسوسے بڑے نابنجار ہووت ہیں۔ مجھے تو کل بھی شبہ ہو گیا تھا کہ وہ باندری باغیچے میں پھر رہی ہے۔ بعد میں وہ ایک کتا نکلا۔ ٹھیک ہی کہوت ہیں کہ دودھ کا جلا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا......''

میں نے تائیدی انداز میں سر ہلایا اور کمرے سے نکل آیا۔

پہلوان بہت باغ و بہار شخصیت تھا۔ اس نہایت کشیدہ ماحول اور دگرگوں حالات میں

بھی اس سے مل کر موڈ میں بہتری محسوس ہوئی۔ پہلوان سے فارغ ہو کر میں میڈیکل رومز کی طرف گیا۔ میرے زخمی انگوٹھے میں ساری رات ہلکا درد ہوتا رہا تھا۔ یہاں بھاؤ نے خاصی طبی سہولتوں کا انتظام کر رکھا تھا۔ ایکسرے مشین بھی موجود تھی۔ میرے بتانے پر ڈاکٹر نے انگوٹھے کا ایکسرے کیا اور تسلی دی۔ اس نے کہا کہ ہڈی میں ہیئر لائن فریکچر ہے۔ ہڈی اپنی جگہ سے ہلی نہیں ہے۔ پچانوے فیصد امکان ہے کہ یہ آرام سے خود ہی ٹھیک ہو جائے گی۔ اس نے بینڈ تیج کر دی اور درد کے لیے میڈیسن دی۔

ہمیں سب سے زیادہ فکرمندی، فخر اور فارس کی طرف سے تھی۔ ابھی تک ان کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں تھی جس وقت ہم مندر سے نکلے تھے فخر کے پاس موبائل فون موجود تھا۔ بے شک اس کی چارجنگ ختم ہو چکی تھی مگر وہ بعد میں چارجنگ کر بھی سکتا تھا لیکن اس کا فون آج تین روز گزرنے کے باوجود بالکل خاموش تھا۔

میں قسطینا کے پاس پہنچا۔ اس کی پیشانی اور کلائیوں وغیرہ پر بینڈ تیج نظر آ رہی تھی۔ یہ زخم اور کٹ اس خونی لڑائی کی نشانی تھے جو ٹیلوں میں خطرناک قاتلہ ریڈکیٹ اور اس فوجی کمانڈر قسطینا کے درمیان ہوئی تھی۔ وہ باغیچے کے قریب ایک روش پر ٹہل رہی تھی۔ میں اس سے فارس اور فخر کے حوالے سے ہی ڈسکشن کرنا چاہ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا اس نے کہا۔ ”یہ آوازیں سن رہے ہو شاہ زائب؟“

میں نے دھیان سے سنا۔ عمارت کی عقبی جانب کسی کمرے سے حال پکار سنائی دے رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ کوئی شخص سخت اذیت میں مبتلا ہے۔ ”کون ہے یہ؟“ میں نے پوچھا۔

”وہی غدارِ اعظم ...... بنارس ...... اس سے پوچھ گچھ کی جا رہی ہے۔“

”لیکن وہ تو زخمی ہے، نیم بے ہوش لگ رہا تھا۔“

”لگ ہی رہا تھا ناں ...... حقیقت میں نہیں تھا، بڑا زبردست فریبی ہے۔“

میں اور قسطینا ایک راہداری سے گزر کر اس کمرے کے سامنے پہنچے جہاں کوتاہ قد بنارس کی طبیعت صاف کی جا رہی تھی۔ ہم نے کھڑکی کی آہنی گرل میں سے دیکھا۔ بھاؤ گینگ کے تین خطرناک رکن، بنارس کو آڑے ہاتھوں لیے ہوئے تھے۔ منظر تعجب خیز تھا۔ بنارس کے سانولے جسم پر صرف ایک انڈرویئر تھا۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ اس کے سامنے پچاس ...... سو ...... اور پانچ سو والے کرنسی نوٹوں کا ڈھیر سا پڑا تھا۔ بنارس کو یہ نوٹ کھانے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ اس کی باچھوں میں انگلیاں دے کر زبردستی اس کا منہ کھولا جاتا تھا اور نوٹ منہ میں گھسیڑ دیئے جاتے تھے۔ پھر ایک مسواک نما لکڑی سے نوٹوں کو اس کے

منہ میں دھکیلا جاتا تھا۔ غالباً وہ کافی نوٹ نگل چکا تھا اور اب ابکائیاں لے رہا تھا۔
''اب مجھ سے نہیں ہوتا۔ میں مر جاؤں گا۔ خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو...... بب......بس ایک دفعہ...... بھاؤ جی سے میری بات کرا دو۔''
''انہوں نے جو بات کرنی تھی، وہ کر چکے ہیں...... اب یہ سارے نوٹ کھاؤ گے تو جان چھوٹے گی۔'' ایک شوٹر دہاڑا۔
''مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوگئی۔ میں ہاتھ جوڑتا ہوں۔ ساری زندگی بھاؤ جی کا غلام بن کر رہوں گا۔''
یہ شخص واقعی رحم کے قابل نہیں تھا۔ اس نے شکیل داراب سے بھاری رقم لے کر ہماری زندگیوں کا سودا کیا تھا۔ اگر مندر سے واپسی پر جنونی چمگادڑیں ہم پر نہ جھپٹتیں اور ہمیں اس افراتفری کا فائدہ نہ ملتا تو پتا نہیں اس وقت ہم کس حشر سے دوچار ہو گئے ہوتے۔ میری لگائی ہوئی چوٹ سے زخمی ہونے کے بعد بھی یہ ٹھگنا مسلسل مکر کرنے میں مصروف رہا تھا۔
میں اور قسطینا کمرے کے سامنے سے ہٹ گئے۔
''کیا خیال ہے، اس کو معافی مل جائے گی؟' قسطینا نے مجھ سے پوچھا۔
''کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ داؤد بھاؤ اپنے اصولوں پر کڑا پہرا دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ 30 سال سے اتنا بڑا گینگ بخوبی چلا رہا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ شاید یہ پہلا موقع ہے جب گینگ کے اندر ایسی سنگین غداری ہوئی ہے۔''
قسطینا بولی۔ ''ابھی لودھی سے بات ہو رہی تھی۔ اس نے بتایا ہے کہ آج صبح بھاؤ نے گینگ کے تین اور بندوں کو گولی سے اُڑا دیا ہے۔ ان کے بارے میں اس بنارس نے ہی بتایا ہے۔ وہ بھی اس کے ساتھ اس پلاننگ میں شریک تھے۔''
''اوہو، پھر تو یہ بھی نہیں بچے گا۔'' میں نے کہا۔
''مجھے تو ترس بھی آ رہا تھا اس پر۔ قد کاٹھ میں ایک بچہ ہی لگتا ہے۔ بچوں ہی کی طرح ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا۔''
''مگر بہت خبیث قسم کا بچہ ہے۔ بچوں والی کھوپڑی میں ایک گھاگ بڈھے کھوسٹ کا دماغ ہے۔ آپ نے دیکھا ہی ہوگا، کھوہ میں کس طرح اس نے اچانک اپنا موبائل فون دارج تک پہنچایا اور دارج نے اس کے ٹکڑے کر دیئے۔
قسطینا موضوع بدل کر بولی۔ ''ناوان کا پتا بھی چل گیا ہے۔ بنارس نے اسے اپنے ایک ہمراز ساتھی کے مکان میں رکھا ہوا تھا۔ ناوان کو وہاں سے نکال لیا گیا ہے۔ تھوڑی دیر میں پہنچ

جائے گا یہاں۔''

''ایس ایس پی تنویر کا پتا نہیں کیا بنا ہے؟''

قسطینا بولی۔ ''لودھی نے بتایا ہے کہ ایس ایس پی کے بیٹے کو چھوڑ دیا گیا ہے...... اور تاجور بھی خیریت سے اسلام آباد پہنچ گئی ہے۔''

تاجور کے بارے میں اطلاع دے کر قسطینا گہری نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی جیسے میرا ردِعمل جاننا چاہتی ہو۔ مجھے خاموش دیکھ کر دوبارہ گویا ہوئی۔ ''تمہیں کوئی فکر نہیں ہے اس کی۔ دارج اس پر بڑا غضب ناک ہے...... کیونکہ کھوہ میں اس نے تمہاری جان بچانے کے لیے خطرہ مول لیا۔''

''دارج کی غضب ناکی سے جب اسے کوئی مسئلہ نہیں تو ہمیں کیوں ہو گا؟'' میں نے بے پروائی سے کہا۔

''تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہے اس کے لیے؟'' وہ میری آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔

''نہیں قسطینا...... مجھے لگتا ہے کہ...... وہ میرے دل سے اتر چکی ہے...... اس نے مجھے اتنے زخم دیئے ہیں کہ اب اس کے بارے میں کچھ سوچنے کو بھی دل نہیں چاہتا۔''

''بہت بڑا جھوٹ بول رہے ہو۔'' وہ پورے یقین سے بولی۔

ہماری گفتگو کو بریک لگ گئے کیونکہ ایک ملازم دوڑتا ہوا ہماری طرف آ رہا تھا۔ ''لودھی صاحب کہاں ہیں جناب؟'' اس نے بوکھلاہٹ میں ہم سے پوچھا۔

''کیوں کیا ہوا؟''

''وہ جی سرخ کپڑوں والا قیدی بہت دنگا مچا رہا ہے۔ اس نے اپنا سر لوہے کی سلاخوں میں پھنسا لیا ہے۔ کہیں مر ہی نہ جائے۔''

''کیا تکلیف ہے اس کو؟''

''شراب مانگ رہا ہے جی...... اور انگریزی میں گندی گالیاں دے رہا ہے۔''

میں اور قسطینا بھاگتے ہوئے عمارت کے عقب میں اس لاک اَپ میں پہنچے جہاں شیطان زادے کو بند کیا گیا تھا۔ یہ ایک مختصر کمرا تھا۔ لوہے کا دروازہ تھا۔ صرف ایک کھڑکی تھی جس میں ''گارڈ'' کے موٹے پائپ سلاخوں کی طرح لگے ہوئے تھے۔ محفوظ کمرے کی وجہ سے رات کو ہی اس گینگسٹر کی مشکیں کھول دی گئی تھیں۔ اب اس کی حالت دیدنی تھی۔ غالباً ان سلاخوں سے ٹکرا ٹکرا کر اس نے اپنا سارا جسم زخمی کیا ہوا تھا۔ اس نے زور لگا کر دو سلاخوں (پائپوں) کے درمیان گنجائش پیدا کرنے کی ناکام کوشش کی تھی اور اپنی گردن اس میں پھنسا لی

تھی۔اب وہ مکروہ آواز میں چلا رہا تھا اور شراب کا مطالبہ بھی جاری رکھے ہوئے تھا۔
ملازم نے کہا۔''اس کا نشہ ٹوٹا ہوا ہے جی۔ چار گھنٹے سے ایک ہی بکواس کر رہا ہے اور کہتا ہے کہ بوتل نہ لاؤ، پورا کریٹ لے کر آؤ۔''
''تو لادو کریٹ، ورنہ یہ مر جائے گا۔تم لوگوں کے پاس شراب کی کیا کمی ہے۔'' میں نے کہا۔
''لودھی صاحب کی طرف سے آرڈر نہیں تھا اس لیے نہیں لائے۔''
''میرا خیال ہے کہ تم جلدی کرو، ورنہ یہ حرام زادہ اپنا ہی خون پینا شروع کر دے گا۔''
''اور کوئی لڑکی بھی لاؤ......لڑکی بھی لاؤ۔'' وہ وہیں سلاخوں میں پھنسا پھنس کسی بدروح کی طرح چلایا۔
''سور کے بچے، پہلے اپنی گردن تو نکال لے۔ پھر تیری آگ بھی اچھی طرح ٹھنڈی کرتے ہیں۔'' میں نے کہا۔
وہ جنونی انداز میں بولا۔''دھمکیاں مت دو۔لڑکی لاؤ۔وہی جس کی تصویر رسالے میں چھپی ہے۔اس پر میرا حق ہے......کیونکہ......میں تم سب مکوڑوں کو اپنے پاؤں کے نیچے مسل سکتا ہوں۔تم سمیت جس نے میرا مقابلہ کرنا ہے میرے سامنے آجائے۔''
''مقابلے کی پیداوار، پہلے اپنی یہ منحوس گردن تو آزاد کرالے۔'' میں نے دانت پیس کر کہا اور ایک ٹھوکر اس کے منہ پر ماری۔اس کے منہ سے خون بہنے لگا مگر اسے مطلق پروا نہیں تھی۔اس نے اپنے ہی پھٹے ہوئے ہونٹ کو چوسنا شروع کر دیا۔
اتنے میں وارث لودھی بھی آگیا۔میں نے اس کے ساتھ مل کر زور لگایا اور اس کی سانڈ جیسی گردن سلاخوں میں سے نکالی۔اس کی آنکھوں میں ایک حیوانی چمک لہریں لے رہی تھی۔ اس چمک میں شراب کی پیاس یوں لشکارا مارتی تھی جیسے بادلوں میں بجلی کڑکتی ہے۔
اس نے ابھی جو بات کہی تھی، اس نے میرے تن بدن میں آگ لگا دی تھی۔اس نے تاجور کی بات کی تھی۔اس سے پہلے پاشا نے بھی مجھے بتایا تھا کہ ان سرخ پوش گینگسٹروں کے پاس تاجور کی کوئی تصویر ہے اور وہ اس حوالے سے آپس میں واہیات شرطیں لگا رہے ہیں۔
اسی دوران میں فارم ہاؤس کا ایک مالی (جو درحقیقت گینگسٹر ہی تھا) ٹرالی دھکیلتا ہوا پہنچ گیا۔اس میں تیز وہسکی 69 کی کئی بوتلیں موجود تھیں۔شیطان زادے نے ان بوتلوں کی طرف یوں دیکھا جیسے کسی صحرا میں چار دن کا پیاسا، ٹھنڈے صاف پانی سے بھری بالٹی دیکھے۔ اس نے خوشی کا نعرہ مارا اور بے ڈھنگے انداز میں رقص شروع کر دیا۔

قسطینا سرگوشی میں بولی۔ ”یہ گندی بکواس کر رہا ہے۔ نشے میں آ کر پتا نہیں اور کیا کیا بکے گا۔ میرا خیال ہے، شراب میں کچھ ملواؤ۔ بے ہوش ہو کر پڑا رہے گا۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ میں نے تائید کی۔

میں نے لودھی کو ایک طرف لے جا کر اس حوالے سے ہدایت دی، اس کے علاوہ یہ وارننگ بھی دی کہ اس بندے کی حیثیت خطرناک ترین قیدی کی ہے کوئی اس کے کمرے میں جائے گا اور نہ کھڑکی سے زیادہ قریب ہوگا۔ دروازے اور کھڑکی کی اچھی طرح تسلی کرنے کے بعد ہم اپنے رہائشی پورشن میں واپس آ گئے۔

میں کئی پریشانیوں میں گھرا ہوا تھا پھر بھی تھکاوٹ اتنی زیادہ تھی کہ سہ پہر کے فوراً بعد نیند آ گئی۔ رات قریباً نو بجے کے لگ بھگ قسطینا نے جگایا۔ میں نے پوچھا۔ ”فارس اور نشتر کے بارے میں کوئی اطلاع ہے؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا اور بولی۔ ”لیکن بھاؤ کے بارے میں اطلاع ہے۔ وہ یہاں آئے ہوئے ہیں۔“

”کہاں ہیں؟“

”پہلے تو رضوان اور سجاول کی عیادت کرنے میڈیکل رومز کی طرف گئے تھے۔ میرا خیال ہے کہ اب لودھی کے ساتھ اس کمرے میں ہیں جہاں اس باسٹرڈ بنارس کو رکھا گیا ہے۔“

میں بنارس والے کمرے میں پہنچا تو کیم شیم داؤد بھاؤ کو ایک آرام دہ کرسی پر بیٹھے پایا۔ وہ پینٹ کوٹ میں تھا۔ سر پر ہیٹ بھی رکھا ہوا تھا۔ میں داؤد بھاؤ کو پہلی بار اتنے طیش میں دیکھ رہا تھا۔ بھاؤ نے بس مجھ سے ہاتھ ملایا اور ایک بار پھر اپنی ساری توجہ بنارس پر مرکوز کر دی۔ کمرے کا منظر عجیب تھا۔ بنارس اسی طرح ایک انڈرویئر میں ملبوس دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ وہ نوٹ جو دوپہر کے وقت اسے کھلائے گئے تھے اب پلاسٹک کی ایک بڑی بالٹی میں پڑے تھے۔ انہیں غالباً کئی گھنٹے پہلے بیئر میں بھگویا گیا تھا۔ اب وہ گل چکے تھے اور اس قابل ہو گئے تھے کہ انہیں نگلا جا سکے اور بنارس وہ پہلے سے زیادہ نگل بھی چکا تھا مگر اب اس کی حالت بری تھی۔ لگتا تھا کہ اسے قے ہونا شروع ہو جائے گی۔

وہ فریادی آواز میں بولا۔ ”معاف کر دیں بھاؤ جی۔ کبھی آپ کے خلاف نہیں جاؤں گا۔ اگر بھروسا نہیں تو...... میرے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالیں...... میری آنکھیں نکال لیں گوشت کا قیمہ بنا کر آپ کے در پر پڑا رہوں گا۔“

''یہ بعد کی باتیں ہیں۔'' بھاؤ نے سفاک لہجے میں کہا۔ ''پہلے یہ سزا بھگتنا ہوگی یہ سارے نوٹ تمہارے پیٹ میں پہنچیں گے۔ انہی نوٹوں کی بھوک تھی ناں تم کو؟ اب کھانا پڑے گا ان کو۔''

وہ ابکائی لے کر بولا۔ ''مجھے پھر الٹی آجائے گی۔''

''تو پھر الٹی کرلو۔ جو الٹی سے نکل جائیں گے ان کا حساب نہیں ہوگا۔''

بھاؤ کے اشارے پر اس کے کارندوں نے ایک بار پھر بنارس کی باچھوں میں انگلیاں ڈال کر اس کا منہ کھولا اور گلے ہوئے نوٹوں کے لقمے اس کے منہ میں ٹھونسنے لگے۔ اسے قے آئی اور اس نے سب کچھ الٹ دیا۔ اس کا رنگ زرد تھا۔ محسوس ہوتا تھا کہ اسے دل کا دورہ پڑ جائے گا۔

میں نے انگلش میں بھاؤ سے کہا۔ ''کہیں یہ مر ہی نہ جائے۔ اگر معاف کرنا ہے تو پھر اسے کر دیجیے۔''

''معافی کی بات یہاں کون کر رہا ہے۔'' بھاؤ چٹانی لہجے میں بولا۔ ''میرے پاس غدار کے لیے کوئی معافی نہیں ہے۔''

لگ یہی رہا تھا کہ بنارس کا آخری وقت آچکا ہے لیکن موت اسے آسانی سے ملنے والی نہیں تھی۔

جب مزید نوٹ بنارس کے منہ میں نہ ٹھونسے جا سکے تو داؤد بھاؤ کے اشارے پر اسے اٹھا کر اس کا سر پلاسٹک کی بالٹی میں گھسیڑ دیا گیا۔ اب اس کی ٹانگیں اوپر اور سر بیئر اور نوٹوں کے ملغوبے میں تھا...... جیسے کوئی بچہ بالٹی میں گر گیا ہو اور دم گھٹنے کی وجہ سے تڑپ رہا ہو، اپنی ٹانگیں چلا رہا ہو۔ اس کی ٹانگیں بھی عجیب ٹیڑھی میڑھی تھیں...... پاؤں بھی سانولے اور بھدے تھے۔ وہ گلے ہوئے نوٹوں کے راتب میں گردن تک ڈوبا ہوا تھا۔ اس کی سانسیں رکنے لگی تو اسے مزید پوچھ گچھ کے لیے بالٹی میں سے نکال لیا گیا۔

اچانک بنارس نے تڑپ کر خود کو چھڑایا اور کھلے دروازے سے باہر نکل کر بھاگا۔ یہ اس کی سراسر اضطراری حرکت تھی۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ وہ یہاں سے نکل کر کہاں جا سکتا تھا۔

''پکڑو اسے۔'' داؤد بھاؤ گرجا۔

لودھی، اشرف اور دیگر کارندے اس کے پیچھے لپکے۔ وہ بھاگ رہا تھا اور ساتھ ساتھ دہائی دے رہا تھا۔ ''مجھے معاف کر دیں...... مجھ سے غلطی ہوگئی...... مجھے معاف کر دیں......

بس ایک بار۔''

اس کی ''معافی'' تو پہلے ہی بہت مشکل تھی، اب یوں بھاگ کر اس نے ناممکن بنا لی تھی۔ وہ برآمدے کی طرف گیا تو سامنے سے دو مسلح افراد اس پر جھپٹے، وہ رخ پھیر کر باغیچے کی طرف نکلا۔ یہ سارا حصہ روشن تھا۔ اگر بنارس کا خیال تھا کہ وہ کہیں چھپ کر بیٹھ جائے گا تو یہ نہ ہونے والی بات تھی۔ چار پانچ افراد اس کے پیچھے لپک رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں اسلحہ تھا مگر وہ گولی نہیں چلا رہے تھے۔ میں بھی اپنا پسٹل نکال کر باہر احاطے میں آ گیا تھا۔ بنارس کو اذیت سے بچانے کے لیے مجھے یہ موقع مناسب نظر آیا۔ جونہی وہ گارڈینیا کی دو ڈھائی فٹ اونچی باڑ پھلانگ کر مویشی خانے کی طرف دوڑا میں نے اس پر فائر کیا۔ گولی اس کے سر کے پچھلے حصے میں لگی اور وہ کسی گیند کی طرح لڑھک کر ایک کیاری میں گرا۔

سب بھاگ کر اس کے قریب پہنچے۔ بھاؤ بھی باہر آ چکا تھا۔ ''کس نے چلائی گولی؟'' وہ دہاڑا۔

سب میری طرف دیکھنے لگے۔ بھاؤ بھی لمبے ڈگ بھرتا ہوا میرے قریب پہنچ گیا......

بنارس کو ایک نظر دیکھ کر ہی پتا چل جاتا تھا کہ وہ دارِفانی سے گزر چکا ہے۔ اعشاریہ 38 کی گولی اس کا کام تمام کر چکی تھی۔

بھاؤ نے قہرناک نظروں سے مجھے گھورا۔ ''شاہ زیب! یہ کیا کیا تم نے۔ کیوں شوٹ کر دیا اسے؟''

''مجھے لگا...... یہ نکل جائے گا۔''

''بکواس بند کرو...... تم نے جان بوجھ کر کیا ہے ایسا'' بھاؤ کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

ایک لمحے کے لیے لگا کہ وہ میرا گریبان پکڑ لے گا پھر وہ مڑا اور پاؤں پٹختا ہوا واپس برآمدے کی طرف چلا گیا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ بھاؤ نے مجھ سے اس لہجے میں بات کی تھی...... اور ایسا بلاوجہ نہیں ہوا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں نے کیا کیا ہے۔ وہ بنارس کو ابھی زندہ رکھنا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے آسان موت دے دی تھی۔

داؤد بھاؤ کے کئی اور ساتھی بھی مجھے گھور رہے تھے لیکن کسی نے کچھ کہا نہیں۔ لودھی کی ہدایت پر بنارس کی نیم برہنہ و خونچکاں لاش کو کیاری میں سے اٹھا لیا گیا اور برآمدے کی طرف لے جایا گیا۔ اس ''بھاگ دوڑ'' اور فائر کی آواز نے پورے فارم میں ہلچل سی پیدا کر دی تھی۔

میں اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔قسطینا نے مجھ سے پوچھا کہ بنارس کے ساتھ کیا ہوا ہے؟''

میں نے دھیمی آواز میں کہا۔'' آپ کو اس پر ترس آیا تھا، اس لیے میں نے سوچا کہ اس کی تھوڑی سی مدد کر دی جائے۔''

''کس طرح کی مدد...... میں نے تو سنا ہے کہ وہ مر گیا ہے۔''

''میں نے ہی مارا ہے۔'' پھر میں نے اسے تھوڑی سی تفصیل بتائی۔ وہ میری رائے سے متفق نظر آنے لگی۔

کچھ دیر بعد مجھے گھورتی ہوئی بولی۔''تم چپ چپ لگ رہے ہو؟ بنارس کا افسوس تو نہیں ہو رہا؟''

''نہیں...... اس خبیث کی کم سے کم سزا تو موت ہی تھی۔''

''تو پھر؟''

''داؤد بھاؤ کچھ ناراض ہو گیا ہے۔ ایک دو سخت باتیں کہی ہیں۔''

یہی وقت تھا جب میرے سیل فون کی بیل ہوئی۔ دوسری طرف داؤد بھاؤ ہی تھا۔ میں کال ریسیو کرتا ہوا لان کی طرف چلا گیا۔ وہ اپنی بھاری بھرکم آواز میں بولا۔''میں تھوڑا سا جذباتی ہو گیا تھا۔ دوسروں کے سامنے تمہیں سخت سُست کہہ دیا۔ بعد میں افسوس ہوا۔ دراصل ابھی میں اس ٹھگنے سؤر کو زندہ رکھنا چاہتا تھا۔ اس کے مرنے کی وڈیو بنانا تھی مجھے تاکہ دوسروں کو عبرت ہو۔ تم اچھی طرح جانتے ہو ہمارے پروفیشن میں اس طرح کی مثالیں قائم کرنا پڑتی ہیں۔ بہرحال جو ہو گیا سو ہو گیا۔ تم بتاؤ کہ اب فخر اور تمہارے اس دوسرے دوست (فارس) کی تلاش کے لیے کیا کیا جائے۔ وہاں کلر کہار اور چکوال وغیرہ میں تو میرے ایک درجن بندے مسلسل ان کا کھوج لگا رہے ہیں۔''

میں نے ذرا توقف سے کہا۔''میری رائے میں تو یہاں لاہور میں بھی آپ کو اپنی ڈوریاں ہلا دینی چاہئیں۔''

''مگر مجھے لگتا ہے کہ لاہور سے زیادہ اسلام آباد کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ شکیل داراب اور دارج داراب دونوں اس وقت اسلام آباد میں ہیں...... ویسے...... تمہاری بات بھی غلط نہیں ہے...... لاہور کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔''

داؤد بھاؤ کا انداز مفاہمانہ تھا۔ اس سے ڈسکشن کر کے میرا موڈ کچھ بہتر ہوا۔ پہلوان حشمت کی خبر گیری دوبارہ نہیں کی تھی...... مگر اب رات زیادہ ہو چکی تھی۔ میں نے سوچا صبح اس

کی طرف جاؤں گا۔

اگلے روز دوپہر کے بعد پہلوان سے ملاقات ہوئی۔ وہ اسی طرح کروٹ کے بل لیٹا ہوا تھا۔ میں نے آواز دی۔ ”چاچا حشمت کیسے ہیں؟“

جسم میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوئی۔ میں نے قریب آ کر پھر آواز دی لیکن جواب ندارد۔ ایک دم خدشہ پیدا ہوا۔ پہلوان جی کہیں چل ہی تو نہیں بسے تھے۔ آگے جا کر دیکھا، اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور وہ حیات تھا۔ میری طرف دیکھ کر فرمایا۔ ”یار! عجب نکمے ہو، ایک وظیفہ پڑھ رہا تھا۔ اب شروع اسٹارٹ سے پڑھنا پڑے گا۔ ایسے کاموں میں غفلت کرنا بہت خطرناک ہووت ہے۔ کچھ ہوائی چیزیں بالکل اَن پڑھ ہووت ہیں۔ وہ ان تعویذوں وغیرہ کو ناہیں پڑھ سکتیں جو ہم نے یہاں دروازوں پر چسپاں کر رکھے ہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے بھینس کے سامنے رادھا ناچ رہی ہو۔ ایسی ہوائی چیزوں کے لیے ڈائریکٹ وظائف وغیرہ پڑھنے پڑتے ہیں۔“

میں پہلوان حشمت کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔ حال چال پوچھا لیکن پہلوان کی سوئی وہیں بندریا لوسی اور اس کی موت والے واقعات پر اٹکی ہوئی تھی۔ میں نے مختصر الفاظ میں پہلوان کے گوش گزار کیا کہ مندر میں اور پھر سون سیکسر کی ایک کھوہ میں کیا واقعات پیش آئے۔ پہلوان جی تاجور کے حوالے سے بھی سوالات پوچھتے رہے۔ وہ کرید کرید کر یہ جاننے کی کوشش فرماتے رہے کہ اس ”پانچ روزہ ساتھ“ میں میرے اور تاجور کے درمیان کس طرح کی گفتگو ہوئی ہے۔ آخر میں ایک طویل سانس لے کر اپنے دو شعر پڑھے۔

کہ گھائل ہوئی ہیں یہ آنکھیں تو ناحق
کہ ویران راہوں کو دیکھیں گے کب تک
خبر کوئی اچھی تو آتی نہیں ہے
بیکار دل دھڑکتا ہے ٹھکا ٹھک ٹھکا ٹھک

میں نے واہ واہ کہہ کر پہلوان کی تھوڑی سی دلجوئی کی اور ٹھکا ٹھک کی تعریف کی۔ وہ کھوئی کھوئی سی نظروں سے کھڑکی سے باہر کا جائزہ لینے لگے۔ نگاہیں اوپر آسمان کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ فرمایا۔ ”دیکھو ابھی تک پرندوں کی طرف سے خیر خیریت ہے۔ حالانکہ وہ ہمیں اور خاص طور سے تمہیں اور قسطینا وغیرہ کو ہر طرف ڈھونڈتے پھرتے ہوں گے۔“

”داؤد بھاؤ نے یہ جگہ بڑی اچھی چنی ہوئی ہے چاچا حشمت۔ یہ واہگہ بارڈر کا علاقہ ہے۔ شہر سے دور۔ یہ جگہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی۔“

''لیکن ان ہوائی چیزوں کو سارے چلتر آتے ہیں شاہ زیب......اور اب تو یہ ویسے بھی طوطوں اور چمگادڑوں کے بھیس میں ہیں۔ شاید تم کو معلوم ناہیں کہ دن کے وقت چمگادڑوں کی نظر جتنی کمزور ہووت ہے، رات کو اتنی ہی تیز ہو جاوت ہے۔ یہ اُڑتے وقت بہت دور دور تک دیکھ سکت ہیں...... یہ سب ان ہی تعویذوں کا کرشمہ ہے کہ وہ اب تک ہم سے دور ہیں۔''

میں نے تائید میں سر ہلانے میں ہی عافیت سمجھی۔

پہلوان حشمت نے چند لمحے توقف کے بعد کہا۔''ویسے کمزور اور تیز نظروں سے یاد آیا کہ یہ جو منڈا میری مالش کرت ہے، اس کی نظر میں بھی کچھ گڑبڑ ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''یہ خبیث پوری طرح نابینا نہیں ہے۔ مجھ کو شک ہے کہ اس کو کچھ کچھ دکھتا ہے۔''

میں نے مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا۔''آپ خود ہی تو کہتے ہیں کہ شک اور وہم کا علاج حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا۔''

''وہم کا علاج ناہیں ہوتا لیکن وہم دور کرنے کا علاج تو ہوتا ہے ناں۔ اور میں نے یہ علاج سوچ لیا ہے۔ شام تک تمہیں بتاؤں گا۔''

اسی دوران میں میرے سیل فون پر کال کا میوزک آنے لگا۔ میں نے کال اٹینڈ کی۔ دوسری طرف سے کوئی آواز نہیں آئی۔ میں ''ہیلو، ہیلو'' کہتا ہوا کمرے سے باہر نکل آیا......

''ہیلو کون؟'' میں نے دو تین بار پوچھا، پھر فون بند ہو گیا۔

پتا نہیں کیوں جب بھی کوئی ایسا فون آتا تھا دل خوامخواہ ''بچہ'' بننے لگتا تھا۔ میں سوچنے لگتا تھا کہ کہیں یہ تاجور کا فون تو نہیں ہے...... کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ وہ مجھ سے کوئی خاص بات کہنا چاہتی ہو...... یا پھر اس کے دل کی گہرائی میں اب بھی کہیں میرے لیے کسک موجود ہو۔ وہ بھی کسی وقت بے ساختہ یادوں کے دھارے میں بہہ جاتی ہو؟ لیکن ہر بار ایسا ہی ہوا تھا کہ بعد میں یہ فون کال کسی اور کی نکلتی تھی۔

سلسلہ منقطع ہونے کے بعد میں سجاول کی عیادت کے لیے چلا گیا۔ اسے دیکھ کر دل جیسے بیٹھنے لگتا تھا۔ اسے حوصلہ تسلی دینے کا کوئی لفظ بھی سوجھتا نہیں تھا۔ ڈاکٹر کے مطابق اس کی آنکھیں مستقل طور پر ضائع ہو چکی تھیں۔ میری موجودگی کے دوران میں ہی سجاول کو خورسنہ کا فون آ گیا۔ وہ اس کی کال سننے میں مصروف ہوا تو میں اٹھ کر رضوان کے پاس چلا گیا۔ اس کے جسم کے جن حصوں سے گوشت کاٹا گیا تھا وہاں پلاسٹک سرجری اور اسکن گرافٹنگ کی

ضرورت تھی۔ یہ سہولتیں یہاں تو مہیا نہیں ہو سکی تھیں۔ فی الوقت تو اسے انتظار ہی کرنا تھا اور بیڈ ریسٹ کرنا تھا۔

دور کہیں عمارت کے عقبی حصے سے چلانے اور پکارنے کی مکروہ آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میری طرح رضوان بھی ان آوازوں کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف کا سایہ سا لہرا گیا بولا۔ ''شاہ زیب صاحب! یہ تو ٹیکساری کا کوئی شیطان لگتا ہے؟''

''ہاں...... باقی تو سارے وہاں ٹیلوں میں مارے گئے تھے۔ ان میں سے ایک کو پکڑ کر یہاں لاہور لے آئے ہیں۔ بڑی حفاظت سے ایک لاک اَپ میں رکھا ہوا ہے۔''

رضوان کا خوف کچھ کم ہوا۔ اس نے پوچھا۔ ''اور ان کی وہ حرام زادی بہن...... جو رائے ونڈ والی کوٹھی میں دندناتی پھرتی تھی؟''

''اس کا نام ریڈکیٹ تھا۔ وہ بھی اپنے انجام کو پہنچ گئی ہے۔ اس میں اور قسطینا میں بڑے زور کا رن پڑا تھا۔ اپنی ہار سامنے دیکھ کر اس نے عیاری کی اور میں نے اس کی کھوپڑی اڑا دی۔''

اس واقعے کی تفصیل نے رضوان کو خوش کیا۔ میری نگاہوں کے سامنے وہ منظر گھوم گیا، جب میں اور رضوان اسٹریچر نما کرسیوں سے بندھے ہوئے تھے۔ رات کی خاموشی میں ریڈکیٹ چپکے سے رضوان پر چڑھ دوڑی تھی۔ نشے میں دھت وہ خوبرو رضوان کو اپنے ''ڈھب'' پر لانے کی جارحانہ کوشش کرتی رہی تھی۔ بہرطور اب یہ سب کچھ ماضی کا حصہ بن چکا تھا۔

''اب اس شیطان زادے کا کیا کریں گے؟'' رضوان نے پوچھا۔

''اسے مار کر اس کا پوسٹ مارٹم کریں گے اور دیکھیں گے کہ ان کی شیطانیت کس میٹریل سے بنی ہوئی ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''آپ مذاق کر رہے ہیں لیکن سچی بات تو یہی ہے کہ یہ سارے انسان نما جانور جتنی جلدی تلف ہو جائیں اتنا ہی بہتر ہے۔''

میں نے اس حوالے سے رضوان کو تسلی دی۔ وہ ذرا توقف کر کے بولا۔ ''قسطینا صاحبہ صبح آئی تھیں میری عیادت کرنے۔ اتنی کم عمری میں وہ اپنے علاقے کی فوج کی کمان کر رہی ہیں، یہ بہت بڑی بات ہے۔''

''اپنے والد کی موت کے بعد اس کی شخصیت ایک بالکل مختلف سانچے میں ڈھل چکی ہے رضوان، اس کے سینے میں ایک فولادی دل دھڑکتا ہے۔''

"لیکن وہ کچھ رنجیدہ سی بھی لگ رہی تھیں۔ شاید اس لیے کہ ابھی تک ان کے شوہر کا کچھ پتا نہیں چلا۔"

"ہاں، یہ ایک مختلف معاملہ ہے۔ کمانڈر فارس جان اور فخرا ابھی تک لاپتا ہیں لیکن ان کی تلاش جاری ہے۔ ویسے وہ دونوں تر نوالہ نہیں ہیں۔ شکیل داراب اور اس کے کرائے کے ٹٹوؤں کو تگنی کا ناچ نچا سکتے ہیں۔"

شام کو ایک بار پھر پہلوان حشمت کی طرف میرا جانا ہوا۔ جناب اسی طرح کروٹ کے بل لیٹے اخبار میں فلموں کے اشتہار دیکھ رہے تھے۔ ان کی چارپائی کے نیچے پائنتی کی طرف پانچ سو کا ایک نوٹ پڑا تھا۔ غالباً پہلوان جی کے تکیے کے نیچے سے پھسل کر یہاں پہنچ گیا تھا۔ پہلوان کو ذرا ستانے کے لیے میں نے نوٹ اٹھا کر جیب میں ڈال لیا۔

پہلوان اخبار دیکھنے میں اتنے مگن تھے کہ مجھے کھنکار کر انہیں اپنی طرف متوجہ کرنا پڑا۔ انہوں نے بدک کر اخبار کو ایک طرف رکھ دیا۔ تنقیدی انداز میں فرمایا۔ "اخبار تو خبروں کے لیے ہووت ہے لیکن اس میں بھی ایسے واہیات اشتہار دے دیوت ہیں کہ لگتا ہے کہ اونٹ کے منہ میں زیرہ دے دیا ہے۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ اشتہار زیادہ ہونے چاہئیں؟"

"یار محاورے میں بات کر رہا ہوں۔ تمہاری اردو ابھی بھی کافی کمزور ہے۔"

میری کمزور اردو یہی بتا رہی تھی کہ اونٹ کے منہ میں زیرے کا مطلب ہوتا ہے ضرورت سے بہت کم، لیکن اگر میں یہ بات پہلوان سے کہتا تو پھر بہت لمبی بحث چھڑ جانا تھی، لہٰذا خاموش رہنا ہی مناسب لگا۔

پہلوان جی سے اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ زینب کی یہاں آمد اور اس کی آسودہ حالی نے پہلوان کو نہال کر دیا تھا۔ وہ چاند گڑھی کی بیٹی تھی اور چاند گڑھی کا ہر فرد ایک طرح سے پہلوان کے گھر کا فرد تھا۔ پہلوان نے سیف اور اس کی بے آسرا بہنوں کے حوالے سے بھی پوری خیر خبر رکھی ہوئی تھی۔ پہلوان کے توسط سے مجھے پتا چلا کہ سیف کی بڑی بہن شازیہ کی شادی ہو گئی ہے۔ یوں شازیہ کی چھوٹی بہنوں کو اپنے خوش اخلاق جیجا اکبر کی شکل میں بھائیوں جیسا آسرا مل گیا ہے۔ سیف کے گھرانے کی خیر سلامتی کا سن کر مجھے دلی سکون ملتا تھا۔ تاجور نے بھی تو بچھڑنے سے پہلے یہی کہا تھا کہ میں سیف کی بے آسرا فیملی کا خیال رکھوں، اگر اس فیملی کو کوئی تکلیف پہنچے گی تو یہ تکلیف وہ خود بھی محسوس کرے گی چاہے وہ کہیں بھی ہو۔

میری اور پہلوان کی ہلکی پھلکی گفتگو کے دوران میں ہی پہلوان کا مالشیا بھی آ گیا۔ وہ اسی طرح دیواروں کو ٹٹولتا ہوا اندر داخل ہوا۔ سلام دعا کے بعد اس نے الماری کے اندر سے مطلوبہ تیل اور ہلدی میں بھگوئی ہوئی روئی وغیرہ نکالی۔

پہلوان حشمت کی حالت پہلے سے یقیناً بہتر تھی۔ انہوں نے خود ہی کروٹ بدلی اور پھر تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ میں نے سمجھا کہ وہ مالش کرانے کے لیے بنیان وغیرہ اتارنا چاہ رہے ہیں مگر وہ تو دائیں بائیں جھانک رہے تھے اور بار بار چارپائی کے نیچے بھی دیکھ رہے تھے۔ تب ایک دم ان کے تاثرات بدل گئے۔ کمر درد کی پروا کیے بغیر وہ اٹھ کھڑے ہوئے نابینا مالشیے کا گریبان پکڑ کر ایک جھانپڑ اس کے سر پر مارا۔

مالشیے نے فریاد بلند کی۔ ''میں نے کیا کیا ہے؟ کیوں مار رہے ہیں مجھے؟''

پہلوان جی دہاڑے۔ ''فراڈیئے...... چکر باز...... اُلو کا پٹھا سمجھا ہوا ہے مجھے۔ تیری تو ایسی کی تیسی۔ مجھ کو پہلے ہی شک تھا کہ تُو پورا نابینا ناہیں ہے کچھ نہ کچھ نظر آوت ہے تجھے۔''

مالشیا چلاتا رہا لیکن اسی دوران میں دو تین مزید دوہتڑ اسے پڑ چکے تھے۔ پہلوان نے اڑنگا لگا کر اسے چارپائی پر گرایا اور اندھا دھند اس کے اوپر چڑھنے کی کوشش کی۔ ظاہر ہے کہ چارپائی نے ٹوٹنا ہی تھا اور وہ ٹوٹ گئی۔

ایک دم ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ کچھ دیر پہلے پانچ سو کا جو نوٹ میں نے چارپائی کے پاس سے اٹھایا تھا، وہ پہلوان نے مالشیے کا ''نابینا پن'' چیک کرنے کے لیے جان بوجھ کر گرا رکھا تھا۔ اب نوٹ کو اپنی جگہ موجود نہ پا کر پہلوان کو آناً فاناً شدید طیش نے گھیر لیا تھا۔ میں بمشکل پہلوان اور مالشیے کے درمیان آیا اور پھر پانچ سو کا نوٹ پہلوان کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ پہلوان نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

میں نے کہا۔ ''چاچا حشمت! یہ دیکھو یہ رہا آپ کا نوٹ۔''

پہلوان کی گرفت ذرا ڈھیلی ہوئی تو آفت زدہ ملازم پہلوان کے نیچے سے نکلنے میں کامیاب ہوا اور دیوانہ وار دروازے کی طرف لپکا۔ چوکھٹ سے اس کی سخت ٹکر ہوئی۔ وہ لڑکھڑا کر گرا لیکن اس نے وقت بالکل ضائع نہیں کیا اور دوبارہ اٹھ کر بھاگ گیا۔

پہلوان جی ہکا بکا میری طرف دیکھتے چلے جا رہے تھے۔ میں نے کہا۔ ''آپ نے بڑی جلد بازی کی۔ کسی گناہ کے بغیر بے چارے کی درگت بنا دی۔''

اب پہلوان کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس کے ساتھ ہی کمر کا درد بھی عود کر آیا۔ وہ کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے اور کراہتے ہوئے ایک کرسی پر فروکش ہو گئے۔ رنگ ایک دم ہی پیلا پڑ گیا

تھا اور آنکھوں سے شدید ترین ندامت جھانکنے لگی تھی۔ کچھ دیر تک خاموش رہ کر اپنی سانسیں درست کیں اور پھر فرمایا۔ ''یہ تو بہت بڑی زیادتی ہوگئی مجھ سے...... میں سمجھتا ہوں کہ تم نے بھی غلطی کی۔ اگر نوٹ اٹھالیا تھا تو مجھے بتا دیتے۔''

''چاچا! مجھے کیا پتا تھا کہ آپ اس طرح پھندا لگائے بیٹھے ہو...... اب تو جو ہونا تھا ہو گیا۔''

''لیکن میں خود کو بالکل معاف ناہیں کرسکوں گا۔'' پہلوان نے کہا اور پیشانی پر پسینے کی نمی دکھائی دینے لگی۔ پہلوان حشمت کی نرم دلی اور انسان دوستی ہر شبہے سے بالاتر تھی۔ اب وہ جو شدید قسم کی پشیمانی محسوس کررہے تھے وہ بھی ان کی انہی خوبیوں کی غماز تھی۔ ان کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اب وہ جلد از جلد ''مضروب'' کو تلاش کرکے اس سے معافی تلافی کرنا چاہتے ہیں۔ عین ممکن تھا کہ وہ اس کے پاؤں پر سر ہی رکھ دیتے۔

پہلوان حشمت کو ان کے حال پر چھوڑ کر میں اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ تیز ہوا چل رہی تھی۔ کبھی کبھی بارش کے چھینٹے بھی پڑ جاتے تھے۔ یہ سردی کی پہلی دستک تھی۔ اکتوبر کا مہینہ بدلتے موسم کی نوید لا رہا تھا۔ موسم کی ایسی کروٹ دل و دماغ میں عجیب سا گداز جگا دیا کرتی ہے۔ ایسا گداز جس میں سوز اور اداسی کی ہلکی سی آنچ بھی ہوتی ہے۔ مجھے میرے بچھڑنے والے یاد آئے۔ میری چچا زاد بہن فائزہ اور چچی آمنہ۔ پھر دراز قد نازک بدن جاناں، جس کے رگ و پے میں شعریت رچی بسی تھی اور جو اپنے دل میں ٹی وی کی ایک نامور اداکارہ بننے کی آرزو رکھتی تھی۔ اب وہ برونائی سے آگے ایک جزیرے میں، پام کے بلند درختوں میں گھرے ہوئے کسی قبرستان میں سو رہی تھی...... اور پھر پنجاب کا رنگ رنگیلا گبرو سیف...... جسے کبڈی میں کوئی پکڑ نہیں سکتا تھا۔ وہ ہر گرفت سے نکل جاتا تھا...... وہ میری گرفت سے بھی نکل گیا تھا اور منوں مٹی کے نیچے سو گیا تھا اور پھر انیق...... چلبلا...... کھلنڈرا...... بظاہر ریشم کی طرح نرم لیکن دشمنوں کے لیے فولاد۔ میرا ہمدرد، میرا غمگسار، اب میرے پاس فقط اس کی یادیں تھیں...... اور وہ قرض تھا جو وہ میرے اوپر چڑھا گیا تھا۔ اپنی جان کا قرض...... اور پھر تاجور...... بے شک وہ زندہ سلامت تھی اور اس کی سلامتی مجھے ہر شے سے بڑھ کر عزیز تھی، لیکن وہ بھی تو میری زندگی سے نکل چکی تھی، اس سے وابستہ بے شمار تلخ و شیریں یادیں ہوا کے جھونکوں میں بس کر آئیں اور اکتوبر کی اس خنک رات میں میرے گرد گھیرا ڈال کر بیٹھ گئیں...... میرے سینے کی بھڑکتی ہوئی آگ میں اپنے ہاتھ تاپنے لگیں...... جیسے وہ یادیں نہ ہوں، ٹھٹھرے ہوئے دیہاتی بچے ہوں۔

میں اسی طرح دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا۔ تیز ہوا کی وجہ سے کمرے میں لگے ہوئے دو انرجی سیور بھی پلکیں جھپکاتے ہوئے محسوس ہوئے تھے۔ غنودگی سی مجھ پر طاری ہونے لگی۔ اسی غنودگی میں تخیل اور تصور کا کھیل بھی جاری رہا۔

اچانک دروازے پر کسی نے بھاری ہاتھ سے دستک دی۔ میں نے وال کلاک دیکھا۔ رات کے بارہ بج چکے تھے، اس وقت کون ہوسکتا تھا۔ ''کون؟'' میں نے بلند آواز میں پوچھا۔

''میں ہوں شاہ زیب! دروازہ کھولو۔'' داؤد بھاؤ کی آواز نے مجھے بری طرح چونکا دیا۔ پتا نہیں کہ وہ کب یہاں فارم ہاؤس میں واپس آئے تھے۔

میں نے چپل گھسیٹی اور جلدی سے جا کر دروازہ کھولا۔ داؤد بھاؤ ہمیشہ کی طرح پینٹ کوٹ میں تھے۔ ان کے ساتھ ایک لڑکی تھی جو سرتاپا چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔

میں نے سوالیہ نظروں سے بھاؤ کی طرف دیکھا۔ وہ بہت کم مسکراتے تھے لیکن عجیب انداز میں ہلکی سی مسکان ان کے ہونٹوں تک آئی۔ بولے۔ ''یہ تم سے ملنے آئی ہے۔ بات کرو اس سے۔'' پھر انہوں نے لڑکی کو اشارہ کیا وہ قدم اٹھا کر ذرا جھجکتی ہوئی میرے کمرے میں چلی آئی۔

داؤد بھاؤ نے معنی خیز انداز میں میری طرف دیکھا اور کچھ کہے بغیر دوسری طرف چلے گئے۔ میں چند سیکنڈ تک تذبذب کے عالم میں کبھی لڑکی اور کبھی داؤد بھاؤ کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر دروازہ بند کیا اور لڑکی کی طرف متوجہ ہوا۔ اب وہ روشنی میں تھی۔ اس کی طرف دیکھ کر مجھے اپنے اردگرد کی ہر شے نگاہوں کے سامنے گھومتی محسوس ہوئی...... وہ تاجور تھی...... اس کی طویل اوڑھنی بارش سے بھیگی ہوئی تھی، وہ کچھ سردی...... اور کچھ شاید اضطراب کی وجہ سے لرز رہی تھی۔

''تاجور، تم یہاں؟'' میں بمشکل کہہ سکا۔

اب تاجور نے اوڑھنی کا نقاب ہٹا دیا تھا اور چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ شرم، خوف اور دکھ کے امتزاج نے اس کے دلکش چہرے کو ایک پھیکا سا رنگ دے دیا تھا۔ وہ خود کو بمشکل بولنے پر آمادہ کر سکی۔ ''داؤد صاحب! مجھے یہاں لے آئے ہیں۔''

''کہاں سے؟'' میں نے بے پناہ حیرت سے کہا۔

''اسلام آباد سے۔ وہاں دارج اسپتال میں داخل ہیں۔ میں ان کی دیکھ بھال کے لیے وہاں تھی۔'' دارج کا نام لیتے ہوئے تاجور کے چہرے پر ایک ناگوار سا سایہ سا لہرا گیا۔

''تمہارا مطلب ہے تاجور...... کہ داؤد بھاؤ نے تمہیں وہاں سے اٹھوا کر یہاں پہنچایا ہے؟''

اس نے سر جھکایا اور نفی میں ہلایا۔

میری حیرت بڑھتی جارہی تھی...... ’’تو اس کا مطلب ہے...... تمہاری...... اپنی مرضی......بھی......؟‘‘

وہ خاموش رہی۔ بس اس کا سر اسی طرح جھکا رہا۔ اس کا انداز گواہی دے رہا تھا کہ میرے اس سوال کا جواب بھی اثبات میں ہے۔ اس سے یہ مطلب بھی لیا جا سکتا تھا کہ داؤد بھاؤ اور تاجور میں رابطہ ہوا ہے اور تاجور نے اس سے مدد طلب کی ہے۔

وہ عجیب دکھی لہجے میں بولی۔ ’’شاہ زیب! اب یہ سب برداشت کرنا میرے بس میں نہیں رہا۔ ان کا رویہ خراب سے خراب ہوتا جارہا ہے۔ لگتا ہے کہ وہ اب اپنے ہوش وحواس میں ہی نہیں ہیں۔ یہاں تک کہ اپنی والدہ کی موت کا ذمے دار بھی مجھے ہی گردان رہے ہیں۔ بیمار ہونے کے باوجود مجھ سے ایسا سلوک کررہے ہیں کہ......‘‘ وہ فقرہ مکمل نہ کر سکی اور سسکنے لگی۔ میں خاموش اور ساکت کھڑا تھا۔

کچھ دیر بعد تاجور نے جیسے دوبارہ اپنے اندر بولنے کی طاقت بحال کی اور عجیب باغیانہ لہجے میں کہا۔ ’’میں اس شخص کے ساتھ اور نہیں رہ سکتی۔ میں نے بہت جھیلا ہے، اب اور نہیں جھیل سکتی۔ وہ میری برداشت آزمانے کے لیے ایک حد کے بعد دوسری حد مقرر کردیتا ہے۔ مم...... مجھے لگتا ہے کہ میں مزید اس کے ساتھ رہی تو اپنے ہوش وحواس بھی کھوبیٹھوں گی۔‘‘

اس کے چہرے پر اب زردی کے بجائے سرخی تھی۔ وہ پہلی بار دارج کے لیے ’’آپ اور ان‘‘ کی جگہ ’’وہ اور اس‘‘ کے الفاظ استعمال کررہی تھی۔ میرے ذہن میں آیا کہ دارج کے زیادہ برے رویے کی وجہ شاید وہ واقعہ بھی ہے جب چند دن پہلے تاجور نے کھوہ میں میری جان بچانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

ذہن میں بہت سے سوالات چنگھاڑ رہے تھے...... لیکن وہ ابھی تک کمرے کے وسط میں گیلی چادر اوڑھے کھڑی تھی اور کانپ رہی تھی۔ میں نے اس کے لیے بستر سے صاف چادر اتاری اور اس سے کہا کہ وہ اپنی گیلی چادر بدل لے۔

چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد اس نے گیلی چادر جسم سے علیحدہ کردی اور دوسری چادر کی طرف ہاتھ بڑھائے۔ یہ تین چار سیکنڈ کا وقفہ میری نگاہ کو جیسے خیرہ کر گیا۔ بہت عرصہ ہوا میں نے تاجور کو توجہ سے دیکھنا چھوڑ دیا تھا لیکن وہ جو کچھ تھی اس کو تو کوئی بدل نہیں سکتا تھا۔ ایک بیاہتا ہونے کے باوجود، اور ایک واہیات شخص کی دسترس میں ہونے کے باوجود وہ اب بھی چاندگڑھی کی الہڑ مٹیار ہی تھی۔

ذرا نم بال...... چاند سی پیشانی...... گہری سیاہ آنکھیں۔ کانوں میں گول آویزے جو گل

رنگ رخساروں پر ڈگمگاتے تھے اور اس کے نیچے لمبی شفاف گردن...... کشادہ شانوں کی وجہ سے گردن کی خوب صورتی میں اضافہ ہوتا تھا اور اس میں ہیرے کی ایک ''چین'' جگمگاتی تھی۔
وہ ہاف سلیو والی کڑھائی دار سیاہ قمیص میں تھی۔ بازوؤں کو سنگِ مرمر سے تشبیہ دی جا سکتی تھی، مگر سنگِ مرمر میں ایک نظر نواز سرخی کا عکس تو نہیں ہوتا اور نہ ایسی بے مثل لچک ہوتی ہے وہ سرتا پا کسی شاعر کی غزل تھی...... کسی ماہرِ فن مصور کی تصویر تھی...... اس شاہکار تصویر پر بس ایک چھوٹا سا عارضی دھبا نظر آ رہا تھا...... یہ اس کے کندھے کا وہ زخم تھا جو چند روز پہلے کھوہ میں ڈیئر ہاؤنڈز کی یورش کے وقت لگا تھا۔ وہاں ایک بینڈ ایج نظر آ رہی تھی۔
میں نے دیکھا تاجور کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ اس کی ناک سرخ ہوتی جا رہی تھی۔ کچھ عجیب سی کیفیت تھی اس کے چہرے پر۔ پھر وہ ہیجانی انداز میں میری طرف بڑھی اور میری باہوں میں آ گئی۔ سسک کر بولی۔ ''میں اب اس جنونی کے ساتھ اور نہیں رہ سکتی۔ مجھے کہیں لے جائیں شاہ زیب! کہیں بہت دور...... جہاں اس کی آواز مجھ تک نہ پہنچ سکے...... جہاں اس کی ہوا بھی مجھے نہ چھو سکے...... پلیز شاہ زیب۔''
وہ مجھ سے یوں چمٹی ہوئی تھی، جیسے ڈوبنے والا زندگی بچانے کے لیے کسی سہارے سے چمٹتا ہے۔ اس کا گداز جسم میرے جسم سے پیوست تھا۔ اس کے ریشمی رخسار میری گردن کو اور میرے چہرے کو چھو رہے تھے۔ اس کے بالوں کی لٹیں...... اس کے چہرے پر نہیں میرے چہرے پر جھول رہی تھیں۔

اچانک میں نے ایک شدید دھچکا سا محسوس کیا۔ میں اسی طرح دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ باہر سرکش ہوائیں چنگھاڑ رہی تھیں۔ کمرے میں میرے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ غنودہ حالت میں دیوار سے ٹیک لگائے لگائے میرا تصور مجھے کہیں کا کہیں لے گیا تھا۔ یہ تصور اتنا طاقتور تھا کہ مجھے ہر منظر نگاہوں کے سامنے دکھائی دیا تھا۔

میں نے ایک گہری دکھ بھری سانس لی اور اپنی خالی باہوں کو دیکھا۔ اب میری ان باہوں تک کس نے آنا تھا؟ جس نے آنا تھا اس میں اتنی ہمت نہیں تھی۔ وہ معاشرے سے اور اپنے حالات سے ٹکرا نہیں سکتی تھی۔ وہ اپنی ایک غلطی اور غلط فہمی کی وجہ سے ایک جذباتی فیصلہ کر گزری تھی۔ اب اس جذباتی فیصلے کی سزا اس کے ساتھ ساتھ مجھے بھی بھگتنا تھی۔ شاید اسی لیے شاعر نے کہا تھا......

یہ جدائیوں کے راستے بڑی دور تک گئے ہیں
جو گیا پھر نہ آیا میری بات مان جاؤ

اچانک میرے سیل فون پر کال کے سگنل آئے۔ میں نے کال ریسیو کی اور دوسری طرف کی آواز سن کر جیسے اچھل پڑا۔ یہ فخر بول رہا تھا.... ہاں یہ فخر ہی تھا۔

''فخر کہاں ہو تم؟ خیریت سے تو ہو؟'' میں نے ہیجانی انداز میں پوچھا۔

''ابھی تک تو خیریت سے ہوں...... آئندہ کا کچھ کہہ نہیں سکتا...... لیکن سب سے پہلے مجھے ایک بات بتائیں...... آپ نے فارس جان کو تو نہیں دیکھا؟''

''نہیں فخر، لیکن وہ تو تمہارے ہی ساتھ تھا۔'' میں نے تعجب سے کہا۔

''وہ ہمارے ساتھ نہیں تھا شاہ زیب! اور اگر تھا بھی تو اب نہیں ہے۔'' فخر کے لہجے سے گہرا دکھ جھلک رہا تھا۔

ایک دم میں کانپ گیا۔ ''کیا کہہ رہے ہو فخر، کھل کر بتاؤ۔''

وہ دبی دبی اور ہانپی ہوئی سی آواز میں بولا۔ ''ایک بات بڑے دھیان سے سن لو شاہ زیب اور دوسروں کو بھی بتا دو۔ فارس جان کی طرف سے پوری طرح چوکس رہیں۔ وہ ہمارے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے...... اور وہ کسی بھی وقت تم لوگوں کو اپنے آس پاس نظر آ سکتا ہے۔'' اس نے ایک لمحہ توقف کیا اور بجھے لہجے میں بولا۔ ''تم ٹھیک سمجھ رہے ہو شاہ زیب! وہ ہاناوانی کا شکار ہو چکا ہے...... میں اس وقت...... تمہیں زیادہ تفصیل نہیں بتا سکتا۔ کیونکہ خود بھی مصیبت میں ہوں۔ بس یہ جان لو کہ فارس جان ایک ایسے گائیڈڈ میزائل کی طرح ہے جسے ہاناوانی نے ہم لوگوں کی طرف چھوڑا ہے۔''

میں سناٹے میں تھا اور فخر کی آواز سن رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ فخر کہیں چھپا ہوا ہے اور اس کے اردگرد کسی طرح کا خطرہ موجود ہے۔

میں نے کہا۔ ''فخر، تم اس وقت کہاں ہو؟''

وہ بولا۔ ''میں ہاناوانی کے تنخواہ دار قاتلوں سے چھپتا چھپاتا یہاں بارڈر کی طرف نکل آیا ہوں لیکن اب مجھے فارم ہاؤس کے راستے کا پتا نہیں چل رہا۔ میرے پاؤں پر چوٹ بھی لگی ہوئی ہے۔ میرا مشکوک حلیہ دیکھ کر کچھ دیہاتیوں نے میرا پیچھا کیا۔ میں یہاں ایک ٹیوب ویل کے کمرے میں پرالی کے ڈھیر میں چھپا ہوا ہوں۔ میرا اندازہ تو یہی ہے کہ یہ جگہ فارم ہاؤس سے بہت زیادہ دور نہیں ہے۔'' وہ بری طرح کھانسنے لگا۔

میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے فخر، تم اپنی جگہ موجود رہو۔ میں ایک مقامی بندے کو بلاتا ہوں۔ تم اسے اپنی لوکیشن کے بارے میں بتاؤ۔ میرا خیال ہے کہ ہم تمہیں جلد ڈھونڈ لیں گے......''

''ٹھیک ہے شاہ زیب! میں انتظار کرتا ہوں۔فون آن ہے لیکن ایک بار پھر فارس کی طرف سے خبردار کررہا ہوں۔''

''او کے، میں تمہیں دوبارہ کال کرتا ہوں۔'' میں نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

فارس کا سن کر سینے میں چنگاریاں سی چھوٹ گئی تھیں۔فخر کی باتوں سے اشارہ ملتا تھا کہ وہ ہاناوانی کے مہلک ٹرانس کا شکار ہو چکا ہے لیکن سوچنے کی بات یہ تھی کہ کیا وہ یہاں فارم ہاؤس تک پہنچ سکتا ہے۔فخر اور فارس صرف ایک بار اس فارم ہاؤس میں آئے تھے اور پھر یہاں سے میرے ساتھ ہی کلر کہار کی طرف گئے تھے۔اگر فخر کو اس الگ تھلگ فارم ہاؤس کا راستہ یاد نہیں رہا تھا تو عین ممکن تھا کہ فارس کو بھی یاد نہ رہا ہو۔

میں فارم ہاؤس کے ہیڈ مالی اشرف اچھو تک پہنچا۔اچھو کہنے کو تو یہاں کا ہیڈ مالی تھا لیکن حقیقت میں وہ کراچی اور حیدر آباد میں تین چار قتل کرنے کے بعد یہاں پایا جا رہا تھا۔ اس فارم ہاؤس کے تقریباً سارے ملازم ہی اپنی اپنی جگہ ''پہنچی ہوئی ہستیاں'' تھے۔میں نے فون پر اچھو کی بات فخر سے کرائی۔فخر نے جو نشانیاں بتائیں ان کے ذریعے اچھو نے دو منٹ کے اندر ہی اس کی لوکیشن کا اندازہ لگا لیا۔

داؤد بھاؤ تو فارم ہاؤس میں موجود نہیں تھا۔میں نے لودھی کو ساری صورتِ حال بتائی۔ لودھی نے فوراً ایک جیپ مہیا کر دی۔لودھی کا کہنا تھا کہ وہ اچھو وغیرہ کے ساتھ جا کر خود فخر کو لے آتا ہے لیکن میں نے خود جانا مناسب سمجھا۔بہر حال جانے سے پہلے میں نے بھاری دل کے ساتھ لودھی کو فارس جان کے حوالے سے آگاہ کر دیا۔لودھی، فارس جان کو شکل سے نہیں جانتا تھا لہٰذا مزید احتیاط کے لیے ضروری تھا کہ میں قسطینا کو بھی صورتِ حال سے بے خبر نہ رکھتا۔ یہ ایک دشواری کا کام تھا۔میں قسطینا کے پاس پہنچا اور تھوڑی سی تمہید باندھنے کے بعد اسے مناسب لفظوں میں وہ بات بتا دی جو کچھ دیر پہلے فخر نے مجھے بتائی تھی۔

قسطینا کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے لیکن آخری رنگ قوت برداشت اور حوصلہ مندی کا تھا۔وہ ایک بے مثل کمانڈر تھی اور اپنے اندر ایک فولادی دل رکھتی تھی۔گمبھیر لہجے میں بولی۔''شاہ زائب! کیا فخر نے......خود......فارس کو اس حالت میں دیکھا ہے؟''

میں نے کہا۔''قسطینا! میری اس سے زیادہ بات نہیں ہو سکی۔وہ خود بھی خطرے میں ہے۔اس کے علاوہ وہ زخمی بھی ہے اور شدید بخار میں پھنک رہا ہے مگر اس کی بات سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے خود فارس کو دیکھا ہے۔''

قسطینا نے ایک آہ بھری۔

میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔ ''قسطینا! یہ بات تو آپ بھی اچھی طرح سمجھ رہی ہیں کہ ہاناوانی کا ٹرانس کوئی مستقل چیز نہیں ہے...... اگر ٹرانس کا شکار ہونے والا زیادہ دیر تک ہاناوانی سے دور رہتا ہے تو پھر وہ اس کے ٹرانس سے نکل جاتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ انیق سے مستقل فون پر رابطہ رکھتی تھی...... میرے خیال میں پرندوں والی صورتِ حال بھی آپ کی نظر سے اوجھل نہیں ہوگی۔''

قسطینا نے سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھا۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''مندر کے تہ خانے میں طوطے مسلسل ہمارے اردگرد موجود رہے۔ دھیرے دھیرے وہ سجیشن کمزور پڑ گئی جو ہاناوانی نے انہیں دے رکھی تھی...... اور میرے خیال میں یہی وجہ تھی کہ جب ہم بنارس کے ساتھ شمشان گھاٹ کی طرف سے نکلے تو پرندوں نے ہماری طرف رخ نہیں کیا...... اس کا مطلب ہے کہ اگر ہم فارس جان تک پہنچ جاتے ہیں اور...... ان شاء اللہ پہنچیں گے تو پھر فارس جان زیادہ دیر اس بلا کے زیر اثر نہیں رہے گا۔''

قسطینا کو تسلی دینے کے بعد میں، اشرف عرف اچھو اور دو دیگر افراد کے ساتھ جیپ میں آ بیٹھا اور فارم ہاؤس سے روانہ ہوا۔ یہ رات کوئی ایک بجے کا عمل تھا۔ بارش بند ہو چکی تھی مگر تیز ٹھنڈی ہوا اسی طرح فراٹے بھر رہی تھی۔ اس علاقے کی پولیس میں بھی اچھو کا اثر و رسوخ تھا۔ اسے اس امر کی مطلق پروا نہیں تھی کہ کہیں گشت کرتی ہوئی پولیس سے آمنا سامنا ہو جائے گا۔ ویسے بھی جس طرح کا موسم تھا ایسی کسی ملاقات کا امکان کم ہی تھا۔

جیپ پہلے نیم پختہ راستے پر ہچکولے کھاتی رہی، پھر ایک خشک ڈیک نالے کے ساتھ ساتھ چلتی ایک کچے راستے پر آ گئی۔ دونوں طرف کھیت اور درخت تھے۔ یہ سفر میری توقع سے زیادہ طویل ثابت ہوا۔ بالآخر ہم ایک دوراہے پر پہنچ گئے۔ اچھو نے اپنی پاٹ دار آواز میں کہا۔ ''سر جی! میرا خیال ہے کہ ایک بار آپ پھر فون کر کے تصدیق کر لیں کہ بائیں طرف ہی مڑنا ہے ناں؟''

میں نے فخر سے دوبارہ کال ملائی اور تصدیق کی۔ ہم ٹھیک جا رہے تھے اور اس ڈیرے کے قریب پہنچ چکے تھے جہاں ٹیوب ویل کے کمرے میں زخمی فخر نے خود کو چھپا رکھا تھا۔

قریباً پانچ منٹ بعد ہم اس چھوٹے سے ڈیرے پر پہنچ چکے تھے۔ وہ مکمل طور پر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ بالکل خاموشی تھی، بس تیز ہوا کی سائیں سائیں تھی جو کیکر اور بیری وغیرہ کے درختوں کو دیوانہ وار جھومنے پر مجبور کر رہی تھی۔ اچھو خود ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ اس نے

ڈیرے پر پہنچنے سے پہلے ہی گاڑی کی ہیڈ لائٹس آف کر دی تھیں۔ پھر اس نے انجن بھی بند کر دیا۔ کچھ آگے جا کر گاڑی رک گئی۔ میں اور اچھو نیچے اترے اور احتیاط سے ٹیوب ویل والے کمرے کی طرف بڑھے۔ اچھو کے ہاتھ میں چھوٹی نال کی رائفل تھی۔ ہم دروازے سے دو قدم دور ہی تھے کہ اندر سے فخر کی بھرائی ہوئی آواز ابھری۔ ''آ جاؤ شاہ زیب، میں نے دیکھ لیا ہے۔''

میں نے پنسل ٹارچ روشن کی اور کوٹھڑی نما کمرے میں چلا گیا۔ یہاں ڈیزل کی بو تھی۔ ایک طرف پرالی کا ڈھیر تھا اور اس کے عقب میں فخر موجود تھا۔ وہ اپنی ایک ٹانگ پر زور دے کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا لباس میلا کچیلا تھا اور سر پر بھی چوٹ کے آثار تھے۔ اس کا چہرہ سوجا سوجا تھا۔ وہ میرے گلے لگ گیا۔ وہ زخمی ٹانگ پر بوجھ نہیں ڈال پا رہا تھا۔ میں نے اس کا بازو اپنے کندھے کے اوپر رکھ کر اسے سہارا دیا اور آہستہ آہستہ چلاتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔

''اگر زیادہ مسئلہ ہے تو تمہیں اٹھا لیتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''نہیں، میں ٹھیک ہوں۔'' فخر نے بوجھل آواز میں جواب دیا۔

اچانک رائفل کے دو بیرل میری کمر سے آن لگے۔ اس کے ساتھ ہی ایک بڑی ٹارچ بھی روشن ہو گئی تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ یہ پینٹ شرٹ والے دو افراد تھے جن کے ہاتھوں میں جدید آٹومیٹک رائفلیں تھیں۔ ایک تیسرے شخص نے اپنی رائفل اشرف عرف اچھو کے سر سے لگا دی تھی۔ ٹارچ بھی اسی شخص کے ہاتھ میں تھی۔

میں نے حیرت کے عالم میں فخر کی طرف دیکھا۔ اس کے سوجے سوجے چہرے پر عجیب سا رنگ تھا۔ آنکھوں میں اجنبیت لشکارے مار رہی تھی۔ یہی لمحے تھے جب مجھ پر ایک اور حیرت ناک انکشاف ہوا۔ فخر کا جو بازو میرے کندھے پر دھرا تھا۔ اب وہ صرف میرے کندھے پر نہیں تھا۔ فخر نے اسے موڑ کر میری گردن کے گرد کس دیا تھا۔ اس کی یہ گرفت سخت سے سخت ہوتی چلی جا رہی تھی۔ میں نے تیزی سے اپنے بریٹا پسٹل کی طرف ہاتھ بڑھانا چاہا لیکن فخر نے پھرتی سے میری کلائی جکڑ لی۔

''نہیں......نہیں......تمہارا کھیل ختم ہو گیا شاہ زیب۔'' وہ پھنکارا۔

سیکنڈ کے دسویں حصے میں یہ بات میری سمجھ میں آ گئی کہ یہ کیا ماجرا ہوا ہے۔ فخر شکار ہو چکا تھا۔

اچانک فائر ہوا اور میں نے اشرف عرف اچھو کو کٹے ہوئے شہتیر کی طرح زمین پر

گرتے دیکھا، اسے شوٹ کرنے والے شخص نے بھی اپنی رائفل کا رخ میری طرف پھیر دیا۔ اپنے دونوں ساتھیوں کی طرح وہ بھی نقاب میں تھا۔ دہاڑ کر بولا۔ ''چالاکی دکھاؤ گے تو تم بھی مارے جاؤ گے۔''

دو تین سیکنڈ کے لیے میں واقعی سکتہ زدہ رہ گیا تھا۔ میرے قدموں میں اچھو کی بے حرکت لاش پڑی تھی۔ کہیں خون کا قطرہ نظر نہیں آرہا تھا لیکن گولی یقیناً اس کے دماغ میں گھس چکی تھی۔

تب مجھ پر انکشاف ہوا کہ دو مزید نقاب پوش ڈیرے میں چھپے ہوئے تھے۔ اچھو کو شوٹ کرنے والا ان سے مخاطب ہو کر حکمیہ انداز میں بولا۔ ''پکڑو باقیوں کو بھی۔''

باقیوں سے اس کی مراد وہی دو افراد تھے جو میرے اور اچھو کے ساتھ فارم ہاؤس سے یہاں پہنچے تھے۔ نقاب پوش ہماری جیپ کی طرف بڑھے۔ یہی وقت تھا جب جیپ کی طرف سے فائرنگ شروع ہوگئی۔ یقیناً اچھو کے دونوں ساتھیوں نے خطرہ بھانپ کر مزاحمت شروع کر دی تھی۔ آناً فاناً دونوں طرف سے فائرنگ شروع ہوگئی۔

اچھو کو شوٹ کرنے والا نقاب پوش چلایا۔ ''یہ جانے نہ پائیں۔''

میں نے ایک بار پھر فخر کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ اپنے فولادی بازو کا شکنجہ اس نے میری گردن کے گرد اور سخت کر دیا تھا اور یہ شکنجہ نہ بھی ہوتا تو مزاحمت کی کوشش ایک بڑی حماقت ہی کہلاتی۔ تین رائفلوں کے بیرل میرے سر اور کمر سے لگے ہوئے تھے۔

اس دوران میں اندازہ ہوا کہ اچھو کے ساتھی جان بچانے کے لیے موقعے سے فرار ہو رہے ہیں۔ اچھو کو گولی مارنے والا پھر دہاڑا۔ ''بھاگنے نہ دینا۔ ان کا ٹائر برسٹ کرو۔'' فائرنگ کے دھماکوں سے قرب و جوار لرز رہے تھے۔ اندازہ یہی ہو رہا تھا کہ اچھو کے ساتھی موقع سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔

یہی وقت تھا جب عقب سے میرے سر پر نہایت شدید ضرب لگائی گئی۔ نگاہوں کے سامنے اَن گنت ستارے ناچ گئے۔ دوسری ضرب نے مجھے ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیا۔ ہوش کھونے سے پہلے جو آخری خیال میرے ذہن میں چمکا وہ یہی تھا کہ فارس شکار نہیں ہوا، فخر شکار ہوا ہے...... لیکن فارس کے سلسلے میں جو غلط فہمی پھیل چکی تھی......؟ پھر ہر خیال اندھیرے میں ڈوب گیا۔

O......❖......O

میرے حواس بحال ہونا شروع ہوئے تو مجھے لگا کہ میں کافی دیر دنیا و مافیہا سے بے خبر رہا ہوں۔ اردگرد کی ہر شے دھندلائی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ میں کسی چٹائی پر ہوں۔ سر کے عقبی حصے سے درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ پلکوں پر جیسے منوں بوجھ تھا۔ میں اپنا ہاتھ سر کی طرف لے گیا۔ وہاں پٹی بندھی ہوئی تھی۔ میں نے آنکھیں پوری کھولیں۔ ہمت جمع کی اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ایسا کرنے سے سر پھوڑے کی طرح دکھنے لگا۔ یہ قریباً بارہ فٹ ضرب سولہ فٹ کا ایک چوکور کمرا تھا۔ صرف ایک کھڑکی اور ایک آہنی دروازہ نظر آرہا تھا۔ میرے جسم پر وہی لباس تھا جو میں نے فارم ہاؤس سے روانہ ہوتے وقت پہنا ہوا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اب میرے پاؤں میں جوتے نہیں تھے۔ پاؤں کی طرف دھیان گیا تو یہ انکشاف بھی ہوا کہ میرا ایک ٹخنا اسٹیل کی ایک چمکدار زنجیر میں جکڑا ہوا ہے۔ یہ خاصی طویل زنجیر تھی اور کسی اژدھے کی طرح بل کھا کر کمرے کے فرش پر پڑی تھی۔

بے ہوش ہونے سے پہلے کے سارے خیالات ایک دم بھرا مار کر دماغ میں گھس آئے۔ فخر کی کال...... ہمارا فارم ہاؤس سے نکل کر ٹیوب ویل تک پہنچنا...... وہاں فخر کے بارے میں خوفناک انکشاف۔ اشرف عرف اچھو کا مارا جانا اور پھر اندھا دھند فائرنگ۔

میں کھڑا ہو گیا اور آہنی دروازے تک پہنچا۔ چاروں طرف خاموشی تھی۔ میں نے دروازے کو ہاتھوں سے کوٹ ڈالا اور بلند آواز سے پکارا۔ ”کوئی ہے...... کوئی ہے یہاں؟“

بار بار کی پرشور دستک کے باوجود کسی طرح کا ردِعمل ظاہر نہیں ہوا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ یہ پوری جگہ خالی ہے۔ آہنی دروازے کے بالکل نیچے ایک چھوٹا مستطیل خلا نظر آرہا تھا۔ اس خلا کو باہر سے بند کیا اور کھولا جا سکتا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ خلا کھانا وغیرہ اندر پہنچانے کے لیے ہے اور ابھی چند گھنٹے پہلے ہی بنایا گیا ہے۔ لوہے کی کٹنگ اور ویلڈنگ وغیرہ کی نشانیاں فرش پر دکھائی دے رہی تھیں۔

تھوڑی دیر مزید، دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد میں فرشی گدے پر آ کر بیٹھ گیا۔ یہ کمرا ہر قسم کے فرنیچر سے خالی تھا۔ ایک سائیڈ پر چھوٹا دروازہ نظر آرہا تھا جو یقیناً واش روم کا تھا...... یہ احساس بے حد خوفناک تھا کہ میں ایک بار پھر خطرناک ساحرہ ہاناوانی کے قبضے میں آچکا ہوں۔ یکایک فخر کا خیال ذہن میں آیا اور دل رنج وغم سے بھر گیا۔ اب اس بات میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ وہ بھی ہاناوانی کا شکار ہو چکا ہے اور شاید اسی عمارت میں کہیں، ایسے ہی پابہ زنجیر موجود ہے۔

کتنا زبردست چکما دیا گیا تھا۔ ٹرانس کی حالت میں فخر نے ہمیں فارس جان کی طرف

سے خبردار کیا تھا اور ہماری پوری کی پوری توجہ فارس جان کی طرف چلی گئی تھی۔ یہ سوچ ذہن میں آئی ہی نہیں تھی کہ فخر کے ساتھ بھی تو کچھ برا ہو سکتا ہے۔ اس چال سے ہمیں دہرا نقصان ہوا تھا۔ فارم ہاؤس سے روانہ ہوتے وقت میں نے قسطینا کے علاوہ لودھی وغیرہ کو بھی فارس کی طرف سے الرٹ کر دیا تھا۔ اب اس صورتِ حال کے سبب فارس کو بھی کوئی نقصان پہنچ سکتا تھا اور یہ بات عین ممکن تھی کہ فارس، ہانا وانی کے ہتھے نہ چڑھا ہو اور بالکل نارمل ہو......

یہاں ایک اور سوال بھی ابھرتا تھا کہ ٹرانس میں آنے کے بعد فخر نے مجھے کیوں ٹیوب ویل والے ڈیرے پر بلایا، وہ خود فارم ہاؤس تک کیوں نہ پہنچ گیا؟ اس کا جواب ذرا سی کوشش سے سمجھ میں آ گیا۔ فخر کو واقعی فارم ہاؤس کا راستہ نہیں آتا تھا۔ اگر راستہ آتا ہوتا تو صرف وہی نہیں، ہانا وانی اور اس کے خونخوار ساتھی بھی فارم ہاؤس پہنچ گئے ہوتے۔ اب تو صرف میں ان کی دسترس میں آیا تھا۔ وہ فارم ہاؤس پہنچ جاتے تو میرے علاوہ قسطینا، پہلوان حشمت اور زینب وغیرہ بھی ان کے نشانے پر آ جاتے...... بہرطور اب بھی فارم ہاؤس کے لیے خطرہ بدستور موجود تھا۔ ہانا وانی اور اس کی ٹیم بارڈر ایریا تک تو پہنچ ہی چکی تھی۔

دوسرا اور زیادہ بھڑکتا ہوا سوال یہ تھا کہ میرے یہاں پہنچ جانے کے بعد، اب کیا ہوگا؟ اس کا جواب یہی تھا کہ اب ہانا وانی سے میرا سامنا ہونے والا تھا اور غالب امکان یہی تھا کہ وہ مجھے جان سے نہیں مارے گی بلکہ اپنے مہلک ٹرانس میں لینے کی کوشش کرے گی تا کہ اپنی ''منحوس قسم'' کے مطابق وہ اپنے مذموم مقاصد پورے کر سکے۔ وہ میرے ہی ذریعے فارم ہاؤس تک پہنچنے کی کامیاب کوشش بھی کر سکتی تھی۔ میرا دھیان سجاول کی طرف چلا گیا اور میں اندر سے ہل گیا۔ اس نے ہانا وانی سے بچنے کے لیے اپنی آنکھوں کی قربانی دی تھی اور اپنے کانوں کو بھی بے حد دلیری سے داؤ پر لگا دیا تھا...... کیا...... برا وقت آنے پر مجھے بھی ایسا ہی کچھ کرنا پڑے گا؟

مجھے اس وقت کچھ معلوم نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں اور میرے اردگرد جو لوگ ہیں وہ کون ہیں...... ہاں جب میں نے دروازہ کھٹکھٹایا تھا اور بلند آواز میں پکارا تھا تو اتنا اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ یہ ایک وسیع عمارت ہے۔ میرے لیے ایک معمایہ بھی تھا کہ میں کتنا عرصہ بے ہوش رہا ہوں۔ سر کی چوٹیں گہری تھیں اور اس کا اندازہ میری شرٹ کے کالر پر موجود خون کے دھبوں سے بھی ہو جاتا تھا۔ مجھے بھوک اور تھوڑی سی پیاس بھی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اپنی ٹھوڑی پر ہاتھ پھیرا اور شیو کی صورتِ حال سے اپنی بے ہوشی کا دورانیہ جاننے کی کوشش کی...... لیکن کچھ خاص آئیڈیا نہیں ہو سکا۔

اسی دوران میں مجھے پہلی بار قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے کھڑکی سے جھانکا سوجی سوجی آنکھوں والا ایک ہٹا کٹا ملائیشین اپنی طرف آتا دکھائی دیا اور اس امر کی تصدیق ہو گئی کہ میں ہاناوانی کے جال میں ہی ہوں۔ ملائیشین کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی جس میں دو برگر اور کولڈ ڈرنک وغیرہ رکھے تھے۔ اس نے دروازے کے نچلے خلا سے یہ ٹرے اندر کھسکا دی اور خشک لہجے میں بولا۔ ''کھالو...... اور اس کے علاوہ کسی چیز کی ضرورت ہے تو بتاؤ۔''

وہ انگلش میں بولا تھا۔ میں نے بھی انگلش میں کہا۔ ''ایک عدد پستول کی ضرورت ہے تاکہ میں تمہاری والدہ محترمہ کی کھوپڑی میں سوراخ کر سکوں۔ جا کر اسے بتاؤ کہ میں اس کے یہ حرام کے لقمے نہیں کھاؤں گا۔ میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''وہ کیڑے مکوڑوں سے بات نہیں کرتیں...... بس انہیں اپنے جوتے سے مسلتی ہیں لیکن ان کے جوتے سے مسلے جانے کا شرف بھی شاید تمہیں حاصل نہیں ہو سکے گا۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں تمہارا اپنا ہی کوئی باسٹرڈ ساتھی ذلت کی موت مارے گا۔''

وہ جیسے آیا تھا، ویسے ہی اپنے بھاری کولہے مٹکاتا ہوا واپس چلا گیا۔ اس عمارت کی چھتیں بلند تھیں اور قدموں کی چاپ بھی ان کے نیچے گونجتی ہوئی سی محسوس ہوتی تھی۔

میں نے ایک بار پھر دروازہ کھٹکھٹانا شروع کیا اور ہاناوانی کو صلواتیں سنائیں...... لیکن کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا۔ مجھے یہاں یہ بھی اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ کیا وقت ہوا ہے۔ یہ دن ہے یا رات ہے؟ میں لاہور میں ہوں یا کہیں اور؟ ہاناوانی یہاں موجود ہے یا کہیں دوسری جگہ پائی جا رہی ہے۔ اَن گنت سوالات تھے مگر جواب کوئی نہیں تھا۔ ذرا خاموشی ہوئی تو میں نے دھیان سے سنا...... اور مجھے ایک سنسنی خیز آواز سنائی دی...... یہ خوب صورت رنگین طوطوں کی آواز تھی۔ وہی طوطے جو ہمارے لیے خونریزی اور دہشت کی علامت بن چکے تھے وہ اسی عمارت میں کہیں موجود تھے۔ شاید کسی کمرے یا بڑے پنجرے میں بند تھے۔ ننھے منے طوطوں کی یہ مہین باریک آوازیں بڑی دلکش ہوا کرتی ہیں لیکن اس وقت یہ آوازیں شہد کی قاتل مکھیوں سے زیادہ مہلک اور خوفناک محسوس ہوئیں۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہاں مجھے کس طرح کے حالات پیش آنے والے ہیں، نہ ہی مجھے فخر کے بارے میں کچھ اطلاع تھی۔ حالانکہ مجھے یقین تھا کہ فخر بھی اسی چھت تلے کہیں موجود ہوگا۔ کس حال میں ہوگا؟ اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ یہاں کے انتظامات سے اندازہ ہو رہا تھا کہ مجھے تادیر یہاں رکھے جانے کی پلاننگ ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ ہاناوانی سے ملاقات کے بارے میں بھی فی الحال کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

بہرحال ہاناوانی سے ملاقات کی بابت میرا خیال غلط ثابت ہوگیا۔ اس لاک اَپ میں میں نے قریباً پندرہ سولہ گھنٹے گزارے تھے جب سوجی آنکھوں والا ملائیشین دو دیگر ملائیشنز کے ساتھ میرے لاک اَپ کے سامنے آن موجود ہوا۔ ایک غنڈا صورت مقامی شخص بھی ان کے ساتھ تھا۔ اس کے بھدے موٹے ہاتھوں میں لوڈ ڈ ایل ایم جی تھی۔

سوجی آنکھوں والے ملائیشین نے مجھ سے کہا۔ ''مدر مادام (ہاناوانی) تم سے ملنا چاہتی ہیں۔ ہم تمہیں ان کے پاس لے کر جا رہے ہیں لیکن اس کے لیے تمہیں اپنے دونوں ہاتھوں کو الٹی ہتھکڑی لگوانا ہوگی۔ دروازے کے نیچے والے خلا کے پاس الٹے ہوکر بیٹھ جاؤ تاکہ تمہیں ہتھکڑی لگائی جاسکے۔''

میں نے کہا۔ ''اور اگر میں انکار کردوں تو؟''

وہ بے پروائی سے بولا۔ ''تو پھر ہمارے پاس جنگلی کتوں اور سؤروں وغیرہ کو گن کے ذریعے بے ہوش کرنے کے لیے انجکشن گن بھی موجود ہے۔''

میں جانتا تھا کہ ان لوگوں کے ساتھ بحث فضول اور وقت ضائع کرنے کے مترادف ہے۔ میں نے ان کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے اُلٹی ہتھکڑی لگوالی۔ مجھے جدید رائفلوں کے سائے میں ایک کوریڈور سے گزارا گیا۔ بلند و بالا چھت والے اس طویل کوریڈور کے ہر حصے سے امارت اور شان و شوکت جھلکتی تھی۔ بالآخر ہم ایک وسیع ہال کمرے میں پہنچے۔ یہاں روشنی اور اندھیرے کا عجیب سا امتزاج تھا۔ میری نگاہ سب سے پہلے جس چیز پر پڑی وہ ہاناوانی کے آنجہانی بیٹے رائے زل کی ایک بہت بڑی پورٹریٹ تھی جو سامنے والی بلند دیوار پر آویزاں تھی اس پورٹریٹ سے ذرا آگے ایک اسٹیج سا تھا جس کو سرخ رنگ کے مخملی کپڑے سے ڈھانپا گیا تھا۔ اس اسٹیج پر ایک شاندار، زرنگار کرسی رکھی تھی۔ اسے دیکھتے ہی جاماجی کے کچھ پرانے روح فرسا مناظر میری نگاہوں میں گھوم گئے۔ ایسی ہی ایک کرسی پر بیٹھ کر اس خطرناک ترین ساحرہ نے مجھ پر اپنی نظروں کا مہلک جادو چلانے کی کوشش کی تھی۔ وہ ست رنگا بھنور وہ غیر مرئی سازوں کا ہیجانی شور، وہ رقص کرتی ہوئی عریاں پرچھائیاں، میں کچھ بھی بھولا نہیں تھا۔

دفعتاً میری نگاہ چھت کی طرف گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی سیاہ جھالر سی چھت کے ساتھ جھول رہی ہے لیکن پھر یہ جان کر ایک کراہت سی جاگی کہ یہ جھالر نہیں تھی۔ درجنوں چمگادڑیں تھیں جو چھت میں موجود آہنی کنڈوں کے ساتھ الٹی لٹکی ہوئی تھیں۔ بڑے سائز کی ایک بالکل سیاہ بلی زرنگار کرسی کے قریب خاموش بیٹھی تھی۔ وہ کسی لیوپارڈ کی طرح دکھائی دیتی تھی

مگر اس کے کھڑے کان، دور سے بالکل سینگوں کی طرح لگتے تھے۔ وہ اپنی آنکھوں میں خونخوار چمک لیے میری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسٹیج کے اردگرد تقریباً چھ مسلح محافظ موجود تھے اور مجسموں کی طرح ساکت کھڑے تھے۔ ان کی شکلیں دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ گرے فورس کے سفاک گارڈز ہیں۔

گھڑی کی سوئیاں آگے کو سرک رہی تھیں اور اس وسیع ہال میں موجود ہر جاندار و بے جان شے جیسے ہاناوانی کی منتظر تھی...... بالآخر ایک دبیز پردے کے عقب سے وہ نمودار ہوئی۔ وہ ایک نیلگوں لبادے میں تھی۔ اس کی آنکھوں پر ہمیشہ کی طرح ایک سیاہ چشمہ نظر آ رہا تھا۔ اس کے وجود کے گرد اسراریت کا ایک ہالہ سا محسوس ہوتا تھا۔ میں نے دھیان سے دیکھا اس کے دونوں کندھوں پر گنجے سروں اور لمبی گردنوں والے دو گدھ بیٹھے تھے۔ جب وہ اسٹیج کی سیڑھیوں پر پہنچی تو یہ دونوں گدھ خود بخود پھڑ پھڑا کر بلند چھت کے کسی تاریک حصے میں اوجھل ہو گئے۔ ہاناوانی بڑی تمکنت سے اپنی کرسی پر فروکش ہوئی۔ کچھ دیر تک سیاہ چشمے کے عقب سے مجھے گھورتی رہی پھر زہر سے لتھڑی ہوئی کڑک دار آواز میں بولی۔ ”تو آخر تم وہاں پہنچ ہی گئے، جہاں تمہیں پہنچنا چاہیے تھا......“

میرے دل نے گواہی دی...... شاہ زیب! تم اپنی زندگی کے بدترین امتحان سے دوچار ہونے والے ہو۔

○...❖...○

ہاناوانی میرے سامنے تھی۔اس کے چوڑے چکلے چہرے پر طیش اور تکبر کے سوا کچھ نہیں تھا۔

میں نے کہا۔" تم ٹھیک کہتی ہو ہاناوانی! میں وہیں پہنچ گیا ہوں جہاں مجھے پہنچنا چاہیے تھا.....لیکن تم لوگوں کی بہادری اور بے خوفی کا یہ عالم ہے کہ درجنوں رائفل برداروں کی موجودی میں بھی میرے ہاتھ الٹی ہتھکڑی میں جکڑے ہوئے ہیں۔"

" گھبراؤ مت ایسٹرن! بہت جلد تمہارے یہ ہاتھ کھول دیں گے اور آزاد بھی کر دیں گے پھر اپنی مرضی سے جو بھی کرنا چاہو گے اس کے لیے آزاد ہو گے۔"

" میں اس آزادی کو اچھی طرح جانتا ہوں۔تم اپنی ایک خداداد صلاحیت کو شیطانی کاموں کے لیے استعمال کر رہی ہو۔تمہاری حرص اور ہوس کی حدیں بہت آگے تک ہیں لیکن یہ رویہ تمہیں برباد کر دے گا۔رائے زل کا تو صرف سر کاٹا گیا تھا،تمہارے جسم کے ٹکڑے ہو جائیں گے......اور وہی لوگ کریں گے جو تمہارے ظلم کا شکار ہو رہے ہیں۔"

دو گن بردار ملائیشین بھڑک کر میری طرف آئے۔لگتا یہی تھا کہ میرے سر پر رائفل کے دستے رسید کریں گے یا پھر مجھے ٹھوکروں پر رکھ لیں گے۔انہوں نے رائفل تو استعمال نہیں کی تاہم ایک گارڈ نے دو تین طوفانی ٹھوکریں میری کمر پر رسید کر دیں۔ہاناوانی کی رعب دار آواز نے انہیں روک دیا۔"نہیں اس کی ضرورت نہیں۔" وہ ہاتھ اٹھا کر بولی۔

" اس کو زیادہ کڑی سزا ملنے والی ہے۔"

دونوں رائفل بردار پیچھے ہٹ گئے۔ان کی جگہ دو لڑکیاں برآمد ہوئیں۔ان کے جسموں پر گرے فورس کی وردیاں تھیں۔انہوں نے بڑی تیزی کے ساتھ میرے جسم کے گرد ایک رسی کو کئی بل دے دیے۔اب میں اس کرسی کے ساتھ پیوست ہو گیا تھا جس پر بیٹھا ہوا تھا۔ایک لڑکی جس کے جسم پر غالباً کیپٹن کی یونیفارم تھی،ایک ٹرے میں میڈیکل کا کچھ

سامان لے کر نمودار ہوئی۔ ایک بڑے سائز کی سرنج میں اس نے دو انجکشن بھرے اور میری قمیص کے اوپر سے ہی میرے بازو میں ٹھونک دیئے۔ میں نے مزاحمت کی تھوڑی سی کوشش کی لیکن جلد ہی سمجھ میں آ گیا کہ یہ بیکار ہے۔

ہاناوانی بڑی شان سے اپنی زرنگار کرسی پر بیٹھی تھی۔ ہمیشہ کی طرح اس کے پورے جسم پر قیمتی نگینوں والے طلائی گہنے چمک رہے تھے۔ اس کے عین سامنے بلند و بالا چھت پر درجنوں چمگادڑیں ایک بڑی سیاہ جھالر کی طرح جھول رہی تھیں۔ کسی خاص نسل کی بہت بڑی سیاہ بلی زرنگار کرسی کے قریب بالکل ساکت بیٹھی تھی۔ کسی وقت تو لگتا تھا کہ وہ بلی زندہ نہیں بلکہ مجسمہ ہے لیکن جب اس کے کان، جو دور سے سینگوں کی طرح نظر آتے تھے، ہلتے تھے تو پتا چلتا تھا کہ وہ گوشت پوست کی ہے۔ گنجے سروں والے دونوں گدھ نہ جانے نیم تاریک چھت میں کہیں اوجھل ہو چکے تھے۔ تاہم قبریں کھودنے والا بجو ایک طویل روشن دان میں مسلسل حرکت کرتا دکھائی دے رہا تھا۔

ہاناوانی اپنے پُراسرار علوم کی آبیاری کے لیے اور اپنی مکروہ توانائیوں میں اضافے کے لیے قبرستانوں میں راتیں گزارتی تھی۔ وہ کھلی قبر میں بیٹھ کر مخصوص چلّے کاٹتی تھی۔ اب وہ کسی قبرستان میں نہیں تھی، ایک عالیشان عمارت میں تھی لیکن یہاں بھی قبرستانوں اور ویرانوں کی نشانیاں اس کے ساتھ ساتھ تھیں۔ وہ اپنی ذات میں انوکھی تھی...... اور اپنے اس تمام تر انوکھے پن کے ساتھ اس وقت میرے سامنے ایک سرخ چبوترے پر فروکش تھی۔

''کیسا محسوس کر رہے ہو ایسٹرن؟'' اس کی آواز میرے کانوں میں گونجی۔

میں نے کہا۔ ''یہی محسوس کر رہا ہوں کہ اپنی جس پُراسرار قوت کا تم ڈھنڈورا پیٹتی ہو اس پر تمہیں خود بھی پورا اعتماد نہیں ہے۔ ورنہ اس کے لیے تم دواؤں کا سہارا کیوں لیتیں۔ تم نے یہ انجکشنز مجھے اسی لیے لگائے ہیں ناں کہ مجھے اپنے منحوس ٹرانس میں لینے کے لیے تمہیں کوئی دشواری نہ ہو۔''

''ہر موذی جانور سے نمٹنے کا الگ طریقۂ کار ہوتا ہے، شیر کو گولی ماری جاتی ہے، کتے کو زہر دیا جاتا ہے اور سانپ کو پاؤں سے مسلا جاتا ہے۔ تمہاری کھال بھی گھڑیال کی طرح تھوڑی سی موٹی ہے اس لیے تمہیں یہ انجکشن دیئے گئے ہیں۔''

میں سمجھ گیا کہ ''کھال موٹی ہونے سے'' اس کا مطلب کیا ہے، اور وہ کس طرف اشارہ کر رہی ہے۔ پچھلی مرتبہ اس نے جاما جی میں مجھے اپنی آنکھوں کے ذریعے زیر کرنے کی کوشش کی تھی اور ناکام رہی تھی۔ اب وہ زیادہ شدت اور توانائی سے حملہ کرنے والی تھی۔

میں بظاہر نارمل نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا تاہم میرے جسم کے ہر مسام سے پسینا بہہ نکلا تھا۔ حقیقتاً مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔

انجکشنز کا اثر ہونا شروع ہو گیا تھا۔ جسم میں عجیب سی سنسناہٹ محسوس ہو رہی تھی ذہن ماؤف ہوتا جا رہا تھا۔ پھر میں نے دیکھا کہ ہاناوانی اپنی سیاہ عینک آنکھوں سے اتار رہی ہے۔ ہال کمرے کی روشنیاں ایک دم بجھ گئیں۔ کچھ اور طرح کی دھیمی نیم گلابی اور زرد روشنیاں اس وسیع ہال کے ایک مخصوص حصے کو روشن کرنے لگیں۔ ان روشنیوں کا محور ہاناوانی کی شاندار نشست ہی تھی۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ بیشتر افراد اس ہال کمرے سے نکل گئے ہیں۔ شاید ایک دو خاص محافظ ہی یہاں موجود رہے تھے۔

''میری طرف دیکھو ایسٹرن۔'' چند سیکنڈ بعد ہاناوانی کی جادوئی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

ذہن میں دھند سی تھی۔ میں نے جیسے بے ساختہ ہاناوانی کی طرف دیکھا اور یہی لمحے تھے جب اس کی جگر پاش نگاہوں نے مجھے پوری طرح اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ مجھے اب کیا کرنا ہے۔ میرے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اور میں اچھی طرح جانتا تھا کہ میرے ہاتھ کے زخمی انگوٹھے میں ایک فریکچر ہے۔ میں ایک بار پھر اپنے ساتھ اذیت اور اذیت کے ذریعے سوچوں کی منتقلی کا کھیل کھیلنے والا تھا۔

چند سیکنڈ مزید گزرے اور پھر ہاناوانی نے مجھے اپنے بدنام زمانہ ٹرانس میں لینا شروع کر دیا۔ اس کی جادوئی آواز میرے کانوں میں گونجنے لگی۔ ''تم سو رہے ہو ایسٹرن...... تم اونگھنا شروع ہو گئے ہو...... تمہارے گرد کیا ہے...... غور سے دیکھو...... تمہارے گرد دھند ہے...... اور یہ آہستہ آہستہ گلابی رنگ اختیار کر رہی ہے......''

دھند واقعی گلابی رنگ میں ڈھل رہی تھی پھر اس میں نیلے اور زرد رنگ کی لہریں شامل ہونے لگیں...... پھر کچھ اور رنگ شامل ہوئے...... پھر یہ وہی ست رنگا بھنور بن گیا جس سے ایک دفعہ پہلے بھی میرا ٹکراؤ ہو چکا تھا۔ ست رنگ کا بھنور پھیل رہا تھا، اس کی رفتار تیز ہو رہی تھی...... وہ مجھے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ ایک ہیجان خیز موسیقی تھی جو آہستہ آہستہ بلند ہوتی جا رہی تھی۔ ہاناوانی شاید اب بھی بول رہی تھی۔ اس کی آواز دور افتادہ گھنٹیوں کی طرح تھی۔ مجھے لگا جیسے اب کچھ کرنے کا وقت ہے۔ اگر میں نے اب بھی نہ کیا تو اس بھنور میں ڈوب جاؤں گا۔ میں نے اپنے زخمی انگوٹھے پر بے رحمی سے دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ ہاتھ سے درد کی

لہریں اٹھیں اور پورے جسم میں پھیلنے لگیں۔ میں چند لمحوں کے لیے جیسے اس خوش رنگ بھنور سے دور ہٹ گیا...... لیکن ایک بار پھر وہی ہوا۔ بھنور کا پھیلاؤ اور اس کی رفتار تیز ہونے لگی۔ کوئی مقناطیس کی طرح مجھے اس بھنور کی طرف کھینچ رہا تھا۔ میں نے دل کڑا کیا...... دانت پیسے اور انگوٹھے پر انگلیوں سے شدید دباؤ ڈال کر ہڈی توڑ ڈالی۔ میرے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے، اردگرد موسیقی کا شور تھا اور نیم تاریکی تھی۔ ہڈی چٹخنے کی مدھم سی آواز پیدا ہوئی بھی ہوگی تو کسی کے کانوں تک کہاں پہنچی ہوگی لیکن اس عمل نے درد کی جو شدید لہریں میرے بازو اور پورے جسم میں پیدا کیں، انہوں نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ ان شدید لہروں کا ردِعمل میری منشا کے مطابق تھا۔ ست رنگا بھنور سُست پڑنے لگا۔ اس کی مقناطیسی کشش کم ہونے لگی۔

یہ اس بھنور کا اور میری اذیت کا مقابلہ تھا...... یہ بدنام ترین ہپناٹسٹ ہاناوانی اور ایسٹرن کا مقابلہ تھا...... گھڑی کی سوئیاں آگے کو سرک رہی تھیں...... اور کوئی بھی اپنی ہار ماننے کو تیار نہیں تھا پھر ہاناوانی نے سنگین ترین ہتھکنڈے کا استعمال شروع کیا۔ وہ میری سوچوں میں گھس چکی تھی...... میرے ذہن میں دندنا رہی تھی۔ وہ اپنی طاقتور سوچ کے زوردار ہچکولوں سے مجھے پھر ست رنگے بھنور کی طرف دھکیلنے لگی۔ تب مجھے محسوس ہوا کہ اس بھنور میں کچھ پرچھائیاں حرکت کر رہی ہیں۔ آہستہ آہستہ یہ پرچھائیاں نمایاں ہو کر نسوانی جسموں کی شکل اختیار کر گئیں۔ یہ دلربا حسینائیں تھیں۔ ان کے لچک دار ریشمی بدن سات رنگ کے اس بھنور میں محوِ رقص تھے۔ پھر مجھے ان میں تاجور نظر آئی۔ اس کے حسین پیکر پر گلاب کے پھولوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ یہی پھول تھے جو اس کے بدن کو ڈھانپ رہے تھے اور اس کی آرائش بھی کر رہے تھے۔ وہ سادہ حسن کا بے مثال نمونہ تھی۔ چاند گڑھی کے چھوٹے سے گاؤں میں کھلنے والا ایک ایسا یکتا پھول جو خوب صورتی کے مروج پیمانوں پر بے شک پورا نہیں اترتا تھا لیکن اپنے اندر ایک ایسی جاذبیت رکھتا تھا جو دلوں کو گھائل کر دیتی تھی...... اور وہ اب بھی میرے لیے دل میں نرم گوشے رکھتی تھی۔ وہ مجھے اپنی طرف بلا رہی تھی۔ وہ بھی محوِ رقص تھی۔ اس کے جسم کے گلاب ایک ایک کر کے جھڑ رہے تھے۔ اس کے پیکر کے دہکے ہوئے سونے کو نمایاں کر رہے تھے۔ اس نے اپنی بانہیں میرے لیے کھول رکھی تھیں۔ وہ مجھے بلا رہی تھی اپنی طرف...... میرے جسم سے جسم ملا دو...... میرے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دو۔ میں ہار گئی ہوں، تم جیت گئے ہو۔

میرے قدم بے ساختہ اس کی طرف اٹھنے لگے۔ بھنور کی کشش بے پناہ ہو رہی تھی۔

میں نے زخمی انگوٹھے کو بے طرح مسل دیا۔ ہڈی ٹوٹ چکی تھی۔ میں اپنی انگلیوں کے ذریعے ہڈی کی کڑکڑاہٹ محسوس کر رہا تھا۔ ٹوٹی ہوئی ہڈی کی کوئی چونچ گوشت میں دھنسنے لگی۔ اذیت بے پناہ ہوگئی۔ پرچھائیوں کے رنگ دھیمے پڑنے لگے، ان میں تاجور کی پرچھائیں بھی تھی۔ چند سیکنڈ پہلے تک یہ پرچھائیں اس قدر جیتی جاگتی لگ رہی تھی کہ اس کے حوالے سے اپنی بے مہار سوچوں کا رخ بدلنا میرے لیے ممکن نہیں رہا تھا مگر اب پھر حقیقت اور تصور میں فرق نمایاں ہونے لگا۔ میں نے بے رحمی سے مٹھی بھینچی...... غالباً ٹوٹی ہوئی مختصر سی ہڈی گوشت میں دھنستی چلی گئی تھی۔ اذیت بے کراں ہوگئی۔ بھنور کا طلسم ٹوٹنے لگا۔ پرچھائیوں کے رنگ پھیکے پڑنے لگے۔ میں کسی نادیدہ حصار سے نکل رہا تھا۔ پہلے مجھے ہاناوانی کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی، صرف کانوں کے اندر گھنٹیاں سی بجتی تھیں اور بھنور دکھائی دیتا تھا لیکن اب ہاناوانی کی آواز بھی سنائی دینے لگی۔ وہ سحر انگیز لہجے میں بار بار کہہ رہی تھی۔ ''میں وہی کروں گا، جو ہاناوانی مجھ سے کہے گی...... میرے الفاظ دہراؤ...... میں وہی کروں گا جو ہاناوانی مجھ سے کہے گی۔''

میرے دماغ کے اندر جیسے یکا یک ہزار پاور کا بلب روشن ہوگیا۔ دھندلائے ہوئے ذہن میں ایک سوچ آئی۔ میں نے غنودہ ذہن کو سنبھالا اور لڑکھڑاتے ہوئے سے لہجے میں بولا۔ ''میں وہی کروں گا جو ہاناوانی مجھ سے کہے گی......''

''دوبارہ بولو۔'' اس نے سحر انگیز آہنگ میں ''سجیشن'' دی۔

''میں وہی کروں گا...... جو ہاناوانی مجھ سے کہے گی۔''

''اپنے ہاتھ پاؤں بالکل ڈھیلے چھوڑ دو...... اور اپنی آنکھیں اب بند کر لو۔''

میں نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیئے اور آنکھیں بند کر لیں۔ اپنے زخمی انگوٹھے پر میرا دباؤ برقرار تھا...... تاہم اب مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں مشکل ترین وقت سے گزر چکا ہوں۔

ہاناوانی کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ''اب کوئی تمہارا دشمن نہیں لیکن وہ جس کے بارے میں، میں تمہیں بتاؤں گی۔ اب کوئی تمہارا دوست نہیں لیکن وہ جس کے بارے میں، میں تمہیں بتاؤں گی۔ کیا تم میری بات سمجھ رہے ہو ایسٹرن؟''

''میں سمجھ رہا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

اس نے اپنی مسحور کن آواز میں کچھ مزید فقرے میری سماعت میں انڈیلے...... وہ بتا رہی تھی کہ سب کچھ بدل گیا ہے۔ ماضی بدل گیا ہے اور حال بھی...... اب میرے اردگرد

سب کچھ نیا ہے......اب وہی عین سچ ہے جو ہاناوانی مجھ سے کہے گی......وہ اپنے ان مخصوص جملوں کے ذریعے جیسے میری برین واشنگ کررہی تھی۔ میں نے آنکھیں موند رکھی تھیں اور بس کبھی کبھی اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کررہا تھا۔ زخمی انگوٹھے پر میرا دباؤ برقرار تھا۔ کسی وقت اب بھی مجھے یہی لگتا تھا کہ اگر میں نے ذہن کو ڈھیلا چھوڑ دیا تو وہ ہاناوانی کی گرفت میں چلا جائے گا۔

ہاناوانی کی طاقتور سجیشن، آواز کی صورت میرے کانوں تک پہنچی۔ ''اب میں تمہیں کچھ چہرے دکھارہی ہوں۔ یہ بظاہر تمہارے دوست تھے لیکن حقیقت میں بدترین دشمن۔ تم ذہنوں اور دلوں کے اندر نہیں جھانک سکتے اس لیے تم ان کے اندر کی گھٹاٹوپ سیاہی سے بالکل بے خبر تھے۔ یہ زہریلے سانپوں کی طرح تمہیں ڈسنے والے تھے اور اب بھی یہی ارادے رکھتے ہیں۔ ایک اور درمیانے سائز کی اسکرین پر میرے ساتھیوں کے چہرے نمودار ہوئے پھر ان میں سے فخر کا چہرہ انلارج ہوکر سامنے آگیا۔ فخر کے بعد فارس جان، فارس جان کے بعد داؤد بھاؤ، سب چہرے نمایاں ہونے لگے۔ ہاناوانی بولی۔ ''اس حرام زادے انیق کی طرح یہ فخر بھی تاجور کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر ہو چکا ہے۔ یہ رقابت کی آگ میں جل رہا ہے......اور شاید تمہیں عجیب لگے مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ افغانی فارس جان بھی تاجور پر عرصے سے بدنگاہ رکھتا ہے۔ یہ دونوں کسی بھی وقت کسی بھی حیلے سے تمہاری جان لینا چاہتے ہیں۔ اگر تم ان کو نہیں مارو گے تو یہ تمہیں مار ڈالیں گے......تم میری بات سمجھ رہے ہو؟''

''میں سمجھ رہا ہوں۔''

''پورا یقین کررہے ہو؟''

''پورا یقین کررہا ہوں۔''

''داؤد بھاؤ تمہاری زندگی کا سودا کر چکا ہے۔ اس نے سارا ملبا اپنے کوتاہ قد کارندے بنارس پر ڈال دیا لیکن سچ یہی ہے کہ وہ بھی شکیل داراب سے ایک بہت بڑی رقم اینٹھ چکا ہے۔ وہ تمہیں اور تاجور کو ایسی جگہ مارے گا جہاں میلوں تک پانی نہیں ملے گا۔ داؤد زہریلے ترین ناگ سے زیادہ زہریلا ہے۔ جہاں ملے اس کا سر کچل ڈالو۔ اس کی کوئی دلیل کوئی وضاحت، قابلِ قبول نہیں ہے۔''

میں خاموشی سے سنتا رہا......

''قسطینا بھی ایک زخمی ناگن ہے۔'' ہاناوانی کی آواز میرے کانوں میں گونجی۔ ''تم

اس کی پہلی محبت تھے اور وہ اس محبت کی ناکامی کو بھولی نہیں۔ وہ تاجور کی جانی دشمن ہے اور یہ دشمنی تمہاری سوچ سے بھی زیادہ ہے۔ دراصل تاجور پر کاری وار کرنے کے لیے ہی وہ یہاں پہنچی ہے۔ وہ اس سے رابطے میں ہے، کسی بھی وقت اسے لاش میں بدل دے گی...... میں تاجور کے سینے میں، ہرن کے سینگ کے دستے والا ایک خنجر دھنسا ہوا دیکھ رہی ہوں۔ ایسٹرن! تم میری باتیں سمجھ رہے ہوناں؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''بغیر کسی شک کے پوری طرح یقین کر رہے ہو؟''

''ہاں، ہاناوانی، پوری طرح یقین کر رہا ہوں۔''

وہ مسلسل بولے جا رہی تھی اور برین واشنگ کر رہی تھی۔ اس نے مختلف دلیلوں اور انکشافات کے ذریعے سجاول، رضوان ٹی اور خورسنہ وغیرہ کے حوالے سے بھی میرے ذہن میں بے تحاشا زہر بھرا۔ اس کے الفاظ کا انتخاب...... اس کی پُر اثر آواز، اس کے لہجے کا اتار چڑھاؤ، سب کچھ خاص الخاص تھا۔ ایک مرتبہ قسطینا نے کہا تھا کہ اس بدذات عورت کو دنیا کے خطرناک ترین ہپناٹسٹ میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ شاید وہ ٹھیک ہی کہتی تھی۔ وہ بدستور میری برین واشنگ میں مصروف تھی۔ اس نے میری نجی زندگی کے حوالے سے مجھے سجیشنز دیں۔ اس نے عورت کا ذکر کیا اور شراب کا ذکر کیا...... اور مجھے بتایا کہ یہ چیزیں میرے شب و روز کا حصہ ہیں۔ میں نے ان سے دور ہو کر خود پر اور اپنی طبع پر ایک ظلم کر رکھا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

وہ ایک طویل دورانیہ تھا...... اور وہ ایک نہایت طویل سجیشن تھی۔ اس مشکل وقت کا ہر لمحہ میں نے جیسے ایک سولی پر گزارا۔ اپنے ذہن کو بیدار رکھنے کے لیے میرا واحد سہارا میرا ٹوٹا ہوا انگوٹھا تھا جسے میں نے اسی ہاتھ کی مٹھی میں جکڑ رکھا تھا۔

بالآخر میری زندگی کی یہ سخت ترین آزمائش گزر گئی۔ ہال کمرے کی روشنیاں جل اٹھیں۔ میں اسی طرح نڈھال سا...... دیوار سے سر ٹکائے، کرسی پر بیٹھا تھا۔ آنکھوں کی جھری میں سے میں نے دیکھا...... دراز قد...... قوی ہیکل ہاناوانی اپنی پُرشکوہ نشست سے کھڑی ہو گئی۔ نیم تاریک چھت میں اوجھل ہونے والے دونوں گدھ پھڑ پھڑاتے ہوئے نمودار ہوئے اور ہاناوانی کے دونوں کندھوں پر بیٹھ گئے (اس اثنا میں ہال کے دو تین دروازے کھلے تھے اور مسلح گارڈز واپس ہال میں آ گئے تھے)

ہاناوانی اپنی سیاہ عینک پہنتی ہوئی بلند و بالا مرکزی دروازے کی طرف بڑھی۔ قبریں

کھودنے والا لحیم شحیم بجو پھدکتا ہوا اس کے پیچھے جا رہا تھا۔ یہ سب کچھ کسی خوفناک ڈرامائی فلم کا حصہ معلوم ہوتا تھا...... لیکن میں جیتی جاگتی حالت میں اور پورے حواس کے ساتھ یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ میرا دل چاہا...... کاش کوئی گارڈ اس وقت میری بندشیں کھول دے...... اور میں سب اندیشے بالائے طاق رکھ کر اس منحوس عورت پر جا پڑوں...... اس کی اکڑی ہوئی گردن کا کڑا کا نکال دوں۔

ہاناوانی کے جانے کے بعد دو گارڈز آگے بڑھے اور انہوں نے رسی کی وہ گرہیں کھول دیں جنہوں نے مجھے کرسی سے باندھ رکھا تھا...... تاہم میرے ہاتھ ابھی تک پشت پر جکڑے ہوئے تھے۔ یہ لوگ انہیں کھولنے کا رسک اب بھی نہیں لے سکتے تھے۔ کم از کم دو رائفلوں کے بیرل میری جانب اٹھے ہوئے تھے۔ اسی دوران میں ایک مقامی گارڈ کی نگاہ میرے زخمی انگوٹھے پر پڑ گئی۔ انگوٹھا خون میں لتھڑا ہوا تھا...... میں نے ٹوٹی ہوئی ہڈی پر اتنی بے رحمی سے دباؤ ڈالا تھا کہ اس کی چھوٹی سی چونچ جلد پھاڑ کر باہر جھانکنے لگی تھی۔ خون کے قطرے فرش پر بھی گرے ہوئے تھے۔

''یہ کیا ہوا ہے؟'' مقامی شخص نے حیرت سے کہا۔

ملائیشین گارڈ انگلش میں بولا۔ ''اسے چوٹ تو پہلے ہی لگی ہوئی تھی۔ لگتا ہے کہ چوٹ پر اور چوٹ لگ گئی ہے۔''

گارڈز کے درمیان جو گفتگو ہوئی، اس سے پتا چلا کہ وہ میرے انگوٹھے کی اس لرزہ خیز حالت کو ان ٹھوکروں کا شاخسانہ سمجھ رہے ہیں جو میری تلخ کلامی سے مشتعل ہو کر گارڈز کے انچارج نے مجھے لگائی تھیں۔

میرے زخمی انگوٹھے پر عارضی طور پر ایک پٹی لپیٹی گئی اور مجھے دونوں کندھوں سے دو گارڈز نے تھام لیا۔ آہستہ آہستہ چلاتے ہوئے، وہ مجھے ہال کمرے سے باہر لے آئے۔

O......❖......O

اونچی چھتوں اور بلند و بالا دروازوں والی اس وسیع عمارت کے اندر ایک نیا کھیل شروع ہو گیا تھا، انوکھا اور پہلو دار کھیل...... میں ہاناوانی کے بدنام زمانہ ٹرانس میں آنے سے بچ گیا تھا مگر ظاہر یہی کر رہا تھا کہ میں اس ٹرانس میں پہنچ گیا ہوں۔ ٹرانس والے واقعے کو اب قریباً چوبیس گھنٹے گزر چکے تھے۔ میں خود کو کھویا کھویا اور گم صم ظاہر کر رہا تھا۔ میں اداکاری کر رہا تھا لیکن مجھے بالکل معلوم نہیں تھا کہ مجھے کس طرح کی اداکاری کرنا چاہیے اور

میں جو ''ایکسپریشنز'' دے رہا ہوں، وہ میرے کردار کو تقویت دے رہے ہیں یا کمزور کر رہے ہیں۔

میری الٹی ہتھکڑی تو اسی وقت کھول دی گئی تھی جب مجھے میرے ''لاک اپ'' میں واپس لایا گیا تھا۔ ایک ڈاکٹر نے میرے بدحال انگوٹھے پر ایک چھوٹا سا پلاستر پر چڑھا دیا تھا۔ میں نے ناشتا کیا تھا اور دوپہر کا کھانا بھی ٹھیک سے کھایا تھا۔ باقی وقت میں بس آنکھیں موندے بستر پر پڑا ہی رہا تھا۔

اگلے روز رات نو بجے کے لگ بھگ میرا کمرا تبدیل کر دیا گیا۔ یہ ایک آرام دہ بلکہ پُرآسائش کمرا تھا۔ اے سی، ایل سی ڈی اور ریفریجریٹر جیسی سہولیات یہاں موجود تھیں۔ بہرحال کھڑکی یہاں بھی نہیں تھی اور دروازے پر ایک چاق و چوبند مسلح گارڈ بھی تعینات تھا۔ یہاں پہنچتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کمرے میں خفیہ نگرانی کا نظام موجود ہے۔ چھت کی بناوٹ اور آرائش کچھ ایسی تھی کہ اس میں بہ آسانی ایک دو منی کیمرے نصب کیے جا سکتے تھے۔ میں نے ان کیمروں کی تلاش میں نگاہیں دوڑانا بھی مناسب نہیں سمجھا اور چپ چاپ لگژری بیڈ پر لیٹ گیا۔ ابھی مجھے لیٹے پانچ دس منٹ ہی ہوئے تھے کہ ایک خدمت گار بھی آن موجود ہوئی۔ وہ ایک مہ رخ، پری پیکر دراز قد لڑکی تھی۔ نہ جانے کیوں اسے دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہوا کہ وہ انڈین ہے۔ یہ اندازہ بالکل درست تھا۔ اس نے مجھے اپنا نام شاردا بتایا اور یہ بھی بتایا کہ وہ پچھلے کئی برس سے جاما جی میں مقیم ہے۔ پہلے وہ عزت مآب ریان فردوس کے محل میں تھی اور وہاں نوخیز رقاصاؤں کو رقص کی تربیت دیتی تھی۔ بعد میں جب ریان فردوس کو شاہی محل میں قتل کر دیا گیا اور بعد کے خونریز واقعات کے نتیجے میں نئے عزت مآب جواں سال ابراہیم نے مسند اقتدار سنبھال لی تو ساری کایا پلٹ گئی۔ شاردا نے بتایا کہ اب ڈی پیلس میں کچھ اور ہی ماحول بن چکا ہے۔ طاؤس و رباب اور مے نوشی کی محفلیں ختم ہو چکی ہیں۔ ان سرگرمیوں سے تعلق رکھنے والے سیکڑوں مرد و زن بے روزگار ہونے کے ڈر سے نیوسٹی کی طرف رخ کر گئے ہیں اور وہاں ہانا وانی کے لیے ''خدمات'' انجام دے رہے ہیں۔ شاردا بھی ان میں سے ہی ایک تھی۔ اس نے واضح الفاظ میں آگاہ کیا کہ اس کا تعلق صرف ناچ گانے سے ہے۔ وہ اپنے فن سے مخلص ہے اور اس نے کبھی بھی جسمانی تعلقات اور جسم فروشی کی طرف جانے کی کوشش نہیں کی۔

میں خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ اس نے مجھے یہ بتا کر حیران کیا کہ اس نے باقاعدہ سیلف ڈیفنس کی تربیت لی ہوئی ہے......اور وہ مجھے بھی ایسٹرن کی حیثیت سے اچھی

طرح جانتی ہے۔ اس کی گفتگو مکمل طور پر جھوٹ نہیں تھی...... اور شاید مکمل طور پر سچ بھی نہیں تھی۔ وہ مجھے مسلسل، ایسٹرن اور مسٹر ایسٹرن کہہ کر مخاطب کر رہی تھی......

''میرا خیال ہے کہ آپ کھانے سے پہلے ڈرنک کرنا پسند کرتے ہیں۔'' اس نے اٹھلا کر کہا اور میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی قد آدم ریفریجریٹر کی طرف بڑھ گئی۔ وہ چست پتلون اور ہاف سلیو شرٹ میں ملبوس تھی۔ ترشے ہوئے سیاہ بال شانوں پر لہرا رہے تھے۔ دو منٹ بعد ہی میرے سامنے شیشے کی خوب صورت میز پر وہسکی کی بوتل اور دیگر لوازمات رکھے تھے۔ یہ میرا پہلا امتحان تھا اور کافی کڑا تھا۔ تاجور کے ساتھ اپنے انوکھے تعلق میں گرفتار ہونے کے بعد میں نے بہت کچھ چھوڑا تھا اور ان میں یہ شراب خانہ خراب بھی شامل تھی۔ اب مجھے اس کی بو سے بھی متلی ہونے لگتی تھی۔ (فخر میری اس کایا پلٹ پر بہت حیران ہوا تھا کیونکہ وہ اب بھی اس شغل کو برا نہیں سمجھتا تھا)

میرا جی چاہا کہ میں ہاتھ مار کر یہ سب کچھ میز پر سے گرا دوں لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ میری ہر ہر حرکت کو دیکھا اور جانچا جا رہا ہے۔ میں ایک خطرناک امتحان سے گزر رہا تھا۔ اگر ہاناوانی اور اس کے گرگوں کو شک بھی ہو جاتا کہ میں کسی طرح کا ڈراما کر رہا ہوں تو میرے لیے صورتِ حال نہایت بدتر ہو سکتی تھی۔ چند سیکنڈ کے اندر ہی میں تذبذب کے ایک شدید ترین ریلے کی زد میں آ گیا، اس ریلے کے اندر جیسے لڑھکنیاں کھانے لگا۔ ایک خیال یہ بھی ذہن میں آیا کہ وقتی طور پر اس مشکل سے جان چھڑانے کے لیے کہہ دوں کہ ابھی موڈ نہیں ہو رہا، مگر بات پھر وہی تھی۔ ہلکا سا شک بھی سارا کھیل بگاڑ سکتا تھا۔

''ایک پیگ بناؤ۔'' میں نے شاردا کو ہدایت کی۔

کچھ ہی دیر بعد پیگ میرے ہاتھ میں تھا اور دل مالش کر رہا تھا مگر میں ''بڑی رغبت'' سے اسے چڑھا گیا۔ پھر دوسرا...... اور پھر تیسرا......

قریباً دو گھنٹے بعد مجھے لگا کہ میں نے خود کو مخمور کر کے اچھا ہی کیا تھا۔ ورنہ جو دیگر امتحان مجھے درپیش تھے، ان سے گزرنا بہت مشکل ہو جاتا۔ ان میں سے ایک امتحان تو خود شاردا ہی تھی۔ اپنی آمد کے وقت اس نے بڑے طنطنے سے کہا تھا کہ وہ صرف رقص و نغمے تک محدود ہے اور ''جسمانی تعلقات'' سے بہت دور رہتی ہے لیکن پُرتکلف ڈنر کے بعد اس کی ادائیں اور اس کے اشارے کنایے کچھ اور کہانی سنانے لگے۔ اس نے خود بھی پی تھی اور اس کی گہری سیاہ آنکھوں میں نشہ نظر آنے لگا تھا۔ وہ بہانے بہانے سے اپنے جسم کو بار بار میرے جسم سے چھوا جاتی تھی اور اس کے ہونٹوں پر معنی خیز تبسم چمک جاتا تھا۔

وہ بولی۔ ''مسٹر ایسٹرن! میں جاما جی میں آنے سے پہلے آگرہ میں رہتی تھی۔ سیلف ڈیفنس کی تربیت میں نے وہیں سے لی تھی۔ میں تب سے آپ کو ایم اے کے چمپئن کی حیثیت سے جانتی ہوں۔ اس وقت سوچا بھی نہ تھا کہ ایک دن ایسا آئے گا جب میں آپ سے ملوں گی...... آپ کے ساتھ ایک کمرے میں ہوں گی۔''

میں نے کہا۔ ''میں نے بھی ایسی بہت سی باتیں نہیں سوچی تھیں جو ہوگئی ہیں...... اور ہو رہی ہیں۔''

وہ اپنی ہی رو میں بولتی گئی۔ ''کمانڈر قسطینا کو میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں، وہ اپنی ضد کی بہت بہت پکی ہیں۔ انہوں نے آپ سے پیار کیا، آپ کو پانا چاہا لیکن پا نہ سکیں..... غالباً آپ کے مجبور کرنے پر ہی انہوں نے اس افغانی فارس جان سے شادی کر لی...... لیکن مسٹر ایسٹرن! آپ کبھی ان کے دل سے نہیں نکلے...... اور یہی وجہ ہے کہ وہ تاجور کی جانی دشمن بن چکی ہیں۔ وہ یہاں پہنچی ہی اس لیے ہیں کہ موقع ملتے ہی تاجور صاحبہ کا کام تمام کر سکیں......''

''ایسا کبھی نہیں ہو سکے گا۔'' میں نے گمبھیر لہجے میں کہا اور تلخ سیال کا پیمانہ ایک بڑے گھونٹ میں خالی کر دیا۔

وہ ہنسی اور اس کے سفید دانت لشکارے مارنے لگے۔ ''کتنی عجیب بات ہے قسطینا تاجور کو مارنا چاہتی ہیں اور ان کے شوہر صاحب تاجور پر جان چھڑکتے ہیں۔ میں اندر خانے کے رازوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔ یہ فارس جان بھی تاجور پر بری نظر رکھتا ہے۔ یہ معاملہ ان ہی دنوں پروان چڑھا تھا جن دنوں تاجور آپ کو امریکی جلادلونگ کے چنگل سے نکالنے کے لیے جاما جی پہنچی تھیں۔ ان دنوں فارس جان نے......''

''اچھا چھوڑو اس ذکر کو۔'' میں نے بھنا کر اس کی بات کاٹی...... ''وہ اب زندہ نہیں بچے گا...... بلکہ...... سمجھو کہ مر چکا ہے...... اور مرے ہوؤں کی باتوں پر اپنا وقت برباد کیوں کیا جائے؟''

''بات تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں مسٹر ایسٹرن۔'' اس نے معنی خیز لہجے میں کہا اور جام میری طرف کھسکایا۔ ایسا کرتے ہوئے شیشے کا کنارہ میرے زخمی ہاتھ سے ٹکرا گیا۔ درد کی ایک لہر سی انگوٹھے سے لے کر کندھے تک چلی گئی۔

میرے تاثرات دیکھ کر وہ گھبرا گئی۔ ''اوہ سوری...... ویری سوری...... شما چاہتی ہوں مجھے پتا نہیں چلا۔''

میں غصے کا گھونٹ بھر کر رہ گیا۔ وہ بتدریج بے تکلف ہوتی چلی جا رہی تھی۔ ایک کے بعد دوسری حد پار کر رہی تھی۔ اب خود ہی اس نے جام بنا کر میری طرف بڑھا دیا تھا۔
میں نے اس کی طرف گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم تو کہتی تھیں کہ تم صرف ڈانس وغیرہ تک محدود ہو اور باقی ''معاملات'' سے دور ہو؟''
''کون سے معاملات؟'' وہ نشیلی نظروں سے دیکھ کر مسکرائی۔
''اتنی انجان نہ بنو'' میں نے اسے گھورا۔
اس نے گہری سانس لے کر میری آنکھوں میں دیکھا۔ ''میں نے غلط نہیں کہا کہ صرف ڈانس اور SINGING تک محدود ہوں، لیکن بندے بندے کی بات بھی تو ہوتی ہے۔ آپ کوئی عام نہیں ہو...... آپ ایسٹرن ہو۔ آپ کے بے شمار پرستار ہیں۔ ان میں ہزاروں لڑکیاں بھی ہوں گی۔ مجھے بھی ان میں سے ایک سمجھیں۔ آپ کے ساتھ سمے گزارنا میرے لیے بڑے فخر کی بات ہوگی۔''
وہ بکواس کر رہی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں اس پر لعنت بھیجی میں جانتا تھا کہ وہ صرف وہی کر رہی ہے، جو اس کے آقاؤں نے اسے حکم دیا ہے۔ میرے لیے بھی ضروری تھا اپنے کردار کا بھرم رکھوں اور اسی طرح ایکٹ کروں جس طرح وقت کی ضرورت ہے۔ سراب کے بعد یہ دوسرا کڑا امتحان تھا۔ اس میں ناکام ہونے سے میری ساری پلاننگ ناکام ہوتی تھی اور میرے پیارے بدترین خطروں کی زد میں آتے تھے۔
شاردا کی اشتعال انگیز اداؤں کا ردِعمل ظاہر کرنا ضروری تھا۔ میں نے اسے جلتی نظروں سے دیکھا اور پھر اس پر جھپٹ پڑا۔ اب وہ میری مصنوعی بے قراریوں کے حصار میں تھی۔ اس کے گلے کی مالا بکھر گئی، چوڑیاں ٹوٹ گئیں، میں نے اسے اپنے قریب تر کر لیا لیکن یہ سب کچھ ایسے ہی تھا جیسے کوئی شخص سیر شکم ہونے کے باوجود غیر مرغوب کھانے کو گلے میں ٹھونسنے کی کوشش کرے اور میں اسے پوری طرح ٹھونسنا چاہتا بھی نہیں تھا، میں کئی سال سے کسی کی محبت میں مبتلا تھا...... اور اس تعلق کے سبب، میں ''محبت میں وحدت'' پر یقین رکھنے لگا تھا۔ مجھے گوارا نہیں تھا کہ اس محبت پر کسی کی شراکت کا جھوٹا سایہ بھی پڑے۔
اس صورتِ حال سے بچنے کے لیے میں نے ایک بار پھر اپنے زخمی انگوٹھے کو استعمال کیا۔ شاردا سے پُر جوش قربت کا مصنوعی کھیل کھیلتے ہوئے میرے ہاتھ اور بیڈ کے کراؤن کا زوردار تصادم ہوا۔ میں بری طرح کراہا اٹھا اور شاردا سے الگ ہو کر بیٹھ گیا۔
میرے انگوٹھے کا پلاستر ہاتھ کے قریباً نصف حصے پر محیط تھا۔ میں نے دوسرے ہاتھ

سے زخمی انگوٹھے کو تھام لیا۔ ''اوہ گاڈ، کیا ہوا؟ زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟'' شاردا اپنے بال
سمیٹتے ہوئے پریشان لہجے میں بولی۔

''کچھ..... زیادہ ہی آئی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ ہڈی پھر ہل گئی ہے۔''

''تو کیا..... ڈاکٹر کو بلانے کی ضرورت ہے؟'' وہ میرے تاثرات دیکھتے ہوئے
بولی۔

''پتا نہیں..... لیکن..... ابھی تھوڑی دیر دیکھتا ہوں، شاید درد کم ہو جائے۔'' میں نے
تکلیف میں ہونے کی کامیاب اداکاری کی۔

وہ رات جیسے تیسے گزر گئی اور وہ خوب صورت بلا بھی ٹل گئی۔ میرے انگوٹھے پر
''چوٹ'' لگنے کے بعد وہ آدھ پون گھنٹا ہی میرے پاس رہی تھی۔ میں نے دو پین کلر گولیاں
کھا کر اسے روانہ کر دیا تھا۔ انگوٹھے میں سچ مچ ہلکا ہلکا درد بھی شروع ہو گیا تھا۔ پین کلرز سے
افاقہ ہوا اور میں کل پیش آنے والے ممکنہ معاملات کے بارے میں سوچتے سوچتے سو گیا۔

اگلا روز کافی ہنگامہ خیز ثابت ہوا۔ وہی کچھ ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ ہانا وانی کو یقین تھ
کہ میں اس کے ٹرانس میں آ چکا ہوں..... اور میرے ٹرانس میں آنے کے بعد وہ مجھ سے جو
پہلا کام لینا چاہتی تھی وہ یہی تھا کہ وہ میرے ذریعے میرے ساتھیوں تک پہنچ جائے..... فخر
تو یہ کام نہیں کر سکا تھا کیونکہ وہ واقعی ''راوی فارم'' کا راستہ بھول چکا تھا لیکن اب یہی
بھلکڑ پن میرے کام بھی آ سکتا تھا۔ (ویسے بھی راوی فارم کا راستہ اتنا آسان نہیں تھا)

صبح نو بجے کے لگ بھگ مجھے اس وسیع و عریض عمارت سے نکالا گیا۔ میرے ذہن
میں خدشہ تھا کہ شاید میری آنکھوں پر پٹی باندھی جائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ مجھے ایک عا
سی اسٹیشن وین میں بٹھایا گیا۔ اس پر لاہور کا نمبر تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ میں لاہور کے آس
پاس ہی کہیں موجود ہوں۔ عمارت باہر سے اتنی شاندار نہیں تھی جتنی اندر سے تھی۔ پاپولر
سنبل اور سرو کے اونچے درختوں سے گھرا ہوا یہ ایک پرانی طرز کا مینشن دکھائی دیتا تھا۔ ک
جگہ سے پلاستر اور رنگ روغن اکھڑا ہوا تھا۔ عمارت کے آگے وسیع و عریض لان تھا جس می
ہر طرح کے پودے موجود تھے۔ اسٹیشن وین میں میرے ساتھ گہری سیاہ رنگت والا ایک
بدمعاش صورت شخص موجود تھا۔ یہ ایک مقامی تھا۔ جیسا کہ بعد میں اندازہ ہوا کہ اردگرد کے
علاقے کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کا نام جمال تھا اور اس کے ساتھی اسے جمالا بھا
کہتے تھے۔ اس کے ایک کان میں سونے کی چھوٹی سی بالی تھی اور چہرے پر پرانے زخمو
کے کئی نشان تھے۔ اس کے ساتھی بھی شکلوں اور حلیوں سے مقامی گرگے ہی لگتے تھے۔ ا

کی تعداد تین تھی اور ان میں سے ایک اسٹیشن وین کی ڈرائیونگ نشست پر بیٹھا تھا۔ وین عمارت سے نکلی تو میں نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ یہ بالکل مضافاتی علاقہ تھا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ میں واہگہ سائڈ سے بہت زیادہ دور نہیں ہوں۔ اس کا مطلب تھا کہ لاہور بھی بیس پچیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہی ہوگا۔

''کس طرف جانا ہے جناب؟'' جمالے نے پنجابی لہجے کی اردو میں دریافت کیا۔

''راوی فارم۔'' میں نے گمبھیر لہجے میں جواب دیا۔

''ہم نے بھی یہ نام تہاڈے سے ہی سنا ہے۔ آپ رستہ بتاؤ گے تو ہم پہنچ جائیں گے۔''

''بارڈر کس سائڈ پر ہے۔'' میں نے جمالے سے پوچھا۔

اس نے پیچھے کی طرف چہرہ پھیر کر دور مشرقی افق کی طرف اشارہ کیا۔ ''کوئی بارہ کلومیٹر کا رستہ ہے۔ بڑی نہر ہمارے سجے پاسے ہے۔''

میں نے کچھ دیر سوچ بچار کے تاثرات دیئے پھر جمالے سے کہا۔ ''پہلے نہر کی طرف چلو، وہاں پہنچ کر شاید کچھ اندازہ ہو جائے۔''

چھوٹی نال کی بھری ہوئی روسی رائفل میری گود میں رکھی تھی۔ میرا بریٹا پسٹل بھی مجھے واپس کر دیا گیا تھا۔ وہ میں نے قمیص کے نیچے لگا لیا تھا۔

اسٹیشن وین وہاں سے روانہ ہوگئی۔ یہ ایک سرد دن تھا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی مگر تمازت بہت کم تھی۔ کل ہاناوانی نے مجھے جو سجیشنز دی تھیں، ان کے مطابق تو داؤد بھاؤ، سجاول اور قسطینا وغیرہ میرے بدترین دشمن تھے اور مجھے پہلی فرصت میں انہیں مار ڈالنا تھا اور میرے یہ دشمن اس وقت کہیں اور نہیں راوی فارم میں ہی پائے جاتے تھے۔ میرا راوی فارم کی طرف جانا عین ہاناوانی کی مرضی کے مطابق تھا۔

آدھے گھنٹے میں ایک نیم پختہ راستے پر قریباً پانچ کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے ہم ایک نالے کے چھوٹے سے پل پر پہنچ گئے۔ یہ پل میں نے پہلے بھی دیکھا ہوا تھا اگر ہم اس نالے کے ساتھ ساتھ قریباً چھ کلومیٹر سفر طے کرتے تو اس راستے پر پہنچ جاتے جو آگے جا کر راوی فارم پہنچنے والی نیم پختہ سڑک سے اٹیچ ہوتا تھا۔ اگر میں واقعی ہاناوانی کے ٹرانس میں ہوتا تو شاید ایک گھنٹے سے بھی تھوڑے وقت میں راوی فارم پہنچ جاتا...... لیکن میں ٹرانس میں نہیں تھا اور یہی وجہ تھی کہ میں نے راوی فارم بھی نہیں پہنچنا تھا۔

مجھے سوچ میں دیکھ کر جمالا گہری نظروں سے پرکھنے لگا...... پھر مؤدب انداز میں

بولا۔ ''کیا سوچ رہے ہو جی؟''

میں نے کہا۔ ''یہ پل تو دیکھا ہوا ہے...... لیکن...... یہ سمجھ میں نہیں آرہا کہ...... یہاں سے دائیں مڑنا ہے یا بائیں......''

جمالے نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آسے پاسے نظر دوڑاؤ جی۔ اگر پل نظر آ گیا ہے تو کوئی اور نشانی بھی سمجھ وچ آ جائے گی۔''

میں نے تھوڑی دیر ''غور و فکر'' کے بعد ان لوگوں کو دائیں رخ پر ڈال دیا۔ اس رخ پر چل کر ہم راوی فارم پر نہیں پہنچ سکتے تھے...... ہاں پہلوانوں کے شہر گوجرانوالہ پہنچ جاتے تو اور بات تھی۔

کم و بیش دو گھنٹے تک میں نے جمالے اور اس کے ساتھیوں کو خوب اِدھر اُدھر خوار کیا...... اور انہیں یہی باور کرایا کہ میں بھی فخر کی طرح راوی فارم کا راستہ ڈھونڈ نہیں پا رہا۔ جمال عرف جمالا اسٹیشن وین سے دور چلا گیا اور ایک کھیت کے کنارے کھڑا ہو کر موبائل فون پر بات کرنے لگا۔ اس کی آواز مجھ تک نہیں پہنچ رہی تھی مگر اندازہ یہی ہو رہا تھا کہ وہ کسی ایسے شخص سے بات کر رہا ہے جو اس کی گلابی اردو کا ترجمہ کر کے ہاناوانی تک پہنچا سکے۔ وہ اسے یہ ''بدخبری'' سنا رہا تھا کہ راوی فارم ابھی تک گمشدہ ہے۔

میرا ذہن بھی مسلسل مختلف سوچوں میں الجھا ہوا تھا۔ میں ہر صورت ہاناوانی کو یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ میں اس کے ٹرانس میں ہوں اور اس حوالے سے کوئی رسک لینا نہیں چاہتا تھا۔ ایسا سوچتے ہوئے میرے ذہن میں یہ بات بھی آئی تھی کہ کیوں ناں جمالے وغیرہ کو راوی فارم تک لے ہی جاؤں۔ اس سوچ کے پیچھے ایک اور سوچ کارفرما تھی۔ اور وہ یہ کہ عین ممکن ہے، داؤد بھاؤ نے خطرے کے پیش نظر راوی فارم خالی کر دیا ہو...... لیکن یہ بس ایک سوچ تھی۔ اتنا بڑا خطرہ مول لینا میرے لیے ممکن نہیں تھا......

جمالے اور اس کے ساتھیوں کو مختلف دیہی علاقوں کی ''ان چاہی'' سیر کرانے کے بعد میں انہیں اسی وسیع و عریض مینشن میں واپس لے آیا جہاں ہاناوانی اور اس کے ملائیشین ساتھی اپنے خطرناک ترین ارادوں کے ساتھ موجود تھے۔

شام کے بعد شاردا ایک بار پھر اٹھلاتی ہوئی میرے کمرے میں پہنچی۔ آج وہ ساڑھی میں تھی اور بال کھلے چھوڑ رکھے تھے۔ میرے ہاتھ کا حال احوال پوچھنے کے بعد بولی۔ ''آج ہم سب کے لیے ایک زبردست تفریح فراہم ہونے والی ہے۔ آپ کا مقابلہ آپ کے ایک پرانے دوست سے ہونے والا ہے جو اب دشمن کی شکل اختیار کر چکا ہے۔''

''کیا کہنا چاہ رہی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''فخر نے آپ کے ساتھ یار مار کا کردار ادا کیا ہے۔ آپ کی محبت پر ڈاکا ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ آج آپ اس سے بدلہ لے سکیں گے۔ ہاناوانی کے حکم کے مطابق آپ دونوں میں آج رات دست بدست لڑائی ہوگی۔ ہاناوانی بھی اس لڑائی کو کلوز سرکٹ ٹی وی کے ذریعے دیکھیں گی۔''

''لیکن...... یہ تو سراسر ناانصافی ہے۔'' میں نے بھنا کر کہا۔ ''وہ حرام زادہ فخری کوئی معمولی فائٹر نہیں ہے۔ وہ مجھے کسی بھی وقت ناکوں چنے چبوا سکتا ہے۔ خاص طور سے اس صورتِ حال میں کہ میرا انگوٹھا بھی سخت زخمی ہے۔''

''ہاناوانی بھی یہ سب جانتی ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ انہوں نے اس لڑائی کو بیلنس کرنے کا بھی کوئی نہ کوئی انتظام کر رکھا ہے۔''

''پتا نہیں، تم کیا کہہ رہی ہو؟''

''میری جانکاری کے مطابق آپ کو زیادہ سے انتظار کرنا نہیں پڑے گا۔ ابھی تھوڑی ہی دیر میں آپ کو بڑے ہال کمرے میں بلا لیا جائے گا۔'' شاردا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

میرے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ ہاناوانی اپنے اسی منحوس منصوبے پر عمل پیرا ہے۔ اپنی قسم کے مطابق وہ ہم سب کو ہمارے ہی ذریعے ایک دوسرے سے مروانے کی تمنا رکھتی ہے۔

○......❖......○

شاردا نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ کم و بیش ڈیڑھ گھنٹے بعد میں اسی ہال کمرے میں موجود تھا جہاں ہاناوانی نے مجھے اپنے مہلک ٹرانس میں لینے کی کوشش کی تھی اور میں نے خود کو درد کے دریا میں ڈبو کر اپنے ذہن کو اس کے حوالے نہیں ہونے دیا تھا...... ہاں یہ وہی بلند و بالا چھت والا پُراسرار ہال تھا جس میں دھیمی اور تیز روشنیوں کے سائے ایک جادوئی ماحول پیدا کرتے تھے۔ کل جس وقت مجھے ہپناٹائز کیا گیا، اس ہال میں کچھ جانور بھی موجود تھے لیکن آج چھت پر جھولتی چمگادڑوں کی جھالر کے سوا اور کچھ نہیں تھا...... ہاناوانی بھی نہیں تھی اور نہ ہی اس کی زرنگار کرسی تھی۔ ایک بہت بڑی اسپاٹ لائٹ قریباً بیس فٹ قطر کے فرش کو روشن کر رہی تھی۔ میں اس روشن دائرے کے اندر پہنچا تو چند ہی سیکنڈ بعد فخر بھی میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔ وہ اس لباس میں نہیں تھا جس لباس میں چند روز پہلے ٹیوب ویل کے کمرے

میں میرے سامنے آیا تھا اور مجھے گن پوائنٹ پر رکھ لیا تھا۔ اب وہ نیلی جین اور ہاف سلیو شرٹ میں تھا جس میں سے اس کے بازوؤں کی توانا مچھلیاں جھلک دکھاتی تھیں۔ وہ دوست تھا لیکن ہاناوانی کا شکار ہو کر جانی دشمن بن چکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے قہر کی بجلی چمک رہی تھی۔ میں نے بھی اسے قہرناک نظروں سے دیکھا اور اس سے لڑنے کے لیے تیار دکھائی دینے لگا۔

ہمارے اردگرد مسلح ملائیشین اور مقامی گارڈز تھے۔ گرے فورس کی وہی لڑکی آگے بڑھی جس کے جسم پر کیپٹن کی وردی نظر آتی تھی۔ اس نے ایک چھوٹا آرمی ڈیگر ایک لاسٹک بینڈ کے ساتھ میرے پنڈلی سے منسلک کر دیا۔ میں نے فخر کی طرف دیکھا۔ اس کی پنڈلی کے ساتھ کوئی تیز دھار آلہ منسلک نہیں تھا۔ اس کے پاس اور بھی کسی طرح کا ہتھیار دکھائی نہیں دیتا تھا۔

میں نے سوالیہ نظروں سے گرے فورس کی آفیسر کی طرف دیکھا۔ وہ شستہ انگلش میں بولی۔ ''تم زخمی ہو ایسٹرن، اور تمہارا حریف زخمی نہیں ہے۔ ہاناوانی کے حکم پر اس لڑائی کو متوازن کیا گیا ہے۔''

میں نے دل ہی دل میں اس آفیسر لڑکی اور ہاناوانی کو ایک موٹی گالی دی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ ہاناوانی کیا چاہتی ہے۔ وہ ہم سب کو مارنا چاہتی تھی لیکن آج رات اس لڑائی میں وہ فخر کے مقابلے میں مجھے شاید زندہ رکھنا چاہتی تھی۔ ظاہر ہے کہ سجاول، داؤد اور قسطینا جیسے پیارے ساتھیوں کو جب میں اپنے ہاتھوں سے مارتا، تو ہاناوانی کو زیادہ شادمانی اور آسودگی محسوس ہوتی۔

فخر کو دیکھا تو میرا دل جیسے کٹ کر رہ گیا۔ یہ وہ فخر تو ہرگز نہیں تھا جو کچھ روز پہلے کلر کہار سے آگے شمشان گھاٹ کے نواح میں ہم سے جدا ہوا تھا۔ میرے کندھے سے کندھا ملا کر ہر خطرے کے سامنے ڈٹ جانے والا۔ میرے پسینے پر اپنا خون گرانے والا۔ یہ تو کوئی اور تھا۔ میرے لیے اس کی آنکھوں میں ایک قاتل چمک لشکارے مار رہی تھی اور میں اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ ایک آسان حریف نہیں ہے۔ وہ ایک چنگھاڑ کے ساتھ مجھ پر حملہ آور ہوا۔ ہم دست و گریباں ہو گئے۔ وہ ایم ایم اے کے ان سارے داؤ پیچ سے واقف تھا جو مجھے آتے تھے...... بلکہ اکثر موقعوں پر ہم نے اکٹھے ہی اکتساب فن کیا تھا اور سخت ٹریننگ کے مراحل سے گزرے تھے۔ وہ پے در پے وار کرنے لگا اور میں ان کا توڑ کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اس کے کئی زوردار پنچ میرے چہرے پر لگے۔ میں نے بھی پاؤں کی ایک

سخت ضرب اس کے سینے پر سامنے کی طرف لگائی پھر ہم گتھم گتھا ہو گئے۔ کسی موہوم امید کے سہارے میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ ''فخر، ہوش کرو۔ میں دشمن نہیں، دوست ہوں، میں شاہ زیب ہوں...... میں تمہارا ایسٹرن ہوں؟''

وہ پھنکارا۔ ''مجھے بھی پتا ہے تم کیا ہو اور میں آج اسی جگہ تمہاری گردن توڑ کر تمہارے سینے پر ناچنا چاہتا ہوں۔''

تین چار منٹ تک ہمارے درمیان زوردار کشمکش ہوئی۔ ہال میں مسلح گارڈز کے سوا اور کوئی نہیں تھا تاہم یقینی بات تھی کہ کلوز سرکٹ ٹی وی کے ذریعے یہ مناظر اور بھی کئی لوگ دیکھ رہے ہیں۔ عین ممکن تھا کہ ان میں ہاناوانی بھی ہو۔ میں اپنے زخمی ہاتھ کو اس لڑائی سے دور رکھے ہوئے تھا مگر گاہے بگاہے اس ہاتھ کو بھی چھوٹی موٹی چوٹ پہنچ رہی تھی۔ اپنے ایکٹ کا بھرم رکھنے کے لیے میں موقع ملتے ہی وحشیانہ انداز میں فخر پر جھپٹ پڑتا تھا...... موقع پر موجود تماشائی اس خطرناک مقابلے سے یقیناً لطف اندوز ہو رہے تھے۔ بالآخر میں نے فوجی خنجر اپنی پنڈلی کے بینڈ میں سے کھینچ لیا۔

میں اپنے پیارے دوست کو اپنے ہاتھوں سے کیسے مار سکتا تھا۔ میں نے اسے موقع فراہم کیا کہ وہ خنجر مجھ سے چھین لے۔ یہ سب کچھ اتنے حقیقی انداز میں ہوا کہ کسی کو پلاننگ کا شائبہ تک نہیں ہوا ہو گا۔ پندرہ بیس سیکنڈ بعد لڑائی میں وہ اسٹیج آ گئی جب غضب ناک فخر میرے سینے پر چڑھا بیٹھا تھا، اس کے ہاتھ میں موجود خنجر کی دھار میری شہ رگ سے قریب تر ہو رہی تھی اور میں اس دھار کو خود سے دور رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ بچانے والے مجھے بچا لیں گے کیونکہ میرا مرنا ان کے ایجنڈے میں شامل نہیں تھا۔ ان کے ایجنڈے میں فخر کا مرنا تھا۔

اور پھر وہی کچھ ہوا...... جس وقت واقعی مجھے لگنے لگا کہ میری گردن آرمی ڈیگر کی دھار تلے آ جائے گی۔ کسی خفیہ اسپیکر سے ملائیشین زبان میں کچھ کہا گیا اور دو تین گارڈز نے لپک کر فخر کو دبوچ لیا اور مجھ سے علیحدہ کر دیا۔ وہ دہاڑ رہا تھا۔ ''ماردوں گا...... ٹکڑے کر دوں گا۔'' اس کی آنکھوں میں حیوانی چمک لشکارے مار رہی تھی۔

گارڈ نے اس کے ہاتھوں سے آرمی ڈیگر کھینچا اور اسے گھسیٹ کر مجھ سے فاصلے پر لے گئے۔ میں نے بھی خود کو بے حد مشتعل ظاہر کیا...... ایک گارڈ نے مجھے بھی کمر سے تھام رکھا تھا۔ میں نے فخر کو مخاطب کیا اور للکارا۔ ''اپنے ہاتھوں سے تیری جان لوں گا...... ایک ایک ہڈی کا سرمہ بناؤں گا۔ دیکھ لینا ایسا ہی کروں گا۔''

میری یہ ساری بڑھک بازی فقط اور فقط فخر کی جان بچانے کے لیے تھی۔ یقیناً ہاناوانی کو یہ بات بہت پسند ہوتی کہ میں ایک زوردار مقابلے میں فخر کو ایک بری موت کا تحفہ دوں لیکن کیا واقعی فخر میرے ساتھ کسی اگلی لڑائی کے لیے زندہ رہ پائے گا؟ اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

میرے زخمی انگوٹھے سے درد کی شدید ٹیسیں اٹھنا شروع ہو گئی تھیں۔ پلاستر کے نیچے سے انگوٹھے کی جانب تھوڑا سا خون بھی رسا تھا۔ ایک لحاظ سے تو یہ اچھا ہی تھا۔ اگر آج رات پھر وہ آفت جان شاردا میرے سر پر منڈلانے لگتی تو اسے دور رکھنے کے لیے یہ اچھا بہانہ موجود تھا۔

اگلے روز شام قریباً سات بجے کی بات ہے۔ میں ایک بار پھر ہاناوانی کے رُوبرو اسی ہال میں تھا۔ آج پھر ہاناوانی اسی طرح ایک ریشمی پردے کے عقب سے نمودار ہوئی جس طرح پہلے روز ہوئی تھی۔ اس کے کندھوں پر لمبی گردنوں اور گنجے سروں والے دو گدھ تھے۔ سیاہی مائل بجو اس کے عقب میں رینگتا چلا آ رہا تھا۔ غیر معمولی سائز کی سیاہ بلی مخملی چبوترے کے سامنے ساکت بیٹھی تھی۔

ہاناوانی کرسی پر براجمان ہونے لگی تو گدھ پھڑپھڑا کر چھت کی نیم تیرگی میں کہیں اوجھل ہو گئے۔ میں چبوترے کے عین سامنے اسی ڈارک براؤن کرسی پر بیٹھا تھا لیکن آج مجھے کرسی کے ساتھ باندھا نہیں گیا تھا۔ صرف اتنی احتیاط کی گئی تھی کہ ہاتھ پشت پر جکڑ دیئے گئے تھے۔ اردگرد موجود گارڈز بھی ایزی موڈ میں ہی دکھائی دیتے تھے۔ غالباً یہ تبدیلی اس لیے تھی کہ ان کی سوچ کے مطابق میں ہاناوانی کے ٹرانس میں تھا۔

ہاناوانی نے اپنی سیاہ عینک اتاری اور ایک بار پھر مجھ پر اپنا تنویمی عمل شروع کیا...... اس بار ہاناوانی کا انداز بالکل مختلف تھا۔

اس کے لہجے میں نرمی تھی اور آنکھوں سے نکلنے والی مقناطیسی لہروں کی شدت بھی وہ نہیں تھی جو میری نگاہوں کے سامنے سات رنگ کے بھنور کو ابھارتی تھی اور میں نہ چاہنے کے باوجود اس کی طرف کھنچتا چلا جاتا تھا۔ بس ایک سنسناہٹ سی ضرور محسوس ہو رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ ہاناوانی کی آواز میری سماعت کے راستے میرے جسم میں سرائیت کر رہی ہے اور رگ و پے میں ایک بے نام آمادگی جگا رہی ہے۔ اپنی قوتِ ارادی کے ذریعے اس آمادگی سے نمٹنا میرے لیے کچھ زیادہ مشکل ثابت نہیں ہو رہا تھا۔

وہ بولی۔ ''ایسٹرن! راستہ یاد کرو...... اس فارم کا راستہ یاد کرو جہاں وہ باسٹرڈ قسطینا

موجود ہے جو تمہاری محبوبہ کی جان لینے یہاں پہنچی ہے۔ وہ ہرن کے سینگ کے دستے والا خنجر اس کے سینے میں اتارنے کے لیے بے تاب ہے۔ اسے مارو ورنہ وہ تاجور کو مار ڈالے گی۔''

اس نے دوبار اپنے یہ جملے دہرائے۔ تب میں نے سوئے سوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''میں بے بس ہوں ہاناوانی...... میں کوشش کر رہا ہوں...... لیکن ابھی ٹھیک سے کچھ یاد نہیں آرہا...... بس ایک پل نظر آتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ جھاڑیاں ہیں اور اس سے آگے کھیت ہیں پھر ایک دیوار سی سامنے آجاتی ہے، میں اس کے پار نہیں دیکھ پاتا......''

ہاناوانی کچھ دیر اسی حوالے سے مجھے مختلف مشورے دیتی رہی، پھر میرے دماغ کو بند جان کر اس نے گفتگو کا رخ بدل دیا۔ وہ داؤد بھاؤ کی طرف آگئی...... اپنی پُراثر آواز میں بولی۔ ''چلو وہ باسٹرڈ قسطینا پھر سہی لیکن داؤد بھاؤ تو راوی فارم میں نہیں ہوتا۔ وہ تو کہیں اور ہوتا ہے اور تم بہت دفعہ لاہور میں اس کے ٹھکانے پر آجا چکے ہو۔''

''بالکل ہاناوانی، اس سوّر کے اڈے کا راستہ مجھے اپنے ہاتھ کی لکیروں کی طرح یاد ہے۔ میں ایک گھنٹے میں وہاں پہنچ سکتا ہوں بلکہ آپ مجھے اجازت دیں، میں وہاں پہنچنا چاہتا ہوں۔ اس نے میرے سر کا سودا کیا ہے۔ وہ آستین کے سانپ سے بڑھ کر زہریلا ہے۔ میں اس کا سر کچلنا چاہتا ہوں، ابھی کچلنا چاہتا ہوں۔''

''میں بھی چاہتی ہوں کہ یہ کام آج ہی ہو لیکن آج رات تمہیں ایک دوسرے دشمن کو بھی جہنم واصل کرنا ہوگا۔ وہ بھی تمہاری پہنچ میں ہے۔''

''آپ حکم کریں ہاناوانی۔''

''خورسنہ...... تم اس کے ٹھکانے سے اچھی طرح واقف ہو۔ وہاں اس کے شوہر نے زبردست پہرا بٹھا رکھا ہے لیکن تمہیں تو وہاں جانے سے کوئی نہیں روکے گا۔ تمہیں اس بدبخت کا سر کاٹنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہی؟''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں ہاناوانی...... وہ اور اس کا بچہ کل کا سورج نہیں دیکھ سکیں گے۔ لالہ موسیٰ کے اس گھر کی دیواروں پر ان کے خون کی پچکاریاں چلادوں گا۔''

''تو پھر نکلو یہاں سے اور پہلے جہنم واصل کرو اس غدار داؤد کو۔ تمہیں دکھانے کے لیے اس نے جو کرنسی نوٹ اس بونے بنارس کے گلے میں ٹھونسے تھے وہ خود اس کے گلے میں ٹھونسے جانے چاہئیں۔'' وہ سرسراتی آواز میں بولی (روشنیوں کا ایک جال سا میرے اردگرد بنا گیا تھا۔ یہ پُراسرار روشنیاں بھی دل ودماغ کو ماؤف کرنے کی صفت رکھتی تھیں)

''میں آج صبح سے پہلے پہلے داؤد بھاؤ اور خورسنہ کی سانسیں پی جاؤں گا۔'' میں نے ہیجانی لہجے میں کہا۔

''لیکن خود کو اب نارمل نہیں کرنا۔ ہر طرح سے نارمل نظر آؤ گے۔ اپنا لب و لہجہ اور اپنے تاثرات بالکل نارمل لوگوں والے رکھو گے۔ تم پوری طرح میرے اثر میں ہو لیکن تم ایسٹرن ہو۔''

''آپ کی ہر بات میرے دل و دماغ میں سما چکی ہے ہاناوانی۔ آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہو گی...... اور شکایت ہو بھی کیوں؟ یہ لوگ آپ سے زیادہ میرے دشمن ہیں۔ میری پیٹھ میں چھرے گھونپے ہیں انہوں نے۔''

''ویل سیڈ...... ویری نائس۔ اب میں اپنی ہدایات دہرا رہی ہوں۔ تم انہیں میرے ساتھ ساتھ دہراؤ گے۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ ایک بار پھر الف ب سے شروع ہو کر آخر تک گئی۔ آخر میں کہنے لگی۔ ''تم اپنا کام اچھی طرح جانتے ہو...... تم داؤد کو کہاں مارنا پسند کرو گے؟ اس کے اڈے پر یا اڈے سے باہر؟''

میں نے بلاتوقف جواب دیا۔ ''مادام! میں کوشش کروں گا کہ اسے اس کے ٹھکانے سے نکال کر مارا جائے۔ کیونکہ اگر میں اسے اس کے ٹھکانے پر ماروں گا تو پھر میرا اپنا دفاع مشکل ہو جائے گا۔''

''ٹھیک ہے، تم اپنے دفاع کو سب سے اہم رکھو گے۔ ابھی تمہیں اپنے اور بہت سے قرض اتارنے ہیں۔''

''میں ایسا ہی کروں گا مادام۔''

○......❖......○

اور یہ منظر تھا لاہور میں داؤد بھاؤ کے خفیہ ٹھکانے کا۔ رات کے قریباً نو بج چکے تھے۔ لاہور کی سڑکوں پر رش تھا...... روشنیوں کی جگمگاہٹ تھی۔ یہ داؤد بھاؤ کا وہی ٹھکانا تھا جہاں مجھے پاکستان میں آنے کے بعد پہلی بار پناہ ملی تھی...... اور میں داؤد بھاؤ کی مدد سے لالہ نظام جیسے دشمن کا قلع قمع کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔ داؤد بھاؤ کی کوئی بھی نوازش مجھے بھولی نہیں تھی...... اور آج میں اسے ''قتل'' کرنے کے لیے یہاں موجود تھا۔

میں ایک چھوٹی کورے گاڑی میں یہاں پہنچا تھا۔ میرے پاس بریٹا کے علاوہ ایک مشین پسٹل بھی تھا۔ اس کے علاوہ ایک دودھاری خنجر تھا جسے میں نے باقی دونوں ہتھیاروں

سمیت اپنی سیاہ جیکٹ میں اچھی طرح چھپا رکھا تھا۔ بھاؤ کا یہ ٹھکانا ایک بارونق علاقے میں تھا۔ اوپر ایک بہت بڑا اسنوکر کلب تھا اور زیر زمین وہ وسیع تہ خانے تھے جہاں قانون سے بھاگے ہوئے لوگوں کی پناہ گاہیں تھیں اور باکسنگ سمیت مار اماری کے مختلف مقابلے ہوتے تھے۔ میں اسنوکر کلب میں پہنچا تو مجھے یہاں کچھ ٹوٹ پھوٹ کے آثار دکھائی دیئے۔ چند کھڑکیوں کے شیشے بھی ندارد تھے۔ لگتا تھا کہ ایک آدھ دن پہلے یہاں کچھ مار اماری ہوئی ہے۔

میری حیثیت یہاں ایک جانے پہچانے شخص کی تھی۔ بھاؤ کے سارے گارڈز مجھے بخوبی پہچانتے تھے۔ مجھے بغیر تلاشی کے بیسمنٹ میں اترنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی کیونکہ یہاں پہنچتے ہی میں نے فون پر بھاؤ کو اپنی آمد کی اطلاع دے دی تھی۔

میں ہال کمرے میں پہنچا تو ''باکسنگ رِنگ'' میں حسبِ معمول باکسنگ جاری تھی۔ مجھے دیکھ کر یہ سلسلہ رک گیا۔ بھاؤ کے ایک دو بے تکلف ساتھیوں کی طرف سے مجھے آفر کی جانے لگی کہ میں Ring میں آؤں اور اپنے بے مثال ہنر کی چند جھلکیاں دکھاؤں...... لیکن جب یہ دیکھا گیا کہ میرے ہاتھ پر ''بے مثال چوٹ'' بھی لگی ہوئی ہے اور پلاسٹر چڑھا ہوا ہے تو مجھ پر زیادہ زور نہیں دیا گیا۔

جواں سال روبی کی موت کے بعد بھاؤ کچھ عرصہ اداس رہا تھا لیکن اب روبی کی جگہ ایک اور پری چہرہ لے چکی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر صوفے سے کھڑی ہوگئی اور سلام کیا۔ اس کے حلیے سے عیاں تھا کہ وہ کچھ دیر پہلے تک صوفے پر نہیں بلکہ بھاؤ کی آغوش میں تھی اور پینے پلانے میں اس کی مدد کر رہی تھی۔ (جب سے گینگ میں غداری والا معاملہ ہوا تھا، بھاؤ کافی پریشان دکھائی دیتا تھا)

میں اندر داخل ہوا تو بھاؤ نے زندگی میں پہلی بار مجھے ٹٹولنے والی گہری نظروں سے دیکھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ ایسے کیوں دیکھ رہا ہے۔ ہاناوانی کی پاکستان میں آمد اور انیق کی موت کے بعد ہم سب ہی جیسے ایک دوسرے کی نگاہوں میں مشکوک ہوگئے تھے۔ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کسی پر ہاناوانی کا داؤ نہ چل گیا ہو۔ خاص طور سے فی الوقت میرے حوالے سے بھاؤ کا شک تو سمجھ میں آتا تھا۔ میں راوی فارم والے ٹھکانے سے اشرف عرف اچھو کو ساتھ لے کر نکلا تھا تاکہ ''راستہ بھولے ہوئے فخر'' کو فارم پر لاسکوں مگر اسے واپس لانے کے بجائے میں خود اوجھل ہوگیا تھا اور اپنے پیچھے ہیڈ مالی (اشرف عرف اچھو) کی لاش چھوڑ گیا تھا۔ اب کئی روز بعد میں اچانک نمودار ہوا تھا اور سیدھا بھاؤ کے خفیہ ٹھکانے پر پہنچا تھا۔

میں نے پُرسکون انداز میں بھاؤ کی طرف دیکھا اور پھر میز کے نیچے ہاتھ لے جا کر وہ دو بٹن آف کر دیئے جو اس کمرے کے خفیہ ویڈیو اور آڈیو سسٹم سے منسلک تھے۔ بھاؤ بے حد چونکی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ بھاؤ جیسے شخص کے لیے یہ اندازہ لگانا ہرگز مشکل نہیں تھا کہ میری جیکٹ کے اندر فرشتۂ اجل کی یہاں آمد کنفرم کرنے کا کافی سامان موجود ہے۔

میں نے اس کے سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''بھاؤ! میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ آپ مجھے یوں شک بھری نظروں سے کیوں دیکھ رہے ہیں اور آپ کا شک کوئی ایسا غلط بھی نہیں ہے۔ میں آج کی رات کو آپ کی آخری رات بنانے کے لیے یہاں آیا ہوں۔ ہاناوانی مجھے اپنے ''ٹرانس'' میں لے چکی ہے۔''

کوئی اور ہوتا تو سرتاپا دہل جاتا لیکن بھاؤ آرام سے بیٹھا رہا۔ اس نے اپنے ہونٹ مضبوطی سے ایک دوسرے پر جما رکھے تھے اور عقابی نظروں سے میرا جائزہ لیتا جا رہا تھا۔ آخر گہری سانس لے کر بولا۔ ''ہاناوانی تمہیں اپنے ٹرانس میں لے چکی ہے لیکن تم اس کے ٹرانس میں آئے ہو یا نہیں؟''

''آپ کو کیا لگتا ہے؟''

''مجھے لگتا ہے...... بلکہ ہمیشہ سے لگتا ہے...... کہ تمہارے اندر کرشماتی صلاحیتیں موجود ہیں۔ شاید تم نے یہاں بھی کوئی کرشمہ دکھایا ہے۔''

''مجھے بھی لگتا ہے کہ...... آپ بندے کے اندر بہت گہرائی تک دیکھ سکتے ہیں۔''

میری بات پر وہ بڑے دھیمے انداز میں مسکرا دیا۔ ہم کچھ دیر تک معنی خیز خاموشی سے ایک دوجے کی طرف دیکھتے رہے۔ ہال کمرے کی طرف سے ''ہاؤ ہو'' کا بلند ہونے والا شور، دھیمی آواز میں اس کمرے تک پہنچ رہا تھا۔ وہاں مارشل آرٹ کی سرگرمیاں جاری تھیں۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''بھاؤ! میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ مجھے آج ہی رات آپ کو ختم کرنا ہے اور پھر لالہ موسیٰ پہنچ کر خورسنہ اور اس کے بچے کی جان بھی لینی ہے۔ ان دونوں کاموں کے لیے، ہاناوانی نے مجھے یہی آٹھ نو گھنٹے دیئے ہیں۔''

''تمہارے ہاتھ کے انگوٹھے کو کیا ہوا ہے؟''

''لمبی کہانی ہے بھاؤ! پھر بتاؤں گا۔ اس وقت تو ایک ایک منٹ قیمتی ہے۔''

''تو کیا چاہتے ہو؟''

میں نے موضوع پر آتے ہوئے کہا۔ ''پچھلے دنوں آپ نے بتایا تھا کہ آپ نے اپنا ایک ''ڈپلی کیٹ'' ڈھونڈ رکھا ہے۔ بوقتِ ضرورت وہ آپ کا روپ دھار کر نقل و حرکت کرتا ہے۔''

''ہاں...... کرسچن ہے۔ فرنینڈس نام ہے اس کا...... لیکن تم اس کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو؟'' بھاؤ کا لہجہ چونکا ہوا تھا۔

''میں لمبی چوڑی تمہید نہیں باندھ سکتا بھاؤ...... میرا سوال یہ ہے کہ کیا ہم اس بندے کی قربانی دے سکتے ہیں؟''

''یہ کیسی بات کہہ رہے ہو تم؟'' بھاؤ کے چوڑے چکلے چہرے پر سوچ اور تفکر کی گہری پرچھائیاں نظر آنے لگیں۔

''بھاؤ! میں ایک مشکل ترین آزمائش سے گزر رہا ہوں...... اور میری وجہ سے آپ سب بھی۔ میں بہت شرمندہ ہوں لیکن اس صورتِ حال سے نکلنے کا کوئی راستہ میری سمجھ میں نہیں آرہا۔ فخر پوری طرح ہاناوانی کے قبضے میں جا چکا ہے۔ وہ اپنی دانست میں مجھے بھی اپنے شکنجے میں لے چکی ہے۔ وہ میرے ذریعے راوی فارم تک پہنچنا چاہ رہی تھی، میں نے اس سلسلے میں تو اسے چکما دے دیا ہے لیکن آج رات اس کا یہ دوسرا حکم مجھے ہر صورت پورا کرنا ہے۔ میرا دماغ تو بند ہو رہا ہے۔ اگر آپ کی سمجھ میں کوئی حل آرہا ہے تو مجھے بتائیں لیکن یہ یاد رکھیں بھاؤ! وہ بہت چوکس اور غیر معمولی طور پر عیار عورت ہے۔''

داؤد بھاؤ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ وہ ساری صورتِ حال کو بڑی اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔ اس حوالے سے میرے اور اس کے درمیان دس پندرہ منٹ گفتگو ہوئی اور دیگر آپشنز پر بھی غور ہوا۔ اس گفتگو میں راوی فارم کی صورتِ حال پر بھی بات ہوئی۔ بھاؤ کی اس اطلاع پر میں نے گوناں گوں تسلی محسوس کی کہ میرے غائب ہو جانے کے بعد اس نے قسطینا، تہنب، سجاول اور پہلوان وغیرہ کو فارم ہاؤس سے نکال لیا ہے، اب وہ لاہور ہی کی ایک کوٹھی میں موجود ہیں۔ گفتگو کا رخ ایک بار پھر ہاناوانی کی طرف مڑ گیا۔ یہ بات تو بھاؤ بہت اچھی طرح جان گیا تھا کہ میں نے ٹرانس میں آجانے کے حوالے سے ہاناوانی کو چکما دے کر ایک بہت بڑا کام کیا ہے۔ اب میری یہ کامیابی ہم سب کو بہت سے شدید خطرات سے بچا سکتی ہے بلکہ ہاناوانی کی موت کا راستہ بھی ہموار کر سکتی ہے۔ میں نے اپنے ہاتھ کے زخمی ہونے کا احوال بھی بھاؤ کے گوش گزار کر دیا تھا) بھاؤ کو یہ سب کچھ بہت عجیب لگ رہا تھا۔ اس قسم کی سچویشن سے اس کا شاید ہی کبھی واسطہ پڑا ہو۔

ایک مرحلے پر وہ بولا۔''...... شاہ زیب! تم فرنیڈس والی بات تو کر رہے ہو مگر میرے ذہن میں دو باتیں آرہی ہیں۔ پہلی یہ کہ مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ دوسری یہ کہ......'' وہ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔ چند سیکنڈ بعد خود ہی سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولا۔''وہ

کوئی ہو بہو میرا ہم شکل تو نہیں ہے۔ بس یہ ہے کہ نقش ملتے ہیں اور ڈیل ڈول ملتا ہے۔ بالفرض اس کی لاش کسی چوراہے میں پڑی ملتی ہے تو بہت جلد، قانون نافذ کرنے والے، اس نتیجے پر پہنچ جائیں گے کہ یہ داؤد نہیں ہے۔''

''اس کا ایک حل ہے میرے پاس...... میں وہ بھی آپ کو بتاتا ہوں لیکن پہلے آپ یہ فیصلہ کرلیں کہ یہ قربانی دے سکتے ہیں یا نہیں؟''

داؤد بھاؤ کا چہرہ چٹان کی طرح سخت تھا۔ تاثرات سے کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔ میں نے کہا۔ ''بھاؤ! ہاناوانی ایک آفت کی طرح یہاں نازل ہوئی ہے...... اگر ہم کسی طرح اس کی شیطانیت سے بچ کر اسے جہنم واصل کرسکیں تو یہ ہماری بہت بڑی کامیابی ہوگی۔''

داؤد بھاؤ نے اپنی چوڑی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے کہا۔ ''شاہی! میں جانتا ہوں کہ کبھی کبھی کچھ فیصلے بے رحمی سے بھی کرنا پڑتے ہیں لیکن جس پر بے رحمی کی جارہی ہو، اس کا کوئی نمایاں قصور بھی تو ہو۔''

''بھاؤ، کبھی کبھی گناہ کہیں اور کیا جاتا ہے، سزا کہیں اور مل جاتی ہے۔ آپ نے ایک بار خود ہی تو بتایا تھا کہ اس فرنیڈس نے اپنے سوتیلے بھائی اس کی بیوی اور اس کی ماں کو گولیوں سے چھلنی کردیا تھا اور لاشیں جلا ڈالی تھیں۔''

بھاؤ کچھ دیر گم صم رہنے کے بعد بولا۔ ''شاہی! یہاں جتنے بھی ہیں وہ کوئی نہ کوئی جرم کر کے ہی تو پہنچے ہیں۔ اس لحاظ سے تو پھر میں بھی قتل کیے جانے کا حق دار ہوں۔''

بھاؤ کی بات میں وزن تھا۔ میں خاموش رہا۔ بھاؤ بھی خاموشی سے گلاس میں وہسکی انڈیلنے لگا۔ گھڑی کی سوئیاں حرکت میں تھیں۔ بھاؤ نے ایک دراز میں سے فرنیڈس نامی اس شخص کی تصویر نکالی۔ بھاؤ کی طرح وہ بھی خوب گورا چٹا تھا۔ شکل اور ڈیل ڈول بھی کافی حد تک ملتا تھا۔ بھاؤ نے کہا۔ ''اس چہرے کو دھوکے کے لیے تو استعمال کیا جاسکتا ہے..... لیکن اگر یہ شخص مرجاتا ہے اور پولیس والے یا دیگر لوگ اسے باریک بینی سے دیکھتے ہیں تو پھر اس کی شناخت کو میری شناخت سے الگ کرنا مشکل نہیں ہوگا۔''

میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''لیکن اس کا حل بھی تو ہوسکتا ہے بھاؤ۔ مشین پسٹل کا ایک بھرپور برسٹ اس کے چہرے کو کافی حد تک ''کیموفلاج'' کرسکتا ہے...... لیکن بات تو پھر وہیں آجاتی ہے...... آپ اس شخص کو کھونا چاہتے ہیں یا نہیں......''

اچانک کچھ آوازوں نے مجھے چونکا دیا۔ یہ کسی قریبی بند کمرے سے ابھری تھیں۔ میں ان چنگھاڑتی ہوئی مکروہ آوازوں کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ ان کا تعلق ٹیکساری گینگ کے

شیطانی ٹولے سے تھا۔ ''یہ ''شیطانی ٹولا'' یوں تو ختم ہو چکا تھا لیکن ایک آدھ ابلیس زادہ اور ان کا باس جان ڈیرک ابھی باقی تھے۔ میں نے حیران نظروں سے بھاؤ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ کون ہے؟''

''وہی شیطان ہے، جسے تم پکڑ کر راوی فارم پر لائے تھے۔''

''لیکن...... یہ یہاں کیسے پہنچ گیا؟''

''ہمارے خدشات سے کہیں زیادہ خبیث نکلا یہ...... لاک اپ کے اندر زبردست ڈراما کیا اس نے...... رات دو بجے پہریدار نے دیکھا تو یہ لاش کی صورت پڑا تھا۔ ناک، منہ سے خون نکل نکل کر فرش پر پھیلا ہوا تھا۔ پہریدار بدحواسی میں اندر چلا گیا۔ اس نے اس کی گردن توڑ دی اور باہر نکل آیا۔ پہلے اس نے اسٹور میں گھس کر اندھا دھند شراب پی، پھر فارم کے بڑے کچن میں گھس گیا۔ وہاں ایک ملازمہ اپنے بچے کا فیڈر دھو رہی تھی۔ اس بدبخت نے اسے وہیں کچن کے فرش پر ریپ کیا اور اس بے ہوش کو ایک واش روم میں لاک کر کے گیراج میں گھس گیا۔ وہاں میرے والی گاڑی بھی موجود تھی۔ پتا نہیں اس نے کس طرح اس کی ڈکی کھولی تھی...... حالانکہ اس میں سیکیورٹی الارم لگا ہوا تھا۔ یہ ڈکی میں گھس کر بیٹھ گیا۔ اسی رات چار بجے کے لگ بھگ مجھے لاہور واپس آنا تھا۔ میں یہاں پہنچا تو یہ باسٹرڈ بھی گاڑی کی ڈکی میں موجود تھا......''

داؤد بھاؤ بات ختم کر کے میری طرف دیکھنے لگا۔ بھاؤ کی آنکھوں میں ہلکی سی کھسیاہٹ بھی دکھائی دے رہی تھی۔ جیسے اسے افسوس ہو کہ وہ اتنا تجربہ کار ہونے کے باوجود اپنی کار میں کسی دشمن کی موجودگی سے بے خبر رہا۔

میں نے تاسف سے سر ہلایا۔ ''بھاؤ! میں نے لودھی اور اس کے ماتحت گارڈز سے کہا بھی تھا کہ یہ ایک خونی جانور ہے۔ اس کے قریب جانے سے بھی پرہیز کریں لیکن...... خیر چلو...... جو ہونا تھا ہو گیا، وہ عورت بچ گئی؟''

''عورت بھی کیا لڑکی سی تھی...... اس کے حواس ٹھیک کام نہیں کر رہے...... اسپتال میں ایڈمٹ ہے۔ یہاں تم نے اوپر اسنوکر کلب میں ٹوٹ پھوٹ کے آثار دیکھے ہی ہوں گے؟'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ بھاؤ بولا۔ ''یہ سب اسی حرام زادے کا کارنامہ ہے۔ ڈکی سے نکل کر یہ کلب میں گھس گیا۔ شکر ہے کہ کلب میں کھیلنے والے نہیں تھے۔ رات کے چار بجے تھے۔ اسنوکر کے ہال میں بس دو چار لائٹس ہی آن تھیں۔ یہاں ایک گاڑی کا ڈرائیور میز پر ہی کمبل اوڑھے سویا ہوا تھا۔ اس نے ڈرائیور کی جیب سے گاڑی کی چابی نکال

لی۔ جانے سے پہلے وہ شیطانی پر آمادہ تھا۔ اس نے ہال کمرے میں سوئی گیس کے وہ کنکشن کھول دیئے جو ہیٹرز وغیرہ کے لیے لگائے گئے تھے۔ حرامی یہاں آگ لگانا چاہتا تھا۔ خوش قسمتی ہماری کہ نیچے یہاں سی سی ٹی وی پر اسے دیکھ لیا گیا۔ گارڈز اوپر پہنچے اور انہوں نے اسے گھیر لیا۔ وہ آسانی سے پکڑا نہیں گیا۔ اچھا خاصا اودھم مچایا اس نے اور توڑ پھوڑ کی دو گارڈز زخمی بھی ہوئے......"

بات کرتے کرتے اچانک داؤد رک گیا۔ میں نے اس کی عقابی آنکھوں میں تیز چمک ابھرتے دیکھی۔ اس نے ہونٹ سکیڑے اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"کیا ہوا بھاؤ؟" میں نے پوچھا۔

بھاؤ نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں۔ اس نے کمرے کے اندر ہی چند قدم چہل قدمی کی پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "شاہی! ایک کام ہو سکتا ہے...... بالکل ہو سکتا ہے۔" اس کے لہجے میں سنسنی تھی۔

میں سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بھاؤ اسی لہجے میں کہنے لگا۔ "ٹیکساری گینگ کا یہ گنجا قاتل قد کاٹھ میں میرے جیسا ہی ہے اور ایک زبردست اتفاق اور بھی ہے...... ہاں زبردست اتفاق ہے......" بھاؤ نے خود ہی اثبات میں سر ہلایا اور پھر میری جانب دیکھ کر بولا۔ "میری طرح اس کے سامنے کے دو دانت بھی نقلی ہیں۔ کسی چوٹ کی وجہ سے ٹوٹ گئے ہوں گے......"

"آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔ آپ کی بات پوری طرح میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔"

"لیکن میری سمجھ میں آ رہی ہے...... سمجھو کہ......تمہارا کام ہو گیا، تقریباً ہو گیا۔"

بھاؤ نے مجھے ساتھ لیا اور تیزی سے اس کمرے میں پہنچا جہاں ٹیکساری کے اس شیطان زادے کو بڑی احتیاط سے مقفل کیا گیا تھا۔

○......❖......○

کم و بیش ایک گھنٹے بعد وہ پلان مکمل ہو چکا تھا جو بھاؤ نے میرے ساتھ مل کر بنایا تھا۔ ہم اسی کمرے میں تھے جہاں شیطان زادے کو مقفل کیا گیا تھا۔ وہ ہمارے سامنے تھا لیکن اس کی طرف سے ہمیں کوئی خطرہ نہیں تھا کیونکہ وہ فرش پر بے ہوش پڑا تھا۔ اسے وہسکی میں تیز اثر والی بے ہوشی کی دوا پلائی گئی تھی۔ یہ کوئی پون گھنٹا پہلے کی بات تھی۔ اب شیطان زادے کے جسم پر داؤد بھاؤ کا لباس نظر آ رہا تھا۔ اس کے گلے میں پلاٹینم کی وہ موٹی زنجیر

تھی جس میں تین چار قیمتی پتھر لگے ہوئے تھے۔ یہ بھاؤ کی پہچان تھی۔ بھاؤ کی تین قیمتی انگوٹھیاں بھی شیطان زادے کی انگلیوں میں دکھائی دے رہی تھیں۔ بھاؤ کی رسٹ واچ بھی اسے پہنائی جا چکی تھی۔ پروگرام کے مطابق شیطان زادے کو بھاؤ کی ہی ایک کیڈلک کار میں جل کر بھسم ہو جانا تھا۔ گاڑی میں چالیس پینتالیس لیٹر پیٹرول کے علاوہ وائٹ فاسفورس کی بھاری مقدار بھی رکھ دی گئی تھی۔ نہایت سرعت سے آگ پکڑنے والا یہ مادہ بڑا دھماکا تو پیدا نہیں کرتا مگر آگ کی شدت اور اس کا والیم بہت زیادہ ہوتا ہے۔

بھاؤ نے مجھے آخری ہدایات دیتے ہوئے کہا۔ ''تم اپنی کورے گاڑی پر نکلو گے، کیڈلک کو میرا اسینئر گارڈ مجید چلا کر لے جائے گا۔ ریموٹ کنٹرول بھی اسی کے پاس ہے۔ ہاؤسنگ سوسائٹی کی کسی خالی سڑک پر مجید کیڈلک کو ریموٹ کے ذریعے اڑا دے گا اور ریموٹ تمہیں دے دے گا تاکہ یہ ثبوت کے طور پر تمہارے پاس رہے۔''

''آپ کا کیا اندازہ ہے...... میرے منہ میں خاک...... آپ کی موت کی خبر کب تک آؤٹ ہو جائے گی؟''

''میرا نہیں خیال کہ اس میں آدھ گھنٹے سے زیادہ لگے گا۔ میری کیڈلک بڑی جلدی پہچان لی جائے گی۔ لاش تو ظاہر ہے جل کر بھسم ہو جائے گی مگر دیگر نشانیاں بہت سے پولیس والوں کے لیے بھی جانی پہچانی ہیں۔'' بھاؤ کا اشارہ پلاٹینم کی چین اور رسٹ واچ وغیرہ کی طرف تھا۔

میں نے وال کلاک کی طرف دیکھا، رات کے گیارہ بجنے والے تھے...... اور ہاناوانی کی منشا کے مطابق ابھی مجھے لالہ موسیٰ بھی پہنچنا تھا، خورسنہ اور اس کے بچے ذیشان کے لیے موت کا ''تحفہ'' لے کر۔ میں اس بارے میں بھی بھاؤ کو سب کچھ بتا چکا تھا۔

میں نے فرش پر بے حس و حرکت پڑے ڈیتھ اسکواڈ کے اس آخری چشم و چراغ کی طرف دیکھا۔ بے ہوشی کی حالت میں بھی اس کے کلین شیوڈ چہرے پر لعنت برس رہی تھی۔ بدنام زمانہ مجرم ''ایول'' کے نطفے سے جنم لینے والی یہ قاتل مشینیں تھیں۔ مجسم بدی و شیطانیت...... وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑا تھا اور جانتا نہیں تھا کہ اسی حالت میں اپنے آخری سفر پر روانہ ہونے والا ہے۔

دس منٹ بعد میں کورے گاڑی میں کیڈلک کے پیچھے پیچھے ایک نیم آباد ہاؤسنگ سوسائٹی میں داخل ہو رہا تھا۔ کیڈلک کو بھاؤ کا مجید نامی سینئر گارڈ ڈرائیو کر رہا تھا۔ ایک قدرے ویران سڑک پر اس نے گاڑی روک دی۔ میں بھی گاڑی کے عقب میں تیس

چالیس میٹر کے فاصلے پر رک گیا۔ مجید باہر نکلا اور میری گاڑی کی طرف آ گیا۔ محفوظ فاصلے پر پہنچ کر اس نے ریموٹ کنٹرول استعمال کیا۔ ایک دھماکا ہوا اور پلک جھپکتے میں کیڈلک آگ کا گولا بن گئی۔ شعلے تیس فٹ سے زیادہ بلند تک پہنچ رہے تھے۔

مجید لپک کر میری گاڑی میں آ بیٹھا۔ ہم فراٹے کے ساتھ وہاں سے آگے بڑھ گئے۔ ہم نے ہاؤس سوسائٹی کے سیکیورٹی گارڈز کو دیکھا جو ایک موٹر بائیک پر سوار تیزی سے آتش زدہ کیڈلک کی طرف لپک رہے تھے۔ چند ہی منٹوں میں یہاں کافی لوگ جمع ہونے والے تھے۔

مجید نے سفید رنگ کا ریموٹ کنٹرول مجھے تھما دیا اور بولا۔ ''شاہ زیب صاحب! ڈی این اے وغیرہ کا کیا بنے گا؟''

''ڈی این اے میچ کس سے کریں گے؟'' میں نے جواب دیا۔ ''تفتیش کرنے والوں کے پاس بھاؤ جی کا میچنگ سیمپل نہیں ہے اور نہ ملے گا۔''

مجید نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔

ہاؤسنگ سوسائٹی سے نکلنے کے بعد میں نے مقررہ جگہ پر مجید کو ڈراپ کر دیا اور پھر گاڑی کا رخ جی ٹی روڈ کی طرف موڑ دیا۔ اب مجھے لاہور سے نکل کر لالہ موسیٰ کی طرف روانہ ہونا تھا۔

......ڈرائیونگ کے دوران ہی میں نے ہاناوانی کے خاص نمبر پر کال ملائی۔ پہلے گرے فورس کی کیپٹن لڑکی کی آواز آئی، پھر ہاناوانی لائن پر آ گئی۔ ''کیا بنا ایسٹرن؟'' اس نے بھاری بھرکم آواز میں پوچھا۔

''پہلا کام ہو گیا مادام ہاناوانی! داؤد کو اس کے کیے کی سزا مل گئی۔ وہ گاڑی میں جل مرا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں خبر آپ کو مل جائے گی۔'' میں نے دبے دبے جوش سے کہا۔

''بلاسٹ کیا ہے؟''

''ایسا ہی کچھ ہوا ہے جی۔''

''ڈرائیونگ کر رہے ہو تم؟''

''جی مادام! یہ جی ٹی روڈ کہلاتی ہے۔ مجھے سیدھا اسی قصبے میں لے جائے گی جہاں خورسنہ رہ رہی ہے۔''

''او کے...... میں دوسری اچھی خبر کا بھی انتظار کر رہی ہوں۔''

رسمی کلمات کے بعد اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

''کورے کار'' گوجرانوالہ کی طرف فراٹے بھر رہی تھی۔ نومبر کی اس ٹھٹھری ہوئی شب میں اس مصروف شاہراہ پر معمول کا ٹریفک جاری تھا۔ یہی سڑک تھی جو آگے جا کر راولپنڈی اور اسلام آباد سے ملتی تھی۔ اسلام آباد جہاں تاجور رہتی تھی اور اس کا زہریلا خاوند رہتا تھا۔ وہ اس کا تمام تر زہریلا پن جھیل رہی تھی...... اور اس میں خوش تھی۔ پتا نہیں کیوں اب مجھے تاجور کے خیال سے ایک طرح کی الجھن ہونے لگتی تھی۔ میں سوچتا تھا کہ میں کیوں ''سوچتا'' ہوں اس کے بارے میں۔ اب میرے اور اس کے درمیان باقی رہ ہی کیا گیا ہے۔ اب آس کی ایسی کون سی ڈور ہے جس کو میں تھام کر بیٹھا رہوں۔ کار کے ریڈیو پر نغمہ گونج رہا تھا۔

اُڑتے اُڑتے آس کا پنچھی دور اُفق میں ڈوب گیا
روتے روتے بیٹھ گئی آواز کسی سودائی کی

میں نے ریڈیو بند کر کے خیالات کا رخ بدلا اور پھر اس شخص کے نمبر پر کال کی جس کو سجاول نے لالہ موسیٰ میں خورسنہ اور اس کے بچے ذیشان کی حفاظت کا ذمے دار بنا رکھا تھا۔ میرا مطلب فیض محمد سے ہے۔ کوٹلی والے ڈیرے پر قیام کے دوران میں، میں نے فیض محمد کو بڑی اچھی طرح پہچانا تھا۔ ادھیڑ عمری کے باوجود فیض محمد کی دانش مندی، ہمت اور ذمے داری میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ میں نے دوسری بار اس کا نمبر پریس کیا تو اس نے کال ریسیو کر لی۔ ''ہیلو۔'' اس کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔

''میں شاہ زیب بول رہا ہوں۔''

''میں نے پہچان لیا ہے، خیریت تو ہے؟''

''خیریت نہیں ہے۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔ ''میں لاہور سے لالہ موسیٰ پہنچ رہا ہوں، بیگم خورسنہ اور بچے کو قتل کرنے کے لیے۔''

چند لمحے سناٹا رہا پھر فیض محمد کی لرزاں آواز سنائی دی۔ ''تم کیا کہہ رہے ہو شاہ زیب؟''

میں نے سنجیدہ لہجہ اختیار کیا۔ ''میری بات دھیان سے سنو فیض محمد...... تمہارے قریب کوئی اور تو موجود نہیں؟''

''نہیں، میں اکیلا ہوں۔''

''کہاں ہو؟''

''جہاں سردار نے ڈیوٹی لگا رکھی ہے۔ بیگم صاحبہ اور بچے کی حفاظت کی۔'' اس نے کہا

پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''ہم نے بیگم صاحبہ کی رہائش کے ساتھ ہی دو گھر کرائے پر لے رکھے ہیں۔ ان کی چھتوں پر ہر وقت آٹھ دس ''ہتھیار بند'' بندے موجود رہتے ہیں۔ میں خود بیگم صاحبہ کے گھر کی چھت پر موجود رہتا ہوں، گھر کے بالکل سامنے جنرل اسٹور پر بھی اپنے ہی دو بندے ہوتے ہیں۔ چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی۔''

''لیکن اب بات چڑیا کی نہیں فیض محمد...... میں خود پر مارنے پہنچ رہا ہوں۔ تم یوں سمجھو کہ کسی نے میری ذمے داری لگائی ہے کہ میں آج رات خورسنہ اور اس کے بچے کو قتل کر دوں اور مجھے یہی ظاہر کرنا ہے کہ میں نے یہ ذمے داری پوری کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، وہ غور سے سن رہے ہوناں؟''

فیض محمد نے اثبات میں جواب دیا۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں گوجرانوالہ کے پاس ہوں۔ دو گھنٹے تک پہنچ جاؤں گا۔ ان ڈیڑھ دو گھنٹوں میں تمہیں دو کام کرنے ہیں۔ پہلا یہ کہ ابھی اسی وقت بیگم خورسنہ اور ذیشان کو اس گھر سے نکال لو اور لالہ موسیٰ میں یا پھر کہیں بھی کسی محفوظ جگہ پر پہنچا دو۔ اس میں کوئی دشواری تو نہیں ہوگی؟''

''اگر یہ بہت ضروری ہے تو پھر میں کر لیتا ہوں۔''

''بہت بہت ضروری ہے اور یہ کام ابھی اسی وقت بہت رازداری سے ہونا چاہیے۔ دوسرا کام یہ ہے کہ گھر کے آس پاس تم نے جو مسلح بندے بٹھا رکھے ہیں انہیں بھی فوراً وہاں سے ہٹا لو، کرائے کے دونوں گھر خالی ہونے چاہئیں۔ خورسنہ والے گھر کو بھی لاک کر دو۔''

فیض محمد نے سنسناتی ہوئی سی آواز میں پوچھا۔ ''یہ وہی کالے علم والی عورت کا معاملہ تو نہیں؟''

''سمجھو وہی ہے، لیکن اس وقت اتنی مہلت نہیں کہ اس بارے میں تفصیل سے بات کر سکیں۔ ہمیں جو کرنا ہے بہت جلدی میں کرنا ہے۔''

فیض محمد کو کچھ ضروری ہدایات دے کر میں نے سلسلہ منقطع کرنے کا ارادہ کیا لیکن تبھی لائن پر کچھ کھسر پھسر سنائی دی۔ فیض محمد اپنے کسی ساتھی سے بات کر رہا تھا...... چند سیکنڈ بعد وہ مجھ سے مخاطب ہوا اور بولا۔ ''شاہ زیب! ابھی ایک اور خبر پہنچی ہے مجھ تک...... شاید تم تک پہنچی ہے یا نہیں؟''

''کون سی خبر؟''

فیض محمد نے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ ''ٹی وی پر داؤد بھاؤ کے بارے میں کچھ چل رہا ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ اسے قتل کر دیا گیا ہے۔ اس کی گاڑی میں دھماکا ہوا ہے۔''

میں نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ ''یہ تو واقعی بہت حیران کن ہے، اور کیا کہا جا رہا ہے؟''

''میں نے خود تو کچھ نہیں سنا۔ یہ دیدار شاہ ہی بتا رہا ہے۔ ابھی پوری طرح تصدیق تو نہیں ہوئی پر کہا یہی جا رہا ہے کہ مرنے والا لاہور کا داؤد بھاؤ ہی ہے۔''

''یہ بہت بری اور بہت بڑی خبر ہے...... چلو جو کچھ بھی ہے تھوڑی دیر میں سچ جھوٹ کا پتا چل جائے گا۔'' چند لمحے توقف کر کے میں نے فیض محمد سے کہا۔ ''تم اپنی ساری توجہ میرے بتائے ہوئے کام پر رکھو فیض محمد...... ذہن میں رہے کہ ہمارے پاس زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے ہیں۔''

فیض محمد سے بات ختم کرنے کے بعد میں نے ریڈیو آن کیا اور داؤد والی نیوز تلاش کرنے کی کوشش کی...... لیکن ابھی یہ خبر شاید ریڈیو والوں تک نہیں پہنچی تھی۔ میں نے ریڈیو آف کر دیا اور اپنے ذہن کو ایک بار پھر لالہ موسیٰ والے معاملے پر فوکس کیا۔ آج رات مجھے ہر صورت ہاناوانی کو مطمئن کرنا تھا۔ میں ایک مرحلے سے تو بخوبی گزر گیا تھا اب دوسرا مرحلہ درپیش تھا۔

میں سوچنے لگا کہ انسانی ذہن بھی کیا گورکھ دھندا ہے۔ ایک طرف اس میں تسلیم و رضا بھی ہے اور دوسری طرف ضد اور ہٹ دھرمی کے ایسے ایسے تماشے بھی دکھاتا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اب یہ ہاناوانی والا معاملہ ہی دیکھا جاتا۔ ہاناوانی کو خورسنہ اور ذیشان کے ٹھکانے کا علم تھا۔ اگر وہ چاہتی تو خود بھی خورسنہ اور ذیشان پر حملے کی ایک کارگر کوشش کر سکتی تھی۔ اس کے پاس گرے فورس کے خطرناک نشانے باز اور خونخوار قاتل موجود تھے...... لیکن وہ قسم کھائے بیٹھی تھی کہ وہ ہمیں نہیں مارے گی، ہم خود ہی ایک دوسرے کو اپنے ہاتھوں سے اذیت ناک موت دیں گے۔ اب تک وہ اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب تھی۔ تاہم آج رات جو کچھ ہو رہا تھا، وہ اس کی سابقہ کامیابیوں سے بہت مختلف تھا۔ اس کے پیچھے ایک وجہ تھی۔ چند دن پہلے میرے انگوٹھے کی ٹوٹ جانے والی ہڈی نے میرے اندر اذیت کا ایک دریا بہایا تھا اور اس دریا نے ہاناوانی کے مسمریزم کو شکست دی تھی۔ یہ اور بات تھی کہ وہ ابھی تک اس شکست سے بے خبر تھی۔

○......❖......○

لالہ موسیٰ پہنچنے سے آدھ گھنٹا پہلے میں نے فیض محمد کو دوبارہ فون کیا۔ اس نے فوراً ہی کال ریسیو کی اور مجھے بتایا کہ میری ہدایات پر عمل ہو چکا ہے۔ بیگم اور بچے کو رازداری کے ساتھ اس رہائش گاہ سے نکال لیا گیا ہے۔ اردگرد سے تمام بندے بھی ہٹائے جا چکے ہیں۔

میں نے فیض محمد سے کہا۔ ''میں پچیس تیس منٹ میں اس مکان پر پہنچ رہا ہوں جہاں خورسنہ اور بچہ رہائش رکھے ہوئے تھے۔ میں وہاں جو کچھ بھی کروں گا تم لوگوں نے اس سے بالکل لاتعلق رہنا ہے۔''

''کیا یہ سردار سجاول کا حکم ہے؟''

''تم اس وقت مجھے ہی سردار سمجھ لو تو تمہاری بہت مہربانی ہوگی۔'' میں نے خشک لہجے میں کہا۔

فیض محمد نے کہا۔ ''داؤد بھاؤ کے بارے میں بڑی خاص خبریں ہیں......''

میں نے کہا۔ ''ہاں، میں نے بھی سن لی ہیں۔ اس بارے میں پھر تبصرہ کرتے ہیں۔''

فیض سے بات ختم کرتے کرتے میں لالہ موسیٰ کی حدود میں داخل ہو چکا تھا۔ خوب صورت وخوش اخلاق لوگوں کا یہ بارونق قصبہ، رات کے اس آخری پہر خاموش اور غنودہ حالت میں تھا۔ بس کہیں کہیں، منہ اندھیرے کھل جانے والی ناشتے کی دکانوں پر ملازمین برتن وغیرہ دھوتے نظر آتے تھے یا دودھ فروشوں اور اخبار فروشوں کی نقل وحرکت دکھائی دیتی تھی۔ میں گنجان آبادی میں اترتا چلا گیا۔ چھوٹے سائز کی یہ کورے گاڑی مجھے پتلی گلیوں میں بھی آگے تک لے گئی۔ میں نے گاڑی کو گھمایا اور ایک نسبتاً کشادہ جگہ پر اس طرح کھڑا کر دیا کہ فوری واپسی میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے۔ میں گاڑی سے اترا۔ بریٹا اور مشین پسٹل دونوں میں نے اپنی چرمی جیکٹ میں رکھ لیے تھے۔ قریب ہی ایک مارکیٹ کے برآمدے میں ایک موٹا تازہ ملنگ بوسیدہ سا کمبل اوڑھے فرش پر سو رہا تھا۔ اس نے مجھے اپنی سرخ آنکھوں سے گھورا۔ اس کے گھورنے میں کوئی خاص بات تھی۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگا کہ یہ کوئی عام ملنگ یا فقیر نہیں ہے۔ عین ممکن تھا کہ یہ ہاناوانی کے چھوڑے ہوئے گماشتوں میں سے ہی کوئی ایک ہو۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے ہاناوانی، خورسنہ کی اس رہائش گاہ کے بارے میں جان چکی تھی۔

کسی قریبی مسجد سے فجر کی اذان بلند ہو رہی تھی۔ میں نیم تاریک گلی میں چلتا سیدھا خورسنہ اور سجاول کی رہائش گاہ پر پہنچ گیا۔ میں جانتا تھا کہ گھر خالی ہے اس کے باوجود میں نے دو چار بار ڈور بیل بجائی...... پھر بیرونی دیوار پھاند کر اندر داخل ہو گیا...... یہ دو بیڈ روم

والا سنگل اسٹوری گھر تھا۔ کھڑکیوں اور روشن دانوں پر غالباً حال ہی میں جالیاں وغیرہ لگائی گئی تھیں۔ ان جالیوں کا مقصد یقیناً اسی خطرے سے بچنا تھا جس نے کچھ عرصے سے ہم سب کو گھیر رکھا تھا۔ سحر زدہ پرندوں کا خطرہ۔ وہ آسمانی آفت کی طرح حملہ آور ہوتے تھے اور ہر شے کو تہس نہس کر دیتے تھے۔

میں نے اندرونی دروازے کھٹکھٹائے پھر ایک دروازے کو دھکیلتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ میں نے لائٹس آن کر دیں اور دہاڑا۔ ''کہاں ہو تم..... باہر نکلو...... میرے سامنے آؤ۔''

سامنے کون آتا وہاں کوئی تھا ہی نہیں۔ میں نے وحشیانہ انداز میں گھر کے اندر توڑ پھوڑ مچائی اور آس پاس کے گھروں میں کھٹ پٹ سنائی دینے لگی۔ مکین جاگ رہے تھے۔ میں نے ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے انتہائی اقدام اٹھایا۔ کچن میں جا کر ''اوون'' کے سارے ''برنر'' کھول دیئے، لاؤنج اور بیڈ روم میں ہیٹرز کی گیس بھی کھول دی۔ پھر عقبی صحن میں جا کر ماچس کی تیلی لاؤنج میں پھینکی، ایک زبردست پھنکار کے ساتھ شعلے بھڑک اٹھے۔ میں عقبی دیوار پھاند کر سڑک پر آ گیا۔ ایک شخص نے مجھے کودتے دیکھا۔

''اوئے کون ہے؟'' وہ ہراساں لہجے میں بولا۔

اس سے پہلے کہ وہ بلند آواز میں کسی کو مدد کے لیے پکارتا۔ میں نے اسے دبوچ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ کسرتی جسم والا نوجوان تھا۔ اس نے اڑنگا لگا کر مجھے گرانا چاہا لیکن یہ اس کے بس کی بات کہاں تھی۔ میں نے نپی تلی شدت کے ساتھ اس کا سر ایک پختہ دیوار سے ٹکرایا اور اسے انٹاغفیل کر دیا۔ اسے زمین پر ڈال کر میں تیزی سے کورے گاڑی کی طرف بڑھا۔ اس کے لیے مجھے تھوڑا سا چکر کاٹنا پڑا۔ اردگرد بھاگ دوڑ مچ گئی تھی۔ خورسنہ کی رہائش گاہ سے دھواں اور شعلے اٹھ رہے تھے۔ آگ ابھی اندرونی کمروں میں ہی تھی۔ اگر بروقت کارروائی ہو جاتی تو اس پر قابو پایا جا سکتا تھا۔

میں گاڑی تک پہنچا۔ اسے اسٹارٹ کیا اور وہاں سے نکل آیا۔ بڑی سڑک پر آیا تو کہیں دور فائر بریگیڈ کی گاڑی کا سائرن سنائی دے رہا تھا۔

...... لالہ موسیٰ سے آٹھ دس کلو میٹر آگے آنے کے بعد میں نے لب سڑک ایک ڈھابے پر گاڑی روکی۔ ابھی اندھیرا تھا۔ ڈھابے پر اکا دکا راج مزدور بیٹھے ناشتے کا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے کل دوپہر سے کہیں ٹک کر کھانا نہیں کھایا تھا۔ میں نے ڈھابے والے کو دودھ پتی کا آرڈر دیا اور ساتھ میں کچھ ڈبا بند بسکٹ منگوا لیے۔ پچھلے چند گھنٹوں

میں، میں نے داؤد بھاؤ اور فیض محمد وغیرہ کو جو فون کالز کی تھیں، وہ میں نے اپنے فون پر سے ڈیلیٹ کر دیں۔ اس کے بعد سب سے پہلے میں نے ہاناوانی کو کال ملائی۔ ''ہیلو ایسٹرن! کہاں ہو تم؟'' ہاناوانی نے پوچھا۔

''مادام! ابھی قصبے سے نکلا ہوں...... مگر یہ دوسرا مشن کامیاب نہیں ہو سکا۔ ویری سوری مادام...... وہ حرام زادی شاید ایک دو روز پہلے اس گھر سے نکل چکی ہے۔''

''اوہ، یہ تو برا ہوا۔'' پھر وہ ذرا توقف سے بولی۔ ''کچھ پتا چلا کہ کہاں گئی ہے؟''

''ہو سکتا ہے کہ وہیں راوی فارم میں اپنے خصم سجاول کے پاس پہنچ گئی ہو۔'' میں نے پُرتپش لہجے میں جواب دیا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہ کر بولی۔ ''چلو کوئی بات نہیں، کہاں تک بچے گی پھر کوشش کریں گے۔ اب تم واپس آ جاؤ۔''

''ٹھیک ہے مادام۔'' میں نے فرمانبرداری سے کہا۔ میں ہاناوانی کو بتانا چاہتا تھا کہ میں نے گھر کو آگ لگا دی ہے لیکن اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ ڈھابے پر چلنے والے ٹی وی کی آواز مسلسل میرے کانوں میں پڑ رہی تھی۔ جلد ہی وہ خبر بھی میری سماعت سے ٹکرا گئی جس کا میں انتظار کر رہا تھا۔ یہ اہم خبر داؤد بھاؤ کی ''ناگہانی موت'' کے بارے میں تھی۔ فوٹیج میں بار بار ہاؤسنگ سوسائٹی کی وہ سڑک دکھائی جا رہی تھی جہاں جلی ہوئی کیڈلک کا ڈھانچا پڑا تھا۔

فیلڈ رپورٹر کہہ رہا تھا۔ ''علاقہ مکینوں کا بھی یہی کہنا ہے کہ انہیں کوئی بڑا دھماکا سنائی نہیں دیا ہے لیکن گاڑی کی حالت سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں بدترین قسم کی آتشزدگی ہوئی ہے۔ غالباً گاڑی میں بڑی مقدار میں کوئی آتش گیر مادہ موجود تھا...... یا پھر رکھا گیا تھا۔ اسپتال ذرائع کے مطابق لاش کی حالت بھی بہت بری ہے۔ اس کے علاوہ......''

اسٹوڈیو میں بیٹھے نیوز کاسٹر نے رپورٹر کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔ ''اسپتال کے ذرائع شناخت کے بارے میں کیا کہتے ہیں، اس واقعے کو اب قریباً چھ گھنٹے گزر چکے ہیں۔ کیا لاش کو داؤد بھاؤ کی لاش کے طور پر شناخت کر لیا گیا ہے؟''

''بالکل جی، لاش کے ساتھ داؤد بھاؤ کی جو ذاتی اشیا موقع سے ملی ہیں، وہ ثابت کرتی ہیں کہ داؤد بھاؤ کو ان کی ذاتی گاڑی میں بلاسٹ کے ذریعے ہلاک کیا گیا ہے......''

''کیا اس واقعے کو کسی طرح کی گینگ وار کا حصہ سمجھا جائے؟'' نیوز کاسٹر نے پھلجڑی چھوڑی۔

"شاید اس کے بارے میں کچھ کہنا ابھی قبل از وقت ہو جی مگر یہ تو حقیقت ہے کہ ہمارے اردگرد کچھ عرصے سے غیر معمولی اور حیران کن واقعات رُونما ہو رہے ہیں۔ پہلے لاہور میں جناب دارج صاحب کی قیام گاہ پر چمگادڑوں کا حملہ ہوا۔ ابھی اس واقعے کی بازگشت ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ دارج صاحب کے قافلے پر حملہ اور پھر ان کی گمشدگی کا واقعہ ہو گیا۔ بیگم یاسمین صاحبہ کی موت ایسا واقعہ ہے جس نے ابھی تک لوگوں کے دلوں کو دہلا رکھا ہے۔ اب یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ہمارے درمیان کچھ نہایت خطرناک غیر ملکی موجود ہیں جو حالات خراب کر رہے ہیں اور جن کے سبب کچھ محیر العقول واقعات سامنے آ رہے ہیں۔"

ابھی گفتگو جاری تھی کہ ڈھابے کے ملازم لڑکے نے چینل تبدیل کر دیا اور اسکرین پر یوسف خاں اور مصطفیٰ قریشی کے پنجابی للکارے سنائی دینے لگے۔ میرا دھیان اب قسطینا اور سجاول وغیرہ کی طرف جا رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ ان کو فون کر کے حال احوال دریافت کروں اور ان سے ان کی صحیح لوکیشن بھی معلوم کروں۔ لیکن پھر میں نے یہ ارادہ ملتوی کر دیا۔ ابھی میں ہاناوانی کے گھیرے میں تھا۔ اس بات کا خدشہ ختم نہیں ہوا تھا کہ وہ کسی وقت مجھے مغلوب کر لے۔ ایسے میں مجھے اپنے ساتھیوں کی لوکیشن کا علم ہونا خطرے سے خالی نہیں تھا۔

اچانک میرے ذہن میں ایک نیا خیال آیا۔ میں جس ڈھابے پر موجود تھا، وہ اس سڑک سے زیادہ دور نہیں تھا جو سیدھی سکھیرا گاؤں کو جاتی تھی۔ بمشکل بیس پچیس منٹ کا راستہ ہو گا۔ پتا نہیں کیوں دل میں آئی کہ یہاں سے گزرتے ہوئے سیف کے گھر والوں کا حال احوال دریافت کرنا چاہیے۔ تاجور نے بھی تو اپنی آخری خواہش یہی بتائی تھی کہ میں سیف کی بے آسرا بہنوں کا خیال رکھوں، اگر سیف کے اہلِ خانہ خوش ہوں گے تو وہ بھی جہاں ہو گی آسودگی محسوس کرتی رہے گی۔

میں نے ہاناوانی سے اجازت طلب کرنے کے لیے اسے فون کرنا چاہا مگر اس کے ملائیشین پی اے نے بتایا کہ مدر مادام سونے کے لیے جا چکی ہیں۔ عام لوگوں کے لیے دن چڑھ رہا تھا اور شاید ہاناوانی کی رات شروع ہو رہی تھی۔

ہاناوانی سے تو رابطہ نہیں ہوا مگر میں سکھیرا گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔ کچھ دیر بعد میں اسی سڑک پر تھا جہاں سے ایک دفعہ تاجور کے ساتھ موٹر سائیکل پر گزرا تھا۔ وہ ساری یادیں ذہن میں تازہ ہو گئیں۔ میں اردگرد کے کھیتوں، کھلیانوں کو محویت سے دیکھتا ہوا جلد

ہی سکھیرا گاؤں کی حدود میں داخل ہو گیا۔ دن چڑھ چکا تھا مگر مطلع ابر آلود ہونے کی وجہ سے ابھی تک اندھیرا محسوس ہوتا تھا۔ کسی وقت ہلکی بوندا باندی بھی ہونے لگتی تھی۔ سکھیرا گاؤں کی گلیاں فی الحال سنسان ہی نظر آ رہی تھیں۔ پھر بھی احتیاطاً میں نے گرم چادر کو سر پر رکھ کر خواتین کے دوپٹے کی طرح لپیٹ لیا تھا۔ میری معلومات کے مطابق سیف کی بڑی بہن شازیہ کی شادی ہو چکی تھی اور اس کا شوہر اکبر آج کل ان کے گھر پر ہی رہ رہا تھا۔ مجھے امید تھی کہ میں اس نوبیاہتا، خوش و خرم جوڑے کو دیکھ سکوں گا۔ میں اس باغ کے قریب سے گزرا جہاں میں نے ایک دفعہ تاجور کو سہیلیوں کے ساتھ اداس موڈ میں بیٹھے دیکھا تھا۔ اس وقت آسیں، اُمیدیں شاید پوری طرح ٹوٹی نہیں تھیں پھر مجھے وہ احاطہ نظر آیا جہاں رنگ رنگیلے پنجابی گبرو سیف سے میرا پہلا ٹاکرا اور پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ دل رنج سے بھر گیا۔

دو منٹ بعد میں سیف کے گھر کے دروازے پر کھڑا دستک دے رہا تھا۔ میری توقع کے عین مطابق دروازہ کھولنے والی سیف کی بہن شازیہ ہی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر اور پہچان کر دنگ رہ گئی۔ ''وقاص...... مم...... میرا مطلب ہے شاہ زیب بھائی آپ؟'' اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں پٹ پٹا کر کہا۔

''السلام علیکم۔''

''وعلیکم السلام بھائی۔ مم...... مجھے یقین نہیں آ رہا۔''

''اب یہیں کھڑے سب کچھ پوچھو گی یا اندر آنے کے لیے بھی کہو گی۔''

وہ ذرا گڑبڑائی پھر بولی۔ ''آئیے ناں...... اندر آئیے ناں......''

میں اندر داخل ہوا اور اس نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ میں گاڑی کافی فاصلے پر درختوں کے بیچ کھڑی کر کے آیا تھا۔ تاکہ گاڑی دیکھ کر کسی کو شک نہ ہو۔

وہ مجھے کمرے میں لے آئی۔ دونوں چھوٹی بہنیں بھی جاگ گئیں اور میرے پاس آ بیٹھیں...... وہ مجھے چہکتی ہوئی چڑیوں کی طرح لگتی تھیں اور انہیں دیکھ کر سینے میں مشفقانہ جذبات کی رو سے چلنے لگتی تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ ان چڑیوں کی چہکار کہیں کھوئی ہوئی ہے۔ گھر کی حالت بھی کچھ زیادہ اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ حالانکہ میں نے پہلوان حشمت کے ذریعے خاصی بڑی رقم شازیہ کی شادی اور گھر کے اخراجات کے لیے بھجوائی تھی۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''شازیہ! اکبر کہاں ہے؟''

شازیہ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر خاموش رہ گئی۔ اس کی جگہ منجھلی بہن نے

کہا۔ ’’بھائی جان...... چچا اکبر گھر میں نہیں ہے...... وہ کافی دنوں سے نہیں ہے۔‘‘

’’کیا مطلب؟ کہیں کام سے گیا ہے؟‘‘

وہ سوالیہ نظروں سے بڑی بہن شازیہ کی طرف دیکھنے لگی، پھر ذرا حوصلہ کر کے بولی۔ ’’اکبر بھائی آج کل پتا نہیں کیا کرتا پھر رہا ہے۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔ وہ کوئی ایک مہینا پہلے گھر آیا تھا۔ تب بھی باجی سے جھگڑ کر گیا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ میں اپنے کاموں میں پھنسا ہوا ہوں اور ہم لوگوں کو اپنی ضرورتوں کے رونے پڑے رہتے ہیں......‘‘

’’پر وہ ہے کہاں؟‘‘ میں نے اپنا اندرونی طیش دباتے ہوئے پوچھا۔

’’لاہور کے پاس ہی کسی کے ساتھ مل کر کوئی کام شام کر رہا ہے۔‘‘ منجھلی بہن نے جواب دیا۔

’’کیا کام کر رہا ہے؟‘‘ میں نے دریافت کیا۔

شازیہ نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے چھوٹی بہن کو مخاطب کیا اور اس سے کہا کہ وہ میرے لیے چائے وغیرہ بنائے۔

دونوں چھوٹی بہنیں باہر چلی گئیں۔ شازیہ کی ناک کی چونچ سرخ ہو رہی تھی اور اندازہ ہوتا تھا کہ وہ آنسو روکنے کی بھرپور کوشش کر رہی ہے۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ’’شازیہ! کیا بات ہے، مجھے بتاؤ، مجھے یہاں کے حالات زیادہ اچھے نہیں لگ رہے۔ کہاں ہے اکبر؟ وہ تو کہتا تھا کہ جیسے ہی اس کے پاس پیسے آئیں گے وہ اپنا کام شروع کر دے گا۔ مشینیں وغیرہ تو پہلے ہی اس نے لی ہوئی ہیں۔ اب معقول رقم بھی آ گئی تھی کارخانہ چلانے کے لیے۔‘‘

وہ کچھ دیر خاموش رہ کر بولی۔ ’’کارخانے کا ہی سوچا تھا انہوں نے لیکن پھر پتا نہیں ایک دم کیا ہوا۔ ارادہ بدل دیا۔ کہنے لگے جو رقم شاہ زیب بھائی کی طرف سے ملی ہے، اس سے میں کوئی اور کام کروں گا۔ کوئی وکھری طرح کا کام۔ وہ کسی کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہ رہے تھے لاہور میں......‘‘

بات کرتے کرتے اچانک شازیہ کو ابکائی آئی اور وہ منہ ڈھانپ کر تیزی سے باہر نکل گئی۔ اسے قے ہو رہی تھی۔ میں نے دیکھا ایک طرف تپائی کے شکستہ شیشے پر دو تین دوائیں پڑی تھیں۔ اندازہ ہوا کہ شازیہ پریگنینٹ ہے۔

میں یہاں سیف کے اہلِ خانہ کو خوش و خرم دیکھنے کی امید لے کر آیا تھا مگر یہاں دکھ اور پریشانی کی پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔

کچھ دیر بعد ڈھلے ہوئے چہرے اور جھکے ہوئے سر کے ساتھ شازیہ دوبارہ کمرے میں آ گئی۔ وہ بڑی حد تک خوبرو سیف کی ہم شکل تھی مگر اس وقت مرجھایا ہوا پھول دکھائی دے رہی تھی۔ چھوٹی بہن اندر آئی اور چائے، بسکٹ، ابلے ہوئے انڈے وغیرہ رکھ کر خاموشی سے باہر چلی گئی۔ وہ بھی پہلے سے کافی کمزور نظر آتی تھی۔

میں نے سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ ”ہاں......تو کیا نیا کام کرنا چاہ رہا تھا اکبر؟“

وہ میری طرف دیکھے بغیر بولی۔ ”پتا نہیں کیا بات سمائی تھی ان کے دماغ میں۔ بڑے بڑے پنجرے بنوا رہے تھے۔ کہہ رہے تھے، میں نے پرندے وغیرہ پالنے ہیں۔ رنگ دار طوطوں کی بات کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ ان کی کچھ نسلیں بڑی مہنگی ہوتی ہیں، بڑی قیمت پڑتی ہے ان کی۔ بندہ دنوں میں امیر ہو جاتا ہے......“

طوطوں کے ذکر نے مجھے چونکایا۔ میں کچھ حیران سا شازیہ کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ میرے تاثرات دیکھے بغیر اپنی ہی رو میں بولتی چلی گئی۔ اس نے بھیگے بھیگے لہجے میں اگلے چار پانچ منٹ میں جو کچھ بتایا، اس سے پتا چلا کہ اکبر شادی کے بعد دو تین ہفتے تک بڑا خوش رہا۔ وہ کام شروع کرنے کے سلسلے میں بڑا پُرجوش تھا۔ شازیہ کے تایا کے اصرار پر وہ یہیں اس گھر میں آ گیا تھا اور شازیہ کی چھوٹی بہنوں کا اپنی بہنوں کی طرح خیال رکھ رہا تھا لیکن پھر ایک دم ہی سب کچھ بدلا بدلا نظر آنے لگا۔ وہ کارخانے کا کچھ سامان لینے کے لیے لاہور گیا اور دو تین دن واپس نہیں آیا۔ واپس آ کر اس نے بتایا کہ اسے ایک پرانا دوست ملا ہے، وہ ٹولنٹن مارکیٹ میں پرندے بیچنے کا کام کر رہا ہے، وہ اس کے ساتھ مل کر بڑے پیمانے پر پرندے پالنا چاہتا ہے۔ اس کی بات کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ نہ ہی یہ پتا چل رہا تھا کہ وہ ایک دم اتنا اکھڑ مزاج اور غصیلا کیوں ہو گیا ہے۔ یوں لگتا تھا کہ ایک دم اس نے کسی طرح کا نشہ شروع کر دیا ہے۔ جو رقم پہلوان حشمت کے ذریعے شازیہ وغیرہ تک پہنچی تھی وہ سب اس کے پاس ہی تھی۔ ایک دن اس نے شازیہ کو بتایا کہ اس نے رقم نکلوا لی ہے اور وہ لاہور جا رہا ہے...... تین چار روز میں واپس آ جائے گا...... مگر وہ واپس نہیں آیا۔ شازیہ کے تایا اور ایک ننھیالی عزیز نے اس کے پیچھے کافی بھاگ دوڑ کی تھی مگر اس کا کچھ پتا نہیں چلا تھا۔ اب شازیہ کے سسرال والے سارا الزام شازیہ پر دھر رہے تھے۔ وہ اسے منحوس قرار دے رہے تھے۔ شازیہ اور اس کی بہنوں پر دہرا عذاب ٹوٹا ہوا تھا۔ دوسری طرف کچھ لوگوں کا یہ بھی کہنا تھا کہ اکبر نے چونکہ پسند کی شادی کی ہے اس لیے اس کے گھر والوں میں سے کسی نے اس پر تعویذ وغیرہ کر ڈالے ہیں......

میں نے شازیہ کی پوری روداد سنی۔ میرے ذہن میں آندھی سی چل رہی تھی اور اس کی اصل وجہ یہی تھی کہ اس روداد میں پرندوں اور طوطوں کا ذکر آ رہا تھا...... یہ اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی کہ ہاناوانی ہر طرف وار کر رہی ہے...... کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ اکبر بھی کسی طور اس کی زد میں آ چکا ہو۔

قسطینا کے ایک بار کہے ہوئے الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے۔ ''شاہ زیب! اس خبیث نے قسم کھا رکھی ہے کہ یہ اپنے بیٹے کے قاتلوں کو خود نہیں مارے گی...... وہ خود ایک دوسرے کو ماریں گے۔''

جب سے یہ پرندوں کے حملے شروع ہوئے تھے، میں نے کئی بار سوچا تھا کہ اگر یہ ہپناٹائزڈ پرندے ہم میں سے کسی کی جان لے لیں تو پھر ہاناوانی کا عہد کیا ہوگا؟ اس کی یہ شرط تو ادھوری رہ جائے گی کہ ہم سب خود ایک دوسرے کی جان لیں گے۔ لیکن اب جس نئی صورتِ حال کا اشارہ مل رہا تھا، اس سے یہ قیاس بھی کیا جا سکتا تھا کہ یہ پرندے بھی دراصل ہمارے ہی ہیں۔ ہمارے پیسوں سے خریدے گئے ہیں...... ان کا تعلق اکبر سے ہے...... اور اکبر ہم ہی میں سے ایک تھا۔

دفعتاً ایک آواز نے مجھے بری طرح چونکایا۔ میں اس آواز کو بہ آسانی پہچان سکتا تھا، یہ تاجور کے چھوٹے بھائی اسفند کی آواز تھی۔ وہ ''آپی...... آپی'' کہہ کر بلا رہا تھا پھر اس کی آواز دروازے کے بالکل پاس سے آئی۔ وہ شازیہ کی چھوٹی بہن سے کہہ رہا تھا۔ ''آپی...... یہ چائے کی پتی۔ آپ نے ابھی منگوائی تھی ناں۔''

''اوہو، تم اتنی ٹھنڈ میں بھاگے ہوئے آئے ہو۔ وہ تو گزارا ہو گیا تھا۔'' شازیہ کی بہن نے جواب دیا۔

شازیہ نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ''اسفند سے ملنا چاہیں گے؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں۔'' میں نے مدھم آواز میں کہا۔ ''بلکہ دین محمد صاحب کے گھر میں کسی کو پتا نہیں چلنا چاہیے کہ میں یہاں آیا تھا۔'' میں نے تاکید کرنے والے انداز میں فقرہ مکمل کیا۔

شازیہ کی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو چمکنے لگے۔ وہ بولی۔ ''چاچا دین محمد اور چاچی کا بہت برا حال ہے۔ ان کو لگتا ہے کہ انہوں نے تاجور کا بیاہ نہیں کیا بلکہ اس کو دیس نکالے کی سزا دے دی ہے۔ وہ بہت اُچے لوگ ہیں۔ اب ان کا اصلی روپ سامنے آ گیا ہے۔ باجی تاجور کا شوہر چاچا، چاچی کی بہت بے عزتی کرتا ہے۔ ایک دفعہ اس کے بڑے بھائی نے

چاچے کو ٹھڈے تک مارے ہیں۔ وہ خود بیمار پڑا ہوا ہے لیکن پھر بھی اس کو ترس نہیں آتا، چاچا، چاچی کو باجی تاجور سے ملنے تک نہیں دیتا۔''

میں نے افسردہ لہجے میں کہا۔''شازیہ! چاچے دین محمد نے یہ بلا خود ہی تو اپنے گلے ڈالی ہے۔ تمہیں یاد ہی ہوگا، تاجور کے ماموں مولوی حبیب اللہ سمیت ہم سب نے کتنا زور لگایا تھا کہ وہ تاجور کا ہاتھ اس بڑے شخص کے ہاتھ میں نہ دیں لیکن وہ اپنی مرضی کر کے رہے تھے۔''

''اب بہت پچھتا رہے ہیں وہ۔ ہر وقت روتے رہتے ہیں۔ کچھ بیمار بھی ہیں۔ آپ کی بات بھی کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ حبیب اللہ کی طرح وہ بھی سچا تھا مگر میں نے اسے بے عزت کر کے گھر سے نکال دیا۔ اب وہ آپ سے بھی معافی مانگنا چاہتے ہیں۔''

میں نے کہا۔''شازیہ! ابھی ان سے ملنے کا وقت نہیں آیا لیکن میری بات یاد رکھنا، ابھی اس گاؤں میں کسی کو میری آمد کے بارے میں کچھ پتا نہیں چلنا چاہیے۔''

شازیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ میرا زخمی ہاتھ گرم چادر کے نیچے تھا۔ چادر سرکی تو اس پر شازیہ کی نظر پڑ گئی۔ وہ متفکر نظر آنے لگی۔''شاہ زیب بھائی! آپ کے ہاتھ کو کیا ہوا؟''

میں اسے کیا بتاتا کہ کیا ہوا؟ اور اگر میں بتا بھی دیتا تو کیا وہ یقین کر لیتی؟ کیا کوئی بھی یقین کر لیتا۔ یہ اکیسویں صدی تھی، یہ سائنس اور ٹیکنالوجی کا زمانہ تھا مگر یہاں میری آنکھوں کے سامنے ایسے واقعات رُونما ہو رہے تھے جن پر یقین کرنا بہت مشکل تھا۔ میرا دھیان ایک بار پھر شازیہ کے دولھے اکبر اور اس کی مصروفیات کی طرف چلا گیا۔ پرندوں والی بات نے میرے اندر ہلچل سی مچائی ہوئی تھی۔ میں اس حوالے سے کسی نتیجے تک پہنچنا چاہتا تھا۔ لاہور کے قریب مضافاتی علاقے میں بلند چھتوں والی جس عمارت کے اندر ہاناوانی فروکش تھی وہاں میں نے ایک دن رنگین طوطوں کے چہکاریں سنی تھیں۔ مجھے یوں محسوس ہوا تھا کہ وہ طوطے اپنے اسی مستقر سے پرواز کر کے خونریز کارروائی کرتے ہیں۔ اگر ان طوطوں کا تعلق واقعی اکبر سے تھا تو پھر عین ممکن تھا کہ اکبر بھی وہیں کہیں موجود ہو۔

میں نے جیکٹ کی جیب سے ہزار ہزار والے آٹھ دس نوٹ نکالے اور سامنے تپائی پر رکھ دیئے۔''شازیہ! اس سے گھر کا خرچا چلاؤ۔ بالکل بے فکر رہو۔ میں بڑی جلدی اکبر کا پتا چلاتا ہوں۔ تم دیکھنا چند روز میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

وہ سسک پڑی۔''نہیں بھائی! آپ نے پہلے ہی بہت کچھ کیا ہے، یہ تو ہماری قسمت کی خرابی ہے کہ......''

''بس اب چپ ہو جاؤ۔'' میں نے اسے پیار سے ڈانٹا۔ ''اگر میری جگہ سیف ہوتا تو کیا تم پھر بھی ایسی باتیں کرتیں؟''

تینوں بہنوں کو تسلی تشفی دے کر، میں جیسے خاموشی سے آیا تھا ویسے ہی واپس آ گیا۔

○......❖......○

اب میں ایک بار پھر بلند و بالا چھتوں اور اونچے دروازوں والی اسی عمارت میں تھا جہاں ہاناوانی اپنی حشر سامانیوں کے ساتھ موجود تھی مگر وہ اس عمارت میں کہاں تھی؟ اس بارے میں ابھی تک کوئی اندازہ نہیں ہو سکا تھا۔ وہ جیسے سات پردوں کے پیچھے چھپی رہتی تھی۔ شام سے ذرا پہلے ایک بار پھر پُراسرار روشنیوں والے اسی ہال میں میری طلبی ہوئی جہاں چھت پر بے شمار چمگادڑیں ایک طویل جھالر کی صورت میں لٹکی رہتی تھیں۔ سارا ماحول وہی تھا جو اس سے پہلے بھی میں کئی بار دیکھ چکا تھا۔ میرے ہاتھ بھی اسی طرح الٹی ہتھکڑی میں تھے جس طرح پہلے ہوتے تھے۔ وہ مجھے اپنے تئیں ٹرانس میں لے چکی تھی، اس کے باوجود میرے حوالے سے کوئی رسک لینے کو تیار نہیں تھی۔

میں ایک بار پھر اس کے سامنے کرسی پر بیٹھا تھا اور وہ مجھے غنودگی کی حالت میں لا کر کیشن دے رہی تھی۔ یہ ایک طرح سے میری تنویمی کیفیت کو ''ری نیو'' کرنے کا عمل تھا۔ اس عمل میں وہ پہلے جیسی شدت نہیں تھی جس میں ست رنگا بھنور میری نگاہوں کے سامنے آتا تھا اور اس کی ناقابلِ مزاحمت کشش مجھے اپنی طرف کھینچتی تھی۔

وہ پوچھ رہی تھی۔ ''داؤد بھاؤ کو مارنے سے پہلے تم نے اس سے راوی فارم کا بھولا ہوا راستہ نہیں پوچھا؟''

''سوری مادام! اس منحوس کی شکل دیکھ کر میرے حواس مختل ہو گئے تھے۔ میرا دھیان اس طرف گیا ہی نہیں...... لیکن......''

''لیکن کیا؟''

''راوی فارم کا نقشہ کچھ کچھ میری نگاہوں کے سامنے ابھر رہا ہے۔ مجھے لگا ہے کہ...... اگر ایک بار اور میں اس علاقے میں پہنچوں تو فارم کا راستہ ڈھونڈ لوں۔''

''اب اس کی ضرورت نہیں۔'' ہاناوانی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''ہم نے اسنوکر کلب سے بھاؤ کے ایک کارندے کو پکڑا تھا، اس نے راوی فارم تک پہنچا دیا ہے لیکن وہاں جانے کا اب فائدہ نہیں، قسطینا اور سجاول سمیت سب لوگوں کو کہیں اور پہنچا دیا گیا ہے۔''

''یہ تو اچھا نہیں ہوا۔'' میں نے ایک معمول کے غنودہ لہجے میں جواب دیا۔

''لیکن تمہیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمہارے لیے ایک اور اچھی خبر ہے۔ تمہارا ایک اور مکار دشمن اس وقت تمہارے اردگرد پایا جا رہا ہے۔ یہ کمینگی اور ہٹ دھرمی میں اپنی مثال آپ ہے۔ تم اسے بہت اچھی طرح جانتے ہو۔''

اس کے ساتھ ہی سامنے لگی اسکرین پر ایک تصویر ابھری۔ میں ہکا بکا رہ گیا۔ یہ تاجور کے والد چوہدری دین محمد کی تصویر تھی۔ وہ سفید پگڑی باندھے ایک ٹریکٹر کے قریب کھڑے تھے۔ ہاناوانی بولی۔ ''یہی وہ شخص ہے ایسٹرن! جس نے تمہاری محبوبہ کو ہمیشہ کے لیے تم سے دور کیا۔ یہ تمہارے اور تاجور کے ملاپ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ دولت اور اثر رسوخ کے لالچ میں اس نے تاجور کو ایک ایسے شخص کے ہاتھوں میں سونپ دیا جو اسے زرخرید لونڈی جتنی اہمیت بھی نہیں دیتا۔ تمہاری تاجور کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے اور جو کچھ آئندہ ہو گا، وہ اسی شخص کا سیاہ کارنامہ ہے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہی ایسٹرن؟''

''آپ..... ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ مادام۔'' میں نے اونگھتے ہوئے سے لہجے میں کہا۔

''اس بندے کو تو تمہاری ہٹ لسٹ میں سب سے اوپر ہونا چاہیے تھا۔ یہ باپ نہیں دشمن ہے..... بلکہ دشمن سے بھی بڑھ کر ایک سانپ..... جس نے اپنی ضد کا پھن پھیلایا اور تمہاری محبت کو ڈسا.....'' وہ سحر انگیز لہجے میں بڑی روانی سے بولتی چلی جا رہی تھی۔ ایک بار پھر، برین واشنگ کا وہی عمل ہو رہا تھا جس سے میرا واسطہ پہلے بھی اس طلسمی ماحول میں پڑ چکا تھا۔ میں اسی طرح کا مغلوب اور مطیع ردِعمل ظاہر کر رہا تھا جس طرح کا ہاناوانی مجھ سے چاہتی تھی۔

میرے ہاتھ پشت پر آہنی ہتھکڑی میں جکڑے ہوئے تھے اور میری دونوں جانب دو مسلح گارڈ موت کے فرشتوں کی طرح موجود تھے، ورنہ دل تو یہی چاہتا تھا کہ اسی جگہ اس عورت کے ٹکڑے کر دیئے جائیں۔

پندرہ بیس منٹ بعد میں پھر اپنے لگژری کمرے میں تھا۔ وہ جب بھی مجھے تنویمی عمل سے گزارتی تھی، میں اس عمل کے بعد دو ڈھائی گھنٹے تک خود کو حالت غنودگی میں ہی ظاہر کرتا تھا۔

میں اپنے بستر پر چت لیٹا تھا۔ ہیجان خیز لباس میں ملبوس دراز قد شاردا اپنے نرم ہاتھوں سے میری پیشانی دبا رہی تھی۔ خود کو اس حسین بلا سے دور رکھنے کے لیے اب ایک کارگر بہانہ میرے ہاتھوں میں آ چکا تھا۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ ایک عرصہ شراب نوشی سے دور رہا ہوں لیکن اب خود کو دوبارہ اس شغل کے لیے مجبور پاتا ہوں۔ معمولات میں اس

تبدیلی نے معدے میں کچھ اینٹھن پیدا کر رکھی ہے۔ رات کو یہ اینٹھن زیادہ ہو جاتی ہے جس کے لیے دوا لے رہا ہوں اور یہ بات کچھ ایسی غلط بھی نہیں تھی۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اس جنس زدہ عورت سے دور رہنے کے لیے میں اس معاملے کو بڑھا چڑھا کر بیان کر رہا تھا۔

وہ اپنی لانبی انگلیوں سے میری پیشانی کا مساج کرتی رہی اور میرے کانوں میں اپنی جدید طرز کی چوڑیوں کی کھن کھناہٹ پہنچاتی رہی اور میں اس کی قربت اور اس کی چوڑیوں کی کھن کھناہٹ سے ہزاروں میل دور اپنے ہی خیالوں سے نبرد آزما رہا۔ اب ہاناوانی مجھے ایک ایسی آزمائش میں ڈال رہی تھی جس سے گزرنا میرے لیے پل صراط پر چلنے سے زیادہ مشکل تھا۔ وہ مجھے ایک ایسے شخص کی جان لینے کے لیے کہہ رہی تھی جو تاجور کا والد تھا...... اس کے لیے محترم ترین ہستی...... اور یقیناً میرے لیے بھی چاچا دین محمد کی زندگی اور سلامتی کی بے حد اہمیت تھی۔ میں ایسا کیونکر کر سکتا تھا...... لیکن اگر نہ کرتا تو پھر وہ روپ عیاں ہوتا تھا جو میری زندگی اور میرے ساتھ بہت سی زندگیوں کا ضامن تھا۔ میں شدید ترین کشمکش سے دوچار تھا۔ بار بار یہ بات دل میں آ رہی تھی کہ کسی بہت بڑی مصیبت میں پڑنے سے پہلے پہلے میں کسی طرح اس عورت کا خاتمہ کر دوں۔

مگر کیسے؟

وہ میرے حوالے سے بے حد بے حد محتاط تھی۔

اگلے روز میں صبح سویرے اٹھا۔ میرے پہلو میں شاردا بے سدھ پڑی تھی۔ اسے اس کی بے ترتیب حالت میں چھوڑ کر میں نے سلیپر پہنے اور اپنے کمرے سے باہر نکل آیا۔ میرے کمرے سے باہر نکلنے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ میں دس پندرہ منٹ اس عمارت کی طویل راہداریوں میں گھومتا رہا اور اندازہ لگانے کی کوشش کرتا رہا کہ ہاناوانی اس وسیع عمارت کے کس حصے میں پائی جاتی ہو گی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ مختلف جگہوں پر مجھے کوئی ایک درجن مسلح گارڈز ملے۔ یہ سب کے سب جاما جی اور نیوسٹی کی گرے فورس کے خطرناک لوگ تھے۔

ایک جگہ گرے فورس کی کیپٹن فرزہ سے سامنا ہو گیا۔ اس نے کڑی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ایسٹرن! آپ کہاں گھوم رہے ہیں؟“

”جاننا چاہ رہا ہوں کہ قابل صد احترام مادام ہاناوانی اس عمارت میں کہاں قیام رکھتی ہیں؟“

”وہ یہاں نہیں ہوتیں۔ بس بوقت ضرورت تشریف لاتی ہیں۔“ کیپٹن نے ترت

جواب دیا۔ ''کیا آپ کو کوئی مسئلہ درپیش ہے؟''

''مسئلہ یہی ہے کہ میں ان کے آس پاس رہنا چاہتا ہوں۔''

''آپ ان کے آس پاس ہی ہیں۔'' کیپٹن نے جواب دیا۔ لہجے میں رکھائی تھی۔

وہ بالکل اٹین شین حالت میں کھڑی تھی۔ میں نے اس کے گال کو چھوتے ہوئے کہا۔

''آپ ذرا ''ریلیکسڈ'' ہو کر کھڑی ہوا کریں۔ اس طرح تھک جاتی ہوں گی۔''

اس کا چہرہ گل رنگ ہو گیا مگر اس نے جواب میں کوئی سخت لفظ نہیں کہا۔ ''میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں؟'' اس نے اسی طرح تن کر کھڑے، رسمی انداز میں پوچھا۔

''جو میں چاہتا ہوں وہ آپ کر نہیں سکتیں کیونکہ آپ اس وقت یونیفارم میں ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ آپ کے ساتھ کہیں بیٹھ کر لنچ کیا جائے۔''

اس نے آنکھوں کی پتلیاں اوپر چڑھائیں۔ ''لگتا ہے کہ آپ رات کو ٹھیک سے سو نہیں سکے اس لیے آپ کے دماغ کو خشکی چڑھ گئی ہے۔ ابھی ناشتے کا ٹائم بھی نہیں ہوا اور آپ لنچ کی بات کر رہے ہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ جا کر اپنی نیند پوری کر لیں۔''

اس کے ساتھ ہی وہ ایڑیوں پر گھومی اور نیم روشن کوریڈور میں اوجھل ہو گئی۔ تاہم جاتے جاتے وہ ایک خوفناک گارڈ کو میری طرف سے چوکس رہنے کا اشارہ کر گئی تھی۔

پتا نہیں کیوں میری چھٹی حس گواہی دے رہی تھی کہ کیپٹن فرزہ شاید ٹھیک ہی کہہ رہی ہے، ہاناوانی اس عمارت میں موجود نہیں تھی۔ وہ بوقتِ ضرورت یہاں آتی تھی۔ میں بظاہر پُرسکون تھا اور خوشگوار موڈ میں دکھائی دے رہا تھا لیکن میرا دماغ گھڑ دوڑ کا میدان بنا ہوا تھا۔ ہاناوانی کہاں تھی؟ اسے کیسے ڈھونڈا جا سکتا تھا؟ کیسے جہنم واصل کیا جا سکتا تھا؟ وہ ہمیں بہت نقصان پہنچا چکی تھی اور ابھی پتا نہیں کتنا پہنچانے والی تھی۔

پھر میرا دھیان اپنے جانِ جگر فخر کی طرف چلا گیا۔ وہ بھی ہاناوانی کی بدنگاہی کا شکار ہو چکا تھا۔ وہ اس کے شکنجے میں تھا۔ اس نے جس طرح دوبدو مقابلے میں مجھ پر بے رحم حملے کیے تھے، وہ کوئی بھولنے والی بات نہیں تھی...... اور اس سے پہلے مجھے ہاناوانی کے جال تک لانے والا بھی تو وہی تھا۔ اب پتا نہیں وہ کس حال میں تھا؟ میرا دل اس کے لیے غم سے بھر گیا اور میں اس وسیع عمارت کی راہداریوں اور غلام گردشوں میں اس کی سن گن لینے لگا۔

ہاناوانی کی طرح فخر کا بھی مجھے یہاں کوئی کھوج نہیں ملا۔ کیا وہ بھی ہاناوانی کے ساتھ کہیں اور تھا؟ تب یکایک ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔ یہ پرندوں کا وہی مدھم سا شور تھا جو ایک دن پہلے بھی مجھے سنائی دیا تھا۔ چوں چوں کی وہ بے شمار آوازیں جن کا تعلق میرے

اندازے کے مطابق رنگین طوطوں سے تھا اور جو جمع ہو کر ایک ہلکے سے شور کی شکل اختیار کر جاتی تھیں۔ صبح کے ان اولین لمحات میں چونکہ ہر طرف سناٹا تھا اس لیے یہ شور زیادہ واضح تھا۔ ایک پہریدار کی نظر بچا کر میں ایک تنگ راہداری میں گھس گیا۔ یہاں بہت کم روشنی تھی اور کچھ گرد و غبار بھی تھا۔ لگتا تھا کہ یہ ایک متروک راستہ ہے۔ پرندوں کے شور کا تعاقب کرتا ہوا میں ایک ایسے گول کمرے میں پہنچا جہاں شور بالکل صاف سنائی دیتا تھا۔ تقریباً پندرہ فٹ کی بلندی پر یا شاید اس سے بھی زیادہ اونچا ایک ادھ کھلا روشن دان تھا جہاں سے یہ آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ ہلکی سی بو بھی محسوس ہوتی تھی جو کبوتروں، طوطوں، مرغیوں سے وابستہ ہوتی ہے۔ میں نے گول کمرے کا دروازہ اندر سے لاک کیا اور زخمی ہاتھ کے باوجود کسی نہ کسی طرح روزن تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے بازوؤں کے زور پر خود کو اوپر اٹھا رکھا تھا اور ایک بڑے مستطیل کمرے میں جھانک رہا تھا۔ یہاں کے منظر نے میرے چودہ طبق روشن کر ڈالے۔ چھوٹے بڑے پنجروں کی کئی چھ منزلہ قطاریں تھیں، ان میں رنگین پروں والے سیکڑوں طوطے بند تھے اور بلبوں کی روشنی میں پھدکتے دکھائی دیتے تھے۔ وہ خوب صورت تھے لیکن کسی نے انہیں بہت خوفناک بنا ڈالا تھا۔

پندرہ بیس درجن طوطے ہال کمرے کے فرش پر بھی دکھائی دیتے تھے لیکن وہ بالکل ساکت تھے۔ وہ اپنے پروں کو بھی بالکل حرکت نہیں دے رہے تھے، جیسے بیٹھے بیٹھے سو گئے ہوں۔ ان کے عین درمیان کوئی موجود تھا۔ وہ آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ دوسری جانب تھا۔ وہ بالکل برہنہ تھا...... وہ بھی بے حرکت تھا۔

کہیں یہ...... اکبر ہی تو نہیں؟ میرے اندر کی حیرت میں سے ایک سوال ابھرا۔

مجھے اپنے اس سوال کے جواب کے لیے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ مجھے روزن سے اسی طرح لٹکے قریباً دو منٹ ہی ہوئے تھے جب بے حرکت طوطوں کے درمیان بیٹھے فرد کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے اسے پہچاننے میں زیادہ دیر نہیں کی۔ وہ اکبر ہی تھا۔ شازیہ کا دولھا...... سیف کا بہنوئی۔

وہ بالکل برہنہ تھا۔ میں لرز کر رہ گیا۔ اس کی آنکھیں، اس کی آنکھیں ہی نہیں لگتی تھیں۔ اس کی آنکھیں ہلکی براؤن تھیں مگر اس وقت وہ اتنی سفید نظر آ رہی تھیں جیسے ان آنکھوں میں سنگ مرمر کی پتلیاں ''فٹ'' ہوں۔ اس کا چہرہ گہرا سرخ اور بے حد تمتمایا ہوا تھا۔ وہ ننگے سر ننگے پاؤں ایک بغلی دروازے کی طرف بڑھا۔ اس کے ارد گرد فرش پر موجود پرندے اس قدر ساکت و جامد تھے کہ دروازے کی طرف اپنا راستہ بنانے کے لیے اکبر نے

اپنے پاؤں سے انہیں دائیں بائیں ہٹایا۔ وہ بے جان چیزوں کی طرح اِدھر اُدھر لڑھک گئے۔ اکبر بغلی دروازے میں اوجھل ہوگیا۔ فرش پر موجود پرندے اسی طرح پڑے رہے۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ جانوروں کو بھی ہپناٹائزڈ کیا جاتا ہے اور اس کے لیے IMMOBILITY کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔

کیا یہاں بھی کوئی ایسی ہی پریکٹس جاری تھی؟

اس کا جواب ہاں میں تھا مگر اچنبھے کی بات یہ تھی کہ ان پرندوں کو ''ہاناوانی'' کسی عمل سے نہیں گزار رہی تھی...... بلکہ ان کا واسطہ اکبر سے پڑا ہوا تھا۔

تو کیا اکبر اس وقت ہاناوانی کے معاون کا کردار ادا کر رہا تھا؟

اس کا جواب بھی ''ہاں'' میں ہی محسوس ہوتا تھا۔ ابھی تو صرف قیاس ہی کیا جا سکتا تھا مگر لگتا یہی تھا کہ اکبر مکمل طور پر ہاناوانی کا شکار ہو چکا ہے۔ وہ اکبر پر اتنی حاوی ہوگئی تھی کہ اس کے ذریعے اپنے معمول کو آگے ٹرانسفر کر رہی تھی۔ اب یہ پرندے اس کی ''سجیشن'' اکبر کے ذریعے قبول کر رہے تھے۔

میں جس طرح روزن سے لٹکا ہوا تھا، وہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ میری کلائیاں اور کندھے شل ہونے شروع ہو گئے تھے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ فرش پر موجود بے سدھ پرندوں میں تھوڑی بہت حرکت نظر آنا شروع ہوگئی ہے۔ میں انہیں مزید دیکھنا چاہتا تھا لیکن نیچے اتر آنا زیادہ مناسب لگا۔ میں اتر آیا اور پھر گول کمرے کا دروازہ ان لاک کر کے واپس اپنے آرام دہ کمرے میں پہنچ گیا۔

ذہن میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ ہر گزرنے والی گھڑی کے ساتھ یہ بات ثابت ہو رہی تھی کہ ہاناوانی نے یہاں اپنے ہاتھ پاؤں پھیلا لیے ہیں...... اور وہ شدید نقصانات پہنچانے کے موڈ میں ہے۔ وہ ہمارے ہی ذریعے ہمیں ہمارے ہی خون میں ڈبونے کا ارادہ کیے ہوئے تھی۔ فخر اس کے ٹرانس میں تھا، اکبر اس کے ٹرانس میں تھا اور اس کے سمجھنے کی حد تک میں بھی اس کے ٹرانس میں تھا۔ اب مجھے ایک اور سنگین ترین امتحان درپیش تھا۔ وہ تاجور کے محترم والد دین محمد صاحب کا قتل میرے ذمے لگا چکی تھی۔

اکبر کا سراپا ایک بار پھر نگاہوں کے سامنے گھومنے لگا۔ خدا کی پناہ...... اس کی آنکھیں تو اس کی آنکھیں ہی نہیں تھیں۔ بالکل سفید، جن میں ہلکا سا موتیا رنگ دکھائی دیتا تھا۔ وہ جیسے کسی اور ہی دنیا کا باسی نظر آ رہا تھا۔ ایک اسی دنیا جہاں سے اس کا پلٹ آنا ناممکن محسوس ہوتا تھا۔

وہ بدقسمت کس طرح ہاناوانی کے جال میں پھنسا؟ یہ سوال بار بار ذہن کو کچوکے لگا رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی تو ابھی مہندی بھی پھیکی نہیں پڑی تھی۔ وہ سکھیرا گاؤں جیسی الگ تھلگ جگہ پر رہائش پذیر تھا۔ اس کا تو مطلب تھا کہ سکھیرا گاؤں اور چاند گڑھی جیسی جگہیں بھی ہاناوانی کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں تھیں اور وہ وہاں موجود کرداروں پر پوری نظر رکھے ہوئے ہے۔ اکبر مشینوں کی خریداری کے لیے گوجرانوالہ اور لاہور گیا تھا...... اور یقیناً وہیں پر ہاناوانی کے ہتھے چڑھا تھا۔

○......❖......○

یہ بڑی دردناک رات تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ دل سینے میں پھٹ جائے گا۔ حالات نے ایک بہت بڑے امتحان سے دوچار کر دیا تھا۔ مجھے ایک ایسے شخص کی جان لینے کے لیے روانہ کیا گیا تھا جس کو میں کانٹا چبھنے کی تکلیف بھی نہیں دے سکتا تھا۔ بے شک اس محترم شخص کی وجہ سے مجھے اپنی زندگی کا سب سے بڑا صدمہ جھیلنا پڑا تھا۔ تاجور مجھ سے جدا ہوئی تھی مگر جو کچھ بھی تھا، وہ اس کا باپ تھا۔

میں یہ سوچ رہا تھا کہ جو یوسف کی موت کے سلسلے میں مجھے معاف نہیں کر سکی تھی، وہ اپنے باپ کو مار دینے کے جرم میں مجھے کیسے معاف کر دے گی اور وہ صرف تاجور کا باپ ہی نہیں تھا، وہ کسی کا شوہر بھی تھا۔ وہ راحیل اور اسفند کے سر کا سایہ بھی تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ میں اس آزمائش سے کیسے نکل سکتا ہوں۔ کوئی ایسا طریقہ جس سے آج رات دین محمد صاحب کی جان بچ جائے اور ہاناوانی بھی میرے حوالے سے کسی شک میں مبتلا نہ ہو۔

میں اسی کورے گاڑی میں سوار تھا جس پر داؤد بھاؤ اور خورسنہ والے مشن پر نکلا تھا۔ دودھاری خنجر کے علاوہ دونوں آتشیں ہتھیار بھی میرے لباس میں موجود تھے۔ میں جی ٹی روڈ پر قریباً آدھ گھنٹے کا سفر کر کے گوجرانوالہ کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔ یہ رات کے گیارہ بجے کا وقت تھا۔ میں یہ بات اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ ہاناوانی کہیں بھی رکنے والی نہیں ہے۔ وہ انتقام میں جنونی ہو چکی تھی۔ بالفرض محال میں دین محمد صاحب کو مار بھی ڈالتا...... یا کسی طریقے سے دین محمد صاحب کے حوالے سے ہاناوانی کو مطمئن بھی کر دیتا تو وہ فوراً مجھے اگلے امتحان میں ڈال دیتی۔ مجھے نوے فیصد یقین تھا کہ وہ داؤد بھاؤ کا وہ دوسرا ٹھکانا بھی ڈھونڈ چکی ہے جہاں بھاؤ نے راوی فارم کے بعد قسطینا، زینب اور سجاول وغیرہ کو منتقل کیا تھا (اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو وہ تفتیشی حربے استعمال کرتی۔ داؤد بھاؤ کے خفیہ ٹھکانوں کے بارے میں

پوچھ پوچھ کر میری کھوپڑی پلپلی کر دیتی۔ مجھے ان سے ٹیلی فونک رابطوں کا کھتی وغیرہ وغیرہ......مگر وہ اس حوالے سے بالکل مطمئن دکھائی دیتی تھی)

دو دن پہلے میرا موبائل فون مجھ سے واپس لے لیا گیا تھا اور اب بھی میں موبائل فون کے بغیر ہی تھا مگر موبائل فون حاصل کرنا میرے لیے چنداں مشکل نہیں تھا۔ میں نے کامونکی سے سات آٹھ میل آگے سڑک کے کنارے ایک نسبتاً سنسان جگہ پر گاڑی روکی اور ایک راہ گیر سے موبائل چھین لیا۔ وہ کوئی غریب دکان دار ہی تھا۔ شور مچانے کی اس میں ہمت نہیں تھی کیونکہ وہ میرے ہاتھ میں پستول دیکھ چکا تھا۔ میں نے کہا۔ ''پریشان نہیں ہونا برادر۔ مجبوری ہے ورنہ یہ تکلیف تمہیں نہ دیتا۔''

تین چار ہزار والا موبائل تھا۔ میں نے ہزار کے چار نوٹ اس کی جرسی کی جیب میں گھسا دیئے۔ وہ ہکا بکا دیکھتا رہ گیا۔ موبائل کی چارجنگ میں نے دیکھ لی تھی۔ بیلنس کے بارے میں پوچھا تو وہ گھگیائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''چار پانچ روپے کا ہوگا جی۔''

''شاباش، تم سے یہی امید تھی...... چلو اب نکل جاؤ یہاں سے اور پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا۔'' اس نے شدومد سے اثبات میں سر ہلایا اور نکل لیا۔

سامنے ہی ایک کھوکھا شاپ نظر آرہی تھی۔ میں نے وہاں سے ''بیلنس'' لیا اور دوبارہ کار میں آبیٹھا۔ ظاہر تھا کہ اس شخص نے سم بند کروائی بھی تو اتنی جلدی تو نہیں کروائے گا۔ ڈرائیونگ کے دوران میں ہی میں نے قسطینا کے نمبر پر ٹرائی کیا مگر نمبر بند جا رہا تھا۔ دوسری کوشش میں نے سجاول والے نمبر پر کی۔ یہاں بیل جانا شروع ہوئی لیکن کال ریسیو نہیں ہوئی۔ میں نے پھر کوشش کی۔ اس مرتبہ تیسری چوتھی بیل پر رابطہ ہو گیا۔ دوسری طرف سے جس کی آواز آئی۔ وہ سجاول نہیں پہلوان حشمت تھے۔ ''ہیلو......کون بولت ہے؟'' پہلوان کی پاٹ دار آواز نے میرے کان میں ''رس گھولا۔''

''آپ کو کیا لگ رہا ہے، میں کون بول رہا ہوں؟''

''اوہو، شاہ زیب......تم؟ اوئے یار! کہاں چلے گئے تھے تم؟ اتنا پریشان ہوا ہوں میں......کہ کبھی زندگی میں نہیں ہوا۔ اوپر سے یہ داؤ د بھاؤ کی موت والا صدمہ۔ یہ تو ایسے ہی ہے جیسے ''مرے کو مارے الٹا کوتوال'' میرا تو جی چاہت تھا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کہیں جنگل کی طرف نکل جاؤں۔ سچ کہوت ہوں اگر کمر پر چوٹ نہ لگی ہوتی تو میں نے کہیں نکل بھی جانا تھا......'' وہ مسلسل بولتے چلے گئے۔

میں نے انہیں بریک لگاتے ہوئے کہا۔ ''اب کیا حال ہے آپ کی کمر کا؟''

پہلوان جی نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر نئی کتھا شروع کر دی۔ ''بس مجھے تو لگت ہے کہ اپنے کیے کی سزا مل رہی ہے...... میں نے ایک اصلی نابینا پر نقلی اور جھوٹا ہونے کا شک کیا۔ اس کو تھپڑ مارے۔ اب میری یہ چوٹ ٹھیک ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی ہے۔''

''آپ نے کہا تھا کہ آپ اس سے معافی مانگ لیں گے۔''

''معافی تو مانگی ہے...... اور دس بار مانگی ہے مگر لگتا ہے کہ اس نے دل سے معاف ناہیں کیا۔ دوسرے سب بھی یہی کہوت ہیں کہ میں نے ایک نابینا پر اس طرح کا ظلم کر کے اچھا ناہیں کیا۔ یہ بات بالکل ٹھیک ہے شاہ زیب! مگر میں بھی کیا کرتا۔ تم کو بھی پتا ہے اس طرح کے کیس عام طور پر ہووت ہیں۔ لوگ اندھے بن کر بھیک مانگت ہیں۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے نابیناؤں کا ایک بڑا کرکٹ ٹورنامنٹ ہوا تھا۔ اس میں شاید سری لنکا کی ٹیم کے دو بیٹسمین پوری طرح نابینا نہیں ہیں۔ انہوں نے مار مار کر دوسری ٹیم کا بھرکس نکال دیا تھا...... ہاں، بھرکس سے مجھے یاد آیا کہ پریشان ہو ہو کر ہم سب کے دماغوں کا بھی بھرکس نکلا ہوا ہے۔ بات تھی بھی پریشانی کی۔ تم غائب ہو گئے تھے۔ ہمیں ڈر تھا کہ تم بھی تو فخر کی طرح ہوائی چیزوں کے ہتھے نہیں چڑھ گئے۔ یہ ہوائی چیزیں بڑی نامعقول ہووت ہیں۔ کب کس پر کس طرح کا وار کر جائیں، کچھ پتا ناہیں چلتا۔ مجھے یقین ہے کہ داؤد بھاؤ کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اور لالہ موسیٰ میں سجاول کے گھر کو جو آگ لگی ہے، وہ ان ہوائی چیزوں کا ہی کالا کارنامہ ہے۔ یہ چیزیں بہت کھوچل ہووت ہیں۔ بندے پر اس طرح وار کرت ہیں کہ بندے کی عقل کی چٹنی بن جاوت ہے۔ اب دیکھو مجھے جو چوٹ لگی ہے، ایسی جگہ لگی ہے کہ میں اپنے ہاتھ وہاں تک پہنچا ہی ناہیں سکتا۔ ورنہ مجھے مالش کرنے کے لیے ایسے ایسے طریقے آوت ہیں کہ ٹوٹی ہوئی ہڈی خود کہہ اٹھتی ہے...... ماشاء اللہ، ماشاء اللہ، اور خراج تسکین (تحسین) پیش کرتے ہوئے خود ہی جڑ بھی جاوت ہے۔'' وہ بے تکان بولتے چلے جا رہے تھے۔

میں نے بڑی مشکلوں سے انہیں روکا اور پوچھا کہ سجاول اور قسطینا وغیرہ کہاں ہیں؟

پہلوان نے ہنس کر کہا۔ ''تم نے غلطی سے جس نمبر پر کال کی ہے یہ سجاول کا ہی ہے۔ میرا اپنا فون تو چارجنگ پر لگا ہوا ہے۔ دراصل یہاں مجھے اور سجاول صاحب کو ایک ہی کمرا ملا ہوا ہے۔ سجاول صاحب واش روم میں گیا ہے بس نکلتا ہی ہووے گا۔ اب تم بتاؤ کہاں، اور کس حال میں ہو۔ تمہاری باتوں سے تو یہی لگت ہے کہ ہوائی چیزوں کا اثر تم پر ناہیں ہے اور اللہ کرے نہ ہی ہو۔ مگر جب تک میں تم کو دیکھ ناہیں لوں گا یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔

بھوت پریت کا میسنا پن کوئی ڈھکی چھپی بات ناہیں۔ ان کے طریقۂ واردات کا کچھ پتا ناہیں چلتا، بس ان کی اپنی ہی ایک دنیا ہے۔ وہ کیا مشہور شعر ہے اس طرح کا...... پرواز تو دونوں کی ہے اس ایک ہی آسماں پر...... شاہیں کا جہاں اور ہے "گرگٹ" کا جہاں اور۔ یہ ہوائی چیزیں گرگٹ ہی کی طرح سات رنگ بدل لیتی ہیں......"

میری کوئی نیکی کام آئی اور بولتے بولتے پہلوان کو ایک دم بریک لگ گئے، فرمایا۔ "لو بھئی، سجاول صاحب سے پہلے مسز قسطینا آ گئی ہیں۔ ان سے بات کرو۔"

چند لمحے تک کھٹ پٹ کی آوازیں آئیں پھر فون پر قسطینا کی کھنکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ "ہیلو شاہ زائب! مجھے امید تھی کہ جلد ہی تمہارا فون آئے گا۔ یہ کس نمبر سے بات کر رہے ہو؟"

"بس ہے کسی کا۔ آپ بتائیں، آپ کی طرف کیا صورتِ حال ہے؟"

"صورتِ حال کی فکر تو تمہارے حوالے سے زیادہ ہے۔" اس نے شستہ انگلش میں کہا۔ بات کرتے کرتے وہ شاید کسی دوسرے کمرے میں چلی آئی تھی۔

میں نے کہا۔ "داؤد بھاؤ کے بارے میں پتا چل گیا ہوگا؟"

"ہاں شاہ زائب! بے حد افسوس ہوا...... لیکن جتنا افسوس ہوا پھر اتنی ہی خوشی بھی ہوئی۔ اسی روز دوپہر کو داؤد بھاؤ کا فون آ گیا۔" وہ رازداری کے انداز میں بولی۔

"یعنی آپ کو پتا چل گیا ہے۔"

"داؤد بھاؤ نے ہی سب کچھ بتایا ہے لیکن یہ اطلاع صرف اور صرف مجھ تک ہی محدود ہے۔ حتیٰ کہ ابھی سجاول کو بھی کچھ پتا نہیں۔ داؤد کے اپنے قریبی ساتھی بھی لاعلم ہیں۔ وہ رُوپوش ہو چکا ہے۔"

"وہ اس صورتِ حال کو ہینڈل کر لے گا۔ جہاندیدہ اور ہوشیار شخص ہے۔"

"ہوشیاری تو تمہاری بھی کچھ کم نہیں، اگر واقعی ویسا ہے جیسا داؤد بھاؤ نے بتایا ہے تو پھر تم سپر مین ہو۔ اور تمہارا انگوٹھا ایک سپر مین کا انگوٹھا ہے۔ بظاہر سب کچھ ناقابلِ یقین لگتا ہے لیکن تم سے کچھ بھی بعید نہیں۔" میں سمجھ گیا کہ قسطینا کس واقعے کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ یقیناً یہ سب کچھ اسے بھاؤ سے ہی معلوم ہوا تھا۔

"لیکن اس وقت یہ سپر مین سخت مصیبت میں ہے۔" میں نے کہا۔ "اسے اپنا کردار نبھانے کے لیے سخت امتحان سے گزرنا پڑ رہا ہے۔ فون پر زیادہ کچھ نہیں بتا سکتا، تھوڑے کہے کو بہت سمجھیں اور دعا کریں۔"

''فخر کے سلسلے میں بھی بہت پریشانی ہے۔''قسطینا نے گہری سنجیدگی سے کہا۔
''ایسی ایک پریشانی تو آپ کی طرف بھی ہے۔ میرا مطلب فارس جان سے ہے کچھ پتا چلا یا نہیں؟''
''ابھی تک تو نہیں۔ امید پر دنیا قائم ہے۔'' وہ حوصلے سے بولی پھر ذرا توقف سے کہنے لگی۔''کیا تم ڈرائیونگ کر رہے ہو؟''
''ہاں قسطینا! اس وقت آپ کو صرف خبردار کرنے کے لیے فون کیا ہے، مجھے لگتا ہے کہ ہاناوانی کو آپ کے اس دوسرے ٹھکانے کا علم بھی ہو چکا ہے۔ وہ کسی بھی وقت اس ٹھکانے پر حملہ آور ہو سکتی ہے۔ آپ، سجاول، پہلوان جی، زینب اور ولید وغیرہ اس کی ہٹ لسٹ میں ٹاپ پر ہیں۔''
''اس بات کا ہمیں بخوبی احساس ہے شاہ زائب! یہ جگہ بہت محفوظ ہے...... شاید راوی فارم سے بھی زیادہ محفوظ۔ یہاں بھاؤ نے حفاظت کا بھی بہت کڑا انتظام کیا ہے۔ پرندوں کے حوالے سے بھی یہاں سیکیورٹی موجود ہے۔ کھڑکیوں، روزنوں پر جالیاں لگائی گئی ہیں اور شاٹ گنز کا انتظام ہے۔''
میں نے قسطینا سے ان کے موجودہ ٹھکانے کے بارے میں نہیں پوچھا۔ اس نے بھی نہیں بتایا۔ وہ جانتی تھی کہ سیکیورٹی کے نکتہ نظر سے اس بارے میں خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔
میں قسطینا کے بعد سجاول سے بھی تھوڑی سی بات کرنا چاہتا تھا مگر اچانک چارجنگ ختم ہو جانے سے سلسلۂ کلام منقطع ہو گیا۔ اب میں گوجرانوالہ سے آگے نکل چکا تھا۔ قرب و جوار میں ہلکی دھند اتر آئی تھی۔ یہ رات کے قریباً بارہ بجے کا عمل تھا۔ میں گاہے بگاہے اپنے عقب سے بھی باخبر رہنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس امر کا اندیشہ ذہن میں موجود رہتا تھا کہ کہیں ہاناوانی نے میری نگرانی کا انتظام نہ کر رکھا ہو۔ بہرحال ابھی تک یہ اندیشہ، اندیشہ ہی رہا تھا۔

دین محمد کے حوالے سے میں کیا کروں گا؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اس سے پہلے میں فیض محمد کو فون کر کے خورسنہ اور اس کے بچے کو اپنی زد سے نکال چکا تھا۔ یہی حربہ دین محمد کی نسبت استعمال کیا جاتا تو ہاناوانی فوراً شک کا شکار ہو جاتی۔ (میرا اندازہ تھا کہ ایک دو باتیں اسے پہلے بھی میرے حوالے سے چونکا چکی ہیں)
ایک آپشن یہ بھی تھا کہ میں دین محمد صاحب کو کہیں غائب کر ڈالوں...... اور یہ ظاہر کروں کہ وہ مارے گئے ہیں لیکن پھر ''ڈیڈ باڈی'' کہاں سے فراہم ہوتی؟ کیا میں کسی غیر

متعلق شخص کی جان لیتا اور اس کی لاش کو شیطان زادے کی لاش کی طرح مسخ کر ڈالتا؟ یہ بھی ممکن نہیں لگ رہا تھا۔ ایک آپشن یہ بھی ہو سکتا تھا کہ دین محمد یا ان کا کوئی ملازم ''کامیاب دفاع'' کرتا اور میں زخمی ہو کر پسپا ہو جاتا وغیرہ وغیرہ۔

میں کئی زاویوں سے سوچ رہا تھا مگر آج رات جو کچھ ہونے والا تھا، وہ بالکل مختلف اور ناقابلِ قیاس تھا۔ وہ میرے لیے زندگی کا ایک تلخ تجربہ بننے والا تھا۔

رات کے قریباً دو بجے تھے جب میں نے کورے گاڑی پہلے کی طرح گاؤں کے بالکل پاس درختوں کے جھنڈ میں کھڑی کی اور یخ بستہ تاریکی میں دیواروں کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا دین محمد صاحب کے گھر کے سامنے پہنچ گیا۔ کہیں دور سے چوکیدار کی سیٹی سنائی دی اور اس نے کسی پختہ دیوار سے لاٹھی ٹکرا ٹکرا کر زور سے آواز پیدا کی۔ آوارہ کتوں نے کچھ دیر شور مچایا اور پھر خاموشی چھا گئی۔

میں نے آٹھ فٹ اونچی بیرونی دیوار پھاندی اور اندر کود گیا۔ دارج داراب سے تاجور کا رشتہ طے ہونے کے بعد اس گھر کو ایک اچھی بھلی جدید حویلی کی شکل دے دی گئی تھی۔ میری معلومات کے مطابق یہاں باقاعدہ گارڈز ہوا کرتے تھے مگر اب چونکہ سارے حالات ریورس ہو چکے تھے اس لیے اس کوٹھی نما حویلی پر بھی زوال آ چکا تھا، نئے ماڈل کی شاندار کار کی جگہ پھٹیچر سی ایف ایکس سوزوکی یہاں کھڑی تھی۔ میں چابیوں کا ایک گچھا اور ایک ماسٹر کی بھی لے کر آیا تھا۔ تھوڑی سی کوشش سے میں اندرونی دروازہ کھولنے میں کامیاب ہوا اور اندر پہنچ گیا۔ لاؤنج نما کمرے کی لائٹ آن تھی۔ اردگرد کے کمروں میں اس لائٹ کے سبب ہلکی روشنی موجود تھی۔ ایک کمرے میں چچی اپنے دونوں بیٹوں راحیل اور اسفند کے ساتھ سوئی ہوئی تھی۔ میں نے ہولے سے اسفند کے سر پر ہاتھ پھیرا اور دروازہ بند کر کے راہداری کی دوسری جانب اس کمرے میں چلا گیا جہاں دین محمد صاحب اپنے کمرے میں سو رہے تھے۔ انہوں نے پگڑی اتار کر میز پر رکھی ہوئی تھی۔ اسی میز پر ان کی کچھ دوائیں وغیرہ بھی پڑی تھیں۔ دواؤں والی اس میز کے پاس ہی حقہ بھی دھرا ہوا تھا۔ کمرے میں بس وہی ہلکی سی روشنی تھی جو لاؤنج کی لائٹ سے پیدا ہوتی تھی۔ کمرے کے پردوں کی بوسیدگی سے اس کوٹھی نما حویلی کے بدلے ہوئے حالات پر تھوڑی سی روشنی پڑتی تھی۔ میں نے کمرے کا دروازہ اندر سے لاک کر دیا...... ابھی تک میں کسی فائنل نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے؟ میری نگاہیں اب تھوڑی روشنی میں بھی دیکھنے کے قابل ہو گئی تھیں۔ میں نے دھیان سے دین محمد صاحب کا چہرہ دیکھا۔ پھر جلدی سے ان کے پاس بیٹھ گیا اور ان کی

پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ یہ ٹھٹھری ہوئی رات اپنے بطن میں ایک ہولناک اتفاق چھپائے ہوئے تھی اور یہ اتفاق میرے سامنے تھا...... دین محمد صاحب کی روح پرواز کر چکی تھی۔ وہ اس دنیا میں نہیں تھے۔ میں نے ان کی کلائی اور گردن ٹٹول کر ان کی نبض ڈھونڈنے کی ناکام کوشش کی اور پھر سر پکڑ کر بیٹھا رہ گیا۔

اگلے دومنٹ میں کسی ڈاکٹری معائنے کے بغیر ہی میں حتمی طور پر جان چکا تھا کہ دین محمد صاحب چل بسے ہیں۔ اندازہ یہی تھا کہ انہیں دل کا دورہ پڑا ہے۔ وہ جس انداز سے بیڈ پر پڑے تھے، پتا چلتا تھا کہ انہوں نے اٹھ کر میز کی طرف ہاتھ بڑھانے کی کوشش کی جہاں دوائیں پڑی تھیں لیکن ناکام ہوئے اور بیڈ کے بالکل دائیں کنارے پر کروٹ کے بل لیٹے رہ گئے۔

ایک بڑا...... بہت بڑا واقعہ رُونما ہو چکا تھا، لیکن اس چھت کے نیچے رہنے والے باقی مکین بالکل بے خبر تھے۔ میں نے کھڑکیوں کے پردے اچھی طرح برابر کر دیئے اور باتھ روم کی لائٹ آن کر کے دروازہ تھوڑا سا کھول دیا تا کہ کمرے میں ہلکی روشنی رہے۔ میرا دماغ گھڑ دوڑ کا میدان بنا ہوا تھا۔ سینے میں رنج تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک یہ سوچ بھی سر اٹھا رہی تھی کہ...... کیا میں موجودہ صورتِ حال کو کسی طور اپنے حق میں استعمال کر سکتا ہوں؟ یہ ایک سفاک اور انسانیت سوز سوچ تھی لیکن جن حالات نے مجھے گھیرا ہوا تھا وہ اس سے زیادہ سفاک اور انسانیت سوز تھے۔

میرے اندر سے ہی جیسے ایک خاموش آواز ابھری۔ ''تم ایسے بے رحم انداز میں کیسے سوچ سکتے ہو، یہ شخص جو تمہارے سامنے مرا پڑا ہے بالکل غیر بھی ہوتا تو اس حالت میں تمہارے لیے قابل احترام تھا لیکن یہ تو غیر بھی نہیں ہے۔ یہ تاجور کا باپ ہے، یہ اسفند اور راحیل کا باپ ہے۔ یہ چچی کا شوہر ہے......''

دوسری آواز نے کہا۔ ''لیکن یہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ جو کچھ تم سوچ رہے ہو، اس سے اسے کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔ ہاں اس سے دوسرے اور بہت سے لوگوں کا بھلا ہو جائے گا اور اس بھلے میں اس محترم شخص کے اپنے بھی شامل ہوں گے۔''

پہلی آواز نے کہا۔ ''ایک بار پھر سوچ لو شاہ زیب! تصور کرو جب یہ راز کھلے گا تو تاجور پر کیا گزرے گی۔ وہ قیامت تک اور قیامت کے بعد بھی تمہیں معاف نہیں کرے گی۔''

کچھ دیر تک یہ کشمکش جاری رہی پھر میں آخری فیصلے پر پہنچ گیا۔ یہاں سے میری واپسی کی پلاننگ مکمل تھی۔ میرے بریٹا پسٹل پر سائلنسر چڑھا ہوا تھا...... میں نے دین محمد

صاحب کی سرد پیشانی پر بوسہ دیا اور پھر دو تین فٹ کے فاصلے سے دو گولیاں ان کے سر اور ایک سینے میں اتار دی۔ ان کا بے جان جسم بیڈ پر تین بار اچھلا اور پھر پہلے کی طرح ساکت ہو گیا۔ میں نے تیزی کے ساتھ کمرا چھوڑ دیا۔

کمرے سے نکلنے اور گاڑی تک پہنچنے میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ سائلنسر لگے ہتھیار سے جو آواز آتی ہے وہ رات کے سناٹے میں کافی نمایاں ہوتی ہے۔ اس آواز کے بعد مجھے دین محمد صاحب کے گھر میں کھٹ پٹ کی آوازیں سنائی دی تھیں۔ عین ممکن تھا کہ اہلِ خانہ یا ملازمین میں سے کوئی جاگ گیا ہو۔ اب دین محمد صاحب کی موت کی خبر آناً فاناً پھیلنے والی تھی۔

میں جلد ہی گاڑی کو پختہ سڑک پر لے آیا۔ ہتھیار میں نے گاڑی کے اندر ہی ایک نہایت محفوظ خانے میں چھپا دیئے تھے۔ دل و دماغ میں ہلچل تھی، حالات کی سنگینی اور مسلسل ٹین شین نے بالآخر دین محمد صاحب کی جان لے لی تھی۔ لگتا یہی تھا کہ انہیں دل کا دورہ پڑا ہے یا برین ہیمرج ہوا ہے مگر ان کی موت اب یقیناً قتل کا رنگ اختیار کرنے والی تھی۔ میں نے انہیں تین گولیاں ماری تھیں۔ یقینی بات تھی کہ زخموں سے کچھ نہ کچھ خون بھی رسا ہو گا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کا معاملہ بعد کا تھا۔ عین ممکن تھا کہ رپورٹ میں موت کی اصل وجہ کا پتا چل جاتا اور یہ بھی ممکن تھا کہ نہ چلتا۔ دورہ پہلے پڑا ہے یا گولیاں پہلے لگی ہیں، اس کا تعین زیادہ آسان نہیں ہوتا۔ میں آج کے مشن کے حوالے سے ہاناوانی کی نگاہوں میں تقریباً سرخرو تھا۔ میں نے دین محمد صاحب کو ان کے گھر میں گھس کر ''قتل'' کر دیا تھا۔

دفعتاً میں بے طرح چونک گیا۔ مجھے اپنے عقب میں کچھ فاصلے پر پولیس کی موبائل گاڑی کی گھومتی ہوئی نیلی روشنی دکھائی دی۔ وہ تیزی سے نزدیک آ رہی تھی۔ یہ خطرناک تھا۔ دین محمد کی لاش پر فائر کیے مجھے پچیس تیس منٹ سے زیادہ نہیں ہوئے تھے۔ اتنی جلدی پولیس کا حرکت میں آ جانا قرین قیاس نہیں تھا...... مگر ناممکن بھی نہیں تھا۔ گشتی پولیس کو فون پر اطلاع ہو جائے تو وہ فوراً حرکت میں آ جاتی ہے اور پھر مجھے علم ہوا کہ عقب میں آنے والی دو گاڑیاں ہیں۔ میرا اور ان کا درمیانی فاصلہ دو فرلانگ سے زیادہ تھا لیکن تیزی سے کم ہو رہا تھا۔ میری سمجھ میں اور تو کچھ نہیں آیا، میں نے کار کی ہیڈ لائٹس آف کر دیں اور یہی وقت تھا جب میری نگاہ کھیتوں کے درمیان بائیں جانب اونچے اور گھنے سرکنڈوں پر پڑی۔ ذہن میں آنے والے ایک تیز رفتار خیال کے تحت میں نے کورے کار کو پھرتی سے ان سرکنڈوں کی طرف موڑ دیا۔ ان کی بلندی بارہ تیرہ فٹ سے کم نہیں ہو گی۔ چھوٹے سائز کی کورے کار

جیسے ان سرکنڈوں میں دفن ہو کر رہ گئی۔ تاریکی میں ہیڈ لائٹس کی حرکت سے اندازہ ہوتا تھا کہ دونوں گاڑیاں جو یقیناً پولیس ہی کی تھیں، تیزی سے قریب پہنچ رہی ہیں۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ وہ کہیں آس پاس رک جاتی ہیں، یا سیدھا آگے نکل جاتی ہیں۔ یہ ایک دو منٹ کا انتظار تھا لیکن بے حد کٹھن تھا۔ سینے میں دل شدت سے دھڑک رہا تھا اور پھر گاڑیاں سرکنڈوں کے عین سامنے پہنچ گئیں۔ دونوں پولیس کی پیٹرولنگ وہیکلز تھیں۔ جب میں نے گاڑیوں کو وہیں پر رکتے دیکھا تو میرے اندیشے حقیقت کا روپ دھارنے لگے۔

ایک پولیس افسر کی بھاری بھرکم آواز ہوا کے دوش پر تیر کر مجھ تک پہنچی۔ ''اوئے یہاں ہی روک لو۔ گوندل سے بھی کہو نکل آئے۔''

دوسرے شخص نے کہا۔ ''سر جی! نہر کا کنڈا ہے، ٹھنڈ بڑی لگتی ہے یہاں۔''

''اوئے ٹھنڈ کے پتر، گرمی تو پھر تجھے تیری ووہٹی ہی دے سکتی ہے۔ ایسا کر کہ مہینے کی چھٹی لے لے، اسی گرم انگیٹھی کی ڈیوٹی دیا کر رات دن۔''

تیسرے شخص نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ''انسپکٹر صاحب کوئی لمبی سی تار ہونی چاہیے بجلی کی۔ ڈیڑھ دو فرلانگ ہو تو تھانے والا ہیٹر سیدھا اس نہر تک پہنچ جایا کرے۔''

کوئی بلند آواز میں ہنسا اور پھر دونوں گاڑیوں سے دس بارہ اہلکار نکل آئے۔ دو تین کے ہاتھوں میں ٹارچیں بھی تھیں۔

مجھ پر یہ عقدہ کھلا کہ یہ پولیس پارٹی میرے پیچھے نہیں لپک رہی تھی بلکہ یہ لوگ اس نہر کے کنارے پل کے سامنے ناکا لگانے پہنچے تھے۔ بہرحال اب تو جو ہونا تھا، ہو چکا تھا۔ یہ لوگ مجھ سے صرف تیس چالیس قدم کے فاصلے پر موجود تھے۔ اب کم از کم ان کے ٹلنے تک میں یہاں سے نہیں نکل سکتا تھا۔ کئی دفعہ بندے سے اندازے کی غلطی ہو جاتی ہے جو ساری پلاننگ کو درہم برہم کر دیتی ہے۔

ان لوگوں نے نہر کے پل کے سامنے باقاعدہ ناکا لگا لیا۔ غالباً انسپکٹر اور سب انسپکٹر وغیرہ تو گاڑیوں میں بیٹھے رہے، ماتحت عملے نے سرد ہوا میں ڈیوٹی سنبھال لی۔ ایک شخص کی آواز آئی۔ ''حوالدار خوشی کہاں فوت ہو گیا ہے، اس سے کہو تھوڑی سی آگ ہی جلا لے، ٹھنڈ بہت زیادہ ہے۔''

ان لوگوں کے طور اطوار سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ یہاں لمبے قیام کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ایک خصوصی ناکا لگتا تھا۔ (سردی بھی معمول سے زیادہ تھی۔ میرے انگوٹھے میں ہلکا درد ہو رہا تھا)......

میرا یہ اندازہ اگلے ایک گھنٹے میں بالکل درست ثابت ہو گیا۔ یہ ایک خصوصی ناکا تھا...... اور اس کی وجہ بھی سمجھ میں آ گئی تھی۔ بیڈ روم میں دین محمد صاحب کو تین فائر لگنے کا معاملہ راز نہیں رہا تھا لیکن حیرت اور دلچسپی کی بات یہ تھی کہ اس واقعے کو ایک ڈیڑھ گھنٹا گزر جانے کے باوجود یہ پولیس پارٹی اب تک یہی سمجھ رہی تھی کہ چودھری دین محمد شدید زخمی ہیں...... اور اسپتال میں ان کی جان بچانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

گاہے بگاہے پولیس کی ایک گاڑی میں واکی ٹاکی کا شور بھی سنائی دیتا تھا اور پارٹی انچارج جس کا نام وحید شاہ تھا بلند آواز میں گفتگو کرتا تھا۔

اسی دوران میں ایک موٹر سائیکل سوار اہلکار موقع پر پہنچا اور اس نے وحید شاہ کو اطلاع دی۔ ''بری خبر ہے جی، چودھری دین، اللہ بیلی ہو گیا ہے...... بلکہ ڈاکٹرز نے کہا ہے کہ وہ مرا ہوا ہی اسپتال آیا تھا۔''

سب انسپکٹر نے بیزاری سے کہا۔ ''جب سروچ دو گولیاں وڑی ہوں تو بندہ مرا ہوا ہی اسپتال پہنچتا ہے۔''

وحید شاہ بلند آواز میں پکارا۔ ''چلو بھئی، سارے الرٹ ہو جاؤ اب...... اور خوشی محمد تو دو کانسٹیبل لے کر پل کی پرلی طرف چلا جا۔ آنکھیں اور کن کھلے رکھنے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ ڈی ایس پی صاحب بھی اب راؤنڈ لگانے والے ہوں گے۔''

اس پولیس پارٹی سے میرا فاصلہ بہت کم تھا، میں کورے گاڑی کے اندر بیٹھا تھا اگر مجھے کھانسی یا چھینک وغیرہ بھی آ جاتی تو یہ لوگ شک میں مبتلا ہو سکتے تھے لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اب میں یہاں سے حرکت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ سرکنڈوں میں احتیاط سے چل کر پیدل آگے جایا جا سکتا تھا مگر اس میں بھی خطرات تھے۔ میں نے گاڑی کے شیشے چڑھائے اور فی الوقت وہیں دبکے رہنا مناسب سمجھا۔ ایک لحاظ سے میرا یہاں رکنا شاید درست ہی ثابت ہوا تھا۔ یقینی بات تھی کہ علاقے میں اس طرح کی مزید چیکنگ بھی ہو رہی ہو گی۔ میں کسی جگہ پھنس سکتا تھا۔

ناکے پر گاہے بگاہے کسی سائیکل یا موٹر سائیکل سوار کو روک لیا جاتا تھا اور شناختی کارڈ وغیرہ چیک کر کے دو چار سوالات کیے جاتے تھے۔ کچھ بے گناہوں کو گالیاں اور ایک ٹریکٹر سوار کو تھپڑ بھی پڑے۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ چودھری دین محمد کی موت کی خبر بڑی تیزی سے پھیل گئی ہے جو کچھ بھی تھا، اس علاقے میں چودھری دین محمد کی ایک اہمیت تھی۔ وہ دارا فیملی کے رشتے دار بن چکے تھے۔ پولیس کی ان ساری پھرتیوں کے پیچھے یقیناً یہ وجہ بھی تھی،

اب رات کے چار بج چکے تھے۔اس کے باوجود میں محسوس کر رہا تھا کہ سکھیرا گاؤں کو جانے والی اس سڑک پر آمدورفت ہو رہی ہے۔ عام حالات میں تو شاید رات کے اس پہر سڑک سنسان ہی ہوتی مگر اب موٹر سائیکلز کے علاوہ چند گاڑیاں بھی نظر آئی تھیں۔ ان گاڑیوں کا رخ سکھیرا گاؤں کی طرف ہی تھا۔ایک جیپ پر قریبی گاؤں ''وارث منڈی'' کا چودھری اور چودھرائن بھی سکھیرا گاؤں کے رخ پر جاتے دکھائی دیئے۔ یقیناً یہ لوگ چودھری دین محمد کی اچانک موت کی خبر سن کر ہی جا رہے تھے۔

ڈیڑھ دو گھنٹے اسی طرح گزر گئے اور پھر رات کی تاریکی میں مدھم اجالے کی آمیزش ہونے لگی۔ میں اسی طرح کورے گاڑی میں بیٹھا تھا اور شیشے چڑھا رکھے تھے۔ مجھے امید تھی کہ اجالا پھیلتے ہی یہ ناکا ختم ہو جائے گا اور میں یہاں سے نکل سکوں گا۔

قریباً آدھ گھنٹا مزید گزرا۔ اب قرب و جوار کے مناظر نگاہوں کے سامنے اجاگر ہونا شروع ہو گئے تھے۔ بہرحال مجھے نیلگوں آسمان اور بلند و بالا سرکنڈوں کے سوا کچھ خاص دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں بہت احتیاط کے ساتھ گاڑی سے اتر آیا۔ چھینا ہوا موبائل فون میں نے آف کر رکھا تھا۔ بریٹا پسٹل گاڑی کے خفیہ خانے سے نکال کر جیکٹ کی جیب میں ڈال لیا تھا۔ چند قدم آگے چلا تو سڑک کا ایک بالکل مختصر سا حصہ دکھائی دینے لگا۔ دو پرائیویٹ گاڑیاں رکی ہوئی تھیں۔

بڑی توند والے انسپکٹر وحید شاہ نے ایک گاڑی سوار سے پوچھا۔ ''ہاں جی، کتھے جانا ہے آپ نے؟''

گاڑی کی پچھلی نشست سے کسی نے بوجھل آواز میں کہا۔ ''میں مولوی حبیب اللہ ہوں......''

''اوہو سوری......سوری جی۔ میں آپ کو دیکھ نہیں سکا۔ بہت افسوس ہوا ہے، جی بہت افسوس ہوا ہے۔'' وحید شاہ نے فدویانہ انداز میں کہا۔

پھر اپنے حوالدار سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''اوئے خوشی محمد۔ چل ایک گڈی لے کر مولوی جی کے ساتھ جا۔ گاؤں کی حد تک چھوڑ کے آنا۔''

مولوی حبیب اللہ نے منع کیا مگر اس نے اصرار کے ساتھ ایک گاڑی ان کے ساتھ روانہ کر دی۔

مولوی صاحب کی آواز کافی دنوں بعد سنی تھی۔ تاہم شکل اب بھی نہیں دیکھ سکا تھا۔ وہ تاجور کے ماموں تھے اور تاجور کو دارج داراب کے پنجہ ستم سے بچانے کے لیے انہوں نے

اپنی سی پوری کوشش کی تھی۔ میرے دل میں ان کا ایک مقام پیدا ہو گیا تھا۔ مولوی صاحب آگے بڑھ گئے۔ میں واپس کورے میں آن بیٹھا...... اور بغیر آواز پیدا کیے دروازے بند کر لیے۔ میرا یہ اندازہ درست نکلا کہ ناکا ختم ہونے والا ہے۔ مولوی حبیب اللہ صاحب کے جاتے ہی پولیس پارٹی نے بھی اپنا ڈیرا اٹھایا اور نہر کے ساتھ ساتھ کچے راستے پر شمال کی طرف نکل گئے۔

میرا تصور مجھے بہت سے تکلیف دہ منظر دکھا رہا تھا۔ چچی کی آہ و زاری اور سینہ کوبی، اسفند اور راحیل کا اپنے باپ کی موت پر دھاڑیں مار کر رونا، تاجور کی حالتِ زار اور بہت کچھ۔ میں نے ایک طویل ٹھنڈی سانس لی اور گاڑی اسٹارٹ کرنے اور سرکنڈوں سے نکلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ میری منزل پھر لاہور کے مضافات میں ہاناوانی کا ''آستانہ'' تھی۔

ابھی میں گاڑی اسٹارٹ کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ ناگاہ میری نظر آسمان کی طرف اٹھ گئی۔ نیلا آسمان صاف نظر آ رہا تھا مگر اس آسمان پر جو کچھ دکھائی دیا، اس نے مجھے سرتاپا ہلا دیا۔ میں نے آنکھیں سکیڑ کر دیکھا اور لرز گیا۔ یہ پرندے تھے...... یہ انہی رنگین پروں والے طوطوں کا جھنڈ تھا جو اس سے پہلے تین دفعہ موت بن کر لوگوں پر جھپٹ چکے تھے اور یہ کوئی چھوٹا جھنڈ نہیں تھا، اس میں سیکڑوں طوطے تھے۔

''یا اللہ خیر۔'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ اس کے ساتھ ہی میرے دل نے گواہی دی کہ یہ کوئی عام جھنڈ نہیں ہے یہ وہی خاص جھنڈ ہے جو دہشت اور ہلاکت کی علامت بنا ہوا ہے۔

اس جھنڈ کا رخ سکھیرا گاؤں کی جانب ہی تھا اور ابھی چند منٹ پہلے مولوی حبیب اللہ بھی سکھیرا گاؤں کے رخ پر گئے تھے۔ کیا یہ جھنڈ مولوی حبیب اللہ کے تعاقب میں یہاں پہنچا تھا؟ میری سمجھ میں اور تو کچھ نہیں آیا، میں نے کورے اسٹارٹ کی، اسے سرکنڈوں والی گیلی زمین سے نکالا اور حتی الامکان رفتار سے مولوی صاحب والی گاڑی کی طرف لپکا۔ یہاں سے سکھیرا گاؤں کا فاصلہ چودہ پندرہ میل سے کم نہیں تھا...... اور میرا اندازہ یہی تھا کہ مولوی صاحب والی دونوں گاڑیوں نے ابھی بمشکل تین چار میل کا فاصلہ طے کیا ہوگا۔ کورے میرا پورا ساتھ دے رہی تھی۔ سڑک میں کھڈے تھے، وہ دو دو فٹ فضا میں اچھل رہی تھی اور دوڑتی چلی جا رہی تھی۔ ڈرائیونگ کے ساتھ ساتھ میں بار بار آسمان کی طرف دیکھ لیتا تھا...... پرندے مجھ سے کچھ آگے تھے، وہ تیز رفتاری سے پرواز کر رہے تھے اور ان کی بلندی پہلے سے کچھ کم ہو گئی تھی۔ صبح کے دودھیا اجالے میں مجھے ان گاڑیوں کی دھول

آنا شروع ہوگئی جو مولوی صاحب کی گاڑی کے ساتھ نا کے سے روانہ ہوئی تھیں۔ ان میں ایک گاڑی پولیس کی بھی تھی۔ یعنی یہ کل تین گاڑیاں تھیں۔ پرندوں کی بلندی کم ہوتے دیکھ کر میرے اندیشے بڑھ گئے، کہیں وہ جارحیت پر آمادہ تو نہیں ہو رہے تھے۔

اگلے دس پندرہ سیکنڈ میں میرا یہ خوف بالکل درست ثابت ہوا۔ میں نے ان خونی پرندوں کو اچانک ان تینوں گاڑیوں پر حملہ آور ہوتے دیکھا۔ وہ شہد کی مشتعل مکھیوں کی طرح گاڑیوں پر جھپٹے تھے۔ مولوی حبیب صاحب والی سفید ٹویوٹا کار سب سے آگے تھی۔ میں نے اسے بری طرح لہراتے اور پھر ایک درخت سے ٹکرا کر الٹتے دیکھا۔ پیچھے آنے والی کار بھی بری طرح لہرا رہی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی بھی کوئی کھڑکی کھلی ہوئی ہے اور خونی طوطے اس کے اندر گھسنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ یہ گاڑی بری طرح گھومی اور ایک کھیت میں جا گھسی۔

میں نے اپنی گاڑی کے شیشے اچھی طرح چڑھا لیے تھے۔ جب میں موقع پر پہنچا تو ایک دلدوز منظر نظر آیا۔ پولیس کی موبائل بھی رک چکی تھی۔ خوشی محمد نامی حوالدار اور اس کے دو کانسٹیبل جنونی طوطوں کی زد میں تھے۔ طوطوں نے ان کو تقریباً چھپا لیا تھا۔ تنومند حوالدار بری طرح لوٹ پوٹ ہو رہا تھا اور ساتھ ساتھ فائرنگ بھی کرتا چلا جا رہا تھا مگر یہ بالکل بے سود فائرنگ تھی۔

وہ کانسٹیبل جسے وحید شاہ نے نو بیاہتا کہا تھا، زمین پر گر پڑا تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں سے طوطوں کو نوچ نوچ کر پھینک رہا تھا لیکن جتنے وہ نوچتا تھا، اس سے دو گنا مزید آ جاتے تھے۔ وہ چلا رہا تھا۔ ''بچاؤ...... بچاؤ......'' اس کی پکار دردناک تھی۔

میں نے کھڑکی کا شیشہ تھوڑا سا نیچے اتارا اور مشین پسٹل کا بیرل باہر نکال دیا۔ میں نے انگلی ٹریگر پر رکھی ہوئی تھی مگر میں کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ یہ بے بسی سی بے بسی تھی...... زندگی میں شاید پہلی بار ایک ایسی سچویشن سے پالا پڑ رہا تھا جس میں میری ساری فائٹنگ اسپرٹ بے فائدہ تھی، آتشیں ہتھیار کسی کام کے تھے اور نہ مارشل آرٹ کی مہارت۔ یہ چھوٹے چھوٹے خوش رنگ طوطے میری نگاہوں کے عین سامنے تین چار افراد کی جان لے رہے تھے مگر میں دیکھنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

مولوی حبیب صاحب کے ساتھیوں میں ایک باریش شخص دوڑتا ہوا میرے پاس سے گزرا۔ بیس پچیس طوطے اس سے بھی چمٹے ہوئے تھے۔ وہ اس کی آنکھوں پر حملہ آور تھے اور اس کی شہ رگ نوچ رہے تھے۔ قریب ہی ایک بارشی جوہڑ کی جھلک نظر آ رہی تھی۔

میں نے اس شخص کو مخاطب کیا اور پکار کر کہا۔ ''سامنے پانی ہے، اس میں کود جاؤ۔''
اس نے میری آواز سنی اور اپنا رخ جوہڑ کی طرف کیا لیکن جوہڑ کے کنارے پر وہ گر پڑا۔ پھر اس سے اٹھا نہیں گیا۔ درجنوں مزید طوطے اس پر ٹوٹ پڑے۔ یہ قیامت صغریٰ کا منظر تھا۔ مولوی صاحب والی گاڑی تناور درخت سے ٹکرا کر پہلو کے بل الٹ گئی تھی۔ میں کورے کو چلا کر اس گاڑی کے بالکل پاس لے گیا۔ اس کی جو کھڑکیاں ٹوٹی تھیں، وہ زمین کی طرف تھیں۔ باقی کھڑکیاں سلامت تھیں۔ طوطے ان کھڑکیوں پر جھپٹ رہے تھے مگر اندر نہیں جا سکتے تھے۔ میں نے عقبی اسکرین کی طرف سے دیکھا۔ مجھے مولوی حبیب صاحب کا خونچکاں چہرہ نظر آیا۔ شدید تصادم کے سبب ان کی روشن پیشانی کا ایک حصہ زخمی اور پچکا ہوا نظر آتا تھا۔ گردن بھی عجیب انداز سے ایک سائڈ پر ڈھلکی ہوئی تھی۔ میرے سینے سے ایک ٹیس سی اٹھی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ تاجور کے غمگسار اور ہردلعزیز ماموں اب زندہ نہیں ہیں۔ جنونی طوطے وزنی پتھروں کی طرح کورے گاڑی کی باڈی اور اس کے شیشوں سے ٹکرا رہے تھے......

بڑی خوفناک صورتِ حال تھی۔ میں گاڑی کے شیشے نیچے نہیں اتار سکتا تھا۔ میں ان خونی طوطوں پر فائر نہیں کر سکتا تھا، میں کسی کو مدد کے لیے نہیں بلا سکتا تھا۔ وہ سیکڑوں کی تعداد میں تھے اور میری نگاہوں کے سامنے لوگوں کی جان لے رہے تھے۔

میں نے گاڑی کے اندر بیٹھے بیٹھے چند لمحوں کے لیے اپنی آنکھیں بند کر لیں...... میں جیسے خود کو یقین دلانے کی کوشش کرنے لگا کہ آنکھیں بند کرنے سے پہلے جو کچھ میں نے دیکھا ہے، وہ اور کچھ بھی نہیں، بس میری جاگتی آنکھوں کا ایک خواب ہے لیکن یہ خواب نہیں تھا۔ یہ ایک حقیقت تھی اور بڑی ہی لرزہ خیز۔ کم از کم چار افراد جان کنی کے عالم میں تھے۔ ان کے چلانے کی دردناک صدائیں بند گاڑی کے اندر بھی میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں اور پھر میں نے آنکھیں کھول دیں۔ ایک بار پھر الٹی ہوئی گاڑی کی عقبی اسکرین میں سے مولوی حبیب اللہ کو دیکھا۔ وہ بالکل بے حرکت تھے۔ پیشانی کا ایک حصہ زوردار تصادم سے اندر کی طرف پچک چکا تھا۔ یقین سے تو کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا مگر لگتا یہی تھا کہ وہ زندہ نہیں ہیں۔

پندرہ بیس سیکنڈ مزید گزرے اور پھر یکایک میں نے محسوس کیا کہ پرندے فضا میں بلند ہو رہے ہیں۔ وہ چار پانچ ٹولیوں کی صورت میں چکرائے پھر ان کی بلندی میں اضافہ ہوا۔ انہوں نے ایک بڑے جھنڈ کی شکل اختیار کی اور وہ مزید اوپر اٹھنے لگے۔ ہاں...... وہ

جارہے تھے ...... وہ "شکار افراد" کو چھوڑ کر جا رہے تھے لیکن ان کے شکار زندہ کہاں تھے۔ وہ تو لاشوں کی شکل اختیار کر چکے تھے۔

میں نے پرندوں کا رخ دیکھا اور اس سنگین ترین صورتِ حال میں بھی اطمینان کی ایک لہر سی محسوس ہوئی۔ پرندوں کا رخ سکھیرا گاؤں کی طرف نہیں تھا۔ وہ مشرقی رخ پر تھے۔ اسی طرف جا رہے تھے، جدھر سے آئے تھے۔

میں نے اپنی شناخت چھپانے کے لیے چہرے پر چھوٹے سائز کی گرم چادر ایک ڈھاٹے کی طرح لپیٹ لی۔ کورے کار کا دروازہ کھولا اور الٹی ہوئی ٹویوٹا کار کی طرف لپکا۔ سفید ٹویوٹا اپنے پہلو کے بل تھی۔ میں نے اوپر والے دروازے کھولنے کی کوشش کی لیکن ناکامی ہوئی۔ وہ بری طرح پھنس چکے تھے۔ میں نے کورے کے پیچھے سے آہنی جیک نکالا اور اس کی ضربوں سے ٹویوٹا کار کی عقبی اسکرین توڑ دی۔

گاڑی میں مولوی حبیب سمیت کل چار فراد تھے۔ ان میں سے فقط ایک ہوش میں تھا۔ یہ باریش نوجوان ڈرائیور کے ساتھ والی نشست پر بیٹھا تھا۔ اس کی ناک بھی سخت زخمی تھی۔ "مولوی صاحب ...... مولوی صاحب۔" اس نے حبیب صاحب کا کندھا پکڑ کے بری طرح جھنجوڑا۔

"ان کو باہر نکالنے کی کوشش کرو۔" میں نے چلا کر کہا۔

ہم نے مولوی حبیب صاحب کو باہر کھینچنا چاہا۔ باریش شخص نے بھی اس میں ہاتھ بٹایا لیکن پھر اس نے ایک دم اپنے ہاتھ پیچھے ہٹا لیے اور دہاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ "مولوی جی! یہ کیا ہو گیا؟ اے میرے مولا ...... اے میرے مولا۔" وہ کہتا چلا گیا۔

میں نے اندازہ لگایا کہ اس نے مولوی صاحب کی کمر کی طرف کوئی گہرا زخم دیکھا ہے۔ یہ اندازہ بالکل درست نکلا۔ میں نے اپنا اگلا دھڑ تھوڑا سا آگے کی طرف کھسکایا تو میری نگاہ مولوی حبیب اللہ صاحب کی کمر پر دونوں کندھوں کے درمیان پڑی۔ وہاں گاڑی کی نشست کا کوئی آہنی، نوک دار حصہ ٹوٹ کر لگا تھا اور جان لیوا زخم دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے قریب سے مولوی صاحب کی آنکھوں میں جھانکا اور مجھے یقین ہو گیا کہ وہ مدد اور طبی امداد وغیرہ کی ساری ضرورتوں سے بے نیاز ہو چکے ہیں۔ سینے میں دکھ کا گاڑھا دھواں بھر گیا۔ میں نے ان کی خوب صورت ہموار داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ ان کے کندھے پر بوسہ دیا اور پیچھے ہٹ گیا۔

میں نے دیکھ لیا تھا کہ مولوی حبیب اللہ کے وہ ساتھی جو طوطوں کے حملے سے بچ گئے

ہیں، واپس آ رہے ہیں اور الٹی ہوئی ''ٹویوٹا'' کی طرف لپک رہے ہیں۔ میں کسی کے سامنے آنا نہیں چاہتا تھا۔ میں جلدی سے واپس کورے میں بیٹھ گیا۔ آنسوؤں کے سبب نظر دھندلا رہی تھی۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور سرعت کے ساتھ اسے موڑ کر وہاں سے نکل آیا۔ ہموار جگہ سے گزرتے ہوئے میری نگاہ ان دو لاشوں پر پڑی جنہیں طوطوں نے نوچا تھا۔ وہ ایک ہولناک منظر تھا۔ نہر کے عین کنارے پر گرے شخص کا چہرہ خون سے لتھڑ کر ناقابلِ شناخت ہو چکا تھا۔ اس کی شہ رگ کی جگہ ایک گہرا خونی گھاؤ نظر آ رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں پر بھی اَن گنت زخم تھے۔ قریب ہی پولیس کا باوردی حوالدار خوشی محمد پڑا تھا۔ اس کے جسم پر بھی بے شمار زخم تھے مگر سب سے بڑا زخم جسے گھاؤ کہنا چاہیے اس کے پیٹ پر تھا۔ اس کا پیٹ اُدھڑ چکا تھا۔ میں زیادہ دیر ان مناظر پر نگاہ نہیں جما سکا اور تیزی کے ساتھ وہاں سے نکل آیا۔

سنسنی کی ایک ہولناک لہر تھی جو ہوا میں فضا میں اور گرد و پیش کی ہر شے میں دوڑ رہی تھی۔ ہاناوانی کے حوالے سے جو بدترین خدشات موجود تھے، وہ حقیقت کا روپ دھار رہے تھے۔ وہ ہر طرف مار کر رہی تھی۔ انتقام میں اندھی ہو کر اپنی ''ہٹ لسٹ'' میں موجود ہر شخص پر حملہ آور ہو رہی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے جو واقعہ رُونما ہوا تھا، اس میں پرندوں کی تعداد نے بھی مجھے ششدر کیا تھا۔ پہلے واقعے میں جس میں بھاؤ کا اہم ساتھی عاشق جٹ ہلاک ہوا تھا، ان پرندوں کی تعداد تین چار درجن سے زائد نہیں تھی لیکن جب کچھ دن بعد یہ پرندے دارج کے قافلے پر حملہ آور ہوئے تو یہ ڈھائی تین سو کے لگ بھگ تھے مگر اب اس تازہ واقعے میں، یہ کم و بیش دگنی تعداد میں دکھائی دیئے تھے۔ یہ عجیب ''دشمن'' تھے۔ انہیں شوٹ نہیں کیا جا سکتا تھا، انہیں پکڑا نہیں جا سکتا تھا، کسی دھماکے میں نہیں اُڑایا جا سکتا تھا۔ یہ ہر جگہ پہنچ رہے تھے، ہر نشانے پر آزادانہ حملہ کر رہے تھے۔ یہ ایک بہت بڑا قاتل جھنڈ تھا۔ اس سے دفاع ناممکن دکھائی دے رہا تھا۔

گوجرانوالا کے قریب ایک ہوٹل کے اندرونی احاطے میں، میں نے گاڑی روک دی اور سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ مولوی حبیب اللہ کی نورانی صورت مسلسل نگاہوں میں گھوم رہی تھی۔ وہ اپنے بہنوئی (دین محمد صاحب) کے انتقال کی اطلاع پر سکھیرا گاؤں کی طرف جا رہے تھے اور جان لیوا حادثے کا شکار ہوئے تھے۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق ان کے کم از کم تین ساتھی بھی اس سانحے میں لقمۂ اجل بنے تھے۔ پرندوں کی یلغار سے جان ہارنے والے پولیس اہلکاروں کی تعداد بھی تین کے لگ بھگ تھی۔

میں نے نشست کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کیں اور سوچنے لگا۔ مجھے سب سے پہلے تاجور کی والدہ اور بھائیوں کا سوچنا چاہیے تھا۔ وہ کسی بھی وقت ہاناوانی کے قہر کا شکار ہو سکتے تھے۔ اگر پرندے آج یہاں تک آئے تھے تو کل سکھیرا گاؤں کے اندر بھی پہنچ سکتے تھے لیکن میرا مسئلہ یہ تھا کہ میری طنابیں ہاناوانی کے ہاتھ میں تھیں۔ کم از کم وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ طنابیں اس کے ہاتھ میں ہیں۔ میں سکھیرا نہیں جا سکتا تھا۔ مجھے ہاناوانی کے پاس پہنچنا تھا۔

یہاں ہوٹل کے احاطے میں آتے ہی میں نے موبائل فون سامنے والی پان شاپ پر چارجنگ کے لیے دے دیا تھا۔ موبائل اب چارج ہو چکا تھا۔ خوش قسمتی تھی کہ ابھی سم بند نہیں ہوئی تھی۔ میرے پاس سیف کی بہن شازیہ کا نمبر موجود تھا۔ میں نے اس سے کال ملائی۔ کچھ دیر بعد اس کی پژمردہ آواز سنائی دی۔ ''ہیلو کون؟'' پس منظر میں عورتوں کے رونے کی بلند آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ''شازیہ! میں شاہ زیب بول رہا ہوں۔ تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ تم کسی کمرے میں چلی جاؤ جہاں شور نہ ہو۔''

قدموں کی چاپ سنائی دی پھر دروازہ بند ہونے کی آواز آئی۔ تب شازیہ جیسے پھٹ پڑی۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے...... یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ ہم پر قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ چاچا دین محمد ہم میں نہیں رہے۔ لوگ جو باتیں بنا رہے ہیں، وہ سنی نہیں جا رہیں۔'' وہ ہچکیوں سے رونے لگی۔

''کیا باتیں بنا رہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

وہ پہلے چپ رہی، پھر ہمت جمع کر کے بولی۔ ''میں کیا بتاؤں۔ میری ہمت نہیں ہو رہی...... وہ کہتے ہیں...... چاچے دین محمد کو آپ نے مارا ہے۔ گاؤں کے ہی کسی بندے نے آپ کو اندھیرے میں چاچے کے گھر سے نکلتے دیکھا ہے۔ آپ والی گاڑی کو بھی دیکھا گیا ہے۔'' شازیہ کی آواز میں رنج اور غم و غصے کا دریا سا بہہ رہا تھا۔

میں سناٹے میں رہ گیا۔ یہ سب اسی سازش کا تانا بانا لگ رہا تھا جس کے تحت مجھے سکھیرا گاؤں جانا پڑا تھا۔ شازیہ کی اشکبار صدا پھر میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ''تاجور کے بڑے 'ماموں بھی نہیں رہے۔ ان کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ لوگ پرندوں کی باتیں کر رہے ہیں۔ پپ...... پرندے جو چلتی گاڑی پر حملہ کر دیتے ہیں۔ یہاں گاؤں میں ہر کوئی ڈرا ہوا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ ایکسیڈنٹ والی جگہ پر بھی کچھ

لوگوں نے آپ کو دیکھا ہے......'' وہ روتی چلی جا رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ''شازیہ! دین محمد صاحب والی خبر مجھ تک پہنچ گئی ہے۔ تم لوگوں کی باتوں کو چھوڑو، تم صرف اپنے دل سے پوچھو...... کیا میں ایسا ہو سکتا ہوں؟ کیا میں دین محمد صاحب کی جان لے سکتا ہوں؟''

''مجھے کچھ پتا نہیں۔ سب یہی باتیں کر رہے ہیں۔ یا اللہ...... یا اللہ۔'' وہ بے قراری میں بولتی چلی گئی۔

''میری بات سنو شازیہ۔'' میں نے اسے بمشکل روکا۔ ''میں نے فی الوقت تمہیں صرف یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے کہ جن لوگوں نے چاچے دین محمد اور مولوی حبیب صاحب کو مارا ہے، وہ مزید نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ سب سے زیادہ خطرہ تاجور کے گھر والوں کو ہے، جن پرندوں کی بات کی جا رہی ہے، وہ عام پرندے نہیں ہیں۔ وہ کسی کے بھیجے ہوئے ہیں۔ وہ سکھیرا گاؤں میں بھی پہنچ سکتے ہیں۔ تم تاجور کے چھوٹے ماموں یا گھر کے کسی اور بڑے سے میری بات کراؤ۔ میں ان کو کچھ سمجھانا چاہتا ہوں......''

وہ بھیگے لہجے میں عجیب رکھائی کے ساتھ بولی۔ ''مجھے نہیں لگتا کہ ان لوگوں میں سے کوئی آپ کے ساتھ بات کرنا پسند کرے گا...... ابھی بہت...... غصے میں ہیں سب۔''

میں نے چند لمحے کے توقف کے بعد کہا۔ ''میں نازک صورتِ حال دیکھ رہا ہوں۔ چاچا دین محمد کے مرنے کی خبر یقیناً تاجور تک بھی پہنچ گئی ہوگی۔ وہ بھی کچھ دیر میں گاؤں آجائے گی۔ اسے بھی بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہوگی۔ یہ پرندے کھلی جگہ پر کسی بھی وقت حملہ کر سکتے ہیں۔ تم خود بھی خطرے سے باہر نہیں ہو شازیہ۔ تم سب کو بھی بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ اگر کسی بڑے سے میری بات ہو جاتی تو......''

میں بول رہا تھا لیکن پھر مجھے اندازہ ہوا کہ شازیہ فون بند کر چکی ہے۔ اس کا ''رویہ'' سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ دین محمد صاحب کے حوالے سے وہ مجھے ذمے دار سمجھنے پر مجبور ہو رہی تھی۔

صورتِ حال نے بے حد غیر متوقع پلٹا کھایا تھا۔ سوال بار بار ذہن میں ابھر رہا تھا، کیا یہ ہاناوانی ہی ہے جو مجھے عام لوگوں کی نظر میں دین محمد صاحب کا قاتل دیکھنا چاہتی ہے؟

میں نے قسطینا کا نمبر پریس کیا اور پہلی کوشش میں ہی اس سے رابطہ ہو گیا۔ وہ یہ نمبر پہچانتی تھی۔ اس نے فوراً کال ریسیو کر لی تھی۔

''یہ کیا ہو رہا ہے شاہ زائب؟'' وہ چھوٹتے ہی بولی۔ ''پہلے ڈین محمد صاحب کے بارے میں خبر ملی اور پھر مولانا حابیب کے بارے میں۔''

''ہاں قسطینا! یہ دونوں واقعات ہو چکے ہیں مگر دین محمد صاحب کے سلسلے میں ایک زبردست اتفاق ہوا ہے۔ وہ میرے پہنچنے سے پہلے ہی اپنی سانسیں پوری کر چکے تھے۔''

یقیناً وہ حیران ہوئی تھی۔ توقف کے بعد بولی۔ ''لیکن کہا تو یہ جا رہا ہے کہ انہیں شوٹ کیا گیا ہے۔''

میں نے مختصر ترین الفاظ میں قسطینا کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ وہ حیرت سے سنتی رہی۔ مجھے بیک گراؤنڈ میں پہلوان جی کے کھانسنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے اس بارے میں پوچھا تو قسطینا نے بتایا کہ وہ پہلوان حشمت اور وارث لودھی کے ساتھ اسی وقت سکھیرا گاؤں روانہ ہو رہی ہے۔

''وہ کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''میں یہاں اس طرح چوہے کی طرح دبک کر نہیں بیٹھ سکتی۔ وہ باسٹرڈ خونخوار ہو رہی ہے، لوگوں کی جانیں لے رہی ہے اور میرے خیال میں اس وقت سب سے زیادہ خطرہ تاجور اور اس کی فیملی کو ہے۔ وہ ان کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا سکتی ہے۔''

''آپ کا یہ خیال تو سو فیصد درست ہے۔''

''اور میں یہ بھی جانتی ہوں شاہ زائب کہ تم ان کی حفاظت کے لیے کچھ نہیں کر سکتے اور تمہیں کرنا بھی نہیں چاہیے۔ یہ تمہاری مجبوری ہے۔ تم خود کو ہاناوانی کے ٹرانس میں ظاہر کر رہے ہو۔ ڈین محمد صاحب کی موت کے بعد اپنے ٹرانس پر ہاناوانی کا یقین پختہ تر ہو گیا ہو گا۔ کیا خیال ہے تمہارا؟''

''آپ بات کی تہ تک پہنچی ہوئی ہیں۔''

وہ گہری سانس لے کر بولی۔ ''ہم سب کے لیے یہی بہتر ہے کہ تم اپنا یہ روپ برقرار رکھو۔ تم ہاناوانی کے حصار میں واپس چلے جاؤ...... اور موقع ڈھونڈو شاہ زائب! یہ خونی عورت مرے گی تو یہ تباہی ختم ہو گی۔''

میں نے ہنکارا بھرا۔ وہ ذرا توقف سے بولی۔ ''ہم ان پرندوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ان کی تعدادِ مسلسل بڑھ رہی ہے۔ وہ جہاں اور جب چاہتے ہیں حملہ کرتے ہیں۔ ہمیں ان کی بنیاد کو ختم کرنا ہو گا۔ اس فتنہ زادی کی کھوپڑی توڑنا ہو گی۔'' قسطینا کے لہجے میں شعلوں کی پھنکار تھی۔

قسطینا کی باتوں سے پتا چلا کہ اس کے ذہن میں یہ خطرہ بھی موجود ہے کہ سکھیرا گاؤں میں جنازے پر بھی پرندوں کا حملہ ہو سکتا ہے...... اس کے علاوہ بھی کچھ قرار واقعی اندیشے اس کے ذہن میں گھوم رہے تھے۔

میں نے کہا۔ ''قسطینا! میں آپ کو کسی طرح کی ہدایت جاری کرنے کا اہل تو نہیں ہوں مگر مجھے یہی لگتا ہے کہ آپ کو اس طرح اس محفوظ ٹھکانے سے باہر نہیں نکلنا چاہیے...... میں ہوں ناں باہر...... میں ہینڈل کرلوں گا ان معاملات کو۔''

''شاہ زائب، تم ان معاملات کو اپنے معاملے کیوں سمجھ رہے ہو، یہ میرے بھی معاملے ہیں۔ فارس جان کا ابھی تک کچھ پتا نہیں۔ نوے فیصد امکان اس بات کا ہے کہ وہ بھی ہاناوانی کے قبضے میں ہے۔ ہاناوانی سے ٹکرائیں گے نہیں تو کیا کریں گے؟''

''قسطینا! آپ یہاں پاکستان میں میرے لیے مہمان کی طرح ہیں۔ آپ کو کوئی نقصان پہنچا تو میرے لیے جھیلنا بہت مشکل ہوگا۔''

وہ خاموش رہی۔ چند سیکنڈ بعد اس کی آواز ابھری۔ ''جو نقصان پہنچنا تھا، وہ تو بہت پہلے پہنچ چکا شاہ زائب...... اب تو ہر نقصان چھوٹا ہی محسوس ہوتا ہے۔''

اس کے لہجے کی معنی خیزی نے مجھے منفعل کیا...... وہ جن واقعات کی طرف اشارہ کر رہی تھی، وہ میرے ذہن میں ہنوز تازہ تھے۔ میرے کہنے پر ہی اس نے اپنے سینے کے اندر اپنی محبت کا گلا گھونٹا تھا اور میری ہی درخواست پر کمانڈر فارس جان سے شادی کرلی تھی۔ قسطینا اور فارس جان کی محبت یکطرفہ تھی۔ وہ اس پر فدا تھا اور قسطینا صرف رشتہ نبھا رہی تھی، خوش اسلوبی کے ساتھ۔

میں نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''قسطینا! میں جانتا ہوں آپ جو ارادہ کر لیتی ہیں، اس سے آپ کو باز رکھنا مشکل ہوتا ہے مگر میری بات پر غور ضرور کیجیے گا۔''

''مشورے کا شکریہ شاہ زائب! تم بھی اپنا خیال رکھنا۔''

قسطینا سے بات ختم کرنے کے بعد میں آئندہ کا لائحہ عمل سوچنے لگا۔ یہ بات تو اچھی طرح سمجھ میں آرہی تھی کہ اب مجھے یہ کورے کار چھوڑ دینی چاہیے۔ علاقے میں دو سنگین ترین واقعات رُونما ہو چکے تھے اور دونوں واقعات میں اس گرے کورے گاڑی کا نام آرہا تھا۔

یہی وقت تھا جب میری نگاہ تھوڑے ہی فاصلے پر کھڑے ایک سوزوکی ڈبے پر پڑی اس کی پچھلی نشست پر غالباً گیس ہیٹرز کے پُرزہ جات وغیرہ رکھے تھے۔ مجھے شک گزرا کہ

اس کا ایک دروازہ لاک نہیں ہے۔ اردگرد کوئی موجود نہیں تھا۔ تسلی کرنے کے بعد میں نے کورے کی نشست کے نیچے سے مشین پسٹل نکال کر اپنی پتلون کے پائنچے کے نیچے جراب میں گھسیڑ لیا۔ بریٹا پسٹل جیکٹ کی اندرونی نشست پر پہنچ گیا۔ ہر کوئی اپنے حال میں مگن تھا۔ میں نے ڈیش بورڈ کے نیچے ہاتھ گھسایا اور تاروں کو جوڑ کر گاڑی اسٹارٹ کر لی۔ یہ سب کچھ دومنٹ کے اندر اندر ہو گیا۔ میں سوزوکی سمیت ہوٹل کے احاطے سے باہر تھا۔

اب دن کے دس بجنے والے تھے۔ یہ ایک سرد اور جزوی طور پر ابر آلود دن تھا۔ سورج کافی اوپر آچکا ہوگا مگر سڑکوں پر دھند موجود تھی۔

میں گوجرانوالہ کے اندرونی حصے سے نکل کر مین روڈ پر پہنچا ہی تھا کہ پولیس کا ایک بڑا ناکا نظر آ گیا۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ میں گاڑی کو بغلی سڑک پر موڑ لیتا۔ میں نے رفتار تھوڑی سی بڑھائی اور نکل جانا چاہا۔ وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ دو باوردی اہل کاروں نے سڑک کے درمیان کھڑے ہو کر مجھے روک لیا۔ دو چار مزید گاڑیاں بھی رکی ہوئی تھیں۔ یہ ایک بارونق گنجان علاقہ تھا۔ یہاں کسی طرح کا ایڈونچر میرے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ آٹومیٹک رائفلوں سے مسلح دو رائفل بردار بالکل الرٹ کھڑے تھے۔ چاروناچار میں نے گاڑی روک دی۔ ایک کرخت صورت انسپکٹر نے گاڑی کے اندر جھانکا۔ گاڑی کی حالت زیادہ اچھی نہیں تھی۔ میرا حلیہ بھی ابتر ہو رہا تھا۔ اس نے درشت لہجے میں پوچھا۔ ''کہاں سے آرہے ہو جوان؟''

''گجرات سے جی...... لاہور جارہا ہوں دکان کا سامان لے کر۔''

''کاغذ دکھاؤ گاڑی کے۔'' درشت لہجے میں کہا گیا۔

میری جانے بلا کہ کاغذ کہاں ہیں اور ہیں بھی یا نہیں؟ میں نے ڈیش بورڈ کے خانے میں دائیں بائیں ہاتھ گھمایا، کچھ نہیں ملا۔

''رجسٹریشن تو گھر بھول آیا ہوں جی۔'' میں نے سکہ بند عذر پیش کیا۔

''باہر آجاؤ۔'' حکم صادر ہوا۔

کچھ پس و پیش کے بعد میں باہر نکل آیا۔ انسپکٹر نے ایک حوالدار کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تلاشی لو اس کی۔''

یہ خطرناک مرحلہ تھا۔ دونوں ہتھیار میرے لباس میں موجود تھے۔ مشین پسٹل پنڈلی کے ساتھ اور چھوٹا بریٹا پسٹل چرمی جیکٹ کی اندرونی جیب میں۔ میں نازک صورتِ حال کے لیے تیار ہو گیا۔ مگر آفرین ہے تلاشی لینے والے پر۔ اس نے لگے بندھے انداز میں

میرے جسم اور ٹانگوں پر ہاتھ چلایا...... چھینے ہوئے موبائل اور تھوڑی سی نقدی کے سوا اور کچھ نہیں ملا۔ انسپکٹر کو دکھا کر اس نے یہ چیزیں دوبارہ میری جیب میں ڈال دیں۔ انسپکٹر ہی کے حکم پر ایک کانسٹیبل گاڑی کے سامان کو بھی الٹ پلٹ کر رہا تھا۔

تان آکر اس بات پر ٹوٹی کہ میرے پاس گاڑی کا کوئی کاغذ نہیں ہے اور شناختی کارڈ یا اس کی کاپی وغیرہ بھی اپنے پاس موجود نہیں رکھتا۔ ''میری گاڑی'' تھانے میں بند ہونے کا حکم جاری ہوا۔

دستور کے مطابق میں نے تھوڑا سا منت ترلا کیا لیکن ہٹے کٹے حوالدار کو میرے ساتھ بٹھا دیا گیا اور گاڑی تھانے روانہ کر دی گئی۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ میری تو خود یہی منشا تھی کہ میں اس بارونق جگہ سے نکلوں جہاں درجن بھر پولیس اہلکاروں کے علاوہ ناکے کا تماشا دیکھنے کے لیے بھی دس بیس لوگ موجود تھے۔

ناکے کے انچارج انسپکٹر نے غالباً یہ سمجھ لیا تھا کہ حوالدار کو میرے ساتھ روانہ کر کے اس نے میرے بچاؤ کے تمام راستے مسدود کر دیئے ہیں اور اب میں قانونی تقاضے پورے کر کے ہی تھانے سے نکل پاؤں گا۔ تلاشی لینے والے حوالدار کی طرح انسپکٹر کی اہلیت اور ہوشیاری بھی ''قابلِ صد تحسین'' تھی۔ حسبِ رواج اور موقع میں نے راستے میں حوالدار کی تھوڑی سی منت سماجت بھی کی کہ وہ کچھ لے دے کر مجھے تھانے پہنچنے سے پہلے ہی سرخرو کر دے مگر ایسے موقعوں پر ماتحت اہلکار عموماً شکار کو تھانے پہنچا کر ہی چھوڑتے ہیں۔

اسی دوران میں حوالدار کے فون پر کال آ گئی۔ اس نے اپنے تنومند جسم کو بمشکل ہلا جلا کر خاکی پتلون کی جیب میں سے موبائل نکالا اور بولا۔ ''ہیلو رانا! کیا بات ہے؟ کہاں سے بول رہے ہو؟''

''یار وہیں پھنسا ہوا ہوں مولوی والے بنگلے میں۔ چھ موتیں ہوئی ہیں۔ دو بندے سخت زخمی ہیں۔ مرنے والوں میں دو ملازم بھی ہیں۔ وہ حوالدار خوشی محمد نارووال والا...... وہ بھی لگا گیا ہے۔'' بولنے والے کی آواز میں غم وغصہ تھا۔ اس کی آواز موبائل فون کے اسپیکر سے نکل کر صاف مجھ تک پہنچ رہی تھی۔

میرے ساتھ بیٹھے تنومند حوالدار نے کہا۔ ''ہاں، ہمیں بھی پتا چلا ہے خوشی محمد کے بارے میں۔ پر یار! یہ پرندوں اور پکھیروؤں کی باتیں کیا ہو رہی ہیں۔ ...ی ہی باتیں پہلے دو تین دفعہ اخباروں میں بھی چھپی ہیں......''

دوسری جانب سے دانش مندانہ لہجے میں کہا گیا۔ ''یہ سب کچھ یہاں ہوا ہے یار

کرامت...... سب کچھ ہوا ہے۔ میں نے اپنی اکھیوں سے دیکھا ہے۔ اللہ ماف کرے۔ لاشوں کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ وہ حرامی طوطے نوچ نوچ کر کھا گئے ہیں سارا ماس...... گردنیں اُدھیڑ دی ہیں...... پیٹ پھاڑ دیئے ہیں۔ یہ پکی...... بالکل پکی بات ہے کہ یہ سکھائے ہوئے طوطے ہیں۔ جیسے لوگ دوسرے جناوروں کو سکھاتے ہیں، شکاری کتوں کو اور بازوں کو......"

"پر رانا، یہ سب کچھ کر کون رہا ہے؟"

"اندر کی بات کا تو وڈے افسروں کو ہی پتا ہوگا۔ مگر اتنی بات تو ہم جیسے جاہلوں کی سمجھ میں بھی آرہی ہے کہ جادو ٹونے والی ساری باتیں بیکار ہیں، یہ کوئی بہت کھوچل قسم کا بدمعاش ٹولا ہے جو ان "جناوروں" کے ذریعے وارداتیں ڈال رہا ہے۔ ہمارے گجرات والے ڈی ایس پی صاحب کا تو یہ خیال ہے کہ یہ لوگ باندروں، چمگادڑوں اور طوطوں وغیرہ کے ذریعے بارڈر ایریا میں کام کرتے ہیں۔ اِدھر کا مال اُدھر پہنچاتے ہیں۔ تمہیں پتا ہی ہے پچھلے دنوں ایک سدھایا ہوا باندر کلر کہار کے قریب مارا بھی گیا ہے۔"

"باندر نہیں رانا...... باندری تھی۔ اور یہ وہی تھی جس نے لاہور میں بھی ایک ہوٹل میں وڑ کر بندے پھٹل کیے تھے۔"

"چلو جو بھی ہے لیکن یار...... آج تو یہ لاشیں دیکھ کر کلیجا، دل، پھیپھڑے سب کچھ منہ کو آ گیا ہے...... اور تم لوگ کیا کر رہے ہو یہاں؟"

"ہم نے بھی جی ٹی روڈ کے ساتھ ہی ناکا لگایا ہوا ہے، گرے رنگ کی گڈیوں کو خاص طور پر روک رہے ہیں...... ایک گرے کورے بھی روکی تھی لیکن وہ کلیئر نکلی......"

"اچھا ایک اور بات نوٹ کراؤ اپنے انسپکٹر کو۔" رانا جلدی سے بولا۔ "کورے گاڑی میں جو بندہ دونوں جگہ دیکھا گیا ہے اس کے ایک ہتھ پر پلستر بھی چڑھا ہوا ہے۔ اس کے بارے میں اور بھی بہت سی باتیں کہی جارہی ہیں پر کنفرم کچھ نہیں ہے۔ کچھ لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ وہی، داؤد بھاؤ کا ساتھی اور نامی گرامی بھگوڑا شاہ زیب ہے مگر سوچنے کی گل یہ ہے کہ......"

رانا اپنی روانی میں بولتا چلا جارہا تھا مگر میرے ساتھ بیٹھے حوالدار کرامت صاحب کی سوئی، ہاتھ پر چڑھے پلاستر پر اٹک گئی تھی۔ تلاشی کے دوران میں یہ لوگ میرے ہاتھ کا مختصر پلاستر دیکھ چکے تھے۔ حوالدار کرامت نے بات سنتے سنتے اپنا سر گھمایا اور اس کی ترچھی نظر میرے ہاتھ پر پڑی۔ اب چھپانے سے کچھ حاصل نہیں تھا۔ رانا سے ہونے والی گفتگو کو

یکسر فراموش کر کے اس نے دہشت زدہ نظروں سے میری طرف دیکھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہہ یا کر پاتا، میں نے اپنا بازو اس کی توانا گردن کے گرد حمائل کر دیا۔ گرفت اتنی سخت تھی کہ اس کا منہ کھلا رہ گیا۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے سوزوکی کا اسٹیئرنگ تھام رکھا تھا۔ اور وہ سڑک پر رواں تھی۔

میں نے اس کا چہرہ دیکھا، وہ کسی لاش کا چہرہ دکھائی دینے لگا تھا۔ میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''کرامت جی! تلاشی کا یہی طریقہ جاری رکھو گے تو کسی دن توپ بھی آپ کی ناک کے نیچے سے نکل جائے گی، آئندہ احتیاط کرنا۔''

اس کے ساتھ ہی میں نے اس کی گردن کا کڑاکا نکال دیا لیکن یہ ایسا کڑاکا نہیں تھا جو اس کی جان ہی لے جاتا۔ یہ بڑا محتاط قسم کا دھچکا تھا۔ وہ آدھ پون گھنٹے کے لیے بے ہوش ہوا تھا۔

اس کا موبائل فون اس کی جھولی میں گر گیا۔ وہ مسلسل آن تھا اور رانا صاحب (جو کوئی حوالدار یا اے ایس آئی تھے) مسلسل بولتے چلے جا رہے تھے۔ ان کی بھاری لیکن مدھم آواز اسپیکر سے ابھر رہی تھی۔ ''یار! اب پتا چلا ہے کہ وہ سکھیرا گاؤں کا زمیندار ہی نہیں، داراب فیملی کا قریبی رشتے دار بھی ہے۔ دین محمد نام ہے اس کا۔ یہ وہی بندہ ہے جس کی بیٹی سے دارابیوں کے پتر نے بڑا گج وج کے ویاہ کیا تھا۔ اس کے قتل نے سارے علاقے میں پسوڑی ڈال دی ہے۔ افسروں کی دوڑیں لگی ہوئی ہیں۔ اسلام آباد سے کئی وڈے لوگ ان دونوں جنازوں پر آ رہے ہیں...... اوئے سن رہا ہے ناں کرامت؟''

رانا نے ذرا چونک کر پوچھا۔ میں نے فون آف کر دیا۔

کچھ ہی دیر بعد میں نے یہ سوزوکی ڈبا ایک مارکیٹ کے عقب میں اس طرح کھڑا کر دیا کہ فوری طور پر کسی کی نگاہ بے ہوش حوالدار پر نہ پڑ سکے۔ ڈبے سے اتر کر میں سڑک پر آیا۔ ایک مسافر ویگن کو ہاتھ کے اشارے سے روکا اور اس میں سوار ہو گیا۔ ویگن لاہور جا رہی تھی۔ ویگن میں سوار ہونے سے پہلے میں نے گرم چادر کی بکل مار لی تھی۔

○......❖......○

قریباً تین گھنٹے بعد میں ایک بار پھر ایک معمول کی حیثیت سے اپنی عامل یعنی ہانا وانی کے ''آستانے'' پر موجود تھا۔ یہاں پہنچنے سے پہلے ہی میں نے چھینا ہوا موبائل فون ایک کھیت کے کنارے پانی کے گڑھے میں پھینک دیا تھا۔ بلند و بالا چھتوں والے اس م مینشن میں داخل ہوتے ہی میرا استقبال شاردا نے کیا جیسے میں بطور ہیرو کوئی بڑا کارنامہ

انجام دے کر واپس لوٹا ہوں۔

''آپ کی کامیابی کی خبر یہاں پہنچ چکی ہے شاہ زیب، ویل ڈن۔ آپ نے اس دھرتی کو اپنے ایک بڑے ورودھی کے بوجھ سے پاک کر دیا ہے۔ یہی شخص تھا جس نے باپ ہونے کے حق کو ہٹ دھرمی کے ساتھ استعمال کیا اور اپنی بیٹی کو دارج جیسے بے رحم کے سپرد کر دیا۔''

مبارک دیتے ہوئے وہ مجھ سے چپکنے کی کوشش بھی کر رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''تمہیں اتنی خوشی کیوں ہو رہی ہے اور اس خوشی کی آڑ میں تم مجھ پر لدنے کی کوشش کیوں کر رہی ہو۔ تمہیں پتا ہے کہ میں کتنا لمبا سفر کر کے پہنچا ہوں، بہت تھکا ہوا ہوں۔''

وہ اٹھلا کر کھڑی ہو گئی۔ ہمیشہ کی طرح اس کا مختصر لباس ایک خاموش دعوت کی طرح تھا۔ ''ایک دو پیگ لے لیں، بالکل فریش ہو جائیں گے۔'' اس نے وہسکی کی چمکتی ہوئی بوتل کی طرف اپنے مرمریں ہاتھ بڑھائے۔

''تم واقعی بے وقوف ہو یا جان کر بنتی ہو۔ تمہیں پتا ہے کہ دوبارہ ڈرنک شروع کرنے سے ہی میرے معدے کا مسئلہ شروع ہوا ہے۔''

وہ گہری نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی، پھر بولی۔ ''کسی وقت تو اپنی خوب صورتی پر شک ہونے لگتا ہے...... اور اس کا کارن یہ ہے کہ مجھے آپ کی نیت گڑبڑ لگتی ہے۔''

''نیت؟'' میں اندر سے بری طرح چونک گیا۔

وہ ہولے سے مسکرائی۔ ''شاید آپ مجھ سے دور رہنے کی کوشش فرما رہے ہیں اور اس کے لیے اپنی طبیعت کو بہانہ بنا رہے ہیں۔''

''میں تمہارے شک پر لعنت بھیجتا ہوں...... اور فی الوقت تم پر بھی۔ جاؤ یہاں سے۔ میں ابھی سونا چاہتا ہوں۔'' میں نے اس کی پنڈلی پر ہلکی سی ٹھوکر لگائی۔

''اُف۔'' وہ پنڈلی کو سہلانے کے لیے جھک گئی، اس کا جسم کچھ اور بھی نمایاں ہو گیا۔

وہ مصنوعی غصے کے انداز میں مجھے ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے باہر چلی گئی۔

شاردا جو بھی کہہ کر گئی تھی، وہ بالکل درست تھا۔ میں نے درد کا بہانہ بنایا تھا اور اس درد کے لیے مے نوشی کو جواز بنایا تھا۔ یوں میں خود کو وقتی طور پر شراب اور شاردا دونوں سے دور رکھنے میں کامیاب تھا مگر مجھے مسلسل خطرہ بھی محسوس ہو رہا تھا۔ میری یہ عذر تراشی ہانا وانی اور اس کے ساتھیوں کو کسی طرح کے شک میں بھی مبتلا کر سکتی تھی۔ اسی شک سے محفوظ رہنے کے لیے میں گرے فورس کی آفیسر ''فرزہ'' میں تھوڑی بہت دلچسپی ظاہر کر رہا تھا۔ مجھے پتا تھا

کہ فرزانہ، شاردا کی طرح مجھے آسانی سے ''مہیا'' نہیں ہو سکے گی۔ یوں بھرم برقرار رہے گا۔

شاردا کو گئے ابھی پانچ دس منٹ ہی ہوئے تھے کہ میرے کمرے کے دروازے پر پھر ''ناک'' ہوئی۔ اس مرتبہ اندر آنے والی گرے فورس کی کیپٹن فرزانہ ہی تھی۔ رسمی کلمات کے بعد وہ اپنی شستہ انگلش میں بولی۔ ''میں آپ کے انگوٹھے کے معائنے کے لیے آئی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اب آپ کا پلاستر اتار دینا چاہیے۔''

میں نے کہا۔ ''میرا یہ زخمی انگوٹھا بلکہ پورے کا پورا میں خود آپ کے حوالے ہوں...... آپ کا حسن کرشمہ ساز جو کرنا چاہتا ہے، وہ کرلے۔''

اس نے پیشانی پر ہلکی سی تیوری ڈال کر ایک نگاہِ غلط انداز مجھ پر ڈالی اور میرے انگوٹھے کی طرف متوجہ ہوگئی۔ وہ صرف کیپٹن نہیں، کیپٹن ڈاکٹر تھی اور گرے فورس میں میڈیکل ٹریٹ منٹ کی خدمات انجام دیتی تھی۔ مجھے ہر دوسرے روز دو یا تین ٹرینکولائزر بھی دیئے جاتے تھے۔ حواس کو دھندلانے والی یہ میڈیسنز کیپٹن فرزانہ مجھے اپنے سامنے کھلاتی تھی کیونکہ یہی ہاناوانی کا حکم تھا۔ یقیناً یہ میڈیسنز ہاناوانی کے شکار پر ہاناوانی کے ٹرانس کو مستحکم رکھنے میں مدد دیتی تھیں۔ ان دواؤں کے اثر سے میری آنکھیں متورم اور حواس میں ایک بے حسی سی رہتی تھی۔ فرزانہ ایک چھوٹا سا الیکٹرک کٹر بھی لے کر آئی ہوئی تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے کٹر کو آن کیا اور بڑی احتیاط سے میرے انگوٹھے کو پلاستر کی قید سے آزاد کر دیا۔ اس عمل کے دوران میں، میں ہلکے پھلکے فقرے اس کی طرف اچھالتا رہا۔ ان فقروں کا جواب اس نے مکمل خاموشی سے ہی دیا مگر جب میں نے اس کے جادوئی لمس کی تعریف کرتے ہوئے اس کا ہاتھ تھاما تو اس کی پیشانی پر بے ساختہ ناگواری کی شکن ابھری اور وہ بولی۔ ''مسٹر ایسٹرن آپ کو یہاں کس چیز کی کمی ہے جو مجھے زچ کرنے پر تلے ہوئے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''بس تمہاری ہی کمی ہے اگر تم آجاؤ تو یہ کمرا جگمگا جائے۔''

''وہ انڈین حسینہ شاردا آپ کو روشنی فراہم نہیں کر رہی؟''

''وہ زیرو کا بلب ہے...... بلکہ بلب بھی کیا موم بتی ہے......اور مجھے سو واٹ کی چمک چاہیے۔'' میں نے اس کے سیاہ بالوں کو چھوتے ہوئے کہا۔

اس نے میرے ہاتھ کو پیچھے ہٹایا اور پوری توجہ میرے انگوٹھے پر مرکوز کرتے ہوئے بولی۔ ''انگوٹھے کو حرکت دیں۔''

میں نے حرکت دی۔ وہ انگوٹھے کو الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی۔ پھر اپنے بیگ میں سے

انگوٹھے کے پرانے ایکسرے نکال کر دیکھے، بولی۔ ''پتا نہیں کیوں، لگتا ہے کہ ہڈی فریکچر ہونے کے بعد بھی انگوٹھے کے ساتھ کھینچا تانی ہوئی ہے۔ ہڈی کی چونچ نے دو تین پٹھے کو چھیدا ہے......''

وہ ایک نازک موضوع کی طرف جا رہی تھی۔ میں اسے پھر نرم گرم فقروں کی طرف لے آیا۔ کچھ اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ یہ چھیڑ چھاڑ اسے واقعی بری لگ رہی ہے یا وہ صرف ظاہر کر رہی ہے۔ جاتے ہوئے اس نے مجھے تاکید کی کہ میں انگوٹھے کے سلسلے میں ابھی احتیاط کروں۔

شام کو شاردا میرے کمرے میں آئی تو اس نے مجھ سے کہا۔ ''ایسٹرن! آپ کو جانکاری دے دوں بلکہ یاددہانی کرا دوں آج اٹھارہ تاریخ ہے۔''

''تو کیا؟''

''شاید آپ بھول گئے، مدر مادام (ہاناوانی) نے کہا تھا کہ آپ کے پرانے دوست اور موجودہ دشمن فخر زمان کے ساتھ پھر آپ کا مقابلہ ہوگا۔ ایسی فائٹس مدر مادام کو اچھی لگتی ہیں۔''

مجھے یاد آیا اور اس کے ساتھ ہی سینے میں دکھ اور پریشانی کی لہر سی دوڑ گئی۔ فخر کے ساتھ اپنی پچھلی خونی لڑائی مجھے بھولی نہیں تھی (میں نے دانستہ اپنا تیز دھار خنجر اس کے قبضے میں دے دیا تھا ورنہ اس ''مارا ماری'' میں فخر کا مرنا طے تھا)

میری فکرمندی کو نوٹ کرتے ہوئے شاردا جلدی سے بولی۔ ''لیکن آپ کے لیے ایک اچھی خبر ہے۔ شاید مدر مادام چاہتی ہیں کہ آپ کے ہاتھ کی چوٹ پوری طرح ٹھیک ہو جائے لہٰذا آپ آپ کو اس یدھ (لڑائی) سے استثنیٰ مل گیا ہے۔''

''استثنیٰ؟''

''جی، آپ کی جگہ ایک اور بندے سے فخر زمان کا مقابلہ کرایا جا رہا ہے۔''

''وہ کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں اس بارے میں جانکاری نہیں رکھتی۔ مگر میرا وچار ہے کہ آپ جلد ہی خود بھی اس تفریح سے لطف اندوز ہو سکیں گے۔'' اس نے کمرے میں موجود ایل سی ڈی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اس کا کہنا درست تھا۔ قریباً دو گھنٹے بعد میں اسی اسکرین پر ایک بار پھر فخر کو دیکھ رہا تھا۔ یہ وہی ہال کمرا تھا جہاں بلند چھت پر درجنوں چمگادڑیں الٹی لٹکی رہتی تھیں۔ یہیں پر میرا

اور فخر کا جوڑ پڑا تھا۔ لیکن اب مجھے فخر ایک اور روپ میں دکھائی دے رہا تھا۔ بلکہ دکھائی بھی کیا دے رہا تھا میرا اندازہ تھا کہ یہ فخر ہی ہے۔ وہ سرتاپا لوہے میں ڈوبا ہوا تھا۔ بالکل جیسے قدیم زمانے کے جنگجو ہوتے تھے۔ سر پر آہنی خود، سینے اور پشت پر زرہ بکتر، کلائیوں اور پنڈلیوں پر آہنی خول۔ اس کا مدِمقابل بھی اسی اہتمام کے ساتھ رنگ میں موجود تھا۔ دونوں کے ہاتھوں میں بیضوی شکل کی ڈھالیں اور کٹار نما تیز دھار آلے تھے۔

''یہ سب کیا ہے شاردا'' میں نے اپنے پہلو میں بیٹھی انڈین حسینہ سے پوچھا۔

''جو کچھ ہے، آپ کے سامنے ہے۔ مدر مادام کو ایسے باؤٹس دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ مادام کی طرح سورگ باشی جناب رائے زل کا بھی یہ محبوب مشغلہ تھا۔''

میں دانت پیس کر رہ گیا۔ جاما جی میں ایسے تماشے ہم نے بہت دیکھے تھے۔ اس ماں بیٹے کی سفاکی کی اَن گنت یادیں ان شب و روز میں بکھری ہوئی تھیں۔

''مادام یہ منظر براہِ راست دیکھ رہی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں سب کچھ ویسا ہی ہے جیسا آپ کی باری میں تھا، وہ کلوز سرکٹ پر ملاحظہ کر رہی ہیں۔''

لڑائی شروع ہوئی۔ دونوں ایک دوسرے پر وحشیانہ حملے کرنے لگے۔ پہلے پندرہ بیس سیکنڈ میں ہی پتا چل گیا کہ دونوں تلوار بازی کے ہنر سے ناواقف ہیں...... اور اس طرز لڑائی کی الف ب سے بھی واقف نہیں...... مگر اصل بات ان کی ہنرمندی یا مشاقی نہیں تھی، اصل بات وہ شدت اور وحشت تھی جو دونوں میں نظر آ رہی تھی۔ وہ چنگھاڑ رہے تھے اور ایک دوسرے کو جان سے مارنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لوہے سے لوہا ٹکرا رہا تھا اور ایک زبردست جھنکار پیدا ہو رہی تھی۔ ایک مرتبہ کیمرے نے دونوں کو کلوز اپ میں دکھایا تو فخر کی آنکھیں اور ناک کا بالائی حصہ واضح کھائی دیا۔ ہاں یہ فخر ہی تھا، میرا یار، میرا غمگسار، میرا مدتوں کا ساتھی، لیکن اس وقت وہ موت کے گھیرے میں تھا۔ وہ فخر لگتا ہی نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک قاتل چمک اور وحشت لہریں مار رہی تھی۔

وہ اپنے مقابل کو دھکیلتا ہوا رِنگ کی آخری حد تک لے گیا اور پھر اسے اڑنگا لگا کر گرانے کی کوشش کی۔ قدیم طرز کی لڑائی میں اس نے یہ جدید مارشل آرٹ کا داؤ کامیابی سے آزمایا تھا۔ مدِمقابل پشت کے بل گرا۔ فخر نے اس کی زرہ بکتر اور خود کے درمیانی خلا کو نشانہ بنانے کی کوشش کی مگر وہ بجلی کی طرح حرکت کر کے پلٹ گیا اور اس کی کٹار اس کے فولادی بازو بند سے ٹکرا کر رہ گئی۔ حریف نے لیٹے لیٹے اپنی دونوں ٹانگیں اچھال کر فخر

سینے پر ماریں۔ فخر لڑکھڑا کر پیچھے گیا اور حریف کو اٹھنے کا موقع مل گیا اور وہ کوئی معمولی حریف نہیں تھا۔ اس کے جسم میں زبردست لچک اور توانائی تھی۔ اس نے کٹار سے فخر پر پے در پے حملے کیے۔ ہر گھڑی یہی لگا کہ اس کی کٹار فخر کے جسم کے کسی ''ان گارڈڈ'' حصے کو نشانہ بنانے میں کامیاب ہو جائے گی اور کھیل ختم ہو جائے گا۔ تاہم اسی دوران میں فخر کو ایک موقع ملا۔ اس نے کٹار دونوں ہاتھوں میں تھام رکھی تھی۔ دونوں ہاتھوں کے ساتھ پورا زور لگاتے ہوئے اس نے حریف کے سر پر وار کیا۔ جیسے اس کے آہنی خود کو دو ٹکڑے کر دینا چاہتا ہو۔ خود دو ٹکڑے تو نہیں ہوا مگر اس کا زیریں تسمہ ٹوٹ گیا اور وہ حریف کے سر سے اتر گیا۔ میں فخر کے حریف کو دیکھ کر دنگ رہ گیا...... وہ کوئی اور نہیں کمانڈر فارس جان تھا...... اسے ہم کئی دنوں سے مسلسل ڈھونڈ رہے تھے۔ اس کا کوئی کھوج ملا تھا اور نہ اس کے حوالے سے کوئی اطلاع ہم حاصل کر سکے تھے۔ اب وہ یہاں طیش میں ڈوبا اور وحشت میں لتھڑا ہوا فخر کے مقابل موجود تھا۔ میں کرب کے عالم میں ایک آتشیں سانس لے کر رہ گیا۔ آخر میرا اور قسطینا کا یہ شک درست ثابت ہوا تھا کہ فارس جان بھی فخر کی طرح ہاناوانی کے بے رحم شکنجے میں کسا جا چکا ہے۔

شاردا میرے پہلو میں بیٹھی میرے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ شاید جاننا چاہتی تھی کہ اپنے دو قریبی ساتھیوں کو ایک دوسرے سے زندگی موت کی لڑائی لڑتے دیکھ کر میں کیا محسوس کر رہا ہوں۔ میں بھی جانتا تھا کہ مجھے اپنے تاثرات سے اپنے اندرونی احساسات کو ظاہر نہیں ہونے دینا ہے۔

وہ اٹھلا کر بولی۔ ''ایسٹرن! یہ سرپرائز کیسا رہا آپ کے لیے؟''

''اچھا رہا۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ''بے وفا دوستوں کی لسٹ میں اس باسٹرڈ فارس کا نام کافی اوپر ہے۔ یہ آستین کا سانپ ثابت ہوا...... یہ تاجور پر گندی نگاہ رکھنے کا مجرم ہے۔ دل تو یہی چاہتا ہے کہ اسے اپنے ہاتھوں سے جہنم واصل کروں لیکن آج اسے اس طرح بھی مرتا دیکھ لوں تو کوئی مضائقہ نہیں۔''

وہ میرے کندھے سے کندھا ٹکراتے ہوئے بولی۔ ''میرے وچار کے مطابق تو آج کی اس لڑائی میں کوئی بھی نتیجہ نکلے آپ کے لیے خوشی کا کارن ہی ہوگا۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور نگاہیں اسکرین پر مرکوز رکھیں جہاں دونوں بڑھ بڑھ کر ایک دوسرے پر مہلک حملے کر رہے تھے۔ فارس جان خود کے بغیر تھا۔ میرے کانوں میں ہاناوانی کے منحوس قسم کے الفاظ گونج رہے تھے...... میں تم کو نہیں ماروں گی۔ تم خود ایک

دوسرے کی گردنیں کاٹو گے۔

شاردا نے پوری دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ''ایک کا ''خود'' گر چکا ہے لیکن اس کے باوجود لگتا ہے کہ لڑائی لمبی چلے گی۔''

شاردا کے آخری الفاظ شور میں دب کر رہ گئے۔ اس کا اندازہ غلط ثابت ہوا تھا، لڑائی لمبی نہیں چلی تھی۔ اس کا فیصلہ ہو گیا تھا۔ فخر نے اچانک ہی سینے پر کمانڈر فارس کی ایک زوردار لات کھائی تھی اور پشت کے بل گر گیا تھا۔ گرتے ہوئے اس کا آہنی خود ایک ستون سے ٹکرایا اور اس نے آگے کی طرف کھسک کر فخر کی آنکھیں ڈھانپ لیں۔ اس سے پہلے کہ فخر اس صورتِ حال کو ہینڈل کر پاتا، کمانڈر فارس برق کی طرح تڑپ کر اس کے سینے پر سوار ہو گیا۔ کٹار فخر کی گرفت سے نکل چکی تھی۔ اس نے چمکیلی کٹار دونوں ہاتھوں میں بلند کی اور اس کا نکیلا حصہ پورے زور سے فخر کے آہنی خود اور زرہ کے درمیانی خلا میں مارا۔ یہ وار یقیناً فخر کی گردن پر تھا۔ فخر کا جسم بری طرح اچھلا۔ اس نے دوسرے وار سے بچنے کے لیے اپنی کہنی موڑی اور آہنی بازو بند اپنی گردن کے سامنے کر لیا۔

فارس چنگھاڑا۔ ''ماردوں گا...... ٹکڑے کر ڈالوں گا۔''

اس نے دو تین بار فخر کی گردن پر مزید وار کرنے کی کوشش کی پھر اس کے آہنی پیراہن میں کوئی اور رخنہ ڈھونڈنے لگا۔ اس نے دو وار فخر کے پہلو میں پسلیوں کے آس پاس کیے۔ اس کی کٹار لہولہان ہو گئی۔ تب وہ فخر کی ٹانگوں پر پل پڑا۔ پنڈلیوں سے اوپر اس نے کٹار نما آلے کی نوک سے فخر کی ٹانگوں کو چھلنی کر ڈالا۔ مجھ سے یہ مناظر دیکھے نہیں گئے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

چند سیکنڈ بعد دوبارہ کھولیں تو گرے فورس کے گارڈز مشتعل فارس جان کو نہتا کرنے کے بعد اسے کھینچ کر باہر لے جا رہے تھے۔ تین چار گارڈز خونچکاں فخر پر جھکے ہوئے تھے پھر انہوں نے اسے ٹانگوں اور بازوؤں سے پکڑ کر اٹھایا اور کیمروں کی آنکھ سے دور لے گئے۔ وہ شدید زخمی لگتا تھا، مگر یہ بھی ممکن تھا کہ ختم ہو چکا ہو۔ اس کی گردن والا زخم کاری محسوس ہوتا تھا۔ یہ زخم کھانے کے بعد اس کی مزاحمت بالکل ختم ہو کر رہ گئی تھی۔

میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا مگر ستم بالائے ستم یہ تھا کہ مجھے اپنے تاثرات بھی چھپانے تھے۔

شاردا حیران لہجے میں بولی۔ ''اس معرکے میں یہ ٹوئسٹ تو حیران کن رہا ہے۔ ٹرے (خود) تو کمانڈر فارس کے سر سے گرا تھا مگر تیا پانچا مسٹر فخر زمان کا ہو گیا ہے۔ شاید کھیلوں کی

بھاشا میں اسے ہی ''کم بیک'' کرنا کہتے ہیں۔''

وہ ایکسائٹڈ تھی۔ اس کے دانت نکلے پڑ رہے تھے اور میرا دل چاہ رہا تھا کہ مکا مار کر اس کے سارے دانت اس کے گلے کے اندر اس کی خوراک کی نالی میں گرا دوں۔ میں فی الوقت تنہائی چاہتا تھا یکسر تنہائی...... اور وہ اس سنسنی خیز لڑائی پر تبصرہ کرنے میں مصروف تھی۔ میں نے بمشکل اسے اپنے کمرے سے باہر کیا اور آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ نگاہوں میں فخر کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ پتا نہیں کہ وہ کس حالت میں تھا؟ آج میں نے فخر اور فارس جان کو جس عالم میں دیکھا تھا، اس کے بعد میرے ذہن میں ایک عجیب سا اندیشہ بھی جاگ گیا تھا۔ کہیں میں بھی تو کسی وقت ہمت ہار کر سچ مچ ہاناوانی کے ٹرانس کا شکار نہیں ہو جاؤں گا۔ اس کے ٹرانس میں نہیں چلا جاؤں گا؟ یہ سوچ بڑی تکلیف دہ تھی۔

وہ مسلسل زخم لگا رہی تھی اور ہر زخم پہلے سے بڑا تھا اور وہ خود پتا نہیں کہاں تھی۔ کن دیواروں کے پیچھے چھپی ہوئی تھی؟ میں مچھلی کی طرح تڑپ کر رہ گیا۔ ''ہاناوانی...... ہاناوانی۔'' میرے سینے سے ایک ہی پکار اٹھ رہی تھی۔

○......❖......○

اگلے قریباً چوبیس گھنٹے میں نے شدید کرب کے عالم میں گزارے۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ اس مینشن سے باہر حالات کیا ہیں؟ تاجور اور اس کے اہلِ خانہ کس حال میں ہیں؟ قسطینا اور پہلوان حشمت کہاں ہیں اور ان کے لیے کیا کر رہے ہیں۔ داؤد بھاؤ کے ''قتل'' نے کیا رنگ اختیار کیا ہے...... اور پرندوں کے حملے میں پولیس اہلکاروں کی موت کو کس تناظر میں دیکھا جا رہا ہے؟ اور تو اور مجھے ابھی تک یہ پتا بھی نہیں چل سکا تھا کہ کل والے خونی تماشے کے بعد فخر کس حال میں ہے......؟ کل والے مناظر میرے لیے سوہانِ روح ثابت ہوئے تھے۔ اب میرا دل فخر کے لیے رو رہا تھا لیکن اگر فارس جان کو نقصان پہنچ جاتا تو بھی یہ ایک جانکاہ صدمہ ہی ہوتا۔ قسطینا ہر پل اس کی راہ دیکھ رہی تھی اور وہ یہاں زندگی موت کی جنگ میں مصروف تھا۔ کیا پتا تھا کہ کل کلاں ہاناوانی کی خباثت فارس جان کو میرے مقابل ہی لا کھڑا کرتی۔

میرا اندازہ تھا کہ اب ہاناوانی ایک بار پھر میرے اوپر اپنے ٹرانس کو ''ری نیو'' کرنا چاہے گی...... اور ایسا ہی ہوا۔ اسی وقت چھریرے بدن والی سبک گام کیپٹن فرزہ نے آ کر بتایا کہ ایک گھنٹے بعد ہاناوانی مجھے شرف ملاقات بخشیں گی۔

قریباً ایک گھنٹے بعد مجھے دو مسلح گارڈز نے میرے کمرے سے لیا اور ایک طویل

کوریڈور سے گزار کر اسی ہال کمرے میں پہنچا دیا جہاں کل فخر اور فارس کی المناک ''ملاقات'' ہوئی تھی۔ تاہم آج اس ہال کا ماحول بالکل مختلف تھا۔ روشنیوں کے زاویے مختلف تھے۔

ایک بات میرے لیے بڑی سنسنی کا باعث تھی۔ آج پہلی بار مجھے ہاناوانی کے سامنے لاتے ہوئے میرے ہاتھ پشت پر نہیں باندھے گئے تھے۔

میں نے بہ زبان خاموشی خود سے کہا۔ ''کیا قدرت کوئی خاص موقع تو فراہم نہیں کرنے والی؟ آج تمہارے ہاتھ باندھے نہیں گئے۔ اگر اسی حالت میں جاماجی کی وہ بدذات فرمانروا تمہارے رُوبرو آجاتی ہے تو تم اپنی قسمت آزما سکتے ہو۔ اس حرافہ کی شہ رگ تک پہنچ سکتے ہو۔ اگر تم خالی ہاتھ بھی ہوئے تو تمہارا فن کام آئے گا۔ تم پلک جھپکتے میں اس کی گردن توڑ دو گے۔ بعد میں جو کچھ بھی ہوگا، دیکھا جائے گا۔ تمہیں اسی جگہ چھلنی بھی کر دیا گیا تو تمہاری یہ موت بہت سے لوگوں کو اس حرافہ کی قاتل زد سے بچالے گی......''

میں یہی کچھ سوچتا ہوا اس مخصوص کرسی پر جا بیٹھا جہاں سے سرخ مخملی کپڑے والا اسٹیج بس چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ اسی چبوترے پر رکھی کرسی پر براجمان ہوکر ہاناوانی مجھے سجیشن دیتی تھی۔

کیپٹن فرزہ کی آواز میرے کانوں میں گونجی۔ ''آپ انتظار کریں۔ مادام تشریف لانے والی ہیں......''

میری دھڑکنیں بڑھنا شروع ہوگئیں...... لیکن اس وقت میرے سارے ارادوں پر اوس پڑگئی جب مجھ پر انکشاف ہوا کہ آج ہاناوانی براہِ راست میرے سامنے نہیں آئے گی۔

سامنے لگی ہوئی جہازی سائز کی اسکرین روشن ہوئی اور اس پر ہاناوانی کا منحوس چہرہ نمودار ہوا۔ وہ کسی اور جگہ موجود تھی اور اس ویڈیو لنک کے ذریعے مجھ سے مخاطب ہورہی تھی۔ اس کے چوڑے چکلے چہرے پر خشونت اور تکبر کی وہی کیفیت تھی جو میرے تن بدن میں آگ لگاتی تھی۔ بدن پر بیش قیمت گہنے سجائے اور آنکھوں پر ''رے بین'' کا سیاہ چشمہ چڑھائے وہ گرے فورس کے کسی اہلکار سے مخاطب تھی۔ وہ دست بستہ کھڑا تھا اور تھر تھر کانپ رہا تھا۔ وہ اس پر گرج رہی تھی۔ ''میرے بیٹے کا قتل ہوا ہے۔ میرے لیے...... میرے انتقام سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں...... کچھ بھی نہیں، میری ذات بھی نہیں۔ تم نے بکواس کی تھی کہ تم یہاں کی مقامی زبان اچھی طرح سمجھتے ہو...... لیکن تمہاری کارکردگی صفر بٹا صفر ہے۔ یہاں کے ہمارے مقامی کارندے تمہیں کسی گدھے کی اولاد سمجھ رہے ہیں۔ دفع ہو جاؤ میری

نظروں کے سامنے سے۔''

وہ اہلکار گھگیانے لگا مگر گارڈز اسے کھینچ کر گھسیٹ کر باہر لے گئے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اسے کوئی کڑی سزا ملنے والی ہے۔ ہاناوانی نے چند سیکنڈ اپنے آپ کو نارمل کرنے میں صرف کیے پھر ایک عمیق سانس لے کر میری طرف متوجہ ہو گئی۔

ٹھہری آواز میں بولی۔ ''گڈ ایسٹرن! خوشی کی بات ہے کہ تمہاری آستینوں میں چھپے ہوئے سانپ باہر نکل رہے ہیں اور ایک ایک کر کے کچلے جا رہے ہیں۔''

''یہ سب کچھ آپ کی وجہ سے ممکن ہو سکا ہے۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''میری وجہ سے ابھی اور بہت کچھ ممکن ہو جائے گا لیکن تم خود کو پُرسکون رکھو...... تمہیں جو سہولتیں دی گئی ہیں، ان سے لطف اٹھاؤ۔''

''سہولتیں؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں پر ابھی تک عینک موجود تھی۔

''ایک سہولت تو وہ انڈین بیوٹی ہے جس سے تم کوئی فائدہ نہیں اٹھا رہے...... اگر وہ پسند نہیں تو کوئی اور بھی آ سکتی ہے......'' اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔

''نہیں مادام! ایسی بات نہیں ہے۔ میں فزیکلی کچھ اپ سیٹ تھا۔''

''تمہیں بہت کچھ کرنا ہے۔ تمہیں اپ سیٹ نہیں...... بالکل سیٹ ہونا چاہیے۔'' وہ بولی پھر اس نے اپنی عینک اتار دی۔ کیمرے نے زوم کیا اور اس کی آنکھیں اسکرین کے تین چوتھائی حصے پر دکھائی دینے لگیں۔

ہال کمرے کی تیز روشنیاں آف ہو گئیں، باقی روشنیوں نے کچھ خاص زاویے اختیار کر لیے اور تب ایک بار پھر وہی تنویمی عمل شروع ہوا جس میں سے میں پہلے بھی کئی بار گزر چکا تھا۔

کانوں میں ہلکی ہلکی گھنٹیاں بجنا شروع ہوئیں اور پھر ہاناوانی کی جادوئی آواز سماعت میں گونجنے لگی۔ ''تم میری طرف متوجہ ہو ایسٹرن اتم مجھے دیکھ رہے ہو...... میری آنکھوں میں جھانکو۔ گہرائی میں جاؤ...... مزید گہرائی میں...... مزید......''

ایک بار پھر سجیشن کا وہی عمل شروع ہوا جو میرے جسم میں عجیب سی سنسناہٹ جگا دیتا تھا۔ وہ اپنے الفاظ کے ذریعے مجھ پر اپنے تسلط کی تجدید کر رہی تھی، اسے مضبوط بنا رہی تھی۔ اسکرین کے ایک کارنر میں گاہے بگاہے وہ چہرے بھی دکھائی دے رہے تھے جن کے خلاف وہ میرے اندر کی نفرت کو مزید توانا بنانا چاہتی تھی۔ خورسنہ کا چہرہ، سجاول کا چہرہ، قسطینا اور

فارس جان کے چہرے۔

میں سن رہا تھا اور غنودہ لہجے میں تائیدی الفاظ ادا کر رہا تھا...... اس بار ہاناوانی کا سجیشن زیادہ الارمنگ تھا۔ میری نگاہوں کے سامنے ایک بار پھر ست رنگے بھنور کے خدوخال ابھرنے لگے۔ میں اندر سے کانپ گیا...... کیا ایک بار پھر میں انہیں بھنور کی طرف کھینچا جا رہا ہوں؟ میری انگلیاں جیسے بے ساختہ میرے زخمی انگوٹھے تک پہنچ گئیں۔ میں نے انگوٹھے کو ہولے ہولے بھینچنا شروع کیا۔ درد کا سہارا لے کر خود کو ہاناوانی کے مقناطیسی بھنور سے دور رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔

ہاناوانی کی آواز میری سماعت میں اتر رہی تھی۔ ”تم وہی کرو گے جو میں کہوں گی۔ تم ان لوگوں سے انتقام لو گے جنہوں نے تم سے دغا کیا۔ تمہارے لیے دشمنی کی آگ بھڑکائی۔ تم ان کو انہی کے سکوں میں جواب دو گے...... یادگار جواب۔“

ست رنگا بھنور نمایاں ہو رہا تھا۔ اس کے رنگ گہرے ہو رہے تھے۔ اس کی کشش بڑھ رہی تھی۔ اس کے اندر...... اس کے اندر تاجور تھی۔ اس کا سیماب بدن تھا۔ اس کا انداز رقص کرنے والا تھا، اس کے جسم سے گلاب جدا ہو رہے تھے۔ میں انگوٹھے پر دباؤ بڑھانے لگا۔ درد کی شدید لہریں میرے جسم میں پھیلنے لگیں۔ کیا ایک بار پھر مجھے اس انگوٹھے کو بری طرح گھائل کرنا پڑے گا؟

یہ اذیت اور کشش کا مقابلہ تھا...... لیکن پھر اچانک بھنور کے رنگ پھیکے پڑنے لگے۔ تاجور کی شبیہ بھی دھندلا گئی...... مجھے اپنی طرف گھسیٹنے والی کشش کم ہونے لگی۔ میں ہپناٹائز کے اس عمل میں سنگین ترین صورتِ حال کی طرف جانے سے بچ گیا تھا۔

○......❖......○

اب میں ایک بار پھر اپنے پُر آسائش کمرے میں بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔ میں خود کو غنودگی کی حالت میں ظاہر کر رہا تھا مگر حقیقتاً میرا ذہن پوری طرح بیدار تھا۔ میں اپنے تصور میں آئندہ کی صورتِ حال کا نقشہ کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ نقشہ بے حد بگڑا ہوا تھا۔ بظاہر میں نے ہاناوانی کے حکم پر دین محمد صاحب کو ''قتل'' کر دیا تھا اور اپنے اوپر ہاناوانی کے تسلط و قبضے پر مہرِ تصدیق ثبت کی تھی مگر پھر بھی لگتا تھا کہ ہاناوانی پوری طرح مطمئن نہیں ہے۔ وہ مسلسل مجھ پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

اگلے روز دوپہر کے وقت ڈاکٹر فرزہ میرے انگوٹھے کے معائنے کے لیے آئی تو اسے قدرے سوجا ہوا پایا۔ وہ اس سلسلے میں مجھے احتیاط برتنے کے مختلف مشورے دینے لگی۔

میں نے کہا۔ ''جی تو یہی چاہتا ہے کہ یہ انگوٹھا جلد اچھا نہ ہو..... تمہارا آنا جانا لگا رہے۔''

اس نے مجھے گھورا اور بولی۔ ''پھر تو آپ پر یہ شک بھی کیا جا سکتا ہے کہ آپ اس انگوٹھے کو جان بوجھ کر خراب کر رہے ہیں۔''

''تمہیں اس انگوٹھے کے خراب ہونے کی فکر ہے۔ ادھر یہ بندہ سارے کا سارا خراب ہو رہا ہے۔ آدھی رات تک کروٹیں بدلتا رہتا ہوں...... ایک صورت نظروں میں گھومتی رہتی ہے۔''

''وہاں جاما جی میں بھی تاجور سے آپ کی محبت کے بڑے چرچے رہے ہیں۔'' وہ اطمینان سے بات کو دوسری طرف لے گئی۔

''میں اس کی بات نہیں کر رہا۔ وہ تو کسی اور کی ہو گئی۔ اس کے بچے کی ماں بھی بننے والی ہے۔ اب کوئی اور راستہ نظر آ رہا ہے مجھے۔'' میں نے دل پھینک عاشقوں کا انداز اختیار کیا۔

وہ لاتعلقی سے میرے ہاتھ اور انگوٹھے کا ہلکا ہلکا مساج کرتی رہی۔ میں نے کہا۔
''گرے فورس کی ملازمت بڑا ٹف اور خشک کام ہے۔ کیا اس خشکی میں بھی کہیں تھوڑی بہت ہریالی دیکھی ہے تم نے؟''
''ہریالی؟'' وہ ہنسی۔ ''بہت دیکھی ہے...... بلکہ پورا ایک باغ دیکھا ہے۔'' اس کے لہجے میں بے باکی تھی۔ میں ششدر رہ گیا۔
''کون خوش نصیب تھا وہ؟''
''خوش نصیب تو وہ بے شک تھا۔ جاما جی اور نیوسٹی میں اس سے بڑا خوش نصیب اور کون ہوگا۔'' فرزہ نے معنی خیز لہجے میں کہا۔
میں چونک گیا۔ ''رائے زل؟''
اس کی پلکیں جھک گئیں۔ یہ اثبات کا اشارہ تھا۔ میری نگاہوں میں ہاناوانی کے عیاش فرزند رائے زل کی شبیہ گھوم گئی۔ وہ چھوٹی چھوٹی آنکھوں کے ساتھ ایک بھاری بھرکم ریچھ ہی لگتا تھا۔ نہ جانے فرزہ جیسی کتنی تھیں جو اس ریچھ کے وزن اور اس کی بدبو سے دوچار ہوئی تھیں...... من مانیوں اور شیطنیت سے لتھڑی ہوئی ایسی زندگی عموماً زیادہ طویل ثابت نہیں ہوتی، رائے زل کی بھی نہیں ہوئی تھی۔ محل کی چھت پر سجاول سیالکوٹی نے اس فرعون صفت کا سر اس کے تن سے جدا کر دیا تھا۔
شاید میرے اور فرزہ کے درمیان گفتگو کچھ دیر مزید جاری رہتی مگر اسی دوران میں شاردا آن وارد ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں کچھ رول کیے ہوئے پیپرز تھے۔ وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''شما کیجیے گا۔ آپ نے اخبار کی ڈیمانڈ کی تھی۔ آپ کی درخواست قبول ہوئی ہے۔ یہ آج کا تازہ اخبار ہے۔ پچھلے دو روز کے اخبار بھی ساتھ ہیں۔''
''شکریہ۔'' میں نے کہا اور اخبار اس کے ہاتھ سے لے لیا۔
''آپ پڑھ لیں گے یا میں آپ کو سناؤں؟'' شاردا بولی۔
''میں نے آنکھوں کا آپریشن نہیں کرا رکھا۔'' میں نے خشک لہجے میں جواب دیا۔
وہ خجل ہوئے بغیر واپس چلی گئی۔ فرزہ بھی اس کے ساتھ ہی چلی گئی تھی۔
میری پوری توجہ اخبار پر مرکوز ہو گئی۔ آج کے تازہ اخبار میں تو کوئی خاص خبر نہیں ملی مگر ایک دن پہلے کے شمارے میں، پرندوں کے حملے، پولیس اہلکاروں کی ہلاکت اور دین محمد و مولانا حبیب کے حوالے سے سنسنی خیز خبریں موجود تھیں۔
اب پرندوں کے ان حملوں کو باقاعدہ ایک سوچی سمجھی سازش قرار دیا جا رہا تھا......

تاہم ہپناٹزم وغیرہ کی بات اب بھی کہیں نہیں تھی۔ یہی کہا جا رہا تھا کہ یہ چھوٹے طوطوں کی ایک خاص جنگلی نسل ہے جس میں جارحیت ہوتی ہے۔ کچھ لوگوں نے انہیں ''ٹرینڈ'' کیا ہے اور اب ان کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ مولوی حبیب اللہ صاحب والے سانحے پر لوگ بے حد رنجیدہ تھے۔ وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ ان جیسی ہردلعزیز شخصیت سے کسی کی کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔ دین محمد صاحب کی موت کے واقعے کو براہِ راست مجھ سے جوڑا جا رہا تھا۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اسے تاجور کا رشتہ نہ دینے کا شاخسانہ قرار دے رہے تھے۔

دین محمد صاحب کی پوسٹ مارٹم رپورٹ میں کنفیوژن کا اظہار کیا گیا تھا۔ کنفیوژن وہی تھا کہ انہیں ہارٹ اٹیک پہلے ہوا تھا یا انہیں گولیاں پہلے لگی تھیں۔ بہرحال اس بات پر سب ہی متفق تھے کہ چوہدری دین محمد کی موت کی رات میں بھی سکھیرا گاؤں کے آس پاس موجود تھا۔ اخبار کی ایک خبر میں بتایا گیا تھا کہ علاقے میں اور خاص طور سے سکھیرا گاؤں میں زبردست ہراس پایا جاتا ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ خونی طوطے سکھیرا گاؤں پر بھی حملہ آور ہو سکتے ہیں۔ سکھیرا کے عام لوگ بھی گھروں کی کھڑکیوں روزنوں وغیرہ میں جالیاں لگوا رہے ہیں۔ بچوں کو کھلی جگہوں پر گھومنے پھرنے سے روک دیا گیا ہے۔ ایک مختصر خبر میں ایک معروف عامل نے بیان دیا تھا۔ ''جادو ایک حقیقت ہے۔ ان دنوں ہمارے اردگرد جو واقعات ہو رہے ہیں، یہ سب سفلی علم کا شاخسانہ ہیں۔ برونائی سے یہاں آنے والی خطرناک عاملہ کے بارے میں خبریں موجود ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ عاملہ کچھ جانوروں اور انسانوں پر مسلط ہو گئی ہے اور انہیں اپنی منشا کے مطابق چلا رہی ہے۔''

اس عامل کی بات حقیقت سے قریب تر تھی۔ تاہم اس نے بھی ہپناٹزم وغیرہ کا کہیں ذکر نہیں کیا تھا۔ غالباً ہپناٹائز یا ہپناٹزم کی یہ ایڈوانس شکل کسی کی سمجھ میں پوری طرح آ ہی نہیں رہی تھی۔

یہاں میرے گھومنے پھرنے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ میں مینشن کے وسیع لان کی طرف بھی جا سکتا تھا۔ تاہم مقامی مسلح کارندے اور گرے فورس کے گارڈ ہر کونے کھدرے میں دکھائی دے جاتے تھے۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا۔ میں ٹہلتا ہوا ایک طویل کوریڈور میں آ گیا۔ غالب امکان یہی تھا کہ ہاناوانی اس وسیع عمارت میں موجود نہیں ہے، پھر بھی ایک جستجو سی تھی۔ کبھی ذہن میں آتا تھا کہ عین ممکن ہے وہ بالائی منزلوں کے کسی الگ تھلگ پورشن میں براجمان ہو...... یا پھر یہاں بھی کوئی تہ خانہ ہو جو اس کا مسکن ہو۔

اطراف کو گہری نظروں سے دیکھتا ہوا میں لان کی طرف چلا آیا۔ اواخر نومبر کا سورج دھیرے دھیرے مغرب کی طرف جھک رہا تھا۔ مطلع صاف تھا۔ اچانک میں بری طرح چونک گیا۔ مینشن کی چھت کی طرف کوئی خلا موجود تھا اور اس خلا میں سے دلکش لیکن بہت خونخوار طوطے، نکل نکل کر فضا میں بلند ہو رہے تھے۔ وہ سیکڑوں کی تعداد میں تھے، وہ ایک طویل جھنڈ کی شکل میں تھے اور اوپر اٹھتے جا رہے تھے۔ ''یا اللہ خیر'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

شاردا میرے عقب میں آن کھڑی ہوئی۔ ''کیا دیکھ رہے ہیں؟''

میں نے لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ شکاری کدھر جا رہے ہیں؟''

''شکاری تو ظاہر ہے کسی شکار کی طرف ہی جاتا ہے۔'' وہ بولی۔

''لگتا ہے یہ طوطے نہیں، چمگادڑیں ہیں جو کسی تاریک غار سے جھنڈ کی شکل میں نکلتی چلی جا رہی ہیں۔''

''چمگادڑیں بھی ہیں یہاں لیکن وہ رات کی شکاری ہیں۔''

''ہاں رات کے شکاری دن میں تو بیکار ہوتے ہیں۔'' میں نے لاتعلق لہجے میں کہا۔

وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی۔ ''مگر کچھ شکاری دن اور رات دونوں میں بیکار ہوتے ہیں۔''

اس سے پہلے کہ میں کوئی تلخ ترش جملہ کہتا وہ وہاں سے کھسک گئی۔ میں ایک بار پھر نیلے آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ طوطوں کا جھنڈ فضا میں بلند ہونے کے بعد بڑی تیزی سے شمال کی جانب رواں ہو گیا تھا۔ سورج کی ترچھی کرنیں ان بے شمار پرندوں پر پڑتی تھیں تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے روشنی کے بہت سے نقطے جھلملا رہے ہوں۔

یہ طوفانِ بلاخیز کس طرف جا رہا ہے؟ یہ سوال میرے سینے کے اندر ایک خاموش پکار کی طرح تھا۔

وہ جا تو اسی رخ پر رہے تھے جدھر چاند گڑھی اور سکھیرا وغیرہ تھے...... یہ بات بعید از قیاس نہیں تھی کہ لالہ موسیٰ کے قریب سکھیرا گاؤں ہی ان کا ٹارگٹ ہو۔ سکھیرا جہاں سیف کی فیملی تھی اور تاجور کی فیملی تھی۔ میرے لیے تسلی کی صرف ایک ہی بات تھی۔ قسطینا، پہلوان حشمت اور لودھی سمیت سکھیرا گاؤں کے آس پاس موجود تھی۔ وہ وہاں ان لوگوں کے تحفظ کا عزم کیے ہوئے تھی اور میں جانتا تھا وہ کوئی عام لڑکی نہیں ہے۔ وہ جاماجی میں گرین فورس کی چیف تھی۔ باپ کی موت اور بعد کے سنگلاخ حالات نے اسے کم عمری میں ہی ایک

بہترین سالار بنادیا تھا۔ وہ ہر قسم کی صورتِ حال سے نمٹنے کی خداداد صلاحیت رکھتی تھی۔

میں نے سوچا، کاش میرے پاس رابطے کا کوئی ذریعہ ہو اور میں قسطینا یا پہلوان جی کو آگاہ کرسکوں کہ موت کی سوغات بانٹنے والا یہ ٹڈی دل یہاں سے پرواز کر کے کسی سمت روانہ ہوا ہے۔

میں بظاہر سکون سے لیکن حقیقتاً بڑی بے قراری سے گراسی لان میں ٹہلتا رہا اور سوچتا رہا کہ کیا سانحہ پیش آنے والا ہے۔

شام سات آٹھ بجے تک کا وقت بڑی بے قراری سے گزرا۔ اس دوران میں سات بجے کے لگ بھگ مجھے یہ اندازہ بھی ہوا کہ خونی پرندے مینشن میں واپس آچکے ہیں۔ مجھے وہ مدھم شور سنائی دیا جو سیکڑوں طوطوں کی ''چوں چوں'' سے پیدا ہوتا تھا۔ یہ شور ایک طویل گردآلود کوریڈور کے سامنے سنا جاسکتا تھا۔

مجھے ٹی وی کیبل یا ڈش وغیرہ کی سہولت مہیا نہیں کی گئی تھی لیکن اس مینشن کے کئی کمروں میں یہ سہولت موجود تھی۔ میں ٹہلتا ہوا ایک ایسے لابی نما لاؤنج میں پہنچ گیا جہاں ٹی وی موجود تھا۔ مجھے وہاں بیٹھے پانچ دس منٹ ہی ہوئے تھے کہ ایک نیوز چینل پر مجھے وہ خبر مل گئی جس کا اندیشہ میرے سینے میں مسلسل دھواں بھر رہا تھا۔

یہ کسی پیٹرول پمپ کا منظر تھا۔ یہاں بہت سے شیشے ٹوٹے ہوئے تھے، فرش پر پرندوں کے بہت سے بے حرکت جسم نظر آرہے تھے۔ ٹی وی کیمرا ''پین'' کر کے ان مرے ہوئے رنگین طوطوں کو دکھا رہا تھا۔ اس کے بعد ایک ایسے چہرے کی شبیہ اسکرین پر ابھری جس نے میری رگوں میں خون جما دیا۔ میں نے ایک بار پھر آنکھیں سکیڑ کر دیکھا۔ یہ ایک مردہ چہرہ تھا اور میں اس کو پہچاننے میں شاید غلطی نہیں کررہا تھا۔

میں نے سر تھام لیا۔ چند سیکنڈ بعد منظر مزید واضح ہوگیا۔ کیمرے نے مرنے والے کے چہرے پر مزید زوم کیا تھا۔ ہاں...... یہ وہی تھے...... یہ وہ بے مثال ڈاکٹر تھے جنہوں نے جاما جی میں اور پھر پاکستان میں مجھ سے بے لوث دوستی کا رشتہ نبھایا تھا...... یہ کرنل ڈاکٹر زار صاحب تھے۔ انہوں نے کاسمیٹک سرجری کے ذریعے ایک نہایت نازک موقع پر میری شباہت تبدیل کی تھی اور مجھے اَن گنت خطروں سے بچایا تھا۔

رپورٹر ہیجانی انداز میں بول رہا تھا۔ ''اور ناظرین! دیکھیں، یہ ہے وہ گاڑی جو اس پمپ پر فیول لینے کے لیے رکی اور ان خونی پرندوں کو اس پر حملہ کرنے کا موقع ملا۔ جونہی گاڑی سواروں نے پمپ بوائے سے بات کرنے کے لیے کھڑکی کا شیشہ نیچے اتارا در جنوں

طوطے گاڑی میں گھس گئے اور ڈاکٹر صاحب سے چمٹ گئے۔ ڈاکٹر صاحب کی بیٹی گاڑی
سے نکل کر بھاگی اور پیٹرول پمپ کے اس سامنے والے کمرے میں گھس گئی۔ وہ بھی زخمی
ہے اور اسے اسپتال روانہ کیا گیا ہے۔"

اسٹوڈیو میں موجود نیوز کاسٹر نے پوچھا۔ "اس بارے میں کیا پتا چلا ہے کہ یہ غیر ملکی
سرجن ڈاکٹر احرار احمد لاہور سے روانہ ہو کر کہاں جا رہے تھے؟"

"جی اب اس بات کی تصدیق ہو چکی ہے کہ مسز قسطینا ان دنوں خفیہ طور پر سکھیرا
گاؤں میں ہی ٹھہری ہوئی تھیں۔ مسز قسطینا کا شمار جاما جی کی اہم ترین شخصیات میں ہوتا
ہے۔ ڈاکٹر احرار کا تعلق بھی جاما جی سے ہے۔ جب انہیں پتا چلا کہ مسز قسطینا یہاں ایک
مضافاتی علاقے میں موجود ہیں تو وہ ان سے ملنے کے لیے روانہ ہوئے مگر یہاں وزیر آباد
کے قریب انہیں یہ حادثہ پیش آ گیا۔"

کیمرے نے ایک بار پھر ڈاکٹر احرار کا چہرہ دکھایا۔ اب اسے کچھ دھندلا کر دیا گیا
تھا۔ تاہم ان کی شہ رگ پر اک گہرا گھاؤ اب بھی جھلک دکھا رہا تھا۔

میرا دل غم و اندوہ سے لبریز ہو گیا۔ یہ کیا ہو رہا تھا ہمارے ساتھ۔ ہاناوانی میرے
قریبی ساتھیوں میں سے ایک اور شکار اچک کر لے گئی تھی۔

فیلڈ رپورٹر بتا رہا تھا...... مسز قسطینا کے حوالے سے جو باتیں مشہور ہیں، وہ کچھ ایسی
غلط نہیں ہیں۔ وہ بلا جھجک خطرات میں کود پڑتی ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے انہوں نے اپنے
ساتھیوں کے ہمراہ اچانک حملہ کر کے شاہ زیب اور اس کے دوستوں کو پولیس کی حراست
سے چھڑایا تھا۔ اب انہوں نے اچانک نمودار ہو کر ڈاکٹر احرار اور ان کی بیٹی ایمان کا دفاع
کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ سکھیرا گاؤں سے آٹھ دس کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے بہت
تیزی سے یہاں پہنچیں۔ تب تک ڈاکٹر احرار جان کی بازی ہار چکے تھے اور ایمان نے خود کو
پمپ کے کمرے میں بند کر رکھا تھا۔ خونی طوطوں نے چاروں طرف سے اس کمرے کو گھیرا
ہوا تھا۔ وہ جالیوں میں چھید کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔"

نیوز کاسٹر نے پوچھا۔ "کیا مس ایمان کی مدد کے لیے اور کوئی موجود نہیں تھا؟"

"جی ہاں، یہی تو افسوس کی بات ہے۔ پمپ پر پرندوں کے حملے سے لوگ اس
خوف زدہ ہوئے کہ جس کا جدھر منہ تھا اُدھر بھاگ گیا۔ درحقیقت علاقے میں ایک
زبردست قسم کا ہراس موجود ہے۔ یہ دیکھیے، یہ کیمرا آپ کو دکھا رہا ہے، یہاں زمین پر تیس
چالیس لیٹر پیٹرول بہہ کر ضائع ہوا ہے وجہ یہی ہے کہ فیول بھرنے والا لڑکا پائپ

پیٹرول نکلتا چھوڑ کر پناہ کی تلاش میں بھاگ گیا۔ لوگ قریبی کھیتوں میں چھپ گئے اور دکانوں میں گھس کر شٹر نیچے گرا دیئے۔"

نیوز روم سے نیوز کاسٹر نے کہا۔ "آپ مسز قسطینا کے بارے میں بتا رہے تھے؟"

"بالکل جی، درحقیقت ایمان احرار کی جان اگر بچ سکتی ہے تو مسز قسطینا کی وجہ سے۔ ان کے ساتھ ایک بندہ اور بھی تھا...... اور خیال یہ ہے کہ وہ داؤد بھاؤ گینگ کا گینگسٹر وارث لودھی تھا۔ عینی شاہدوں نے بتایا ہے کہ مسز قسطینا کار پر یہاں پہنچی تھیں مگر انہوں نے ہیلمٹ پہن رکھا تھا اور ایک طویل برساتی نما چیز بھی ان کے جسم پر تھی۔ ان کے پاس شاٹ گن تھی جو چھرے ہمیں یہاں ملے ہیں وہ سیمی آٹومیٹک شاٹ گنز کے 16 اور 20 گیج کے کارتوسوں کے ہیں...... اس کا مطلب ہے کہ مسز قسطینا صورتِ حال کے لیے ہر طرح تیار ہو کر آئی تھیں۔ انہوں نے پرندوں پر اندھا دھند فائرنگ کی، مبینہ طور پر لودھی نے بھی ان کا بھرپور ساتھ دیا۔ اس کا ثبوت یہ پچاس ساٹھ پرندے ہیں جو یہاں مرے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ مسز قسطینا نے کمرے میں گھس کر زخمی لڑکی کو نکالا اور ایک ایمبولینس میں ڈال دیا......" ذرا توقف کر کے فیلڈ رپورٹر نے ایک بار پھر کیمرا مین کے ذریعے مرے ہوئے پرندوں اور ٹوٹی ہوئی کھڑکیوں کی جھلک ناظرین کو دکھائی۔

نیوز کاسٹر نے پوچھا۔ "کیا یہ درست ہے کہ پولیس کے موقع پر پہنچنے سے پہلے ہی مسز قسطینا اور لودھی وہاں سے نکل چکے تھے؟"

"جی ہاں، عینی شاہدوں سے یہی پتا چلا ہے۔ پولیس حسبِ معمول اس وقت پہنچی جب یہ واقعہ تقریباً اختتام کو پہنچ چکا تھا۔ تب تک قسطینا صاحبہ والی گاڑی وہاں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ غالب امکان یہی ہے کہ اس پر لگی نمبر پلیٹ بھی اصلی نہیں ہوگی۔"

رپورٹر سے بات ختم کرنے کے بعد نیوز کاسٹر نے ایک اسٹیپ شاٹ اپنے ناظرین کو دکھایا۔ یہ قسطینا ہی کی تصویر تھی۔ یہ تصویر کسی مہنگے موبائل سے لی گئی تھی اور خاصی واضح تھی۔ قسطینا کے سر پر ہیلمٹ تھا اور ہاتھ میں ایک جدید شاٹ گن تھی۔ وہ اس تصویر میں پہچانی جا رہی تھی۔ پھر اس کی ایک اور تصویر اسکرین پر نمودار ہوئی۔ یہ مزید واضح تھی اور اس میں قسطینا کے خدوخال صاف نظر آتے تھے...... اس تصویر میں لودھی کے چہرے کا تھوڑا سا حصہ بھی نظر آتا تھا۔

میں کمرے میں واپس آ گیا۔ ڈاکٹر احرار کی اندوہناک موت میرے لیے بے حد تکلیف دہ تھی۔ میری آخری اطلاعات کے مطابق ڈاکٹر احرار آسٹریا میں تھے اور وہاں کاسمیٹک سرجری

پر کوئی ریفریش کورس کر رہے تھے۔ شاید ان کی موت انہیں بیٹی سمیت یہاں کھینچ لائی تھی۔ ان
سے اپنی آخری ملاقات یاد آئی جو کراچی میں ہوئی تھی۔ دل درد سے بھر گیا۔

اسی دوران میں دروازے پر مدھم ''ناک'' ہوئی اور شاردا کی آواز آئی۔ ''مے آئی کم
ان؟''

مجھے اس سے چڑ سی ہوگئی تھی مگر فی الوقت میں اس سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ میں نے
اسے اندر آنے دیا۔ مجھے فخر کے حوالے سے بے حد تشویش تھی۔ میں نے اسے سخت زخمی
حالت میں دیکھا تھا۔ پتا نہیں کہ وہ ''سروائیو'' بھی کر سکا تھا یا نہیں۔

میں نے شاردا سے فخر کا ذکر کیا اور اس سے پوچھا۔ ''وہ بدبخت مرا ہے یا نہیں؟''

وہ بولی۔ ''کافی ڈھیٹ نکلا ہے۔ شاید اس کو آپ نے ہی مارنا ہے۔''

''مطلب کہ بچ گیا ہے؟''

''ہاں، اس کی گردن پر زخم تو کافی گہرا آیا تھا، پر سانس اور خوراک کی دونوں نالیاں
کٹنے سے بچ گئیں۔ علاج ہو رہا ہے۔ لگتا ہے کہ دو چار دن میں اٹھ کر بیٹھ جائے گا۔''

میں نے اس خبر کو بظاہر رنج لیکن درحقیقت بے حد خوشی سے سنا۔ میں نے شاردا سے
پوچھا۔ ''کیا وہ اور افغانی (فارس جان) دونوں یہیں پر ہیں؟''

شاردا نے اس کا جواب اثبات میں دیا پھر بولی۔ ''ایک اور سما چار ہے آپ کے لیے
اور میرا وچار ہے کہ وہ آپ کو خوشی دے گی۔''

میں سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔ اس نے وزیر آباد کے قریب پیش
آنے والے اس سنگین واقعے کے بارے میں بتایا جس میں ڈاکٹر احرار جان سے گئے
اور ان کی بیٹی زخمی ہوئی تھی۔ میں نے شاردا سے کہا کہ یہ ''خوش خبری'' مجھے مل چکی ہے۔

O......❖......O

اگلے چار پانچ روز میں کوئی خاص واقعہ رُونما نہیں ہوا، سوائے اس کے کہ ایک
میں نے شازیہ کے شوہر بیس بائیس سالہ اکبر کو دیکھا۔ وہ اسی ہال کمرے سے نکل رہا
جہاں ہاناوانی مجھے بھی گاہے بگاہے، اپنا ٹرانس ''ری نیو'' کرنے کے لیے بلاتی تھی۔
اندازہ ہو رہا تھا کہ اکبر پر ''ٹرانس'' کے غیر معمولی اثرات ہیں۔ اس کی حرکات و سکنات
یوں لگتا تھا جیسے وہ نیند کی حالت میں چلتا پھرتا ہے۔ اس کی آنکھوں کا رنگ بالکل تبدیل
چکا تھا۔ آنکھوں کے اندر جیسے سنگِ مرمر کی پتلیاں فٹ کر دی گئی تھیں۔ وہ بالکل برہنہ تھا
اردگرد کی ہر شے سے بیگانہ دکھائی دیتا تھا۔ ایک گارڈ کے ساتھ چلتا ہوا وہ عمارت کے

پورشن کی طرف چلا گیا جہاں سیکڑوں پرندے اس کے زیر اثر تھے۔ وہ جیسے ہاناوانی کا نمائندہ بن کر ان پرندوں کو ہپناٹائسز کے عمل سے گزارتا تھا۔ اکبر کو دیکھ کر میں یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ کیا وہ کبھی نارمل حالت میں واپس آ بھی سکے گا؟ شازیہ کے ہاتھوں کی مہندی ابھی پھیکی بھی نہیں پڑی تھی اور وہ اس سے کوسوں دور کسی اور ہی دنیا میں چلا آیا تھا۔ اسے برہنہ کیوں رکھا جاتا تھا، یہ بھی میری سمجھ سے باہر تھا۔

چھٹے ساتویں روز کی بات ہے جب پھر ایک اندوہناک واقعہ ہوا اور اس نے مجھے اندر تک ہلا ڈالا۔ شاردا نے اپنی دانست میں مجھے یہ ''خوش خبری'' سنائی کہ آج ہم پھر افغانی فارس جان کو مارا ماری کرتے ہوئے دیکھ پائیں گے۔

''کس کے ساتھ مارا ماری؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کا تو مجھے پتا نہیں...... آپ بھی تو ہو سکتے ہیں...... آپ ایم ایم اے کے چمپئن ہیں۔ آپ کے لیے فارس جان جیسے حریف کو قبر میں پہنچانا کون سا دشوار کام ہے۔''

''لیکن، میرا تو ہاتھ ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں؟''

وہ مسکرائی۔ ''ایسے عذر یہاں نہیں چلتے جناب! آنجہانی رائے زل کی طرح مادام کے پاس ان کا حل موجود ہوتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ آپ کو اور مدِمقابل کو یکساں مواقع فراہم کرنے کے لیے مدِمقابل کا انگوٹھا بھی آپ ہی کی طرح گھائل کر دیا جائے۔'' پھر ذرا توقف کر کے بولی۔ ''ویسے میں مذاق کر رہی ہوں۔ مجھے نہیں لگتا کہ مادام ہاناوانی فی الحال آپ کو کسی ''مقابلے'' میں اتاریں گی۔''

شاردا نے درست ہی کہا تھا۔ اس رات فارس جان کے ساتھ جس کا مقابلہ ہوا وہ میں نہیں تھا۔ وہ وہی، زخمی فخر زمان تھا۔ بہت دکھ ہوا یہ سب دیکھ کر۔ اس کی گردن پر ابھی تک سفید پٹی بندھی ہوئی تھی۔ ٹانگوں پر بھی کئی جگہ بینڈیج موجود تھی۔ یہ غیر معمولی بے رحمی کی مثال تھی لیکن اس سے بڑھ کر ایک اور بات تھی۔ دوسری طرف فارس جان کے جسم پر بھی چند گہرے زخم نظر آ رہے تھے۔ یقیناً یہ زخم اسے جان بوجھ کر لگائے گئے تھے۔ تاکہ دونوں حریفوں کا پلڑا برابر ہو سکے۔ شاردا کی کہی ہوئی بات درست ثابت ہوئی تھی۔

اس مرتبہ فخر اور فارس کا کاسٹیوم مختلف تھا۔ وہ دونوں پتھر کے زمانے کے بندے نظر آتے تھے۔ ستر پوشی کے لیے ان کے جسموں پر صرف کسی کھال کے ٹکڑے موجود تھے۔ ان کے ہاتھوں میں لکڑی کی مضبوط شاخوں سے بنے ہوئے ایسے نیزے تھے جن کے پھل لوہے کے بجائے تیز دھار نکیلے پتھروں کے تھے۔ اسی طرح کی کلہاڑیاں بھی ان کے قریب

موجود تھیں۔ ان کی داڑھیاں بڑھی ہوئی تھیں۔ وہ ننگے پاؤں، ننگے سر ایک دوسرے کے رُوبرو تھے۔ چہروں پر قاتلانہ چمک، آنکھوں میں وحشت اور درندگی کے لشکارے۔ انہیں دیکھ کر ہی پتا چل جاتا تھا کہ وہ ایک دوسرے پر درندوں کی طرح جھپٹنے کے لیے تیار ہیں۔

میری دھڑکنیں زیروزبر ہو رہی تھیں۔ ان میں سے کوئی بھی مرتا میرا کلیجا شق ہو جاتا...... لیکن مجھے یہ سب دیکھنا تھا اور اپنے حقیقی تاثرات چھپا کر دیکھنا تھا۔ شاردا چہکی۔ ''میرا وشواس ہے، آج ان میں سے ایک یقیناً یہیں پر دم توڑے گا۔ ویسے آپ کس کے مرنے کو زیادہ پسند کریں گے؟''

''جو بھی مر جائے۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔

اور پھر لڑائی شروع ہو گئی۔ دونوں بے دریغ ایک دوسرے پر جھپٹنے لگے۔ ان کی چنگھاڑیں ایل سی ڈی کے اسپیکرز سے نکل کر کمرے میں گونجنے لگیں۔ میں نے سوچا، یہ کیسی شیطانی قوت ہے جس نے ان دو افراد کو ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بنایا ہے جو ایک دوسرے پر جان چھڑکنے والے تھے۔

لڑائی شروع ہونے سے پہلے ہی دونوں زخموں سے چُور تھے...... لڑائی کے بعد ان کو مزید زخم لگنے لگے۔ شروع میں فارس کا پلڑا بھاری لگا مگر پھر فخر کی ایم ایم اے کی بے پایاں صلاحیت کام دکھانے لگی۔ وہ اپنا کامیاب دفاع کرنے لگا۔ دونوں لہولہان ہوتے جارہے تھے۔ ہر زخم جیسے میرے اپنے جسم پر لگ رہا تھا۔ میں دیکھ نہیں سکتا تھا مگر آنکھیں بھی بند نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے نظر کا زاویہ بدل لیا، اسکرین سے نگاہ ہٹالی لیکن دردناک آوازوں اور چنگھاڑوں سے کان کیسے بند ہو سکتے تھے۔ وہ بڑا اذیت ناک دورانیہ تھا۔ اچانک فخر کا ایک داؤ چل گیا۔ فخر کا پتھریلا نیزہ قریباً نو انچ تک فارس کے پیٹ میں گھس گیا۔ فخر نے فارس کے سینے پر ٹانگ رسید کر کے نیزہ اس کے پیٹ میں سے نکالا۔ وہ جوان رعنا پشت کے بل گرا۔ فخر وحشت میں اس کے سینے پر چڑھ گیا۔ اس نے خون آلود نیزہ اب دونوں ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ جب چند سیکنڈ بعد کھولیں تو کھیل ختم ہو رہا تھا۔ فخر کا نیزہ فارس کی چھاتی میں عین دل کے مقام پر اتر گیا تھا اور اندر ہی ٹوٹ گیا تھا مگر اس نے دوسرا نیزہ اٹھالیا تھا اور دیوانگی کے عالم میں بار بار فارس کا سینہ چھلنی کر رہا تھا۔ فارس، ایک حریت پسند، جاماجی کا سرفروش کمانڈر، قسطینا کا شوہر...... ایک لاش میں بدل چکا تھا...... ہاں، وہ زندگی کی سرحد پار کر گیا تھا مگر فخر کی وحشت ابھی باقی تھی۔ مسلح گارڈز فخر کو کھینچتے ہوئے خونچکاں لاش سے دور لے گئے۔

○......❖......○

یہ کیسی زندگی تھی؟ یہ موت سے بدتر ہوتی جارہی تھی۔ میرے اپنے ایک ایک کر کے اس عفریت کے منہ میں جارہے تھے جس کا نام ہاناوانی تھا۔ وہ انہیں نگل رہی تھی، ناپید کررہی تھی۔ آج فارس جان بھی چلا گیا تھا۔ وہ قسطینا کے ساتھ یہاں یہ عزم لے کر آیا تھا کہ نیوسٹی کی اس قاتلہ کو انجام تک پہنچائے گا اور ہمیں اس کے شر سے محفوظ رکھنے میں قسطینا کی مدد کرے گا لیکن آج وہ میرے ہی ایک قریبی ساتھی کے نیزے سے چھلنی ہو کر رہ گیا تھا۔

میں نے بڑے کرب کے ساتھ سوچا...... ہاناوانی! کہاں ہو تم...... میرے سامنے آؤ۔ میں دو چیزوں میں سے صرف ایک چیز برداشت کرسکتا ہوں۔ اپنا وجود یا تمہاری زندگی۔

میں رات آخری پہر تک جاگتا رہا۔ میری آنکھوں میں انگارے سلگتے رہے اور سینے میں بار بار پتھر کے زمانے کا ایک نیزہ گڑتا رہا۔ میں قسطینا کو کیا شکل دکھاؤں گا۔ میں اسے کیا جواب دوں گا؟ وہ شب و روز فارس کی راہ دیکھ رہی تھی جو بھی تھا، وہ اس کی زندگی کا ساتھی تھا۔

اگلے روز شام کے وقت ایک عجیب صورتِ حال کا سامنا ہوا۔ مجھے کیپٹن ڈاکٹر فرزہ نظر آئی۔ میں نے سمجھا کہ وہ میرے انگوٹھے کے معائنے کے لیے آئی ہے لیکن یہ اندازہ غلط ثابت ہوا۔ آج اس کا لباس بھی مختلف تھا۔ وہ اکثر یونیفارم میں ہوتی تھی مگر آج کریم کلر کی پینٹ اور سفید رنگ کی پھولدار شرٹ میں تھی۔ بال ایک خوشنما جوڑے کی صورت میں بندھے ہوئے تھے۔ ایک نیم گرم شال اس کے کندھوں پر تھی۔ اس نے مناسب سا میک اپ بھی کررکھا تھا۔ میں اسے یوں دیکھ کر چونکا۔

اپنے اندرونی اندوہ کو چھپاتے ہوئے میں نے مسکراتے لہجے میں کہا۔ ''اماوس کی راتوں میں یہ چاند کہاں سے نکل آیا اور وہ بھی سرِ شام؟''

وہ بولی۔ ''اگر یہ چاند ہے...... تو بھی یہ نکلا نہیں، نکالا گیا ہے۔ آپ کو موم بتی وغیرہ کی روشنی کم معلوم ہوتی تھی ناں۔''

میں ایک بار پھر چونکا۔ وہ معنی خیز لہجے میں شاردا کا حوالہ دے رہی تھی اور اس سے میری بے رغبتی کا ذکر کررہی تھی لیکن ان باتوں سے اس کی یوں آمد کا کیا تعلق تھا؟

اندر آ کر اس نے اپنی انگلیاں مروڑیں اور پھر صوفے پر بیٹھ گئی۔ آج اس کے اسٹائل اور چال ڈھال میں وہ اٹین شین والی کیفیت نہیں تھی۔ اگلے چار پانچ منٹ میں ہمارے

درمیان جو گفتگو ہوئی، اس سے ایک سنسنی خیز انکشاف ہوا۔ وہ یہاں میرے پاس شاردا کی جگہ لینے آئی تھی...... اور یقیناً یہ سب کچھ ہاناوانی کے حکم پر ہی ہوا تھا۔ ہاناوانی کے وہ الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے جو اس نے پچھلی نشست میں مجھ سے کہے تھے...... خود کو پُرسکون رکھو ایسٹرن۔ ان سہولتوں سے فائدہ اٹھاؤ جو تمہیں یہاں مہیا ہیں۔ اگر ساتھی لڑکی تمہیں پسند نہیں تو کوئی اور مہیا ہو سکتی ہے...... کوئی بھی۔

ہاناوانی جانتی ہوگی کہ میں شاردا کے بجائے کیپٹن فرزہ میں دلچسپی ظاہر کر رہا ہوں، لہٰذا فرزہ کو میری طرف روانہ کر دیا گیا۔

ہاناوانی اس حوالے سے اتنی متفکر کیوں ہو رہی تھی؟ کیا میرا یہ اندیشہ درست تھا کہ وہ میری کیفیت کی طرف سے پوری طرح مطمئن نہیں ہے، وہ ہر طرح تسلی کرنا چاہتی ہے کہ میں واقعی مکمل طور پر اس کے ٹرانس میں آ چکا ہوں۔ درحقیقت میں نے دل پر بہت جبر کر کے شراب کو تو ہاتھ لگا لیا تھا مگر عورت سے اب بھی دور تھا، کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ میرا یہی گریز ہاناوانی کو شک میں مبتلا کرتا ہو؟ چند ہی لمحوں میں مجھے اپنی پیشانی پر پسینے کی نمی محسوس ہونے لگی۔ میں ہاناوانی کا اعتماد کھونا نہیں چاہتا تھا...... کسی صورت کھونا نہیں چاہتا تھا۔ پتا نہیں کیوں چار پانچ روز سے میرا دل یہ گواہی دے رہا تھا کہ ہاناوانی کے خاتمے کی اگر کوئی صورت نکلے گی تو اسی اعتماد کے اندر سے نکلے گی۔ داؤد بھاؤ نے بھی کچھ ایسی ہی بات کہی تھی۔ اس نے کہا تھا۔ ''شاہ زیب! اگر تم ہپناسز کے سلسلے میں ہاناوانی کو چکما دینے میں کامیاب ہو گئے ہو تو یہ تمہاری ایک بہت بڑی کامیابی ہے۔ اسے برقرار رکھو۔''

اور اسے برقرار رکھنے کے لیے میں نے اب تک ہر ممکن کوشش کی تھی۔ دین محمد صاحب کا خون تک اپنی گردن پر لے لیا تھا۔ تو کیا اب میں اس ایک کمی کی وجہ سے ہاناوانی کا اعتماد کھو دوں گا؟ مجھے صاف محسوس ہوا کہ وہ میرا امتحان لے رہی ہے اور اسی امتحان کے لیے اب اس نے شاردا کے بجائے کیپٹن فرزہ کو میری خلوت میں بھیجا ہے۔

میرے سینے میں ایک ہولناک اتھل پتھل ہو رہی تھی۔ اس اتھل پتھل کا تعلق اس نئی آزمائش اور نئے حالات سے تھا۔ مجھے واضح پتا چل رہا تھا کہ مجھے اس آزمائش سے سرخرو ہونے کے لیے ایک دیوانی کوشش کرنا ہوگی۔ شاید اپنی قائم کی ہوئی خاص حدود سے آگے نکلنا ہوگا۔ یہ میرے لیے بہت کٹھن کام تھا بلکہ سوہانِ روح تھا۔ میں جس قسم کے حالات سے گزر رہا تھا، کسی عورت کے لیے میرے اندر ایک ذرا سی رغبت بھی موجود نہیں تھی اور پھر میرے وہ وعدے جو میں نے خود سے کر رکھے تھے۔

محترم حاذق ذکری کے ایک بار کہے ہوئے الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے۔ انہوں نے ایک مرتبہ گرین فورس کے ایک ایسے سرفروش کا ذکر کیا تھا جسے جاسوسی کے لیے نیوسٹی بھیجا گیا تھا۔ وہ ایک دین دار شخص تھا مگر نیوسٹی میں اپنا بہروپ برقرار رکھنے کے لیے اس نے حشیش کھائی تھی، جوا کھیلا تھا اور نائٹ کلبوں میں راتیں گزاری تھیں۔ وہ اپنے ٹارگٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہوا تھا تاہم بعدازاں اسے رائے زل کے وفادار گارڈز نے شوٹ کر دیا تھا۔ حاذق ذکری نے اس کے کردار کو سراہا تھا اور کہا تھا کہ اس سرفروش نے جو کچھ کیا، اپنے فرض کی انجام دہی میں کیا۔ اس کی پارسائی اور پاک دامنی ہر شک و شبہے سے بالا تھی اور افضل تر تھی۔

مجھے بھی یہاں اپنا بہروپ بچانا تھا اور ہر صورت بچانا تھا۔ مولانا حبیب اللہ اور ڈاکٹر احرار کے بعد اب فارس جان کی موت دیکھنے کے بعد میرے اندر کی کیفیت عجیب ہو چکی تھی۔ ایک آگ تھی جو میرے سینے کو جھلسا رہی تھی۔ یہ انگارے نہیں تھے، اب یہ شعلے تھے۔ یہ میرے چاروں طرف پھنکار رہے تھے۔ ڈنر کے بعد میں نے کیپٹن فرزہ سے کہا کہ وہ وہسکی لائے۔ وہ لے آئی۔ میں نے اوپر تلے کئی پیگ چڑھائے...... بدبودار تلخ سیل نے وہ کچھ کیا جو وہ کرتا ہے۔ یہ ایک سیال تھا مگر اس نے آگ بجھانے کے بجائے اور بھڑکا دی۔

کیپٹن فرزہ گہری نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ رات آہستہ آہستہ آگے کو سرک رہی تھی۔ آرام دہ کمرے میں خوشگوار حرارت تھی مگر سیال کی گرمی نے اس حرارت کو خوشگوار سے کچھ زیادہ کر دیا تھا۔

''کیا سوچ رہی ہو کیپٹن فرزہ؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''یہ سوچ رہی ہوں کہ آپ کیا سوچ رہے ہیں...... اور...... کیا چاہ رہے ہیں؟''

''تم کیا چاہ رہی ہو؟''

''میری چاہ آپ کی چاہ سے منسلک ہے۔'' وہ شستہ انگلش میں بولی۔

''لیکن میں جانتا ہوں، تمہاری ''چاہ'' وہ نہیں جو تم ظاہر کر رہی ہو۔ شاید تمہاری مجبوری تمہیں میرے بیڈروم میں لائی ہے۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔'' وہ مجھ سے نظریں ملائے بغیر سپاٹ لہجے میں بولی اور شال جواب تک اس کے کندھوں پر تھی اتار کر ایک طرف رکھ دی۔ اس کا سڈول، پُر شباب جسم نمایاں ہو گیا۔

میں نے وال کلاک کی طرف دیکھا۔ سوئیاں اب رات گیارہ بجے کا وقت بتا رہی

تھیں...... مینشن میں خاموشی کا راج تھا۔ بس طوطوں کا مدھم سا شور تھا جو ایک ہلکی بھنبھناہٹ کی صورت سنائی دیتا تھا۔ (ان کی تعداد اب یقیناً سیکڑوں سے اوپر ہو چکی تھی)
میں نے ایک اور تلخ جام اپنے اندر انڈیلا اور فرزہ کے قریب چلا گیا۔ اس نے جو شال اپنے کندھوں سے اتاری تھی، سائڈ ٹیبل پر پڑی تھی۔ میں نے وہ اٹھائی اور دوبارہ اس کے کندھوں پر ڈال دی۔ وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے کہا۔ "نہیں فرزہ! آج کی رات میں ذرا مختلف انداز میں گزارنا چاہتا ہوں۔"
"مختلف انداز؟"
"شاردا۔" میں نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔
وہ بدستور میری آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ جیسے جاننے کی کوشش کر رہی ہو کہ میرا جواب کہاں تک درست ہے۔
میں نے کہا۔ "تم خوب صورت ہو۔ کوئی بھی تمہاری قربت چاہے گا...... لیکن...... میرے ذہن میں فی الوقت شاردا ہے۔"
اس نے اپنے ڈھیلے جوڑے کو دوبارہ باندھا، صوفے پر بیٹھ کر اپنے سینڈل پہنے، پھر کھڑے ہو کر ایک عجیب نظر مجھ پر ڈالی۔ اس نظر میں شکریے کی جھلک صاف نظر آتی تھی۔
وہ چلی گئی تو میں نے تلخ بدبودار سیل کا ایک اور جام چڑھایا اور شاردا کو بلا لیا...... وہ شب میرے لیے بہت تکلیف دہ تھی۔ میں وہ سب نہیں چاہتا تھا جو کر رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں اپنے اندر مسلسل وہ آتشیں سیال انڈیل رہا تھا جو حواس کو مختلف کر دیتا ہے۔ شاردا میرے قریب تھی۔ وہ بیک وقت خوش بھی تھی اور خوف زدہ بھی۔ کسی وقت اس کی آنکھوں کے اندر حیرت امڈ آتی تھی۔ میں شعلوں میں گھرا ہوا تھا۔ بانہوں میں تو شاردا تھی مگر نگاہوں میں نکو شہزادے انیق کی لاش تھی، سجاول کی بے نور آنکھیں تھیں، مولانا حبیب اللہ کا خون آلود چہرہ تھا، ڈاکٹر احرار اور فارس جان کے بے جان جسم تھے۔ ذہن میں صرف ایک ہی بات تھی۔ مجھے اپنا بہروپ ہر صورت برقرار رکھنا ہے...... ہاں بہروپ برقرار رکھنا ہے کیونکہ اسی میں سے ہاناوانی تک پہنچنے کا راستہ نکلے گا۔

○......❖......○

اگلے روز میں دوپہر گیارہ بارہ بجے کے قریب بیدار ہوا۔ سر بھاری تھا، طبیعت بہت بوجھل ہو رہی تھی۔ شاردا کمرے سے جا چکی تھی۔ رات کے واقعات نگاہوں کے سامنے گھومے تو طبیعت اور دل و دماغ کی کثافت بڑھ گئی۔ پھر فارس جان کی موت کے منا

پردۂ تصور پر ابھرے اور جسم چٹخنے لگا۔ میں واش روم چلا گیا اور لباس سمیت شاور کے سرد پانی کے نیچے کھڑا ہو گیا۔

یوں لگتا تھا کہ گناہ کی ایک گٹھڑی سر پر رکھی گئی ہے۔ رات ہوئی اور پھر صبح ہو گئی۔ گھڑی کی سوئیاں آگے کو سرکتی رہتی ہیں اور وہ سرکتی رہیں۔ مستقل حرکت کرنے والی یہ سوئیاں بھی عجب ہیں...... یہ علی الصباح پھانسی پانے والے کے لیے اپنی رفتار سُست نہیں کرتیں اور نہ ایک حسین شام میں وصالِ یار میں تڑپنے والے کے لیے رفتار تیز کرتی ہیں۔ وہ میری زندگی کے بڑے یاس انگیز اور تاریک شب و روز تھے۔ دماغ میں ہر وقت ایک دھند سی بھری رہتی تھی۔ اس دھند کی ایک وجہ شاید وہ میڈیسنز بھی تھیں جو مجھے باقاعدگی سے کھلائی جاتی تھیں۔ مجھے باہر کے حالات کا کچھ علم نہیں تھا۔ نہ ہی یہ پتا تھا کہ قسطینا اور پہلوان حشمت وغیرہ اب کہاں ہیں۔ یقینی بات تھی کہ وہ کھلے عام تو سکھیرا گاؤں میں نہیں رہ سکتے تھے لیکن میں جانتا تھا کہ وہ سکھیرا کے آس پاس ہی کہیں موجود ہوں گے۔ قسطینا ارادے کی بڑی پکی تھی اور اس نے برملا کہا تھا کہ وہ تاجور اور سیف کی فیملی کی حفاظت کے لیے جا رہی ہے اور ان پر کوئی آنچ نہیں آنے دے گی۔

فارس جان اب اس دنیا میں نہیں تھا لیکن قسطینا یقیناً اس کی بخیریت واپسی کے لیے دعا گو تھی۔ اس کے بارے میں سوچ کر میرا دل ہولنے لگتا تھا۔ ٹی وی کے ذریعے جو تھوڑی بہت خبر مجھ تک پہنچی تھی، اس سے پتا چلتا تھا کہ داؤد بھاؤ کی ''موت'' تو کنفرم ہو چکی ہے۔ تاہم دین محمد صاحب کے ''قتل'' کے حوالے سے تھوڑا سا کنفیوژن موجود ہے۔ اس کی وجہ پوسٹ مارٹم رپورٹ ہی تھی جس میں شبہے کا اظہار تھا کہ دین محمد صاحب کو گولیاں پہلے لگی ہیں یا انہیں اٹیک پہلے ہوا ہے۔

میں نے ہفتے کے روز کیپٹن فرزہ کو اپنے بیڈ روم سے واپس بھیجا تھا اور اس واقعے کو اب تین روز گزر چکے تھے۔ اس دوران میں وہ مجھے میڈیسن دینے کے لیے آتی رہی تھی۔ ہر دفعہ مجھے اس کی آنکھوں میں ''شکریہ'' کا لفظ لکھا ہوا نظر آیا تھا...... تیسرے روز شام کے بعد مجھے ایک بار پھر اسی ہال کمرے میں لے جایا گیا جہاں ہاناوانی اسکرین پر نظر آتی تھی اور اپنے ہپناسز کی تجدید کرتی تھی۔ میرے ہاتھ آج بھی باندھے نہیں گئے تھے۔ وہی کرسی تھی، وہی نیم تاریک ہال تھا، وہی سازوں کی پُراسرار دُھن تھی لیکن آج ایک چیز مختلف نظر آئی۔ ہال کی بلند و بالا چھت پر وہ طویل جھالر موجود نہیں تھی جو الٹی لٹکی ہوئی چمگادڑوں کی وجہ سے وجود میں آتی تھیں۔

اسکرین پر ہاناوانی کا منحوس چہرہ نمودار ہو چکا تھا۔ سیاہ عینک آنکھوں پر موجود تھی۔ وہ بولی۔ ''مجھے خوشی ہے کہ تم انجوائے کر رہے ہو۔ ویسے بھی جب جانی دشمن ایک ایک کر کے جہنم واصل ہو رہے ہوں تو جشن منانا بنتا ہی ہے۔''

''آپ بالکل درست فرما رہی ہیں۔'' میں نے فدویانہ لہجے میں کہا۔

وہ کچھ دیر مجھے گہری نظروں سے دیکھتی رہی...... پھر ذرا توقف سے بولی۔ ''تم جوان ہو، ہینڈسم ہو، اپنا حلیہ درست کرو۔ تمہارے بال الجھے ہوئے ہیں، شیو بڑھی ہوئی ہے......''

''میں خیال رکھوں گا مادام۔''

''اپنے لیے اچھا لباس منتخب کرو۔ اپنی خوراک کا خیال رکھو۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ تم کھانے کے سلسلے میں بہت بے پروا ہو۔''

''میں آئندہ احتیاط کروں گا مادام۔''

''تاجور تمہیں ملے گی اور ضرور ملے گی۔ وہ آدم کی بیٹی قسطینا اور تمہارے باقی بدخواہ مل کر بھی تمہارا اور تاجور کا راستہ نہیں روک سکتے۔''

''آپ میری پشت پناہ ہیں تو پھر مجھے یقین ہے کہ ایسا ہی ہوگا۔''

اس گفتگو کے بعد ہاناوانی اپنی اصل کارروائی کی طرف آ گئی۔ اس نے اپنی منحوس سیاہ عینک اتار دی اور مجھے حکم دیا کہ میں اپنی آنکھیں اس کی آنکھوں میں پیوست کر دوں۔ وہ اپنی سجیشنز تازہ کرنے میں مصروف ہوگئی...... ایک بار پھر کشش اور مزاحمت کا وہی کھیل شروع ہوگیا۔ (اطمینان کی بات یہ تھی کہ اس کھیل میں مجھے مسلسل کامیابی مل رہی تھی)

تیس چالیس منٹ بعد میں اپنے کمرے میں واپس آ گیا اور خود کو نڈھال سا ظاہر کرتے ہوئے بستر پر دراز ہو گیا۔ ہر سجیشن کے بعد مجھے ایسا ہی کرنا پڑتا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں اور شاردا اپنی لمبی نرم انگلیوں سے میری پیشانی دبا رہی تھی۔ مجھے اپنے دل میں ایک کھٹکا سا محسوس ہو رہا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ہال کمرے کی بلند چھت سے الٹی لٹکی ہوئی درجنوں چمگادڑیں نظر نہیں آئی تھیں۔ وہ کہاں تھیں؟ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ وہ بھی کسی جگہ حملے کے لیے روانہ ہوئی ہوں۔ دیر تک یہ سوچ مجھے پریشان کرتی رہی پھر اس اندیشے کو ذہن سے دھکیل کر میں سو گیا۔

اگلے روز شاردا بنی ٹھنی نظر آ رہی تھی۔ وہ جیسے اپنی اداؤں سے مجھے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پچھلے تین چار روز سے میں نے اس پر کوئی خصوصی توجہ نہیں دی تھی۔ دوپہر کو اس نے خود میری شیو بنائی تھی اور اب میرے لیے درجنوں جوڑے لے کر آئی

تھی۔ چاہتی تھی کہ پسندیدہ لباس منتخب کرنے میں میری مدد کرے۔ مجھے اس کی موجودگی زہر لگ رہی تھی تاہم میں نے کوئی تلخ ترش بات اس سے نہیں کہی...... میں چاہتا تھا کہ مجھے کوئی باہر کی خبر اس سے مل سکے (میں نے آج ٹی وی لاؤنج کی طرف جا کر کچھ سن گن لینے کی کوشش کی تھی مگر وہاں کسی نیوز چینل کے بجائے HBO لگا ہوا تھا)

اس سے پہلے کہ میں شاردا سے کچھ پوچھتا، وہ خود ہی بول اٹھی۔ ''رات بہت ہنگامہ رہا۔''

''کہاں؟''

''آپ کے بیڈ روم میں۔''

''کیا بکواس ہے۔'' میں نے کڑے تیوروں سے پوچھا۔

وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ ''نہیں، مذاق کر رہی ہوں ..... وہاں سکھیرا گاؤں میں بہت ہنگامہ رہا۔ بڑی ہلچل مچی۔''

''پہیلیاں مت بجھواؤ، کیا ہوا؟'' میں نے چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''ایک اور فضائی حملہ۔'' اس نے کہا۔ پھر ذرا توقف سے بولی۔ ''چمگادڑوں کی یورش۔ مدر مادام آپ کے دشمنوں کا صفایا کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔''

میری رگوں میں خون جیسے منجمد ہو گیا۔ نگاہوں میں راحیل، اسفند، شازیہ اور اس کی بہنوں کے چہرے گھوم گئے۔ میں نے اپنے اندرونی اضطراب کو بمشکل چھپایا اور سپاٹ لہجے میں پوچھا۔ ''کیا بنا؟''

''لگتا ہے کہ موت کے خوف نے سکھیرا کے لوگوں کو بہت چوکنا کر دیا ہے جو سماچار میں نے ٹی وی پر دیکھی ہیں ان سے تو یہی پتا چلا ہے کہ گاؤں کے لوگ گھروں میں بند تھے۔ کھڑکیوں اور روزنوں وغیرہ پر جالیاں لگی ہوئی تھیں۔ خاص طور سے جو دو گھر اصل ٹارگٹ تھے، وہاں بہت احتیاط کی گئی تھی۔''

''کوئی جانی نقصان؟'' میں نے پوچھا۔ اندر سے دل کانپ رہا تھا۔

''کوئی خاص نہیں۔ سماچار میں بتایا گیا ہے کہ کھیتوں میں کام کرتے ہوئے دو بندے ہلاک اور چار پانچ زخمی ہوئے ہیں۔ کھلی جگہوں پر بندھے ہوئے کچھ مویشیوں کے مرنے اور گھائل ہونے کی بھی اطلاع ہے...... ویسے ایک اور بات بھی کنفرم ہوتی نظر آ رہی ہے۔ آپ کی وہ نمبر ایک بدخواہ اور روودھی قسطینا بھی سکھیرا کے آس پاس ہی کہیں موجود ہے۔''

''وہ کیسے؟''

''کل رات جب چمگادڑوں نے کھیتوں میں کام کرتے لوگوں اور مویشیوں پر حملہ کیا تو کچھ نامعلوم لوگوں نے ان پر شکاری گنز سے کارتوسوں کی بوچھاڑ کی۔ انہوں نے اپنے چہرے کپڑوں میں چھپا رکھے تھے۔ اس سے پہلے ایسا ہی کچھ ''باغی ڈاکٹر احرار'' والے واقعے میں ہوا تھا۔ وہ واقعہ بھی تو سکھیرا گاؤں سے کیول آٹھ دس کلومیٹر کی دوری پر ہوا تھا۔''

میں سناٹے کی کیفیت میں یہ ساری باتیں سن رہا تھا۔ میں نے شاردا سے کہا کہ وہ مجھے آج کا اخبار فراہم کرے۔

اس نے کہا۔ ''میں نے آپ کو بتایا تھا کہ اخبار کی فراہمی مادام کی آ گیا (اجازت) سے ہی ہو سکتی ہے اور آ گیا کیپٹن فرزہ لے سکتی ہیں۔''

''تو کیپٹن فرزہ تک میرا یہ مطالبہ پہنچاؤ۔'' میں نے کہا۔

اس روز تو مجھے اخبار نہیں مل سکا لیکن اگلے روز مل گیا۔ چمگادڑوں کے تازہ حملے والا واقعہ چونکہ ایک دور دراز گاؤں میں ہوا تھا لہٰذا اسے اتنی زیادہ پروجیکشن تو نہیں مل سکی تھی پھر بھی ایک دو خبریں موجود تھیں۔ ان مویشیوں کی تصویریں بھی تھیں جو اس حملے میں جان سے گئے تھے۔ ایک تصویر میں گاؤں سے ملحقہ ایک کھیت دکھایا گیا تھا۔ جس میں سات آٹھ مردہ چمگادڑیں پڑی تھیں۔ خبر میں اس زبردست خوف و ہراس کا ذکر بھی کیا گیا تھا جو علاقے کے لوگوں میں موجود تھا۔

اسی اخبار میں اندر کے صفحے پر ''ایک کالمی'' ایک اور خبر موجود تھی جس نے مجھے بری طرح چونکا دیا۔ میں نے رکی ہوئی سانسوں کے ساتھ پڑھا۔ اس خبر میں گوٹھ موراناں کے قبرستان کا ذکر تھا...... ہاں وہی موراناں کلاں جہاں انیق کا آبائی گھر تھا۔ اس مختصر خبر کا متن عجیب تھا۔ اوپر سرخی تھی۔ ''قبرستان میں انوکھی واردات'' نیچے متن میں لکھا تھا۔ جانوروں نے قبر کھود کر لاش نکالنے کی کوشش کی۔ خیال ظاہر کیا جا رہا ہے کہ یہ قبریں کھودنے والے بجو تھے جنہوں نے ایک قبر کی بے حرمتی کی۔ وہ قبر میں دو تین بڑے سوراخ کرنے میں کامیاب ہوئے اور میت تک پہنچ گئے۔ انہوں نے میت کا ایک ہاتھ چبا ڈالا۔ اتفاقاً قبرستان کا چوکیدار جو گورکن بھی تھا، موقع پر پہنچ گیا۔ اس نے ٹارچ کی روشنی میں یہ منظر دیکھا اور لاٹھی سے جانوروں کو بھگانے کی کوشش کی۔ بجوؤں نے پلٹ کر گورکن پر حملہ کیا اور اس کی پنڈلیاں زخمی کر دیں۔ گورکن کا شور سن کر ایک مسلح چوکیدار وہاں پہنچ گیا۔ اس نے چند فائر کیے جس کے بعد یہ آوارہ جانور رُوپوش ہو گئے۔ گورکن کا کہنا ہے کہ اس لحاظ سے یہ انوکھا

واقعہ ہے کہ بجو وغیرہ اس طرح پلٹ کر حملہ نہیں کرتے ...... اس کے علاوہ گورکن کا یہ بھی کہنا ہے کہ مذکورہ قبرستان میں یہ جانور شاذونادر ہی دیکھا جاتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ قبر داؤد بھاؤ کے اسی نوجوان ساتھی کی تھی جسے کچھ عرصہ پہلے نامی گرامی ڈکیت سجاول سیالکوٹی نے قبائلی علاقے میں قتل کیا تھا۔

میرا سر گھومنے لگا۔ اخبار ایک طرف پھینکا اور دیوار سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ یہ کوئی عام خبر نہیں تھی۔ کم از کم میرے نزدیک تو عام نہیں تھی۔ میں جانتا تھا کہ اس کے پیچھے اسی بدذات ہاناوانی کا ہاتھ ہو گا۔ یہ کیسی بلا تھی۔ اس کے انتقام کی کوئی حد بھی تھی یا نہیں؟ یہ اپنے دشمنوں کی قبروں کو بھی معاف نہیں کر رہی تھی۔ میرے ذہن سے لاہور کے مضافاتی علاقے والا وہ واقعہ ابھی نکلا نہیں تھا۔ جب مقامی قبرستان میں اسی ہاناوانی کے کارندوں نے ''میری قبر'' پر اندھا دھند برسٹ مارے تھے۔ قبر کے کتبے کو گولیوں سے چھلنی کیا تھا اور اب انیق؟

انیق ...... میرا انکو شہزادہ ...... اس کو مر کر بھی چین نصیب نہیں ہو پا رہا تھا۔ موذی جانوروں نے اس کا ہاتھ چبا ڈالا تھا۔ اگر اتفاقاً گورکن وہاں نہ پہنچ جاتا تو وہ جانور نہ جانے اس جواں مرگ کی لاش کا کیا حال کرتے ...... ننانوے فیصد امکان اسی بات کا تھا کہ طوطوں، چمگادڑوں اور گدھوں کی طرح یہ بھی ہپناٹائزڈ جانور تھے۔ غالباً انہیں کسی گاڑی میں اس قبرستان تک پہنچایا گیا ہو گا ...... ہاناوانی سے کیا ممکن نہیں تھا؟

بہت عرصے بعد میری آنکھوں میں نمی آ گئی۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ ''معاف کرنا یار! میری وجہ سے بہت دکھ اٹھائے تم نے ...... اپنی زندگی تک گنوا دی ...... چھوٹی عمر میں اپنی ساری حسرتوں سمیت قبر میں جا سوئے ...... اور میرے دشمن تمہیں وہاں بھی چین سے رہنے نہیں دے رہے ...... مجھے معاف کر دینا انیق ...... لیکن میرا وعدہ ہے تم سے کہ ...... تمہاری مجرم تک ضرور پہنچوں گا، جب تک سینے میں سانس ہے، جب تک آنکھ میں روشنی ہے ...... جب تک جسم میں زندگی کی حرارت ہے، میں پیچھے نہیں ہٹوں گا ......

کامیابی کس طرف سے آتی ہے، کہاں سے آتی ہے؟ کب آتی ہے؟ کچھ پتا نہیں ہوتا لیکن معلوم نہیں کیوں مجھے یقین سا تھا کہ ہاناوانی تک پہنچنے کا کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکلے گا۔ بے شک وہ سات دروازوں کے پیچھے تھی لیکن یہ دروازے کھل سکتے تھے۔ اس کا بے رحم انتقام اب قبروں تک پہنچ رہا تھا۔ وہ ظلم اور تکبر میں فرعونیت کو چھو رہی تھی اور اس کے لیے کسی دریائے نیل میں تو طغیانی آنا تھی۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا آیا ہے ...... اب بھی جو کچھ ہو رہا

تھا، میرے سامنے تھا..... قانون شکن پولیس آفیسر قیصر چوہدری اپنے انجام کو پہنچا تھا، لالہ وریام مکافاتِ عمل کا شکار ہوا تھا اور اس سے پہلے رائے زل اور آقا جان جیسے جابر اور امریکی لونگ جیسے جلاد اذیت ناک موت کے منہ میں گئے تھے۔ بے شک ہمیشہ ایسا ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ عیاشیوں، بداعمالیوں اور ناانصافیوں والی زندگی زیادہ طویل نہیں ہوتی اگر ہو بھی تو وہ طویل زندگی نہیں طویل عذاب ہوتا ہے۔

میرا ذہن کچھ عرصہ پیچھے چلا گیا۔ اپنی سفاک بہن ہاناوانی کے ستم کا شکار ہونے والے محترم حاذق ذکری نے ایک بار کہا تھا۔ ''اکثر جو نظر آ رہا ہوتا ہے، وہ ہوتا نہیں، اگر کوئی شخص خدا کے قانونوں کو توڑتا ہے اور خوش بھی نظر آتا ہے تو وہ خوش نہیں ہے۔ وہ شادماں نہیں ہے۔ خوشی کا اصل پیمانہ اندر کی خوشی ہے، ظاہری اسباب نہیں۔''

انہوں نے ذرا توقف کیا تھا اور پھر سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا تھا۔ ''دوستو! میں تمہیں مثال دیتا ہوں۔ عین ممکن ہے کہ نمک کے ساتھ سوکھی روٹی کھا کر ٹھنڈا پانی پینے والا...... فائیو اسٹار ہوٹل کے بوفے سے زیادہ مزہ لے رہا ہو اور عین ممکن ہے کہ پیٹ سے گھٹنے جوڑ کر پھٹے پرانے لحاف میں سخت بستر پر سونے والا، ائرکنڈیشنڈ گرم روم میں گداز گدوں پر استراحت کرنے والوں سے زیادہ آرام میں ہو اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ کسی راجا اندر کی طرح حسیناؤں کے جھرمٹ میں گھرے ہوئے شہزادے سے، وہ عام شخص زندگی سے زیادہ حظ اٹھا رہا ہو جسے معمولی صورت والی باوفا شریکِ حیات نصیب ہے......''

سہ پہر کے وقت فرزہ مجھے وہ مخصوص سکون بخش دوائیں کھلانے آئی، جو وہ ہر دوسرے روز باقاعدگی سے دیتی تھی۔ اس میڈیکیشن کے بعد دماغ سن سا ہو جاتا تھا۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد ساڑھی میں لپٹی ہوئی شاردا آ گئی۔ اس نے مجھے بتایا کہ ابھی کچھ ہی لمحوں میں مجھے ہال کمرے میں ہاناوانی کے رُوبرو جانا ہوگا۔ ہپناسز کو ''ری نیو'' کرنے کا یہ وہی عمل تھا جو پہلے بھی کئی بار ہو چکا تھا۔ تاہم میں جانتا نہیں تھا کہ آج اس میں بہت کچھ مختلف ہے۔

دس منٹ بعد میں پُراسرار روشنیوں اور ناقابلِ فہم موسیقی والے اسی ہال میں موجود تھا۔ بلند و بالا چھت پر سیاہ چمگادڑوں کی طویل قطار تھی۔ آج اس ہال کمرے میں میرے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ وہ دو گارڈز بھی نہیں تھے جو ہپناسز کے عمل کے وقت بھی ہال میں موجود رہتے تھے۔ میرے دل میں ہر وقت یہ ڈر موجود رہتا تھا کہ کہیں ہاناوانی اپنی طاقتور سجیشن کے ذریعے مجھ پر حاوی نہ ہو جائے۔ یہی وجہ تھی کہ اس ہال کمرے میں آ کر مخصوص کرسی پر بیٹھتے ہی میں اپنے زخمی انگوٹھے پر اپنی انگلیوں کی گرفت مضبوط کر دیتا تھا اور خود کو زیادہ

زیادہ اذیت پہنچانے کے لیے تیار ہو جاتا تھا۔ میرا پختہ ارادہ ہوتا تھا کہ اگر خود کو ہاناوانی کے چنگل سے بچانے کے لیے مجھے اپنا یہ انگوٹھا توڑنا پڑا تو توڑ لوں گا۔ بہرحال اب تک اس کی نوبت نہیں آئی تھی۔ درحقیقت پہلے شدید ترین حملے کے بعد، ہاناوانی نے زیادہ شدت سے حملے نہیں کیے تھے۔ وہ صرف اپنے ہپناٹزم کی تجدید کرتی تھی ... میں کسی نہ کسی طرح اپنا دفاع کرنے میں کامیاب ہو جاتا تھا۔

اب بھی میں کرسی پر اسکرین کے سامنے بیٹھا تھا۔ میں نے عام سے انداز میں اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ رکھے تھے۔ اس انداز کے سبب میرا زخمی انگوٹھے والا ہاتھ میرے بازو کی اوٹ میں آ گیا تھا۔ اب میں اس انگوٹھے کے ساتھ کچھ بھی کرتا، دیکھنے والوں کی نظر سے اوجھل ہی رہتا۔

آج ہاناوانی کے فربہ جسم پر کھلا لبادہ نہیں تھا۔ وہ قدرے بہتر لباس میں نظر آ رہی تھی۔ اس کے جسم پر قیمتی جڑاؤ زیورات جگمگا رہے تھے۔ کچھ رسمی باتوں کے بعد اس کی سیاہ عینک اس کے چہرے سے جدا ہوئی اور سجیشن کا عمل شروع ہوا۔ وہ پہلے چند جملوں کے ساتھ میرے ذہن کو غنودگی کی حالت میں لاتی تھی اور پھر اصل سجیشن شروع کرتی تھی۔ آج سجیشن شروع ہوئی تو میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ یہ خلافِ معمول سجیشن تھی۔ یہ کچھ اس طرح سے آگے بڑھ رہی تھی۔

''ایسٹرن کنگ، تم نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی...... کسی سے نہیں...... تم صرف ایک کو چاہتے ہو...... صرف ایک کو...... تمہارے اندر صدیوں کی پیاس ہے اور وہ صرف ایک کے لیے ہے۔''

''جی مادام۔'' میں نے حسبِ معمول غنودہ لہجے میں کہا۔

''تم اس کی چاہ میں دیوانے ہو۔ وہ جب تم کو ملے گی تو تم اپنی ساری محبتیں، تمام شدتوں کے ساتھ اس پر نچھاور کر دو گے۔''

''جی مادام۔''

اسکرین کے دائیں پورشن پر ایک تصویر نمودار ہوئی۔ یہ ہاناوانی کی تصویر تھی۔ وہ کسی باغ میں کھڑی تھی مگر یہ تصویر کوئی پچیس تیس سال پہلے کی تھی۔ وہ جوان تھی اور کسی حد تک خوش شکل بھی۔ وہ اسی لباس میں نظر آ رہی تھی جو لباس ہاناوانی نے آج پہن رکھا تھا۔ گہرے سرخ پھولوں والا ایک پنک گاؤن، اسی رنگ کا لیس دار دوپٹا گلے میں...... اور ایک لنگی نما سا اس جسم کے زیریں حصے پر۔

ہاناوانی اپنے سحر انگیز لہجے میں بولی۔ ''یہ میں ہوں ایسٹرن......اور یہ بھی میں ہوں جو تم سے مخاطب ہوں۔ تمہاری ساری چاہتوں، ساری خواہشوں اور زندگی کی حرارتوں کا رخ میری طرف ہے......صرف میری طرف ہے۔ تم اس بات کو محسوس کرو۔ اس کی گہرائی میں جاؤ......اور گہرائی میں...... کچھ اور گہرائی میں...... کیا تم محسوس کرر ہے ہو؟ بولو کیا تم محسوس کرر ہے ہو؟''

میں خاموش رہا۔ ست رنگا بھنور نمودار ہونے لگا۔ آج اس میں تا جور نہیں تھی۔ کوئی بھی نہیں تھا۔ فقط ہاناوانی تھی۔ وہی پچیس تیس سال پہلے کی ہاناوانی۔ میں نے انگوٹھے کو دبا کر اپنی اذیت میں اضافہ کیا۔ اذیت کی لہریں، کشش کی لہروں پر غالب آنے لگیں۔ اس بھنور کے رنگ مدھم پڑنے لگے۔

ہاناوانی نے پھر پوچھا۔ ''بولو ایسٹرن، تم اس چاہت کو محسوس کرر ہے ہو؟ بولو محسوس کرر ہے ہو؟''

''ہاں ہاناوانی میں کر رہا ہوں......''

''میں اسی طرح جوان ہوں......اسی طرح خوشنما۔ تم مجھے چھونے کے لیے بے قرار ہو۔ میرے قریب آنے کے لیے مضطرب ہو...... میں جانتی ہوں، تم کیا چاہتے ہو...... میں ہر ہر بات جانتی ہوں...... میں تمہاری اس صدیوں کی پیاس کو سمجھتی ہوں۔ کیا تم بھی اس پیاس کو محسوس کرتے ہو؟''

''جی مادام! میں بھی محسوس کرتا ہوں۔''

وہ ایک عجیب سجیشن تھی...... بالکل غیر متوقع۔ وہ کچھ فقروں کو بار بار دہرا رہی تھی۔ اس کا لہجہ گمبھیر تر ہوتا جا رہا تھا اور اس کے ساتھ میری دھڑکنیں بھی سرپٹ ہوتی جا رہی تھیں۔ میرا دل گواہی دینے لگا تھا کہ اونچی دیواروں اور بند دروازوں کے اندر سے راستہ نکلنے والا ہے۔ اس سفاک قاتلہ تک پہنچنے کا راستہ نکلنے والا ہے۔

○......❖......○

اگلے دو روز زبردست اضطراب میں گزرے۔ ہر گھڑی یہی لگتا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ شاید ہاناوانی کی طرف سے مجھے بلاوا آنے والا ہے لیکن کچھ نہیں ہوا۔ نہ ہی ہاناوانی نے دوبارہ کوئی رابطہ کیا۔

وہ کیا سوچ رہی ہے، کیا پلان کر رہی ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ یہ تو میں اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ ایک بداخلاق و جنس زدہ عورت ہے۔ اس نے دو یا تین بیاہ بھی رچائے

تھے اور مبینہ طور پر اپنے دو خاوندوں کو ذلیل و خوار کر کے اپنی زندگی سے نکالا تھا۔ پرسوں جب وہ ویڈیو لنک کے ذریعے مجھ سے بات کر رہی تھی۔ تب بھی مجھے اس کی آنکھوں کے اندر ایک طرح کی دبی دبی بھوک دکھائی دی تھی...... وہ مناظر مجھے یقین دلا رہے تھے کہ جلد یا بدیر کچھ ہونے والا ہے۔ اس حوالے سے ایک اور اشارہ بھی بڑا اہم تھا۔ پچھلے تین روز سے مجھے شاردا کہیں نظر نہیں آئی تھی۔ اسے مجھ سے پیچھے ہٹا لیا گیا تھا۔

بوٹے سے قد والی کیپٹن فرزہ حسبِ معمول مجھے ٹرینکولائزر دینے کے لیے آتی تھی اور کسی وقت میرا زخمی انگوٹھا بھی دیکھتی تھی۔ اس شام وہ آئی تو بولی۔ ''میری سمجھ میں نہیں آتا مسٹر ایسٹرن! آپ کے انگوٹھے کی سوجن جاتی کیوں نہیں؟ اب تک اسے بالکل ٹھیک ہو جانا چاہیے تھا۔''

میں نے کہا۔ ''بھئی، ایم ایم اے کے چیمپئن کا انگوٹھا ہے۔ آسانی سے ٹوٹتا نہیں، اگر ٹوٹ جائے تو آسانی سے ٹھیک نہیں ہوتا۔''

''لگتا ہے کہ آپ بہت بے احتیاطی کرتے ہیں۔ ایک تو اپنے ہاتھ کو لٹکا کر رکھتے ہیں۔ دوسرے کہیں نہ کہیں اسے چوٹ بھی لگوا لیتے ہیں۔ اب دیکھیں...... جوڑ کے نیچے سے یہ ساری جگہ سرخ ہو رہی ہے۔''

میں اسے کیا بتاتا کہ اس انگوٹھے کی شامت، میں گاہے بگاہے خود ہی لے کر آتا ہوں۔ اگر میں کسی کو یہ سب بتا بھی دیتا تو شاید وہ یقین نہ کرتا۔ جسمانی اذیت کے ذریعے اپنے ذہن کو تنویمی عمل سے دور رکھنے والی بات آسانی سے سمجھ میں آنے والی نہیں تھی اور اس میں صرف جسمانی اذیت ہی نہیں تھی میری اپنی قوتِ ارادی بھی اہم کردار ادا کر رہی تھی۔

مینشن کے گراؤنڈ فلور کے ٹی وی لاؤنج میں مجھے اکثر ملائیشین گارڈز ہی بیٹھے نظر آئے...... ٹی وی پر انگلش کی کوئی فلم یا ڈاکیومنٹری لگی ہوتی تھی مگر ایک روز میں نے دیکھا تو چار مقامی محافظ موجود تھے اور نیوز چینل پر کوئی ٹاک شو چل رہا تھا۔ یہ دیکھ کر میں چونکا کہ موضوع ہپناٹزم اور اس سے متعلقہ باتیں تھیں۔

ایک دانشور بڑے پُرجوش لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ''میں پھر کہوں گا بنیادی طور پر یہ ساری بحث ہی بکواس ہے۔ ہپناٹزم کی سائنسی حقیقت متنازعہ ہے اور یہ بات تو کسی طور سمجھ میں نہیں آتی کہ کوئی بندہ یا بندی...... پرندوں اور جانوروں کو مطیع کر لے اور اپنی مرضی سے چلانا شروع کر دے۔ انسان کا ذہن اور ہے، حیوانات کا اور۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ سب کچھ کسی جرائم پیشہ گروہ کی پلاننگ ہے۔ یہ ایک خاص نسل کے طوطے اور خاص نسل کی

چمگادڑیں ہیں، ان کو دہشت پھیلانے کے لیے ''ٹرینڈ'' کیا گیا ہے، ہم اس میں خواہ مخواہ ہپناٹزم کو گھسیٹ رہے ہیں، اگر یہ فضولیات......''

''یہ فضولیات نہیں ہیں۔'' سامنے بیٹھے ہوئے ماہر نے گرج کر اپنے مدِ مقابل کی بات کاٹی۔ ''ہپناٹزم کو بکواس کہنے والے کی اپنی عقل پر سوالیہ نشان ہے۔ ہپناسز بے شمار شکلوں میں ہمارے سامنے ہے اور ہم ہر روز اسے دیکھتے ہیں۔ کسی کہانی میں جذب ہو جانا، رو پڑنا اور ہنس دینا...... فلم کے کسی منظر کو دیکھ کر سکتہ زدہ رہ جانا...... کسی پُر اثر مقرر کی جوشیلی تقریر کو سننا اور سینے پر گولی کھانے کے لیے تیار ہو جانا، ہپناسز نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ اور اب تو ہپناسز کو باقاعدہ نفسیاتی بحالی اور دیگر علاج معالجے کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔''

اینکر پرسن نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے ہماری گفتگو دوسرے رخ پر چلی گئی ہے...... ہم اس پُراسرار خاتون کی بات کر رہے تھے جو جزیرہ جاماجی سے یہاں پہنچی ہے اور کہا جا رہا ہے کہ وہ وہاں اہم سیاسی اور انتظامی حیثیت رکھتی ہے۔''

ایک شریکِ گفتگو نے بڑی ٹھہری آواز میں کہا۔ ''فوزیہ! اہم سیاسی حیثیت کوئی نہیں۔ میرے پاس ساری معلومات موجود ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے جاماجی میں جو زبردست اکھاڑ پچھاڑ ہوئی، اس کے بعد ہاناوانی نامی اس عورت کا اقتدار، جاماجی کے ایک چھوٹے علاقے پر باقی رہ گیا ہے۔ اس عورت اور اس کے بیٹے رائے زل کی اخلاقیات پر ہمیشہ سوال اٹھائے جاتے رہے ہیں۔''

اینکر پرسن نے پھر مداخلت کی۔ ''یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہاناوانی نے طویل چلّے کاٹے ہیں اور وہ پُراسرار علوم میں مہارت رکھتی ہے۔''

''آپ کی چلّوں والی بات درست ہے فوزیہ! یہ بات تصدیق شدہ ہے کہ یہ عورت اپنی طویل چلّہ کشی کے دوران میں ایک کھلی قبر کے اندر بیٹھ کر راتیں گزارتی رہی ہے۔ جہاں تک پُراسرار علوم کی بات ہے تو اس میں افواہیں زیادہ ہیں، میری ذاتی رائے میں حقیقت صرف یہ ہے کہ وہ ہپناسز میں غیر معمولی مہارت رکھتی ہے، دیکھیں، میں ''غیر معمولی'' کا لفظ استعمال کر رہا ہوں۔ ہر فن، ہنر اور صلاحیت کے میدان میں کچھ لوگ ''ایکسٹرا آرڈینری'' ہوتے ہیں...... یہ عورت......''

اینکر پرسن نے پھر مداخلت کی تلوار چلائی اور ماہر کی بات اچک کر بولی۔ ''یہ عورت جو کچھ کر رہی ہے، اس کے پیچھے انتقام کا جذبہ ہے۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ پروفیسر صاحب، آخری دو منٹ میں آپ ہمیں اس انتقامی رویے کے بارے میں کچھ بتا دیں۔''

پروفیسر صاحب کافی دیر سے، بولنے کے لیے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے فوراً بولے۔ ''مس فوزیہ! جہاں تک میں سمجھ پایا ہوں یہ عورت فطری طور پر منتقم المزاج ہے۔ ماضی میں اس نے اپنے ایک خاوند کو زہر دے کر مارا۔ ایک مقامی صحافی کو جھوٹے مقدمے میں پھنسا کر صرف اس لیے پھانسی پر چڑھایا کہ وہ اس کے عیاش بیٹے کے کرتوتوں پر انگلی اٹھاتا تھا۔ اس نے کئی موقعوں پر ہپناسز میں اپنی غیر معمولی صلاحیت کو اپنے حریفوں کو مارنے کے لیے استعمال کیا، اس کی ایک حالیہ مثال اس کے اکلوتے بھائی حاذق ذکری کا قتل ہے۔''

شاید یہ بحث کچھ دیر مزید جاری رہتی، مگر ایک آدھ منٹ بعد ٹاک شو کا ٹائم ختم ہو گیا اور اینکر پرسن نے گفتگو لپیٹ کر اجازت طلب کر لی۔

دو گارڈز کی عقابی نگاہیں مسلسل مجھ سے چپکی ہوئی تھیں۔ میں اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ آج کل مجھے بڑا پُر تکلف اور مرغن کھانا دیا جا رہا تھا مگر ڈاکٹر احرار اور فارس کی موت دیکھنے کے بعد میری بھوک جیسے مر کر رہ گئی تھی۔ پھر بھی دکھانے کے لیے کچھ نہ کچھ تو اندر ٹھونسنا ہی پڑتا تھا۔ آج بھی میرا ڈنر، روسٹ چکن، سبزی پلاؤ اور جاما جی کے خاص سیخ کباب پر مشتمل تھا۔ ڈنر کے بعد میں ذرا چہل قدمی کے لیے لان کی طرف نکل آیا۔ یکا یک ایک چنگھاڑ سنائی دی اور کسی نے عقب سے مجھے دبوچ لیا۔

میرے سر پر جیسے کسی نے بم پھوڑ دیا تھا۔ یہ فخر تھا جو مجھ پر حملہ آور ہوا تھا۔ اس نے مجھے یوں جکڑا تھا کہ میرے دونوں بازو بھی اس کی گرفت میں آ گئے تھے۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو میں پلک جھپکتے میں اس کا شکنجہ توڑ دیتا مگر وہ فخر تھا اور وہ جنونی کیفیت میں تھا۔

اس نے مجھے اٹھا کر دیوار سے پٹخا..... مگر اپنے بازوؤں کا شکنجہ ٹوٹنے نہیں دیا۔ وہ دہاڑ رہا تھا۔ ''تم نے مارا تھا میری بیوی کو اور بچے کو۔ تم قاتل ہو، میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔ قبر تک تمہارا پیچھا کروں گا۔''

میرا سر پھٹ گیا تھا۔ ٹرینکولائزرز کے سبب میری قوتِ مزاحمت پہلے ہی بہتر نہیں تھی۔ فخر جیسے فائٹر کو زیادہ وقت دینا ٹھیک نہیں تھا۔ میں تیزی سے الٹے قدموں پیچھے ہٹا اور فخر کو ایک ستون سے ٹکرا دیا۔ اس کی گرفت ڈھیلی پڑ ی۔ میں نے نیچے جھک کر اس کی ٹانگ پکڑ لی اور اسے پشت کے بل گرا دیا۔ میں بھی پشت کے بل اس کے اوپر تھا۔ پلٹنا مشکل تھا مگر میں کسی طرح پلٹ گیا۔ میرا سخت مکا اس کے جبڑے پر پڑا۔ اس نے نیچے پڑے پڑے مجھے سر کی ضرب لگانے کی کوشش کی مگر ناکام ہوا۔ میں نے دیکھا اس کی گردن پر لگے ہوئے

دو تین ٹانکے کھل گئے تھے...... پھر بھی اس کا جوش و خروش غیر معمولی تھا۔
یونیفارم میں ملبوس کیپٹن فرزہ چلاتی ہوئی آگے بڑھی۔ اس کے ساتھ تین چار مسلح گارڈز بھی تھے۔ فرزہ میرے اور فخر کے درمیان آ گئی۔ گارڈز نے فخر کو جکڑ لیا۔ میں پیچھے ہٹنے میں کامیاب ہو گیا۔ فخر کی آنکھوں میں شعلے رقص کر رہے تھے۔ ویسے ہی شعلے جو فارس کی جان لیتے وقت اس کی آنکھوں میں رقصاں تھے۔ ''تم قاتل ہو...... تم قاتل ہو۔'' وہ دھاڑ رہا تھا۔
گارڈز مکھیوں کی طرح اس سے چمٹ گئے اور اسے کھینچ کر اندر لے گئے۔
''یہ پتا نہیں کیسے باہر نکل آیا۔'' فرزہ بڑبڑائی اور میرے سر کی چوٹ کو دیکھنے لگی۔ چوٹ تو آئی تھی مگر زخم زیادہ نہیں تھا۔ کمرے میں میرے سر پر بینڈ ایج چپکاتے ہوئے بھی وہ ترحم آمیز نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ وہ کچھ کر نہیں سکتی تھی لیکن بڑی اچھی طرح جانتی تھی کہ اس مینشن میں اپنی بدترین دشمن کے نرغے میں ہوں۔
کیپٹن فرزہ کے جانے کے بعد میں بستر پر لیٹ گیا اور فخر کی بدترین حالت پر کڑھنے لگا۔ یہ سامنے کی بات تھی کہ جس طرح میرے ذہن میں میرے ساتھیوں کے خلاف زہر بھرنے کی کوشش کی گئی تھی اسی طرح فخر اور فارس وغیرہ کے ذہنوں میں بھی زہر بھرا گیا تھا۔ فخر کی بیوی اور دو ماہ کا بچہ برسوں پہلے ڈنمارک میں ایک کار ایکسیڈنٹ میں جان سے گئے تھے اور وہ واقعی ایک کار ایکسیڈنٹ تھا لیکن آج فخر بالکل بے بنیاد طریقے سے ان دو اموات کا ذمے دار مجھے قرار دے رہا تھا۔
آہ..... پتا نہیں کہ ستم گر حالات کی زبان سے ابھی مجھے کیا کیا سننا تھا اور کیا کیا دیکھنا تھا۔
اس سے اگلے روز کیپٹن فرزہ کی زبانی ہی مجھے پتا چلا کہ ایک گارڈ کی غلطی کی وجہ سے گراؤنڈ فلور کے اس پورشن کا دروازہ کھلا رہ گیا تھا جہاں فخر کو رکھا گیا تھا۔ وہ باہر نکلا اور پھر مجھے دیکھ کر اس کا طیش عروج کو پہنچ گیا تھا۔ اسی روز شام کے وقت ہاناوانی نے پھر مجھے سیجیشن کے لیے ہال کمرے میں طلب کر لیا۔ اس مرتبہ بھی وہاں میرے اور ہاناوانی کے سوا کوئی نہیں تھا (ہاناوانی LIVE موجود نہیں تھی، پہلے کی طرح لارج سائز کی ایل سی ڈی پر تھی) وہ اسی لباس اور گیٹ اپ میں تھی جو پچھلی مرتبہ نظر آیا تھا۔ اس کی سیجیشن کا انداز بھی وہی تھا۔ کچھ اس طرح کے فقرے تھے جو وہ کئی بار دہراتی تھی۔
''تم مجھے چھونے کے لیے بے قرار ہو...... میرے قریب آنے کے لیے مضطرب ہو۔''

''میں جانتی ہوں تم کیا چاہتے ہو اور تم جانتے ہو، میں کیا چاہتی ہوں۔''

''میں تمہاری مدتوں کی پیاس کو سمجھتی ہوں۔ تم بھی اس پیاس کو محسوس کرو۔ گہرائی میں جا کر مزید گہرائی میں......''

میرے جسم پر چیونٹیاں سی رینگتی رہیں...... میں کشش کے حصار میں تھا۔ تاہم اس کشش کی شدت پچھلی دفعہ سے کچھ کم تھی۔ میں اس کا مقابلہ کرنے میں کامیاب رہا اور اپنے لگژری روم میں واپس پلٹ آیا۔ خود کو نڈھال سا ظاہر کرتے ہوئے بستر پر دراز ہو گیا۔ میری نقاہت کی یہ کیفیت بالکل مصنوعی بھی نہیں تھی۔ جب میں ہاناوانی کے اسرار کا سامنا کر کے آتا تھا تو واقعی رگ و پے میں ایک ناتوانی سی محسوس ہوتی تھی۔ اس میں کچھ عمل دخل ان نشہ آور دواؤں کا بھی تھا جو ہر دوسرے روز باقاعدگی سے مجھے دی جاتی تھیں۔

وہ ہفتے کی شام تھی۔ میرے کمرے کی کھڑکی سے باہر مغربی افق پر سرخی پھیلی ہوئی تھی اور دسمبر کا سورج اپنا مختصر سفر ختم کر کے چہرہ چھپا چکا تھا۔ بے شک میں مضافاتی علاقے میں تھا مگر یہ لاہور کے ہی مضافات تھے، یہ لاہور کا آسمان تھا، یہ لاہور کا موسم تھا۔ یہیں لاہور میں کہیں بھاؤ کی کسی پناہ گاہ میں ہی سجاول موجود تھا...... ولید اور رضوان ٹی موجود تھے...... اور زینب بھی، پیاری سی گڑیا سی شہزادی، جواب ہر ہائی نس کہلاتی تھی۔ وہ مجھ سے ملنے پاکستان آئی تھی اور اب پھنس گئی تھی۔ بہر حال مجھے داؤد بھاؤ کی ذات پر اعتماد تھا۔ اس نے ان کی حفاظت کا بیڑا اٹھا رکھا تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہ حفاظت کر کے دکھائے گا۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ میں چونک گیا۔ کیپٹن فرزہ نے آ کر مجھے اطلاع دی کہ آج مجھے پھر ہاناوانی سے ملنا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ یہ ملاقات ہال میں نہیں کسی اور جگہ ہو گی۔ میرے سینے میں میرا دل جیسے پسلیاں توڑ کر باہر نکلنے کے لیے بے تاب ہو گیا۔ شاید وہ وقت آ گیا تھا جس کا انتظار تھا۔ فرزہ کی آنکھوں میں مجھے اپنے لیے افسردگی اور یاس کی جھلک دکھائی دی۔ پہلی دفعہ میری آنکھوں پر پٹی باندھی گئی۔ مجھے اس وسیع و عریض مینشن کے مختلف کوریڈورز سے گزار کر سیڑھیوں پر لایا گیا۔ سیڑھیاں چڑھ کر میں اس مینشن کی تیسری منزل پر آ گیا۔

یہاں مکمل خاموشی تھی اور یہ جگہ سینٹرلی ائر کنڈیشنڈ تھی۔ قدموں کی چاپ بلند چھتوں کے نیچے گونجتی محسوس ہوتی تھی۔ پہریدار بہت دھیمی آواز میں بات کرتے تھے۔ مجھے ایک قالین پوش راہداری میں پہنچایا گیا اور پھر کئی دروازوں سے گزار کر ایک کشادہ کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں مجھے بھاپ کی خوشگوار حرارت محسوس ہوئی۔ مجھے تھام کر یہاں لانے والے

گارڈز نے میری آنکھوں کی پٹی کھول دی۔ میں نے اردگرد دیکھا اور حیران ہوا۔ یہ ایک حمام کی سی شکل تھی۔ یہاں ایک بھاپ مشین سے بھاپ نکلتی تھی اور پورے کمرے کو بھرتی تھی۔ یہاں چھوٹی چھوٹی آنکھوں اور چپٹی ناک والی چار ملائیشین لڑکیاں موجود تھیں۔ ایک لڑکی جو انچارج نظر آتی تھی، میرے پاس آئی اور انگلش میں گویا ہوئی۔ ''آپ اپنے بال ترشوا لیجیے۔''

میں نے اثبات میں جواب دینا ہی مناسب سمجھا۔ میں اس موقع پر ذرا سی غلطی کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ ایک مشاق لڑکی نے میری شیو کی اور دوسری نے میرے سر کے چھوٹے سے زخم سے میڈیکل ٹیپ اتار کر میرے سر کے بال تراش دیئے۔ اس کے بعد مجھے غسل کا مشورہ دیا گیا۔ میں حمام کے اس حصے میں چلا گیا جو غسل کے لیے مخصوص تھا۔ اس واش روم کے اندر ہی ایک وسیع وارڈ روب بھی تھی جہاں میرے سائز کے قریباً ایک درجن لباس موجود تھے۔ یہ وہی لباس تھے جو چند دن پہلے میں نے شاردا کے ساتھ مل کر منتخب کیے تھے۔ میں نے ان میں سے ایک لباس پہن لیا۔ یہ ملائیشین طرز کا ایک دھاری دار گاؤن اور ٹراؤزر تھا۔ ایک ریک پر پیرس کی بہترین خوشبوئیں موجود تھیں۔ میں نے ایک پرفیوم WHITE MUSK کے چند پف استعمال کیے۔ اس کے بعد میں ڈریسنگ روم سے باہر آ گیا۔

لڑکیاں بالکل خاموش تھیں مگر ان کی آنکھوں میں دبی دبی مسکراہٹ جھلک دکھاتی تھی۔ معلوم نہیں کہ یہ ٹرینکولائزرز کا اثر تھا یا یہاں موجود بھاپ میں بھی کوئی سرور آور چیز شامل تھی، میرا دماغ سنسنا رہا تھا۔

میں نے نیم باز آنکھوں سے انچارج لڑکی کو دیکھا اور پوچھا۔ ''مادام سے ملاقات کب ہوگی؟''

وہ دھیمے سے مسکرائی۔ ''تھوڑا انتظار کرنا ہوگا، آپ یہاں بیٹھیں۔'' اس نے ایک آرام دہ سجے سجائے کیبن کی طرف اشارہ کیا۔ میں وہاں گداز صوفے میں دھنس گیا۔ یہاں بھاپ کے اثرات نہیں تھے۔ کیبن کی بڑی دیوار پر وہی پوٹریٹ لگی ہوئی تھی جو اس مینشن میں کئی جگہ نظر آتی تھی۔ یہ ریچھ نما رائے زل کی تصویر تھی۔ ہاناوانی کا منحوس ''لخت جگر'' انچارج لڑکی نے میرے سامنے سفید شراب کی ایک سربمہر بوتل رکھ دی۔ یہ نہایت پرانی اور قیمتی رم تھی۔ میرے اشارے پر اس نے بوتل کھول کر ایک جام بھرا اور ایک طرف ہٹ کر ادب سے کھڑی ہوگئی۔ میں چھوٹے چھوٹے تلخ گھونٹ لینے لگا...... میری بے چینی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ گزرنے والی ہر ساعت ایک صدی جیسی تھی۔ میرا دل گواہی دے رہا

تھا کہ بالآخر وہ لمحات قریب آرہے ہیں جن کا انتظار میں شب و روز کر رہا ہوں۔ بس ایک ہی دھڑکا تھا۔ ان آخری لمحوں میں مجھ سے کوئی غلطی نہ ہو جائے...... میرے ظاہر اور باطن کا فرق آشکار نہ ہو جائے۔

انتظار بڑا کٹھن تھا۔ یوں لگتا تھا کہ گھڑی کی کبھی نہ تھمنے والی سوئیاں آج تھم گئی ہیں۔ ایسا انتظار شاید میں نے کبھی کیا ہو۔ تب ایک مدھم بزر سنائی دیا۔ انچارج لڑکی اندر گئی اور چند ہی سیکنڈ بعد واپس آگئی۔ مجھے اندر جانے کا اذن مل چکا تھا۔

میں دبیز قالین پر ننگے پاؤں چلتا ایک بھاری بھرکم چوبی دروازے کے سامنے پہنچا۔ اس ساگوانی دروازے کو ہولے سے دھکیلا تو وہ بے آواز کھلتا چلا گیا۔ یہ ایک کشادہ بیضوی کمرا تھا۔ یہاں ایک اونگھتی ہوئی بہت مدھم نیلگوں روشنی تھی۔ سب سے پہلے میری نگاہ ہاناوانی پر ہی پڑی۔ وہ ایک بہت بڑے بیڈ پر بڑی تمکنت سے نیم دراز تھی۔ یہ پہلی بار تھی کہ مجھے اس کے فربہ چہرے پر سیاہ عینک نظر نہیں آئی۔ اس بیضوی شکل کے کمرے میں اکثر چیزیں شفاف نیلگوں شیشے کی تھیں۔ شیشے کی تپائیاں، شیشے کی کرسیاں، شیشے کے ریکس، حتیٰ کہ شیشے کا ہی بیڈ جس کا صرف چوکھٹا لکڑی کا تھا۔

''دروازہ بند کردو اور ادھر آجاؤ ایسٹرن۔'' وہ سپاٹ آواز میں بولی۔

دروازہ بولٹ کر کے میں اس کے قریب چلا گیا۔ نیوسٹی کی کرتا دھرتا، ایک بدنام ترین ہپناٹسٹ، کھلی قبر میں راتیں گزارنے والی عاملہ، ہاناوانی مجھ سے صرف تین چار فٹ کے فاصلے پر تھی۔ شیشے کے فرنیچر کے بعد اس کے کمرے میں مجھے جو دوسری خاص چیز دکھائی دی، وہ ہاناوانی کی تصویریں تھیں بلکہ یہ ایک ہی تصویر تھی جو سفید دیواروں پر مختلف جگہوں پر مختلف سائزوں میں آویزاں تھی۔ یہ وہی تصویر تھی جو ہاناوانی نے سیجشن کے دوران میں مجھے دکھائی تھی۔ اس کی جوانی کی تصویر۔ بیڈ پر نیم دراز ہاناوانی نے اس طرز کا لباس پہن رکھا تھا جو اس تصویر میں تھا...... بالوں کی بناوٹ اور زیورات کا انداز بھی وہی تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ تصویر اور سامنے لیٹی ہوئی ''بھدی بلا'' ہاناوانی کی عمروں میں پچیس تیس سال کا فرق تھا۔

''میرے لیے ڈرنک بناؤ ایسٹرن۔'' اس نے حکمیہ انداز میں کہا اور شیشے کی تپائی کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے دیکھا، یہاں بھی شراب کی ویسی ہی بوتل تھی جو میں نے باہر کیبن میں دیکھی تھی۔ اس کے لیبل پر قریباً تیس سال پرانی تاریخ تھی۔ یعنی اسی وقت کی شراب جب یہ

آتش خود بھی جوان تھی۔ میں نے ایک پیگ بنایا اور اسے پیش کیا۔
وہ میری طرف دھیان سے دیکھنے اور چسکیاں لینے لگی۔ اس کی آنکھیں کوئی عام آنکھیں نہیں تھیں۔ یہ ایک خطرناک ترین ساحرہ کی آنکھیں تھیں۔ میں نے گڑ بڑا کر نظریں جھکا لیں۔ یہ خدشہ سوہانِ روح تھا کہ کہیں اس ساحرہ کی جگر پاش نگاہیں میرے ''اندر'' سے آگاہ نہ ہو جائیں۔ اس نے مجھے کہیں بیٹھنے کے لیے نہیں کہا۔ میں کھڑا رہا، وہ نیم دراز چسکیاں لیتی رہی۔ ''میری ٹانگیں دباؤ گے؟'' اس نے سوالیہ، لیکن حقیقتاً حاکمیہ لہجے میں کہا۔
میں اس کی پائنتی کی طرف بیٹھ کر اس کی پلپلی پنڈلیاں دبانے لگا۔ سینے میں شعلے رقصاں تھے۔ یہی عورت تھی...... ہاں یہی عورت تھی...... جس نے پچھلے چند ماہ میں مجھے ناقابلِ بیان زخم لگائے تھے۔ آج وہ میرے رُوبرو تھی، میں اسے چھو رہا تھا۔
اس نے اپنی ایک ٹانگ ذرا سا اٹھائی اور اپنے پاؤں سے میرے رخسار کو چھوا، جیسے وہ پاؤں نہ ہو اس کا ہاتھ ہو اور وہ میرے رخسار کو سہلا رہی ہو۔ میں اردگرد کا جائزہ لے چکا تھا اور شاید ہر اندیشے کو بالائے طاق بھی رکھ چکا تھا۔ بعد میں کیا ہو جانا ہے، یہ میں اپنے دماغ سے نکال چکا تھا۔ اس نے تکیے کی ٹیک چھوڑی اور ہاتھ آگے بڑھا کر میرے بالوں میں اپنی انگلیاں چلائیں۔ اس کی نگاہوں کی منتقمانہ تپش میں اپنے چہرے پر محسوس کر رہا تھا۔ قدرے جارحانہ انداز میں اس نے میرے بال مٹھی میں جکڑے اور مجھے اپنی طرف کھینچ لیا۔ یہ تہلکہ خیز لمحے تھے۔ میں نے اس کے بھاری وجود کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔ دایاں بازو اس کی گردن کے گرد حمائل تھا۔ یہ قربت کی گرفت نہیں تھی، یہ نفرت کی گرفت تھی جو اس عورت کے لیے میرے روئیں روئیں میں سرائیت کر چکی تھی۔ جب یہ گرفت سخت ہونا شروع ہوئی تو ہاناوانی کے چہرے کا رنگ بدلا...... اس کی آنکھیں کچھ زیادہ کھل گئیں...... اگلے دو یا تین سیکنڈ شاید ہاناوانی کی زندگی کے حیرت ناک ترین سیکنڈ تھے۔ اس کی گردن میرے بازو کے بے رحم شکنجے میں کسی جا چکی تھی۔ وہ کسی بہت بڑی ڈولفن مچھلی کی طرح تڑپی۔
میں نے اس کے منہ پر تھوکا۔ ''حرام زادی...... تُو میرے انیق کی قاتل ہے، تُو میرے ساتھیوں کی قاتل ہے...... اور آج تیرے حساب کی رات ہے۔''
میری گرفت سخت تر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ کوئی اور ہوتا تو اس کی گردن ٹوٹنے کے قریب ہوتی لیکن یہ گردن کسی درخت کے تنے جیسی تھی۔ اچانک وہ ہوا جس کی مجھے توقع نہیں تھی۔ یکا یک اس بیضوی کمرے کے ایک نیم تاریک گوشے میں تیز سرسراہٹ ہوئی۔

وہی جہازی سائز کی سیاہ بلی برآمد ہوئی جسے میں نے اکثر ہاناوانی کے پاؤں میں بیٹھے دیکھا تھا۔ وہ بلامبالغہ کسی درمیانی سائز کے لیوپارڈ چیتے کی قامت رکھتی تھی۔ ایک کریہہ آواز کے ساتھ وہ مجھ پر جھپٹی۔ میں نے اس کے تیز پنجوں کی چبھن اپنی پشت پر محسوس کی۔ میں ہاناوانی کے بھاری جسم سمیت پلٹا۔ یوں پلٹنے سے میں ہاناوانی سمیت شیشے کی تپائی پر گرا۔ تپائی کے ٹکڑے ہو گئے۔

اب ہاناوانی ڈھال کی طرح میرے اوپر تھی اور میں پشت کے بل قالین پر تھا۔ بالکل کھڑے کانوں والا یہ بلی نما خوفناک جانور میرے چاروں طرف گھوما اور پھر بائیں پہلو سے مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں نے اپنی پسلیوں سے اوپر کے گوشت پر اس کے نکلے دانتوں کی پکڑ محسوس کی۔ دوسری طرف ہاناوانی میری گرفت سے نکلنے کے لیے پورا زور لگا رہی تھی۔ میرے دائیں ہاتھ کی گرفت میں شیشے کی تپائی کا ایک ٹکڑا آ گیا۔ یہ ایک مضبوط پایہ تھا جس کے اگلے حصے نے ٹوٹ کر برچھی کی شکل اختیار کر لی تھی۔ میں نے پوری طاقت سے یہ پایہ بدبودار سیاہ جانور کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ اس نے ایک بار پھر کریہہ آواز نکالی اور ایک طرف لڑھک کر تڑپنا شروع کر دیا۔ وحشت کے عالم میں، میں نے دوسرا وار ہاناوانی پر کیا۔ سخت شیشے کا قریباً ڈھائی فٹ لمبا نکیلا ٹکڑا قریباً ایک فٹ تک ہاناوانی کی انتڑیوں میں گھس گیا۔ وہ کسی بدروح کی طرح چلائی اور خون کا گرم فوارہ میرے سینے پر گرا۔ اس کا خون دیکھ کر میں جیسے دیوانہ سا ہو گیا۔ میں اسے پلٹ کر اس کے اوپر آ گیا۔ ایک اور وار میں نے اس کے سینے پر کیا جو اچٹتا ہوا اس کے کندھے کی طرف گیا اور شیشے کی برچھی اس کے جسم میں گھس گئی۔ ہاناوانی کی آنکھوں میں تحیر جیسے منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کا سراپا خون میں لت پت ہو رہا تھا۔

یہی وقت تھا جب ہاناوانی کی خاص خادمائیں چلاتی ہوئی اس بیڈ روم میں گھس آئیں، ان کے عقب میں مسلح گارڈز تھے۔ اب کسی بھی لمحے مجھ پر فائرنگ ہو سکتی تھی، میں اٹھ کر کھڑکیوں کی طرف دوڑا، اور تڑپتے پھڑکتے بلی نما جانور کو پھلانگتا ہوا ایک دیوار گیر شیشے سے ٹکرایا۔ شیشے کو توڑتا ہوا میں ایک بالکونی میں گرا۔ ایک ملائیشین شکل وصورت والا ہٹا کٹا گارڈ بھاگتا ہوا میری طرف آیا۔ ساتھ ساتھ وہ اپنے کندھے سے رائفل اتارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شیشے کا مضبوط پایہ ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا۔ بس اس کا برچھی نما سرا آگے سے ٹوٹ گیا تھا۔ میں نے یہ پایہ گھما کر گارڈ کے چہرے پر رسید کیا۔ وہ تیسری منزل کی اس بالکونی سے الٹ کر نیچے گرا۔ اس کی آخری آواز بھیانک تھی۔

کسی پاس والے کمرے سے کوئی ملازمہ دہشت زدہ آواز میں چلا رہی تھی۔
''سیکیورٹی سیکیورٹی۔''

میں مخالف سمت میں دوڑا اور ایک بلند دروازہ کھول کر ایک چھوٹے سے بیڈروم میں گھس گیا۔ یہ کمرا غالباً سیکیورٹی گارڈز کے سونے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ فی الوقت یہاں صرف ایک گارڈ موجود تھا اور وہ بھی شاید شوروغل سن کر ابھی بیدار ہوا تھا۔ وہ افراتفری میں اپنا پسٹل اپنے ہولسٹر میں لگا رہا تھا۔ کچھ اور سوچنے کی مہلت نہیں تھی، میں سیدھا اس گارڈ پر جا پڑا اور ٹوٹا ہوا شیشہ اس کی گردن میں یوں گھونپا کہ وہ تقریباً آر پار ہو گیا۔ گارڈ کوئی آواز نکالے بغیر تیورا کر گرا۔ میں نے اسے ہاتھوں پر سنبھال لیا۔ اس کی گردن سے خون کی پچکاریاں سی نکل رہی تھیں اور آنکھیں الٹی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ میں گرے فورس کے اس گارڈ کو گھسیٹ کر ایک چھوٹے سے تاریک اسٹور میں لے گیا۔ یہاں گارڈز کا ہی سازوسامان اور ''ان دھلی'' وردیاں وغیرہ پڑی تھیں۔ ان میں سے کوئی وردی میرے کام آسکتی تھی۔ میں نے تیزی سے جان بلب گارڈ کی تلاشی لی۔ سی زیڈ پسٹل کے علاوہ اس کی جیبوں سے ایک موبائل، ایک لائٹر، سگریٹ کا ایک پیکٹ اور تھوڑی سی نقدی نکلی۔ میں نے صرف موبائل اور پسٹل اپنی تحویل میں لیا۔ اب میرا ارادہ کوئی وردی ڈھونڈنے کا تھا مگر اس سے پہلے ہی کسی قریبی کوریڈور میں بھاگتے قدموں کی آوازیں آنے لگیں۔ کسی مقامی گارڈ نے بلند آواز میں کہا۔ ''نیچے نہیں گیا...... ابھی نیچے نہیں گیا۔''

دوسرا بولا۔ ''چھت کی طرف بھی نہیں گیا ہوگا، دروازہ بند ہے۔''

گرے فورس کے گارڈز ملائی زبان میں واویلا کر رہے تھے۔ میرا دھیان اسٹور کے ادھ کھلے دروازے سے گزر کر کمرے کے فرش کی طرف گیا۔ یہاں گارڈ کے خون آلود جسم کو گھسیٹے جانے کے نشانات واضح دکھائی دے رہے تھے۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ تلاش کرنے والے اس کمرے میں پہنچتے تو پھر اس تاریک اسٹور کے کونے کھدروں میں بھی ضرور جھانکتے۔ فائنل رزلٹ یہی تھا کہ یہ اسٹور روم مجھ مزید پناہ فراہم نہیں کر سکتا۔

وردی کا خیال چھوڑ کر میں اسٹور سے نکلا اور کمرے سے گزر کر ایک قریبی بالکونی میں چلا گیا۔ یہاں سے اس مینشن کا سامنے والا احاطہ دکھائی دے رہا تھا۔ بھاگ دوڑ مچی ہوئی تھی۔ بالکونی کے عین نیچے تالاب تھا۔ میں دن کے وقت بھی اسے کئی دفعہ دیکھ چکا تھا۔ کبھی یہ سوئمنگ پول کے طور پر استعمال ہوتا ہوگا مگر اب اس میں ٹھہرا ہوا پانی تھا جس پر ہلکی ہلکی کائی بھی تھی۔

پہریدار میرے قریب تر پہنچ رہے تھے۔ مجھے اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آیا کہ میں رسک لے کر تالاب میں چھلانگ لگا دوں، بلندی پینتیس فٹ کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ میں نے پسٹل اور موبائل کو قریب پڑے ہوئے ایک شاپر میں لپیٹا اور پھر اس نیم تاریک ''پول'' میں پاؤں کے بل کود گیا۔ ایک زور کا چھپاکا ہوا۔ میں تین چار فٹ نیچے جا کر پھر سطح آب پر ابھر آیا۔

یہ سامنے والا احاطہ کئی کینال پر مشتمل تھا۔ پہریدار فاصلے پر تھے پھر بھی چھپاکے کی آواز ایسی نہیں تھی کہ ان تک نہ پہنچتی۔ مجھے ایک پکارتی ہوئی سی آواز سنائی دی۔ کسی نے انگلش میں کہا تھا۔ ''ادھر دیکھو...... جلدی کرو۔''

○......❖......○

پانی بے حد سرد تھا لیکن اس وقت سردی اور درد وغیرہ کے احساسات دماغ سے بالکل نکل چکے تھے۔ سوئمنگ پول کا کنارہ زیادہ دور نہیں تھا۔ میں نے دو ہاتھ چلائے اور کنارہ پکڑ کر باہر نکل آیا۔ سوچنے سمجھنے کا وقت نہیں تھا۔ کوئی نصف درجن افراد لپکتے ہوئے ''پول'' کی طرف آرہے تھے (انہوں نے ابھی کچھ بھی دیکھا نہیں تھا) اس کے سوا اور کوئی حل نہیں تھا کہ میں دوبارہ عمارت کے اندر گھس جاتا۔ ایک خم دار کوریڈور میں بھاگتے بھاگتے میں نے سی زیڈ پسٹل نکال کر اس کا سیفٹی کیچ ہٹا لیا۔ کوریڈور میں پوری روشنی تھی اور اردگرد افراتفری مچی ہوئی تھی۔ چند سیکنڈ بعد میں نے خود کو اسی منحوس ہال کے سامنے پایا جہاں مجھ پر تنویمی عمل ہوتا رہا تھا۔ اس وقت ہال بالکل خالی تھا اور دروازہ چوپٹ کھلا تھا۔ میری نظر ہال کی بلند چھت پر پڑی۔ فی الوقت وہ چمگادڑیں بھی کہیں نظر نہیں آئیں جو ایک جھالر کی سی شکل بناتی تھیں۔ ہال میں گھسنے کے بجائے میں بائیں جانب مڑ گیا۔ گرے فورس کا ایک باوردی اہلکار میرے سامنے آیا، میں نے تاک کر سیدھا اس کے دل پر فائر کیا، وہ اوندھے منہ گرا۔ میں اسے پھلانگ کر اس لابی میں آگیا جہاں بائیں جانب وہ کشادہ کمرے تھے جن میں سیکڑوں طوطے بند تھے۔

یکایک لابی کی بائیں جانب ایک کاؤنٹر کے عقب سے پکارتی ہوئی نسوانی آواز ابھری۔ ''رک جاؤ، گولی مار دوں گی۔''

میں نے پہچان لیا، یہ کیپٹن فرزہ کی آواز تھی۔

میں رک نہیں سکتا تھا۔ فائر بھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ فرزہ کاؤنٹر کی آڑ میں تھی۔ میری سمجھ میں یہی آیا کہ بھاگتا رہوں۔

وہ پھر دہاڑی۔ ''ہالٹ...... ہالٹ۔''

لگتا یہی تھا کہ وہ فائر کردے گی لیکن اس نے نہیں کیا...... اور اگر کیا تو اس وقت جب میں دروازے سے تقریباً نکل چکا تھا۔ اس کی چلائی ہوئی دو تین گولیاں دروازے کے آس پاس ہی کہیں لگیں۔

میں دوڑتا ہوا پھر کھلی جگہ پر آ گیا۔ یہ مینشن کا عقبی احاطہ تھا۔ یہ بھی کم و بیش چھ کینال جگہ ہوگی۔ یہاں گھاس کے قطعوں کے درمیان آم، جامن اور شہتوت وغیرہ کے درخت تھے۔ یہ نیم تاریک جگہ تھی۔ یہاں بھی ایک گیٹ موجود تھا۔ ایک مقامی پہریدار نے بلند آواز میں اپنے کسی ماتحت کو حکم دیا۔ ''گیٹ بند کر دو لائٹس آن کر دو۔''

میرے دیکھتے ہی دیکھتے گیٹ بند کر دیا گیا۔ ایک ایک کر کے روشنیاں آن ہونا شروع ہو گئیں۔ عمارت کے سامنے والے احاطے میں بھاگ دوڑ جاری تھی۔ اب ہوائی فائر بھی کیے جا رہے تھے۔ میں جہاں کھڑا تھا، وہاں کسی وقت بھی گارڈز اور مقامی پہریداروں کی نظر میں آ سکتا تھا۔ مجھے فوری طور پر چھپنے کے لیے ایک قریبی درخت بہت موزوں نظر آیا۔ اس کی زیریں شاخیں کچھ ایسے رخ سے تھیں کہ میں آسانی سے اس کے اوپر چڑھ گیا۔ ایک دوشاخے پر پاؤں رکھ کر میں کچھ مزید اوپر گیا۔ یہاں شاخیں تیلی تھیں اور پتے بہت گھنے تھے۔ یہ لونگ پیپر کا درخت تھا۔ شاخ در شاخ کافی اوپر تک چلا گیا تھا۔ میں قریباً بیس فٹ کی بلندی پر محفوظ جگہ پر پہنچ گیا۔ نیچے زبردست افراتفری تھی۔ سامنے والے احاطے میں نسبتاً زیادہ شور تھا۔ اس تین منزلہ قدیم مینشن کی تقریباً تمام روشنیاں آن ہو چکی تھیں۔ یہاں پچھلے احاطے میں بھی ٹارچیں اور سرچ لائٹس گردش کر رہی تھیں۔

تب ہی عقبی احاطے کا گیٹ کھلا اور ایک اسٹیٹ کار تیزی سے احاطے میں داخل ہوئی۔ پھر وہ عقبی برآمدے کے قریب رکی اور اس میں سے سفید کوٹ والا ایک بارعب شخص برآمد ہوا۔ یقیناً وہ کوئی سینئر ڈاکٹر یا سرجن ہی تھا۔ اپنے دو معاون کے ساتھ وہ بڑی عجلت میں اندر چلا گیا۔ یقیناً ہاناوانی کو اس مینشن کے اندر ہی طبی امداد دینے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

تین چار گارڈز اپنی ٹارچوں کے روشن دائروں کو گردش دیتے اس درخت کے بالکل قریب چلے آئے جہاں میں موجود تھا۔ انہوں نے روشن دائرے درختوں پر بھی ڈالے۔ میں پتوں میں چھپا ہوا تھا۔ اک دائرہ گردش کرتا ہوا میرے اوپر سے گزرا۔ چند سیکنڈ کے لیے میں سکتہ زدہ بیٹھا رہا۔ کچھ معلوم نہیں ہو سکا کہ میں دیکھا گیا ہوں یا نہیں؟

پہریداروں کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ وہ مجھے دیکھنے میں ناکام رہے ہیں۔ ان میں سے ایک مقامی تھا۔ باقی گرے فورس کے کمانڈوز تھے جو یہاں گارڈز کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ وہ درخت کے بالکل نیچے کھڑے تھے۔ ایک نے انگلش میں کہا۔ ''میں نے خود تو نہیں دیکھا لیکن کہا یہی جارہا ہے کہ مادام سخت زخمی ہوئی ہیں۔ ان کی انتڑیاں کٹ گئی ہیں۔ سینے پر بھی زخم ہے...... سنگین سچویشن ہے۔''

''ایک سینئر گارڈ اوپر سے گر کر مرا ہے۔ کم از کم دو لاشیں میں خود دیکھ چکا ہوں۔ کچھ زخمی بھی ہیں۔'' دوسرے شخص نے قدرے ہراساں لہجے میں کہا۔

برآمدے کی طرف سے گرے فورس کے کسی آفیسر کی للکارتی ہوئی آواز آئی۔ ''یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو، باؤنڈری کے ساتھ ساتھ پوزیشن لو۔ وہ اندر ہی ہے باہر نہیں نکلا۔''

''یس سر...... یس سر......'' دو تین آوازیں ابھریں اور درخت کے نیچے کھڑے مسلح افراد اپنی ٹارچوں کی روشنی درختوں پر پھینکتے باؤنڈری وال کی طرف بڑھ گئے۔

میں نے وہیں گھنی شاخوں کے درمیان کھڑے کھڑے پسٹل کو چیک کیا۔ غیر متوقع طور پر اب اس میں صرف تین گولیاں تھیں۔ ان تین گولیوں کے ساتھ دو درجن کے قریب ایسے گارڈز کا مقابلہ کرنا جو جدید آٹومیٹک اسلحے سے لیس تھے، ممکن نہیں تھا۔

تو پھر کیا کیا جائے؟

مجھے کمک کی ضرورت تھی۔ فوری کمک کی ضرورت۔ میرا دھیان سیدھا داؤد بھاؤ کی طرف گیا۔ داؤد بھاؤ کے ہاتھ بہت لمبے تھے۔ خاص طور سے لاہور اور گردونواح پر اس کا ایک طرح کا تسلط تھا۔ میں اپنی آخری ملاقات میں داؤد بھاؤ کو اس مینشن کا مکمل حدود اربعہ بتا چکا تھا۔ تاہم اس وقت مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ ہانا وانی واقعی اس مینشن میں ملے گی یا نہیں۔ اب یہ واضح ہو چکا تھا کہ وہ اسی مینشن میں موجود ہے اور یہ بھی پتا چل چکا تھا کہ اس مینشن میں مسلح افراد اور اسلحے کی پوزیشن کیا ہے۔

میرے پاس مقتول گارڈ کا سیل فون موجود تھا۔ اس میں چار جنگ اور بیس پچیس روپے کا بیلنس بھی موجود تھا۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ داؤد بھاؤ کے خاص نمبر پر کال کی۔ دوسری تیسری کوشش میں کال ریسیو ہوئی لیکن بولنے والا بھاؤ نہیں اس کا دست راست وارث لودھی تھا۔

لودھی کی آواز پہچانتے ہی میں نے کہا۔ ''لودھی، شاہ زیب بول رہا ہوں۔ بہت اہم بات ہے، بھاؤ کو فون دو۔''

بھاؤ پاس ہی موجود تھا۔ دو سیکنڈ بعد اس کی بھاری بھر کم ''ہیلو'' سنائی دی۔
میں نے بغیر کسی تمہید کے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔ ''بھاؤ! میں مینشن میں موجود ہوں۔ ہاناوانی سخت زخمی ہو چکی ہے۔ وہ یہیں تیسری منزل پر موجود ہے......''
''کہاں موجود ہے؟ تم بہت آہستہ بول رہے ہو۔'' بھاؤ نے کہا۔
''بھاؤ میں اس وقت گرے فورس کے کمانڈوز اور مقامی گارڈز کے گھیرے میں ہوں۔ مینشن کے عقبی احاطے میں ایک درخت پر ہوں۔ آپ کی فوری مداخلت کی ضرورت ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ میں زیادہ دیر یہاں چھپا نہیں رہ سکوں گا......''
بھاؤ کے اندر کا مہم جو شخص بیدار ہو گیا۔ اس کی آواز میں ایک طنطنہ سا پیدا ہوا۔ تیزی سے بولا۔ ''کیا پوزیشن ہے وہاں کی؟ کمانڈوز کتنے ہیں اور کرائے کے مقامی ٹٹو کتنے ہیں؟''
میں نے اسے مختصراً مکمل سچویشن سے آگاہ کیا۔ باؤنڈری وال کی صورتِ حال اور اندر کمروں کے ماحول کے بارے میں معلومات دیں۔ آخر میں، میں نے کہا۔ ''بھاؤ! یہ سنہری موقع ہے۔ آپ جتنی جلدی پہنچ سکتے ہیں، پہنچ جائیں...... پرندوں کی طرف سے کوئی رسک نہیں ہے۔ وہ رات کے وقت حملہ نہیں کرتے۔ ابھی مجھے ہاناوانی کی خاص چمگادڑیں بھی کہیں نظر نہیں آئیں۔ احتیاط کے طور پر اگر آپ کے لوگ سیفٹی ہیلمٹ اور جیکٹ وغیرہ پہننا چاہتے ہیں تو پہن لیں۔''
''نہیں، اس میں بہت دیر لگے گی۔ مجھے لگتا ہے کہ تمہارے پاس ٹائم زیادہ نہیں ہے۔''
''اوکے بھاؤ، فون بند کر رہا ہوں۔ دو تین بندے پھر اس طرف آ رہے ہیں۔'' اس کے ساتھ ہی میں نے کال منقطع کر کے فون آف کر دیا۔
گارڈز ٹارچوں کی روشنی مختلف درختوں اور کونے کھدروں میں پھینکتے اسی لونگ پیپر (پیپل) کی جانب آ رہے تھے۔ میں نے دم سادھ لیا۔ گارڈز کی رائفلوں کے اوپر اٹھے ہوئے بیرل مجھے صاف نظر آ رہے تھے۔ ایک ذرا سا شبہ مجھے گولیوں سے چھلنی کرنے کا سبب بن سکتا تھا۔ ٹارچ کا ایک روشن دائرہ حرکت کرتا ہوا مجھ پر آیا۔ چند سیکنڈ تک گنجان شاخوں اور پتوں کے اوپر رکا، پھر آگے بڑھ گیا۔ گارڈز بھی آگے بڑھ گئے۔
غنیمت تھا کہ اس عمارت میں رکھوالی کے کتے موجود نہیں تھے، ورنہ شاید میں اس درخت پر خود کو یوں کیموفلاج نہ رکھ سکتا۔ میرا لباس بھیگا ہوا تھا اور ہوا بڑی سرد تھی۔ مجھے

یہاں ایک چھینک بھی آ جاتی تو میرے لیے موت کی سزا کا راستہ ہموار ہو سکتا تھا۔ یہ لوگ اتنے خوف زدہ تھے کہ شاید مجھے ''ہینڈز اَپ'' کرنے کا رسک بھی نہ لیتے۔ پسلیوں سے اوپر جہاں بلی نما جانور نے اپنے دانت آزمائے تھے، میں سخت درد محسوس کر رہا تھا۔ درحقیقت یہ جانور ہی تھا جس کے سبب میں ہاناوانی کو موقع پر ختم نہیں کر سکا تھا۔ بہرطور وہ جان لیوا حد تک زخمی ہو چکی تھی۔

دفعتاً میں چونکا۔ وہی سفید اسٹیٹ کار جو کچھ دیر پہلے ایک دو ڈاکٹر صاحبان کو لے کر آئی تھی۔ ایک اوٹ سے ریورس ہو کر نکل رہی تھی۔ وہ مڑی اور گیٹ کی طرف بڑھی۔ باوردی مقامی گارڈز نے گیٹ پہلے ہی کھول دیا تھا۔ گاڑی سیدھی نکلتی چلی گئی۔

یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ گاڑی میں صرف ڈاکٹر صاحبان گئے ہیں یا پھر...... ہاناوانی بھی ہے۔ اس اسٹیٹ کار کے نکلنے کے دو منٹ بعد ایک مہران کار بھی تیزی سے باہر نکلی اور پھر فوراً ہی ایک جیپ اندر بھی داخل ہوئی۔ گیٹ پھر سے بند کر دیا گیا۔ فوروہیل سلور رنگ کی جیپ میں سے کچھ اور مقامی گارڈز اترے اور اِدھر اُدھر پھیل گئے۔

صورتِ حال واضح نہیں ہو رہی تھی۔ کمانڈوز اور گارڈز کے للکارے گاہے بگاہے یخ بستہ سناٹے کو چیر رہے تھے۔ ان لوگوں کو جیسے یقین تھا کہ میں ابھی یہیں پر موجود ہوں۔

یہی وقت تھا جب میری نگاہ ایک اور منظر پر پڑی۔ دو سرچ لائٹس کی روشنی میں مجھے نظر آیا کہ سیکڑوں طوطے فضا میں بلند ہو رہے ہیں...... وہ ایک طویل جھنڈ کی صورت میں مینشن کی چھت کے خلا سے نکلتے چلے جا رہے تھے۔ ان کا انداز جارحانہ نہیں تھا...... وہ سیدھا اوپر اٹھ رہے تھے۔ پھر جھنڈ کے اگلے حصے کا رخ شمال کی جانب ہو گیا۔ یوں محسوس ہوا کہ یہ پرندے اس عمارت کو چھوڑ کر کہیں اور جا رہے ہیں۔

تو کیا ہاناوانی بھی زخمی حالت میں یہاں سے نکل چکی تھی؟ ممکن تھا کہ اس کی حالت نازک ہو......اور ڈاکٹر اسے یہاں سنبھال نہ سکے ہوں۔

یہ سوال ایک دہکی ہوئی سلاخ کی طرح میرے دماغ میں اتر گیا۔ میں نے ایک بار پھر موبائل آن کیا اور داؤد بھاؤ سے رابطہ کیا۔

''بھاؤ، آپ کہاں ہیں؟''

''ہم راستے میں ہیں، جلو پارک سے آگے نکل چکے ہیں۔'' بھاؤ نے جواب دیا۔

''بھاؤ، مجھے شک ہو رہا ہے کہ ہاناوانی کو شدید زخمی حالت میں یہاں سے نکالا گیا ہے یہ درست ہے تو پھر اسے کسی قریبی اسپتال میں لے جایا جائے گا۔ آپ اپنے بندوں کو

قریبی اسپتالوں اور پرائیویٹ کلینکس کے حوالے سے الرٹ کریں۔''

''تم جانتے ہو، میں خود تو کسی سے رابطہ نہیں کر سکتا۔ ہاں میں لودھی سے کہتا ہوں۔''

''ابھی میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا...... ہوسکتا ہے کہ ہاناوانی ابھی مینشن میں ہی ہو۔ اگر ایسا نہیں تو پھر وہ ایک سفید اسٹیٹ کار میں نکلی ہے آپ راستے میں ایسی کار پر نظر رکھیں۔''

''تم بے فکر رہو۔'' داؤد بھاؤ نے کہا۔

گارڈز مجھے اس مینشن کے چپے چپے پر ڈھونڈ رہے تھے۔ وہ کسی بھی وقت مجھ تک پہنچ سکتے تھے۔ انچارج گارڈ نے للکارتی ہوئی آواز میں اپنے ماتحتوں سے کہا۔ ''بڑی سرچ لائٹ لے کر آؤ۔ ان درختوں پر بھی اچھی طرح دیکھو۔''

فوراً ہی ایک سرچ لائٹ کے بجائے دو لائٹس آ گئیں۔ درختوں کے مختلف حصے روشنیوں میں نہانے لگے۔ میرے گرد خطرہ بڑھتا جا رہا تھا۔ میری نگاہ بار بار چار دیواری سے آگے تاریک میدان کی طرف اٹھ جاتی تھی۔ اور پھر مجھے دو روشنیاں نظر آئیں۔ روشنیاں اچانک ہی نمودار ہوئی تھیں۔ شاید پہلے ان کو آف رکھا گیا تھا۔ یہ کسی بڑی گاڑی کی ہیڈ لائٹس تھیں۔ انجن کی آواز سے بھی پتا چلتا تھا کہ یہ کوئی بھاری گاڑی ہے۔ پھر یہ گاڑی سماعت شکن آواز کے ساتھ عقبی احاطے کے گیٹ سے ٹکرائی۔ تصادم شدید تھا۔ گیٹ تھامنے والے پلرز میں سے ایک ڈھے گیا اور ایک بھاری بھرکم ''ڈمپر'' گیٹ کو روندتا اندر داخل ہو گیا۔

اچانک ہی نیم تاریکی میں دھماکوں کے ساتھ شعلے لپکنے لگے۔ دوطرفہ فائرنگ شروع ہو گئی تھی۔ گیٹ کی قریبی روشنیوں میں، میں نے وارث لودھی اور رضوان ٹی کو صاف پہچانا۔ وہ ''ڈمپر'' کی آڑ لے کر تابڑ توڑ فائرنگ کر رہے تھے۔ ایک اور جیپ ٹوٹے ہوئے گیٹ کو روند کر اندر داخل ہو گئی، اس میں بھی بھاؤ کے ماہر شوٹرز تھے۔

درخت کے عین نیچے سے ایک مقامی گارڈ نے خوف زدہ آواز میں کہا۔ ''یہ کیا ہے، کون لوگ ہیں یہ؟ پولیس تو نہیں ہے۔''

دوسرا بولا۔ ''بھاؤ گینگ کے لوگ ہو سکتے ہیں۔''

''بیڑا غرق۔'' پہلے نے مزید خوف زدہ ہو کر کہا۔

شاید وہ کچھ اور بھی کہتا مگر ایک گولی اس کے جسم میں کہیں لگی اور وہ پہلو کے بل گر گیا۔ میں درخت پر ہی تھا مگر تھوڑا سا نیچے آ گیا تھا۔ دس بارہ فٹ کی بلندی سے میں نے دوسرے

گارڈ پر چھلانگ لگائی۔ وہ اوندھے منہ میرے نیچے گرا۔ اس کی کنپٹی پر لگنے والی پسٹل کی ایک شدید ضرب نے اسے نیم بے ہوشی میں دھکیل دیا۔ میں نے اس کی ٹرپل ٹو رائفل تھامی اور فائرنگ کرتا ہوا برآمدے کی طرف نکل گیا۔

داؤد بھاؤ نے قریباً چالیس شوٹرز کے ساتھ ایک زبردست ہلا بولا تھا۔ (حسبِ دستور داؤد بھاؤ خود اس کارروائی میں شریک نہیں تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا وہ کوئی 300 میٹر پیچھے ایک بند اسٹیشن وین میں موجود تھا)

صرف چار پانچ منٹ کی نہایت تیز رفتار کارروائی کے بعد نتیجہ سامنے آ گیا۔ اس مینشن میں گرے فورس کے اتنے گارڈز موجود نہیں تھے، جتنے ہم سمجھ رہے تھے۔ یہاں صرف سات گارڈز تھے۔ باقی کرائے کے مقامی ٹٹو تھے۔ ان میں سے کچھ تو شدید حملے کے بعد بھاگ گئے تھے۔ مینشن میں کاؤنٹر فائرنگ کرنے والوں کی تعداد پندرہ کے لگ بھگ تھی۔ ان میں سے تین جان سے گئے، کچھ زخمی ہوئے اور باقیوں نے ہتھیار ڈال کر ہاتھ کھڑے کر دیئے۔ گرے فورس کے لوگوں میں سے بھی دو بندے اس حملے میں مارے گئے اور باقیوں نے سرنڈر کر دیا۔

وارث لودھی دوڑتا ہوا میرے پاس آیا اور لپٹ گیا۔ ''آپ خیریت سے ہیں جناب؟''

''میں تو خیریت سے ہوں مگر کچھ اور لوگ خیریت سے نہیں ہیں۔''

رضوان ٹی حیرت سے میرے لباس کو دیکھ رہا تھا اور میں حیرت سے اس کا جائزہ لے رہا تھا، وہ اپنے زخموں سے ابھی پوری طرح صحت یاب نہیں ہوا تھا مگر ''میری محبت'' میں اس لڑائی کا حصہ بن گیا تھا۔ اسے ایک جواں مرد کی طرح رائفل بدست دیکھ کر مجھے مسرت ہوئی۔ رضوان نے پوچھا۔ ''فخر اور فارس جان یہیں پر ہیں؟''

''ہاں فخر یہیں پر ہے اور سب سے پہلے ہمیں اسی کو دیکھنا چاہیے۔''

''اور وہ حرام زادی؟'' رضوان اور لودھی تقریباً ایک ساتھ ہی بولے۔

میں نے گہری سانس لے کر مینشن کی تیسری منزل پر نگاہ دوڑائی۔ ''مجھے اندیشہ ہے کہ وہ یہاں سے نکل چکی ہے لیکن حتمی بات تو گرے فورس کے یہ اہلکار ہی بتا سکیں گے۔'' میں نے ان چار پانچ اہلکاروں کی طرف اشارہ کیا جن کو بھاؤ گینگ کے شوٹرز نے ٹھنڈی گھاس پر اوندھا لٹا رکھا تھا اور ان پر رائفلیں تان رکھی تھیں۔

مجھے امید تھی کہ فخر کے علاوہ شازیہ کا محبوب خاوند اکبر بھی یہیں پر ہوں گے۔ میں

وارث لودھی کو ساتھ لے کر عمارت کے اندرونی حصے کی طرف لپکا۔ یہاں جگہ جگہ گولیوں کے خول بکھرے تھے اور ٹوٹے ہوئے شیشوں کے ٹکڑے تھے۔ ہم اندرونی کمروں میں پہنچے تو پرندوں کے پنجرے خالی تھے۔ اکبر بھی آس پاس کہیں نظر نہیں آیا...... ہمارے نزدیک سب سے اہم سوال یہ تھا کہ ہاناوانی یہاں موجود ہے یا نہیں......؟

ہم تیزی سے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے تیسری منزل پر پہنچے۔ یہ اس عمارت کی وہی منزل تھی جسے خصوصی طور پر ڈیکوریٹ کیا گیا تھا۔ فرشوں پر دبیز قالین اور کھڑکیوں پر قیمتی پردے تھے۔ یہ جگہ مرکزی طور پر ائرکنڈیشنڈ تھی اور یہاں بلا کی خاموشی تھی۔ حمام نما پورشن کا دروازہ کھلا تھا مگر بھاپ کے مرغولے کہیں دکھائی نہیں دیتے تھے۔ نہ ہی چھوٹی آنکھوں اور چپٹی ناکوں والی خادمائیں دکھائی دیتی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اب اس جگہ کوئی موجود ہی نہیں ہے۔

میں رائفل بدست، اس شاندار بیڈروم میں داخل ہوا جہاں کچھ دیر پہلے ہاناوانی سے سنگین ترین ملاقات ہوئی تھی۔

''یہاں تو بڑا تہلکہ مچا ہوا ہے۔'' وارث لودھی کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

واقعی بیڈروم کا منظر دیدنی تھا۔ شیشے کا بیشتر فرنیچر ٹوٹ چکا تھا۔ کریم رنگ کے بیش قیمت قالین پر خون کے بڑے بڑے داغ تھے۔ سامنے ہی وہ بلی نما جسیم جانور مردہ پڑا تھا جس نے ہاناوانی کا دفاع کیا تھا۔ اس کا بالکل سیاہ جسم خون میں لتھڑا ہوا تھا۔ یقیناً ہاناوانی کے جسم سے بھی خون کے فوارے نکلے تھے تاہم جانور اور ہاناوانی کے خون کی علیحدہ علیحدہ شناخت ممکن نہیں تھی۔

''یہاں کوئی نہیں ہے۔'' ایک شوٹر نے آکر وارث لودھی کو اطلاع دی۔

وارث نے کہا۔''پوری بلڈنگ میں پھیل جاؤ، ہر جگہ تلاش کرو۔''

میں نے مداخلت کی۔''میرے خیال میں اس کی ضرورت نہیں۔ پہلے، پکڑے جانے والے گارڈز سے پوچھا جائے کہ ہاناوانی کہاں ہے۔''

ہم تیزی سے سیڑھیاں اترتے ہوئے گراؤنڈ فلور پر پہنچے۔ راستے میں ہمیں کم از کم 11 لاشیں دکھائی دیں، یہ ہاناوانی کے ساتھیوں کی تھیں۔ مینشن کے وسیع لان میں گرے فورس کے پانچ گارڈز موجود تھے۔ اب ان کی مشکیں کسی جا چکی تھیں۔ رضوان ٹی نے ان میں ایک کو اس کے بالوں سے پکڑ رکھا تھا...... اور اس سے پوچھ گچھ کر رہا تھا۔ اس کے ناک سے خون جاری تھا۔

میں نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے انگلش میں پوچھا۔ ’’کہاں ہے تمہاری مدر مدام؟‘‘
وہ کراہتے ہوئے بولا۔ ’’میں نے بتایا ہے، وہ یہاں نہیں ہیں۔ ان کی حالت اچھی نہیں تھی۔ ڈاکٹرز انہیں یہاں سے لے گئے ہیں۔‘‘
’’کہاں لے گئے ہیں؟‘‘
’’مم...... مجھے کچھ پتا نہیں۔‘‘
’’تو کسے پتا ہے؟‘‘ میں نے پوچھا۔
’’ہم میں سے کسی کو پتا نہیں۔‘‘ وہ خون تھوکتے ہوئے بولا۔
’’پھر وہی بکواس۔‘‘ رضوان نے رائفل کا دستہ زور سے اس کی کھوپڑی پر رسید کیا۔ وہ چلاتا ہوا گھاس پر لیٹ گیا۔
رضوان دوبارہ اس پر جھپٹنا چاہتا تھا مگر میں نے روک دیا۔
میں وارث لودھی کو ایک طرف لے گیا اور دھیمی آواز میں پوچھا۔ ’’بھاؤ کہاں ہیں؟‘‘
’’وہ اسٹیشن وین میں ہیں، کچھ پیچھے کھڑے ہیں۔ میرے سوا کسی کو پتا نہیں کہ وہ یہاں ہیں بلکہ......‘‘ وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔
میں اس کی ادھوری بات کا مطلب سمجھ گیا۔ وہ کہنا چاہتا تھا...... بلکہ کسی کو یہ بھی پتا نہیں کہ وہ ابھی حیات ہیں۔
میں نے لودھی سے پوچھا۔ ’’بھاؤ نے تمہیں کوئی ہدایت دی ہے؟‘‘
’’جی ہاں، میں نے اپنے بندوں سے کہہ دیا ہے کہ وہ اردگرد کے اسپتالوں اور پرائیویٹ کلینکس میں پتا کریں۔ جیسے ہی کوئی اطلاع ملے مجھے خبر دیں۔‘‘
’’چلو آؤ اب فخر کو ڈھونڈیں۔‘‘ میں نے کہا اور رائفل بدست دوبارہ مینشن کے اندرونی حصے میں داخل ہو گیا۔

وارث اور رضوان چند شوٹرز سمیت میرے پیچھے آئے۔ رضوان نے میرے پیچھے لپکتے ہوئے کہا۔ ’’شاہ زیب بھائی! آپ زخمی ہیں، آپ کے زخم سے ابھی بھی خون رِس رہا ہے۔ پہلے آپ پٹی کرا لیں۔‘‘
’’کرا لیتا ہوں پٹی بھی...... جہاں اتنی دیر گزری ہے، چند منٹ اور گزر جائیں گے۔‘‘ میں نے اسے اطمینان دلایا۔
کسی اندرونی کمرے سے دروازہ پیٹنے اور پکارنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ہم ان ہی آوازوں کا کھوج لگاتے ہوئے، مینشن کے وسطی حصے میں پہنچ گئے۔ یہاں ایک کمرے میں

فخر بند تھا۔ آہنی گرل والی ادھ کھلی کھڑکی میں سے اس کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ وہ دروازہ پیٹ رہا تھا اور واویلا کر رہا تھا۔ ''مجھے باہر کیوں نہیں نکالتے ہو...... کہاں مر گئے ہو سارے...... یہ کیا ہو رہا ہے......؟''

فخر کی آنکھوں کے ساتھ ساتھ اس کا چہرہ بھی ورم زدہ تھا۔ وہ گہرے نشے میں نظر آتا تھا۔ غالب خیال یہی تھا کہ اسے بھی میری طرح تیز ٹرینکولائزرز دیئے جاتے ہیں۔ جونہی فخر کی نظر مجھ پر پڑی، اس کی بے چینی اور جارحیت دوسری شکل اختیار کر گئی۔ اس نے اپنی آنکھیں میری آنکھوں میں گاڑیں اور دہاڑا۔ ''کس نے گولیاں چلائی ہیں یہاں؟ تم نے چلائی ہوں گی۔ تم نے چلائی ہیں۔ میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔ تم قاتل ہو۔ تم ہمیشہ سے قاتل ہو۔''

وہ کھڑکی کے قریب چلا آیا اور جالی کی دوسری جانب سے میرے منہ پر تھوکنے کی ناکام کوشش کی۔

میں کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گیا۔ رضوان اور لودھی نے سراسیمہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے ان کے اندیشوں کی تصدیق کرتے ہوئے کہا۔ ''ہاں...... اپنے حواس میں نہیں ہے۔ یہ نشہ آور دواؤں اور ہاناوانی کے اثر میں ہے۔''

''تو پھر کیا ہوگا؟'' لودھی نے دکھ بھرے لہجے میں پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ...... یہ آہستہ آہستہ خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔''

رضوان نے سوچ بھرے انداز میں میرے خیال کی تائید کی...... ''مجھے سجاول بھا والا معاملہ یاد آ رہا ہے...... وہ بھی تو کچھ عرصے بعد ٹھیک ہونا شروع ہو گئے تھے۔''

میں نے کہا۔ ''فی الحال ہمیں اس کو...... اس کے حال پر چھوڑنا ہوگا اور نگہداشت کرنی ہوگی۔''

لودھی کا ایک ساتھی بھاگتا ہوا آیا۔ اس نے اطلاع دی۔ ''طوطے بہت شور مچا رہے ہیں۔ لگتا ہے کہ جالیاں توڑ دیں گے۔ ان کا کیا کرنا ہے؟''

میں بری طرح چونک گیا۔ طوطوں والے کمرے تو خالی تھے۔ ابھی چند منٹ پہلے میں نے خود دیکھا تھا...... اور ان طوطوں نے میرے سامنے مینشن کی چھت کے خلا سے پرواز کی تھی۔ میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ لپکتا ہوا ان نیم تاریک کمروں تک پہنچا جہاں دیوار کے ساتھ ساتھ بہت سے پنجرے تھے۔ یہ سارے پنجرے اب خالی پڑے تھے لیکن اطلاع دینے والا بھی غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ ایک کونے والے پنجرے میں دس پندرہ طوطے ا

موجود تھے۔ یہ پنجرہ شاید غلطی سے بند رہ گیا تھا۔ باقی طوطے پرواز کر گئے تھے اور یہ یہیں پر بند تھے۔ ان پرندوں کی بے قراری دیدنی تھی۔ وہ جنون کے عالم میں پھڑ پھڑا رہے تھے۔ اپنی نکیلی، خم دار چونچوں سے پنجرے کی جالی کو ادھیڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کچھ ایسے تھے جو پیچھے ہٹ ہٹ کر پنجرے کی جالیوں سے ٹکرا رہے تھے۔ وہ زخمی ہو رہے تھے، ان کے پر جھڑ رہے تھے مگر انہیں کچھ پروا نہیں تھی۔

لودھی ایک نڈر شخص تھا مگر پرندوں کی وحشت دیکھ کر وہ بھی کچھ ٹھٹک گیا۔ رائفل پر اس کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''ان کو شوٹ نہ کر دیں؟''

''نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔ مجھے نہیں لگتا کہ یہ پنجرے سے نکل سکیں گے، اگر نکل بھی آئے تو رہیں گے تو اس کمرے میں ہی۔ مجھے امید ہے کہ آہستہ آہستہ ان کی حالت بھی بہتر ہو جائے گی۔''

پرندوں والا یہ پورشن دو بڑے اور ایک چھوٹے کمرے پر مشتمل تھا۔ چھوٹے کمرے میں موجود ایک بغلی دروازے سے گزر کر ہم ایک اور کمرے میں پہنچے۔ کمرے میں موجود ساز و سامان سے پتا چل گیا کہ یہ شازیہ کے نوجوان شوہر اکبر کا کمرا ہے مگر حسبِ اندیشہ اکبر یہاں موجود نہیں تھا۔ وہ اس پورشن میں اور اس کے اردگرد کہیں بھی نہیں تھا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا، وہ ہانا وانی کے فرار ہونے والے غیر ملکی ساتھیوں کے ساتھ ہی یہاں سے نکل گیا ہے۔

قریباً چالیس منٹ بعد میں اس مینشن سے دو ڈھائی فرلانگ کے فاصلے پر داؤد بھاؤ کی اسٹیشن وین میں موجود تھا۔ مینشن کے اردگرد کا علاقہ بالکل سنسان تھا۔ یہ جھاڑ جھنکاڑ والی بے آباد زمین تھی۔ اسٹیشن وین جھاڑیوں کی تاریکی میں کھڑی تھی۔ بھاؤ اور اس کے ذاتی ڈرائیور کے علاوہ وین میں اور کوئی نہیں تھا۔ بھاؤ نے بھی داڑھی مونچھوں اور بالوں کے بدلے ہوئے رنگ کے ذریعے اپنا حلیہ کافی تبدیل کر رکھا تھا۔ بھاؤ نے فون کال کے بعد اپنا موبائل کوٹ کی جیب میں رکھا اور بولا۔ ''لودھی نے اپنے ساتھیوں کو لاہور اور گوجرانوالہ میں بالکل الرٹ کیا ہوا ہے۔ ابھی تک کسی سرکاری یا غیر سرکاری اسپتال سے اس کمینی زادی کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ہے۔''

میں نے کہا۔ ''میری رائے تو یہی ہے بھاؤ کہ بڑے اسپتالوں یا کلینکس وغیرہ میں دیکھنے کے بجائے اسے ان چھوٹے کلینکس میں دیکھا جائے جہاں ڈاکٹرز پرائیویٹ پریکٹس کرتے ہیں۔''

''اس کے زخموں کی کنڈیشن کیا ہے؟'' بھاؤ نے پوچھا۔

''شدید زخم ہیں۔ عین ممکن ہے کہ اسے بچانے کے لیے بڑی سرجری کی ضرورت ہو...... اس کے علاوہ اس کے ایک دو غیر ملکی ساتھی بھی سخت زخمی ہوں گے۔ تلاش کرنے والے اس بات کو بھی ذہن میں رکھیں۔''

بھاؤ کی بڑی بڑی آنکھوں میں گہری سوچ کی پرچھائیاں لہرا رہی تھیں۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ ''تمہارا کہنا ہے کہ پرندے یہاں سے اُڑ کر کہیں چلے گئے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ ہاناوانی کے گروہ کے پاس یہاں کوئی اور ٹھکانا بھی ہوگا۔ ایسے ہی کسی کم آباد علاقے میں کوئی سنسان بلڈنگ۔''

''لیکن ضروری نہیں بھاؤ کہ یہ ٹھکانا یہیں کہیں آس پاس ہی ہو۔ وہ کہیں بھی ہو سکتا ہے، کسی دوسرے علاقے میں...... یا دوسرے شہر میں۔ یہ پرندے تو منٹوں میں کہیں کے کہیں پہنچ جاتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ انہوں نے یہاں سے لمبی پرواز کی ہے۔''

دور کہیں کسی گاڑی کا مدھم سائرن سنائی دیا۔ یقیناً یہ مقامی پولیس کی کوئی موبائل تھی۔ بھاؤ نے چونکی ہوئی آواز میں کہا۔ ''مینشن میں چلنے والی گولیوں کی آواز کافی دور تک گئی ہو گی، کہیں یہ پلیسے تو متوجہ نہیں ہو گئے؟''

میں نے کہا۔ ''یہ کافی ویران جگہ ہے اور ایسی سرد راتوں میں یہ پولیس والے گشت کے بجائے بجلی کے ہیٹر لگا کر تھانے کے کمروں میں دبکے رہتے ہیں۔ یہ بات ایک بار آپ نے ہی بتائی تھی۔''

ڈرائیور سمیت ہم تینوں دھیان سے پولیس موبائل کا سائرن سنتے رہے۔ یہ آواز برساتی نالے کی دوسری جانب سے آرہی تھی۔ ہماری توقع درست ثابت ہوئی۔ یہ آواز قریب آنے کے بجائے دھیرے دھیرے دور ہوتی چلی گئی اور پھر معدوم ہوگئی۔ اب رات کا تیسرا پہر شروع ہو چکا تھا، داؤد بھاؤ نے اپنی رسٹ واچ دیکھی اور کہا۔ ''میں زیادہ دیر یہاں ٹھہر نہیں سکتا، مجھے واپس جانا ہوگا اور میں چاہتا ہوں کہ تم اور فخر بھی میرے ساتھ ہی چلو۔ یہاں تمہارے لیے کئی طرح کے خطرات ہیں۔''

''آپ بے فکر رہیں بھاؤ، میں جلد ہی پہنچ جاؤں گا۔ ابھی مجھے ہاناوانی کے پکڑے جانے والے کارندوں سے تھوڑی پوچھ گچھ کرنی ہے۔ میں اس بلڈنگ میں گھوم پھر کر پوری طرح تسلی کر لینا چاہتا ہوں۔''

بھاؤ بولا۔ ''قسطینا اور پہلوان حشمت ابھی تک سکھیرا گاؤں کے قریب ایک ڈیرے پر موجود ہیں۔ ڈیرے پر اپنا ہی بندہ ہے۔ وہ ہر طرح سے قسطینا کی مدد کر رہا ہے مگر

خیال ہے کہ اب قسطینا اور پہلوان کو وہاں سے واپس آجانا چاہیے۔ گاؤں کے لوگ اب پوری طرح محتاط ہو گئے ہیں اور اپنی حفاظت خود کر سکتے ہیں۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے جی۔ یہاں سے فارغ ہو کر میں قسطینا اور پہلوان سے رابطہ کرتا ہوں۔ انہیں اب مزید خطرہ مول نہیں لینا چاہیے۔"

داؤد بھاؤ بولا۔ "قسطینا بہت دلیر لڑکی ہے۔ وہ واقعی اس لائق تھی کہ اسے جاما جی میں گرین فورس کا کمانڈر بنایا جاتا۔ تمہیں پیٹرول پمپ والے واقعے کا پتا چلا ہے؟ وہاں بھی یہ خونی طوطے جا پہنچے تھے۔"

"جی ہاں، میں نے نیوز میں سب سن لیا تھا۔" میں نے افسردگی سے کہا۔ "ڈاکٹر احرار کی موت میرے لیے ایک بہت بڑا دھچکا ہے۔"

"مگر ڈاکٹر کی بیٹی کی جان قسطینا کی وجہ سے بچ گئی۔ اس طرح کا دوسرا خونی واقعہ سکھیرا گاؤں کے اندر ہوا۔ وہاں بھی قسطینا بروقت پہنچی اور اس نے لوگوں کی جان بچائی۔"

میں نے کہا۔ "داؤد بھاؤ! جاما جی جس طرح کے حالات سے گزر رہا ہے، وہاں قسطینا کی اشد ضرورت ہے مگر وہ یہاں ہمارا دفاع کرنے میں لگی ہوئی ہے، میں نہیں چاہتا کہ وہ مزید خطرات مول لے۔"

"ابھی تک اس کے شوہر کا بھی کچھ پتا نہیں۔" بھاؤ نے فکرمندی سے کہا۔

میرے سینے پر گھونسا سا لگا۔ میں نے ابھی تک بھاؤ کو فارس جان کی المناک موت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ درحقیقت میرے سوا ابھی کسی کو اس واقعے کا علم نہیں تھا اور میں خود بھی ابھی تک ایک "پُرامید شک" میں مبتلا تھا۔ کبھی کبھی ذہن میں یہ خیال ابھرتا تھا کہ کیا پتا شدید زخمی ہونے کے باوجود فارس کے سانس کی ڈور مکمل طور پر نہ ٹوٹی ہو اور وہ بچ گیا ہو (فخر کو بھی تو میں نے ایک موقع پر مردہ سمجھ لیا تھا)

○......❖......○

یہ دن کا وقت تھا۔ ہم ابھی تک اس مینشن میں ہی تھے۔ لودھی کے ساتھیوں نے مینشن کا ٹوٹا ہوا عقبی گیٹ پھر سے کھڑا کر دیا تھا۔ مینشن کے مختلف حصوں کی تلاشی لی گئی تھی۔ شاردا اور ایک ملائیشین ملازمہ ایک اسٹور روم سے ملی تھیں۔ انہوں نے خود کو وہاں چھپا رکھا تھا۔ مختلف حصوں سے اسلحہ اور ایمونیشن وغیرہ بھی ملا تھا۔ ایک بڑے اسٹور سے درجنوں بوریاں دستیاب ہوئی تھیں۔ ان میں پرندوں کا دانہ دنکا بھرا ہوا تھا۔

اسی دوران میں لودھی کا ایک ساتھی اندر آیا اور اس نے افسردہ لہجے میں کہا۔ "پچھلے

صحن سے دو لاشیں ملی ہیں۔ ان میں سے ایک شاید......" وہ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

میں سمجھ گیا کہ وہ فارس جان کی بات کر رہا ہے۔

ہم اس عقبی لان میں پہنچے جو قریباً نصف ایکڑ رقبے میں تھا۔ یہیں پر "لونگ پیپر" کے ایک مہربان پیڑ نے خطرناک ترین گھڑیوں میں مجھے پناہ فراہم کی تھی۔ یہاں کچھ زمین پر لودھی کے ورکروں نے ایک بڑا گڑھا کھود رکھا تھا اور بدبو سے بچنے کے لیے منہ پر کپڑے وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ ایک چٹائی پر مٹی سے لتھڑے ہوئے دو انسانی ڈھانچے پڑے تھے۔ ان ڈھانچوں پر بس کہیں کہیں گوشت دکھائی دیتا تھا۔

میں نے ایک ڈھانچے کو دیکھا اور دل بیٹھ گیا۔ یہ جواں ہمت کمانڈر فارس جان تھا۔ اس کی کھوپڑی اور چہرے پر تھوڑی سی کھال باقی تھی...... باقی سب کچھ شاید گدھ اور خونی طوطے نوچ چکے تھے...... لباس کے نام پر فارس کی پسلیوں میں کپڑے کی کچھ دھجیاں پھنسی رہ گئی تھیں۔ دوسری لاش کو بھی میں نے پہچان لیا۔ یہ گریے فورس کا وہی ملازم تھا جو اپنی ایک کوتاہی کی وجہ سے ہاناوانی کے عتاب کا شکار ہوا تھا۔ ہاناوانی نے اسے میرے سامنے اپنے سفاک کارندوں کے حوالے کیا تھا۔ اس کی کھوپڑی کسی وزنی اور کند آلے کی ضرب سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ صاف پتا چلتا تھا کہ ان دونوں کو "بعد از موت" خونی طوطوں اور گِدھوں کی خوراک بنایا گیا ہے اور پھر بے گور و کفن گڑھوں میں دبا دیا گیا ہے۔

میں نے لودھی کے ساتھی سے کہا۔ "ان پر چادریں ڈالو۔ کمانڈر کی لاش کو بڑے احترام سے سامنے والے برآمدے میں پہنچا دو۔"

لودھی نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ آپ اس لاش کو یہاں سے لے جانا چاہیں گے۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ بولا۔ "میں اس کے لیے تابوت کا انتظام کرواتا ہوں۔ میرا اندازہ ہے کہ ہم لاش کو محفوظ طریقے سے لے جانے کے لیے ڈمپر ٹرک استعمال کر سکیں گے۔"

لودھی اسی ڈمپر ٹرک کی بات کر رہا تھا۔ جس نے رات کو ٹکر مار کر مینشن کا عقبی گیٹ توڑا تھا۔ وہ ابھی تک احاطے میں ہی پارک تھا۔ ہاناوانی کے پکڑے جانے والے ساتھیوں کو بھی اسی ٹرک میں "کیموفلاج" کر کے یہاں سے لے جایا جا سکتا تھا۔

میں نے لودھی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "اس بلڈنگ میں اپنی موجودگی کے سارے ثبوت ختم کرا دو۔ ہمیں اب جلد از جلد یہاں سے نکلنا ہوگا۔"

○......❖......○

لاہور شہر میں داؤد بھاؤ کے پاس بہت سے خفیہ ٹھکانے موجود تھے، یہ بھی ان میں سے ایک تھا۔ یہ ڈیڑھ کینال کی دو منزلہ کوٹھی ٹاؤن شپ کے علاقے میں تھی۔ اب میں یہاں موجود تھا۔ وارث لودھی اور رضوان بھی میرے ساتھ ہی یہاں پہنچے تھے۔ سجاول، زینب اور ولید پہلے سے یہاں موجود تھے۔

سب سے پہلے میں نے زینب سے ہی ملاقات کی۔ وہ جاماجی کی ''نوعمر ملکہ'' بن چکی تھی مگر کسی وقت ایک ننھی بچی کی طرح ہی نظر آتی تھی۔ وہ میرے گلے لگ کر سسکنے لگی۔ اسے بھی دین محمد صاحب اور مولوی حبیب کی اموات کی خبریں مل چکی تھیں۔ وہ دونوں چاند گڑھی کے تھے اور زینب انہیں بخوبی جانتی تھی۔ وہ بہت سہمی ہوئی تھی۔ میں نے اسے دلاسا دیا۔ میرے پہلو پر بندھی ہوئی پٹی کو محسوس کر کے وہ چونکی۔

''آپ زخمی ہیں؟''

''معمولی چوٹ ہے۔ دو چار دن میں ٹھیک ہو جائے گی۔''

''کیسے آئی؟''

میں اسے کیا بتاتا کہ کیسے آئی...... اور بتاتا تو وہ یقین کر لیتی؟ میری نگاہوں میں وہ تہلکہ خیز منظر گھوم گیا جب میں مینشن کے بیڈ روم میں ہاناوانی کی گردن توڑنے کے درپے تھا اور ایک نیم تاریک گوشے سے نکل کر اچانک جسیم سیاہ بلی نے مجھ پر خوفناک حملہ کیا تھا۔

میں نے گول مول بات کر کے زینب کو مطمئن کیا۔ زینب...... قسطینا اور پہلوان کے لیے بھی بہت پریشان تھی۔ میں نے کہا۔ ''میں ابھی قسطینا کو فون کرنے والا ہوں۔ وہ سکھیرا گاؤں سے جلد ہی یہاں پہنچ جائے گی۔ وہ بالکل خیریت سے ہے۔ پہلوان بھی خیریت سے ہے۔''

زینب نے رو دینے والے انداز میں کہا۔ ''قسطینا بہت اچھی ہیں، بہت زیادہ۔ وہ ہمارے لیے خطرے مول لے رہی ہیں۔ وہ آپ کی بہت عزت کرتی ہیں۔ آپ کی پریشانی کو اپنی پریشانی سمجھتی ہیں۔''

''مجھے پتا ہے زینب! اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ وہ یہاں آ جائے۔ میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ اب تم اور قسطینا وغیرہ واپس جاماجی چلے جاؤ...... ہاناوانی والا معاملہ تو اب تقریباً ختم ہو گیا ہے۔''

''کیا مطلب؟ وہ مر گئی ہے؟'' زینب نے بے تاب ہو کر پوچھا۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں امید کی چمک نمودار ہو گئی تھی۔

"مری تو نہیں، زینب لیکن شاید مر جائے اور اگر بچ بھی گئی تو ابھی بہت عرصے تک کسی کو نقصان پہنچانے کے قابل نہیں ہو گی۔"

پھر میں نے اسے مختصراً بتایا کہ وہ مینشن میں ہونے والے معرکے میں شدید زخمی ہو چکی ہے۔ ہم کچھ دیر اس بارے میں مصروف گفتگو رہے۔ ہانا وانی کے بارے میں سن کر زینب کی آنکھوں میں تفکر کی پرچھائیاں کافی ماند پڑ گئی تھیں۔

کچھ دیر بعد میں نے قسطینا کے نمبر پر کال کی۔ یہ نمبر مجھے داؤد بھاؤ نے ہی فراہم کیا تھا۔ قسطینا کو فون کرتے ہوئے میرے دل پر بہت بھاری بوجھ تھا۔ میرے پاس قسطینا کے لیے ایک بری خبر تھی۔ اور یہ خبر مجھے ہی اس تک پہنچانا تھی۔ فارس جان کا تابوت میں بند جسم یہاں اس کوٹھی میں پہنچ چکا تھا اور بیسمنٹ کے ایک ائر کنڈیشنڈ کمرے میں رکھا تھا۔

دوسری کوشش میں قسطینا سے رابطہ ہو گیا۔ وہ خوش گوار موڈ میں تھی۔ بولی۔ "شاہ زائب! مجھے ہانا وانی کے بارے میں اطلاع مل چکی ہے۔ داؤد بھاؤ نے مجھے رات کو ہی بتایا تھا۔ ویسے یہ عین ممکن ہے کہ وہ اس زمین کو اپنے گندے بوجھ سے آزاد کر چکی ہو۔"

"کیا مطلب؟"

"دیکھو ناں، وہ شدید زخمی ہوئی ہے اور داؤد بھاؤ کے درجنوں کارندے اسپتالوں اور چھوٹے بڑے کلینکس میں اس کی ٹوہ لگا چکے ہیں۔ وہ کہیں نہیں ملی۔ اس سے یہ امید پیدا ہوتی ہے کہ شاید وہ علاج معالجے کی حدوں سے گزر چکی ہے۔"

"ایسا ہو بھی سکتا ہے...... اور نہیں بھی۔" میں نے کہا پھر ذرا توقف سے اپنی بات جاری رکھی۔ "قسطینا! داؤد بھاؤ کا خیال ہے اور میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ اب آپ اور پہلوان سکھیرا سے واپس آ جائیں۔ اللہ نے چاہا تو اب وہاں کوئی خطرہ نہیں ہو گا ویسے بھی علاقے کے لوگ بہت محتاط ہو چکے ہیں۔"

"ہاں، تمہاری بات درست ہے شاہ زائب! ابھی تھوڑی دیر پہلے میرے اور پہلوان جی کے درمیان بھی یہی بات ہو رہی تھی مگر دن کی روشنی میں تو ہم یہاں سے نکل نہیں سکتے۔ علاقے میں شکیل داراب کے لوگوں کی موجودگی ثابت ہوتی ہے۔ مقامی پولیس بھی الرٹ ہے۔ انسپکٹر قیصر اور وریام کی موت کے بعد یہ لوگ تمہارے ساتھ ساتھ مجھے بھی جانی دشمن سمجھ رہے ہیں۔"

"اسی لیے تو کہتا ہوں کہ اب آپ واپس آ جائیں۔"

"میں اس بارے سوچتی ہوں۔ ویسے ہو سکتا ہے کہ ہم رات کو نکل آئیں۔"

میں نے قسطینا کو تاکید کی کہ وہ رات کو نکل آئے۔

شام کو زینب نے مجھے بتایا کہ اس نے میرے لیے اپنے ہاتھوں سے کھانا بنایا ہے۔ یہ اس کی دیرینہ خواہش تھی اور وہ آج اسے ہر صورت پورا کرنا چاہتی تھی۔ اسے بھی ابھی فارس کی موت کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا۔ اس نے بھی ایک تابوت کوٹھی میں داخل ہوتے دیکھا تھا مگر اس کا خیال تھا کہ اس میں وہ چند پرندے بند ہیں جو مینشن سے پکڑے گئے ہیں۔

رات کو زینب نے واقعی پُرتکلف کھانے کا اہتمام کیا تھا۔ پانچ چھ طرح کی ڈشز تھیں۔ مکئی کی روٹی، دیسی مرغ کے قورمے اور رنگ برنگے میٹھے چاولوں نے چاندگڑھی کے شب و روز کی یاد تازہ کر دی۔ یہ سب کچھ زینب نے خود بنایا تھا۔ میرا دل بوجھل تھا مگر میں خود کو نارمل رکھے ہوئے تھا۔

میں نے کہا۔ ''یور ہائی نس سے اتنی خدمت لے کر میں خود کو گنوار اور جاہل سمجھنے لگا ہوں۔''

''میں ایک معمولی خادمہ کی طرح آپ کی خدمت کرنے کی خواہش رکھتی ہوں۔ آپ کیا جانیں میرے دل میں آپ کا کیا مقام ہے۔''

میں بولا۔ ''اگر اتنا کچھ پکانا تھا تو پھر رضوان اور ولید کو بھی مدعو کر لیتیں۔''

''میں نے انہیں بلایا ہے۔ وہ بس آ ہی رہے ہیں۔'' زینب نے کہا۔

''معافی چاہتا ہوں یور ہائی نس! آپ کی عقل مندی پر شبہ کیا۔'' میں بولا۔

''ایسا نہ کہا کریں شاہ زیب بھائی۔'' وہ لاڈ سے ٹھنکی۔ میں نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا اور اس کا سر چوما۔

دو منٹ بعد رضوان اور ولید بھی پہنچ گئے۔ (رضوان کے گہرے زخموں پر اسکن گرافٹنگ کی تکنیک استعمال ہوئی تھی اور وہ بھرنا شروع ہو گئے تھے) کھانے کے بعد زینب نے خود اپنے ہاتھوں سے بادام پستے والی سبز چائے بنائی اور بہت منع کرنے کے باوجود ہمیں سرو کی۔ کھانے کے بعد رضوان اور ولید تو چلے گئے۔ میں اور زینب باتیں کرتے رہے۔ وہ اپنے گھریلو حالات کے سلسلے میں بہت مطمئن تھی۔ ابراہیم نے اسے سر کا تاج بنا کر رکھا ہوا تھا۔ پھر گفتگو کا رخ قسطینا اور اس کے حالات کی طرف مڑ گیا۔

باتوں کے درمیان زینب نے رازداری کے لہجے میں کہا۔ ''شاہ زیب بھائی! جاما جی میں تقریباً سب ہی لوگوں کو پتا ہے کہ کمانڈر قسطینا آپ کو چاہتی تھیں اور آپ سے شادی کی

خواہش رکھتی تھیں لیکن اگر وہ ایسا کرتیں تو انہیں جاما جی چھوڑ کر آپ کے ساتھ جانا پڑتا۔ انہوں نے اپنے پیار کی قربانی دی اور کمانڈر فارس جان کو اپنی زندگی کا ساتھی بنالیا۔''

''یہ بات درست ہے زینب۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔

وہ ہولے سے مسکرائی اور کرید نے والے انداز میں بولی۔ ''ویسے کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ اس میں آپ کی کوشش کو بھی دخل ہے۔ شاید آپ ہی نے قسطینا کو مشورہ دیا تھا کہ وہ کمانڈر فارس جان کو اپنا جیون ساتھی بنالیں۔''

''ہاں زینب! میں نے ایک مرتبہ اس سے یہ بات کہی تھی۔ دراصل مجھے پتا تھا کہ قسطینا کو کمانڈر فارس جان سے بہتر شوہر نہیں مل سکتا۔ وہ اس سے بہت محبت کرتا تھا۔''

''لیکن وہ تو نہیں کرتی تھیں اور شاید...... اب بھی وہ ایک رشتہ ہی نبھا رہی ہیں۔''

''یہ بات تم کیسے کہہ سکتی ہو؟''

''قسطینا اور فارس ہمارے ساتھ ہی تو ڈی پیلس میں رہتے ہیں۔ کئی چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ قسطینا کی محبت میں وہ شدت نہیں جو فارس جان کی محبت میں ہے۔ ویسے وہ ان کا بہت خیال رکھتی ہیں۔ ان کی ذرا سی تکلیف پر تڑپ جاتی ہیں۔ انہیں اپنی نگاہوں کے آس پاس ہی رکھنا چاہتی ہیں...... لیکن پھر بھی......'' وہ کہتے کہتے خاموش ہوگئی۔ شاید اسے محسوس ہو گیا تھا کہ میرے اور اس کے درمیان احترام کا جو رشتہ ہے وہ اس موضوع پر تفصیل سے بات کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

زینب نے گفتگو کا رخ ایک بار پھر اپنے محبوب شوہر ابراہیم کی طرف موڑ دیا۔ وہ معصومانہ انداز میں شرماتی بھی رہی اور ابراہیم کی باتیں بھی کرتی رہی۔ وہ ابراہیم سے فون پر میری بات کرانے کی خواہش رکھتی تھی۔ اس نے اپنے قیمتی موبائل فون سے جاما جی میں رابطے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوسکی۔

ڈنر کی ٹیبل سے میں بہت بوجھل دل کے ساتھ اٹھا تھا۔ اب قسطینا اور پہلوان حشمت یہاں پہنچنے والے تھے اور...... مجھے قسطینا کو بتانا تھا کہ وہ جس فارس جان کا انتظار بے تابی سے کر رہی ہے، وہ اب نہیں آئے گا...... وہ ایک مسخ لاش کی صورت بیسمنٹ کے ایک کمرے میں پڑا ہے۔

قسطینا اور پہلوان کی آمد رات بارہ بجے کے لگ بھگ ہوئی۔ ہر دم چہکنے والے پہلوان حشمت راہی افسردہ تھے۔ مولوی حبیب اللہ کی موت کا گہرا اثر لیا تھا پہلوان نے۔ قسطینا نارمل ہی دکھائی دیتی تھی۔ میں نے پہلوان سے ان کی پشت کی چوٹ کا حال احوال

پوچھا۔ ''چاچا حشمت! اب چوٹ کیسی ہے؟''

انہوں نے فوم کی ایک گدی مجھے دکھائی اور بولے۔ ''چلنا پھرنا تو آسان ہے لیکن بیٹھنا کافی مشکل ثابت ہووت ہے۔ اس لیے یہ گدی رکھی ہوئی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''تکلیف کے باوجود آپ سکھیرا گاؤں جا پہنچے؟''

''چوہدری دین صاحب اور مولانا کی موت کا سن کر مجھ سے رہا نا ہیں گیا تھا۔'' پہلوان جی نے آنکھوں میں آنسو بھر لیے۔

مختصر گفتگو کے بعد میں قسطینا کو ایک علیحدہ کمرے میں لے گیا۔ وہ پینٹ شرٹ کے بجائے مقامی طرز کے لباس میں تھی۔ جسم کے گرد ایک شال لپیٹ رکھی تھی۔ ہم آمنے سامنے کھڑے تھے۔ وہ میرے تاثرات دیکھ کر چونک سی گئی۔ بولی۔ ''شاہ زائب! خیریت تو ہے؟''

''ہے بھی اور...... نہیں بھی۔''

''فخر کی وجہ سے پریشان ہو۔ لیکن تم نے خود ہی تو بھاؤ کو بتایا ہے کہ وہ جلد نارمل ہو جائے گا اور...... میرا اپنا خیال بھی یہی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''قسطینا! میرے پاس آپ کے لیے ایک بری خبر ہے۔''

''بری خبر؟'' وہ بری طرح ٹھٹک گئی۔ شال اس کے شانے سے ڈھلک کر فرش کو چھونے لگی۔ وہ میرا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

میں نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ اسی طرح ساتھ لگائے لگائے اور اپنی بانہوں میں لیے ہوئے میں نے کہا۔ ''قسطینا...... فارس جان ہمارا ساتھ چھوڑ گیا ہے۔''

قسطینا کے جسم میں عجیب بے تاب سی لرزش پیدا ہوئی۔ اس نے مجھ سے پیچھے ہٹ کر میری طرف دیکھنا چاہا مگر میں نے اسی طرح اسے بانہوں میں لیے رکھا۔

''ہاں قسطینا! فارس، جان کی بازی ہار گیا ہے۔ وہ ہاناوانی کا شکار ہوا ہے۔ اس کی میت نیچے بیسمنٹ میں پڑی ہے۔''

وہ ساکت تھی مگر بدن لرز رہا تھا۔ پھر مجھے محسوس ہوا کہ میرا شانہ گرم آنسوؤں سے تربتر ہوتا جا رہا ہے۔ جاماجی کی کمانڈر انچیف رو رہی تھی۔ جس کی آنکھوں میں، میں نے کبھی نمی تک نہیں دیکھی تھی وہ آج اس طرح روئی تھی کہ دھارے سے بہہ نکلے تھے۔

پھر وہ نڈھال ہو کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنی کہنیاں، گھٹنوں پر رکھیں اور ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ اس کا سینہ ہچکیوں سے دہلنے لگا۔ اسی دوران میں رضوان اور

ولید بھی آ گئے۔ میں قسطینا کے قریب بیٹھ گیا اور اس کا شانہ سہلانے لگا۔

○......❖......○

ہاناوانی کو جان لیوا طور پر زخمی ہوئے ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ بے حد کوشش کے باوجود ابھی تک اس کا کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا۔ پتا نہیں کہ اسے زمین کھا گئی تھی یا آسمان نگل گیا تھا...... نہ ہی اس کے "تباہی کے سفیر" یعنی پرندے کہیں نظر آئے تھے۔ قسطینا، کمانڈر فارس جان کی لاش لے کر واپس جاما جی پہنچ چکی تھی۔ زینب اور ناوان بھی اس کے ساتھ ہی گئے تھے۔ میری معلومات کے مطابق قسطینا نے واپس جانے کے لیے سفارتی ذرائع استعمال کیے تھے۔ ورنہ تو شکیل داراب کے چہیتے پولیس افسر اسے جگہ جگہ ڈھونڈ رہے تھے۔

میں اپنے ساتھیوں سمیت ابھی تک داؤد بھاؤ کی اسی نئی پناہ گاہ میں تھا۔ پوش رہائشی علاقے کی یہ 30 مرلہ کی کوٹھی ہمیں ہر خطرے سے محفوظ رکھے ہوئے تھی۔ ایسے علاقوں میں لوگ اپنے اڑوس پڑوس کی زیادہ خبر نہیں رکھتے۔ یہاں بھی ہمیں ڈسٹرب کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ فخر کی حالت میں کوئی خاص فرق نہیں آیا تھا۔ ایک ڈاکٹر مسلسل اس کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ وہ چند "طوطے" جو ہم مینشن سے یہاں لائے تھے، ایک بڑے پنجرے میں بند تھے۔ پہلوان جی ان سے بہت خوف زدہ رہتے تھے۔ ان کو پورا یقین تھا کہ یہ پرندے نہیں بدروحیں ہیں، جنہوں نے طوطوں اور چمگادڑوں وغیرہ کی شکل اختیار کر رکھی ہے۔ یہ کسی بھی وقت اپنی اصل حالت میں آ جائیں گی اور پنجرہ توڑ کر باہر نکل آئیں گی۔ مگر میرا اپنا خیال تھا کہ یہ طوطے بتدریج نارمل حالت کی طرف آتے جا رہے ہیں۔

ایک روز صبح کے وقت مجھے کسی نے جھنجوڑ کر جگایا۔ یہ رضوان تھا۔ اس نے کہا۔ "شاہی بھائی! بڑا غضب ہو گیا۔ تین چار طوطے کسی طرح پنجرے سے نکل آئے ہیں۔ وہ ایک سرونٹ کوارٹر میں گھس گئے ہیں۔ ایک ملازمہ ڈر سے بے ہوش ہو گئی ہے۔ آپ جلدی آئیں۔"

میں رضوان کے ساتھ کوٹھی کے عقبی لان میں پہنچا تو زبردست خوف و ہراس نظر آیا۔ کوٹھی کے ملازم، گارڈز اور دیگر مکین دور دور کھڑے تھے اور خوف زدہ نظروں سے چھوٹے سے سرونٹ کوارٹر کی طرف دیکھ رہے تھے۔ دو تین گارڈز نے سرونٹ کوارٹر کی طرف رائفلیں بھی سونت رکھی تھیں۔ پہلوان جی پیش پیش نظر آئے۔ انہوں نے بہت سے پرانے کپڑے منگوا لیے تھے اور ان پر مٹی کا تیل چھڑک رہے تھے۔ وہ پتا نہیں، کیا کرنے والے تھے۔

ہیڈ ملازم نے دہشت زدہ لہجے میں مجھے بتایا۔ "کل ایک نیا ملازم آیا تھا، اسے پتا

نہیں چلا۔ اس نے پنجرے میں باجرہ ڈالنے کے لیے پنجرے کا دروازہ تھوڑا سا کھولا تو یہ طوطے باہر نکل آئے۔ میں نے دیکھ لیا اور جلدی سے دروازہ بند کیا۔ نہیں تو، پتا نہیں سارے ہی نکل آتے۔''

''اب کہاں ہیں طوطے؟'' میں نے پوچھا۔

ہیڈ ملازم بولا۔ ''کوارٹر کے اگلے کمرے میں گھس گئے ہیں۔ ہم نے دروازہ باہر سے بند کر دیا ہے۔ یہ کل تین طوطے ہیں۔''

''کسی کو زخمی تو نہیں کیا انہوں نے؟''

''نہیں، لیکن خوف سے مالی بشیر کی بیوی بے ہوش ہو گئی ہے۔ مالی نے خود کو کوارٹر کے پچھلے کمرے میں بند کر رکھا ہے۔''

میں پہلوان حشمت کے پاس پہنچا۔ وہ مجھے لال آنکھوں سے دیکھ کر بولے۔ ''تم سے کہا تھا ناں کہ مار ڈلوان کو...... یہ کوئی نہ کوئی طوفان لے آویں گے۔''

''او ہو کون سا طوفان آ گیا ہے پہلوان جی، انہوں نے کسی کو زخمی تو نہیں کیا۔''

''وہ تو ہماری ہوشیاری کام آئی کہ ان کو بند کر دیا۔ ورنہ پتا ناہیں کیا کر گزرتے۔ اب اس کا ایک ہی حل سمجھ میں آوت ہے۔ ان پرانے کپڑوں کو آگ دکھا کر کسی طرح کمرے کے اندر پھینک دیتے ہیں۔ بند کمرے میں دھواں بھرے گا تو یہ مر جاویں گے۔''

میں نے کہا۔ ''پہلوان چاچا! سنا تھا کہ خوف کی وجہ سے سیانے بیانے بندے بھی بدحواس ہو جاتے ہیں۔ آپ بھی یہی کر رہے ہیں۔ کمروں میں دھواں بھریں گے تو مالی بھی اندر ہی ہے۔ وہ بھی بے ہوش یا فوت ہو جائے گا۔ کوارٹر میں آگ بھی لگ سکتی ہے اور میرا خیال یہ ہے کہ یہ پرندے اب اتنے خطرناک نہیں رہے جتنا ہم سمجھ رہے ہیں۔''

''تم زیادہ دلیر بنتے ہو اسی لیے نقصان اٹھاوت ہو۔ ہم ان کو مارنے میں جتنی دیر کریں گے، اتنا ہی پچھتاویں گے۔''

ایک دو ملازم بھی پہلوان کے حق میں بولنے لگے۔ سب کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

تب وارث لودھی آگے بڑھا اور بولا۔ ''شاہ زیب صاحب! ویسے ہمیں کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہیے۔ یہ رہائشی آبادی ہے۔ اگر یہ خونی طوطے یہاں سے نکل کر کسی دوسری کوٹھی میں گھس گئے تو خطرناک ہوگا۔ یہ کسی بچے پر بھی حملہ کر سکتے ہیں۔ آپ کو پتا ہی ہے یہ سیدھا شہ رگ کی طرف یا آنکھوں کی طرف آتے ہیں۔''

''مجھے یقین ہے لودھی! ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ میں نے کل بھی تمہیں بتایا تھا۔ اب یہ نارمل ہوتے جارہے ہیں۔ مجھے نہیں لگتا کہ یہ کوئی خطرہ کھڑا کریں گے۔''

''اگر آپ کہتے ہیں تو بھاؤ جی سے مشورہ کر لیتے ہیں فون پر۔'' وارث لودھی نے رائے دی۔

''نہیں، کوئی ضرورت نہیں۔ میں ساری ذمے داری لیتا ہوں۔ تم لوگ چاہو تو کمروں میں چلے جاؤ۔''

میرا دل گواہی دیتا تھا کہ پچھلے چھ سات روز میں پرندے بڑی حد تک ہاناوانی اور اکبر کے ٹرانس سے نکل چکے ہیں۔ احتیاطاً میں نے ایک چادر منڈاسے کی طرح چہرے اور گردن سے لپیٹ لی اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔ دروازہ میں نے دوبارہ بند کر دیا تھا۔

تینوں خوش رنگ طوطے ایک جستی ٹرنک کے اوپر موجود تھے۔ ٹرنک پر کھانے کی ایک ٹرے رکھی تھی۔ اس میں ڈبل روٹی کے بچے کھچے ٹکڑے تھے، وہ ان پر چونچیں چلا رہے تھے۔ میری آمد نے انہیں مشتعل نہیں کیا۔ یہ ایک اچھی علامت تھی۔ چند لمحے ان کا جائزہ لینے کے بعد میں نے وہ چادر اتار دی جس سے منہ سر لپیٹا ہوا تھا۔ اس چادر کو ہاتھوں پر پھیلا کر میں بڑی احتیاط سے طوطوں کے قریب گیا اور پھر سرعت سے چادر ان پر پھینک دی۔ دو طوطے میری گرفت میں آگئے۔ تیسرا اُڑ کر چھت کے پنکھے پر جا بیٹھا...... تاہم اس کے انداز میں بھی جارحیت نظر نہیں آئی۔ میں چادر میں لپٹے دونوں طوطوں کو لے کر باہر آگیا۔ وہ عام انداز میں پھڑ پھڑا تو رہے تھے مگر انہوں نے کسی بھی طرح کاٹنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ قریباً نارمل ہو چکے تھے۔ میں نے ایک طوطے کا سر چادر میں سے باہر نکالا۔ اس کے سر کو اپنی انگلی سے ہولے ہولے سہلایا۔ اس کی ننھی منی آنکھوں میں زندگی کی چمک اور معصومیت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

تھوڑی سی دیر میں رضوان نے ایک ملازم کے ساتھ مل کر تیسرا طوطا بھی پکڑ لیا اور تینوں کو دوبارہ پنجرے میں ڈال دیا۔ کوٹھی میں خوف کی فضا ایک دم تحلیل ہوگئی تھی۔ صرف پہلوان حشمت تھے جو کہیں نظر نہیں آرہے تھے۔ انہوں نے خود کو شاید کسی کمرے میں بند کیا ہوا تھا۔

کامن روم میں آکر رضوان نے امید بھرے لہجے میں کہا۔ ''شاید فخر بھائی بھی اسی طرح نارمل ہو جائیں۔''

''شاید...... کی بات نہیں رضوان...... وہ ضرور نارمل ہوگا...... بلکہ ہو رہا ہے۔''

O......❖......O

اگلے آٹھ دس روز کوشش جاری رہی مگر ہاناوانی اور اس کے مفرور ساتھیوں کا کوئی کھوج نہیں مل سکا۔ بارڈر ایریا میں واقع مینشن کے اندر پیش آنے والے واقعے کو زیادہ تشہیر نہیں مل سکی تھی۔ بس یہی کہا گیا تھا کہ دو مسلح گروہوں کے تصادم میں کچھ غیر ملکی بھی مارے گئے ہیں اور خیال ہے کہ ایک گروہ کا تعلق جاما جی کی بدنام عاملہ ہاناوانی سے تھا۔ نیوز میں ان پنجروں کا ذکر کیا بھی گیا تھا جو پرندوں کے لیے استعمال ہوئے تھے اور ان پنجروں کا تعلق خونخوار طوطوں سے جوڑا گیا تھا۔ داؤد بھاؤ کے ساتھیوں نے عمارت میں اپنی موجودگی کا ہر ثبوت بڑی ہوشیاری سے مٹا دیا تھا۔

جو ڈیڑھ درجن پرندے ہمارے ساتھ یہاں پہنچے تھے، وہ اب بالکل نارمل ہو چکے تھے۔ سریلی آوازوں میں چہکارنے والے وہی خوشنما طوطے جن کو دیکھ کر دل میں شادمانی پیدا ہوتی ہے۔ فخر بھی تیزی سے رُوبصحت تھا۔ ڈاکٹروں کے مشورے کے مطابق اسے زیادہ تر سکون آور دواؤں کے اثر میں رکھا جا رہا تھا۔ اب وہ ہمیں تھوڑا بہت پہچاننا شروع ہو گیا تھا۔ کسی وقت وہ دکھ کے عالم میں اچانک بلند آواز سے رونے لگتا تھا اور بے معنی الفاظ ادا کرتا تھا۔

سجاول کی طرف سے اب مجھے زیادہ فکر نہیں تھی۔ داؤد بھاؤ کی کوشش سے خوبرو اور چوکس خورسنہ اپنے بچے سمیت اس محفوظ پناہ گاہ میں پہنچ چکی تھی۔ وہ بڑی مستعدی سے خاوند کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ ان تینوں کے لیے کوٹھی کی بالائی منزل کا ایک پورشن مختص کر دیا گیا تھا۔ ان آٹھ دس روز میں ایک کے سوا کوئی اہم واقعہ نہیں ہوا تھا۔ تاہم اس واقعے نے ہمیں ہلا کر رکھ دیا۔ خاص طور سے پہلوان جی کا خوف ایک بار پھر عروج پر پہنچ گیا۔ ایک رات بارہ بجے کے لگ بھگ کوٹھی کے بیسمنٹ میں سے فائرنگ کی آواز آئی۔ اوپر تلے سات آٹھ فائر کیے گئے۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں ہاناوانی کے پانچ گرفتار شدہ ساتھیوں کو رکھا گیا تھا۔ میں اور وارث لودھی لپکتے ہوئے بیسمنٹ میں پہنچے۔ اندر کے منظر نے ہمیں ششدر کر دیا۔ ایک بڑے کمرے میں گرے فورس کے ان پانچوں افراد کی خونچکاں لاشیں پڑی تھیں۔ پانچوں کے سر میں گولیاں لگی تھیں۔ موقعہ واردات کو دیکھنے کے فوراً بعد ہی اندازہ ہو گیا کہ ان میں سے ایک لیفٹیننٹ نے پہلے اپنے چاروں ساتھیوں کو شوٹ کیا پھر پسٹل اپنی کنپٹی پر رکھ کر گولی چلا دی۔ میں اور رضوان ان پانچوں افراد سے گاہے بگاہے پوچھ گچھ کر رہے تھے۔ موقع محل کے لحاظ سے ان پر جسمانی تشدد بھی کیا گیا تھا۔ تاہم ابھی تک وہ پانچوں ہمیں

ہانا وانی کے حوالے سے کوئی اہم بات نہیں بتا سکے تھے۔ اب غالباً ان کو یہی لگا تھا کہ وہ زیادہ کم بختی کا شکار ہونے والے ہیں۔ لہٰذا آفیسر نے پہلے اپنے سوئے ہوئے ساتھیوں کے سر میں گولیاں ماریں پھر خود کو شوٹ کر لیا۔ اس سارے واقعے میں تحیر خیز سوال یہ تھا کہ اس کمرے میں بھرا ہوا پستول کہاں سے آ گیا؟ ایک اندازہ یہ تھا کہ شاید اس بیسمنٹ میں ہی کہیں غلطی سے یہ پستول رہ گیا تھا...... یا پہلے سے پڑا ہوا تھا۔ بہر حال پہلوان حشمت اور اس طرح کے دو تین دیگر افراد اس واقعے کو بھی پُراسرار رنگ دینے کی کوشش کرتے رہے۔ مرنے والوں کی لاشوں کو بھاؤ کے کارندوں نے ہی کہیں ٹھکانے لگا دیا تھا اور اب یہ باب بند ہو گیا تھا۔

میں قریباً روزانہ ہی بالائی منزل پر جا کر سجاول سے ملاقات کر رہا تھا۔ اس روز بھی میں گیا تو خورسنہ کو سجاول کی خدمت میں مصروف پایا۔ سجاول بیڈ پر ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ خورسنہ نے اس کے سینے پر ایک تولیا پھیلایا ہوا تھا اور اپنے ہاتھوں سے اس کی شیو بنا رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ ذرا شرما گئی اور ہاتھ روک لیے۔

میں نے کہا۔ ''بھئی! شیو والا کام ایسا نہیں جو ادھورا چھوڑا جا سکے اب تو ویسے بھی تقریباً مکمل ہو گئی ہے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ خوش دلی سے بولی پھر اس نے نہ صرف شیو مکمل کی بلکہ ایک چھوٹی چمکدار قینچی سے سجاول کی گھنی مونچھوں کے ابتر بال بھی برابر کر دیئے۔

پھر مجھ سے اجازت لے کر وہ واش روم کی طرف چلی گئی جہاں ننھا ذیشان نہا رہا تھا اور اسے ماں کی مدد کی ضرورت تھی۔

میں نے سجاول کی بے نور آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''سجاول! خورسنہ کو تمہارے آس پاس دیکھ کر مجھے بہت تسلی ہوتی ہے۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے کہ اس کی شعاری اور خدمت گاری تمہاری زندگی کی ساری کمیاں خامیاں دور کر دے گی......''

''لیکن یار اس کی زندگی کی کمیاں خامیاں کون دور کرے گا۔ میرے لیے اس نے ملک چھوڑا، اپنے پیارے چھوڑے، بہت مصیبتیں جھیلی ہیں اس نے...... اور ابھی پتا نہیں اور کتنی جھیلنی ہیں۔''

''تم دل چھوٹا نہ کرو سجاول! تم دیکھنا سب ٹھیک ہو جائے گا۔ داؤد بھاؤ کوشش کر رہا ہے کہ کسی اچھے آئی سرجن سے رابطہ ہو۔ امید ہے کہ کوئی نہ کوئی راہ ضرور نکلے گی۔''

وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ''اچھا چھوڑو ان باتوں کو...... رضوان مجھے بتا رہا تھا

کہیں جارہے ہو، شاید سکھیرا گاؤں؟''

''ہاں، لیکن کل رات جاؤں گا۔ صبح تک واپس آجاؤں گا۔ دراصل مجھے سیف کی بہنوں کی بہت فکر ہے۔ شازیہ کے شوہر اکبر کو میں نے بری حالت میں دیکھا ہے۔ پتانہیں کیوں مجھے لگتا ہے کہ وہ زندہ مل بھی گیا تو دوبارہ نارمل نہیں ہو سکے گا۔''

کچھ دیر تک میں اور سجاول اس بارے میں بات کرتے رہے، دلکش وخوش قامت خورسنہ نے اپنی جرسی کی آستینیں اڑسی ہوئی تھیں اور کسی مشین کی سی برق رفتاری سے گھر کے کام کاج میں مصروف تھی۔ اس کی بنائی ہوئی خوش ذائقہ چائے پینے کے بعد میں واپس نیچے آ گیا۔

اگلی رات نو بجے کے لگ بھگ میں ایک بار پھر سکھیرا گاؤں میں موجود تھا۔ یہ دسمبر کی ایک ٹھٹھری ہوئی دھند آلود رات تھی۔ میں سیدھا اسی ڈیرے دار کے پاس پہنچا تھا جس کے دوستانہ رابطے داؤ د بھاؤ کے ساتھ تھے اور جس کے پاس قسطینا اور پہلوان حشمت نے کئی روز گزارے تھے۔ اس ڈیرے دار کا نام خوشحال خیلوی تھا۔ میں ایک سوزوکی کار پر یہاں پہنچا تھا۔ اپنے چہرے پر چھوٹی داڑھی اور مونچھوں کا اضافہ بھی میں نے کر لیا تھا۔ لباس بالکل مقامی طرز کا تھا، مجھے امید تھی کہ آسانی سے پہچانا نہیں جا سکوں گا۔ گرم چادر کی بکل مار کر میں سیف کے گھر کے دروازے پر پہنچ گیا۔ گھر کی کھڑکیوں اور روزنوں پر نئی جالیاں لگی ہوئی تھیں اور جالیوں والا یہ اہتمام کچھ اس گھر تک ہی خاص نہیں تھا، مجھے پورے گاؤں میں یہ حفاظتی انتظامات نظر آئے۔ میری دستک پر دروازہ کھولنے والی خود شازیہ ہی تھی۔ وہ پہلی نظر میں مجھے پہچان نہیں پائی لیکن جب میں بولا تو تھوڑی سی دقت کے ساتھ اس نے مجھے شناخت کر لیا۔ اس کے قبول صورت چہرے پر دکھ اور خوشی کی ملی جلی کیفیت نمودار ہوئی۔ ذرا ہچکچانے کے بعد اس نے ایک طرف ہٹ کر مجھے اندر آنے کا راستہ دیا۔ دونوں چھوٹی بہنیں بھی گریز اور چاہت کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ مجھے ملیں۔ ایک طرح کا خوف بھی ان کی آنکھوں میں جھلک دکھاتا تھا۔ اس خوف کے ڈانڈے چوہدری دین محمد کی موت سے جڑے ہوئے تھے (جسے یہاں قتل سمجھا گیا تھا)۔ بہرحال قسطینا اور پہلوان نے یہاں آنے کے بعد بڑی رازداری سے سیف کی بہنوں سے ایک ملاقات کی تھی اور میرے حوالے سے ان تینوں کے ذہن کافی حد تک صاف کیے تھے۔

ہم کمرے میں پہنچے۔ ساتھ والے بڑے کمرے میں ایک دری بچھی ہوئی تھی اور وہاں بتیوں کی مہک تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ کچھ دیر پہلے تک یہاں شاید قرآن خوانی وغیرہ

ہو رہی تھی۔ میں نے اس بارے میں شازیہ سے پوچھا تو اس نے بتایا۔ ''ان کے لیے دعا کرائی ہے۔ اللہ ان کو خیر خیریت سے گھر واپس لے کر آئے۔'' شازیہ کا اشارہ اپنے گمشدہ شوہر اکبر کی طرف تھا۔

میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ چھوٹی بہن بولی۔ ''بھائی جان! آپ کو کچھ پتا چلا جیجا جی کے بارے میں؟''

''ابھی تو نہیں، لیکن میرا دل کہتا ہے کہ وہ خیریت سے ہے اور جلد ہی گھر واپس آئے گا۔''

شازیہ کی آنکھوں میں نمی چمک گئی۔ گھر میں مسلسل ایک سوگ کی سی کیفیت تھی۔

میں نے شازیہ سے پوچھا۔ ''دین محمد صاحب کی موت کے حوالے سے عام لوگوں کی کیا رائے ہے؟''

وہ بولی۔ ''بس جی جتنے منہ آتی باتیں ہیں۔ شروع شروع میں سب کو آپ پر بہت زیادہ غصہ تھا۔ وہ پوری طرح آپ کو ذمے دار سمجھ رہے تھے۔ پھر مولوی جی والا واقعہ ہو گیا...... اور پرندوں والی بات کا پتا چلا۔ اس کے بعد لوگوں نے سوچنا شروع کر دیا کہ شاید...... آپ پر بھی اس جادو ٹونے کا اثر ہوا ہے اور اس اثر کی وجہ سے آپ نے چاچا دین محمد کو گولیاں ماری ہیں۔ میرے دماغ میں بھی تب یہی بات آ رہی تھی مگر پھر......''

''پھر کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''پھر آپ کا فون آ گیا تھا۔ آپ نے مجھے بتایا تھا کہ چاچا دین محمد کو آپ نے نہیں مارا۔ آپ کی باتوں سے پتا چل رہا تھا کہ آپ پورے ہوش حواس میں ہیں، اور آپ پر کسی طرح کا کوئی اثر بھی نہیں لگتا تھا۔''

''تم نے یہ بات تاجور کو بھی بتائی؟''

شازیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''وہ اتنی دکھی ہیں کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتی، وہ آپ پر اندھا یقین رکھتی ہیں۔ وہ یہ بات مان ہی نہیں سکتیں کہ آپ نے ان کے والد کو مارا۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر ایسا ہوا بھی ہے تو پھر آپ پر اسی کالے علم والی عورت کا اثر ہو گا۔ رو رو کر انہوں نے اپنا حال بہت برا کر رکھا ہے......''

''شازیہ! کیا تم کسی طرح اس کو یہ حقیقت بتا سکتی ہو کہ یہ سب کیسے ہوا ہے؟ میرا مطلب ہے کہ جب بھی اس سے تمہاری ملاقات ہو تم اس کو یہ بتاؤ کہ دین محمد صاحب کی جان کس طرح گئی ہے۔''

"جب مجھے خود ٹھیک سے معلوم نہیں تو ان کو کیسے بتاؤں گی؟ پہلوان جی نے صرف اتنا بتایا ہے ہمیں کہ چاچا دین محمد کی موت کی وجہ ان کی بیماری تھی۔"

میں نے کچھ دیر توقف کرنے کے بعد کہا۔ "شازیہ! تمہیں پتا ہے کہ اخباروں میں کیا بات چھپی ہے۔ ڈاکٹروں نے دین محمد صاحب کی پوسٹ مارٹم رپورٹ دی ہے۔"

چھوٹی بہن بولی۔ "ہاں...... میں نے سنا تھا۔ ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ شاید چاچا دین محمد کو دل کا دورہ بھی پڑا تھا۔"

"یہ بہت اہم بات ہے شازیہ، اور ایک زبردست اتفاق بھی ہے...... ابھی اس بات کا پتا بہت کم لوگوں کو ہے، دراصل......"

میرا فقرہ ادھورا رہ گیا کیونکہ بیرونی دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ شازیہ اٹھ کر باہر گئی۔ کسی عورت کے اندر آنے کا پتا چلا۔ چند سیکنڈ بعد شازیہ اکیلی ہی کمرے میں داخل ہوئی اور مجھ سے مخاطب ہو کر سرگوشی کے لہجے میں بولی۔ "فردوس آئی ہے۔ کیا آپ اس سے ملنا چاہیں گے؟"

فردوس کا نام سن کر میں چونکا، یہ تاجور کی وہی ہمراز ملازمہ تھی جو اب سسرال میں بھی اس کے ساتھ ہی گئی تھی۔ آج کل وہ اسلام آباد میں وارج کی رہائش گاہ پر تاجور کے ساتھ ہی مقیم تھی۔

چند لمحے سوچنے کے بعد میں نے شازیہ سے کہا کہ وہ فردوس کو اندر لے آئے۔ شازیہ گئی اور تھوڑی دیر میں فردوس کو لے آئی۔ فردوس بھی دکھ حیرت اور خوف کی ملی جلی کیفیت میں تھی۔ وہ اب ایک امیر کبیر گھرانے کی ملازمہ تھی۔ اس کے جسم پر قیمتی لباس تھا اور صحت پہلے سے بہت اچھی نظر آتی تھی۔ اس نے ڈرے ڈرے انداز میں ماتھے پر ہاتھ لے جا کر مجھے سلام کیا۔

وہ میری داڑھی مونچھ پر حیران تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ کچھ لوگوں کی نظروں سے بچنے کے لیے حلیہ ذرا بدل رکھا ہے۔

وہ روہانسی آواز میں گویا ہوئی۔ "سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو وقاص کہہ کر بلاؤں یا پھر آپ کو شاہ زیب صاحب سمجھوں۔"

"میں شاہ زیب ہی ہوں فردوس، تم بتاؤ، تم کیسی ہو؟"

"مم...... میں ٹھیک ہوں جی...... پر آپ؟" اس نے پھر خوف زدہ نظروں سے شازیہ کی طرف دیکھا۔ جیسے میرے بارے میں کچھ جاننا چاہتی ہو۔

میں نے اس کی کیفیت بھانپتے ہوئے کہا۔ ”میں بھی بالکل ٹھیک ہوں فردوس، اپنے پورے ہوش و حواس میں تم سے بات کر رہا ہوں۔ میرے سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں......تم بتاؤ......تمہاری مالکن کیسی ہے؟“

وہ کچھ دیر چپ رہی پھر اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ ”وہ بہت مصیبت میں ہے صاحب جی۔ مجھے تو لگتا ہے کہ کسی دن اس کو کچھ ہو جائے گا۔ وہ بندہ ضرور اس کی جان لے کر رہے گا۔ وہ ایک بلا کی طرح اس سے چمٹ گیا ہے۔“

”لیکن فردوس......اس کی ذمے دار بھی تو وہ خود ہی ہے۔ ایک وقت تھا جب وہ اس سے چھٹکارا پا سکتی تھی مگر اس نے نہ پایا، جان بوجھ کر خود کو مصیبت میں رکھا، اور اب تو مجھے لگتا ہے کہ وہ خود بھی تکلیف میں رہنا چاہتی ہے۔ کیونکہ اسے اس کی عادت ہوگئی ہے۔“

”صاحب جی، کسی وقت تو لگتا ہے کہ وہ انسان نہیں جانور ہے۔ بات بے بات اس کو ذلیل کرتا ہے۔ لوگوں کے سامنے اسے عزت سے بلاتا ہے مگر اصل میں نوکرانیوں سے بھی برا سلوک کرتا ہے۔ ہم آئے دن اس کے منہ اور ہاتھوں پر چوٹوں کے نشان دیکھتے ہیں۔ یہ خیال بھی نہیں کرتا کہ وہ کس ’حالت‘ میں ہے اور یہ بھی نہیں سوچتا کہ ابھی اس کے دل میں باپ کی موت کا غم بالکل تازہ ہے۔“

”دارج کی اپنی حالت کیسی ہے؟“

”اسی طرح مردار کی طرح پڑا رہتا ہے۔ کچھ دنوں کے لیے حالت کچھ چنگی ہوگئی تھی لیکن پھر پہلے کی طرح ہو گیا۔ اپنی والدہ کی موت کے بعد کچھ اور بھی چڑچڑا اور غصے والا ہو گیا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ بیماری نہیں، اللہ کی لاٹھی پڑی ہے اس پر۔ بستر پر ہو کر بھی سب کی جان عذاب میں رکھتا ہے، اگر ٹھیک ہوتا تو کیا کیا قیامتیں اٹھاتا۔“

میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ”تم یہاں کیسے آئی ہو فردوس؟“

”بڑی مشکلوں سے دو دن کی چھٹی ملی ہے جی۔ بچوں کو ساتھ رکھنے کی اجازت دے دی ہے ان لوگوں نے......بچوں کو ہی لینے آئی ہوں۔ پرسوں واپس چلی جاؤں گی۔ آج شازیہ نے بلایا ہوا تھا قرآن خوانی پر۔ آ نہیں سکی اس لیے معافی مانگنے آئی تھی اس سے۔ شاید آپ سے بھی ملاقات ہونی تھی اس لیے چلی آئی۔“

میں نے کہا۔ ”فردوس! دین محمد صاحب کی موت کے بارے میں کیا خیال ہے تاجور کا؟“

فردوس کے فربہ جسم میں لرزش سی نمودار ہوئی اور اس کی سرمہ لگی آنکھوں میں پھر خوف

انڈ آیا۔ گہری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میں اس بارے میں کیا کہوں جی۔ وہ آپ کے بارے میں کچھ برا سوچ ہی نہیں سکتی۔ وہ وہی سمجھتی ہے جو دوسرے بہت سے لوگ سمجھتے ہیں۔ وہ اسی کالے علم والی زنانی کی بات کرتی ہے...... وہ کہتی ہے کہ ہمارے آلے دوالے جو کچھ بھی ہورہا ہے اسی بدذات عورت کی وجہ سے ہورہا ہے۔ وہ آپ کو قصوروار نہیں سمجھتی۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اگر ساری دنیا بھی آپ کے خلاف ہو جائے تو وہ آپ کو بے گناہ ہی کہے گی۔''

''میں اس سلسلے میں بے گناہ ہی ہوں فردوس۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''جج...... جی۔'' وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولی۔

میں نے بات جاری رکھی۔ ''ابھی تمہارے آنے سے ذرا پہلے میں شازیہ کو اسی بارے میں بتا رہا تھا...... چوہدری دین صاحب کی موت کے بعد اسپتال میں ان کا پوسٹ مارٹم ہوا تھا۔ اس کی ایک رپورٹ چھپی ہے۔ تم نے اس بارے میں کچھ سنا ہے؟''

فردوس نے اپنا سر نفی میں ہلایا۔

میں نے کہا۔ ''فردوس! وہ رپورٹ بتاتی ہے کہ دین محمد صاحب کو گولیاں بعد میں لگیں، اس سے کچھ دیر پہلے انہیں ہارٹ اٹیک ہو چکا تھا۔''

''ہاں...... ہاں۔ اتنی سی بات تو میں نے بھی سنی تھی۔'' فردوس نے ہنکارا بھرا۔

''یہ بات بالکل درست ہے فردوس۔ دین محمد صاحب کی موت دل کے دورے سے ہوئی ہے۔''

فردوس، شازیہ اور دونوں چھوٹی بہنیں حیرت سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔

میں نے ان چاروں کو مخاطب کرتے ہوئے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ ''میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، اس کا ایک ایک لفظ سچ ہے اور میں جھوٹ کیوں بولوں؟ جو لوگ جھوٹی سچی باتیں بنا رہے ہیں، مجھے ان کا کوئی ڈر نہیں۔ جس وقت میں دین صاحب کے گھر میں داخل ہوا اور ان کے کمرے میں پہنچا، وہ دم توڑ چکے تھے۔ شاید انہیں گزرے ہوئے بیس تیس منٹ ہوئے ہوں گے۔ ان کی سانس ختم ہو چکی تھی۔ دل بالکل رک چکا تھا۔ جسم ابھی پوری طرح ٹھنڈا نہیں ہوا تھا...... مگر وہ ایک لاش تھے۔''

چاروں بڑے تعجب سے میرا چہرہ تک رہی تھیں۔

میں نے کہا۔ ''اب ہر کسی کی طرح تمہارے ذہن میں بھی یہ سوال ابھر رہا ہوگا کہ میں

یوں چوری چھپے دین صاحب کے گھر میں کیوں گھسا اور ان پر گولیاں کیوں چلائیں؟ اس کا جو جواب میں تمہیں دوں گا، اس کا ایک ایک لفظ بھی سچ ہے۔ یہ میری مجبوری تھی کہ میں دین صاحب پر گولیاں چلاؤں۔''

''مجبوری......؟'' شازیہ خشک لبوں پر زبان پھیر کر ہکلائی۔

جواب میں، میں نے ٹھہر ٹھہر کر آسان لفظوں میں سب کچھ فردوس اور تینوں بہنوں کے گوش گزار کر دیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ کس طرح وہ بدذات عورت ہمیں ایک دوسرے سے مروانے کے لیے ایک بڑی قسم کھائے بیٹھی ہے۔ کسی طرح اس نے مجھے اپنے اثر میں لے کر یہاں بھیجا اور کس طرح میں اس کے اثر میں آئے بغیر یہاں سکھیرا گاؤں پہنچا۔ میں نے ان چاروں کو بتایا کہ میں اس عورت کی نظروں میں سچا ہونے کے لیے دین محمد صاحب کو کہیں غائب کر دینے کا ارادہ رکھتا تھا مگر جب میں نے انہیں پہلے سے مردہ حالت میں پایا تو پھر دل کڑا کر کے وہ کیا جو وہ بدذات عاملہ مجھ سے چاہتی تھی۔ میں نے ان کے مردہ جسم پر گولیا چلائیں اور وہاں سے نکل گیا۔

یہ سب کچھ ان چاروں نے بے حد تعجب اور حیرت کے عالم میں سنا۔ آخر میں، میں نے فردوس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم چاہو تو رازداری کے ساتھ تاجور کو یہ سب کچھ بتا سکتی ہو مگر ابھی کسی اور سے یہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔''

پھر میں نے شازیہ اور اس کی بہنوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''تم تینوں بھی ابھی یہ بات اپنے تک ہی رکھو تو بہتر ہے۔ اگر تم کسی سے یہ ذکر کرو گی تو پھر تم سے پوچھا جائے گا کہ یہ سب کچھ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟ اور میں نہیں چاہتا کہ میری یہاں آمد کا کسی کو پتا چلے تم میری بات سمجھ رہی ہو ناں؟''

تینوں نے ایک ساتھ اثبات میں سر ہلایا۔ ان لمحوں میں وہ تینوں ڈری سہمی کم سن بچیوں کی طرح لگ رہی تھیں۔ شازیہ کی آنکھوں میں اکبر کا جاں گسل انتظار کروٹیں لیتا تھا۔ میں نے ان تینوں کے سروں پر ہاتھ پھیرے اور ان سے تسلی تشفی کی باتیں کیں۔ بہرحال اکبر کی حالت کا میں نے کوئی ذکر نہیں کیا۔

میں نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا کہ غیر ملک سے آنے والی وہ خطرناک عاملہ بہت بری طرح زخمی ہو کر موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ وہ بچ بھی گئی تو ابھی کافی دنوں تک ہمیں کوئی پریشانی دینے کے قابل نہیں ہوگی...... لیکن ''احتیاط'' اپنی جگہ لازم ہے۔

فردوس کے جانے کے بعد میں نے گھر کے اخراجات کے لیے ایک معقول رقم شازیہ

کے حوالے کی...... گھر کی ایک دیوار پر خوبرو پنجابی گبرو سیف کی ایک تصویر آویزاں تھی۔ میں نے اس پر ایک محبت بھری نظر ڈالی اور جیسے خاموشی سے آیا تھا، ویسے ہی واپس چلا آیا۔

O......❖......O

میں لاہور واپس آچکا تھا۔ میرے ذہن میں کھلبلی سی تھی۔ ملازمہ فرزانہ نے تاجور کی بے کسی کا جو نقشہ میرے سامنے کھینچا تھا اس نے مجھے بے کل کر دیا تھا۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو رہا تھا کہ تاجور کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے شاید اس میں، میں بھی قصوروار ہوں۔ میں پاکستان میں تھا اور تاجور کے اردگرد موجود تھا۔ کلر کہار کے علاقے میں کھوہ کے اندر جو واقعہ پیش آیا تھا، وہ بھی مجھے اچھی طرح یاد تھا۔ لڑائی کے دوران میں جب ایک شیطان زادے نے مجھ پر عقب سے حملہ کیا تو تاجور چیل کی طرح اس پر جھپٹی تھی اور اس پر کاری وار کیا تھا۔ اس واقعے کے بعد میں نے دارج کی نگاہوں میں تاجور کے لیے مزید غیظ وغضب دیکھا تھا...... ایسی ہی باتوں کے بارے میں سوچتے سوچتے پتا نہیں کیوں میرا دل چاہا کہ ایک بار دارج سے رابطہ کروں اور اسے بتاؤں کہ میں بہت جلد پاکستان چھوڑ کر جانے والا ہوں۔ میرے اور تاجور کے درمیان اب کچھ باقی نہیں ہے...... ہوسکتا ہے کہ آئندہ وہ دونوں کبھی میری شکل نہ دیکھیں۔

میں نے ایک دفعہ پہلے بھی مندر کے تہ خانوں میں دارج کے ساتھ بڑی نرمی سے بات کی تھی اور اس کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا تھا۔ کچھ سوچ بچار کے بعد میں نے دارج کا پرسنل نمبر ملایا...... دو کالز کا تو کوئی جواب نہیں آیا لیکن پھر رابطہ ہو گیا۔ دارج کی جھلائی ہوئی بیزار آواز سنائی دی۔ ''کون؟''

''میں شاہ زیب بات کر رہا ہوں، سوری کہ تمہیں ڈسٹرب کیا۔''

چند لمحے خاموشی رہی پھر دارج کی غیر متوقع طور پر نرم آواز سنائی دی۔ ''ہاں، کیسے ہو تم؟''

''میں ٹھیک ہوں، تمہاری طبیعت کیسی ہے؟''

''وہی سب کچھ چل رہا ہے...... ویسے میں خود تم سے رابطہ کرنے والا تھا، اچھا ہوا کہ تم نے فون کر لیا۔''

میں نے اس کایا پلٹ پر حیران ہوتے ہوئے کہا۔ ''خیریت ہے؟''

''خیریت ہی ہے...... میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ ایک اہم بات کرنی ہے۔ یہ ملاقات کیسے ہوسکتی ہے؟ کیا تم...... یہاں اسلام آباد میری رہائش گاہ پر آسکتے ہو؟''

میں نے چند لمحے توقف کر کے کہا۔ ''اگر یہ بہت ضروری ہے تو میں آجاتا ہوں لیکن......تم جانتے ہو کہ ڈی ایس پی قیصر اور وریام کی موت کے بعد تمہارے برادر شکیل صاحب بہت طیش میں ہیں۔ پولیس مجھے ہر جگہ ڈھونڈ رہی ہے۔''

''اس سلسلے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں، اگر تم چاہو تو میری اپنی گاڑی تمہیں لاہور سے یہاں لاسکتی ہے۔''

میں نے اس پر رضامندی ظاہر کی۔ کچھ مزید گفتگو ہوئی اور یہ ملاقات طے ہوگئی۔

مجھے دارج سے اس طرح کے رویے کی توقع نہیں تھی۔ یہ کوئی سازش بھی ہوسکتی تھی۔ بہر حال میں رسک لینے کے لیے تیار تھا۔ جانے سے پہلے داؤد بھاؤ سے مشورہ کرنا بھی ضروری تھا۔

یہ اگلے روز سہ پہر تین بجے کی بات ہے میں ایک گاڑی میں سوار دارج داراب کی عظیم الشان رہائش گاہ میں داخل ہو رہا تھا۔ یہ ٹنٹڈ شیشوں والی جیگوار گاڑی دارج داراب کی ذاتی گاڑیوں میں شامل تھی۔ طویل ڈرائیو وے سے گزر کر باوردی ڈرائیور نے گاڑی پورچ میں کھڑی کی۔ یہاں دارج کا اسپیشل ذاتی گارڈ طویل قامت آدم بھی موجود تھا۔ (یہ شخص مندر میں میری دی ہوئی چوٹوں کے سبب سخت زخمی ہوا تھا مگر اب کافی حد تک تندرست نظر آرہا تھا۔ تاہم اس کی آنکھوں میں لشکارے مارنے والا کینہ چھپائے نہیں چھپا تھا) بظاہر احترام سے میری جامہ تلاشی لی گئی اور پھر میں آدم کی معیت میں ایک قالین پوش راہداری میں پہنچ گیا۔ یہاں آدم بھی رک گیا اور ایک خوش شکل ملازمہ نے میری رہنمائی کر کے مجھے ایک سجی سجائی وسیع نشست گاہ میں پہنچا دیا۔ عمارت کا یہ حصہ یقیناً داراب فیملی کے ذاتی استعمال میں تھا۔

مجھے قریباً پندرہ بیس منٹ تک دارج کا انتظار کرنا پڑا......آخر تاجور نظر آئی۔ وہ دارج کی وہیل چیئر کو دھکیلتی ہوئی اندر لا رہی تھی۔ بالکل گم صم تھی۔ پہلے سے کافی کمزور ہو چکی تھی۔ رنگ سرسوں کی طرح زرد۔ جیسے کسی مصور نے ایک خوب صورت تصویر بالکل پھیکے رنگوں میں بنا ڈالی ہو۔ اس نے اپنا جسم ایک طویل چادر میں ڈھانپ رکھا تھا۔

''السلام علیکم۔'' میں نے کھڑے ہو کر کہا (اگر دارج اکیلا ہوتا تو شاید میں کھڑے ہونے کی زحمت نہ کرتا)

''وعلیکم سلام...... بیٹھو، تشریف رکھو۔'' دارج نے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بھاری بھر کم لہجے میں کہا۔

تاجور نے کرسی کو مقررہ جگہ پر روک دیا۔ پھر وہ جھکی، اس نے ایک گرم شال دارج کے گھٹنوں پر پھیلا کر اس کے پاؤں کے نیچے سے گزار دی تاکہ اس کا زیریں جسم ڈھکا رہے، وہ جیسے خاموشی سے آئی تھی ویسے ہی واپس چلی گئی۔ اس نے میری طرف دیکھا تک نہیں تھا۔

تاجور کو یوں وہیل چیئر دھکیلتے دیکھ کر مجھے فردوس کی بات یاد آگئی۔ پرسوں اپنی گفتگو میں اس نے بتایا تھا کہ گھر میں درجنوں ملازم ہونے کے باوجود دارج، تاجور سے سخت کام لیتا ہے۔ وہ نہ صرف رات دن اس کی دیکھ بھال کرتی ہے بلکہ اس کا کھانا بھی خود پکاتی ہے دیگر کاموں کی طرح دارج کے لیے بار بار چائے بنانا، اپنے اور دارج کے کپڑے پریس کرنا، اور اپنے بیڈروم کی صفائی ستھرائی بھی اس کی ذمے داریوں میں شامل ہے۔ اب تاجور کو دارج کی وہیل چیئر دھکیلتے دیکھ کر مجھے اس صورتِ حال کا ثبوت مل گیا تھا۔

جلد ہی نشست گاہ کی تنہائی میں دارج اصل موضوع پر آگیا...... وہ بولا۔ ''جو کچھ ہمارے درمیان ہوا، اچھا نہیں ہوا...... لیکن میں چاہتا ہوں کہ پچھلی باتوں کو ذہن سے نکال کر ہم ایک نئے معاملے پر بات کریں۔''

''میں سن رہا ہوں، دارج صاحب۔''

وہ چند لمحوں کے لیے گہری سوچ میں چلا گیا پھر بھاری لہجے میں بولا۔ ''وہاں کلر کہار میں جس طرح والدہ کی جان لی گئی، میں کبھی بھول نہیں سکتا۔ میں ان قاتلوں کو معاف نہیں کر سکتا، مرتے دم تک نہیں کرسکتا۔''

''ان کی موت واقعی بے حد دکھی کرنے والی تھی۔ میں ان شیطان زادوں کی فطرت کو بڑی اچھی طرح جانتا تھا...... اسی لیے میں نے بار بار میڈم کو ان کی طرف جانے سے منع کیا۔ تمہیں بھی کہا کہ میڈم کو ان کی طرف نہیں جانا چاہیے...... بہرحال اب ان باتوں سے کچھ حاصل نہیں۔''

''ہاں، میں بھی چاہتا ہوں کہ یہ ذکر بار بار نہ کیا جائے، میں اب آگے دیکھنا چاہ رہا ہوں۔ والدہ کے جانے کے بعد ایک دن بھی ایسا نہیں جو میں نے چین سے گزارا ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ والدہ کا اصل قاتل وہی جان ڈیرک ہے جس کے نیچے وہ شیطان زادے درندگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''وہ انسان نہیں تھے، وہ قاتل مشینیں تھیں۔ انہیں چلانے والا یقیناً جان ڈیرک ہی تھا۔ ان شیطان زادوں کے خون میں دوڑنے والی ساری سفاکی اسی جان ڈیرک

کی بخشی ہوئی تھی۔''

''کیا تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ شیطان زادے اب ختم ہو چکے ہیں؟''

''ہاں میرا خیال یہی ہے۔ کم از کم پاکستان میں تو ان میں سے کوئی موجود نہیں۔ ہاں ہوسکتا ہے کہ باہر ایسے کوئی دو چار نمونے باقی بچ رہے ہوں۔''

نہایت خوش پوش ملازمہ چائے اور لوازمات کی ٹرالی دھکیلتی ہوئی اندر لے آئی۔ اس نے سفید دستانے پہن رکھے تھے۔ چائے بنا کر وہ واپس چلی گئی تو دارج نے کپ سے چسکی لیتے ہوئے کہا۔ ''میرے لوگوں نے اس سلسلے میں کچھ ہوم ورک کیا ہے، مجھے پتا چلا ہے کہ جان ڈیرک یورپ واپس پہنچ چکا ہے۔''

''یورپ میں کہاں؟'' میں نے پوچھا۔

''میرے اندازے کے مطابق اٹلی میں۔ یقیناً تمہیں پتا ہی ہوگا کہ ٹیکساری گینگ میں پچھلے دنوں زبردست پھوٹ پڑ گئی تھی۔ وہ دو حصوں میں بٹ گیا تھا...... دونوں گروپس نے مار مار کر ایک دوسرے کا بھرکس نکال دیا ہے۔ اب جان ڈیرک گینگ کے بچے کھچے لوگوں کے ساتھ اٹلی کے شہر روم میں موجود ہے۔''

دارج کو کیا پتا تھا کہ ''ناقابل تسخیر ٹیکساری گینگ'' میں یہ پھوٹ کیوں اور کیسے پڑی ہے۔ چند سیکنڈ میں وہ سارے واقعات نگاہوں کے سامنے گھوم گئے اور ان واقعات میں وائٹس کا اہم کردار بھی ذہن میں تازہ ہو گیا۔

میں نے دارج سے پوچھا۔ ''کیا جان ڈیرک کو روم میں دیکھا گیا ہے؟''

''نہیں، اسے تو نہیں لیکن اس کے ایک بڑے خاص آدمی کو دیکھا گیا ہے۔ عام طور پر وہ جہاں ہوتا ہے، ڈیرک بھی وہیں ہوتا ہے۔ اس کا نام تو کچھ اور ہے لیکن اسے پرنس سومو کہا جاتا ہے۔ کافی موٹا شخص ہے اور میری معلومات کے مطابق وہ آج کل اپنے اسی خطرناک موٹاپے سے پیچھا چھڑانے کے لیے روم کے ایک انٹرنیشنل اسپتال میں داخل ہے۔ بہت مہنگا اسپتال ہے۔ امیر کبیر اور بڑے بڑے رئیس ہی اس ہیلتھ سینٹر کے اخراجات کو برداشت کر سکتے ہیں۔''

''تمہارے لوگوں نے پرنس سومو کو ٹریس کرنے کی کوشش نہیں کی؟''

''اگر وہ اسپتال سے باہر ہوتا تو اس کی نگرانی کر کے کوئی نتیجہ نکالا جا سکتا تھا مگر وہ اسپتال کی چار دیواری میں ہے اور اس کے تین چار ذاتی گارڈز ہر وقت اسپتال کے اندر بھی اس کے اردگرد موجود رہتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''فرض محال ہم کسی طرح اس پرنس کو چھاپ بھی لیتے ہیں تو کیا گارنٹی ہے کہ وہ ہمیں جان ڈیرک تک پہنچا دے گا...... یا جان ڈیرک کی موجودہ لوکیشن اس کے علم میں ہوگی؟''

''میری معلومات کے مطابق پرنس سوموکا سراغ ملنا کوئی معمولی کامیابی نہیں ہے۔ مجھے پچانوے فیصد یقین ہے کہ وہ باسٹرڈ جان ڈیرک اس وقت روم میں ہی ہے۔''

چند لمحے توقف کر کے میں نے گہری سانس لی۔ ''تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

دارج نے کہا۔ ''میں جانتا ہوں شاہی! تم یہ کام کر سکتے ہو۔ اس سلسلے میں تمہیں جس طرح کا تعاون چاہیے، میں تمہیں دینے کو تیار ہوں۔'' اس نے اپنی واسکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک چھوٹا لفافہ میری طرف بڑھایا۔ ''اس میں ایک بلینک چیک ہے جو بھی بھرنا چاہو بھر لو۔''

''اور اس کے بدلے میں؟''

''مجھے جان ڈیرک کا سر چاہیے......'' وہ ٹھہرے لہجے میں بولا۔

میں نے کہا۔ ''دارج! تم جانتے ہو، تمہارا کزن شکیل داراب اپنے چہیتوں قیصر اور وریام کی موت کے بعد میرے خون کا پیاسا ہو رہا ہے۔ میرے لیے پاکستان سے باہر تو کیا، گھر سے نکلنا بھی مشکل ہے۔ اگر میں تمہاری ذاتی گاڑی میں یہاں نہ پہنچتا تو شاید راستے میں ہی دھر لیا جاتا۔ پولیس اور تمہارے کزن کے گماشتے مجھے ہر جگہ ڈھونڈ رہے ہیں۔''

''تمہیں پاکستان سے باہر نکالنے کی ذمے داری میری ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارے پاس وقاص کے نام سے شناختی اور سفری کاغذات موجود ہیں۔ وہ استعمال ہو سکتے ہیں۔''

چند لمحے توقف کر کے میں نے پوچھا۔ ''تمہارے کزن کو یہ سب کچھ ہضم ہو جائے گا؟''

''میری اور تمہاری اس ڈیل کی خبر اور کسی کو نہیں ہوگی۔'' وہ ٹھہرے لہجے میں ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔

میں نے کہا۔ ''میں اس بارے میں فوری طور پر کوئی جواب نہیں دے سکتا...... اپنے ساتھیوں سے مشورہ کر کے کل رات تک تمہیں آگاہ کر دوں گا۔''

وہ رضامند ہو گیا۔ میں اس کو چیک واپس کرنا چاہ رہا تھا مگر اس نے کہا کہ نہیں، میں چیک ابھی پاس ہی رکھوں۔

○......❖......○

درحقیقت جان ڈیرک کا سراپا میری نگاہوں میں بھی گھومتا رہتا تھا۔ میں اسے اس کے منطقی انجام تک پہنچانا چاہتا تھا۔ ہاناوانی کی یورش کی وجہ سے عارضی طور پر ڈیرک پس منظر میں ضرور چلا گیا تھا، مگر فراموش ہرگز نہیں ہوا تھا۔ پھر میرے ذہن میں ایک اور خدشہ بھی موجود تھا۔ بے شک شیطان زادوں کی فصل تباہ ہوگئی تھی مگر اس کا بیج تو ابھی موجود تھا۔ ایولی کے زہریلے جرثومے سے مزید ''ہلاکت خیز پودوں'' کی نشوونما کی جاسکتی تھی۔ اس ساری ہلاکت آفرینی کو جڑ سے ختم کیا جانا ضروری تھا۔

میں ذہنی طور پر اٹلی جانے کے لیے تیار ہوگیا۔ دارج کا یہ کہنا بالکل درست تھا کہ جان ڈیرک کے ایک نہایت قریبی ساتھی کا کھوج لگا کر اس نے ایک اہم کامیابی حاصل کی ہے۔ اب اس سے آگے بڑھنا اس کے بس کی بات نہیں تھی اور وہ مجھ سے تمام تر نفرت کے باوجود میری مدد کا طالب ہوا تھا۔

تیسرے روز ایک بار پھر فون پر میرا اور دارج کا رابطہ ہوا۔ میں نے جان ڈیرک کے پیچھے اٹلی جانے پر اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔ اس سلسلے میں داؤد بھاؤ اور سجاول سے مشورہ میں پہلے ہی کر چکا تھا۔

ایسے موقعوں پر انیق میرا ہمدم و ہم قدم ہوتا تھا لیکن وہ ہمیشہ کے لیے الوداع کہہ چکا تھا...... فخر موجود تھا۔ وہ بتدریج بہتر ہو رہا تھا مگر اس کی حالت ہرگز ایسی نہیں تھی کہ اسے ساتھ لے جانے کا سوچا جا سکتا۔ آجا کے رضوان ٹی رہ جاتا تھا۔ اس کے گہرے گھاؤ ابھی پوری طرح مندمل نہیں تھے۔ پہلوان حشمت کو میرے جانے کی خبر ہوئی تو وہ بضد ہوگئے کہ میرے ساتھ جائیں گے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ میری بہترین دیکھ بھال کر سکتے ہیں اور انہوں نے ایک دو کہاوتیں بھی سنائیں جن کا مفہوم یہ تھا کہ نوجوان اور جوشیلے لوگوں کے ساتھ ایک آدھ پختہ کار و دھیمے شخص کا ہونا اشد ضروری ہوتا ہے...... اس سے بہت سے خطرات ٹل جاتے ہیں۔

پہلوان جی کو ساتھ لے جانا بے معنی تھا۔ ان کے اصرار کے باوجود میں نے انہیں ٹال دیا اور ان سے درخواست کی کہ وہ سکھیرا چلے جائیں اور وہاں سیف کے اہلِ خانہ کا خیال رکھیں۔ تاہم اگلے روز میرے ذہن میں ایک اور بات آئی۔ میں نے تھوڑا سا سوچا اور مجھے لگا کہ پہلوان جی کو ساتھ لے جانا ایک لحاظ سے فائدہ مند ثابت ہوسکتا ہے۔ میں نے اس بارے میں داؤد بھاؤ سے بھی مشورہ کیا۔ میرے ذہن میں جو بات آئی تھی، اس کی تائید داؤد

بھاؤ نے بھی کی۔ میں نے اس حوالے سے پہلوان حشمت کو آگاہ کیا۔ ان کا چوڑا چکلا چہرہ اندرونی جوش سے سرخ ہو گیا۔ ہم سفر کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ جان ڈیرک اس وقت مکمل تباہی کے دہانے پر کھڑا تھا۔ اسے سنبھلنے کا وقت دینا، کسی طور مناسب نہیں تھا۔ مجھے کچھ ضروری چیزیں درکار تھیں جو مجھے داؤد بھاؤ کے ذریعے مہیا ہو گئیں۔ بھاؤ کے ایک قابلِ اعتماد ایکسپرٹ کے ذریعے میں نے اپنے چہرے پر معمولی نوعیت کی کاسمیٹک تبدیلیاں بھی کروالیں۔ ان میں بالوں میں رنگ اور ان کی تراش خراش شامل تھی۔

تیسرے روز کی بات ہے۔ ہم ساڑھے بارہ گھنٹے کا طویل فضائی سفر طے کر کے اٹلی کے دارالحکومت روم میں لینڈ کر چکے تھے۔ پہلوان حشمت کی زندگی کا یہ پہلا فضائی سفر تھا اور پاکستان سے باہر بھی وہ پہلی بار تشریف لائے تھے۔ وہ بہت خوش اور جذباتی نظر آتے تھے۔ یہ شام کا وقت تھا۔ تاریخی شہر روم کی روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ ٹھٹھری ہوئی فضا میں جگہ جگہ اَن گنت آثارِ قدیمہ دعوتِ نظارہ دیتے محسوس ہوتے تھے۔ دن کا روم اوجھل ہو رہا تھا اور رات کا روم انگڑائی لے کر بیدار ہو رہا تھا۔

دارج داراب کی کسی کمپنی کا مقامی منیجر یہاں ہمارے قیام و طعام اور دیگر ضروریات کا ذمے دار تھا۔ اس جواں سال شخص کا نام جمشید ملک تھا۔ اس کا تعلق پاکستان سے ہی تھا۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی چمک ہلکورے لیتی تھی اور اندازہ ہوتا تھا کہ بظاہر شریف نظر آنے والا یہ شخص دارج داراب کے حکم پر ہر جائز و ناجائز کام کر سکتا ہے۔

جمشید ملک کے شاندار لاج میں پہنچنے کے بعد اور کھانا وغیرہ کھانے کے بعد ہم نے کچھ دیر تک آرام کیا، پھر آئندہ کا لائحہ عمل تیار کرنے میں مصروف ہو گئے۔ ''رائل میڈیکل ویٹ لاس سینٹر'' کے اندر داخل ہو کر پرنس سوموسے ملنا ہی سب سے اہم مسئلہ تھا۔ رائل سینٹر میں چونکہ یورپ بلکہ پوری دنیا کی اہم شخصیات زیر علاج ہوتی تھیں لہٰذا یہاں نگرانی اور سیکیورٹی کے بھی خاص الخاص انتظامات تھے۔ میں نے پاکستان سے روانگی کے وقت یہ بات تو پہلوان جی کو بتا دی تھی کہ انہیں چند دن کے لیے ایک امیر شخص کی حیثیت سے ایک اسپتال میں داخل ہونا پڑے گا، مگر دیگر تفصیلات انہیں معلوم نہیں تھیں۔ میں نے پہلوان جی کو ''بریفنگ'' دیتے ہوئے کہا۔ ''آپ کا نام تو حشمت ہی رہے گا مگر اس کے ساتھ ہم میاں لگا دیں گے، یعنی میاں حشمت راہی۔ آپ سیالکوٹ کے علاقے میں قریباً 30 مربع زمین کے مالک ہیں۔ اس کے علاوہ دو چار زرعی فارم اور باغ آپ کی ملکیت ہیں۔''

پہلوان نے کہا۔ ''یار! مجھ سے اتنا جھوٹ بلواؤ جتنا مجھے ہضم ہو سکے۔ یہ 30 مربعے

بہت زیادہ ہیں۔ ان میں سے کچھ کم ناہیں ہو سکتے۔ کہاں راجا بھوج کہاں گنگو تیلی۔‘‘

’’آپ کو کوئی جھوٹ شوٹ نہیں بولنا پڑے گا اور نہ آپ کی بات یہاں کسی کی سمجھ میں آئے گی۔ میں آپ کا پی اے یعنی پرسنل سیکریٹری ہوں۔ آپ کی طرف سے جو کچھ بھی بولنا ہے، مجھے بولنا ہے لیکن آپ کے ذہن میں یہ باتیں موجود ضرور ہونی چاہئیں۔ آپ کی دو بیویاں پہلے سے موجود ہیں، اب آپ تیسری کے موڈ میں ہیں۔ اس کے علاوہ آپ......‘‘

’’یار بس کرو۔‘‘ پہلوان نے میرے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ’’کیوں میری عاقبت خراب کرنے کے چکر میں ہو۔ ایک تو سنبھالی ناہیں جارہی اور تم تین تین میرے سر پر بٹھا رہے ہو اگر اس بات کا پتا چل گیا تو جو ایک ہے وہ بھی ناہیں رہے گی۔ وہ پہلے ہی مجھ سے روٹھ کر میکے بیٹھی ہوئی ہے۔ پورا سال ہونے کو آیا ہے اب تو......‘‘ پہلوان جی کے چہرے پر دکھ کے سائے لہرا گئے۔ پھر وہ چونک کر بولے۔ ’’ویسے اسپتال میں علاج کیا ہوگا میرا؟ کوئی طاقت شاقت کی دوائیں کھلائیں گے؟‘‘

’’طاقت شاقت کی نہیں...... کمزوری شمزوری کی۔ دیکھیں آپ کا وزن کس قدر بڑھا ہوا ہے۔ پیٹ تو جیسے علیحدہ سے رکھا ہوا ہے آپ کا۔ اگر ایک دو ہفتے آپ وہاں رہ سکے تو کچھ اسمارٹ ہو جائیں گے۔‘‘

پہلوان جی کا رنگ زرد پڑ گیا اور مجھے احساس ہوا کہ میں نے یہ آخری جملہ بول کر غلطی کی ہے۔ خلاف توقع وہ وزن کم ہونے کے خیال سے خوف زدہ ہو گئے۔ وہ بولے۔

’’یہ تم کیا کہوت ہو شاہ زیب! تمہارا دماغ گھاس چرنے تو ناہیں چلا گیا۔ یہی وزن تو ایک پہلوان کی شان ہووت ہے۔ میں اس میں سے ایک رتی کم کرنے کی اجازت ناہیں دے سکتا۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام۔ ہم سے رقم بھی بٹور لیویں گے اور ہمارا وزن بھی کم کر دیویں گے۔ نہ بابا نا۔ اس طرح ایک میان کے اندر دو بھینسیں بانسری ناہیں بجا سکتیں۔‘‘

اپنی غلطی درست کرتے ہوئے میں نے پہلوان جی کو سمجھانے بجھانے کی کوشش کی اور جزوی طور پر کامیاب ہوا۔ میں نے ان سے کہا۔ ’’آپ گھبرائیں نہیں، ویسے تو وہ لوگ فوری طور پر میڈیسنز وغیرہ نہیں دیں گے...... اور اگر دیں گے بھی تو کون سا ہمیں اپنے سامنے کھلائیں گے۔ آپ اس سلسلے میں بالکل بے فکر رہیں......‘‘

میں نے اس سلسلے میں انہیں بمشکل مطمئن کیا۔ ہم دونوں کے لیے ڈریسز اور دیگر لوازمات جمشید ملک نے پہلے ہی تیار کر رکھے تھے۔ پورے سیٹ اپ کے ساتھ ہم تیسرے

روز ایک شاندار مرسیڈیز کار میں رائل میڈیکل سینٹر پہنچ گئے۔

شہر کے مہنگے ترین اور ہائی سیکیورٹی کے علاقے میں یہ ایک چہار منزلہ عمارت تھی۔ اس کے آگے اور پیچھے وسیع ''اوپن ایریاز'' تھے۔ جاگنگ ٹریکس، کشتی رانی کے لیے مصنوعی جھیل، گولف کورس، اسپورٹس کمپلیکس اور اس طرح کی کئی جدید سہولیات یہاں موجود تھیں۔ ہمیں جگہ جگہ موٹے اور نیم موٹے مرد و زن دکھائی دیئے۔ پہلوان حشمت کھڑکھڑاتی ہوئی سفید شلوار قمیص، قیمتی کوٹ اور کلے دار پگڑی میں ملبوس تھے۔ واقعی...... وہ جب تک اپنی زبان نہ کھولتے اور ''غلط محاورے'' وغیرہ نہ بولتے وہ ایک وڈیرا ٹائپ چیز ہی نظر آتے تھے۔

جمشید ملک کے پاس جان ڈیرک کے قریبی ساتھی پرنس سوموکی دو تین تصویریں موجود تھیں جو وہ ہمیں دکھا چکا تھا۔ ہم اس رائل میڈیکل سینٹر میں اسے بہ آسانی پہچان سکتے تھے مگر پہچانتے تو تب جب وہ نظر آتا۔ یہاں ایڈمیشن کے بعد ہمیں دو لگژری کمروں پر مشتمل ایک سوئٹ مہیا کر دیا گیا۔ میں پی اے اور اٹینڈنٹ کی حیثیت سے پہلوان جی کے ساتھ مقیم تھا۔ موٹاپے اور عمومی صحت کے حوالے سے پہلوان جی کے ابتدائی ٹیسٹ ہوئے جنہوں نے انہیں کافی خوف زدہ کیا۔ اس دوران میں، میں مسلسل مسٹر سوموکی ٹوہ میں رہا...... دو تین روز میں، میں صرف یہ جان سکا کہ وہ یہاں کے خاص نگہداشت کے یونٹ میں مقیم ہے کیونکہ اس کے جسم کے اندر سے چربی کو سک کیے جانے کا عمل ہونے والا ہے۔ اس کی قیام گاہ کی حیثیت وی وی آئی پی تھی۔ تین گارڈز بھی اس کے ساتھ ہمہ وقت موجود ہوتے تھے۔

یہ چوتھے روز کی بات ہے۔ میں پہلوان جی کو جاگنگ ٹریک پر چہل قدمی کرانے کی کوشش کر رہا تھا اور پہلوان جی مجھے بار بار یاددہانی کرا رہے تھے کہ وہ اپنے جسم میں ایک رتی وزن کی کمی بھی گوارا نہیں کریں گے، دفعتاً میری نگاہ ایک نہایت بھاری بھرکم، قدآور شخص پر پڑی۔ میں نے تصویر دیکھی ہوئی تھی اس لیے فوراً پہچان گیا۔ یہ پرنس سوموہی تھا۔ اس کا چربی دار جسم اتنا پھیلا ہوا تھا کہ حیرت ہوتی تھی۔ میڈیکل سینٹر کے دو تین ملازمین اسے دونوں طرف سے سہارا دے کر چلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک باوردی لڑکی بھی اس کام میں تعاون کر رہی تھی۔ دو مسلح گارڈز پندرہ بیس قدم پیچھے آ رہے تھے۔ ان کا تعلق یقیناً ٹیکساری گینگ کے اس اہم شخص سے ہی تھا۔ مجھے اور تو کچھ نہیں سوجھا، میں دس پندرہ قدم تیزی سے اٹھا کر چربی اور گوشت کے اس سومو نامی ڈھیر کے پاس پہنچا۔ عقب میں

آتے ہوئے گارڈز الرٹ ہو گئے۔ سینٹر کے باوردی ملازمین نے بھی مجھے کڑی نظروں سے گھورا۔

''فاصلہ رکھو...... کون ہو آپ؟'' ایک گارڈ نے کڑے لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔

میں نے کہا۔ ''ویری ساری، میں محترم کو دیکھ کر خود کو ان سے دور نہ رکھ سکا۔''

دو گارڈز میرے سامنے دیوار بن کر کھڑے ہو گئے، ان کے تیور اچھے نہیں تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے یا کرتے گوشت کا پہاڑ خود مجھ سے مخاطب ہو گیا۔ ''آنے دو، کیا چاہتا ہے یہ؟''

میں نے دو قدم آگے آ کر کہا۔ ''ایک بار پھر معافی چاہتا ہوں سر۔'' پھر میں نے کچھ فاصلے پر موجود پہلوان حشمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ پاکستان کے ایک بڑے لینڈ لارڈ میاں حشمت راہی ہیں۔ میں ان کا پی اے ہوں...... اور ان کے ساتھ یہاں مقیم ہوں۔ ویری ساری سر...... میرے ایک بہت قریبی انکل ہیں، آپ کی صورت ان سے اتنی زیادہ ملتی ہے کہ میں ششدر رہ گیا ہوں، مجھے یقین ہے کہ جب آپ اپنا کچھ ویٹ لاس کر لیں گے تو ان سے اور زیادہ مشابہ ہو جائیں گے۔''

وہ دیوہیکل گینگسٹر کچھ اچھے موڈ میں تھا لہٰذا مسکرا کر بولا۔ ''یہ کوئی اچھی علامت نہیں ہے۔ اگر تمہارا انکل مجھ سے مزید مشابہ ہو گیا تو پھر وہ کسی بھی وقت کسی بھی جگہ شوٹ ہو سکتا ہے۔ مجھے تمہارے انکل سے ہمدردی محسوس ہونے لگی ہے۔'' پھر گینگسٹر کی نگاہ پہلوان حشمت پر پڑی اور وہ بولا۔ ''یہ تمہارا لینڈ لارڈ بہت مصیبت میں نظر آتا ہے اس کو اتنی دھ کیوں لگوا رہے ہو۔ یہ موٹا تو ہے مگر بہت زیادہ بھی نہیں۔ اتنی چربی تو اس اسپتال کا بھاری بھرکم ''بل'' آنے سے ہی ڈھل جائے گی۔''

میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''دراصل میرے صاحب کچھ وزن اور کھونا چاہتے ہیں۔ ان کی شادی ہے۔''

''پہلی یا دوسری؟'' گینگسٹر نے شرارتی انداز میں پوچھا۔

''تیسری جناب! دراصل صاحب کو فار ایسٹ کے خدوخال والی لڑکیاں پسند ہیں۔ ان کی پہلی دو بیویاں جاپانی ہیں، اب یہ تیسری چینی ہے۔ پر مجھے لگتا ہے جی کہ اس تیسری شادی کے بعد یہ پھر پہلے کی طرح فربہ ہو جائیں گے۔ یہ تیسری بیوی نہ صرف چینی ہے بلکہ سنا ہے کہ بہت اچھے چائینز کھانے بھی پکاتی ہے۔ کُکنگ کے بہت سے مقابلوں میں حصہ لے چکی ہے۔''

گینگسٹر پرنس سوموا پنے گنجے سر پر ہاتھ پھیر کر ہنسا اور شیطانی انداز میں بولا۔ ''پھر تو تمہارے اس باس کی اور میری دلچسپیاں ملتی جلتی ہیں۔ میں بھی چند سال پہلے تک ان جاپانی لڑکیوں کا بڑا گرویدہ رہا ہوں۔ ان کی فٹ نس دیکھ کر دل خوش ہو جاتا ہے، اٹھارہ برس کی ہو یا اڑتالیس کی زبردست فٹ نس ہوتی ہے۔''

اس نے دھیان سے پہلوان حشمت کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''اپنے باس کو بلاؤ کچھ بات ہی کریں ان سے۔''

میں نے کہا۔ ''یہ زمیندار ہیں۔ انگلش وغیرہ نہیں جانتے۔ لیکن میں گفتگو میں آپ کی مدد کرسکتا ہوں۔'' یہ جاپانی، چینی عورتوں والا شوشا میں نے یوں ہی نہیں چھوڑا تھا۔ میری معلومات کے مطابق ماضی قریب میں یہ شخص اس طرح کے مشغلے میں بہت مصروف رہا تھا۔

میں پہلوان حشمت کو گینگسٹر سومو کے پاس لے آیا۔ دونوں ایک بڑی چھتری تلے دو آرام دہ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ تیسری میں نے سنبھال لی۔ ہمارے درمیان گفتگو کچھ اس طرح ہوئی۔ میں نے اردو میں پہلوان سے کہا۔ ''میں نے گوشت کے اس پہاڑ کو یہ بتایا ہے کہ تم جاپانی چینی عورتوں میں بڑی دلچسپی رکھتے ہو اور تمہاری تیسری شادی ایک بڑی ماہر چینی کک سے ہورہی ہے۔''

''مجھے لگتا ہے کہ تم نے ضرور مجھے کہیں بری طرح پھنسا دینا ہے۔ یہ شکلوں سے ہی بڑے خطرناک لوگ نظر آوت ہیں۔''

میں نے پہلوان کے پنجابی فقرے کا ترجمہ کرتے ہوئے پرنس سوموکو بتایا۔ ''میاں حشمت کہتے ہیں کہ جاپان بہت جدید ملک ہے، وہاں کی خوراک وہاں کی سہولتیں اور آب و ہوا، وہاں کے لوگوں کی تندرستی اور صحت پر بہت اچھا اثر ڈالتی ہیں۔''

سومو کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں پھر شیطانی چمک ابھری بولا۔ ''اپنے باس سے پوچھو، جاپانی سسرال کو چھوڑ کر چینی سسرال کی طرف کیوں آ گئے ہو؟''

میں نے اس فقرے کا ترجمہ پہلوان کے سامنے یوں کیا۔ ''پہلوان جی! ایسے منہ بنا کر نہ بیٹھیں، تھوڑا سا مسکرائیں۔ یہ ڈراما کامیاب ہوگا تو آگے بڑھ سکیں گے......''

پہلوان جی نے فرمایا۔ ''تم مجھ پر گندے گندے الزام لگا رہے ہو اور ساتھ ہی مسکرانے کا بھی کہوت ہو۔ میں کوئی اداکار نا ہیں ہوں کہ ہر طرح کی ایڈوانس مینٹ دے لوں۔''

''شاید آپ، ہر طرح کی پرفارمنس کہنا چاہتے ہیں؟'' میں نے کہا۔

''چلو یہی سہی، مگر مجھ سے اتنا ہی کام لو جتنا میں کر سکتا ہوں۔'' پہلوان جی نے مسکرانے کی کوشش کی جو کسی حد تک کامیاب رہی۔

میں نے کہا۔ ''میاں حشمت کہتے ہیں کہ گلدستے میں ایک کے بجائے زیادہ قسم کے پھول ہوں تو وہ مزید اچھا لگتا ہے...... ویسے بھی ہم میٹھے لوگ ہیں۔ چینی کے استعمال کے بغیر ہمارا گزارا نہیں۔''

پرنس سومو بلند آواز میں ہنسا۔ ''تمہارا باس دلچسپ آدمی ہے۔ چلو اس کے ساتھ اس سینٹر کی اسپیشل گرین ٹی پیتے ہیں۔''

کچھ ہی دیر بعد میں، پہلوان حشمت اور پرنس سومو ایک وی آئی پی اپارٹمنٹ میں موجود تھے۔ یہ پرنس سومو کی قیام گاہ کا ڈرائنگ روم کہلا سکتا تھا۔ یہاں ایک دیوار پر روزمرہ خوراک کے بڑے بڑے چارٹ آویزاں تھے اور ورزش کی دو جدید ترین مشینیں پڑی تھیں۔ مجھے اتنی جلدی کامیابی کی توقع نہیں تھی۔ جاپانی خواتین والی مشترکہ دلچسپی کے سبب ہم یہاں اس بڑے گینگسٹر کی مہمان نوازی کا تجربہ کر رہے تھے۔ پہلوان اور پرنس سومو کی گفتگو جاری تھی اور میرے نہایت غلط لیکن حسب حال ترجمے کی وجہ سے پرنس سومو کو مزا آ رہا تھا۔ پہلوان جی نے بس اتنی مہربانی کی تھی کہ میری گزارش کے بعد اپنے چہرے پر بارہ بجا کر نہیں رکھے تھے۔ اس گفتگو کے دوران میں ہی پرنس سومو کے نہایت قیمتی سیل فون پر ایک کال آ گئی۔ وہ اپنے فون کی طرف متوجہ ہوا اور انہی لمحوں میں مجھے وہ موقع مل گیا جس کا میں دیر سے منتظر تھا۔ میں نے لاہور سے روانہ ہوتے وقت داؤد بھاؤ سے اپنے لیے ''ضروریات'' کی جو چیزیں منگوائی تھیں۔ ان میں میرا پرانا ''دوست'' امریکن کمپنی کا ''پن ہول کیمرا'' بھی تھا۔ یہ نہایت مختصر کیمرا میری جیکٹ کی سائڈ پاکٹ سے میری مٹھی میں منتقل ہو چکا تھا۔ میں نے غیر محسوس طور پر اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور اسے ساگوان کی منقش ٹیبل کے ایک پائے کے ساتھ اندر کی طرف چپکا دیا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر یہاں سی سی ٹی وی کیمرا موجود بھی ہے تو وہ میری اس حرکت کو نہیں دیکھا پایا ہوگا۔

ایک زبردست امید بندھ گئی تھی۔ یہ عین ممکن تھا کہ ہمارا کیمرا اپنی جگہ پر محفوظ رہتا اور ہم سومو کے ذریعے سے کچھ اہم معلومات حاصل کر سکتے۔ بہر حال یہ کام تھا بہت خطرناک۔ ٹیکساری گینگ ہوشیار ترین لوگوں کے گروہ کا نام تھا۔ یہ لوگ خطرے کی بو سونگھنے میں ماہر سمجھے جاتے تھے۔

اپنے سوئٹ میں واپس آ کر میں نے اپنے سیل فون پر اپلیکیشن لگا کر اسے ا

ریسیور کی شکل دی اور مطمئن ہو گیا۔ کیمرا کام کر رہا تھا۔ وہ میز کے نیچے تھا تاہم اس کا زاویہ ایسا تھا کہ میز کی بلوری ٹاپ کے اندر سے کمرے کا کچھ حصہ نظر آتا تھا۔ آڈیو کے سگنل بھی واضح تھے۔

مجھے اور پہلوان حشمت کو اس کیمرے سے بہت سی امیدیں تھیں مگر اگلے تین چار روز تک ہم بار بار چیک کرنے کے باوجود کوئی خاص آڈیو یا ویڈیو حاصل نہیں کر سکے۔ پرنس سومو زیادہ تر ساتھ والے کمرے میں ہوتا تھا۔ اس کے اور گارڈز کے درمیان کسی وقت جو گفتگو ہوتی تھی، اس سے پتا چلتا تھا کہ ٹیکساری گینگ کا حشر حقیقی معنوں میں خراب ہو چکا ہے۔ واٹس وائے گروپ کی حالت بھی ناگفتہ تھی۔ اس کے بیشتر اہم ارکان ہلاک ہو چکے تھے یا آہنی سلاخوں کے پیچھے پہنچ گئے تھے۔ واٹس کی نوعمر بیٹی آج کل شاید روس میں کہیں پائی جاتی تھی۔ واٹس بھی دو تین ماہ سے لاپتا تھا اور یہ خیال بھی ظاہر کیا جا رہا تھا کہ وہ مارا گیا ہے۔

پانچویں چھٹے روز میرے ''دوست کیمرے'' نے ایک اہم ویڈیو مجھ تک پہنچائی۔ پرنس سومو اسی کیمرے والے کمرے میں تھا۔ اس کی لوکیشن ایسی تھی کہ وہ ایک ہموار بیڈ پر الٹا لیٹا صاف نظر آ رہا تھا۔ گوشت اور چربی کا ایک ڈھیر سا تھا جو بیڈ پر دھرا تھا۔ دو جواں سال جاپانی عورتیں نظر آئیں تاہم دھیان سے دیکھنے پر پتا چلا کہ وہ ہیجڑے ہیں۔ وہ پرنس سومو کے مساج میں مصروف تھے۔ پرنس سومو بار بار ایک زوردار جماہی لیتا تھا اور اس کا منہ کسی مگرمچھ کے جبڑوں کی طرح پھیلا ہوا دکھائی دینے لگتا تھا۔ اسی دوران میں اس کے سیل فون پر کال کا میوزک ابھرا۔

دونوں مالشیئے منظر سے اوجھل ہو گئے۔ یقیناً یہ کوئی اہم کال تھی اور سومو نے ان دونوں کو باہر نکال دیا تھا۔ میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔ کال اہم ہی لگتی تھی۔

سومو نے دوسری طرف سے کہی جانے والی بات سنی پھر بولا۔ ''زیادہ زخمی کتنے ہوئے ہیں؟'' دوسری طرف سے جواب دیا گیا۔ پرنس سومو بولا۔ ''نرسری میں اس طرح کا واقعہ ہونا معمولی بات نہیں۔ چار پانچ تو سمجھو بے کار ہو گئے ناں۔ لعنت ہے تم سب پر۔ باس ڈیرک اس پر معاف نہیں کرے گا۔''

دوسری طرف سے کچھ کہا جانے لگا جسے پرنس سومو نے طیش کے عالم میں سنا۔ پھر اس نے اپنے بھاری جسم کو کئی ہلکورے دیئے اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

چند لمحے بعد وہ پُرسوچ لہجے میں بولا۔ ''ان کو تو برن یونٹ میں ہونا چاہیے لیکن چلو

میں کوشش کرتا ہوں، یہ عام ڈاکٹرز کے بس کا کام نہیں۔ میں اورنج والی ''او ڈی'' بھیج دیتا ہوں۔ تم فوراً TWELL والوں کے پاس چلے جاؤ۔ ان کے پاس ایک بہت اچھا ڈاکٹر ہے۔ وہ تمہارے ساتھ ہی چلا جائے گا۔ یہ TWELL ادھر ہی ہے جونی کے نئے گھر کے پاس۔''

دوسری طرف سے کچھ کہا گیا۔ ''تم ذمے دار ہو تمہیں جواب دینا پڑے گا۔'' سومو نے غصے کے عالم میں فون بند کر کے ایک طرف صوفے پر پھینک دیا اور اپنی جہازی سائز کی شرٹ پہننے کی ناکام کوشش کرتا ہوا کیمرے کے فریم سے نکل گیا۔

پہلوان حشمت نے سوالیہ انداز میں منہ کھول رکھا تھا اور میری طرف دیکھ رہے تھے۔ انہیں اس گفتگو کے بس دو چار لفظ ہی سمجھ میں آپائے ہوں گے۔ اپنے مخصوص انداز میں بولے۔ ''ڈاکٹر اور نرسری کی بات ہورہی تھی۔ کیا یہاں جانوروں کی طرح پودوں کا ڈاکٹر بھی ہووت ہے؟''

میں نے کہا۔ ''جناب! نرسری صرف پودوں کی ہی تو نہیں ہوتی۔ جہاں بچے ہوتے ہیں اس کو بھی تو نرسری کہا جاتا ہے۔ اور یہ معاملہ مجھے بہت زیادہ سیریس لگ رہا ہے۔ نرسری اور بچوں کا جو ذکر ہوا ہے، یہ میرے ایک بڑے سنگین شک کو بڑھاوا دے رہا ہے۔''

''کچھ مجھے بھی بتاؤ گے یا پھر سسپنس ہی بڑھاتے رہو گے۔''

میں نے چند لمحے توقف کے بعد کہا۔ ''میں آپ کو سب کچھ بتاؤں گا لیکن پہلے مجھے خود کسی نتیجے پر پہنچ لینے دیں۔''

''کوئی اشارہ ہی دو۔ وہ کہیا ہوت ہیں کہ...... باقی سب کچھ اضافی ہوتا ہے...... عقل مند کے لیے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔''

''پہلوان جی، ٹیکساری گینگ تقریباً ختم ہوگیا ہے مگر اس کی جڑیں ختم نہیں ہوئیں اور آپ کو پتا ہی ہے بے شمار زہریلے پودے ایسے ہوتے ہیں جن کی جڑیں ختم نہ ہوں تو وہ پھر پھوٹ پڑتے ہیں۔''

کبھی کبھی پہلوان جی کا ذہن بڑی تیزی سے کام کرتا تھا۔ وہ بات کی تہ تک پہنچ گئے اور بولے۔ ''تم ٹھیک کہوت ہو۔ جڑیں ختم ناہیں ہوئیں اور ہیڈ مالی بھی ابھی زندہ ہے۔ یعنی وہی سوّر کا تخم جان ڈیکر۔''

''جان ڈیکر نہیں، جان ڈیرک۔'' میں نے تصحیح کی۔

میرے ذہن میں کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ میرا اندازہ غلط بھی ہوسکتا تھا مگر پرنس نے

نرسری اور بچوں کا ذکر کیا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ ہر بچہ ان کے لیے بے حد قیمتی ہے۔ پرنس جیسا شخص کوئی تعلیمی ادارہ کھولنے سے تو رہا۔ یقیناً یہ کوئی اور بات تھی۔ سومو کے الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے۔ اس نے کہا تھا۔''ان کو تو کسی ''برن یونٹ'' میں ہونا چاہیے تھا لیکن چلو میں کوشش کرتا ہوں۔''

کیا کوئی حادثہ ہوا تھا جس میں کچھ لوگ یا کچھ بچے جل گئے تھے اور انہیں فوری طبی امداد کی ضرورت تھی اور اگر یہ بچے تھے تو پھر کون تھے؟ کہیں وہ انہی شیطان زادوں کی کوئی اگلی کڑی تو نہیں تھی؟ گوشت پوست کی وہی قاتل مشینیں جنہوں نے ایک عرصے سے ٹیکساری گینگ کے مخالفین پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا...... نہایت خطرناک ''انٹرنیشنل بدمعاش ایول'' کے اسپرم سے جنم لینے والے وہی انسان نما جانور جن کی سفاکی کی مثال ملنا مشکل تھی۔

میرے لیے اطمینان کی بات یہ تھی کہ پن ہول کیمرا اپنی جگہ موجود تھا اور ٹھیک کام کر رہا تھا۔ تاہم کیمرا وہ کارکردگی نہیں دکھا پا رہا تھا جو اسے دکھانا چاہیے تھی۔ پرنس سومو کا زیادہ تر وقت اس اپارٹمنٹ کے دوسرے کمروں میں گزر رہا تھا۔ چند دنوں تک اس کے پہاڑ جیسے جسم کے اندر سے ''لیپوسیکشن'' کے ذریعے فالتو چربی بھی نکالی جانے والی تھی۔

میں نے سوچا کہ اگر کیمرا کوئی خاطر خواہ کارکردگی نہ دکھا سکا تو پھر گھی نکالنے کے لیے انگلیاں ٹیڑھی کرلی جائیں۔ یعنی براہِ راست پرنس سومو کو چھاپ لیا جائے اور اس کے تربوز جیسے کھوپڑے پر پستول رکھ کر اس سے کچھ اگلوا لیا جائے...... یا پھر اس کی گردن کو کسی تیز دھار چھری کے نیچے لایا جائے۔ پہلوان جی نے میرے خیال کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''ہفتوں تک یہاں رہ کر انتظار کرنے کے بجائے بہتر تو یہی لگتا ہے کہ کسی طرح اس بندے کو شکنجے میں کس لیا جاوے اور میں تمہیں بتا دوں ایسے بندوں کا بس جسم ہی جسم ہووت ہے، زور کچھ ناہیں ہوتا ان میں۔ اسے چھاپنا تمہارے لیے کچھ مشکل نہیں ہووے گا۔''

میں نے کہا۔''پہلوان جی آپ بھی تو کافی موٹے تازے ہیں لیکن آپ میں تو زور بھی ہے۔''

''میری بات اور ہے۔ دراصل......'' وہ بات کرتے کرتے رک گئے۔ غور سے میری طرف دیکھا۔ جیسے سمجھنے کی کوشش کر رہے ہوں کہ میں نے مذاق تو نہیں کیا۔ پھر ذرا ڈھیلے لہجے میں بولے۔''اچھے جسم کے لیے اچھی خوراک بہت ضروری ہے۔ ایک پہلوان کی مناسب خورک کے واسطے کم از کم دو ہزار روپیا روزانہ کا چاہیے ہووت ہے۔ اب تم خود ہی

سوچو چار بچوں اور بیوی کا پیٹ پالنے والا حق حلال کی کمائی سے اپنے لیے دو ہزار روز کا کہاں سے لاوے گا۔ بلکہ میں تو سمجھت ہوں کہ اگر میرا گھر خراب ہوا ہے اور گھر والی عرصے سے روٹھ کر میکے میں بیٹھی ہوئی ہے تو اس کی اصل وجہ بھی خرچوں کی زیادتی ہے۔''

''آپ نے ''ہڈی جوڑ'' کا کام بھی تو چھوڑ دیا ہے۔''

''ہڈی جوڑ کا کام اب باقی ہی کہاں رہا ہے؟ کبڈی اور کشتی وغیرہ میں چوٹیں لگتی تھیں، یہ کھیل اب کم کم ہی ہووت ہیں۔ ڈانگ سوٹے کی لڑائی تو ویسے ختم ہو گئی ہے۔ بسنت اور گڈی بازی بھی اب ناہیں ہوتی۔ آجا کے موٹر سائیکل سے گرنے والوں کا تھوڑا بہت آسرا ہووت تھا، یہ لوگ بھی اب سیدھے ڈاکٹروں کی طرف بھاگت ہیں، اپنا بیڑا غرق کروانے کے لیے۔ چاند گڑھی تک میں ایک دو ڈاکٹر آ کر بیٹھ گئے ہیں۔'' پہلوان جی نے اداس شکل بنائی۔

میں نے کئی دفعہ مالی طور پر پہلوان جی کی اعانت کی کوشش کی تھی مگر ان میں خودداری بدرجۂ اتم موجود تھی۔ یہاں تک کہ انہوں نے وہ زیور بھی کہیں استعمال نہیں کیا تھا جو تاجور کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد میں نے انہیں دیا تھا۔ پہلوان جی حساس بھی بہت تھے۔ مثلاً کئی ہفتے گزرنے کے باوجود وہ ابھی تک یہ بات بھولے نہیں تھے کہ راوی فارم میں انہوں نے ایک نابینا ملازم کو غلطی سے دھوکے باز سمجھا اور مارا۔ وہ ہرجانے کے طور پر اپنی بچت میں سے اس نابینا کو ڈیڑھ دو ہزار روپیا دے چکے تھے اور اب بھی مطمئن نہیں تھے۔ کئی دفعہ دکھی انداز میں شعر پڑھ چکے تھے۔ ہر روز پندرہ وی دفعہ خود کو پھٹکارا ہے...... نابینا کو مارا ہے، نابینا کو مارا ہے۔ درحقیقت یہ عام سادہ سا بندہ، انسان دوستی، بے لوث محبت اور دلیری جیسی بہت سی خوبیوں سے مالا مال تھا۔ اب بھی وہ اپنی جان خطرے میں ڈال کر یہاں میرے ساتھ موجود تھا اور ہر اوکھلی میں سر بھی دے رہا تھا۔

پہلوان جی نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''شاہ زیب! میں تو کہوت ہوں کہ دو چار دن تک اس کیمرے کو دیکھا جائے۔ اس دوران میں اس سومو پہلوان کا آپریشن بھی ہو جاوے گا۔ اگر کیمرے کی طرف سے کوئی اچھا رزلٹ نہ نکلا تو پھر پہلوان کو دبوچ لیا جائے۔ جب موت کا فرشتہ اس کی نظروں کے سامنے پھڑ پھڑاوے گا تو یہ سب کچھ اگل دیوے گا۔''

''لیکن پہلوان جی، ہمیں اس کے خطرناک گارڈز کو بھی تو دیکھنا پڑے گا...... اور پھر یہاں ہر طرف سی سی ٹی وی کیمرے بھی لگے ہوئے ہیں۔''

پہلوان جی نے اپنا سر اثبات میں ہلایا اور ان کا جوش کچھ ٹھنڈا پڑتا محسوس ہوا۔ میں نے موبائل فون کی اسکرین پر نگاہ دوڑائی۔ کیمرے کا فریم خالی پڑا تھا۔ چھوٹی موٹی آہٹوں کے سوا کوئی آواز بھی سنائی نہیں دیتی تھی۔ میں نے کہا۔ ''پہلوان جی! آپ کے کردار میں پرنس سوموکو کافی دلچسپی محسوس ہوئی ہے۔ میرے خیال میں پرنس کے ساتھ ہمیں اپنا رابطہ کچھ اور بڑھانا چاہیے۔ ہم اس سے جتنا قریب رہیں گے، جان ڈیرک کا کھوج لگانے میں اتنی ہی آسانی رہے گی۔''

پہلوان حشمت نے میرے خیال کی تائید کی۔

یہ تیسرے روز کی بات ہے۔ رات کے دس بجے تھے۔ ہمیں اس میڈیکل سینٹر میں آئے سات روز ہو چکے تھے۔ ان سات دنوں کا خرچہ ہوشربا تھا۔ پہلوان جی کو جو ادویات دی جاتی تھیں، وہ گٹر میں بہہ جاتی تھیں مگر جو پرہیزی کھانے انہیں کھلائے جا رہے تھے ان سے وہ سخت الرجک تھے۔ اب ورزشوں کا ایک سلسلہ بھی شروع ہونے والا تھا جس کے بارے میں پہلوان جی کا خیال تھا، یہ ان کے ''وزن'' کے خلاف ایک سازش ہے اور وہ اسے کسی طور برداشت نہیں کریں گے۔ میں نے تھوڑی دیر پہلے بھی ان کی منت سماجت کی تھی اور انہیں راہِ راست پر لانے میں مجھے جزوی کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ انہوں نے گہری سانس لے کر فرمایا تھا۔ ''میں نے تمہیں پہلے ہی کہا تھا کہ ایک میان کے اندر دو بھینسیں بانسری نا ہیں بجا سکتیں۔ ایک دیسی بندے کو ولایتی ورزشوں اور دواؤں سے نقصان ہو سکتا ہے فائدہ نا ہیں۔ ایسے ہی ولایتی ڈاکٹروں کے بارے میں کہا جاوت ہے کہ...... نیم حکیم اور منہ میں رام رام......''

○......❖......○

میں اور پہلوان جی سونے کی تیاری کررہے تھے جب ایک دم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ کہیں پاس سے ہی فائرنگ کی خوفناک آواز آئی تھی۔ پہلے رائفل کا ایک طویل برسٹ چلا، پھر پسٹل سے چار پانچ فائر اوپر تلے ہوئے، تب ایک بار پھر آٹومیٹک رائفلوں کے دو تین چھوٹے برسٹ سنائی دیئے۔

میڈیکل سینٹر کے اندر خطرے کے سائرن گونجنے لگے۔ میں اور پہلوان جی اپنے سوئٹ سے باہر آئے تو سینٹر کے مسلح گارڈز نے ہمیں روک لیا۔ ''نہیں سر، ابھی آپ باہر نہیں نکلیں۔ خطرہ ہے۔'' ایک اٹالین گارڈ نے میرے سامنے آتے ہوئے کہا۔

''مگر ہوا کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''شاید کوئی مسلح شخص سینٹر میں گھس آیا ہے۔ گولیاں چلا رہا ہے۔'' گارڈ ہانپی ہوئی آواز میں بولا۔

اردگرد بھگدڑ سی محسوس ہورہی تھی۔ کئی افراد بلند آواز میں چلا رہے تھے اور بھاگ دوڑ کررہے تھے۔ ''مین گیٹ بند کردو۔'' کسی کی پکارتی ہوئی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

ہمارا راستہ روکنے والا گارڈ اس آواز کی طرف متوجہ ہوا تو مجھے وہاں سے نکلنے اور جائے وقوعہ کی طرف جانے کا موقع مل گیا۔ پہلوان جی بھی میرے پیچھے آئے۔ انہوں نے کہا۔ ''مجھے لگت ہے کہ فائرنگ پرنس والے کمروں کی طرف ہوئی ہے۔''

وہ ٹھیک کہہ رہے تھے۔ ہلچل کا مرکز وہی جگہ نظر آتی تھی۔ فائرنگ اب رک گئی تھی، مگر ہراس کی فضا گمبھیر ہوتی جارہی تھی۔ ہم اس وی آئی پی پورشن کے قریب پہنچے تو میڈیکل سینٹر کی سیکیورٹی نے ہمیں روک دیا۔ تاہم ایک ٹوٹی ہوئی کھڑکی کے شیشے سے اندر کا جو منظر نظر آیا، اس نے مجھے بری طرح ٹھٹکا دیا۔ کمرے کے اندر جو لاش پڑی تھی، وہ کسی اور کی نہیں

پرنس سوموکی تھی۔اس کے جسم پر فقط ایک نیکر تھی۔گوشت اور چربی کا وہ پہاڑ، اوندھے منہ قالین پر پڑا تھا اور لہولہان دکھائی دے رہا تھا۔ پرنس سوموکے دو ذاتی گارڈز بھی لاشوں کی صورت اختیار کر چکے تھے۔ایک کی لاش لابی میں اور دوسرے کی کمرے کے اندر ہی پڑی تھی۔

اندازہ ہو رہا تھا کہ حملے کے وقت پرنس سوموحسبِ معمول مساج کروا رہا تھا۔ میڈیکل سینٹر کا سیکیورٹی انچارج بھاگتا ہوا موقع پر پہنچ گیا۔اس نے دھواں دھواں چہرے والے ایک گارڈ سے پوچھا۔''کیسے ہوا یہ سب؟''

گارڈ بولا۔''سر! محترم پرنس کے ذاتی گارڈز میں سے ہی ایک نے ان پر گولیاں چلائی ہیں۔ باقی دو گارڈز نے ان کا دفاع کرنے کی کوشش کی ہے۔ان میں سے ایک مارا گیا ہے،دوسرا زخمی ہے۔''

''اور حملہ آور؟''سیکیورٹی آفیسر نے پوچھا۔

گارڈ نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے لرزتی آواز میں کہا۔''وہ اندر پڑا ہے۔وہ بھی مارا گیا ہے جی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اسے دیکھا ہے۔ پرنس پر فائر کرتے ہوئے۔''

اسی دوران میں دو تین افراد کسی زخمی کو ہاتھوں میں اٹھائے باہر لائے اور ایک ایمبولینس میں ڈال دیا۔ یہ جاپانی خدوخال والا ایک خواجہ سرا تھا۔

مزید ایمبولینس گاڑیوں کے ہوٹر بھی سنائی دے رہے تھے۔سینٹر میں موجود خطرے کا سائرن بھی مسلسل گونج رہا تھا۔ میں اور پہلوان حشمت سکتہ زدہ کھڑے تھے۔ہم سومونامی گینگسٹر کے حوالے سے کیا پروگرام بنا رہے تھے اور وہ آناً فاناً موت کی آغوش میں چلا گیا تھا۔ میرا دھیان سیدھا گینگ کی آپس کی لڑائی کی طرف ہی جا رہا تھا۔ یہ لوگ چن چن کر ایک دوسرے کو قتل کر رہے تھے۔

پہلوان نے حیرت کے حصار سے نکلتے ہوئے کہا۔''یہ کیا ہو گیا ہے، اتنی زیادہ سیکیورٹی میں بھی یہ موٹا مارا گیا......اور وہ گارڈ تو کہہ رہا تھا کہ باہر سے کوئی مسلح شخص اندر گھسا ہے؟''

''نہیں، ایسا نہیں ہوا۔ بہت سخت سیکیورٹی ہے۔ یہ سارا کام اندر سے ہی ہوا ہے۔ محافظ ہی قاتل بن گیا ہے۔''میں نے جواب دیا۔

○......❖......○

میڈیکل ویٹ لاس سینٹر میں رہنا اب بیکار تھا۔ ہم وہاں سے ڈسچارج ہو کر دارج داراب کے مقامی منیجر جمشید ملک کے پاس واپس آ گئے۔ انڈرورلڈ کا ایک اور سپر اسٹار موت کے منہ میں چلا گیا تھا۔ اس خبر نے نیوز میں اچھی خاصی جگہ بنائی تھی۔ ایسے شخص کی موت پر افسوس تو نہیں ہونا چاہیے لیکن ہمیں ایک دوسرے زاویے سے افسوس ہو رہا تھا۔ ایک کلیو ہماری گرفت سے نکل گیا تھا۔ ایک دو موہوم اشارے دے کر یہ ''پرنس سومو نامی بندہ'' ہماری نگاہوں سے مکمل طور پر اوجھل ہو گیا تھا۔ پتا نہیں کہ اس کی لاش کہاں گئی، اسے کہاں دفنایا یا جلایا گیا؟ اس کے لواحقین اور متاثرین کون تھے؟ سب کچھ ایک دبیز پردے کے پیچھے چھپا رہا۔ جمشید ملک کو بھی اس سلسلے میں کوئی کھوج نہیں مل سکا۔

جو موہوم اشارے پرنس سومو کے حوالے سے مل سکے تھے، ان کا تعلق اسی ویڈیو کلپ سے تھا جو ہمیں اسپائی کیمرے کے ذریعے حاصل ہوا تھا۔ سومو نے اپنے کسی ماتحت سے بات کرتے ہوئے اورنج رنگ کی اوڈی گاڑی اور کسی ٹویل نامی جگہ کا ذکر کیا تھا۔

پہلوان حشمت، جمشید ملک اور میں لنچ کے بعد بیٹھے اسی سلسلے میں سوچ بچار کر رہے تھے۔ جمشید ملک نے کہا۔ ''روم ایک بڑا شہر ہے۔ یہاں سیکڑوں کی تعداد میں اوڈی گاڑیاں ہوں گی...... لیکن ایک بات ہمارے لیے فائدہ مند ثابت ہو سکتی ہے۔ آپ نے اورنج کلر کا ذکر کیا ہے۔ یہ کلر زیادہ نظر نہیں آتا اور شاید زیادہ پسند بھی نہیں کیا جاتا۔ ایسی کاروں کی تعداد زیادہ نہیں ہو گی۔ کیا پتا کہ پورے شہر میں ایسی پندرہ بیس اوڈی کاریں ہوں۔''

جمشید کی بات سمجھ میں آ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''تم کہنا چاہتے ہو کہ رجسٹریشن ریکارڈ کے ذریعے مطلوبہ گاڑی کا سراغ لگایا جا سکتا ہے؟''

''بالکل...... یہ ممکن ہے۔ ایسی معلومات حاصل کرنا بہت زیادہ مشکل نہیں ہے۔ یہاں میرا ایک مقامی دوست ہے جو اس سلسلے میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے، میں آج ہی اس سے رابطہ کرتا ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''دوسرا سراغ یہ TWELL نامی جگہ ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا یہ کوئی اسپتال یا پرائیویٹ کلینک وغیرہ ہو گا؟''

''جو کچھ آپ نے بتایا ہے اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے۔ سومو نے کسی ڈاکٹر کو جائے وقوعہ پر لے جانے کی بات کی ہے اور اپنے مخاطب سے کہا ہے کہ وہ اسے ٹویل سے پک کر لے۔''

پہلوان حشمت نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ گاڑی کا کھوج

لگانے سے اسپتال کا کھوج لگانا زیادہ آسان ثابت ہووے گا۔"

"لیکن یہ کوئی بڑا اسپتال تو نہیں ہوگا۔" جمشید ملک نے یقینی انداز میں کہا۔ "ایسا کوئی نام میں نے ابھی تک نہیں سنا، ہاں کوئی چھوٹا اسپتال یا پرائیویٹ کلینک ضرور ہوسکتا ہے...... ویسے اس لفظ "ٹویل" کا مطلب بھی پلے نہیں پڑ رہا۔"

"انٹرنیٹ سے بھی مدد لی جا سکتی ہے۔" میں نے کہا۔

جمشید نے اثبات میں سر ہلایا پھر سگریٹ کا طویل کش لے کر متفکر انداز میں بولا۔ "تباہ حال ہونے کے باوجود ٹیکساری گینگ کا کچھ نہ کچھ اثر و رسوخ موجود ہے۔ اب دیکھیں، کچھ پتا نہیں چل پایا کہ میڈیکل سینٹر میں مرنے والوں کی لاشوں کا پوسٹ مارٹم کہاں ہوا، پوسٹ مارٹم کے بعد انہیں کہاں لے جایا گیا اور دفنایا گیا؟ سب کچھ تاریکی کے پردے میں چلا گیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "یہاں تمہارے اٹلی میں بھی دو نمبریاں کچھ کم نہیں ہیں...... بلکہ شاید ایشیائی ملکوں سے بھی کچھ زیادہ ہی ہیں۔"

اگلے چھ سات روز تک جمشید ملک نے کافی دوڑ دھوپ کی۔ وہ اپنے سارے مقامی رابطوں کو حرکت میں لے آیا مگر دونوں پہلوؤں سے ہم کوئی کھوج نہ پا سکے۔ پاکستان میں داؤد بھاؤ سے بھی گاہے بگاہے رابطہ ہو رہا تھا اور دارج داراب سے بھی۔ دارج کو اپنے اس منیجر پر بہت اعتماد تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کی مدد سے ہم جان ڈیرک کا کوئی نہ کوئی سراغ پا ہی لیں گے۔ میرا خیال ایسا نہیں تھا۔ ٹیکساری والے بہت اعلیٰ پائے کے مکار مجرم سمجھے جاتے تھے۔ ان تک پہنچنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔

کسی وقت میں تنہا بیٹھا ہوتا تو میرا دھیان مینشن کے اندر ہونے والی مار دھاڑ کی طرف چلا جاتا۔ فخر اور فارس کا خونی مقابلہ اور اس مقابلے میں فارس کی موت کا منظر میرے ذہن سے نکلتا ہی نہیں تھا۔ پھر ہاناوانی کا جان لیوا طور پر زخمی ہونا اور مینشن سے اوجھل ہو جانا...... میرا اور فخر وغیرہ کا بھاؤ کی ایک اور پناہ گاہ میں پہنچنا...... قسطینا کا فارس کی ڈھانچا نما لاش وصول کرنا اور اس کی آنکھوں میں کرب کے طویل ہوتے ہوئے سائے، وہ سب مناظر نہ بھولے جانے والے تھے۔ چھوٹی سی ایک اور بات بھی کئی دفعہ ذہن میں آئی تھی۔ مینشن میں فائرنگ کے دوران میں جب میں تیزی سے بھاگتا ہوا باہر نکلا تھا تو ہاناوانی کی ایک ماتحت کیپٹن فرزہ نے مجھے للکارا تھا اور ہالٹ ہالٹ پکار اٹھی مگر اس نے پوزیشن میں ہونے کے باوجود مجھ پر فائر نہیں کیا تھا۔ اس کی کوئی وجہ بھی ہوسکتی تھی مگر یہ بھی ممکن تھا کہ

ایک موقع پر میری طرف سے اچھے سلوک کی وجہ سے اس نے مجھے رعایت دی ہو۔
پتا نہیں کہ جاماجی میں قسطینا اب کہاں اور کس حال میں تھی۔ میں نے چار پانچ دفعہ اس سے رابطے کی کوشش کی تھی۔ ایک مرتبہ سیٹلائٹ فون بھی استعمال کیا تھا مگر کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ ایک روز زینب اور ابراہیم سے میرا رابطہ ہو گیا۔ ابراہیم کی خیر خیریت دریافت ہوئی۔ وہ اب مکمل طور پر صحت یاب تھا۔ اس نے اپنے خون میں موجود زہر کو شدید ترین فاقہ کشی کے ذریعے ملیا میٹ کر دیا تھا، اور یہ سب کچھ اس کی اپنی بیوی زینب سے محبت کی وجہ سے ہی ممکن ہو سکا تھا۔ ابراہیم بھی انیق کی بے وقت موت اور سردار سجاول کی بینائی ختم ہونے کے سبب افسردہ تھا۔ اس نے اپنے افسوس کا اظہار کیا۔ زینب کی زبانی قسطینا کی صورتِ حال کا پتا چلا۔ اس نے بتایا کہ وہ جاماجی میں نہیں ہیں۔ یہاں بہت غمگین رہتی تھیں، کچھ دن کے لیے جزیرے سے باہر چلی گئی ہیں۔

''کہاں؟''

''ٹھیک سے بتایا تو نہیں، کہتی تھیں کہ کچھ دن کہیں بڑے سکون کے ساتھ خاموشی سے رہنا چاہتی ہوں۔''

''میں نے انہیں کئی بار فون کیے مگر رابطہ نہیں ہوتا۔'' میں نے زینب کو بتایا۔

''وہ اپنا پہلے والا فون یہیں چھوڑ گئی ہیں۔ کوئی نیا فون اور نیا نمبر ہے ان کے پاس۔'' زینب نے جواب دیا۔

''تمہیں معلوم ہے نمبر؟''

وہ بولی۔ ''معلوم تو ہے...... لیکن...... خیر آپ کو تو بتا ہی سکتی ہوں۔ دراصل انہوں نے کسی کو بھی نمبر دینے سے منع کر رکھا ہے۔ بہت اداس رہتی ہیں آج کل، ایک دن انہوں نے......'' وہ کہتے کہتے ایک دم خاموش ہو گئی۔

''بات مکمل کرو زینب، شش و پنج میں ڈال رہی ہو۔''

وہ ذرا ہچکچا کر دھیمی آواز میں بولی۔ ''شاہ زیب بھائی، ایک روز میں ان کے ذاتی کمرے میں گئی۔ وہاں چھوٹے چھوٹے پوسٹرز کے بے شمار ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان بیٹھی رو رہی تھیں۔ میں یہ دیکھ کر...... حیران ہوئی...... کہ وہ آپ اور قسطینا کی تصویروں کے پوسٹر تھے۔ آپ نے بتایا تھا ناں کہ جب آپ جاماجی سے پاکستان واپس گئے تھے تو قسطینا نے آپ کی الوداعی دعوت کی تھی، اس نے آپ سے لڑائی کے داؤ پیچ سیکھے تھے اور ریکارڈنگ وغیرہ بھی کی تھی...... یہی تصویریں تھیں، انہوں نے کہیں سنبھال کر رکھی

ہوئی تھیں۔"

میں خاموش رہا۔

زینب بولی۔" وہ روتے ہوئے مجھ سے کہنے لگیں۔' زینب، میں نے چاہا کسی اور کو، شادی کسی اور سے کی، شاید اسی کی سزا مجھے فارس کی موت کی شکل میں ملی ہے...... وہ آج کل عجیب سی کیفیت میں ہیں، عدت کی مدت پوری کیے بغیر ہی کہیں چلی گئی ہیں۔"

"اس کا فون نمبر دو زینب۔"

زینب نے فون نمبر دے دیا۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ یہ کسی دور دراز ملک کا نہیں بلکہ سارڈینیا کا نمبر تھا۔ وہ یہاں قریب ہی موجود تھی۔ زینب کو بھی پتا نہیں چلا تھا کہ یہ کہاں کا نمبر ہے۔ اسی روز سہ پہر کو میں نے جمشید ملک کے نمبر سے اسے سارڈینیا کال کی۔ شروع میں تو فون نہیں اٹھایا گیا مگر تیسری چوتھی کال پر قسطینا کی دھیمی سی رعب دار آواز ابھری۔

"ہیلو، کون؟"

"قسطینا، فون بند نہ کرنا۔ یہ میں ہوں شاہ زیب! بہت اہم بات کرنی ہے۔"

دوسری طرف کئی سیکنڈ خاموشی رہی۔ مجھے شک گزرا کہ کہیں اس نے فون ہی تو بند نہیں کر دیا پھر وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔"شاہ زائب! میرا نمبر کہاں سے ملا تمہیں؟"

"جہاں سے بھی ملا لیکن مل تو گیا، یہ آپ نے کیا حرکت کی ہے۔ یہاں سارڈینیا آ کر بیٹھی ہوئی ہیں......"

"کوئی خاص بات نہیں شاہ زائب، بس کچھ دن اکیلے میں گزارنا چاہتی ہوں۔"

"مگر وہاں آپ کی فورس کا کیا بنے گا، آپ چیف ہیں؟"

"میں نے عارضی طور پر چارج ایک تجربہ کار جنرل کے سپرد کر دیا ہے۔" اس کی آواز میں نقاہت اور پژمردگی تھی۔

پھر وہ ایک دم چونک کر بولی۔"تم کہاں ہو؟" یقیناً اس نے میرا نمبر دھیان سے دیکھا تھا۔

"اتفاقاً آپ کے کافی قریب موجود ہوں، اٹلی میں۔"

"کس شہر میں؟"

"روم میں، یہاں سے آپ تک اسپیڈ بوٹ پر بمشکل ڈیڑھ گھنٹے کا راستہ ہو گا۔"

وہ چپ سی ہو گئی پھر ذرا حیرانی سے کہنے لگی۔"تم یہاں کیسے آئے ہو؟"

"آپ کی اداسی دور کرنے کے لیے۔"

''بے پَر کی مت اُڑاؤ شاہ زائب! یقیناً تم کسی اور چکر میں ہو۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ...... ہاناوانی ابھی زندہ ہو...... اور یہاں پائی جا رہی ہو؟''

''بات تو کچھ اسی طرح کی اہم ہے، لیکن میں اس طرح فون پر آپ کو تفصیل سے نہیں بتا سکتا۔''

''نہ ہی بتاؤ تو اچھا ہے۔''

''مگر آپ کو بتانا ضروری ہے۔ اسی لیے تو فون کیا ہے۔''

''نہیں شاہ زائب! میں ابھی کچھ ہفتوں تک بالکل ڈسٹرب ہونا نہیں چاہتی۔'' اس کی آواز کی شکستگی نے مجھے بے چین کر دیا۔ وہ میری خاطر پاکستان گئی تھی اور وہاں سے اتنا بڑا دکھ لے کر لوٹی تھی۔ میں اس عالم میں اسے یوں تنہا چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔

''آپ سے ملنا بہت ضروری ہے قسطینا۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ وہ کچھ دیر مجھے ٹالنے کی کوشش کرتی رہی پھر نیم رضامندی کے انداز میں خاموش ہوگئی۔

○......❖......○

اور اب میں سارڈینیا میں موجود تھا۔ یہ روم سے کچھ ہی فاصلے پر ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے۔ یہ اپنے پُرسکون ماحول، خوب صورت ساحلوں اور ماربل کی وجہ سے جانا جاتا ہے۔ میں اور قسطینا ایک ساحلی ہوٹل کے نہایت خوب صورت سرسبزا... میں بیٹھے تھے۔ دس پندرہ میٹر کے فاصلے پر سمندر کا جھاگ اُڑاتا پانی دعوتِ نظارہ دیتا تھا۔ چمکیلی دھوپ کی خوشگوار تمازت نے وہاں بیٹھنے کو، اور خاموشی سے سمندر پر نگاہ دوڑانے کو ایک دلچسپ تفریح بنا دیا تھا۔ خاموشی طویل ہوئی تو میں نے قسطینا کی طرف دیکھا۔ اس کے بوائے کٹ بال اب کچھ بڑے ہو چکے تھے اور ڈیانا کٹ کی شکل اختیار کر گئے تھے۔ وہ جیولری نہیں پہنتی تھی مگر کبھی کبھار بالکل چھوٹے ٹاپس اس کے کانوں میں دکھائی دیا کرتے تھے۔ اب بھی وہ اس کے سلکی بالوں کے نیچے اپنی جھلک دکھا رہے تھے۔ اس نے کسی کرکٹر کی طرح سفید شرٹ اور سفید پتلون پہن رکھی تھی۔ اس کی بائیں کلائی پر مندمل ہوتے ہوئے زخموں کے ایک دو نشان تھے۔ (یہ اسی خوفناک لڑائی کی نشانیاں تھیں جو کلر کہار کے ویرانے میں قسطینا اور ریڈ کیٹ کے درمیان ہوئی تھی)

''کیا سوچ رہی ہیں آپ؟'' میں نے پوچھا۔

''یہی کہ میں اتنی دور کیوں چلی آئی؟ شاید اس لیے کہ میں اندر سے بے سکون ہوں۔''

''اور میں مزید بے سکون کرنے کے لیے یہاں پہنچ گیا۔''

''یہ تو ہے۔'' اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور ہوا نے اس کے بالوں کو زوردار ہلکورا دے کر اس کے گلابی چہرے پر بکھیر دیا۔ وہ بالوں کو پیچھے ہٹاتی ہوئی بولی۔ ''میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ تم یا کوئی اور قریبی جاننے والا میرے اس قدر نزدیک وہاں روم میں موجود ہوگا۔''

''اگر قدرت نے اس طرح کا کچھ کیا ہے تو شاید ہم دونوں کے لیے اس میں کوئی بھلائی پوشیدہ ہو۔ آپ کا موڈ جس طرح کا ہو رہا ہے کیا پتا کسی دن آپ مایوسی کے عالم میں ہوٹل سے نکل کر سیدھا چلتی جاتیں اور خود کو لہروں کے سپرد کر دیتیں۔''

''نہیں خیر، اتنی بھی کمزور نہیں ہوں میں۔ سنبھلنا جانتی ہوں۔ تمہیں اچھی طرح پتا ہے۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

''جاماجی کی سلامتی آپ کے سنبھلنے سے ہی مشروط ہے۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''ہاناوانی اگر زندہ بچ گئی ہے تو زخمی بلا کی شکل اختیار کر جائے گی اور اگر مر گئی ہے تو بھی اس کے وارث مزید زہریلے ہو کر خطرناک کارروائیاں کر سکتے ہیں، وہاں جاماجی میں ابراہیم ناتجربہ کار ہے۔''

''تم مجھے یہ بتانے کی کوشش نہ کرو کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میں جاماجی کی طرف سے پوری طرح مطمئن ہوں اسی لیے یہاں موجود ہوں۔ کیا تم جہاں سے آئے ہو وہاں کے بارے میں پوری طرح مطمئن ہو؟'' اس کا اشارہ پاکستان اور لاہور کی طرف تھا۔

''میں وہاں کے حالات سے مکمل باخبر ہوں قسطینا، بھاؤ سے تقریباً ہر روز رابطہ ہو جاتا ہے۔ ہاناوانی کی موجودگی کا ابھی کوئی ثبوت نہیں ملا۔ نہ ہی دوبارہ جنونی پرندوں کی کوئی جھلک نظر آئی ہے۔''

قسطینا نے ذرا توقف سے کہا۔ ''ہاناوانی ایک بد اخلاق ترین عورت ہے، اس کی اسی بد اخلاقی نے تمہیں اس کے بیڈروم تک پہنچانے میں کردار ادا کیا۔ ہمیں امید رکھنی چاہیے کہ وہ جان سے چلی گئی ہے...... یا پھر جان لیوا طور پر زخمی ہو گئی ہے اور عرصے تک دوبارہ اپنی پہلی والی فارم میں نہیں آپائے گی۔''

''میں جانتا ہوں، اس کے زخم بہت کاری تھے۔ ماہر کہتے ہیں کہ جب ہپناٹسٹ جسمانی طور پر بیمار یا کمزور ہوتا ہے تو اس کی سجیشن دینے کی طاقت بھی متاثر ہو جاتی ہے۔''

قسطینا نے میری جانب ستائش کی نظروں سے دیکھا اور بولی۔ ''ہاناوانی کے تنویمی عمل

کا مقابلہ کرنا اور اس کے ٹرانس میں ہو کر بھی اس کے ٹرانس میں نہ ہونا تمہاری بہت بڑی کامیابی تھی۔''

''بس یہ شدید جسمانی درد کے ذریعے اپنے ذہن کو جگائے رکھنے کا ایک عمل تھا۔'' میں نے اپنے زخمی انگوٹھے کو سہلاتے ہوئے کہا۔

وہ ذرا چونک کر بولی۔ ''فخراب کیسا ہے؟''

''پرسوں آپ کے پاس آنے سے پہلے بھی میری لاہور میں لودھی اور رضوان سے بات ہوئی تھی۔ ان کا کہنا ہے کہ اس کی حالت تیزی سے بہتر ہو رہی ہے۔ اس کا برہم مزاج اب دھیما پڑ رہا ہے۔ کسی وقت رونے لگتا ہے۔ اپنے ماحول کو اور ساتھیوں کو اس نے پہچاننا شروع کر دیا ہے۔''

''وہ...... جانتا ہے کہ اس نے فارس کو مارا ہے؟''

''نہیں قسطینا...... جو وقت اس نے ٹرانس کی حالت میں گزارا ہے، اس کے بارے میں تقریباً بے خبر ہے۔ رضوان بتا رہا تھا کہ فارس کے علاوہ میرے اور بنارس کے بارے میں بھی بار بار پوچھتا ہے کہ ہم کہاں ہیں۔''

قسطینا ایک آہ بھر کر خاموش ہو گئی۔ میں اپنے اور قسطینا کے لیے گرین ٹی لینے کے لیے ایک قریبی کاؤنٹر کی طرف چلا گیا۔ اسی دوران میں 600 ہارس پاور کی ایک نہایت ہیوی موٹر بائیک پر سوار دو نوجوان قسطینا کے سامنے سے گزرے۔ یہ لمبے بالوں اور کرخت چہروں والے اٹالین لوفر لگتے تھے۔ انہوں نے قسطینا کو دیکھ کر سیٹی بجائی۔ انداز چھیڑنے والا ہی تھا۔

قسطینا نے ان پر توجہ نہیں دی۔ کچھ آگے جا کر وہ پھر واپس آ گئے۔ ان پر مستی سوار تھی۔ انہیں کیا پتا تھا کہ وہ جس پر لائن مارنے کی کوشش فرما رہے ہیں وہ ایک آرمی کو ہینڈل کرتی ہے...... آگ اور بارود سے کھیلنے والی ایک دبنگ جنگجو...... اگر وہ ان لڑکوں کی وجہ سے مشتعل ہو جاتی تو وہ یقیناً کچھ دیر بعد اسٹریچرز پر نظر آتے۔ بہر حال ان کی قسمت اچھی تھی۔ انہوں نے اس مرتبہ بھی سیٹی بجانے اور ایک آدھ فقرہ اچھالنے پر اکتفا کیا۔ پھر بھونروں کی طرح بھیں بھیں کرتے کسی اور طرف نکل گئے۔

چائے پیتے ہوئے میں نے قسطینا سے کہا۔ ''میں نے کل بھی آپ سے کافی سر کھپایا ہے، آج بھی یہی کہوں گا، یہاں اکیلے رہنے کے بجائے میرے ساتھ روم چلیں، بڑا مزیدار بارونق شہر ہے۔ پہلوان حشمت اور جمشید بھی ہیں وہاں...... آپ کا دل بہل جائے گا۔

گرتی ہوئی دیواروں پر ایک اور ضرب لگانے کی کوشش بھی کریں گے۔''
''گرتی ہوئی دیواریں؟ کیا مطلب؟'' اس نے بھویں اچکائیں۔
''وہی ٹیکساری گینگ کی باقیات۔ میرا دل کہتا ہے کہ جان ڈیرک وہیں روم میں کہیں موجود ہے۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ کیمرے کی ریکارڈنگ میں اس کے ساتھی پرنس نے کسی ''ٹویل'' نامی جگہ کی بات کی تھی۔ وہ جگہ، علاقہ یا عمارت جو بھی ہے، ضرور بہ ضرور روم میں ہے۔ ہم کوشش کریں تو اسے ڈھونڈ سکتے ہیں۔''
''تو پھر کرو ناں کوشش۔ تمہارے پاس دارج کے مقامی ذرائع بھی ہیں۔''
میں نے طویل سانس لی۔ ''تو آپ نہیں جائیں گی؟''
وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر کھوئی کھوئی نظروں سے سمندر کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔
''نہیں شاہ زائب! میں ابھی خود کو کمپوز کر رہی ہوں۔ مجھے کچھ وقت چاہیے۔''
''قسطینا! تنہائی میں خود کو کمپوز کرنے کا آئیڈیا کچھ زیادہ اچھا نہیں ہے۔ آخر کچھ تجربہ میرا بھی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ خود کو زیادہ بے سکون کر لیں۔''
''تم سائیکاٹرسٹ کب سے بن گئے؟''
''جب سے آپ کو جاما جی سے اتنی دور اس حال میں دیکھا ہے۔''
وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ پشت کی طرف سے اپنی پینٹ جھاڑتے ہوئے بولی۔ ''میں بالکل ٹھیک ہوں شاہ زائب اور اس پُرسکون ہوٹل میں مجھے اچھا لگ رہا ہے۔ یہاں کوئی مجھے جانتا پہچانتا نہیں۔ میں بالکل ایک کامن پرسن کی طرح وقت گزار رہی ہوں۔''
''یعنی آپ کے نہ جانے کا فیصلہ حتمی ہے؟''
''ہاں۔'' اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔
ہوٹل میں ہم دونوں کے کمرے ساتھ ساتھ ہی تھے۔ ڈنر کے بعد لابی میں بیٹھ کر ہم سمندر کا نظارہ کرتے رہے۔ چاندنی ٹھٹھری ہوئی لہروں پر رقص کرتی تھی اور جھاگ میں جذب ہو کر اسے اور بھی سفید بناتی تھی۔ میں مسلسل قسطینا کو قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ مسلسل انکار کرتی رہی۔ آخر میں اس نے فقط اتنی رضامندی ظاہر کی اگر میں مزید ایک ہفتے تک روم میں رکا تو پھر وہ وہاں پہنچ سکتی ہے۔ میں جانتا تھا کہ وہ صرف ٹال رہی ہے۔ عین ممکن تھا کہ کل میرے یہاں سے نکلتے ہی وہ قریب کے کسی اور پُرسکون مقام مالٹا یا پھر سسلی کی طرف نکل جاتی۔
صبح ناشتے پر وہ بالکل گم صم تھی۔ شاید اسے بھی میری بات نہ ماننے کا افسوس تھا۔ میں

نے اسے مسلسل رابطے میں رہنے کی تاکید کی۔ اس سے رخصت ہو کر میں پورٹ پر پہنچا۔ یہاں سے تیز رفتار لگژری بوٹس روم کے لیے چلتی تھیں۔ آسان آمدورفت تھی۔ بعض اوقات تو سفری کاغذات بھی چیک نہیں ہوتے تھے۔ ٹکٹ لے کر میں دیگر مسافروں کے ساتھ انتظار گاہ میں بوٹ کا انتظار کرنے لگا۔ ابھی بوٹ کے آنے میں دیر تھی۔ قریباً بیس پچیس منٹ بعد مجھے چونکنا پڑا۔ میں نے قسطینا کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ اس کا سفری سامان ایک پورٹر کے پاس تھا...... وہ آ رہی تھی۔

○......❖......○

میں ایک بار پھر روم میں تھا۔ قسطینا بھی میرے ساتھ تھی۔ یہ بڑے چمکیلے دن تھے۔ روم کی سڑکوں اور گلی کوچوں میں سیاحوں کا رش تھا۔ قسطینا بھی پہلی بار روم آئی تھی۔ وہ یہاں کے تاریخی مقامات دیکھ کر قدرے حیران ہوئی۔ اور اس حیرانی نے ہی اس کا دھیان بٹانے میں بھی مدد کی۔ پہلوان کے اکثر ''اقوالِ زریں'' قسطینا کو مسکرانے پر مجبور کر دیتے تھے۔ میں ان اقوالِ زریں کا ترجمہ قسطینا کو سناتا تھا۔

دوپہر کے بعد میں اور قسطینا اور کبھی کبھی پہلوان حشمت بھی روم گردی کے لیے نکل جاتے۔ میرے چہرے پر کاسمیٹک تبدیلیاں موجود تھیں اور میں نے لباس وغیرہ میں بھی کافی چینج پیدا کیا تھا۔ مجھے یہاں پہچانے جانے کا کچھ زیادہ اندیشہ نہیں تھا۔ باقی رہے قسطینا اور پہلوان...... انہیں یہاں کس نے شناخت کرنا تھا۔ ایک رات میں اور قسطینا اسی طرح شہر کی سڑکوں پر رواں تھے۔ میری نگاہ مختلف جگمگاتے سائن بورڈز کا طواف کر رہی تھی۔ شاید ایسے ہی گھومتے پھرتے ''ٹویل'' نام کا کوئی کلینک یا اسپتال وغیرہ نظر آ جاتا...... یا کوئی اور ایسی جگہ جس کا تعلق اس نام سے ہوتا۔

اسی دوران میں دارج کے مقامی منیجر جمشید کا فون آ گیا۔ اس نے کہا۔ ''شاہی صاحب! اورنج کلر کی آخری دو گاڑیوں کی چھان پھٹک رہ گئی تھی، وہ بھی مکمل ہو گئی ہے۔ اب تک ہمارے علم میں آنے والی پندرہ گاڑیاں تو کلیئر نکلی ہیں۔ چھ گاڑیاں ایسی ہیں جو روم میں موجود نہیں...... یا ویسے ہی لاپتا ہیں۔''

''اور ٹویل کے حوالے سے کوئی پیش رفت؟'' میں نے پوچھا۔

''بڑی حیرانی کی بات ہے جی۔ جگہ کا نام معلوم ہو جائے تو، آج کل نیٹ کے ذریعے کھوج لگانا بڑا آسان ہو جاتا ہے۔ روم کے ہر چھوٹے بڑے اسپتال، کلینک یا فارمیسی وغیرہ کا نام پتا ''نیٹ'' پر موجود ہے۔ مگر ''ٹویل'' نام سے کوئی جگہ نہیں مل رہی۔''

''اور روم سے باہر؟''

''اردگرد کے علاقوں فلورنس اور نیپلز وغیرہ میں بھی کوئی کھوج نہیں ملا۔''

''ٹھیک ہے، ہمیں کوشش تو جاری رکھنا پڑے گی۔''

میں نے فون بند کر دیا۔

''ایک نیا خیال ذہن میں آرہا ہے۔'' میں نے قسطینا سے کہا۔

''کوئی ڈھنگ کا خیال ہے تو بتاؤ۔''

''کیوں ناں میں اپنی اصل شکل اور حلیے میں آجاؤں۔ کسی بغیر چھت والی گاڑی میں بیٹھ کر پورے روم میں گھوموں...... اور گھومتا رہوں۔ اگر ٹیکساری کے کچھ لوگ روم میں موجود ہیں تو ضرور مجھے دیکھ لیں گے اور ان کے اندر کے قاتل انگڑائیاں لے کر بیدار ہو جائیں گے۔''

''میں نے کہا تھا ناں کہ کوئی ڈھنگ کا خیال ہے تو بتاؤ۔'' قسطینا نے برا سا منہ بنایا۔ ''وہ تمہارے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ تمہاری پہلی جھلک دیکھتے ہی ٹھائیں سے تمہارے ناریل میں سوراخ کر دیں گے۔''

میں نے گاڑی ایک کشادہ سڑک پر موڑتے ہوئے کہا۔ ''آج کل آپ منفی انداز میں بہت سوچ رہی ہیں۔ آپ کو کوئی بھی مثبت بات یاد نہیں رہتی......''

''کیا مطلب؟'' اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ ہلکے رنگ کے گلاسز کی وجہ سے اس کی آنکھوں کی کیفیت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

''آپ تو بڑے ٹھسے سے فرماتی تھیں کہ آپ میری پرستار ہیں۔ میری فائٹس بڑے شوق سے دیکھتی رہی ہیں۔ کسی وقت براہِ راست مجھ سے ملنا آپ کا سپنا تھا...... وغیرہ وغیرہ۔''

''پرستار تو میں اب بھی ہوں۔'' وہ مجھے دیکھے بغیر بولی۔ اس کے ڈیانا کٹ بال باہر کی سی روشنی کی وجہ سے ہلکے سبز دکھائی دے رہے تھے۔

''مجھے تو نہیں لگتا...... یا شاید پھر آپ...... بھلکڑ ہیں۔''

وہ کچھ دیر خالی خالی نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی، پھر ایک دم چونک کر بولی۔ ''اوہ گاڈ، میں واقعی بہت ڈسٹرب ہوں...... آج تو تمہاری برتھ ڈے ہے شاید۔ 28 تاریخ ہے ناں آج؟''

میں مسکرا کر رہ گیا۔ اس کا موڈ ایک دم بدلا ہوا نظر آنے لگا۔ اس نے اپنی کلائی گھما کر

رسٹ واچ دیکھی اور بولی۔ ''گیارہ بج کر پندرہ منٹ ہوئے ہیں۔ ابھی تمہاری برتھ ڈے ختم ہونے میں پورے پینتالیس منٹ باقی ہیں۔ ہم اسے ''سلیبریٹ'' کریں گے۔ ابھی کریں گے۔''

اس نے اردگرد نگاہ دوڑائی۔ تھوڑے ہی فاصلے پر ایک ریستوران کا نیون سائن جگمگا رہا تھا۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ اسٹیئرنگ پر رکھ دیا۔ ''چلو...... گاڑی اس طرف موڑو۔''

میں نہ نہ کرتا رہ گیا۔ وہ مجھے ریستوران کی پارکنگ میں لے آئی۔ ''چلو، اب نکلو باہر۔ یہ آرڈر ہے میرا۔''

ان لمحوں میں وہ واقعی ارادے کی پکی نظر آرہی تھی۔

ہم گاڑی سے نکل کر ریستوران میں داخل ہوئے۔ اندر کا ماحول خوب صورت تھا، مگر رش بھی کافی تھا۔ وہ بار بار گھڑی دیکھ رہی تھی۔ بھاگتی ہوئی سیدھی منیجر کے پاس پہنچی اور اس کو کچھ ارجنٹ آرڈر دیئے۔ ان میں اہم آرڈر ایک کیک، چند گلدستوں اور کینڈلز وغیرہ کا تھا۔

قسطینا کا دبنگ لب ولہجہ اور اس کی عجلت نوٹ کر کے منیجر خود آفس سے نکل آیا اور ہم دونوں کے لیے ایک خالی میز کا انتظام کیا۔ میں ایک طرف کھڑا قسطینا کی بھاگ دوڑ دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیا یہ وہی قسطینا ہے؟ جاما جی کی آرمی کی بارعب چیف، جاما جی بڑے بڑے فوجی افسر اور عمائدین جس کے سامنے مؤدب نظر آتے تھے اور جس کے ڈر اس کے مخالفین لرزتے تھے......؟

ان لمحوں میں وہ صرف ایک نوجوان، جذباتی لڑکی دکھائی دے رہی تھی، جس ذہن میں اچانک ایک بات سمائی تھی اور وہ اسے پورا کرنے پر تل گئی تھی۔

کیک آیا تو مجھے حیرانی ہوئی۔ وہ مہنگا اور کافی بڑا کیک تھا۔ قریباً دس پاؤنڈ کا۔ ''یہ کیا ہے۔ ہم اسے کیسے کھائیں گے؟''

''ہم اکیلے نہیں، بہت سے کھائیں گے۔'' اس نے کہا۔

اسی دوران میں ریستوران کے آرکسٹرا نے برتھ ڈے کی دھن بجانا شروع کر دی ڈائننگ ہال کی مختلف میزوں سے اٹھ کر کئی مرد وزن ہمارے اردگرد اکٹھے ہوگئے۔ یہ سا تیز رفتار ارینج مینٹ قسطنیا نے ہی کی تھی۔ میں نے تالیوں کی گونج میں کیک کاٹا اور وہ بہت جلد ختم ہو گیا۔

جب لوگ کھا کر اور ہمیں وش کر کے اپنی اپنی جگہوں پر چلے گئے اور اپنے اپنے

میں مگن ہو گئے تو ہم نے ڈنر کیا۔ اٹلی کا پیزا مشہور ہے اور یہ ہمارے ڈنر کا بھی حصہ تھا۔ وہ بولی۔ ''سوری شاہ زائب! اتنی جلدی میں کوئی تحفہ تو نہیں دے سکی۔ یہ بعد میں ہوگا۔''

میں نے صدق دل سے کہا۔ ''آپ اب جزیرہ سارڈینیا والے بوجھل موڈ سے نکل آئی ہیں، میرے لیے یہی تحفہ ہے۔''

وہ نفی میں سر ہلا کر رہ گئی۔

کچھ ہی دیر بعد ہم باہر آ کر اپنی فیاٹ گاڑی میں سوار ہو رہے تھے۔ موسیقی کے شور نے میرے سر میں ہلکا درد شروع کر دیا تھا۔ سامنے ہی ایک کلینک نظر آ رہا تھا، ساتھ میں فارمیسی بھی تھی۔ میں نے اس ''گیٹ ویل'' نامی فارمیسی سے اسپرین لی اور واپس گاڑی میں آ گیا۔ قسطینا خود ڈرائیو کرنا چاہ رہی تھی۔ میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ہماری گاڑی پارکنگ سے نکل کر کوئی نصف کلومیٹر دور ہی گئی تھی کہ قسطینا نے ایک دم اسے سڑک کے کنارے پر روک دیا۔

''کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بری طرح چونکی ہوئی تھی، بولی۔ ''شاہ زائب! تم نے جس فارمیسی سے میڈیسن لی، اس کا نیون سائن دیکھا تھا؟''

''ہاں...... دیکھا تو تھا۔''

''کیا لکھا ہوا تھا؟''

''میرا خیال ہے گیٹ ویل نام تھا۔'' میں نے جواب دیا۔

''گیٹ ویل ہی تھا اور گیٹ ویل کے پہلے دو حرف جی اور ای کچھ زیادہ ہی روشن نظر آ رہے تھے...... جیسے...... جیسے وہ نئے لگائے گئے ہوں۔''

''ہاں، کچھ ایسی ہی بات تھی۔'' میں نے اس سائن بورڈ کو اپنے تصور میں لاتے ہوئے کہا۔

یکایک میرے دماغ میں پھلجڑی سی چھوٹ گئی۔ اگر GETWELL کے پہلے دو حرف نہ ہوں تو وہ TWELL پڑھا جاتا ہے۔

''اوہ گاڈ...... قسطینا...... کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ ٹویل نہ ہو بلکہ گیٹ ویل ہو......''

''اور کچھ عرصہ پہلے تک اس کے پہلے دونوں حروف خراب ہوں...... یا انہیں درست کرنے کے لیے اتار لیا گیا ہو۔'' قسطینا نے میری بات مکمل کی۔

یہ سب کچھ بڑی تیزی سے ہم دونوں کے ذہن میں آیا...... اس کے ساتھ ہی قسطینا

نے کچھ آگے جا کر یوٹرن لیا اور گاڑی واپس اس فارمیسی کی طرف موڑ دی۔ کچھ ہی دیر بعد ہم پھر فارمیسی کی پارکنگ میں موجود تھے۔ یہ فارمیسی غالباً 24 گھنٹے کھلی رہتی تھی۔ اب بھی سفید کوٹوں والے ملازمین کاؤنٹر کے پیچھے دکھائی دے رہے تھے۔

میرے ذہن میں آنجہانی پرنس سومو کے وہ الفاظ گونج رہے تھے جو میرے پن ہول جدید کیمرے نے ریکارڈ کیے تھے۔ کسی جگہ بچوں کے جلنے کی اطلاع پا کر پرنس سومو نے اپنے کسی ماتحت سے کہا تھا۔ ''تم فوراً TWELL والوں کے پاس چلے جاؤ۔ ان کے پاس ایک بڑا اچھا ڈاکٹر ہے۔ وہ تمہارے ساتھ ہی چلا جائے گا۔ یہ TWELL ادھر ہی ہے جونی کے نئے گھر کے پاس۔''

جونی بھی یقیناً پرنس کے کسی گرگے کا نام ہی ہوگا۔ وہاں پر پرنس نے شاید دو چار بار گیٹ ویل کلینک اینڈ فارمیسی کا نیون سائن دیکھا تھا۔ اس وقت پہلے دو حرف موجود نہیں تھے اور اس نے اسے ٹویل ہی سمجھا تھا۔

اب بھی مجھے اور قسطینا کو صاف دکھائی دے رہا تھا کہ گیٹ ویل کے پہلے دو حرف یعنی جی اور ای نمایاں طور پر زیادہ روشن دکھائی دیتے تھے جبکہ باقی حروف مدھم اور قدرے بوسیدہ تھے۔ اس دوحرفی غلطی کے سبب ہمیں یہاں روم میں بہت مغز کھپائی اور سڑک پیمائی کرنا پڑی تھی۔

میں نے کہا۔ ''قسطینا! آپ نے اچھا دماغ دوڑایا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں وہ کھوج مل گیا ہے جس کی تلاش ہم یہاں کئی ہفتے سے کر رہے تھے۔''

''اور یہ اس وجہ سے ہوا ہے کہ میں تمہاری برتھ ڈے منانے کے لیے تمہیں زبردستی یہاں سامنے والے ریستوران میں لے آئی، حالانکہ تم صاف انکاری تھے۔''

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ صرف اس لیے ہوا کہ میں آپ کو زبردستی یہاں روم میں لے آیا حالانکہ آپ صاف انکاری تھیں۔''

وہ ہنس دی۔ میں نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ ''مجھے نوے فیصد یقین ہو چکا ہے کہ کسی برن یونٹ کا وہ ڈاکٹر یہیں سے گیا ہوگا جس کی بات پرنس نے کی تھی۔''

''تو پھر اب؟''

''اب آگے کا کچھ کام جمشید ملک کرے گا۔ وہ پندرہ سال سے یہاں مقیم ہے اور روم کا کیڑا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے سیل فون نکالا اور جمشید سے رابطہ کرنے میں مصروف ہو گیا۔

○......❖......○

آگے کا کام کافی تیزی سے ہوا تھا۔ جمشید نے صرف چوبیس گھنٹوں میں اس ایبٹ نامی ڈاکٹر کو ٹریس کر لیا۔ ایبٹ کا تعلق ایک بڑے اسپتال کے ''برن یونٹ'' سے تھا اور وہ گیٹ ویل نامی اس کلینک سے بھی منسلک تھا۔ اب جمشید کسی طرح اس ایبٹ نامی ڈاکٹر کو چھاپنے کی فکر میں تھا۔

ہم جمشید کی رہائش گاہ پر ہی تھے۔ قسطینا سو رہی تھی۔ میں اور پہلوان حشمت کھانے کی میز پر تھے اور لنچ کر رہے تھے۔ پہلوان جی نے کہا۔ ''جمشید نے جس ڈاکٹر کا کھوج لگایا ہے، کیا وہ کوئی کشمیری ہے؟''

''کیا مطلب؟''

''تم خود ہی تو کہوت ہو کہ وہ بٹ ہے...... اے بٹ؟''

''نہیں جناب، اے بٹ نہیں...... ایبٹ...... ڈاکٹر ایبٹ۔ یہ انگریزی نام ہے۔''

پہلوان جی نے ہونٹ سکیڑے۔ ''آچھا...... ایبٹ...... یہ کیا نام ہے۔'' پھر ذرا چونک کر بولے۔ ''جیسے ایبٹ آباد...... اس میں بھی تو ایبٹ آتا ہے...... ویسے کیا یہ ڈاکٹر بہت زیادہ بوڑھا ہے؟''

''یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''بھئی ہو سکتا ہے ناں کہ یہ جو ہمارا ایبٹ آباد ہے اس کا نام اسی ڈاکٹر کے نام پر ہو۔ اس ڈاکٹر کے والد نے اپنے بیٹے کے نام پر یا پھر دادا نے پوتے کے نام پر رکھا ہو......''

''نہیں حضور، یہ ایبٹ آباد تو بہت پرانا نام ہے۔ آپ کس طرف نکل گئے۔ واپس آجائیں۔''

''چلو آ گیا واپس۔ اب اٹھو...... تھوڑی سی کسرت ہو جاوے، تم کو پرسوں بھی کہا تھا کہ کچھ فرصت کے دن ہیں۔ تھوڑا بہت فائدہ اٹھا لو مجھ سے۔ دیسی کشتی کے کچھ اور داؤ پیچ سیکھ لو۔ کام آویں گے۔''

میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''پہلوان جی! میں نے آپ کو بتایا تھا، یہ جو قسطینا ہے مجھ کو بہت لائق فائٹر سمجھتی ہے...... بلکہ استادوں کا استاد سمجھتی ہے۔ اس کے سامنے تھوڑی بہت عزت رہنے دیں۔ باقی دیسی کشتی تو آپ سے سیکھنی ہی سیکھنی ہے۔''

اسی دوران میں دوسرے کمرے سے کھٹ پٹ کی آوازیں آئیں۔ ''لگتا ہے کہ قسطینا صاحبہ جاگ گئی ہیں۔'' میں نے کہا۔

پہلوان جی نے برا سا منہ بنایا۔ ''تم بھی یہی چاہتے تھے۔ وہ کیا کہوت ہیں...... اندھا کیا چاہے، دو ریوڑیاں۔'' انہوں نے پھر محاوروں کو ''مکس'' کیا۔

اس سے پہلے کہ پہلوان جی کوئی نئی بحث شروع کرتے، ڈور بیل بھی ہونے لگی۔ یہاں کوئی ملازم نہیں تھا۔ میں نے خود ہی اٹھ کر دروازہ کھولا اور دنگ رہ گیا۔ جمشید ملک اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ موجود تھا۔ انہوں نے ایک جواں سال، بے ہوش شخص کو اٹھا رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر چوٹوں کے نشان بھی تھے۔ یہ وہی ایبٹ نامی ڈاکٹر تھا۔

قسطینا بھی اٹھ کر آ گئی۔ بے ہوش ڈاکٹر کو ایک بیڈ پر لٹا دیا گیا۔ جمشید نے کہا۔ ''خود بے ہوش کیا ہے، میڈیسن دے کر، ابھی ہوش میں آ جائے گا۔''

''کچھ بتایا اس نے؟'' میں نے پوچھا۔

''بہت کچھ۔'' جمشید دبے دبے جوش سے بولا۔

''مثلاً؟''

''پہلے تو یہی کہتا رہا کہ وہ کہیں گیا ہی نہیں، پھر اتنا مانا کہ وہ لوگ اسے آنکھوں پر پٹی باندھ کر لے گئے تھے...... مگر اب سب کچھ بک دیا ہے اس نے۔ ایک ایک بات بتا دی ہے۔''

کچھ دیر بعد ایبٹ نامی یہ شخص ہوش میں آ گیا۔ وہ بہت ڈرا ہوا تھا اور جمشید ملک کے ہر سوال کا جواب فرفر دے رہا تھا۔ ایک دو منٹ میں ہی اندازہ ہو گیا کہ اس کی حیثیت ایک موقع پرست اور لالچی ڈاکٹر کی ہے اور اپنے اسی لالچ کی وجہ سے وہ اس پھندے میں پھنسا تھا۔ ٹیکساری والوں نے اسے ایک بڑی رقم کا جھانسا دے کر اس سے اپنا کام نکلوایا تھا۔ اسے آنکھوں پر پٹی باندھ کر روم شہر کے مضافات میں لے جایا گیا تھا اور چند ایسے بچوں کا علاج کرایا گیا تھا جن کے جسم کے کچھ حصے آگ سے جھلسے ہوئے تھے۔ میں نے جمشید سے پوچھا۔ ''جب یہ کہہ رہا ہے کہ اسے آنکھوں پر پٹی باندھ کر لے جایا گیا تو پھر یہ ہمیں اس ٹھکانے کے بارے میں کیسے بتائے گا؟''

''یہ اسی سے سنیے۔'' جمشید نے کہا۔ پھر ڈاکٹر ایبٹ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''چلو بتاؤ اپنی مبارک زبان سے۔''

ڈاکٹر ایبٹ نے کہا۔ ''آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی لیکن میرے کان تو کھلے تھے اور میں سونگھ بھی سکتا تھا...... درحقیقت میں سونگھنے کی وجہ سے ہی جان سکا کہ میں کہاں لایا گیا ہوں۔''

اس نے چند لمحے توقف کر کے اپنے رخسار اور ٹھوڑی کی چوٹوں کو سہلایا پھر کراہتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ ''جو بو میرے نتھنوں سے ٹکرا رہی تھی۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ میں ایک کھاد فیکٹری میں ہوں۔ اس نتیجے تک پہنچنے میں اردگرد چلنے والی دو تین مشینوں کی آوازوں نے بھی مدد دی۔ شہر سے کچھ فاصلے پر وہ ایک ہی کھاد فیکٹری ہے اور مجھے ننانوے فیصد یقین ہے کہ مجھے وہیں لے جایا گیا تھا۔''

''کیا دیکھا وہاں تم نے؟'' میں نے دریافت کیا۔

ڈاکٹر ایبٹ نے ڈری ڈری نظروں سے ایک بار پھر جمشید ملک کا جائزہ لیا۔ جمشید اپنی نوک دار مونچھوں کو مروڑ رہا تھا۔ ایبٹ نے بات جاری رکھی۔ ''وہاں کافی بڑے دو یا تین تہ خانے ہیں۔ وہاں ایک کمرے میں تین تین، چار چار سال کے پانچ چھ بچے تھے۔ وہ کئی جگہ سے جھلسے ہوئے تھے۔ دو بچوں کے جسم تو ستر اسّی فیصد جل چکے تھے اور ان کے بچنے کا امکان نہیں تھا۔ باقی کے بارے میں امید کی جا سکتی تھی۔ میں نے انہیں ''پلاسٹک آؤلیٹرز'' میں رکھوایا اور ضروری طبی امداد دی۔ میں اگلے چوبیس گھنٹے تک وہیں پر رہا۔''

''وہاں اور کس سے ملاقات ہوئی تمہاری؟'' جمشید نے کڑے لہجے میں پوچھا۔

''درمیانی عمر کا ایک بارعب سا بندہ تھا۔ اس کے ماتحت اس سے بہت زیادہ ڈرتے تھے...... حالانکہ ماتحت خود بھی کافی دبنگ لوگ تھے۔''

''درمیانی عمر کے شخص کا حلیہ کیا تھا؟'' میں نے سوال کیا۔

ڈاکٹر ایبٹ نے جو حلیہ بیان کیا، اس نے میری دھڑکنیں بڑھا دیں۔ یقیناً قسطینا کی کیفیت بھی یہی رہی ہوگی۔ یہ ٹوٹے ہوئے ٹیکساری گینگ کے باس جان ڈیرک کا حلیہ تھا۔ اس کے بارے میں جو آخری بات ایبٹ نے بتائی، اس نے ہمارے اندازوں پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ ایبٹ نے کہا۔ ''اس شخص کے ایک پاؤں پر شاید کوئی زخم تھا۔ وہ اس پر پوری طرح بوجھ نہیں ڈال پاتا تھا۔''

قسطینا نے پوچھا۔ ''جن بچوں کا تم نے علاج کیا، ان کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے، وہ کون تھے؟ اور وہاں کیوں تھے؟''

اس سوال کا ڈاکٹر نے جو جواب دیا، وہ ہمارے لیے بے حد سنسنی خیز تھا اور ہمارے بدترین اندیشوں کی تصدیق بھی کرتا تھا۔ وہ بولا۔ ''میں اس بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتا، نہ ہی مجھ میں اتنی ہمت تھی کہ ان لوگوں سے بچوں کے بارے میں کرید کر سوالات کرتا۔ یہ بات میں اچھی طرح جان گیا تھا کہ یہ کوئی کالا دھندا ہی ہے...... ہاں ایک بات میرے

دماغ میں ضرور کھٹکی...... اور اب بھی کھٹک رہی ہے۔ یہ پانچ چھ بچے بالکل ہم عمر تھے اور ان کی شکل وصورت بھی کافی ملتی جلتی تھی۔''

اب مزید کسی تصدیق کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ میری اور قسطینا کی نگاہوں کا سنسنی خیز تبادلہ ہوا۔ ہم سمجھ گئے کہ ٹیکساری گینگ پر ایک فیصلہ کن ضرب لگانے کا وقت آ گیا ہے۔ ہم نے ڈاکٹر ایبٹ سے تھوڑی سی پوچھ گچھ مزید کی، پھر اسے کمرے میں بند کر کے دوسرے کمرے میں چلے گئے اور سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔

○......❖......○

یہ روم کی ایک ٹھٹھری ہوئی دھند آلود رات تھی۔ سڑکوں پر حدِ نگاہ بہت کم رہ گئی تھی۔ یہ بارہ بجے کا وقت تھا۔ ہر طرف ایک تاریک سناٹے کا راج تھا۔ ہم ایک ٹرک پر سوار تھے جس پر ڈیری کی مصنوعات فروخت کرنے والی کسی کمپنی کا نام موٹے حروف میں درج تھا۔ ٹرک میں میرے اور جمشید ملک کے علاوہ قسطینا اور پہلوان حشمت بھی موجود تھے۔ ٹرک کے عقبی حصے میں ہماری ضرورت کا کافی سامان آٹومیٹک رائفلز، ایمونیشن، گیس ماسکس اور ہینڈ گرینیڈز کی صورت میں موجود تھا۔ جمشید ملک چاہتا تو آٹھ دس مسلح افراد بھی اس کارروائی کے لیے مہیا کر سکتا تھا مگر اس کھاد فیکٹری کی پوری صورتِ حال جاننے کے بعد میں نے اور قسطینا نے اسے منع کر دیا تھا۔

یہ کافی وسیع وعریض کھاد فیکٹری تھی مگر پچھلے ایک سال سے قریباً بند پڑی تھی، بس اس کا ایک چھوٹا سا یونٹ ہی کام کر رہا تھا۔ یورپی ممالک میں آج کل زیادہ تر کام مشینوں نے سنبھال رکھا ہے۔ بڑے بڑے کارخانوں اور دفاتر کو معدودے چند افراد چلا لیتے ہیں اس فیکٹری میں بھی پانچ چھ ملازم ہی ڈیوٹی دیتے تھے اور وہ بھی دن کے اوقات میں۔ نیچے تہ خانوں میں جو اصل سرگرمی جاری تھی۔ اس کی نگہداشت بھی آٹھ دس افراد ہی کرتے تھے۔ یہ اعداد وشمار ہم نے ڈاکٹر ایبٹ کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں نکالے تھے...... بعد ازاں یہ درست بھی ثابت ہوئے۔

ہمارا ٹرک درمیانی رفتار سے چلتا ہوا اس وسیع فیکٹری کے دائیں پہلو کی طرف آ گیا۔ فیکٹری کے اس جانب کی زمین ابھی خالی پڑی تھی۔ آثار بتاتے تھے کہ اس پر کاشت ہوتی ہے لیکن فی الوقت کاشت بھی نہیں تھی۔ فیکٹری کی چار دیواری قریباً پندرہ فٹ اونچی تھی۔ خاردار تاروں نے اس کی بلندی میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ جگہ جگہ سرچ لائٹس بھی تھیں۔ ان لائٹس کی موجودگی میں بلی کا بچہ بھی دیوار کے بالائی سرے پر نظر آتا تو دکھائی دے جاتا۔

یقیناً نگرانی کے کیمرے بھی یہاں موجود تھے مگر ابھی تھوڑی دیر میں یہ سب انتظامات ناکام ہونے والے تھے۔ جمشید ملک نے الیکٹرسٹی کے ایک ایسے اہلکار سے رابطہ کیا تھا جو اس صنعتی ایریا میں بجلی کی سپلائی کا ذمے دار تھا۔ اس نے ایک بھاری رقم وصول کی تھی اور اس کے عوض وہ آج رات عین بارہ بج کر تیس منٹ پر اس ایریا کی بجلی دس منٹ کے لیے منقطع کرنے والا تھا۔ یہ آٹھ دس منٹ ہمارے لیے اندر گھسنے کے لیے بہت کافی تھے۔ (دیگر یورپی ممالک کے برعکس اٹلی میں کرپشن و رشوت ستانی ہمیشہ موجود رہی ہے)

ہم پوری طرح تیار ہو کر آئے تھے۔ ضروری اسلحے کے علاوہ تار کاٹنے والے اوزار بھی ہمارے رک سیکٹر (پشتی تھیلوں) میں موجود تھے۔ پروگرام کے مطابق فی الحال جمشید ملک اور پہلوان حشمت کو ٹرک میں ہی رہنا تھا۔ جمشید کے پاس سیل فون اور واکی ٹاکی دونوں موجود تھے اور اسے مسلسل رابطے میں رہنا تھا۔

ٹرک جمشید ڈرائیو کر رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''ہیڈ لائٹس آف کر دو اور اسے موڑ کر باؤنڈری وال کے بالکل پاس لے جاؤ۔''

اس نے میری ہدایت پر عمل کیا، یہی وقت تھا جب فیکٹری اور اردگرد کی بجلی کی رو منقطع ہو گئی۔ ہر طرف پھیلے ہوئے اندھیرے میں کچھ مزید اضافہ ہو گیا۔ فیکٹری کے اندرونی حصوں میں اب بھی مدھم روشنی تھی۔ جمشید نے کہا۔ ''یہ اندر کے جنریٹر وغیرہ کی روشنی ہے، یا پھر یو پی ایس وغیرہ ہوں گے۔''

''ہمیں اس سے کوئی مسئلہ نہیں۔'' قسطینا نے کہا اور ٹرک سے باہر نکلنے اور اوپر چڑھنے کے لیے تیار ہو گئی۔ وہ ایک اعلیٰ تربیت یافتہ کمانڈو تھی اور میں اس کی ان صلاحیتوں سے جاما جی میں بہت اچھی طرح واقف ہو گیا تھا۔

ہم دونوں ٹرک سے باہر نکلے اور سائڈ والی آہنی سیڑھی پر چڑھ کر ٹرک کے کیبن کی چھت پر آ گئے۔ اب باؤنڈری وال تک پہنچنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ پہلے میں اوپر گیا۔ وال کی موٹائی پندرہ انچ کے لگ بھگ تھی۔ اس پر پاؤں جما کر کھڑے ہونا زیادہ دشوار نہیں تھا۔ اوپر جا کر میں نے قسطینا کا ہاتھ پکڑا اور وہ بھی اوپر آ گئی۔ خاردار تار کی چار لائنیں تھیں۔ دو میں نے اور دو قسطینا نے کاٹ ڈالیں۔ ہمارے پاس وقت زیادہ نہیں تھا۔ قریباً آٹھ منٹ گزر چکے تھے۔ لائٹ کسی بھی وقت واپس آ سکتی تھی۔ ہم دونوں دیوار سے لٹک کر اندر کی طرف کود گئے۔ کلاشنکوف رائفلیں ہماری گردنوں سے جھول رہی تھیں، ہم انہیں ایک لمحے کے نوٹس پر استعمال کر سکتے تھے۔

''مجھے لگتا ہے کہ سی سی ٹی وی کیمرے بھی بند ہیں۔''قسطینا نے تیز سرگوشی کی۔
''مگر کمروں میں لائٹ آ رہی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اندر کیمرے بھی چل رہے ہوں۔''
''ہمیں جانا کس طرف ہے؟''اس نے پوچھا۔
میں نے اطراف کا جائزہ لیا۔ ڈاکٹر ایبٹ نے جو کچھ بتایا تھا، کافی مبہم تھا۔ مگر اتنا اندازہ تو ہو ہی چکا تھا کہ زیرِ زمین جانے کا راستہ کس طرف ہوگا۔
کسی قریبی برآمدے سے کوئی شخص بلند آواز میں پکارا۔''مین ڈی پی کو چیک کرو، یا پھر کال کرو ان حرام زادوں کو۔''
''جی سر۔'' کسی ماتحت نے جواب دیا۔ پھر ایک سایہ سا سیدھا ہماری طرف ہی بڑھا۔ وہ شاید مین سوئچ چیک کرنے کے لیے آرہا تھا۔ اس کے پیچھے ایک اور باوردی مسلح شخص بھی تھا۔ جس کے ہاتھ میں ٹارچ تھی۔ ہم فی الوقت کوئی ہنگامہ افورڈ نہیں کر سکتے تھے۔ ایک دیوار کے ساتھ تاریک کونے میں سمٹ کر کھڑے ہو گئے۔ یہ بالکل مختصر جگہ تھی، شاید دو تین فٹ مربع کی۔ یہاں گہری تاریکی تھی۔ ہم ایک دوسرے سے لگ کر کھڑے تھے۔ ہمارے نتھنوں میں کھاد فیکٹری کی مخصوص بو داخل ہو رہی تھی اور کچھ فاصلے پر چلنے والی کسی چھوٹی مشین کی آواز تھی۔ مسلح افراد ہمارے قریب موجود تھے اور باؤنڈری وال کے قریب لوہے کی ایک فرشی کیبنٹ سے چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے پھر ایک اور ٹارچ بردار بندہ بھی وہاں پہنچ گیا۔ قسطینا اتنا قریب تھی کہ میں نہ صرف اس کے جسم کی حرارت محسوس کر رہا تھا بلکہ اس کی تیز دھڑکنیں بھی سن رہا تھا۔ لیکن ان دھڑکنوں میں کسی طرح کے ڈر کے بجائے ایک طرح کا جوش تھا۔ وہی جوش اور ولولہ جو خطرات سے کھیلنے والے لوگوں کے دلوں میں بوقتِ مبارزت پیدا ہوتا ہے۔ اس کی سانس میری گردن سے ٹکرا رہی تھی اور اس کے تراشیدہ بال میری ناک سے چھو رہے تھے۔ کوئی اور موقع ہوتا تو شاید ہم اس صورتِ حال پر جھجک محسوس کرتے لیکن یہ خطرے کی گھڑیاں تھیں۔ ایک ٹارچ کا روشن دائرہ ہمارے پاؤں کی جانب آیا تو میں نے قسطینا کو کچھ اور بھی اپنی طرف کھینچ لیا۔
جلد ہی شخص آگے نکل گیا۔ ٹارچ بردار بھی تیز قدم اٹھاتے ہوئے فیکٹری کے سامنے والے حصے کی طرف بڑھ گئے۔ ہم ایزی ہو کر کھڑے ہو گئے اور یہی وقت تھا جب فیکٹری کی برقی رو بحال ہو گئی۔ وہ جگہ جہاں ہم کھڑے تھے، کئی دیگر جگہوں سمیت یک دم روشنی میں آ گئی۔ اگر بجلی کی رو چند سیکنڈ پہلے بحال ہو جاتی تو ہم فوراً ان تین افراد کی نگاہوں میں آ جاتے جو مین سوئچ وغیرہ چیک کر رہے تھے۔

''میرا خیال ہے کہ اب نکلیں یہاں سے۔'' میں نے کہا۔ میری نگاہ فیکٹری کے وسیع احاطے کے مرکز کی طرف تھی۔ یہاں بہت سی بیکار مشینری، پلاسٹک کی شیٹس میں لپٹی پڑی تھی۔ پلاسٹک جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا اور ہوا میں لہرا رہا تھا۔

ہم جھک کر دوڑتے ہوئے اس ہیوی مشینری کی بھول بھلیوں میں گھس گئے۔ ''رکو شاہ زائب!'' اچانک قسطینا نے چونکی ہوئی آواز میں تیز سرگوشی کی۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ قسطینا، ایک ڈھلوان چھت والے تنہا کمرے کے سامنے کھڑی تھی۔ کمرے کے دروازے کے آگے ایک بڑا شیڈ تھا۔ کمرے کا دروازہ سلائڈنگ تھا اور اسٹیل سے بنا ہوا تھا۔ ''ایسے دروازے عام طور پر ''بیس مینٹس'' وغیرہ میں کھلتے ہیں۔'' وہ دھیمی اور پُر اعتماد آواز میں بولی۔

''ایسا ہی لگ رہا ہے۔'' میں نے تائید کی۔ ''مگر ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ یہاں سی سی ٹی وی موجود ہیں۔ ہمیں ڈائریکٹ ایکشن لینا ہوگا۔''

میں نے کلاشنکوف کا آہنی دستہ پورے زور سے سلائڈنگ دروازے کے کنٹرول پینل پر مارا۔ پینل میں شارٹ سرکٹ ہوا اور اسپارک کے ساتھ دھواں نکلنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی سلائڈنگ ڈور نے ''مستی'' شروع کر دی۔ اس کے پٹ قریباً دو فٹ تک کھلے اور پھر تیزی سے بند ہو گئے۔ دروازے کی طرف سے یہ حرکت بار بار ہونے لگی۔ وہ دو فٹ تک کھل کر پھر بند ہو جاتا تھا۔ ہم تیزی سے اس میں داخل ہو گئے۔ قسطینا نے دروازے کے اندر والے کنٹرول پینل سے ذرا سی چھیڑ چھاڑ کی اور دروازے کی ''مستی'' ختم ہو گئی۔ وہ مکمل طور پر بند ہو گیا۔ ایک خم دار زینہ نیچے کی طرف جا رہا تھا۔ ہم نے رائفلیں بالکل تیار حالت میں کر لیں۔ احتیاط سے قدم اٹھاتے ہم ایک اور دروازے کے سامنے پہنچے۔ دروازے کے آس پاس خاموشی تھی۔ میں نے اسے دھکیلا اور وہ بے آواز کھل گیا۔ اس کے کھلنے کے ساتھ ہی اندر کسی جگہ سے ہلکی آوازیں سنائی دینے لگیں جیسے کسی ہال کمرے میں کچھ لوگ باتیں کر رہے ہوں۔

یکایک ایک قوی ہیکل گن مین ہمارے سامنے آ گیا۔ ہمیں دیکھ کر اس کے چہرے پر حیرت کی یلغار ہوئی اور اس کے ہاتھ بے ساختہ اپنی رائفل کی طرف بڑھے۔ قسطینا نے رائفل کا آہنی دستہ گھما کر اس کے جبڑے پر رسید کیا۔ وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح میری طرف آیا۔ میں نے اسے ''ویل کم'' کیا۔ اسے اپنے بائیں بازو پر سہارتے ہوئے میں نے اسی بازو سے اس کی گردن جکڑ لی۔ چند سیکنڈ بعد وہ ایک نیم روشن گوشے میں ایک خاصے

بڑے ڈسٹ بن کے اندر دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑا تھا۔

میں اور قسطینا آوازوں کی سمت بڑھے۔ یہ ساری جگہ مرکزی طور پر گرم تھی۔ دو تین صاف ستھری طویل راہداریاں بھی نظر آئیں۔ بڑے سائز کے کچن اور کھیلوں کے لیے مخصوص ہال بھی دکھائی دے رہے تھے۔ یہ رات کے قریباً ایک بجے کا عمل تھا مگر کہیں سے کھانوں کی خوشبو اٹھ رہی تھی اور الکحل کی بو بھی چکراتی محسوس ہوتی تھی۔ تین خانساماں ٹائپ ملازم نظر آئے جو کھانے کی بڑی بڑی ٹرالیاں دھکیلتے ہوئے کسی ہال کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔ ہم نے ایک بڑے ستون کے عقب میں خود کو چھپایا۔

''یہاں کچھ بچے ہیں۔'' قسطینا نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

''اتنے بچے بھی نہیں ہیں۔ آوازوں سے تو لڑکے اور لڑکیاں لگ رہے ہیں۔''

کچھ ہی دیر بعد ہم اس قابل ہو گئے کہ ایک بلند و بالا کھڑکی کے اندر سے ہال میں جھانک سکیں۔ اندر کا سرخ پردہ کچھ سرکا ہوا تھا اور منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ہمارے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ اس ہال کمرے میں قریباً چالیس بچے موجود تھے۔ لیکن ہماری توقعات کے برخلاف ان کی عمریں چودہ پندرہ سال کے لگ بھگ تھیں۔ ان میں سے پچیس کے قریب لڑکے اور پندرہ کے لگ بھگ لڑکیاں تھیں۔ سب لڑکیوں کے بال بہت چھوٹے چھوٹے تھے اور لڑکوں کے سر مکمل طور پر منڈے ہوئے تھے۔ لڑکپن کی اس کچی عمر میں بھی ان سب کے طور اطوار پکی عمروں والے تھے بلکہ اس سے بھی آگے کے تھے۔ وہ کھانے کی میزوں پر ندیدوں کی طرح کھا رہے تھے اور ''پی'' رہے تھے۔ کچھ ڈانسنگ فلور پر تھے اور بے ہودہ انداز میں اچھل کود کر رہے تھے۔ یہ سب تقریباً ہم شکل تھے۔ نیم عریاں لباسوں والی نوخیز لڑکیاں بھی پیچھے نہیں تھیں۔ دو لڑکیاں نشے میں دھت آپس میں گتھم گتھا تھیں اور غلیظ گالیاں بک رہی تھیں۔ ایک لڑکی کچھ دور ایک میز پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھی تھی۔ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے اور چہرے پر تازہ چوٹیں نظر آتی تھیں۔ یقیناً وہ بھی کچھ دیر پہلے کسی سے سر پھٹول کرتی رہی تھی۔ ڈانسنگ فلور سے کچھ فاصلے پر تین چار لڑکیاں پانچ چھ لڑکوں کے ساتھ فحش حرکات میں مصروف تھیں۔ ان سب کی شیطانی ہنسی ہال میں گونجتی محسوس ہوتی تھی۔

''اس شیطانی ٹولے کی نئی پود۔'' میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

''بے شک لیکن ہمارے خیال میں تو یہاں چھوٹی عمر کے بچے تھے؟'' قسطینا نے سرگوشی کی۔

''عین ممکن ہے کہ وہ بھی ہوں۔''

یہی وقت تھا جب قسطینا نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ دھیان سے کچھ سن رہی تھی۔ میں نے بھی دھیان دیا۔ کہیں پاس سے ہی چھوٹے بچوں کے رونے کی باریک آواز سنائی دی۔ یہ بالکل چھوٹے بچے لگتے تھے۔ جیسے چار پانچ ماہ کے۔

''یقیناً اور بچے بھی ہیں یہاں۔'' میں نے کہا۔

ہم بڑی احتیاط کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھے اور ایک دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے چھوٹے بچوں کی آوازوں کی طرف بڑھے۔ کئی جگہ ہمیں تیزی کے ساتھ خود کو کسی اوٹ میں کرنا پڑا، کیونکہ یہاں میل اور فی میل ملازمین کی آمدورفت جاری تھی۔ یہ سب کے سب نیلے رنگ کی وردیوں میں تھے۔

جلد ہی ہم ایک اور ہال کمرے کے اندر جھانکنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس ہال کمرے کو دبیز شیشے کی ایک دیوار کے ذریعے دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ یہاں مدھم نیلگوں روشنی تھی۔ ہال کے ایک حصے میں چھوٹے چھوٹے بیڈز پر کوئی چالیس کے لگ بھگ بچے سو رہے تھے۔ ان کی عمریں وہی تین تین چار چار سال تھیں۔ ان کی نگہداشت کے لیے دو ملازمائیں یہاں موجود تھیں، جیسے اسپتالوں کے وارڈز میں نرسیں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں، یہ بھی [illegible]ت میں تھیں۔ ہال کے دوسرے پورشن میں بیڈز کے بجائے بے بی کارٹس تھیں۔ ان کارٹس میں جو چھوٹے بچے سو رہے تھے (یا رو رہے تھے) ان کی عمریں مشکل سے چار پانچ ماہ کی ہوں گی۔ ان کی تعداد تیس کے قریب تھی۔ یہاں بھی آیا جیسی تین ملازمائیں موجود تھیں۔

میرے اور قسطینا کے اندر کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ وہ سرگوشی میں بولی۔ ''تو یہ ہے وہ نرسری جس کا ذکر پرنس سومو نے کیا تھا۔''

''نرسری نہیں بلکہ نرسریاں۔ شاید تین نرسریاں۔''

یکایک بھاری قدموں کی آواز نے ہمیں ٹھٹکا دیا۔ کوئی گارڈ اس رخ پر آ رہا تھا۔ ہم اس صورتِ حال کے لیے پہلے سے تیار تھے۔ لپک کر ایک چھوٹے سے دروازے میں داخل ہو گئے۔ ہم تھوڑی دیر پہلے دیکھ چکے تھے، یہ ایک چھوٹا سا اسٹور روم تھا۔ یہاں تاریکی تھی اور گتے کے بڑے بڑے کارٹن رکھے تھے۔ یہ خشک دودھ، ڈائپرز اور ادویات وغیرہ کے کارٹن تھے۔ ہم ان کے عقب میں ایک خلا کے اندر سمٹ کر بیٹھ گئے۔

''اب کیا کرنا ہے؟'' قسطینا نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

"یہ شیطانوں کی نئی فصل تیار ہو رہی ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس زہریلی فصل کا کاشت کار وہ حرامی جان ڈیرک بھی یہیں موجود ہے۔" میں نے ذرا توقف کیا اور پھر پختہ ارادے سے کہا۔ "قسطینا! ہم اس ٹیکساری گینگ کی اصل جڑ تک پہنچ گئے ہیں۔ ہمیں یہ سب کچھ ختم کرنا پڑے گا...... سب کچھ۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہی، پھر سرسراتے لہجے میں بولی۔ "تمہارا مطلب ہے کہ یہ سب بچے بھی؟"

"یہ بچے نہیں ہیں قسطینا! یہ انسان نما حیوان ہیں۔ یہ ایک بڑے طوفان کی نشانیاں ہیں۔"

"لیکن شاہ زائب......" وہ ایک دم خاموش ہو گئی۔ جو وہ کہنا چاہ رہی تھی، وہ میں سمجھ رہا تھا۔ غالباً وہ یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ اس میں چار پانچ ماہ کے اور تین چار سال کے بچوں کا کیا قصور تھا۔ وہ اس دنیا میں آچکے تھے اور ابھی بے ضرر تھے۔ ایسی ہی بات میرے ذہن میں بھی آرہی تھی اور اس بارے میں سوچا جا سکتا تھا...... لیکن یہ تو بعد کی باتیں تھیں، فی الوقت تو ہمیں اس بڑے شیطان کی تلاش تھی جس کی بے مثال خباثت کے زیر اثر یہ سارا "کارخانہ" چل رہا تھا۔

قسطینا نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر چپ ہو گئی۔ ہمیں اسٹور روم کے اندرونی دروازے کی دوسری جانب قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ پھر اندرونی دروازے کے ہضمی قفل میں چابی گھومنے کی آواز آئی، ہم بالکل الرٹ ہو گئے۔ دروازہ کھلا۔ کسی شخص نے اسٹور روم کی لائٹس آن کر دیں۔ میں نے کارٹنز کے عقب سے دیکھا۔ یہ کافی بڑے اور لمبوترے چہرے والا کوئی ڈچ ڈاکٹر لگتا تھا۔ اس نے سفید کوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ جھک کر کھڑا ہو گیا اور ایک بڑے ریفریجریٹر کے اندر سے کوئی دوا تلاش کرنے لگا۔ میں نے بڑی تیزی کے ساتھ اس اسٹور روم کا جائزہ لے لیا تھا۔ مجھے کہیں کوئی سی سی ٹی وی کیمرہ نظر نہیں آیا۔ میں نے قسطینا کی طرف دیکھا پھر لپک کر دراز قد ڈاکٹر کو عقب سے دبوچ لیا۔ اس کی عینک اتر کر دور جا گری۔ میں نے اس کی گردن اپنے بازو میں جکڑ لی تھی، وہ کوئی آواز نہیں نکال سکا۔

اگلے چار پانچ منٹ اس ڈاکٹر کے لیے بے حد بھیانک تھے۔ مجھ پر وحشت سوار تھی۔ میں جانتا تھا اور قسطینا بھی جانتی تھی کہ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ تہ خانوں کے بیرونی دروازے کا ٹوٹا ہوا کنٹرول پینل کسی بھی وقت سیکیورٹی والوں کی نظر میں آسکتا

تھا۔ ڈسٹ بن میں پڑا ہوا بے ہوش گارڈ بھی زیادہ دیر چھپا نہیں رہ سکتا تھا۔ میں نے ڈچ ڈاکٹر کے منہ میں اسی کا اسکارف گلے تک ٹھونس دیا تھا۔ میرے تیز ''دھار خنجر'' نے کام دکھایا تھا اور ڈاکٹر موصوف کے بائیں ہاتھ کی ''چار انگلیاں'' کاٹ کر ایک طرف رکھ دی تھیں۔ ڈاکٹر کا خون بڑی تیزی سے ضائع ہو رہا تھا۔ جب میں نے قسطینا سے سائیلنسر لگا پستول لے کر ڈاکٹر کی نیم سفید کنپٹی پر دھرا اور اسے باور کرایا کہ وہ عدم آباد روانہ ہو رہا ہے تو اس کے کپڑے گیلے ہو گئے اور اس نے سر کے اشارے سے مجھے یقین دلایا کہ وہ مجھے اپنے حرامی باس و آقا ''جان ڈیرک'' کی تشریف گاہ میں لے جاتا ہے۔ ہم نے اسکارف اس کے منہ میں ہی رہنے دیا۔ تاہم تیزی سے نکلتے ہوئے خون کو روکنے کے لیے اس کی انگلیوں پر ایک عارضی بینڈ یج کس دی۔

وہ جن دو کوریڈورز میں سے، ہمیں لے کر گزرا وہاں کل تین سی سی ٹی وی کیمرے تھے۔ یہ تینوں کیمرے قسطینا نے اپنے سائیلنسر لگے پسٹل سے ناکارہ کیے۔ میں نے کلاشنکوف کا مختصر بیرل ڈاکٹر کی کنپٹی پر رکھا ہوا تھا اور اسے ذرا سی مہلت دینے کو بھی تیار نہیں تھا۔ ڈاکٹر نے ایک سلائڈنگ دروازے پر پہنچ کر بائیں ہاتھ سے کنٹرول پینل پر بٹن پریس کیے اور دروازہ کھل گیا۔ چند قدم آگے جا کر اس نے یہی عمل اسٹیل کے ایک اور مضبوط دروازے پر دہرایا۔

یہی وقت تھا جب تہ خانوں میں ایک تیز الارم بجنا شروع ہو گیا۔ اس کی آواز اتنی بلند اور باریک تھی کہ کانوں میں گھستی محسوس ہوتی تھی۔ مگر تب تک ہم ایک بڑا چوبی دروازہ کھول کر ایک لگژری بیڈ روم میں داخل ہو چکے تھے۔ ہمارے سامنے گہرے سلیٹی رنگ کے سلیپنگ گاؤن میں جو شخص موجود تھا، وہ یورپ میں دہشت کی علامت تھا۔ مغربی دنیا کا بدنام ترین گینگسٹر، ڈیتھ اسکواڈ کا بانی، انسان نما شیطانوں کا موجد، میرے لڑکپن کی فرینڈ ایزی کا سفاک قاتل، مجھے ایم اے کے دلکش میدان سے نکال کر جرم اور قتل و غارت کی دلدل میں دھکیلنے والا باسٹرڈ...... جان ڈیرک۔

''ہیلو جان ڈیرک۔'' میں نے کہا۔ ''آج کی رات بڑی نصیبوں والی ہے۔ پاکستان سے اتنی دور تمہاری شکل پھر دیکھنے کو مل گئی۔''

''خبردار۔'' قسطینا گرجی۔ ''اپنے یہ منحوس ہاتھ اپنے گاؤن کی جیبوں سے دور رکھو۔''

قسطینا کی گرج سن کر وہ جہاں کا تہاں رک گیا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت کا دریا بہہ رہا تھا۔

یہی وقت تھا جب ایک بلند دہاڑ سنائی دی۔ میں نے پتھرائی نظروں سے دیکھا۔ ڈیتھ اسکواڈ کا ایک سرمنڈا شیطان بڑی وحشت کے ساتھ کسی گوشے سے نکلا اور قسطینا پر حملہ آور ہوا۔ اس کے ہاتھ میں تقریباً ایک فٹ لمبے پھل والا نہایت تیز دھار چھرا تھا...... اس چھرے کا نشانہ قسطینا کی شہ رگ تھی۔

بس یہ سیکنڈ کے دسویں حصے کا کھیل تھا۔ تیز دھار چمکیلا چھرا تھا اور قسطینا کی شہ رگ تھی......قسطینا تیزی سے پیچھے کی طرف گری۔ چھرا اس کی گردن کو جیسے چھوتا ہوا گزر گیا۔ وہ پشت کے بل گری اور گن اس کی گرفت سے نکل گئی۔ سرمنڈا شیطان وحشی ہو رہا تھا۔ وہ ایک چنگھاڑ کے ساتھ قسطینا پر جھپٹا۔ میں نے اس پر کلاشنکوف کا فائر کیا۔ چار گولیاں برسٹ کی شکل میں نکلیں مگر ان میں سے ایک بھی شیطان کو چھو نہیں سکی۔ اس نے قسطینا کو چھاپ لیا۔ چھرے کا دوسرا وار اس نے قسطینا کے چہرے پر کرنا چاہا۔ قسطینا نے اس کی کلائی پکڑ کر کوشش بھی ناکام بنادی۔

یہ سب کچھ ایک یا دو سیکنڈ کے اندر ہوا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا جان ڈیرک فرار ہو رہا تھا۔ وہ لنگڑاتا ہوا دروازے کے پیچھے اوجھل ہوا۔ اس کے پیچھے جانا ضروری تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ قسطینا اکیلی، سرمنڈے شیطان سے نمٹ سکتی ہے۔ اس نے ان شیطانوں کی سرغنہ ریڈکیٹ کو ناکوں چنے چبوا دیئے تھے، یہ تو پھر ریڈکیٹ کا ماتحت تھا۔

میں تیزی سے جان ڈیرک کے پیچھے لپکا لیکن اس سے پہلے میں نے ایک کام کیا۔ قسطینا اور گنجے قاتل کا پلڑا برابر رکھنے کے لیے میں نے وہاں موجود ڈچ ڈاکٹر کے میں پورا ایک برسٹ منتقل کردیا۔ میں رائفل بدست کمرے سے نکلا تو جان ڈیرک ایک سلائڈنگ دروازے کے پیچھے اوجھل ہو رہا تھا...... بلکہ اوجھل ہو چکا تھا۔ اسٹیل کا دروازہ سلائڈ کرتے ہوئے بند ہو رہا تھا۔ بمشکل ایک فٹ خلا باقی رہ گیا تھا۔ میں نے پوری رفتار سے دروازے کی طرف دوڑ لگائی۔ ارادہ یہی تھا کہ دروازے کے پوری طرح بند ہونے سے پہلے اس میں کلاشنکوف کا بیرل گھسا دوں گا مگر یہ ہو نہ سکا۔ میرے پہنچنے تک دروازہ بند ہو چکا تھا۔ یہ بڑا ہیوی دروازہ تھا۔ میں نے اضطراب کے عالم میں پہلے اس پر ٹانگیں رسید کیں پھر اس کے کنٹرول پینل کو کلاشنکوف کے برسٹ سے اڑا دیا۔ اس کا بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ دروازہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔

جان ڈیرک نے خود کو اس محفوظ دروازے کے پیچھے قید کرلیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ مجھے فوری طور پر کیا کرنا چاہیے؟ میں واپس جان ڈیرک کے بیڈروم کی طرف آیا

میرے پہنچنے تک وہاں قسطینا اور سرمنڈے شیطان کے درمیان زندگی اور موت کا کھیل ختم ہو چکا تھا۔قسطینا نیچے تھی اور شیطان زادہ اس کے اوپر تھا۔تاہم شیطان زادے کے جسم میں گولیوں کے کم وبیش دس سوراخ موجود تھے۔قسطینا کے مشین پسٹل نے اسے چھلنی کر ڈالا تھا۔وہ اسے اپنے اوپر سے دھکیلتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''جان ڈیرک کہاں ہے؟''قسطینا نے ہانپی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''اس نے خود کو ایک چیمبر میں بند کرلیا ہے۔''میں نے کہا۔

دس گولیاں کھانے کے باوجود ڈیتھ اسکواڈ کے جنونی قاتل کا جسم ابھی تک پھڑک رہا تھا۔وہ سیدھا قسطینا کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔وہ انسانی آنکھیں نہیں تھیں۔کسی درندے کی بھی نہیں تھیں......وہ جیسے کسی بدروح کی آنکھیں تھیں۔اچانک اس نے ہاتھ بڑھا کر قسطینا کا ٹخنا پکڑ لیا۔وہ قسطینا کو اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا۔میں نے کلاشنکوف اس کی طرف سیدھی کر لی مگر میں جانتا تھا کہ فائر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔شیطان زادے میں اب اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ قسطینا کو اپنی طرف گھسیٹ سکتا۔چند سیکنڈ میں اس کی نگاہ پتھرا گئی اور اس کی مجبور آنکھوں پر موت کی مہر ثبت ہوگئی۔قسطینا کے ٹخنے پر اس کی گرفت اب بھی قائم تھی۔قسطینا نے اس کی یہ گرفت دوسرے پاؤں کی ٹھوکر سے ختم کی اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔''اب کیا کرنا ہے شاہ زائب؟''اس نے پوچھا۔

ہم ایک بار پھر اس کمرے کی طرف بڑھے جہاں جان ڈیرک نے خود کو محصور کیا تھا۔ایسا کرتے ہوئے ہمیں ڈچ ڈاکٹر کی لاش کو پھلانگ کر گزرنا پڑا۔لاش کا ایک ہاتھ چار انگلیوں کے بغیر تھا۔یہ ان کٹی ہوئی چار انگلیوں کا کرشمہ ہی تھا کہ سخت جان ڈاکٹر ہمیں یہاں ڈیرک کے بیڈروم تک لے آیا تھا۔ہم بند سلائڈنگ دروازے کے سامنے پہنچے۔دروازے کے نیچے قریباً ایک انچ کی درز موجود تھی۔میں نے نیچے جھک کر اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس درز سے منہ لگایا اور پکار کر کہا۔''ڈیرک!خود کو ہمارے حوالے کر دو۔ہم ان تہ خانوں کو آگ لگانے والے ہیں۔جل مرنا کوئی آسان کام نہیں ہے،بہتر یہی ہے کہ باہر نکل آؤ۔''

اندر سے کسی طرح کا کوئی جواب نہیں آیا۔قسطینا نے کلاشنکوف کی نال دروازے کی نچلی درز میں رکھی اور ایک طویل برسٹ چلایا۔برسٹ کی آواز ان تہ خانوں میں دور تک گونجی۔ہمیں صاف پتا چل رہا تھا کہ ہمارے اردگرد لوگ موجود ہیں مگر وہ ہمارے قریب نہیں آرہے تھے۔

ہم دونوں نے ایک محفوظ جگہ پر پوزیشن لے لی۔ہمارے عقب میں تہ خانے کی

سنگلاخ دیوار تھی اور سامنے ایک پتھریلا کاؤنٹر تھا۔ ”کیا بات ہے۔ یہ لوگ ہمارے قریب کیوں نہیں آرہے؟“ قسطینا نے رائفل سے نیا میگزین اٹیچ کرتے ہوئے پوچھا۔

”ہوسکتا ہے کہ جاما جی کی کمانڈر انچیف سے ڈر رہے ہوں۔“ میں نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

”مذاق نہیں شاہ زائب، یہ ان کی کوئی حکمتِ عملی بھی ہوسکتی ہے۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق یہاں جان ڈیرک کے کم از کم بیس مسلح گارڈز موجود ہیں۔ ان میں ڈیتھ اسکواڈ کے دو چار شیطان بھی ہوں گے۔ یہ لوگ اس طرح رکنے والے نہیں۔ خصوصاً اس صورتِ حال میں کہ جان ڈیرک بھی سلائڈنگ ڈور کے پیچھے چوہے کی طرح پھنسا ہوا ہے۔“

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا، ایک بار پھر جان ڈیرک کے کسی گارڈ کی للکار سنائی دی۔ ”تم کو گھیرا جاچکا ہے۔ بہت بری موت مارے جاؤ گے، خود کو حوالے کردو۔“

یہ دھمکی تیسری چوتھی بار دی گئی تھی مگر عملی طور پر کچھ نہیں کیا گیا تھا۔ اسی دوران میں کہیں آس پاس سے کسی کے پکارنے کی مدھم آوازیں آنے لگیں۔ یوں لگا کہ کوئی شخص کہیں پر بند ہے اور مدد کے لیے بلا رہا ہے۔ ”قسطینا! آپ چوکس بیٹھیں، میں دیکھتا ہوں یہ کون ہے۔“ میں نے کہا۔

قسطینا نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں پتھریلے کاؤنٹر کے عقب سے نکل کر آواز کی سمت گیا۔ یہ کوئی ”اسٹور روم“ ٹائپ جگہ تھی۔ میں نے لکڑی کے دروازے پر ایک چھوٹا برسٹ چلایا اور اس کا ہضمی قفل توڑتا ہوا اندر داخل ہوگیا۔ یہاں مجھے ایک ادھیڑ عمر شخص نظر آیا، اس کا لباس کوٹ پینٹ پر مشتمل تھا مگر یہ کوٹ پینٹ چیتھڑوں کی شکل اختیار کرچکے تھے۔ کھچڑی بالوں اور داڑھی والا یہ شخص شکل وصورت سے اٹالین ہی لگتا تھا۔ اس کے پاؤں میں ایک زنجیر تھی۔ اسے دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ بیمار ہے اور اس نہایت سرد، سیلن زدہ جگہ پر اذیت سے بھرپور وقت گزار رہا ہے۔

تھوڑی سی کوشش سے میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ جان ڈیرک کا ایک پرانا ساتھی بلاڈی تھا۔ اس کی نظر، مستقل طور پر تاریکی میں رہ کر اتنی کمزور ہوچکی تھی کہ وہ مجھے ٹھیک سے دیکھ بھی نہیں پا رہا تھا۔ بہر حال اتنی بات وہ سمجھ گیا تھا کہ یہاں میرے اور جان ڈیرک کے درمیان کوئی معرکہ چل رہا ہے اور گاہے بگاہے فائرنگ کا تبادلہ بھی ہورہا ہے۔ وہ بولا۔ ”تم جو کوئی بھی ہو، خوش قسمت ہو، تم ایک ایسی جگہ پر ہو جو ان تہ خانوں میں بہترین ہے۔“

''کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ سامنے والی گیلری دیکھ رہے ہو؟ ان لوگوں کا سارا اسلحہ اور ایمونیشن وہیں پر ہے اور یہ جگہ اتفاقاً تمہارے قبضے میں ہے۔ یہ کچھ نہیں کر سکتے۔ صرف دھمکیاں دے سکتے ہیں۔ بہترین موقع ہے۔ اُڑا دو ان حرام زادوں کو ختم کر دو۔''

بات سمجھ میں آ رہی تھی۔ گارڈز کافی تعداد میں ہونے کے باوجود ہمارے قریب نہیں آ رہے تھے۔ اس کے پیچھے غالباً یہی وجہ تھی۔ میں نحیف و نزار بلاڈی کو سہارا دے کر قسطینا کے پاس پتھریلے کاؤنٹر کے عقب میں لے آیا۔ میں نے قسطینا کو مختصر الفاظ میں بتایا کہ یہ بندہ کیا انکشاف کر رہا ہے۔

ابھی بمشکل میری بات مکمل ہوئی تھی کہ ڈیتھ اسکواڈ کا ایک شیطان زادہ کسی عفریت کی طرح چلاتا ہوا اس گیلری کی طرف لپکا جہاں بلاڈی کی اطلاع کے مطابق ہتھیار اور ایمونیشن موجود تھے۔ اس خبیث کو ایک لمحے کی مہلت دینا بھی حماقت تھی۔ میں نے اس کی چمکیلی کھوپڑی پر برسٹ چلایا اور کھوپڑی کو پھٹتے ہوئے سرخ تربوز کی شکل دے دی۔ اسی دوران میں بلاڈی نے پتھریلے کاؤنٹر کے عقب میں موجود ایک کنٹرول پینل پر چند بٹن پریس کیے۔ دیوار پر ایک ''سرویلینس ڈسپلے'' نمودار ہو گیا۔ چھوٹی چھوٹی دس بارہ اسکرینز پر ان تہ خانوں کے اور باہر کے مختلف مناظر نظر آنے لگے۔ ''یہ سب سے اہم منظر ہے۔'' بلاڈی نے ایک اسکرین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ اس گیلری کے پیچھے والے ہال کمرے کا منظر ہے۔''

ہم نے دیکھا کہ اس ہال کمرے میں کم و بیش چودہ پندرہ گارڈز موجود تھے مگر ایک دو کے سوا کسی کے پاس ہتھیار نہیں تھا۔ وہ سخت پریشانی کے عالم میں تھے اور ایک دوسرے سے جھگڑ رہے تھے۔ اس جھگڑے کی وجہ یقیناً ان کی اپنی ہی سنگین غلطی تھی۔ وہ جس جگہ پر اپنے ہتھیار رکھ آئے تھے، وہ جگہ اب ان کی پہنچ میں نہیں تھی۔ ان میں ایک شیطان زادہ بھی تھا اور وہ سب سے زیادہ مشتعل نظر آ رہا تھا۔ آواز تو نہیں آ رہی تھی لیکن شیطان زادے کے تاثرات اور انداز سے صاف پتا چلتا تھا کہ وہ اپنے ساتھی گارڈز کو گندی گالیاں دے رہا ہے پھر وہ طیش کے عالم میں چنگھاڑا اور اس نے اپنی گن سے اوپر تلے پانچ چھ فائر کیے، اس کے کئی ساتھی فرش پر گر کر تڑپنے لگے۔ باقیوں نے جان بچانے کے لیے اس پر حملہ کر دیا۔

بلاڈی مجھ سے مخاطب ہو کر چلایا۔ ''یہ بہترین موقع ہے مار دو ان سب کو۔''

''کہاں سے جانا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ ہماری رہنمائی کے لیے ہمارے آگے آگے دوڑا۔ شیطان زادے کی لاش اور اس کے پھٹے ہوئے ''تربوز'' کو پھلانگتے ہوئے ہم بلاڈی کے پیچھے لپکے۔ میں آگے اور قسطینا پیچھے تھی۔ کچھ آگے جا کر بلاڈی نے ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے ٹانگ مار کر دروازہ کھولا۔ اندر جان ڈیرک کے خونخوار گارڈز آپس میں ہی گتھم گتھا تھے۔ کچھ گارڈز شیطان زادے کی طرف ہو گئے تھے اور کچھ دوسری طرف۔ ان کی حالت ان دو پرندوں سے مشابہ تھی جو آپسی لڑائی میں اتنے مگن ہو جاتے ہیں کہ شکاری ان کو خالی ہاتھوں آسانی سے دبوچ لیتا ہے۔

میں نے اور قسطینا نے بے دریغ برسٹ چلائے۔ کلاشنکوف کی گونج دار آوازوں سے در و دیوار لرز اٹھے۔ ہم نے جان ڈیرک کے ساتھیوں کو اچھل اچھل کر زمیں بوس ہوتے دیکھا۔ یہاں موجود شیطان زادہ اپنے ہی ساتھیوں کی مار سے زخم زخم تھا مگر ابھی زندہ تھا۔ وہ کسی شکاری درندے کی طرح ہماری طرف لپکا۔ تب تک قسطینا ایک ہینڈ گرینیڈ کی سیفٹی پن کھینچ چکی تھی۔ اس کا پھینکا ہوا یہ "M-67" گرینیڈ سیدھا شیطان زادے کی چھاتی پر لگا۔ سماعت شکن دھماکے کے ساتھ اس کے پرخچے اُڑتے نظر آئے۔ ہم دیوار کی اوٹ میں ہو گئے تھے۔ ہال کمرے میں موجود کئی اشیا نے آگ پکڑ لی۔ اسی دوران میں، میں نے دوسرا گرینیڈ اندر پھینک دیا۔ اس نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ اب ہال کمرے میں ادھ جلی، خونچکاں لاشوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

ہم دوڑتے ہوئے سیڑھیاں اترے اور پھر اس مضبوط سلائڈنگ دروازے کے سامنے پہنچ گئے جس کے پیچھے جان ڈیرک نے خود کو چھپایا تھا۔ دروازے کی ظاہری ہیئت ہی یہ بتانے کے لیے کافی تھی کہ یہ آسانی سے ہمیں راستہ نہیں دے گا۔

بلاڈی نے کہا۔ ''تمہیں یقین ہے کہ ڈیرک یہیں پر گھسا ہے؟'' میں نے اس کے سوال کا جواب اثبات میں دیا وہ بولا۔ ''تو پھر فکرمند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں...... یہاں سے نکلنے کا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ سمجھو اپنی شامتِ اعمال کے نتیجے میں وہ ایک چوہے دان میں پھنس گیا ہے۔''

''اگر وہ اندر دبک کر بیٹھا رہا تو عین ممکن ہے کہ اس دوران میں اسے مزید کمک پہنچ جائے۔'' قسطینا نے کہا۔

''نہیں، ایسا کچھ نہیں ہو گا۔ اس چیمبر کا درجۂ حرارت یہاں باہر سے ہی کنٹرول ہوتا ہے۔ میں ہیٹرز بند کر دیتا ہوں اور کولنگ سسٹم آن کر دیتا ہوں۔ خدا نے چاہا تو پندرہ بیس

منٹ میں جناب کی ہڈیوں کا گودا بھی جمنا شروع ہو جائے گا۔'' بلاڈی کے لہجے میں اپنے باس جان ڈیرک کے لیے نفرت کا سمندر ہلکورے لے رہا تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ فرعون صفت جان ڈیرک کی کسی حرکت کے سبب اس کا یہ قریبی ساتھی اس کا جانی دشمن بن چکا ہے۔ بعدازاں یہ تجزیہ بالکل درست ثابت ہوا۔

''وہ دیکھا شاہ زائب!'' قسطینا نے چونکے ہوئے انداز میں ایک اسکرین کی طرف اشارہ کیا۔

اس کا چونکنا درست تھا۔ یہ اسکرین اس ہال کمرے کا منظر دکھا رہی تھی جہاں کچھ دیر پہلے ہم نے ٹین ایجر لڑکے لڑکیوں کو مست حال میں دیکھا تھا۔ ان کی عمریں پندرہ سولہ سال کے لگ بھگ تھیں۔ اب یہ سب کے سب بالکل مختلف موڈ میں نظر آ رہے تھے۔ یقیناً انہوں نے زبردست فائرنگ کے علاوہ دودستی بموں کے دھماکے بھی سن لیے تھے۔ اب یہ اس ہال کمرے سے باہر نکلنا چاہتے تھے مگر ان کے نگہبانوں نے خطرہ محسوس کرتے ساتھ ہی ہال کے دروازے باہر سے مقفل کر دیئے تھے۔ اب یہ شیطان زادے اور شیطان زادیاں باہر آنا چاہ رہے تھے۔ وہ خوف کے بجائے جوش میں نظر آتے تھے، جیسے وہ خود بھی اس سنسنی کا حصہ بننا چاہتے ہوں، مرنے اور مارنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ وہ بدروحوں کی طرح چلا رہے تھے۔ دروازوں سے ٹکرا رہے تھے۔ کھڑکیوں کو توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو ایک دوسرے کے کندھوں پر چڑھ کر ایگزاسٹ فین کے خلا تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

''یہ باہر نکل آئے تو ایک نیا طوفان کھڑا کر دیں گے۔'' قسطینا نے کہا۔

بلاڈی ہراساں آواز میں بولا۔ ''ختم کر دو ان کو۔ یہ آزاد ہو گئے تو ہم سب کو مار ڈالیں گے۔ یہ انسانوں کے بھیس میں درندے ہیں بلکہ درندوں سے بڑھ کر، یہ بہت زہریلی فصل ہے...... بہت ہی زہریلی۔ اس فصل کا ہر چھوٹا بڑا پودا، ہر بیج ختم کر دو......''

میں نے اور قسطینا نے اپنی رائفلوں کے ساتھ نئے میگزین اٹیچ کیے اور اس ہال کمرے کے سامنے پہنچ گئے جہاں ٹین ایجرز بند تھے۔ ان کے لیے ہمارے دلوں میں رحم کی کوئی رمق نہیں تھی۔ ہم نے ان پر موت کی بارش کرنے کے لیے ایک کھڑکی منتخب کی۔ اپنی رائفلوں کے بیرل ہم نے کھڑکی کی آہنی گرل میں رکھے۔ اس سے پہلے کہ یہ ''ہم شکل شیطان زادے'' اور شیطان زادیاں پوری طرح سمجھ سکتے کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے، ہم نے رائفلوں کے منہ کھول دیئے۔ کلاشنکوفوں کی گھن گرج نے تہلکہ مچا دیا۔ پچیس تیس سیکنڈ

کے اندر ہم نے وہاں موجود سب لڑکے لڑکیوں کو قتل کر ڈالا۔ بلکہ ان کے لیے ''قتل'' کے بجائے تلف کیے جانے کا لفظ استعمال کرنا چاہیے۔ وہ ایک ایسا ابلیسی ٹولا تھا جو مستقبل قریب میں ہر طرح کی خباثتوں اور وحشتوں کو اپنے اندر سمو کر تباہی پھیلانے والا تھا۔ اب وہ سب کے سب خونچکاں لاشوں میں بدل چکے تھے۔ آخری وقت میں ان میں سے چند ایک نے اپنے ہی ساتھیوں کے زخمی جسموں یا ان کی لاشوں کو ڈھال بنانے کی کوشش کی تھی، تاہم میں نے اور قسطینا نے احتیاط کی تھی کہ ان میں سے کوئی ایک بھی زندہ نہ بچ سکے۔ وہ بالکل آخری لمحوں تک بدروحوں کی طرح چلاتے رہے تھے اور گالیاں بکتے رہے تھے۔

بلاڈی نے مجھے مخاطب کیا اور بلند آواز میں بولا۔ ''یہاں چھوٹے بچوں کے دو گروپس اور ہیں ان کو بھی ختم کیا جانا ضروری ہے۔''

''نہیں، انہیں ختم نہیں کرنا۔ انہیں صرف تحویل میں لینا ہے۔'' قسطینا نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

بلاڈی بولا۔ ''لیکن میڈم وہ بچے نہیں، سنپولیے ہیں۔ وہ بھی بڑے ہو کر ڈیتھ اسکواڈ ہی بنیں گے۔ وہی درندگی پھیلائیں گے جس کے لیے یہ ''اسکواڈ'' جانا پہچانا جاتا ہے۔''

''ہم کل کے بارے میں آج کوئی فیصلہ نہیں دے سکتے۔ ابھی وہ صرف بچے ہیں...... اور بچہ موم ہوتا ہے، اسے جس طرف چاہے موڑا جا سکتا ہے۔'' قسطینا نے پورے یقین سے کہا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں خاموش رہا۔

ہم اس دوسرے ہال کمرے کے سامنے پہنچ چکے تھے جس کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ایک حصے میں موجود بچوں کی عمریں تین چار سال کے لگ بھگ تھیں۔ دوسرے حصے میں بہت سے بے بی کارٹس تھے اور ان میں چند ماہ کے نوزائیدہ بچے تھے۔ تین چار سال کی عمروں والے بیشتر بچے زبردست شور کے سبب جاگ چکے تھے۔ ان کی دیکھ بھال کرنے والی ''آیائیں'' انہیں چھوڑ کر بھاگ گئی تھیں۔ اب ان میں سے بیشتر رو رہے تھے، یا سہمے سہمے اپنے بیڈز پر بیٹھے تھے۔ میں انہیں زندہ چھوڑنے کے بارے میں ابھی تک تذبذب میں تھا مگر قسطینا اس سلسلے میں یقیناً اپنا ذہن صاف کر چکی تھی۔ جب میں نے ان بچوں کے خوف زدہ چہرے دیکھے، ان کی حیرت زدہ نگاہوں کی بے بسی محسوس کی تو میرا اپنا ارادہ بھی ڈانواں ڈول ہو گیا۔ بے شک یہ بھی ''ایول'' کے بچے تھے لیکن بچے تھے۔ ان کے کل کے بارے میں آج ہی فیصلہ کر کے ان کو مار دینے کا ہمیں کوئی حق نہیں تھا۔ میں نے کلاشنکوف کے ٹریگر پر رکھی ہوئی انگلی پیچھے ہٹا لی۔ قسطینا کی تیز نظروں نے میری اس حرکت کو نوٹ کیا

اور اس کے سینے سے اطمینان کی طویل سانس خارج ہوگئی۔ بالکل چھوٹی عمر کے بچوں کو مارنے کا ہم نے سوچا ہی نہیں تھا۔ ان میں سے زیادہ تر اپنے اپنے بے بی کارٹس میں سو رہے تھے۔ کچھ اپنی باریک آوازوں میں اپنی نگہبانوں کو پکار رہے تھے۔ ان میں سے ایک بچہ فرش پر گر چکا تھا مگر اسے اٹھانے والا کوئی نہیں تھا۔ کیونکہ کرائے کی خدمت گار خواتین اس پورشن سے بھی اوجھل ہو چکی تھیں۔ قسطینا جلدی سے دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ اس نے فرش پر گرے ہوئے شیر خوار کو اٹھا کر اپنے گلے سے لگایا۔ اس کے آنسو پونچھے اور ماتھا چوما۔

بلاڈی نے میرے قریب آکر سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ''میری رائے میں تو ان سب بچوں کو زندہ نہیں چھوڑنا چاہیے، تمہاری ساتھی عورت ہے، اور وہ ایک عورت کے ذہن سے سوچ رہی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''وہ عورت کے ذہن سے سوچ رہی ہے اس لیے ہم سے بہتر سوچ رہی ہے۔''

''تم لوگ پودا کاٹ رہے ہو اور جڑ کو وہیں چھوڑ رہے ہو، جڑ کی طرف دھیان دو۔''

''جڑ کی طرف پورا دھیان ہے اور اسے ہم چھوڑیں گے نہیں۔''

''یعنی تم باس جان ڈیرک کو جڑ کہہ رہے ہو؟''

''نہیں بلاڈی، میں ایول کے اس جرثومے کو جڑ کہہ رہا ہوں جو جان ڈیرک کے پاس محفوظ ہے...... اور جب تک وہ منجمد جرثومہ موجود ہے، اس سے سیکڑوں ہزاروں بچے پیدا کیے جاسکتے ہیں۔''

میری یہ بات بلاڈی کے دل کو لگی۔ اس کے چہرے پر چمک نمودار ہوئی، وہ بولا۔ ''یہ بات تو تمہاری ٹھیک ہے لیکن......''

''تم جانتے ہو ایول کے اسپرم کو کہاں محفوظ کیا گیا ہے؟'' میں نے بلاڈی کی بات کاٹتے ہوئے سوال کیا۔

''میں سو فیصد یقین سے تو نہیں کہہ سکتا لیکن قوی امکان یہی ہے کہ وہ منجمد جرثومے اسی چیمبر میں ہیں جہاں باس ڈیرک گھسا ہے۔''

میں نے بلاڈی کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم ڈیرک سے دشمنی پر تلے ہوئے ہو پھر بھی اسے باس کہہ رہے ہو؟''

اس نے اپنی بڑھی ہوئی نیم سفید داڑھی کو کھجایا اور فلسفیانہ انداز میں بولا۔ ''اگر یہ شہر

روم تباہ ہو جائے، ملبے کا ڈھیر نظر آنے لگے تو پھر بھی اس کو روم ہی کہیں گے۔ یہ ڈیرک دنیا کا احمق ترین اور سفاک ترین شخص ثابت ہوا ہے، پھر بھی میرے منہ سے اس کے لیے بے ساختہ ''باس'' ہی نکلتا ہے۔''

''احمق ترین کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''اس شخص سے زیادہ بے وقوف اور کون ہوگا جو اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی مارے۔ ٹیکساری گینگ میں ڈیرک اور والٹس وائے برابر کے پارٹنر تھے۔ اول تو ڈیرک کو چاہیے ہی تھا کہ وہ والٹس کی کم سن بیٹی کو اس لیے اپنی حراست میں نہ رکھتا کہ وہ بالغ ہو اور وہ اسے بے آبرو کر سکے لیکن اگر وہ یہ کر ہی گزرا تھا تو پھر کم از کم اسی وقت ہوش کے ناخن لیتا جب والٹس اور اس کی بیٹی اس کے قبضے سے نکل گئے اور والٹس خم ٹھونک کر میدان میں آ گیا۔ میں نے اس وقت بھی اس احمق ڈیرک کے پاؤں پکڑے تھے اور کہا تھا کہ وہ اس طرح والٹس سے لڑ کرا تنے عظیم الشان گینگ کی بینڈ نہ بجائے۔ والٹس سے معافی تلافی کر لے اور صلح کا ماحول بنا لے لیکن یہ ہٹ دھرم نہیں مانا۔ الٹا مجھے غدار قرار دے کر زنجیریں پہنا دیں۔ اب جو نتیجہ نکلا ہے، وہ سب کے سامنے ہے۔''

جو بچہ قسطینا نے فرش سے اٹھایا تھا، وہ ابھی اس کی بانہوں میں تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے اپنی لوڈڈ کلاشنکوف اٹھا رکھی تھی۔ وہ بڑے دھیان سے چیمبر کے بند سلائڈنگ ڈور کی طرف دیکھ رہی تھی۔ مجھ سے مخاطب ہو کر وہ بولی۔ ''ہمیں زیادہ دیر نہیں کرنی چاہیے، کسی بھی طرح چیمبر میں داخل ہونا ضروری ہے۔''

میں نے کہا۔ ''آپ دیکھ رہی ہیں، کنٹرول پینل تو میں نے اڑا دیا ہے پھر بھی دروازہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔''

''کیوں نا دستی بم استعمال کیے جائیں شاہ زائب، یہ کافی طاقتور بم ہیں۔''

''چلیں یہ بھی آزما لیتے ہیں مگر پہلے چھوٹے بچوں کو آس پاس سے ہٹا لیا جائے۔'' میں نے تجویز پیش کی۔

ہم نے بڑی تیزی سے کارروائی کی، بلاڈی کے علاوہ ایک دو گورنرس نے بھی ہمارا ساتھ دیا۔ ہم نے ستر پچھتر کے قریب تمام چھوٹے بڑے بچوں کو چیمبر کے سامنے والے ہال سے نکال کر عقبی کمروں میں پہنچا دیا۔

اسی دوران میں میرے سیل فون کی بیل ہونے لگی۔ ہم تہ خانوں میں تھے۔ اس کے باوجود سگنل یہاں تک پہنچ گئے تھے۔ یہ پہلوان حشمت کی کال تھی۔ چھوٹتے ہی بولا۔ ''تم

لوگوں نے میرے دماغ کا فالودہ بنا دیا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اکیلا یہاں کیا کروں؟''

''اکیلا کیوں، جمشید بھی تو آپ کے ساتھ ہے۔''

''وہ نا ہیں ہے، جب اندر سے بہت زیادہ فائرنگ کی آواز آئی اور دستی بموں کے دھماکے بھی ہوئے تو وہ بھی چاردیواری پھاند کر اندر چلا گیا۔ اس کا خیال تھا کہ تم لوگوں کو اس کی مدد کی ضرورت ہووے گی۔''

''لیکن وہ تو ہم تک نہیں پہنچا؟''

''میں نے اس کو روکا بھی تھا...... لیکن وہ نا ہیں رکا۔''

''غلطی کی اس نے......'' میں نے کہا پھر پہلوان حشمت سے پوچھا کہ کیا وہ ٹرک میں اکیلے ہیں؟

اس کا جواب پہلوان نے اثبات میں دیا۔ میں نے کہا۔'' آپ جہاں موجود ہیں وہ جگہ خطرے میں آ سکتی ہے۔ آپ کوشش کریں اور ٹرک کو الٹا چلا کر کچھ پیچھے درختوں میں لے جائیں۔''

وہ بولے۔''میں نے ٹرک کبھی سیدھا بھی نا ہیں چلایا تم الٹا چلانے کو کہہ رہے ہو، بہر حال میں کوشش کرتا ہوں۔''

اسی دوران میں پہلوان جی سے رابطہ منقطع ہو گیا۔

قسطینا کو بھی جمشید کی طرف سے فکر لاحق ہو گئی۔ اسے یوں فالتو دلیری کا مظاہرہ کر کے اندر نہیں آنا چاہیے تھا جس دوران میں، میں پہلوان حشمت سے بات کر رہا تھا، قسطینا نے بڑی مہارت سے تین "M-67" دستی بموں کو اس طرح کو ٹیکٹ کر دیا تھا کہ وہ ایک ساتھ بلاسٹ ہو سکتے تھے۔ اس کے لیے قسطینا نے ایک ڈیٹونیٹر اور ایک الیکٹرک تار استعمال کی تھی۔ یہ سب اس کی فوجی ٹریننگ کا حصہ تھا۔ ہم مختلف دروازوں کی اوٹ میں چلے گئے۔ قسطینا نے بڑی مہارت کے ساتھ سلائڈنگ ڈور کے عین سامنے بلاسٹ کر دیا۔ یہ نہایت طاقتور دھماکا تھا۔ اس کے باوجود آہنی ڈور کو کوئی خاص نقصان نہیں پہنچ سکا۔ صرف نیچے کی طرف قریباً ڈھائی فٹ مربع کا اتنا خلا پیدا ہو سکا کہ ہم رینگ کر اندر جا سکیں...... چاروں طرف بارود کی تیز بو پھیل گئی تھی۔ قریبی کمروں میں موجود چھوٹے بچوں نے دھماکے کے سبب رونا چلانا شروع کر دیا تھا۔ کئی دیواروں میں دراڑیں نظر آنے لگی تھیں۔ میں نے کلاشنکوف کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور دروازے میں نمودار ہونے والے خلا کے بالکل قریب بیٹھ کر

جان ڈیرک کو للکارا۔ ''باہر نکل آؤ ڈیرک! تمہارے بچنے کا کوئی راستہ نہیں...... اور میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ زندہ جل مرنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔''

اندر سے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا اور یہی وقت تھا جب میری چھٹی حس نے گواہی دی کہ جان ڈیرک شاید اس چیمبر میں موجود نہیں ہے۔

''کیا کوئی اور راستہ بھی ہے یہاں سے نکلنے کا؟'' میں نے بلاڈی سے تیز سرگوشی میں پوچھا۔

''بالکل نہیں...... یہ پورا چیمبر اسٹیل کی چادر کا بنا ہوا ہے۔ باس ڈیرک نے اسے اپنی عیاشیوں کے لیے ساؤنڈ پروف بھی بنا رکھا ہے۔ سب خفیہ میٹنگیں بھی یہاں ہوتی ہیں۔''

''پتا نہیں کیوں مجھے لگ رہا ہے کہ وہ لنگڑا اب یہاں نہیں ہے۔''

میں نے خلا کے اندر جانا چاہا تو قسطینا نے میرا کندھا تھام لیا۔ ''رسک نہ لو شاہ زائب۔'' اس نے کہا۔

یہی وقت تھا جب میری نگاہ چیمبر کی سامنے والی دیوار پر پڑی۔ یہاں بھی ایک خلا نظر آ رہا تھا۔ میں تیزی سے اس دھواں دھواں چیمبر میں گھس گیا۔ اب قسطینا اور بلاڈی کو بھی میرے پیچھے آنا پڑا۔ ہم ششدر رہ گئے۔ چیمبر کی سامنے والی آہنی دیوار میں بھی قریباً ڈیڑھ فٹ ضرب تین فٹ کا ایک مستطیل خلا نظر آ رہا تھا اور یہ کسی دھماکے سے وجود میں نہیں آیا تھا۔ اس کے لیے ویلڈنگ کا شعلہ استعمال کیا گیا تھا۔ ویلڈنگ مشین اور اس کے کیبل وغیرہ بھی پاس ہی پڑے تھے۔ دیوار میں یہ راستہ ابھی بالکل تازہ تازہ بنایا گیا تھا۔ خلا کے کناروں سے اب بھی دھواں اٹھ رہا تھا۔

''وہ نکل بھاگا ہے۔'' قسطینا نے دانت پیس کر کہا۔

اسی دوران میں بلاڈی نے چیمبر میں موجود ایک ملٹی پل مانیٹرز والے سرویلینس سسٹم کو آن کر دیا۔ ایک دیوار کے ساتھ چودہ پندرہ کے لگ بھگ اسکرینز روشن دکھائی دینے لگیں۔ کچھ اسکرینز پر اندرونی اور کچھ پر بیرونی مناظر تھے۔ یہی وقت تھا جب ہانپا کانپا ہوا جمشید ملک زخمی حالت میں اندر داخل ہوا۔ اس کے سر سے بہنے والا خون اس کی آنکھوں میں بھر رہا تھا اور ایک گھٹنا بھی سخت گھائل دکھائی دیتا تھا۔ اس نے کہا۔ ''شاہ زیب صاحب وہ...... جیپ پر بھاگ گیا ہے۔ میں نے خود دیکھا ہے اسے۔ ایک جرمن گارڈ بھی اس کے ساتھ ہے۔'' جمشید کا اشارہ یقیناً جان ڈیرک کی طرف ہی تھا۔

میں ڈیرک کو کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتا تھا۔ ''چلو آؤ میرے ساتھ۔'' میں نے جمشید

سے کہا اور تہ خانوں سے نکلنے کے لیے سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔

''کوئی فائدہ نہیں شاہ زیب صاحب۔'' جمشید بولا۔ ''فیکٹری کے احاطے میں چار گاڑیاں تھیں۔ان چاروں کے ٹائر ڈیرک کے گارڈ نے برسٹ کر دیئے ہیں۔''

''یہ دیکھو...... یہ جا رہا ہے...... یہ جا رہا ہے۔'' بلاڈی نے ایک اسکرین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ یہ اسکرین اس کھاد فیکٹری سے باہر کا منظر دکھا رہی تھی۔اب دن کا اجالا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔فیکٹری کے گرد کی بے آباد زمین اور اس سے آگے کے درخت وغیرہ صاف دکھائی دے رہے تھے۔ہمیں اسکرین پر ایک کھلی چھت والی فورڈ جیپ نظر آئی۔اس میں کم از کم دو افراد تھے۔وہ فیکٹری کے جنوبی گیٹ سے نکل کر برق رفتاری سے گھنی جھاڑیوں کی طرف جا رہی تھی۔ زمین ناہموار تھی۔ جیپ تیز رفتاری کے سبب اچھل رہی تھی اور اپنے پیچھے گرد کا بادل چھوڑ رہی تھی۔''باسٹرڈ...... یہ پھر بچ کر نکل جائے گا۔'' بلاڈی نے اپنی ہتھیلی پر دوسرے ہاتھ کا مکا رسید کیا۔

بلاڈی اس علاقے کا واقف حال تھا۔وہ شاید ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔جیپ ان لامتناہی جھاڑیوں میں گھس جاتی تو پھر اسے دوبارہ ڈھونڈنا آسان نہ ہوتا۔

اچانک ہمیں اسکرین پر ایک اور منظر نظر آیا۔اس منظر نے ہمارے اٹھتے ہوئے قدموں کو روک دیا۔ہمیں ایک ٹرک نظر آیا۔ یہ ٹرک کسی اوٹ سے نکلا تھا اور تیزی سے جیپ کی طرف بڑھا تھا۔یہ وہی ٹرک تھا جس پر ہم یہاں اس کھاد فیکٹری تک پہنچے تھے۔اس ٹرک میں پہلوان حشمت تھا۔

''اوہ گاڈ، یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ تو مسٹر حشمت ہیں۔'' قسطینا نے حیرت کے عالم میں کہا۔

''ہاں لگتا ہے کہ انہوں نے جان ڈیرک کو دیکھ لیا ہے، یہ اسے روکنے کی کوشش کریں گے۔'' میں نے کہا۔

ہم دم بخود یہ منظر دیکھتے رہے، ٹرک، جیپ کے پہلو کی طرف سے نمودار ہوا تھا۔ وہ جس رفتار سے جیپ کی طرف جا رہا تھا، لگتا تھا کہ دس پندرہ سیکنڈ کے اندر جیپ سے جا ٹکرائے گا۔

اور پھر یہی کچھ ہوا۔ ہم نے سکتہ زدہ نظروں سے دیکھا۔ٹرک ناہموار زمین پر بری طرح اچھلتا ہوا پہلو کی طرف سے فورڈ جیپ سے جا ٹکرایا اور یہ کوئی معمولی تصادم نہیں تھا۔ جیپ نے پوری ایک قلابازی کھائی اور جھاڑیوں میں گھس گئی۔ٹرک بری طرح دائیں بائیں

لہرایا۔ چند سیکنڈ کے لیے یہی لگا کہ شاید پہلوان حشمت اسے الٹنے سے بچا نہ سکیں مگر پھر وہ اپنے اگلے پہیوں پر گھوم کر دوبارہ جیپ سے جا ٹکرایا۔ جیپ کا عقبی حصہ ٹرک کے نیچے پھنس کر رہ گیا گرد کا بادل سا اٹھتا نظر آیا۔

ہم چیمبر سے نکلے اور اندھا دھند فیکٹری کے بن گیٹ کی طرف بھاگے۔ مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ ایسے نازک ترین موقع پر پہلوان حشمت کی موجودگی اس قدر اہم ثابت ہو گی۔ انہوں نے یقیناً کھلی جیپ میں جان ڈیرک کو فرار ہوتے دیکھ لیا تھا اور جی داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس سے جا ٹکرائے تھے۔ ہم رائفلیں سونتے ہوئے موقع پر پہنچے۔ میں نے دور ہی سے دیکھ لیا، جان ڈیرک اپنی تباہ حال جیپ کے اندر سے کوئی شے کھینچ کر نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق یہ کوئی ہتھیار وغیرہ تھا۔ جب اس نے ہمیں آتے دیکھا تو اپنی کوشش ادھوری چھوڑ کر گھنی جھاڑیوں کی طرف لپکا۔ فاصلے سے اس کا حلیہ واضح نظر نہیں آرہا تھا تاہم اتنا پتا تو چلتا تھا کہ وہ زخمی ہے۔ وہ لنگڑاتا ہوا بھاگ رہا تھا۔ ہم ٹرک اور اس کے نیچے پھنسی ہوئی جیپ کے پاس سے گزرے۔ پہلوان حشمت تو کہیں دکھائی نہیں دیئے تاہم ڈیرک کا ساتھی گارڈ جیپ میں نظر آیا۔ وہ بے ہوش تھا اور شدید زخمی حالت میں تھا۔ فی الوقت ہمارا سارا فوکس جان ڈیرک پر تھا۔ وہ خودرو جھاڑیوں اور درختوں میں داخل ہو چکا تھا۔

''رک جاؤ ڈیرک......شوٹ کر دیں گے۔'' میں نے پکار کر کہا۔

جواب میں وہ پلٹا اور اس نے ہم پر پستول کا فائر کیا۔ فاصلے سے کیا جانے والا فائر ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکا۔

''میرا خیال ہے کہ ہوائی فائر کرو یا پھر اس کی ٹانگوں پر گولی چلاؤ۔'' قسطینا نے بھاگتے بھاگتے مشورہ دیا۔

میں نے ہوا میں کلاشنکوف کا ایک برسٹ چلایا۔ آواز زوردار تھی۔ بہت سے پرندے درختوں سے اڑ کر فضا میں چکرانے لگے۔ ''تم بھاگ نہیں سکتے ڈیرک! خود کو ہمارے حوالے کر دو'' میں نے پھر اسے وارننگ دی۔

اس وارننگ کے جواب میں ڈیرک نے پھر پستول کا فائر کیا مگر یہ فائر اس نے ہم پر نہیں خود پر کیا تھا۔ اعشاریہ تین، آٹھ کے طاقتور کولٹ پستول کی گولی اس کی کنپٹی کو توڑتی ہوئی اس کے مغز میں گھس گئی۔ وہ مردہ چھپکلی کی طرح اوندھے منہ کیچڑ زدہ زمین پر گرا۔ ہم بھاگتے ہوئے اس کے سر پر پہنچے۔ اس نے آخری ہچکی ہمارے سامنے لی۔ اس کے چہرے کا

دایاں حصہ خون سے اور بایاں حصہ سیاہی مائل کیچڑ سے لتھڑا ہوا تھا۔ اس کی پتھرائی ہوئی نگاہیں ہم پر مرکوز تھیں اور وہ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا تھا...... تم نے مجھے ہر چیز سے محروم کر دیا...... مگر آسان موت سے محروم نہیں کر سکے۔

میں واپس ٹرک کی طرف لپکا۔ مجھے پہلوان حشمت کی فکر تھی۔ قریباً سو قدم کا فاصلہ برق رفتاری سے طے کر کے ٹرک تک پہنچا...... پہلوان نے اپنا فرض ادا کر دیا تھا...... اور یہ فرض ادا کرنے کے بعد خود بری طرح ٹرک کے اندر ہی پھنس گئے تھے۔ جیپ سے تصادم اور درختوں سے ٹکراؤ کے نتیجے میں ٹرک کا اسٹیئرنگ کچھ اس طرح ٹیڑھا ہوا تھا کہ پہلوان جی کی توند اس کے نیچے پھنس کر رہ گئی تھی۔ ویسے وہ کسی بھی سخت چوٹ سے محفوظ ہی نظر آتے تھے۔ انہوں نے میری طرف دیکھا اور کراہتے ہوئے بولے۔ ''یار نکالو مجھ کو۔ مجھے لگت ہے کہ میرا سانس دھنی (ناف) میں پھنس گیا ہے۔''

میں نے ہاتھ لمبا کر کے ڈرائیونگ سیٹ کا لیور دبایا اور اسے پیچھے کی طرف سلائیڈ کیا۔ پہلوان جی کی توند آزادی پا گئی۔ وہ اپنے چربی دار جسم کو تیزی سے ہلکورا دیتے ہوئے باہر نکل آئے۔ ان کی نگاہیں جان ڈیرک کو ڈھونڈ رہی تھیں۔

''جان ڈیرک ختم ہو گیا ہے چاچا حشمت، اس نے خود کو شوٹ کر لیا ہے۔'' میں نے دور درختوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

پہلوان جی کے سینے سے اطمینان کی طویل سانس خارج ہوئی۔ ''وہ پورا مر گیا ہے ناں؟'' انہوں نے مزید تسلی کے لیے پوچھا۔

''پورے سے بھی کچھ زیادہ۔'' میں نے انہیں یقین دلایا۔

جیپ میں موجود جرمن گارڈ بھی دم توڑ چکا تھا۔ جمشید ملک نے اس کے چہرے پر ایک پرانا کپڑا پھیلا دیا۔ ہم پہلوان حشمت کے ساتھ واپس اس کیچڑ آلود جگہ پر پہنچے جہاں ٹیکساری گینگ کا کرتا دھرتا ایک لاش کی صورت میں پڑا تھا۔ قسطینا نے کہا۔ ''شاہ زائب! اصل مسئلہ تو ابھی باقی ہے۔''

میں سمجھ گیا۔ اس کا اشارہ ایول کے منجمد جرثومے کی طرف تھا...... اور بلاڈی نے بتایا تھا کہ وہ اسٹیل کی چادر والے چیمبر میں ہی کہیں محفوظ ہے۔ میں نے بلاڈی سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''ہماری مدد کرو۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ اٹالین پولیس کسی بھی وقت یہاں پہنچ جائے گی اور اس سے پہلے پہلے ہمیں وہ ''خاص اسپرم فریزر'' تلاش کرنا ہے جس میں ایول کا اسپرم موجود ہے۔''

''ہمیں واپس اسٹیل والے چیمبر میں جانا ہوگا۔'' بلاڈی نے پیشانی سے پسینا پونچھتے ہوئے کہا۔

جمشید ملک میرے قریب آیا اور کان میں سرگوشی کی۔ ''شاہ زیب صاحب! آپ کو پتا ہے کہ جان ڈیرک کی لاش کے سلسلے میں دارج داراب صاحب کی ڈیمانڈ کیا ہے؟''

''ہاں...... مجھے پتا ہے۔''

''تو پھر مجھے اجازت دیں۔'' اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''میری طرف سے اجازت ہے۔'' میں نے کہا۔

جمشید ملک نے اپنے لباس کے نیچے سے ایک برچھا نما تیز دھار آلہ نکالا اور ان جھاڑیوں کی طرف بڑھا جہاں ڈیرک کی خونچکاں لاش پڑی تھی۔

اب ہمارے لیے سب سے اہم کام یہی تھا کہ منجمد جرثومے والا ''اسپرم فریزر'' ڈھونڈا جائے۔ اس کے لیے ہمیں واپس کھاد فیکٹری میں داخل ہونا تھا۔ قسطینا بھی واپس فیکٹری میں جانا چاہ رہی تھی۔ اس کے نزدیک بھی منجمد جرثومے کا حصول اہم تھا۔ ابھی فیکٹری کی جانب ہم نے پندرہ بیس قدم ہی اٹھائے تھے کہ میں ٹھٹک کر رک گیا۔ میرے ذہن میں ایک خیال برق کی طرح کوندا تھا۔ چند منٹ پہلے جب ہم فیکٹری سے نکل کر یہاں پہنچے تھے تو میں نے جان ڈیرک کو تباہ حال جیپ میں سے کچھ نکالنے کی کوشش کرتے دیکھا تھا۔ اس وقت میرا خیال تھا کہ شاید وہ نہتا ہے اور کوئی ہتھیار نکالنے کی کوشش کر رہا ہے مگر ہتھیار تو اس کے پاس موجود تھا۔ کیا وہ کچھ اور نکالنا چاہ رہا تھا؟

مجھے رکتے دیکھ کر قسطینا اور بلاڈی بھی رک گئے۔ ''کیا ہوا شاہ زائب؟'' قسطینا نے پوچھا۔

''ایک منٹ قسطینا! میں جیپ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا اور جیپ کی طرف پلٹا۔

جیپ کا پچھلا حصہ ٹرک کے نیچے پھنس چکا تھا۔ سارا فریم چرمر ہو گیا تھا۔ اسی چرمر فریم میں جرمن گارڈ کی لاش بھی اٹکی ہوئی تھی۔ میں نے جیپ کے اندر دائیں بائیں نگاہ دوڑائی۔ جرمن گارڈ کی خون آلود ٹانگوں کے نیچے مجھے ایک نہایت چمکیلا ہینڈل سا دکھائی دیا۔ میں جیپ کے اندر کود گیا۔ گارڈ کی بھاری بھرکم ٹانگوں کو ایک طرف ہٹا کر میں نے مڑی تڑی ہوئی نشست کے نیچے دیکھا اور دھڑکن تیز ہو گئی۔ یہاں قریباً دو مکعب فٹ کا ایک نہایت جدید باکس نظر آ رہا تھا۔ سفید رنگ کے اس باکس پر دو ڈیجیٹل میٹرز تھے ان میں سے ایک

اسپارک کررہا تھا۔ایک میٹراس باکس میں نائیٹروجن کے لیول کے بارے میں بتا رہا تھا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہ ہی وہ ''اسپرم فریزر'' ہے جس میں دنیا کی خطرناک ترین ''کاشتکاری'' کے لیےایک نہایت زہریلا بیج موجود ہے۔ بدنام زمانہ ایول کا وہی جرثومہ جو ڈیتھ اسکواڈ کے لیے کبھی نہ ختم ہونے والی سپلائی لائن کی حیثیت رکھتا تھا۔ میں نے چمکیلے ہینڈل سے پکڑ کراس باکس کو باہر نکالنا چاہا اور تب مجھے پتا چلا کہ وہ نشستوں کے ٹیڑھے ہو جانے والے آہنی فریم میں پھنسا ہوا ہے۔ جان ڈیرک کو بھی یقیناً اسی وجہ سے ناکامی ہوئی تھی۔ بلاڈی نے انگلی سے اشارہ کیا اور چلا کر بولا۔''یہی ہے وہ باکس، یہی ہے۔''

اب قسطینا اور بلاڈی کے علاوہ جمشید اور پہلوان بھی جیپ میں داخل ہو گئے تھے۔ قسطینا کی آنکھوں میں بھی چمک لہرا گئی تھی۔ یقیناً باکس کو دیکھ کر وہ بھی سمجھ گئی تھی کہ جس گوہرِ مقصود کے لیے ہم فیکٹری جا رہے تھے، وہ یہاں اس جیپ میں موجود ہے۔ہم سب نے مل کر باکس کو نکالنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوئے۔

''فریم کو سیدھا کرنے کے لیے کوئی ہتھوڑا ہونا چاہیے۔'' جمشید ملک نے کہا۔

پہلوان جی ٹرک میں گھسے اور ایک وزنی جیک اٹھا لائے۔ ہم نے اس جیک کی ضربوں کے ساتھ فریم کو سیدھا کرنے کی کوشش کی مگر فوری طور پر کامیابی نہیں ہوئی۔ یہی وقت تھا جب ہمارے اندیشوں نے حقیقت کا روپ دھار لیا۔ کچھ فاصلے سے پولیس کاروں کے مدھم سائرن سنائی دینے لگے۔ روم کی پٹرولنگ پولیس موقعے کی طرف آ رہی تھی۔ وقت بہت کم تھا۔ میں نے کلاشنکوف کو ریڈی کیا اور قسطینا سمیت باقی ساتھیوں سے کہا کہ وہ جیپ سے باہر آ جائیں۔ وہ سب باہر آ گئے۔

میں نے کلاشنکوف کے بیرل کا رخ ''اسپرم فریزر'' کی طرف کیا۔ میگزین میں پوری اٹھائیس گولیاں موجود تھیں۔ میں نے دو قدم پیچھے ہٹ کر تین طویل برسٹ چلائے اور فریزر باکس کو چھلنی کر کے رکھ دیا۔ وہ ایک چھوٹے سے ریفریجریٹر کی طرح تھا اور اس کے اندر برقی رو کے بغیر بھی ٹمپریچر کو کنٹرول کرنے کا نظام موجود تھا۔ اس کے اندر انتہائی حفاظت کے ساتھ شیشے کی چھوٹی چھوٹی بہت سی ٹیوبز رکھی گئی تھیں، اس کے علاوہ بھی کئی لوازمات تھے۔ دو تین سیکنڈ کے اندر ٹیکساری گینگ کا یہ نہایت ''قیمتی اثاثہ'' چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تبدیل ہو گیا۔ اس باکس کی بیرونی باڈی بھی ناقابلِ شناخت پرخچوں میں بدل گئی تھی۔

پٹرولنگ پولیس کی گاڑیاں اب ہم سے زیادہ دور نہیں تھیں۔ ہم تیزی سے جھاڑیوں

کے طویل سلسلے میں داخل ہو گئے۔ لوڈڈ ہتھیار ہمارے ہاتھوں میں تھے۔ اگر کسی کی طرف سے ہمیں روکنے کی کوشش کی جاتی تو ہم قرار واقعی مزاحمت کر سکتے تھے۔ جمشید ملک کے جسم پر کئی چوٹیں تھیں۔ وہ ذرا لنگڑا کر چل رہا تھا...... اس لنگڑاہٹ کی وجہ گھٹنے کا زخم تھا۔ جمشید ملک نے ریگ زین کا ایک وزنی بیگ بھی اٹھا رکھا تھا۔ اسے آسانی فراہم کرنے کے لیے میں نے یہ بیگ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ بیگ کا وزن چھ سات کلو سے کم نہیں تھا۔ ہم سب جانتے تھے کہ اس بیگ میں کیا ہے؟

اس بیگ میں جان ڈیرک کا کٹا ہوا سر تھا۔ کچھ دیر پہلے جمشید ملک نے مجھ سے اسی سلسلے میں اجازت طلب کی تھی۔ کچھ عرصہ پہلے پاکستان میں کلر کہار کے مقام پر ٹیکساری والوں نے سفا کی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دارج کی والدہ بیگم یاسمین کا سر اس کے تن سے جدا کیا تھا۔ دارج کی خواہش تھی کہ وہ جان ڈیرک سے اسی انداز میں بدلہ لے...... اور آج اس کی یہ خواہش پوری ہوئی تھی۔

ہم جلد از جلد موقع واردات سے دور نکل جانا چاہتے تھے۔ اسے خوش قسمتی ہی کہنا چاہیے کہ جلد ہی ہمیں ایک تنہا سڑک نظر آ گئی اور اس پر رواں ایک اسٹیشن وین بھی دکھائی دے گئی۔ یہ کسی فضائی کمپنی کی وین تھی جو علی الصباح ملازمین کو لے کر ائیر پورٹ کی طرف جا رہی تھی۔ ہم جھاڑیوں میں رہے، قسطینا نے آگے بڑھ کر وین کو روکا۔ ڈرائیور نے کھڑکی کا شیشہ نیچے اتار کر قسطینا سے بات کی تو ہم رائفلیں سونتے ہوئے جھاڑیوں سے نکل آئے۔ ڈرائیور کے علاوہ وین میں ایک فی میل اور دو میل ملازم موجود تھے۔ ہم نے انہیں پچھلی نشستوں کے درمیانی خلا میں مرغیوں کی طرح دبک کر بیٹھنے پر مجبور کر دیا اور ڈرائیور کو گن پوائنٹ پر وین آگے بڑھانے کا حکم دیا۔

قسطینا کو میں بے حد پریشان دیکھ رہا تھا۔ ''آپ بچوں کے لیے فکرمند ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''وہ بالکل غیر محفوظ ہیں پتا نہیں کہ ان کے ساتھ کیا سلوک ہونے والا ہے؟ ویسے بھی وہاں کمروں میں دھواں بھر رہا تھا۔''

جمشید نے کہا۔ ''میڈم! آپ اس بارے میں پریشان نہ ہوں۔ یہاں الیکٹرانک میڈیا بہت الرٹ ہے۔ میں ابھی آپ کے سامنے ایک دو نیوز چینلز کو یہ بچوں والی خبر بریک کرتا ہوں۔ چند منٹ میں وہاں ''او بی وینوں'' کی قطاریں لگ جائیں گی۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے اجازت طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

جمشید نے اپنے موبائل فون پر کسی واقف کار جرنلسٹ کا نمبر پریس کیا۔ جونہی رابطہ ہوا وہ بولا۔ ''ہیلو مسٹر فرائیڈ! آپ کا ایک پرستار بول رہا ہوں۔ آپ کے لیے ایک بڑی دھانسو خبر ہے اور بالکل تازہ ترین......'' اس کے ساتھ ہی وہ جرنلسٹ کو کھاد فیکٹری میں ہونے والے آپریشن کی تفصیل بتانے میں مصروف ہو گیا۔

جرنلسٹ سے بات ختم کر کے اس نے لاوارث بچوں کی ایک مقامی این جی او سے رابطہ کیا اور اپنی شناخت کرائے بغیر اس کے کسی ممبر کو اطلاع دی کہ کھاد فیکٹری میں کم و بیش ''پچھتر'' معصوم بچے موجود ہیں اور انہیں فوری مدد اور تحفظ کی ضرورت ہے۔ میں نے دیکھا......قسطینا کے چہرے پر اطمینان کی اجلی چمک نظر آنے لگی تھی۔

کچھ آگے جا کر ہم نے ایک ویران جگہ پر اسٹیشن وین چھوڑ دی۔ اسٹیشن وین چھوڑنے سے پہلے، ہم نے اس میں موجود ملازمین کو بری طرح دھمکا دیا تھا کہ وہ آدھ گھنٹے سے پہلے یہاں سے باہر نہیں نکلیں گے۔ ان کے سیل فون بھی جمشید ملک نے اپنے قبضے میں کر لیے تھے۔ (جنہیں بعد میں آگے جا کر پھینک دیا گیا) ہم نے اپنے ہتھیار جیکٹس اور اوورکوٹ وغیرہ کے اندر چھپا لیے تھے۔ جمشید ملک اس علاقے سے پوری طرح واقف تھا۔ درختوں سے قریباً دو منٹ کی تیز رفتار واک کر کے ہم ایک کشادہ سڑک پر نکل آئے۔ یہاں ہمیں ٹیکسی وغیرہ دستیاب ہو سکتی تھی۔ اچانک ہمیں احساس ہوا کہ ادھیڑ عمر بلاڈی ہمارے ساتھ نہیں ہے۔ ہم نے اسے ارد گرد دیکھا وہ کہیں موجود نہیں تھا۔ وہ کھسک چکا تھا۔ اس کے حوالے سے یہ خیال پہلے ہی میرے ذہن میں موجود تھا۔ ایک لحاظ سے یہ بہتر ہی ہوا تھا کہ اس نے اپنا راستہ خود چن لیا تھا۔ ویسے اگر وہ مجھے ایسٹرن کی حیثیت سے پہچان لیتا تو شاید میرے ساتھ رہنے کو ترجیح دیتا۔ لیکن میرے حلیے اور داڑھی مونچھوں کے سبب وہ مجھے پہچاننے میں ناکام رہا تھا۔ اس کی نگاہ بھی ''سو فیصد'' کام نہیں کر رہی تھی جب ہمیں یقین ہو گیا کہ بلاڈی اب نہیں ملے گا تو ہم نے ایک ٹیکسی رکوائی۔ اس ٹیکسی نے آٹھ دس منٹ میں ہمیں جمشید ملک کی رہائش گاہ پر پہنچا دیا۔ یہاں پہنچ کر ہم نے خود کو محفوظ و مامون محسوس کیا۔

قسطینا نے پہلوان حشمت کی تعریف دل کی گہرائیوں سے کی۔ کہنے لگی۔ ''آپ نے یہاں ہونے کا حق ادا کر دیا ورنہ تو ڈیرک شاید یہاں سے بھی نکل جاتا۔ میں آپ کی اس بروقت کارروائی سے بہت متاثر ہوئی ہوں۔''

میں نے قسطینا کے ان انگلش جملوں کا ترجمہ کر کے پہلوان جی کو سنایا تو ان کے گال سرخ ہو گئے۔ وہ بولے۔ ''اس وقت جو کچھ میری سمجھ میں آیا، میں نے کر دیا۔ میں نے کھلی

جیپ میں ڈیرک کی لشکتی ہوئی ٹنڈ دیکھ لی تھی۔ میں نے سوچا، یہ آسمان سے تو گر پڑا ہے اب اسے کھجور میں اٹکاؤ......یعنی اس پر ٹرک چڑھاؤ سو......سو چڑھا دیا۔"

پہلوان جی ہمیشہ کی طرح شلوار قمیص میں تھے۔ انہوں نے اپنے پیٹ سے جرسی اور قمیص اٹھائی۔ توند کئی جگہ سے بری طرح چھلی ہوئی تھی اور وہ جگہیں سرخ ہو رہی تھیں۔ میں نے کہا۔" چاچا حشمت! ہم نے ہمیشہ توند کی برائیاں ہی سنی ہیں مگر مجھے لگتا ہے کہ آج آپ کی زندگی اس توند کی وجہ سے ہی بچی ہے۔"

"کیا کہنا چاہت ہو؟ میں سمجھا ناہیں؟"

"دیکھیں ناں اگر آپ کی توند اسٹیئرنگ کے نیچے نہ پھنستی تو آپ نے تو جوش میں ٹرک سے باہر نکل آنا تھا اور جان ڈیرک کو پکڑنے کی کوشش کرنا تھی۔ اس کے پاس بھرا ہوا پسٹل تھا اور وہ جنونی ہو رہا تھا۔ میرے خیال میں تو آپ کا یہ بڑھا ہوا پیٹ آپ کے لیے باعثِ رحمت ثابت ہوا ہے۔"

پہلوان جی نے مجھے کڑی نظروں سے گھورا جیسے اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے ہوں کہ میں یہ بات سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں یا اس میں مذاق کی ملاوٹ بھی ہے۔ شاید وہ تفتیش شروع کر دیتے مگر اسی دوران میں جمشید ملک نے نیوز چینلز کی سرفنگ شروع کر دی۔ ابھی کچھ دیر پہلے پیش آنے والے واقعے نے نیوز چینلز پر تہلکہ مچا رکھا تھا۔ دھڑا دھڑ خبریں آ رہی تھیں۔ اہم ترین خبر کھاد فیکٹری کے تہ خانوں سے برآمد ہونے والے معصوم بچوں کی تھی۔ کچھ واقف حال صحافیوں نے ان بچوں کا تعلق بڑی سرعت کے ساتھ ڈیتھ اسکواڈ کے ہم شکل قاتلوں کے ساتھ جوڑ دیا تھ'۔ ایک تبصرہ نگار چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔"بہت عرصے سے یہ شبہ ظاہر کیا جا رہا تھا کہ آپسی لڑائی کے بعد ٹیکساری گینگ کے بچے کھچے لوگوں کی خفیہ سرگرمیاں یہاں روم کے مضافات میں جاری ہیں......اور یہ بھی کہا جا رہا تھا کہ ڈیتھ اسکواڈ کے لیے ایک نئی پود تیاری کے مراحل میں ہے۔ آج یہ سب کچھ ثابت ہو گیا ہے۔ شک کی کوئی گنجائش نظر نہیں آ رہی......جی ہاں کوئی گنجائش نظر نہیں آ رہی۔"

نیوز کاسٹر نے ہیجانی لہجے میں تبصرہ نگار کی بات کاٹی۔"......اور یہ دیکھیے ناظرین! یہ ملاحظہ کریں۔ یہ تازہ ترین فوٹیج ہے۔ اس ہال کمرے میں چالیس کے لگ بھگ لاشیں موجود ہیں۔ یہ سب......جی ہاں یہ سب ہم شکل ٹین ایجر لڑکے اور لڑکیاں ہیں۔ ان سب کی عمریں چودہ پندرہ سال کے قریب دکھائی دیتی ہیں......انہیں بہت قریب سے شدید فائرنگ کر کے قتل کر دیا گیا ہے۔"

تبصرہ نگار نے کہا۔ ”مگر ہم شکل بچوں کو نقصان نہیں پہنچایا گیا۔ وہ تقریباً سب محفوظ ہیں...... اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کی حفاظت میں ہیں۔ کئی سوال اٹھ رہے ہیں ان ٹین ایجرز کو کیوں مارا گیا اور بچوں کو کیوں چھوڑا گیا؟“

کیمرا اب کلاشنکوف کی گولیوں کے وہ سیکڑوں خول دکھا رہا تھا جو ہماری فائرنگ کا نتیجہ تھے۔

ایک چینل پر فیکٹری سے باہر ہونے والے واقعے کی تفصیل بتائی جا رہی تھی۔ کھلی جیپ کے اوپر چڑھا ہوا ڈیری کمپنی کا ٹرک صاف نظر آ رہا تھا۔ رپورٹر کہہ رہا تھا۔ ”ذرائع بتا رہے ہیں کہ یہاں سے جرمن گارڈ کے علاوہ ایک سرکٹی لاش بھی ملی ہے جسے پولیس اہلکاروں نے یہاں سے شفٹ کر دیا ہے۔ جائے وقوعہ کو دیکھ کر پتا چلتا ہے کہ فیکٹری کے اندر کی طرح یہاں باہر بھی ٹھیک ٹھاک معرکہ ہوا ہے۔ ابھی کہنا قبل از وقت ہوگا مگر لگتا یہی ہے کہ اس کارروائی کے پیچھے ٹیکساری کے بدترین مخالفین ایسٹرن کنگ اینڈ کمپنی کا ہاتھ ہو سکتا ہے......“

خبریں جاری تھیں کہ میرے سیل فون پر کال کا میوزک آنے لگا۔ میں نے دیکھا۔ ”یہ پاکستان سے داؤد بھاؤ کی کال تھی۔ یہ اس کا وہ خاص نمبر تھا جو کسی بھی طرح ٹریس نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس نے اپنی بھاری آواز میں کہا۔ ”مبارک ہو، میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ تم نے ٹارگٹ حاصل کر لیا ہے۔“

”شکریہ داؤد بھاؤ! آپ کو بھی مبارک ہو۔“

”جس درخت کو اوپر سے کاٹ دیا گیا ہے، میرا خیال ہے کہ سب سے بڑا درخت وہی تھا۔“

”آپ درست سمجھ رہے ہیں۔ وہی بڑا درخت تھا۔“ (ہم کوڈ ورڈز میں بات کر رہے تھے۔ بڑے درخت سے بھاؤ کی مراد، جان ڈیرک تھا)

”چھوٹے پودے بھی ملے ہیں؟“ بھاؤ نے پوچھا۔ وہ اب ہم شکل بچوں کی بات کر رہا تھا۔

”بالکل ملے ہیں۔ جو کچھ بڑے تھے ان کو رکھنا تو بیکار تھا۔ وہ بالکل زہریلے ہو چکے تھے۔ انہیں تلف کر دیا ہے۔ چھوٹے پودے رکھ لیے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ ابھی برے اثرات سے بچے ہوئے ہیں۔“

”اور بیج؟“ داؤد بھاؤ نے اشاراتی زبان میں منجمد جرثومے کے بارے میں پوچھا۔

''اسے بھی تلف کر دیا ہے اور میرے خیال میں یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔''

''ویل ڈن۔'' داؤد بھاؤ نے کہا۔ ''یہاں بھی خبریں آ رہی ہیں اور سب اچھی خبریں ہیں۔'' پھر داؤد بھاؤ نے ذرا توقف سے کہا۔ ''تمہاری واپسی کب ہو رہی ہے؟''

''کیوں خیریت ہے؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''ہاں، ابھی تک تو خیریت ہے...... لیکن ہمیں اس بدمعاش عورت کو یکسر فراموش نہیں کرنا چاہیے اگر وہ مرگئی ہے تو اور بات ہے لیکن اگر زندہ بچ گئی ہے تو زیادہ دیر خاموش نہیں رہے گی۔ اپنی ہمت طاقت کے مطابق کچھ نہ کچھ حرکت ضرور کرنے گی۔''

مجھے فکر لاحق ہوئی کہ کہیں داؤد بھاؤ مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش نہ کر رہا ہو، میں نے تھوڑا سا کریدا لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکال سکا۔ شاید داؤد بھاؤ کے ذہن میں یہ تھا کہ خطرے سے پہلے خطرے کی پیش بندی کر لی جائے۔ فخر کے بارے میں بھاؤ نے بتایا کہ وہ کافی حد تک نارمل ہو چکا ہے۔ سجاول، خورسنہ، ولید اور رضوان کے بارے میں بھی بھاؤ نے مکمل خیریت کی اطلاع دی۔

...... یہ تیسرے روز کی بات ہے۔ رات کا وقت تھا۔ روم شہر سردی کی لپیٹ میں تھا...... مگر دور حد نگاہ تک جگمگا رہا تھا۔ میں اور قسطینا گھر کی بالائی منزل کے ایک کمرے میں بیٹھے تھے۔ سامنے دیوار گیر شیشہ تھا اور اس شیشے میں سے شہر کا ساحلی علاقہ خاصی دور تک دکھائی دیتا تھا۔ کشتیاں، تفریحی بجرے اور جہاز اپنی اپنی منزلوں کی طرف رواں تھے۔ قہوے کی چسکی لیتے ہوئے میں نے کہا۔ ''پھر کیا سوچا آپ نے؟''

وہ کچھ دیر، دور سمندر پر حرکت کرتے روشن نقطوں کو دیکھتی رہی پھر بولی۔ ''نہیں شاہ زائب! ابھی مجھے واپس جاماجی جانے دو۔ شاید کچھ وقت گزر جائے اور دل و دماغ نارمل ہوں تو میں تم سے ملنے پاکستان چلی آؤں......''

''اور اگر دل و دماغ نارمل نہ ہوئے تو؟'' میں نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''کیوں نہیں ہوں گے۔ تم فون کرتے رہنا ناں۔'' وہ میری طرف دیکھے بغیر بولی۔

باہر کی کچھ روشنیوں کا عکس اس کے چہرے کے ایک رخ کو روشن کر رہا تھا، دوسرا رخ نیم تاریکی میں تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ کس کیفیت سے گزر رہی ہے۔ اسے سہارے کی ضرورت تھی لیکن وہ سہارے کی خواہش ظاہر کر کے خود کو ہلکا اور کمزور ثابت کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اسے اپنا پندار شاید اپنے آپ سے بھی زیادہ عزیز تھا۔

میری نگاہوں میں وہ تہلکہ خیز مناظر گھوم گئے جب میں اور وہ، سر ہتھیلیوں پر رکھ کر

کھاد فیکٹری کے اندر کودے تھے۔ گارڈز سے بچنے کے لیے ہم ایک نیم تاریک کونے میں سمٹ گئے تھے۔ ایک دوسرے کے اتنے قریب آگئے تھے کہ ایک دوسرے کے دل کی دھڑکن اور نبض کی حرکت تک محسوس کر سکتے تھے۔ کتنے سنگین لمحات تھے وہ، لیکن پھر بھی میں نے قسطینا کو اور شاید اس نے بھی مجھے پوری طرح محسوس کیا تھا۔

''کس خیال میں کھو گئے ہو؟'' اس نے اپنے تراشیدہ بالوں کو ہلکا سا ہلکورا دے کر پوچھا۔

''سوچ رہا ہوں، آپ کا جانا کیوں ضروری ہے؟''

''کئی وجوہات ہیں شاہ زائب! وہاں فورسز کو میری ضرورت ہے۔ ابراہیم کو ضرورت ہے اور سب سے زیادہ فکر مجھے اس بات کی ہے کہ مجھے ہاناوانی کے بارے میں پتا چلنا چاہیے۔ وہ جہنم واصل ہوگئی ہے یا ابھی زندہ ہے...... جاماجی کا روشن مستقبل اس کی موت سے مشروط ہے۔''

میں نے گہری سانس لی۔ ''اس بارے میں تو میں بھی فکر مند ہوں۔''

''میں وہاں جا کر تمہاری یہ فکر مندی دور کروں گی۔ ان شاء اللہ بہت جلد...... تمہیں ہاناوانی کے بارے میں ٹھیک اطلاع پہنچاؤں گی۔''

''اور اکبر کے بارے میں۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔ ''قسطینا! میرے خیال میں اس نے جتنے بھی شکار کیے ہیں ان میں سے اکبر کا شکار بدترین طریقے سے کیا ہے۔ وہ مکمل طور پر اس کے بنائے ہوئے سانچے میں ڈھل چکا ہے اگر وہ بچ بھی گیا تو اس کی واپسی مشکل نظر آتی ہے۔''

''خدا سے اچھے کی امید تو رکھنی چاہیے شاہ زائب۔''

''ہاں، اچھے کی امید تو رکھنی چاہیے۔''

اتنے میں جمشید ملک کھنکھارتا ہوا اندر داخل ہوا۔ میرے منع کرنے کے باوجود وہ دو دن سے ایک عجیب چکر میں الجھا ہوا تھا۔ یہ کافی ایب نارمل چکر تھا۔ وہ اپنے باس دارج داراب کی خواہش کے مطابق جان ڈیرک کا کٹا ہوا سر کسی طرح پاکستان پارسل کرنا چاہتا تھا۔ کٹے ہوئے سر کو اس نے باقاعدہ میڈیکل طریقے سے PRESERVE کرایا تھا مگر اسے روانہ کرنے کے حوالے سے کئی خدشات سامنے آئے تھے۔

''کیا بنا تمہارے مشن کا؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''مشن امپاسیبل تو نہیں تھا مگر اب باس نے خود ہی ارادہ بدل دیا ہے۔ ان کا کہنا

ہے کہ اس منحوس سر کو کسی ایسی سنسان جگہ پھینک دوں جہاں آوارہ جانور رات بھر اس کی عزت افزائی کریں اور صبح تک وہ پہچانا نہ جائے۔ سو میں اسے شہر سے باہر ایک پرانے قبرستان میں پھینک آیا ہوں۔"

"کوئی تصویر وغیرہ تو اتار لینا تھی اس کی۔" قسطینا نے کہا۔

"صرف تصویر سے کام چلنے والا نہیں تھا جی۔ دارج صاحب نے اسکائپ پر اس منحوس کھوپڑے کا "لائیو" نظارہ کیا ہے اور پوری طرح تسلی کی ہے۔ یہ دیکھیے اس کی ریکارڈنگ بھی ہے۔"

جمشید نے اپنے سیل فون پر ویڈیو کلپ دکھایا جس میں ٹیکساری گینگ کے سرغنہ کا سرِ پُرغرور فرش پر لڑھکا ہوا نظر آرہا تھا۔ اس پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں اور خشک کیچڑ چمٹا ہوا تھا۔ یہ انجام تھا اس فرعون صفت، ستم ایجاد کا جس نے ایک زہریلے بیج سے ایک جان لیوا فصل تیار کی تھی۔ ایک ایسا ابلیسی ٹولا کھڑا کیا تھا جس نے طویل عرصے تک اس کے مخالفین کی زندگیوں کو جہنم کا نمونہ بنائے رکھا تھا۔

○......❖......○

یہ دس روز بعد کی بات ہے، میں واپس پاکستان پہنچ چکا تھا۔ میں لاہور میں تھا۔ وہی شہر ہزار رنگ جس سے میری اَن گنت یادیں وابستہ تھیں۔ یہیں پر وہ پُرشکوہ مغلیہ قلعہ بھی تھا جس کی سیر کرتے ہوئے میں نے ایک ایسا سنہری چہرہ دیکھا تھا جو میرے سینے کے اندر ہمیشہ کے لیے نقش ہو گیا تھا۔ میں چاہتا بھی تو اس چہرے کے نقوش کو پوری طرح مٹا نہیں سکتا تھا...... ہاں، وہ کسی اور کی تھی لیکن آج بھی میرے دل میں بستی تھی۔ میرے سینے کے اندر اس حسین چہرے کا اثر و رسوخ کم ضرور ہو گیا ہو گا مگر ختم نہیں ہوا تھا۔

میں اور پہلوان حشمت، داؤد بھاؤ کی اسی پناہ گاہ میں واپس آئے تھے جہاں سے اٹلی کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ لاہور کے خوب صورت رہائشی علاقے ٹاؤن شپ میں یہ دو منزلہ عمارت اب تک ہمارے لیے بہترین ٹھکانا ثابت ہوئی تھی۔ یہاں پر سجاول، فخر اور میرے دیگر ساتھیوں کے علاوہ وہ چند طوطے بھی موجود تھے جو اب ہاناوانی کے ٹرانس سے آزاد ہو چکے تھے اور چہکتے ہوئے خوشنما پرندوں کے سوا اور کچھ نہیں تھے۔ مجھے سب سے زیادہ خوشی فخر کو دیکھ کر ہوئی۔ وہ ایک غیر معمولی دور سے گزرا تھا لیکن نوے پچانوے فیصد نارمل ہو چکا تھا۔ ایک سائیکاٹرسٹ سے مشورے کے بعد داؤد بھاؤ نے خود فخر سے ملاقات کی تھی اور اسے دو چار قسطوں میں وہ سب کچھ بتا دیا تھا جو ٹرانس کی حالت میں اس کے

ساتھ پیش آیا تھا۔ان سارے واقعات میں فخر کے لیے اہم ترین صدمہ کمانڈر فارس جان کی موت کا تھا۔فخر خود اس موت کا سبب بنا تھا اور بہت کوشش کے باوجود وہ خود کو ابھی پوری طرح اس احساسِ جرم سے نکال نہیں پایا تھا۔وہ کئی بار مجھ سے...... اور غائبانہ طور پر قسطینا سے بھی معافی مانگ چکا تھا۔ جب میں نے فخر کو ہاناوانی کے شدید زخمی ہونے کا آنکھوں دیکھا احوال خود اپنی زبان سے سنایا تو اسے کافی سکون ملا۔ وہ بولا۔"شاہ زیب! تم لوگوں کی خواہش ہوگی کہ وہ بدکار عورت زخموں کی تاب نہ لا کر جہنم واصل ہو چکی ہو لیکن میری آرزو ہے کہ وہ ابھی سانس لے رہی ہو اور میں اپنے ہاتھوں سے اس کی جان لے سکوں۔"

پھر اس نے تاجور کے والد دین محمد اور مولوی حبیب اللہ صاحب کی موت کا ذکر چھیڑ دیا اور ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں ویرانی کے سائے طویل ہونے لگے۔ایسے موقعوں پر پہلوان حشمت اچھا کردار ادا کرتے تھے۔ وہ ہلکی پھلکی گفتگو شروع کر کے ماحول کو فخر کے لیے تبدیل کر دیتے تھے۔اب بھی انہوں نے ایسا ہی کیا۔فلسفیانہ انداز میں فرمانے لگے۔

"اوپر والے کے کام بھی عجب ہووت ہیں جس طرح کبھی کبھی اونچی دکان سے بالکل پھیکا سا نان مل جاوت ہے، اسی طرح کبھی کسی پھٹیچر سی دکان سے بڑا خستہ اور گرما گرم نان بھی دستیاب ہو جاوت ہے۔اب میری اس توند کو ہی دیکھیں۔آپ سب اس کو مذاق کا نشانہ بناوت تھے۔اب یہ توند وہاں ٹرک کے ٹیڑھے ہونے والے اسٹیئرنگ میں نہ اٹکی ہوتی تو اب تک تو میرا چالیسواں بھی ہو چکا ہوتا۔یعنی موٹاپے میں سے زندگی کا راز نکل آیا۔اب اس طرح کی دوسری مثال بھی محافظہ (ملاحظہ) کرو، میں نے ایک نابینا کو غلطی سے تھپڑ مارا اور اس کی سزا میں میری ڈچی کی ہڈی میں چوٹ لگ گئی۔اب یہ چوٹ بالکل ٹھیک ہوگئی بھلا کیسے ہوئی؟" پہلوان نے پوچھا۔

"کیسے ہوئی؟" رضوان ٹی نے سوال کیا۔

"چوٹ لگنے سے ہی ٹھیک ہوئی۔ میں نے کسی کو بتایا ناہیں کہ تم لوگ پھر مذاق اڑاؤ گے۔ جب میں نے وہاں انگلینڈ (اٹلی) میں ٹرک کو جیپ پر چڑھایا تو کمر کو ایسا کرارا دھچکا لگا کہ چوٹ غائب۔اسی کو کہتے ہیں کہ لوہے کو لوہا کاٹت ہے۔"

پہلوان جی نے باقاعدہ اٹھ کر اپنی کمر کو چاروں طرف گردش دے کر دکھایا اور ہماری تسلی کی۔

ولید نے کہا۔"چاچا پہلوان! لگتا ہے کہ آج کل آپ کے بہت اچھے دن چل رہے ہیں۔ان اچھے دنوں سے آپ کیوں فائدہ نہیں اٹھاتے۔ ہماری چاچی سے صلح کر لیں۔ وہ

کب تک اس طرح روٹھ کر میکے بیٹھی رہیں گی؟''

پہلوان جی کے چہرے پر ایک دم سنجیدگی طاری ہو گئی۔ بولے۔''تم لوگ سو بار پوچھ چکے ہو اور میں سو بار بتا چکا ہوں۔ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ وہ خود گئی تھی اور آنا ہوگا تو خود ہی آوے گی۔ اس کی اور میری طبیعتوں میں بہت فرق آ چکا ہے۔ یہ تو اب اسی محاورے والی بات ہے کہ ایک میان میں دو بھینسیں بانسری ناہیں بجا سکتیں۔''

رضوان اور ولید کے ساتھ ساتھ فخر کے چہرے پر بھی دبی دبی مسکراہٹ نظر آنے لگی۔

○......❖......○

ایک روز میں بڑی خاموشی کے ساتھ لاہور سے سکھیرا گاؤں پہنچا اور سیف کے اہلِ خانہ سے ملاقات کی۔ یہ گھرانہ مسلسل دکھوں اور پریشانیوں کی زد میں تھا۔ کئی بار میں سوچتا تھا کہ کاش رنگ رنگیلا گبرو سیف میرے پیچھے پیچھے لیہ کے پاراہاؤس نہ پہنچا ہوتا تو یہ ساری آفتیں اس سے اور اس کے گھرانے سے دور رہتیں۔ سیف کی بہن شازیہ بڑی ہمت والی لڑکی تھی۔ اپنی شادی کے چند دن بعد سے ہی وہ ایک طرح سے بیوگی کی زندگی گزار رہی تھی مگر اچھے دنوں کی آس اب بھی اس کے سینے کی گہرائی میں موجود تھی۔

''اکبر کا کچھ پتا چلا شاہ زیب بھائی؟'' اس نے نم آنکھوں کے ساتھ پوچھا۔

''حوصلہ رکھو شازیہ، خدا کے گھر دیر ہے اندھیر نہیں۔ ہم مسلسل اس کی کھوج میں ہیں۔ قسطنینا واپس جاما جی جا چکی ہے۔ اسے یقین ہے کہ اکبر وہیں پر ہے، وہ بہت جلد اسے ڈھونڈ نکالے گی۔''

تینوں بہنوں سے تسلی تشفی کی باتیں کر کے اور ان کو گھر کے اخراجات کے لیے ایک معقول رقم دے کر میں لاہور واپس آ گیا، ٹاؤن شپ کی اسی دو منزلہ عمارت میں جو داؤ د بھاؤ نے ہمیں پناہ گاہ کے طور پر فراہم کر رکھی تھی مگر جب میں یہاں پہنچا تو کھلبلی سی نظر آئی۔ سب سے پہلے سجاول سے ہی ملاقات ہوئی۔ وہ چھڑی کے سہارے برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔

''کیا ہوا سجاول! خیریت تو ہے؟''

''ہاں ویسے تو خیریت ہے مگر باہر سڑک پر کچھ ہوا ہے۔ کسی گاڑی والوں نے ایک موٹر سائیکل سوار کو ٹکر ماری ہے اور اسے گاڑی میں ڈال کر لے گئے ہیں۔''

''یعنی اغوا کیا ہے؟''

''کچھ ایسا ہی کہا جا رہا ہے۔''

اسی دوران میں خورسنہ بھی بچے کو اٹھائے وہاں پہنچ گئی اور اس نے اس واقعے کی

تصدیق کی۔ اچانک میرے سیل فون پر کال کا میوزک آنے لگا۔ یہ داؤد بھاؤ کا خاص نمبر تھا۔ داؤد بھاؤ نے کہا۔ ''شاہ زیب، یہ جگہ اب محفوظ نہیں رہی، تم لوگوں کو فوراً یہاں سے نکلنا ہوگا۔''

''کیوں کیا ہوا ہے؟''

بھاؤ نے کہا۔ ''ابھی کوٹھی کے سامنے جو بندہ اٹھایا گیا ہے وہ خفیہ پولیس کا اہلکار تھا۔ اسے میرے ہی لوگوں نے اٹھایا ہے۔''

اب بھاؤ کی بات سمجھ میں آ رہی تھی۔ یہ اندیشہ درست تھا کہ ڈی ایس پی قیصر چوہدری وغیرہ کی موت کے بعد سے شکیل کے کارندے مسلسل ہمارے کھوج میں ہیں۔ اگلے قریباً ایک گھنٹے میں جو کچھ ہوا بڑی تیزی سے ہوا۔ ایک اسٹیشن وین کوٹھی پر پہنچ گئی۔ اس میں انیق کے بعد بھاؤ کا دست راست لودھی بھی موجود تھا۔ ہم سب کو اس وین کے ذریعے اسلام آباد روانہ ہونا تھا۔ وہاں داؤد کی ایک اور محفوظ پناہ گاہ موجود تھی۔ ہم نے عمارت میں سے اپنی ضروری اشیا سمیٹ لی تھیں۔ ان ضروری اشیا میں وہ چند ایک طوطے بھی شامل تھے جن کا تعلق کبھی ہاناوانی سے رہا تھا۔ عمارت سے ہمارے ساتھ روانہ ہونے والوں میں انڈین شاردا بھی تھی۔ وہ مکمل طور پر ہاناوانی سے کنارہ کش ہو چکی تھی۔ تاہم اس کی طرف سے ہم اب بھی محتاط رہتے تھے۔ روانگی سے قبل ہم نے عمارت میں اپنی موجودگی کے بیشتر ثبوت مٹا دیئے تھے۔

اسٹیشن وین ہمیں لے کر بذریعہ موٹر وے اسلام آباد روانہ ہوئی۔ اس وین پر کسی فارن ایمبیسی کی نمبر پلیٹ تھی جو یقیناً جعلی ہی ہوگی۔ ہم ''بھیرا انٹر چینج'' سے کچھ فاصلے پر تھے جب خاص نمبر سے بھاؤ کا فون دوبارہ آیا۔ اس نے اپنے پروگرام میں کچھ تبدیلی کی تھی۔ وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''شاہ زیب! میری رائے یہ ہے کہ تم سب کو ایک ہی جگہ پر اکٹھے نہیں ہونا چاہیے۔ اسلام آباد میں ہمارے پاس ایک نہیں، تین چار ٹھکانے ہیں۔ میری رائے تو یہ ہے کہ تم لوگ خود کو دو تین جگہوں پر بانٹ لو۔''

''مثلاً کس طرح؟''

''سجاول، خورسنہ اور ولید کو علیحدہ کر دو۔ یہ راولپنڈی میں رہ لیں۔ فخر اور تمہارا پہلوان حشمت سیکٹر 2 کے ایک فلیٹ میں رہ لیں گے۔ اس انڈین لڑکی کو بھی ان کے ساتھ کر دو۔ کھانا وانا بنا لے گی۔ تم اور رضوان شکر پڑیاں چلے جاؤ۔ وہ تمہارے لیے بالکل ٹھیک جگہ ہے۔ وہاں تمہارے ساتھ میری ملاقات بھی ممکن ہو سکے گی۔''

ہم نے اس سلسلے میں کچھ ڈسکشن کی۔ سجاول، رضوان اور فخر سے بھی مشورہ کیا۔ آخر میں فیصلہ یہی ہوا کہ داؤد بھاؤ کے مشورے پر من وعن عمل کیا جائے۔

○......❖......○

یہ شکر پڑیاں کے قریب رہائشی آبادی میں ایک دو منزلہ گھر تھا۔ رقبہ صرف پانچ مرلے تھا مگر کشادہ کمرے تھے اور ہر طرح کی تزئین و آرائش موجود تھی۔ مجھے اور رضوان کو یہاں ہر طرح کا آرام مہیا تھا۔ رضوان کھانا پکانا بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ لہٰذا ہمیں ہوٹل سے رجوع کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہمیں یہاں آئے ہوئے آٹھ دس روز ہو چکے تھے۔ اس دوران میں اس کے سوا کوئی اہم واقعہ نہیں ہوا کہ ایک بار داؤد بھاؤ اپنے بدلے ہوئے حلیے میں بڑی خاموشی کے ساتھ یہاں آیا تھا اور ایک رات ہمارے ساتھ ہی بسر کی تھی۔ بے شمار لوگوں کا خیال یہی تھا کہ داؤد بھاؤ اس جہانِ فانی سے کوچ کر چکا ہے مگر شکیل داراب جیسے گھاگ لوگ اب بھی اس کا کھوج لگاتے پھرتے تھے۔ یہ بات بھی سنی جا رہی تھی کہ شکیل داراب پولیس اور انتظامیہ پر اپنا اثر و رسوخ استعمال کر رہا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ اگر داؤد بھاؤ کہیں نظر آ جائے تو اسے دیکھتے ہی شوٹ کر دیا جائے۔ شکیل کا خیال یہی تھا کہ لالہ وریام اور ڈی ایس پی قیصر کی اندوہناک موت کے پیچھے داؤد بھاؤ کا اہم کردار ہے۔

وہ فروری کی ایک سرد شام تھی۔ ملکہ کوہسار مری کی طرف سے برفیلی ہوائیں آ رہی تھیں اور اسلام آباد کو یخ بستہ کر رہی تھیں۔ میں آتشدان کے قریب اکیلا بیٹھا تھا اور ماضی کو کھنگالنے میں مصروف تھا۔ جب بھی سوچ کا رخش ماضی کی پگڈنڈی پر قدم رکھتا تھا، تاجور کی یاد خود بخود دل و دماغ کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ آج کل میں اس کے شہر میں ہوں۔ اس کے محل نما گھر سے شاید سات آٹھ کلو میٹر کے فاصلے پر۔ میں بھی انہی یخ بستہ فضاؤں میں سانس لے رہا تھا جن میں وہ لے رہی تھی۔ اگر وہ چاہتی تو گاڑی میں بیٹھ کر صرف دس پندرہ منٹ میں مجھ تک پہنچ سکتی تھی (ایک روز پتا نہیں کس جذبے کے تحت میں نے اپنا فون نمبر اور ایڈریس اسے SMS کر دیا تھا) شاید دلِ ناداں اب بھی آس کی کوئی نہ کوئی ڈور باندھ کر رکھنا چاہتا تھا۔

دین محمد صاحب کی موت والا واقعہ کوئی چھوٹا واقعہ نہیں تھا۔ میں نے مجبوری کی حالت میں ان کے مردہ جسم پر گولیاں چلائی تھیں۔ وجہ صرف یہی تھی کہ اس وقت میں ہاناوانی کو یہ بھرپور تاثر دینا چاہتا تھا کہ میں پوری طرح اس کے قبضے میں ہوں...... لیکن اپنی اس کارروائی نے مجھے شرمندگی کے سمندر میں ڈبوئے رکھا تھا۔ تب میرے ذہن میں یہ خوف

بھی جاگزیں ہوا تھا کہ اپنے والد کے قتل کے لیے تاجور مجھے کبھی معاف نہیں کرے گی۔ تاہم پھر جو کچھ ہوا تھا، اس نے میرے دل میں تاجور کی محبت اور عزت کچھ اور بڑھائی تھی۔ جذباتی ریلے میں بہنے کے بجائے اس نے بھی دانشمندی سے حقیقت کا دامن تھاما تھا۔ پہلے تو اس نے یہ بات ہی ماننے سے انکار کیا تھا کہ میں اس کے والد کی جان لے سکتا ہوں۔ اس نے خود کو یقین دلایا تھا کہ میں نے جو کچھ کیا ہے اسی خطرناک ہیجان کے زیراثر کیا ہے جس میں اس شیطان صفت عاملہ نے مجھے اور دیگر لوگوں کو مبتلا کر رکھا ہے۔ بعد میں جب میں نے سیف کی بہن شازیہ کے ذریعے اس تک یہ بات پہنچائی تھی کہ میں اس عاملہ کے زیراثر نہیں تھا اور میں نے دین محمد صاحب کو مارا بھی نہیں بلکہ وہ پہلے سے دم توڑ چکے تھے...... تو اس نے میرے اس بیان کو بھی من وعن تسلیم کر لیا تھا۔ شاید اس طرح اس نے اپنی ایک سابقہ غلطی کا مداوا بھی کیا تھا۔ وہی سیف والا معاملہ جس میں اس نے مجھے گناہ گار سمجھا اور مجھ سے دور چلی گئی۔

آس ٹوٹ کر بھی ٹوٹتی نہیں ہے۔ شکر پڑیاں کے نزدیک اس گھر میں کئی بار، میں کسی آہٹ پر چونکا تھا۔ قدموں کی چاپ نے میرے جسم میں سنسناہٹ دوڑائی تھی۔ نہ جانے کیوں لگتا تھا، کسی دن اچانک وہ سارے بندھن توڑ کر ساری مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر آجائے گی۔ آنکھوں کے کٹوروں کو آنسوؤں سے لبالب بھر کر میری طرف دیکھے گی اور دوڑ کر مجھ سے لپٹ جائے گی۔ مجھے اپنے بازوؤں کی پوری طاقت سے بھینچے گی اور کہے گی...... شاہ زیب! میں جھوٹی زندگی نہیں گزار سکتی۔ جب میرے دل میں صرف آپ ہو تو میں کسی اور کی بن کر کیوں رہوں؟ کیوں ہر پل خود کو گناہ کی دلدل میں دھنساتی رہوں۔ مجھے یہاں سے کہیں دور لے جاؤ۔ جہاں میرے اور آپ کے سوا اور کوئی نہ ہو۔

آج بھی اس سرد شام میں آگ تاپتے ہوئے، میں یہی سوچ رہا تھا۔ کیا وہ اپنے جہنم سے نکلنے کی کوشش کرے گی؟ کیا وہ دنیا کی پروا کیے بغیر سچ کو اپنانا چاہے گی کئی بار دل میں آتا تھا کہ ایک بار ملازمہ فردوس کے ذریعے اس سے فون پر بات کرنے کی کوشش کروں لیکن پھر یہ خیال میں نے ذہن سے نکال دیا تھا۔ چند ماہ پہلے میں نے فردوس سے وعدہ کیا تھا کہ میں اس معاملے میں اب اسے مزید نہیں گھسیٹوں گا۔ میں ہر صورت اس وعدے کی پاسداری کرنا چاہتا تھا اور ویسے بھی مجھے لگتا نہیں تھا کہ میرا کہا سنا اس پر کچھ اثر کر سکتا ہے۔ وہ اب بہت دور نکل چکی تھی شاید...... اس کی سوچ کے سارے زاویے تبدیل ہو چکے تھے۔ ایک بچے کی ماں بننے والی تھی وہ۔

اچانک فون کے میوزک نے میرے خیالوں کا سلسلہ منقطع کیا۔ یہ کال جاما جی سے قسطینا کی تھی۔ ''ہیلو قسطینا! کیسی ہیں آپ؟'' میں نے پوچھا۔

''تم خود کال کر کے یہ سوال کرتے تو زیادہ اچھا لگتا۔'' وہ اداس لہجے میں بولی۔

''یقین کریں، میں نے پرسوں دو بار کوشش کی مگر رابطہ نہیں ہو سکا۔ بہت مشکل سے کال ملتی ہے۔ اب بھی ٹرائی کرنے کا سوچ ہی رہا تھا۔''

''سوچنے کا شکریہ۔'' وہ بولی۔

''اور حالات کیا ہیں ادھر؟'' میں نے پوچھا۔

وہ ذرا توقف سے کہنے لگی۔ ''ایسی خبریں مل رہی ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ تمہارے حملے میں زخمی ہونے کے بعد ہاناوانی واپس جاما جی نہیں آئی۔ وہ وہیں پاکستان میں کہیں ہے یا پھر کسی ہمسایہ ملک میں۔ یہاں جاما جی میں اس کے جو دو تین اہم ٹھکانے ہیں وہ خالی پڑے ہیں۔''

''یہ تو پھر تشویشناک بات ہوئی؟'' میں نے کہا۔

''لیکن ایک بات تشویش کم کرنے والی بھی ہے۔'' قسطینا نے کہا۔ ''اطلاعات بتاتی ہیں کہ تم نے اس پر بڑے کارگر وار کیے ہیں۔ وہ کئی ماہ بعد بھی اپنے ان زخموں سے ابھر نہیں سکی۔ جہاں بھی ہے سخت علالت کی حالت میں ہے اور شاہ زائب! اگر وہ واقعی سخت علالت کی حالت میں ہے تو پھر...... متعلقہ لوگ اور ماہرین یہی کہتے ہیں کہ ایسے تنویمی عامل اور ہپناٹسٹ کی کارکردگی نہ ہونے کے برابر رہ جاتی ہے۔''

میری نگاہوں کے سامنے وہ مناظر گھوم گئے جب ہاناوانی کے بیڈروم میں، میں نے شیشے کے ٹوٹے ہوئے وزنی پائے کے ساتھ ہاناوانی کو کاری زخم لگائے تھے۔

تھوڑی دیر، میرے اور قسطینا کے درمیان اس معاملے پر بات ہوئی۔ پھر میں نے پوچھا۔ ''قسطینا! سیف کے بہنوئی اکبر کے بارے میں کوئی اطلاع؟''

''سوری شاہ زائب! کوئی خاص اطلاع نہیں مگر اندازہ یہی ہے کہ اکبر بھی وہیں ہے جہاں وہ حرام زادی ہے......''

''عین ممکن ہے قسطینا...... کہ وہ پاکستان میں ہی کہیں ہو؟''

''یہ ہوسکتا ہے...... وہ مینشن سے شدید زخمی حالت میں نکلی تھی۔ اس حالت میں اسے بہت لمبا سفر تو کرایا نہیں جا سکتا تھا۔''

''اگر وہ پاکستان میں یا ارد گرد کہیں ہے تو پھر اسے یہیں پر ڈھونڈنا چاہیے۔ آپ۔

کب آنا ہے پاکستان؟"

وہ ذرا توقف سے بولی۔ "ابھی نہیں شاہ زائب! کچھ مسائل ہیں یہاں۔"

میں نے مسائل کے بارے میں پوچھا لیکن اس نے بات گول کر دی۔ تاہم دو روز بعد جب جاماجی سے زینب نے کال کی تو کچھ سن گن ملی۔ گفتگو کے دوران میں زینب نے کہا۔ "کمانڈر قسطینا کے لیے مرحوم ریان فردوس کے ایک بھتیجے احمد ثانی کا رشتہ آیا ہے۔ احمد ثانی جاماجی کے امیر ترین لوگوں میں شمار ہوتا ہے۔ برونائی میں اس کی دو تین بڑی فیکٹریاں ہیں اور اس کے اپنے ذاتی "شپ" ہیں۔"

"اوہ...... یہ تو نئی خبر سنائی تم نے۔" میں نے کہا۔ پھر ذرا توقف سے پوچھا۔ "تو پھر کہاں پہنچی بات؟"

"ابھی تو قسطینا کی عدت پوری ہوئے دس پندرہ روز ہی ہوئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ایک دو ہفتے بعد باضابطہ طریقے سے کچھ بات چیت ہوگی۔"

"تم تو قسطینا کے ساتھ رہتی ہو، اس کا ردِعمل کیا ہے؟" میں نے زینب سے پوچھا۔

"قسطینا کے اندر کے بارے میں ان کے چہرے سے جاننا کچھ آسان نہیں ہوتا مگر میرا خیال ہے کہ وہ اس سلسلے میں ابھی تو رضامند نہیں ہیں۔ حالانکہ...... احمد ثانی غیر شادی شدہ ہیں۔ جوان اور خوب صورت ہیں۔ اگر رشتے کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ کمانڈر قسطینا کے لیے بہت ہی مناسب ہے۔"

"ہاں...... مجھے بھی نہیں لگتا کہ وہ اس بارے میں آسانی سے رضامند ہوگی۔" میرے منہ سے جیسے بے ساختہ نکل گیا۔

زینب بولی۔ "وہ آج کل بہت اداس موڈ میں ہیں بھائی! آرمی ہیڈکوارٹر میں رات گئے تک اپنے کام میں غرق رہتی ہیں۔ واپس آکر کمرے سے ہی نہیں نکلتی ہیں۔ جاماجی کے لوگ ان کو دیکھنا اور سننا چاہتے ہیں مگر وہ صرف ایک بار ڈی پیلس کی بالکونی میں لوگوں کے سامنے آئی ہیں اور وہ بھی چار پانچ منٹ کے لیے۔"

میں قسطینا کے دلی جذبات سمجھتا تھا۔ کبھی کبھی وہ مجھے ایک گہرے منجدھار میں محسوس ہوتی تھی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ ہاتھ بڑھاؤں اور اسے تھام لوں۔ اس نے قدم قدم پر جس طرح میرا ساتھ دیا تھا، میرے لیے اور میرے ساتھیوں کے لیے اپنی جان ہتھیلی پر رکھی تھی اور اب بھی رکھے ہوئے تھی، اس کا کچھ حق بنتا تھا اور اس کے دل میں کیا ہے، میں جانتا تھا۔ دوسری طرف تاجور کا خیال تھا...... ہاں دوسری طرف تاجور کا خیال تھا۔ وہ خیال...... جواب

صرف ایک خیال ہی تھا۔ تاجور کی زندگی کی سمت تبدیل ہو چکی تھی۔ وہ پنجرے کے طوطے کی طرح پنجرے کو ہی اپنا گھر سمجھنے لگی تھی۔ وہاں سے نکلنے کی اسے کوئی خواہش نہیں تھی اور اب اس کی زندگی کے ساتھ ایک ننھی سی نئی زندگی جڑنے والی تھی...... اس کی سوچوں کا رخ اور کا اور ہو چکا تھا۔

○......❖......○

یہ قریباً ایک ماہ بعد کی بات ہے۔ وہ بھی شام ہی کا وقت تھا۔ سورج کی الوداعی کرنیں مارگلہ کی پہاڑیوں کو روشن کر رہی تھیں۔ رضوان تھوڑی سی شاپنگ کے لیے قریبی مارکیٹ گیا ہوا تھا۔ میرا زخمی انگوٹھا ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں تھا، میں نے خود ہی اس کی ہلکی پھلکی بینڈ تیج کی اور پھر فون پر سجاول اور خورسنہ کا حال احوال پوچھنے میں مصروف ہو گیا۔ اچانک ڈور بیل ہوئی۔ رضوان کے پاس تو چابی موجود تھی، اسے بیل دینے کی کیا ضرورت تھی۔ میں نے سجاول کو خدا حافظ کہا اور دروازے کی طرف گیا، تاہم اس سے پہلے میں نے دراز میں سے اپنا بریٹا پسٹل نکال کر بیلٹ میں رکھا اور جیکٹ کے بٹن بند کر لیے۔

''کون؟'' میں نے دریافت کیا۔

دوسری طرف سے قسطینا کی آواز آئی۔ ''میں ہوں شاہ زائب۔''

میں ششدر رہ گیا۔ دروازہ کھولا تو وہ اپنے مخصوص لباس سفید پینٹ اور نارنجی پل اوور میں میرے سامنے کھڑی تھی۔ اپنی بے ساختہ بے تکلفی کے ساتھ وہ میرے گلے لگ گئی۔ ''کیسے ہو شاہ زائب؟''

''سخت حیران اور پریشان۔ بہت بڑا سرپرائز دیا آپ نے۔''

''تم نے سمجھا ہوگا، شاید کوئی بچا کھچا سر منڈا خبیث تمہیں ہیلو ہیلو کہنے آ گیا ہے۔''

''یہ کیسے سوچا آپ نے؟''

وہ گلے سے لگے لگے بولی۔ ''میں اپنے پیٹ پر کسی چیز کی سختی محسوس کر رہی ہوں اور یقیناً یہ تمہارا بریٹا پسٹل ہی ہے جسے تم نے افراتفری میں اپنی بیلٹ کے اندر ٹھونسا ہے۔''

ہم دونوں ہنسنے لگے۔ میں نے قسطینا کا ٹرالی اٹیچی کیس سنبھالا اور اسے کامن روم میں لے آیا۔ اسے سراپا دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ کی تو شاید...... شادی ہونے والی تھی؟''

''تو ہو گئی ناں۔'' اس نے اطمینان سے کہا۔ ''چٹ منگنی پٹ بیاہ۔ ہمارے ہاں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔''

''اوہ......تو......کہاں ہیں وہ؟''

''وہ بھی آئے ہیں۔ باہر ٹیکسی کار والے کو پے منٹ کر رہے ہیں۔''

مجھے، سینے میں ایک ہلکا سا دھواں پھیلتا محسوس ہوا۔

میں نے کھڑکی کا پٹ کھول کر باہر جھانکا۔ ٹیکسی کار موجود نہیں تھی، کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی شوخ مسکراہٹ چمک رہی تھی۔ قسطینا کا یہ خوشگوار موڈ میں طویل عرصے بعد دیکھ رہا تھا۔ ''کیوں مایوسی ہوئی؟'' اس نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

''نہیں، اس کے برعکس ہوا۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے بھی نہیں لگتا تھا کہ آپ اتنی جلدی اتنے اہم فیصلے پر تیار ہو جائیں گی۔''

وہ اپنے جوتوں کے تسمے کھولتے ہوئے بولی۔ ''جلدی یا دیر کی بات نہیں ہے شاہ زائب! جو فیصلہ کرنا ہی نہیں، اس کے بارے میں خود کو وقت دینے سے مطلب؟...... لہٰذا......سامان اٹھایا اور یہاں چلی آئی تمہارے پاس۔''

''لیکن آپ......''

''لیکن میں یہاں ٹھہروں گی نہیں۔'' اس نے تیزی سے میری بات کاٹی۔ ''اور نہ ہی دوبارہ تم سے ملوں گی...... اگر تم نے اپنی بول چال کا یہی انداز رکھا۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے پوچھا۔

''یہ آپ جناب...... اب نہیں چلے گا جس طرح میں تمہیں بے تکلفی سے تم کہہ کر بلاتی ہوں، تمہیں بھی بلانا پڑے گا اور اس کے علاوہ......'' وہ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔

''اور کیا؟'' میں نے استفسار کیا۔

''اور بھی کچھ باتیں ہیں آہستہ آہستہ سوچوں گی۔'' وہ میری طرف دیکھے بغیر بولی۔

''آپ......مم......میرا مطلب ہے تم کوئی اشارہ تو دو۔''

''مثلاً یہ کہ میں کچھ دنوں کے لیے اپنے اندرونی آرمی آفیسر کو خود سے بالکل دور رکھنا چاہتی ہوں۔ ایک عام لڑکی...... سوری ایک عام عورت کی طرح رہنا چاہتی ہوں۔ مثلاً کچن میں داخل ہونا چاہتی ہوں۔ کوکنگ کرنا چاہتی ہوں۔ مزے مزے کے کھانے بنانا چاہتی ہوں، اور کھانا چاہتی ہوں۔''

''خود ہی؟''

''نہیں...... اگر رسک لے سکو تو تم بھی شریک ہو جانا۔'' وہ ہنسی اور اس کے سپید

دانت چمک اٹھے۔اس کی آواز کچھ بھاری تھی مگراس بھاری پن میں بھی ایک طرح کی دلکشی تھی۔

میں نے کہا۔''ٹھیک ہے۔یہاں سب کچھ حاضر ہے......اور کچن بھی حاضر ہے لیکن ایک عورت کے لیےنہیں،ایک لڑکی کے لیے......''

وہ میری بات سمجھ کر بولی۔''ایم ایم اے کے چمپئن کو مکھن لگانا بھی آتا ہے؟''

''آتا تو نہیں مگر کبھی کبھی کوشش کر لیتا ہوں۔''

وہ جھکی اور اپنا اٹیچی کھولنے میں مصروف ہوگئی۔

کچھ دیر بعد رضوان بھی بازار سے واپس آ گیا۔وہ بھی قسطینا کی اس اچانک آمد پر از حد حیران ہوااور خوش بھی۔

قسطینا بہت موڈی لڑکی تھی۔سنجیدگی اور افسردگی کے طویل دورانیے کے بعد اب وہ خوشگوار موڈ میں دکھائی دیتی تھی۔اگلے دو تین روز اس کا یہی موڈ برقرار رہا۔میرے اور رضوان کے بہت منع کرنے کے باوجود وہ کچن میں جانے لگی۔ملائیشین طرز کے کھانے وہ اچھے بناتی تھی۔کچھ ڈشز میں مرچیں زیادہ ہوتی تھیں لیکن میں اور رضوان اس کی دل شکنی نہ کرتے ہوئے قوتِ برداشت کا مظاہرہ کرتے تھے۔کسی وقت ہم جاماجی اور پاکستان کے لطائف کا تبادلہ بھی کرتے۔رات نو بجے کے بعد وہ دو گھنٹے کے لیے باقاعدگی سے ٹی وی دیکھتی تھی۔اس کی چوائس انگلش کی کوئی مزاحیہ فلم ہوتی تھی۔شایداس طرح سے وہ اپنے اندر کی افسردگی کو دور کرنے کی کوشش کرتی تھی۔تاہم اس کے باوجود کسی وقت وہ بات کرتے کرتے ایک دم کہیں کھوسی جاتی تھی۔میں جانتا تھا کہ اس کے یوں کھو جانے کی وجہ کمانڈر فارس کی یاد ہی ہوتی تھی۔

ایک دوپہر گھر کی چھت پر ٹہلتے ٹہلتے اس نے تاجور کا ذکر چھیڑ دیا۔بولی۔''شاہ زائب!کیا کسی طرح تاجور کواس شخص سے نجات نہیں دلائی جاسکتی؟''

میں نے کہا۔''قسطینا!میں نے آپ کو......میرا مطلب ہے تمہیں...... پہلے بھی بتایا تھا کہ نجات اسے دلائی جاتی ہے جو خود کو کسی مصیبت میں سمجھتا ہو۔جب وہ اپنے حال سے مطمئن ہے اوران تکلیفوں میں ہی خوش ہے تو پھراس کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟اگر ہم زیادہ کچھ کریں گے تو وہ یہی سمجھے گی کہ ہم اس کا گھر برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔''

قسطینا نے ایک لمبی سانس کھینچی اور بولی۔''پتا نہیں کہ وہ کس مٹی کی بنی ہوئی ہے۔میں نے خود بھی،فون پراور آمنے سامنے اس سے کئی دفعہ بات کی ہے۔اسے سمجھایا کہ اگر وہ ان

زنجیروں کو توڑنے کی کوشش نہیں کرے گی تو یہ اسے مزید اپنی لپیٹ میں لیتی چلی جائیں گی...... یہاں تک کہ اس کا دم گھٹ جائے گا اور وہ تازہ ہوا کے لیے ترس کر ختم ہو جائے گی...... وہ سنتی تو سب کچھ ہے مگر قائل کسی بات پر نہیں ہوتی۔"

"میں سمجھتا ہوں قسطینا کہ اسے سمجھانے بجھانے کا وقت اب گزر چکا ہے۔ اس کے جسم میں جو ایک نئی زندگی پل رہی ہے، اس نے اس کی سوچوں کا رخ مکمل طور پر بدل دیا ہے۔" ہم باتیں کرتے ہوئے چھت سے نیچے کمرے میں آ گئے۔

"لیکن شاہ زائب! کسی وجہ سے کسی مرد سے شادی ہو جانے اور اس کے بچے کی ماں بن جانے کا مطلب یہ تو نہیں ہوتا کہ ساری زندگی اس کے ساتھ تباہ کر دی جائے۔ اس کے مزید بچے پیدا کیے جائیں اور ان کے مستقبل بھی مخدوش بنا دیئے جائیں۔"

میرے اور قسطینا کے درمیان کچھ دیر تک اس موضوع پر بات ہوتی رہی۔ پھر میں نے موضوع بدلنے کے لیے کہا۔ "قسطینا! چھوڑو ان باتوں کو...... تم یوں سمجھ لو کہ مشرقی عورتیں خاص طور سے ہمارے اس خطے کی عورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہ کر میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ "اور اس خطے کے مرد؟"

میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔ "غم جھیلنا جانتے ہیں۔ ہمدرد ہوتے ہیں...... اور کسی کا دل نہیں دُکھاتے۔"

"دُکھاتے ہیں...... دل تو دُکھاتے ہیں۔" اس نے معنی خیز انداز میں کہا اور دوسری طرف دیکھنے لگی۔

مجھے جاما جی میں زیر زمین سرنگوں کا وہ منظر یاد آ گیا جب میں نے قسطینا سے التجا کی تھی کہ وہ میرے بارے میں سوچنا چھوڑ دے اور کمانڈر فارس جان سے شادی کر لے۔ ان لمحوں میں قسطینا کے چہرے پر جس طرح کے کربناک تاثرات ابھرے تھے، وہ بھی مجھے آج تک یاد تھے۔

میں نے کہا۔ "قسطینا! پرانی باتوں کو چھیڑو گی تو تمہارے موڈ اور تمہاری صحت دونوں کے لیے اچھا نہیں ہوگا...... پہلوان حشمت بھی تو یہی "کہوت" ہیں۔ رنج و غم کی دوڑ میں جو آگے آگے جائیں...... اپنی قبروں کی جانب بھاگے بھاگے جائیں۔"

قسطینا نے عجیب نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولی۔ "تم...... بہت برے ہو شاہ زائب۔" اس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی چمک رہی تھی۔ وہ اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

''میں تمہاری اس بات سے مکمل اتفاق کرتا ہوں کمانڈر قسطینا۔''

وہ مڑی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے پہلوؤں پر رکھے۔ غصے اور شوخی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ میری طرف دیکھتی رہی، پھر ایک دم مجھ پر جھپٹ پڑی۔ میں نے صوفے سے اٹھنے کی کوشش کی مگر تب تک وہ مجھ سے ٹکرا چکی تھی۔ میں لڑکھڑا کر الماری سے جالگا۔ اس نے میرے سر پر گھونسا رسید کرنا چاہا۔ میں نے جھک کر یہ وار بچایا۔ وہ اپنے ہاتھ پاؤں کو مشینی انداز میں حرکت دینے لگی۔ وہ اچھی خاصی فائٹر تھی۔ (ریڈ کیٹ سے اس کی زبردست فائٹ ابھی تک میرے ذہن میں تازہ تھی) میں صرف اس کے وار روکنے پر اکتفا کر رہا تھا۔ اپنی ناکامی پر وہ مزید مشتعل ہو رہی تھی۔ ایک موقع پر اس نے تیز رفتاری سے اڑنگا لگایا اور میں پشت کے بل قالین پر گر گیا۔ وہ میرے اوپر چڑھ بیٹھی۔ رضوان بالائی منزل پر ہوتا تھا۔ تاہم یہ شور شرابا اسے نیچے لا سکتا تھا۔

میں نے کہا۔ ''خدا کا خوف کرو چیف! رضوان نیچے آ جائے گا۔''

''آنے دو۔'' وہ ہانپی ہوئی آواز میں بولی...... اور میرے ہی بتائے ہوئے طریقے کے مطابق مجھے آرم لاک لگانے کی کوشش کی۔ ایسا کرتے ہوئے اس کا ہاتھ بری طرح میرے زخمی انگوٹھے سے ٹکرایا۔ زخم ابھی پوری طرح مندمل نہیں تھا۔ میرے ہونٹوں سے بے ساختہ ہلکی سی کراہ نکل گئی۔

وہ ایک دم چونک کر رک گئی۔ پھر غالباً میرے چہرے پر اذیت کے تاثرات دیکھ کر جلدی سے نیچے اتر آئی۔۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے زخمی انگوٹھے والا ہاتھ دوسرے ہاتھ سے تھام رکھا تھا۔ قسطینا کے تاثرات بھی ایک دم بدل گئے۔

''سس...... سوری...... ویری سوری شاہ زائب! میرے دماغ سے بالکل نکل گیا۔ اوہ گاڈ، مجھے لگتا ہے تمہیں زیادہ چوٹ آئی ہے۔'' اس نے نرمی سے میرا انگوٹھا تھاما۔

میں چند روز پہلے تک انگوٹھے پر فائبر کی ایک چھوٹی سی کیپ چڑھائے رکھتا تھا تاکہ وہ چوٹ سے محفوظ رہے لیکن آج وہ کیپ بھی نہیں تھی۔ ایک جانب سے انگوٹھا بالکل سرخ نظر آنے لگا تھا۔ قسطینا بے چین دکھائی دی۔ قسطینا نے انگوٹھا دونوں ہاتھوں میں تھام کر اسے منہ لگایا اور اسے گرم کرنے کے لیے روایتی طریقے سے پھونکیں مارنے لگی۔

''ویری سوری شاہ زائب۔'' اس نے پھر کہا۔

''نو مینشن قسطینا! بچ بچاؤ ہو گیا ہے۔ دو چار روز مزید کیپ چڑھا لوں گا۔''

جیسے ایک بے ساختہ عمل کے تحت اس نے میرے زخمی ہاتھ کو اپنے گال سے لگایا اور

پھر اسے ہولے ہولے دبانے لگی۔

کچھ دیر تک کمرے میں بوجھل سی خاموشی رہی پھر قسطینا نے کہا۔ ''شاہ زائب! ایک وقت تھا، جب میں تمہیں انٹرنیٹ پر یا ٹی وی پر دیکھتی تھی۔ اس وقت تم کو براہِ راست دیکھنا یا تم سے بات کرنا بھی بہت دور کی بات لگتی تھی لیکن پھر دیکھو کہ وقت نے کیسا کھیل کھیلا۔ تم خود میرے پاس پہنچ گئے۔ کہاں سے چل کر کہاں آ گئے اور پھر......''

''پھر کیا؟''

''پھر دور بھی ہو گئے۔''

''پھر وہی پرانی باتیں۔''

''اچھا چلو نئی بات کر لیتے ہیں۔'' وہ ذرا اٹھلا کر بولی۔ ان لمحوں میں وہ بالکل عام لڑکی لگ رہی تھی۔

''کون سی نئی بات؟''

''آج کھانے میں کیا پسند کرو گے؟''

''جو بھی چیف بنا لے۔''

''چلو پھر آج تمہاری پسندیدہ ویجی ٹیبل بناتی ہوں۔ تم کیا کہتے ہو اسے اپنی زبان میں...... پنڈی ٹوری۔''

''پنڈی ٹوری نہیں۔ بھنڈی توری۔ مگر آپ جناب تو فرماتی تھیں کہ اسے کاٹنا، اسے اندر سے چیک کرنا اور اسے بھوننا کسی سزا کی طرح لگتا ہے۔''

''تو تھوڑی سی سزا بھی تو ملنی چاہیے ناں ڈیئر...... تمہارا انگوٹھا دُکھایا ہے۔'' وہ مسکرائی۔

قسطینا کے جانے کے بعد میں نے کمرے میں الٹ پلٹ ہو جانے والی چیزوں کو درست کیا اور کھڑکی سے باہر جھانکا۔ رضوان وہاں چھوٹے سے لان میں موجود تھا۔ وہ نیچے تو آ گیا تھا مگر معلوم نہیں کہ اس نے اندر کے مناظر دیکھے تھے یا نہیں۔

دو روز بعد کی بات ہے۔ موسم سرد اور ابر آلود تھا مگر بارش کا امکان نظر نہیں آتا تھا۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا۔ رضوان کچھ دیر پہلے سجاول اور خورسنہ وغیرہ سے ملنے راولپنڈی چلا گیا تھا۔ وہ ان سے کافی گھل مل چکا تھا۔ خاص طور سے جب سے سجاول کی آنکھوں والا معاملہ ہوا تھا، وہ اس چھوٹی سی فیملی کے ساتھ کافی انس محسوس کرنے لگا تھا۔

میں نے دیکھا، قسطینا نے میری قمیص پہن رکھی تھی اور نیچے چھوٹا سا ٹراوَزر تھا۔ وہ گھر

میں اِدھر اُدھر گھوم رہی تھی۔ ''یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے بھئی؟'' میں نے پوچھا۔

''ذرا لانڈری کرنے لگی ہوں، میرے سارے کپڑے دھلنے والے ہیں۔'' اس نے کہا۔

''یہ کیا کر رہی ہو قسطینا! رضوان کو دو وہ باہر سے لانڈری کروا لے گا۔''

''وہ تو مجھے بھی پتا ہے لیکن میرا دل چاہ رہا ہے بلکہ مجھے اپنے بھی دو، میں اکٹھے ہی واش کر دوں گی۔''

''قسطینا، کیوں شرمندہ کر رہی ہو۔ یہ اچھا نہیں لگ رہا۔''

''مگر مجھے لگ رہا ہے۔ دو اپنے کپڑے۔'' وہ حکمیہ لہجے میں بولی۔

میں بہت منع کرتا رہا مگر اس نے دو جوڑے نکال ہی لیے۔ میں نے کہا۔ ''دیکھو، بارش ہو سکتی ہے۔ لانڈری کے لیے یہ وقت مناسب نہیں۔''

''میں نے کون سا دھوبی گھاٹ پر جا کر دھونے ہیں۔ آٹومیٹک مشین ہے۔ سوکھے سکھائے باہر نکل آئیں گے۔ اس طرح کے کام تو ہماری فوجی ٹریننگ کا حصہ ہوتے ہیں۔'' وہ عجیب سے موڈ میں تھی۔

اس نے بڑی پھرتی سے تیس چالیس منٹ میں نہ صرف لانڈرنگ کر لی بلکہ اس کے بعد گرما گرم چائے اور جاماجی طرز کے چکن پکوڑے بھی تیار کر لیے۔ یہی وقت تھا جب ڈور بیل کی آواز سنائی دی۔ میں نے سمجھا کہ شاید رضوان واپس آ گیا ہے لیکن دروازہ کھولا تو حیران رہ گیا۔ سامنے ایک برقع پوش لڑکی کھڑی تھی۔ نقاب میں سے صرف اس کی آنکھیں ہی دکھائی دیتی تھیں مگر میں آسانی سے پہچان گیا۔ یہ تاجور کی آنکھیں تھیں، ہمیشہ کی طرح ساکت...... خاموشی نے ان آنکھوں کو ڈھانپ رکھا تھا۔

''تاجور! تم یہاں؟'' میں نے لرزاں لہجے میں کہا۔

وہ دو قدم اٹھا کر اندر آ گئی۔ میں نے بیرونی دروازہ بند کر دیا۔ چند ہی سیکنڈ بعد ہم دس بارہ فٹ کا لان طے کر کے کامن روم میں تھے۔ ''کیسے ہیں آپ؟'' اس نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

یہی وقت تھا۔ جب ڈرائنگ روم کی طرف سے قسطینا کی چہکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''کہاں ہو ڈیئر! چائے تیار ہے۔''

دو سیکنڈ بعد قسطینا خود بھی سامنے آ گئی۔ وہ ابھی تک میری ہی شرٹ میں تھی۔ آستینیں اڑسی ہوئی تھیں۔ اس لباس میں ایک خوبرو لڑکا سا نظر آتی تھی۔ تاجور کو دیکھ کر اور پھر پہچان کر وہ

بری طرح چونکی۔ ''اوہ...... تاجور...... تم یہاں؟'' اس نے حیرت اور خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کہا۔

تاجور کو بھی جیسے ہرگز توقع نہیں تھی کہ وہ یہاں قسطینا کو دیکھے گی۔ وہ حیران رہ گئی۔

''آپ کو دیکھ کر بہت حیرانی ہوئی قسطینا! آپ...... کب آئیں؟'' تاجور نے پوچھا۔

قسطینا اب بری بھلی اردو سمجھنے لگی تھی اور بول بھی لیتی تھی۔ کہنے لگی۔ ''تین چار ڈیز ہوا۔ دراصل...... ان فیکٹ......'' اس کی اردو جواب دے گئی۔

میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''تاجور! یہ ہفتے کے دن یہاں پہنچی ہیں۔ کچھ روز جاما جی سے دور رہ کر گزارنا چاہتی ہیں۔ یہاں وقتی طور پر مم...... میرے اور رضوان کے ساتھ رہ رہی ہیں۔''

تاجور نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ تاہم اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ یہاں کے بے تکلف ماحول کو پوری طرح محسوس کر چکی ہے۔ ''تم کس طرح آئی ہو یہاں؟'' میں نے تاجور سے پوچھا۔

اس نے چند لمحے توقف کیا پھر دھیمے لہجے میں بولی۔ ''آپ کے گھر کے پیچھے جو مارکیٹ ہے، وہاں آئی تھی تھوڑی سی شاپنگ کے لیے۔ سوچا آپ کو اور رضوان کو دیکھتی جاؤں۔ ڈرائیور وہاں گاڑی میں ہی بیٹھا ہے۔''

''کم آن تاجور! پلیز سٹ ڈاؤن ڈیئر، تو تم کو اس گھر کا ایڈریس مالوم تھا؟''

''جی ہاں۔'' تاجور نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ ''دراصل میں...... بہت...... جلدی میں ہوں۔ بب بس تھوڑی سی بات کرنا چاہتی تھی...... شش شاہ زیب سے بلکہ آپ سے بھی۔'' اس نے قسطینا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تو بیٹھو ناں، کیا کھڑے کھڑے بات کرنی ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ صوفے کے کنارے پر غیر آرام دہ طریقے سے بیٹھ گئی۔ اپنا نقاب اب وہ نیچے ٹھوڑی تک کھسکا چکی تھی۔ وہی کھلتا ہوا گندمی چہرہ، جس پر جذبات کی ذرا سی یورش سے سرخ رنگ بکھر جاتا تھا۔ وہ میک اپ کے بغیر تھی۔ کچھ کمزور اور کمہلائی ہوئی سی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے کھلے ڈیزائن والا برقع پہن رکھا تھا جس میں اس کے جسم کی بناوٹ کافی حد تک چھپ گئی تھی۔ اس کی کلائیاں خالی تھیں اور ایک کلائی پر سیاہی مائل نشان سا نظر آتا تھا۔ ملازمہ فردوس نے بتایا تھا کہ ایسے نشانوں کی نسبت اس کے شوہر دارج کی مار پیٹ سے ہے۔

وہ سپاٹ لہجے میں ہم دونوں کو جیسے ایک ساتھ مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ ''میں...... سیف کے گھر والوں کی طرف سے بے حد پریشان ہوں۔ بڑے بھائی اور ماں باپ کی موت کے بعد شازیہ اور اس کی بہنوں کے دکھ پہلے ہی کچھ کم نہیں تھے...... اب سنا ہے کہ...... شازیہ کے شوہر اکبر کا بھی کچھ پتا نہیں چل رہا۔''

''ہاں تاجور! ابھی تک تو نہیں چلا...... مگر میں مایوس نہیں ہوں۔ امید ہے کہ اس کے سلسلے میں کوئی اچھی خبر ملے گی۔ وہ نہ صرف ملے گا...... بلکہ اس عورت کے شکنجے سے بھی نکلے گا۔''

''پتا نہیں کہ ان لوگوں کے گھر کا خرچا کس طرح سے چل رہا ہے۔'' تاجور نے چند سیکنڈ خاموش رہنے کے بعد کہا۔

''تاجور! میں پانچ چھ روز پہلے بھی سکھیرا گیا ہوں۔ تینوں بہنوں سے مل کر آیا ہوں۔ تم نے ایک ذمے داری مجھ پر لگائی ہے اور میں نے وہ قبول کی ہے، اس کے باوجود کیوں پریشان ہوتی ہو؟ ایسا کرو گی تو مجھے لگے گا کہ تم اس ''معاملے میں بھی'' مجھ پر بھروسا نہیں کر پا رہی ہو۔''

جواب میں اس نے کچھ نہیں کہا، بس پلکیں جھکائے بیٹھ رہی۔ بالکل خاموش اور ساکت۔ جیسے گوشت پوست کے بجائے پتھر کی ہو۔

اس کا یہ انداز الجھن میں مبتلا کر رہا تھا بلکہ تھوڑا سا غصہ بھی آ رہا تھا...... کیا تاجور کے پاس میرے لیے شازیہ اور اس کی بہنوں کے سوا اور کوئی موضوع نہیں ہے۔ وہ جب کبھی بھی ملی تھی اس کی گفتگو کا رنگ ڈھنگ یہی رہا تھا۔

قسطینا نے مجھے خاموش دیکھا تو اپنی طرف سے بھی تاجور کو تسلی دی، اور اسے یقین دلایا کہ ہم سیف کی قربانی کو کسی طرح فراموش نہیں کر سکتے۔ سیف کی تینوں بہنوں کو کبھی کوئی کمی محسوس نہیں ہونے دیں گے...... بلکہ بڑی بہن کے شوہر کو بازیاب کرانے میں بھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھیں گے۔

قسطینا کے بے حد اصرار پر تاجور نے چائے کا صرف آدھا کپ پیا اور بڑی عجلت میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے برقع کے اندر ہاتھ ڈال کر اپنے گلے سے سونے کا ایک وزنی جڑاؤ ہار اتارا اور میز پر رکھتے ہوئے بولی۔ ''مم...... میری خواہش ہے کہ آپ لوگ جو کچھ سیف کی بے آسرا بہنوں کے لیے کر رہے ہیں، اس میں میرا یہ تھوڑا سا حصہ بھی شامل کر لیں۔''

میں نے اس کی یہ پیشکش قبول نہیں کی اور زبردستی ہار اسے واپس کیا۔ (میرے دل کی گہرائی میں یہ اندیشہ بھی موجود تھا کہ کہیں اس ہار کی وجہ سے اس کے سسرال میں اس پر کوئی

اور مصیبت نہ آ جائے) وہ ہمیں خدا حافظ کہہ کر پیدل ہی گھر کے عقب میں واقع کثیر المنزلہ شاپنگ سینٹر کی طرف چل پڑی۔ میں نے اسے کہا کہ میں اسے کار تک چھوڑ آتا ہوں مگر اس نے کہا کہ یہ مناسب نہیں۔

اس کے جانے کے بعد میں اور قسطینا دیر تک تاجور اور دارج کے حوالے سے بات کرتے رہے پھر رضوان بھی آ گیا اور گفتگو میں شریک ہو گیا۔ روم سے واپس آنے کے بعد دارج سے صرف ایک مرتبہ فون پر میری بات ہوئی تھی۔ جان ڈیرک کے کٹے ہوئے سر کے مناظر ''اسکائپ'' پر دیکھ کر اس کے جذبۂ انتقام کی تسکین ہوئی تھی۔ اس نے مجھے یاد دلایا تھا کہ اس کا دیا ہوا بلینک چیک ابھی تک میرے پاس ہے اور میں اپنی صوابدید کے مطابق جو چاہوں اس پر بھر لوں۔ میں نے دارج کی اس پیشکش کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ جو دوسری بات دارج نے مجھ سے کہی تھی وہ اپنے کزن شکیل داراب کے حوالے سے تھی۔ ماضی میں جان ڈیرک اور شکیل کی دوستی رہی تھی اور دارج ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ شکیل کو پتا چلے کہ وہ (یعنی دارج) بھی ڈیرک کی موت کا خواہاں تھا۔ نہ صرف خواہاں تھا بلکہ اس نے ڈیرک کے قتل کے سلسلے میں مجھ سے خفیہ ملاقات بھی کی تھی۔

اس رات دیر تک میں تاجور کی آمد کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس نے خود کو جیسے اپنے آپ میں بند کر لیا ہوا تھا۔ وہ اپنے ہی انداز سے سوچتی اور ایکٹ کرتی تھی۔ قسطینا کو بے تکلفی کے ماحول میں یہاں اس گھر میں دیکھ کر اس نے پتا نہیں کیا سوچا تھا لیکن جو کچھ بھی سوچا وہ اس کے چہرے سے عیاں نہیں ہوا تھا۔ نہ ہی اس حوالے سے اس نے کوئی بات کی تھی۔ وہ جیسے لاتعلق سی ہوتی جا رہی تھی۔ لاتعلق اور...... دور۔

یہ اگلے روز شام کی بات ہے۔ میں داؤد بھاؤ سے سجاول کے بارے میں بات کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے لیے جلد کچھ کیا جانا ضروری تھا ورنہ نقصان ہو سکتا تھا۔ اسی دوران میں قسطینا نے جوش کے عالم میں مجھے پکارا۔ وہ پھرتی سے سیڑھیاں طے کرتی ہوئی چھت سے نیچے آ رہی تھی۔

میں نے بھاؤ سے اجازت چاہی اور فون رکھ دیا۔ قسطینا تند بگولے کی طرح اندر داخل ہوئی۔ اپنا سیٹلائٹ فون اس کے ہاتھ میں تھا۔

میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کھڑے کھڑے مجھے ''ہگ'' کرتے ہوئے کہا۔ ''شاہ زائب، ایک بڑی اچھی خبر ہے ہم سب کے لیے۔ ہاناوانی کے بارے میں ایک اطلاع ہے۔''

''اطلاع؟''

''ہاں، ہاناوانی کی ایک میڈیکل رپورٹ جاماجی میں ''لیک'' ہوئی ہے۔ بہت خاص رپورٹ ہے اور کہیں باہر سے جاماجی بھیجی گئی تھی تا کہ نیوسٹی میں ہاناوانی کے ذاتی معالج اسے دیکھ سکیں۔''

''کیا رپورٹ ہے؟''

اس نے میرے بال مٹھی میں بھینچتے ہوئے کہا۔''شاہ زائب! تم نے اس بدبخت عورت کا تقریباً کباڑا کر دیا ہے۔ اس کے زخم جان لیوا ہیں۔ خاص طور سے تم نے اس کے پیٹ پر جو وار کیا تھا وہ بہت کارگر ثابت ہوا ہے۔ اس نے اس کی انتڑیوں کے ساتھ ساتھ اس کے جگر اور پتے کو بھی بہت سخت نقصان پہنچایا ہے۔ یہ دیکھو میرے موبائل میں یہ رپورٹ موجود ہے۔''

قسطینا نے موبائل میرے سامنے کیا اور بولی۔''یہ دیکھو......ان دو فقروں سے پتا چلتا ہے کہ پچھلے قریباً چار مہینوں میں ہاناوانی کی لگ بھگ پندرہ سرجریز ہو چکی ہیں......مگر اس کی حالت بہتر نہیں ہو سکی۔ خاص طور سے اس کے جگر کا ستیاناس ہو چکا ہے۔''

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔''میرے انگوٹھے کا بھی تو ستیاناس ہو گیا تھا۔''

''لیکن شاہ زائب، اس انگوٹھے سے جو کام تم نے لیا وہ یادگار ہے۔ میں نے...... تمہیں اسی وقت بتا دیا تھا کہ یہ تمہاری بہت بڑی کامیابی ہے، تم ہاناوانی کے ٹرانس میں ہو کر بھی اس کے ٹرانس میں نہیں تھے۔ میں سمجھتی ہوں کہ تمہاری یہی کامیابی ہے جس نے ہاناوانی کو جان لیوا زخم دیئے ہیں۔ یہ نیچے دیکھو، رپورٹ میں کیا لکھا ہوا ہے۔''

میں نے دیکھا۔ رپورٹ کے اس حصے سے پتا چلتا تھا کہ کیم شیم ہاناوانی کا وزن محض چالیس کلو کے قریب رہ گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ سوکھ کر کانٹا ہو چکی تھی اور بستر تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔

قسطینا بولی۔''میں پورے یقین سے کہہ سکتی ہوں شاہ زائب! یہ منحوس عورت اب ہمیں نقصان پہنچانے کے قابل نہیں رہی۔ یہ جہاں کہیں بھی ہے اپنی زندگی کے آخری دن گزار رہی ہے۔''

''لیکن سوال تو یہی ہے کہ یہ ہے کہاں......اور تباہی کے وہ سفیر کہاں ہیں جو اس کے ہم رکاب رہتے تھے۔ میرا مطلب ہے کہ وہ پرندے......طوطے، چمگادڑیں، گدھ اور پھر وہ نیولے، بچھو وغیرہ۔''

''شاہ زائب! میں نے اس بارے میں جاماجی کے ایک مشہور عامل سے ڈسکشن کی تھی۔ اس کا کہنا تھا، بے شک ہاناوانی ایک بہت بڑی ہپناٹسٹ ہے مگراس کی طاقت اس کی صحت مندی اوراس کی زندگی سے مشروط ہے۔ اگر وہ مر جاتی ہے تو اس کا ہر معمول خود بخود اس کے اثر سے آزاد ہو جائے گا...... بلکہ اگر وہ زندہ بھی ہے مگر سخت بیماری کی حالت میں ہے تو اس کی ''صلاحیت'' بری طرح متاثر ہو جائے گی اور زیادہ امکان یہی ہے کہ صفر ہو جائے۔''

''لیکن قسطینا! اکبر خصوصی طور پر اس کے شکنجے میں جکڑا ہوا تھا اگر......''

''اب کچھ نہیں ہوگا شاہ زائب! مجھے پوری امید ہے۔'' قسطینا نے تیزی سے میری بات کاٹی۔ ''ہاناوانی جس حال میں ہے اس کا ہر معمول اس کی گرفت سے نکل چکا ہے...... یہ دیکھو یہاں پر یہ رپورٹ کیا کہہ رہی ہے۔ اس کے پیٹ میں کچھ مصنوعی انتڑیاں لگائی گئی ہیں اوراسے نالی کے ذریعے مخصوص خوراک دی جاتی ہے۔ کسی وقت وہ مکمل بے ہوشی کی حالت میں ہوتی ہے......اور یورین وغیرہ پاس نہیں کر پاتی۔''

''قسطینا! سوال پھر یہی پیدا ہوتا ہے کہ وہ بدبخت ہے کہاں؟ اس رپورٹ سے تو کچھ واضح نہیں ہوتا، نہ ہی اسپتال اور معالج وغیرہ کا پتا چلتا ہے''

قسطینا نے گہری سوچ میں کھوئے ہوئے کہا۔ ''شاہ زائب! مجھے لگتا یہی ہے کہ وہ پاکستان میں ہی کہیں ہے۔ اگر تم داؤد بھاؤ کو خصوصی توجہ دینے کے لیے کہو تو عین ممکن ہے کہ یہاں وسطی پنجاب میں ہی کہیں اس کا کھوج مل جائے۔''

O......❖......O

دوروز بعد کی بات ہے۔ صبح کا وقت تھا۔ کچن سے سوں سوں کی آواز آرہی تھی۔ میں پہنچا تو قسطینا پیاز کاٹنے میں مصروف تھی۔ آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔

''یہ کیا ہورہا ہے جی صبح سویرے؟'' میں نے پوچھا۔

''انڈوں کا آملیٹ بنارہی ہوں، تمہارا پسندیدہ...... پیاز اور ہری مرچوں والا۔''

''کیوں شرمندہ کرتی ہو تم...... بلکہ شرمندگی کے سمندر میں ڈبو دیتی ہو۔ جاماجی کے عوام کو پتا چل گیا کہ ان کی چیف یہاں ایک چھوٹے سے کچن میں گھس کر پیاز اور ہری مرچیں کاٹ رہی ہے تو وہ ذمے دار کو...... یعنی مجھے مار مار کر چٹنی کی شکل دے دیں گے۔''

''تم بھی تو مجھے شرمندگی کے سمندر میں ڈبوتے ہو۔'' وہ ادا سے بولی۔

''کیا مطلب؟''

''جب خاموشی سے میری بھرپور مرچوں والی ملائیشین ڈش کھاتے ہو، رضوان تو پھر سی سی کرلیتا ہے تم تو وہ بھی نہیں کرتے۔''

''یعنی آپ...... میرا مطلب ہے......تم حساب برابر کرتی ہو۔''

''اس کو حساب برابر کرنا نہیں، عادت ڈالنا کہتے ہیں۔ کچھ چیزوں کی عادت ڈال رہی ہوں۔''

''کیوں؟''

''تم بھی تو کچھ چیزوں کی عادت ڈال رہے ہو۔'' وہ میری طرف دیکھے بغیر بولی۔

''ہاں...... یہ بات تو ہے۔'' میں نے زیرلب مسکرا کر کہا۔

اسی دوران میں قسطینا کے سیٹلائٹ فون کا میوزک بجنے لگا۔ نیپکن سے ہاتھ پونچھتے ہوئے اس نے کال ریسیو کی۔ ''ہیلو! اس نے ذرا رعب دار آواز میں کہا اور پھر دوسری طرف کی بات سننے لگی۔ اس کے تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا کہ کوئی اہم خبر ہے۔ دو تین منٹ بعد بات ختم کر کے اس نے فون ایک طرف رکھا اور بولی۔ ''نیوسٹی کے سب سے بڑے سرکاری اسپتال کے سب سے بڑے ڈاکٹر وارد ماش کو فائرنگ اسکواڈ کے سامنے کھڑا کر کے گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا ہے۔ ان پر الزام ہے کہ ہاناوانی کی جو میڈیکل رپورٹ افشا ہوئی ہے اس میں وہ قصوروار تھے۔ اندیشہ ہے کہ ایک اور سینئر ڈاکٹر کو بھی ایک دو روز میں موت کی سزا دے دی جائے گی۔''

''اتنی جلدی مقدمہ اور اتنی جلدی فیصلہ؟'' میں نے کہا۔

''شاہ زائب! تم اسے جلدی کہتے ہو، نیوسٹی میں ہاناوانی اور اس کے بیٹے نے بدترین آمریت قائم کر رکھی تھی۔ وہاں تو دو گھنٹے کے اندر گرفتاری سے لے کر پھانسی تک کے سارے مراحل طے ہو جاتے ہیں...... تم نے خود بھی جاماجی اور نیوسٹی میں ایسے نظارے دیکھے ہوئے ہیں۔''

قسطینا ٹھیک کہہ رہی تھی۔ لڑائی کے بعد نیوسٹی سکڑ کر ایک کالونی کی شکل میں رہ گیا تھا مگر وہاں اب بھی جنگل کا قانون ہی تھا۔ پرسوں جب قسطینا نے مجھے ہاناوانی کی میڈیکل رپورٹ کے بارے میں بتایا تھا تو مجھے ہلکا سا یہ شک گزرا تھا کہ کہیں یہ کوئی جعلی رپورٹ نہ ہو، مگر اب جس طرح کی خبریں آرہی تھیں، رپورٹ کے بارے میں شک و شبہے کی گنجائش ختم ہو رہی تھی۔

اس نئی خبر کے حوالے سے میرے اور قسطینا کے درمیان بات ہورہی تھی جب قریبی کمرے میں رکھے ہوئے میرے فون کی بیل ہونے لگی۔ میں نے جاکر کال ریسیو کی، دوسری طرف پہلوان حشمت تھے۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔''شاہ زیب! کچھ پتا چلاتم کو؟''

''نہیں۔'' میں نے چونک کر کہا۔

''تاجور کی والدہ فوت ہوگئیں۔''

یہ ایک بہت افسوسناک خبر تھی۔ میں کئی سیکنڈ تک کچھ بول نہ سکا۔ وہ بیمار تو طویل عرصے سے تھیں۔ ایک دو بار گوجرانوالہ کے اسپتال میں بھی ایڈمٹ رہی تھیں۔ اب شاید شریکِ حیات کی رخصتی کے بعد انہوں نے بھی رختِ سفر باندھنا مناسب سمجھا تھا۔

قریباً ایک گھنٹے بعد ہم ان کی آخری رسوم میں شرکت کے لیے اسلام آباد سے لالہ موسیٰ کی جانب روانہ ہورہے تھے۔ میرے منع کرنے کے باوجود قسطینا بھی ساتھ ہولی تھی۔ رضوان بھی جانا چاہتا تھا۔ پہلوان حشمت اپنے طور پر پہلے ہی روانہ ہوگئے تھے۔ ہم داؤد بھاؤ کی فراہم کردہ ایک پرائیویٹ کار کے ذریعے سکھیرا گاؤں پہنچے۔ میں اپنے تبدیل شدہ حلیے میں تھا۔ بھورے رنگ کی داڑھی مونچھوں نے میری شباہت کافی حد تک بدل دی تھی۔ قسطینا ایک طویل چادر میں تھی اور اسی چادر کے نقاب میں چہرہ بھی چھپایا ہوا تھا۔

ہم سکھیرا پہنچے تو سہ پہر کا وقت تھا۔ فروری کی دھوپ نے ٹھٹھری ہوئی فضا کو ہلکی سی تمازت دے دی تھی۔ چند ماہ پہلے جب میں سکھیرا گاؤں آیا تھا تو یہاں جنونی پرندوں کی دہشت نے دھاک بٹھا رکھی تھی، لوگ گھروں میں دبکے ہوئے تھے اور کھڑکیوں روزنوں پر آہنی جالیوں کے پہرے تھے۔ آہنی جالیاں تو اب بھی کہیں کہیں نظر آرہی تھیں مگر خوف اور دہشت کی فضا ختم ہوچکی تھی۔ بالآخر ہم نے ہاناوانی کا سحر توڑ دیا تھا۔ وہ کسی نامعلوم مقام پر ابتر حالت میں شاید آخری سانسیں لے رہی تھی۔ امید یہی تھی کہ اس کے استحصال کا شکار پرندے اور دیگر حیوانات بھی اپنی معمول کی زندگی اور فطرت کی طرف لوٹ چکے ہیں۔

مرحوم دین محمد کی خستہ حال حویلی کے سامنے کئی گاڑیاں اور موٹر سائیکلیں وغیرہ موجود تھیں۔ لوگوں کے بیٹھنے کے لیے شامیانے لگا کر دریاں بچھائی گئی تھیں۔ گاڑیوں میں نئے ماڈل کی ایک ٹویوٹا جیپ بھی نظر آرہی تھی۔ اس کے علاوہ ایک ڈبل کیبن تھی جس میں تین چار گارڈز تھے۔ ٹویوٹا جیپ میں یقیناً تاجور ہی یہاں پہنچی تھی۔ حویلی کے اندرونی حصے سے خواتین کے رونے کی آوازیں آرہی تھیں۔ قسطینا اندر چلی گئی اور ہم باہر لوگوں میں جا بیٹھے۔

اب اس گھر کے کرتا دھرتا تاجور کے چھوٹے ماموں حنیف تھے۔ وہ بھی مولوی حبیب کی طرح باریش تھے۔ عمر 35 کے لگ بھگ تھی۔ تاجور کے بھائی راحیل اور اسفند ان سے بہت مانوس تھے۔ میں نے اپنا تعارف کرایا تو حنیف صاحب نے مجھے پہچان لیا۔

جنازہ تیار ہی تھا۔ عصر کے فوراً بعد تدفین کا عمل گاؤں کے قبرستان میں ہو گیا۔ اسی قبرستان میں دین محمد اور مولوی حبیب صاحب بھی ابدی نیند سو رہے تھے۔ مولوی حبیب صاحب کی موت کا منظر ایک بار پھر میرے ذہن میں تازہ ہو گیا اور دل میں افسردگی بھر گئی۔

رضوان نے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔ ''میں اور آپ پولیس کو مطلوب ہیں۔ ایسے موقعوں پر سادہ پوش پولیس اہلکار بھی جنازے کے اردگرد موجود رہتے ہیں۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو لیکن مجھے ابھی تک کسی پر ''سادہ پوش'' ہونے کا شبہ نہیں ہوا۔ دو چار باوردی اہلکار ضرور دکھائی دیئے ہیں اور وہ معمول کے مطابق ہیں۔ شاید کسی نے اس فوتیدگی کو زیادہ اہمیت ہی نہیں دی۔''

باتیں کرتے ہوئے ہم مرحوم دین محمد صاحب کی حویلی کی طرف واپس آ گئے...... گاؤں کی کسی قریبی گلی میں کچھ بلیوں کے رونے کی مسلسل آوازیں آ رہی تھیں۔ اب کچھ آوارہ کتوں کا شور بھی ان آوازوں میں شامل ہو گیا تھا۔

رضوان بولا۔ ''ہمارے بڑے کہا کرتے تھے کہ جب بلیاں روتی ہیں تو زلزلہ آنا ہوتا ہے۔''

میں نے رضوان کا جملہ سنا تو ضرور مگر اس پر کوئی ردِعمل نہیں دیا۔ نہ جانے کیوں میری نگاہ سامنے کیکر کے ایک درخت پر بیٹھے کوّوں پر مرکوز ہو کر رہ گئی تھی...... مجھے لگا جیسے ان کووں کی حرکات و سکنات معمول کے مطابق نہیں ہیں۔ وہ پھڑ پھڑا رہے تھے اور بے چین نظر آتے تھے۔ شاخوں پر بیٹھتے اور پھر فوراً ہی دوبارہ اُڑ جاتے۔ جیسے وہ کوئی خوف زدہ کرنے والی چیز دیکھ رہے ہوں۔ پتا نہیں واقعی ایسا تھا یا مجھے وہم ہو رہا تھا۔ ابھی میں یہی سوچ رہا تھا کہ گاؤں سے باہر کھیتوں کی طرف سے تین چار بار شاٹ گن چلنے کی مخصوص آواز آئی۔

اس آواز کو آئے تین چار منٹ ہی ہوئے تھے کہ دو نوجوان لڑکے بھاگتے ہوئے گلی میں داخل ہوئے۔ ان کے رنگ کچھ بھاگنے کی وجہ سے، اور کچھ تناؤ کی وجہ سے ہلدی ہو رہے تھے۔ وہ قریب آئے تو ان میں سے ایک نے گاؤں کے بڑوں کو اطلاع دیتے ہوئے کہا۔ ''وہاں نور محمد کے کھیتوں میں کچھ طوطوں نے حملہ کر دیا ہے۔ وہ اس کی دو بھینسوں

سے چمٹ گئے ہیں...... اور...... اس کے ڈھارے میں بھی گھس گئے ہیں...... ڈھارے کے اندر سے رونے پیٹنے کی آوازیں آرہی ہیں......"

سب سکتہ زدہ رہ گئے۔ کسی نے پوچھا۔ "فائر کس نے کیے تھے؟"

لڑکے نے ہانپی آواز میں کہا۔ "چاچے نور نے ہی کیے تھے۔ دو چار مر گئے ہوں گے، لیکن وہ تو پندرہ بیس طوطے تھے...... بلکہ زیادہ ہی تھے۔"

رضوان اور میں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ذہن میں خطرے کی اَن گنت گھنٹیاں بج اٹھیں۔ ہماری گاڑی میں وہ اسنیپر گن موجود تھی جو کلر کہار والے معرکے میں استعمال ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ نہایت طاقتور ٹیلی اسکوپ بھی موجود تھی۔ میں اپنی گاڑی کی طرف گیا اور اسنیپر گن سے ٹیلی اسکوپ علیحدہ کر کے حنیف صاحب کے ساتھ حویلی کی چھت پر چلا گیا۔ رضوان کے علاوہ تین چار اور افراد بھی میرے پیچھے تھے۔ حنیف کی بتائی ہوئی سمت کے مطابق میں نے نور محمد نامی شخص کے ڈیرے کو دیکھنے کی کوشش کی۔ کھیت تو نظر آرہے تھے مگر تین چار پھیلے ہوئے درختوں کی وجہ سے ڈیرا اوجھل تھا۔ مغرب کی طرف جھکے ہوئے سورج میں اکا دکا بدلیوں کے کنارے سرخ نظر آرہے تھے۔ باقی آسمان دور تک شفاف اور نیلگوں تھا...... یہی وقت تھا جب میری نگاہیں دور افق پر ایک پھیلی ہوئی سیاہی مائل لکیر پر پڑیں۔ میں نے اس جدید فوجی ٹیلی اسکوپ کا فوکس درست کیا...... اور یہ وہ لمحے تھے جب میرے جسم کے سارے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ اس چوڑی لکیر کی حقیقت واضح ہوئی...... ہاں سیاہی مائل لکیر جو دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ پرندے تھے جو سکھیرا کی طرف آرہے تھے۔ لڑکوں نے تو پندرہ بیس کی اطلاع دی تھی لیکن یہ پندرہ بیس نہیں تھے، سو دو سو بھی نہیں تھے...... یہ شاید ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ ہاں یہ وہی طوطے تھے جو چند ماہ پہلے لاہور کے مضافات میں ایک مینشن سے پرواز کر کے تاریک افق میں اوجھل ہو گئے تھے۔ اب یہ پلٹے تھے اور ان کی تعداد تب سے بہت زیادہ تھی......

"کیا ہوا شاہ زیب بھائی؟" رضوان نے میرے تاثرات دیکھ کر پوچھا۔

میں نے رضوان کے بجائے تاجور کے ماموں حنیف کو مخاطب کیا۔ "گاؤں خطرے میں ہے حنیف صاحب...... سخت خطرے میں ہے۔ مزید پرندے بھی آرہے ہیں۔ بہت زیادہ تعداد میں ہیں۔ آپ لوگوں سے کہیں...... گھروں میں گھس جائیں...... یا پھر...... آپ مسجد میں اعلان کرائیں...... جلدی کریں......"

مسجد حویلی کے بالکل ساتھ ہی تھی۔ مولوی حنیف کا رنگ فق ہو گیا اور وہ تیزی سے

سیڑھیاں اتر کر نیچے چلے گئے۔ باقی افراد بھی دھڑا دھڑ سیڑھیاں اترے اور گلی میں جا کر شور مچا دیا کہ خطرہ ہے، پرندے آرہے ہیں۔''

یہ سارا منظر بڑا ڈرامائی تھا۔ یکا یک جیسے پورے سکھیرا میں بھگدڑ مچ گئی۔ عام لوگوں میں سے شاید ہی کسی نے یہ سوال پوچھنے کی زحمت کی ہو کہ پرندے کہاں ہیں۔ ارد گرد موجود چھوٹے بچوں کو ان کے بڑوں نے اپنے بازوؤں میں سمیٹا اور پناہ کی تلاش میں دوڑے۔ وہ ساری دہشت یکا یک پلٹ آئی تھی جو چند ماہ پہلے ان گلی کوچوں میں دندنائی تھی۔

''رضوان، ہمیں سب سے پہلے حویلی کے اندرونی دروازوں کو بند کرنا چاہیے۔'' میں نے قریباً چلا کر کہا اور رضوان کے ساتھ سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے پہنچ گیا۔ نیچے بھی تہلکہ مچا ہوا تھا۔ کچھ عورتیں حواس باختہ ہو کر اپنے گھروں کو بھاگ گئی تھیں اور کچھ حویلی کے ہی اندرونی کمروں میں دبک گئی تھیں۔ حویلی کے روزنوں اور کھڑکیوں پر ہنوز جالیاں موجود تھیں اور یہ ایک خوش آئند بات تھی۔ اچانک قسطینا میرے سامنے آئی چادر ابھی تک اس کے سر پر موجود تھی۔ ''کیا ہوا شاہ زائب! پرندوں کی بات کون کر رہا ہے؟''

''پرندوں کی ''بات'' نہیں ہو رہی قسطینا پرندے آگئے ہیں۔ بہت بڑی تعداد میں ہیں۔''

''تت...... تمہارا مطلب ہے، وہ طوطے؟'' میں نے اثبات میں جواب دیا۔

مسجد کے لاؤڈ اسپیکرز جاگ چکے تھے۔ کوئی شخص بڑے گھبرائے ہوئے انداز میں لوگوں کو خطرے سے آگاہ کر رہا تھا۔

حویلی کے اندرونی حصے کے تین دروازے تھے۔ دو چھوٹے اور ایک کافی بڑا۔ دونوں چھوٹے دروازے تو بند تھے لیکن بڑا مین ڈور ابھی کھلا تھا۔ ہم بھاگتے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔ میں نے ایک بوڑھی عورت کو سہارا دیا۔ قسطینا نے ایک روتے ہوئے دو تین سالہ بچے کو اٹھا لیا جو شاید اپنی ماں سے بچھڑ گیا تھا۔ ابھی ہم مین دروازہ بمشکل بند ہی کر پائے تھے کہ جیسے بھونچال سا آ گیا۔ جنونی طوطے اندھا دھند کھڑکیوں اور دروازوں سے ٹکرانے لگے۔ وہ تعداد میں اتنے زیادہ تھے کہ انہوں نے ٹڈی دل کی طرح کھڑکیوں کی جالیوں کو ڈھانپ لیا۔ اندر موجود عورتیں اور بچے خوف زدہ انداز میں چلا رہے تھے۔

یکا یک ایک جانب سے کربناک آوازیں بلند ہوئیں، میں اور قسطینا لپکتے ہوئے وہاں پہنچے۔ ''اوہ خدایا۔'' قسطینا کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

چار پانچ طوطے ایک لڑکی پر پل پڑے تھے۔ اس نے چہرہ اپنے ہاتھوں میں چھپا رکھا

تھا اور زمین پر لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔ میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ یہ شازیہ کی منجھلی بہن تھی۔ اس کا نام تو کچھ اور تھا مگر اسے ''چھوٹی'' پکارا جاتا تھا۔ یہ طوطے ایک دروازے کی نچلی درز سے اندر گھسنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ درز اتنی زیادہ تھی کہ مزید طوطے اندر گھس رہے تھے۔

''قسطینا! تم ان کا راستہ بند کرو۔'' میں نے پکار کر کہا اور خود ''چھوٹی'' کی مدد کرنے لگا۔ میں نے دو طوطوں کو کھینچ کر اس کے جسم سے علیحدہ کیا اور ہیجان کے عالم میں انہیں اپنے جوتے تلے مسل ڈالا۔ تیسرے طوطے نے میری کلائی پر کاٹا۔ اپنی خم دار تیز چونچ سے اس نے کلائی کی چھوٹی سی بوٹی علیحدہ کر دی۔ میں نے اسے بھی کھینچ کر دیوار سے دے مارا۔ دو تین طوطے چھوٹی کے نیچے آ کر کچلے گئے تھے۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ قسطینا نے بڑی پھرتی کے ساتھ اپنی طویل گرم چادر کے ذریعے دروازے کی نچلی درز بند کر دی تھی۔ شازیہ اور ایک عورت اس کی مدد کر رہی تھیں۔ یہ دوسری عورت وہی ملازمہ فردوس تھی۔ طوطوں کی آمد رک گئی تو یہاں موجود عورتوں کی دہشت کچھ کم ہوئی۔ انہوں نے رول کیے ہوئے ایک قالین کو درز کے سامنے اس طرح ٹکا دیا کہ وہ مکمل طور پر بند ہو گئی۔ کچھ عورتیں شازیہ کی زخمی بہن کو دیکھنے لگیں۔ کچھ مردہ طوطوں کو پاؤں سے دھکیل دھکیل کر ایک کمرے کے کونے میں لے گئیں۔

باہر کہرام مچا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا جنونی طوطے وزنی پتھروں کی طرح گھر کی کھڑکیوں اور دروازوں سے ٹکرا رہے تھے۔ حویلی کے قریبی گھروں سے چلانے کی دردناک آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ یقیناً یہ وہ گھر تھے جن کے مکین بروقت خود کو محفوظ نہیں کر سکے تھے۔ مجھے اپنا دل بیٹھتا ہوا محسوس ہوا۔

یہ کیا ہو گیا تھا؟

ہم تو سوچ رہے تھے کہ یہ بلا ٹل چکی ہے لیکن یہ موجود تھی اور پہلے سے کہیں زیادہ شدت کے ساتھ موجود تھی۔ تو پھر ہاناوانی کے زخم کیا ہوئے تھے؟ اس کا بستر مرگ پر ہونا کیا فائدہ پہنچا سکا تھا؟ کیا وہ رپورٹ جھوٹ تھی، یا پھر کوئی اور انہونی ہو چکی تھی۔

قسطینا نے میری زخمی کلائی دیکھی اور کرب سے بولی۔ ''اُف اللہ، کتنی ظالم کاٹ ہے ان کی۔'' اس نے ایک صاف کپڑا پھاڑ کر میری کلائی پر کس دیا۔

میں نے شازیہ کی بہن کو دیکھا۔ میری بروقت کوشش نے اسے شدید زخمی ہونے سے بچایا تھا۔ اس کے کندھوں اور کمر پر چند زخم تھے۔

حویلی کا یہ پورشن تین کمروں پر مشتمل تھا۔ دو کمروں میں سے فرنیچر وغیرہ اٹھالیا گیا تھا اور یہاں دریاں بچھی ہوئی تھیں۔ کم و بیش تیس عورتیں اور بچے اس پورشن میں موجود تھے...... ان میں شازیہ کی دونوں بہنیں، اور فردوس بھی تھی۔

میں نے فردوس سے پوچھا۔ ''تمہاری مالکن (تاجور) کہاں ہے؟''

وہ ہانپی کانپی آواز میں بولی۔ ''وہ جی ساتھ والے کمروں میں ہیں۔ وہاں کھانے کا انتظام ہو رہا تھا۔ کافی ساری اور عورتیں بھی ہیں وہاں۔''

مطلب یہی تھا کہ تاجور خاندان کی دیگر عورتوں کے ساتھ حویلی کے دوسرے پورشن میں تھی۔ اندازہ یہی ہو رہا تھا کہ ان عورتوں اور مردوں نے بھی خود کو محفوظ طریقے سے بند کر لیا ہے۔ راحیل اور اسفند بھی وہیں تھے۔ کچھ قریبی گھروں سے بلند ہونے والی آوازیں اتنی کربناک تھیں کہ جی چاہتا تھا، کانوں میں انگلیاں ٹھونس لی جائیں۔ ہم ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ یہ ایک ایسی آفت تھی جس کا مقابلہ کرنا ناممکن نظر آتا تھا۔

قسطینا نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''شاہ زائب! شاید تمہارے داؤد بھاؤ ٹھیک ہی کہتے تھے کہ ہم سب کو علیحدہ علیحدہ رہنا چاہیے۔ دیکھو ایک اتفاق کے تحت ہم اکٹھے ہوئے اور یہ کیا آفت ٹوٹ پڑی۔''

یہ بات میرے ذہن میں بھی آ رہی تھی۔ ہاناوانی کی ہٹ لسٹ میں موجود کئی نام یہاں موجود تھے۔ میں خود، قسطینا، رضوان ٹی، پہلوان حشمت، تاجور، شازیہ اور اس کی بہنیں۔ اس کے علاوہ تاجور کے دونوں بھائی راحیل اور اسفند......

پرندے اس حویلی کے در و دیوار سے چمٹے ہوئے تھے، دیوانگی کے عالم میں پھڑ پھڑا رہے تھے اور مختلف اشیا سے ٹکرا رہے تھے۔ شام اب گہری ہو رہی تھی اور ان پرندوں میں خونی چمگادڑیں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ یہ وہی محاصرے کی سی صورتِ حال تھی جو اس سے پہلے کلر کہار کے قریب شکستہ مندر میں رُونما ہوئی تھی (پرندے کئی روز تک مندر کو اپنے نرغے میں لیے رہے تھے) اب یہاں مرحوم دین محمد کی یہ حویلی نرغے میں تھی...... اور صرف حویلی ہی نہیں پورا سکھیر اگاؤں نرغے میں نظر آتا تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں یہ خونخوار پنکھی اس الگ تھلگ آبادی کا محاصرہ کر چکے تھے۔ یہاں پولیس کیا کر سکتی تھی...... یا کوئی بھی اور کیا کر سکتا تھا۔ کوئی دشمن ہوتو اسے مارا جائے، کوئی جانور ہو تو اسے ہلاک کیا جائے...... یہ تو ٹڈی دل کی طرح چھوٹے چھوٹے جاندار تھے مگر ان کے چھوٹے چھوٹے جسموں میں بلا کی وحشت اور خونریزی موجود تھی۔ کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ اب تک سکھیر ا میں کتنے لوگوں کو

ہلاک اور زخمی کر چکے ہیں...... اور صرف انسان ہی نہیں یقیناً مویشی اور دیگر پالتو جانور بھی ان کا نشانہ بن رہے تھے۔

ایسے موقعوں پر ہمارا دھیان سیدھا داؤد بھاؤ کی طرف ہی جاتا تھا۔قسطینا نے بھی اسی حوالے سے بات کی، بولی۔ ''میرے خیال میں تمہیں داؤد بھاؤ کو اطلاع دینی چاہیے۔''

''کر تو بھاؤ بھی کچھ نہیں سکے گا۔ چلو، بات کر کے دیکھتے ہیں۔'' میں نے کہا اور سیل فون نکال کر بھاؤ کا نمبر پریس کیا۔

تیسری کال پر بھاؤ نے اپنے اس خاص نمبر پر کال ریسیو کی۔ ''ہیلو......'' اس کی بھاری آواز آئی۔ بھاؤ بہت جلدی میں تھا اور کسی حد تک تناؤ میں بھی محسوس ہوتا تھا۔

''بھاؤ کہاں ہیں آپ؟''

''سمجھو کہ...... مشکل میں ہوں۔شکیل داراب نے اپنی اصلیت دکھائی ہے۔'' بھاؤ نے ذرا توقف کرنے کے بعد کہا۔

اس کے ساتھ ہی کہیں قریب سے سب مشین گن کے دو فائر ہوئے۔تب ایک کاؤنٹر فا[illegible] سنائی دیا، یہ سیون ایم ایم رائفل کا تھا۔سب مشین گنز زیادہ تر پولیس والوں کے استعمال میں نظر آتی ہیں۔ میں نے کہا۔''بھاؤ کیا پولیس سے...... آمنا سامنا ہے؟''

بھاؤ کے جواب دینے سے پہلے پھر ایک فائر کی آواز سنائی دی اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔

''کیا ہوا؟'' رضوان نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''مجھے لگتا ہے کہ بھاؤ خود کسی مشکل میں ہے۔اس کے آس پاس فائر ہو رہے ہیں۔''

''کیا پولیس؟'' قسطینا نے پوچھا۔

''ہوسکتا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

یہ بات میرے علم میں تھی کہ بااختیار لوگ جو ایک عرصے تک داؤد بھاؤ کے ذریعے اپنے کام نکلواتے رہے تھے...... اسے دباؤ میں رکھنے کے لیے مقدموں میں پھنساتے رہے تھے اور پھر خود ہی بچاتے بھی رہے تھے...... بالآخر اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ اب بھاؤ کو اپنے بس میں رکھنا مشکل ہو گیا ہے، وہ اسے مارنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔شکیل جیسے گھاگ لوگوں کو ہرگز یقین نہیں تھا کہ داؤد بھاؤ لاہور والے کار بلاسٹ میں ہلاک ہو چکا ہے۔ وہ اس کی ٹوہ میں تھے۔ بھاؤ نے خود مجھے بتایا تھا کہ بازیابی کی صورت میں شکیل داراب اسے پولیس مقابلے میں پار کرنے کا حکم دے چکا ہے۔

یہ بڑی نازک صورتِ حال تھی۔شاید بھاؤ کو اس وقت میری مدد کی ضرورت تھی، مجھے

اس کے آس پاس ہونا چاہیے تھا، مگر میں یہاں خود، ساتھیوں سمیت ایک بڑی آفت میں پھنس گیا تھا اور یہ آفت بھی کوئی چھوٹی نہیں تھی۔

حویلی میں اور اردگرد اب بھی بھگدڑ تھی۔ دو بکریاں جن سے درجنوں طوطے چمٹے ہوئے تھے، ممیاتی اور چلاتی ہوئی حویلی کے صحن میں سے گزریں اور کسی طرف اوجھل ہو گئیں۔ کمرے میں چند عورتیں بلند آواز میں رو رہی تھیں۔ ایک عورت دہشت کے سبب بے ہوش ہو گئی تھی اور باقی اس پر جھکی ہوئی تھیں۔ قسطینا لپک کر وہاں پہنچی۔ اس نے بے ہوش عورت کا ''گھیراؤ'' کرنے والی خواتین کو پیچھے ہٹایا اور اسے طبی امداد دینے کی کوشش کرنے لگی۔

تاجور کے چھوٹے ماموں حنیف دھواں دھواں چہرے کے ساتھ میری طرف آئے، ان کے ہاتھ میں موبائل فون تھا۔ مجھ سے مخاطب ہو کر بولے۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے ہمارے ساتھ...... کس گناہ کی سزا مل رہی ہے؟'' ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''کیا ہوا جی؟'' میں نے پوچھا۔

وہ ہیجانی لہجے میں بولے۔ ''میرے ملازم کا فون آیا ہے...... وہ کہہ رہا ہے کہ قبریں کھودنے والے بہت سے بجو گاؤں کے قبرستان میں گھس گئے ہیں۔ بہت زیادہ تعداد میں ہیں۔ انہوں نے ایک پوری قبر کھود ڈالی ہے...... انہوں نے...... انہوں نے بھائی دین محمد کی میت کفن سمیت نکال لی ہے۔ اسے قبرستان سے گھسیٹ کر گاؤں کی طرف لا رہے تھے کہ پولیس کی گاڑی وہاں پہنچ گئی۔ پولیس والوں نے اندھا دھند گولیاں چلائیں اور بڑی مشکل سے میت چھڑائی......'' تاجور کے ماموں سر پکڑ کر ہچکیوں سے رونے لگے۔

چند سیکنڈ کے بعد ذرا سنبھل کر بولے۔ ''پولیس والوں نے میت کو بند گاڑی میں رکھ لیا ہے مگر ایسا کرتے ہوئے دو پولیس والوں کی جان چلی گئی ہے۔ طوطوں نے ان پر حملہ کیا اور ساتھیوں کے سامنے ان کے جسم نوچ کھائے اور ان کی گردنیں ادھیڑ دیں۔'' حنیف محمد ایک بار پھر چہرہ چھپا کر سسکنے لگے۔

میں نے انہیں دلاسا دیا۔ وہ چند سیکنڈ بعد دوبارہ اشک بار لہجے میں بولے۔ ''اب پولیس والے گاڑی میں بند ہیں۔ ان کے پاس شاید گولیاں بھی ختم ہو گئی ہیں۔ گاڑی کسی کھڈے میں پھنسی ہوئی ہے۔ بہت سے بجو اور نیولے اب بھی قبرستان میں ہیں۔ وہ دوسری قبروں کو کھودنے کی کوشش کر رہے ہیں......''

میرے جسم پر چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ یہ کیسا انتقام تھا جس کی کوئی انتہا ہی نہیں تھی۔

یہ کیسا غیظ و غضب تھا جو کسی طور ٹھنڈا ہونے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ یہ اپنے دشمنوں کو قبروں میں بھی چین لینے نہیں دے رہا تھا۔

اس غیظ و غضب کا منبع کون تھا، اس غیظ و انتقام کا منبع ''ہاناوانی'' تھی۔ وہ بدبخت عورت جو اپنی آتشیں نفرت میں لپٹ کر ہر حد پار کر رہی تھی۔ میرے سینے میں الاؤ سا بھڑک اٹھا۔ جی چاہا کہ وہ میرے سامنے ہو اور میں اسے دردناک موت کے سارے مطالب پوری تشریح کے ساتھ سمجھا دوں۔

کیا وہ یہیں تھی؟

اپنے اس خونی لشکر کے آس پاس موجود تھی؟

موت کے ان لاتعداد ہرکاروں کو اپنے ساتھ لے کر یہاں پہنچی تھی؟

ابھی میں یہی سوچ رہا تھا کہ کسی گاڑی کے انجن کی گونج سنائی دی۔ پھر چند ہی لمحے بعد یہ سیاہ گاڑی بیرونی گیٹ سے گزر کر حویلی کے احاطے میں داخل ہوگئی۔ یہ دس نشستوں والی ایک دیوہیکل جیپ تھی۔ احاطے میں گھسنے کے بعد وہ چند سیکنڈ کے لیے رکی۔ بیسیوں طوطے اس کے اردگرد منڈلا رہے تھے...... تب گاڑی کا انجن ایک بار پھر گرجا اور وہ کسی مشتعل ہاتھی کی طرح اس بڑے اندرونی دروازے کی سمت آئی جس کے عقب میں ہم موجود تھے۔ جیپ ایک دھماکے کے ساتھ دروازے سے ٹکرائی۔ شیشم کا نہایت مضبوط منقش دروازہ ایک مرتبہ ہل کر رہ گیا۔ جیپ ریورس ہوئی اور تب میں نے اس کی ڈرائیونگ نشست پر بیٹھے ہوئے فرد کو دیکھا۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یقیناً قسطینا اور رضوان کی کیفیت بھی یہی ہوئی ہوگی۔ وہ کوئی اور نہیں، شازیہ کا شوہر اکبر تھا۔ اس کا چہرہ پہچانا نہیں جا رہا تھا لیکن یہ اسی کا تھا۔ سیاہی مائل سرخ اور بری طرح تمتمایا ہوا اور اس کی آنکھیں...... ان کو دیکھ کر جھرجھری سی محسوس ہوتی تھی۔ آنکھیں بالکل سفید تھیں جیسے پتھر کی ہوں، مگر ان کے اندر پتلیاں اسی طرح گہری سیاہ تھیں۔ وہ ایک براؤن جیکٹ میں تھا۔ ایک سیاہ عینک اس کے گلے میں جھول رہی تھی۔ ہاناوانی کی طرح اس کے کندھے پر بھی کوئی بڑا پرندہ پھڑپھڑا رہا تھا، میں اسے ٹھیک سے دیکھ نہیں سکا۔

میں سناٹے کی کیفیت میں دیکھ رہا تھا۔ اس کا مطلب کیا تھا؟ اس کا مطلب یہی تھا کہ اکبر، ہاناوانی کے نائب کی صورت میں یہاں موجود ہے۔ اکبر کو ہاناوانی کے ٹرانس میں سمجھنا شاید درست نہیں تھا...... یہ ٹرانس سے آگے کی کیفیت تھی۔ وہ شاید ہاناوانی کے دست راست کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ میں پیراسائیکالوجی اور ہپناٹائسز جیسے علوم کے بارے

میں بہت زیادہ نہیں جانتا تھا مگر مرحوم بزرگ حاذق ذکری نے ایک دفعہ بتایا تھا کہ ہاناوانی جیسے عامل بعض اوقات اپنی توانائیاں اپنے کسی معمول میں منتقل کر سکتے ہیں۔

"یہ تو اکبر ہے لیکن یہ پہچانا نہیں جا رہا۔" رضوان نے لرزتی آواز میں کہا۔

اسی دوران میں دیوہیکل شیورلیٹ جیپ پھر دروازے سے ٹکرائی اور اسے بے طرح جھنجوڑ دیا۔ میں نے کہا۔ "قسطینا! ہمیں اس دروازے کو ٹوٹنے یا کھلنے سے بچانا ہوگا۔ ورنہ کچھ باقی نہیں بچے گا۔"

ہم اس بڑے کمرے کی طرف لپکے جس میں باقی دونوں کمروں کا فرنیچر عارضی طور پر رکھا گیا تھا۔ ہم سب نے مل کر ایک بھاری بھرکم صوفہ اٹھایا اور اسے دروازے کے ساتھ لگا دیا۔ پھر ایسا ہی ایک صوفہ اس دوسرے صوفے کے اوپر جما دیا۔ تاجور کے چھوٹے ماموں حنیف کے کہنے پر کئی افراد، جن میں عورتیں بھی تھیں، ایک وزنی ڈبل بیڈ کو گھسیٹ کر لائے اور ہم نے اسے صوفوں کے ساتھ اس طرح ٹکا دیا کہ دروازے کو مزید سپورٹ مل گئی۔ اس دوران میں دیوہیکل جیپ دروازے کو کم از کم دو ٹکریں مزید مار چکی تھی۔ دروازے کی چولیں ہلنا شروع ہوگئی تھیں۔ لاتعداد خونی چمگادڑیں اور طوطے دیوانہ وار کھڑکیوں سے ٹکرا رہے تھے۔ انہیں تھوڑی سی جگہ بھی مل جاتی تو وہ کسی سیلابی ریلے کی طرح ان کمروں میں داخل ہو جاتے ...... اور اس کے بعد جو کچھ ہو سکتا تھا، اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں تھی۔

اب سامنے والے کمرے میں موجود شازیہ بھی اپنے شوہر کو پہچان چکی تھی۔ وہ بھی دیکھ رہی تھی کہ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے...... اس نے اپنا چہرہ کھڑکی کی جالی سے لگایا اور کربناک آواز میں پکاری۔ "اکبر! اکبر! میری طرف دیکھو۔ یہ میں ہوں شازیہ...... خدا کے لیے رک جاؤ...... خدا کے لیے رحم کرو ہم پر......"

وہ کھڑکی کی جالی پر دوہتڑ مارنے لگی اور چلا چلا کر اکبر کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ جیپ کی ایک کھڑکی ادھ کھلی تھی، یقیناً شازیہ کی آوازیں بھی اکبر کے کانوں تک پہنچ رہی ہوں گی، مگر وہ تو اردگرد سے یکسر بیگانہ تھا۔

فروری کی اس ٹھٹھری ہوئی شب میں یہاں اس دورافتادہ گاؤں سکھیرا میں جو کچھ ہو رہا تھا، عقل و سمجھ اور قیاس سے بالاتر تھا۔ یہ اکیسویں صدی تھی، یہ ٹیکنالوجی اور انٹرنیٹ کا دور تھا...... یہاں ہر بات میں وجہ اور لاجک ڈھونڈی جاتی تھی۔ ہپناٹزم یا ہپناسز کے بارے میں تو فقط یہی سنا تھا کہ یہ لوگوں کے اذہان کو متاثر کرتا ہے اور متاثر ہونے والوں کے کچھ افعال، عامل کی خواہشات کے مطابق ہو جاتے ہیں مگر یہاں تو کچھ اور ہی نقشہ تھا۔ عامل

ایک تھا اور معمول بے شمار...... اور وہ انسان نہیں حیوان تھے۔ وہ اپنی اپنی فطرت کے بالکل خلاف چل رہے تھے۔

مجھے یہی لگا کہ بدترین وقت آ گیا ہے۔ قسطینا کے چہرے پر میں نے پہلی بار خوف کی ہلکی سی جھلک دیکھی۔ ''شاہ زائب! اگر ہم ابھی اکبر کو روک نہ سکے تو دروازہ ٹوٹ جائے گا۔''

اندر موجود عورتیں اور بچے اب دیوانہ وار چلا رہے تھے۔ مسلسل ٹکروں سے دروازے کی چوکھٹ اکھڑنا شروع ہو گئی تھی۔ رضوان ٹی نے عقل مندی کا مظاہرہ کیا تھا اور شروع میں خطرے کا احساس ہوتے ہی چھوٹی نال والی آٹومیٹک رائفل گاڑی میں سے نکال لی تھی۔ یہ رائفل اب میرے ہاتھ میں تھی۔ اکبر جیپ کو ایک بار پھر ریورس کر رہا تھا تاکہ اسے پھر دروازے سے ٹکرا سکے۔ میں نے رائفل اس کی جانب سیدھی کی اور بلند آواز میں دھمکایا۔

''اکبر! میں چھلنی کر دوں گا۔ میری طرف دیکھو...... دیکھو میری طرف۔''

اس نے ایک بار دیکھا، اور پھر یوں منہ پھیر لیا جیسے کچھ نظر ہی نہ آیا ہو۔ میرے سینے میں الاؤ روشن تھا۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ اب اکبر کی واپسی ممکن نہیں ہے۔ لیکن کیا...... میں اسے روکنے کے لیے اسے گولی مار سکتا ہوں؟

یہ ایک ایسا سوال تھا جس نے پل بھر میں میرے جسم کو سن کر دیا۔ میں نے سیف کی جان لی تھی۔ اس کی موت کی وجہ سے اس کے والدین کی زندگیوں کے چراغ بجھے تھے۔ اس کا پورا گھرانہ زندہ درگور ہوا تھا۔ ''نہیں...... اب نہیں...... میں اب یہ نہیں کر سکوں گا۔'' میرے دل کی گہرائی سے یہ خاموش پکار بلند ہوئی۔

اسی دوران میں شازیہ تڑپ کر آئی اور اس نے میری رائفل تھام کر اس کا رخ اکبر کی طرف سے پھیر دیا۔ وہ پکاری۔ ''نہیں شاہ زیب بھائی! خدا کے لیے نہیں......''

میں نے رائفل نیچے جھکا لی۔

حیرانی کی بات تھی۔ دیوہیکل جیپ کی ایک کھڑکی ادھ کھلی تھی۔ اس کے باوجود جنونی پرندے اس گاڑی میں داخل نہیں ہو رہے تھے۔ وہاں صرف لمبی گردن والا ایک گنجا گدھ تھا جو اکبر کے ایک شانے پر پھڑ پھڑا رہا تھا۔ جیپ ایک بار پھر پُرشور آواز کے ساتھ دروازے سے ٹکرائی اور چوکھٹ اکھڑنا شروع ہو گئی۔ وزنی صوفے جیسے ڈگمگانے لگے۔ جگہ ایسی تھی کہ شیورلیٹ جیپ ٹکر مارنے کے لیے دور تک پیچھے نہیں ہٹ سکتی تھی، یہی وجہ تھی کہ دروازہ ابھی تک زمین بوس نہیں ہوا تھا...... بہرحال اس کی حالت ہر ٹکر کے بعد مخدوش تر ہو رہی تھی۔ جیپ کی ہیڈ لائٹس بھی ٹوٹ چکی تھیں۔

جیپ ایک بار پھر پیچھے ہٹی اور رک گئی۔ اس بار وہ فوراً ہی دروازے کی طرف نہیں آئی۔ شاید اکبر کچھ اور سوچنے لگا تھا۔

دو تین عورتوں نے دہشت زدہ انداز میں ایک کھڑکی کی جانب اشارہ کیا اور واویلا کرنے لگیں۔ منظر واقعی دہلانے والا تھا۔ کسی طرف سے کوئی نصف درجن بجو برآمد ہوئے تھے اور اپنے نکیلے دانتوں سے ایک کھڑکی کی جالی کو بھنبھوڑنے لگے تھے۔ یوں لگا کہ انہیں تھوڑا سا وقت اور مل گیا تو وہ جالی کو اکھاڑ دیں گے۔ قسطینا کے پاس مشین پسٹل موجود تھا۔ اس نے بلاتوقف ان مشتعل جانوروں پر چار پانچ فائر کیے۔ چند ایک نشانہ بن کر تڑپنے لگے۔ باقی اوجھل ہو گئے۔ ہمارے اردگرد موجود خواتین لرزہ براندام تھیں۔ وہ اس بات پر ششدر بھی نظر آ رہی تھیں کہ ایک عورت نے اس طرح آتشیں ہتھیار استعمال کیا تھا اور جانوروں کو نشانہ بنایا تھا۔

دیوہیکل جیپ اب اپنی جگہ ساکت کھڑی تھی۔ وہ اندھیرے میں تھی اس لیے کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ اندر موجود اکبر کیا کر رہا ہے اور کس پوزیشن پر ہے؟ شازیہ نے ایک بار پھر کھڑکی کی جالی سے چہرہ لگا لیا تھا اور شوہر کی منت سماجت کرنے لگی تھی۔

''کیا بیوی کے رونے چلانے کا اس پر کچھ اثر ہو رہا ہے؟'' قسطینا نے مجھ سے پوچھا۔

''مجھے تو نہیں لگتا کہ ایسا کچھ ہو گا۔''

''مگر...... وہ رک تو گیا ہے شاہ زائب۔''

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، میرے سیل فون پر کال کے سگنلز آنے لگے۔ یہ پہلوان حشمت تھے۔ یہ کچھ دوسرے مرد و زن کے ساتھ حویلی کے اسی پورشن میں بند تھے جہاں تاجور بھی تھی۔ یہ لوگ چونکہ مین ڈور سے دور تھے اس لیے زیادہ محفوظ تھے۔

پہلوان حشمت نے سخت گھبرائے ہوئے لہجے میں ہماری خیریت دریافت کی۔ پھر پوچھا۔ ''شاہ زیب! یہ بار بار دھماکے کی آواز کیا آوت ہے۔ کیا کوئی گاڑی کسی چیز کے ساتھ ٹکراوت ہے؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں جی، کچھ ایسی ہی بات ہے۔ آپ کی طرف خیریت ہے؟''

''ابھی تک تو ہے لیکن پتا ناہیں کہ رہے گی یا ناہیں۔'' پہلوان جی کی آواز کانپ رہی تھی۔ انہوں نے کہا۔ ''ابھی باہر سے علاقے کے ایس ایچ او کی ایک کال آئی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ دو تین تھانوں کی پولیس یہاں آ گئی ہے مگر ان کی کچھ سمجھ میں ناہیں آ رہا کہ وہ کیا کریں۔ یہ لوگ گاؤں سے باہر کھیتوں میں، اپنی گاڑیوں کے اندر بند ہیں۔''

میں نے پہلوان جی کو ایک دو ہدایات دیں۔ اسی اثنا میں دیو ہیکل جیپ کا انجن پھر پھنکارنے اور دھاڑنے لگا۔ شاید اکبر پھر دروازے پر چڑھ دوڑنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ اسی اثنا میں حنیف اور دو تین دیگر افراد کیکر کی لکڑی کے چند تختے لے کر آ گئے۔ انہوں نے آناً فاناً لکڑی کے تختے دروازے کے سامنے جوڑے اور ان پر اسٹیل کی لمبی میخیں ٹھونک دیں۔ اب دروازہ ایک بار پھر کچھ دیر تک دفاع کے قابل ہو گیا تھا۔

جیپ نے دروازے کو دو تین ٹکریں رسید کیں تب ایک بار پھر پیچھے ہٹ گئی۔ ذہن میں بار بار خیال آ رہا تھا کہ کہیں ہاناوانی بھی تو اس جیپ میں موجود نہیں۔ تاہم اس کی تصدیق کرنا آسان نہیں تھا۔

شازیہ مسلسل رو رہی تھی۔ ایک ادھیڑ عمر شخص اس کی ڈھارس بندھانے میں مصروف تھا۔ دیہاتی لباس والا وہ شخص مجھ سے مخاطب ہوا اور رو دینے والے لہجے میں بولا۔ ''اب اس کا کیا حل ہو سکتا ہے؟ اگر یہ دروازہ ٹوٹ گیا تو ہم میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچے گا۔''

''حل تو وہی ہے جو سامنے نظر آ رہا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اکبر کو کسی طرح روک لیا جائے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ وہ کسی بھی طرح رکے گا نہیں۔ سوائے اس کے کہ...... وہ ختم ہو جائے۔''

شازیہ روتی رہی۔ ادھیڑ عمر شخص نے بھی جواب میں کچھ نہیں کہا۔

میں نے گمبھیر، افسردہ لہجے میں کہا۔ ''پتا نہیں کہ آپ لوگوں کو معلوم ہے یا نہیں...... اور آپ اس پر یقین کر پائیں گے یا نہیں، مگر حقیقت یہی ہے کہ وہ بدذات عاملہ اب خود کچھ کرنے کے قابل نہیں...... وہ جو کچھ کر رہی ہے اب اکبر کے ذریعے کر رہی ہے...... اگر اکبر درمیان میں نہیں ہو گا تو...... یہ سارا طلسم ٹوٹ جائے گا۔ یہ پرندے یہ جانور سب اپنی اس وحشت سے نکل آئیں گے...... یقیناً اسی وقت نکل آئیں گے۔''

شازیہ کی ہچکیاں تیز ہو گئیں۔ اکبر کے ''درمیان میں نہ ہونے'' کا مطلب وہ اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔ یہ اس کی موت کی طرف اشارہ تھا...... کچھ دیر مزید اسی طرح گزری آہنی جالی چبانے والے بدشکل بجو پھر ایک کھڑکی کے قریب جمع ہو رہے تھے۔ چمگادڑیں جیسے اندھی ہو کر کھڑکیوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ جیپ کا انجن ایک بار پھر گرجا اور اس مرتبہ وہ غیر معمولی طاقت سے دروازے کی طرف بڑھی۔ یہ تصادم پہلے سارے ''تصادموں'' سے شدید تھا۔ دو تختوں کے کیل اکھڑ گئے اور دروازہ چٹخنے لگا۔ قسطینا نے کہا۔ ''اب جیپ ''فور وہیل ڈرائیو'' پر آ گئی ہے۔ اب یہ دروازہ توڑ دے گی۔''

چھوٹے بیرل والی روسی رائفل پر میری گرفت سخت ہو گئی مگر...... سوال تو پھر وہی تھا...... کیا میں اکبر کو گولی مار سکتا ہوں؟

دروازے کی حالت دیکھ کر اب عورتوں نے بے تحاشا رونا چلانا شروع کر دیا تھا۔ وہ کمروں کے کونوں کھدروں میں چھپ رہی تھیں، ان میں فردوس اور شازیہ کی بہنیں بھی تھیں...... سب کے چہروں پر موت کی زردی تھی۔

میرے اندر سے ایک آواز بلند ہوئی۔ ''شاہ زیب! تم اچھی طرح جانتے ہو، اب اکبر کو مارے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ اگر یہ سوچتے رہو گے کہ اکبر کے اہل خانہ کیا کہیں گے، دنیا کیا کہے گی تو پھر سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ تمہیں پہلے فیصلوں کی طرح آج ایک اور تکلیف دہ فیصلہ کرنا ہی پڑے گا۔'' میں نے رائفل کا سیفٹی کیچ ہٹایا، اس کا بیرل اوپر اٹھایا...... اور یہی وقت تھا جب اوپر تلے دو فائر ہوئے۔ دھماکوں سے کمرا لرز اٹھا...... یہ پمپ ایکشن گن کے فائر تھے۔ میں نے شیورلیٹ جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر اکبر کو اسٹیئرنگ کے اوپر گرتے دیکھا......

میں پلٹا تو وہی ادھیڑ عمر شخص نظر آیا جو کچھ دیر پہلے تک شازیہ وغیرہ کو تسلی دے رہا تھا۔ بڑھی ہوئی سفید شیو والے اس شخص کی آنکھوں میں آنسو نظر آئے۔ شازیہ تڑپ کر اس کے بازو سے لگ گئی اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ یہی وقت تھا جب میں نے کھڑکی سے جھانکا۔ حویلی کے احاطے میں موجود برقی روشنی میں دو بڑے سائز کے سیاہی مائل گدھ نظر آئے۔ یہ خاص نسل کے گدھ میرے جانے پہچانے تھے۔ یہ وہی تھے جو ہاناوانی کے کندھوں پر نظر آتے تھے۔ وہ پھڑ پھڑاتے ہوئے آئے اور حویلی کے ادھ کھلے پھاٹک کے اوپر بیٹھ گئے۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں یہ اعلان کر رہے تھے کہ ان کی مالکن...... جاماجی کی خطرناک ترین عاملہ بھی یہاں آس پاس موجود ہے......

○......❖......○

سیف کی بہن شازیہ بلند آواز میں رو رہی تھی۔ اس کی چھوٹی بہنیں بھی آہ و بکا کر رہی تھیں۔ وجہ ظاہر تھی۔ ہم سب کو کھڑکی میں سے دیوہیکل شیورلیٹ جیپ کا اندرونی منظر نظر آ رہا تھا۔ اسٹیئرنگ پر اکبر اوندھا پڑا تھا۔ پمپ ایکشن گن کی دوسری گولی نے اس کے سر کا ایک حصہ توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اکبر ختم ہو چکا تھا۔

نیم سفید داڑھی والا شخص بھی رو رہا تھا اور شازیہ کو تسلی دینے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ میں نے ملازمہ فردوس سے پوچھا۔ ''یہ کون ہے؟'' میرا اشارہ نیم سفید داڑھی والے شخص کی طرف تھا۔

فردوس روہانسی آواز میں بولی۔ ''یہ...... اکبر کا بڑا بھائی ہے، بہت پیار تھا اسے......'' وہ اپنا فقرہ مکمل نہ کر سکی۔

میں اور رضوان حیران رہ گئے۔ یہ شخص جو بھی تھا، اس نے بڑی دانش مندی اور حوصلے ہمت کا ثبوت دیا تھا...... وہ سمجھ گیا تھا کہ میں ایک ایسا کام کرنے سے ہچکچا رہا ہوں جو کرنا بہت ضروری ہو چکا ہے اور اس نے وہ کام اپنی پمپ ایکشن گن سے کر دیا تھا۔ اس نے ان نازک ترین لمحوں میں اکبر پر دو فائر کیے تھے اور اسے بے جان کر ڈالا تھا۔

''یہ دیکھو شاہ زائب! یہ پرندے پیچھے ہٹ رہے ہیں۔'' اچانک قسطینا نے ایک کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

وہ درست کہہ رہی تھی۔ مجھے بھی صاف محسوس ہوا کہ پرندوں کی غیر معمولی وحشت میں کمی واقع ہوئی ہے۔ وہ کچھ منتشر سے نظر آنے لگے تھے لیکن بہت سے ایسے بھی تھے جو اب بھی کھڑکیوں اور دروازوں پر جھپٹ رہے تھے۔

میں نے ایک بار پھر لمبی گردنوں والے گنجے گدھوں کی طرف دیکھا جو حویلی کے گیٹ پر بیٹھے پر پھڑپھڑا رہے تھے۔ ''قسطینا! مجھے لگتا ہے کہ ہاناوانی بھی کہیں آس پاس ہی موجود

ہے۔'' میں نے ہیجانی انداز میں کہا۔
''کہیں وہ اس سامنے والی جیپ کے اندر ہی تو نہیں؟''
''مجھے نہیں لگتا کہ ایسا ہے۔''
اکبر کی موت کو سب نے دیکھ لیا تھا اور محسوس کر لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کمروں میں موجود بیشتر عورتیں ماتمی انداز میں رونے لگی تھیں۔
اگلے ایک دو منٹ میں ہم نے اپنے اردگرد ایک حیران کن تبدیلی محسوس کی۔ یہی وہ تبدیلی تھی جس کے بارے میں ہم دو تین بار بات کر چکے تھے۔ ہمارے اردگرد موجود ناقابلِ یقین حالات کی طرح یہ تبدیلی بھی ناقابلِ یقین ہی تھی۔ کھڑکیوں اور دروازوں سے چمٹے ہوئے خونی پرندے اب محاصرہ چھوڑ کر ہوا میں پھڑ پھڑانے لگے تھے۔ ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جو فضا میں بلند ہو رہے تھے۔ ان میں طوطوں کے علاوہ اَن گنت سیاہی مائل چمگادڑیں بھی تھیں مردار خور گدھ، بجو اور نیولے بھی اب منظر سے اوجھل ہو رہے تھے۔
تو کیا وہ سب کچھ درست تھا جس کی ہم نے امید باندھی تھی۔ مرحوم حاذق ذکری کے الفاظ ایک بار پھر میرے کانوں میں گونجنے لگے۔ انہوں نے کہا تھا...... یہ تنویمی عمل کی ایک غیر معمولی شکل ہے۔ اس میں جب عامل کی جسمانی طاقت سلب ہوتی ہے، یا عامل ختم ہو جاتا ہے تو اس کے معمول پر اس کے سارے اثرات بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ اکبر ختم ہو گیا تھا...... اور ہمارے اردگرد موجود سارے حیوانات اس کے ٹرانس میں تھے...... اب وہ اس ٹرانس سے نکل رہے تھے۔ یہ سب کچھ بے حد عجیب تھا لیکن ہمارے سامنے تھا۔ ہم اسے بڑی وضاحت سے دیکھ رہے تھے۔
''میرا خیال ہے شاہ زائب! اب ہمیں باہر نکلنا چاہیے اور اس قاتلہ کو دیکھنا چاہیے۔''
''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' میں نے قسطینا کو جواب دیا۔
ہم نے ہتھیار سنبھالے، رضوان بھی ہمارے ساتھ تھا۔ ہمارے دروازہ کھولنے سے پہلے تاجور کے ماموں حنیف صاحب نے ساری عورتوں کو ساتھ والے کمرے میں بند کر دیا۔ ہم نے دس پندرہ سیکنڈ مزید انتظار کیا اور پھر شکستہ دروازے کو کھولتے ہوئے باہر نکل آئے۔ اردگرد موجود پرندوں نے ہماری طرف لپکنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ بے حد خوش آئند تھا۔ ہم نے سب سے پہلے دس نشستوں والی دیوہیکل جیپ کے اندر جھانکا۔ اس میں مردہ اکبر اور ایک پھڑ پھڑاتے ہوئے گدھ کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ سیاہی مائل گدھ بھی اب اکبر کے کندھے پر نہیں تھا۔ وہ اس کے سر پر بیٹھا تھا اور اس کے زخم کی طرف متوجہ تھا۔ رضوان کی

رائفل سے نکلنے والی گولی نے مردار خور کو مردار کی شکل دے دی۔ ہم حویلی کے صحن کی طرف لپکے۔ جسم کا سارا خون میرے سر کی طرف یلغار کر رہا تھا۔ ابھی چند سیکنڈ پہلے میں نے جیپ میں اس شخص کی لاش دیکھی تھی جو جنونی پرندوں اور جانوروں کا ایک ''لشکر'' لے کر اس چھوٹے سے گاؤں پر حملہ آور ہوا تھا اور اب تک نہ جانے کتنی جانوں کے زیاں کا سبب بن چکا تھا لیکن وہ کون تھا؟ وہ تو اسی گاؤں کا بیٹا تھا۔ وہ انہی گلی کوچوں میں کھیل کر جوان ہوا تھا اور مستقبل کے سہانے سپنے دیکھے تھے۔ وہ اپنی نوبیاہتا بیوی کو خدا حافظ کہہ کر یہاں سے روزی کمانے کے لیے نکلا اور اس بدذات عورت کا شکار ہوا تھا جسے ہاناوانی کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اصل قاتلہ تو یہی منحوس عاملہ تھی۔ اپنے کئی عزیز ساتھیوں کی طرح ہم نے بالآخر اکبر کو بھی اپنے ہاتھوں سے مارا تھا۔

وہ کہاں تھی؟ اگر وہ زندہ تھی تو اس کا ہر سانس ہماری حمیت کو للکار رہا تھا۔ ہمیں زیر بار کر رہا تھا۔ ہم صحن سے نکل کر گلی میں آ گئے۔ ہمارے عین سامنے ایک تانگے کے قریب ایک گھوڑا زخمی حالت میں اور چند مرغیاں مردہ پڑی تھیں۔ پندرہ بیس قدم کی دوری پر ایک انسانی لاش بھی نظر آ رہی تھی۔ دفعتاً میری نگاہ گلی کے آخری سرے پر اونچی چھت والی جیپ پر پڑی۔ یہ بھی ایک شیورلیٹ تھی مگر اندر والی جیپ سے کچھ چھوٹی تھی۔ یہ بڑی تیزی سے ہچکولے کھاتی ہوئی موڑ پر اوجھل ہو گئی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ اس پر کوئی فرار ہوا ہے۔ اب قسطینا اور رضوان نے بھی جیپ کو دیکھ لیا تھا۔

''ہمیں پیچھا کرنا چاہیے۔'' قسطینا نے تیزی سے کہا۔

ہم اس کورے کار کی طرف لپکے جس پر یہاں پہنچے تھے۔ آٹھ دس سیکنڈ بعد ہم کورے کار میں تھے اور بڑی تیزی سے شیورلیٹ جیپ کے پیچھے جا رہے تھے۔ اکا دکا پرندے ہماری گاڑی سے ٹکرائے لیکن زیادہ تر اب فضا میں بلند ہو چکے تھے۔ نیم تاریکی میں ہمیں اردگرد کے مناظر دکھائی دے رہے تھے اور یہ لرزہ خیز تھے۔ ہمیں کئی پالتو جانوروں کی لاشیں نظر آئیں۔ ایک بچہ زخمی حالت میں تڑپتا دکھائی دیا۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ایک بند دروازے کی اوٹ سے چند مرد وزن نکلے اور اس دو تین سالہ بچے کو اٹھا کر اندر لے گئے۔ شیورلیٹ جیپ کی سرخ بتیاں بڑی تیزی سے ہچکولے کھا رہی تھیں۔ ہمارا درمیانی فاصلہ 100 میٹر کے قریب تھا۔ ہم نے دیکھا کہ ایک پولیس موبائل کے قریب کھڑے دو اہلکاروں نے آگے بڑھ کر شیورلیٹ جیپ کو روکنے کی کوشش کی۔ ایک سیکنڈ کے اندر پولیس والوں پر ایک لمبا برسٹ فائر کیا گیا اور وہ زمین پر گر پڑے۔

ڈرائیونگ سیٹ پر میں تھا۔ میں نے تیسرا گیئر لگایا اور گاڑی کی رفتار حتی الامکان حد تک بڑھادی۔ ''قسطینا! فائر کرو۔'' میں نے کہا۔

قسطینا پہلے سے تیار تھی۔ اس نے کھڑکی کھول کر اسنیپر گن سے نشانہ لیا۔ ہماری گاڑی بری طرح ہچکولے کھا رہی تھی۔ یہی کیفیت شیورلیٹ جیپ کی تھی۔ ایسے میں نشانہ لینا آسان نہیں ہوتا مگر وہ قسطینا تھی۔ سخت فوجی تربیت سے گزری ہوئی ایک چنیدہ جنگجو۔ اس کے دوسرے فائر نے ہی شیورلیٹ کا ایک عقبی ٹائر برسٹ کر دیا۔ وہ پہلے سے زیادہ ڈگمگانے لگی اور اس کی رفتار میں بھی نمایاں کمی آ گئی۔ وہ فور وہیل ڈرائیو تھی اور ہر طرح کے راستوں پر بہت تیزی سے سفر کرسکتی تھی مگر ایک ٹائر ناکارہ ہونے کے بعد وہ ہماری عام کار سے بھی کم تر حیثیت اختیار کرگئی تھی۔ تین چار منٹ کے اندر ہم نے اسے جالیا۔

رضوان نے چھوٹے بیرل والی رائفل سے جیپ پر تابڑ توڑ گولیاں چلائیں۔ اندر سے جوابی فائرنگ ہوئی۔ کم از کم دو ہتھیاروں سے گولیاں چلائی جارہی تھیں پھر جیپ چلتے چلتے اچانک گھومی اور ہل چلے کھیتوں میں گھس کر رک گئی۔

''شاید ڈرائیور کو گولی لگ گئی ہے۔'' قسطینا نے خیال ظاہر کیا۔

''ڈرائیور کو لگ گئی ہے اور دوسری رائفل بھی چپ ہوگئی ہے۔'' میں نے آوازوں پر کان دھرتے ہوئے کہا۔

اگلے قریباً تیس سیکنڈ تک فائر اور کاؤنٹر فائر ہوا۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ ہم نے اپنی کورے کار کو پچاس ساٹھ فٹ آگے بڑھایا۔ کار کی ہیڈ لائٹس میں شیورلیٹ کا اندرونی منظر جزوی طور پر نظر آیا۔ دو ملائیشین گارڈز مردہ حالت میں دکھائی دیئے۔ ہم رائفلیں سونت کر کورے کار سے نکل آئے۔ احتیاط سے آگے بڑھے۔ ایک کھڑکی کا شیشہ چکنا چور ہو چکا تھا۔ جیپ کا ڈرائیور شدید زخمی حالت میں تھا اور ایک طرف لڑھکا ہوا تھا۔ مجھے اس کے قریب کوئی ہتھیار دکھائی نہیں دیا۔ جس چیز نے مجھے اور قسطینا کو ایک ساتھ چونکایا، وہ جیپ کی اندرونی حالت تھی۔ جیپ کے پچھلے حصے میں نشستیں نہیں تھیں۔ یہاں ایک جدید وہیل چیئر رکھی تھی یہ چیئر خالی تھی۔ جیپ کا ایک عقبی دروازہ کھلا ہوا تھا، یہی محسوس ہوتا تھا کہ ابھی کوئی یہاں سے نکل کر کھیتوں کی طرف گیا ہے۔ ''کیا وہ ہاناوانی ہے؟'' یہ سوال بڑی تیزی سے ہمارے ذہنوں میں ابھرا۔

رضوان نے ٹارچ کی روشنی زمین پر ڈالی۔ وہاں ہلکی ہلکی نمی تھی۔ کسی چیز کے گھسٹنے کے نشان نظر آئے جو مکئی کے اونچے کھیت کی طرف جارہے تھے۔ یقیناً کوئی وہیل چیئر سے اٹھ

کر ان کھیتوں میں داخل ہوا تھا۔ نوے فیصد امکان یہی تھا کہ وہ ہاناوانی ہوگی۔ ہم ہتھیار سونت کر کھیت میں داخل ہوئے۔ ہمارے پاؤں نرم اور یخ بستہ کیچڑ میں لتھڑ گئے۔ کھیت میں پانی لگا ہوا تھا۔ ٹارچ رضوان کے ہاتھ میں تھی۔ اس کے روشن دائرے کو حرکت دیتے ہم آگے بڑھنے لگے۔ دور ہمارے عقب میں گاؤں کی طرف اب بھی اکا دکا فائروں کی آوازیں آرہی تھیں۔ پولیس گاڑیوں کے دور افتادہ سائرن بھی سنائی دیتے تھے۔ ہمارے سامنے کھیت میں کچھ فاصلے پر آوارہ کتوں کا شور تھا۔

''یہ کتے کیوں شور مچا رہے ہیں؟'' قسطینا نے ٹھٹکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

ہم ذرا تیزی سے آوازوں کی سمت بڑھے اور پھر چند سکنڈ بعد ہم نے ایک حیران کن و عبرت ناک منظر دیکھا۔ ہمارے سامنے کھیت کے سیاہی مائل کیچڑ میں لتھڑا ہوا، ایک مدقوق جسم پڑا تھا۔ یہ ہاناوانی تھی۔ کتے، جیسے اسے بھنبھوڑنے کی تیاری کر رہے تھے۔ ایک جسیم کتے کے منہ میں ہاناوانی کی ایک آستین تھی اور وہ اسے کھینچ رہا تھا۔ ہمارے قریب پہنچتے ہی کتے ڈرے ڈرے انداز میں پیچھے ہٹے اور پھر ہماری طرف مڑ مڑ کر دیکھتے ہوئے، ٹھٹھری ہوئی تیرگی میں اوجھل ہو گئے۔

کیا انوکھا منظر تھا۔ جاماجی کی سابقہ حکمران، جزیرے کے سیاہ و سفید کی مالک، بدنام زمانہ ہپناٹسٹ، بے تاج ملکہ ہاناوانی، گوبر کی کھاد اور کیچڑ میں لتھڑی ہوئی ہمارے سامنے پڑی تھی، اس کا وزن واقعی پینتیس چالیس کلو کے قریب رہا ہوگا۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئیں، آنکھیں اندر دھنسی ہوئیں، سفیدی مائل بال منتشر، وہ ناقابلِ شناخت ہو رہی تھی۔ ٹارچ کی روشنی اس کے چہرے پر تھی، وہ ہمیں پہچاننے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ میں نے اس کی مشکل آسان کرتے ہوئے کہا۔ ''تیرے اندیشے بالکل درست ہیں ہاناوانی! یہ ہم ہی ہیں...... تیری ہٹ لسٹ کے اہم ترین نام۔''

قسطینا نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ دیکھ کر حیران ہو رہے ہیں کہ اَن گنت بے گناہوں کی جانیں لینے والی کو اپنی جان کتنی پیاری ہے۔ وہ اب بھی اپنے انجام سے بچنا چاہ رہی ہے۔ اس حالت میں بھی یہاں سے بھاگنے کی فکر میں ہے۔''

اب وہ ہمارے ہیولوں کو پہچان رہی تھی۔ ہمارے ہاتھوں میں آتشیں ہتھیاروں کی موجودگی محسوس کر کے اور ہمارے لہجوں کی تپش بھانپ کر اس کی گدلی آنکھوں میں خوف کے مہیب سائے پھیلنے لگے۔ شاید اپنی ناتوانی کے سبب وہ کچھ بول نہیں پا رہی تھی۔ انجام کے خوف نے اسے بدحواس کر رکھا تھا...... وہ ایک بار پھر آگے کی طرف رینگنے لگی۔ جیسے کسی

بھی طرح ہماری نظروں سے اوجھل ہو جانا چاہتی ہو۔ اسے دیوانے پن کے سوا اور کیا کہا جا سکتا تھا۔ حیرت کی بات تھی کہ اس بدترین حالت میں بھی اس کے مدقوق جسم پر قیمتی گہنے موجود تھے۔ گلوبند، انگوٹھیاں، وزنی کڑے، وہ کیچڑ میں آگے کی طرف کھسکتی تھی تو یہ زیورات جھنجھنانے لگتے تھے۔

پولیس کاروں کے سائرن اب بالکل نزدیک سنائی دینے لگے تھے اور یہ وہی پولیس تھی جس پر شکیل داراب جیسے لوگوں کا تسلط تھا۔ ہاناوانی گرفتار ہو جاتی تو کیا پتا کہ اس کے لیے پھر زندگی کے راستے نکل آتے۔ قانونی پیچیدگیاں، سفارتی استثنیٰ، بیماری کا عذر، خبر نہیں کیا کیا سامنے آ جاتا۔

میں نے سوالیہ نظروں سے قسطینا کی طرف دیکھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ہاناوانی ہانپی کانپی ہوئی تھی۔ اس نے قسطینا کو مخصوص انداز میں سر ہلاتے دیکھ لیا تھا۔ اس کے منہ سے بے ساختہ ڈری ڈری سی آوازیں نکلنے لگیں۔ پولیس کی گاڑیاں اب مکئی کے کھیت کے کنارے پہنچ چکی تھیں۔ میں نے اسنیپر گن ہاناوانی کی طرف سیدھی کی۔ یہ ''دور مار'' رائفل تھی مگر ہم اسے ''نزدیک مار'' کے طور پر استعمال کرنے والے تھے۔ ہاناوانی کی گدلی آنکھوں میں دہشت کی یلغار ہوئی۔

میں نے کہا۔ ''ہاناوانی، مناسب تو یہی تھا کہ تجھے اس گاؤں کے آوارہ کتوں کے لیے چھوڑ دیا جاتا تاکہ وہ تجھے نوچ سکیں مگر بہتر یہی ہے کہ تیرا فوری خاتمہ کر دیا جائے۔''

اس نے اردگرد دیکھا، جیسے کسی مددگار کو ڈھونڈ رہی ہو۔ درجنوں مسلح محافظوں اور ان گنت ہمنواؤں کے حصار میں رہنے والی اس خونخوار ملکہ کی مدد کرنے والا آج کوئی نہیں تھا۔ آخری لمحوں میں اس نے اپنا ہاتھ اٹھایا، جیسے مجھے اس عمل سے روکنا چاہتی ہو، کوئی آفر یا کوئی سودا کرنا چاہتی ہو۔ میں نے صرف چار فٹ کے فاصلے سے اسنیپر کی دو طاقتور گولیاں اس کی منحوس کھوپڑی میں اتار دیں۔ وہ دوبارا اچھلی اور وہیں گوبر آلود کیچڑ کے اندر ساکت ہو گئی۔

ہمارا پولیس سے بچنا ضروری تھا۔ ہم مکئی کے اس پانچ فٹ اونچے کھیت کے اندر جھک کر بھاگتے ہوئے مشرق کی طرف نکل گئے۔ بھاگتے بھاگتے میں نے اوپر نگاہ اٹھائی۔ آسمان پر ستاروں کے جھرمٹ تھے۔ ان ستاروں کے پیش منظر میں پرندوں کے ایک بڑے غول کی پرچھائیاں تھیں۔ یہ غول اور اس کے اردگرد چھوٹے چھوٹے جھنڈ پرواز کرتے ہوئے نامعلوم منزلوں کی طرف جا رہے تھے۔ ان کی غلام روحیں آزاد ہو چکی تھیں۔

○......❖......○

ایک نہایت ہنگامہ خیز رات کی صبح ہوگئی۔ یہ چھ، ساڑھے چھ بجے کا وقت تھا۔ ہم اسلام آباد میں واپس اپنے ٹھکانے پر پہنچ چکے تھے۔ لالہ موسیٰ سے یہاں تک پہنچنے میں ہم نے تین گاڑیاں بدلی تھیں جن میں دو ٹیکسی کاریں بھی شامل تھیں۔

ہاناوانی کی موت کے بعد اس کیچڑ آلود کھیت سے نکل کر میں نے فوری طور پر دو کام کیے تھے۔ ایک تو پہلوان حشمت کو فون کیا تھا اور انہیں کہا تھا کہ وہ فوراً گاؤں سے نکل جائیں کیونکہ پولیس انہیں گرفتار کرسکتی ہے۔ دوسرا اور زیادہ ضروری کام داؤد بھاؤ سے رابطے کا تھا۔ سکھیرا گاؤں والے ہنگامے کے دوران میں داؤد بھاؤ سے میری جو مختصر ٹیلی فونک گفتگو ہوئی تھی، وہ کافی پریشان کن تھی۔ بھاؤ کسی مصیبت میں تھا۔ اس کے اردگرد فائر ہو رہے تھے اور غالب امکان یہی تھا کہ بھاؤ کا سامنا پولیس والوں سے ہے۔ میں نے بھاؤ کو کال کی تھی اور اب تک وقفے وقفے سے آٹھ دس بار کر چکا تھا مگر ''بیل'' تو جاتی تھی، رابطہ نہیں ہوتا تھا۔ میں نے لودھی کو بھی کال کی تھی مگر اس کا فون مسلسل بند جا رہا تھا۔ کچھ پتا نہیں چل سکا تھا کہ بھاؤ کس حال میں ہے۔

جو خبریں آرہی تھیں، ان سے معلوم ہوا کہ سکھیرا گاؤں میں کم وبیش دس افراد جان سے گئے ہیں۔ زخمی ہونے والوں کی تعداد 150 سے زائد تھی۔ ان میں سے کچھ شدید زخمی تھے۔ فائرنگ سے جاں بحق ہونے والے دو پولیس اہلکاروں کا واقعہ اس کے علاوہ تھا۔ ہپناٹائزڈ جانوروں کے اس حملے میں درجنوں مویشی اور پالتو جانور بھی ہلاک وزخمی تھے۔ اطلاعات کے مطابق دین محمد صاحب کی میت کو فی الفور دوبارہ دفنا دیا گیا تھا اور اب قبرستان پر پولیس کی بھاری نفری متعین تھی۔ یہ سوچ کر دل کانپ جاتا تھا کہ سکھیرا کے قبرستان میں لاتعداد بجو گھس گئے تھے اگر انہیں بروقت روکا نہ جاتا تو کیا پتا وہ قبروں سے لاشیں نکال کر گاؤں کی گلیوں میں گھسیٹنا شروع کر دیتے۔ تاجور اور اس کے دونوں بھائیوں کے بارے میں جو معلومات ملیں، ان کے مطابق وہ رات والے واقعے میں محفوظ رہے تھے۔

رضوان دوسرے کمرے میں آدھ گھنٹے سے نیوز دیکھ رہا تھا۔ اس نے آکر بتایا۔ ''ابھی تک داؤد بھاؤ یا لودھی کے حوالے سے کوئی خبر نہیں ہے جی۔''

''عین ممکن ہے کہ کسی اہم خبر کو روک لیا گیا ہو۔'' قسطینا نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ پھر اس کی نگاہ میری زخمی کلائی پر پڑی جہاں پر سے جنونی طوطے نے کچھ گوشت نوچ لیا تھا۔ وہ

جلدی سے دوسرے کمرے میں گئی اور وہاں سے میڈیکل باکس اٹھا لائی۔

رضوان نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ''خوشی اور غم کا عجیب سا ملاپ ہو گیا ہے۔ اکبر کی موت پر اس کی بیوی کی آہ و بکا یاد آتی ہے...... لیکن پھر جب ہاناوانی کی موت کا عبرتناک سین نگاہوں کے سامنے گھومتا ہے تو کچھ ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے۔''

قسطینا نے میری کلائی پر بینڈیج کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ بہت بڑی کامیابی ہے رضوان، میں سمجھتی ہوں کہ حقیقی معنوں میں جاماجی آج آزاد ہوا ہے۔ انیق اور فارس سمیت ان سارے مقتولوں کی روحیں آج سرشار ہوں گی جن کی زندگیاں، ہاناوانی کے انتقام کی بھینٹ چڑھیں۔ کل رات جو کچھ ہوا، اسے جاماجی کے باشندے ہمیشہ یاد رکھیں گے۔''

وہ کچھ دیر خاموشی سے میری جانب دیکھتی رہی پھر رضوان سے مخاطب ہو کر بولی۔

''تمہارے یہ شاہ زائب بھائی جاماجی میں پہلے ہی ایک ہیرو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اب ان کا نام کچھ اور روشن ہوگا۔''

میں نے کہا۔ ''قسطینا! یہ سب میں نے اکیلے تو نہیں کیا، اس کے لیے بہت سے لوگوں نے بہت سی قربانیاں دی ہیں۔'' میرا اشارہ انیق، یونس، فارس جان، اکبر، سجاول سیالکوٹی اور بہت سے دیگر ساتھیوں کی طرف تھا۔

یہی وقت تھا جب سجاول کا فون بھی آ گیا۔ اس کی آواز خوشی اور جوش کی ملی جلی کیفیت سے لرز رہی تھی۔ اس تک بھی ہاناوانی کی موت کی اطلاع پہنچ چکی تھی۔ میں اسے اس واقعے کی تفصیل بتانے میں مصروف ہو گیا۔

○......❖......○

ہاناوانی، اس کے ملائیشین گارڈز اور اکبر وغیرہ کی لاشیں پوسٹ مارٹم کے لیے سکھیرا سے لاہور لے جائی جا چکی تھیں، اطلاعات کے مطابق جس ہاناوانی کو ہم دور دور تک تلاش کرتے رہے تھے وہ جہلم کی ہی ایک وسیع کوٹھی میں موجود تھی۔ وہاں دو سرجن اور دو تین ڈاکٹرز پرائیویٹ طور پر اس کا علاج کرتے رہے تھے۔ اسی کوٹھی میں آپریشن کی ساری سہولیات بھی مہیا کر لی گئی تھیں۔ اب ڈاکٹرز کی وہ ٹیم بھی گرفتار ہو چکی تھی۔ ان میں ایک سینئر سرجن جاماجی سے آیا تھا۔ یہاں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ہاناوانی کی لاش بھی پولیس نے ضروری کارروائی کے لیے لاہور پہنچائی تھی مگر اس کے جسم پر دس پندرہ کے بجائے صرف پانچ چھ زیورات کا ذکر تھا۔ ہاناوانی کو مارنے کا کریڈٹ بھی پولیس خود لے رہی تھی۔ بہرطو[ر] ہمیں ان باتوں سے کوئی فرق پڑنے والا نہیں تھا۔ ہمیں جو کام کرنا تھا، وہ کر چکے تھے او[ر]

یقیناً یہ ایک ''بڑا'' کام تھا۔

رات کو میں بازار سے کھانا منگوانا چاہ رہا تھا مگر قسطینا نہیں مانی۔ اس نے خود ہی پاکستانی طرز کی بریانی بنائی۔ دس بجے کے لگ بھگ جب ہم دونوں کھانا کھا رہے تھے، رضوان سیڑھیاں اتر کر ہانپا ہوا ہمارے پاس پہنچا۔ اس کے تاثرات یہ بتانے کے لیے کافی تھے کہ وہ کوئی خاص خبر لے کر آیا ہے۔

''آپ ٹی وی نہیں دیکھ رہے؟'' اس نے پوچھا۔

''کیوں کیا ہوا؟'' میں نے چونک کر دریافت کیا۔

''بہت بڑی نیوز ہے جی...... بہت بڑی۔'' اس نے جلدی سے ٹی وی آن کر دیا اور اس کے ساتھ ہی زبردست بریکنگ نیوز دیتے ہوئے بولا۔ ''دارج کا کزن شکیل داراب قتل ہو گیا ہے۔''

میں سناٹے میں رہ گیا۔ شکیل کسی معمولی شخص کا نام نہیں تھا۔ یہ داراب فیملی کا وہ چشم و چراغ تھا جو سیاست کی بساط کا اہم ترین مہرہ تھا۔ وہ بادشاہ نہیں، بادشاہ گر تھا۔

اس دوران میں رضوان ایک نیوز چینل ٹیون کر چکا تھا۔ وہاں تہلکہ مچا ہوا تھا۔ سکلیوسو نیوز چل رہی تھی۔ نیوز کاسٹر بلند آواز میں بول رہا تھا۔ ''اب تک کی اطلاع کے مطابق شکیل صاحب کے جسم پر تیز دھار آلے کے کم و بیش سات وار ہیں۔ سینے اور گردن کے تین چار زخم نہایت مہلک ثابت ہوئے اور انہوں نے ان کی جان لے لی۔''

رضوان نے چینل بدلا۔ یہاں بھی دہائی مچی ہوئی تھی۔ نیوز کاسٹر اپنے فیلڈ رپورٹر سے ہیجانی انداز میں ہم کلام تھا۔ رپورٹر درختوں سے گھری ہوئی ایک کھلی جگہ پر کھڑا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ''جی، یہ وہ جگہ ہے جہاں سے مبینہ طور پر آج شام محترم شکیل داراب کو اغوا کیا گیا۔ ان کے لیے دھمکیاں موجود تھیں۔ اس کے باوجود وہ شام کے وقت صرف دو تین گارڈز کے ساتھ گھر کے سامنے جاگنگ کے لیے نکل آتے تھے...... یہ دیکھیں جی، یہ وہ جگہ ہے جہاں جاں بحق ہونے والے تینوں گارڈز کے خون کے دھبے موجود ہیں۔''

اسٹوڈیو میں موجود نیوز کاسٹر نے پوچھا۔ ''اس بارے میں کیا بتایا جا رہا ہے، حملہ آوروں کی تعداد کیا تھی؟''

''وہ دو ''ڈبل کیبن'' گاڑیوں میں اچانک نمودار ہوئے تھے۔ داراب فیملی کے ذرائع کے مطابق ان کی تعداد دو درجن سے کم نہیں تھی۔ انہوں نے یہ کارروائی پوری پلاننگ کے ساتھ کی...... اور چند سیکنڈ میں ٹارگٹ حاصل کر لیا مگر اندازہ یہی ہوتا ہے کہ اپنے اغوا کے

بعد شکیل داراب نے غیر معمولی دلیری اور ہمت کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے اغوا کاروں کی زبردست مزاحمت کی، جس کے بعد اغوا کاروں نے گاڑی میں ہی جناب شکیل داراب پر چاقوؤں کے پے در پے وار کیے اور انہیں گاڑی سے پھینک کر فرار ہو گئے۔''

''اطلاعات کیا کہتی ہیں۔ کیا شکیل داراب موقع پر ہی دم توڑ گئے؟'' نیوز کاسٹر نے پوچھا۔

''جی نہیں، انہیں فوری طور پر اسپتال لے جانے کی کوشش کی گئی مگر وہ اسپتال نہیں پہنچ سکے۔''

سیکنڈ نیوز کاسٹر نے کہا۔ ''داؤد بھاؤ کے بارے میں یہی کہا جاتا ہے کہ یہ شخص خود فیلڈ میں نہیں آتا۔ اس کی طرف سے کی جانے والی ساری کارروائیاں اس کے خطرناک کارندے کرتے ہیں مگر یہاں یہ کہا جا رہا ہے کہ وہ خود بھی موقع واردات پر موجود تھا۔''

''جی بالکل، کچھ عینی شاہدین کا کہنا ہے کہ انہوں نے نہ صرف داؤد بھاؤ کو موقع واردات پر دیکھا ہے...... بلکہ اس کے قریبی ساتھیوں شاہ زیب اور فخر وغیرہ کو بھی پہچانا گیا ہے۔''

میں اور قسطینا ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگے۔

اسی دوران میں فیلڈ رپورٹر نے داراب فیملی کے ایک سینئر ملازم سے سوال جواب شروع کر دیئے۔ یہ شخص داراب ہاؤس کا گیٹ کیپر تھا۔ اس نے بڑے ٹھسے سے کہا۔ ''فائرنگ کی زوردار آوازیں سن کر میں گیٹ سے باہر نکلا...... اور جاگنگ ٹریک کی طرف بھاگا۔ ہمارے دو گارڈز ڈھیر ہو چکے تھے جبکہ تیسرا جس کا نام دلاور ہے بڑی دلیری سے جوابی فائر کر رہا تھا...... مگر ان کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ میں نے بھاؤ کے قریبی ساتھی شاہ زیب کو دیکھا۔ اس نے بڑے قریب سے دلاور پر آٹومیٹک رائفل کے فائر کیے۔ اس دوران میں بھاؤ نے پکار کر اپنے شوٹروں سے کچھ کہا۔ وہ مالک (شکیل) پر پل پڑے۔ میں واپس بھاگا تاکہ دوسرے گارڈز کو اطلاع دے سکوں۔ اتنے میں وہ لوگ مالک کو گاڑی میں ڈال کر موقع سے نکل گئے۔''

میں، قسطینا اور رضوان ششدر تھے۔ داراب فیملی کا یہ وفادار ملازم سفید جھوٹ بول رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس کو یہ سارا بیان باقاعدہ رٹایا گیا ہے اگر اس نے موقع واردات پر میری اور فخر کی موجودگی والا سنگین جھوٹ بولا تھا تو پھر یقیناً اس نے اور بھی بہت سے جھوٹ بولے تھے۔

رضوان نے کہا۔ ’’حیرانی ہو رہی ہے۔ لاہور کے جس علاقے کا یہاں تذکرہ ہو رہا ہے، وہ ہائی سیکیورٹی والا علاقہ ہے۔ وہاں مسلح بندوں سے بھری ہوئی دو گاڑیاں پہنچ گئیں اور پھر یہ بندے ایک سنگین واردات کر کے نکل بھی گئے۔ یہ سارا کچھ گڑبڑ والا معاملہ لگ رہا ہے۔‘‘

’’مگر یہ تو ہے کہ شکیل داراب مارا جا چکا ہے۔‘‘ قسطینا نے کہا اور ٹی وی اسکرین کی طرف اشارہ کیا...... جہاں اسپتال کا منظر دکھایا جا رہا تھا۔ روتے پیٹتے لوگ ایک دوسرے کو گلے سے لگا رہے تھے پھر ایک سرجن کا بیان ٹیلی کاسٹ کیا جانے لگا۔

میرا دھیان ایک بار پھر بھاؤ کی طرف جانے لگا۔ وہ کہاں تھا؟ اس سے رابطہ کیوں نہیں ہو پا رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر اس کے خاص نمبر پر ٹرائی کیا۔ حسبِ سابق بیل ہوتی رہی لیکن جواب نہیں ملا۔

’’شاہ زائب، کہیں ایسا تو نہیں کہ...... شاکیل ڈاراب (شکیل داراب) کو واقعی تمہارے داؤد بھاؤ نے مارا ہو......‘‘

’’جب تک بھاؤ سے رابطہ نہ ہو یقین سے تو کچھ نہیں کہا جا سکتا۔‘‘

’’شاہ زائب! وہ بھاؤ کو پولیس مقابلے میں مروانے کا ارادہ کر چکا تھا۔ مطلب یہی کہ ڈی ایس پی قیصر کی موت کے بعد ان کی دشمنی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ ایسے میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔‘‘

’’اسی لیے تو بار بار سوچ رہا ہوں کہ اللہ کرے داؤد بھاؤ خیریت سے ہو......‘‘ میرے فون پر کال کے سگنل آئے۔ میں بری طرح چونک گیا۔ یہ بھاؤ ہی کا نمبر تھا۔ میں نے کال ریسیو کر کے فون کان سے لگایا۔ میرا بولنا مناسب نہیں تھا۔ چند سیکنڈ بعد بھاؤ کی بھاری رعب دار آواز میرے کانوں میں گونجی۔ ’’شاہ زیب! تمہیں پتا چل گیا ہوگا، شکیل قتل ہو چکا ہے۔‘‘

’’جی ہاں، بھاؤ لیکن......‘‘

وہ میری بات کاٹ کر بولا۔ ’’بہت پکڑ دھکڑ ہونے والی ہے، مجھے اندازہ ہے کہ پنڈی اور اسلام آباد میں تمہاری رہائش گاہیں بھی خطرے میں آ جائیں گی۔ تم لوگ فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔‘‘

میں نے بے چین ہو کر کہا۔ ’’بھاؤ! مجھے آپ کی آواز سے لگ رہا ہے کہ آپ زخمی ہیں۔‘‘

''ایسی کوئی بات نہیں۔'' بھاؤ نے جیسے خود پر ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ''میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے، بس تم لوگ اسلام آباد پنڈی سے نکل جاؤ فوراً۔''

''بھاؤ، آپ کہاں ہیں...... میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا، شکیل کو کس نے مارا ہے...... اور آپ نے......''

اچانک مجھے پتا چلا کہ دوسری طرف سے رابطہ منقطع کیا جا چکا ہے۔ ''ہیلو بھاؤ...... ہیلو......'' میں نے دوبارہ بے قراری سے کہا پھر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

''کیا ہوا شاہ زائب؟'' قسطینا نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''ڈاؤد بھاؤ تو خیریت سے ہیں؟''

میں نے سر ہلایا۔ ''نہیں قسطینا! مجھے لگ رہا ہے وہ زخمی ہیں، خاصے زخمی ہیں۔''

اگلے پانچ دس منٹ میں، میں نے کئی بار کوشش کی مگر داؤد بھاؤ کا فون خاموش ہو چکا تھا۔

اسی دوران میں خورسنہ کا فون آ گیا۔ وہ پریشان لہجے میں بولی۔ ''شاہ زیب صاحب! کچھ دیر پہلے داؤد بھاؤ کا فون آیا ہے، انہوں نے کہا ہے کہ......''

''ہاں، مجھے پتا ہے خورسنہ، مجھے بھی فون آیا ہے۔ تم ایسے کرو فوراً ضروری سامان پیک کرلو۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں یہاں سے نکلنا پڑے گا۔''

''جی ہاں، بھاؤ جی نے بھی یہی کہا ہے۔'' خورسنہ بولی۔

اسی اثنا میں فخر نے فون تھام لیا۔ میں نے اسے مختصر الفاظ میں سچویشن سے آگاہ کر کے تیار رہنے کی ہدایت کی۔

میں نے قسطینا اور رضوان کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ اس کے بعد میں نے سیکٹر 2 میں رہائش پذیر پہلوان حشمت اور ولید کو فون کیا۔ انڈین لڑکی شاردا بھی یہیں رہائش پذیر تھی۔ تاہم ولید نے فون پر بتایا کہ پہلوان ابھی یہاں نہیں پہنچے۔ میں نے ولید اور شاردا سے کہا۔ ''شکیل داراب کے قتل والا واقعہ بہت بڑا ہے۔ اس کے سنگین نتائج نکلنے والے ہیں۔ داؤد بھاؤ کی ہدایت کے مطابق ہمیں فوراً یہاں سے نکلنا ہوگا۔ تم لوگ زیادہ ضروری سامان پیک کرلو۔''

ولید نے کچھ سوال کیے جن کے میں نے مختصر جواب دیئے۔ آخر میں کہا کہ ہم ایک ڈیڑھ گھنٹے میں انہیں ''پک'' کرنے کے لیے پہنچ رہے ہیں۔

ایک بار پھر ہمیں افراتفری کے عالم میں اپنے ٹھکانے چھوڑنے پڑ رہے تھے۔ ویسے

کچھ دیر پہلے شکیل کے قتل کی خبر ملتے ہی میرے ذہن میں یہ اندیشہ آن موجود ہوا تھا۔ شکیل کے قتل میں میرا یا فخر وغیرہ کا کوئی کردار نہیں تھا۔ اس کے باوجود ہمیں ملوث کیا گیا تھا اور یقینی بات تھی کہ ہماری تلاش میں بھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی جائے گی۔ یہ بھی عین ممکن تھا کہ بھاؤ کا کوئی اہم ساتھی پولیس کی گرفت میں آچکا ہو اور بھاؤ کو اندیشہ ہو کہ وہ شدید جسمانی تشدد سہہ نہیں پائے گا اور ان پناہ گاہوں کے بارے میں اگل دے گا۔

شکیل کے قتل کی خبر ملتے ہی میں نے اپنی اگلی پناہ گاہ کے بارے میں سوچ لیا تھا۔ جن دنوں میں کوٹلی کے قریب سجاول کے ڈیرے پر موجود تھا، میں نے سجاول کے ساتھی کے ساتھ ہری پور اور ایبٹ آباد کا ایک چکر لگایا تھا۔ وہیں پر مجھے ایبٹ آباد کے مضافات میں ایک نئی آبادی بہت پسند آئی تھی۔ یہاں چھوٹے بڑے بہت سے گھر برائے فروخت اور رینٹ پر موجود تھے۔ میں نے سوچا تھا کہ اگر کسی وقت شکیل داراب اور انسپکٹر قیصر چوہدری کی عقابی نظروں سے اوجھل ہونا پڑا تو یہ علاقہ ہر لحاظ سے بہت سازگار رہے گا۔

''کیا سوچ رہے ہو شاہ زائب؟ کیا لودھی وغیرہ بھی شفٹنگ میں ہماری مدد کریں گے؟''

''میرا خیال ہے کہ نہیں، داؤد بھاؤ کی خواہش ہے کہ اس بار ہمیں جو کرنا ہے، اپنے طور پر کریں۔ بھاؤ کا کوئی بندہ اس میں ملوث نہ ہو، تاکہ ہم زیادہ محفوظ رہ سکیں۔''

''بات تو بالکل ٹھیک ہے۔'' قسطینا نے اثبات میں جواب دیا۔

رضوان نے کہا۔ ''میرے ذہن میں ایک آئیڈیا ہے۔ ہماری سواری کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔''

میں اور قسطینا سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھنے لگے۔ وہ بولا۔ ''ہمارے مکان کی بائیں جانب فائر بریگیڈ کا اسٹیشن ہے۔ یہاں تین چار گاڑیاں موجود ہیں۔ ایک گاڑی اسٹیشن کے پچھواڑے کھڑی ہے۔ پچھلے دس پندرہ دنوں میں، میں نے تو اسے اپنی جگہ سے حرکت کرتے نہیں دیکھا۔''

''تو کیا چاہتے ہو تم؟''

''اس کو حرکت دیتے ہیں۔ میں نے دیکھا تھا وہ بالکل چالو حالت میں ہے۔ ایک بار انیق بھائی نے مجھے سکھایا تھا کہ اگنیشن کے تار جوڑ کر انجن کیسے اسٹارٹ کیا جاتا ہے۔''

''کہیں کوئی پنگا نہ ہو جائے۔'' میں نے کہا۔

''آپ بالکل بےفکر رہیں۔ یہ وہ پہلے والا رضوان نہیں ہے جناب۔''

کچھ سوچ بچار کے بعد ہم نے رضوان کو اس کام کے لیے بھیج دیا اور خود سامان پیک کرنے لگے۔

رضوان نے اپنا کام کر دکھایا مگر وہ اس طرح نہیں ہوا جیسے وہ چاہتا تھا۔ وہ سرخ رنگ کی بس نما گاڑی لے آیا مگر اسٹیئرنگ پر وہ خود نہیں تھا، محکمے کا ہی کوئی بندہ تھا۔ یہ فائر بریگیڈ کا باوردی ڈرائیور تھا۔ چند لمحے بعد اندازہ ہوا کہ رضوان نے اسے گن پوائنٹ پر رکھا ہوا ہے۔

''ایک لحاظ سے یہ بہتر ہی ہے۔'' قسطینا نے کہا۔ ''باوردی ڈرائیور زیادہ محفوظ ثابت ہوگا۔''

اگلا قریباً ایک گھنٹا بڑا مصروف اور تناؤ والا تھا۔ ہم نے نہ صرف سیکٹر ٹو میں جا کر ولید اور انڈین شاردا کو ''پک'' کیا...... بلکہ آٹھ دس کلو میٹر طے کر کے پنڈی پہنچے اور وہاں سے سجاول، خورشنہ اور فخر کو بھی اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ اپنے ہتھیار ہم نے نشستوں کے نیچے اس طرح چھپا رکھے تھے کہ کسی فوری ضرورت کے تحت انہیں سرعت سے نکالا بھی جا سکے۔ قسطینا کے لیے شاردا نے ہی ایک برقع کا انتظام کر دیا تھا۔

فائر بریگیڈ کی یہ گاڑی ہمارے لیے بڑی کارآمد ثابت ہو رہی تھی۔ ہمیں کہیں پر روکنے کی کوشش نہیں کی گئی، حالانکہ پورے پنڈی میں سخت قسم کے ناکے لگنے شروع ہو گئے تھے۔ اسلام آباد کی سڑکوں پر بھی ہم نے پولیس موبائلز کی اضافی نقل و حرکت دیکھی۔ پنڈی کے ایک دو مقامات پر ہمیں تھوڑی تعداد میں مظاہرین بھی نظر آئے جو ٹائر جلا رہے تھے اور نعرہ زنی کر رہے تھے۔ یقیناً یہ شکیل داراب کی موت کا ردِعمل تھا۔ قسطینا نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ ''یہ شاکیل ڈارب کوئی اچھا آدمی تو نہیں تھا، پھر یہ احتجاج؟''

میں نے کہا۔ ''قسطینا! ہمارے ہر برے سے برا سیاست داں بھی کچھ لوگوں کے لیے بہت اچھا بلکہ آنکھوں کا تارا ہوتا ہے۔''

ہمیں براستہ مری، نتھیا گلی سے ہوتے ہوئے ایبٹ آباد پہنچنا تھا۔ اب رات کے ایک بجے کا عمل تھا۔ ایسے اوقات میں احتجاج وغیرہ تو نظر نہیں آیا کرتا مگر اندازہ ہو رہا تھا کہ کل شکیل کے خونچکاں قتل کے ردِعمل میں کچھ نہ کچھ لوگ ضرور سڑکوں پر نکلیں گے۔ فائر بریگیڈ کی اس گاڑی کا تنومند ڈرائیور رضوان کے گن پوائنٹ پر تھا اور بڑی فرمانبرداری سے اس کی ہدایات پر عمل کر رہا تھا...... دراصل یہ شخص رضوان کو اس گاڑی کے اندر ہی سوتا ہوا مل گیا تھا۔ ہم صبح چھ بجے کے لگ بھگ ایبٹ آباد میں تھے۔ موسم برفیلا تھا۔ شہر کے اردگرد چوٹیوں

پر برف کی سفیدی بہت نمایاں تھی۔ یہاں ہمیں کوئی اضافی سیکیورٹی دکھائی نہیں دی۔ (وجہ یہی تھی کہ شکیل داراب کے قتل والا واقعہ یہاں سے بہت دور لاہور میں ہوا تھا) ہم پروگرام کے مطابق ایبٹ آباد کی ایک نواحی رہائشی آبادی میں داخل ہوئے۔ ایک مقام پر گاڑی روک کر میں نے گاڑی کے باوردی ڈرائیور کی کنپٹی پر مشین پسٹل کی ایک زوردار ضرب رسید کی اور اسے کچھ دیر کے لیے بے ہوش کر دیا۔ یہ ہماری مجبوری تھی کیونکہ وہ اتنا پریشان تھا کہ کسی بھی وقت شور مچا کر ہمارے لیے مصیبت کھڑی کر سکتا تھا۔ فاضل نامی اس ڈرائیور کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے گئے۔

باقی لوگ گاڑی کے اندر ہی رہے۔ میں اور رضوان باہر نکلے اور ایک ڈیڑھ گھنٹے کے اندر کرائے کے ایک پورشن کا انتظام کر لیا۔ اس پورشن میں منتقل ہونے کے فوراً بعد ہم نے فائر بریگیڈ کی اس گاڑی سے چھٹکارا حاصل کیا۔ رضوان اسے لے گیا اور شہر سے باہر کافی فاصلے پر چھوڑ آیا۔ اس نے گاڑی میں سے ہر وہ نشانی مٹا دی تھی جس سے ہماری موجودگی کا شک ہو سکتا تھا۔ گاڑی کے ڈرائیور فاضل کو ہم کسی صورت نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ لہٰذا وہ ہمارے ساتھ تھا۔

ٹی وی پر آج صرف اور صرف ایک ہی موضوع تھا۔ شکیل داراب کا ''بہیمانہ قتل'' اس موضوع کے پیچھے سکھیرا گاؤں والا خونی و تہلکہ خیز واقعہ بھی دب کر رہ گیا تھا...... حالانکہ اس واقعے میں ہاناوانی کی موت بھی شامل تھی۔

نیوز کاسٹر اپنے رپورٹر سے پوچھ رہا تھا۔ ''آپ بتائیں شہر کی اس وقت کیا صورت حال ہے۔ عام لوگوں کے تاثرات کیا ہیں؟''

رپورٹر نے مائیک اپنے ہونٹوں سے قریب کرتے ہوئے کہا۔ ''اس وقت صبح کے دس بجے ہیں۔ کچھ علاقوں میں مارکیٹیں ابھی تک بند ہیں اور وہاں کشیدگی پائی جاتی ہے۔ کچھ چوراہوں پر داراب فیملی کے چاہنے والوں نے ٹائر وغیرہ بھی جلائے ہیں مگر مجموعی طور پر لاہور یا دیگر شہروں میں کوئی شدید ردِعمل دیکھنے میں نہیں آیا۔ ہاں پنجاب کے تقریباً سارے شہروں میں سیکیورٹی ہائی الرٹ ہے۔''

نیوز کاسٹر نے پوچھا۔ ''پولیس کے ذرائع کیا کہتے ہیں...... کیا اس نہایت سنگین واردات کے حوالے سے کچھ گرفتاریاں بھی عمل میں آئی ہیں؟''

''جی ہاں، پولیس نے رات پھر مختلف علاقوں میں چھاپے مارے ہیں اور درجنوں افراد کو اپنی تحویل میں لیا ہے۔ یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ کچھ چھاپا مار ٹیمیں لاہور سے باہر

بھی گئی ہیں۔''

''کیا اس سلسلے میں سکھیرا گاؤں میں بھی کوئی کارروائی ہوئی ہے؟''

''جی ہاں، اس قتل کے اہم ملزمان شاہ زیب اور رضوان وغیرہ کو آخری مرتبہ سکھیرا میں ہی دیکھا گیا تھا۔ پولیس نے اپنی تفتیش کا دائرہ سکھیرا تک پھیلایا ہے۔ وہاں مختلف لوگوں سے پوچھ گچھ ہوئی ہے..... مگر کوئی گرفتاری عمل میں نہیں آئی۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ہاناوانی والے غیر معمولی واقعے کے بعد سکھیرا میں ابھی تک سوگ اور گہرے دکھ کی فضا ہے۔''

ٹی وی اور اخبارات کی خبروں میں بڑے دھڑلے کے ساتھ یہ بات دہرائی جارہی تھی کہ شکیل داراب پر قریباً دو درجن مسلح افراد نے دھاوا بولا تھا اور ان مسلح افراد میں، میں اور میرے ساتھی بھی تھے۔ بے بنیاد جھوٹ کو اتنی شدت سے دہرایا جارہا تھا کہ وہ سچ معلوم ہونے لگا تھا۔

ایک نیوز چینل پر ٹاک شو جاری تھا۔ اینکر لڑکی نے ایک سینئر صحافی سے پوچھا۔ ''آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ کچھ عرصہ پہلے گینگسٹر داؤد بھاؤ کو مردہ تصور کرلیا گیا تھا لیکن اندیشوں کے مطابق وہ نہ صرف حیات ہے بلکہ اتنی بڑی کارروائی بھی کرگزرا ہے۔''

صحافی نے کہا۔ ''پہلے تو میں یہ کہوں گا کہ داؤد بھاؤ کے لیے گینگسٹر کا لفظ زیادہ موزوں نہیں۔ اسے ڈان کہنا چاہیے۔ ایسا ڈان جس کا نیٹ ورک لاہور سے باہر بھی دور دور تک پھیلا ہوا ہے۔ جہاں تک آپ بھاؤ کے مردہ اور پھر زندہ ہونے کی بات کررہی ہیں، مجھے یہ سارے کا سارا معاملہ ہی کئی پہلوؤں سے مشکوک لگتا ہے، کل ایک چینل پر نیوز میں واقعے کے ایک عینی شاہد کا بیان دکھایا جارہا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ تمام وقت اس ایریا میں موجود تھا۔ اسے کہیں بھی مسلح افراد سے بھری ہوئی دو گاڑیاں نظر نہیں آئیں۔ فائرنگ کی جو آوازیں سنائی دیں وہ بھی زیادہ شدید نہیں تھیں۔ اس کا کہنا ہے کہ فائرنگ کے وقت صرف ایک ڈبل کیبن گاڑی داراب ہاؤس کی طرف سے آئی۔ اس میں جس بندے کی جھلک نظر آئی وہ عین ممکن ہے کہ داؤد بھاؤ ہو......''

قسطینا نے ٹی وی آف کرتے ہوئے کہا۔ ''شاہ زائب! چھوڑو ان ٹاک شوز کو۔ تم نے کل رات کو بھی بس دو چار نوالے ہی لیے تھے جب شاکیل کے قتل کی نیوز آگئی۔''

''قسطینا! میں نے کہا ہے ناں کہ مجھے ابھی بھوک نہیں۔''

''تو جن کو تھوڑی بہت بھوک ہے، ان کو تو بھوکا نہ رکھو۔'' وہ پیشانی سے اپنے بال

ہٹاتے ہوئے بولی۔

''اوہو، میں نے کہا تو تھا کہ تم لوگ ناشتا کرلو۔'' میں نے چونک کر کہا۔

''باقیوں نے تو کرلیا ہے لیکن ایک آدھ نے ابھی نہیں بھی کیا۔'' وہ ہولے سے مسکرائی اور اس کے غیر معمولی سفید دانت جھلک دکھانے لگے۔

میں نے ذرا توقف سے کہا۔ ''ایک دوسرے کی زیادہ ہی عادت تو نہیں ہوتی جارہی ہمیں؟''

''ایک کا تو پتا نہیں...... دوسرے کو شاید ہوتی جارہی ہے۔'' وہ ہنس دی۔ اورنج جوس کا وہ گلاس اٹھالیا جس میں سے کچھ پی کر میں نے ٹیبل پر رکھا ہوا تھا۔

○......❖......○

کرائے کا وہ پورشن بالکل عارضی طور پر تھا تاکہ ہم سر تو چھپا سکیں۔ اگلے تین چار روز میں ہم نے کوشش کر کے قریباً ایک کینال کی نہایت کشادہ کوٹھی کرائے پر حاصل کرلی اور فائر بریگیڈ کے ڈرائیور سمیت وہاں پر شفٹ ہوگئے۔ ڈرائیور کو ہم نے مریض ظاہر کیا ہوا تھا اور مسلسل ٹرینکولائزر کے نشے میں رکھا ہوا تھا۔ ہماری یہ نئی رہائش گاہ بڑی خوب صورت و دلفریب جگہ پر تھی۔ ایک طرف نتھیا گلی کی بلند و بالا برف پوش چوٹیاں نظر آتی تھیں اور دوسری طرف حویلیاں اور ہری پور وغیرہ کی سرسبز ڈھلوانیں تھیں۔ یہاں ہم خود کو کافی محفوظ محسوس کررہے تھے۔ شکیل داراب کے قتل سے جو سنگین صورتِ حال پیدا ہوئی تھی، اس کا زیادہ اثر وسطی پنجاب کی طرف ہی تھا۔ داؤد بھاؤ اور لودھی بھی ایک معما بنے ہوئے تھے، ان سے اب تک کوئی رابطہ نہیں ہو پایا تھا۔ اطلاعات کے مطابق نازک صورتِ حال دیکھ کر بھاؤ کا سارا گینگ زیرزمین جاچکا تھا۔

قسطینا کے حوالے سے میرے ذہن میں کسی وقت ایک جنگ سی ہونے لگتی تھی۔ کیا کچھ ایسا ہوسکتا تھا کہ آگے چل کر میری اور قسطینا کی راہیں ایک ہوجائیں؟ اس سوال کا جواب میرے ذہن سے اکثر نفی میں ہی آتا تھا لیکن کسی وقت مثبت جواب کا اشارہ بھی ملتا تھا۔ یہ ممکن تھا کہ کچھ عرصہ ہم اسی طرح ایک ساتھ رہتے اور کچھ وقت گزارتے تو کچھ خوش گوار تبدیلیاں رُونما ہوجاتیں۔

ایک ٹھٹھری ہوئی شام میں قسطینا اور میں ٹیرس میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ سورج دور نتھیا گلی اور مری کے پہاڑوں کے پیچھے اوجھل ہورہا تھا۔ میں نے چسکی لیتے ہوئے کہا۔ ''قسطینا! ایک دن تم نے تجویز دی تھی کہ اس خوب صورت علاقے میں کہیں آگے جا کر

کیمپنگ کی جائے۔ ساتھیوں سمیت دو چار دن وہاں گزارے جائیں۔“

”ہاں کہا تھا شاہ زائب، لیکن اب تو میں واپس جا رہی ہوں۔ میرا جانا اب ضروری ہے۔“ مجھے ہلکا سا شاک محسوس ہوا۔

”یہ بیٹھے بٹھائے کیسے پروگرام بن گیا؟“ میں نے حیرانی سے کہا۔

”آج صبح بھی جاما جی سے ابراہیم کا فون آیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ہاناوانی کی موت کے بعد نیوسٹی کے کچھ علاقوں میں بہت کشیدگی ہے۔ نیوسٹی کے اکثر لوگ اب خود کو جاما جی میں مدغم کرنا چاہتے ہیں۔ مٹھی بھر لوگ ان کی مخالفت کر رہے ہیں۔“ قسطینا نے مجھے تفصیل سے سب کچھ بتایا۔ میں خاموشی سے سنتا رہا۔

صرف پانچ دن بعد قسطینا ہمیں وہاں ایبٹ آباد میں چھوڑ کر واپس جاما جی چلی گئی۔ اس سلسلے میں اس احمد ثانی شخص نے ہی اس کی مدد کی تھی جیسا کہ مجھے معلوم ہوا تھا احمد ثانی کے اپنے ذاتی ”شپ“ بھی تھے۔ ایسے ہی ایک کارگو ”شپ“ کے ذریعے قسطینا بڑی رازداری سے آٹھ دن کا سمندری سفر طے کر کے کراچی سے برونائی اور پھر جاما جی چلی گئی۔ وہاں واقعی اس کی فوری ضرورت تھی۔ نیوسٹی میں ایک انتہا پسند گروپ نقصان دہ کارروائیاں کر رہا تھا۔

ایبٹ آباد کی اس خوب صورت و پُر فضا کوٹھی میں ایک اداسی سی محسوس ہونے لگی۔ اس طرح کے ماحول کو پہلوان حشمت اپنی پھلجڑیوں سے بدل دیا کرتے تھے لیکن آج کل وہ بھی اوجھل تھے۔ بس ایک روز فون پر ان سے رابطہ ہوا تھا۔ میں نے انہیں یہاں ایبٹ آباد آنے کا کہا تھا لیکن وہ ٹال گئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ان کے گھریلو حالات مزید خراب ہیں۔ ان کی بیوی کے بھائیوں نے کہا ہے کہ وہ بیوی اور بچوں کا ماہانہ خرچا دیں...... لگتا ہے کہ اب معاملہ طلاق کی طرف جا رہا ہے......

میں نے پہلوان جی سے کہا۔ ”آپ تحمل سے کام لیں۔ حالات ذرا بہتر ہوتے ہیں تو میں خود آپ کے سسرالیوں سے ملوں گا اور حالات کو سنبھالنے کی کوشش کروں گا۔“

وہ تنک کر بولے تھے۔ ”یہ کوئی پولیس مقابلہ ناہیں ہے یار! جس میں تم کچھ کر کے دکھا سکو گے۔ یہ اور طرح کے بکھیڑے ہووت ہیں...... تم اپنا معاملہ ناہیں سنبھال سکے، کسی اور کا کیا سنبھالو گے......“ میں سمجھ گیا۔ پہلوان کا اشارہ تاجور والے معاملے کی طرف ہے۔ پہلوان جی کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ آج کل چاند گڑھی کے آس پاس ہی کہیں ٹھہرے ہوئے ہیں۔

دارج داراب کے بارے میں تازہ ترین خبر یہ تھی کہ وہ بالآخر علاج کے لیے امریکا چلا گیا ہے۔ تاجور بھی اس کے ساتھ ہی چلی گئی تھی۔ غالباً بچے کی ڈیلیوری بھی بیرون ملک ہی ہونا تھی۔ ویسے ایک متضاد اطلاع یہ تھی کہ تاجور اس کے ساتھ نہیں گئی ہے......اور یہیں اپنے سسرال میں ہے۔

ایک روز جاماجی میں زینب سے اسکائپ کے ذریعے بات ہوئی۔ میں نے عام سے لہجے میں اس سے پوچھا۔ ''تمہاری چیف آج کل کیا کر رہی ہے؟''

وہ میرا اشارہ سمجھ کر بولی۔ ''قسطینا پچھلے سات آٹھ روز کافی مصروف رہی ہیں......ان کے یہاں آنے سے نیوسٹی والی یورش کافی دب گئی ہے اور ابراہیم خود کو کافی ایزی محسوس کر رہے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''احمد ثانی والا معاملہ کیسا جا رہا ہے؟''

وہ بولی۔ ''اس بارے میں تو مجھے زیادہ معلوم نہیں۔ احمد ثانی کے بڑوں کی طرف سے رشتے کی بات کی گئی تھی مگر قسطینا کے منفی جواب کے بعد دونوں طرف خاموشی ہو گئی تھی۔ اب دوبارہ کوئی بات ہوئی ہو تو پتا نہیں...... ویسے تو پرسوں بھی احمد یہاں محل میں آئے ہوئے تھے۔ ہماری...... شش......شادی کی سالگرہ تھی۔'' وہ ذرا شرما کر بولی۔

''مبارک ہو یور ہائی نس......آپ کو بھی اور ابراہیم کو بھی۔''

''ایسا نہ کہا کریں بھائی۔'' وہ ذرا ٹھنک کر بولی۔

''اچھا......اور کیا حالات ہیں؟''

ایک دم وہ بولی۔ ''ایک اور بات یاد آئی......قسطینا نے ایک بچہ گود لیا ہے۔ پتا ہے وہ کون ہے؟ آپ اندازہ لگائیں وہ کون ہو سکتا ہے۔''

''بھئی، تم ہی بتاؤ۔'' میں نے کہا۔

''یہ ان ہی چھوٹے بچوں میں سے ایک ہے جن کو آپ نے روم کی کسی کھاد فیکٹری سے رہائی دلائی تھی۔''

میں سناٹے میں رہ گیا۔ یعنی وہ بدنام زمانہ ایول کے ٹیسٹ ٹیوب بچے کی بات کر رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، زینب نے چونک کر کہا۔ ''یہ دیکھیں جی، کتنی لمبی عمر ہے ان کی۔ ان کی بات ہو رہی تھی اور یہ بھی آ گئی ہیں۔'' زینب نے اپنے سیٹلائٹ فون کا کیمرا گھمایا، مجھے سامنے ہی قسطینا کھڑی نظر آ گئی۔ وہ یونیفارم کے بجائے جینز اور سفید جرسی میں تھی۔ اس کی بانہوں میں چھ سات ماہ کا ایک گول مٹول بچہ تھا۔ وہ ہمک رہا تھا، قلقاریاں مار

رہا تھا۔ وہ بچے کا گل رنگ رخسار چوم کر بولی۔ ''ہیلو شاہ زائب! کیسے ہو؟''

''آپ...... میرا مطلب ہے تم کیسی ہو؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں...... اور یہ دیکھو...... اس کا نام میں نے تاشفین رکھا ہے، کیسا نام ہے یہ؟''

''بہت خوب صورت، اسی بچے کی طرح۔''

وہ بچے کے روشن چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''شاہ زائب! یہ ایک بچہ ہے۔ بالکل ایک سادہ، کورے کاغذ کی طرح۔ ہم جو چاہیں گے، اس پر لکھا جائے گا۔ اس کی بنیاد جو بھی ہے مگر قدرت نے اس کے اندر برائی کے ساتھ اچھائی کا بیج بھی رکھا ہے۔ ہم جس بیج کی پرورش کریں گے وہی درخت کہلائے گا۔''

زینب نے قسطینا سے پوچھا۔ ''تاشفین کا مطلب آپ نے نہیں بتایا؟''

''بہت مہربان، ہمدرد اور انسان دوست۔ یہ ایول کا الٹ ہے اور مجھے یقین ہے یہ الٹ ہی ثابت ہوگا۔ نہ صرف یہ بلکہ اس کے سارے معصوم بہن بھائی۔ اگر اچھے لوگوں نے ان کی اچھی پرورش کی تو وہ ایول نہیں ''ایول کلر'' ہوں گے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو قسطینا۔'' میں نے تائید کی۔

بچہ منہ کھول کر قسطینا کا رخسار چوسنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ قسطینا نے مسکرا کر اس کا منہ چوما اور پھر قریب کھڑی مستعد آیا کے حوالے کر دیا۔ وہ اسے فیڈر سے دودھ پلانے میں مصروف ہوگئی۔

قسطینا نے سنجیدہ ہوتے ہوئے پوچھا۔ ''شاہ زائب! بھاؤ کے بارے میں کچھ پتا چلا؟''

میں نے کہا۔ ''ابھی تک صرف اتنا کھوج ملا ہے کہ لالہ وریام اور ڈی ایس پی قیصر چوہدری کی ہلاکت کے بعد پولیس نے جو اندھا دھند چھاپے مارے تھے، ان میں بھاؤ کی ایک سوتیلی بیٹی بھی گرفتار ہوئی تھی۔ ابھی تک اس کا کچھ پتا نہیں ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال یہ بھی ہے کہ وہ پولیس کی حراست میں جاں بحق ہوگئی تھی۔ اس کی ہلاکت کے بعد ہی شکیل اور بھاؤ کے درمیان دشمنی مزید بھڑکی تھی اور شکیل نے بھاؤ کو دیکھتے ہی گولی مار دینے کا حکم دیا تھا۔''

قسطینا نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ''پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے شاہ زائب کہ بھاؤ کسی مصیبت میں ہے...... ہوسکتا ہے کہ میرا یہ اندازہ غلط ہو لیکن پھر بھی...... ہمیں اس کی

تلاش میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھنی چاہیے۔''

''ان حالات میں جتنی کوشش ہو سکتی ہے، وہ تو کر رہے ہیں۔ کسی وقت سوچتا ہوں کہ خود لاہور کی طرف رخ کروں؟''

''نہیں......نہیں۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''یہ بڑا رسک ہوگا شاہ زائب۔'' اس کے لہجے کی تہ میں بے قراری اور اپنائیت کی لہر میں نے صاف محسوس کی۔ وہ اپنے اندر بہت گہری تھی۔ اس کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہی ہے۔

''سجاول کا کیا حال ہے؟'' اس نے ایک دم موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔

''لاہور میں اس کے تفصیلی ٹیسٹ وغیرہ ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں مکمل طور پر ضائع ہو چکی ہیں مگر یہ بات طے ہے کہ آنکھ کے پیچھے پردے میں روشنی موجود ہے......اگر میچنگ ''کورنیاز'' میسر آجائیں تو اچھے آپریشن کے ذریعے نظر بحال ہونے کی امید کی جا سکتی ہے۔''

''سجاول صاحب کی حیثیت ہمارے داماد کی سی ہے شاہ زائب، اس سلسلے میں کسی بھی طرح کی مدد کی ضرورت ہو تو ہم حاضر ہیں۔ خورسنہ کے بارے میں بھی مجھے فکرمندی رہتی ہے۔ اس نے محبت کی خاطر بڑی قربانی دی ہے۔''

''وہ بہت اچھی خاتون ہے قسطینا! جی جان سے سجاول کی خدمت کر رہی ہے۔ اس کے علاوہ گھر اور بچے کی ذمے داریاں بھی سنبھالے ہوئے ہے۔ اس کے بس میں ہو تو وہ اپنی آنکھوں کی روشنی نکال کر سجاول کی آنکھوں میں رکھ دے۔ اس نے ایک بلند ہمت بیوی ہونے کا حق ادا کر دیا ہے۔''

''وہ ہمیشہ سے ایسی ہی ہے۔ میں اسے کافی حد تک جانتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ کسی وقت تمہارا دوست سجاول اس سے بہت سخت بھی ہو جایا کرتا تھا مگر وہ خندہ پیشانی سے اس کی باتیں برداشت کرتی تھی۔'' وہ ذرا چپ رہی پھر ہنس کر بولی۔ ''میں نے تاج محل کا وہ ماڈل بھی دیکھا تھا جو جاما جی میں خورسنہ نے سجاول کو دیا تھا اور اس نے غصے میں مکا مار کر اسے توڑ ڈالا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ خورسنہ اس کے ساتھ پاکستان چلے۔''

''ہاں قسطینا، اور میرے خیال میں وہی ان دونوں کی زندگی کا ٹرننگ پوائنٹ تھا۔''

''خورسنہ سے ملنے کو بہت دل چاہتا ہے......کافی عرصہ ہو گیا اسے دیکھے ہوئے......''

میں نے ذرا توقف کر کے کہا۔ ''اگر فرصت ملے تو......آجاؤ۔''

''مجھے پھنسانا چاہتے ہو؟ تمہیں پتا ہے کہ پاکستان میں، میں بھی مطلوب ہوں۔''

''یہ تو تم بات برائے بات کر رہی ہو۔ میں جانتا ہوں تم ڈرنے والی نہیں ہو۔''

''مگر سفر بھی تو آسان نہیں ہے شاہ زائب۔''

''احمد ثانی صاحب کے ہوتے ہوئے کیا مشکل ہے؟ سنا ہے کہ ان کے ایک دو ''شپ'' کراچی آتے جاتے رہتے ہیں۔'' میں نے ذومعنی لہجے میں کہا۔

دوسری طرف کچھ دیر خاموشی رہی۔ وہ میری طرف یعنی کیمرے کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ پھر جیسے ایک دم ٹھٹک کر اس نے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ دوڑائی۔ ''اوہ سوری، مجھے ایک میٹنگ میں شریک ہونا تھا پھر بات کریں گے۔'' اس نے مڑ کر جلدی سے بچے کا گال سہلایا اور زینب سے اور مجھ سے اجازت لیتی ہوئی واپس چلی گئی۔

مجھے زینب کے ذریعے جاماجی کے حالات کی خبر ملتی رہتی تھی۔ تیسرے چوتھے روز زینب کا فون آیا تو اس نے بتایا کہ احمد ثانی اور قسطینا والے معاملے کی بات ایک بار پھر چل رہی ہے۔ اب کچھ بڑوں کو درمیان میں لایا گیا ہے۔ احمد ثانی کی فیملی قسطینا کا رشتہ مانگ رہی ہے۔

''اور قسطینا؟'' میں نے پوچھا۔

''ان کی طرف سے ابھی کوئی واضح جواب نہیں۔'' زینب نے بتایا۔

مجھے لگ رہا تھا کہ قسطینا شدید تذبذب میں ہے۔ میں نے اس بارے میں اس سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک روز اسکائپ پر اس کے ساتھ گفتگو ہوئی۔ وہ ابھی ابھی کسی فوجی میٹنگ سے لوٹی تھی۔ وردی ابھی تک اس کے چھریرے جسم پر تھی۔

رسمی گفتگو کے بعد میں نے کہا۔ ''قسطینا! ہم بے تکلف دوستوں کی طرح ہیں۔ کوئی بھی بات مجھ سے چھپایا نہ کرو، بلا جھجک کہہ دیا کرو۔''

''کہہ دیا کروں؟'' اس نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''بالکل۔''

وہ اپنے بوٹوں کے تسمے کھولتے ہوئے بولی۔ ''شاہ زائب! اس روز بڑی عجیب سی بات کی تھی تم نے...... اور عجیب لہجے میں۔''

''کون سی بات؟''

''یہی کہ احمد ثانی کے ''شپ'' ہیں...... اور اب مجھے سفر میں کون سی دشواریاں پیش آسکتی ہیں...... تمہارے لہجے میں طنز تھا۔''

''تم نے شاید اس کو کچھ زیادہ محسوس کیا ہے...... اس کے لیے سوری...... میں نے تو

ایک عام سی بات کی تھی۔ لگتا ہے کہ تم کچھ زیادہ حساس ہوتی جا رہی ہو۔''

وہ کشن سے ٹیک لگاتے ہوئے بولی۔ ''ہاں...... یہ بات تو ہے۔ کسی وقت بالکل اپ سیٹ ہو جاتی ہوں۔ یہ آرمی کی ذمے داریاں جو مجھے بہت عزیز ہیں...... یہ بھی کسی وقت بوجھ لگنے لگتی ہیں۔''

''اسی لیے تو کہتا ہوں، ایک بار پھر آب و ہوا کی تبدیلی کرلو۔ چند ہفتوں کے لیے یہاں آ جاؤ۔''

وہ خاموش رہی، پھر ذرا چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ہر بار مجھے ہی آنے کے لیے کہتے ہو۔ تم بھی تو آ سکتے ہو مسٹر ایسٹرن کنگ۔''

''میں وہاں آ کر کیا کروں گا؟''

''بہت کچھ ہوگا کرنے کو۔ جاما جی کے لوگ تمہیں چاہتے ہیں۔ جاما جی کی تعمیرِ نو ہو رہی ہے۔ تم یہاں رہ کر بہت کچھ کر سکتے ہو۔ بلکہ ہم دونوں مل جل کر کر سکتے ہیں۔''

میں نے گہری سانس لی۔ ''قسطینا! تم جانتی ہو وہاں پہلے کیا حالات رہے ہیں اگر کچھ لوگوں نے ماضی کے حوالے سے مجھ پر...... بلکہ ہم دونوں پر انگلیاں اٹھانا شروع کر دیں تو پھر؟''

وہ تنک کر بولی۔ ''دنیا کی پروا کرنے والے دنیا کے بے وقوف ترین لوگ ہوتے ہیں۔ دنیا کا تو کام ہی باتیں کرنا ہوتا ہے۔''

''پھر بھی...... ہم کس حیثیت سے ایک دوسرے کے شانہ بشانہ چلیں گے؟''

اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ چمکی۔ ''ایک چمپئن اور ایک پرستار کی حیثیت سے۔ ہمارا یہ تعلق بہت عرصے سے ہے...... اور یہ کبھی ختم نہیں ہوگا۔'' پھر ذرا توقف سے بولی۔ ''بلکہ شاہ زائب! ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ میں تم سے مارشل آرٹ کے اسرار و رموز سیکھوں گی۔ تم مجھ سے مسلح عسکری تربیت کے بارے میں جان پہچان حاصل کرنا۔''

کچھ دیر تک میرے اور قسطینا کے درمیان اسی نہج پر بات چیت چلی...... پھر میں نے واشگاف انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''قسطینا! کسی وقت مجھے لگتا ہے کہ تم...... اپنے اوپر ایک خول چڑھانے کی کوشش کر رہی ہو...... دیکھو...... اگر میرے اور اپنے تعلق کے حوالے سے تمہارے ذہن میں کوئی خاص تجویز موجود ہے تو برملا کہہ دو۔ میں تمہیں اپنے بہت قریب محسوس کرتا ہوں اور میں یہی چاہتا ہوں کہ یہ قربت برقرار رہے۔''

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ان لمحوں میں اس کی آنکھوں کے اندر ایک روشنی سی نمودار ہوئی۔ وہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر بے باکی سے بولی۔ ''پرو پوز کر رہے ہو؟''

میں بھی بے باک ہوا۔ ''یہی سمجھ لو...... بلکہ یہی سمجھو۔''

اس کے چہرے پر رنگ سا دکھائی دیا۔ ان لمحوں میں وہ ایک فوجی کمانڈر نہیں ایک عام لڑکی محسوس ہوئی۔ لیکن پھر فوراً ہی وہ سنبھل گئی۔ اپنی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر خالی خالی نظروں سے میری جانب دیکھتی رہی...... آخر گویا ہوئی۔ ''شاہ زائب! میں اس بارے میں تم کو پھر بتاؤں گی۔''

''اوکے۔'' میں نے کہا۔ ہمارا رابطہ منقطع ہو گیا۔

تین روز بعد دوبارہ اسکائپ کے ذریعے ہمارا رابطہ ہوا۔ میرے موبائل کی اسکرین پر نمودار ہو کر قسطینا نے جو کچھ کہا، اس کا خلاصہ یہی تھا کہ وہ ایک بیوہ ہے، جبکہ مجھے اپنے لیے اچھی سے اچھی لڑکی مل سکتی ہے۔ اس کے علاوہ اس پر فورسز کی ذمے داریاں ہیں...... پتا نہیں کہ وہ اپنی بیرونی اور گھریلو ذمے داریوں کو ایک ساتھ نبھا پائے گی یا نہیں...... وغیرہ وغیرہ۔

میں نے اس کی ساری باتیں خاموشی سے سنیں۔ جب وہ سب کچھ کہہ چکی تو میں نے کہا۔ ''کچھ اور کہنا ہے یا بس؟''

''بس۔'' وہ ادا سے بولی۔

''تو پھر بس...... میں آج پھر تمہیں پرو پوز کرتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ تم آج ہی جواب دے دو تو بہتر ہے۔''

قسطینا نے کہا۔ ''فوج ہمیں ڈسپلن سکھاتی ہے اور ڈسپلن یہی ہے کہ ہر کام کو اس کے طریقے کے مطابق ہونا چاہیے۔''

''کیا مطلب؟''

''پرو پوز کرنے کا اور اس کا جواب دینے کا بھی تو ایک طریقہ ہوتا ہے۔ میں طریقے کے مطابق ہی جواب دوں تو بہتر ہے۔''

''میں سمجھا نہیں؟''

''...... میں اپنا جواب...... کسی بڑے کو بتاؤں گی...... لیکن بڑا تو کوئی آس پاس ہے نہیں...... چلو پھر...... زینب کو بتا دوں گی۔'' اس نے مسکرا کر کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

○......❖......○

زینب بہت خوش تھی۔ قسطینا کی رضامندی میرے لیے بھی اطمینان اور کسی حد تک خوشی کا باعث تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ اب یہی راستہ بہتر ہے۔ قسطینا نے میرے لیے بہت قربانیاں دی تھیں۔ یہاں تک کہ ازدواجی بندھن جیسے مرحلے سے بھی گزر گئی تھی۔

لوگ اُڑتی چڑیا کے پر گن لیتے ہیں۔ یہاں بھی کچھ ایسی ہی صورتِ حال ہوئی تھی۔ پتا نہیں کہ یہ خبر کیسے اور کس طرح جاماجی کے عمائدین میں پھیلنا شروع ہوگئی تھی۔ مجھے زینب اور ابراہیم کی زبانی پتا چلا کہ جن لوگوں کو اس بارے میں معلوم ہو رہا ہے، وہ خوشی اور گرم جوشی کا اظہار کر رہے ہیں۔ تاہم بہت سے ایسے ہیں جن کے نزدیک ابھی یہ صرف ایک افواہ ہے...... اس موضوع سے ہٹ کر ایک اور افواہ بھی جاماجی میں موجود تھی اور وہ یہ کہ کسی رات ہاناوانی کی قبر کھلے گی اور وہ پھر جیتی جاگتی حالت میں نمودار ہو جائے گی۔ وہ ان سب دیسی اور بدیسی لوگوں کو چن چن کر مارے گی جو اس کے بیٹے اور اس کی موت کے ذمے دار ہیں۔ جاماجی کے کچھ جاہل ترین لوگوں کا ایک گروہ ایسا تھا جو ایسی بے سروپا باتوں پر بڑے ''خشوع وخضوع'' سے یقین کر رہا تھا۔

ہم ایبٹ آباد میں ہی مقیم تھے۔ داؤد بھاؤ کے حوالے سے میری پریشانی کم ہونے نہیں آ رہی تھی۔ قریباً ایک ماہ گزرنے کے باوجود اس سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ اس کی خاص سم بند جا رہی تھی۔ دوسرے نمبرز بھی خاموش تھے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ بھاؤ کو واقعی پولیس مقابلے میں پار کیا جا چکا ہو؟ یہ سوال ایک دہکی میخ کی طرح بار بار میرے دماغ میں اتر جاتا تھا۔ (لیکن یہ بات بھی حقیقت تھی کہ بھاؤ کوئی تر نوالہ نہیں تھا) اگر وہ زندہ تھا تو پھر ہم تک اپنی اطلاع کیوں نہیں پہنچا رہا تھا۔ بھاؤ گینگ کے زیادہ تر افراد زیرِ زمین جا چکے تھے۔ چند ایک نے احتیاط نہیں کی تھی، وہ پولیس کے ہتھے چڑھے تھے یا پھر جھوٹے سچے مقابلے میں پار کر دیئے گئے تھے۔ بہرحال پکڑے یا پار ہونے والوں میں لودھی شامل نہیں تھا۔ شکیل داراب جیسے اہم شخص کے قتل کے آفٹر شاکس اب تک جاری تھے۔ اس بات کی تصدیق بھی ہو چکی تھی کہ بھاؤ کی ایک سوتیلی بیٹی تھی جسے وہ سگی بیٹیوں کی طرح ہی چاہتا تھا، ڈی ایس پی قیصر اور لالہ وریام کی موت کے بعد جہاں بہت سے دیگر لوگ پکڑے گئے تھے وہاں یہ لڑکی بھی تھی۔ گرفتاری کے وقت وہ حاملہ تھی۔ پیٹ پر کوئی سخت ضرب آنے کی وجہ سے اس کی حالت غیر ہوئی اور اس نے لاہور ہی کے ایک اسپتال میں دم توڑ دیا۔ کہا جا رہا تھا کہ اسی واقعے کے بعد بھاؤ نے اپنے دو درجن ساتھیوں کے ہمراہ شکیل پر حملہ کیا اور اسے قتل کیا۔

داؤد بھاؤ کے حوالے سے ایک امکان یہ بھی تھا کہ وہ بیرون ملک نکلنے میں کامیاب ہو گیا ہو۔ اس سلسلے میں، میں نے آج صبح بھی بھاؤ کے ایک پڑھے لکھے کارندے اعجاز جازی کو کچھ ہدایات دی تھیں۔ جازی پولیس کے مطلوبہ لوگوں میں شامل نہیں تھا اور لاہور ہی میں مقیم تھا۔ جازی کا فون شام کے وقت آیا۔ اس نے کہا۔ ''شاہ زیب بھائی! آج سارا دن ائرلائنز کا ریکارڈ چیک کراتے ہوئے گزارا ہے۔ پچھلے قریباً ڈیڑھ ماہ کے ریکارڈ میں کوئی ایسا ثبوت نہیں کہ بھاؤ نے اپنی اصلی یا نقلی شناخت کے ساتھ پاکستان سے باہر سفر کیا ہو...... ہاں اس چھان بین سے ایک اور بات کا پتا چلا ہے...... اور وہ یہ کہ دارج داراب علاج کے لیے، پچھلے مہینے کی اٹھارہ تاریخ کو لاہور سے ''اتحاد'' کی پرواز کے ذریعے لندن گیا تھا...... اس کا ذاتی ڈاکٹر اور ایک ملازم بھی ساتھ گئے تھے۔''

''ہاں، اس کے جانے کا تو پتا تھا مگر تاریخ معلوم نہیں تھی۔ غالباً دارج کی بیوی بھی ساتھ ہی تھی۔''

''لیکن ٹکٹوں کے ریکارڈ سے تو یہی پتا چلا ہے کہ شاید بیوی ساتھ نہیں تھی۔'' جازی نے کہا۔

اس طرح کی ایک اطلاع مجھے بھی مل چکی تھی۔ بہر حال میں اس بارے میں خاموش رہا۔

فون کال کے بعد میں سوچنے لگا کہ دارج، تاجور کو یہاں کیوں چھوڑ گیا ہے۔ شاید وہ خود ہی جانا نہ چاہتی ہو۔ اس کی والدہ حال ہی میں فوت ہوئی تھیں اور اس کے چھوٹے بھائیوں کو تسلی تشفی اور نگہداشت کی ضرورت تھی۔ بہر طور میں اب ان سب باتوں کے بارے میں زیادہ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔

اسی روز رات کو قسطینا سے بھی بات ہوئی۔ گفتگو کے دوران میں اس نے داؤد بھاؤ اور سجاول کے بارے میں بھی دریافت کیا، پھر تاجور کے بارے میں پوچھا۔ تاجور کا ذکر چھڑا تو ذرا طویل ہو گیا۔ ایک موقع پر وہ کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولی۔ ''شاہ زائب! تاجور کے لیے میں خود کو کبھی کبھی بہت دکھی محسوس کرتی ہوں۔ یقیناً تمہاری کیفیت بھی ایسی ہوتی ہو گی۔''

''ہاں قسطینا یہ تو ہے...... مگر اب ہم اس کے بارے میں مزید سوچنا چھوڑ ہی دیں تو بہتر ہے۔ کہتے ہیں ناں کہ زندگی ہر طرح کے اچھے برے حالات میں اپنے لیے راستے ڈھونڈ ہی لیتی ہے۔ اس کی زندگی بھی ڈھونڈ لے گی۔''

وہ اچانک بولی۔ ''کیا اسے بھول سکو گے شاہ زائب؟'' اس کے لہجے میں درد تھا۔
اس کے سوال نے مجھے کنفیوژ کیا پھر میں نے سنبھل کر کہا۔ ''قسطینا! ہم سب کو زندگی کے کسی موڑ پر بہت کچھ بھولنا پڑتا ہے۔ شاید ہم میں سے کوئی بھی اس سے مبرا نہیں ہے۔''
گفتگو سنجیدہ ہوتی جارہی تھی۔ قسطینا اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی پھر کچھ آہٹیں سنائی دیں۔ اس کے پورشن میں زینب اور ابراہیم آگئے تھے۔ ہم نے سلسلہ منقطع کر دیا۔
میں بستر پر نیم دراز دیر تک سوچتا رہا۔ کہنے کو میں نے کہہ دیا تھا کہ زندگی کے کسی موڑ پر ہم کو سب کچھ بھولنا پڑتا ہے لیکن کیا تاجور والی پھانس واقعی کبھی میرے دل سے نکل سکے گی؟

میں نے سوچا اور سینہ درد سے بھر گیا۔ میں اٹھ کر بالکونی میں ٹہلنے لگا۔ اپریل کا آغاز ہو چکا تھا۔ برفیلی ہواؤں کا زور ٹوٹ رہا تھا۔ دور تاریکی میں نتھیا گلی کی نواحی روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ نگاہوں کے سامنے ماضی قریب کے مناظر گھومنے لگے۔ ان بلند و بالا پہاڑوں کے عقب میں ہی تو راولپنڈی کا وہ شہر تھا جہاں خوشگوار دھوپ والے ایک موسم میں تاجور اور میں اکٹھے ہوئے تھے۔ ہمارے درمیانی فاصلے ختم ہو رہے تھے۔ ہماری رسم نکاح ادا ہونے والی تھی مگر پھر سب کچھ درہم برہم ہو گیا تھا۔ وہ مایوسی کے شب و روز تھے۔ ذہن کے اندر تاریکیاں تھیں مگر آس کی کچھ کرنیں بھی جگمگاتی تھیں۔ دل کہتا تھا کہ ایسا ہو نہیں سکے گا۔ محبت کے کچے دھاگے تو فولاد سے زیادہ مضبوط ہوتے ہیں۔ وہ ایک روز پلٹ آئے گی۔ جہاں چاہ ہوتی ہے وہاں راہ بھی ہوتی ہے۔ کوئی نہ کوئی راہ نکل آئے گی۔ وہ کوئی نہ کوئی راہ نکال لے گی۔ کیا انہونیاں نہیں ہوتیں؟ کیا سنگلاخ چٹانوں میں سے چشمے نہیں پھوٹتے۔ کیا شب کی اتھاہ تاریکی میں سے سحر نمودار نہیں ہوتی؟ کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔
میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا انتظار کیا تھا۔ اس کی طرف سے رخ پھیر کر بھی اسے ہی دیکھتا رہا تھا۔ اسے بھول کر بھی اسے یاد کیا تھا۔ دور تو ہوتا گیا تھا مگر اس طرح کہ ہر لمحے میری سماعت اس کے قدموں کی چاپ پر لگی رہی تھی۔ ہر آن یہی محسوس ہوتا تھا کہ وہ عقب سے آ کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دے گی۔ کہے گی...... دیکھیں شاہ زیب! ہر دیوار گرا کر آ گئی ہوں۔ ہر رکاوٹ توڑ ڈالی ہے...... اب مجھے کہیں لے جاؤ۔ اس زمانے سے اس دنیا سے بہت دور۔
ہاں میں مڑ مڑ کر دیکھتا رہا تھا مگر کوئی آیا نہیں تھا۔ یہ سب کچھ تو کہانیوں میں ہوتا ہے۔ وہ زندگی کی تلخ ترین حقیقتوں کے نرغے میں تھی اور نرغے میں ہی رہی تھی اور پھر

دھیرے دھیرے اس کا خیال میرے دل و دماغ میں دھندلانا شروع ہو گیا تھا یا شاید وہ دھندلایا نہیں تھا۔ کہیں گہرائی میں چلا گیا تھا۔ جیسے کسی بہت پرانی اور مشکل کتاب کے صفحوں کے اندر ایک پھول دفن ہو جائے۔

اس رات میں دیر تک جاگتا رہا۔ اپنے فون میں سے اس کا نمبر ڈیلیٹ کر دیا۔ ملازمہ فردوس کا ریکارڈ بھی ختم کر دیا۔ میرے پاس ایک یو ایس بی تھی جس میں تاجور اور اس کی فیملی کی کچھ تصویریں محفوظ تھیں۔ میں نے وہ یو ایس بی بھی ضائع کر دی۔ میں نے اپنی تمام سوچوں کا رخ نئے راستوں اور نئی مسافتوں کی طرف موڑنے کی کوشش کی۔

دو تین روز بعد زینب کا فون آیا تو اس نے بتایا کہ جاماجی میں یہ خبر عام ہو گئی ہے کہ آپ جاماجی واپس آ رہے ہیں...... اور یہ کہ مستقبل قریب میں کمانڈر قسطینا سے آپ کی شادی متوقع ہے۔ لوگ اس حوالے سے بہت خوش ہیں اور ان میں جوش پایا جاتا ہے۔ وہ جلد سے جلد اس خبر کی مکمل تصدیق چاہتے ہیں۔

ایبٹ آباد میں اب سرد موسم نہیں تھا۔ کسی وقت ہلکی بارش ضرور ہونے لگتی تھی۔ آج بھی رم جھم ہو رہی تھی۔ ہم لوگ اپنی پناہ گاہ سے بہت کم نکلتے تھے مگر کسی وقت نکلنا ضروری ہو جاتا تھا۔ ایک روز مجھے بال ترشوانے کے لیے وسطی شہر میں جانا پڑا۔ اپنے اور چچا زاد ولید کے لیے کچھ کپڑے بھی لینے تھے۔ میں ایک گاڑی پر بازار پہنچا بال ترشوا کر سیلون سے نکل ہی رہا تھا کہ بری طرح ٹھٹک گیا۔ میری نگاہ پہلوان حشمت پر پڑی۔ وہ تین حکیم شمیم خان صاحبان کے ساتھ ایک ہنڈا کار میں بیٹھ رہے تھے۔ میں تیزی سے اس طرف بڑھا۔ میرے پہنچتے پہنچتے کار وہاں سے چل پڑی۔ میں اس کے پیچھے لپکا، ابھی اس کی رفتار تیز نہیں ہوئی تھی۔ میں نے کار کی باڈی پر ہاتھ مار کر اسے روکا۔ کار سوار حیرت سے مجھے دیکھنے لگے۔ تب پہلوان جی نے بھی دیکھا اور مجھے پہچان لیا۔ وہ پہلے سے کچھ کمزور اور خاصے سنجیدہ نظر آ رہے تھے۔ میں انہیں قریباً چار ماہ بعد دیکھ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر ان کے چہرے پر خلافِ معمول خوشی کے تاثرات بھی نمودار نہیں ہوئے۔ ہمیشہ کی طرح وہ شلوار قمیص اور ڈبی دار کوٹ میں تھے۔ دواؤں اور مختلف تیلوں والا مخصوص تھیلا ان کے پاس تھا۔

''پہلوان جی! آپ یہاں کیسے؟'' میں نے کھڑکی میں سر ڈال کر پوچھا۔

مجھے حیرت ہوئی کہ پہلوان جی گاڑی سے باہر نہیں نکلے بلکہ وہیں بیٹھے بیٹھے کہا۔ ''میں بھی تم کو یہاں دیکھ کر حیران ہوا ہوں...... میں یہاں کسی کام سے آیا تھا۔ اب واپس گوجرانوالہ جا رہا ہوں۔''

''آپ کہاں غائب تھے۔ کوئی رابطہ ہی نہیں ہو رہا تھا آپ سے۔''

''بس کچھ کاموں میں پھنسا ہوا تھا۔'' پہلوان جی نے قدرے بے رخی سے کہا۔

مجھے صاف پتا چل رہا تھا کہ پہلوان جی کا رویہ بہت تبدیل ہے۔ وہ پریشان لگ رہے تھے۔ اگلے دو تین منٹ میں ان سے جو مختصر بات ہوئی، اس سے پتا چلا کہ یہ ہنڈا کار والے خان صاحبان، پہلوان جی کو بطور ''ہڈی جوڑ ماہر'' جانتے تھے۔ ان کی والدہ کو پاؤں کا فریکچر تھا۔ وہ پہلوان جی کو یہاں ایبٹ آباد لے کر آئے تھے اور اب پہلوان جی چھ سات روز یہاں قیام کے بعد واپس جا رہے تھے۔ میزبان انہیں ایبٹ آباد کے بس ٹرمینل تک چھوڑنے جا رہے تھے۔

پہلوان جی کو روکنے اور انہیں کار سے اتارنے میں مجھے کافی کوشش کرنا پڑی۔ میں نے انہیں یقین دلایا کہ آج ہی انہیں لاہور جانے والی اسپیشل بس میں سوار کرا دوں گا۔

دھیمی بارش میں ہم دونوں چھتری کے نیچے چلتے ہوئے، ایک قریبی ریستوران کے فرسٹ فلور پر آن بیٹھے۔ کافی صاف ستھرا ریستوران تھا۔ یہ دوپہر کے قریباً ایک بجے کا وقت تھا۔ لنچ ہونا چاہیے تھا لیکن غیر متوقع طور پر پہلوان جی نے انکار کیا اور میں نے سوپ منگوا لیا۔ پہلوان جی کے بجھے ہونے کی پہلی وجہ تو میری سمجھ میں یہی آ رہی تھی کہ ان کے گھریلو حالات مزید خراب ہو گئے تھے اور بات طلاق وغیرہ تک پہنچی ہوئی تھی۔ تاہم کچھ دیر بعد اندازہ ہوا کہ یہ بات بھی ہے مگر اس کے علاوہ ایک اور بڑی بات بھی ہے۔

میں حیران کن طور پر پہلوان جی کی آنکھوں میں کسی وقت نمی بھی دیکھ رہا تھا۔ بادل ایک بار پھر گھر کر آ گئے تھے اور دوپہر میں ہی گہری شام کا سماں ہو گیا تھا۔ ریستوران کے اس نیم روشن گوشے میں سے بھیگی سڑک کا منظر صاف نظر آتا تھا۔

میں نے کہا۔ ''چاچا حشمت، اتنا عرصہ آپ کے ساتھ رہا ہوں۔ آپ مجھ سے کچھ چھپا نہیں سکتے۔ میں دیکھ رہا ہوں آپ اِدھر اُدھر کی باتیں تو کر رہے ہیں لیکن کوئی اصل بات بھی ہے جس کی طرف آپ نہیں آ رہے......''

یک دم وہ مزید بے چین نظر آنے لگے۔ ''شاہ زیب! تم مجھے جانے ہی دو تو یہ چنگا ہے۔ اس پھٹ کو (زخم کو) جتنا کریدو گے اس میں سے خون ہی نکلے گا۔''

''کون سا پھٹ؟'' میں واقعی مضطرب ہونے لگا۔

وہ کچھ دیر، پرنم آنکھوں سے میری طرف دیکھتے رہے پھر ایک دم کھڑے ہو گئے۔ وہ جانا چاہ رہے تھے۔ میں نے انہیں بازو سے تھام لیا۔ زبردستی روکا۔ ... اور بمشکل دوبارہ

نشست پر بٹھایا۔ پتا نہیں کیا ہوا، انہوں نے میز پر کہنیاں ٹیک کر ایک دم اپنا سر تھاما اور سسکیوں سے رونے لگے۔ میں لرز گیا۔ میں پہلوان جی کو پہلی بار ایسی حالت میں دیکھ رہا تھا۔ آنسو ان کے چہرے پر بہتے صاف دکھائی دیئے۔ قریبی میزوں پر موجود افراد ذرا ٹھٹک کر ہماری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے پہلوان جی کا کندھا تھاما اور دلاسا دینے لگا۔ انہیں دوبارہ سنبھلنے میں کئی منٹ لگ گئے۔ ان کی آنکھوں میں گہری سرخی دکھائی دینے لگی تھی اور چہرہ دکھ کی آماجگاہ تھا۔ بالآخر وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔ ''اس نے مجھے قسم دی تھی کہ یہ بات ہمیشہ کے لیے میرے اندر دفن رہے گی ......اور میں نے وعدہ کیا تھا لیکن تم ...... تم مجھے یہ قسم توڑنے پر مجبور کر رہے ہو، اچھا ہوتا ہم نہ ملے ہوتے۔''

''آپ کس کی بات کر رہے ہیں چاچا حشمت؟''

''تاجور کی۔'' انہوں نے کہا اور ایک بار پھر ان کی سرخ آنکھوں میں آنسو بھر گئے۔ میں حیران ہوا۔ وہ بھی کچھ دیر خاموش رہ کر مہیب آواز میں بولے۔ ''تمہیں وہ دن یاد ہووے گا جب وہ پنڈی کے شکر پڑیاں والے گھر میں تمہارے پاس آئی تھی۔ اس نے تم سے کہا تھا کہ اس کی گاڑی تھوڑی دور شاپنگ سینٹر میں کھڑی ہے اور ڈرائیور اس کا انتظار کر رہا ہے؟''

''جی ہاں ...... مجھے یاد ہے۔''

پہلوان جی بولے۔ ''وہ پرائیویٹ کار نہیں، وہ ٹیکسی تھی اور تب اس میں خود میں بھی تھا۔ میں تاجور بیٹی کے ساتھ ہی وہاں آیا تھا......''

''مگر اس نے تو......''

''ناہیں شاہ زیب! اس نے جھوٹ بولا تھا اور اس دن اس نے تم سے جو کچھ بھی کہا، وہ جھوٹ تھا...... وہ غلط تھا...... وہ غلط بیانی کرتے ہوئے اس کو یقیناً اپنے آپ کو مارنا پڑا ہووے گا...... اور اس نے مار دیا۔'' پہلوان جی نے ایک بار پھر اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

''چاچا حشمت! پلیز مجھے سب کچھ کھل کر بتائیں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔''

''اب سمجھنے سے کوئی فائدہ ناہیں شاہ زیب ...... صرف دل ہی دکھے گا، زخم اور گہرے ہوویں گے۔'' وہ چند لمحے چپ رہنے کے بعد بولے۔ ''شاہی! وہ بہت بے رحم دن تھا۔ کاش اس دن وہ سب نہ ہوا ہوتا جو ہوا۔ تمہیں یقین نہیں آوے گا شاہی ...... لیکن حقیقت وہی ہے جو میں تمہیں بتانے لگا ہوں ...... اس روز تاجور نے تمہارے دروازے پر ناہیں..

تمہاری زندگی پر دستک دی تھی۔ سمجھو کہ وہ آگ کا ایک بڑا دریا پار کر کے آئی تھی اور ایک حیران کرنے والی خوش خبری لائی تھی تمہارے لیے۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چھپے ہوئے تھے اور اس کا دل کسی چھوٹے سے بچے کے دل کی طرح دھڑک رہا تھا۔"

"کیسی خوش خبری چاچا حشمت...... وہ تو...... وہ تو صرف ملنے آئی تھی...... اور یہ یاد دہانی کرانے آئی تھی کہ میں سیف کی فیملی کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھوں کیونکہ اب اکبر بھی ان کے سر پر نہیں ہے۔"

"ناہیں شاہ زیب! وہ یہ کہنے ناہیں آئی تھی۔ وہ تو تمہیں حیران کرنے آئی تھی۔ تمہیں اپنی زندگی کی سب سے بڑی...... اور سب سے اچھی خبر دینے آئی تھی۔ اس نے تم سے بہت کچھ چھپایا تھا شاہ زیب...... بلکہ ہم سب سے۔"

"آپ کس حوالے سے بات کر رہے ہیں چاچا؟"

چاچا حشمت نے اپنا سر دیر تک دونوں ہاتھوں میں تھامے رکھا۔ ریستوران کی کھڑکیوں سے باہر بادل گھرے ہو رہے تھے تاہم بارش ابھی تک دھیمی تھی۔ وہ گمبھیر آواز اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ "شاہ زیب! تمہیں یقیناً یہ سن کر بہت حیرانی ہووے گی کہ تاجور کبھی بھی امید سے نہیں ہوئی۔ یہ سارا صرف اسی دارج کا ڈھونگ تھا۔ اس نے تاجور کو سات پردوں میں رکھا ہوا تھا۔ اس نے اپنی معذوری چھپانے کے لیے یہ مشہور کیا کہ وہ بچے کی ماں بننے والی ہے۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ...... تاجور کی حیثیت ایک شادی شدہ کنواری جیسی تھی۔ وہ اس معذور شخص کا ہر ستم خاموشی سے سہتی رہی ہے۔ اس کی گالیاں اس کی مار پیٹ، اپنے ماں باپ کی توہین، اس نے سب کچھ بڑے صبر اور ہمت سے برداشت کیا ہے۔ وہ بے بس تھی اور اس کے سوا اور کچھ کر بھی ناہیں سکتی تھی مگر اوپر والا تو بے بس نہیں ہے ناں۔ وہ تو سب کچھ دیکھت ہے ناں۔ بتاؤ دیکھت ہے ناں؟" پہلوان حشمت نے جذباتی لہجے میں پوچھا۔

"بے شک ایسا ہی ہے۔" میں نے کہا اور سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔ "دارج کسی طور ٹھیک ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اسے تاجور کی بددعا لگ رہی ہے۔ وہ اس پر زہر اگلتا تھا اور کہوت تھا کہ وہ اسے بددعائیں دیتی ہے۔ وہ کہوت تھی کہ میں کوئی بددعائیں ناہیں دیتی مگر ہوسکتا ہے کہ میرا وجود ہی نحوست بن گیا ہو۔ ایک روز دارج نے طیش میں آ کر اسے گولی مارنے کا ارادہ کر لیا مگر یہ بھی نہ کر سکا۔ تاجور نے رو رو کر اس سے کہا کہ وہ اس کی جان لے لے یا پھر آزاد کر

دے۔ وہ تقریباً پوری ایک رات، ہاتھ جوڑ کر اس کے سرہانے کھڑی رہی، روتی رہی اور اپنی موت یا آزادی کے لیے اس کی منت کرتی رہی۔ رات کے آخری پہر وہ ایک دم آگ بگولا ہو گیا۔ چنگھاڑا کہ وہ جانتا ہے، وہ آزادی کیوں مانگ رہی ہے، وہ اپنا پرانا یارانہ بحال کرنا چاہت ہے۔ اس نے تاجور کو بے طرح پیٹا، اس کے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ وہ بستر سے اٹھ ناہیں سکتا تھا، پھر بھی اس نے چھڑی کی ضربوں سے اسے بے حال کر دیا۔ وہ بے ہوش ہو گئی۔ ملازمہ فردوس ان ساری باتوں کی گواہ ہے۔ وہ ایک دوسری ملازمہ کی مدد سے اسے اٹھا کر باہر لے آئی۔ اگلے روز شام کو تاجور کو حیرت کا شدید دھچکا لگا۔ اس کے سرہانے طلاق کے کاغذات پڑے تھے۔ دارج نے اسے آزاد کر دیا تھا۔ ساتھ ہی ایک بڑی رقم کا چیک تھا اور ایک خط تھا، جس میں دارج نے لکھا تھا...... وہ یہاں سے چلی جائے۔ وہ اس کی شکل دیکھنا ناہیں چاہتا اور نہ اپنی شکل دکھانا چاہتا ہے......''

یہاں تک بتا کر پہلوان حشمت چپ ہو گئے۔ ان کی آنکھوں میں مسلسل نمی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ سر جھکائے میز کی چمکیلی سطح کو دیکھتے رہے۔ کھڑکیوں سے باہر بجلی چمکی اور بادل گرجنے لگے۔ بارش موسلا دھار ہو گئی۔ ٹین کی مخروطی چھتوں پر اس کا شور بہت بلند تھا۔ سڑک پر ٹریفک کم ہوتی جا رہی تھی جو کچھ میں سن رہا تھا، اس پر یقین نہیں آ رہا تھا مگر یقین کیے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔

خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد میں نے گمبھیر لہجے میں پوچھا۔''اس کے بعد وہ کہاں گئی چاچا حشمت؟''

''دارج نے اسے پابند کیا تھا کہ وہ ابھی چند ماہ تک طلاق کی بات کو اپنے تک ہی رکھے گی۔ کسی کو بھنک ناہیں پڑنے دیوے گی۔ وہ خاموشی سے اپنے میکے اپنے چھوٹے ماموں حنیف کے پاس آ گئی۔ تمہیں پتا ہی ہووے گا کہ تاجور کے چھوٹے ماموں کا اپنا کوئی بچہ نہیں ہے۔ صرف ایک بھتیجا ہے جسے اس نے اپنے بچے کی طرح پالا ہے۔ شفیق نام کا یہ لڑکا سیالکوٹ میں کپڑے کا کام کرت ہے۔ چاندگڑھی میں تم نے اسے دیکھا ہی ہووے گا۔''

میری نگاہوں کے سامنے ذرا بھاری جسم والے ایک خوش پوش نوجوان کی شبیہہ گھوم گئی۔ اپنے ڈیل ڈول کی وجہ سے وہ اپنی عمر سے کچھ بڑا نظر آتا تھا۔ بڑا سیدھا سادہ اور کام سے کام رکھنے والا تھا۔ جب میں اور انیق چاندگڑھی میں تھے اس کی شادی ہوئی تھی مگر شادی کے دس پندرہ روز بعد ہی اس کی بیوی تیز آندھی میں اونچی چھت سے گر کر جاں بحق ہو گئی تھی۔

پہلوان حشمت نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''جب سے سکھیرا میں پرندوں کا خونی حملہ ہوا ہے لوگ بہت ڈر گئے ہوئے ہیں۔ کئی لوگ تو گاؤں ہی چھوڑ گئے ہوئے ہیں۔ چاند گڑھی سے بھی کئی لوگ نکلے ہیں۔ تاجور کے ماموں حنیف بھی ان میں شامل ہیں۔ وہ آج کل اپنے بیٹے کے پاس سیالکوٹ میں ہیں۔ دارج سے طلاق کے بعد تاجور نے وہ چیک پھاڑ کر پھینک دیا تھا جو اسے دارج کی طرف سے ملا تھا۔ وہ بھی ماموں کے ساتھ سیالکوٹ ہی چلی گئی تھی۔ دونوں چھوٹے بھائی بھی اس کے ساتھ تھے۔ وہیں پر سے ایک روز مجھے اس کا فون آیا اور اس نے رازداری سے مجھے اپنے پاس سیالکوٹ بلایا۔ میں وہاں پہنچا تو اس نے مجھ پر راز کھولا کہ بالآخر دارج نے اسے طلاق دے دی ہے اور خود انگلینڈ میں شفٹ ہو گیا ہے۔ وہ بہت دکھی تھی۔ ماں باپ کی موت کے بعد خود کو بہت اکیلا محسوس کر رہی تھی۔ اگر چھوٹے ماموں کا آسرا اسے نصیب نہ ہوتا تو پتا ناہیں کہ کیا ہو جاتا۔ وہ تم لوگوں کے حالات کے بارے میں بہت فکرمند تھی۔ جاننا چاہتی تھی کہ سکھیرا پر پرندوں کے بڑے حملے اور ہاناوانی کے مرنے کے بعد کیا ہوا؟ قسطینا کہاں ہے؟ سجاول کا حال کیا ہے اور...... فخر ابھی ٹھیک ہوا یا ناہیں جو کچھ مجھے معلوم تھا میں نے اسے بتایا اور یہ بھی بتایا کہ تم اپنے دوست رضوان کے ساتھ راولپنڈی میں ہی کہیں ٹھہرے ہوئے ہو۔''

پہلوان جی نے چند لمحے توقف کیا اور پھر میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولے۔ ''تمہیں پتا ہے ناں کہ تم نے ایک بار جو گہنے تاجور کے لیے بنوائے تھے، وہ میرے پاس تھے۔ تمہارے بہت کہنے کے باوجود وہ گہنے میں نے کبھی بیچے ناہیں تھے۔ تمہارا کیا خیال ہے کیوں ناہیں بیچے تھے؟''

میں نے کچھ نہیں کہا بس سوالیہ نظروں سے پہلوان جی کی طرف دیکھتا رہا۔

وہ کہنے لگے۔ ''میں جانت تھا شاہ زیب! تمہارے دل و دماغ میں آج بھی تاجور کا خیال موجود ہے، تم اس کا انتظار کرت ہو۔ میں نے یہ سب کچھ تاجور بیٹی کو بتایا اور اس کو وہ گہنے بھی دکھائے...... وہ رونے لگی...... اس نے کہا...... اب یہ کیسے ممکن ہے؟ میں نے کہا، ممکن ہے تم ہمت کرو تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ میں نے کئی گھنٹے تک اس سے بات کی۔ میں جانتا تھا کہ اس کے دل کے اندر بھی گہرائی میں کسی انہونی کی آس چھپی ہوئی ہے، وہ جو مسلسل دارج سے رہائی مانگتی رہی ہے تو اس کے پیچھے بھی تمہاری محبت ہی رہی ہے۔ بالآخر وہ رضامند ہو گئی شاہ زیب! بات لمبی ہو جاوے گی۔ مختصر قصہ یہی ہے کہ اس روز تاجور اس کام کے لیے ناہیں آئی تھی جو اس نے بتایا...... اس روز...... وہ تمہاری زندگی میں داخل

ہونے کی آس لے کر تمہاری طرف آئی تھی۔ تمہاری محبت کی خاطر اس نے باقی کی رکاوٹیں توڑنے کا بھی فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ تمہارے پاس آوے گی۔ رشتے داروں اور دنیا کی پروا کرے گی اور نہ ان کی باتوں کی۔ وہ تمہیں بتا دے گی کہ وہ ہمیشہ تمہاری تھی، اور اب بھی تمہاری ہے...... لیکن...... شاہ زیب......"

پہلوان حشمت کی آوز بھرا گئی اور آنکھوں میں پھر نمی چمکنے لگی۔ وہ تو غیروں اور اجنبیوں کے بھی ہمدرد تھے، تاجور کو تو پھر بیٹی کی طرح سمجھتے تھے۔ وہ کچھ دیر خاموش رہ کر خود کو سنبھالتے رہے پھر بولے۔ "اس دن میں نے اسے بچوں کی طرح خوش دیکھا تھا، یہ اور بات ہے کہ وہ اس خوشی کو مکمل طور پر ظاہر ناہیں کر رہی تھی۔ میں نے اسے کہا تھا کہ میں ٹیکسی کار میں رہتا ہوں، تم اکیلی اندر جاؤ...... وہ چلی گئی تھی۔ پروگرام یہی تھا کہ بعد میں تم آؤ گے اور مجھے بھی لے جاؤ گے...... لیکن...... تم تو ناہیں آئے، کچھ دیر بعد وہ خود ہی آ گئی۔ اس کا چہرہ مرجھائے ہوئے پھول کی طرح تھا۔ بالکل زرد ہو رہی تھی۔ میں نے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ اس نے خود کو سنبھالا اور بولی کہ کچھ ناہیں...... میرے اصرار پر کہنے لگی کہ گھر جا کر بتاؤں گی۔"

پہلوان حشمت نے توقف کر کے کھڑکیوں سے باہر موسلا دھار بارش کو دیکھا اور رندھی ہوئی آواز میں بولے۔ "شام کے بعد تاجور نے مجھے بتایا کہ اب یہ سب کچھ ممکن ناہیں ہے۔ اس معاملے کو اب یہیں روک دیا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ میرے بار بار پوچھنے پر اس نے پہلے مجھ سے عہد لیا کہ میں یہ بات صرف اور صرف اپنے تک رکھوں گا اور اس بات کو اب ہمیشہ کے لیے یہیں پر ختم کر دوں گا۔ میں وعدہ کر چکا تو اس نے بتایا کہ "قسطینا" جاماجی میں نہیں ہے، وہ واپس پاکستان آ چکی ہے، تمہارے ساتھ رہ رہی ہے۔ اب تم دونوں بہت خوش ہو۔ تب مجھے یقین ناہیں آیا تھا شاہ زیب، لیکن پھر بعد میں، میں بھی جان گیا کہ تم اور قسطینا اکٹھے رہ رہے ہو اور وہ تمہاری زندگی میں آنے والی ہے۔ میرا اندازہ یہی تھا کہ قسطینا نے تمہارے لیے اور ہم سب کے لیے جو بہت سی قربانیاں دی ہیں، ان کے نتیجے میں تم اس کے بہت قریب آ چکے ہو۔"

پہلوان جی سر جھکا کر خاموش ہو گئے۔ ان کے چہرے پر دنیا جہان کا تاسف سمٹا ہوا تھا۔ میں بھی سناٹے کی سی کیفیت میں تھا...... یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ ہو چکا ہے۔ سینے میں جیسے ایک بہت بڑا گھاؤ لگا تھا اور اس میں سے لہو ابلنے لگا تھا۔ میں تاجور کے حوالے سے اب تک اسی بات پر شاکی رہا تھا ناں کہ وہ ہمت نہیں کر پائی مگر اس نے یہ سب کچھ غلط

ثابت کیا تھا۔ وہ آئی تھی، بالکل اسی طرح جس طرح میں نے کبھی اسے اپنے تصور میں آتے دیکھا تھا...... وہ اپنے سارے جذبوں، اپنی چاہتوں اور امیدوں کو سمیٹ کر دیوانہ وار میری طرف لپکی تھی...... لیکن وہ کیسا بے مہر دن تھا...... وہ کیسی بدنصیب سہ پہر تھی۔ مجھے وہ ''سب کچھ'' ملنے والا تھا جو میں آج تک چاہتا رہا تھا جس کے لیے تڑپتا رہا تھا جس کے لیے میں نے خود کو ایک طویل، خون رنگ داستان کی بھول بھلیوں میں گم کیا تھا لیکن جب وہ ''سب کچھ'' خود چل کر میری دہلیز تک پہنچا تھا، میں اس سے دور جا چکا تھا۔

وہیں پہلوان حشمت کے سامنے کرسی پر بیٹھے بیٹھے میرا جسم جیسے جان سے خالی ہو گیا۔ اس سیہ بخت سہ پہر کے سارے مناظر میری نگاہوں میں گھومنے لگے۔ میرے، دروازہ کھولنے پر برقع پوش تاجور کا اچانک اندر داخل ہونا، اس کی آنکھوں کی گہرائی میں کہیں جگنوؤں کی چمک نمودار ہوتی ہوئی...... اور پھر...... کچن کی طرف سے قسطینا کا مجھے آواز دینا۔ میری ہی قمیص پہنے بڑے بے تکلف موڈ میں سامنے آنا...... اور پھر......

سب کچھ ایک ایک کر کے نظروں کے سامنے گھوم گیا۔ ایک دیہاتی دوشیزہ ہونے کے باوجود تاجور بلا کی ذہین اور معاملہ فہم تھی...... گھر میں داخل ہونے کے بعد کے وہ چند لمحے اسے سمجھانے کے لیے بہت کافی ثابت ہوئے تھے کہ معاملات کس رخ پر رواں ہو چکے ہیں۔

میں سوچنے لگا۔ وقت کی گھڑی پر مدام حرکت کرتی ہوئی سوئیوں نے میرے ساتھ کیسا کھیل کھیلا تھا۔ قسطینا کی آمد سے صرف دو تین دن پہلے تک میں کتنی شدت سے تاجور کو یاد کرتا رہا تھا۔ اس کی یادوں کو جیسے، الوداعی بوسے دیتا رہا تھا اور شاید دل کی گہرائی میں، اتھاہ گہرائی میں کسی انہونی کے بارے میں بھی سوچتا رہا تھا لیکن تب زندگی نے ایک نیا رخ دکھایا تھا، ایک نیا دروازہ کھولا تھا...... اور اس دروازے میں سے قسطینا مسکراتی ہوئی اندر داخل ہو گئی تھی۔ یوں داخل ہونے میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ بھی سراسر حالات کے دھارے پر تھی۔

اس سے پہلے کہ میں پہلوان سے پوچھتا کہ تاجور اب کہاں ہے، وہ بول پڑے۔

''تمہارے گھر سے واپس آنے کے بعد تاجور نے رو رو کر مجھے مجبور کیا کہ میں اپنے وعدے پر قائم رہوں گا اور اب اس بارے میں تم سے کوئی بات ناہیں کروں گا۔ میں نے تاجور سے کہا کہ ٹھیک ہے۔ میں شاہ زیب سے ناہیں ملوں گا اور نہ بات کروں گا مگر تم خود تو ایک دفعہ شاہ زیب سے بات کر لو۔ کیا پتا کہ کوئی غلط فہمی ہو۔ وہ بولی کہ نہیں، کسی غلط فہمی کی گنجائش ہے

اور نہ خوش فہمی کی۔ میں نے دو تین دن تک مسلسل اس سے سر کھپایا تھا۔ میں نے اسے مجبور کیا کہ وہ کم از کم ایک بار تم سے رابطہ کرے، تمہیں اپنے حالات بتائے اور تم سے قسطینا کے بارے میں بھی سن گن لے لے۔ میں نے اس سے کہا...... تاجور بیٹی کیا پتا کہ شاہ زیب صرف اس لیے قسطینا کی طرف متوجہ ہوا ہو کہ تم اس سے بہت دور چلی گئی تھیں اور واپسی کا امکان ناہیں تھا۔ وہ جواب میں مجھ سے کہنے لگی...... ناہیں چاچا حشمت، سچی بات تو یہ ہے کہ میں کبھی ان کے قابل ہی ناہیں تھی۔ میں ایک دیہاتی لڑکی تھی، وہ باہر کی دنیا کے مانے ہوئے کھلاڑی تھے۔ ایک زمانہ ان کا چاہنے والا تھا۔ ان کی اڈاری (اڑان) بہت اونچی تھی۔ میں چاند گڑھی کی زمین پر ٹھوکریں کھانے والی کہاں تک ان کا ساتھ دے سکتی تھی جو کوشش مجھ سے ہو سکی اتنی تو میں نے کی...... لیکن...... میری اتنی حیثیت ہی نہ تھی کہ ان کے کندھے سے کندھا ملا کر چل سکتی۔ وہ جذباتی ہو رہی تھی۔ میں نے اسے بہت سمجھایا شاہ زیب! اس کے سامنے ہاتھ تک جوڑ دیئے۔ آخر وہ تمہیں فون کرنے پر رضامند ہو گئی...... لیکن شاہ زیب......"

پہلوان حشمت نے اپنے نچلے ہونٹ کو ہولے سے دانتوں میں دبایا اور گم صم ہو گئے۔ کچھ دیر بعد ایک طویل آہ بھر کر بولے۔ "شاہ زیب! حالات نے اس بے چاری کو بہت دھکے دیئے ہیں۔ اس تھوڑی سی عمر میں اس نے کیا کچھ ناہیں دیکھ لیا لیکن اندر سے تو وہ وہی بالڑی ہی ہے ناں۔ یہاں کی کڑیوں جیسی کڑی۔ جو دل کی بات اپنی زبان پر لاتے ہوئے سو بار سوچتی ہیں...... پسینا پسینا ہوتی ہیں۔ شاید وہ ان حدوں کو پار کر ہی ناہیں سکتیں جو اس دھرتی نے اور یہاں کی مٹی نے ان کے لیے بنا دی ہوئی ہیں...... میں وہ نظارہ کبھی ناہیں بھول سکتا شاہ زیب! رات کے وقت، اپنے ماموں کے گھر میں جب وہ تمہیں فون کرنے کے لیے بیٹھی تو میں ایک بند کھڑکی میں سے اس کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اتنی بے چین اور بے بس نظر آوت تھی کہ مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ کبھی بیٹھتی تھی، کبھی کھڑی ہووت تھی، کبھی کمرے میں چکرانے لگت تھی۔ اس نے ایک دو بار تمہارا نمبر پریس بھی کیا مگر پھر بند کر دیا۔ پھر وہ اتنا روئی کہ لگا اپنی جان دے ڈالے گی۔ اس کی ہچکیاں سن کر اس کا ماموں حنیف جاگ اٹھا۔ میں بھی کمرے میں چلا گیا۔ اسے بڑی مشکل سے سنبھالا۔ اس نے ماموں کے سامنے بہانہ بنایا کہ اس کے سر میں سخت درد ہے۔"

جونہی پہلوان خاموش ہوئے میں نے جیسے تپ کر ان سے پوچھا۔ "چاچا حشمت! اب کہاں ہے وہ؟"

پہلوان جی کے چہرے پر کوئی نیا تاثر نہیں ابھرا۔ میز پر کہنیاں ٹیک کر ریستوران کی کھڑکی سے باہر دیکھتے رہے۔ بارش کم ہوگئی تھی مگر گہری ہوتی شام کو تیز، ٹھنڈی ہواؤں نے اپنے نرغے میں لے لیا تھا۔ وہ ٹھہرے لہجے میں گویا ہوئے۔ ''میں پہلے ہی قسم توڑ کر گناہ گار ہو رہا ہوں، مجھے اور گناہ گار نہ کرو۔ ویسے بھی میں تمہیں بتا دیوت ہوں۔ اب اس کی طرف جانے کا کوئی فائدہ ناہیں ہے۔''

''کیوں فائدہ نہیں ہے...... کیوں نہیں ہے؟'' میں اتنے زور سے بولا کہ ریستوران میں موجود تقریباً تمام مرد و زن چونک کر ہماری جانب دیکھنے لگے۔ ہیڈ ویٹر لپکا ہوا آیا، پہلوان حشمت نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بتایا کہ وہ مداخلت نہ کرے، سب ٹھیک ہے۔

ہیڈ ویٹر واپس چلا گیا۔ میرے سینے میں انگارے دہک رہے تھے۔ یہ سب کیا ہوا تھا؟ کیسے ہوا تھا؟ میں نے پہلوان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے، دھیمے لیکن آتشیں لہجے میں کہا۔ ''آپ کیا سمجھتے ہیں۔ آپ بتائیں گے نہیں تو میں اس تک پہنچ نہیں سکوں گا۔ میں پہنچوں گا...... میں پوچھوں گا اس سے۔ اس نے مجھے اتنے بڑے دھوکے میں کیوں رکھا، پچھلے چھ برسوں میں قدم قدم پر تو مجھ سے جھوٹ بولے ہی تھے، آخر میں اتنا بڑا ظلم کیسے کر دیا مجھ پر۔''

''اس نے کوئی ظلم ناہیں کیا شاہ زیب، جو کچھ کیا ہے تمہارے اور اس کے حالات نے کیا ہے اور نصیب نے کیا ہے۔''

میں نے گہری نظروں سے پہلوان کی طرف دیکھا اور مجھے یقین ہو گیا کہ وہ جتنا بتا چکے ہیں اب اس سے زیادہ کچھ نہیں بتائیں گے۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ چند کرنسی نوٹ، ویٹر کے لیے میز پر پھینکتے ہوئے میں نے کہا۔ ''میں جا رہا ہوں چاچا حشمت!''

انہوں نے مجھے بازو سے تھام لیا۔ ''یہ سب ٹھیک ناہیں شاہ زیب! اب یہ سب بیکار ہے۔''

میں نے اپنا بازو چھڑایا۔ ''مجھے معاف کر دیں چاچا حشمت! لیکن مجھے جانا ہے۔ ہاں ایک بات کا اطمینان رکھیں۔ آپ پر کوئی بات نہیں آئے گی کسی کو اشارہ تک نہیں ملے گا کہ آپ نے کچھ بتایا ہے۔''

پہلوان جی کے روکتے روکتے میں باہر نکل آیا۔ ذہن میں صرف ایک ہی بات تھی۔ مجھے تاجور کی طرف جانا ہے۔ اس سے پوچھنا ہے کہ اگر وہ آزاد ہوگئی تھی...... اگر سب کچھ

ہمارے حق میں چلا گیا تھا تو پھر...... پھر کیوں اس نے سب کچھ چھپا لیا۔ ایک دفعہ بات تو کر لی ہوتی۔ ایک بار ٹھیک سے میرے دل میں جھانک تو لیا ہوتا۔

میں موسم کی پروا کیے بغیر اسی وقت ایبٹ آباد سے نکلا اور سیالکوٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں اکیلا جمنی جیپ پر سوار تھا (یہ گاڑی رینٹ پر ہمیں مالک مکان نے ہی فراہم کر رکھی تھی) ہوائیں بہت تیز تھیں اور میرے دماغ میں بھی کچھ ایسی ہی آندھی چل رہی تھی۔ راستے میں ہی میں نے بھاؤ کے خاص کارندے اعجاز جازی سے بھی رابطہ کر لیا۔ یہی جازی تھا جس نے کچھ عرصہ پہلے مجھے یہ معلومات فراہم کی تھیں کہ دارج کی بیوی یعنی تاجور، دارج کے ساتھ انگلینڈ نہیں گئی تھی (اس وقت میں حیران ہوا تھا مگر اب یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ گئی تھی کہ وہ کیوں نہیں گئی تھی۔ وہ دارج کی زندگی سے ہی نکل چکی تھی) سیالکوٹ کی طرف جاتے ہوئے میں نے فون پر جازی سے کہا کہ وہ فوراً سیالکوٹ پہنچے، ضروری کام ہے۔ جازی پہلے ہی گوجرانوالا میں تھا۔ اس نے کہا کہ وہ ڈیڑھ دو گھنٹے میں سیالکوٹ پہنچ جائے گا۔ میں نے اسے کسی مناسب ہوٹل میں کمرا بک کرانے کا بھی کہہ دیا۔ میں نے راستے میں ہی ملازمہ فردوس سے بھی رابطہ کرنے کی کوشش کی تاکہ اس سے تاجور کی موجودہ رہائش کے بارے میں کچھ بتا سکے مگر رابطہ نہیں ہوا...... جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا وہ دارج کے دو تین ذاتی ملازمین کے ساتھ ہی انگلینڈ شفٹ ہو چکی تھی۔

رات کے دس بجے تھے جب میں اور عجاز جازی سیالکوٹ کے ایک فور اسٹار ہوٹل کے نیم گرم کمرے میں بیٹھے تھے۔ میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے سکھیرا میں سیف کی بہن شازیہ سے رابطہ کیا تھا۔ شوہر اکبر کی موت کے بعد وہ کئی ہفتے سخت علیل رہی تھی، اب کچھ سنبھل چکی تھی۔ اس کو ابھی تک اس بات کا علم نہیں تھا کہ دارج نے بالآخر تاجور کو آزاد کر دیا ہے۔ اسے بس اتنا پتا تھا کہ تاجور آج کل اپنے ماموں حنیف کے پاس آئی ہوئی ہے اور ماموں حنیف سیالکوٹ میں کہیں رہ رہے ہیں۔ شازیہ سے فقط اتنا معلوم ہو سکا کہ ماموں حنیف کے لے پالک بیٹے کی دکان خواجہ صفدر روڈ کی طرف کہیں ہے۔

میں نے اپنے سامنے بیٹھے جازی سے کہا۔ ''یہاں سیالکوٹ میں ایک شفیق نامی بندے کو ڈھونڈنا ہے۔ یہاں صفدر روڈ کے علاقے میں اس کی کلاتھ شاپ ہے۔''

''شاپ کا نام معلوم ہو تو یہ آدھ گھنٹے کا کام ہے جی۔''

''نام معلوم نہیں لیکن یہ بندہ چاندگڑھی کا رہنے والا ہے۔ اس کا حلیہ وغیرہ بھی میں تمہیں بتا دیتا ہوں۔ مجھے کل دوپہر سے پہلے پہلے اس بندے کا اتا پتا چاہیے۔''

''میں ابھی نکل جاتا ہوں جی۔ زمین کی تہ سے بھی ڈھونڈ نکالوں گا۔'' اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

وہ بھاؤ کے بہترین کارندوں میں سے تھا۔ انڈر ورلڈ کے نہ جانے کتنے پھڈے، اغوا اور قتل اس کے کھاتے میں ہوں گے۔ میں نے کہا۔ ''جازی! اس بندے کا صرف پتا لگانا ہے، اس پر ہاتھ نہیں ڈالنا اور نہ اسے کوئی نقصان پہنچنا چاہیے۔''

پینٹ جیکٹ میں ملبوس لمبا تڑنگا جازی مجھے سلام کر کے رخصت ہو گیا۔ وہ رات میرے لیے بے حد بے قراری لے کر آئی تھی۔ ذہن میں رہ رہ کر پہلوان حشمت کا یہ فقرہ گونج رہا تھا...... اب اس کے پیچھے جانے سے کچھ فائدہ نہیں شاہ زیب...... پہلوان جی نے ایسا کیوں کہا تھا؟

اگلے روز دوپہر سے پہلے ہی جازی کا فون آ گیا۔ اس نے گینگسٹرز کے مخصوص لب و لہجے میں کہا۔ ''باس! دکان کا پتا چل گیا ہے۔ نگینہ کلاتھ ہاؤس، پروپرائٹر محمد شفیق...... صفدر روڈ کی ایک بڑی مارکیٹ میں ہے لیکن یہ دکان پچھلے چار روز سے بند ہے...... پتا چلا ہے کہ مالک شفیق کی شادی ہے۔''

میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ یوں لگا کہ دل کی گہرائی میں چھپا ہوا ایک موہوم اندیشہ ایک دم سنگین حقیقت کا روپ دھارنے لگا ہے۔ شفیق کی شادی ہو رہی تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ یہ شادی...... میں اس سے آگے مزید نہ سوچ سکا۔ میرے کانوں میں ایک بار پھر پہلوان حشمت کے الفاظ گونجے...... اب دیر ہو گئی ہے۔ اب اس کے پیچھے جانے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔''

میں نے بے قرار لہجے میں جازی سے کہا۔ ''شفیق کی رہائش گاہ کا پتا کیوں نہیں چلا اب تک؟''

وہ بولا۔ ''باس! پڑوسی دکانداروں سے پتا چلا ہے کہ شفیق یہاں کرائے کے گھر میں رہتا تھا۔ پچھلے ہی ہفتے اس نے یہ گھر تبدیل کیا ہے۔ شاید شادی کے لیے ذرا بڑے گھر میں شفٹ ہوا ہے۔ اس نئے گھر کا ابھی کسی کو معلوم نہیں۔''

''کیسی بات کر رہے ہو تم؟'' میں نے ذرا سختی سے کہا۔ ''زمین کی ساتویں تہ سے مطلوبہ بندے کو ڈھونڈ نکالتے ہو۔ یہ تو ایک عام شہری ہے۔ پتا کرو اس کا۔ کہاں شفٹ ہوا ہے وہ...... پہلے والے گھر میں جاؤ۔ ہو سکتا ہے وہاں سے پتا چل جائے۔'' میرے لہجے کی سختی اور عجلت کو محسوس کر کے جازی پریشان ہو گیا۔ اس نے ''یس باس'' اور ''او کے'' کہتے

ہوئے مزید ایک گھنٹے کی مہلت مانگی۔

''جازی! ایک گھنٹے کا مطلب ایک گھنٹا ہی ہونا چاہیے۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں بے چینی سے ہوٹل کے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ کیا ایسا ممکن تھا؟ کہیں تاجور کو اسی شفیق کے ساتھ تو نہیں بیاہا جا رہا تھا؟ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ تاجور کا اور اس کا کوئی جوڑ ہی نہیں تھا۔ گو وہ جواں سال تھا مگر فربہ جسم اور پیشانی سے اُڑے ہوئے بالوں کی وجہ سے پینتیس چالیس کا نظر آتا تھا۔ بے حد سادہ اور مسکین طبیعت تھا۔ تعلیمی لحاظ سے بھی بمشکل میٹرک تک ہی پہنچا ہوگا۔ اس کی زندگی شاید اس کی کپڑے کی دکان اور گھر تک ہی محدود تھی۔ تاجور کے چھوٹے ماموں حنیف کو تو دو تین ملاقاتوں میں، میں نے اچھی طرح پہچان لیا تھا۔ وہ کوئی مطلب پرست بندے نہیں تھے۔ گھر میں خوش حالی بھی تھی۔ یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ کسی لالچ کے تحت اپنے لے پالک بیٹے کا رشتہ تاجور سے جوڑ دیتے۔ اگر بالفرض یہ صورتِ حال بن بھی گئی تھی تو پھر اس میں تاجور کی رضامندی شامل رہی ہوگی۔

یہ سب کچھ بظاہر ناممکن نظر آ رہا تھا مگر یہ انہونیوں کا موسم تھا۔ کیا پتا کہ یہ نہ ہونے والی بات بھی ہو رہی ہو۔

قریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد جازی کا فون آ گیا۔ وہ قدرے ہانپی ہوئی آواز میں بولا۔ ''یس باس! محمد شفیق کی رہائش گاہ کا پتا مل گیا ہے۔ مرغزار کالونی کے علاقے میں یہ ایک دو منزلہ گھر ہے۔ محمد شفیق اور اس کے والد کے پاس بالائی پورشن ہے اور یہ پورشن انہوں نے چند روز پہلے ہی کرائے پر لیا ہے۔ اسی کالونی میں وہ شاید اپنا گھر بھی شروع کر رہے ہیں۔''

میرے سینے میں دل دھڑ دھڑ بجنے لگا تھا۔ میں نے جازی سے مکمل ایڈریس معلوم کیا...... اور سمجھ لیا۔ جازی نے کہا۔ ''یہ شادی والی بات بھی درست ہی لگ رہی ہے جی۔ گھر میں یقیناً کوئی فنکشن ہے، لائٹس وغیرہ لگائی جا رہی ہیں۔''

میرے پورے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔

چند ہی منٹ بعد میں ''جمنی'' پر سوار تیزی سے مرغزار کالونی کے ایریا کی طرف جا رہا تھا۔ یہ اتوار کا دن تھا۔ سہ پہر کے دو بجے تھے۔ سڑکوں پر رش زیادہ نہیں تھا۔ چمکیلی دھوپ شہر کے در و دیوار کو روشن کر رہی تھی۔ پھول پودوں پر بہار کی دستک تھی۔ یقیناً یہ ایک دلکش نظارہ رہا ہوگا مگر میرے سینے میں جو تہلکہ مچا ہوا تھا، اس کے شور میں مجھے کچھ دکھائی اور سنائی نہیں دے رہا تھا۔ قریباً آدھ گھنٹے میں، میں اپنی منزل پر موجود تھا۔ میری ہدایت کے مطابق

جازی نے کوئی مزید پیش رفت نہیں کی تھی۔ وہ خاموشی سے اپنی تاریک شیشوں والی مہران میں بیٹھا رہا تھا۔ کوٹھی نما دو منزلہ گھر مجھے دور ہی سے دکھائی دے گیا تھا۔ دو الیکٹریشن وہاں آرائشی لائٹس لٹکانے میں مصروف تھے۔ مجھے ارد گرد کوئی شناسا چہرہ نظر نہیں آیا۔ ایک بڑی عمر کے صاحب، شلوار قمیص اور ٹوپی میں ملبوس، دروازے کے قریب ٹہل رہے تھے اور لائٹس لگانے والے لڑکوں کو ہدایات وغیرہ دے رہے تھے۔

میں سیدھا ان کے پاس ہی چلا گیا۔ ''السلام علیکم۔'' میں نے کہا۔

''وعلیکم السلام۔'' انہوں نے جواب دیا اور ذرا حیرت سے مجھے دیکھنے لگے۔ رسمی کلمات کے بعد میں نے ان سے پوچھا۔ ''یہ شفیق صاحب کپڑے والے ادھر ہی ہوتے ہیں؟''

''ہاں، چند دن پہلے ہی آئے ہیں...... اپنی فیملی کے ساتھ...... آپ کون؟''

''شفیق کے گاؤں چاند گڑھی سے آیا ہوں، اس سے ملنے۔''

''لیکن وہ تو شاید گھر والوں کے ساتھ باہر نکلے ہوئے ہیں۔'' انہوں نے اپنی توند پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

میں نے گھر کی پیشانی پر جھولتی ہوئی رنگ برنگی لائٹس کی لڑیوں پر نظر دوڑائی۔ ''کوئی شادی وغیرہ کا فنکشن ہے؟'' میں نے عام سے لہجے میں پوچھا۔

وہ مسکرائے۔ ''نہیں جی...... یہ تو میرے پوتے کی سالگرہ ہے۔ ہم نیچے والے پورشن میں رہتے ہیں۔ شادی تو یہاں پرسوں ہوئی تھی۔''

''پرسوں ہوئی تھی؟''

''جی ہاں۔ نئے کرائے دار شفیق کی شادی۔ یہی گھر لڑکے کا تھا اور یہی لڑکی کا۔ دونوں کزن ہیں، پھوپی زاد اور ماموں زاد۔ شادی بھی کیا تھی، بس نکاح اور رخصتی کی رسم تھی۔ چالیس پچاس بندے تھے سارے...... پر آپ تو بتا رہے ہیں کہ آپ دوست ہیں دولھے کے۔ آپ کو پتا ہی نہیں؟''

بڑی عمر کا شخص بولتا چلا جا رہا تھا مگر میرے کانوں میں بس ''سائیں سائیں'' کی آواز تھی۔ جسم جیسے سن ہو کر رہ گیا تھا۔ دونوں کزن تھے۔ پھوپی زاد اور ماموں زاد...... الفاظ میرے ذہن میں نیلے شعلوں کی طرح پھنکار رہے تھے۔ وہ شادی ہو چکی تھی۔ اس کا کیا مطلب تھا؟ اس کا مطلب یہی تھا کہ تاجور اپنے ماموں زاد شفیق کی بیوی بن چکی ہے۔

کیا وہ ایک بار پھر مجھ سے بہت دور جا چکی تھی؟ مجھے اس طرح سکتہ زدہ کھڑے دیکھ

کر بزرگ نے مجھ سے پوچھا۔ ''خیریت تو ہے میاں! آپ کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی۔''

میں کوشش کر کے بولا مگر اپنی ہی آواز مجھے کہیں بہت دور سے آتی محسوس ہوئی۔ ''شفیق اوراس کی فیملی کہاں گئے ہیں۔'' میں نے پوچھا۔

اسی دوران میں گھر کے دروازے پر ایک لڑکی نظر آئی۔ غالباً اس بزرگ کی بہو یا بیٹی تھی۔ بزرگ نے اس سے پوچھا۔ ''عاصمہ! کچھ پتا ہے حنیف صاحب اور گھر والے کہاں گئے ہیں؟''

لڑکی دروازے کی اوٹ سے بولی۔ ''سیر کے لیے نکلے ہیں۔گلشن پارک کا نام لے رہے تھے۔'' پھر اس نے مجھ سے دریافت کیا۔ ''بھائی! آپ کے پاس ان کا فون نمبر نہیں ہے؟''

''نہیں۔'' مجھے اپنی ہی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔

لڑکی چھپاک سے اندر گئی اور ایک چھوٹا سا شادی کارڈ لے آئی۔ بزرگ نے کارڈ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہاں فون نمبرز لکھے ہیں ان کے۔''

میں نے کارڈ دیکھا اور زمین آسمان کی گردش جیسے تھم گئی۔ بدترین اندیشے، حقیقت بن چکے تھے۔ دو دن پہلے ہونے والی اس شادی کے کارڈ پر دولھا کا نام محمد شفق اور دلہن کا نام تاجور دین محمد لکھا تھا۔

کچھ کہے سنے بغیر میں تیزی سے گاڑی کی طرف مڑ گیا۔ یہی وقت تھا کہ جب کسی اوٹ سے لمبا تڑنگا اعجاز جازی نکل کر میرے سامنے آیا۔ میں دروازہ کھول کر گاڑی میں بیٹھا تو وہ بھی پچھلا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔ ''تمہاری ضرورت نہیں ہے۔'' میں پھنکارا۔

''باس! آپ یہاں اجنبی ہیں۔ضرورت پڑ سکتی ہے۔'' اس نے کہا۔

میں اسے سخت جواب دیتے دیتے رہ گیا۔ میرے اردگرد جیسے ایک دھند سی تھی۔ مجھے کچھ پتا نہیں، میں نے کب گاڑی اسٹارٹ کی، کب وہاں سے نکلا اور کب بڑی سڑک پر پہنچا...... جازی، جیپ کی عقبی نشست پر موجود تھا۔ اس کا ساتھ چلے آنا شاید ایک لحاظ سے درست ہی تھا۔ گلشن پارک کا راستہ مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں تھا۔ اگر میں اکیلا ہوتا تو دو چار جگہ رک کر پوچھنا پڑتا۔

بہار کی اس خوش رنگ شام میں سورج اپنی نرم سنہری کرنیں نچھاور کر رہا تھا مگر مجھے یہ کرنیں انگاروں کی طرح لگ رہی تھیں۔ یہ چھٹی کا دن تھا۔ سڑکوں پر معمولی ٹریفک تھا۔

میں پندرہ بیس منٹ میں مطلوبہ پارک تک پہنچ گیا۔ میں کیا کرنا چاہتا تھا، مجھے کچھ پتا نہیں تھا۔ کیا میں تاجور کو دیکھتے ہی اس پر چلانا شروع کر دوں گا؟ کیا میں اسے پکڑ کر جھنجوڑوں گا؟ اس پر اپنے آتشیں سوالوں کی بارش کروں گا؟ کیا میں اس کے شوہر کی شکل برداشت نہیں کر پاؤں گا اور اس پر ٹوٹ پڑوں گا؟ میں کیا کروں گا اور جو کروں گا اس سے کیا حاصل ہوگا۔ کیا میں تاجور کو زبردستی اپنے ساتھ لے جا سکتا ہوں؟ اگر زبردستی کی بات تھی تو پھر میں نے یہ بہت پہلے کیوں نہ کر لی؟ یا میں اس وقت اسے حاصل کیوں نہ کر پایا جب وہ سجاول کے ڈیرے پر تھی۔ میری ذرا سی کوشش سے وہ مجھے حاصل ہو سکتی تھی؟ یہ بڑے پیچیدہ سوال تھے۔ یہ گہری محبت کی روداد تھی۔ شاید اس میں نیم رضامندی یا رضامندی درکار نہیں ہوتی۔ اس میں ایک بے ساختہ والہانہ پن درکار ہوتا ہے۔ ایک بے پناہ آمادگی، ایک غیر معمولی خود سپردگی...... اور وہ سب کچھ مجھے کبھی نہیں ملا تھا اگر تھا تو مجھ تک پہنچا نہیں تھا...... اور اگر پہنچا ہی تھا تو اس وقت جب اس کا وقت نہیں تھا۔

میں پارک کے بیرونی جنگلے کے ساتھ موجود پارکنگ تک پہنچا۔ یہاں سے اس وسیع پارک کا کافی حصہ دکھائی دیتا تھا۔ یہاں لکڑی، گتے اور پلاسٹک آف پیرس کے بنے ہوئے کچھ ماڈلز بھی نظر آ رہے تھے۔ یہ تاریخی عمارتوں کے ماڈلز تھے، کچھ مجسمے وغیرہ بھی تھے۔ شاید کسی آرٹ کالج کے اسٹوڈنٹس نے بنا کر یہاں رکھ دیئے تھے۔ وینس کے ایک، ''چھ سات فٹ اونچے'' مجسمے کے گلے میں ایک بورڈ آویزاں تھا جس پر پنجابی میں لکھا گیا تھا۔ ''سردی توں آزادی دا جشن۔''

دفعتاً میری نگاہ تاجور کے چھوٹے ماموں حنیف صاحب پر پڑی۔ وہ بیرونی چار دیواری سے کچھ فاصلے پر سرسبز گراؤنڈ میں چادر بچھائے نماز پڑھ رہے تھے۔ تب میری نگاہ ان کے بیٹے شفیق پر پڑی۔ تاجور کے چھوٹے بھائی راحیل اور اسفند بھی اس کے ساتھ تھے۔ وہ تینوں ایک فٹ بال نما گیند سے کھیل رہے تھے اور تب میں نے اسے دیکھا ... ہاں یہ وہی تھی۔ وہ قدرے چمکیلے سبز لباس میں تھی۔ اس کی کلائیوں میں ہفت رنگ چوڑیوں کی جھلک تھی۔ وہ اپنی ممانی کے ساتھ، سرو قد درختوں کے عقب سے نمودار ہوئی تھی۔ اس ایک جھلک نے ہی مجھے بتا دیا تھا کہ اب یہ عورت تاجور کی صرف ممانی نہیں بلکہ ممانی ساس ہے۔

تاجور اپنی کامدار شنوار کا ایک پائینچہ تھوڑا سا اٹھائے چل رہی تھی۔ شاید بے خیالی میں اس نے اپنا پاؤں کسی گیلی کیاری میں رکھ دیا تھا اور وہاں سے کچھ کیچڑ اس کے پائینچے اور سینڈل پر لگ گیا تھا۔ فربہ اندام شفیق کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ تاجور سے مخاطب

تھا۔ بلند آواز میں بولا۔ ''کیا ہوا جی؟''

جواب میں تاجور نے اپنے کیچڑ آلود سینڈل کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ کہا۔ میں اس کی آواز نہیں سن سکا۔

شفیق لپک کر گیا اور چٹائی پر رکھے ایک بیگ سے پانی کی بڑی بوتل نکال لایا۔ اس نے نیچے جھک کر تاجور کا کیچڑ آلود پائینچہ پکڑا اور اسے دھونے لگا۔ تاجور کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ اسے منع کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ نوبیاہتا شفیق نے نہ صرف اپنی دلہن کا پائینچہ دھویا بلکہ اس کے منع کرنے کے باوجود اس کی سینڈل بھی اتروائی اور دھو دی۔ اس کے ایک ایک انداز سے عیاں تھا کہ وہ سو جان سے اپنی اس حسین دلہن پر قربان ہے۔ وہ بڑی سادگی کے ساتھ مگر بہت محبت بھرے انداز میں آگے پیچھے پھر رہا تھا۔ پھر وہ اسے بھی آمادہ کرنے لگا کہ وہ ان کے ساتھ کھیل میں شریک ہو۔ ایسا کرتے ہوئے اس کا گول چہرہ تمتما رہا تھا اور پیشانی جو قریباً نصف سر تک پہنچی ہوئی تھی چمک رہی تھی۔ تاجور نے مسکراتے ہوئے اسے ٹال دیا اور ساس کے قریب ہی پھول دار چٹائی پر بیٹھ گئی۔

میں گاڑی کے اندر ہی تھا۔ گاڑی کے ''سن وائزرز'' میں نے اس طرح جھکا دیئے کہ ان لوگوں کی نظر براہِ راست میرے چہرے پر نہیں پڑ سکتی تھی۔

ڈھلتے سورج کی سنہری کرنیں تاجور کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ پھر نرم ہوا کا ایک جھونکا آیا اور اس کی دو ریشمی لٹیں، ہمیشہ کی طرح اس کے چہرے پر رقصاں ہو گئیں۔ وہ شاید سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ میں اس کے اس قدر قریب موجود ہوں اور اسے دیکھ رہا ہوں۔

پتا نہیں کیوں اس وقت میرے دل میں یک بات آئی۔ میں نے اپنی نشست کے نیچے ہاتھ ڈال کر اپنا سائیلنسر لگا بریٹا پسٹل نکال لیا۔ میں غم و اندوہ کے سمندر میں تھا۔ میرا دل چاہا کہ گاڑی سے نکل کر پارک چلا جاؤں۔ دو گولیاں تاجور کے جسم میں اور کم از کم ایک اپنے سر میں اتار لوں۔

بریٹا پسٹل پر میری گرفت مضبوط ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اردگرد کی ہر شے جیسے میری نظروں میں دھندلا چکی تھی۔ سرسبز گراسی گراؤنڈ پر کھیلتے کھیلتے راحیل، اسفند اور شفیق آپس میں گتھم گتھا ہو گئے تھے۔ راحیل اور اسفند اپنے بہنوئی شفیق سے بہت مانوس دکھائی دیتے تھے۔ شفیق نے تاجور کو مخاطب کر کے زور سے ہانک لگائی۔ ''تاجور جی، یہ دیکھیں آپ کے پیارے بھائی کس طرح مجھ سے بے ایمانیاں کر رہے ہیں۔''

ماموں حنیف نے کہا۔ ''کیوں تنگ کر رہے ہو اس کو۔ تمہاری عزت کی جگہ پر ہے

نالائقو۔‘‘

وہ سب ہنسنے لگے۔ فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے کچھ الفاظ میری سمجھ میں آرہے تھے کچھ نہیں۔

جازی نے مجھے پسٹل نکالتے دیکھ لیا تھا۔ وہ گمبھیر لہجے میں بولا۔ ’’باس! آپ کیوں زحمت کررہے ہیں۔ مجھے حکم دیں۔ ابھی ایک منٹ میں پوری فیملی کو اُڑا دیتا ہوں۔ اگر ان میں سے کسی کو اٹھانا ہے تو بھی بس ایک اشارہ کردیں۔‘‘ جازی کے لہجے میں بلا کی بے خوفی اور سفاکی تھی۔ میں جانتا تھا آس پاس اس کے تین چار خونخوار شوٹرز بھی ضرور موجود رہے ہوں گے۔

اس کی پیشکش کے نتیجے میں میرے دماغ کے اندر چنگاریاں سے چھوٹ گئیں۔ وہ پچھلی نشست پر بیٹھا تھا۔ میں نے اسے زور سے دھکا دیا۔ وہ گاڑی کی پچھلی کھڑکی سے جا ٹکرایا۔ میرے تاثرات نے اسے سمجھا دیا کہ ان لمحوں میں اس کا خاموش رہنا ہی مناسب ہے۔ میرے اندر کی آتشیں اتھل پتھل کا یہ عالم تھا کہ اردگرد کی ہر شے میری نگاہوں میں دھندلائی ہوئی تھی۔ مجھے بس یہ فیملی نظر آرہی تھی اور درمیان میں بیٹھی ہوئی تاجور...... جو اپنے شوہر اور بھائیوں کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ میں نے کھڑکی کا شیشہ تھوڑا سا نیچے اتارا۔ سائیلنسر لگا پسٹل سیدھا کیا...... اور اوپر تلے تین فائر کیے۔

فائرنگ کے فوراً بعد ہی میں نے گاڑی تیزی سے آگے بڑھا دی تھی۔ میری آنکھوں میں آتشیں آنسو تھے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے سامنے سڑک ہموار نہیں ہے بلکہ اوپر اٹھتی چلی جارہی ہے۔ اوپر اور اوپر۔

عقبی نشست پر جازی ساکت و جامد بیٹھا تھا۔ شاید اسے بھی اندازہ نہیں تھا کہ میں ایسا کروں گا...... غالباً اردگرد موجود کسی شخص کو بھی ٹھیک سے پتا نہیں چلا ہوگا کہ یہاں کیا ہوا ہے۔ پسٹل پر سائیلنسر چڑھا ہوا تھا۔ بس تین بار ’’ٹھک ٹھک‘‘ کی مخصوص آواز آئی تھی اور پارک کے اندر ’’محبت‘‘ چھلنی ہوگئی تھی۔

○......❖......○

وہ دو راتیں میری زندگی کی تلخ ترین راتیں تھیں۔ دہکتے انگاروں پر لوٹتی ہوئی یہ راتیں ہزار راتوں پر بھاری تھیں۔ ان میں رنج و غم کا ایک آتشیں سمندر تھا اور پچھتاوے کے زہریلے جھکڑ تھے۔ میں سیالکوٹ ہوٹل کے اس کمرے میں تھا جو جازی نے میرے لیے بک کرایا تھا۔ میرے حکم پر جازی نچلی منزل کے ایک دوسرے کمرے میں شفٹ ہوگیا تھا۔

میں تنہا رہنا چاہتا تھا۔ بالکل تنہا۔ میں نے ٹی وی کا سوئچ نکال دیا تھا اور فون کو بھی خاموش کر دیا تھا۔ سکون آور گولیوں کی ایک بھاری ڈوز لے کر میں بے سدھ پڑا رہا تھا۔ کھانا پینا تو دور کی بات ہے میں نے کمرے سے باہر جھانک کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ تیسرے روز میں نے فون دیکھا تو اس پر رضوان اور جازی کی کوئی چار درجن مسڈ کالز موجود تھیں۔ پہلوان حشمت کی تین کالز کے علاوہ پانچ چھ کالز زینب اور قسطینا کی بھی تھیں۔

میں نے فون ایک طرف پھینک دیا اور خیالات میں گم ہو گیا۔ پارک میں دیکھے ہوئے مناظر ایک بار پھر میری آنکھوں میں دہکے ہوئے نیزے اتارنے لگے۔ تاجور کا چہرہ انلارج ہو کر جیسے پورے پردۂ تصور پر پھیل گیا۔ میں اسے گولی نہیں مار سکتا تھا اور میں نے ماری بھی نہیں تھی۔ ایسا کرنا شاید میرے بس میں ہی نہیں تھا۔ شدید غیظ و غضب اور دکھ کے عالم میں، میں نے جو تین فائر کیے تھے وہ محبت پر نہیں ''محبت کے مجسمے'' پر تھے۔ دیگر ماڈلز اور مجسموں کی طرح، آرٹس کالج کے کسی اسٹوڈنٹ نے ایک مجسمہ کیوپڈ کا بھی بنا رکھا تھا۔ محبت کا دیوتا کیوپڈ جو اپنا مہلک تیر کھینچے، ہر گھڑی دلوں کا خون کرنے کو تیار رہتا ہے۔ شدید فرسٹریشن کے عالم میں، میں اور تو کچھ نہ کر سکا تھا، بس قریب ہی موجود اس مجسمے کا سر چکنا چُور کر دیا تھا۔ وہ دھڑ سے علیحدہ ہو کر گھاس پر جا گرا تھا۔ اردگرد موجود لوگوں میں سے شاید ہی کسی کو اصل صورتِ حال کا علم ہوا ہو۔ انہوں نے بس کیوپڈ کے سر کو اچانک زمین بوس ہوتے دیکھا ہوگا۔

ان لمحوں کے بارے میں سوچ کر میں کتنی ہی دیر گم صم رہا۔ تب ایک بار پھر موبائل فون کی طرف دھیان چلا گیا۔ میں نے دیکھا ایک دن پہلے قسطینا نے میرے موبائل پر بھی کچھ بھیجا تھا۔ یہ ایک ویڈیو کلپ تھا۔ اس میں ڈی پیلس کی بالکونی دکھائی گئی تھی۔ بالکونی کے نیچے محل کے وسیع عریض احاطے میں پانچ چھ سو مرد و زن جمع تھے۔ ان کے ہاتھوں میں کتبے تھے اور وہ پُرمسرت انداز میں جوشیلے نعرے لگا رہے تھے۔ کچھ کتبے تو مقامی زبانوں میں تھے، کچھ انگلش میں تھے اور پڑھے جا رہے تھے۔ ان پر میرے لیے ''خوش آمدید'' الفاظ درج تھے۔ میرے اور قسطینا کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار تھا۔ اس کے علاوہ قسطینا سے پُرزور درخواست تھی کہ وہ محل کی بالکونی میں آئیں اور اپنے پرستاروں سے اپنے خیالات شیئر کریں۔

میں نے یہ سب کچھ نہایت دکھ اور جھلاہٹ کے عالم میں دیکھا اور فون آف کر دیا۔

اگلے روز دوپہر سے پہلے میں نے سیالکوٹ کا وہ ہوٹل چھوڑ دیا اور خاموشی سے واپس

ایبٹ آباد پہنچ گیا۔ سجاول، خورسنہ، رضوان اور ولید وغیرہ میری اس اچانک غیر حاضری پر سخت پریشان رہے تھے۔ ان کی معلومات کے مطابق تو میں بال کٹوانے نکلا تھا اور پھر کسی ضروری کام سے مجھے سیالکوٹ جانا پڑ گیا تھا۔ اس سے زیادہ انہیں کچھ معلوم نہیں تھا۔ مجھے اصل واقعہ تو چھپانا ہی تھا، یہ میری مجبوری تھی۔ کسی ذاتی ضروری کام کا کہہ کر میں نے انہیں ٹال دیا۔ خورسنہ نے میری بخیریت واپسی کے لیے کافی نوافل کی منت مان لی ہوئی تھی۔ وہ بہت محبت کرنے والی خاتون تھی۔ ایک فیملی کے فرد کی طرح ہم سب کا خیال رکھتی تھی اور امور خانہ داری انجام دیتی تھی۔

رضوان مجھے مسلسل ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا مگر اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ مزید کچھ پوچھے۔ شام کے وقت اس نے ایک لفافہ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ جاما جی سے آپ کے لیے آیا ہے بذریعہ کوریئر۔''

''اس پر تو تمہارا نام لکھا ہوا ہے اور وہ بھی پورا نہیں۔''

''ایسا غالباً احتیاط کے طور پر کیا گیا ہے۔ یہ آپ کے لیے ہے۔ قسطینا صاحبہ نے بھیجا ہے۔''

میں نے لفافہ کھولا۔ اس میں برونائی کے لیے میرا بزنس کلاس ہوائی ٹکٹ تھا۔ برونائی سے آگے جزیرہ جاما جی کے لیے بھی لگژری بوٹ کی بکنگ موجود تھی۔ وہ مجھے جاما جی بلا رہی تھی۔ میرے دل کی حالت عجیب تھی۔ میں نے کمرے میں جا کر دونوں ٹکٹ پھاڑے اور ڈسٹ بن میں پھینک دیئے۔ یہ صرف پچھتاوے اور غم کا موسم تھا۔ میں ساتھیوں پر اپنی دلی کیفیت پوری طرح ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ رات کو خورسنہ کے بے حد اصرار پر میں نے تھوڑا سا کھانا کھایا اور طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے کمرے میں چلا گیا۔ محترم حاذق ذکری نے کہا تھا۔ ''جو چیزیں آپ کے مقدر میں نہیں ہوتیں، وہ آپ کو میسر ہو کر بھی آپ کی نہیں ہوسکتیں۔ حتیٰ کہ وہ لقمہ بھی جو آپ کے مقدر میں نہیں ہوتا آپ کے گلے میں پھنس جاتا ہے اور ڈاکٹر انگلیاں ڈال ڈال کر اسے باہر نکال لیتے ہیں۔''

مگر مقدر کی ایسی ستم ظریفیوں کو جھیلنا بھی تو کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ میرے موبائل فون میں شکر پڑیاں والے گھر کا ایک ویڈیو کلپ موجود تھا۔ اس میں بس گھر کے در و دیوار دکھائے گئے تھے۔ ایک دروازے کو دیکھ کر میں سوچنے لگا، یہی دروازہ تھا جہاں سے آس امید کی ڈوروں سے بندھی ہوئی تاجور اندر داخل ہوئی تھی۔ وہ پہلوان حشمت کو ٹیکسی میں چھوڑ آئی تھی۔ اس کے سینے میں دبی دبی خوشی تھی اور یقیناً اس کا بدن لرز رہا ہوگا۔ یہاں

اس کامن روم میں کھڑے ہو کر اس نے مجھ سے بات کی تھی...... اور پھر اس کچن کی طرف سے چھکتی ہوئی قسطینا نمودار ہوئی تھی۔ وہ ساری باتیں سارے منظر میرے پردۂ تصور کو مجروح کرنے لگے۔ کاش وقت کی سوئیوں کو الٹا چلایا جا سکتا...... میں جان سکتا کہ وہ کتنی حیران کن تبدیلیوں کی اطلاع لے کر اور کن خوشیوں کا سندیسہ اپنے پلو میں چھپا کر یہاں پہنچی ہے۔

جی چاہتا تھا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کہیں نکل جاؤں۔ ہر طرف گہری تاریکی نظر آتی تھی جس میں روشنی کی کوئی چھوٹی سی کرن بھی نہیں تھی...... بار بار خیال آتا تھا کہ چپکے سے ڈنمارک یا آسٹریا کی طرف چلا جاؤں۔ وہاں کے کسی چھوٹے سے پُرسکون قصبے میں خود کو سب سے الگ تھلگ کر لوں...... مگر فی الحال ایسا کرنا آسان نہیں تھا۔ یہاں آنکھوں سے محروم سجاول تھا...... اور داؤد بھاؤ تھا جس کا ابھی تک کوئی کھوج نہیں ملا تھا۔ لودھی بھی جیسے ناپید ہو گیا تھا۔ جازی اپنے بچے کھچے فعال ساتھیوں کے ساتھ مل کر بہت کوشش کر رہا تھا مگر کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ (فائر بریگیڈ کے ڈرائیور فاضل کو میں نے جازی کے حوالے کر دیا تھا اور کہا تھا کہ جب تک ہم اس ایبٹ آباد والے ٹھکانے پر ہیں، وہ اسے اپنے پاس رکھے)

بھاؤ کی آخری فون کال مجھے اسلام آباد والے گھر میں ہی موصول ہوئی تھی...... تب اس نے بہت مختصر بات کی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ ہم اپنی پنڈی اور اسلام آباد والی پناہ گاہیں چھوڑ دیں اور اپنے طور پر کسی طرف نکل جائیں۔ تب بھاؤ کی باتوں سے یہی تاثر ملا تھا کہ شکیل کے قتل والا بڑا واقعہ ہو چکا ہے اور اب بڑے پیمانے پر گرفتاریاں وغیرہ ہوں گی۔

جوں جوں وقت گزر رہا تھا، داؤد بھاؤ اور لودھی کے حوالے سے اندیشے بڑھتے جا رہے تھے۔ اگر بھاؤ زندہ تھا تو پھر اب تک اس نے رابطہ کیوں نہیں کیا تھا؟ بیرون ملک ہونے کی صورت میں بھی اس کے پاس رابطے کے سیکڑوں طریقے تھے۔

میں اپنا نمبر مستقل طور پر بند کر دینا چاہتا تھا مگر یہ بھی ممکن نہیں تھا۔ اس نمبر پر بھاؤ یا لودھی کی کوئی کال آ سکتی تھی۔ میں نے اس فون کو مستقل طور پر سائیلنٹ پر کر دیا اور چارج کر کے ایک بیگ میں ڈال چھوڑا۔ ارادہ یہی تھا کہ چوتھے پانچویں روز اسے نکال کر چارج کر لیا کروں گا۔ میں نے ایک دوسری ''سم'' کا استعمال شروع کر دیا۔ چھ سات روز بعد کی بات ہے خوش پوش خورسنہ میرے پاس آئی۔ اس کی آنکھیں نم تھیں۔ بڑی دھیمی آواز میں بولی۔

''شاہ زیب صاحب پلیز آپ برا نہ مانیے گا، آپ سے ایک درخواست کرنی ہے۔''

''کہو خورسنہ۔'' میں نے اپنی اندرونی یاسیت کو دباتے ہوئے نارمل لہجے میں کہا۔

''میں کوئی جذباتی بات نہیں کر رہی ہوں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں سجاول کو اپنی آنکھیں دے دوں۔ یقین کریں شاہ زیب صاحب! مجھ سے ان کی یہ معذوری دیکھی نہیں جاتی۔ وہ دیکھ پائیں گے تو مجھے لگے گا کہ میں خود......''

''پلیز شٹ اَپ۔'' میں نے اسے پیار سے ڈانٹا۔ ''بیکار کی باتیں مت کرو۔ ہم کوئی ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھے ہوئے۔ پوری کوشش کر رہے ہیں کہ کہیں سے کوئی ڈونیشن مل سکے۔ فخر کا ایک ڈاکٹر دوست سری لنکا میں ہے۔ شاید تمہیں پتا ہی ہو، سری لنکا میں آنکھوں کے بہت زیادہ عطیات دیئے جاتے ہیں۔ فخر پوری کوشش کر رہا ہے کہ بائی ٹرن یا آؤٹ آف ٹرن وہاں سے کوئی عطیہ مل سکے۔''

میں نے خورسنہ کو ہر طرح سے تسلی دی۔ وہ کچھ دیر چپ رہی پھر ذرا ڈرے لہجے میں بولی۔ ''شاہ زیب صاحب! آپ سے ایک اور بات بھی کرنا تھی۔ پلیز آپ ناراض نہ ہوئیے گا۔'' اس کے لہجے میں بے حد عاجزی تھی۔

''کہو خورسنہ میں سن رہا ہوں۔''

وہ نظریں جھکا کر کہنے لگی۔ ''ہر ہائی نس زینب کے پاس میرا پرانا فون نمبر تھا۔ کل رات انہوں نے جاما جی سے مجھے فون کیا۔ وہ بہت زیادہ پریشان ہیں کہ آپ سے رابطہ نہیں ہو پا رہا۔ انہوں نے مجھ سے قریباً روتے ہوئے کہا ہے کہ میں آپ کے لیے ان کا پیغام پہنچاؤں آپ کم ازکم ایک بار ان سے بات کر لیں۔''

اس رات میں نے اپنے پہلے والے نمبر سے زینب سے بات کی۔ اس نمبر پر قسطینا، ابراہیم، زینب اور پہلوان جی سمیت بہت سی کالز آئی ہوئی تھیں۔ ٹیکسٹ اور وائس میسجز بھی تھے جو میں نے نہیں دیکھے۔ زینب سے بات ہوئی تو وہ سچ مچ آبدیدہ ہو گئی۔ اس نے وہی شکوے کیے جو متوقع تھے۔ اسے یقیناً خورسنہ نے بھی یہ بتایا تھا کہ میں دس بارہ روز سے بے حد ''اپ سیٹ'' ہوں۔

وہ وجہ جاننا چاہ رہی تھی۔ میں نے کسی کو نہیں بتایا تھا، اسے کیسے بتا دیتا۔ میں نے کچھ ذاتی مسائل کا ذکر کیا لیکن وہ نہیں مانی، وہ بولی۔ ''شاہ زیب بھائی! مجھے بھابی خورسنہ نے بتایا ہے کہ آپ ایک روز بال کٹوانے اور شاپنگ کے لیے گھر سے نکلے تھے پھر کسی ارجنٹ کام سے سیالکوٹ کی طرف چلے گئے۔ وہاں سے تین چار روز بعد آئے۔ تب سے آپ بہت زیادہ پریشان ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ ہفتوں سے بیمار پڑے ہوئے ہیں۔''

میں نے زبردستی اپنے لہجے میں مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ دس بارہ روز

پہلے کی بات کر رہی ہو تم۔ اب میں کافی حد تک ٹھیک ہوں۔ آج بھی پوری پلیٹ بریانی کی دہی کے رائتے کے ساتھ کھائی ہے اور گاجر کا حلوہ بھی۔ بس کوئی ذاتی سا مسئلہ تھا۔ تمہیں پتا ہی ہے کہ ''دشمن داری'' میں ایسے معاملے چلتے ہی رہتے ہیں۔ اب یہ معاملہ کسی حد تک ''سیٹل'' ہو گیا ہے۔''

وہ ناراض لہجے میں بولی۔ ''میں آپ کو بہت اچھی طرح جان چکی ہوں۔ ایسے معاملوں سے گھبرانے والے آپ نہیں ہیں۔ یہ کوئی اور بات ہو گی۔ کہیں...... یہ...... تاجور والا کوئی مسئلہ تو نہیں ہے؟''

اس نے بالکل درست سوال کیا تھا مگر میں درست جواب نہیں دے سکتا تھا۔ میں نے کوشش کر کے اس کے اس حملے کو ٹالا...... اور کسی حد تک مطمئن کیا، وہ کہنے لگی۔ ''ادھر قسطینا بھی پریشان ہیں۔ آپ ان سے ایک دفعہ بات ضرور کر لیں۔ انہیں یہ بھی شک ہے کہ شاید انہوں نے آپ کے لیے جو ٹکٹیں وغیرہ بھیجی ہیں...... یہ آپ کو برا لگا ہے یا پھر ایسی ہی کوئی اور بات ہے۔''

''نہیں زینب! خدا گواہ ہے مجھے اس سے کوئی ناراضی نہیں ہے۔ میں نے کہا ہے ناں کہ میں اپنے ہی ایک معاملے میں الجھا ہوا ہوں۔''

وہ بولی۔ ''قسطینا آپ سے بہت محبت کرتی ہیں اور شاید اسی طرح جاما جی کے لوگ بھی کرتے ہیں۔ جب سے یہاں آپ کی آمد کی خبر ہے عام لوگ تقریباً ہر روز ڈی پیلس کے سامنے جمع ہوتے ہیں۔ اپنے اپنے انداز میں خوشی کا اظہار کرتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ آپ کو کب تک یہاں پہنچنا ہے۔''

میرے دل پر ایک تیر سا لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ شاید میں اب کبھی جاما جی نہ جا سکوں گا۔ میری اندرونی کیفیت کچھ عجب ہو چکی تھی۔ بہر حال میں یہ سب کچھ زینب سے تو نہیں کہہ سکتا تھا۔ میں نے کہا۔ ''پیاری زینب! ابھی جلد نہیں آ سکوں گا۔ بس دعا کرو کہ اپنے اس مسئلے سے نکل آؤں۔ اس کے بعد ہی کچھ سوچ سکوں گا۔''

وہ کچھ دیر چپ رہ کر کہنے لگی۔ ''لیکن پلیز بھائی! آپ ایک بار قسطینا سے تو بات کر لیں...... آج ہی کر لیں۔''

''ٹھیک ہے زینب! میں اس سے بات کرتا ہوں۔ تم بے فکر رہو...... کچھ دیر لگے گی...... مگر سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''پلیز آپ ان سے کوئی ایسی بات نہ کرنا جس سے ان کی پریشانی بڑھے۔ وہ آپ

کے آنے کے خیال سے بے حد خوش ہیں۔ ایک فوجی کمانڈر کی حیثیت سے انہیں نیوسٹی کے بارڈر کے پاس بہت سی زمین ملی ہوئی تھی۔ اس میں سے آدھی زمین انہوں نے جنگ میں بے گھر ہو جانے والے لوگوں کے لیے عطیہ کر دی ہے۔ وہاں کوئی کالونی وغیرہ بنے گی۔ میں اور ابراہیم اچھی طرح جانتے ہیں، یہ عطیہ اس اندر کی خوشی کا اظہار ہے جو قسطینا آپ کی آمد کے حوالے سے اپنے دل میں رکھتی ہیں۔ اگر وہ......''

''میں سب جانتا ہوں زینب۔'' میں نے قدرے بیزاری سے زینب کی بات کاٹی۔ ''میں نے کہا ہے ناں کہ میں اس سے تفصیل کے ساتھ بات کروں گا۔ تم خود کو پریشان نہ کرو تھوڑا وقت لگے گا......مگر......امید ہے کہ حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔''

اگلے روز میں کوشش کے باوجود قسطینا سے بات نہیں کر سکا مگر میں نے اس کو پرانے نمبر سے ایک طویل ٹیکسٹ میسج ضرور بھیج دیا۔

میں نے اسے لکھا کہ یہاں بھاؤ کی گمشدگی سنگین صورتِ حال اختیار کر گئی ہے۔ شکیل داراب کے قتل کے بعد سے سکیورٹی ہائی الرٹ ہے اور نقل و حرکت آسان نہیں۔ پھر بھی میں بھاؤ کا سراغ لگانے کی پوری کوشش کر رہا ہوں۔ معلوم نہیں کہ وہ کس حال میں ہے۔ زندہ بھی ہے یا نہیں۔ جب تک بھاؤ کی خیر خیریت کا پتا نہ چل جائے، میں کسی اور طرف توجہ نہیں دے سکتا...... میں نے ٹکٹیں بھیجنے پر اس کا شکریہ ادا کیا اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ ابھی میں جاماجی نہیں آسکوں گا۔ میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ فون پر بات چیت ممکن نہیں کیونکہ میں ایسی جگہ پر ہوں جہاں پر ایسا رابطہ میرے لیے مشکل پیدا کر سکتا ہے۔ قسطینا کو یہ میسج کرنے کے بعد میں نے یہ ''سم'' بند کر دی۔

○......❖......○

سیف کی بہن شازیہ ایک بڑے صدمے کے اثرات سے نکلنا شروع ہو گئی تھی۔ یہ بھی کہا جا رہا تھا کہ اس کا برسر روزگار دیور اسے بخوشی سہارا دینے کے لیے تیار ہے، عین ممکن ہے کہ کچھ عرصے بعد وہ ازدواجی بندھن میں بندھ جائیں۔ فخر اب بالکل نارمل تھا۔ فارس جان کی موت کے حوالے سے اس کے اندر جو احساس جرم موجود تھا، وہ ہم سب کی کوششوں سے بتدریج ختم ہو گیا تھا۔ میں فخر کو اکثر سجاول کے پاس بیٹھے دیکھتا۔ وہ سجاول کے ساتھ دل جوئی کی باتیں کرتا رہتا تھا۔ تاہم رضوان پرسوں سے مجھے کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ میں نے اس سلسلے میں فخر سے پوچھا تو اس نے بتایا۔ ''لاہور میں اس کے ایک بہت قریبی عزیز کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے، وہ اس کی خبر گیری کے لیے گیا ہے۔ تمہیں بتا کر جانا چاہتا تھا مگر تم تو

ٹرینکولائزر کی لمبی ڈوز لے کر پڑے ہوئے تھے۔"

مجھے ہلکا سا شک گزرا کہ شاید فخر کچھ چھپا رہا ہے مگر میں نے زیادہ کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔ میں نے صرف اتنا کہا کہ اسے باہر نکلتے ہوئے احتیاط کرنا چاہیے۔ ہم سب پنجاب پولیس کو بہت زیادہ مطلوب ہیں۔

تب مجھے ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ فخر کے مشورے کے ساتھ رضوان کتنے خطرناک کام پر نکلا ہوا ہے۔ اس کا پتا ایک روز بعد چلا جب رضوان لاہور سے واپس ایبٹ آباد پہنچا۔ اس کے چہرے پر دبا دبا جوش تھا۔ وہ اور فخر بند کمرے میں کچھ کھسر پھسر کرتے رہے پھر دونوں میرے پاس آ گئے۔

فخر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "شاہ زیب! رضوان نے بھاؤ کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کی ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ اہم معلومات اس کے کھوج میں مدد دے سکیں۔"

"کیا مطلب؟ تم تو کہتے تھے کہ یہ کسی دوست کی عیادت کے لیے......"

"غلط کہا تھا، تاکہ تم زیادہ پریشان نہ ہو جاؤ۔" فخر نے میری بات کاٹی۔ "ساری پریشانیوں اور مسئلوں کا ٹھیکا تم نے تو ہی نہیں لے رکھا۔ کچھ ہماری ذمے داری بھی بنتی ہے۔" فخر نے کہا۔

رضوان لاہور سے ایک یو ایس بی لایا تھا۔ میں یہ جان کر ششدر رہ گیا کہ اس یو ایس بی میں وہ سی سی ٹی وی ویڈیوز تھیں جن سے شکیل داراب کے قتل کی اصل صورتِ حال سامنے آتی تھی۔ یہ خاص الخاص فوٹیجز ایک اہم تفتیشی افسر کے پاس محفوظ تھیں اور اس کا اشارہ فخر اور رضوان کو ایک انگلش اخبار کی خبر سے ملا تھا۔ رضوان نے خود کو شدید خطرے میں ڈال کر براہِ راست اس تفتیشی افسر کو دبوچا تھا۔ یہ شیر کے منہ میں سے نوالہ چھیننے والی بات تھی اور رضوان ٹی اس میں کامیاب رہا تھا۔

ہم نے ایل سی ڈی پر یہ خفیہ فوٹیجز دیکھیں اور ششدر رہ گئے۔ وہ بیانیہ سراسر غلط ثابت ہو گیا کہ دو ڈبل کیبن گاڑیوں میں موجود دو درجن مسلح افراد نے ہلا بولا اور سخت مقابلے کے بعد شکیل داراب کو اغوا کر لیا۔ فوٹیجز میں ہر چیز بالکل واضح تھی اور یہ بھی واضح ہوتا تھا کہ بہت کم "فیلڈ" میں نکلنے والا داؤد بھاؤ جب ایک نر شیر کی طرح میدان میں نکلا تھا تو اس نے کیا تہلکہ مچایا تھا۔ اپنی بیٹی کی، پولیس حراست میں ہونے والی موت نے اسے سراپا قہر و غضب بنا دیا تھا۔ اس بات کی پروا کیے بغیر کہ اعلیٰ حکام کی طرف سے اسے پولیس

مقابلے میں مارنے کا حکم دیا جا چکا ہے، وہ دیوانہ وار ایک ہائی سیکیورٹی علاقے میں گھسا تھا اور اپنے نہایت ''ہائی ویلیو ٹارگٹ'' شکیل داراب کو مسلح محافظوں کے درمیان سے اچک لیا تھا۔ بھاؤ اکیلا تھا...... بالکل اکیلا۔

پہلی ویڈیو میں شکیل داراب کو اپنی رہائش گاہ کے سامنے جاگنگ کرتے ہوئے دیکھا جا سکتا تھا۔ وہ ٹریک سوٹ میں تھا۔ ہیڈ فونز لگا رکھے تھے۔ دو محافظ اس کے پیچھے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ اردگرد بھی گن بردار گارڈز نظر آتے تھے۔ یکا یک فائرنگ کی آوازیں سنائی دیں۔ فوٹیج میں دو گارڈز زخمی ہو کر گرتے دکھائی دیئے۔ باقی پناہ کی تلاش میں بھاگے۔ شکیل داراب بھی اوندھے منہ ٹریک پر گرا۔ صاف اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی ٹانگ میں کہیں گولی لگی ہے۔

تب ایک دوسرے سے زاویے سے حاصل ہونے والی فوٹیج نظر آئی۔ ایک ڈبل کیبن گاڑی آڑی ترچھی، درختوں میں رکی ہوئی تھی۔ اس میں صرف ایک شخص تھا اور وہ خود داؤد بھاؤ تھا۔ فائرنگ اسی گاڑی میں سے کی گئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ دروازہ کھول کر باہر نکلا اور جاگنگ ٹریک پر گرے ہوئے شکیل داراب کی طرف لپکا۔ اس کی لپک میں واقعی کسی ببر شیر کی سی جھلک تھی۔ شیر جو اشد ضرورت کے وقت ہی شکار کے لیے نکلتا ہے...... لیکن جب نکلتا ہے تو اس کا حملہ دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ شکیل کے ''بہادر اور جاں نثار گارڈ'' اس اچانک حملے کے نتیجے میں تتر بتر ہو چکے تھے۔ تاہم جب داؤد بھاؤ، شکیل کے سر پر پہنچا تو درختوں میں سے فقط تین گارڈز نکلے اور انہوں نے بھاؤ کو دبوچنا چاہا۔ درمیانی عمر کا بھاؤ اب بھی بلا کا حوصلہ رکھتا تھا۔ اس نے اپنی اے کے 47 رائفل سے ایک اور چھوٹا برسٹ چلایا۔ جواب میں بھی گولیاں چلیں۔ محسوس ہوا کہ ایک دو گولیاں داؤد بھاؤ کو بھی لگی ہیں۔ دس پندرہ سیکنڈ کے لیے بھاؤ اور گارڈز میں دست بدست لڑائی ہوئی...... جس کے دوران میں جاگنگ ٹریک پر رینگ کر نکلنے کی کوشش کرتا ہوا شکیل داراب صاف نظر آیا۔ بھاؤ نے دو گارڈز کو ڈھیر کر دیا، ایک سخت زخمی ہوا۔ بھاؤ نے زخمی شکیل داراب کو ٹانگ سے پکڑا اور گھاس پر گھسیٹتا ہوا ڈبل کیبن گاڑی تک لے آیا۔

بھاؤ کی دہاڑیں اور شکیل داراب کی ''بچاؤ بچاؤ'' کی آوازیں فوٹیج میں صاف سنی گئیں۔

بھاؤ خود بھی زخمی تھا، تاہم اس نے آناً فاناً شکیل کو ڈبل کیبن میں پھینکا اور گاڑی کو برق رفتاری سے موڑ کر آگے بڑھا دیا۔ اس موقع پر ایک بار پھر چند فائر ہوئے اور

''سیکیورٹی......سیکیورٹی'' کی حواس باختہ آوازیں سنائی دیں۔

تیسری فوٹیج زیادہ واضح نہیں تھی مگر اس میں ہونے والی کارروائی بھی بہ آسانی سمجھی جا سکتی تھی۔ یہ ایک بغلی سڑک کا منظر تھا۔ ڈبل کیبن سڑک سے اتر کر آڑی کھڑی تھی۔ چاروں اشارے چل رہے تھے۔ اسٹریٹ لائٹ کی روشنی میں پتا چلتا تھا کہ گاڑی کے اندر دو افراد گتھم گتھا ہیں۔ یقیناً یہ بھاؤ اور شکیل ہی تھے۔ چند سیکنڈ بعد گاڑی کا ایک اگلا دروازہ کھلا اور کسی نے جیسے لات مار کر ایک شخص کو باہر پھینک دیا۔ ٹریک سوٹ کی جھلک صاف نظر آئی۔ یہ شکیل داراب ہی تھا۔ گاڑی آناً فاناً آگے نکل گئی۔

''زبردست۔'' فخر نے فوٹیجز دیکھ کر کہا۔

''اور سفید جھوٹ بھی زبردست۔'' رضوان نے لقمہ دیا۔ ''اس جھڑپ میں نہ آپ نظر آئے ہیں، نہ شاہ زیب بھائی اور نہ ہی داؤد بھاؤ کے دو درجن ساتھی۔ ان خبیثوں نے اپنی بزدلی چھپانے کے لیے یہ ساری بکواس کی۔''

فخر نے کہا۔ ''لگتا یہی ہے کہ بھاؤ نے گاڑی کے اندر شکیل کو گن پوائنٹ پر رکھا ہوا تھا اور ایک ہاتھ سے ڈرائیو بھی کر رہا تھا۔ بھاؤ خود بھی زخمی تھا اس لیے شکیل نے ہمت کی اور گاڑی سے کودنا چاہا۔ دونوں میں ہاتھا پائی ہوئی اور بھاؤ نے طیش کے عالم میں چاقو کے پے در پے وار کر کے اس شیطان صفت کو چیر ڈالا۔''

شیطان صفت اور فرشتہ صورت...... میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ گورے چٹے خوبرو شکیل کو دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ یہ بہت لمبے ہاتھوں والا، بہت بارسوخ شخص اندر سے کتنا کالا اور بدصورت ہے۔ اس کے گناہ اور جرائم لاتعداد تھے......تاہم اس کا فقط ایک گناہ ہی اس کی موجودہ سزا کے لیے کافی تھا۔ اس عیاش نے اپنی محترم ٹیچر پر بھی ہوس کی نگاہ رکھی اور جونہی لڑکپن سے گزر کر وہ بالغ ہوا اس نے اُسے طلاق دلوائی اور شادی کے نام پر اسے اپنی دسترس میں لے آیا اور یہیں پر بس نہیں ہوئی، ٹیچر ناہید سے جی بھرنے کے بعد اس نے اس سے نگاہیں پھیر لیں اور اسے توہین آمیز انداز میں وظیفہ خوار کی سی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا۔

''کن خیالوں میں کھو گئے شاہی؟'' فخر کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔

''کچھ نہیں یونہی کوئی بات یاد آ گئی تھی۔''

رضوان ٹی خاموش بیٹھا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم نے مجھے بتائے بغیر بہت بڑا رسک لیا رضوان۔ اگر فوٹیج حاصل کرنے کی کوشش میں دھر لیے جاتے تو کیا

ہوتا؟ تمہیں ٹارچر کی چکی میں پیس کر وہ لوگ چند گھنٹوں میں یہاں ایبٹ آباد بھی پہنچ جاتے۔''

''اگر نوبت یہاں تک پہنچتی تو میں بھی آپ کو خدا حافظ کہہ دیتا۔'' رضوان نے اپنے پسٹل اور پھر اپنی کنپٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔ اس کے گلابی ہونٹوں پر ایک دلیر مسکراہٹ چمک رہی تھی۔

اس کے انداز نے مجھے متاثر کیا۔ آج کے رضوان ٹی اور ملنگی ڈیرے والے رضوان ٹی میں کتنا فرق تھا۔ وہ سائیکو ڈاکٹر ارم کے جنسی شکنجے میں پھنسا ہوا ایک بے بس نوجوان تھا۔ یہ خطروں کے سامنے سینہ چوڑا کر کے کھڑا ہو جانے والا ایک دلیر شخص تھا۔

فخر نے گفتگو کا رخ موڑتے ہوئے کہا۔ ''اس فوٹیج سے دو چیزیں واضح ہوتی ہیں۔ پہلی یہ کہ کارروائی کے دوران میں بھاؤ زخمی ہوا تھا اور کافی زخمی ہوا تھا۔ دوسری یہ کہ وہ تن تنہا تھا۔ لودھی بھی اس کے ساتھ نہیں تھا۔ کسی وقت تو مجھے لودھی کا کردار بھی کچھ مشکوک لگنے لگتا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ ہم اس اینگل سے تھوڑی سی چھان بین کریں۔ یہاں مری میں لودھی کا ایک ہوٹل ہے، جس کا کرایہ اسے باقاعدگی سے ملتا ہے۔ میں نے اور رضوان نے سوچا ہے کہ اس ہوٹل سے کسی باخبر بندے کو اٹھایا جائے اور ذرا طریقے کے ساتھ اس سے پوچھ گچھ کی جائے۔''

''لیکن میں اس کا مشورہ نہیں دوں گا۔ اس میں بھی خطرات موجود ہیں۔'' میں نے کہا۔

''یار! کچھ خطرات ہم کو بھی تو اٹھا لینے دو، کیا بھاؤ کا ہم پر کوئی حق نہیں ہے۔ تم ذرا اپنے آپ کو آرام دو اور اپنی طبیعت بحال کرو۔ اس دوران میں ہم یہ کام کرتے ہیں۔''

''یہ اندھیرے میں تلوار چلانے والی بات ہے فخر...... اگر اس ہوٹل سے پولیس کچھ حاصل نہیں کر سکی تو ہم کیسے کر سکیں گے۔''

میرے، فخر اور رضوان کے درمیان اس سلسلے میں طویل ڈسکشن ہوئی۔ بعض اوقات بندہ کسی کام کو انجام دینے کے لیے لمبی چوڑی پلاننگ میں مصروف ہوتا ہے اور حالات ایک دم پلٹا کھا جاتے ہیں۔ خورسنہ ہمیں چائے سرو کر رہی تھی جب اچانک فخر کے فون پر کال کا میوزک ابھرا۔ اس نے اسکرین پر نظر دوڑائی اور اس کے چہرے پر ہیجانی کیفیت نمودار ہوئی۔ میں نے بھی آگے جھک کر اسکرین دیکھی اور ششدر رہ گیا۔ یہ وہی کال تھی جس کا ہم ہفتوں سے شدت کے ساتھ انتظار کر رہے تھے۔ یہ داؤد بھاؤ کی کال تھی۔

میں نے بے قرار ہو کر فون، فخر سے جھپٹ لیا۔ ''ہیلو...... ہیلو۔'' میں نے کہا۔

دوسری طرف سے بھاؤ کے بجائے اس کے ''دست راست'' لودھی کی آواز آئی۔
''ہیلو شاہ زیب صاحب! میں لودھی بول رہا ہوں۔ دیر سے کوشش کررہا ہوں، آپ کا فون بند جارہا ہے۔''
''ہاں......کوئی مسئلہ تھا......لیکن......تم بتاؤ کہاں ہو، تمہیں اور بھاؤ جی کو فون کر کر کے ہلکان ہو گئے ہیں۔ بندۂ خدا! کم از کم کوئی اطلاع تو دینا تھی...... بھاؤ جی کہاں ہیں؟'' میں نے بے چین ہو کر پوچھا۔
''وہ بھی یہیں ہیں میرے پاس......ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔کل سے آپ کو یاد کررہے ہیں۔''
''انہیں فون دو...... مجھے آواز سناؤ ان کی۔'' میں نے قریباً چلا کر کہا۔
اس نے پہلے تو ٹالا پھر فون بھاؤ کے کان سے لگا دیا...... بھاؤ کی بہت بھاری اور بہت مدھم آواز سنائی دی۔ نقاہت میں ڈوبی ہوئی ایک جاں گسل سرگوشی جیسی ''شاہ زیب! کہاں ہو......میں تم سے......بات کرنا......چاہتا ہوں۔''
بھاؤ کی اس آواز نے مجھے جیسے لرزا دیا۔ فخر، رضوان اور خورسنہ کی کیفیت بھی مختلف نہیں تھی۔ میں نے کہا۔ ''بھاؤ! آپ ٹھیک نہیں لگ رہے، آپ......''
میری بات ادھوری رہی کیونکہ فون دوبارہ لودھی نے پکڑ لیا تھا۔ وہ بھرائی ہوئی بوجھل آواز میں بولا۔ ''بھاؤ جی کی حالت بہتر نہیں، آپ کہاں ہو؟ اور کتنی دیر میں پہنچ سکتے ہو؟'' وہ غالباً اب بھاؤ کے پاس سے ہٹ گیا تھا۔
مجھے پتا تھا کہ یہ بھاؤ کا خاص فون نمبر ہے۔ اس کو کسی بھی ذریعے سے ٹریس نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں نے کہا۔ ''میں ایبٹ آباد میں ہوں۔ ابھی نکل پڑوں گا مگر تین چار گھنٹے تو لگ ہی جائیں گے۔''
لودھی کا گمبھیر لہجہ سن کر میرا دل بیٹھ گیا، وہ بولا۔ ''تو پھر آپ نکل پڑیں۔''
اس کے ساتھ ہی اس نے مجھے اور رضوان کو اپنی مکمل لوکیشن سمجھا دی۔ یہ پنڈی کے مضافات میں کوئی پرائیویٹ کلینک تھا۔

O......❖......O

قریباً چار گھنٹے بعد میں، رضوان اور فخر پنڈی کے مضافات میں ایک نئی رہائشی سوسائٹی میں موجود تھے۔ یہاں ایک اعلیٰ درجے کا پرائیویٹ اسپتال تھا۔ یہ اسپتال ایک ایسے سینئر ڈاکٹر صاحب کا تھا جن کی زندگی کسی وقت بھاؤ کی وجہ سے بچی تھی۔ یہ شاداب احمد نامی

ڈاکٹر صاحب بھاؤ کے لیے جان بھی قربان کرنے کو تیار رہتے تھے۔ بھاؤ بڑی رازداری کے ساتھ اسی کلینک کے ایک الگ تھلگ اسپیشل کمرے میں زیرِ علاج تھا۔

بھاؤ کی پہلی جھلک دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ وہ علاج معالجے کی ساری ضرورتوں سے گزر چکا ہے۔ ہمارے سامنے بستر پر ایک کمزور اور زرد رنگ بھاؤ موجود تھا۔ اس کے منہ پر گیس ماسک تھا۔ اردگرد لائف کو سپورٹ کرنے والی مشینیں نظر آ رہی تھیں...... مگر ''لائف'' شاید موجود نہیں تھی...... اور اگر تھی تو نہ ہونے کے برابر۔

وارث لودھی ایک طرف آبدیدہ کھڑا تھا۔ ایک سینئر ڈاکٹر، بھاؤ کے ہاتھ میں لگے کینولا میں کوئی انجکشن دے رہا تھا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔ اس نے مایوسی میں سر ہلایا۔ بھاؤ ''کومے'' جیسی کیفیت میں تھا۔ میں اس کے بالکل قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے اس کا بالوں بھرا سرد ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھاما۔ ''بھاؤ جی...... بھاؤ جی۔'' میں نے تین چار مرتبہ سرگوشی کی۔

بھاؤ کے ہاتھ میں ایک بے ساختہ تھرتھراہٹ نمودار ہوئی۔ چند سیکنڈ بعد اس کی بند آنکھوں کے گوشوں میں ایک نمی سی چمکی۔ مجھے لگا کہ اس نے میری آواز سنی ہے۔ میں نے بھاؤ کے کان کے قریب دھیمے لہجے میں کچھ فقرے کہے۔ میں نے اسے بتایا کہ ہم آ گئے ہیں۔ اب ہم یہیں موجود ہیں...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔

اپنے فقرے خود مجھے بھی کھوکھلے محسوس ہو رہے تھے۔ ہمارے پہنچنے کے قریباً دو گھنٹے بعد بھاؤ کے سانس کی ڈور ٹوٹ گئی۔ ایک زمانہ اس کے نام سے کانپتا تھا تو بے شمار لوگ اس کے پرستار بھی تھے۔ اس نے اچھے برے ہر طرح کے کام کیے تھے...... اس نے ایک طویل عرصے تک قانون، اور پولیس کے ساتھ ایک سنگین نوعیت کی آنکھ مچولی کھیلی تھی۔ وہ بڑے فخر سے کہا کرتا تھا کہ اپنے اس سارے تہلکہ خیز کیریئر کے دوران میں اس کو فقط چند روز جیل میں گزارنے پڑے ہیں۔ وہ اپنے آخری دنوں تک پولیس اور قانون کے ہتھے نہیں چڑھا تھا اور اب ویسے ہی وہ ان کی پہنچ سے بہت دور چلا گیا تھا۔

اسپتال کے ہی ایک کمرے میں ڈاکٹر شاداب، وارث لودھی اور ہم تینوں سوگوار بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر شاداب نے بتایا۔ ''بھاؤ قریباً ڈھائی ماہ پہلے سخت زخمی حالت میں مجھ تک پہنچے تھے۔ ان کو تین گولیاں لگی تھیں۔ ایک ٹانگ میں اور دو پیٹ میں۔ پیٹ میں لگنے والی دو گولیوں نے اندرونی عضلات کو خاصا نقصان پہنچایا تھا اور آخر میں یہی ان کی موت کا سبب بنیں۔''

لودھی اشک بار آواز میں بولا۔ ''بھاؤ نے بڑی جرأت سے اپنی اس تکلیف کا مقابلہ کیا ہے۔ جب تک ان میں ہمت رہی خود اٹھتے بیٹھتے رہے اور خود چل کر واش روم میں جاتے رہے۔ رات کو پہروں تک خاموشی سے تکلیف برداشت کرتے رہتے تھے مگر بتاتے نہیں تھے کہ مجھے یا کسی اور کو بے آرامی نہ ہو۔''

ڈاکٹر شاداب نے بتایا۔ ''ان کے لیور کو سخت نقصان پہنچا تھا۔ بہت کوشش کے باوجود ہم اس نقصان کا ازالہ نہیں کر سکے۔ انسان کی تو بس کوشش ہی ہوتی ہے۔''

میری نگاہوں میں ایک بار پھر وہ منظر گھوم گیا جب داؤد بھاؤ، ڈبل کیبن گاڑی میں سے نکل کر شکیل داراب جیسے ہائی فائی ٹارگٹ پر جھپٹا تھا۔ اس نے درجنوں محافظوں میں گھرے ہوئے اس طاقتور شخص کو سیکنڈوں میں بے دست و پا کر ڈالا تھا۔

اگلے روز اسپتال کے ہی بیسمنٹ میں ہم نے خاموشی سے نماز جنازہ ادا کی۔ بھاؤ کی مرحوم بیٹی کا خاوند وہاں موجود تھا۔ بھاؤ کی تدفین وغیرہ کا انتظام اسی نے ہی کر رکھا تھا۔ وہ اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ بھاؤ کو بند گاڑی میں لے کر ہری پور کی طرف روانہ ہو گیا۔

شام کو ڈاکٹر شاداب نے مجھے اپنے آفس میں بلایا۔ وہ دبنگ طبیعت کے مالک ایک لحیم شحیم آدمی تھے، بولے۔ ''مسٹر شاہ زیب! داؤد بھاؤ آپ کے لیے کچھ دے گئے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ میں یہ چیز آپ ہی کو ہینڈ اوور کروں۔''

انہوں نے ایک ڈبیا نما میڈیکل کنٹینر مجھے دیا۔ میرے اندازے کے مطابق اس میں کوئی خاص اینٹی بائیوٹک محلول تھا۔

''یہ کیا ہے ڈاکٹر صاحب؟''

''یہ داؤد بھاؤ کی آنکھوں کا عطیہ ہے...... کسی سجاول نام کے بندے کے لیے۔''

میں سناٹے میں رہ گیا۔ ڈاکٹر صاحب بغور میرا چہرہ دیکھتے رہے۔ پھر بولے۔ ''شاید آپ کو معلوم ہی ہوگا...... مسٹر سجاول کے سارے ٹیسٹ اور میچنگ رپورٹس وغیرہ داؤد بھاؤ ہی کے پاس تھیں۔ جب یہ سجاول لاہور میں تھا تو بھاؤ اس کی آنکھوں کا علاج کراتے رہے تھے۔''

''جی ہاں۔'' میں نے جیسے چونک کر کہا۔

مجھے سب یاد تھا، جب ہم ڈی ایس پی قیصر چوہدری کی موت کے بعد کلر کہار کی طرف چلے گئے تھے تو سجاول مکمل طور پر بھاؤ کے سپرد ہی تھا۔ ڈاکٹر شاداب کی آواز میرے کانوں میں گونجی۔ ''بھاؤ کی یہ ڈونیشن بالکل میچنگ ہے۔ آپ جلد سے جلد آپریشن کا انتظام کرا

لیں۔''

شاید اسی کو گردشِ زمانہ کہتے ہیں...... اور شاید یہی حالات کی نیرنگی ہوتی ہے۔ ایک وقت تھا جب انیق کی موت کے بعد بھاؤ، سجاول کا جانی دشمن بن گیا تھا۔ وہ سجاول کو انیق کا قاتل سمجھتا تھا مگر اسی بھاؤ نے مرتے مرتے سجاول کو اپنی آنکھوں کی روشنی دے دی تھی۔

○......❖......○

اگلے دو ہفتے میں دو تین کام بڑی تیزی سے ہوئے۔ پہلا تو یہ کہ پنڈی میں ڈاکٹر شاداب کے ہی اسپتال میں بڑی رازداری سے سجاول کی آنکھوں کا آپریشن ہوا...... اور اس کی بصارت اسے واپس مل گئی۔ وہ ایک دیدنی منظر تھا جب اسپتال کے ایک کمرے میں اس نے خورسنہ کو اور ہم سب کو دیکھا۔ اس موقع پر جو جذباتی باتیں ہوئیں، وہ تاعمر یادر ہنے والی تھیں۔ خورسنہ کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھمنے میں نہیں آرہے تھے۔

اس یادگار واقعے کے تین چار روز بعد پہلوان حشمت سے بھی ملاقات ہوگئی۔ انہوں نے سجاول ہی کو فون کر کے میرا کھوج لگایا تھا اور پنڈی کے اس پرائیویٹ اسپتال تک آپہنچے تھے۔ وہ پہلے سے کافی کمزور نظر آرہے تھے۔ لباس بھی خستہ حال تھا اور شاید یہ وہی لباس تھا جو ریستوران میں ملاقات کے موقع پر انہوں نے پہن رکھا تھا۔ وہ دیر تک میرے گلے لگے رہے۔ میں نے ان سے معافی مانگی کہ میں اس روز انہیں اس طرح ریستوران میں چھوڑ کر وہاں سے نکل آیا تھا۔ پہلوان جی نے مجھے پاکستان کے ایک معروف خیراتی ادارے کی رسید دکھائی اور بتایا کہ تاجور کے لیے خریدا گیا جو زیوران کے پاس پڑا تھا، وہ انہوں نے ادارے میں دے دیا ہے۔ ان کا لہجہ بوجھل تھا۔ میں نے کہا۔ ''جیسے آپ کی مرضی۔ آپ نے جو کیا ٹھیک کیا ہے۔''

ہم بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ ان دنوں عیدالفطر کی آمد آمد تھی۔ بے شک یہ اسپتال تھا پھر بھی یہاں عید کے مدھم رنگ محسوس کیے جاسکتے تھے۔ راولپنڈی شہر میں بھی عید کی آمد والی کیفیت موجود تھی۔ لیکن تہواروں کی خوشی تو دلوں کے اطمینان سے مشروط ہوتی ہے۔ جب اندر خزاں کا موسم ہو تو سب کچھ اجڑا اجڑا ہی دکھائی دیتا ہے۔ ہم اسپتال کے رہائشی پورشن کے دو کمروں میں مقیم تھے۔ رات کو بھی میرے اور پہلوان جی کے درمیان بات ہوتی رہی۔ ایک موقع پر وہ افسردہ لہجے میں بولے۔ ''شاہ زیب میری معلومات کے مطابق تاجور کی شادی اس کے ماموں زاد شفیق سے ہو چکی ہے۔ اب وہ لوگ نارووال یا سیالکوٹ میں ہی کہیں رہ رہے ہیں۔ یہ شادی تاجور کی رضامندی سے ہی ہوئی ہے۔ وہ شاید اب پلٹ کر

دیکھنا نہیں چاہتی ہے۔ میں نے یہ بھی سنا ہے کہ گاؤں میں اس کی اور اس کے بھائیوں کی جو تھوڑی بہت زمین ہے، وہ بھی بیچی جا رہی ہے۔''

''اس کی شادی کے بارے میں مجھے معلوم ہو چکا ہے چاچا حشمت۔'' میں نے بوجھل لہجے میں کہا۔

پہلوان حیران ہوئے۔ کچھ دیر گم صم رہے پھر رقت آمیز لہجے میں کہنے لگے۔ ''شاہ زیب! ہمارا تمہارا دیر کا ساتھ ہے۔ میں نے آج تک تم سے کچھ ناہیں مانگا۔ آج تم سے کچھ مانگنا چاہت ہوں۔''

''آپ کہیں چاچا حشمت۔''

''شاہ زیب! اب تاجور کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ وہ جیسے جینا چاہتی ہے اس کو جی لینے دو۔''

پہلوان جی کو معلوم نہیں تھا کہ میں اسے اس کے حال پر چھوڑ چکا ہوں۔

ایک توقف کے بعد میں نے ان کا سرد ہاتھ تھام کر ٹھہرے لہجے میں کہا۔ ''ایسا ہی ہوگا چاچا حشمت...... لیکن...... میں نے بھی آج تک آپ سے کچھ نہیں مانگا۔ آج کچھ مانگتا ہوں۔ آپ انکار نہ کرنا۔''

انہوں نے چونک کر میری طرف دیکھا اور بولے۔ ''کیا کہنا چاہت ہو؟''

''آپ مانیں گے ناں؟''

وہ کچھ دیر خاموش رہ کر بولے۔ ''ہاں...... مانوں گا۔''

''آپ کو کل بتاؤں گا۔ ہم کو کہیں جانا ہے۔''

اگلے روز میں اور پہلوان قریباً تین گھنٹے کا تیز رفتار سفر کر کے راولپنڈی سے گجرات کے نواح میں پہنچ چکے تھے۔ اب پہلوان اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ میں کیا کرنے جا رہا ہوں۔ میں اس گاؤں جا رہا تھا جہاں ایک طویل عرصے سے پہلوان جی کی شریکِ حیات اپنے چار بچوں سمیت روٹھی بیٹھی تھی۔ پہلوان جی بالکل گم صم تھے۔ کسی وقت ان کی پیشانی پر پسینا چمکنے لگتا تھا جسے وہ اپنے کندھے پر رکھے رومال سے پونچھتے تھے۔ ایک دو بار تو مجھے یوں لگا کہ وہ مجھے کار روکنے کا کہیں گے اور یک دم نیچے اتر جائیں گے۔ اس طرح کی گمبھیر صورتِ حال میں، میں نے انہیں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ شاید ان کے شوہرانہ وقار اور انا کو ٹھیس پہنچ رہی تھی۔

بالآخر ہم گاؤں کے نواح میں پہنچ گئے۔ یہاں سے پختہ سڑک چھوڑ کر ہمیں دو تین

میل نیم پختہ راستے پر سفر کرنا تھا۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا۔ اگلے روز عید تھی۔ بسوں اور ویگنوں وغیرہ پر مسافروں کا بے تحاشا رش تھا۔ ایک اسٹاپ پر لوگوں کا ہجوم نظر آرہا تھا۔ پہلوان کی نگاہ ہجوم پر پڑی اور میں نے انہیں بری طرح چونکتے دیکھا۔

''کیا ہوا؟'' میں نے پہلوان کی نظر کا تعاقب کیا۔

''وہ...... وہ دیکھو...... وہ نصرت ہے۔'' انہوں نے انگلی سے ایک طرف اشارہ کیا۔

میں نے دیکھا درمیانی عمر کی ایک دراز قد عورت چادر میں لپٹی، چار عدد چھوٹے بڑے بچوں کے ساتھ بس کے انتظار میں کھڑی تھی۔ دو اٹیچی کیس بھی ان کے قریب دکھائی دے رہے تھے۔

''آپ کی بیوی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں...... پر یہ کہاں جاوت ہے؟''

اسی دوران میں ایک نسبتاً خالی بس اس اسٹاپ پر رکی۔ اس سے پہلے کہ عورت بچوں سمیت تیزی سے بس میں سوار ہوتی، میں کار سے نکل آیا۔ میں نے جا کر عورت اور بچوں کو روکا۔ درمیانی شکل وصورت والی چونتیس پینتیس سالہ عورت تعجب سے میری جانب دیکھنے لگی۔ اس کا لباس معمولی تھا اور اس کی ستواں ناک میں چاندی کا کوکا چمک رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ''آپ پریشان نہ ہوں...... آپ سے کوئی ملنے آیا ہے۔''

''کون؟'' عورت نے آدھے گھونگھٹ کی اوٹ سے پوچھا۔

میں نے گاڑی کی طرف اشارہ کیا۔ وہاں پہلوان جی کو دیکھ کر خاتون سکتہ زدہ ہوگئی۔ بچے بھی حیران نظر آئے۔

میں پہلوان جی کو گاڑی سے باہر نکال لایا۔ اگلا منظر قابل دید تھا۔ بچے پہلوان جی سے لپٹ گئے۔ بڑا بچہ کوئی گیارہ بارہ سال کا تھا۔ سب سے چھوٹی بچی تھی۔ اس کی عمر تین چار سال ہوگی۔ بالکل پہلوان جی کی طرح گول مٹول تھی۔ پہلوان جی بھی آبدیدہ ہوگئے۔

بڑے بچے نے کہا۔ ''ابا جی! ہم بھی آپ کے پاس ہی جا رہے تھے۔''

یہ ایک حیران کن انکشاف تھا۔ خاتون نے چہرہ چادر کی اوٹ میں کر لیا تھا۔ تاہم چادر کی مسلسل لرزش بتا رہی تھی کہ وہ بھی رو رہی ہے۔ پہلوان جی نے بہتی آنکھوں کے ساتھ بچوں کے منہ چومے۔ پھر وہیں زمین پر بیٹھ کر چھوٹی بچی کو گلے سے لگایا اور سسکیوں سے رونے لگے۔

ضد اور جھوٹی انا کے بت...... دونوں طرف...... ٹوٹ چکے تھے۔

سچ کہتے ہیں کہ قدم اٹھانے سے ہی فاصلے طے ہوتے ہیں...... اور جب آگے بڑھیں تو سنگلاخ دیواروں میں بھی در نمودار ہو جاتے ہیں...... قدرت کو رحم آنے لگتا ہے۔

○......❖......○

پہلوان جی اور بچوں نے عید وہیں گاؤں میں ہی منانے کا فیصلہ کیا...... وہ مجھ سمیت گاؤں میں رک گئے۔ پہلوان جی کا سسرالی گھر نیچی چھتوں والے دو تین نیم پختہ کمروں پر مشتمل تھا۔ اس فیملی کے لیے وہ چاند رات بڑی خوش کن تھی۔ رات کو کھانے کے بعد گاڑھے دودھ اور زیادہ چینی والی دودھ پتی پیتے ہوئے پہلوان نے سوالیہ نظروں سے میرے ہاتھ کی جانب دیکھا۔

میرے ہاتھ میں ایک کاغذ نظر آ رہا تھا۔ یہ وہی سادہ چیک تھا جو کئی ماہ پہلے تاجور کے خاوند دارج داراب نے مجھے دیا تھا اور کہا تھا کہ میں جو چاہوں اس پر بھر لوں۔ یہ آج تک سادہ ہی تھا مگر آج میں نے اس پر ایک معقول رقم بھری تھی۔

میں نے چیک پہلوان کی طرف بڑھایا تو وہ بولے۔ ''یہ کیا ہے؟''

میں جانتا تھا کہ کوئی بھی غلط جواب پہلوان حشمت کو ہتھے سے اکھاڑ سکتا ہے۔ پہلوان حشمت میں خودداری اور انا بدرجۂ اتم موجود تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو مشکل ترین حالات میں...... بلکہ آخری دم تک بھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتے۔ امداد قبول کرنا تو دور کی بات ہے، پہلوان کو اس کا ذکر سننا بھی پسند نہیں تھا۔

میں نے کہا۔ ''چاچا حشمت! یہ آپ کی محنت اور کاوش کا صلہ ہے۔''

''کون سی محنت؟''

''وہ محنت جو آپ نے کی...... اور ایسے وقت پر کی جب ہم سب تقریباً بے بس ہو چکے تھے۔ آپ کی جرأت نے ایک بہت بڑے مجرم کو گھٹنوں پر لا پھینکا۔ دارج داراب نے کہا تھا کہ اس کی ماں کے قاتل کو موت کے گھاٹ اتارنے والا اس سادہ چیک پر جو چاہے بھر سکتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کے اصل حق دار آپ ہیں۔''

پہلوان حیران نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ یقیناً ان کی نگاہوں کے سامنے بھی روم کے مضافات کی وہ ''فلم'' چل گئی تھی جب جان ڈیرک، کھاد کی فیکٹری سے نکل کر بھاگا تھا۔ وہ ہماری زد سے نکلنے والا تھا جب پہلوان جی نے بے خوفی سے ٹرک اس کی جیپ پر چڑھا دیا تھا۔

''تیس لاکھ؟'' پہلوان جی نے چیک دیکھ کر بے پناہ حیرت سے کہا۔

''اس کام کے مقابلے میں یہ بھی بہت کم ہے چاچا حشمت، بہت ہی کم۔''
پہلوان جی بہت کچھ کہنا چاہ رہے تھے تاہم میں نے انہیں خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔

تیسرے روز جب یہ چیک کیش ہو گیا تو مجھے یوں لگا جیسے پہلوان جی کی مالی حالت کے حوالے سے ایک بڑا بوجھ میرے سر سے اتر گیا ہے۔ اس روز مجھے واپس ایبٹ آباد جانا تھا۔ پہلوان جی سے وداع ہوتے وقت میں ان سے گلے ملا۔ وہ سخت جذباتی ہو رہے تھے۔ میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بولے۔ ''شاہ زیب! جہاں اتنی باتیں مانی ہیں ایک بات اور مان لو...... تم...... قسطینا سے...... شادی کر لینا۔''

میں نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ دے ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ یہ جواب نفی میں تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرا دل مرد و زن کے تعلق سے ہی اچاٹ ہو چکا ہے۔ میرے لیے اب یہ سب کچھ ماضی کا حصہ تھا۔

○......❖......○

شکیل داراب کی موت کے اثرات ابھی تک موجود تھے۔ ہماری اطلاعات کے مطابق کئی تفتیشی ٹیمیں ملک کے مختلف حصوں میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس صورتِ حال میں ہمارا علیحدہ ہو جانا ہی مناسب تھا۔ سجاول، خورسنہ، چھوٹے ذیشان اور ولید کے لیے ڈاکٹر شاداب نے ہی باجوڑ ایجنسی میں ایک محفوظ پناہ گاہ کا انتظام کر دیا تھا۔ رضوان نے فخر کے ساتھ ہی کراچی جانے کا پروگرام بنا لیا۔ وہ بحری راستے سے مسقط جانا چاہ رہے تھے۔ اس سلسلے میں فخر کا ایک راک اسٹار دوست اس کی مدد کر رہا تھا۔ میں نے بھی ان کے ساتھ ہی نکلنے کا پلان بنا لیا۔

قصہ مختصر ہم ایک شاندار لانچ کے ذریعے بڑی سہولت کے ساتھ مسقط پہنچے۔ وہاں چند روزہ قیام کے دوران میں، میں نے اپنے نئے سفری کاغذات تیار کرائے اور کوپن ہیگن جانے کی تیاری کرنے لگا۔ میں ان فضاؤں سے، اس ماحول سے بہت دور چلے جانا چاہتا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ میں پاکستان میں یا پاکستان کے آس پاس رہا تو میرا دم گھٹنا شروع ہو جائے گا۔ اس کی وجہ کیا تھی؟ اس کی وجہ وہی تھی جس نے مجھے ہر قدم پر ٹھیس پہنچائی تھی اور زخم دیئے تھے۔ میں اکثر سوچتا تھا کہ دارجی سے آزاد ہونے کے بعد تاجور کے لیے صورتِ حال کتنی آسان اور سازگار ہو چکی تھی۔ پہلوان حشمت نے اسے مجبور کیا تھا کہ وہ کم از کم ایک بار مجھے فون کر کے ساری سچویشن بتا دے۔ وہ فون لے کر بیٹھی رہی تھی مگر مجھ سے رابطہ

نہیں کر پائی تھی۔ اگر وہ کر لیتی تو سارا منظر نامہ ہی تبدیل ہو جاتا...... وہ کیوں تھی ایسی؟ آخر عورتیں ایسی کیوں ہوتی ہیں۔ شاید اسی لیے انہیں پہیلیوں سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگتا تھا کہ ایک عورت کی وجہ سے محبت اور مرد و زن کے خوب صورت تعلق سے میرا دل اچاٹ ہو گیا ہے۔ تاجور کے رویے کے حوالے سے میرے دل میں رنج و غم تو بہت تھا مگر کسی وقت ایک ایسا خیال بھی آتا تھا جس کے سبب یہ تکلیف کچھ کم محسوس ہوتی تھی۔ مجھ سے دور جانے کے بعد اگر وہ چاہتی تو کسی بہت اچھی جگہ بھی شادی کر سکتی تھی۔ جاماجی میں اس کی خوب صورتی کا چرچا ایک خاص انداز میں ہوا تھا۔ صحافی مائیکل کی وجہ سے اس کی کچھ دلکش تصویریں انٹرنیشنل رسائل میں شائع ہوئی تھیں۔ اسے ایک خاص قسم کی دیہی دلکشی کی مالک قرار دیا گیا تھا......اور تو اور اگر وہ چاہتی تو شاید کروڑ پتی صحافی مائیکل بھی اسے بخوشی اپنی شریکِ حیات بنا لیتا۔ مگر اس نے ایک عام دکاندار، کپڑا فروش شفیق کو شریکِ حیات بنایا تھا......اور اپنے اس حال پر پوری طرح مطمئن تھی۔ ہاں وہ ایک پہیلی ہی تھی۔

قسطینا کو نہ جانے کس طرح میرے نئے موبائل نمبر کا علم ہو گیا تھا۔ مسقط میں مجھے اس کی کئی کالز آئیں جو میں نے اٹینڈ نہیں کیں۔ پھر اس نے کئی ٹیکسٹ میسج بھیجے۔ وہ کوئی ٹین ایجر لڑکی نہیں تھی۔ کم عمر ہونے کے باوجود اس نے دنیا کا بہت سرد و گرم دیکھا تھا بلکہ کسی وقت یہ بات ناقابلِ یقین لگتی تھی کہ وہ ایک آرمی کو ہیڈ کر رہی ہے......وہ چاہتی تھی کہ جو بھی صورتِ حال ہے وہ اس کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہے، میں صرف ایک بار اس سے تفصیلی بات کر لوں۔

اور پھر ایک دن یہ بات ہو ہی گئی۔ غالباً بات شروع کرنے سے پہلے ہی قسطینا کو پچاس ساٹھ فیصد یقین ہو چکا تھا کہ پُلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر گیا ہے......اور میں اب وہ نہیں رہا جو اس کے جاماجی لوٹنے سے پہلے تھا اور جس نے اس کے پیچھے جاماجی آنے کی حامی بھری تھی۔

ہماری گفتگو نرم لب و لہجے کے ساتھ شروع ہوئی اور پھر سنجیدہ تر ہوتی گئی۔ قسطینا بولی۔ ''شاہ زائب! میں کوئی بچی نہیں ہوں جسے بہلانے کی کوشش کرو گے۔ میں کسی لاحاصل انتظار میں مبتلا ہونا نہیں چاہتی۔ مجھے صاف لفظوں میں بتا دو کہ تم اب یہاں جاماجی آنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔''

میں نے چند سیکنڈ خاموش رہنے کے بعد گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''شاید نہیں۔''

دوسری طرف سناٹا سا چھا گیا۔ پھر قسطینا نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ ''ایک دن میں

نے تمہارے سامنے ان سارے خدشات کا ذکر کر دیا تھا جو میرے اور تمہارے تعلق کے حوالے سے سامنے آسکتے تھے۔ تم نے سب کچھ سنا تھا اور کہا تھا کہ میں نے یہ سب کچھ سن اور سمجھ لیا ہے...... اور میں اب بھی تمہیں پروپوز کررہا ہوں۔ مجھے تمہارا جواب سننے کی بہت جلدی ہے، میں آج ہی تمہارا جواب چاہتا ہوں۔ یہ سب تم نے ہی کہا تھا ناں؟''

''ہاں قسطینا! یہ میں نے کہا تھا۔''

''تو پھر...... آج وہ سب کچھ بھی ختم ہو گیا؟''

میں خاموش رہا۔ خاموشی طویل ہوتی گئی۔

اس کی بھرائی ہوئی آواز ابھری۔ ''میں سمجھ گئی، وہ سب کچھ ختم ہو گیا...... چلو کوئی بات نہیں شاہ زائب! میں خود کو سمجھا لوں گی اور وہ سب لوگ بھی، جو دیوانوں کی طرح تمہارا انتظار کررہے تھے، سمجھ جائیں گے کہ جس کا انتظار تھا، اس کو اب نہیں آنا۔'' اس کے ساتھ ہی فون بند ہو گیا۔

میں کتنی ہی دیر ساکت و جامد اپنی جگہ بیٹھا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ کچھ معاملوں میں بالکل بے بس ہو کررہ گیا ہوں۔

اس فون کے چھ سات روز بعد ابراہیم سے میری بات ہوئی۔ اس نے بجھے ہوئے لہجے میں مجھے بتایا کہ احمد ثانی اور قسطینا کے رشتے کی بات ایک بار پھر چل پڑی ہے اور اس بار برونائی کی شاہی فیملی کے کچھ ممبر بھی اس سلسلے میں کردار ادا کررہے ہیں۔ لگتا ہے کہ اس بار یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گا۔

ابراہیم افسردہ تھا۔ شاید وہ اس حوالے سے کچھ اور باتیں بھی شیئر کرنا چاہتا ہو گا مگر میں نے گفتگو کا رخ نیوسٹی کے ادغام اور وہاں کے حالات کی طرف موڑ دیا۔

○......❖......○

زندگی کا پہیا سدا حرکت میں رہتا ہے۔ راستے کتنے بھی ناہموار ہوں، منزلیں کتنی بھی بے نشاں ہوں، یہ گاڑی تو چلتی ہی رہتی ہے۔ پچھلے ایک ڈیڑھ سال میں میری زندگی کی گاڑی بھی کسی نہ کسی طور چلتی ہی رہی ہے۔ رات اور دن ایک دوسرے کا پیچھا کرتے رہے ہیں...... شامیں اور صبحیں اپنے اپنے وقت پر نمودار ہو کر وقت کے پہیے کو آگے دھکیلتی رہی ہیں۔ میں بہت بدل چکا ہوں...... بہت زیادہ...... کبھی کبھی تو حال اور ماضی کے شاہ زیب میں زمین آسمان کا فرق محسوس ہوتا ہے۔

آج سنڈے تھا۔ میں صبح سویرے ہی اٹھ گیا۔ حسبِ معمول ورزش کی پھر برآمدے

میں آ گیا۔ یہاں ایک اسٹائلش سا استری اسٹینڈ بڑے قرینے سے رکھا گیا تھا۔ میں نے خود ہی اپنے کپڑے استری کیے۔ باتھ روم میں جا کر شاور لیا اور سلیپنگ سوٹ کی جگہ پینٹ شرٹ پہن لی۔ کچن میں آ کر میں نے خود ہی ناشتا تیار کیا اور الیکٹرک کیتلی پر چائے کا پانی گرم کرنے لگا۔

کچن کی کھڑکی سے باہر سمندر نظر آتا ہے۔ وہی سمندر جس کے شمال مغربی کنارے پر کہیں پاکستان ہے اور تاجور آباد ہے۔ میری معلومات کے مطابق وہ ایک اچھی ازدواجی زندگی بسر کر رہی ہے۔ رضوان اور فخر انگلینڈ میں ہیں۔ فخر نے وہاں ایک اعلیٰ پائے کی سیکیورٹی ایجنسی ڈویلپ کر لی ہے۔ رضوان بھی اس کے ساتھ ہے۔ اپنی وجاہت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے رضوان نے وہاں کچھ ماڈلنگ بھی کی ہے۔ سجاول اور خورسنہ کابل میں کہیں موجود ہیں۔ ڈاکٹر شاداب کی ایک ای میل کے مطابق سجاول ایک پیاری بچی کا باپ بن گیا ہے اور آج کل اسلحے کے قانونی اور جائز کاروبار کے ذریعے رزقِ حلال کما رہا ہے۔ قسطینا جاماجی میں ہے۔ وہ بھی ایک بچے کی ماں بن چکی ہے...... لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ یہ میرا ہی بچہ ہے...... جی ہاں...... میری اور قسطینا کی شادی ہو چکی ہے...... وہ بڑی انوکھی لڑکی ثابت ہوئی ہے۔ وہ ہر لحاظ سے انوکھی ہے...... ایک فوجی کمانڈر ہے، پھر بھی گھر کے سارے امور انجام دینا اسے اچھا لگتا ہے۔ کچن بھی خود سنبھالتی ہے۔ آج چونکہ چھٹی کا دن تھا اس لیے میں نے اس کے جاگنے سے پہلے ناشتا تیار کرنے کا شوق پورا کیا ہے۔

''کہاں ہو شاہ زائب؟'' اس کی آواز نے مجھے چونکایا۔

وہ سیدھی کچن میں چلی آئی۔ نہا دھو کر نکلی تھی اور معمول سے زیادہ نکھری نظر آ رہی تھی۔ اس کے خوب صورت بال پہلے کی طرح ڈیانا کٹ ہیں۔

''کیا کر رہے ہو ڈیئر؟'' اس نے کہا۔

''شاید تم بھول رہی ہو، آج سنڈے ہے اور سنڈے کے دن تم نے مجھے ناشتا بنانے کی اجازت دے رکھی ہے۔''

''تم ضد کے بڑے پکے ہو۔'' اس نے میری چھاتی پر کھٹاک سے مکا رسید کیا۔

''پکی تو تم بھی بہت ہو قسطینا۔'' میں نے کہا۔ اس نے مجھے گھورا اور اپنے نم بالوں کو ڈرائی کرنے کے لیے ڈریسنگ روم کی طرف چلی گئی۔

میں کچن سے نکل کر وسیع و عریض کامن روم میں آن بیٹھا اور چینے لگا۔ یہ سب کیسے ہوا تھا؟ ابھی تک یقین نہیں آتا تھا۔ قریباً ڈیڑھ برس پہلے کے وہ مناظر مجھے آج تک یاد

تھے۔ تب قسطینا سے آخری ٹیلی فونک گفتگو کو ڈھائی تین ہفتے ہوئے تھے، میں مسقط میں ہی تھا اور یورپ جانے کے لیے اپنے سفری کاغذات تیار کرا رہا تھا۔ ایک رات، فخر اور رضوان بازار گئے ہوئے تھے (پاکستان سے بہ خیریت نکل کر وہ خود کو کافی ایزی محسوس کر رہے تھے) میں کمرے میں اکیلا بیٹھا ٹی وی پر نیوز دیکھ رہا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا گھر تھا۔ پاس ہی سے سڑک گزرتی تھی۔ اچانک کمرے کا دروازہ دھماکے سے کھلا اور میں قسطینا کو اپنے سامنے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ پینٹ شرٹ میں تھی۔ اوپر سے ایک بڑی شال لپیٹ رکھی تھی۔ یقین نہیں آیا کہ وہ جاماجی سے چل کر مسقط آن پہنچی ہے اور رات کو اس وقت میرے سامنے کھڑی ہے۔ اس کے تاثرات بڑے ہیجانی تھے۔ آنکھوں میں ایک آتشیں سرخی تھی۔

میں نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔ ''اس نے دروازہ اندر سے بند کر دیا اور بغیر کسی تمہید کے بولی۔ ''میں فیصلہ کرنے آئی ہوں۔''

''تمہیں کیا ہو گیا ہے قسطینا! بیٹھ کر بات کرو۔''

''فیصلہ بات سے نہیں ہوگا۔'' اس نے عجیب لہجے میں کہا اور اپنی شال کے نیچے اپنے ہاتھوں کو حرکت دی۔

قریباً ڈیڑھ برس پہلے کا وہ منظر آج تک میری نگاہوں میں تازہ تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں دو کولٹ پسٹل نظر آئے۔ اس نے ایک میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''میرے ساتھ چلو...... یا مجھے شوٹ کر دو...... ابھی...... اسی وقت۔ اگر تم شوٹ نہیں کرو گے تو پھر میں تمہیں کروں گی...... ابھی...... اسی وقت۔''

مجھے لگا کہ میرا اپنا پارا بھی چڑھ رہا ہے۔ میں نے پسٹل ایک طرف پھینک دیا۔ ''میں تمہیں شوٹ نہیں کر سکتا۔''

اس کی آنکھوں میں شعلے لپکے اور اس نے بے دریغ پسٹل میری طرف سیدھا کر لیا۔ وہ چند سیکنڈ تھے مگر صدیوں پر بھاری تھے۔ ہر لحظہ مجھے یہی لگا کہ وہ ٹریگر دبا دے گی۔ اس کے سرخ چہرے پر پسینے کی نمی نمودار ہوئی۔ پھر اس نے چلا کر پسٹل ایک طرف پھینک دیا اور مجھ پر پل پڑی۔ وہ کوئی معمولی حملہ نہیں تھا، وہ جنونی ہو رہی تھی۔ مارشل آرٹ سے اس کی رغبت اور اس کی سخت فوجی ٹریننگ نے اسے ایک خطرناک فائٹر بنا دیا تھا۔ کوئی اور ہوتا تو وہ لمحوں میں اس کی ہڈیاں توڑ ڈالتی مگر میں اپنا دفاع کرنے میں کامیاب ہو رہا تھا۔ ساتھ ساتھ میں چلا رہا تھا۔ ''قسطینا...... ہوش کرو...... خود کو سنبھالو...... یہ ٹھیک نہیں ہے۔''

ہمارے اردگرد کی کئی قیمتی اشیا ٹوٹ پھوٹ رہی تھیں۔ وہ مجھ سے گتھم گتھا ہو گئی......

ایک بغلی کمرے کی کھڑکی توڑتے ہوئے ہم باہر آن گرے۔ یہ ذیلی سڑک تھی۔ لوگ آ جا رہے تھے۔ یہ عجیب لڑائی دیکھ کر وہ دنگ رہ گئے۔ قسطینا نے ٹانگ چلائی۔ یہ ضرب اتنے زور سے میرے چہرے پر لگی کہ میں سنبھلنے کی کوشش کرتا ہوا ایک کراکری شاپ کے کاؤنٹر سے جا ٹکرایا۔ کاؤنٹر کے بڑے بڑے شیشے چکنا چور ہو گئے اور میں ان شیشوں کے اوپر گرا۔ قسطینا مجھے چھاپنے کے لیے مجھ پر جھپٹی۔ اگر وہ مجھ تک پہنچ جاتی تو عین ممکن تھا کہ شیشوں کی وجہ سے...... میرے ساتھ ساتھ وہ بھی زخمی ہوتی۔ میں نے اس پر پہلا وار کیا اور اپنی دونوں ٹانگیں جوڑ کر اس کے سینے پر ماریں۔ وہ دھکے سے کئی فٹ پیچھے گری۔ عین اسی وقت ایک لیموزین کار کے بریک بری طرح چرچرائے۔ قسطینا اس سے ٹکراتی ہوئی دور تک لڑھک گئی۔

''قسطینا!'' میں نے بلند آواز سے کہا اور اس کی طرف گیا۔ کچھ اور لوگ بھی لپکے۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ اردگرد موجود لوگ ہکا بکا تھے۔ اس طرح کی انوکھی لڑائی انہوں نے پہلے کہاں دیکھی ہوگی۔ اسی دوران میں عربی لباس والے ایک شخص نے ایمبولینس سروس والوں کو فون کر دیا تھا۔ ایک دو منٹ بعد ہی ایمبولینس پہنچ گئی۔ ہم بے ہوش قسطینا کو اٹھا کر نزدیکی اسپتال میں لے گئے۔ شعبۂ حادثات میں قسطینا کا چیک اپ ہوا۔ اس کے سر پر سخت چوٹ آئی تھی مگر زیادہ سنگین چوٹ پہلو کی تھی۔ لیموزین کی ٹکر سے اس کی دو پسلیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ اسے فوراً آپریشن تھیٹر میں لے جایا گیا۔ اسی اثنا میں فخر اور رضوان بھی پہنچ گئے۔ وہ بھی یہاں قسطینا کی آمد اور پھر اس کے زخمی ہونے پر ششدر تھے۔ صبح سات بجے کے لگ بھگ وہ تھیٹر سے باہر آئی۔

وہ اب ہوش میں تھی، مگر آنکھیں بند تھیں۔ شکر کا مقام تھا کہ پھیپھڑے پر زیادہ گہرا زخم نہیں آیا تھا۔ بہر حال اس کے لیے ضروری تھا کہ کچھ دن کے لیے ذرا بھی حرکت نہ کرے۔

میں چوبیس گھنٹے اس کے پاس اسپتال میں ہی رہا۔ وہ ٹرینکولائزرز کے اثر میں تھی۔ میں چاہتا تھا کہ اس کے مکمل ہوش میں آنے سے پہلے پہلے میں کہیں اوجھل ہو جاؤں، ورنہ پھر وہی طوفان برپا ہو سکتا تھا۔ میرے سفری کاغذات تیار تھے۔ میں ایک دو روز کے اندر ڈنمارک روانہ ہو سکتا تھا مگر اس رات ایک عجیب واقعہ ہوا۔ میں اسپتال کے وی آئی پی کمرے میں قسطینا کے تیماردار کے طور پر موجود تھا اور اس سے آٹھ دس فٹ کے فاصلے پر ایک بیڈ پر سو رہا تھا۔ رات کے وقت مجھے اپنے سینے پر بوجھ محسوس ہوا۔ آنکھیں کھول کر

دیکھا تو بھونچکا رہ گیا۔ وہ میرے سینے پر سر رکھے لیٹی تھی۔ ڈاکٹروں کی ہدایت تھی کہ وہ اپنی جگہ سے معمولی حرکت بھی نہیں کرے گی مگر وہ اپنے بیڈ سے اتر کر یہاں پہنچ گئی تھی۔

''قسطینا...... یہ کیا کیا ہے تم نے؟'' میں نے سخت پریشانی میں کہا۔

وہ اسی طرح لیٹے لیٹے غنودہ آواز میں بولی۔ ''تم دیکھ ہی رہے ہو۔''

''ڈاکٹر صاحب نے کیا کہا تھا، تمہیں یاد نہیں؟''

''تو کیا ہوگا؟ مر ہی جاؤں گی ناں...... مرنے دو۔''

میں نے دیکھا، اس کے پہلو کی بھاری بھرکم بینڈ تج پر خون کے نشان نمودار ہو گئے تھے۔ یہ سب اس کی حرکت کا نتیجہ تھا۔ میں نے اٹھ کر بیٹھنا چاہا مگر ناکام ہوا کیونکہ اس کا سر اسی طرح میرے سینے پر تھا۔ ''قسطینا! یہ ٹھیک نہیں۔ تم خود کو بہت نقصان پہنچا لو گی۔'' میں نے جھلا کر کہا۔

''میں خود بھی یہی چاہتی ہوں۔'' اس نے ایسے لہجے میں کہا جس میں کرب، مایوسی اور دکھ اپنی انتہا کو چھو رہے تھے۔ مجھے اپنے سینے پر اس کے آنسوؤں کی حرارت محسوس ہوئی۔ وہ بدترین حالات میں بھی روتی نہیں تھی مگر آج......

ایک دم میرے اندر ایک روشنی بجھ گئی اور ایک روشنی جل اٹھی۔ اس دوسری روشنی نے دھیرے دھیرے مجھے پوری طرح اپنے حصار میں لے لیا۔ میں نے اس کے کندھے کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا تاکہ اس کو خود سے دور ہٹا سکوں، پھر اس گرفت کا انداز بدل گیا۔ میرا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ میں نے دوسرا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا...... اور آہستہ آہستہ اس کے بالوں کو سہلانے لگا...... وہ کچھ اور بھی میرے ساتھ پیوست ہو گئی۔

یکا یک میں اپنے خیالوں سے چونکا...... میں وہیں ڈی پیلس کے کمرے میں صوفے پر بیٹھا تھا۔ قسطینا کی آواز نے مجھے تصورات سے چونکایا تھا۔ وہ ناشتے کی ٹرے لیے ہوئے جھک کر چلتی اندر آ رہی تھی۔ ٹرے اس نے اکیلے نہیں اٹھا رکھی تھی۔ اس کے ساتھ دو ڈھائی سالہ تاشفین بھی تھا۔ وہی ٹیسٹ ٹیوب بے بی جسے قسطینا نے گود لیا تھا۔ ایک طرف سے ٹرے ننھے تاشفین نے پکڑ رکھی تھی۔ قسطینا بولی۔ ''کہہ رہا تھا۔ میں ناشتا لے کر جاؤں گا۔''

قسطینا اور تاشفین نے ٹرے میرے سامنے رکھ دی۔ میں نے تاشفین کا رخسار چوما۔ کتنا ذہین، پیارا اور پیار کرنے والا تھا۔ اسے دیکھ کر یقین ہونے لگتا تھا کہ ماں کے پیٹ سے کوئی بھی برا پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تربیت، ماحول اور حالات ہوتے ہیں جو کسی کو شیطان اور کسی کو فرشتہ سیرت بناتے ہیں۔

میں نے دیکھا، ٹرے میں میرا بنایا ہوا ناشتا تھا مگر اس میں بادام، اخروٹ اور پنیر سے بنا ہوا جاماجی کا مزیدار حلوہ بھی تھا۔ یقیناً یہ ابھی قسطینا نے بنایا تھا۔ میں نے کہا۔ ''اتنا ہیوی ناشتا۔ بھئی یہ کیا سازش ہے۔ میں ایک شریف بندہ ہوں۔ تمہیں میری اسمارٹ نس سے کوئی خطرہ نہیں ہونا چاہیے۔ ویسے بھی جاماجی میں آج کل خوب صورت لڑکیاں کچھ کم ہی نظر آرہی ہیں۔''

وہ مسکرائی۔ ''مجھے آپ جناب سے کوئی خطرہ نہیں مگر جناب ہماری کمانڈو فورسز کے چیف انسٹریکٹر بھی تو ہیں۔ صبح سے شام تک مارشل آرٹ سے گتھم گتھا رہتے ہیں۔ آپ کو توانائی کی بہت ضرورت ہے۔''

میں نے کہا۔ ''میرے لیے توانائی کا بندوبست پہلوان حشمت کی طرف سے ہوتا رہتا ہے۔ پاکستان سے کل بھی ان کا ایک ''محبت نامہ'' موصول ہوا ہے جس میں بہت سے دیسی نسخہ جات درج ہیں۔''

میں نے ایک تہ شدہ لفافہ جیب سے نکالا۔ یہ پہلوان جی کا ہی خط تھا۔ میں نے قسطینا کو پڑھ کر سنایا۔ اس میں پہلے تو پہلوان جی نے کچھ مقوی دیسی نسخے درج کیے تھے پھر اپنا اور اردگرد کا حال احوال اپنے شاندار املاء میں لکھا تھا...... شاہ ظیب! تم نے جو رقم دی تھی اس میں بڑی برقت پڑی ہے۔ گوجرانوالا میں میرا ہڈی جوڑ کا کام چل پڑا ہے۔ بے وکوف لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے میں نے اپنے ساتھ کلینک میں ایک سرجن ڈاکٹر بھی ملازم رکھ لیا ہے۔ کبھی کبھی میں اور ڈاکٹر کسی ''کیس'' پر جھگڑ بھی پڑت ہیں۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ ایک میان میں دو بھینسیں تو بانسری ناہیں بجاسکتیں۔ بہرحال آخر میں سرجن صاحب کو ہی میری بات طسلیم (تسلیم) کرنا پڑ جاوت ہے۔ گوجرانوالا میں ہی میں نے تین مرلے کا بنا بنایا گھر پرچاز (پرچیز) کرلیا ہے۔ تمہاری دعا سے تینوں بڑے بچے اسکول جانا شروع ہو گئے ہیں۔ بڑا تو بہت ہی لائک نکلا ہے...... خاص طور سے اردو کے مضمون میں سب کو پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ اسی لیے تو میں کہا کرت ہوں۔

تھوڑی سی کمی ہے جور و جفا کی
ورنہ جوانوں میں ذہانت ہے بلا کی
سن لے او کاکا، سن لے او کاکی
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی ظرخیز ہے ساقی

میں اور قسطینا ہنسنے لگے۔ اسی دوران میں ہیڈکوارٹر سے کال آگئی۔ قسطینا اپنے کسی

ماتحت سے رسمی گفتگو کرنے لگی۔ میں نے اٹھ کر قریبی کمرے کی کھڑکی میں سے جھانکا۔ ہمارا تین چار ماہ کا خوب صورت بے بی، انگلش آیا کی نگرانی میں بے بی کاٹ کے اندر سو رہا تھا۔ میں نے نگاہوں نگاہوں میں اسے پیار کیا۔

اچانک چلانے کی زوردار نسوانی آواز آئی۔ پھر ٹیرس کی طرف کوئی ملازمہ بلند آواز میں پکاری۔ قسطینا نے فون بند کیا۔ میں اور قسطینا لپکتے ہوئے طویل غلام گردش سے گزرے اور محل کے وسطی حصے میں پہنچے۔ ابراہیم کی ایک خادمہ قالین پر بے ہوش پڑی تھی۔ دو خادمائیں فق چہروں کے ساتھ عقبی جانب اشارے کر رہی تھیں اور فریادی انداز میں کچھ بولتی چلی جارہی تھیں۔ جو چند الفاظ میری سمجھ میں آئے وہ یہی تھے۔ ''ہاناوانی...... وہ یہاں ہے...... وہ آگئی ہے۔''

''کیا بکواس ہے؟'' میں گرجا۔

اسی دوران میں کچھ اور افراد بھی افراتفری میں نظر آئے۔ ایک خواجہ سرا کے پیچھے لپکتے ہوئے میں اور قسطینا اس بہت بڑی بالکونی میں پہنچے جہاں سے ڈی پیلس کا وسیع و عریض احاطہ نظر آتا تھا اور شاہی خطاب کیے جاتے تھے۔ چند لمحے کے لیے میں اور قسطینا بھی ششدر ہوئے...... وہاں واقعی منحوس، نطفۂ ناتصدیق، ہاناوانی موجود تھی۔ مگر وہ انسانی قامت میں نہیں تھی۔ اس کی بلندی تقریباً تیس فٹ رہی ہوگی، چوڑائی چودہ پندرہ فٹ کے قریب تھی۔ وہ اپنی بہت بڑی زرنگار کرسی پر بیٹھی تھی۔ آنکھوں پر سیاہ چشمہ اور جسم پر قیمتی گہنے نظر آتے تھے۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ سب گہنے پیتل کے تھے۔ ہاناوانی کا یہ بلند و بالا مجسمہ لکڑی اور ہارڈ بورڈز وغیرہ سے تیار کیا گیا تھا۔ بہت سے مقامی لوگوں نے اسے بانسوں کے ایک جال پر اٹھا رکھا تھا۔ عقب میں بھی ہزاروں لوگ تھے۔ وہ پُرجوش نعرے لگا رہے تھے۔ مزید لوگ بھی احاطے میں داخل ہو رہے تھے۔

قسطینا نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''آج وہ دن ہے جب جاماجی کی لڑائی ہاناوانی اور اس کے بیٹے کی بدترین شکست پر ختم ہوئی تھی۔ یہ لوگ اس کی یاد منا رہے ہیں۔''

''مگر...... ہاناوانی کا یہ مجسمہ؟''

''میرا خیال ہے کہ یہ لوگ اسے آگ لگائیں گے۔''

قسطینا کا خیال درست تھا۔ دیوہیکل مجسمے کو لوگوں کے ہجوم میں ایک کشادہ جگہ پر رکھ دیا گیا۔ مقامی عاملوں نے اس مجسمے پر کچھ تعویذ وغیرہ باندھے اور کچھ پڑھ کر پھونکا۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح یہ اندیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا کہ یہ منحوس عورت کبھی اپنی قبر

سے نکل سکے گی۔ یہ سب دل کو تسلی دینے والی باتیں تھیں ورنہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اس بدکار عورت کی بری روح دو سال پہلے سکھیرا کے نواح میں...... مکئی کے ایک کھیت کے اندر گوبر اور کیچڑ میں لتھڑ کر اپنے قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی تھی۔

ایک مشعل کے ذریعے ہاناوانی کے مجسمے کو آگ لگائی جانا تھی۔ اَن گنت لوگوں نے نعرہ زنی شروع کی۔ وہ مجھ سے درخواست کر رہے تھے کہ میں خود نیچے آ کر اس مجسمے کو آگ دکھاؤں۔ یہ مجھ سے ان کی دیرینہ محبت اور چاہت کا ایک اظہار تھا۔ جب اصرار بڑھا تو میں قسطینا اور جواں سال ابراہیم کو لے کر بالکونی سے نیچے آیا۔ مجسمے پر تارپین کا تیل چھڑکا گیا تھا اور اس کی بُو ہمیں صاف محسوس ہو رہی تھی۔ ہم تینوں نے اس مشعل کے ذریعے ہاناوانی کے مجسمے کو آگ لگائی۔ مجسمے نے لمحوں میں آگ پکڑی اور شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ عین اسی لمحے لوگوں نے فلک شگاف نعرے بلند کیے اور بے شمار، جوتے، چپلیں اور پتھر وغیرہ اچھلتے دکھائی دیئے۔ یہ سب کچھ نفرت کا اظہار تھا اور یہ سب کچھ بھی الاؤ کا حصہ بن گیا۔

دہکتے انگاروں کے اوپر دھواں آسمان پر پھیلتا جا رہا تھا۔ اس گاڑھے دھوئیں کی عمر نہ ہونے کے برابر تھے۔ اس کے عقب میں جاماجی کا چمکتا ہوا سورج تھا، اور نیلا آسمان تھا اور نئی نویلی صبح کی شفاف ٹھنڈی ہوا تھی۔

سب کچھ اچھا تھا...... مزید اچھا ہونے والا تھا مگر ایک نہ مٹنے والی یاد تو میرے دل میں موجود تھی۔ ایک کسک تو زندگی کا حصہ تھی۔ بے شک کچھ لوگ زندگی سے نکل کر بھی کسی نہ کسی صورت زندگی میں موجود رہتے ہیں...... ہر اہم موڑ پر یاد آتے ہیں۔ کوئی مانے یا نہ مانے، کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے لیکن حقیقت یہی ہے کہ ہم سب کی زندگیوں میں کوئی ''ایک'' تو ایسا موجود ہوتا ہی ہے......

○......ختم شد......○